

سرکش از محمود احمد مودی {ایدمنز اردو بکس}

3

2

1



5

4

9

8

7

12

11

10

سکس



محمود احمد مودی

پیش لفظ

کمانیاں ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہیں، سنی جاتی رہی ہیں، پڑھی جاتی رہی ہیں، اور یہ سلسلہ شاید اب تک جاری ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ انداز بدلتے رہے۔ ہر رنگ، ہر رنگ اور ہر ڈھنگ سے کمانیاں سامنے آئیں۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، کہ ڈائجسٹوں نے کمانی فکسی اور داستان طرازی کو بہت سے نئے اسلوب دیے، جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی رہے اور اپنی اپنی جگہ ایک نئی روایت بھی بنے۔ ادب کا کوئی غیر متعصب مورخ اگر کبھی ادب کی دوانتہ ارانہ اور غیر جانبدارانہ تاریخ مرتب کرنے بیٹھے گا، تو افسانہ طرازی میں ڈائجسٹوں کی طویل خدمات اور ان کے ناقابل فراموش کردار کا تجزیہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ ہمارے ملک میں جہاں پہلے تو خواندگی کی شرح شرمناک حد تک کم ہے، پھر لوگوں میں قوت خرید اس سے بھی زیادہ شرمناک حد تک کم ہے اور پھر کمانیں رسالے خرید کر پڑھنے کا رجحان اس سے بھی زیادہ شرمناک حد تک کم ہے وہاں ڈائجسٹوں کی اشاعت لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے بھی اوپر گئی جبکہ لاکھوں افراد انہیں لائبریریوں سے کرائے پر لے کر بھی پڑھتے رہے۔ تو بلاشبہ یہ ڈائجسٹ ڈکان لے والوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے بشرطیکہ تعصب اور جہالت کی عینک اتار کر اس حقیقت کا جائزہ لیا جائے۔ ڈائجسٹوں نے بہت بڑی ریڈر شپ پیدا کی۔ لوگوں میں پڑھنے کی عادت پیدا کی۔ ایسے حالات پیدا کیے کہ کم از کم دس ہزار لوگ لکھنے لکھانے کو کل وقتی پیشے کے طور پر اختیار کر چکے۔

[illegible]

لکھنے کے قصن میں پیشہ میری کوشش رہی ہے کہ میری تحریروں زندگی سے قریب تر ہوں۔ میں اپنے کردار اپنی گلی کوچوں سے ہی لیتا ہوں۔ وہی گلی کوچے جن میں آپ اور میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہ سب کردار ہمارے ارد گرد کہیں نہ کہیں بکھرے ہوتے ہیں۔ تھوڑی بہت رنگ آمیزی بہر حال مصنف کا حق اور داستان طرازی کا تقاضا ہے۔ اس طویل کہانی میں متعدد کرداروں کے بارے میں آپ کو گماں گزرے گا کہ آپ زندگی میں کہیں نہ کہیں ان سے مل چکے ہیں یا انہیں دور سے دیکھ چکے ہیں۔ اس کہانی میں کہیں ظہر و مزاج کا مدحدر آپ کے محسوسات کو گدگدائے گا تو کہیں زندگی کی بے ہودہ حقیقتیں آپ کو خون کے آنسو رلائیں گی۔

”سرکش“ ایک سادہ دل اور مصوم لوجوان کی کہانی ہے جسے وقت کا دھارا اپنے ساتھ بہاتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں لے گیا۔ زندگی نے اسے کیا سے کیا بنا دیا لیکن بنیادی طور پر وہ سادہ و مصوم اور نیک طبیعت ہی تھا اور یہی رنگ اس پر غالب رہا۔ موقع میر آئے ہی اس نے رخصت حیات کو اپنی خواہش کے مطابق مثبت راستوں پر ہی چلایا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ صاحب کو کوئی پسند نہیں کرتا اس کے باوجود میں نے ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ، کسی نہ کسی ڈھنگ سے اپنی تحریروں میں مصدقیت برقرار رکھنے کی پوری پوری شعوری کوشش کی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری یا مجھ جیسے دوسرے مصنفوں کی تحریروں نے اس معاشرے سے کیا فائدہ کم کرنے یا قاری کو EDUCATE کرنے میں کوئی کردار ادا کیا ہے یا نہیں، لیکن اپنے اپنے وسائل اور مواقع کی مناسبت سے اپنی سی کوشش کیے جانا ہر باخیر تخلیق کار کا فرض ہے البتہ کہانی نویس میں اپنے ذاتی سیاسی نظریات کی جھلک یا واضح عکس لے آنے کا میں قائل نہیں ہوں۔ یہ چیز مجھے دوسروں کی تحریروں میں بھی بری لگتی ہے کیونکہ یہ بہت ٹپ پو نیچا قسم کا عمل ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پچاس برس سے ہمارے ملک میں ٹپ پو نیچا سیاست ہی ہو رہی ہے۔ منافقت، مکد فریب اور اپنے سوا ہائی سب کو بھاد کر دینے کے منصوبوں کا نام ہمارے ہاں سیاست ہے۔

میں ”سرکش“ کے بارے میں کبھی کسی خوش فہمی میں جھلا نہیں رہا۔ میرے خیال میں یہ کوئی بہت شہلکہ خیز، سرکش آرا یا چاروں طرف دھوم مچا دینے والی تحریر نہیں تھی۔ اس میں تھیب و فراز بھی آتے رہے۔ کچھ لوگوں نے ہمیشہ اسے بہت پسند کیا۔ کچھ نے بھی پسند کیا تو کسی قلم کو ناپسند کیا اور آگے چل کر پھر پسند کرنے لگے۔ میں ملا جلا معاملہ چلا رہا جیسا کہ زیادہ تر قلم دار کہانیوں کے بارے میں چلتا ہے لیکن جب اسے بند کیا تو ایک عجیب کرامت برپا ہو گیا۔ اس کے اختتام پر جس قسم کے خطوط ادارے کو موصول ہوئے اور جس طرح کے کچھ خطوط مجھے ذاتی طور پر براہ راست بھی موصول ہوئے انہیں پڑھ کر میں سخت حیرت زدہ ہوا۔ ان میں سے بعض تو تقریباً ناقابل یقین تھے اور اس بات کا حیرت انگیز ثبوت تھے کہ بعض کہانیاں لوگوں کی ذاتی زندگی پر کس شدت سے اثر انداز ہوتی ہیں اور تبھی مجھے یہ گماں بھی گزرا کہ یہ بہر حال اپنے دور کی ایک بے پناہ پسند کی جانے والی کہانی تھی..... لیکن بہر حال ہر داستان کو..... یا پھر داستان نویس کو ایک نہ ایک روز ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ کہانی مکمل اور کتابی صورت میں پیش خدمت ہے۔ ایک قلمساز کے ساتھ نئے سرے سے پڑھنے کا لطف اپنی جگہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کبھی کسی سے کچھ قصیں مس ہو گئی ہوں اس کے لیے بھی یہ کتابی سلسلہ خوش آئند ہوگا..... اور نئے قارئین کے لیے تو بہر حال یہ ایک خصوصی تحفہ ہی ہوگا۔

----- آپ کا اپنا -----

دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔-----

ابھی گر پڑیں گی لیکن بچوں کے معاملے میں انھوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

گھر یا تھا میں ایک بڑا سا نیم بچہ ہال نما کمر تھا جس کے وسط میں ڈیڑھ دو گواہی ایک دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جو روہ داری کا نہیں محض حد بندی کا کام دیتی تھی۔ دونوں بھائی ایک ایک حصے میں رہائش پذیر تھے۔ وہیں سب بچوں سمیت سونا،

دہیں کھانا پکانا اور وہیں نہانا دھونا۔

احاطے میں چھوٹا ایک چھوٹا سا کمر ابھی تھا یہ میری اور والدہ صاحب کی خواب گاہ تھی۔ میں اپنے والد کا اکلوتا لڑکا تھا۔ آپ کو شاید حیرانی ہو رہی ہو گی کہ میرے والدہ صاحبہ دلیریائی مقابلے میں اپنے بھائیوں سے اتنا پیچھے کیوں گر رہ گئے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میری والدہ مجھے یعنی پہلے بچے کو جنم

دی بچپن کی ہر یاد میرے ذہن میں تسلسلے کی طرح جھلکاتی ہے حالانکہ

موجودہ زمانے کے میدان کے مطابق ان یادوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ایک سرحدی قصبہ تھا جہاں میں نے ہوش سنبھالا۔ شکر گڑھ اس کا نام ہے۔

ہمارے گھر میں خدا کا دیبا سب کچھ تھا میرا مطلب ہے

کہ دولت و خوشحالی کے علاوہ سب کچھ۔ میرے دور چچا بھی اسی گھر میں رہتے تھے اور ان کے درمیان گویا زیادہ سے زیادہ بچوں کا باپ بننے کا مقابلہ جاری تھا۔

میری دونوں چچیوں کی حالت بڑے تھکا تھی۔ دونوں بڑوں کا ڈھانچہ بن چکی تھیں۔ جسم میں گویا خون کی رشتیں ٹپک رہی تھیں۔ بیٹھ جاتی تھیں تو اٹھنا نہیں جاتا تھا اور اٹھ جاتی تھیں تو گھٹا تھا کہ

جیسے عورت ہو چکی ہیں، تم ہو جاتی ہیں لمبا بی کا خیال تھا کہ میں
میرٹک کر کے کسی دختر میں ٹوک باہر کے خاندان کا نام بدش
کر دوں گا۔

میں ان کی خواہش کی تعمیل میں بڑی باقاعدگی سے اسکول
جاتا تھا اور بڑی باقاعدگی سے ماسٹر صاحب کی ٹانگیں دیکر
ان کے گھر کا سودا سلف لاکر اور دیگر چھوٹے موٹے کام کر کے
گھر آ جاتا تھا۔ کبھی کبھی انھیں دیکھنے سے فرست مٹی مٹی
تو وہ انداز کم کچ پڑھا بھی دیا کرتے تھے۔ قصور مان کا بھی
نہیں تھا۔ اس کی سرکاری تعلیم انھوں نے ایک مرتبہ مجھے
بتایا تھا کہ ان کی خواہ مزاد سے سے کم یعنی چھ مہر دے
ہو چکا ہے۔ یہ نہیں ہے اور اس کی وصولی کے لیے بھی انھیں
خبر کے جو شرموگر لگانے پڑتے ہیں۔

اسکول سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس وقت ہی
وقت ہوتا تھا۔ گھر میں اس دندرد سما جو کڑی رہتی تھی کہ کسی
گور میرا خیال نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں
بابا جی اور دولوں بچا شام ڈھلے ٹھکے ہائے آتے تھے اور
چند ٹیپ کے نیچے بیٹھ کر باری باری نہاتے تھے اور پھر کھانے
پر روت پڑتے تھے۔ کھاتے ہی لیٹ جاتے تھے اور رات
کا اندھیرا گہرا ہونے تک اٹھاتے گھر میں نہیں پورے قصبے
پر سکوت چھا جاتا تھا۔ انسان خاموش ہو جاتے تھے اور گھٹے
بیٹھ گنا شروع کر دیتے تھے۔

اس کیسٹ سے آگے کبھی کبھی میں قصبے سے نکل جاتا
تھا۔ سیالکوٹ کو جانے والی ٹرک کے قریب سیم زدہ زمین
میں ایک جگہ نہلا تھا جس پر چھوٹی سی بلیا بنی ہوئی تھی۔
اس بلیا کی دیوار پر بیٹھ کر میں آتی جاتی لاریوں اور ٹریلوں کو
دیکھتا کرتا اور نہ جانے کیلک ہو جا کرتا۔ یہ تو میں آپ کو بتا رہی
ہوں کہ سوچنے کی بیماری مجھے بچپن سے لاسی تھی۔ بچپان
یہ دیوار گویا میرا مرکز غور و فکر تھی۔

پراہی اسکول سے نکل کر میں ڈل اسکول میں آیا تو ایک
ڑکے سے میری بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ نام تو اس کا
میرا بن تھا مگر چونکہ قصبوں و ممالک کی دیرینہ روایت چلی آ رہی
ہے کہ کسی کو اس کے مبع اور اصل نام سے نہ پکارا جائے۔
اس لیے اسے میرا جو کہا جاتا تھا۔ خود میرا اپنا بھی یہ حال
تھا کہ نام تو افضل تھا مگر پکارا نہ گئے۔ نام سے جانا تھا۔
راجو مٹی سارا کا تھا۔ قد کا ٹھیک ٹھیک سے تقریباً آدھا
لیکن تھا بہت بدعاش۔ اس کے باپ کی کرپانے کی دکان
تھی جہاں عوام آ کر جو بھی بیٹھا پڑتا تھا۔ سب سے پہلا کام

ہی تے ہی اس دکان سے رخصت ہو گئی تھیں۔
بابا جی کو چھ کاتے تھے چھوٹے بچے کی ہاتھ میں دیتے
تھے اور سیلے وہ ہیں ہنسی خوشی رواشت کر رہی تھیں۔
بچے میں ایک آدم مرتبہ وہ ہمارے اعلازم خصوصاً ڈرگا بھی
بندوبست کرتی تھیں۔ یعنی اس بعد ہمارا تمام ایک ہاتھ کوشت
پکایا جاتا تھا جس کے لیے آٹا راد کا استعمال کیا جاتا تھا۔ مٹی
بڑی آج کل دیکھی نہیں ہوتی۔

قصور بھی کا بھی نہیں تھا۔ میرے ابا اور عجمائی مٹی کی
مٹی اس میں بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ مٹیوں بھائی دراصل ملک اسمان
صاحب کے مزار سے تھے۔ سو روپے جینے سال میں دو چار روپے
پٹروں کے اور ہر فصل پر چند روپاں مٹے کی مٹی قصبے صاحب میں
سوچتا ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ان آج کل پر ہم سب
کا گراؤ کیونکر ہو رہا تھا اور ہم زندہ کس طرح تھے؟ ورنہ کچھ

میں آگے سے کہ اس وقت جو ٹیکہ اس کٹر مل کیٹیاں اور غو نہیں
بنی تھیں اس لیے ہر چیز کی تلاش کٹر مل میں تھی۔

خاص خوراک اور شربت زندہ ماحول اور تمام تر ضرورت ہاں ہیں
سین کے باوجود میری اٹھان اور صحت گھر میں سب سے بہتر
تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اپنی دل پر کیا تھا۔ اللہ انھیں
جنت میں ملے دے۔ میں نے سنا ہے وہ خاص حسین اور عبادہ و جلال
والی خاتون تھیں۔ وہ اس گاؤں کی نہیں تھیں۔ کشمیری تھیں۔ یہاں
یہ وہی میں صحت بیمار تھا۔ شاید اسی وجہ سے آج بھی نے ان کے
بعد دوسری شادی نہیں کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصل وجہ یہ
ہی ہو کہ وہ ذہن کوئی لاوارث خاتون تھیں۔ نہ آتی ہو کیا کہا
جا سکتا ہے۔ وہ دل کے بعد اللہ ہی جانے۔

بابا جی کو مجھے تعلیم دلانے کا بہت شوق تھا۔ ان کی خواہش
تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں یعنی میرٹک کروں۔ ہمارے
قصبے میں ڈل، سکول تو موجود تھا۔ بابا جی کا ارادہ تھا کہ اگر میں
ڈل، اسکول کام مدرسہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ مجھے میرٹک
کے لیے سیالکوٹ بھیج دیں گے۔ خواہ اس کے لیے انھیں اپنا
سارا اثاثہ بچا پڑے۔ میں ان سے کبھی روچھنے کی جرأت نہیں
کر سکا کہ وہ اثاثہ تھا کیا؟ جنگ کا سی وہ دو چار ہائیاں جن پر ہم
سوئے تھے یا وہ کاد ٹرک جس میں ہم اپنی دھوئیاں اور
کڑتے رکھتے تھے؟ یا چھروہ ٹرادی گائے جو ہر وقت چرتی
رہتی تھی لیکن دودھ چن قطر دل سے زیادہ نہیں دے تھی۔

بہر حال... بابا جی کے پاس کوئی اثاثہ تھا یا نہیں میرے
لیے ان کا جذبہ ہی ناقابل فراموش ہے۔ آج بھی ان کی باتیں یاد
آتی ہیں تو میری آنکھیں جو اب بے حد شاک، نامہرواں اور

رومانی ٹاول

75/-	حمیدہ جمین	زیمب
75/-	حمیدہ جمین	شام بربہ
75/-	حمیدہ جمین	حتا اور پتر
75/-	حمیدہ جمین	گیت یہ میرے

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

نے گھوڑے پر اکٹھا کیا کسی نے کہا نہیں ویسے میں اعتقاد
واسکٹ کی جیب میں ایک چھوٹا سا جاکوڑا لایا تھا ہم نے
لالی جی میں بیٹھے بیٹھے کچھ گڈیریاں پڑھیں پھر اچانک سے لنگے کی
دوسرے ٹیس سٹاک کر ایک لمبے دی۔ مجھے سگریٹ بینی تو نہیں
آتی تھی لیکن میں بھی راجو کے انداز میں کش لے کر فضا کو محسوس
کے غرابے کرتا رہا اور چٹکی بجا بجا کر راکھ جھانک رہا ایک
بار میں نے دھواں حلق سے اتارنے کی کوشش کی تو پھندا
لگ گیا اور آنکھیں باہر کھل گئیں چنا پھر میں نے دھواں
لنگے کی کوشش ترک کر دی آج میں پہلی بار ڈروکھواں جوان جوان
ساحسوس کر رہا تھا۔

فلم دیکھ کر اور راجو کو خدا جاننا نہ کہ میں گھر آیا تو سب
سوچے تھے۔ جگر ہٹا کر بے میں آیا جی بھی خولنے سے
تھے لیکن میں اپنی چارپائی پر بیٹھ لگا تو انھوں نے اچانک
سر اٹھا کر کہا بیٹا! رات کو دریسے گھر نہ آیا کرو فلم دیکھنی ہوا
کے تو اقرار کو حق سے چھ والا ڈروکھواں کر دے کہ کہ انھوں
نے دوبارہ سر تکیے پر رکھا اور خڑاٹے لینے لگے۔

میں سرور کے ماسے ہونے پر جس کی طرح چارپائی میں
دب گیا میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر انھیں کس طرح علم ہوا
کہ میں فلم دیکھنے گیا تھا۔ اس رات مجھے بہت درد میں جا کر
زندہ آئی۔ میری رگ وہے میں اس طرح سنسنی دوڑ رہی تھی
جیسے میں نے واقعی کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہو فلم کے
منظر میں سے ذہن سے گزری نہیں ہوئے تھے میری یکذلت
بہرہ زندگی میں پہلی بار مجھ کی ایک لمبی آنکھ
بڑی مشکل سے زندہ آئی۔ اس رات میرے پسوں

وہ بکرتا تھا کہ ابتدائی آمدنی کے مددین وہ پہلے جیب میں ڈالتا
تھا بعد میں پیسے لگے میں ڈالنا شروع کرتا تھا
اسکول میں وہ بڑا شریف زادہ بن کر رہتا لیکن شام
کو جب ہم چھاپڑے تو اس کے کتے میں پاں دبا ہوتا اور
انگوٹوں میں نیچے کا سگریٹ دیکھا کی دیوار پردہ میرے قریب
ہاگ پڑا رنگ دکھ کر بیٹھ جاتا اور جیسے کتے سے کچلی بجا
بجا کر راکھ جھانک اور جب کوئی کتلی بڑی راکھی یا عورت پگھڑی
سے گزرتی تو اس طرح اسے اکٹھا کرتا کہ وہ تو نہ دیکھنے پائے
لیکن میں صبور نہ تھا۔

فلیں دیکھنے کھڑا ہو رہا سیما تھا۔ اس نے مستطابھے
اینا فلم بینی کا ساتھی بننے کی دعوت دے دی پیسے تو اس کے
پاس ہوتے ہی تھے ایک جگہ دو گھنٹہ خریدنا اس کے لیے
کوئی مسئلہ نہیں تھا میں اس کا مقصد تو سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے ایک
در سے بڑی گھڑی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا میں قد
کاٹھ میں کوس میں سب سے بڑا تھا اور وقت سے پہلے ہی
میری سس سس بھیجے جی تھیں مجھے کلاس مدم میں پہلے بار دیکھنے
والا تو یہی سمجھتا تھا کہ شاید میں دو چار سال قبل ہوتا ہوں۔

بہر حال مجھے راجو کے ساتھ فلم دیکھنے کے لیے چلنے میں
کوئی تھکن نہیں تھا وقت میرے پاس بہت تھا وہاں ٹرائی کا
اتفاق مجھے کسی بڑا تھا لیکن ایک بات بہر حال ملے تھی کہ میں
کسی سے ڈانٹا جی تھا نہ زندگی کی یکسانیت سے میں پہلے ہی بڑا تھا
تھیں کے راجو میں ایک سینما ڈاس ہو جڑ تھا تو
اس کی انڈیل لوہ کا سے جس سے عمل میں آتی تھی لیکن نام اس
کاشیش عمل تھا۔ اس کے نہایت بد حال قسم کے ہال میں پانی
دھو کی کسی پر لندھیے میں بیٹھ کر میں نے جب اپنی زندگی کی
پہلی فلم دیکھنی شروع کی تو مجھے میں قد سنسنی محسوس ہو رہی تھی
انہی شاید کوئس کو پہلی بار امریکا کی سرزمین دیکھ کر بھی نہ ہوتی ہو۔

کئی مٹا فیر میں بیٹھ سے اس حد تک اچھا لکھ لکھ لکھ
فرگرتے کرتے پکار کئی مناخا پیدا ہونے میرا تھوہا کہ مجھے
بدول کے اظہار سے باز رکھا کہ ہمارے ارد گرد جذبات
کا اظہار جاری تھا۔ رئیس اسٹیبل اندر ب... ب... ب...
کی آواز میں وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ ایک مرتبہ
تو میری جگہ پر جانا میری تھی نے جالی دار نقاب پہن کر وقف
شروع کیا تو ساتھ ہی ایک دھوئی پوش نوجوان نے جی اسکرین
کے پورے کے پاس ناچنا شروع کر دیا۔ ہم تھوڑا کلاس میں
بیٹھے تھے اور ہی کچھ بھی نہ ہوتی تھی۔
انٹرول کے دوران میں صرف ایک کانٹا موٹھوں والوں

جب راجہ میر کا اور میں دونوں کا کردار ادا کرنا ہوتا تھا تو راجہ زمین پر گر کر ہوتی بی بی میر میں کی طرف اشارہ کر کے ہنستے سے کہتی ہوتی آواز میں کہتا ہوا بے غیرت اچھے اس لڑکی کی عزت پر اتنا ڈالتے ہوئے شرم نہیں آئی، میں تجھے کیا بجا جاؤں گا؟

میں ایک عقائد امیر فقہ لگانا اور راجہ میر بھٹ پڑنا میں بھڑک مٹ مار کھانے لگا۔ ایک بار اس نے سچ بچ مجھے گھونسا دیکر دیا جو اتفاق سے میرے گھٹنے پر لگا اور وہ ہاتھ نہ نکال رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سی سوچ اٹھ گئی تھی۔

کبھی کبھی ہم کھیتوں میں بی بی میر کی گھوڑے سے بھی دوڑاتے اور کھیتوں میں کام کرتی ہوتی بی بی میر کی لڑکی کو اٹھا کر گھوڑے پر ڈال کر فرار ہونے کی کوشش کرتے، اس قسم کی شرمگاہ میں ایک مرتبہ تو ہم اتنے محو ہوئے کہ سیدھے نہریں بن کر گئے۔ وہ تو شکر ہے کہ ہم دونوں ہی کو تیرنا آتا تھا، ورنہ اس وقت تو اس پاس کوئی بچانے والا بھی نہیں تھا اور اس مقام پر نہر بھی بھی کچھ زیادہ ہی گہری۔

ہم آٹھ گھنٹے محنت میں بی بی میر کے تھکے اور رونا داری کی ہمیں خاصی سمجھ آنے لگی تھی۔ ویسے بھی عام لڑکوں کی نسبت ہم دونوں ہی کی ذہنی سطح بلند تھی۔

ایک مرد میں بی بی میر بھاگتا پھیل کر چرس رہا تھا کہ نہ جانے کس طرف سے ایک نہایت مقررہ انداز میں آواز سنائی دی "آج تمہاری بی بی میر کی نہیں آئی کیا؟"

میں گتے سمیت دیوار پر سے اٹھ کر گتے چلا رہا تھا کہ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو بیکار کے سر سے پوچھنے

وہ بے صافی کی لڑکی کھڑی نظر آئی، وہ سر اٹھائے میری طرف دیکھ کر شکر ادا ہی تھی اور اس کے ہوا ر سفید مات، ذہل سے رنگے ہوئے ریلے سانچے میں ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے۔

دیہاتوں وغیرہ میں ہم جیسے مزدوروں اور ان کے بالی بچوں کو بھی کئی کمین ہی سمجھا جاتا ہے بلکہ کئی کم اور کمین زیادہ... لیکن صلی تو ہم سے بھی کمتر مخلوق شمار ہوتے ہیں۔

وہ اصل، ملک صاحب کے اضلاع میں کام کرتا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہاں اس کی عزت تھی یا نہیں، لیکن اس کی لڑکی انہماک کے بلے میں جیتے ہی سنا تھا کہ مصنی ہوتے ہوئے ہی اس میں غور ملایا جوتا تھا۔ ملک کے گھر میں کام کرنے جاتی تھی مگر

کی نوعیت بھی بدل گئی۔ پہلے عموں خواتین میں گئے، بھالو گیدڑ اور گھوڑے وغیرہ نظر آ کر کرتے تھے لیکن اس رات میوہ عام سے مشابہ لڑکیوں کے بھڑک مٹ کے نظر آتے رہے۔ گھوڑا بھی نظر آیا لیکن اس پر زرق برق شاہانہ لباس زیب تن کیے اور سر پر تاج سجائے میں خود شگاہا تھا۔ پولیس تیار بھی ٹھیک اور ہی تھی غائب میں نے لڑکیوں سے کہہ کر اس کی شکل میں لگنے سننے میں کچھ زیادہ ہی وقت ضائع کر دیا۔ کیونکہ جب گشتوں کے پھٹنے لگانے کی نوبت آئی تو کسی نے مجھے جکادیا۔

وہ بھی نفس پر حسب معمول بالائی لیے میرے قریب کھڑی تھیں اور حکم دے رہی تھیں کہ میں گانے کا دودھ وہ لوں پہلی بار میں اس وقت لگانے جانے پر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس کیفیت گانے کے تھنوں سے دودھ نکالنا، سحر آؤں سے تیل لگانے کی نسبت زیادہ مشکل کام تھا۔

بہر حال گھٹے سموات اپنی جگہ جاری ہے لیکن اس دن کے بعد راجہ میر دوستی اور بھی مضبوط ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کے دوست ہی نہیں ایک دوسرے کی عزت بھی تھے۔ میں اس کا باری کا ڈھقا دھیرا سا رہا کہ کاراؤنڈ شیر۔ نعمت ہی کا شعل بڑے تو اثر سے جاری تھا۔ اب تو مجھے تمام آواکوں کی شناخت بھی ہو چکی تھی۔

شام کو کبھی کبھار میں اور راجہ میر میں موچھے کے چائے خانے پر بھی بیٹھتے تھے۔ موچھا چائے بھی پیتا تھا اور ساتھ ساتھ سائیکل کے پچر بھی لگاتا تھا۔ ان دونوں کاموں میں کیا قدر مشترک تھی میں بھی نہیں سمجھ سکا۔ شاید قدر مشترک آدمی تھی دونوں ہی کام اچھے چلتے تھے۔ موچھے کے ہاں اجاد آتا تھا اور کبھی کبھار دنیا جہاں کے دھکے کھانا کھانا کوئی فلمی رسالہ بھی اپنی تھا تھا۔

کبھی کبھار میں اور راجہ میر میں باس یا بیلا پر ویرانی دیکھ کر شرمگاہ بھی کیا کرتے۔ تمام کردار ہم پس میں بانٹ لیا کرتے۔ کبھی راجہ میر میں جاتا اور میں دونوں کبھی میں رو جاتا اور راجہ میر میں وہ اپنے گلے میں پڑے ہوئے رومال کو آچل بنا کر اس کا سر اٹکلی پر بیٹھتا اور کھوتے ہوئے غمزہ اور باریک سی آواز نکالتے ہوئے پوچھتا "تم مجھے چھو کر تو نہیں جانتے تھے شہری بابو؟"

میں بھاری لیکن روینٹک آواز بنا کر کہتا "کیسی باتیں کرتی ہو گاؤں کی گوندی! ہم نے تو اپنی زندگی تمہارے نام پر گزاری ہے۔ ہمیں چھو کر کہانے سے تو بہتر ہے کہ ہم دنیا ہی چھوڑ جائیں۔"

اردو کے شاہکار سفر نامے	ضیاء ساجد	200/-
فنتح مشہور سفر نامے	ضیاء ساجد	250/-
فنتح مشہور افسانے	ضیاء ساجد	150/-
منتخب اعلیٰ افسانے	ضیاء ساجد	125/-

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

پٹائی کا گولہ لے کر دل کے ساتھ ساتھ گزرتے اور پچھڑے پچھڑے بھی دھڑکنے لگیں گے، اُس دن کے بعد سے مجھے تاجاں بابا جی کہتا ہے۔

”جہ... جہ... جہ... میں نے سُکراتے ہوئے کہا۔
عشق کا ایسا دردناک انجام۔ اُسے سائل حسینہ، تجھے کس کم عمر عاشق کا دلوں کی نہیں دکھانا چاہیے تھا؟ تجھے حیرت تھی کہ راجو نے یہ واقعہ تجھے نہیں بتایا تھا حالانکہ وہ مجھ سے کوئی بات چھپانا نہیں تھا۔
”ہڈا سا تو وہ ہے تاجاں بولی تو ادب باتیں کرتا ہے اتنی بڑی بڑی۔“

”میرے ہائے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے گناہ بابر پر دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھٹھکتے ہوئے کہا، ”وہ تو ڈسا اساتھیں تھیں۔“
”اُس نے گناہ اٹھا کر میرے کندھے پر مارا اور بدستور سنی ضبط کرتے ہوئے بولی، ”یہ تم دونوں اتنی چھوٹی چھوٹی عموں میں اتنے بدعاش کیوں ہو گئے ہو؟ میں نے سنبھلے کم فہم بہت دیکھتے ہو۔“

”قصور فلموں کا نہیں سائلو حسینہ!“ میں نے دردناک لہجے میں کہا، ”قصور ہماری رگوں میں دوڑتے ہوئے لو کہاتے پھر میں نے سبجہ بدل کر سنبھلے ہوئے پوچھا، ”تم نے ما جو کویری میری دیکھ لی؟ کیا تھا؟“
”تم دونوں یہاں شوٹنگ جو کرتے رہتے ہو؟ اُس نے سُکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تھیں کسے معلوم ہوا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، ”تم تو شوٹنگ شروع کرنے سے پہلے الطینان کر لیتے تھے کہ وہ دور تک کوئی موجود تو نہیں؟“
”میں دباں ہوتی تھیں، اُس نے کافی فاصلے پر موجود ایک

کیا حال پر مالکوں اور ملازمین میں سے کوئی میری نظر سے بچنے لے رہا تھا۔
دیر نہ لگوں کے ڈریوں پر تو اس ہلنے کی دیکھاں گھر کی مرنی ہی ہوتی تھیں۔
تاجاں کی شہرت بڑی تھی، جیسے جیسے سنا تھا کہ رنگ پر کھنکھ نہیں بیٹھنے دیتی، کام سے کام رکھتی ہے اور کام ختم کے گھر آ جاتی ہے۔ اُس کا کنا تھا کہ شائع نہ ہو بھی ہو جاتی تھی۔
اگر کوئی طاقت استعمال بھی کرے تو جھگڑا، موت، ٹوٹ جانا، یہ باتیں میں اپنے چھاؤں اور چھپوں کو کرتے سُکراتا تھا۔

تاجاں مجھ سے سات سال بڑی ہوئی، وہ مجھ سے چھ جسم کی ایک دراز قدر کی تھی، سونچیں سوئی ہوئی تھیں اور جسم میں گولائیاں بھر زیادہ ہی محسوس ہوتی تھیں۔ تیل میں پچھڑے ہوئے بال ہمیشہ پیچھے کو کھینچے ہوئے ہوتے تھے، بڑی بڑی سمٹ گونجتی ہوئی رات، ہمیشہ دزل سے سے چمکانے لگتی تھی اور دزل سے ہی کے رنگ سے اس کے بھرے بھرے ریشے پھٹ پھر زیادہ ریشے نکلنے لگتے تھے، آنکھوں میں کھل کے بغیر بھی فہم سے سے کھینچے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت وہ وائل کی تنگ اور اداسی جی قیاس جو شاید اُسے کسی ملکائی نے دی ہو گی کہنے ہوئے تھی، رشور کی جگہ سیاہ دھوئی تھی اور پیروں میں کھٹے تھے۔ جس بندی اور جس زیادہ سے پیر میں بیٹھا تھا وہاں سے اُسے دیکھنا خاصا خوشگوار عمل تھا، میں گرتے گرتے تو سنبھل گیا تھا، محراب جیسے کچھ کھوس گیا تھا۔
وہ بلیا پر چڑھتے ہوئے بولی، ”میں نے کچھ پوچھا تھا۔“
”ایں...“ میں نے جو منگتے ہوئے کہا، ”ہاں... وہ کون سی چیز تھی؟“

”وہی بدعاش... راجو کا بچہ۔“ اُس نے گویا سنی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”اُسے بدعاش کیوں کہہ رہی ہو؟“ میں نے ہلکی سی خفگی ظاہر کرنے کی کوشش کی، ”وہ دوست ہے میرا... اور پھر شریف لو کہتے سہ۔“
”واقعی بہت شریف ہے،“ وہ اپنی قیاس کو کھینچ کر گویا لبا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی، ”ایک روز مجھے گلی میں روک کر قہر دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا، ”چچے! میں تو آن بڑھ ہوں خود ہی بڑھ کر نہ کہنے کا کہا ہے، کہنے یا تھوں سے اُس نے قہر کھول کر پڑھنا شروع کیا، جان من تاجاں! تمہیں دیکھ کر جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، میں نے دین اُسے چپ کر لیتے ہوئے پوچھا، ”کیوں؟“
”سے پہلے تمہارا دل نہیں دھڑک رہا ہو؟ کیا؟ اُسے اُلو، دل کا تو کام ہی دھڑکانا ہے۔ البتہ اگر آئندہ تو نے مجھے یوں گلی میں روک کر پڑھنے لگھوں والا عشق بھانسنے کی کوشش کی تو اسی

دیند کا گھبرو جان! بن جائے۔

کھدیر ریندرا جو آگیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں شوٹنگ
دیگر دیکھنے کے لیے کوئی اور لوکیشن تلاش کرنی پڑے گی یہ ملے
کچھ محنت نہیں رہی تھی۔

ہم نے لوکیشن بدل دی ہر حال تاہم اس سے اس کے
بعد بھی کبھی کبھار سامنا ہوتا رہا مگر مجھے میں تو میری اس سے
بڑھ چھڑ ہوئی ہی رہتی تھی لیکن ان کو قبول کر دیا وہ بات نہیں کرنی
تھی پس مشکوک کہ سر کو مختلف سی حرکت دے کر گزر رہا تھا تھی راہ
قبضے سے باہر کبھی ملتی تھی تو دو چار منٹ ٹوک کر بات کر لیتی
تھی۔ وہ تھوڑے سے بہت دنوں بعد چیک بالیس جاتی نظر آتی
رہتی تھی کبھی ماسی کو لینے جا رہی ہوتی تھی، کبھی اس کی خریدت
پوچھتے اور کبھی اس کے پیچھے کے لیے کوئی دوا آتھا جسے... تمام
میں نے اس کی ماسی کو کبھی دیکھا نہیں۔

آٹھویں جماعت میں ہمارے آخری چھپنے تھے جب ہم اسکول
اسکول کو ترقی دے کر لائی نایا گیڈان دولہا ڈال اور میٹرک کی
حد تک یہ سہولت حاصل تھی کہ جن لوگوں کو مارٹر صاحبان ذرا
لاقی خیال کرتے تھے انھیں بورڈ کے تحت امتحان میں بٹھاتے
تھے اور جنہیں ذرا کمزور سمجھا جاتا تھا ان کا امتحان اسکول ہی کی سطح
پر ہو جاتا تھا مگر اس سبب ہی کو اگلی کلاس میں دھکا دینے کی کوشش
کی جاتی تھی کوئی بہت ہی پیسہ ڈی جونا تھا تو وہ جاتا تھا اسی لیے
اسکول سے امتحان پاس کرنے والے کی نسبت بورڈ سے امتحان
پاس کرنے والے کی قدر زیادہ قدر تھی۔

میں نے ایک مارٹر صاحب کی منت تو شاید کر کے بورڈ
کے تحت امتحان دیا تھا مگر انکو وہ جیسے اسکول ہی سے امتحان
دولانے پر تھے ہوئے تھے۔

جس روز میٹر ڈولٹ اجازت آنا تھا اس روز کے لیے
میں نے قبضے کے کھوٹے کٹاں ڈالنے کو تاکید کر رکھی تھی کہ میرے
لیے ایک کافی ضرور دے لیکن جب میں آوا بآہی اس روز پہنچتے
کا پتے اس کے پاس پہنچے تو ہتھکا کر وہ سارا اجارہ ایک میں
بیچ چکا تھا مجھے ڈاٹیشن آیا میں نے اس کا گریبان بچا دیا اور
اشال سے پیچھے آتا رہ گھوڑا سیر کر کے ہی لگا تھا کہ بابا جی
نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

اشال والا رہی ٹوپی سنبھالتے ہوئے بولا: بھئی زیادہ
پر معاشی دکھائی تو اس اچھ او کو کہہ کر اندر داخل گا... غنہ گوئی
کی خبر لگا وہل گا... قبضے معلوم نہیں میں روزنامہ بوستان
کا بچہ تھی بچوں اور نامہ بھی:

بچے زیادہ اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ بچہ کیا ہوتا ہے

دقت کی طرف اشارہ کیا تو درخت پر پر لڑکے کر شاخوں میں چھپ
جاتی ہوں اس لیے انھیں نظر نہیں آتی۔ بلندی سے شوٹنگ
بھی خدا اچھی طرح نظر آتی ہے۔

”اٹوٹی پھٹی! میں نے دل میں سوچا۔ مجھے اس تھوڑے سے
خدا مت پر ہمدردی تھی کہ ہماری زبان سے کسی کیسی مضحکہ خیز حرکتیں
وہ دیکھتی رہی تھی تاہم میں نے دل کی دلی ہی میں رکھتے ہوئے
پلو چھاپا تو کم درخت پر چڑھ لیتی ہو۔“

”کیوں نہیں میں تو گھوڑے پر سواری بھی کر لیتی ہوں، نہ میں
تیر بھی لیتی ہوں“ وہ قدر سے بے پردائی سے بولی یہ کوئی
مشکل کام تو نہیں ہیں، پھر وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی شرم
پڑ رہی ہے اب میں چلوں۔ وہ قبضے کی طرف نہیں، شرک کی
طرف جا رہی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”چاکس بالیس! اس نے جواب دیا چاکس بالیس شرک
کے پادھر بھاڑ پڑھ سہل کے فاصلے پر تھا میں اپنی ماسی کو
یاد سے جا رہی ہوں“ وہ بولی ڈاکا کی طبیعت کچھ عجیب نہیں ہے
میں نے ملکوں کے ہاں کام پر بھی جانا ہوتا ہے۔ ابانے کہا ماسی
کو بلا لے کچھ دن گھر کا کام دہ سنبھال لے گی۔ ویسے بھی وہ اگر کچھ
دل نہ دے تو کہہ رہی تھی۔

”تم اگلی جا رہی ہو چھوٹی تھوڑے سے ساتھ چلتا ہوں“ میں نے
دیار سے اترتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک فلمی مکالمے کا پھانہ
کیا تو آخر تم ہمارے گاؤں کی عزت ہو مینا سے! تمہاری خجالت
ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔“

”میں تو خود دل کی تر اس نے افسانہ سے جواب دیا تو میں
میرے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں۔ لوگ دیکھیں گے تو باتیں
بنائیں گے یہ کہہ کر وہ اس کے بڑھ گئی میں بہوت کھڑا اسے
جانتے دیکھتا رہا اس کی کمزوری چاکس اس کی لہرائی ہوئی سب
کچھ بہت بھلا لگا رہا تھا۔

وہ شرک پلڑے کے کچے میں اتر چکی تو میں نے اپنے سر کا
کا ہاتھ لیا۔ گویا میں آٹا بٹا ہو چکا تھا کہ کوئی جوان بلکہ میری اور
راجو کی اصطلاح میں نفل جوان لڑکی میرے ساتھ چلتے دقت
یہ اندیشہ محسوس کرنے کی تھی کہ لوگ دیکھیں گے تو باتیں بنائیں گے
یہ تصور بڑا سستی خیز تھا میں نے اپنے رنگ پچھتے مٹول کر
دیکھے۔ بازوؤں کی پھیلوں کا ہاتھ لیا سب کچھ عجیب تھا کہ
ہی تھا۔

”خوش رہے پتیر!“ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو
دعا دی۔ اب تھوڑی سی گھبراہٹ ہی شروع کرے تاکہ تو جلدی سے

میں تھا صاحب ایک روز اسکول میں دھتے کھدے وہاں ایک ٹکڑے
نے آکر مجھے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے بلا رہے ہیں سبکے
گھر اجٹ سی ہونے لگی نہ جانے کیا بات تھی؟ آج تو میں نے
کوئی شرارت بھی نہیں کی تھی مگر حال دل مضبوطی کے ہیڈ ماسٹر
صاحب کے دفتر میں پہنچا میرے اردو کے استاد بھی دال دلیٹھے
ہوئے تھے۔

”تھارانا نام ہے افضل؟“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے عینک
کے شیشوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے پوچھا مجھے بڑی غرضی
ہوئی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب جیسی معزز و سستی چمبے میرے درست
نام سے مخاطب کر رہی تھی۔

”جی ہاں“ میں نے تھوڑا سا زلزلہ کر جواب دیا۔
”تھانے پاس کوئی صاف شلوار نہیں ہے؟“ افضل نے
میرا سر تباہا جانتے ایسے ہوئے پوچھا اس غیر متوقع سوال نے
مجھے پریشان کر دیا۔ اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید صاف شلوار نہیں
نہ رکھ سکے جسے جسم میں چمبے اسکول سے نکالنے کی قیادت
کی جا رہی ہے۔

”جی ہاں... ایک ہے تو کسی... میں اسے اچھی طرح

اللہ تبارک و تعالیٰ، تو اسے اٹھا کر ٹھٹھے پر ٹٹھا ہوا تھا لیکن ابھی ٹٹٹ
ڈپ کر چکے ایک طرف کولے گئے پھر سہا جلد کی تلاش میں
نکل کھڑے ہوئے۔
موجھے کے چلتے خانے پر شید سے ٹپٹال دالے کی دکان
پر جہاں ٹٹٹ یعنی گھنٹیوں کے بجائے کپڑا فروخت ہوتا تھا اور
مٹھ حلالی کے ہاں... کہیں بھی اخبار نہیں تھا جہاں جانتے ہی پتا
چلتا کوئی مانگ کر لے گیا ہے۔

مجھ سے زیادہ آبا جی بے تاب تھے اور ایک ہاتھ سے پرچی
اور ایک ہاتھ سے دھوئی تھپٹھانے فریٹ سے آگے آگے دوڑتے
چارپے تھے غرق اور اضطراب گویا انھیں اڑانے سے جا رہا
تھا۔ مجھے ان کا وہ انداز آج تک نہیں بھولا لسان باب کے سوا
کون کسی کی کامیابی و ناکامی کے بارے میں جانتے کے لیے
آنا مشتاق و مضطرب ہو سکتا ہے؟

بالآخر ایک گلی میں راجو جین اپنے گھسٹے گھسٹے سامنے کھڑا
مل گیا اس کے ہاتھ میں اخبار تھا میں نے ایک کرا بائی کے
برابر ہوا چھاک کر دیکھا کجھت نکلیں کے انتہار دیکھ کر ہاتھ
”زلزلہ کیا راجو؟“ میں نے اور آبا جی نے مختلف
بہوں اور مختلف لفظوں میں ایک ہی سوال کیا۔ آبا جی نے تو
اس کے ہاتھ سے اخبار سی پھین کر مجھے بتوایا۔

”وہ بچہ کیا ہے یاد زلزلہ؟“ وہ نمونہ بنا کر بھلا تو ہم دونوں
ہاں جو سنے گئے تھے ڈوڈوڑن میں۔

”اللہ تبارک و تعالیٰ ہے“ آبا جی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔
”کوٹہ نے آج بھی یہ عزت اور کامیابی بخشی۔ خدا تبارک و تعالیٰ اکرم
جسے کہ اسے خاندان میں بھی کوئی ٹکڑا ٹپٹا پاس ہے۔ پھر انھوں
نے کئی مرتبہ میری پیشانی پر تھپی۔“ ان کی آنکھوں سے ٹھکر کے
آنسو چھپکھپاتے تھے جو ان کی شخصیت سی ماڑی میں جذب
ہو چکے تھے پھر انھوں نے معدی کی چمبیں ٹٹولیں۔ ایک ایک
پوچے کے دونوں اور چند آنسو برآمد ہوئے۔ اس وقت آبا جی
کی چمب میں اس ہی موجود تھے۔ وہ انھوں نے مجھے دیتے ہوئے
کہا ”وہ گھٹو کے ہاں سے لڈو لے کر اپنے دوستوں کا ادھار معکم
بچوں کا منہ میٹھا کر دینا میں کام پر جا رہا ہوں۔ بڑی دیر ہو
گئی ہے مجھے۔“

آبا جی کے جاتے ہی راجو نے ایک نظر میری مٹھی میں
پیسے ہوئے دونوں پر ڈال ادھر آنکھ مار کر بھلا آج کی فلم کو تیری
طرف سے ہی استاد۔

ان پیسوں کے کہہ منے نہ دیا بٹٹے کے بجائے فلم ہی دیکھی۔

شب و روز کوئی گورہ ہے تھے۔ ان دنوں میں میرے

ڈائجسٹوں کے مقبول سلسلے

سکرش ————— (۱۲ حصے)	عزیز احمدی	۴۲۰۰
ڈائیگر ————— (۱۳ حصے)	مشائی احمدی	۶۵۰۰
غیبت ————— (۵ حصے)	انوار صدیقی	۲۲۵۰
درخشاں ————— (۲ حصے)	انوار صدیقی	۱۰۰۰
روگ ————— (۵ حصے)	م. الف صدیقی	۲۴۰۰
دہشت گرد ————— (۴ حصے)	سلیم نادرانی	۲۰۰۰
سرفروش ————— (۲ حصے)	انظر کلیم	۱۲۰۰
شہناز ————— (۲ حصے)	انظر کلیم	۱۲۰۰
انسان اور شیطان ————— (۲ حصے)	محمد نواز	۱۵۰۰

۱۱۷

مکتبہ القریش سرکھ روڈ، اردو بازار
لاہور فون: ۷۶۶۸۹۵۸

دھلو اوں گا میں نے چھپکا تے جوئے جواب دیا مگر کیا کیا۔
میں سوال کھل کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

”بیتر... میرا مطلب ہے یہ خود وار... ہاں مگر ماشر صاحب
نے کھل کر اگلا صاف کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہندو اصل تھیں لاہور
بیجھنا چاہتے ہیں۔“

ایک لمحے کے لیے گویا میرا دل دھڑکا بھل گیا۔ مجھے
معلوم تھا کہ سائے ظلم اسٹوڈنٹ لاہور میں ہیں، سڈی ہیروئنیں بھی
لاہور ہی میں رہتی ہیں۔ ہیروئن سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔
مگر ماشر صاحب اپنے سائے پرستے ہوئے کھڑے کھانڈات
کے پلندے کو اٹھتے پھرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”تو بھی کوہ مسئلہ
یہ ہے کہ لاہور میں کوئی میلہ شہید ہو رہا ہے، کئی دن چلے گا۔
اس میں اس کو حل کے درمیان مختلف مقابلے بھی ہوں گے۔
ہمارے اسکول سے بھی ایک ایک کھلاڑی کبڑی، پاکستان
اور ہائی چیمپ کا جانشین کا مصیبت یہ ہے کہ دعوت ایک مقرر
کے لیے بھی آئی ہے کوئی وہاں تقریری مقابلے بھی ہوں گے۔
کھلاڑی تو ہم نے سب منتخب کر لیے ہیں، مقرر کوئی نہیں ہے۔
جو ایک آئے ہے اس کی آواز دے سے بھی زیادہ غراب ہے۔ اور
کے ماشر صاحب نے تعلیمی نام تجویز کیا ہے لہذا ہم نے سوچا
ہے کہ مقرر کے طور پر ہمیں بھیج دیں۔“

”لیکن سر... میں نے تو کبھی تقریر کی ہی نہیں ہے میں نے
مقرر سے بچے میں کہا

اس کے بعد ماشر صاحب نے اس موضوع پر کچھ
دیہ تقریر کی کہ تقریر کا فن کیا ہوتا ہے پھر کہنے لگے ”وہی بھی
ہم کوں ساتھیوں اولمپق مقررہ کی جبرن اسمبلی میں تقریر کرنے کے
لیے بھیجے ہے جس وقت انا فائدہ یہ ہے کہ اسکول کے خرچ پر
لاہور کی سیر کر آؤ گے مجھے واصل تمہارے ماشر صاحب نے
بتایا ہے کہ تمہاری آواز بڑی زوردار ہے۔ ماشر صاحب
تھیں تقریر کھڑے گئے اور ٹو بھی دی گئی خاص مسئلہ
نہیں ہے، بس تیار رہنا۔ ایک ہفتے بعد تھیں ماشر صاحب
کے ساتھ جانا ہے۔ ہم نے تمہارا نام لکھ لیا ہے۔“

آج کل جس طرح کسی کے ذہنی جانے یا ج پر جانے
کی تیاری ہوتی ہے اسی زور شور سے میرے لاہور جانے کی
تیاری شروع ہوئی تھی میں تیار ہی نہ تھی اور زور شور ویلوہ
تیار کرنے کے لیے تھا۔ کیا ایک شلوار قمیض بھی ہے
میں نے خود تین مرتبہ دھو کر صحن سے استری کر دیا جوڑے
میری سے مرمت اور یا لاش کر دے رکھے۔ ایک دوست سے
شیشی میں تھوڑا سا خوشبودار تیل مانگا کہ کھا کہ لاہور جاتے

ہونے لگا کر مایوس ہے۔

تقریر کی مقابلہ و دیگر کی تادریخ سے ایک دن پہلے ہم
چند رپے کے ماشر صاحب کے ساتھ لاہور روانہ ہوئے۔ ہماری
بس جب لاہور کی حدود میں داخل ہوئی تو فرط اشتیاق سے
میرا دل اس کس کس لکھا کی طرح دھڑک رہا تھا جو مجھے عروسی کی
طرف روانہ ہونے لگا۔

ماشر صاحب ہمیں بتاتے جا رہے تھے یہ شاہی مسجد
ہے... اس کے رابہ میں شاہی قلعہ ہے... یہ بھائی گیٹ
ہے... یہ دائیں ہاتھ پر لگی میں دربار وانا صاحب ہے۔“

اگلی سٹاپ سے دو تین آدمیوں نے مگر مگر ہماری طرف
دیکھا پھر ان میں سے ایک نے قدم سے غمی آواز میں دوسرے
سے کہا ”لاہور دی بیاں و بچن آئے نہیں ہر وہ بھی بیاں آچکے
آئے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی نے زوردار فقرہ لگایا گویا یہ کوئی
عمدہ لطف تھا۔ ماشر صاحب کھینچنے سے ہو کر ٹپ ہو گئے

دو بار لاہور آچکے تھے مگر اشتیاق ان کا بھی قابل دید تھا تاہم
”اس شخص کا فقرہ سننے کے بعد ان پر بھی گویا وہی فرنگی تھی۔
ان دونوں رنگوں سے کسٹیشن پر ہی بیشتر بسوں کا ٹرمینل ہوتا
تھا لیکن ہم بھائی گیٹ کے چوک میں ہی آ کر گئے۔ جہاں قیام

کا بندوبست دوسرے شہروں سے آئے ہوئے بہت سے
لوگوں کے ساتھ گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں کیا گیا تھا، جو
ان دنوں خالی تھا۔ اس ہوسٹل میں قیام کرنے کا سب سے

بڑا فائدہ ہمیں یہ ہوا کہ ہم نے فٹنس سسٹم کا استعمال سیکھ لیا۔
رات کو ہمیں نہیں میں کھانے کے لیے بلایا گیا۔ خفوں
میں لوگوں کو بگٹا یا چار یا چار شفت میں بیشتر رپے کے
دیہاتی اور نیم دیہاتی قسم کے ہی تھے جبکہ کھانا شہری قسم کا
تھا۔ ہمیں نے جب چھ دو ٹیاں چٹ کرنے کے بعد میسروری
سائن طلب کیا تو میرا نام شخص نے ناپندہ ملی کی نظر سے ہم
سب کو گھورتے ہوئے کہا ”اگلی شفت کے لیے بھی کچھ چھوڑ
گئے یا نہیں؟“

اس کے بعد دلی زبان میں ماشر صاحب نے ہمیں بھایا
کہ ہمیں اپنے آپ کو بے حد مذہب، شائستہ اور قناعت پسند
خاکر کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے چوتھی مرتبہ سائن مانگے گا لادہ
تو رک کر دیا۔

پہلے کے سلسلے کی سرگرمیوں کا انتظام یونیورسٹی گلاؤنڈ
پر تھا اور تقریری مقابلوں میں ہمارا فہرست کو آنا تھا۔ ماشر
صاحب تو دیگر تفصیلات و دیگرہ معلوم کرنے کے لیے صبح ہی کمرے
سے رخصت ہو گئے۔ البتہ ہمیں تاکید کر گئے کہ ان کی واپسی تک

خان صاحب نے ضرور کی ڈیوار کھرا بنا جاری تھا اور اٹھایا
نہیں تھا بلکہ سب سے پہلے بغیر میری مدد میں حاصل کر دیا۔ کدھر جاتا پڑا
لے ہاں؟

قدیم میں تہذیب سے کہا۔
”قدیم کدھر؟“ اس سے منہ پر کسی کام کا فطرہ؟ اس نے
موت چوڑی کھیل دیتے ہوئے جیسے ہی بیٹھے پوچھا۔

اب میں لکھ رہا تھا ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب
نہیں تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”شوٹنگ دیکھنے؟“
میرا جواب سننے ہی خان صاحب کو جیسے حال آگیا وہ
ڈنڈا اٹھاتے ہوئے کھڑکھڑے ہوئے اور حاکمیت سے میری نعل
آگاتے ہوئے کدھر شوٹنگ دیکھنے آیا ہے اور تم سے پوچھے
بغیر کدھر جاتا ہے۔ خان صاحب! اور کدھر کچھ؟ خان صاحب نے
پائے بائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے پوچھا اور آٹھ دس آئی کدھر سے سے کدھر جاتے
گواہی کسی کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے کسی کا خلیہ
مستقل تھا کوئی بہت سی شکستہ حال نظر آ رہا تھا کسی کا چہرہ
سنا ہوا تھا اور کوئی بیمار بیمار نظر آ رہا تھا ان میں ایک سبز
شکر کی تھی اور وہ دیکر سب کے چہروں پر امید کا رنگ تھا اور
جیسے نہنگی سے ان کا نام لیا کسی بھی امید کے بدلے نام تھا۔
”یہ سب بھی شوٹنگ دیکھنے کے واسطے آیا ہے۔“ خان

صاحب نے غصہ سے کہا۔ ”اور آج کا نہیں بہت بدلت
ہے تو اسے۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی میرا عاشق ہے کوئی
شیم کو اس کا عاشق۔۔۔ کوئی بھلور جان رہتا ہے اور کوئی بہت
ذہین کے لیے نہنگی تو رہا کرنے کو تیار ہے۔۔۔ ابھی تو ہم نے
ان میں سے کسی کو اندر جانے نہیں دیا۔۔۔ تم تو ابھی پہلی دفعہ
آیا ہے تو تم کو شکر کا اندھا چاہیے؟“ وہ مجھے ہلکا سا خراب
خان صاحب کے منہ سے سب سے پہلے دیکھ کر دیا۔

میں نے گویا بعض اپنی بحالت تلاش کے لیے جڑ منٹ
والی کی طرح اندر اس دروازے اور اس کے سامنے پہنچنے پر
پرستور اس کے لیے آجائے تھے۔ دو ایک گاڑیاں بھی اس کے
سے باہر کھڑی اور خان صاحب نے لکھ کر ان کے لیے پورا لکھ

کہا۔ ”میں گواہی میں اس کے داخل کو پہچان نہیں سکا۔
چند منٹ بعد میں وہاں سے بڑا اور قریبی گی میں گس
گیا چند منٹ پہلے کس ایک مڑ مڑتے ہی کھلی سی جگہ پہنچ گیا۔
ساتھ ایک اور غارت کا گلیا چڑا لکھ تھا جو کھٹا چڑا تھا اور
اس پر کوئی چکر لکھ بھی نہیں تھا۔ میں چکھاتے ہوئے اندر چلا گیا۔
یہ شہنشاہ اسٹوڈیو تھا۔“

بائیں ہاتھ پر طولی لان تھا اور اس کے مقابل ستونوں والے
برآمدے میں دروازوں کی نظار سی نظر آ رہی تھیں سب کمرے
بند تھے۔ لان کے دوسری طرف بھی اسی طرح ستونوں والے
برآمدے تھے۔ ان میں دروازے نظر آ رہے تھے وہ کدوں
کے دروازے معلوم نہیں ہوتے تھے بہت اونچے اونچے مڑی
دروازے تھے جیسے عمارتوں میں جیلوں یا پھر قلعوں کے دروازے
جاسکتے تھے۔ ان دروازوں پر زنجیر بھی پڑے ہوئے تھے یہ عمل
دوسرے تھی اور اوپر بھی تقریباً نیچے ہی کا سا نقشہ تھا۔

یہاں کچھ دیرانی اور سکوت تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا
کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، بند دروازوں کے پیچھے ہو رہا تھا۔ آواز کا
آدمی اور آدمی ہر جگہ رہے تھے، کوئی شہناہ صوبت نظر نہیں
آ رہی تھی۔ یہ سب کچھ میرے تصورات سے کافی مختلف تھا۔ میرے
ذہن میں کچھ ایسا نقشہ تھا کہ اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہوں گے
تو کہیں پچھوٹی سی نہر کے کنارے ٹیلوٹم دروازہ نظر آتی ہوگی۔ کچھ
آگے بڑھتے ہوں گے تو گھاس پر شیریں موجود نقص دکھائی دیتی
ہوگی۔ مزید آگے جلتے ہوں گے تو سرسبز بڑے گھوڑے پر
سوار تلواریں اور آدمی ہر جگہ دکھائی دیتی ہوگی۔ کچھ اگے
بڑھتے ہوں گے تو تیر سلطانہ کسی گوشے میں رہیں سے سرگوشیوں
میں مصروف نظر آتی ہوگی لیکن یہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔

میں آواز دے گئے کسی طرح اور آدمی ہر جگہ رہا تھا اور بائیں
ہو کر واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اونچے مڑی دروازوں
میں سے ایک دروازہ اچانک کھلا اور ایک دروازہ عورت
جو پہلی نظر میں مجھے مرعوبہ معلوم ہونے لگی تھی اسے باہر آئی وہ سیاہ
پشت ٹیلوٹم تھیں اور قریبی سے رنگ کی چمکی جھلک پھٹ پھٹ
ہوئے تھی پیرول میں غل جھلک تھے اس کے تار شہرہ بھوٹے
بال چوڑے کدھوں پر جھول رہے تھے بڑے مرد مارا انداز
میں وہ ٹھٹھک ٹھٹھک کرتی ہر آواز تھی۔

اس کے چہرے پر سرسبز پاؤں اس قدر چمکیا ہوا تھا جیسے
کسی نے بڑکے سے باقاعدہ صنف کیا ہے اس کی انھیں خوب
قیس مگر انھیں اتنے زیادہ کا میل سے سجایا گیا تھا کہ وہ مصنوعی
معلوم ہونے لگی تھیں اس کے بائیں ہاتھ دوسرے تھے۔ ایک

کلیپ بورڈ پر ہوا تھا جس پر کدھوں کا پلندہ اٹکا ہوا تھا وہ
شخص اس عورت سے قدم لگا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا جیسی
وہ اپنی عینک سے جھانک رہا تھا اور بھی کا غزات۔۔۔ ان کا غزات
کو اٹھ پٹ کر وہ عورت کو کدھوں کے بلنے کی کوشش کر رہا تھا۔
ایک اور شخص قدم سے پیچھے تھا لیکن پکا جلا آ رہا تھا اور وہ دم۔۔۔
میں دم کی گردان کر رہا تھا اس کے پیچھے ایک بھد سے قدم سے

مجھے واقعی نہیں معلوم تھا کہ وہ کن صاحب کا ذکر کر رہا تھا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کوئی گھر تھا یا محل میں نے تیزی سے پلٹ پڑنے میں ہی عاجز ہو گیا تھا میں نے کہا کہ لان کی طرف آیا تو وہاں اب وہ سب بندہ لوگ اسی جگہ نظر آجائیں مختلف عمروں اور مختلف جسامتوں کی لڑکیاں سحرین کے لباس یکساں تھیں۔ پڑائی طرز کے ہمبرڈا کرتے اور چوڑی دار پا جاہے... ان میں سے بیشتر کے چہرے اچھے اچھے تھے۔

چھوٹا لڑکا تھا جو ایک خوبصورت سرخ بالوں اٹھائے ہوئے تھا۔ سب سے پہلے ایک معصومیت لگاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ مردار انداز میں چلتی ہوئی صورت کسی کی طرف بھی متوجہ نہیں تھی۔ وہ بابر اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی اسے جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔

ٹھٹھک کرتی وہ میرے قریب سے بھی گزر گئی اور خوشبو کا ایک جھونکا اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔ میں غیر ارادی طور پر اسی سمت گھوم گیا بعد وہ وہ جاری تھی وہ مزید چند قدم چل کر کسی کمرے کا پھر ٹا سا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ باقی لوگ بھی اندر چلے گئے تو دروازہ بند ہو گیا۔ جب وہ چہرہ میرے سامنے نہیں رہا تب میں نے پہچان لیا کہ وہ تو مسرت نذیر تھی۔ میرا دل کھنکھانے لگا۔ وہ زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ یاد آسا محسوس ہوا کہ میں نے بد وقت مسرت نذیر کو کیوں نہیں پہچاننا پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر بد وقت بھی پہچان لیتا تو کیا کر لیتا؟

اسی اثنا میں ایک اور بڑا دروازہ کھلا اور بھاری بدن اقدار سے پھوٹے قدر کے ایک صاحب شامی لباس زیب تن کیے باہر آ گئے۔ جیسے جیسے ہی وہ اپنا اویسلا کھلا شامی لباس پہنے ہوئے تھا اس کا لڑکا بڑا تھا، آتا رہتا ہے جیسے جیسے تب میں نے دیکھا کہ شامی لباس کے نیچے انھوں نے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ لباس دروازہ آتا رہتا تھا۔ اب وہ کچھ اور زیادہ کو نکھالیا جو ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب وہ کچھ اور زیادہ عجیب لگنے لگے۔ یعنی تھری پیس سوٹ، سر پر تاج اور ناک پر مسے فریم کی عینک... جب انھوں نے گتے کا شامی تاج بھی اُٹھا کر کسی نوجوان کو پہنا دیا تب میں نے پہچان لیا کہ وہ آغا خاں تھے میں انھیں سلام کرنا چاہتا تھا مگر انھوں نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔

ادھر ادھر گھومتا پھرتا میں اسٹوڈیو کے ایک انارگ قلعہ سے جتنے میں جا پہنچا جہاں لکڑی کے ایک گیسٹ کے عقب میں پچھو لوں بھری سیٹوں سے ڈھکا ہوا ایک مکان سا لکھائی دے رہا تھا مکان کے بائیں طرف بھی ترشی ہوئی گھاس کا فرش اور پھول دار پودوں کی کنبیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک مالی ایک کیماری کے پاس بیٹھا کھڑکی سے زمین کھود رہا تھا اور نہایت بڑا سر اور انداز میں زبردست اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا پھر برائے پڑی تو ہاتھ روک کر چلایا تو اپنے کمرے میں آگئے جہاں آگئے تھے معلوم نہیں صاحب نے منع کیا ہو یا نہ کہ کوئی ان کے گھر کے سامنے سے نہ گزرے۔

بھارت میں ایک شہر میں پاکستان کی سرحد و شاز داستان جس نے پاکستان کی آن کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور بھارتی دہشت گردوں کے سامنے سپر پلائی دیوار بن گیا۔

شیو سینا کے دہشت گرد

انے حمید

پراجا جلدول میں شائع ہوئی

- ٹاپ سیکرٹ مشن (اول) - / ۱۵۰ روپے
- کشمیر کے غازی (دوم) - / ۱۵۰
- کھنڈا کشن (سوم) - / ۲۰۰
- گوکند کے مجاہد (چہاں) - / ۲۰۰

مکتبہ القلیش، سرگرمو، اردو بازار

لاہور، فون: ۶۶۶۸۹۵۸

دفتر میں سے قریب ایک کار کے بریک پر چڑھ کر
میں نے بدحواس ہو کر دیکھا کہ ٹیکے سبز رنگ کی وہ بی سی گاڑی
مجھ سے محض چند انچ کے فاصلے پر ٹکی تھی اور اگر نہ ٹکی ہوتی
تو میرا ایلیدروین چکا ہوتا۔ گاڑی ایک بھاری بھر کم سامان
چلا رہی تھی اس نے سڑک پر اتار دیا تو میں دیکھ سکتا تھا کہ جس عورت
بھی دیکھ پارہا تھا اسی سے اس کی دولت مندی کا اندازہ کر کے
مربوب ہو سکتا تھا۔

اس کے برابر ایک عورت بیٹھی تھی جس نے نہ پہلے کی
کھال جیسے فریم اور نہ سرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ لگایا
بلکہ اتنا وہ جو کچھ قدرے انسانی ایک آپ میں تھی اور اسی
قسم کے چشمے کے ساتھ میں حال ہی میں اسے ایک فلم میں بھی
دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے اسے فوراً پہچان لیا، وہ نیلو تھی۔
مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا رنگ سائولر تھا میرا خیال
تھا کہ تمام ہیروئینیں سرخ و پسیدہ ہوں گی۔ ان دنوں عروج
منست نڈر اور نیو ہی کو حاصل تھا اور مجھے خوشی یہ تھی کہ میں
نے وہ وطن ہی کو دیکھ لیا تھا۔ اب تو میری نظر میں یہ سوال بھی
اہم نہیں رہا تھا کہ اگر میں گاڑی کے پیچھے آ گیا ہوتا تو کیا ہوتا؟
ان دنوں نے بیک وقت اپنی اپنی طرف کی کھڑکی سے
سرنگا لایا ہے میں مرد سے پہلے کی ہو مرنے کے کچھ اور بھی طرے
ہیں کا کا۔ جن میں وقت بھی کم لگتا ہے اور جان بھی آسانی سے
نکلے گی۔ اس کی آواز شاید منہ کے خار سے بڑھل تھی میں
نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک نظر نیلو کو دوبارہ دیکھا اور دوا
کر سڑک پار کی کوئی نہ شکر کی طرف واپس جانے والی میں نکلی
جلدی تھی۔

میں اس پہر کے قریب ہوٹل واپس پہنچا اور گویا بوقت
ہی پہنچ گیا کیونکہ میرے پیچھے کے چند منٹ بعد ہی ماسٹر صاحب
ہی واپس آ گئے۔ میں میں کھانا ختم ہو چکا تھا اور اب میں ماسٹر
صاحب سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے سخت جھوک لگی ہے
درز زدہ پوچھنے کے کھانے کے وقت کہاں تھا؟ ان کے ساتھ
ایک اور شخص بھی تھا دوسرے لوگوں کو تو انھوں نے اس شخص
کے ساتھ بھیج دیا کیونکہ اس کا تعلق کھیلوں کے مقابلوں کی
نگرانی سے تھا۔ مجھے انھوں نے اپنے ساتھ ہی رکھا اور کچھ
دیر بعد ہم پیچھے آ گئے۔

ماسٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ہمیں کوئی گاڑی لینے آئیگی
لیکن ایک گھنٹا ہمیں سڑک کے کنارے کھڑے کر دیا اور
کوئی گاڑی نہ آئی۔ دوسرے بہت سے لوگ ان کے
پہنچنے وغیرہ اپنے طور پر تانگوں، بائسن اور ٹیکسیوں میں لالہ کر

سے تھے مگر وہ آپس میں خوب چپقلیں کر رہی تھیں۔ دو ایک
تو نہ جانے کس بات پر ہنس ہنس کر دہری ہوئی جا رہی تھیں۔
میں ان کے قریب پہنچا تو میں نے انھیں بھاگ چلا
کر پہچاننے کی کوشش کی کہ شاید ان میں بھی کوئی ہیروئن
موجود ہو مگر کوئی صورت مجھے شگنائی نہیں ہوئی پھر
مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکیاں انھیں تو بعض گاڑیوں کے
دوران ہیروئن کے عقب میں کھڑی ہوتی تھیں۔ ہیروئن اگر
داخل صرف سڑک کالی تھی تو یہ بھی داخل طرف سڑک کالی تھیں
اور اگر ہیروئن بائیں طرف کو جھکتی تھی تو یہ بھی بائیں طرف کو
جھک جاتی تھیں، اگر ہیروئن لکھاں پر لوٹنے لگتی تھی تو یہ
بھی لکھاں پر ورتا ہو کر لڑکیاں دروازے لگتی تھیں۔ میں نے
اخباروں کے مضمون پڑھنے والوں کو دیکھا تھا کہ انھیں پکڑا
گزر کر کہا جاتا ہے۔ میں بڑی حیرت سے سوچا کہ اتنا کھانا
کوئی لڑکی ہی خالص ہو سکتی ہے؟

میں انھیں گھومتے ہوئے شاید کافی ہفتہ معلوم ہو رہا
تھا۔ وہ لوگوں میں سے دو تین میری طرف دیکھ کر سننے سے
سے کھی کھی کرے لگیں گویا اب کوئی نیا طیفہ شروع ہو گیا
ہو۔ ایک بولی تو مگر دیکھو اور اندازہ لگھو... معلوم ہوتا ہے
آنکھوں ہی آنکھوں میں نکل جلتے گا معلوم نہیں کون ہے؟
بہت ہی زیادہ ہی شکل معلوم ہو رہی ہے۔

ایک اور سائری اور سوکھی مڑی سی لڑکی جس کے
ہنسیوں کی بڑی کچھ زیادہ ہی ابھری ہوئی تھی پہلی لڑکی کی
کمر پر دھپ رہا کر رہے ہوئے بولی تو اتنی مدت ہو گئی تھی
لگاٹ لگاٹ کا پانی پیٹے مگر بندے کی پہچان نہ آئی ادنی
اس کی تو شکل سے صاف ظاہر ہے کہ شوٹنگ دیکھنے کے لیے
آیا ہوا ہے۔

نہ جلتے کہوں مجھ پر بدحواسی طاری ہو گئی اور میں سیدھا
گیٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ لڑکیوں کے تیز اور تھکے جسم سے
تغائب میں تھکے۔

اسٹوڈیو سے باہر آ کر مجھ پر پوچھتا ہے کہ کا دورہ پڑا۔ میرا
بھی چاہا کہ اپنا بھلا دیں گے کہ جوتا نا کر دو جاہر تہہ اپنے ہی
سر پر رسید کر دیں بھلا لڑکیوں کے سامنے آتا رہا وہ نہ
کی کیا ضرورت تھی؟

دفتر مجھے یاد آیا کہ ماسٹر صاحب نے سختی سے ہدایت
کی تھی کہ کوئی لوگ ہوٹل کے کمرے سے باہر نہ جائے اور میں
کہاں گھومتا پھر رہا تھا یہ خیال آتے ہی میں سڑک پار کرنے
کے لیے پکارا۔

رومانی ناول

75/-	سلی رعنا	دل کا آگن
75/-	سلی رعنا	کالے کنول
100/-	سلی رعنا	اور دیا جلا رہا
100/-	سلی رعنا	موج گرداب

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

ملک پہنچا ہی تھا اور ٹانگوں کی ٹپک پاٹ پڑا تو بانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک تیز آواز سنائی دی تو بے... انار بند ٹھک رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر آواز بند سنبھالا تو زوردار قہقہہ پڑا۔

”جناب صدر اودھ خواتین و حضرات! میں نے ماسٹر صاحب کی حسب ہدایت انجی و انسٹ میں گرج و گز اور آواز میں تغیر شروع کی لیکن بھوک پیاس گرمی اور گھبراہٹ سے میری اونچوٹا میرے گھٹے کی جو حالت تھی اس کے باعث آواز کچھ ایسی ہی نکلی جیسے کوئی بچہ مازچہ سے وان میں پھنستے ہی آخری بار چلا یا جو۔

ساتھ ہی اندھیرے سے آواز آئی منو آتین یہاں کہاں ہیں بھائی؟“ بچا سوئی آدمیوں نے ہم آپرنگ ہو کر قہقہہ لگایا میں نے بے بسی سے جناب صدر کی طرف دیکھا وہ گھوٹے پر چڑھے ہوئے دھماکی طرح منہ پر دو مال رکھے بیٹھے تھے۔ شاید اس کی اوٹ میں مسکرا رہے تھے۔

ماہرین کو شاید میری صورت دیکھتے ہی مجھ سے کوئی خاص عداوت ہو گئی تھی کہ انھوں نے میرے آتے ہی زور شور سے ہونٹاں شروع کر دی تھی ورنہ پہلی تقریر کے دوران دو تین مرتبہ صرف ہنسنے پاٹ کی سی آوازیں ہی سنائی دی تھیں۔ میں اب بالکل بھول چکا تھا کہ اس مقام پر مجھے کیا ایکشن دینا ہے۔ لیکن میں کسی طرح اتار چڑھا کر لانا ہے۔ میں نے ڈانٹ پر بلا وجہی گھونسا سید کیا اور وہ بھی اتنے زور سے کہ وہ گرتے گرتے پچھلے سے سنبھال کر میں نے تقریر کیا پس رٹا دیا سابق کوہنسا شروع کر دیا آواز کے جاتے رہے تھے پڑتے رہے لیکن میں فر فر روت چلا گیا سانس لینے کے

فرصت ہوتے رہے۔ بالآخر ماسٹر صاحب نے بھی ایک سانگے والے کی خدمات حاصل کیں اس سانگے میں پہلے ہی اتنے آدھی گدھے ہوتے تھے کہ ٹانگوں سے اندھیر ہی نہیں آ رہا تھا اس ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گھوڑا انسانوں کے ایک ٹیڑھ کو کینے لیے چلا جا رہا ہے۔ میں اور ماسٹر صاحب بائد انوں پر تھے تو گھوڑا انہیں مطلق ہوتے ہوتے رہ گیا مگر انہوں نے کوہنسا پڑا... کہ اس نے میں یونیورسٹی کے آؤٹ پینچا کر پھر اس وقت تک بھوک سے میری حالت بھی اس گھوٹے ہی جیسی ہو گئی تھی مگر نہ جانے کیوں آج مجھے ماسٹر صاحب کے سامنے لب کھولتے کچھ زیادہ ہی شرم آ رہی تھی۔ یونیورسٹی کے آؤٹ پینچ کر ہمیں رات تک احتیاط کے سہلے سے گزنا پڑا۔ بھوک پیاس سے میری حالت تباہ تھی پھر مچاڑ میں نشانیں قسم کے کئی لوگوں کو میں نے پانی کے لیے کہا مگر کسی نے کان نہیں دھرا کہیں نہیں کھینچا یا جاتا تھا کسی کہیں بالآخر میں ایک بڑے سے ٹیٹ میں پہنچا یا گیا جہاں وہ صحت و تغیر کی عطا شدہ ہونا تھا۔ شمس سامعین سے ہماری ہوتی تھیں۔ مجھے اس طرح پر بھیج دیا گیا جہاں درمیان میں تین کریمیل پر جناب صدر زور پڑے تھے اور ان کے وائس بایں دس دس کریمیل کی قطار میں تھیں۔ موصوف کے حق میں ہونے والے تحریروں ایک قطار میں تھے اور مخالفت میں ہونے والے دوسری قطار میں رہے دوسری قطار میں سب سے آگے بٹھایا گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین سیکنڈ بعد میں اپنے آپ کو اندھا محسوس کرنے لگا کیونکہ اس طرح کے کنائی کے سامنے نہایت بڑی بڑی ٹانٹس فٹ تھیں۔ بہت ہی تیز روشنی براہ راست ہمارے

ہونوں پر نہ رہی تھیں اور اگر منہ پھیر لیتے تب بھی تیز زور روشنی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سامعین کو اب مجھے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ مجھے گویا ایک تاریک فضا کے سامنے قرار کر رہی تھی۔

بڑی بڑی ٹانٹس کے عین سامنے ٹیٹے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دھبے میں رہ گئے اور مطلق جو پہلے ہی خشک تھا اب زور خشک ہو گیا۔ مجھ ہیروں پر دیکھتے ہی خفیت سی لرزش لائی تھی۔ میں دل میں دہرائی تقریر کے نکات ترتیب دینے کو مشتعل کر رہا تھا جو اب بار بار سے ترتیب ہونے لگا ہے مجھے ساتھ ہی ماسٹر صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہانے میں کچھ غلط اساطیر کے خیالات دل میں آ رہے تھے آخر وہی تو تھے جنھوں نے مجھے اس مصیبت میں دھکیلا تھا۔ اسٹیج سیکڑی نے مایک ہر میرا نام پکارا میں ابھی ڈانٹ

یہ بھی میں دس بارہ جھول کے لہو نہیں جا کر لوٹا تھا اور تھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ قہقہہ جاری ہیں۔ رفتہ رفتہ میری آواز گنتی جاری تھی اور شور مٹا رہا ہے پر حادی آئی جا رہی تھی۔ بالآخر مجھے احساس ہوا کہ پڑا ل میں صرف میں ہی گر ج رہا ہوں اور چاروں طرف بکا کا سکوت طاری ہے۔ مجھے شرم ہوا کہ شاید تمام حاضرین اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے خاموشی ہو کر آنکھیں میچ کر رکھے جو نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تو ایک نشت ملک شگاف قہقہے کو بج اٹھے۔ میں نے بدحواس ہو کر دوبارہ روتھوٹے کی طرح بولنا شروع کر دیا۔

ایک تو ماسٹر صاحب نے تقریر اتنی لمبی بکھری تھی کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آ رہی تھی میرے عقب میں بار بار گھنٹی بجنا کر مجھے احساس دلایا جا رہا تھا کہ وقت ختم ہو چکا ہے۔ لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ تقریر ختم کر کے ہی چھوڑوں گا۔ تقریر میں قیاسی انداز کی بھی بھر مار تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ بعض جگہ پر ہلکے کر میں نے بنجالی شروع کر دی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے منہ پر لپٹ کر اپنے آپ کو اردو کے قریب کر لیا۔

ہزار خد کے تقریر ختم ہوئی۔ مجھ سے زیادہ اس کے ختم ہونے کی خوشی شاید سامعین کو تھی کیونکہ انھوں نے تالیلاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا میری سزا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی مجھے پھر وہیں لائٹس کے سامنے بیٹھ کر باقی اٹھارہ مقررین کی تقریریں سننی تھیں۔

جیسے ہی سلسلہ ختم ہوا تو میری حالت یہ تھی کہ آواز میں کبھی دیر سے آتی آواز نہیں ہوتی تھیں اور کبھی قریب سے آتے تھیں کہ سامنے نیلے پیلے راتھ بے ناچ رہے تھے۔ مقابلے کے اقسام ملک نتائج شریف کر لیسے گئے تھے جن میں کپ ملنے تھے ان میں مل گئے کچھ کو تقریر بھی سنا دیں۔ مجھے بھی جناب صدر کی میز کے قریب بلایا گیا اور سترے عروفت میں چھپا ہوا ایک سرٹیفکیٹ تمغہ دیا گیا اس پر خالی ہوا میں میرا نام و سترہ قلم سے لکھا گیا تھا میں نے آنکھیں پھاڑ کر برشلی پڑھا مضمون میں تھا کہ موصوف محمد افضل ولد محمد افضل نے واقعی اس مقابلے میں شرکت کی تھی اور میں۔

یہی غیرت تھا اور نہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ کوئی ایسی نہ تھا تو اس جس پر لکھا ہو کہ آج کے مقابلے کا بدترین مقرر محمد افضل تھا اور آئندہ اسے اس قسم کے مقابلوں میں حصہ لینے سے باز رکھا جائے۔

میں جب ایلیج سے اُترنے لگا تو مجھے بیڑیاں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شکر ہے ماسٹر صاحب نے عقل مندی کی تھی کہ آگے گئے تھے انھوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کے آگے اور یوں تیزی سے ایک طرف کوسے چلے گیا اندیشہ ہو کر لوگ آگے آ کر مجھے مارنا نہ شروع کر دیں۔

بلکہ دیر بعد ہم کے اور میری بیٹائی کچھ بحال ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کچھ ایک لمبی میز کے قریب کھڑے تھے اور بڑے بڑے قسم کے کھانے کچھ ہوئے تھے بہت سے لوگ تیزی سے میز کی طرف چلے آ رہے تھے اور بعض لوگ کھانا پر ٹوٹ بھی پڑے تھے۔ میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ آسکیں بڑھکا کر مل پڑا۔

جون چل کھانا پیٹ میں پہنچا گیا، خواص کی کارکرنگ بحال ہوئی گئی۔ معلوم نہیں میں کتنے ڈروے صاف کر چکا تھا کبھی کبھی نے میرا ہاتھ روک لیا۔ میں نے بڑھ کر دیکھا وہ ماسٹر صاحب تھے وہ کھانا ہی نظر سے ادھر ادھر دیکھ کر میرے کان میں بولے۔ "ہنس کر مارا تم یہاں تقریریں مقابلے میں آگے تھے؟ بیٹا توئی کے مقابلے میں نہیں؟"

اس وقت مجھے بسیار غوری کا مطلب معلوم نہیں تھا لیکن اتنا تو ہر حال میں سمجھ ہی گیا کہ وہ مزید کھانے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے دل پر بھر کر ان کا حکم مارا اور ان کے ساتھ بوسٹل واپس آ گیا۔ ابانی لڑکے بھی واپس آ چکے تھے۔ ہمارے ایک لڑکے نے باکسنگ کے مقابلے میں حصہ لیا تھا اس کے منہ پر ہلیاں بندھی ہوئی تھیں، دو دو آنت، غائب تھے۔ وہ ہونٹ کھینچے ہوئے تھے۔ نام نہاد سہ ماہی اس سے غلیظ کا قبضہ معاذ کیا تو بولا "باکسنگ کا مقابلہ تو میں ہار گیا لیکن کشتی کا جیت گیا۔"

لیکن تمہیں کشتی کے مقابلے میں کس کجالت نے بھیجا تھا؟ ماسٹر صاحب نے حیران سے پوچھا۔

"وہ جی... اس لڑکے نے ہمیں مجھے تین چار گونے مارے تو مجھے فخر آ گیا اور میں نے اس سے کشتی شروع کر دی۔ چارے باکس نے تینا لڑا میں نے اسے آٹھا آٹھا کر خوب بٹھا کر وہ ذلیل بچہ مجھے گھر لے گیا۔"

"چہ... چہ... بڑا خسوس تھا اس کجالت کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ماسٹر صاحب نے تفسیر یہ ہے کہ اسے تو چاہیے تھا کہ تمہیں بچوں کے ہار پھانسا تھا۔" بلا میں لڑنا۔

ہمارے اسکول کے لڑکوں میں سے صرف ایک نے کوئی

پوزیشن حاصل کی تھی اور وہ تھی ریس میں تیسویں پوزیشن۔
اسٹریٹ صاحب نے اسی پر غور کا شکر ادا کیا۔ اس لڑکے کی بیچھے
بھرنی کی لیکن اس کے بعد کافی دیر تک اسٹریٹ بٹھہ رہے۔

دوسرے روز کو کہ ہم جیسی تاریخ سے قصبے واپس پہنچے
لیکن میڈیا سٹریٹ صاحب دیگر اسٹاف اور میٹریک کے لڑکے کے ساتھ
استقبال کے لیے اسکول میں ہی موجود تھے۔ انھیں ہماری آمد
کی اطلاع تھی۔ ہماری کار کو رکنی سن کر میڈیا سٹریٹ صاحب کا
بھی منہ ٹلک گیا لیکن کچھ زیادہ نہیں۔

وہاں سے جان چھوٹی تو گھر پہنچا۔ باجی کام پر سے واپس
آ چکے تھے۔ انھیں میں نے مندرے حروف میں چھپا ہوا ٹریفک
دکھا یا تو خوشی سے پھونسے نہیں سماتے گھر کے ممبروں کو
دیکھانے کے بعد اسے حفاظت سے طاق میں رکھتے ہوئے لے
آئے۔ اسے بازار سے فریم کروا لیا۔ وہاں آیا کریں گے تو
دیکھا کریں گے۔ عزت بنے گی۔

معلوم نہیں وہ کن بھالوں کا ذکر کر رہے تھے میں
نے توجہ سے ہوش سنبھالا تھا گھر میں کوئی ممان آتے
نہیں دیکھا تھا بہر حال ٹریفک میں نے حفاظت سے لے
دیا۔ نہا دھو کر کھانا کھانے کے بعد میں اباجی کی نظر بھا کر
راجو سے ملنے کے لیے نکلی کھڑا ہوا۔ اس سے باتیں کرنے
اور اسٹوڈیو کی یہ کار احوال سنانے کو دل چاہتا تھا۔

اُس کے گھر کے فریڈ پینچ کر میں نے ٹوکی آواز کا
سگنل دیا۔ حالانکہ ہمارے گھر والوں میں سے کوئی بھی ہمیں
ایک دوسرے سے ملنے سے منع نہیں کرتا تھا مگر معلوم نہیں
ہمیں کیوں ایک دوسرے کو خفیہ سگنل کے ذریعے بلائے ہیں
مزہ آتا تھا اور سگنل کس حد تک خفیہ تھا؟ اس کا اندازہ اس
سے کر لیجئے کہ ایک روز دراجو کا بڑا بھائی جو ٹاؤن کیشی میں
لوکر تھا، مجھے ہزاروں مال تو پوچھنے لگا۔ یہ تم راجو کو کس قسم
کی آواز نکال کر لاتے ہو؟

”ٹوکی“ میں نے چپکلی سے ہونے جواب دیا۔
”بہت خوب لاؤہ مطلق انداز میں سر طراتے ہوئے لولا۔“
”پھر تو تمہیں آواز بدلنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی اپنی آواز
آواز میں بدلاتے ہو۔ میں کچھ اور سمجھتا تھا۔“

میرا سگنل سننے ہی راجو ہنس گیا۔ میری جیب میں کچھ
پیسے باقی تھے اس لیے میں نے فی جیب سے کہا۔ ”آؤ بیل کر بیچے
کے اسٹال پر بیٹھے ہیں۔ چھانے سے بھی پیش گئے اور گپ سنب
بھی کریں گے۔“

اسٹال پر پہنچ کر میں نے موچکے کو ملانی والی چائے کا
آؤ دیتے ہوئے فرمائش کی ”یار ڈرا کر آؤ فون پر وہ دیکارڈ
تو لگاؤ بناؤ۔ فونوں رب دی سول تیرے مال پر بیار ہو گیا وے
جتا جیتی پیچھے اور ماراں چائے میں چیتی ذرا زیادہ ڈالنا۔“

موچکے کا آؤ فون بھی موچکے ہی کی طرح عجیب و غریب
تھا۔ اس پر نور جہاں کا درکار ڈال گیا جانا تھا تو آواز سہل کی نکلتی
تھی اور سہل کو سننے کی کوشش کی جاتی تھی تو لگتا تھا کہ لڑا
ہیں کر رہی ہے۔ اس پر سہم یہ کہ موچکا فرمائش کے مطابق
کبھی دیکارڈ نہیں لگاتا تھا کہ انہم فوری طور پر تو نہیں لگاتا
تھا۔ لڑا اس وقت میری فرمائش ایک کان سے سن کر دوسرے
کان سے نکلتے ہوئے جو دیکارڈ لگا گیا وہ یہ تھا۔

جا ابجی حسرتوں پہ آئینو ہوسا کے سوچا
راجو نے نکلی کی بجھدی کرسی پر پاؤں اوپر کر کے
بیٹھے ہوئے کہا ”اور سننا دیا۔ ایسی ہی تقریر شمر کرے؟“
”تقریر کو گولی مارو تو میں نے میز پر جھپکتے ہوئے کہا میں
تو تمہیں یہ بتانے کے لیے لایا ہوں کہ میں اسٹوڈیو کی سیر کرنے
کا اپنوں بڑی اچھی طرح۔“

”اسٹوڈیو کی سیر؟“ راجو انھوں نے جگہ سے اٹھ پانی اڑا دیا
اڑ پٹے اچھل پڑا اور جگہ اُس کے ہاتھ سے گر گئے گرتے
بچاہ کسی سے ملاقات ہوئی؟“ اُس نے بڑے اشتیاق
سے پوچھا۔

”سب ہی سے ہوئی۔ میں نے ایک اشانی سے نیازی
سے جواب دیا۔ ”صحیح سنو ش، درپن تیرے ملاقات، مسرت، نڈر
نیلو، نیلی، انڈوس، ٹیڈر، آؤ، اسلم پرور، سبھی تو وہاں موجود تھے۔“
”کسی سے بات نہ آئے ہوئی؟“ راجو میرے قریب کھنکھاتا
”سبھی سے ہوئی۔“ میں نے چند گھنٹہ پہلے بانی پینے کے

بعد کہا تھا یا نہیں تو ان کے اخلاق سے بہت ہی متاثر ہوا۔
بہت ہی لطیف لوگ ہیں میں نے جب انھیں بتایا کہ میں
ان سب کا بڑا مداح ہوں اور بڑی دُور سے ان سے ملنے
آنا ہوں تو بہت ہی خوش ہوئے۔ پوچھنے لگے ”میرا فضل!“
تمہارے لیے جانے یا سنی وغیرہ منگواؤں؟“ میں نے تکلف
میں انکار کر دیا کہ کہیں مدیہ نہ سمجھیں میں چلنے لگا تو نیلو
نے یہ تک پوچھ کر تمہارے پاس سواری نہیں ہے تو میں
اپنی گاڑی میں طہر چھوڑ آؤں لیکن میں میں شکر ہے ادا کر کے
اسٹوڈیو سے نکل آیا۔ اور وہ جو آج کل نیا سیر و بہت
چڑھ رہا ہے۔۔۔ محمد علی اور وہ جو نئی سیر و ہے نا۔۔۔
بہت ہی خوب صورت۔۔۔ وہ جو بڑی آنکھوں کی وجہ سے لنگر بڑی

سی لگتی ہے نہ بیا... ان دونوں سے بھی ملاقات ہوئی
بلکہ محمد علی سے تو بہت باتیں ہوئیں۔ کمرہ تھا جس کی کھلی تھائے
قبضے میں آؤں گا، اور تمہارے دوستوں سے بھی ملے گا۔
را جولی آنکھیں بہت پھیل چکی تھیں۔ میں نے انہیں
مزید پھیلا کر مناسب نہیں سمجھا اور کپ بادی کا یہ سلسلہ روک
لیا۔ دھیرے دھیرے را جولی آنکھیں معمول پر آئیں لیکن اب بھی
وہ کچھ ایسی حیرت دہی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
جیسے میں کوہ قاف کی سیر کر کے آیا ہوں۔

ہاں اگر وہ سنبھل کر لڑا تو یاد آ گیا نیلوالی ہے؟ میں نے
سکسے پر غور میں غلم میں جیسی گوری پختی اور خوبصورت نظر
آتی ہیں حقیقت میں ایسی نہیں ہوتیں۔

اسٹوڈیو کے قریب بی بی گاڑی کے نیچے چلے جانے
سے بال بال بچا تھا اور نیلوانے کھڑکی سے سر نکال کر غصے
سے میری طرف دیکھا تھا تو ایک ایک آپ کی آنکھوں کے
باہر جو جیسے اس کی رنگت گندھی سی ہی لگی تھی لیکن میں
جانتے کیوں اسے گوری چینی ثابت کرنے پر تل گیا۔ نہیں
یار! میں نے زور دے کر کہا تو وہ تو سرخ و سفید سے کالی
یا سائلی تو کوئی بریدیں بھی نہیں ہے۔ میں تو سب کو اتنے
قریب سے دیکھ کر آیا ہوں جتنے قریب اس وقت تم بیٹھے
ہو۔ میں اس طرح ہیر و منوں کے رنگ و روپ کا دفاع
کند ہا تھا گویا اب میرے مستقبل کا دروازہ ہوا اور ان کے
سمس پر حرف آئے کی صورت میں بھلے کوئی ناقابل تلافی نقصان
پہنچے گا اندیشہ جو میں بچہ لے کر خلوں دل سے گھس گیا
را تھا کہ بھلے خود بھی یہی محسوس ہونے لگا تھا کہ میں سچ ہی
بول رہا ہوں۔

اس دن کے بعد را جولی میری دھاک کچھ زیادہ ہی بیٹھے
گئی۔ اب وہ میرا دوست سے نہ بلکہ چلا نظر آتا تھا۔
شب و روز نہ غم محسوس طور پر گزرتے جا رہے تھے۔

میرٹک کے امتحان قریب تھے تو مجھے عشق ہو گیا زندگی
کا پہلا عشق... پہلا عشق انسان کو کبھی نہیں بھولتا۔ مجھے
ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں اس لڑکی پر عاشق ہو گیا
ہوں۔ سالانہ میں کافی عرصے سے اسے دیکھتا آ رہا تھا کہ وہ
بھاری گئی ہی میں سامنے چند مکان چھوڑ کر رہتی تھی اور
اُس طرف سے جو کچھ بنی بند تھی اس لیے کہیں آتے جاتے وقت
اُسے ہمارے ہی گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں
نے بہت کم لمحوں کو برق جیتے دیکھا تھا۔ وہ انھی میں سے

ایک تھی۔ وہ نہ بیشتر لڑکیاں عمر و کیفیتوں وغیرہ پر کام کا جس
حسرت لگتی تھیں اور برقع نہیں پہنتی تھیں مگر کسی کی مجال
نہیں تھی کہ وہ چلتے اٹھیں گھورتا اور جھپٹ جھاڑ کرنے کی
کوشش کرتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بیشتر لوگ ایک
دو ہرے کے شجرہ نسب تک سے واقف تھے۔ خود انھیں
شکایت پہنچ جاتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ تقریباً جو میں
گھنٹے کام کا چ کر کے والی یہ لڑکیاں ایسی مردار اور مزید
ہوتی تھیں کہ ذرا سی خلاف مشابہت پر استغیثیں چڑھا لیتی
تھیں اور کوئی قابل تہمتی تھیں تو کہ ان میں بہت کم ہی ایسی
تھیں جن کے پاؤں میں تھوڑی ہوتی تھی۔

جس لڑکی کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا نام غیم تھا۔ ان
کارہن میں کچھ شہری قسم کا تھا۔ غیم کے متعلق میں آپ کو
کیا بتاؤں... آپ نے کبھی جنسی کا بھول دیکھا ہے؟ ہر روز
تو جھانک رہا ہوں بالکل ویسی ہی تھی۔ سفید نازک اور خوشبو
کھیرتی ہوئی برقع سے بھی اس کے وجود کی نزائیں اٹھتی
رہتیں، خوشبو بکھرتی رہتی۔ اب ایسی لڑکی سے کوئی پیار نہ
کرے تو کیا کرے؟

وہ کبھی بھلا ہی گھر سے نکلتی تھی اور جب بھی نکلتی تھی
میںوں کا صبر و قرار ٹوٹ کر لے جاتی تھی۔ میں روزانہ اسکول
جاتے وقت نظر آ جاتی اس روز تو اسکول میں بیٹھنا ہی دشوار
ہو جاتا۔ ہر طرف اسی کی صورت دکھائی دیتی، ہر چیز سے اس
کی خوشبو آتی۔

ایک روز تو میں کتابیں بغل میں دھانے اسکول جانے
کے لیے گھر سے نکلا اور وہ آگے جاتی نظر آ گئی تو میں گویا
نیند کی سی کیفیت میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا معلوم
نہیں میں کب تک چلتا رہا۔ عین اُس وقت آیا جب
وہ اچانک ہی میرے سامنے سے غائب ہو گئی۔ میں نے
سر جھٹک کر اوڑھ دھڑکیا تو اپنے آپ کو ایک چار دیواری
میں کھڑے پایا۔ سامنے ایک چھوٹی سی عمارت پر ایک
دھندلا سا بورڈ چھوڑ رہا تھا جس پر لکھا تھا دوست کاری مرکز
ایک خزانہ کی طرح ہے۔ پھر مجھے میرے سامنے کھڑی
بھی گھوڑی تھی اور کھڑی سی آواز میں پوچھ رہی تھی تم کہاں
تھو اٹھائے جیلے جا رہے ہو؟ کس سے مل رہے ہو؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور سر ہر پاؤں رکھ کر
وہاں سے بھاگ آیا مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ کبھی بھلا وہ دوست کاری
کے اسکول جاتی تھی لیکن اس کا کوئی وقت مقرر تھا اور نہ
دن... جانے کیوں باقاعدگی سے نہیں جاتی تھی۔ بہر حال

ہندوؤں کے لئے 4 ہندوؤں کی مخالفت لکھا جاں ہے ہندوؤں کے لئے 4 ہندوؤں کی مخالفت لکھا جاں ہے ہندوؤں کے لئے 4 ہندوؤں کی مخالفت لکھا جاں ہے

مصنف: اقبال کاظمی

انگلے

○ ایک ایسے سرفروش کی ہنگامہ خیز زندگی کی سرگزشت، جو اپنے ملک کی سرحدوں کی سلامتی کو یقینی بنانے کے لئے دشمن ملک کے شاطر ہندوؤں کی سازشوں کو ناکام بناتا رہا۔

○ اقبال کاظمی کے قلم کی روانی اپنے جو بن پر ہے۔ قلم کیا ہے؟ ایک تلوار ہے، جو ہندوؤں کی سازشوں کے تانے بانے کو کاٹتی چلی جاتی ہے۔

○ محبت کی داستانوں کو رقم کرنے والے اقبال کاظمی کا قلم اس کہانی میں بھی تشنہ نہیں رہا۔

خوبصورت سرورقی، سفید کاغذ، عمدہ طباعت

دو جلدوں میں مکمل سیٹ - 360 روپے

76689589

اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا میرے سامنے کھڑی وہ بہت چھوٹی اور نرم و نازک سی لڑکی تھی لیکن وہ بالکل پُر سکون تھی جبکہ میری ٹانگوں میں بالکی سی لڑش تھی حالانکہ میں نے اصرار اور صبر کیج کر اطمینان کر لیا تھا کہ ٹانگیں کوئی نہیں ہے، وہ شاید غم میں بھی مجھ سے بڑی تھی۔ ایک ایک جگہ سی ٹکنت اور وقار تھا اس کے انداز میں۔

میں نے جب سے فقہا ساریکٹ لگا ل کر لکھنا بہت ہی اس کے نازک اور کڑا نہایت میں تھماتے ہوئے لے کہا تو آپ کی یہ ایک بات تھی میرے پاس۔ اور فرمایا میں لگاتے قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ لگی کے سر سے پرہیز کر رہی تھی لڑکھنے کی حرمت تھیں بڑی کد اس نے بیکٹ ہاتھ میں ہی رکھا ہے یا چھینک دیا ہے، وہ دین کھڑی ہے یا اپنے گھر میں داخل ہو چکی ہے۔

خطر میں میں نے اسے جواب بھر کہا، پہنچانے کا طریقہ بھی بتا دیا تھا چنانچہ اس دن کے بعد جواب کا انتظار شروع ہو گیا۔ پہلے دن تو اندیشوں ہی سے دھانسنے لگا کہ کس خط اس نے پڑھنے کے بعد اپنے باپ کو نہ دے دیا ہو جو شاید لاشی کے گھر لے کر آجائے۔ آدنی کو کہہ وہ دھان یا ان ہی محتاط غصے کا تیز لگتا تھا چنانچہ اندیشہ محسوس ہوتا کہ میرا بھی راجہ والا ہی انجام نہ ہو کر ٹکی میرا خداداد ایسی میرے منہ پر سے مارے مگر کچھ بھی نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔

میں نے ایک بار پھر کاغذ پر دیکھ دیا ہے کچھ ناکال کے قسم کا خط لکھا وہ بھی پہلے ہی خط کے سے انداز میں اس تک پہنچ گیا مگر اس کے جواب میں بھی خاموشی رہی، ناراضگی نہ برہی۔ تو تیرہ دن التفات، کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا البتہ یہ قسم ضرور پورا کر اب اس سے سامنا شاد و نادر رہی ہوئے لگا خاباً اس نے گھر سے لنگنا بہت کم کر دیا تھا۔

میں کبھی کبھی ادھر ادھر کھڑا ہو کر اس کا انتظار کیا کرتا اور کچھ یوں لگتا جیسے میں حدوں سے انتظار ہی کر رہا ہوں۔ یہی ٹانگیں شل ہو چکی ہیں، آنکھیں تھرا گئی ہیں اور زندگی کی آخری دمق بھی میرے جسم سے نچر کر خضاوں میں تحلیل ہو چکی ہے۔۔۔ اور یہ انتظار لایسا انتظار تھا جس کے لیے کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا جس کے پیچھے من کوئی اس نہیں تھی۔ بے وجہ ہے وہ اور حاصل انتظار۔

بالآخر انتظار کا یہ سورج دُوب گیا میرے پیٹ کے امتحان شروع ہو چکے تھے اور میں حتی الامکان کوشش کرنے لگا تھا کہ کڑھائی کے علاوہ کوئی بات میرے حاکم میں نہ آئے۔

میں دن بھی مجھے دھم سا ہو جاتا کہ آج وہ گھر سے نکلے گی اس دن میں چار چار گھنٹے ٹکی میں کھڑا رہتا۔ بالوں میں تیل چھڑ کر اور کچھ پیچی کر کے میں راست میں پورا دا بھیا نظر آئے کی کوشش کرتا کرتا کبھی کبھی میرے صبیحتی الامکان صاف رکھنے کی کوشش کرتا۔ اگر کبھی کبھی راجی و غیرہ برداشت نہ ہو کر نہ رہیں تو خود ہی دھولیا۔ عرصہ تک عشق نے شخصیت میں بڑا نکھار پیدا کر دیا تھا۔

مگر وہ کج نصیبی چرانت کر اللہ میال کے ہاں سے پتھر کا دل لے کر آئی تھی کبھی اس کی آنکھوں میں اس جذبے اس التفات کی دین تک نظر نہ آئی جس کی آواز نہ دے میرے تھے سے دل میں آگ لگا رہی تھی۔

بالآخر میں نے اپنی استعداد کے مطابق خوبصورت ترین الفاظ جمع کر کے اس کے نام ایک خط لکھا۔ دل میں دل میں نہ جانے کتنے دن تک میں اس خط کی ترتیب و ایض میں مصروف رہا اور جب کتنے بیٹھا تو میرا خیال تھا کہ خط بہت لمبا ہو جائے گا لیکن کبھی کا ایک منظر پورا ہوئے ہی خوشخبرہ الفاظ ختم ہو گیا، اس لیے اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔

خط کے اصل الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن یہ یقین ہے کہ سکنا بول کے دیا خط میں ایسا نہیں لکھا اس لیے کہ قربت کے اظہار میں سچائی، خلوص اور لگی کی خوشبو صرف ایک بامری آتی ہے باقی سبب اتفاقیات ہوتی ہیں انسان سے ہوتے ہیں۔ منافقت اور دوسری ہوتی ہے۔ وہ میری پہلی محبت تھی اور پہلا محبت نامہ، یہی تو اس میں سچائی کی خوشبو تھی۔

خال خط بھیجنا مجھے آداب محبت کے کچھ ضلالت نظر آیا اس لیے کئی روز کا عجیب خرچ بچا کر مقصود پہنچا ہے چار آنے والی عطری ایک شیشی اور بارہ آنے والا دھبی و مال غیر بارہ ان تینوں چیزوں کو ایک چھوٹے سے ٹھانے میں لپیٹا اور کوئی دن تک بڑی حفاظت سے جیب میں لیے پھرتا رہا۔

کوئی مناسب موقع نہ ملا بالآخر ایک روز منڈل موقع تیسرا ہی گیا وہاں سے آدنی تھی اندیشہ گھر سے نکل رہا تھا۔ عام طور پر وہ یوں میرے قریب سے گزرتی تھی جیسے آئے علم ہی نہیں کہ میں بھی کس موجود ہوں یا اگر میرا کوئی وجود ہے بھی تو محض راستے کے ایک طرف کھڑے ہوئے کسی ٹرڈ ٹرڈ دھت یا۔۔۔ تحت جھڑکی کی طرح۔ جن کی طرف کوئی نظر اٹھا کر دیکھے۔ یہ بھی زحمت نہیں کرتا۔ چنانچہ مجھے آگے بڑھ کر اس کا رستہ روکا پڑا اس کا آدھا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ چلوں کی جھلریں

جان کو کس حد اب میں ڈال بیٹے تھے۔ میں نے پیادہ پانی کی پتی پر بیٹھتے ہوئے کہا: بابا! آخر آپ مجھے مزید تعلیم کیوں دلانا چاہتے ہیں، یہیں رہ کر یا پھر شہر جا کر چھوٹی موٹی نوکری کر میں اب کبھی کر سکتا ہوں اور ہم پر کوئی تسنن زیادہ بوجھ تو ہیں نہیں کہ میں بہت زیادہ کمال کی ضرورت ہو۔

”تم نہیں سمجھ سکتے بیٹا! انھوں نے بچہ ای آکار کر کچھ بولی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: بات صرف کمال کی ہی نہیں ہوتی... انسان کے کچھ خواب بھی ہوتے ہیں... میری تہا ہے کہ دنیا بھی تم قدر کم کا ڈنڈا لیکن ساتھ ہی کوئی مشورہ اور بڑے آدمی ہو... رو بہا تو بہت سے لوگوں کے پاس ہے لیکن وہ سب بڑے اور مشہور آدمی تو نہیں ہیں نا! پھر جیسے ان کی نظر اپنے خوابوں کی پھول پھولتوں میں پھٹنے لگی۔ ”میرا جی چاہتا ہے کہ شہر میں تمھارا بڑا سا بنگلا ہو۔ تنہا ہی بڑی کوئی پڑھی لکھی عجم قسم کی عورت جو فصل آسنے پر تم لوگوں کے لیے کبھی پیاز کی اور کبھی لہسن کی بوری یا پھر ٹیوں کا گٹھڑ لے کر آیا کروں اور جنگل کے باغیچے میں کھیتے ہوئے میرے گول مٹول پوتے پوتیاں غور جیبا کرے۔ دادا جی آگئے... دادا جی آگئے! پھر وہ دو دو کر میری ٹانگوں سے چٹ چٹا کر کے: بابا جی کے چہرے پر اس مسرت آگئی اس قدر سے سرجی سی آگئی مان کی آنکھیں دو دو جوا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ میں نے شہر لے کر کس کسٹش کی لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے وہی سہی آواز میں کہا: بابا جی! اگر میں بڑا اور امیر آدمی بن گیا اور شہر میں میرا بنگلا ہو تو کیا آپ میرے ساتھ نہیں رہا کریں گے؟ آپ بھلا پھر کس طرح لہسن پیاز کی بوری یا گٹھڑ کا گٹھڑ لے کر آیا کریں گے؟“

”نہیں بیٹا...“ بابا نے سر کھپاتے ہوئے کہا: میں تو بالکل سیدھا سادہ دیہاتی سا آدمی ہوں میں بھلا جنگل میں رہتا کہاں اچھا لگوں گا میں تو یہیں رہا کروں گا میں بیٹے دو بیٹے دے دیتے آسمان پر کروں گا تم میں اتنی مہربانی کرنا کہ اپنے دوستوں وغیرہ کو یہ مدت بتانا شروع کر دینا کہ یہ بڑھا ہمارا نوکر ہے بسا کہ کئی پڑے تھے اور دولت مند بیٹے اپنے دیہاتی والدین کے بلایے میں آتے گئے میں تم مجھے بابا جی ہی کہا کرنا۔ ایکسے میں بھی اور سب کے سامنے بھی تاکہ میں بھی جی بھر کے اس غریبی و محسوس کر سکوں کہ میں ایک لائق، مشہور اور سعادت مند لوگ کے کا باپ ہوں!“

میں ایک ننگ بابا جی کی طرف دیکھتا رہا اب میرا قد ان سے اونچا ہو چکا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے بہت بلند قامت لگ

دیتے بھی اب، شیم نے گویا گھر سے نکلتا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے بھی اس کے حق پر کوئلہ کے نہیں خانے نہ دھکیل کر اس پر زور دیا تھا کہ اتھل ڈال دیا میرا خیال تھا کہ یہی شکل ناگانی اور غریبی میرے شہر کا انجام ہے اور میں نے اس پر صبر کر لیا تھا۔

میرا کس میں۔ نے سیکٹر ڈیڑ فٹ میں پاس کر لیا تو باجی کو شوق چڑھا کہ وہ مجھے مزید اعلیٰ تعلیم دوا میں گئے انھیں یہی احساس ہو چکا تھا کہ اب زمانہ بدل چکا تھا اتھل میرا کس کی کوئی خاص قدر نہیں رہی تھی اور انھیں یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ کوئی کوئی بہت اور بچا قسم کا سودہ نہیں ہوگا بلکہ گھر کی سے آگے جہاں اور بھی سی۔ دوسرے وہ اپنے ہمسوؤں کے بچوں کو بھی کالج میں داخلہ لینے کی تیاریاں کرتے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ میں بھی ان کے اصرار پر مصالحت وغیرہ کے لیے سیکٹر چلا گیا جب میں نے خرچہ وغیرہ کا حساب لاکران کے سامنے رکھا تو وہ چپ سے جو گئے۔

اس زمانے میں گو کہ تعلیم بہت سستی تھی لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے تیس سالس روپے لینے کا خرچ بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ غالباً ابھی کوئی کشادگی نظر نہیں آ رہی لیکن وہ بہت ہارنے والے نہیں تھے۔ گولی میز تو جو لوگ گھر میں دیتا اب نہیں تھی، اس لیے اس رات انھوں نے جاپانی اور موٹر ڈھاکا کافر نس بلائی جس میں دو تیل چھا اور ان کی بنگالت خرید کر تھیں۔ بابا جی نے مسئلہ ان کے سامنے رکھا کہ روٹے کو خوب یلیم بہر حال میں دلانی ہے اور اس کے لیے انھیں بھڑکوں اور بھڑکوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ جہاں شکرانہ کافر نس نے منہ مار کر باری باری یہی جواب دیا: ”تم تو اپنے بچوں میں سے کسی کو تعلیم نہیں دلا سکتے، تمھارے بچے کے لیے کیا تعاون کریں؟“

بابا جی اپنا سامنے لے کر رہ گئے۔ کافر نس پونہی ختم ہو گئی اور اس رات ابھی مہوئی سے کچھ پہلے ہی چاند میں منہ چھپا کر لٹ گئے۔

دوسرے روز وہ کام پر سے واپس آئے تو ان کے چہرے پر بگڑے شہر میں کسا انھیں لال نہیں تھا میں اس وقت اپنی جاپانی کسٹ رہا تھا خوب انھوں نے میرا کٹھا چھینکے ہوئے کہا: تم فائدہ وغیرہ بھر کر کہہ لینا۔ دماغ کے کٹاؤں آئے سے پہلے میں تھیں پیسے دے دوں گا۔ داخلہ زور لینا اور کتابیں وغیرہ بھی لے آنا، فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ معلوم نہیں وہ کس طرح زبردست کر پے تھے اپنی

لے کر ہی بے عزتی کا مال ٹوہ بہت تھا اور مذمت سے دل چاہ رہا تھا کہ ایک آدھ کا جھڑا توڑ دوں مگر پولیس کا سن کر میں غصہ ہی اندر کچھ کھوسا گیا تھا۔ عمارتوں کا جو میں کوئی جاننے والا نہیں تھا میں تو کسی سوچ کر خود اکاٹھ کر آ رہا تھا کہ باجر کے لیے کرشٹ کا کھڑا جان لیوا ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ زمین میں راج کر لاش لے کر کس منہ سے گھر واپس جانا لیکن راجو نے اس پہلو پر سوچا تاکہ میں تنہا وہ کو باہر آ کر میرا بڑا بھائی ڈالنے لگا تھا۔ وہ لے وہ باتیں یاد دلادلا رہا تھا جو میں نے پچھلے مرتبہ لاہور سے جانے کے بعد اسے سنائی تھیں۔

میں خاموش رہا اور دل ہی دل میں مشورہ تو بنا کر تیار تھا کہ اس واقعے کے بعد میرے ذہن میں اس خواہش کی جڑیں کھد اور گہری ہو گئیں کہ کبھی میں اس مقام پر پہنچوں کہ اپنے دوستوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں داخل ہو دوں فلائٹ میں سے لے کر ہیر دکن تک ہماری راہ میں اکٹھیں پھیل کر سے مجھے نہیں معلوم تھا کہ کون لوگ اس کیفیت کے مالک ہوتے تھے اور میں کس طرح اس مقام تک پہنچ سکتا تھا۔ میرا مشورہ بھی اس خواہش پر بیٹھنے پر مجبور کرتا تھا لیکن دل اکٹھا تھا کہ اس خواہش کی آبیاری کیے جا رہی تو اب کا ہیر دکن چکا تھا۔

شعبوں کا کافی دن ہوئے بنانے لگا تھا ریشو بناتے وقت میں اکثر دھندلے سے آہٹھنے میں غفلت زادوں سے بار بار اپنے حیرت کا جائزہ لیتا اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا کرتا کہ اس حیرت کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن مجھے کوئی واضح جواب نہ ملتا کیسی میں اپنے آپ سے سوال کرتا کیا میں ہیر دکن سکتا ہوں؟ اپنی شکل ہماری کو کبھی کبھی سے لیکن میرے حتی الامکان خیر جاندارین کر اور خود ہی کسی سے ہاتھ پر کر دیکھتا تھیے اپنا چہرہ پاکستانی ہیر دکن کے مروجہ معیار پر پورا اترتا دکھائی نہ دیتا۔

میری جسمانی ساخت ہیر دکن کے عیار پر مبنی نہیں تھی کسی حد تک میں ماڈی بلڈ نظر آتا تھا۔ ہیر دکن میں آتا تھا کہ مجھے ہاں ہیر دکن کا جو قصہ دراز ہے جس میں اس پر پورا نہیں اترتا البتہ کسی جاہل اور سفاک چور دہری کے کردار کے لیے میری شخصیت بے موزوں تھی بھر میں اپنے دل کو ٹھٹھاتا تھا اس ہوتا کہ ہیر دکن میں بننا ہی نہیں چاہتا تھا میں تو اس سے بھی کوئی اونچی چیز بننا چاہتا تھا۔۔۔ نہ جانے کیا؟

راجو کا دلچسپی میں میرے ساتھ نہیں تھا۔ فرسٹ ایئر سے اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا باپ اکثر بیمار رہنے لگا تھا اور اس نے راجو کو مستحق ادا کر پڑھا دیا تھا۔ سکول کے زمانے

ہے تھے، بہت ہی اونچے۔ وہ بہت کم باتیں کرتے تھے لیکن جو بھی کہتے تھے گویا دل میں کھلب کھل کر کہہ جاتی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ اچانک ان کے سینے سے جیسے جیسے جھڑا اور کسی تھکے بچے کی طرح زور زور سے دو تھکے ٹھیک ٹھیک ایک عجیب سی جھجک مانع رہی اور اس دوران وہ جڑہ غما کر کے سے باہر چلے گئے۔

میں نے کچھ کچھ میں راسخ لے لیا اور تھکے تھکے دو سال غیر محسوس سے انداز میں گزر گئے۔ ان دور رسوں میں زندگی میں کوئی خاص تلاطم نہ آیا۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ تقریباً وہی پہلے سے معلومات رہے۔ وہی عورتیں دکھائی دیتی رہیں۔ ایک چھوٹا سا اتفاق یہ ضرور پیش آیا کہ اس دوران مجھے ایک بار پھر لاہور کا چکر لگانا پڑا۔ بد قسمتی سے اس بار راجو میرے ساتھ تھا۔ وہ اصرار کرنے لگا کہ اسٹوڈیو کی ہیر ضرور کی جائے۔ مجھے یاد تھا کہ میں اس کے سامنے خاموشی کھیں لگا کر چکا چول اس لیے میں نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

انسان کے مقدر میں جو قسمت ہوتی ہے وہ تو آٹھانی ہی بڑا تو ہے چنانچہ میں بھی اٹھانا پڑی۔ ہیر تو ہم باری، زید نور اور شاہ نور اسٹوڈیو کی کمرے لیکن چونکہ راجو دل کے ہاتھوں خاصا ذلیل ہو گیا تھا شاہ نور میں تو ہم نادانستی میں ایک سیٹ پر بھی جا پہنچے جہاں جینرٹ کو ہم شمیم آرا پر ایک گانا بچھ کر رکھ دیتے رہے پھر پوچھا کہ فریض پر رکھیں ہوئے ہوئے بڑے سوچے بورد زید اور دھار اور پھیل ہوئی۔ بھلی کی موٹی موٹی ٹاروں میں اٹھ کر راجو کر پڑا۔ وہ اٹھنے لگا تو اس کا ہاتھ کسی ایسی جگہ پر لگا جہاں سے اسے کرشٹ کا خاصا زور دار چھٹکا لگا اور وہ اٹھ کر سیدھا شمیم آرا پر جاگرا جو اس وقت ہاتھ بورد کی ایک عورت کی دیوار سے لگی تھی۔ شمیم آرا آنکھوں میں ٹال کر ایسے گانا بچھ کر کر رہی تھی دیوار شمیم آرا اور راجو تینوں ہی ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔

اس کے بعد ہمارے ساتھ خاموشی بڑی ہوئی۔ ڈاڑھ بھر لاشٹ ٹیڈل اور مگر چوگان و جڑو نے پہلے تو یہ تصدیق کی کہ ہم کسی متعلقہ آدمی کے ساتھ نہیں آئے پھر انھوں نے ہماری پٹائی ٹھانے کا ارادہ کیا اور ایک صاحب نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ انھیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے لیکن شمیم آرا ہی کی بدولت ہماری جان بچ گئی۔ اس نے نہایت بیزاری سے کہا کہ وہ جلد از جلد یہ سب ختم کر کے گھر جانا چاہتی ہے اس لیے کسی ثالث پکڑیں۔ آخر کچھ وقت نہ صاف کیا جاسے۔ یوں ہماری جان بھی ادا انھوں نے ہمیں صرف ڈھڈا ڈولی کر کے فلور سے باہر پھینکنے پر اکتفا کیا۔

اسب بھنے خیال آ رہا تھا کہ جب میں شمیم کی محبت میں مبتلا ہوا تھا تو میں نے اس کے گھر شادی کا پیغام بھجوا دیا تھا۔ لیکن اپنی اس سوچ پر بھی مجھے خود استغناء کیسے ہوتا تھا۔ بھلا میرا رشتہ سہلے کر کون بناتا؟ اور میں اس وقت عمر کے لحاظ سے اتنا چھوٹا تھا کہ میرے منہ سے شادی کی بات سن کر آباد پوچھا دیتا۔ شاید مجھے دو چار چائے رسید کر دیتے۔ اس کے علاوہ شمیم نے بھلا انکسائٹ ہی کیا نظر کیا تھا جو مجھے اتنی شہ ملتی۔

اُس روز میں گلی میں کھڑا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا اور اپنی اُداسی کو دل میں چھپانے شمیم کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی کوڑوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہوتی تھی۔ شاید بول سے کوڑا ملے۔ بسے تھے یا پھر میرا دم تھا۔ دھنسا ایک بچی کیلے کے تھیلے میں اپنے کھول کی کھڑکیاں اور چھوٹی سی تختی ڈالے۔ دروازہ کھول کر نکلی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری کسی کی تھی لیکن آسمان میں جاتا تھا کہ یہ شمیم کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔

میرے قریب تک کر بھی نہ آیا۔ ایک منٹ کی کھول کر ایک طرف اُڑا کا غذا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو یہ شمیم کا جیسہ دیا ہے۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے جیسے سکتا سا ہو گیا۔ پھر میں نے کاغذ بچی کے ہاتھ سے چھپٹ لیا اور وہ ایک گہری سانس لے کر آگے دوڑی۔ ملی گئی۔ میں نے کاغذ کو اسی طرح مٹھی میں چھپایا جس طرح بچی چھپا کے لاتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر شمیم کے گھر کی طرف دیکھا۔ دونوں پٹ تقریباً ملے ہوئے تھے۔ معمولی سی درخت تھی بیج میں... اور اس کے کچھ ڈیڑھ چھوٹی اندھیرا تھا مگر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس درخت سے وہی کھول آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں جن میں کبھی مجھے انکسائٹ کی شہنشاہ جھلانی نظر نہیں آتی تھی۔ کیا دم رخصت رہا آنکھیں پھر پڑھان ہو رہی تھیں مگر اب کیا فائدہ؟ پھر دل نے کہا، احمق کیسے؟ فائدے نقصان کو کوئی مار... کسی کی محبت تو سراسر یہ حیاست ہوئی ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ملے سمیٹ لینی چاہیے اور شیر... اسی سے اتنی غرض نہیں میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہ ہی کہا ہے، فرما دیا چل کر دیکھ تو سہی، کاغذ کے اس پرزے سے پر کھٹکا کیا ہے۔

اپنے کمرے میں آکر حلقوں کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے رد کو کھولا۔ چھوٹے چھوٹے خرابوڑ اور ہموار الفاظ کا خواندہ میرے سامنے بکھرا ہوا تھا۔

کے اور بھی کئی ساتھی ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ مان کی جگہ ارد گرد کے دیہات کے بہت سے ٹپکے کالج میں دکھائی دیتے تھے۔ میرا اب بڑھائی میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ بس گویا کوئی قسم سی تھا۔ ہاتھ پر مجھے بڑا سست سا کام لگتا تھا جبکہ میری ارد گرد میں سو گویا دوڑتا نہیں تھا۔ کھوٹا تھا کوئی آتش فشاں تھا جو جسم میں مقید تھا۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کوئی بنگلہ مگر خیر۔ ولولہ بکھرا کام۔ زندگی کی سست ریزی سے بچے کبھی کبھی چڑھنے لگتی تھی۔

اپنی دونوں میں سے کسی سے سنا کہ شمیم کی شادی ہو رہی ہے۔ بات لاہور سے آئے گی۔ میرے کمرے میں اس کے مضمون کی آگ سرد ہو گئی تھی۔ میں بولے گا کہ میرے تھے مگر یہ خبر سن کر پیسے لگے ہیں۔ دنی ہوئی کوئی پینکٹری ہو یا کراک شعلہ بننے لگی۔ کوئی بھولی مری سی کسی کسک اُچھڑائی۔ کوئی خواہیدہ زخم جاگ اُٹھا۔ تین برس بڑا خول عرصہ ہو تا ہے۔ اس عرصے میں لوگ ماننے کیا کیا بھول جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی اس کی یاد کسی تاریک گوشے میں پڑے گا۔ آدھ موت کی طرح چھپ چکی تھی مگر اس کی شادی کی خبر سن کر جیسے یاد کا یہ موتی ایک بال پر جھللا اُٹھا۔ میرا یہ چاہا کہ اسے ایک صحت قسم کا خط لکھوں جس میں لے لے دے وہاں ہر جانی دھوکے کا زور ایسے ہی بیسیوں دوسرے القابات سے نوازوں... مگر پھر مجھے اپنے آپ پر ہی کچھ عجیب ترحم آئینے انداز میں منسی لگتی تھی۔ فوراً ہی زہاں آگیا تھا کہ اُس نے جھلا لہر سے وفا کا وعدہ یا محبت کا فکرت کر لیا۔ اب ایک تھا جو وہ بے وفادار منکر محبت ہو گئی۔

ایک محبت سے میں نے اس کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ میں لگتا تھا جیسے وہ کسی ترخانے میں رہتی تھی۔ اب جبکہ اس کی شادی کے چرچے سننے لگا کہ میرے تھے تب بھی ان کے گھر میں کوئی خاص تھیل یا لوگوں کی آمد رفت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میری پہلے کا سا سکوت طاری رہتا تھا۔ اس کا باب جمجھ ہی مچھ مچھ کر ڈھکیں۔ میرے کمرے پر نکل جاتا تھا۔ وہ کسی دیکھ کاٹھی تھا اور بہت کم کو شخص تھا۔ شاد زانو وہ کسی سے بات کرتا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ سے ایک ہی شیر فرالی میں رکھا تھا جو اب مجھ گھس گھس کر ملل کے اس کو تے سے مشابہ دکھائی دینے لگی تھی۔ جیسے یہاں رنگ بے دیا گیا ہو۔

کبھی کبھی وہ شمیم کی ماں کو سامنے کر لے کر فائدے ہاتھ میں اُٹھائے کہیں جایا کرتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ شمیم کی ماں کو کوئی املازم قسم کی بیماری تھی۔ مگر وہ اس کے علاج کے لیے کوشاں تھا۔ کئی شہر مل کے اسپتالوں کے پکڑ پکڑا تھا۔

میرے اپنے! تم حیران تو ہو گے کہ تم نے تقریباً تین برس پہلے خط لکھا تھا اور میں آج جواب دے رہی ہوں۔ میں پھر محو بریاں تھیں جنھوں نے تمہارے ہنسکے بیرون میں زنجیریں ڈالنے کی کھیں۔ تم کیا جانو کہ یہاں تک جن شر توکل کا اظہار تم نے اپنے خط میں کیا تھا اس سے کہیں زیادہ خیریت سے میں نے تمہیں جا رہے۔ تمہارے متعلق سوچتے سوچتے نہ جانے کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ کتنا جی چاہتا ہے کہ تم سے ملوں، تمہیں دیکھوں۔ تم سے آن گشت بائیں کر دوں۔

تاخیر تو بہت ہو گئی ہے لیکن سوچتی ہوں اب بھی کچھ گھر باقی ہیں، جانتے جانتے کیوں نہ ایک طاقت کی یادیں، اس غالی دامن میں مٹھ لے جاؤں کل میرے آئی اے صبح ہی صبح سا کلوٹ چلے جائیں گے اور ملت گئے واپس آئیں گے۔ کل اقامہ بنے تمہیں بھی کارگسے چھٹی ہوگی، جو سکے تو اس آشت شہت کو دلا سائے نہ آجہا نہیں پہنچے۔ وہاں سے کی گزری کئی رکھوں گی کہ پورا وہاں نہکے کے دریاں موقع مناسب دیکھ کر اٹھنا چاہا۔ احتیاطاً ملکی تفتیش اس لیے نہیں کر دوں گی کہ مجھے معلوم ہے میری عزت تمہیں اپنی عزت سے زیادہ پیاری ہوگی۔ قیمت کرنے والوں کا یہی دستور ہوتا ہے۔ تمہاری!

شمیم

اس کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اس کا نام پڑھ کر نہ جانے کیوں ذہن میں چھٹا سا جھجھکیا جیسے چاندی کے برق ہاتھ سے چٹوٹے کہ پتھر ملی زمین پر جا پڑے ہوں۔ ایک من موٹی سی صورت ذہن کے وہند لائے فرق یروں آپس کے لیے جھک کر غائب ہو گئی جیسے تھکے فضا میں لڑا جھٹا رہا جیسے سمندر کی کسی سر پر چاندنی کی قفل۔

میرے ارد گرد چھیل کی خوشبو پھیل گئی۔ دل کے اہرام ہیں مقیدہ یزیدوں کی حوطہ شدہ لاشیں جیسے انجھڑیاں لے کر اٹھ کر پڑی ہوئیں۔ انہیں نئی زندگی مل گئی تھی۔ یہ کہنے کے لیے ایک کو دی ہو کر کسی غم سے کیا جس کی مصروفیت پر جوتانی چکے سے شب خیز مارچ کی تھی وہ زمانہ یاد آیا جب میں قیسم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنوں گلی میں گھڑا اٹھا کر کیا کرتا تھا۔

جب ہر وقت دل میں ایک مٹی سی غش، ایک ہلکا سا سوز اور ایک تھکن سی آج محسوس ہوا کرتی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر ان سب جذلوں نے دوسرا جنم لیا اور میرے حواس پر چھاتے چلے گئے۔ روی جذبہ وہی مگن وہی اشتیاق اور وہی جوش و خروش عود کر آیا۔ رات بھر اسی سنسنی کے باعث نیند نہ آئی۔ صبح باہمی کے جلنے کے بعد میں نے اپنی اکلوتی تپکوں اور شیش شرٹ پر کوٹوں والی انٹری بڑی محنت سے پھیری شینو دوسرے بنائی اور لال صابن کی کچی کچی ٹیکی انہاں سے من ختم کر کے چھوڑی۔ آج اس جانب جہاں نے بلایا تھا جس کا نام ذہن میں آتے ہی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ حسب مقدمہ دراپتام تو ضروری تھا۔ تقریباً ساڑھے تین بجے میں نے پچھلی گلی کا چکر لگایا تو موقع مناسب نظر آیا۔

عقبی دروازے کے سامنے سے گزرتے گزرتے میں نے قضا خطوط سے چاروں طرف دیکھا اور غیر محسوس طور پر ہاتھ بڑھا کر دروازے پر ہلکا سا باؤ ڈالا، دونوں پٹ لٹکے چلے گئے۔ میں سر ہٹ کر جلدی سے اندر گھسا اور دروازہ بند کر دیا اس کمرے کا فرش بہت نچا تھا میں جیسے ترخانے میں آکر گیا تھا۔ یہاں تھم خانے جیسی ہی سیلین اور ٹنگا اندھا تھا۔ ایک طرف چار دیواری پڑی تھی جس پر سیٹے سے بستہ لگا ہوا تھا۔ ایک دیوار میں چند نشتے لگا کر لاداری قفا کو لیگز بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں کتا ہیں کا بیاباں اور اخبار وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی جو کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس کے پاس ہی ٹوٹے پھر پر شیم مٹی ہوئی تھی، یہ شاید اُسی کا کمر تھا۔

میری آنکھیں اب کم روشنی سے مانوس ہو چکی تھیں اور کمال سے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی تھی اور نہ ہی اس کے چہرے پر تلیخہ آ رہا تھا وہ تو بس جیسے سنے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ میں پہلی بار اتنے قریب سے اُسے سرتا یاد دیکھ رہا تھا۔ میرا دل جیسے دھڑکنا جھکو لیا جا رہا تھا۔

پینیل کا پھول کچھ کھلا یا سہا سا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی ناکل حلقے اور پستان پر شکنیں یوں ساکت تھیں جیسے سلم آب پر لہریں ایک تخت کسی جاووںی عمل سے متعب ہو چکی ہوں۔ گہری آنکھوں میں دھواں دھواں سا پھیلا ہوا تھا جیسے اس نے کافی دنوں تغفلت کی آگ میں جلتے ہوئے گڑے سے ہوں۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا لباس کافی پرانا اور مسکڑا سا لگا رہا تھا۔ ایک عجیب سا ڈکھمسور کیا جیسے میرے من پسند کھلونے کو کسی نے بے توجہی اور بے پروائی سے عزیزنا سب سی جگہ پر پھینک دیا ہو۔ اگر اس کے جسم پر کوئی خوبصورت سی ساری ہو تو اچھا چہرے کی شکل چھپانے کے لیے اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوتا تو وہ کسی بھی فلمی ہیروئن سے زیادہ حسین نظر آتی۔

چند لمحے ہم بہت بے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر اس نے یوں طویل سا سانس لی جیسے ہوائیں اس کی شہید کی واقع ہو چکی ہوں۔ لیکن وہ بولی اب بھی کچھ نہیں کہیں بھی بدستور خاموش تھا۔ میرا دل گویا سینے کے بجائے کپڑوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی بھی یہی کیفیت تھی مگر وہ مہبت جھری جھیل تھی۔ ذات کی تہ میں جانے کیا کچھ چھپانے ہوئے تھے۔ بالآخر میں نے اپنی توانائی جمع کی اور اس کے قریب چلا گیا۔ تب اس نے سرگوشی میں کہا: ”خوش آمدید“ وہ اسی طرح ٹانگ پر ٹانگہ کے موڑے پر بیٹھی تھی اور میں اس کے سامنے بزم کی طرح کھڑا تھا۔

”خوش آمدید اس طرح نہیں کہتے“ میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔
”تو کب کس طرح کہتے ہیں؟“ اس نے ہر اٹھا کر آنکھوں میں محسوس سی حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی مہر میں گردن کچھ اور لمبی ہو گئی۔

”میں بتاتا ہوں“ میں نے جھجک کر اس کے ہاتھ تھمتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا اور وہ جھجھکی سی لے کر سر جھکا کر رہ گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کے جھجک جیسے نرم ہاتھ ہر طرف کی طرح سرد تھے تاہم اس کا رویہ سرد نہیں تھا۔ ہم چار پانی پراہٹے۔

میں تو اس قدر سی لیکن بہر حال مرد تھا اور مرد کو ذرا سی شرٹ ملے تو ریس کے ٹھوڑے کی طرح سر پٹ، دوڑنے لگتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں جس کا ارادہ لے کر نہیں آیا تھا، جس کی مجھے تپا نہیں تھی وہ سب کچھ ہو گیا پھر چند لمحے بعد میں نے دیکھا وہ تکیے میں منہ چھپاتے پھوٹ پھوٹ کھڑی تھی۔ میں نے تکیے سے اس کا سر اٹھایا۔ آئینہ گویا اس کے دل میں کسی چشمے کی طرح مدھون تھے اور اب راہ پاتے ہی یہ چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔ اس کا چہرہ مرتھکا۔

میں پریشان ہو گیا۔ مجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کر دوں۔ کیسے اسے چپ کر دوں؟ میں نے بڑی اپنائیت سے اس کے کندھے

پر ہاتھ رکھا اور ہلکاتے ہوئے کہا: ”شعور... دیکھو اس میں صرف میرا ہی تو قصہ دو نہیں...“ تو ایسی رد نے باہریشان ہوئے والی کیا بات ہے... کچھ نہیں ہوتا... بس مختص...“

اس نے میری بات کاٹ دی اور جیسے چپکس اٹھا کر دل نہ نہیں کہیں اس وجہ سے نہیں رو رہی تھی اس پر کوئی ڈکھیا ہوتا تھا۔ اس میں تو مجھ سے ایک بات تو چھپا چاہتی ہو۔

”تم گواہ ہونا کہ میں نے اپنے کردار کی کس طرح حفاظت کی تھی؟“ جب سے جوانی کے غار زار میں میں قدم رکھا تھا تب سے مجھے جانے کس کس نے مجھ پر حال چھینے کیسے کی کہ میں نے کسی کی طرف توجہ کی؟ کیا میں نے کسی کو اپنے آپ تک پہنچنے کی اجازت دی؟ میں نے اپنی خواہشوں پر پیر سے لگاؤ رکھا ہے۔

تمہاری کا عذاب جھیلی رہی، طلب لگاؤ میں جھلی رہی۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ کانٹوں میں رہ کر دامن کو بچانے لگا۔ حالانکہ جوانی کا ایک ایک بل کوئی آزمائش ہوتا ہے۔ مجھ میں اسے آزمائشوں میں پوری آرتی رہی اور اسی طرح میں سنا سن مال کی ہو چکی ہوں۔ میں چاہتی تو اس سے پہلے بھی نہ ماننے لگتی۔ مرتبہ

میں یہاں بلا سکتی تھی۔ میرا کمر اس قدر لمبا تھا کہ میں اسے دیکھ ہی لیا ہے۔ کچھ چلی گئی میں بھی اس کا ہوا دار ہے۔ رات کو میں یہاں ہوتی ہوں۔ بار بار ایسا بھی ہوا ہے کہ سوتے سوتے آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ میرے ملق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ جسم سینے میں ترمو چکا ہے اور ہاتھ پاؤں نرٹنے لگے ہیں۔ تب میں پچھلی گھوم لک کر دیر تک ٹھنڈی ہوائیں ٹپکی ہوں لیکن کسی کو کبھی میرے وجود کا صحیح طور پر احساس تک نہیں ہو سکا کہ اس گھر میں کوئی لڑکی بھی رہتی ہے... میں نے اپنے آپ پر یہ بندشیں کیوں لگائے تھیں؟ صرف اس لیے کہ مجھے ماں باپ کی عزت بیاہی تھی... اور اسی ماں باپ نے میرا رشتہ ایک ایسے گھر سے

سے ملے کیا ہے جس کی بیٹیاں عمر میں تقریباً میرے برابر ہیں۔ صرف ایک مرتبہ ہم اپنے دھڑکے کچھ عزیزوں کے ہاں لاہور گئے تھے، دہاں نہ جانے کس سلسلے میں وہ بھی موجود تھا... اس نے صرف ایک مرتبہ مجھے دیکھا اور تب سے میرے والدین کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس نے انہیں نہ جانے کیا کیا بڑھائی ہے، کیا جاؤ کیا ہے یا کیا لالچ دیا ہے کہ وہ راضی ہو گئے ہیں۔ چند دن بعد ہم لاہور چلے جا رہے تھے وہیں شادی ہوئی اور شاید اپنی ابھی پھر کہیں واپس نہ آئیں۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور بستر کی چادر سے آنسو پونچھنے لگی۔ میں دم بخود تھا۔ وہ اپنی ہدایت سی کیفیت سے تدریجے سنہلے ہوئے لولی ہو گئی تھی بہت سوچا...

کرتے انہیں تیرا کی کرتے یا اسی طرح کے کسی اور مسئلے میں
دن گزرتا تھا

ایک روز سہ پہر کے وقت میں نہر کے کنارے غلیل
سے خانہ باری میں مشغول تھا۔ مجھے قصبے کی طرف
سے ایک لڑکا منظور آباد کا بی دیا منظور عمر میں مجھ سے
کچھ چھوٹا تھا وہ ہمارے براہدالی گلی میں رہتا تھا اس کی چھ
پر نظر پڑی تو دوڑنے لگا قریب آیا تو میں نے دیکھا اس کے
چہرے پر ہوا میاں اڑ رہی تھیں۔

”الغفل!“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور تھا سے باپ
کو نکل کر دیا گیا ہے“

ان الفاظ کا فوری طور پر توجہ نہ کر کوئی اثر نہیں ہوا کوئی
بھی اپنی ذات سے ان کا کوئی تعلق ہی محسوس نہیں ہوا۔ اتنی
فیض منش انسان تھے کسی سے ان کی دوستی بھی نہ دشمنی۔
انہیں کون قتل کر سکتا تھا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ اس روز اپریل
کی پہلی تاریخ تھی۔ شاید منظور نے مجھے اپریل فول بنانے کا یہ
بھونڈا طریقہ اختیار کیا تھا لیکن جب میں نے اس کے خشک
ہونٹ اور خردہ آنکھیں دیکھیں تو میرا دل گویا ڈونے لگا۔
”اس قسم کی بچوں میں تمہاری گردن بھی توڑ سکتی ہوں۔“

میں نے اس آئندہ کہا کہ وہ بات بدل گئی اس کا تسلیم کر لے گا
کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا، مذاق کر رہا تھا اس کا ایسا نہیں ہوا وہ
پہلی پھی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر تنوک نکل کر
بولایا میں مذاق نہیں کر رہا، لاش ملک اسلم زان کی جو میں دیکھی
ہوئی ہے... تمہارے بچا دینرو بھی وہیں موجود ہیں پلاؤس
بھی آئی ہوئی ہے“

تب مجھے چپ لگ گئی میرا ذہن جیسے مٹی ہو گیا
اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ معلوم نہیں اس طرح
میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا اس طرح ہوا
یہ سب کچھ صبح تو وہ اچھے بھلے زمینوں پر گئے تھے... کوئی
ایسی دلیسی بات نہیں ہوتی تھی“

مجھے صحیح طور پر تو معلوم نہیں منظور بولا ہم دونوں
تیز تیز قدموں سے قصبے کی طرف چل دیے تھے۔ ہر گز نہیں
آتا ہے کہ رات چوہدری کمال دین کے آدھوں نے ملک
اسلم زان کی زمینوں سے پالی کا بیج اپنی زمینوں کی طرف کر
لیا تھا۔ آج صبح ملک نے ان لوگوں کو ڈرلے دھکانے کے
یے اپنے کچھ بندے ان کی زمینوں پر بھیجے، ان میں تمہارا
باپ بھی تھا۔ ملک نے اسے بندوں کے کچھ بھیجا تھا وہاں
بات بڑھ گئی۔ بہت جھگڑا ہوا۔ تمہارے باپ کو تو گویا ہاتھ

بہت سوچا... خود کو احتساب کی منوی پر چڑھایا، اپنے آپ
سے جواب مانگا کہ آخر میں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کی
پاداش میں مجھے اس جہنم میں دھکیلا جا رہا ہے مجھے کوئی
جواب نہ ملا... آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس جہنم میں پہنچنے
سے پہلے ایک گناہ تو کروں تاکہ میرے خود کو یہ سمجھا کر قتل نہ
سکوں کہ یہ عذاب میرے گناہ کی سزا ہے... بغیر گناہ کے
سنگسٹ ہونا تو بہت ہی اذیت ناک ہے نا... تم بتاؤ کیا
میں نے غلط کیا ہے“

میں اس سے کیا جواب دیتا؟ میں تو برف کا بت بنا بیٹھا
تھا۔ میرا ذہن بہت چھوٹا تھا اور اس کی باتیں بہت بڑی۔
میں کچھ بھی نہ بول سکا میرا ذہن سناتا رہا تھا۔ میں تو صرف
ایک خوبصورت لڑکی سے ملنے اسے اپنی محبت کا احساس
دلانے اس کے لفاظی کے گچھے شکوے کرنے اور اس کے
جود کو بہت قریب سے محسوس کرنے کے لیے یہاں آیا
تھا۔ محض لوجوانی کا سنسنی خیز اشتیاق اور جوش و خروش میرا
بہتر تھا۔ میں عقل و دانش کا پتلا نہیں تھا۔ انجانے میں میرے
قدم نہ جانے کس دنیا کی طرف اٹھ گئے تھے اس نے مجھے
نہ جانے کیوں اپنے ظالم سوال کی منوی پر لٹکا دیا تھا۔
میں اسے بھی کول جواب نہ دے سکا۔

اس کے ہاں سے مجھے جلد واپس آنا پڑا۔ اس نے خود
ہی ہندو امرار بھے رخصت کر دیا۔ گھر آ کر میں گھنٹوں سرودہ
چپکی کی طرح اپنے بستر پر پڑا رہا۔

اس دن کے بعد اس نے مجھے کبھی نہیں بلایا حالانکہ
دہارہ اس سے طے کا اشتیاق جلد ہی میرے دل میں از سر نو
قوت پکڑ گیا تھا۔ پہلی ملاقات کے اختتام کی دہرا مذنی
اور تھان کو میں بھول گیا تھا اور صرف سنسنی خیزی یاد رہ گئی
تھی مگر وہ جیسے مجھے بھول ہی گئی تھی۔ کبھی اس کی جھلک
انکائی دی نہ کوئی پیام آیا۔ اب تو اس سے اپنی ملاقات
میں محض خیال کی اختراع محسوس ہونے لگی تھی۔ میں بھی اپنے
لگا تھا کہ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

اس خواب کی تجدید نہ ہونے کی تصدیق کہ وہ لوگ مکان
نیک ایک رات خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ عجیب لوگ
تھے... سارا گھر نہ ہی عجیب تھا۔ اسے سیم توہلی مٹی میں میرے
لڑکی غلش لگتی، بہر حال چون نش قدم وہ سوچ کر ہرگز نہ
بہتر لگتی تھی، اس پر دفتر دفتر لڑکیوں کی دھول جیتی پٹی لگتی۔

ان دونوں میں ایف نے اس کا امتحان لے کر فارغ ہو
چکا تھا۔ رزلٹ کا انتظار تھا عموماً غلیل سے پرندوں کا شمار

نورالاسرار ماسکوم کے ماسکوم

نوجوان امجد علی کی

پراسرار اور عبرت انگیز
داستان

دو لڑکی

م۔ الف صدیقی کے پراسرار قلم سے

نورالاسرار ماسکوم کے ماسکوم

قیمت فی حصہ 60/- روپے

قیمت سیٹ 300/- روپے

ناشر

مکتبہ القریب، سرکلر روڈ

اردو بازار لاہور 2

کا موقع ہی نہ... انہوں نے... منظور نے معذرت
خواہ نہ سی نظروں سے سیری طرف دیکھا اور انہوں نے گڈا
سے اسے کاٹ کر رکھ دیا... اور بھی لوگ نہ تھے وہیں۔

زمیندارانہ زندگی میں یہ انوکھی یا عجیب خیالات نہیں۔
روزہ ہی لڑائیاں ہوتی ہیں، روزہ ہی گولیاں اور گٹھ لیسے چلتے
ہیں، روزہ ہی آدمی مرے ہیں اور نہ ہی ہوتے ہیں اور وہ عام
طور پر زمینداروں کے مزار سے ہی ہوتے ہیں۔ آپ شہروں
میں رہتے والے لوگ اخبار کے کسی کو نہ کھدوسے ہیں اس
قسم کی چند سطر پر سرسری نظر سے دیکھتے ہیں زمین کے
تنازعہ پرچہ افراد قتل یا آپ شاید اس بارے میں کچھ سوچنے
کی جگہ نہ سمجھتے ہیں کہ تھے ہوں گے، خود ہم لوگ بھی اس
قسم کی خبروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے، خبر کی اثر کوئی
اہمیت ہوتی ہے تو وہ صرف متفوقوں کے لڑائیوں کے لیے
ہوتی ہے۔ جس کے سر سے باب کا سایہ اٹھ جائے، جس
کا سہاگ اٹھ جائے، جس کی آنکھوں کا نور بجھ جائے اس
سے پوچھیے کہ صرف ایک شخص کا قتل ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے
کس طرح ایک فرد کے رخصت ہونے سے ایک خاندان
اُپر ہوتا ہے کس طرح ہمدیامت کی ایک داستان اور صوری
رہ جاتی ہے کس پر کیا قیامت گہرا جاتی ہے۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ عوامانہ تو زمین قتل ہونے والے
کی ہوتی ہے اور نہ ہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔
وہ تو بس حکم کا غلام ہوتا ہے۔.. اور غلام بھی وہ جسے بین
مول خرید لیا گیا ہوتا ہے۔

چودھری کمال دین اور ملک اسلم زمان... یہی دو
ہمارے علاقے کے رئیس زمیندار تھے۔ دونوں میں نہ جانے
کس زمانے سے جھگڑا چلی آ رہی تھی۔ بڑے زمینداروں کو
چونکہ کوئی خاص کام نہیں ہوتا، اس لیے شاید جھگڑا
کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ شتم کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی
اس نے اس کے دو چار آدمی مرادیسے اور کبھی کا محل کا جو
توڑنے کے لیے اس نے اس کے دو چار آدمیوں پر گولی
چلا دی... اس کا کچھ بچتا ہے نہ اس کا... جیل جانے کے
لیے کبھی آدمی موجود ہوتے ہیں اور پیشیاں نکلتے کے لیے بھی
ہر مرحلے پر خرچ کرنے کے لیے دولت ہوتی ہے اور فنا تو صرف
ان کا مقصد ہوتا ہے جن کے سر کا سامن قتل ہوتا ہے۔

ملک اسلم زمان کی حویلی تک پہنچتے پہنچتے میں نہ جانے
کتنی کیفیتوں سے گزرا کبھی جھجھکیلا غضب کا وہ ہڈ پڑتا
تھوڑی جاہتا تھا اور اس نے والی ہر چیز کو جس نہں کو دل

ساتھ اپنے دل سے ہر شخص کی گردن اڑا دوں۔ کبھی دل ڈوب جاتا تھا اور کبھی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے تھے جیسے مجھے منہ لے موت لینے کے لیے کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ کبھی چھوٹ پھوٹ کر دوسرے کو پی جاتا۔

میں عمومی سی کیفیت میں ملکِ اسلام زمان کی جو بیلیاں داخل ہوا جس کا کھنکھسی طرز اور بعض میدان سے مشابہ تھا اس وقت میں نے نہ جانے کتنے آدمی بھرے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے دل کی ہر جھٹکا ہٹ سنائی دے رہی تھی جو میری آنکھ کی ہر جھٹکا ہی تمام گئی۔ ہر جو میں نے کھانسی سے راستہ سے دھکا دیا میں میرا اس چارپائی تک جا پہنچا جس پر مسند چادر سے ڈھکی ہوئی آبا جی کی لاش پڑی تھی میرے درجہ کی علامت آج ایسی غیاد سے عروم ہو چکی تھی۔

چارپائی کے قریب ہی تھا جسے دارا در چتر بہا جسے گرسیدوں پر بیٹھے تو میں پنی رہے تھے۔ ان کے قریب ہی کچھ لوگ فرش پر آتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی کے بازو اور کسی کے سر پر بیلیاں بندھی ہوئی تھیں اسانے ہی ملکِ اسلام ناں بھی کر سکی پر بیٹھا تھا۔

میں چارپائی پر بٹھا۔ تھکانے دار نے مجھے روکنے کے لیے اپنا ہید بڑھایا۔ میں نے بیٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا ہید بڑھایا میں متعلق رہ گیا۔ اس نے سولایہ نظروں سے ملکِ اسلام زمان کی طرف دیکھا اور پھر ہید بڑھایا میں نے چادر اٹھائی۔ میرے سامنے آبا جی کا چہرہ نہیں چہرے کے کئی ٹکڑے تھے۔ ایک طرف سے کھڑی سے مغز اور کئی ہوئی نہیں جھا جاکہ رہی تھیں۔ دیگر سے منہ کے نقوش مٹی اور لہو میں تھڑے ہوئے تھے۔

ہاورد میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور یہ شکستہ چہرہ چھب گیا میں نے شاید اسے ایک بادو دیکھنے کے لیے دیکھا تھا مگر آج بھی وہ میرے ذہن پر اسی طرح نقش ہے۔ میں دفن چاہتا تھا مگر آنسوؤں کے سرتے خشک ہو چکے تھے۔ اس لیے نہ جانے کس طرف سے دو آدمی بڑھے اور مجھ سے پٹ کر دوسرے لگے۔ میں نے انھیں قتل کرنے کی ہمت نہ کی۔ وہ ہندو لائی نظروں سے ان کی طرف دیکھا، وہ میرے چچا تھے۔ انھیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے ملکِ اسلام زمان کی طرف بڑھا وہ ایک بے سنگ

بیل بھاری بھر کم، دلازداد اور عجیب آدمی تھا اس کے جڑوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا اور سرور کھٹ گئے خمر سے والی موٹی سی بگڑی تھی۔

اس وقت وہاں موجود تمام افراد کو گویا سانپ سونگ گئی، اجب میں نے ملکِ اسلام زمان کو گریبان سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھالیا اور کھنکھناتی سی آواز میں کہا: ملک! تمہیں تو ابھی طرح معلوم تھا کہ میرے باپ کو گولی چلانا نہیں آتی پھر تم نے انھیں مارنے کے لیے کیوں بھیج دیا؟

میرا خیال تھا کہ اس کا جواب میں ہو گا کہ اس وقت جو بھی آدمی یا سر تھے انھیں بھیج دیا گیا لیکن اس کے بجائے وہ غرور کیا کہ کون کتا ہے کہ میں نے اسے بھیجا تھا؟ وہ تو خود ہی نہ جانے کس وقت ڈیرے سے بندوق اٹھا کر اور دو چار آدمیوں کو ساتھ لے کر فرش میں چل دیا تھا کہ میں چوہدری کمال دین کے آدمیوں کو سبق سکھاتا ہوں۔ میں تو اس وقت ڈیرے پر تھا ہی نہیں پھر اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا: میرے پاس کیا بندوق چلانے والوں کی کمی تھی جو میں اللہ میاں کی گائے کو بھیجتا؟ کون کتا ہے؟ میں نے اسے بھیجا تھا؟

اس نے سولایہ نظروں سے اصرار دیکھا۔ گریبان میری گرفت میں ہونے کی وجہ سے وہ آسانی سے گردن نہیں ٹھکھار دیا تھا لیکن جہاں تک میں اس کی نظر گئی لوگوں نے سر جھٹک لیے گویا یہ زبان غموغی کہہ رہے ہوں۔ مافی باپ! جہاں تک کہہ رہے ہیں وہی درست ہے۔

اسی دوران میں چار بندوق بردار آدمی آگے بڑھے اور انھوں نے ایک جھٹکے سے مجھے ایک طرف کھینچ لیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی ملکِ اسلام زمان کا گریبان میرے ہاتھ سے نہ چھوٹ سکا۔ اس کے کڑے کا ایک خاصا چوڑا ٹکڑا چرر کی آواز کے ساتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔ بندوق برداروں نے سولایہ نظروں سے ملک کی طرف دیکھا تو با اجالت طلب کر رہے ہوں کہ میرا داغ درست کر دیا جائے لیکن خلاف توقع ملکِ اسلام زمان ہر تانہ انداز میں منکر اویلا اسی دوران میں نے ایک بندوق بردار کے پیٹ میں گھونسا سرکڑ دیا تھا اور وہ فہر اوٹنے کے بعد اوڑھے قمرے فرش پر گر پڑا تھا۔

اسی لمحے تھا جسے دار صاحب نے اٹھ کر سر زلف کے سے انداز میں ہید میرے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا کہ بس کر چھو کر سے ان زیادہ ذرا فساد مت چار مانا کہ تیرے لیے بڑے صدمے کا مقام ہے مگر یہ بھی تو دیکھ کہ غلطی تیرے باپ ہی کی تھی۔

میں نے تھا نندار کی طرف تعلقاً توجہ نہیں دی اور ایک ملک ملک کو کھڑو تار اس کا گریبان چاک ہو چکا تھا اور

تو برقی ہے... ہمدرد اپنی جگہ ہے لیکن کسی کے سونگ میں کھانا پینا تو نہیں چھوڑا جاسکتا... یہ تو خودکشی کے مترادف ہے اور خودکشی حرام ہے۔

میرے قلم میں آنسوؤں کی ٹپکیں پھیلی ہوئی تھیں ایک لفظوں میں منہ چپا کر چوڑے پھوٹ کر دہسنے لگا بڑا مہیری کر تھکتے رہے اور کھانا کھاتے رہے یہ کچھ دیر بعد میں آنسو گر کر باہر آنے لگا تو ملک کے تین آدمیوں نے میرا رستہ روک دیا کہ کیا ملک صاحب! تمہیں اندر لایا ہے یہاں تک کہ اس کا منہ اس کے ساتھ چل دیا۔ میں کچھ شک سا گیا تھا کہ میری دست بھری میں کسی بات پر احتجاج کرنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنی حیرت والے ایک طویل و سرخ لہجے میں نے گئے جہاں فرش پر دیر سترخ قالین اور کھڑکیوں پر سترخ ہی پر سے تھے۔ ملک اسلم نہاں ایک بھاری بھر کم صوفے پر بیٹھ کر راز تھا اس کے سامنے تپائی پر لوڑوں کی ایک موٹی سی گڈی رکھی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ سیدھا ہنسا اور لپٹے لپٹے گیا اور کہنا لگا کہ صاحب کرتے ہوئے لولاؤ دیکھو زبرداری اجائی نقصان کی تلافی تو ممکن نہیں... تمہارا باپ کو گھر اپنی غلطی سے قتل ہوا لیکن میرا رشتہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ سر پرستوں والا ہی رہا ہے۔ میں نے ان کی زندگی میں ان کے ساتھ اودمان کے مرتبے کے بعد ان کے لواحقین کے ساتھ ہمیشہ اچھے سے اچھا سلوک کرنے کی کوشش کی ہے جو جو اسو ہو... میں بھاری جود کر سکتا ہوں اس کے لیے حاضر ہوں۔

اس نے تپائی سے لوڑوں کی گڈی اٹھائی جس پر زبرد کا جھلا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے ایک آدمی نے گڈی چھوڑ دی تھی۔ وہ دیکھ کر ہنسا کہ میں نے ملک بولا اس رقم سے تم ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ تمہارے مزاحم باپ پر میرا کوئی ڈھائی تین ہزار روپے کا قرض تھا میں وہ بھی معاف کرنا ہوں۔

میں نے ایک نظر لوڑوں کی گڈی کی طرف دیکھا میں نے زندگی کی کسی اتنی رقم نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت وہ مجھے ہنس غلاخت محمد دس ہزار روپے تھی۔

”صرف دس ہزار روپے میں ایک بیٹے سے اس کا باپ خرید رہے ہو؟“ میں نے ملک اسلم نہاں کو گھور کر دیکھا۔ وہ آنکھیں میکرے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا میں نے گڈی اس کے منہ پر کھینچ دی۔

میں نے اس پر نظر ڈالا تھا۔ اس نے مشفقانہ انداز میں ہاتھ لگا کر ہاتھ پکڑے ہوئے کہا: ”اس پر ملاحظہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ صاحب! موقع ہی ایسا ہے... اور پھر اس کا خون آجی گرم ہے... تو جوان ہے نا...“

اس دوران میرے دونوں چچا بھی مجھے پکڑ کر کھڑے ہو گئے تھے تاکہ میں ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکوں۔ میں نے ذات پس کر کہا میں میرے باپ کے قاتل تم ہو اسلم نہاں... اور یاد رکھنا کہ یہ قتل نہیں بہت ہنگام پڑے گا۔

وہ ایک بار پھر میرا ہاتھ اور قدم سے غمغما کر دیا۔ گویا کسی بچے کی لٹرائی سے غفلت ہو کر جاتا ہو مگر صورتحال اس کی اجازت نہ دے رہی ہو۔ ہاتھ دے دے میرے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ملک کو غلط کیا۔ چھوکر بہت بڑھتا جا رہا ہے... کیا خیال ہے! اختیار اس کے خلاف دھکیلا دینے کے الزام میں پرچا دھج نہ کر لوں؟ ابھی وقت بڑھتا ہے اس قسم کی ایف آئی آگام آجاتی ہے۔

”نہیں... نہیں... اس کی ضرورت نہیں... ملک اسلم نے ہاتھ ہلا کر کہا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملک طرف سے جا کر بھاڑا گیا۔ اس کے بعد بڑی طویل کاہد و انتظار ہوئی۔ پونیس بیٹھی نہ جانے کیا کچھ قلم نہ کرتی رہی مجھ سے کسی نے کچھ پوچھا نہ کچھ بتایا۔ پھر لاش کو پوسٹ ماڈم کے لیے مقامی اسپتال میں لے جایا گیا۔ میرے دونوں چچا ساتھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی لاش واپس لی گئی اور ملک اسلم ہی کی زیر نگرانی تدفین کی تیاریاں جوئے میں شام ڈھیلے ملک تدفین بھی ہوئی میں آنکھیں سب لوگ ملک کی حویلی پر ہی واپس آئے جہاں کھانے کا انتظام ہو چکا تھا۔ پیچھے آ کر چکی تھیں صحن ہی میں دیواری بھرا کر کھانا کھانا جانے لگا۔

زاد ای دیر میں وہاں شادی کا سامان ہو گیا۔ لوگ ہنس رہے تھے، ایک دو سکرے سے جھپٹا کر دے رہے تھے کوئی کھانا لائے والوں کو کھانا نہ تھا۔ یہاں میرے پاس لے میں دو میاں تو ڈاکٹر ہو رہے ہی شہر میں ڈال دیا ہے۔ کوئی آواز دے رہا تھا۔ گھنٹے ڈاکٹر ڈاکٹر پائی تو لانا... اور ہاں اور گرم روٹیاں بھی پکوانا۔

یہ سب دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں موت کی سوا گواہی سایہ منگ بھی رہی ایک طرف دلاوار سے چمک بنگلے بیٹھا تھا۔ میرے سامنے بھی کھانا سجا دیا گیا تھا اور ایک بنگلہ بڑے بڑے لڑائے بنگلے کے ساتھ ساتھ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہشتی موت

”پھر تم نے کیا کیا؟“ اُن کے بچے میں کسی حد تک
 اشتیاق جھلک آیا۔
 ”میں نے اُس کے منہ پر سے ماری وہ رقم۔“ میں نے
 جواب دیا۔

بڑے چمکا چہرہ، کچھ سا گیا، تو تھا سے اس طرح کرنے
 سے جانے والا تو آپس نہیں آسکتا تھا۔ وہ دبی دبی سی
 آواز اور ہچکا ہٹ آہیں سے مجھے میں بولے بولے ہی
 ہوتی رقم... کچھ کام ہی سنور جاتے تھے۔
 میں ایک ملک اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے
 نظر نہیں مل رہے تھے میرے دل کو جیسے کسی نے ہتھی میں
 مسل کر رکھ دیا۔ پسا... پسا... سب کو اسی کی ہوس
 پڑی ہوئی تھی۔ لعلق اُناتے تھے کہ خون کے رشتے سب اس
 کے سامنے بیچ تھے۔ کسی کا خون کسی کے لیے، ہنر چمک تھا
 جسے کیش کرنے کا موقع وہ کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ موقع ملتا تو
 بھائی، بھائی کی لاش پر بیٹھ کر سوئے بازی کر سکتا تھا۔ آخر
 یہ سب کیا تھا؟ کیا پیسے میں واقعی اتنی طاقت تھی یا لوگ
 ہی اندر سے کچھ زیادہ کھولے ہوئے تھے؟

آج کی کی موت کے صدمے سے میں کچھ سنبھل چکا تھا۔
 میری آنکھیں خشک رہنے لگی تھیں لیکن پیسے چمکا کر یہ بات
 سن کر جانے کیوں میرا رخ بدلتا تھا۔ کوئی چاہنے لگا دل
 جیسے یکایک ہی دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ میں نے صرف ایک
 نظر بڑے چمکا کی طرف دیکھا اور وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلے
 گئے۔

وقت گزرتا رہا۔

میں سمجھتا تھا کہ آج کی کی موت کا رخم میری جان سے
 لے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں نے صرف نہایت کواں کہا نیوٹن
 پڑھا تھا کہ وقت سب سے بڑا امر ہے۔ لیکن اس کا تجربہ
 مجھے انھی دنوں میں ہوا۔ جول جول دن گزر رہے تھے سینے کا
 گھاؤ بھرتا گیا۔ میں جُڑوا نما کمرے میں مڑا۔ سہ ماہی ہوتا چلا
 گیا۔ ایسا تھا تھا جیسے میں ہمیشہ سے تیار ہو رہا ہوں...
 آج کی گویا ایک بھولی بھری سی کہانی بن گئی۔

رفتہ رفتہ میری کیفیت استہان پر آگئی۔ سب کی بات
 پر سبھی بھی آنے لگی۔ اور زندگی دوبارہ کم از کم اس حد
 تک مزید و ٹھیک محسوس ہونے لگی کہ اب مرے کوئی نہیں
 چاہتا تھا کہ وہ شب و روز نہ کہ عجیب ہی انداز میں گزر رہے
 تھے۔ دن بھر میں آوارہ گائے کی طرح منہ اٹھائے چہرہ کھینچا

نوٹ پرانے تھے اور دربر ہر جگہ دھجلا تھا اس کے چہرے
 سے ٹھٹھالے سے پہلے ہی نوٹ بھڑکیں بکھر گئے۔ مزید کہ
 کچھ نہیں کی تھی کسی سے کمرے سے نکل آیا کسی نے مجھے
 دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

میں سیدھا گھر آگیا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سب
 لوگ چلی ہی میں تھے۔ گھر میں جیسا سا نا پھلا ہوا تھا اس کے
 زیادہ سنا میسرے دل میں تھا۔ میں اپنے کمرے میں چار پائی
 پر جا کر اور کچے میں منہ جھپٹے دیر تک رہا مگر فریادی
 نور پر میں بار بار سر اٹھا کر آج کی کالی چار پائی کی طرف
 دیکھتا اور ہر بار پہلے سے زیادہ شدت سے رونا آتا۔ مجھے
 یقین نہیں آتا تھا کہ یہ چار پائی اب ہمیشہ خالی رہے گی۔ مابقی
 گو کہ میرے سینے زیادہ بات نہیں کہتے تھے لیکن ان کے وجود سے
 ہی جو یا ساری روئیں تھیں اب وہ نہیں تھے تو در و دیوار
 بھی کھلنے کو دوڑ رہے تھے۔ اپنا آپ بڑا عزیز غفلت سا لگ
 رہا تھا جیسے میرے کوئی سا بھائی ہٹ گیا ہو۔

شام کے سامنے مجھے ہونے کو سب لوگ داپر لگے
 بچاؤ وغیرہ میرے پاس ہی آ بیٹھے۔ وہ خود رو رہے تھے لیکن
 مجھے تسکین دے رہے تھے اور جوں جوں وہ تسکین لے رہے
 تھے توں توں میرے آنسوؤں میں روانی آتی جا رہی تھی۔ جالے
 اُٹھانے آنسوؤں کے چشمے چھوٹ پڑے تھے۔ بالآخر رات
 بیت گئی اور سب اپنے اپنے ٹھکانے پر جا کر سو گئے۔ اب
 پھر وہی کس کس تھا اور میری تنہائی۔ نیند جانے کس طرح سر حال
 بن آجاتی ہے۔ میں بھی بالآخر اپنے دکھ کو سینے سے دھکے
 بچکانے لیتے لیتے سو گیا۔

سوئم ہو چکا تو میرے ہوا گویا سب دھیرے دھیرے
 اس صدمے اس واقعے کو بھٹو لئے لگے۔ بچاؤ اسی طرح زمینوں
 پر مانے لگے۔ بچیاں اسی طرح گھر داری میں جُڑ گئیں۔ بچے
 اسی طرح دھما پڑ کر دی جانے لگے۔ بس ایک یں تھا جس کے
 سینے میں رخم پر تھا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد ایک روز بڑے چمکا رات کو میرے
 کمرے میں آئے۔ مابقی والی چار پائی پر بیٹھ کر کچھ دیر ادھر ادھر
 لگا دیکھ کر سننے کے بعد بولے ”میں نے سنا ہے ملک اسلم
 زماں تھیں دس ہزار روپے سے رونا تھا۔“ اُن کے مجھے میں
 دلی ہی شرم ساری تھی جیسے انھیں یہ تذکرہ اچھا محسوس
 نہ ہو رہا ہو۔ لیکن کسی وجہ سے وہ بات کہنے پر مجبور ہوئے۔

”ہاں... دے تو رہا تھا۔“ میں نے دیکھے بچے میں کہا۔

جیسے کسی خوابیدہ آتش فشاں کا دھماکہ کھل جاتا۔ نس نس میں
 زہر سا کھل جاتا اور نس تو پی کے بلند بالا دو دو لپو لپو زہر
 فٹلتے ہوئے سو جا کرتا کہ ایک روز نہیں اپنی آتش اُتھام سے
 اس کوئی کوفتا کتر کر دوں گا اور اس میں رہنے والوں کو ٹھوکر دوں
 سے ڈرا کر رکھ دوں گا لیکن پھر وہی حقیقت ہے پندری ہو کر آتی اور
 میں اپنے آپ سے بوجھنے لگتا رہتا تھا اسی امکان سے، کیا بھی
 میں اس قابل ہو سکوں گا؟ میرا شعور مجھے کوئی جواب نہ دیتا
 نہ مثبت... بس دل میں ایک پراسرار سا تاہم پھیل جاتا تھا
 ابھی میں بے مقصدیت کے اس علاقے سے گزری رہا تھا
 کہ گھر میں چھوٹی بچی کا روئے بھی بدلنا شروع ہو گیا۔ اگر کل رات
 کو ذرا بھی دیر سے گھر آتا تو کھانا موجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہی
 جاگ رہی ہوتی تو بڑی بے نیازی سے کہہ دیتی تھیں۔
 ”بچا ہی نہیں تھا...“ میں نے سوچا شاید باہر ہی کھا کر آؤں گا
 حالانکہ افسوسمندانہ تھا کہ میری جیب میں پیوٹی کوڑی بھی نہیں
 ہوتی تھی۔ باہر اگر کوئی کھانا دیکھتا تو اسے ملاقات ہو جاتی تھی تو
 کھانے پینے کی کچھ باتیں ہو جاتی تھیں۔

اب میں کوشش کرتا تھا کہ جس وقت سب کھانا کھا لیں
 میں گھر پر ہی موجود رہوں۔ ان موقعوں پر بھی میرے ساتھ جو
 سلوک ہونے لگا وہ تنہا کوٹ مٹانے کے لیے کافی ہوتا تھا
 بچی ایک چنگیز میں الگ ہی دو دو میاں اور پیالی میں ہر شکل
 انشاساں نکال کر جس سے ممکن چند ٹولے کھاتے جا سکیں، یوں
 پکڑا دیتیں جیسے وہ برہمن ہوں اور میں اچھوت... پکڑائی کیا
 تھیں گویا مائدہ پر رانی تھیں اس وقت ان کی پیشانی پر سونہ
 بڑے ہوتے تھے۔

اگر میں غلطی سے دوبارہ سالن مائیک لپتا تو پھر اکلنے
 والے لیے میں کہیں نہ کہیں نے یہاں دنگ بگاڑی ہے کیا
 یہاں کوئی منکر کھلا ہوا ہے، اپنے بچوں کو تو کہیں اس سے محکم
 دیتی ہوں بوجھلا کہ ان کے بچے جن میں سے بیشتر میری ٹانگ سے
 بھی چھوٹے تھے جتنا کھاتے تھے اس سے بے اندیشہ مسون
 ہوتا تھا کہ اگر مائے علاقے میں بھی خود لگے ذخیرے ختم
 ہوئے تو اس کی بڑی وجہ وہی ہوں گے۔

ایک روز جبکہ میں اپنے کمرے میں موجود تھا اور بات
 چھوٹی ہی تو تھی معلوم تھی میں نے انھیں بڑا بڑا بلڈ بڑی بچی
 سے باتیں کر کے سنا یہ کام کا نہ کارج کا... موشن مانج کا...
 اتنی بھی حرام خوری ابھی نہیں ہوتی... کوئی لنگڑا لٹو بھی نہیں
 ہے کہ انسان کس کھا کر ہی کھلا رہا ہے۔ پھر فٹ کا قدر نکال لیا
 ہے... ساڈھ عیسی کاٹھی ہے مگر میں کام نہیں کریں گے...

یہاں بیٹھ گیا تو کبھی وہاں... کبھی اس سے گپ شپ کر لی تو
 کبھی اس سے... میرا ایلٹ اسے کارڈز لٹا چکا تھا اور
 میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو چکا تھا مگر مستقبل سے عدم
 دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ میں مارکس ٹیٹ یا سٹرنگ کٹ ایک نئے
 کالج نہیں گیا تھا اور نہ ہی بی بی نے میں دانے کی کوشش کی
 تھی۔ کوئی مشورہ دینے والا تھا نہ رہنمائی کرنے والا کسی کو
 اس امر سے دلچسپی نہیں تھی کہ میرا کیا ہے گار۔

میری خود بھی مجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کبھی
 میں سوچتا کہ وہیں کوئی نوکری کروں لیکن سیالکوٹ روڈ پر جو دوکان
 چھوٹے موٹے کارخانے قائم ہوتے تھے، ان میں بھی دوسرے
 ہی شہروں اور دیہاتوں سے لوگ آکر ملازم ہوتے تھے۔ ہمارا
 علاقہ صرف ان پڑھ مزدوروں کے معاملے میں خود کفیل تھا اور
 ان کی پیسے ہی اتنی فراوانی ہو چکی تھی کہ ہر کارخانے کے گیٹ
 پر موٹے موٹے فسطوں میں لکھا ہوتا تھا ”بھرتی بالکل بند ہے“
 کوئی سفارش نہ کرنے کی کوشش نہ کرتے۔

قیسے کے جوڑے کے تھوڑا بہت بڑھ لکھ جاتے تھے ظاہر
 ہے وہ مزدوری نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ملازمتوں کے لیے لاہور
 سیالکوٹ یا دوسرے شہروں کا رخ کرتے تھے اور وہاں تن
 سود پے کی کلر کی یا کسی میز دالی کسی اور نوکری کی خاطر گھر بار
 چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

میں بھی کبھی لاہور جانے کا سوچتا لیکن جب مجھے
 یہ خیال آتا کہ وہاں میرا کوئی اس حد تک شناسا بھی نہیں کہ
 مجھے دو چار باتیں اپنے مکان کے تھڑے پر ہی سونے کا اشارہ
 دے دے تو میں دل مسوس کر دھاتا اور پھر مشن یہ بھی تھا کہ
 نوکری ملنے تک میں کھانا کہاں سے اور کہاں سے دیگر اخراجات
 پورے کرتا؟ فی سہ سے وہاں لوگ میرے لیے اپنے دفنوں
 میں گریبان خالی رکھے تو میں بیٹھے تھے کہ مجھے دیکھتے ہی کہہ آتے
 ”آئیے آئیے“ افسوس صاحب، ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔
 یہ سنبھالے دفن اور بیچے تین بیسے کی پیشکش خواہ۔

خدا کا شکر ہے کہ میں کم متل تھا یا کم تعلیم یافتہ مگر خوش
 فہم نہیں تھا۔ بعض لوگوں کی نظر میں صورت حال کے دو پہلو ہوتے
 ہیں۔ ایک روشن پہلو اور دوسرا زیادہ روشن پہلو۔ مجھے آج
 بھی اس بات کی خوشی ہے کہ میں بھی راپنیں جسے صورت حال
 کے دو پہلوں کا قائل تھا مگر ان میں سے ایک تارکک ہوتا
 تھا میں اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا تھا
 دن اس طرح کو مگوئے عالم میں گزر رہے تھے کہ کبھی
 کبھی میں ایک اہم زمان کی حویلی کے قریب سے گزرتا تو سینے میں

ایک روز میں راجو سے ایک دیوانہ آدھارا جس کے
واپس کیے جانے کی اسے یا بھے قطعاً کوئی اہمیت نہیں تھی اسے
کو روکے کے چائے خانے پر جا بیٹھا اس قسم کا دھکارا جو
اکثر و بیشتر ہی بھے دیتا رہتا تھا اور ایک طرح سے میری شکستہ
حالی کے ان دلوں کا وہی ایک ٹوٹا چھوٹا سا سہارا تھا۔ وہ
کا نڈاری میں پھنس کر خالصتاً کا نڈاری رہنے لگا تھا اب اس
کے پاس میرے ساتھ آوارہ گردی کرنے کا وقت نہیں ہوتا تھا
اور میں نے کسی کی زبانی سنا تھا کہ گھر میں اس کی شادی کی
تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔

اس روز میں بہت ہی آؤ اس تھا اپنے چاروں طرف
بھے اندر جا رہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ جلداز جلد گزرتے
یا کسی سمت میں نکل کھڑے ہوئے کوئی چاہ رہا تھا لیکن کچھ
سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں گرم پانی پینے کے بعد ٹھنڈی چائے کی پیکل لیتے
ہوئے اپنے خیالات میں غلطیاں تھا کہ نہ جانے کس طرف
سے عبدالستار راکھ کر میرے قریب آ بیٹھا۔ عبدالستار میری
گل سے کچھ فاصلے پر ہی شے بازار کے قریب رہتا تھا وہ تھا
تو میرے چھوٹے چچا کا ہم عمر اور اسی کے ساتھ بچپن میں کھیلا
گود تھا لیکن وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا اور بقول اس
کے یہ اس کی خوش قسمتی تھی بہت سنس مکھ اور خوش مزاج
آدمی تھا۔ شش سالہ لڑکوں سے بالکل ہم عمروں کی طرح
بے تکلفی سے پیش آتا تھا میں نے کبھی صبح لوہ پر جلنے
کی کوشش نہیں کی تھی لیکن سنا تھا کہ وہ پیر مکھ شاہ کے
ہاں منشی سے اس کی زینبوں کا حساب وغیرہ دیکھتا ہے۔
وہ اپنا کب مینز پر رہتے ہوئے لولاہا میں نے بڑے
بڑے لٹکے ہوئے منہ دیکھے ہیں لیکن آنا لٹکا ہوا منہ آج
تک نہیں دیکھا اس نوجوان میں اتنی آوازیں نہیں تو سنے
میں نے سنا کہ اس کی کوشش کی لیکن شاید بھے کوئی
خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ لوہے کی کوشش کی تو آواز بھی
یوں کھڑکی ہوئی تھی جیسے صحن میں ریت پھنسی ہوئی ہو۔
"خیریت ہی ہے... میں تو ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا" میں
نے کہا۔

"برخوردار!" اس نے کھیر جیسی گڑھی چلنے کا ایک
گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد کہا "جہاں تو کام ہی چھوڑے
پڑھنا ہے۔ جہاں میں ہوتا ہوں وہاں کا نظام ہی اسی فن پر
چل رہا ہے... اور تم پر مت سوچو کہ میں کوئی غیر ہوں رہے
اپنا جگہ یا رہی سمجھو... اور یہ خیال بھی دل میں مت لاؤ

تورہ جڑی کر لیں گے بالو اب صاحب گھر میں پڑے اندھے
ہیں گے یا ملنے تلنے کی کتابیں اور رسالے پڑھتے دیں
میں تو شک آگئی ہوں اس غذا ہے"

"میں تو خور و خر سے اسی لیے یہ عذاب پالا ہی نہیں
تھا بہن! بڑی جی نے بہ آواز بلند جواب دیا "واللہ جنت
نسب کرے مجھے جی کو... پہلے انھوں نے ہمارے ساتھ
ہی چلنے کی کوشش کی تھی لیکن میں سوچا کہ وہ جی نے
کے لالچ میں نہیں آئی تھیں نے ہی سوچا کہ سوچا کہ اسے
کریج بھیس گئے کہ انھوں نے میں خرید لیا ہے"
"بس آپا نہیں تو اسی کے شرم دیکھنا نے مارے دکھا"
چوڑی تھی گھر کا خانا فرما "واللہ بھٹے جب تک وہ زندہ
رہے ان کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اب
ان کی اولاد کو بھی مملکت رہے ہیں۔"

میں حساس ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن جن حالات
سے میں گور چکا تھا اور گور نہ تھا ان میں تو ایک ساڑھی بھی اگر
پر گھٹو گھٹا تو اس کا کبھی بھی شاید چھپتی ہو جاتا بعض تو کھی
مری عورتوں کی زبان پڑی سفاک ہوتی ہے ایک لمحے کے
لیے تو میری آج جا کہ جا کر گلی کو یاد لاول کہ یہ مکان جس کے
جنت کے نیچے کچھ وہ سب سر چپائے بیٹھے تھے میرے باپ نے
ہی خرید لیا تھا اور گو کہ اس وقت اس کی قیمت پیکڑوں ہی میں
تھی مگر اسی وہ عرض اتارے برسوں لگ گئے تھے اور میرا
باپ تالار رہا تھا جسے ان کے توالے کے خود اس جہرہ نما
کرسے میں زندگی گزارتا رہتا مگر میں یہ بات ان سے نہیں
کہہ سکتا میں اپنے آپ کو اتنی کیلی پر آوارہ نہیں کر سکا پھر
پیرا جی چاہا کہ جا کر ان کی کلوی نما گردن مٹھی میں جا کر کوڑک
سے توڑ دوں مگر اس کی بھی جنت نہ پڑی۔ ابائی نے بھے
ایٹھن ان کا احترام کرنا سکھا یا تھا اور ابھی ابائی کو اس دنیا
سے خیریت ہوئے چند جینے ہی تو ہوئے تھے۔ ابائی کی
ذات کو تو میں بھول چلا تھا مگر ان کی مرہات کو بھولنے میں
شاید وہی وقت تھا تھا۔

سلام خوری بھے خود بھی پسند نہیں تھی مگر میرا مسئلہ
یہ تھا کہ کروں تو کیا کروں کا شت کاری بھے اتنی نہیں تھی
مزدوری ملتی تھی نہیں تھی اور شاید بھے ہو بھی نہیں سکتی
مگر بارہ برس کی تعلیم نے بھے اس قابل نہیں چھوڑا تھا...
مزدوری کے دل کو نہیں بچاتی تھی میں نہ اوجھ کا رہا تھا اور نہ
اچھا... بیچ میں ٹنگ گیا تھا تاہم اس دن کے بعد سے
میں اس معاملے میں زیادہ دلچسپی میں رہنے لگا۔

آدمی کے پیروں تلے سے زمین نکال دیتے ہو تو اس نے مزید تصدیق چاہی۔

”شاید...“ میں نے اب بھی اچھکی ہٹ کر بیٹھے ہیں کہا تو میں نے کسی کے قدموں تلے سے زمین نکلتی دیکھی تو نہیں لیکن محسوس کیا ہے کہ سنسنے والا کسی حد تک گھبراہٹ اور جانا ہے۔ ”میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا کیا بات کیا ہے؟ تم بھلے تھے تجھ سے میں کیوں بھٹکا کہتے ہو؟“ اس نے ایک بار پھر اور صراحت دے دیا اور اطمینان کی سانس لے کر کہا اور اصل میں ایک جن کی ضرورت ہے اس کی آواز سرخوشی میں دھل گئی تھی۔ ”ہمارا جن بھاگ گیا ہے میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے کی خاموشی کے بعد پوچھا تو میں تجھیں کس طرف سے جن نظر آتا ہوں؟“

”میں تجھیں قدموں سے وضاحت سے سمجھا تھا، وہ طویل سانس لے کر بولا کہ تم نے یہ تو سن ہی رکھا ہو گا کہ پیر منگل شاہ کے قبضے میں جن ہیں۔“

”اے اے! میں نے سنا تھا ہے لیکن کبھی ان باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تو میں نے کہا۔“

”حقیقت یہ ہے کہ پیر منگل شاہ کے قبضے میں کم از کم ایک جن ضرور تھا اس کا نام و جد تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پچھلے دنوں اسے دہلی کا وزیر لایا گیا اور وہ دہلی بھاگ گیا۔“

پیر صاحب نے اسے ٹھٹھا لکھ دیا۔ ”تنخواہ بڑھانے کے پیش کش کی محنت اس نے ایک نہیں سنی، وعدہ استغوث سے انداز میں خاموش ہو گیا لیکن اب بھی اسے گھوڑا تھا۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں، بات تو میں نے کہا۔“

”اچھا سمجھیں آجائیں گی، او وہ ہاتھ اٹھا کر گویا کھانسی دیتے ہوئے بولا اور اصل میں نے بڑی محنت سے پیر منگل شاہ کی شخصیت کا تاثر دیا ہے، کئی افراد کی مشترکہ محنت و محنت کا نتیجہ ہے کہ آج پیر منگل شاہ اس قدر باکمال اور کھڑکھڑا شخصیت کے طور پر مشہور ہے اور اس کے ہاں حقدارین کا اتنا بزدل ہوا ہوتا ہے، جن کا قہقہہ یہ ہے کہ... لیکن پہلے یہ بتاؤ تم نے پیر صاحب کا فیروا کیا ہے؟“

”باہر سے پہنچا ہے... وہی... ان کی زمینوں پر وہ جو خاصا لمبا چوڑا دو منتر لگا رکھا ہے... اسی کی بات کہ رہے ہو نا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے ان بات میں سر ہلایا تو وہاں ایک تو طویل طریقہ اختصار گاہ ہے جہاں جا کر متقدمین بیٹھے ہیں...

کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکوں گا میں بظاہر بڑا معمولی لیکن درحقیقت بڑے کام کا آدمی ہوں، معاملہ کسی بھی خاص آدمی کا ہو تو میں بہت طرفدار سے کام آسکتا ہوں اور تم سے تو میں خود بھی آج کل میں ملاقات کا ارادہ رکھتا تھا چنانچہ ہوا تم یہاں بیٹھے دل لگے تم بالکل تھکے ہو، مسئلہ کیا ہے، شاید ہم دو دنوں کی ایک دوسرے کے کام آسکیں۔“

مجھے اس کی باتیں قدموں سے محسوس ہی نہیں لیکن اس کا لہجہ اس قدر دلکش اور چابکدہ تھا کہ میں نے پچھلی ہٹ آئینہ انداز میں اسے سب کچھ بتا دیا کہ زندگی کی بے مقصدیت اور بے معاشی میرا مسئلہ تھا اور یہ بھی کہ گھر میں میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا میری گفتگو ایک ایسے شخص کی گفتگو تھی جو اس نامہ ریا دنیا میں بالکل بے امان رہ گیا تھا، میں نے محسوس کیا کہ آخری جھلک پر شاید میری آواز بھی بھڑکتی تھی۔

بعد ازاں آتے اور دھر دھر دیکھا اس پاس کوئی نہیں تھا۔ ہم طویل سفر کرنا چاہتے تھے اس کے ایک کونے میں بیٹھے تھے، اس نے میرا کندھا تھپکے ہوئے کہا کہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں، ملاقات کی آخری سیڑھی تھی تم مجھے کوئلہ نوجوان کو اس طرح دل شکستہ ہونا زیب نہیں دیتا، جو میں اپنے سامنے سے محروم ہو جاتے ہیں عموماً ان پر تو اس سے بھی زیادہ بڑی بڑی مصیبتیں آتی تھیں جو ہر بہر حال میرے پاس تمہارے لیے ایک عجیب چیز ہے، جو تمہارے لیے کسی بھی باضابطہ قسم کی نوکری سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن ایک بات تو میں تم کو کہنا اگر تمہیں اس تجویز سے اتفاق نہ بھی ہوا اور میری پیش کش تمہیں نامعلوم ہو تب بھی کسی سے اس کا ذکر نہ کرنے کی ضرورت نہیں بس اس بات کو میں ختم سمجھنا اور سمجھ لینا کہ ہماری ملاقات ہوئی ہی نہیں تھی، اوہ تمہیں کوئی بھاری نقصان بھی پہنچ سکتا ہے سمجھ گئے نا؟“

”مجھ کو تو میں نے سن لیا ہے، کبھی غباری طور پر میرے لیے میں اشتیاق جھلک آیا، بات کیا ہے؟“

”میں نے سنا ہے، جب تم خاص طور پر موڈ میں آکر لیتے ہو تو تمہاری آواز بڑی بارکب محسوس ہوتی ہے اور یہ بھی کہ تم کئی طرح کے لہجے اختیار کر سکتے ہو؟“ اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے تصدیق چاہی۔

”اے اے! کئی حد تک درست ہے، یہ بات لاگو نہیں ہے اچھا کہتے ہوئے جواب دیا۔“

”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اگر تم غصے میں بولو تو اچھے بھلے

بائی آنسیر پر ایک ایک کر کے سائل اندھ جاتے ہیں جہاں ایک کمرہ خاص میں پیر صاحب ایک اونٹنے تخت پر تشریف لیا ہوتے ہیں تخت پر آرام گدے اور اس پر بہت بڑا اور ہماری سامیہ پکڑا بچھا ہوتا ہے جو تخت کے چاروں طرف فرش تک لٹکا ہوتا ہے۔ جن تخت کے نیچے بیٹھا ہوتا ہے موٹے سیاہ کپڑے میں ایک جھوٹا مسو راج ہوتا ہے جس سے آنکھ لگا کر جن ابھی طرح سائل کو دیکھ سکتا ہے۔ روشنی کا نظام کچھ ایسا ہے کہ زیادہ روشنی پیر صاحب پر ہی رہتی ہے فرش تک پہنچے ہوئے کپڑے پر روشنی کمر لگتی ہے اور اگر کپڑے بھی تو سرسری نظر میں دیکھنا ممکن نہیں ہوتا کہ اس میں ایک ننھا مسو راج ہے اور اس سے آنکھ لگا کر کوئی باہر جاتا کہ ہے۔ خصوصاً ایک معتقد کا ذہن تو اس طرف جا ہی نہیں سکتا۔

ہے۔... میری طرح؛ ہمیں نے حیرت سے پوچھا
کہ اب بھی وضاحت کی ضرورت باقی ہے، "عبدالستار
نے گویا اڑ امانتے ہوئے پوچھا۔

میں خاموش رہا تو وہ مسلط کلام کرتے ہوئے لہرا۔
 "جی کے پاس ایک مائیک موجود ہوتا ہے جو کمالات کے
 ایک ایسی فائز اور پاد اسپیکروں سے منسلک ہوتا ہے۔
 پادوں اسپیکر چاروں دیواروں میں ڈٹ ہیں۔ جن جب حکم
 ملے پرقندے ہے جب کسی آواز میں ہوتا ہے تو اس کی آواز
 مزید عجیب سے انداز میں سائل پر چاروں طرف سے گویا مکمل
 آکر ہوتی ہے اور وہ دم بخود رہ جاتا ہے۔"

۱۰ خاموشی سے سنے جاؤ کو اس نے مجھے جھڑک دیا۔ دھوننا رہے کہ جس سائل کی باری ہوتی ہے۔ ہمارا دار لنگھانے والا کاغذ پہلے ہی اگر جن کو اس کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک معلومات فراہم کر دیتا ہے مثلاً یہ کہ اس کا کوئی عزیز یا بیٹا وغیرہ فلاں عارضے میں مر گیا تھا یا زخمی ہو گیا تھا یا مردہ صورت ہے تو اس کے شوہر کا نام اور اگر مردہ ہے تو اس کے بیوی بچوں وغیرہ کا نام۔۔۔ اس علاقے میں ایک دوسرے کے بارے میں ایسی چھوٹی موٹی معلومات رکھنا کوئی عجیب کی بات نہیں۔ دوسرے اس مقصد کے لیے روایتی خزانہ قسم کی روایتیں بھی ہمارے ہاں ملازم ہیں جن کا کام آئے بھانے سے دن بھر گفتات گھروں میں گھومتا اور معلومات جمع کرنا ہوتا ہے۔ وہ بھی ہماری مدد اور رہنمائی

کے لیے ان اوقات میں ڈیرے پر ہی موجود ہوتی ہیں جب
پیر صاحب معتمدین کو شریف علاقات سمجھتے ہیں۔ ساحلِ حبیب
پیر صاحب کے حضور پیش ہوتا ہے تو پیر صاحب صرف ایک
لمحے کے لیے پُر حلال نفوس سے اس کی طرف دیکھتے ہیں اور
دوسرے تھمت پر ہاتھ مار کر کہتے ہیں ”وہاں جو مالے یا قوت
ہن! اور مجھے اس سائل کے بارے میں کچھ بتا۔“ تا تب جن
صاحب مالک پر سٹلی سی بجا کر آدھی چلنے کی سی آواز پیدا
کرتے ہیں اور پھر ایک خاص انداز میں بولنا شروع کرتے
ہیں۔ یہ رورت فلاں بنت فلاں جس کے تن پر سبز چھوڑی والا
لباس ہے اپنی غلطی سے ایک بار گندھے مالے میں گر گئی تھی۔
آج بھی یہ حالات کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔۔۔ اسے روپے
پیسے کی اکھن در پیش ہے۔۔۔ ”ہن! کی باتوں کے دوران پیر
صاحب سر جھکا کر آنکھیں بند کیے مراجعہ کی کسی حالت میں
بیٹھے رہتے ہیں اور سادہ لوح سائل با سائل عموماً ہتھ پھر کا پتی
بجاتی ہے۔“ ”ہن! کے پاس معلومات کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ
خاموش ہو جاتا ہے یا درمیان میں ہی کہیں پیر صاحب کسی
مصلحت کی تحت اسے خاموش کرانا ہنتر سمجھتے ہیں تو سختت پر
ایک بار پُر حلال انداز میں ہاتھ مار کر خیالات متنبالیتے ہیں۔
اگر تم اس کام کے لیے رہنما نہ ہو گئے تو ہمیں تقریباً ایک ہفتہ
اس کام کی تربیت دی جائے گی۔۔۔ میرے سرسل کرائی جائے گی۔
صوتی تاثرات دینا اور موقع محل کے لحاظ سے بھجے بدل سکایا
جانے گا جس کے بعد تم تربیت یافتہ جن بن جاؤ گے جس سائل
کو تم پہناتے ہو گے اور اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو گے
اس کا اظہار بھی کر دیا کرنا۔۔۔ مجھے آئندہ ہے کہ تم اس کام
کو بڑی مہمتی سے سر انجام دینے لگو گے۔ اس کے علاوہ بھی
کچھ شعبہ سے ہیں جو دریاں دکھاتے جاتے ہیں مثلاً پانی میں آگ
لگا دینا یا گلاس میں ہاتھ ڈال کر پھیک پانی کو میٹھا بنانا۔۔۔
لیکن ان سے تمھارا کوئی تعلق نہیں۔۔۔ یہ ایک شعبہ ہے۔
میں چند لمحے خاموش رہا پھر میں نے سچے سچ پکارتے ہوئے کہا۔
”مجھے تنخواہ کتنی ملے گی؟“

”کیا مینا بی بی سے توبہ پت مکمل کر لینے کے بعد پانچ سو روپے مہینہ ر“ بعد اس تنازعے خواب دیا اور اگر باس... میرا مطلب ہے میرا صاحب تمہاری کارکردگی سے خوش رہے تو دقتاً خوشاً انعام و اکرام بھی تمہارے کا۔“

”کیا واقعی؟“ کہیں نے بے یقینی سے پوچھا۔ پانچ سو روپے ماہوار اس زمانے میں خاصی بڑی خواہ تھی۔ پیر صاحب کی آخری آمدنی ہے؟“

قوتوں کے اثر کی وجہ سے اسے واپسی میں دیر ہو رہی ہے۔
اُس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر کہا تم مجھ ہی بیچ
پہنچ جا یا کرو تا کہ ہم مقتدر کی آمد کا سلسلہ شروع ہونے سے
پہلے ہی بغیر مشق و تیرہ کر دیا کریں۔ اس کے بعد دل چاہے تو
گھر چلے جا یا کرو اور دوسرے قوت میں ایک دو گھنٹے کے لیے
آجایا کرو۔ یعنی زیادہ محنت کرو گے آنا ہی وقت کم صرف
ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، میں آج اٹھ گیا،“ میں نے کہا وہ کام چوٹی
سے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔
دوسرے روز میں آٹھ بجے کے قریب پیر محل شاہ کے
ڈیرے پر پہنچا دو منزلہ مکان آبادی سے کافی فاصلہ پر چاروں
طرف سے گھیرا ہوا تھا قریب ہی میوہ و دلی میوہ لگا
ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ پر کوئی سو قدم کے فاصلے پر ملک اسلم نزل
کی زمینیں شروع ہوتی تھیں۔ ان سے متصل ہی چوہدری کمال دین
کے فارم اور زمینیں تھیں۔

مکان باہر سے تو بعض ڈیرا ہی نظر آتا تھا لیکن اندر پہنچ
کر مجھے اندازہ ہوا کہ کسی حوالی سے کم نہیں تھا۔ ملک اور گلیاں
یہاں سے بہت دور تھیں مگر بجلی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔
پختہ احاطے کے بارے میں رائے رائے میں جیتیں بھی نظر

آ رہی تھیں۔ احاطے میں ایک بہت بڑی چابوتی پر ایک
بھاری پھر کم دھوٹی پوش بیٹھا حقہ لگا کر اڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی
حقہ چھوڑ کر ایک کمرے کے قریب آ کر گویا اُسے اندیشہ ہو کہ میں
حق آٹھا کر سیدھا اندر نہ چلا جاؤں۔

میں نے اُسے اپنا نام بتایا اور وہ مزید کچھ کئے بغیر
اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد میری عبد الستار اُس کے ساتھ باہر آیا
اور میرا ہاتھ تھام کر اندر لے گیا۔ وہ فضا خوش نظر آ رہا تھا۔
وہ مجھے جس کمرے میں لے گیا وہ ایک وقت خواب گاہ

بھی معلوم ہوئی تھی اور کمرے انتہائی بھی۔ ایک چوڑی چٹکی۔
خوبصورت مسری پر ایک شخص ٹانگیں لٹا کئے بیٹھا تھا۔ بلند
نئے اُس سے میرا تعارف کرایا تو مجھے بتایا کہ وہ پیر محل شاہ
تھا۔ میرے ذہن میں اس کا تصور یہی تھا کہ وہ لمبی سی دائی
والا کوئی بھاری بھر کم بزرگ ہوگا مگر وہ جوان تھا... اور بہت
ہی خوبصورت جوان۔

اُس کی رنگت سرخ و سپید آنکھیں موٹی موٹی شانوں
تک پہنچے ہوئے بھورے بال اور نقوش بے حد دلکش تھے۔
چہرے تھرے سے وہ بے حریفی اور نازک مزاج لیکن جمالی
اعتبار سے کڑی جوان لگا رہتا تھا۔ اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو

”تم تو صرف اپنی ہی خواہش کو پیر صاحب کی آمد کے
بارے میں سوال کرنے لگے، وہ فخریہ انداز میں مسکرایا وہاں
آٹھ آدمی ایسے ہیں جن کی خدمات صرف پیری سرمدی والے
دھند سے ہیں اور ان میں سے دو ایک کی تحواری اس سے
بھی زیادہ ہے جو تمہاری ہوئی اس کے علاوہ زمینوں پر کام
کرنے والے کچھ آدمی بھی ہیں جو پارٹ ٹائم پیری سرمدی والے
کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ انہیں اس کا معاوضہ الگ ملتا ہے
آمد کی کا تو تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ بخور دار دولت آشر کی
طرح گرتی ہے... اسی کمائی سے قریب صاحب نے زمینیں
خریدی ہیں۔ سامی چار ہی مرتبے ہیں۔ آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے
ہے۔ ادھر پیری سرمدی کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔
چند برس کی بات ہے، بڑی توپ چیز بن جائیں گے وہ... میں
تو ان کا کافی ہوں نا... مجھے تو سر چیز کا اندازہ ہے۔ میں سوچتا
ہوں کہ اگر کبھی پیر صاحب مجھے ملے ملازمت سے نکال دیا یا
کسی وجہ سے مجھے خود ملک ہونا پڑا تو میں کسی دور دراز علاقے
میں جا کر یہی دھند شروع کر دینا گا۔ وقت تو گئے گا لیکن اگر
دھند چمک گیا تو نہیں بھر جائیگی“

”مجھے یقین نہیں آ رہا،“ میں نے کہا۔
”تم یقینی اور بے یقینی کو چھوڑو، بعد استار نا گوری سے
بولا یہ بتاؤ کہ کام کے لیے تیار ہو یا نہیں؟“

میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا میں
سائل کے بارے میں بتاؤ کیا پیر صاحب کی جاسوسہ وغیرہ کو بھی کچھ
معلوم نہیں ہوتا اس کے بارے میں جتن کیا کتاب ہے؟“

”کچھ بھی نہیں،“ عبد الستار نے جواب دیا اس سے پیر
صاحب براہ راست مسئلہ پر چھ پلٹے میں پیر اگر ضروری سمجھتے
ہیں تو بہن کو طلب کرتے ہیں اور اُس سے ویسا منت کرتے ہیں
کہ مسئلہ حل ہو جائے گا یا نہیں۔ ظاہر ہے جن کا جواب معمولی سی
چٹکیاں ہوتے ہیں بعد ہمیشہ اثبات میں ہوتا ہے۔“

میں نے چہرے پر غور کیا اور کہا یہ ٹھیک ہے سار جانی
میں تیار ہوں۔“

عبد الستار نے ایک گہری سانس لی گویا کوئی بوجھ سر سے
اُتر گیا ہو۔ پیر صاحب مقتدرین سے ملاقات دو ہرے کے
کھانے کے بعد شروع کرتے ہیں آج کل وہ جن کے بغیر
کام چلا رہے ہیں لیکن اس طرح دھند لگے مندا جا رہے اور شرت
پھیلنے کا عمل بھی کچھ سخت پڑ گیا ہے۔ لوگ پیر صاحب بدنے
مشہور ہیں کہ کھانے کے ان کا جن آج کل کسی سائل، مسئلہ حل
کرنے کے مسئلے میں کہیں دور دراز گیا ہو اسے اور کچھ شیطانی

مجھے اس کی طاقت کا کچھ اندازہ ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں کسی منک انسان کو سمجھ کر دینے والی طاقت تھی۔

وہ ایک ایسا ریاضی پتھر پینے چلے تھا اور اس کے قریب ہی میری پر ایک ڈیوڑھا تھا جس کا سوچے اُس نے میں دیکھتے ہی آفت کر دیا تھا۔ اُس نے جس سامنے ہی گئی گریسولہ بیٹھنے کا ہتھارہ کیا۔ مگر بیٹھ چکے تو اُس نے ایک خوبصورت سنہرے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سگائی اور پیکٹ ہماری طرف بھی بڑھایا۔ میں نے تو شکریے کے ساتھ انکار دیا لیکن عبدالستار نے سگریٹ سگائی۔

ایک کش نے کر محل شاہ نے سگریٹ نظروں سے میرا ہاتھ لیا۔ میں حتی الامکان بڑا اعتماد نہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاہم اپنے معمولی لباس اور پرانے جوتوں کی وجہ سے مجھے کسی منک کیڑی اور خرم عکس پروردہ ہی تھی۔

”افضل میاں! آہا! آخر محل شاہ نے بیٹھے بیٹھے میں کہا۔“ عبدالستار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تم سے تمام ضروری باتیں ملے کر چکے اس لیے میرے کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ تمہارا خاندانی پس منظر وغیرہ مجھ کو سب سے معلوم کر لیا ہے۔ اب اُس حرف ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم بہت جلد ہی اچھی طرح اسے ذہن نشین کر لو۔ مجھے اور کسی بھی بات کی بے باک نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ میرے آدمی اس قابل ہوں کہ ان کی آنکھیں بند کر کے ان پر بھر دیا کروں۔ ...“

مازوری ان کی آدھن صفت ہو۔ ان کا سینہ مستدرجہ۔ اوپھے لوگوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ ان آدمیوں سے قوت ہے تو بڑی سے بڑی سختی میں بھی میرا کوئی راز افشا نہ کروں۔ ... یہاں تم پرے پرے تماشے دیکھو گے، تمہارا دل چاہے تو کچھ تماشوں میں نام نہاد ایک بھی جو کچھ ہو لیکن کبھی بھولی کبھی میرے اور عبدالستار کے سوا کسی میرے شخص کے سامنے بیٹھ کر کوئی لفظ زبان پر نہ لانا۔ میں یہ بتانا اچھا نہیں جانتا لیکن مجبوراً راجع کرنا پڑے۔ اس کے میری اس برادری کی خلاف ورزی کرنے والے کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی موت جس میں لاش بھی واقفین کو نہیں ملتی۔ میرے ہاں انسان کی باقی سب خطا میں معاف ہیں۔

”بھگتے آہ!“ اس وقت تک میری جھجک بھی کافی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا انہیں آپ کا مقصد بڑا اچھی طرح سمجھ گیا ہوں آپ مجھے اپنی توقعات سے بڑھ کر گھبرا جائیں گے۔

محل شاہ نے مسکراتے ہوئے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور

عبدالستار سے کہا: ”اُسے کمر خاص دکھا دو اور چاہا بکرت کی مدد سے آج سے ہی اس کی ٹرینگ شروع کر دو۔“

عبدالستار کا اشارہ ہاتھیں اٹھا اور اس کے پیچھے چلے دیا۔ خواب گاہ ہی کی ایک دیوار میں موجود دھڑلے گول کر و متعلق کمرے میں داخل ہوا۔ یہی کمر خاص تھا۔ اس میں ویسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس کچھ کیوں اور دو ڈول کی نشست کچھ اس قسم کی تھی کہ کافی حد تک ساؤنڈ پروف معلوم ہوتا تھا۔ فرش پر دیر قائم نہیں بچھا ہوا تھا۔ جانے کیوں یہاں پہنچتے ہی مجھے خشکی اور سکون کا احساس ہوا۔ الامرکہ چست میں بیٹھ بونے دونوں بیٹھے بھی بند تھے۔

ایک دیوار کے قریب وہ تخت رکھا تھا جس کے بائیں میں عبدالستار مجھے بتا چکا تھا۔ اس پر دو گڈیچے رکھے ہوئے تھے۔ عبدالستار نے تخت کے چاروں طرف پرنس کی طرح ٹٹکا ہوا کپڑا اٹھا کر مجھے دکھایا۔ یہی ایک نئی گڈی پڑی تھی جس پر مجھے بیٹھا تھا۔ اس پر سیاہ قلم سے منک ٹائٹ بھی پڑا تھا۔ قریب ہی ایک فرماچی اور گلاس بھی رکھا تھا کہ اگر ڈول کی کے دوران جن صاحب کا کھانا خشک ہو جائے تو انہیں باہر کرنے کی نصیحت نہ کرنی پڑے۔

میں نے ہند منٹ کے لیے تخت کے نیچے بیٹھ کر بھی دیکھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ کسی تلک نیچے میں بیٹھا ہوں۔ کپڑے میں موجود ایک سختے سے سوراخ سے میں باہر کا منظر اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ چند لمبے بعد ہی اندر کی تاریکی سے میری آنکھیں بانوس ہو گئیں۔ عبدالستار بولا تو ایک کاشن آئی کہ کے آؤ ماش کے طوف پر کچھ پورے۔

میں نے خفا ہی انداز میں ایک منکالہ بولا اور کمرے میں گوجے والی آواز نہ کی کہ میں خود ہی متاخر ہو گیا۔ ان ڈول پر سے ہی آواز سے متعلق برقی آکات کچھ زیادہ عام نہیں ہوئے تھے، خصوصاً ہمارے پسماندہ علاقے میں۔ ... اور پھر اسپیکر بھی یقیناً کچھ خاص ہی قسم کے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی آواز اسپیکروں سے نکلنے والی آواز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ انہی اس کی سمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ آواز میں جیسے بولے سے جیسے جیسے تھی۔ میں نے کئی قسم کے بھون میں بول کر دیکھا اور کئی قسم کی آوازیں نکالیں۔ نتیجہً واقعی نے حد تاثر نہیں کیا اور ابھی تو میری تربیت نہیں ہوئی تھی۔ دیکھا کہ یہ کام مجھے بے حد آسان محسوس ہونے لگا۔

میں باہر آیا تو عبدالستار نے مجھے دیواروں پر آویزاں وہ چاندنی بریں دکھائیں جن کے پیچھے ایک فٹ تھے۔ یہ سارا

کچھ تر بیت اور کچھ خود نوکی بنا کر کس چند ہی دن میں اس قابل ہو گیا کہ تقریباً پچاس فیصد سائیں کا چہرہ دیکھ کر ہی ان کی غرض بجا بن لیتا تھا لیکن سنی تو میری اس نذر کم ہوئی جب میں نے سائلہ کے طرہ پر چھوٹی جی کو سامنے کھڑے پایا۔ ان کے ہمیشہ منو کے ہنسنے والے ہونٹ کچھ زیادہ ہی کھلے ہوئے تھے اور چند ہی چند ہی انگلیں سر پر بیت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے تو میں ایسا گڑبڑا کر اٹھ کر بھاگے ہی لگا تھا مگر فوراً ہی خیال آ گیا کہ وہ مجھے غصہ ڈی دیکھ سکتی ہیں۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ انھیں کون سا مسئلہ یہاں لے آیا تھا۔ وہ ویسے تو خیر زندگی ان کے لیے اور وہ زندگی کے لیے ایک عظیم مسئلہ تھیں مگر خاص طور پر ان کی غرض کا قیقن کرنا مشکل تھا۔ انھیں کسی بھی چیز کی غرض ہو سکتی تھی مگر موت کے... اس کے باوجود میرے خیال میں جن کا رد پلے کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔

حیرت ہے اس بات پر بھی تھی کہ وہ پیر مٹھل شاہ کے ہاں آنے کی عقل کیسے ہوئی تھیں؟ جس طرح ڈاکٹر وٹ کے ہاں ایک مقررہ لمب تو ہوتی ہی ہے خواہ مریض مرے یا نہ رہے اور اس کے علاج کے علاوہ دیگر خرچ اپنی جگہ ہوتے ہیں اسی طرح مٹھل شاہ کے ہاں آنے والوں سے دس روپے

سلا بے حد عمدہ اور پینے وقت کے لحاظ سے خاص سی ڈانٹ کو تھا کہ کسے کا ساتھ مکمل کرانے کے بعد بعد التارنے صلوہ پوری اور کسی سے میری تواضع کی اداس کے بعد میری تربیت کا مسئلہ شروع ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد چونکہ مجھے لمٹ کر دل پٹنا تھا کہ کرنے کا موقع ملا تھا اس لیے اس کے بعد طبیعت بڑی بڑی بچل ہو گئی تھی۔

تربیت کے دوران میرا تقریباً سارا دن ہی مٹھل شاہ کے ہاں گزرنے لگا۔ اس عرصے میں میں ماحول سے مایوس بھی ہو گیا اور مجھے مٹھل شاہ کے دھندل کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملی۔

اس کے معتقدین میں ہمارے قبیلے ہی کی جلتی خواتین اور مرد شامل تھے۔ میں تو ان سب کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا جبکہ ارد گرد کے قبیلوں اور دیہاتوں سے بھی نہ جانے کتنے لوگ آتے تھے۔ ان میں سے یقیناً کچھ کی اغراض خدا کی نشا سے پوری بھی ہوتی ہوں گی مگر وہ اسے پیر صاحب کی کرامت ہی سمجھتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مٹھل شاہ کی شخصیت میں سحر تھا۔ بعض عورتیں فرض اس سے تہلہ نہ ٹھک کے لیے ہی آتی تھیں۔ انھیں کوئی مسئلہ پیش نہیں ہوتا تھا۔ بعض باقاعدہ مٹھل شاہ پر عاشق تھیں اور اس کی غایات خصوصی کی طالب رہتی تھیں۔ کسی کو بالوں کرنا مٹھل شاہ کے مشک میں شامل نہیں تھا اس لیے وہ انھیں بھی بالوں نہیں کرتا تھا۔ کسی کو ایک دن وقت دیتا تھا اور کسی کو دوسرے دن۔

اس قسم کے تماثلوں سے میرے اعصاب اٹھل پھٹل رہنے لگے تھے لیکن اب میری ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی اور میری کوشش تھی کہ کچھ عرصہ صحت اور بھلائی سے اپنا کام انجام دے لوں۔ باہانچ مورد و پے ماہر کے قہقہے سے مجھے اپنی نیکی برقرار رکھنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ مٹھل شاہ میری کارکردگی سے بے حد خوش تھا اس کی رائے میں میں اس کے ساتھ جن سے زیادہ عقل رکھتا تھا اور آواز کے شعبہ سے دکھانے میں کسی نیلواہ ماہر تھا۔

میرے علم و عقل میں اضافہ کرنے میں چاہا یا برکت کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جنہیں بعد التار کے ساتھ میری تربیت پر مامور کیا گیا تھا۔ موصوف ایک ریٹائرڈ سپہ سالار تھے لیکن مجھے تھا کہ اپنے دودھ میں مردوں سے گفتگیاں انھوں نے کم ہی لڑی تھیں۔ انھوں نے مجھے عورت کی نفسیات اور فیاض شامی کے ایسے ایسے گزرتا تھے کہ میں خواب میں بھی آواز کرتا تھا۔

مقبول شاعر قاتل شفا فی کے کردار و کلام کا

مفصل تعارف و انتخاب

قتیل سے جمیل

مرتبہ ضیاء ساہد

قیمت - / 100 روپے



مصنف:

اے حمید

پلیکان

● بھارت کے ہیبت ناک تاریک جنگلوں میں واقع خفیہ مندروں کی لرزہ خیز روداد۔

● انسانی بلیدان کے لرزہ خیز واقعات، جن کا اس کتاب کے مصنف نے بھارت کے جنگلوں میں سیاحت کے دوران اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، اور ایک بار خود بھی ایک دیوی کی مورتی پر قربان ہوتے ہوتے بچا۔

دو جلدوں میں مکمل سیٹ - 375 روپے

اسٹاکسٹ: 

سکت نہیں تھی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ ان کی حالت پر چند ہیبت ناک قسمیں اور لگاؤں غمگینوں پر ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا: اب میرے آٹا کو اپنا مسئلہ بنا۔ وہ چکی بجاتے ہی لئے حل کر دیں گے۔ افسوس کہ میں حکم دیں گے تو ہم چھ حاضر ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر میں نے ایسی ہلکی سی آواز پیدا کی جیسے کوئی پرندہ اڑا ہو۔ پھر میں نے مائیک کا سوئچ آف کر دیا۔

سکوت چھا چکا تو چکی کی کچھ برت بندھی۔ وہ دوڑا نو بیٹھ کر ہاتھ باندھتے ہوئے یوں: "صنوبر امیر ایک ہی مسئلہ ہے۔ غربت سے میں تنگ نہیں، مگر کے دردمے میں تنگ نہیں لیکن اسے بچھڑے میں تنگ آگئی ہوں۔ میرے دس بچے ہیں اور آج کل میرا پھر کٹائی کاٹنے کو بی چاہئے لگا چھ فوراً بجے اور پھر نہیں چاہیے خدا کے لیے مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں جس سے میرا یہ دھڑکا بیٹھ ہمیشہ کے لیے دودھ ہو جائے۔"

"عجیب ناخوشی عورت ہے تو..." مٹھل شاہ کی بار بار آواز سنائی دی: "عورتیں میرے پاس ایسے تعویذ مانگنے آتی ہیں کہ ان کی گود ہری ہو جائے اور تو مجھ سے اس کا الٹ تعویذ لینے آتی ہے۔ خیر... ہر گز مجھے مالوس نہیں کریں گے..." مٹھل شاہ نے گھٹنی جگا کر منشی بنار کو بلایا۔ یہ بزرگ اپنے دعوے کے مطابق شاعر تھے۔ شطرنج کھیلنے کے تھے اور مٹھل شاہ کے ہاں تعویذ کھینچ کر مامور تھے۔ پانی میں کٹھا ملا کر تعویذ کھینچتے تھے اور سال کو بتاتے تھے کہ یہ فلک و زعفران اور عرق گلاب کا مرکب ہے۔

"منشی جی! اس عورت کو اولاد کی بذرش والا تعویذ لکھیں!" مٹھل شاہ نے ہدایت کی: "اور کھینچنے کے بعد اس پر مجھ سے قسم ضرور کروائیں!"

منشی جی چاہتے تو مٹھل شاہ دوبارہ چکی سے مخاطب ہوا۔ "تعویذ تو ابی جگہ ہے، یہ لیکن تو میرے سیدھے جاکر لیڈی ڈاکٹر شیریں خان سے ہی ضرور مل لے۔ یہی تیرا مسئلہ مستقل طور پر حل ہو گا۔ کبھی؟ اب جا... باہر جا کر بیٹھ جا۔ تیرا تعویذ وہیں پہنچ جائے گا!"

چچی اٹھتے تھموں باہر چلی گئیں۔ اس دن کے بعد تو کھر میں گویا میری حیثیت ہی بدل گئی۔ حالانکہ پہلے بھی میں نے چکی کو بتایا تھا کہ میں ایک فلور مل میں ملازم ہو گیا ہوں اور مجھے خاصی معقول تنخواہ ملا کر دی گئی۔ مقصد یہی تھا کہ وہ مجھے ذلیل کرنا چھوڑ دیں اور کسی حد تک

کاغذ نہ تو دروازے پر ہی دھروالیا جاتا تھا اور یہ وصولی ایسے روج پر در اور پھر تقدس ماحول میں غل میں آتی تھی کہ دینے والے کو ذرا بھی نہیں کھشتی تھی بلکہ اس کا دل چاہتا تھا کہ جیب دین خالی کر دے۔

اس کے بعد اکثر حاجت مندوں پر تعویذ یا عملیات اور وضعیوں وغیرہ کے ضمن میں زعفران، کالی مرچی یا کالے بکریے وغیرہ کا جو خرچ پر چھانٹا تھا وہ الگ تھا۔ اس کے بعد بھی اگر سکت باقی رہ جاتی تھی تو بعض لوگ جو شہر قدرت میں از خود نڈر نہ چھین کرنے سے باز نہیں آتے تھے، خصوصاً جن کی فراور آتی تھی، وہ تو بار بار آتے تھے اور پیر صاحب کے قدموں میں گھومتے تھے۔ چچی اگر دس روپے کا مڈانہ دے کر اندر آتی تھیں تو میرے لیے بلاشبہ یہ حیرت کا مقام تھا کہ وہ لوگ میں نے ان کے پاس یکشت دس روپے بھی نہیں دیکھے تھے۔

مٹھل شاہ نے مجھے گلے دیتے ہوئے کہا: "مٹھل شاہ بوجا اسے یا قوت، جن! اور مجھے اس عورت کے ہالے میں کچھ بتاؤ!" میں نے پہلے تو فخر گل بکاؤلی کے جن کی طرح ایک ہیبت ناک قہقہہ لگا یا پھر چچی کے فحشہ نسب کا کافی حصہ بیان کر ڈالا کہ یہ عورت فلاں کی بیوی، فلاں کی بیٹی اور اتنے بچوں کی ماں ہے۔ آخر میں میں نے کہا: "لے رو بہت بڑھیا..." حالانکہ وہ کوئی ایسی بوڑھی بھی نہیں تھیں۔ ان کا دوسواں اور تازہ ترین بچہ صرف دو سال کا تھا۔ تیرا ایک نوجوان بیٹا بھی ہے اور تو اس یتیم واپسیر کے ساتھ بہت بڑا سلوک روا رکھتی ہے۔ اسی لیے خدائے بزرگ دیر تھجھ پر ناہر مان ہے اور جب تک تو یہی مدیہ اپنائے رکھے گی تیرے حالات خراب ہی رہیں گے۔ تو سدا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر روتی ہے گی۔ تجھے نہیں معلوم وہ یتیم بچہ بڑا بھانگوان ہے۔ اس کی دماغی لے گی تو تیرا بڑھاپا بڑے لکھ میں گزرے گا!"

میں نے دیکھا، چچی ہنسنے لگی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر قائل پر تقریباً اوندھے منہ کرتے ہوئے یوں: "جن سائیں! مجھ سے بڑی بھانجھوٹی بڑی بھول ہوئی۔ میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگوں گی اور آئندہ اپنے خدا سے بھی زیادہ اس یتیم کی خدمت کروں گا۔ اسے اپنے بچوں سے زیادہ پیار دوں گی!"

"اسی میں تیری خیلائی ہے بڑھیا! میں نے انھیں چلانے کی خاطر نفلنڈ بڑھیا پر دوبارہ زور دیتے ہوئے کہا۔ لیکن شاید اس وقت ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چلنے کی ان میں

اور ناکارہ ذہنوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ آدمی میں لکھ رکھاؤ
آجاتا ہے۔ سیطرے سے بات کرنی آجاتی ہے۔ ذہن خود بخود ہی
گنگناں سلجھا لیتا ہے۔ میں ماحول کے کنوئیں سے نہی لیکن
ذہن کے کنوئیں سے ضرور دھیرے دھیرے باہر آنے لگا تھا۔ مجھے
نہیں معلوم تھا کہ ایک مفلوک احوال انسان کی زندگی میں صرف
پانچ سو رپے کی رقم اتنے بڑے بڑے انقلابات لاسکتی ہے۔

ایک رات میں مٹھل شاہ جی کے کمرے میں بیٹھا تھا اس
رات میرا ڈیرے پر ہی قیام کرنے کا پروگرام تھا۔ عبدالستار بھی
وہیں موجود تھا۔ دور پل رہا تھا۔ بہنیں بڑی ترنگ میں تھیں۔
تینوں کی محرومی میں نمایاں فرق تھا۔ مگر ہم ایک دوسرے کو
تصنّف سے مخاطب کرنے لگے تھے اور جب دور چلتا تھا تب
کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ایسی ہی ایک مٹھل کے دوران
مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مٹھل شاہ کا اصل نام عادل بخش تھا۔
اس نام کو وہ خود بخود تقریباً بھول چکا تھا۔

جب ان دنوں کی آنکھوں میں بھی سرنی گری ہو گئی
تو میں نے مٹھل سے کہا: ”ایک بات پوچھوں؟“
مٹھل شاہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگا۔ انداز سوال یہ تھا۔
اس کے ترنگ میں آنے کی نشانی یہی تھی کہ اسے چپ لگ
جاتی تھی لیکن کچھ خبر نہیں ہوتی تھی کہ کس بات پر پوچھا جائے اور
دستاں گوئی یا پھر خطابت کا سماں باندھ دے۔

”میں یہ جاننا چاہتا ہوں مٹھل شاہ... میں نے سنا ہے کہ
ہوئے کہا: ”تم جو یہ جھلی پر نہ ہوئے ہو تو کوں کے معصوم
اعتقاد سے کھیلے ہو۔“ تمہیں بھی اپنے آپ پر اتنیس یاد پڑتا ہو
محسوس نہیں ہوتا؟ کبھی کوئی، بھین یا خوش تھیں نہیں سنا ہے؟“
اس نے ایک غریب ہنسا راہرا ہنسا ہنسا کر سلائی اور کش
لے کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر گلاس خالی کرتے ہوئے بولا: ”بلکی
سی ایک خوش تو ہمیشہ ہی ذہن کی گہرائی میں رہتی ہے۔ بائبل کی
طرح جیسے کسی گہری اور سکون، جھیل کی تر میں ایک ننھی سی
پھلی ہمیشہ تیرتی رہے لیکن ایک بار اپنا آپ بہت ہی بڑا لگا تھا۔
بہت گہرا غم لگا تھا دل پر۔ مگر پھر سے دھیرے دھیرے بھر گیا۔ اب
صرف کبھی کبھار میں اٹھتی ہے... وہ خاموش ہو کر حیرت کو
گھورنے لگا۔

عبدالستار نے اس کے لیے نیا جام تیار کیا تو وہ ایک گھونٹ
بھر کر بولا: ”کافی عرصہ پہلے کی بات ہے، ایک عورت، میرے
پاس آئی۔ بہت ہی خوبصورت عورت۔ لیکن اس کی خوبصورتی
ایک عجیب سی اداسی میں ملفوف تھی۔ اس کا دواں دواں اداس
تھا۔ بعض عورتوں کو دیکھتے ہی انسان محزون سا ہو جاتا ہے۔ وہ

انسانوں والا سلوک کر رہی مگر ان کے دویے میں ذرا بھی تبدیلی
نہیں آئی تھی۔ ان کا کسانوی تھا کہ میں نے اپنی پوزیشن مٹانے
کے لیے خواہ مخواہ جھوٹ بولا ہے اور وہ بھی میری بات کا یقین
کر رہی تھی۔ تب میں تنخواہ لاکر ان کے ہاتھ پر رکھوں گا۔

اب خود بخود ہی انہیں میری بات کا یقین آ گیا تھا۔
میں گھر پہنچتا تو وہ دور ہی سے بلا میں نہیں... ہاتھ...

میرا بچہ کام پر سے آیا ہے... تھک گیا ہو گا... لے دو دو
کا پیالہ پی لے... اچھا چل جائے گی لے... اچھا میں ڈی
گرم کرتی ہوں... میں نے ذرا سا مکین بچا کر رکھا ہے تیرے
سان میں ڈالنے کے لیے۔ اس قسم کے مکالمات سے میرا
استقبال ہوتا۔ کپڑے دھلے ہوئے اور بستر بچا ہوا تھا۔ غرضیکہ
باہر ہی عیش... اور گھر میں بھی۔

دو مہینے راتیں میں نے مٹھل شاہ کے ڈیرے پر رہی
گزاریں۔ تب بھی گھر میں کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں کہاں رہا
اور کیا کرتا رہا۔ ڈیرے پر گزرتے والی راتیں میری زندگی میں انقلاب
لا رہی تھیں۔ میں مٹھل سے نوشی اور عیش کوئی سے متعارف
ہونے لگا تھا۔ مٹھل شاہ مجھ پر مہربان تھا اور مٹھل میں
مجھے شریک کرنے لگا تھا۔

جس روز منشی عبدالستار جو درحقیقت منشی نہیں ایک طرح
سے مٹھل شاہ کا جرنیل لیجر تھا اس نے پہلی تنخواہ میرے ہاتھ پر رکھی
اس روز خوشی سے میرے ہاتھ کا پیچھے لگے اور ایک بار تو رقم
میرے ہاتھ سے گرتے گرتے تنک... اور جب اس رقم میں سے
میں سو رپے اپنی جیب میں اور دو سو رپے میں نے لے
ہا کر چھوٹی چھٹی کے ہاتھ پر رکھے تو چند لمحے کے لیے تو انہیں گویا
مکھڑا ہوا۔ انہوں نے میری آنٹی بلا میں لے آئی۔ بلا میں کہ میرے
پاس بلاؤں کا سارا اسٹاک ختم ہو گیا اور پہلی بار میں نے
اپنے آپ کو انسان محسوس کیا۔ ورنہ پہلے مجھے آدرا بلاؤں میں
اپنے سے زیادہ باعزت لگتا تھا۔

جس پر ڈھنگ کا لباس اور چہرے پر قد سے آسودہ حالی
کی جگہ آئی تو احساس ہوا کہ دنیا کچھ اتنی زیادہ بڑی ہو گئی نہیں۔
غیر محسوس طور پر انہیں گفتگو میں اعتماد بھی جھلکنے لگا تھا اور ساتھ
ہی گویا ذہن کے کچھ ترنگ آلود سے پرنے سے بھی راں ہو گئے
تھے۔ غم کے کام کرنے لگے تھے۔ معاملات کی سمجھ آنے لگی
تھی اور عقل پہلے کی طرح بہت ہی محدود محسوس نہیں ہوتی تھی۔
کافکے کے بے وقعت سے مرزے جیسے نوٹ لکھتے ہیں باق
بڑی تاثیر رکھتے ہیں۔ دولت غالباً دنیا کا سب سے بڑا جرنل
ان کا سب سے اچھا مشربت فولاد ہے۔ بڑے بڑے سعادت چھوٹ

خاموش ہو گیا اور ایک بار پھر جھٹ کو گھوڑے لگا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
 ۱۰ پھر وہ کہاں گئی؟ بالآخر میں نے گویا کسی سر سے پھر کھینچے جیسے پوچھا۔

صبح اس کی لاش ایک کنوئیں میں پائی گئی تھی بمثل شاہ نے جواب دیا۔ دنیا بھر کی افروغی اس کے لہجے میں کٹی ہوئی تھی۔ اس کے گھر والوں اور دیگر لوگوں نے سہی سمجھا کر اس نے بے اولادی کے مردے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی ہے اس واقعے کے بعد اپنے آپ سے بڑی نفرت محسوس ہوتی تھی اور سب کچھ چھوڑ چکا کہ کسی طرف کو نکل جائے کوئی چاہنے لگا تھا۔ مگر میں اس عورت کے قتلے میں بہت بزدل تھا۔ اپنے آپ کو سزا دے دے سکا تو سزا سے تعلق کے بعد زندگی کی ملازمتیں اسی طرح جاری رہیں مگر ذہن سے اس کا تصور آج تک نہیں نکلا۔ وہ یہاں زخم چھوڑ گئی ہے وصال شاہ نے سینے پر دل کی جگر ہاتھ رکھا۔

مجھے شیم یاد آگئی اور میرے سینے میں بھی جیسے کوئی خوابیدہ کسی غمش جاگ اٹھی۔ سپردگی اور بچتا واس کچھ عورتوں میں جانے کیوں یہ دونوں جذبے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس رات عقل ختم ہوئی تو میں ممان خانے میں جا کر سونے کے بجائے دیر تک کھیتوں میں شلتا رہا اور مثل شاہ کے بلے میں سوچتا رہا۔ وہ تجربات کا سمندر تھا اور شرای عجیب کار تھا۔

لوگ اس کے پاس اپنے سبھی دکھوں کی دوائی آتے تھے۔ اس کے ہاں کام کرتے ہوئے اگلے مہینے میں نہیں لے ایک اور ایسی شخصیت کو اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے دیکھا جا کو میں آتھو بیابانوں چکا تھا کہ جس پر نظر پڑتے ہی سارا لڑکپن ذہن میں تازہ ہو گیا۔

وہ تاجاں تھی۔ وہی تاجاں جو کبھی ناک پر کھینچے نہیں دیتی تھی مگر اس وقت اس کی حالت ایسی اتر چکی کہ کوئی بھی شاید خود ہی اس پر بیٹھنا پسند نہ کرتی۔ میں نے اسے ڈھائی تین برس بعد دیکھا اور ان برسوں میں اس پر نہ جانے کیا کیا باتیں بیت گئی تھیں۔ قتلے سے زیادہ فاصلے سے تو شاید میں اسے پہچان ہی نہ پاتا۔

اس کی صحت مند ریسیلاہیں اور کڑو سب ختم ہو چکی تھی شکست اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ وہ کھڑکڑ ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ ڈر کیولا کا زانہ ایڈیشن لگ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سوکھے سوکھے کمر خدیہ، ہونٹوں پر پیڑیاں اور سالونی رنگت میں مریضانہ سی زردی کا استخراج۔ جانے کیوں وقت اس پر اس قدر

انہی میں سے ایک تھی۔ میرے لیے سنسنی کی بات یہ تھی کہ میں بچی نہیں وہ بھی جیسے دیکھ کر سر زردی نظر آرہی تھی۔ کہنے کی کدے اولادی اس کا مسئلہ ہے اس نے لیڈی ڈاکٹر سے بھی مشورہ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ انھیں اس میں نہیں مانگے بے شوہر میں ہو کر شوہر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا تھا خاندانی آنا اور معلوم نہیں کس کس چیز کا سوال پیدا ہو جاتا تھا۔ اس نے زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ شاید اسے ہو کر زندگی تلخ کرنے کا صرف ہمانا چاہیے تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اسے بہتیت پر لپٹا چاہیے۔ ورنہ وہ بیٹکی دوسری شادی کر دے گی۔ عورت نے دعا دارہ اور گزشتہ سب کر کے دیکھ لیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے تو بڑ گشتا نہیں شہرہ یا شاید وہ دلچسپ لگتی تھی۔ اس کا مسئلہ صرف یہ تھا کہ اپنی ازادگی زندگی کو بچانے کے لیے وہ کسی طرح اپنی ساس کو مانا بن کر دکھا دے۔ بالآخر بن کا خاتمہ خواہ کا داغ پیشانی سے مٹا دے۔ اس نے اپنی ماسٹان سنانے میں چھ کمریت دیر لگا دی تھی، اس لیے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ رات کو آسکتی ہے کسی قندوچکا مہل کے بعد اس نے ہاں بھری کر کسی ہوائے سے یا مہل پا کر چوری چھپے وہ آجائے گی اور وہ واقعی آگئی۔

وہ مجھ میں خوش نظر آرہی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے معمولی سا سنگھار بھی کیا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کے ڈھبے، چہرے پر ہلکا سا غارہ اور ہونٹوں پر تھنی۔ خاص اہتمام سے نور سے ہونے وال اور کسی عطر کی خوشبو میں بسا ہوا لباس۔ اس کی ہاں چلیں حیا کے بوچھے سے چھکی پڑ رہی تھیں اور ہر جہش پڑ رہی تھیں پر گلاب کیلے پڑ رہے تھے۔

میں بہت سا ہو گیا۔ مجھے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قدرت مجھ پر اتنی ہی مہربان ہو سکتی ہے۔ یا پھر میرے زندگی کا پہلا اتفاق تھا۔

سینہ بھر خود بخود ہونے سے بہت پہلے وہ وہاں جانے لگی تو دروازے کے قریب پہنچ کر اس پر جیسے اختلاج کا سا دورہ پڑا۔ ہار بار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی تھی اور ہر قدر کانپنے لگتی تھی۔ میری موجودگی کا جیسے اسے احساس ہی نہیں رہا تھا۔ زبردست وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہی تھی۔ یہ میں نے کیا کیا... یہ میں نے کیا کیا... میں تو اپنے شوہر کی وفادار تھی۔ اس سے محبت کرتی تھی... اسے وفادار کرنے کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا... میرا عمیر... میرا خدا کیسے مجھے محاف کرے گا... میں نے اسے بہت سمجھایا۔ سمجھا یا اور لبتیاں سے کمر رخصت کر دیا۔ مگر اس رات وہ گھر واپس نہیں گئی بمثل شاہ

اہم راہ ہو گیا تھا۔
مٹھل شاہ یقیناً اسے جانتا تھا کیونکہ اس نے مجھے

بولنے کا سیکھل دیا ہے بغیر حیرت سے کہا تھا: "تاجا! تیری یہ حالت...؟ تو ہمارے پاس کیسے آگئی؟" میں تو تو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔"

"میں تو کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی شاہ جی! وہ مٹھل سے انداز میں مسکراتے ہوئے کمزوری آواز میں بولی۔
"عشق کے نقشے میں جو تھی..."

"ہم نے تمہارے کہنا تھا کہ عشق تیرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ مٹھل شاہ کی آواز آئی۔ مگر اس وقت تجھے ہماری بات کا اعتبار نہیں آیا تھا۔ تو نے ہمیں جھوٹا پیر کہا تھا۔"

"عشق تو کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوتا شاہ جی! وہ بولی۔
"باپ نے مجھے بہت منع کیا تھا کہ کھوسے کے ساتھ بیٹگیں مت

بڑھا مگر اس وقت میں پوری پوری میری رہی ہوئی تھی اور شکر امیر را بچھا تھا۔ باپ نے شادی کی اجازت نہیں دی تو میں اس کے ساتھ جھاگ گئی۔ ہم لاہور چلے گئے تھے شاہ جی!

کچھ دن تو آرام سے گزرتے مگر جب سر چھپانے کا کوئی صحیح ٹھکانہ نہ ملا اور فاقے بجلی ہونے لگے تو سارا عشق روفو چکر ہو گیا اور ایک روز رانچھا اپنی ہیر کو ایک دلال کے ہاتھ

پا کر ہزار میں بیچ گیا۔ اسی دوران ایک بچہ بھی ہوا جو منہ سے سے گر گیا۔ ڈیڑھ سال کوٹھے پر گزارا۔ وہاں بڑی جان لیوا

ہماری لگ گئی شاہ جی! تاکہ نے بڑا دلچسپ کرایا۔ آپ کو کو دتر ہے شاہ جی کہ آدمی جس مٹھل سے چمکے گا نا ہے۔ وہ خراب

ہو جائے تو اس کی مرمت اچھی طرح کرنا ہے۔ میں بھی ان کی مدد کرنے کی کوشش تھی۔ مگر جب مختار خراب ہو تو علاج بھی

خواب ہوتا ہے۔ مرضی حد سے بڑھ گیا تو انہوں نے دھکے دے دے کر نکال دیا۔"

اسے کھانسی آگئی یا شاید وہ عجیب سے انداز میں منہ سے تھکی زبان آدمی کے ساتھ ملا مذاق کرتا ہے شاہ جی! جب میں

کوٹھے سے جھاگ جانا چاہتی تھی تو وہ لوگ مجھے بید سے مار رہے تھے اور جب میں وہیں سر چھپا کر رہنا چاہتی تھی تو انہوں نے مجھے دھکے دے دے کر نکال دیا۔ وہاں باپ کے پاس

والہو! آگئی مگر اب باپ بھی مجھے نہیں کہتا۔ میں زبردستی گھر

میں کسی پر رہی ہوں مگر باپ میرا نام اٹھتے جھٹکتے ہوئے کہتا ہے

گالیاں دیتا ہے اس کا رویہ دیکھ کے کہیں کبھی تو مجھے نہیں

اتنا کہ یہ وہی باپ ہے جو میرے بچپن میں مجھے سینے پر ڈال

کر لوری سنا تھا۔ وہ ایک بار میرے عجیب سے انداز میں

کر خاموش ہو گئی اور پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کو کھینچنے لگی۔
"میں نے کب مٹھل شاہ کی آواز سنائی نہ دی۔ اس کے پاس آنے والے بھی لوگ کسی نہ کسی اعتبار سے دیکھا رہے ہی ہوتے تھے اور زمانہ وہ ایک سے ایک بڑھ کر دلواؤش ولسان

سنا تھا اور کسی سے متاثر نہیں ہوتا تھا صرف اپنے نذرانوں کا حساب دیکھتا تھا مگر ان چند سادہ سے جلوں نے شاید میرے بھی اندر سے اٹھل پھل کر دیا تھا۔

"اب ہمارے پاس کس لیے آئی ہے؟ بالآخر اس نے پوچھا صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے لیے کدہ بدبو اور کراہی پر

برقرار رکھنے میں خاصی دقت پیش آ رہی ہے۔
"دوبنے کو تنکے کا ساہرا ہوتا ہے شاہ جی! وہ سراسر اٹاک

ای مضحل سے انداز میں سکرانی۔ اس کا یہ اٹھلاؤ دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوا تھا۔ میں بھی تنکے کا ساہرا لینے آئی ہوں میں نے

سوچا شاید آپ کے پاس دلوں کو دم کرنے کا کوئی فن ہو جس کے اثر سے میرا باپ پھر مجھے سے سیاسی طور پر یاد کرنے لگے۔
"تجھے فی الحال اس فن کو بڑی ضرورت ہے۔ میں نے

مٹھل شاہ کی آواز سنی اور میرے سوس کے سین یا شاید چار ٹوٹ تاجاں کے پروں کے قریب آگئے۔ یہ لے جا کر اپنے باپ

کی بیٹھلی پر رکھ۔ اس کا دل پھر سے مہم ہو جائے گا۔
تاجاں نے جرح سے فقروں سے ادھر دیکھا۔ اس کے

سوکھے سر کے سے جونٹ لڑا گئے۔ آپ مجھے نہیں شاہ جی! ہم غریبوں کا ہر مسئلہ ہی پیسے نہیں بچھتا۔ بابا تو میرے ہاتھ سے

روٹی بھی نہیں لیتا رقم لینے کے گاؤں اور پھر میں اسے کیا بڑھان کی کر کہاں سے لاتی ہوں؟ آپ غلط سمجھتے ہیں شاہ جی! میں آپ کے

پاس اس قسم کی مدد لینے نہیں۔ میں دل کی تسلی کے لیے آئی تھی تو مزمل جاتا تو دل کو ٹھکانا ہوتا جی! وہ گویا ہاتھ ہر کہ

کہ ہے جھکائے داپس کے لیے مٹھل شاہ کی آواز آئی۔
"مٹھل ہے... ٹھیک ہے۔ جانشی ہمارے کو مزمل بھی بچی جا۔

میں سوچوں گا کہ میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"بہت بہتر۔ وہ ابھی سے بولی اور نوں پر نذر ڈالے

بغیر رخصت ہو گئی۔ میں دم بخود بیٹھا تھا۔ مجھے بہت تاخیر سے

معلوم ہوا تھا کہ میں نے اسے تاجاں کو قہقہے سے لکھ کر چاک

بیالیں کی طرف بجاتے دیکھا تھا ان دونوں درختیت وہ کسی سے

نفسے جا رہی ہوتی تھی۔ مجھے ان دونوں کے نہیں تھی۔ وہ نہ اس کی

انگھوں میں جھللاتے ستارے دیکھ کر کہی جاتا کہ ان دونوں وہ

زمین پر نہیں عشق کے آسمان پر تھی۔

وہ جا چکی تو میں نے اپنی کہیں گاہ کا پردہ اٹھا کر گردن

نے بارعب آواز میں پوچھا۔

”ہاں! لڑکی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”ہیں خوش کرو گی تو من کر مراد مل جائے گی! وہاں تک
مٹھل شاہ نے کہا۔ میں نے اسے اس قدر محبت سے اور
غیر محتاط انداز میں حرف مٹھا زبان پر لاتے پہلے کبھی نہیں
سنا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی کو دیکھ کر وہ آپسے میں
نہیں رہا تھا۔

”جی... پتہ لڑکی نے حیران حیران سی آنکھوں سے اتر چکا۔
”یا قوت جتن! مٹھل شاہ نے مجھے پکارا تو اسے بتا دیا کہ میں
خوش کرنے والے کو کیا ملتا ہے۔“

”من کی مراد تو میں نے خاص انداز میں نہایت بھاری
آواز میں کہا۔ یہ الفاظ ایک طویل مثنوی کے زیر اثر خود بخود ہی
میرے منہ سے نکل گئے تھے۔ ورنہ میں کتنا کچھ ادا چاہتا تھا۔

تب مٹھل شاہ تخت سے کود پڑا۔ اب میں ان دلوں کو
دیکھ سکتا تھا۔ مٹھل نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے
ہوئے کہا ”اس لڑکے سے تمہارے تعلقات رہے ہیں نا؟“
لڑکی نے آنکھیں چڑائیں اور سر جھکا کر چار دو پتھر لنگی
پر بیٹھنے اور کھڑے ہوئے گویا بادل ناخداستہ ثبات میں سر ہلایا
اور حرارت دھبی آواز میں بولی ”اسی لیے تو میں زیادہ پریشان
ہوں۔ ورنہ شاید صبر بھی کر لیتی!“

”تب پھر ہمیں خوش کرنے میں کیا حاجت ہے؟ مٹھل شاہ
نے اطمینان سے کہا اور اس کی کلاں کی پکر پکر سے مٹھل غواہ
کے دروازے کی طرف لے چلا۔ لڑکی نے مٹھل چاروں طرف
دیکھا۔ گویا کوئی راہ فرار تلاش کر رہی تھی۔ اس نے غائبانہ
کہے لیے منہ بھی کھولا لیکن تذبذب میں رہ گئی اور جب تک وہ
کسی فیصلے پر پہنچتی تب تک مٹھل شاہ اسے لے کر متقل کرے
میں چاچکا تھا اور دروازہ بند ہو چکا تھا۔

میرادل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور یہ تیزی
جذبات کے باعث نہیں، اتناوش کے باعث تھی۔ مصیبت بھی
کوڑی کی موجودگی میں میں تخت کے نیچے سے نکل نہیں سکتا تھا
اور اب لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

خاصی دیر بعد متقل کرے کا دروازہ کھلا اور لڑکی اسی کمرے
میں آگئی۔ مٹھل شاہ باہر آنا دکھائی نہیں دیا۔ لڑکی کے بال پریشان
تھے اور درشت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ کمرے کے وسط میں
پتھر کا اس نے اپنے آپ کو اچھی طرح چاروں طرف چپا کر مارن
آنکھیں کھلی رہنے دیں۔ پھر اس نے زخمی شہنشاہ کی کسی نظروں
سے متقل کرے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا اٹھتے تیر

نکال کر اوپر دیکھتے ہوئے کہا ”میں اس لڑکی کو جانتا ہوں
مٹھل شاہ! میں آج رات جا کر اس کے باپ سے بات کروں
گا اور اگر وہ سیدھا نہ ہوا تو دو چار ہاتھ بھی بڑھ دوں گا۔“
”بھرباتی ہونے کی ضرورت نہیں! مٹھل شاہ مکرایا یہ
کوئی زیادہ اہم معاملہ نہیں۔ چند دن میں اس کا باپ تار مل ہو
جائے گا۔ اولاد چھوٹی بڑی ہر طرح کی خطائیں کرتی ہے اور ان
باپ بالا خراشیں معاف کر دیتے ہیں۔ بڑی خطاؤں کو بھولنے
میں ذرا زیادہ دن لگتے ہیں اور اب جلدی سے سر اندر کر لو۔
انکا ضرورت مند آہو گا! میں نے سر اندر کر لیا اور ایک بار
پھر بطور حق اپنے فرائض انجام دینے لگا۔

اسی قسم کے ٹیپ وڈرائز کے ساتھ خامی بخش و عشرت
اور غیر وحاشیت سے دن گزر رہے تھے۔ سماجی دالے ہاتھ کے
تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد کا ذکر ہے، ایک روز ایک لڑکی کمرے خاص میں
آئی۔ میں بائیس سے زیادہ عمر نہیں ہو گی اس کی۔ جلیے لباس
اور رکھ رکھاؤ سے کسی اچھے گھر کی لگی تھی۔ چہرے پر بھی مسرورہ حالی
کچھ تک تھی۔ بڑی سی ریشمی چادر پہنے ہوئے تھی۔ صورت سے
بھونچا چمکا تھا۔

اس قسم کی کھنکھناتی شخصیات مٹھل شاہ کے ذہن سے پر
کبھی کبھار ہی آتی تھیں۔ میں چپچیپ سے اس کا سر تباہا ترہ اپنے
مٹھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اوپر تخت پر مٹھل شاہ بھی مٹھل کر پڑ گیا
تھا۔ لڑکی کچھ متحوش اور پریشان نظر آ رہی تھی۔

مٹھل شاہ کے سنانوں کے جواب میں لڑکی نے جو ”اندر لو“
دیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ایک غریب اور بے سارا لڑکی ہے
پھر رشتے داروں نے اس کی پرورش کی ہے۔ اسے ایک لڑکے
سے جفت ہے لیکن جن رشتے داروں نے اسے پالا ہے۔ وہ اس
کی شادی کسی حال میں بھی اس لڑکے سے کرتے پر تیار نہیں ہیں
بلکہ انھوں نے لڑکے کو ریا دیا دھکا دیا بھی ہے۔ لڑکا دروازوں
قسم کا ہی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے مروج نکال کر کسی کو بتائے
بغیر یہاں آئی ہے اور کسی ایسے قویز گنہگار کے طلبگار ہے جو
اس کے رشتے داروں کے خلاف بدل دے۔

باقی تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کی یہ بات میرے دل
کو نہیں لگی تھی کہ وہ ایک غریب اور بے سارا لڑکی ہے۔ پہلے
وہ اپنی غربت اور ناداری پر زبردستی رہی تھی۔ بعد میں
رشتے داروں کا رونا روئے لگی تھی۔ مجھے امید تھی کہ مٹھل شاہ نے بھی
اس بات کو محسوس کر لیا ہو گا لیکن وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مزہ
کھانے والا آدمی نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔
”اپنے محبوب کی خاطر تم ہر قربانی دینے کو تیار ہو؟“ اس

بھی یہ بات اس کے چہرے سے ظاہر نہیں تھی۔

”زبان سنہال کربات کر پو لیے ! مٹھل شاہ بھی دہڑا۔
”تجھے ہمارے مرتبے کا علم نہیں؟“

”تجھے تیرے مرتبے پر تو میں ابھی پہچانا ہوں“ تھانیدار

نے کہا۔

نیرا مکالمہ ادھورا رہ گیا تھا اور میں مانیک تھانے کی بخود

بیٹھا تھا۔ مٹھل شاہ کا مستند پولیس کو دیکھ کر اچھے قدموں کرے

سے کسک چکا تھا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ مٹھل شاہ کے ساتھ

ساتھ میں بھی بے نقاب ہو چکا ہوں۔ تھانیدار نے جھک کر

بھاری سیاہ کپڑا الٹ دیا اور بائیں ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ کر

مجھے باہر گھسیٹ لیا۔

اس نے میرے جسم کے ایک ایسے حصے پر ٹھکڑا دیا

کیا۔ جہاں ٹھکڑا کھانا شرافتھانہ نہیں کرتے۔ اسی لمحے مٹھل شاہ

کو جانے کیا سوچی۔ اس نے بڑھ کر تھانیدار کی ٹھوڑی پر ایک

گھونسا مسد کر دیا۔ تھانیدار دھڑک دیا اور مٹھل شاہ کے گھونے

نے گویا اس کا صبر و ضبط ختم کر دیا۔ اس نے اٹھنا دھند دو

فاشر کیے۔ فائرز کی گولیوں سے دو دو بار لڑکر رہ گئے۔

میں نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید میرا انتقالی

پر حال عمل میں آچکا ہے۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ تھانیدار کے

ریوالور کا رخ تو میری طرف تھا، یہی نہیں۔ میں نے اپنے ہسم پر

ہاتھ پیر کر اپنی سلامتی کا یقین کیا اور مٹھل شاہ کے بعد آنکھیں

کھول کر مٹھل شاہ کی طرف دیکھا۔

وہ بھی خیر و عافیت ہی سے تھا۔ البتہ کافی خوفزدہ نظر

آ رہا تھا۔ شاید کوئی گولی اسے چھوتے ہوئے گزر گئی تھی۔ تھانیدار

اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ سے خون کی پتلی سی لکیر خورجی نکلی

اگلی تھی جبہ صاف کرتے ہوئے وہ غصہ ناک لہجے میں بولا۔

”یہ گھونسا تمہیں بہت منگنا پڑے گا۔“

میرے خیال میں تو مٹھل شاہ کو وہ گھونسا چلنے پہلے

ہی بہت منگنا پڑ چکا ہوتا۔ بشرطیکہ تھانیدار کا نشانہ ذرا اچھا

ہوتا۔ اس کے ریوالور کی حالت بتاتی تھی کہ برس بار برس سے

اس نے گولی چلانے کی رحمت نہیں کی۔

تھانیدار نے ایک سیاہی کو اشارہ کیا اور اس نے آگے

بڑھ کر مٹھل شاہ کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ میں اس دوران غیر

ارادی طور پر جو ہالوں کی طرح دھانے کی طرف کھینکے کی

کوشش کر رہا تھا لیکن تھانیدار میری طرف سے غافل نہیں تھا۔

اس نے ایک بار پھر نہایت غیر شریفانہ انداز میں میرے ہم کے

منوہر علاقے پر بڑھ کر رسید کی۔

اس بار مجھے بھی شدید غصہ آیا۔ دل تو میری چاہا کہ اٹھ کر

چلتی ہوئی باہر جانے کا دروازہ کھول کر غائب ہو گئی۔

اس کے غائب ہوتے ہی میں تخت کے نیچے سے نکلے

آیا اور میں نے بڑھ کر دروازے کی کڑی لگا دی تاکہ کوئی

اور سائل اندر نہ آئے۔ اس دوران مٹھل شاہ خواب گاہ سے

باہر آچکا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور ناتحانہ مسکراہٹ تھی۔

میں نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا ”تم نے اچھا

نہیں کیا مٹھل شاہ! اتنی جلد بازی اور تقریباً زبردستی ابھی نہیں

ہوتی۔ جانے کیوں میرا دل ڈوب رہا ہے۔“

”ابھی کچھ تمہارے دل نے تیرا نہیں سیکھا۔۔۔؟“

ڈوبتا ہی رہتا ہے۔ وہ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مسکرایا

”گہراؤ مت۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں سے جانے کے بعد عام طور

پر کوئی زبان نہیں کھولتی اور اگر کھولے بھی تو تمہیں شاید

اندازہ نہیں کہ ہمارے پاس ہر طرح کا بندوبست ہے۔ تم

آرام سے اپنی جگہ پر بیٹھو۔ میں نے ہدایت کر رکھی ہے کہ تم

کسی بھی حال میں اپنی جگہ مت چھوڑا کرو۔ تم کسی روز یہ سارا

ڈرامہ ہی فلاپ نہ کر دینا۔“

اس کا اطمینان دیکھ کر میں بھی مطمئن ہو گیا اور اپنی جگہ

پر جا بیٹھا۔ مٹھل شاہ نے کڑی کھول دی اور اپنے تخت پر

بیٹھ کر کھٹکی کا مین دبا کر عبدالستار کو سگسل دیا کہ وہ اگلے سائل

کو اندر بھیج دے۔

میں اور مٹھل شاہ مل جل کر ضرورت مند کی دل جوئی

میں لگ گئے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا تو میرے دل سے اندیشوں کے

سلیبے چھٹنے لگے اور دو گھنٹے بعد میں اس واقعے کو تقریباً بھول

چکا تھا اور غالباً مٹھل شاہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔

اس واقعہ کے بعد ایک مستند کو اپنی خاص جانی آواز میں

کچھ جرات سے رشتہ تھا کہ اچانک دروازہ اس طرح کھلا

جیسے کسی نے پوری قوت سے اس پر لٹا کر رسید کی ہو۔ ایک

بادری پولیس والا اندر آ گیا۔ میں اسے پہچانا تھا۔ وہ علانیہ

کا تھانیدار تھا لیکن یہ وہ تھانیدار نہیں تھا جس نے میرے

آج کی کے قتل کی بے مثل تفتیش کے فرائض انجام دیے تھے۔

یہ نوجوان تھا اور خاصی بارجم شخصیت کا مالک تھا اور اس سے

بھگنیزادہ بارجم وہ بھاری ریوالور تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے

چہرے میں کانٹیل بھی تھے۔ انھوں نے بھی بند قفس اٹھائی ہوئی تھیں۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھالنے لگا۔ تھانیدار

میں میرے سامنے آڑا اور اوپر مٹھل شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے

گرماء نیچے آنکڑ ڈالیے! میں تیری پیری تیری نکالتا ہوں لا

مٹھل شاہ تخت سے کود پڑا۔ وہ اگر کھرا چکا تھا۔ تب

میلے کا اشارہ کیا تو حریف گر کر ارشاد مؤدبانہ لیجے میں تھا نیدار سے مخاطب ہوا "ہیں کس جرم میں پکڑا جا رہا ہے باقی باہم ہم تو یہاں تویر لینے آئے ہوئے تھے"

تھا نیدار نے پہلے تو اسے ایک نہایت نستعلیق قسم کی مگالی دی پھر اس کے سینے پر بیدار رہ کر کہتے ہوئے کہا "اب تم تھانے جل کر جھپٹے تویر لینا۔ میں تمہیں ایسا تویر دوں گا کہ ساری نظر تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی"

ارشاد کے چمڑے چمکے اور غٹوس سینے پر بیدار رہ کر کہا "گویا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ پلیس جھپٹا لے لیو تھا نیدار! آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لولا "نیک بیک کہ رہا ہوں ہی۔ ہم لوگ تو یہی وجہ سے تویر لینے آئے تھے... یہ کوئی جرم تو نہیں ہے نا ہی؟ تھانے جاتے وقت انسان کو اس کے جرم کا تو پتا ہونا چاہیے نا ہی... کیا میں جھوٹ کہ رہا ہوں؟ وہ گویا ایک ایک لفظ پر زور دے رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے..." تو جوان تھا نیدار اشارات میں سر ہلاتے ہوئے لولا "کہ تم بدعاشوں کا ڈالا بڑا منظر افسوس ہے تمہیں قانونی پشت پناہی کا زخم بھی ہے اور بدعاشی کا کھر بھی۔ لیکن میں تمہاری ساری اکثر فوں نکال دوں گا۔ پھر اس نے بید سے ارشاد کی بندوق کو چھوڑتے ہوئے کہا "اس بندوق کا لائنس ہے تمہارے پاس؟"

"بندوق...؟" ارشاد نے نہایت جرت سے اپنے کندھے سے منگی ہوئی بندوق کی طرف دیکھا گویا اب تک اس کی موجودگی سے لاعلم رہا ہو "یہ تو میری نہیں ہے... معلوم نہیں کس نے میرے کندھے پر لٹکا دی ہے؟ اس نے نہایت معصومیت سے کہا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ تھا نیدار گرمی کھا کر وہیں اس کی کھڑکی نہ کھول دے مگر خلاف توقع تھا نیدار اسے گرمی سمجھ کر گھوڑے لگا جیسے نظروں ہی نظروں میں توں رہا ہو۔ بالآخر وہ واپس آکر لولا "تم چلو تو کسی کا کا! میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ کہنے پر انٹیلیجنس لٹکا کر دو وہ پتہ پتا کیسے بنتے ہیں؟"

"اجھا نا ہی باپ" ارشاد نے سادہ مندی سے چمک کر کہا "جیسے تمہاری مرضی"

ہم حریف سے باہر آئے تو دو تانگے تیار کھڑے تھے۔ تھا نیدار نے ہمیں ایک تانگے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مشعل شاہ نے دھیمی آواز میں کہا "تھا نیدار صاحب! ادھر میری جیب کھڑی ہے۔ میں اس میں لے چلو۔ باقی لوگ تانگے میں آجائیں گے"

بدبخت کو زمین پر دسے ماروں مگر اسی اندیشے سے باز رہا کہ اس بار بھی اگر وہ اپنا آنکھ پر قدیم قسم کا لوبہ استعمال کر بیٹھا اور گولی نشانے پر لگ گئی تو یہ نتیجہ بن کھلے ہی مڑ جاتا تھا۔ میرا ذہن اس حقیقت کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ بیٹھے جھٹلے لیوں اچانک ہمارا تختہ بھی الٹ سکتا ہے۔ یقین مجھے مکمل طور پر اس وقت آیا جب میرے ہاتھوں میں بھی چھوڑا ہوا ڈال دی گئیں۔ ٹھوس اور سرد آہنی کڑوں کے لمس نے ایک لمحہ ہی میری بے یقینی رفع کر دی اور میں ان گنت اندیشوں کے احساس سے نکل ہو کر رہ گیا۔

تھا نیدار نے نہایت حقارت سے پہلے مجھے اور پھر مشعل شاہ کو دروازے کی طرف دھکیلا۔ ہم باہر آئے تو اندازہ ہوا کہ ہمارا تختہ خانے خانے منظم انداز میں الٹا گیا تھا۔ وہ لڑاکے اند باؤی لگاؤ قسم کے گڑگے جن کی بندوقیں اندسہ تول ہر وقت لوڈ رہتے تھے، چند سپاہیوں کے گھیرے میں بے بس سے بیٹھے تھے۔

سپاہیوں کی رنگ آلودی بندوقیں تو ان کے لیے شاید اتنی اہمیت نہیں رکھتی تھیں لیکن وروی کی اہمیت بہر حال مسلم تھی۔ بے بسی سے زیادہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آ رہے تھے۔ جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ کوئی حجابی کا دھانی کریں یا نہیں۔ انھوں نے سوائے نظر دوسرے مشعل شاہ کی طرف دیکھا۔

مشعل شاہ نے غالباً آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں تسلیم خم کیے رکھنے کا حکم دیا اور وہ انڈوں پر بیٹھی ہوئی مضبوطی کی طرح جسے جو حرکت ہی رہے۔ مشعل شاہ کا باقی آکشاف مثلاً منشی عبدالستار منشی شتار احمد رشید اور چہا برکت وغیرہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

سپاہیوں نے گڑگوں کو بھی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور وہ اس جہاز پر چاڑھانی سے اترتے جن پر قبضے کی کڑی نچاڑتی گوبندو کی کھیل سکتی تھیں ان میں سے صرف ایک کے پاس اس وقت بندوق نظر آ رہی تھی۔ باقی گڑگوں کے ہتھیار غالباً چاڑھانی کے نیچے کاٹ کر باڑ میں دبے ہوئے تھے۔ یہ لوگ جب گپ شپ کرنے اور حقہ پینے اس چاڑھانی پر بیٹھے تھے تو ہتھیار نیچے ہی رکھ دیتے تھے۔ جب کہ پاس بندوق موجود تھی اس کا نام ارشاد تھا اور وہ ایک طرح سے جیف گڑگہ تھا۔ مشعل شاہ کے خصوصی باؤی لگاؤ کے فرانٹس انجلم دیتا تھا۔

ہم سب ایک جگہ کھڑے ہوئے تو نوبیا ایک چھوٹا سا ملبوس تیار ہو گیا۔ تھا نیدار نے آج شاید ہمارا ملبوس ہی نکالنے کا تیرہ کیا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں حریف کے صدر دروازے کی طرف

حرف اشارا کرتے ہوئے کہا میری ساری توجہ تو گرو کی طرف تھی... پھر وہ گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا غیر... کوئی بات نہیں۔ گرو ہمارے قبضے میں ہے تو چلیے خود بخود ہی آجائیں گے۔ پھر اس نے مجھے اور منگل شاہ کو شکلہ بار نظروں سے گھورا اور گوہان کو تاننا چلانے کا حکم دیا چاروں سپاہی دوسرے تانگے میں بیٹھ گئے تھے۔

بڑا حیرت ناک منظر تھا۔ ہر جہر جہر سے بھی ہم گزرنے راستے کے دونوں طرف لوگوں کا جھوم تھا۔ میں اور منگل شاہ تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ کر دیاں پسے سر جھکا کر بیٹھے تھے۔ سر اٹھا کر کسی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا کیوں مجھے احساس تھا کہ دو روپہ کھڑے ہوئے لوگوں میں میرے تمام شہنشاہ اور بچاؤ و وزیر و سپاہی شامل تھے۔ قبضے میں جیسے آنا خانانہ باری گرفتاری کی خبر پھیل چکی تھی اور سب ہی ہماری رسوائی کے گواہ بننے کے لیے آگئے تھے۔ غیبت یہ تھا کہ سب خیم خود دست کھڑے تھے۔ ورنہ کیا بعید تھا کہ جو لوگ کل تک فرطِ احترام سے شاہ کے سامنے آگئے تھے انھیں اٹھائے تھے۔ آج ہم پر سنگاری درج کر دیتے۔

تھا منگل شاہ کے دیر سے دیوانہ خالصہ پر نہیں تھا لیکن آج جیسے راستہ سیلوں لبا ہو گیا تھا خدا خدا کہ کے زرد رنگ میں پوٹنی ہوئی تھا سنے کی عمارت دکھائی دی۔ کچھ بات یہ ہے کہ تھا سنے میں داخل ہوتے وقت ہم نے منگے کی منی لی تھی۔ کم از کم لوگوں کی گھبرائی ہوئی آنکھوں سے تو نجات ملی تھی۔ میں نے منگل شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بالکل بیوقوف اور پُر اعتماد نظر آ رہا تھا بلکہ شاید کسی قدر غصے میں بھی تھا اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کھنکھاتا تھا۔

تھا نیدار نے ہمیں اندر سے جا کر اپنی میز کے قریب بٹری ہوئی پڑ پڑ بٹھا دیا اور خود بڑی محنت سے اپنی ٹوکی پر جا بیٹھا اور دونوں کنہیاں میز پر لگا کر بند کر گاتے ہوئے یوں پڑ خال نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا گویا کوئی میزبان فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ نہانوں سے کسی موضوع پر گفتگو شروع کی جائے۔ اب وہ اس طرح جذباتیت میں گرفتار نظر نہیں آ رہا تھا جس طرح ہمیں گرفتار کرتے وقت تھا۔ تمام سپاہی اس کمرے سے باہر ہی رکھا گئے تھے۔

بالآخر منگل شاہ نے ہی سکوت توڑا و کیا سوچ رہے ہو ملک صاحب؟ اس نے غالباً تھا نیدار کی میز پر ٹوکی ہوئی تھی۔ پھر اس کا نام پڑھ لیا تھا۔ پورا نام ملک محمد حیات تھا۔ میں سوچ رہا ہوں پہلے تم دونوں کو اٹھانے کا چتر گواٹے جائیں یا پہلے ایف آئی آر کاٹی جائے اور تھا نیدار نے

دیکھا رہی تو میں نے قبضے والوں کو دیکر کرنا ہے... تھا نیدار بولا اس لیے تمہیں تانگے میں چلن پڑے گا باقی لوگوں کی توجہ کوئی پورا نہیں۔ وہ تو بے شک برقیے میں کرتھانے آجائیں۔

تھا نیدار منگل شاہ سے کچھ زیادہ ہی خار کھائے ہوئے تھا۔ اس نے ہمیں اگلے تانگے کی اگلی نشست پر بٹھایا اور خود ایک سپاہی کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھنے لگا۔ دفعتاً میں نے چاروں لوگوں کو نہایت تیزی سے حرکت میں آتے دیکھا۔ حیرت کے اعتبار سے وہ ابھی تھے گھر چھنے کی کیمپری سے غفلت میں دوڑ پڑے تھے اور وہ سپاہی جراثیم کیسے میں لیے ہوئے تھے۔ زمین پر گلا بازبان کھاتے نظر آ رہے تھے۔ جب تک تھا نیدار کو صورت حال کا اندازہ ہوا اور سپاہی سیدھے کھڑے ہونے میں کامیاب ہوئے۔ تب تک چاروں گز گئے غائب ہو چکے تھے کوئی فصلوں میں گھس کر غائب ہو گیا تھا کوئی مزارکوں کے مکانات کے عقب میں غائب ہو گیا تھا اور کوئی چھلاوے کی طرح کسی سمت میں دوڑا تھا اور پھر اس راستے پر صرف خاک ہی آؤتی نظر آتی تھی۔ وہ خود نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں ان چاروں کو نہایت سست انسان سمجھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ انھیں دن رات پڑے ایندھن نہ دیا رکھانے بیٹھے کے سوا کوئی کام نہیں آتا اور ضرورت پڑنے پر وہ آسانی سے بل بھی نہیں سکتے گھر اس وقت تو انھوں نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ سپاہیوں نے مشکل ای گری ہوئی بندھیں اٹھائیں پھر ان کے ٹبر دیکھ کر ایک دوسرے پر چپٹے گئے۔ امام دین یو تیری بندوئی ہے؟

”اوسے... امام دین کی بندوئی تو میرے پاس ہے... دھو کر لے لے گی ہے... اور میری بندوئی کس کے پاس ہے؟ دوسرے سپاہی کی آواز آئی۔

وہ شاہ کا کافی دیر تک بندوئی کے تبادلے کے سلسلے میں لگن دیکھا کرتے رہے۔ تھا نیدار نے ڈپٹ کرافٹیں چپ کر لیا اور انکی سے پوچھا کہ تم نے ان لوگوں پر گولی کیوں نہیں چلائی؟“ بندوئی ہمارے ہاتھوں میں رہی کہاں تھیں سڑا ایک ٹاپی نے موبائیل فون میں کما دیا اور پھر آپ نے فائر کا آرڈر بھی نہیں دیا تھا؟ پھر اس نے ایسی نظروں سے تھا نیدار کے دلوں اور انھوں کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے کہ رہا ہو آپ کے پاس بھی تو رہا اور موجود تھا۔ آپ نے کیوں گولی نہیں چلائی؟“ تھا نیدار نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر منگل شاہ کی

نہایت سنجیدگی اور رسائیت سے جواب دیا۔

”وکیونکہ جو محرمات و مشعل شاہ نے نہایت خیریں بچے میں کہا گویا تھانیدار نے چتروں سے نہیں قورم اور شیر مال سے ہماری خاطر طور کوش کے ارادے کا اظہار کیا ہو۔“ میں کوئی لاوارث اور مفلس مزارع تو ہوں نہیں اور نہ ہی میں بس اینڈ پر چھپیں کاٹنے والا کوئی معمولی جیب کڑا ہوں جس پر تم اپنا چھتر آزمائی کا شوق پورا کرو۔ میرے جیسے آدمیوں کا معاملہ بہت آگے تک جاتا ہے جس میں تم جیسے افراد کو کوئی عدالتوں اور کئی وکیلوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے جہاں چھتروں کا سلب بھی دہرا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ یہ خیال تو دل سے نکال ہی دو۔ یہ مشورہ دینے کا ایک وجہ اور بھی ہے جو جلد ہی تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ باقی رہا ایف آئی آر کا مسئلہ تو مجھے بتا دو کہ تم چارچ کیا لنگنا چاہتے ہو؟“

”وہو کے بازی چھٹا ساری سرکاری کارندے برقا تلانہ علم سرکاری فرائض کی بجائے اور میں رکاوٹ پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ... آئندہ دیکھا تو سوچ چکی ہیں میں نے تمہارے لیے وہ تھانیدار نے بتایا۔“

مشعل شاہ نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ تھانیدار فوراً بولا۔ ”تجربہ شایہ غرضی ہو رہی ہے کہ میں نے زنا بالجبر کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ میں زنا تو کسی گیس چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اس الزام کو عدالت میں کھینچنا نہیں چاہتا اور نہ ہی اس کی تصویریں اخباروں میں چھپتے دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ وہ میرے واقف کا دل کی لڑکی ہے۔ بہر حال اس کے بغیر بھی میں تجھیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ تم اس دفعہ سے تو بہر کو لوگے۔“

”تو بہر تو میں دیکھ ہی کر نے کو تیار ہوں بھائی محرمات“ مشعل شاہ نے بڑے غلو سے کہا۔ ”بلکہ یوں چھو کہ تو بہر کو ہی چکا ہوں۔ اب اس علاقے میں وہ خدا چلنے کا امکان ہی کیا رہ گیا ہے۔ منہ دیکھنے کے قائل تو چھوڑا نہیں تم نے۔ اس لیے اب یہ نوع چھو کروں والی جذباتی گفتگو تو چھوڑو۔ تمہیں کوئی بچی طرح معلوم ہے کہ جو جراثیم تم نکلا رہے ہو انہیں اگر تم ثابت کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تب بھی مجھے چند مہینے سے زیادہ سزا نہیں ہوگی اور اس سے کہیں زیادہ لمبے عرصے تک عدالتوں میں تم بھی گھسٹو گے اور ہم میں۔ اس لیے عقل سے کام لو اور لینے دینے کی بات کرو۔“

”لینے دینے کا معاملہ کر رہا ہے وہ تھانیدار ملائٹ سے بولا۔“ سارے قہقہے کو تمہاری گرفتاری کا علم ہے۔ وہ جو ایک ندانی فوجداری قسم کا اخباری نامزدہ ہے جس نے سارے اخباروں

کی نائندگی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے... وہ بھی دوڑا آ رہا ہوگا میں کس کس کا نمہ بند کروں گا؟“ تھانیدار کا نہ مکمل طور پر مصالحت نہ ہو چکا تھا اور وہ اب بڑے صبر و سکون سے مذاکرات پر اتر آیا تھا۔ مجھے اس کے طرز عمل کی یہ تبدیلی بہت ہی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ تو ذرا ہی دیر میں جھاک کی طرح بیٹھ گیا تھا حالانکہ اب ہم اس کی چار دیواری میں تھے اور کافی حد تک اسی کے رحم و کرم پر تھے جبکہ باہر اس نے جس طرح آنکھیں دکھائی تھیں مجھے اندیشہ تھا کہ وہ تمہارے پہنچتے ہی ہماری کال آؤ چھتر شروع کر دے گا۔ مگر یہاں تو انشا ہی حساب تھا۔

”میں تمہیں اتنا ہی دے دوں گا کہ سب کام سمجھ ہو جائے گا“ مشعل شاہ بولا۔ ”تمہارا نمہ بند ہو جائے تو باقی سب کے نمہ بھی بند ہو جائیں گے۔“

مذاکرات چلتے رہے۔ میرے منہ سے میں جو کچھ ہی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ وہ صبر دے دے کھل گئیں۔ مذاکرات بالآخر کامیاب سے اختتام پذیر ہوئے۔ پچاس ہزار پر سو رطلے پا گیا۔ تاہم تقابلاً نے دو شرطیں رکھیں۔ پہلی یہ کہ ایک رات ہمیں بہر حال حالات میں رہنا پڑے گا۔ علی العہد اس وجہ سے چھوڑ دے گا کہ ناکر تانہ پید ہو کہ ہم نہایت پر رما ہوئے ہیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ مشعل شاہ آئندہ اس علاقے میں صورت نہیں دکھائے گا۔ کم از کم اس وقت تک کہ میں گوشہ نشین رہے گا جب تک تھانیدار کا تانہ نہیں ہو جاتا۔ یہ شرط رکھنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔ مشعل شاہ کھنکھایا۔

”مجھے میں بولا میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہم مشعل دکھانے کے قابل ہی کب رہے ہیں؟ پھر اس نے تھانیدار کی اجازت سے ایک سپاہی کو ڈوبے پر بھجوا دیا کہ اس کو بھی پیغام دے آئے کہ مجھ سے پہلے مطلوبہ رقم تمہارے پہنچا دی جائے۔“

اس کے بعد تھانیدار نے ارادہ کر لیا کہ وہ حالات کے بدلنے اور سپاہی کمرے میں بھجوا دیا جہاں دو لڑکے چھٹے تھے اور شک و خیرہ بھی پڑا ہوا تھا۔ شاید وہاں کوئی پولیس والا ہی رہتا تھا۔

مشعل شاہ بہت اداس نظر آ رہا تھا۔ میں نے تنہا میسر آنے کے باوجود اس سے باتیں شروع نہیں کیں اور نہ کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے کیوں میں اس بڑی طرح تھا ہوا تھا جیسے سخت شفت کی ہو۔

میری سوتلے کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں کیونکہ جیسی رات ڈوگر ہی ہوتی میں ہمارے کمرے کے نیچے کے کھانکھوں کی کوچ سنائی دینے لگی۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ان چیخوں کو دہانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے خوفزدہ سے بیچے میں شلنگ سے پوچھا۔

”یہ نقیض ہو رہی ہے وٹھل شاہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ اگر ہمارے پاس پیسے کا ٹھکانہ ہوتا تو اس وقت ہم بھی اسی طرح زرقنیش ہوتے و پھر وہ بیزاری آمیز انداز میں کوٹ بدل کر بیٹے گیا۔ اس کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن میں ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکا۔

تھانیدار اپنے گھر چلا گیا تھا لیکن آدھی رات کے قریب وہ ہمارے کمرے میں آگیا۔ بڑا خوش نظر اور باقاعدہ موچیکوں کو بل دیتے ہوئے بولا ”تھانیدار آدھی رات کے آگیا ہے، اگر چاہو تو تم اسی وقت جا سکتے ہو۔“

ہم اس کے ساتھ پیچھے آئے۔ منشی عبدالستار ایک رات کیس گود میں رکھے تھانیدار کی بڑے قریبی بیٹھا وٹھل شاہ کو دیکھ کر وہ احترازا آواز کھڑا ہوا۔

”آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی سرکار؟“ اس نے موٹا ہاتھ لیے ہیں پوچھا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا ”ہیں ذرا وکیل صاحب کو اطلاع کرنے ضرور چلا گیا تھا۔ انھوں نے صبح صبح بے جا کی درخواست دائر کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں لیکن وہیں مجھے رقم کی بات پہنچا مٹا۔ اچھا ہی ہوا یہ سارا معاملہ خوش اسلوبی سے سنبھالا گیا۔ کام تو دوسری طرح بھی ہو جی جاتا لیکن ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آپ کو ذرا سی بھی تکلیف نہ ہو۔“

”بہر حال... جو ہوا سو ٹھیک ہوا وٹھل شاہ نے بیزاری آمیز لہجے میں کہا ”آپ رقم ملک صاحب کے حوالے کرنا تو کامیاب گھر پائیں۔ غیندے آ نکلیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔“

حکام محمد حیات صاحب نے نہایت شانہ و آبرو کے انداز میں رقم وصول کر کے فوراً ہی ایک سپاہی کے ہاتھ میں بھجوا دی اور ہم ان سے ہاتھ ملا کر یوں باہر آگئے تو چاند نہ تھا کسی کاندھاری مچا ہے پر غلدار آمد کے بعد رخصت ہو رہے ہوں۔ زرقنیش طنزوں کی دلی دلی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں اس وقت تک آسودگی کی سانس نہیں لے سکا جب تک ہم تھانے کی عمارت سے کافی دور نہیں نکل گئے۔ شاید نقیض کا دائرہ وسیع رکھنے کے لیے ہی تھانہ ایسی عمارت میں بنایا گیا تھا جس کے ارد گرد کافی فاصلے تک کوئی مکان وغیرہ نہیں تھا۔

”کام بڑا خراب ہو گیا جی“ راستے میں منشی عبدالستار نے بھرہ کیا۔ رات کے سناٹے میں کچے راستے پر ہم تینوں

بد روحوں کی طرح چلے جا رہے تھے۔

”کبھی کبھی انسان کی ذرا سی غلطی سے اس کی ساری باؤشاہت الٹ جاتی ہے وٹھل شاہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”خیر... تم یہ ذکر چھو دو... یہ بتاؤ کہ ہمارے پہلوان واپس آگئے یا نہیں؟“ پہلوانوں سے اس کی مراد اس کے گھر گئے تھے۔ ”جی ہاں۔ گھر بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں وٹھل عبدالستار نے بتایا۔ ارشاد دے تو ایک اور ہی کام کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ واپس آیا تو کتنے لگا میں تھانیدار کا کھردیکھ آیا ہوں۔

تھانے سے کچھ ہی دور سرکاری کوارٹر میں رہتا ہے جس کی چار دیواری سات فٹ چھ اینچ اونچی ہے اور اسے چھ پھلانگنے کی محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ تھانیدار کا چھ سالہ لڑکا باہر ہی کھیلتا رہتا ہے۔ اگر آج رات تک کوئی بات نہ ہو تو اس کے بچے کو اٹھا لاؤں گا۔ پھر اس سے پوچھیں گے کہ شادی کچھ دن ہے یا نہیں۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا کہ ابھی اس حد تک جانے کی ضرورت نہیں۔ کہیں بات زیادہ ہی نہ بگڑ جائے۔“

”اچھا کیا جو تم نے اسے منع کر دیا وٹھل شاہ بولا۔ میں خود بھی اس معاملے کو صلہ وصال سے نہانا چاہتا تھا بات تو پہلے ہی بہت بگڑی ہوئی تھی۔ وہ تو ہماری کوئی بیک کا گٹھی“ گھر پہنچتے ہی وٹھل شاہ اپنی خوابگاہ میں ایک آرام کری پر ڈھیر ہو گیا اور تھکے تھکے لہجے میں عبدالستار سے مخاطب ہوا۔ ”لوئیس اور گلاس منگو اوڈر سب ساتھیوں کو نکالو۔“

تھوڑی دیر میں ملازموں نے چپنے پلانے کے تمام لوازمات سجادیے اور کمرہ آدمیوں سے بھر گیا جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا ایک غیر رسمی سے اجلاس کا منظر تھا میں وٹھل شاہ کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ نہایت ہی خاموشی سے پینے کا شغل شروع ہو گیا اور کوئی ضروری فرض انجام دیا جا رہا ہو۔ ماحول پرسوگاری سی طاری تھی۔

بالآخر وٹھل شاہ نے سکوت توڑا اور غصے سے بوجھل لہجے میں سب کو مخاطب کیا ”دوستو! میں تم سب کا حکمران رہا ہوں کہ تم نے مختلف جینٹلمن میں میرے لیے ہمیشہ قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بے پناہ دکھ محسوس ہوا ہے کہ تم میں سے بیشتر ساتھیوں کی رفاقت اب مجھے حاصل نہیں رہے گی تم لوگوں کو یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہو گا کہ اب میں یہاں کم از کم چند سال کے لیے قومنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ چند سال بعد لوگ بہر حال سب کچھ بھول جائیں گے لیکن فی الحال افسانے گوئی کرتے رہیں گے۔ حالانکہ مجھ بات کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگی بہر حال اب کافی عرصے کے لیے

میں لوٹنے لگا۔ وہ کئی پیگسوں کی چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں خون آکر ہوا تھا۔ چہرہ پیٹے ہوئے تانبے سے شاداب آ رہا تھا۔

دفعۃً وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پیغہ نہ نہایت ہی خوفناک سی ساخت کا ایک بزرگ لایا اور ہوا میں لڑائی دے رہا تھا۔ اگر آپ کسی کے خوف سے علاقہ چھوڑ کر جا رہے ہیں تو مجھے حکم کریں۔ میں چند منٹ میں اس کا مراد کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ وہ تقاضا یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ حکم کریں تو اسے میں... اس نے خبر لڑاتے ہوئے دانت چیر کر کچھ کی آواز نکالی۔

”اس سے بات بنے گی نہیں زیادہ بگڑے گی ارشاد پیارے اور نہ میں تمہیں کہیں کہ یہ حکم دے چکا ہوں اور مصل شاہ مشفقانہ انداز میں سکرایا۔ اس کی غور آنکھوں میں بھی کی جھلک تھی۔ میں اپنی بساڑے کے مطالب کی بھی ملاحظہ سے فکر لینے کے لیے تیار ہوں لیکن قانون سے اتنی اعلیٰ نہ کر لینے کے میں حق میں نہیں۔ بس... میں نے جو فیصلہ کیا ہے میں اس پر کاربند رہوں گا۔“

میں گم قسم بیٹھا تھا اور سب سے کم لڑ رہا تھا میرا خیال ہے، میں مشکل شاہ سے بھی زیادہ ادا تھا۔ میں ایک ملک اس کی طرف دیکھنے جا رہا تھا۔ میری جھڑپیں نہیں آ رہی تھیں اس کا شمار اچھے لوگوں میں کروں یا نہ کروں میں۔ بڑا ہی عجیب کر دار تھا۔ اسی طرح وہ واقعہ بھی عجیب ہی تھا جس کی بدولت مجھے جھٹانے چاہا تھا۔ ہمارے یہ چوتھی سی دنیا تہ و بالا ہو گئی تھی۔ روزانہ ہر جگہ اس سے کہیں زیادہ سنگین واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔ گمان سے شاید یہ کسی کو اتنا نقصان پہنچا ہو جتنا ہمیں پہنچا تھا۔

خود شہل شاہ زندگی میں جانے کتنی مرتبہ اس جرم کا مرتکب ہوا تھا مگر اس کا بال بھی بریک نہ ہوا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید قدرت کو اسی طرح آخر کار ایک نہ ایک روز کسی بھی معمولی چیز سے کسی سیلاب کے آگے بند باندھنا ہوتا ہے۔ کسی عمل کو انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔

مجھے اس لڑکی پر بھی حیرت ہو رہی تھی جس کی وجہ سے دراصل ہماری بساط بیانیہ تھی۔ وہ خود شہل شاہ کے سامنے اقرار کر چکی تھی کہ وہ کوئی ایسی پاکیزہ وحشیہ بھی نہیں تھی اور خواہ محبوب کے قدموں میں ہی بھی لیکن ہر حال دوشیزگی کا پڑھاوا تو پڑھا چکی تھی اور شاید اس کی کوکھ میں گناہ کا پھل بھی پل رہا تھا ابھی وہ اتنی عواص باختر تھی۔

میرا یہاں نہ رہنا ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی میرا دل بہت عرصے سے اس دھندے سے اور اس علاقے سے کچھ اگڑا اگڑا سا ہے۔ چنانچہ میں ایک طویل آدمی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ میری زمینیں نہیں رہیں گی اور منشی عبدالستار بدستوران کاٹھا بھولے رکھے گا۔ مجھے فی الحال خود بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں جاؤں گا۔ بہر حال میں منشی عبدالستار سے رابطہ رکھوں گا اور رو بہ رابطہ رہوں گا۔ اسی سے جنگوں کا نہیں سن ہے کہ سکون قلب کی تلاش میں میں بہت ہی دوزخیں جاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں کسی لوٹ کر ہی نہ آؤں۔ سان حالات میں مجھے کچھ بات تم سب لوگوں کو قاری کرنا پڑے گا۔ بہر حال میں تم میں سے کسی کو بھی بے روزگار نہیں ہونے دوں گا۔ سب کو رخصت ہوتے وقت کم از کم چار ماہ کی تنخواہ ملے گی اور سب کو میں اپنے دوستوں اور شاگردوں کے نام رقعے دے کر جاؤں گا۔ یہ وہ دوست اور شاگرد ہیں جو میری بات کہیں ٹالیں گے نہیں اور میرے پیچھے ہونے آدمی کو کہیں نہ کہیں کام پر ضرور لگائیں گے۔ یہاں یہی بکری اور عیاشی تو شاید جم لوگوں کو میسر نہ آ سکے لیکن روٹی پانی تو چلتا رہے گا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ تو لوگوں کو کہیں دینے دوں۔ نہ میں کی آمدنی میں سے تو لوگوں کو تنخواہیں ملتی رہیں گی۔ تمہیں اقرار ہی ہو گا کہ میں مالی بوجھ کو بوجھ شمار نہیں کرتا۔ ہمیشہ کہا رہا ہے جس شاندار انداز میں دولت حاصل کی ہے اسی شاندار انداز میں خرچ بھی کی ہے لیکن میں نے ان خیال کے تحت اپنا یہ فیصلہ بدل دیا کہ میری سروس کے لیے تو لوگوں کو تنخواہ حاصل نہیں رہے گا اور نہ ہی یہاں کا ٹھکانہ درست ہے گا اس لیے میں تم لوگوں کو قاری کرنے کا ناگزیر فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ دوستو! میں اپنا ہوں یا تمہارے ہر حال میں تقاضا راضی رہا ہوں۔ مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو میں نے کسی کا دل دکھایا ہو تو مجھے صاف کر دینا۔“

اس نے شراب کا گلاس میرے ہاتھ میں رکھ کر سب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ آخر کی بجائے اس نے ایسے جھڑپائی انداز میں کہے تھے کہ میرا بھی دل بھر گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری کوئی بہت ہی عزیز بڑی چیز سے جدا ہونے لگی ہو۔ حالانکہ میرا اور اس کا ساتھ محض چند ماہ کا تھا۔

میں تو اپنے محسوسات کو دہاتے ہی بیٹھا تھا لیکن وہ آدمی تو دھڑا میں مار مار کر مرنے لگے۔ شراب کے گلاس انھوں نے اپنے سر پر الٹ لیے اور پھر سینہ کو کوئی کرنے لگے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز بے انتہال کر گیا ہو۔

مصل شاہ کا خاص اخص گرگ ارشاد اس کے قدموں

ہوئے تھے۔ جمہوری جو شہری۔

میں نے بھی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی معلوم نہیں مجھے اب یہاں رہنا بھی تھا یا نہیں اور معلوم نہیں ان کی سست رفتار کھوٹا ہوا بیسیری بات کو قبول بھی کرتی یا نہیں۔ میں نے ان میں سے کسی سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی اور شہنشاہت واپس چل دیا۔ دوبارہ ڈیرے کے قریب سے گزرتا ہوا میں اس پلایا تک جا پہنچا جس کے ایک سرے پر گویا میرا بچپن تھا اور دوسرے سرے پر جوانی۔ یہ پلایا ان دونوں کناروں کو ملائے ہوئے تھی۔

سورج زرد ہو چلا تھا اور کندی دھوپ میں نالے کا گدلا پانی بھی سیال ہونے کی طرح چمک رہا تھا اور میں اس آئینے میں گزر رہے ہوئے آئینہ کا دھندلا دھندلاکس دیکھ رہا تھا۔ وہ راجہ کے ساتھ شوٹنگز... وہ تاجاں کے ساتھ مکالمہ... وہ دھڑچاگ... وہ خوش فکری کے دن۔ اتنے تھوڑے سے عرصے میں جیسے سب کچھ خواب ہو کر رہ گیا تھا۔

راجہ کی شادی ہو گئی تھی اور وہ گویا اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ بیشعز خانوں میں اور خصوصاً دیہاتوں میں وہ تھوڑوں میں چونکہ خاندان کا ایک ہی گھر میں رہنا ناکام مسئلہ ہوتا ہے۔ خواہ حالات کیسے ہی نامناسب کیوں نہ ہوں اس لیے شادی کے بعد میرا بچپن کا یار بھی سی رعایت نہ رہا تھا اور اپنی نئی سی جان پر کھیل رہا تھا۔

میں اور وہ ہیں سے قونہ جاننے کے بہت میں جانا تھا اور کسے محترم ہیں۔ ہر حال جیسے جہاں بھی جانا تھا علم نے کے بعد ہی جانا تھا لیکن راجہ تو جیتے ہی ہی جو کم رسبہ ہچکچاتا صحبت یہ تھی کہ یہ شادی اس کی لڑکی پسند کی بھی نہیں تھی۔ مگر یہ بڑے چاؤ سے ہو پسند کر کے لائی تھی۔

ایک دو بار راجہ نے الگ ہونے کی بات کی تو میری پرہیز سے ہونے باپ نے دھکی دے دی کہ وہ غن کی نمایاں بہا دے گا اگر اس میں ناکام رہا تو نوکشی کرنے کا اور اگر اس میں بھی ناکام رہا تو راجہ کو عاق کر دے گا اور قیامت کے دن اس کا گریبان پرٹے گا۔ غلام اس کی گفتگو کا یہ تھا کہ اس کی زندگی میں راجہ الگ نہیں ہو سکتا۔

چند دن پہلے ہی راجہ مجھے سوچے کے چائے خانے میں ایک نیم تاریک سے گوشے میں بیٹھا ملا تھا۔ اس وقت چائے خانے میں ہم دونوں کے سوا کوئی گاؤں نہیں تھا۔ اس کے سامنے آئینہ لگا چائے کے برتن سجے ہوئے تھے۔

میں اس کے سامنے جا کر بیٹھا تو وہ اچھل پڑا جیسے اس

اس کے باوجود اس نے جا کر اپنے وارثوں کو ٹھٹھا لے کر سرائی بنا دی تھی اور وہ بھی بات چیت کے بجائے اپنے واقف کار تھا۔ نیکار تک چاہیے تھے لیکن بعد میں ساری لہرواں کے دوران وہ لڑک یا اس کے والی وارث کہیں نظر نہیں آئے تھے اگر تھا نیکار واقعی کارروائی کے بڑھانے کا ارادہ رکھتا تھا تو ان کی موجودگی کے بغیر تو نہیں بڑھا سکتا تھا۔ مجھے مشکل شاہ پر بھی حیرت تھی کہ اپنے خاں کو کہنے میں اس لڑکی کو دیکھ کر ایک لحظہ ہی کس طرح ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس لمحے مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ اس آدمی کے سال کا ایک چل یہ بھی ہے کہ لے دیتیں شادی کر لیں چاہیں۔ مجھے اس تنہا نیکار پر بھی حیرت تھی۔ شروع شروع میں وہ گویا بیل کا کالا بچن بنا ہوا تھا جس کا بھاپ کا والو کھل لیا تھا اور بھاپ کا ایک پھونکا ہوا ہواٹھان اس کے وجود سے بڑھ کر ہوا تھا لیکن میں اتنے میں قہقہے کا چکر لگا لگا اور دونوں کو ہماری روائی کا تماشا دکھانے کے بعد حیرت حیرت کی افلاکی روح کو پیسے قرار دیا تھا اور پھر لینے دینے کی بات شروع ہوتے ہی گویا اس کے بواؤں کی ساری بھاپ تم ہوئی تھی۔

دن چڑھے میں سرکار اٹھا اور ناشتے سے ناخن پھر مشکل شاہ کے کمرے میں پہنچا تو اسے بے حد مصروف پایا۔ وہ عداوت تمام معاملات نہایت تفصیل سے سمجھا رہا تھا کہ اسے کس طرح اہتمامات چلانے ہوں گے۔

یکہ دیر بعد میں بوم ہو کر کوٹوں کے چمکے نکل کر مشکل شاہ بازمنوں کی طرف آ گیا۔ ہزاروں کاموں میں مصروف تھے۔ سب لوگ مجھے مشکل شاہ کے خاص آدمیوں میں سے ایک سمجھتے تھے اور عموماً مجھے دیکھ کر مسکین سے انداز میں دست انداز لیتے تھے لیکن آج سب نے گویا منہ پھٹا ہوا تھا اور میری رفتار کی تو زسی نظروں سے دیکھ کر سر جھکا کر یوں پہلے سے بارہ جوش و خروش سے کام میں مصروف ہو گئے تھے جیسے

اول اور دوسری برکی بات کا غصہ نکال رہے ہوں۔ ہزاروں میں میں میں بھی شامل نہیں۔ وہ تو مجھے دیکھ کر

اس کے دوسرے شیش اور ہر کو اس حد تک بھانے کی کوشش کرنے لگا کہ مجھے اندیشہ ہو گیا کہ ان کی گرد میں نہ ٹوٹ جائیں۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو میری اور مشکل شاہ کی گرفتاری کی نظر کس حد تک معلوم تھا۔ اصل واقف حال نے انہیں دیکھا تھا یا نہیں۔ ہر حال ان کا غصہ ایک طرح سے مخمور ہونے لگا جس پر انہیں غصہ آتا تھا۔ اس کی زمینوں پر کام بھی جاری رکھے

مر کے قریب سے پرواز کرتی رہتی تھیں مگر وہ بیٹھا کر اڑام سے کھانا کھاتا رہتا تھا یا پھر میرے خیال میں راجہ کو ہانپنے ایک اور شاسا مردان علی کی طرح بن جانا چاہیے تھا جو ہری کے تیور بہت ہی پہلے خود آئینیں چڑھاتا تھا اور اس کی ابلی دھناتی کرتا تھا کہ اس میں اگلے مینے ٹک کی سے تھری کر کے کی سکت نہیں رہتی تھی اور گھر کے باقی افراد پر بھی ایسی دھنٹ کاری ہو جاتی تھی کہ وہ رھری جھڑپیں شروع کرنے کا خیال دماغ سے نکال دیتے تھے۔ آخر میں میں نے گویا غلامی کے طور پر کہا: "میاں راجہ! شیر بنو شیر!"

تب اس بے وقوف سے راجہ نے بڑے بڑے کی بات کی۔ کہنے لگا: "انسان بنیادی طور پر تقریباً وہی رہتا ہے جو قدرت نے اسے بنا دیا ہے۔ اگر اپنے آپ کو کوئی بھڑکوں اور نصیحتوں کے ورہیے بدن ممکن ہوتا تو ہر شخص ہی مثالی انسان نہ بن جاتا، اب مجھے ہی دیکھ لو، جب سے میں نے ڈبل کارنگی کی کتاب پڑھ لی ہے، میں ناچار ہوا ہوں، جین شروع کیجیے، پڑھی ہے تب سے میں اور بھی زیادہ پڑھنا دیکھتا ہوں، "اور اگر اسی طرح کوئی نہ کھڑو لیں، چپ چپ کر کھانا شراب پینے کا سلسلہ جاری رہا تو جینا بھی جلد ہی ترک کر دینگے، میں نے قسم دیا۔"

تھما سے قسم میں لگی شکر: "وہ جلدی سے بولا۔ اب ایسے آدمی کو کوئی کیا بھاتا؟ چنانچہ میں اسے چلنے کے کہہ میں دھکی پیتے چھوڑ کر اٹھ آیا تھا۔

چلیا میرے بیٹھے بیٹھے مجھے پھر شیم یاد آئی اور میرے دل پر جیسے کسی نے کندھ چھری سے گری کی خراش ڈال دی۔ وہ میرا پیلا عشق... وہ میری تشنہ کیل جنت... وہ ایک پڑا راری کمانی جس کا شروع ہونا بھی خواب گستاخا اور تھوڑا سا ہی۔ مجھے تاجاں یاد آئی ماس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر جانے کیوں اس کی یاد سے دل میں درد سا ہوتا تھا۔ شاید اس کی برادری دیکھ کر دل دکھتا تھا۔

ایک عجیب سی ادائیگ وپے میں آنے لگی اور میں یوں گرد و پیش پر نظر ڈال رہا تھا جیسے دوبارہ یہ سب کچھ دیکھنا نصیب نہیں ہوگا حالانکہ ابھی یقینی طور پر معلوم نہیں تھا کہ مجھے قصبے میں رہنا ہوگا یا یہاں سے کوچ کرنا ہوگا۔

میں جذبات و احساسات کے اس دروازے میں کبھی قویب جاتا تھا اور کبھی اجبر آتا تھا۔ دشت میں نے شرک کی طرف سے ایک شخص کو پولی کندھے پر لٹکائے آتے دیکھا۔ قریب آنے پر میں نے دیکھ کر وہ میرے چہرے پر چپا تھے۔

کا لنگوٹیا نہیں بلکہ ساس سامنے بیٹھی ہو نہیم تارکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا شیوہ بڑھا ہوا تھا اور آنکھیں اس کو کی آنکھوں سے مشابہ نظر آ رہی تھیں جسے کافی عرصے سے آشوب چشم کی شکایت چل آ رہی ہو۔

کسی قسم کی رسمی گفتگو کے بغیر اس نے قہقہے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور نہ جانے کہاں سے دیسی وکی کا ایک ٹوٹا نکالا۔ ایک کپ اس نے اپنے لیے اور ایک میرے لیے بھرا لیکن میں نے فحش میں سر لگاتے ہوئے کہا: "شکر ہے یا سہ ماہی تم ہی پیو۔ ہم تو آجکل دلائی پیہتے ہیں!"

وہ چوہی: "اس نے پڑ خیال انداز میں سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے ہنکا بھرا: "آجکل بڑی اونچی پوڈوں میں ہو!"

"وہ تو مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا: "تم بتاؤ کہ اتنی بچی ہواؤں میں پرفاز کرنے کی تمہیں کیا ضرورت پیش آگئی؟ ابھی تو تھری شادی کو آٹھ نو ماہ ہی ہوئے ہیں!"

"آٹھ نو ماہ؟ اس نے حیرت سے دہرایا: "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آٹھ نو ماہ میں گزر چکی ہیں مجھے اس عذاب میں گرفتار ہوئے! اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ وٹک کے کپ میں گرنے لگے۔

میں نے اس سے پوچھا: "یہ قسم شراب کیوں پی شرع کر دی؟ اس سے کیا تھا؟" صاحب میں کی ہو جائے گی؟" معلوم نہیں: "وہ سادگی سے بولا: "میں تو غریب لڑکے کے لیے پیتا ہوں" یہ ماکہ ہم شو نگلوں میں بھی کئی مرتبہ استعمال کر چکے تھے۔

"ابے اتو کے چٹے" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: "شراب پی کر تم تو مرن لگوں میں ہر دینا ہے۔ وہ بھی پرانی لگوں میں۔ حقیقی زندگی میں تو شہر میں کرو قرض بھی یاد آتے لگتے ہیں جنہیں ہم نے بعد کوش بھلیا جلتے وہ مجھے بتانے لگا کہ اس کے گھر میں کیا کچھ ہوتا ہے اور وہ کس قدر پریشان تھا۔ حالات کی طرح اس کے تالپوں ہی نہیں آتے تھے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر مثالیں دیں۔ کئی شور سے وہ کہہ کر یا تو اسے ہانپے ایک پڑوسی محمد فیاض کی طرح بے حس نہ پڑا اور اپنے آپ میں لگن انسان بن جانا چاہیے۔

محمد فیاض کے گھر میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔ چھٹے تھالیاں اور دوسری چیزیں اس کے

اس گھر کی طرف جانے کو دل چاہ رہا تھا، بچے کے جتانوں پھیلنا لٹوٹا۔

میں جب کافی بیزار ہو چکا تو اٹھ کر واپس ڈیرے پر آیا۔ شعل شاہ تمام معاملات سے فاسخ ہو چکا تھا۔ اس کے دو موٹے کپس بیک کے جارہے تھے جن لوگوں کو وہ سفارشیں دے رہا تھا۔ چاہتا تھا اسے چکا تھا۔ میرا تہہ بھی تیار رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ روپے بھی۔

رقم اور رقم میرے حوالے کر کے شعل شاہ نے مجھے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں کا محل وقوع اندر دیا۔ ملک پہنچنے کا طریقہ بتانے کے بعد کہا کہ یہ علاقہ درمیان سے خاصا قریب ہے۔ یہاں نہر پر آبادانگینی کے نام سے ایک کسٹیشن پکینی خاصا بڑا پل بنا رہی ہے۔ اس پکینی کے مالک بنگالہ صاحب خود ہی پکینی کے چیف انجنیئر بھی ہیں اور کسی نہ کسی حوالے سے میرے دوست ہیں۔ تم سیدھے اسی سے جا کر ملنا۔ وہ تمہیں کسی نہ کسی خانے میں فٹ کر لیں گے۔

میں شعل شاہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ تالین پر گاؤں تک لے گیا۔ پھر شعل شاہ فری کشست جی ہوئی تھی۔ شعل شاہ غلاب توقی اب ملول نظر میں آ رہا تھا۔ میرے کندھے پر تکی دیتے ہوئے لولا لولا جو ان دوست حالات سے گھبراہٹ میں زندگی ہی تو بھر کبھی ملیں گے... اور اس... کبھی مدد کی ضرورت ہو تو طش عبدالتاریاں موجود ہو گا۔ تم کسی وقت بھی اس کے پاس آ سکتے ہو۔

میں شک کے ساتھ نہ کہہ سکا۔ ماحول بڑا سنگین تھا۔ باتوں باتوں میں شعل شاہ نے یہ بھی کہا کہ چلو اچھا ہی ہوا ہم بھی اس زمانے کے آواز گونگ کر لیں گے۔ ورنہ میری فیری کے چکر میں الجھ کر ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ سورج کا دھڑلے نکلتا ہے کہ ضرور دیتا ہے۔

”ولیسے پیر سائیں آپ نے ایک دم ہی یوں اٹھنے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟“ بالائی گاؤں کے رولار شاہ نے پوچھا۔ ”شیک ہے میری فیری چھوڑ دی لیکن زمینداری تو ہے۔ آپ اپنی بادشاہت پر موجود قوی ہیں۔ آپ کو کون سا ذریعہ سے باہر جانا ہوتا ہے جو لوگ آپ پر انگلیاں اٹھائیں گے؟“ ”بس پار دل ہی نہیں مان رہا۔ مشکل شاہ نے جواب دیا۔ جہاں لوگ ہمارے ہاتوں دھوکہ دے رہے ہیں وہاں اب اس عالم میں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔ لوگ ہمیں جھٹی پروا دے رہا ہے۔ ہمتوں کا بیڑا اور نہ جانے کیا کیا بھیجیں اور پیشہ دیکھتے ہزار طرح کے افسانے لکھتے ہیں۔ بے شک ہم زیادہ تر

پیسے کے پاس پہنچ کر وہ لگ گئے اور اسی نظر سے میری طرف دیکھنے لگے جیسے ان کے اور میرے درمیان صرف نیت کا رشتہ تھا۔ میں نے انہیں سلام کیا لیکن وہ جواب دینے پر لے نہ بڑھا۔ نام روشن کیا ہے تو نے خاندان کا... ہمارے گاؤں میں بڑے بڑے برعاش پیا ہوتے مگر کسی کی عزت لطف بھی کسی نے اٹھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہر سب کا لکھی کی آبرو کبھی نہیں ٹوٹی۔ تو نے تو ان نامی گرامی برعاشوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اس برعاش جھٹی پر کے ساتھ مل کر لوگوں کو لڑتے ہوئے رہا اور میری کان پٹانہ چلا دینے میں رنجے ایک لمحے کے نیچے بھی گھر میں رہنے نہ دیتا۔ جوان مان بیٹا، ایں ہماری... وہ تو خدا کا شکریہ کہ تیری اہلی اس شکل سے شرافت اور مصداقیت کا نقاب اٹھ گیا۔ اگر اپنے پا کاچر ہے تو آئندہ ہمیں شکل نہ دکھانا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ وہ کسی غصہ و رعب کے طرح پگڑنڈی پر دھول اڑاتے آگے بڑھتے چلے۔ ”میں ان سے کہنا چاہتا تھا۔ پیارے چچا آپ خواہ مخواہ دھوکہ دینا کہ جاشین بنانے پر تے ہوئے ہیں اور قصبے میں افواہیں پھیل چکی ہیں۔ ان پر یقین کر لیجئے۔ میں مجھ سے کہہ لوچہ تو لیجئے۔ میں نے عزتیں تو کیا ایک عزت بھی نہ ٹوٹی۔ میں تو محض سخت کے نیچے چھپا ہوتا تھا۔ کوئلوں کی لائیں مارا گیا ہوں۔ باقی جہاں تک خاندان کا نام ڈھونڈنے ملے ہے تو نام اس سے چلے بھی ہیں نے کبھی تیرے ل دیکھا۔ ہم تو نہ تین میں تھے نہ تیرہ میں۔ قصبے میں ہماری بٹ کے بیٹوں سے زیادہ نہیں تھی۔ میرا باپ اور آپ کا بھائی مل ہو گیا۔ اس کے الزام میں کوئی ایک گرفتاری اور مل میں انہیں مل۔ آپ کی خوش فحیاں آپ کو بدلہ دے دیں چاکو یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ قصبے کے برعاشوں نے ل عزت کی طرف اٹھ اٹھا کر دیکھا تھا یا نہیں تو مجھے انہیں تھا ہر حال قصبے کے مشرف کا کچھ کرتے تھے یہ مجھے آواز کے مل رہے کہ کافی حد تک معلوم ہو گیا تھا۔

چکانے یہ بھی غیب کی تھی کہ گھر میں جوان جہاں بیٹیاں میرے دونوں چچاؤں کی طرف ایک ایک ہی جی تھیں۔ ان سے ایک کی عمر غالباً چھ سات سال اور دوسری کی آٹھ نو سال۔ میرے خیال میں تو انہیں جوان جہاں کہلانے کے لیے ابھی مال دے رہے تھے اور ان سے ان سے ہمیشہ ایسا ہی مشغول تھا۔ لوگ ناہیا کوئی بزرگ پھر سے کہہ سکتا ہے۔ ہر حال اب ان کو لکھ کوئی فائدہ تھا اور نہ ضرورت۔ میرا خود کوں سا

گزرتے گئے۔ ان سارے لوگوں میں سے میں نے صرف تمہاری سیٹے میں کسی آگ کی تپش محسوس کی ہے۔ یہ کسی چیز کی طلب کی آگ ہے۔"

اس آگ کی تپش کبھی کبھی مجھے بھی محسوس ہوتی تھی مگر میں ہمیشہ اسے ناآسودہ خواہشوں کا اظہار سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔ مگر یہ کبھی نہ ٹھل شاہ جیو عجیب آدمی تھا۔ عجیب وقت پر کوئی عجیب بات کر دیتا تھا۔ انسان کو پرھنا بہر حال اسے آتا تھا۔ اگر اس نے تھوڑی سی نفس کشی، مطالعہ اور عبادت و ریاضت کی ہوتی تو شاید کچھ بے بیہوش بن جاتا۔

بالآخر ٹھل شاہ جیو جب میں ڈائیونگ بیٹ پر جا بیٹھا، انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے بیٹ کے نیچے پڑی ہوئی اپنی رائفل چری غول سے نکال کر چپک کی پیرا سے واپس واپس رکھ دیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے اس نے ہاتھ دھو لایا اور دوسرے ہی لمحے مختصر جیب دھول اڑاتی سرک کی طرف چل دی۔

سرک پر پہنچنے کے کچھ دیر بعد اس کی بھی سرخ قباں بھی نظر آئی بند ہو گئیں اور انجن کی ٹینف کی گھون گھون بھی محسوس ہو گئی۔ رات نے ایک بار پھر سکوت و سناٹے کا کفن پہن لیا۔ سب یوں سرائٹا ہے اب بھی منظر کی نگاہوں سے سرک کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ٹھل شاہ دو چار میل کا چکر لگا کر واپس آ جائے گا اور سب کا منہ یوں لٹکا ہوا تھا جیسے انھوں نے ابھی ابھی کسی قریبی عزیز کی میت دفن کی ہو۔

میرا اندازہ ہے کہ سب سے زیادہ اداس شاہ میں تھا لیکن اگر میں آئینہ دیکھتا تو مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ کسی اداس و معزوں انسان کا چہرہ نظر نہ آتا۔ میرا مسئلہ یہی تھا کہ میں اداسی کو صرف محسوس کر سکتا تھا، اسے نہ تو نظروں میں بیان کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی خاص تاثر میرے چہرے پر آتا تھا بلکہ میں اس دوران کسی سے کوئی بات کرنے کی سوجنا تھا تو ذہن میں اتفاقاً بھی میرے پیچھے سے ہی آتے تھے۔

بالآخر سب لوگ ڈیر سے کی طرف چل رہے۔ آج رات تو سب کو حویلی میں ہی رہنا تھا۔ صبح اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہونا تھا۔ میں اپنی جگہ ہی کھڑا رہا تو منشی عبدالستار نے لگ کر مڑتے ہوئے کہا: "تم ہمیں آؤ گے کیا؟ دوپہار راتوں کے لیے تو شاہ جی سب کو ہی حویلی میں رہنے کی اجازت دے گئے ہیں۔" "لیکن میرا دل اب یہاں ٹھہرنے کو نہیں چاہ رہا۔" میں نے کہا: "میں اسی وقت جا رہا ہوں۔" میں نے کہا: "چاہتا تھا کہ دل کی تلاش مجھے کسی بھی طرف کو چل پڑنے پر مجبور نہ کر دی۔"

ڈیر سے پرہیز رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی باہر بھی جانا پڑ جاتا ہے۔ پہلے ہم باہر جاتے تھے تو لوگ راہوں میں انھیں پھلتے تھے۔ تقسیم سے جھک جاتے تھے۔ اب کہیں ہم پر ایسے مٹا یا پرانی جو تیاں نہ پھینکیں۔

یہ افراد ہیں تھوڑا عرصہ رہیں گی شاہ جی؟ منشی عبدالستار نے کہا: "آپ کے خلاف جو پروپیگنڈا ہو چکا ہے اس کا توڑ کیا جا سکتا ہے۔ تھوڑے عرصے میں ہی فیکری کا دھندلاؤ ٹھنڈا ہو جائے گا لیکن رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

منشی عبدالستار کو تو میرے خیال میں خوش ہونا چاہیے تھا کہ ٹھل شاہ کے جلنے سے سب کچھ اس کے ہاتھ میں آ رہا تھا مگر وہ بھی اسے رکنے کے لیے کوشاں تھا۔ ٹھل شاہ کے آدمی واقعی بڑے وفادار تھے۔

ٹھل شاہ ایک شانی بے نیازی سے بولا: "جب سب ٹھیک ہو جائے گا تو شاید ہم بھی لوٹ آئیں۔" اسی اثنا میں دو طازم بوتلوں اور گلاسوں کی کشتیاں اٹھائے سرے میں آ گئے۔ پھر پرف لائی گئی اور دور چلنے لگا۔

"یہ ہماری الوداعی محفل ہے۔" ٹھل شاہ نے اعلان کیا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر وہ اپنا گلاس بلند کرتے ہوئے بولا: "ہم سب کی خوبصورت رفاتوں کے نام۔"

ٹھل شاہ کی منشا یہ دور ہلکا چلکا ہی رہا۔ اس لیے جب سب لوگ اٹھے تو برقی ہوش و حواس تھے۔ کھانے کا انتظام دوسرے کمرے میں تھا۔ سب آستینیں چڑھا کر لہو و آفاق کے کپڑوں پر ٹوٹ پڑے۔ آج جلنے والے سب کو پیر ہوئی ہو کر لگی ہوئی تھی۔ لوگ کھانا لاتے لاتے تھک گئے تب کہیں جا کر کھانے والوں نے جھڑپوں کو بریک لگائے۔

کھانے کے بعد گھڑے ٹوں اور جھڑپوں کا دور چلا۔ اس وقت نکلت رات گری پر پہنچی تھی۔ بالآخر ٹھل شاہ جلنے کے امادہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نام ضروری سامان جیب میں لا دیا جھکا تھا۔ وہ جیب میں ہی جلنے کا امادہ رکھتا تھا اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کہاں جا رہا تھا۔ خود اسے ہی نہیں۔

ٹھل شاہ فرماؤ! سب سے گھٹے ٹھنڈے لگا کر لوگوں کا سردار ارشاد اس کے گھٹے لگ کر ایک بار پھر جھڑپوں کی طرح جھڑپوں جھڑپوں کر کے روکنے لگا۔ پیر سائیں، آپ کے بغیر ہم تمہیں جھڑپوں گے۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا: "ٹھل شاہ نے اسے شفق خانہ انداز میں فائنٹ کر چھپ کر لیا۔"

مجھ سے گھٹے ملے ہوئے ٹھل شاہ بولا: "میں حویلی میں ہی لیکن تمہارے حقائق میری پیشگوئی ہے کہ تم دنیا میں ضرور کچھ کر

حیرت انگیز اور ناقابل یقین صلاحیتوں کے مالک
ایک نوجوان کی ناقابل فراموش داستان

مصنف:
ایم الیاس



قاری کی دھڑکنوں کے زیر و بم پر سفر کرتی ہوئی ایک
اچھوتی اور دلکش تحریر، جس کا تانا بانا دلچسپیوں کی سحر انگیز
لذت سے بنا گیا ہے۔ خیر و شر کی کہانی اتنی ہی پرانی ہے جتنی یہ
کائنات۔ نیکی اور بدی اول سے برسرِ پیکار ہیں، صرف ہر دور
کے انداز و اطوار بدلتے رہتے ہیں۔ اور یہی بدلتے ہوئے انداز
و اطوار واقعات کے اجزائے ترکیبی کو بدل کر ایک داستان کو
دوسری سے، مقصد ایک ہونے کے باوجود مختلف بنا دیتے ہیں
اور دلچسپیوں کو نیا پن عطا کرتے ہیں۔

جادو ہماری دنیا کی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ اور مذکورہ کہانی
اسی جادو اور طلسم کی کرشمہ سازیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

خوبصورت سرواقل، بہترین طباعت، سفید کاغذ۔ قیمت: 250/- روپے

اسٹاکسٹ: ↓

مکتبہ النور، 10/11/1432ھ، لاہور۔ 2

ایک بار شعل شاہ کار قصبہ کے رہنے والے ایک لکھنؤ میں چلائی جانے والی کوئی مقبول نوکری مل گئی اور کچھ بچت ہوتی نظر آئی تو مزید کچھ رقم پس انداز کر کے لاہور چلا جاؤں گا۔

کھڑے کھڑے میرے پیروں میں خوں جھنڈے گا اور ہنڈے محسوس ہونے لگی تو میں آہستہ آہستہ اودھر اودھر دوڑنے لگا میں اس وقت جبکہ میں تھک ہار کر حویلی کی طرف واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا اور دوسری طرف سے دو بیڑاٹس جھرجھریاں پھرتی ہوئی قریب آتی دکھائی دیں۔ میں نے دوڑنا بند کیا اور جیسے جگہ دیکھی جھپ پڑی، ایسے کو کوٹنے کے لیے ہاتھ ہلانے شروع کر دیا۔ ان دنوں چونکہ ڈاکو حضرات کی تجارتی سرگرمیاں معاف کیجیے گا مذہب سرگرمیاں چونکہ زوروں پر نہیں تھیں اس لیے ویرانے میں بھی کسی کو ہاتھ ہلاتے دیکھ کر ڈرامور حضرات فوراً گاڑی روک لیتے تھے اور اس اندیشے میں مبتلا نہیں ہوتے تھے کہ اگر دو گرو بھائیوں میں اس کے ساتھی بند تو ہیں یا نہیں ہوتے ہوں گے۔

پس میں جب میں ایک کچھلی سیٹ پر بیٹھا اور اگتے ہوئے مسافر گروین موٹر موٹر کر چند حیاتی ہوئی سی انگوٹوں سے میرا معائنہ کر چکے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور کرایہ ادا کرتے ہوئے کنڈکٹر کو تاجیکہ کی دھمکی کی نام کے گاؤں کے پاس مجھے خود

ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ دور ویرانے میں کھڑا ایسے کوئی مجھے ہمارا ہاسے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا مجھے معلوم تھا کہ یہ ان کی بچھ میں آنے والی ہائیں نہیں۔

لیکن اس وقت کہاں جاؤ گے؟ فٹنی نے حیرت سے پوچھا۔
"شاہ جی نے کہا تھا کہ چوڑے کی طرف جلتے والی آخری بس عموماً بارہ بجے یہاں سے گزرتی ہے" میں نے جواب دیا۔
"اگر بس مل گئی تو میں آج ہی اس طرف نکل جاؤں گا جہاں شاہ جی نے مجھے جانے کے لیے کہا ہے"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میں تیزی سے گھوما اور سڑک کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد میں سڑک پر پہنچ گیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف تاریکی اور سائے کا راج تھا کبھی کبھار کوئی کتا فریادی سے انداز میں چونک اٹھتا یا کوئی گھبراہٹ نہ جانے کس ایسے پر گریہ زاری سی کرنے لگتا اور اس سے شہ پاک کو کوئی بھی تکرر بھی اپنا راک شروع کر دیتا لیکن یہ محض چند منٹ کے لیے ہوتا اس کے بعد پھر وہی پڑھول سنا۔

میری جیب میں دو ہزار روپے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ لاہور بھی جاسکتا تھا جو میری پرانی آنرز تھی۔ میرا دل مجھے اس کی ترغیب بھی دے رہا تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ میں کوئی مقبول ذرا بیٹھ معاشی تلاش کرنے سے پہلے ہی یہ رقم کھاتی کر رہا ہوں نہ کر دوں۔

بل کھاتی سڑک پر ایک طرف سے دو بیڑاٹس نمودار ہوئیں جو چند لمحے بعد قریب آگئیں۔ وہ ایک بس تھی۔ پڑی سے راستہ سیا کرکٹ لاہور جانے والی بس۔ اسی وقت اس کا رخ لاہور کی طرف تھا۔

میں بیڑاٹس کی زد میں آیا تو ڈرامور نے رفتار نکل کر کوئی اور کنڈکٹر نے دروازے سے لپکتے ہوئے بیچ رو پھاٹ کھتے جانا اسے باوجودی؟

میرا بڑی شدت سے دل چاہا کہ وہ دوں لاہور اور بس کر لیں میں چڑھ جاؤں لیکن جانے کون سی طاقت مجھے جس جگہ سے کھڑی رہی۔ میں کچھ بھی نہ بولا۔ بالآخر کنڈکٹر نے ڈی پر ہاتھ مار کر کہیں نکل دیا اور رفتار تیز ہونے سے پہلے اکر چلا یا۔ باؤڑنے کہتے وی نہیں جانا۔ اندازاً بے بیگم نے تیاں بار کے کروں کڑ دتا اسے " (بالو کو کہیں نہیں جانا تھاپے بیگم نے جو تے مار کر گھر سے نکال دیا ہے)

مجھے کنڈکٹر پر غصہ نہیں آیا اس وقت میری سوجھ بیزری دھند سی نہیں تھی میں سڑک پار کر کے دوسری طرف ٹرہا گیا۔ اب میں فیصلہ کر چکا تھا۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ

مشہور مصنف اظہر کلیہ کے مقبول ناول

پیکار : ۱۷۵/-

سفر و ش : ۲ حصے ۱۰۸/-

مشہور : ۲ حصے ۱۰۸/-



۵۰

ہی یاد سے اتار دینا... مجھے اس جگہ کا پتا نہیں ہے... پہل
بار جا رہا ہوں ؟

نکرنے کو روادشا ہو۔ چاہو تو کام سے سوجاؤ۔ میں جنگ
دوں گا و کڑھ کر نے اطمینان دلایا۔ سونا تو مجھے کیا تھا بہر حال
ترم چادر اچھا طرح لپیٹ کر اور سر پیوڑا کر بیٹھ گیا۔ سن کے
پیران اور اس گرم چادر کے علاوہ اس وقت میرے پاس
کچھ وقتا نوی پتیلے میں دو جڑی شلوار قمیص اور لٹڑے سے
نگایا ہوا ایک کوٹ تھا۔

اسلحے کے طور پر میری واسکٹ کی جیب میں ایک گزری مار
پاؤ تھا جس کی موجودگی میں مجھے ویران مقامات پر راتوں میں
ٹھوٹے ہونے بھی زیادہ خوف نہیں آتا تھا۔

بس ایک خاص ٹرم میں کھڑکھڑاتی رال رہی اور نہ جانے
کب مجھے غودگی کی آگئی۔ میں نے پاؤں میٹ پر ہی رکھ کر
فلٹوں میں سر چھپا لیا۔ میں اس وقت چمک رہا تھا۔ جب کڑھ کر نے
ملا سے میرا کندھا ہلایا ٹھیکری آگیا تھا۔

میں غودگی میں لوکھڑاتا بس سے اترا اور بس فوراً ہی
بلا ہڑی۔ تاہم کڑھ کر نے چلتے چلتے ایک طرف اشارہ ضرور کیا
تاکہ ادھر سے ٹھیکری ہو۔

بس کے ہلنے ہی مجھے احساس ہوا کہ چاروں طرف گھٹاؤ
غیر اچھا ہوتا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا اور
بہر کڑھ کر نے اشارہ کیا تھا ادھر کہ از کھ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں
دے رہا تھا۔ شاید کسی صاحب بھیرت کو کچھ دکھائی دے رہا تھا۔
میں نے ذہن میں نقشہ کو تیار کر کے کی کوشش کی جو
فل شاہ نے مجھے بھجوانے کے لیے ایک کاغذ پر بنایا تھا۔ لٹری
بڑھن میں آگیا کڑھ کر نے شکل شاہ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ جب
فلٹاؤپ، انھیر چھایا ہوا ہو تب اس نقشے سے کوئی نگر استفادہ
کیا جاسکتا ہے۔ دور دور تک کوئی ذی روح تو کیا کسی بدو
لہجہ بولی کے آثار بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

کچھ لمحے بعد میں نے غور کیا کہ آسان پر بادل پھانے
ہوئے تھے اور کہیں ایک تاراجی جھللا تا دکھائی نہیں دے رہا
غاسی لیے انھیر اس قدر گہرا تھا۔ شکر ہے کہ دیہاتیوں کو
نادر ہوا کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے اور مختلف علاقوں کے
نادر ہوا کی خوشبو میں فرق بھی محسوس ہو جاتا ہے۔

میں ان قریب ہی کہیں سے مجھے کسی نہری کی بو آرہی تھی
درمحل شاہ نے یہی سب سے بڑی نشانی بتائی تھی کہ بس
مجھے نہر کے آس پاس ہی کہیں آتا ہے گی۔ میں نے ناک کے
مار سے نہری تلاش شروع کی اور کچھ دیر بعد ناک ہی کے

بل اس میں گرے گرتے بچا۔

عجیب خاموش طبع قسم کی نہر تھی۔ میں ایک کچے پلٹے
پر چڑھا تو مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے عقب میں نہر
ہو گی لیکن جب مجھے پانی کی سرسراہٹ سنائی نہیں دی تو میں
برسی طرف دھلانے سے اترا چلا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ کچھ
ویفرہ کے بکوسے اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے مجھے
اندازہ ہوا کہ نہر میں پانی رائے نام تھا۔ موسم جو سردیوں کا تھا۔

میں واپس نشیب میں آگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جس طرف
بس گئی تھی ادھر نہر پہنچ ہی تھا اور اسے پار کر کے میں نہر کے
متوازی ایک چھوٹی سی نہر پر پہنچ سکتا تھا لیکن محل شاہ نے
بتایا تھا کہ اس طرف سے مجھے کافی بڑا چکر کا منڈا پڑے گا۔ کچھ
ماسٹر ایک طرح سے شارٹ کٹ تھا۔ اس شارٹ کٹ پر
میں کچھ دور تک ہی چلا تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور وہ بھی
نہایت زور و شور سے۔ میں بوکھلا گیا اور نہا کی تلاش میں ادھر
ادھر دوڑنے لگا۔ مجھے دراصل فکر یہ تھی کہ میری واسکٹ کی جیب
میں رکھے ہوئے نوٹ اور مشکل شاہ کا دیا ہوا رقم بیجگ کر
بیگانہ نہ ہو جائے۔

یہ کچھ اچھا حلوم نہ ہوتا کہ میں اپنی مطلوبہ جگہ پر جا پہنچتا

اور ایک سادہ کاغذ نکال کر کتا: جناب! میرے جو آپ کوئی کاغذ
پر کہیں کہیں نیلے دھبے نظر آ رہے ہیں یہ دراصل الفاظ تھے اور
یہ کاغذ دراصل شکل شاہ کا دیا ہوا سفارشی رقم ہے۔

کسی بوکھلائے ہوئے چمکے کی طرح پناہ کی تلاش
میں ادھر ادھر دوڑتے ہوئے یکایک مجھ پر آشفتہ ہوا کہ مجھے
اب سمت کا تعین نہیں رہا لیکن نہر دست مجھے اس پر کوئی خاص
تشویش نہیں رہی تھی۔ میرے کپڑے خالص بیجگ چکے تھے اور
مجھے یکایک ہی ٹھنڈ بھی لگنے لگی تھی۔ اس لیے فی الحال میری
فکر میں اہمیت صرف پناہ کی تھی۔

بالآخر میں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ شکر ہے کہ زیادہ
زور سے نہیں ٹکرایا۔ ورنہ شاید کھڑی دوپٹوں میں ہی قہر جاتی
اور مجھے ہیشہ کے لیے ہی پناہ مل جاتی۔ ٹٹول کر دیکھنے پر اندازہ
ہوا کہ وہ ایک درخت تھا۔

کوئی درخت مجھے زندگی میں کبھی اتنا پراا موسی نہیں ہوا
تھا جتنا اس وقت وہ درخت محسوس ہوا۔ ایسا لگا مجھے کوئی
پھڑا ہوا بھائی مل گیا ہو۔ حالانکہ مجھے کسی بھائی کے پھڑنے کا
تجربہ نہیں تھا کیونکہ میرا کوئی بھائی تھا ہی نہیں لیکن اس وقت
مجھے یہی تشبیہ سوچ ہی تھی۔

اسی لمحے شاید قدرت کو خیال آ یا کہ اس شخص کو اتنا بھی

چھوٹی سی لائین میرے چہرے تک بند کر دی تھی۔ غالباً وہ میرے چہرے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

گھر اندھیرے کے بطن سے نکل کر اپنا کبھی یہ چھوٹی سی لائین سامنے آئی تو اس کی موٹی سی ریشمی سے بھی میری آنکھیں پھنسیا گئیں۔ جب تک میری آنکھوں کی پڑھناٹ دور ہوئی تب تک لائین روار کا گھم کر چھائیوں کے عقب سے میرے عین سامنے اچکا تھا۔ تب میں نے دیکھا وہ ایک لڑکی تھی۔

اللہ تیری شان!

رات کا یہ پہر گھٹنا جنگل، سناٹا، ویرانی اور ایک لڑکی ایسا تو صرف فلموں میں ہوتا تھا۔ وہ بھی کسی کی فلم میں۔ تاہم لڑکی واقعی نہیں تھی جیسی فلموں میں دکھائی جاتی ہیں۔

وہ غالباً خانہ بدوش تھی۔ بنجارن قسم کی کوئی چیز۔ اس کا رنگ سانولا رخساروں کی پٹریاں ابھری ہوئی اور ہونٹ بھرے چہرے تھے۔ پورے چہرے پر صرف اس کی آنکھیں ایسی تھیں جن کی تعریف میں شاعر غزلیں لکھتے ہیں۔ کوئی کوئی لڑکی ایسی ہوتی ہے کہ صرف آنکھوں کی وجہ سے اس کا پورا چہرہ بہت دلکش معلوم ہوتا ہے اور اگر وہ آنکھیں بند کر لے تو دل سے اترنے لگتی ہے۔ تاہم اس لڑکی میں آنکھوں کے علاوہ بھی کئی چیزیں

زیادہ اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہیے۔ اس لیے بکلی چمک اٹھی اور اس مختصر سے وقفے میں میں نے دیکھ لیا کہ میں جہاں کھڑا تھا وہاں وہ درخت تنہا نہیں تھا اس کے اوپر بھی بہت سے بھائی بند موجود تھے۔ ذرا آگے ورتوں کا ایک جھنڈ تھا وہاں میں بارش سے زیادہ مفلورہ سکتا تھا۔ اس لیے میں آگے بڑھ گیا۔ برقی کٹی بار کو نڈی اور وقفے وقفے سے میں آگے بڑھتا رہا۔ پھر اندھیرے میں بھی میں نے جھانکی انداز میں بازو آگے کو پھیلا کر سفر جاری رکھا حتیٰ کہ میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں درخت اتنے گنے اور گنجان تھے کہ بارش کا ایک قطرہ بھی نیچے نہیں پہنچ رہا تھا اور نہ ہی تیز ہوا مجھ کو جھری رہی تھی۔ جہاں پہنچ کر میں نے سکون کی سانس لی اور غور کرنے لگا کہ میری یہ ڈرگٹ کیوں بن رہی تھی۔ کافی غور و غوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غور و غوض کا کوئی فائدہ نہیں جن کی ڈرگٹ تھی ہوتی ہے وہ ہر حال میں بنتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاتا ہے کہ تقدیر میں جو لکھا ہوا ہے تو سہنا ہی پڑتا ہے۔

بارش جس تیزی سے آئی تھی شاید اسی تیزی سے ختم بھی ہو گئی۔ ایک جگہ رنگ کر گئے سوچنا پڑا کہ اگر میں بت تبدیل کر دوں بھی تو کس طرف جاؤں؟ ایسا نہ ہو کہ جنگل سے نکل کر کھائی میں جا کر دل یا جنگل کے کسی ایسے حصے میں جا پہنچوں جہاں کوئی فائدہ کش قسم کا لکڑی کا بیڑ یا گھات لگائے بیٹھا ہو۔ بالآخر میں نے چاقو کھول کر دائیں ہاتھ میں تھاما، تھملا بائیں ہاتھ میں لٹکایا اور ناک کی سیڑھی میں چلنے کا فیصلہ کیا۔ چند منٹ میں میں نے جنگل چند گز کا فاصلہ طے کیا اور خشک کر رہ گیا۔ کافی آگے ایک جگہ مجھے غالباً بھی لمبی گھاٹس کے عقب میں ایک لمحے کے لیے روشنی یوں متحرک نظر آئی تھی جیسے چند جگہ جھلکائے ہوں یا پھر کچھ چمکائیاں اور کچھ مدم ہو گئی ہوں۔ میں اندازاً اس مقام پر پہنچا جہاں میں نے روشنی کی جھلک دیکھی تھی۔ چاقو میرے ہاتھ میں تیار تھا اور میرے اعضاء تنے ہوئے تھے۔ اچانک اندھیرے کی دیوار کی اوٹ سے جیسے توپ کا ایک روشن گولہ میرے چہرے پر آن پڑا۔ میں لوٹ کر دیکھ گیا۔ بعد میں میں نے خدا کا فکر ادا کیا تھا کہ میں نے چاقو سے اندھا دھند وار نہیں کر دیا۔ بات کچھ بھی نہیں تھی، صرف تاریکی اور جنگل کا پُر مدیت باول اپنی شہدے سے بازیاں دکھا رہا تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ اونچے اور گھنے جھاڑیوں کی دیوار کے عقب میں کوئی چھپا ہوا تھا اور اس نے اچانک اندھیرے

ابلیگا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی تاریخ پیش کی گئی ہے

جلد اول (1950ء)

اردو بازار لاہور

قابل ذکر تھیں۔

اس کی سڑول کلاٹیاں کنبیوں تک چاندی کی بلی بلی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے جولانہ اور عجیب و غریب ڈیزائن کی سلی ٹیٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے کپڑے سے پلاٹینم ایک خیمہ تیار ہو سکتا تھا مگر اتنا بھاری بھر کم لباس بھی اس کے جسم پر ناکافی محسوس ہو رہا تھا۔ بڑا باغی قسم کا جسم تھا۔

اس کے ہاتھ بڑے مضبوط نظر آتے تھے۔ بالوں کی ٹیٹیں کندھوں پر رکھری ہوئی تھیں۔ فلموں میں بیٹوں نے جو خانہ بدوش لوگیاں اور بنجارے وغیرہ دیکھی تھیں ان کا حلیہ بھی کافی مزیدار ایسا ہی ہوتا ہے بس فرق صرف یہ تھا کہ ان کی چولی اور گھٹا عموماً بڑا زرق برق ہوتا ہے گوشتے کداری والا اور اس کے سر پر عموماً ایک ٹوکلی سی ٹوپی مزور ہوتی ہے۔ شاید نلسن زاور ہائیڈارک کی نظر میں یہ تاج ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ تاج خاندانوں لڑکی کے پاس کہاں سے آتا ہے اور قصبے کے دوران بھی وہ جی طرح اسے سر پر چھائے رکھتی ہے وہ ایک الگ آرٹ ہے۔

میں ہی اس کا نہیں وہ بھی میرا سرتاپا جائزہ لے رہی تھی اور ہتھیار مردانہ میرے اقدار میں ہی نہیں اس کے ہاتھ میں بھی تھا۔ ایک ہاتھ میں لٹائن اور دوسرے ہاتھ میں ایک بالشت کی چھری جو چمکی نہیں تھی مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی دھار لینا آتی تھی جی کہ وقت ضرورت اس سے شیوہ بھی بنایا جاسکتا تھا بشرطیکہ وہ کسی مرد کے پاس ہوتی۔

بالآخر مجھے ہی شرم آئی کہ میں مرد ہو کر ایک لڑکی کے سامنے چاقو نکالے کھڑا تھا چنانچہ میں نے اسے بند کر کے اسٹاک کی جیب میں ڈال لیا تب اس نے جی چھری اپنے لٹکے کی کسی پراسرار سی جیب میں ڈال لی۔ جیب کی شاید چھری وغیرہ کا زنبیل تھی جس میں ایک لمحے کے لیے کبھی تک اس کا بازو بھی غائب ہو گیا تھا۔

”شکل سے کافی بے وقوف لگتے ہو تو وہ مکالتے ہوئے بول رہے تھے ایک جھٹکا سا لگا اور غیر ارادی طور پر میں نے یوں ہلکے سے ہاتھ پھیرا جیسے اس پر سے طاقت کی علامات مٹا رہا ہوں۔ بلی ملاقات اور پہلا تبصرہ... اور وہ بھی ایسا بہت شگن۔

وہ غور ہی گویا اپنے تبصرے کی وضاحت کرتے ہوئے بول رہا تھا مطلب ہے اس وقت تو زیادہ بے وقوف نہیں لگ رہے تھے۔ میں لٹائن کو گھاس میں چھپا کر جھانپوں کے درمیان سے نکلیں دیکھ رہی تھی۔

”ایک ایک گشتا تو پ اندھیرے میں تھیں میری شکل اور اس پر ہرگز ہونی طاقت نظر آ رہی تھی تو میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”اندھیرے میں بھی زیادہ فاصلے نہ ہی لیکن قریب سے تو ہم ہر چیز صاف دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری آنکھیں عادی ہیں اندھیرے کی۔ اس کے لمحے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

”تم تنہا ہو تو میں نے پوچھا۔

”اں۔ کیوں؟ علم کرنا ہے مجھ پر؟ اس نے برستور شوخی سے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی ”لفضان میں رہو گے“

ایک لمحے کے لیے تو میرے دل میں آئی کہ لٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کر کے اور دو چار پتھیاں اسے دے کر بیٹھے تو اس کی اکثر فوں فوں کاو پھر آگے بات کروں مگر اس فوں فوں کو دباتے ہوئے میں نے حتی الامکان نرمی اور ملائمت سے کہا ”میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ رات کو اس وقت تنہا اس جنگل میں آتے ہوئے تھیں ڈر نہیں لگا؟“

”ڈر؟ جنگل سے کیسا ڈر؟ وہ جھمکے سے بولی تو یہاں تو یہ بے ضرر سے درخت ہوتے ہیں یا چھوٹے موٹے جنگلی جانور جو اس وقت تک عموماً کچھ نہیں کہتے جب تک انہیں پھڑکانا جائے۔ انسان کو ڈرنا ہی ہو تو شہروں سے ڈر سے اونچی اونچی عمارتوں والے شہروں سے۔ جہاں لوگ بغیر چھڑے ہی ایک دوسرے کے غرن کے پیاسے رہتے ہیں۔ دھوکے سے علم کرتے ہیں اور ہاتھ پریشہ کمزور کو کھل سا ہتھاپ ہے۔“

کبھت فلسفہ بگھار رہی تھی۔ میری کھڑکیں نہ آیا کہ کیا

کہوں۔ وہ ایک گہری سی سانس لے کر بات جاری رکھتے

ہوئے بولی ”جنگلوں سے کیا ڈرنا... جنگل ہی تو ہم جیسے لوگوں

کا گھر ہوتے ہیں۔ زندگی جنگلوں میں گزرتی ہے۔ بلکہ میری ماں

... اللہ اسے جنت نصیب کرے۔ بڑا بڑا قہقہہ میری توہمیں لگ رہی

جنگل میں ہوتی تھی۔ وہ اس وقت لکڑیاں چٹختے ہوئی تھی۔

”اور تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟ کیا تم بھی لکڑیاں چٹنے آتی

ہو تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ میرا مطلب سمجھتے ہوئے مجھے

اس نے غالباً گھونسا رسید کرنے کا ارادہ کیا مگر نہ چلنے کیا

سوچ کر ملوٹی کر دیا۔

”میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی“ اس نے دھیسے

سے لمحے میں کہا۔ جانتے کہوں اس نے یہ وضاحت ضروری سمجھی

تھی گو کہ یہ اندازہ میں خود بھی کر چکا تھا۔ دفعتاً میں نے چوکنے

ہوئے پوچھا۔ ”تم یہاں کر کیا رہی تھیں؟ یہ سوال میں سب سے

پہلے کرنا چاہتا تھا مگر گفتگو کا آغاز ہی جلتے کس ڈھب پر ہوا تھا۔

”حالات دراصل ایسے ہیں کہ مجھے اپنے باپ کے ہاتھ کا

پکایا ہوا کھانا کھانا پڑتا ہے۔ وہ دھنڈے سی سانس لے کر بولی۔

اب اس کی فالتو باتوں پر بالکل دھیان نہیں دے رہا تھا۔
 "یہ بتاؤ کہ تم مجھے سجاد صاحب تک پہنچا سکتی ہو؟"
 "اس وقت؟" وہ گویا سوچ میں پڑ گئی۔ "وہ ناراض ہوگا۔"
 "نہیں ہوں گے۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "اور اگر
 تمہیں اتنا ہی ڈر ہے تو تم دور سے مجھے ان کا ٹھکانا دکھا کر
 اپنے گھر چلی جانا۔" پھر جیسے اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ گھر
 کہاں ہے تمہارا؟

"گھر؟" وہ خود استغنائی کے سے انداز میں مسکرائی۔ "میرا
 چیتھڑوں اور ٹاٹ کے پونڈوں سے بنے ہوئے نیچے کو گھر
 گھر کہتے ہو تو اس عزت افزائی پر میں تمہاری شکر گزار ہوں۔
 وہ بڑی شستہ پنجابی میں گفتگو کر رہی تھی۔ بہر حال میرا وہ
 "شاد مار گھر سجاد صاحب کے ٹھکانے سے زیادہ دور میں ہے
 اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سجاد صاحب کا ٹھکانہ
 بھی یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ میرے پیچھے آجا
 وہ اچانک ہی غلطی اور لالچین کو قصہ سے احتیاط سے دھیرے
 دھیرے بھلائی آگے چل دی۔

مجھے اس کے نقشوں کے سحر سے آزاد ہونے میں چند
 سیکنڈ لگے اور میں پک کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ گھنے جنگل کا
 سمت کا اندازہ نہیں رہتا۔ مگر وہ جیسے ہر درخت اور اس کے
 حدود دار لہر سے واقف تھی اور یوں تیزی سے بھی دائیں بگڑا
 مڑتی جا رہی تھی جیسے کوئی صبار قمار کھیلی پانی کے خلاف بہاؤ

"اور وہ لوگ برسوں سے کھانا پکا رہا ہے مگر ابھی تک اسے
 معلوم نہیں ہو سکا کہ چیزوں کو گھلار کیسے جاتا ہے اور دن بھر کی
 محنت مشقت کے بعد مزہ ایسا کچھ نہ دیتی دوسرے بنا ہوا ہوتا
 ہے اس لیے میں جو کچھ سامنے آتا ہے کھا جاتی ہوں اور نہ
 زیادہ کھا جاتی ہوں۔ عام طور پر میں کٹرہضم پختہ ہضم کی مثال بنی
 رہتی ہوں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علی الصباح کے بجائے
 رات کے کسی پہر جنگل کا رخ کرنا پڑ جاتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں سمجھ گیا۔ میں نے جلدی سے اس
 کی بات کاٹ کر کہا۔
 "سمجھ گئے ہو تو اب مجھے بھی سمجھاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہے
 ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں راستہ بھول گیا ہوں۔" میں نے کہا۔
 "وہ تو میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب میں نے تمہیں کسی
 ملٹی مزاج لوٹر کی طرح منہ اٹھائے بھڑائی کے قریب آتے
 دیکھا تھا کہ وہ بولی میں پوچھنا دراصل یہ چاہتی تھی کہ کہاں
 سے آئے ہو کہاں جاتا ہے؟"

"شاید تم سمجھ نہ سکو۔" میں نے یہ سوچ کر کہ وہ ایک
 چٹائی پر بٹھرائی ہے، ہنسی بکاتی ہے، کہاں اس علاقے میں
 سجاد اینڈ کمپنی کے نام سے ایک کمپنی... کمپنی سمجھتی ہو؟ تو وہ
 کمپنی پٹا ڈالے ہوئے ہے۔ کوئی سڑک اور کچا بنا رہی ہے۔
 مجھے اس کے مالک سجاد صاحب سے ملنا ہے۔"

"اچھا؟" اس کی آنکھیں نہ جھلنے کیوں کچھ پھیل سی گئیں۔
 "تمہاری واقفیت ہے سجاد صاحب سے؟ دوست ہیں تمہارے؟"
 "ہاں۔" دوست ہی سمجھ لو۔ میں نے یہ معمولی سا جھوٹ
 بولنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"میرا خیال ہے اگر تم انہیں اپنے آبا کا دوست کہہ دو تو
 زیادہ مناسب ہو گا۔ کیونکہ وہ عمر میں تم سے تقریباً تین گنا بڑے
 ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں جھینپے یا شرمندہ ہونے کے بجائے اس خیال سے
 اچلی پڑا کر وہ سجاد صاحب کو جانتی تھی؟ تم ان سے واقف ہو؟"
 میں نے تصدیق چاہی۔

"اس علاقے میں کون ان سے واقف نہیں؟ وہ ٹھنڈی
 سانس لے کر بولی۔ "وہی وہ خود بہت کم لوگوں سے واقف
 ہیں۔ جتنی کہ مجھ سے بھی واقف نہیں ہیں۔ شاید ان کی عمر کا
 تقاضا ہے۔۔۔ ورنہ یہاں تقریباً ہر شخص مجھ سے واقف ہے
 یا واقف ہونے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔"

"ایک تو تم باتیں بہت کرتی ہو۔" میں نے کہا۔ "میں

ہو تھپے؟ میں نے آسان لفظ کے شکل معنی ڈھونڈ لیے۔

”اور اب تم کو گے کہ مجھ میں تو سرفی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔“ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پیرتے ہوئے بولی۔

”میں تو کالی ہوں۔“

”نہیں غیر... کالی تو نہیں البتہ سانولی تو ہم۔ بنگال کی لکھی ہو۔ خاص کر ان ساحرا لکھنوں کی وجہ سے۔ میں نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ چلتے چلتے ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں درحقیقت اس کی تعریف کرنا چاہتا تھا اور میں نے جو کچھ بھی محسوس کیا تھا، اس قدر دل سے کہہ ڈالا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے الفاظ کو اس نے تعریف پر محسوس کیا تھا یا تہلیل پر۔ وہ خوش تھی یا برہم۔ یہ بھی میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے میری طرف گہری نظر سے دیکھ کر وہ دوبارہ چل پڑی تھی اور جھیل کی طرح پرسکون رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی، ”ہم خانہ بدوش ہیں نام ایسے ہی ہوتے ہیں کچھ عجیب و غریب سے۔ بعض اوقات تو وہ نام نہیں شخصیت پر مقرر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک لڑکی ہے اس کا نام نور ہوا ہے مگر وہ آنکھوں کے نور سے غروم ہے میں نے سنا ہے نور جاں ہندوستان کی ملکہ تھی۔ ہماری بڑاوردی کی نور جاں ہیک نام لکھی ہے۔“

کم بخت نے چہرہ پر برہمی کی مار دی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس سے مزید گفتگو سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ میری صمت کے لیے اچھا نہیں تھا۔

اسی دوران میں نے دیکھا کہ خاوار تاروں کی حد بندی سے کافی آگے مزید بہت سے خیمے لگے ہوئے تھے لیکن یہ خیموں میں خیمے نہیں تھے بس پتے پرانے کپڑوں اور کپلوں وغیرہ کے گھڑوں کو جو بڑے بڑے مڑی مڑی ٹکڑیوں کے ڈھانچوں پر ڈال لیا گیا تھا۔ لال لیتینا انھی میں سے کسی میں رکتی تھی خانہ بدوشوں کے اس قسم کے خیمے میں بارہا دیکھ چکا تھا۔

دفعہ خاوار تاروں کے قریب شلووار قمیض میں ملبوس ایک لمبا حلقہ شخص نہ جانے کس طرف سے برآمد ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لافٹ تھی اور دوسرے میں ٹارپ۔ اس نے دور سے ہم دونوں کے چہروں پر ٹارپ سے روشنی ڈالی میری آنکھیں چمکدیا گئیں۔

لالہ نے زیر لب اس شخص کو ایک عجیب و غریب گالی دی جس کی معنویت پر غور کر کے اسے انسان کے روکنے کھڑے ہو سکتے تھے۔

میں اپنا راستہ بناتی جا رہی تھی۔

روشنی بہت مدہم تھی اور اس کا لباس بے حد بھاری پیر کم۔ اس کے باوجود اس کی چال دیکھنا اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنے والی بات تھی۔ میں کوشش کرنے لگا کہ نظر جھکا کر صرف اس کے پیروں تک محدود رکھوں جو جوتوں سے غروم تھے۔ اس کے باوجود زیادہ ہرنا یا بے ہنگم نہیں تھے۔

ہم زیادہ نہیں چلے۔ اچانک ہی ہنگل سے نکل آئے۔ میں نے اپنے آپ کو چیل میدان میں پایا۔ بادل پھٹ چکے تھے اور مکمل سا چاند گویا نکلتا ہوا ان کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ بارش کا پانی زمین جذب کر چکی تھی اور اب خشک ہوا میں مٹی کی سوندھی خوشبو درجی ہوئی تھی۔

دھندلی چاندنی میں دور مجھے ایک وسیع رقبے پر عجیب عجیب سے دیوے بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے اور لوہی کا رخ اسی طرف تھا۔

”نام کیا ہے تمھارا؟ میں نے اس کے شانہ بہ شانہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”لالہ! اس نے جواب دیا اور مزید کہہ نہ بولی۔ وہ اب بے حد مزیدہ نظر آرہی تھی اور جیسے کسی اور ہی خیال میں الجھی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ رہی نہیں رہی تھی۔

کچھ اور آگے پہنچے تو وہ دیوے کے قریب صاف دکھائی دینے لگے۔ میں نے دیکھا کہ بہت وسیع رقبہ پر چار دیواری کے سے انداز میں خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔ اس جنگل سے باہر قطاروں میں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی طرح پتھروں کی پچاسوں ڈھیریں لگی ہوئی تھیں۔

خاوار جنگل میں کہیں تارکول کے ڈوم کھڑے تھے اور کہیں قطار میں دیوہیکل شیشیں کھڑی تھیں۔ کون روڈروں، مسکڑ، ٹرک، بلڈوزر، جیپیں اور نہ جانے کیا کیا اٹالیا۔ کہیں لوہے کے گاؤں ترتیب سے چنے ہوئے تھے تو کہیں سرپے کے انار لگے تھے۔ غرضیکہ قوتی ریلوں میں استوال ہونے والا نہ جانے کیا کیا سامان اور کسی کی مشینری وہاں موجود تھی۔

خاوار تاروں کے اندر ہی ایک مقام پر گویا سا مسلمان کا حدود ختم ہو رہی تھی۔ اس سے آگے ترتیب سے چھوٹے بڑے اور تھلے ڈنگا گنگا قسم کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں چند ایسے کسے بھی نظر آ رہے تھے جیسے ایک حاضی رائلٹی گاہ تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

انور کا جائزہ لینے کے بعد میں نے لالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ پر عجیب سا نام ہے تمھارا۔ لالی کا مطلب تو خاوار مٹی

ہم خاردار حد بندی کے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا
اس میں تاروں ہی کے حال سے تیار شدہ ایک بڑا سا دروازہ
بھی تھا۔ جیسے کھول کر وہ چمکدار قسم کی شخصیت باہر آگئی۔ وہ اچھڑ
عمر تھا اور گویا مقابلہ ہو چکا ہو وہی میں جھٹ لینے کی تیاری کر رہا
تھا۔ اس کی مونچھیں کیا تھیں! بس دو صحت مند گھریلوں کی ڈمیں
تنی ہوئی تھیں۔

اس نے عجیب انداز سے ہمارا استقبال کیا۔ پتہ ہی پتہ نہ تھی
ہاتھوں سے لالی کو کھڑکتے ہوئے بولا: "اچھا... تو یہ ہے تیرا
یار جس کی خاطر تو کسی کو گھاس نہیں ڈالتی۔ میں بھی کموں یہ ہر
بہتر تھے پانچویں روز آدھی رات کو کیوں جنگل کی طرف دوڑی جاتی
ہے۔ آج اسے روشنی میں لے آئی یا پھر اس نے مجھے
مشرقی جہازہ بخشا اور غائباً زیرِ بونچھ فزیرہ انداز میں سکرایا۔ لونڈا
تو شکاک ٹھاک ہی تاڑا ہے... کڑیل جوان ہے۔ شکل صورت کا

کے انداز میں تعمیر شدہ چار کمرے موجود تھے جو کیدار نے ان میں سے ایک کے دروازے پر دستک دید۔ دستک اس نے آہستہ ہی دی تھی لیکن دروازہ جھکے ہوئے کچھ چادر کا تھا اس لیے رات کے سناٹے میں آواز کچھ زیادہ ہی بلند محسوس ہوئی۔

فورا ہی اندر سے ایک گونجی آواز آئی "کون ہے؟" صاحب جی! یہ آپ کا کوئی سمان آیا ہے، چوکیدار نے صرف اتنا کہا اور فوراً وہاں سے کھسک گیا۔ آواز سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ تھوڑا صاحب ابھی سوئے نہیں تھے۔ اس احساس سے میری کچھ حواس بندھی۔

کمرے کی چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی میں پرہے کے عقب میں روشنی نظر آنے لگی اور اسی لمحے کمرے کی پیشانی پر رنگا ہوا ایک بلب بھی روشن ہو گیا جس سے میں روشنی میں نہرا گیا۔ صبح کا دروازہ زنگ آلود تھنوں کی گھر رگھر کے ساتھ کھلا اور خوبصورت ٹائٹ گاؤن میں ایک پختہ عمر شخص میرے سامنے آن کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دیکھی جیسی مردانہ سی خوشبو کا جھونکا میرے تھنوں سے کھرایا۔

وہ ایک وجیرہ اور دراز قد شخص تھا۔ مجھ سے بھی کچھ نکلتا ہوا۔ رنگ سرخ و سپید تھیں اور لمبے لمبے بال جس اس وقت بھروسے ہوئے تھے، ان میں سفیدی غالب تھی۔ وہ بھاری بھر کم اور ملازم تھا، ابھی لوگوں میں سے ایک جن کا بڑھا پاپسی قابل رشک معلوم ہوتا ہے۔

"تو یہ میں تھوڑا صاحب! میں نے سوچا۔ وہ بھی بھروسہ جوازہ لے رہے تھے۔ پیشانی پر رنگین تھیں اور انداز سے سمان ظاہر تھا کہ وہ سوچ رہے ہیں۔ کیا ایسا بھی میرا کوئی سمان ہو سکتا ہے؟"

میں نے خاموشی سے مٹھل شاہ کا قدم ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے رقم پر بڑھا، ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر شاید از سر نو پورا رقم پر بڑھا۔ بالآخر انھوں نے ایک خویل سانس... ایسی سانس عموماً انسان اسی وقت لیتا ہے جب وہ گفتگو میں کھو دیا ہوا نکلا چرنا نہیں کہہ پاتا۔

انھوں نے انگلیوں سے اپنے منظر ہالوں میں نگاہ کی پھر دونوں ہاتھ گاؤن کی جیبوں میں ڈھونڈتے ہوئے بولنے لگی زندگی میں آئے مجھے تیس سال ہو چلے ہیں۔ آج تک میں نے ہزاروں آدمیوں کو ملازم رکھا ہے اور بڑے بڑے عجیب حالات میں بڑے عجیب آدمی میرے پاس ملازمت کی درخواستیں پیش کرتے ہوئے آئے ہیں لیکن رات کے اس پھر آج تک کوئی شخص اس طرح رقم لے کر ملازمت کے لیے نہیں آیا اور وہ بھی ایک

بھی بڑ نہیں... کہاں سے گھرا ہے یہ بکرا؟" میں اگر کوکری کی تلاش میں نہ آیا ہوتا تو اس کی رائفل اور تین و تون کی ہر ایکے بغیر اس توڑن آمیز طرز فکر پر میں اس کی مونچھیں اکھاڑ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا لیکن لالی نے اسی لمحے اسے جوتین چار فیصیح و بیغ قسم کی گالیاں دیں، وہ اس کے آباؤ اجداد کو روجوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھیں مگر وہ انھیں بڑے مبر و سکون سے پی لیا۔

لالی نے گالیوں کے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا: یہ میرا بار نہیں، بڑے صاحب کا سمان ہے۔ بارش میں راستہ بھول کر جنگل میں جھپٹتا پھر رہا تھا... اتفاقاً مجھ سے آکر آیا تو ادھر لے آئی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں نے اسے صحیح جگہ تک پہنچا دیا۔ آگے تم بڑے صاحب تک پہنچاؤ یا نہ پہنچاؤ تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ کہہ کر وہ مڑی اور اپنے اسی بیٹوں والے انداز میں گویا بکروں سے لیتی خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ ادھر کو چل دی۔ جدر خانہ پر وٹوں کے نیچے نظر آ رہے تھے۔

بڑے صاحب شان دو الفاظ میں گویا جاہد تھا جس سے چوکیدار نہ صرف ایک جھگڑے سے انسانیت کے جانے میں لگا ہوا بلکہ اس نے بڑ بڑا کر دونوں ایریاں جوڑ کر اور رائفل سیدھی کر کے مجھے ایک زوردار پلوٹ بھی دے مارا۔

زندگی میں میرے لیے پہلا گارڈ آف آڑ تھا۔ میں نے انسانیت تپا ک سے اس کا جواب دیا اور نہ صرف چوکیدار کی غلط کامی کو صاف کر دیا بلکہ اس سے گرجوشی سے معاملہ بھی کیا جس پر اس کی جان میں جان آئی۔

میں نے اس سے دھڑکتی کہ وہ فوراً مجھے تھوڑا صاحب کے پاس پہنچا دے تو اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا: صاحب! وہ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ وہ آج رات ہی خود کار ڈرائیو لے کر لہور سے یہاں پہنچے ہیں اور شاید ابھی سوئے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے تک ان کے کمرے میں جی جی رہی تھی؟ "بھئی ناراض ہوں گے تو مجھ پر ہوں گے تم نہیں مجھے پہنچا کر کھسک آنا" میں نے کہا۔ اس نے یوں سر ہلایا گویا یہ کوئی بے حد اہم کلمہ ہو جو بڑی مشکل سے اس کی کوئی عقل میں آیا ہو پھر اس نے مجھے پیچھے آگے کا اشارہ کیا۔

میں اس کی رہنمائی میں خاردار تاروں کی حد بندی میں قلعہ پزیروں کے درمیان پھرتا ہوا چل دیا۔ ایک جگہ میں نے لڑکا کی بیٹوں پر پہلی کتے موٹے موٹے تاج بھی تھے ہوئے دیکھے ہزار شاہید دور کہیں کسی کچھ سے مل سکتا تھے۔ بالآخر ہم اسی گوشے میں آ پہنچے جہاں عائشہ کی رائفل

کشی لے کر اس انداز سے کہا گویا ہمارے درمیان کافی دیر سے گفتگو جاری تھی۔ وہ بدعاش ابھی تک جیل نہیں پہنچا، میں تو ہر ملاقات پر اس کے بارے میں یہی پیشگوئی کرتا ہوں کہ ایک نہ ایک روز وہ جیل کی دوشیاں تو ڈرہا ہوگا، ان کے لیے میں اس بڑے بھائی کی سی شفقت تھی جو شریر چھوٹے بھائی کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

آپ کی پیشگوئی پوری ہونے میں بس تھوڑی سی ہی کسر رہ گئی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا: تاجا صاحب منہل کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر فکر مندی جھلک آئی۔

دیکھا ہوا تھا؟ انھوں نے تیزی سے پوچھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا حقیقت حال بتا دینے میں مجھے کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔ میں نے مختصراً انھیں سارا قصہ سنا دیا جس کے دوران ان کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے، منہل شاہ کے چپکلائے کی سن کر انھوں نے غیر محسوس طور پر انھیں کی سانس لی۔ بدعاش پنجابی گویا انھوں نے سکرانے ہوئے کہا: اب

معلوم نہیں کہاں گیا ہوگا عجیب ہی آدمی ہے۔ اس کا کچھ پرانا ہی ہوتا کس وقت کیا کر گزری۔ میرے پاس ہی آجانا۔ میں جا رہا ہوں روز بعد یہی جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ ہی چلے پڑا۔ کچھ آواز دلا رہا ہوگا؟ وہ مجھ سے نہیں گویا اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔

منہل شاہ کے قریب رہتے ہوئے اور اس کی بے تکلفی دیکھتے ہوئے مجھے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ کوئی خاص آدمی تھا۔ اس کے باصلاحیت ہونے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خاصے بڑے علاقے میں اس کے نام کا چرچا تھا لیکن میرے خیال میں اس وہ پس ماندہ علاقے میں لوگوں کو بے وقوف بنانے اور ان کے اعتقاد سے کھینچنے والا ایک شاطر آدمی تھا جس نے اس دھندے میں اور کچھ رزقوں سے کاف دولت کافی تھی لیکن مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا کہ بڑے کا موثر اور دولتمند لوگوں کے حلقوں میں بھی اس کی بے تکلفا: آشنائی اور دوستیاں ہوں گی کیونکہ میں نے اپنے مختصر سے دو ملازمت میں اس کے پاس کبھی کسی ڈھنگ کے آدمی کو آئے نہیں دیکھا تھا۔

میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کب کہاں اور کیوں منہل شاہ کے دوست بنے لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس قسم کے سوالات کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ تاجا صاحب جیسے اپنے خیالوں سے چرکتے ہوئے۔ "ویسے تم جو خوش قسمت۔ ایسے کو فتح پر پہنچے ہو جو کئی پلوں۔ تمہارے لیے مناسب ترین تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں

ویرانے میں اس قسم کے پروجیکٹ کے دوران اسٹاپ پر کیا تم جس تک انکار نہیں کر سکتے تھے؟

میں فحش سا ہو گیا۔ میرے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میں وقت کا احساس کیے بغیر اچانک ہی منہا کا شعل شاہ کے ڈیرے سے کیوں چل پڑا تھا۔ تاجا صاحب نے شاید میری خجالت کو محسوس کر لیا اور گویا اس کی تلافی کے لیے شفقتاً انداز میں مسکرائے۔ "خیر۔ اندر آنا۔ وہ مڑتے ہوئے بولے۔ میں ان کے پیچھے اندر چلا گیا۔

کمرے کو باہر سے دیکھ کر میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا اندر سے وہ اس سے بہت مختلف تھا اور بے حد وسیع بھی۔ وہ ایک صاف ستھرا کباڑ خانہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک کونے میں تپانی پر ایک بڑا سا سوٹ کس کھلا پڑا تھا جس سے نفیس قسم کے بلوسات جھانک رہے تھے۔ ایک طرف اسٹیشنر پر کچھ ہینگے لٹکے ہوئے تھے جن میں سے دو پرسوٹ اور ٹائیاں موجود تھیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے نقشے آویزاں تھے۔

ایک میز پر غالباً پلاسٹک پر اس سے بنے ہوئے کچھ ماڈلز بھی رکھے تھے۔ ایک گونے میں موٹے سے میز پر بس والا بیڈنگ ہوا تھا جس پر ولایتی کپڑوں سمٹ ہوا پڑا تھا جیسے کوئی چیتا گول بول سا ہو کر گھات لگانے بیٹھا ہو۔

کمرے میں سب سے زیادہ بڑی چیز ایک میز تھی جس پر ایک ٹیبل لیپ، روشن تھا اور دنیا بھر کے کاغذات، فائلیں، راجر جڑا کرتا تھا۔ نقشے، اسٹیشنری اور رزبانے کیا کیا ابلا قسم کی چیزوں کا انبار تھا۔ ایک کھلی فائل پر مڑنے سے فریم کی نظر کی دینگ بھی پڑی تھی۔ کمرے میں ادھے کے فریم کی کئی کرسیاں بھی موجود تھیں۔ تاجا صاحب نے میز سے ایک ڈبا اٹھا کر ایک سگار نکال کر سٹرے لائٹر سے سلگا یا اور اپنے بیڈ پر جا بیٹھے۔ مجھے انھوں نے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کپڑے کا تھیلہ میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ تاجا صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ اپنا دیا تھیں والا شہر مارک تو کہیں رکھ دیا اس میں کوئی بہت سی قیمتی چیز ہے؟

میں نے قہرے کھینا نا ہو کر تھیلہ ایک کرسی پر رکھ دیا جادھا گویا میری حالت سے منظور ہو رہے تھے اور جان بوجھ کر ایسے جملے بول رہے تھے۔ ہنسی ان کے ہونٹوں کے گوشوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ ان کے کمرے سے استغناء یہ فقرے بھی بڑے محسوس نہیں ہوتے تھے۔ وہ کافی خوش مزاج آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کوئی اتنا زیادہ بات کرتے تھے تو جمل پھن کر نہیں کرتے تھے۔

"تو تعصیب منہل شاہ نے سہیما ہے۔" انھوں نے سگار کا

بولے: ”بجائے اس کے کہ تم اور سائٹ انجنیر صبح اٹھ کر ایک دوسرے سے خنزیری کرفٹیں نہیں تھرا کر کام بھی ابھی خود ہی بکھا دیتا ہوں“

وہ اٹھے اور بڑی چیز پر بکھرے ہوئے انباروں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر انھوں نے زرد رنگ کا ایک کارڈ نکالا جس پر غائب بنے ہوئے تھے۔

”میدان میں تھاری میزنگی ہوا کہ کسی اور صبح اٹھ بیچے تمام مزدور تھکے سائے سائے قطار میں کھڑے ہوا کر س گئے و تھاد صاحب کارڈ پر سے سائے رکھتے ہوئے بولے: ہر ایک کے پاس ایسا کارڈ ہو گا جس پر اس کا نام و غیرہ درج ہو گا۔ ہر تاریخ کے غائبے میں اس کے کام کے اوقات اس طرح درج کیے جائیں گے انھوں نے قلم کے کنبھے بھجانا شروع کیا اور پھر کہا: اس کارڈ کو دیکھ کر یہی شیئر ہر مزدور کو ادا کیلئے کرے گا“

پھر انھوں نے مجھے وہ تمام ضروری باتیں بتائیں جن کا مجھے خیال نہ تھا۔ وہ یقیناً ایک کامیاب انڈسٹری تھے۔ میں ان کی کپڑی میں ایک مولیٰ کارند دھننے والا تھا۔ مگر وہ اس انماک سے مجھے میرا کام بکھا رہے تھے۔ گویا ان کی کپڑی کا سارا دار و مدار ہی مجھ پر ہو۔ آدھے گھنٹے میں میں سب کچھ سمجھ گیا۔ بلکہ مجھے عموماً ہونے لگا کہ میں کافی عرصے سے تھاد انڈسٹری میں ٹائم سپر جلا رہا ہوں۔

جب تھاد صاحب کو اطمینان ہو گیا کہ میں کام سمجھ چکا ہوں تو وہ بولے: ”اب اس وقت میرا خیال ہے کہ کسی اور کو جگانا تو مناسب نہیں۔ تم ایسا کرو کہ میرے پیشے کے نیچے ایک گڑا اور کبیل پٹشا ہو جاوے۔ وہ نکالو اور فرض پر پھانک کر انی الحال ہو جاوے۔ صبح میں تھاری رہائش کا انتظام کرو دوں گا۔ خیال ہے کہ صبح تھیں ڈیوٹی نبھانے پر مجھے اندھیرے اٹھ جانا ناگہان آرام سے تیار ہو سکو اور گھوم پھر کر تمام ضروری چیزیں اور میاں کا کاحول

موجود ہوں اور آج ہی پہنچا ہوں۔ ورنہ میں کبھی کبھار ہی یہاں ہوتا ہوں۔ میرا گھرا بور میں ہے اور عام طور پر ایک وقت میں پلہ ربات پر میرا کوئی نہ کوئی پڑ چیکٹ نہ کیٹیکل ہوتا ہے۔ میں کام اور ربات کا جائزہ لینے کے لیے اچانک ہی دو چار دن کے لیے بون کسی سائٹ پر اور کبھی کسی سائٹ پر جا پہنچتا ہوں۔ زیادہ تر میں دفتری کاموں اور ٹیکوں کے حصول کے سلسلے میں مصروف رہتا ہوں مگر میں یہاں موجود نہ ہوتا تو محض اس رقبے کی بنیاد پر وہی تمہیں گھاس نہ داتا۔ دوسری اہم بات یہ کہ آج تھے ہی مجھے ایلی ٹریپ سینسے کو ملی ہے کہ ٹائم سپر بھاگ گیا ہے۔ کثیر الشفاق سے بچتی رہتا۔ وہ جاتے جاتے ٹائم سپر کو اختیار دے گیا کہ زوروں کو اس ہفتے کی مزدوری دی ادا کر دے کیونکہ کارگزاری احباب بھی اسی کے پاس ہوتا ہے۔ ایک ہفتے کی ضروری وغیرہ صرف نہیں ہزار کی رقم تھی۔ ٹائم سپر نے اسے ہی قیمت بھگاد لے کر بھاگ گیا۔ نقصان کو جو ہوا سو ہوا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ٹائم سپر کے نہ ہونے سے بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ مزدور بلی اور خنزیری پر اتر آتے ہیں“

وہ بہت روانی سے بات کرتے تھے۔ میں ان کے خاکے کے بہاد میں تھا کہ اچانک انھوں نے بوجھ لیا کہ تم کتنا رہتے ہوئے ہو؟

”ایک سال سے نہ میں نے منجھل کر کہا۔

”اوہ... تم تو خاصا پڑھے ہوئے ہو بخوبی وہ سکاٹے۔ میرا کام تو براڈری پاس سے بھی چل جاتا۔ خیر... اچھا ہی ہے مارے لیے ترقی کے مواقع موجود رہیں گے پس تو سمجھ لو کہ انکی اور اسی وقت سے اس پر وچیکٹ پر میری پستی کے اظہار ہو گئے۔ تنخواہ تھاری سات سو روپے مینہ ہوگی۔ رہائش لے لیے بھی نہیں کہیں ایک عدد حیمہ مساکر دیا جائے گا کھانا اور دیگر اخراجات تھکے سے اپنے ہوں گے۔ یہاں ہماری ف کے پڑاؤ کی وجہ سے قریب ہی کھوکھوں میں تقریباً ہر چیز بخوبی چھوٹی دکانیں کھلی ہوئی ہیں ضرورت کی ہر چیز تمہیں بچا کر سے گی۔ اس ورلڈ میں یہ ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہے اگر تھاد دل لگ گیا اور تم نے ویاتمداری سے کام کیا تو سال کے لیے تو تھاری نوکری پکی ہے۔ دو سال بعد میرا خزانہ کم ہو جائے گا۔ کام مکمل ہو جائے گا۔ ہر حال اس کے برعکس اگر تھاری مرضی ہوئی تو میں تمہیں اپنے کسی دوسرے بھائی پر بھرتی دوں گا۔ ٹھیک ہے؟ تمہیں منظور ہے؟“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا۔

تھاد صاحب ایک بار پھر خود کھائی کے سے اترائیں

50/-	قر تسکین	اسلام کے نامور مجاہدین
40/-	قر تسکین	اسلام کی نامور خواتین
75/-	قر تسکین	سومسلمان مشاہیر
35/-	قر تسکین	ملک کی عورتیں

ای غیر متوقع طور پر غائب ہو جائے، دوسرا سیٹھے ان کے دربار میں
ہے۔ آپ کو نہ کہیں، اشتہار دینا پڑتا ہے، نہ کہیں کارکن کی تلاش
کرنا پڑتا ہے اور سچی کمری سے ذکر بھی کرنا نہیں پڑتا۔

یہ سب اور بولنے کا کمر ہے۔ و سجاد صاحب نے اگلے
آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: شاید اس کی وجہ یہ ہے
کہ میں خود بھی کسی کو نہیں دیکھتا۔ جاننے والا عموماً خود ہی ہوتا
ہے اور اکثر مجھے کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا کر جاتا ہے لیکن میں
بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ
خود ہی میرے مفادات کا خیال رکھتا ہے۔ پریشانی چھوٹی ہو
بڑی میں اس سے بچو، وعافیت نکل ہی آتا ہوں۔

اس کے بعد سجاد صاحب نے ایک شخص کو میری ہاتھ
دغیرہ کے بارے میں کچھ ہدایات دیں اور خود دیگر لوگوں کے
ساتھ اصل سائٹ پر روانہ ہو گئے۔ وہ شخص جس کا نام محمد نواز
تھا، مجھے اپنے ساتھ میدان میں لگے ہوئے ایک چھپر کی طرف
لے گیا جس کے نیچے لوہے کی ایک چھوٹی سی میز اور کچلا

تھی۔ میز پر ایک رجب اور قلم، سیٹھ دغیرہ بٹسے تھے اور سائے
مزدوروں کی بہت سی قطاریں لگی ہوئی تھیں جس میں خانہ بدوش عورت
بھی شامل تھیں۔

جانے کیوں یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا
کہ قطار میں سب سے آگے لائی کھڑی تھی وہ بھی اپنے زر
بیر کا ڈاکوٹا ہونٹوں میں دبائے ہوئے گہری گہری نظروں سے
میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ دن کی روشنی میں وہ گورن
رات کے کہیں بہتر خوش شکل اور پرکشش نظر آ رہی تھی لیکن
پھول کی طرح جو معمول میں نقشہ بدلا ہوا ہو۔

میں جانے کہاں کہو گیا تھا اس وقت چونکا جب
ساتھ آنے والے شخص محمد نواز نے کہا: آپ یہاں بیٹھ کر
کام کروں اس کے بعد میرا کام شروع ہو جائے گا۔ میں ان کی
کی نگرانی پر مامور ہوں۔

میں کرسی پر جا بیٹھا، قلم منہال کر جب میں نے ان کی
کے سامنے محنت کشوں کی اتنی لمبی قطار کو دیکھا تو دل پر
بڑا با اختیار اور کوئی نہ کر سکتا قسم کا افسوس کیا۔ لال نے
میری طرف بڑھایا اور جیسے سے مجھے میں کہا: تو تم ہوا
نے نام کبیر تم تو خود ٹائم نہیں آئے۔ ہمارا نام کیا ہے
"ہلال دن تھا نا؟ میں نے مندرت خرابا نہ ہے
میں کہا: گویا مجھے کسی افسر نے جھڑپلائی ہو، تم یہاں لگا کر
"میں یہاں پتھر توڑتی ہوں۔ اس نے ملی میٹر
کے ساتھ جواب دیا: اور ساتھ ہی ان لوگوں کی کھوپڑیاں

دیکھ سکوں۔ میں بھی مندر اندھیر سہمی اٹھتا ہوں۔ اگر وہ نہیں دیکھ سکتے
تو براہمت مٹاتا۔

کبھی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں ان کی انکساری سے
شزدہ ہوتے ہوئے بولا: اگر آپ حکم دیں تو میں سوئے بغیر
بھی گزارا کر سکتا ہوں۔

"میں اب اپنے ملازموں کو اتنا بھی مستعد دیکھنا نہیں
چاہتا، انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کبل پیٹ کر کوٹ
لیتے ہوئے بولے: "سوئے سے پہلے ٹیبل لمپ بچھا دینا۔"
میں نے ان کے بیڈ کے نیچے سے کبل اور گڈانکال کر
ایک گوشے سے کچھ چیزیں ہٹا کر بچھایا اور لیٹ بچھا کر سونے
کے لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ
مجھے اس دوسری نوکری میں بھی اس غیر روایتی ملاقات پر طبیعت
میں سرکشی تھی اور میں محسوس کرتا تھا کہ میں روایتی قسم کے پاس
جس کے مزاج میں حاکمیت اور غرے بازی کا فطریہ ہونے کے
پاس نوکری نہیں کر سکتا۔

میری خواہش تھی کہ صبح مندر اندھیر سے میں خود ہی اٹھتا لیکن
مجھے سجاد صاحب نے ہی جگایا۔ ایک نوکران کی خدمت میں
ان موجود ہوا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ روم وغیرہ دکھایا۔ اسٹاف
کے خاص خاص آدمیوں کے لیے دو الگ الگ سٹم باٹھ رہی تھیں
کبھی کچھ موجود تھا۔

نوکر ہی نے میرے لیے نامشتہ تیار کیا، میرے کپڑے
استری کیے اور جب میں سجاد صاحب سے بیڈنگ ٹاگ کر شیو
بنکر تیار ہو کر ان کے ساتھ ہی باہر آیا تو ہلوق اور دیوانی میں
خاصا بھار اور سلیقہ مندر شری معلوم ہو رہا تھا۔

میں اور سجاد صاحب باہر آئے تو بہت سے افراد غاردار
تاروں کے پاس کھڑے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ
اپنے اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہیں۔ سجاد صاحب نے
ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں کوئی ساٹھ، اسی، چھتر، چھتر
کوئی مریو، کوئی ڈیڑھ سین کوئی اسٹور کپڑ کوئی اکاونٹنٹ کوئی کیشیئر
اور نہ جانے کون کون۔

سجاد صاحب نے ساٹھ انجینئرز جن کا نام سہانی تھا، کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہاں اصل پاس یہ ہیں۔ تقریباً
سب لوگ ان کو جواب دے رہے ہیں۔ میں تو کبھی کبھی آتا ہوں۔
سہانی صاحب خاصے بارے میں آدمی معلوم ہوتے تھے
اور بچے تھے، انداز میں مسکراتے تھے۔ وہ اپنی نفل میں دبے
ہونے کا غفلت کا پلندہ درست کرتے ہوئے بولے: "وہ سجاد
صاحب! آپ ہیں خوش قسمت آدمی سب کا کوئی بھی کاہنہ کہتے

خانہ بدوشوں کے خیمے تو بہت زیادہ تھے لیکن ان میں سے بہت کم لوگ مزدوری کرتے تھے۔ باقی نہ جانے کیا کر رہے تھے کوئی کھانہ بیارہج کرنا تھا۔ کوئی بھیک مانگتا تھا اور کوئی کچھ اور تاہم زیادہ تر لوگ جن میں بچوں والی عورتیں بھی شامل تھیں علی الصبح خیموں سے نکل جاتے تھے اور نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے تھے شام ڈھلے واپس آتے تھے۔

لالی اپنے خیمے کی طرف جا رہی تھی اس کے ایک اٹھ میں ہتھوڑی تھی اور دوسرے پر بریکر پٹیاں لپیٹی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر گری گری نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی گزری۔ میں نے محسوس کیا کہ جب وہ اس انداز میں میری طرف دیکھتی تھی تو مجھ پر ایک عجیب بے خودی سی طاری ہونے لگتی تھی۔ میں گرد و پیش سے بے نیاز سا ہو جاتا تھا اور آسمان اور زمین کے درمیان کہیں بکھرے لیٹے لگتا تھا۔ ایک عجیب سا جادو تھا اس کی آنکھوں میں۔

”کھانا کھانے جا رہی ہو؟ غیر ملکی طور پر میں نے پوچھ لیا۔
”ظاہر ہے“ وہ تھکے سے لہجے میں بولی۔ ریلے ہونٹوں کے گوشوں سے ہنسی پھلکی پڑ رہی تھی؟ ہمارے خیمے میں انسان کھانا کھانے جا سکتا ہے یا پھر سونے۔ اور تو وہاں کوئی ایسی تفریح ہے نہیں جس کے لیے کوئی دوڑا جائے یا پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی ”چاہا ہو تو تم

جو بھی اکیلے ڈبکی یا کر چیئر نے کی کوٹش کرتے ہیں؟
دفعۃً اس کے عقب سے کوئی شخص بھٹکاتے ہوئے لیے میں بولا ”اری اب ہسٹ ہیں۔ جو بھی ٹائم کپڑا ہے اس سے لمبی لمبی باتیں شروع کر دیتی ہے۔“
لالی نے مرکز قہر آلودی نظر سے اس شخص کی طرف دیکھا اور دانت پیس کر بولی ”صبح ہی صبح میں تیرے منہ نہیں لگا جاتی۔ سارا دن غلاب گزرے گا۔“

میں نے اس کے کار پر وقت کا انداز اور دستخط کر دیے اور وہ اس میدان کی طرف چل دی جہاں بڑے بڑے پہاڑی پتھروں کے انبار تھے۔ قریبی پہاڑیوں سے یہ پتھر توڑ کر یہاں لاتے جاتے تھے اور مزدور انھیں توڑتے تھے۔ ڈھیر بال لگتی رہتی تھیں اور بعد میں مرکز انھیں قریب ہی سائے پر پھانتے تھے۔

میں کام سے جلد ہی فارغ ہو گیا ہتھوڑا سا پیور ورک لگی میرے فٹے تھا۔ اسے مکمل کرنے کے بعد میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا لیکن زیادہ دیر بیٹھا میرے پس کی بات میں تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں کھینچنے لگتے تھے۔ چنانچہ میں ذرا مائل ہاتھ روٹھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

سجاد صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہاں واقعی ایک عجیب سی دنیا آباد تھی کہیں مزدور پتھر توڑ رہے تھے کہیں لوگوں پر لٹائی ہوئی تھی اور کہیں اتروائی انسان اور شیپیں ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا رہی تھیں۔

ایک طرف قطار میں کچھ کھوکھے تھے جن میں ناٹی، کچرا، نعلانی سب ہی موجود تھے کسی اور کی جگہ کھڑے ہو کر مل سائے کر بھی دیکھا جا سکتا تھا جہاں نہ کارخ موڑ کر مکمل کی کباب ڈالنا جا چکے تھے۔ یہاں کی سیدہ میں دور سے مرکز بھی نہتی آ رہی تھی جن کا کافی کام مکمل ہو چکا تھا۔ دور ایک طرف ایک کپے لٹے پر ایک بس ٹوچل اُٹان جا رہی تھی۔ اس کی چھت پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور بس کسی بدست باقی کی طرح جھوم رہی تھی۔ سڑال بھی غالباً اس زمانے کا تھا جب ابیں نمی نمی ہوا ہوئی تھیں۔ اس طرف غالباً قریب ہی کہیں آبادی بھی جھڑپیں جا رہی تھی۔

میں جب راؤنڈ مکمل کر کے آیا تو کھانے کا وقفہ ہو چکا تھا۔ سڑال سر پر آچکا تھا اور دھوپ میں تیزی لپٹتی تھی۔ مخمور لڑکے بیٹھے تیار تھا کہ کچھ مزدور قریبی آبادیوں سے آتے تھے غالباً دیکھا اس وقت ایک طرف درختوں کے نیچے بیٹھے لوگ کھلے لگا کھا رہے تھے۔

جالب کی شعری سیاسی جدوجہد کی معتبر و موثر دستاویز

جالبہ انصاف کا طالب

مرتبہ: ضیاء ساجد

قیمت: =/100

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

طاعن
ڈاکٹر ایم اے قریشی
 ۱۳ حصے
 مکمل سیٹ - ۶۵/-
 مکتبہ القریش، سرگھر روڈ، اُردو بازار، لاہور

گتا ہے۔ میرے لیے بس اتنی ہی کافی ہے کہ گھر بیٹھے ہی بابا کی دہشت دور دور تک پہنچی ہوئی ہے۔ زبان نکالی تو لوگ مجھ سے پتھر چھوڑ کر لپکتے ہیں یا دو گالیاں دے کر چار بجے سے لپکتے ہیں لیکن اس سے آگے بڑھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا جس نے بھی ایسی ویسی کوئی کوشش کی وہ بعد میں مہینوں کمر پر ہاتھ رکھ کر روتار ہا۔ ایسے موقعوں پر بابا پیلیوں کا درد بھولی جاتا ہے اور ایسے آدمیوں کو کلکڑی کی طرح درمیان سے توڑنے پر تیار ہوتا ہے۔ بابا ہی کے بھروسے پریشانی جی بے خوفی سے منہ بٹھائے اچھر اچھر پھر کر رہتی ہوں۔ وہ اس دورانیے میں کب کا کوئی بیٹھ جائے گا کیا ہوتا میرا مطلب ہے وہ انگوٹھا بیٹھ جائے گا۔ بے شک۔ بے شک۔ میں نے ٹائید میں سر ملایا۔ اس دوران کا ناختم ہو چکا تھا۔ آخر میں بابا فاسٹ ہوا تھا۔ وہ کپڑے سے ہاتھ لہو پھٹے ہوئے بولا "دلے کوئی زیادہ ہی سنگین مسئلہ آن پڑے تو میرے پاس ایک بندوق بھی ہے۔ آٹھ دس کے لیے تو میں نہتا ہی کافی ہوں" اس کے اس خیال سے میں متفق تھا۔

مجھے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح متاثر کرنے کے لیے اس نے جھاک کر تخت کے نیچے ہاتھ ڈالا اور نہ جانے کہاں سے کھینچ کھانچ کر ایک بندوق نکال کر پہلے تو مجھے یہ جاننے کے لیے کہ وہ بندوق ہی ہے، انگوٹھ پر کافی زور دینا پڑا۔ اس کی حالت بتاتی تھی کہ شاید پہلی جنگ عظیم کی پہلی گولی ہی سے چلائی گئی تھی اور اب اگر اس سے کوئی گولی چلائی گئی تو وہ چلانے والے کی زندگی کی آخری گولی ہوگی کیونکہ اس کے بعد نہ بندوق رہے گی اور نہ چلانے والا۔

"بابا! انسانہ کیسا ہے تھکا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

"نشانے کی مہم پر چھو" وہ پیار سے بندوق پر ہاتھ پھرتے ہوئے بولا "اڑتی ہوئی کبھی کو نشانہ بنا سکتا ہوں"

"دلے! آپس کی بات ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا "تو تھی ہوئی کبھی نظر آجاتی ہے تمہیں؟"

ہاتھ میری گرفت میں نہیں آ رہا تھا اور اس کا قدم بھی چھڑے نکلتا ہوا تھا۔ مصافحہ کرتے وقت اس کے انداز میں معمولی سی اکساری تھی۔

اس نے مجھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے بری ہی نہیں میرے بال بچوں کی خیریت بھی دریافت کی۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ بچے تو کیا ابھی بچوں کی توقع میں کابھی کہیں دور دور تک پناہیں ہے تو اس نے گویا غیر محسوس طور پر قدمے اطمینان کی سانس لی۔

بابا کھانا تیار کر چکا تھا۔ لالی نے وقت ضائع کیے بغیر تخت پر کھانا سما دیا اور ہم تینوں ہی کھانے بیٹھ گئے۔ خاصا معقول کھانا تھا۔ کھانے کے دوران باتوں کا دور چل رہا تھا۔ لالی تقریباً ہر نوالے پر میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھی اور جانے کیوں ہر بار اس کی آنکھوں میں شوخی سی جھلک آتی تھی۔

بابا بہت جلد بے تکلف ہونے والا آدمی تھا اور ایسے آدمی مجھے بہت پسند تھے کیونکہ میں خود انھی میں سے تھا جیوں انگلی تھام دی جائے تو جلد ہی وہ پینچے تک جا پہنچتے ہیں۔ یہی بے تکلفی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا "بابا! تم کام کیوں نہیں کرتے؟"

مجھے بجا طور پر حیرت تھی کہ بابا جو پتھر تو کیا تھوڑی بہت کوشش سے چٹانیں بھی توڑ سکتا تھا وہ تو گھر میں بیٹھا دولی ہانڈی اور جھاڑو برتن کرتا رہتا تھا اور وہ دلہا ہے یہ کام زیب دیتے تھے جا کر دن بھر پتھر توڑتی تھی۔ وہ اپنی کومل ہوائی گوسنگ وخت کی نذر کر رہی تھی۔

"میں اسی لیے لوگوں سے ہٹے ہوئے کرتا ہوں" وہ گہری سانس لے کر بولا "کہ وہ کسی نہ کسی موقع پر مجھ سے یہ وال ضرور کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میری پیلیوں میں درد رہتا ہے۔ اس لیے میں نے لالی کے حصے کا کام سنبھال لیا ہے اور اپنا کام لالی کو دے دیا ہے۔ ویسے بھی لالی کی ماں اسے بچوئی ہی چھوڑ کر مر گئی تھی۔ تب سے مجھے گھر دار کی عادت ہی بھی پڑ گئی ہے"

"لیکن پتھر تو ہاتھوں سے توڑنے پر تھے ہیں پیلیوں سے نہیں" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم! ابھی میری عمر کو نہیں پہنچے کاکا! وہ دولہا چاہتے ہوئے بولا "تمہیں نہیں معلوم پیلیوں کا درد کسے کہتے ہیں کوئی بچی تخت کا کام مسلسل اور زیادہ دیر کروں تو بڑی تکلیف میں پڑ جاتا ہوں" اس کا لہجہ ہمدردی طلب تھا۔

"میں نے ہی بابا کو گھر بٹھا دیا ہے۔ لالی نے گویا باب کا لٹا کر لیا۔ مجھے سخت غمت کرنا اور گھر سے باہر کام کرنا اچھا

کی وجہ یہ تھی کہ آتے وقت ہمیں اکاؤنٹ لوگ دیکھ رہے تھے اور اب میرا اندازہ یہی تھا کہ سب لوگ واپس آچکے ہوں گے، میں نے یہی سوچ کر خود بھی اس کے ساتھ جانے کی کوشش نہیں کی۔

بابا اس دوران بڑے انماک سے اپنے حق کی جملہ تباہ کر رہا تھا۔ علم حق پر رکھ کر وہ دوبارہ میرے پاس بیٹھے ہوئے بولا "دوسرے کا کھانا کھانے تو تم روز نہیں آجلیا کرو گے، کھانا تو بڑا واہیات ہوتا ہے۔ لالی کو تو غیر میرے ہاتھ کا کھانا بھی کچھ زیادہ پسند نہیں..... اس کی وجہ تو یہ ہے کہ وہ خود بہت اچھا پکا لیتی ہے۔ اس لیے کسی دوسرے کے ہاتھ کال کے من کو نہیں بھاتا، لیکن تم ایماندار سے کہو کہ میں غراب پکاتا ہوں؟" "ہرگز نہیں" میں نے واقعی دیا تدار سے کہا میرے اس خیال کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں اس سے بھی کم از کم زیادہ غراب کھانے کا چکا تھا۔

ٹھیک دو بجے میں بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ بابا نے ایک بار پھر اپنی پیشکش کو دہرایا تو میں نے ازراہ تکلف کہا "روز روز آنا اچھا نہیں لگتا بابا! آدھی بوچھڑ بن جاتا ہے" حالانکہ دل پر ایسی چاہ رہا تھا کہ اس سولت پر خدا کا شکر اور بابا کا شکر یہ ادا کروں اور پھر لالی جیسی میزبان میسر ہو تب تو دن میں ایک بار کیا دس بار آئے کوئی چاہتا ہے۔

"کھانے کا کوئی بوچھڑ نہیں ہوتا، برعکس وہاں بابا نے خلافِ عادت گری نجدی کے کما کھانا سب اپنے ہتھ پر کھاتے ہیں اور پھر دو آدمیوں کے کھانے میں تیسرے کی بچائش تو نکل ہی آتی ہے۔ بشرطیکہ وہ قیصرانہ جیسا نہ ہو" وہ تو نہ پر ہاتھ پیرتے ہوئے مسکرایا۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا اور واپس آگیا۔

محمد نواز میری میز کے قریب میرے انتظار میں ہی کھانا تھا۔ میں بیٹھ کر اس سے پوچھ کر ہر شے میں سب مزدوروں کی حاضری مل کر چکا تو وہ شریعتی کنواری لڑکیوں کی طرح ناخن کرتے ہوئے بولا "صاحب! بڑا ناہن تو ایک بات کروں؟"

مجھے کافی حد تک اندازہ تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے غمی منی حکم کا سا لہجہ اختیار کر کے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تھیں جو کچھ کھانا ہے بلا خوف خطر کو محمد نواز؟"

وہ اپنی بنیدگی کے شے میں گرفتار تھا۔ میرے لہجے سے ذرا بھی غلطی ہوئے بغیر دستورِ وادع کرتے ہوئے بولا "آپ یہاں نے ہیں جی... جیلے جاس معلوم ہوتے ہیں... میں آپ کو اپنا کچھ کر مشورہ دینا چاہتا تھا... یہ جرنل کی ہے لالی! اس کے چکر میں آپ نہ پڑیں، اس کا کام ہی مزدور

"مذاق مت آڑو گا کا؟ وہ خوش دل سے بولا "نکمری اب بھی تم جیسے جوانوں سے بہتر ہے" یہ کہتے ہوئے وہ تخت سے اتر آ اور نیچے دکھا ہوا پانی سے جھلا ہوا گلاس اس نے ٹھوکر مار کر گرا دیا کیونکہ وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔

"بابو صاحب! آپ کے لیے چائے بناؤں؟ لالی نے پوچھا۔ وہ جب مجھے بابو صاحب کی تھی تو میری نس نہیں گویا جلتی ہوئی تھی۔

"چائے میں بالکل نہیں پیتا" میں نے کہا۔ چائے کے آخر میں جان من کہتے تھے میں بروقت رک گیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ زبان کو سر پر یک لگ گئی تھی۔ مانا کہ وہ بے تکلف لوگ تھے لیکن اب پہل ہی ملاقات میں اتنا زیادہ پھیلنا بھی اچھا نہیں تھا۔ بابا کی بندوق خواہ بے ضرر تھی بابا خود تو بے ضرر نہیں تھا بلکہ بندوق کے بغیر وہ زیادہ خطرناک تھا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟ لالی نے پوچھا۔

"پونے دو" میں نے گھڑی کا شیفر نہیں کے دامن سے صاف کرتے ہوئے بتایا۔

"کھانے کا وقفہ ختم ہو رہا ہے۔ اب چلنا چاہیے" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جب تک ہم نام کبیر ہیں تھیں وقت کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں ایک بار پھر جان من کہتے تھے وہ کہ گیا۔

ایک تو بعض اوقات کوئی نفع جانے کیوں دہن میں پھنس کر رہ جاتا ہے جیسے ریکارڈر سوئی لگ گئی ہو۔

"مربانی ہے آپ کی؟ وہ میرے شانہ لہجے کے جواب میں مغلیہ دور کی کینزوں کی طرح آداب بجالاتے ہوئے شرارت سے مسکرا کر بولی "لیکن وہاں دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں؟"

بدنام کرتے ہیں؟

"دوسرے لوگوں کی ایسی کیسی بیٹھ بیٹھے وہ جو کہتے ہیں کہنے دو۔ بیٹھ بیٹھے تو لوگ بادشاہوں کو بھی گایاں دے لیتے ہیں بلکہ اچھا ہے اس طرح ان کے دل کا کچھ غبار نکل جاتا ہے۔

میں نے کسی نے کچھ کہا تو میں اس کے دانت نکال دوں گا اور اگر کوئی مجھ سے زیادہ طاقتور ہوا تو بابا کو بلالوں گا۔ میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "وہ کسی کو کیا معلوم کہ میں تمہارے کارڈ پر کیا وقت دے کر رہا ہوں؟"

"اچھا بابا! ام بابو لوگوں کو تو باتوں کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں تو پہلے وہ ہاتھ جوڑ کر بولی اور شیخے کا پرہیز کر

باہر چلی گئی۔ میں نے غمگس کیا کہ وہ میرے ساتھ اپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ آئے ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔ شاید اس

سے کھانا کھلا کر وہ جو پر جو احسان کرتے تھے، اس کا بدلہ کھانے کی میں اس طرح کوشش کرتا تھا کہ کبھی پکانے کے لیے مرغی، بھلی یا کوئی اور اچھی چمبہ نہ ملتا تھا۔ جو ویسے ان کے ہاں نہیں پکیتی تھی کبھی مٹھائی کا ڈنبا بھلے جاتا۔ مٹھائی لالی کو بہت پسند تھی حالانکہ وہ خود مصری کی ڈلی تھی۔ کبھی میں بابا کے لیے منگنی گسٹریٹ کا بیکٹ لے جاتا، جنھیں وہ بڑے اہتمام سے پیتا اور کوشش پر لویوں وہ واہ کرتا جیسے کسی صاحبِ ذوق نے کوئی عمدہ شعر سن لیا ہو۔

بابا اس حد تک بے تکلف ہو چکا تھا کہ کبھی کبھی دو چار روپے ادھار بھی مانگ لیتا تھا اور میں اسے دو چار کے بجائے دس میں دے دیا کرتا تھا اور یہ ایک ایسا ادھار تھا جس کے متعلق ہم دونوں کو ہی معلوم تھا کہ کبھی چکا یا نہیں جائے گا۔

ان سب باتوں سے میرا قصد محض احسان کا بدلہ چکانا نہیں تھا بلکہ میں ان غنائتوں کے بوجھ تلے اس بھاری حکمِ حضرت کو دوبارے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بھی اللہ کا بندہ ایک ہی شاہکار تھا اس شانِ بے نیازی سے میرے تمام خدائے قبول کرتا تھا جیسے میری آنے والی نسلوں پر احسان کر رہا ہو اور محض میرا دل رکھنے کے لیے انھیں شرفِ قبولیت بخش رہا ہو۔

ایک بار مری انداز میں میں نے باپ بیتی کے سامنے سابقہ قائم کپڑا کا ڈکھیر چھرتے ہوئے کہا: سنا ہے وہ بھی دوپہر کا کھانا آپ ہی کے ہاں کھاتا تھا؟

میرا خیال تھا کہ بابا پہلے تو پوچھے گا کہ تمہیں کس نے بتایا؟ پھر وہ تردید کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کے برعکس وہ بلا تاثر بولا: ہاں کھاتا تھا۔ اس کے پھولے پھولے چہرے پر میں نے پہلی مرتبہ جتنی دوسری کے آثار دیکھے: ہم نے اسے بھی پر دلی جان کر اپنی مروت اور جذبہٴ ممانِ نوازی سے مجبور ہو کر اسی طرح کھانے کی دعوت دی تھی جس طرح تمہیں دی گئی تھی وہ بدبخت بھگا کہ کھلنے میں لالی بھی شامل ہے۔ وہ جلد ہی اس پر بھی اٹھ مٹھ صاف کرنے کی نگرانی میں ہوا گیا۔

لالی کے گدھی رخساروں پر وہی سرخی دھڑکنی اور اس نے یوں باپ کی طرف دیکھا گویا کہ مری ہو بابا! کاش قرابے بے ہودہ انداز میں گفتگو کے عادی نہ ہوتے؟

بابا کے تاثرات اور لب و لہجے کو محسوس کرتے ہوئے ایک بار تو میں بھی اپنے بارے میں سوچ میں پڑ گیا کہ کبھی میں بھی اپنی شامت کو تو دعوت نہیں دے رہا؟

لالی میرے ذہن پر اس حد تک سوار ہو چکی تھی کہ زیادہ دیر سے مجھے دھت اور کھپا بھی لالی نظر آتا تھا۔

کو بے وقوف بنانا ہے۔ وہ جو کھلے ٹائم کبھی تھکا نہ رہتا، وہ جی شوش دن سے اس کے چکر میں آگئے تھے۔ اسی لیے وہ نہ تو کبھی جم کر کام کر کے اندر ہی اس لڑکی سے انھوں نے کوئی فیض پایا یا آپ نوجوان ہیں۔ آپ کا خون گرم ہے اس عمر میں ایسے بھلاے بہت اچھے لگتے ہیں مگر عشق کے ساتھ ساتھ تنہا بہت محنت سے بھی کام لینا چاہیے۔ آجکل کے زمانے کا تقاضا یہی ہے۔

”میں تمہارے غلوں، محبت اور اپنائیت کے لیے بے حد شکر گزار ہوں مگر نواز میں نے بھی اسی کی طرح تجھ پر ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: تم نے مجھے اس قابل جانا کہ پہلے ہی دن غلطانہ مشورے سے نوازا۔ یہ تمہاری غلاست ہے۔ عرض یہ ہے کہ میں شکل سے شاید بے وقوف نظر آتا ہوں مگر اتنا بے وقوف ہوں نہیں یہ دوسری بات ہے کہ میں لڑکیوں کے ہاتھوں بے وقوف بننے کا ذرا شوقین واقع ہوا ہوں۔ اگر لالی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے تو نہ دے۔ لالی بیسی لڑکیوں کے ہاتھوں بے وقوف بننا روز روز تو نصیب نہیں ہوتا نا؟“

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ناخن کرتا بھی بھول گیا۔ اس نے پوچھا کہ کسے کا ارادہ کیا مگر پھر طعنی کر دیا اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے شاید مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ اس کا غلطانہ فیصلہ تھا کہ اس نے ایک شخص کو بے وقوف بننے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

اس شام رہائش کے لیے مجھے ایک غیر الاٹ کو بیٹا گیا جس میں لوہے کا ایک پتنگ، ایک چھوٹی سی تپائی اور کئی موجودہ تھی۔ ضرورت کی دوسری چند چھوٹی موٹی چیزیں میں نے کیبنوں پر مشتمل عظیم الشان شاہنگ سے منتر سے خریدیں اور رات کو آرام سے ٹانگیں پسار کر سو گیا۔ روتی، سر جھپٹانے کو جگہ اور عشق کے مواقع۔ یہ تین چیزیں مجھے تیر تیر تھیں۔ اب مجھے کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔

اس دن کے بعد سے میرا یہ معمول بن گیا کہ دوپہر کا کھانا میں لالی کے خیمے میں کھاتا۔ اتنی احتیاط البتہ ضرور کرتا تھا کہ جب وہ کھانے کے وقتے میں اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوتی تو میں اس کے ساتھ نہیں جاتا تھا بلکہ بعد میں بالکل تنہا کے سے انداز میں وہاں جا پہنچتا تھا۔

بابا مجھ سے اب اور بھی زیادہ بے تکلف ہو چکا تھا۔ ہم ٹھکر ٹھکرے دوستوں کی طرح گفتگو کرتے تھے۔ باقاعدگی

البتہ کبھی کبھی میری کارکردگی کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔

بہر حال مجھ سے افسران اور دیگر ملازمین ممبئی خوش تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ افسران کے لیے میں مندرست ہی کامیاب اور قسم کا ملازم تھا اور وہ غلطیاں بھی تسلیم کر لیتا تھا جو میں نے نہیں کی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ میں حتی الامکان غولوں کو اور چاکر تھی سے اٹھیں وقتاً فوقتاً کھن بھی لگا کر ہوتا تھا جس سے انھیں کافی فرحت حاصل ہوتی تھی کیونکہ اس دیرانی میں وہ خشک قسم کے فرائض انجام دیتے ہوئے کافی تنگ آ چکے ہوتے تھے۔

ساتھی ملازمین کے لیے میں کافی یار باش آدمی تھا۔ ہر ایک کی سنے والا، ہر ایک کو چاہئے پانی کی ضرورت دینے والا اور عملی ٹھہر پر کسی دیکھ لفظی طور پر ہر ایک کا کھانا شے والا۔ اس لیے وہ بھی مجھ سے خوش رہتے تھے۔ میں اپنی جگہ خوش تھا اور میری خوشیوں میں اضافہ لانی کو دیکھ کر ہوتا رہتا تھا۔

مجھے لالی سے اظہار عشق کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اس کے بارے میں کیا کچھ سوچتا ہوں کیوں سوچتا ہوں۔ اسی سوچوں کا نتیجہ تھا کہ کبھی کبھی رات کو سوتے میں اچانک میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ میرا جسم پیسے میں تر ہوتا تھا لیکن صلیق میں کانٹے پڑے ہوتے تھے۔ میں اٹھ کر ٹھنڈے پانی کے کئی گلاس پیتا تھا اور بہت دیر کر ٹھنڈا پانی پیتا تھا۔

منشعل شاہ کے ہاں مجھے پینے پلانے کی تھوڑی سی عادت پڑ چکی تھی۔ اس عادت نے دو ایک بار مجھے معمولی سا تنگ کیا۔ ایک ڈرائیور سے ذکر کیا تو ایک بار اس نے ٹھہرا پلایا۔ بڑا کبوس لگا۔ میں نے دوبارہ پینے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم طلب باقی رہی لیکن اسی طرح جیسے راکھ میں چنگاری دہی ہو اور راتر رفته اپنی معمولی سی حرارت بھی کھو رہی ہو۔

ایک روز لالی کام پر نہیں آئی۔ دوپہر تک میں یوں بے چین رہا جیسے میری کمر پر کوئی چوڑا چڑھا ہوا ہو۔ میرا کاغذی کام اب کافی بڑھ چکا تھا۔ ورثہ شاید میں دوپہر سے پہلے ہی ختمے میں جا کر وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

بچے بریک ہوتے ہی میں گویا رستہ ٹھوکر اس کے خیمے کی طرف بھاگا۔ وہ سر پر کڑا باندھے رضائی پیسے بڑی تھی اور... اور خیمے میں تنہا تھی۔ جس کی وہ انبجار بھر شواہم کا گناہی خیمے میں نہیں تھا۔

لالی نے سراٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں گویا وہیں قفل ہو گیا۔ اس کی ہانکیوں سرخ تھیں اور گور کر میری طبیعت کی

تین مہینے یوں گزر گئے جیسے کسی دلچسپ فلم کا مہینہ نہ ہو۔ میں کبھی کے ہاں میں خوب رہا جس کی تھا اور میرا وہی اچھی طرح دل لگ گیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کسی نئی پکنک پر آیا ہوا ہوں۔

نہروں میں پانی آ گیا تھا۔ فاضل وقت میں میں تیراکی کرتا۔ علی الصبح دوڑ لگاتا اور سڑکیں وڑھیں کرتا۔ جنگلوں اور ویرانوں میں بچ کا ساں بے صدفحت بخش ہوتا ہے۔ دن بھر کے لیے انسان کو تازہ دم کر دیتا ہے۔

میرا ایک لمحے کے لیے بھی فارغ بیٹھے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ڈیوٹی کے علاوہ بھی دن بھر کے لیے کوئی نہ کوئی مصروفیت ڈھونڈی ہوتی تھی۔ ڈرائیوروں کو چاہئے پانی سے غرض رکھ کر میں نے کبھی بھاری ہر طرح کی گاڑیاں پکڑ لیں تھیں انداب دن بے دن ان کی ڈرائیونگ میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چوکیدار والے دو تھے۔ ان میں سے ایک جس سے میرا پہلے ہی روز سامنا ہوا تھا، اس سے میری مڑتال ڈراما لگتی تھی۔ کبھی کبھی میں اسے بھی چاہئے پانی اور دیگر بہانوں سے ہلا بھلا کر جنگل میں لے جاتا اور اس کی رائفل سے نشانے بازی کی مشق کرتا لیکن اس کے لیے مجھے گولیوں کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی اور گولیاں عامی منگنی تھیں۔ بہر حال جتنی بھی جتنی منگنی لگتی پانی تھی اس حد تک میں اس منگنیے شے کو بھی جاری رکھتا تھا۔ نشانہ میرا خاصا شیک تھا کہ لاہور کا رخ نہ کر کے میں

کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ شاید لاہور کا رخ نہ کر کے میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ فلمی دنیا اور دیگر روٹنی سیلوں کی کشش اپنی جگہ لیکن میں ممکن تھا کہ میں اپنی ٹھکانے یعنی دوپہر اور شام کے بعد نوکری کی تلاش میں جوتیاں چٹخا رہا ہوتا یا پھر سٹیشن پر قلیوں کے جم غفیر میں شامل ہو چکا ہوتا اور ڈرائیونگ ٹائپنگ بازی یا دیگر دفتری کام سیکھنے کے بہانے مسافروں کے بازو ان کے کندھوں سے عیلہ کرنے کی تربیت حاصل کر رہا ہوتا۔

یہاں تقریباً سبھی لوگ میرے دوست بن چکے تھے، مجھے جاننے لگے تھے۔ تبادو صاحب کو میں نے اپنی اندر کے بعد مزید صرف دو مرتبہ یہاں دیکھا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں علاؤ آدمی میرے پاس ہوتے تھے۔ ساٹھ اپنی اور پوجیک منجر صاحب۔

ساٹھ انجینئر صاحب کو تو کمرہ لے کر بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ بے خیالی میں وہ دھور مار کر میز کھٹکھا لیتے تھے۔ چنانچہ انھیں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ میں ڈیوٹی انجام دے رہا ہوں یا نہیں اور اگر دے رہا ہوں تو کس طرح۔ پوجیک منجر صاحب

آنکھوں میں نیلیاں اچلا تھا۔

”بندوق ساتھ رکھنے کا تو وہ تکلف ہی کرتا ہے۔ میں نے کہا: لڑنے کے لیے اسے بندوق کی کیا ضرورت ہے؟“

”بڑے آدمیوں کو اپنا رعب شوب بھی تو رکھنا ہوتا ہے وہ ہنستے ہوئے بولی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ بابا بہت بڑا آدمی تھا۔ جسامت میں۔“

کافی دیر بعد خیمے کے قریب ہی کہیں بابا کی آواز لوں ابھی جیسے رات کے ستارے میں کہیں شیر و ہار اٹھا ہو۔ اندازاً بابا ہی تھا جیسے وہ کوئی خوشخبری لے کر آیا ہو اور لالی کو سنانے کے لیے بلے چہن ہو۔

ہم اس وقت کچھ زیادہ باعزت حالت میں نہیں تھے۔ میرے کانوں میں نیلیاں سی بجنے لگیں اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ میں احمقانہ انداز میں چارپائی سے اتر کر جوتے پہنے۔ لگا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ مرے سے پہلے انسان کا جوتے پہننا کچھ زیادہ ضروری نہیں ہوتا لیکن میں بابا کی بندوق کا گنڈا اپنے سر سے ٹکڑے ٹکڑے ٹکڑے اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتا تھا۔

اسی عالم میں خیمے کا پردہ اٹھا اور بابا سنے اندر قدم رکھا۔ مجھے صرف دو ہی چیزیں نظر آئیں، سایک تو اس کی پھر چڑاتی ہوئی نوچیں اور دوسری اس کے کندھے سے جھانکتی ہوئی بندوق۔

اس لمحے میں نے انسانی مایوسی کے عالم میں فیصلہ کیا کہ مجھے مقابلہ کرنا چاہیے۔ ”دو تاجوا آدمی بھی کسی حد تک ہاتھ پاؤں تو مارتا ہے۔ اسی ارادے سے میں نے بٹھتے ہوئے اٹھنے کی کوشش ہی کی تھی کہ بابا کی آواز سنائی دی تو کوئی بات نہیں... کوئی بات نہیں... میں تو جا رہا ہوں بابو صاحب! پھر آجاؤں گا۔“

وہ اطمینان سے مڑا اور نوچیں مروڑتا باہر چلا گیا۔ حیرت کی زیادتی سے شاید میں اس وقت اتنا ہونق نظر آ رہا تھا کہ لالی بے اختیار دانتوں میں چادر دبا کر کھی کھی کرنے لگی۔ کئی لمحے بعد میرے اوسان کچھ بحال ہوئے تو میں نے بے پناہ طویل سانس لی اور وہ بھی اس انداز سے گویا کسی اٹیم انجن کا والو کھل گیا ہو۔

چند لمحے پہلے اس خیال سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ چکے تھے کہ بابا نہ چلنے کیسا بدنگام چماتے گا! میں اس کے ہاتھ سے بچوں کا بھی یا نہیں لیکن اب جبکہ بلا مرے کل پکلی تھی تو میں شکر ادا کرنے سے پہلے حیرت میں مبتلا ہو چکا تھا۔

خزانی کے باعث تھی لیکن یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ مجھے تو یہ بخار ہی کی مرضی محسوس ہوئی تھی اور میرا دل اٹھل پھل ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی نکت بھی اس وقت چپے ہوئے تاجے سے مشابہ نظر آرہی تھی۔

”کیا ہوا دل انھیں؟ میں ٹپک کر اس کے پاس پہنچا۔“ کچھ نہیں... وہ دلکش انداز میں مسکرائی، بس ذرا بخار چڑھ گیا ہے۔ بابا میرے لیے ہنڈ سے دوائی لینے گیا ہے۔“ قریبی گاؤں یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا جہاں سے ضرور دیر چھوٹی ہوئی، بیماری کی صورت میں دوا لے آتے تھے۔ ایک شخص وہاں ڈپنسری کرتا تھا جس کی کوالٹیکشن یہ تھی کہ کچھ عرصہ وہ ایک ڈاکٹر کے ہاں کیشیئر رہ چکا تھا۔

”اور موتی کہاں ہے؟ میں نے سکتے کے پاس سے بھی یوں دریافت کیا جیسے وہ گھر کا ایک فرد ہی ہو اور مجھے اس کی عدم موجودگی پر غامی تشویش ہو۔“

”وہ بھی بابا کے ساتھ گیا ہے۔“ شخصیں شاید علم نہیں کہ بابا جب باہر جاتا ہے تو موتی اس کے ساتھ ضرور جاتا ہے۔ لالی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ میں شرارت کی جھلک سی محسوس کی۔ میں نے سکون کی سانس لی تو اس کی آنکھوں میں شرارت کا رنگ گہرا ہو گیا۔

”تم نے مجھے اطلاع کر دی ہوئی۔ میں تمہیں دوا سگولیتا اور اگر بابا ہی کا جانا ضروری ہوتا تو اسے کبھی کسی گاڑی میں بٹھوا دیتا۔ میں نے ہلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا: لاؤ بیٹھی دکھاؤ گنڈا بخار ہے؟“

اس نے کلائی اچھے تھادی۔ کلائی واقعی تپ رہی تھی اور میں بھی تیز چل رہی تھی۔ میں کلائی تھامے ساتھ ہی کہیں بڑی طرف بھی منتقل ہو گیا۔

میری طرف انور دیکھتے ہوئے وہ بولی: ”واضح رہے کہ بابا بندوق بھی لے کر گیا ہو ہے اور میرے اندازے کے مطابق اس کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں ہے۔“ اس کے الفاظ ایسے ہی تھے جیسے مجھے خبردار کر رہی ہو، باز رکھنا چاہتی ہو لیکن مجھے میں شرارت تھی اور آنکھوں میں دغوت... اور پھر وہ کوئی مزاحمت بھی نہیں کر رہی تھی۔

”بابا کے پاس بندوق کا لاشنس ہے کیا؟ میں نے میرت سے پوچھا۔“

”بابا کو دیکھ کر اور پھر بندوق کی حالت دیکھ کر کوئی اس سے لاشنس طلب نہیں کرتا۔ زیادہ بیوقوف علاقوں میں وہ جاتا ہی نہیں، لالی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی

کمال ہے... بابا کی غیرت جو جس میں نہیں آئی وہ میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑھ گیا۔

ایک دفعہ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ بعض انسانوں کے جسم میں خون کی کمی ہوتی ہے بعض میں چرنے کی اور بعض میں خولاد کی۔ بابا میں ذرا غیرت کی کمی واقع ہوئی ہے "لالی نے خوشدلی سے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے لیے میں تلخی یا طنز کا شائبہ تک نہیں تھا جس وقت میں بابا کی آواز سن کر سخت حواس باختر ہو چکا تھا اس وقت بھی وہ اسی طرح اٹھنا نہ دیکھ سکے سے ٹپک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے بابا کے روتل کا پیلے ہی سے اندازہ تھا۔

میں محض تھوک نکل کر رہ گیا میری کچھ بیش نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ وہ چادر کا کونا انگلی میں پھینٹے اور کھڑے ہوئے بولی۔

"بابا دراصل میرا سگ باپ نہیں ہے۔"
ایک بار پھر میری کھوپڑی ابل کر رہ گئی۔ میں نے تھوک نکل کر پوچھا "تو چہرہ کون ہے؟"

"بس کوئی ہے۔" اس نے لمبے بڑائی سے جواب دیا۔

"بہر حال ہے بہت اچھا آدمی... مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ کب اور کن حالات میں نہ بچہ سے جدا ہوئے۔ اس وقت وہ زندہ تھے یا مر چکے تھے جب میں بابا کو ملی۔ بابا کا کہنا ہے کہ میں نے اس وقت بولنا بھی نہیں سیکھا تھا اور میں ایک غار میں زندہ بچی کی طرح کوڑے کے ڈبیر پر لیٹی تھی سڑی چیزیں اٹھا کر کھا رہی تھی جب بابا نے مجھے اٹھا یا بہت دیر تک وہ ادھر ادھر میرے کسی وارث کو تلاش کرتا رہا اور جب کوئی نہ ملا تو اپنے خیمے میں لے آیا بڑی محنت اور شفقت سے اس نے مجھے پالا ہے۔"

"سگ باپ نہ سی... میں نے واسٹ پینٹے ہوئے کہا۔

"بہر حال جیسا کہ تم بتا رہی ہو کہ اس نے تمہیں کافی محبت و اپنائیت سے پالا ہے" اس صورت میں اسے کچھ تو اعزاز ملنا چاہیے تھا۔ میں تو چشم تصور سے کل برسوں کے انجواؤں میں کوئے کھدے میں لگی ہوئی شکر کی مری بھی دیکھ چکا تھا۔ بابا نے بیٹی اور اس کے آشنا کو قابل اعتراض حالت میں باکرہ فعل کر دیا؛ اب اس سے زیادہ قابل اعتراض حالت کی ہو سکتی تھی؟

"دراصل بابا کچھ عجیب سا آدمی ہے" وہ بال بیلے ہوئے بولی۔ "اگر میں اس وقت صرف اتنا کہہ دیتی کہ تم میری مری کی خلاف ورزی میں گئے ہو اور میری عزت پر حملہ آور ہوئے ہو تو وہ تمہیں جان سے مارنے کی کوشش کرتا میری مرضی کے خلاف کوئی میری طرف انگلی بھی اٹھائے تو بابا کے ہاتھوں اس کی

جان جاسکتی ہے لیکن... وہ ایک بار پھر شر میلے سے انکار میں انگلی پر چادر پھینٹے اور کھڑے لگی۔ "تمہارے ہارے میں تو اسے معلوم ہے تاکہ تمہیں پسند کرتی ہوں... تمہے محبت کرنے لگی ہوں"

میں تو روزِ اول سے ہی اس کی محبت میں گرفتار تھا لیکن میں نے یہ بات کبھی اس سے کہی نہیں تھی۔ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اسے ابھی طرح معلوم تھا۔ تاہم اس دن کے بعد سے مجھ کو یہاں کچھ زیادہ نہ رہنے میں دوہرہ کو کھانا کھانے لالی کے خیمے میں پہنچا تو بابا اکثر ہی غائب ہوتا تھا یا غائب ہونے کی تیاریاں کر رہا ہوتا تھا۔ اسے کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا تھا۔

وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ان دنوں کوئی مجھ سے سیکھتا۔ ابتدا میں چند دن میں بابا سے نظر میں ٹھنڈا رہا خیال تھا وہ بھی مجھ سے نظر نہیں ملا یا کہ اسے گامیوں کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے اسے علم ہی نہ ہو کہ اس کی عدم موجودگی میں کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی نظر چڑانا چھوڑ دیا۔

لالی کو بار بار مری نہیں ایک نشر تھی۔ سگریٹ چرس یا شراب وغیرہ سے کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ وہ میرے خون کے ذلت میں شامل ہو گئی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ میں اس سے عروم ہوا تو میرے دماغ کی مریاں پھٹ جائیں گی، میں مر جاؤں گا۔ میں جتنی دیر اس سے دور رہتا اس کی طلب میں تڑپتا رہتا۔ میں نے جب یہاں آنے کا قصد کیا تھا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ زندگی کی اتنی سترتیں اور لذتیں اس دیر لانے میں میری مشغور ہوں گی۔ اب تو میں دن میں نہ چلنے کتنی بد لشکر کرتا تھا کہ میں نے لاہور کا رخ نہیں کیا تھا۔ شاید چرس حق میں اتنا اچھا ثابت نہ ہوتا جتنا اچھا ویرانہ ثابت ہوا تھا۔ جیش کوششی کے اس دور کے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک روز جبکہ بابا خیمے میں موجود تھا اور لالی کھانا کھا کر جا چکی تھی تو بابا ہچکچاتے ہوئے بولا "بابو صاحب! ایک بات کہوں... بڑا مت منانا... تمہیں اپنا کچھ کر رہا ہوں؟" میرا دل ڈوبنے لگا کہ شاید بابا مجھے اپنا سمجھتے ہوئے نہایت اپنائیت سے درخواست کرے گا کہ بر ضرر دار کس سے یہاں کھانا کھانے لگنا نہ آنا۔ اس میں تمہارا اور میرا دونوں ہی کا فائدہ ہے، بس بہت ہر مکی "اب یہیں بخش دو۔"

میں نے مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مک کرو بابا! میرے خیال میں اب ہمارے تعلقات ایسے تو بے نہیں

معارف و تعلیم کے نام پر ایک نیا دور

سنگتراش

ایک سنگتراش کی حجت کا ذکر و بیان
جس کی محبوبہ کی روح پرست کے قہقہے میں تھی

دو جلدوں میں۔ جلد اول۔ 175/- جلد دوم۔ 175/- مکمل سیٹ۔ 350/- روپے

سنگتراش

معارف و تعلیم کے نام پر
ایک نیا دور
جس کی محبوبہ کی
روح پرست کے قہقہے میں تھی

انتقام پر تلی ہوئی زہریلی ناگتوں، جل کماری اور ناگ رانی کے طلسماتی تصادم
میں گھرنے کے بعد ایک نئی زندگی حاصل کرنے والے محمد سلطان خان کی
لرزہ خیز کہانی، جو اقلیم علیم نے اسی کے الفاظ میں بیان کی ہے۔

دو جلدوں میں۔ جلد اول۔ 175/- جلد دوم۔ 175/- مکمل سیٹ۔ 350/- روپے

مکتبہ القرايش

7668958

اشکست

E.mail: al_quraish@hotmail.com

چھوٹے موٹے کام میں اوپر کے بیویوں سے چلتا آیا تھا اور پھر مجھے تنخواہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔

دوسرے دن جب دوپہر کے کھانے کے بعد لالی کام پر واپس چلی گئی تو میں حسب معمول چند منٹ کے لیے وہیں ٹھہرا رہا تاکہ اس کے بعد روانہ ہو سکوں۔ اسی وقفے میں میں نے رقم بابا کے حوالے کی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس معاملے کو لالی سے مخفی رکھنا چاہتا ہے۔ مجھے بھی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اسے بتاتا میرا کام اس کے بغیر بھی چل رہا تھا بلکہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ بات معلوم ہونے کے بعد وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے اور بے رحمی نہ اختیار کرے کہ شاید میں اس کی نوازشات اور خصوص کا حساب روپے پیسے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رقم وصول پانے کے بعد بابا بڑے تواتر سے مجھے سے خائب رہنے لگا جس پر میں دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کرتا کہ کافی دن نہایت خوبصورت انداز میں گزر گئے۔ اس کے بعد بابا دوبارہ کھانے کے وقفے کے دوران مجھے میں جو بڑھنے لگا۔ اب اس کا منہ کچھ نکلا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک روز تنہائی میسر آنے پر میں نے پوچھا کیا بات ہے... علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیا؟

”فائدہ کیا خاک ہونا چاہی... ان نقصان ہو رہے“ وہ ٹھوڑی کھاتے ہوئے بولا ”اب تو مجھے اٹھتے بیٹھتے پتھر آنے لگے ہیں“

قد سے توقف کے بعد وہ بولا ”ایک اور ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے۔ وہ جرمنی سے خاص طور پر سنگاوی ہوئی دواؤں سے علاج کرتا ہے لیکن وہ مکمل اور شرطیہ علاج کے چار ہزار روپے مانگتا ہے۔ اب میری تو بہت نہیں پر پڑ رہی تھی کہ کھانے سامنے ہاتھ پھیلاؤں“ اس کی آنکھیں پھر آئیں اور آواز زہری سی گئی ”مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں۔ میں کھل کھل کے مہ جازنگ کا تو کون سا فرق پریشانے کا لیکن مجھے لالی کی فکر ہے۔ وہ کہاں جائے گی؟ کس کے آسے پر رہے گی؟ میرے بغیر وہ تو دنیا میں پاؤں بھی نہیں گزار سکتی“

میں کتنا تو یہ چاہتا تھا! بابا! لالی کی تم فکر نہ کرو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔ آخر اب بھی اس طرفان بڑے نیکو میں نے ہی سنبھالا ہوا ہے لیکن آدمی کو اب اتنا صاف گو بھی نہیں ہونا چاہیے۔

ادھر بابا نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ وہ میرے سامنے ہاتھ پھیلا نہیں چاہتا لیکن وہ حقیقت میں اتنا غصہ نہ پھیلا دیا تھا اور بڑے

کہ اتنے تکلف سے یوں اجازت لے کر گشتگو کی جائے نہ خوش رہو بابو صاحب! وہ میرا کھانا تھیک کر لولا۔ میں تعین گھر کا ایک وزو بھوکری زبان کھول رہا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شوگر کا مریض ہوں۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے اس اہم راز سے مجھے آگاہ کرنا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ پھر مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ مجھ سے فرمائش کرے گا! بابو صاحب! شوگر کے علاج کا کوئی کارگر نسخہ تمہارے علم میں ہو تو ذرا بتا دو ورنہ میں شکریہ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ وہ مکمل اور شرطیہ علاج کے دو ہزار روپے مانگتا ہے۔ بہت عرصے سے میں اس مرض کو نظر انداز کرتا آ رہا تھا لیکن اب بہت جواب دے رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے میں کھل کھل کر مر رہا ہوں۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے بابو صاحب! اگر کہیں سے مجھے دو ہزار روپے قرض حسنہ مل جائے تو میری زندگی بچ سکتی ہے۔ مجھے اب میرے پاس کہیں سے رقم آتی ہے پیسے واپس کر دوں گا“

میں نے نہایت غصہ اور سناٹا منہ لہجے میں کہا۔ ”اتنی سی بات کے لیے تم اتنی شرم اور جھجک میں مبتلا تھے بابا؟ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ کل ہی لاڈوں کا دو ہزار روپے۔ میں پہلا کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ میرا اور لالی کا پیارا بابا صحت دو ہزار روپے نہ ہونے کی وجہ سے کھل کھل کر شرم ہو جائے۔ تم نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا؟ اتنا عرصہ چاری جھیلے رہے“

”خوش رہو روبرو دار! دو گوا چنڈ بات سے غلوب ہوتے ہوئے بولا“ میں دراصل یہی سوچ کر غصہ رہا کہ معلوم نہیں تم اتنی رقم کا بندوبست کر سکتا یا نہیں۔ بابا! مانا کہ میری فکر کی مولی ہے لیکن میں آدمی معمولی نہیں ہوں۔ میں نے اس موقع پر تعویذ ہی سہی گھارنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ نوکری تو اس میں اپنے فیسے دن گزارنے کے لیے کر رہا ہوں۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ میرے دن اب زیادہ نہیں رہے۔“

بابا نے مجھے شوگر کے حساب سے دوا میں دیں جو بھلائی کی دواؤں کی طرح غلوں سے مالی تھیں۔ پھر چند منٹ اچھا دھو کر کی باتیں کر کے میں چلا آیا۔ میں شکر کر رہا تھا کہ شکر گلوں سے ملک جو مدد نہ کر کے لے کر چلا تھا وہ جوں کی توں محفوظ تھی۔

۱۰ باتوں میں مت ٹالو میری جان! مسئلہ کیا ہے؟ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور موٹے موٹے شیشوں کے عقب سے اس کی آنکھیں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے ابھی نکل کر مفر پر گر پڑیں گی۔

”مسئلہ بتا بھی دوں تو کیا فائدہ؟ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا، تم کون ساحل کرو گئے؟“

۱۱ تم بتاؤ تو میری جان! وہ کسی کچھ کر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ہماری طاقت آزمائے بغیر ہی تم نے ایک طرف فیصلے کرنے شروع کر دیے۔ تجھیں کیا معلوم کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں؟

۱۲ مجھے چار ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ دے سکتے ہو؟ میں نے بات کو لگھائے پھر لے لیا۔ استغناء میرے لیے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اب کان دیا کر چلا جائے گا یا کمزور سی آواز میں پوچھے گا، تجھیں کیا ضرورت آن پڑی چار ہزار روپے کے؟ پھر شے چھانٹ تو تم ہو۔ کہیں تجھیں کچھ بیٹھنا نہیں ہوتا۔ تنخواہ میں تنہا رہی ابھی بھلی گزر رہی ہے۔

اس کے بجائے وہ ادھر ادھر دیکھ کر لڑاؤ دارانہ انداز میں بولان میں تو خود تم سے اس موضوع پر بات کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ ضرورتیں ہر شخص کو ہوتی ہیں اور ضروریات پوری کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ موعود ہوتا ہے لیکن اس کے لیے دفتری زندگی میں ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم سنئے آدمی تھے اس لیے بات کرتے ہوئے ہم بھی ہلکا رہے تھے۔

دہم سے ملاؤ کون کون ہے؟ میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

۱۳ میں اور کیشیئر۔ اکاؤنٹنٹ نے جواب دیا۔ تمہارے آنے سے پہلے یہاں سے چھوٹے موٹے مسئلے آرام سے چل رہے تھے۔ اب بھی باقی مسئلے تو چل رہے ہیں لیکن وہ مسئلہ جس میں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے، وہ کا ہوا ہے۔ اگر تم تعاون کے لیے تیار ہو تو کیشیئر شے چار ہزار روپے تو میں تجھیں ابھی دلا دیتا ہوں۔ اس کا حساب ہم بعد میں پورا کر دیں گے۔ تمہیں کا فائدہ ہے۔ سب کو آئندہ بھی اپنا اپنا حصہ ملتا ہے گا اور کسی کا کچھ بچرے گا بھی نہیں۔ کیا ارادہ ہے؟

۱۴ ”مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میں نے متذہب لہجے میں پوچھا۔“
”تمہیں روزانہ تجھیں تیس لیسے ضرور دے کے کارڈز کی انٹری کرنا ہوگی جن کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔ اکاؤنٹنٹ نے اطمینان سے کہا۔ میں ان کا حساب بنا کر واؤچر منظور کر دیا

فریقے سے پیسہ یا تھا۔ میں چکر کر رہ گیا تھا۔ شیٹی بگنا رہا مجھے کہ مسکا پڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بے وقوف میں بن رہا تھا یا بایا۔ مین میری نظر میں اس سوال کی کوئی خاص اہمیت ہی نہیں تھی۔ اہم بات تو یہ تھی کہ مجھے ہر حال میں بابا کو خوش رکھنا تھا۔

سوال یہ تھا کہ میں چار ہزار روپے کہاں سے لاتا ہوں؟ سوال پر زیادہ تفصیل سے غور و خوض کیے بغیر میں نے حکم لگائی کہ قبر پر ایک نہیں دو دفنوں لائیں مارتے ہوئے کہا، تم فکر ہی نہ کرو بابا! رقم کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ جہاں تمہارا دل ملے علاج ضرور کرواؤ۔ البتہ اس مرتبہ رقم کا انتظام کرنے کے لیے مجھے چند دن کی ملت دے دو۔

دو فور جذبات سے بابا کی موٹھیں پھر پھٹنے لگیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ غصے سے بے قاعلو ہوتا، میں دیکھنا تھا جو اچھے سے باہر آ گیا۔ بابا دراصل وہ دیوتا تھا جس کے قبضے میں میری عملی شہزادی تھی مگر یہ دیوتا کچھ مختلف قسم کا دیوتا تھا۔ خراج طلب کرتا تھا۔

میں واپس ڈیوٹی پر پہنچا تو مجھے ہر چیز کچھ دھندل دھندل سی نظر آ رہی تھی اور کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مشکل تمام اپنے دماغ کو درست رکھتے ہوئے میں جڑشوں کی خانہ پڑی میں مصروف رہا۔ اس دوران اکاؤنٹنٹ نے یونی گھومتے پھرتے میری طرف دوپکڑ لگائے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تاریخ وقت میں وہ ادھر ادھر چکر لگاتا رہتا تھا۔ کبھی کسی کے پاس بیٹھ کر چائے پانی کی کبھی کسی سے گپ شپ کر لی۔

دوسرے چکر میں اس نے میری میز پر جھک کر ڈیوٹی میں مشکل دیکھتے ہوئے کہا، یہ آج میرے رات گئے کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟ کس نے تمہارے جذبات پر دھڑکتی مار دی ہے؟

میں نے سخت لٹکوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت مجھے وہ بھی زہر لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کے بے دھنگے منہ پر ایک گولہ سا رسید کر کے دانت پیٹ میں پہنچا دوں اور اس کی موٹے موٹے شیشوں والی عینک اڑا کر کسی جینس کے لگا دوں۔ مگر ہوتا علوماً یہی تھا کہ غصہ مجھے ان لوگوں پر آتا تھا جن پر میں اتار نہیں سکتا تھا۔ عموماً وہ میرے ساتھی اور مرہبان ہی ہوتے تھے۔

بردی شکل سے میں نے مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ایک تو تم لوگ معلوم نہیں کیوں آجاتے ہو زخموں پر لٹکے چڑھنے۔ جاؤ جا کر کسی گھوڑے کے ساتھ مل کر تسوڑی بست لگاؤ۔ چرلو۔ شکل سے لگ رہا ہے کہ جھوکے ہو۔

سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا یہ رقم ان کی جیب سے لپٹ
اصل سرمائے سے تو نہیں نکلتی۔ مسلمان ہی میں سے کم بھلی
ہے۔ چنانچہ اسے تاجدار صاحب کا نقصان نہیں سمجھا جاسکتا۔
اس پر معاش کی یہ دلیل کام کر گئی۔ دل میں شیطان تو
ویسے ہی قتل بازیان کیا رہا تھا مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ
جس اسمانی پر میں کام کر رہا تھا وہ کسی خاص اہمیت کی حامل
تھی۔ اب اکاؤنٹس نے راستہ دکھا دیا تھا تو میرے جسم میں
سنسنی سی دوڑنے لگی تھی۔

بالآخر میں نے تعداد کی ہابی بھری اور دوسرے روز
اکاؤنٹس نے مجھے چار ہزار روپے لایسے جنھیں لے کر میں
کھانے کے وقفے میں دوڑا دوڑا لائی کے خیمے میں پہنچا کھانا
اور گپ شپ کے بعد جب لالی واپس کام پر پہنچی تو میں نے
رقم نکال کر بابا کے حوالے کی۔

دو ہزار ملنے پر بابا کی مونچھیں جذبہ تشکر سے جھ
ٹک پھڑپھڑاتی تھیں، اب اس سے زیادہ زور سے پھر پھر ٹپٹی
آخر رقم بھی تو زیادہ تھی۔

میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ لالی کو بھی علم ہونا چاہیے
کہ میں اس کے بابا کو کچھ عذارت کر رہا ہوں لیکن بابائے
پہلے ہی مجھے منع کر دیا تھا کہ ہمارے درمیان جو بھی لین دین
ہو لالی کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

”وہ بڑی خود دار لڑکی ہے“ بابائے کہا تھا اگر اسے
معلوم ہو گیا کہ میں نے تم سے مدد طلب کی تھی اور تم مدد کر
رہے ہو تو وہ ہم دونوں ہی سے روٹھ جائے گی۔ اس کی خود کار
کا آغاز تم اسی بات سے لگا کر وہ ایسی نرم و نازک لڑکی
ہوتے ہوئے بھی پتھر توڑ کر یا پھر اٹھیں ڈھو کر اپنای نہیں
میرا بھی پیٹ ہلاتی ہے۔ حالانکہ میں طرح وہ تھا جسے ساتھ سیٹ
سے اگر کسی ایر آدی کے ساتھ سیٹ ہو جاتی تو عیش و آرام سے
گزر بسر کر سکتی تھی لیکن وہ محض اپنا اکیسواکھ کرنے کی قائل
نہیں ہے۔ اپنے دل کے کٹنے پر جیتی ہے۔ تم پاس کادل
آگیا ہے تو اپنا پیٹ کچھ تم پر بچھا دو کر نے لگی ہے جس سے اسے
کوئی دلچسپی نہ ہو وہ یزدی اکیسواکھ سے اس کی طرف دیکھ بھی لے
تو ہزار گایاں سناتی ہے۔ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے ؟
چنانچہ میں بڑی قربانوار سے نہایت خفیہ انداز میں
بابا کو ادراہم پینچا رہا تھا۔ لالی کو متاثر کرنے کی کیا ضرورت تھا
وہ بیچارہ تو پہلے ہی مجھ سے بہت بری طرح متاثر تھی اور
کوئی بھی موقع میسر آئے پر مزید متاثر ہوتی رہتی تھی۔

چار ہزار وصول پاکر بابائے میری توقع کے مطابق ایک

کر دیں گا اور کیشیہ ادا ٹیگی کر دیا کرے گا۔ اس کے علاوہ
مزوروں کے لیے بعض اوزاروں کی خریداری اور اس کے
ساتھ ساتھ اور تمام کا حساب بھی تمھارے ہی توسط سے بننا
ہے۔ اگر تم اصل ضروریات کے ساتھ پانچ دس فی فی ضروریات
کی فہرست بھی بنا کر آگے بڑھا دیا کرو تو میں اور کیشیہ تمھیں
بند کر کے باقی کام کر دیا کریں گے۔ منظور ہے ؟

میں خاموش رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ بابا کا مظاہرہ کرنا
کے لیے میرے سامنے کوئی جائز طریقہ نہیں۔ اور مصالہ
پورا نہ ہونے کی صورت میں کالا دیو میرے اور لالہ شہزادی
کے درمیان حائل ہو سکتا تھا اور میری نگوں میں چونک جاتی کا
آتش فشاں کچھ زیادہ ہی آفت جہانے ہوئے تھا، اس لیے
مجھے شہزادی سے ترک تعلقی کو اوارا نہیں تھا۔

پچکپا ہٹ مجھے اس لیے نہیں تھی کہ میرا کردار یا اخلاق
بہت بلند تھا۔ میں بالکل آپ جیسا یا آپ کے دوستوں جیسا عام
سا آوی تھا خواہ ایشیں مجھے بھی اسی طرح تعریف دیتی تھیں جو طرح
ہمارے معاشرے کے بیشتر انسانوں کو دیتی ہیں۔ میں ان نایاب
لوگوں میں سے نہیں تھا جو لالہ اور ترغیبات کے سیلاب میں
چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں۔ میں بہت ہی معمولی اور حقیر سا
آدمی تھا۔

میری پچکپا ہٹ کی وجہ صرف تاجدار صاحب تھے۔ وہ
شریف آدمی تھے۔ ان کے چہرے پر میں نے ہمیشہ سب کے لیے
شفقت، محبت اور مہربانی کا سایہ دیکھا تھا۔ مزور سے لے کر
سائٹ انجنیئر تک، وہ سب ہی کے کام آسنے کی کوشش کرتے تھے
مجھ پر ان کا یہ احسان کیا کہ تھا کہ جب میں خزاں رسیدہ ہوتے
کی طرح حالات کے دوڑ پر ابھرا اڈھر بھٹکنے کے لیے نکل
کھڑا ہوا تھا تو انھوں نے ہی میرا ہاتھ تھام کر گویا مجھے سنبھلنے
کا موقع دیا تھا۔

وہ سب پر حتی الوسع اعتماد کرتے تھے اور نہیں نقصان
پہنچانے پر میرا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پانی پچکپا ہٹ
کی یہی تفصیلی وجہ اکاؤنٹس کو بتا دی۔

وہ کرسی کچھ اور آگے کھسکاتے ہوئے بولا تاجدار صاحب
کے پاس میں ہم سبک بھی یہی جذبات ہیں جو تمھارے ہیں
لیکن ہم اپنی دانت میں انھیں نقصان نہیں پہنچا رہے ہوتے ہو
ناضل کام کیے بغیر تصور ساز فاضل معاوضہ حاصل کر رہے ہوتے
ہیں۔ تاجدار صاحب کو جس نوعیت کے ٹھکے ملتے ہیں، ان میں
انہیں لاکھوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس میں سے اگر سال میں
ایک دو لاکھ ہم تم جیسے لوگ ادھر ادھر کر لیتے ہیں تو اس

شام کو وہ منہ لگانے اور سر میں کچھ خاک ڈالے اس پتھر میں آیا جہاں بیچے کے بیس کام کرتا تھا اور اس نے تقریباً روتے ہوئے مجھے بتایا کہ بس میں اس کی جیب کٹ گئی... والد وہ کرایہ ایک راگبیر سے ملگ کر مشکل واپس پہنچا ہے۔

مجھے کچھ ایسی قسم کے انسانے کی توقع تھی لیکن یقین نہیں تھا۔ اب تک میں تذبذب میں رہتا تھا کہ شاید بابا جو ضرورت بیان کر رہا ہے، وہ واقعی اسے درپیش ہو سکیں اب میرا ذہن ایک طرف ہو چکا تھا۔ بابا ذرا قد سے مختلف قسم کا دلال تھا لالی ایک طرح سے اس کی ملکیت تھی، بیش تو قطعی نہیں۔ وہ اس سے جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا اٹھا رہا تھا۔

گویا اب ہمارے درمیان کچھ لو کچھ دو کا اصول مجہم نہیں رہا تھا، واضح ہو چکا تھا۔ مجھے اس سمجھوتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں ایک بلی کی غلش ضرور تھی کہ جس بے چاری کی چرائی کا خرچہ کھایا جا رہا ہے اسے علم ہی نہیں تھا کہ بالا بالا کیا ہو رہا تھا۔ وہ تو اپنی دانست میں عشق میں تن من وارنہ تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ بابا اتنی رقموں کا کرتا کیا تھا؟ کہاں کہاں لگا کر آتا تھا؟ میں نے پوچھ کر اس پر سے تو ظاہر کرنا نہیں تھا کہ میں اس پر اکتفا نہیں کرتا اور اس کا طریقہ واردات کچھ چکا ہوں۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ شاید وہ کوئی سنگ قسم کا نشہ کرتا ہو، کہیں بازار میں میں گانا دانا سنتا ہوا لیکن ہے ایک لڑکی کا خرچہ وصول کر کے کسی دوسری عورت کے قدموں میں جا رکھتا ہو، کچھ بھی ممکن تھا۔

بابا گویا مجھے قسمی دیتے ہوئے بولا، کام کا خیال میں نے اب دماغ سے نکال دیا ہے، میری کوشش بری ہو گی کہ آئندہ میں تمہیں تکلیف نہ دوں۔ میں تمہارے احسانات کے بوجھ تلے دب چکا ہوں۔

”ایسے نہ کو بابا! تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم مجھے اپنا سمجھتے ہو۔ اس صورت میں تمہیں مجھ سے تکلیف نہیں برتا چاہیے تمہیں جیب بچھا اور میری بھی ضرورت ہو تو تم بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتے ہو“ میں نے یہ بات اسی طرح کہی تھی جس طرح کوئی اداکار بکرے کے سامنے مکالمہ بولتا ہے۔ رہا رہا یا غلوں اور وابستگی سے عاری مکالمہ۔

بابا نے اس کے بعد واقعی خاصے طویل عرصے تک کوئی فرمائش نہیں کی لیکن اس دوران ایک نئی مصیبت اڑھٹھری ہوئی۔ ایک دلال نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ چند دن پہلے تک تو اسے محض اندیشہ تھا لیکن اب بہتر یقین ہو چکا تھا۔

بار پھر آئے دن خیمے سے غائب رہنا شروع کر دیا۔ کھانا وہ لپکا کر رکھ جاتا تھا۔ بڑا ہی مہربان بابا تھا۔ ہماری ہر طرح کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔

اکاؤنٹس اور کیشیئر سے میرے تعلقات بہت گہرے اور محلات نہایت عمدگی سے طے ہو چکے تھے۔ چار ہزار کا سبب بھی برابر ہو چکا تھا اور مزید تصور نہایت حصہ بھی مجھے وصول ہونے لگا تھا۔ غیر کی غلش نے بہت کم جو حصہ مجھے پہنچا کیا تھا۔ اس کے بعد روپے پیسے کی کشش نے یہ غلش دبا دی تھی۔ میرے پاس رقم نہیں انداز ہونے لگی تھی۔ گو کہ مجھے معلوم تھا کہ یہ رقم میرے کہیں غائب بابا ہی کے کام آئے گی پھر بھی ہر حال روپے کی موجودگی کا ایک الگ ہی غماز ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کچھ اکثر کے پلٹنے لگا تھا لیکن جب بھی تادمٹا مائٹ پر آتے تھے اور میرا ان سے سامنا ہوتا تھا تو میں باؤسے کی ماری ہوتی تھی کی طرح اپنی کھال میں سٹوکر جاتا تھا۔ کافی عرصہ میں غریبی دعوے کی عیش و عشرت کے مواقع فراہم کرنے کے بعد بابا ایک بار پھر خیمے میں پایا جانے لگا۔ اب وہ کچھ ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ ایک روز مجھے بتانے لگا کہ اکثر نے اس کے فلاں فلاں میٹھ لینے کے بعد فیصلہ دے دیا ہے کہ اس کا شوگر کام فرض بالکل دور ہو چکا ہے۔

ابھی سارا کیا دے انفاق میرے منہ میں ہی تھے کہ وہ پہلے کی نسبت کہیں کم چپکا ہٹ کے ساتھ بولا، اب تو میں ہی کوچنے لگا ہوں کہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ بیٹی کام کرتی ہے اور ہٹا کٹا باپ گھوٹیں پڑا رہتا ہے۔ اگر کہیں سے تھوڑے سے پیسے مل جائیں تو میں بھی میدان میں کہیں لگا کر کچھ سودا سلف لکھوں۔ نہ کانداری تو بیٹھنے کا کام ہے اور بیٹھنے کا کام ہی آسانی سے کر سکتا ہوں۔

مجھے اب زیادہ گھما پھرا کر بات کرنا ضروری محسوس نہیں ہوا۔ میں نے میدھے سادے طریقے سے پوچھا کہ کتنی رقم چاہیے بابا؟

”بیس ہزار کافی ہوں گے“ اس نے بھی نہایت سیدھے سادے طریقے سے جواب دیا۔

”دل چاہیں گے“ میں نے اختصار سے کہا۔ چند دن غور کرو۔

چند دن بعد میں نے یہ رقم بھی اسے متیار دی جس کے بعد اس نے بالا بالا ہی میدان میں کوئی گھوٹ کھا پسند کر لیا۔ ہر حال میں ہی خالی ہوا تھا جس کا مجھے علم ہی نہیں تھا اس کے بعد وہ سودا سلف لینے شکر گڑھ بن گیا۔

رہ گیا تھا نیکی ساتھ ہی میرے دل میں ایک ٹیب سا خون بھی بیٹھ گیا تھا۔ اسی خوف کے تحت میں نے اس کے خیمے کا رخ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے دیکھنے کو اس کا حال بدلنے کو اس کی دھواں بندھانے کو بہت ہی چاہتا تھا۔

بابا ایک بار ایک جگہ مجھے راستے میں ملا۔ اچھا بھلا بشارت بشارت چلا جا رہا تھا لیکن مجھے دیکھ کر سسکے چھوڑے جیسا محسوس ہونے لگا۔ لالی کی حالت منجمل تو گئی ہے لیکن سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو گئی ہے۔ بھاری۔

اس سے کوئی بات بچتی ہوئی نہیں تھی لیکن بھولی وضو اور نکاح کا ایک ہلکا سا پردہ ہر حال ہمارے درمیان حال رہا تھا۔ ہم غفلت میں گھٹکتو ہوتی تھی۔

میں نے کچھ رقم بابا کو دیتے ہوئے کہا: تم اس کے آرام کا خیال رکھنا اور اسے اچھی خوراک کھلانا۔

خوف پھر بھی دل میں جاگزیں رہا اور میں اسے دیکھنے نہ گیا لیکن اس کے تین دن بعد وہ خود ہی کام پر لگتی جیسا بھول جیسے ہی صبح وہ سب سے اگے قطار میں کارڈ پلے کھڑی تھی اور سسکا رہی تھی۔

بابا نے بتایا تھا کہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو گئی ہے بھاری! میرے خیال میں وہ زرد تو نہیں ابنتہ کہ گوری ہو چکی تھی۔ پہلے کی نسبت وہ غریب کھلی کھلی اور کھری کھری سی نظر آ رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس کی صحت تو پہلے سے اچھی ہو چکی تھی۔ بہر حال میں نے زیادہ حیران ہونے کے بجائے شگ کی سانس لی۔

چند دن میں سب کچھ موصول پر آ گیا، مع بابا کی فائزہ کے۔ نت نئے ہتکنڈوں سے اس نے مجھ سے نہیں اٹھنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

ایک بار میں نے یونہی سرسری صاحب کیا تو پتا چلا کہ میں تقریباً تیس ہزار روپے بابا کی تونہ میں جھوک چکا تھا اور میری اپنی یہ حالت بھی کہ میرا نکل سرمایہ وہی چند روپے بچرے اور روزمرہ کے استعمال کی چند پھولی موٹی چیزیں تھیں جو میں نے اپنی تنخواہ میں سے خریدی تھیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ تیس ہزار روپیہ میرے پاس آتا سکتا ہے اور اب ہاتھ آتا تو لالہ جگہ میں بڑے جلدی ریشمی ریشموں کی طرح یہ رقم تھوڑی تھوڑی کر اپنی خانہ بدوش مجبور کے نام نہاد باپ کی نذر کر چکا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی کہ میں خاموشی عیاشی کا سرکب ہو رہا تھا۔ اتنے پیسوں میں تو لوگ جانے کیا کیا کر رہے تھے۔

میں بے حد پریشان ہو گیا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے متوجہ نہیں کیا کہ ہم نے تو ہر ممکن احتیاط... اشارتاً اسی نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا اور اسی لیے میں فکر میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔

”بے احتیاطی سرزد ہوتے کیا پتا چلتا ہے؟ وہ خبرانی ہوئی آواز میں بولی۔ وہ سر جھکانے تحت پر بیٹھی تھی اور پاؤں کے انگوٹھے سے کچے فرش کو کڑی رہی تھی۔

”اب کیا ہو گا؟ میں نے پوچھا۔ میری آنکھوں کے آگے نیلے پیلے تار سے سے پانچ رہے تھے۔ مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ مجھ پر لالی پر کیا الزام آئے گا اگر نہ راز کھول گیا تو قبیلے والوں کا کیا رد عمل ہو گا؟ لالی کو کون دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا یا میرے لیے کیا ابھن کھڑی ہوگی۔

مجھے تو معرفت اور صفت ایک ہی تشویش تھی کہ اگر وہ بے گناہ روح اس دنیا میں آگئی تو کیا وہ لاوارثوں کی طرح ان دیدہ و شکستہ شخصوں میں پردوش بنائے گی؟ تا جا نوسمی ہو گا تو وہ میرا خون اس کا کیا بنے گا؟ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ دنیا میں نہ ہی آئے۔

”میں نے اس پہلو پر لالی سے بات کی تو وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی: ”سوچا میں نے بھی یہی تھا... یہاں خیموں میں ایک گھومت ہے... وہ میری رہنمائی کر سکتی ہے... وہ ایک عورت کو جانتی ہے جو شاید کبھی قسم کی ڈاکو سے یا شاید بڑھی بھٹی والی ہے... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت پیسے مانگتی ہے... اور پھر مجھے چند دن بچھٹی بھی کرنی پڑے گی... بیماری کا دھونگ رہنا پڑے گا...“

”ان سب باتوں کی تم کوئی فکر نہ کرو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں کہا: ”پیسے کی بھی کوئی فکر نہ کرو میں یہ سب بندوبست کروں گا۔ تم کسی بھی طرح اس مصیبت کو ٹالو۔“

اس بار مجھے تین ہزار کا بندوبست کرنا پڑا رقم لالی کے حوالے کرنے کے بعد میں نے کئی دن تک اس کے خیمے کا رخ نہیں کیا اور وہ بھی کام پر نہیں آئی۔ رقم اس نے بہت ہی چپکچپاتے ہوئے لی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ لرزتی ہوئی آواز میں اس نے کہا تھا: ”افس! سنا ہے اس معاملے میں جان بھی چل جاتی ہے۔ میرے لیے دھارنا... ہم بہت گنہگار ہیں لیکن اللہ تو گناہگاروں پر بھی رحم کھاتا ہے۔ بندہ یہ صحاف نہیں کرتے۔“

اس کے آنسوؤں اور لہجے کی لرزش سے یہ اولیٰ کٹ کر

برہنہ ہو باقی کے بچے ؟

وہ استغنائیہ سے انداز میں مسکرایا اور میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے خود کلائی کے لیے جیسے میں بولا : "اوسرا پسند کرتی ہے... لالی سے ٹیک ہی کھا تھا کہ یہ نوجوان پورا اچھا ہے و پھر وہ قد سے بلند آواز میں بولا : "زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کہہ دیا ہو کہہ دیا۔ آئندہ نیچے کے قریب بھی نظر آئے تو لوگ چارپائی پر ڈال کر ہی واپس لے جائیں گے۔" "تھیں شاید اپنے اس بادی زدہ جسم پر کچھ زیادہ ہی ناز ہے ؟" میں نے سختی سے کہا : "ایسا نہ ہو کہ مجھے چاقو مار کر تھامے اس غدار سے ساری ہوائ کافی بڑھے۔"

وہ دانت ٹپیں کر اٹھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر میں اپنی نیکی حکمت عملی طے کر چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ دایاں گھونسا میں اس کی ناک پر سید کروں گا اور بائیں کینچی پر ارد چھیے ہی وہ لوگ مٹانے کا اس کے گھٹنے پر بھاری بوٹ کی زوردار ٹھوکر سید کروں گا۔ جسم کے نازک حصوں پر ہی ضرب لگانے سے اس کو کچھ بگڑ سکتا تھا۔ نگہ لیے ہم برگھونے برسانے سے تو شاید اس کا بال بھی بیکانہ ہوتا جسے حتی الامکان بھرتی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی گرفت میں آنے سے بچانا تھا۔ اگر میں اس کی گرفت میں آجاتا تو پھر میری خیر نہیں تھی۔

مجھے اپنی یہ حکمت عملی آزمانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ خیمے کا پردہ اٹھا کر اچانک لالی اندر آئی اور ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔

"بس... بس... وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی : "زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ اتنے خوبصورت ڈرلے کا اتنا بھونڈا انجام نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے اس کے الفاظ پر خاص توجہ دیے بغیر کہا۔

"اپنے بابا کو کچھ بھلاؤ لالی ! یہ..."

"میں تو تمہیں سمجھانے کے لیے خیمے میں واپس آئی ہوں۔ ورنہ آرام سے باہر کھڑی تم دونوں کو سکون کی طرح اوتارے

ٹس رہی تھی ! وہ اطمینان سے تخت پر بیٹھتے ہوئے بول پھر اس نے نہایت سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا : "بابا ٹیک ہی

تو کہہ رہا ہے جناب افضل صاحب ! اب تمہیں یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب تمہارے پلے ہی کچھ نہیں رہا ویسے

بھی اب کپین کا ٹیکہ ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ہمارا قبیلہ تو چھب یا جوڑیاں کی طرف چلا جائے گا۔ تم اور تمہاری

کینہ نہ جانے کہاں جاؤ گے۔ ہمارے ! یہیں جداتھیں اور بچد ہی رہیں گے تو پھر وہاں جان بچنے سے کیا فائدہ پتا

شاید میں اولیٰ درجے کا احمق تھا مجھے خواہ مخواہ ہالاک ہونے کا زخم تھا۔ ادھر کپین کا کام بھی ختم ہو رہا تھا مجھے پتا چلا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی ماہ تک کپین بستر بویا پھیٹ رہی تھی۔ اس کے بعد بعض لوگ جنہیں عارضی بنیادوں پر ملازم رکھا گیا تھا، انھیں فارغ کر دیا جاتا۔ کچھ لوگ ہڈیاں میں لاہور واپس چلے جاتے اور کچھ لوگوں کو نئے اسٹاف کے ساتھ مل کر ریڈ بول کے قریب کہیں جانا تھا جہاں نیا پروجیکٹ شروع ہو رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا شمار ان میں سے کون سے لوگوں میں تھا۔ بہر حال جو دو ڈھائی ماہ باقی تھے، ان میں میں احتیاطاً اپنے لیے کچھ پس انداز کر لینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں آگے کیا حالات پیش آئے تھے۔ اس لیے میں نے بابا کی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور کئی بات تو یہ تھی کہ اب لالی سے بھی میرا دل بھرتا سا جا رہا تھا۔

دو سال ہونے کو آ رہے تھے۔ انسان ایک ہی کتاب کا کمان تک پڑھتا رہتا اور اب مقتبل کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ کسے کھڑا جانا تھا۔ ادھر میں نے بابا پر نوادشات سے ہاتھ کھینچا "ادھر آؤں نے ہنزار کی طرح خیمے میں موجود ہنزار شرن کر دیا۔ ایک روز لالی کھانا کھا کر خیمے سے نکل ہی تھی کہ بابا بولا : "افضل یہاں ! اس بار میں تم سے بہت ہی چھوٹا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ ہو جائے گا کوئی بندوبست پتا"

"نہیں ! میں نے پلا تامل نہایت سپاٹ لے لیے ہیں جواب دیا : "اور آئندہ بھی تم مجھ سے ایک پیسے کی بھی آمد نہ رکھنا۔ اس درخت سے جتنے ٹوٹ بھاٹا لے سکتے ہو وہ تم بھارت چکے۔"

اس نے مجھ سے بھی زیادہ سپاٹ لے لیے ہیں کمان تو پھر آئندہ تم بھی اس خیمے کا رن نہ کرنا تمہیں جتنی عیش کرنی تھی وہ کر چکے۔"

میں بھٹا تھا کہ اپنی کام تر بے غرق کے باوجود بابا جیسے لوگوں میں خود ہی بہت ضروری موجود ہوتی ہے مگر شاید میرا خیال غلط تھا۔ مجھے اب لالی سے مراسم رکھنے کی کوئی خاص خواہش نہیں رہی تھی لیکن بابا کے دھڑکس دینے کے انداز سے مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسے انا کا مسئلہ محسوس کیا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے دیکھنے والے پانچ میں سے مشتمل ہو کر کہا : "میں لالی کی اجازت سے آتا ہوں... وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ تمہاری جو بیٹھ کیا ہے کہ مجھے منہ کر دے۔ تم تو خود اس کے گھڑوں

ریاض الدلیلیس فی تلک عہد حیات کی دلدہری

قیمت فی کتاب - 90/- روپے

ایک ریاض الدلیلیس فی تلک عہد حیات کی دلدہری کے
تہجیدیکہ سوں کی روداد و جرم و سزاکل و ناقابل فراموش
کہانیاں جو انسانی عرض و سوں کا آئینہ ہیں

سزایافتہ	ستم نصیب	جرم بے گناہی	بے فیض
ہوس زادہ	فخر و صفت	بنائے فساد	نامراد

سردارالحج و ملک (ایڈووکیٹ) کی یادداشتیں

قیمت فی کتاب - 90/- روپے

قانونی تہجیدیکہ گریاں عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات
زان، زراد و زمین کے تنازوں سے جہنم لینے والے عقوبات

آئینہ خانہ	ابن الہوس	زیر کپڑا	خود گرفتہ
سفید خون	بارگشت	ڈراپ سین	آتش زر

مکتبہ القریشی © سرکردوڈ

اردو بازار، لاہور۔ فون: 7668958

E-mail: alquraish@hotmail.com



دولت جمع ہو جائے گی ؟

”میں باقاعدہ طوائف کسٹا نا نہیں چاہتی ۔ وہ بڑا نمائے بغیر اطمینان سے بولی۔“

”تو پھر یہاں بھی کسی زیادہ مالدار اور بڑے عہدے والے

کو پھانسا تھا کہ وقت میں زیادہ رقم جمع ہو سکتی تھی ۔ میں نے کہا۔“

”زیادہ مالدار یا زیادہ بڑے عہدے والے زیادہ جالا لاک

ہوتے ہیں ۔ ہم جیسی لڑکیوں پر وہ کہاں تمہیں خرچ کرتے ہیں ؟

وہ صاف گوئی سے بولی : ”البتہ اگر میں شہر میں سیٹ ہو گئی تو

پھر میری شان دیکھنا ۔ بڑے بڑے دہلیز پر لگ رگڑی گئے ۔“

”اے ۔ اگر لڑکی ناک کٹوالے تو اس کی دہلیز پر ناک

رگڑنے والے بہت مل جاتے ہیں ۔ میں نے کہا ۔ جرت انگیز

طور پر میں اب بے حد چرسکون ہو چکا تھا اور غصے کے بجائے

خاصی حد تک تسلی سے بات کر رہا تھا ۔ ویسے آپس کی بات

ہے ۔۔۔ بے وقوف بننے والوں میں میرا نمبر کون سا تھا ؟

”صرف دوسرا ۔ اس نے بلا ناخن جواب دیا ۔ اس دوران

بابا بڑے اطمینان سے ایک طرف پچھتا ناخنوں سے میل نکال

رہا تھا بالکل اس طرح جیسے اس کے قریب گھر کے دو افراد

بیٹھے اختلافات پر تبادلہ خیال کر رہے ہوں ۔

”اس صورت میں بھی پہلا تمہیں یہ پتہ توڑنے کی مشقت

اٹھانے کی کیا ضرورت ہے ؟ گھر بیٹھے کھانا یا کرو ۔ تھوڑی بہت رقم

کم ہو جائے گی تو کیا ہوا ۔ کچھ زیادہ عرصے انتظار کر لینا میں

نے چاہتے ہوئے لمحے میں مشورہ دیا ۔

”میں لوگوں کی نظریں اور خصوصاً قبیلے والوں کی نظر میں

محنت کش لڑکی ہی رہنا چاہتی ہوں ۔ اس میں حرج بھی کیا ہے ۔

روزمرہ کی زندگی کے اخراجات اس طرح چلتے رہتے ہیں ۔ انسان

تندرست بھی رہتا ہے ۔ باقی رقم ساری کی ساری بیک میں جوں

کی توں جمع ہوتی رہتی ہے ۔ اس نے بڑے اطمینان سے

بتایا : ”ویسے بھی ہمارے قبیلے میں چھوٹی مولیٰ آوارگی پر تو نظر

نہیں رکھتے کیونکہ باقاعدہ قسم کی دھندے بازی کو بہت بڑا سمجھا

جاتا ہے ۔“

”فرض کرو ۔۔۔ میں نے ملائمت سے کہا : ”جس طرح تم

نے اطمینان اور صاف گوئی سے بتا رہا ہے کہ سب ضرورتی سے

تمہارے مجھے بے وقوف بنایا ۔۔۔ اس پر میں آپ سے بابا ہو جان

ڈنگا فساد برپا کروں ۔۔۔ شور مچا دوں کہ تم نے مجھے لوٹ کھایا

ہے ۔ تو کیا ہو گا ؟

”تمہاری ذہنت ہوگی اور کیا ہو گا ؟ وہ اطمینان سے بولی ۔

”تم ایک مولیٰ تنخواہ دار ملازم ہو ۔ جو پرہیزی رئیس خرچ کرنے کا

میں نے سمجھا شاید میرے کان بکا رہے ہیں ۔“ بچے ہی

بچ نہیں رہا ۔۔۔ اور وہ بال جان جیسے الفاظ کیا واقعی لالی کے گونے

سے نکلے تھے ؟ میں جیسے برف کا بت بن کر رہ گیا تھا میں نے

انہیں بچاؤ چھڑا کر دیکھا ۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی تھی

نولالی ہی ۔ لیکن شاید اس کے جسم میں کوئی اور روح حلول کر

چکی تھی ۔

اس قسم کی صورت حال میں انسان غمو آجے بس کی سی

کینٹ میں صرف یہی کہہ پاتا ہے : ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟ میرے

منہ سے بھی غیر زاد سی طور پر یہی الفاظ سرگولی کے سے انداز

میں برآور ہوتے ۔ تم تو کہا کرتی تھیں کہ میری جنت میں کبھی

دنیا جان کا کوئی ہوش نہیں رہا ۔۔۔ اور جانے کیا کچھ ۔۔۔“

”جنت ۔۔۔“ کچھ ایسے انداز میں انہی کو میرے ہم

میں پھر برسی سی دو گئی : ”جنت تو مجھے صرف تیرہ چودہ سال

کی عمر میں ایک شخص سے ہوئی تھی لیکن وہ اپنا مطلب لکال

کر کھے دوئی دھوتی چھوڑ کر چلا گیا تھا ۔ اس کے گھر سے مجھے

کبھی سے جنت نہیں ہوئی ۔ اب تو میں ایک ہی مقصد ہے

جس کے تحت زندگی بسر ہو رہی ہے ۔ وہ اب ٹانگ پر

ٹانگ رکھے سارا نیویں کی سی ملکیت سے بیٹھی تھی اور میری

آنکھوں میں جھانک رہی تھی ۔ ذرا بھی جھجک نہیں رہی تھی ۔

میں حیرت کے جھجکے سے کچھ منجھل چکا تھا ۔ لالی نے

مجھے خوش نصیبوں کی دنیا سے اٹھا کر اس طرح تھا تو کی دنیا

میں پید کیا تھا جس طرح تلی مال گاڑی سے آؤں کی بوری اٹھا

کر بیٹ فارم پر پھینک دیتے ہیں ۔

”اور وہ مقصد کیا ہے ؟ میں نے تلخ لہجے میں پوچھا ۔

”زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنا اور ایک روز قبیلے سے

اٹک ہو کر کسی شہر میں آرام سے بیگت کی طرح زندگی بسر کرنا

اس کے بلا ناخن جواب دیا : ”آخر ہم بھی انسان ہیں ۔ ہماری بھی

کچھ خواہشات ہیں ۔ کیا ضروری ہے کہ میں اسی طرح میلے پٹروں

میں دیر ملاؤں میں محنت مزدوری کرتی رہوں ۔ بیٹے پرانے نیچے

میں رہوں اور راہ چلتا ہوا ہر شخص مجھے گھر کی مرضی کچھ کر دست

درازی کی کوشش کرے یا غش آواز سے کہے ؟

”روپیہ کمانے کے لیے اگر تم نے اپنے آپ کو فروخت

کر لینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ذرا صبر کرو ۔ میں نے

زیر لب لہجے میں کہا : ”شرمناک ہے تو ابھی سے کیوں نہیں چل

پانگہ ؟ اتنا روپیہ تو جمع ہو چکا ہو گا تمہارے پاس ۔ وہاں کوئی

مکان لے کر صفائی ستھرائی اور سیٹھ سے کوئی آقا شروع کر دو

الطرفہ دولت مند کا گوں کے لیے دروازے کھلے رکھو ۔ جلد ہی بہت

ہی اچھی چل رہی ہے... لیکن میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ جو تم نے ہمارے گناہ کے پھل کا چکر چلا یا تھا، وہ بھی بعض افسانہ ہی تھا نا؟

"ظاہر ہے" اس نے نہایت اطمینان سے مختصر جواب دیا میں چند لمحے خاموش کھڑا اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے آنکھ نہیں پھپکی۔ میں نے سرگوشی کے لیے میں کہا میں تمہیں معاف نہیں کروں گا لالی!

وہ تھکے استغنائے سے مجھے میں بولی "آج کل کون کے معاف کرنا ہے؟ آج اگر تم کسی کی انگلی سے ایک قطرہ خون نکال لو تو کل طاقت حاصل ہونے کے بعد جب تک وہ تمہارے پاس رہے گا تو کوئی نہیں پلاو دے گا تب تک اسے جین نہیں آئے گا۔ وہ زمانے گزر گئے جب لوگ انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دیا کرتے تھے۔ اب تو لوگ طاقت نہ رکھتے ہوئے بھی انتقام کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ اندر ہی اندر گل کھاتے رہتے ہیں۔ میں بھی جب کسی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتی ہوں تو جوابی حملے کے لیے تیار رہتی ہوں۔ تم جب بھی چور وار کرنے کے لیے آؤ گے مجھے اپنے دفاع کے لیے تیار پاؤ گے"

میں نے محض مرہٹے پر اکتفا کیا اور پیچھے سے نکل آیا۔ مجھے یہ محسوس کر کے بے حد حیرت ہوئی کہ میں کچھ زیادہ چلاؤں یا نہیں تھا بلکہ میرے وجود میں ہلکی سی افسردگی اور ریخ بنگلی کی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اتنی چڑچڑاہٹ اور جھنجھلاہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی جتنی میرے خیال میں ہونی چاہیے تھی۔

مجھے کچھ تعجب سا ہو رہا تھا۔ عورت کے کیا کیا رپ ہیں؟ کیا میں عورت کو کبھی سمجھنے کے قابل ہو سکوں گا؟ ایک دشمن تھی... وہ بھی بڑا عجیب سا جہان بان چھٹکا سے لگی تھی۔ دل کی لوح پر فراش سی ڈال گئی تھی... اور ایک پر لالی تھی... اس نے بہت بلندی پر پہنچا کچھ سے میری پہچان لی تھی۔

"ایک بات بہر حال ہے، میں نے اپنے آپ کو بھکایا کہ عورت پر کسی حال میں بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو بھروسے کے قابل ثابت کر دے تو بات دہری ہے لیکن تم ذہنی طور پر اس کی طرف سے ہر دھوکا کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس پر اس حد تک نیکرمت کرو کہ وہ تمہاری بھوری بن جائے اور اسے اس حد تک اپنی زندگی کا جزو مت بناؤ کہ اس کے جانے کے بعد زندگی میں غلہ محسوس ہونے لگے اور تم تو عرصہ قسمت ہوا فصل میاں کر رہی ہو۔ اس نوجوانی میں ہی بڑے متنوع تجربات حاصل ہو رہے ہیں ورنہ

دعویٰ کرو گے تو سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہو گا کہ تمہیں تمہارے پاس آئیں کہاں سے؟ ظاہر ہے تم نے نہیں اور بھرا پھیر کی ہوگی اسے بھی چھوڑو۔ دوسری بات یہ ہے کہ شور مچانے کی یوزریشن میں مرد نہیں، عورت ہوتی ہے۔ اگر میں نے ایک بیچ بچ بھی مار دی کہ یہ شخص میری عزت پر حملہ آور ہوا ہے تو تمہیں نہ جانے کتنی رائیں کسی تھانے میں اپنے دلک کر گزارنی پڑیں۔ پہلے میرا بابا اور میرے قبیلے والوں کے ہاتھوں جو پٹائی لگے گی وہ الگ ہوگی"

اتو کی چچی بہت چالاک اور عیارتی۔ میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے فیصلوں میں ایسی نادیدہ دکانیں بھی پائی جاتی ہوں گی۔

مجھے دوپے پیسے کا افسوس نہیں تھا جس راستے آیا تھا اسی راستے چلا گیا۔ البتہ انا کو ایک دلچسپ کام اور دلچسپ انسان کو بڑا غار سا ہوتا ہے اگر اسے یہ معلوم ہو کہ کوئی لڑکی۔ خاندان بدوش ہی سی... اس پر عاشق ہے... اور اس وقت اپنی نظر میں بھی بڑی غاری سی ہوتی ہے جب پتا چلے کہ وہ ان پڑھ سی لڑکی آپ کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

لالی اب ویسے بھی مجھے کچھ اچھی نہیں لگتی تھی اس وقت تو بالکل ہی گندی پھلی لک رہی تھی مجھے خود ہرجرت ہو رہی تھی۔ میں اب تک اس لڑکی کے پیچھے پاگل تھا؟ قسمت ہے مجھ پر۔

وہ گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی "ویسے تمیں زیادہ برا بھی نہیں مٹانا چاہیے۔ آخر کسی نہ کسی موڑ پر تو یہ کسی قسم ہوئی ہی تھی۔ تم مجھ سے شادی تو نہیں کر سکتے تھے نا؟ پہلے وہ مجھ سے یہ سوال کرتی تو شاید میں ہرج میں پڑ جاتا لیکن اس وقت میں نے بلا تامل جواب دیا نہیں "تو پھر اتنی چپیں چپیں کی کیا ضرورت ہے؟ ذہنی تیزی سے بولی "جاؤ جاؤ کہ آرام سے زندگی گزارو۔ جو وقت گزر گیا سو اچھا کر گیا۔ اچھا وقت بھی انسان کا سرمایہ ہی ہوتا ہے اس کے اپنے چہرے پر خوشی تھی نہ تاسف۔ گز رہے لمحوں کی کوئی نشانی کوئی نقش کوئی پرجائیں ہی کے چہرے پر ساتی نہیں تھی۔ چہرہ کیا تھا، بہت گری جھیل تھی۔

میں نے دیکھے مجھے میں کہاں تھے یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ بابا کے وہ بیٹا بڑوں کے قصے "وہ دکاندار کی کٹھن سب بھانے تھے۔ مجھ سے روپہ اینٹنے کے چلے تھے۔ بابا کو تو شاید زندگی میں کبھی زکام تک نہیں ہوا ہو گا اور دکاندار کی بھی اسے جلا کیا ضرورت ہو سکتی تھی جبکہ اس کی دکان تو گھر میں

میں تیرا کی کاٹا فربھی کر لیتا تھا لیکن جس روز میں ناخوش پڑا
یا سنگھڑ ہوتا تھا، اس روز تیرا کی کے لیے ضرور جاتا تھا نہ کہ
بٹ جاتا تھا۔

نہر کا پاٹ بہت چڑا تھا۔ وقای نقطہ نظر سے نہر
بہت اہم تھی اور جو کچھ ہماری کمپنی نے تعمیر کیا تھا، وہی نکالی
نقطہ نظر سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ سرحدیاں سے زیادہ
دور نہیں تھی۔ رات کے شائے میں بھی کھجاریاں فوجی مشینوں
کے دھاکوں کی جھم جھم گونج سانی دیتی رہتی تھی۔ دن میں بھی
کبھی نہر کے اس پار درختوں کی آگ آگ کا گڑیاں کہیں آتی جاتی نظر
آ جاتی تھیں لیکن ان کی نقل و حرکت شاید نہر کے اس طرف
تک نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے کبھی کسی کونہر کے اس طرف آنے
نہیں دیکھا تھا۔

میں بہت دیر تک تیرا پار شاہ کا ہند کا پھیل چلا تھا
اور پانی میں ٹھنڈے موس ہونے لگی تھی۔ میں اس وقت نہر
کی طرح نہر کے تقریباً وسط میں تیر رہا تھا جب میں نے نہر
کے دوسرے کنارے کے اونچے پشے پر ایک شخص کو اس طرح
نمودار ہوتے دیکھا جیسے کسی اداکار کو اچانک ہی ایلی پر دھاک
دیا گیا ہو۔

وہ میاں سی فاک پتوں نہیں اور چرسے کی سیٹ میں تھا
اور اس کے سینے پر کینوس کا ایک پتلا بندھا ہوا تھا۔ جیکٹ کی
زپ کھلی تھی۔ وہ جوان اور مختصر تھا اور اس وقت بے صبر لاشن
اور بد جاس فکڑ آرہا تھا۔

وہ تیزی سے پشے کی ڈھلان سے نیچے آنے لگا معلوم
نہیں پشے کی کچی مٹی میں اس کے پاؤں چس رہے تھے۔ پانی
اور وجہ سے وہ بری طرح لٹکھڑا رہا تھا نیچے پہنچے تک شاید
وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا یا پھر شاید جان بوجھ کر ان
نہایت بے ڈھنگے انداز میں نہر میں کود پڑا۔

میرا خیال ہے اسے تیرنا تو آتا تھا لیکن اس وقت
اس کی حالت تیرنے کے قابل نہیں تھی۔ شاید وہ بہت دیر
سے دوڑتا ہوا آیا تھا اور اس کی سانس قابو میں نہیں تھی شاید
اس کی ایک ٹانگ اور بازو میں چوٹ بھی لگی ہوئی تھی۔

چند گز تو وہ تیرا، اس کے بعد ڈکیاں کھانے لگے نہر بہت
گہری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ چند لمحوں کے اندر اندر وہ دب
جائے گا۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور غوطہ لگا کر
اسے پشت پر لے کر اُبھر آیا۔ میں اپنی گردن اس کے اتھوں
سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا عموماً ڈوبتا ہوا آدمی اس جہری
طرح لگے کا ہار ہو جاتا ہے کہ بچانے والے کا بھی سانس رک

بند جا کر سامنے آئیں گے۔ تب تک ہم تیرا دو صاحب یا قانون
کی دسترس سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ میں نہیں اندھیرے
میں نہیں رکھوں گا۔ جتنی بات یہ ہے کہ اگر ہم پکڑے گئے تو
شرکیہ جسم کے طور پر تیرا نام بھی لیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔
ویسے تیرا ہی پوزیشن اس وقت تک سب سے زیادہ صاف
ہے۔ اس لیے تھکاتے تھے میں یہی بہتر ہے کہ آج کل میں ہی کھسک
لو۔ اسلخا وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں۔ بس تیرا دو صاحب کے نام
ایک رگھی اطلاع چھوڑ جانا۔ ظاہر یہ کہ ناجیسے تیرا کی کسی عزیز
بھتی کی طرف سے اپنا کام بھی کوئی بڑی ضرورت ہے اور شاید
تم واپس نہ آ سکو۔ ویسے بھی کام تو ختم ہو ہی رہا ہے۔ کہہ دینا
کہ نئے پروجیکٹ پر جانا تمہیں ٹوٹ نہیں کرنا تھا کہ حالات
اجازت نہیں دیتے۔

میں سوچوں گا وہ میں نے دیکھے ہیں کہا۔
سوچنے کا اب وقت نہیں ہے وہ اٹھتے ہوئے بولا۔
ہرگز نہ دے والا طرح ہے حقیقت ہے۔ میں نے تمہیں ماری ہو تو حال
کچھ ماری ہے اور بہترین دوستانہ مشورہ دے دیا ہے۔ اب اپنا
بچاؤ کرنا تھا تیرا اپنی ڈرے واری ہے۔

وہ چلا گیا اور مجھے سوچوں میں گرفتار چھوڑ گیا۔ مجھے
قانون امریکا کو ان کی انگشت نکالی وغیرہ کی کوئی خاص فکر نہیں
تھی۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں بددیانت ہو اور خانی
ثابت ہونے کے بعد تیرا دو صاحب کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ باقی
تمام تفکرات غمنی تھے۔

سوال یہ تھا کہ یہاں سے بھاگ کر میں جاؤں کہاں؟
کیسا بے ٹھکانا تھا میں۔ ایک بے آشیانہ پتلی سکم مری میں
مال باپ کے سامنے سے عروم ہونے والا میں دنیا میں کیسا
تنبہا ہو جاتا ہے۔ پہلی بار مجھے اپنی حالت پر کچھ زیادہ ہی غور
ہوا۔ کہہ کی حد تک۔

وقت کو پٹا کھاتے دیر بھی تو دیر نہیں لگتی۔ کل صبح
تک میں جے حدوش اور اندر سے بے حد مضبوط تھا۔ آج چند
لمحوں کے اندر اندر میں بے حد سنگھڑ اور اندر سے کھنڈر ہو چکا
تھا۔ کہاں جاؤں؟ کہاں کا رخ کروں؟ یہی سوال میں رہا تھا
جب یہاں آیا تھا تب تو دو ہزار روپے پتے بھی تھے اور ان
کی وجہ سے دل کو کافی دھارس بھی لگی مگر اس وقت تو حبيب
میں کل دو ڈھائی سو روپے تھے۔ چند دن پہلے ہی تنخواہ ملی تھی۔
کچھ آدھار آثار دیا تھا۔ کچھ رقم شانہ انداز میں ٹھکانا۔ بڑی تھی۔
ڈیوٹی کا وقت ختم ہوا تو میں نہر کے اس دو ڈھانڈھے
کی طرف چل دیا جہاں میں تیرا کی کرتا تھا۔ عام حالات میں تو

چکر کاٹ کر اس طرف آتا تھا۔

دینا ہے اور اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

کرنے کو تو میں نے اشارہ کر دیا تھا لیکن اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے شروع ہو گیا تھا کہ میں نے ناحق ہی رہنمائی کی۔ اس شخص کی جو حالت میں نے دیکھی تھی، اسے یاد کرتے ہوئے اس پر تیسرا آ رہا تھا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو گھولنے کی کوشش کی کہ اگر رہنمائی کو اس کی تلاش تھی تو یقیناً وہ کوئی مجرم اسی ہو گا۔ کوئی ایسا مجرم یا جاسوس وغیرہ۔ اس صورت میں اس کا پکڑے جانا ہی بہتر تھا۔

اپنی اس سوچ پر مجھے خود ہی ہنسی آگئی۔ میں تو کچھ اس طرح اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا جیسے میں خود کوئی بڑا پادشاہ عابد و زاہد اور دیانتدار انسان تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ خیال بھی گزرا کہ شاید محاشرے میں بیشتر انسان مجرم ہی ہیں، کوئی قانون کا مجرم، کوئی خدا کا مجرم، کوئی بندوں کا مجرم اور کوئی غیر کا مجرم۔ بات بس اتنی ہے کہ جس کا جرم ظاہر ہو جائے وہ ملعون ہو جاتا ہے۔ جس کا جرم چھپا رہے وہ معزز بنا رہتا ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شخص اگر اپنی شکستہ حال اور نگاہوں کے باوجود دو میل لمبا میدان عبور کر کے جنگل تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف رہا تو شاید مارا جائے۔ اس کے گلے تک پہنچنے سے پہلے ہی رہنمائی شاید اس کو چاہیے۔ البتہ اس نے اگر کہیں ادھر ادھر نکل کر کوئی جاگتے پناہ تلاش کر لی تو شاید رہنمائی کو غلطی سے دے جائے۔

چند منٹ بعد اندھرا پھیل گیا اور میں نمرے نکل آیا۔ پھر بس کر اور جیسی دیکھے سے بال بنا کر میں واپس اپنی غیرت کی طرف چل دیا۔

راتے میں ایک جگہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب ایک ٹوٹا چوٹا پتھر سا تھا جس میں ایک نیچ پڑی تھی اور اس کے سے نیچ ہوئی ایک نیچ استادہ تھی۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ کافی عرصہ پہلے یہاں ایک شخص نے کوئی کام شروع کیا تھا جو اب نہیں تھا۔ بالآخر ایک دن وہ کسی سے اس کا کرایہ ادھار لے کر اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔

اسی چھتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے اندر سے ایک نیچ پر ایک ہیولا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی سگریٹ تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے جسے میں نے نمرے میں دیکھا تھا۔ اس نے بھی لیٹنا مجھے دیکھ لیا تھا لیکن چھپنے کی کوشش کرنے کے بجائے وہ مجھے متوجہ کرنے کے سے انداز میں کھنکھارا اور تب میں نے پہچان لیا۔ وہ مفروضہ شخص

اس شخص نے اس عالم میں بھی خاصی سمجھ داری کا مظاہرہ کیا اور میری کمر سے لپٹ گیا۔ اس کا کینوس کا تھیلہ میری کمر میں چھو رہا تھا۔ کمر پر لاوے میں اسے دوسرے کنارے پر لے آیا۔ وہ خود ہی میری کمر سے اتر کر اندر جا بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ منہ سے پانی بہل بہل کر کے نکل رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اس کے ہاتھ اور پچھلیوں کے اندر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دھشت زدہ نظروں سے میری طرف اور پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم نے میری جان بچائی ہے بھائی... لیکن اس وقت میں صبح گھر پر تھکا رہا تھا کہ یہ بھی ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں... دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں... خدا حافظ... اللہ تمہارا بھلا کرے...“

وہ اپنا اوروں کا ہوا ایک طرف کو بھاگتا چلا گیا اور چند لمحے بعد ٹپلوں کے عقب میں غائب ہو گیا۔

میں دوبارہ نمرے میں اتر گیا اور اٹا تیرے لگے۔ میں کافی حد تک پرسکون ہو چکا تھا اور اس شخص سے گھراؤ کے بعد بھی میں پریشان ہونے کے بجائے مزید پرسکون ہو گیا تھا۔ مجھے دراصل یہ اطمینان حاصل ہوا تھا کہ کچھ لوگ دنیا میں مجھ سے کہیں زیادہ پریشان ہیں۔

چند لمحے بعد ہی ایک جیب گھگھراتی ہوئی پٹے پر نمودار ہوئی اور سیدھی ہو کر ٹپ گئی۔ یہ رہنمائی جیب تھی۔ اس میں تین آدمی موجود تھے۔ ایک ڈرائیور کر رہا تھا اور دوسری بیٹریں پر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں انٹینس تھیں۔

کتنی جیب میں کھڑے ہو کر انہوں نے مشامی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا پھر ان کی فکر مجھ پر پڑی۔ پہلے تو انہوں نے ایک جھلکے سے انٹینس کا رخ میری طرف کر لیا اور میں نے اپنے آپ پر فخر پڑھ لیا لیکن نا کافی دیر میں شاید ان پر وقت ہی احساس ہو گیا کہ میں ان کا مطلوب آدمی نہیں ہوں اور نہ شاید ان کی جگہ سازی کے باعث میں زندگی سے محروم ہو چکا ہوتا۔

”جوان! ان میں سے ایک نے بھاری آواز میں مجھے پکارا۔

”تمہارے ادھر خاکی پتلون اور کالی بیگٹ والے کسی آدمی کو تو نہیں دیکھا؟“

”دیکھا تو ہے“ میں نے کہا۔ ابھی ابھی میرا کہہ کر کے ادھر کو دوڑا ہے۔ میں نے ٹپوں کی طرف اشارہ کیا۔ ٹپوں کے عقب میں تقریباً دو میل تک جیشیل میدان تھا۔ پھر جنگل شروع ہو جاتا تھا۔

”میرا بیٹا! رہنمائی کرنا اور ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ جیب گھگھراتی ہوئی پڑنے لگی کہ طرف چل دی۔ ہماری کہیں کا تیار کیا ہوا ہاتھ ابھی آمد و رفت کے لیے نہیں لگتا تھا۔ جیب کو کافی لمبا

نہیں ہمارے کپڑے کا ایک ڈرامہ نیا حسین تھا۔

اوسے اتم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے چہرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ دفعتاً ایک خاص ڈرامہ سے ٹھٹھکی ہوئی۔ کجنت اندھیرے میں بیٹھا بھری ہوئی سگریٹ پی رہا تھا۔ میں جی ذرا غور و فکر کر رہا ہوں اس نے بھاری آواز میں نہایت شائستگی سے جواب دیا یہ بنگلہ غور و فکر کے لیے بڑی سوزوں ہے۔ میں اکثر شام کو یہیں آجاتا ہوں۔

اوسے اتم غور و فکر بھی کرتے ہو؟ میں حیرت سے

تقریباً چلا اٹھا۔
دیکھو... کیا میں انسان نہیں ہوں افضل صاحب؟

اس نے گویا برا نہ مانے ہوئے پوچھا۔
میرا خیال تھا کہ تم ڈرامہ نیا حسین سے لے کر اے پھر لے دے

کیا غور و فکر کرتے ہو تم؟
یہی کہ آج سے شراستی سال بعد جب تیل کے ذخیرے ختم ہو جائیں گے تو ہم ڈرامہ نیا حسین کا کیلئے گا اس نے بے خیال بے میں کہا۔

اگر تم اس وقت زندہ ہوئے تو کسی اونٹ پر ڈرامہ نیا حسین لگ جانا میں نے ہنسی منہ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ بہت سے عجیب ختم ہو جائیں گے تو ڈرامہ نیا حسین کا امتحان لے لائیں کا چکر نہ اسے دی نو کرنے کی فکر اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگوں کی جائیں بھاری پرورداری کے ہاتھوں غمخوار ہیں گی۔
افضل بابو! ایک تو تم کسی شے میں کبھی مجبور نہیں ہوتے وہ گویا میری حالت پر انداز کرتے ہوئے بولا پھر مجھے اپنا ایک اسے خیال آیا تمہارے لیے بھی سدا گواں سگریٹ ہیں نے پکٹ میں بھری بھرائی تیار رکھی ہوئی ہیں۔

نہیں یار! انی الحال تم بے بیو۔ میں اس وقت تمہاری طرح غور و فکر کے موڈ میں نہیں ہوں میں چہرے نکل آیا۔

آسان پرتار سے خود راہ چلے گئے۔
میں نے پلے کٹھن سے جا کر کھانا کھایا۔ پھر ذہن میں اس رقص کا مضمون ترتیب دیتے ہوئے جو میں بھلا صاحب کے نام چھوڑ کر چانا چاہتا تھا بھیجے کی طرف چل دیا۔

خاردار تاروں کے گٹھ پر چڑھ گیا ابھی نہیں آیا تھا تاہم اس کی ناراضگی کی کڑی برکھ تھی۔

میرا خیال سب سے پہلے خاردار تاروں کے عین قریب تھا۔
روہ اٹھا کر جب میں لنگن نامہ لکھنے میں داخل ہوا تو اچانک ہی تاریک خیمے میں میری آنکھوں کے سامنے گویا پھلجڑی سی جھوٹ گئی میرے سر پر جیسے نہایت بے آواز طریقے سے

توپ کا گولہ آگ لگاتا تھا۔

غالباً کسی نے شوک جینے سے میری کنکھی پر وار کیا تھا۔
آخری بات جو مجھے یاد رہی وہ یہ تھی کہ میرے گھٹنے کے فرش سے ٹکرائے تھے۔ اس کے بعد خیمے میں چھٹی ہوئی تاریکی میرے حواس پر بھی چھا گئی۔ مجھے احساس نہیں کہ کتنی دیر بعد میں پرکشش آیا۔ تاہم یہ احساس ضرور ہے کہ پرکشش ہی نہ ہو وہاں نہ ہوئی ہوئے کو پہننے لگا تھا۔ سر میں تکلیف ہی اتنی تھی، معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی نے قسم کا گولہ میرے سر کو لوہے کا گولہ بھجوا کر اس پر تھوڑے سا برسا کر اس سے کوئی چیز بنانے کی کوشش ہے۔

میں نے غیر ارادی طور پر اپنے سر کی طرف سے جانا چاہا۔
احساس ہوا کہ میرے ہاتھ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہے تھے چند لمحے بعد میری آنکھوں کی دھندلاہٹ دُور ہوئی تو دیکھا کہ میں اپنے خیمے میں ہی تھا اور میرا پیر و محسوس ٹیپ بھی روشن تھا۔
میں لوہے کے پائپوں والے پینک پندرہ واڑ تھا اور میرے جسم پر چاند بھی پڑی ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ یا قبل پینک سے بندھے ہوئے تھے اور اُنہ میں پکڑ رکھا ہوا تھا اور اس پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔

میرے قریب لوہے کی گڑھی پر ایک شخص اطمینان سے ہانک رہا تھا۔ ایک نفی رسالے کی دست گردانی کر رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں لٹکتی ہوئی سگریٹ پی ہوئی تھی کسی نفی تصویر کو دیکھتے ہوئے اس نے منہ میخیز انداز میں سر ہلایا اور چٹکی بجا کر دیکھ بھال کی۔ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ بڑے ہی اناجھاک سے مطالعے میں مصروف تھا۔

اُسے دیکھتے ہوئے کئی بار میں نے غیر ارادی طور پر پلکیں جھپکائیں تھیں کہ مجھے نہیں ہو گیا کہ یہ میرا دام نہیں ہے۔ وہ شخص کجنت دہی تھا جس کی میں نے اس وقت جان بچائی تھی جب وہ کسی قریب الگ اور لاوارث کتنے کی طرح نہریں ڈوب رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی جب اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں نہریں جھپکایں لگائی اور اس وقت بھی اس کا چہرہ قابل دید تھا جب میں نے اسے نہر سے نکال کر کٹا کر پڑا دیا تھا۔ اس کے ناک اور منہ سے جھل جھل پانی بہ رہا تھا۔ آنکھیں کسی جبار آگ کی آنکھوں سے شاربہ نظر آرہی تھیں۔ منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

مگر اب وہ گر پڑا۔ اس کے انسر کی طرح ٹھٹھکی سے چھا ہوا تھا اس کی جیکٹ تو چمڑے ہی کی تھی۔ بانی سے اس کا کچھ نہیں بچا تھا۔ اب اس کی پتوں و مینو بھی موٹھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کجنت نے لنگھی پٹی پک کر لی تھی۔ عدو یہ تھی کہ

نہ نہ نظر آوا اس میں گھس گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے زنب سے پہلے یہاں سرگٹ اور ماچس آسانی سے مل گئی۔ وہاں اٹل جلا کر میں نے سارے خیمے کا جائزہ لیا اور ایک ڈنڈا منجھال کر سرگٹ سدا کر پرے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میرا چونکرات گئے تک اس خیمے ہی میں رہنے کا ارادہ تھا اس لیے پہلے مکین کا بندوبست کرنا ضروری تھا... اس کے بعد کیا ہوا وہ تو اندازہ کر ہی سکتے ہو کہ وہ معدت خواہ از سے انداز میں شکرایا یہ کچھ دیر پہلے چاروں طرف سناٹا اور سکوت پھیل گیا تو میں نے پھر دیکھ لیا کہ وہاں اب تو مجھے آشوبش ہونے لگی تھی کیونکہ تھیں بے ہوش ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔

اس کا مطلب ہے تم نے چھپنے کے لیے جنگل کا رخ نہیں کیا تھا؟ میں نے پوچھا۔

میں پاگل سمجھا رہا ہوں؟ وہ اطمینان سے بولا اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ زندگی کا فاصلے کو ابھی بڑھتا ہوا اجازت تھا جنگل تو بہت دور تھا اگر میں جنگل کا رخ کرتا تو یہ بھر زلزلہ میری کھوپڑی اٹا دیتے دور نہانگ وانگ میں گولی مار کر لنگڑا ٹولا تو کہہ دیتے میرا رولر اور ویسے بھی راتے میں کیس گر گیا تھا ہر حال یہ بجز زب سے اس قسم کی آٹھ بھولی کا مجھے بڑا تجربہ ہے۔

گویا میں یہ سمجھنے میں تھی بھانجوں کو تم اسمگلر ہو؟ میں نے حتی الامکان شائستہ انداز میں جواب دیا کہ نہ کبھی کو کشش کرتے ہوئے کہا۔

”بے شک... لیکن نہایت معمولی قسم کا“ اس نے انجاری سے جواب دیا میری ایک کیب اور گاڑی اس وقت نہر کے پرٹی طرف کے جنگل میں چھپی ہوئی ہے اپنی دانست میں تو میں اسے بڑی محفوظ جگہ پر چھپا کر آیا ہوں لیکن اگر وہ بجز زب کے بچھے چڑھ گئی یا کوئی حریف اسمگلر اسے لے آتا تو میں دیوالیہ ہو جاؤں گا ایک بار پھر مجھے خطرہ مول لینا ہے۔ جہاں پہنچیں پر رکھ کر جنگل میں جانا ہے تب سے بڑی مصیبت ہے کہ میں تمہا جنوں۔ آج تک کوئی بھنگ کا ساتھی ہی نہیں ملا، جو ملا پھنسلے والا ہی ملا اپنی دراصل تھہر رہی بڑی ڈھیلی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ اس مرتبہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کیب نہایت خیریت سے سرحد پار پہنچا کر وہاں سے سب سے بڑی کیب لے کر آ رہا تھا تو یہ بجز چھپے لگ گئے۔ دراصل نیاجو کی انچارج آیا ہے بچکر زیادہ ہی مستعد ہے اس سے کوئی بات نہیں بن سکتی۔“

معاشرے کی سکرٹ بھی میرے ہی پیکٹ سے پی رہا تھا اس نے اپنے سامنے ہی پتائی پر رکھا ہوا تھا میں سرگٹ بیتا تو نہیں تھا مگر خیمے میں آئے راتے یا دروستوں کی تواضع کے لیے ایک ڈنڈا منجھال رکھا تھا کبھی کبھار خود بھی منہ کا ڈال دینے کے لیے وہ چاروں طرف لگتا تھا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ اس میں نے تجھے اس نہر میں بیٹھنے دیا ہوتا لیکن میں چونکہ منہ میں پکڑا تھا ہونے کی وجہ سے کچھ کہنے کی ہوشیاری نہیں تھا اس لیے میں نے غصے کھانے پر اکتفا کیا۔ یہ آواز بھی صرف اتنی ہی تھی کہ میں خود بھی مشکل سے سن سکا مگر اسے اس شخص کو احساس ہو گیا کہ میں کسسا رہا ہوں۔ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ نہایت ہی شرمسار نظر آنے لگا اور گھنٹہ اندہ سے مجھے میں بولا اسماعل کہنا مارا اندھیرے میں بتائی نہیں چلا کر میں اپنے مسن پر ہی وار کر رہا ہوں۔ دیسے بھی غیر اپنی جان بچانے کا مسئلہ درپیش تھا لیکن جلائے کے بعد جب میں نے تمہاری شکل دیکھی تو بہت ہی نرم محسوس ہوئی خصوصاً اس لیے کہ میں نے ڈنڈا منجھال سے سرو پر کچھ زیادہ ہی زور سے یہ سدا کر دیا تھا۔

اس نے سرگٹ کا ایک کش لیا اور میں اس دوران ایک بار دیکھ کسسا یا۔ وہ میری بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے بولا منجھال سے لٹکے پاؤں باندھنے اور منہ میں پکڑا ٹھونسنے کی زیادتی میں نے صرف احتیاط کی ہے کہ میں تم ہوش میں آتے ہی چھٹا چلا تا شروع کر دیا یا تھا یا نہیں شروع کر دو۔ اگر تم مردوں والا وعدہ کر دو کہ شورش راہیں کرو گے تو میں تمہارے منہ سے پکڑا نکال سکتا ہوں تاکہ تم ہم کی بات جیت کر سکیں۔ مجھے میرے سر میں اٹھتی ہوئی نیسوں نے جس حد تک اجازت دی اس حد تک میں نے زور زور سے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے نرم اور دوستانہ لہجے سے یہ اعتراض کافی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر میری زبان کو آزاد کر دیا اور میں گویا آگے سے زیادہ آزاد ہو گیا میں نے اطمینان کی ایک ٹول سانس لی میری تکلیف خود بخود ہی کافی حد تک ختم ہو گئی۔

”تم یہاں گھس کیسے آئے؟“ میں نے پوچھا میری آواز خامی کر دہر گئی۔

”بجز زب سے بچنے کے لیے ادھر آ نکلا تھا“ وہ ایک بار پھر نہانگ پر نہانگ کہہ کر مجھے ہونے بولا وہ لوگوں کی نظر سے بچنا چاہتا تھا دراصل وہاں تک آنا پوچھا اور پھر سینے کے بل لیٹ کر اس حد بندی کے اندھا گیا اور سب سے پہلے جو

و تم اپنے آئندہ دونوں طرف کے لوگوں کے لیے میں بڑا بھر دے گا کہ وہی ہوں۔ یعنی اُجرت جتنی شاہ اپنے کسی کار بند سے کو دیتا اتنی ہی رقم بلکہ کمیشن مجھے دے دے گا لیکن یہ رقم لانے کا کام ہے خطرناک... مال لانے سے بھی زیادہ خطرناک...
 ”تو دلاس سے ادا ہو گئی پاکستانی کرنسی میں ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جس کرنسی میں چاہا وہی میں ہو سکتی ہے۔ بس اسی حساب سے مال کی قیمت میں فرق پڑ گیا تھا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ میں نے جانے کیوں سوال کر دیا۔

”وقت گزاری کے لیے؟“ اس نے سا دگی سے جواب دیا۔
 ”میں اس وقت اندر ہی اندر کچھ فکرس ہوں بھٹے بہت نذر کی کھجور بھی لگی ہے۔ یہ میں دھیان بنانے کے رکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کا مطلب ہے کہ میں مزید دو گھنٹے تک اسی طرح لیٹا رہوں گا جس طرح آئرلینڈ میں پیر لینڈ پر ہوا تھا ہے۔ میں نے پوچھا کہ میرے قواعد و ضوابط ہونگے ہیں۔ اگر تم مجھے کھوئی دو تو میں مردوں والا وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ میں اخیان سے بڑھ کر تم سے کچھ نذر کرنا کہتا ہوں۔ تمہاری باتیں سن کر جانتے کیوں میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی ہیں۔ تمہاری کھجور کا بھی میں شاید کچھ دوا دے گا کہوں۔“

وہ چند لمحے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے قتل رہا پھر گہری سانس لے کر بولا اور صرست تو یہی بتاتی ہے کہ تم مرد نہ تھے جو تم پر پھر وسایا جا سکتا ہے۔ مہر حال اُچھا دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی پٹوں کا پانچاغا صا اور پر تک اُٹھایا۔ اس کی پٹنڈلی پر چڑھنے کی تقریباً بالشت بھر لی نیام سی بندھی ہوئی تھی جس سے ہاتھی دانت کا دستہ جھانک رہا تھا اس سے دستہ پڑ کر کھینچا اور شلش کرنا ایک خنجر نیام سے نکل آیا۔ اس کا چل بالشت بھر سے نکلتا ہوا ہی تھا۔

”میں تمہیں کھولنے لگا ہوں اور اُچھا بٹا رہا ہوں کہ خنجر میرے ہاتھ میں ہو تو مجھ سے پرنگا لینے والے کو پھینک دے گا۔“ وہ اُٹھتے ہوئے بولا اور اس وقت میں اندر ہی اندر فکرس بھی ہوں یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں اور۔ جب میں زور سے اور کھجور ہوتا ہوں تو باتیں بہت کرتا ہوں اور اگر کسی کو ذرا بھی بڑی نیت سے حرکت میں آتے دیکھتا ہوں تو بالکل ہی طرح ہی شمشیر لگ کر کاٹ ڈالتا ہوں جیسے تم کسی اسیر تک کو پوری قوت سے کھینچتے رہو اور وہ ٹوٹ کر اچھا تک

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا چند ہی لمحوں وہ کوئی پڑا ناشا معلوم ہونے لگا تھا۔ سر میں لیس کچھ کم ہو چکی تھیں۔ تاہم اُچھا پاؤں ایک ہی پوزیشن میں رہنے کے باعث خل ہوئے جارہے تھے۔

”اب تمہارے ارادے کیا ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”اُس نے اپنی گھڑی دیکھی اسے جھکا دیا پھر میرے طرف دیکھ کر بولا یہ بند ہو گئی ہے۔ واٹر پروف نہیں ہے۔ نار اس مرتبہ مجھے تجربہ ہوا ہے کہ اسمگلر کو ہمیشہ واٹر پروف گھڑی رکھنا چاہیے۔“

”اُس نے چادر ہٹا کر میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور ایک لمحے کے لیے کچھ سوچ کر بولا۔“ دو گھنٹے بعد میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں میری وجہ سے جو تکلیف اُٹھانا پڑی اس پر میں سخت شرمندہ ہوں۔ تمہارا احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ رقم کے ذریعے اس کا صلہ تو نہیں دیا جا سکتا لیکن میں اپنی شرمندگی کم کرنے کے لیے کچھ رقم یہاں رکھ دیتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد اُٹھالینا۔“ اس نے ہاتھ پر دھار کر تپائی پر رکھا ہوا کیونس کا تھیلا اُٹھایا جب میں نے اُسے نہر سے نکالا تھا تو وہی تھیلا اس کے سینے پر بندھا ہوا تھا۔ اُس نے تھیلے کی زیپ کھولی۔ میں لیٹا ہوا ہونے کے باوجود دیر دیکھنے بغیر نہر سے گا کہ اس میں نوٹوں کی کئی گنتیاں تھیں۔ اس نے سو سو کے نوٹوں والی ایک گڈی نکال کر پانچ نوٹ گن کر گڈی سے علیحدہ کر کے تپائی پر رکھ دیے اور ان پر ایک کپ رکھ دیا۔ مہلدا ہوا کو کوئی جھجکا کرتے اور وہ اُٹھا جائیں۔

”اُس نے شاید سو سو کر لیا کہ میں اس کے رقم کے رنگ کو خور سے دیکھ رہا ہوں۔“ اُس نے ہونے بولا۔ یہ رقم میری نہیں کسی کی امانت ہے۔ مجھ سے بڑے ایک اسمگلر... خدا کا شکر ہے کہ میں رقم چھپانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ معلوم نہیں وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔۔۔ میری بات کا یقین بھی کرتا یا نہیں۔“

”لیکن تمہارے پاس کہاں سے آگئی اس کی رقم؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”تمہیں یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ مجھے قسم کے اسمگلر کے کے درمیان اُڈھا رہی جلتا ہے۔ وہ دشمن کے ہونے لگا۔ میں جس اسمگلر کا ذکر کرتا ہوں، اسمگلنگ کے میدان میں اُس کا نام جتنی شاہ ہے۔ پچھلے دنوں اُس کی ایک کھیپ اُڈھا رہی تھی۔ یہ دینی بھی تھی جیسے آج میں مال دے کر آ رہا ہوں جتنی شاہ کے پاس آج کوئی کارندہ نہیں تھا۔ اُس نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ

کردہ ہو تو دل پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "مجھے تم اشرف خان کہہ سکتے ہو آپس کی بات ہے... ویسے یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔"

"اصلی نام سے مجھے کوئی غرض بھی نہیں، میں نے یہ بدلنے سے کہا، مجھے تو صرف انھیں غائب کرنے کے لیے کوئی نام چاہیے تھا۔ ان کو اشرف خان! تم مجھے ایسا سا بھی کیوں نہیں بندھ لیتے؟ میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ میں خاصا کام کا آدمی ہوں۔"

"اُس نے دودھ کا پیالہ خالی کر کے تھالی پر رکھا اور چند لمبے خاموشی سے مجھے گھورتا رہا، کیا تم سنجیدہ ہو؟" بالآخر اُس نے پوچھا۔

"موت کی حد تک، میں نے جواب دیا۔
"یہاں تمھیں کیا تکلیف ہے؟" اُس نے پوچھا۔
"میں نے تمھیں اس لیے شرارت کی پیش کش نہیں کی کہ تم میرا اثر دہرائیں، مجھے نہیں نے قدر سے رکھا، میں نے کہا، بہت سی باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں، اور نہ ہی ان کے اظہار کا کوئی فائدہ ہوتا ہے، بہر حال تمھاری تسلی کے لیے تمھاری ہی وصحت کر دیتا ہوں، میرا خیال تھا کہ تم خود ہی اس بات کو سمجھ جائے گے۔ میں یہاں ایک معمولی ملازم ہوں اور انارکسی میں کہ اگر اس پہنچ میں رہا تو معمولی ملازم ہی رہوں گا، گوئیو میرے پاس نہ تو کوئی ہتھیار ہے اور نہ ہی خاص تعلیم، جبکہ میں بہت سی دولت کمانا چاہتا ہوں اور بہت زیادہ دولت کا کوئی جائز راستہ مجھے نظر نہیں آتا، میں نے لائن بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"رہ پیر کمانا ہماری لائن میں بھی آسان نہیں، وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا، "اس میں بھی جائز کاروبار ہی کی طرح علت ہے، مشقت ہے، درجہ بندی، ہیں، وہاں سے درمیان بھی سرمایہ دار طبقہ، غریب طبقہ، ملل کلاسی، غریبہ ہر طرح کی مخلوق پائی جاتی ہے۔ کاروبار کا رقبہ، میں ایک دو سرے کی دکان، کھینچنا اور آگے بڑھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنا۔ یہ سب کچھ ہمارے ہی ہیں، ہوتا ہے، ہمارے دھندے میں بھی قسمت، لعن کا ساتھ دیتی ہے، بعض کا نہیں دیتی، غریب کہ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح جائز کاروبار کی دنیا میں ہوتا ہے، لیکن بہر حال ہمارا کاروبار ناجائز ہے اس لیے ہم وطن کے دشمن بھی ہیں، مجرم بھی، قاتل کی راہ کاروں اور اچھی پس اور اپنے منہ کے مٹھوں بھی۔ اگر تم میرے ساتھ شامل ہو جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی انکار نہیں لیکن اس لائن کو چھوڑنے کی سچ سمجھ کر مت آنا، اور یہ بھی مت بھٹکا کہ آج اس دھندے

تمھارے منہ پر آئے۔"

دو واقعی بہت باتیں کر رہا تھا، خیر گو کہ اس نے باہر انداز میں بڑا اچھا کیا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ اس نے کبھی کسی کی شہرت کا کوئی توکی۔ وہ خوشی لگتا نہیں تھا۔

"اُس نے میرے ایک ہاتھ کی بندش کاٹی اور میری آنکھوں میں جھانکا، شاید اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری بہت ہی کوئی خرابی آئی ہے یا نہیں، حالانکہ میرا اپنے آپ کو خراہ خراہ زخم دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اگر وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا رہا ہوتا تب میں کچھ کرنے کی ہوتا۔"

دوسرے ہاتھ کی بندش کاٹ کر اُس نے دوبارہ ہیرن طرف دیکھا، سخت کھڑکڑاہی تھا، ہاتھ کھینچتے ہی میں نے اپنا سر ہٹا کر دیکھا، ہڈی کے قریب ایک اور عیونٹا سا سر نمودار ہو چکا تھا، لیکن افسوس کہ اس میں عقل نہیں، صرف درد تھا اور کچھ خون بھی پس پس کر بالوں کی جڑوں میں جم چکا تھا۔
"تمھاری آتما زیادہ باتوں اور دوستانہ رویے کی بدولت میرا دل تمھاری طرف سے اتنی جلدی صاف ہو گیا ہے، میں نے جوت کو سہلاتے ہوئے کہا، "اور نہ شاید میں اس شرب کا انتقام لینے کے لیے تمھارے اس کھڑکی نما خنجر کی پروا کیے بغیر تم پر ٹوٹ پڑا۔"

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر خنجر تھا، مگر انداز میں کھڑا تھا، میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور اٹھ کر پہلے سو بے کے ایک شیت سے سر روئی دو گولیاں نکال کر پانی سے کھائیں پھر مٹی کے تیل کا پتھر لہار وشن کیا جو میں نے کبھی کبھار کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے دیکھا ہوا تھا۔

"میں نے دو انڈے اُبال کر اور دودھ کی ایک پیالی گرم کر کے اس کے سامنے رکھی تو وہ خاصا حیران نظر آنے لگا، شاید اسے میری طرف سے کسی قسم کی مہربانی کی توقع نہیں تھی، کچھ سوچ کر اس نے بالآخر اٹھا ہاتھ لگا کر اسے طاق رکھتے ہوئے خنجر بنام ہلکے لکھیا اور انڈے سے مرثب کرنے لگا، تاہم اُس کی نظر مجھ پر ہی جمی رہی، جنگ پڑنا نہیں لگتا، پیچھا تھا۔

پچھلے کئی منٹ سے خیمے میں سکوت غاری تھا، میں اس نذران مسلسل سوچتا رہا تھا، کیا ان بالوں کے بارے میں جو اس نے بتائی تھیں اور کچھ اپنے مستقبل کے بارے میں... بالآخر میں نے کھٹکھٹ کر گھاساٹ کر سنے ہوئے کہا، "تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

وہ انڈے نکل چکا تھا اور اب بے صبری سے گرم دودھ کو بڑے بڑے گھونٹ بھر رہا تھا، ایک لمحے کے لیے رک

”ہم ٹوٹے تو آج ہی سے تم پر ہیں برسنے لگے گا۔“
 ”اگر میرے سب کچھ درست ہے تو تم اپنی لائنیں بول نہیں
 بلاتے؟“ میں نے پوچھا اور اگر جان کر دوبارہ جتنی ہی خوار
 اٹھائی ہے تو پھر جان پہچان پر کیوں رکھی جائے؟“

”میں یہی ہی آج تک نہیں سمجھ سکا وہ ٹھنڈی سانس
 لے کر بولا میں نے خود بھی بار بار جان کر دیار کی طرف جانے کا
 سوچا لیکن مجھے کبھی حالات مناسب نظر نہیں آئے۔ شاید
 بات یہی آتی ہے کہ جس لائن میں رچ گیا اس کا اس
 سے ٹکنا دشوار ہو جاتا ہے۔ شاید کچھ چھوٹے اسمگلر سوچتے ہیں
 کہ بہت سادہ ہے آجائے تو وہ ذرا شان سے کوئی کاروبار کریں
 لیکن جب وہ اس سطح پر پہنچ کر کوئی کاروبار شروع کرنے کی
 سوچتے ہیں تو بے شمار دشواریاں راستے میں حاصل نظر آتی
 ہیں اور پھر اس وقت تک ان کا رونا دھنا آنا آسان وسیع
 اور منافع بخش ہو جاتا ہے کہ کاروبار میں زیادہ کشش
 نظر نہیں آتی۔ اس کے باوجود دوسرے حالت بہت سے بڑے اسمگلر
 اپنے دھندے کے قانونی آؤفسر ہم کرنے کے لیے بہت سے
 کاروبار بھی کرتے ہیں لیکن اس کے لیے بھی پہلے بہت سی
 قانونی دیواریں چھلانگنی پڑتی ہیں۔“

”بہر حال ترقی کی امید تو کی جا سکتی ہے نا؟ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں انٹرچیک آڈی سخت جان ہو اور جان کی اسے
 کوئی پروا نہ ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”جان کی پروا کر کے ہمیں کیا کرنا ہے؟“ میں نے شکرتے
 ہوتے کہا۔ ”یہاں تو سا کوئی دنیا میں دوسرے والا ٹھیک ہے باقی
 رہی سخت جال۔۔۔ تو وہ تم خود ہی دیکھ لیتا۔“

”مجھے اپنے متعلق کچھ اہم بتاؤ تو اس نے فرمائش کی۔

”تم پوچھتے جاؤ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دیتے
 گا کوئی شخص کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے مجھ سے یوں والا
 کرنے شروع کر دیے جیسے وہ میری سوانح عمری مرتب کرنے
 کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے حتی الامکان سہائی سے ہر سوال کا
 جواب دینے کی کوشش کی۔ یعنی اس حد تک سچ بولا جس سے
 مجھے نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔“

وہ سب سے بارے میں تقریباً سب کچھ جان چکا تو مطمئن
 انداز میں سر ملانے کے بعد ٹاچہ بڑھاتے ہوئے بولا وہ لاؤ
 ٹاچہ، آج سے ہم فنی فنی کے پادشہ ہونے کی قیام آج رات
 ہی میرے ساتھ روانہ ہونا چاہتے ہو؟ مجھ سے پتہ چلتا ہے کہ تم نے
 وہ گھر سے میں شیفٹ لگاتا تھا۔

”ہاں لیکن نے فیصلہ کن مجھے میں جواب دیا۔

”سخت یا سخت قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہو سوچ بچار
 میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے۔“ وہ مسکرایا تو تمہاری
 یہ غریبی پسند آئی۔ ”پھر اس نے آگے آکر جھک کر میری کالی
 پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور واپس جا کر گڑبڑ
 مچھٹے ہوئے بولا میں ابھی ایک گھنٹہ اوپر میں گزارنا چاہتا
 ہوں۔ اس دوران ہر شے کے کپ شپ کرنے کے بجائے
 میں انہیں اس دھندے کے مزید شیفٹ وغیرہ سمجھاتا ہوں
 میں تم شریک ہونے جا رہے ہو۔ اگر تمہارا ذہن تھوڑا سا
 تھکا رہے اور تجربات سے پہلے ہی تم نے ان باتوں کو فکری
 نشیں کر لیا تو بہت فائدہ سے محروم رہو گے۔ بجائے اس کے
 کہ انسان خود مار لگا لگا کر وہ تجربات حاصل کرے بہتر ہوتا
 ہے کہ کسی اور کے تجربات سے استفادہ کر لیا جائے۔“

وہ کسی پورے ہی روح کی طرح میرے ذہن کی سوچ پر
 تجربات رقم کرنے لگا مختلف دلوں پر، مختلف سرکاری و غیر
 سرکاری لوگوں سے معاملہ سازی، حالات سے نکلنے کے طریقے
 اور نہ جانے کیا کچھ۔ آدھ بولن گھنٹے ہی میں مجھے بول مسکروں
 لگا جیسے میں نے کوئی توجہ کو اس نکل کر لے مار شرف خان بٹل
 سے جتنا عقل مند لگتا تھا، شکل سے نہیں لگتا تھا عقل کی حد
 تک تو وہ دانش مندی و تجربہ بات کا ایک سمندر معلوم ہوتا تھا۔
 میں حتی الامکان کیسوی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور نہ ہی
 کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ جب خاموش ہوا تو میں اپنی رائے کا اظہار کے بغیر
 نہ رہ سکا یہ باتوں سے تو تم اس میدان کے بے تاج بادشاہ
 لگتے ہو لیکن۔۔۔ میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا یہ لگتا
 اپنی طرح درویش ہی لگتے ہو۔“

”میں سمجھ گیا۔“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا وہ تم کہنا
 یہ چاہتے ہو کہ بظاہر تو میں کنگل نظر آتا ہوں، حقیقت میں میں
 نہیں اپنی لائن میں اسمگلر کے حساب سے لگتا ہی ہوں
 اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ میں ایک بہت بڑی خامی ہے۔
 میں بہت جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتا ہوں کہ اگر تم ایک
 اسمگلر کی حیثیت نہیں رکھتے ہو تو چاہیے۔ اس کے علاوہ
 ذہنی دلاؤ اور وقت و غیرہ جیسی چیزیں بھی اسے لائق نہیں
 ہوتی جالیں۔ لوگوں سے حتی کہ اپنے ساتھیوں تک سے
 معاملت میں اسے خاصی حد تک شفاک ہونا چاہیے۔ میں
 نے ایک گھری سانس لی ہو کیا اہم نے بھی بہت لیکن لوگوں
 نے ہمارے پاس رہنے نہیں دیا بہر حال۔۔۔ اس میں لوگوں
 کا زیادہ قصور نہیں میری اپنی خامیوں کا زیادہ دخل ہے۔“

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا اب ہمیں چلنے کی تیاری کرنی چاہیے، تم اپنی جوانی جو انتہائی ضروری چیزیں ساتھ لے کر لے جانا چاہتے ہو وہ ایک کرور کو کوشش کرنا کہ تم لے سکتے ہو ایک سوٹ نہیں کے علاوہ کچھ تہہ نہ ہو

میرے پاس ایک سوٹ کیس بھی نہیں ہے کسی نے سکر لے ہوئے کہا میں جلاتی دست قسم کا انسان ہوں۔ صرف ایک بیگ لے کر چلوں گا اور وہ تیار کرنے میں مجھے چند منٹ ملیں گے

میں بیگ تیار کر چکا تو شرف خان سوچ میں ڈوبے ہوئے بیٹھے میں بولا تمہارا یہاں سے جانے کا کیا طریقہ ہو گا؟ چپ چاپ یہی غائب ہو جاؤ گے یا کسی کو اطلاع دے کر جاؤ گے؟

”اطلاع دے کر جاؤں گا وہ نہیں نے کہا اور یہاں اس لئے رکھ کر کاغذ قلم لے کر ساٹھ انچینغ صاحب کے نام ایک رقعہ لکھنے لگا رقعہ لکھ کر تیرہ کے کہیں آؤ گے کھڑا ہوا شرف خان بھی اٹھ کھڑا ہوا لینوس کا اتصال اس نے دوبارہ سینے سے باندھ لیا تھا اور ٹیکٹ کی زینب بند کر لی تھی۔

میں نے الوداعی نظر نیچے پر ڈالی میرا بیشتر سامان اس وقت بھی روزمرہ کی سی ہے تہہ سے نکھرا ہوا تھا اور ہر چیز گویا میرے ساتھ ہے مجھے ٹیکس دہی تھی، ہر زبان کو شوشی پوچھ رہی تھی یہ تم نے اچانک ہی نہیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا۔ عجیب سیلائی آؤی ہو تم بھی۔ زندگی کے اتنے بڑے بڑے فیصلے ہوں چکی بجاتے ہی کر لیتے ہو۔ ہر حرکت کی تو گویا تمہیں عادت ہی ہو گئی ہے۔ ابھی ایک اور تم پر بند نہیں ہوتا لیکن تم اپنی اگر ڈری گورنر سے پرادر کر دو سرے اور کی تلاش میں نکل پڑے ہو تے ہو

میری زندگی کا یہ ایک اور باب تھا جسے میں آج خود ہی زندہ لا تھا ہر وہ جگہ جہاں آپ نے دوچار دن گزارے ہوں اس سے ایک عجیب آہستہ سی ہو جاتی ہے میرا وہ ایک غمزدہ ہو رہا آہستہ میرے دل میں بھی ایک گس گس جگہ رہی تھی مگر ساتھ ہی ایک عجیب سی بے کلی بھی تھی جو مجھے گسا رہی تھی کہ یہاں سے نکل چلو۔ یہاں اب تمہارے لیے بہتری کا کوئی امکان نہیں رہا۔ آگے بڑھتے ہو تمہاری منزل کیس اور ہے جس روز منزل پر پہنچ جاؤ گے تمہیں خود بخود ہی قرار آ جائے گا

عالم سے کچھ دور ایک اور نکتہ سامنے تھا جس میں بڑے مضبوط دلوں والی نام کی ایک ٹرک رہتی تھی۔

اس کے نیچے میں بھی میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش اور سنی خیز باب کھلا گیا تھا جس کے انجام نے ایک بار تو مجھے قبا بازیاں کھلا دی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے لگن لگا کہ شاید یہ لائی ہی کے آنکھیں پھیر لینے کا اثر تھا کہ ہر چیز نے آنکھیں پھیر لی تھیں، ہر چیز سے اعتبار اٹھ گیا تھا وہ میرا ہی تھی تو گویا سارا جگہ میرا تھا۔

جانے کیوں میرے سینے کی گھڑائوں سے ایک آہ سی نکل گئی اور میں نے اس سے تمام خیالات چھٹک بٹنے کی کوشش کرتے ہوئے شرف خان کی طرف مڑا وہ بغور مجھے دیکھ رہا تھا میں نے سکر لے ہوئے اسے نیچے سے باہر پھینکے کا اشارہ کیا۔ باہر آ کیس نے پیر چراؤ جم اب جا کہیں رہے ہیں؟

”جہاں میں نے گاڑی چھپائی تھی کاش وہ وہیں موجود ہو۔ اس میں پچاس ہزار کے سونے کا ایک چھوٹا سا بیگٹ اور جعلی دلائی شراب کی کچھ بیٹیاں موجود ہیں سکار سے آ کر کر رہا تھے وقت میں سونے کا بیگٹ تو ساتھ لے ہی سکتا تھا نیکی وہ میں نے کچھ زیادہ ہی حفاظت سے چھپا کر رکھ دیا تھا نکال ہی نہیں سکا شراب کے انٹیم میں بھی میں نے کچھ عرصے سے خواہ مخواہ ہی ہاتھ ڈال رہا ہے۔ منافع تو کہ اس میں بھی کافی ہے مگر یہ جگہ بہت گھبراتی ہے۔ کچھ جیسے کم وسائل والے آدمی کے لیے بڑے پیمانے پر اس کی نقل و حرکت مشکل ہے۔“

ان دنوں چونکہ اپنے ہاں بھی اصلی اور جعلی ہر طرح کے شراب آسانی سے دستیاب تھی ہاں لیے اسمگل کرنے کی کیا ٹھیک تھی؟ یہ میری سمجھ میں نہ آتا تو میں نے شرف خان سے پوچھا کہ وہ بولا اپنے ہاں جو جعلی دلائی شراب دستیاب ہے وہ صاف پہچانی جاتی ہے کہ یہ جعلی ہے ہر ڈوسی ملک میں جو جعلی دلائی شراب دستیاب ہے وہ بڑے آرام سے دلائی کے دھوکے میں نکل جاتی ہے۔“

”تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ گاڑی رنجرز کے ہتھے نہیں چڑھی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”انھیں دراصل یہ بتا کر ملا تھا کہ گاڑی میں ہم دو آدمی ہیں اور جب ہم نے دیکھا کہ گاڑی کی درجہ سے ہم کہیں نہ کہیں پھنس جاتے ہیں تو ایک گاڑی کے نکل بھی گا اور دوسرا مال لے کر جنگل میں دوڑ پڑے گا تو کوشش کرے گا۔“

میں خاموش رہا۔ ہم تھکے پڑنے کی طرف جا رہے تھے۔ یادوں کے محلوں سے جھپٹ چلا کر تھکا ہوا مکمل سا جامد آسمان پر رنگ رہا تھا۔ دھندل دھندل جانے کی عادت

ہی گھٹی جھاڑیاں اور کھس پتہ آدم گھاس کے جھنڈ موجود رہتا تھا۔ ان کے درمیان رسائی پانی نے ٹیڑھی میڑھی پٹیاں سی گئیں تھیں۔ یہ علاقہ کسی دیران جزیرے سے مشابہ تھا۔ لیکن یہ دیران جزیرے جیسے نہیں تھا۔ یہاں کچھ انگریزی فیلوں میں دیکھے تھے۔

مزید تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر ناہوار جنگل ہی سے مشابہ علاقے میں پہنچ گئے۔ لیکن یہاں درخت اور جھاڑیاں بہت پھدری تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سامنے ہی پڑنے پڑنے درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ دشتا اشرف خان نے میرے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے سرگوشی کی زبان پر اشارہ کیا: "وہ فکٹوں کے بل کر گرجا یا ماساں گیا۔" میں نے اس کی تقلید کی اور بیک دیت پر دیکھ کر اس کا فیتہ انگلیوں میں پھنسا لیا۔

اشرف خان کسی فیصلے پر کے کی طرح تھکے پھٹائے سامنے جھنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اب توجہ دی تو احساس ہوا کہ جھنڈ کے درمیان کھس پتہ سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور شاید یہ روشنی متحرک بھی تھی۔

"وہاں کوئی موجود ہے؟" اشرف خان نے سرگوشی کر کے پوچھا۔ میں نے سرگوشی کر کے جواب دیا: "نہیں، وہاں کوئی نہیں ہے۔" میں نے انھوں نے میرا سراخ لکھ دیا تھا۔ دوبارہ انھوں نے مجھے اس وقت دیکھا تھا جب میں کار چھپا کر کچھ دیر بیٹھا تھا۔ لیکن یہ لوگ چورہ کی طرح حرکت کر رہے ہیں؟

"گامی ای جھنڈ میں موجود ہے؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں، اشرف خان نے آہستہ میں سر ہلایا۔ میں حیران رہ گیا۔ اگر وہ اس علاقے میں اس جھنڈ تک کار لے آیا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ ریخڑ کی جیب اس کے قبا میں تھی، تو میرے خیال میں اسے بہترین ڈرائیو کا ایوارڈ ملنا چاہیے تھا۔

"آؤ ذرا دیکھیں کون ہے؟" اشرف خان نے اشارہ کیا اور ہم چو پالوں کی طرح آگے بڑھنے لگے۔ بیک کو میں اپنے ساتھ کیسے جا رہا تھا۔ جوں جوں ہم جھنڈ کے قریب پہنچے چاہے تھے، پر لکڑی کی ٹکی ہوئی جڑوں کے درمیان سے اندر سے گھر چکے دکھائی دینے لگا تھا۔

مزید قریب پہنچ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ جھنڈ میں تین آدمی موجود تھے۔ فیلوں کے پاس طاقت ور ٹارن میں موجود تھیں اور وہ بڑے انہماک سے کار کا سامنا کر رہے تھے جیسے انھوں

طرف گیا یا سفید لکڑی کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ میں نے مرکز رکھ کر میری اودھالی کی ٹیمپسٹیاں، دو بوسیکل مشینیں، پتھرول کے انبار سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ادب ان کے پیچھے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم لوگ کچھ نشیب کی طرف جا رہے تھے۔

پل پار کر کے ہم پکے راستے پر چلنے لگے، دیرانے میں پہنچتی ہوئی دو دھڑکنوں کی طرح۔ ایک موٹر پمپنگ کر رہا تھا۔ بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "اس طرف درجی بیرکس ہیں۔" ناچار زبانی پاس ہو کر تو کبھی پھول کر بھی اس طرف نہ جانا۔ یہ راستے پر تین سب اچھی طرح ذہنی نشین کر لو۔ چندہ میں میل کا یہ علاقہ ہم چھوٹے اسمگلروں کی کائنات ہے۔ ساری آنکھ بولی ہیں اس علاقے میں کھینچی ہوئی ہے۔ وہ سامنے تقریباً چار میل لبا اور ڈھائی تین میل پڑا تھا۔ جنگل جھلا پڑا ہے۔ میں نے کچھ جھٹے میں درخت لٹے گئے ہیں کہ سو سو کی کریمیں بھی نہیں پر نہیں پہنچیں۔ اسی جنگل میں ہم اسمگلروں، ڈاکوؤں اور جانوروں کی بہت سی پناہ گاہیں موجود ہیں۔

پھر وہ کسی ماہر انٹرپرائز کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک اشارہ کرتے ہوئے اور اٹھتی سے خواہ میں لہر یا سا بناتے ہوئے بولا: "وہاں تک لوں میرے کسی شکل میں بھی علاقہ ہے۔ اگر تم کنارے کنارے چلو تو کبھی سرحد تمہارے سامنے قریب ہوگی کہ ایک قدم بڑھایا تو دوسرے ملک میں اور کہیں سرحد کی میل دور ہوگی؟"

وہ جبر جبر اشارہ کر رہا تھا، مجھے ان اطراف میں سوائے جھاڑیوں اور فیلوں، ٹیلوں اور ناہوار میدان کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اشرف خان میری نظروں کے خال میں کوٹھوس کرتے ہوئے بولا: "دوکرہ دور سے تمہاری کچھ گھم میں نہیں آئے گا۔ میرے ساتھ دوسرے تو یہ علاقہ تھا۔ یہاں سے اپنے اٹھا کہیں جائے گا؟"

وہ ایک بار پھر چلنے لگا۔ میں اس کے ساتھ تھا لیکن میرا ذہن نہ چلنے کے لیے ہمارے بارے میں غور کر رہا تھا کہ منہ اٹھا کر اس نئی راہ پر چلے تو لکھا تھا: "یہ مجھے اس بھی آئے گی یا نہیں؟" کچھ دیر بعد ہم جنگل میں داخل ہو گئے۔ لیکن زیادہ دور تک درختوں کے درمیان نہیں چلے جہاں وہ دوبارہ کھلے میں نکل آئے۔ پھر ہم نے ایک نالائبر وکیا جو تھا تو تقریباً شک ہی نہیں پھر بھی اس سے گدے سے میںیں بدبو اٹھ رہی تھی۔

ہم دوسری طرف ڈھلان میں آئے تو جیسے پہاڑی سا علاقہ شروع ہو گیا۔ کہیں نشیب، کہیں فراز، کہیں سطح راستہ۔ کہیں ٹوٹی پھوٹی سی چٹانیں اور نیم پختہ زمین۔ یہاں کہیں تو بہت

نے سر کی حرکت سے بارش مچول کی طرف اشارہ کیا وہ جین کو ڈراٹو لگا کر آئی ہی ہے۔

”مچو چال کے بغیر کڑی اشارہ کیسے ہوگی؟“ جیم ٹم کو نے پوچھا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ بارش ڈاکو بولا۔ میں سوچ تو کر انٹینسٹی کی تاریں جوڑ لوں گا۔“

اسی لمحے میرے قریب ہی اشرف خان نے سرگوشی کی۔ ”سارے باتیں تو اس طرح کر رہے ہیں جیسے باپ کا مال ہے۔“ وہ کہہ سہیں بنی خانہ کو، تو اسے اندھے کان میں ہم تو اس مال کی خاطر مرنے مرنے پہنچے ہیں۔ جان، تھیلی پر رکھ کر دوبارہ یہاں تک آگئے ہیں اور یہ آرام سے اسے لے جا رہے ہیں۔“

میں نے دیکھا اُس کا بھرپور نام سے باہر آچکا تھا۔ وہ کچھ آگے کو کھینچے ہوئے پہلے سے جی ڈی بی سرگوشی میں بلاؤ تم صرف اس جیم ڈاکو کو سنبھال لینا، باقی دونوں کو دیکھ لوں گا۔ کوکشی کرنا کہ تمہارا شمار ہلاک نہ ہونے پائے میں بلاؤجہ کی خون ریزی پسند نہیں کرتا۔“

وہ اس طرح بات کر رہا تھا جسے میرے ہاتھ میں کوئی بات ہی تباہ کن ہتھیار موجود ہے۔ اُدھیں جاتے ہی اس شخص کے پرچھے ڈاؤن لگا دیں گے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے خود اس ڈاکو کے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا اندیشہ تھا کیونکہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ جیم تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہندو بھی تھی جبکہ میں خالی ہاتھ تھا۔ بہر حال یہ ایک طرح سے اشرف خان کی نظر میں شاید میری قابلیت کا امتحان تھا اور میں اس پہلے ہی امتحان میں اپنے آپ کو نابل ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے بیگ چھوڑ دیا اور ہم دونوں درندوں کی طرح جھاڑو جھنگڑاؤں کو دھیرے دھیرے پیچھے ہٹے ہوئے آگے بڑھے۔ اگر وہ تھیں گار کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو ہماری حرکت سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ سن سکتے تھے۔

میں نے عین اُس وقت جیم ڈاکو پر چھلانگ لگائی جب وہ ہندو کا بٹ مار کر لڑکھڑکی کا شیشہ توڑنے لگا تھا۔ اشرف خان نے بھی میرے ساتھ ہی چھلانگ لگائی تھی۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس حال میں تھا۔ میں نے البتہ اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت محسوس کیا کہ میرا چھلانگ لگانے کا انداز میرے لیے کمر آدرہ تھا۔ اسی کی بدولت وہ جیسا میرے قیام میں آگیا۔

دراں جب میں نے اس پر چھلانگ لگائی تو وہ جھک بٹا ہوا تھا۔ اس کی گردن سیدھی اسی کھڑکی میں گئی جس کا اُس نے شیشہ

زنگ میں پہل بار کر رکھی ہو۔ وہ میٹھے رنگ کی، کئی سال پرانے بالوں کی ایک فودڑ دیکھ کر بھی۔

وہ تین آدمی جو اس کا معائنہ کر رہے تھے گہرے گھرے رگوں کی طرح ڈھالی شور قیصوں میں تھے۔ سر دل پر بڑی بڑی چڑیاں تھیں اور ہر ایک کی کمر میں کار تو رسوں کی بیڑ بندھی ہوئی تھی۔ کندھوں سے بندھیں گلی ہوئی قیصیں ان میں سے ایک کی بجھے شکل بھی نظر آئی۔ اس کی دائرہ جی جھاڑو کا ڈکھ بڑھی ہوئی تھی اور وہ بھیجیں بھی اس میں اس طرح نہ علم قیص کو دہن نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ان کے گھوڑے بھی خرباب ہی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً ڈاکو تھے۔

ان میں سے دو تو مچول سے ہی تھے البتہ ایک طاقتور اور مضبوط نظر آتا تھا طاقت و درشتی خاص کھڑکی کے شیشے سے روشنی کاریں ڈالتے ہوئے بولا۔ یہ تو بہر حال طے ہے کہ کاکشی اسمگلر کی ہے۔“

”عین ممکن ہے کہ کاریں دھسکی کے علاوہ بھی کچھ مال ہو۔“

ایک مچول شخص بولا۔

”نکلے تھے تھوڑوں کو پانی پلانے۔“ دوسرا مچول ڈاکو بولا۔

”آگے لگئی دھسکی۔“

”کوئی بات نہیں اگھوڑوں کو آج دھسکی ہی ہلاکت ہے۔“

”قیص بھی پیش کرنے دو، کیا باؤ کریں گے کیسے نواب قیص کے ہاتھوں سے واسطہ پڑا تھا؟“ پہلا مچول بولا۔ شاید دھسکی پانی کر

برنگ میں اس پر نہیں کسی ایسی سمت میں لے جائیں اجمال کوئی حوالہ شمار ہاتھ آجائے کافی دونوں سے دونوں ہی ہر

نہی ہے۔ معمولی چور اچھوں کی طرح راجگروں سے گھڑیاں اور

مردود روپے چھین کر کسٹ ہنگ گزارا ہو گا۔“

جیم شخص کار کا معائنہ کرتے کرتے مڑ کر بولا۔ میں تو

کب سے کہہ رہا ہوں کہ مل کر کوئی بس دیکھ دیکھتے ہیں۔“

دوسرا مچول سا شخص بولا۔ تیسرے اور سردار کے زخم

بھر جا رہے ہیں۔ طرح طرح کام شروع کریں گے۔ فی الحال تو صرف

ڈاکو کرنے والی بات ہے۔“

”اچھا ہا۔ باتوں کو چھوڑ دو۔ جیم شخص سیدھا ہوتے ہوئے

بولا۔ نواب مسئلہ ہے کہ اس مال کو دیر سے ہنگ کس طرح

سے ہمیں بخراب کی پیشیاں گھوڑوں پر لاد کر لے جانا تو مشکل ہے

اور پھر گلی، اندر سے اچھی طرح تلاشی بھی لینی ہے۔ کیا خیال

ہے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر دوڑا۔ بھول لوں؟“

”ہاں میرا خیال ہے تو تو ہی کو ایک مچول سے ڈاکو نے

باز کیا ہے۔ یہ کہا تو کار ہی کو ڈیرے پر لے چلتے ہیں۔“ اُس

ڈال ہوتا۔

گھوڑے نے جب دیکھا کہ میں بچ گیا ہوں تو وہ بکلی کی سی پھرتی سے اچھلا اور ایک بار پھر اس نے اپنے پورے وزن سے مجھے ہٹا دیں تھے کچھلنے کو کوشش کی لیکن اس بار بھی میں حتی الامکان پھرتی سے ایک طرف کو ہو گیا تھا کیسے اٹھنے کا تو گھوڑے نے گھنٹہ کر بجلی کی سی تیزی سے مجھے دولتی دریدہ کرنے کی کوشش کی یہ دولتی گاڑی پر پڑی اور اس میں دو ڈینٹ بڑھ گئے جس دولتی نے فوراً ویسی گاڑی میں ڈینٹ ڈال دیے تھے، اگر وہ مجھے بڑھتی ہوئی تو نہ جاسے میرا کیا حال ہوتا راضی میں خود روانی ختم ہوتے ہی نہ جاسے کیا حال چڑکا تھا اور اب واقعی میں خاصا بدحواس ہو چکا تھا۔ ڈاکوؤں نے تمنا تو ہمارے لیے کوئی مشابہت نہیں بنو تھا۔ ہم بکلی کراؤ ان پر ٹوٹ پڑے تھے اور معرکہ صرف چند سیکنڈ کا ثابت ہوا لیکن اس ایک گھوڑے نے مصیبت گھڑی کر دی تھی۔ وہ گھوڑا یقیناً اس جیم ڈاکو کا تھا جسے میں نے صرف بے ہوش کیا تھا جبکہ دوسرے دو گھوڑے جن کے مالک خان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے، قدم سے لافٹتی سے ایک طرف کھڑے تھے۔

میں نے گھوڑے کی دہراڑی کے بہت سے قصے سنا

توڑا تھا۔ کنارہ دل پر ابھری ہوئی نوکریں کر چوں نے اس کے چہرے اور گردن کو نہ جانے کس حد تک چیر ڈالا تھا۔ وہ بڑی طرح بیجا اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

میں اس کی کمر پر سوار تھا میں نے اسے کھڑکی میں کچھ اود آگے تک ٹھونسا پھر اس کی کمر سے آکر گردن پر رکھی ہوئی اس کی بندوق اٹھالی۔ جیسے ہی وہ کھڑکی سے سر نکالنے میں کامیاب ہوا میں نے اس کی ٹیپٹی پر بندوق کاٹ کر سپر کیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا چہرہ اور گردن لوہیوں میں ترسختی اور مزید خون آبلہ تھا۔ بہر حال وہ زندہ تھا۔ میں نے اشرف خان کی ہدایت کا خیال رکھا تھا اور اس پر گولی نہیں چلائی تھی میرے خیال میں اس میں میری طاقت کو کم اور خوش قسمتی کو زیادہ دخل تھا کہ میں گھنٹہ چند لمحے ہی میں اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ اشرف خان خون میں اٹھ رہا تھا۔ پھر میرے کچھ حیران پریشان سا کھڑا نظر آیا۔ دونوں بھول ڈاکو پت پڑے تھے اور ان پر ایک نفر ڈالتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ مرنے چکے ہیں۔ ان کے چروں وغیرہ پر کہیں خراش تک نہیں تھی میں ان دونوں کے مہلوے سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

جب آدمی تھا کہ اشرف خان بھی مجھے بے وجہ جزوی سے برید کر کے کی تعین کر کے خود اس نے چشم زدن میں دونوں ڈاکوؤں کا صفایا کر دیا تھا۔

وہ گویا صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ اگر میں ان دونوں کو نہ مارتا تو ان میں سے ایک یقیناً مجھے مار ڈالتا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کپڑے چھانک کر اس طرف بڑھا جہاں میں اپنا بیگ چھوڑا تھا۔ دفعتاً میں نے ہینامیٹ کی ایسی خون ناک آواز سنی جس نے مجھے گرزاد دیکھو گھوڑوں کی ہینامیٹ میں سے زندگی میں جانے کتنی بار سنی تھی مگر اس میں کوئی عجیب ہی بات تھی ایک عجیب سی زندگی۔

میں نے بروقت ہی پلٹ کر دیکھ لیا۔ وہ تین گھوڑے جنہیں میں نے ایک طرف کھڑے دیکھا تھا ان میں سے سبھی رنگ کا ایک گھوڑا اٹھے دونوں پاؤں اٹھائے تھے پھر پرجھپٹ رہا تھا۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور چوڑے چوڑے دانت خوفناک انداز میں چھانک رہے تھے۔ اس وقت وہ گھوڑا نہیں کوئی اور ہی خون ناک مخلوق لگ رہی تھی۔

میں نے اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے اضطراری انداز میں اپنی جان بچانے کے لیے میں زمین پر گرا اور لڑھکتا چلا گیا۔ اگر میں بروقت اپنی جگہ سے نہ ہٹا ہوتا تو گھوڑے نے یقیناً مجھے ناپوں سے کچل ڈالا اور دانتوں سے بیچھوڑ

بغداد کی رات

قمر اجتالوی

الف لیلی کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات، وجہ اور نیل کے دامنوں میں لپٹا ہوئی رات جسے بے شمار کتابوں کے حوالوں سے آراستہ کیا گیا ہے



عشر مکتبہ الفکر دہلی
اردو بازار لاہور

مارا جاؤں؟

اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رافل کدھتے سے ٹکرائی اور دوسرے ٹکرائی رافل اٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولا میرا خیال ہے اب ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل لینا چاہیے بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔

میرا عقیدہ ایسا ہو رہا تھا جیسے میں کپڑوں سمیت اکھاڑے میں اتر گیا تھا اور کسی مشتاق پہلوان نے مجھے خوب پٹخیاں دی تھیں میں نے کپڑے بھی طرح جھاڑے۔ درختوں جھاڑوں اور ٹکی ہوئی چوڑوں کے حلقے سے نکل کر اپنا بیگ اٹھایا اور واپس کار کے قریب پہنچا۔

اشرف خان دوسری طرف کھڑا مردہ گھوڑے کے عقب سے سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی اس طرف چلا گیا گھوڑا اڑا تر چھاڑا تھا۔ اُس کی گردن تشبیہی سی کیفیت میں سر دی ہوئی تھی۔ اُدھی کھوپڑی کے ساتھ اس کی ایک آنکھ بھی غائب ہو چکی تھی دوسری آنکھ کھلی تھی اور اس میں بخونناہ انتقام کی چمک اب بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ اس کی شکست کھوپڑی سے خون اور جھجے کا مغربہ بہہ بہہ گرد زمین پر جھنسنے لگا تھا۔

بلکہ کمرست سی سوس ہوئی اور میں نے نظر پھیر لی مجھے

ماحول میں کسی تبدیلی کا احساس ہوا۔ ادھر ادھر دیکھا تو اس تبدیلی کا ادراک ہو گیا۔ دونوں گھوڑے غائب ہو چکے تھے۔

”ان دونوں لاشوں اور اس زندہ ٹکڑا کو کیا کرنا ہے؟“ میں نے اشرف خان سے پوچھا۔

”جو جمال ہے اور جیسا ہے اسے وہیں اور اسی حالت میں بڑا رہنے دو۔ اشرف خان نے جواب دیا اور جالی نکال کر کار کا دروازہ کھولنے لگا۔

اُس نے رافل کار کے فرش پر ڈال دی اور دوسرا دروازہ کھول کر اسٹریمگ سمٹھال لیا۔ میں نے بھی رافل سمٹھال کے آگے فرش پر ہی رکھ دی اور اشرف خان کے برابر بیٹھ کر جیسے دیکھا کار میں صرف دو ہی سیٹیں تھیں بیکھلا حصہ نشستوں سے خالی تھا۔ اس میں کار ٹکی جھرے ہوئے تھے اور ان پر خوبصورت لیبل بھی چمک رہے تھے۔

”ان پر سے کپڑا ہٹ گیا ہے وہ ذرا جمع کر دو۔ اشرف خان نے ہدایت کی۔ میں ان بیٹیلوں کو ابھی طرح کپڑے سے ڈھانپ چکا تو اشرف خان نے کار اسٹارٹ کی اور چند لمحے بعد ہم جھنڈے سے باہر آچکے تھے۔

ہچکوک سے اور لرزے کھاتی ہوئی کار بالآخر گلز بند پڑی پرائی اور ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد ہم چارمک ہی ایک

نئے کوٹ میں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہی تھیں لیکن یہ میرے دھم دھم کان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی گھوڑا مالک کو گزند پہنچنے دیکھ کر اس قدر عذباتی ہو سکتا ہے۔ اُس کی غضب ناک نینے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اشرف خان نہ جانے کہاں چھب گیا تھا۔ میں بڑی سے گھوم کر کار کے دوسری طرف پہنچا۔ گھوڑا ابھی میرے غائب میں وہیں پہنچ گیا۔

مجھے اتنا احساس ہزار تھا کہ اگر میں ادھر ادھر بھاگا تو گھوڑا میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ میں بڑی سے کار کے پیچھے گھس گیا۔ گھوڑے نے پہلے گھوم کر کار کو دو تین دو لٹیاں دیں۔ میں پھر جبکہ کر خود بھی کار کے پیچھے گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر وہ بیچہ گیا۔ سر تو اس نے کار کے پیچھے گھس کر ہی لیا تھا۔ باقی جسم کو بھی اندر لانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ ایک تو پکیزہ کار کا اپنا وزن، دوسرے اس میں شراب کی بٹلی، تیسری لاری ہوئی تھیں، اس کے باوجود گھوڑے کی زور آزمائی سے وہ اوپر نیچے ہونے لگی تھی۔ گھوڑے کے ہاتھوں سے نکالنے دوئے چوڑے چوڑے دانت بھ سے بشکل ایک باشت کے غلطے پر تھے اور دھونکی کی طرح چلتی ہوئی اس کی سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ میں دوسری طرف کو کھٹکنا مارا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اگر گھوڑے کی غضب ناک کاہسی عالم رہا اور وہ یوں نہ نہنگتا رہا تو کوئی بعد نہیں کہ وہ گاڑی کو مارٹ اٹائے۔ اس لیے میں نے اُسے گاڑی کے پیچھے جیسا ہوا چھوڑ کر دوسری طرف سے نکل جانا ہی بہتر سمجھا مگر ساتھ ہی اس انتظار سے غلبہ ہوا۔ وہ حیوان بھی گاڑی کے پیچھے سے نکل آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کے گرد گھوم کر پھر تک پہنچنے کی کوشش کرے ایک زندہ دار دھماکا ہوا اور اس کی تقریباً اُدھی کھوپڑی اڑ گئی۔

وہ گر پڑا لیکن مجھے جیسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس سے بچے چل کر اگل چکا ہے۔ چند لمحے تک میں گاڑی کا سہارا لیے کھڑا رہتا رہا پھر میں نے سر نہ دیکھا۔ اشرف خان رافل لگا تھا۔ میں بے کھڑا تھا۔

وہ گاڑی کسی خیال سے چونک کر مسکراتے ہوئے لولا۔ اسی وقت لولا پار تھیں۔ اتنی تکلیف اس لیے اٹھائی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا چاہیے۔ انسانوں کے معاملے میں تو مجھے جیسے ایک ایک سیکڑے کے ہزاروں حصے ہیں۔ میں کوئی نہ کوئی فائدہ کرتے ہیں لیکن اس گھوڑے نے تو واقعی مجھے بھی کھلا دانتا پھلے تو میں خنجر ہی لیے اس پر چھپنے لگا تھا لیکن بروقت احساس ہو گیا کہ خنجر سے اسے مارنے سے میں خود ہی نہ

آئی لیکن روشنی ناکافی ہونے کی وجہ سے میں اس کے منہ کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا۔

اشرف خان کا اشارہ پا کر میں اس کے پیچھے پیچھے چھکار چھوٹے گیٹ سے اندر پہنچا عورت نے گیٹ بند دیا اور قریب ہی دیوار پر موجود ایک سسٹم بج بورڈ کی طرف بڑھا کر برآمدے کی بجلی روشن کر دی۔

وہ درمیانے قد کی ایک پختہ العمر اور پرکشش عورت تھی۔ اس کے جسم پر مشرب خرابی کا ڈھیل ڈھالا لبادا تھا اس کی کشت کو چھپانے کے بجائے اجاگر کر رہا تھا اس تراشیدہ بال زیادہ منتشر اور پریشان نہیں تھے اور آنکھوں نیند کا غماز بھی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس کی رنگت کھلی کھلی بیضی اور ہونٹ بھرتے بھرتے تھے۔ مجموعی طور پر اسے کرسی احساس جو تھا کہ اشرف خان بیوی کے معاملے خاصا خوش قسمت ہے۔

اشرف خان نے اس سے صحیح طور پر میرا تعارف کرا کر ضرورت محسوس نہیں کی۔ بس اتنا کہنا کہ یہ عدا افضل ہے سے یہ ہیں رہے گا۔ عورت نے میرا سراپا بارہ دیا۔ میں کی بڑی بڑی آ

تنگ سی سڑک پر پہنچ گئے سڑک پر پہنچتے ہی فوراً فرار سے بھرنے لگی۔ اشرف خان واقعی بلا شاق ڈراؤنی عورت تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے ایک شہر کا نام لیا۔ نام تو تو کوئی اور تھا لیکن میں مصلحت اسے شہزاد کوٹ کہوں گا۔ اس شہر کا نام میں نے بار بار سنا تھا۔

”وہاں میرا گھر ہے۔“ اشرف خان نے بتایا تو اپنے بٹ سے جھائی بند ڈال رہتے ہیں۔ مال کی وصولی اور سپلائی کا وہاں معقول انتظام ہے۔“

”کیا میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”غلام رہے اور کہاں رہو گے؟“ اس نے عجیب سے انداز میں ایک نظر میری طرف دیکھا میں خاموش رہا۔ اب میں بے فکر ہو چکا تھا۔ روٹی اور مالش میرے یہ وہی مسئلے زیادہ ملگن ہوتے تھے۔ یہ مل ہو جاتے تھے تو مجھے کوئی خاص فکر نہیں رہتی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے تیز رفتار سفر کے بعد ہم شہزاد کوٹ میں داخل ہوئے۔ صحیح صاف کے آگاہ اچھی خودوار نہیں ہوئے تھے۔ تاہم کسی مسجد سے انڈان کی آواز سنائی دینے لگی تھی شہر کی سڑکیں اور گلیاں کوئی نظر آرہی تھیں۔ ایک سڑک کے کنارے میں نے ایک چوکیدار کو چارپائی پر بستر بچھا تے دیکھا۔ جب ڈنیکے بیدار ہوئے گا وقت ہو رہا تھا تو اس بے چارے کا سونے کا وقت شروع ہو رہا تھا۔

یہاں بیشتر مکان بلند بلائیں پرانی طرز کے تھے چوڑی چوکی اور تنگ دروازے، بیڑھی بیڑھی اور مٹی کی گلیوں میں چکراتی ہوئی کار بالآخر کھلے کھلے سے علاقے میں نکل آئی۔ اس گلی کا فرش اینٹوں کا تھا اور گلی میں مکان درحقیقت بین چادر ہی تھے۔ بانی پلاٹ خالی پڑے تھے۔ گلی کے اختتام پر ریشب میں ایک وسیع میدان سا تھا اور اس سے آگے کجیت شروع ہو جاتے تھے۔ شاید یہ شہر کا آخری حصہ تھا۔

اشرف خان نے کالے گیٹ والے ایک مکان کے سامنے گاڑی روکی اور انجن بند کیے بغیر مجھے جیب سے ایک چابی نکال کر دیتے ہوئے بولا۔ گیٹ کے ساتھ ہی گیراج کا جو دروازہ نظر آ رہا ہے اس کا کالا کھوکھلا کوشش کرنا کہ دروازہ کھولنے کا وقت کوئی آواز نہ پیدائے جو۔

میں نے گیراج کا دروازہ کھول دیا اور اشرف خان نے گاڑی اندر پہنچا دی۔ وہ باہر آچکا اور میں گیراج کو دوبارہ مقفل کر چکا تو مکان کا چھوٹا گیٹ جیسے خود بخود ہی بے آواز طریقے سے کھل گیا۔ اس نے مجھے آگے ایک عورت کی جھلک نظر

ایک عجیب سی ادا سی جاگزیں تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ ہوئے سے باتیں میں سر ہلا کر دے تھی۔

مکان خاصا کشادہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہ جگہ راداری سے مشابہ تھی۔ ایک طرف دو کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ان کے مقابل غالباً فاضل شغل خانہ دکن وغیرہ تھا۔ آگے وسیع صحن تھا اور اس سے آگے بارادہ رات کے یہ جیسے مزید کمرے نظر آ رہے تھے۔

عورت جیسے کسی ان پڑھی بات کے جواب کا انتظار کر رہی تھی اور اشرف خان سر ہٹا کر اُن کے ہاتھوں میں بیوی جیسے گوشت کے عالم میں تھے۔ بالآخر عورت نے پوچھ کر لیا۔ بڑے کان ٹھہراتے۔ اس وقت تک اشرف خان گویا فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ

آگے قدم بڑھاتے ہوئے بولا: "مہمان خانے میں ایک کھیت سے تعلق رکھنا یا ڈرائنگ روم تھا۔ اشرف خان نے اس سے ایک کمرے کی کڑی کھولی اور اندر پہنچ کر لاسٹ آکن کر دی۔ یہ ایک کمانڈر تھا جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ بڑا سنگین ریز اور صوفے وغیرہ بھی موجود تھے۔ یہ ایک پستانی پر مبنی فون میڈ تھا۔ یہ بڑا مصلیٰ اور آستہ دہی راستہ گزرتا تھا جس میں ایس قیام کرنے والے تھے۔ پھر بھی میں نے گویا تصدیق کی خاطر پوچھ لیا یہ یہاں ٹھہرنا ہو گا کچھ؟"

ہے شک! اشرف خان نے جواب دیا: "آج سے اس کمرے کو اپنا کمرہ اور اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ ایک چھوٹی سی تکلیف تمہیں اٹھانا پڑے گی کہ باقی روم اس کمرے سے ملتی نہیں ہے بلکہ وہ دروازے کے سامنے ہے۔ اس نے اندر سے سے بنایا۔ ذرا کچھ فرصت ملے اور کچھ خالتو رقم آئے تو اس مکان میں کچھ تبدیلیاں کراؤں گا۔"

وہ کمرے کے مقابل بنے ہوئے باقی روم کی وجہ سے کچھ اونٹھا کچھ نہ رحمت ہو گی اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے پوش پٹے گھر میں سنبھالا تھا جہاں سروسے سے باقی روم کا قصور ہی موجود نہیں تھا۔

میں نے کمرے میں داخل ہو کر ایک ایک طرف دیکھ دیا۔ اشرف خان کی بیوی بچوں میں باقی دے دیے۔ دیکھ کر کھڑی بہات کا نظریل سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب تم کپڑے بدل لو۔" منہ نہ دھو لو۔ اشرف خان بولا: "تب تک میں بھی اپنا کلیہ درست کرتا ہوں۔ بدینہ اتنی دیر میں ناشتے کا بندوبست کر لے گی۔ ہم ڈش کرنا آتا کریں گے اور اس کے بعد دن بھر سوئیں گے۔ رات کو اٹھ کر ہم جاؤں گے۔"

گے کر گلش کا کاروبار کیا چل رہا ہے؟

میں نے ذہن نشین کر لیا کہ اشرف خان کی بیوی کا نام ندینہ تھا۔ اس نے اب تک صرف ایک ہی جملہ بولا تھا: "اس کا اولاد اور لب و لہجہ اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ آواز بے رس اور بچی کھڑوری سی تھی اور لب و لہجہ سے اس کے تقریباً اُن پر طرح ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔ جیکہ ظاہری شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک بد سلی اور کبھی موٹی عورت معلوم ہوتی تھی۔ وہ میاں بیوی جیسے کمرے میں جھڑک کر رخصت ہو گئے تو میں نے دروازہ بند کر کے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جوتوں سمیت بیڈ پر دروازہ جو کیا اور کچھ نمری سائیں یعنی ششور کر دیں۔ ایک طویل عرصے بعد اتنی جھانک سے واسطہ پڑا تھا اور ایک طویل عرصے بعد الیا آرام دہ بیڈ نصیب ہوا تھا۔

یوں کھینچے بعد جیکہ دن کی روشنی اچھی طرح پھیل چکی تھی، ہم جیون کا پیو ہتر چلے۔ میں مکان کے رات سے میں بڑی ہوئی ٹوڈنگ ٹیبل پر موجود تھے۔ گھر میں کوئی ملازم وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک نل نہ مینہ ہے ہی اس تھوڑے سے وقت میں پھر لوہ ناشتے کے لیے صرف بہت سی بیڑیں تیار کر ڈالی تھیں بلکہ اپنا ٹیکہ بھی مزہ دیکھا رہا تھا۔ وہ سر ٹھکانے خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھی۔ وہ بہت کم گوشت معلوم ہوتی تھی۔ شاید یہ گھسٹ ایک اجنبی کی، یعنی میری موجودگی کا آخر تھا یا پھر اسے احساس تھا... کہ بولنے سے اس کی شخصیت کا تاثر عروج ہوتا ہے۔

ہم ناشتے سے ہاتھ کھینچ چکے تو زور نہ نہ اٹھتے ہوئے براہ راست کچھ سے پوچھا: "تم چائے پیو گے یا کافی؟" کافی میں نے کبھی نہیں پی تھی، سو چونکہ آج اسے ہی ٹرائی کرنا چاہیے۔ فدا رعب بھی بڑ جلنے کا کہہ مابود لست، ناشتے میں کافی پینے کے عادی ہیں۔

"کانال مل جائے تو مناسب رہے گا۔" میں نے بوجہ انتہائی شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ کچن میں ملی گئی تو اشرف خان محض غٹ گورائے لٹنگو کے انداز میں بولا: "ملازم میں نے احتیاطاً نہیں رکھا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے ملازم وغیرہ رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ زہر نہ بڑی اچھی عورت ہے، اس نے بڑی عمدگی سے ساری گھر دار کا مہمان دار کی وغیرہ سنبھال رکھی ہے۔ ہنگامی حالات سے بھی اچھی طرح منٹ لیتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر مزید سوالات نہیں کرتی اور عام صورتوں کی طرح مفر نہیں کھاتی۔"

میں صرف تائیدی انداز میں سر ہلا کر دے گیا۔ کچھ کسی کے

اور پھر واپس آکر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشرف خان کو اٹار دیا
اشرف خان میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کھڑا ہوا۔

باہر آکر اس نے دیکھا گیٹ کے سامنے بیٹل رنگ
کا ایک چھوٹا بچہ آپ ٹک کھڑا ہوا تھا۔ اگلے حصے میں ٹیڈی اور
اور اس کے ساتھ ایک اور شخص موجود تھا۔ آنکھوں نے اس کو گریز
ہی گرم جوش اور محبت سے اشرف خان سے معاف کیا اور ایک
دوسرے کاحال چال پر جھٹکے۔ اشرف خان نے باتوں کے ردول
بچے جانی دیتے ہوئے درایت کی کہ گیلارج کا دوازہ کھول دوں
گیلارج کا دوازہ کھل چکا تو ایک آپ کے ڈرائیور سے
گاڑی آئے رخ اس طرح گیلارج میں آدھی داخل کر دی کہ گلی
میں آ جا گا کوئی شخص نہ دیکھ سکے کہ کب آپ میں کیا لالچا ہوا
چار ماہ سے۔ ویسے بھی خیر گلی میں آمدورفت ہی کہاں تھی۔ میں چار
ہی کل مکان تھے اور وہ بھی کچھ اجازت اجازت سے ہی نظر آتے
تھے۔ اشرف خان نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ غلطی
جو ا کا ڈاکوگ سرسری طور پر اسے جانتے تھے وہ اسے کوئی
ناجربی سمجھتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ آپ میں پہلے سے بھی کچھ کاشن ہوا
تھے لیکن یہ کاشن گھر پر آشیا سے ضرورت کے تھے مثلاً صابن
تیل کی شیشیاں اور سفین وغیرہ۔ نوواردوں نے اشرف خان کی کاشن
سے حساس کی پشیمان نکال کر اس طرح آپ میں بھی کاشن
اشیا نے صرف کے کاشنوں میں چھپ کر رہ گئیں۔ خریدنے اور
ترتیب سے گاڑی بھرے کے بعد آنکھوں نے ٹیل گیٹ بند
کر دیا اور ٹیڈی رسیاں کھینچ دیں۔

اس کے بعد اشرف خان نے اپنی گاڑی کے ایک غبر
خانے سے ایک چھوٹا سا چرمی بیگ نکال کر ڈرائیور کے
حوالے کیا جسے اس نے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ ڈرائیور
کے ساتھی نے ایک موٹا سا لفافہ نکال کر اشرف خان کے
حوالے کرتے ہوئے کہا یہ باس نے کہا ہے کہ ہم نے جو مال ہوا
تھا اس کی قیمت کاٹ کر یہ کمیشن بنا ہے۔ اب اگلے سو روپے
ملک حساب ہے باقی ہے۔

اشرف خان نے لفافہ کھول کر دیکھے بغیر گاڑن کا جب
میں رکھ لیا اور ایک دوسرا لفافہ نکال کر ڈرائیور کو تھامے
ہوئے کہا یہ یاد آؤں راستے میں یہ نفیس خان کی امانت بھی دینے
جانی۔ اس سے کہنا کہ کمیشن میں نے رکھ لیا ہے۔

وہ لوگ جا چکے تو ہم اندر آ بیٹھے۔ زور نہ چائے بناواں
چائے ہمیں دے کر وہ خود اندر جا کر کوئی کام کرنے لگی۔ ہم
ڈرائیونگ ٹیبل پر بیٹھے چائے کی چٹکیاں لینے کے ساتھ ساتھ

خانگی معاملات پر توجہ دے کر کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ اندیشہ
ہی رہتا تھا کہ کوئی نامناسب بات منہ سے نہ نکل جائے اس
لیے ایسے مواقع پر ہم خوش رہنا ہی بہتر سمجھتا تھا۔

چند منٹ بعد ندینہ میرے لیے کافی اور اشرف خان کے
لیے چائے لے کر آگئی ناشتے کے اس حرف آخر سے فارغ
ہو کر اشرف خان باپ ملگاتے ہوئے بولا وہ اب تم جا کر آرام
سے جب تک مل چاہے سو تے رہو۔ ڈرائیور کی طرح ہم
لوگوں کی بھی عموماً باتیں جانتی ہیں اور دن سو تے ہیں۔
اس وقت وہ ڈرائیونگ ٹیبل پر بیٹھا ناٹا لنگ پر ناٹا لنگ
رکھے ایک ہاتھ ناٹ گاؤن کی جیب میں ڈالے اور باپ
کے کش نکالتے ہوئے خاصا مسخرہ آدھی لنگ پر ناٹا لنگ کوئی
ڈاکٹر یا دوسرا شخص کے گاؤن پر پٹھا کھاتا تھا۔ اس وقت
ایسے دیکھ کر گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ اس شخص کی رایشن ڈرائیور
جنگلوں اور سرحدی علاقوں میں جلان پھیل کر رہے گزرتی ہیں۔
میں ایسے وہیں بیٹھا ہوا چھوڑ کر لینے کہسے میں آ رہا ہوں
بڑے بڑے گزراں گئے کی طرح سو گیا جو کوئی دن آوارہ گردی کرے
اور کئی دن کا بھی ڈاکو میں گزارے گھر واپس پہنچی ہو۔ میں
شاید زیادہ دیر نہیں سویا تھا۔ جیب میں نے خواب میں لالی کو
دیکھا اور میری بینڈ گھری ہوئے کے بجائے اچاٹ ہو گئی تھی
پر جھینٹا اسٹ سی طاری ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس
برجائی اور بدست عورت کو خواب میں دیکھوں۔

لیٹے لیٹے پہلے سے ہوئے میرا دل چلا کہ کھڑے کوئی
بیزر توڑ ڈیالوں۔ دینی اس خواہش پر بہ مشکل قابو رکھتے ہوئے میں
اٹھا اور پردہ ہٹا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر پھیلی دھوپ پھیلی
ہوئی تھی صبح کے چلنے اندھیرے میں نہیں نے جو کیفیت سے دیکھے
تھے وہ دراصل لاوارث قسم کے سبز زارہ حلقہ ہوتے تھے۔ ماں
میں کوئی غفلت ہی نہ کاشت کا رہی۔ اوچی اوچی گھاس پھیل ہوئی تھی
جو زمینوں کے رات میں خاص طور پر اشتعال دیتی ہے۔ بیچ میں
کیس کیس چھوڑ دیاں اور نالے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس پورے منظر
سے اکتا کرش پر دیکھ کر دوبارہ بیڈ پر آکر اور سر نہ پھینک کر
کچھ دیر کی کوشش کے بعد سو گیا۔

دو دن بعد میری آنکھ رات گئے کھلیں اشرف خان مجھ سے
پہلے یہاں پر ہوا تھا اور کھانے پر میرا انتظار کر رہا تھا کھانے
سے فارغ ہو کر اس نے مجھے بتایا کہ میں نے پانی کو فنا کر دیا ہے
گیارہ بجے کے قریب کا رات کے آکر مال سے جاؤں گے۔

ٹیک گیارہ بجے کال بیل بجی اشرف خان کی ہدایت
کا انتظار کیے بغیر ندینہ نے جا کر چھوٹا گیٹ کھول کر باہر جانے کا

گپ شپ بھی کر رہے تھے۔ اشرف خان بتا رہا تھا کہ اس کی برادری کے لوگ اپنے دھندے کو امپورٹ ایکسپورٹ کہتے ہیں۔ اشرف خان کا دواہر دو طرفہ تھا یعنی وہ امپورٹر بھی تھا اور ایکسپورٹر بھی اور اس کا کام بارڈر کسٹم پر چلتا تھا یعنی مال کے بدلے مال... اور مال بھی دوسروں کا ہوتا تھا اس لیے اس کے کام میں خطرات بہت زیادہ تھے اور آمدنی کم۔ اسے مال لے جاتے وقت بھی خطرات کا سامنا ہوتا تھا اور مال لاتے وقت بھی۔

اس کا زیادہ تر کاروبار پڑوسی ملک سے تھا جس میں منافع کی شرح زیادہ نہیں تھی جو چین میں لائی اور لے جاتی تھیں ان کا حجم زیادہ ہوتا تھا اور قیمت کم... اس کا کہنا تھا کہ ایک دوسرے پڑوسی ملک سے کاروبار کرنے میں زیادہ فائدہ تھا۔ وہ اسی کوشش میں تھا کہ وسائل بڑھ جائیں اور کچھ کام کی پارٹنروں سے رابطے قائم ہو جائیں تو اسی ملک سے منشیات امپورٹ کی جائیں کچھ لوگ بارکیٹ میں دی جائیں اور دستاقل برطانیہ تو امیر جماعت کی طرف ایکسپورٹ کی جائیں یا پھر کراچی میں سیٹ ہو کر بحری راستے سے چھوٹے حجم کی مگر قیمتی اشیاء امپورٹ کی جائیں۔ سرفینک اس کے ذہن میں ترقی کے پڑے۔ منجانب سے تھے اور اب میری ذات سے اس نے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ ایک جان نثار ساتھی پشیمرانے کے بعد اس کے کام کی رفتار گھٹنی ہو جائے گی۔

ایسی ہی باتیں کرتے کرتے اس نے جیب سے رقم کا وہ لفافہ نکالا جو مال لے جانے والی پارٹی لے گئی تھی۔ رقم نکال کر اس نے گنی پھر آٹھ سو نوٹ میری طرف بڑھائے ہوئے بولا "یر چھ ہزار روپے ہیں آدھا حصہ... یہ تم کو دے دوں گا"

میں نے اتار بڑھائے بغیر قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا "اے اس کیجیپ میں یقیناً تمہارا حصہ زیادہ بننا تھا۔ درحقیقت تمہاری ہی بدولت میری واپسی ممکن ہوئی ہے۔" وہ نے نہیں پرانے مال پرانی رقم اور اپنی جان ملک سے بھی ہاتھ دھو چکا ہوتا روئے بھی تیار اب تم فم فم فم فم کے پادھر رہا اس لیے اپنے حصے کی رقم لے لو اور دو جو تمہارا جی چاہے کرو"

"لیکن میری اتنی اعمال ایسا کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہا۔" اب اس میں رقم کی ضرورت ہو "میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ زرنہ اس دوران برآمدے میں گئے ہوئے واٹش

میں پر اسٹری ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ دھڑک رہی تھی۔ وہ جیسے اپنے آپ میں محسوس تھی اور اس کے خیال میں شاید ہم وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ اس نے ایک بار بھی اٹھ کھڑا کر بھاڑی طرف دیکھا ملک نہیں تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے حصے کی رقم بھی فی الحال تم ہی اپنے پاس رکھو مجھے جب اوجھڑی رقم کی ضرورت پڑے گی میں تم سے لے لیا کروں گا۔" باقی رقم چاہو تو کاروبار میں لگاتے رہو اگر وہاں ہم منافع ساتھ کے ساتھ کھاتے رہیں گے تو کاروبار کو بڑھانے کی نوبت کہاں آئے گی؟ اس نے بے یقینی کے ساتھ انداز میں میری طرف دیکھا اور گم ہونے سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا "تم صحیح محسوس ہیں ویسے ہی پائیز جو جیسے کی جیسے تلاش تھی تمہارے فکر و محو۔ کیسے تمہاری ایک ایک پائی کا حساب رکھوں گا؟"

اس لمحے ذہن نے ٹھوکر پھاٹ سی نظریے میری طرف دیکھا اور ویسے سے ہاتھ پوچھ کر اپنے مخصوص اطلاق سے انداز میں میز پر آ بیٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میز پر پڑی ہوئی لمبی لمبی سواری سگرٹوں کا پیکٹ اٹھا یا اور ایک سگرٹ نکال کر سگائی۔ اپنے تراشیدہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے دو تین گھر سے گھرے کش لینے اور ایک بار پھر نیم دائیں سپاٹ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اسے اپنی آنکھوں اپنے بچھے اور اپنے چہرے کو سپاٹ رکھنے کا فن آتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ خلوت میں وہ ایسی سپاٹ عورت نہیں تھی۔

"تمہیں ماش کیلینی آتی ہے؟" دفعتاً اشرف خان نے پوچھا "ہاں، کوٹ پیس یا فلاش؟"

"آئی تو ہے لیکن زیادہ نہیں" میں نے جواب دیا۔ "کوئی بات نہیں، کام چلے گا" اشرف خان بولا "لیکن ہم ہمسوں کے بغیر نہیں کیسے؟" اس نے کچھ رقم رکھ ہی لوٹا اس نے گن کر کچھ نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیے۔ میں ان دونوں کے ساتھ اٹھ کر بیڈروم میں آ گیا۔ ایک آراستہ دہراستہ کرتا تھا۔ فرنیچر کے پھیلاؤ سے جو جگہ بچ گئی تھی اس میں دو بیچر تھیں۔ ایک گھونٹے رکھے ہوئے تھے۔ ہم قابلیں پر بیٹھ کر ماش کیلینی لکھنے لگے۔

سگرٹ زرنہ کے ہونٹوں میں رہی ہوئی تھی اور اس سے دھوئیں کی پتی سی کلیر ہوا میں بلند ہو رہی تھی۔ باتیں زیادہ تر اب بھی میں اور اشرف خان ہی کر رہے تھے زرنہ بہت

میں جو رشام کو اس سنگٹ، بلیک مارکنگس، قمار بازی اور قیر گری کے دھندلے سے وابستہ افراد جمع ہوتے تھے اور عام کاروباری اصطلاحات میں کام کی باتیں یا پھر گپ شپ کیا کرتے تھے۔ بظاہر یہ سب معززین نظر آتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب لوگ آپس میں بے انتہا بے تکلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے سامنے سے بھی غماز رہتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو ایک دوسرے کے اصل ٹھکانوں یا گھر بار کا بھی علم نہیں تھا۔ تاہم ان کی گویا ایک غیر رسمی اور بے ضابطہ سی انجمن قائم تھی روہ میر محلے میں حتیٰ الوسع ایک دوسرے کے کام لانے کی کوشش کرتے تھے۔

رہنورد منڈی میں ایک دوسرے سے شے خنک کر دینا معاملات بھی طے پاتے تھے۔ ایک دوسرے سے لین دین اور کاروباری تعاون کے لیے مقامات کا تعین کیا جاتا تھا۔۔۔۔۔ اشرف خان نے بہت سے اہم آدمیوں سے میرا تعارف کر دیا تھا۔

اس دوران میں نے اشرف خان کے طریق کار اور اس کی فطرت کا بخور شاہدہ کیا۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ درحقیقت خود مختار اسمگلر نہیں تھا۔ اس کی حیثیت ایک طرح سے آرڈر پر کام کرنے والے کی تھی۔ کبھی کبھی اسے آرڈر ہی خالصے طویل وقفے کے بعد ملتا تھا اور کبھی کام نہ کرنے میں اس کی اپنی گسستی آڑے آتی تھی۔ ہر کیسب پرچھانے اور لانے کے بعد وہ کافی دنوں تک گھر میں بیٹھا بیٹھا آرام کرتا رہتا تھا جیسے کوئی بہت ہی ناقابل یقین قسم انجام دے کر آیا ہے۔ حتیٰ کہ پڑے پڑے سے اسے احساس ہونے لگا تھا کہ قمر تیزی سے خراج جوڑی ہے اور کچھ اس کی بیوی نے دبا دی ہے تب وہ انگریزی کے کڑا کھڑا ہوتا تھا اور بھاگ دوڑ میں لگ جاتا تھا کہ اسے کوئی نیا آرڈر مل جائے۔ کبھی کبھی اسے خود مختار طور پر کام کرنے کا شوق چڑھتا تھا تو قمر کی کمی کا مسئلہ آڑے آ جاتا تھا۔

اسی لیے میں نے اس سے اپنا حصہ لینا شروع نہیں کیا تھا کہ وہ اسے کاروبار میں لگانا شروع کرے تاکہ ہم خود مختار بننے کی کوشش کریں لیکن عام طور پر سورج بچار کے دھولان ہی اس کے لینے جیسے کہ صفایا ہو جاتا تھا پھر وہ یہ دلیلیں پیش کرنے لگتا تھا کہ اتنی تنخواہی رقم سے ہم کیا ذاتی کاروبار کریں گے۔ چھوٹی کیسب لے کر جانے میں بھی اتنا ہی خطر ہے جتنا بڑی کیسب لانے سے جانے میں۔ اس لیے وہ بڑی کیسب لانے کی تیار لوں میں لگا رہتا تھا اور ہماری وہ مثال رہتی تھی

کم ہوتی تھی کبھی کبھی وہ دھوکے میں کی گھروں کے عقب سے ایک نظریہ کی طرف دیکھ لیتی۔ اس کی سرگیت کی طرح اس کی آنکھوں کی گہرائی میں بھی کوئی چیز دھیرے دھیرے سنگ دی تھی۔ جب یہ جنگاری کونے سے اٹھتی ہوئی تو اس کی آنکھیں یقیناً بہت خوبصورت لگتی ہوں گی۔ ایک بار میں نے سوچا

”تم تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کھینچتے رہے۔ اس دوران زور نہ دینے کی نگرانیں بھونکنا اور دوسرے اپنی لب اسٹاک درست کی۔ اس نے مجھ سے اور اشرف خان سے تقریباً تین چار سو روپے جیت لیے مجھے ہارنے کے باوجود کھیل میں لطف آ رہا تھا۔“

بالآخر اشرف خان نے کھیل ختم کرنے کا اعلان کیا اور نذرینہ سے گویا مسخرے کر کے ہونے لگا۔ ”بھئی افضل کے پیسے تو واپس کر دو، یہ سب چارہ تو نیا اور انڈی تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ کھیلنا کیا معانی رکھتا ہے؟“

”ہڈری ہوئی چیز واپس لینے میں میرے خیال میں تو ہارنے والے کو بھی لطف نہیں آتا“ نذرینہ نے بھاری سہی آواز میں کہا۔ پھر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئی تو کیا خیال ہے؟ ”مگر افسوس“ ”جی ہاں۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا ”یہاں تک بڑی ہوئی رقم واپس مانگ رہا ہوں۔۔۔ یہ تو اشرف خان صاحب میری جمدی میں مٹی گسٹ گواہ چسٹ والا کاردار کہہ رہے ہیں۔“

”بس؟“ ”نذرینہ، اشرف خان کی طرف دیکھ کر دھیرے سے ہنس دی۔ اشرف خان نے بے پردائی سے کدھرے آجکادے اور پتے سمیٹ کر کیسٹ میں ڈالنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ نذرینہ جب براہ راست مجھ سے مخاطب ہوئی تھی تو میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی تھی۔ اگر وہ اشرف خان کی بیوی نہ ہوتی تو میں دل ہی دل میں اس کے بارے میں واضح طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ مجھے اچھی لگ رہی تھی یا بڑی میرے میسر میں چونکہ تنخواہی بہت زندگی باقی تھی، اس لیے میں اپنے میزبان مہربان اور نڈے سے کاروباری جتنے دالک بیوی کے بارے میں اپنے محسوسات غیر جانبدارانہ رکھنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنے کمرے میں آگیا اور بیڈروم کلاسیکل موسیقی کا ایک نہایت خواب آور قسم کا پروگرام سنتے سنتے سو گد اس دن کے بعد سے خالصے عربیہ تک ہماری مصروفیت کچھ اسی قسم کی رہی۔ کھانا پینا، سونا، تاش، یا کوئی اور اسی قسم کا کیل کھیلنا، اخبار رسالے پڑھنا اور کبھی کبھی باہر جانا۔ شرمیلک ریوڑ کے نام سے ایک خاصا میہاری قسم کا ٹوٹل تھا۔ اس کے لیے ٹیوٹل

تھا لیکن لالی مجھے بار بار یاد آنے لگی تھی۔ میں اس کا تصور ذہن سے جھکنے کی کوشش کرتا تو میری سوچیں زندگی کی طرف تنگی نہ جاتیں رہ رہ کر وہ میں ان دونوں کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن اور تھا ہی کون جس کے بارے میں میں سوچتا اور وہیں کو بہانا۔ ایک ختم تھی تو وہ بھولا بھلا خواب بن گئی تھی۔ ایک روز میں صبح تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو شریف خان میز پر نہیں تھا غلام اس وقت وہ میز پر اخبارات پھیلائے بیٹھا ہوا تھا کرسی پر وہ کھینچے جانے کی آواز سن کر نہ رہ کر نہ دھم سے باہر آئی۔ وہ حسب معمول ایک ریشمی کالون پہنے ہوئے تھی۔ بال کھلے تھے اور وہ غول میں سرگشتہ دہی ہوئی تھی میرے افسانہ پر اس نے بتایا کہ شریف خان کسی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے اور درپردہ دو گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔

”تم ناشتے میں کیا پسند کر گے؟“ اس نے موٹل کے بیروں کی طرح پیشہ ورانہ سے مجھے میں پوچھا میرے یہاں قیام کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ اس تہا ناشتہ کرنا تھا لیکن اسے بتا دیا کہ میں کس چیزوں کا ناشتا کرنا چاہتا تھا اور وہ اپنے گاؤں کی لیٹ درست کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

وہ ناشتا تیار کر کے لے آئی اور برق میرے سامنے سجانے کے بعد خود میز کے ایک سرے پر بیٹھ کر چائے کی چٹکیاں لینے لگی لیکن کچھلے ہوئے بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی سگتی ہوئی ایک تھی سگریٹ اب بھی اس کی انگلیوں میں دلی ہوئی تھی لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سگریٹ کے کش بہت کم بقی تھی رعام طور پر سگریٹ اس کی انگلیوں یا جوڑوں میں دلی ہوئی سگتی رہتی تھی لیکن اوقات وہ پوری سگریٹ سے صرف ایک آدھ ہی کش بقی تھی اور اسے انگلیوں میں کھاتے ہوئے پُر خیال نظروں سے گزرتی رہتی تھی کہ سگریٹ ختم ہو جائی تھی۔

اس وقت اسے موٹل پر بے پناہ سکوت طاری تھا لیکن میری رگ دہے میں ایک عجیب سا شور رہا تھا جس کوئی بات کرنا چاہتا تھا لیکن الفاؤ نہ جانے کون مر رہا تھا ہونے لگے۔ مجھے آج تک میں کوئی بڑے نظر نہیں آکا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی کسی بچے کا تذکرہ سنا تھا کسی بار میرا شریف خان باندہ سے پوچھنے کوئی چاہتا تھا کہ کیا ان کا کوئی بچہ نہیں تھا، اس وقت میں نے بالآخر اسی موضوع سے بات شروع کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ ان کی شادی کو کتنا عرصہ گزر چکا تھا۔ ویسے تو خیر شریف خان تقریباً پچاس سال کا لگتا تھا اور زرنہ بھی تیس سے اوپر کی تھی اور دونوں کافی پرانے شادی

کہ نو سو تیل ہو گا نہ یاد دہانا چاہیے۔
بہر حال میں خاموشی سے اس کے ساتھ لگا ہوا تھا اور میری یہ اُمید قائم تھی کہ جس ترقی کے مواقع ضرور حاصل ہوں گے۔ دیے بھی میں کسی قسم کے تھکن سے تو دو جا رہا تھا۔ اپنے بھائی کی مناسبت سے میں گویا ناہنہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ رہنے کو شاندار کمرہ کھانے کو من پسند خوراکیں اور پینے کو بھی من پسند رہا تھا جیسے بیسوں کی عزت رہتی تھی وہ مجھے شرف خان سے مل جاتے تھے کام کا تجربہ میں الگ حاصل کر رہا تھا، سب لالہ اور بھیکے لالہ چاہیے تھا؟

میں اس دوران چند مصائب یا شرف خان کے ساتھ لگا تھا۔ ایک بار تو میں گویا صرف اس سٹیٹ کے طور پر اس کے ساتھ رہا تھا۔ دوسری بار میں نے ڈونور کے فرائض انجام دیے تھے جس سے گھر راستے صبح طر پر مجھے میں مدد تھی یہ میری مرتبہ ہم کسی پارٹی کے لیے پورا ٹرک لے کر آئے تھے اور اس دوران میری زینے داری یہ رہی تھی کہ میں ٹرک کو کہیں بھی گھیرے میں نہ آنے دوں۔

میں بال کے اوپر اور تیرا لے نیچے رائفل لیے لیٹا رہا تھا۔ شرف خان کی ہلاکت تھی کہ شرف خان آتے ہی وہ ٹرک کے پچھلے حصے میں چلی ہوئی ایک گھنٹی کے ذریعے مجھے سگتی دے گا جس کے بعد میرا کام صرف یہ ہو گا ناڈھا دھندنا ٹرک شرف خان کو ملے۔

یہ کہیں بھی ہم بخیر و عافیت ڈلیور کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس میں میں خاصی موزم بھروسہ کرتی رہا۔ ہم اس پوزیشن میں تھے کہ جیسے پہلے پر اپنا کام بھی شروع کر سکتے تھے تاہم اس کے لیے بھی سرحد پار کی پارٹیوں سے مذاکرات ضروری تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جب ہم کسی کی آواز کیوں لے کر باہر گئے تو اپنے معاملات بھی طے کر کے کہیں گے۔

اس دوران شروع کے دن دن تو ہم اپنی اس بڑی کامیابی کا جشن ہی مناتے رہے۔ اپنی پی کر گھر میں آدھ سے بارے رہے اس مرتبہ تو میں نے بھی جام لڈھانے کے معاملے میں اپنا حوصلہ بھرنا نہ نہ کبھی تھوڑی بہت بچی تھی وہ وہ دونوں جب اپنے کو دے میں چلے جاتے تھے تو میرے لیے اپنے کمرے میں آکر نہ جانے کیوں سونا ڈھوار بڑھاتا تھا۔ اپنی تمام تر مدد و سہی سے باوجود میرے ذہن کا کوئی حصہ جاگ رہا تھا اور کوئی چیز مجھے بھروسے کی شرج ڈنک مارتی رہتی تھی۔

اس عالم میں میں اور تو بہت سی چیزیں دل کو بھجول جاتا

میری یا مجھے اس کی کوئی فاضل پروا نہیں ہے۔ لیکن ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ تاہم جہاں سے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی بندھن موجود نہیں ہے کسی وقت بھی کوئی پٹری بدل سکتا ہے۔

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ زمانے نے مجھے تحریکات و واژوں کی شکل میں بہت کچھ دے دیا تھا۔ لیکن دنیا کے ہمارے دور و ماحول سے کہیں زیادہ جان چکا تھا جتنا عموماً میری عمر کا کوئی نوجوان جان سکتا تھا لیکن آج میرے خزانہ علم میں یہ عجیب ہی اضافہ ہو رہا تھا۔

”آخرت خان تم سے شادی کیوں نہیں کر لیتا؟“ کہنے نے تدریسے سنبل کر پوچھا۔

”اس کی مرضی تو وہ ہے پروا ہی سے کہہ دے۔ اچھا کر لیا اور گریٹ کا کش لینے لگی۔ اس کے چہرے کا تناؤ کافی حد تک دھڑک رہا تھا اور مجھے کی شکستہ لگی تھی۔ لوٹ آئی تھی۔ مسکراتے ہوئے بولی: اب تو جمع معنوں میں اس نے مجھے نہیں بلکہ میں نے اسے دکھا چکا ہے۔“

میں خاموشی سے چائے کی پیکیاں لٹا رہا۔ میرے دل میں عجیب اچھل پھل سی چلی ہوئی تھی۔ زریں بوں میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے نظروں ہی نظروں میں تو لے کر کشش کر رہی ہو۔ پھر میرے ہاتھ بھاگتا چلا گیا۔ میرا اب میری طرف دیکھتے وقت اس کی نظر میں پہلے کی طرح سپاٹ نہیں ہوتی تھی۔ عموماً وہ کسی سوچ میں ڈوبی نظر آتی تھی اور شاید یہ میرا وہم تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں سوچتی تھی لیکن کیا سوچتی تھی اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

پہلے شرم کے کہیں خاموشی سے اس کے گلے پر سے ہاتھ اٹھا اور ایک رسالہ منتخب کر کے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میں اپنی مومچل کا رخ بدلنا چاہتا تھا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ جھجکا کہ بالآخر میں نے رسالہ چھینا لیا اور دوبارہ کر دیکھنے کے بعد دوبارہ باہر آگیا۔ میں نے برآمدے کی طرف دیکھا۔ اندر شباب ڈانٹنگ میبل پر بیٹھیں تھیں۔ اس نے بیٹھو میں جاکر دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں چند لمحوں پہلے سے کہنے کی طرح صحن میں ٹھنڈا چھاپا ہوا سکوت طاری تھا لیکن میری کپڑوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ آخر کار میں دوبارہ کمرے میں آگیا اور بے خوابی کے مزین کی طرح کر دیکھیں بدلتے لگا۔ میری گردنوں کا سلسلہ اس وقت تک جب اشرف خان گھر آگیا اس نے بتایا کہ اس کے کسی دوست کا ڈرائیونگ کے چالان سے متعلق

شدہ گفتے تھے لیکن کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ بعض لوگ جماعتوں کے سلسلے میں جلد باز نہیں ہوتے۔ پیش و آرام سے زندگی گزارتے ہیں اور عمر کے آخری حصے میں شادی کر لیتے ہیں۔

”آخرت خان سے تمہاری شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا ہے؟“ بالآخر میں نے کھڑکی کی سی آواز میں پوچھا۔ جانے کیوں میں اشرف خان اور زریں سے شروع ہی سے آپ جناب کے تفکرات میں نہیں پڑا تھا اور نہ ہی انھوں نے کبھی اس کا بڑا مانا یا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد جواب دینے کے بجائے اس کا سوال کر دیا: ”تمہارا خیال ہے کہ میں اشرف خان کی بیوی بنوں؟“

”تو پھر اور کیا ہو؟“ امیرا مٹھکا کا کھلا دیکھا۔ اس نے میرے سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا۔ لیکن جھکا کر جیسے کچھ میں پوچھ رہی تھی۔ اشرف خان کی بیوی نہیں ہوں۔ میں بدستور عورت بننا چاہتا تھا۔ میں نے اس عقول کی طرح اپنا سوال دہرایا تو پھر اور کیا ہو؟

وہ گویا میری نا اچھی پر قدرے درج ہو کر بے بسی سے دو فلز ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی: ”میں بس ایسے ہی ہوں... میں کچھ بھی نہیں ہوں...“ بچپن میں میں قسیم پر لکھی تھی۔ رشتے داروں اور کچھ عیروں کے ہاتھوں میں ہوتی رہی۔ کتنے سختے ہاتھوں سے گھر کا سارا کام کاج کے معاوضے کے طور پر قبضہ اور لاپرواہی رہی۔ بالائی ہوتے ہی ایک اور خطر عرصہ کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ وہ ذہنی طور پر بیمار تھا۔ اپنے نہ جانے کون سے جذبے کی تسکین کے لیے مجھے عجیب عجیب جسمانی سزائیں دیتا تھا۔ اس کے دل سے بھاگتی تو نایک قسم کی ایک عورت کے متھے چڑھ گئی۔ اس نے جسم فروشی کے رستے پر نگاہ ڈال دی۔ میری آدھی سے زیادہ گائی اور ضرور دیکھتی تھی لیکن ویسے اس نے ہر طرح کا عیش و آرام دیتا کیا اور تو اس کے لیے مجھ میں عزت نفس بھی بیدار کرنے کی کوشش کی۔ زریں استغاثہ سے انداز میں ہنس دیتی تھو عورت مر گئی تو میں بس یوں ہی اصرار و اصرار پھر نہ لگی پھر مجھے اشرف خان مل گیا۔ اس نے مجھے ساتھ رہنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ میری حیثیت کچھ بھی سہی لیکن میں خوش اور مطمئن ہوں کہ میرے باقی کچھ مضبوط ہو چکے ہیں اور مجھے ایک چار دیواری کی پناہ دیتے ہیں۔ یہ مکان اشرف نے میرے نام کیا ہوا ہے۔ تقریباً تین سال ہو گئے ہیں مجھے اس کے ساتھ رہتے ہوئے میں پہلی عورت نہیں بنی۔ مجھ سے پہلے بھی وہ عورتیں کچھ عرصے کے لیے اس کے ساتھ رہ چکی ہیں کیوں نہ کہیں سے اسے اپنے مطلب کی عورت مل جاتی ہے۔ اسے

نہیں سمجھا۔ میں اپنی سرعتی کی مالک ہوں، جب چاہوں اسے
چھوڑ کر جا سکتی ہوں، وہ کچھ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کچھ کر پاتا ہے
... کچھ تو سمجھ میں ہے؟

”لیکن... لیکن میں...“
”لیکن وہ کچھ نہیں...“ اسی نے میری بات کاٹ دی۔
”میں ایک وقت میں ایک ہی تھان سے بندھ کر رہنے والی
گئی تھی ہوں کسی زمانے میں، میں شاید ایک آوارہ گائے تھی مگر
اب نہیں ہوں۔“

مجھ پر تھوڑا سا بھروسہ ہی تھا، میرا دل چاہ رہا تھا
کہ کڑیاں اٹھا کر کوئی شہر گزروں یا زینہ کو ہاتھوں سے چڑھ کر
اس کا سر دیوار میں سے باہر لیکن میں خود پریشان کرتے ہوئے
اور مزید کوئی دلیل بازی کیے بغیر تیزی سے گھومنا اور اپنے کمرے
کی طرف چل دیا۔

”سنا...“ دفعتاً عقب سے اُس کی آواز سُن کر میں ٹٹک
گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور مجھے ایک سلتی خیز سی تیرانی کا سامنا
کرنا پڑا۔ اُس کے ہونٹوں کے گوشوں سے شریر سی ہنسی پھوٹی
پڑ رہی تھی کہیں وہ دوبارہ اُس کے قریب جا پہنچا
”ہیں... اتنی ہی جہت تھی؟“ اُس نے شراب جیسے میں
پوچھا میں عجیب مجھے کے سے عالم میں کھڑا تھا مجھے کچھ
سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بولوں تو کیا بولوں؟

اُس نے خود ہی میری مشکل حل کر دی، میرے جھکا کر ایک
انگٹھے کے ناخن سے دوسرے انگٹھے کا ناخن گڑھتے ہوئے
بولی وہیں سے کہا تھا کہ میں ایک وقت میں ایک ہی تھان سے
بندھ کر رہنے والی گئی تھی ہوں، میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں
ہمیشہ ایک ہی تھان سے بندھ کر رہنے والی گئی تھی۔
”اس کا مطلب ہے، اشرف خان کی چھٹی...“ میں
نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”ہاں، اشرف خان کی چھٹی...“ اُس نے فیصلہ کن جیسے
میں کہا، اس سے پہلے کہ وہ میری چھٹی کرا دے، میرے کتے
میں بہتر رہی ہے کہ میں اُسے چھٹی سے دلی۔“

میرے انسانی وجود میں چھپا ہوا حیوان خوشی سے تھاپیں
بھرنے لگا، میں نے ایک سترت بھری جھج مارنے کے لیے
مڑے کھڑا لیکن نہ بندھنے میرے کند پر ہاتھ رکھ دیا۔
تھوڑا سا مڑے گھٹنے بعد جب کہ ہم بیڈ روم سے نکل کر
دوبارہ ڈانٹنگ کھیل پر آ پہنچے تھے کال بیل بجی۔ اشرف خان
واپس آچکا تھا، کال بیل بجانے کا اس کا خنوس انداز تھا۔ زینے
جاکر دوبارہ کھولنا، اشرف خان اندہ آچکا تو وہ اس کے آگے
آگے جاتی ہوئی واپس ڈانٹنگ کھیل تک پہنچ کر بلا جھکا جھٹ

کوئی کام مختص اس کے سلسلے میں وہ کہیں گیا تھا، کام ہو
نہیں سکا تھا۔ دوسرے روز اُسے پھر جانا تھا۔
میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا پھر اس کے
ساتھ تاش کھیلنے لگا اور میرے اندر دیر سے دیر سے جیسے جھگ
سی بیٹھی پڑ گئی۔

دوسرے روز صبح حسب معمول تیار ہو کر ڈانٹنگ کھیل
پر پہنچا تو میں نے غصوں کو لیا کہ اشرف خان گھر سے جا چکا
ہے۔ زینہ اس وقت رات میں پر ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس
کی تسکتی ہوئی سرگرمی آٹھینے کے دلک پر لکھی ہوئی تھی۔ میں
اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میری موجودگی کا احساس ہوجانے
کے باوجود اُس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اُسے اطمینان
ہے ہاتھ خشک کرنے کے بعد تولیہ لٹکانے لگی۔

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تب اُس نے ترقی
ظہر سے میری طرف دیکھا اور دیکھے جیسے میں لٹی ہو گئی تھی
غصوں کی بات سے تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟
میں نے ایک طویل سانس لی جس سے میرے دل کا
کچھ سکون ملا اور میں نے دیکھے جیسے میں کہا بات یہ ہے
زینہ، تم کہیں اشرف خان کا نفی نفی کا پادشہ نہیں۔ اس کی
ہر چیز میں برابر کا خریک ہوں۔ تم بھی ایک طرح سے اس
کی املاک میں شامل ہو، تمہارے معاملے میں بھی میری تھتے
داری تسلیم ہونی چاہیے۔ کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟

وہ چند لمحے ٹٹکیں جھکائے بغیر میری طرف دیکھتی رہی
جیسے میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ
مطلب مجھ کو وہ بھڑکے گی یا کم از کم جھڑکنے کی آواز کی ضرورت
کرے گی لیکن اس نے اسی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ ایک
تھنڈی سانس لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور بڑے تحمل سے
بولی وہ پہلے بات غور ہے کہ میں لوگوں کی کوئی گوفی اسونے چاندی
کا کوئی زور بجا ہاد و مزہ نہیں ہوں کہ جس کا بٹوارہ ہو سکے یا
جس میں پادشہ شریک ہو سکے میں ایک زندہ سلامت عورت
ہوں اور غصوں کو شت پورست سے بنے ہوئے ایک جسم ہی
کی مالک نہیں ہوں، میرے سینے میں دل بھی دھڑکتا ہے اور
گھوڑی میں پھوڑی سی عقل بھی موجود ہے۔ میری لہجہ ایک کچھ
ہے، میری کوئی پسند نہ بھی ہے اور اس کی کچھ اہمیت بھی
ہے، تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے تمہیں جو
تھاں کہتا ہے جس ان سے تم نے کچھ غلط انداز سے قائم کر لیے
ہیں اشرف خان کے ساتھ میری رفاقت کتنی ہی بے وقت
اور بے بنیاد سی لیکن اس نے بھی مجھے اپنی املاک کی طرح

میں داخل ہوا تھا اُس سے دل سننے اُسی روز نہ دیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہوگا۔

مجھے اُسوس ہے اشرف خان! میں نے نظر جھکا کر اس سے... تم تو بلاوجہ ہی شرمندہ ہو رہے ہو اس حیرت وہ قدم سے جاندار انداز میں ہنسا وہ ہم سے لوگوں میں ایسے نشیب دفوا کرتے ہی رہتے ہیں۔ زور بند سے میرا کوئی ایسا نام تو تھا نہیں کہ جس پر عزت یا بے عزتی کا سوال پیدا ہو یا میں شرمسار ہوں اور مجھے مشتعل ہونے کی ضرورت پیش آئے۔ ہم تینوں ایذا اپنی مرضی کے مالک و مولا ہیں۔ اب اس حضور کو چھوڑ کر کام کی بات کرتے ہیں۔ مذہبہ! اذرا چائے تو بنا لاؤ وہاں تک پھیلا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر جو تناؤ اور آنکھوں میں جو وحشت چند لمحے پہلے تک نظر آرہی تھی وہ اب مفعول ہو چکی تھی۔ بہت جلد ہی وہ باطل ہو گیا تھا۔ مذہبہ جلد سے بنائے کچن میں چلی گئی تو اشرف خان پائپ بھر کر سگاتے ہوئے بولا: یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ چھوٹی موٹی سلط پر ہم اس وقت بھی اپنا ذاتی کام شروع کرنے کی پوزیشن میں ہیں لیکن آج جب میں باہر گیا تو ایک بہت بڑی کھپ کا آرڈر مل گیا اس کھپ میں ہمیں چائیں بچاس ہزار روپے بیچ سکتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انچ پورٹ کے مال کا ٹرک ہمیں لاہور سے لے کر چلنا ہوگا اور اس سفر کے قریب نکلنے والے ایک خفیہ سرحدی راستے سے مل اُس پار پہنچنا ہوگا۔ وہیں سے امپورٹ کا مال لے کر میں لاہور پہنچا ہوا ہوگا یعنی ہمیں روٹ بدلنا ہوگا اور اس روٹ پر خطرات زیادہ ہیں۔ ایک آدمی بطور گائیڈ ہمارے ساتھ جائے گا۔ باقی ساری فیسے واری ہماری ہوگی۔ میں نے ابھی کوئی ہمتی جواب نہیں دیا کہ میں نے پارٹی سے کہا ہے کہ میں اپنے پانڈنر سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔

”اس میں مشورہ کرنے والی کیا بات تھی؟ میں نے سنبھل کر جموں کے اتحاد دے اور جہول کے گورد کو دھندلے سے باہر کرتے ہوئے کہا: کاروباری اعتبارات میں نے مکمل طور پر تمہارے سپرد کر رکھے ہیں۔ تم جس معاملے کو بھی چاہنے یا بتر سمجھو اس میں میری طرف سے بھی مائی بھر سکتے ہو۔ جیسے بھی جب تک ہم ٹرے آرڈر نہیں بکریں گے اسٹور روٹوں پر نہیں چھیں گے، تجارت منزلہ قدم نہیں اٹھائیں گے، تب تک ترقی کیسے کریں گے؟ اگر ہم نے اپنا حوصلہ نہ کھولا اور منت سے خطرات مول نہ لیے تو ہم ترقی کیسے کریں گے؟

”بہت خوب“ وہ اطمینان کی سانس لے کر بولا: تم

میرے بار بارانی کرسی پر بیٹھ گئی جس پر وہ چند لمحے پہلے بیٹھی تھی۔

اشرف خان ہمارے مقابل آن کھڑا ہوا اور ایک کرسی کے پشتے پر ہاتھ جاکر ہمارے چروں کا جائزہ لینے لگا۔ میں اس سے نظر ہٹا رہا تھا لیکن مذہبہ اطمینان سے بیٹھی سگریٹ کے کش لیتی ہوئی نیم وا اور نیم چھٹی آنکھوں سے اس کے طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر ذرا بھی گریزاں نہیں تھی۔ اشرف خان سننے کی بجائے تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ تبدیلی میری باندھنی آنکھوں میں اور چروں پر ہی نقش نہیں تھی۔ تبدیلی تو درد دیوار سے بھی جھانکتی نظر آرہی تھی۔ تبدیلی ہوا میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اشرف خان اب ایسا آؤ بھی نہیں تھا۔ چند لمحے ماحولی پر عجیب سا سکوت طاری رہا میں اپنی دھمکنیوں کی دھماک کنپٹیوں میں سن رہا تھا۔ بالآخر اشرف خان کرسی کھینچ کر یوں بیٹھ گیا جیسے اُس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ اُس کا منہ آترگ تھا میں اس وقت شدت سے جاہ و ہاتھ کر کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ بولے سکوت کسی نہ کسی طرح ٹوٹے۔ خواہ اشرف خان گایاں بگے ہوئے بھر پر ٹوٹ ہی پڑے۔ سکوت اشرف خان نے ہی ٹوٹا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے یہی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا: ”میرا خیال ہے میرا تختہ الٹ چکا ہے۔“

مذہبہ نے مجھے جواب کی زحمت سے بچا دیا۔ میرے بول سے بول یہ معلوم نہیں تھا۔ تختہ الٹا ہے یا میرا دماغ اُٹف گیا ہے۔ میرے خیال میں بات صرف اتنی ہے کہ میں نے وفاداریاں تبدیل کر لی ہیں۔ مہم مردوں کو بھی تو جاننا ہوتا ہے ہر طرح کے بندھن ہٹنے بعد نظروں کی مدد سے توڑ دینے کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ میں نے سوچا لیکن ابھی کیوں نہ اپنی پوزیشن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایسا ہی حق حاصل کرنے کی کوشش کر دوں۔ ویسے بھی اب تمہیں مجھ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی اشرف خان!

”ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔“ اشرف خان کھیلتے سے انداز میں ہنسا۔ جو کچھ ہو چکا ہے میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے باقی معاملات حسب معمول چلتے رہیں، ہمارے دلوں میں کوئی فرق نہ آئے۔ میں آج ہی اپنا سامان انفل کے کمرے میں منتقل کر لوں گا اور افضل اپنا سامان تمہارے کمرے میں لے گئے گا۔ وہ ایک بار پھر کھیلتے سے انداز میں ہنس دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا: میں جس روز تمہیں لے کر اس گھر

بھی ہوئی حلیہ بہت کم تھی اور جس کے بستروں میں آتے کھٹل
تھے کہ اگر وہ لڑکھل کر کو شش کرتے تو شاید ہمیں گھسیٹ کر
کر لیں اور اُدھر اُدھر لے جاتے۔

مجھے اس بار بھی اپنے پنوں کے شہر میں زیادہ گھومنے
بھرنے کا موقع نہیں ملا۔ اشرف خان نے مجھے جو کل تک
ہی مجھ پر دہشت کی ہدایت کی تھی رات گئے ایک شخص جس
کے نفیس سوٹ سے نہایت پیاری خوشبو پھوٹ رہی تھی
ناک پر وہ مال رکھے ہم سے شے آیا۔

اس سے بہت دیر تک سرگوشیوں میں باتیں ہوتی ہیں۔
دو رخصت ہو کر آئے ہم نے بھی جنت سفر باندھا۔ جو کل تک کمر اچھڑ
کر ہم ایک ٹیکسی میں راوی روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ اپنی
منزل سے اندازاً دو تین فرسنگ پہلے ہی ہم نے ٹیکسی چھوڑ
دی اور باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔

ٹرکوں کے ایک اڈے کے پچھلے ٹیڈ میں ترپال سے
ڈھکا ہوا ایک ٹرک تیار کھڑا تھا۔ یہی وہ ٹرک تھا جسے ہم لے
کر جا رہے تھے سائیکسنگ وکیل پر موجود شخص ڈرائیور بھی
تھا اور گاڈ بھی۔

دوسرے روز تقریباً اسی وقت ہم ایک پورٹ کا
مال پہنچا کر اپنی سوٹ کا مال لا کر مقررہ جگہ پر تیز وعافیت پہنچا
کر اور اپنی رقم لے کر فارغ ہو چکے تھے۔

اشرف خان نے کہا تھا کہ اس چکر میں خطرات زیادہ
ہوں گے لیکن مجھے تو یہ دودھ اپنے معمول کے دوروں
سے زیادہ آسان محسوس ہوا تھا۔ پیدل بلدیہ احساس ہوا تھا کہ میں
ہی نہیں اشرف خان بھی ابھی تک کنوئیں کا مینڈک ہی تھا
وہ نہ تاروں سے آگے جہاں اندھی تھے۔

یہ دورہ میرے لیے بے پناہ تجربات کا موقع تھا۔
نت نئے لوگ انت نئے راستے انت نئے طرہ ریلے۔ یہ
تجربہ تو مجھے پہلے بھی یاد ہو چکا تھا کہ دولت یا ندوکی کی مال
کس طرح بندہ ازل کو بھی جیم زندن میں کھول دیتی ہے
لیکن اس دورے میں یہ تجربہ کچھ زیادہ ہی وسیع پہلے حاصل
ہوا۔ دولت یا طاقت... مکھن راستوں پر پہنچنے کے ہی دو
سہارے تھے اور جو لوگ ان دونوں سہاروں کو استعمال
کرنا جانتے تھے، منزل خود آگے بڑھ کر ان کے قدم چومتی تھی۔
میں نے اس دورے کے بعد اپنے آپ کو بڑا حوصلہ محسوس
کیا۔ یہ روٹ خاصا مزہ خیز تھا اور کھٹک کی بات یہ تھی کہ جس
تک پہلے سے ہم مال لے کر آئے تھے ان کے ساتھ دو ڈھان
کھٹے بھی ہم نے یوں مزے مزے کے مشاغل میں گزارے،

نہ صرف مجھے تہذیب کی کیفیت سے نکال لیا بلکہ میرا
حوصلہ بھی بڑھا دیا۔ اگر ہم یہ چکر مکمل کرنے میں کامیاب ہو
جئے تو پھر ذاتی کام شروع کرنے کے لیے ایکسٹنشن روٹ
پر قدم رکھیں گے۔ ہم ایک طرف کاروبار کریں گے صرف پیر
ہم طور کم کے بغیر اسٹیل سے دوسرے پڑوسی ملک سے
مال لائیں گے۔ برقی سامان کے چھوٹے پڑوسے ولایتی سگریٹ
اصل ولایتی شراب اور دوسری بہت سی چیزیں ایک ہی
جگہ میں سب کچھ۔

”یہ آؤ زر والی کھپ کب لے کر جانا ہو گا؟“ میں نے پوچھا
”انتظامات مکمل ہونے میں ہفتہ دس دن تو لگ جائیں
گے تو اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے مجھے تم تیار ہی چھوڑیں گے کہادہ حقیقت
میں نے ہفتہ دس دن کی ہولت کا کس کو لینان کی سانس لی
تھی۔ میری زندگی میں جو نامور کیا تھا وہ میں نے جو نیا قدرتی
کیا تھا؟ ابھی میں جی بھر کے اس کی جھولی جھپٹوں میں بہکتا جا رہا
تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ آئی آسانی سے
ہو جائے گا اور اشرف خان کی طرف سے مجھے ایسے معمولی
سے مقل کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ کہ جس سلطنت میں
میں محض جتنے وار بننا چاہتا تھا، وہ لوہی کی بلوری مجھے ہی
لے جاتے گے۔

جائے کے دوران ہم نے مزید چند کاروباری تفصیلات
طے کیں۔ مشرانج کے کسی خمرے کی طرح یکا یک ہی میں میسے
کسی دوسرے خانے میں آگیا تھا۔ میں دفن کا افسل نہیں رہا
تھا۔ حقیقتاً میری حیثیت کچھ افضل سی ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ
ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اشرف خان کی جگہ پر آگیا تھا
اور اشرف خان میری جگہ پر آگیا تھا۔ حقیقت بھی کا حد تک
یہی تھا۔

اس کے بعد آٹھ دن جیسے کسی سنانے خواب کی طرح
بہت گئے۔ نہ سیر بہت ہی عجیب عورت تھی۔ میں حیران تھا
کہ اشرف خان نے اس سے دو سہارے ہوا اس قدر آسانی
سے کیوں قبول کر لیا تھا۔ اس عورت کے لیے تو قتل ہو سکتے
تھے مگر شاید میرے اس خیال کی وجہ میری نوجوانی تھی...
اشرف خان کی عمر کو سوچ کر شاید میری دل سے یہ نہ نہ تیار

فوس دن ہم دونوں مزدوری سامان سے لیس ہو کر لاہور
پہلے گئے۔ میرے پہلوں کا شہر۔ یہاں ہم لہندہ شہر کے
ایک نہایت گھٹیا اور کٹام سے جو کل میں پہنچے جس کے
تک وہ ایک کمروں کی دیواروں پر لٹواری کی پیکوں سے

پانچ سینما ہاؤس تھے جن میں کسی پٹی سی نہیں ملتی تھیں۔
 فلموں کے بارے میں اب میرا ذوق کچھ بلند ہو چکا تھا۔ پہلے
 والی بات نہیں رہی تھی کہ خواہ کوئی بھی فلم سنی جو منہ اٹھا کر
 دیکھنے چاہیے۔

میں نے گھنٹا گھر جا کر ایک مشہور قسم کی دوکان سے
 خوشبودار بان کھایا اور ادھر ادھر آدھرا آدھرا گردی کرنے لگا۔ دو دن
 مجھے یاد آیا کہ شہر کے ایک سرے پر میل لگا ہوا ہے جس میں
 تھیں، مگر کس موت کا کٹواں اور اس طرح کے دوسرے
 بہت سے کھیل تماشے موجود ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میرے اندر
 کے دیوانے نے انگ اٹھائی اور میرا رخ میل کی طرف ہو گیا۔
 شہر سے باہر کی طرف اپنی دسے پر تقریباً ایک میل چل
 کر میں اس طویل و طویل میدان تک جا پہنچا جہاں اس وقت زندگی
 کے ہنگامے جو ان تھے، چاروں طرف چوٹی بھوں پر بڑی
 بڑی لاشیں نصب تھیں۔ ہر طرف جہازیں سائیکس کے بیٹھے
 رنگارنگ بوڑھے نظر آ رہے تھے۔ ان کی موت کا کٹواں نظر آ رہا
 تھا کہیں سرس، کہیں بنڈال میں سرخس کی عورت اور پھر کشمیری
 نکلے سے پانی آنے کا نظارہ دکھایا جا رہا تھا۔ کسی بنڈال میں
 نامعلوم سیڑیوں کے جانور دکھانے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا۔

سب اعلانات لاؤڈ اسپیکروں پر جاری تھے۔
 میں غمی رہتا رہی چل رہے تھے۔ کان بڑی آواز سنائی نہیں
 دے رہی تھی۔ رکھو سے کھوا چل رہا تھا۔
 تقریباً ہر بنڈال کے باہر ہندی پر نصب شدہ ایک تھ
 پر ٹکٹ لکھ اپنے اپنے صندوقچے لیے بیٹھے تھے۔ ان کے
 پاس ہی ایک دو دو کر اور ایک دو دو ٹکٹوں کا ٹول کی نوٹس پر توں
 نما چھل کو میں مصروف تھیں۔

جن کپڑوں کو ٹکٹیاں قیصر نہیں تھیں وہ تیسری جنس سے
 ہی کام چلا رہی تھیں۔ یہ جنس چونکہ سنسکر کی پابندوں سے
 آزاد قسم کا شوشہ کرتی تھی اور ہر قسم کے مکالموں کا منہ ٹوٹ
 جواب دیتی تھی، اس لیے ان کے گرد اس سے زیادہ جھوم
 تھا جتنا لوگوں والے تختوں کے گرد تھا۔

اور گرد کے دیہات سے لوگ جوق در جوق پہنچے ہوئے
 تھے۔ بڑے بڑے اور غریب و غریب صدائیں سننے میں
 آ رہی تھیں۔ میدان کو گھر کے کنارے قسم کا تھا اور ہوا بھی خوب
 تیل رہی تھی اس کے باوجود فضا میں پسینے کی جگر رہی تھی۔
 جگہ جگہ چھوٹے موٹے کھیل تماشے بھی جاری تھے کہیں
 مشین پر زور آزمائی کی دعوت دی جا رہی تھی تو کہیں نشانہ بازی
 کے ایک کے دسے دس پیلے کے انجام کے اعلانات کیے

گواہم وہاں اسمگلنگ کے لیے تین پیلے کے پیلے ہوئے تھے۔ سکھوں
 نے ہماری بڑی خاطر دلت کی تھی، ہر طرح کی خاطر دلت۔

تیسرے روز ہم واپس شہر آکر کوش پینچ گئے اور صبح
 آرام کرنے لگے۔ یہ ہم تو بڑی بار بار رہی تھی اس لیے میرے
 خیال میں آرام بھی کچھ زیادہ طویل وقفے کے لیے ہونا چاہیے تھا۔
 یہ بھی میرے اندر ایک تبدیلی تھی۔ درہ اس سے پہلے میں آرام
 سے بڑا چڑا تھا۔ خصوصاً ہم سے واپس آنے کے بعد میرے
 اعصاب پر ہیجان سا طاری ہوتا تھا اور شدت سے ہر اول
 چاہتا تھا کہ فوراً ہی کسی اور جگہ پر نکل جاؤں لیکن میرے سامنے
 کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ مجبوراً میں ریکارڈنگ پر مل گیا۔
 سن کے انچادہ سالے بڑھ کر اشرف خان اور ذرینہ کے ساتھ
 تاش کھیل کر یا پھر کبھی بھلا باہر ادھر ادھر آوارہ پھر گرفت
 گزارا تھا۔

اس مرتبہ عجیب عالم رہا۔ اشرف خان عموماً گھر سے
 غائب رہتا اور میرا گھر سے نکلنے کو دل نہ چاہتا۔ معاملات
 ہو گیا تھا۔ میں نے عموماً کیا کہ مجھ پر کابی اور مٹاپا غلبہ آنے
 لگتا ہے۔ ادھر ذرینہ نے مجھے خصوصی اہتمام سے پکارتے ہوئے
 کھانے کھا کھا کر کسی حد تک صاحب تو نہ بنا دیا تھا۔ الا آخر
 میں نے علی الصباح اٹھ کر کھیتوں کے پار ویرانے کی طرف
 دوڑ لگانے کے لیے جانا شروع کر دیا۔

روزانہ کوئی میل کی دوڑ لگانے سے پہلے آخر تک پہنچ
 جگہ پر آئے شروع ہوئے درہ میں تو آپ کو وہ دیکھ کر حیرت
 کرنے لگا تھا جو بربادی کا موسم گزارنے کے لیے کھنڈار
 میں آن سوا تھا۔

اشرف خان اس دوران ذاتی کاروبار کے امتحانات
 میں مصروف رہا۔ نہ تشریف لائے تھے۔ تاش گرد ہا تھا۔ معلومات جمع
 کر رہا تھا اور جو بھی ضروری کام تھے انھیں نشانہ تھا۔ جب
 خراج کے نام پر وہ ذرینہ کو تین ہزار روپے مال نہ دیا کرتا تھا۔
 وہ اس مرتبہ اس نے میرے حساب میں سدیے تھے۔ ناب
 کتاب کا وہ بے حد کھرا تھا۔

ایک روز میں نے ذرینہ کو ایک چڑھائے ہوئے
 اور رات کا کھانا بھی ڈٹ کر کھایا ہوا تھا۔ اچانک ہی مجھ پر
 انکشاف ہوا کہ ذرینہ کی طبیعت نامناسب ہو چکی ہے۔ اس کی
 کے حال پر چھوڑ کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ موسم بے دانا
 تھا۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں بڑی ترنگ میں تھا۔
 اور سطر درجے کے اس شہر میں تقریباً کوئی خاص جگہ نہ تھی
 اور یہ چیز بعض اوقات مجھے بہت کھلتی تھی۔ دسے دسے کپار

رقاص نے نوٹ دیکھا تو ساری ادائیں بھول کر عقاب کی طرح اس پر چھٹی۔ ترجیحی نظر کی کشاری، پتلی مڑکی چمک، وہ شاخ گل کا سا جھکاؤ، وہ مڑمڑ انگلیوں کے ابرو سے گھبراہٹ میں گویا وہ سب کچھ بھول گئی۔ بس نوٹ اچٹکے کے لیے جھلک پڑی شاید اسے اندازہ تھا کہ میں محض مذاق کر رہا ہوں اور اس کا لائق بڑھتا دیکھ کر نوٹ واپس کھینچ لوں گا۔ وہ جھکی تو تیرہ روشنی اس کے چہرے اور جسم پر کچھ ایسے زاویے سے پڑی کہ سارا جسم ٹوٹ گیا۔ فاصلے سے جو سراب باندھا تھا اس کی حقیقت کھل گئی۔ جسے میں رطلی سمجھا تھا وہ بھی تیسری جنس کا ہی ایک نمونہ تھا۔ قدرت نفیس قسم کا نمونہ۔

میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور سوکا نوٹ اس نعل بے شر پر بچھا دو کر کے، جھوم سے نکل آیا۔ ایک طرف کو بھونکیں نے دونوں انھوں سے انھیں کل کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنی نظر کو قدم سے ستر محسوس کیا۔ اس کا ج کے جوہن ڈبل پیگ میں نے سر سے میں اڑیے تھے شاید ان کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ شاید یہ اس اثر کا نتیجہ تھا کہ چند لمحے پہلے میں اس تیسری جنس کو میلے کی جینہ اول تھکر کر بکس بڑا تھا۔ اب بھی وقفے وقفے سے میری کھوپڑی گویا بتوا میں بکوسے لینے لگتی تھی۔

کم ظرف کہیں کے! ذرا سنبھل کر جلوہ تم لوگ زیادہ ہی ترنگ میں آگئے ہو! میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اس جگہ سے کچھ کھمکے ایک درخت کے نیچے ٹھوکی کی ایک جھانک بھر کسی میز پر پھیلنے لے اس پر دو پڑوسکی ٹوپ رکھنے آدھی آستینوں والی اسپورٹس شرٹ پہننے ایک باڈی بلڈر اپنے بازو کی پھیلیاں اُجھارے بیٹھا تھا اس کے چہرے پر مسرت تمام جسم کے عضلات بول کھینچے ہوئے تھے اور انھیں کسی بھی قسم کے اثر سے یوں عاری تھیں کہ وہ انسان کے بجائے مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے قریب ہی ترچھے کھڑے ہوئے ایک بورڈ پر اعلان درج تھا کہ کوئی بھی شخص صرف دس روپے کے مقابلے میں سو روپے کی شرط لگا کر اس سے بچتا اڑائے۔ اگر باڈی بلڈر ہار گیا تو وہ دس کے مقابلے میں سو روپے ادا کرے گا۔ ایک منحنی سا جو کہ یہی اعلان میگا فون پر بار بار دُہرا رہا تھا اور اگر کد کھڑے ہوئے لوگوں کو جوش دلائے کہ کوشش کر رہا تھا حتیٰ کہ دبے دبے نظروں میں وہ ان کی غیرت کو بھی ہلکا کر رہا تھا۔ ارد گرد کافی لوگ کھڑے تھے۔ ان میں کچھ گھرجوان بھی تھے

بارے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ بیسے شرج کر کے ان مقابلوں میں حصہ لینے والوں یا ٹکٹ لے کر بٹالوں کے اندر جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ بیشتر لوگ یونہی گھوم پھر کر دل خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غربت اور حسرت ان کے چہروں سے عیاں تھی مگر وہ پھر بھی خوش تھے۔ ہر چیز کے نظارے پر ہی اچھل اچھل کر اور حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال کر ہی اپنا ہیوان کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ...

پھر ایک عجیب سا سرور طاری تھا اور میرے اندر کارہیاتی پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں حالانکہ غائبے محو تھے میں تھا لیکن اسی عمدہ کا ایک قطرہ ان کر رہ گیا تھا میں ہر گھل تما شے میں پوری رہ چکی تھی۔ راتھا۔ ایک تھمر کے باہر ناشی تھتے پر قدمے گوارا شکل وحدت کی ایک رطلی کو غرق دیکھ کر میں نے بڑیں بھی ماریں۔

ایک جگہ ایک تھتے پر بیٹھے خاصی خوبصورت اور گوری چنی رطلی تھرتھتی دکھائی دی۔ رٹھ کیا کر رہی تھی جان تو پڑی تھی۔ میرے خیال میں وہ پورے پہلے کی حسین تر سن رطلی تھی۔ بے اعتیاد بل چاہے کہ اس کی توجہ حاصل کی جائے لیکن اس کے گرد نہ جانے کتنے پروانے دل و جان اُھرنے جلنے کس کس جہز کے اندر رٹھنے لے موجود تھے۔ بہر حال میں قسمت آزمائی سے باز نہ رہ سکا۔

رنگ رنگ کے انسان کو چیرتا ہوا میں بلندی پر نصب شدہ اس تھتے کی طرف بڑھا۔ بازاری آوازیں اور بوقیانہ ہلکے میسے اندر کے جوان کو لگا لگا کر رہے تھے مگر بعض آواز سے تو حد سے ہی بڑھے ہوئے تھے اور سماعت کو ٹھنڈ کر رہے تھے۔

لوگوں کا جو حلقہ تھتے کے زیادہ قریب تھا ان میں سے کچھ پہلے ہاتھ بلند کر کے ایک ایک کے نوٹ رقاصلی نذر کر رہے تھے۔ سر نوٹ لینے کے لیے وہ ایک نئی ادا سے ہر دالوں کی طرف جھکتی تھی اور چاروں طرف ایک شور برپا ہو رہا تھا۔

میں نے اس کے قریب جگہ بنا کر پہلے تو مڑمڑ میں انگلیاں رٹھ کر زوردار سیٹی بجائی اور پھر سوکا ایک کو کو آواز ہوا نوٹ اس کا اندر کرنے کے لیے بلند کیا۔ جھوم کے سرور پر رہا رہا تے ہوئے ایک ایک روپے کے چند میل سے نوٹوں کے درمیان میرا کو کا نوٹ گویا فوج کے جھنڈے کی طرح بلند ہوا تھا۔

مگر کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا تھا۔

مجھے حیرانی تھی کہ اگر باڈی بلڈز کا بیچ بچوں قبول کیے جانے کی یہی رفتار تھی تو اس بے جا سے کا خرچ کیسے چلتا تھا؟ جسم کی اس لمبی چوڑی عمارت کو وہ کیوں کو قائم رکھے ہوئے تھا؟ شاید یہ سوچ کر میں نے دس کا ایک ٹوٹ اُس کے سامنے میز پر رکھ دیا اور اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ ٹوٹ جلدی سے اس کے جوکر اناؤنسٹر اور پروپیگنڈا سیکرٹری نے اٹھا کر چپ میں رکھ لیا اور باڈی بلڈز نے قہقہے جھک کر کتنی میز پر ٹنگائی میں نے بھی اس کی سیدھی کتنی ٹنگا کر خود اُس کے پنجے میں پھنسا دیا اُس کی گرفت اتنی تھی بلاشبہ اس کا جسم محض دکھاوے کا نہیں تھا اُس نے یقیناً جسمانی ریاضت جاری رکھی ہوئی تھی۔

ہائی اسکول ایک کالج کے زمانے میں اس طرح بوجھ رانا اور طاقت آزمائی کرنا ہمارا مشغلہ ہوا کرتا تھا مگر اب تو ایک عرصہ گزر چکا تھا کسی سے زور آزمائی کیے۔

جو کرنے پہلے تو میری جرأت مندی کی تعریف میں دو چار جملے بولے پھر دن، نو، تھری کی ٹانگ لگائی اور ہمارے درمیان زور آزمائی شروع ہو گئی رنجھے احساس تھا کہ بیسیوں آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں، لوگ شاید دم سناٹے کھڑے تھے۔

کچھ تو اس احساس سے کہ اتنی آنکھیں میری جانب مگرائیں اور کچھ نہیں نے بیٹھے وقت باڈی بلڈز کی آنکھوں میں سے تو بے استغرائی سے چمک نوردار ہوتی دیکھی تھی۔ ان دونوں باتوں نے مجھے بڑی مضبوطی بخشی مجھے میرے انداز سے زیادہ ویر تک ٹھہراؤ حاصل رہا۔

کئی سیکنڈ تک ہمارے بازو ساکت رہے اور طاقت کو جواباً برابری طاقت ملتی رہی لیکن وہ بیٹھہ قد باڈی بلڈز تھا۔ بیچر آزمائی اس کا دن رات کا کام تھا۔ بلاشبہ وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور بھی تھا تبھی یوں کھلے میدان میں بیچ بچے دیے بیٹھا تھا لیکن بلاخراس کے بازو میں پکیپا ہٹ آئی شروع ہو گئی اور پھر سیکنڈ کی موتی کی سی رفتار سے بازو جھکنے لگا۔ کیسٹ تو میری کہ مقابلہ تولدیا تو اس نے خوب کیا آخر کار میں نے اس کا بازو بوری طرح میز پر ٹنگا دیا تاہم اس کی ہی نہیں میری پیشانی پر بھی پسینے کی بوئیں ابھر آئی تھیں۔

اور گرد و موجود لوگوں نے نایاب بجا میں ادھیں پیشانی سے پسینہ پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا میں جلسے کے لیے مڑنے لگا تو باڈی بلڈز نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے میرا ہاتھ

پرکڑ کر مجھے روکا پھر اپنے جوکر بیٹھٹی سیکرٹری کے لیے ہوئے انعام کے علاوہ مزید ایک سوکانوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنا یہ میری طرف سے ہے جاؤ جوان! بڑی ہدایت کے بعد کسی سے بچھڑانے میں لطف آیا ہے۔

”مجھے خیال نہیں رہا تھا...“ میں نے دونوں نوٹ اسے چاہ کر نے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو انعام تو مختاری مزدور میں مجھے پیش کرنا چاہیے تھا، اس بات پر کہ اتم اپنی طاقت کا شرافت کی حدود میں رکھتے ہوئے ہدفی کماد سے جو ترم مدار کے مرد ہو لیکن فوس کہ مجھے یہاں زیادہ تعداد میں تھا اسے قدر دان نظر نہیں آ رہے تھیں نے سہ کے ان دونوں کے ساتھ ایک نوٹ اپنی طرف سے ملا دیا نوٹ اُس کی میز پر رکھ کر اور اسے بگا بگا چھوڑ کر میں تیزی سے آگے بڑھتا جا کر کافی آگے مجھے تھیراؤ سرس سے ملتی جلتی ایک بیچر نظر آئی۔ پندل بہت بڑا تھا اور باہر خاصا سیٹے کا ایک چھو سا بیچ بنا ہوا تھا۔ اس پر ٹنگٹ فردوش اور جوکر کے علاوہ پھر سے پھر سے جسم کی ایک سالونی لیکن خاصی پُرکشش ہوا جس کے تراشیدہ بال بڑی خوبصورت سی کندھوں پر جھکے ہوئے تھے اور اُسے بے نیازی سے ایک ہندو قہقہے پر بیٹھتی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ لوگ اُسے متوجہ کر سکیے کے لیے حسبِ مقدار حرکتیں کر رہے تھے مگر وہ تو کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی تاہم ایک آفتی پر نظر جانے لگی تھی ایک جوکر اس کی طرف اشارہ کر کے ٹانگ پر بار بار اعلان کر رہا تھا اور یہ میں مس بکلی جوکر کی کے تختے سے ٹنگ لگا کر کھڑی ہوں گی اور ماسٹر منظور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان پر خفگی کی بارش کریں گے۔ خجور اس کے سر سے پائل تک جھلک رہی تھی۔ ہوتے تھے میں بیوسٹ ہوں گے خجور کی اس لیٹار کے سامنے کھڑے ہونا بڑا دل گزرتا کا کام ہے صاحب۔ جلدی آئے... چند منٹ بعد س کا اور ماسٹر منظور یہ سنسنی نیر کھیل آپ کے سامنے پیش کر رہے اس کے علاوہ گھوڑے کے کرتب... ایک پسینہ سا ٹیکل پر حیرت انگیز کارنامے... جھٹکوں پر کھیل مٹانے... سب کچھ صرف تین روپے میں... جلدی ٹنگٹ یحبی اور اند آئیے سوچ بچار میں وقت ضائع مت کیجیے، شو مشورہ مجھے میں صرف چند منٹ باقی ہیں۔“

پندل پر چند بوڑھے آدمی آدیاں تھے جن پر ان کھیل کا شاید کی منظر کشی کی گئی تھی جن کا اناؤنسٹر ذکر رہا تھا۔ یہ بوڑھے شاید برس ہا برس سے کوئی ایک ہی بیٹھ رہا کرتا تھا۔ پچیس سے

دیر اور دیر... اپنے حدود اور سر کے بلے میں کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔

میں کسی ٹرک میں موٹی پٹائی پر پڑا تھا میرے دائیں بائیں اور اور سر ہانے پانچویں سب طرف بڑی بڑی چوٹی تھیں ان کے درمیان عقوڑی سی جگہ چھوڑ کر رکھے بھی کسی بلے کلمہ اور بے جاں چوڑی طرح ڈال دیا گیا تھا ٹرک پر غالباً ترپال ہی تھی ہوئی تھی میں ٹھپ اندھیرے میں پڑا تھا کبھی کبھی غالباً کوئی اور ٹرک یا گاڑی وغیرہ قریب سے گزرتی تھی تو رادر اور دھیرے آکاؤ کا سور اور ان کے راستے لئے جبر کے بلے کچھ روشنی اندر پہنچ جاتی تھی ٹرک کی حالت سے کسی طرف رواں دواں تھا۔

میرا سر بھاری تھا اور زمان جیسے ششک روئی کا گولا بن کر رہ گئی تھی۔ جسم کا جوڑ ڈھکھا تھا اور جھوک سے بندے میں کمین سی اٹھ رہی تھیں۔ ریلوں تک رہا تھا جیسے مجھے بن کھائے پیسے شدید تکت کرتے کرتے کئی دن گزر گئے ہیں۔ میری حالت بتا رہی تھی کہ وہ رات یقیناً کب کی بیت چکی تھی، جس رات مجھے شہر کو کوٹ کے میلے سے اٹھایا گیا تھا۔ یہ شاید دوسری رات تھی معلوم نہیں کتنے گھنٹوں سے میں بلے ہوشی کی حالت میں سفر میں تھا۔

مجھے اس وقت کچھ سوچا بھی بلے حدود اور کام محسوس ہو رہا تھا اس کے باوجود میں نے ذہن پر حتی الامکان زور دیا لیکن میں ذرا بھی اندازہ نہیں لگا سکا کہ مجھے اغوا کرنے والے کون ہو سکتے ہیں اور میری ان سے کیا دشمنی تھی جو انھوں نے یہ زحمت کی ہے؟ جہاں انھوں نے مجھے بلے ہوش کیا تھا وہاں تو شاید انھیں میری شکل بھی نظر نہ آئی جو پھر انھوں نے کیا میں مجھے اغوا کیا تھا، کیا مقصد ہو سکتا تھا ان کا؟

جب مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملا اور کھوپڑی کا بھاری بن کر گیا تو میں نے جھنجھلاہٹ، امیزا انداز میں چیخا شروع کر دیا لیکن میری چیخ و پکار کی وجہ صرف جھوک تھی میں جاہتا تھا کہ کوئی میری طرف متوجہ ہو تو اس سے کہوں کہ محتو! مجھے جہاں دل چاہے لے جاؤ لیکن کچھ پلا تو دور!

شاید میرے حق سے آواز چھڑ زیادہ زوردار نہیں نکلی رہی تھی یا پھر جس جگہ اور جس انداز سے میں آواز دے رہا تھا وہ دگر قسم کی حالت میں پڑا تھا اس کی وجہ سے چلتے ٹرک کے شور میں میری آواز ٹرک کے اگلے حصے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا مسئلہ صرف جھوک ہی نہیں ہے مجھے سرور بھی لگ رہی تھی۔

لے کر آج تک ہر میلے ٹھیلے ہر سرکس میں، ہر جگہ میں نے ایسے ہی لارڈز اسی حالت میں دیکھے تھے کہ ان پر جی ہوئی قوم روں میں یہ قہر کرنا مشکل ہوتا تھا کہ ان کی کون سا ہے اور کون سا لڑکھاں کہاں سے لور جو کر کہاں ہے۔

اس پٹنڈال پر ٹکٹ معقول قیمت میں فروخت ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں بھی کوئی کچھ کر میرے دلی میں بھی کچھ لگدگی سی ہوئے گی تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا شوق و زور دکھوں گا لیکن اس سے پہلے مجھے شہرت سے وہ مذہت محسوس ہو رہی تھی جس کے لیے وہاں اسکولوں میں بچے ایک انگلی اٹھا کر ماسٹر صاحب سے اجازت طلب کرتے تھے۔ میں کسی گوشہ تنہائی کی تلاش میں چل دیا کہانی دوڑھا ڈیڑا کے ایک چھند میں جہاں تاریکی بھی تسلی بخش تھی اور لوگوں کے آمد رفت بھی نظر نہیں آ رہی تھی کچھ کچھ گیسو سبیل بدلتی رہا اور رنگ میں تھا شاید کچھ لگنا بھی رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد جب کہ میں اٹھنے لگا تھا اپنے اس پاس مجھے عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ میں بھی اور اور دھونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس کو کا مینج ہی گویا میری ناک پر ان لگا یہ کوئی گلاب کا پتھر تھا جسے کسی نے مضبوطی سے میری ناک پر جمادیا تھا اس پر میرے سے تو اس کو فٹل کرنے والی کو جھوٹ دی تھی۔ میری گردن کسی کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں تھی اور اوپر سے ناک منہ پر دھال کی وجہ سے بالکل ہی دم گھٹا جاتا تھا اس عالم میں بھی میں نے کسی کی طرح آواز بند کر کر دیکھی اور اپنے آپ کو گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک میرے حواس پر دھند چھانے لگی تھی۔

میں نے بہت زور آزمائی کی لیکن مجھے قابو نہیں کرنے کی کوشش کوئی ایک شخص نہیں کر رہا تھا، وہ یقیناً کتنی تھے اور ان کی مدد کے لیے وہ وہاں بھی موجود تھا جو غالباً کلوروفام میں جھپکا ہوا تھا۔

چند سیکنڈ کے اندر اندر میرے ہاتھ پاؤں بلے جان سے جوڑ گئے لیکن میں بلے ہوش اب بھی نہیں ہوا تھا۔ وقتاً کی سنہ میری کپڑی پر گھونسا رسید کیا جو اس وقت مجھے تھوڑے کے برابر محسوس ہوا۔ تو اس نے شکل بدل کر میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھے کا شور شرابا... دو تھیاں... میں بھی سب کچھ کہیں دور اندھیرے میں منظر میں چلا گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد مجھے دھیرے دھیرے ہوش آیا۔ میں کچھ نہیں ہلا تھا۔ ہاتھ پاؤں بلائے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ گھوڑی دھیلوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کچھ

کو شرفِ قبولیت حاصل ہو چکا ہے مگر دوسرے ہی لمحے میں
موت چھوڑ دے جس نے صدر کی کھوپڑی میں ہاتھ ڈال کر دھات کی
ایک لمبوتری سی ڈیال نکالی۔

ڈیال نکال کر اس نے ایک بڑی سی سرخ نکال اور
اس پر موٹی سی سوئی فٹ کر لی۔ دوسری جیب سے اس نے
چھوٹی سی ایک شیشی نکالی جس میں تقریباً بے رنگ سا
کوئی تیل نظر آرہا تھا۔ نہایت بچھری سے اس نے سوئی
کے ڈھکن سے گڑا کر تیل کو سرخ میں منتقل کیا۔

میں اس وقت کی طرح اسے دیکھنے میں اس کو دیکھ کر
تھکا کے مجھے صبح صبح برا احساس ہی نہیں ہو سکا کہ اس دورانیہ
پر گڑی دوسرے نے میرے قریب بیٹھ کر بڑی تین اوپر چڑھا کر
ہے میں اس وقت چونکا جب اس نے سوئی نکالی اور سرخ لے
مجھ پر تھکا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ اتنا لمبا میرے لیے
ہو رہا تھا یہ میری دیکھ راست کا اچھا جواب تھا۔ میں نے
کھانے کے لیے کچھ مانگا تھا اور وہ مجھے نہ مانے کس چیز کا
انجکشن لگانے پر تیار تھے۔

میں بہت کسمپاسا تھا لیکن میرے ہاتھ پاؤں بندے
ہوئے تھے پر گڑی دوسرے نے مجھے پرکھ کر رکھا اور سوئی
دوسرے نے بے دردگی سے سوئی میرے بازو میں گھونپ دی
جسے اقدار میرے حلق سے ملکی سی تیج نکل گئی۔ اس کا اندازہ میں
نے کئی بار موٹیوں کی کو انجکشن لگنے دیکھے تھے۔ میری اپنی حالت
اس وقت شاید کسی مویشی سے بھی بدتر تھی۔

تیل میرے جسم میں منتقل کر کے سوئی نکال دے سوئی
میرے بازو سے نکالی اُسے روٹی کے ایک بھاہ سے
صاف کیا اور سرخ سے آگاہ کر دوں جو خوش نہایت مشتاقی و
حمارت سے دوبارہ ڈیال میں رکھ لیں۔ اس کے بعد انھوں نے
لائٹ بجھائی پھر قہقہے سے ہنسی واپس وہیں کھسکی جہاں سے ٹال
تھی پھر غائبانہ اپنی کان پر دھاک لگا کر دیکھے۔ انہر کہ وہ ہر چیز کو پہلے
اسی والی حالت میں اسے کے بعد ڈرا عموماً کیب میں لوٹ گئے
چند لمحے بعد ٹوک دوبارہ چل پڑا۔

یہ سب کچھ چند منٹ کے اندر اندر ہو گیا اور اب
میں نے ان دو ڈال کو اسی کام کے لیے بلایا تھا جسے وہ منقوت
تندہی اور انماک سے انجام دینے کے بعد لوٹ گئے تھے
میرے ذہن پر ایک بار پھر تنہائی کا حلقہ پڑنے لگا تھا اور
اس سے رٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں لوں کے دروازہ میں ڈوب رہا تھا۔ افرارہ اود
منظر میری آنکھوں میں کبھی جھلکا اُٹھتے تھے اور کبھی معدم

میرے ہاتھ پاؤں اس طرح باندھے گئے تھے کہ میں
اُٹھ کر بیٹھ سکتا تھا گو کہ کمر درمی دستی کی بندشوں سے ہاتھ
پاؤں میں جو چکے تھے تھے کی طرح اکڑے ہوئے جسم کو کسی
نہ کسی طرح حرکت میں لا کر آ کر کاٹیں اُٹھ ہی بیٹھا اور میں
نے اپنی تمام تر بچی کو مانا کی جستج کر کے ایک نئے عزم سے
لگا چھوڑنا شروع کر دیا۔

بالآخر میں نے محسوس کیا کہ ٹوک کی رفتار کم ہو رہی ہے
پھر شاید اسے سڑک سے اُتار لیا گیا۔ چند ہنگاموں کے بعد
بالآخر ٹوک رک گیا۔ ڈرائیور کیب کا دروازہ کھلنے اور بند
ہونے کی آواز آئی پھر ٹوک کا ٹیل گیٹ کھول کر نکال دیا گیا
اور کوئی ٹوک کے بھی حصے میں چڑھا کر دیا۔

میرے پیروں کی طرف سے ایک میٹھی کھائی گئی اور
تندہی ہوا کہ ایک زیادہ تیز جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا
پھر کسی نے کوئی سوئیج دیا یا اور ٹوک کے عقبی حصے میں ایک
موزلر میں جھونکا جڑا پھر ٹوک اس باب روشن ہو گیا اس وقت
اس کی کمر درمی روشنی سے بھی میری آنکھیں تیز دھیا گئیں۔
دو نیم نیم آدھی میرے سلسلے کھڑے تھے جس کے
چہرے اس کمزور اور زرد روشنی میں بھی تپے ہوئے تھے۔ تپنے
کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بہت بڑے بڑے گھیر
کی شلواریں قد سے مٹی قیصیں اور صدیاں پہنے ہوئے تھے۔
ایک کے سر پر گڑی بھی تھی۔ دوسرے کی مونچیں ابھی گھنی
تھیں کہ جوتھ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

پر گڑی دوسرے نے پہنے ہوئے ایک سوئی سی گالی دی جو
اُس کے منہ سے کچھ زیادہ ہی موٹی محسوس ہوئی پھر اُس نے لڑتی
چھوٹی اردو میں پوچھا تو کیا تکلیف ہے؟

اُس نے مجھے جو گالی دی تھی پہلے تو میں اس کے جواب
میں اس کے دانت معدے میں پہنچانا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن
نہیں تھا۔ چنانچہ میں صوف پر پڑھنے پر اکتفا کرنا چاہتا تھا کہ
کیا وہ مجھے کھانے پینے کے لیے کھڑے کا ایلوہ دھتے ہیں
یا نہیں؟ اس کے بعد اگر ان کا موٹو زیادہ خوشامد نظر نہ آتا تو
میں شاید یہ بھی پوچھ لیتا کہ آخر میرا قصور کیا تھا جو وہ مجھے
قریبانی کے جانور کا سا سلوک کر رہے تھے۔

میں نے اپنی آواز اور ہلکے کوئی الامکان نرم اور عجزانہ
رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: بھائی صاحب مجھے جنت
بھوک اور سردی لگ رہی ہے۔

اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور انکھوں
کی آنکھوں میں تبادلہ خیال کیا۔ میرا خیال تھا کہ میری یہ خواہش

میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر کس رڑکے تھے کوئی کوئی لڑکا کا، چودہ ہندہ سے اوپر کا تھا، دہائی اس سے بھی کم ہی عمر کے تھے، بیکے بعد دیگرے سب ہی کسماتے ہوئے پیدا ہو رہے تھے۔

سب کے سب خوف اور لاعزتھے چروں سے مرہیں نظر آتے تھے، ان کے بال بے تحاشا ہڑے ہوئے اور مٹی میں اگلے ہوئے تھے۔ آفتاب حلقوں میں دھنی ہوئی تھیں اور جوتوں پر پیڑیاں جی ہوئی تھیں کسی کے تن پر بیج سالم لباس نہیں تھا، انھوں میں دشت انتہائی مایوسی اور موت کی بے پروائی جاگزیں تھی۔

میرے دیکھتے دیکھتے وہ سب کے سب ہی پیدا ہو گئے۔ میں ہی ان کی نگاہوں کا مرکز تھا، شاید وہ سب یہاں کافی عرصے سے تھے اور میں ان کے درمیان زیادہ تھا لیکن وہ مجھے تجسس سے نہیں پس پڑی تھے، مقدسہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شاید ترحم کی جھلک تو تھی لیکن ہمدردی کی نہیں۔ شاید ان کے احساسات شل ہو چکے تھے۔ ان میں سب سے بڑا غائب ہی تھا۔

بھیر ایک عجیب سی مڑی طاری تھی، میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری بے ہوشی نے میرے جسم کو ہی نہیں میرے بن میری روح اور میری قوت اور کو بھی بے انتہا ضعیف کر دیا تھا۔ مجھ میں جیسے زندگی کا قوت ختم ہو گیا تھا، کوئی لگن کوئی خواہش سستی کر چکی تھی۔

کافی دیر تک میں کسی بھرا کچھوے کی طرح بڑا رہا جب بھیر میں کسی حد تک ہلنے کی سکت پیدا ہوئی تو احساس ہوا کہ معدے میں کچھ کا جو عفریت سوچا تھا وہ بھی دھیرے دھیرے پیدا ہو رہا تھا اور معدے کی دیواروں کو اپنے خوفناک پنجوں سے کھینچنے لگا ہے۔

اتھ پاؤں ہلانے تو سب سے زیادہ تکلیف دہ میں بازو میں دہل اٹھی جہاں منجھوں والے اس شخص نے سرخ کی موٹی سی موٹی گھونٹی تھی، ہائی جسم ویسے ہی اڑا ہوا تھا تاہم اس احساس سے خوشی ہوئی کہ میرے بازو آؤٹے نگرہ دھڑکیں ہی ملے یہ خوشی آدھی رہ گئی جب کھل بٹا کر میں نے دیکھا کہ میرے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میرے ہی نہیں دہل موجود ہر رڑکے کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تاہم میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔

نہ یہ... یہ کوئی سی جگہ ہے... ہم سب کے پیروں میں بیڑیاں کیوں پڑی ہوئی ہیں؟ میں نے خاص خاص پر کسی

دہاتے تھے۔ اشرف خان... ذریعہ... وہ گھر... وہ... یہ... کیا وہ سب میرے منظرہ جانیں گے؟ اشرف اور ذریعہ کس قدر پریشان ہوں گے... وہ میلہ... وہ... میں لگی... وہ اس کا رشتہ سہرا پا... ابھی تو مجھے اس سے نصرت پہل کرنے کی خوشخبری تھی یہ خبر پر کیا افتاد ٹوٹ پڑی ہے؟ کاش میں اپنے آپ پر ضبط کیے رکھتا، پیشاب کرنے کے لیے رگوں کے جھرم سے دُور نہ آیا جوتا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اذہیرے گوشوں میں ایسی مصیبتیں بھی انسان کی کھات میں پائی ہیں اور میں اس وقت اس پر چاہا رہا تھا کہ اسے گان تک نہیں ہوتا۔

جیسے دھیرے دھیرے میری سوچوں کے آوارہ گھوڑے بھی لکھنے لگے اور میں ایک بار پھر اندھیری دیواروں میں اتر گیا۔ دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں اپنے آپ کو برسوں کا لپٹن محسوس کر رہا تھا۔ قہاریت کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں جھپکنے میں بھی نہ بخوبی آ رہی تھی۔ چاروں طرف نہایت دھندلے سے اچالے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انا احساس اللہ ضرور ہو گیا تھا کہ میں اس وقت حالت سفر میں نہیں ہوں۔

کوئی بار لپٹیں جھپکنے پر جب نظر کی دھندلہ ہٹ دھیر ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک عجیب اور شگستہ سے چھتر بنا کر ہے میں خشک گھاس چوس کے فرش پر پڑا تھا، اس کے سر کی دیواریاں بے رنگ تھیں، ان کے منہ اور پیٹ میں چھت چھتر سے بے غفلت پر منتقل تھی۔ ایک دیوار میں کھڑکی کے طور پر خاصا بڑا شگاف تھا جس سے صبح کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

سر کی پٹے پناہ تھی لیکن میرے جسم پر صرف ایک پتلا سا بوسیدہ اور انتہائی غلیظ کسل پڑا ہوا تھا۔ عام حالات میں شاید میں اسے چھو نہ بھی پسند نہ کرتا لیکن اس وقت میرا دل بھرا ہوا تھا کہ میری اس میں کچھ ہالوں اور اچھی طرح اس کے پیچھے گلوامت جاؤں لیکن جسم میں اتنی بھی سکت نہیں تھی میرے لوٹ اور شک گیا اس چھت کی حرارت نے میرے جسم کو اڑنے سے توجہ بجا ہوا تھا لیکن قہاریت بہر حال اپنی جگہ تھی۔

میں اس چھتر بنا کر سے میں تنہا نہیں تھا۔ اس محقر سے دھیرے میں ہندہ سوز نفوس موجود تھے۔ ایک ایک کھل میں دھڑکن میں ٹنگاڑے سے پڑے تھے اور کچھ ایسے تھے جو بھرا دھیرے تھے اور کھل اپنے ساتھ ہوں پر چھوڑ کر خود بھولوں میں آؤٹے دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔

میرے جسم میں ایک خوفناک سی مردار دھڑکیں رہ رہ کر لگ رہی تھیں۔ اپنے ارد گرد موجود چروں کو دیکھ کر

انوار صدیقی کے پرستار متوجہ ہوں!

● انوار صدیقی کا لازوال شاہکار..... ”انکا“

● ہر دور کی لازوال کہانی

● آپ کی محبوب

آپ کے دلوں کی دھڑکن

آپ کی جانی پہچانی..... ”انکا“

اب انکار انی کے رُوپ میں

نئی جوجھ، نئے بائکین، نئی نئی شوخیوں اور ہنگامہ خیز شرارتوں کے ساتھ عنقریب جلوہ گر ہو رہی ہے۔

انکارانی

جو 28 سال سے آپ کے ذہنوں میں محفوظ ہے

جو 28 سال سے مصنف کے ذہن میں کلبداتی رہی

میں کا پیار ہے۔ اور اس کی خوشیاں اور شرم و خجالت کے
دائے بچاؤ آپ کو میرے حسن کی عمر گزاریوں میں تیز کر لیں گے

ہم نے اپنے آپ کو اپنے مسکن کی حرکات میں بھی تحریر کر لیا ہے

مکمل سیٹ دو جلدیں قیمت = 400 روپے

اسٹاکس: مکتبہ القزیش مرکز دہلی اسلام آباد 668958

پاک کی طرف دیکھ کر بغیر پوچھ لاپوچھ اپنی آواز بچھے خود بھی اجنبی سی
 غصہ ہوئی کمر دھڑکیٹھی بیٹھی اور کھڑکی پر تکی ہوئی سی۔
 چند لمحوں کے بعد سب لڑکے خاموشی سے بدستور بچھے
 نظر کرتے رہے جیسے انھوں نے یہی بات سنی ہی نہ ہو پھر
 بند والوں نے یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے خواب
 یہاں بہت بڑی فتنے عمار کی ہو جسے وہ ایک دوسرے کے
 نذر ہوں پر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہوں۔
 بالآخر ایک سانورے سے لڑکے نے کھنکھار کر گلا خف
 لیا اور بے حد جھمی آواز میں بولا یہ خرکا کر کمپ ہے؟
 "خرکا کر کمپ؟" میں تقریباً جمع اٹھا۔
 "اسے ہستہ بولو تو سانورے لڑکے نے خوفزدہ بھیجے میں کہا۔
 "ابہر دو دانے کے آس پاس پھر کدہ موجود ہوگا، وہ انچی اڑا دیں
 میں بات کرنے والوں پر بہت ناواضح ہوتا ہے؟
 مجھے اب خوف سے زیادہ تیرا ہی تھی۔ میں نے یہ تو سنا
 تھا کہ مردہ فروش اور اسی قبیل کے دوسرے صحبت لوگ سن
 لڑکوں کو اٹھا کر خرکا کر کمپوں میں پہنچا دیتے ہیں لیکن میں نے
 یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھ جیسے چھ فٹ کے جوان کو بھی اٹھا
 لڑکا کر کمپوں میں پہنچا یا جاسکتا ہے۔ گویا بات دراصل صرف
 مناسب موقع محل کی تھی مناسب موقع تیسرا کرنے پر اعتماد
 کرنے والے کسی کو بھی اعتماد کر سکتے تھے۔

مجھے خرکا کر کمپوں کے متعلق کوئی خاص معلومات حاصل نہیں
 تھیں کہ یہ کن کن علاقوں میں پائے جاتے ہیں، کیوں پائے جاتے ہیں؟
 اور یہاں نمونوں سے کیا کام لیا جاتا ہے؟ انھیں انڈیا کی کر کے
 کیوں لیا جاتا ہے؟ اور بعض خرکا کر کمپوں کی موجودگی کا علم ہو جانے
 کے بعد قانون نافذ کرنے والے بڑے بڑے گرو گنگشاں انڈیا
 تمام کمپوں نہیں کر پاتے؟ مجھے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ
 مجھے زندگی میں خرکا کر کمپ سے واسطہ بھی پڑ سکتا ہے اور وہ
 مجھ زندگی کے حین موثر ہو... جبکہ عیش و آرام کا ایک نیا سفر
 شروع ہو چکا تھا۔

لیکن یہاں کل بس ہم ہی لوگ ہیں، "میں نے اسے سنا
 ہزاروں طرف گردن کھما کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا
 "نہیں..." سانورے لڑکے نے اس مرتبہ تحقیر کے
 سے مجھے میرا جواب دیا تو یہاں ایسی چار کوٹھریاں ہیں کل گزریاں
 لڑکے ہیں؟

ابھی نہیں کہ اور پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دروان چڑ
 سے اٹھا اور بیٹھے دھانے لباسوں میں دو تہہ آؤر اڈی ڈراٹا
 سے انداز میں اندر آ گئے۔ ایک کے ہاتھوں میں بالٹی اور ایک

میں سی باسکٹ تھی دوسرے شخص کے ایک ہاتھ میں سب
 مشین گن اور دوسرے میں چمڑے کا چابک تھا۔ چابک کی
 چمڑی رستی خاصی موٹی تھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جس
 کے یہ چابک پڑتا ہوگا چمڑی آدھیر کر رکھ دیتا ہوگا۔

ان دونوں کو دیکھ کر سمجھنے ہوئے چہرے کچھ اور سہم گئے۔
 لڑکے ایک خاص انداز میں دیواروں سے ٹک کر اڑوں
 بیٹھ گئے۔ ان دونوں آدمیوں کے آتے ہی ان میں یوں جھگڑ
 سی مچ گئی تھی جیسے بیٹھل کے گلے میں دو پھڑپھڑے آن گئے
 ہوں صرف میں ہی تھا جو اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ دیواروں کے ساتھ ساتھ کسی دھات
 کی پلیٹیں اور کچھ غلیظ سے مک قطار میں رکھے ہوئے تھے ہر
 لڑکے نے ان میں سے ایک ایک پلیٹ اور ایک ایک
 ٹک اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ میں چونکہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں
 تھا شاید اسی لیے ہندوئی اور چابک بردار نے قریب آ کر مجھے
 ایک لٹ دیر کی مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ میں آؤں
 کی لوہی کی طرح لڑاکا کر نہایت آسانی سے دیوار سے جھانکا
 فرق صرف یہ تھا کہ میں سمجھنے کی سہی حالت میں جا کر گڑھا۔

چند لمحوں کی کوشش کے بعد میں سیدھا ہونے بیٹھ گیا۔ میں
 نے نفرت اور بے بسی آمیز غصے سے اس شخص کی طرف دیکھا
 جس نے مجھے لٹ دیر کی تھی۔ وہ اب پچھلے ٹک کر دو دانے
 پر اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ ایک وقت سب پر نظر رکھ سکے۔
 مجھے یوں دیکھتے تھے جیسے میں نے چابک کو ایک جھٹکا دیا اور پٹاک
 کی سی آواز پیدا ہوئی میں نے نظر جھکانا اس وقت بھر میرے
 دوسری لٹ یا چابک کھانے کی ہمت نہیں تھی۔

دوسرے شخص نے باسکٹ اور بالٹی کمرے کے وسط
 میں رکھ دی تھی۔ اب میں نے دیکھا کہ بالٹی میں میٹھے پانی سے
 مشابہ چائے تھی اور باسکٹ میں موٹے موٹے سمٹھے نان۔ میرے
 قریب سے کسی لڑکے نے ایک پلیٹ اور ایک ٹک میری
 طرف بھی کھسکا دیا تھا۔

راشیاں بردار شخص نے نہایت چھڑتی سے سب کے ٹک
 چائے سے بھر دیے اور سب کی پلیٹوں میں ایک ایک نان
 رکھ دیا اس کام سے فارغ ہوتے ہی دونوں باہر چلے گئے
 اور دروازہ کھٹکھٹا کر ان کی سی آواز کے ساتھ دوبارہ بند ہو گیا۔
 لڑکے نذر دیوں کی طرح نان کے نچے چائے کے ٹھونٹ
 کے ساتھ حلق سے اٹارنے لگے تھے۔ میرے پاس والے
 لڑکے نے مجھے ٹھوکا دیا جلدی ناشتہ ختم کر دو۔ کام پر جانے
 کا وقت ہو رہا ہے، اگر دیر لگاؤ گے تو چابک پڑیں گے؟

سب لڑکے قطار بنا کر کمرے سے نکلنے لگے۔ سرسراہٹ سے چھپ چھپ کر آکر اسی طرح قطع کے اور غفلت غمراہ کے چھپ چھپ کر آئے اور کمرے سے نکلنے لگے۔ سب کے پیروں میں اسی قسم کی بیڑیاں تھیں جن کی موجودگی میں بہت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر آہستہ آہستہ جلا جاتا تھا۔ یہ تیر چلنے یا دوڑنے کی کوئی شے میں انسان مرنے کے بل کر سکتا تھا۔

میں نے غیر محسوس سے انداز میں ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ کوئی پہاڑی علاقہ تھا، ہم غالباً کسی چھوٹی سی وادی کے وسط میں تھے جس کو نظریہ سے سمجھنے کے لئے اس سے متصل آبی اور کوٹھریاں نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف اطفال نما طویل و عریض رقبہ تھا جس کے گرد خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں مگر اس سے میں کوئی مویشی وغیرہ موجود نہیں تھا البتہ کافی دُور بہت سے گدھے ادھر ادھر پھرتے تھے اور چھدری چھدری بھاڑیلا پر مرنے والا رہتا تھا۔

کم تر لڑکوں نے جگہ پہلے اٹھائے ہوئے تھے اور جو لڑکے قدم سے زیادہ عمر کے اور نسبتاً مضبوط تھے ان کے کندھوں پر کلاں تھیں، کچھ پہلے اور کلاں زمین پر بنا کر اس شکل میں بڑی تھیں۔ ہم جہاں کھڑے تھے وہ ناہموار اور نرم پتھر والا زمین تھا۔ چاروں طرف خامی اونچی اونچی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے کچھ پہاڑیاں تو سرخی مائل مٹی ہی کے بلند بالا دھیر معدوم ہوئی تھیں اور کچھ پہاڑیاں پختہ تھیں۔ ان کے دامن سے غالباً پتھر تو اُجاٹا تھا تاہم ان کے رنگ کا لیکن کچھ سیاہی مائل پتھر تھا۔

ٹیلوں اور پہاڑیوں کے اس دائرے کے عقب میں کیا تھا یہ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ کم از کم وہاں سے نہیں جہاں ہم کھڑے تھے۔ چاہے اب اور سب مشین کن دلوں کے علاوہ یہاں اشخاص موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لہا سا ہتھیار تھا اور کندھے پر براہِ فضل لٹکی ہوئی تھی۔ کمرے کے گرد گولوں کی چوٹی بندھی تھی۔ دوسرا حال ہاتھ تھا لیکن رائفل اس کے کندھے پر بھی موجود تھی۔

قیدی لڑکوں کے علاوہ فی الوقت یہاں یہ چار اشخاص ہی نظر آ رہے تھے۔ چاروں ہی جو کئے اور نہ مہمضت نظر آتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ان سے جھگڑا شروع کرنا اور تمام قیدی لڑکے بھی دی و جان سے میرا ساتھ دیں تب بھی ان میں سے کسی کو بھی قتل کر کے سے پہلے پہلے ہمارے ہم چلتی ہو جائیں گے۔ وہ انہی یا ان کے حق نہیں تھے۔ قیدیوں

میں نے اس کے مشورے کی بدولت نہیں بلکہ مجھ کے غفلت سے شکست کھا کر ٹیٹ اور ٹک کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ سان اور چائے دونوں ہی چیزیں ٹھنڈی تھیں کافی حوصلے سے میں جن حالات کا عادی ہو چکا تھا ان میں اگر اس قسم کی چائے اور نان میرے سامنے رکھا جاتا تو میں نظر بھر کر ان کی طرف دیکھ بھی نہ پاتا لیکن اس وقت میں نے رغبت سے قہہ پینا شروع کر دیا۔

پہلے دو تین گھنٹے چائے اور ٹیٹ میں بھے وقت پیش آئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے منہ میں گویا روٹی سی بھری ہوئی تھی۔ زبان سوچی سوچی سی تھی لیکن ٹھنڈی چائے کے دو تین گھنٹے بھرے کے بعد منہ کے عضلات کچھ روال ہو گئے اور وہ خشک نان کسی لذیذ ڈش کی طرح تیزی سے معدے میں منتقل ہونے لگا۔

میں نے تقریباً دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہی یہ عظیم ناشتا ختم کر لیا۔ معلوم نہیں میرا معدہ کب سے خالی تھا۔ بیٹ میں ایک دم ہی ٹھنڈا نان اور ٹھنڈی چائے پینی تو طبیعت متلاسی لگی لیکن پھر خود بخود ہی سنبھلنے لگی اور چند گھنٹے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری قہامت بھی کم از کم کچھ سچا فیصلہ تو ختم ہو چکی تھی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا جہاں تو معلوم ہوا کہ کلائی پر گھڑی ہی نہیں ہے۔ غیر ارادی طور پر میں نے کوہٹ اور قیص کی جیبیں مٹوئیں۔ میں گھر سے خاصی رقم لے کر سیر فرسج کے لیے نکلا تھا مگر اب میری کسی جیب میں کچھ نہیں تھا اور فرسج بھی نہایت لاجواب تیرا چکی تھی۔

مجھے اٹھائے لوں ایک لمحے کسی عمل سے کسی انسان کی زندگیوں تہ دبلا بھی ہو سکتی ہے۔ یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اصل ہم اس قسم کے واقعات و حادثات کے بارے میں پڑھتے ہیں یا کسی سے ذکر سنتے ہیں تو بس وہ ہمارے لیے محض ایک قصہ ہوتا ہے۔ دوسروں کی سرگزشت ہمیں گمان تک نہیں ہوتا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ کوئی حادثہ ہمیں بھی پیش آ سکتا ہے۔

میں ابھی سوچوں ہی میں گم تھا کہ وہی دونوں آدمی ایک بار پھر ورنہ دار کمرے میں آئے۔ اب چاہک ان میں سے ایک نے اٹھا رکھا تھا اور سب نشین کن دوسرے نے چاہک دلوں نے چاہک چٹکاتے ہوئے کمرے سے اُٹھ کر خود بخود ہم سب حرام خور کا پچھڑا بھی تک آرام سے بچھا ہے... اٹھو... خانہ خراب۔

کو بے گانے رکھنے کا انھیں نہ جانے کتنا طویل تجربہ حاصل تھا۔
وہ درجہ ایسی حسدیت پر پورا نظر نہیں آ رہے تھے اور کچھ اس
انداز میں جہالت گرد لگتے پھر رہے تھے کہ کسی سر پھرے کو
الٹی پر چیلنے یا حملہ کرنے کا سوچ نہ مل سکے۔ حالانکہ یہاں
بلے کوئی سر پھرہ انظر ہی نہیں آ رہا تھا شاید ان قیدیوں کو
کافی تجربہ حاصل ہو چکا تھا اور انھوں نے نہ جانے کیسی کیسی
ستھیاں برداشت کی تھیں کہ ان کی بدلت ہوٹ چکی تھی اور
ان کی روح بہت شکست قبول کر چکی تھی۔

جایک والے نے ایک بار پھر جایک کو چھپکا یا۔ یہ
گیا ایک اشارہ تھا۔ لڑکے فوراً تین سیدھی قطاروں میں تقسیم
ہو گئے۔ میں بھی ایک قطار میں سب سے پیچھے کھڑا ہو گیا۔
مجھے بطور خاص کوئی حکم نہیں دیا جانے لگا تھا اور نہ ہی کوئی مجھے
نوازدہ کی طرح دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے ان
سب میں فصل لک چلنا ہو گا۔ سب درست حالات کا تقاضا ہی تھا۔
جایک والے نے ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے انگلی
بلا بلا کر قیدیوں کی گنتی کی تھی۔ ذرا گہری نظر سے دیکھا اور پھر
جایک کو چھپکا دیا۔ سب لڑکے کھڑے ہوئے اور ایک سمت میں
روانہ ہو گئے۔ اب میری جھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔
میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

چاہک والامیر سے قریب آیا اور جاہک کو جھٹکانے
 کر ڈی چوٹی ارد میں بولا تو تم دھرنا ہے... اگر سیدھا میں
 گاتو تم تھارے ساتھ نہی کرے گا... ابھی گئی اٹھاؤ اور
 بدھ دھرا کا لوگ پتھر توڑے گا دھر تھی پتھر توڑ سبھا
 میں نے سعادت مندی سے اثبات میں سر لایا۔ وہ
 اس وقت میری دسترس میں تھا لیکن کوئی خیال دل میں لانا نہ
 تھا سب میں کن والاکچھ دو کہ پٹاپٹیں جھپکے بغیر چکی
 انھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ کن کی نال کو کہ جلی ہوئی تھی
 لیکن اس کی نگاہ کی طرف نہ تھی۔

میں نے دل ہی دل میں واضح فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے مجھے کچھ وقت یہاں کے ماحول کا جائزہ لینے اور حالات کو سمجھنے میں گزار کر رہا ہوں گا اور اس کے بعد کسی موقع کا انتظار کرنا ہو گا۔ میں نے پہلے اُٹھایا اور لوگوں کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ عثمانی کرنے والوں میں سے ایک کو کھڑکیوں کے پیچھے کس ملا گیا ایک گڑھوں کو ٹھکانے کے رہائشیوں کی طرف لے جانے لگا۔ بابک والا اور سب مشین گن والا ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ اڑنے کے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ نے پہلے سے پتھر توڑنے شروع کر دیے تھے دوسرا گروہ ایک

ٹیلے کے دامن سے مٹی کھودنے لگا تھا۔ مجھے بھی ایک لڑکے
نے اشارے سے بلکہ بتادی جہاں سے میں پتھر کو دسکتا تھا۔
گینتی سے چند اٹھا مار کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی
آسان کام نہیں تھا۔ مجھے جن دو لڑکوں کی مدد سے دو مرتبہ کوشش
کیا گیا تھا، انھوں نے میرے اعصاب پر بہت ہی برا اثر ڈالا تھا
اور سے خرواک نہ ملنے کے سبب جان ویسے ہی بڑی دھمکی تھی۔
بہر حال رفتہ رفتہ میرے کام میں روانی آتی گئی جلد ہی
میرے ہاتھوں میں چھالے بڑھ گئے لیکن میں نے کام جاری رکھا۔
کچھ لڑکے پہاڑی سے لڑنے والے پتھروں کو دھو کر نشیب
میں لے جا رہے تھے جہاں کچھ لڑکے ہتھوڑوں سے انھیں
مزید چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح
جس طرح میں سچا داؤد بلیکینی میں ملازمت کے دوران سائٹ
پر مزدوروں کو پتھر کوڑنے دیکھتا تھا۔ مزدور... جن میں لالی بھی
شامل تھی۔ اس وقت لالی کی یاد سے بھی دل کے کسی گوشے
میں کسک نہ اُبھر رہی پریشانیوں، افکارات اور مصائب نے
گدگداتے والی یاریں بچھڑائے والوں کا درد اور محرومیوں کے
کسک، سب کچھ چھین لیا تھا۔

پھر وہ کہہ چلا "اے بھائی! ہوسنے پتھروں کو گدگدھوں پر
لٹکے ہوئے بوروں میں جبر ہے تجھے۔ جودھر معنی کی کھدائی ہو
رہی تھی اور بھی کچھ اسی طرح کے مصلوں میں کام جاری تھا
وہ جاہلان زمین پر کھڑی تھیں۔ پتھروں سے ان پر تھیں اچھال
کر مٹی چھانی جارہی تھی اور پھر گدگدھوں پر لٹکے ہوئے بوروں میں
کھڑی جارہی تھی۔

جس گدھے پر بھی لٹائی مکمل ہو جاتی تھی اسے رٹکے آگے لٹک جیتے تھے اور وہ نہایت سعادت مندی سے سہ جھانے ہوئے انداز میں ایک طرف کو چل دیتا تھا۔ یوں آگے بڑھتے گدھوں کی روانگی کا سلسلہ جاری تھا۔ میدان عبور کر کے یہ گدھے ایک پہاڑی کے گرد گھومتے نظر آتے تھے پھر اس کے عقب میں کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ ہر گدھ اس پندہ منٹ بعد خود ہی لوٹ آتا تھا۔ اس کا بوڑھا بھائی ہو چکا جوتا تھا۔ مایوں ایک تسلسل سے گدھوں کے جاتے اور واپس آنے کا عمل جاری تھا۔ کہہ دیجئے وہ ساٹھ ستر رہے جنوں کے معلوم نہیں وہ کہاں جا رہے تھے۔

میں نے قریب ہی کام کرتے ہوئے ایک لڑکے سے پوچھا کہ یہ لڑکے کسے آخر جاتے کہاں ہیں؟

لڑکے نے میری طرف دیکھ کر بغیر ایک لمحے کے نیلے رنگ کی روک کر پیشانی کے پسینے کو بھیٹا اور اس طرح بولا کہ اس

جوں گے لہذا میرے لیے یہی ظاہر کرنا بہتر تھا کہ مجھ میں کوئی خاص سرگشتی یا عزت نفس کا احساس ہے ہی نہیں۔ بلادِ بر آویت برداشت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں دوبارہ کام میں لگ گیا۔

دوپہر کو کھانے کا وقفہ ہوا، ہم سب کو ٹھہروں میں دایا آگئے۔ کچھ دیر بعد صبح ہی کے سے انداز میں کھانا آگیا۔ ذرا صرف یہ تھا کہ اس مرتبہ ہالٹی میں چلنے کی جگہ چلنے ہی جیسی پتلی والی تھی، لیکن جتنی شفقت میں کر کے آیا تھا اس کے بعد درندوں کی کھوہ سے مشابہ وہ کوٹھری مجھے گوشہٴ فردوس اور وہ دہشت کھانا من و سلویٰ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ سب سے لیے کھانے کی ایک ہی مقدار مقرر تھی خواہ کسی کی خوراک زیادہ تھی یا کم۔

صرف آدھے گھنٹے بعد ہمیں دوبارہ کام پر جانا پڑا۔ اس کے بعد شفقت اس وقت تک جاری رہی جب تک شام کا دھند لگا چیلنا شروع نہیں ہو گیا۔ دات کو لائین کی معمولی سی روشنی میں بیٹھ کر ہم نے دوپہر جیسا ہی کھانا کھا یا اور کسی بے زبان مخلوق کی طرح خاموشی سے کپلوں میں گھس گئے۔ کبھی کوئی لوٹا کر دھٹ لینے کی کوشش کرتا تھا تو اس کی گراہ نکل جاتی تھی یا پھر اس کی پیڑیاں چٹک اٹھتی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ لوگوں میں بیزاری شکستہ دلی اور مایوسی دوڑ کر رہا بہت ہی مشکل تھا۔ لینے قریب بیٹھ جوتے ایک طرف کے سے میں نے سرگوشی میں بات شروع کرنے کی کوشش کی، اگر ہم مل کر رات کو یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ وہ میری بات کاٹ کاٹ کر لولا، رات کو باہر نکلنے کی کوشش محبت کرنا۔ بہت مار پڑتی ہے۔“

میں نے کہا، میں نے دیکھا ہے باہر صرف ایک چوکیدار ہوتا ہے، اگر ہم کوئی حکمت عملی تیار کر لیں تو اس پر قابو پا کر یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“

طرے نے جواب نہ دیا اور کوٹ بدل کر میری طرف پیٹھ کر کے سویا۔ یہ بیزاری اور شکستہ دلی کی انتہا تھی۔

دوسرے روز میں نے کام کے دوران نیز محسوس طور پر آہستہ آہستہ بھاڑی برقعے بلندی تک جا کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی اس جگہ سے مجھے دو پہاڑیوں کے درمیان کچھ فاصلہ نظر آیا اور اسی راستے سے مجھے دوڑ کہیں سرسبز خوشیوں کے چھند دکھائی دیے۔ ان درختوں کے درمیان اور اس پاس مجھے ادھکے پتھے اور پتھے پتھے مکانوں کی جھلک دکھائی دی، شاید ادھر کوئی بستی تھی۔ شاید ان خراکوں

کے جوتے ہلٹے نظر نہ آئیں، یہ تو مجھے نہیں معلوم۔۔۔ مجھے یہاں آئے چار ماہ ہو چکے ہیں مگر آج تک مجھے پتا نہیں چلا کہ یہ کدھے کہاں جاتے ہیں اور میرا خیال ہے کسی بھی لوگ کو نہیں معلوم۔۔۔ وہ ہانپ رہے تھے لیکن فوراً ہی اُس نے دوبارہ کام شروع کر دیا۔

میں کوٹ بھی اتار چکا تھا اور قیص بھی۔ اس کے باوجود میرا جسم لینے میں تر تھا، میں نے جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ پتھر توڑنے کے کام میں طاقت تو درکار تھی ہی لیکن اس کی اپنی ایک ٹیکنیک بھی تھی جس سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ طاقت صرف کرنی پڑتی تھی۔

میدان میں جو قیدی لوگ کے کام کر رہے تھے، صحت ان میں سے کسی کی بھی قابلِ رشک نہیں تھی مگر محسوس ہوا کہ وہ کردہ سخت جان ہو چکے تھے اور انھیں کام کی ٹیکنیک بھی آچکی تھی بہت کم وقت میں ان میں بھی ٹیکنیک سے واقف ہونا جا رہا تھا۔ اپنی دانت میں ان کی جتنی لامرکان جانفشانی سے کام کر رہا تھا اس کے باوجود ایک بار چابک والا ٹھٹھا ٹھٹھا میرے قریب آیا اور حقارت سے بولا، اوئے... تم اتنا لمبا چوڑا جوان ہے اور ابھی تک تم نے دو چھٹا تک پتھر نہیں توڑا۔۔۔“

حالانکہ میں بھاڑی کے جسم سے جتنے پتھر اُڑا کر پڑا تھا ان کے انبار میں اس جیسے دو آدمی دفن ہو سکتے تھے مگر وہ سب پتھر نشیب میں منتقل ہو چکے تھے۔ میں نے اس شخص کو گھوڑا تو نہایت غیر متوقع طور پر اس نے ٹائیٹس سے چابک میرے بڑے پیرا میرے پہلو اور گھر پر گیا کسی نے کد چھری سے لیکر کھینچ دی۔ اگر میں فوراً سختی سے دانت نہ بھیج لیتا تو شاید بڑی طرح بلبلا اٹھتا۔

اُس نے دوبارہ چابک جھٹکے ہوئے پتھر آمیز انداز میں کہا، تو گھوڑا کیا ہے؟ نظر جھکا کر بات کر دینا نہ خراب؟“

میں نے رگ دپے میں اٹھتی ہوئی اشتعال اور نفرت کی نہ کو بہ مشکل دبا دیا اور کن انھیوں سے ادھر ادھر دیکھنا نشیب میں دوسرا خراک سب مشینوں کی سنبھالے ایک پتھر چوڑا کنا بیٹھا تھا۔ سب مشینوں کو کہ اس نے بظاہر سے پروانی سے گود میں رکھی ہوئی تھی لیکن انکی بدستور دیگر ہر بھی اور کن کا گونج بھی ہماری ہی طرف تھا۔

میں نے نظر جھکا لی اس کے سوا چارہ ہی کیا نہیں سمجھ لیا تھا کہ ابتداء میں اس طرح بات بے بات سرزد نہ کر کے دراصل وہ اپنے قیدی کی سرگشتی اور خودداری کا خاتمہ کرتے

سو چتا رہتا کہ میری اچانک گشتی کی پرزور نہ اور اشرف خان کا تو عمل کیا ہوا ہوگا؟ کیا نہ میرے لیے متفکر رہے ہیں ہوگا؟ کیا اشرف خان بھی میری گشتی سے پریشان ہوگا؟ یا خدا کا کمر ادا کرنا ہوگا؟ اب تو ہم ذاتی کا دیوار شروع کرنے والے تھے۔ ترکی کے کھسکے کھسکے منصوبے بنائے تھے ہم نے... پھر کس سوچا کہ کیا اب مجھے کسی یہاں سے ملے گی نہیں افسوس ہو گی؟ کیا میں یونہی مشقت کرتے کرتے ہر جاؤں گا؟ اس سوال سے آگے مجھے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا اور میں دایو سی کے مندر میں ہاتھ پاؤں مارے مارے سو جاتا۔

خرکار کھپ میں مجھے دسواں دن تھا اس وقت وہاں اصباح میری آنکھ کھل گئی کوٹھری کے ایک گوشے سے دہلی دہلی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔

کوٹھری میں ایک ہی چوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں جی ہوتی تھیں اس کے پٹ ہم کھڑے رہتے تھے گو کہ اس وجہ سے ہمیں رات کو سردی محسوس ہوتی تھی لیکن اگر ہم اسے نہ کوٹھری میں اچھل جیسی اچھوس ہونے لگتی تھی۔

اس کھڑکی کے راستے صبح صادق کا دھندلا دھندلا آجالا کوٹھری میں قدم رکھ چکا تھا اس کے علاوہ لائین بھی روشن تھی حالانکہ رات کو حسب معمول ایک لڑکے کے اسے بچا دیا تھا میں نے دیکھا کہ اسے میں ایک لڑکا کھٹول میں سر پہ بٹھا تھا، وہی دور تھا۔ وہ اپنی آواز کو دبائے کی حتی الامکان کو شش کر رہا تھا سو بچکیاں بھٹکیں تھیں نہیں رہی تھیں۔

اُس کا چہرہ گو کہ کھٹولوں اور بازوؤں کے حلقے میں چھپا ہوا تھا لیکن اس نے اس پر نظر ڈالتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ یہاں اجنبی تھا... تو وارد تھا... اس جہنم میں آن پہنچنے والا نیا معقوب... نیا قیدی۔

مجھے یقین تھا کہ جی لوگوں نے کھیلوں سے ہر نکلے ہوئے تھے وہ بھی آنکھیں فلز آس کی کھسکے تو وارد لڑکے کی طرف دیکھ رہے ہوں گے لیکن وہ ظاہر میری کر رہے تھے جیسے سو رہے ہوں۔

میں دیکھتا ہوا اُس لڑکے کے قریب پہنچا لیکن میں نے اُسے مخاطب نہیں کیا رہا مجھے اندھیرا تھا کہ میں نے کچھ کہا تو وہ توصل پاکر خاموش ہونے کے بجائے اور زیادہ زور زور سے دونا شروع کر دیں اس سے رات میں نہ جانے کس وقت کوٹھری میں دھکیل دیا گیا تھا۔

کا قلعہ ہی بستی سے ہے یہیں اس طرف ایک مرتبہ بھی نظر نہ کر نہیں دیکھ سکا چاہے والا نگور کی طرح اچھلتا ہوا میرے جیسے آہستہ آہستہ اس نے بلا تاہل میری کمر چاہے رسید کیا۔ ایک بار چھوٹے چھوٹے انگارے سے آگے آگے میرے آگے جا بک کر کل والی منظر بھی کی تکلیف کم نہیں ہوتی تھی کہ ایک اور پرانی تھی اگر کس کسی طرح اپنی کمر نظر ڈال سکتا تو یقیناً اس وقت مجھے اس پر کراس کا نشان نظر آتا۔

سردام خود...؟ وہ بد شکل اور کچھ صفت شخص نظر آیا۔ آنا اور کس لیے پڑھا ہے...؟ اور یہ اور اور دھڑک رہا تھا ہے...؟ بھانسنے کا خیال دل سے نکال بد وال خور اور میرے آج کس کوئی نہیں بچا گا... اور کس کام ختم ہوگا تو ہم کم کو دیکھ جگہ بچے گا... باقی سب خیال کھوٹے سے نکال دو...؟ اس نے بات کا اختتام میں چار موٹی موٹی گایلوں سے کیا لگو میں خوں کے گھونٹوں کی بجائے بھگتے ہوئے بولا اور دست بھگتے ہوئے

خرکار چاہے بھگتے ہوئے بولا اور دست بھگتے ہوئے لوگوں پر نظر نہیں رکھ سکتا... ہماری ہزار آنکھیں میں بڑا کھٹول اسی لیے میں بڑی طرح اچھل پڑا ٹوٹ... ٹوٹ ٹوٹ کی خوفناک سی آواز کے ساتھ میرے پیروں کے قریب ہی چلنے لگی اڑی تھیں اور سنگناخ چٹانوں کا ایک بھرا ہوا سا کونا آؤ گیا تھا سنگناخ میرے جسم سے بھی ٹوٹتے تھے۔ سبب اس میں کہ میں نے ہلکا سا برٹ ہانا تھا میرے اچھلنے کے انداز پر دونوں خرکاروں نے خوفناک انداز میں قہقہہ لگایا۔ میں جتنا خوفزدہ ہوا تھا میں نے اپنے آپ کو اس سے کس زیادہ خوفزدہ ظاہر کیا چاہے والا وہاں ہی بچے چلا گیا۔

وہ دن بھی گزشتہ دن کی طرح گزر گیا اس کے بعد مزید تین دن اسی انداز میں گزر گئے حالات میں کوئی تبدیلی آئی نہ میری معلومات میں کوئی اضافہ ہوا۔ مجھے ان چند دنوں میں ہی لوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہمیشہ سے میری زندگی کا یہی معمول چلا آ رہا ہے۔

وہ اشرف خان کے گھر میں عیش و آرام میں گوارا ہوا وقت وہ اس کے ساتھ مال لانے لے جانے کی ہمتا پر جانا اور پھر وہ زبردستی نواز شات... سب کچھ جیسے خواب ہو کر رہ گیا تھا۔

دن بھر کی مشقت سے ٹوٹا جسم لے رات کو جب میں خشک گھاس پھوس پور بوسیدہ وغیرہ کھل پر شتمل بستر میں سکرامٹ کر لیتا تو آنکھوں میں بادلوں کی کہ جہاں جھپٹے لگتے ہرل جھٹوں کی چھت پر نظر جملے میں رات گئے تک لپٹا ہی

راشد تھا۔

راشد نے کوہمت مند تھا لیکن ظاہر ہے اس نے زندگی میں کبھی اس قسم کی شفقت نہیں کی تھی۔ چند روزہ جتنی چھڑا کر وہ روٹا ہوا ہو گیا اور ایک طرف بیٹھ گیا چابک ولا منکرہ شکل نکلا اس کے پاس آیا غلط محو اس نے راشد پر چابک نہیں برسایا بعد تو یہ ہے کہ وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

دیہ کام نہیں ہوتا تو عمل معنی ڈھونڈنے کا کام کرنا شروع کرنے راشد کو حکم دیا وہاں سے جڑا کر دوسری طرف سے گیا۔

اب اس نے راشد کو جس کام پر لنگھا وہ یہاں کا آسان ترین کام تھا مگر راشد کے لیے یقیناً وہ بھی آسان نہیں تھا نام وہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کبھی کبھی کن انکھیں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا اتنی دور سے بھی کسی نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی ناخوشی کا نئے ہی تھیں۔

چابک والا منکرہ شکل کر رہا رہا تو سبھی کسوں کی طرف سے غش بڑا کر رہا تھا چابک والا منکرہ و شہر معیوب حرکت کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا چابک والا منکرہ وہاں کو لایا تھا بدواخت کی بھی ایک حد ہوئی ہے بالآخر راشد نے غلی اٹھانے والے سے ڈوڑی اس کے منہ پر نہ ماری اور بے بسی سے دوڑتے روئے اسے گایاں بنے نکلا۔

بد شکل خرا کر کو تو جیسے ہمارا دل گیا اس نے خود بخود انداز میں جھڑپ چھڑکایا اور دوسرے ہی لمحے راشد پر برساں شروع کر دیا راشد غریبی عداوت انداز میں جھڑپ چھڑک کر اس کے پاٹ چہرے سے بے لول پائے اپنے کام میں مصروف تھے جیسے کسی نے ان کے کانوں میں سیسہ بھریا ہو۔

راشد کی پتھریل سے میرا دل دھلنے لگا میری رگوں میں ہو گوا جھنے لگا تھا لیکن پتھریل میں دھچک سی ہورہی تھی۔

میرے بازو کو پتھریل سے ہٹا کر چپکے تھے۔ اب میں نے ہاتھ دوک لیا اور پہلائی سے نیچے آنے لگا یہ لڑیوں کی وجہ سے میں بہت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے پر مجبور تھا خصوصاً ڈھلان پر۔

نشیب میں بیٹھا ہوا ایم شمیم دوسرا فرکار سب مشین گئی سنبھلے مستزاد سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس کی توجہ دینے بھی کافی دیر سے صرف میری ہی طرف تھی گوا نے بھی طرح اندازہ تھا کہ تھوڑا بہت راجہ عمل صرف میری طرف سے ہی ظاہر ہو سکتا ہے۔

جب اس نے دیکھا کہ میں ایک نہیں رہا ہوں تو اس نے سب مشینیں گن مبدی کر لی میں تب بھی زڑا کر اس نے

کچھ دیر بعد جب اس کی چکی تھکنے لگی اور اس نے محسوس کر لیا کہ اس کے دل کا غبار نکل چکا ہے تو میں نے حوصلہ دینے والے انداز میں اس کا بازو چھتا ہوا تب اس نے سر اٹھا کر خوفزدہ سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ مجھے جانے کیوں حیرت کا سا جھٹکا لگ رہا کہ اسے حد خود بصورت تھا۔ صاف ستھری جلد موٹی موٹی آنکھیں آنکھوں سے بال، تیکھے نقوش اور نازک نازک نظر آنے والے ہاتھ پاؤں اس کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے جسم پر اس وقت صرف کرتا چلا تھا یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی بہت اچھے گھرانے کا فرد تھا۔

وہ دیوار سے ٹپک ٹپک کے اکڑوں بیٹھا تھا درد و کر اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ مجھے قریب پار وہ خوفزدہ سے انداز میں قدر سے پرے کو کھسک گیا۔ اس کے پیر دل میں بھی بیڑیاں بہنا ہی چاہتی تھیں۔ "ٹورو نہیں" میں نے سرگوشی کی یہ کلام مجھے سے تھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا انھیں کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟ سرگوشی میں ہی جواب دیتا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ایک ایک کر سرگوشی میں بولا "لاہور سے... لیکن میں رہنے والا کراچی کا ہوں..." پتھریاں اگڑا کر اس نے چپا کے اٹل لاہور آیا ہوا تھا۔

"اٹلی یکے ہو گئے؟" میں نے پوچھا۔ "میں گھر والے کے منع کرنے کے باوجود اکیلا سیر پائے کو نکل کھڑا ہوا تھا..." وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا "میں کسی میں شالا مارنا چاہتا تھا..." وہاں سے چالپنی پر چوکی کسی کی اس کا ڈنڈا ٹور بھیجے نہ جانے کن کن راستوں سے کہاں لے گیا۔ مجھے شہر سے باہر کے راستوں کی زیادہ پہچان نہیں تھی... جب مجھے گواڑ کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی... میں نے ڈنڈا ٹور پر جتنی مشورہ کیا تو اس نے ایک ویران سڑک پر گاڑی رولی اور سڑک میری ناک پر کھون جیسی ایک شیشی سے نہ جانے کس دوا کی چھوڑ کر دی... بیٹے اسپرے کرتے ہیں... میں نے بے ہوش ہو گیا۔ کچھ کھلی تو میں یہاں تھا۔ میں کئی گھنٹے سے یہی سوچ رہا ہوں۔ "گھر اومت، سب ٹپک ہو جائے گا" میں نے اسے تسلی دی نہیں جو اپنے لیے کچھ کرنے پر قادر نہیں تھا اسے تسلیاں سے نہ تھا۔

میری تسلیاں محض لطف تسلیاں ہی رہیں مدد نہ پڑھا تو بالکل اسی طرح جیسے میں قد بول کے گچے میں شامل ہوا تھا اس نوداد ہر کے کو بھی شفقت کے پسند چکیل دیا گیا۔ اس کا نام

راشد کو مار پڑی بند ہو چکی تھی، وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے
دور اٹھا۔

جاہک واسے خراکار کی نظر اس وقت تک مجھ پر پڑ
چکی تھی، اس لیے وہ راشد کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے اُٹھنے
اُگیا۔ اس وقت تک میں اٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
اُس نے سب مشین گن وٹنے سے اپنی زبان میں کچھ
کہا، پھر میرے قریب آکر طیش میں آتے ہوئے ناشورخ کر دیا، ناشور
شاخیں آواز ادا کر کے ساتھ بڑا توڑ پھوٹا، جاہک میرے ہتھوڑے پر سے
اور میں ایک بار پھر اٹھ کر گر گیا۔

اُس نے جاہک جھٹکنے ہوئے مجھے اُٹھنے کا حکم دیا، جوں
توں میں اُٹھ چکا تو وہ غصہ ناک انداز میں بی جاہک ہراتے
ہوئے چلا آیا، چلو... چل کر کام کرو۔

میں لڑناں و ترساں ایک بار پھر جاہک چھوڑ کر اُٹھنے لگا، کچھ
دیر بعد راشد کو بھی دوبارہ کام پر وکیل دیا، حالانکہ اُس کے
حالت خیر تھی، کانپتے ہاتھ پر ولے سے وہ جس قدر بھی ممکن ہو
سکا کام بقتار نامہ جاہک والا اب اس پر تشدد کر کے اسے
کام کرنے پر مجبور نہیں کر رہا تھا۔

راشد اب کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، کسی سے آنکھ
نہیں ملا رہا تھا، غذا ادا کر کے شام کو کام ختم ہوا اور ہم چراں
نصیب اپنی کوٹھڑیوں کی طرف جانے لگے، تو میں نے راستے میں
راشد سے بات کر کے اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی، لیکن

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ پھر کر چل دیا۔
اُس رات اُسے ہماری کوٹھڑی میں نہیں آنے دیا گیا۔
جاہک والا بد شکل خراکار نے اپنے ساتھ ہی لے گیا، اُس رات
میں سو نہیں سکا، معلوم نہیں میری یہ بے خوابی میرے جسم
میں اُٹھتی ہوئی لمبوں کی وجہ سے تھی یا راشد کی ان کرناک
گفتی گفٹی چٹخوں کی وجہ سے جو رات کے ایک حصے میں چند
منٹ کے لیے سنا کی دی تھیں۔

اس وقت میں سنی الامکان احتیاط سے دنگا ہوا دوانے
تک پہنچا تھا اور میں نے ایک جھری سے جھانک کر دیکھا تھا،
کوٹھڑیوں کے سامنے دھندلی چاندنی میں حسب معمول تیسرا
خراکار اٹھنے کے لیے اُٹھ رہا تھا، عموماً صرف رات کو ہی

نظر آتا تھا۔
یونہی تین دن گزر گئے، ان تین دنوں میں میری پسلیوں
کا زخم کچھ بھر گیا اور پٹوں کی تکلیف بھی کم ہو گئی، لیکن راشد
ان تین دنوں میں برسوں کا مریض نظر آنے لگا، اتنا زحمت
نہوڑ رہی تھی، آنکھوں کے گرد سیاہی، نو داڑھی، کٹی ہوئی
ہونٹوں پر پٹری جی رہتی تھی، اس سے شفقت چھڑائی گئی

ایک بار پھر میری آمد کے پہلے روز دسے انداز میں میرے
پیروں کے قریب ہکا سابر سٹ مارا مجھے مرنے کا پڑا، لیکن اسی
لے میں نے اپنی گتتی اس پر کھینچ لی۔

ظاہر ہے گتتی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اتنے فاصلے
پر کسی کا نشانہ لیا جاسکتا اور پھر وہ کوئی ایسا غافل بھی نہیں
تھا، ذرا سی جھکائی سے کر صاف کچھ گیا پھر وہ نیچے ٹپے قدم
اُٹھا، میری طرف بڑھا، راشد کی بغیر اب بھی سنانی سے
رہی تھیں، لیکن میرے سوا جیسے کوئی بھی انھیں نہیں سن رہا تھا۔
خراکار مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر گیا، کس نے ہمیشہ
بے محسوس کیا تھا، کہ وہ کسی کے بھی زیادہ قریب نہیں جاتا تھا۔
میں اکثر بیشتر اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا تھا، اس
کے قبضے میں رہنے والی سب مشین گن ہی میری امیدوں کا
مرکز تھی، لیکن اسے حاصل کرنے کا کوئی امکان مجھے نظر نہیں
آتا تھا، کس آج تک کوئی بھی ایسا طریقہ نہیں سوچ سکا تھا
جس سے یہ گن میرے ہتھ لگ سکتی یا بولے کہ ہر طریقے
میں جان جائے کہ امکان موجود تھا اور اسی خوف نے مجھے
کسی بھی طریقے پر عمل درآمد سے باز رکھا تھا، بہر حال ان کی طرح
مجھے بھی جان پاری تھی، لیکن اس وقت میں نے اندھا دھند
خراکار پر چھپنے کی کوشش کی۔

وہ صرف ذرا سا مجھے ہٹا اور میری رسانی سے نکل گیا
اور جب میں اپنی جھونک میں اٹھ رہا، تو اُس نے ایک قدم
بڑھا کر میری پسلیوں میں گن کی نال ماری۔ درد کی شدید لہر سے
میں کراہ اُٹھا۔ بیٹریوں کی وجہ سے میں اپنے آپ کو گرنے
سے نہ بچا سکا، میری پسلیوں پر سے کھال پھٹ گئی تھی اور
توں میری سنی قبضے کو جھگو نے لگا تھا۔

ابھی میں سنبھل نہیں پایا تھا کہ اُس نے میری پسلیوں میں
دور ہی طرف ٹھکر کر سیدھی میں نے اُس کا پاؤں گرفت میں
لینے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا، اُس کے پیروں
میں کمرانہ چار اچھ سوئے تھے، کی پشادوری چیلیں تھیں اور اس
کی ٹھکر سے مجھے ہی محسوس ہوا تھا جیسے میری کوئی پسلی ٹوٹ
گئی ہے۔

اُس نے ایک نہیں اپنی ٹھکر کی دیکھیں جن میں سے
ایک میرے ہتھ پر بھی پڑی جس سے چند لمحے کے لیے
میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، یہ اندھیرا چھٹا تو
تو میں نے اپنے آپ کو اوندھے منہ زمین پر پڑا یا پھر خراکار
والے اپنے غصوں سے مسطح پتھر پر جا بیٹھا تھا اور پہلے ہی کی طرح
تسخرانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

ہے۔ گینتی میں نے چھوڑ دی زمین پر میں بہت گرا اور وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔ بلکوں کے درمیان خفیت سی جبری سے میں دیکھ رہا تھا کہ میری پر خارش کا میاب رہی تھی۔ ہنگام میں معصوم تمام بچوں کے مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے انجنا بگ نہیں چھوڑی تھی۔

سب مشین گن والا خرملاہنی جگہ سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈاگ بھڑا میرے قریب آگیا۔ میرے اتنے قریب وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آتا تھا۔ غالباً مجھے بلانے جلانے کے ارادے سے اس نے گن ایک لاکھ میں پکڑی اور دوسرا لاکھ میرے چہرے کی طرف بڑھاتے ہوئے تھا۔

میں نے اس سے بہتر حرکت کی اس میں دقت نہ رہی نہیں کیا اور اپنے دل میں ہلکی ہوئی تمام تر نفرت کو گواہی دینی میں سمجھ کر پہلی کی سی تیزی سے اس کی ناک پر گھونسا رسید کیا۔ میری نفرت کی شدت اور میری خواہش انتقام نے شاید مجھے کئی گنا طاقت و درندہ پن عطا کیا۔ میں نے ہڈیاں ٹوٹنے کی دانت آواز مسمیٰ سمجھے یقین تھا کہ کم از کم اس کی ناک کی کوئی ہڈی سلامت نہیں رہ گئی ہوگی۔

وہ بڑی طرح ڈر کر ایسا اس نے ایک ہی لمحوہ میں میری حرکت سے جوئے ناز کر کے کی کوشش کی لیکن میں اس وقت تک اٹھ چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ان کو پکڑا اور اس کے چہرے پر ٹھکر رسید کی۔

گن اس کے ہاتھ سے چھوڑ گئی اور میرے ہاتھوں میں اٹھئی۔ وہ چپٹا گریڑا تھا اور اس کا آدھے سے نہ بارہ چہرہ خون میں لہو چکا تھا۔ ناک کی جگہ غصہ ایک اور غصہ اس نظر آ رہا تھا۔ میں نے گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے تیرے بڑے بڑے بڑے ہلکا سا ہی دھاڑا لاکھا کہ خرملاہنی ہم کو چھٹی ہو کر رہ گیا۔ وہ دریاں سے تقریباً دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

میں مڑا اور جتنی تیزی سے چل سکتا تھا کھڑکی کی طرف چلا آئے۔ شاید کبھی ان کا دل میں جینسوں کو دوڑنے کے کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہو جن کے مالک ان کی انگلیوں میں رشی باندھ دیتے ہیں۔ میرا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے ابھی چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کھڑکیوں کے عقب سے وہ خرملاہنی دوڑتا ہوا سامنے آیا جرات کو پہرہ دیا کہ تاحقہ اس کے ہاتھ میں داخل تھی۔ اس نے اندازاً چند فاصلہ کیا۔ شکر ہے کوئی کسی کو نہیں لگی اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ سکتا۔ اس نے اسے بھی چھٹی کر دیا۔ چابک والے بد بخت اور بد شکل خرملاہنی کی تلاش میں میں

تھی اس کی تھی الامکان ناز برداری کی جانے لگی تھی مگر اس کی حالت مشقت کر کے والوں سے بدتر تھی۔

اب وہ کم نظر آتا تھا اور اس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی لیکن اس کی صورت ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے سوالیہ نشان عطا رہتی تھی۔ نفرت کا نہر میری رگ دپے سے قطرہ قطرہ کسی ایک نقطے پر سمٹ رہا تھا لیکن اس کے اخراج کا کوئی راستہ نہ تھا۔

راشد کی آمد کے غالباً ساتویں یا آٹھویں دن ایک بار پھر اس سے نرم سلوک بند کر دیا گیا اور اس کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ میں نے گن آنکھوں سے دیکھا۔ چابک والا پھر اس پر چابک برسا رہا تھا۔

یعنی جلانا میرے لیے دشوار ہو گیا۔ گینتی کی ہر ضرب گویا میری اپنی ہی کھوپڑی پر پڑ رہی تھی۔ نفرت کا وہ نہر جو قطرہ قطرہ کہیں صبح ہو رہا تھا۔ آتش سیلاب بن گیا تھا اور میرا سینہ گویا چھٹ پڑنے کو تھا۔

میرے اندر کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ بے غیرت! ایک معصوم کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے اور تو محض اس لیے خاموش تماشائی بنا ہو کر ہے کہ تجھے جان سے لے لیتے۔ وہ تو نے بڑھا میں۔ یاد رکھ کہ تجھ جیسے بزدل شخص جان اتنی ہی باری ہوتی ہے ان کا مستعد بیڑیاں اور غصہ کہ ہی ہوتی ہیں۔ آج تو کسی مظلوم کی پکار پر ہلک نہیں کہہ رہا اس کی سزا یہی ہوگی کہ تیری زندگی اس طرح بیڑیاں پہنے مشقت کرتے اور درندہ صفت انسانوں کے ٹھکانے کھاتے گزر جائے گی۔ خون تھوکتا ہوا میرے گاتوں ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ یہ اندھیرا چھلنے ہی تجھے فیصلے کی روشنی مل گئی ایک طریقہ میں نے کئی دن پہلے سوچا تھا لیکن قسمت آزادی کا فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ آج جب یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی کوئی ایسی بھی چیز نہیں کہ اسے اس قدر بے غیرتی سے بسر کیا جائے تو بات سب کچھ بھی زیادہ مشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ چابک والا اس وقت کھڑکی میں جا چکا تھا۔

میرا ایک پاؤں ایسے پتھر پر لگا ہوا تھا جو اپنی جگہ سے اٹھ کر اٹھا تھا۔ میں نے اس پر خوب طاقت صرف کی۔ بالآخر وہ میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا اور لوٹ کر اٹھا۔ نیچے جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی پہاڑی سے رول کر گیا۔ میں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہ فریاد دیتی میری کوشش ہی تھی کہ مجھے زیادہ بوجھ بھی نہ آئے۔ پائیں اور ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھی برقرار

پھروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے چاہوں گا کچھ ان کے سامنے پھینکا اور چلا کر کہا اس میں غبروں کے حساب سے ہر ایک کی بیڑیوں کی چابی موجود ہے۔۔۔ جو بھی غبار ہونا چاہتا ہے وہ قسمت آزمائی کر دیکھے۔

مجھے یہ دیکھ کر بالواسی ہوئی کہ وہ سب مذہب کے عالم ہیں کھڑے تھے اور خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری چھٹی جس تھے کسی خطرے کا احساس دلانے تھی کوئی ایسا خطہ جو چاروں طرف سے غبریتوں کی طرح نہ کھوے لیکن نہایت ہی خاموشی سے بڑھ چلا آتا تھا۔ چاروں طرف کچھ تباہی، یہ کوئی طاری تھا۔ ایسا سکوت جس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور مجھے دم سا ہوا کہ دو کس کس سے گھوڑے کی ٹاپوں کی سی آواز ابھری تھی لیکن فوراً ہی معدوم ہو گئی تھی۔

میرے خیال میں میرے پاس آنا وقت نہیں تھا کہ میں لوگوں سے مزید باتیں کرنے میں ضائع کر تا یا ان کے وقت بڑھانے کی کوشش کرتا۔ راشد البتہ جھانکنے کے لیے تیار بلکہ مجھ میں تھا۔ میرے لیے ہی کافی تھا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا اور ہم ایک سمت میں دوڑ پڑے۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ جدھر کا میں نے رخ کیا ہے اور چاروں طرف کے عقب میں کیا ہے لیکن اس گنگا کی لائن میں نہ کہ میری حیات گویا کچھ تیز ہو گئی تھیں میں کسی نہ کسی حد تک یہ اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ کس طرف خطرے کے لہر کا تپ زیادہ ہیں اور کس طرف کم۔

ایک چھوٹے سے ٹیلے کے گرد گھوم کر جب ہم اس پہاڑ نعلی لڑی سے نکلے تب بھی سامنے ہمیں کوئی راستہ، کسی آبادی کے آثار یا کوئی اوصاف اندراج نظر نہ آئی۔ بس سنگلاخ پہاڑیاں ہی تھیں اور ان کے درمیان بن کھائی اور بچی گڑگا ہیں۔ تاہم میں تن بہ تعلقہ ہو کر راشد کا ہاتھ تھامے دوڑتا رہا۔

راشد بہت جلد ہی تھک گیا۔ بڑی طرح پہننے لگا تاہم وہ گڑگاڑی کسی نہ کسی طرح میرے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اسے بہت ہی دشوار گزار تھے کہیں کہیں تو اچانک ہی ہم کسی کھائی کے کنارے پہنچ جاتے جہاں دو چائیں دیواروں کی طرح آٹھنے سامنے نمودار ہو جاتی تھیں اور درمیان میں کئی ٹپ جڑا اور نہ جانے کتنا گہرا حلاء سا ہوتا تھا۔ ان کھائیوں کو پھلانگتے میں راشد کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ وہ آٹنا چھڑا نہیں تھا کہ میں آسانی سے اسے اٹھا کر کھائیاں پھلانگ سکتا۔ اندازے کے

لوٹری میں لکسا تو وہ کھوہ میں پچھے ہوئے درندے کی طرح پھر چپٹا کوٹھڑی میں ایک طرف دیوار پر ایک راغلل بھی ٹکی ہوئی تھی لیکن شاید اس غیبت کو اس تک پہنچنے کی فرصت ہی قسمر نہیں آئی تھی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے گن کا رخ اس کی طرف کر کے ٹرائیگر دیا اور دوسرے ہی لمحے وہ میرے قریب ہی آن لگا۔

اس کے جسم سے خون جھل جھل بہ رہا تھا اور مجھے اس سے گھن آ رہی تھی۔ وہ مجھے انسان کے بجائے کوئی غفریت لگ رہا تھا جس کے بوجھ سے زمین کو خجائٹ مل گئی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا تو دیکھا کہ راشد کو ٹھٹھری کے دہانے پر کھڑا تھوڑا سا کتبہ لٹا تھا۔ اس کے پیروں میں اس وقت بھی بیڑیوں موجود تھیں۔ ہم سب قیدیوں کی بیڑیاں تھیں دار تھیں اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہر ایک کی چابی علیحدہ ہے۔ اچھا بیڑی کا کچھ اچھا ایک لٹکی صوری کی جیب میں ہوتا ہے۔ ایک دانے کی صوری خون میں تیر رہی تھی تاہم میں نے اس کی جیبوں میں ہاتھ مار کر دیکھا ایک جیب میں واقعی چابوں کا کچھ موجود تھا۔ میں نے کچھ نکال کر چابیاں پہنے راشد کی بیڑیوں پر آزمائی شروع کی۔ یہ وقت ضائع کرنے والا مرحلہ تھا اور مجھے پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ یہاں صرف یہی تین خیر موجود رہے ہوں گے جو زمانہ یہاں نظر آتے تھے اور جو میرے فاعل سرچکے تھے۔ اس پاس قیدیان کے اور ٹھکانے اور سلسلے موجود تھے۔ اس کے علاوہ میں نے کافی دیر ایک سرسبز کھاڑی کے کنارے میں ایک بستی کی جھلک بھی دیکھی تھی۔ لیکن بستی نامی گنگا کی آواز دلائل تک بھی پہنچی ہو رہا ان لوگوں کا لیے ہی کوئی نظام موجود ہو جس کے تحت کسی کو بڑی حد تک امن لگائے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ دیگرہ خیرا بہر حال تھے۔

دفعاً میں نے دیکھا کہ میری چابی پر ایک نمبر کھرا ہوا تھا اور بیڑیوں پر بھی نمبر موجود تھے۔ میں نے گھبراہٹ میں یہ نمبر دیکھے ہی نہیں تھے اب مجھے ہر چاہی کو آزمائے کی ضرورت نہیں تھی۔ راستہ کی بیڑی پر یہاں بس نمبر نہ تھا۔ میں نے بائیں نمبر کی چابی دیکھ کر اس کے تالے میں گھسائی اور بیڑی فوراً کھلی۔ اسی طرح میں انہی بیڑیاں بھی کھول چکا تو میں نے راشد کا ہاتھ پکڑا اور باہر کو دوڑا۔ اب راشد کی حالت کچھ سنبھل چکی تھی۔ غبار کی آلودگی نے اسے تعویت بخش دی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر کو پکڑا۔

باہر تمام لوگوں کے کام چھوڑ چھاڑ کر کھڑے تھے۔ ان کے

معدی سی غلطی سے پاؤں پسل سکتا تھا اور دونوں ہی موت کے منہ میں جا سکتے تھے۔ اکیلا چھلانگ لگاتے ہوئے وہ کا پھنکے لگتا تھا۔

اسی اثنا برائیں نے عقب میں کہیں سے فائروں کی بازگشت سنی اور پری دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔ حملہ کی رفتار جو کچھ بھی پڑ چکی تھی اس کو تیز تر کرنا پڑا۔ اشد اب میرے ساتھ لکڑی یا گھسٹہ پر اتھکا اس کی حالت غیر تھی ماسی کی بدولت میں نے موت کے منہ میں چھلانگ لگائی تھی لیکن اب میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ فرار کے ٹھن میں مر چکی تھی یا ثابت قدم رہی رہ سکتا تھا یا نہیں۔

اگر اس کو انائی اس کا ساتھ دے بھی جاتی تب بھی یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ منزل پر حملہ سے مقتدر میں ہو گئی یا نہیں کیونکہ میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں میں کس سمت میں بھاگ رہے ہیں۔ اگر کہاں چلنا چاہتے ہیں؟ عین ملکی تھا کہ انسی پہاڑیوں میں چھٹکے چھٹکے آواز ہم کو بلک پیاس اور ٹھن سے دم توڑ دیتے تھے۔ کئی گز میں آسے کہ ہے پر اٹھا کہ بہت دور تک دھڑکا رہا۔

ہم ایک سے علائقے میں پہنچ چکے تھے جہاں غایا ہوا بڑوں کے پانی کی وجہ سے کافی گرمی ہوئی تھی یہاں اس قدر بھیل تھی کہ قدم اٹھانا دشوار تھا۔ اگر اندازے کے قدامت غلطی سے کر پڑے تو ناک میں بار ہو سکتا تھا۔ ایک مصیبت یہ تھی کہ رات کے کچھ بڑوں میں جوتے نہیں آجی تھم کے سینڈل تھے جو ٹوٹ چکے تھے اور ان کی وجہ سے بھی لے پھٹنے میں اندھ نیلہ دشواری پیش آرہی تھی، لیکن میں اس بات کے بھی قائل نہیں تھا کہ وہ ان سینڈلوں کو اتار کر چھینک دے۔ مجھے معلوم تھا کہ ننگے پاؤں تھوڑی ہی دور چل کر اس کے پاؤں دھواں ہو جائیں گے۔

خدا خدا کر کے کافی زدہ علاقہ ختم ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم تیز رفتاری سے چل رہے ہیں۔ ایک جگہ تو بار بار اشد گرمی پڑا اور تقریباً دس گز سے بڑے بڑے پانی جہاں اب نہیں چھو جا رہا تھا۔

”آسی بندہ بہت مت پروردی“ میں نے اپنے پیچھے مڑ کر کہا، ”میں تو وعدہ نہیں کرتا سفر پانی سے“

میرے اعانہ اے تو انانی نہیں بخش سکے۔ وہ بدستور منحصر اور متعادل رہا۔ یہاں حالت پیاس کی وجہ سے بھی کچھ زیادہ تھاب تھی نہ میں باہر کرکشی پڑ رہی تھیں اور حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔

آگے لڑنے کے زیادہ دشوار گزار نظر آ رہا تھا اس لیے

میں نے رات کو ایک بار پھر کندھے پر اٹھالیا اور ایک عزم نو سے اپنی آٹا نایاں جمع کر کے چل پڑا اس طرح میں نے تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کیا مگر آگ کا ایک بار پھر میری پیچھے بولی آتی رہی کچھ چلی سی یہ دہاڑی رخصتا میں خفہ سے کی تو محسوس ہونے لگی لیکن میں خطرے کی سمت کا تعین کرنے سے قاصر تھا۔

میں نے رات کو کندھے سے اٹا دیا اور دست کے کھلم میں چاروں طرف دیکھا لیکن میرے چاروں طرف چٹانیں ہی چٹانیں تھیں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کس چٹان کے عقب میں کیا تھا۔ دھنسا میرے اعصابی نظام نے کسی سانس آسے کی طرح خطرے کا سنگل دھول کر اخطرہ لینا اور ہر ہی تھک جس طرف میں دھول تھا شاید کچھ لوگ کسی اور راستے سے ہم سے آگے پہنچ چکے تھے۔ شاید وہ ہمیں دیکھ بھی چکے تھے اور حیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میری جگہ کے نیچے سرسراہٹ سی ہونے لگی میرے انداز سے شاید رات نے بھی جان لیوا تھا کہ ہمیں کس خطرے کا سامنا ہے۔ آج ایک بار پھر لکیری سی طاری ہونے لگی تھی۔ ”جگر دوست! میں نے سرگوشی میں آسے قتل دی رہیں سلسلے کی طرح میرے ساتھ گئے۔“

میں نے سب شبہی گھاتے ہوئے چاروں طرف دیکھا ساکت اور سنگسار چٹانیں گویا نادیدہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھیں اور دھیرے دھیرے میری طرف کھسک رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کون سی جس تھی جس نے مجھے ایک سخت ٹھکڑوں کے بل مٹھنے پر مجبور کر دیا۔ رات کو تو میں نے وہ دھکوں کے تقریباً گز ہی دیا تھا۔ کسی لمحے تقریباً ایک سا چٹائی نما ٹھکڑے اور ہمارے سروں کے قریب ایک پتھر مٹی دیوار سے جڑا تھا۔

آئے ہیں اگر انہیں یہ اندازہ نہ ہوتا کہ ہم کس سمت میں نکلے
ہیں تو ہماری بقا کے کچھ امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔

اب ہم جس علاقے میں پہنچ چکے تھے یہاں کچھ سبز و نظر
آئے لگا تھا پھر ہم ایک شہر جاتے پہاڑی نالے کے قریب
جا پہنچے اور بے دم ہو کر اس کے کنارے پر گر گئے۔ کافی دیر
تک ہم وہیں پڑے ہی طرح اپنے تھے رہے ہر سانس پر گویا
ہیلوں میں چھریاں سی چبھ رہی تھیں۔

میری حالت کچھ سنبھل توئی نے اندھے ہو کر نالے
میں جھانکنا نہ چاہا سچ فٹ چوڑا تھا اور اس میں ہوتا ہوا پانی
گوگرد شفاف تھا مگر اس تیزی سے بہہ رہا تھا کہ نہاتوار کھائی
سے شاہ اس گڑ گڑا میں مسند جاک سی پھیلی ہوئی تھی۔
میں نے موشیوں کی طرح گردن جھکا کر پانی پینے کے

کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی البتہ چہرہ اور بال پانی میں
تر ہو گئے۔ بالآخر میں نے دونوں ہاتھ رکھائے اور جلد میں
بھر بھر کر پانی پینے لگا۔ راشد نے دیکھا تو وہ بھی پینے کے
بل رہ گیا ہوا گناہ سے تک آئے کی کوشش کرنے لگا مگر اس
میں کھینے کی بھی سکت نہیں تھی۔

ایک نوجوان کی عجیب داستان

جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا

گم کر دہ

یعقوب جمیل کے قلم سے

فوری صورت سرورق، بہترین طباعت و کتابت

قیمت = 100 روپے

مکملہ القریٰ

سرگرم روڈ اردو بازار لاہور

7668958

جنگ بال اٹھیں۔

میں ریگ کر ایک بڑے سے چھری کی آڑ میں ہو گیا راشد
میرے پیچھے تھا مجھے اب یقینی طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ میری
جان کے کوئٹھن کس سمت میں ہیں لیکن میں نے نہ نہیں کیا نظر
کیچ نہیں کر رہا تھا محض چٹانوں پر گولیاں چلانے کا کیا ناٹھ ؟
میں نے جزد سے انتظار کیا بالآخر ایک چٹان کے عقب
سے مجھے ایک مال اور اس کے پیچھے ایک سر اُٹھتا دکھائی دیا
میں نے چارہ پنج گولیاں چلائیں اسرواں سے غائب ہو گیا مگر
اس کے جواب میں بہت سی گولیاں چٹانوں سے ٹکرانیں رہیں
اندازہ تھا کہ چٹانوں کے عقب میں کم از کم چار آدمی موجود تھے۔
ان میں سے ایک کو شاید مذبح پختی تھی۔

دو پتھر دل کے درمیان ایک خلیف سی دلا میں نہیں نے
معمولی سی حرکت دیکھی اور اس دماغ پر گولیاں برسائی گئی
گئی سی ایک جرح سنا دی لیکن اس کے ساتھ ہی میرا دل
بیٹھ گیا مگر کابینٹ خالی ہو چکا تھا۔

اب بقا کا راستہ ایک ہی ہو سکتا تھا کہ اس سے پہلے کہ
میرے ناہرہ دشمنوں کو اس امر کا احساس ہو کہ میرے پاس
ایونٹش ختم ہو چکا تھا وہیں دھان سے کھک ہوں۔ میں نے اٹھ
تھوڑی کھانڈ شروع کر دیا راشد میرے ساتھ تھا لیکن میں نے
وہیں پہنچ کر دی حالانکہ وہ اب بھی مجھے کم از کم لاطمی کا کام
تو یہی ہی سکتی تھی لیکن رائفل اور مٹی گن کے سامنے ایک
لاطمی کیا اہمیت تھی ؟ اور پھر اس کے ذہن سے چھٹکارا
بٹھے دشوار گزار راستوں پر بھاگ دوڑیں قد سے ساری ہو گئی تھی۔

راشد خاصی تھکی سے میرا ساتھ دے رہا تھا جان کے
نورنے اس کے تھکے مارے جسم میں ایک نئی توانائی بھری
تھی ہم اٹھتے قدموں چلتے ہوئے جب انشیب میں پہنچ گئے اور
پہاڑی کے گرد گھوم چکے تو ہم نے دھڑا شروع کر دیا اب ہم
اس سمت میں نہیں جا رہے تھے جس طرف پہلے رواں تھے۔
اپنی درست میں نہیں حملہ آوروں سے کتر کر تھی لاکھان آگے
نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا مجھے معلوم تھا کہ انہیں ہماری
خبر ہو چو کہ اس احساس ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

میں سورج کی مدد سے سمت کا اندازہ رکھنے کی کوشش
کر رہا تھا صرف اس لیے کہ میں ہم ان بھول جھلیوں میں بھٹکتے
تھے میں حملہ آوروں کے سامنے ہی نہ جا سکتا۔

دوڑتے دوڑتے راشد ہی کی نہیں میری بھی حالت
غلاب ہو گئی تھی۔ راشد تو اب ہر بہرہ قدم پر گر رہا تھا تاہم میرا
دل کہہ رہا تھا کہ اپنے حق کے بیواسلوں کو کافی دیر چھ چھوڑ

بالآخر میں نے ہی جیلوں میں بھر بھر کر اُسے بھی پانی پلایا۔
سیر ہو کر پانی پینے کے بعد ہم جوت پینے سے پہلے گردن تک
ہمارے چہرے کو یا شفاف پانی سے دھل چکے تھے اور دیکھتے
معدے کو بھی اس تازہ اور لکیائی پانی سے ٹھنڈک سی میسر ہو چکی
تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ جلد ہی ہم نے
اپنے آپ کو کافی حد تک تازہ دم محسوس کیا۔ خالی پیٹ میں پانی
ذرا چھاتو تھا لیکن جلد ہی تکلیف معدوم ہو گئی۔

بالآخر ہم اٹھ بیٹھے۔ میں نے جوتے اتارے اور پاؤں
نامے میں دھکا کر بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہوئے پیروں کو ٹھنڈے ٹھنڈے
پانی کی ٹکڑی سے بٹا آرام سا محسوس ہوا۔ شہروں میں بیمار اور
نیم بیمار لوگ نیم گرم پانی سے جسم کے دھکے دھکے جوتے تھنوں
کی ٹکڑی کرتے ہیں لیکن مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ دیکھتے ہوئے
جسم پر شفاف پہاڑی پانی کی ٹکڑی کیا معانی رکھتی ہے۔
راشد اُدھر دیکھ رہا تھا جدھر پانی کی راویں رکاوٹیں
ذرا کم تھیں سادھر پانی پر جھاک بھی کم تھی، وہ کچھ لوٹا گئے
لو کہ سک کر غور سے اُدھر دیکھنے لگا۔ رفتادہ خرفہ زہ انداز میں
بیچ آٹھا ایک بار پھر وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

میں جلدی سے کھک کر راشد کے قریب پہنچا۔ میں نے
جب پہاڑی ٹالے کے اس حصے کی طرف دیکھا جس طرف
راشد ایک ٹکڑے دیکھ رہا تھا اور خوف سے تھر تھر کاپ رہا تھا تو
مجھے بھی ایک بار تو بھر بھری سی آگئی۔

شفاف پانی میں پتھروں کے درمیان ایک لاش اٹکی ہوئی
تھی۔ لاش کسی عورت کی تھی اور اس پر لباس کی جگہ محض
چند دھبیاں تھیں۔ اس کا سر دھڑ سے تقریباً علیحدہ ہی تھا۔
محض چند نسلوں اور تھوڑی سی کھال کی بدولت وہ جڑا ہوا تھا

اور مکمل طور پر الگ نہیں ہوا تھا۔ عورت یقیناً خوبصورت اور
سرخ و سپید رہی ہوگی مگر اب جبکہ وہ زندگی سے محروم ہو چکی
تھی، اس کی نس نس خون سے خالی ہو چکی تھی اور نہ جانے
کب سے پانی میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس کی جلد پیچھے اور
گلے ہوئے لٹھے سے مشابہ ہو چکی تھی تو اسے دیکھ کر اسی
طرح خوف آ رہا تھا جیسے دیرانے میں اچانک ہمارا سامنا کسی
بدروح سے ہو گیا ہو۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے خالی خالی
نسیں اور ترخہ ڈراؤنے سے انداز میں جھانک رہا تھا۔

ٹھٹکی طاری ہو تو چھوٹی چھوٹی معجزیں بھی بہت بڑی معلوم ہوتی ہیں۔

راشد تو نیچے بھاگنے کے بعد ٹھٹک ہوٹوں پر ٹھٹک زبان پھیر رہا تھا۔ گوکہ ایک امید نوکی روشنی اس کی آنکھوں میں جھلک آئی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ چھٹانگ لگانا کم از کم اس وقت اس کے بس کی بات نہیں۔ ہاتھ میں بیٹے کے بل کھائی میں لیٹ گیا۔ میں نے بہ ہزار دقت پہلے راشد کو نیچے لٹکایا اور جب اسے سڑک اپنے پیروں سے کلنی قریب محسوس ہونے لگی تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ خیریت سے نیچے کود گیا۔ اس کے بعد میں نے حتی الامکان محتاط ہو کر آنکھیں بند کر کے بیٹوں کے بل چھٹانگ لگائی۔ ایک بار تو میرا بیٹہ جھل کر رہ گیا اور خالی مددہ گویا طلق کے راستے باہر آ گیا۔ اس کے باوجود میں نے آنکھیں کھولنے سے پہلے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی آبدی کی طرف پہنچنے کی کچھ امید تو بندھی۔

چند لمبے ہم سڑک کے کنارے بیٹھے سانس درست کرتے رہے پھر اٹھ کر کنارے ہی کنارے ڈھلان کے رخ پر چل دیے۔ بل کھائی سڑک پر ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے اور ہم دائرے سے مشابہ ایک موڑ مڑ رہے تھے کہ عقب سے گھر گھر کی آواز جانی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک ٹرک آ کر کھائی دیا۔ ٹرک کے کین میں ڈرائیور کے علاوہ بھی دو آدمی نظر آ رہے تھے۔

”میرا خیال ہے قدرت نے اب صحیح طور پر ہی ہماری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے رکتے ہوئے کہا ”مجھے امید ہے کہ اس ٹرک میں ہمیں لٹ مل جائے گی۔“

دو گھنٹے میں نے راشد کی طرف دیکھا۔ وہ ٹرک کی طرف دیکھتے ہی اسی طرح سسم کر رہ گیا تھا جیسے خرگوش نے دیر نے میں بھڑبھڑے کو دیکھ لیا ہو۔ وہ سرسراہٹ سی آواز میں بولا ”بھائی جان! یہ لوگ بھی تو بالکل ویسے ہی لگ رہے ہیں.... خرگوشوں جیسے.... ہم اتنی تکلیف اٹھا کر ایک مصیبت سے نکلنے کے بعد دوسری مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔“

”ہر قومیت میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں راشد میاں! میں نے مریانا انڈیا میں اسے سمجھایا۔“ خضرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا، ورنہ ویسے بھی شاید ہم اس علاقے میں بھٹکتے بھٹکتے بھوک پیاس سے مر جائیں۔“

اس سے پہلے کہ راشد مزید کچھ کتا ”ٹرک ہمارے قریب آں رکاوٹ ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر پشتوں میں کچھ پوچھا۔ میری آنکھیں پٹ دیکھتے ہوئے وہ فوراً اردو میں بولا۔ ”کون ہے

جانے اسے کس جرم کی ایسی سیمانہ سزا دی گئی تھی! شاید۔“

کرکڑ ہو گیا عورت ہو گئی اس کاسب سے بڑا جرم تھا۔ اس علاقے میں موت دیے بغیر کبھی گویا قطعی عام سی چیز تھی۔ کرکڑ بیل شاید طاقتور کے لئے محض پاربرداری کا ایک جانور تھا۔ بیل جھل کا قانون رائج تھا اور اس علاقے کا غالباً کسی مذہب سائبر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاید ملک کا قانون یہاں پر نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اس احساس سے بھی ابکائی سی آرتی تھی کہ ہم تامل میں جس جگہ سے پانی پل چکے تھے اس سے چند گز پیچھے ہی یہ لاش پھنسی ہوئی تھی اور پانی کا مہاؤ بھی ہماری ہی طرف تھا۔ راشد پر صرف خوف ہی کا غلبہ تھا۔

میں نے اپنی جھٹکی اور ٹھٹکی کو بھول کر راشد کا ہاتھ تھام کر اٹھنے ہوئے کہا۔ ”ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنا سفر جاری رکھیں۔ یہاں بیٹھ کر ایک تو خواہ مخواہ اس لاش کی موجودگی کے انداز سے طبیعت خراب ہوتی رہے گی، دوسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہمارا پیچھا کرنے والے ہم تک نہ آسکیں۔“

راشد نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ بولے بغیر میرے ساتھ چل پڑا۔ ایک بار پھر ٹاہنوں پر پاؤں راستوں پر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ دھوپ اب ڈھلنے لگی تھی۔ راشد کچھ دور تو خاصی چستی سے میرا ساتھ دیتا رہا لیکن بالآخر اس پر پھر جھٹکی اور ٹھٹکی غلبہ پانے لگی۔ وہ تھوڑی سی حالت میں ایک ٹھٹک افق کی طرف

دیکھا اور گرتا پڑتا میرے ساتھ چل رہا تھا۔ ہم وہاں ہوٹوں پر بڑیاں جم چکی تھیں اور چروہ ستا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی حالت بھوک سے بھی خراب ہوگی۔ خود میرے پیٹ میں نفسی سی اٹھ رہی تھی۔ اس کے باوجود میں حتی الامکان ٹانگا رہنے کی کوشش کر رہا تھا تاہم اب کسی طرف سے خطرے کی بو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ معلوم ہی ہوتا تھا کہ ہم اندویشی کے سہارے اپنے خون کے پیاسوں کو چکر دینے لگا کایا ہوا ہو گئے تھے۔

قریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد جبکہ راشد چلے چلے پار پار لڑا کر گرتے لگتا تھا، تقریباً معجزانہ طور پر ہم ایک سڑک پر پہنچ گئے۔ کچھ دیر پہلے ہم ایک نیڑھی میڑھی میڑھی کھوہ میں چل رہے تھے۔ اس کے اختتام پر ہمیں یوں لگا جیسے آگے عیسٰی کانیوں کے سوا کچھ نہیں مگر جب ہم نے جھٹک کر دیکھا تو تقریباً پندرہ فٹ نیچے خاصی چوڑی سڑک نظر آئی۔ اس ٹرک کے دوسری طرف ایستہ کھائیاں ہی تھیں۔ اب مسئلہ پندرہ فٹ کی بلندی سے چھٹانگ لگانے کا تھا۔ انسان پر جب

راشد کی بھی کچھ جان میں جان آگئی تھی۔ وہ
ذہن اور جسم کو کچھ آرام اور سکون میسر آجائے تو وہ سر
مٹا لے جاگ اٹھتے ہیں۔ ٹرک والوں کی طرف سے کچھ
اطمینان ہوا تو بھوک کے عفریت نے ایک بار پھر مدد
کچھ شروع کر دیا اور اس کا احساس اب پہلے سے زیادہ شدید
ہوئے لگا۔ تاہم میں ضبط کئے بیٹھا رہا۔ راشد کی حالت
سے بھی زیادہ خراب تھی۔ فحشیت کے مارے اس کی آنکھیں
بار بار بند ہونے لگتی تھیں اور سر دائیں بائیں دھٹکے لگا
تاہم وہ چونکہ دوسرے دروازے کی طرف بیٹھا تھا اس
ڈرائیور اس کی کیفیت سے بے خبر تھا۔

مل کھاتے پہاڑی راستے پر سفر خاصی ست رفتاری سے
چلے ہو رہا تھا تاہم اندھیرا پھیلنے تک ہم پتھریوں سے انحراف
اور ٹک سی سیدھی سڑک پر سفر کرنے لگے جس کے دونوں
طرف چھریلے سے میدان تھے اور ٹرک کی روشنیوں کی بنا
تک رسائی تھی۔ وہاں تک تو کوئی کھائی وغیرہ نظر میں آ
تھی۔

اب بھوک کی لازمت میری برداشت سے بھی باہر ہو
تھی اور بھوک بڑی ظالم چیز ہے۔ ساری انسانی خصوصیات
چھین لیتی ہے۔ شرم، جھج، حیا، فحشیت، شائستگی سب وہاں
نہ جاتی ہے۔ میں نے بھی بلا اثر انہیت کی جھج کو بلا
طاق رکھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا ”خان صاحب! آپ کے
پاس کھانے کے لئے کچھ ہوگا؟ ہم دونوں بھوک کے مارے
قریب الگ ہیں۔“

”ہم کو اس کا اندازہ تھا۔“ ڈرائیور مشتعلانہ لہجے میں بولا۔
”اسی لئے ہم ان خطرناک راستوں پر بھی گاڑی چڑھا رہا تھا۔
بس اب تھوڑی دیر میں ہم ایک ہوٹل پر پہنچنے والا ہے۔ جب
تک تم لوگ یہ کھاؤ۔“ اس نے مختصر انداز میں ایک ہاتھ سے
اسٹیرنگ تمام کر کے بھوک کے مارے ہاتھ سے چٹ
کے نیچے سے کپڑے کا ایک چھوٹا ٹھیکڑا نکالا اور میری گود میں
رکھ دیا۔

میں نے تھیلے میں ہاتھ مار کر دیکھا۔ اس میں کچھ سیب تھے
میں اور راشد عیدوں کی طرح صیہوں پر ٹوٹ پڑے۔ سیب
کل پانچ پھیپھے تھے۔ وہ ہم نے چٹ کر دیے۔ پیٹ میں کچھ کھا
تو انسانی جذبہ بھی لوٹ آئے۔ دنیا بھی نسبتاً بہتر لگنے لگی اور
منزل بھی کچھ قریب نظر آنے لگی۔ ورنہ اب تک یہی لگ رہا
تھا کہ ہم ایک تاریک پٹی پر چل رہے ہیں جو شاید بالکل کی
طرف جا رہی ہے۔

تم لوگ؟ کدھر سے آیا ہے؟ کدھر جانا ہے؟“
میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا بتانا مناسب
رہے گا۔ کسی نیبی طاقت نے گویا خود بخود ہی میرے منہ سے ج
نکلوا دیا۔ ”بھائی صاحب! ہم بہت مصیبت زدہ ہیں۔ خراب
یکپ میں پھنس گئے تھے۔ بڑی مشکل سے نکل کر بھاگے
ہیں۔ اگر آپ ہمیں کسی شریک پہنچاویں تو آپ کا بڑا احسان
ہوگا۔“

چند لمبے روکھے نہ بولا۔ ایک بار تو مجھے انفوس بھی ہوا کہ میں
اتنی تیزی سے جگ کیوں بول گیا۔ ڈرائیور پر خیال نظروں سے
ہمارا جائزہ لے رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی جھک جھک کر
ہمیں سر تپا دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ راشد کا ہاتھ
میرے ہاتھ میں تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے جسم پر
کچھ سی ٹاری ہے۔

بلاخر ڈرائیور نے گویا کسی خیال سے چوکتے ہوئے اپنے
ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ٹرک سے اتارے اور ہمارا جائزہ لیتے
ہوئے ٹرک کے چپٹیلے حصے کی طرف چلے گئے۔ وہ دونوں
نوجوان تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ راشد ٹرک میں بیٹھنے سے
گریزاں تھا لیکن میں نے بہر حال تن بہ تقدیر ہوئے اور جواہ
کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ راشد میرے ساتھ تقریباً گھسٹا ہوا
ڈرائیور کیمین میں آ بیٹھا۔

ڈرائیور کو میری بات سن کر جیسے چپ سی لگ گئی تھی یا پھر
شاید اس میں جذبہ تجسس ہی نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے مزید
کچھ بھی نہیں پوچھا۔ کسی قسم کی تھیلیات جاننے کی کوشش
نہیں کی اور ٹرک کو تیز لگا دیا۔

کافی دیر تک وہ سڑک پر نظر بھانے خاموشی سے ڈرائیور کرتا
رہا۔ بلاخر میں نے خود ہی اس ناگوار سے سکوت کو توڑتے
ہوئے پوچھا۔ ”تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“

”پشاور۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم چار گھنٹے کا سفر کیا ہے۔
پشاور میں ہم دورات ٹھہرے گا پھر ہنڈی کے لئے روانہ ہوگا
تم لوگ کدھر جانا ہے؟“

میں نے راشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ لاہور
جائے گا۔ میں اس کو وہاں چھوڑ کر سیالکوٹ جاؤں گا۔“

ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔ ”وہ اب بھی ہماری طرف دیکھے بغیر پر خیال
لہجے میں بولا۔ ”ہم تم کو پشاور ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دے گا۔
وہاں سے تم لوگ ٹرک سے لاہور چلے جانا۔“

اس کے لہجے سے میری تشویش کافی حد تک کم کر دی۔ وہ
واقعی ہماری مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ

مشہور مصنف اظہر کلیم کے مقبول ناول

پکار : ————— ۱۷۵/-

سرفروش : ۲ حصے ۱۰۸/-

شہباز : ۲ حصے ۱۰۸/-

کوئی ہمارے حسن ذرائع سے سوالات ہی کرنا شروع کر دیتا جبکہ اس بندۂ خدا نے خود ہم سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔
ذرائع نے سب کے لئے فراخ دلی سے کھانے کا آرڈر دیا اور کچھ دیر بعد جب گرم گرم روٹیاں اور پیسے ہوئے گوشت کی کڑائی ہمارے درمیان رکھی گئی تو اس کی خوشبو سے مجھ پر ریشہ غلی کی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور ایک لمحے کے لئے تو مجھے شبہ ہوا کہ خوشی کے مارے میں کیس بچوں کی طرح قلعادیاں نہ مارنے لگوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ اپنے کھانے کی رفتار پر قابو رکھنے کے لئے مجھے اس سے بھی زیادہ جدوجہد کرنی پڑی۔ شکر ہے روشنی کم ہونے کی وجہ سے کوئی میری حرکات و سکنات اور تاثرات صحیح طرز پر نہیں دیکھ پا رہا تھا ورنہ شاید یہ اس کے لئے ایک عجب و غریب نظارہ ہوتا۔

مسک صرف یہ نہیں تھا کہ مجھے اس وقت شدید بھوک لگی ہوئی تھی بلکہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کتنے ہی دن بعد میں نے ایسے کھانے کی شکل دیکھی تھی جسے کھانا کہا جاسکتا تھا۔ ذرائع پر غالباً میری کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ ملامت سے بولا۔
”تو ذرا ہاتھ روک کر کھانا۔ ایسا حالت میں جبکہ تم ضرور سب سارے فائے کاف کر رہا ہے ایک دم ڈٹ کر کھانے سے طبیعت خراب ہو جاتا ہے۔ سمجھا؟ ویسے آگے تمہارا مرضی..... ہمارا تم کو کھانے سے منع کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن تمہارا فائدے کے لئے ہوتا ہے۔“

کچھ دیر بعد کم از کم مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بھوکوں مرتے کی آدی کے لئے سبب شاید اتنی اچھی چیز نہیں کیونکہ پانچ آدھے ہی گھنٹے بعد پیٹے سے زیادہ شدت سے بھوک لی آگئی تاہم قیمت یہ رہا کہ زیادہ دیر یہ اذیت برداشت نہ کئی پڑی۔

دیرانے میں سڑک سے کچھ ہٹ کر قدرے نشیب میں بہانہ ہی کچھ روٹیاں زمین کا سینہ چر کر نکل آئی تھیں۔ یہ کچھ ہڑدیکس لپٹتے جو دو برس بڑے چھپروں میں اور ان کے سامنے زمین میں گڑی ہوئی لکڑی کی بلیوں پر لٹکے رہتے تھے۔ ان چھپروں میں تندور چولے میز کرسیاں وغیرہ بچھ دی تھیں۔ چھپروں کے سامنے کھلے آسمان تلے موٹے دھاتے پلوں والی اتنی بڑی بڑی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کسی چھوٹے موٹے اکھاڑے کا کام دے لیتی تھی۔ ان چارپائیوں کے درمیان لکڑی کی بے جھم اور ہلکی بھرم میزوں پر چھکوں کی جگہ پانی کے چھوٹے پورے گڑے اور الوغیم کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ٹرک چھپروں کے قریب رک چکا تھا۔ یہاں کئی ٹرک پہلے ہی سے کڑے تھے۔ چارپائیوں پر چند ذرائع اور کلینر وغیرہ کھائے پینے یا فرش کیوں نہیں معروف تھے اور چند نیم دراز تھے۔ چھپروں میں تندور پر روٹیاں لگ رہی تھیں۔ دیکھوں میں چچے لکھنارے تھے اور ہوائیں دنیا کی سب سے سوتھمی خوشبو.....

حالی کی خوشبو چکرار ہی تھی۔ ایک چھپر کی پیشانی پر ایک چھوٹا سا بورڈ بھی آواز تھا لاکا ہوا تھا۔ دھوکے میں یہ بورڈ تقریباً سیاہ ہو چکا تھا تاہم اس پر اردو کی جلی حرف میں لکھا ہوا ذرائع اور ہوٹل پڑھا جاسکتا تھا۔ اس کے نیچے قدرے کم جلی حرف میں یہ اعلان بھی پڑھا جاسکتا تھا کہ یہاں ذرائع اور بھائیوں کے لئے ہر چیز دستی سہی میں ہونے کی پالی ہے۔ ملاوٹ ثابت کرنے والے کو ایک ہزار روپے تو انعام۔

اس دیرانے میں یہ خالص دیکھی قسم کا رستوران اس وقت بے بہت ارضی محسوس ہو رہا تھا۔ میں اور راشد اپنے حسن ذرائع کے ساتھ ٹرک سے اتر آئے۔ ذرائع کے دونوں ہاتھ بھی ٹرک کے پچھلے حصے سے اتر آئے تھے۔ ذرائع نے غلابا دانستہ طور پر ایک ایسی چارپائی بیٹھنے کے لئے منتخب کی تھی پر روشنی کی صحیح طور پر رسائی نہیں تھی۔ میں ایسی ہی کچھ پر بیٹھا چاہتا تھا۔ اگر ہم روشنی میں بیٹھتے تو اس ماحول میں علی اور راشد کی شکستہ حالی اور اینٹیت ہر ایک کو کھٹکتی۔ شاید

بات اس کی درست تھی تاہم اس پر عمل کرنے کے لئے مجھے اپنی اوجھٹی ہوئی قوت ارادی کو بڑی مشکل سے بیدار کرنا پڑا۔ اٹھانے کے بعد تو سے کا دور چلا جس سے میرے حواس میں چستی آنے کے بجائے غماز طاری ہو گیا۔

ڈرائیور نے لواٹلی کی اور کچھ دیر بعد ہم اٹھ کر دوبارہ ٹرک میں بیٹھ کر چل دیے۔ وہی ٹرک کی گھول گھول، وہی گرد و پیش کی دیرانی، وہی مل کھائی سیاہ پٹی سے مشابہ سڑک۔ دھیرے دھیرے خود کی میرے ذہن پر غالب آگئی۔ راشد مجھ سے پہلے ہی دروازے سے نیک لگائے آزاد تر چھاڑا سوراٹھا اور کسی ٹی کی طرح خرخراتا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسی پر تقریباً ڈھیر ہو گیا اور جانے کب پریوں کے بندھ لے میں جمو لے لیتا ہوا سو گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر سوتے رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے جھنجھو رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ ڈرائیور مجھے اور راشد کو جھنجھو رہا تھا۔ ہم دونوں آنکھیں ملے ہوئے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرک ایک سڑک کے کنارے رکا ہوا تھا۔ سامنے ہی سالنوروی اسٹیشن کی ایک عمارتی دیوار نظر آ رہی تھی جس میں ایک عمرانی دروازے پر زرد اور زردوروی روشنی بکھیرتا ہوا ایک بلب جھول رہا تھا۔ ”وہ سامنے ریلوے اسٹیشن ہے۔“ ڈرائیور نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”تم کوھر جا کر اپنا کمرہ ہمارا خیال ہے“ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک گاڑی لاہور کی طرف روانہ ہو گا۔ تم لوگ اسی سے نکل جاؤ۔“ پھر وہ اپنی صدری سے سوسکے دو نوٹ نکالتے ہوئے بولا ”بغیر ٹکٹ جانے کا کوشش مت کرنا“ ورنہ اتنا مصیبت اٹھا کر بھی شاید دو چار مہینے اور گھر نہ پہنچ سکو۔ جیل بھی خراب کرکے کچھ کم نہیں۔“

میں نوٹ لیتے ہوئے چٹکچٹا رہا تھا چنانچہ وہ اس نے میری میلی کچلی تھیں کی جیب میں ٹھونس دیے۔ پھر جیسے اسے کچھ اور خیال آیا، سیٹ پر رکھی ہوئی شدہ دو گرم چلوں میں اٹھا کر میری گود میں ڈالتے ہوئے بولا ”تم لوگوں کا تو طیارہ اتنا خراب ہے کہ ٹکٹ ہونے کے بلکہ خود تم کو کوئی آوارہ گرد یا چور اپکا سمجھ کر نہ پکڑے۔ تمہارا بات تو لوگ بعد میں سنیں گا۔ اس لئے تم دونوں ایک ایک چلو لیے رکھنا۔ سردی سے بھی بچھ گا اور یہ میلا کچلا کپڑا بھی کٹلی حد تک چھپا رہے گا۔“

میں نے غیر ارادی طور پر اس شخص کا ہاتھ تھام لیا اور گلوگیر سے کہنے میں لگا ”خان صاحب! تم انسان نہیں، فرشتہ ہو۔“ اس نے کھیلنے سے انداز میں قہقہہ لگایا ”یہ بھی تم نے

عجیب بات کیا برادر! ہم تو ابھی صحیح طریقے سے انسان بننے لگے۔ تم نے ہم کو فرشتہ بنا دیا۔“

اس کے دونوں ساتھی ٹرک کے چھپتے چھپتے سے اتر کر دروازے کے قریب اکھڑے ہوئے تھے اور غلبہ غلبہ اترنے کے شکر تھے۔ میں نے ڈرائیور سے الوداعی سلام کرتے ہوئے کہا ”میں ابھی تک اپنے محسن کا نام بھی منہ نہیں ہوسکا۔“

”نام کو چھوڑو بھائی۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”ہم تو ارحمان کام پر رکھنا ہے۔ ہمارا خیال میں ہمارا جو کام تھا ہم نے بھی صحیح طریقے سے پورا نہیں کیا کیونکہ ہمارا بھی کچھ مجبور ہے۔ ہم کو معاف کر دینا۔ ہم بس تمہارا اتنا ہی خدمت کرنا تھا۔ اور ہاں، جس علاقے میں تم کو اتنا تکلیف اٹھانا پڑا وہاں ہی علاقہ تھا۔ اس کے لئے بھی ہم کو معاف کر دینا۔ ہمارا میں بڑا عجیب کام ہوتا ہے۔ ہم کو بہت فائدہ آتا ہے لیکن کیا کرے...؟ ہم مجبور ہے۔“ اس کے لیے میں مجبور طور شامل تھا۔

دو سر جھٹک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسٹیشن کا سنبل لیا تھا۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ اب یہ رخصت ہو جانا چاہیے۔ میں نے دل ہی دل میں اسے نہ جانے کتنی دعائیں دیں اور ٹرک سے اتر آیا۔ راشد مجھ سے پہلے اتر چکا تھا۔ ہم نے ڈرائیور کے ساتھیوں سے بھی ہاتھ ملانا وہ بس خاموشی سے ہمیں گھورے جارہے تھے جیسے ہم عجوبہ ہیں۔ ہم چلوں میں لیٹ کر چل پڑے تو وہ دونوں ٹرک سوار ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے انجن بیدار ہوا، بیڈلا روشن ہوئیں اور ٹرک حرکت میں آ گیا۔

میں راشد کو ساتھ لئے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل رہا پلیٹ فارم پر خاصی چل پھل تھی۔ ایک قلی کو روک کر نے ٹرکوں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ تقریباً آٹھ گھنٹے بعد خیبر میل، کراچی کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ میں ہم لاہور جا سکتے تھے۔ تھوڑا کلاس کے دو ٹکٹ خرید کر آہنی سائبان تلے ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد راشد بولا ”بھائی جان! اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ ہم اس جہنم سے نکل آتے ہیں کیا ہم واقعی اب گھر پہنچ جائیں گے؟“ اس کے بچے میں بے عنوان خوف کی جھلک تھی۔

”انشاء اللہ۔“ میں نے دھڑکی سے کہا۔ میں اس وقت بہت سی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے پاؤں تانے

”وہ تو تم اکیلے بھی اپنی کمائی سلاؤ گے تو اخبار میں نیچر چھپ جائے گا۔ میری موجودگی ضروری نہیں“ میں نے قدرے رکمانی سے کہا ”مجھے اپنی تصویریں اور داستان شجاعت اخبار میں چھپوانے کا اتنا زیادہ شوق نہیں۔ ہر حال“ تم اپنی کمائی اس طرح سٹاف جس طرح میں نے کہا ہے اور مجھے اپنے گھر لے جانے پر اصرار مت کرو۔ دراصل میرے انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر میں تمہارے ساتھ گھر چلا گیا تو لمبائی پھر شروع ہو جائے گا اور جس طرح تمہیں گھر پہنچنے کی جلدی ہے اسی طرح مجھے بھی ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ میرے گھر والے بھی جانے کس قدر پریشان ہوں گے۔ کیا حال ہوگا ان کا۔۔۔ اور پھر مجھے تو جسیں گھر پہنچانے کے بعد بھی کئی طویل سفر کرنا ہوگا۔ ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تمہیں اسی طرح کرنا چاہئے جس طرح میں کہہ رہا ہوں“ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک بار پھر اصرار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے میں نے جلدی سے کہا ”اور اگر تم میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہو تو پھر ہم میں سے اپنا اپنا راستہ لیتے ہیں۔ تم خیبر پل سے لاہور چلے جاؤ“ میں کوئی اور ٹریند پکڑ لوں گا جس سے مجھے اپنے علاقے کی طرف جانے میں آسانی رہے۔“

راشد کا منہ اتر گیا۔ سرہی آواز میں بولا ”اب اتنی بے رخی اختیار مت کیجئے۔ ٹھیک ہے“ میں آپ کو گھر لے جانے پر اصرار نہیں کرتا لیکن مجھے میرے گھر تک ضرور چھوڑ آئیے۔ تمنا تو مجھ میں اب ایک قدم بھی چلنے کی ہمت نہیں رہی۔ مجھے تو اس تصور سے ہی خوف آ رہا ہے۔ اگر آپ مجھے اکیلا چھوڑ گئے تو میں شاید ہی گھر پہنچ سکوں۔“

وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز پر بے پناہ ترس آیا۔ میرا اسے تنہا رخصت کرنے کا قلعہ ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو میں نے محض اس سے اپنی بات سنانے کے لئے دھمکی دی تھی۔ اس کے بعد ہمارا مشترکہ غاموشی ہی میں گزرا۔ راشد نے مصوبانہ سے اشتیاق کے تحت میرے بارے میں جاننے کے لئے کئی سوالات کیے۔ میں نے ان کے جواب گول مول سے ہی دیئے۔ ظاہر ہے، میرا اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بلاخودہ بولا ”بعد میں معلوم نہیں یاد رہے یا نہ رہے“ آپ اپنا ایڈریس تو لکھ کر مجھے دے دیں۔ میں جب لاہور سے اپنے گھر کراچی چلا جاؤں گا تو آپ کو خط لکھا کروں گا۔ کبھی آپ میرے گھر بھی آئیے گا۔ میں۔۔۔ می اور ڈیٹی کو آپ کے متعلق بتاؤں گا تو شاید وہ مجھے انہیں کہ میں آپ کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آیا۔“

اس لئے مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو صحیح طور پر اپنا ایڈریس معلوم ہی نہیں تھا۔ آج تک کبھی کسی کو ایڈریس بتانا ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ دنیا میں کوئی ایسی ہستی نہ رہ گئی تھی جو مجھے خط لکھتی۔ اشرف خان کا مکان جس میں وہ رہتا تھا، اس کا نمبر وغیرہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اشرف خان یا ذرینہ کے نام بھی میں نے اس مکان پر کوئی نوٹ وغیرہ آئے نہیں دیکھا تھا البتہ شہر کے مرکزی علاقے میں رینز ہوٹل کے قریب ہی ایک پان والے کی دکان تھی جہاں سے اشرف خان پان سکریٹ اور سگار وغیرہ لیا کرتا تھا اور قریب وقت میں دو چار منٹ کے لئے کھڑا ہو کر دکان دار سے قہرمان بہت گپ شپ بھی کر لیتا تھا۔ اس دکاندار کی معرفت میں نے کبھی کبھار اشرف خان کے خط آتے دیکھے تھے۔ اس مطلب میں تھا کہ وہ گھر کے بچے پر خط لکھنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا چنانچہ میں نے ایک کیٹیشن والے سے قلم ایک راشد کو اسی پان والے کا ایڈریس دے دیا۔۔۔

”اس دکان کی معرفت تم مجھے خط لکھ سکتے ہو“ میں نے ”مکان تو کرائے کا ہے اور کوئی پتا نہیں کب ہم لوگ چھو جائیں۔ یہ ایڈریس ہر حال، مستقل ہے۔“

راشد نے سکریٹ کی ڈبہ کا وہ کھولا جب میں رکھ لیا جس میں نے ایڈریس لکھا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈبہ سے ٹرین پلیٹ قدر پر اچھی اور پلیٹ فارم پر ایک ہی ہنگامہ ڈی بج گئی۔ ہم دو ساریلوے اسٹیشن یکدم ہی پر ہجوم نظر آنے لگا۔ جانے کن کون سے کونے کھدروں سے لوگ نکل آئے اور ٹرین پر بار ٹوٹ پڑے گویا اس سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہو۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے اور راشد کے لئے کڑی کے تختوں والی دو سیٹوں پر قبضہ کیا اور یوں سکھ کی سانس لی گوا بے کراں سمندر میں ڈوبے ڈوبے ہمیں تیرنے کے لئے دو لائف بوئیں میسر آ گئی ہیں۔

سزا ہمارا تقریباً اسی طرح ملے ہوا جس طرح قہر نکلاں میں ہو آ رہے۔ پشاور سے اس کلاس میں سفر کرنے کا البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اپنے ملنے کی وجہ سے ہم جس احساس کمتری میں مبتلا تھے وہ ہمارے دل سے نکل گیا۔ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد ہم اپنے ملنے کی طرف سے غامے بے پردا ہو گئے کیونکہ اس ڈبے میں کئی آدمیوں کے ملنے ہم سے ملنے چلے ہی تھے۔ لاہور پہنچ کر بھی میرے پاس تقریباً سو سو روپے بچے ہوئے تھے۔ اس نیک دل ڈرائیور نے جس طرح ہماری مدد کی تھی اسے یاد کرتے ہوئے میرے دل سے اس کے لئے بے انتہا

چلنے کی ہدایت کی کیونکہ پولیس کا ایک سپاہی ہمیں عجیب
منگولک سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سر حال وہ ہر لمحہ بھلا زمانہ
تھا، ورنہ محض اپنی شکستہ حالی کی وجہ سے شبیہ قرار پا کر ہم نہ
جائے کب کے اسی قسم کی کسی شخصیت کے جتنے چڑھ چکے
ہوتے اور ہمارے قبضے سے جانے کیا کچھ برآمد ہو چکا ہو گا اور ہم
حوالات میں در آمد ہو چکے ہوتے۔

گلبرگ پینشنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ سر والا بل پاور
کرنے کے بعد راشد کو اپنے بچپے کے گھر کا راستہ اچھی طرح یاد تھا۔
لیٹی مارکیٹ کے قریب سے ایک گلی میں مڑنے کے بعد
راشد نے ایک جگہ ٹیکسی روک لی اور اشارے سے بتایا وہ رہا چچا
کا گھر۔ سفید چار دیواری والا۔

وہ ایک شاندار کوشی تھی۔ میں مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
اس کاکٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیو نے میں نے چاہا کی کار میں کھڑی
تھیں۔ تین کلریں باہر ڈرائیو والے کے ساتھ کھڑی تھیں۔
اٹھین علی اندر جانے کے لئے راستہ نہیں ملا تھا۔

میں نے راشد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: اب تم جاؤ،
زندگی رہی تو پھر کبھی انشاء اللہ اچھے حالات میں ملیں گے۔
راشد ٹیکسی سے اتر کر درے بے دلی سے گھر کی طرف
چل دیا۔ وہ مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا جس سے مجھے کچھ گھبراہٹ سی
ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیو سے کہا: بس اب جلدی سے
گاڑی ریورس کر کے نکلو اور مجھے پرائیویٹ لاری اڑے لے
چلو۔

شام ڈھل رہی تھی اور مجھے اندیشہ تھا کہ زیادہ رات ہو گئی تو
سیالکوٹ جانے والی بس شاید ہی ملے لیکن سر حال میں ابھی
وقت پر لاری اڑے بھی گیا جس کے بعد میرے سفر کا دوسرا
مرحلہ شروع ہو گیا۔

میری وہ رات بھی تقریباً پوری ہی سفر میں گزر گئی۔ طبع تو
میرا جو تھا سو تھا لیکن نیند کی کمی، تھکن، گردوغبار اور اچھے بھلے
انسانوں کو قریب المارگ کو دینے والے کھانوں نے مجھے بالکل
ہی بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔ علی الصبح شہزاد کوٹ کے لارے
اڑے پر اتر کر میں نے پہلے ایک چائے خانے میں کچھ کھا لی لینا
ضروری سمجھا۔ اس چائے خانے میں ہاتھ دھوتے وقت میں
نے سینٹ کے غلیظ سبک کے لوہر گئے ہوئے آئینے کے نیچے
کھبے دھندلے سے نکلے میں اپنی شکل دیکھی اور خود ہی ڈر
گیا۔ میں زمانہ غار کا کوئی ایسا شخص دکھائی دے رہا تھا جو پیدل
صحرائے گولبی عبور کر کے آیا ہو۔

چائے خانے سے میں تقریباً ایک لمہ پرانے اور گڑھی کی

برقعہ پر دو جہانیں نکل رہی تھیں۔ گوانا پاؤں کو زیادہ عرصہ
نہیں گزر سکا پھر بھی وہ زمانہ کرج کے زمانے سے بدتر تھا۔
چساک اپنے ہاں کچھ مددایت سی بن چکی ہے کہ ہر زمانہ
لے والے زمانے سے کچھ بہتر ہی ہو آئے اور بعد میں لوگ
نے یاد کر کے کہ آپس بھرا کرتے ہیں۔ ہم چاہتے تو سوا سو
لاپے کی اس معمولی سی رقم سے کراچی بھی پہنچ سکتے تھے۔
لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ان دنوں عام رواج تھا کہ بٹے
سے ٹیکسی ڈرائیور اور کوچیاں، مسافر کو پکڑ کر مختلف سٹوں
پر لے جاتے تھے۔ ہوتا تھا کہ مسافر کا کوٹ یا کپڑا کسی
ایک ٹانگے میں بیچ جاتا تھا اور صندوق دوسرے ٹانگے میں اور
اسے خود کسی تیسرے ٹانگے میں بیٹھ کر ان دنوں کا قاتل کرنا
پڑا تھا یا پھر دائیں اٹھین ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں
آجاتی تھی اور بائیں اٹھین دوسرے کے ہاتھ میں اور وہ دونوں
انہی طرح کے جھنڈوں کی طرح لہراتے اپنی اپنی ٹیکسی کی طرف
در لیتے تھے جبکہ مسافر کو کوئی تیسرا ہی ٹیکسی ڈرائیور کندھے
پر اٹھا کر اپنی ٹیکسی کی طرف لے جاتا تھا۔

بات سے بات نکل آئی۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ جب ہم ویننگ
لاؤنج میں آئے تو ہمارے چلنے دیکھ کر ٹیکسی ڈرائیوروں نے
بہیں قطعاً لٹ نہیں دی البتہ ٹانگے والوں کے سامنے ہمیں
پوری طرح سینہ سپر ہونا پڑا۔ ٹانگے میں جانے کے ہم متحمل
نہیں ہو سکتے تھے۔ راشد نے مجھے بتایا تھا کہ اگر ہم نے ٹانگے
میں بیٹھ کر اسٹیشن سے گلبرگ جانے کی کوشش کی تو شاید ہم
اگلی صبح ہی پتھیں۔ میں خود کو کہ لاہور سے ایسی صحیح طور پر
آگیا تو نہیں تھا لیکن چند چکر لگنے کے بعد اتنا اندازہ مجھے بھی
ہو چکا تھا کہ کونسا علاقہ کس سمت میں ہے اور کہاں سے کتنے
فاصلے پر ہے۔

باہر آ کر میں نے ایک ٹیکسی تلاش کی جس کا ڈرائیور کھڑکی
میں کبھی ٹکاے اور گھر رہا تھا۔ یہ شخص یا تو کامل الوجود تھا اور اس
کا اندر بھی اسی کی طرح اور گھر رہا تھا یا پھر اس کی خودی بہت بلند
تھی اور اس نے اندر جاکر سواریاں تلاش کرنے کو شان کے
غلاف سمجھا تھا۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ بہت دیر گاڑی چلا
چکا ہو اور اب تھک چکا ہو۔ سر حال وہ آدمی ٹیکسی معلوم ہوتا
تھا میں نے اسے خواب نیم غروش سے جگایا اور گلبرگ چلنے
کی فراہم کی۔ ڈرائیور نے اپنی حیرت کا قطعاً اظہار نہیں کیا
البتہ یہ ضرور بتایا کہ کرایہ میرے کے مطابق نہیں، مرضی کے
مطابق ہو گا۔ اس کی مرضی کے مطابق۔ ہم اس بات کی ذرا
بھی پروا کیے بغیر جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور اسے فوراً

ی کو میری دایلی کی امید نہیں رہی تھی۔

”اب اندر آ جاؤ۔“ ہونٹوں کی طرح کب تک میں کمرے رہو گے؟ بلاخر ذرینہ نے ہاٹوں میں انگلیاں بھرتے ہوئے کہا اور دایلی کے لئے مڑ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں اور اشرف خان بھی بیڈ روم میں پیچھے۔ میں تو جانتے ہی ڈھل بیڈ ڈھیر ہو گیا جس میں ذرینہ کے وجود کی خوشبو چھٹی ہوئی تھی۔ اشرف خان ایک طرف کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ ذرینہ نے پانی سے چمکت اٹھا کر ایک سرگٹ سٹائی اور سٹکار میز کے قریب کھڑی ایک بار پھر کمری نظروں سے مجھے نکلے گئی۔

ہاتھوں پر عجیب سا سکوت طاری تھا۔ ایسا سکوت جس کے دوران سب کے ذہنوں میں سوالات کا سیلاب چل رہا ہوتا ہے اور لفظوں کا لاوا اٹل پڑنے کو بے تاب ہوتا ہے مگر بولنے میں کوئی پہل نہیں کرتا۔

”ذرینہ؟“ میں نے کمری سامنے لے کر کہا اس سے پہلے کہ تم کوئی سوال کرو اور میں اپنی رام کمانی شروع کروں مہترہو کہ تم پہلی کی سی تیزی سے میرے لئے کچھ کھلنے پینے کو لے آؤ۔“

اس نے آنکھیں سے اٹکتی میں سر ہلایا اور باہر چلی گئی۔ میں جس بیڈ پر لیٹا تھا وہ کوئی غیر معمولی بیڈ نہیں تھا لیکن اس وقت مجھے کسی شخص ہونا تھا جیسے میں روٹی کے گالوں سے بنے ہوئے کسی ہنڈولے میں بگورے لے رہا ہوں۔

اشرف خان سگار سگاتے ہوئے بولا ”ذرینہ بے چاری تمہاری فکر میں تقریباً پاگل ہو رہی تھی۔ پہلے تو اسے مجھ پر ٹک رہا کہ شاید میں نے تمہیں غائب کر دیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ محض عورت کی خاطر کسی کے خلاف اس طرح دل میں کینہ رکھنا میری فطرت نہیں۔ پھر جب ذرینہ نے خود مجھے بھی بے پناہ پریشان دیکھا تو اسے بھی میری بات کا یقین آیا۔ وہ سگار کو انگلیوں کے درمیان گھمانے لگا۔ میں نے زور دے کر تمباکو نوش دیکھا تھا جو کبھی سرگٹ پیئے لگتا تھا، کبھی سگار اور کبھی باپ۔“

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”میں نے تمہاری تلاش کے سلسلے میں پولیس میں ریٹ ورنج کرانے کے سوا ہر وہ کوشش کروائی جو میرے بس میں تھی۔ پولیس میں ریٹ ورنج کرانے کا نہ تو کوئی قاعدہ تھا اور نہ ہی ہم جیسے لوگ اس قسم کے چکروں میں پولیس کے سامنے آنے کا خطرہ سول لے سکتے ہیں۔ تاہم میں نے نئی طور پر کتنے ہی جاسوس اور کھتی قسم کے آدمیوں کو شاہانہ خرچ اور گاڑیاں وغیرہ دلوا کر اور ہر وہ ڈالے

طرح سخت ایک ہیں چیلنے میں چاکم ہو کر اور نامکول جیسی چائے حلق سے اتارنے میں کسی قدر کامیاب ہو کر نکلا تو طبیعت پہلے سے بھی زیادہ بد مزہ تھی۔ میں اپنے آپ کو کوسا رہا تھا کہ ان چائے خانوں کی حالت سے واقف ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ میل رکا۔ جیسا اتنی خرابی پروا نہ تھی، تو تھوڑی دیر اور تکلیف برداشت کر کے گھر پہنچ کر ذرینہ کے ہاتھ سے بنی ہوئی کوئی لذت زور گرما گرم خوشبودار کھانی چٹا۔ بے مبری انسان کو عموماً دلیل ہی کرائی ہے۔

تاگلے میں بیٹھ کر میں گھر پہنچا، اس وقت صبح صلاقی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے کل نیل بجائی۔ توقع یہی تھی کہ ذرینہ گیٹ کھولے گی۔ کل نیل بچتے پر ہمیشہ وہی گیٹ پر آتی تھی خواہ وقت کچھ بھی ہو لیکن اس وقت چھوٹا گیٹ اشرف خان نے کھولا مگر اس طرح جیسے اسے اندیشہ ہو کہ گیٹ اگر کچھ زیادہ کھول دیا کوئی سیلاب بنا گھر میں در آئے گا۔ کسی پردے واری بی بی کی طرح اس نے پٹ کی اوٹ سے جھانکا۔ باہر روشنی بہت کم تھی کوئی گھر میرا حلیہ زیادہ ہی شاد ار تھا۔ پہلی نظر میں اس نے مجھے نہیں پہچانا اور درشت لہجے میں پوچھا ”کون ہے؟“

”وہ جو تیرا میک راہوں میں مارا گیا۔“ میں نے آہ بھر کر کہا۔ میری آواز سے اس نے مجھے پہچان لیا اور گیٹ پورا کھولتے ہوئے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر گھسٹ لیا۔ ریلواری میں روشنی تھی۔ گیٹ بند کر کے وہ میرے دونوں بازو تھا ہے چند لمحے تو یوں میرا چہرہ دیکھا رہا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے مجھے سینے سے لگایا حالانکہ میں اس کے اتنا قریب ہونا نہیں چاہ رہا تھا کہ مجھے خود اپنے جسم سے الٹی بو آ رہی تھی جیسے کسی آوارہ اور غلاقت پسند نیل کے جسم سے آسکتی ہے لیکن اشرف خان کو کیا اس کی کوئی پروا تھیں تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی والہانہ تھا جیسے بچپن کا چھڑا ہوا دوست کسی اجنبی دیس میں مل گیا ہو۔ اس کے ظلوں اور گرم خوشی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کی شہر زخمی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد پٹے تھے۔ معلوم یہی ہو رہا تھا کہ میری گشتگی نے اسے بہت پریشان کیا تھا۔

ہمارا اس وقت ختم ہوا تو میں نے دیکھا ”ذرینہ بھی آنکھیں ملتی بیڈ روم کی طرف سے چلی آ رہی تھی۔ وہ اشرف خان کی طرح ملتی تو کوئی بات بھی تھی مگر وہ کینت دو قدم دور ہی رک کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے بھی جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ان دونوں

بھارت میں ایک، محب وطن پاکستانی
کی سرفروشانہ داستان جس نے
پاکستان کی آن کیلئے اپنا سب کچھ قربان
کر دیا اور بھارتی دہشت گردوں کے
ساتھ سیسہ پلائی دیوار بن گیا۔

ٹیڈو سینا کے دہشت گرد

ایم حمید

چار جلدوں میں شائع ہو گئی ہے۔

- ٹاپ سیکرٹ مشن (اول) ۱۵۰/- روپے
- کشمیر کے غازی (دوئم) ۱۵۰/-
- کمانڈو ایکشن (سوم) ۲۰۰/-
- گوکلنڈہ کے مجاہد (چہارم) ۲۰۰/-

ناشر

مکتبہ انصاری، سرکل روڈ، اردو بازار

لاہور، فون: ۶۶۶۸۹۵۸

کہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اپنے ہی ہم پیشہ لوگوں کے ایک گروہ
سے میری پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے جو کلنی عمر سے ٹھنڈی
رہی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا، شاید انہیں ہینک پگنی ہو کہ
مجھے ایک کام کا ساقھی مل گیا ہے اور اس کی وجہ سے میں کچھ
زنی کرنے لگا ہوں اس لئے انہوں نے ہی تمہیں اغوا کر
لیا ہے چنانچہ میں نے ان کے ایک آدمی کو تھوڑے میں کیا اور ایک
دوست کے اڑے پر لے گیا جہاں میں نے اس پر سختی اور تشدد
کے حقیقت انگوائی چاہی لیکن وہ کسی طرح بندشوں سے
آزار ہو گیا اور مجھ سے مقابلے میں اتفاقاً میرے ہاتھوں مار گیا۔
ملا کہ میرا اسے مارنے کا ارادہ قطعاً نہیں تھا۔ اب اس گروہ کو
مکی معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا آدمی میرے ہاتھوں مرا ہے چنانچہ
وہ الگ خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ بھول بھری دشمن پہلے
سے زیادہ شدت سے ابھر آئی ہے۔

”کس کا گروہ ہے وہ؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے
پوچھا ”تم نے پہلے تو اس کا کوئی ذکر نہیں کیا؟“
”پہلے کبھی کوئی موقع ہی نہیں آیا ذکر کرنے کا۔“ وہ بولا۔
ماہر لہجو کا گروہ کھاتا ہے وہ۔ آٹھ دس غاصے خطرناک
آدمیوں کا ٹولا ہے۔ لیجیو ان کا سردار ہے۔ کسی زمانے میں یہ
فلس جو بڑوں اور نسروں سے چھٹیاں پکڑا کرتا تھا۔
”میرا خیال تھا کہ ہماری برادری آپس میں دشمنی نہیں
رکھتی ہوگی۔“ میں نے کہا ”ہم لوگ آپس میں دشمنی کے
مقتل کس طرح ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے پہلے ہی اتنے طاقتور
دشمن موجود ہیں۔ ریجنرل، کسٹم والے، ایکسٹرا والے، پولیس
والے اور نہ جانے کون کون۔“

”ہمارے درمیان لڑائیاں دراصل چھوٹی چھوٹی باتوں پر
شروع ہوتی ہیں جو بڑھتے بڑھتے انا کا مسئلہ بن جاتی ہیں اور
لڑائیاں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مسئلوں
کے درمیان ہوتی ضرور ہیں۔“ اشرف خان نے مریانا لیجے
میں کھلیا ”انسان چونکہ میری رائے میں بنیادی طور پر درندہ
ہے اس لئے لڑائی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ مذہب
بہتوں میں مسلک اور فرقے کی بنا پر، خانہ انوں میں دولت اور
خانہ دار کی بنا پر، پڑوسیوں میں حسد و رقبت اور بے مروتی کی
بنا پر اور کئی طبقوں میں طاقت و اقتدار کی جھینٹا جھینٹ کی بنا پر۔
اُنیکہ کسی نہ کسی بہانے سے انسان کی انسان سے لڑائی چلتی
تھا رہتی ہے۔ ملکوں کے درمیان لڑائیاں تو چلتی ہی ہیں لیکن
مجھ نے ایک ہی شر کے اندر کہیں دو ٹھیکیں بھی ایسی نہیں
دیکھیں جن میں رہنے والے تمام لوگ ایک دوسرے سے

شق، ایک دوسرے سے پار کرنے والے اور باہم سرور ہوں اور بس یہی آج کے انسان کا الیہ ہے.....
 ”یار... خدا کے لئے قلعہ کم جھانڈ۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے گزردی آواز میں کہا، ”اور کام کی بات کرو۔ اس وقت قلعہ مجھ سے ہنسنے نہیں ہو رہا۔ میرے پیٹ میں کلیں ہی چھ رہی ہیں۔“

”میں بتانا یہ چاہ رہا تھا۔“ اشرف خان قدرے کھینچا ہو کر بولا، ”کہ قانون کے مقابلے میں، ہر حال، ہم اسٹیکر لوگ خاصی حد تک خودی ہوتے ہیں۔ اگر ہماری کسی ہم پیش پارٹی کو ایسی صورت حال سے واسطہ پڑ جائے کہ اس کے سامنے اس کا ذاتی دشمن بھی ہو اور قانون کے نمائندے بھی تو وہ پارٹی ذاتی دشمن کے کندھے سے کندھا جوڑ کر قانون کے نمائندوں کا مقابلہ کرے گی۔“

”ہر حال.... یہ تم نے ابھی خبر نہیں سنائی کہ ماٹریلیو کا ٹولہ ہمارا دشمن ہو گیا ہے۔ میں نے ہوئی میں اکثر گپ شپ کے دوران ان لوگوں کا ذکر سنا ہے۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا، ”اور ان تذکروں سے مجھے بھی اندازہ ہوا تھا کہ یہ کچھ زیادہ اچھا، وحشی اور خودخواہ قسم کے لوگ ہیں۔ اسٹیکر سے زیادہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں بلکہ ڈاکوؤں سے بھی کچھ غلیظ سطح کے لوگ.... کیونکہ ڈاکوؤں کا بھی کوئی نہ کوئی ضابطہ اخلاق ہوتا ہے مگر یہ کچھ ماوراءِ آداب و آداب کی چیز ہیں جس کی کوئی ناکندہ نظر آئے تو یہ اپنے ہم پیش لوگوں کی خبری کرنے سے بھی نہیں چرکتے۔ کیا یہ سب کچھ درست ہے؟“

”ہاں.... تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔“ اشرف خان نے دھیمے لہجے میں کہا، ”ہر جگہ، ہر پیشے میں ایسی کچھ کلی، بیہیزس موجود ہوتی ہیں۔ یہ جو تم کبھی کبھار اپنے ہم پیشے بھائی بھندوں کے غیر متوقع طور پر پکڑے جانے کی خبریں سنتے ہو، وہ گرفتاریاں ایسی کلی، بیہیزس کی غداری کی وجہ سے ہی عمل میں آتی ہیں۔ درندہ ہماری برادری میں تشاکل کرنے والے معمولی اسٹیکر سے لے کر بڑے سے بڑے گروہ تک میں خبری کو بہت ہی جج فضل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ماٹریلیو کا ٹولہ کچھ الگ تھلک قسم کی چیز ہے۔ یہ تقریباً ایک ہی جیسی طبیعت کے لوگوں پر مشتمل ایک خاندان ساہن کر رہا گیا ہے۔ ان لوگوں میں بیک وقت لومڑی کی سی مکاری بھی ہے اور بھیڑیے کی سی درندگی بھی۔“

”جب تمہیں یہ سب کچھ معلوم تھا تو میرے خیال میں تم نے ان سے دشمنی کی تجویز کر کے ملالت ہی کی ہے۔“ میں

نے بیڈ پر کٹ لیتے ہوئے کہا۔
 ”دراصل تمہاری اچانک گشتی سے میری عقل خنڈ ہو کر رہ گئی تھی۔“ وہ قدرے شرمندگی سے بولا، ”ہر حال، ہم آگے ہو۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مل کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔“

وہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑا تھا۔ اس لائن میں اس کا تجربہ زیادہ تھا اور مجھے اس لائن میں لانے والا وہی تھا۔ میں نے اس سے اس کی رفتی شب بھی چھین لی تھی اس کے باوجود اس کے غلوں اور اعگوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میری تمام تر کم عمری اور نا تجربے کاری کے باوجود وہ کہتے حوصلے سے میری تقریباً ذات پختہ کی حد کو پہنچی ہوئی باتیں بھی سن لیتا تھا۔ اسے مجھ پر مان بھی کتنا تھا۔ کیسے اپنا بہت بھرے اعگو سے کر رہا تھا، اب تم آگے ہو.... اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مل کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔“ مجھ جیسے تلافی آدی کو ایسے ساخی کا میرا جانا خوش نصیبی نہیں تو اور کیا تھی؟

وہ مکار کا کش لینے کے بعد کہہ رہا تھا، ”تمہاری گشتی سے بہت ہی زیادہ نقصان ہوا۔ جیسے پانی کی طرح بننے لگا، کام ٹھپ ہو کر رہ گیا، جو منصوبے تمہارے ساتھ بنائے تھے وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ظاہر ہے، وہ سب کام اب کٹنی آگے جا پڑے ہیں۔ تمہاری حالت تو کٹنی خراب نظر آ رہی ہے۔ آخر کار ہو گیا تھا، کیا جیتی تم پر؟ میں یہ سب کچھ جاننے کے لئے اب تک جانے کس طرح اپنے جنس کو دبائے بیٹھا تھا لیکن میرا خیال ہے، اب تو شروع ہو ہی جاؤ۔“

”تمیں....“ میں نے کراہ کر کہا، ”ذریعہ کو بھی آجائے دو“ درندہ بعد میں اس کی فرمائش پر یہ داستان غریب جزو دہان شروع کرنا پڑے گی اور مجھ میں اس بے ہودہ داستان کو دہرانے کی ہمت نہیں.... اور ہاں.... دراز ذریعہ کو آواز دو دو گھل گھل گئی۔ میں نے تو اسے ہنگامی طور پر کچھ تیار کرنے کو کہا تھا مگر وہ شاید بکا روٹ کرنے بیٹھ گئی ہے۔“

”تم خود ہی آواز دو دیا۔“ وہ کازج پر گویا کچھ سکتے ہوئے بولا، ”ابنا اب اس پر کوئی رعب نہیں رہ گیا ہے۔“

الفاظ ابھی اس کی زبان پر ہی تھے کہ ذریعہ ایک بڑی سے زے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ زے میں رکھے ہوئے ہر برتن سے بھرا اٹھ رہی تھی۔ اشرف خان نے ایک ہاتھ بیڈ کے قریب کھٹکڑی اور ذریعہ نے زے سے اس پر دھک دی۔ ماما محسوس کر رہا تھا کہ آرام دہ ماحول میں پہنچے ہی میری ہمت یک لخت ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ اب تک میں گویا جوش و خروش،

سے ہنسی آ رہی ہے کہ تمہاری اس دوران کیا درگت بنی رہی ہوگی۔ ”وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر واقعی ہنسنے لگی۔

”یہ بھی دراصل خوشی محسوس کرنے کا ایک انداز ہے۔“

میں نے سنجیدگی سے کہا: ”مجھے خود بھی اب وہ سب کچھ خلصا مسئلہ خیر محسوس ہو رہا ہے۔ انسان جب کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوتا ہے تو جان گلے میں الٹی ہوتی ہے لیکن جب غیر متوقع طور پر اس مصیبت سے نکل آتا ہے تو وہ سب کچھ مسئلہ خیر محسوس ہونے لگتا ہے.... لیکن تم اب یہ کئی کئی بند کرد اور میرے لئے کمزور کا کوئی صاف ستھرا جوڑا نکالو۔ میں شیدیا کر نکل دو کر اور کپڑے بدل کر انسانی جون میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس طرح تو مجھے نیند بھی نہیں آنے گی!“

میرا وہ دن سوئے ہوئے اور رات جاگتے ہوئے گزری۔ اس کے بعد مزید تین دن نہایت غیر محسوس انداز میں گزر گئے۔ آرام، آسائش، عمدہ خوراک، ذرینہ کی قربت اور خدمت گزاری۔ ان سب چیزوں نے مجھے بہت جلد تازہ دم اور پہلے کی طرح توانا کر دیا۔ خرکار کیمپ میں گزرے ہوئے دن مجھے کھلی ایک ناگوار خواب محسوس ہونے لگے۔ میں تو جیسے اس گھر سے کبھی کہیں گیا ہی نہیں تھا۔

پانچویں دن البتہ اس خواب کا علاوہ قدرے شدت سے ہوا۔ اس روز تو اتر تھا۔ میں اور اشرف خٹن ناشتے کے لئے ڈائننگ ٹیبل پر آنے سانسے بیٹھے تھے۔ ذرینہ کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ میں حسب عادت اخبارات الٹ پلٹ رہا تھا جبھی ایک اخبار کے رنگین سٹڑے ایڈیشن کے صفحات پر مجھے ایک ماٹس چہرے کی جھلک نظر آئی۔ میں نے جلدی سے وہ صفحہ اپنے سانسے پھیلایا۔

اس صفحے پر دراصل راشد کی کئی چھوٹی بڑی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ ایک خصوصی فیچر تھا جس کی شہ سرفی تھی۔ راشد خرکار کیمپ سے کس طرح فرار ہوا۔

ایک صفحے کے اس نیچے میں کئی مختصر سیریاں اور ہائی لائنس بھی نظر آ رہی تھیں۔ کہیں لکھا تھا۔ ماٹس کے جگر کوٹے کب تک خرکار کیمپوں میں پہنچائے جاتے رہیں گے؟ کہیں چہ کھنے میں جو اساسی اشیائیں ہٹا کر پوچھا گیا تھا۔ خرکار کیمپوں پر تھون کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا؟

ایک گوشے میں ایک اور سوال منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ بھارا اور بڑوں کے اقواء کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ اس مہذب معاشرے میں جنگل کا تھون کب تک چلے گا؟ مہذب معاشرہ ختم ہوتا، میروں چاہا کہ اخبار بھڑا کر ایک

ردائی میں مصو تیں برداشت کرتا آ رہا تھا مگر منزل پر پہنچنے ہی چھ بجے میں اٹھنے کی بھی بہت نہیں رہی تھی لیکن جون ہی پانچوں، اٹھڑوں، کلن اور نہ جانے کس کس چیز کی خوشبو میرے نچوں تک پہنچی، میری روح بھر جھری لے کر بیدار ہو گئی اور میں اسپرنگ والے گڈے کی طرح ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ پیٹ کا دودھ سرد ہوا تو میں نے ذرینہ اور اشرف خان کو

تفصیل سے بتایا کہ مجھ پر کیا جاتی تھی۔ ذرینہ اس دوران حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اشرف خان بولا: ”کیا تم غریبی ہے.... ہم لوگ موت کا سامنا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن ایسی باتوں کے متعلق ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔“ پھر وہ جھرجھری سی لے کر بولا: ”خیر.... کوئی بات نہیں۔ ہمارے ذرا پاؤں مضبوط ہو جائیں۔ ان خرکاروں میں سے جو بچے کے ہوں گے، ان کے بھی پر بچے اڑا کر آئیں گے۔ چھوڑیں گے نہیں ان فیضوں کو....“

”پر بچے تو ب اڑائیں گے نا جب اس خرکار کیمپ تک پہنچ سکیں گے۔“ میں نے کہا: ”مجھے تو اس کے عمل وقوع کا ذرا ہی اندازہ نہیں۔“

”اوہ....“ اشرف خٹن نے ہانسی سے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا: ”اب تم آرام کرو۔ کم از کم تین چار دن نہیں آرام ہی کرنا چاہیے۔ اس کے بعد بیٹھ کر کاروبار کی بات کریں گے۔“ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ذرینہ کا کچھ سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھی تھی۔ اشرف خٹن کے جانے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھی بدستور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

”تم کیوں دور بیٹھی کسی الوی ملاہ کی طرح تیرے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ جا رہی ہو؟“ میں نے معنوی شکل سے کہا: ”کچھ بول رہی ہو نہ بتا رہی ہو اور نہ حال چال سن رہی ہو۔ کیا تمہیں مطلب ہو کچھ کیا ہے؟“

”مجھے سنا ہے نہیں بلکہ اڑ رہا ہو کچھ کیا ہے۔“ وہ طویل سانس لے کر بولی اور اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھی۔ میں اب کئی بھی چیزیں کسی بھی انسان کو عزیز نہیں سمجھتی اور نہ ہی کسی چیز سے محرومی یا کسی انسان سے چھڑنے کا مجھے ذرا بھی ملال ہوتا ہے مگر تمہاری گمشدگی نے واقعی مجھے حواس باختہ کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے خود اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ کیا میں کسی کے لئے اتنی پریشان ہو سکتی ہوں اور.... اور اب میں نے تمہاری طرف سے صبر کر لیا تھا۔ مجھے امید نہیں رہی تھی کہ تم بالکل ٹوٹے لیکن اب جبکہ تم ٹوٹ آئے ہو تو مجھے اس تصور

طرف پچھنک دوں لیکن محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہائی لائٹس پر نظر دوڑا تاہم ایک سرخی تھی اس رخ بست رات کا قصہ جب ناز و نعم میں پلے ہوئے راشد کے بیروں میں بیڑیاں ڈال کر اسے چارپائی کے ساتھ کسی جانور کی طرح بلانہ دیا گیا۔

ایک جگہ نمایاں لفظوں میں لکھا تھا "سنگلاخ راستوں پر دوڑتے دوڑتے اس کے پاؤں لولہاں ہو گئے اور وہ بھوک پیاس سے بے دم ہو کر گر پڑا۔"

اسی طرح کی دو چار ہائی لائٹس اور تھیں۔ فچر کو سنسنی خیز بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ کٹنی مرے پہلے اخباروں کے خصوصی ایڈیشنوں میں اسی طرح نازی کیبوں سے اتھلی قیدیوں کے فرار کی داستانوں کے ترے چھپا کرتے تھے۔

الحمد للہ کہ آزادی کے بعد ملک اس معاملے میں خود کفیل ہو گیا تھا اور اب اس قسم کی طبعی اود استائیں وافر مقدار میں میسر آنے لگی تھیں۔ اگر اخبارات کو شش کرتے تو ہر اخبار روزانہ ہی اس طرح کی دو چار کہانیاں تلاش کر سکتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ فچر رائٹر نے بڑے جوش و جذبہ سے یہ فچر لکھا ہو گا اور غالباً یہ بھی تصور کیا ہو گا کہ اس فچر کی اشاعت کے بعد کھلی بیچ جائے گی، حکام کے اہل انوں میں زلزلہ آجائے گا، ایک دو دن کے اندر اندر تمام خرد کار کیبوں کا قلع قمع ہو جائے گا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن اگر فچر رائٹر پرانا اور کھاگ ہو گا تو اس نے محض ڈیوٹی پوری کرنے اور اخبار کی اشاعت بڑھانے کی نیت سے فچر لکھا ہو گا۔ جو سوال اس نے اٹھائے تھے ان سب کے جواب اسے خود بھی بخوبی معلوم ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس کے فچر کا رد عمل ارباب اختیار کے حلقوں میں صرف اتنا ہی ہو گا جتنا کسی بڑی سی جمیل میں خاما سکر جھینکنے کا ہوتا ہے یعنی سٹیج پر چند لمحوں کے راز سے پھیلے اور معدوم ہو گئے۔ کل تک اخبار بھی پرانا ہو جائے گا اور بات بھی۔

راشد کی تصویریں بھی بڑے اہتمام سے چھپی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر تو اسی حال میں تھی جس حال میں ہمیں نے اسے اس کے گھر کے قریب چھوڑا تھا۔ باقی تصویریں اس نے غالباً خوب اچھی طرح تیار ہو کر سوٹ پیس کر مائی گا کر اور پوز بنانا کر سمجھوائی تھیں۔ فوٹو گرافر نے اس کی تصویر کشی میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کی یقیناً پوری پوری کوشش کی تھی۔

یہ سب چیزیں گہری نظر سے دیکھنے کے بعد میں نے سرسری نظر سے فچر پڑھا۔

راشد نے عقل مندی سے کام لیا تھا اور واقعات اسی طرح

بیان کئے تھے جس طرح میں نے اسے ہدایت کی تھی۔ تین خرد کاروں کے قتل وغیرہ کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس قسم کے واقعات کے بغیر ہی فچر رائٹر نے فچر میں سنسنی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ فچر نے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ راشد نے سب سے میرا ذکر بھی کر دیا تھا تاہم زیادہ وضاحت سے کام نہیں لیا تھا۔ فچر رائٹر نے اس کے اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح لکھا تھا۔ "میری رہائی میں درحقیقت میری اپنی عقل مندی یا جرأت کو زیادہ دخل نہیں ہے بلکہ اس کا سراسر اہم افضل صاحب کے سر ہے جو ایک بڑے بھائی کی طرح مجھ پر مہربان ہو گئے تھے۔ تمام قیدی لڑکوں میں صرف انہوں نے ہی فرار ہونے کی جرأت کی۔ رات کو انہوں نے ہی پتھر سرسرا کر ہرے دار کو بے ہوش کیا اور میری اور اپنی بیڑیاں توڑیں۔ وہی مجھے اس سرحدی علاقے سے یہاں لا اور میں میرے بچا کے گھر تک چھوڑ کر گئے لیکن وہ اس قدر وضع دار اور کچھ شریلے آدمی تھے کہ انہوں نے میرے گھر والوں کے سامنے آنا بھی گوارا نہیں کیا، مبادا یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ احسان بنانے آئے ہیں۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑ کر واپس لوٹ گئے۔ میں نے ہر حال گھر میں آتے ہی ان کے متعلق اپنے چچا کو بتا دیا تھا۔ میرے ابو بھی کراچی سے لاہور پہنچے ہوئے تھے۔ انہیں جب افضل بھائی کے متعلق معلوم ہوا تو انہوں نے ان کی تلاش میں آدمی دوڑائے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور افضل بھائی جا چکے تھے۔ ہر حال ان کا ایڈریس میرے پاس موجود ہے۔ ہم خود بھی نہ سمجھی جا کر ان سے ملیں گے۔ میں اور میرے گھر والے زندگی بھر ان کے احسان کا بوجھ نہیں اٹا سکیں گے۔ شاید یہ سطور ان کی نظر سے گزریں لیکن ان سے انہیں اندازہ نہیں ہو سکے گا کہ ان کے لئے ہم سب کے دل کس قدر عقیدت، احترام اور احسان مندی سے لبریز ہیں۔۔۔"

وغیرہ وغیرہ۔

میں فچر کی آخری سطر پر پہنچا تو آگے لکھا تھا بقید صفحہ 141 پر۔ میں ابھی وہ صفحہ تلاش کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ زندگی قدرے تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، "کیا اب تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے مجھے کٹنی کاگ تمہارے سر پر توڑنا پڑے گا؟"

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ نہ جانے کب ہاشتا میرے سامنے رکھ چکی تھی۔ اشرف خان نے تو ہاشتا شروع ہی کر دیا تھا اور میری محبت ہی کی وجہ سے وہ منہ چلائے ہوئے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ زریزہ بھی کپ تھامے مصنوعی عقل

کے بارہ زیادہ عقل مند نہیں لگتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں اس نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اور راشد کے مطلق جان کر جس طرح بات کی تھی اس سے وہ مجھے کافی سادہ لوح بلکہ کسی حد تک گاڈی سا لگنے لگا تھا۔ میں نے ایک اندازہ یہ بھی قائم کیا تھا کہ ہنگامی حالات میں معقول فیصلے کرنے اور ان سے نینٹے کی صلاحیت بھی اس میں کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن مجموعی طور پر وہ قابل قدر آدمی تھا۔ اور دوست، ساتھی اور شریک کار کے طور پر تو بہت ہی بے نظیر شخص تھا۔

اس روز سے ہم نے کام شروع کر دیا۔ مالی حالت چونکہ ایک بار پھر کچھ کمزور ہو چکی تھی اس لئے ذاتی کھپ لانے کا پروگرام ہم نے مزید کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا اور آرزو کے کام کی تیاری کرنے لگے۔ چرس کی ایک بہت بڑی کھپ لے جانے اور سونے اور جنلی ولایتی شراب کی ایک کھپ لانے کا کام مل رہا تھا۔

روایتی کی تیاریوں کے دوران اشرف خان نے ایک مرتبہ کہا۔ ”یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس مرتبہ جانے وقت بھی اور آتے وقت بھی کھپ، ہائی جیک ہونے کا سخت خطرہ موجود ہے۔ اگر ایسے کوئی آٹار دیکھو تو جان لڑا لیکن ہائی نہ چھوڑنا ورنہ مال کی مالک پارٹیاں ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں گی اور ہمیں اس دھندے سے بے دخل کر کے چھوڑیں گی اور اگر ہم نقصان پورا کرنے کی کوشش کریں گے تو دیوالیہ ہو جائیں گے لیکن نقصان پورا نہیں ہو گا۔“

”کس کی طرف سے ہائی جیکنگ کا خطرہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ماسٹر لیو کے ٹولے کی طرف سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہائی جیکنگ بھی ان کے کاروبار کا ایک اہم حصہ ہے اور عام طور پر وہ دشمنوں پر یہ دبا بھی آزماتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھا جائے گا۔“ میں نے اپنا جرمین لیوگر صاف کرتے ہوئے کہا۔ یہ ریوالور چھپلے جگر میں ہمیں ہندوستان میں رہائش پذیر ایک افغان نے دیا تھا۔ وہ اس پارٹی کے ساتھ تھامس سے ہم نے مل لیا تھا۔ مجھے اشرف خان نے بتایا تھا کہ شکر گڑھ، چوندہ، چیمب، جوڑیاں اور لاہور کے آس پاس سے وہ شخص یوں سرحد عبور کر آ رہا تھا جیسے اپنے گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا جائے۔ ادھر افغانستان سے ہمارے آزاد علاقوں میں آتا اور دو میل چوڑی اس سرحدی پٹی میں سفر کرتے ہوئے ملک کے کسی بھی حصے میں داخل ہو جاتا یا پھر افغانستان سے تاشقند کے راستے روس

سے مجھے گھور رہی تھی۔ ”آخر ایسی محنت سے تم پڑھ کیا رہے تھے؟“ اشرف خان نے پوچھا۔ میں نے اخبار اس کی طرف بڑھلایا۔ اس نے اخبار میز پر پھیلایا۔ وہ ناشتا بھی کر آ رہا اور فیچر بھی پڑھا۔ اس دوران میں نے بھی ناشتا شروع کر دیا اور فیچر کا تیسرا حصہ بھی تلاش کر کے پڑھ لیا۔ اشرف خان پڑھ چکا تو اخبار اس کے سامنے سے زبردستی اپنی طرف کھسکا لیا۔

”لڑکا تو خاصے دولت مند گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔“

اشرف خان نے سرسری سے لہجے میں تبصرہ کیا۔

”ہاں۔“ میں نے تاکید کی۔ ”مجھے اس نے بتایا تھا کہ اس کا باپ کوئی صنعت کار قسم کی چیز ہے۔ اس کا باقی خاندان بھی کافی آسودہ حال لگتا ہے۔ میں اسے اس کے چچا کی کوٹھی تک چھوڑ کر آیا تھا۔ کافی شاندار کوٹھی تھی۔“

”دیئے تمہیں اس سے اتنی بے نیازی بھی نہیں برتنی چاہیے تھی۔“ اشرف خان سگڑ سگڑ کر بولا۔ اس کے ساتھ باگھر والوں سے مل لینا چاہیے تھا۔ تعلقات استوار ہو جاتے۔ وقت پڑنے پر آدمی کبھی کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

”تم میرے اس وقت کے محسوسات کو نہیں سمجھ سکتے۔“

میں نے ممانعت سے کہا۔ ”میں زندگی میں پہلی بار تین آدمیوں کو قتل کر کے آ رہا تھا۔“ مصیبتوں نے میرا جسم شل اور دماغ ماؤف کر رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ راشد کے گھر پر مجھے بڑے ہجوم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان میں پولیس والے بھی ہوں گے اور اخبار والے بھی۔ میں اپنے اندر اسے لوگوں کا سامنا کرنے کی بہت نہیں پارہا تھا۔ تمہیں تو اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم جیسے لوگوں کے دل میں دیسے ہی چور ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے منہ سے کوئی ایسی دسکی بات نہ نکل جائے یا کوئی دیسے ہی میرے بارے میں کسی قسم کی چٹان بین نہ شروع کر دے۔ جن تین بد بختوں کو میں قتل کر آیا تھا وہ بے شک موت سے بھی بڑی کسی سزا کے مستحق تھے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ کسی کو اس سلسلے میں راشد کی یا میری کسی زبانی تعلقات کی وجہ سے کچھ علم ہو گیا تو بجائے میری دلیری پر مجھے شاباش ملنے کے میری کھٹیا کی نہ شروع ہو جائے۔ بس کچھ اسی قسم کی ہنس میسجوں کی بناء پر میری احتیاط پسندی نے مجھے وہی طور پر گریز اور کنار کشی ہی کا مشورہ دیا تھا۔ ہائی رہا تعلقات استوار ہونے کا سوال۔ تو وہ بعد میں بھی ہو سکتے ہیں، جب یہ سائل پر لانا ہو چکا ہو گا۔“

”ہاں... یہ باتیں تو تمہاری ٹھیک ہیں۔“ اشرف خان نے لہجہ میں سرکایا۔ اب وہ مجھے عمر میں بڑا اور تجربے کا رہنے

سے واپس بھی آگئے۔ حکمت اللہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کسی نے ہمارا ہل ہائی چیک کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ غرضیکہ کوئی بھی قتل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ بس معلومات میں تھوڑا سا نشانہ ہوا اور وہ یہ کہ کبھی کبھار ہمیں راستے میں جو 'تھون پنڈ' قسم کے سرکاری لوگ ملتے تھے انہوں نے رشوتوں کے رٹ کچھ بڑھادیے تھے۔

اس کیپ کا منافع کیش کی صورت میں ہم تک پہنچنے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا۔ اس دوران ہم حسب معمول میٹس و آرام کرتے رہے۔ اس ٹرپ سے ہماری مالی حالت خاصی بہتر ہو گئی اور ہم افغانستان سے 'کاروبار' کرنے کا پروگرام بنانے لگے۔ اس سلسلے میں جن پارٹیوں سے ہماری بات چیت ہوئی ان کا مشورہ یہ تھا کہ اگر ہم ان اطراف میں کاروبار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پشاور میں رہائش اختیار کرنی چاہیے۔ لیکن ہم اپنا اصل اواز 'ہیڈ کوارٹر اور رہائش شہر لوگوت' میں ہی رکھنا چاہتے تھے۔ ہمارا مکان ہی ہمارا 'اڑا' ہیڈ کوارٹر اور رہائش گاہ غرضیکہ سب کچھ تھا۔ اشرف خان تو اس شہر میں خاصے طویل عرصے سے رہ رہا تھا۔ میں خود تھوڑے ہی عرصے میں اس شہر سے اتناوس ہو چکا تھا کہ کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ یہاں بے پناہ سکون بھی تھا اور نہ جانے کیوں بے پناہ تحفظ کا بھی احساس ہوا تھا۔ یہاں ہم اپنے آپ کو کسی پرسکون جیل کی جگہ میں بیٹھے ہوئے کچھوں کی طرح محکوم محسوس کرتے تھے۔ بہر حال ہم پشاور میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک رائج آفس قائم کرنے پر غور کر رہے تھے۔

ابھی ہم اس سلسلے میں انتظامات میں مصروف تھے کہ ایک اور بڑی کیپ کا آرڈر مل گیا۔ یہ کیپ اٹلانٹک آسٹن تھا کہ اس کے لئے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے بعد ہماری مالی حالت مزید بہتر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ہم صرف جن دن کے دھقے کے بعد ہی اس کاروباری دورے پر روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ یک طرفہ تک ٹرپ تھا۔ مال صرف اسپورٹ کرنا تھا۔ کچھ لے کر نہیں جانا تھا۔ حجم کے اعتبار سے یہ بہت چھوٹی سی کیپ تھی لیکن تھی بے حد منافع بخش۔ مال سارا کاسا اشرف خان کی گاڑی میں ہی آگیا تھا۔ چاندی کی سلاخیں تھیں اور مارفین کے انجکشن۔ مارفین کے انجکشن پر لانا دنوں پاکستان میں کسی وجہ سے غیر معینہ مدت کے لئے پابندی لگ گئی تھی اور یہ انجکشن بلیک میں دس پندرہ گنا قیمت پر بک رہے تھے۔ اس کیپ کے ساتھ روسی ساخت کے چلائے بھول کی ایک چھوٹی سی جٹی بھی تھی جو آرڈر دینے والی پاملا

چلا جانا اس شخص کے پاس ہاتھ کا کام تھا۔ وہ آج کہیں ہوا تھا اور کل کہیں۔ سرحدی راستوں اور ان کے چور و اڈوں پر وہ شخص اتھارٹی تھا۔

اشرف خان کی رائے میں وہ بہت ہی کام کا آدمی تھا اور اشرف خان اس سے تعلقات بڑھانے کا سخت خواہش مند تھا لیکن اس سے ملاقات شہر و دوری ہوتی تھی اور اس کا رویہ ہم جیسے اسکول کے بچوں سے ہوتا ہے۔

مجھ سے مل کر اور تھوڑی دیر باقی کر کے وہ نہ جانے کیوں بہت خوش ہوا تھا۔ انڈین علاقے کے ایک کھنڈر میں ہماری محفل جی تھی۔ چپے پلانے کا دور بھی چلا تھا۔ یہ کھنڈر بڑے کام کی جگہ تھی۔ آئے دن یہاں معلوم نہیں کس کس کی محفلیں جسنی تھیں۔ عموماً یہاں کونوں کھدروں میں تھروں اور اینٹوں تلے کسی ایک پارٹی کے دوسری پارٹی کے نام چھوڑے ہوئے رشتے وغیرہ بھی ملتے تھے۔ ان تحریری بیانات کو وہ پارٹیاں خود ہی سمجھ سکتی تھیں۔

میں اس شخص حکمت اللہ تاجک نے کسی بات پر تنک میں آکر مجھے یہ نالیوگر تھنڈا دیا تھا حالانکہ میری نظر اس کے مشین پمپل پر تھی۔ وہ چھوٹے سائز کا بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی کام کی چیز تھی۔ میں نے انہیں اور ٹکلف کو بلائے طاق رکھتے ہوئے اس کے لئے دست سوال دراز بھی کر دیا تھا مگر اس نے نہایت شائستگی سے انکار کر دیا تھا حالانکہ میں نے قیمت کی بھی پیشکش کر دی تھی۔

حکمت اللہ جو فارسی، پشتو، اردو، انگریزی، روسی اور تین چار دوسری علاقائی زبانیں روانی سے بولتا تھا مجھے بتانے لگا تھا کہ وہ مشین پمپل اس کے پاس کافی عرصے سے ہے اور بہت ہی وفادار، ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ اس سے اسے ایک ہندوستانی سالگا محسوس ہونے لگا ہے اس لئے وہ کسی بھی قیمت پر نہیں دے سکتا البتہ وہ کوشش کرے گا کہ اسے کسی پکڑ میں ملاقات کا امکان ہو تو وہ ویسا ہی ایک اور مشین پمپل میرے لئے لیتا آئے گا کسی کے ہاتھ بھجوا دے۔

اس پکڑ میں حکمت اللہ تاجک سے ملاقات ہونے کی سوہوم سی امید تھی۔ جس پارٹی سے ہم ملنے جا رہے تھے اس سے اس کی خاصی دوستی تھی اور کبھی کبھار اگر وہ انڈیا میں ہوا تھا تو ان کی 'اعزازی سرپرستی' کی غرض سے ان کے ساتھ چلا آتا تھا۔

دوسری رات ہم صبح پر روانہ ہوئے اور تیسری رات خیریت

تاریخی ناول

خالد بن ولید	الماس ایم۔ اے۔/200
سلطان نیچہ شہید	الماس ایم۔ اے۔/200
نواب حیدر علی خان	الماس ایم۔ اے۔/200
سلطان صلاح الدین ایوبی	الماس ایم۔ اے۔/450

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

تینوں بھائیوں کے آدمی مربوط ہو کر ام کے تحت چھاپا مارنے میں آ رہے ہیں۔ میرے بھائی کا کہنا ہے کہ اسے اطلاع دینے میں بھی تاخیر ہو گئی ہے۔ وہ لوگ اب میں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس مرتبہ رشوت سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی لمبا ہی چکر ہے۔ اور سے دباؤ بڑا ہے۔ ہمارے تمام رابطے اور ذرائع دریافت کر لئے گئے ہیں اور کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ مجھے حیرت یہ ہے کہ کس قسم والوں کو تو۔۔۔ خطاب اس شہر کے وجود کا بھی علم نہیں تھا۔ چہ جائیکہ عمار اٹھکانہ۔ آخر وہ کس طرح یہاں تک آ پہنچے؟ اور پھر اس طرح چھاپا چیسے ہم بہت ہی بڑے۔ بہت اونچے درجے کے اسلگر ہیں۔“

”اب یہاں کھڑے سوچ بچار ہی کرتے رہو گے یا نکل جائیں گی فکر بھی کرو گے؟“ میں نے تیزی سے کہا۔

”ہاں۔ میں اپنی کچھ چیزیں لے لوں۔“ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ اسی لمحے باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی اور پھر گیت دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ دھڑ دھڑانے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ گیت چند لمحوں بعد قبضے سے اٹھ کر فرش پر آ رہے گا۔

اشرف خان چند لمحوں بعد اپنے کمرے سے صرف ایک بریف کیس اٹھائے دوڑا ہوا نکلا۔ اس وقت تک میں بھی خواب بگھڑے اپنا روبرو ڈھل لایا تھا۔ اور اسے میں نے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ میری کچھ میں نہیں آیا تھا کہ مجھے اور کیا لینا چاہیے تھا۔ میرے پاس اور تھا ہی کیا؟

اسی لمحے میں نے گیت دالی دیوار پر ایک شخص کا سر نمودار ہوتے دیکھا۔ انہوں نے دیوار بچا کر اندر آنے کے لئے چھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شخص جسے میں لوہے چڑھتے دیکھ رہا تھا بائیں ہاتھ سے دیوار پر گرفت رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس

نے نہ جانے کس متعدد کے تحت منگوئی تھی۔ ہم عام طور پر جس قسم کا بل لاتے اور لے جاتے تھے یہ کپ اس سے ذرا مختلف تھی۔ اور ہمارے ٹرپ بھی غیر معمولی طور پر خوشوار اور آسان رہا تھا۔ بل ہمیں ایک دودن کے لئے اپنے بل گیراج ہی میں رکھنا تھا۔ بل کی وصولی کے لئے ایک شخص کو لاہور سے آنا تھا اور ایک قسم کے کوڈورڈ کے ذریعے اپنی شناخت کرا کے ہمیں ہماری رکم کی ادائیگی کر کے بل لے جاتا تھا۔

جس روز ہم بل لے کر آئے اس روز بہت خوش تھے۔ شام کے کھانے سے پہلے پہلے پلانے کا دور چلے لگا۔ کھانوں پر ہم اپنی جمع پونجی اور متوقع رقم کا حسب کتاب کر کے انوشٹ کا طریقہ کار طے کر رہے تھے۔ ہمارے بیشتر کام برآمدہ میں بڑی ہوئی ڈاننگ نیٹیل پر ہی ہوتے تھے۔ ذریعہ ایک طرف نیٹیل لاشٹکی سے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ دھنسا نیٹیل کی کھنٹی بجی۔

ذریعہ اشخی اور کوٹے میں تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ میں نے گھاس میز پر رکھ دیا اور بغور ذریعہ کو دیکھنے لگا جو ریسیور اٹھا کر کان سے لگا رہی تھی۔ اشرف خان شاید کسی اور سوچ میں گم تھا۔ وہ سگڑ کے کش لیتے ہوئے نیم آنکھوں سے برآمدہ کے ایک ستون کو گھور رہا تھا۔ ہم نے ابھی بہت کم بلی تھی لیکن سرور محسوس ہونے لگا تھا۔ سرور شاید ہمارے اندر سے بھوت رہا تھا۔

ذریعہ نے صرف چند لمحوں کے لئے کچھ سا پھری۔ ”ایک سیکنڈ بولڈ کیجئے۔ میں ابھی بات کرتی ہوں۔“

اس نے ٹیلی فون سینٹ اٹھا کر اشرف خان کے سامنے ڈاننگ نیٹیل پر لا رکھا اور ریسیور اسے تھماتے ہوئے بولی۔

”ہمارے بھائی کا فون ہے۔۔۔ نہایت اہم ہنگامی قسم کا پیغام ہے۔“ اشرف خان ایک دم سیدھا ہوا کر بیٹھ گیا۔ ریسیور اس نے

ذریعہ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ”ہیلو۔“ کہتے ہی وہ خاموش ہو گیا اور پوری توجہ سے دوسری طرف سے بولنے والے کی بات سننے لگا۔ میں نے ہوا میں خطرے کی بو محسوس کر لی تھی اور میرے اعصاب میں تھڑ سا آگیا تھا۔

دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اس نے خاصی طویل بات کی باختر اشرف خان نے ریسیور کرپٹل پر چٹا دیوں اٹھ کھڑا ہوا دیکھ کر ہی میں لگے ہوئے کسی طاقتور امیر گیت نے اسے اچھل دیا۔ میں اس سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ نہایت بدحواسی سے بولا۔ ”پولیس، کسٹم اور ایکسائز۔۔۔“

موجود تو نہیں۔ عین ممکن تھا کہ مکان کو گھیرے میں لے لیا گیا ہو۔ مگر اس طرف کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ قد آدم گھاس بھی ساکت تھی اشرف خان نے باہر قیاب میں چلا گیا لگ بھگ زبرد کے خیال کو بلائے طاق رکھتے ہوئے میں بھی اس کے پیچھے کود پڑا۔ سم زدہ کچی زمین کی پٹی عبور کر کے ہم قد آدم گھاس میں کھڑے ہو کر دوڑتے چلے گئے۔

وقتاً میں نے ایک گونج وار آواز سنی۔ غالباً کوئی میکانیون پر بول رہا تھا "اشرف خان! ابھانے کی کوشش! فضل ہے... اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرو۔ تمہارے ساتھ نری بری جائے گی۔"

اتفاقاً خیر مجھے بھی اندازہ تھا کہ جن ٹھکوں سے ان لوگوں کا تعلق تھا ان سے کس قسم کی نری کی توقع کی جاسکتی تھی جب کہ ان کے ایک آدمی کی کھوپڑی بھی میرے ہاتھوں اڑ چکی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے گھاس سے سر ذرا نکال کر مڑ کر دیکھا۔ خواب گاہ کی جس کھڑکی سے ہم کودے تھے اس میں دو آدمی آویسے دھڑے لٹے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں میکانیون تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ریو اور۔ کھڑکی میں صرف دو ہی آدمیوں کے لئے کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ باقی لوگ شاید ان کے پیچھے تھے۔ ہمارے دوڑنے سے گھاس بری طرح ہل رہی تھی اس لئے انہیں جیتا جیتا تو اندازہ تھا کہ ہم کھانا ہیں اور کس طرف دوڑ رہے ہیں لیکن انہوں نے ہمارا انتخاب ابھی تک شروع نہیں کیا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ شاید ابتداء ہی میں میرے ہاتھوں اپنے ایک ساتھی کے بارے جاننے کی وجہ سے وہ کلائی محتاط یا شاید خوف زدہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے غالباً تین سیکنڈ انتظار کیا اور جب ہمیں رکتے نہیں دیکھا تو ریو اور والے نے ریو اور چوکھٹ پر ٹکا کر اور قدرے جھک کر فائر کیا۔ کبشت ریو اور کیا تھا گویا پھولنی کا توپ تھی۔ دھماکے سے میرے کان جھنجھٹا اٹھے۔ غیبت غا کہ اس وقت میں پیچھے مڑ کر دیکھ چکا تھا اور اس شخص کے پوزیشن لیتے ہی پہلو کے مل گھاس میں گر چکا تھا۔

اشرف خان البتہ اپنی دو میں رکوع کی سی حالت میں اور ناک کی سپاہ میں دوڑا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے میں گولی کو دیکھ کر نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ضرور ہو گیا کہ گھاس کو چھلنی ہوئی وہ وہاں سے گزری تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اشرف خان کو لڑکھاتے دیکھا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں مزید فائرنگ کے قوی امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ کر اشرف خان کی طرف پکا لپکا

کے دائیں ہاتھ میں ریو اور تھا۔ جیسے ہی وہ کچھ اور اوپر ہوتا اس کے لئے ہمیں نشانہ بنانا ذرا بھی مشکل نہ ہوتا کیونکہ ہم گویا کھلے میدان میں کھڑے تھے۔ اور شاید اشرف خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ فرار کی کوشش کرے، مقابلہ کرے یا گرفتاری دے۔

چنانچہ میں نے ایک سیکنڈ کے براہ میں جسے میں فیصلہ کیا اور ریو اور نکال کر دیوار پر چڑھتے ہوئے شخص کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ابھرتا ہوا سر دیوار پر سے تائب ہو گیا۔

اس وقت تک اشرف خان غالباً فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور خواب گاہ کی طرف دوڑا۔ زبرد کی طرف اس کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ میں نے مڑ کر ایک نظر زبرد کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپید پڑ چکا تھا اور وہ دانش مین کے قریب کھڑی بھیڑیوں کے نرے میں گھری ہوئی ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

کوئی اور موقع ہو تا تو شاید اس کی اس کیفیت پر میرا دل خون ہو جاتا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس وقت اپنی جان کے تحفظ کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم معلوم ہو رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اشرف خان کی فکر کی جاسکتی تھی جو اپنے ہاتھ بیڑوں اور اپنی ہمت کے بل پر ساتھ دوڑ سکتا تھا۔

"آؤ زبرد... جلدی آؤ۔" میں نے ہاتھ ہلا کر مٹھی مٹھی آوازیں کہا۔ اس نے متذہب سے انداز میں قدم اٹھایا۔ اس کی قوت فیصلہ جو اب دے چکی تھی۔ موت یا کسی اور سنگین خطرے سے خوفزدہ ہو کر دوڑنا جہلی اور فطری سی بات ہے۔ لیکن اس وقت وہ جہلی روٹا نکال ظاہر کرنے سے بھی قاصر تھی۔ اس نے دو لمبے لمبے ڈگ بھرے پھر فرش پر پڑی ہوئی کسی چیز سے الجھ کر گری۔ شاید وہ کوئی برتن تھا اور اس کے اپنے ہی ہاتھ سے گرا تھا۔

زبرد گری تو دوبارہ اٹھ نہیں سکی۔ ہم اس وقت تک خواب گاہ میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر زبرد کا انتظار کرنا چاہا لیکن اسی لمحے گیت کی طرف سے گولی پھینکنے کی آواز آئی۔ گولی غالباً کسی ڈانگک جیٹر سے فکرائی تھی کیونکہ میں نے کھڑکی کے پرچے اڑنے کی آواز سنی تھی۔

اس وقت تک اشرف خان بھی کھڑکی کھول چکا تھا۔ اس طرف بھی دو درودر تک جھاڑ جھنکار پھیلے ہوئے تھے۔ اشرف خان اندھا دھند باہر چھانک لگا لگا۔ لیکن میں نے ایک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور پہلے باہر جھانک کر اطمینان کیا کہ لڑھکر کوئی

عالمی ہماری ٹانگوں میں گولیاں مارنے کی کوشش کی تھی۔ ان گلیوں کا فرش اینٹوں کا تھا۔ اینٹوں کے ٹکڑے اڑ کر مجھے اپنے جسم سے ٹکراتے ہوئے محسوس ہوئے۔ روشنی کی سیدھ میں نہ ہونے کی وجہ سے ہم بیل بیل بچ گئے۔ البتہ اشرف خان یکدم داہیں مڑنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا۔ قیمت تھا کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہی تھا ورنہ اگر وہ ایک بار گر جاتا تو اسے اٹھانے کے لئے رکنا عالمی ہم دونوں کی موت کا باعث بنتا۔

اشرف خان کی کیفیت اس وقت کیا تھی اس کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا لیکن اپنے بارے میں اس وقت یہ محسوس کر کے مجھے خود بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میرے حواس معمول سے کچھ بہتر طور پر ہی کام کر رہے تھے۔ میں قطعاً بد حواس نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دردندوں کے حواس اس وقت زیادہ مستعد ہو جاتے ہیں جب وہ مصیبت میں ہوتے ہیں۔ انسان بھی میرے خیال میں بنیادی طور پر کلنی حد تک دردند ہی ہے۔ البتہ شہری زندگی اور جدید تمدن نے اس سے دردندوں والے پیشرو اوصاف اور اچھی خصوصیات چھین لی ہیں اور ان کی جگہ زیادہ بری خصلتیں بھر دی ہیں۔ اشرف خان لظوظات ہونے کے نامے خدانے اسے جن اعلا خوبیوں سے نوازا تھا اور جن کی برد سے اس کی دردنگی کو دلیا گیا تھا وہ کلنی تیز رفتاری سے معدوم ہو رہی ہیں۔

میں اشرف خان کا ہاتھ تھامے اس طرح گھوما کہ روشنی کی زد میں نہ آنے پاؤں۔ جپ گلی کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ اس نازک لمحے میں بھی میں ان لوگوں کی غلطی کا تجزیہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ گلی میں کوئی خاص روشنی نہیں تھی، اگر لوگ خاموشی سے چند سیکنڈ اور انتظار کر لیتے اور ہیڈ لائٹس آن نہ کرتے تو ہم اپنی جھونک میں کم از کم گلی کی وسط میں پہنچ چکے ہوتے۔ اس وقت اگر وہ لائٹس آن کر کے فائرنگ کرتے تو ہمارے بچنے یا واپس بھاگنے کے امکانات بہت کم ہوتے لیکن انہوں نے بے جہری اور حکمت عملی کی کمزوری کا مظاہرہ کیا اور ہمارے گلی میں قدم رکھتے ہی ایکشن میں آ گئے۔

فائر دوبارہ کسے گئے۔ عالمی اور دیو اور لوہا ایک رانٹل استعمال کی جا رہی تھی۔ ہم اس سے قتل ہی ہم گلی کا موزو مڑ چکے تھے۔ دوڑتے ہوئے ہم دوسری گلی میں داخل ہوئے۔ اشرف خان عالمی ٹانگ کی سیدھ ہی میں دوڑتے رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ جپ ہمارے نقاب میں آئے گی جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ ایک بار پھر ہمیں سانسے سے آکر پکڑنے کی

برائی لک بچنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر بری طرح لگڑتا ہوا ایک بار پھر دوڑنے لگا۔ مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ اسے کوئی لگ بچنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ اسے کوئی لگ بچنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

انٹی کے بعد بھی بہت سے فائر کئے گئے لیکن گولیاں ہمارے قریب سے گزرتی رہیں۔ گولیوں سے بچنے کے لئے ہم ممکن حد تک حکمت عملی سے بھی کام لیتے جا رہے تھے۔ اشرف خان کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی ایک پرکٹ سے ذرا نیچے پتلون پر ایک سرخ لکیر پھیل چکی جا رہی تھی۔ گولی بارود بری طرح لڑکھڑکیا لیکن دوڑتا رہا۔ پتا خرم میں نے اس کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ تھاما اور ہم شانہ بشانہ دوڑنے لگے۔ اس طرح ہمارے گولیوں کے زد میں آنے کا امکان زیادہ ناکر جانے کیوں ہم پر اب فائرنگ نہیں کی جا رہی تھی۔ بارودوں کی ریش سے تو ہم شکل آئے تھے لیکن ان لوگوں کے ہاں یقیناً بڑی ریش کے ہتھیار بھی ہوں گے۔ جانے کیوں انہوں نے ایسا کوئی ہتھیار استعمال نہیں کیا تھا ورنہ ہی کوئی اسے نقاب میں آتا دکھائی دیتا تھا۔

اندرا پھیل چکا تھا اور ہمارے عقب میں جیسا سکوت چھللا اور آغاس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ اپنے ایک ساتھی کی موت سے خوب زدہ ہو گئے تھے اس لئے اندھیرے میں اسے نقاب میں نہیں آ رہے تھے یا پھر ہمیں گھیرنے کے لئے وہ کوئی حکمت عملی اختیار کر رہے تھے۔

ہم اس قطعہ اراضی پر تین گھنٹے رخ بھاگ رہے تھے۔ جو گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ اس طرح ہم ایک چھوٹی سی سڑک کے کنارے تک پہنچ سکتے تھے جس کے دونوں طرف خالی مکانات تھے۔ اگر ہم بخیر ہفت اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب جاتے تو آبادی کی کچھ بھینٹوں میں گم ہونے کی کوشش کرسکتے تھے بشرطیکہ کسٹم یا پولیس وغیرہ کا کوئی آدمی ہم سے بڑی سیج راستے سے چکر لٹ کر وہاں ہمارے استقبال کے لئے موجود نہ ہوتا۔

میرا اندیشہ بے جا نہیں تھا۔ گھاس سے نکل کر اور کچے سے گزرا کر جب ہم قدرے بلندی پر پہنچے تو ایک چھوٹی سی سڑک پہنچے اور اس کے ایک کنارے پر پھیل ہوئی چھوٹی چھوٹی گلیں تھیں۔ ایک میں ٹھہرنے لگے تو اچانک ہی سامنے سے تیز لائنیں نمودار ہوئی۔ وہ عالمی کوئی جپ تھی جس کی ہیڈ لائٹس لہنگی سی آن کی گئی تھیں۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم صحیح فوڑے روشنی کی زد میں نہیں آئے تھے۔ ہیڈ لائٹس آن کرسکتے ہی ایک ساتھ کئی فائر کئے گئے۔

کوشش کریں گے اور اگر وہ ہمارے عقاب میں بھی آتے تب بھی ہمارا محض دوڑتے رہنا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ جیسے آگے آگے ہم کب تک دوڑ سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ اشرف خان دشمنی بھی ہو چکا تھا۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم انہیں پکڑ دے کہچہ منٹ کی مسلت حاصل کرتے اور پھر کسی ایسی سمت میں نکلنے کی کوشش کرتے کہ وہ لوگ الجھن میں پڑ جائے اور کوئی فیصلہ نہ کر پاتے کہ ہم کدھر گئے ہوں گے۔ اگر ہم انہیں پکڑ دینے کے لئے اسی گلی میں کہیں مقاب ہو جاتے تو اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ لوگ صحیح نتیجہ اخذ کر لیتے کہ ہم یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں اور یہ بھی یقین ممکن تھا کہ وہ سمجھتے ہم آگے اور کسی گلی کی طرف نکلے ہیں۔

شہزاد کوٹ ایک چھوٹا شہر تھا۔ شام گہری ہوئی ہی یہاں گلی کوچوں میں دیرانی چھانے لگتی تھی۔ تین چار جو بڑے بازار تھے ان میں البتہ رات گہری ہونے تک رونق رہتی تھی۔

ایک عسرت زدہ سے مکان کا دروازہ مجھے کھلا نظر آیا۔ دروازہ سا فوڑوہ، بے پتھر مگر اب بھی مضبوط نظر آتا تھا۔ دروازہ ایک کشادہ راہداری میں کھلتا تھا جس کے وسط میں تار کے سرے پر چھوٹا سا ایک زرد بلب لٹکا ہوا تھا جس کے پس منظر میں کڑی کے جالے بھول رہے تھے۔

راہداری میں ایک طرف دو دروازے نظر آ رہے تھے جن پر بھاری تالے پڑے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہنگے دار چوٹی زینہ لوہے چارہا تھا۔ راہداری کے دوسرے سرے پر ڈیپے کے عقب میں اگر مکان کے نچلے حصے کا دروازہ تھا تو وہ نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ وہاں تک روشنی کی رسائی نہیں تھی۔ میں اشرف خان کا ہاتھ پکڑ کر اسی مکان میں گھس گیا۔ مکان میں قدم رکھنے ہی میں نے سب سے پہلے قاشرف خان کی پشت بلب کی طرف کرتے ہوئے یہ جائزہ لیا کہ اس کے جسم سے خون چھتا تو نہیں آ رہا۔ خون کے دھبے ہمارا سراغ دے سکتے تھے۔

پشت پر اس کی پتلون خون میں بھیج گئی تھی اور دائیں ٹانگ پر خون چھلتا ہوا آ رہا تھا لیکن ابھی پتلون میں ہی جذب ہو رہا تھا، زمین پر چپکنا شروع نہیں ہوا تھا تاہم یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ غلبہ پتلون کی کم از کم ایک ٹانگ ضرور تر ہو جائے گی اور پھر خون زمین پر چھپنے لگے گا۔

اس طرف سے وقتی طور پر مطمئن ہو کر میں نے دو قدم آگے بڑھ کر اچھل کر اس چھوٹے سے بلب پر رونق اور کا دست مار کر اسے توڑ دیا جو اس راہداری میں بھاری روشنی پھیلائے

ہوئے تھا۔ پھر میں نے دروازے کی بھاری کنڈی چڑھائی اور اشرف خان کا ہاتھ پکڑ کر چوٹی میڑھیاں چڑھنے لگا۔ اشرف خان کو میڑھیاں چڑھنے میں کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ دو تین مرتبہ تو وہ بے ساختہ کرہ اٹھا لیکن آدمی حوصلے والا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہونا شاید اب تک گر چکا ہو۔

میں لوہے ہتھکڑیاں سے ہی ایک کمرے کا بڑا سادہ دروازہ کھلا کر آیا۔ کمرے میں خاصی تیز روشنی تھی۔ سامنے ہی دروازے ساتھ لوہے کا ایک بڑا سا پنگ تھا جس پر ایک گھریلی سی عورت دس بارہ سال کے ایک لڑکے کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ دونوں ہی کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں اور وہ خوف زدہ نظموں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے قریبی گلی میں چند لمحے قبل ہوئے والی ہڈیوں کی آوازیں اور پھر اپنے مکان کی گلی حویلی سے ہماری آمد کا شور سن لیا تھا۔ وہ عاتلہ پڑا تھے۔ خوف کے مارے شاید ان میں اپنی جگہ سے ہلنے کی کج سکت نہیں رہی تھی۔

میں سیدھا کمرے میں جاگسا۔ روبرو میرے ہاتھ میں عورت نے پیچنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ لڑکا اس سے چپٹ گیا۔ میں نے روبرو سے عورت کو ڈرانے کے بجائے روبرو جیب میں رکھ لیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ عورت کے خوف میں اضافہ ہوا تو شاید یک

لخت اس کے حلق سے فلک شکاف فتح بلند ہو جائے۔ میں نے ان کے قریب جانے کی جہی کوشش نہیں کی اور نہ ہی درشت اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا۔ میں نے فی الامکان شیریں لہجے میں اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن جتنی دور سے ہم دوڑتے ہوئے آ رہے تھے اور جی طرح ہانپ رہے تھے اس کی وجہ سے مجھے اپنے لہجے میں بڑا پیدا کرنے میں خاصی وقت پیش آئی۔

”ہن!“ میں نے جلدی سے کہا، ہم سے ٹھہرانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم چور، ڈاکو وغیرہ نہیں ہیں۔ ہماری ذات سے تمہیں یا تمہارے بچے کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ صرف دشمنی کے پیکر میں کچھ بد معاش اور کچھ پولیس والے ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں..... ویسے ہم شہر آدمی ہیں..... تمہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں..... خدا کے لئے شہر مت کرنا ورنہ مجبوراً ہمیں سختی کرنی پڑے گی۔“

البتہ نے دھمکی سے بھر اثر دکھایا۔ عورت کے چہرے ع عضلات جو بری طرح سکھنے ہوئے تھے، کچھ ڈھیلے پڑنے لگے

تاریخ کے نامور مصنف

سید راہی

کے ایمان افروز قلم سے ایک

نوجو صورت تحفہ

ایم اے

جسمیں حضرت آدم علیہ السلام
سے لے کر خاتم الانبیا حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
تک دنیا کی مکمل تاریخ پیش کی
گئی ہے۔



آپ کی ذاتی لائبریری کیلئے ایک انمول اور مستند اضافہ
جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
نوجو صورت سرورق، بہترین کتابت و طباعت
پانچ ہزار صفحات پر مشتمل،

مکمل بیٹ سات جلدوں میں دستیاب ہے اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں!

— ناشی —

مکتبہ القریش، سرکل روڈ، اردو بازار، لاہور۔ ۲

فون: ۷۶۶۸۹۵۸

حتیٰ کہ لڑکے پر بھی میری بات کا خوشگوار اثر ہوا تھا۔ عورت نے شوک نگل کر گہری سانس لی اور جیسی پیشی سی آواز میں بولی۔
”کیا چاہتے ہو تم....؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے ملاحت سے کہا۔ بس تم خاموش بیٹھی رہنا اور کوشش کرنا کہ تمہارا بچہ بھی کوئی آواز نہ نکالے خواہ ہم یہاں کچھ بھی کرتے پھر اس اور خواہ تم باہر کسی کو کچھ بھی کہتے سنا۔“

قریبی دیوار پر مجھے سوچ بورد نظر آیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سوچ آف کر دیا۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ میرے اندازے کے مطابق پورا مکان ہی تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ مکان کا پچھلا حصہ غائب گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہوا میں پاز، چاول اور چند دوسری چیزوں کی ٹلی جلی ہو چکی ہوئی تھی۔ اوپر کی منزل پر بھی اگر کوئی اور کمرہ پر استعمال تھا تو اس وقت وہاں روشنی نہیں تھی۔

اس کمرے میں گلی کے رخ پر بھی تین عمرانی دروازے بنے ہوئے تھے جن میں پٹ نہیں تھے۔ ان دروازوں سے آگے خاصی لمبی بالکونی تھی جو گلی کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ اس بالکونی پر چھین پڑی ہوئی تھیں۔

اشرف خان ابھی تک بری طرح ہاتھ رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی آواز کسی لمی کی خرخراہٹ سے مشابہ محسوس ہورہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مجھے کہیں دور سے کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ یقیناً یہ اسی جیب کی آواز تھی جس میں موت کے ہرکارے ہماری تلاش میں پھر رہے تھے۔ جیب کبھی ست رفتار سے آگے جاتی ہوئی محسوس ہورہی تھی اور کبھی اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پیچھے آ رہی ہے۔ وہ لوگ یقیناً بری طرح ہماری تلاش میں سرگرداں تھے اور کسی صورت بھی یہ ہم ترک کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

چند لمے بعد میں نے جیب کی آواز زیادہ قریب آتے محسوس کی۔ شاید وہ لوگ بہت سی گلیوں میں ایک سرے سے جھانکنے کے بعد واپس آ رہے تھے۔ اشرف خان کا ہاتھ اب تک میرے ہاتھ میں تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے جسم میں ایک عجیب سا ارتعاش آچکا ہے۔ وہ یوں مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا کہ اسے خطرہ ہو کہ ہاتھ چھوڑا تو گر پڑے گا۔

”تم بھی اسی آہنی پلک پر ایک طرف کو بیٹھ جاؤ۔“ میں نے نام لے کر بغیر اشرف خان کو مخاطب کیا۔

”میں.... میں بیٹھ نہیں سکوں گا۔“ وہ مرتعش اور بوجھل آواز میں بولا۔ میں شاید صرف لیٹ سکتا ہوں۔ وہ بھی اندر چلا پہلو کے بل۔“

”ٹھیک ہے۔ تم لیٹ جاؤ۔ میں ذرا بالکونی سے گلی میں بیٹھوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا پھر میں نے غمایت لپ، احترام اور ملاحت سے عورت کو مخاطب کیا۔ بھائی! اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو اپنے بچے کو لے کر اوپر دیوار کے ساتھ چلا ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ ہم بس آپ کو کچھ دیر تھکا دیں گے۔“

اس عورت نے یقیناً سوچا بھی نہیں ہو گا کہ کبھی دو تہوں اس حالت میں کہ ان میں سے ایک زخمی ہو گا اور ایک ریوالت بدست، درانہ دار اس کے مکان میں کھینیں گے، پولیس اس کے نقاب میں ہوگی مگر وہ اس کے ساتھ اس قدر تذبذب شاعستگی سے پیش آئیں گے۔

”ہم دوسرے کمرے میں چلے جائیں؟“ اندھیرے میں عورت کی سرگوشی ابھری۔ میں نے اس آواز میں اشتیاق کا جھلک محسوس کی۔ اب میں اس پر اس حد تک بھی اعتماد کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اسے اس کے مکان کے دوسرے کمرے میں جانے کی اجازت دے رہا جس کا حدود اور انداز مجھے معلوم نہیں تھا۔

”نہیں... اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے بدست ملاحت سے کہا۔ اندھیرے میں دو پہلوں کی حرکت سے گم نے اندازہ کر لیا کہ میں بیٹا کرسی پر منتقل ہو گئے ہیں جب میں نے اشرف خان کو پلک پر لالچا۔ اس وقت تک جیب کی آواز اندازاً ہونے لگا تھا کہ وہ گلی میں داخل ہو چکی ہے۔

میں بچوں کے بل چلا ہوا بالکونی میں پہنچا اور جتنی اٹھائے بغیر اس کے عقب سے گلی میں جھانکنے لگا۔ ریوالت ایک بار میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ جیب واقعی گلی میں آ رہی تھی۔ ان کی رفتار نیچے کی حد تک کم تھی۔ جس سرے سے وہ گلی میں داخل ہوئی تھی صرف اسی طرف دیوار میں لگے ہوئے ایک کب میں اسٹریٹ لائٹ توڑ پھوٹ گئی جس کی روشنی توڑی گئی کے لئے بھی ناکافی تھی۔ جیب اس لائٹ سے غاصی آگے آچکی تھی اس لئے میں اس میں موجود افراد کی صورتیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ان کی تعداد اور ان کی تمام حرکت و سکنت کا جائزہ ضرور لے سکتا تھا۔

جیب کا پڑا ہوا تھا۔ پچھلی نشست پر موجود دو افراد ریوالت تھے اور ان کے ہاتھوں میں ریوالت تھے۔ ذرا نیچے کے ساتھ

گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر جیپ ریورس گیر میں واپس آنے لگی۔ اس وقت تک کچھ لوگوں نے ہمت کر کے کھڑکیوں دروازے کھول لیے تھے۔ کھڑکیوں میں مردوں کے عقب میں خواتین کے سر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ایک مکان سے ایک شخص نے بہ آواز بلند بنگالی میں جیپ والوں سے پوچھ ہی لیا "خیریت تو ہے گی؟"

جیپ میں سے کسی نے براہ راست اس کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ رانٹل بردار نے قدرے جھک کر جیپ میں رکھا ہوا میکانوں اٹھایا اور ہائیں ہاتھ میں اسے تھامتے ہوئے باقاعدہ اعلان کرنا شروع کر دیا "خواتین و حضرات! اتنی اسٹانڈنگ اسکوڑ اور ایکسٹرنل کسٹم کے افسران حکم پوریس کے قانون سے اس وقت دو خطرناک اسٹانڈنگ کی تلاش میں مصروف ہیں۔ یہ اسٹار ایک کسٹم آفسروں کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔ معزز اور شریف شہریوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہوشیار رہیں کھڑکیوں دروازے بند رکھیں۔ امید ہے کہ کوئی معزز اور شریف شہری ان اسٹانڈنگ کو ہند دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر یہ دونوں کسی کے گھر میں گھس بھی آئے ہوں اور ڈرا دھکا کر پناہ لینے کے لئے کوشش ہوں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں... سوچتے ہی مدد کے لئے پکاریں۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ یہ دونوں کسی کو نقصان نہ پہنچائے پائیں اور ہم جلدی ہی انہیں نکالیں کرلیں۔ کچھ دیر تک بہت دستبند پٹانے پر ان کی تلاش شروع کی جائے گی۔"

جیپ ریٹکتی ہوئی واپس گلی کے سرے تک چلی گئی۔ قدرے کشادہ اور پختہ گلی میں پہنچ کر جیپ نے ریورس گیر میں ہی موڑ کاٹا اور پھر قدرے تیز رفتاری سے سیدھی آگے بڑھتی ہوئی میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔

لوگوں نے باؤاں بلند ایک دوسرے کو کچھ قیمتی مشوروں سے نوازا پھر اپنے اپنے دروازے اور کھڑکیوں بند کرنے شروع کر دیے۔ شکر ہے انہوں نے سرکاری کارندے کے مشورے پر عمل شروع کر دیا تھا ورنہ لڑکیاں بنا کر کھڑے ہونے کے لئے گلی میں نہیں نکل آتے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ انہی مشوروں پر عمل کرتے ہوئے میرے عقب میں کمرے میں بیٹھی ہوئی عورت جسے میں نے فوراً اپنی باتی 'ہونے کا شرف بخش دیا تھا' شور مچاتا شروع نہ کر دے کیونکہ اس وقت اسے اس کام کا سنہری موقع میسر تھا۔ میں اس سے کلنی فاسٹ پر بالکونی میں کھڑا تھا اور اشراف خان پٹنگ پر لونڈا ہاربا ہوا تھا۔ میں ابھی تک اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا تھا کہ اس کے پاس کوئی

بچا ہوا فاضل ساہو لباس میں تھا مگر اس کے پاس رانٹل تھی۔ زائرین کی توجہ صرف ڈرائیور پر تھی مگر بانی تینوں اشخاص زبانت چمکتا تھے اور شکار پر نکلے ہوئے چیتر کی طرح مستعد نظر آ رہے تھے۔ وہ مشکوک نظروں سے ہر کوئی کھدے 'پرکزی اور ہر دروازے کا جائزہ لیتے جا رہے تھے۔

ایک بار تو انہوں نے اس بالکونی کی طرف بھی دیکھا جس میں کھڑا ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کی پہلی حس شاید انہیں میری موجودگی کا احساس دلادی ہے۔ ریالور کے ٹرائیگر پر میری انگلی کا ڈانڈا خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ میں چاہتا تو ایک لمحے میں ان تینوں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن بلے کیوں اب میں خون ریزی سے گریز کر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ لاشوں کی خوف اور مصیحت بھی تھی۔ میرے ریالور میں اب صرف پانچ گولیاں تھیں۔ فاضل گولیاں میرے پاس نہیں تھیں۔ اگر کچھ گولیاں صالح ہو جائیں تو پھر ہمارے بچنے کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ان جیپ والوں کے علاوہ بھی نہ بلے کتنے آدمی ہماری گھات میں تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ اس لئے مکان کو زیادہ مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ دروازہ باہر سے متعل بھی نہیں تھا لیکن پھر مجھے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ آس پاس کے تین ہزاروں مکانات بھی اسی طرح تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لوگوں نے یقیناً اطراف میں تاریکی کی آواز سن لی تھیں لیکن ابھی تک کوئی گلی میں نہیں نکلا تھا بلکہ مکانوں کی کھڑکیوں دروازے بھی بند نظر آ رہے تھے۔ اگر لوگ گلی میں نکلے بھی رہے تھے تو شاید میرے ہی جیسا کوئی طریقہ استعمال کر رہے تھے جس کے باعث باہر سے انہیں دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

جیپ کی نمبر پلیٹ پر تھوڑی سی روشنی پڑ رہی تھی۔ نمبر پلیٹ پر غائبے جلی حروف میں 'پوریس' لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی نظریں بالکونی سے ہٹ گئی اور وہ دوسرے دروازوں اور کھڑکیوں کا جائزہ لینے لگے۔ پھر ریٹکتی ہوئی بالکونی کے پیچھے سے گزرتی چلی گئی۔

میں نے آخری ریزی فلروں میں جرمینوں کو اسی طرح اپنے علاقہ اور مقبوضہ علاقوں میں گھٹ کرتے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں ہمیں تلاش کرنے کا یہ لان کا کیسا اندازہ تھا۔ شاید انہیں ملکا تو قحطی تھی کہ ایک بار پھر ہم خود ہی اچانک کسی کوئی گھاسے سے نکل کر ان کے سامنے آجائیں گے۔

ہتھیار موجود ہے یا نہیں؟

میں واپس کرے میں آیا۔ اندھیرا اب اتنا کرا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عورت اور اس کے بچے کی طرف دیکھا۔ وہ آرام سے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اعلان یقیناً انہوں نے بھی سن لیا تھا مگر انی اللہ ان کا کوئی گروہ کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہو تھا۔ ہمارے نکلنے ہی وہ شور مچا دیتے تو بات دوسری تھی۔

”نی نی! گھر میں لور کوئی نہیں ہے؟“ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”نہیں..“ عورت نے ہلکے ہونے جواب دیا ”میرا میاں ایک کام سے اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ صبح آئے گا۔“

اشرف خان فوراً مجھ سے مخاطب ہوا ”لیکن تم سرِ حال رات بھر یہیں کتنے کا پروگرام مت بنانا۔ میرا دل کمر رہا ہے کہ ان لوگوں نے محض نفیاتی حربے کے طور پر وہ دھمکی نہیں دی تھی بلکہ واقعی جلد ہی یہاں وسیع پیمانے پر ہماری تلاش شروع کی جائے گی۔ دو چار گیلوں میں تو شاید ایک ایک گھر کی تلاش بھی لی جائے۔“

”بیٹھے بٹھائے پکاک ہی ہماری تلاش شروع ہو گئی ہے اور وہ بھی اس طرح جیسے ملک کے سب سے بڑے اسمگلر ہم ہی ہیں۔“ میں نے تعجب سے کہا۔

”میں خود بھی بے حد حیران ہوں...“ اشرف خان کراہ بولا۔

”میں خاصے بڑے بڑے گروے پرے ہیں لیکن آج تک اس طرح کسی کی تلاش شروع نہیں ہوئی۔ اپنی اسمگلنگ اور کسٹم والوں نے تو کبھی لوہر کا رخ ہی نہیں کیا تھی ہم لوگوں نے اس شر کو اپنی کمین گاہ بنایا ہوا تھا۔ کبھی کبھار ایکسائز یا پولیس والے حرکت میں آجاتے تھے تو ان میں ہمارے خبردار بہتہ خور موجود ہیں۔ ہمیں کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ یک دم ہی جانے کیوں زلزلہ سا اٹھیا ہے۔“

”اس کی دہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔“ میں نے کہا ”یا تو کسی نکلے میں کوئی نیا یا بڑا افسر آیا ہے جس نے تسلسلہ چلانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے یا پھر اس معاملے کی دہی میں ہمارا ماسٹر لیہو بیٹھا ہوا ہے۔“

”میرا ذہن بھی انہی دونوں امکانات کی طرف جا رہا تھا۔“ اشرف خان بولا اور ایک بار پھر کراہا۔

”تمہیں کوئی کہل لگی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا بتاؤں...“ وہ سرسار سے لہجے میں بولا ”ایک شریف

اور گھریلو عورت کی موجودگی میں بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔“ پھر وہ گویا موضوع بدلنے ہوئے بولا ”اب لور اوروہ کیا ہے؟ میری تو عقل خبط ہو گئی ہے... خدا کا شکر ہے میرے ساتھ تو موجود ہو۔“

”میرا خیال ہے سروسٹ تو ہم انہیں پکڑ دیتے مگر کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں نکل لینا چاہیے۔“ میں نے کہا اور اشرف خان کو اٹھنے میں مدد دینے کے لیے اس کی طرز ہاتھ بڑھائی۔ وہ ہنگ سے اتر آیا۔ برف کیس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

”تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ موجود ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہتھیار کا مجھے معلوم نہیں کیوں خیال ہی نہیں آیا۔“ بولا۔ ”کسی بھی مصیبت کے وقت راہ فرار اختیار کرنے اور مجھے سب سے پہلا خیال یہ آتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہ کچھ رقوم موجود ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں پیسہ بھی دراصل ایک طرح کا ہتھیار ہی ہے... اپنا تریف کیس اٹھانے کے لیے میں مجھے ریوالور لینے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ راکفل بیل۔ نیچے بڑی تھی لیکن خیر... راکفل تو ایسے وقت میں ساتھ کر بھاگنا ویسے ہی مشکل رہتا... بس ایک خنجر ہے جو میری گت سے بندھا ہوا ہے۔“

”چلو خیر... اللہ مالک ہے۔“ میں نے بڑے اعتقاد سے کہا۔

”آؤ چلیں... پھر میں نے مرکز عورت کو مخاطب کیا ”آپ۔ تہلوان اور مرہانی کا بہت شکر ہے باقی! اگر آپ ہمارے جانے۔ بعد بھی شورو غل نہ چائیں تو یہ آپ کی اطلاع ملی اور دروازہ کا قیوت ہو گا۔ دیسے بھی آپ کے شور مچانے سے ہمیں تو نقصان پہنچے گا سو پہنچے گا لیکن آپ بھی کچھ زیادہ ٹانگے نہ نہیں رہیں گی۔ ظاہر ہے پولیس تھانے کی پوچھ گچھ سے کہ کو بھی گزرنا پڑے گا۔ اور پھر ہم اکیلے تو ہیں نہیں۔ ہمارے ساتھی بھی ہیں۔ ہم اگر پکڑے بھی گئے تو ہمارے ساتھی لوگوں کو معاف نہیں کریں گے جنہوں نے ہمیں پکڑا دیا۔“

میں نے یہ بات سمجھ کر ہر ہون گی... اور پھر آپ کا توبہ پیارا سا بیٹا بھی ہے جس کی ذمہ داری میں سنبھالنے کا آپ کو خیال رکھنا ہے۔ خدا حافظ۔“

میں اشرف خان کا ہاتھ پکڑ کر بیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ عورت تھکاوٹ بخود بیٹھی تھی۔ امید تو مجھے یہی تھی کہ وہ میں بھی شور نہیں مچائے گی۔ میرے خیال میں لوگوں کو گناہ دلچسپی اپنے ذاتی حفظ سے ہوتی ہے۔ مگر ان کی اپنی ذات

جا رہا تھا۔ یہاں ایک کھلے پلاٹ پر بڑے سے چھپر میں جی کی درکشاپ تھی۔ جی ایک نوجوان موٹر سیکٹ تھا۔ وہ ایک خوش مزاج کرسچین تھا اور غالباً شر کا بہترین موٹر سیکٹ تھا چند ایک شاگرد بھی اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ درکشاپ کے قریب ہی ایک نیم پختہ مکان میں رہتا تھا۔ اشرف خان کو جب کبھی گاڑی کا کوئی کام کرانا ہوتا تو اسی سے کراتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جی ہمارے اصل پیشے سے واقف ہے۔ ہمارے ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی کئی لوگوں کے اصل دھندوں سے واقف ہے مگر وہ ایک کشادہ دل نوجوان ہے، کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا۔

جی کا غیر رسمی گیرج جسے وہ ہمیشہ درکشاپ ہی کہتا تھا، خامے وسیع رہنے پر بھلا ہوا تھا۔ مفت کی زمین تھی۔ اس بہتی والے سہمی تانہاڑ تھلوزات کے مالک تھے۔ جی نے اس طویل وعریض چھپر کے گرد خاردار آکر لگا رکھی تھی اور اس کی حد بندی لکڑی کی بلبلوں سے بنا ہوا ایک گیٹ بھی تھا۔

درکشاپ میں بے اندازہ کاٹھ کبابز بکھرا ہوا تھا۔ دو گاڑیاں بھی کھڑی تھیں لیکن وہ اچھی حالت میں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ کئی گاڑیوں کے ڈھانچے بھی پڑے تھے۔ جی کے مکان میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دستک دی تو وہ جلدی نکل آیا۔ شاید وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ٹیکر اور بٹیاں پہنے ہوئے تھا۔ اس کا سٹولا کسرتی جسم کزور روشنی میں بھی چمک رہا تھا۔

وہ گھر میں اپنے پورے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم نے اسے بلایا تو ثابت کے پردے کے عقب سے باری باری چند بچوں، بیڑوں حتیٰ کہ ایک بڑے میاں نے بھی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی کہ جی کو بلانے والے کون ہیں۔ ہم اسے اس طرف لے گئے جہر د روشنی کچھ اور کم تھی۔ دوسرے کنبے سے پس پردہ موسیقی کی طرح پولیس و سل اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسی عموماً فلوں کے ذرا لمبائی مناظر میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے سنوئی جاتی ہیں۔

اشرف خان کی پتلون گو کے پیچھے کی طرف سے خون میں بویگ رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ جی نے پہلی ہی نظر میں یہ چیز نوٹ کر لی تھی اور وہ ایک لخت ہی کچھ چپ سا ہو گیا تھا ورنہ اس نے ہمیں خوش آمدید تو بڑی گرمجوشی سے کہا تھا۔

”ہمیں کوئی گاڑی چاہیے جی!“ اشرف خان نے بلا تمہید کہا۔ ”کوئی سی بھی گاڑی جو کسی نہ کسی حد تک قاتل اعتبار ہو“

کوئی نقصان نہ پہنچے تو عموماً وہ خاموش قماشائی ہی رہتا پسند کرتے۔ بچے آکر میں نے آہستگی سے دروازے کی کھڑکی کھولی اور دھیر دھیر کھلی میں جھانکا۔ لائن کیلیر ہی نظر آ رہی تھی۔ ہم باہر نکلے اور مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گلی کے سرے تک ہم فیرت سے پہنچ گئے۔ موڑ سے جھانک کر میں نے قدرے کھلی سڑک پر اس طرف دیکھا جہر جب مٹی کی۔ اس طرف اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف کی گلیوں میں گھسنا پاجے تھے لیکن جیسے ہی ہم سڑک کے وسط میں پہنچے، باتیں طرف دور کیں سے پولیس و سل سنائی دی اس کے ساتھ ہی ریوالور سے فائر کیا گیا۔ کوئی نہ جالنے کس طرف سے چلائی گئی اور کس طرف گئی اور فائر کرنے والا بھی کوئی دکھائی نہیں دیا بلکہ ہم بے حتمشا دوڑنے لگے۔

دوسری طرف کی گلیاں نسبتاً بڑی میز می اور پر پیچ تھیں اور ہم حتیٰ الامکان تیزی سے دوڑ رہے تھے اس کے باوجود خلف نویمیت کی آوازیں گویا ہمارے تعاقب میں تھیں۔ بلنے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم تعاقب کرنے والوں کو لاپسے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔

دوڑتے دوڑتے اشرف خان بے دم ہو گیا اور بار بار لا کھڑے لگا تو میں ایک نیم کھنڈر مکان کے شکستہ جھجے کے قریب رک گیا۔ اشرف خان بری طرح ہانپ رہا تھا اس کی پتلون کی دوسری ٹانگ بھی خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔

”اس طرح کام نہیں چلے گا دوست!“ وہ بری طرح ہانپتے ہوئے بلا تھاب زد آنکھ دوسرے تم میری رہنمائی میں چلو۔۔۔ میرا خیال ہے ہمیں اس شر سے ہی فرار ہونا پڑے گا اور اس کے لیے گاڑی کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔“

اس کا خیال درست تھا۔ ہمیں اس وقت گاڑی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ شہزاد کوٹ میں ٹیکسیاں تو چلتی ہیں جن میں ورنہ کسی ذرا نیور سے ٹیکسی جھینے کی کوشش کی باکمی تھی۔ رکشے بھی کچھ ہی عرصہ قبل چلتا شروع ہوئے تھے اور وہ بھی اکاد کا نظر آتے تھے۔ گاڑیاں لوگوں کے پاس بہت کم تھیں اور وہ بھی رات کے وقت تو صرف مین بازاروں میں ہی نظر آتی تھیں۔

چند لمبے سٹاکر اشرف خان انگڑاتا ہوا ایک بار پھر چل پڑا۔ اس بار میں اس کی رہنمائی میں چل رہا تھا۔ کئی گلیوں میں پکڑنے کے بعد ہم شہر کی خوشحال آبادی کے پلو میں آبلو کی گلی میں پہنچ گئے اور تب میں سمجھ گیا کہ اشرف خان کئی

کام ہی سنوارنے کا ایک ذریعہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ (انہوں نے کام نہیں رکنا چاہیے۔ ویسے بھی میں جی کو قتل کر کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس کے گھر والے بھی ہمیں دیکھ چکے ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”خون تو ویسے بھی ہمارے ہاتھوں پر ہے۔ اگر ہم جی کو قتل کر بغیر بھی پکڑے گئے تو کیا ہمارے خیال میں سچ جانیں گے؟ ہمارے اپنے جرائم کے علاوہ بھی معلوم نہیں کس کس کے جرائم ہمارے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔“

اس کے باوجود میں حمیس جی کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ جی بہت بڑے کنبے کا واحد کھیل ہے۔ میں اسے تم بہت پہلے اس کنبے پر شوق ہو چکے ہیں کہ بھولنا صرف اس وقت بنایا جائے جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ آگے تھلڑا مرضی... میں کمزور پڑ رہا ہوں... موت مجھے اپنی جھلی دکھا رہی ہے... تم جاہلو تو ابھی سے خود بخود ہی اختیار کر سکتے ہو۔ اشرف خان نے بظاہر سپاٹ سے لمبے میں یہ بات کی مگر لیکن اس کی دھم میں بے بسی کا جو کرب تھا اسے صرف میری محسوس کر سکتا تھا۔

”ہماری لائن میں تم جیسے شریف النفس اور وضعدار انسان بھی کم ہی آتے ہوں گے۔“ میں نے بد مزگی سے کہا اور ریو اور جیب میں رکھ لیا۔ ”اب اپنے اس بیٹے سے کہو کہ دوڑ کر چلیں لے آئے۔“

میں نے محسوس کیا کہ جی نے گہری سانس لی تھی۔ وہم دونوں کی طرف ایک نظر دیکھ کر مسکرایا اور پھر مجھ سے چلا ہوا پرائیوادی اور پرانی شراب۔ دونوں کی بات ہی کچھ اور بڑا ہے۔ پرانا آدمی مصلحتوں اور موقع محل کو زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔“

”اچھا اب اشرف خان کو زیادہ مکا لگنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے جی کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ باگ چلیاں لے آؤ۔“ پھر میں نے اشرف خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور اگر یہ اندر جا کر بیٹھ گیا تو...؟

”نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔“ اشرف خان نے اپنی تمام تر تکلیف کے باوجود پر اعتماد انداز میں مسکراتے کی کوشش کی۔ ”ہم لیٹو برنس کر رہے ہیں۔ جی کو رقم کی ضرورت ہے۔“

اس نے اپنا برف کس تھپتھپایا۔ جی دوڑا ہوا اندر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ دیر لگے گا جبکہ ہمارے لیے ایک ایک پل بھاری تھا۔

”پولیس پیچھے لگی ہوئی ہے؟“ جی نے سرسری سے لمبے میں پوچھا۔ اشرف خان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”گازی اس وقت میرے پاس صبح حالت میں تو کوئی نہیں“ جی بولا۔ ”پچھلے تین دن میں صرف ایک ٹیوب گاؤر ایک ٹوکس آئی ہے۔ دونوں کے انجن ڈاؤن کئے ہوئے ہیں۔ گاؤں کی گاڑیاں ہیں۔“

”میں مفت میں نہیں مانگ رہا جی!“ اشرف خان بولا۔

”یقیناً دوں گا۔ تم کہہ رہا چوری ہو گئی... پیسے بھر دینا۔ اگر ہم خدا نخواستہ پکڑے بھی گئے تو تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔“

”اس صورت میں...“ وہ گویا کسی سوچ میں پڑ گیا پھر جیسے فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ”میری اپنی اسکوڑا ہے۔ کھر کے پیچھے

کھڑی ہوئی ہے۔ ساتھ گاڑی ہے لیکن بہر حال مکینک کی گازی ہے۔ بہترین کنڈیشن میں ہے۔ وہ لے جاؤ۔ جہاں تک

جانا چاہو گے ساتھ دے گی۔ اس آڑے وقت میں بھی محض تمہاری لحاظ داری میں تم سے میں اس کے تھیں ہزار لے لوں گا۔“

ساتھ کے ماڈل کی گازی... اور وہ بھی اسکوڑا... اور پچیس ہزار روپے؟“ میں تقریباً چلا اٹھا۔ ساتھ ہی میں نے ریو اور نکال لیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ نوجوان موقع پرست ہے۔ ہماری مجبوری دیکھتے ہی فائدہ اٹھانے پر تلی گیا ہے، سودے بازی پر اتر آیا ہے۔

میں نے ریو اور کی بل اس کی پسلیوں میں چھپو تے ہوئے کہا۔ ”چالی کھل ہے؟“

”چالی گھر میں ہے۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان بچھ کر کہا۔ وہ خوفزدہ ضرور ہو چکا تھا لیکن حتی الامکان مضبوط نظر آتے ہی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اشرف خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم یہیں ٹھہرو۔ میں اسی طرح اسے اندر لے کر جاتا ہوں اور چالی لے کر آتا ہوں۔ زیادہ گڑبڑ کرے گا تو لٹووں گا۔ ہم اسے ایک جیسے بھی نہیں دیں گے۔ ہم اس وقت منہر اور قاتل ہیں، شاپنگ پر نکلے ہوئے عرب شیخ نہیں۔“

”نہیں... نہیں...“ اشرف خان نے سختی سے میرا ریو اور والا ہاتھ پیچھے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ جی شریف نوجوان ہے۔ تھوڑا بہت لالچ سب میں ہوتا ہے۔ ہر انسان ایسے موقع کی تلاش میں ہوتا ہے جو اسے فوراً کسی نہ کسی حد تک دولت مند بنا دے۔ اگر جی بھی حسب توقع فائدہ اٹھانے پر تلی گیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں وہ یہ جیسے ویسے بھی

آگے بڑھ کر خاردار تاروں کے درمیان بنے ہوئے چوٹی کیٹ کا تکا چابی سے کھولا اور جلدی سے پھیر میں سے دو مڑے ترے اور کرکس میں لتھڑے ہوئے ڈبے اٹھالیا۔ ڈبے اس نے خود گاڑی تک پہنچائے۔

کرم لکر کی وہ اسکواڈ اپنی ظاہری حالت سے ہی کسی مسکینک کی گاڑی نظر آتی تھی۔ عام حالات میں اس کی مارکیٹ ویلیو شاید چار پانچ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہوتی لیکن یہ وقت گاڑیوں کی مارکیٹ ویلیو کا اندازہ لگانے کا نہیں، دنیا کی مارکیٹ میں اپنی جان کی ویلیو دیکھنے کا تھا۔

اشرف خان لکر کی بچھلی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔ اب تک وہ اپنی بہت کا لاشہ سنبھالے سنبھالے کام لیتا ہوا دوڑا چلا آیا تھا۔ اب سارا میر آیا تو کسے ہوئے سننے کی طرح گر پڑا۔ میں نے اسٹریمک سنبھالا اور گاڑی اشارت کی۔ جی نے مجھے گاڑی کی علامات و اطوار کے بارے میں چند ضروری باتیں بتائیں اور میں گاڑی کو کبھی چار دیواری سے باہر لے آیا۔ گاڑی کی ظاہری حالت کے برعکس اس کا انجن اتنی بری حالت میں نہیں تھا۔ ”گڈ لک“ جی مینے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر کسی جگری دوست کی طرح ہمیں خدا حافظ کہا۔ میں اسٹریمک ہاتھ میں آتے ہی اپنے آپ کو پہلے کی نسبت کچھ زیادہ پراعتماد محسوس کرنے لگا تھا۔

گندے ٹالے کی بلیا عیور کر کے ہم خوش حال لوگوں کی مختصر سی آبادی میں آگئے۔ یہاں کی گلیاں کشادہ، صاف ستھری اور مکان سلپتے کے تھے۔ ان میں لان وغیرہ بھی تھے۔ ازراہ مروت انہیں کوٹھیاں بھی کہا جاسکتا تھا۔

میں نے ابھی تک ہیڈ لائٹ آن نہیں کی تھی۔ ایک مکان کی پلویڈری دال کے قریب گاڑی روک کر میں نے سڑکرا اشرف خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ”ہیں چلنا کہیں چاہئے؟“

اشرف فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ آنکھیں بند کر کے ہونٹ برابر دانتوں میں بچھنے رہا تھا۔ چہرے پر پیسے کی نمی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ یقیناً بڑی مشکل سے تکلیف برداشت کر رہا تھا جب وہ بولا تو آواز اس کے حلق سے اذیت بھری کراہ کی طرح نکلی۔

”تکلیف اب میری برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پہلے عظیم پورہ کی طرف چلو۔۔۔ اور یہ خیال رکھنا کہ انہی اطراف میں ہماری تلاش جاری ہے۔ میں ممکن ہے کہ خاص راستوں پر گشت شروع ہو گیا ہو تم نکلی

شرف خان کو شاید کھڑا ہونے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ مین میں... گڑھی ہوئی ایک ٹکی کا سارا لپے کھڑا تھا۔ اس کا بڑا پیسے میں تر تھا اور رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی۔ اس کے دنت یقیناً خشک ہوئے جا رہے تھے۔ سبھی وہ بار بار ان پر زبان برہا تھا۔

باقاعدگی گھر سے نکلا دکھائی دیا۔ میرے خیال میں یہ بھی نیت ہی تھا کہ وہ دوبارہ باہر آ گیا تھا۔ تاہم اس بار وہ ہمارے قریب نہیں آیا۔ دوری سے چابیاں ہماری طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ”اشرف خان! میں تم پر اعتبار کرتے ہوئے چابیاں دے رہا ہوں۔ اب تم بھی مردوں کی طرح بات بھانا۔ رقم دینے بغیر بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ معذرت کے ساتھ بتانا چلوں کہ تھوڑی سی احتیاط میں نے بھی کر لی ہے۔ میرے پاپا اس وقت ذہل ہیل کس لیے اس چھوٹی سی کڑی میں بیٹھے ہیں...“ اس نے اپنے مکان کی چھوٹی سی کڑی کی طرف اشارہ کیا جس میں چند لمبے پہلے تک روشنی نظر آ رہی تھی مگر اب غائب ہو چکی تھی ”ہاں اگر تم دونوں میں سے کسی نے مجھے نقصان پہنچانے یا گاڑی کی قیمت دینے بغیر بھاگنے کی کوشش کی تو پاپا مجبوراً ممکن استعمال کریں گے اور یہ گین پاپا کو انگریزوں کے زمانے میں ان کے پاس نے تھوٹتائی تھی مگر پاپا کا کہنا ہے کہ وہ چابیاں تو اب بھی اس سے شیر کا شکار کرسکتے ہیں۔“

”بٹریک شیر چڑیا گھر کے بچھرے میں بند ہو۔“ میں نے لقمہ دیا۔

اشرف خان مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”جیس معلوم ہے جی کہ ہم لوگوں کی لائن میں زبان کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ پھر اس نے ریف کیس ملی پر ٹھاکر کھولا اور پکاس پکاس کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں جن پر درز کے پھلے لپٹے ہوئے تھے، نکال کر یکے بعد دیگرے جی کی طرف اچھال دیں جنہیں اس نے بے تابانہ سے انداز میں دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا۔ وہ اب خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

”گاڑی عین مکان کے پیچھے ایک کچی چار دیواری میں کھڑی ہے... اور یاد رہے کہ تم اسے چرا کر لے جا رہے ہو۔“ وہ بولا۔

”ہیڈرول کی کیا پوزیشن ہے؟“ اشرف خان نے پوچھا۔ ”نگلی فل ہے۔ اگر کو تو دو ڈبے اور دوے دوں۔ درکشاپ میں رکھے ہیں۔“ جی نے بڑے غلوص سے کہا۔ ”دے ہی دو۔“ اشرف خان بولا۔ جی پہلے مکان کے اندر جا کر نوٹوں کی گڈیاں کسی کو تھما کر آیا پھر اس نے تیزی سے

کوشش کی لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ محض ہونٹوں کے کھنڈاؤ تک محدود رہی۔ اس کے پورے چہرے پر ہی کھنڈاؤ اچلا تھا۔

اس کی چٹون کی ایک ٹانگ تو تقریباً پوری ہی خون میں تر ہو چکی تھی اور اب بھی بدستور خون ٹپک رہا تھا۔ دوسری ٹانگ پر بھی خون پھیل رہا تھا۔ میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ اب تک گویا موت ہمارے تعاقب میں رہی تھی مگر مجھے خوف محسوس نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میرے دل کو گویا کچھ ہوا تھا جس طرح اشرف خان کا حوض خون میں تر دیکھ کر ہونے لگا تھا۔

مجھے احساس تھا کہ اس دقت دل مضبوط رکھنے کی بہت زیادہ ضرورت تھی چنانچہ میں نے اس کی طرف سے نظر ہٹائی اور گاڑی آگے بڑھادی۔ میں نے اس سے تسلی کا بھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے موقع پر تسلی کے الفاظ انسان کو خواہ مخواہ جذباتی کر دیتے ہیں اور جس درد کو وہ دبانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے وہ کچھ اور ابھر آتا ہے۔ وہ مواقع کچھ اور ہوتے ہیں جب تسلی دقتی سے درد آدھا رہ جاتا ہے۔

اس علاقے کے راستوں سے مجھے کچھ زیادہ واقفیت نہیں تھی لیکن میں اندازے سے عظیم پورہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک گلی میں گاڑی موڑی تو اچانک ہی راستے سے دو بادوردی پولیس والے آتے دکھائی دیے۔ دونوں کے کندھوں پر بندوقیں تھیں۔ ان میں سے ایک بارش تھا۔ وہ آنکھیں میکر کر بڑے غور سے گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعۃً مجھے احساس ہوا کہ میں نے ابھی تک گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن نہیں کیں حالانکہ اب انہیں آف رکھنے کا کوئی خاص ناکمہ بھی نہیں تھا۔ اضطراری طور پر میں نے لائٹس آن کر دیں۔ میری اس حرکت نے شاید انہیں اور زیادہ شک میں مبتلا کر دیا۔ وہ سڑک کے کنارے رک کر پوری توجہ سے گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ آہم انہوں نے ہمیں کوئی اشارہ وغیرہ نہیں دیا۔ بس خاموشی سے کھڑے دیکھتے رہے۔ ان کے قریب سے گزرتے وقت میں نے چہرہ تر چھالو کی قدر تارکی میں رکھنے کی کوشش کی تاہم یہ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں ان سے چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

گلی کا موڑ مڑتے وقت میں نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں اب بھی وہیں کھڑے گاڑی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اشرف خان چونکہ پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا اور اب اس نے آنکھیں بھی بند کر لی تھیں اس لیے وہ سپاہیوں کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں نے بھی کوئی ذکر نہ کیا۔

”کوچوں ہی کے راستے چلنا۔“
”عظیم پورہ میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ڈاکٹر ذنب۔۔۔ اس وقت میرا ڈاکٹر ذنب سے ملنا از حد ضروری ہے۔“ وہ کراہا۔

”یہ کوئی کو ایف اے ڈاکٹر ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ہی، بہت زیادہ۔“ اشرف خان نے جواب دیا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے آڑے دقت میں بہت کام آتا ہے جب ہم اس قسم کے حالات میں دخی ہو جاتے ہیں کہ پوچھ گچھ کے ذریعے کسی اسپتال یا کسی دواستانڈ ڈاکٹر کے کلینک وغیرہ کا رخ نہیں کر سکتے تو وہی ہماری مدد کرتا ہے۔ اس کی دوسری بڑی خوبی۔۔۔۔۔ یہ ہے کہ اس نے کبھی میڈیکل کانج بائی نہ کی دقت نہیں کی۔ مگر بیٹے ہی معلوم نہیں کس طرح اچھا خاصا ڈاکٹر بن گیا ہے۔۔۔ حتیٰ کہ سرجری میں بھی عمل دخل رکھتا ہے۔ پہلے ایک اسپتال میں آپریشن جیمپٹر اسٹنٹ تھا اور ایک نرس کی عزت لوٹنے کی کوشش میں ناکام ہو کر لوگوں سے ہڈی پھلی تروانے سے پہلے وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔“

”ڈاکٹر ذنب۔۔۔ عجیب نام ہے۔“ میں نے کیر لگاتے ہوئے کہا۔

”جس وقت اس کا یہ نام پڑا ہے سنا ہے کہ اس وقت وہ واقعی کسی پلے ہوئے دہچے کی طرح موہا تھا۔“ اشرف خان کراہتے ہوئے بولا ”لیکن اب تو محض دہچے کی ایک ٹانگ معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے محسوس کیا کہ اشرف خان باتیں کر کے اپنی تکلیف کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر پہلو۔ کر بل نیم دراز تھا اور میں دیکھ چکا تھا کہ اب خون اس کی چٹون سے ٹپک ٹپک کر رہا ہے فرش پر پڑی ہوئی گندی سی سیٹ میں جذب ہو رہا تھا۔

میں حتی الامکان تیز رفتاری سے کار چلانے لگا۔ چند لمحے بعد میں نے عقب سے اشرف خان کو کراہوں کے درمیان کہتے سنا ”اگر اسی رفتار سے میرا خون بتا رہا تو کچھ دیر بعد میں تو خزا ہوا آم ہو کر رہ جاؤں گا۔“

غیر ارادی طور پر ایک بار پھر میں نے گاڑی روک لی۔ اس گلی میں اندھیرا تھا اس لیے میں نے سوچے تلاش کر کے اندر کی لائٹ آن کی جو خوش قسمتی سے آن ہوئی تھی۔ جی نے واقعی گاڑی کو خاصی اچھی حالت میں رکھا ہوا تھا۔

میں نے بزرگ ایک بار پھر اشرف خان کا جائزہ لیا۔ اس نے سب سابق ایک حوصلہ مند انسان کی طرح مسکراتے کی

”نی اٹل تو ہم پولیس کو پکڑوے آئے ہیں۔“ اس بار بھی میں نے ہی جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب بولن بھی اشرف خان کے لیے کوئی خوشگوار عمل نہیں رہا۔

”بہر حال.... ان حالات میں کھوج لگاتے ہوئے بچھا کر انان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوتا۔“ ڈاکٹر ذنبہ خود کلائی کے انداز میں بولا۔ پھر جیسے وہ اصل موضوع پر آگیا ”میں سرجری کی کوشش کروں گا، ورنہ خون کا بہاؤ روکنے کا بندوبست کر رہی دوں گا۔ پانچ ہزار روپے فیس ہوگی۔ ایڈوائس۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر۔“ اشرف خان کراہتے جلدی کرو۔ ”ڈاکٹر ذنبہ نے ہاتھ کھڑکی سے اندر پھیلایا۔ اشرف خان نے کار کے فرش پر رکھا ہوا برف کیس کھول کر ایک گندی نکالی اور اس کے ہاتھ پر رکھ دی جو اس نے جلدی سے ویسٹ کوٹ کی جیب میں ٹھونس لی۔

”دو منٹ صبر، میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ کسی سرور مرغ کی طرح سجدہ کرتا ہوا مکان میں چلا گیا۔ میں نے کار کے اندر کی لائٹ بجھادی اور اوپر اوپر کا جائزہ لیا۔ اکا دکا کانٹوں میں روشنی نظر آ رہی تھی تاہم گلی میں آمد و رفت نہیں تھی۔

ڈاکٹر ذنبہ جلدی دوبارہ باہر آگیا۔ اب وہ پتلون بٹل شرٹ میں تھا اور سیاہ رنگ کا بڑا سا میڈیکل بیگ اٹھائے ہوئے تھا۔ ”چلو۔“ اس نے قریب آکر کہا۔

”کہیں؟“ میں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں اندر مکان میں بلائے گا جنہاں اس نے غریبی دعوے کا کوئی چھوٹا موٹا آپریشن جمیٹر بنا رکھا ہوگا۔

”شر سے نکل کر کسی دیر ان سے مقام پر درختوں وغیرہ کی اونٹ میں گاڑی روک لینا۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”تو کیا سرجری گاڑی ہی میں ہوگی؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

”بے شک۔“ اس نے بدستور اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ گھر پر اس قسم کے کاموں کا فطریہ مول نہیں لیتا۔ ویسے جب کوئی مجرم پولیس مقابلے کے بعد فرار ہوتا ہے اور پولیس کو یہ علم بھی ہوتا ہے کہ وہ زخمی ہو چکا ہے تو عموماً وہ لوگ ایک جگر میرے قریب خانے کا بھی لگا لیتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ پولیس عام طور پر مجھ جیسے شہزادہ کو تنگ کرتی رہتی ہے، انہیں خدمت خلق کا موقع نہیں دیتی۔“

”باتوں میں وقت ضائع مت کرو افضل۔“ اشرف خان کمزور سی آواز میں بولا۔ اور جیسے ڈاکٹر کہتا ہے، ”کرتے جاؤ۔“

چند لمبے بعد ہم عظیم پورہ میں داخل ہو گئے۔ تب میں نے رنڈ کم کرتے ہوئے پوچھا ”کس طرف جانا ہے؟“

اشرف خان نے کراہ کر کہنی کے غلے ذرا اونچا ہوا کر کھڑکی سے باہر دیکھا اور راستوں کے پارے میں ایک ساتھ ہی چڑھایا ت دینے کے بعد ایک بار پھر جھکے جھکے انداز میں لٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر سر اٹھا کر دیکھا اور کہا ”آگے آئیں ہاتھ پر جو گلی آئے گی اس میں دائیں ہاتھ پر ایک ہی دو منزلہ مکان ہے۔ اس کے سامنے گاڑی روک لیتا۔“

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق دو منزلہ مکان کے سامنے گاڑی روکی اور اتر کر دروازے پر دستک دی۔ جلدی ایک شخص نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر پردہ دار خاتون کی طرح جھانکا۔

”ڈاکٹر ذنبہ....؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ اشرف خان سے اس کا اصل نام تو بچھ لیا جائے تھا۔ ممکن ہے وہ اس نام سے مخاطب کیے جانے پر برا ہی مناجائے۔

مخالف توقع وہ فوراً باہر آگیا اور نہایت ہی شائستگی سے بولا۔ ”کی فرمائیے؟“

”اشرف خان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک پست قد آدمی تھا۔ کسی زمانے میں یقیناً کٹنی موٹا رہا ہو گا۔ اب چربی اور گوشت غائب ہو جانے کی وجہ سے کمال ذہیلی ہو کر اس کے چہرے اور جسم پر تنگ سی گئی تھی تاہم وہ بوڑھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی رنگت سفیدی اور مونے مونے ہونٹ خالصے کی سی رنگت کے تھے۔ گول گول آنکھوں سے لالچ ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک اونچی سے دھوئی اور گلی جیپوں والی واسٹ پینے ہوئے تھا اور پسی نظر میں خالصتاً دہقان نظر آتا تھا۔

وہ پراستیاں انداز میں گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اندر کی لائٹ آن کر دی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر اشرف خان کو دیکھا۔ اشرف خان آنکھیں کھول کر اسی متصل سے انداز میں مسکرایا۔

”کٹنی دیر کدی تم نے آئے میں۔ خون کٹنی برس گیا ہے۔“ ڈاکٹر ذنبہ نے کسی جمید یا سلام دعا کے بغیر کہا ”کون سی گولی ہے؟“

”دیوالوری کی یا راکٹل کی؟“ اشرف خان کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ”اور غالباً پولیس بھی تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے ڈاکٹر۔“ ذنبہ نے میری طرف دیکھے بغیر اشرف خان کو مخاطب کیا۔

کے ارد گرد جسم کو سن کرنے والی دوا لگنے لگا۔ چند لمحوں میں جب اس نے خستہ زخم کو چھڑا تو اشرف خان کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی جس کا اس نے نہ جانے کس طرف درمیان میں ہی گھاموٹ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری کارروائی نہیں دیکھ سکوں گا اس لیے میں منہ پھیر کر کمرے اترنے لگا لیکن ڈاکٹر وہیہ نے فوراً پوچھ لیا "کہاں جا رہے ہو؟" "میں آس پاس کہیں شلتا ہوں، تم اپنا کام کرو" میں نے کہا۔

”نہیں۔ تم اسٹیرنگ پر ہی موجود رہو اور الٹ رہو۔ ذرا بھی خفہ محسوس کرو تو فوراً گاڑی بڑھالیتا۔ خواہ میرا کام کسی بھی سرے میں ہو“ اس کی تم پر دانہ کرنا۔ ”ڈائنگ کے لیے میں سناکی کی حد تک خود غرضی کی جھلک تھی۔ اسے صرف اپنی فکر تھی۔ میں منہ پھیر کر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ عجب سے سٹائی دینے والی اشرف خان کی آواز میں کچھ ایسی ہی تھیں جیسے کسی بکرے کو کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو لیکن ساتھ ہی اس کے منہ پر سختی سے کچھ بانڈھ دیا گیا ہو۔ میں ہونٹ بچھپتے اندر مڑے میں گھورتا رہا۔

میں نے جیسے لہاجوں کی طرح گھٹ رہے تھے۔ میں اپنے اعصاب کو حتیٰ الامکان برسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جس پیشے میں آچکا تھا، اس میں قدم قدم پر اعصابی جنگ سے ہی واسطہ پڑتا تھا لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اعصابی مضبوطی کے بغیر ہی کام چلا رہے تھے یا شاید اعصابی مار سے سپرد کر وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ حال ہو گیا تھا۔ شہزاد کویت میں ہی اشرف خان کے قوسل سے میری ایک لڑائی عمر اسٹیکر سے ملاقات ہوئی تھی۔ بظاہر وہ ... اوسط درجے کا ایک معزز و کاغذ دار تھا۔ اچھا بھلا گھر تھا اس کا لیکن عالم یہ تھا کہ رات گئے اگر کوئی کال نکل بجا دیتا تھا تو وہ فوراً چارپائی کے نیچے کھس جاتا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ آنے والا کون ہے۔

میرا ذہن وحشی ٹھوڑے کی طرح جانے کون کون سے
دشت خیالی میں بھٹکا رہا۔ مجھے وقت کا احساس نہیں رہا تھا اور
شاید یہ اچھا ہی تھا۔ جانے کتنی دیر بعد عتب سے واکٹر دہ کی
آواز سنائی دی۔ کوئی بہت گہری چلی گئی ہے۔ شاید اس کی ٹوک
کسی ہڈی میں بیوست ہے۔ صبح کو زاروں کے بغیر اور آپریشن
حیض سے باہر اس کوئی کو ڈھانا تقریباً ناممکن ہے۔ جان جانے کا
خلو ہے۔ میں نے ہسپتال بھر کر ڈرم سی دیا ہے۔ خون اب
برائے نام رس رہا ہے اور امید ہے کہ کچھ دیر بعد بالکل ختم
جائے گا۔ مناسب موقع ملنے ہی تم کی صبح جگے پر سرجری

میں نے خاموشی سے کار میں بیٹھ کر اسٹرنگ سمجھ لی۔ ڈاکٹر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میڈیکل بیک اس نے سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ ایک بار پھر ہماری کار گلیوں میں چکر اے لگی۔ گلیوں سے نکل کر میں نے شہر سے باہر جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر ناکہ بندی نہ کر دی گئی ہو اس لیے سڑک پر میں بہت ہی ہوشیاری سے گاڑی چلا رہا تھا تاہم مجھے کہیں دور دور تک ناکہ بندی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ شاید ابھی اس کی فورت نہیں آئی تھی یا ابھی اس مقصد کے لیے اتنی پولیس فورس مقرر نہ تھی۔

قدرت نے ایک اور مہربانی کی۔ اس راستے سے باہر جاتے وقت شرکی حدود میں ہی ایک ریلوے کراسنگ بھی آتی تھی جس کا پانچ گنا عموماً بندی ملتا تھا اور کٹنی دیر اس کے کھلنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ پچانک عبور کرنے کے بعد دائیں بائیں کہیں کہیں کھیت نظر آتے تھے اور کہیں کہیں غیر آباد زمینیں اور ان پر درخت اور جھاڑ جھکاڑ۔ ایک مناسب ہی جگہ دیکھ کر میں نے کار روک لی اور ڈاکٹر میڈیکل بیک اٹھا کر پچھلے حصے میں چلا گیا۔

”لائٹ جلاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔ اس دیرانے میں کار کا انجن روکی حصہ اس ذرا سی لائٹ سے گویا جگمگا اٹھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے بھی اپنے میڈیکل بیک سے سیلوں سے چلنے والا ایک چھوٹا سا لپٹ نکال کر اٹلی سیٹوں کے پشے میں پھنسا دیا۔ پچھلی سیٹ پر وہ خود پھنس پھنسا کر اس طرح بیٹھ گیا کہ اشرف خان بھی اس کی مطلوبہ پوزیشن میں لینا رہے اور وہ خود بھی اپنا کام ختم دینے کے لیے حرکت کر سکے۔

میں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے کم از کم اس حد تک تواضع و تواضع کرنے کی زحمت کر لی تھی کہ سر جیوں والے پتلے ریز کے دستے چڑھا لیے تھے۔ اس کے سر جی کے آلات بھی بظاہر کچھ صاف ہی معلوم ہوتے تھے اور اسٹریٹنگ کٹ میں رکھے ہوئے تھے لیکن معلوم نہیں یہ کٹ خود بھی جراثیم سے محفوظ تھی یا نہیں۔

اس نے جب اشرف خان کا زخم مریاں کیا تو اس کی تو
سکڑیاں ہی نکل گئیں۔ میں بھی سختی سے دانت جینچنے بغیر نہ
روہ سکا۔ پتلون کی رگڑ اور دوڑ بھاگ سے زخم پھیل گیا تھا اور
بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔ خون اب بھی یوں وقفہ وقفہ سے
رک رہا تھا جیسے اندر سے کوئی طاقت سمیٹ سمیٹ کر اسے
ہر دھکیل رہی ہو۔

ڈاکٹر ذبیحہ جٹک کہہ رہی تھیں زخم کا معائنہ کرتا رہا پھر مایا بادیہ اس

راستے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔“

وہ یوں سنجیدگی سے کہہ رہا تھا جیسے میں واقعی اس کی فکر میں دہلا ہوا جا رہا تھا۔ مگر حاکمیں کا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور گاڑی سے اتر کر سڑک کی طرف چل دیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر اشرف خان نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں بولا: ”چلا گیا؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا: ”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ میں نے روانی میں پوچھ تو لیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ یہ سوال نہایت غیر ضروری بلکہ تکلیف دہ تھا۔ اس کی طبیعت کا احوال تو اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ ”اب کہاں چلنا چاہئے؟“ میں نے جواب کا انتظار کیے بغیر جلدی سے پوچھا۔

”میری عقل تو یہی کہہ رہی ہے کہ ہمیں لاہور چلنا چاہئے۔“ اشرف خان نے ایک ایک کمرہ کا کمرہ برف کیس میں اب صرف پانچ ہزار کی ایک گڈی رہ گئی ہے۔ جلدی میں ”میں صرف برف کیس ہی اٹھا سکتا تھا۔ باقی کچھ رقم تجوری میں تھی۔ وہ نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب ہمیں کسی مفروضہ سارے کی ضرورت ہے جس کی امید مجھے کیس سے نظر نہیں آ رہی۔۔۔۔۔ لاہور میں میرا ایک دور کارشتے دار ہے۔ ہماری ہی لائن کا آدمی ہے لیکن وہ بہت بڑا آدمی ہے۔۔۔۔۔ عام حالات میں اس سے گزشتہ دو تین برسوں میں دو تین ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ دیکھو تو کوئی خاص لفت نہیں کراتا لیکن شاید اس مصیبت کے وقت میں کام آجائے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خصوصاً مام لوگوں میں۔۔۔۔۔ الٹ معاملہ۔۔۔۔۔ کہ عام حالات میں رشتے دار زیادہ اچھی طرح نہیں ملتے لیکن آڑے وقت میں تمہارا بہت کام آنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ وہ سانس درست کرنے کے لیے خاموش ہو گیا۔

اگر اس کی یہ مہموم سی امید سراب تھی تب بھی فی الحال میں اسے اس کا احساس دلانا نہیں چاہتا تھا بلکہ میں خود بھی اپنی تمام تر حقیقت پسندی کے باوجود اس وقت تاریک پسلو سے نظر چلنے میں ہی عافیت محسوس کر رہا تھا۔

”اسے تم میرا کزن ہی سمجھ لو۔“ اشرف خان چند لمحے کراہنے کے بعد سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا: ”قاسم خان اس کا نام ہے۔“ پھر اس نے ایڈریس مجھے سمجھایا۔

”اگر بہت تیز رفتاری سے بھی چلیں تب بھی لاہور کا سفر کم از کم چار گھنٹے کا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ”وہ بھی اس صورت میں کہ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور ہمیں

یہ گولی نظر ایسا۔ فی الحال یوں سمجھو کہ ابتدائی طبی انداز میں ہے۔ میں نے ضروری انجکشن بھی لگا دیے ہیں۔ اشرف خان کی چٹون کی حالت دیکھ کر میں گھر سے ایک پاجاما بھی لے آیا تھا جو میں نے لٹھے پر پستویا ہے۔ خون آلودہ چٹون میں نے باہر پیک دئی ہے۔“

میں نے دل کڑا کر کے مڑ کر دیکھا۔ اشرف خان سیٹ پر آڑا بچھا پڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ سیٹ سے نیچے تھی۔ وہ نکلیں بند کیے گمری گمری سانسیں لے رہا تھا۔ چہرے سے بدناتعمدہ بوند بوند کر کے ٹپک رہا تھا۔ اس کے جسم میں شاید پچھلے ہی رہ گیا۔ خون کی تو گویا رقیق بھی نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر دنیہ نے روٹی لور بیٹوں کا ایک پیکٹ اور دو شیشیاں نیچے رکھائے ہوئے کہا: ”یہ چیزیں میں گاڑی میں ہی چھوڑ رہا ہوں۔ اگر اشرف کے زخم پر روٹی لور پانی خون میں بھیگ جائے یہ نلی شیشی دلا پادور اچھی طرح چھڑک کر دوبارہ بیڈج لٹالو تو اسے آدھے گھنٹے کے وقفے سے اس دوسری شیشی سے دودھ گولیاں اسے دیتے رہنا۔ پانی میسر نہ بھی ہو تو یوں ناس میں ڈال دینا۔ ہیں تو یہ گولیاں لیکن انجکشن کا اثر کبھی نہ۔ اس سے زیادہ فی الحال اس کے لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔“ اس کی آواز اس وقت مجھے ایسی ہی محسوس ہو رہی تھی جیسے وہ اپنے میں کوئی گمراہ رہا ہو حالانکہ وہ کبیرت تھی اور ہر سکون لمحے میں بول رہا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے بیک میں بیٹھا معمولی سے دکام میں جتنا کسی شخص کو دوا اور ایلات دے رہا ہو۔ میں اس کے کام سے مطمئن نہیں تھا۔ برے خیال میں اس کی خدمات حاصل کرنے کا کوئی خاص نوہ نہیں ہوا تھا۔ پانچ ہزار خرچ کر کے کچھ اور بھی کیا جاسکتا لیکن ہر حال۔۔۔۔۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔

”اب تمہیں واپس چھوڑنے کا مسئلہ ہے۔“ لیکن میں نے ٹھک لہجے میں کہا: ”میں واپس شہر کی طرف جانے کا خفیہ ارادہ نہیں لے سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک شہر کی ناکہ بندی ہو چکی ہوگی۔“

میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر دنیہ کافی احتجاج کرے گا مگر شاید وہ اس کی صورت حال کا عالمی تھا۔ ”طبیعتاً سے بولا: ”کوئی بات نہیں۔ میں سڑک پر چلا جاتا ہوں۔ اگر کوئی گاڑی شہر کی طرف جاتی ہو تو کوئی بڑا ہاتھ کر کے لٹ لے لوں گا۔۔۔۔۔ بلکہ بہتر ہے کہ بڑی چلا جاؤں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ جائے گا لیکن پیدل بڑا زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ پیدل چلنے والوں کے لیے تو رستے کراٹھ کے پاس سے شہر میں داخل ہونے کے بیسیوں

سی سڑک تھی، اس لیے اس کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔
میں نے رفتار کم رکھی۔
اشرف خان ایک ایک کر بولا: ”ذرا تیز رفتاری سے چلو۔۔۔“
میری تکلیف کی پروا نہ کرو۔ اگر تکلیف برداشت سے باہر
ہوگی تو میں بتا دوں گا۔“

اس کی ہدایت پر میں نے رفتار بڑھادی۔ ہائی وے پر پہنچ کر
دھچکوں میں کچھ کمی آگئی اور میں نے رفتار مزید بڑھادی۔ اب
ہم طوفانی انداز میں لاہور کی طرف محو سفر تھے۔ رات کی تاریکی
میں راستہ ایک سرنگ کی طرح میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔
جب کوئی بہن سامنے سے آتی تھی تو گردوغبار کا ایک بگولا سا اڑا
جاتی تھی جو ہیڈ لائٹس کے سامنے کچھ دیر تک کھٹکتی تھی۔
طرح طرح کے محرک رہتا تھا۔ پھر گاڑی اسے پیچھے چھوڑ جاتی تھی۔
ایکسپریس میں نے پورا ہی دبا رکھا تھا اور اس رفتار پر گاڑی کا
انجن بھر پور طریقہ کھڑکھڑاتے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کھڑکھڑاہٹ
جیسے دور ہوتی چلی گئی اور کچھ دیر بعد کسی نا معلوم مقام پر ابھرنی
ہوئی مدھم مدھم موسیقی کی طرح سنائی دینے لگی۔ اس
موسیقی کی تپل پر میرے ماضی کا ہر لمحہ تھرکتا ہوا میرے سامنے
سے گزرنے لگا۔

وہ عسرت زدہ بچپن، وہ گنہگار جوانی، وہ بے مقصد شب
درواز۔ خدا میں انسان تھا یا کئی ہوئی چٹنگ؟ میری قسمت میں
کیا لکھا تھا؟ گروش دوراں مجھے کہاں لے جانا چاہتی تھی؟ مجھے
کچھ اندازہ نہیں تھا۔ دیر تک میں نہ جانے اندر ہی اندر اس
کس سے باتیں کرتا رہا۔ جانے کن کن مرئی، غیر مرئی چیزوں کو
چیلنج دیتا رہا۔ پھر مجھے ذہن یاد آئی۔ معلوم نہیں وہ کس مل
میں ہوئی؟ کس آسانی سے ہم اسے چھوڑ کر بھاگ آئے تھے
.... لیکن نہ بھاگتے تو کیا کرتے؟ اسے ساتھ لینے کے چکر میں
اس کے ساتھ ہم بھی کہیں اور ہی پہنچ جاتے۔

بہر حال وہ عورت بھرا تھی۔ اندر اور باہر سے ایک جیسی۔
سخت، بے حس مگر شفاف، بے کردار تھی مگر دنیا کی بیشتر
عورتوں کی طرح دیا کار اور کھوکھلی نہیں تھی۔ مجھے اپنے دل
میں کلک سی محسوس ہونے لگی۔ مجھے اس وقت ہی چھین
ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن بلکہ شاید بہت جلد ہی میں اس کی
تلاش میں واپس آؤں گا۔

سفر میں ہمواری آئی تو دیگر محسوسات جن کی طرف اب
تک دھیان نہیں کیا تھا، سر اٹھانے لگے۔ پیاس بہت
شدت سے محسوس ہونے لگی، طاق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔
بھاگ دوڑیں، کھینچیں، مہر کی کلاں اور جوتے گھر آئے، اس صبا

راستے میں کہیں روکا نہیں گیا۔ ”میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا
کہ اگر راستے میں دوران سفر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو
ہم کیا کریں گے لیکن یہ بات مجھے اس سے پوچھنے کا حوصلہ
نہیں پڑ رہا تھا۔“

وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔ حسب عادت مسکراتے کی
کوشش کرتے ہوئے بولا: ”میری طبیعت تو اگر خراب ہونی
ہے تو بس ہونی ہی ہے.... اور دوسرے بھانجے دوڑتے ہوئے تو ہم
اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکیں گے.... اس لیے بہتر ہے کہ
کسی خاص سمت میں ہی کسی مقصد کے تحت سفر شروع کیا
جائے.... صبح سے پہلے ہم انشاء اللہ لاہور پہنچ ہی جائیں گے....
تم بس اب دل میں یہ ٹھان کر کہ یہ دھن ذہن میں بٹا کر روانہ ہونا
کہ تمہیں ہر حال میں لاہور پہنچنا ہے.... تمہیں تو تجربہ ہو ہی چکا
ہے کہ جب ہماری قوت ارادی پوری طرح بیدار ہوتی ہے تو ہم
بڑی سے بڑی رکھوت پھیلا کر جاتے ہیں۔ میں تمہیں قاسم
خان کا ایڈریس سمجھا دیتا ہوں تاکہ اگر میں راستے میں
بلے ہوش بھی ہو جاؤں تب بھی تم سیدھے اس کے گھر تک پہنچ
سکو۔ اسے ساری بات بتا دینا.... میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ اگر
زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ہماری مدد ضرور کرے گا.... میرے
ذہن پر اب غنودگی سی طاری ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں
تکلیف برداشت کرتے کرتے میرے اعصاب جواب دینے
لگے ہیں یا ڈاکٹر ذہن نے مجھے جو انجکشن لگائے ہیں ان میں کوئی
خمار آور انجکشن بھی شامل تھا۔ میرا خیال ہے، اب تم اللہ کا نام
لے کر چل ہی پڑو۔“

میں نے محسوس کیا کہ ہم لوگ اچھے تھے یا برے لیکن ہر
کام خدا کا نام لے کر کرتے تھے۔ اللہ کو ہم تقریباً ہر بات میں یاد
کر لیتے تھے۔ اللہ پر دراصل سب ہی کو برا مانا ہوتا ہے کیونکہ
اللہ صرف اچھے لوگوں کا ہی نہیں، برے لوگوں کا بھی ہوتا ہے۔
ان سے ناراض ہوتا ہے، تب بھی انہیں اپنی رحمت سے
بایوس نہیں کرتا۔ یہ صرف بندے ہی ہیں جو کسی سے ناراض
ہوتے ہیں اور ذرا سی بھی طاقت کے مالک ہوتے ہیں تو ان کی
کوشش ہوتی ہے کہ اپنے معبود کا رزق بند کر دیں، اسے جلا
دیں، مار دیں، ناک کر دیں۔

میں نے گاڑی اشارت کی اور کچھ دور تک کے لیے میں چلے
کے بعد سڑک پر آگیا۔ یکنی سڑک چار بانچہ میل آگے جا کر
لاہور جانے والی سڑک سے ملتی تھی۔ سڑک کچھ ہموار نہیں
تھی۔ ہموار اور صحیح حالت میں تو خیر میں نے کبھی ان سڑکوں کو
بھی نہیں دیکھا تھا، جنہیں بالادھ کے کہا جاتا تھا، تو پھر مجھے

اب اس کے چہرے پر سینے کا ایک قطرہ تک نہیں تھا اور چہرہ جو کچھ دیر پہلے لٹھکی کی طرح سفید تھا اب تھمارا تھا جیسے ہمایا کچا سارا خون دین سٹ آیا ہو۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی چھو کر دیکھی، وہ بری طرح تپ رہی تھی۔ میں نے اسے آہستگی سے ٹٹولا۔ اس کا سارا جسم ہی ایسا ہو رہا تھا جیسے دیکتے نور سے نکلا گیا ہو۔ سانسوں کی آواز کسی خرفودہ ملی کی فخر اہٹ سے مشابہ تھی۔ میرے چھونے اور ٹٹولنے سے وہ ذرا بھی نہ کھسکا۔ وہ دنیا دار ایسا سے بے خبر تھا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ فی الحال اسے اسی طرح چارہ بنے دیا جائے۔ لاسٹ بجھا کہ میں نے میرے کو بلا۔ کوئلہ ڈر نکس کی دو بوتلیں خریدیں اور کچھ کھانے کی چیزیں لٹافوں میں پیک کر آئیں اور خود بھی کچھ کھائے بغیر یہ چیزیں گاڑی میں رکھ کر آگے روانہ ہو گیا۔ پانی البتہ میں نے خوب پی لیا تھا۔ پانی کو کھارہ تھا مگر پینے سے کوئی بد مزگی محسوس نہیں ہوئی تھی اور اب میں اپنے آپ کو کلن حد تک تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن اشرف خان کی طرف سے مجھے تشویش تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اب میں جلد از جلد لاہور پہنچنا چاہتا تھا۔

اشرف خان اس انداز سے لیٹا ہوا تھا کہ اس کے سینہ سے مرنے کا خطرہ نہیں تھا اس لیے میں نے رفتار کم نہیں کی تھی البتہ ہر آٹھ دس میل بعد میں گاڑی ایک طرف روک کر اس کا جائزہ لے لیتا تھا۔ وہ بدستور مری نیند میں تھا یا شاید بے ہوش تھا۔ میں نے دیکھا اس کے ذہم پر رکھی گئی بہت سی روٹی اور بیجوں کی کٹی تھیں بھی خون میں بھیجنے لگی تھیں لیکن میں نے بیہوش تبدیل کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ مبادا وہ بے آرام نہ ہو جائے۔ اس کے جسم سے اب گریا آج آ رہی تھی۔ راستہ بھر میرا کھانے پینے کو دل نہیں چاہا اور اشرف خان نے بھی آنکھ نہیں کھولی۔ میں خیر رعایت سے لاہور کی حدود میں داخل ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ پولیس کی جیب بھی نظر آئی لیکن وہ لوگ بہت تیزی سے میری مخالف سمت میں کہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

اشرف خان کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا البتہ اس کے چہرے سے کی سرفی غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ غیر معمولی پلاہٹ نے لے لی تھی۔ مجھے یہ شبہ بھی ہوا کہ اس کے چہرے پر درم آنے کی تھی یا شاید یہ عض میرا دم تھا۔ اس کی سانس بھی اب کچھ بے ربط سے انداز میں چل رہی تھی۔

لیجی اہمر رہی تھیں۔ اشرف خان بے چارے کا تو معلوم نہیں کیا حال تھا۔ اندر ہی اندر اس پر جو کچھ گزرتی تھی وہ پوری کوشش کرتا تھا کہ باہر سے کسی کو اس کا اندازہ نہ ہونے پائے۔ میں نے اسے آواز دے کر اس کا حال پوچھا۔ پہلے تو کوئی جواب نہ آیا۔ دوبارہ پکارنے پر اس کی آواز جیسے کہیں میلوں دور سے آئی "میں.... بس ٹھیک ہی.... ہوں.... تکلیف کم اور...." پاس زیادہ ستاری ہے.... میرا خیال ہے 'ڈاکٹر دنیہ نے مارینا کا انجکشن تو لگایا تھا مگر تکلیف کچھ زیادہ ہی ہے.... فنوڈگی غلبہ نہیں پاری.... سچ میں لنگ کر رہ.... گیا ہوں.... نیند بھی نہیں آ رہی.... اور ذہن.... پوری طرح جاگ بھی.... نہیں رہا۔" "میرا خیال ہے 'چارچھ میل کے بعد ڈرائیروں والا ایک ہٹیار خانہ آنے والا ہے۔" میں نے کچھ دیر پہلے دیکھے ہوئے ٹیک میل کے حوالے سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا "وہاں میں تھیں پانی کے ساتھ گولیاں بھی دوں گا اور کچھ کھانے کی بھی کوشش کریں گے۔"

وہ ہٹیار خانہ میرے اندازے سے کافی دور نکلا۔ اس تک سفر خاموشی سے کٹا۔ اس کی پیشانی پر مستانہ ہوش 'کاہورڈ' تو رہا تھا حالانکہ اسے ہوش تو کیا صحیح طور پر ریستوران بھی نہیں کہا جاسکتا تھا البتہ اس کے مستانہ ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کے دو تین میرے مستانوں ہی کی طرح کوہر کوہر پکراتے پکڑ رہے تھے۔ اینٹوں سے بنے ہوئے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا فٹس بھی غنسا مستانہ معلوم ہوا تھا اور اس کی آنکھیں دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کی رگ دپے میں غلبہ بھرے ہوئے سرکسٹ کی مستی رہی ہوئی ہے۔

میں نے گاڑی چھپروں سے کچھ فاصلے پر اندھیرے ہی میں کھڑی کی تاکہ میرے اندر زیادہ تاک جھانک نہ کریں۔ میں جب اپنی مطلوبہ چیزیں منگا چکا اور میرا واپس چاچکا تو میں نے اشرف خان کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے پیچھے جھک کر لٹکے اندھیرے میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ کہنی سر کے نیچے رکھے 'آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ٹانگیں بھی اس نے کسی نہ کسی طرح موڑ کر گھٹنے تقریباً پیٹ سے لگائے ہوئے تھے اور بائیں کروت لیٹا ہوا تھا۔ پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ 'دائیں ٹانگ اس سے موڑی نہیں جا رہی تھی لیکن اب شاید تکلیف کا احساس کچھ کم ہو چکا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے دیکھاؤں یا سونے دوں 'گولیاں اسے کھلاؤں یا رہنے دوں۔ میں نے ذرا ہمز طور پر اس کا ہاتھ پینے کے لیے لاسٹ آن کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ

’خیر۔۔۔ اب ایسی توپ چیز بھی نہیں ہوں گے تمہارے خان صاحب۔‘ میں نے دل میں سوچا۔ ایک تو ان نیچے والوں کو ہر جگہ ہر مقام پر اپنی اہمیت اور غیر ضروری مستندی دکھانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ انہیں احساس نہیں ہوتا کہ بعض اوقات کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے اور یہ درمیان میں چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں۔

”میں خان صاحب کے رشتے کے ایک بھائی کو لے کر آیا ہوں۔“ میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”زخمی ہے۔۔۔ بے ہوش پڑا ہے۔۔۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔۔۔ اسے فوری طور پر خان صاحب کی مدد کی ضرورت ہے۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

چوکیدار نے مشکوک سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پہلے سے بھی زیادہ بے مہربانی میں کہا: ”اب تو تم بالکل ہی لالہ بات کرتا ہے۔ خان صاحب کا تو کوئی رشتہ کا بھائی نہیں ہے۔ ان کا تو کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ تم کدھر سے اس وقت صبح فجر کے ٹیم ان کے رشتے دار کو اٹھا کر لے آیا ہے؟“ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بد بخت بھاری بکرا کسی صورت میں بھی معقولیت پر آمادہ نہیں ہوگا، میری بات نہیں مانے گا۔ اسی لئے میں نے ایک ہنگامی فیصلہ کیا۔ میں نے سرسری سی نظر سے اوپر اوپر دیکھا۔ کشادہ نگاہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے ایک آواز کے جو ایک پودے کے قریب کھڑا ٹانگ اٹھائے فاشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حواج ضروریہ سے فارغ ہو رہا تھا۔ اچانک میں نے پوری قوت گویا ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہوئے چوکیدار کی ٹانگ کے قریب گھوننا رسید کیا۔ یہیل گھوننا رسید کرنا انسان کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ پتہ چھٹ سکتا ہے اور انسان کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ قذائف میں مجھ سے بھی ٹکنا ہوا وہ ساٹھ نادر پایہ اپنی آسانی سے نہیں مرے گا۔

میرا بازو نہایت معافی سے دو سلاخوں کے درمیان سے گزر کر اس کے پیٹ تک پہنچا تھا اور اس وقت میرے گھونٹنے کے پیچھے میرے وجود کی ساری طاقت ہی کام کر رہی تھی، مگر اس دوران میرا ہاتھ ذرا بھی کسی سلاخ سے مس ہو جاتا تو شاید کوئی بڑی ٹوٹ جالی یا کم از کم کھال تو اوڑھ لی جاتی۔

چوکیدار اورغ کی زوردار آواز کے ساتھ ہوا میں اچھلا ڈھرا ہوا، کچھ سے کی سی حالت میں پختہ روش پر گرا بھرتا کر پٹ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے مزید حرکت نہیں کی۔ آج بھی

اشرف نے مجھے قاسم خان کا جو ایڈریس بتایا تھا وہ گلبرگ کا تھا۔ گلبرگ بھی میں کسی رہنمائی کے بغیر ہی پہنچ گیا البتہ اب یہی مطلوبہ غیر میں مطلوبہ کو بھی تلاش کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی اور سڑکوں پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اکلک گاڑیاں ہی اتنی جاتی دکھائی دی تھیں۔ پیدل چلنے والا کوئی نظر نہیں آیا تھا جسے روک کر میں راستہ پوچھتا۔

اکلک کو ٹھیکوں کے صدر دروازوں یا چار دیواری کے آس پاس مجھے چوکیدار نظر آئے اور پھر میں نے انہی سے مدد لی۔ انہیں میری بات اور مجھے ان کی بات سمجھنے میں دقت تو کافی پیش آئی لیکن برہ حال کچھ نہ کچھ رہنمائی تو مل ہی گئی۔ ان میں ایک چوکیدار تو ایسا بھی تھا جسے اس کو بھی کانسٹیبل معلوم نہ تھا جس کی وہ چوکیداری کر رہا تھا۔ بہت کم کو ٹھیکوں پر نمبر یا نیم پلٹیں نظر آ رہی تھیں۔

تقریباً پون گھنٹے کی خواری کے بعد میں پلازما مطلوبہ کو بھی پہنچ گیا۔ اس کے گیٹ کے ایک ہلو پر مارشل کے کنوے میں قاسم خان کا نام کندہ تھا۔ میں نے سکون کی ایک طویل سانس لی اور گاڑی گیٹ کے عین قریب لے گیا۔ موٹی موٹی سلاخوں والا یہ گیٹ زیادہ اونچا نہیں تھا مگر اس پر اندر کی طرف موٹا سا تاجھول رہا تھا اور کچھ دور ایک بازو کے قریب کرسی پر چوکیدار صاحب بیٹھے اور کچھ رہے تھے۔ بدوقت کرسی کے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے ہارن سے ہلکی سی بپ کی آواز پیدا کی تو چوکیدار چونکا اور اٹھ کر گیٹ کے قریب آیا۔ وہ چھوٹ سے بھی اونچا کزبل جوان تھا۔ پھولی پھولی مونچھیں اور ڈھیلی ڈھالی سیاہ شلوار قمیص، روایتی قسم کا بارعب چوکیدار۔ کوٹھی بھی ای کی طرح بارعب اور قدرے قدیم طرز کی تھی۔ آگے طویل وعریض لان تھا۔ اصل غارت کھلی پیچھے ہٹ کر تھی۔ میں نے گاڑی سے اتر کر گیٹ پر پہنچ کر دھیمی آواز میں کہا: ”مجھے قاسم خان صاحب سے ملنا ہے۔۔۔ بہت ضروری کام ہے۔ انہیں فوراً اطلاع کرو۔“

”بیگاریات مت کر۔“ چوکیدار نے رکھائی اور کھنگلی سے کہا: ”رات دس بجے سے لے کر صبح آٹھ بجے تک گھوڑوں کے سوا کوئی اس گیٹ سے اندر نہیں آ سکتا۔ یہ خان صاحب کا حکم ہے کہ جس کے لیے انہوں نے پہلے سے خود نہ بولا ہو اس کے لیے کسی بھی حالت میں گیٹ نہ کھولا جائے اور نہ ان سے پوچھنے کے لیے انہیں جگایا جائے۔ چاہے پولیس بھی ان کے دارنٹ لے کر آجائے، ان کو بھی صبح تک باہر بٹھایا جائے۔“

وہ مڑ کر دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں نے بھی اس کے پسلو سے جھانک کر دیکھا، راہداری کا فرش مالکوں کا تھا اور پالش کی وجہ سے مدھم مدھم روشنی میں بھی آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھ جیسا آدمی تو شاید اس فرش پر چلنے وقت ہر قدم پر دو مرتبہ پھسلتا۔ کشتہ راہداری کے دونوں طرف کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔

اس راہداری کے موڑ سے ایک کتے کا خونگ سر برآمد ہوا۔ اس کی پالش بھرکی زبان باہر نکلی ہوئی اور نوکیلے دانت دور ہی سے چمک رہے تھے۔ میں نے پہلی بار اتنا زبان دراز نہ کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پورا کا پورا سامنے آگیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ جسات کے اعتبار سے بھی وہ بے حد غیر معمولی کتا تھا۔ جسات کے اعتبار سے وہ کتا کم اور ایسا گدھا زیادہ معلوم ہوتا تھا جس کی صحت معمول سے کچھ کم ہوگئی تھی اور تعلیم کی کمی سے قد ذرا چھوٹا رہ گیا تھا۔

شکر کا مقام ہے کہ اس کتے کے گلے میں زنجیر موجود تھی جس کا سرا ایک قوی پیکل شخص کے ہاتھ میں تھا اور وہ قوی پیکل شخص رات کے پچھلے پیر بھی یوں تمام تر لوازمات کے ساتھ سوٹ پہنے ہوئے تھا جیسے ابھی ابھی کسی دفتر سے اٹھ کر آ رہا ہو۔ ٹھوڑی سی حیرت مجھے اس خیال سے بھی ہوئی کہ کتوں کو تو لوگ عموماً رات کے وقت چار دیواری کے بجائے کھلے میں چھوڑتے ہیں لیکن یہ عجیب کتا تھا جسے مالکوں نے اندر رکھا ہوا تھا اور اب بھی اسے زنجیر سے پکڑ کر لایا جا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ کتا انسانی معمولات کا عادی رہا ہو۔ یعنی دن میں گھر کی چوکیداری کرتا ہو اور رات کو خوابگاہ میں کسی شاندار قسم کے بیڈ پر سوتا ہو۔

جس شخص کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر تھی وہ لمبا ترنگا اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس کی رعیت جے ہوئے تانبے جیسی تھی۔ اس کی چندیا بالکل صاف تھی اور روشنی میں چمک رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ قدرتی مہیا تھا یا بعد کو شیش لٹکا کر اس حالت میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ بالکل اسی قسم کا سنگ مرمر معلوم ہوتا تھا جیسے عموماً ہندوستانی اور پاکستانی غلوں میں دکھائے جاتے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے نالے قد کا ایک اوجڑ عمر شخص بھی سلیر کھینتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر دھاری دار سیلینگ سوٹ تھا۔ کچھری بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے جن میں وہ انگلیوں سے نکلتی کر رہا تھا۔ دروازے پر کھڑا ہوا تو کہ ایک طرف کو ہٹ گیا۔ دراز قد

بچے چاروں خانے چٹ ہی پڑا رہا۔

”واہ بے گھونے، خوب کام دکھایا۔“ میں نے خود ہی اپنا ہاتھ چوم لیا کیونکہ اس وقت اس مشاقہ گھونے کی یاد دہانی ہو گئی اور نہیں تھا۔ پھر میں اس بھوکے بندر کی سی پھرتی سے بہت پرچھا جسے دوسری طرف کھانے کی کوئی چیز نظر آ رہی ہو۔ پہلی طرف کو دکر میں نے چوکیدار کی صوری ٹٹولی۔ اس کی جب میں تین چار چابیوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ ان میں سے ایک چابی گیت کے نالے کی بھی تھی۔

گیت کھولنے سے پہلے میں نے چوکیدار کو گھسیٹ کر ایک بازہ کی اوٹ میں لٹا دیا۔ گاڑی اندر لا کر میں نے گیت پر نسی بجز دیا، تلا نہیں لگایا۔ برآمدے کے سیڑھیاں چڑھ کر میں نے گلی تیل کا ٹین دہلیا۔ تیل نہ جانے کہاں گئی، مجھے اس کی خفیف یا آواز بھی سنائی نہیں دی۔ دروازہ جلد ہی کھل گیا۔ آنکھیں ملے ہوئے ایک شخص سے شخص نے باہر جھانکا۔ یہ بھی کوئی گولہ ملازم قسم کی سی چیز تھا۔ اہل خانہ معلوم نہیں کون سے ٹانے میں سوئے ہوئے تھے۔

میں نے اس ملازم کے سامنے بھی اسی قسم کا کٹھن دہرایا جو ہمیں جب چوکیدار کی خدمت میں عرض کر چکا تھا۔ سب قوتی انہوں نے بھی میری گزارش کو درخور اعتناء سمجھا اور کم از کم اسی قسم کا جواب دیا جیسا چوکیدار دے چکا تھا۔ دل تو یہی چاہا کہ ان موصوف کے ساتھ بھی وہی سلوک کروں جو میں چوکیدار کے ساتھ کر چکا تھا اور اس کے بعد خود ہی دھمکتا ہوا ملازم قاسم خان کی خواب گاہ میں جاٹھسوں لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اب قاسم خان کے ہر ملازم سے ہی ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اگر اس کا ہلکا بد کرنے کا امکان ہو تو وہ بھی قسم ہو جائے۔ صورتحال بہت تنجیدگی کی متقاضی تھی اور مجھے اپنی خاطر نہ سہی، ”شرف

خان کی خاطر قتل“ بردباری اور قوت برداشت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ دفعتاً تو ذکر کو چھو خیال آگیا اور وہ کسی احتیاط پسند چہرے کی طرح چمکتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا ”تمہیں چوکیدار نے اندر کیسے آئے دیا؟“ پھر اس نے آنکھیں سیر کر گیت کی طرف دیکھا جنہاں ظاہر ہے، اسے چوکیدار کی کوئی جھلک نظر نہ آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک نقشے سے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ گھر سے تو خاتمے مضبوط تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے دروازے میں پاؤں جھنسا لینا چاہیے۔ دفعتاً اس کے عقب میں راہداری سے آہٹ سنائی دی۔

سے تو ہم نے شہزاد کوٹ میں ہی پہنچا چھڑایا تھا اور یہاں تک راستے میں کسی نے مجھے شک کی نظر سے نہیں دیکھا۔" تب اس نے گویا غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی پھر میٹ کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے ہی پوچھا "جو کیدار کو لے ہے؟"

"وہ مجھے کسی قیمت پر اندر آنے نہیں دے رہا تھا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ اسے ایک گھونسا سید کرنا پڑا..... وہ دواہ بازہ کے قریب لینا ہوا ہے۔"

قاسم خان نے ناگوار سی بے باڈی گارڈ کی طرف دیکھا اور کہا "یہ حال ہے.... ہم ان لوگوں کے مجھ سے پر بھرا ہوا گھر چھوڑ کر سوئے رہتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ ایک گھونے میں جیت ہو جاتے ہیں۔"

اب مجھے قاسم خان پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کمبخت نے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا کہ اشرف خان کی حالت کیسی ہے اور نہ ہی وہ اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔ پہلے یہ اطمینان کرنے میں لگ گیا تھا کہ میرے پیچھے پولیس تو نہیں گئی ہوئی۔ پھر جو کیداروں کی اہلیت پر تبصرہ کرنے بیٹھ گیا۔ ہماری آمد سے وہ کچھ کچھ بے زار بھی نظر آ رہا تھا جیسے خواہ خواہ ہی شیشے بھلے کسی شخص پر کوئی بے گار ہو گئی ہو۔

چند لمبے وہ خاموشی سے ہوا میں گھومتے ہوئے ہاؤں میں اٹھیاں پھیرا رہا گویا کچھ سوچ رہا ہو پھر اس نے کونے میں سکر سمٹ کر کھڑے ہوئے نوکر کو مخاطب کیا "جہاڑ..... جا کر سروٹ کو اور ٹیبلٹ کو بلا کر ساتھ لے لو اور اس جو کیدار کے بچے کو بڑا سنگھار کر بلکہ چار چوتے سر پر مار کر ہوش میں لاؤ۔"

پھر اس نے گویا بادل بناؤ اسے برآمدے کی سیڑھیاں اڑ کر کار کا دروازہ کھول کر چند لمبے اشرف خان کا بازو لیا۔ اشرف خان ابھی تک بے ہوش تھا اور اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس کے چہرے پر مجھے سڑکے دوران جو تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔

در حقیقت درم ہی کی وجہ سے تھی۔ اب اس کے چہرے پر نمایاں تلوار پر درم آچکا تھا اور خون صرف اس کی بینچ پر دکھائی دے رہا تھا۔ جسم میں کیس اس کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"اس کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے۔" اس نے سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے تبصرہ کیا۔

وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے جناب، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ خاموش رہا۔ قاسم خان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "سنگھار میں اپنے پیچھے یا اس قسم کے دیگر مسائل وغیرہ کی رسائی نہیں

شخص نے کئے کی ذخیرہ کا کچھ اور حصہ ہاتھ پر لپیٹ کر ملٹی میں دبا ہوا تاکہ کئے کی رسائی کسی دوسرے شخص تک نہ ہو سکے اور وہ دوسرا شخص غالباً میں ہی تھا۔ قریب پہنچ کر کئے نے شعلہ ہار نظروں سے ایک بار میری طرف اور پھر دروازہ کھینے کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہا ہو کہ اس اجنبی کا کیا کرنا ہے؟ چرچا کر رہی ہے یا صرف شہ رگ چٹائی ہے؟

دراز قد کھنچا شخص جو یقیناً قاسم خان تھا، آنکھیں میکرے سوا لہ انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے دونوں بازو قدرے غیر فطری انداز میں ذرا اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی دونوں ہڈیوں میں ہولشروں کے ساتھ دیو اور موجود تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا، میں نے تیزی سے کہا۔ قاسم خان صاحب! میں شہزاد کوٹ سے آیا ہوں۔ آپ کا کزن اشرف خان میرے ساتھ ہے لیکن وہ...."

دراز قد سمجھے شخص نے غراتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ قاسم خان صاحب میں نہیں، یہ ہیں.... "اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ٹائے آدمی کی طرف اشارہ کیا "میں ان کا بڑی گارڈ ہوں۔"

میں اپنے اندازے کی غلطی پر ذرا گزرا گیا لیکن نورانی سنبھل گیا۔ بہت قد شخص اب آگے آ گیا تھا اور قدرے ٹیچنڈیگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے نقوش قطعی عامیانہ، ہونٹ موٹے موٹے اور رنگت قدرے سناٹا تھی۔ اس کی صرف آنکھیں قدرے غیر معمولی تھیں، ان میں لومڑی کی آنکھوں جیسی مکارانہ چمک تھی۔ وہ کسی بھی اعتبار سے "دور پار سے بھی اشرف خان کا شرتے دار بلکہ سرے سے خان ہی نظر نہیں آتا تھا۔ اشرف خان کو رہا پنا اور دروازہ تھا۔ اس کے بال بھورے اور آنکھیں نیلا ہٹ کی طرف مائل تھیں۔

میرا سلسلہ کلام جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جوڑتے ہوئے میں نے بات جاری رکھی اور نہایت اختصار سے سارا قصہ قاسم خان کو سنایا جس کے دوران وہ بار بار اپنا وزن مضطربانہ انداز میں ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتا رہا تاہم اس کے چہرے پر اضطراب یا تشویش کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ قدرے بے زاری آمیز غل سے میری بات سن رہا تھا۔

میرے خاموش ہوتے ہی وہ بولا "تمہیں یقین ہے کہ پولیس نے یہاں تک تمہارا پیچھا نہیں کیا؟"

"جی ہاں۔ مجھے یقین ہے۔" میں نے جواب دیا "پولیس

بھی سیای مائل ہو چکا تھا لیکن ایک چیز میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ گیت اس قدر رنگ آلود تھا مگر بند کرتے وقت اس کے قبضوں سے زرا سی چوں کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔
گیت بند کر کے واپس آکر اعظم خان نے سیای مائل چوٹی دروازے ہی میں لگا ہوا کل تیل کا شبن دبا یا جو سرسری نظر میں دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ جلد ہی ایک شخص نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند جھانک رہی تھی۔ وہ جوان ہی تھا تاہم عرش مجھ سے بڑا تھا اور خاصا مضبوط نظر آتا تھا۔ بنیادی طور پر میری ہی طرح وہ بھی ایک ایسا بے سالی ہی معلوم ہوا تھا جس نے شر آکر شری رہن سہن سیکھ لیا تھا اور بہت سی چالاکیاں بھی اس میں آتی تھیں۔

اعظم خان کو دیکھ کر وہ یک لخت کچھ مستعد سا نظر آنے لگا۔
”باہر آؤ۔“ اعظم خان نے اسے حکم دیا۔ ”ایک بندے کو اندر گیسٹ روم میں پہنچانا ہے۔ زخمی ہے۔“

وہ شخص باہر آگیا اور ہم تینوں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی کے پاس آئے۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اشرف خان کی حالت دیکھ کر اس شخص کے چہرے پر کوئی قصہ نمودار نہ ہوا۔ اس قدر مہربان سکون سے وہ اعظم خان کے ساتھ مل کر اشرف خان کو گاڑی سے نکلنے لگا جس طرح پیشہ ور مزدور کمپس سے بوری اٹھاتے ہیں۔

میں بھی ان کے ساتھ لگ گیا۔ اشرف خان کے جسم کو میں نے جہاں بھی ہاتھ لگایا، انگارے کی طرح تپتے ہوئے ہی پایا۔ اس کے چہرے پر درم غمیلیاں نظر آنے لگا تھا اور رنگت میں نہیں کہیں نیلاہٹ جھلکنے لگی تھی۔ سانس بھی اگڑی اگڑی ہی تھیں۔ نہایت احتیاط سے اسے اٹھا کر ہم اندر لے چلے۔

اس کو خفی کی اندر اور باہر کی حالت میں اتنا ہی فرق تھا جتنا کسی درویش کے ظاہر اور باطن میں۔ اندر سے اس کے فرش آئینوں کی طرح چمک رہے تھے اور درویدوار پر میل یا گندگی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

ایک ہل اور ایک ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ ایک آرام دہ بیڈ روم تھا۔ اشرف خان کو ہم نے ایک آرام دہ بیڈ پر لوند حال لایا۔ اس دوران ایک اور شخص بھی کمرے میں آگیا۔ وہ لاویز عمر تھا لیکن فیض زہرہ نوجوانوں کی طرح جینز جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ ہل لپکے لیے تھے۔ شرٹ بڑے بڑے رنگین پھولوں والی تھی۔ اس کا جسم کسرتی تھا اور اکڑا اکڑا ہوا تھا۔ کاکڑا سینے ہوئے تھا۔ اس نے مجھ

نے دتا اور نہ ہی میں ان معاملات کے سلسلے میں کچھ کرتا۔ بہر حال، تم فکرت کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے پاؤں کاڈ سے مخاطب ہوا ”اعظم خان!“ کچھ وقت تمہارے بغیر بھی گزارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یاد کہ اس نوجوان کے ساتھ چلے جاؤ۔ انہیں تم دو نمبر پر لے جاؤ۔ جمیل اور شرف سے کہنا کہ ان کی ہر ضرورت آرام کا خیال رکھیں۔ اشرف خان کو سنبھالیں۔ انہیں ذکر تم فوراً واپس آؤ۔ تب تک میں تیار ہوتا ہوں۔ اس کے بعد ہم کچھ ضروری انتظامات کر کے ان کے پاس پہنچیں، سمجھ گئے؟“

اعظم خان نے بڑے بروہاری سے اثبات میں سر ہلایا اور مجھ کی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر میں نے اسٹیئرنگ بلٹی سنبھالا اور اعظم خان کی رہنمائی میں ایک اور سفر شروع کیا۔

کچھ دیر بعد ہم جس علاقے میں داخل ہوئے وہاں قدم قدم مراکوں کے درمیان سبزے کے قطعات تھے اور بڑی بڑی اونچوں کے باغیچوں میں بابا ہر کچے راستوں پر گھنے درخت اترے تھے۔ یہاں بیشتر سڑکیں دائروں کی سی شکل میں تھیں۔
”یہ کون سا علاقہ ہے؟“ میں نے یو نیونی ازراہ تجسس پوچھا۔

”تم لاہور کے علاقوں سے واقف نہیں ہو!“ اعظم خان عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔
”واقف تو ہوں مگر سب علاقوں اور سب راستوں سے ناواقف نہیں بنے جواب دیا۔

”یہ مائل ماٹون ہے۔“ اس نے اختصار سے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی ہدایات کے مطابق دائیں بائیں رُستے ہوئے بلاخر میں نے گاڑی ایک ایسی کوٹھی کے پورچ لایا جادو کی جیسے باہر سے دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی انسان رہتا ہو گا۔ وہ بدبو دھواں کا مسکن لگتی تھی۔ بیل دھڑلہ لائن پر گھاس جھاڑ جھکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی لگا۔ ڈرائیوے کا فرش بری طرح ٹوٹا ہوا تھا۔ ہر طرف سوکے فٹلے کے انبار لگے ہوئے تھے اور دیواروں پر رنگ روغن کا تو نہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کی جگہ سیاہ کائی سی جی دی تھی جو کہیں کمری تھی اور کہیں ہلکی۔ حتیٰ کہ کھڑکیوں کے شیشوں پر بھی ایسی سیای اور گرد و غبار تھا جو اتنا جس کی وجہ سے ان کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے گاڑی روکی تو اعظم خان نے اتر کر سب سے پہلے

صورت حال کو دیکھ کر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ خاموش تماشاکی کی طرح ایک طرف کو کھڑا ہو گیا تھا۔

اشرف خان اپنی اس منتقلی کے دوران کسمپاشا تک نہیں تھا۔ اب بستر پر بھی وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے کپڑوں کا بیشتر حصہ ایک بار پھر خون میں تر ہو چکا تھا۔ ایک بعض جگہوں سے خون خشک بھی ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے زخم سے مزید خون نہیں رس رہا تھا۔ جتنا خون لکنا تھا نکل چکا تھا، شاید اس کے جسم میں اب خون رہا ہی نہیں تھا اور اگر وہ بھی گیا تھا تو صرف اٹاک کے زندگی سے اس کا فنا ہوا تھا۔

”تم اسی کمرے میں اشرف خان کے پاس بیٹھو۔“ اعظم خان ایک خوبصورت کاؤچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”آرام کرنا چاہو تو دوسرے بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو وہ سوچ لوڑ پر ایک کل منٹ لگا ہوا ہے۔“ اسے دیا دیا۔ کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔ میں واپس قاسم خان کے پاس جا رہا ہوں۔ ہم جلد از جلد کسی کونے کی سیل آئیں گے۔ اوسکے؟“

”اوکے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ تینوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا اور کمرے میں سکوت چھا گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور کاؤچ پر دروازہ ہو گیا۔ میری کمرے سے آکر تختہ ہو گئی تھی۔ ایک دم لینا تو بے اختیار کراہ نکل گئی۔ چھت پر نظریں جمائے میں سسٹانے کے سے انداز میں گہری گہری سانس لیتا رہا۔

چند لمحوں کے اندر اندر گزرے ہوئے واقعات خواب پریشانی کی طرح میری چشم تصور میں پرچھائیوں کی مانند رقصیں تھیں۔ بیٹھے بٹھائے تقدیر کا صرف ایک تھپڑ انسان کو کہیں سے کہیں پھینک دیتا ہے۔ اب تو خیر میں پھر بھی کچھ سکون محسوس کر رہا تھا لیکن جب میں ایک طرح سے بل صراحت عبور کر کے قاسم خان کے گھر پہنچا تھا تو اس کے روپے نے پہلے تو میرے گھٹنوں سے جان ہی نکال دی تھی اور اس کی سرد مری و لاشعلتی دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا تھا اور اپنے آپ سے پوچھنے لگا تھا کہ یہ ہے وہ شخص جس سے میں جانے کتنی امیدیں وابستہ کیے ہائپا کا پتا دوڑا چلا آیا تھا؟

شکر ہے قاسم خان نے جلد ہی سرد مری کی نقاب اتار دی تھی یا شاید زندگی کے محاملات میں اس کا انداز ہی ہوتا تھا۔ یعنی اس کے اثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بات تو جسے نہیں سن رہا اور نہ ہی اس میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن درحقیقت اس وقت وہ اسی سلسلے میں اپنے ذہن میں لائحہ

عمل تیار کرنے میں لگا ہوا تھا۔

میں نے ایک نظر اشرف خان کی طرف دیکھا۔ اس نے اقرار قری کے لمحوں میں قاسم خان کے پاس آئے کا بغیر ٹھیک ہی کیا تھا۔ اب ہم خالصے مضبوط حصار میں تھے۔ یہ تحفظ اور اعتماد کا احساس ہونے لگا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب اشرف خان بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے صحیح دوا کی ساتھ علاج میرا آ جائے گا۔

کسی قدر آرام اور سکون بسر آتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ غنودگی سے بالکیں بوجھل ہوئی باری تھیں۔ شاید کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگ ہی گئی تھی کیونکہ جب میں نے اپنے کان کے عین قریب ایک تجزی نویانی آواز کی تویں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ آنکھیں مل کر میں نے سامنے دیکھا مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر ایک جوان اور تقریباً سیاہ نام عورت کمرے دونوں ہاتھ رکھے ٹیکسی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی ٹکٹیں تھیں۔ وہ بنا اسکرٹ، لمبے سفید موڑے اور اونچی اڑتی کی جوتاں پہنے ہوئے تھی۔ اس کے نقوش بے حد حینکے اور جسم بے حد متناسب تھا۔ ہمارے ملکی معیار حسن کے مطابق۔ اس میں بس ایک کمی تھی کہ اس کی رنگت تقریباً سیاہ تھی، وزن اسے خاصی حسین عورتوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس کے چہرے پر کہیں کہیں پسینے کے دھبے چمک رہے تھے جو اس کی آبیوی رنگت پر خاصے پھلے لگ رہے تھے۔

وہ روانی سے انگریزی میں بولی۔ میں نے ہانسا لگا دیا ہے۔ اُر جہیں کچھ کہتا ہے تو ڈانٹنگ روم میں آجاء۔“

میں نے ایک لمحے کے لیے اپنے محسوسات پر غور کیا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں ٹپٹپ میں ٹپٹپ تو اٹھ رہی تھیں اور فضاہت بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن کچھ کھانے کو قطعاً دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آہم میں نے بستر سمجھا کہ مدد سے میں تھوڑی بہت خوراک ٹھونس لی جائے۔ ابھی نہ جلنے لگی تھی بھانگ دوڑی تھی اور اگر پیٹ خالی ہو تو انسان کا جسم کیا خواہش بھی صحیح طور پر کام نہیں کرتے۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں تقریباً ایک گھنٹا سو رہا تھا جبکہ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے بس آنکھ ہی جھپکی ہے۔ میں نے اشرف خان کی پیشانی اور رخسار وغیرہ چھو کر دیکھے۔ اس کا جسم بدستور آگ بٹا ہوا تھا۔ چہرے پر دردم اس قدر بڑھ چکا تھا کہ شکل ہی بدل بدل رہی تھی

کمرے میں میرے اور اس عجیب عورت کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میرا اب بھی کچھ کھانے کو تھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن ایک گلاس جوس کا پیا تو جیسے مدت سے کھڑی ہوئی کسی گاڑی کے زنگ آلود پردوں کو تیل مل گیا۔ معدے کی میٹھیری میں کچھ ردائی آگئی تو میں نے تھوڑا بہت ناشتا کرایا۔ یہی نہیں بلکہ میز پر غیر ملکی سگریٹوں کا ایک پیکٹ پڑا دیکھ کر میں نے ایک سگریٹ بھی سٹیکل اور دھوئیں کے غرارے کرنے لگا۔

میں سگریٹ ختم کر چکا تھا جب وہ عجیب عورت دوبارہ کمرے میں آئی اور پہلے کی نسبت ذرا مودبانہ لہجے میں بولی: ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو دوبارہ اسی کمرے میں جا کر بیٹھ جائیں جہاں آپ کے رُخنی ساتھی موجود ہیں۔“

میں خود اسی ارادے سے اٹھنے ہی لگا تھا۔ میں اس کی رہنمائی کے بغیر ہی گیسٹ روم میں واپس آ گیا۔ اشرف خان بدستور مومی جیسے کی طرح ساکت پڑا تھا۔ ایک بار پھر جان لیوا انتظار کا مرحلہ شروع ہو گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ اعظم خان کو مجھے دیکھتے ہوئے کھٹے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ بیٹھے رہتا میرے لیے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں شلنے لگا۔

دفعۃً چیزیں جیکٹ والے کا ڈبائے اوجیز عمر شخص نے دروازہ کھول کر اندر بھٹاکا اور اطلاع دی ”ہاں کاٹون ہے“ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

میں ایک کر اس کے ساتھ ہال میں آیا۔ میرے پیلو کتے ہی قاسم خان کی آواز سنائی دی۔ وہ بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں بول رہا تھا ”نوجوان! میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ ایک پرائیویٹ لیکن بہت بڑے اسپتال کے آپریشن ٹھیٹر میں اشرف خان کا آپریشن ہو گا۔ کوئی تم سے پوچھنے کا تو کچھ نہیں لیکن پھر بھی یاد رہے کہ اشرف خان کو حادثہ گولی لگی ہے۔ گوکہ حادثے کا بھی میڈیکل لیگن کیس بنتا ہے لیکن اس حادثے کا میں نے بنے گا۔ میں جلد ہی ایک ڈاکٹر اور ایک گاڑی لے کر پہنچ رہا ہوں جو ایسولینس کا کام دے گی تاہم اس پر ایسولینس کا نشان نہیں ہو گا۔ تم لوگوں کو رخصت کر کے میں تو آؤں چلا جاؤں گا“ میرا ایک آدمی تمہارے ساتھ رہے گا جو کام سنبھالے گا۔ میں نے سوچا“ تمہیں اطلاع دے دوں۔ اب تم بس تیار ہی رہنا“

”میں تو تیار اور تھکر بیٹھا ہوں۔“ میں دھیمی آواز میں کہا۔ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔

اور بلاہٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ مزید تشویش کی بات تھی کہ محسنوں سے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہ کھولی تھی اور از خود جنش تک نہیں کی تھی۔ سانس نا اتنی مدد ہم چلی رہی تھی کہ کوشش کے بعد ہی محسوس کی جاتی تھی۔

اس کی کیفیت پہلے سے بدتر پار ایک بار پھر میرے دل بچھوٹنے لگا۔ اعظم خان کو یہاں سے مجھے ایک گھنٹا ہو چلا تھا ابھی تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں وہ لوگ کس کے انتظامات میں مصروف تھے۔

آخری رگت والی وہ عورت کمرے پر ہاتھ رکھے بدستور جواب لب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی پیشانی ٹکلیں گھری ہوئی جا رہی تھیں گویا اپنے سوال کا جواب نہ پا کر جاگوا رہی محسوس کر رہی ہو۔

”دل تو نہیں چاہ رہا“ میں نے گزارے لائن انگریزی میں کہا۔ اسپتال میں کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑا بہت ناشتا کروں۔ کیا ان تمام نام پوچھ سکتا ہوں؟“ میں نے اپنی ننگری انگریزی کے ساتھ ساتھ انگریزوں والا ہی مینورزم (Mannerism) اختیار کرنے کی کوشش کی اور فوراً ہی تعارف کی فرمائش کر ڈالی۔ خلاف توقع اس نے نہایت ہی سرد مری سے میری رن دیکھا اور مجھے گھورتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

”میرا نام جانتا کچھ ضروری تو نہیں.... اور اگر تم مجھے نام سے قائل کرنا بہت ہی ضروری سمجھتے ہو تو پھر کس ٹرپ کہہ لیتے ہو۔“

”ٹرپ! یعنی پیندا۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”عجیب سا نام ہے۔“

”میں عورت بھی بہت عجیب ہوں۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی میرے شانہ پہ شانہ چل رہی تھی۔ قدم میں وہ مجھ سے کچھ ہی پھوٹی تھی۔ ایک راہداری گزر کر ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ تھا تو ڈانگ روم ہی لیکن اس کا ماحول بند روم سے زیادہ خوابناک تھا۔ کھڑکیوں پر لمبائی پردے گرے ہوئے تھے۔ چھت کے وسط میں ایک خوبصورت فانوس لٹکا ہوا تھا جس سے کئی رنگوں کی خوابناک کاروشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

بڑی سی میز اشیائے خوردنوش کے برتنوں سے بھری پڑی تھی۔ میز سولہ افراد کے لیے تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ٹائٹل کے انتظام بھی سولہ افراد کے لیے ہی کیا گیا ہے۔ فی الحال تو

بہاؤ خب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔

رہیو رو دکھ کر میں مڑا تو ادھر عمر کاڑوا لے میری طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا ہمارا بھی تک تعارف ہی نہیں ہوا۔ مجھے شرف کہتے ہیں۔ میں باس کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔
”مجھے بھرا نفل کہتے ہیں اور میں باس کا ادنیٰ غلام نہیں ہوں بلکہ سرے سے غلام ہی نہیں ہوں۔“ میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

”بہت خوب۔“ اس نے مزید دانت نکالے ”آپ تو خاصے زندہ دل فوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ برحال، باس آپ کے لیے خاصے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی انہیں کسی کے لیے یہ نفس نہیں کہیں جاتے نہیں دیکھا۔ وہ تو صرف انکارات جاری کرتے ہیں۔“

”وہ دراصل میرے لیے نہیں، میرے اس سماجی کے لیے پریشان ہیں جو فوجی حالت میں کمرے میں بے ہوش پڑا ہے۔ وہ دربار کے رشتے سے خان صاحب کا کزن ہے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کو بھی میں بلند آواز میں بولتے ہوئے اندیشہ سا محسوس ہوتا تھا جیسے سارا سکون درہم برہم ہو جائے گا۔ ”برحال، خان صاحب کی مہربانی ہے کہ وہ یہ نفس ان کا تردد کر رہے ہیں، ورنہ آجکل صاحب حیثیت اور طاقتور لوگ اپنے دربار کے رشتے داروں کو کب پوچھتے ہیں۔ خصوصاً مصیبت زدہ رشتے داروں کو۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”پھر اس نے سرسری سے کچھ میں پوچھا ”باس آ رہے ہیں نا؟“
”ہاں، کہا تو انہوں نے یہی ہے۔“ میں نے بتایا۔
”آؤ، باہر ہی کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتے ہیں۔“ اس نے تجویز پیش کی۔

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ راہداری سے گزرتے وقت مجھے ایک طرف بچھن نظر آیا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں ٹریپ اندر کھڑی دونوں ہاتھ کر رہے خانہ سال کو کسی بات پر ڈانٹ رہی تھی۔

”یہ عورت کون ہے؟“ میں نے سرسری لیے میں شرف سے پوچھا۔

”یہ اس گھر کی گھراں ہے۔“ آنس فیبر کا عمدہ قہقہہ سننے لگا۔ ”اس کے مقابلے میں باس نے اسے ہاؤس فیبر کا عمدہ دیا ہوا ہے۔ بڑی بد بخت چیز ہے۔ اچھے بھلے آدمی کو کبھی ہمارے دیوار سے چپکا ہوا ہے۔“ میرا مطلب سمجھ رہے ہو۔ ”وہ مجھے آنکھ مار کر مسکرایا اور جس پر مہربانی نہ ہو اسے آنکھ اشکابات

بھی نہیں کرتے رہتی۔“

میں نے تقیبی انداز میں سر ہلایا اور پوچھا ”اس کا نام کیا ہے؟“
”نام تو جی ہے لیکن کئی ناموں سے جانی جاتی ہے۔ ہم ٹریپ بھی کہلاتی ہے اور باس کے کچھ ملازم جل کر اسے کوبڑ بھی کہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ہم برآمدے میں آکر ہوئے اور اسی طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں محسوس کیا کہ شرف مجھے کریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بظاہر بے حد معصوم بنا رہا لیکن اس کے سوالوں کے جواب ام طرح گول کرتا رہا کہ اسے شک بھی نہ ہونے پائے کہ میں اسے کچھ بتانے سے کترا رہا ہوں اور اسے کوئی قاتل ذکر بہت کم معلوم نہ ہونے پائے۔

بہاؤ خریٹ کے سامنے کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی اور شرف نے لپک کر گھٹ کھولا۔ آگے پیچھے دو گاڑیاں پوسٹا آئیں۔ ایک تو نیلی اور سفید اسٹیشن ویگن تھی اور دوسرا ایک چم چم کرنی مرسیڈز جسے بارودی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس کا پچھلی نشست پر قاسم خان نیم دراز تھا اور اعظم خان پاس بے مستعد بیٹھا تھا۔ اسٹیشن ویگن میں ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک ہی شخص تھا۔

دونوں گاڑیوں کے دروازے کھلے۔ اسٹیشن ویگن سے چھوٹے قد کا قریبی مائل ایک شخص اتر آیا جو درمیانے درجے کے سوٹ میں بھی خاصا معزز اور خوشحال نظر آ رہا تھا۔ وہ مونے سے قریب کی نظر کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ ہاتھ نہ براف کیس تھا۔

مرسیڈز سے قاسم خان اور اعظم خان بھی اتر آئے اور ہم سب خاموشی سے اندر آ گئے۔ سلام دعا، تعارف یا رسمی کلام وغیرہ کا قطعاً تبادلہ نہیں ہوا۔ ہم سب گیسٹ روم میں آئے عینک والا شخص ڈاکٹر تھا۔ اس نے براف کیس سے اسٹیتسکوپ اور چھوٹی ٹارچ نکالی اور کسی سے پوچھے بغیر شرف خان کا سانس شروع کر دیا۔ پہلے اس نے تباہ دیکھنے کے لیے جینز کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن پھر جانے کیا سوچ کر اسٹیتسکوپ سے چیک کرنا شروع کر دیا۔ آنکھ کی پتلیاں دیکھیں، نشتوں میں روشنی ڈالی۔
کافی دیر بعد وہ سیدھا ہمارے طرف مڑتے ہوئے بولا اسے تو حیرت ہوئے کم از کم تو صاحب خان ہو چکا ہے۔“

میرے پیروں تلے سے گویا زمین کھل گئی تھی۔ لب بام پہن کر کند ٹوٹا گیا مٹی رکھتا ہے، اس کا اندازہ مجھے اسی لمحے ہوا۔
اس سے پہلے میں نے یہ منہم صرف شعر میں ہی بڑھا تھا مگر شعر زمانہ اور بات ہے اور عملی طور پر اس کیفیت سے گزرنا اور بات۔ ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا زہر کو چھونے اور زہر کو کھانے میں۔

اب تک میں اندر سے بہت مضبوط تھا، اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا اور بے غوثی سے ہر صعوبت برداشت کرنا آتا تھا کیونکہ امید کی شعل دل میں روشن تھی۔ توقع تھی کہ بالآخر سب کچھ وقت گزر جائے گا۔ اشرف خان ٹھیک ہو جائے گا تو ان تمام صعوبتوں کی یاد بھی ذہن سے محو ہو جائی گی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ میں محض ایک بے منزل سفر کے لیے اپنے آپ کو تھکا رہا ہوں۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید مجھ سے مذاق کیا جا رہا ہے لیکن پھر اپنے اس خیال کے بے تکیہ پن پر دل ہی دل میں مجھے خود بھی غمت محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے اندر اندر میں نہ جانے کتنی کیفیات سے گزرا اور بالآخر جب میں نے اپنے آپ کو اس حقیقت پر یقین کرنے کے لیے آمادہ کر لیا تو یقیناً مجھے ہولناک تشاکی کا احساس ہوا۔

میں بے جان سے انداز میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اشرف خان میرے لیے بے حد اہم آدمی تھا۔ میں اپنی جگہ، اپنی دانست میں بہت مضبوط سہی، بے خوف سہی اور ہر طرح کے حالات میں گمراہہ کر لینے کا اہل سہی لیکن وہ گویا میری ذات کا سائبان تھا۔ مجھ پر سایہ کسے ہوئے تھے۔ ایسے کاروباری شریک روز کھل ملتے ہیں جو دوستی کو دنیا کی ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں۔ میں واقعی دنیا میں شمار کیا تھا۔ میرا اب کوئی دوست نہیں تھا۔ میں رونا چاہتا تھا لیکن آنسو پیسے پینے کی گمراہیوں میں اتر گئے تھے اور انکارے بن کر دل کو خاک کر رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ سب میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر قاسم خان آگے بڑھا۔ اس نے بہت بدھانے والے انداز میں میرے کندھے پر چھکی دی۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کے خیال میں شاید میرے غم کا پس کی دوا اور تھا۔ ڈاکٹر کی طرف مڑ کر وہ بولا، ”آپ اب جائیں۔ بعد میں مجھ سے مل لیجئے گا۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ جمیل اور شرفو سے مخاطب ہوا۔
”ہرات میں کسی وقت لاش لٹکانے لگا رہتا۔“

آخر میں وہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہوا ”تم فی الحال آرام کرو، تمہارے اعصاب کو سکون کی ضرورت ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت محسوس کرو تو شرفو، جمیل یا سربپ سے کہہ دیجئے۔ دو ایک روز بعد ہم مزید بات کریں گے۔“
ان چند مختصر سے جملوں میں اس نے گویا سارے فیصلے کر دیے اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کا چہرہ ہر اثر سے عاری تھا۔ اشرف خان کی لاش کی طرف اس نے دوبارہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ باہر جانے کے لیے وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”خان صاحب! کیا اشرف کے لیے آخری غسل.... نماز جنازہ وغیرہ کا کوئی بندوبست نہیں ہو گا؟ آخری رسوم انجام نہیں دی جائیں گی اس کی؟“ میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

قاسم خان نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ گویا اسے مجھ سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں تھی۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں کچھ سی ناگواری چھپی ہوئی تھی۔ ”کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہماری لاش کے آدمیوں میں آخری رسوم کا اہتمام تو صرف انہی کے لیے کیا جاسکتا ہے جو طبی موت مرے۔“
”اس نے اشرف خان کی لاش کی طرف اشارہ کیا؟ اس قسم کے حالات میں اگر ہم آخری رسوم کے پکڑ میں پڑ جائیں تو ساتھ ساتھ ہمیں اپنی آخری رسوم کا بھی بندوبست کرنا پڑے گا“ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور سر جھکاتے ہوئے دیکھے

لہجے میں کہا، ”در اصل میں بنیادی طور پر تو رسانی ہی ہوں نا خان صاحب.... برا عجیب سا لگ رہا ہے مجھے.... کل تک اشرف خان میرا ایک بازو تھا.... آج مر گیا ہے تو جیسے غلط چیز کی طرح نوج کر پھینکا پڑ رہا ہے۔“
”ابھی تو آموز ہو۔ آہستہ آہستہ ان باتوں کے عادی ہو جاؤ گے“ قاسم خان نے ایک بار پھر میرا کندھا تھپتھپایا۔
میں نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رشت بھی محسوس کی
”ہر حال زیادہ کبیدہ خاطر ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ عین ممکن ہے کہ میونسپل کارپوریشن کی طرف سے اشرف خان کی آخری رسوم کا انتظام ہو جائے“ دھنسا آتے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چوہے ہوئے بولا ”حیرت ہے، مجھے ابھی تک تمہارا نام ہی نہیں معلوم۔“

”محمد افضل“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

قاسم خان نے شرفو کی طرف دیکھا اور کہا ”افضل صاحب کو کوئی کمر اکھلاؤ جنم سے دو چار دن ٹھہریں۔“

جوڑے اور ایک سوئٹر کا بند بست کر دو۔ سائز میں تھوڑا
بست فرق ہو تو کوئی پروا نہیں۔ مجھ میں ایک بری عادت تھی
ہے اور وہ یہ کہ میں دو تین اخبار ضرور پڑھتا ہوں۔ ”میں نے
اسے اخبارات کے نام بتائے۔ ”اگر یہ اخبار یہاں آتے ہیں تو
اچھی بات ہے۔ اگر نہیں تو کسی کو بھیج کر منگوادو۔“
اس کا چہرہ آذرات سے عاری رہا تاہم وہ اثبات میں سرہانہ
دروازے کی طرف راہیں جانے لگی تب میں نے جھپکتے
ہوئے پوچھا ”سنو.... وہ میرے ساتھی کی لاش کا کیا پتا؟“
اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی کول
جیسی آنکھیں بھی ہر قسم کے تاثر سے خالی تھیں۔ دھجھے سے
لیجے میں بولی ”یہ میرا شجبہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بھی
پوچھنا تو شرف تو یا نہیں ہے پوچھنا۔“

”اچھا.... میرے خیال میں اتنا تو تم کر ہی سکتی ہو کہ جس
کمرے میں میرے ساتھی کی لاش پڑی تھی وہی میرا ایک
بریف کیس رکھا ہے۔ وہ مجھے پہنچاؤ۔“ میں نے کہا۔ بریف
کیس دیے تو اشرف خان کا تھا لیکن اس وقت تو میں ہی اس کا
مالک گناہ لگتا تھا۔ اس میں توڑی بست رقبہ باقی تھی اور شاید
کچھ کاغذات یا دوسری کوئی کام کی چیز بھی موجود رہی ہو۔

”بریف کیس تو پہلے ہی یہاں پہنچایا جا چکا ہے۔“ اس نے
دوسری بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گردن تھما
کر دیکھا۔ بریف کیس موجود تھا۔ میں نے مطمئن انداز میں
سرہانہ اور مس ٹریپ کھٹ کھٹ کرتی دروازے کی طرف
چل دی۔ میزاول ایک بار پھر اتھل پھٹل ہونے لگا۔ دروازہ بند
ہونے پر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس عورت کا میرے
سامنے آنا میرے حق میں اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ آتے
وقت اتنی قیامت نہیں ڈھاتی تھی جتنی جاتے وقت۔ معلوم
ہوتا تھا کہ کلیجہ نکال کر ساتھ لے جا رہی ہے۔ شب دیکھ کر
بچی!

کچھ دیر بعد میری مطلوبہ چیزیں مجھے پہنچادی گئیں۔ میں
تیار ہو کر کمرے سے نکلا۔ میں اب اپنے آپ کو بہت ہلکا جھکا
محسوس کر رہا تھا۔ قدرت کی بھج پر یہ ایک بڑی نوازش تھی کہ
بڑے بڑے حدیث کا اثر میرے ذہن سے بہت جلد دور
ہو جاتا تھا۔

راہداری میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے راستے میں
اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا جہاں گزشتہ شام تک
اشرف خان کی لاش موجود تھی۔ لاش اب وہی نہیں تھی۔
بیڈ پر خالی اور بے شکن چادر اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی

شرف نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ
لوگ نہیں چاہتے تھے کہ میں اب اس کمرے میں موجود
رہوں۔ میں نے ایک نظر اشرف خان کی لاش کی طرف دیکھا۔
نیلا اور پھولا پھولا سا چہرہ اشرف خان کا چہرہ تو لگ ہی نہیں رہا تھا۔
الوداع اشرف خان.... میرے دوست! میں نے دل ہی دل
میں کہا اور اپنے پتلون میں اٹھتی ہوئی ایک عجیب سی ٹیس کو
دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اب کوشش کر رہا تھا کہ ماحول
سے کچھ دیر کے لیے لافلتی ہو جاؤں اور بے حس کی چادر
اوڑھ لوں۔ کیا ہو چکا ہے اور کیا کچھ ہونے کی توقع ہے، سب
کچھ بھول جاؤں۔

شرف کی رہنمائی میں میں ایک کمرے میں پہنچا۔ جو کمرے
میں اب تک دیکھ چکا تھا۔ یہ ان کی نسبت کالی چھوٹا تھا اور
معتدل قسم کے کسی ہوٹل کے کمرے سے مشابہ تھا۔
شرف کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر ڈھیر
ہو گیا۔ کچھ دیر تک میرے ذہن میں سناٹا ہی رہتی رہتی
اور وہ رہ کر کچھ واقعات کا عکس یوں جھلکنا آ رہا جیسے اندھیرے
میں۔ جگنو۔ پھر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے گویا
سب سوچوں کی گھڑی ہی باندھ کر کسی تاریک گوشے میں
پھینک دی اور گہری نیند سو گیا۔

کوئی میرے آہرام میں خلل نہیں ہوا۔ جب میں پوری
طرح بیدار ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے دن کی دوپہر قریب
ہے۔ میں تقریباً چوبیس گھنٹے سو رہا تھا۔ شرف کی ہدایت کے
مطابق میں نے سائڈ ٹیبل میں لگا ہوا ایک کال بٹن دبایا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دھمک ہوئی اور میری
اجازت پا کر مس ٹریپ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس وقت
جینز اور شرٹ میں تھی۔ بالوں کی پولی ٹیل باندھ رکھی تھی۔
خوشبو کے جھوکے اس کے وجود سے پھوٹ رہے تھے۔ کئی
ساتواں رنگت سے بھی ہلا کی تازگی جھلک رہی تھی۔ وہ اوپری
ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ کینٹ کا تھپیلے ہی اونچا
تھا۔ اب تو پوری اونٹ کی اونٹ لگ رہی تھی۔ میں نے کیس
پڑھا تھا کہ اونٹ کالے بھی ہوتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ
تھی کہ اس کی ہر جڑی قدم کے ساتھ دل اوپر نیچے ہوتا تھا۔

وہ سوائیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے
کسی سرائی کی طرح کھڑکھٹنے کے سارے بیٹھے ہوئے کلمات
سب سے پہلے تو میں پیٹ بھر کر کھانا کھانا چاہتا ہوں۔ جو کچھ
بھی تیار ہو، میںیں کمرے میں بھجواؤ۔ اس کے علاوہ میرے
کپڑوں کی حالت بالکل تباہ ہے۔ اگر ہو سکے تو میرے لیے ایک

نواب حیدر علی

الاس ایم اے قیمت: 200/-

ایک بے بس نوجوان کی حیرت انگیز داستان
جسے اپنی موت کا وقت معلوم ہو گیا تھا

مظلوم

یعقوب جمیل کے ہو شر با قلم سے
جس کا قارئین کو برسوں سے انتظار تھا

پاکستان ایڈیشن

فون 7668958

قاری ہوں۔ بور ہو رہا ہوں۔ ویسے بھی باس نے کہا تھا کہ آپ کو تماکیں نہ جانے دیا جائے تو بہتر ہی ہے۔
اس کے آخری خط پر مجھے کچھ ناگواری سے محسوس ہوئی۔
اس کا باس کون ہوتا تھا میرے لئے ہدایات جاری کرنے والا؟
لیکن اس کے لیے کی ملامت اور گائیڈ والی تجویز نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ میرے حق میں یہ بہتری تھا کہ شر کا ایک بھیدی میرے ساتھ ہوتا۔

”گائیڈ بن رہے ہو تو ذرا نیو رکا عظیم عہدہ بھی سنبھال لو۔“
میں نے گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”ہم آج صاحب بلوار بن کر بیٹھیں گے۔ آخر ہمارا بھی حق بنتا ہے کہ کبھی بھی آرام سے ذرا نا تھیں پھیلا کر بیٹھیں۔“
”کیوں نہیں صاحب جی؟ اس نے فوراً مودب ہوتے ہوئے کہا: ”آپ چاہیں تو نا تھیں کیا“ بازو وغیرہ بھی پھیلا کر بیٹھیں۔ پھر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بہت سی بیعدار قسم کے ذرائع روں کے انداز میں بولا: ”شرف رکھیے حضور!“
ہم دونوں نے بیک وقت قہقہہ لگایا لیکن اسی لمحے میری نظر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑی اور میرا قہقہہ ادھورا رہ گیا۔ ایک

دن ہے۔ یہ بھڑائی طرح کسی کی آمد کا منتظر ہو۔
اشرف خان کی یاد آتے ہی میرے دل میں ہلکی سی ٹیس
اچی لیکن میں نے فوراً اس کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا۔
میں اب مزید دھکی ہوتا نہیں جانتا تھا۔ میرے ذہن کو گزشتہ روز بتاتا شدید جھٹکا لگ چکا تھا، وہی کلنی تھا۔ جیسے حالات میں
بھی سی لیکن بہرحال قدرت نے مجھے میرے خوابوں کے شر
بچا دیا تھا۔ بریف کیس سے نکلی ہوئی کچھ رقم بھی میری جب
میں تھی اور کار کی چابیاں بھی۔ میں اب کسی حد تک پختہ بھی
ہو چکا تھا اور زمانے نے تجربات و خدوآت کی شکل میں بھی مجھے
بہت کچھ دے دیا تھا۔ میں اب اپنے اسکول منیجر کے ساتھ
ریاست سے آیا ہوا نو عمر لڑکا نہیں تھا۔ میں اب ایک نئے زاویہ
نظر سے، ایک نئے اہتمام سے شہر کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ کل کیا
ہوگا؟ یہ میں فی الحال سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

ویسے بھی میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں جو چند چھوٹے
سوتے تجربے حاصل کئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اکثر
آپ کے یہ سوچنے سے آپ کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا کہ
کل کیا ہوگا۔ کل وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔

میں اپنے خیالات کے بے لگام گھوڑے کو تھام میں کرنے
کی کوشش کرتے ہوئے باہر آیا۔ شرفو اسی طرح برآمدے کے
ستون سے ٹک لگے کھڑا تھا جس طرح ایک بار پہلے وہ مجھ
سے باتیں کرتے وقت کھڑا تھا۔ شاید یہ اس کی پسندیدہ جگہ اور
اس طرح کھڑا ہونا اس کا پسندیدہ پوز تھا۔ اگر وہ ایکسٹروٹو شاید
اس پوز میں اس کی تصویر اس عمارت کے ساتھ اکثر چھپا کرتی۔
”دوست“ ”دو فنکار“... شرفو اور ستون۔

میں جھٹس ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف
دیکھ کر آگے بڑھنے لگا تو وہ قدموں میں پسند اڑانے والے لیے
میں بولا: ”کہاں جا رہے ہو برادر عزیز؟“

اس کا طبع اب بھی کلاؤ انزوالا ہی تھا۔ اوجیز عمری کے بلو جو
وہ اس ٹھیلے میں چٹا تھا۔ صرف اس کا نام اس ٹھیلے کے
ساتھ نہیں چٹا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ اس نے اب تک
اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی خود وہ اپنا تعارف
کراتے وقت اپنا پورا نام بتاتا تھا۔ شرفو ہی کہتا تھا۔

”میں ذرا شہر کی سیر کرتے جا رہا ہوں“ میں نے سرسری سے
لے میں کہا۔

”میں بھی آپ کی ساتھ چلا ہوں۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے
بولا: ”میرا خیال ہے، آپ شہر کے راستوں سے کچھ زیادہ واقف
نہیں ہیں۔ میں گائیڈ کی فرائض انجام دے سکتا ہوں۔ بالکل

تھے اور ان میں سے کسی کسی پر بلب ٹمٹا رہے تھے۔
 ہاتھ روٹی میں آندہ نظر پھیل ہوئی یہ سڑک "نرکانہ" ہوا
 میں رہی ہوئی رات کی رانی کی مہک "یہ سب کچھ مجھے میر
 بھلا لگ رہا تھا۔ میں گہری سانس لے رہا تھا۔ کلی، تھوڑ
 اور منگنی ہوا میں صحیح معنوں میں انسان کو آزادی اور خدا کی ہر
 نعمتوں کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً جب جیب میں چار پیسے
 بھی موجود ہوں۔ "تھکن"، "نارنگی"، "تھن" اور "تھن" میں گھرے
 ہوئے انسان کو آپ لاکھ بتاتے رہیں کہ وہ آؤں ہے مگر اس کے
 چہرے پر رونق مشکل سے ہی آئے گی۔ جسم میں سنسنی بھی
 مشکل سے ہی دوڑے گی۔

"میری رائے میں یہ لاہور کی خوبصورت ترین سڑک ہے۔
 دنیا خواہ کچھ بھی کہے "شرف بولا۔ اس نے رفتار بالکل کم کر لی
 تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر کے دونوں طرف پھیلے ہوئے نو
 تعمیر شدہ عمارتوں کے سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا
 "یہ نیو کیسپس اور یونیورسٹی کے ہوسٹل ہیں۔"

ان سے کچھ آگے پہنچنے کے بعد ویرانہ سا شروع ہو گیا۔
 دونوں طرف کچھ دور تک تو کھیت پھیلے ہوئے دکھائی دے
 رہے تھے۔ ان سے آگے کیا تھا؟ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ آدوں
 کی سوہم سی روشنی میں بہت کم فاصلے تک کا منظر دیکھا جاسکتا
 تھا۔ وہ بھی ٹھنڈی بولوں کی سی شکل میں۔

ایک جگہ شرف نے گاڑی روک دی اور ہم اتر کر سر کے
 کنارے پر پھولدار پودوں کے ایک جھنڈ کے قریب بیٹھ گئے۔
 شرف نے بوتل کی سیل توڑتے ہوئے کہا "یونہی چلے گی۔" پلا
 گھونٹ بھرتے ہوئے وہ بولا "نئی دوستیوں کے نام۔"
 اپنی باری پر میں نے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "نہیں۔"
 پرانی دوستیوں کے نام۔"

اس شب اس ویرانے میں بیٹھے بیٹھے دیرے دیرے
 اداسی کی دھند میرے ذہن پر جھٹکتی گئی۔ غدار نے مجھے اداس
 دور کرنے میں مدد نہیں دی "اسے اور بھی گمراہ کر دیا۔" اداسی کے
 اس گڑے مردے کو تحت الشعور کے اندر حیرتوں سے اکھاڑ کر
 شعور کی جلیج بھجتی روشنیوں میں لایچیکا۔ "آدوں کی مدد
 روشنی میں کبھی کبھی غم کا پانی سیال چاندی کی طرح جھلکا اٹھتا
 تھا۔ کبھی دور کہیں جہازوں میں کوئی جگنو چمکا اور غائب ہو جاتا
 اسی طرح بھولے بھولے کچھ لوگ بھی میرے ذہن میں
 ایک لمحے کے لیے اپنی یاد کا انکار کر دیتے اور پھر جانے لگتے
 چھپ جاتے۔ جلنے کو کس حال میں تھا؟

میں بالکل چپ تھا۔ شرف خاصی تڑپ میں آچکا تھا اور ہر
 موضوع پر میری معلومات میں اضافہ کرنے پر علا ہوا تھا۔

عجیب سے احساس جرم نے میرا دل سرد کر دیا۔ اسی گاڑی کی
 پچھلی سیٹ پر میں کل اشرف خان کو لٹا کر لایا تھا۔ میں لاہور کی
 طرف آ رہا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا یار دھیرے
 دھیرے ایک دوسری ہی دنیا کی طرف منحوس تھا۔

میں نے توجہ پٹانے کے لیے فوراً دوسرا دھیرے چڑوں کی
 طرف دیکھنا شروع کر دیا اور پھر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شرف گاڑی
 ریورس کر کے گیٹ سے باہر لے آیا۔ کچھ دور تک گاڑی
 ڈرائیو کرنے کے بعد وہ بولا "یہ گاڑی ہے یا گدھا گاڑی؟"
 "جس حالات میں یہ میسر آئی ہے، ان حالات میں ہمیں
 صرف گدھا بھی قبول ہوتا۔ اسے تو پھر بھی کم از کم گاڑی تو کہا
 جاسکتا ہے۔ خواہ گدھا گاڑی ہی سہی۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

میں روڈ پر آکر شرف نے مجھے بتایا "یہ فیروز پور روڈ ہے"
 چوراسے پر پہنچ کر اس نے رفتار بالکل کم کرتے ہوئے مجھے ہر
 سڑک کے بارے میں بتایا کہ اس کا نام یہ ہے "اس کا نام وہ ہے۔"
 فلاں سڑک فلاں علاقے سے گزرتی ہوئی فلاں سڑک سے
 جا کر ملتی ہے۔ شہر کا نقشہ کچھ یوں ہے اور اب ہم فلاں سڑک پر
 جا رہے ہیں۔ وہ مجھے سمجھانا چاہتا تھا اور میں سب کچھ ذہن
 نشین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک بار دوپہر چوراسے پر پہنچ کر اس نے سر دس روڈ پر گاڑی
 روکتے ہوئے کہا "یہ گلیبر کی مین مارکیٹ ہے۔" پھر وہ ایک
 چھوٹی سی دکان میں جا کھڑا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لفافہ لیے
 جلدی سے گاڑی میں آ بیٹھا۔ لفافے میں بوتل پھنی ہوئی تھی۔
 تب میں نے دیکھا وہ شراب کی دکان تھی۔ ان دنوں شراب
 کی فروخت پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔

"میں نے سوچا کہ میری کتنی ہے تو بھر پور لطف اندوز
 کی جائے۔" وہ بوتل گھوڑا کھارٹ میں رکھ کر گاڑی اسٹارٹ
 کرتے ہوئے بولا "آپ کو ایسا شاندار میزید، ڈرائیو اور حکم کا
 غلام شاید کہیں نہ ملے صاحب جی؟ ہم ایک بار پھر نہیں دیئے۔"
 میں گردن پیش کا جائزہ لیتا جا رہا تھا اور وہ مجھے راستوں کے
 بارے میں اور قابل ذکر عمارتوں کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔
 جلد ہی ہم ایک سر کی چھوٹی سی پلٹا پر پہنچے جہاں سے اس نے
 گاڑی بائیں ہاتھ موڑ لی اور سر کے ستواؤں پر چلے لگا۔

میں چاروں طرف سبز ہی سبز تھا۔ گھر، گھر، گھر، گھر۔ سر
 کے دونوں طرف سڑکیں تھیں۔ کم چڑی مگر خوبصورت اور
 ہموار۔ ان کے ایک طرف فٹ پاتھ بھی تھا۔ سر کے کنارے
 ڈھلان پر بھی سبز تھا اور سڑکوں کے دونوں طرف درخت سایہ
 کے کھڑے تھے۔ شہر پر شام اتار آئی تھی اور میں تقریباً رات
 ہی جیسا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کہیں کہیں الیکٹرک پول موجود

کہ جب سینکڑا ٹرانا ہے تو اس کے گلے میں جو تھیلیاں سی پھرتی ہیں، انہیں انگریزی میں کیا کہتے ہیں اور یہ کہ کسی قسم کی آواز دالی لڑکی کن خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ لیڈون سے بلیڈ سے بیانی چاہئے۔

اجاک اس نے یوں بڑبڑا کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا جیسے سگریٹ پینا کوئی بہت ہی ضروری کام تھا جسے انجام دینا وہ بھول گیا تھا۔ جلدی میں اس نے سگریٹ فلٹر کی طرف سے جلائی۔ اسے شرم میں پیچیک کر اس نے دوسری سگریٹ سٹاک اور پیکٹ میری گود میں ڈال دیا۔ میں ایک لمحے پیکٹ کو دیکھتا رہا پھر اس نے بھی ایک سگریٹ سٹاک لی۔ آج صاحب بہادر کا پوری عیاشی کا دن تھا۔

ایک طویل کش لے کر شرف فیصلہ کن لیے میں بولا: اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔

”میں...“ میں نے برائے نام روشنی میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ میں بہت اختصار سے باتیں کرنے کا عادی ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی جب زبانی امتحان میں مجھ سے کسی چیز کی تفصیل پوچھی جاتی تھی تو خلاصہ بتاتا تھا اور خلاصہ پوچھا جاتا تھا تو خاموش رہتا تھا۔ شرف نے ایک گنگنا سناقتہ لگایا۔

میں نے بات جاری رکھی: میں دہائی گھرانے کی پیدوار ہوں۔ میں چھوٹا تھا تو میں مرگیا۔ تھوڑا بڑا ہوا تو باپ مر گیا۔ تھوڑا اور بڑا ہوا تو دونوں چچاؤں کی آنکھ کا پانی مر گیا اور انہوں نے مجھے گھر سے نکل باہر کیا۔ اوھر اوھر دھکے کھانا ہوا پھر آخر شرف خان سے آکر آیا اور اس کے ساتھ مل کر چھوٹے چبانے پر اوھر کا مال اوھر کرنے لگا۔ ہم تیزی سے ترقی کر رہے تھے لیکن فلک، کچر قمار کو ہماری ترقی ایک آنکھ نہ بھائی اور شرف خان مر گیا۔ یہ سب نقدی کی کل داستان حیات میں نے بھی نقشہ لگانے کی کوشش کی اور اپنے قہقہے کے کھوکھلے پن پر خود ہی جبران رہ گیا۔

”بھر بھی تم خوش قسمت ہو یا؟“ وہ یقیناً ہی حد سے زیادہ عجیبہ ہو گیا۔ کم از کم پیچھے کہیں تسمار کوئی گھراؤ نہیں کسی کو تسمار انتظار تو نہیں رہتا، نہیں کسی سے جھوٹ تو نہیں بولنا پڑتا۔ میں بھی دہائی ہوں لیکن میرا دہائی میں ایک بھرا پر اگھر ہے، میرا چھوٹا بھائی ہے جو کالج میں پڑھ رہا ہے، بوڑھی ماں ہے جو میرے سر پر سرے کے پھول دیکھنے کے انتظار میں موت کے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ نوسال قبل میں بالکل قلمی انداز میں اپنی بہن کی شادی کے لیے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے شہر آیا تھا لیکن میرے ساتھ جو نرینڈی ہوئی وہ شاید قلمی

نرینڈی سے کچھ مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ اب جبکہ میری بہن کی شادی کے لیے روپیہ جمع ہو چکا ہے، نیز تیار ہے تو کوئی رشتہ نہیں مل رہا کیونکہ اس کی عمر زیادہ ہو چکی ہے۔ میں مجھے کہتی ہے کہ میں کچھ کوشش کروں اور شرمیں ہی اپنی برادری کا کوئی لڑکا دھوڑنے کی کوشش کروں۔ وہ اس لیے مصیبت کے ساتھ مجھے یہ تاکید کرتی ہے کیونکہ اسے علم ہی نہیں کہ میرا واسطہ کن لوگوں سے ہے، کن لوگوں میں روز و شب گزرتے ہیں اور میں کیا کام کرتا ہوں۔ انہیں تو یہی معلوم ہے کہ میں شرمیں ایک چھوٹی سی فرم میں منیجر لگا ہوا ہوں۔ ”در حقیقت تم کیا کرتے ہو؟“ میں نے دھستے لیے میں پوچھا۔

”میں بہت کچھ کرتا ہوں اور بظاہر دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں کرتا۔“ وہ چٹکی بجا کر سگریٹ کی رائیٹ جھاڑتے ہوئے بولا۔ ”میں اس مائل ٹائڈن والی کو بھی میں تقریباً ہر وقت موجود رہتا ہوں۔ پاس کو جب بھی کوئی ایمر جسی پڑتی ہے، وہ اس کا رخ اوھر ہی کو موڑ دیتا ہے۔ میں ہر ایمر جسی کو سنبھالتا ہوں۔ میں صرف مال لانے لے جانے کے لیے کہیں نہیں جاتا۔ اس کے علاوہ پاس کسی وقت کسی بھی کام کے لیے مجھے طلب کر سکتا ہے، کہیں بھیج سکتا ہے یا میرے پاس آسکتا ہے۔ میں بڑی کثیر القاصد قسم کی چیز ہوں۔“ وہ خود اپنا مذاق اڑانے کے لیے انداز میں ہنس دیا۔

اسے جیتا ایک طویل عرصے کے بعد اپنے دل کا بوجھ کم کرنے کا موقع ملا تھا۔ مجھے اس سے بد روی تھی۔ خصوصاً اس بنا پر کہ اس نے اتنے کم وقت کی شناسائی میں اپنا آپ میرے سامنے بے ختاب کر دیا تھا۔ اپنی ذاتیات اور گھریلو مسائل سے بھی پردہ اٹھا دیا تھا۔

”زندگی اسی کلام ہے پیارے“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں بھی اسی یقین کے ساتھ زندہ ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”اس کبھی کبھی یہ مجھے دل گرفتہ کر دیتی ہے۔“ اس نے بولتی ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں یہ بولتی ہی کا کمال تھا کہ وہ اتنی جلدی مجھ پر کھل گیا تھا۔

اجاک ہی وہ اٹھتے ہوئے بولا: ”تو، چلیں۔“

”کہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی اصل شر کی سیر ہو رہی ہے۔“ وہ گاڑی کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔

اگلی پلایا سے سیر کر کے کے بعد اس نے گاڑی دوسری طرف کی سڑک پر واپس موڑ لی۔ ایک پارکسری مستعد گاڑی کی طرح وہ مجھے ہر موڑ، ہر سڑک کے بارے میں بتانے لگا۔

میرا ہاتھ تھا سہ بازار میں آیا اور آگے چلے گا۔

اس نے جانے کی ضرورت محسوس کی نہ میں نے پوچھنے کی
میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ بازار حسن تھا۔ وہ ایک لمبی سی لم
دار سڑک تھی جس کے اطراف میں جانے کتنی پرہیزگاریاں
بجلی ہوئی تھیں۔

کچھ مینی سنوری طوائفوں کے جھرمٹ ابھی اپنی رہائش
گاہوں سے نکل کر کوٹھوں کی طرف آرہے تھے۔ کچھ اپنی
دکانیں سجا چکی تھیں۔ اکثر کوٹھوں کے دروازے کھلے تھے اور
ساؤنڈز ابھی اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ کبھی کبھی
سے چلنے کی ادھوری تھپ تھپ، یا ہارمونیم کی روں روں، کسی
زخمی کی کراہ کی طرح ابھرتی اور معدوم ہو جاتی۔

کسی کسی بلاناغے پر بھی کوئی رقاصہ بن سنور کر کھڑی ہوئی
تھی اور ستلاشی نگاہوں سے گزرتی ہوئی ٹیوں کی طرف دیکھ
رہی تھی۔ پان سگریٹ اور اشیائے خوردنوش کی دکانوں والے
اپنی دکانوں کو آخری ربک دے رہے تھے۔ یہاں کی دکانیں
بھی شاید طوائف دکانیں تھیں۔ رات کا رنگ گہرا ہونے پر
ان کی ترسین و آرائش ہو رہی تھی۔

پھولوں کے گجرے والے قدم قدم پر کھڑے تھے اور ہر
آنے جانے والے کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بازار میں
خوب چل پھل تھی۔

قدرے عجیب سے انداز میں کچھ لوگ یکے بعد دیگرے
ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ان میں کوئی ٹانا تھا، کوئی لمبا۔ کوئی
بھول تھا اور کوئی خوب گھٹا ہوا۔ کوئی سیاہ فام تھا اور کوئی خوب
گورا ہٹا۔ کوئی کلین شیو تھا اور کوئی گھٹی مونچھوں، جوڑی چھاتی
والا۔ کسی کی ہاتھوں سے پان کی بیک برسی تھی تو کسی کی
آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

کوئی تن کر چل رہا تھا تو کسی کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں
لیکن ایک بات ان سب میں مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب بیٹھی
بٹھتی سی آواز میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کبھی ایک ہمارے
قریب آتا اور قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے ان دیکھی
حسیاتوں کے الف لیلو حسن کی کمائیاں سناتے لگتا۔ کبھی
دوسرا قریب آتا اور ہمیں پرستان میں لے چلے کا وعدہ کرتے
لگتا۔ کبھی کوئی اور تعاقب میں آتا اور ہمیں صاحب ذوق
نواب زادے قرار دیتے ہوئے ہمارے ذوق کی تسکین کے
لیے اپنی خدمات پیش کرتا۔

شرنوبت سے مشابہ انداز میں ان سب کو ٹال جلا جا رہا تھا۔
بلاخرہ ہم ان سب کو پیچھے چھوڑ آئے۔ اب کوئی بھی سرگوشی
ہمارے تعاقب میں نہ تھی۔ شرف نے رک کر متلاشی نظروں

خاصے طویل سفر کے بعد وہ ایک موڑ کھینچے ہوئے بولا "وہ
سانے سیکر پھوٹ ہے۔۔۔ میرے خیال میں تو اصل لاہور بس
یہاں سے شروع ہوا ہے۔ مجھے یہاں پہنچ کر بڑی خوشی ہوئی
ہے۔ کچھ روتی بیلہ نظر آتا ہے اور میں ٹھہرا تھمادی طرح ہی
بنیادی طور پر رسائی۔۔۔ روتی بیلے کا دلہا وہ۔ جینز پہن لی ڈکیا ہوا۔"
"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مغربی ممالک میں
جینز رسائی ہی پہنچتے ہیں یا پھر شرمیں رہنے والے غریب غریبا، جو
اچھا لباس انورڈ نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں شاید یہ شہری اور
فیشن ایبل ہونے کی علامت ہے۔" میں نے اس پر اپنی علیت
کا رعب جھانسنے کی کوشش کی۔

"ہمارے ہاں اگر جینز شہری اور فیشن ایبل ہونے کی
علامت ہے تو ٹھیک ہی تو ہے۔ وہ منہ ہا کر بولا "کیونکہ ہمارا عام
رسیاتی تو بے چارہ ٹخنوں سے ایک پلاٹ اوپنی دھوئی بھی
مشکل سے انورڈ کرتا ہے۔"

اب ہم جس تک سی سڑک پر تھے وہاں ٹریفک کا عجیب سی
جالم تھا۔ ٹانگوں کے گھوڑے سائیکل سواروں سے بھل گیر
ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں اور کاریں گویا ایک
دوسرے سے دست و گریب 'ہونے کے لیے پیٹاب تھیں
اور اسکوٹسوار ان سب کے درمیان سے اپنا راستہ بنانے کے
لیے کوشش تھے۔ پیدل چلنے والے گویا ان سب کو ہی ٹکست
فلاش دینے کے خواہاں تھے۔ وہ سارے ہنگامے سے بے نیاز
جہاں سے دل چاہتا تھا چاہک ہی سڑک پار کرنے لگتے تھے۔
سڑک پار کرنے کے دوران غالباً انہیں خیال آ جاتا تھا کہ مسئلہ
قیٹانورٹ یا فلسفہ ارسطیس پر غور کرنے کے لیے یہ بہترین
مقام ہے چنانچہ وہ کمری سوچ میں ڈوب جاتے تھے اور اسی
دوران غالباً انہیں غنودگی آ جاتی تھی۔ سڑک پار کرتے ہی البتہ
وہ مستعد اور چٹان چوبند نظر آنے لگتے تھے۔

کئی بار مجھے حدت محسوس ہوا کہ کوئی گھوڑا ہماری کاری
کھڑکی سے گردن اندر لا کر میرا کار چپاتے ہوئے پوچھے گا "اور
سناء یار کیا حال ہے؟" چنانچہ میں نے کھڑکی کا شیش چڑھایا۔
میں بھولا نہیں تھا کہ میں بھی بنیادی طور پر رسائی ہی تھا لیکن
شاید میں اتنا بھی رسائی نہیں تھا کہ اس روتی بیلے سے محفوظ
ہو سکتا۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اپنے خوف کا اظہار شرف پر بھی کر دیا۔ وہ بولا "اسی
لے تو میں تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ ویسے خیر، دو چار دن کی
بات ہے، تم بھی اس ٹریفک کے علوی ہو جاؤ گے۔"

کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک تنگ سے بازار میں موڑ لی
اور پھر اگلی گلی میں ذرا سی جگہ پارک روک لی۔ گاڑی سے اتر کر وہ

تائیکہ نے دروازہ بند کر دیا تھا اور لڑکی نے رقص کے ساتھ ایک غزل شروع کر دی تھی۔ اور شروع ہوئے ہی آواز میں کونٹے کے آداب بتا رہا تھا۔ نوٹ کس طرح دیئے جاتے ہیں۔ رقص کی کوئی لڑکا مطلب کیا ہوتا ہے اور اس کے جواب میں کیا کرتا ہے۔ آتے اور جاتے وقت کونٹے پر موجود دیگر افراد سے کیا سلوک کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد وہ تائیکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”نو آواز ہے۔ بھلی بار آیا ہے۔ اسے طور طریقے سکھا رہا ہوں۔“ ”چھوڑیں جی۔ خودی سیکھ جائیں گے۔“ پچاس سالہ تائیکہ پندرہ سالہ دو شہرہ کی طرح اٹھلا کر بولی ”ان کی پریشانی مجھے بتا رہی ہے کہ اب یہ آئندہ اس بازار میں آتے جاتے ہی رہیں گے البتہ ایک انڈیشہ ضرور ہے۔“ وہ نہایت ہی سرد آہ بھر کر بولی ”کہ جب تک یہ پختہ کار ہوں گے تب تک ہماری رہائش نہ لیٹ دی جائے۔ ہمارے بچے پر دن بہ دن سختیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ فن دم توڑ رہا ہے۔“

تائیکہ کے منہ سے لفظ ”فن“ کا استعمال سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر اس کی مراد انگریزی والا FUN تھا تو شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی ورنہ جس انداز میں لڑکی مرزا غالب کی غزل کو ایک فلمی گانے کی طرز پر گاری تھی، اس سے تو میں پتا چل رہا تھا کہ اردو لافان کلنی عرصے پہلے ہی کم از کم اس کو کونٹے پر دو دم توڑ چکا ہے۔

رقاصہ مجھ پر نرزدہ مرزا تھی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے پاس زیادہ رقم موجود ہے۔ مجھے آتے وقت چاہی نہیں چلا تھا کہ شرف بوٹی بھی ساتھ لے آیا تھا۔ غزل کے بعد لڑکی اپنی اوقات پر یعنی فلمی گیتوں پر اپنی اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ خواہ خواہ ماحول کو جو اسے پچ آف کلاس دینے کی ہمواری کو خوشی کی جا رہی تھی اس سے نجات مل گئی تو سب اپنی اپنی جگہ تنگ میں آ گئے۔

بازار حسن کا تصور میرے لئے ہمیشہ ایک عجیب اور پراسرار سی دنیا کا رہا تھا اور میں کلنی حد تک خوش تھا کہ آج میں نے یہ دنیا دیکھ لی تھی۔

انچائک ایک ہلکا سا کھانا کھا ہوا۔ دراصل کسی نے لات مار کر دروازہ کھولا تھا۔ ساتھ ہی چارپانچ آدمی دھڑ دھڑ کرتے اندر آ گئے۔

وہ منی میں تھڑے ہوئے جوتوں سمیت بے داغ چاندنی پر آن کھڑے ہوئے۔ ان میں سے تین تو اچھے خاصے نیم پہن گئے تھے۔ سب کے گریبان کھلے ہوئے تھے اور سب کے گلے میں مظر تھے۔ سب کی شلوار قمیصیں ڈھیلی ڈھالی اور

ہے چاروں طرف دیکھا۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس بازار میں داخل ہونے سے پہلے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ خشک سی ہوا بنی رہی ہے لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے لوہاں رہی ہے۔ مجھے اپنے چہرے پر ہنس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے خشک بوٹوں پر زبان پھیر لی۔

سانے ہی ایک کونٹے پر بیٹھی ہوئی رقصہ مسکرائی۔ وہ بھی کہ شاید میں نے اسے دیکھ کر بوٹوں پر زبان پھیری ہے۔ میں نے اس کے بے تحاشا میک اپ کی وجہ سے گڑے ہوئے چہرے سے گھبرا کر رخ بدل لیا۔

ایک دوسرے کمرے میں بھی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کمرے میں اتنی تیز روشنی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ پانچ چھ سازندے بیٹھے ساز درست کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک فریبی مائل سازنی سی تائیکہ بیٹھی بڑے جوش و خروش سے پانچ چار ہی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں چاندنی پر وہ پتلی سی لڑکی شہزادہ انداز میں بیٹھی تھی۔

شکل و صورت تو اس کی کوئی غیر معمولی نہیں تھی مگر ایک بات غیر معمولی ضرور تھی کہ اس نے میک اپ بہت ہلکا کیا ہوا تھا۔ ورنہ اب تک مجھے جتنے چہرے نظر آئے تھے ان سب کے اصل نعوش دریافت کرنے کے لیے شاید باقاعدہ کھدائی کرنی پڑتی۔ جیسے کیوں اتنے زیادہ اور سستے قسم کے میک اپ سے لکھے دھشت ہوتی تھی۔ غنیمت تھا کہ شرفو بھی ابھی تک ایسے کسی چہرے کی طرف نہیں لپکا تھا۔

میں جس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر اس قدر ہلکا میک اپ مجھے ایک انسانی محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس کے پاس میک اپ کا سامان ختم ہو گیا تھا۔ وہ ہمیں اپنی طرف حوجہ باگر بیروں میں گفتگو باندھنے لگی۔ شرفو میرا ہاتھ پکڑ کر لڑکھٹے کی طرف بڑھ گیا۔

تائیکہ نے یوں اٹھ کر ہمارا استقبال کیا جیسے وہ ہمارے ہی انتظار میں اس عمر کو پہنچ گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے ہماری بلائیں بھی لیں۔ اس کے روپے میں مصنوعی جوش و خروش اور طوم کی اس قدر فراوانی تھی کہ میں کچھ شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ لڑکی بھی جھک کر آداب بھلائی۔ ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔

باہر چوتھے پر ایک مرقع سالز کا بیٹا بڑے اٹھاک سے کھڑک پنا رہا تھا۔ تائیکہ نے اسے دو ڈالیا اور ہمارے لیے کولڈ ڈرنکس اور پانچ منگوائے۔ کولڈ ڈرنک پینے کے بعد میرے اہلکار کچھ بہل ہوئے اور میں اپنے آپ کو اس قابل محسوس کرنے لگا کہ جو کچھ میرے سامنے تھا اس سے محظوظ ہو سکوں۔

دھت تھے۔

”شہری بابو ہیں۔ پچاروں کا دم خشک ہو رہا ہے۔“ دتے نے کھر کھرائی آواز میں کما اور سب نے ہم آہنگ قہقہہ لگایا۔ سوئی تاڑ کچھ اس قسم کا تھا جیسے کمرے میں بہت سے کتے بلیاں لڑ پڑی ہوں۔

”بیٹھ جا، بیٹھ جا۔“ مجبور بد معاش نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کے دھکیلنے سے میں واقعی دھکیلا جاتا۔ مجھے بہت بد مزگی محسوس ہو رہی تھی۔ ان بد بختوں نے نہ جانے کیوں انکر سارا الخف غارت کر دیا تھا۔

مجھ سے زیادہ بد مزگی شاید مجبور بد معاش کو محسوس ہوئی تھی کیونکہ میں اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر پیلے سے زیادہ دباؤ ڈالتے ہوئے بولا: ”اے بیٹھ جا! ہم تو روز ہی ناچ کا ناچ کھتے ہیں۔ ہم تو تھیں ناچ دھکائے آتے ہیں۔ تھکی کا ناچ۔“

اس بار بھی میں پیچھے نہ ہٹا تو اس نے مجھے اگلے ہاتھ کا تھپڑ رسید کرنے کے لیے بازو تھمھلایا۔ اس کا دامن میں نے کھائی پر روک لیا۔ ماحول کا سکوت یک لخت ہی ٹوٹ گیا جیسے کسی مشینی نظام کا ٹین دبایا گیا ہو اور ہر چیز حرکت میں آئی ہو۔ اور صحن نے مجبور بد معاش کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا اور وہ دو ہوا ہوا اور اوھر شرف نے نہ جانے کیا دواؤں آؤلیا کہ اس کے سامنے راست روک کر کھڑا ہوا لیکن خیم بد معاش یوں دردناک سے ہوتا ہوا باہر سڑک پر جا کر اچھے کسی لڑاکا بھائی نے شراب کے لائے ہوئے ناقص آؤلوں کا تھمھلانا اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا ہو۔ بولت بھی اس کے ساتھ ہی باہر جا کر یوں سڑک پر اس کی کڑیوں بکھر گئیں۔

شرف ایک دوسرے بد معاش کی طرف متوجہ ہونچا تھا۔ اسی دوران اتفاقاً میں نے دیکھ لیا کہ ایک دوسرا بد معاش پانی اٹھا کر اس کے سر پر رسید کرنے لگا تھا۔ میں نے بروقت کار سے پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا اور اس کی کمر میں گھونسا رسید کر کے پسلیوں میں گھونسا مارا اور پھیلنے کا موقع دینے بغیر کھینچنے سے اسے اوپر اٹھا کر مچھڑا۔ فرش پر قائلین ہونے کے باوجود اس کی ریڑھ کے ہڈی پر اتنی چوٹ ضرور لگی کہ وہ بری طرح بلبل کر اچھلا اور اونچا ہوا گیا اور اسی حالت میں تے کرنے لگا۔

اس دوران شرف دوبارہ اپنا خاص دائرہ استیلا کرتے ہوئے ایک اور بد معاش کو باہر پھینک چکا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنی ایک ٹانگ اور دونوں بازوؤں کو یک وقت ایک خاص انداز میں

بڑھکیلے رنگوں کی تھیں۔

ان کے جسموں سے پینے کی اور سانسون سے سستی شراب کی بو کے جھکے اٹھ رہے تھے۔ وہ غالباً خالص روایتی قسم کے دیسے ہی گلی کوچوں کے بد معاش تھے جیسے عموماً پنجابی قلموں میں ولن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

ان میں سے ایک نے رقاصہ کی چکی سے کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عجیب اعتقاد انداز میں مسکرانے لگا۔ ساز تو ان لوگوں کی آمد کے ساتھ ہی خاموش ہو چکے تھے۔ اب لڑکی بھی خاموش تھی تاہم بے چاری حتی الامکان دلیری سے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

ان میں سے ایک قدرے مجبور اور ایک خیم خیم شخص میرے اور شرف کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ پکلیں جھپکائے بغیر سرخ سرخ آنکھوں سے یوں ہمیں گھور رہے تھے جیسے پھانسی کرنے کی کوشش کر رہے ہوں مگر شاید ان کے علم میں کچھ کمی تھی کہ ہم پھانسی نہیں ہو پارہے تھے بلکہ الٹا ہمارے ذہنوں پر جو شمار ساطاری تھا وہ بھی دور ہونے لگا تھا۔

کمرے کا منظر یک لخت ساکت ہو کر رہ گیا تھا جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رک گئی ہو۔ کئی سیکنڈ تک سب کچھ یوں ہی رہا۔ معلوم نہیں وہ کب تک چاہتے کیا تھے۔ بس یوں اپنی اپنی پوزیشن سنبھال کر بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے جیسے ابھی ان سب کی تصویر اٹاری جائے گی۔ بلاخر شرف جیسے اس سکوت سے بور ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے معلوم خیم خیم بد معاش کو بڑی شائستگی سے مخاطب کیا: ”بھائی صاحب! اگر آپ لوگوں نے گناہ ہی سنا ہے تو آپ آرام سے بیٹھیں۔ ہم چلے جاتے ہیں۔“ اس بد معاش نے گویا شرف کی بات سے بغیر اس کے پاس رکھی ہوئی بوتل اٹھائی اور لٹھائی ہوئی نظروں سے روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے بہ آواز بلند بولا۔

”لوئے دتے! ولا جی ہے... آدھی سے زیادہ بھری ہوئی ہے۔“ ”رکھ لے... رکھ لے۔“ اس بد معاش نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر حکم دیا جس نے ابھی تک اسی انداز میں رقاصہ کی کلائی پکڑی ہوئی تھی۔

”بے شک رکھ لیں بھائی صاحب!“ شرف نے ملاصت سے کہا: ”آپ لوگ اپنا شوق پورا کریں اور ہمیں جانے دیں۔“ اس نے بد معاشوں کے درمیان سے راست ہٹا کر گزرتا چلا

مندی سے گردن ہلائی۔

”بھینس جی۔ آپ تشریف رکھیں۔“ بالی جی ”شرفو کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔ ان کے لمبے میں رخصتداری کی بوجھل تہوں میں لپٹی ہوئی ایک التجا تھی۔ ”ابھی تو رات پڑی ہے۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو آپ حکم کریں میں آپ کو یہیں منگا دیتی ہوں۔“

”بس بالی جی! ہمیں آپ اجازت دیں۔“ شرفو انتہائی ملاطفت سے بولا ”ہم شریف اور ذرا بزدل سے لوگ ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لڑائی اور دھیکھا دھسکی کی خبر پر کوئی عسکری سپاہی وغیرہ اس طرف نہ آنکھ یا وہ لوگ خود ہی فریاد کر کے تھانے نہ جا پھریں۔ آپ کو معلوم ہے ہم جیسے شریف لوگ تھانے پکڑی کے چکر سے ذرا گھبراتے ہیں۔“

بالی جی نے ایک لمبے کے لیے حذبذب سے انداز میں میری اور پھر شرفو کی طرف دیکھا گویا فیصلہ نہ کر پاری ہوں کہ شرفو کی بات پر بھینس کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم اتنے ہی شریف آدمی ہوتے جتنا کہ شرفو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو بد معاشوں کی آمد پر ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر جوتیاں چھوڑ کر بھاگ چکے ہوتے یا پھر اس وقت کو نفع سے باہر پڑے اپنی ہڈیاں سسٹا رہے ہوتے۔

خود فریبی، سلوگی یا پھر مصلحت کو شکی کی انتہا تھی کہ بالی جی نے شرفو کی بات پر یقین ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا اور جلدی سے بولیں ”تھانے پکڑی سے آپ مت گھبرائیں باہو جی! اللہ کے فضل سے بڑی عزت ہے اپنی تھانے پکڑی میں۔ ہم نے سب سے بنا کر رکھی ہوئی ہے۔ اور پھر ہماری یونین بھی ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں اس غنڈہ گردی کا معاملہ اپنی یونین کے سامنے بھی پیش کروں گی۔“

”بس بالی جی! میں نے عرض کیا تھا کہ ہم اب کسی قیمت پر نہیں ٹھہر سکتے۔“ شرفو قدرے رکھائی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا اب مزہ کر رہا ہو گیا ہے۔ دوسرے مجھے ایک کام بھی یاد آ گیا ہے۔ آپ ایسا کریں۔ آپ یہ رکھ لیں۔“ شرفو نے میری جیب سے سو کالیک نوٹ نکال کر بالی جی کی طرف بڑھایا۔

میرا خیال تھا کہ اب بالی جی کی ہاتھیں کھل جائیں گی اور وہ بہ آسانی ہمیں جانے کی اجازت دے دیں گی کیونکہ لالچ کی پرچھائیاں گویا مستحقان کے چہرے پر ڈیرا ڈالے ہوئے تھیں لیکن خلاف توقع یہ پرچھائیاں کمری سنجیدگی کی = میں چھپ گئیں۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے شرفو کی طرف دیکھا اور عجیب سے ہی انداز میں مسکرائیں۔

”بھو جی، آپ تو اس فوجوں کو کونٹھے کے آداب سکھارے تھے

یہ سب کچھ گویا چشم زدن میں ہو گیا تھا۔ اگر وہ ہم سے زیادہ نئے ہیں نہ ہوتے تو شاید ان سے ٹھٹھا ہمارے لیے اتنا آسان نہ ہوتا۔ اب صرف جناب وانا صاحب رہ گئے تھے جو نہایت بہتہ انداز میں قیص کے نیچے ہاتھ ڈال کے چاقو نکال چکے تھے مگر یہ چاقو کھولنے کا انہیں موقع نہ مل سکا۔ شرفو نے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ لڑکھڑا کر میری طرف آیا تو میں نے اس کی گدی پر کھڑا ہاتھ رسید کیا۔ وہ جھکول کھا کر شرفو کی طرف کرتے دکھا تو اس نے منہ پر ایسا گھونسا رسید کیا کہ ہڈی ٹوٹنے کی نواز مجھے بھی سنائی دی۔ غالباً اس کی ناک سیاہ ہو گئی تھی۔ پھر لمبے کے لیے وہ ہمارے درمیان گویا دلی ہلی بن کر رہ گیا۔ اس کا بن کھڑا گراہی دار چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ شرفو نے چاقو اٹھایا۔ دتے نے غالباً اسے اپنی موت کا پیغام سمجھا اور ٹکڑا ہوا باہر بھاگا۔ قاتلین پر بظاہر بے ہوش پڑے ہوئے دونوں بد معاش بھی شاید کن آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور غالباً ہی انتظار میں تھے کہ اب ان کا سردار راہ فرار اختیار کرے اور کب وہ اس کی تھلید کریں۔ وہ اس کے پیچھے جھٹک دوڑے اور اس لمبے میں نے دیکھا کہ وہ دونوں بد معاش جو لڑکے پر جا کر گرے تھے، پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔

ہم نے اپنے پکڑے بھاڑے، بیل درست کئے اور ٹانگیہ اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چروں پر رونق لوٹ آئی تھی۔ شرفو نگوارہی سے بولا ”تمہارے ہاں آگے والے سب لوگوں کو کیا ہی طرح اخراج کرنی پڑتی ہے؟“

”ارے باہو جی! تو یہ کہیں۔ ہمارے کو ٹھکے کی طرف تو آج تک کسی ایسے دیسے آدمی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی۔“ ٹانگیہ فوراً اپنے لمبے میں رعب اور دبدبہ سونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”یہ تو شاید شہر میں نئے تھے اور نئے نئے ہی بد معاش بنے ہیں۔ شراب ہنسن نہیں ہو سکی اس لیے منہ اٹھا کر آگے دوڑنا ان کی بھلا کیا جرأت تھی۔ ہم کچے ڈبے دار ہیں۔ کوئی خانہ بدوش نہیں ہیں۔ اس بازار میں اپنی بڑی عزت ہے۔ ایسے لوگ مجھے بد معاشوں کا ہمارے پاس بڑا پکڑنا درست رہتا ہے لیکن بس اتفاق ہی ہے کہ آج ہمارے آدمی ذرا غم دیکھتے تھے ہوئے ہیں ورنہ دوڑے پر ہی ان کا بھڑا ہوتا۔“

”بے شک۔ بے شک۔“ شرفو نے تاکید میں سر ہلایا۔ ”یہ جو لڑکی آپ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہے یہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔“ اس نے اس وقت کی ایک طور قلمی ہیروئن کا نام لیا۔ ”اس کی سگی بہن ہے جی، یہ۔“ ”بے شک۔ بے شک۔“ شرفو نے ایک بار پھر سداوت

بتایا۔ میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے شہر سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ لاہور شہر تو ایک مدت سے میرے خوابوں میں بسا ہوا تھا۔ چلی بار میں آیا تھا تب بھی اس شہر کی ہر چیز مجھے شہسباہی لگی تھی۔ اب تو شہسائی گویا کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میں ابھی یہ فیصلہ تو نہیں کر سکا تھا کہ میں کیوں گاکیلا۔ لیکن یہ فیصلہ بہر حال ضرور کر چکا تھا کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اسی شہر میں رہوں گا۔ میری کہیں جڑیں تھیں نہ شامیں۔ کسی شہر میں میرا کوئی دوست تھا نہ کہیں کوئی ایسا رشتہ دار جو میری رفاقت کی طلب میں بے چین ہوتا۔ میں تو کہیں بھی ذرا ڈال لیتا، میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس صورت میں بہترین کی تھا کہ وہاں رہا جائے جہاں رہنے کا روح مطالبہ کرتی تھی۔ اب میں خوارمی میرے حصے میں آئی تھی یا خوشحالی اور مسرت، دونوں ہی صورتیں مجھے قبول تھیں۔ ہم واپس پہنچے تو جمیل برآمدے میں کھڑا تھا۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے میں نے شرفو سے پوچھا: اس شخص کا یہ کیا مصروف ہے؟

”کوئی خاص نہیں۔ اسے معمولی کاموں کے لیے رکھا گیا ہے۔ ایک طرح سے تم اسے میرا مددگار سمجھ سکتے ہو۔“ شرفو بلا گاڑی سے اتر کر ہم برآمدے میں پہنچے تو جمیل مودبانہ انداز میں شرفو سے مخاطب ہوا: ”سر! تقریباً دس منٹ پہلے باس کا فون آیا تھا۔ آپ سے کوئی بہت ضروری کام ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ آئیں انہیں فون کر لیں۔“

”تم نے باس کو یاد نہیں دلایا کہ سنیچر کی رات میری اپنی ہوتی ہے، اس رات میرے اپنے کچھ پروگرام ہوتے ہیں۔“ شرفو قدرے ہلکاری سے بولا۔ مجھے اس کے لیے ہر چرت ہوئی۔ میں تو اسے محض سر تسلیم خم کرنے والا ایک معمولی کارندہ سمجھتا تھا۔

”باس کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں یاد تھا۔“ جمیل بولا۔ خود ہی کہہ رہے تھے کہ ایک خاص ہی معاملہ ہے جس میں صرف شرفو کی کو بیجا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی اور اس کام کو کر سکتا تو وہ سنیچر کی رات تمہیں ہرگز طلب نہ کرتے۔“ ”ہم...“ شرفو نے پر خیال انداز میں ہلکارا بھرا ہر میری طرف دیکھ کر بولا: ”تم چل کر ڈاننگ روم میں بیٹو۔ میں بات سے بات کر کے آتا ہوں۔“

میں نے پہلے اپنے کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، اپنا طبلہ درست کیا پھر ڈاننگ روم میں پہنچ گیا۔ شرفو ابھی تک ٹاباکسی کمرے میں فون پر مصروف گفتگو تھا۔ میں نے ابھی کرسی نیمبل ای تھی کہ مس ٹپ کھنکھ

مگر خود بھی شاید بھول گئے۔ ”بائی جی دھیمے لیے میں بولیں۔“ ہم پوٹھی بھلا رقم کیوں لیں۔ ہم بھیک تو نہیں کھاتے۔“ شرفو نے گھبرا کر نوٹ میری جب میں ٹھوس دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف چل دیا۔ باہر آنے سے قبل میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکا کر ساندلوں کے قریب کھڑی تھی اور اپنے ناخنوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے جس لمحے اس کی طرف دیکھا تب اسی وقت اس نے سر اٹھایا۔ ایک ٹائیپ کے لیے ہماری نظرس لیں۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ ہر تاثر سے عاری۔

ہم باہر آ گئے۔ کچھ لوگ جو کٹھے پر ہونے والے ہنگامے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ادھر ادھر کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ تتر بتر ہو گئے۔ شرفو تیز قدموں سے اسی طرف واپس چل دیا جہر سے ہم آئے تھے۔

چند لمحے پہلے بالائی جی کی باتیں سن کے میرا ارادہ تھا کہ باہر جا کر خوب قیمتی لگاؤں۔ شاید میں اور شرفو شکل سے اتنے ہی... بےوقوف نظر آتے تھے کہ انہوں نے بے ٹکان گھسی ہانک دی تھیں۔ میں اپنے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں ممکن ہے میری شکل پر حماقت برستی محسوس ہوتی ہو لیکن شرفو تو خاصا مستقل آدمی معلوم ہوتا تھا اور اس کے بالوں میں سفیدی کی جھلک بھی تھی۔ اس کے علاوہ بالائی جی یہ بھی دیکھ چکی تھیں کہ وہ بازار حسن میں یا نہیں تھا اس کے بلوجو انہوں نے خوب اونچی ہانک تھی۔ مگر اب باہر آ کر مجھ میں ان کی باتوں پر ہنسنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

بالائی جی کے آخری پہلے سے مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ خصوصاً یہ الفاظ۔ ”ہم بھیک تو نہیں کھاتے۔“ اس پہلے نے میرے خیالات میں عجیب سی ہلچل برپا کر دی تھی اور میری سوچیں جانے کس کس سمت میں بھٹکتے لگی تھیں اور میں جانے کیسے کیسے فلسفوں کی گمراہی میں چلا گیا تھا۔ طوائف اپنی طرف بڑھا ہوا نوٹ واپس کر دے یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ”معاف کرنا یا ر...“ شرفو بولا: ”آج اپنے مقدمہ میں تفریح نہیں تھی۔“

”میرے خیال میں تو کلنی تفریح ہو سکتی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا: ”تم تو اس طرح معذرت طلب کر رہے ہو جیسے وہ بد معاش تمہارے اپنے ہی جیسے ہوئے تھے۔“

وہ ہنس دیا۔ اس کی ہنسی بھی ہلکی سی تھی۔ وہ بھی کچھ کھوٹا کھوٹا سا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ہم واپس چل دیے۔ واپسی میں شرفو نے روٹ بدل دیا اور مجھے کچھ اور داستانوں کے بارے میں

ایک وطن پرست اور کفن بدوش نوجوان کی داستانِ لہو رنگ جو محبتِ وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا

سناٹے بکے آگے لڑائی کی کہانی
جن کے من کا لے لیں

دہشت گرد

سلیم فاروقی کے ایڈوینچر س قلم سے

4 حصوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت مکمل سیٹ
-240/- روپے

ناشر

کتب خانہ انجمن اہل حق - برکات پورہ
لاہور بازار لاہور - 2

مت کرتی کرے میں آگئی۔ میں نے گھر میں داخل ہونے کے بعد اس کی تلاش میں لہو اور نفیرس دوڑائی تھیں مگر وہ کسی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ جیسے کسی خفیہ گوشے میں بیٹھ کر لوگوں کی حرکت و سکنات کا جائزہ لیتی رہی تھی۔

"کھانا لگاؤں؟" اس نے جبکہ کچھ پینچی میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لباس سے اسی مخصوص کلون کی خوشبو ڈھری تھی جو غالباً اسے کچھ زیادہ ہی پسند تھا لیکن اس خوشبو اس کے اپنے وجود کی بھی خوشبو شامل تھی۔

"ہاں... لگاؤ۔" میں نے تھوک نکل کر جواب دیا۔ وہ کھانا لگانے لگی۔ میں خاموش بیٹھا اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ کینٹ بڑی کھمبور تھی۔ کھانا لگ چکا تو رفیق آگیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ بیٹھ کر بلدی جلدی پٹینس اپنی طرف کھینکتے ہوئے بولا "بھئی میں لکھا لکھتا ہی جا رہا ہوں۔ شاید علی الصباح ہی ڈاؤنٹی ہو... اور ما... باس نے کہا ہے کہ کل رات تو بجے وہ تم سے ملاقات کریں گے تیار رہنا اور کہیں جانے کا پروگرام مت بنانا۔ میں میں لے کر چلوں گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سر ہلایا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب یہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ روزی مجھے از خود اس موضوع پر قلم خان سے بات کرنے کی ضرورت تھی۔ یقیناً وہ خود ہی اس موضوع پر آ رہا تھا۔ شرف تو جلدی جلدی کھانا کھا کر دہشت ہو گیا۔ میں خاصی تک بیٹھا ہر ڈش سے انتہائی کسے کی کوشش کرتا رہا۔ ہر ماہیہ حد لذت تھی۔

کھانا کھا کر میں اٹھا تو ذہن پر عجیب سا شمار غاری ہو رہا تھا۔ طوم ہو رہا تھا کہ جب پلی تھی اس وقت اس نے کوئی خاص اثر نہیں دکھایا تھا اب چہ رہی تھی۔ یا پھر شاید یہ کھانے کا شمار تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدل کر میں کسی بیڈ مگرچہ کی طرح بستر پر چلت ہو گیا اور اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ نہ خود ار افضل صاحب! کھانے لذت ہوں تو میں غریبوں کی طاعت ٹوٹ پڑا کرو۔ ایک تو کئی دن سے تم ورزش وغیرہ نہیں کر رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا ہیٹ انجیل راہوں پر آگے نکل جائے کہ پھر اسے واپس بلانا ممکن نہ رہے۔"

نیز بھی نہیں آری تھی اور آنکھیں کھلی رکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ ذہن گویا آسمان اور زمین کے درمیان کسی کھنکھارے تھا۔ اس دوران میں ٹپ نے دروازہ کھول کر کمرے میں بھانکا اور سپاٹ لیمے میں پوچھا "کسی چیز کی ضرورت تو

نہیں؟

”نہیں۔“ میں نے کہا اور مجھے اپنی آواز خود بھی عجیب محسوس ہوئی۔ ”بس ذرا وارڈز روپ کھول کر میرا برف کس مجھے دیتی جاؤ۔“

آہستگی سے اپنے عقب میں دروازہ بند کر کے وہ وارڈز روپ سے برف کیس نکال کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر واپس جانے لگی تو میں نے اس کی کٹائی پکڑ لی۔ ”مجھے دراصل تمہاری ضرورت ہے۔“ میں نے خالص لٹکوں والے انداز میں کہا۔ ”آخر تم اتنی مفروضہ کیوں ہو؟“

اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ ہر حال کوئی عجیب ہی عمل تھا جس کے تحت میں نے اپنا کپڑا ہتھ سے اچھل کر ہوائیں قلابازی کھائی اور یوں اونڈھا بیڈ پر آن کر اچھے میں کوئی بیماری بھرم، کڑمیل جوان نہیں بلکہ محض ایک آلیٹ تھا جسے خائنوں نے فرانک پین میں تلخے دقت ہوا میں اچھل کر پلٹ لیا تھا۔

اس کے بعد میری کپہنی پر ہتوڑا سا پڑا اور چند لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جلد ہی میری آنکھیں دوبارہ دیکھنے کے قتل ہو گئیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں بے ہوش نہیں ہوا۔ میں فحشر رہا کہ ابھی کوئی اور چھوٹی موٹی قیامت بھی ٹوٹے گی لیکن خیریت ہی رہی۔

مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سیدھا ہوسکا۔ اونڈھا ہی لینا آنکھیں پٹ چارہ تھا اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ مس ٹرپ نے ہی کیا ہے۔ کیا وہ کم بخت جو ڈو جانتی تھی؟

بڑے اطمینان سے وہ سنگھار میز کا اسٹول کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ میں نے کروٹ لینا چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ الود کی پٹھی نے شاید کسی خاص ہی رنگ پر ہاتھ مار دیا تھا کہ جسم ہی جیسے بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔

”کو... مرنو آیا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میری پلکیں خود بخود ہی تیزی سے تھپکے جاری تھیں۔

”تم نے پہلی بار جب میری طرف دیکھا تھا تب سے میں تمہاری آنکھوں میں فطور کی پرچھائیاں دیکھ رہی ہوں۔“ وہ منجیدگی سے بولی۔ ”میرا خیال تھا کہ میری سرورمی دیکھ کر تم باز آ جاؤ گے لیکن تم بہت ذہین آدمی ہو۔“ اس نے اپنی مردانہ قیاس کا کار درست کیا۔ ”تمہارا خیال شاید یہ رہا ہو گا کہ میں چونکہ مشکوک قسم کے لوگوں کے لیے کام کرتی ہوں اور چونکہ مجھے تم جیسے مفروضہ قسم کے لوگوں کے درمیان رہتی

ہوں۔ ان کی خدمت گزار کرکے ہوں اس لیے میری حیثیت کھلنے کی سی ہوگی۔ جس نے چاہا بازو پکڑ کر کھینچ لیا اور میں چونکہ کھلی ہوں اس لیے اس پر زبانی پر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوں گی۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کو مسلنے کے بعد ان پر چھوٹک مار کر گویا تلیدہ گرد اڑائی اور کمری سانس لے۔ ”ہر حال ایسا نہیں ہے۔ اپنی یہ غلط فہمی ہمیشہ کے لیے دور کرو۔ دوسری بات یہ کہ میں مس نہیں سوز ہوں۔ کٹنی عرصہ پہلے جب میں اس گھر میں آئی تھی تو مس تھی تب سے سب کو عادت پڑی ہوئی ہے کہ میرے نام کے ساتھ مس لگائے دیکھتے ہیں۔ ویسے بھی سب مجھے ہمیشہ تشاہی دیکھنے کے عادی رہے ہیں اس لیے انہیں شاید یاد ہی نہیں رہتا کہ میرا ایک شوہر اور ایک چھوٹی سی بچی بھی ہے۔“

ایک گھنٹہ بعد اٹھ کھڑی ہوئی ”ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے اشارہ کیا۔

میری طرف سے جب آنکھیں پٹ پٹلنے کے سوا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک خاص انداز سے ہلکا سا جھٹک دیا۔ میرے پرزے شاید کچھ مل کھٹے تھے۔ اس جھٹکے سے وہ گویا کسی حد تک اپنی اپنی جگہ پر واپس آئے اور میرے جسم میں کچھ جان بھی آئی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ سارے کے بغیر میں نہیں چل سکوں گا۔ میرا ہاتھ تمام کر دو باہر لے چل۔ میں کسی انڈر ٹینٹنگ فقیر کی طرح اس کا سارا لیے لڑکھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ پچھلے راستے سے کوٹھی کی اصل عمارت سے باہر آئی۔ پچھلی طرف بھی کوٹھی کی چار دیواری میں کٹنی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ اس طرف ایک انگیس تھی جو شاید سڑوٹ کو اوزر کا کام دیتی تھی۔

وہ مجھے اسی طرف لے جا رہی تھی لیکن میں نے پہلے رک کر کھلی ہوائیں چند کمری کمری سانسیں لینا بہتر سمجھا۔ اس عمل سے مجھے اپنے اوسان بھال کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اب میں اپنے آپ کو تقریباً نارمل محسوس کر رہا تھا البتہ کپہنی ابک بدستور دکھ رہی تھی۔

پہلا خرم اب تکسی کی ایک کھڑکی کے قریب جا پہنچے۔ اس کمرے میں روشنی تھی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور پٹ بٹھا تھا۔ قہوڑا سا کھلا تھا۔ مس ٹرپ نے پہلے خود مختار انداز میں اندر جھانکا اور پھر مجھے اشارہ کیا۔

میں نے جھانک کر دیکھا وہ اوسط درجے کا ایک صاف خنرا بیڈ روم تھا۔ ڈبل بیڈ پر سنری پالوں اور گلابی چرے والی ایک پھول سی بچی لپٹی تھی۔ اس کی عمر ڈیڑھ دو سال ہوگی۔ قریب ہی ایک شخص بیٹھا بڑے اٹھاک سے اسے فیکر پلا رہا تھا۔

بغیر نہ رہ سکا۔

”ظاہر ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی ”خدا کا شکر ہے کہ میری بچی باپ پر گئی ہے۔ مجھ پر نہیں گئی۔“

میں ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک میں نے پوری قوت مجتمع کر کے بجلی کی سی تیزی سے اس کی کھنٹی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ کسے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر پڑی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا لیکن وہ نہیں اٹھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے امید تھی کہ کچھ دیر بعد وہ خود ہی ہوش میں آجائے گی اور اٹھ کر اپنی انکس میں چلی جائے گی۔

اپنے کمرے میں آکر میں اطمینان سے سو گیا۔ میرے دماغ پر جو بخار چڑھا ہوا تھا وہ اتر گیا تھا۔

دوسری صبح میں سو کر اٹھا تو ذہن کلفتی حد تک ہلکا چھلکا تھا۔ آوازہ اخبارات میرے قریب ہی رکھے تھے۔ معلوم نہیں کون رکھ گیا تھا۔ تینوں اخباروں کی شہ سرخیاں میرے لیے غیر دلچسپ تھیں۔ میرے لیے سب سے اہم خبر وہ تھی جو مشکل کالم میں ایک کونے میں چھپی ہوئی اور صرف چند سطروں پر مشتمل تھی۔

دریائے راوی کا ایک کتا ہوا حصہ نئے بڑھادریا کماجاتا تھا اس میں گزشتہ روز ایک لاش پائی گئی تھی۔ بری طرح پھولی ہوئی ایک مرد کی لاش جس کے کولے میں گولی بوس تھی۔ لاش کا مختصر ساحلہ درج کرتے ہوئے ایپل کی گئی تھی کہ اگر اس کا کوئی وارث ہو تو شام تک پولیس سے رابطہ قائم کرے ورنہ اسے لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا جائے گا۔ تاہم پولیس تفتیش جاری رکھے گی۔

میں نے اخبار فرش پر پھینک دیا اور دیر تک ٹھنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ خیالات کا پیڑوہ بکس ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ ذہن میں پیچھے ان گنت کن سمجھوڑے، سنبولے ریک رہے تھے۔ نس نس کوؤس رہے تھے۔

اشرف خان ایماذقی تم لاوارث دفنائے جاؤ گے؟ پھر اس آئینے میں میں نے اپنے مستقبل کا عکس دیکھنے کی کوشش کی۔ کیا میرا انجام بھی یہی ہوگا؟ ایک لاوارث لاش... پھولی ہوئی... منج شدہ لاش... جسم کے کسی حصے میں بیست شدہ گولی... اخبار کے کونے میں چند سطری خبر۔ بس؟ کیا یہی زندگی کا کل تھا؟ یہی حاصل تھا۔ ساری بھانگ دوڑ اور ساری جدوجہد کا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ خود ہی اپنا دل بڑھایا نہیں... محمد افضل! حیرے تو رہتا ہے کہ تو ایک طاقتور آدمی بنے گا اور طاقتور آدمی کی موت بھی ان کی زندگی کے

نہی اتنی پائی مارے بیٹھا تھا۔ مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کا نہ بچت سے کم نہیں تھا۔ بچی کی طرح وہ بھی بے پناہ بصورت تھا۔ سنہری بال، سرخ و سپید رنگت، غلانی آنکھیں، چمکے نقوش اور خوبصورت کھنٹی سوچیں۔ اس کا جسم کسرتی رہتا ہوا تھا۔

بچی کو دودھ پلاتے ہوئے وہ بچوں ہی جیسی آواز بنا کر اس سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ فیڈر تقریباً غالی ہو چکا تھا۔ بالآخر بارے کو وہ شخص کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں ٹرپ میرا ہاتھ پکڑ کر دوسری کھڑکی پر لے آئی۔ یہ کڑکی ایک کشتہ بکن کی تھی۔ اس کھڑکی سے میں نے دیکھا وہ نفس نہایت نفاس سے فیڈر کو سٹک پر دھو رہا تھا۔ فیڈر دھو کر اس نے اگلے ہوئے پانی کے ایک برتن میں ڈال دیا۔

سٹک پر چائے کا ایک کپ پڑا تھا۔ اسے بھی اٹھا کر اس نے نہایت مشاقی اور نفاس سے دھو کر کپڑے سے خشک کر کے لڑکی کیس میں رکھا، چوما بند کیا اور تانہ اندہ نظر سے بکن کا بارے کو باہر چلا گیا۔

ایک بار پھر ہم بیڈ روم کی کھڑکی پر آ گئے۔ اب وہ شخص وارڈ راب سے کپڑوں کا ایک جھوٹا سا ڈھیر نکل چکا تھا۔ اسٹری کی میز پر کھڑا ہو کر وہ بڑی دلجمعی سے کپڑے اسٹری کرنے لگا۔ ان میں بیشتر کپڑے مردانہ ہی تھے لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ مس ٹرپ ہی کے تھے۔

بچی سوئے کی کوشش میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ میں لڑکی سے ہٹ گیا۔ مس ٹرپ مجھے بازو سے قیام کر کچھ دور لے گئی۔

”یہ سمجھو اور سلیقہ شعار شخص کون تھا؟“ میں نے بچی کو لڑکی پوچھا۔

”میرا شہر۔ اور کون؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، گویا یہ زبان غروشی کمرہ رہی ہو۔ کیا ابھی اس سوال کی نوکارت باقی تھی؟

میں نے تھوک نکل کر ایک نظر اس کی طرف اور ایک نظر بکن کی طرف دیکھا۔ مجھے شرفی بات یاد آئی۔ مس ٹرپ کے بارے میں اس نے بتائے ہوئے کما تھا ”یہ عورت“ مرد کو لکھی بنا کر دیوار سے چپکانے کا فن جانتی ہے۔“

مجھے اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا اس لیے میں اس کے دیگر کارناموں کے بارے میں تو کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن بہر حال جو مسئلہ میں دیکھ چکا تھا وہ کافی تسلی بخش تھی۔

”وہ بچی بھی تمہاری ہے؟“ میں مزید ایک امتحان سوال کیے

”گڈ۔“ اس نے طمانیت سے گردن ہلاتی ”اس کا مطلب ہے تم بالکل ہی گڈ سے نہیں ہو۔“

”نہیں۔ میں اس کا کزن ہوں۔“ میں نے کہا ”اب تم بڑے اور میرے لیے ناشتے کا بندوبست کرو۔ میں تیار ہو کر آ رہا ہوں وہ اپنے سر کا وہ حصہ سلائی باہر چلی گئی جہاں میں نے گزشتہ شب اسے گھونسا رسید کیا تھا۔ وہ دن میں سے پڑنے لگنے، سوچنے اور کھانے میں گزارا۔ سہ پہر کو جب ماحول اورانی ہی چھا گئی تو میں نے لان پر جا کر تھوڑی سی ڈور لگا لی اور چند منٹ تک ڈیڑھ بیٹھیں بھی لگا لیں۔ طبیعت پر چھائی ہوا کسل مندی کسی حد تک دور ہو گئی۔

شرفو سارا دن مجھے نظر نہیں آیا۔ رات کے کھانے پر وہ بھی گیا۔ وہ ایک نیلی فوکس دیکھن میں آیا تھا۔ کھانے کے بعد اور نے گڈری دیکھی اور مجھے ساتھ لے کر اسی گاڑی میں قلم کار کی کوشی کی طرف چل دیا۔

مجھے یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی کہ قاسم خان کے چوکیدار نے مجھے نہیں پہچانا! پھر شاید اس نے چہرہ پاٹ رکھے ہی نہ غایت سبھی تھی۔

اس گھر کے کتے لمباں بھی شرفو کو اچھی طرح پہچانتے تھے وہ بالکل گھر کے فرد کی طرح مجھے ساتھ لیے سیدھا سلاطین میں جا پہنچا۔ اسٹڈی کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک مہم سے ملازم نے اطلاع دی ”صاحب چند منٹ میں آ رہے ہیں آپ کے لیے کیا ملاں؟“

”چائے۔“ شرفو نے اندر پہنچ کر ایک چڑی کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھے ہوئے کہا ”ایک طویل و مزین کرا تھا اور دار کی ترتیب و آرائش کچھ عجیب سی تھی۔ یہ بیک وقت لائبریری بھی معلوم ہوتا تھا، کانفرنس روم بھی اور ایک طرہ سے کسی کا دفتر بھی۔

ہم چائے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ قاسم خان ایک عہد سوٹ زیب تن کئے ایسی محتات اور بروہاری چہرے پر لے کرے میں داخل ہوا جیسے کوئی پروفیسر کسی اہم موضوع پر مگو سیمینار سے خطاب کرنے کے لیے آؤ بیڑم میں داخل ہو رہا ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اعظم خان تھا اور بائیں ہاتھ ایک ایسی حسین عورت کہ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار جھٹکنا لگا۔ ایک تو آج کل پرکشش خواتین کو دیکھ کر مجھے کچھ زیادہ ہی جھٹکے لگتے تھے۔ میرے خیال میں تو یہ کوئی اچھی عیال نہیں تھی۔ مجھے ہر حال میں مارل رہنے کا فن سیکھنا چاہئے تھا

وہ عورت قدم میں قاسم خان سے کچھ تھکی ہوئی تھی۔ گردن چنی اور یونانی دیویوں کے سے حسن کی مالک۔ اس کے یا

شایان شان ہی ہوتی ہے۔ کسی طرح بھی ہو سکے طاقتور بننے کی کوشش کرو اور فی زمانہ سب سے بڑی طاقت دولت ہے۔“ مجھے نہیں معلوم کہ کب دروازہ کھلا اور کب مس ٹریپ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میں اس کی آواز سن کر چونکا۔

”میں چاہتی تو اس بے خبری کے عالم میں تمہاری کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم کر سکتی تھی۔“ وہ کہہ رہی تھی ”لیکن میں اب مزید ہنگامہ آرائی نہیں چاہتی کیونکہ اس طرح تو ہنگامہ آرائی کا سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہیں آئے گا۔ لیکن تم مجھے اتنا ضرور بتادو کہ رات تم نے مجھے گھونسا کیوں مارا تھا؟“

”یہ بتانے کے لیے کہ میں اتنا زور نہیں ہوں جتنا تم نے سمجھ لیا تھا۔“ میں نے گہری سانس لے کر اپنے خیالات سے بچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کب کہا کہ تم زور ہو۔ طاقت میں تو ظاہر ہے میرا تم سے کوئی جوڑ نہیں۔“ وہ ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”میں نے تمہیں طاقت سے نہیں ٹینک سے مارا تھا۔“

”ٹینک سے نہیں تم نے مجھے بے خبری میں مارا تھا۔“ میں نے کیا! اگر میں خبردار ہوتا تو تھوڑی بہت ٹینک میں بھی دکھا سکتا تھا۔“

”بے خبر کہیں تھے تم؟“ وہ غفلت سے بولی ”میرے علاوہ تو تم کسی چیز کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔“

”وہ تو درست ہے۔ لیکن میں تم سے ملنے کی توقع نہیں کر رہا تھا اور یہ بھی بے خبری ہی کی ایک قسم ہے مس ٹریپ!“

میں نے کہا۔

”اوہ... خدا کا واسطہ...“ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”مجھے ٹھٹ پونجیہ قسم کے جاسوسی ٹائڈل والے اس نام سے مت پکارو... اور میں کل تمہاری غلط فہمی اچھی طرح دور کر چکی ہوں کہ میں مس نہیں مسز ہوں بیکز انڈوس دیسے میرا نام جوتی ہے اور میں اسی نام سے پکارے جا پائند کرتی ہوں۔“

”تمہارا شوہر ادھر ہی کا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”رہنے والا ادھر ہی کا ہے۔ نسلا پوری ٹین ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا جوتی! اب تم جاؤ۔“ میں نے اطمینان سے کہا ”مجھے جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی، میں تمہیں زحمت دوں گا۔ میں نے تمہیں اس ٹکڑے دیکھا بند کر دیا ہے جس سے اب تک دیکھ رہا تھا۔ اب تم میری طرف سے اطمینان رکھو۔ اب میری نظر میں تم میں اور سامنے رکھی ہوئی تپائی میں کوئی خاص فرق نہیں۔“

ٹی ہل کر پھلے ہوئے تھے۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کا کتان نہ ہوئی تھی۔ وہ لباس یا میک اپ کے سلسلے میں قطعاً کوئی نام نہ نہ ہوئے نہیں تھی لیکن اپنے صاف سحرے چہرے پر اپنی لباس کے ساتھ اگر وہ اس وقت سیکڑوں بنی سنواری بات کے جہرم میں بھی ہوتی تو سب سے بہتر نظر آتی۔ اس امر پر بینش کے قریب رہی ہوگی۔ اس کے آنے سے کرا ہنوس سا ہو گیا۔

”یہ میری بیوی ہے۔ سلی۔“ کام خان نے اندر آتے خاص طور پر مجھ سے یوں اس کا تعارف کرایا جیسے اسے پڑا رہا کہ اگر یہ بات مجھے نہ بتائی گئی تو میں اس خانوں کو کچھ سمجھ لوں گا۔ میں نے شائستگی سے اسے سلام کیا۔ اس نے لمبے میں جواب دیا اور ایک ہی لمحے میں میرا سر تپا جائزہ لیا۔ اس ایک لمحے میں اس نے گویا میرا ظاہر ہی نہیں نا بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں کیا تھیں گویا انکسے لگتی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ گویا باحوال سے لا تعلق سی

ہم بیٹے کے باپ والی ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ اس میز گرد کے ہوئے صوفے بھی گول ہی تھے اور بہت ہی نرم۔ انسان اس طرح ان میں دھنس جاتا تھا کہ گمان گزرتا تھا انسان صوفے پر نہیں بیٹھا بلکہ صوفہ انسان پر بیٹھا ہے۔ ”میں تمہارے وقت ضائع نہیں کروں گا افضل میاں!“

خان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ”میں نے تمہارے ساتھ رنگ نہایت اہم کاندھاری امور طے کرنے کے لیے رکھی۔ تمہاری باتوں سے اور کچھ اپنے طور پر میں نے یہ اندازہ ہے کہ تم اور اشرف خان پارٹنرشپ میں دو سروں کے لیے کر رہے تھے۔ اب جبکہ اشرف خان مرچکا ہے اور تم نہایت اہم اتفاقی حالات میں شہزاد کوٹ سے بھاگے ہو“ اس کے بعد اس نے تمہارا دلچسپ جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہو گا۔ کیا میرا دوست ہے؟“

”جی ہاں۔“ میں نے انہماک میں سر ہلایا۔

”میرا ایک اندازہ یہ بھی ہے کہ تمہارے پاس کوئی خاص لہجہ نہیں ہے اور تمہارے ذہن میں کوئی واضح پروگرام بھی نہیں ہے۔“ کام خان بولا۔

”یہ بھی درست ہے۔“ میں نے حلیم کیا۔

”ان حالات میں ایک تو یہ میرا اخلاقی فرض بھی بنتا ہے کہ مجھے ضرورت بھی ہے کہ میں تمہیں اپنے لیے کام کرنے کی پیشکش کروں۔“ وہ صوفے کے بیٹھے سے ٹیک نہ ہونے بولا ”یہ مت سمجھنا کہ تمہارے حالات اور

تمہاری مجبوریوں سے ناکدہ اٹھاتے ہوئے میں تمہیں کوئی ناروا سی پیشکش کروں گا۔ میں اتفاقاً پرست نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میری پیشکش تمہیں باعزت محسوس ہوگی۔ میں تمہارے متعلق زیادہ نہیں جانتا لیکن میری نظر کہتی ہے کہ تم کام کے آدمی ہو اور پھر یہ کام لینے والے پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ وہ نازا شیدہ پتھر کو تراش کر ہیرا بنالے۔ تمہیں شاید اندازہ ہو گیا ہو کہ میرا کام خاصے وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے لیکن میرا گرد و اتار بڑا نہیں ہے۔ میں نے محض زیادہ غری دیکھ دیکھ کر خوش ہونے کے لیے تھو خیرے بھرتی نہیں کر رکھے جو آئے دن میرا بل پڑا کر میرے لیے درد سر کا باعث بنے رہیں۔ میرے پاس بہت سی کم آدمی ہیں لیکن میں چنے ہوئے۔ اپنی جگہ ہر شخص ہر قسم کی ملائمتوں کے اعتبار سے دس بیس آدمیوں پر بھاری ہے۔ خاصے طویل عرصے کے بعد ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میں اپنے ایک قیمتی ساتھی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ کل رات وہ درخیز کے ہاتھوں مارا گیا۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کی موت کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ سازش کس نے کی ہے یہ بھی مجھے جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ اس کی موت کی وجہ سے میرے لیے کچھ الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں ان سے منٹ لوں تو پھر سازش کرنے والوں سے بھی منٹ لوں گا۔ خیر۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری لائن میں بھروسے کا آدمی بہت مشکل سے ملتا ہے۔ ایک رینجڈی اگر تمہیں مجھ تک لے ہی آئی ہے تو اب میری تجویز یہ ہے کہ تم میرے لیے بھروسے کے آدمی بن جاؤ۔ میرے ساتھی کی جگہ لے لو جسے میں کھو بیٹھا ہوں۔ میں کو شش کروں گا کہ تمہیں بھی اس ساتھی کی کمی محسوس نہ ہو جسے تم کھو بیٹھے ہو۔ تمہیں میری تجویز سے کوئی دلچسپی ہے؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے اس کی طویل تقریر کا ایک ایک لفظ غور سے سنا تھا لیکن میں فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جیسے لمبے میں کہا ”اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مجھے کیا طے کا تو میں زیادہ آسانی سے کوئی جواب دے سکوں گا۔“

”ہر کھپ کے اخراجات نکل کر خالص منافع میں سے دس فیصد تمہارا ہو گا اور یہ بڑی معتقل پیشکش ہے۔“ وہ بولا۔

”میرا کام چھ نکلے چھوٹے پیمانے پر نہیں ہے اور میرے ساتھی اکثر مصروف رہتے ہیں اس لیے بہت جلد تم اپنے آپ کو آسودہ حال محسوس کرو گے۔“

”ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنکارا بھر اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں اس کی پیشکش پر غور کر رہا

والی کو بھی صرف بنگالی ضروریات کے لیے وقف ہے۔ یہ پوری کوشش کرتا ہوں کہ وہاں ہر وقت کم سے کم لوگ رہیں۔ شرفو کل تھیں تھارانا ٹھکانا دکھا دے گا۔

”بت بستر۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اسی خوشی میں چائے کا ایک دور اور چل جائے تو اچھا ہے۔“ طویل گفتگو کے بعد قاسم خان مسکرایا ”گھر بیگم کی طرف سے ہمیں ایسے ہی مشروبات کا دور چلانے کی اجازت ہے۔ چائے، کفن، شربت، اسکو اش وغیرہ۔ بیگم کا کہنا ہے کہ ہماری باہر ہی معلوم نہیں کیا کچھ پینے چلاتے رہتے ہیں اس لیے گھر تو بوقت سے پرہیز رہنا چاہئے۔ چنانچہ میرے گھر میں اور ہر کچھ موجود ہے مگر بار نہیں ہے۔“

اس کی بیوی جو اس دوران ٹانگ پر ٹانگ رکھے نہیں اٹھا کہ سے نکل کڑکی ننھی سی رہتی ہے اپنے ناخن نازک فحاشت اور نزاکت سے گھس رہی تھی، سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی اور ایک بار پھر ایسی کام میں مصروف ہو گئی تھی قاسم خان کی بات سن کر قدرے حیرت ہوئی۔ اگر اس کی بیوی ایسی ہی روایتی اور گھریلو قسم کی خاتون تھی تو پھر اس کے تاجاز کاروبار کو کیوں گھر وراثت کر رہی تھی؟ نہ صرف وراثت کر رہی تھی بلکہ اس سے متعلق میٹنگ میں بھی بہ غصہ نہیں آکر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے تو اس کی موجودگی کا کوئی جواز نظر نہیں آیا تھا۔ تمام گفتگو قاسم خان نے ہی کی تھی۔ اس کی بیوی نے تو موافقت یا مخالفت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اور نہ ہی قاسم خان نے اس سے کسی مرحلے پر رائے طلب کی تھی۔ پھر آخر اسے آکر ہمارے ساتھ بیٹھنے کی ضرورت کیا؟ پھر میں نے سوچا، بعض اوقات بیویاں یونہی بلا مقصد شوہر کے ساتھ آتی ہیں یا سنہ اٹھا کر ان کے ساتھ چل دیتی ہیں

چائے اس انداز میں پی گئی گویا یہ ایک اہم فریضہ تھا۔ کپ رکھتے ہی قاسم خان اٹھ کھڑا وہ اب تم آرام کرو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو شرفو کو بتادو۔ مجھے اب ایک جگہ جانا ہے۔ اس امر سے مجھے خوشی ہوئی کہ میٹنگ درخواست کرنے وقت اس نے یہ نہیں کہا تھا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ اس بات کی بھی مجھے خوشی تھی کہ قاسم خان کے انداز و اطوار سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ باس بننے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات دیکھ کر اور غلطیوں بڑھ کر میرے ذہن میں اس لائن کے ”باس“ کا جو تصور تھا، کم از کم وہ زیادہ قطعاً نہیں تھا۔ گفتگو دو شخصیتوں کی تھی ان کے اعتبار سے وہ میرے تصور سے مختلف تھا۔

باہر آکر ہم گاڑی میں بیٹھے اور مائل گاؤں والی کو بھی

ہوں۔ حالانکہ میں اس پر قطعاً غور نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اس کی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔ کبھی تو بہت ہی خوبصورت بیوی میری تھی۔

”چند ایک سوئی موٹی باتیں اور جتنا چلوں۔“ قاسم خان بولا۔

”تمہاری رہائش کا انتظام میرے ذمے ہو گا اور تمہیں ایک ہفتے کی ٹرینگ ملے گی۔ ٹرینگ بس یہ ہوگی کہ کچھ لوگوں سے ملنا ملنا ہو گا تاکہ وہ تم سے اور تم ان سے واقف ہو سکو۔ ذہن نشین کرنا ہو گا کہ کس وقت کس شخص سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ ہمارے روت سمجھنے ہوں گے اور یہ بھی سمجھنا ہو گا کہ کس صورت میں کیا قدم اٹھایا جائے گا۔ ہریادی کے اپنے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ میرا طریقہ کار دوسروں سے ذرا مختلف ہے اس لیے میں نے بہت کم عرصے میں اپنے حریفوں سے کہیں زیادہ ترقی کی ہے۔ میرے ہاں تمہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا اور میں اپنے ساتھیوں کو بچھلنے پھولنے کا موقع دینے کے معاملے میں بچہ فراخ دل واقع ہوا ہوں۔ خصوصاً ان ساتھیوں کو جو میرے لیے کام کرنے کے دوران مجھ سے الگ ہونے کے بعد، یہاں تک کہ کسی سازش کا شکار ہو کر گرفتار ہو جائے کے بعد بھی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے پائے۔ گو کہ میرا انتظام ایسا ہے کہ کسی ساتھی کی طرف سے اس کی تمام تر کوشش کے باوجود مجھے نقصان پہنچے گا اسکان کم ہی ہوتا ہے لیکن انسان کو ہر حال خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔ ہر وقت جو کس رہتا ہی بستر ہوتا ہے۔ میں نے تقریباً ہر پہلو تمہارے سامنے واضح کر دیا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

”ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”بہت خوب۔“ اس نے غمازیت سے سر ہلایا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میں نے جلدی سے کہا۔

”لیکن ٹرینگ شروع کرنے سے پہلے میں کم از کم تین دن کی مزید سہولت چاہوں گا۔ میں ابھی تک بھر کر لاہور کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں کی ہر گلی، ہر کونچے سے آشنا ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں پوری تہدی سے کام میں جت جاؤں گا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ قاسم خان بولا۔ ”تین دن ضروری نہیں... جب تک تمہارا موزن نہ بنے تم آرام کرو۔“

گو مو پھر۔ جب کام کا موزن ہو مجھے فون کر دینا۔ ایک شخص آئے گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یوں، بھوکہ اس سے ملاقات ہوتے ہی تمہاری ٹرینگ شروع ہو جائے گی۔ ہر حال اپنے نئے ٹھکانے پر تم کل ہی منتقل ہو جاؤ۔ مائل گاؤں

گھر میں سجا رکھی ہیں۔ سہلی دراصل اونچے درجے کی ایک کلب ڈانسر تھی۔ کچھ عرصے بیروت میں بھی رہی... مجھے ذرا ایک سکرت سٹاف کروانا۔" اس نے ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے ٹیکٹ اور لائسنس کی طرف اشارہ کیا۔

سکرت کا ایک کش لے کر وہ بولا "جہاں تک مجھے معلوم ہے، قاسم خان نے بیروت ہی کے ایک ہوٹل میں اس کا رقص دیکھا تھا اور وہیں مرغیہ شم کی طرح ترپنے لگا تھا۔ اس زمانے میں اس کے پاس زیادہ مال وال نہیں تھا۔ خود ہی اوپر اوپر پھیرے لگایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی لمبا ہاتھ بھی پڑ جاتا تھا۔ اس چکر میں اس کے پاس جو کچھ بھی تھا، لے کر سہلی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہوٹل کے ایک سوٹ میں مقیم تھی۔ ہمیں یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ ڈانس تو درحقیقت اس قسم کی ڈانسرز کا سائڈ بزنس ہوتا ہے۔ قاسم خان کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے سہلی کے قدموں میں رکھ دیا اور سہلی نے اسے شرف میزبانی بخشا منظر کر لیا۔ رات کے کسی حصے میں غلابا نہایت حسرت بھرے لہجے میں سہلی نے کہا ہو گا کہ اس کے جسم کے قوس دیوانے ہیں۔ اس کی ایک ایک جھنجھٹ پر قربان جاتے ہیں اور اس کے ساتھ وقت گزاری کے لیے سرے جاتے ہیں لیکن اسے شریک زندگی بنانے کے لیے کوئی تیار نہیں حالانکہ وہ بیچ کے سامنے جسم کی نمائش کا یہ وعدہ اور ملک ملک، شہر شہر بھٹکنے کی یہ عادت ترک کرنا چاہتی ہے۔ کسی ایک جگہ گھر بنا کر بیٹھنا چاہتی ہے مگر ہر وہ شخص جو سہلی کی نظر میں ذرا بھی مشغول تھا، اس سوال پر بدک جاتا تھا البتہ چھوٹے موٹے آوارہ گرد اور لنگتے فوراً تیار ہو جاتے تھے مگر ان کے لیے خود سہلی کا دل نہیں مانتا تھا کہ کہیں گڑھے سے نکل کر کھائی میں نہ جا کرے۔ سننے میں آیا کہ جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں دونوں ڈرنک تھے۔ سہلی جھپکلیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ خالص مشرقی انداز میں دلن فنی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ آرزو دل ہی میں لیے ایک روز قبر میں جاسوے گی۔ اس کی باتیں سن کر قاسم خان بھی زار و قطار روئے لگا۔ پھر ایک وہ اٹھا اور دیوانوں کی طرح باہر چلا گیا۔ رات کے اس پر اس نے چلنے کھلنے سے ایک عرصے لباس خریدنا، معلوم نہیں کھلے سے پہنوں اور دوسری آرائشی چیزوں کا بندوبست کیا۔ ایک جہش آف جیس کو پکڑا۔ ایک انیمیریز ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کیں۔ تقریباً اڑھائی گھنٹے بعد کرا کر گزرا۔ لائق انداز میں آراستہ ہو چکا تھا اور سہلی سرخ جوڑا پہنے گھومتھ نکلے بیٹھی تھی اور... ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ چند دن بعد وہ سیل آگئے۔

لن چل دیے۔ راستے میں شرف بولا "تم بہت خوش قسمت ہو۔ قاسم خان کے گروہ میں تو چھوٹی سے چھوٹی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے بھی بہت سے لوگ ترستے ہیں۔ جبکہ نہیں تو وہ ایک دم ہی اپنے ایک پرانے ساتھی کی جگہ دے رہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں وہ تمہارا کام دیکھے بغیر ہی... تم سے متاثر ہو گیا ہے۔ آدمی بہت چال جو ہر شے ہے۔ اس کا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا۔"

"ان ڈانرٹس قریف کا شکر ہے۔" میں نے کہا "دیے یہ شخص تھا کون اور کس طرح مارا گیا جس کی جگہ مجھے لایا جا رہا ہے؟" یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" شرف معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "میرا اس لائن سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ واقعی لاعلم تھا یا مصلحت کوئی سے کام لے رہا تھا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ قاسم خان کا طریقہ کار ابھی سے مجھے کافی حد تک سمجھ میں آنے لگا تھا۔ ہر شخص کا ایک دوسرے سے صرف ضروری حد تک رابطہ۔ ہر اہل شخص پر اعلیٰ فوری نیل... اور اسی قسم کی دیگر بہت سی خصوصیات تھیں جن کی جھلکیاں مجھے نظر آنے لگی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ شخص مجھے بہت تیز اور خوفناک انداز میں کام کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک مشینری سیٹ کر دی تھی۔ ہر پڑہ اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ صرف اس مشینری کو آپریٹ کرنے کے سلسلے میں دوڑ بھاگ میں مصروف رہتا تھا۔ تمام میرے خیال میں شرف سے کچھ دوسری چیزوں کے بارے میں پوچھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس بارے میں میں نے براہ راست سوال نہیں کیا۔ سرسری سے لہجے میں کہا "قاسم خان اور اس کی بیوی کی جوڑی بڑی بے جوڑی لگتی ہے۔ قاسم خان بالکل عام سا آدمی لگتا ہے اور اس کی بیوی کچھ غیر معمولی عورت لگتی ہے... ہے نا؟"

"اس میں کچھ ہاتھ تمہارے تصور کا بھی ہے۔" شرف سرسری سا لہجے میں بولا "تمہاری عمر ہی ایسی ہے، اس عمر میں گھر کی سترانی بھی بہت غیر معمولی عورت لگتی ہے۔ بہر حال تمہارا خیال بیکر غلط بھی نہیں ہے۔ میں ہمیں اس کے بارے میں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کیونکہ جلد یا بدیر ہمیں خود بھی معلوم ہو جائے گا تقریباً اب ہی پرانے کارکن اس کے بارے میں جانتے ہیں اور خود قاسم خان نے بھی اس بات کو چھپانا زیادہ ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے اب بھی سہلی کے دلہن کی بعض نہایت خوبصورت تصویریں فریم کروانے

ہونے کی ضرورت نہیں۔ اول تو وہ خود بھی ایسی کوشش نہیں کرے گا بلکہ یہاں کوئی بھی تمہارے سکون میں خلل ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا، وہ ایک مختصر لیکن معقول اور صاف ستھرا پورشن تھا۔ کمرے صرف دو تھے لیکن کشادہ تھے۔ صحن پر آمہ می نہیں بلکہ چارچہ گز کا ایک مختصر سا ٹان بھی موجود تھا۔ ہلکا پھلکا فرنیچر اور ضرورت کی دیگر چیزیں بھی موجود تھیں۔ فون بھی تھا۔

اس خیال سے مجھے عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا کہ میں خود بخود انداز میں یہاں رہوں گا۔ مجھے یاد آیا کہ قیسے میں رہائش کے دوران جب میں کالج چھوڑ کر گھر میں چھپیوں کے سامنے اور باہر قرض خواہوں کے سامنے ذلیل ہوا تھا تو اپنے خوابوں کی انتہا یہ ہوتی تھی کہ کاش شرمیں ہزار آٹھ سو کی نوکری مل جائے، رہنے کے لیے اپنا ایک صاف ستھرا سا کمرہ اور جس میں ایک بیڈ اور دو کرسیوں کے علاوہ پھت کا چٹکا بھی موجود ہو تو چرکیا ہی بات ہے۔ مزے آجائیں۔ زندگی کیسی میٹھ و عشرت میں گزرے۔ اور اب جو کچھ مجھے مل رہا تھا اور مل چکا تھا، میری توقعات بلکہ میری اوقات سے زیادہ تمام زندگی کا راستہ ڈرا بدل گیا تھا۔ اس بارے میں کبھی دل میں کچھ کلک سی محسوس ہوتی تھی لیکن میں اس طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ ”دو تین روز تک میں تمہارے لیے کسی ملازم کا بھی بندوبست کر دوں گا۔“ شرفو کہہ رہا تھا۔ ”اس کی تنخواہ تمہارے ذمے ہوگی اور اس پورشن کا کرایہ بھی ماہ بہ ماہ تمہارے حساب سے کٹتا رہے گا۔ قاسم خان حساب کا بہت کھرا ہے۔“ ”آمدنی معقول ہو اور میری گزیر بسر پیش آرام سے ہو رہی ہو تو مجھے کسی قسم کا حساب کتاب اور کوئی وغیرہ کھلی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”اب تم آرام سے یہاں رہو اور اس مکان سے مانوس ہونے کی کوشش کرو۔“ شرفو بولا۔ ”میں اب چلا ہوں“ فرصت ملی تو شام کو پندرہ گاہوں گا۔ اگر تم زیادہ دیر کے لیے کہیں جانے لگو، آٹھ دس گھنٹے یا ایک آدھ رات کے لیے تو ڈائل ہاؤن والے فون نمبر پر کسی کو بھی اطلاع ضرور دے کر جایا کرو۔ نمبر میں کلمہ کر دے جاتا ہوں۔ شام کو گھر سے نکل کر اوپر نوھر گھومنا۔ جب تک میں نوکر نہیں بھیجتا تب تک گزارا کرنے کے لیے تمہیں کھانے پینے کے کئی ٹھکانے اور ریستوران نظر آجائیں گے لیکن یہاں نہیں۔ مین مارکیٹ کے قریب۔ تمہاری گاڑی میں بیٹیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ فی الحال تم اسی سے گزارا کرو۔ بریکمنل تذکرہ اس گاڑی کے کاغذات موجود ہیں نا؟ کسی

قاسم خان بحر حال عمدہ کا پکارا۔ بہت اچھی طرح اس نے اپنی بات نبھائی اور اس عورت نے بھی اپنے آپ کو بالکل بدل لیا۔ اب تو مکمل طور پر ایک گھریلو عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ قاسم خان کے لیے خوش بخت بھی بہت ثابت ہوئی ہے۔ سنا ہے اس نے ترقی ہی شادی کے بعد کی ہے اور اب تو اس نے اپنا جائزہ کاروبار بھی خوب میٹ کر لیا ہے۔

”اولاد...؟“ میں نے پوچھا۔

”دو لڑکے ہیں، کم عمری ہیں۔ ایک امریکا میں پڑھ رہا ہے“

دو سرا یہاں ہے۔“ شرفو نے بتایا۔ ہم باؤل ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچ چکے تھے۔ ڈرائیوے میں شرفو گاڑی سے اترتے ہوئے انگوٹھی لے کر بولا۔ آج میں بہت تھکا ہوا ہوں ورنہ تمہیں تھوڑی سی سیر اور کرائے اب کل دوپہر کو ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ، شب بخیر۔“ وہ یک لخت ہی گویا مجھ سے لا تعلق سا ہو کر اندر چلا گیا۔ شرفو کے روئے میں یہی ایک خاص بات تھی کہ اچانک کھٹ سے گویا اس کے ذہن میں کوئی سوچ دب جاتا تھا اور اس کی سوچوں کا ٹریک بدل جاتا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور پہنچ جاتا تھا۔ جیل ورداڑہ کو سولے میرا ہنجر کھڑا تھا۔ میں بھی اندر آکر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

دوسرے روز شرفو نے دوپہر کے وقت مجھے ساتھ لیا اور گلبرگ کے ایک مکان میں لے گیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور درمیان سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ دونوں حصوں کے دو الگ الگ چھوٹے چھوٹے گیٹ تھے۔ دونوں پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ایک گیٹ پر کسی شیخ احمد خان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ نام کے نیچے تین چار ڈگریاں اور الیکٹریکل انجینئر کا عہدہ بھی لکھا ہوا تھا۔

شرفو دوسرے گیٹ کا دروازہ کھولنے لگا جس پر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ ”تم تو مجھے کسی شریف آدمی کے پڑوس میں ڈالنے لگے ہو۔“ میں نے کہا۔

”تم بھی ایک شریف آدمی ہو۔“ شرفو میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”تمہارے پورشن کے گیٹ پر تمہارے نام کی بھی تختی لگے گی جس کے مطابق تم ایک نام نہاد کپہنی کے سبز نمبر ہو گے۔“

”تو کیا وہ شخص بھی...؟“ میں نے دوسرے پورشن کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔ نہیں۔“ شرفو جلدی سے بولا۔ ”وہ واقعی کوئی شریف آدمی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ دونوں کرائے کے پورشن ہیں۔ تمہارے پورشن کا دو سال کا کرایہ دیا جا چکا ہے۔ تمہیں اپنے پڑوسی سے زیادہ فزی

ایم اے راحت کے طلسماتی قلم سے

تاریکے واوی

دو جلدوں میں

حصہ اول = 150/-

حصہ دوم = 150/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

ایک کوچیان سے زیادہ اثر سوخ کا مظاہرہ کر سکتا تھا لیکن میں فی الحال اس جاگیردار کو فٹ بال کی طرح نہیں اچھل سکتا تھا کیونکہ میں قلمی ہیرو نہیں تھا۔ ملک اسلم کے ساتھ جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا اس کے لیے مجھے ابھی بہت طاقت درکار تھی۔ جسمانی طاقت نہیں، کچھ اور ہی طرح کی طاقت۔ ایسی طاقت جس کے بل پر میں بھی سماج کے سینے پر چٹان کی طرح جم کر کھڑا ہو سکوں۔

اسکرین پر کمانی کا کھڑ مزید دو تین چکر کاٹ چکا تھا۔ جاگیردار اپنی حویلی میں بیٹھ لیٹے پڑا تھا اور ہیرو سے بدلہ لینے کے لیے اپنے خواربوں سے صلح مشورہ کر رہا تھا جبکہ ہیرو اپنے آنگن میں ہیروئن کو بخار کے نمر کے کنارے پیر کراتے ہوئے دو گانا گانے میں مصروف تھا۔

میں نے اکثر اپنے گاؤں میں کوچیانوں کو محض اس لیے جاگیرداروں کے سامنے زمین پر ناک سے لکیریں نکالتے اور جوتوں سے چنے ہوئے دیکھا تھا کہ انہوں نے گاڑی پر جاتے وقت کسی جاگیردار کی جیب یا کار کے سامنے سے آٹک ہٹانے میں ایک آٹھ سینڈ کی تاخیر کر دی تھی۔

بہر حال اسکرین پر جو کچھ ہو رہا تھا اس سے محفوظ ہونا بھی میرا اخلاقی فرض تھا۔ کیونکہ میں نے اس کے لیے پیسے خرچ کیے تھے اور ان متاع کاکم از کم اتنا فائدہ ضرور تھا کہ رگوں میں خون کی گردش کچھ تیز ہو جاتی تھی اور زندگی سے کٹے ہوئے کچھ وعدے یاد آ جاتے تھے۔

لہذا دیکھ کر میں دابھی آیا اور ایک بار پھر مریضوں کی طرح

جینی ہوئی یا چرائی ہوئی تو نہیں ہے؟
 نہیں۔ خریدی ہوئی ہے تمام میرے نام پر نہیں ہے۔
 بے تپتا لاؤٹنس مجھے شہزاد کوٹ میں اشرف خان نے
 پاتا تھا۔ ”آہ... اشرف خان! میں نے جلدی سے اس کا خیال
 سے جھٹک دیا۔ ”میں اتنی کلفتی ہے۔“ وہ بولا ”دراصل
 کسی اس قسم کی قانونی کارروائیوں کا خطرہ مول نہیں لیتا جو
 اپنے درجے کے چور اچکوں کے خلاف ہوتی ہیں۔“ مزید
 رسوا کرنے اور کچھ دیر دیالیا دینے کے بعد بلاآخر شرف
 مت ہو گیا۔

میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ ہاتھیں۔ ہاتھیں۔ ایک
 دوسرے اور دوسرے سے تیرے محض کے پاس جانا۔
 اتنا سننا۔ زندگی میں کوئی پہل ہی نہیں رہی تھی۔ سرد
 راحت کی پیداوار تھا۔

میں گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا اور صحت دیر تک اور اور
 اور گری کر رہا۔ راستے ذہن نشین کر رہا۔ گرد و پیش کو
 لینے کی کوشش کر رہا۔ ایک جگہ دودھ دہی کی دکان نظر آئی
 میں نے لمبی کا ایک تنگ ساڑھی لٹا کر لیا اور ذہن پر اس کا
 رلے آکر سوجھا۔ شام ڈھلے بیدار ہو کر میں دیر تک چھت پر
 لڑی جھانے چت لینا رہا۔ ہر طرف سکوت پھیل رہا تھا۔ یہ
 اتنا کچھ زیادہ ہی پرسکون تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ گھبرگ کا
 نئی سرا معلوم ہوا تھا۔ کبھی کبھار گلی سے کسی گاڑی کے
 رولنے کی آواز فضاء میں اور تلاش سایہ اور کھاتی تھی۔ اس کے
 دھڑ دھڑ سنا۔ میری رگوں میں ایک عجیب سی بے گلی کا
 پائپا سرسرا رہا تھا۔

بلاخر میں ایک بار پھر اٹھا اور گاڑی نکال کر میں مارکیٹ جا
 گیا۔ کھانا کھا کر میں مارکیٹ کے قریب ہی واقع ایک سینما میں
 بیٹھا۔ پتیلی فلم لگی ہوئی تھی۔ کئی دنوں سے کوئی فلم نہیں
 لگی تھی۔ تنگ اور تاریک سینما ہال میں جھنڈ کر دل کو کچھ
 آرام ملا۔ فلم خاصی نکل چکی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ آواز
 کی طرح ہوا ہو گا بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ انجام کیا ہو گا، اس
 سلسلہ میں فلم سے لطف اندوز ہوتا تھا کیونکہ میں لطف
 اندوز ہونے کی نیت لے کر آتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہیرو جو پیشے کے اعتبار سے کوچیان واقع ہوا تھا
 شہزاد کوٹوں ٹھوکر میں مارا کر ہوا میں اچھلنے لگا جیسے وہ جاگیر
 نہ ہو بلکہ سیالکوٹ کی بنی ہوئی کوئی فٹ بال ہو۔

ایک جاگیردار کا کچھ پر بھی بہت بھاری قرض بقی تھا اور میں
 فائدہ قرض کچھ اسی انداز میں چکانا چاہتا تھا۔ میری صحت بھی
 اتنا کمزور سے کچھ بہتر تھی اور میں ضرورت پڑنے پر کم از کم

دہل میراقت ضائع نہ ہوتا اور میں تیز رفتاری سے سڑک پر کل دن چڑھے تک دابوں آسکتا تھا۔ ابھی چوتھے میں نے ہم خان کے لیے کام شروع نہیں کیا تھا اس لیے میں نے کسی کو اپنے جانے کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا اور گاڑی میں بیٹھ کر شزا کوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

رات کے چھپکے پہر میں شزا کوٹ پہنچا۔ میں شرمیل دابوں ہوا تو میرا دل کچھ زیادہ ہی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب سا خوف ذہن پر سوار تھا۔ چند دن پہلے تک یہ شرمیل انور کی طرح صبران محسوس ہوتا تھا لیکن آج دشمنوں کا شہر لگ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کبھی کبھار ایک پولیس جپ ران کے وقت گشت پر نکلے ہوتے ہیں۔ اس وقت مجھے امید تھی کہ اس سے سہانا نہیں ہو گا کیونکہ رات ڈھل چکی تھی۔ تاہم میں حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا۔

گاڑی میں نے گھر سے کچھ دور ہی ایک محفوظ سی جگہ چھوڑ دی۔ اندیشہ تھا کہ مکان کی گمرانی نہ ہو رہی ہو اس لیے میں بچھل طرف سے داخل ہونا چاہتا تھا اور بچھل طرف گاڑی لے جانے کے لیے راستہ ٹھیک نہیں تھا۔ اگر بچھل طرف بھی گمرانی کے لیے کوئی موجود ہوتا تو دور ہی سے اس کا سراغ لگنا اور اسے چکر دے کر بھانپنا یا مقابلہ کرنا آسان تھا۔

میں کھیتوں کی طرف سے مکانوں کی آخری قطار کے عقب میں پہنچا۔ کئی دیر تک میں قد آدم گھاس میں رہا گردو پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے تو میں گھاس میں چلا ہوا مکان کی طرف بڑھا۔ گھاس کا سلسلہ ختم ہوا تو میں کچھ اور محتاط ہو گیا۔

لوہی نیچے جکی زمین میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گڑے بھی تھے جن میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ کہیں کہیں مینڈک ٹرڑاتے ہوئے ایک گڑے سے دوسرے گڑے میں چلا گئیں لگا رہے تھے۔

مکان کی بڑی سی عقبی کمرہ کی اب مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ خوب گھاس میں روشنی ہے لیکن کمرہ بند تھی اور پردہ نہایت ہی احتیاط سے پھیلا دیا گیا تھا کہ درائی بھی روشنی باہر نہ جانے پائے۔

میں کمرہ کی کاشیہ کھٹکھٹا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خیال میں بستر پر تھا کہ میں کسی طرح نہایت خاموشی سے اندر پہنچاؤں جائزہ لیتا کہ دہل میرے لیے کوئی پسند آتو موجود نہیں ہے اگر کوئی پسند موجود ہوتا تو میں اس کے آثار محسوس کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسی خاموشی سے دابوں آسکتا تھا۔ کمرہ کی قریب پہنچ کر میں نے سن سن لینے کی کوشش

بستر پر لیت گیا۔ سکوت سے اب میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ رگ و پے میں سرسراہٹ ہوئی ہے کئی لمحہ پہ لمحہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ایک غلط تھی جو مجھے ہر مسام جانے سے ڈس رہی تھی۔ ایک عجیب سی آگ تھی جو میرے اعصاب کو جھلسا رہی تھی۔ کوئی تاویذ پر چھائیں میرے قریب سرگوشیل کر رہی تھی کہ مجھے کوئی ضروری کام کرنا ہے مگر میں اسے بھول رہا ہوں۔

بیلہ پر پت لینے جھٹ کی طرف نکلتے نکلتے اچانک میرے ذہن میں چھٹا سا ساہو اور مجھے معلوم ہو گیا کہ بے کلی کا باعث کیا تھا۔ مجھے کونسا ضروری کام کرنا تھا جسے میں اب تک بھولا ہوا تھا۔ کمرے کی سفید اور ہموار چھت جسے میں ایک تک دیکھ رہا تھا گویا ستیا کی اسکرین بن گئی اور اس پر کھڑا پ میں ایک چہرہ ابھرا آیا۔ زربند کا چہرہ۔

کیسے خود غرض تھے ہم۔ میں اور اشرف خان کس طرح اسے چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ اس وقت یہ بات قطعی منطقی لگی تھی کہ اسے ساتھ لینے کے پیکر میں ہم بھی مارے جائیں گے۔ فائدہ کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک بے مقصد قربانی تھی۔ لیکن اب یہ باتیں بہت خود غرضانہ لگ رہی تھیں۔ خود غرضی کی انتہا یہ تھی کہ چھپکے چند دنوں میں اس کے متعلق میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس پر کیا گزری ہوگی؟ میں کس طرح اس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا؟ اس قسم کا کوئی خیال میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

میں بے تابیہ انداز میں اٹھ بیٹھا۔ اب اگر ذہن میں یہ چھٹا کا ہو ہی گیا تھا تو اب میں ایک لمحے بھی مبر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ عورت خزانہ کیسی بھی تھی اور اس کا مجھ سے جو بھی تعلق تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے طرز عمل میں محبت کا گداز شامل تھا۔

مجھے امید تھی کہ وہ مجھے گھر پر ہی مل جائے گی۔ پولیس نے اگر اسے پکڑا بھی ہو گا تو آخر کار چھوڑ دیا ہو گا کیونکہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہمارے دھندوں سے درحقیقت اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس کی ہی نہیں اپنی نظر میں بھی سرخرو ہونے کے لیے میرا اس کے پاس جانا ضروری تھا اور اگر میں اسے اپنے ساتھ لے کر آتا تو میرے مدد و شب بھی اچھے گزر سکتے تھے۔ وہ اس قسم کی عورت تھی کہ ساتھ رہتی تھی تو زندگی کا اہم جزو بن جاتی تھی اور اگر اس سے ترک تعلق قصود ہوتا تو وہ نہ کسی کو پریشان کرتی تھی اور نہ خود پریشان ہوتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسی وقت شزا کوٹ جاؤں گا۔ اگر

ہا کہ یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے جو ابھی ٹوٹ جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بالآخر میں اندر چلا گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر قطعاً حیران نہیں ہوئی۔ شاید اس میں حیران ہونے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ تاہم اس کے آنسوؤں کی طغیانی کچھ اور بڑھ گئی۔ سسکیں رک گئیں مگر کچلے سٹلے چہرے پر ایک ایسی اذیت کے آثار ابھر آئے جو شاید اس کی اب تک کی تمام اذیت پر بھاری تھی۔

بید پر سکراسناس اس کا مجبور جسم یوں لرزے لگا جیسے اس کے وجود میں ہزاروں ذرے متحید ہوں۔ اس نے شاید جینے کی کوشش کی تھی مگر حلق سے محض ایک پھٹی پھٹی سی بے معنی سی آواز نکلی۔ بمشکل وہ بول پائی "کیا لینے آئے ہو اب یہاں؟" دفع ہو جاؤ... میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ "تم اپنی نفرت میں حق بجانب ہو۔" میں نے سنبھل کر دھمکے لہجے میں کہا "لیکن خدا را چند لمحے کے لیے غیر جذباتی ہو کر مجھے سب کچھ بتا دو۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں اس حال میں بھی غیر جذباتی رہ سکتی ہوں؟" اس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا اور ایک بار پھر کرہ اٹھی۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ اس کی دو انگلیوں کے باخبر بھی عتاب تھے اور ایک انگلی بری طرح سوتی اور مڑی ہوئی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے میرے سوال کا جواب دے دو۔" میری آواز بے اختیار رندہ سی گئی۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس کے قریب ٹھنوں کے بل... قالین پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ ہچکچاہٹ لیتی رہی۔ اس کا جسم جھٹکے کھاتا رہا۔ بالآخر ٹوٹتی ہوئی سی آواز میں بولی "تین ٹھنوں نے باہمی اشتراک سے چھاپا مارا تھا۔ تم اور اشرف یکایک گویا ان کے لیے بہت اہم ہو گئے تھے۔ یقیناً کسی نے انہیں پ دے دی تھی۔ ٹپ ہی نہیں اور بھی بہت کچھ دیا ہوگا۔ تمہارے فرار کے بعد انہیں یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ اشرف خان زخمی ہوا ہے اور جانے کیوں انہیں قوی امید تھی کہ وہ زندہ نہیں بچے گا... "ان کا خیال درست ہی نکلا زرنہ... " میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

زرنہ کے ہکڑے ہوئے چہرے پر ایک لمحے کو تغیر آیا مگر اس نے بات جاری رکھی۔ "وہ مجھے پکڑ کر لے گئے۔ وہ جانا چاہتے تھے کہ دوسرا کون تھا اور اس نے کہہ کر کارخ کیا ہوگا" کہل سے اسے پکڑا جاسکتا ہے؟ میں بھلا کیا بتاتی؟ مجھے خود بھی یہ بتاتے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ واقعی کچھ بھی نہیں جانتی تھی... مگر

کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے جو تے اتار کر کھڑکی کے قریب رکھے اور کھڑکی کا چھجکا پکڑ کر جسم کو سینٹے ہوئے پیچھے پر چڑھ گیا۔ وہاں سے گرنے کا پورا پورا خطرہ مول لیتے ہوئے میں دیوار پر پہنچا جو بمشکل بیڑہ بالشت چڑی تھی۔ دیوار پر ہاتھ تھاکر میں دوسری طرف لٹک گیا پھر پیچوں کے بل رانداری نما لمبو ترے صحن میں کود گیا۔ بیدروم کی کچھ کھڑکی مکان کے اندر نکلتی تھی اس کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور روشنی باہر آ رہی تھی۔ یہی نہیں دوداڑے کا ایک پٹ بھی نکلا ہوا تھا۔

اس لمحے میں نے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنی۔ ایسی سسکیں جنہیں ہونٹوں میں دبائے رکھنے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ ان سسکیوں میں ہلکی ہلکی آہیں بھی شامل تھیں۔ میرے جسم میں ایک سردی لہر دوڑ گئی۔ اس آواز کو صبح طور پر پہچانتا تو مشکل تھا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ آواز زرنہ کے علاوہ کسی کی نہیں۔ چند لمحے میں دیوار سے چپکاپے حس و حرکت کھڑا پھر پیچوں کے بل کھڑکی کے قریب پہنچا۔ عسلا انداز میں کمرے میں جھانکا۔ زرنہ اندر موجود تھی اور تھامی تھی لیکن اسے پہچاننے میں مجھے خاصی دقت پیش آئی اور جب میں نے اسے پہچان لیا تو میرا جسم سن ہو گیا۔

وہ بید پر آزادی زنجیر پڑی تھی۔ اس کھڑکی کی طرح جسے بہت سے فساد پسند بچوں نے بری طرح فوج کھسوت کر ایک طرف پیٹک دیا ہو۔ اس کے ہونٹ کٹے پھٹے اور سوچے ہوئے تھے۔ رخساروں اور پیشانی کی جلد پھٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد غلاہٹ اور ورم تھی۔ آنکھیں تقریباً چھپ گئی تھیں 'ہل بری طرح اٹھے ہوئے تھے اور اس کے بالو جو کچھ چھدرے چھدرے سے لگ رہے تھے۔

بازوؤں اور گردن وغیرہ کا بھی پتہ نہ نظر آ رہا تھا اس پر نکل تھے یا پھر ایسے نشانات جیسے اس کے جسم کو سگریٹوں یا پتے ہوئے لوہے سے دھما گیا ہو۔ ان تمام نشانات پر کہیں سرخ' کہیں پتلی اور کہیں کوئی بے رنگ دوا لگی ہوئی تھی۔

وہ گرم پانی کی بوتل لیے کہیں کہیں غور کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے اس میں بھی دقت پیش آ رہی تھی۔ اس سے کسی کوٹ بھی لینا نہیں جا رہا تھا۔ دوسرا ساس کی طرف کو بھی پلٹی تھی تو کرہ اٹھتی تھی۔ بے اختیار اس کے حلق سے سسکیں نکل جاتی تھیں جنہیں وہ مسخ شدہ ہونٹ بھینچ کر روکنے کی کوشش کرتی تھی لیکن پھر غالباً ہونٹوں کی تکلیف کے باعث یہ بھی ممکن نہیں رہتا تھا۔ آنسو اس کی متورم آنکھوں سے اٹھے چلے آ رہے تھے۔

چند لمحے تک تو میں خود کو یہی قریب دینے کی کوشش کرتا

کون یقین کرتا؟ میں نے تمہارے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔"

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے بچوں کی طرح سینے سے لگاؤں، پچکاروں، چپ کر اؤں مگر مجھ میں اسے ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں تھی۔ محض اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہی میرا دل خون ہوا جا رہا تھا۔

قدرے سنبھل کر وہ بولی "پہلے انہوں نے اطمینان کیا کہ میرا کہیں کوئی اثر و رسوخ نہیں... میرا کردار، میرا ماضی کچھ ایسا کمال فخر نہیں... پھر تو میں ان کے لیے لوٹی ہوئی چنگ بن گئی... میں کوئی عزت دار عورت نہیں ہوں افضل لیکن اتنی ذلت کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آخر کار آج وہ اپنی تفتیش سے شک گئے اور مجھے یہاں بھیج گئے۔ میں نہیں کہہ سکتی شاید مکان کی نگرانی بھی ہو رہی ہو۔ یا شاید بس... اب ان کی دلچسپی ختم ہو گئی ہو۔ جو کچھ ہو چکا ہے ان کے خیال میں یہی بالکل ہو... " وہ خاموش ہو گئی۔

"جو کچھ بھی کیا ہے بہر حال تم اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔" میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ سارا رے کر اسے اٹھا سکوں۔

"نہیں... نہیں۔" وہ دہشت زدہ ہو کر کچھ اور سمٹ گئی۔ "مجھے ساتھ لے جانا تو درکنار خدا کے لیے تم میرے پاس زیادہ دیر بیٹھو بھی مت۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جس طرح چند دن قبل چھوڑ گئے تھے۔ میں خود ہی اپنے آپ کو سنبھال لوں گی۔ خود ہی اپنے معاملات سلجھا لوں گی۔ خدا اس مسئلہ کا رکنی مسرت کرے۔" اشرف خان نے یہ مکان میرے نام کو دیا تھا۔ یہاں اب زیادہ نقد یا کوئی کام کی چیز تو باقی نہیں رہی لیکن بہر حال سرچھپانے کا ٹھکانا تو ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لوں گی۔ تم بس فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے کسی کی مدد... کسی کے سارے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لیے مجھے تھاپھوڑ دو۔"

میرا خیال تھا اس کی برہمی اور جذباتیت آنسوؤں کے ساتھ برہ جائے گی۔ میں اسے روکنا دیکھا براحتی کہ اس کے آنسو ختم گئے۔ شاید آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے تھے۔ آنسوؤں نے اس کے اور میرے درمیان فاصلے گھٹانے کے بجائے بڑھا دیے۔ اس کا ارادہ پہلے سے زیادہ مضبوط محسوس ہونے لگا۔

بیگانگی میرے لیے جس وہ بولی "خدا کے لیے اب چلے بھی جاؤ۔ مجھے تمہاری موجودگی سے دہشت ہو رہی ہے۔ میں نے ان لوگوں کے سامنے بہت بڑی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ تم نے اگر مجھ سے رابطہ قائم کیا تو میں تمہیں پھڑکانے کی کوشش

کروں گی۔ ایک نوں نمبر بھی دیا تھا انہوں نے مجھے... تمہاری خاطر میں اب بھی اتنا کر رہی ہوں کہ اپنی قسم پوری نہیں کر رہی ہوں... لیکن خدا راقم چلے جاؤ۔ میری بھلائی چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ ہمارا تمہارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ اب اسے بھول جاؤ۔" اس نے بعد کوشش کر دلی اور منہ پھیر کر اس طرح لٹ گئی کہ اس کے گھٹنے ہیٹ سے لگ رہے تھے اور گرم پانی کی بوتل اس نے پیلیوں پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کا جسم اب بھی ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" میں نے گڑ گڑاؤ میں پوچھا۔

"ہاں... ہاں۔" وہ لذت زدہ کھٹی کھٹی آواز میں بولی۔ اس کے لیے نے مجھے بتایا کہ مجھے اپنی کتاب زندگی سے یہ ورق اب چھڑا کر پھینکنا ہی ہو گا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی اور ایسا فیصلہ کرنا اس کا حق بنتا تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔" بٹا خرمش نے شکست خوردہ لیے میں کہا۔ "کیا میں تمہارے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کرنا چاہوں؟" "میں نے کر لیا ہے۔" وہ رکھائی سے بولی "سرورسٹ اس سے جو کچھ ہو سکا تھا کر گیا تھا۔ صبح دو اؤں کا بندوبست کر کے آئے گا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر میری کچھ مدد کر سکتے ہو تو یہی کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

میں کمرے سے نکل آیا۔ میرے کندھوں پر جیسے منوں وزن لدا ہوا تھا۔ ہشکل میں اسی راستے سے باہر پہنچا جس راستے سے آیا تھا۔ میں نے بیڑی روم کی کھڑکی کھول کر کودنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کے لیے مجھے زبرد کے سامنے چاہنا پڑتا جبکہ وہ مجھ سے منہ پھیرے لیٹی ہوئی تھی۔

باہر کھڑکی کے پاس رکے ہوئے جوتے پہن کر میں داہیں چل دیا۔ میں دکھوں اور غموں کا ظاہری طور پر ہی نہیں دلی میں بھی ہمیشہ مشکندہ ہی اڑانے کا عالمی رہا تھا کہ وہ میرے اعصاب کو توڑ پھوڑ نہ سکیں لیکن اس وقت میرا دل ہتھاپو جھل غامض ہی جانتا تھا۔ کوشش کے باوجود مجھے کوئی مزاحیہ بات یاد نہیں آ رہی تھی۔ صورت حال کے لیے کوئی مزاحیہ تشبیہ نہیں سوچ رہی تھی۔

پہیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا اور خاصی خشک ہوا چل رہی تھی مگر مجھے فضا میں بے حد جس محسوس ہو رہا تھا۔ محض شاید فضا میں نہیں میرے سینے میں تھی۔

میں گاڑی میں آ بیٹھا۔ چاروں طرف پرندوں کی چہکار سنائی دینے لگی تھی۔ اچھا بھلا رہا تھا۔ میں نے گلوہ پکپکٹ

جو اس جمہور کی کامیابی تھا۔ اس بلا بٹشا کی تہذیب منظر کی تہذیب سے کچھ ہی کم پرانی تھی۔ کسی ذہن نے اس بلا بٹشا ایک مونی تھا۔ شہر کی ایک سڑک پر بیٹھا کرتا تھا۔ جاتے کب اور کس طرح چھوٹے موٹے اسٹوروں نے اسے اپنے تجربہ اور پیامبر کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے اس بے ضرر سے بوڑھے مونچے کے پاس چھوٹے موٹے اسٹور جو لے پائش کرانے کے بہانے رکھتے اور کہہ جاتے کہ فلاں آئے تو اسے بتا دیتا کہ فلاں وقت فلاں جگہ سے مل وصول کر لے یا فلاں جگہ پر مل اس وجہ سے نہیں پہنچ سکا۔ آئندہ پروگرام یہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ چھوٹے موٹے سرکاری الیکٹرک بھی جوتے مرمت کرانے یا پائش کرانے کے لیے اس کے پاس رکھتے تھے۔ بلا بٹشا باتوں باتوں میں کبھی کبھار ان سے بھی کوئی کام کی خبر حاصل کر لیتا تھا اور اسے اسٹوروں تک پہنچا دیتا تھا۔ ان خدمات کے عوض اسٹور اسے تھوڑی بہت رقم دیتے رہتے تھے اور شاید ان ہی دنوں بلا بٹشا کو اہل ایس ڈی کے کیسپول کی لت لگ گئی جسے نشے باز راکٹ کہتے ہیں۔

اس راکٹ نے بہت کم وقت میں بلا بٹشا کو قبر کے کنارے پہنچا دیا۔ اسے روٹی کی نہیں 'راکت' کی فکر رہتی تھی۔ جو کچھ بھی اس کے پاس ہوتا اس سے وہ راکٹ خریدتا، خواہ کسی بھی قیمت پر ملتا۔ نشہ نوٹا تو دیوانوں کی طرح وہ ہر چیز کو نوچا کھوٹا، اور دوسرے پھر تاول فول بلکہ کام کاج کے قاتل نہ رہا۔ اسٹوروں کے لیے بھی بھروسے کے قاتل نہ رہا۔ کبھی کبھار وہ شہر کی کسی سڑک کے کنارے یا کسی ٹلی میں منہ دیے پڑا ہوا نظر آجاتا۔ کوئی ترس کھا کر کسی طرح اسے اٹھا کر اس کی جمہور میں پہنچا دیتا، کوئی ترس کھا کر کھانا یا تھوڑے بہت پیسے دے دیتا۔

جمہور میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مرغیوں کے کسی بڑے ڈھبے میں گھس گیا ہوں۔ عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی وہیں۔ ایک کونے میں بلا بٹشا کے ماسی کی یادگار چند ڈبک آلود اوزار اور مڑے مڑے کتے بیٹھے کچھ جوتے پڑے تھے۔ ایک کونے میں چولہا، ایلیمینٹیم کے دو چار ٹیڑھے میزھے برتن اور گھڑا وغیرہ اوندھا سیدھا پڑا تھا۔

جھلکی چارپائی کی قبر میں بلا بٹشا گھری بیٹھا تھا۔ پہلے تو مجھے گمان گزرا کہ اس کی روح نفسِ مضمی سے پرواز کر چکی ہے۔ اس کا پوچھا سنا کہ اسے انداز میں کھلا ہوا تھا۔ رات برہنہ کر اس کے رخساروں پر خشک ہو چکی تھی۔ اس کی رحمت سیاہ اور چہرہ جھرمج بھرا تھا۔ ہاتھ پیروں پر نہیں رسیوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے استخوانی جسم پر ایک سیلی

جیسے دارنوبی اور تاریک شیشوں کی عینک نکلی۔ یہ دونوں تہذیب میں نے لاہور میں آدھ گروڈی کے دوران خریدی تھیں۔ مجھے جیسے آدمی کے لیے یہ بڑی کار آمد چیزیں تھیں۔

لوبی پہننے اور عینک لگانے کے بعد میں نے عتب نما آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں اور بل چھپنے سے چہرے میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ گہری سانس لے کر میں سینٹ سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے بدن میں کھڑکی سی ایک دبی تھی۔ میرے وجود میں کیسی جیسے دلی چنگاری سی پھوٹی تھی اور شعلہ بقی جاری تھی۔ میں سر تپا بتائے اذیت تھا۔ میرا دواں دواں گل رہا تھا۔ ہر مسام جان ل اگل رہا تھا۔

جان سن! یہ تو زندگی کا کوئی قرینہ نہ ہوا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یوں تو لوگ زمین کے سینے پر تھمارے پاؤں کبھی جھٹے نہیں دیں گے۔ میں بہت دیر تک سوچا رہا۔ بالآخر مجھے امید کی ایک کرن دکھائی دے گئی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ لی اور تیز رفتاری سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

شہر کے مضافات ہی میں واقع ایک بہت بڑا کباب خانہ میری منزل تھا۔ کباب خانے تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ گاڑی نے ایک پرانے اور عبور و رفت کے نیچے روک دی۔ کباب خانے کے گرد ایک نیچی سی چار دیواری احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اندر ایک طرف چھپر سا تھا۔ کچھ ساز و سامان اور کالٹھ لبا لاس چھپر میں ہوتا تھا اور باقی کھلی آسمان تلے کھرا رہتا تھا۔ اس چار دیواری کی ایک دیوار کے ساتھ ایک جمہور پڑی کدھا جوڑے کھڑی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس جمہور پڑی تک پہنچا۔ جمہور پڑی کا نام نلودہ روزہ چپٹ کھلا دیکھ کر مجھے ہلوسا سی ہوئی کہ شاید اب یہاں کوئی نہیں رہتا لیکن کچھ آگے بڑھا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آوارہ قدم سے نظر نہ رکھنے والی وہ چارپائی اب بھی جمہور پڑی میں موجود تھی جو میں ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب اشرف خان کے ساتھ مل آیا تھا۔

یہ چارپائی درحقیقت چارپائی بھی نہیں تین پائی تھی۔ پانچ پائے کا صرف تھوڑا سا حصہ ہی باقی تھا اور کسی اینٹوں کے ذریعے پوری کی گئی تھی۔ یہ چارپائی کسی دانشور کے خیالات کی کی گمانی لیے ہوئے تھی اور اس پر لیٹنے کے بعد انسان کوڑے کی ٹال جیسی شکل اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھوری اتنی تھی کہ کتے بلیاں تو اس کے پانوں کے درمیان سے گزر سکتی تھیں۔

اس پر لیٹا بیٹھا ایک آرٹ تھا جو صرف بلا بٹشا کو ہی آتا تھا

کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔
 پتا چڑھ کر اس نے فی منی میں سر ہلایا اور سرگوشی نما آواز میں پوچھا
 ”کیا اب تم یہ رقم واپس لے لو گے؟“ اس کے لیے میں ہلائی
 حسرت تھی۔

میں فوری طور پر اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کا مارا
 جسم ہی ہولے ہولے کلپ رہا تھا۔ وہ گویا مجھے قائل کرنے کی
 کوشش کرتے ہوئے بولا ”استو لہجو کاٹھا کا شاید تمہیں کوئی
 بھی نہ پتا سکے۔“

”اس کے کسی ساتھی کا اتنا پتا؟“ میں نے پوچھا۔
 وہ سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے اس کے چند شدہ ذہن پر زیادہ مجبور
 تو نہیں تھا لیکن کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔
 پتا چڑھتا ہوا سر اٹھایا اور کانپتی آواز میں بولا ”کافی عرصہ
 پہل کی بات مجھے یاد پڑتی ہے... ایک نوجوان... غلام احمد اس
 کے لیے کام کرتا تھا۔ ان دنوں تو اس کا خاص آدمی تھا۔ اگر زندہ
 ہو گا تو اب بھی پتہ اس کے لیے کام کر رہا ہو گا۔ بات زیادہ پرانی
 بھی نہیں ہے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کبھی رہتا تھا۔“ وہ
 ہانپنے لگا تھا لہذا خاموش ہو کر سانس درست کرنے لگا۔
 کچھ دیر بعد اس نے مجھے ایڈریس سمجھانا شروع کیا جو پتا
 میری سمجھ میں آئی گیا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا
 اور جمو پڑی سے نکل آیا۔

مجھے یقین تھا کہ ہماری خبری کرنے اور ہمارے ساتھ بے
 انتہا سخت سلوک کرانے میں استو لہجو کے سوا کسی کا ہاتھ
 نہیں تھا۔ یہ بھی غیبت تھا کہ اشرف خان کچھ ہی عرصہ قبل
 مجھے اس کے بارے میں کافی کچھ بتا چکا تھا اور اس حقیقت سے
 بھی آنکھ کھچکا تھا کہ ان کے درمیان پرانی دشمنی کی ایک کڑی چلی
 آ رہی ہے۔

اشرف خان کھچکا تھا اور اس طرح گویا استو لہجو کی
 خواہش انتقام کی تسکین کا سامان ہو چکا تھا اور اب یہ سلسلہ
 میں ختم ہو سکتا تھا لیکن اشرف خان کی موت اور پھر زندہ کا
 حشر دیکھنے کے بعد میرے دل میں انتقام کا شعلہ بڑھ گیا تھا۔
 استو لہجو کی کینکری اور سفاکی کا بدلہ لینے کی ذمہ داری
 نے اپنے سر لے لی تھی۔

فی الحال میں اپنے آپ کو اس پوزیشن میں تو محسوس نہیں
 کر رہا تھا کہ استو لہجو کو اگر تلاش کر بھی لیتا تو براہ راست جا کر
 اس سے ٹکرا جاتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس جگہ وہ کسی بلا شعلہ
 کم نہیں تھا۔ بہر حال میں اس کے دل پر ایسی ہی کوئی خراش
 ضرور لگا سکتا تھا جیسی اس نے میرے دل پر لگائی تھی۔
 مجھے غم تھا یہ ایک قسم کی سہولت حاصل تھی کہ میرے

چیکٹ واسٹ اور مختصر سی دعوتی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور
 آنکھوں کے گوشوں میں ٹپل جی ہوئی تھی۔

مجھے اس پر رحم بھی آیا اور ایک لمحہ کے لیے کراہت بھی
 محسوس ہوئی لیکن پھر ایک اور ہی جذبہ ان تمام کیفیات پر
 غالب آ گیا۔ میں اسے ہلانے جلانے کے لیے ہاتھ بڑھانے ہی
 لگا تھا کہ ایک لخت اسے جھرجھری سی آئی اور اس کے جسم کو
 یوں جھٹکے گئے گئے گریا جلی کا کوئی ٹکا تڑ جس میں کرنت بھی
 دوڑ رہا ہو، بار بار اس کے جسم سے مس ہو رہا ہو۔

چند لمبے بعد اس کی حالت کچھ احوال پر آئی اور وہ
 خر خراہٹ کی آواز کے ساتھ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔
 آنکھیں بدستور بند تھیں۔

میں نے کافی دیر اسے ہلایا جلیا تا اب اس نے بالکل آنکھیں
 کھولیں اور نہایت ہی بیزاری سے میری طرف دیکھا۔
 ”کون ہے؟ کیا بات ہے؟“ اس نے نہایت ہی ضعیف
 آواز میں پوچھا۔

میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا اور میرے خیال میں بات
 اس کی دلچسپی کے موضوع سے شروع کی جاتی تو شاید جلد
 مقصد پورا ہو جاتا۔

”راکت چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں امید کی کرن لہرائی اور
 اس نے چارپائی کی پٹی تمام کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے
 سارا دے کر اسے بٹھایا۔

”تم راکٹ لائے ہو؟“ اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔
 ”نہیں، لیکن میں تمہیں کچھ رقم دے سکتا ہوں جس
 سے تم کئی دن کا کھانا خرید سکتے ہو۔“ میں نے کہا اور دس
 کے چند نوٹ اس ہاتھ میں تھمویے۔

وہ کانپتے ہاتھوں سے انہیں گھنٹے لگا۔ پھر اس نے ہاتھوں کی
 طرح اپنے ایک ہاتھ پر کٹا اور میری طرف دیکھ کر گھبراہٹ زدہ
 سے انداز میں پشتمے ہوئے بولا ”یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا
 ... کہ میں خواب... نہیں دیکھ رہا...“ اس نے ایک بار پھر ہاتھوں
 کی طرح نوٹ گئے۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ پہلے سے زیادہ
 کلپ رہے تھے۔

”تم مجھے بتا سکتے ہو کہ استو لہجو کاٹھا کہاں ہے؟“ میں
 نے پوچھا۔

”استو لہجو کاٹھا...؟“ اس نے سرسراہٹ ہوئی سی آواز
 میں دہرایا۔ ایک لمحہ پہلے اس کی آنکھوں میں امید کی جو کرن
 لہرائی تھی، دم توڑ گئی۔ حد سے زیادہ ابھرے ہوئے اس کے
 زخموں نے کئی بار بجے اور حرکت کی۔ شاید وہ مزید کچھ بولنے

سر سرائی ہوئی سٹاکی کی لڑ کو محسوس کر سکتا تھا۔ میرا دل اس وقت فترت سے لبرزد تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس میں اس فوجیان کا اغراضی طور پر کوئی حصہ تھا یا نہیں لیکن میری فترت کو دہندہ کرنے کے لیے یہی احساس کافی تھا کہ وہ اس شخص کا کارندہ تھا جس کا ہم میں اپنے دشمنوں کی مختصر سی فترت میں لگھ چکا تھا۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے تھوک نکل کر جواب دیا ”میں ایک دوست کے ساتھ یہاں رہتا ہوں، وہ دو تین روز کے لیے کہیں گیا ہوا ہے۔“ سردست وہ کچھ زیادہ خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خوف سے زیادہ اس پر حیرت غالب تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا تاہم ممکن حد تک تصدیق کر لیتا ہوتا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلا ہوا دروازے تک پہنچا۔ غلام احمد کو بدستور دیو اللور کی زد پر رکھتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا اسے تنبیہ کی اپنی جگہ سے ہٹا مت۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ دوسری طرف بیڑوم تھا۔ اس کا دوسرا دروازہ کھلا ہوا تھا اور آگے صحن نظر آ رہا تھا۔ گھر خالی ہی معلوم ہوا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غلام احمد کو جو بدایت کی تھی وہ اس پر عمل کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میرے منہ پھیرنے ہی اس نے قسمت آزمائی کی ضمان لی۔ ایک دیوار پر چھوٹے چھوٹے دستوں والی دو دکھاڑیاں آرائشی انداز میں کیلوں پر لگی ہوئی تھیں۔ غلام احمد یک لخت ٹوٹ جانے والے اسپرنگ کی طرح اچھل کر ان کی طرف لپکا کر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

گو کہ میں دوسرے کمرے میں جھانک رہا تھا مگر میں نے اسے اچھلتے دیکھ لیا تھا۔ میں ایڑی کی بل گھوما کر بے واسطہ میں پہنچا اور اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ کھڑکی تک پہنچ پاتا، میں نے اس کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ اٹکائی سی لے کر وہ ہوا گیا پھر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ میری دوسری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور منہ خون میں تھڑ گیا۔ شاید ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر تقریباً پہلے ہی والی پوزیشن میں بیٹھ چکا تھا۔ اب بھی وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ فترت سے مجھے گھور رہا تھا۔ تکلیف کی وجہ سے اس کے چہرے پر کھنچاؤ آچکا تھا۔

”نی اللہ میں سے تم سے زری برتی ہے۔ وہ بارہ حرکت کر کے تو زیادہ نصیحتیں اٹھاؤ گے۔“ میں نے ملاحت سے کہا اور صوفے پر بیٹھ کر دیو اللور والا ہاتھ گھٹنے پر ٹکا لیا۔ دیو اللور کا رخ

میں کسی کو بھی صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ سب لہجہ میں سے مجھے کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، میرے نام تک بے خبر تھے۔ میں اس وقت تک ان کی دہترس سے ڈرا ہوا تھا کہ جب تک میں خود ان کے سامنے آنے کا فیصلہ کر لیتا اور ظاہر ہے ایسا فیصلہ میں اسی وقت کر سکتا تھا جب بے آپ کو اس قاتل محسوس کرتا۔

کار میں بیٹھ کر میں کچھ دیر بعد جس گلی میں پہنچا یہاں فز کے نچلے حصوں میں دوکانیں تھیں مگر وہ اس وقت بند تھیں۔ میں نے گاڑی کچھ آگے وہ مکانوں کے درمیان ایک ریلے سے خالی پلاٹ پر روکی اور پیدل واپس آیا۔

ایک تنگ سی بنگلی گلی میں داخل ہو کر میں نے وہ دروازہ لاش کیا جس کے قریب ہی بیڑھیاں اوپر جانی دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر پہنچ کر میں نے ایک تنگ سی راہداری کے نام پر موجود دروازے پر دستک دی۔

دوسری مرتبہ دستک دینے پر ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ اظہار اور جہان میں تھا۔ ایک ہاتھ سے وہ دروازہ تھامے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے آنکھیں ملیں، پاؤں رابند کھینچا اور سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ وہ یقیناً نیند سے اٹھ کر آیا تھا لیکن ایک اجنبی کو سامنے پا کر فوراً بے کنا ہو گیا۔ ”اے اس کی عمر میں کے قریب ہوگی۔ چھوٹے قد اور گھٹے دے جسم کا مالک تھا۔“

مجھے یاد آیا، میں نے اس شخص کو دو تین مرتبہ رینو ریلز میں دیکھا تھا لیکن اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے اور کس کے لیے کام کرتا ہے۔

دراستہ روکے کھڑا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ سیدھی طرح مجھے اندر نہیں آنے دے گا چنانچہ میں نے جیکٹ کی جیب میں پھنسا ہوا ہاتھ نکال لیا۔ میرا پسندیدہ جرمن لیوگر میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ دوسرا ہاتھ میں اس کے سینے پر جاتے ہوئے اسے دھکا دیا۔ وہ ٹوٹ کر اتار ہوا اور کمرے کے وسط میں پھنچا اور یک پائی سے الجھ کر گر پڑا۔

میں اس دوران کمرے میں داخل ہو کر مڑ کر دیکھے بغیر کھلی چڑھا چکا تھا۔ مختصر سا پتھر سا ڈرا تنگ روم معلوم ہوا تھا۔ سامنے کسی اور کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ غلام احمد شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔ تیار رہا ہے یا کس کے ساتھ۔

”مگر میں اس وقت اور کون ہے؟“ میں نے اس کے سینے کا نکتہ لپیٹے ہوئے پوچھا ”کون کون تمہارے ساتھ رہتا ہے؟“ براہِ روبرو میرا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ وہ اس لہجے کی میں

ہیں۔ ہم جیسوں کو تو صرف اکالمت ملتے ہیں۔ میں اب اسکو بھیسو کے قریبی ساتھیوں میں شمار نہیں ہوتا۔ بلکہ قریبی ساتھی اب کوئی رہا نہیں۔ وہ دونوں ہی بس ایک دوسرے کے قریبی ساتھی ہیں۔ ہم نے اس تبدیلی کو اس لیے زیادہ محسوس نہیں کیا کہ ہمارے کمیشن بڑھ گئے ہیں۔ وہ اسلئے ہاتھ سے خون پونچھنے لگا۔ اس نوجوان کا نام کیا ہے؟ "میں نے محض معلومات کی خاطر پوچھا۔

"علی مراد۔" غلام احمد نے جواب دیا۔
"تم نے کبھی اسے دیکھا ہے؟ کس قسم کی چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جھڑے جسم کا لسانو جوان ہے۔ مٹھی داڑھی ہے۔ بل ٹھکرایا ہے۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی ہیں۔ سناہے جدید اسلحہ کے استعمال میں اس کا جواب نہیں۔ بہت جلد ٹھٹھے میں آجاتا ہے۔ اسکو بھیسو سے بھی کچھ بڑھ کر سفاک اور بے رحم ہے۔ میں نے صرف دو مرتبہ اسے دیکھا ہے اور۔۔۔ بے پناہ خوف محسوس کیا ہے۔"
"اور یہ اسکو بھیسو کس قسم کا جانور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بن مانس قسم کی چیز ہے۔ سیاہ خام۔ پست قد اور سانڈ کی طرح مضبوط۔ اس کی آواز بھی بھیسی سی ہے۔ اس کے دم سے اس کے رک رکھنا اور پسٹلے کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آتا۔ وہ سوٹ وغیرہ پستیا ہے۔ سگار پیتا ہے۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی بول لیتا ہے۔" غلام احمد نے بتایا۔

"ہوں۔۔۔ تو ہمیں واقعی اس کا ٹھکانا معلوم نہیں؟" میں اٹھ کر اس طرح کمرے میں بیٹھنے لگا کہ اس کے اور میرے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ رہے۔ وہ اب کو کہ بھاری کی تصویر بن بیٹھا تھا لیکن میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ اب مجھ پر حملہ نہیں کرے گا۔ البتہ اتنا مجھے یقین تھا کہ مزید مار پیٹ سے بچنے کے لیے وہ میرے سوالوں کے جواب میں جی بول رہا تھا۔

"نہیں۔ مجھے واقعی اس کے ٹھکانے کا علم نہیں۔" وہ تیزی سے بولا "میں نے کہا تا کہ علی مراد کے آنے کے بعد اسکو کے طور طریقے ہی بدل گئے ہیں۔ اب اسے جب بھی ہلکا ضرورت ہوتی ہے وہ خود ہم سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ یہاں معلومات کے مطابق میرے علاوہ صرف چار آدمی اور اس کے لیے کام کر رہے ہیں اور ان کی حیثیت کارندوں ہی کی سی ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اسکو ہر طرح سے ہمارا خیال رکھنا۔ مصیبت کے وقت ہم سے تعلق نہیں ہوتا۔" وہ مزید

اب بھی اس کے بیٹھے ہی کی طرف تھا۔ اسے لات رسید کرنے کے دوران میرے تاریک پیشوں کی جھلک ہانک پر کچھ نیچے تک پھیل آئی تھی۔ میں نے اسے صحیح جگہ بنانے کے بجائے اتار کر گود میں رکھ لیا۔

غلام احمد نے آنکھیں سیڑ کر مجھے گھورا اور یکدم ہی اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اتر آئے "تم... تم اشرف خان کے ساتھی تو نہیں؟" اس نے پھکاتے ہوئے پوچھا۔ ہونٹ پھٹے ہوئے کے باعث اس کی آواز بدلی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ خون کے کچھ چھینٹے بھی ہوا میں اڑے۔

"بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔" میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ اب تم میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے زیادہ ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرو گے۔"
وہ خاموش رہا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

"اسکو بھیسو کھل مل سکا ہے؟" میں نے پوچھا۔ وہ بدستور خاموش رہا تو میں صوفے سے اٹھنے لگا۔ وہ خوف زدہ انداز میں دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "تم جو قسم کو میں کھانے کے لیے تیار ہوں... میں واقعی نہیں جانتا کہ وہ کھل رہا ہے۔ تاہم اتنا مجھے معلوم ہے کہ آج وہ شرمس نہیں ہے۔ ایک آدھ دن میں آجائے گا۔"

میں نے دوبارہ صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا "تم مجھے لوٹھانے کی کوشش کر رہے ہو؟ شاید تم بھول رہے ہو کہ میں بھی لائن ہی کا آدمی ہوں۔ ہم جن کے لیے کام کرتے ہیں کیا ہم ان کے ٹھکانوں سے واقف نہیں ہوتے؟ اسکو بھیسو کوئی قسمی اسلحہ تو نہیں ہے کہ اس کے قریبی ساتھی بھی اس کی شخصیت سے براہ رفت ہوں۔ وہ کسی نامعلوم شخص سے خائے میں بیٹھا ہو، صرف ٹیلی فون پر اکالمت جاری کیے جاتے ہوں اور کوڈ ورڈز میں گفتگو کی جاتی ہو۔"

"بھرا... تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے۔" غلام احمد لرزتی سی آواز میں بول اٹھا۔ "اسکو بھیسو کا نام سن کر ذہن میں کسی جاہل اور ان بڑھ سے آدمی کا تصور آتا ہے۔ وہ ہے بھی ایسا ہی۔ لیکن اس کا طریق کار ایسا نہیں ہے۔ کم از کم اب ایسا نہیں رہا۔ اس کا ذہن بہت تیز ہے۔ اور اب تو ایک اور شخص بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ وہ بیس لاکھوں ایم ایس سی پاس نوجوان ہے۔ کچھ عرصہ امریکا میں بھی رہا ہے۔ سنا ہے وہ وہی زیادہ ز جیلوں میں ہی رہا ہے۔ جب سے وہ اسکو بھیسو کے ساتھ شامل ہوا ہے، اس کے طور طریقے ہی بدل گئے ہیں۔ اب صرف وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بات سے واقف ہوتے

تجے کیسے رک گیا۔

”شٹا۔“ میں نے رک کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جب تمہارا یہ بگڑا ہوا چہرہ دیکھے گا تو بہت تھلائے گا اور تجھے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا؟“

”عین ممکن ہے۔“ غلام احمد نے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ۔“ میں نے گویا اس بات کو غیر اہم سمجھ کر قسم کرتے ہوئے کہا۔ اگر تھیں اچانک اسٹو بیھو سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو تم کیا کرتے ہو؟“

”کچھ عجیب سا سلسلہ ہے... شاید تم یقین نہ کرو۔“ وہ ہلکے بولے بولا ایک فون نمبر ہے جو اس نے ہمیں دے رکھا ہے۔ میں نے جب بھی اس پر فون کیا تو کھوری سی ایک نوائی آواز سنائی دی ہے۔ فون اسٹو نے بھی ریسو نہیں کیا لیکن میں نے اس نمبر پر جو بھی پیغام دیا ہے وہ چند منٹ کے اندر اور اسٹو کو مل گیا ہے۔ میں نے تجسس سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ پانچ چلانے کی کوشش کی تھی کہ یہ نمبر کس کا ہے۔ ڈائری میں یہ نمبر موجود نہیں ہے۔ ہر حال میرے خیال میں اس کا سرانگہا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہ کوئی زیادہ بڑا شر نہیں ہے۔ آئیٹیک ایجنسی بھی کچھ ہی عرصہ پہلے یہاں لگا ہے۔ میں نے ایجنسی میں ایک وائٹ کار تلاش کیا۔ اس سے کام نہیں چلا تو ایک نور اچھے خالص عہدے دار کو اچھی رقم کی بھی پیشکش کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ معلومات کر کے دو ایک دن میں جواب دے گا۔ دو سب سے دن اسٹو بیھو میرے پاس آیا اور ڈکڑ مری سے لہجے میں بولا۔ میں نے نہیں جو نمبر دے رکھا ہے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تم کئی دن سے مارے مارے پھر رہے ہو۔ ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے جس سے؟ بڑی مشکل سے میں نے اسے یقین دلایا کہ میں شخص تجسس سے مجبور ہو کر ایسا کر رہا تھا تو وہ بولا ”مجھے تجسس پسند لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے۔ میرے نزدیک ان کا محض مقام گندہ ٹلا ہے جس کی تہ میں لیٹ کر وہ اطمینان سے نارت تک غور و فکر کر سکتے ہیں۔ تجسس پسندوں کو ہمارے دعوے میں نہیں کسی لیبارٹری وغیرہ میں سرخ آئینر ہونا چاہئے“ مجھے اس کی یہ باتیں تھقہ بہ تھقہ یاد ہیں۔ ہر حال میری ضرورت پر اس کا دل صاف ہو گیا تھا اور وہ پہلے ہی کی طرح زور اور محبت سے پیش آنے لگا تھا۔“

”وہ نمبر بتاؤ۔“ میں نے کہا۔ اس نے نمبر بتایا جسے میں نے ذہن نشین کر لیا۔

”اشرف خان کے معلق مخبری اسٹو بیھو نے ہی کی تھی

؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ ہلکے پھلکے تو میں ہونٹ سمجھ کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ جلدی سے بولا ”ہاں... مجھے پتا چلا تھا۔ اسٹو نے اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔ رزبیہ بھی خرچ کیا تھا اور کسی اثر و رسوخ والے آدمی کی مدد بھی حاصل کی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ تم دونوں سرکاری آدمیوں سے مقابلے میں مارے جاؤ۔“

میں اب غلام احمد کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ سسی سسی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید کچھ بھی نہ پایا ہو کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ میرا ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آیا تھا کہ میں خود بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ریو الوور کلاسٹ غلام احمد کی کپٹنی پر پڑا تھا اور وہ دوسری طرف کو لڑھک گیا تھا۔ میں چند لمحوں میں گھڑا۔ وہ بے حس و حرکت ہی رہا۔

میں اس کے بیڈ روم میں آیا اور اپنی ضرورت کی چند چیزیں تلاش کرنے لگا جو بقیہ آٹھ مل گئیں۔ ایک مضبوط ریٹھی لٹرائیڈ، ایک قلم بور ایک رائٹنگ پیڈ۔

از اور ہڈ کا پھندا میں نے غلام احمد کے گلے میں ڈال کر اسے ایک تخت کس دیا اور گرہ لگادی۔ اس کی سانس رکی تو بیوشی ختم ہو گئی اور وہ بری طرح پھٹنے لگا لیکن پھندا اپنے گلے سے نہ ہٹا سکا۔ اس کی گردن اور چہرے کی نسیں یوں پھول گئیں گویا ابھی پھٹ پڑیں گی۔ آنکھیں پٹی آئیں۔ ہاتھ خروہ ساکت ہو گیا اور دھشت ان آنکھوں میں نمود ہو کر رہ گئی۔

”سواری ڈیڑ غلام احمد...“ میں نے زیر لب کہا۔ ”تمہارا تصور صرف اتنی ہی تھا کہ تم اسٹو بیھو کے لیے کام کرتے تھے۔ میں اگر تمہارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا تب بھی ایک ایک روز تم کسی نہ کسی کے ہاتھ سے مر سکتے ہی۔“

اس کے بعد ایک کمری میں نے تباہی کے قریب کھینچی اور بیڈ کو نہایت توجہ اور اطمینان سے لگتے لگا۔

اسٹو بیھو اپنے ایک ٹائیڈ شاگرد کی طرف سے یہ حیرت خیز قبول فرمائیے۔ اشرف خان مرچکا ہے۔ اس خبر سے آپ کو بے حد خوشی ہوئی ہے؟ میں نے سوچا اس موقع پر چھٹی سوئی خوشی بھی ہمیں سنالیں۔ اس طرح حساب بھی برابر ہو جائے گا۔ ایک لاش کے بدلے ایک لاش۔ گو کہ مجھے معلوم ہے کہ غلام احمد کی آپ کے لیے وہ حیثیت نہیں تھی جو اشرف خان کی میرے لیے تھی۔ ہر حال جلدی میں یہی ہندوست ہو سکا ہے کیونکہ میں اس وقت ملک سے باہر جا رہا ہوں لیکن یہ مت سمجھئے گا کہ پیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ جس قدر جلد ممکن ہو سکا

”کس تھے میری جان؟“ مصافحے اور مصافحے سے فارغ ہو کر اور ایک ہی سانس میں کئی رسی جملے بولنے کے بعد اس نے گوی پر بیٹھے ہوئے کماٹ تھمارے تو وہ خط بھی آئے پاس ہیں۔“

میں بھی جاننے کے لیے نوٹس کے پاس رکھا تھا۔ خط راشن کے سوا کسی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ خط و کتابت کے لیے میں نے اسی کو نوٹس کا ایڈریس دیا تھا اور نوٹس پر نظر پڑنے ہی مجھے یہ بات یاد آگئی تھی ورنہ میں اب تک راشن کو بھولا ہوا تھا۔ نوٹس نے دو خوبصورت لٹائے نکال کر مجھے تھمائیے جن پر کئی جگہ اس کے کتبھی ٹنگر پڑیں، نہایت عمدگی سے ثبت ہو چکے تھے۔ میں نے نوٹس کا شریہ ادا کیا اور ہندہ مومنیت سے ہی مغلوب ہو کر نہ صرف ایک صحت مند قسم کا بیٹھا پان ہو کر کھا لیا بلکہ سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خرید لیا۔ کلنی عرصے بعد آج دھوئیں کے غرارے کرنے کوئی چلا رہا تھا۔

نوٹس کو میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا قطعاً علم نہیں تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے میری اور اشرف خان کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔ وہ وقت یاد کر کے میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی جب میں اور اشرف خان اسیٹھے اس دکان پر آیا کرتے تھے۔

میں نے گپ شپ کے انداز میں نوٹس کو بتایا کہ اشرف خان ملک سے باہر چلا گیا ہے اور اب میں بھی جا رہا ہوں، فی الحال یہ سب نہیں ہوا کہ مستقبل قیام کہاں ہو گا۔

”خیر جب بھی کہیں منتقل ہو جاؤ، خط ضرور لکھنا افضل جانی۔“ اس نے قدرے متوجہانہ انداز میں تاکید کی۔ شاید اس نے دل ہی دل میں ان چیزوں کی غمراہی بھی چھٹی شروع کر دی تھی جو وہ مجھ سے منگوانا چاہتا تھا۔

میں نے دونوں خطوط جیب میں ٹھونسنے اور اسے خدا حافظ کہہ کر آگے چل دیا۔ ٹھیک اور ٹوٹی میں نے دوبارہ ہنسی۔ بازار میں چل پل شروع ہو چکی تھی۔ بیشتر دکانیں کھل چکی تھیں۔

نئی گراف آفس پہنچ کر میں نے ایک پبلک بوتھ میں کھڑے ہو کر وہ نمبر ڈال لیا جو غلام احمد نے مجھے بتایا تھا۔ دوسری ٹھنکی پر ہی ریسپورڈ لیا گیا۔ ”جی فرما ہے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ آواز نسوئی لیکن کھدري تھی۔ غلام احمد نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔

”استلا بھو جیسے ہی واپس آئے اسے ایک پیغام دے دنا۔“ میں نے آواز بدلے اور لہجہ خفیہ لاسکین پاٹ رکھنے کی

”میں واپس آؤں گا اور آپ کو کسی ایسی ہستی کی لاش کا تختہ پیش کروں گا جو آپ کو بہت ہی پیاری ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ دل چھڑا مت کیجئے گا۔“

میں سمجھتا تھا کہ ہماری لائن میں کلنی غر اور مریدان قسم کے مجرم پائے جاتے ہیں۔ سینہ تان کر آنے سانسے کھڑے ہونے والے۔ اپنے جھگڑے خود ٹھنڈے والے۔ لیکن جس انداز سے تم نے تجھری کر کے اور دوسرے پکر چلا کے اشرف خان اور اس کا ساتھ دینے والوں کو کچلنے کی کوشش کی اس سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہماری لائن میں تم جیسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا شمار مردوں میں کیا جاسکتا ہے نہ عورتوں میں۔ اگر تم میں غیرت کی کوئی رشت باقی ہوگی تو یہ رشتہ لے کر دوڑے ہوئے پولیس کے پاس نہیں جاؤ گے اور اگر تمہارے رگ پٹھوں میں ذرا بھی جان ہوگی تو اپنی جنگ خود ہی لڑنے کی کوشش کرو گے۔ بہرحال تم خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کرو، میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا کروں گا۔ خطر رہتا۔ اور بعد میں شکوہ نہ کرنا کہ خبردار نہیں کیا تھا۔ امید ہے تم سمجھ چکے ہو گے کہ میں کون ہوں۔ خدا حافظ۔“

خط لکھ کر میں نے تنقیدی زاویہ نظر سے اسے پڑھا۔ ٹھیک ہی لکھا گیا تھا۔ میرے منسوب کا اب اگر استلا بھو پر وہی اثر ہوتا جو میں چاہتا تھا تب بات سہی۔

وہ ورق میں نے رائٹنگ پیڈ سے ٹیپڈ کر کے غلام احمد کے گریبان میں پھنسا اور کمرے سے نکل آیا۔ دروازہ میں نے نہایت اطمینان سے بند کرنے کے بعد بیچے آکر گلی میں نکلے سے پہلے اطمینان کر لیا کہ کوئی باہر موجود تو نہیں۔

گازی میں بیٹھ کر میں اس گلی سے نکلا تو میرا ارادہ ٹپکی کر اف آفس جانے کا تھا جہاں پبلک ٹیلی فون بوتھ بھی موجود تھے۔ میں شہر کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ میری نظر نوٹس پڑاڑی پر پڑی۔ وہ اپنی پان سگریٹ کی دکان کھول کر اسے بجھاڑنے پوچھنے کے بعد بیٹھے کی تیاری کر رہا تھا۔

میں نے گازی اس کی دکان سے کلنی آگے لے جا کر ایک جگہ روک دی جہاں اس کی نظر نہ پڑ سکے۔ پھر میں پیدل واپس آیا اور تاریک شیشوں کی ٹھیک آواز نے اسے بعد میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سگریٹوں کا ایک ریک درست کرتے کرتے وہ چریک کر مڑا اور مجھے دیکھ کر اس نے یوں ہانپیں پھیلانیں جیسے کوئی چھڑا ہوا دوست مل گیا ہو۔ وہ تمام لوگ جو اس سے بھی کوئی چیز ادھار نہیں لیتے تھے ان سے وہ اسی طرح ملتا تھا۔

ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔" اس نے سلسلہ متعلق کر دیا۔ بستر پر گرتے وقت میں نے اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے دیگر مسائل حل ہونے کے ساتھ ساتھ شرف جیسے آدمی سے بھی میری ملاقات ہوگئی تھی اور وہ میری کسی خاص کوشش کے بغیر میرا دست بھی بن گیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے ساتھ رہ کر زندگی کئی دلچسپ اور رنگین محسوس ہونے لگتی ہے۔

فون کی گھنٹی نے مجھے مگرمی خیز سے جھکایا۔ دوسری طرف شرفو تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو سکتا ہوں یا نہیں۔ ویسے تو میرا اس وقت بستر سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا اسے یاد کر کے میں فوراً چاق و تیز ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم آؤ گے گھنٹے بعد آ جاؤ۔ میں تیار ہوں گا۔" میں نے کہا۔

آؤ گے گھنٹے بعد وہ پہنچ گیا اور ہم اس کی کار میں بیٹھ کر سڑک روڑ پر ایک وکیل کے دفتر میں پہنچے جہاں شرفو کے ڈاکٹراٹ تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہے۔ اس دوران معمولی سی گرما گرمی بھی ہوئی۔ کچھ قائلین بھی اٹھا اٹھا کر کبھی جٹی گئیں اور کبھی کھول کر دیکھی گئیں۔ معاملہ میری سمجھ میں آرہا تھا اور اس قابل تھا کہ اس میں دلچسپی لی جاسکے اور چند عجیب و غریب قانونی مشغلوں کو سمجھا جاسکے لیکن اس وقت میں اس قسم کی چیزوں میں دلچسپی لینے کے لیے تیار نہیں تھا تاہم کسی نہ کسی طرح اپنی باتوں کو روکے ہوئے تھا۔

خدا خدا کر کے یہ بحث تمام ہوئی۔ شرفو نے فونوں کی ایک گزری وکیل صاحب کے حوالے کی اور ہم آرام سے دبیرانہ ایئر کنڈیشنڈ دفتر سے باہر آ گئے۔

"یار...." میں نے میز پر حیاں اترتے وقت حمیدین آہستہ آہستہ میں کہا کہ تم تو ہر معاملے میں بہت ہی مجھے ہوئے آدمی لگتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ دہشت سے آیا ہوا کوئی شخص نوسال میں ایسی شاطر چہر بن سکتا ہے۔"

وقت کا صحیح استعمال کیا جائے تو نوسال بہت طویل مدت ہوتی ہے۔ "وہ مگرمی سانس لے کر بولا۔" اور بہت کم لوگوں کو یہ انداز ہوتا ہے کہ ہم دہشتی زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ ہم تن آسان نہیں ہوتے اور جہد کار بھی کرتے ہیں برے کی طرح سوراخ کر کے گھستے پلے جاتے ہیں۔ سخت جان ہوتے ہیں۔ اپنی جگہ خود بتا لیتے ہیں۔ اگر تم بھی سوراخ لگانے کی کوشش کرو تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ اچھا لی اور برائی، جائز اور

نہیں کرتے ہوئے کہا۔

"کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف سے فوراً مخاطبہ لے کر چاکیا۔ وہ جو کوئی بھی تھی یقیناً چوہک اٹھی تھی "استاد بھوکو جب تم میرا پیغام دو گے تو وہ خود ہی سمجھ جائے گا کہ کون بول رہا تھا۔" میں نے سرد مہری سے کہا کہ اس سے کہا تو غلام احمد کے مکان میں اس کے لیے ایک تحفہ موجود ہے۔ اس قدر جلد ممکن ہو اسے وصول کر لے۔ اس سے پہلے کہ آپ اس تک پہنچے۔ استاد بھوکو کم از کم ایک نظر اسے دیکھ لے تو بہتر ہو گا۔ خدا حافظ۔" میں نے فون بند کر دیا۔

مجھے جہاں بھی رکنا ہوتا تھا گاڑی اٹھاٹا اس جگہ سے کٹنی در کٹنی کرتا تھا۔ پیدل میں گاڑی تک پہنچا اور مزید ایک لمحہ ان ضائع کئے بغیر پائی دے کی طرف چل دیا۔

میں لاہور واپس پہنچا تو دن کے دو بج رہے تھے۔ مجھے اپنے بازے سے زیادہ دیر ہوگئی تھی اور میں خاصا تھک چکا تھا۔ مگر پہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ریسپور اٹھایا تو دوسری طرف سے شرفو کی آواز سنائی دی۔

"شکر ہے خدا کا...." وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "کہاں تھے مائی تم؟ میں تو سمجھا تھا کہ شاید تمہارا ارادہ بدل گیا اور تم واپس پلے گئے یا کسی اور طرف کو نکل گئے۔"

"ابنا اب تک کار کیا روٹو کی ہے بر اور محترم شرفو صاحب!!" میں نے مضطرب سانس لے کر کہا کہ جس مقام کو خیر یاد کرے اس کی طرف لوٹ کر نہیں گئے۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آیا تھا۔ فرار ہوتے وقت میں اور اشرف خان ایک جگہ کچھ سرائے چھوڑ آئے تھے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے انہیں بھی مٹا آؤں۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا تم نے۔" اس نے طمانیت سے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "شام کا کیا پروگرام ہے؟" مجھے ایک صاحب سے ملنے جانا ہے جن سے شاید مستقبل میں بھی تمہیں اکثر واسطہ پڑے۔ میں نے سوچا ہے، تمہیں بھی ساتھ لیتا ہوں۔ واپسی پر کچھ دیر کے لیے ایک جگہ رکیں گے۔ وہ ایک آسیب زدہ سی کوٹھی ہے مگر وہاں چند بہت ہی نیکون قسم کی بد رو میں رہتی ہیں۔ ہم جیسے مسافروں کی بہت قدر کرتی ہیں بے چاری۔ اگر تم مناسب سمجھو تو انہیں شرف بڑائی بخش دیا جائے۔"

"نی اٹل تو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ریسپور مجھے اتنا بھاری معلوم ہو رہا ہے جیسے دروزش کے لیے زمیں اٹھایا ہوا ہے۔ میں سوئے لگا ہوں۔ تم روانہ ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے مجھے فون کر لیتا۔ اگر میں ہوش و حواس میں ہوتا تو تیار

”طبیعت تو اپنی ٹھیک ہی رہتی ہے۔“ شرفو انگوڑی لڑ
ہوئے بولا ”مگر تمہیں معلوم ہے اپنی طاقت کا۔“ انکے تو سیر
تفریح پر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا اور کئی دنوں سے کئی
مستقل کمپنی میسر ہی نہیں تھی۔ بس اس زندہ دل نوجوان سے
دوستی استوار ہوئی ہے تو شاید کبھی کبھار تمہارے درویش
حاضری دیتے رہیں۔“

”ذہبہ نصیب۔ ذہبہ نصیب۔“ میڈم نے پلو بولے
ہوئے قدرے بے رحمانی سے کہا ”وہی آج آئے ہو تو کچھ
زیادہ ہی جلدی آگئے ہو۔ لڑکیاں ابھی تیار ہو رہی ہیں۔ یک
اپ کر رہی ہیں۔“

”ہمیں گھر جانے کی ایسی کوئی جلدی نہیں۔“ شرفو بولا ”تم
اگر مصروف ہو تو مصروف ہی رہو۔ ہمارے لیے چنے کو کچھ
بجھاؤ۔“

”میں ابھی بھجواتی ہوں۔“ میڈم اٹھتے ہوئے مومنیت
آمیرو انداز میں مسکرائی۔ وہ یقیناً اس وقت کسی پھر میں الجھی
ہوئی تھی۔ مڑتا ہمارے پاس بیٹھی تھی۔ وہ چلی گئی اور کچھ
بعد ایک اور نوکر جو اپنی حرکات و سکنات سے گونا گونا معلوم
ہو تا تھا، چنے پلانے کا سامان رکھ گیا۔

ہم کچھ ترک میں آئے تو میں نے شرفو سے کہا تم اپنا بل
ایسا کیوں رکھتے ہو؟ قاسم خان کے کینگ میں تم جتنی اہمیت
کے حامل ہو... اور پھر مگر کس دور میں ہو... اس میں یہ چیز
جیکٹ۔ یہ گلے میں بندھا ہو اور دل اور ہاتھ میں کڑاؤ وغیرہ
چٹا نہیں۔ تمہیں معززانہ طے میں رہنا چاہیے۔ تم ایک مختصر
لیکن طاقتور تنظیم کے انگریز ہو۔“

وہ ہنسنے لگا اور کئی دیر تک ہنساتا رہا۔ پھر سنجیدہ ہونے
ہوئے بولا ”اس قسم کی چیزیں مجھے اب احساس کسری میں جلا
نہیں کرتیں۔ میری ذات سے اس طرح کے نقیانی
الجھلوے تو ختم ہو گئے ہیں۔ میں اپنا طیلہ جان بوجھ کر اپنا
رکھتا ہوں۔ میں خود چاہتا ہوں کہ میری شخصیت کا تاثر کچھ اپنا
ہی بنے کہ میں وہ گاؤں ہوں جسے کئی عرصے میں چار پچھ
آئے ہیں تو فیشن ایبل شری نوجوان بننے کے شوق میں جلا
ہو گیا ہوں۔ اس طرح میرے بارے میں لوگ غلط فہمی
شکار رہتے ہیں۔ انہیں سمجھی پتا چلتا ہے جب میں ان کی گردن
ٹاپا ہوں۔“

”گناہات تو یہ ہے کہ بلی بار کچھ کر میں بھی تمہیں را
گاؤں ہی سمجھا تھا۔“ میں نے قدرے کھسائی ہنسی کے ساتھ
اعتراف کیا۔ ”شکر ہے اس تاثر کے تحت میں نے کوئی مصلحت
نہیں کی ورنہ شاید آج تم دوست نہ ہوئے۔“

ٹاپا جاز دو دنوں سطحوں پر جو لوگ بہت اوپر گئے ہیں وہ بنیادی طور
پر رسائی تھے۔“

پھر اس نے مجھے رسائی اور شری کی نقیبات اور دونوں کے
پس منظر کا فرق سمجھایا اور اپنے ہیکر کے اختتام پر کہا ”میں چاہتا
ہوں تم اس سے بھی کم وقت میں مجھ جاؤ۔ تمہارے اندر
تھکن مجھ سے بھی زیادہ ہے اور تمہیں مجھ سے کہیں کم عمری
میں مضبوط سارے بستر آگئے ہیں۔ تمہاری عمر میں میں سو
بڑا سو کی نوکری ڈھونڈتا پھر تا تھا۔ دفاتروں سے مجھے دھکے
دے کر نکالا جاتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کم سے کم وقت ضائع
کر دو اور میرے تجربات سے استفادہ کرو۔ مجھے تم ایک چھوٹے
بھائی کی طرح اچھے لگنے لگے ہو۔ گو کہ میں اپنے چھوٹے بھائی
کو کبھی اس لائن میں ڈالنا پسند نہیں کروں گا جس میں ہم بڑے
ہیں لیکن اب پڑی ہے۔ جس تو کم از کم تم تو زندگی سے اپنے
شلیان شان خراج وصول کرلو۔“

باز کے دوران ہم اسمن آباد پہنچ چکے تھے۔ شرفو نے ایک
چھوٹی سی کوشی کے سوچ میں گاڑی روکی۔ اس کوشی پر عاتق
کئی برس پہلے پیلا پیٹ کر لیا گیا تھا جو اب جگہ جگہ سے اکڑ رہا تھا
اور ٹیلا سا ہو چکا تھا۔ مگر اب بھی آنکھوں کو چبھتا تھا۔ کوشی
کسی کپڑاں گاہ کے بنائے پنی ڈیوڈی کا دفتر معلوم ہوتی تھی۔
شرفو نے کل نکل بجائی۔ ساتوے سے ایک لڑکے نے
دواہ اس حد تک کھولا کہ ہماری شخصیں دیکھ سکے۔ دروازے
میں ذخیرہ لگی ہوئی تھی۔

”ارے شرفو دادا ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ وہ یقیناً بنگال تھا اور
خانساہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے لباس پر لیپن بندھا ہوا تھا۔
اس نے دروازے کی ذخیرہ ہٹادی اور ہم اندر چلے گئے۔

یائیں ہاتھ پر ایک مستقل قسم کا دارانگ دم تھا۔ شرفو
جتنے نظریے سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا تقریباً لٹ ہی گیا
خانساہی اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

”میں میڈم کو جا کر بولتا ہوں۔“ تھوڑی دیر بعد قریہ اندام سی
ایک اوجڑ عورت مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔
خوشبو کا ایک جھوٹا سا اس کے ہتھم تھا۔ اس کا لباس ایک

اپ سب کچھ بڑے سلیٹے کا تھا اور وہ براہِ اعتبار سے ایک معزز
عورت معلوم ہوتی تھی لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مجھے انہی
خاص عورتوں والا محسوس ہوا جنہیں اب میں بھی کافی حد تک
پچانے لگا تھا۔

”کہیں تجھے شرفو دادا اتنے دنوں سے؟“ میڈم اپنے لیے
میں اپنا بیت سونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”نصیب
و دشمن طبیعت تو ٹھیک تھی؟“

مشورے پر عمل کرنا ہی بہتر سمجھا کہ اچھا وقت گزارو اور دفع ہو جاؤ۔

رات کے تقریباً بارہ بجے میں اور شرف وہاں سے دفع ہو گئے۔ ہم بڑی ترنگ میں تھے۔ مزگ چوچی پر کرائی گوشت کی ایک دکان پر ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد شرف نے مجھے گھر چھوڑا اور چلتے چلتے پوچھا ”صبح کا کیا پروگرام ہے؟ میں تو کل دن میں بہت مصروف رہوں گا۔“

”میں بھی اب مصروف ہو جانا چاہتا ہوں۔ چھوٹی موٹی تفریح تو ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔“ میں نے کہا ”قاسم خان مجھے جو شنگ دلوانا چاہتا ہے میرا خیال ہے وہ میں صبح ہی سے شروع کر دوں۔“

”جیسے تمہاری مرضی“ شرف نے کدھے اچکائے اور رخصت ہو گیا۔ دوسری صبح مجھے قاسم خان کو فون کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں سوکر اٹھا ہی تھا کہ شیطان سی شکل دلا ایک بوڑھا میرے ہاں آن پہنچا۔ وہ سفید شرٹ اور کینوس کے سفید ہی جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جادو گردن جیسی اس کی نیکی سی داڑھی بھی سفید تھی اور جانے کیوں مصنوعی مصنوعی نظر آ رہی تھی۔

”میرے بچے! میں وہ شخص ہوں جس نے بیسیوں پتھروں کو تراش کر ہیرا بنایا ہے۔“ اس نے ٹیگ سے میرے ساتھ چل کر کمرے میں پہنچ کر کہا ”تمہیں بھی ہیرا بنانے کی ذمہ داری قاسم خان نے مجھے سونپی ہے۔ چلو... میرے ساتھ چلو۔“ اس کی آواز کسی حد تک طوطے جیسی تھی۔

میرے ذہن سے ابھی نیند کا شمار صحیح طور پر نہیں اترتا تھا۔ میں نے آنکھیں ملنے ہوئے کہا ”مجھے ہیرا بنانے میں کوئی اعتراض نہیں چچا میاں! مگر ابھی تو میں نے غسل... ناشتا کچھ بھی نہیں کیا۔“

”ناشتے کی ضرورت نہیں! بڑے میاں نے فیملہ کن لیے میں کہا! بس اگر ٹھنڈا پانی دستیاب ہے تو اس سے نلو! تاکہ تمہارا ذہن پوری طرح بیدار ہو جائے۔ ناشتا تم میرے ساتھ کرنا۔ ایسا لا جواب ناشتا کراؤں گا کہ اس کے بعد روزانہ ناشتا کرنے میرے پاس دوڑے آؤ گے۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہو گا۔ میرا تربیت کا طریقہ بڑا سائنٹیفک قسم کا ہے۔ تمہیں اس طرح سنجیدگی سے کچھ دن میرے ساتھ گزارنے ہوں گے جیسے کوئی کلاس اینڈ کر رہے ہو۔ کچھ پریکٹس... بھی ہوں گے۔ تمہاری ذہانت اور ہبلوری کے امتحان بھی ہوں گے۔ بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوں

”شاید“ اس نے میم سے لیے میں کہا اور پھر قدرے تلخ ہوئے بولا ”اور ہاں میں قاسم خان کا نام لینے اور یہ بک وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بائیکیدار ہوں۔ مختلف فرموں کا بلڈنگ میٹریل اور لیبر پلائی کرتا ہوں۔“ کچھ؟“ وہ مجھے آنکھ مار کر مسکرایا ”اور خود بچہ بارے میں بھی غماز رہا کہ۔“ تھکنے میں بھی۔“

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد چار لپٹ کرے میں داخل ہو گئی۔ ان کے ساتھ خوشبوؤں کا بل رٹا بھی کمرے میں در آیا۔ میری نظر میں تو وہ چادر ہی جن تھیں۔ ان میں صرف ایک ہی کی تھی کی بنی ستوری نے کے باوجود ان کے چہروں پر زندگی کی چمک نہیں تھی۔ میں نے ان میں سے کم عمر ترین کو اپنی ساتھی کے طور پر فب کیا اور ایک دوسرے کمرے میں پہنچ کر تھکنے میرے آئے۔ بعد ایک سرٹل پر بڑی ترنگ میں پوچھا ”تم اس زندگی میں بے آگش؟“

”اف... خدا کی پناہ! اس نے بیزاری سے سر ہٹا دیا ”کیا تم دونوں کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی اور سوال نہیں ہو تا؟ وہ ماہ بیت گیا جب میں جگر تمام کرے اس سوال کے جواب میں پانی دکھ بھری کمانی سنایا کرتی تھی۔ تم مرد لوگ، میں اچھا وقت گزارنے آتے ہو۔ تمہیں چاہئے کہ اچھا وقت گزارو اور دفع دہاؤ۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہم جیسی لڑکیوں کا کمانی کیا ہوتی ہے یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود شاید تم اب صرف چسکے لینے کے لیے پوچھتے ہو۔ ورنہ اس تردد کی ظاہر ضرورت ہے۔ وہ جو کتھوں میں لکھا ہوتا ہے کہ ہر بڑے نئی کی کاسیانی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے یا یہ کہ اورت سی کسی شخص کو بڑا آدمی بناتی ہے۔ تو میرے خیال میں ل کی ہم دونوں ایک اور بات بھی کتھوں میں لکھی جانی چاہئے اور یہ کہ ہر عورت کی ذلتوں کے پیچھے ایک مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن اتنی سی کمانی ہے۔ اسے بار بار دہرانے سے کیا فائدہ؟

میں اگر اس وقت آئینہ دیکھتا تو شاید اپنی آنکھیں مجھے ہنس کی کینڈ کی طرح گول نظر آتیں۔ میں نے بجا طور پر بت سے کہا ”اس کم عمری میں اتنی جتنی؟“

”کوئی خانے میں گزارے ہوئے تین سال کسی شرفانہ لم پر گزارے ہوئے تین برس پر بھاری اور ان سے کیس لڑا کھن ہوتے ہیں۔“ وہ پہلے سے زیادہ تلخی سے بولی۔ اس کا سر ڈبکا کر اپنی شام خراب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سردست میں چونکہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا ”سوئے کھینکا ہونے کے۔“ چنانچہ میں نے اس کے

گی۔ اگر تم میرے مطلوبہ معیار کو پہنچ گئے تو تم قاسم خان کے خاص الخاص آدمی بن جاؤ گے۔“

میں تیار ہو کر اس کے ساتھ نکلا اور اس کے بعد تقریباً بیس دن کے دوران مجھے دو یا شاید تین مرتبہ یہ گھر آنے کا موقع ملا۔ میری شینگ کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی۔

اس دوران مجھے دو پڑوسی ملکوں کی سرحدوں پر وہ محفوظ مقامات بھی دکھائے گئے جن سے قاسم خان کاہل آتا اور جاتا تھا۔ آزادی کی طور پر ایک کھپ ہری گھرائی میں بھی منگوئی گئی۔ میں اور اشرف خان تو جان کی بازی لگا کر کام کرتے رہے تھے۔ ہماری کھپ بہت چھوٹی ہوتی تھی اور خطرات بہت زیادہ۔ اس کے مقابلے میں مجھے تو قاسم خان کا کام کم خطرناک لگا تھا حالانکہ اس میں مل کی نقل و حرکت بڑے پیمانے پر تھی۔

مجھے کام پہلے کی نسبت آسان لگ رہا تھا اور قاسم خان میری کارکردگی پر پھولا نہیں سارا تھا۔ وہ بزرگوار جنوں نے کچھ دن کے لیے میرے کوچ کے فرائض انجام دیئے تھے۔ انہیں صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں کہاں دھکے کھاتا رہا ہوں اور کیسے کیسے حالات میں اپنی ہتھیاری جنگ لاتا رہا ہوں اس لیے وہ میری تمام تر کارکردگی کا سراپا ہی نہ سمجھتے رہتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی تربیت کا نتیجہ تھا اور یہ کہ میں بے حد ہونہار شاگرد تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی شاگرد کو اتنی جلدی ٹرینڈ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

اس دوران میرا پیدوارٹ بھی بڑا دلایا گیا تھا۔ قاسم خان کا ارادہ تھا کہ سیدھے راستوں سے بھی مجھے دو تین پارٹوں کے ساتھ چند ممالک کے چکر لگوائے جائیں گے۔ ان اطراف میں صرف ایک طرف پھیرا ہوا تھا۔ کم حجم کی مشیات لے جاتی جاتی تھیں۔ قاسم خان کا خیال تھا کہ اگر میں نے اس سائز پر بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تو اس کا برا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن یہ نوبت آنے کی اسے کم ہی امید تھی۔ خفیہ سرحدی راستوں سے ہی مل لانے لے جانے کا کام اتنا زیادہ تھا کہ کسی اور طرف توجہ دینے میرے لیے مشکل تھا۔

قاسم خان کے پاس قتل اعتبار آدمیوں کی کمی تھی اس کے باوجود وہ مجھ پر زیادہ بوجھ بھی نہیں ڈالتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کام کے دوران مجھے مستقل وقفوں کے لیے عیش و آرام بھی میسر رہتا ہے۔ ورنہ میرے اعصابی طور پر کمزور پڑنے کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

قاسم خان کا کمپورٹ ایکسپورٹ کا چھوٹا سا جائز کار بار بھی تھا۔ وہ اپنے اسی دفتر میں بیٹھا تھا جہاں سے یہ برٹس ریل کیا جاتا تھا۔ وہ کمپلوں کا سالانہ باہر بھیجتا تھا اور اس کا دفتر نہایت

شاندار تھا۔ وال ٹو وال کلرٹ، چٹکا ہوا فرنیچر، ایئر کنڈیشنر، کمرے، نہایت چلبلی قسم کی سیکریٹری وغیرہ۔ غرض یہ کہ ایک مستقل دفتر کے تمام ہی لوازمات موجود تھے گو کہ مجھے تقریباً نہیں تھا کہ اس دفتر سے اتنا بڑا ہوتا تھا جتنی اس کی شان شوکت تھی۔

اس دفتر کے ایک کمرے میں اپنی کرسی کے عقب میں ایک دیوار گیر شیشی میں ایک آدھ ریکٹ، ایک گیند اور کمپلوں کی دو تین اور تھریں سبائے قاسم خان بیٹھا ہوا تھا۔ میرے صرف ایک مرتبہ اس سے ملنے اس دفتر میں جا پہنچا تھا اور وہ بھی بلا اطلاع۔ تبھی اس نے نہایت ملاحظت سے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اپنے کالے دھندے سے متعلق کسی بھی شخص سے اس دفتر میں قطعاً ملاقات نہیں کرتا حتیٰ کہ ان لوگوں میں سے کسی کو اس دفتر کے نمبر پر فون کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی ایمر جنسی ہوتی تھی تو فون پر اس سے صرف اتنا کہا جاتا تھا کہ وہ دو نمبر پہنچ جائے اور وہ ملازمتوں والی کو بھی براہ راست کالے دھندے سے متعلق تمام معاملات طے کرنے، وقت رات نو بجے کے بعد شروع ہوتا تھا اور اس سلسلے میں ملاقاتیں اس کے گھر پر اسٹڈی میں ہوتی تھیں اور ان تمام ملاقاتوں کے دوران اس کی بیوی موجود رہتی تھی۔ مطلوبہ نہیں وہ خاموش طبع اور گھریلو قسم کی خاتون اتنی تکلیف کیلئے اٹھاتی تھی یا شاید قاسم خان کو ہی اسے ساتھ بٹھائے رکھنے، شوق تھا۔ ہر قسم کی مشکوک یا کارروائی کے دوران وہ خاموش اور لا تعلق ہی بیٹھی رہتی تھی۔

تقریباً بیس دن کے تربیتی کورس کے بعد مجھے چند دن آرام کرنے کا موقع ملا۔ شرفی کی ہر ای میں دو تین شاخیں حسین انداز میں بھی مگزریں۔ گھر میں نوکر لایا تھا اس لیے اب گھر میں بھی کچھ دل نگلے لگا تھا۔

ایک رات میں یہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا کہ میری نظروں میں پڑے ہوئے دو خطوط پڑی۔ یہ راشد کے خطوط تھے جنہیں میں نے کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انہیں کھول کر پڑھا تو اپنے آپ پر بڑی شرم آئی کہ اس پیارے بھائی کے خطوط سے اتنے طویل طویل دو خطوط لکھے تھے اور میں نے آج تک انہیں کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

خطوں میں ویسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن ہر جملہ راشد کے خلوص اور اپنیت کا مظہر تھا۔ اس نے یہی لکھا تھا کہ وہ خیر و عافیت سے اپنے گھر پہنچا تو اس کے والدین کی خوشی کے مارے کیا حالت ہوئی اور یہ کہ میرے بارے میں جاننے کے بعد اس کے والدین مجھ سے ملنے کے کس قدر مشتاق تھے۔

ملتی کر دیں اور اپنے کارندوں کو ہدایت کردی کہ وہ روزِ مہر زندگی میں بھی بچہ احتیاط برتیں اور نہایت بے ضرر اور شریف شہری بن کر شب و روز بسر کریں۔ اس مقصد کے لیے اس کے خیال میں یہ بھی ضروری تھا کہ ہم لوگ بازاؤں حسن اور عشرت کدوں وغیرہ کا رخ نہ کریں۔

زندگی میں عجیب بے کفایتی تھی۔ میرا بیشتر وقت گھر پر بے جلیب لینے میں گزرتا۔ اسی دوران راشد کا ایک اور خط آگیا۔ اپنے مخصوص مخلصانہ انداز میں اس نے اوجہ اوپر کی باتوں کے بعد ایک بار پھر اپنی دعوت کا اعادہ کیا تھا کہ زندگی کی مصروفیات تو چلتی ہی رہتی ہیں، بہتر ہو گا کہ میں خود وقت نکال کر کراچی کا چکر لگائوں ورنہ دینے تو شاید کبھی فرصت نہ ملے۔

اس رات میں نے مسجد کی گلی سے سوچا کہ واقعی میں فرصت کے ان دنوں میں کراچی کا چکر کیوں نہیں لگا آتا؟ کراچی دیکھنے کا مجھے ویسے بھی اشتیاق تھا جو مصروفیات میں دب کر رہ گیا تھا اور اب تو مجھے راشد کے والدین سے بھی ملنے کا کچھ کچھ اشتیاق ہو چلا تھا۔ راشد کے ہر خط میں ان کی طرف سے میرے لیے دعائیں لکھیں ہوتی تھیں۔

دوسری صبح میں نے شرف سے کہہ کر جہاز میں کراچی کے لیے روزِ پرویش کر لی۔ شام کو میں نے فون پر قاسم خان کو اطلاع دی کہ میں چند روز کے لیے کراچی جا رہا ہوں تو اس نے کراچی میں دو تین کام میرے ذمے لٹکائے۔ ان کی تفصیل سمجھانے کے بعد وہ بولا: "ان کاموں کے بارے میں مجھے گھر کے نمبر پر فون کر کے رپورٹ ضرور دے دے اور اپنا وہاں کا کوئی رابطہ کا نمبر بھی بتا دے تاکہ اگر اچانک ہمیں تمہاری ضرورت پڑ جائے تو ہمیں بلایا جاسکے۔"

"بہت بہتر۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی روز میں نے راشد کو ٹیلی گرام بھی دے دیا تھا کہ میں فلاں دن ڈھائی بجے والی پرواز سے پہنچ رہا ہوں۔ یہ ٹیلی گرام دیتے وقت میں نے اپنے آپ کو بے حد اہم ہستی محسوس کیا۔ جناب محمد افضل صاحب بذریعہ جہاز کراچی تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ بھی گویا زندگی کا ایک اہم موز تھا۔

تیسرے روز مجھے روانہ ہونا تھا۔ شرف مجھے ایئر پورٹ تک چھوڑنے آیا۔ وہ کئی بار ہوائی سفر کر چکا تھا۔ میں نے اس سے تمام طور طریقے اچھی طرح سمجھ لیے تاکہ ہم سفروں اور خصوصاً ایئر ہوسٹس کو احساس نہ ہونے پائے کہ میں پہلی بار ہوائی سفر کر رہا ہوں۔

طیارہ نصابی سیٹ میں بلند ہوا تو چند لمحوں بعد ہی مکان ماہجن کی ذیوں جتنے دکھائی دیتے گئے اور مزید کچھ دیر بعد طیارہ

میں نے دونوں غلطوں میں مجھے کراچی آنے کی دعوت دی تھی اور کئی کئی بار اس کا اعلان کیا تھا۔

پہلی بار کسی نے اس قدر مصومانہ غلوں کے ساتھ مجھے بلا لکھا تھا۔ میں سسکرائے بغیر رہ سکا۔ اس وقت میں فارغ تھا اور مجھے کوئی مصروفیت نہیں سوجھ رہی تھی۔ میں اسی وقت سے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

میں نے تاخیر سے خط لکھنے پر معذرت کی اور لکھا کہ میں نے لاہور منتقل ہو کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ انہی مصروفیات کی وجہ سے میں خط نہیں لکھ سکا تھا اور یہ کہ آئندہ وہ مجھے لاہور ہی کے ایڈریس پر خط لکھا کرے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ جیسے ہی موقع ملا میں اس کے پہلی ضرورت آؤں گا، مجھے خود بھی اس کے اہل خانہ سے ملنے کا شوق ہے۔ حالانکہ ایسا قطعاً نہیں تھا۔ بہرحال اس قدر غلوں کے جواب میں مجھے کچھ تو لکھا تھا۔

اس خط کا جواب آنے تک میں کلنی مصروف ہو گیا۔ سرحد پار کے دو پھیرے لگے۔ بڑی مصروف راتیں گزریں اور دونوں ہی پھیرے نہایت پر خطر ثابت ہوئے۔ ایک پھیرے میں کسی پابلی نے ہمارا اہل بانی جیک کرنے کی کوشش کی اور دوسرے پھیرے میں کسی کی مخبری کی باعث رنجش کے انہوں میں اور میرے دو ساتھی مرستے مرستے پہنچے۔ بہرحال دونوں پکڑوں میں میں مل سمیت عافیت سے نکل آیا۔

قاسم خان اب تو میری کارکردگی سے بہت ہی خوش تھا۔

میرے کیشن کی رقم میرے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا "آج رات تم میرے اکاؤنٹسٹ سے اس کے گھر پر مل لینا۔ وہ تمہیں سمجھا دے گا کہ تم کس طریقے سے اکاؤنٹ کھلاؤ گے اور کتنی رقم کو کس طریقے سے استعمال کرو گے اور باقی رقم کمال رکھو گے۔ ظاہر ہے یہ رقم اتنی ہی تو نہیں رہے گی۔" "محق جائے گی اور رقم بڑھنے کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بڑھیں گے۔ بہتر ہے کہ شروع سے ہی طریقے سے چلو۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ اس کے بعد چند دن فرصت دی۔ اس دوران میں نے راشد کے تیسرے خط کا بھی غور سا جواب تحریر کر دیا۔

نہاری اٹلی کیپ ملک سے باہر جاتی تھی۔ ہم اس کی کارروائیوں میں مصروف تھے کہ قاسم خان کو اطلاع ملی کہ گورنر کی ہدایت پر اسلام آباد کے خلاف ایک خصوصی مہم شروع کی جارہی ہے جس میں بلا امتیاز ہر اسٹیکر اور اس کی پشت پناہی کرنے والوں کو رگڑ دیا جائے گا۔

قاسم خان نے اپنی تمام سرگرمیاں غیر معینہ مدت کے لیے

وہ واقعی راشد تھا لیکن سرسری نظر میں اسے بچپان نہیں پتا تھا۔ میرے ذہن میں اس کی اسی وقت کی تصویر تھی جب میں اپنے ساتھ اسے بھی خرکار کپ سے رہائی دلا کر فرار ہوا تھا۔ چیمبروں میں پڑا ہوا ایک زرد ٹیف اور قرقر کا پتھر لڑکا۔

اپنے گھر اور اپنے باپ کے پاس واپس پہنچنے کی خوشی آرام و آسائش اور ایسے ہی دیگر عوامل نے اتنے کم عرصے میں اسے بہت زیادہ بدل کر رکھا تھا۔ اب تو وہ مجھے پہلے سے تنہا بڑا بڑا بھی لگ رہا تھا۔ عمر میں محض چند ماہ کا اضافہ بھی خاصی تبدیلیاں لے آیا تھا۔

اب وہ نئی چیز اور سفید شرت میں بیوس اٹھی مگر ایک سرخ دھبہ لڑکا تھا جس پر سرسری نظر زائل کر ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی دولت مند گھرانے کا فرد ہے۔ اس کے بھورے بال کھنڈر اند انداز میں بکھرے ہوئے تھے اور کچھ تیس پیشانی پر بھی جھکی ہوئیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ دو چار سال بعد وہ صنف مختلف میں بے حد مقبول رہے گا گو کہ اس کی شخصیت میں مردانہ رنگ بھی کی رہے گی۔

میں باہر آیا تو راشد نہایت گرم ہوئی سے مجھ سے گلے خانا۔ ہمارے درمیان رسی جھلون کا تہلہ ہوا اور راشد میرے ہاتھ سے بیگ لے کر ایک طرف بڑھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ راشد کے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہو گا اس لیے اس وقت مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی جب اس نے بیڑیوں کیے پاس رک کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان سے لئے افضل بھائی! یہ میرے والد ہیں... اور یہ میری بڑی بہن ہیں راجہ۔

میں نے ان دونوں شخصیات کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنی اپنی جگہ وہ دونوں ہی نہایت خوبصورت اور آئیڈیل جسم کی شخصیتیں تھیں۔ راشد کے والد کا قد تقریباً میرے ہی جتنا یعنی چھ فٹ سے لدا ہوا تھا۔ چوڑے کندھے، سرخ دھبہ رنگ، ٹھٹھڑالے بال، چمکیلی آنکھیں اور دو گلش نقوش۔ ان کے بچوں کی عمریں دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی اپنی عمر پینتالیس سے کم نہیں ہوگی لیکن وہ پینتیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ موسم معمولی سا خشک تھا لیکن وہ تھری جیما سوٹ میں تھے جیسا کہ عام طور پر بزنس میں ہوتے ہیں۔

میرے ذہن میں ایک آئیڈیل باپ کا تصویر تھا وہ بالکل اس کے مطابق لگتے تھے۔ لڑکپن میں اپنے والد کو جب میں بوسیدہ سی دھوئی کرتے اور میلی چمکی میں قدرے خیدہ مگر کے ساتھ، تھوڑا تھوڑا سا کھنڈتے ہوئے کیتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا تھا تو کبھی کبھار راشد کے والد سے ملتی جلتی

بادلوں سے بھی اوپر آگیا۔ تب میرا دل ایک عجیب سی سرت سے لبریز ہو گیا۔ پہلی بار مجھے فضاء کی دستوں کا احساس ہوا۔ اس کم سن پرندے کی خوشی شاید ایسی ہی ہوتی ہوگی جو میں سے اڑنا سیکھنے کے بعد پہلی بار خود کچھ پھیلا کر ہوا میں نکلا ہو۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے عیارہ فضا میں نہیں اڑ رہا بلکہ میں خود اواز پھیلائے بادلوں سے اوپر تیر رہا ہوں۔ یونہی آزاد فضا میں اڑتا اور عام لوگوں سے کہیں زیادہ بلندی پر رہتا میرا خواب تھا۔ میں سرور تھا کہ خدا نے مجھے شکر گڑھ کی گلیوں میں رہنا ہوا کیزا بننے سے بچالیا تھا۔ کسی نہ کسی ذریعے سے میں کچھ لوپر آئی گیا تھا اور ابھی میں مزید اوپر جانا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے میں منٹ کا ستر خدوں کی ایک عجیب سی دنیا میں ہلکورے لیتے لیتے یوں کٹ گیا کہ ایک نسوانی آواز نے جب اعلان کیا کہ چند منٹ بعد ہم کراچی ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں اور سگریٹ نوشی کرنے والوں کو اپنی سگریٹیں بجھا کر سینیٹیلٹ پانڈھ لینی چاہئے تو مجھے یہ مذاق سا محسوس ہوا۔ کیا واقعی میں کراچی پہنچ گیا تھا؟ کسی زمانے میں کراچی کا تصور میرے ذہن میں ایسا ہی تھا جیسے وہ کوہ قاف کے آس پاس واقع کوئی بستی ہے۔ کراچی تو کراچی کسی زمانے میں شکر گڑھ سے لادور آنا کوئی بہت بڑی مصلح عبور کرنے سے زیادہ مشکل محسوس ہوتا تھا۔ بے وسیلہ ہونا بھی کیا الیہ ہے کہ چند کوس کا فاصلہ بھی سمندر رواں پار کا ستر محسوس ہوتا ہے اور ایک وہ بھی لوگ ہیں جنہیں گھوٹے پھرنے کے لیے دنیا بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔

خیالات کی بھول، بھتیگوں میں ہلکتا میں خیارے سے اتر کر بس میں کھڑے ہو کر لاؤنج تک پہنچا۔ میرے ساتھ چونکہ کوئی سالان نہیں، صرف ایک بیگ تھا اور وہ میرے ہاتھ میں تھا اس لیے مجھے کنویر بیٹل کے قریب کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں پڑی اور میں بیگ ہلاتا دروازے کی طرف چل دیا۔

شیشے کی دیوار کے پار کچھ لوگ، آنے والے کچھ لوگوں کو ریو کرنے کے لیے کھڑے تھے مجھے کسی حد تک امید تھی کہ اگر میرا ٹیبل گرام راشد کو مل چکا ہو گا تو شاید وہ مجھے ریو کرنے آئے لیکن وہ مجھے ان لوگوں میں کہیں نظر نہ آیا۔ پھر میں نے دیکھا ریگ کے پائپ کا سارا لمبے ایک نہات خوبصورت لڑکا جانے کسے دیکھ کر نہایت پر جوش انداز میں ہاتھ ہلا رہا تھا۔

میں نے وہ قدم آگے بڑھ کر قدرے قریب سے دیکھا تو بے اختیار ذہن پر کہ اٹھا "ارے...! یہ راشد ہی تو ہے۔"

مشہور مصنف اختر کلیم کے مقبول ناول

پکار : ۱۷۵/-

سرفروش : ۲ حصے ۱۰۸/-

شہباز : ۲ حصے ۱۰۸/-

نے دیکھے لیجئے میں کہا اور مجھے یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی کہ میرے بولنے کے انداز میں ایک طرح کا شرمیلا پن شامل تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا : ”راشد کے خطوط سے جس قدر غلوں جھلکتا تھا وہ مجھے بھی بہت دنوں سے مجبور کر رہا تھا کہ اگر آپ لوگوں سے ملوں لیکن انہی دنوں میں نے بھی ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کر لیا تھا اور آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ بڑے بڑے کاروبار میں کتنی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”بے شک... بے شک۔“ راشد کے والد نے سر ہلایا۔ ”جہاں تک غلوں کی بات ہے تو راشد ہی کے نہیں ہم سب کے دل میں ہمیں دیکھے بغیر ہی تمہارے لیے غلوں اور ممنونیت کے جو جذبات موجود ہیں ان کا اظہار مشکل ہے۔ تم نے ایک طرح سے ہمارے پرے ہی خاندان کو کوئی زندگی دی ہے۔ راشد میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ اگر یہ ایسے دوبارہ نہ ملتا تو میں اس کی ماں اور بہن بیٹیوں ہی زندہ و زور ہو جاتے۔ خصوصاً مجھے تمہارے اس انداز نے تو بہت ہی متاثر کیا کہ تم نے ہمارے لیے اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد احسان جتنا تو درکنار ہمارے سامنے آنے کی بھی کوشش نہیں کی اور لاہور میں راشد کو میرے بھائی کے گھر کے دروازے پر ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ اس وقت ہم اوپر ہمارے دھڑکنے والے رختے دار بھی وہی موجود تھے اور سب ہی تمہاری اسس پیازی پر حیران رہ گئے تھے اور سب ہی کے دلوں میں تم سے

نئی شخصیت میرے ذہن میں آتی تھی اور میں سوچا کہ آقا کا زمانہ اگر مجھے ایسے کسی شخص کے گھر پر لے کر دیا ہو تو کیا حرج نہیں ہے؟ مجرب میں اپنے والد کی شفقت اور محبت کو دیکھتا تھا دیکھتے اپنے اس خیال پر شرمندگی ہی محسوس ہوتی تھی اور میں یہاں تک کہ اس میں کسی اور شخص کے ہاں پیدا ہوا ہوتا تو شاید وہ مجھے اتنی محبت نہ کرتا۔

راشد کا شاید پورا کینہ ہی خوبصورت لوگوں کا کینہ تھا۔ رابطہ اپنے باپ اور بھائی سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی اور شاید اس لیے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی کہ وہ لڑکی تھی ہر وقت نازک اندام۔ رنگت نہایت ہی صاف اور اجلی اجلی اور اس کے لیے لیے مجھ سے بھی کسی حد تک شرمے پن کی طرف مائل تھے جو رشیم کے سلیجے ہوئے تاروں کی طرح ہوا کی لہروں سے تھے۔ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح جینز اور شرٹ پہنی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی جینز ویلٹ کی تھی۔ ان ٹیکسٹ کیڑے سے اس کی شخصیت کی نزاکت کا اثر اور گرا ہوا تھا۔

وہ اتنی گھری گھری لڑکی تھی کہ اس کے گرد روشنی کا ایک ہل سا قوس کرتا محسوس ہوتا تھا اور وہیں جیسے اس کے دوسرے تاری اور خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کچھ ان کی طرح فرحت کا احساس ہوتا تھا جیسے آپ نے علی الصبح برف تھری ہوا میں چل قدمی کرتے ہوئے کسی سرسبز گیلدی میں شبنم سے نمائے ہوئے فوشگت پھولوں کو دیکھ لیا ہو۔

اس کی خواہش کی آغوشوں پر لمبی چلوں کی جھارے رات کی گلاب کی پنکھوٹیوں جیسے ہونٹ تھر تھرائے اور اس نے دھیمی اور حترم آواز میں کچھ کہا جو میں سمجھ کر دوسرے کی نہیں سکا کیونکہ میں اس کی شخصیت کے بحر میں کچھ زیادہ ڈال رہا تھا۔ راشد کے والد نے منبوی سے مصافحہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ کو ہلکا سا جھکا دیا تو میں چونکا اور گزشتہ لمحے کی بات محبت پر مجھے شرمندگی ہی ہوئی۔

راشد کے ابو بے تکلفی سے کہہ رہے تھے : ”بھئی تم سے ملنے کا تو اس قدر اشتیاق تھا کہ اگر چند دن اور نہ آتے تو تم سب خود لاہور آتے کا پروگرام ہمارے تھے۔ ان ہی دنوں ہمارے مکان پر ہوا کی لہر... میرے کاروبار میں کچھ ایسا پکڑا ہوا کہ ہم میں سے کسی کا بھی شرم سے باہر جانے کا پروگرام ہی نہیں بن سکا اور ہاں... یہ بھی بتانا چلوں کہ مکان کے دونوں بچوں کی ماں کا نام ہے۔ وہ گھر بڑی بے آباہی سے اٹھارہ انچار کر رہی ہے۔“

”مجھے بھی آپ لوگوں سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔“ میں

طاقت کی حسرت سی رہ گئی تھی۔

"بس جی... وہ وہ وقت ہی عجیب تھا۔ اس کا تو اب تذکرہ ہی چھوڑیں۔" میں نے نظر جھکاتے ہوئے کہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ راحیلہ کی خوابناک سی آنکھیں مسلسل مجھے ہی تنک رہی تھیں اور عجیب بات یہ تھی کہ اس احساس سے میری دھڑکن تیز ہوئی جا رہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ لاکھ میں ان مردوں میں سے تھا کہ جو نظر بھر کسی خاتون کی طرف دیکھ لیتے ہیں تو ایک لمحے بعد وہ بٹلیں جھانگتے گنتی ہے اور یوں بے چین سی ہو جاتی ہے جیسے اس کے جسم پر چو نہیں رہی ہیں۔

میرے لئے خود بھی اپنی یہ کیفیت ناقابل فہم تھی کہ میں راحیلہ سے نظر ملاتے ہوئے گھبرا ہوا تھا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس وقت اس کے والد سامنے کھڑے تھے۔

"میرا خیال ہے اب چلتا چاہئے۔ کئی ویرہ منٹ پہلے کا نظارہ کر لیا۔" راشد کے والد بولے۔ ہم چاروں پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیے۔

پارکنگ لاٹ میں ان کی سفید مرسیڈز موجود تھی۔ ڈرائیور بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے فوراً ہمارے لیے دروازے کھولے۔ راشد کے والد نے پہلے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"سر! پہلے آپ شریف رکھیے۔" میں نے اپنی دانست میں مینارزم کا مظاہرہ کیا۔ راحیلہ اور اس کے والد جانے کیوں بے ساختہ ہنس دیئے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے راشد کے والد ملاحت سے بولے۔

"اگر تم مجھے سر اور جناب وغیرہ کے بجائے صرف اکل کو تو بہتر رہے گا۔ بریکل تذکرہ میں اپنا نام بھی بتا دوں۔ مجھے ذرا دل چاہتا ہے۔"

"میں بے حد شرمزاد ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا حق دیا کہ آپ کو اپنائیت سے مخاطب کر سکوں۔" میں نے قدر سے کہیا ہٹ سے کہا۔

اس بار صرف راحیلہ ہنسی اور اس کی ہنسی پہلے سے زیادہ متزن تھی۔ وہ بدستور سحر آتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ بہت تکلف پسند انسان ہیں افضل صاحب!"

"پہلی ملاقات ہے۔" میں نے بمشکل اس سے نظر ملاتے ہوئے کہا۔ اس کی ہنسیوں آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ "لیکن ہمیں تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے برسوں سے آپ کو جانتے ہیں۔" وہ بلا تامل بولی۔

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں؟ غلطی ہے آپ لوگوں کا... تو اڑش ہے آپ کی... میں صرف یہی کہہ پاتا گاڑی میں بیٹھ کر ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ میں روڈ پر پہنچ کر راشد مجھے بتانے لگا کہ یہ ڈرگ روڈ ہے۔ بس سیدھے اسی پر چلتے ہوئے ہم گھر پہنچ جائیں گے... سوسائٹی میں ہے ہمارا مکان... اب تو ہمارے مکان کے قریب ایک پھاڑی پر ایک پارک بھی بن گیا ہے۔ مل پارک نام رکھا گیا ہے اس کا... آپ کو شاید ہمارے مکان کا محل وقوع پسند آئے۔"

"راشد!" راحیلہ اس کی بات کانٹے ہوئے شریر لہجے میں بولی "تم تو اس طرح افضل صاحب کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہو جیسے ہمارا مکان 'مکان نہیں کوئی ہو بلے ہے اور تم ایئر پورٹ سے افضل صاحب کو نہیں بلکہ کسی سیاح کو بڑی مشکل سے گھر گھار کر لائے ہو اور قہر مند ہو کر یہ انگو آگاہ بھی نکل نہ جائے۔"

انگل زانو نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ راحیلہ کے لہجے میں قدرے سنجیدگی آگئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تو یہ بھی ہم افضل صاحب کو اپنے مکان پر نہیں اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔ مکان اور گھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے؟"

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم خوش فاضل صاحب؟ راشد نے مصنوعی خفگی سے کہا "اور میں جانتا بھی نہیں جانتا۔" "جان لو۔ شاید مستقبل میں کسی کلاس فیلو کوئی پر طیت کا رعب ڈالنے کی ضرورت پیش آجائے۔" راحیلہ چپھرنے والے انداز میں بولی "مکان تو محض دروازے کے مجموعے کا نام ہے اور گھر اسے کہتے ہیں جو ان دروازے کے اندر ہوتا ہے۔ افضل صاحب ہم سے ملنے آئے ہیں، ہمارے مکان سے نہیں۔"

"تم اپنی قابلیت بھانڈنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیا کرو؟ راشد بولا۔ اس کے لہجے کی مصنوعی خفگی برقرار تھی۔ "بہر حال میں تمہاری قابلیت سے کبھی متاثر نہیں ہوں گا۔ تم کو شش جاری رکھو۔ کو شش جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں! اسی قسم کی خوشگوار نوک جھونک میں راستہ کٹ گیا۔ راحیلہ گو کہ سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ کی نہیں گنتی تھی لیکن اس کی گفتگو میں زبردست گہرائی اور گیرائی تھی۔ تاہم اس کے مزاج کے بارے میں کوئی حقیقی فیصلہ کرنا کم از کم اپنی اپنی لیے ممکن نہیں تھا۔ کسی لمحے اس کے انداز گفتگو میں بچوں کی سی مصیبت جھلک آئی۔ کسی لمحے وہ گفتگو کے اعتبار سے اسی سالہ خاتون محسوس ہونے لگتی اور کسی لمحے وہ مین اپنی

ہجر کی طرح سخت موت کی طرح ہے تم ایک شعلہ جوا لاش کی داستان

جو لطیف جذبوں سے آشنا تھا، لیکن معاف کرنا
اُس کی فطرت میں شامل نہیں تھا

ما قبال

مصنف: اقبال کاظمی

6 حصوں میں شائع ہو گئی ہے

قیمت فی حصہ -/60 روپے مکمل سیٹ -/360 روپے

اشاکٹ مکتبہ التعلیمی سکر روڈ اردو بازار لاہور 2

حسن بن کر وہ معنی تھی جس نے دیگر غامیایں چھپائی تھیں۔ مثلاً میں نے تو انہیں صرف سلام کرنے پر ہی اکتفا کیا مگر انہوں نے مجھے بچوں کی طرح سینے سے چمکا کر پیار کیا۔ یہ نہیں، جانے کیوں ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے۔ شاید ان کے سینے میں غلوم اور محبت کا ایسا بے پناہ دریا موجزن تھا جس پر بند بانو مٹان کے بس میں نہیں تھا۔ مجھے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں پہلی بار اس غارتوں سے مل رہا ہوں۔ غلوم سے تو انکل زیادہ بھی جیش آئے تھے لیکن وہ سرچل ایک بزنس مین تھے اور ظاہر ہے بزنس مین بھی کوئی جھوٹے موئے یا ناکام قسم کے نہیں تھے۔ شاید اسی لیے ان کی کسی بھی بات میں بے ساختگی نہیں تھی۔ ان کی تمام حرکات و سکنات گویا ایک خاص تربیت کی پیداوار اور ہر جملہ نیا تلا محسوس ہوتا تھا۔ ان کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ جو بھی بات کر رہے ہیں وہ ان کے دل کی آواز ہے۔ تقریباً ہر کامیاب بزنس مین کا معاملہ کچھ ہی ہوتا ہے۔

وہ اچھے زمانے تھے۔ لاہور سے کراچی تک کے سفر میں بھی اگر کھانے کا وقت ہو جاتا تھا تو جہاز پر کھانا پیش کیا جاتا تھا گوکہ اسے کھانا بڑے حوصلے کی بات تھی۔ میں محض چند تھکے ذہن پر کر کے آیا تھا اور اب غمناک رہے تھے۔ سخت بھوک لگ رہی تھی۔

آئی نے میرے دل کی بات کر دی۔ انکل کے بازو کا سارا لے کر چلے ہوئے پولیس "بٹا" اسب سے پہلے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاؤ، تمہارے انتظار میں ہم میں سے کسی نے بھی نہیں کھلیا۔"

دروازے سے داخل ہوتے ہی مسطر سی خنکی نے ہلکا استقبال کیا۔ دائیں ہاتھ پر غول و عریض ڈرائنگ روم کھڑوانا کھلا نظر آیا لیکن ہم اس کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ اس سے آگے ایک بیڑی لان تھا۔ اس کی آرائش بھی ڈرائنگ روم سے کم نہیں تھی۔ اس کے متعلق ڈرائنگ روم تھا۔

ڈرائنگ ٹیبل پر برتن کچھ اس طرح سجائے جا رہے تھے جیسے کسی پارٹی کی آمد کا اہتمام ہو۔ میرا ایک ایک نوکر لے جا چکا تھا میں ان کے ساتھ کھانے بیٹھا تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے چاروں اپنی اپنی پند کے تمام کھانے میرے معدے میں ٹھونس دینا چاہتے ہیں۔

یہ کیجیے، یہ کھائیے، یہ تو آپ نے پکھا ہی نہیں۔ اس قسم کی آوازیں بڑے قوت سے میرے آس پاس سے بلند ہونے لگیں۔ میں بھی مختلف ڈشوں کے ساتھ ہر ممکن اصف

عر کے مطابق ایک شروع و شک، اضر اور آسودہ حال لڑکی نظر آنے لگی تھی دیا کے کسی بھی مسئلے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جو ہر چیز کو صرف سطحی نظر سے دیکھ سکتی تھی اور جس کا مطمح نظر بس یہی تھا کہ کھیل کود، کھانا پینے، پیش کرو اور دنیا کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہو کر رخصت ہو جاؤ۔

بہر حال اتنے مختصر سے وقت میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کرنا تو ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ راستے میں میں نے اس کی شخصیت سے ذہن ہٹا کر کچھ دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی لیکن یہ کام مجھے کافی تکلیف محسوس ہوا۔ اس لڑکی میں کوئی بات ضرور تھی۔ میرے خیال میں یہ تقریباً ممکن تھا کہ اس سے ملے، اس کے پاس بیٹھنے حتیٰ کہ اس سے صرف چند لمبے بات کر لینے کے بعد بھی کوئی شخص اس کے بارے میں سوچنے سے اپنے آپ کو باز رکھ سکتا۔

انکل زیادہ کا وہ مکان یا گھر جس کے بارے میں راستے میں بحث ہوتی رہی تھی، دراصل ایک دو منزلہ شاندار کوٹھی تھی جس میں بے تحاشہ ماربل استعمال کیا گیا تھا۔

انکل زاد نے بتایا تھا کہ راشد کی امی گھر بے نیالی سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں اسے محض ایک رسمی سی بات سمجھا تھا لیکن وہی پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ غارتوں واقعی لان پر کرسی ڈالے میرے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ وہ اس طرح مجھ سے ملیں جیسے میں بھی ان کا کوئی چھڑا ہوا بیٹا تھا۔ ان لوگوں کے غلوم نے مجھے تقریباً پریشان ہی کر دیا تھا۔ میں بیک وقت اتنے افراد کی طرف سے اتنے غلوم کا سامنا کرنے کا عادی نہیں تھا۔

ایک بات میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ راشد کے والدین کی بڑی کچھ بے جوڑی تھی۔ آئی نہ کہ انکل زاد سے عمر میں بھی کچھ بڑی معلوم ہوتی تھیں اور غالباً کچھ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھیں۔ وہ غالباً کافی عرصہ پہلے ہی ملاپ کے حدود میں قدم رکھ چکی تھیں۔ رنگت بھی سفیدی تھی اور شاید بچاری بننا بھی رہتی تھیں۔ کچھ عرصے سے ان کا بلڈ پریشر بھی رہتا تھا اور جوڑوں کا درد بھی جاگ اٹھا تھا جس کی وجہ سے وہ ایئر پورٹ نہیں آسکی تھیں ورنہ وہ بھی مجھے ریسیو کرنے کے لیے آئے کا ارادہ رکھتی تھیں۔"

تاہم ان تمام باتوں کے باوجود مجھے جلنے کیوں ان کی شخصیت انکل زاد کے مقابلے میں زیادہ سن موہتی محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کے غلوم میں بے ساختگی تھی۔ ان کے طرز عمل میں حیرت انگیز نہ تک سادگی تھی۔ وہ سرتاپا مصومیت تھیں اور یہی مصومیت ان کی شخصیت کا

محسوس کیا کہ ایک ٹانگے کے لیے انہوں نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا تھا۔ میرے دل میں ایک جھنجھٹ سی بیٹھ گئی۔ میرے بارے میں ان کی سوچ میں یقیناً کوئی تبدیلی آئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گہری سانس لے کر پہلے ہی جیسے ہمارا اور خوشگوار لمحے میں بولے "ایکپورٹ رُخواہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے معلومات زیادہ سے زیادہ رکھنی چاہئیں۔ معلومات پر بھی بڑی حد تک اس کی کامیابی کا دار و مدار ہوتا ہے۔"

ابھی مجھے آپ جیسے لوگوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ میں نے حتی الامکان انکساری سے کہا "حقیقت میں تو ابھی میں نے پرنس شروع ہی نہیں کیا، ابھی تو ایک طرح سے میں ابتدائی اصول ہی سیکھ رہا ہوں۔"

اس کے بعد موضوع تبدیل ہو گیا۔ میری ذات کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ وہ چاروں مجھے بہت اچھی طرح جان لینا چاہتے تھے۔ میں انہیں اپنے بارے میں ہر بات حتی الامکان سچ سچ بتانے کی کوشش کر رہا تھا اور صرف وہیں جھوٹ کی آمیزش کر رہا تھا جہاں ملنا پڑتا تھا۔ میرے خیال میں ضروری تھا۔ وہ دونوں اسی طرح کپ شپ، آرام اور کچھ ان ڈور تقریبات میں مگرمگیا۔ دوسرے روز ٹانگے کی میز پر انکل زاہد بولے۔

"افضل میاں! میری تو آج سے بے پناہ مصروفیات شروع ہو رہی ہیں البتہ یہ دونوں بچے آجکل کلغ سے فارغ ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر تم جو چاہو تقریبی پروگرام بناتے رہو۔ یہ جہیں کراچی کا چھپ چھپ دکھائیں گے۔ تمام تپیل ذکر مقامات کی میر کراویں گے۔ اپنے دوستوں سے ملوائیں گے اور جس طرح بھی تم چاہو گے چلک وغیرہ کے پروگرام بنائیں گے۔ ان کاموں میں یہ دونوں بہت بھالی بہت تیز ہیں۔ امید ہے یہ جہیں بورضیں ہونے دیں گے۔ البتہ اگر میں نے تم لوگوں کو کہنی دینے کی کوشش کی تو تم بور بور جاؤ گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم ان کے ساتھ دو اور کراچی میں اپنے قیام کا لطف اٹھاؤ۔ اس گھر کو بھی اپنا گھر ہی سمجھ کر رہنا۔ سمانوں کی طرح کھٹک مت برتنو نہ خواہ مخواہ الجھن ہوگی۔ اوکے؟"

"اوکے سر!" میں نے بیٹھے بیٹھے انہیں سیلٹ کیا اور وہ مسکرا دیے۔

ٹانگے کے بعد انکل زاہد تو اس طرح رخصت ہو گئے جیسے انہیں کوئی ٹرین پکڑنی ہو اور ان کے جانے کے بعد راحیلہ نے مجھے اور راشد کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی اس نے رضاحت کی "افضل صاحب! آپ میں نے آپ کی میزبانی کا چارج سنبھال لیا ہے۔ سب پروگرام میری مرضی سے نہیں گئے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھ لیا کروں گی کہ آپ کو

رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ برے اور دوسرے لوگوں کے کھانے کی رفتار میں وہی فرق تھا۔ گڑھا گاڑی اور ٹرین کی رفتار میں ہوتا ہے۔ میں نے قدرے مہارت محسوس کرتے ہوئے رفتار کم کی لیکن اب تو دیر بچی تھی۔ مجھ سمیت غالباً ہی شکم میر ہو چکے تھے اور ہانے سے ہاتھ کھینچ رہے تھے۔

کھانے کے بعد میری پسند پر کئی کا اور چلا جس میں کپ پ بھی ہوئی رہی۔ انکل زاہد نے سرسری سے مجھے میں ایک ہی پوچھ لیا "کیا پرنس کر رہے ہو یا خود دار؟"

ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا سٹایا۔ میرے ذہن سے یہ کی شکل گیا کہ ایسے موقعوں کے لیے عموماً ہمارا ایک گھڑا گھڑا رہا ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے سکوت کے بعد میں کہہ سکا۔

پورٹ ایکپورٹ۔"

"بہت خراب۔" انکل نے سر ہلایا "بھئی ہم بھی پہلے اسی بیان میں تھے لیکن پائنٹر شپ تھی۔ ساتھ ہی کا ہڈیاں جھ ر رہے پر پیوٹ مینی ہم صنعت کاری کی طرف آگئے تو سنا ہے کہ اب اسپورٹ ایکپورٹ میں حالات بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے ٹائیکون کے دھندے میں ہی کروڑوں بنالے۔ کیا بیٹھ مل رہا ہے آج کل ٹائیکون کی ساریوں پر؟"

مجھے ریٹ کے نقلی معنی تو معلوم تھے لیکن یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ پرنس کی دنیا میں اس قطعہ کا کیا عمل دخل ہے۔ چہ جائیکہ میں ریٹ کی شرح بتا سکا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں پیسے بولنا ہی بھول گیا۔ مجھے احساس تھا کہ سب ایک ٹک ٹک طرف دیکھ رہے ہیں۔

بمختل سنبھل کر میں نے کہا "میں نے تو سمجھ دے ہائے پر ابھی جانا کام شروع کیا ہے۔ ٹائیکون کی ساریاں بیچنے کا مجھے ابھی اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے تو ڈبوں میں بند اشیائے خورد و نوش سے کام کا آغاز کیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے ٹن فوڈ؟" انکل گویا بے چینی سے تقریباً چلا اٹھے "اس کا آرڈر جہیں کہاں سے مل گیا؟ ہمارے لٹنڈ کی ڈیکارڈ کہاں کھل آئی؟"

میں نے ایک بار تمام خان کے ہاں ڈبوں میں بند اشیائے خورد و نوش کا کچھ ذکر سنا تھا۔ معلوم نہیں بات کیا ہو رہی تھی لیکن اس وقت میں آکھم میرے ذہن میں آیا تھا اور میں نے کہا جڑ دیا تھا۔

"وہی... مل ایٹ سے ایک چھوٹا سا آرڈر مل گیا تھا۔"

کھانے کے زور سے مجھے میں کہا۔

"اچھا... اچھا... زاہد صاحب نے سر ہلایا لیکن میں نے

قہمائی دی پروگرام اور گپ شپ غرضیکہ ہر چیز کے بارے میں اس کا جھکاؤ ان پیلوؤں کی طرف ہوتا تھا جس میں عروا کی کی جھلک چمکی جاتی تھی۔

کل باتوں باتوں میں اتفاقاً آئی اس کے پس منظر کی طرف بھی اشارہ کر چکی تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ زاہد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے ہاں پہلی اولاد لڑکا ہو لیکن جب لڑکی ہو گئی تو انہوں نے اسے لڑکوں جیسے کپڑے پہنانے شروع کر دیئے ہمیشہ لڑکوں والے کھلونے لاکر دیئے۔ کلانی عرصے تک انہوں نے گویا اس بات کو بھی بھلائے رکھا کہ لڑکی کا نام راحیلہ رکھا گیا ہے۔ وہ اسے لڑکی کے نام سے پکارتے رہے۔ راشد کی پیدائش کے دو تین سال بعد تک ان کا یہ عقیدہ تو ختم ہو گیا لیکن راحیلہ کے ننھے سے ذہن میں شاید اس کے کچھ اثرات جڑ پکڑ گئے۔

میں دل ہی دل میں اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ میرے خیال میں ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بس قدرت ہی کی طرف سے عطا کردہ کچھ رجحانات ہوتے ہیں۔ اگر راشد کی مثل سامنے رکھی جاتی تو دیکھا جاسکتا تھا کہ اسے کسی نے زونہ رجحانات کی طرف مائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس کے اندازہ اطوار میں بے پناہ طاعت اور دھیان تھا۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ اس کے اندازہ اطوار میں نسوانیت کی جھلک ملتی تھی۔ بس دیسے ہی جانے کیوں اس کی نوعمری اور اچھا صحت کو دیکھتے ہوئے اس میں تیزی و تیزی اور جارحانہ کا دلولہ تیزی کی کمی محسوس ہوتی تھی جو اس عمر کے لڑکوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

اس کی حرکات و سکنات میں براغیرا تو تھا اور میرا خیال ہے وہ جب کسی کو پسند کرتا تھا تو اس کے انداز میں ایک طرح کی عقیدہ بندی اور دلالتانہ پن سامنے آتا تھا۔ لڑکیوں یا لالچلی بچوں میں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

بظاہر تو راحیلہ کی شخصیت میں بھی سبک دہی کا سلا مہا بن نظر آتا تھا لیکن کچھ وقت اس کے قریب رہنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے سے مشابہ کوئی بہت چمکا چمکا تھا۔ ایک ہاں میں کوئی پہلو جھلکا تھا تو دوسرے ہاں میں کوئی اور پہلو۔ کبھی اس کی ذات سے کسی رنگ کی مدافعت چھوٹی تھی اور کبھی کسی رنگ کی۔

بات کرتے کرتے اچانک اس کی نیکیوں آجھیں ققصول کی طرح چمک اٹھیں اور گلابی چہرہ سرخ ہو جائے۔ کسی بات پر خوش میں آکر وہ میز پر گھوسا روٹی تو ساری کر رکھا کھٹک اٹھتی۔ بظاہر اس کے ہاتھ اتنے نرم و نازک نظر آتے

میرے بنائے ہوئے کسی پروگرام پر کوئی اعتراض تو نہیں؟ سب سے پہلے تو یہ بتا دیں کہ آپ کو میری اس بات پر تو کوئی اعتراض نہیں جو میں نے ابھی کی ہے؟

میں کہنا چاہتا تھا۔ ایسا حسین میزبان میرے ہوتے کس کیفیت کو کسی بھی پروگرام پر اعتراض ہو سکتا ہے؟ لیکن قریب ہی آئی جیٹی ہماری طرف دیکھتے ہوئے شفقت سے مسکراتی تھیں اس لیے میں یہ کہہ نہ سکا تاہم میں نے محسوس کیا کہ راحیلہ نے میری آنکھوں میں یہ جواب پڑھ لیا تھا۔

”بھئی مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں نے دھبی آواز میں کہا ”میں تو یونہی فرصت کے چند دن گزارنے کے لیے آیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میرا یہ دورہ توقعات سے کہیں زیادہ پر لطف بلکہ یادگار رہے گا۔“

”بھئی ہم جس پر مہمان ہو جاتے ہیں اس کے لیے ہم ہر چیز کو یادگار بنادیتے ہیں۔“ راحیلہ نے بے باکی سے کہا ”اور جس سے ہماری ٹھن جائے اس کا ہم بیجا حرام کر دیتے ہیں۔ کیوں راشد؟“

”بے شک۔ بے شک۔“ راشد نے تائید میں سر ہلایا۔ آئی نے بطور خاص راحیلہ کو مخاطب کیا ”جی! اجلی کہیں بھی جاؤ اور جو بھی پروگرام بناؤ، یہ خیال رکھنا کہ کہیں کوئی شرارت نہ ہو۔ تم میں سے کوئی کسی لڑائی جھگڑے میں الجھنے کی کوشش نہ کرے۔۔۔۔۔ مطلب یہ کہ مجھے کوئی بری خبر سننے کو نہ ملے۔ خیال رکھنا کہ تمہاری میں مستقل مریض ہے۔“

”مہی! آپ قطعاً فکر نہ کریں۔ ایک عرصہ ہو گیا ہے آپ نے میری طرف سے کوئی ناگوار خبر سن؟“ راحیلہ نے اٹھ کر پیار سے اپنی ماں کے رخسار پر بوسہ دیا۔

راشد میری طرف جھٹکتے ہوئے قدرے نیچی آواز میں بولا۔ ”راحیلہ اب تک جوڑو سے دو بد معاش لڑکوں کے کھدھے اور پسلیں توڑ چکی ہے اور دو مرتبہ یہاں کے بے اور پیراؤن پوائنٹ پر رورے اور سے تین بد معاشوں کو زخمی کر چکی ہے۔ ایک مرتبہ تو ایک ایف آئی آر میں داخلہ اس کا نام بھی لیا تھا۔ پہلے یہ بھرا ہوا رورے اور اپنے پاس رکھتی تھی۔“

میں نے قدرے حیرت سے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ اس کے نام میں بھی بے پناہ شریفیت اور نسوانیت تھی اور اس کی شخصیت بھی خشم میں ہلنےے ہوئے پھول سے مشابہ نظر آتی تھی تاہم میں نے اس گھر میں اپنے آپ تک کے خشم سے قیام کے دوران ہی اس کے بارے میں چند باتیں محسوس کیں تھیں جو اس ناثر کی نفی کرتی تھیں۔

وہ لڑکوں والے کپڑے پہنتی تھی اور مٹلے ”میر و قفر“

آرمیوں کے بیٹھے اور ٹھونس ٹھانس کرنے کے لیے ہیں
 بائیس آدمیوں کی گنجائش ہے۔ مجھے اکثر اپنی دوستوں اور بھر
 ان کے دوستوں کو خوک کے حساب سے لاد کر ادھر ادھر لے
 جاتا ہوں۔ اس لیے یہ گاڑی بڑی سوزوں رہتی ہے۔“
 ”دیے اگر تم نے اسی حساب سے دوستوں کی بازواری
 جاری رکھی تو جلد ہی تمہیں ایک ٹرک خریدنا پڑے گا راجہ!
 راشد نے قہقہہ دیا۔ میں بے ساختہ ہنس دیا۔

راجہ نے ایک ہاتھ سے عینک ٹاک پر ڈرائیج کو کھسکاتے
 ہوئے ایک لمحے کے لیے مرکز راشد کی طرف دیکھا اور طرہ
 انداز میں بھوس اچکا کہ ”اب تو تمہیں بھی بولنا آتا ہے
 بلبل ایسٹ کراچی یا پھیر شاید افضل صاحب کی آمد سے کچھ
 حوصلہ مل گیا ہے؟“

”نہیں۔ میں نے دراصل صبح ناشتے میں تمہارا جھوٹا جوس
 پی لیا تھا۔ راشد نے سادگی سے جواب دیا۔ یہ اسی کا اثر ہے۔ خیر
 تم اس کا برامت متاؤ۔ میں تو سال میں ایک آدھ ہی جملہ
 مارتا ہوں۔ تم تو سارا سال جملے بھی مارتے ہو اور گھونٹے بھی۔“
 ”چلو معاف کیاؤ راجہ۔ پیشانی پر جھک آنے والے ہوں کو
 ایک خفیف جھٹکے سے ہناتے ہوئے بولی۔ گاڑی اس وقت
 غلابا سوسائٹی ہی کے علاقے میں ادھر سے ادھر مڑتی جا رہی تھی۔
 راجہ مجھ سے مخاطب ہوئی ”سب سے پہلے تو میں آپ کو
 اپنی چند دوستوں سے ملواؤں گی۔ ان میں سے دو غیر ملکی بھی
 ہیں۔ شاید ان کے بوائے فرینڈ بھی ساتھ ہوں۔ آپ برا تو
 نہیں منائیں گے نا؟“
 ”میں کیا ان کا گارجن ہیں جو ہر امناؤں کا ہوتے....
 بلبل پر دانی سے کہا۔

”ان کے گارجن تو اس وقت برساتے ہیں جب لڑکی کوئی
 بوائے فرینڈ نہیں رکھتی۔“ راجہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی اور
 اس کے ایک لمحے بعد ہی اس نے گاڑی قدرے پرانی اور مختصر
 سی ایک کھڑکی کے پورچ میں جا رکی۔

لان پر دو کتے اچھل کود میں مصروف تھے جو سرسری نظر
 میں انجھی ہوئی اون کے دو گولے معلوم ہوتے تھے۔ وہ
 مختصر الوجود ہی تھے لیکن ان کا اصل جسم شاید اس سے بھی
 کہیں زیادہ مختصر تھا تاہم بڑا ہر دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے بل اس
 قدر لمبے اور گھٹے تھے کہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ان کے منہ
 کس طرف ہیں اور دماغ کس طرف۔

غلابا گاڑی کی آواز سن کر ہی جلی دار دو اونے کے عقب
 سے ایک سفید ٹام لڑکی نکل آئی۔ وہ شرٹ پینٹ میں تھی۔
 تراشیدہ سنری بلی کندھوں پر جھول رہے تھے۔ دو ڈوٹی ہوئی وہ

جہ کہ برائیک کی بھاری بھر کم ڈانگ نکل پر اس انداز سے
 گوندا رہ کر اس کے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی تھی۔
 میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اسے گھر میں آزادی بھی
 فب حاصل تھی۔ اپنے بارے میں کسی بھی قسم کے فیصلے
 کرنے میں وہ کلن حد تک خود مختار معلوم ہوتی تھی۔ کوئی اس پر
 اپنی رائے ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ انکل زاہد بھی
 ہیں۔

راشد کو کہ اسے اپنی ”آلیا اس قسم کے کسی اور القاب سے
 نہیں پکارتا تھا۔“ سیدھی طرح ہم لیتا تھا لیکن میں نے محسوس
 کیا تھا کہ وہ بے جاہد اس سے مت ریتا تھا۔ اگر وہ ایک خاص
 انداز سے اس کی طرف دیکھ لیتی تھی تو چوہے کی طرح دیک
 جاتا تھا۔

وہ مجھے بہت ہی عجیب لڑکی محسوس ہوئی تھی۔ حیران
 کر دینے والی، سمجھ کر دینے والی۔ گولے کی طرح انسان کو
 بیٹائیے لینے والی۔

میں اور راشد تیار ہو کر باہر آئے تو راجہ ڈرائیو سے میں
 ایک نیلی اور سفید اسٹیشن ویگن اشارت کیے ڈرائیو تک
 بیٹ پر چنبھی تھی۔ ٹاک پر بڑے بڑے تاریک شیشوں کا چشہ
 لٹا تھا اور ہل کیلے تھے۔

اس نے مجھے اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ راشد
 بچے جیڑ گیا۔ میں اپنے لباس اور مجھ کے بارے میں کبھی
 زیادہ حقائق یا ٹھوس نہیں رہا لیکن اس وقت راجہ کے برابر
 بیٹھے ہوئے مجھے اپنا آپ کچھ ناموزوں سا لگا۔ میں شاید کچھ
 بھائی سا لگ رہا تھا۔

اس سے پہلے میں نے جب بھی یہ محسوس کیا تھا کہ میری
 شخصیت سے کچھ دیسانی ہیں سا جھٹک رہا ہے تو میں کسی قسم
 کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت میرا ہی
 ہار تھا کہ کاش میں اپنے لباس اور رک رکھناؤ سے راجہ اور
 راشدی کے طبقے کا فرق رکھ رہا ہوں۔

یہ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ میں اب لباس تو اچھے سے
 پہنا ہوں اور کرسکتا تھا۔ صرف انتخاب میں سلیمہ رستے اور رک
 رکھنا تو سب سے زیادہ کی ضرورت تھی۔ میں نے فیصلہ
 کیا کہ اگر آج تو وہ گرہ کی دور ان موقع ملا تو زور امید تراش
 فراش کے کچھ ریڈی میڈ کپڑے خریدوں گا۔

میرے اور راشد کے بیٹھے ہی راجہ ایک جھٹکے سے کلچ
 ہوا ڈر گاڑی بڑھاتے ہوئے بولی ”پہلے میرے پاس
 ٹیبلٹ کنور ٹیبلٹ تھی لیکن اب میں نے اپنے لیے یہ
 والی دیکھ رکھی ہے۔ اس میں شریفانہ طریقے سے چودہ

”اچھا اب بکواس کٹنی ہو چکی۔ چلو تم دونوں گاڑی میں بیٹو جاؤ“ راحیلہ نے حکم دیا۔ انہوں نے اندر جا کر نہ تو کسی کو مطلع کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی سے اجازت طلب کی بلکہ جس جگہ کھڑے تھے وہیں سے ایک کر گاڑی میں چڑھے اور نہایت سہولت سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ قصہ کدھر کا ہے۔

روشن کی بجزی نہایت فریادی انداز میں ہاتھوں تلے چڑھ اٹا اور گاڑی سڑک پر اٹھی۔ اس کے بعد گاڑی جس کو ٹی میں جا کر رکی وہاں سے بھی تقریباً اسی انداز میں ایک ترک لڑی کو ساتھ لایا گیا۔ اس کا نام جو ریا تھا۔ وہ تھا تھی اور بے حد حسین تھی۔ اس کے مزاج میں کچھ سنجیدگی تھی۔ معلوم نہیں راحیلہ سے اس کی دوستی کیونکر بندھ رہی تھی۔

اس کے بعد ایک پاکستانی لڑکی کو ساتھ لایا گیا۔ اس کا نام مصباح تھا۔ چھوٹے قد کی ساتویں سی لڑکی تھی مگر بے پناہ تیز و طرار۔ اس کی زبان تہنیتی کی طرح چلتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاڑی میں بیک وقت چار پانچ افراد کا خلافت ہو گیا ہو۔

اس کے بعد دو اور لڑکیوں کے گھروں پر چھاپا مارا گیا مگر موجود نہیں تھیں۔ گاڑی معلوم نہیں کس کس سڑکوں پر گزرتی رہی تھی۔ راحیلہ نہایت جارحانہ انداز میں ڈرائیو کر رہی تھی۔

”آخر باتو چلے تم چاہتی کیا ہو؟ پروگرام کیا ہے؟“ مصباح نے غائبانہ رویہ میں مڑتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو تم فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ راحیلہ نے گمراہانہ انداز میں کہی۔ ”اور اسی لیے میں گاڑی تیز چلا رہی ہوں۔“ گاڑی تیز چلتی ہے تو میرا دماغ بھی تیزی سے کام کرنے لگتا ہے لیکن آج کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یوں کہو کہ تھوڑے دنوں میں کئی ہیں مگر میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پائی۔“

”شاید گاڑی کی طرح تھوڑی کھڑکی کو بھی سروس ٹیوننگ وغیرہ کی ضرورت ہے۔“ مصباح نے مٹا کر کہی۔ ”کچھ اندازاً تو ہو کہ آخر تم کس نوعیت کا پروگرام چاہنا چاہتی ہو؟“

”میں صرف ایڈیٹر کی صلاحتی ہوں۔“ راحیلہ نے جواب دیا۔ پھر اچانک خود ہی چکی بجاتے ہوئے بولی۔ ”مجھ میں ایسا ایک ایڈیٹر۔“

”کیا؟“ گھارائے عقبی سیٹ سے سارس کی طرح گردنا پڑھاتے ہوئے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

گاڑی کے قریب آئی اور مٹھلیاں بھیج کر مٹھی مٹھی پر خوش آواز میں انگریزی میں بولی۔ ”ہائے رائیڈ! تم کمال مرگ ہیں نہیں؟“ لہجہ خالصتاً امریکی تھا۔

راحیلہ گاڑی سے اتر کر اس سے ملی۔ گلے شکوؤں کا تبادلہ ہو چکا تو راحیلہ نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ یہ ہمارے مسلمان مسٹر افضل ہیں۔ اور یہ میری دوست کلارا ہے۔“ کلارائے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ روٹی کے ٹکڑے کی طرح نرم تھا۔ وہ کچھ زیادہ خوش مزاج لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ بغیر کسی بات کے ہی اس کی ہاتھیں یوں کھلی جاری تھیں کہ پورے دانت گٹنے جاسکتے تھے جو بے حد خوبصورت تھے۔ اس کے چہرے پر زندگی کی بھرپور چمک تھی۔

راحیلہ اس کے بارے میں مزید کچھ بتانے ہی لگی تھی کہ ٹائمر کے درشت کی طرح لمبا اور کچھ اسی طرح قدرے فیدہ سا ایک برائش سفید خام نوجوان بھی جالی دار دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ وہ سرگرمی سے کچھ عرصہ اڑانا آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر گوشت بہت کم تھا لیکن ڈھانچا خالص چڑچڑکا تھا۔ اس کا طبع کٹنی حد تک معززانہ ہی تھا مگر جانے کیوں اس نے گلے میں مونے مونے منکوں کی ایک لہا ڈالی ہوئی تھی۔

”تم نے ابھی تک اس پوج سے بچھا نہیں چھڑایا؟“ راحیلہ نے زیر لب کلارائے کہا۔

”کیا کہہ رہی ہو رائیڈ؟“ کلارا بھی زیر لب بولی۔ ”وہ میرا عجیب ہے۔ اب بھلا اس سے بچھا چھڑانے کا کیا سوچ پیدا ہوتا ہے؟“

”اس سے تو بہتر تھا کہ تم نے کسی الیکٹریک پول سے منکئی کر لی ہوتی۔“ وہ کم از کم روشنی دیتا تھا۔ راحیلہ آہ بھر کر کہی۔ اس دوران وہ نوجوان اونٹ کی طرح ہچکولے سے لیتا ہوا قریب آ چکا تھا۔

”کلارائے مجھ سے راحیلہ نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا۔“

”ان سے پیسے افضل۔ ان کا نام ڈرائیو چلانا ہے۔ البرٹ تھا۔“ ہم کچھ دوستی کے تھے اور کچھ اپنی سولت کی خاطر انہیں الٹی کہتے ہیں۔ یہ بد قسمتی سے شاعر ہیں اور صرف کیونکہ ان کے خلاف تھیں لکھتے ہیں۔ دن میں پچاس ساٹھ ستر سو پتے ہیں اور تقریباً اتنی ہی نظمیں لکھتے ہیں۔ جس دن نظمیں، ستر سو سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ان دنوں انہیں کھانا بہم نہیں ہو پڑتا کہ انہوں نے کھانا ہو۔“

”تم تو کچھ جانتے سے کام لے تمہیں رائیڈ! الٹی سنجیدگی سے بولا۔“ میں دن میں پچاس ساٹھ نظمیں تو نہیں لکھتا۔ زیادہ سے زیادہ چالیس لکھتا ہوں۔“

بھارت میں ایک محب وطن پاکستانی کی سرفروشانہ داستان جس نے پاکستان کی آن کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اور بھارتی دہشت گردوں کے سامنے

سیسہ پلٹی دیوار بن گیا۔

اے حمد

چار جلدوں میں شائع ہو گئی ہے

شیو سینا کے دہشت گرد

ٹاپ سیکرٹ مشن	(اول)	۱۵۰/- روپے
کشمیر کے غازی	(دوم)	۱۵۰/-
کمانڈو ایکشن	(سوم)	۲۰۰/-
گوکندہ کے مجاہد	(چارم)	۲۰۰/-

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور، فون: ۶۶۸۹۵۸

انفraz میں ضرور سترے خوف میں لکھی جائے گی۔ مگر یہ تو وہی "ب" ہوا کہ کھودا پاز اور نکلا چہا۔ وہ بھی مراد... تم نے تو کیا ہی بڑی دی... وہ بھی گڈائی چچ پر لے جا کر... یعنی اگر سوئمنگ ہی کرتی ہے تو پچیس تیس میل دور جا کر دیکھ کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ انٹرکان کے سوئمنگ پول پر جا کر کر لیتے ہیں۔"

راجیلہ نے بڑی طرح اسے گھورا "کچھ لوگ کنویں کے مینڈک ہوتے ہیں۔ تم سوئمنگ پول کی مینڈکی ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ ایڈونچر کسے کہتے ہیں۔ اسی لئے تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہوٹل کے سوئمنگ پول میں اور ایک دور افتادہ ویران ساحل پر سوئمنگ کرنے میں کیا فرق ہے۔ افسوس ہے تمہاری بلا لگتی ہے کہ اتنا عمر میری صحبت میں وہ کر بھی تم نے کچھ نہیں سیکھا۔"

"مسک سوئمنگ کاسٹیوم کا بھی تو ہوگا" کھاراپیشان سی ہو کر بول۔

"ایک تو میں تم امریکیوں کی اس عادت سے بڑی پریشان ہوں..." راجیلہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی "مگر جب تک کسی بھی کام کے لئے مخصوص لباس، مخصوص اوزار یا مخصوص ماحول میرے نہ ہو تو لوگ ہاتھ نہیں ملائے۔ اب تک تو تمہیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ ہمارے ہاں سمندر پر لڑکیاں سوئمنگ کاسٹیم میں نہیں مانتی۔ لڑکیاں تو اگر لڑکیوں کو اجازت

کالونی روک کر راجیلہ نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کھاراپیشان اس کا نظیر ابھی "ٹرک لڑکی" دور یا اور پاکستانی لڑکی مسلمان سب ہی مذہب انہماک میں بیٹھے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ راجیلہ کا بھائی راشد تو دینگن کے فرش پر ہی نہم راز تھا۔

راجیلہ ایک لمبے خاموش رہی تو کھاراپیشان "راجیلہ! ہمارا کازمیک... اب تو سسٹنس کا وقت کافی طویل ہو گیا ہے۔ بتا بھی پکڑو... آخر تم کیا چاہتی ہو؟ کیا اس سنیما کی تھرو کلاس میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھ کر فلم دیکھنی ہے؟"

"نہیں۔ یہ سنیما بہت گندہ ہے۔ یہاں کسی ایڈونچر میں تو نہیں آئے گا" راجیلہ بالوں میں انگلیاں پیچھرتے ہوئے بولی "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سوئمنگ کے لئے سمندر پر چلیں گے... گڈائی چچ پر... یہاں شپ ریسکینگ ہوتی ہے نا... اس سے دو سینٹل اور حرمت ہی صاف ستر اسلحہ ہے۔ وہاں پتلا اتنا صاف ہوتا ہے کہ میں تیرتی ہوئی ننھی ننھی پھیلیاں بھی صاف نظر آتی ہیں... اور اس طرف جا آجی کوئی شادو تاروئی ہے۔ قسم ہے برا مزہ آئے گا۔ ہم آپس میں تیرائی کے مقابلے منقہ کریں گے اور نیچے والوں کو انعام کے طور پر وہیں سے لکڑے بکڑ کر دے جائیں گے۔"

"اخت ہے تم پر" مہربان بولی "میں کبھی بھی کہ تم لکڑی ایسی تجویز پیش کرنے لگی ہو جو تاریخ میں نہ سہی تو کم از کم

کچھ باتیں کرنے لگے تاہم ان کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

ساتے ٹیلگوں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ یہاں ساحل کے قریب واقعی پانی بہت شفاف تھا اور اگر اس میں موتیوں کا عظیم نہ ہو تا تو اس پر بہت بڑی جمیل گمانیں گزرتا۔ جانے کیوں ایک لمحے کے لئے مجھے گمان گزرا جیسے ہم کسی دوسرے سیارے پر آگئے ہیں۔ یہاں کی کھلی چرسکون اور مرطوب سی فضا میں دل ایک انجانی سی سرست سے سرشار ہوا جا رہا تھا۔

میں نے ابھی تک کسی ہوٹل کے سونٹنگ پول میں تیراکی تو نہیں کی تھی لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ واقعی اس فضا میں وقت گزارنے اور ہوٹل کے سونٹنگ پول میں اپنے آپ کو بھلانے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ راحیلہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ کھفت ایڈنبرج کے مفہوم سے ضرور واقف تھی۔ شاید اس کے وجود میں بھی میری ہی طرح ایک بھری ہوئی روح مقید تھی۔ خطرہ بندی، فطرت کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر اس کی سنسنی خیزی سے محظوظ ہونا، موقع پاتے ہی تعصن اور تکلفات کی دنیا سے نکل بھاٹنا، دوسروں کو کسی خاطر میں لانا۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری بہت سی خصوصیات اس میں اور مجھ میں بڑی حد تک مشترک معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ایک عام لڑکی ہرگز نہیں تھی۔

کبھی کبھی میں شیم بیداری کے عالم میں ایک الف لیلی کی لڑکی کی شخصیت کا لانا بٹاتا رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس قسم کی لڑکی کا دنیا میں ماننا بہت مشکل ہے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس قسم کی لڑکی مجھ سے چند سو میل کے فاصلے پر اس شہر میں موجود ہے جہاں مجھے کئی بارے آچکے تھے۔

میں جب بھی راحیلہ کی طرف دیکھتا تھا میرا ذہن سوچوں کی ایسی ہی بھول بھلیوں میں پھٹنے لگتا تھا اور میری دگ وپے میں جیوتھیں نہ دیکھنے لگتی تھیں۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے حتی الامکان احتراز کرتا تھا مبادا وہ میری زندگی کی حسرت بن جائے۔

ایک اور شخص جسے آشوروں کے ادھیروں میں اس ہم سے پھولنے والے بھی سراپا ہوا تھا، کیا میں اسے حاصل کر سکتا ہوں؟ لیکن جب میں نے اپنا جائزہ لیا تو اپنے آپ کو بے حد کھٹکنا محسوس کیا۔ میں عملی زندگی کے میدان میں لڑنے والے سے داخل ہونے والا ایک نیم رسانی اور راحیلہ سا نوجوان تھا۔ میری عمر بھی کم تھی۔ ابھی مجھے غلام سلط رانستوں کا معلوم نہیں کب تک دھکے کھانے تھے۔ میرے اور اس کے درمیان بہت ہی بڑی طبع حاکم تھی۔ اسی لئے میں ہر

ہے؟ "اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا "تھوڑی سی وقت پیش آنے گی تو آنے دو۔ کپڑے بھاگ جائیں گے تو اس میں بھی لڑکی کوئی بات نہیں۔ آنے سے پہلے کچھ دیر ساحل پر دو دو بھاگ کریں گے تو کپڑے سوکھ جائیں گے اور اگر نہ سوکھتے تو آتے وقت گاڑی کی سب کھڑکیاں کھلی رکھیں گے۔ راستے میں کپڑے خشک ہو جائیں گے اور اگر نہیں بھی ہوں گے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمیں اپنی گاڑی میں اپنے ہی گھروں کو آنا ہے۔ میری اس تمام بکواس کے باوجود اگر تم سونٹنگ کاسٹیوٹ کے لئے ہمسہ ہو تو تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا اور راشد کا سونٹنگ کاسٹیوٹ تو اسی دیکھ میں، مگر چھوٹی موٹی ضروری چیزوں کے ساتھ ہی موجود رہتا ہے۔ باقی لوگوں کے لئے ہم ابھی صدر چل کر خرید سکتے ہیں۔"

"ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔ ہم تو ایسے ہی اٹھ کر چل دے تھے" کارا اپنے منگھیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ تمہارے لئے ہم چندہ کر لیں گے" راحیلہ اطمینان سے بولی۔

"بلوئیر چھوڑ دو..." کارا راپا کر جیسے فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی "اسی طرح ٹھیک ہے جس طرح تم نے بتایا ہے۔"

اس پر راحیلہ نے بازو لہرا کر مسرت بھرا ایک نعرہ بلند کیا۔ راہ چلتے ہی آدھوں نے مرکز ہماری گاڑی کی طرف دیکھا لیکن راحیلہ کو جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے گاڑی اشارت کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔ اگلے راؤنڈ لاپاؤٹ سے ہم لوگ واپس مڑے اور اسٹیشن دیکھ کر ایک بار پھر گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی اور طوفانی انداز میں ٹریفک میں راستہ بناتی ہوئی ان راستوں پر بڑھنے لگی۔ میرے لئے اجنبی تھے۔

مجموع آباد علاقوں سے نکلنے کے بعد ویران راستوں پر بھی خاصی دیر تک سفر جاری رہا اور راستے میں ایک دوسرے پر فخر سے کھنکھاتے ہوئے چلتا رہا۔ پتا تو راحیلہ نے گاڑی کی پیچ پیچہ ریشہ ٹیلوں کے قریب گاڑی لے جا دو کی اور سب نے اپنے چٹانگ لگا دی۔ نرم ریت میں ہمارے پاؤں دھنس جا رہے تھے۔ چار سو ایک عجیب سا سکوت اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ٹوکری پر

لڑوں کا ہم سا شور اور پردوں کی کچھ مخصوص آوازیں سنائی دے رہی تھیں اس کے باوجود گھیر خاموشی کا احساس ہو رہا تھا۔ کافی فاصلے پر چند کشتیاں پانی میں کھڑی تھیں اور پچھلے پرانے، پلے کچی کپڑوں میں چند بوڑھے سے بچھیرے کنارے پر بیٹھے اپنے جال مرمت کر رہے تھے۔ انہوں نے چند چھائی ہوئی جھجس سی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور آپس میں

ابنی سنی اُن سنی کرتے ہوئے بولا ”ابھی ابھی میں نے ایک نظم کہہ ڈالی ہے۔ نظم کچھ یوں ہے۔
 یہ زمیں یہ ہوا یہ فضا سب ہمارے لئے ہے
 یہ پُر سکون ساحل.....“

راحیلہ نے اسے نظم ختم کرنے کی سلت نہیں دی اور پانی میں اٹا تھرتے ہوئے چلائی ”خدا کے لئے بند کرو یہ نظم۔ اس قسم کی کم و بیش ڈیڑھ ہزار نظمیں تقریباً اسی الفاظ میں تم سے پہلے بھی بہت سے شعراء کہہ چکے ہیں اور ان میں سے بیشتر بچوں کی کتابوں میں چھپی ہیں۔ ایک تو تمہاری کھوپڑی میں مفلح نام نہیں نظموں کی فیکٹری فٹ ہے۔ اور حرمین دہلیا اور دوحہ کھنگے سے نظم باہر۔“

”میں بھی اسے بہت منع کرتی ہوں کہ اتنی نظمیں نہ کہا کرے“ نکلا راہولی ”کس شادی کی نوبت آنے سے پہلے ہی دماغ نہ چل جائے۔“

”خیر تمہارا یہ اندیشہ تو بالکل فصول ہے“ راحیلہ بولی۔
 ”نظمیں کہنے کے لئے وہ کیا دماغ استعمال کرتا ہے؟ بڑی بھولی ہو تم۔ البتہ یہ مکان ضرور موجود ہے کہ نظمیں سننے سننے تمہارا دماغ چل جائے گا۔“

میں نے محسوس کیا تھا کہ راحیلہ ابھی کا بہت ہی مذاق اڑاتی تھی عمرو نہایت ہی فراخ دل اور خوش مزاج نوجوان تھا۔ قطعاً برا نہیں مانتا تھا۔ زور نہج نہیں تھا۔ بظاہر بڑا سنجیدہ اور ظلفی باپ نظر آتا تھا مگر حقیقت جس مزاج اس میں بھی موجود تھی۔

اس نے آہ بھرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں تھجہ پانی اس کی ٹانگ میں چلا گیا۔ زوردار چھینک لے کر وہ سوسوس کرنا ہوا بولا ”راکیلہ! ایک تو تمہارے ملک میں شاعروں کی قدر نہیں۔ بہت تائدہ دی کرتے ہو تم لوگ شاعروں کی۔“

”نہیں... نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ شاعروں کی تو ہمارے یہاں بہت قدر ہے“ راحیلہ نے زور دے کر کہا ”پھر وہ بری مصوویت سے بولی“ لیکن تم شاعر ہو کیا؟“

”تم لوگوں کی سٹندیا دیکھ کر میرا پی چاہ رہا ہے کہ یہیں ڈوب مروں۔“ ابھی غوطہ لگاتے ہوئے بولا ”عد ہو گئی تائدہ دی کی“

”یہاں تو پانی کم ہے۔ ذرا آگے جا کر ڈوبا“ راحیلہ چلائی۔
 ”اور آکر مدد کی ضرورت ہو تو تم بھی ساتھ چلتے ہیں۔ ڈوبنے میں تمہاری مدد کریں گے۔“

ابنی اپنے مخصوص انداز میں تیرتا ہوا دور چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک تیراکی کا شغل جاری رہا۔ ایک بار جب ہم لہروں کی تیزی کے لاجور کلاؤ آگے تک نکلا، گھمے تو راحیلہ نے ایک

اکی کوشش میں معروض دہتا تھا کہ اس کی شخصیت میرے نہروں پر زیادہ حاوی نہ ہوئے پائے۔ اس کے باوجود یہ عالم تھا کہ اس سے میری ملاقات کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور میرا بیشتر وقت اس کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے بارے میں سوچتے..... وقت سستی اور سٹی خوابشوں سے ذہن بالکل پاک رہا تھا۔ اسے پائے کے لئے میں نہیں میری روح نکال کرتی تھی اور یہ تجربہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے بارہو میں اس کی طرف لپکے بغیر رہتا بھی نہیں تھا۔

اس وقت بھی میں اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انجین بند کر کے وہ ایک سرکش شہزادی کی سی شان سے نیچی اتری۔ ایک شیشوں کا پیشہ اس نے سیٹ کی طرف اچھال دیا۔ ب اپنے جوتے وغیرہ اتار رہے تھے۔ میں نے بھی جوتے اتارے اور جیبوں سے چیزیں نکال کر گاڑی کی سیٹ پر رکھیں اور راحیلہ نے گاڑی کو منتقل کر دیا اور چابیوں کا کچھ گاڑی کے نیچے ہی ریت میں چھپا دیا۔

اس نے مضمیں بھینچ کر دونوں بازو ہوا میں بلند کر کے یک بار پھر ظفی ریڈ انڈینز کے سے انداز میں بے معنی سانچو لایا۔ میرے سوا سب نے اس کا ساتھ دیا پھر وہ سب مویشیوں کے ایک چھوٹے سے ریزور کی طرح سمندر کی طرف دوڑا۔ میں بچکا ہٹ کے سے عالم میں ایک لمحے وہیں کھڑا رہا۔ ان پھران کی تقلید میں دوڑا اور ان سب سے آگے نکل گیا۔ یکا دو دیکرے سب نے پانی میں چھلانگ لگادی۔

کچھ گھیرے دور بیٹھے یوں ہماری طرف دیکھ رہے تھے جیسے ہم جاکچ ہیں یا پھر واقعی کسی دوسرے سیارے کی مخلوق۔ جس نے اچانک ان کی پرسکون دنیا پر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے آتے ہی سکوت میں ڈوبے ہوئے اس ساحل پر ٹکریا تھا سچی تھی۔

ابنی اپنی گھمیر کے آس پاس ہی اونٹ کی طرح گردن پانی سے نکالے تھیر رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ اپنی آنکھوں پر چپکے سے ہل ہلاتے ہوئے بہ آواز بلند بولا ”واہ... کتنے عرصے بعد طرز پر نما نا نصیب ہوا ہے...“

”یہ سمندر کا دوا دینے کی کیا ضرورت تھی؟“ راحیلہ کی کی بات کاٹتے ہوئے بولی ”تم سیدھی اور سچی بات کرنے کے لئے یوں بھی کہہ سکتے تھے۔ آہ! کتنے عرصے بعد نما سب ہوا ہے۔“

ہونٹ موٹے موٹے اور بال ہتھکھریا لے تھے۔ ان میں سے صرف ایک ہی کچھ پست قد تھا باقی چاروں دروازہ قد اور کمری جسم کے مالک تھے۔ پست قد بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ بھی گیندے کی طرح گھٹا ہوا تھا۔

انہیں اپنی طرف متوجہ پاکر انہوں نے اپنی نظروں کا ڈھیر کچھ بدل لیا۔ ان میں سے ایک نے خاصی اونچی آواز میں بھوک جس پر باقی چاروں نے ہم آہنگ ہو کر گونج دار سارو قہقہہ لگایا۔ زبان کم از کم میرے لئے اجنبی تھی اس کے باوجود مجھے اس نوجوان کا مغموم ہنسنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے لڑکیوں کے بارے میں نہایت شرمناک سا تبصرہ کیا تھا۔ میری کھوپڑی ایک لمبے کے لئے گھوٹی لیکن میں خاموش اور مختصر رہا۔

وہ پانچویں شیشے کے سے انداز میں ایک طرف کو چل دئے لیکن مڑ مڑ کر دیکھتے جا رہے تھے اور ان کا مرکز نگاہ صرف لڑکیوں تھیں۔ مجھے ”ابھی یا راشد کو تو انہوں نے گویا درخور اشتیاق نہیں سمجھا تھا۔ آہیں میں وہ کچھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے تمام اب ان کی آوازیں صحیح طور پر ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔“

وہ کچھ دور چلے گئے تو راحیلہ نے میری طرف دیکھ کر ایک مہمی سانس لی۔ میں بھی جواباً محض مسکرا کر اور ایک کڑی سانس لے کر رہ گیا۔ ابھی کسی سانس کی طرح اکڑوں بیڑ کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ہوا ”تمہارے ملک میں فوٹ فیصد مرد اب بھی اسی طرح لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہیں جیسے انہوں نے اس سے پہلے کبھی لڑکی نہیں دیکھی۔“

ہم خاموش رہے۔ کیا کہنے؟ بالآخر میں نے ہچکچاتے ہوئے انگریزی میں کہا ”نکلن ہے انہوں نے لڑکی تو دیکھی“ لیکن چار حسین لڑکیاں ایک وقت میں ایک ہی جگہ پر دیکھی ہوں۔“

”ان لڑکیاں تیرے شکر یہ سزا افضل!“ ترک لڑی جو ریا فوراً بولی۔

”شکر ہے آپ بھی بولے“ راحیلہ نے گویا اطمینان کی سانس لی ”ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید آپ کی زبان کی سرور کر لینی پڑے گی۔ شاید تاؤ سے چپک گئی ہو۔“

اب میں اسے کہتے تھا کہ مجھے انگریزی اتنی درجہ خاصی تھی لیکن بولتے ہوئے جبکہ محسوس ہوتی تھی۔ عادت تو نہیں تھی۔

ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ پانچوں نوجوان جلد ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے لیکن وہ سچے دور جا کر رہے

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”کچھ عرصہ پہلے تک یہ علاقہ اسمگلروں کی سب سے بڑی گزرگاہ تھا لیکن جب سے اوسر شپ بریکنگ کے باقاعدہ اختلاطات ہوئے ہیں اور علاقہ ایک طرح سے صنعتی سا ہو گیا ہے تب سے اسمگلروں نے راستے بدل لئے ہیں۔“

اسمگلر! راحیلہ کی زبان سے یہ لفظ سننے ہی جانے کیوں ایک لمبے کے لئے میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے ذریعہ نظر سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی اور طرف دیکھ رہی تھی۔

بالآخر ہم تھک کر پانی سے نکلے اور رست پر آ گئے۔ کاراوا بولی ”مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔“

صبح بولی ”بھوک تو سبھی کو لگ رہی ہوگی یا عزیز۔“ لگ جائے گی۔ یہ راحیلہ کی بچی ایک دم منہ اٹھا کر دوڑ پڑی۔ کھانے پینے کا کوئی بندوبست کرنے کے متعلق اس نے سوچا ہی نہیں... اور کچھ نہیں تو کم از کم کسی ہوٹل سے لےج یا کسی ساتھ لے لیتے۔“

”تم یہ سمجھ لو کہ بھوک برداشت کرنا بھی ایڈ وینچر میں شامل تھا“ راحیلہ بے پروائی سے بولی۔

”بھئی میرے لئے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں“ ابھی نے اطمینان سے کہا ”مجھے تو اگر بھوک لگتی ہے اور کھانا میر نہیں ہو تا تو میں دو سگریٹ پی لیتا ہوں“ وہ اس وقت تک گاڑی سے اپنا سگریٹ کا پکٹ نکال لایا تھا اور ایک سگریٹ ساکا چکا تھا۔ ”اسی لئے تمہاری حالت حق سے مشابہ ہوتی جا رہی ہے“ راحیلہ فوراً بولی۔ وہ ابھی کو خوار کرنے کا کوئی موقع اچھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

”سگریٹ پینے والے کو حق سے تشبیہ دینے میں کوئی مناسبت نہیں ہے“ ابھی اطمینان سے ہوا ”تمہارا خیال ہے کہ میں نے حق دیکھا نہیں ہے؟ کلنی عرصہ ہو گیا ہے مجھے تمہارے ملک میں رہے ہوئے۔“

راحیلہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ جانے کیا دیکھ کر خاموش ہو گئی اور درے حنڈ پست سے انداز میں اٹھ بیٹھی۔ وہ دھرت سیکڑے سے ایک طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی پیشانی پر غلٹیں ابھرتی تھیں۔ باقی سب نے بھی اسی سمت میں دیکھا جہاں ہر وہ دیکھ رہی تھی۔ سبھی گویا کچھ چو کہنے سے ہو گئے۔

دراصل ہمیں احساس ہی نہیں ہوسکا تھا کہ کب اور کس طرف سے وہ پانچ بیاہ قائم اور نیم خیم نوجوان وہاں آ گئے تھے اور کلنی فاصلے پر ایک ریٹیل نیلے کے قریب کھڑے پیٹہ زیادہ ہی عجیب نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے

مقبول مصنف علیم الحق کی

لازوال اور خوبصورت تحریریں
جن کو آپ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

مٹی کی امانت (۲ جلدیں) ۳۰۰/۰۰

وقت کے فاصلے ۲۲۵/۰۰

پروانہ ۱۷۵/۰۰

حج اکبر ۱۵۰/۰۰

بیلے کا سیاہ پھول ۱۵۰/۰۰

کان کن ۱۰۰/۰۰

بالائے ستم ۹۰/۰۰

امید کا دیا ۱۰۰/۰۰

جانم جان جہاں ۹۰/۰۰

دادا چوڑی اور نوڈی ۱۳۵/۰۰

مکتبہ النقیش
سرگرم بازار لاہور

فونے — ۰۰۰

اج مشورہ سا کر کے لوٹ آئے۔ انداز اب بھی چل نہی
کا تھا۔ اس بار وہ سلتے ہوئے عین ہمارے سامنے سے
زبرے۔ ان کا گویا بس نہیں چل رہا تھا کہ آنکھوں ہی
لوگوں میں لڑکیوں کو ٹھک جاتے۔ بڑی ڈھٹائی سے وہ ایک
کا سر تپا جائزہ لے رہے تھے۔ سونے سونے ہونٹوں پر
پادشت آہیز سا کھچاؤ تھا۔

اس بار انہوں نے صنفِ کثرت پر بھی ایک نظر ڈالنے
ہزمت کی تھی۔ راشد کو تو انہوں نے گویا بچہ سمجھ کر صرف
بجاری دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ البرٹ کا استغنائی سا جسم اور
ہلے ہلے دیکھ کر انہوں نے اسے بھی کوئی اہمیت نہیں دی
۔ غلابادہ اسے کوئی مرل سا بیٹھنے سمجھے تھے۔

صرف مجھے انہوں نے نظروں ہی نظروں میں تو لا تھا۔ اگر
کا بد معاشی دکھانے کا کوئی ارادہ تھا تو غالباً انہیں صرف میری
سے تھوڑی بہت مزاحمت کا خطرہ تھا۔

وہ ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر نیم دائرے میں کھڑے
کئے۔ ان میں سے دو نے بیڑیاں سا قالیں اور پے در پے کئی
مالے کر چنگی بجا کر راکھ جھاڑنے لگے۔ وہ سب یوں....
کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ہم چڑیا گھر کے چمچے میں
باتور ہیں اور وہ ٹمکت خرید کر ہمارا اظہار کرنے آئے ہیں۔
میں نے محسوس کیا کہ اب مزید خاموش رہ کر گزارا نہیں
لگتا تھا لیکن میں ابھی اٹھا ہی تھا کہ راحیلہ مجھ سے پہلے اٹھ
ان کے قریب جا پہنچی اور بڑے منسوبانہ لہجے میں وہ بولی "کیا
لوگ کہیں اور جا کر کھڑے نہیں ہو سکتے؟"

ان میں سے ایک حتی الامکان شرخ لیے اور خاصی ساف
ہی بولا "کیوں؟ کیا یہ جگہ تم لوگوں نے خرید لی ہے؟"
اس سے پہلے کہ راحیلہ کچھ کہتی ایک اور نوجوان اس کی
لپ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "فصد چھوڑو
ہذا کی بیٹی! چلو ہم تمہیں اپنے لڑے کی سیر کر کے لا دیں۔
نچر کر سر بھی بہت ہے۔"

وہ شاید ہم سب کو ہی چڑی اور بیٹی سمجھ رہے تھے۔
بلی اس نوجوان کو وہ تھلہ بہت مہکا چڑا۔ راحیلہ نے اس
بہتے ہوئے بازو پر کراٹے کا ہاتھ مارا پھر اس کے تھلے پر
کر دیکھ کر اس کا توازن خراب کرتے ہوئے یوں اسے
ہلا کر جس بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کب اور کس طرح منہ کے
نچر کر پس آکر۔ اس کی ٹانگ منہ اور آنکھوں میں ریت
پڑی۔

اس سے پہلے کہ وہ خود اٹھ پائیس نے پاؤں سے پکڑ کر
نہ اٹھا اور ایک زوردار لٹا رسید کر کے اس کے ساتھیوں

کی طرف دیکھ لیا جو چکا کر رہے تھے۔ انہیں شاید یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان کے ساتھی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بظاہر نرم و نازک نظر آنے والی اسی لڑکی نے کیا تھا جسے نابالغوں نے دوسری لڑکیوں سمیت مہم کی گزروں کی طرح اٹھا کرے جانے کا ارادہ کیا تھا۔

میری لات کھان کر ان کا ساتھی ان سے جا کر آیا اور ان میں سے دو کو ساتھ لیتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ باقی دو گویا ہوش میں آکر ایک ساتھ راحیلہ پر چبے لیکن وہ یوں ان کے درمیان سے نکل گئی کہ کوئی اسے چوم بھی نہ سکا۔ وہ دونوں آپس میں کھرا گئے اور راحیلہ نے بیک وقت ان دونوں کی گردنوں پر کراٹے کے ہاتھ رسید کیے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں پر اس وار کا کیا اثر ہوا کیونکہ میں ایک اور نوجوان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا جو ریت سے اٹھتے ہوئے اپنی داسکت کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سا چاقو نکال چکا تھا (آج لکھتے ہوئے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ تاجا نزلہ کا سوجھوہ دور نہیں تھا) اس سے پہلے کہ وہ چاقو کھول پاتا یا کھڑا ہو سکتا میں دو ڈکراس تک پہنچا اور اس کے چاقو والے ہاتھ پر پوری قوت سے ٹھوکر رسید کی۔ دوسروں کی طرح میں بھی چونک کر تنگ پاؤں ہی تھا اس لئے میری ٹھوکر سے اس کا ہاتھ تو ٹاٹھ نہیں ہوا تاہم یہی قیمت رہا کہ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گیا۔

وہ بد بخت آنکھوں کی طرح میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور میں بھی ریت پر گر گیا۔ ہمارے درمیان زور آزمائی ہونے لگی اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح میری گردن گرفت میں لے سکے۔

اسی کشمکش کے دوران میں نے ایک نہایت حیران کن منظر دیکھا۔ استخوانی جسم کا الگ الگ الہرٹ اب تک بڑی لافعلی سے کھڑا سگریٹ کے نشے لے رہا تھا گویا اس کے سامنے کوئی جھڑا نہیں بلکہ بچوں کا کھیل تماشا ہو رہا ہو۔ کارا، جو بریا اور مہربان بھی ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

میری نظر ابھی پر پڑی تو اس نے سگریٹ ایک طرف اچھالی اور اپنے مخصوص انداز میں اونٹ کی طرح ہٹکولے لیتا ہوا ایک نوجوان کے قریب پہنچا جو راحیلہ کو زیر کرنے کی کوششوں میں مصروف اپنے دوسرا سینوں کا ہاتھ پلانے کے لئے لپک رہا تھا۔ ابھی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف لیا پھر بجلی کی سی پھرتی سے اس کی کمر اپنے بازو کے حلقے میں جکڑ لی۔ اس کے سونکے سونکے سے بازوؤں کی گرفت یقیناً آہنی ٹھیکے سے کم نہیں تھی کیونکہ اس میں چھتے

ہی وہ ہٹا کتا نوجوان ذبح ہوتے ہوئے کسی بکھرے کی طرح ہوا چھانے اور پھٹنے لگا تھا۔

میری توجہ ایک لمحے کے لئے اوجھڑ گیا۔ وہ نوجوان جس نے مجھے دلوچا ہوا تھا خاصی حد تک مجھ پر غالب آ گیا۔ میں ممکن تھا کہ وہ میری گردن دوپٹے میں کا سیاب ہو جاتا لیکن خوش قسمتی سے مجھے ایک ٹائیپ کے لئے اس کی گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا اور میں نے فوراً ہی اسے اپنے ٹخنوں پر اچھال کر دور پر پھینک دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ پاتا میں اسے جا دوچا۔ کچنی کے ایک خاص حصے پر خاص انداز میں رسید کیا ہوا ایک ہی گھونسا اس کے لئے کافی رہا اور وہ بے حرکت ہو گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو میدان تقریباً صاف ہی تھا۔ دو نوجوان راحیلہ کے قدموں میں اونٹھ پڑے تھے۔ دونوں کی ٹانگیں پٹکی ہوئی سی لگ رہی تھیں اور ہوت پھٹ چکے تھے۔ ان کے چہرے خون اور ریت میں گھڑے ہوئے تھے اور گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ ابھی نے جس نوجوان کو بازوؤں کے ٹھیکے میں جکڑا تھا وہ بھی ریت پر چب پڑا تھا اور بے ہوش نظر آ رہا تھا۔ راحیلہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابھی سے پوچھا "تم نے اسے مار تو نہیں ڈالا؟"

"نہیں... بس گردوں پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا" ابھی نے سدا کر سے جواب دیا۔

پانچواں نوجوان جو قدمیں سب سے چھوٹا تھا سب سے عقلمند رہا تھا۔ اس نے ذم میں جلاہ کر مزید مار کھانے کی حماقت نہیں کی تھی اور بھاگ نکلا تھا۔ جس وقت میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بہت دور نکل چکا تھا۔ وہ نرم ریت پر جو ایسی برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا کہ میں حیران ہوئے بغیر نہ دھڑ جلد ہی وہ ایک ٹیلے کے عقب میں غائب ہو گیا۔

"ایک تو ہمیں اس قسم کے بد بخت لوگ کیس بھی چین سے تفریق ہی نہیں کرنے دیتے" راحیلہ ہاتھ جھماکتے ہوئے بولی "جہاں چلے جاؤ وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔"

"مہربان، جو بریا اور کارا بدستور ایک طرف اطمینان سے بیٹھی تھیں جیسے دھوپ سینک رہی ہوں۔ مہربان انگلی سے ریت پر کادونوں ہاتھ ہوتے بولی "تم تفریق کے لئے بیٹھ چکے بھی تو ایسی منتخب کرتی ہو... اللہ میاں کے پچھواڑے... تم خود جھگڑے کو دعوت دیتی پھرتی ہو۔ تمہاری پیشانی پر کھسکے آئے آئے حضرات! دیکھا نہ ہو کیسے نہیں آپ کو خوش آمد گاہی ہو! تم خود ایسی بکسوں پر آکر اور ساتھ ہمیں بھی لاکر

سابق راحیلہ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

راحیلہ مڑتے ہوئے بولی ”ڈرائیوگر دیر بیچے کا خیال رکھنا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں تو نہیں آ رہی۔“

”جس آگے نظر کے لئے جتنی مسافت مل چکی ہے اس کے بعد کوئی گاڑی تصادمی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی“ ابھی بولا۔

ابھی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ منسلاتی علاقے میں تو ٹریفک برائے نام ہی تھا اس لئے راحیلہ اپنی گاڑی سے ہوائی جہاز کا کام لینے کی کوشش کرتی رہی۔ مسروف سڑکوں پر پہنچ کر اس نے رفتار کچھ کم کی۔ پلازہ گاڑی ایک نہایت مشہور ہوٹل کی پارکنگ لائن میں جا کر۔

ہمارے کپڑے اس وقت تک اچھی طرح خشک ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے ٹیبلے معقول ہرگز نہیں تھے۔ جس اکیلا شاید اس ٹیبلے میں اس ہوٹل کا رخ کرنے کی بھی ہمت نہ کرتا لیکن اس وقت گروپ کی لیڈر راحیلہ تھی اور وہ جس بے فکری اور اہمیت سے گاڑی سے اتر کر ریوایلوگ ڈور کی طرف چل دی تھی اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بالکل سہولت سے یہاں آئی رہی ہے۔ چنانچہ اس کی قیادت اور دوسرے ساتھیوں کی ہماری میں مجھے بھی اندر جاتے ہوئے قطعاً جب تک محسوس نہ ہوئی۔ ہم ہوٹل کے ریستوران میں جا بیٹھے۔

اس وقت ریستوران میں کھانا کھانے والے اگلا کافی تھے۔ ان سے زیادہ تو دیر موجود تھے۔ ان سب نے بڑی انکساری سے دانت نکال نکال کر راحیلہ کو سلام کیا۔ یقیناً وہ سب راحیلہ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ہم نے ایک بڑی میز سنبھال لی۔ کھانے کے دوران بھی ایک دوسرے پر فقرہ بازی ہوتی رہی۔ راشد سب سے کم بولتا تھا تاہم اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بور ہرگز نہیں ہو رہا۔ راحیلہ اٹلین سینڈوچ کا ایک فقرہ چباتے ہوئے بولی ”ویسے خیر... آج کا ایڈیٹر بھی برا نہیں رہا۔“

”ہاں۔ اگر وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہوتے اور ہمیں اٹلے جانے میں کامیاب ہو جاتے تب تو اس ایڈیٹر میں چار چاند ہی لگ جاتے“ مصباح منہ بنا کر بولی ”قلبی ہیروئن کی طرح ہمارا تو کوئی بھائی بھی نہیں تھا کہ ہم منہ پر ہاتھ سے چھپا بنا کر زوردار آواز لگائیں۔“ ”دیر... اور ڈیڑھ سو سیل دور بیٹھا ہوا ہمارا بھائی جو اتفاق سے قلم کا ہیرو بھی ہوا“ نیکل گاڑیوں اور آئینوں کو الٹا ہوا ہم تک آن پہنچا اور اپنی بس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کا بھرتا بھارتا۔“

”تم مجھے اپنا بھائی سمجھو“ راشد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر

پہنچاؤں کو غنڈہ گردی کی اجازت دیجی ہو۔“

”دراصل میں چاہتی ہوں کہ ایسی جگہیں بھی کسی طرح نام شرفاء کے لئے تفریح کے قتل ہو جائیں“ راحیلہ گہری سنجیدگی سے بولی ”میری خواہش ہے کہ بد معاشوں میں ایسی دہشت پھیلے کہ آئندہ وہ سیدھی سادی فیملی کے بھی قریب آنے ہوئے ڈریس کے مبادا ان کی لڑکیاں جو ڈو کرانے کی ماہر ہوں، مبادا ان کے مرد بھی ہڈی پھلی ایک کرنے میں ممدارت رکھتے ہوں۔“

”منہ دھو رکھو اپنا“ مصباح چلے کئے سے انداز میں بولی۔

”تصادمی یہ خواب بھی پورا نہیں ہو گا۔ اکیلا چٹا کیا بھاز پھوڑے گا۔ تم اور دیر انوں سے غنڈہ گردی ختم کرنے کا ارمان لئے پھر رہی ہو اور ادھر عالم یہ ہے کہ بھرے گڑے بازاروں میں غنڈے کزور اور مجبور لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں، بے عزت کرتے ہیں۔“

”میرا جہاں تک بس چلے گا میں تو وہیں تک کر سکتی ہوں۔“

راحیلہ بال جھٹک کر بے نیازی سے بولی۔

ابھی ایک نئی سرگرت ساگتے ہوئے بولا ”اب ہمیں ہمیں کھڑے ہو کر پاؤں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ وہ نو جوان دوڑتا ہوا جس طرف گیا ہے مجھے غصہ ہے کہ اس طرف اس کا کوئی قبیلہ وغیرہ نہ رہتا ہو... وہ دھمکھو... پھیرے بھی دوڑتے ہوئے اسی سمت میں جا رہے ہیں۔ شاید ان کا تعلق بھی اسی قبیلے سے ہو۔ کہیں بہت زیادہ تعداد میں لوگ اسلحہ وغیرہ لے کر نہ آجائیں۔ بستر کی سے کہ ہم بھاگ چلیں۔“

”کھوپڑی خالی ہونے کے باوجود کبھی کبھی تم بڑی عقل کی بات کر جاتے ہو“ راحیلہ بولی۔ پھر اس نے مڑ کر سب کو اشارہ کیا ”آؤ ساتھیو! اس سے پہلے کہ ہمیں چٹنی بنانے کی کوشش کی جائے بستر کی سے کہ ہم ڈوم دبا کر بھاگ لیں۔“

مصلح پر ایک چٹنی سی چار دیواری اور اس کے وسط میں ایک چیجر رہا ہوا تھا۔ ابھی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”جانے سے پہلے ہم ان بے ہوش آدمیوں کو اس چیجر میں نہ لٹا جائیں۔“

”عقل کی صرف ایک بات کر کے فوراً ہی اپنی اوقات پر اٹکے اور کرنے لگے وہی امتوں والی باتیں“ راحیلہ گویا جل کر بولی ”بھائی! یہ لوگ ہمارے اعلیٰ انکشاف سے متاثر ہو کر بعد میں ہمیں شکر دینے کا خط نہیں لکھیں گے۔ یہ جہاں پرے ہیں انہیں وہیں پرے رہنے دو اور چلو۔“

ابھی لمبے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا نہایت سداوتندی سے ہمارے ساتھ ہولیا۔ چند لمبے بعد ہماری اسٹیشن دیکھن دھول اڑاتی ہوئی واپس سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ میں حسب

بڑے غلوں سے کہا۔

ایک لمحے کے لئے میری دھڑکن تیز کر دی۔

"اتنی انکساری اور کسر نفسی بھی کس کام کی جو مجھ جیسے پینڈو کا دماغ خراب کر دے" میں نے کہا اور فوراً ہی پوچھ لیا۔

"سمجھتی ہیں نا آپ... کہ پینڈو کسے کہتے ہیں؟"

"کیوں نہیں سمجھتی" وہ گویا میری سادگی پر ہنسنے ہوئے بولی "خاندانی طور پر ہم خود بہت بڑے پینڈو ہیں۔ میرے والد کا تعلق شرقی پنجاب کے ایک بہت چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے" میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ "گویا وہی حاملہ ہو گا کہ... خوب گزرے گی جو مل بینہیں گے پینڈو دو۔"

"مصرغ دزن سے گر گیا ہے" وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ آپ اس طرح قریب کرتے۔ خوب گزرے گی جو مل بینہیں گے دستانی دو۔"

"گویا آپ کو مصرعوں کا دزن بھی درست کرنا آتا ہے؟" میں واقعی حیرت زدہ رہ گیا۔ اس چھوٹی سی عمر میں آپ کو کیا کچھ آتا ہے؟

"دیکھتے جا بیٹے" وہ اٹھنے ہوئے بولی "دیپے پر سنبھل تہ کہ میں کچھ ایسی چھوٹی بھی نہیں، انیس سال عمر ہو چکی ہے میری۔"

"حیرت ہے!" میں نے بھی دوسروں کے ساتھ اٹھنے ہوئے کہا "میں تو آپ کو سترہ اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں سمجھ رہا تھا۔"

"میری عمر، البتہ، شخصیت، خیالات اور نظریات کے بارے میں اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

میں خاموش رہا۔ ایک بار پھر میرا یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ میں جب سے اس سے ملا تھا میرا زیادہ تر وقت اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرا تھا۔

والہی میں راحیلہ نے سب کو باری باری ان کے گھروں پر اتارا اور پھر اپنے گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ بولی "اب میں ذرا اپنا بیوروٹنی کا کچھ کام کروں گی۔ اس کے بعد مجھے ایک پروفیسر صاحب کے گھر جانا ہے۔ رات کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد تاش کی محفل ہٹے گی۔"

میں تیسرے دوم کی طرف جانے کے لئے مڑا۔ دلچسپ مجھے یاد آیا کہ اب تک مجھے قاسم خان کو فون کر کے اطلاع دینی چاہیے تھی کہ میں کلاں موجود ہوں۔

"تمہیں؟" منہاج نے استہزائیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "تو کتنا شوق ہے تمہیں بھائی بننے کا" بھروسہ لہندی سانس لے کر بولی "تمہارا قصور نہیں۔ تمہاری عمر ہی ایسی ہے۔ اس عمر میں لڑکوں کو بڑا شوق ہوتا ہے لڑکیوں کو بس

بیلے کا لیکن تم جیسے بھائی کا دانا ہونا تو براہِ ری ہے۔ اب وہیں ساحل پر اتنی اٹھانچ ہوئی مگر بحال ہے جو تم نے اٹھائی بھی بلانی ہو ہمارے ساتھ ہی کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھے رہے۔"

راشد کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے کھیاہٹ کی سرخی آئی لیکن پھر وہ گویا ڈھیٹ بن کر راحیلہ کے کندھے پر چبھکی دیتے ہوئے بولا "مجھے لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا شیر جو لڑا ہوا حمیدان میں۔"

منہاج گویا میری معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے میری طرف مڑتے ہوئے بولی "ان بھائی بن کا حاملہ بھی انت قسم کا ہی ہے۔ میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں اور بچپن سے ہی ان کا یہ عالم ہے کہ راشد کا کسی لڑکے سے جھگڑا ہو جاتا تھا تو یہ روتا ہوا سیدھا راحیلہ کے پاس جاتا تھا کہ فلاں لڑکے نے مجھے مارا ہے اور راحیلہ جاکر اس لڑکے کی پٹائی کیا کرتی تھی۔"

راہیلہ اس گفتگو میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے چنگی بجا کر دھڑ کو بلایا اور حکم دیا "مل لٹاؤ" دھڑ ایک نوٹدر میں لپٹا ہوا اہل تھالی میں رکھ کر لے آیا تو

میں نے اپنی دانست میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے اوائلی کے لئے جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور پلیٹ اپنی طرف کھسکانے کی کوشش کی۔ راحیلہ اور منہاج جانے کیوں ہنس دیں۔ راحیلہ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مجھے مل اٹھانے سے روک دیا۔ اس گرم دگدگاز ہاتھ کے لمس سے میں جھرمجھری سی لے کر رہ گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہی وہ ہاتھ تھا جس نے دو خرمند فوجیوں کی شکیں بگاڑی تھیں۔

"آپ شاید بھول گئے ہیں کہ آپ ہمارے سہماں ہیں" راحیلہ بولی "دیتے تو خیر ہم بوقت ضرورت سہماؤں سے بھی چہرہ وصول کر لیتے ہیں لیکن فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

دھڑ اس کے لئے قلم بھی لایا تھا۔ راحیلہ نے بڑے اطمینان سے مل پر دستخط کر دیے اور دھڑ مل واپس لے گیا۔ راحیلہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "میں آپ کی اس حقیر غلامہ کے سانس چلے ہیں" جس شیریں لمبے میں اس نے آپ کی اس حقیر غلامہ، گما تھا اس نے جانے کیوں

دھڑ اس کے لئے قلم بھی لایا تھا۔ راحیلہ نے بڑے اطمینان سے مل پر دستخط کر دیے اور دھڑ مل واپس لے گیا۔ راحیلہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "میں آپ کی اس حقیر غلامہ کے سانس چلے ہیں" جس شیریں لمبے میں اس نے آپ کی اس حقیر غلامہ، گما تھا اس نے جانے کیوں

دھڑ اس کے لئے قلم بھی لایا تھا۔ راحیلہ نے بڑے اطمینان سے مل پر دستخط کر دیے اور دھڑ مل واپس لے گیا۔ راحیلہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "میں آپ کی اس حقیر غلامہ کے سانس چلے ہیں" جس شیریں لمبے میں اس نے آپ کی اس حقیر غلامہ، گما تھا اس نے جانے کیوں

دھڑ اس کے لئے قلم بھی لایا تھا۔ راحیلہ نے بڑے اطمینان سے مل پر دستخط کر دیے اور دھڑ مل واپس لے گیا۔ راحیلہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "میں آپ کی اس حقیر غلامہ کے سانس چلے ہیں" جس شیریں لمبے میں اس نے آپ کی اس حقیر غلامہ، گما تھا اس نے جانے کیوں

دھڑ اس کے لئے قلم بھی لایا تھا۔ راحیلہ نے بڑے اطمینان سے مل پر دستخط کر دیے اور دھڑ مل واپس لے گیا۔ راحیلہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "میں آپ کی اس حقیر غلامہ کے سانس چلے ہیں" جس شیریں لمبے میں اس نے آپ کی اس حقیر غلامہ، گما تھا اس نے جانے کیوں

میں نے اپنے لیے میں حتی الامکان محاسن سموتے ہوئے کہا۔
 "میری زندگی میں آپ پہلی اور شاید آخری خاتون ہیں جنہیں
 میں نے جب بھی دیکھا ہے خاموش ہی دیکھا ہے۔"
 حشرم نہیں نے ایک بار پھر میرے اعصاب کو گھمگھایا۔
 "میں بلا ضرورت بولنے کی قائل نہیں۔" اس نے پیلے سے
 زیادہ شیریں لہجے میں کہا پھر نالباؤہ بخیدہ ہوتے ہوئے بولی۔
 "کیا آپ کراچی میں سینہ واحد سے مل چکے؟"

مجھے ایک بار پھر حیرت کا خاصا زور وار تھکا ہوا داشت کرنا
 پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میری کراچی میں موجودگی بھی اس کے علم
 میں نہیں ہوئی چاہئے تھی جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ قاسم
 خان نے مجھے کراچی میں سینہ واحد سے ملنے کی ہدایت کی تھی۔
 مجھے ایک چھوٹا سا پکٹ جس پر ایک قسم کی بیل بھی لگی ہوئی
 تھی سینہ واحد کے حوالے کرنا تھا اور کچھ مشکوک کرنی تھی۔ وہ جو
 بھی جواب دیتا اسے قاسم خان تک پہنچاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ
 اس معاملے سے میرے اور قاسم خان کے علاوہ کوئی واقف
 نہیں تھا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ یہ بات صرف میرے اور خان
 صاحب کے درمیان ہے میڈم!" میں نے ہنچکاتے ہوئے کہا
 "بے شک" وہ ماتحت سے بولی۔ "یہ بات آپ دونوں
 کے ہی درمیان ہے۔ مجھے اس کا کوئی سرپر نہیں معلوم۔ اور
 نہ ہی میں معلوم کرنا چاہتی ہوں مجھے تو خود ہی خان صاحب کہہ
 مکے تھے کہ اگر ان کی عدم موجودگی میں آپ کا فون آجائے تو
 پوچھ لوں کہ آپ سینہ واحد سے مل چکے ہیں یا نہیں۔"
 "اوہ..." میں نے اطمینان کی سانس لی۔ "آپ انہیں بتا
 دیجئے گا کہ آج تو کراچی پہنچے ہوئے مجھے صحیح معنوں میں پہلا ہی
 دن ہے۔ ایک آدھ دن میں مل لوں گا اور اس کے بعد دوبارہ
 فون کروں گا۔"
 "بہت بہتر۔"

"احتیاطاً آپ میرا فون نمبر نوٹ کر لیجئے" میں نے کہا
 اور فون نمبر اسے نوٹ کرانے کے بعد خدا حافظ کہہ کر سلسلہ
 منقطع کر دیا۔ ریلیور رکھنے کے بعد جانے کیوں میں دیر تک
 اس عورت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس میں کوئی عجیب بات
 ضرور تھی بلکہ بہت سی باتیں عجیب تھیں۔ آج اس کے لیے
 نے بھی مجھے چڑھایا تھا۔ اپنے گھر میں مہنگوں کے دوران
 اس نے کبھی صحیح طور پر نظر اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا
 تھا لیکن آج سیکڑوں میل دور سے فون پر بات کرتے وقت
 اس کا لہجہ بے حد صبرانہ تھا نہ جانے کیوں؟
 بالآخر اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر میں نے اپنا

"راہیلہ! مجھے لاہور ایک فون کرنا ہے" میں نے ہنچکاتے
 ہوئے کہا۔

"تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" وہ بڑی حیرانی سے
 لہ "آپ کے کمرے میں ایک فون کا ایکسٹینشن موجود ہے۔"
 سکران۔

اپنے کمرے میں ایکسٹینشن میں بھی دیکھ چکا تھا۔ میرا
 نقد راہیلہ سے یہی تصدیق کرنا تھا کہ میں اسے استعمال
 کر سکتا ہوں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے غسل کر کے لباس
 بدل کر ایلاور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ باہر آنے سے
 مل فون پر قاسم خان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔
 تاہم ایک انتہائی حشرم آواز نے مجھے بتایا کہ قاسم خان گھر پر
 بند نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی پوچھا "آپ محمد افضل بول
 رہے ہیں نا؟"

میں حیران رہ گیا۔ اتنی حشرم آواز والی کسی ہستی کے لئے
 ای آواز اتنی شناسا کب سے ہو گئی تھی کہ فون پر بھی پہچان لی
 تھی؟

"جی ہاں" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا "اور آپ
 ان ہیں؟"

ایک حشرم نہیں نے میرے کانوں میں رس گھولا "حیرت
 باب نے مجھے پہچان نہیں۔ اور قیاس لگانے کی کوشش بھی
 لی۔ میں مسخر خان ہوں۔"

"اوہ...." میں نے ایک گہری سانس لی بلاشبہ اس عورت
 کا آواز ابھی بے پناہ ڈر و بھرت تھی۔ میں نے اسے چند ایک
 تھوکانے کے گھر میٹنگ کے دوران بیٹے دیکھا تھا لیکن وہ
 شہنشاہ لاہوری اور خاموشی سے بھٹی رہتی تھی بلکہ ہر بار
 مائیراں ہوتا تھا کہ اگر اسے اسی طرح لاہوری اور خاموشی
 تو وہ مہنگوں میں بیٹھتی ہی کیوں تھی؟ شرف سے اس کے
 تکی کے بارے میں تو دیر امت جان لینے کے بعد میرے ذہن
 میں اس کا تصور ایک ایسی عورت کا تھا جو بہت جھٹکے کے بعد
 اگر اپنی منزل پر کامیابیت آسودگی و سکون اور پاکبازی سے
 بل طرف تھیں سیٹ زندگی گزار رہی تھی جس کی ایک
 امت یہ تھی کہ قاسم خان اس کی خوشنودی کی خاطر گھر میں
 لے کے سامنے شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا بلکہ گھر میں اس
 نے شراب نوشی کا کوئی بندوبست ہی نہیں رکھا تھا۔ گردہ کے
 کارکن کی میٹنگ کے دوران بھی کافی پاجامے وغیرہ کا دور پیتا

"آواز سے نہ پہچانتے میں میرا زیادہ تصور نہیں میڈم!"

میں سکتی بھی نہیں آیا ہوتا۔ میں اپنے اہم معاملات اسی وقت طے کرتا ہوں۔ آپ میری سیکرٹری کو اپنا ایڈریس لکھوا دیں۔ صبح میرا ڈریسنگ روم آپ کو آپ کی قیام جگہ سے ملے گا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کتابک کی سی آواز سنائی دے اور ایک لمحے کے سکوت کے بعد سیکرٹری کی آواز ابھری "اپنا ایڈریس لکھوا دیجئے۔" میں نے بادل ناخواست ایڈریس لکھوا دیا۔

.....○.....

دوسری صبح جلد اٹھنے کے لئے میں ٹیبل کھانک میں الارم لگا کر سویا تھا۔ الارم بجنے پر میں اٹھ نکلیا لیکن تیار ہونے میں بھر بھی دیر لگ گئی۔ اس وقت میں جوتے پہن رہا تھا جب اگلے زائد کے ملازم نے آکر مجھے بتایا کہ ایک گاڑی مجھے لینے کے لئے ڈرائیو دے میں کھڑی ہے۔

میں جب عقبی دروازے سے گزر کر چکر کائنات ہوئے عین کی طرف جا رہا تھا تو میں نے راجیو کو ٹریک سوٹ پہنے دروازے اور جوڑو کرائے کی مشق کرتے دیکھا۔ وہ ہوا میں اتنی ہلندی تنک فلپا بیاں کھا رہی تھی کہ دیکھنے والا بے اختیار دل قہقہے لگے۔ مجھ پر نظریاتی تو وہ ایکشن ترک کر کے دروازے کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "یہ آپ کو کس کی گاڑی لینے آئی ہے؟" اس کی سانس پھولی ہوئی نہیں تھی، صرف معمولی سا ارشاد تھا آواز میں گونج رہا تھا۔

"سینٹ واحد کی۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "سینٹ واحد کو آپ سے یا آپ کو سینٹ واحد سے کیا کام پڑ گیا؟" اس نے چپکلیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ میری دھڑکن قدرے تیز ہو گئی۔ "آپ جانتی ہیں سینٹ واحد کو؟" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"افضل صاحب! " وہ گرمی سنجیدگی سے بولی۔ "ہماری فیملی تقسیم کے بعد سے ہی یہاں آباد ہے۔ تمہارے بہت لوگوں کو تو ہم جانتے ہی ہیں۔"

"بس ان سے تمہارا سا کاروباری مسئلہ بند رہا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو تو معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ وہ کتنے بڑے ایکسپورٹرز ہیں۔"

اس نے آنکھیں میں سرلا دیا۔ بولی کچھ نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی بھی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے مڑی اور لان کے ایک گوشے میں جا کر اچھل کود کرنے لگی۔

میرا دل کچھ بچھ سا گیا۔ میرے شعور کے کسی دور انداز

بیک ٹول کر ایک چٹ نکلی۔ اس پر کچھ فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ میں نے سینٹ واحد کے گھر کا نمبر ڈاکل کیا۔

"سینٹ واحد کی رہائش جگہ۔" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے ٹیلیفون پر غیروں کے سے لہجے میں کہا۔ "فرمائیے آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری کل کسی گھر سے نہیں بلکہ ٹیلیفون ایکسچینج سے ریسرو کی تھی ہے۔

"سینٹ واحد سے۔" میں حتی الامکان پروتھار لہجے میں بولی۔ "میں ان کی سیکرٹری سے ملتا ہوں۔ وہی سینٹ صاحب سے آپ کی بات کرا سکیں گی۔" اس شخص نے کہا اور فون پر کلک کلک کی آواز سنائی دینے لگی۔

"خدا یا! یہ کس قسم کا آدمی ہے جس نے گھر پر بھی سیکرٹری رکھی ہوئی ہے؟" میں نے سوچا۔ اسی لمحے دوسری طرف سے ایک خوش گوار نسوانی آواز سنائی دی۔ "مئی فرمائیے؟" میں نے اپنی درخواست کو برائی تو اس نے گویا میرا انٹرویو لیتا شروع کر دیا۔ میں کون ہوں، کس سلسلے میں سینٹ واحد سے بات کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

"بی بی" میں نے قدرے آہستہ کہا۔ "آپ سینٹ صاحب سے فقط اتنا کہہ دیں کہ لاہور سے سینٹ قاسم کا آدمی آیا ہے اور کاروباری سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اس کے بعد جلد ہی سینٹ واحد سے میرا رابطہ ہو گیا۔ اس

نے بغیر کسی تعارف کے یوں سرسری انداز میں خیریت دریافت کی جیسے اسے جلدی کیس جانا ہو۔ مجھے قاسم خان نے بتا دیا تھا کہ اس بات کا تو فی امکان ہے کہ سینٹ واحد کے فون ٹیپ ہوتے ہوں اس لئے میں نے حتی الامکان محتاط لہجے میں کہا۔

"سینٹ صاحب! پچھلے ماہ آپ لاہور تشریف لائے تھے تو ایک وزر میں سینٹ قاسم خان نے آپ سے ایک نئے آنکھ کی ایکسپورٹ کا ذکر کیا تھا اور آپ نے اس میں دلچسپی ظاہر کی تھی میں اسی سلسلے میں آپ سے مناجاہت ہوں۔ ٹھونہ بھی ساتھ لایا ہوں۔ سینٹ قاسم کو اصل میں نئی منڈیوں کی تلاش ہے اور اب وہ آپ جیسے بڑے لوگوں کا تعاون یا پارٹنرشپ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔"

دوسری طرف ایسا سکوت طاری رہا کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید سینٹ واحد نے سلسلے منقطع کر دیا ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی تصدیق کرتا سینٹ کی آواز سنائی دی۔ "آپ کل علی الصبح میرے دفتر میں آجائیے۔" اس کا لہجہ ہر تاثر سے عاری تھا اور وہ کچھ انگریزی انگریزی سی اردو بول رہا تھا۔ "میں تو تقریباً آٹھ بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ اس وقت میرے اسٹاف

میں ذرا نیو رکی رہشالی میں ایک لفٹ تک پہنچا۔
 ذرا نیو رلا بی بی میں رکے ہوئے لفٹ ہوائے کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے مودبانہ لہجے میں بولا۔ ”یہ آپ کو سیٹھ صاحب
 کے دفتر تک لے جائے گا۔“
 ”آئیے آئیے سر!“ لفٹ آپرٹر اٹھاری سے دانت
 ٹکالتے ہوئے بولا۔ اس وقت عمارت میں اکاؤنٹانٹوں کی آتے
 جاتے نظر آرہے تھے۔

سیٹھ واحد کا دفتر چھٹی منزل پر تھا اور نیا پورا فلوری اس
 کے پاس تھا۔ لفٹ آپرٹر مجھے دروازے پر پہنچا کر چلا گیا۔
 دروازے کی خوبصورت باب پر ہاتھ رکھتے وقت میرے دل کی
 دھڑکن معمول سے کچھ تیز ہو چکی تھی۔ میں اس شخص سے
 ملنے جا رہا تھا جو ہماری مخصوص دنیا میں ایک انسانی کردار کی
 طرح مشہور تھا۔ اس کے گرد اسٹے انسانوں اور کمپنیوں کا جال بٹا
 ہوا تھا کہ اصل شخصیت کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ معلوم
 نہیں ان انسانوں اور قسے کمپنیوں میں سباز آرائی کس حد
 تک تھی۔ سیٹھ واحد کے بارے میں بہت کچھ مجھے اپنے طور
 پر معلوم تھا اور بہت کچھ قاسم خان نے مجھے بتا کر بھیجا تھا۔ قاسم
 خان ہماری نظر میں بہت بڑا دولت مند آدمی تھا ہارمیک ہاں
 لیکن سیٹھ واحد... کا ذکر وہ یوں کرتا تھا جیسے کوئی غفلت مکتب
 کسی بہت بڑے استاذ کی بات کر رہا ہو۔ میرے ذہن میں اس کا
 خاکہ بے حد متاثر کن تھا۔

دروازہ کھول کر میں نے اندر قدم رکھا تو خود کو ایک طویل
 و عریض ہال میں پایا۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک خوبصورت
 ریسپشن کاؤنٹر تھا جس پر تین ٹیلی فون سیٹ رکھے ہوئے
 تھے۔ ہر ایک کا رنگ اور ساخت دوسرے سے مختلف تھی۔
 اسی کاؤنٹر سے بائیں ایک اور چھوٹا سا کاؤنٹر تھا جس کے عقب
 میں چھوٹا سا داخلی ایلیپٹنگ کا بورڈ نصب تھا۔

ہال میں دونوں طرف شیشے اور پائانی روڈ کی دیواروں سے
 چھوٹے بڑے کیمین بنے ہوئے تھے جن میں میزس کریاں
 اور دیگر تمام دفتری لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ہال کے اختتام پر
 سامنے تین دروازے نظر آ رہے تھے جن پر پتیلی کی نیم پتیلیں
 چمک رہی تھیں۔ ہال میں کہیں بھی کسی نشست پر کوئی بھی
 کارکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً ابھی آئے کا وقت نہیں ہوا تھا
 ہال کے اختتام پر تینوں دروازے بند تھے تاہم ایک

دروازے پر تھری پیس سوٹ میں ایک ترمند اور دروازہ شخص
 کھڑا تھا۔ سوٹ اس کے مضبوط اور ورزشی جسم پر کچھ چھٹا
 بیٹھا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پختہ العمری تھا لیکن اس کی
 آنکھوں میں ہلاکی چمک تھی۔ وہ جیسے میرا ہی خطر تھا اور جیسے

نوٹے میں خطرے کی مدھم سی ٹھنسی بج رہی تھی۔ آج دوسری
 مرتبہ مجھ سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ پرسوں میں جب سیٹھ
 چاہتا تھا کہ میں کی میز پر انکل زائدہ سے مجھ سے خیرے کا ردبار
 لے بارے میں پوچھ لیا تھا اور میں نے فوراً گھڑا گھڑا جواب
 لے دیا تھا۔ اسپورٹ ایکسپورٹ۔۔۔ لیکن جب انہوں
 نے پوچھی سرسری سے انداز میں ٹائیکون کی ساریوں پر
 بیٹھ کے بارے میں پوچھا تھا تو میں گڑبڑا گیا تھا اور اب میں
 نے راجیلہ کے سامنے سیٹھ واحد کے ہاں جانے کی بات کر دی
 تھی۔ انسان لاکھ چالاک اور محتاط ہو لیکن قدرت جب اس
 سے غلطی کرا چاہتی ہے تو اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی غلط
 بات نکل اوتی ہے۔

میت کی طرف جاتے وقت میں یہ اندازہ لگائے کی
 کوشش کر رہا تھا کہ میری ان میسم سی غلطیوں سے مجھے کیا
 نقصان پہنچ سکتا ہے؟ فوری طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں
 ذرا نیو دی پریشان ہو رہا تھا۔ میں شاید انکل زائدہ اور راجیلہ کے
 طرز عمل کے جو معانی اخذ کر رہا تھا وہ میرے اپنے ہی اندرونی
 ذوق کی پیداوار تھے۔ چور کی دھاڑ میں تنکا والا معاملہ تھا۔
 ضروری نہیں تھا کہ انکل زائدہ یا راجیلہ کے دل میں میرے پیشے
 کے متعلق کوئی شک پیدا ہوا ہو۔

میں ذرا نیو دے میں پہنچا تو گاڑی دیکھ کر ایک بار تو میری
 آنکھیں چند حیا نکلیں۔ وہ گہرے سرخ رنگ کی ایک نیم چم
 کرتی سرخ سرسبز تھی جس کا پورڈی ذرا نیو ہاں کھڑا میرا
 انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ٹائی کی نگہ درست کی اور خواہ مخواہ
 لکھ لکھ کر ٹھکانا صاف کرتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھا۔
 ذرا نیو نے سلام کر کے لپک کر میرے لئے دروازہ کھولا اور میں
 بچل نشست پر جا بیٹھا۔

گاڑی کیا تھی؟ آرام و آسائش کے بہت سے انتظامات
 سے آراستہ گویا ایک چھوٹا سا گھر تھا جو سڑکوں پر پھولے لے
 رہا تھا۔ باہر کی آوازیں اندر نہیں پہنچ رہی تھیں اور اس کے
 اپنے انجن کی آواز سوتی ہوئی ملی کی خیرا بہت سے مشابہ تھی۔
 کچھ دیر بعد گاڑی غالباً شہر کے مرکزی علاقے میں جا پہنچی۔
 میں سڑکیں زیادہ چھڑی نہیں تھیں اور ہر جگہ گاڑیوں کا
 جھوم تھا ہر سڑک کے دونوں طرف بلند دیوار عمارتیں سر
 اٹھائے کھڑیں تھیں اور یہ سب مرکزی دفاتر معلوم ہوتے
 تھے۔ بالآخر گاڑی ایسی سی ایک خوبصورت اور نو تعمیر شدہ
 عمارت کی پارکنگ لائٹ میں داخل ہوئی اور آہستہ آہستہ
 گہری ہوئی ایک ایسی جگہ پر جا کر جو غالباً صرف اس کے لئے
 تھیں۔

ناظر داریت بھی نہیں کر سکوں گا۔ آپ کی میزبانی مجھ پر اوصار دی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم وقت ضائع کے بغیر ہی نام کی بات کر سکیں گے۔" میں نے اپنا ہریف کیس میز پر رکھا اور ہریف کیس سے ایک چھوٹا سا پکٹ نکال کر میں نے.... ہر پر رکھ دیا۔ "یہ ہے نمونہ۔"

"مجھے معلوم ہے کہ مال اچھا ہی ہو گا۔" وہ پکٹ کی طرف دیکھتے بغیر بولا۔ "لیکن میں چند باتوں کی وضاحت کر دوں تو بہتر ہو گا۔" اس نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی پوری شخصیت میں قابل ذکر آنکھیں ہی تھیں۔ موٹی موٹی اور گہری سیاہ آنکھیں۔ ان آنکھوں کی تہ میں جیسے کوئی چیز دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔ دھیمی دھیمی آنچ تھی ان آنکھوں میں شاید یہ کسی جذبے یا کسی لگن کی آنچ تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لئے بچت کی طرف دیکھتے ہوئے غالباً کچھ سوچا اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔
"کوئین امیروئن اور دیگر منشیات کی مارکیٹ تو بہت اچھی ہے لیکن تاج کل سیری دلچسپی اس طرف بہت کم ہے اور اگر مجھے مال کی ضرورت بھی ہو تو میرے اپنے وسائل کچھ کم نہیں۔ مال کی سب سے زیادہ آمد سرحدی علاقوں کی طرف سے ہے اور ہر سرحدی شہر میں میرے ٹھکانے اور میرے آدمی موجود ہیں۔ لاہور میں بھی میرا خلاصہ بڑا اڈا موجود ہے۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے کسی قسم کے تعاون یا پارٹنرشپ کی ضرورت نہیں۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے جیسے لمحے میں کہا۔ "لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ نے دلچسپی خاطر کی تھی؟"

"ہاں" اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ملایا۔
"میں یہی بتانے لگا تھا۔ دراصل اس پارٹی میں قاسم خان صاحب تھے اس محبت اور غلوں سے پیش آئے تھے کہ میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں مسٹر افضل کہ میں محبت، غلوں اور احترام کا بھوکا ہوں۔ جب کوئی شخص سے محبت یا غلوں سے پیش آئے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے لئے کچھ کروں۔ محض اسی لئے میں نے قاسم خان کو تعاون کا اشارہ دیا تھا۔"

"گویا اب آپ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں؟" میں نے تدریے جھینٹے ہوئے لمحے میں کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ ایک بار پھر مسکرایا کہنیت کو منتقل کرنا چاہتا تھا۔ "میرا غمسر کر دو سرے کے مطلوبہ انداز کی طرف آتا تھا۔"

"مجھے ان لوگوں سے مراسم برحانے کا شوق ہے جو مجھ

اسلام کے نامور مجاہدین قمر تسکین 50/-
اسلام کی نامور خواتین قمر تسکین 40/-
سومسلمان مشاہیر قمر تسکین 75/-
ملک ملک کی عورتیں قمر تسکین 35/-

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

سے عزت سے پیش آئیں۔" وہ سلسلہ کلام جوڑتا ہوا بولا۔
"ویسے بھی صاحب کیا پتا زندگی میں کون کس وقت آپ کے کام آجائے۔ اس لئے میں بعض اوقات دوسروں کی خاطر ایسے کام بھی کر لیتا ہوں جن میں مجھے.... کوئی فائدہ نہیں ہوتا یا برائے نام ہوتا ہے۔ میں اپنی شامانیوں اور اپنے دساک سے قاسم خان کو فائدہ پہنچانے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے عوض میں اس سے کچھ مانگوں گا نہیں۔ اگر وہ خود مجھے کچھ دینا چاہے گا تو اسے میں اس کی نوازش سمجھوں گا۔" اس کے لمحے میں غضب کی انکساری تھی۔ بڑے طریقے اور سلیقے سے وہ گفتگو کو اس موڑ تک لایا تھا۔ میں اس کے انداز سے متاثر ہونے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے بعد شرائط، طریق کار اور دیگر معلومات بری عمدگی سے اور بہت کم وقت میں طے پا گئے۔ میں اپنے آپ کو اس قسم کی باتوں کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ مجھ میں اپنے میدان کے "بڑے" لوگوں سے معاملات طے کرنے کی اہلیت بھی موجود تھی۔

میں جاننے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے رخصت کرنے کمرے کے دروازے تک آیا اور دروازے پر کھڑتے ہوئے ایک شخص سے مخاطب ہوا۔ "دوسری گاڑی کے ڈرائیور سے کہنا انہیں واپس چھوڑ آئے۔"

میں واپس گھر پہنچا تو راجیو ڈانگ روم میں بیٹھی اکلی ہاشاکر رہی تھی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور سر کی جنبش سے اپنے متقابل پیشہ کا اشارہ کیا۔ میں چند چکا جب بھی وہ خاموش ہی رہی اور یوں سر جھکا کر ہاشاکر نے نئی نیسے میری موجودگی سے بے خبر ہو چکی ہے۔

مجھے اس کے انداز میں بے اعتنائی کی جھلک محسوس ہوئی اور جانے کیوں اس احساس سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اپنی

وہ ایک بار پھر بے ساختہ ہنسے۔ "لڑکیوں کو چاند سے تشبیہ تو بہت سے لوگ دیتے آئے ہیں لیکن آج پہلی بار کسی لڑکی کے لئے سورج کی تشبیہ سنی ہے.... اور عجیب اتفاق ہے کہ وہ لڑکی میں ہوں۔"

"میرے نزدیک حسن ہی نہیں اور بھی بہت سی خوبیاں کی علامت سورج ہے۔ چاند نہیں۔" میں نے کہا "چاند مجھے یاسیت کی علامت لگتا ہے۔ جو ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی دیتا ہے برسات کی سونے راتوں میں۔"

"واہ.... یہ تو معرکہ ہو گیا۔" راحیلہ گویا محفوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"اتفاق سے یہ ایک مصرعہ ہی ہے لیکن شاعر نے یہ جگہ کے لئے کہا تھا۔ میں نے چاند پر جڑ دیا ہے۔" میں نے بیلا "بہر حال سلیقے سے جڑا ہے۔" اس نے گویا مجھے داؤ دی۔

"کاش مجھے اور بھی باتیں کہنے کا سلیقہ ہو آ۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مثلاً....؟" اس نے شریر نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا "اس دوران میں ملازم نے میرے لئے ناشتا لگا دیا تھا۔ وہ ناشتا لگا کر جا چکا تو میں نے جیسے لمبے میں کہا۔" میں نے کہا تاکہ اگر سلیقہ ہو تو آتم بھی بات کرتے۔ جب سلیقہ ہی نہیں تو بات کرنے کا کیا فائدہ؟" بات کر کے دراصل بات خراب ہی کرتی ہے۔"

"پھر بھی آپ کہیں تو سمجھیں۔" اس کے لمبے میں دبا دبا سا اشتیاق تھا۔ "بعض باتیں بے ساختگی میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ ان میں اگر ناپ تول کر الفاظ استعمال کیے جائیں اور بڑی کوشش کے ساتھ شاعرانہ سلیقہ پیدا کیا جائے تو ان کا حسن جانا رہتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے غلوں کی منک اڑ جاتی ہے۔"

باتیں وہ خود بھی جھڑپتے بے ساختہ ہی کرتی تھی پھر بھی ان میں اتنی درستی اور سلیقہ نظر آتا تھا کہ تیرے طرح دل میں تازہ ہو جاتی تھیں اور جب وہ غیر سنجیدہ ہوتی تھی تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دل کو چھو لینے والی باتیں بھی کر سکتی ہے۔

چند لمبے پہلے وہ مجھے سرد مرادو سنجیدہ نظر آتی تھی تو میرا دل ڈوب گیا تھا اور اب اس کی حسین و شگاف آنکھیں میرا جانب مگر ان تھیں 'وہ پورے اشہاک و اشتیاق سے میری بات سن رہی تھی تو میرا دل بیوں اچھل رہا تھا اور میں اپنے رنگ دہے میں یوں سنسنی محسوس کر رہا تھا جیسے میں بالکل ہی نو عمر لڑکا ہوں اور اپنے سے کہیں بڑی اور بفرط قسم کی لڑکی سے اعتماد محبت کرنے کے لئے چننا ہوں مگر مجھے موزوں الفاظ نہیں مل رہے۔ میں خود بھی حیران تھا کہ در راتوں میں یہ کیا

اس کیفیت پر بڑی حیرت ہوئی میں بڑا حقیقت پسند آدمی تھا۔ ایک لڑکی جس سے میری شناسائی کو پورے دو دن بھی نہیں گزرے تھے، اگر مجھ سے سرد مری برت بھی رہی تھی تو اس میں میرے لئے تشویش کی کیا بات تھی؟ اور پھر بات صرف حقیقت پسندی، دلیل یا منطق کی بھی نہیں تھی۔ اس کم مری میں ہی زندگی نے مجھے اس سے کہیں گہرے ذہم دیئے تھے، بڑی بڑی عرصوں کے صدمے میں جمیل چکا تھا۔ اس اعتبار سے تو یہ صدمہ میرے لئے بے انتہا معمولی ہونا چاہئے تھا۔

اول تو اس میں میرے لئے صدمے والی کوئی بات نہیں ہونی چاہئے تھی۔ یہی اگر راحیلہ کے رویے میں کوئی دھکی چھپی بے گانگی تھی تو مجھے اس سے کیا میرا کون سا اس سے کوئی تعلق خاطر تھا لیکن اپنی تائید دلیوں اور منطق کے باوجود میں اپنے آپ کو نہیں سمجھا سکا۔ میں نے یقیناً اپنے آپ کو ملول و افسردہ محسوس کیا۔

"کیا بات ہے بڑا سنا پھلایا ہوا ہے؟" میں نے پھر وہی تازہ میں پوچھا۔

"یہی تو ہمیشہ سنا رہا ہے۔" وہ مری مری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ نے یہاں شور و غل کب سنا ہے؟"

"نہیں.... میرا مطلب ہے کوئی نظر نہیں آ رہا.... کہاں گئے سب لوگ؟" میں کچھ گڑ بڑا سا گیا۔

"ابو آفس گئے۔" راشد کو اپنے کسی دوست سے کام تھا۔ اسی کا آج ایک اسٹاکس قسم کا ایکسٹری اترانے کے سلسلے میں.... ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ تھا۔ وہ وہاں گئی ہیں۔ باقی رہ گئی ہیں۔ تو میں یہاں آپ کے سامنے بیٹھی نے خانہ سالن کا بنایا ہوا یہ

بڑا آفس قسم کا آلیٹ چہاری ہوں۔ یہ تو ہو گئی گہری طور پر کی کٹری۔ اب یہ بتائیے کہ میرے سامنے بیٹھی ہی آپ کا کتہ کیوں لٹک گیا ہے؟" اس کے لمبے میں اچانک ہی اس کی مخصوص شوخی ٹوٹ آئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ سیکڑوں نیچے ہوئے قطعے ایک فٹ روشن ہو گئے ہوں۔

"میں دراصل تمہارے لمبے اور تھماری آنکھوں سے جھانکتی ہوئی مری سنجیدگی بلکہ سرد مری دیکھ کر ڈر گیا تھا۔" میں نے صاف کوئی سے کام لیا۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ "میں چند منٹ کے لئے بھی سنجیدہ ہوتی ہوں تو جانے کیوں لوگ سسم سے جاتے ہیں۔" "بھی سورج سے تو لوگ صرف روشنی اور حرارت کی ہی توقع رکھتے ہیں نا۔" میں نے ایک آسودہ سی سانس لے کر کہا۔ "اگر سورج بھی تاریکی اور ٹھنڈک پھیلانے لگے تو لوگ خود غمزدہ تو ہوں گے نا۔"

تعلیم جمود کر والدین کے ساتھ انگلیٹھ چلی گئی۔ وہاں پہنچتی رہی۔ پھر والدین خاص طور پر اس کی شادی کرنے کے لئے پاکستان آئے۔ اس کی شادی ہوئی تو رخصتی کے موقع پر وہ بھی ایک عام مشرقی لڑکی کی طرح عروسی جوڑا پہنے اپنے والدین سے گلے مل کر دباؤ میں مارا کر رو رہی تھی یہ منظر دیکھ کر ہماری ایک ذرا کم پڑھی لکھی قسم کی رشتے دار خاتون بڑی حیرت سے اپنی سیلی سے بولیں۔ ”بھئی کمال ہے... اتنی ماؤرن لڑکی... اتنی پڑھی لکھی... اتنا عرصہ دلائی میں رہی مگر بالکل عام لڑکیوں کی طرح رو دھو رہی ہے۔“ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ بات وہ لڑکی کی تعریف کے طور پر کہہ رہی تھیں یا اپنی دانست میں اس کے عیب کی نشاندہی کر رہی تھیں، ہر حال ان کے لہجے سے جھٹکتی ہوئی حیرانی کو محسوس کر کے مجھے بڑی ہنسی آئی۔ ان خاتون کے خیال میں شاید میری دوست جیسی لڑکیوں میں شرانے کی اہلیت باقی نہیں رہتی یا پھر انہیں شرانے کا حق حاصل نہیں رہتا۔ کچھ اسی قسم کی بات آج آپ نے کی ہے۔ ”بھئی لڑکی تو ہر حال میں لڑکی ہی رہتی ہے۔ اس کے ان گنت جذبے تو اچھوتے ہی رہتے ہیں نا۔“

میں ہانسا کر نا بھول گیا تھا اور دم بخود بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں جیسے چوبک کر کسی اور ہی دنیا سے حقائق کی دنیا میں واپس آیا۔ میں نے دھجے لہجے میں کہا۔ ”اس کم عمری میں تمہارے خیالات میں سمندر دوں جیسی گہرائی ہے اور جوں جوں تمہاری شخصیت پرت در پرت میرے سامنے منکشف ہوتی جا رہی ہے میں زیادہ سے زیادہ تمہاری ذات کا میر ہوتا جا رہا ہوں۔ میں تم جیسی ایک لڑکی کے بارے میں اکثر سوچا کرتا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ دنیا میں ایسی کسی لڑکی کا وجود بھی ہو گا۔ تمہارا المنا مجھے ایک خواب سا لگتا ہے۔ اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی آنکھ کھلی گئی اور یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ یہ سب باتیں تو اپنی جگہ لیکن میری اصل بات کا تو جواب وہ ہی گیا۔ ہماری ملاقات کو اتنا کم وقت گزرا ہے کہ مجھے تم سے یہ پوچھنا بھی عجیب محسوس ہو رہا ہے کہ کیا تم نے بھی میرے لئے کچھ محسوس کیا ہے؟“

ایک بار پھر اس کے رہنما گہائی سے سرخ ہو گئے۔ وہ سر ہکا کر بے مقصدت انداز میں پلٹ کر گھماتے ہوئے بولی۔ ”دل تو اپنا فیصلہ ایک لمحے میں دے دیتا ہے۔ مزید دیر تو عقل اور دماغ کی وجہ سے لگتی ہے جو ہمارے سامنے شعوری قسم کے سوالات کھڑے کئے رہتا ہے کہ ہلی فلاں انسان میرا آئینہ دل تو ہے لیکن کیا اس کے ساتھ میرا گزارا ہو جائے گا؟ ہم اسے پا کر کھو دیتے پر مجبور تو نہیں ہو جائیں گے؟ یہ اور اس قسم کے

انتساب تھا کہ اس لڑکی کی جنبش ابھرتے میرے محسوسات میں اتھل پھٹل ہونے لگی تھی۔ میرے جذبات لڑکاس کے اشاروں کے تابع ہو گئے تھے؟

”اب تم مجھے سلیف کے بغیر بات کرنے کی اجازت دے ہی رہی ہو تو سنو....“ میں نے دونوں کنٹیاں میز پر رکھ کر قہر سے کہنے ہوئے کہا۔ ”بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تمہاری بات میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ بہت بری طرح اور مجھے اندیشہ ہے کہ میری شدت کا یہی عالم رہا تو میں وہی تو ازل کو بیٹھوں گا کہ تم مجھ جیسا کٹر اور حقیر آدمی یہ توقع تو کر نہیں سکتا کہ میری بات کے جواب میں تم بھی لڑکی جیسی پسند کرنے لگی۔ میں خوش قسم قلعہ نہیں ہوں۔ چنانچہ اپنی اس قسم جو تانہ کیفیت کو مد نظر رکھتے ہوئے میں اس نیچے پر پہنچا ہوں کہ جتنی جلد بھی میں سے چلا جاؤں بہتر ہے۔ اپنے دل و دماغ اور صلاب کو خوجاؤ کہ کی بیجان خیزی میں رکھنے کا کیا فائدہ؟“

وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھتی رہی اور سیرا دل امید و تخم کی سی کیفیت میں دھڑکنے لگا کہ معلوم نہیں اب وہ کیا کرے گا۔ جب وہ پوری طرح میرا معلوم سمجھی تو اس نے یہی نلیت ہی شریں لڑکی طرح سر جھکا لیا۔ اس کے رخساروں پر لڑائی اور گہری ہو گئی اور ہنکھڑائیوں جیسے ہونٹ یوں کپکپائے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، مگر کہنے میں کامیاب نہ ہو سکی ہنرگاہی لڑکیوں شرما کر سر جھکا لینا خود اپنی جگہ ایک جواب تھا۔

”اے میرے خدا....! میں بے ساختہ بول گیا، بھائی جیستہ تیرا تیرا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تو تم شرما بھی جاتی ہو؟“

”کیوں کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟“ اس نے سراخا کر غلت سارگی و مصومیت سے پوچھا۔ لمبی چٹکوں کی جھاروں کے لئے اس کی نیلی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

اس کا سوال واقعی جواب کر دینے والا تھا۔ میں ایک بار پھر گہرا سانس لیا۔ ”نہیں... نہیں... میرا مطلب یہ تھا کہ تم اتنی تیز و طرار لگتی ہو.... اتنی راست گو.... اتنی آزاد خیال.... جو خود کرانے کی ماہر.... مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ تمہارے رخساروں پر بھی یوں کلاب کھل سکتے ہیں۔ تمہاری چٹکیں بھی لٹکا رہی ہوں۔ تم اب یہ سب کچھ دیکھا ہے تو تم پہلے سے بھی زیادہ بھٹی گئی ہو۔ نیزے کی لٹی کی طرح میرے لٹکے لٹور بھی گہری اتر گئی ہو۔“

”میری ایک دوست ہے....“ وہ جذبے کے گرداب سے نکلا کر بارہوں میں آنکھیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”عمر میں تم سے کچھ بڑی ہے۔ اسکول اور کالج میں مجھ سے سونینٹو گنا۔ جس اتفاقاً میری دوست بن گئی تھی مگر پچھرا اور میری

سیکڑوں سوالات۔

”میں تو دل کا فیصلہ بانٹنا چاہ رہا تھا۔“ میں نے قدرت مضطربانہ لہجے میں کہا۔

”دل کا فیصلہ تو آپ کے حق میں ہے۔“ وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی پھر اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ گویا وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ ”افضل.... مجھے دراصل تمہارے کھڑے پن، نہ بہت متاثر کیا ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو اپنے آپ کو اس سے زیادہ ظاہر کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ تمہارے انداز و اطوار میں کسی بھی اعتبار سے تسبیح یا بناوٹ نہیں ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ تم کسی کے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے، بس کچھ ایسا ہی میرا آئیڈل تھا۔ تمہیں میرے لئے جی نہیں میرے دماغ نے بھی قبول کر لیا ہے۔“

”راہیل!“ شدت جذبات سے میری آواز گلے میں اٹکنے لگی۔ ”زندگی مجھ پر کبھی بہت ہی ہاموں میں رہی ہے اور کبھی بہت ہی میراں۔ ہر حال میں نے اس کی ہامیوں کو ہی یاد رکھا ہے اور ہامیائیوں کو بھلا آ گیا ہوں.... اور میرا خیال ہے زندگی کی سب سے بڑی فوٹوش آج میرے حصے میں آئی ہے تو خوشی کی شدت سے میری عجیب حالت ہے... یوں لگ رہا ہے جیسے میری روح پڑ پڑا کر جہم کے نفس سے آواز ہو جائے گی نہ وہ دھڑلے سے ہنس دی۔ وہ جب آہستہ ہنستی تھی تو اس کی ہنسی بے حد مہترم اور ٹھنک دار ہوتی تھی۔ بالکل جلتیرنگ کی طرح.... یا پھر جیسے ہٹل کی مثال میں یکدم بہت سے ننھے ننھے موتی آن کرے ہوں۔ پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

”خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔“

ہمارے دو مہمان خاص چوڑی ڈانٹنگ نیل جاسٹین عکراس کا چہرہ میں ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ مختصر سائے پیہ ہاتھ اس وقت روئی کے گالے کی طرح نرم تھا، جب وہ بڑبڑایا کرانے کے ایکشن میں آتی تھی تو یہی ہاتھ گویا کھلاڑی کا... پھل بن جاتا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ ”اپنے طبقے کے بہت سے لڑکوں سے مختلف مواقع پر میری ملاقات ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ سنجیدگی سے اور کچھ محض تفریح طبع کے خاطر میری جانب بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ سب کے سب مجھے جعلی لگتے ہیں۔ ممنوعی اور سنگینی سے۔ ان کی اٹھان اس قدر ملاوٹ پرستانہ ماحول میں ہوئی ہے کہ جذبات اور محسوسات ان کے نزدیک محض لواکاری کا دوسرا نام ہے۔ وہ دل اور دل کے زبردست کی بات کرتے ہیں تو حریف لگتا ہے کہ

جھٹ بول رہے ہیں۔ میرے طبقے کے لڑکوں میں سب سے مکر ہے سانچگی اور کھرا پن نہیں ہے جو میری نظر میں بڑا زیادہ اہم ہے۔

”میں لمبی چوڑی بات نہیں جانتا۔“ میں نے اس کے ہاتھ کو چھینکے ہوئے کہا۔ ”میں تو محض ایک چتر ہوں۔ ہر خوش نصیبی ہے کہ میں اپنی اصل شکل صورت میں نہیں اچھا لگا ہوں۔ تمہاری ایک نظر نے مجھے ہیرا بنا دیا ہے۔“ ملازم کی آہٹ سن کر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ملازم نے اسے کانٹے لگے آ رہا تھا۔ ہم نے کانٹے سے صرف چھوڑ چھڑائی کی تھی۔ کہا کیا کہہ نہیں تھا اور اب تو مجھے کھانے کوئی خواہش نہیں رہی تھی اور شاید یہی حال راہیل کا تھا۔ ملازم کے جانے کے بعد وہ گویا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ ”میرے طبقے کے لڑکوں میں سے کچھ کو شاید یہ شکل و صورت کی وجہ سے اچھی لگتی ہو گی اور کچھ کو اسے اوساف اور سرگرمیوں کی وجہ۔ کچھ کی نظر میں میری اہمیت محض اسٹیٹس کی وجہ سے ہوگی۔ وہ اپنے ذہن کے کمپیوٹر پر حساب کتاب لگاتے ہوں گے کہ مجھے حاصل کر کے ان کا سو روٹی دولت میں کتنی فی صد اضافہ ہو گا اور دیگر کیا فائدہ حاصل ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے کسی کے دا میں میری کمک نہیں ہے۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرنا ہو گا کہ اگر میں اسے نہیں ملی تو اس کی زندگی ویران ہو جائے گی بلکہ سب اس انداز میں سوچتے ہوں گے کہ اگر راہیل نہ ملی تو ظلال ٹھیک رہے گی اور اگر ظلال بھی نہ ملی تو پھر ظلال ٹھیک رہے گی۔ بس لئے ان میں سے مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔“

”لیکن میں تو....“ میں نے کہنا چاہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ میری بات کانٹتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”مجھے معلوم ہے آپ میرے بارے میں کیا محسوس کرنے لگے ہیں۔ اسی لئے تو میں نے دو دن کی شناسائی میں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے ورنہ اس ہاتھ کو کھانے کی حسرت میں جانے کتنوں نے منہ کی کھائی ہے۔“

”آج مجھے یقین آ گیا ہے کہ جذبہ ہے جو ہوں تو انہیں بھی ممکن ہو جاتا ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”جے اور کھرے انسانوں کے درمیان رہ کر اور خود بھی جے اور کھرہ بن کر انسان برا سمجھ رہا ہے۔“ وہ مہربانہ لہجے میں بولی۔

”تم نے دیکھا ہو گا کہ میری دوست لڑکیاں اور ان کے ساتھی بھی اسی قسم کے لوگ ہیں۔ وہ اگر دولت مند بھی ہیں تب بھی ان میں تکلف، تسبیح یا لالچ نہیں ہے اور نہ ہی انہیں بروقت اپنے اسٹیٹس کی حفاظت کرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔“

دائجسٹوں کے مقبول ترین سلسلے
جن کا آپ کو انتظار تھا
کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں



- سرگشت (۱۲ حصے) محمد احمد مدنی ۴۲۰/۰۰
- مائیگر (۱۳ حصے) مشتاق احمد قریشی ۴۸۰/۰۰
- جلیث (۵ حصے) انوار صدیقی ۲۵۰/۰۰
- درخشاں (۲ حصے) انوار صدیقی ۱۰۰/۰۰
- روگی (۵ حصے) م. اے صدیقی ۳۰۰/۰۰
- دہشت گرد (۴ حصے) سلیم فاروقی ۲۰۰/۰۰
- سرفروش (۲ حصے) اظہر کلیم ۱۲۰/۰۰
- شہباز (۲ حصے) اظہر کلیم ۱۲۰/۰۰
- انسان اور شیطان (۲ حصے) محمد فرار { ۱۵۰/۰۰



مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

فونہ: _____

”ہی چیتوں سے میں ملا ہوں انہیں تو میں نے ایسا ہی لیا
”میں نے تسلیم کیا “ اور واقعی تم لوگوں کے ساتھ وقت
بڑھنے پہلی بار احساس ہوا کی زندگی کی اصلی مسرت کیا ہے
لغتاً میرے ذہن کیسے اندھیرے گھسٹے میں سے جیسے کائنات پیدا
ہو شہور میں رینگ آیا۔ میری ذات کے گہد میں اندر ہی
جے کوئی آواز گونجی۔ ”دو غلے انسان! اپنی محبت اور اپنے
بات کے بارے میں تو بہت سچ بول رہا ہے مگر اپنی ذات
گہد میں سب سے بڑی سچائی چھپائے بیٹھا ہے۔ اسے یہ
پتا کہ تو درحقیقت کون ہے؟ تیرا پیشہ کیا ہے؟ وہ اتنی
بہت اور سادگی سے ذات کی سچائی کا فلسفہ بتا رہی ہے اور
تاس کی ہل میں اپنا مار رہا ہے مگر اپنی ذات کے بارے میں
اندھ رہا ہے.....

مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اندر ہی اندر گویا اپنے آپ کو
یا ”محبت اور جنگ میں سب جاتے رہے۔ میں راحیل کی
ذہن تو سچا ہوں نا؟ باقی باتیں پھر دیکھی جائیں گی۔ چپے کی
ایک اہمیت ہے؟ اگر میں اس کی نظر میں اچھا ہوں تو مجھے اس
کو توڑنا نہیں چاہیے۔ اس سے اسے بھی صدمہ ہو گا اور
میں اسے کھولنے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

یوں میں خاموش رہا اور تقریباً مطمئن بھی۔ دل میں ایک
کی خطن تھی مگر میں نے اسے دبائے رکھا۔

راحیل چلیں اپنے سامنے کھکاتے ہوئے بولی ”اپنے
محبت کی ہر بات کی تان چو کہ شادی پر آکر ٹوٹی ہے اس
نے ہی ایک اور بات کی وضاحت کرتی چلیں۔ شادی کے
ٹامپ میں اپنے ڈیڑی کے فیصلے سے کبھی اختلاف نہیں
ملتا کی اور یہ بات طے ہے کہ ڈیڑی میری شادی کسی ہم پل
دکان میں ہی کریں گے۔ وہ لڑکے کی دولت مندی کو بہر حال
بات دین کے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آج کے بعد سے
اپنا نسب العین بنانا کہ تمہارا جو بھی کاروبار ہے اسے ترقی
پنکے لئے جتنی بھی زیادہ سے زیادہ محنت ملے گی تم
اسے اور جلد از جلد ہماری سطح پر آنے کی کوشش کرو گے...
واقعہ تم نے کی ہوئی ہے اب مسئلہ صرف معمولی سے تیز
نکسے۔ بہر حال وقت ہمارے پاس کافی ہے۔ ابھی ہماری
ساکھ ایسی زیادہ نہیں ہیں۔“

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ جلد از جلد آگے آنے کے
میں خود کتابا چین تھا۔ اس کے بجائے میں نے پھر عز
میں کہا ”تمہاری محبت کی شدت یا گرم دیکھنا کہ میں کتنی تیزی
دھڑکتا ہوں۔ میں دیکھ کا وہ گھبراہٹ ثابت ہوں گا جو بظاہر
بہت پھسڑی نظر آتا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے سب سے

آگے نکل جاتا ہے "دیے یہ حقیقت تھی کہ اس کے اقربا محبت سے میرے عزائم کو غنی زندگی ملی تھی۔ جس کام کے لئے میں نے اپنے ذہن میں ایک سال کا ہدف رکھا ہوا تھا اس کے بارے میں اب میں سوچ رہا تھا کہ اسے ایک ماہ میں ہی کر لینا چاہئے۔ تاہم ترقی تو میں اب اسی کام میں کر سکتا تھا جو میں کر رہا تھا۔ کوئی شرفانہ کام کرنے کی توجہ میں صلاحیت تھی اور نہ ہی سنے سب سے تجربے کرنے کی جرأت۔ میرے خیال میں مجھے جو کچھ بننا تھا میں بن چکا تھا۔ اب بات صرف چھوٹے سے بڑا بننے کی تھی۔

اسی دوران آنٹی یعنی راجیلہ کی ای لیوٹ آئیں اور ہمارے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو سکی۔ مگر اب مزید کسی بات کی ضرورت بھی کیا تھی؟ ہم تو گویا مستقبل بعید تک کے پروگرام بھی طے کر چکے تھے اور میں گویا ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ آنٹی کافی خشکی خشکی لگ رہی تھیں۔ میں نے ان کی خیر خواہی پر چھٹی۔ وہ اپنی کسی نامعلوم بیماری کی وجہ سے پریشان تھیں۔ شمر کے نہ جانے کتنے بڑے بڑے ڈاکٹر کتنے برسوں سے ان کا علاج کر رہے تھے اور بیماری کے بارے میں ہر ایک کی رائے مختلف تھی۔

میں نے نہایت غلطی سے ان سے بد روی کا اظہار کیا۔ یوں تو میں ان سے ملنے ہی ان کے لئے اپنے دل میں اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا لیکن اب تو اس اپنائیت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو چکا تھا۔

ان سے باتیں ختم ہو گئیں تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے ناشتا تو کیا ہی نہیں تھا۔ راجیلہ معذرت کر کے ناشتے کی میز سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ میں نے ٹھنڈی ہو جانے والی چیزیں واپس کر کے ملازم سے دوبارہ ناشتا بنایا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ آنٹی نے کمری نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ شاید ایک لمحے کے لئے انہوں نے سوچا تھا کہ آخر میرے سامنے رکھا ہوا ناشتا کیوں ٹھنڈا ہو گیا تھا؟ کوئی ایسی ضروری باتوں میں مصروف رہا تھا میں؟ تاہم میں نے ان کی نظر کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ راجیلہ کی نظر میں اپنی محبت کی قبولیت کے بعد مجھے دوسری باتوں کی پروا کم رہ گئی تھی۔

میں ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے میزبھوں کے قریب پہنچا تو راجیلہ سے سامنا ہوا۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے نکل رہی تھی۔ مجھے میزبھوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر بولی "آپ کہاں گوشہ نشین ہونے جا رہے ہیں؟ ہم تو آپ کو شمر کی میر کرانے کا پروگرام بناتے بیٹھے ہیں۔"

"ذہبے نصیب" میں نے فوراً میزبھوں سے واپس مڑتے ہوئے کہا "اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لئے کیا ہوگی کہ مجھے تم جیسا گائیڈ میسر ہو۔"

"ہو سکتا ہے" گائیڈ اسے اپنی خوش بختی محسوس کر رہا ہوا کہ ایک طویل انتظار کے بعد تم جیسا مسلمان میسر آیا۔" وہ گھر سے اندر آئیں ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ باہر جانے کے لئے ہم دوبارہ ڈانٹنگ روم سے ہی گزرے تو میں نے آنٹی کو وہیں بیٹھے دیکھا۔ وہ سر جھکانے نہایت ہی بے دلی سے کہنے لگی کہ شمر کر رہی تھیں۔

"مئی! میں افضل صاحب کو شمر کے کچھ مشہور مقامات کی میر کرانے لے جا رہی ہوں۔" راجیلہ نے ڈانٹنگ ٹیبل کے پاس سے گزرتے وقت گویا محض اٹھانا کہا۔

انہوں نے سراٹھا کر پھر خیال ہی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور جیسے جیسے میں کہا "بہتر ہو تاکہ راشد کی دہائی کا انتظار کر لیتیں۔ اسے بھی ساتھ لے جائیں" میں نے محسوس کیا کہ راجیلہ سے ہر کوئی دب کر ہی بات کرنا تھا۔ اسے واضح لگے میں کبھی کوئی ہدایت نہیں دی جاتی تھی۔

"مجھے معلوم ہے وہ کہاں گیا ہے" راجیلہ خشک سے لگے میں بولی "میں راستے میں اسے دیکھتی چلوں گی۔ اگر وہ مل گیا تو ہم اسے ساتھ لے لیں گے۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ راستے میں کہیں نہیں رکی۔ سبب عادت طوقالی انداز میں اسٹیشن وگن چلائی ہوئی سب سے پہلے وہ قائد اعظم کے مزار پر پہنچا "پھر کلکشن" اس کے بعد کھارڑی اور دہائی میں اسی نے گھر کے قریب ہی واقع محل پارک مجھے دکھایا۔

"دیے تو یہ سب مقامات رات ہی کو دیکھنے کے ہیں" پارک کی ایک شینچ پر بیٹھے ہوئے وہ بولی "لیکن رات کو ہر بات بہت ہی رش ہو جاتا ہے اور اس وقت ہم جیسے کراچی کے پرانے رہنے والوں کو ایسی جگہوں پر جاتے ہوئے کچھ عجیب لگتا ہے۔ کم از کم مجھے تو لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ ہی پیٹو محسوس کرتی ہوں۔ تم تو رات پیٹو نظر آنے سے تو ہم نہیں شرارتے۔"

"تمہیں تم نے ایک پیٹر درگاہ کی طرح جلدی جلدی مجھے تمام خاص خاص مقامات دکھا کر گویا فرض پورا کیا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اس معاملے میں تو میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ بلا تامل بولی "عام تقریبی مقامات پر جانا مجھے بہت پر کام لگتا ہے مجھے صرف ایسے مقامات پر جانے میں لطف آتا ہے جہاں

سینکڑوں انسانوں کے خوفناک قاتل
مشہور زمانہ ٹھکانہ امیر علی کی
سنسی خیر داستان

انسان اور شیطان

محمد فراز

۲ حصوں میں شائع ہو گئی ہے
فی حصہ ۶۰/- روپے مکمل سیٹ ۱۲۰/- روپے

ناشر

مکتبہ القریش، سرکل روڈ
اردو بازار لاہور ۲

”میرا بھی یہی خیال ہے“ وہ جلدی سے بولی ”جنیس
بہی نہیں میں ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے وہ ایک
دوسرے کے لئے فنا ہو جاتے ہیں۔“
”فنا ہونے کا حوصلہ ہے تم میں؟“ میں نے اس کی
آنکھوں میں تہکانا۔

”تم اپنی کو“ اس نے انسا سوال کر دیا۔
”میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ میں تمہاری خاطر کہاں تک
جاسکتا ہوں۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا“ میں نے غلامی دل سے کہا۔
”میں نے جو کچھ کہا ہے اسے بھولنا مت“ وہ دھیرے
سے بولی ”ایسے بن کر دکھانا کہ جب تم ڈیڈی کے سامنے
میرے لئے ہاتھ پیرایو تو وہ انکار نہ کر سکیں۔“
”تم مطمئن رہو۔ یہ سویر میرے سوا کوئی نہیں جیت
سکے گا“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس کے حسین چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ ایک دن ڈا
جس کے ساتھ دو تین سال کا ایک بچہ بھی تھا ہمارے سامنے
سے گزرا۔ درش پر ہاتھ جاتے دونوں میاں بوی نے کئی بار
مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔

”ایک تو میں اپنی سوسائٹی کے انسانوں کی اس عادت سے
بڑی تک ہوں“ راحیلہ گردن جھٹک کر بولی ”ہمیں بھی کوئی
لڑکا اور لڑکی اکٹھے بیٹھے ہوں تو ابلاش اور شیم ابلاش قسم کے
چمڑے چمٹات تو کیا اچھے بھلے مہر صورت آدمی بھی دور تک

ی قسم کی سنسی خیزی کوئی ایڈو سخر ہمارا فخر ہو۔“
”ایڈو سخر تخلیق کرنا بعض اوقات اپنے ہاتھ میں بھی
آئے“ میں نے کہا ”شٹا کیمائزی سے منورہ ہم کشکی میں
بکر گئے حالانکہ ہم چاہتے تو تیرتے ہوئے بھی جاسکتے تھے۔
شٹا پارک ہم اوصراوھر سے سمندر کا نظارہ کرنے کے بجائے
اہل پردہ ڈٹتے ہوئے کسی اونٹ یا گھوڑے سے شرابہ کر
رہا کھینکتے تھے۔ یا پھر ان چارپائے لٹکے قسم کے نوجوانوں سے
لڑا شروع کر سکتے تھے جو بار بار ہمیں گھورتے ہوئے گزر
ہے تھے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی ہم ایڈو سخر کا لطف اٹھا سکتے
ہے۔ ہم خاصی بلندی پر بیٹھے ہیں۔ پارک کے اُس سرے پر
ہر ہم بچے چھلانگ لگاتے ہیں اور پہاڑی پر سے لڑھکتے
لے گئے سڑک پر پہنچ سکتے ہیں۔“

بیٹے بیٹے اس کی گردن پیچھے کو جھٹک گئی۔ اس کے
اشہدہ مجھ سے بال بالی ہوا میں ہمارے تھے اور ڈبے سورج
انگنی کر میں اس کے چہرے کے گرد ہال سا بنائے ہوئے
ہے۔ اس وقت سرسری سی نظر سے اسے دیکھتے ہو گئیں
زرا تھا کہ شاید اس کا اطلاق کسی سفید فام قوم سے ہے مگر عموماً
یہ فاموں کے فقرش میں وہ ٹیکمپان اور رگمت میں اس
ت کی آمیزش نہیں ہوتی جس کی وجہ سے راحیلہ بے پناہ
شش نظر آتی تھی۔

اس کی یہی تھی تو وہ بولی ”افضل! تم بہت دلچسپ آدمی
ہو گئے آج مجھے تمہارے گائیڈ کے فرائض انجام دینے
مائی اور ست نہیں ہوئی ورنہ اس قسم کے کاموں سے میری
لگتا ہائی ہے۔“ دینے بھی میرے خیال میں مقامات قابل دید
ہے ”انسان قابل دید ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کا شاہدہ کرنا
اہل۔ غمراؤں اور ماسلوں وغیرہ کا کیا ہے یہ تو یونہی اپنی جگہ
آکر ہیں گے۔ انسانوں کا کچھ پتا نہیں۔ کون کل رہے کون
سے۔ کون کیا سے کیا ہو جائے اور کس پر کیا جیتے۔ اس لئے
تیکمپان کے انسانوں سے متعلق یادوں کو دامن میں جکھ کیا
سکتا کیا خیال ہے؟“

”بعض اوقات تم اتنی گہری باتیں کرتی ہو کہ میں ان میں
سب جانا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ میں اس طرح نہ ڈوب جاؤں
ملائف گاڑ بھی مجھے نہ بچا سکیں“ میں نے کہا۔
”وہ ایک بار پھر نہیں“ ہماری محبت شونی و سنجیدگی کا ایک
بہ احترام ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ حقیقت میں تو ہم دونوں بے حد
لگاؤ ہیں۔ یہ شوقی تو محض دل ہمالوے اور وقت گزارنے کے
لئے ہے“ میں نے کہا۔

اس طرح گڑبڑ کر دیکھتے جاتے ہیں کہ اگر سامنے میں ہوں گا ڈھلکا غائب ہو تو سیدھے اس میں جاگیریں۔“
”اس جوڑے کو تم ان لوگوں میں شمار نہیں کر سکتیں“
میں نے ان میاں بیوی کی طرف اشارہ کیا جو کلان دور پہنچ چکے تھے۔ ”یہ بے چارے تو ہمیں دیکھ کر شاید ہانسی کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تھے۔ شاید انہوں نے بھی کبھی اسی طرح کسی شیخ پر ہینہ کر بیان دیا ہوا ہو۔“

”اور اب بچتا رہے ہوں“ راحیلہ نے لہجہ دیا۔
میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ راحیلہ بھی ہنس دی لیکن پھر یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”لیکن ہم کبھی نہیں بچتا رہیں گے۔ ہے؟“

”نہیں۔ کبھی نہیں“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اپنے آپ کو عجیب سا محسوس کیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”افضل! اگر اس وقت تم اپنا تجربہ کر دو تو کیا اپنے آپ کو کسی زمانہ انسانے یاد دہانے کے لئے کسی روایتی فلم کے ہیرو نہیں محسوس کرو گے؟ زری روزانہ کی باتیں کرنے والا... خوابوں کے جل جھنڈ والا۔ جبکہ تم تو کسی اور ہی دنیا کی پیدوار ہو۔ تمہاری تو لائن ہی کچھ اور ہے...“

میرے اندر سے جانے کون بول اٹھا لیکن کسی تو ڈونگی ہے۔ انسان کی لاش خواہ کچھ بھی ہو مگر محبت کی پیاس تو اس کے دندوں سے نہیں نکل سکتی تھی۔ میں غلط سطر راہوں کا مسافر ہوں تو کیا ہوا؟ کیا مجھے محبت کرنے کا حق حاصل نہیں؟ اگر حق حاصل ہے تو پھر اپنے آپ سے شرمایا کیا؟ محبت تو سبھی تقریباً اسی طرح کرتے ہیں۔ اور پھر ہماری محبت تو زری انسانوں ہی نہیں۔ ہم تو بے اختیار ایک دوسرے پر مرہٹے کے ساتھ ساتھ اختیار اور شعوری طور پر بھی زندگی کی کچھ گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔ مستقبل کے کچھ منصوبے بنا رہے ہیں۔ عملی دنیا کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تو سبھی کو کرنا ہوتا ہے؟ گھر تو سبھی کو رہنا ہوتا ہے؟“

اپنے اندر کی اس بحث و تھیں سے مطمئن ہو کر میں نے مسکراتے ہوئے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ غلام جیسے رددن کی ملاقات میں ہی مجھے پڑھنا سیکھ گئی تھی۔ ایک ہی نظر میں گویا میری روح میں جھانکتے ہوئے بولی ”تم نے ابھی ابھی دل ہی دل میں کوئی اہم فیصلہ کیا ہے۔ کیا ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا ”ہاں... جانے کیوں اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا کہ اس طرح پارک کی ایک بیچ پر بیٹھ کر وہ جہان کرتے ہوئے ہم بے وقوف اور پیپ تو نہیں لگ رہے؟“

وہ بے اختیار ہنسی ”مجھ ایک خیال میرے دل میں آیا تھا۔ کالج کے زمانے میں بھی خیر ہمارے طبقے کی لڑکیاں ذہنی طور پر بڑی پیچیدہ رہتی تھیں اور اعلیٰ طبقے کے عیش کے شکار ہوتی تھیں۔ کوئی لڑکی جلا ہوتی تھی لیکن بد قسمتی سے اگر کوئی جلا ہو ہی جاتی تھی تو ہم جیسی لڑکیاں اس بے چاری کا بیٹا دیکھ کر دہشت میں آ جاتیں۔ اس بے چاری کا یہ عالم ہوا تھا کہ عیش میں نہ سو کھا ہو ہے۔ راتوں کو آخر شادی ہو رہی ہے۔ ہر البیہ گانے ہم آجیں بھری جا رہی ہیں۔ بجز وصال کے موضوع پر شعر سنائے جاتے جا رہے ہیں۔ محبوب کو پیغام بھیجئے، ایک ہتک دیکھنا! ملاقات کرنے کے لئے مواقع ڈھونڈئے جا رہے ہیں۔ اور ہمارا یہ عالم ہوا تھا کہ اس بی بی کو دیکھ دیکھ کر ہنس کر رہے ہوئے جا رہے ہیں اور سب تو بتی اس کو سمجھا رہے ہیں۔ اور اب یونیورسٹی میں آکر تو اور بھی ذہنی پہنچ آچکی ہے۔ خصوصاً ہمارے طبقے کی لڑکیوں میں... لیکن...“ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

لیکن کیا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔
”لیکن اب جیسے سب کچھ دھماکا ہو گیا ہے۔ وہ آہ بھر کر لگا۔“
”دوسروں کے وہ تمام مراحل و مسائل جن پر ہم بننے بنے اب یوں لگتا ہے کہ ان سب سے ہمیں بھی گزرنے پڑے گا... اور کچھ ابھی سے محسوس ہو رہا ہے کہ ان میں بھی ایک لذت ہے شاید یہی زندگی ہے“ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔
اچانک وہ جیسے کسی خواب سے چونک کر اور جھرمجی سی لے کر بولی ”آؤ افضل گھر بیٹیں۔“

ہم گھر پہنچے تو راشد جانے کب کا واپس آ چکا تھا لیکن اتنی نے راحیلہ سے نہیں پوچھا کہ ہم نے اسے ساتھ کیوں نہیں لیا تھا۔ اس کے بجائے اسی قسم کی باتیں شروع ہو گئیں کہ کئی کئی گئے، کیا کیا دیکھا، کیا لگا، وغیرہ وغیرہ۔

میں جس جگہ بھی گیا تھا۔ تو مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی محسوس ہوتی تھی اور نہ ہی اب ان سوالوں سے کوئی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میری دلچسپیاں تو صرف راحیلہ کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں۔ مجھے خوشی تھی تو صرف ان بات کی کہ آج میں اس کے ساتھ سیر کرتا ہوا تھا اور آج میں ان گت باتیں کی تھیں۔ اب ہماری منزل بے حد واضح اور روشن تھی۔ میں بے حد خوش تھا۔

رات کو اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے لاہور ڈن کیا۔ محبت کا اخبار اپنی جگہ تھا لیکن میں نے اپنا کام ”اپنی ذات و اپنی فراہموش نہیں کی تھیں۔ مجھے سینہ دھند سے اپنی منتظر کی رپورٹ کا تمام غلغلہ کو دینی تھی۔

ی تو اقرار محبت کیا تھا جس کا پہلا نہ جانے کب سے قصورات میں بسا ہوا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ یہ بیولا محض میرے تصویر کی پیداوار ہے اور قصورات ہی کی دنیا میں آخر کار کسی دن اپنی موت آپ مر جائے گا۔ میں نے کب سوچا تھا کہ ایسی کوئی لڑکی حقیقتاً دنیا میں موجود ہوگی اور اگر موجود بھی ہوگی تو بھلا میری اس سے ملاقات ہونا ضروری تو نہیں تھی اور اگر ملاقات ہو بھی جاتی تو کیا ضروری تھا کہ وہ بھی مجھے جانے لگتی؟ ایسا سوچنا میرے خیال میں تو خالصاً خوش فہمی کی بات تھی مگر آج میری یہ خوش فہمی حقیقت میں ڈھل چکی تھی۔

ظاہر ہے انسان کو زندگی میں اس کے کسی نہایت ہی حسین خواب کی تعبیر مل جائے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ رگ و پے میں ایک عجیب سا بیجان کرد نہیں لینے لگتا ہے۔ ابھی تو میں اس خوشی کو صحیح طور پر محسوس بھی نہیں کر پاتا تھا کہ رسم کشی کے میدان میں واپس پہنچنے کا حکم مل گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ سب باتیں میں قاسم خان سے نہیں کر سکتا تھا۔ ہماری دنیا میں اس قسم کی افسانوی باتوں کی صحیح فہم نہیں تھی۔

قاسم خان پر زور سبب میں کہہ رہا تھا "ہاں بھئی... تمہارا فوری طور پر واپس آنا بہت ضروری ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تمہارے بغیر اب میرا کام چلنا بہت ہی مشکل ہے" ہماری لاش میں باس کبھی یوں کھل کر اپنے کسی کارندے کی تعریف نہیں کرتا۔ خواہ وہ اس کے لئے کتنا ہی اہم ہو۔ اور اس نے کتنا ہی بڑا کارندہ کیوں نہ انجام دیا ہو۔ اگر قاسم خان اپنے واضح انداز میں اعتراف کر رہا تھا کہ میں اس کے لئے ناگزیر ہو چکا ہوں تو اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھ سے بہت ہی زیادہ متاثر ہو چکا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں نہایت فراخ دل بھی تھا۔ سادگی کی حد تک فراخ دل۔ اس کی یہ سادگی مجھے بہت بھلی لگی۔ وہ عیار اور کینہ آدمی نہیں تھا اور مجھے حیرت تھی کہ ان دو خصوصیات سے عاری ہوتے ہوئے اس نے اتنی ترقی بھی کس طرح کر لی تھی؟ "اچھا... جیسے آپ کی مرضی" بلاخر میں نے مزہ لیجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ کلنی دیر تک تو میں اپنی جگہ سے اٹھ ہی نہیں سکا۔ میرے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ بہت دیر تک میں بستر پر بے حس و حرکت پڑا چھت کو گھورتا رہا۔

کائنات پر گہرا سکوت طاری تھا یا پھر شاید میرے اندر ہی سکوت چھا گیا تھا۔ کمرے میں جیسے میرا دم گھٹنے لگا۔ بڑی شدت سے میرا دل چاہا کہ باہر جا کر کھلی ہوا میں لمبی لمبی سانسیر

قاسم خان مجھے گھر پر ہی ملا۔ سینٹھ واحد سے میرے بیابان مذاکرات کی خبر سن کر اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ ہم کو کہ مول الفاط میں ہی بات کر رہے تھے لیکن میں چشم نور سے قاسم خان کی کھلی ہوئی ہواچیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی ٹٹٹی بجا تھی۔ اب تک ہم جتنے خطرات مول لے کر اور جس طرح جان جو کھوں میں ڈال کر جتنا وحندہ کرتے تھے "سینٹھ واحد کے ساتھ معاملات صحیح چلنے کی صورت میں ہم اس سے فوری محنت کر کے جو کتنا منافع کما سکتے تھے اور سینٹھ واحد جیسے آدمی سے تعلقات پر ان چڑھنے کی صورت میں دیگر فوائد کے امکانات بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ ہم سندھ کی مارکیٹ، فوراً کراچی کے ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کاروبار میں قدم بٹھا سکتے تھے۔ شہل مغربی سرحدوں سے کاروبار کرنے والے اسمگلروں کے لئے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان خطوط پر "محنت" کر کے رفتہ رفتہ وہ بین الاقوامی اسمگلروں کے کم از کم درمیانی طبقے میں تو شمار ہو ہی سکتے تھے۔ ویسے تو خیر بین الاقوامی اسمگلروں کے درمیان طبقے میں بھی ایسی ایسی توپ چیزیں بڑی تھیں جن کے سامنے قاسم خان جیسے اسمگلروں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

"مجھے تم پر فخر ہے افضل!" قاسم خان بولا۔ اس کے لیے میں دبا دبا جوش تھا "میں تو سمجھتا تھا کہ تم صرف مل لانے لے جانے کے معاملے میں ہی عذر اور بلا صلیت آدمی ہو لیکن تم تو معاملات طے کرنے میں بھی ماہر نکلے۔ مجھے امید ہے کہ اب ہم ایک دوسرے کے لئے اور بھی زیادہ کار آمد سامعشی ثابت ہو سکیں گے..." پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "اب تم ایسا کرو کہ فوری طور پر لاہور واپس آ جاؤ۔ میں چند دن کے لئے لندن چارہا ہوں جس کے لئے میں کراچی سے ہی فلائٹ پکڑوں گا اور واپسی پر میں سینٹھ واحد سے باقی معاملات خود طے کرنا آؤں گا جس کے بعد ہم عملی کام شروع کر دیں گے۔ اس دوران یعنی میری عدم موجودگی میں تمہیں سبزی منڈی سے مل کی بہت بڑی گھپ لانی ہے اور پینڈی کی ایک پارٹی کو دینی ہے۔ اس مرتبہ سارا لین دین تمہیں اپنی مرضی کے مطابق کرنا ہو گا۔ کہیں سے تمہیں کوئی بدایات نہیں ملیں گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے..." میں نے ذوقی ہوئی سی آواز میں کہا لیکن کیا میرا فوری آنا ضروری ہے؟"

میں اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ فوری طور پر کراچی سے رخصت ہونا مجھے سزائے موت کے حکم کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔ میں اسے یہ بھی بتا سکتا تھا کہ ایک مدت تک جینکنے کے بعد میری منزل مجھے ملی تھی۔ اس مدد نے آج

لوں۔ بالآخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ حوک نگل کراثبات میں سر ہل کر رہ گیا۔

"اسے ہی محبت کہتے ہیں" وہ خوابناک سے لمبے میں بولی "جتنی محبت۔ جس میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے محسوساتی رابطہ قائم ہو جائے۔ چوٹ ایک کو گتے، درد دوسرا بھی محسوس کرے۔ مصیبت ایک پر پڑے، بے چینی دوسرے کو بھی محسوس ہو۔ ایک کا دل پکارے تو دوسرا دوا چلا آئے۔ خواہ ان کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہو۔۔۔ درحقیقت محبت اسی کا نام ہے باقی سب کچھ کیواس ہے۔ باقی سب طلب کے مختلف روپ ہیں جنہیں لوگ محبت کا نام دے دیتے ہیں میں دم بخود بیٹھا تھا۔ میرا ذہن جیسے پیاسی زمین بن گیا تھا جس میں اس کے الفاظ سلوان کی چلی پھوار کی طرح بے بے رو رہتے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "مجھے معلوم ہے اس وقت تم کوئی ضروری بات مجھے بتانا چاہتے تھے۔ شاید اسی لئے میں نے بے چینی محسوس کی اور میں اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آئی تھی۔۔۔ اور پھر شاید تمہارے لاشعور نے بھی تمہیں آگاہ کیا اور تم یہاں پہلے آئے۔"

"ہاں شاید میں بات قسمی" میں نے دھیسے لمبے میں کہا۔ "میں تمہیں بتانا یہ چاہتا تھا کہ میں کل کسی وقت واپس لاہور چلا جاؤں گا۔"

چند لمبے وہ کچھ نہ بولی۔ افسردہ سی نظروں سے ایک ٹنک میری طرف دیکھتی رہی پھر اسی عالم سکوت میں اس کی جھیل سی آنکھوں سے دو آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔ جانتے کیوں اب تک جیسے مجھے گمان نہ گزرا تھا کہ وہ رو بھی سکتی ہے۔ اس کی ذات مجھے چٹان محسوس ہوئی تھی۔ لیکن جذبے بر حال دگب سنگ میں ابھی مرآت کر جاتے ہیں۔

میرا اپنا معاملہ کونسا مختلف تھا؟ زمانے کی بے مری، طرح طرح کے حادثات اور تجربات، کم عمری میں ہی زندگی کے... اور گت پیلوئس سے آجی اور پھر کہنت میرا پیشہ۔ ان سب چیزوں نے کل کر مجھے بھی تو برا بخشنی ہے پر والور لاہانی بتایا تھا مگر راجیل سے ملنے کے بعد دل میں کیسا گداز پیدا ہوا تھا۔ وہی دن کی رفات میں ہی عالم تھا کہ اب اس سے دور جانا ایک کڑی آزمائش بن گیا تھا اور اب اس کے آنسو تو گویا انگارے بن کر میرے دل پر آن کر رہے تھے۔

"روٹی کیوں ہو؟" میں نے تڑپ کر کہا "میں لاہور ہی تو جا رہا ہوں۔ لاہور، کراچی سے کونسا دور ہے۔ انسان کی جیب

کمیت روم لوپ کی منزل پر تھا۔ یہاں دو بند روم اور بھی تھے جو استعمال نہیں ہوتے تھے۔ ان سے آگے نہیں تھی۔ میرس کے ایک کونے سے چوہا سا ایک ذینہ ان میں جا رہا تھا۔ اس ذینے کے راستے ان کی روش پر اثر کر چھان گھر کے کسی فرد کو ڈسٹرب کئے بغیر گھر سے باہر بھی جاسکتا تھا۔

کمرے سے نکل کر اس ذینے سے میں نیچے لان پر آگیا۔ رات زیادہ نہیں جتنی تھی مگر اوس پرانی شروع ہوئی تھی اور دھندلی چاندنی میں کہیں کہیں اوس کے قطرے سجے سہتیوں کی طرح جھلنا رہے تھے۔ بے اختیار میرا نگے پاؤں گھاس پر چلنے کوئی چاہا۔ میں نے سلیپر روش پر ہی چوڑے اور گھاس پر چلنے لگا۔

چل قدمی کرتا ہوا میں جب اس حصے میں پہنچا جہاں ان چیزز پڑی ہوئی تھیں تو میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ایک کرسی پر راجیل بیٹھی تھی۔ سبز پودوں کے پس منظر سے وہ کچھ فاصلے سے مجھے جھٹک سفید دھوئیں کا ایک بیولا معلوم ہوئی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سفید ٹائٹ گاؤن میں تھی۔ پاؤں میں سفیدی سلیپر تھے۔ اتفاق یہ تھا کہ ان چیزز اور میز وغیرہ کا رنگ بھی سفید ہی تھا اور چاندنی میں راجیل کی رنگت بھی کچھ زیادہ سی سپید نظر آ رہی تھی۔ سرخی جیسے غائب ہو چکی تھی۔ ہوا میں نمی ہونے کی وجہ سے کچھ دور سے یہ منظر سرسری نظر میں دھندلا ہوا ہوا سا لگ رہا تھا۔ کسی پر اسرار خواب کی طرح۔ ایک لمحے کے لئے تو میں مبسوت سا ہو گیا اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اگر میں نے قدم آگے بڑھایا تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ یہ منظر میری نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ یہ پُرقوں لمحہ میرے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔

راجیل کو میری موجودگی کا احساس ہو چکا تھا مگر وہ بدستور ایک ٹنک چاند کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس وقت اس کی روح جیسے کہیں انتہائی دنیا میں محو پرواز تھی۔

بالآخر میں اس کی طرف بڑھا اور چند قدم چل کر اس کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھا۔ تب دھیرے دھیرے جیسے اس کی نظریں چاند کے ظلم سے تڑاو ہوئیں اور اس کی ذات کا اڑن کشلا ہونے ہوئے حقائق کی دنیا میں اتر آیا۔

میری طرف دیکھتے ہوئے ایک ٹھٹھکی سی سکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ سرگوشی نمائش میں بولی "مجھے معلوم تھا کہ تم لان پر ضرور آؤ گے۔ یقیناً تمہارا بچہ چنے کمرے میں دم ٹھٹھنے لگا ہو گا۔۔۔ تم نے بھی ناگاہل اشت اضطراب محسوس کیا ہو گا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ اس

”میں نے کہا تاکہ میں خوفزدہ ہو گئی ہوں“ وہ جھرمجری سی لے کر بولی ”میں بڑی بے خوف لڑکی تھی مگر جب سے اس جذبے نے دل میں جڑیں مضبوط کی ہیں گویا دوسوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے۔ خیر اڑ گئی ہے۔ ہر دقت دل عجیب عجیب اندیشوں سے لرزتا رہتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے“ کہیں دیرینہ نہ ہو جائے... اور سب سے بڑا اندیشہ یہ ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کو نہ پاسکے تو زندگی کس طرح گزرے گی؟“

”کیوں نہیں پاسکیں گے ہم ایک دوسرے کو؟“ میں نے قدرے تندہی سے کہا ”کیا رکاوٹ ہے ہمارے راستے میں؟“

”تم ڈیڈی کو نہیں جانتے“ وہ غلامی گھورتے ہوئے بولی۔

”وہ جتنے عظیم الطبع، متعین مزاج اور باہر مت نظر آتے ہیں درحقیقت ویسے ہیں نہیں۔ اندر سے وہ چٹان کی طرح سخت اور پوری طرح عملی دنیا کے آدمی ہیں۔ میں تمہیں یہ بتانے میں ناکام نہیں سمجھتی کہ انہوں نے کمی سے شادی محض ان کی دولت کی خاطر کی تھی۔ وہ خود تو بانی میں ایک معمولی ملازم تھے۔ ہماری اسی کا تعلق دولت مند گھرانے سے ہے اور وہ اپنے ماں باپ کی انکوٹی لڑکی تھیں... لیکن ڈیڈی کی کامل تعریف بات یہ ہے کہ انہوں نے کمی کی دولت کو عیاشیوں میں نہیں لٹایا مگر محض ان پر اس طرح مری تھیں کہ انہوں نے اپنی تمام دولت دجا دلوں ہر چیز ہر اختیار روڈروں سے انہی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ کسی بھی قسم کے کاغذات وہ دستخط کرانے کے لئے لاتے تھے تو کمی انہیں پڑھتی بھی نہیں تھیں۔ بس آنکھ بند کر کے سائن کر دیتی تھیں۔ اندھا املاہ رہا ہے انہیں بیش ڈیڈی پر۔ اور ڈیڈی نے بھی کبھی ان کے اعزاز کو نہیں نہیں بچائی۔ بیش اپنی ذمے داریوں کو محسوس کیا ہے۔ کمی سے کہیں زیادہ حسین عورتیں ان کے گرد منڈلاتی رہیں کیونکہ وہ وجہ بھی تھے اور دولت مند بھی لیکن ان کا کبھی کسی کے ساتھ اسکیڈنل نہیں بنا۔ وہ کبھی کسی کی طرف متوجہ نہ کھائی نہیں دے۔ مچلی سے شادی تو انہوں نے کو کہ ان کی دولت کی خاطر کی تھی اور نہایت صاف گوئی سے اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن شادی کے بعد شاید کمی کی کامل رشک عادت کی وجہ سے وہ انہی کے امیر ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے کمی کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہی کیا ہے اس میں کمی نہیں آئے دی اور دولت کی خاطر شادی بھی انہوں نے محض اس لئے کی کہ دولت سے دولت کمانے کا انہیں بہت شوق تھا۔ ویسے تو انہیں یقین تھا کہ وہ خال ہاتھ بھی جدوجہد شروع کر کے ایک نہ ایک دن دولت مند ضرور بن جائیں گے لیکن ان کے خیال میں یہ لمبا راستہ تھا۔ انہوں نے شادیت کٹ اختیار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ

بارہ اور دل میں لگن ہو تو روزلا ہو سے کراچی کا پکڑا نکلتا

اس نے دونوں ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں گود میں رکھ لئے اور سر جھکا کر دھتے لیجے میں بولی ”یہ تو مجھے معلوم تھا کہ لندن بعد ہر حال تھیں واپس جانا ہی ہے لیکن اتنی جلدی کی آزمائش کے لئے گویا میں تیار نہیں تھی۔ ابھی تو ہم نے باہر کے ہاتھیں بھی نہیں کیں۔ لنگھوں سے خواب بھی کیا ہے۔“

”ایک عمر بڑی ہے ان باتوں کے لئے“ میں نے گویا بڑائی کے اظہار کے لئے مسکرا کر اسے دلاسا دیا ”اصل چیز تو بت اور پھر بیان دعا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت بھی ہے اور ہم ایک دوسرے کو وفا کا قول بھی دے چکے ہیں۔ باقی تو ملوثی باتیں ہیں۔“

”کبھی کبھی انسان کا افسانوی ہونے کو بھی تو دل چاہتا ہے؟“

”وہ دیکھ لیجے میں بولی“ اور پھر محبت بھائے خود دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہونے کے باوجود بڑا افسانوی سا جذبہ ہے...“

”اس نے“ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت صمیمیت سے چلیں جھپکائیں پھر جواب کا انتظار کے بغیر دل ”آج کی شگلاخ“ بے کیف اور بے مرد دنیا میں کھل رہ گئی ہے نہایت؟ سب دو اور دو چار کے اصول پر سوچتے ہیں۔ سب ضرورتوں کا پورا کرتے ہیں۔ کون کسی کے لئے جیتا ہے اور کون کسی کے لئے مرنے والا ہے۔ بہت ہی افسانوی سی چیز لگتے لگتے ہیں۔ وہ افسرہ سے انداز میں مسکرائی ”پھر بھی ہر بہت کرنے والا یہی سمجھتا ہے کہ اس کی طرح ٹوٹ کر شاید ہی کسی نے محبت کی ہو۔“

”ہمارے اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم بالکل اچانک... نہایت حادثاتی انداز میں... غلوں کی تمام تر شدتوں کے ساتھ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ”اور اس نہایت کا راز اتنا شدید ہے کہ میں اس سے خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ اتنی خوفزدہ کہ بچ بچو تو میں اسے ترک کر دیتا چاہتی ہوں۔ اس سے آزاد ہو جانا چاہتی ہوں مگر یہ بچ جو میرے دل کی گڑبڑ میں پھرا ہے راتوں رات گویا تیار و رشتہ بن گیا ہے شہ جڑ سے اکھاڑ پھینکا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں مجبور ہو گئی ہوں... چاہوں بھی تو اس سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔“

”کیوں چھٹکارا پاہا چاہتی ہو تم؟“ میں نے کہا ”یہ نعت تو کسی کسی کے حصے میں ہی آتی ہے۔“

کس اور میری بات کی کرکے کی کوشش نہ کریں۔" راجا قدرے مریضانہ لہجے میں بولی "دولت کے ہیں... بلادیہ اور مجمل دونوں صنعت کاروں کے لڑکے ہیں اور میرے دور پلاس کے کڑ بھی ہیں۔ مجھے معلوم ہے وہ دونوں ہی مجھ میں دلچسپی رکھتے۔ صرف وہی نہیں ان کے والدین بھی مجھے پسند ہی کی تھی سے دیکھتے ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ عمر میری وجہ سے ان دونوں خاندانوں میں ایک خاموش رقیبت چل نکلی ہے۔ اور میرے والدین بھی ان دونوں لڑکوں کو میرے لئے موزوں سمجھتے ہیں اور ایک طرح سے مجھے میں ہیں کہ کسے ترجیح دیں۔ اس سلسلے میں رائے کی کے لئے وہ مجھے کھار مجھے بھی کر دیتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہم دونوں کے حق میں یہ کچھ اچھی صورت حال نہیں ہے۔ کہ مجھے ان کے کان میں یہ بات ڈالنی پڑے گی کہ میری پسند کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری پسند کو یکسر نظر انداز نہیں کریں۔ بشرطیکہ تم ان کی توقعات پر پورے اترنے کے قابل ہو گئے۔ اس نے جو یہ کڑوں والی بات چھری تھی اسے سنے ہوئے میرا تو دل ہی ڈوبنے لگا تھا لیکن اس کے آخری الفاظ میری ڈھارس بندھ گئی۔

چند لمبے ہم دونوں خاموش رہے پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے یاسیت ذرہ سے انداز میں مسکرائی "انتا اچھا ہے کہ ہم نے تفصیل سے یہ سب باتیں کر لیں۔ اب ہمارے ذہنوں میں ایک دوسرے کی بات کوئی ایہام نہیں رہے گا۔ میں صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں بس ایک تنگ اس کی طرف دیکھ کر جا رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس میں موافق صورت کو سینے میں کہیں نقش کر لوں۔ میری محنت محسوس کرتے ہوئے اس نے شریلے سے انداز میں سر ہلا کر اور طویل سانس لے کر بولی "تو پھر کل تم لاہور واپس جا رہے تھے؟ مرنے دکنے کی کوئی صورت نہیں؟"

"تم کو تو رک جانا ہوں" میں نے اس لئے کے محبت آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لیکن میرا بچہ میرے لئے خاص ہے بڑے کاروباری نقصان کا باعث، ہمارے جنس معلوم ہے کہ میں کل دیوار کی دیواریں بنایا ہوں۔ ابتدائی میں اس قسم کے نقصانات کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اب تم نے حکم صادر کر دیا ہے کہ مجھے اپنا اشتیاق بند کرنے کی جدوجہد تیز کرنا ہوگی۔"

"ہاں... اسی لئے میں اب جنس رکھنے کو ہرگز نہیں کہوں گی" وہ گویا اپنی افسردگی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "بلکہ میں جنس یہ بھی نہیں کروں گی کہ تم اب

برصاپ میں جا کر قدرے آسودہ حال ہو جانا کوئی خاص کارنامہ نہیں۔ اب بھی دولت سے دولت لگائی ان کا محبوب مشکل ہے اور اس کے لئے وہ بعض بڑی بڑی اور نہایت مخدوش بازیاں لگانے سے بھی نہیں چوکتے اور معلوم نہیں یہ ان کی زبان ہے یا خوش ہمتی کہ بہت ہمیشہ انہی کی ہوتی ہے۔ میں یہ سب کچھ جنس اس لئے بتا رہی ہوں کہ جنس ڈیڑی کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان سب باتوں کو تم خواہ ڈیڑی کی زندگی کے خفی پسو سمجھو یا مثبت لیکن مجھے وہ اسی طرح جان دول سے عزیز ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ وہی میرے آئینہ میں ہیں۔ وہ بڑے پریکٹیکل آدمی ہیں مگر ان کی عملیت پسندی میں بھی بڑا حسن ہے۔ میرے ذہن میں اپنے آئینہ کا جو خاکہ ہے بالکل ویسا ہی ہے۔ میں ان سے بے گداز نہیں کر سکتی۔ میں وہی کہوں گی جو وہ کہیں کے خواہ اس کے لئے مجھے پوری زندگی خون تھوکتے ہوئے گزارنی پڑے۔"

"عجیب بات ہے..." میں نے آہستگی سے کہا "لیکن آخر وہ چاہیں گے کیا؟"

"پہلی بات تو یہ... کہ انہوں نے خود بے شک دولت کے لئے مئی سے شادی کی تھی لیکن وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ کوئی ان کی بیٹی سے دولت کے لئے شادی کرے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ دوسری بات میں جنس پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ وہ اپنے اشتیاق کا آدمی دیکھیں گے۔ اپنے جیسی خصوصیات اس میں دیکھنا چاہیں گے۔ اب جنس زیادہ سے زیادہ دولت کمانے اور اپنا اشتیاق بلند کرنے کے لئے اپنی جدوجہد تیز کرنی ہوگی۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"میں جب تمہارے ڈیڑی سے جنس مانگنے آؤں گا اس وقت میں ایک ممتاز اور صاحب حیثیت آدمی ہوں گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ اپنے اس دعوے کی تکمیل کے لئے میرے پاس زیادہ سات نہیں تھی۔ چند برس کی بات اور بھی کہ انکل زاہد کو رابطہ کی شادی کی فکر شدت سے لاحق ہو جاتی بلکہ میرا اندازہ تھا کہ اگر اس سے پہلے ہی انہیں کوئی معقول رشتہ مل گیا تو وہ اس فرض سے سبکدوش ہونے میں دیر نہیں کریں گے لیکن مجھے اطمینان تھا کہ اگر میں مارا نہ گیا اگر قادر نہ ہو گیا تو اس عرصے میں میرے پاس دولت کی ریل چل ہوگی کیونکہ میں نے بھی دولت کے حصول کے لئے شراکت ہی اختیار کیا ہوا تھا۔

"اگر تم یہ بات پورے وقوف سے کہہ رہے ہو تو پھر میں ڈیڑی اور مئی کو اشارہ دے دوں گی کہ میری پسند کیا ہے تاکہ وہ

”بس آئی! ایک کاروباری مسئلہ اٹھ کھڑا ہے“ میں نے مہذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا ”اور میرے بچے وہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

انکل زلف کانی کی چسکیاں لیتے ہوئے بولے ”بھئی اگر کوئی مالی مشکل ہو تو مجھ سے کہتے ہوئے بالکل نہ بچکانا۔ مجھے تمہارے کام آکر خوش ہوگی۔ کاروبار میں خفیہ و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں۔“ ان کے لہجے میں حقیقی خلوص کی خوشبو تھی۔ میں اس پیش کش پر خوش ہونے کے بجائے جانے کیوں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ میں نے فوراً پرزور لہجے میں کہا ”نہیں“ نہیں انکل! مالی مسئلہ کوئی نہیں ہے۔ مسئلہ انتقال ہے۔ برصِ حال آپ کی عکسائے پیش کش کا بہت بہت شکر ہے۔“ میرا انداز کسی حد تک اس سفید پوش کا سا تھا جو بھوک سے قریب المرگ ہوتا ہے مگر جب اسے کوئی کھانے کے لئے پوچھتا ہے تو وہ ہنسنے لگتا ہے۔ ”مگر آپ لارکہ دیتا ہے“ جی نہیں۔“ شکر ہے۔ میں تو گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا۔“

خیر مجھے حقیقتاً رتم کی ضرورت تو تھی ہی نہیں۔ انکل زلف سے میں رتم لے کر کیا کر سکتا تھا؟ کوئی شرط نام کام تو مجھے آسانی نہیں تھا۔ اور جو میرا دھندہ تھا وہ ایسے ہی ٹھیک چل رہا تھا۔ فی الحال میرا آزادانہ طور پر دھندہ شروع کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے افضل میاں! اگر تمہارا اجازت ہی ضروری ہے تو چلے جاؤ“ انکل دفتر جانے کے لئے اٹھتے ہوئے بولے۔ لیکن ہوسکے تو جلد دوبارہ پکڑ لگتا۔ تم سے یہ ملاقات ہے حد تشنہ سی رہی۔ کچھ ہم بھی مصروف رہے اور کچھ ہم بھی اندازہ سے بہت پہلے چل دیے۔ اور ہاں... تمہاری سیٹ کفرم ہو جائے تو مجھے دفتر فون کر دینا۔ میں آجاؤں گا۔ ہم سب جنمیں سی آف کرنے چلیں گے۔“

مجھے شام کی فلاٹ میں سیٹ ملی اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ سب کے سب مجھے ائروپورٹ تک چھوڑنے کے لئے چل دیے۔ ائروپورٹ پہنچ کر کانی دیر تک ہم رینگ لاونچ میں ہی کھڑے بائیں کرتے رہے۔ اسی قسم کی بائیں جیسی عموماً ایسے موقعوں پر کی جاتی ہیں۔ ہمارے میری فلاٹ سے متعلق اطلاع ہوا تو میں سب کو خدا حافظ کہہ کر ڈیپارچر لاونچ کی طرف چل دیا۔ بورڈنگ کارڈ میں لے چکا تھا۔

ڈیپارچر لاونچ کے بیٹھے کے دروازے پر رک کر میں نے سڑک دیکھا۔ وہ لوگ میز میوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ راجیلہ سب سے پیچھے تھی اور دونوں ہاتھ بٹلوں میں دیے دست سے انداز میں جاری تھی۔ میں اسی وقت اس نے بھی

یہ ضرورت سمجھی کراچی کا پکر بھی مت لگتا۔ بس یکسوئی سے اپنے کام میں لگ رہا... ہاں مجھے بات یاد آگئی ہے خط ضرور لکھتے رہتا۔“

”وہ تو تم نہ کہیں تب بھی ظاہر ہے میں ضرور لکھتا“ میں نے کہا۔ البتہ میں یہ پوچھا چاہ رہا تھا کہ خط میں کس پتے پر لکھا کرتوں گا؟

”اسی گھر کے پتے پر اور کون؟“ میرا سوال اس کے لئے گویا قدرے جراتی کا باعث بنا تھا۔ پھر وہ جیسے میرا مطلب سمجھتے ہوئے مجھے تسلی دینے کی خاطر بولی ”مگر میں میری ڈاک کوئی نہیں کھولتا۔ ہوسکتے تو کبھی کبھار فون بھی کر لیا کرتا“ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش آئی۔

”میرا خیال ہے ہمیں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”کون کب کب جذباتی ہوتا ہے؟“ وہ بھی جیسے اپنے محسوسات کو چھپاتے ہوئے دھڑکتے سے ہنس دی ”اب تم جا کر آرام سے سو جاؤ۔ کل جنمیں یکدم پھر ماحول کی تبدیلی کا سامنا کرنا ہے۔ کوئی فلاٹ سے جاؤ گے؟“

”میرے پاس اسی فلاٹ ہے۔ صبح ہی دیکھوں گا کہ کوئی فلاٹ میں سیٹ مل سکتی ہے“ میں نے کہا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ”اچھا... تو پھر میری طرف سے تو ابھی سے خدا حافظ“ اس کا ذہیلہ زحلا گاؤں ہوا میں لہرایا اور پھر وہ جھوٹے جھوٹے قدم اٹھاتی یوں میری نظر سے اوجھل ہو گئی جیسے چاندنی سے بنا ہوا کوئی بیلا دھیرے دھیرے ہوا میں تیرتا ہوا بالآخر تاریکی میں مدغم ہو گیا ہو۔

میری کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ مجھے لگا کہ کھانا تو ساتھ ہی اس احساس کی لذت بھی تھی کہ کوئی انتظار کرے گا، میرے بارے میں سوچے گا۔ اس احساس میں واقعی ایک عجیب ٹکک آمیزی لذت پنپ رہی تھی کہ کہیں آپ کا بھی کوئی چاہنے والا موجود ہے جو آپ ہی کی طرف جھری راتیں گنتا اور اندر ہی اندر آنسو پیچا ہے۔ انہی محسوسات سے الجھتا ہوا بالآخر میں اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔

دوسری صبح جب میں نے ناشتے کی میز پر اطلاع کیا کہ میں آج لاہور واپس جا رہا ہوں تو ابھی حیران رہ گئے۔ حتیٰ کہ راجیلہ نے بھی یوں حیرت کا اظہار کیا جیسے اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے جانے کا سن کر سب سے زیادہ اور اسی آئی کے چرسے پر نظر آنے لگی تھی۔

”لیکن یہ اچانک تمہارا باپسی کا پروگرام کس طرح بن گیا؟“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولیں ”تم تو کئی دن رہنے اور میرا دفتر کرنے کا پروگرام بنا کر آئے تھے؟“

تھے کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ اب جیسا تیسرا بھی رشتہ میرے آئے گا میں کر دیں گے لیکن اللہ نے من کی مراد کے مطابق یہ دے دیا ہے۔ اب زور اور پند ایک خاص طبوسات کا انتظام مجھے ہی کرنا ہے۔۔۔ اور مجھے لگتا ہے کہ یہ سب چیزیں اے کر میں عین سوچ پر ہی گھر پہنچ سکوں گا کیونکہ ابھی پہلے بہت سے ضروری کام نٹھائے ہیں اور انہی کے دوران شاپنگ کرنی ہے۔ شاپنگ میں ذرا تم بھی میرا ساتھ دینا۔ مجھے تو زور پکڑے دنیہ کے بارے میں خاک بھی پڑ نہیں۔“

”چتا تو مجھے بھی کچھ نہیں“ میں نے مسکراتے ہوئے کہہ دیا۔ ”بہر حال تمہارے ساتھ چلا چلوں گا۔ بشرطیکہ پاس نے مجھے بھی کاموں میں بری طرح نہ الجھا دیا۔ اس نے جس طرح ہنگامی انداز میں مجھے بلایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے بہت سے معاملات نٹھائے پڑیں گے۔۔۔ اور اوپر سے طرہ یہ کہ پاس خود لندن جا رہا ہے۔“

”ہاں۔۔۔“ شرف مسکرایا۔ ”پاس آج کل بہت اونچی ہواؤں میں ہے۔ بہت خوش ہے۔ خیر۔۔۔ اچھا ہی ہے۔ پاس خوش ہوتا ہے تو ہمارے بھی کچھ دن بھر نہ لگتے ہیں“ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولا ”ہمیں تو زندگی میں بس ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح بہن کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ یہی ایک بوجھ تھا کہ صوں پر۔ یہ کام نہت جائے گا تو بس ہم تو ڈالو ہیں۔ کسی اور کی مجھے کوئی خاص فکر نہیں۔ دل ہی دل میں میں نے اپنے آپ سے صرف بہن کے فرض سے سبکدوش ہونے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد ماہ دولت بالکل بے فکری اور عیش و عشرت سے زندگی گزاریں گے۔“

”اب کونسا تم فکر دوں میں ویسے ہوئے جا رہے تھے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اندہر کا حال تمہیں کیا معلوم“ وہ طویل سانس لے کر گاڑی میں لیو رڈ گلبرگ کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

”ہم جب باؤل ٹاؤن دلی کو گئی پر پہنچے تو یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ ڈرائیو سے قاسم خان کی سرسبز موجود تھی۔ جمیل باہری موجود تھا اور اس نے ہمیں بتایا کہ پاس میرا ہی انتقاد کر رہا ہے۔ مجھے کچھ عجیب سا ہی لگ رہا تھا کہ میں کیا کہی قاسم خان کے لئے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا تھا حالانکہ میرے اپنے خیال میں ابھی میں نے کوئی ایسی بے مثال کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔

”ہم اندر پہنچے تو قاسم خان ہمیں ڈانٹتے دم میں لا۔ جوتی عرف مس ٹرپ اس کے سامنے کافی کے برتن رکھ رہی تھی۔ قاسم خان بہت چاک سے مجھ سے ملا چپے میں اس کا کارندہ

مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ٹانپے کے لئے ایک ساہ سالہ لڑکا۔ خاموشی کی زبان میں اس نے ایک لمحے میں جیسے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

”میں نے جو کچھ کہا تھا وہ سب یاد ہے نا؟“ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا۔

”سب یاد ہے۔۔۔ اور میرے دم تک یاد رہے گا۔“ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ لوگوں کی بیڑ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے لاہور فون کر دیا تھا اور لاہور ایئر پورٹ پر شرف مجھے پیلے آیا ہوا تھا۔ شرف کو میں صرف تین چار دن بعد ہی دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے بہت بدلا بدلا دکھائی دے رہا تھا۔ گھر اکھر اور بے حد آسودہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ لاہور کی فضا بھی مجھے بہت مختلف، بہت ہمز محسوس ہو رہی تھی۔ تبدیلی شاید انسانوں میں، در فضاؤں میں نہیں آتی تھی بلکہ تبدیلی مجھ میں ہی آتی تھی۔ ”حرکت میرے ہی دل سے پھوٹ رہی تھی۔ میرا دل پہلے سنگار میدان تھا، اب شاید اس میں پھول کھل اٹھے تھے۔ گرد و پیش کی ہر چیز مجھے بھلی لگ رہی تھی۔

میں اور شرف جب ایک دوسرے سے گلے مل کر اچھی طرح ایک دوسرے کی پسلیاں کڑا کڑا چکے تو باہر آکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شرف نے گاڑی اشارت کر کے پارکنگ لائٹ سے نکال لی اور ہم سڑک پر پہنچ چکے تو میں نے پوچھا ”کیا بات ہے تم بہت خوش نظر آ رہے ہو؟“ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی انجانے تصور سے تمہارے چل پوں تھما اٹھتے ہیں کہ گل گل اور ٹٹاڑیا چندر زیادہ معلوم ہونے لگتے ہیں؟“

”ہاں یاد۔۔۔ میں بہت خوش ہوں اور اپنی خوشی کی وجہ میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں“ وہ مسرور لہجے میں بولا ”بات صرف اتنی ہے کہ میری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔“

”مبارک ہو“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

”شکریہ“ وہ سرلا کر بولا ”پرسوں ہی گھر والوں کا خط آیا تھا تب سے میں بے چین تھا کہ تمہیں یہ خبر سناؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ صرف تم ہی میری خوشی کو محسوس کر سکتے ہو۔ یہاں اور تو کسی کو کسی کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ قاسم خان کو بھی نہیں جس کے لئے ہم جان بھری پر رکنے پھرتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ بات تو یہ“ میں نے آہستہ سے کہا۔

نہیں دوست ہوں۔ مس ٹرپ نے خاموشی سے ہمارے لئے بھی کلنی تیار کی پھر اسی طرح خاموشی سے کمرے سے رخصت ہو گئی۔

بیٹھے کے بعد رسمی باتیں ہو چکیں اور کلنی تقریباً ختم ہو چکی تو قاسم خان گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا "میں تو کل شام یہاں سے کراچی اور پھر وہاں سے لندن کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ آٹے والے دونوں میں تم دونوں کو یہاں بہت کام کرنا ہے۔ حالات نے کچھ اس طرح کروٹ لی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ پے دوپے کی کردہ نش لی ہیں" وہ سکار نکالتے ہوئے مسکرایا "اور ان کروٹوں کی وجہ سے بہت سے معاملات الجھ کر رہ گئے ہیں۔ کچھ اچھی خبریں بھی ہیں اور کچھ بری خبریں بھی ہیں۔ کچھ عرصے کے لئے تم دونوں کو شاید کچھ ایسے کام بھی انجام دینے پڑ جائیں جو تم دونوں کے دائرہ کار میں نہیں آتے..." میں نے مسکراتے ہوئے شرفو کی طرف دیکھا جس کا منہ ہلک گیا تھا۔ قاسم خان ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "کیا اتنے تم دونوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف لیں دیکھ رہے ہو؟"

شرفو تو کچھ نہ بولا۔ میں نے کہا "در اصل ہم پہلے ہی بات کر رہے تھے کہ مصروفیات کچھ بڑھ نہ جائیں جبکہ اٹھارہ تاریخ نو شرفو کی بہن کی شادی آ رہی ہے۔"

قاسم خان نے اس خبر پر کوئی خاص رد عمل ظاہر کئے بغیر لہا۔ "ارے بھئی اٹھارہ تاریخ تک تو تم فارغ ہو چکے ہو گے۔ صرف تین چار دن کی مصروفیات ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میرے کام کا نظام بہت مختصر ہے گروہ پر چل رہا ہے اور میری مختصر سی مشینری سے وہ اہم پڑے کھٹک گئے ہیں اس لئے تم پر اضافی کام کا بار پڑ رہا ہے۔ کچھ لین دین کے معاملات ہیں۔ بہت لوگوں کے حصے پہنچانے ہیں۔ چند دن تاریخ کو تم لوگوں کو ایک اہم کھپ وصول کرنے "بہتری منڈی" کی سرحد پر جانا ہے۔ مال کو سرحد پار تو فروخت کنندہ پابندی پٹھان دے گی۔ وہاں سے اسے پنڈی تک لانا تمہاری ذمہ داری ہوگی۔ پنڈی میں بہادر پانی وصول کر لے گی۔ اس کے بعد وہ جیلے اور اس کا نام۔ کھپ بہت اہم ہے۔ صرف ایک ٹرک ہی ہو گا لیکن اس کی قیمتیں ہو گا۔ اوپر کو کٹ لہا ہوا ہو گا۔ ایک بات کا خاص خیال رکھنا ہے کہ کسی بھی قیمت پر ہل چھوڑ کر نہیں بھاگنا ہے۔ اس سب میں تمہیں ہر سبھاوردوں کا کہہ دو بیخیزوں کو نہ سی ہے۔ کہیں کہاں سے تمہیں کوڑو دوڑوں کو گزر جانے دیا ہے کہ اور کہاں رسمی طور پر تمہیں روکا جائے گا۔ اصل فخرہ لڑ ایک پوائنٹ پر بنے وہاں سے ٹھل گئے تو سمجھو کام ختم

ہو گیا۔ خیر... یہ سب تفصیلات تو بعد میں ملے ہوں گی....." اس کا رویہ سخن شرفو کی طرف ہو گیا "اس وقت میرا اصل مقصد تو تمہیں خبردار کرنا تھا کہ تم ذاتی طور پر تیار رہو۔ مال لانے کے لئے افضل کے ساتھ تمہیں جانا ہو گا کیونکہ جمشید میرے ساتھ لندن جا رہا ہے۔"

جمشید وہ محض تھا جو ایک طرح سے مال کے "بڑی گاڑ" کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ہم دونوں مال لینے اکٹھے جاتے تھے۔ تیسرا ڈرائیور ہوتا تھا۔ بعض اوقات ڈرائیور کے فرائض بھی ہم دونوں میں سے ہی کسی ایک کو یا باری باری دونوں کو انجام دینے پڑتے تھے۔ مال اگر ٹرک میں ہوتا تھا تو ایک وقت میں ہم میں سے ایک آدمی نیچے ڈرائیور والے حصے میں ہوتا تھا اور دوسرا اسٹین گن وغیرہ لئے ٹرک میں مال کے اوپر لیٹا ہوتا تھا اور اس کی چاروں طرف نظر ہوتی تھی۔ اگر ہمارے بری طرح پس پس جلتے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا تو اوپر والے کو کھٹل دے دیا جاتا تھا اور وہ زبردست طریقے سے فلائنگ شروع کر دیتا تھا۔ نیچے بیٹھے ہوئے آدمی کلام مٹا کٹھکتہ عملی کے ساتھ ٹرک کو ہچاکر ٹھل لے جاتا ہوتا تھا۔

جمشید نہایت بے جگر آدمی تھا اور اپنے کام میں بے حد ماہر۔ اس کی حیثیت ایک طرح سے میرے اسسٹنٹ کی تھی وہ تقریباً ان پڑھ ہی سا آدمی تھا۔ معلوم نہیں قاسم خان کیوں اسے اپنے ساتھ لندن لے جا رہا تھا۔

"تو مجھے مال لانے کے لئے افضل کے ساتھ جانا ہو گا؟" شرفو نے پینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ایک مدت ہو گئی ہے مجھے اس قسم کی کسی مہم پر مجھے ہوئے۔ ایک عرصہ پہلے مجھے کبھی کبھار چھوٹی موٹی کھپ کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔" "گھبرانے کی ضرورت نہیں" قاسم خان نے گویا استحوصلہ دیا "مجھے معلوم ہے تمہاری اس دور کی مشاغل و مہمات آج بھی برقرار ہے۔"

"گھبرانے کی کیا؟" شرفو کی مسکراہٹ بدستور پینکی سی رہی "گھبرانے تو ہم نے اسی دن چھوڑ دیا تھا جس دن آپ کے حلقے میں آ گئے تھے۔"

"گھڑ" قاسم خان سکار کی راگ بھاڑتے ہوئے بولا "اس مہم سے گویا تمہارا بھی منہ کا کاٹھ تبدیل ہو جائے گا۔ بہت عرصہ ہو گیا تمہیں ٹھٹھٹھے ٹھٹھے قسم کے کام انجام دیتے ہوئے۔ اب ہم آتے ہیں دوسرے اہم کام کی طرف۔ میں نے تمہیں بتایا کہ ہماری مختصر سی مشینری کے دو پڑے اپنی جگہ سے کھٹک گئے ہیں۔ اس سے میری سرلو ایک تو کچی جمشید تھا جو میرے ساتھ لندن جا رہا ہے۔ دوسرا پڑہ شلارخ

ساتے کھلی کتاب ہوتی ہے۔ ہر کنزوی کسی نہ کسی زندہ یا مردہ فرد کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔
 ”اب مسئلہ کیا ہے؟“ شرفو نے سرگوشی نمائیے میں پوچھا۔

”مسئلہ یہ ہے کہ شاہ رخ غدار کی کر گیا ہے“ قاسم خان سرگرمی سانس لے کر بولا ”کیپ دراصل میں نے پہلے ہی پار کر لی تھی۔ تھوڑا سا مال گاڑی میں چھوڑ دیا تھا اور جان بوجھ کر اس طرح کی حرکتیں کی تھیں کہ وہ اپنی اس گلگ والوں کے بچے چڑھ جائے۔ کیپ بڑی نہ سی لیکن اتنی بے وقعت بھی نہیں تھی۔ شاہ رخ جیسے لوگوں کے لئے تو بہت تھی۔ اذہار میں بہت معمولی سا مال پکڑے جانے کی خبر آئی ہے اور میں نے اپنے ذرا لٹے سے تصدیق کر لی ہے۔ اپنی اس گلگ والوں کو واقعی اتنی ہی مال ہاتھ لگا ہے۔“

”مکن ہے شاہ رخ اس خوف سے روپوش ہو گیا ہو کہ کس دہ آپ کے عتاب کا نشانہ نہ بنے“ شرفو نے ذلیل ظاہر کیا ”وہ کم عمر ضرور ہے مگر ایسا بچہ بھی نہیں ہے“ قاسم خان پہلو بدل کر بولا ”اسے معلوم ہے کہ بعض اوقات ہمیں اس سے بھی بڑی کیپ کا نقصان برواشت کرنا پڑا ہے لیکن کیپ سے ہاتھ دھونے والے سیدھے ہمارے پاس آتے ہیں اور ساری صورت حال بتا دیتے ہیں۔ ہم تصدیق کر لیتے ہیں کہ کیو مگر ایسا ہوا اور کسی کا کچھ نہیں جگوتا۔ شاہ رخ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ پھر اس کا بازوے والی پارٹی سے ملتا۔ اور پھر مانی ٹوکے والے جیسے آدمی کی کنزوی میں چھپا۔ ان سب باتوں سے اس کی غدار کی تصدیق ہو گئی ہے۔ مجھے خلو یہ ہے کہ وہ کسی ذاتی وجہ کے تحت یا کسی پارٹی کے ہمارے میں آکر سرکاری محکموں کو ہمارے بارے میں ٹپ دینے کی کوشش نہ کرے۔ گو کہ اسے کوئی خطرناک قسم کی معلومات حاصل نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی مدد سے ہمارے خلاف کچھ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود میں چونکہ اپنی عمارت میں کوئی خدوش لینت چھوڑنا پسند نہیں کرتا اس لئے....“ وہ بات اور حوری چھوڑ کر معنی خیزت انداز میں مسکرایا۔
 ”اس کا پتہ صاف کرنا ہے؟“ شرفو نے بھیجی جیسی آواز میں پوچھا۔

”ہاں“ قاسم خان نے سرگوشی نمائیے میں جواب دیا اور سکار کا کش لینے لگا۔

چند لمحوں کے بعد وہ بوجھل سکوت طاری رہا۔ پھر قاسم خان نے ہی یہ سکوت توڑا ”یہ کام آج رات ہی ہونا ضروری ہے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد کنزوی کا بلندہ دھلا چوٹی دوڑاؤ

ہے جو صحیح معنوں میں کھٹک گیا ہے۔“
 شاہ رخ کو ہم سرسری طور پر جانتے تھے۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ گروہ میں شامل ہے لیکن صحیح طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ گروہ میں اس کی پوزیشن کیا ہے، وہ کرتا کیا ہے اور قاسم خان کے نزدیک اس کی اہمیت کتنی ہے؟ یہ بھی قاسم خان کی پالیسی ہی کا ایک حصہ تھا کہ جب تک بھی ممکن ہو گروہ کے بیشتر اراکان کو ایک دوسرے سے حتی الامکان لائق رکھا جائے۔ جن لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی کام پر جانا پڑتا تھا وہی ایک دوسرے کو کسی حد تک جانتے تھے۔ شاہ رخ ایک اسٹارٹ ’خوش شکل اور نفیس ساتو جوان تھا۔ وہ بظاہر کسی معزز گھرانے کا فرد اور کسی صاف ستھرے اور اے کا ملازم نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان بھی نہیں مگزرتا تھا کہ وہ کسی ایسے ویسے وھندے میں بھی لوٹ ہو سکتا ہے۔“
 ”میں نے سنا ہے شاہ رخ روپوش ہو گیا ہے؟“ شرفو جیسے سے لمحوں میں بولا۔

”ٹھیک سنا ہے تم نے“ قاسم خان سکار کا کراکش لے کر بولا ”مجھے فرصت ہی نہیں ملی کہ تم سے اس مسئلے پر بات کرنا۔ قصہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں شاہ رخ سرحد پار سے ایک چھوٹی سی کیپ لے کر آیا۔ گو کہ سب معاملات سیٹ تھے لیکن معلوم نہیں کیوں اور کس طرح اپنی اس گلگ اسکا والوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ مال چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ خیر۔ یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ویسے بھی کیپ چھوٹی تھی اس لئے وہ کیا بھی اکیلا تھا۔ بہر حال خطرہ ٹل جانے کے بعد اسے مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہئے تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ افضل کے کراچی جانے سے بھی پہلے کی بات ہے۔ کئی دن تک مجھے اس کا کوئی سراغ ہی نہیں ملا۔ پھر خبر آئی کہ اس نے باڑہ کی ایک پارٹی سے ملاقات کی ہے جسے ہم اپنے مخالفوں میں ہی شمار کرتے ہیں۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ لاہور واپس آیا۔ میرے جاسوسوں نے مجھے خبر دی ہے کہ کل سے وہ مانی ٹوکے والے کی کنزوی میں چھپا ہوا ہے۔“

کنزویاں قدیم لاہور کے مختلف حصوں میں کہیں کہیں موجود وہ عمارتیں ہیں جو مغلوں کے دور سے چلی آ رہی ہیں۔ ایک ہی بڑے سے احاطے میں پچاسوں سے زائد کیپس کی کوشیزوں وغیرہ پر مشتمل عمارت کنزوی کہلاتی ہے۔ بعض کنزویاں ایسی بھی ہیں جن میں ڈھائی ڈھائی سو خاندان آباد ہیں جو درحقیقت ایک ہی واحد و خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ’لڑائی جھگڑے‘ پیار و محبت، تقریبات اور لین دین سب سنبھالا ہوا ہے اور سب کی زندگی ایک دوسرے سے

مائی نوکے والے کے لئے بھی رہت دو۔ اگر شاہ رخ است یا کسی اور کو کچھ بتا بھی چکا ہے تو اویل تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی اور اگر ہوگی بھی تو اس کی موت کے بعد ختم ہو جائے گی۔" ایک بار پھر چند لمحوں کے لئے کمرے میں سکر اسکوٹ چھایا۔ قاسم خان میری طرف دیکھ کر مذمت خواہانہ سے ابواڑ میں مسکراتے ہوئے بولا "تم بھی سوچو گے کہ اگر سستانے بھی نہیں پائے اور کام شروع ہو گیا۔"

"میں کون سا کراچی سے پیدل آیا ہوں" میں نے اپنے لیے سے خوشدلی کا اظہار کرنے کی کوشش کی لیکن درحقیقت میں کچھ ایسا خوش نہیں تھا۔ میں اس خوشرو نوجوان کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی موت کا پروانہ جاری ہو چکا تھا۔ ہر حال کام تو کام تھا اور ہمیں اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

پتھہ در اور گفتگو ہوتی رہی۔ کئی دیگر چھوٹے موٹے معاملات کی تفصیل ملے ہوئی اور بالآخر قاسم خان جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے وہ دروازے پر رک کر بولا۔۔۔ "شاہ رخ والے معاملے کی رپورٹ تم صبح جلدی بیٹھے دے دینا۔ کل میں سات بجے ہی اٹھ جاؤں گا۔"

وہ جا چکا تو میں اور شرفو چند لمحوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پتھر خرم نے پوچھا "یہ مائی نوکے والا کون ہے؟" میں نے پہلے بھی کہیں دو ایک بار اس کا نام سنا ہے۔

"لاہور میں رہو گے تو اکثر سنتے رہو گے" شرفو ہماری سانس لے کر بولا "خاصا مشہور آدمی ہے۔ اسے تم لاہور کا "لوک ورثہ" کہہ سکتے ہو" وہ دھیرے سے ہنسا "ریٹائرڈ قسم کا پہلوان ہے اور نائی گرائی بد معاشوں میں اس کا شمار ہوتا ہے مگر یہ ان روایتی قسم کے بد معاشوں میں سے ہے جو بہت سے شریفوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ جن کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں اور جو کبھی وضع داری کا واسن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ مثلاً یہ کہ مائی نوکے والے کی ذات سے کبھی کسی کزور اور غریب کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ کوئی کزور اور غریب اگر کوئی فریاد لے کر اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ حتی الامکان اس کی مدد کرتا ہے۔ وہ کزنز کے دو دھائی سو غریب خاندانوں کا محافظ ہے۔ اس کی کزنز میں کوئی بد معاشی کوئی جرم نہیں ہوتا۔ کسی کو سستانے والا کوئی آدمی وہیں پٹنگ نہیں سکتا۔ بہت سی بڑی بڑی شخصیتوں نے اس سے بہت بڑے بڑے کام لئے ہیں۔ بہت اونچے درجے کا بد معاش ہے مگر درویشوں کی طرح رہتا ہے۔ پڑھے لکھوں کی بڑی قدر کرتا ہے اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس نے دو تین ہیر ہٹ

کر دیا جاتا ہے اور اس دروازے کے عقب میں ہی اب سے پہلے مائی نوکے والے ہی کا رہائشی حصہ ہے جس کے سامنے بی بی نوکیلی چوڑی اور بھاری بھرکم چارپائی پر وہ خود یا اس کے درچار کر کے بیٹھتے تھے وغیرہ عکازاتے رہتے ہیں۔ مائی نوکے والا پرانا آدمی ہے۔ اس کی سوچ بھی پرانی ہے لیکن ہر حال خطرناک آدمی ہے۔ اس سے ایجنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے ایک بڑا شدہ کانڈ نکالا اور اسے کھول کر میرے پر بچایا یا اس پر آڑی طرحی ٹیکہ بول سے یک نقشہ سا بنا ہوا تھا۔

"میرے ایک ضعیف سرانصرمان نے بڑی محنت سے یہ نقشہ تیار کیا ہے۔ اسے اتفاقاً ہی شاہ رخ کا سراغ مل گیا تھا مگر اس کے بعد اس نے اس مقصد کے لئے بڑی محنت کی ہے کہ یہ سراغ ہاتھ سے نکلے نہ پائے" قاسم خان مسکرایا "میساکہ میں نے تینا رات بارہ بجے کے بعد کزنز کا بھاری بھرکم اور بلند دہلا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور کزنز کی چادر پوری بھی دوسرے بلند دہلا دکانوں سے بالکل بڑی ہوئی ہے۔ عقب میں جو یہ چوٹی سی گلی ہے۔۔۔"

وہ نقشے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ نقشہ وہ درحقیقت شرفو کو سمجھا رہا تھا بولا ہور کے گلی کو چوں کا کبڑا تھا۔ قاسم خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس گلی سے تم درحقیقت اس مکان پر پڑھو گے اور اس طرف سے کزنزوں میں پاؤں رکھ کر کزنز میں کودو گے۔ یہ کوششوں کے درمیان نیز سے میرے راستے ہیں لیکن تم جہلی کو دو گے وہیں سے تمہیں پائیں ہاتھ کے اس راستے پر صرف دس بارہ قدم چلنا ہے۔ اس کوشش میں شاہ رخ چناہ گزین ہے۔ چونکہ میرے اس کوشش کا۔۔۔ نہیں کا ایک چور کو سا کھڑا بھی دروازے کی چوکھٹ پر لگا ہوا ہے جس پر چونکہ نمبر لکھا ہوا ہے۔ کام کافی ہوشیاری سے ہونا چاہئے۔ مائی نوکے والا اپنی جگہ خطرناک ہے لیکن شاہ رخ خود بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ رات کو وہ بجلی کی سی پھرکتی سے نکلتا ہے اور آگے بند کر کے محض آواز پر بھی نکل کرے تو کوئی نشانے پر لگتی ہے۔ وہ جتنا کم عمر اور مضموم نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں۔ اپنے افضل میاں کی طرح" قاسم خان میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

میں بھی مسکرایا لیکن شرفو کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ ہنسنے پر نظر نہ مارتے ہوئے دیکھنے لگے میں بولا "لاش کا کیا کرنا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔۔۔ وہیں چھپو رہو" قاسم خان بے پروائی سے بولا "اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ تم تو اسادہ در

حال چل پوچھتے اور خیر و عافیت جاننے کی بھی کوشش نہیں کی۔
"ظاہر ہے زندہ سلامت نظر آرہے ہو تو اس کا مطلب
یہی ہے کہ خیر و عافیت سے ہی لوٹ کر آئے ہو۔" وہ سنجیدگی
سے ہی بولی "اگر کوئی ہاتھ پاؤں، ناک کان کم نظر آ رہا ہو تو
پوچھتی بھی کہ کمال رہ گیا۔"

"ہائے ... تمہیں کیا معلوم کہ ہماری تو سب سے قیمتی
محتاجی کراچی میں رہ گئی ہے۔ ہم اپنا دل وہیں چھوڑ آئے ہیں
سیاہ قلم شزاوی! " میں نے غمناک لہجے میں کہا۔

"ایک تو دل تمہارے پاس معلوم نہیں تمہوکے
حساب سے رکھے ہوئے ہیں۔ جلی دیکھتے ہو اسپتیر پارٹ کی
طرح ایک آدھ پھینک دیتے ہو۔" وہ بدستور سنجیدگی سے ہرلی
تأمین اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے میرے انداز
مخاطب کا قطعاً برا نہیں منایا تھا۔ اس کی یہ خوبی بھی بڑی ہے
مسلحہ تھی کہ اس کی سنجیدگی میں بھی بے پلہ زندہ دلی پسلی ہوتی
تھی۔

میں اسے یقین دلانے لگا تھا کہ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں
اور نہ ہی کسی دل گلی کا تذکرہ کر رہا ہوں بلکہ واقعی میں کسی کے
تشریم کش کا گھماکل ہو کر آیا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں
نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کیا جانتا تھا میں بھی بھلا اس راز کا
دوسروں سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ راجیل کا تصور
راجیل سے تعلق خاطر ہماری باتیں ہمارے بیان۔ یہ تو
انہیں تمہیں میرے پاس۔

"اچھا۔ جلدی سے کہنا کھلا دو۔ بہت بھوک لگ رہی
ہے" میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ اس نے گہری گہری
فکروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی مہلی مونی ظالم
آنکھوں میں بدستور نگل کا جادو رہا ہوا تھا۔ اس نے شاید کچھ
پوچھنا چاہا تھا مگر ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ خاموشی سے مڑی اور
کمرے سے باہر چلی گئی۔

کہنا کھا کھا میں اپنے کمرے میں آلیٹا اور بارہ بیچ تک
آرام کرنے کی غرض سے سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند
جیسے آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن پر جانے کن کن
مختار خیالات کا جھوم تھا۔ کبھی راجیل کا چہرہ اور کراچی میں
مکڑارے ہوئے تین ڈنوں کی ان گنت یادیں پلنار کر رہی تھیں
اور کبھی زندگی کے مسائل ذہن کے افق پر سر اٹھا رہے تھے اور
کبھی ان کاموں کی فکر ستا رہی تھی جو قاسم خان نے ہمارے
ذمے لگائے تھے۔

بالآخر میں نے سونے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔... کیونکہ میں
نے محسوس کر لیا تھا کہ نیند نہیں آئے گی لیکن جب میں نے
سونے کا ارادہ ترک کر دیا تو آنکھ لگ گئی۔

بچپانی قافیں بھی بٹائی ہیں جن کی کہانیاں بھی غالباً اس نے خود
کھائی تھیں۔ ایک بار ایک اخبار نویس نے اس سے انٹرویو لیتے
ہوئے پوچھا تھا کہ اس کی فلموں کی کامیابی کا راز کیا ہے جبکہ وہ
تقریباً ان پڑھ آدمی ہے۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ وہ صرف
اس لئے اچھی قافیں بنانے میں کامیاب ہوا کہ اس نے زندگی
کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور زندگی سے قریب تر قافیں ہی
بنانے کی کوشش کی ہے اور جہاں تک حالات نے اجازت دی
ہے حقائق کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔
"یہ تو بڑا دلچسپ کردار ہے" میں نے کہا "میرا تو اس سے
لنے کوئی چاہئے لگا ہے۔"

"دعا کرو کہ کم از کم آج کی رات تو اس سے ملاقات نہ ہو"
شرفو بولا "دور نہ اٹکان ہے کہ اس کا وہ واقعی کے پاؤں جیسا ہونا
شیشم کا چمکتا ہوا مگر بھر کا ڈنڈا ہماری کھوپڑیاں پاش پاش نہ کر دے"
"ڈنڈا رکھتا ہے وہ لپٹے پاس؟" میں نے قدرے حیرت
سے پوچھا۔

"دیے تو خیر ضرورت پڑنے پر وہ ہل بھر میں کہیں نہ کہیں
سے اٹھیں گن یا راتھل بھی نکال لیتا ہے" شرفو بولا "لیکن وہ
سوٹا گویا اس کا ڈنڈا مارک بن کر رہ گیا ہے۔ ہر وقت اس کے ہاتھ
میں ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اس کا نام ملنی ٹو کے والا کیوں ہے۔
تو کہ تو اس کے ہاتھ میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس کا نام تو مانی
سونے والا ہونا چاہئے تھا۔"

میں نے اپنا مک موضوع بدلتے ہوئے کہا "مجھے تو بھوک
لگ رہی ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا" شرفو بولا "کہنا کھا لیتے ہیں۔
اس کے بعد کچھ دیر آرام کر لیں گے۔ بارہ بجے کے بعد ہم گھر
سے نکلیں گے اور میرے خیال میں مناسب یہ رہے گا کہ ہم
اپنے ملے بھی تھوڑے بہت تبدیل کر لیں۔ میرے بیڈ روم
کی الماری میں تھوڑا سا ایسا سامان موجود ہے جس سے بظاہر تو
انسان کی شخصیت میں زیادہ تبدیلی نہیں آتی مگر درحقیقت وہ
ناکمل شناخت ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے بے پردائی سے کہا "تم جو مناسب
سمجھو کر لیں۔ میں تو صرف تمہارے مددگار کے طور پر ساتھ
چل رہا ہوں۔"

شرفو نے آواز دی اور مس شریب کمرے میں آگئی۔ اس
کے چہرے پر حسب معمول گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔
شرفو اسے کھانے کے بارے میں بتا دیا تو میں نے کہا "بہت ہی
مستور عورت ہو تم۔ ہر وقت یوں منہ سجائے رکھتی ہو کہ
عورت کم اور آنکس کا مجسمہ زیادہ معلوم ہوتی ہو۔ اب
مابدولت کراچی کے دورے سے واپس آئے ہیں اور تم نے

جس اور بھی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دیے بھی اب ایسی کھیاں شروع ہو رہی تھیں جس سے گاڑی تو کیا سائیکل گزرا تا بھی آسان نہیں تھا۔

رات کے دو بجتے کو تھے لیکن اس علاقے میں ابھی تک خاصی چل چل پھل تھی لیکن جب ہم نے ... ٹک و ٹارک کی گلیوں کا رخ کیا تو وہ دیر ہی نظر آئیں۔ ان گلیوں کا فرش اینٹوں کا تھا اور ہر گلی کے درمیان سے مٹی گزر رہی تھی۔ دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ پانی کے سیسوں جستی پائپ بچھے ہوئے تھے۔ جن میں بعض ایک بھی کر رہے تھے اور رات کے سناٹے میں 'شر شر' کی مدھم آوازوں کے ساتھ پانی کی باریک باریک دھاریں ہوا میں بلند ہو رہی تھیں۔

ایسی ہی اینٹکی گلی سے گزرتے وقت شرفو نہایت دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا "اگر مائی ٹو کے والے سے سامنا ہو جائے تو اس پر گولی مت چلاتا۔ مجھے وہ شخص بہت بھلا مانس لگتا ہے ... اور پھر بچھلے دونوں ایک جھگڑے میں اس کا ہون پٹا بھی مارا جا چکا ہے گولیوں سے چھلی ہو گیا تھا۔ تب سے مائی بہت دل شکست ہو چکا ہے مجھے تو اس سے ہر روزی محسوس ہوتی ہے خواہ کسی کی نظر میں وہ اچھا ہو یا برا۔"

میں نے ان بات میں سر ہلایا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ بالآخر ایک جگہ پہنچ کر شرفو رک گیا۔ یہاں گلی سامنے سے بند تھی۔ بہت پیچھے کھڑے دیواروں میں پوسٹ ٹک پر ایک بلب لگا ہوا تھا۔ جو گرد و غبار سے بری طرح دھندلا چکا تھا تاہم اس کی کچھ نہ کچھ روشنی گلی کے اس سرے تک بھی پہنچ رہی تھی۔ جس میں ہم کھڑے تھے لیکن دور سے دیکھنے والے کو شاید یہاں اندھیرا نظر آتا۔ آنکھیں یہاں کے مائل سے مانوس ہو جاتیں تو پھر چند گز دور تک کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

ہمارے عین سامنے تو کسی مکان کی نہایت بلند عقبی دیوار تھی لیکن دائیں ہاتھ پر کوئٹے میں ایک نیا مکان تھا۔ جس کا دروازہ گلی کی سطح سے بھی کچھ نیچا تھا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اس دروازے پر بلا جھول رہا تھا۔ مائی مکان بھی ٹارک کی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ہر طرف گھرا سکوت طاری تھا۔

"ہمیں اس دیوار پر چڑھنا ہے" شرفو نے نیچے مکان کی طرف مستنذیر کی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اکرڈن بیٹھ گیا اور شرفو میرے کندھے پر کھڑا ہو گیا۔ میں اسے لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے منڈیر پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے سارا دے کر اسے اوپر پٹپٹا دیا جس کے بعد اس نے منڈیر پر جھک کر ہاتھ نیچے لٹکا کر مجھے اوپر چڑھنے میں مدد دی۔ دو مکانوں کی چیموٹوں پر سے مائی کی طرح گزرنے کے بعد ہم کسری کی دیوار پر جا پہنچے۔ شرفو نے نیچے جھانک کر اطمینان کا

کسی کے جھنڈے سے میری آنکھ کھلی۔ وہ شرفو تھا جو میرے قریب کھڑا کہہ رہا تھا "صدقے ہاؤں تمہاری بے فکری کے۔ اس طرح گھوڑے چھ کر تو میں نے تمہیں کبھی سوتے نہیں دیکھا کہ الارم سے بھی ... تمہاری آنکھ نہیں کھلی۔ اتنا ہم کام قاسم خان نے ہمارے سپرد کیا ہوا ہے اور تمہیں جیسے کوئی پرواہی نہیں۔"

میں آنکھیں لمبا ہوا جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ روم میں جا کر ٹھنڈے پانی سے سر اور چہرہ تر کر کے میں نے سستی دور کی اور کچھ دیر بند میں تیار ہو کر شرفو کے ساتھ کمرے سے نکلا تو وہ اپنے کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آؤ تھوڑا سا حلیہ بھی بدل لیں۔"

شرفو نے اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر بعض چند منٹ صرف کیے اور میرے چہرے پر ایسی نمایاں سببیلیاں نظر آنے لگیں کہ ایک لمحے کے لئے تو مجھے خود بھی اپنی صورت انہی محسوس ہوئی۔ میرے چہرے پر لمبی اور گھنی سوچوں کا اضافہ ہو چکا تھا جس کے نیچے میرا بالائی ہونٹ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ پائیں رخسار پر ایک موٹا سا مسہ نظر آ رہا تھا۔ سر پر ایک خاص قسم کی اونی ٹوپی تھی اور جسم پر ڈیٹیلی ڈھالی شلوار تھیں۔ میں سرحدی علاقے کا کوئی باشندہ نظر آ رہا تھا۔ شرفو کے دعوے کے مطابق واقعی چند چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں نے بڑا فرق پیدا کر دیا تھا اور مجھے ناقابل شناخت بنا دیا تھا۔

شرفو خود بھی اپنا حلیہ تبدیل کر چکا تھا۔ اس نے ہمہ وقت گلے میں بندھا رہنے والا دوپٹا 'پھولدار شرٹ اور اپنی ایسی ہی دیگر مخصوص چیزوں سے چھپا چھڑا لیا تھا۔ وہ اس وقت غامض عمدہ قسم کے تھری پیس سوٹ میں تھا۔ چہرے پر فریج کٹ داڑھی اور سر پر فلیٹ ہیٹ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے سادہ پیشوں کی ٹیک بھی لگا رکھی تھی جو بظاہر فکری ٹیک ہی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تو اب اچھا بھلا خوشحال اور پڑھانکشا آجری یا کسی بڑی کمپنی کا کوئی ڈائریکٹر وغیرہ معلوم ہو رہا تھا۔ "تم میرا حلیہ بھی اپنے ہی جیسا معززانہ بنا سکتے تھے" میں نے کمرے سے نکلنے وقت شکوہ کیا۔

"اگر دونوں ہی معززانہ حلیہ بنا کر بیٹھ جاتے تو پھر لڑائی بھڑائی وغیرہ ذرا مشکل ہو جاتی" شرفو بولا "واضح رہے کہ اس وقت تم میرے ذرا نیو رہو۔"

باہر آکر ہم گاڑی میں بیٹھے۔ اسٹیرنگ وھیل میں نے سنبھالا۔ جہاں تک مجھے راستے آتے تھے وہاں تک میں ذرا نیو کر آچلا گیا۔ اندرون شہر کی گلیوں میں پہنچ کر شرفو نے ہدایات اپنی شروع کیں۔ بالآخر ہم نے ایک ایسی جگہ گاڑی چھوڑ دی

دیکھا تھا اور فوراً ہی بچان لیا تھا یقیناً وہ مانی ٹو کے والا تھا۔ دروازہ
اسی نے کھلا تھا اور ہم نے اسی کو رگیدنے کی کوشش کی تھی
لیکن ظاہر ہے وہ اتنی آسانی سے رگیداجائے والا آدمی نہیں تھا
وہ قدم میں زیادہ اونچا نہیں تھا لیکن جسامت میں واقعی
گیڈنے کی طرح مضبوط تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی غالب
تھی عمر چہرے سرے سے قطعاً بڑھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی
رنگت تپے ہوئے آبنے سے مشابہ تھی۔ گردن کسی سانہ کی
طرح مضبوط تھی اور سینہ خوب چوراور بھرا ہوا تھا۔ اس کے
رخسار پر آنکھ کے نیچے زخم کا خاصا نمایاں نشان تھا۔ موٹی موٹی
آنکھوں میں سرخی تھی۔

اس کے جسم پر صرف کھدہ کی ایک ڈھیلی ڈھالی واسٹ
تھی اور وہ کوٹھڑی کے وسط میں صدیوں پرانے کسی درخت
کے تنے کی طرح جما کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شیشم کا
ایک موٹا سا ڈنڈا تھا جیسا عام طور پر غلتا ہوں وغیرہ میں ملک
بھگ گھونے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس ڈنڈے کو
یقیناً خوب تیل پایا گیا تھا کیونکہ وہ بلب کی روشنی میں چمک رہا
تھا۔ جس ہاتھ میں مانی ٹو کے والے نے یہ موٹا بھرا ہوا تھا اس کی
اسی کلانی میں چاندی کا ایک موٹا سا کڑا بھی چمک رہا تھا۔
شرفو نے یقیناً کوٹھڑی میں گھسے ہی اس کے منہ پر مشین
انداز میں گھونسا رسید کر دیا تھا کیونکہ اس کے ہونٹوں کے
گوشے سے خون کی ایک تکی سی لکیر بہہ نکلی تھی مگر مانی کو چپے
اس کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

شرفو ایک گھٹنے کے بل کھڑا تھا۔ دیو اور اس کے ہاتھ میں
تھا۔ شاہ رخ نے ذوالکتنای بردت ہمیں دیو کی زد پر لیا تھا
لیکن ہم چاہتے تو ایک ٹاپے میں مانی ٹو کے والے پر ناکر چکے
ہوتے لیکن ظاہر ہے شرفو پہلی ہی کد چکا تھا کہ وہ اس شخص کو
قتل کرنا ہوا نہیں کر سکتا اور مجھے بھی وہ منع کر چکا تھا اس لئے
میں بھی عین فیصلہ کن سرط پر ہٹ چکا ہوں کا شکار ہو گیا تھا۔
”تم دونوں نے ابھی تک دیو اور نہیں چھینکے“ میرے
عقب سے ایک بار پھر شاہ رخ کی آواز ابھری۔ باڑی غالباً ایک
سینڈ سے بھی کم دقت میں الٹ چکی تھی اور میرے خیال میں
فی الحال شاہ رخ کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ دیو اور
استعمال کرنے کے معاملے میں شاہ رخ کی پھر کی بات قاسم
خان ہمیں خبردار کر چکا تھا اس لئے کسی قسم کا غلطہ مول لینا
حمایت ہی تھی۔ شاہ رخ چونکہ جسامتی طور پر کمزور آدمی تھا
اس لئے دیو اور پر اس کا انحصار زیادہ تھا اور میرا تجربہ حال بدلی
لاٹس میں اس قسم کے لوگ دیو اور استعمال کرنے میں ذرا بھی
درخ نہیں کرتے۔

اگر ہم اپنے آپ کو صریح طور پر ہلاکت میں ڈالنے

اقدام کیا اور دھڑے تر تیب کو ٹھریوں وغیرہ کا سلسلہ پھیلایا
تھا اور ہر طرف سکوت طاری تھا۔ چند لمحے اور دھڑے کا جائزہ
لینے کے بعد ہم یکے بعد دیگرہ معاملے میں اتر گئے۔

چون نمبر کی کوٹھڑی تک پہنچنے میں ہمیں دقت پیش
نہیں آئی۔ چونک پر لگے ہوئے چوکور ٹین کے ٹکڑے پر
سفید نمبر ٹکڑے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا کوٹھڑی کے
ساتھ دروازے کی درزوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔
شاہ رخ یقیناً جاگ رہا تھا۔

ہم دونوں دروازے کے دائیں بائیں دیوار سے
چپک گئے۔ دیو اور ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ اسی پوزیشن میں
شرفو نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی کنڈی ہلائی۔

”کون؟“ اندر سے فوراً ہی تیز گھر گھر مانی ٹو آواز میں پوچھا گیا
”مانی“ شرفو نے گھٹنی ٹکٹی اور بھاری مگر غیر واضح آواز
میں کہا۔ اندر شاہ رخ نے اطمینان کی سانس لی۔ اس سانس کی
آواز ہمیں باہر بھی سنائی دی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔

حکمت عملی یہ طے پائی تھی کہ ہم دروازہ دار اندر ہمیں
لگے۔ میرا سر تھکا ہوا ہو گا اور میں پیسے کی طرح شاہ رخ کے
ہیٹ پر ٹکڑے کر کے دھکیلا ہوا پیچھے لے جاؤں گا جبکہ شرفو
اسے سنبھالنے کا موقع دے بغیر اس کے منہ پر گھونسا رسید
کر کے اسے مزید بدحواس کرے گا اور اگر اس کے ہاتھ میں کوئی
تھیابار وغیرہ ہو تو وہ جھین لے گا۔

اس حکمت عملی پر عمل ضرور ہوا لیکن اس کے علاج
بہت مختلف نکا۔ میں نے دروازہ دار اندر گھسے ہوئے سر
جو کا کر دروازہ کھولنے والے کو ٹکڑے ضرور رسید کی گھر میں اسے
دھکیلا ہوا پیچھے نہیں لے جا سکا۔ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے
میں کسی باغی گینڈے یا پھر قدرے نرم قسم کی کسی چٹان سے
کڑ گیا ہوں۔

یہ چٹان اپنی جگہ سے ہلکی ضرور لیکن صرف دو تین
قدم پیچھے ہٹ کر پھر ایک جگہ جم گئی اور میں بری طرح لڑکھایا۔
اگر وہ شاہ رخ ہوتا تو میرے اندازے کے مطابق اسے عینی
دیوار سے جا کڑنا چاہئے تھا۔

شرفو نے بھی یقیناً اپنے حصے کا کام کیا تھا لیکن کامیابی اسے
بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ صورتحال میں کسی قسم کی تبدیلی
نہیں آئی تھی۔ میں نے فوراً بیترابہلے ہوئے دیو اور سیدھا
کیا لیکن اسی لمحے پیچھے کہیں کونے سے آواز آئی ”خبردار ناکر
مت کرنا۔ افضل....! شرفو! تم دونوں اس دقت میرے دیو اور
کی زد پر ہو“ یہ شاہ رخ کی آواز تھی۔

اگر وہ نہ بولا ہوتا تب بھی میں شاید فائر نہ کر پاتا کیونکہ جس
چٹان پر میں کوئی چلائے لگا تھا اسی لمحے میں نے اسے صریح طور پر

”دعنا شرفِ پنجابی میں مانی ٹوکے والے سے مخاطب ہوا۔
”ویسے آپس کی بات ہے پہلوان جی! آپ شاہ رخ کی حفاظت
کیوں کر رہے ہیں؟“

”حفاظت کیوں کر رہے ہیں؟ مانی نے ٹھیکہ پنجابی میں
سداگنی، آمیز لہجے میں دہرایا ”بات تو کوئی خاص نہیں ہے باؤ جی!
بس ایک دفعہ جیل میں اس نوجوان کے باپ سے ملاقات ہوئی
تھی۔ اس نے جیل میں ہماری بڑی خدمت کی تھی۔ اب تو
مرچکا ہے بچہ۔ بس اسی کے حوالے سے ہمارے پاس آیا تھا یہ
کہنے لگا میں مصیبت میں ہوں، کچھ لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔
میں نے کہا، بچو! فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تو ہماری پناہ
میں ہے اور جو ہماری پناہ میں آجائے اسے مارنا مذاق نہیں ہو آ۔
بس اتنی سی بات ہے۔ اب تم بتاؤ تم کیوں اس معصوم نوجوان
کے پیچھے پڑے ہو؟ کیا وہ درویش ہے تمہارا؟ حیرت ہے اب
گولیاں شولیاں چلانے والے ایسے جی دار بھی اس شہر میں پائے
جانے لگے ہیں جنہیں مانی ٹوکے والا نہیں جانتا۔“

شرف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مانی نے جواب کے لئے
اصرار بھی نہیں کیا۔ وہ مگر خیال انداز میں اپنے منہ کو دھیرے
دھیرے حرکت دے رہا تھا۔ پھر وہ اٹکے ہاتھ سے ہونٹ سے
بستی ہوئی خون کی لکیریں صاف کرنے لگا۔ شاہ رخ نے ایک بار
پھر اسے مخاطب کیا ”میں چاہتا تھا کہ باڑہ والوں کے پاس میری
بھتیجی ہوئی رقم جلدی نکل آتی تو میں ان لوگوں سے اچھے بغیر
ہی کہیں نکل جاتا۔ میں یہ ملک ہی چھوڑ جاتا۔ میں اب لائسنس
بدلنا چاہتا ہوں۔ میں اب خضرچ کا مہرہ بن کر نہیں رہنا چاہتا۔“
”ہم تو تم سے مذاکرات کرنے آئے تھے شاہ رخ!“ شرف
نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم نے بڑی غلطی کی جو
ردپوش ہو گئے۔ مل پکڑا لیا تھا تو کیا ہوا۔ تمہیں سیدھے ہاس
کے پاس آکر رپورٹ دینی چاہئے تھی.....“

”میں بچہ نہیں ہوں شرفو!“ شاہ رخ مفہوم سے انداز
میں مسکرایا ”تمہیں بھی اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اصل
میں کیا ہوا ہے اور مجھے بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ تم لوگ
یہاں تک کیوں آئے تھے... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میرے
سامنے تو اب یہ مسئلہ ہے کہ تم دونوں کا کیا کروں؟ میں تمہیں
بلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن..... بصر جلی۔ بھائی جنگ ہے۔
ہم میں سے اب ایک ہی فریق زندہ رہ سکتا ہے“ اس نے
ریو الوور کی جنبش دی لیکن مانی ٹوکے والے نے ہاتھ اس کے
ریو الوور کے سامنے کر دیا۔

”اس کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ شور شرابا ہو گا
میری کٹری والوں کے آرام میں خلل پڑے گا۔ غریب
ملت مزدوری کرنے والے لوگ ہیں۔ تمک ہار کر سوئے

ہوئے اپنے ریو الوور استعمال کرنے کا فیصلہ کر بھی لیتے تب بھی
ظاہر ہے جنگمہ برپا ہو گا اور ہمارے لئے مانی ٹوکے والے کی
کٹری سے لکھنا ایسا ہی ہوتا جیسے شیر کی کھجارسے زندہ واپس جانے
میں نے تن بہ نقد یہ ہو کر کسی اور موقع کا انتظار کرنے کا فیصلہ
کیا۔“

شرف بھی یقیناً ایک نالیے کے اندر اندر انہی خطیہ پر
سوچ چکا تھا۔ وہ جس زاویے پر تھا وہاں سے کون انھیںوں سے
بانا شاہ رخ کو دیکھ بھی سکتا تھا۔ اس نے ریو الوور پیچھنے میں
بلی کی۔ اس کے بعد میں نے بھی ریو الوور زمین پر ڈال دیا۔
مانی ٹوکے والا جو اس دوران دلچسپی آمیز نظروں سے ہمیں
دیکھ رہا تھا عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر اس کی ستون نما
ہانگ حرکت میں آئی اور اس نے ٹھوکر مار کر ایک ساتھ ہی
دونوں ریو الوور کو غڑی کے کونے میں پینچا دیے۔

اب میں نے گروں زرا سی گھما کر دیکھا۔ کو غڑی کی ایک
پوار میں ایک دروازہ اور نظر آ رہا تھا۔ شاہ وہ کوئی دوسری
فصل کو غڑی تھی یا پھر ہاتھ بدم چپ کی کوئی جگہ تھی۔ اس
کے ایک پٹ کے عقب سے شاہ رخ باہر آ رہا تھا۔ اس کی شیو
بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور کپڑوں پر
لپٹیں نظر آ رہی تھیں۔ شرفو سیدھا کھڑا ہو گیا۔

شاہ رخ کی نظر ہم دونوں پر جمی رہی لیکن اس نے مخاطب
نہ ٹوکے والے کو کیا ”دیکھا چاہا؟ میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ
مجھے اصرار نکالیں گے۔ بہت ظالم ہیں یہ... اور بہت ہی لمبے
تھ ہیں ان کے۔“

مانی نہایت مشفقانہ اور نرمیانہ لہجے میں بولا ”او میرا بھڑا!
مجھے بتا تو سی یہ لوگ ہیں کون؟ کس کے آدمی ہیں؟ میں ان
اندوہست کر دیتا ہوں۔ پکابندوہست۔ ان کی آنے والی سلیس
کی تیری آنے والی نسوں سے پرے پرے رہیں گی۔ مگر تو
اب ہی نہیں کھوں۔“

مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ شاہ رخ نے ابھی مانی ٹوکے
والے کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاہ رخ باری باری ہم دونوں کو
نور سے ہوئے ”وانت قدرے بھیج کر بزدلانے کے سے انداز
بولا ”سب کچھ بتا دوں گا چاہا لیکن ان کا بندوہست کرنا کچھ
ناممکن نہیں جتنا تو سمجھ رہا ہے۔ اتنے معمولی لوگ نہیں
ہیں۔ کیوں افضل؟“ وہ میری طرف دیکھ کر قدرے تروس
سے انداز میں مسکرایا وہ پُر اعتماد اور دلیر نظر آنے کی ہر ممکن
شکل کر رہا تھا۔

”غزت افزائی کا شکر یہ شاہ رخ اور نہ اس دنیا میں تو ہر کوئی
پڑھا لکھا سب کو چڑھتا ہے“ میں نے سنجیدگی
نکالا۔

ہوا میں بلند ہوا اور عین اسی لمحے بدحواس ہو کر دروازے کی طرف بھاگا ہوا شاہ رخ اس کی زد میں آگیا۔

سو نائیک طرح کی جتنا قوت کے ساتھ اس کے سر پر چڑا اور اس کا سر غائب و حصول میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے لیے پاؤں کی وجہ سے صحیح طور پر تو یہ پتائیں چل سکا کہ اس کے سر کا کیا حشر ہوا تھا لیکن ہم نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ وہ پٹ سے زمین پر گر اور اس کے سر سے بہن میں نر کے خون اور مغز کا مغز سا بہا نکلا۔ مانی نو کے دلا ایک بار تو گویا سکتے میں آگیا۔ وہ بھی بے جان شاہ رخ کو دیکھتا اور بھی اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سونے کو پھر وہ پاؤں کی طرح بڑبڑاتے لگا "اوسے مانی ایہ تو نے کیا کیا..... اوسے مانی...." سو نائیک کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ خونوں کی طرح اپنا ہاتھ دائیں سے کاٹنے لگا۔

شرفی دقت نہ اپنا اور میرا دیو اور اٹھا چکا تھا جسے بے خیال میں اس نے مانی کے حق میں اچھائی کیا کہ اس کی کینٹی پر دیو اور کا دستہ رسید کر دیا۔ مانی ایک لمحے کے لیے بدست بائیں کی طرح ڈنگا پھر کٹے ہوئے شہر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

"بھاگو....." شرفی نے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔

فائروں کے دھماکوں سے رات کا سکوت دوہم برہم ہو چکا تھا اور دوسرے نوہرے طرف مانی کی آوازیں بھی بلند ہونے لگی تھیں لیکن آس پاس سے ابھی کوئی گزری دروازہ کھٹا نظر نہیں آیا تھا۔ غیبت یہ تھا کہ ہماری رلو فرار عقبی سمت میں تھی اور راستے میں بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ شاید بہت دیر بعد ہی کسی کا اس طرف دھیان جائے کہ کوئی دوسرے بھی فرار ہو سکا ہے۔ کوٹھڑی کے صدر دروازے کی طرف سے فرار ہونا تو ناہاب ممکن نہیں رہا تھا۔

تلی تلی سالگرہ آغوشوں سے بنی ہوئی دیوار کی رینوں میں پاؤں پھنسا کر اوپر چڑھنے کے بعد ہم متصل مکان کی چھت پر کھڑے پھر پہلے ہی کی طرح پیچوں کے بل چلے ہوئے مندرجہ پہنچ کر پھیل گئی میں کودے اور کپڑے جھاڑ چلے گئے۔ اپنے اپنے دیو اور ہم چپا چکے تھے۔

اس سگلی میں کوئی نہیں تھا۔ اور دوسرے نوہرے ٹھیکوں سے ہوتے ہوئے ہم کھڑی سے بہت دور نکل آئے۔ گاڑی تک پہنچنے کے لیے ہمیں پہلے کی نسبت زیادہ طویل پتھر کاٹنا پڑا۔ راستے میں شرفی بولا "اپنی فلیٹ ہیٹ تو میں اٹھا لیا ہوں لیکن میری ٹیک وہیں کسیں رہ گئی۔ لڑائی میں دونوں چھتیاں مری گئیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ٹیک کے بغیر بھی تم آتے ہو۔" میں نے کہا۔

ہوئے ہیں "مانی نے گویا شاہ رخ کو پکارتے ہوئے کہا "آگے کوئی گزرو کریں تب تمہیں دیو اور استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ میں ابھی اپنے آدمیوں کو بلاتا ہوں۔ وہ نہایت خاموشی اور صبر و سکون سے ان کا بندوبست کر دیں گے۔ چار چھ دن بعد کسی دریا شہر سے ان کی ناقابل شناخت لاشیں مل جائیں گی۔" وہ شاہ رخ کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے آگے بڑھا۔ کوٹھڑی ظاہر ہے کشادہ نہیں تھی۔ دروازے تک جانے کے لیے اسے میرے اور شرفی کے درمیان سے گزرنا تھا اور وہ کچھ زیادہ محکمہ بھی نہیں تھا۔ اس قسم کے لوگ حکمت عملی یا احتیاط وغیرہ کو کم ہی ملحوظ رکھتے ہیں۔ طاقت کے زعم میں زیادہ رہتے ہیں۔

جیسے ہی شرفی اس کی لوٹ میں آیا اس کی ٹانسیو بہکت میں آئی جسے کوئی نہ دیکھا ہوا اسپرنگ ٹوٹ کر اچلا ہو۔ لالت ایسی جگہ چڑی کے کچھ نہ کچھ آواز کھانسی۔ مانی "اورغ" کی دہر دار آواز کے ساتھ قدرے تھکا ہوا شاہ رخ نے اسی لمحے بے دردی فائز کر دیا لیکن اس نے عقلمندی کی کہ اس نے فائز شرفی پر نہیں کیا تھا کیونکہ شرفی حقیقتاً کلنی حد تک مانی کی اوٹ میں ہی تھا۔ شاہ رخ نے اگر اضطرابی طور پر اس پر گولی چلائی ہوتی تو زیادہ امکان یہی تھا کہ گولی مانی کو لگتی۔

شاہ رخ نے گولی دراصل مجھ پر چلائی تھی لیکن اس ہنگامے کا شروع ہونا میرے لیے مسکت میسر آ جانے کے مترادف تھا۔ میں اس دوران نہ صرف فرش پر گر چکا تھا بلکہ شاہ رخ سے کچھ دور ہو چکا تھا۔ یہ بات شرفی کو بھی نہیں معلوم تھی کہ میرے ٹھپے میں ایک اور دیو اور اڑسا ہوا تھا۔

شاہ رخ کی چلائی ہوئی پہلی گولی تو اس دروازے میں لگی جس کے عقب سے وہ خود... برآمد ہوا تھا۔ فوراً ہی اس نے فرش کی طرف دوسرا فائز کیا لیکن میں مسلسل لوٹ لگا رہا تھا۔ اس گولی سے بھی بچنے یا اس دوران شرفی اور مانی نو کے دلا الجھ چکے تھے اور اپنی پہلے دلی جگہ سے کچھ آگے آگئے تھے جس کی وجہ سے شاہ رخ کو ایک بار پھر فائز کرنے میں ایک لمحے کے لیے دشواری پیش آئی۔ میرے لئے یہی ایک لمحہ کلنی تھا اور اگر اس دقت شاہ رخ اپنے حواس میں ہوتا تو شاید خود بھی میرے نشانے کی داد دیتا حالانکہ میں نے بہت کمزور زلوچے سے فائز کیا تھا لیکن صفائی کا یہ عالم تھا کہ شاہ رخ لمحہ سے صرف دیو اور نکل کر دور جا کر۔ اس کی اٹھی تک زخمی نہیں ہوئی۔

وہ بدحواس ہو کر دروازے کی طرف بھاگا اور اس لمحے صدر حمل نے ایسا پلٹا کھلایا جس کا میں نے گمان تک نہیں کیا تھا۔ ہوا یہ کہ اسی لمحے شرفی کسی طرح مانی کی گرفت سے نکل کر کھڑے ہوئے۔

نے اس کے ذریعے پر آکر فلزنگ کی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لاش کاٹ کھین ذکر آیا اور نہ کہیں کسی کو ہام و نشان ملا۔ بڑا فخر ہے یہ اپنا مانی نوکے والا بھی۔ محض فلزنگ کو پولیس نے کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مانی پر سرایا زاری اس کے ذریعے پر بار بار فلزنگ ہو چکی تھی۔ دو چار دن میں بات ٹھنڈی پڑ جائے گی۔" میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا کھانے کے بعد میں اپنے کاموں کے سلسلے میں نکل کھڑا ہوا۔ اسی شام قاسم خان نے ہمیں گزشتہ رات کی کارکردگی کے سلسلے میں خصوصی پولیس سے بھی نوازا۔

قاسم خان مزید کچھ کاروباری معاملات طے کرنے کے بعد باجکا تو شرفو نوٹوں کی گڑھی اپنے کمرے کی چھوٹی سی دیوار گیر سیف میں رکھتا ہوا بولا "چلو اچھا ہوا کہ کچھ اور رقم حاصل ہو گئی۔ چیز کی تیاری کے سلسلے میں شاہنگ کچھ اور اچھی ہو جائے گی" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "کب چلنے کا پروگرام ہے شاہنگ پر؟"

"اب ذرا فرصت تو میرا آئے" میں نے امانت سے کہا۔ ہوا یہ کہ اگلے تین دنوں میں ہمیں ذرا بھی فرصت میسر نہ آسکی وہ فارغ ہو تا تو میں مصروف ہو جاتا تھا اور میں فارغ ہوتا تو قاسم خان نے اسے دو ڈایا ہوا آٹھا۔ قاسم خان خود بھی ابھی تک لندن روانہ نہیں ہو سکا تھا۔ اب اس نے پروگرام کچھ بدل دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ اس اہم کھپ کے آنے کے بعد ہی لندن جانے کا منصوبہ لائے کے لئے مجھے اور شرفو کو جانا تھا۔ قاسم خان خود بھی بہت مصروف نظر آتا تھا۔ معلوم نہیں وہ سس چکر میں تھا۔ میں نے ایک خاص بات یہ محسوس کی تھی کہ جب سے میں کراچی سے آیا تھا قاسم خان نے ایک بھی میننگ اپنے گھر پر نہیں رکھی تھی۔ جہاں میننگ کے دوران اس کی بیوی سسکی ضرور ساتھ بیٹھی رہتی تھی۔ خواہ وہ بولتی کچھ نہ تھی، خاموش اور لافظی سے ہی بیٹھتی تھی۔ اب قاسم خان یا تو فون پر ہی ہدایات دیتا تھا یا خود ہی لائل ٹاؤن والی کو غشی پر آجاتا تھا۔

اسی مصروفیات میں وہ دن بھی گلیا جب مجھے اور شرفو کو کھپ لینے جانا تھا۔ لاہور سے ہم بذریعہ جہاز پشاور پہنچے اور وہاں سے بائی روڈ ہمیں طورخم تک کا سفر کرنا پڑا۔ یہاں ایک دیرانے میں پہاڑی پر واقع چند گھروں پر مشتمل ایک میسجی میں ہمارے لئے ایک جیب کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا جس میں بیٹھ کر ہم مطلوبہ علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔

مطلوبہ علاقے میں ہمارا ٹرک موٹو تھا لیکن سرحد پار

آجے تھلی دی۔ دلچسپ شرفو نے میرا ہاتھ دھلا اور ہم گلی میں ذرا ایک طرف کو دھک کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے قدرے چوڑی راک پر غالباً گشت پر موجود دو سپاہی ایک طرف کو دوڑے جا رہے تھے۔

ہمارے اندازے کے مطابق فلزنگوں کی آواز یہاں تک تو نہیں پہنچی تھی کیونکہ یہاں گھروں میں ہر طرف حسب سابق پابان تھا۔ کوئی ہچکل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ممکن تھا کہ سپاہیوں کو کسی نے گزربوک اطلاع دی ہو یا ممکن ہے کہ وہ کسی اور ہی جگہ میں دوڑے جا رہے ہوں۔ وہ نظروں سے اونچھل چکے تو ہم چوڑی گلی میں آکر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس جانے لگے۔

سامنے میں میں نے شرفو سے کہا "آپس کی بات بنے مجھے ٹھانری کی موت کا افسوس ہے۔ اچھا نوجوان تھا۔ اس نے اپنی زندگی محض ایک غلطی... یا یوں کہو کہ محض تھوڑے سے الٹیج سے گوا دی۔"

"خود ہی اس کی موت کا جو ابھی پیش کر رہے ہو اور خود ہی افسوس بھی کر رہے ہو" شرفو غصی سیٹ سے بولا "وہ ذاتی مباحیوں والے انداز میں پھیل کر بیٹھا ہوا تھا اور میں واقعی اس کا ذرا انداز معلوم ہو رہا تھا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "ہماری دنیاسیں کسی کی موت پر تانت یا صدمے کی گھنٹا نہیں ہوتی۔ بس جو مر گیا ہو مر گیا۔"

"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے... اور میں نے اپنے آپ کو ٹھانری اور سٹنڈل بننے کی خاصی تربیت بھی دے لی ہے لیکن پھر گنا... بس اپنے آدمیوں میں سے کسی کی موت مجھے تھوڑا سا ضرور ہلا دیتی ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں" میں نے بے باک سے سر جھکا "صبح تک مارل ہو جاؤں گا۔"

اچھی صبح تک تو میں دیر تک سو تا رہا۔ شرفو نے معلوم کیا کہ اب اس کو رپورٹ دی اور اس کے بعد اپنے ڈس کے ہالیک کام بھی سناتا رہا۔ دوپہر کے کھانے پر اس سے ملاقات نہ ہو اپنی جنون واپس آچکا تھا۔

"واقعات جس طرح پیش آئے تھے میں نے من و عنان کو بتا دیا ہے" میں نے مجھے بتایا "بیس خوش تھا۔ اس کا لاش کا شہ رخ جو کھل مانی نوکے والے کے ہاتھ سے سراسر ہراس کی لاش دیکھ کر کوئی اندھا بھی ہٹا سکے گا کہ اس کی موت کے سونے سے واقع ہوئی ہے۔ اس لئے مانی اس کی لاش نہ کر دیا اپنی غلطی" ڈسے واری سمجھ گیا۔ اس کا خیال ٹھیک تھا۔ بیس نے اپنے ذرائع سے بتا کر لیا ہے۔ مانی نے پولیس کو اطلاع دیا ہے کہ گزشتہ رات اس کے گھر پر حملہ ہوا۔

ٹرک گھر گھر کر آ ہوا خاص تیز رفتاری سے منزل مقصود کی طرف دوڑاں دوڑاں تھا۔ ٹرک اور اس کے دونوں طرف پہلے ہوئے درختوں کے تے صرف وہیں تک دکھائی دے رہے تھے جن تک پہنچنا انیس کی زمائی تھی ورنہ بس چاروں طرف گویا کمی تاریکی کا ایک سمندر تھا جس میں ہم ایک تھر پہلی کی طرح تھمر رہے تھے۔

مجھے خوشی یہ تھی کہ قاسم خان نے نقشے میں جس علاقے کو "بجڑون" قرار دیا تھا ہم اس سے بھی تھوڑی غلطی گزر آئے تھے۔ بقی مقامات پر تو معاملات سیٹ ہی تھے۔ شرفو ٹرک کے پچھلے حصے میں تریال کے اوپر پوزیشن سنبھالے لیٹا ہوا تھا۔ راستے میں کچھ دیر ٹرک میں نے بھی ڈرائیو کیا تھا اور کچھ دیر شرفو کی جگہ بھی ڈیوٹی دی تھی۔ اور اس دور ان شرفو نے آرام بھی کیا تھا۔

اب میں نیم دراز ہو کر کچھ دیر نیند لینے کا ارادہ کری رہا تھا کہ یک لخت مجھے چونک کر سیدھا ہوتا پڑا۔ میری سستی اور غنودگی یوں کافور ہو گئی جیسے مجھے بجلی کا جھکا لگا ہو۔ دراصل سامنے بہت دور سوک پراچاک دو سرج لائٹس روشن ہوئی تھیں، ان سرج لائٹس کی روشنی کچھ اس انداز میں پھیلی ہوئی تھی کہ ہم یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ یہ لائٹس ایک بجلی جیب پر نصب تھیں۔

اس جیب کے ساتھ ہی ایک فوکس وینک بھی موجود تھی۔ دونوں گاڑیاں سوک پریوں ترچھی کھڑی تھیں کہ راستہ تقریباً مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔

"لوئے خانہ خراب یہ تو کسم کی گاڑیاں ہیں" ڈرائیور رئیس گل بڑبڑایا پھر اس نے سوالیہ انداز میں پھیلا طرف دیکھا۔ کسی بھی خلاف معمول صورتحال میں یہ لے کرنا میری ذمہ داری ہوتی تھی کہ کیا حکمت علمی اختیار کی جائے گی۔ میں نے سب سے پہلے ڈیش بورڈ پر ایک ٹن دبا کر اور موجود شرفو کو ہوشیار ہونے کا سگنل دیا۔

"اس علاقے میں کہل سے آگے کسم والے چھپائے خود کلائی کے سے لیے میں کہا اور اسٹین کسن سیٹ کے نیچے سے کھینچ لی" یہ جو اس طرح بے موقع کلمات لگا کر کہنے ہوئے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ ہر حال میں ہمیں بچنا چاہتے ہیں شاید تجزی ہو رہی ہے"

میں نے اشارے سے رئیس گل کو بتادیا کہ اسے بیکرا نہ اور خود بھی الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک گاڑی سے بیٹاؤں کے ذریعے ہمیں دکنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ رئیس گل نے رفتار بالکل کم کر دی تھی جیسے دکنے لگا ہو لیکن قریب پہنچ کر اس نے

آپا تھا وہ جیب لے کر داپس چلا گیا۔ ہمارے ٹرک میں صرف ڈرائیور موجود تھا جو ڈرائیور و کین میں آرام سے کبل اوڑھے سو رہا تھا۔ اس سنگناخ ویرانے میں جہاں اس کے ٹرک کے سوا کوئی قابل ذکر چیز دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی وہ اس طرح اطمینان سے سویا ہوا تھا جیسے ہم اور آپ اپنی خواب گاہ میں سو رہے ہیں۔

یہ ہمارا بھروسہ کا آدمی تھا اور اس علاقے سے جب بھی ہمارا بل آتا تھا، ڈرائیور کے فرائض عموماً ہی انا سہ دیتا تھا۔ ٹرک پر دیگر عالم ٹرکوں ہی کی طرح رنگ رنگے الفاظ میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا نام وغیرہ بھی لکھا ہوا تھا اور شیر جیتوں وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس ٹرانسپورٹ کمپنی کا وجود کہیں نہیں تھا۔ ٹرک پر نمبر پلٹ وغیرہ بھی بجلی تھی اور اس کے کاغذات بھی بجلی تھے۔

اس ٹرک میں خفیہ خانے بھی موجود تھے۔ کم حجم کی اشیائا منشیات کی نقل و حمل کے لئے یہ خانے استعمال کئے جاتے تھے۔ اس وقت ٹرک میں معمولی مقدار میں پتھر کا کوئلہ لدا ہوا تھا۔

ہم نے ڈرائیور کو اٹھایا۔ بڑبڑا کر ایک ہاتھ سے آنکھیں ملنے ہوئے اس نے دو سزا ہاتھ سیٹ کے نیچے لے جانے کی کوشش کی مجھے معلوم تھا کہ وہاں اسٹین گن پڑی ہوگی۔ میں نے اس کا ہاتھ نیچے نہیں جانے دیا۔ اس وقت تک وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور مجھے پہچان کر مسکرانے لگا تھا۔

دستی باتوں کے بعد اس نے اشیائے خورد و نوش سے ہماری تواضع کی۔ اس کے پاس قوسے سے لے کر مرغ مسلم تک سبھی کچھ موجود تھا۔ جدید قسم کے اور باہر کے پتے ہوئے ناشتے دان اور تھربسوں میں ہر چیز گویا تازہ کی تازہ تھی۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم گپ شپ کر رہے تھے کہ ابل کا ٹرک آ پہنچا۔ وہ اپنے

مقررہ وقت سے تقریباً تین گھنٹے لیٹ تھے۔ ان کے ساتھ دو فاضل آدمی بھی تھے۔ ہم سب نے مل کر پہلے ٹرک سے کوئلہ اُدارا۔ مال دوسرے ٹرک سے اُدار کر اپنے ٹرک میں سیٹ کیا اور اوپر دوبارہ کوئلہ بھر دیا۔ ان کابلوں کے لئے ضروری سامان ٹرک میں موجود تھا۔ ٹرک پڑیال وغیرہ ہاندھنے کے بعد ہم نے سرحد پار سے آنے والوں کو رقم کی ادائیگی کی اور پھر ہم تینوں اپنی اپنی پوزیشن سنبھالنے کے بعد داپس کے سفر روانہ ہو گئے اور وہ لوگ اپنے ملک کی طرف چلے گئے۔

.... ☆

آخر شب لگانا ٹپ اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ہمارا

قسم نے گویا اس کے ہاتھوں پر قسمت آزمائی کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک دھماکہ ہوا اور فوجیں بہت بری طرح لڑکھڑائی ہوئی کچے میں اتڑی اور پھر ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ مطلوب نہیں ہار بہت ہونے کی وجہ سے وہ بے قابو ہوئی تھی یا ڈرائیور ری مارا گیا تھا۔ بہر حال اس کے عقب میں سٹاپ چھایا۔ چند ہی لمحے میں ہم کٹنی دور نکل آئے۔ ایک بار پھر تاریکی اور سائے میں صرف ہمارے ٹرک ہی کی گھر گھر گونج رہی تھی۔

مزید چند میل کا فاصلہ طے ہو جانے کے بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی ہمارے عقاب میں نہیں آ رہا تو میں نے رئیس گل کو ٹرک روکنے کی ہدایت کی۔ ڈرائیور زکیب کی نصیحت پر بدستور سکوت چھایا ہوا تھا اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔

ٹرک سڑک کے ایک کنارے پر رُک چکا تو میں نے کھڑکی سے سر نکال کر شرفو کو کئی آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔

ٹارچ لے کر میں اوپر چڑھا اور یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ وہ اس مشطیل نب نما شخص میں بے حس و حرکت اوندھا پڑا تھا۔ اسٹین گن ایک طرف کو پڑی تھی اس کے ہاتھ اور چہرہ خون میں تر تھا اور بہت سا خون اس گدے میں جذب ہو چکا تھا جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔

میں نے اس کا چہرہ ذرا اوپر کر کے دیکھا۔ گولی اس کی پیشانی میں بیست ہوئی تھی اور سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔ یہ جاننے کے لئے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی اور ہونٹ نیم وارہ گئے تھے جن کے عقب سے اس کے ہموار دانت بھاگ رہے تھے۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی شرفو مر چکا تھا؟ ایک لمحے کے لئے میری نظر دھندلا گئی اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید میں ٹرک سے پیچھے گر جاؤں گا۔ زندگی دینے اور زندگی بچھین لینے کے بھی خدا کے اپنے ہی انداز تھے۔ شرفو جو اتنی محفوظ جگہ پر لیٹا ہوا تھا اس کی عین پیشانی میں گولی محسوس گئی تھی اور میں جو ٹرک کے دروازے سے نکل کر گر گیا کی بجائے اس کی بو جھاڑ کے عین سامنے سے جو بالی فائرنگ کر رہا تھا، غراش سے بھی محفوظ رہا تھا۔

بہشکل تمام میں نیچے اتر آیا اور خاموشی سے رئیس گل کے برابر آ بیٹھا۔ اس نے تشویش آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا ”کیا بات ہے؟“

ایک لمٹ ایسی سیٹھ پڑ دیا اور ایک جھٹکے سے اسٹینڈنگ میل چمکاتے ہوئے ٹرک کو کچے میں اتار کر اگلے کا فطرہ سول بنے ہوئے نکال لے جانے کی کوشش کی۔

ایکلا ٹرک دیکھ کر ناپائاں لوگوں کو اتنی دیدہ دلیری کی توقع میں تھی۔ جب اور فوجیں دیکھیں بہر حال اشارت ہی تھیں۔ یہ نے تیزی سے رُٹن لیا اور ٹرک کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن ٹرک کسی فیصلے غریب کی طرح گر جاتا اور ہچکولے غانا اسے سلیڈ مار کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

سانڈ کچھ اس زاویے سے تھی اور کچھ اس وقت جب میں کچے میں اتر کر اس طرح بے توازن ہو چکی تھی کہ فوراً لٹ گئی۔ عین اسی لمحے ٹرک پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے دوبارہ شرفو کو گھٹل دیا اور فوراً ہی اوپر سے جو بالی فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں نے خود ابھی گولی نہیں چلائی تھی۔

ٹرک سڑک پر آچکا تھا اور دوبارہ وہ رفتار پکڑ چکا تھا مگر خرابی کی ت یہ تھی کہ فوجیں دیکھیں ہمارے عقاب میں لگ چکی تھیں اور اس سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ پہلے گولیاں بلندی کی طرف چلائی گئی تھیں لیکن اب وہ لوگ فائر لائن پہنچ رہے تھے میں سمجھ گیا کہ وہ ٹرک پرست کرتا چاہتے تھے مگر رئیس صاحب نام میں ماہر تھا۔ وہ ٹرک کو بچانے لئے جا رہا تھا۔ ”اس فوجی کو بھی اللہ بے رئیس گل“ میں نے فائرنگ لے شور کے درمیان میں کہا۔

”آپ کو پتا ہے کہ فوجی آسانی سے کہیں اٹتی ہے صاحب۔“ رئیس گل نے کہا۔ ”اور پھر خطرو یہ ہے کہ ہم نے فست قریب آنے کا موقع دیا تو شاید وہ لوگ ہار بہت رستے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔“

اس وقت میں اسٹینڈنگ پر ہوا تو یقیناً فوجیں کو الٹ دیتا دو شاید ٹرک کا ہار بھی بہت ہونے سے بچا لیتا۔ بشرطیکہ ان کے برابر موجود ہوں۔

دفعات میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ٹرک کے اوپر سے بالی فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ جیسی فوجی لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور زکیب کا دروازہ کھولا اور ایک نو اس کی کھڑکی سے گزار کر دروازے کے سارے قلعے سے ایک پاؤں پائیدہ ان پر نکالا اور اسٹین گن بغل میں دبا کر فی الامکان بچے کے انداز میں ایک پرست مارا۔ فوجی کسی قول بننے لائنیں غائب ہو گئیں۔

فوراً ہی میں نے دوسرا پرست مارا۔ اس کا نتیجہ میں دیکھ تو میں سا لیکن میں نے اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ وہ اسٹین گن پتہ نہ ہو گئی ہے۔ ایک لمحے کے لئے فوجی ترجیحی ہوئی اور

”ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں“ میں نے ٹرک سے اترتے ہوئے کہا۔

میں دفتر میں پہنچا تو وہ شخص نیلی فون میرے سامنے کھڑے کرخوں... باہر چلا گیا۔ اس کی کرسی پر بیٹھ کر میں نے خبردار کرنا شروع کیا۔ کئی بار کی کوششوں کے بعد بالآخر میرا لاہور قاسم خان سے رابطہ قائم ہوا۔ اس کا یہ فون غیر انتہائی ہنگامی صورتحال کے لئے مخصوص تھا لیکن اس پر بھی کال سلی نے ریسیو کی۔ اس کی آواز سے قطعاً پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ سوری تھی جب کہ میرے اشتہار پر اس نے بتایا کہ قاسم خان سربا تھا۔

بہر حال اس نے جلد ہی قاسم خان کو چگا کر فون سمجھایا۔ میں نے جب قاسم خان کو کوڈ دروڑ میں بتایا کہ شرفو مرچکا ہے تو اس نے فوری طور پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ بس ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ حیرت، دکھ یا صدمہ۔ اس نے کسی بھی تاثر کا اظہار نہیں کیا اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا۔ چلنے کیوں مجھے اس کے اس طرفِ عمل پر اندر ہی اندر دھچکا سا لگا۔

”لاش کمال ہے“ بالآخر اس نے اکرے ہوئے لمبے میں پوچھا۔

”ہم نے ٹرک میں چھپائی ہوئی ہے“ میں نے جواب دیا۔ ”الحق.....“ وہ شاید اس سے آگے بھی کوئی لفظ کہنے لگتا مگر خود پر ضبط کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا پھر بولا ”تمہیں سب سے پہلے لاش کو کہیں دیرانے وغیرہ میں دفن کر دینا چاہئے تھا۔ کیسے عجیب آدمی ہو تم..... بال توجہ سے سوچے تم ایک لاش کو بھی ساتھ ساتھ اٹھائے بھر رہے ہو۔“

”جناب خان صاحب!“ میرے حلق میں کڑواہٹ سی گھٹنے لگی ”وہ ہمارے دیرینہ رفیق کی لاش ہے۔ میں ات لاہور لانا چاہتا تھا کہ اسے کسی قدر معقول طریقے سے دفن کیا جاسکے۔“

”میں کیا تم اس کا مقبرہ تعمیر کراؤ گے؟“ وہ تیزی سے بولا۔ ”معلوم نہیں لاشوں سے کیوں تمہیں قلبی لگاؤ محسوس ہونے لگتا ہے۔ دیکھو میری بات سنو“ اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی ”سامعہی شخص اس وقت تک ہمارے سامعہی ہوتے ہیں جب تک وہ زندہ ہوتے ہیں۔ مر جانے کے بعد یہ شخص شخص محض ایک لاش ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد وہ دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ تم نے کتنے ترک و اختتام سے اسے دفن کیا ہے۔ البتہ کسی لاش کی وجہ سے حصار اپنا جائزہ ضرور اٹھ سکتا ہے۔ تم نے اپنی تربیت بڑی عمدگی سے مکمل کی ہے لیکن تربیت کا یہ اہم نکتہ شاید تم بھول جاتے ہو۔“

”شرفو مرچکا ہے“ میں نے روہینے والے لمبے میں اسے بتایا۔ شرفو سے اس کی شناسائی صرف آج کی ملاقات تک ہی محدود تھی تاہم میں نے محسوس کیا کہ اس کے دل کو بھی اس الطحان سے دھچکا پہنچا تھا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں ہی سوگوار انداز میں خاموش رہے۔ میں اپنے آپ کو سنبھالتے اور دل ہی دل میں خود کو سمجھانے میں لگا رہا اور وہ ایشیئرنگ دھیل پر دونوں بازو نکالے، سرک پر نظر پڑا نہ جانے کیا سوچا رہا۔ بالآخر اسی نے سکوت توڑا ”اب کیا کرنا ہے؟“

”چلو چل کر پہلے لاش کو تو چھپائیں“ میں نے اپنی آواز کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے اوپر چڑھ کر لاش کو اس خون آلود گدے میں اور پھر ایک چادر میں اچھی طرح لپیٹا اور ٹرک میں ایک جگہ سے کونسل بنا کر کھل کے زبوں کے درمیان جگہ بنا کر لٹادیا۔ اوپر ڈبے رکھ کر ہم نے سب سے اوپر پہلے کی ہی طرح کونسل پھیلا دیا۔ لاش کو چھپانے کے بعد پھر کھیل داؤں کے ساتھ ہم ایک بار اپنے ستر پر چل پڑے۔

پشاور شہر کی حدود سے کچھ پہلے ہی ٹرکوں کا ایک اڈا تھا اور اس سے متصل ہی ایک بڑے پیمبر میں ڈرائیوروں کا ایک مخصوص ریسٹوران تھا۔ پیمبر خان نما اس ریسٹوران میں کچھ ڈرائیور بھاری بھر کم اور لمبی چوڑی چارپائیوں پر نیم دراز تھے کوئی خزانے بھی لے رہا تھا۔ دو ایک ڈرائیور کھانا کھا رہے تھے۔ ایک چوڑے پردے کی چھائی وغیرہ سامنے سجائے ہوئے ایک شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا اور بے استی سے انداز میں برتن اٹھائے لوہر سے آدھر جا رہا تھا۔

اوپر آکر بہت سے ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ ٹرکوں کے اڑے کے وسط میں چھوٹا سا ایک نیم پختہ سا کمرہ موجود تھا جس میں لوہے کی ایک میز کرسی اور ایک بیچ وغیرہ چھپ چکی تھی۔ میرے لئے سب سے اہم بات یہ تھی کہ میز پر سیاہ رنگ کا ٹیلی فون سینٹ سوڈن تھا۔ میز پر ایک شخص موجود تھا جو کچھ کانٹرات بیچ کر کے ایک فائل میں لگا رہا تھا۔

میں نے ریسٹورن میں گئے کہ ”اس شخص سے جا کر بات کرو کہ ہمیں چند منٹ کے لئے تھمائی میں فون پر لاہور بات کرنی ہے۔“

رسٹورن میں گئے ٹرک ایک دوسرے کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا اور جا کر اس شخص سے بات کی۔ کئی منٹ کے بعد بالآخر۔ ”رہیں آیا اور بولا“ وہ تیار ہے صاحب! لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ تہی دیر بھی دفتر سے باہر رہے گا ایک سو روپیہ فی منٹ کے حساب سے پیر لے گا۔“

زمین کی صرف اوپری سطح کچھ نرم تھی۔ اس سے نیچے زمین تقریباً سنگاخ تھی۔ ہمیں کھدائی کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ بالکل ہم چھ فٹ لمبا ڈیرہ نہت گمراہ گڑھا کھودا۔ اسے اسی میں شرف کو دفن کر کے ہم جلدی سے ترک میں بیٹھ کر دوبارہ پشاور کی طرف چل دیے۔ کم از کم بھ میں اس کے مدفن پر غصے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کل میرا وہ جگر پیار میرے ساتھ ہی مذاق کرتا زندہ سلامت اس دیر لے کر گزرا تھا۔ آج وہ یہاں قابل رحم انداز میں بیٹھ چکا تھا اور کوئی اس کے لئے دعاے مغفرت کرنے والا نہیں تھا۔ کسی کو اس کی موت کا ظلم تک نہیں تھا۔ بس یہی کچھ زندگی کا حال تھا۔ ساری کٹاکشیں حیات کا یہی حاصل تھا۔ سوچتے سوچتے ایک بار تو میں نے محسوس کیا کہ شاید واپس پہنچ کر چند دنوں تک میں یہ پیشہ چھوڑ دوں گا جس کی مجھے چات لگ چکی تھی۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بعض ارٹوے پھیل جاتی ہیں وحشت کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر انہیں فوری طور پر کسی شکل میں نہ ڈھالا جائے یعنی فن پر عمل نہ کیا جائے تو بعد میں انہیں کوئی شکل دینا ممکن نہیں رہتا۔ کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بات بالکل درست تھی۔ وہ چند دن میرے پاؤں کی ذخیریں بن گئے تھے۔

میں یہ کہنا چاہتا تھا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کل کو اگر میں لار کیا تو میرا سبز آخرت بھی بس اسی طرح ہو گا۔ لیکن یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ منہ سے خواہ وہ کچھ بھی کہتا لیکن دل میں ہر حال اس کے پاس میرے سوال کا یہی جواب ہوتا۔ مجھے اگر اس دنیا میں اس صحنے سے وابستہ رہنا تھا تو اب تک اس کے ہر سناکناہ پہلو سے سمجھو کر لے کر لے جانا چاہیے تھا۔

جس طرح قاسم خان مجھے شرف کی لاش لٹکانے لگانے کی ہدایت کر رہا تھا اس سے کہیں اچھی طرح تو لاداروں کی تدفین ہو جاتی تھی۔ میں قاسم خان سے یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ شرف کے گھر والوں کا کیا بے گاہ نہیں کہیں شرف کی لاش بھی نہیں لی سکے گی۔ جیسے اپنی آنکھوں سے دفن ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکیں گے کہ سال دو سال کے بعد دل کو کسی حد تک قرار ہی آجائے لیکن مجھے خود ہی احساس ہو گیا کہ یہ سب سوالات غیر ضروری تھے۔ قاسم خان کے لئے یہ باتیں مسائل کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔

”اچھا... ٹھیک ہے“ میں نے تھوک نکل کر اپنی آواز کو بارل رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں سب کام ختم کر کے کل واپس پہنچ جاؤں گا۔“

”بالکل ٹھیک۔ ہمارے حوصلہ رکھو“ قاسم خان نے مطمئن لہجے میں کہا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ میں ہمارے بھی ہوں اور حوصلہ مند بھی بلکہ اس کی طرح کافی حد تک مستدل بھی لیکن ساتھیوں کے لئے میرا دل سو مری رہتا ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کے بعد بھی۔

بو جھل قدموں سے میں اس کمرے سے نکل آیا۔ وہ شخص جو غالباً آفس کلرک یا شاید آفس کا مالک ہی تھا ابچہ دور ہجر کے نیچے گمراہ گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اوائلی کی اور واپس واپس نکل کے ساتھ ترک میں جا بیٹھا۔

جس طرف سے ہم آ رہے تھے اوپر ایک طویل فاصلے تک چلائی سڑک کے دونوں طرف ویرانہ ہی دیر لے رہا تھا۔ وہیں کہیں تدفین کا کام انجام دیا جاسکتا تھا۔ میں نے رہیں محل کو واپس چلنے کی ہدایت کی اور اس کے اشتہار پر است تیار کر ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بس ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اس راستے پر کئی میل کے سفر کے بعد ویرانے میں ایک مناسب مقام دیکھ کر رہیں محل نے میری ہدایت پر ترک کچے میں آباد اور ایک لمبا کی روٹ میں پہنچ کر روک دیا۔ ہم نے نہ آؤں۔ نہ کیا اور نہ ہی ہڈیاں آف کیوں بلکہ انہی کی روشنی میں بدلی اور نیچے وغیرہ کی مدد سے زمین کھودنی شروع کر دی۔

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی
ایک آشفٹ حل کی داستان عبرت جسے قانون نے مجرم بنادیا

وقصہ اہلیسی

انوار صدیقی

150/4

ڈاکٹر صاحب آف لٹریچر

اردو بازار لاہور

خان کے حوالے کیا۔ نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر اور انہیں سرسری سے انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد قاسم خان کے چہرے پر گویا زندگی کی چمک ٹھہری ہو گئی۔
میں نے زبان اسے مختصر حساب کتاب سمجھایا۔
اس نے کوئی خاص توجہ دے بغیر طمانیت سے اثبات میں سر ہلایا پھر نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔
”یہ تمہارا کیشن اور خصوصی بونس“ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”بونس اس خوشی میں کہ تم شرف کے مرے کے باوجود اس کیب کو ٹھوگی سے نکل لانے میں کامیاب رہے۔ اب بٹاؤ شرف کو تکرار کیا؟“

طلسم زادی

☆ ----- ایم۔ اے۔ راحت

روشنی کی دنیا سے دُور پُر اسرار دنیا کی کہانی جہاں مافوق الفطرت زندگی کا دور دورہ تھا۔ دو دشمنوں کی عجیب داستان جنہوں نے جب ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ تو ایک ناقابل یقین کہانی نے جنم لیا۔

ایم۔ اے۔ راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت: حصہ اول - /150

قیمت: حصہ دوم - /150

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

دوسرے روز میں واپس لاہور پہنچ گیا۔ ہل راستے میں پارٹی نے مجھ سے لیا تھا اور جب میں لاہور پہنچا تو میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا موٹ کیس تھا جس کے اوپر ہی مجھ میں چند کپڑے اور چھوٹی موٹی چیزیں تھیں جو میری نہیں تھیں۔ ان کے نیچے آدھے سے زیادہ سوٹ کیس نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ریس مکمل اپنا معاملہ لے کر پنڈی ہی میں مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ نالایا واپس چلا گیا تھا۔

بائل ٹاؤن والی کو بھی پہنچ کر میں نے سب سے پہلے نماز دھو کر اپنا حلیہ درست کیا، قاسم خان کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی پھر کھانا کمانے کے لئے ڈانٹنگ روم میں جا پہنچا۔
میں نے پمپ میرے لئے کھانا لگاتے ہوئے بولی ”شرفو تمہارے ساتھ واپس نہیں آیا“ میں نے ٹھہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اور بظاہر بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ شدت سے جواب کی منتظر ہے۔ اس کے سوال نے میرے دل میں بھڑکی تھی جس جگہ کی منت میں ہیشکل رہائے ہوئے تھا۔

”وہ مرہ کا ہے“ بااخر میں نے مجھے لیے میں کہا۔ پینٹ میز پر رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش آگئی پھر اس نے انگلی سے پینے پر سلیب کا نشان بنایا اور زیر لب کچھ کہا اس کے بعد دوبارہ پرسکون انداز میں اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اسی کمرے میں موجود کراچی کی دیوار گیر الماری سے برتن نکالنے لگی۔ اس نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ تفصیل جاننے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔

”تم نے کوئی خبر نہیں کیا؟“ میں نے سر ہٹا کر چہری کاٹنے سے کھینچے ہوئے کہا۔ میں اب اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

”کیا تبصرہ کروں؟“ اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی ”اس گھر میں رہتے ہوئے موت کی یہ گیارہویں اطلاع ہے جو میں نے کم و بیش اسی انداز میں سنی ہے جس طرح پہلے شتی آتی ہوں۔“

”شاید اسی طرح کئی اور شخص اسی ڈانٹنگ نیکل پر بیٹھا تیسری میری موت کی خبر سنا رہا ہو“ میں نے دھتکے لیے میں کہا۔

”شاید....“ اس نے سپاٹ اور ہسم لیے میں جواب دیا۔
کم بہت کو اپنے تاثرات چھپانے میں مکمل حاصل تھا۔
میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ قاسم خان آن پہنچا۔
اعظم خان اس کے ساتھ تھا مگر وہ کمرے کے باہری رک گیا تھا۔
میں نے سب سے پہلے نوٹوں کا ادھ بھرا موٹ کیس قاسم

نوجوان امجد علی کی پراسرار اور عبرت انگیز داستان



م۔ الف صدیقی کے پراسرار قلم سے

ہزار حصوں میں شائع ہو گئی

قیمت فی حصہ ۵۰/- روپے
مکمل سیٹ ۲۵۰/- روپے

ناشر

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور ۲

میں نے بہت دھیمی آواز میں الٹک الٹک کہہ کر اسے سب
کچھ بتا دیا۔ وہ مہر سانس لے کر بولا "مجھے معلوم ہے اشرف
خان کی موت کے بعد تمہارے لئے یہ دوسرا بڑا تنگنا ہے لیکن
اطمینان کی بات یہ ہے کہ تم اسے دل گرفتہ اور دل شکستہ نظر
نہیں آ رہے جتنے اشرف خان کی موت پر تھے۔ دو چار اور ایسے
صدے پڑیں گے اور عمر اور تجربہ بڑھتا جائے گا تو خود بخود ہی تم
مردم پر وف ہوتے جاؤ گے۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ جانے کے لئے
اٹھ کھڑا ہوا۔ میں باہر گاڑی تک اسے چھوڑنے آیا۔ گاڑی
میں بیٹھنے سے پہلے اس نے میرا کندھا تھپک کر کہا "سب کچھ
ذہن سے جھٹک دو اور کسی اچھی سی جگہ پر جا کر یہ رات بے
دقتلا میں گزار دو تاکہ کل تک دل ہلکا ہو جائے۔"

میں نے اس مشورے کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔
اعظم خان نے چوتھا سا سوٹ کیس اپنی سیٹ کے نیچے رکھ لیا
تھا۔ قاسم خان بیٹھ چکا تو ملازم جمیل نے جا کر گیت کھول دیا اور
مریضہ بڑا کیوسے کی بجری کو چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔

میں نے قاسم خان کے مشورے پر عمل نہیں کیا کیونکہ
نی الوقت میرا دل بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اسپرین کی دو گولیاں کھا کر
کچھ سکون محسوس ہوا تو سو گیا۔

دوسری صبح میں دن چڑھے اٹھ کر شیونانے کے ارادے
سے غسل خانے کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ میری نظر سائیڈ
نیل پر رکے ہوئے کلاک پر پڑی جو تاریخ بھی بتا رہا تھا۔ تاریخ
دیکھ کر میرے ذہن میں چھانکا سا ہوا۔ نیل کلاک اٹھارہ
آدھ چار بتا رہا تھا۔

آج تو شرف کی بہن کی شادی تھی۔

مجھے بھوک نہیں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں
آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ درحقیقت فوری طور پر تو میں یہ
فیصلہ بھی نہیں کر لیا تھا کہ میری اہمن کیا ہے؟ بس یہ یاد آتے
ہی ذہن میں چھانکا سا ہوا تھا کہ آج شرف کی بہن کی شادی ہے۔
وہ بہن جسے نہ جانے کتنے عذاب ناک انتظار کے بعد انھوں پر
حاکم لال دیکھنا نصیب ہوئی تھی۔۔۔ اور جس کو ڈولی میں بٹھانے
کا شرف کو بڑا ارمان تھا۔ اپنی بہن کی شادی کو ہی وہ سب سے بڑی

زینے داری سمجھتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس فرض سے
سکدوٹ ہونے کے بعد اسے دنیا کی کسی اونچ نیچ کی کوئی فکر
نہیں رہے گی۔ کسی بات کی کوئی پروا نہیں رہے گی۔

مجھے یاد آیا کہ چند دن پہلے جب میں کراچی سے واپس
آ رہا تھا تو ایئر پورٹ پر شرف نے کتنے مسرورہے میں یہ خبر سنائی
تھی کہ اس کی بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔ مجھے اس کے
الفاظ بھی یاد تھے۔ کیسا بھگن بھگن تھا، اس کے ساتھ اس نے کہا تھا

ظاہر ہے اب شرف کی رقم کا تو کوئی مصروف نہیں تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اس کی رقم سے اپنے اندازے کے مطابق ضروری چیزیں خریدنے کے بعد اگر کچھ بچ گیا تو وہ بھی سالانہ کے ساتھ اس کے گھروالوں کو دے دوں گا اور اگر میری کمزوری چیزیں خریدنے کے سلسلے میں رقم کم پڑی تو اپنے پاس سے ڈال دوں گا۔ اس کے علاوہ بھی میں خالصتاً اپنی طرف سے شرف کی بہن کے لئے کچھ نہ کچھ خریدا چاہتا تھا۔

میں نے شرف کی بھائی ہوئی خدیجہ جگہ سے سیف کی چابی نکال کر سیف کھولا تو مجھے دھچکا سا دکھ۔ سیف بالکل خالی تھا۔ اس میں رقم تو کیا سارے کاغذ کا ایک پرزہ تک نہیں تھا۔ میں اور شرف جب شاہ رخ کو ٹھکانے لگانے کی مہم سے واپس آئے تھے تو قاسم خان نے ہمیں اس کام کا الگ سے معاملہ دیا تھا۔ جسے وہ یوں فرمایا تھا کہ اس وقت شرف نے پانچ ہزار کی گھڑی تو میرے سامنے سیف میں رکھی تھی جبکہ اس میں پہلے سے بھی رقم موجود تھی۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ کاغذات اور لٹاے وغیرہ بھی نظر آئے تھے۔ مگر اب یوں لگ رہا تھا جیسے سیف بھی کچھ رکھا ہی نہیں گیا تھا۔

چند لمحے تو میں وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اس طرح تو میں شخص وقت ہی ضائع کر رہا ہوں۔ سیف بند کر کے میں سڑا تو ایک بار پھر ٹھیک کر رہ گیا۔ دروازے پر سے ٹرپ کھڑی خالی خالی ہی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی ”کس چیز کی تلاش تھی تمہیں؟“ اس نے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیتے ہوئے ظاہر سرسری سے کہنے میں پوچھا۔

میں نے اس خیال سے کہ کہیں وہ میری نیت پر شبہ نہ کرے اسے بتایا کہ میں کیا تلاش کر رہا تھا اور کیوں تلاش کر رہا تھا۔

”شاید تمہیں معلوم نہیں....“ اس نے ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں جھانکا ”میں کا اصول ہے کہ جب کوئی مر جائے تو اس کی چھوڑی ہوئی ہر چیز نقد رقم کاغذات یا کوئی بھی ایسی چیز جس سے مرنے والے کی شناخت میں کوئی مدد مل سکتی ہو، سب کچھ باس کی تحویل میں چلا جاتا ہے اور ان چیزوں کے بارے میں کوئی کبھی قسم کا دعویٰ یا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم کارندوں کو نقد رقم اور دیگر چیزیں کم سے کم اپنے پاس رکھنی چاہئیں۔ یہ بات شرف کو بھی معلوم تھی۔ لیکن شاید اس کا خیال تھا کہ اس کا کام محفوظ رقم کا ہے اس لئے وہ اپنی زندگی میں ہی... اور شاید جلد ہی اپنی جمع پونجی کو استعمال کرنے کا۔ چنانچہ اس نے اپنا اثاثہ کسی محفوظ جگہ پر بچانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اسے شاید اس سادہ ترین حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ موت کا کیا معروسہ“ وہ مجھے سے انداز میں مسکرائی۔

میں ایک لمحہ وہیں کھڑا خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور

”میں بے یقین تھا کہ تمہیں یہ خبر سناؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ صرف تم ہی میری خوشی کو محسوس کر سکتے ہو۔ میں اور تو کسی کو کسی کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حتیٰ کہ قاسم خان کو بھی نہیں جس کے لئے ہم جان بیکاری پر لئے بھرتے ہیں۔“

اس نے یہ بھی کہا تھا ”لڑکے والوں کو بہت جلدی ہے۔ انہی نے لکھا ہے کہ گھبرانہ بہت ہی شریف اور بہت ہی اچھا ہے۔ ہم تو سوچتے تھے کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔ اب جیسا تیسرا بھی رشہ میسر آئے گا اس کی دوسری گے۔ لیکن اللہ نے من کی مراد کے مطابق ردے دیا ہے۔ اب زیورات اور خاص خاص عروسی ملبوسات کا انتظام مجھے ہی کرنا ہے.... اور مجھے لگتا ہے کہ یہ سب چیزیں لے کر میں عین موقع پر ہی گھر پہنچ سکوں گا کیونکہ ابھی میں بہت سے ضروری کام ٹھکانے ہیں اور اسی دوران شاپنگ کرنی ہے۔ شاپنگ میں ذرا تم بھی میرا ساتھ دینا۔ مجھے تو زیور کپڑے وغیرہ کے بارے میں خاک بھی علم نہیں۔“

میں نے اس کے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا مگر آج وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ میں بظاہر کیسے مٹا کر انداز میں اس کے ہمراہ خالی کو ایک دیرانے میں بے نشان قبر میں دفن کر آیا تھا۔ ابھی ابھی میری سمجھ میں آئی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شرف کے گھر والے کس بے باکی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ان بچاروں کے پاس تو شرف کا صحیح ایڈریس بھی نہیں تھا.... اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ شادی کے لئے زیور کپڑا لے کر پہنچنا شرف کی ذمہ داری تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر تو درازا سی باتیں ناک کا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ میں تو سب سے بڑی اور اہم چیزوں کا دار و مدار ہی شرف پر تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ نو بج رہے تھے۔ اگر میں آدھی اور طوفان کی طرح حرکت میں آجاتا تو کھینٹے ڈھکے میں شاپنگ کر کے کار میں تقریباً چار بجے تک شرف کے گاؤں پہنچ سکتا تھا۔ گاؤں ”سرگودھا شہر“ روز ”پر تھا اور ہائی وے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ باہر یاہر سے میرا دیکھا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گاؤں کا کوئی آدمی میرا دوست ہے گا اور مختصر سی رفاقت کے بعد مجھ پر بھی جائے گا۔

اس کے گھر کا صحیح پتا تو مجھے معلوم نہیں تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ گاؤں پہنچ کر اس کا گھر تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ دیہات میں کسی کا گھر تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ میں جس قدر جلد مل سکوں گا تو شرف کا تار ہوا اور شرف کے کمرے میں پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ شرف کا کوئی اکاؤنٹ نہیں تھا وہ اپنی کل جمع پونجی اپنے کمرے میں نصب شدہ چھوٹے سے سیف میں رکھتا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس سیف کی چابی کس ہوتی ہے۔

پندرہ سال بعد میری گاڑی سرکلر روڈ کے بے جگم ٹرنک میں شامل ہو گئی۔ گاڑی کا پچھلا حصہ ڈبوں، پینکوں اور دیگر ساز و سامان سے بھر دیا تھا۔ میں جس حد تک بھی ممکن تھا، تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میرا وہی اندازہ درست رہا کہ مجھے ٹرنک میں اچھے اچھے راشیوں کے پل پر بیٹھے ہیں پون کھنڈ لگ گیا۔ صحیح معنوں میں میں ایک بگے جھوٹے روانہ ہو سکا تھا۔ اب میں اشدائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کر کے بھی چار بیٹے سے پہلے گاڑی نہیں بچ سکتا تھا اور شادی بیاہ میں عوامناچار بیٹے خصوصی وغیرہ کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ مجھے اس تصور سے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ شرفو کے گھر والوں کی نہ جانے کیا حالت ہوگی؟ باپ تو اس کا تھامی نہیں۔ میں دو بے چھوٹے بھائی اور ایک بے بن بھی جس کی شادی ہو رہی تھی۔ میں خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے اندازے سے کچھ پہلے ہی گاڑی بچ گئی۔ گاڑی میں نے ہائی وے سے کچے میں اتاری تو کچھ بیٹوں کے قریب کھیلے ہوئے کچھ بیٹے شور مچاتے ہوئے گاڑی کے پیچھے لگ گئے۔ میں نے گاڑی روک کر انہیں سے شرفو کا گھر معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ بتا سکے مگر جب میں نے بتایا کہ اس گھر میں آج شادی ہو رہی ہوگی تب انہوں نے فوراً میری عملی رہنمائی کردی بلکہ اسی جلوس کی سمیت میں 'میں شرفو کے مکان تک پہنچا۔

مکان کے سامنے ہی کھلے میدان میں درختوں کے سائے میں چار بیٹوں پر بارانی بیٹے اوگھ رہے تھے۔ کچھ تو لینے ہی ہوئے تھے۔ ایک طرف باپے والے قدرے بیزار سے انداز میں بیٹھے تھے۔ مکان کے قریب ہی دیوار کے ساتھ کچھ دیکس آڑی تر جمی پڑی تھیں۔ دیکس غل ہو چکی تھیں اور چوٹے جھجکے تھے۔ کہیں قاقص وغیرہ لگائے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا بلکہ کھلے میدان میں ہی کچھ جگ صاف کر کے دریاں بچھائی گئی تھیں جو آب الہی سید می پڑی تھیں۔ ایک طرف دو تین تین بچروں سے بھرے رکے تھے۔

ہر چند کہ وہاں شادی کے لوازمات موجود تھے مگر فضا میں عجیب سی سوگواہی رہی ہوئی تھی۔ ویسے تو دوری سے میری گاڑی کو دیکھ کر بڑبڑا ہوا چوک گئے تھے لیکن جب میں میں مکان کے قریب ہی جا پہنچا تو چار بیٹوں پر لینے ہوئے آدمی بھی اٹھ بیٹھے اور تجسس نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے پھر شاید انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ آنے والا شرفو نہیں تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بھی کسی سے کچھ پوچھنے یا پچھانے میں دقت ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی اور بے دھڑک مکان کے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دروازہ کھلائی تھا اور گھن میں بہت سے مردوں اور عورتوں کا جھوم نظر آ رہا تھا۔ مکان نیم پختہ

وہ داپس جانے کے لئے سڑنے لگی تو میں نے گویا فیملے پر چپختے ہوئے کہا "خیر... میں اس موضوع پر پاس سے بھربات کروں گا۔ میں شرفو کے گاڑیوں جا رہا ہوں۔ اگر پاس قانون آئے تو خواہ تم اصل بات ہی بتاؤ اور چاہو تو کہہ دینا کہ میں کسی ذاتی کام سے شرفو سے جا رہا ہوں۔ کل تک لوٹ آؤں گا۔ ذرا بھی تم مناسب سمجھو کہہ دینا خدا حافظ۔"

میں تھکی سے جا پر آیا۔ میری گاڑی یہاں نہیں تھی۔ وہ گلبرگ میں میری رہائش گاہ میں کھڑی تھی چنانچہ میں اسی فوس وکین میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو شرفو کے اشتعال میں جتنی تھی۔ میں اپنے گھر ہی کی طرف جا رہا تھا۔ میرا اکاؤنٹ گھر کے قریب ہی ایک چھوٹی سی برانچ میں تھا۔ کچھ نقد رقم گھر میں بھی رکھی ہوئی تھی۔

میرے اخراجات خاصے زیادہ تھے اور پھر مجھے "کام" کرتے ہوئے بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میں بمشکل تیس تیس ہزار روپیہ بچا ہوا تھا۔ اس میں سے بیشتر رقم بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ میں موجود تھی۔ ایک نام نادر کاروباری ادارے کے نام پر یہ اکاؤنٹ کھلایا گیا تھا۔ اس ادارے کی تھوڑی سی اسٹینڈری بھی چھپوائی گئی تھی جو میری رہائش گاہ پر اسنور دوم کی ایک الماری میں پڑی تھی۔

گھر سے بینک تک لے کر میں بینک پہنچا تو دس بج چکے تھے۔ میں سیدھا فیئر کے پاس چلا گیا تاکہ انتظار میں مزید وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ وہ زبانہ قیمت تھا۔ فیئر لائسنس کی دیکھنے والوں کو کتاہ نہیں کیا تھا۔ چھوٹے اکاؤنٹ ہولڈر کو دیکھ کر بھی فیئر کری سے اٹھ کر اشتعال کرتا تھا اور ہر متعلقہ مسئلے میں حتی الامکان مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ چند ہی منٹ بعد میں اپنی تقریباً ساری رقم نکال کر بریف کیس میں رکھ کے گاڑی میں اتر کر کھلی کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

نادر کھلی پہنچ کر میں نے جس طوفانی انداز میں شاپنگ کی اس طرح شاید ہی کسی نے کی ہو۔ ذرورات اور عروسی بلوسات وغیرہ کی دکانوں کی آرائش میں شاید ہی کبھی ایسا کوئی کام کیا ہو جس نے میرے جتنی جھلک میں سامان خریدا ہو، کسی چیز کی قیمت میں ایک پیسہ بھی کم کرانے کے لئے نہ کہا ہو اور میں یہ لینے کی بھی دھمت نہ کی ہو۔

میری عقل نے جہاں تک ساتھ دیا، میں نے ضرورت کی تقریباً سب ہی چیزیں خرید لیں۔ میرا اٹھ اس وقت رکا جب میری جیب میں صرف ایک ہزار روپیہ رہ گیا۔ مختلف دکانوں کے درمیان گھن چکر بن کر میں پیسے میں بھگ چکا تھا اور میری اس تمام تر زبرد بازی کے باوجود مجھے بازار میں تقریباً اڑھ گھنٹا لگ گیا تھا۔ وقت گویا پر لاکر اڑ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو بارہ بج چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شرفو سے نکلنے نکلنے بھی ایک بج جاتا۔

سای تھا تاہم کافی طویل و عریض معلوم ہوتا تھا۔

تھا کہ شرفو اب کبھی بھی گھر نہیں آئے گا۔

نوجوان نے انکپاٹ آئینہ انداز میں بہت جاری رکھی۔ لڑکے والوں کو جب یہ پتا چلا کہ شرفو بھائی ابھی تک نہیں پہنچے ہیں تو وہ شور مچا رہے ہیں کہ ان کے ساتھ دھوکا دیا ہے۔ انہیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ لڑکی کا بھائی شرفو بڑے اچھے عہدے پر ملازم ہے اور وہ بڑا اچھا چھوڑے گا.... مگر کون ان کی باتیں سن سکتا ہے غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔

اس دوران ضعیف خاتون آنکھیں کھولی چکی تھیں اور امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "خالد! آپ نے تو شرفو کو لکھا تھا کہ یہ بڑے شریف اور بھلے لوگ ہیں؟"

"شریف اور بھلے تو ہیں بیٹا" شرفو کی اسی غصہ بھرے انداز میں بولیں "لیکن خود راہت لڑکچہ تو سب میں ہی ہوتا ہے نا.... اور پھر ہم سے بھی تو وعدہ خالی ہو رہی ہے نا۔"

وہ قطعی طور پر ایک دیہاتی اور سیدھی سادی خاتون تھیں مگر غضب کی روادار اور کھلی مزاج تھیں۔ لڑکے والوں کو برا نہیں کہہ رہی تھیں۔ کردار سے لے کر میں بولیں "تم دوست ہو شرفو کے؟ کیا فرماتے ہو؟"

"خالد! شرفو کو عین وقت پر چھٹی نہیں مل سکی۔ بہر حال سلمان سب بھیج دیا ہے اس نے" میں نے تھوک نکل کر کہا اور شرفو کی اسی کی طرف سے منہ پھیر کر نوجوانوں کو مخاطب کیا "جاؤ، جا کر گاڑی سے سلمان نکال لاؤ۔"

"خدا یا! اتنے لاکھ لاکھ شکر ہے" شرفو کی اسی نے ایک طویل سانس لی۔ ان کے سینے سے جیسے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ اس وقت انہیں صحیح طور پر شرفو کی نیروعلایت دریافت کرنے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ دونوں بھائی لگ کر کمرے سے باہر چلے گئے تاہم وہ عورت جو بڑی لی کے ہاتھ سلا رہی تھی وہیں بیٹھی اسی طرح ہاتھ سلاتی رہی۔ بڑی لی نے مجھے قریب ہی پڑے ہوئے موزے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

باہر جیسے آن کی آن میں خبر پھیل چکی تھی کہ شرفو خود تو نہیں آسکا مگر اس نے جیڑ کا سلمان بھیج دیا ہے۔ باہل پر سے جیسے ٹکٹ باسٹ، جیڑاری اور سوگاری کے سائے چھٹ گئے تھے۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ ایک تو میں نے آج تک اس طرح عین رخصتی کے وقت کسی لڑکی کا جیڑ آتے نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے مجھے یہ بات بڑی عجیب لگ رہی تھی کہ روپیہ پیر انسان کی زندگی میں کیسے عجیب ترشے دکھاتا ہے۔ بچپن ہی سے میں روپے پیسے کے ہونے اور نہ ہونے کے عجیب و غریب اثرات دیکھتا چلا آ رہا تھا اور مجھے یہ معاملہ بڑا دلچسپ لگا تھا۔ بہت ہی عجیب چیز ہے یہ بے جان کرنسی بھی جرم سے مکرر چیزوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ انسان اپنے گرد و پیش کا

میں سیدھا اندر چلا گیا۔ صحن میں نہیں نے ایک آراستہ دیوان پر گولہ کو بھی دیکھا۔ اس کی شکل تو میں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس نے ہماری بھر کم سرا تو چرے سے ہلایا ہوا تھا مگر اب بھی منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو ایک نوجوان بیٹھے تھے جن کے سروں پر لوٹنے لوٹنے طروں والی کلف لگی پگڑیاں تھیں اور گلے میں گلاب کے ہار تھے جو اب مریضانے لگے تھے۔

دو عین اور صاحبان کے گلے میں بھی پھولوں کے ہار نظر آ رہے تھے۔ وہ صاحب ریش تھے اور ایک طرف کھڑے کچھ لوگوں سے اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انداز بحث و تکرار کا ساتھ لیکن کلن بڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بحث کرنے والوں کے گرد مردوں اور عورتوں کا جھگڑا تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے۔

اچانک کسی کی توجہ میری طرف مبذول ہو گئی اور پھر ایک ایک کر کے کبھی کی گردنیں میری طرف گھومتی چلی گئیں اور دوسرے ہی لمحے وہاں گہرا سکوت چھا گیا۔ میں نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی اور قریب کھڑی ایک اوجیز عورت سے پوچھا "شرفو کی ماں کہاں ہے؟"

عورت نے خاموشی سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور میں بلا تھک اس کمرے میں جا گھسا۔ میں نے دیکھا ایک ضعیف عورت آنکھیں بند کئے ایک چوڑے سے ہلکے پرچت بڑی تھی۔ ایک عورت اس کا ہاتھ سلا رہی تھی اور دو نوجوان اس کے گھٹنے سلا رہے تھے۔ نوجوانوں کے چروں سے وحشت مچاں تھی۔

مجھے دیکھ کر ان میں سے ایک نوجوان جو نسبتاً کم عمر تھا اٹھ کھڑا ہوا اور بے تابی سے بولا۔ "کیا شرفو بھائی آگئے؟ کیا آپ ان کے ساتھ آئے ہیں؟"

"ہیں سمجھ لو کہ شرفو آگیا ہے" میں نے نوجوان کا کندھا پیستیا "تم بھائی ہو نہ شرفو کے؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"اسلم" نوجوان نے جواب دیا۔

"کیا صورتحال ہے؟ یہ باہر کیسا ہنگامہ ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فلاح ہو چکا ہے.... کھانا بھی کھایا جا چکا ہے" نوجوان نے انکپاتے ہوئے بے بسی آئینہ انداز میں بتایا "لیکن رخصتی کے وقت جھگڑا ہو گیا ہے.... ہم نے جیڑ کی صرف دو چار چیزوں کا بندوبست کیا وہاں تھا۔ ہم شرفو بھائی کے آگے پر تھے۔ انہوں نے لکھا تھا 'خواہ میں عین رخصتی کے وقت پہنچوں لیکن پہنچوں گا ضرور۔'"

میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ ان بچہ داروں کو ممکن تک نہیں

مشاہدہ کرے تو اسے روپے پیسے کی بہت ہی حیرت انگیز قسم کی شعبہ بازیوں دیکھنے کو ملیں۔

ابھی اس گھر میں ہی شادی کے تمام لوازمات پورے تھے اور شادی ہو چکی تھی مگر نذر کا سامان نہ ہونے کی وجہ سے کس طرح چند جانیں دوسو سو کی سولی پر لٹکی ہوئی تھیں اور کس طرح داخل پر بے چینی اور نوحہ کے سامنے پھیلے ہوئے تھے اور چند ہی لمحوں میں کس طرح بازی پلٹ گئی تھی ہر چہرے پر رونق ہی آگئی تھی۔

میرے لئے پیش کے ایک لمبے سے گلاس میں شراب آچکا تھا۔ کئی مرد اور عورتیں شخص اور شراب سے انداز میں کن انگوٹھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزرے۔ انہیں یقیناً میرے بارے میں معلوم تو ہو چکا تھا مگر وہ اگر مجھ سے ملنے ہوئے شراب پیتے تھے۔

چند ہی منٹ میں جیڑ مچن میں چارباؤوں پر سجایا گیا۔ جو چہرے شرف کے گھر میں تیار کی گئی تھیں وہ بھی ساتھ رکھ دی گئی تھیں۔ اجتماعات تھا روپے پیسے کی قدر قیمت آج کے دور سے یقیناً کافی زیادہ تھی۔ تیس پینتیس ہزار کے سامان میں پیسے پورا مچن بٹلنگ بٹلنگ کر اٹھا تھا۔ ہر طرف دادواہ ورتی تھی۔ دلہنا کا باپ برسے عاجزانہ انداز میں اگر مجھ سے ملا اور باتوں باتوں میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ سامان وغیرہ کی تو کوئی بات نہیں تھی وہ تو محض شرف کی ماں کو ان کے وعدے یا دلا رہے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے منکر آکر بات ٹال دی۔

میں کھانا کھا چکا اور باہر ہنگامہ سرد پڑ چکا تو رخصتی کا غلغلہ بلند ہونے لگا۔ اس وقت تک شرف کی ای بستر سے اٹھ چکی تھیں اور ان کی طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ وہ مجھ سے اتنی محبت اور شفقت سے باتیں کر رہی تھیں کہ مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک یہ خاندان میرے لئے ایسی تھا ہوش سنبھالنے چ میں نے اپنے آپ کو ماں کی محبت سے محروم پایا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے آج تک اس محرومی کا کوئی خاص احساس نہیں ہوا تھا۔ جس چیز سے انسان آشنا ہی نہ ہو اس سے محرومی کا احساس کم ہی ہوتا ہے۔ مگر آج جب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوا تھا کہ ماں ایسی ایک ہستی ہوتی ہے تو احساس ہونے لگا تھا کہ واقعی میں سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے۔ رخصتی کا مرحلہ آیا تو شرف کی ای بولیں ”آج شرف کا نہ آنا شاید میرے سینے کا کھڑا بن جانا لیکن تمہاری آمد نے میرا سارا دکھ دور کر دیا ہے بیٹا! مجھے اب محسوس ہی نہیں ہو رہا کہ شرف اس اہم موقع پر موجود نہیں ہے۔ میرے لئے تم ہی شرف بن گئے ہو۔ چلو.... چل کر بسن کو رخصت کرو۔“

میں ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا تو سیلیوں کے بھرمت میں بیٹھی ہوئی اس اجنبی لڑکی کو دیکھ کر یکایک ہی

نہ جانے کیوں میرے سینے میں جیسے محبت کے سوتے چھوٹ پڑے۔ میں ایک لمحے کے لئے ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ تخت پر بیٹھی تھی۔ سیلیوں نے اس کا گھونٹ اٹھا دیا تھا۔ مجھے تو وہ قطعاً زیادہ عمر کی نہیں لگی۔ زیادہ سے زیادہ چوبیس پچیس سال کی لگ رہی تھی۔ شاید دیہات کے حساب سے وہ زیادہ عمر کی ہو سکتی تھی یا پھر اس وقت دس بن کر اس پر روپ اٹھایا تھا۔ اس کی اصل شخصیت کا تاثر اس لمحے کی خوبصورتی میں دب کر رہ گیا تھا۔ وہ تو بہت ہی معصوم سی تھی۔ میرے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا اس سے بہت مختلف۔ شرف کی بسن تو وہ لگتی ہی نہیں تھی۔

اس کی ای اس کے قریب پانچویں تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ کچھ دیر ماں بیٹی آنسو بہاتی رہیں پھر اس کی ای آنکھیں پو پھٹے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے گلوگیر آواز میں بولیں ”یہ بھی اچھو گلو اور شرف کی طرح تیرا بھائی ہے کلثوم! آج یہ ہماری خاطر اتنی تکلیف اٹھا کر آیا تو ہماری عزت رہ گئی۔“

”بھیا.....“ وہ میرے گلے سے لگ کر بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگی۔ میرا بھی دل بھر گیا۔ اس ایک لمحے میں میری چشم تصور نے نہ جانے کتنے خواب دیکھ ڈالے تھے وہ واقعی میری بسن تھی جو برسوں تک مجھ سے چھڑی رہی تھی۔ جیسے ہمارا بچپن اسیٹھ ہی گزر رہا تھا۔ میں اس کی شرارتوں پر اسے مارا تھا اور وہ شکایت لے کر ماں کے پاس جاتی تھی۔ کبھی وہ میرے کھلونوں کو چیر دیتی تھی تو میں اس کی پٹیاں کھینچ لیتا تھا۔ ”روٹی کیوں ہے لپٹی؟“ میں نے منکرانے کی کوشش کی اور اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ پھر میں نے دھتے لمبے میں کہا ”میں تجھ سے بس ایک ہی خاص بات کرنا چاہتا ہوں کلثوم! اوپے تو شادی کے بعد لڑکی کے معاملات میں سیکے والوں کا کوئی دخل نہیں رہ جاتا۔ اس کے باوجود اگر تو کبھی بہت ہی زیادہ تنگ ہو جائے.... کوئی تجھے زیادہ ہی ستائے تو اسے پر صرف دو سطر کا ایک خط لکھ دینا جس سے پر شرف کو لکھتی ہے۔ صرف نام شرف کی جگہ میرا لکھ دینا۔ بس میں آکر سب ٹھیک کر دوں گا۔ زندگی میں کبھی کسی بات سے گھبرا نہیں۔ کبھی ڈرنا نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں تب تک کوئی تجھے دکھ دینے کی کوشش نہیں کر سکا۔“

وہ میرے سینے سے لگ کر اور بھی زیادہ ہلک ہلک کر رونے لگی۔ میرا دل اس تصور سے اور بھی زیادہ طویل ہو رہا تھا کہ اس کا اصل بھائی میرا دوست ایک دیر لانے میں مددوں تھا اور میں یہ بات اسے فاطمی نہیں سنا تھا۔ کم از کم اس وقت نہیں جانتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ راز کب تک راز رہے گا اور جب مشکف ہو گا تو کس طرح ہو گا؟

شرف کے نام گھر والوں کے خط ایک دوکاندار کے پتے پر

آتے تھے جسے ہمارے ٹھکانے وغیرہ کا کوئی آٹا پا نہیں تھا۔ میرے بھی اس دکاندار سے بہت اچھے مراسم تھے۔ میں جا کر شرفو کے نام آنے والی ڈاک بھی وصول کر سکتا تھا اور اگر کبھی میرے نام کوئی خط آتا تو وہ بھی مجھے مل سکتا تھا۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا۔

بالآخر رخصتی کا مرحلہ بھی تمام ہوا۔ مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف اہل خانہ اور دو چار دوسرے لوگ افسرہ سے انداز میں بیٹھے رہ گئے۔ وہ گھر میں چند لمبے پتلے ایک ہنگامہ برپا تھا کہ دم بچھے سوتا سوتا سا ہو گیا۔ رات پڑنے لگی تھی۔

میں نے کھانا کر کھانا صاف کیا اور شرفو کی امی کو مخاطب کیا۔
"خالہ! اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔"

میری اس بات سے گویا انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ تقریباً اچھلی ہی پڑیں اور گویا اپنی ساری افسردگی بھول کر بگڑتے ہوئے بولیں "پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ بھلا اس طرح ہم تمہیں کیسے جانے دے سکتے ہیں؟ تمہیں دو چار دن تو رہنا چاہئے اور اگر اس کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم آج کی رات تو تم کسی طرح نہیں جاسکتے۔ لاہور سے یہاں تک تم خود موٹر چلا کر آتے ہو اور یہاں آکر بھی آرام کا ایک لمحہ نصیب نہیں ہو اور اب فوراً ہی سفر واپس چل دو گے؟ کسی پاگلوں والی بات کی ہے تم نے۔"

تھکن تو کسی حد تک میں واقعی محسوس کر رہا تھا مگر رات میں وہاں ٹھہرا ہوا غلاب مصلحت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کو جب وہ ملے بیٹے کچھ فارغ ہو کر بیٹھیں گے، ذہن کچھ ہلکا ہو گا تو محفل ضرور بنے گی اور پھر وہ مجھ سے شرفو کے بارے میں گریہ گریہ کر بہت کچھ معلوم کرنا چاہیں گے۔

مجھے معلوم تھا کہ شرفو نے کس محنت سے اپنی اصلیت مگر والوں سے اس طرح چھپا رکھی تھی کہ انہیں اس کے بارے میں ذرا سا بھی سراغ حاصل نہیں تھا اور اب میری پوزیشن اس سے بھی زیادہ نازک تھی کیونکہ میں شرفو کی موت کا راز چھپائے بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کس بات کے جواب میں مجھ سے غلطی ہو جاتی۔ معلوم نہیں میرا کون سا لفظ انہیں شک میں مبتلا کر جاتا۔ میں رات بھر کسی قیمت پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

شرفو کے سب سے چھوٹے بھائی اسلم نے تو نہایت مصوبیت سے اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا "بھائی جان! ابھی تو ہمیں شرفو بھائی کے بارے میں آپ سے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں.... وہ کوئی کمیٹی میں کام کرتے ہیں؟ ہمیں وہ لاہور آنے اور خود سے ملنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ آخر ایسی بھی کیا نوکری کہ انسان اپنی بس کی شادی پر بھی صرف ذریعہ سوئیل دور سے بھی نہ آئے؟ کبھی کبھی تو ہم ان کے بارے میں عجیب

عجیب شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگتے ہیں۔"
"بھائیوں کے بارے میں دل میں شک نہیں رکھا کرتے۔" میں نے مسکراتے کی کوشش کی لیکن مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری مسکراہٹ روج سے خالی تھی۔ پھر میں نے اس کا کدھا تھک کر کہا "بھائی! اگر چھوٹے بھائی بہنوں سے کچھ چھپا بھی رہے ہوں تو اس میں بھی شاید چھوٹوں ہی کا فائدہ ہو اور پھر تم یہ توقع کیوں کر رہے ہو کہ جو باتیں تمہارا حقیقی بڑا بھائی تم سے چھپاتا ہو وہ میں تمہیں بتا دوں گا؟ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ شاید عقربہ کبھی شرفو کو کہیں بیرون ملک بھیج دے اور وہ ایک طویل عرصے تک تم لوگوں سے ملنے نہ آئے۔"
"وہ ملک میں رہ کر کون سا ہم سے ملنے پر مہینے آجاتے ہیں؟" بھٹلا بھائی غلام محمد منہ بنا کر بولا "کبھی کبھار عید بقرعید پر ہی ملاقات ہوتی ہے۔"

"بہر حال.... تمہیں شاید یہ احساس نہ ہو کہ تم لوگ شرفو کے دل سے کتنے قریب ہو" میں نے انہیں ردائی تھل دی۔
شرفو درحقیقت انہی لوگوں پر تو سب کچھ ٹاٹ کر گیا تھا۔

کبھی وہ بھی میری ہی طرح سیدھا سادا دیمائی رہا ہو گا۔ اپنے والدین اور کس بن بھائیوں کے لئے کمانے کی غرض سے شہر گیا ہو گا۔ میں اس سے کبھی تفصیل سے نہیں سن سکا تھا کہ وہ کب اور کس طرح ان راءوں پر چل نکلا تھا جن کی کوئی منزل نہیں تھی۔ کارگزار حیات کی اس سودے بازی میں اس کے ہاتھ میں کیا آیا تھا؟ جو کچھ کلیا تھا اس میں سے بیشتر کھائی لیا، کچھ عیاشیوں میں اڑا دیا۔ جو تھوڑی بہت پونجی بچائی وہ مالک کے پاس واپس چلی گئی۔ گویا کنویں کی مٹی کنویں ہی میں لگ گئی اور شرفو جان سے بھی چلا گیا۔ یہ تو بہت کھانے کا سودا تھا۔ اس کا کہہ جس کی بہتری کی خاطر وہ آنکھیں بند کر کے چل پڑا تھا۔ وہ تو وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ بلکہ اگر آج میں بہت نہ کرنا تو اس کی بس کی شادی بھی رنجیٹوں کا شکار ہو جاتی۔

ہاں اتنا ضرور تھا کہ شرفو کی گزشتہ برسوں کی تک و دو کی بدولت اس کا گھرانہ فائدہ کشی سے بچ گیا تھا۔ ایک بار شرفو نے سرسری سے انداز میں مجھے بتایا تھا کہ جس وقت وہ کمانے کی غرض سے گاؤں سے نکلا تھا اس وقت اس کے گھر میں فائدے ذرا اڑا لے چکے تھے۔ اس کے بعد روز روز اتنا ضرور ہوا تھا کہ ان کی گزرتا ہوا آرام سے ہونے لگی تھی۔ شرفو کا سب سے چھوٹا بھائی اب کالج میں پہنچ چکا تھا اور مجھے بھائی نے کچھ عرصہ قبل چند ایک زمین خرید لی تھی جسے وہ اکیلا ہی ال الیل صحیح طرح سے آباد کرنے کی تک و دو میں لگا ہوا تھا۔ اب جبکہ شرفو اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور میں ممکن تھا کہ مستقبل میں بھی ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہ دکھ پاتا اور ان کے کسی کام نہ آسکا۔ لیکن بہر حال اب یہ اندیشہ نہیں تھا کہ انہیں قانون کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے لئے یہ احساس بڑی طمانیت کا باعث تھا

اور میں اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

کسی نہ کسی طرح ان سے اجازت لے کر میں ہرجال واپس لاہور روانہ ہو گیا۔ رات کے پچھلے پیر میں گھر پہنچا۔ نوکر کو میں نے سوئے سے اٹھایا۔ پہلے اس سے معذرت کی پھر اسے زبردست قسم کا ناشتا تیار کرنے کی ہدایت کی۔ مجھے سخت ہموک لگی ہوئی تھی اور ناشتا کر کے میرا پروگرام دن بھر سونے کا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں جب سو کر اٹھوں تو میرا ذہن ہر وہ چیز سے آزاد ہو۔ شرف کی موت اور پھر اس کے گھر بنانے کی بھاگ دوڑ سے میرا ذہن کچھ بوجھل سا ہو گیا تھا اور یہ بوجھل پن جھٹکن کے باعث نہیں تھا۔ میرے محسوسات میں بہت شکست و ریخت ہوئی تھی اور میں نیند کا سارا لے کر سب کچھ ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ میں بہت عجیب انداز کا حساس آدمی تھا۔ جب چاہتا تھا توڑی سی کوشش سے اپنے صدات کو لا شعور کے اندر چھپے میں داخل کر دیتا تھا، ان کے بارے میں سوچ سوچ کر گھٹا نہیں رہتا تھا۔ اپنے آپ کو باکارہ نہیں کر لیتا تھا۔ جذباتیت بھی مجھ پر سوار ہوتی تھی تو بہت بری طرح ہوتی تھی لیکن اگر میں چاہتا تھا تو فوراً ہی اپنے آپ پر توڑا سا جبر کر کے بلا کا سفاک اور سرد مہر بھی بن جاتا تھا۔ میری دن بھر سونے کی حسرت پوری نہیں ہو سکتی۔ تین بجے کے قریب فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے بستر میں لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف قاسم خان تھا۔

”آج پانچ بجے اگر دو نمبر پر آباد ہو چکے ہو تو شپ رہے گی“ وہ دھمکے لہجے میں بولا ”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ذرا سرسری ایک بات کرنی ہے۔“

احکامات دینے میں قاسم خان کا عمو بھی انداز ہوتا تھا۔ صرف ہنگامی حالات میں اس کے لہجے سے تازہ یا قدرے تنگم کا اظہار ہوتا تھا ورنہ یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ایک دوست دوسرے دوست کو کہیں مدعو کر رہا ہو۔ دو نمبر سے مراد ماڈل ماڈن ولی کو بھی ہوتی تھی۔

اپنے طرز عمل سے قاسم خان بیشہ ایک مشفق و مہربان آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ جس طرح دنیا کا بیشتر کاروبار چل رہا تھا اسی طرح یہاں بھی معاملہ طلب و رسد کا تھا۔ شفقت اور مہربانی صرف اسی کے لئے تھیں جو کام کا آدمی تھا اور صرف اس وقت تک کے لئے تھیں جب تک وہ کار آمد رہتا تھا۔ ادھر ہی اس کی لادیت ختم ہوئی اور حشر و غشقت و مہربانی کا سلسلہ یوں منقطع ہو گیا جیسے لہ ادا نہ کرنے پر بجلی کے ٹکے والے کنکشن کو ہٹا دیتے ہیں۔ محبت و مہربانی کا کنکشن یہاں صرف غرض سے قائم تھا۔

پہلے اشرف خان اور پھر شرف کی موت۔ قاسم خان کا طرز عمل دیکھ کر مجھے دو جھٹکے لگ چکے تھے۔ میرے دل

میں ایک گہری سی بیڑہ جمی تھی۔ پہلے میں خود بخود ہی اپنے آپ کو قاسم خان کے جہاں ٹائروں میں شاکر کرنے لگا تھا اور آخر سوچا کہ اتنا کہ جب بھی موقع آیا میں قاسم خان کے لئے جان قربان کرنے سے گریز نہیں کروں گا لیکن اب میں نے اس ارادے کی پوری پابندی کر لا شعور کی اندھیری کو غری میں پھینک دی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بروقت سمجھا لیا تھا کہ اس دنیا میں سب سے قیمتی چیز اپنی جان ہوتی ہے۔ خصوصاً میری جان اتنی فالتو ہرگز نہیں تھی کہ میں قاسم خان جیسے باس کے لئے گنو آؤتا۔ مجھ جیسے نہ جاننے کتنے احمق اس کے لئے جانیں گنوا چکے تھے اور اسے شاید ان کے نام بھی یاد نہ رہے ہوں اور نہ ہی اس نے شاید کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہو کہ مرنے والے کے اگر کچھ لواحقین تھے تو ان پر کیا گزری؟

”میں بیچ جاؤں گا“ میں نے مختصر اُکھا کر اوار میں منہ چھپا کر لپٹ گیا۔ پانچ بجنے میں ابھی خاصی دیر تھی۔

چار بجے میں بستر سے نکلا اور ٹھوڑی سی ورزش کے بعد تیار ہو کر ٹھیک پانچ بجے ماڈل ماڈن ولی کو بھی پہنچ گیا۔ اس کے تقریباً دو تین منٹ بعد ہی قاسم خان بھی آن پہنچا۔ میں اس وقت ڈانٹنگ روم میں بیٹھا تھا اور مس ٹریپ میرے لئے کھلی لا چکی تھی۔ عموماً ہماری بیستر ضروری اور غیر ضروری گفتگو ڈانٹنگ نیل پر ہی ہوتی تھی۔

”کیا حال ہے میرے شیر؟“ قاسم خان نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ مار کے پوچھا ”تمہاری انسردگی کچھ دور ہوئی یا نہیں؟“

”ہو گئی“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ میں اس کے استقبال کے لئے اٹھ چکا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے متقابل بیٹھ گیا۔ اعظم خان دودا زے ہی پر وہ گیا تھا۔ قاسم خان کے عمو پر مس ٹریپ اس کے لئے جو کس کا کلاس لائی اور قاسم خان پہلی چسکی لیٹے ہوئے سرسری سے انداز میں بولا ”تم شرف کے گھر گئے تھے؟“

”ہاں“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا تاہل جواب دیا ”اس کی بہن کی شادی بھی ادر میں صرف یہ دیکھنے لیا تھا کہ انہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

”پھر کیا پتا چلا؟“ قاسم خان نے پوچھا۔

”انہیں مدد کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن شرف کے نہ بیٹے سے بہت پریشان تھے“ میں نے جواب دیا ”آدم میں نے انہیں مطمئن کر دیا۔ میں نے کچھ نہ کچھ بات تو بنائی دی ہے۔“

”تم نے انہیں شرف کی اصلیت یا ہم سے اس کے تعلق کا کوئی سراغ تو نہیں دیا؟“ قاسم خان نے بدستور سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

”کیا آپ مجھے اتنی ہی بے وقوف سمجھتے ہیں؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

ضروری ہو تھا اور اندیشہ ہوتا تھا کہ کوئی چیز ذہن سے محو ہو جائے، انہیں ہم کو ڈر و ڈڈ میں چھوٹی سوتلی پرچیوں پر لکھ کر پرس وغیرہ میں اڑس لیتے تھے۔ کوئی اور شخص ان سے کوئی مطلب افہم نہیں کر سکتا تھا۔

قاسم خان چاہتا تو میں کو بھی میں ابوہر اوہر بھرنے لگا۔ شرف کا کرا خالی دیکھ کر ایک بار پھر مجھ پر اسیت کا حملہ ہوا۔ شرف جیسے اس گھر کا ایک لازمی جزو بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے بغیر وہاں لگ رہا تھا جیسے کو بھی کا کوئی ستون گر گیا ہے۔ میرے سوا کسی فرد پر شرف کی عدم موجودگی کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر میں وہاں سے نکل کر آیا ہوا۔ آج مس ٹرپ سے چھینر چھاؤ کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ فوس دیکھ میں نے وہاں چھوڑ دی تھی۔ ٹیکسی میں میں گھر گئے آیا اور گھر سے گاڑی لے کر مین مارکیٹ آیا۔ گاڑی ایک جگہ چھوڑ کے بے مقصد انداز میں ابوہر اوہر گھومنے لگا۔ مارکیٹ میں بڑی چل پل تھی۔ ماول کو بتگانے کے لئے حسین چہرے عموماً اسی وقت نکلتے تھے۔ ہوا خوری بھی ہو جاتی تھی اور تھوڑی بہت شاہنگ بھی۔ کسی کسی گاڑی سے تو حسن کا کچھ زیادہ ہی ذخیرہ لہہ پڑتا اور خوبیاں کھوشیوں کے جمونے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کچھ دیر تک میں مارکیٹ کے دائرے میں گھومتا رہا۔ پھر ایک دکان سے کچھ رسالے خریدے اور ایک قریبی اسٹیک بار میں جا بیٹھا۔

باہر بھی رات کی تاریکی قدم بھانے لگی تھی اور اسٹیک بار میں بھی گلابی روشنی سے ماول کو بڑسکون بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دھیمی دھیمی آکر بڑی موسیقی اور گرد کی میزوں پر بیولوں کی طرح نظر آنے والے مرد اور عورتیں "ایئر کنڈیشنر کی سرسراہٹ" مضاف میں بہت سی خوشبوؤں کا استخراج اور سگریٹوں کے دھوئیں کی بکلی کی تھی۔ یہ سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ میرے اعصاب کو کچھ سکون ملا۔ میں ایک کونے میں بٹھا بیٹھا کوئلہ کالی کی چسکیں لیتا رہا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں گلابی اندھیرے سے انوس ہو چکی تھیں اور مجھے مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی صورتیں صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ ساتھ ہی چشم تصور بھی کام کرنے لگی تھی۔ میں اپنے متکلی راجیلہ کو بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے دونوں ہاتھوں کے ملتے ہیں چہرہ نکالے شرح و شرح نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور سرگوشی غماض میں کہہ رہی تھی "تم نے تو بڑی الماطونی محبت کے وعوے کئے تھے اور عالم یہ ہے کہ اسے دنوں میں تم نے خط تک نہیں لکھا۔"

"جانی! تمہیں چو کہ میری اصلیت کا علم نہیں اس لئے تمہیں کیا معلوم کہ یہاں زندگی کس ڈھب سے گزرتی ہے" میں نے لب ہلائے بغیر جواب دیا "کبھی کبھی تو چندہ چندہ دن جمایاں لیتے اور وقت گزاری کی ترکیبیں سوچتے

"نہیں۔ نہیں" وہ جلدی سے بولا۔ "میں محض قلبی کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ ویسے تمہیں وہاں جانے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے تمہیں اپنی لائن کا ایک خاص نکتہ بتایا تھا کہ لالوں سے ہماری کوئی رشتہ داری نہیں رہ جاتی۔ کسی کے مرنے پر اس کے لئے جذباتی مت ہوا کرو۔ جذباتیت اگر کسی کام آئتی ہے تو صرف زندگی میں ہی کام آتی ہے۔ کسی کے مرنے کے بعد ہماری جذباتیت کا نہ تو مرنے والے کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہمیں۔ شاید تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہوں۔ میں جاہلوں تو تمہاری نظر میں ایک اچھا 'فلسفہ' اور ایئر پینڈ باس بننے کے لئے جذباتیت کا لبادہ اوڑھ سکتا ہوں لیکن میں صرف تم سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کرنا کیونکہ میں حقیقت میں صرف تم سے ہی مخلص ہوں۔ اس لئے میں تمہیں اپنی لائن کا ایک بالکل صحیح اور کامیاب آدمی بنانا چاہتا ہوں۔"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور میرا دل اس سے اور بھی دور ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میرا مخلص دوست اور رہنما ثابت کرنے پر حلا ہو رہا تھا اور مجھے اس کی باتوں میں سب سے زیادہ کسی غلوں ہی کی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ صرف یہ کہتا کہ خود غرض زمانے کے مروجہ بیانیے ہی تھے اور ان کے بغیر زمانے کی دودھ میں آگے نکلتا ذرا مشکل تھا تب تو میں اس کی بات سے اتفاق کر لیتا مگر وہ خود بخود ہی غلوں و محبت جیسے معاملوں میں ٹانگ اڑا رہا تھا۔ اس بلکاس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

قاسم خان مجھے اور بہت سی باتیں سمجھاتا رہا اور میں سعادت مندی سے سراہتا رہا۔ اس کے بعد "پریس" کی باتیں شروع ہوئیں۔ قاسم خان کا خیال تھا کہ پرزے نکالنے کے لئے مناسب وقت آچکا تھا۔ اس کے کھینٹے رابطے استوار ہوئے تھے اور اس کا گنا تھا کہ اب ہمیں بہت زیادہ سرگرمی سے کام شروع کر دینا چاہئے۔۔۔ میں خود سرگرمی سے کام شروع کرنے کے لئے بے چین تھا کیونکہ اوہر تو میں کراچی میں راجیلہ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ لاہور جاتے ہی دولت مند بننے کی جدوجہد تیز کروں گا اور لوہر آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جج پوٹھی بھی خرچ کر دی تھی۔ اس وقت میرے پاس زیادہ سے زیادہ مینے بھر کے اثراجات کا بندوبست تھا۔ ہاں کی کچھ نقد و حرکت شروع ہوئی تو میرا بھی کیشن بنتا۔ قاسم خان بتا رہا تھا کہ وہ دو دن بعد لندن روانہ ہو رہا ہے اور کراچی سے فلائٹ کھڑنے سے پہلے یا پھر واپسی پر سینٹھ واحد سے بھی ملتا ہوا آئے گا۔ وہ مجھے تفصیل بتانے لگا کہ اس کی عدم موجودگی میں مجھے کیا کرنا ہو گا۔

ہماری نشست تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران کچھ چپ و رک بھی ہوا۔ بعض ہدایت جنس لفظ بہ لفظ یاد رکھنا

آئے تو تھارے آباؤ اجداد کی رومیں بھی بلایا انھیں کی۔ ہمیں انھی طرح معلوم ہے کہ تم ہمیں وغیرہ سے دیکھ اس لئے دلوار ہے ہو کہ تمہیں معلوم ہے کہ بیشک کی طرح آج بھی ہماری بیب میں کوئی چیز نہیں ہے اور تم جیسے نوادر ہیں ہمیں ایک پرگر بھی کھلانے کے متعلق نہیں ہو سکتے، حالانکہ خدا نے تم جیسے بالوں کو جس طرح دولت سے نوازا ہے اس کے جواب میں تم کم از کم اٹھارہ تفکر کے طور پر ہی تمہیں چاہئے کہ ہم جیسے اہل دانش کی خدمت کرتے رہا کرو جس پر فلک آج ہمارا ہو گیا ہے تو وہ تم جیسوں کے سامنے حقیر نظر آنے لگے ہیں ورنہ وہ بھی زمانہ تھا کہ تمہارا آپ سر کے کنارے بکڑے کی ریز بھی لگایا کرتا تھا اور تم کبھی سستی کی گلیں میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ میلی ٹیکر پہنے ننگے پاؤں بھرا کرتے تھے۔ گھبرگ اس وقت صحیح طرح سے آبدی بھی نہیں ہوا تھا۔ یہاں اکاؤنٹ کا کوئی غیاں تھیں اور کبھی کبھی بیتیاں جن میں تم جیسے کم عرف لوگ ہڑے تھے جو آج صاحب بانک اور صاحب کاروبار ہو گئے ہیں۔“

میرا خیال تھا کہ اس ریلارک پر نو جوان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو جائے گا اور وہ دینر کو فیصلہ کن انداز میں حکم دے گا کہ بڑے میاں کو بلا تامل باہر بیٹھ دیا جائے۔ لیکن میں نے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رو سا کہ نو جوان کے چہرے پر ترم آئینہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ اس کی تحمل مزاجی قابلِ داد تھی۔ وہ اپنے سٹے لیے میں بولا ”ان فقیرات پر شرم تو آپ کو بھی آتی چاہئے حضور دلا! ہم تو بالکل تھی دست اور آپ کی نظر میں بالکل غریب و ذلیل تھے مگر خدا کے کرم سے کسی نہ کسی قابل ہو گئے مگر آپ کو تو خدا نے ہر چیز سے نوازا تھا۔ آپ نے معلوم نہیں کہیں اور کس طرح سب عادت کر دیا کہ آج آپ دس روپے کا برگر کھانے کے لئے دس کھنے بحث و مباحثہ تو کر سکتے ہیں مگر اوائی نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو پچاسوں مرتبہ مفت کھانا کھلا چکا ہوں مگر اب یہ سلسلہ نہیں چلے گا۔ یہ ہمارا کاروبار ہے کوئی تفکر غائب نہیں۔ سمجھے؟“ پھر وہ تہرے دھیمے لہجے میں بولا ”جس باپ کے بچہ ذرا فروش ہونے کا آپ ہمیں طعنہ دے رہے ہیں، ہمیں اس بچہ ذرا فروش باپ پر نفرت ہے بڑے میاں! انہی بچہ زوں کی کمائی سے انہوں نے ہمیں پڑھنے کے لئے دلالت بھیجا تھا۔ وہ خود ان پڑھ تھے مگر انہوں نے ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی تعلیم سے غافل نہیں ہونے دیا۔“ ہمیں یہ سب چاہا کہ ہم بھی انہی کی طرح بچہ زوں کی ریز بھی لگا لیں۔ انہی کی کمائی سے ہم نے یہ پلاٹ خریدا تھا جس پر اسٹیک بار تعمیر ہوا ہے۔ اس وقت اس پلاٹ کی کمرائی چوٹ تھی اور اس میں گندہ پانی کھڑا تھا۔ لوگ ہم پر ہنستے تھے کہ ہم شاید اس جوڑ میں پھیلیں پائیں گے۔“

ہوئے مگر جانتے ہیں اور کبھی کئی کئی دن تک گویا سولی پر لٹے رہتے ہیں۔ رات دن کچھ عجیب سی طرح کی مصروفیت ہوتی ہے۔ بظاہر کچھ زیادہ مصروف بھی نظر نہیں آتے مگر فرصت بھی میسر نہیں ہوتی اور پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ....“

اچانک میں اس پرسکون ماحول میں کچھ شور شرابا سا سن کر چونک اٹھا۔ میں نے دیکھا، کلاؤنٹر کے قریب ایک عکڑا سا دینر ایک بڑے میاں کو گرمیاں سے پکڑے کھڑا تھا۔ بڑے میاں تازہ کے درخت کی طرح لمبے لیکن بالکل مضنی تھے اور ان کے جسم پر ویسا ہی ایک سوٹ تھا جیسا آپ نے چارلی چینل کے دور کی فلموں میں اکثر مزاحیہ اداکاروں کو پہنے دیکھا ہوگا۔ شہر والی کی طرح پیچھے سے لمبا کوٹ، تنگ چٹلون اور بھالدار ٹیسی پر بڑی سی بو۔

کلاؤنٹر پر کھڑا ہوا نو جوان اسٹیک بار کے انکان میں سے ہی ایک تھا۔ وہ اشارے سے دینر کو کوئی ہدایت دے رہا تھا۔ دینر بڑے میاں کو دروازے کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بڑے میاں وہاں سے ہلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اپنی جگہ تھے رہنے کے لئے انہوں نے ریز میوں کا چوڑی پٹلا بکھڑا تھا اور اپنی دانت میں حتی الامکان غصہناک نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اس کوشش میں صورت اور بھی مشککہ خیز ہو گئی تھی۔ ذاکر نو جوان کی طرح لنگی ہوئی موٹھیں بڑی طرح پڑ پڑا رہی تھیں اور وہ منتناں ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ”بھیکو! چند روپوں کے لئے مرے جا رہے ہو۔ ایشیا کے عظیم ترین بول نگاری بے عزتی کر رہے ہو۔ ناچار وراثت نے ہمارے گران کا زمانہ نہیں دیکھا۔ ایسے ٹٹ پونجیا اسٹیک بار میں تو ہم اپنے کتنے کو بھی کچھ کھانا پسند نہیں کرتے تھے....“

”حضور دلا! اسی لئے تو ہم کی بار پانچ بانہہ کر آپ کی خدمت میں عرض کر چکے ہیں کہ اس گھٹیا اسٹیک بار میں تفریف نہ لایا کریں۔ یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے“

کلاؤنٹر پر کھڑا ہوا نو جوان دھیمے لیکن ذہین لہجے میں بولا ”ہم آپ کی بے عزتی نہیں کر رہے۔ صرف اس لئے باہر کا راستہ دکھا رہے ہیں تاکہ آپ اپنے بیٹھنے والے کو کوئی شایان شان جگہ تلاش کر سکیں“ نو جوان اپنی آواز حتی الامکان نیچی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹالابا نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہوں اور اسٹیک بار کا پرسکون ماحول ماحول ہو۔ تاہم میرے علاوہ بھی وہ چند لوگ جو کلاؤنٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اس طرف متوجہ ہو چکے تھے لیکن بس اس حد تک کہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے تجسس سی انکروں سے متشدد کچھ رہے تھے۔

بڑے میاں گویا تھکلا کر بولے ”میاں! ہمیں نظروں کی بار دینے کی کوشش نہ کرو۔ ہم نے بول نگاری چھوڑ دی تو کیا نوا نظروں کے بلا شہ ہم اب بھی ہیں۔ مگر ہم شہر مزاج پر اثر

سنہائی ہوئی سی آواز میں بولے "اوحار کی بنیاد پر تو میں یہاں
صرف ایک ہرگز کھانے آیا تھا لیکن اب تم میرا ہوسے گئے ہو
تو میرا خیال ہے مجھے تمہاری مہمانی سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے
یہ کہہ کر بڑے میاں نے مینو اٹھایا اور چنگی بجا کر بڑے
شہادت انداز میں دیکر کو قریب بلایا۔ دیکر گویا بادل نواز سے آیا تھا اور
کھانے والی نظروں سے بڑے میاں کو گھور رہا تھا۔ بڑے
میاں کی طرارت دیکھ کر اندازہ کرنا قطعی ناممکن تھا کہ چند لمے
پہلے ان کی بے عزتی ہو رہی تھی۔

"ویرا" انہوں نے بڑی تمکنت سے کہا "ایک گھر
نکس کی پلیٹ" ایک کلب سینڈویچ اور ایک پلیٹ فراڈ کرائس
.... اور ہاں ... ان سب چیزوں سے پہلے چکن کرم سوپ لانا
مت بھولنا ... اور کھانے کے آخر میں میں بلیک کلائی چنا
پسند کروں گا ... اور ہاں ... ذرا باہر والے لڑکے سے کتنا برابر کی
دکان سے گوڈ لیف کا ایک ٹیکٹ بھی پکڑ لے۔"

دیکر انہیں گھورتا ہوا خاموشی سے چلا گیا۔ کسی کی
نوازشات سے استفادہ کرنے کا فن واقعی بڑے میاں کو آتا تھا۔
میں نے ان کے مشن سے وجود کا جائزہ لیتے ہوئے قدرے
حیرت سے کہا "آپ نے جن چیزوں کا آرڈر دیا ہے کیا آپ
واقعی وہ سب کھا لیں گے؟"

"زندگی میں وہی تو شوق ہیں ہمیں۔ ایک اچھا کھانے
کا اور دوسرا اچھا پینے کا" بڑے میاں نے کرسی کے پتے سے
ٹیک لگا کر اطمینان سے جواب دیا

"مشاء اللہ" میں نے تہی منہ کر کے ہوئے کہا۔ ایک
لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا "میں آپ کا نام جان
سکتا ہوں؟"

"آتش دہلوی" بڑے میاں نے اپنی فوجی حرکت موڑنے کا
سرا مرد ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے واقعی حیرت کا شدید ہنگامہ
لگا مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ میں اس وقت چھوٹا تھا
جب آتش دہلوی کے سبکی ٹائلوں نے دھوم مچائی ہوئی تھی۔
مجھے اپنی تمام تر کم عمری کے یادوں کو تکیاں دے سناں اور ہر طرح
کے ٹائلوں وغیرہ پر ہنسنے کا زبردست چہرہ تھا۔ خریدنے کا تو میں
مستعمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے آندہ لائبریریوں سے کرائے پر
لے کر پڑھا کرتا تھا۔

مجھے اس وقت بھی معلوم تھا کہ آتش دہلوی نے کبھی تو
چند ہی ٹائلوں پر عمر ان میں سے ہر ایک کے کسی کسی ایڈیشن
چھپ چکے ہیں۔ ان کے ایک ٹائلوں کو بہت بڑا اہل انعام بھی مانتا
تھا۔ میں نے ان کے سبھی ٹائلوں پر مے تھے اور اس زمانے میں
ان کا زبردست مداح تھا۔ میں اکثر ان سے ملنے کے خواب دیکھا
کرتا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ملاقات ہوگی تو اس طرح
ہوگی!

وہ اچانک ہی ٹائلوں نگاری کے افق سے غائب ہو چکے تھے

دھن نوجوان کی آواز پر غالب تھی مگر میں صرف اس لئے سن
پارہا تھا کہ میں کلاؤنٹر کے ٹین سامنے ایک کونے میں بیٹھا تھا راہ
میں کوئی میز نہیں تھی اور میں ہمہ تن گوش تھا۔ باقی دو چار
لوگ جو اس طرف متوجہ تھے وہ نسبتاً ذرا زیادہ فاصلے پر تھے اور
ان کی دلچسپی صرف یہ دیکھنے کی حد تک تھی کہ کب بڑے
میاں کو اٹھا کر باہر پھینکا جائے گا۔ اور وہ مرحلہ آتی چکا تھا۔
نوجوان نے چنگی بجا کر ایک اور دیکر کو قریب بلایا اور سخت
لمبے میں بڑے میاں سے کہا "اس سے پہلے کہ آپ اہل زبان
اور اہل ادب ہونے کے باوجود مزید بد زبانی اور بد تنیزی کا مظاہرہ
کریں، بہتر ہے کہ خود ہی باہر چلے جائیں ورنہ میں آپ کو اٹھوا
کر پھینکوں لگا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ
آئندہ اگر آپ کی جب میں پیسے ہوں تب بھی یہاں شریف
لانے کی زحمت نہ کریں۔"

بڑے میاں بھی ایک ہی ذہن اور ہڈر تھے۔ نتائج کی پروا
کے بغیر مزید برا بھلا کہنے لگے۔ گھڑے وغیرہ انہیں اٹھانے
کے لئے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور دوسروں پر ان کی باتیں
پکڑنے کے لئے آگے بڑھا مگر اس وقت تک میں اٹھ کر کلاؤنٹر
کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"چھوڑو انہیں" میں نے دھمکے لمبے میں کہا کہ آواز
دوسرے گاہکوں تک نہ پہنچے "یہ جمل بیٹھنا چاہیں بیٹھے دو اور
جو کچھ بھی کھانا چاہیں انہیں کھانے دو۔ مل میں اوار کروں گا۔
کلاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے ناگوار سی میری
طرف دیکھا اور بولا "میں کہہ چکا ہوں کہ اب یہ اورنگی کرنے
کے باوجود میرے اسٹیک بار میں کچھ نہیں کھا پانی سکتے۔ میں
یہاں ان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"برادر عزیز" میں نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پر
ہاتھ رکھ دیا "کچھ دیر پہلے تم اپنی گفتگو سے مجھے بے حد سلجھے
ہوئے اور سمجھو اور انسان معلوم ہوئے تھے لیکن اب ایک دم
پچکانہ ضد پر اتر آئے۔ ایک ایسا بزنس من کبھی اپنی بڑس کی
جگہ پر جھگڑا نہیں کرتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟" میں نے
اس کے کندھے پر ہاتھ کا دیا تو بڑھاپا اور اس کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کے مسکراتے لگا۔ نوجوان تھکا ہوا سمجھدار۔ میری
آنکھوں میں یقیناً اس نے میرے عزائم پر بڑھ لئے تھے اور
مقاومت کی راہ اختیار کرنے میں ہی بہتری سمجھی تھی۔ ایک
طویل سانس لے کر اس نے سر کے اشارے سے دیکر کو سمجھا
دیا کہ میری بات مان لی جائے۔

وغیرہ بڑے میاں کو چھوڑ دیا اور وہ قاتلانہ انداز میں
میری ہی میز پر بیٹھنے۔ میں نے ان کے متعلق چیلنے ہوئے
پوچھا "کیا کھانا پسند فرمائیں گے آپ؟"

بڑے میاں نے اپنی کچڑی ٹاک سے کوئی تادیبہ کسی
انسانی۔ چند صیانی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور

انوار صدیقی کے پرستار متوجہ ہوں!

● انوار صدیقی کا لازوال شاہکار ”انکا“

● ہر دور کی لازوال کہانی

● آپ کی محبوب

● آپ کے دلوں کی دھڑکن

● آپ کی جانی پہچانی ”انکا“

اب ”انکارانی“ کے روپ میں

نئی جگہ، نئے بانگین، نئی نئی شوخیوں اور ہنگامہ خیز شرارتوں
کے ساتھ عنقریب جلوہ گر ہو رہی ہے

”انکارانی“

جو 28 سال سے آپ کے ذہنوں میں محفوظ ہے

جو 28 سال سے مصنف کے ذہن میں کلباتی رہی

مجموعہ انوار صدیقی کی شہین اور قلم نگار نے
اسے اپنے آپ کی محنتوں میں تحریر کر لیا ہے

مکمل سیٹ دو جلدیں قیمت - 400/- روپے

اسٹاک

7668958

اور پھر کچھ ناول کی صنف پر بھی زوال آ گیا تھا۔ بہت سی مگریرے و خواہات کی بنا پر ناولوں کی اشاعت دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگ بہت سے مشاہیر کی طرح آتش دہلی کو بھی بھول گئے تھے۔ میں بھی بھول گیا تھا۔ آج ملاقات ہوئی تھی تو یہ ذہن میں ان گنت یادوں کے درپے کھل گئے تھے۔

اس خوف سے کہ یادوں میں کچھ زیادہ ہی بے اہلہ جاؤں، میں نے بڑے میاں سے باتیں شروع کر دیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح میں انہیں مانجانا جانتا ہوں۔ بڑی بے پروائی سے وہ بولے "ہاں.... بہت لوگ ہمیں جانتے تھے۔ شاید اب بھی جانتے ہوں۔ یہ کم بخت تو دوسرے... اس اسٹیک بار کے مالکان۔ یہ تو ہمیں ذاتی طور پر جانتے تھے مگر جب سے ہماری خوشی رخصت ہوئی ہے اور ان کے پاس دولت آئی ہے تب سے انہوں نے ہمیں پہچانا چھوڑ دیا ہے۔"

"لیکن جناب! ناول لکھ کر آپ نے جو دولت کمائی... کیا کیا؟" انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا "ناول لکھ لکھ کر دولت کس کجبت نے کمائی تھی؟ ہمارے معاشرے میں کبھی شخص لکھ کر بھی کسی نے دولت کمائی ہے؟ ناول لکھ لکھ کر کوئی امیر ہوا ہے؟ کیسی بڑی قوتی کی بات کی ہے تم نے۔ ارے بے خود دار! میں تو ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھا اور بہت ہی اہم محکمے میں، بہت ہی اہم سین رہا تھا۔" بڑے میاں بڑی بے تکلفی سے مجھے آنکھ مار کر شکر اے "کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ناول تو میں شوقیہ لکھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پیشہ ور لکھنے والوں کو بھی ناول کے سو بڑے سو روپے ملتے تھے اور مجھے سو بڑے سو روپے ملتے دے شرم آتی تھی اس لئے میں نے کبھی نہیں لے۔"

"جیلے کسی بھی ذریعے سے کسی لیکن آپ آج وہ حال تو تھو؟ پھر مکمل چلائیادہ سب کچھ؟" میں نے پوچھا۔ "معلوم نہیں" انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ اس دوران ورتنے سوپ ان کے سامنے لا کر رکھ دیا تھا۔ سوپ سے بھاپ اٹھ رہی تھی مگر بڑے میاں اس میں نمک وغیرہ ملا کر بے مبری اور نذیر سے پن سے نیچے بھر کر حلق سے اتارنے لگے۔ ان کے جواب پر میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یعنی آپ کو علم نہیں کہ آپ کس طرح منسل ہو گئے؟ میں ایک بار پیچیدہ پوچھتے بغیر نہ رہ سکا۔"

"نہیں" انہوں نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا "مجھے صرف یہ علم ہے کہ اس دنیا میں ایک لڑکی ہوتی تھی۔ مہ پادہ اس کا نام ہو یا تھا مگر میں اسے پارو کہتا تھا۔ مجھے صرف اس بات کا ہوش ہے کہ میں اس کی محبت میں دیوانہ تھا۔ دنیا کی ہر رکاوٹ کو پہنچا لگتے ہوئے میں نے اس سے شادی کر لی تھی۔ میری عمر اس سے خاصی زیادہ تھی لیکن بہر حال کسی نہ کسی

طرح شادی ہوئی مگر تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شادی کے کئی برس بعد بھی اس سے میری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شادی کے گیارہ برس بعد وہ مجھے چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ چھ سال کا ہمارا ایک بچہ تھا، اسے بھی ساتھ لے گئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ میری محبت تو یک طرفہ ہی چلی آ رہی تھی۔ اسے تو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی دہی دہی تھی۔ اس کے بعد کی باتیں مجھے کچھ صحیح طور پر یاد نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرا دل بے اہل تھا۔ لیکن میرا خیال ہے میرا دل بے اہل نہیں تھا بلکہ بانی ہر چیز الٹ تھی تھی۔ شاید دنیا یا پھر صرف میری دنیا ان پلٹ ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے خود اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں سے برباد کیا ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میری اس کیفیت سے میرے ہر شے دوست اور عزیز نے حسبِ مقدور فائدہ اٹھایا اور مجھے لوٹا۔ مگر مجھے صحیح طور پر کچھ نہیں معلوم۔ اور اگر معلوم ہو تا تب بھی کیا فرق پڑتا تھا؟ اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا "میرا دنیا کی ہر چیز سے اعتبار اٹھ گیا ہے اور جب دنیا سے آدمی کا اعتبار اٹھ جائے تو اسے کسی بھی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں دم بخود بیٹھا بڑے میاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے باتیں کرنے کے بعد اس سے کہیں زیادہ تیزی سے پیالے میں بچے ہوئے سوپ کو صاف کرنے میں بکھرتے گئے تھے۔

"پھر بھی آتشِ صاحب... میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ اہلِ قلم ہیں... اس طرح خالی جیب آپ میں آج گھومتے ہیں... اپنی بے عزتی کراتے ہیں۔ آخر آپ کی کیا آپ کو کس طرح اس بات کی ایلازت دیتی ہے؟" "عزیز بس!" انہوں نے استہزاء سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "بے چاری میری اناکو لٹے جھٹکے لگے ہیں کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور میں نے اسے نہایت اطمینان سے بے غیرتی کی قبر میں لٹا دیا ہے۔ یہ محبت کا جھٹکا ہوا... اس کے ساتھ ہی اشتہار کا بھی جھٹکا ہو گیا اور آخر میں ابھی حرام موت ماری گئی۔ اب تو صرف یہ بانی کیا ہے۔" انہوں نے گرمی سے تدریس کے انداز میں کہا "پھر مجھ پر کر دکھایا" اور یہ تین وقت کھانے کا وقت تھا۔ "دینے اگر آپ اس قسم کی بدبوں کے بجائے نہ بناؤ۔ سستے کمانوں کے کسی لڑکے پر پلے جالیا کریں... میں نے اب بھی ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مجھے اچانک انٹیمسٹ سمجھانے میں ذرا دقت ہو رہی تھی "مثلاً کوئی تندور وغیرہ... تو وہیں عام طور پر آپ جیسے ذوالِ زہرہ شرفا کو اگر مفت کھانا کھانا دیا جائے تو ملک کم از کم بے عزتی کرنے پر کمر بستہ نہیں ہوتا۔"

"میری عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ میں زیادہ گھٹیا بدبوں پر نہیں رہ سکتا" انہوں نے دیکھ کر لائی ہوئی چکن فراڈ رائس کی

بڑے میاں کی باتوں نے میرے ذہن میں سوچوں کے کئی دروازے کھول دیے۔ مجھے امکان نظر آنے لگا کہ مستقبل میں ان سے کوئی نہ کوئی کام لے سکتا ہوں۔ صرف مستقبل ہی نہیں حال کے لئے بھی ان کا ایک مصرف میرے ذہن میں آچکا تھا۔

”پہلے تو میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی“ میں نے گاڑی سے ٹیک لگا کر گھڑے ہوتے ہوئے کہا ”لیکن اب آپ نے ذکر چھیڑا ہے تو ایک خیال آیا ہے۔ ایک لڑکی ہے... دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے“ گو کہ ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہونے زیادہ عرصہ نہیں گزرا... ”میں نے ایک ایک کر کے ربط سے انداز میں اسے بتانا شروع کیا“ کئی دن سے میں اسے خط لکھنے کا سوچ رہا ہوں لیکن کچھ تو مصروفیات آڑے آتی رہیں اور کچھ دینا مضمون بھی نہیں بنا جیسا میں سوچتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بہت خوبصورت قسم کا خط لکھوں۔ متاثر کرنے والا۔ میرے ذہن میں تو بڑے خوبصورت خیالات کی ریل چل رہی ہے۔ موزوں الفاظ کا بھی گویا ایک سیلاب سامنا آتا ہے اور بات چیت میں بھی خاصی برجستگی کا مظاہرہ کر لیتا ہوں لیکن جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو معلوم نہیں ذہن کو کیا ہو جاتا ہے۔ ہر لفظ پر قلم اٹکے لگتا ہے۔ ذہن میں خیالات کچھ اتنی زیادہ پچھل چلا جاتے ہیں کہ کوئی ترتیب ہی باقی نہیں رہتی۔ کچھ سمجھ

لیٹ اپنی طرف کھٹکتے ہوئے کہا ”میری نشست و اُذیت اس سے زیادہ اونچی پتھوں پر رہی ہے۔ یہ تو میں اپنا یاد کر اگر یہاں آیا ہوں۔ لی لعل تو کام چل رہا ہے کبھی لہار کوئی تم جیسا فراخ دل شناسا یا غیر شناسا مہمان مل جاتا ہے۔“ بھی انہی بد بختوں کا دل سخاوت کی طرف مائل ہو جاتا ہے“ میں نے کٹاؤنٹری کی طرف اشارہ کیا ”البتہ جب بہت ہی زیادہ ہونے آتی ہے کہ تو تندرستوں کا رخ بھی کر لوں گا۔“ بڑے میاں بلاشبہ بہت ہی عجیب چیز تھے۔ میں انہیں لٹا دیکھتا رہا اور ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ بڑے میاں زبیر ہو کر کھائے اور کھلی وغیرہ جی چکے تو میں نے بل لدا کیا رہم کیسے ہی اٹھ کر باہر آگئے۔

”واہ... واہ... لطف آگیا“ بڑے میاں پچہ پچہکے سے پوچھ کر دیکھ لیتے ہوئے بولے ”ایک مدت کے بعد ڈنٹ کر لٹا نصیب ہوا ہے۔“ میں گاڑی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ وہ بھی میرے سامنے ہی رک کر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر مستعد سے لہجے میں بولے ”ہاں... اب تیار رہو دربار! کام کیا ہے؟“ ”کام؟“ میں نے حیرت سے کہا ”میں نے تو آپ سے کسی کام کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“ ”وہ تو درست ہے“ بڑے میاں نے بردباری سے سر ہلایا۔ ”لیکن اس دنیا میں کوئی بغیر مطلب کے کسی کے کام نہیں آتا“ غرض کے بغیر کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ تم بھی اپنا مقصد صاف صاف بتاؤ۔ میں تمہاری ہر خدمت کے لئے تیار ہوں“ بڑے میاں کا دنیا پر سے اعتبار بالکل ہی اچھا لگتا تھا۔ انسانی انداز ان کی نظریں بے معنی ہو جیتی تھیں۔ مجھے ان کے انداز فکر سے دھچکا سا لگا لیکن ان سے فلسفیانہ جھگڑا خیال کا کوئی اندہ نہیں تھا۔

”مجھے جب بھی کسی نے چہرہ بھر کر کھانا کھلایا ہے مجھ سے کوئی نہ کوئی کام ضرور لیا ہے“ بڑے میاں بات جاری رکھتے ہوئے بولے ”کبھی کسی نے کہا یہ بیکت فلاں وقت پر فلاں جگہ کھڑی ہوئی فلاں رنگ کی گاڑی میں ڈال آتا۔ کبھی کسی نے کہا کہ فلاں وقت پر فلاں جگہ کھڑا ہوا ایک آدمی جسے فلاں چیز دے گا۔ وہ لاگڑ میں دے دیتا۔ کبھی کسی نے کہا فلاں وقت پر فلاں جگہ سے ایک عورت گزرتی ہے“ نظر ہٹا کر استے یہ وعدہ دے دیتا اور چونکہ آپ بزرگ ہیں اس لئے وہ عورت یا کوئی اور آپ کو کچھ نہیں دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی خدمات انجام دینے کے سلسلے میں ایک مرتبہ میں ایک عورت کے ہاتھوں چٹے چٹے اور ایک مرتبہ پولیس کے ہتھے چڑھتے چہرے دیکھا ہوں لیکن آج کل میری خدمات سے فائدہ اٹھانے والے نہ جانے کہاں جا بیچے ہیں۔ شاید کہیں بلوں میں کس گئے ہیں۔“

ہو ناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی

ایک آشفستہ حل کی داستان عبرت جسے قانون نے

مجرم بنادیا

رقص ابلیسی

انوار صدیقی



اشرفیہ کتب خانہ

اردو بازار لاہور

میری خاموشی سے ان کا خوشگوار موزوں گویا یکدم بدل ہو گیا۔
چھپیل کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "لگنے لگانے
کے معاملے میں بیشتر لوگوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ان کے
ذہن میں خیالات کا تو ایک سیلاب ہوتا ہے لیکن جب وہ اسے
کاغذ پر منتقل کرنے بیٹھتے ہیں تو نہیں کر پاتے اور کچھ عجیب سی
تحریر سامنے آتی ہے" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ پوچھے۔
"پہلا خط غالباً تم ابھی لکھو یا چاہو گے؟"

"ہاں" میں نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا "میں
آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلا ہوں۔ ایک خط ابھی لکھ
دیجئے۔ اس کے بعد جب بھی ضرورت ہو اس کے آگے کی میں خود
ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں گا۔"
"ٹھیک ہے" وہ مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"میں یہاں سے زیادہ دور نہیں رہتا۔"

ان کی رہنمائی میں کئی گلیوں میں مڑنے کے بعد پلازہ
میں نے گاڑی ایک کوچھی کے سامنے پارکی۔ کوچھی خاصی
طویل و عریض تھی مگر اس کی حالت تباہ تھی۔ دیواروں سے
سینٹ اکڑ کر گر رہا تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے نہ چلنے کتے
برسوں سے رنگ دھوئیں کو ترس رہے تھے۔ لان میں گھاس
بھاڑ جھکاڑ کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور گیٹ کے پاس بھی پختہ
دوش پر خشک پتوں کا انبار تھا۔ کوچھی پر عجیب سی برسی
رہی تھی۔ جیسے اس میں انسان نہیں محض ایک آدم بددعا
رہتی ہے۔ گیٹ کھلائی تھا مگر آتش ریلوی نے مجھے گاڑی باہر
ہی روک لینے کی ہدایت کر دی۔

"یہ آپ کا مکان ہے؟" میں نے قدرے حیرت سے
پوچھا۔ مکان خواہ نیم شکستہ ہی سہی لیکن گلبرگ میں حویلی نما
اچھے لمبے چوڑے مکان کا مالک ہونا بہت ہی معنی رکھتا تھا۔
"میرا" بڑے میاں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دے
"میرا ہوتا تو اب تک ضرور کوئی مجھ سے ہتھیار چکا ہوتا یا میں خود
ہی بیچ کر کھانا چکا ہوتا" انہوں نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور
بٹلی گیٹ کی طرف بڑھے جو ابھرتا تھا کہ ایک وجہ میں اس
سے ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔

جھاڑ جھکاڑ سے گزرتے ہوئے ہم کوچھی کے عقبی حصے
کی طرف بڑھے۔ اس دوران بڑے میاں بتانے لگے "یہ مکان
ایک صحریہ کا ہے جو اس زمانے سے ہماری شناسا ہے جب
ہماری بھی اس شہر میں تھوڑی سی آبرو تھی۔ پتھاری جوانی ہی
میں پیڑہ ہو گئی تھی۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ خدائی سے خوف زدہ
ہو کر کھلی منزل پر کچھ کرایہ دار رکھ لے تھے کہ آدمی نکار پید بھی
رہے گا اور خدائی کا خوف بھی نہیں ستائے گا۔ تب سے اب
تک وہ تینوں کتبے بیس برائیاں ہیں گو کہ ان کی اولاد میں بھی
جوان ہو گئی ہیں۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ سرکاری کاپی
عالم ہو چکا ہے مگر وہ تینوں کتبے ابھی تک وہی اسی روپے ماہوار لی

میں نہیں آتا کہ پہلے میں کیا لکھوں اور بعد میں کیا۔ اگر آپ
تیسرے چوتھے دن مجھے اس کے نام ایک خط لکھ دیا کریں تو اس
کام کے عوض میں آپ کو پانچ سو روپے مہینہ دے سکتا ہوں۔
کبھی تو یونہی بس میری طرف سے خط لکھ دیا کریں اور کبھی اگر
اس کا خط آیا ہو تو اس کا خوبصورت سا جواب۔ کیا آپ میرا یہ
کام کر سکتے ہیں؟"

"کیا تم واقعی پانچ سو روپے ماہوار دیا کرو گے؟ جھوٹ تو
نہیں بول رہے؟" بڑے میاں نے پچھنی پچھنی آنکھوں سے
میری طرف دیکھا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔
"میں اتنے گھٹیا قسم کے جھوٹ نہیں بولا کرتا" میں نے
جھل سے کہا "اگر آپ چاہیں تو پہلے مہینے کے پانچ سو روپے
آپ کو ابھی دے دوں؟"

"دے دو" انہوں نے بلاتامل اور بلا تکلف ہاتھ پھیلا کر
کہا۔ سرگ پر کھڑے ہو کر رقم دینا مجھے کچھ عجیب سا محسوس
ہوا۔

"گاڑی میں بیٹھ جائیے" میں نے ان کے لئے دروازہ
کھولتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے
دروازہ بند کر کے جیب سے پرس نکالا اور سو سو کے پانچ نوٹ
نکل کر ان کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے نوٹوں کو الٹ پلٹ
کر دیکھا پھر انہیں ہوں جلدی سے اپنے چارلی چلن مار کر کوٹ
کی اندرونی جیب میں رکھ لیا جیسے اندیشہ ہو کہ کہیں میں ارادہ نہ
بدل دوں اور رقم واپس نہ مانگ لوں۔

"تمہاری پیشکش نے دراصل مجھے اس لئے خواہش
بانت کر دیا ہے..... بڑے میاں گہری سانس لے کر بولے "مگر
میں تو اپنے گھٹے کے دو ایک نوجوانوں کو پانچ پانچ سو روپے میں پانچ
پانچ سو روپے کے محبت تانے لگھ کر رہا ہوں۔ آج کل تو کم بہت
اس قسم کے قدر دانوں نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے۔"

"اب آپ کو آپ کے فن کا صحیح قدر دان مل گیا ہے"
میں نے منکرانے ہوئے کہا "اس لئے آپ کے فن کی
مارکیٹ وسیع بڑھ گئی ہے۔ اب اس وسیع کو برقرار رکھنے کا۔
اور ہاں.... اگر آپ کفایت شعاری سے کام لیں تو اس رقم میں
کم از کم چندہ میں روز تک کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی
خواری سے بچ سکتے ہیں۔"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ میں
اس رقم کو کس طرح خرچ کرتا ہوں" بڑے میاں گویا براہ راست
بولے "یہ رقم اب میری ہو چکی ہے اور اتنے خرچ کرنا میرا ذاتی
مسئلہ ہے۔ میں تمہاری ذاتیات میں ڈانگ اڑانے کا کوئی ارادہ
نہیں رکھتا۔ تم بھی میری ذاتیات میں ڈانگ مت اڑاؤ۔"
میں نے بے پردائی سے کہہ دیا اچھا بے اور یہ کہتے
کہتے رہ گیا "آپ جنم میں جائیں۔ میری بات" اس میں کوئی
شک نہیں تھا کہ بڑے میاں تھے بڑی شیرازی چیز۔

اور نچا اٹھا تھا کہ جھٹ کو چورا تھا۔ ایک کرسی پر انگریزوں کے زمانے کا ایک نیکل فین گردن میز کیس کے کھڑا تھا۔ دھول میں اس کا اصل رنگ چھپ چکا تھا۔

ایک کونے میں بڑے پائپ سے مشعل گیس کا ایک چولہا اوندھا چڑا تھا۔ اس کے گرد چند غلیظ برتن لٹے سیدھے بڑے تھے۔ چولہے کے گرد ایک دائرے میں فرش پر نہ جانے کیا چیز سیاہ کالی کی طرح جمی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر کھوئیوں پر چند کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ہاتھ روم سے کسی برتن میں مسلسل پانی پینے کی ٹپ ٹپ سنائی دے رہی تھی۔ چھت کے گوشوں میں گڑی کے جانے لگے ہوئے تھے۔

بڑے میاں توشیح زدہ نظروں سے اوجر اوجر دیکھ رہے تھے۔ غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جتنے کھلے میاں۔ میں نے خود ہی یہ مسئلہ حل کر دیا اور چار پائی پر سے بست سے اخبار ایک طرف پیکیج کر خود ہی اپنے لئے جگہ بنال۔ بڑے میاں نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر انہوں نے نیکل فین کو کرسی سے اتار اور گول پتائی سے کچھ چیزیں بوند شکل کھسکا کر بالشت بھر جگہ پیڑا کی۔ کہیں سے کھینچ کھانچ کر انہوں نے ایک میلا سا کافہ اور شکستہ سا قلم نکالا۔ یہ تیارواں مکمل ہونے کے بعد انہوں نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی کے پٹنے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے "مجھے اس لڑکی کے بارے میں مختصرہ کچھ بتادو... وہ کیسی ہے؟ تمہارے اس کے بارے میں محسوسات کیا ہیں؟ اور اسی قسم کی کچھ اور چھوٹی موٹی باتیں میں رابطہ کے متعلق امیں جو کچھ بھی بتا سکتا تھا بتانے لگا۔ چند منٹوں میں کرسی انہوں نے غمایت سے سر ہلایا "بس... بس... ٹھیک ہے۔ اب تم خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔"

وہ چند لمحوں میں اسی غیر مرئی چیز کو گھورتے رہے پھر کانٹہ پر جھک گئے اور عجیب جھوٹانے سے انداز میں قلم کھینچنے لگے۔ میں گھنٹے کے معانے میں بڑے میاں کی روانی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چند ہی منٹ میں انہوں نے کانٹہ میز سے میز سے لفظوں سے بھر کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ بڑے میاں نے میری طرف سے لکھا تھا۔ "میری اپنی! اکھاڑش حیات نے کئی دن تک خدا گھنٹے کی صلت نہ دی اور جب گھنٹے بیجا تو صورت یہ رہی کہ کئی دن تک تمہیں خدا لکھ لکھ کر چپاڑا مارا۔ کسی خط سے دل مطمئن نہ ہوا۔ انفاق تمہارے شایان شان ہی نہ لگے۔ جذبے عظیم تھے اور الفاظ حقیر۔"

تم سے ملنے سے قبل کوپا نہیں ہی نہیں تھا کہ اس دنیا میں تم جیسی بہتیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اتنی انمول اور دل میں ساجانے والی۔ کہ جن کے تصور سے ہی رگ و پے میں سرور اور عیش و سکون سی پھیل جاتی ہے۔

میں مرد ہوں! اعمار میری کزوری ہے لیکن میں محض

دورشن کرایہ دے رہے ہیں اور مکان کی یہ حالت ہو چکی ہے غمزدہ بننے کا کام نہیں لینے۔ نہ کرایہ بڑھاتے ہیں نہ اپنے پلے سے کچھ خرچ کر کے مکان کی حالت درست کرانے میں مدد دیتے ہیں۔ اب تو وہ گویا خھر ہیں کہ بڑی بی اگلی دنیا کو سدھاریں تو وہ تینوں کنبے مل کر مکان کے چھوٹے کنبے۔ بڑی بی کو اب تنہائی سے اتنا خوف نہیں آتا جتنا ان کرایہ وادوں سے آتا ہے کہ کہیں ان میں سے کوئی رات کو موقع پا کر ان کا گھلا نہ دبا دے۔ کسی حد تک ترس لکھا اور کسی حد تک مطمئن کے پیش نظر انہوں نے پچھلی طرف بڑا ہوا ایک فاصلہ اسٹور لگا کر بلا کرایہ برسوں سے مجھے دیا ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میں آدھے وقت میں ان کے کسی کام آسکتا ہوں "بڑے میاں نے استہزائیہ سے انداز میں قہقہہ لگایا "اب کوئی اس بے چاری سے پوچھے کہ جو شخص زندگی میں خود اپنے کسی کام نہ آسکا ہو وہ کسی دوسرے کے کیا کام آئے گا؟"

میں پچھلی طرف پہنچ چکے تھے۔ اس طرف دیوار پر سیاہ کالی جی جمی ہوئی تھی۔ نکاسی وغیرہ کے ڈنگ آلود اور بدست ہوئے پائپوں کے قریب سے ایک تنگ اور گول ذیہ تل کھٹا ہوا دوسری منزل پر جا رہا تھا۔ ہم نے جیسے ہی اس ذیہ پر قدم رکھا ایک قریبی بالگونی سے بکھرے ہوئے پاؤں والی ایک وحشت زدہ سی بڑھیا نے جھانکنا اور کڑبٹ آواز میں پوچھا "کون ہے؟" پھر اس کی نگاہ ہم پر پڑی اور اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ "حیرت ہے..... آج تو بڑی جلدی گھر آگئے ہو۔" بڑھیا بولی اور جواب کا انتظار کے بغیر بالگونی کی جی بجھا کر واپس اندر چلی گئی۔

"محسوس تو نہیں ہوا کہ یہاں غلی خزل پر تین کنبے رہتے ہیں" میں نے اوجر اوجر دیکھتے ہوئے کہا۔ "گنہت سر شام سو جاتے ہیں اور منہ اندر جے اٹھ کر شور شرابا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے اپنے کاموں پر جانے کی تیاری کیا کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے پوری ایک چالیں جنگ پر ہانے کی تیاری کر رہی ہے۔" بڑے میاں بولے۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے آگ کھولا اور اندر پہنچ کر لائٹ آن کی۔ کمرہ کسی بڑے سے صندوق سے مشابہ تھا۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ اگر میں صحیح طور پر تن کر کڑا ہوتا تو میرا سر چھت سے ٹکرائے لگتا۔ یہاں بھی دیواروں اور چھت کا پسترا اکڑ رہا تھا۔ پہلی نظر میں تو شبہ یہ ہوا تھا کہ یہ درحقیقت کمرہ نہیں کسی ریجھ کی کدو ہے جو انسانوں کا سار بہن سمن کھینے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایک طرف لوہے کے پائپوں اور تھلا محل اسپرنگوں پر مشتمل چارپائی موجود تھی مگر اس پر بستر کی جگہ پرانے اخباروں کا انبار تھا۔ بستر تقریباً گھڑی کی سی شکل میں فرش پر بڑا تھا۔ ایک گول پتائی پر پرائی کتبوں اور نہ جانے کس کانٹہ گہاڑ کا اتنا

کی تھی۔ میں نے بھی جانا ضروری نہیں سمجھا۔

میرا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر آرام سے اپنی رانٹنگ ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد میں نے اس خط کو کئی بار پڑھا۔ بڑے میاں نے واقعی کانڈ پر کیجو نکال کر رکھ دیا تھا۔ اپنا نہیں، میرا۔ وائنٹا کی سب کچھ میرے جذبات تھے۔ میں نے چشمِ قصور سے دیکھنے کی کوشش کی کہ راجیلہ یہ سب کچھ پڑھ کر کس قدر خوش ہوگی۔ میری رگ و پے میں گدگدائی ہونے لگی۔

میں نے خاص طور پر غریبہاں ایک خوبصورت رانٹنگ پیڈ نکالا اور نہایت احتیاط سے حتی الامکان خوشنہی کے ساتھ یہ مضمون رانٹنگ پیڈ پر نقل کیا، خط کو خوشبو میں بھلایا اور ایک نفیس افسانے میں بند کر کے رکھ دیا۔ میں جب سوئے کے لئے لیٹا تو مجھے اپنی اس ساری کارروائی پر کچھ ہنس بھی آئی۔ عجیب بچکانہ پن ساتھ میری ان تمام حرکتوں میں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو تسلیم کر دیا کہ عشق میں کی سب کچھ ہوتا ہے، ساری ذہنی، جسمانی ہوا ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ پر اعتبار ہی کب رہتا ہے۔ یہی سب کچھ بھلا گتا ہے جو میں کر رہا تھا۔ صحیح معنوں میں محبت میں گرفتاری میں اب ہوا تھا۔ دوسری صبح اس خط کو پوسٹ کرنے کے بعد مجھے کچھ قراز سا آیا لیکن کچھ ہی دیر بعد جواب کے انتظار کی بے قراری شروع ہو گئی حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ابھی تو خط منزل کی طرف روانہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن عشق میں منطقی جواز بھلا کب ملے ہیں۔

دوسرے روز میں جہاز سے پشاور روانہ ہو گیا۔ وہاں سے مجھے ایک اور سرحدی علاقے کی طرف روانہ ہونا تھا اور بہت بڑی کھپ لے کر آنا تھا۔ گروہ کے دوسرے دو ارکان بھی میرے ساتھ تھے لیکن ہم بظاہر انہیوں کی طرح قطعی لاشعقی سے سڑ کر رہے تھے۔

مال لانے، کھپ کو خریداروں تک پہنچانے اور رقم کی وصولی میں کئی دن لگ گئے۔ میں واپس لاہور پہنچا تو قاسم خان حسب پروگرام لندن جا چکا تھا اور اس کی واپسی کا کوئی حتمی پروگرام نہیں تھا۔ اس کی واپسی تک رقم میری ہی تحویل میں رہنی تھی۔ رقم بہت بڑی تھی۔ میں چاہتا تو لے کر فرار بھی ہو سکتا تھا۔ اتنی رقم سے بہت کچھ کیا جاسکتا تھا اور پھر قاسم خان کے لئے میرے دل میں کچھ ایسی اہمیت اور ہمدردی بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن میں ایک دم پڑا تھا مار کر اپنی جڑیں کاٹنے کے بجائے آہستہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا فائدہ اٹھا کر اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا قائل تھا تو قاسم خان کے ساتھ رہنے ہوئے اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا طریقہ میں نے سوچ لیا تھا۔

اس رقم سے مجھے مستقل کیشن ملنا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس رقم سے میں قاسم خان کے کام کے متوازی چھوٹے پیمانے پر اپنا کام بھی شروع کر دوں گا۔ میں کیشن کی رقمیں جمع

مکائے نہیں لکھ رہا بلکہ اپنی روح کی آواز کو لفظوں کی زندگی دے کر تم تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم میری ہستی میں اس طرح شامل ہو چکی ہو کہ اگر میں خود کو تم سے الگ کر دوں تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا کہ تم میرے لئے کیا ہو۔ بس اتنا جان لو کہ میری روح تم سے محبت کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے تمہاری خوشبو آتی ہے۔ ہر شام کے ڈھلتے سورج، ہر شام کی شخص، ہر رات کی غنڈی چاندنی اور ہر صبح اوس میں بیٹھے ہوئے پھولوں کی محبت نے مجھے تمہاری یاد دلائی۔ تم سے الگ ہو کر اپنا وجود ہوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی کے اوپر بلبلی۔ نہ ثابت۔ نہ سکوں۔ اگر کچھ ہے تو تمہاری غمور نگاہوں کا عیس اور ہم دونوں کے مستقبل کی امیدیں۔ تمہارے چہرے کی دھجکی کی کھٹک اور پیار کی دھنک سے میری زندگی عبارت ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں نے اپنا دل نکال کر شمع کے شعلے پر رکھ دیا ہے اور وہ تھوڑے تھوڑے شمع کے آنسوؤں کے ساتھ پگھل رہا ہے۔ تمہاری محبت نے مجھے ایک ضدی بچہ بنایا ہے جو چاند کو اپنے گھر کے آگن میں اٹارنے کی ضد کرتا ہے۔ تمہاری ذات کا چاند اگر میرے گھر کے آگن میں نہ آتا تو شاید زندگی میرے لئے کوئی ایسی چیز نہ رہے کہ جس میں دلچسپی کی جلے۔ کیا تم بھی میرے بارے میں یہی سب کچھ سوچتی ہو؟

تمہارا اپنا

خط پڑھ کر میں نے قدرے حیرت سے بڑے میاں کی طرف دیکھا پھر اس کمرے کے وحشت زدہ ماحول پر نظر ڈالی۔ بڑے میاں مشہور شہری فنیوں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولے "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یقین نہیں آ رہا۔ کہ یہ خوبصورت خط اس بے درود اور اتنی بے آرامی کے ماحول میں لکھا گیا ہے" میں نے کہا۔

"تحقیق ہمیشہ تکلیف کی کوکھ سے جنم لیتی ہے" بڑے میاں مسکرائے "میں جب آسودہ حال تو اب بھی ذہنی طور پر کئی محرومیوں کا شکار تھا۔ اسی لئے میری تحریر میں درد تھا اور میرے ناول اس قدر مقبول تھے۔ اب میری محرومیاں اور تکلیفیں بڑھ گئی ہیں۔ میں چاہوں تو پہلے سے زیادہ اچھا لکھ سکتا ہوں مگر اب لکھنے سے دل ہی اجاٹ ہو گیا ہے اور پھر مجھے خبیث سمجھ کر کوئی مجھ سے کچھ لکھوانے پر اصرار بھی نہیں کرتا۔"

"بہت بہت شکریہ" میں نے خط نہ کر کے جب میں رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا "آپ کا شکریہ تو میں نے دیکھ ہی لیا ہے"

"آئندہ جب بھی مجھے خط لکھوانا ہو گا میں حاضر ہوا چاہوں گا"

"رات ہی میں آیا کرتا۔ دن بھر میں اپنی اس قبر۔ ضرور رہتا ہوں" بڑے میاں نے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں باہر آ گیا۔ انہوں نے میرا نام جاننے کی کوشش نہیں

ایک دلن پرست اور کفن بدوش نوجوان کی داستانِ لہو رنگ جو بہت دلن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا

شائع شدہ کے لئے
نور علی شاہ

دہشت گرد

سیلم فاروقی کے ایڈ و نچر س قلم سے

4 حصوں میں شائع ہو گیا ہے

قیمت مکمل سیٹ
240/- روپے

ناشر

مکتبہ الفکر لندن
اردو بازار لاہور 2

ہے اپنے دولت مند ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے۔
”اب“ میں ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

قاسم خان کا بل تو میں لے کر آتا ہی تھا۔ اب مجھے یہ کرنا
زکریا کے ساتھ ہی چھوٹ موٹی کپ اپنی بھی لے آیا کرتا۔
س کے لئے مجھے نے گاہک تلاش کرنے تھے۔ بل سیالائی
زبان والی پارٹیوں سے کچھ ساز باز کرنی تھی اور اپنے ساتھ
اپنے والے دوسرے کارکنوں کی آنکھوں میں قہقہوں کی
پل جو کھینچی تھی۔ میری نظر میں اب یہ زیادہ مشکل کام
ہو رہا تھا۔ میں اپنی لائن میں کافی ٹیچہ چکا تھا۔

اس نور سے وابستہ رہنے قوی امید تھی کہ راحیلہ کی
اپنے سے خط کا جواب آچکا ہو گا مگر میری یہ امید پوری نہیں
ہوئی۔ راحیلہ کا خط نہیں آیا تھا۔ مجھے کچھ دھچکا لگا۔ پھر
میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اتنا بھی بے مبر نہیں ہونا
ہوگا۔ ضروری نہیں کہ میرے احساسات میں جو شدت
ہو رہی شدت دوسری طرف بھی ہو..... اور پھر ابھی مجھے خط
لکے کچھ اتنے زیادہ دن بھی نہیں گزرے تھے۔ ضروری نہیں
تاکہ وہ میرا خط لے ہی جواب لکھنے بیٹھ جاتی۔ خود میں نے بھی
دیکر اپنی سے آنے کے کتنے دن بعد اسے خط لکھا تھا حالانکہ
میں وعدہ کر کے آیا تھا کہ جاتے ہی لکھوں گا۔

ان دلائل سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے بعد میں
کیا بار پھر آتش دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خوش قسمتی
سے وہ مجھے اس صندوق نما کمرے ہی میں اپنی گدڑی میں
برائے کی حالت میں بیٹھ ہوئے مل گئے۔ میری فرمائش پر
میں نے ہی خوشی سے فوراً ایک اور محبت نامہ لکھ دیا۔ یہ
”میرا نام بھی بہت ہی خوبصورت تھا۔ کچھ ”میر کی باتوں کے
”لکھے۔ کچھ قضا کے شکوے۔ کچھ غم و درال کی معذرتیں۔
”کچھ خیالوں کی ستم کاریاں۔ سبھی کچھ سوچا تھا ظالم نے۔ یہ
”محبت آتش بھی بس آوی کیا تھے۔ محبت ناموں کی فیکٹری
”ظلم ہوتے تھے۔ ادھر آرزو دیا اور ادھر اہل تاذب تاذب تاذب
”میں مرضی کے مطابق محبت نامہ برآمد۔ اس بار تو میں نے
”بہ اعتبار ان کے ہاتھ پر م لکھے۔ گھر آکر میں نے بڑی محبت
”سے اس محبت نامے کو خوبصورت رائٹنگ پیڈ کے تین
”رواق پر نقل کیا اور حسب سابق انگلی صبح پوسٹ کر دیا۔

چند دن بعد میرے دونوں خطوں کا مشترکہ جواب آگیا۔
”نہ مختصر اور سیدھا سلا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس طرح کسی مجھے
”بے ادب سے نہیں لکھوایا کیا تھا جس طرح میں نے لکھوایا
”تاکہ ہم اسے پڑھ کر میں مجوم اٹھا۔ اس میں معذرتیں تھیں
”از سر نو اقرا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ اعتراف تھا کہ
”مجھے خطوں نے اس کی روح کو گدگدایا تھا۔ تاکہ وہ خط
”پڑھ لکھے ہوئے نہیں تھے لیکن ان میں جذبات تو میرے
”تھے۔ راحیلہ کے خط میں اختصار اور سادگی کے باوجود بہر حال

ہوا۔ اس مرتبہ میں واپس آیا تو کھپ کے ساتھ میرا ہاتھ بھی تھوڑا سا مل گیا تھا۔ یہ سال خاموشی سے مارکیٹ میں چلا گیا۔ قاسم خان کو تو کیا، میرے ساتھ جانے والوں کو بھی اس کی بھڑوں کاں خبر نہیں ہو سکی۔ اس سوئے کا سامنا میرے کیشن کے علاوہ تھا۔ یعنی اس پچھلے میں مجھے ڈوبنا تھا۔

اس موقع پر میرے دل میں شرف کی یاد کا خوابیدہ و غم جاگ اٹھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید میں اس کے ساتھ مل کر اپنی اس پہلی کامیابی کا چھوٹا سا جشن منانا لگتا۔ اصل بات میں شاید اسے بھی نہ بتاؤ کہ یہ جشن کس سلسلے میں ہے۔ یہ عروس کر کے مجھے حیرت ہوئی کہ اس بار شرف کی یاد میں وہ شہرت نہیں تھی کہ دل لہو لو ہو جاتا۔ ایک ٹیس سی جاگ اٹھی تھی، اس قدر کی ایک لہر اتر کر گزرتی تھی۔ اور میں، رفتہ رفتہ ہر جانے والے کی یاد کا زخم بھرنے جاتا ہے اور میرے دل کے زخم تو کچھ زیادہ ہی تیزی سے بھرتے گئے۔ یہ شاید ایک طرح سے قدرت کی عنایت ہی تھی۔ ہر حال میں نے اکیلے ہی تھوڑی بہت عیاشی کر لی۔

دوسرے دن راجیل کا خط آ گیا۔ میری سرشاری کچھ اور بڑھ گئی۔ رات ہوتے ہی میں اس خط کا جواب لکھوانے کے لئے جناب آتش دہلوی کے دولت کدے کی طرف دوڑا۔ آج خلاف معمول میری دستک کے جواب میں جناب آتش نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ ان کی کانپٹی ہوئی سی آواز سنائی دی ”کون؟“

”آپ کا پرستار“ میں نے کہا۔ ابھی تک انہیں میرا نام بھی معلوم نہیں ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آواز سے وہ مجھے پہچان لیتے ہیں۔

”ذرا سادہ کھادو۔ دروازہ کھلا ہی ہے“ ان کی آواز خلاف معمول کچھ زیادہ ہی کلاب رہی تھی۔ میں دروازے کو تھوڑا سا دھکیل کر اندر پہنچا تو ٹھک کر رہ گیا۔ بڑے سیاہ فرش پر بچے ہوئے گدے پر چٹ پڑے تھے۔ ان کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرے کے ڈھلکے ہوئے گوشت پر ٹیل لٹائیں طور پر نظر آ رہے تھے۔ نکلا ہونٹ بڑی طرح منو جا ہوا تھا اور ہاتھ پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ شاید انہوں نے چہرے پر کسی دوا کی پاش بھی کی تھی۔ پکنالی سی چمک رہی تھی۔

”یہ آپ کو کیا ہوا؟“ میں نے تشویش زدہ انداز میں ان کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی ہچکچاہٹا تھا۔

”جرم ضعیفی کی سزا ملی ہے“ انہوں نے مفہوم انداز میں مسکراتے کی کوشش کی لیکن کھنکھ کر رہ گئے۔

”صاف صاف بتائیے کہ ہوا کیا ہے؟“ میں نے کمری سنجیدگی سے کہا۔

”ارے کوئی خاص بات نہیں ہے“ انہوں نے میرے

ظہور کی ملک تو موجود تھی۔ میں اس رات حضرت آتش دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس خط کا جواب لکھوا کر دوسرے دن پوسٹ کر دیا۔

اس دوران قاسم خان لندن سے واپس آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے بتایا کہ سیٹھ دھند سے اس کی ملاقات ہو گئی تھی اور اس سے خلاصا تھون حاصل ہونے کی امید تھی۔ ان دنوں قاسم خان کے جائز کاروبار کا بالکل بیڑہ غرق ہو چکا تھا اس لئے دوسرے دھندے کی طرف اس کی توجہ کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی اور وہ بڑا سرگرم نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے حساب دیا۔ رقم اس کے حوالے کی اور اس نے فوراً ہی کیشن میرے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی وہ مسکراتے ہوئے بولا ”اتنی رقم اتنے دنوں تک تھمادی تحویل میں رہنا بھی ایک طرح سے تمہارا امتحان تھا افضل! مجھے خوشی ہے کہ دیگر کئی امتحانوں کی طرح تم اس امتحان میں بھی پورے اترے ہو۔ مجھے تم پر اعتماد تو اپنے پرانے ساتھیوں سے بھی زیادہ ہے لیکن میرا تجربہ ہے کہ بہت بڑی رقم دیکھ کر اچھے اچھوں کی نیت خراب ہو جاتی۔“

”میں تو اس رقم کی حفاظت کرتے کرتے پریٹن ہو گیا تھا“

”میں نے کہا۔“

”دراصل اس کے لئے کسی ایسے اکاؤنٹ کا انتظام نہیں ہو سکا تھا جس میں اسے جمع کر لیا جاسکتا“ قاسم خان نے سر کاٹش لیتے ہوئے بولا ”شرف کی موت کے بعد اسے بازل ٹاؤن والی کو بھی پر بھی رکھنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا چلو اس پرانے تھمادی نیت کا امتحان بھی ہو جائے اور صلاحیتوں کا بھی۔“

”تم کسی اہم امانت کی حفاظت کر سکتے ہو یا نہیں۔ لیکن تم صحیح چیزوں میں اتنے مختصر عرصے میں میرے قاسم مقام بن گئے ہو۔“

”ایک بار تو میں نے سوچا کہ رقم بچم صاحب کے حوالے کر دوں“ میں نے کہا ”مگر پھر بھی سوچ کر وہ گیا کہ یہ آپ کی ہدایت کی خلاف ورزی ہوگی۔“

”سلی ٹم سے برگزیدہ رقم نہیں“ قاسم خان مسکراتے ہوئے بولا ”تمہیں معلوم نہیں کہ وہ ہمارے دھندے کے سلسلے میں کسی چیز کو انگیٹھنے پر بھی تیار نہیں ہوتی۔ وہ اس دھندے کو برداشت کر رہی ہے کی بڑی بات ہے۔ اس کا پس چلے تو آج مجھ سے یہ دھندہ چھڑواؤ۔“

میری نظروں میں سلی کا سراپا گھوم گیا۔ بلاشبہ وہ عورت نہیں، ساتھ تھی مگر جانے کیوں اس معاملے میں اس کا سر قاسم خان پر نہیں چل سکا۔ میرے خیال میں اگر وہ ایک طاقتور ساتھ تھی تو دولت کا بھوت بھی کچھ کم طاقتور نہیں تھا۔ قاسم خان کے سر پر دولت کا بھوت سوار تھا۔ سلی کی حسین اور ملکوتی شخصیت کا سر بھی اس بھوت کو اتارنے میں ناکام رہا تھا۔ اس ملاقات کے تقریباً ایک ہفتے بعد میں اسکے نور پر روانہ

شمیلے کا سواہی

مصنف طارق اسماعیل ساگر

خوبصورت سرورق

دیدہ زیب پر تنگ و طباعت

قیمت = 150 روپے

سرگرم روز اردو بازار لاہور

فون 7668958

پوچھا۔

”کیا فائدہ ہوتا پولیس کو اطلاع دینے کا؟“ آتش دہلوی مغموم سے انداز میں مسکرائے ”پولیس اس قسم کے معاملات کو اہمیت نہیں دیتی۔ خصوصاً جن لوگوں کا کہیں عدالت میں چل رہا ہو۔ ان کا متعلق یہی ہوتا ہے کہ کرایہ داروں اور مکان مالکان کے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں زیادتی مالک مکان کی ہوتی ہے اور کہیں کرائے دار کی۔ ان کشیدوں کو سلجھانا عدالتوں کا کام ہے۔ البتہ اگر صورت حال بہت سنگین ہو جائے، قتل و غریب کی قیامت آجائے تو پھر پولیس توجہ دیتی ہے۔ اس قسم کا جھگڑا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اس وقت زیب النساء قاتلے چلی گئی تھی۔ پولیس نے دونوں فریقوں کو سمجھا بھا کر گھر بھیج دیا تھا۔ پھر زیب النساء کے پاس ہے نہیں کہ اس قسم کے کاموں میں خرچ کر سکے۔ کوئی ذریعہ آمدن ہی نہیں ہے۔ میاں بس یہ مکان اور تھوڑی بہت پونجی چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ کئی عرصے سے بیچاری چاہ رہی ہے کہ اس مکان کو کوچ کر کوئی چھوٹا موٹا کرائے کر رہے لگے اور باقی رقم سے مگر اوقات کرے۔ ایک کمرے سے زیادہ کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ مگر تنازعہ ہونے کی وجہ سے کوئی اس کا مالک ہی نہیں بننا۔ بر حال..... میرا کچل بیٹھا ہوتا ہے۔ شاید اب عدالت زیب النساء کے حق میں فیصلہ دیدے اور اس طرح اس کے مسائل حل ہو جائیں..... اچھا خبر چھوڑو۔ میں نے بھی تمہیں کن وکٹروں میں الجھایا۔ میں تمہیں خدا گھہہ کر دیتا ہوں“ انہوں نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اٹھنے سے باز رکھا۔ ”یہ منظور رہتا کون سے پورشن میں ہے؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”بڑے گیٹ کی طرف جو سب سے پہلے پڑتا ہے“ بڑے میاں نے جواب دیا۔

بزد کا سارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن غارت کے سبب ہسپتال نہ ہو سکے ”تم خط لکھوانے آئے ہو نا...؟ میرا دایاں اچھ تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی لکھ دیتا ہوں۔ ذرا تجھے سارا دے کر اٹھا۔“

”امی آپ کوئی ماریں خدا کو۔ آپ لینے ہی رہیں اور پہلے مجھے تفصیل سے بتائیں کہ آپ کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے بھٹاکر کہا۔

”تم معلوم کے بغیر نہیں رہو گے“ انہوں نے گہری ماس لی اور ایک لمبے کے توقف سے بولے ”معلوم نہیں میں نے تمہیں بتایا تھا نہیں کہ وہ جو زیب النساء ہے نا.... وہی پوچھا جسے تم نے پہلی مرتبہ یہاں آتے وقت دیکھا تھا۔ اس مکان کی مالک۔ اس نے اپنے کرایہ داروں پر کیس کیا ہوا ہے۔ آٹار پیدا ہو چکے ہیں کہ وہ کیس جیت جائے گی۔ اس پر ایک پورشن میں رہنے والے کرائے دار عبدالغفور کا جبران پیشہ منظور بہت چرائے گیا ہے۔ وہ ذرا بد معاشری میں بھی پاؤں دھر رہا ہے۔ بالی دکر کرائے دار ذرا شریف طبیعت کے ہیں۔ ان کی بد معاشری بس اتنی ہے کہ.... تھپتھپتے ہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے بڑے انہوں نے چند سال میں نہ تو کرایہ بڑھایا ہے نہ خالی کرتے ہیں لیکن ان کے تہوروں سے پتا چلتا ہے کہ عدالت کا جو بھی فیصلہ ہو گا وہ اسے بے چون و چرا تسلیم کر لیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ انہوں نے کبھی بد تمیزی نہیں کی۔ کبھی زیب النساء سے اچھٹے کی کوشش نہیں کی... لیکن یہ تو فوج ان ہے.... منظور.... اسے جب سے احساس ہوا کہ ہے کہ کہیں ان لوگوں کے حق میں نہیں جا رہا تب سے سخت مشتعل ہے۔ کئی کئی بات پر نیچے برآمدے میں زیب النساء سے اچھ پڑا۔ گدی گدی کہاں دینے لگا۔ اس کی عمر کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ خود سسٹن کریں پچھتاوہ زیب النساء نے قاتل رحم انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے اس دنیا میں صرف میں ہی وہ شخص ہوں جو اس کی کوئی مدد کر سکتا ہے۔ میں نے منظور سے صرف اتنا ہی کہا کہ زیب النساء اس کی ماں کی عمر کی ہے“ اسے کم از کم اس صورت کچھ کالیاں تو نہیں دینی چاہئیں۔ منظور تو گویا فطری تھا کہ کوئی اگر کچھ میں کچھ بولے۔ اس نے تباہ تو مجھے کئی گونے رسید کر دیے۔ میری کٹائی موڑ دی.... وہ وہ میں پکرا کر گر پڑا وہ نہ معلوم میں میرا کیا شکر کرتا۔ میں نہیں اس نے تو میری اور زیب النساء کی بزرگی کا ذرا بھی خیال کئے بغیر ہمارے ملازم کے بارے میں ایسی شرمناک باتیں کرنا لیں کہ ہمارا زمین میں سہانے کو دل چاہنے لگا۔ زیب النساء ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اٹھ کر کھتی ہے.... بہت دوری تھی بیچاری اپنی بد تمیزی پر.... دنیا میں اس کا کوئی ہے ہی نہیں.... یہ میری ملازم پٹا اسی نے کی ہے۔“

”آپ لوگوں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی؟“ میں نے

ہاتھ کرنے کے لئے شخص کسی کا گھڑا ہی ہونا کافی نہیں تھا۔
”منگور تمہارا ہی نام ہے؟“ میں نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

”ہاں۔ کیوں؟“ وہ اب کچھ چوکنا نظر آنے لگا تھا۔
”اور پچھلے کمرے میں رہنے والے بڑے میاں آتش صاحب کو تم نے ہی مارا تھا؟“ میں نے بڑی وسایت سے پوچھ کر میں نہیں چاہتا تھا کہ نوجوان کی شناخت کے سلسلے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش رہ جائے۔

”ہاں میں نے ہی مارا تھا“ اس نے زہلائی سے جواب دیا۔
پھر اس کے لیے میں تسخیر جھلک آیا ”تم سنا ہی ہو اس کے؟“
آخری لفظ اس کے ہونٹوں پر ہی تھا جب میرا گھٹنا اس کی ٹانگ پر پڑا۔ ”اور“ کی آواز کے ساتھ وہ جھکاؤ میں نے اس کی گدی پر ایک چاب رسید کی۔ اس قسم کے معمولی درجے کے فلنگوں سے بننے کے لئے تو میرے دیکھی دواؤں اور طاقت و تخت چائی ہی کافی تھی لیکن اب تو میں کس قسم سے خود اور کرائے کے چند خاص نکاح اور نہایت ہی کار آمد دواؤں بھی سیکھ چکا تھا۔ ان کی تجرباتی شش تو میں کافی کر چکا تھا لیکن صحیح طور پر انہیں آزمانے کے لئے کسی دن سے دل چل رہا تھا۔
منگور اونٹ سے منہ کر کے لگا لگا کر آئے اپنی واپس میں نہایت ہی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے میری ہانگ کھینچ کر مجھے بھی گراتا چاہا لیکن اس کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی۔ میری گھوڑا اس کے منہ پر پڑی ابدہ وہ اونٹ سے منہ کرنے کے بجائے الٹ کر گرا۔

پیکاک اندر سے ایک اویز عمر اور میانہ قامت کا شخص دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ تھی۔ اس نے آؤ دیکھنا نہ آؤ سلاخ اندھا دھند گھبرا کر میٹری گھونپڑی پر رسید کرنا چاہی۔ میں جو کالی دے کر ایک طرف ہو گیا اور سلاخ کا سرا جیسے ہی فرش سے لگرایا میں نے پوری قوت سے اس پر ہاؤں رکھ دیا اور ساتھ ہی اویز عمر شخص کی کپٹی پر ایک بھر پور گھونسا رسید کیا۔ سلاخ میرے ہاؤں کے نیچے دلی رو گئی اور وہ شخص دور جاگرا اور دین بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کے لئے کپٹی پر ایک گھونسا ہی کافی رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اندر سے دو تین گھوڑیں دو دروازے پر آئیں اور وہ چن چن کرنے کے لئے اندر میں چینی ہی لگی تھیں۔
”بچاؤ.... بچاؤ....“ کہیں سے پھرتی سے رو اور نکال کر منظور کی کپٹی پر رکھ دیا۔

”تجربہ....“ اگر کسی عورت نے ذرا بھی آواز نکالی تو میں منظور کو گولی مار دوں گا“ میں نے غضب ناک مجھے میں کہا۔
غور توں کو جیسے سناٹ سوگ کیا اور ان میں سے ایک نے توشہ میں دوپٹا گھونٹ لیا۔ میں نے ایک نظر میں ہی ان کا جائزہ لے لیا۔ ان میں سے دو جوان اور ایک اویز عمر تھی۔ غالباً منظور کی

”میں ابھی آیا“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”میری واپس تک آپ کرنے سے نہیں نکلیں گے۔“
”ارے.... کھل جا رہے ہو تم؟“ وہ ایک سخت سیٹھ مجھے اور کسی نہ کسی طرح اٹھ بیٹھے ”تم.... تم منظور سے بھگڑاؤ نہیں کرنے جا رہے؟“ جی ہاں.... خدا را بھگڑاؤ کرنا.... معاملہ اور طویل کھینچ جائے گا.... ہمیں بھی سمیت بڑے گی اور کہیں تم بھی نہ نقصان اٹھاؤ گی.... رہنے دو.... چلیز۔ چوڑو اس فیص کو۔“

”میں بھگڑا کرتے نہیں“ بھگڑاؤ فتح کرنے جا رہا ہوں“ میں نے دروازے پر رک کر کہا ”آپ قطعاً کسی بھی قسم کی فکر نہ کریں اور آرام سے لیٹے رہیں۔“
”ارے جی نہیں.... تم ایک معزز اور مذہب نوجوان ہو۔“
کہیں اس اجنب کے منہ لگو گئے۔ میں تو تیس ساری بات بنا کر ہی بچتا تھا ”وہ بے چارے واقعی بہت پریشان ہو گئے تھے۔ ان کی زبانی مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ میں کم از کم بظاہر تو ”معزز اور مذہب“ نظر آنے لگا تھا۔

میں بڑے میاں کے کمرے کی باہر کی طرف سے کنڈی لگا کر نیچے گیا۔ سامنے کا گیٹ حسب معمول کچھ اس انداز میں کھلا تھا جیسے اس مکان کا کوئی وارث نہ ہو۔ میں جب بھی یہاں آتا تھا، بے عنوان سی مصلحت کے تحت گاڑی باہر ہی نیچے فاسٹ پر کھڑی کر کے آتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے گیٹ بند کر دیا۔ مکان کی دونوں طرف کی دیواریں تسلی بخش حد تک بلند تھیں اور پر آمدے میں گلوب بھی روشن تھا۔ مکان کی ساخت میں نمایا کچھ تبدیلیاں کر کے کچھ جیسے کو اس طرح تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا کہ تینوں کے دروازے پاس پاس ہی تھے۔ اوپر کی منزل پر صرف دو کمرے تھے جو بڑی لمبے کے استیبل میں تھے۔ اندر سے دیکھتے بغیر بھی شخص آتش صاحب کے بتانے پر اس مکان کا نقشہ کلی حد تک میری سمجھ میں آچکا تھا۔

میں نے مطلوبہ پورشن کے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی پوچھا ”کون؟“ کھواڑ مردانہ تھی اور انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اندر کسی دستک کا انتظار ہی کیا جا رہا تھا۔

”منگور صاحب کا بیٹی گرام سے جی“ میں نے لہجہ تھوڑا سادہ ل کر کہا۔ پندرہ سینڈ بعد دروازہ کھل گیا اور شٹور اقیس میں لمبوس ایک نوجوان کریمان کے ثمن بند کرنا ہوا باہر گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کچھ انہیں زدہ سا نظر آنے لگا۔ نمایاں اسے کسی اعتبار سے ٹیلی گرام رولاد دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ ہی میرے ہاتھ میں ٹیلی گرام تھا کوئی چیز تھی۔ نوجوان خلاصا بھگڑا تھا اور قد میں بھی مجھ سے ذرا ہی کم تھا کم اس کے باوجود اسے دروازہ ہی شمار کیا جاسکتا تھا۔ بھگڑا ہونے کی بنا پر ہی نمایا کافی حد تک گھمڑہ تھا اسے اپنے آپ پر۔ بہرحال مجھ جیسے آدمی سے دود

بیچے بٹ گیا۔ میں نے بازو سے پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔
 ”اسے صاف کر دے، بیٹا! اسے صاف کر دے“ وہ ہاتھ
 جوڑتے ہوئے بولی ”میں نے اسے پہلے ہی منہ کیا تھا کہ
 بوڑھے آدمی پر ہاتھ نہ اٹھا کر اسے اپنی حالت دکھانے کا کچھ
 زیادہ ہی جوش چڑھا ہوا تھا۔ میں نے گستاخاکہ جو دن میں اکیلے
 ہوتے ہیں، خدا کسی نہ کسی کو ان کا بھی حمایتی بنا کر بھیج دیتا ہے
 ... مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔“

”تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ آئندہ بھی تمہاری
 بات سنے گا؟“ میں نے سر دھبے میں کہا ”میرا خیال ہے، مجھے
 اس کی ضمانت ہمت پرانے کا کوئی بندہ دست کرنا پڑے گا مگر یہ
 آئندہ ماں کی بات اچھی طرح سن سکے۔“

”آئندہ یہ آتش صاحب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں
 دیکھے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ... خواہ اس سے اپنی بات منوانے کے
 لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے“ عورت ٹکڑا کر کہی۔

”دیکھو بڑی بی! عورت سے میری بات سنو“ میں نے رومال
 کے ذریعے اپنی مانی پر سے خون کا ایک چھینٹا صاف کرتے
 ہوئے کہا ”تمہارا دادا دوسرے کرائے والوں کا مکان مانگن سے
 سے جو جھگڑا چل رہا ہے اس سے مجھے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔
 میں چاہوں تو تم سب کو سلطان سمیت اٹھوا کر راوی میں بھی
 پھینکوا سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ ہاں اتنا ضرور
 چاہوں گا کہ عدالت جو بھی فیصلہ دے، اس پر تم سب بلا چون
 و چرا عمل کرنا۔ اس سے زیادہ مجھے تمہارے بھگڑنے سے کوئی
 دلچسپی نہیں لیکن مجھے ان دو ضعیف اور بے سارا افراد کی خیر
 و عافیت سے ضرور دلچسپی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی
 شخص، بڑی بی زیب النساء یا بڑے میاں آتش صاحب کو ذرا
 سی بھی زہنی یا جسمانی تکلیف پہنچائے حالانکہ ان دونوں کو میں
 صحیح طور پر جانتا بھی نہیں اور نہ ہی وہ مجھ سے صحیح طور پر واقف
 ہیں لیکن اس معاملے میں تم مجھے ایک طرح کا خدائی فوجدار
 کہہ سکتی ہو۔ میرا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ تم لوگوں میں سے
 کوئی بھی ان دونوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے اور بس۔ اگر
 میری اس ہدایت پر عمل ہوا تو تم میں سے بھی کسی کو آئندہ کوئی
 تکلیف نہیں پہنچے گی ... سمجھیں؟“

”تم بالکل اطمینان رکھو“ بڑی بی جلدی سے سر ہلا کر
 بولیں۔ مجھے یقین تھا کہ بانی دو پور رشتوں کے دروازوں کے
 عقب میں بھی یقینی یقین موجود تھے اور کسی آنکھیں درازوں
 سے جھانک رہی تھیں مگر انہوں نے بقیان نہیں جانی تھیں۔
 یقیناً وہ لوگ سب آنکھ دیکھ چکے تھے اور میری تقریر دل پہ
 بھی اچھی طرح سن چکے تھے۔ مگر ظاہری کر رہے تھے کہ وہ تو
 اپنے گھروں میں بے خبر سوئے ہوئے ہیں۔
 میں نے منظور کو گمراہی سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ خمبوط
 المواسوں کی طرح اوپر اوپر کو ڈول رہا تھا۔

ہاں تھی۔ منہ میں دوپٹا ہی نے ٹھونسا تھا۔ وہ اجیز عرق خفص جو
 ایک ٹھونسا لکھا کہ ”انا غفلت“ ہو گیا تھا، غائب منظور کا باپ تھا۔
 نہیں عورتیں سخت دہشت زدہ نظر آ رہی تھیں۔

میں نے کچھ کچھ لپٹے لپٹے میں کہا ”میں منظور کو جان سے
 مارنے نہیں آیا، صرف تمہارا سانس دینے آیا ہوں لیکن اگر
 تم لوگوں نے شور شراب کیا تو میں اس کا بڑا صاف عکری دوں گا۔
 دیکھو شور شراب کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اس علاقے میں
 شور شراب سن کر کوئی کسی کی مدد کو نہیں آتا۔“

اس دوران منظور کے حواس شاید کسی حد تک بحال
 ہو گئے تھے اور اس نے غائب یہ سمجھا تھا کہ میں پوری طرح
 عورتوں کی ہی طرف متوجہ ہوں۔ اس وقت تک وہ اٹھ نہ چکا تھا
 اور میں نے ریو اور اس کی کینٹیل سے بیٹھا تھا اور میں خود بھی
 سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ منظور نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے
 ہوئے میرے ریو اور پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ ریو اور تو اس کے
 ہاتھ نہیں آیا البتہ اس کا دست اس کے منہ پر پڑا۔ میرا خیال ہے
 اس کے دو تین دانت اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ
 رکھ کر بری طرح ہلپٹا اور پھر اس کی انگلیوں کے درمیان سے
 خون الٹ پڑا۔

وہ ایک بار پھر اشتعال میں آیا اور اپنے اوسان جمیع کر کے
 ریو اور کوئی پروا کئے بغیر اپنے سامنے کی طرح میری طرف لپکا کہ
 اس نے میرے چہرے پر نگر رسید کرنے کی کوشش کی مگر اس
 کوشش میں اسے میرے ہاتھیں ہاتھ سے کراٹے کا ایک اور داؤ
 سنا پڑا۔ ساتھ ہی میں نے اس کی گدی پر ریو اور کا دست رسید
 کیا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن پتہ روش پر ڈھیر ضرور
 ہو گیا۔ اس کے حواس ختم ہو چکے تھے۔ عجیب سے انداز میں
 لپکن جھپٹا رہا تھا، جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔ اس کے
 دہشت پھٹ پھٹ تھے اور منہ کی جگہ گوشت اور خون کا ملبوہ
 نما نظر آ رہا تھا۔ ابروؤں کے قریب بھی زخم آچکے تھے اور
 چہرے پر درم بھی نمودار ہو چلا تھا۔ میرے خیال میں اب اس
 میں مزید مارنے کی سکت نہیں تھی۔ اگر میں اسے ایک آدھ
 ہاتھ اور رسید کر دیتا تو شاید وہ بے ہوش ہو جاتا۔

میں نے ریو اور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور منظور کی
 پٹلیوں پر نوکر رسید کرتے ہوئے کہا ”اٹھو تا میرے شیر خانہ
 ابھی تو میرا لہجہ بھی گرم نہیں ہوا اور تم بے لپی لیت گئے کیا تم
 آتش صاحب جیسے ضعیفوں اور عمر رسیدہ لوگوں ہی سے لڑنے
 میں ماہر ہو؟“ اٹھو ... شاہاش ...

اس موقع پر وہ عمر رسیدہ عورت جو میرے انداز سے
 کے مطابق منظور کی ماں تھی، خاموش نہ رہ سکی۔ منہ میں
 ٹھونسا ہوا دوپٹا نکال کر وہ آگے بڑھی اور میرے پیروں میں
 گرنے لگی مگر میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا اور جلدی سے

اختیائے ...

”زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے بی خالہ“ میں نے تیزی سے کہا ”اگر خدا کو منظور ہوا تو شاید میں آئندہ بھی آپ کی مدد کے لئے آن پہنچوں... ویسے آپ کو میری مدد پر اس حد تک تحیہ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ آخر آپ نے اپنی زندگی بھی تو میری مدد کے بغیر ہی گزاری ہے۔ کوئی آپ کا ہل بھی بچا نہیں کر سکا۔ آئندہ بھی اگر خدا کو منظور ہوا تو کوئی آپ کو ذرا سا بھی مگر نہ نہیں پہنچا سکے گا۔“

میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ بڑی لمبی وہیں ہنگامہ کھڑی تھیں۔ شاید انہیں مجھ سے اپنی درویشانہ گفتگو کی توقع نہیں تھی۔

اوپر آکر میں نے دیکھا بڑے میاں اٹھ کر کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور تشویش زدہ انداز میں دروازے ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میرا سر کیا جائزہ لیا اور غالباً یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ میرے ٹھپٹے میں کوئی زیادہ بے ترہی یا نوٹ پھوٹ کے آثار نہیں تھے جس سے انہوں نے یقیناً یہی نتیجہ اخذ کیا ہو گا کہ میں ماریجٹ اور خون خرابے سے محفوظ رہا ہوں۔

”میں تو بنگلے کی آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا“ وہ عمری سانس لے کر بولے ”اور اتنی دیر میں میرا آدمی خوں سوکھ گیا“ ”کوئی بنگلہ نہیں ہوا“ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا ”اور آپ کو خون منکھلنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پیار سے اس کو سمجھادیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ کبھی آپ لوگوں کے ساتھ بد تمیزی نہیں کرے گا۔ اب آپ کو اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”ڈرنا کون کہنت ہے“ آتش دہلوی کرہا کر بولے۔ ”میں نے تو دنیا کی ہر چیز سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ موت کا بھی مجھے تو اب کوئی خوف نہیں رہا۔ لیکن یہ جو چوٹ وغیرہ کی تکلف ہوتی ہے... یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ خصوصاً کوئی ایسی چوٹ جو مجھے بستر پر لیٹنے پر مجبور کر دے۔ خواہ خواہ بستر پر لیٹے رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ چند گھنٹے کی نیند سے قطع نظر میں صرف اس وقت بستر پر لیٹنا چاہتا ہوں جب مجھے موت آ رہی ہو۔“

اچانک انہیں جیسے کچھ یاد آگیا۔ چونک کر شک زدہ کی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے ”کیا تم نے واقعی پیار سے منکر کو سمجھ لیا تھا؟ اور کیا واقعی اس نے تمہاری بات سن لی تھی؟“

”ہاں... آپ اس کی فکر نہ کریں“ میں نے کہا ”اوپر اطمینان سے سوئیں۔ میں اب چلتا ہوں۔“

”یقین تو نہیں تھا کہ اس نے پیار سے تمہاری بات سن لی ہوگی“ بڑے میاں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتے ”نہ

”تم نے بھی میری بات اچھی طرح سن لی ہے نا؟“ میں نے اس کی پہلوں پر ہلکا سا گھونسا رسید کیا۔ وہ ہلپلا یا اور اس کے منہ سے خون کے کئی چھینٹے اڑ کر میرے گوت، مٹائی اور شرٹ پر آن کرے۔ مجھے سبہ حد افسوس ہوا کہ میں نے اس کہنت کو آخری شیخ نہ ہی رسید کیا ہو تا تو اچھا تھا۔ گھونسا کھا کر اس نے جلدی سے انتہا میں سر ہلادیا۔

”اگر چاہو تو جا کر اس واقعے کی رپٹ درجن کرانے کی کوشش کر لیتا“ میں نے اس کے گریبان کو تھکا دیتے ہوئے کہا ”لیکن جانے سے پہلے اپنے کفن و دفن کی تیاری مکمل کرنا کیونکہ تمہارے سے واپسی پر شاید تم زندہ گھر نہ پہنچ سکو۔“ اور تم قتلے کی دلیزیر قدم رکھو گے اور اور مجھے علم ہو جائے گا“ میں نے اسے گھر کے کھلے دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ نزدیک کھڑی ہوئی عورتوں نے فوراً اسے سنبھال لیا اور سارا دوسے کر اندر لے جانے لگیں۔

میں نے بڑی لمبی کی طرف مڑتے ہوئے کہا ”جاؤ جا کر پر خوردار کی مرہم پی لو اور ہڈیاں سینکے کا بندوبست کرو۔ صبح تک شاید اسے اندازہ ہو سکے کہ اس بوڑھے آدمی کو اس کی ماریجٹ اور کل گھوج سے کتنی تکلیف پہنچی ہوگی۔“

میں تیزی سے مڑا اور بھلی لان کے جھاڑ جھکاڑ سے گزرتا ہوا پیچھے کی طرف چل دیا۔ میں پیچھے بچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بڑی لمبی رُوب النساء اپنی بیڑیوں میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے لپک کر میری پائیں میں اور قدمے حیرت سے بولیں۔ ”تم کون ہو جیسا؟ تم تو ہمارے لئے فرشتہ رحمت بن کر آگئے... تم شاید آتش صاحب کے شہساز ہو۔ میں نے ایک مرتبہ تمہیں ان کے ساتھ دیکھا تھا؟“

”جی ہاں۔ میں ان کا دوست ہوں“ میں نے کسی قسم کی کر بھوش کا اظہار کئے بغیر کہا ”آپ مجھے فرشتہ رحمت وغیرہ ہرگز قرار نہ دیں۔ میں تو برا مانگا بگڑا انسان ہوں۔ میں نے آپ پر کوئی اسٹین نہیں کیا۔ میں تو بس اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ گزروں پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

بڑی لمبی گھومنے سے میں بولیں ”اللہ تمہیں اس کا جروے گا۔ تم ذرا میرے گھر میں تو آؤ... کچھ دیر بیٹھو... مجھے خدمت کا موقع دو... کھانا کھاؤ“ چاہے ہو۔“

ان کے انداز کی سادگی پر مجھے ہنسی آتے آتے رو گئی۔ تاہم میں نے اپنے لیے کی کرکمالی اور شبیگی پر قرار رکھتے ہوئے کہا ”میرے پاس وقت بھی نہیں ہے اور چاہے یا کھانے کی مجھے طلب بھی نہیں ہے۔ پھر کسی وقت سہی۔“

میں ان سے باز چھڑا کر آگے بڑھنے لگا تو وہ جلدی سے دو قدم آگے آکر بولیں ”اگر اس بد معاش نے دوبارہ ہم پر زحمت اور گزندوں کو بد معاشی تو کیا ہو گا؟ میں ممکن ہے کہ مار کھانے کے بعد وہ زیادہ مشتعل ہو جائے... کوئی خطرناک قدم

نثار کرتا تھا۔ میری "ترقی" کی رفتار تلی بخش بلکہ کچھ تیزی تھی۔ گوکہ ابھی میں کوئی بڑا سرمایہ وار تو نہیں بنا تھا لیکن کچھ بات یہ ہے کہ میں نے سمجھ اتنی رقم کا بھی تصور تک نہیں کیا تھا جتنی میرے پاس جمع ہو چکی تھی۔ میں اب اپنے آپ کو بے حد بڑا سمجھتا ہوں کرتے لگا تھا اور ساتھ ہی میرے دل میں مزید دولت حاصل کرنے کی خواہش جڑیں پکڑتی جا رہی تھی۔ شاید دولت چیز ہی ایسی ہے۔ ایک بار آتی شروع ہوتی ہے تو پھر اس میں اضافہ کرنے کا شوق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

مجھے اب کچھ کچھ امید ہو چلی تھی کہ وہ وقت شاید آتی جائے جب میرا شمار بھی اچھے بھلے سرمایہ داروں میں ہو سکے گا۔ میں نے کہیں انگریزی میں کسی غیر ملکی تاجر کا قول دہرایا تھا کہ آجکل کی تیز رفتار کاروباری دنیا میں صرف پلاٹین گاما شکل ہوتا ہے، اس کے بعد تو رقم سے رقم جتنی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ میں اب اس دھن میں لگ گیا تھا کہ کسی طرح میرا پلاٹین پورا ہو جائے۔ دس لاکھ روپیہ چند سال پہلے تک میں نے بھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کرشن چندر کے ایک افسانے میں بھی اسی قسم کی بات پڑھی تھی۔ بمبئی کے پس منظر میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہاں روپے کی مثال برف کے گولے کی سی ہے۔ برف پوش پہاڑ کی چوٹی سے ایک بار برف کا گولا لڑھکاتا تو نیچے نیچے تک وہ اترتا ہوا جاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ راستے میں وہ نہ جانے کتنی برف اپنے ساتھ لپیٹتا ہوا لے جاتا ہے۔ یہی حال روپے کا ہے۔ ایک بار بہت سا روپیہ بمبئی کے بازار میں پھینک دیا تو پھر اس کے بڑھنے کا ہمت نہ کیجیے۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے پاس اگر ایک ملین پورا ہو بھی گیا تو وہ بیک منی ہوگی۔ اسے علی الاطلاق کسی جائز کاروبار میں لگا دیا میرے لئے ایک مسئلہ ہو گا لیکن اس مسئلے کے سلسلے میں میں کچھ زیادہ متشدد نہیں تھا۔ اصل مسئلہ تو میرے خیال میں دولت کا آنا تھا۔ اس کا بیک یا واپس ہونا بعد کا مسئلہ تھا۔ بیک کو بھی واپس ہونے کیا در لگتی ہے؟ آخر یہ بڑے بڑے مالیاتی مشیر بڑی بڑی دگریوں والے قانون دان کس لئے ہیں؟ ان میں سے کوئی نہ کوئی مشورے دیتے والا کرلہ جھٹلے والا ہے بھی میرا مسئلہ تھا۔ اور پھر میں قاسم خان سے بھی بہت کچھ سیکھتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی میرے خیال میں دولت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ بیک نہ واپس... اگر کوئی رنگ ہوتا بھی ہے تو بس سنرا ہوتا ہے جس کی چٹکانہ آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

اس دوران میرا لکھی بار کراچی جانے کوئی چاہا لیکن شروع میں تو مصروفیات زیادہ رہیں اور کچھ اپنے پاؤں مضبوط کرنے کی دھن رہی۔ بعد میں کئی بار میں نے راجیلہ کو فون کیا اور اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں چند دن کے لئے کراچی آنا چاہتا ہوں تو اس نے مجھے منع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایم اے قاضی کے

صح معلوم ہو جائے گا" پھر جیسے وہ چوک کر بولے "اورے جی چلیو۔ جا کھل رہے ہو؟ ابھی تو میں تمہیں خط کا جواب لکھ کر دوں گا۔ میرا بھم مضروب ہے۔ میرے خیالات تو مضروب نہیں۔"

"رہتے ہیں آتش صاحب! میں اتنا خود غرض بھی نہیں ہوں۔ خط دو دن بعد بھی لکھا کیا تو کوئی صبح نہیں" میں نے کہا۔ "اچھا... اگر تمہیں میری حالت پر اتنا ہی ترس آ رہا ہے تو اپنی کردہ میں ہوں ہوں" تم لکھتے جاؤ۔ اس طرح مجھے کوئی جنت نہیں ہوگی "بڑے میاں بولے۔ بالآخر مجھے ان کی بات اتنی پڑی۔ انہوں نے پہلے راجیلہ کا خط پڑھا اور پھر چپے لپے لپٹنے کے بعد جواب لکھواتا شروع کیا۔ جواب کیا تھا "ذمہ داری لکھوں گا ایک دریا تھا جو نہایت روانی سے بہتا رہا تھا۔ اس تکلیف کے عالم میں بھی انھوں نے مجھے جو خط لکھواتا اسے مکمل کرنے کے بعد میں نے پڑھا تو دل دے بغیر نہ رہ سکا۔ خط! کلپٹ کرانے میں بھی ان کے انداز کی وہ ذمہ داری برقرار تھی جو ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے خطوں سے جھلکتی تھی۔ گھر آکر میں نے حسب معمول اس خط کو زیادہ خوبصورتی اور نفاست سے نقل کیا اور خوبصورت لٹائے میں رکھ کر صبح پوسٹ کر دیا۔

○●○

میری سائز پرنس والی اسٹیم کا پیاب رہی تھی۔ پرنس قاسم خان کا تھا اور سائز میری۔ اس کے مال کی "ور آؤ برآمد" کے ساتھ ساتھ میرا مال بھی ادھر سے ادھر ہو رہا تھا اور قاسم خان کو کالوں کان خبر نہیں تھی۔ اپنے کارندوں کی نہ مات سے فائدہ اٹھانے میں اس کا جواب نہیں تھا اور اس کے اٹھارے سے فائدہ اٹھانے میں میرا کوئی جواب نہیں رہا تھا۔

میں نے مال کی نقل و حمل کا انتظام اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا تھا کہ میرے ساتھ جانے والے پرانے اور قابل اعتبار کارندوں کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ کتنا مال آئے گا۔ کس بارنی کو جانے گا۔ رقم کی وصولی کب، کہاں اور کیسے ہو چکی ہے یا ہوئی... اس کے علاوہ میں نے اپنے مال کے لئے مارکیٹ ہی اٹھائی تھی۔ میں اب بھی ان لوگوں کو ہی مال دے رہا تھا جن کا قاسم خان سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ ہی آئندہ کوئی واسطہ پیدا ہونے کی توقع تھی۔

میری ترقی پونہ میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ کوشش کی رقم تو میرے اکاؤنٹ میں جا رہی تھی جو قاسم خان کے علم میں تھا اور جس کی ایک قانونی شکل موجود تھی لیکن سائز پرنس "کی رقم میرے پاس نقد جمع ہو رہی تھی جس کا چند حصہ ایک بینک کے لا کر میں رکھتا تھا اور کچھ رقم میرے پاس موجود رہتی تھی۔

میں اب اپنے آپ کو چھوٹے منوٹے دو تین دن میں

وہ جب بار سے مجھے لائی کھتی تھی تو میں سارے بچے شکوے بھول جاتا تھا۔ میں نے عمری سانس لے کر کہا "چل ٹھیک ہے۔ تم اطمینان سے بیچو دو۔" میں اس دوران جس فون بھی نہیں کروں گا تاکہ تمہاری یکسوئی میں کوئی فرق نہ آئے۔۔۔"

"لیکن خط لکھنا سرت چھوڑنا" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے فوراً تحقیق کی "خواہ میں جواب دوں یا نہ دوں لیکن تم خط لکھتے رہنا۔ تمہارے خطوط سے میری ذہنی یکسوئی میں کوئی غلطی نہیں پڑے گا بلکہ ان خطوط سے مجھے نیاوصلہ ملے گا۔ انہی کی بدولت میرے سینے میں ایک غلط سار قضا رہتا ہے۔ کسی عجیب بات تھی کہ وہ خطوط اس شخص کے لکھے ہوئے تھے جس کی اپنی زندگی میں دلوں کی چنگاری بھی لگی نہیں تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں خط حسب معمول لکھتا رہوں گا۔" میں نے اپنے خیال سے چوتھے ہوئے کہا "تمہارے اختتام ختم ہوئیں پھر میں کراچی آنے کا پروگرام بنائوں گا۔" پھر بھی شاید تمہیں آنے کی ضرورت نہ پڑے۔" اس نے ایک بار پھر کھٹک دار سا نقشہ لگایا اور میرے کھوں کے قریب پیسے جلتے گنگ بج اٹھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے ہلے۔ "میرے اختتام ختم ہوئے ہی شاید ہمارا پورا کتبہ ہی چند فون کے لئے لاہور آئے۔ ڈیڑی تو شاید صرف ایک دن کو آئیں لیکن ہم لوگ زیادہ سے زیادہ دن رہنے کی کوشش کریں گے۔ اس بار تم ہمیں لاہور کی سیر کرانا۔"

"کیوں نہیں" میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی "تم آؤ تو۔۔۔" سی۔ لاہور کا گوشہ گوشہ تمہیں دکھائیں گے۔" "بیشک گوشہ اتفاق سے ہم نے پہلے ہی دیکھے ہوئے ہیں۔" وہ ہنس کر بولی "لیکن جب گائیڈ کے فرائض تم انجام دے گے تو ہر چیز میں ایک ناپن اور خوبصورتی آجائے گی۔"

مزید چند منٹ اسی قسم کی گفتگو کے بعد پھر خرم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ کافی عرصے سے میری اس قسم کی ٹیل فون کلاڑی دھ سے مل پڑا رہا ہے۔ آج کل مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ آج کل میں بھی اسی رفتار سے آ رہا تھا اس لئے اخراجات میں تھوڑے بہت اضافے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ویسے بھی جہاں محبت کا کھانا چل رہا ہو وہاں تو مغربی میں بھی اس کم کے اخراجات کی پروا نہیں ہوتی۔ آدمی ہر حال میں انہیں پورا کرنا ہے، خواہ قرض لے کر ہی کرے اور خواہ بعد میں دے دے یا کھائے۔ عشق میں آدمی واقعی دیوانہ ہوتا ہے۔ میرے پیچھے میں انسان کو فواد ایصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے اعصاب فولادی ہی تھے لیکن مجھے بھی وہاں انڈینوں اور ایشیائیوں کا بوجھ ان پر بھی پڑنا پڑا تھا۔

اختتام کی تیاری کر رہی ہے اور بڑی بخیرگی سے دن رات پڑھائی میں مصروف ہے، اس لئے مجھے زیادہ وقت نہیں دے سکے گی۔ ظاہر ہے اس صورت میں میرے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کئی بار اس سلسلے میں بات ہونے کے بعد بالآخر میں نے اپنا پروگرام چند ماہ کے لئے ملتوی کر دیا۔

ان چند مہینوں میں میری دولت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ راجیل نے خط و کتابت اسی جوش و خروش سے جاری تھی۔ جوش و خروش میری طرف سے ہی زیادہ تھا، راجیل کے خط عام طور پر مختصر اور سیدھے سادے ہوتے تھے لیکن ظاہر ہے اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ کوئی سیری طرح کسی مجھے ہوئے ادیب سے تو خط نہیں لکھواتی تھی۔ وہ خود فون پر ایک بار کہہ چکی تھی "افضل! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے خوبصورت خط لکھ سکتے ہو۔ تمہارا ہر خط پڑھ کر میں کیف و سرور اور حسین خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی ہوں۔ میں ان خطوں کے شلمان شان جواب نہیں لکھ سکتی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ جواب لکھا ہی نہ کروں۔ بس ان خطوں کو پڑھ کر ہی اظہار اندوز ہوتی رہوں۔"

اس پر میں نے بوکھا کر کہا تھا "ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔" خواہ تم کیسا ہی جواب لکھو لیکن تمہو ضرور... مجھے معلوم ہے کہ ان سادہ الفاظ کے عقب میں کیسے متوجہ اور حسین جذبات پنپ رہے ہیں۔"

اس وقت مجھے ایک لمحے کے لئے شرم سی بھی محسوس ہوئی تھی کہ میں نے راجیل کو ایک غیر متعلق شخص کے لکھے ہوئے الفاظ کے سحرے سنا کر کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ ان خطوط میں جذبات تو درحقیقت میرے ہی تھے اور الفاظ بھی کم و بیش میں دی استعمال کرنا چاہتا تھا جو آتش دہلوی مجھے لکھ کر دیتے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ مجھے لکھنے کا سلیقہ نہیں تھا۔

مزید چند ماہ گزر چکے تو راجیل کی طرف سے خطوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کافی دن کے انتظار کے بعد میں نے قدرے وحشت کے عالم میں فون کیا تو پتا چلا کہ بات کوئی خاص نہیں تھی، بس اس کے اختتام شروع ہو چکے تھے۔ وہ ایک ہی سانس میں اپنے اپنی تمام مہمندیات کی تفصیل بتاتی چلی گئی۔ پھر اصل موضوع پر آئی۔

"آج کل اور کسی بھی بات کا ہوش نہیں ہے لئی" وہ اپنی مخصوص کھٹک دار ہنسی کے ساتھ بولی "میں ڈیروست لکھائی پڑھائی ہو رہی ہے۔ میں پڑھائی کے معاملے میں کبھی اتنی سیریس نہیں مگی لیکن اب ایک طرح سے ڈیڑی کے ساتھ میری شرم گئی ہے۔ میں ان پر ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں صرف سیرپائوں اور رنگاں میں سب سے آگے نہیں ہوں بلکہ پڑھائی میں بھی اپنی برتری ثابت کر سکتی ہوں۔"

کے مستقبل قریب میں اس کا ارادہ ضرور ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اس کے بعد اس کا اور میرا ساتھ برقرار رہے گا یا نہیں۔ جس کتنا ہی برا آدمی کسی لیکن میرے اندر شاید کسی نہ کسی کو نے کھد رے میں ایک اچھے آدمی کی درج ضرور موجود تھی۔ خواہ کتنی ہی کمزور روح کسی لیکن ہر حال وہ ابھی سانس لے رہی تھی۔ تاہم از حدوں میں بھی میں اپنی ایک تھوڑی سی شان برقرار رکھنے کا خواہش تھا۔ میں نے بعض نئے بازوں کی ایسی بری حالت دیکھی تھی اور ان کی وجہ سے بعض ایسے خوبصورت گھرانوں کو اڑتے دیکھا تھا کہ منشیات سے میرے دل میں نفرت سی بیٹھ گئی تھی۔ میں لوگوں کے گھروں کو اجاڑنے میں حصے دار نہیں بننا چاہتا تھا اور دوسرا عالم یہ تھا کہ ایسی ایسی منشیات لٹاؤ ہوئی جاری تھیں جن کے سامنے شراب کا ٹھکڑا کچھ نہیں تھا۔

میری طبیعت کے برعکس میری لائن کے زیادہ تر لوگوں کا رجحان منشیات کی طرف تھا کیونکہ یہ چیزیں غم میں کمی ہوتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی نقل و حمل میں آسانی تھی۔ قیمت بہت زیادہ ملتی تھی، اس لئے بہت سے عناصر کے لئے زیادہ بھاری رقموں کی متقاضی نکالی جاسکتی تھی۔ اتنی بڑی رقمیں جنہیں دیکھ کر بڑے بڑے پارسا بھی ڈول جاتے تھے۔ آنے والے چند دنوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ اس پارٹی کو انکار کر کے میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ شاید قدرت مجھے کسی بہت بڑے نقصان سے بچانا چاہتی تھی۔ جیسا کہ میں اعتراف کر چکا ہوں کہ میں کوئی اچھا انسان نہیں لیکن شاید یہ میرے اندر چھپے ہوئے اس کمزور سے اچھے انسان کے وجود کی خوش بختی تھی کہ قدرت مجھ پر ہرمان ہی رہتی تھی۔

اس پارٹی سے ملاقات اور آنے والے دنوں کے واقعات کا آپس میں کوئی تعلق تو نہیں لیکن ان میں ایک چکر مشترک تھا اور وہ تھا کوکین کا چکر۔ اس اتفاق پر بھی مجھے کچھ کم حیرت نہیں تھی۔

ہوا یہ کہ اس روز میں نے صبح آنکھ کھلتے ہی حسب عادت قریبی پٹائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ملازم صبح کی گھٹ کے قریب پرے ہوئے دو اخبار لاکر اس پٹائی پر رکھ دیتا تھا۔ میں نے ایک اخبار اٹھایا اور آنکھیں کھلتے ہوئے صفحہ اول کی موٹی موٹی سرخیوں پر نظر دوڑائی۔ ایک سرخی پڑھ کر مجھے حیرت کا اتنا شدید جھکا لگا کہ میں بیڈ سے گر گئے۔ بچا۔ فینڈ کا اخبار لکھتے ہی میرے ذہن سے امریکا اور میں بیٹے کی طرح پوچھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ہوش و حواس پر قابو رکھتے ہوئے میں نے دوبارہ سرخی کو بغور پڑھا۔

ممتاز پاکستانی تاجر قاسم خان نیو یارک کے ہوائی اڈے پر گرفتار۔ کئی پونڈ کوکین برآمد۔ نیو یارک پولیس کی تحقیقات کے مطابق طرم کی یہ کوکین اسمگل کرنے کی دوسری کوشش تھی۔

ایسے میں راجیک سے چند منٹ کی گفتگو مجھے ہر سکون بنا دیتی تھی۔ دل کو جیسے قرار سا آجاتا تھا۔ سینے میں بھڑکتا ہوا بے اطمینانی کا قہقہہ نکلتا تھا۔

چند دن سے البتہ راولی کچھ چین لکھ رہا تھا۔ قاسم خان کراچی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے اسے امریکا کے لئے فلائٹ پکڑنی تھی۔ وہ چند دن پہلے ہی چلا گیا تھا۔ کراچی میں اسے کچھ کام تھے اور سیٹھ واحد سے بھی ملنا تھا۔ اپنے اس دورے کا مقصد بھی اس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ ملک سے باہر ملک بعض اوقات شہر سے باہر جاتے وقت بھی وہ مجھے اشارہ بھی نہیں دیتا تھا کہ وہ کس چکر میں جا رہا ہے۔ مجھے بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس مرتبہ تو میں اس چکر میں تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اپنے مال کی ذرا بڑی کھپ لے آؤں۔ میں نے انتخابات بھی مکمل کر لئے تھے لیکن بس پھر میں نے تہذیب ہی کے عالم میں دن گنوا دیے۔ اصل میں مجھے میرے ایک تجربے اطلاع دی تھی کہ آنے والے چند دن ہمارے روٹ کے اسمگلروں کے لئے خطرناک ہیں۔ اس لئے میں آرام سے گھوم پھر کر دن گزار رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق قاسم خان امریکا پہنچ چکا تھا۔ اس بار وہ کوئی خاص کام میرے ذمے نہیں لگایا تھا۔

اس دوران کچھ لوگوں کے توسط سے میری ملاقات کراچی کی ایک پارٹی سے ہوئی جو خاصی بھاری مقدار میں ایک بڑی ملک سے کوکین منگوانا چاہتی تھی (ان دنوں بیرونی کا نام بھی شاید ہی کسی نے سنا ہو۔) حتیٰ کہ ہماری لائن کا بھی کوئی کوئی آدمی ہی اس خونخوار چیز کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیل سے آگاہ تھا۔ جدید ترین نشہ کوکین ہی کا تھا اور ہمارے خطے میں اس کا کادوبار عروج کی طرف مائل تھا تاہم ملک میں اس کی کھپت برائے نام تھی۔ زیادہ تر باہری جاری تھی۔)

مجھے معلوم تھا کہ کوکین کہاں کہاں تیار ہو رہی ہے اور اس کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ ہمیں مل دینے والی کون سی پارٹی یہ کام کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بڑی ملک کی ایک دوا ساز فیکٹری بھی اس کام میں ملوث تھی۔ کوکین تیار کرنا تو اس فیکٹری کا "پارٹ ٹائم بزنس" تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آجکل سب سے زیادہ فائدہ اسی میں تھا۔ پارٹی کی پیشکش بہت ہی پرکشش تھی لیکن ویلیو وہ کراچی میں چاہتے تھے۔ اس میں دسک زیادہ تھا۔ ایک تو میں نے اس لئے ہائی میں بھری دوسرے نہ جانے کیوں کوکین کے کام ہی ہاتھ ڈالنے کو دل ہی نہیں چاہا۔

منشیات میں سے اب تک میں نے صرف شراب اسمگل کی تھی۔ اس کے علاوہ کبھی اندرون ملک یا بیرون ملک سے کسی طرح کی منشیات ابھرے تو اصرار کرنے پر طبیعت آدھ نہیں ہوتی تھی۔ یہ لائن ہی الگ تھی۔ قاسم خان نے بھی بھی تک اس لائن میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا لیکن مجھے معلوم تھا

کی طرف ہاتھ قطعاً نہیں بڑھایا۔ کتنی معمولی سے کچھ فزادہ پرشور انداز میں بچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی لیکن جتنا خوش خاموش ہو گئی۔

تیاری مکمل کر کے میں نے ملازم کو بلایا اور لنگھتا کرتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا "چچا میاں! آتم بہت دن سے گاؤں جانے کی چھٹی مانگ رہے تھے۔ آج سے تم جاہو تو غیر معینہ قدرت کی چھٹی پر گاؤں جاسکتے ہو۔ مجھے جیسے ہی دوبارہ تمہاری ضرورت پڑے گی، تار دے کر یا خط لکھ کر تمہیں بلا دوں گا۔ میں ایک ضروری سفر پر جا رہا ہوں۔ لیکن اگر تم چھٹی کی اس پیشکش سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو دس منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ گھر کی فاضل چالی اپنے پاس رکھنا۔ میرے پاس اپنی چالی موجود ہے۔ بتاؤ دس منٹ میں تیار ہونا منظور ہے؟"

چچا میاں چند لمبے تو حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔ جیسے انہیں یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں یا پھر شاید میری بات ہی فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ چند لمبے بعد انہوں نے چونک کر احمقانہ انداز میں اٹھتے ہوئے سر ہلایا اور قدرے شریکے لہجے میں بولے۔

"وہ... جی... تیار تو میں نے پہلے ہی کی ہوئی ہے... میرا ارادہ تھا کہ اگر آج بھی آپ نے چھٹی نہ دی تو آپ کے نام ایک رقمہ چھوڑ کر دیے ہی چیکے سے کھٹک جاؤں گا۔ خواہ بعد میں آپ مجھے نوکری سے ہی نکال دیں۔"

"بہت خوب! اس عمر میں بھی ماشاء اللہ کافی تحریزی ذہن بلیا ہے آپ نے" میں نے جو فون کے تھے ہاتھ سے کہا۔ "میں ہی ذرا دھڑوازی ہے آپ کی ذرا نہ بندہ کس قاتل ہے؟ چچا میاں ہنک کر آداب نبھائے۔ چچا میاں نے بھی خاص اچھی حس مزاج پائی تھی۔ ان سے بات کر کے اکثر لطف آتا تھا۔ اچانک فون کی کھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ چچا میاں بڑی مستعدی سے فون کی طرف بڑھے اور جب میں نے اچانک ٹانگ بڑھا کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ منہ کے لمبی کرتے کرتے بیچ۔

"گھٹنا سی معاف" وہ ہاتھ جھماڑتے ہوئے بولے "آپ میرے معاملات میں کچھ زیادہ ہی ٹانگ اڑانے لگے ہیں۔" "نئی فون تمہارا نہیں" میرا معاملہ ہے" میں نے تعجب کی "اور اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اب چھٹی دیر تک تم گھر میں موجود ہو" فون میں اٹھاؤ گے۔ اب جانکر فوراً سامان اٹھاؤ اور گاڑی لائے کی طرف دوڑ لگاؤ۔ میں تو جا رہا ہوں میں سوٹ کیس اور بریف کیس اٹھا کر کمرے سے نکل آیا۔ فون کی کھنٹی اس وقت تک خاموش ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ فون کرنے والی سہلی تھی۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ

ایک بار وہ کوئین نیویارک لے جانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ مزید اگتھکات کی توقع ہے۔

خبر کے متن میں خاصی تفصیل موجود تھی لیکن میرے لئے سرخیاں ہی کافی تھیں۔ خبر کے ساتھ قاسم خان کی تصویر بھی موجود تھی۔ خبر میں ڈیٹ لائن نیویارک ہی کی تھی۔ یہ خبر اس اخبار کے اپنے ہی نمائندے نے لکھی تھی جو نیویارک میں مقیم تھا۔

خبر مذکور میں کافی دیر تک سکتے کی ہی کیفیت میں پیشابرا۔ حیرت مجھے بہت سی باتوں پر تھی۔ ایک تو اس بات پر کہ قاسم خان پہلے کچھ عرصے سے مجھے خبر ضروری طور پر مستعد اور منضرب نظر آ رہا تھا لیکن مجھے شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ وہ کس چکر میں ہے اور مظلوم نہیں، اس نے کسی اور کو بھی ان چکروں میں شریک کیا تھا یا نہیں؟ اور اسے خود مال لے جانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ گروہ میں اس مقصد کے لئے دو تین موزوں کارندے موجود تھے؟

ایک مجھے اس بات پر بھی چھت تھی کہ یہ خبر اخبار تک پہنچ گئی تھی اور شائع بھی ہو گئی تھی مگر اس سے پہلے پولیس ذریعہ کو کچھ علم نہیں تھا۔ اگر پولیس پاسی اور سرکاری ادارے کو کوئی اطلاع ہوتی تو کوئی نہ کوئی ضرور قاسم خان کی بیوی سہلی سے رابطہ قائم کر آتا اور سہلی کو اطلاع ہوتی تو مجھے بھی ہو جاتی۔ سہلی کو ذاتی طور پر بھی نیویارک سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے سر پر بھی قح کا اخبار دیکھ کر اچانک ہی بم بجے گا۔

اچانک میں سکتے کی ہی کیفیت سے چوٹا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا "برخوردار الی! جبران ہونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے بلکہ عمر پڑی ہے۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ جب تم جیسا آدمی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائے، جیجی آرام سے بیٹھ کر اکٹھای جبران ہو لے۔ جب تک آؤ تو میرے تب تک تو اس آؤ تو کی حفاظت کے لئے ذہن کو مستعد رکھنا چاہئے اور صرف اسی ایک بہت میں زیادہ توجہ رکھنی چاہئے۔ گو کہ تم نے اپنے آپ کو گم نام، بے شناخت اور حتی الامکان لائق سارا رکھا ہے۔ اس کے باوجود تمہارے لئے بہت سے خطرات کے امکانات موجود ہیں... احتیاط اچھی چیز ہے..." میں نے بڑے سے ذہن لگائی اور مشین کی طرح حرکت میں آ گیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی رقم خفیہ نمکائے سے نکال کر بریف کیس میں رکھی اور وہ تمام چھوٹی موٹی چیزیں بھی جن سے میری شناخت متعین کرنے میں ذرا سی بھی مدد مل سکتی تھی۔ ایک سوٹ کیس میں میں نے چند اچھے اچھے کپڑے اور ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں ڈال لیں۔

میری تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں جب فون کی کھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ایک نظر فون کی طرف دیکھا ضرور مگر اس

خلفہ نہیں۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ یہ خبر پہلے مجھے ملنے کے بجائے اخبار تک کیسے پہنچ گئی؟

”مجھے خود اسی بات پر حیرت ہے“ میں نے کہا ”عام حالات میں تو قاسم خان لندن یا نیویارک میں قیام کے دوران دوسرے تیسرے دن یہاں فون کرتا رہتا تھا۔ کیا نیویارک کی پولیس نے اسے گرفتار کرنے کے بعد کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے یا اپنے گھر والوں سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی ہوگی؟ وہ لوگ تو بہت مذہب اور دنیا میں انسانی حقوق کے بہت بڑے دعوے دار ہیں۔“

”خیر۔۔۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی ”تم آجائے، جیسی تفصیل سے بات کریں گے۔“

”میں آپ سے لان پر ملنا پسند کروں گا“ میں نے کہا۔ اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا لیکن اس بار اس کی ہنسی میں بے بسی کی سی پگھل بھی تھی ”جیسی حد کر دی تم نے تو“ یہ کہنے ہوئے اس نے شاید پیشانی پر ہاتھ بھی مارا تھا ”اب تو تم مجھے احتیاط پسند کے بجائے ڈر پوک لگتے لگے ہو۔ میں جہ کہہ رہی ہوں کہ فی الحال خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ اور یہ فون پر بھی اتنا محتاط ہونے اور دبی آواز میں گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ فون ٹیپ نہیں ہوتا۔ یہ محفوظ نمبر ہے اور آئندہ بھی محفوظ ہی رہے گا۔ البتہ ہمارا جو اسی گھر کا دو سرا فون نمبر ہے اس کے بارے میں آئندہ کے لئے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ فی الحال تو وہ بھی محفوظ ہے۔“

”لیکن ہاں تو کبھی کبھی شبہ کا اظہار کرتے تھے“ میں نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

”ہاں کو کیا معلوم۔ قاسم خان تو فراخ دہ۔۔۔“ ایک لخت اسے گویا عطا ہونے کا خیال آیا اور اس نے جملہ احوال اجود دیا لیکن میں اس کے لیے کی تبدیلی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جیسے میری توجہ جتانے کے لئے جلدی سے بولی ”تو پھر آ رہے ہو یا تم؟“ اور وہاں۔۔۔ اگر تم غیر ضروری احتیاط پسندی پر مصر ہی ہو تو میں تمہیں لائن پر ہی ملوں گی۔ دیکھو تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کردہ کے باقی سب لوگ مجھ سے مل کر اور نئی ہدایات ملے کر جا چکی ہیں۔“

اس کا انداز گفتگو مجھے کچھ اجنبی، اجنبی سا لگ رہا تھا۔ برسر حال میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ چند لمحے میں صورت حال پر غور کرنا اور پلا فریوٹس سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں نے وہیں چھوڑ دی۔ ٹیکسی میں میں قاسم خان کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ چند ہی منٹ کا فاصلہ تھا۔ ٹیکسی میں سے نکلی کے موڑ پر ہی چھوڑ دی اور وہاں سے بائیں طرف دھڑک دھڑک کر ٹیکسی میں داخل ہوا جہرہ در حقیقت مجھے اس ٹیکسی سے آگے کہیں نہ لگتا تھا۔ گاڑی کوئی ٹھکوک صورت نظر نہیں آ رہی تھی

آپ وہ فون نہیں کرتے گی، خود آئے گی اور اسے میرے گھر تک پہنچنے میں چند ہی منٹ لگتے۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں گھر سے نکل آیا۔ میں زیادہ دور نہیں گیا۔ گلی پر ہی میں درمیانے درجے کا ایک مشوکل ہوٹل موجود تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے فرضی نام سے ایک کمرہ لیا اور آرام سے جا کر کمرے میں لیٹ گیا۔ ایک دینر کے ہاتھ میں نے تمام اخبارات اور کچھ رسائل منگوا لیے۔ اخبارات کو میں نے اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ خبر صرف وہی بڑے اخبارات میں موجود تھی۔ ایک وہی جو میں گھر پر دیکھ چکا تھا۔ دوسرا انگریزی کا ایک بڑا اخبار تھا۔ اس میں قاسم خان کی تصویر نہیں تھی اور خبر بھی مختصر تھی۔

اخبارات اور رسالوں کی ورق گردانی میں میں نے کافی وقت صرف کیا۔ پھر اطمینان سے ناشتا کیا۔ اس کے بعد میں نے قاسم خان کے گھر کا نمبر آخر آخر کو دیا۔ نمبر فوراً ہی مل گیا اور دوسری طرف سے منطقی کی بے تابانہ آواز سنائی دی۔ وہ جیسے فون کی منتھری تھی۔ کسی بھی فون کی۔

میں نے اپنا نام بتائے بغیر دیکھی آواز میں کہا ”آپ نے اخبار دیکھ لیا؟“

”آف۔۔۔ خدا کی پناہ!“ اس نے میرے سوال کا جواب دے بغیر اطمینان کی سانس ل ”تم کہاں تھے جیسی؟ میں تمہیں فون کر کے تکلیف نہ تھی۔ پھر خود گئی مگر تمہارے ہاں تھلا ہوا تھا۔ تم پہلے ہی سے کہیں غائب تھے یا غیر پڑھ کر غائب ہوئے ہو؟“ ”جو بتی چاہے“ سمجھ لیجئے ”میں نے ہنگام سے قہقہے کے ساتھ جہم سا جواب دیا ”احتیاط تو برسر حال انسان پر لازم ہے نا۔ ہم جیسے انسانوں پر۔۔۔“

”الحق تو تم“ اس نے ممانعت سے کہا تاہم اس کے لیے میں اضطراب کی بھی آمیزش تھی۔ یہ ایک ہی اس کے انداز میں بے تکلفی آجی تھی۔ اس لیے میں اس نے کبھی مجھ کی بات نہیں کی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”فوری طور پر گھر آکر مجھ سے ملو۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ہم وقت ضائع کرنے کے مشغول نہیں ہو سکتے۔“

”گھر تو میں نہیں آ سکتا میڈم!“ میں نے کہا ”احتیاط پسندی کا تقاضا یہاں ہے کہ میں آپ کے گھر کے پاس بھی نہ پہنچوں۔“

”ارے۔۔۔ جیسی حیرت ہے۔۔۔“ اس نے منظرانہ قہقہہ لگایا ”تم تو کچھ زیادہ ہی ڈر گئے ہو۔ تم اس لائن میں اب کوئی نئے آدمی تو نہیں رہے۔ تمام نشیب و فراز کا تجھیں پتا ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ شہر میں ہمارا بھی تو وزارت اثر رسوخ ہے۔ قاسم خان بڑا اہم آدمی تھا۔ ہم پر کوئی ایسی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑی۔ تم بے فکر ہو کر آؤ۔ کم از کم فی الحال کوئی

کے بارے میں زبان نہ کھولنے والی بڑا ہنگامی تھی مجھے اس کا لہجہ اور بھی برا لگا۔ جیسا تاروں کے بارے میں ان کا طرز عمل کیا تھا۔ میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ لیکن مجھے حیرت یہ تھی کہ آج سلی جج کے بیٹے میں بات کیوں کر رہی تھی۔ وہ قاسم خان کی بات کرتے وقت اپنے آپ کو بھی اس کے ساتھ شامل کر رہی تھی بلکہ آج تک صورت یہ رہی تھی کہ وہ کبھی کسی میننگ میں ایک لفظ بھی نہیں بولتی تھی۔ لافعلی سے ایک طرف بیٹھی رہتی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تمہارے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے اخبار میں خبر دیکھنے ہی یوں محسوس کیا ہے ہمارے سروں پر آسمان گر رہا ہے یا زمین پھٹ پڑی ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے کام یوں نہیں ہوتے۔" وہ سب تو درست ہے "میں نے پلوید لے ہوئے کہا۔" مگر میری احتیاط پسندی میں دراصل زیادہ دخل میری چھٹی حس کا ہے۔ میری چھٹی حس مجھے کسی طوفان کی آمد کا پادارے دہی ہے۔ میں ہوا میں کسی بہت بڑے خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی بہت بڑی عمارت قطعی غیر متوقع طور پر زمین بوس ہونے والی ہو۔"

"خان سہنس" وہ سگریٹ کی راگ بھارتے ہوئے حمارت سے بولی "مجھے یہ انسانوی اور قلمی قسم کے ڈانپ لاگ ایتھے نہیں لگتے۔ تم ایتھے بھلے پر کیلک آؤی ہو۔ یہ مجھ کی باتیں چھوڑ دو۔"

"قاسم خان نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا کہ ہماری لائن میں چھٹی حس بہت اہم چیز ہے "میں نے کہا۔

"قاسم خان بے چارہ خبر مجھے کیا بتائے گا؟" اس نے ایک

طویل کش لیا اور گھواں پیری سمت میں چھوڑتے ہوئے

میری آنکھوں میں تھانکے غلی۔ ایک لمحے کے وقف کے بعد

وہ گویا دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی "میرا خیال

ہے، ہمیں کھل کر گفتگو کرنی چاہئے۔ تم بھی کچھ ابھن وہ

نظر آ رہے ہو اور میں بھی بات کرتے ہوئے کچھ دشواری

محسوس کر رہی ہوں۔ تم شاید اب بھی نہیں سمجھ سکتے ہو کہ یہ

سارا کاروبار درحقیقت میرے ہی دم قدم سے چل رہا ہے۔

ہمارے سارے سیٹ اپ کے پیچھے میرا ہی ذہن کام کر رہا ہے

میں نے ہی قاسم خان کو قاسم خان بنایا ہے۔ ورنہ وہ کیا تھا؟

ایک معمولی درجے کا آپکا۔۔۔ جو کبھی کبھار خود اہانت بل اپنے

سوٹ کیسوں وغیرہ کے خفیہ خانوں میں چھپا کر کسی ملک میں

لے جاتا تھا اور وہ بھی اس وقت جب دنیا کے خاص خاص

ایئر پورٹس پر ممنوع چیزوں کی نشاندہی کرنے والی جدید ترین

مشینیں نصب نہیں ہوئی تھیں۔ قسمت نے جب ہم

دونوں کو ملا دیا تو میں نے اسے آگے بڑھنا سکھایا اور رفتہ رفتہ

اس مقام پر پہنچ گیا جس میں چند دن پہلے تک تم اسے دیکھتے رہے

جس کے بارے میں میں سوچ سکتا کہ شاید وہ قاسم خان کی کوئی کی غمرانی کر رہی ہے بلکہ کئی میں سرے سے کوئی تھانی نہیں۔ اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد میں اچانک گیت کی طرف مڑ گیا۔ چوکی دار اس وقت بھی موجود تھا اور معمول سے کچھ زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گیت کھول دیا۔ سلی واقعی لانا پر موجود تھی۔ اس کے ارد گرد چار پانچ لانا پیئرز خلا پڑی تھیں اور سامنے تہائی پر کالی پات اور چند مک رکے تھے۔ سلی بیٹھ کی طرح حسین، پُر وقار، خوش لباس اور پُر سکون نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ غیر ملکی سگریٹوں کا بڑا سائیکٹ بھی اس کے سامنے پڑا تھا۔ گویا تبدیلی اس کے طرز تفکر میں ہی نہیں آئی تھی، انداز و اطوار میں بھی آئی تھی۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ تبدیلی اچانک آئی تھی یا مجھے علم ہی اچانک ہوا تھا۔

میں قریب پہنچا تو اس نے بڑے سرسری سے انداز میں میری طرف دیکھا اور سامنے بیٹھے کا اشارہ کیا۔

"کچھ ہو گئے؟" اس نے پوچھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ

اس کی آواز میں شمار کا بوجھل پن تھا اور اس کی آنکھیں بھی

کوئی محمود سافسانہ ساری تھیں۔ میرے ذہن میں جو خیال آیا

اسے میں نے فوراً ہٹک دیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ قاسم خان

کی موجودگی میں یہاں جب میننگز ہوتی تھیں تو درگس وغیرہ

سرو نہیں کی جاتی تھیں۔ قاسم خان نے مجھے بتایا تھا کہ سلی

گھر میں شراب وغیرہ کی موجودگی برواشت نہیں کرتی۔ اور آج

خود سلی کی آنکھوں سے شمار چٹک رہا تھا، لہجے میں بوجھل

پن تھا۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا؟

میں نے فنی میں سر ہلادیا "تب وہ گویا یکدم اصل موضوع

پر آتے ہوئے بولی "تم بالکل گم ہو۔ انداز نے اور اس

طرح یکدم روپوش ہو جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم سے

تمہارے تعلق کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جب تک

قاسم خان خود یا میں تمہارے بارے میں زبان نہ کھولوں تب

تک تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ اور ہم سے تمہیں

اس قسم کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ ہمارے جسموں کا اگر کوئی

ریشر ڈیٹ الگ کر دے تب بھی ہم اپنے راز میں اہل سکتے۔

اپنے جاں نثاروں کو کسی مصیبت میں نہیں ڈال سکتے اور یہی

توقع ہم اپنے جاں نثاروں سے رکھتے ہیں۔"

اس نے جب چھوٹی ہی مجھے گدھا کھا تھا تو اس کے

لہجے میں بڑا لانا اور اہانت تھی "اس کے باوجود جانے کیوں

مجھے اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔ سلی جیسی حسین اور پُر کشش

عورت اہانت سے اگر کسی کو کالیاں بھی دیتی تو شاید اسے بھلی

نکٹیں مگر مجھے پہلی بار اس کا لہجہ چھ رہا تھا۔ پھر جب اس نے یہ

جسموں کا ریشر ڈیٹ الگ کر دینے کے باوجود بھی جاں نثاروں

انجینیاں کتنی سخت ہیں۔ اس بار بھی اس نے مجھے اپنے پروگرام کی ہوا تک نہیں گنتے دی اور پلاٹر چکڑا لیا۔ وہ جوتے ہیں تاکہ "سودن چور کے ایک دن شاہ کا" وہ ایک طویل سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

"چیلے..... یہ سب کچھ تو اب ہو چکا۔" میں نے سنبھل کر کہا۔ "سوال یہ ہے کہ اب آپ کیا کریں گی؟"

"سب سے پہلے تو میں یہ کر رہی ہوں کہ جس قدر جا رہا بھی ممکن ہو سکامیں امریکا روانہ ہو جاؤں گی۔" وہ نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "ویسے اور کلٹ کے لئے میں نے آدمی دوڑا دیے ہیں۔ آج شام تک پہنچل جائے گا۔ نیویارک پہنچ کر مجھے قاسم خان کے لئے دیکھوں وغیرہ کا بندوبست کرنا ہو گا اور اگر کوئی سفارش لاسکی، کوئی اثر و رسوخ کام آسکا تو اس کے لئے بھی کوشش کروں گی کہ وہ اس کی امید نہیں ہے۔ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ہر حال قاسم خان لمبے عرصے کے لئے اندر ہو جائے گا۔ اس مسئلے میں ہمیں کسی خوش فہمی میں گرفتار نہیں رہنا چاہئے۔ قاسم خان کے کہیں کا فیصلہ ہو جانے کے بعد میں واپس آکر کام خود سنبھال لوں گی۔ یہی پروہ رہنے کے بجائے میں تم لوگوں کے سامنے آ جاؤں گی۔ کچھ عرصہ تم لوگوں کو غیر فعال رہنا ہو گا۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو ہم دوبارہ اپنے دھندے سے لگ جائیں گے۔"

"میں معذرت چاہوں گا۔ شاید میں آپ کے لئے کام نہ کر پاؤں" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیا...؟" اس نے بری طرح چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے سر پر جیسے کوئی بم پھٹ چکا تھا۔

میں نے فیصلہ کن لمحے میں اپنے الفاظ دہرائے تو ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں سفلی جھلک آئی۔ نہایت غصے غصے لمحے میں وہ بولی "تمہیں معلوم ہے کہ ہم جیسے لوگوں سے قطع تعلق کرنا کوئی آسان کام نہیں؟" "مجھے معلوم ہے۔ اگر مجھے اس میں کوئی دشواری پیش آئی تو میں اسے برداشت کروں گا" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

کسی مصلحت کے تحت اس نے گویا ایک سخت چیز ابد لئے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں میں سفلی کی لہر پکایک مددوم ہو گئی اور اس کی جگہ دل فریب عنایتوں کا رنگ جھلک آیا۔ بڑے شہر میں لمبے لمبے وہ بولی "میرا خیال تھا کہ قاسم خان کے بجائے تمہیں براہ راست میرے لئے کام کر کے زیادہ خوشی ہوگی۔ آخر کیوں تم نے اپنا ایک ایسا فیصلہ کر لیا؟"

"بات خوشی اور دکھ کی نہیں ہے" میں نے دھتے لمحے میں کہا "بات اعتماد اور دل کی گواہی کی ہے۔ تاکہ اب تک سارا کام آپ ہی کی حکمت عملی سے چل رہا تھا اور بلاشبہ آپ نہایت ہی ذہین اور بصلاحیت خاتون ہیں جس کا سب سے بڑا

میں دم بخود سہلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت جو میرے خیال میں بے راہروی کی زندگی چھوڑ کر ایک بد قماش کا سارا تھول کر بچی تھی اور اپنے حقد پر قائم تھا۔ یہاں تک کہ چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ میں اس سے اس کے کھوئی حسن کے علاوہ اس کی ذات میں بلند و بالا چٹائوں جیسی منہ بولی دیکھ کر بھی متاثر ہوا تھا مگر آج یہ قصور پاش پاش ہو گیا تھا۔ وہ ایک سخت ہی ایک نئے روپ میں میرے سامنے آئی تھی۔ غیر معمولی عورت وہ اب بھی تھی مگر کچھ اور طرح کی۔ میں اب بھی اپنے آپ کو اس سے مرعوب محسوس کر رہا تھا مگر کسی اور انداز میں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میرے نقطہ نظر سے قاسم خان بالکل چند قوی ہے۔ جب تک وہ لفظ بہ لفظ میری ولایت پر عمل کرتا رہا، کامیاب رہا۔ پہلے پھنسا رہا۔ روز بروز نفی کرتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے شوق چرایا کہ اسے اپنے طور پر بھی فیصلے کرنے اور انتظامات چلانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے اور اس نے اس کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے بے روپ غلطیوں کیلین میں کسی نہ کسی طرح معاملات کو سنبھالتی رہی۔ کہیں میری مثل کام آئی، کہیں میرے تجربات، کہیں میرے حسن کا جادو چل گیا اور کہیں میری معاملہ سازی کی بدولت بلا ٹل گئی۔ کہیں وہ یہ کام آیا اور کہیں روپے کو استعمال کرنے کا سلیقہ۔ غرضیکہ بات ٹھنی نہیں... مگر بجائے اس کے کہ قاسم خان اپنی غلطیوں سے سبق لیتا، اس کا اعتقاد احمقانہ ہوتا چلا گیا۔ سیٹھ واحد سے راہ رو کم پیدا کرنے سے میں نے اسے منع کیا تھا مگر معلوم نہیں کیا وہ سیٹھ واحد کا کام سننے ہی ریشہ غلطی ہو جا رہا تھا۔ وہ اس بات کے لئے مزا جاتا تھا کہ کبھی اس کا شکر بھی سیٹھ واحد کے دوستوں میں ہو۔ شاید سیٹھ واحد ہی اس کا انڈیل تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ بڑی پچھلی خواہ تھی ہی بدد نظر آئے تھے بلکہ خود بھرتی پچھلی کو کھٹا جاتی ہے یا پھر دینے ہی بڑی پچھلی کے ساتھ کسی رگڑے میں ادا کی جاتی ہے مگر اس نے میری بات نہ مانی۔ پہلے تمہیں سمجھا، پھر خود اس نے لے لئے جئے لگا۔ لیکن کی پچھلی کھپ لے کر وہ گدھوں کی طرح منہ اٹھا کر خود ہی چل رہا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ میں نہیں لیکن جب کامیاب نہ آتا تو میرے سامنے اس نے خوب جتنی بگھاری۔ اس کا خیال تھا کہ باہر مل لے جاتا تو بالکل آسان ہے کیونکہ وہاں سنان پر قصور اہمیت احمق کیا جاتا ہے۔ انسان کا ایک ایک ٹول کر اور اس کے سنان کی سلائیوں تک آدھڑ کر نہیں دیکھی ہتھی۔ ویسے بھی وہ ماسی میں چھوٹی سونی چترس لے کر بہت سے ممالک کے مابین پھرتی ہے۔ یہ خیر دعایت کر رہا تھا اس لئے اس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ لیکن شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ مشیات کے سلسلے میں بیشتر ممالک کی پولیس اور دیگر

اندازوں کی روشنی میں بات مت کرو۔ مجھ سے دو اور دو چار کی طرح ٹھوس بات کرو۔“

”میں جو بھی بات کر رہا ہوں وہ دو اور دو چار کی طرح ٹھوس ہی ہے خواہ اس کے پیچھے میرے واسطے کام کر رہے ہوں یا اندازے“ میں نے بے تپے لہجے میں کہا۔

وہ پکلیں جھکے بغیر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ اندری اندر سچ و آداب نگاہی ہے لیکن بظاہر وہ جھیل کی طرح پرسکون تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس عورت کے ہاتھ میں ابھی بڑے دناسل اور بڑی طاقت باقی ہے۔ اسے یقیناً اس بات پر برا فیش آ رہا ہو گا کہ مجھ جیسے نو آموز اور انہی کے پروردہ نوجوان پر اس کا گولی دار نہیں چل رہا تھا۔ میں نہ تو اس کے لیے میں چھپی ہوئی دھمکی سے مرعوب ہوا تھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی خوف نوازشات کے وعدے نے میرا دل بھلایا تھا۔

عام حالات میں شاید میں اتنی غیر معمولی عورت کی آنکھوں میں اپنے لئے مرد محبت کی جھلک دیکھ کر خوشی سے پھولانے سا مانگین جب سے میں راجیلہ کی محبت میں گرفتار ہوا تھا اور کراچی سے واپس آیا تھا تب سے اس کا تصور گویا مستقل طور پر میری توجہ سوچوں پر سے دار بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کسی اور سے ناتا جوڑنے کو اب گویا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کسی کی طرف التفات طلب نہ تھی۔ دیکھنا جرم سامحوس ہونے لگا تھا۔ سلی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ اس کا فون ہے۔ سلی سگریٹ چسک کر بے تابی سے اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔

اس کی واپسی خاصی دیر بعد ہوئی۔ اس دوران میں انتظار ہو چکا تھا کہ ملازم سے چائے منگوا کر پی چکا تھا۔ سلی آکر خاموشی سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے لئے چائے کا ایک کپ تیار کیا۔ اس دوران میں نے اس کے ہاتھ میں بت ہی خفیف سی لرزش محسوس کی۔ بظاہر وہ پہلے ہی کی طرح پرسکون تھی لیکن میں نے اس کے انداز میں ایک تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چند لمحوں پہلے جو چنگاری سی روشن تھی وہ گویا یکایک ہی بجھ چکی تھی۔ وہ چائے کی چند چسکیاں لے چکی تو میں نے پوچھا ”فون امریکا سے تھا؟“

”نہیں“ وہ دھیمے لہجے میں بولی ”سینہ واحد کا فون تھا اور وہ سیں لاہور سے ہی پل رہا تھا۔“

”سینہ واحد کا!“ میں نے قدرے حیرت سے کہا ”شاید اس نے اخبار میں خبر دیکھی ہوگی۔“ اخبار بدردی کر رہا ہوگا۔ ”اخبار بدردی“ وہ سچ سے انداز میں ہنس دی ”ابلی اہم کون سی دنیا کے باشندے ہو؟ بعض اوقات تو تم مجھے اپنی لان کے آوی نہ نہیں گتے۔ سینہ واحد کے پاس اتنا وقت نہیں

ثبوت یہ ہے کہ اب تک کوئی آپ کے اصل روپ سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔ اور اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی شخصیت کے کتنے رنگ ہیں... ہانا کہ قاسم خان کی کامیابیاں آپ ہی کی ذہانت کی رہیں منت رہی ہوں کی لیکن میرا خیال ہے اس میں کچھ نہ کچھ دخل تو اس کے مقدر کا بھی رہا ہو گا۔ میں مقدر کا بت ہی قائل ہوں میڈم...!“

”یہ مجھے میڈم وغیرہ جیسے ہماری بھرم الثبات سے مخاطب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی ”تم سیدھے سادے طریقے سے مجھے سلی کی کہ کر بات کر سکتے ہو۔“

”بھرم... تو میں یہ کہہ رہا تھا سلی کہ میں مقدر کا بت ہی قائل ہوں“ میں نے سلسلہ کلام جوڑا ”قاسم خان آپ کی نظر میں کتابی احمق سی لیکن ممکن ہے“ اب تک اس کا مقدر اس کا ساتھ دیتا رہا ہو۔ اب جبکہ وہ ہم سے بہت دور ہے اور شاید اس کی قدر گردش میں آچکی ہے تو جانے کیوں مجھے وہم ہو رہا ہے کہ اب بات نہیں ہے کی۔ میرا کچھ دل نہیں مان رہا اب گردہ میں شامل رہنے کو۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے غیر منطقی آدمی ہو“ اس کی آنکھوں میں سرد مہری سی آگئی۔ مجھے واقعی بڑی حیرت تھی کہ میں آج تک اس عورت کو دریافت نہیں کر پایا تھا۔ میں جب سے اسے قاسم خان کی بیوی کے روپ میں دیکھ رہا تھا، وہ ایک سلاوی پسند، قول بھالنے والی اور بڑی وفا شعار قسم کی عورت تھی جسے دیکھ کر گمان بھی نہیں مگرز تھا کہ وہ کبھی بیروت کے کسی کلب میں ڈانسر تھی۔ اس کی شخصیت پر اس کے ماضی کی محسوس ہی پوچھنا جس بھی تو نظر نہیں آتی تھی، سوئے اس کے کہ پختہ العمر ہونے کے باوجود اس کا جسم سڈول تھا اور خدوخال کی رعنائی دو دکھی برقرار تھی۔ اب میں اسے دیکھ رہا تھا تو یہ یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ یہ وہی عورت تھی جو اپنے ماضی کو کج کر سلاوی پسند، قول بھالنے والی اور وفا شعار بیوی بنی ہوئی تھی۔

مجی بات تو یہ ہے کہ مجھے دل ہی دل میں اس عورت سے ہلکا سا خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ پل پل رنگ بدلنے والی وہ عورت اپنے اندر جانے کتنے زہر چھپائے بیٹھی تھی لیکن میں بھی اچانک ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر مجھے زندگی کے میدان میں کچھ اور تیزی سے آگے بڑھنا ہے تو مجھے اس عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہوگی۔ اپنی آگ اور خود بخار حیثیت بنانے کا یہ بڑا عمدہ موقع تھا۔ میں اب قاسم خان جیسے خود غرض آدمی اور سلی جیسی ناقابل اعتبار عورت کی گلوئی سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا اور اس سے اجابا موقع مجھے شاید بھر کبھی نہ ملتا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”مجھ سے واہموں اور

دیوتاؤں کے شہر نیپال میں بسنے والے

ایک درندے کی پر اسرار داستان

درندہ

یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے جس کا

قارئین کو برسوں سے انتظار تھا



فون 7668958

ہوتا کہ وہ اہل ہندوؤں کے اظہار میں خالص کرتا پھرے۔
اس سے بات کر کے مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے
جس نے ایک لمحے کے لئے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا کہ
کیسے تندرست رہتے ہیں تو نہیں ہیں؟
میں خنجر انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ چائے کی مزید چند چٹکیاں لے کر کپ میز پر رکھتے
ہوئے بولی "سیٹھ دادہ دراصل اپنی رقم مانگ رہا تھا۔"
"رقم... کیسی رقم؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی "یہ سن کر شاید تمہیں
بھی حیرت ہو کہ قاسم خان نے کوئین کی یہ کپ... سیٹھ دادہ
کے توسط سے حاصل کی تھی جو نیو مارک انٹرنیٹ پر پکڑی گئی
ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کپ کریڈٹ پر تھی۔"
"کریڈٹ پر...؟" میں ایک بار پھر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
"لیکن تھری لائن میں تو کریڈٹ نہیں چلتا۔"

"ہاں... یہی اس معاملے کا مزید حتمی حلف نامہ پہلو ہے۔"
سلی نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کے پتے سے ٹیک
لگالی "قاسم خان نے اس سے پارٹنرشپ کی بنیاد پر یہ کپ
لی۔ جس کی رو سے معاہدہ کچھ اس قسم کا بننا تھا کہ وہ بین الاقوامی
مارکیٹ میں اس کپ کی قیمت فروخت میں حصے دار ہوں
گے اور قاسم خان ہر حال میں اس کا آدھا حصہ سیٹھ دادہ کو ادا
کرنے کا پابند ہو گا۔ گویا اس معاملے میں قاسم خان نے کوئی
ایک حلفت نہیں بلکہ حلفت در حلفت کی ہے۔ اس حساب
سے کپ کی قیمت دو کروڑ سے اوپر ہے۔ یعنی قاسم خان
سیٹھ دادہ کو ایک کروڑ روپیہ ادا کرنے کا پابند ہے۔ اب کوئی
قاسم خان سے پوچھتے کہ گھر! تمہیں اس قسم کی پارٹنر
شپ میں کوئین لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم کوئی اتنے
لگے کروڑ سے نہیں تھے کہ ملکی مارکیٹ کے ریت سے کوئین
فرید کر لے جاسکتے۔ قاسم خان زیادہ سے زیادہ پانچ سات لاکھ
روپیہ خرچ کر کے اتنا ہی ملے جاسکتا تھا۔ پکڑا جاتا تو نقصان
پانچ سات لاکھ کا ہی ہوتا اور وہ ذاتی نقصان ہوتا۔ ہم کسی کو
جواب دے تو نہ ہوتے۔ سیٹھ دادہ کو بھی اس پر بہت فائدہ اُڑا
ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اس نے قاسم خان کو مل لے جانے کا

مکمل ترین طریقہ بھی بتایا تھا مگر قاسم خان نے معلوم نہیں
لیتا تھی تو طراری ثابت کرنے کے لئے پھر صرف چاہیے
تھا کہ ہزار روپیہ بچانے کے لئے خود مل لے جانے کی کوشش
کی اور پکڑا گیا۔ اس نے ایک تخت ہی بنایا کھیل کا ڈبّا، کتیا ہی
نہوڑی۔ اب ہزار ایک کروڑ روپیہ سیٹھ دادہ کو دے کر ہماری گرفت
بانے کی باتیں؟

"کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اسے ایک کروڑ ہی دیا جائے۔"
میں نے کہا "اسے بھی معلوم ہے کہ مل بھی پکڑا گیا ہے اور

قاسم خان بھی۔ ظاہر ہے ہمیں بہت بڑے بحران کا سامنا ہے
وہ ملکی مارکیٹ ریت سے ہم سے پانچ سات لاکھ لے لے!
سلی کی آنکھوں میں تھکن سی جھلک آئی۔ ایک بار پھر
اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کوئی پتہ
اس کے سامنے ہے سوچا ہی نہیں کہ جارہا ہو۔ کچھ باتیں
واقعی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں اور کچھ میں جان بوجھ
کر بھی پتہ نہ ہوا تھا۔

"تمہیں اچھا ہللا معلوم ہے لی کہ اسٹورڈ کے اصول
کتنے سخت ہوتے ہیں "بالآخر وہ بولی "عام لوگ نہایت کٹھنوں
پر اقرار دیتے اور معاہدے طے کرتے ہیں "وکیلوں اور گواہوں
کی موجودگی میں سب کچھ لکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بعد میں
جب بھی انہیں موقع ملتا ہے یا وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں
تو ان معاہدوں سے منکر ہو جاتے ہیں اور ان کے معاملات
برسوں عدالتوں میں لگے رہتے ہیں لیکن ہم لوگوں میں ایسا
نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ زبانی ہوتا ہے لیکن بس جو طے ہو گیا
سو ہو گیا۔ اس سے منکر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں کسی کی نیت میں فرق آیا وہیں دو فریقوں میں ٹھن گئی۔
کتنی ہی باتیں خالص ہوتی ہیں اور بلاخر ایک پارٹی چمڑی ہوتی
دشمنی کسی ایک فریق کی تباہی اور کبھی کبھی تو دونوں فریقوں کی
تباہی پر ختم ہوتی ہے... اور ہمارا معاملہ تو سیٹھ دادہ سے ہے۔
سیٹھ دادہ ان لوگوں میں سے نہیں کہ جن کے ساتھ کئے گئے
معاملے سے منکر ہونے کے بعد کوئی اس ملک میں رہ سکے
بلکہ اس سے بد معاملگی کرے تو کسی اور ملک میں بھی
خیر و رعایت سے رہنا ممکن نہیں۔"

پانچ گوار لیے میں کہا۔

”بھئی تو نہیں لیکن آدمی کو گھنایا ہے دیر تو نہیں لگتی“ وہ ملاحت سے بولی۔

”میں گروہ میں بیٹھ جوں مردوں کی طرح رہا ہوں۔ گروہ سے باہر بھی جوں مردوں ہی کی طرح رہوں گا“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”کرو گے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی مجھے خود کچھ نہیں معلوم۔ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ شاید میں کراچی چلا جاؤں گا“ میں نے کہا۔

”سرمحل... جب تک میں ہوں تب تک رابطہ کی کیا صورت رہے گی؟“ اس نے پوچھا۔

”میں خود رابطہ قائم کر آ رہوں گا“ میں نے کہا۔

”دیے تم تو خواہ خواہ گھبرا کر گھر چھوڑ گئے ہو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ تمہیں کوئی پکڑا بھی چاہے تب بھی تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ خطرہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو سب سے زیادہ مجھے ہو سکتا ہے۔ تم لوگ تو صرف اسی وقت خطرے میں ہوتے ہو جب مل تمہارے پاس ہوتا ہے۔

رنگے ہاتھوں پڑے جانے کی صورت میں ہی تمہیں کوئی سنگین سزا مل سکتی ہے۔“

”خیر... یہ میرے مسائل ہیں“ میں اٹھتے ہوئے بولا۔

”میں چلوں...“

”خدا حافظ“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے بغیر بولی۔

گیت کے قریب پہنچ کر میں نے سر کر دیکھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ چوکی دار نے گیت گھول دیا تھا۔ میں تیزی سے سڑا اور باہر آگیا۔ دزدیدہ سی نظروں سے میں نے ایک بار کھوئی کے خوبصورت دروازے پر سرور دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے دل میں لگی

ہی کک محسوس ہوئی۔ کچھ زیادہ مدت نہیں جی گئی کہ میں گاڑی کی پچھلی نشست پر اشرف خان کی لاش لئے اس گھر کے دروازے پر پہنچا تھا۔

اس گھر کے وسیلے سے مجھے بہت کچھ ملا تھا۔ پلہ، تجربہ، دولت، خود اعتمادی اور باخ نظری... بہت جلد ہی میں اس گھر سے غائب ہو کر جا رہا تھا لیکن مجھے اپنے اس فیصلے پر زیادہ پچھتاوا نہیں تھا۔ میرے دل نے کہا تھا کہ مجھے جلد از جلد قاسم خان سے جان چھڑا لینی چاہئے، ورنہ میں رگڑا جاؤں گا۔ میں سرمحل

دل کی آواز پر لبیک کہنا چاہتا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نہایت پر امن انداز میں گروہ سے الگ ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ شہ رخ کا انجام مجھے یاد تھا۔ اس نے تو خیر ہیرا پھیری کر کے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے معلوم

تھا کہ دیانند آدمی سے کام کرنے والوں کے لئے بھی قاسم خان یا

”تو چھوڑ سرائی پتھر آزماد“ میں نے قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری جیش ابرہہ سے تو بڑے بڑے پتھر لیے لوں گے قتل کھل سکتے ہیں۔“

”خاک کھل سکتے ہیں“ وہ میری بات کا برا مانے بغیر چپکلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”میری مریں نگاہیں تم جیسے نو جوان اور نو آسوز پر تو کوئی اثر کر نہیں سکیں“ سیٹھ واحد جیسے گھاگ آدمی کا دل کیا موم کر رہی گی۔“

”میری بات اور ہے“ میں نے کہا ”میں تو کسی سے وفا کا پیار نہیں رہا ہوں“ ورنہ شاید تمہارے قدموں میں لوٹ رہا ہوتا۔“

”سیٹھ واحد کی بھی بات اور ہے“ وہ دھتکے لہجے میں بولی۔ ”تم اسے نہیں جانتے۔ میں جانتی ہوں۔ وہ جب ہانگ کانگ کے قریب نیلے پانیوں میں جھاگ اڑائی موٹر بوٹ میں لینا ہوتا ہے یا پلورڈیہ اسکے کسی ساحل مقام پر دھوپ سینک رہا ہوتا ہے تو اس کے دائیں بائیں نہ جانے کس کس رنگ و نسل کی اور کتنی ہی لڑکیاں موجود ہوتی ہیں۔ وہ شمول سا انسان اگر اتنی آسانی سے نظروں کے تیروں سے گھاگل ہونے لگتا تو آج وہ سیٹھ واحد نہیں، کوئی چڑھتا ہوتا“ پھر یک لخت جیسے سلی کو کچھ یاد آگیا۔ ”یہ جو تم ابھی وفا کا پیاں بھانے کی بات کر رہے تھے“ یہ کیا قصہ ہے؟ کیا تم بھی ایسے کسی سنگین مرض میں مبتلا ہو چکے ہو؟“

”ان باتوں کو چھوڑو۔ اس وقت ہم زیادہ ضروری باتیں کر رہے ہیں“ میں نے کہا۔

”چھوڑو... اب کیا باتیں رہ گئی ہیں“ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی ”تم نے تو بات ہی ختم کر دی۔ بہت غلط وقت پر ساتھ چھوڑ رہے ہو تم۔“ اگر قاسم خان بری ہو کر آگیا تو تمہیں قتل کر اؤے گا۔ یہ نیک کام میں بھی کر سکتی ہوں لیکن میں اس آس پر تمہیں چھوڑ رہی ہوں کہ شاید کچھ عرصے بعد تم اپنا ارادہ بدل دو۔“

”جہاں تک جان کے خوف کا تعلق ہے تو تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ جب انسان یہ خوف دل سے نکال دیتا ہے تبھی اس لاش میں آتا ہے“ میں نے کہا ”اور جہاں تک ارادہ تبدیل کرنے کا سوال ہے تو میں ایسے ارادوں کو شاذ و نادر ہی دل میں جگہ دیتا ہوں جنہیں تبدیل کرنا پڑے۔“

”خیر...“ وہ طویل سانس لے کر بولی ”یقین رکھو“ میں تمہارے بغیر بھی کاہل رہا ہوں۔“ گروہ میں تمہاری کمی میں بہت جلد پوری کر لوں گی۔“

”مجھے خوشی ہوگی“ میں نے بات لہجے میں کہا۔

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرو گے؟“ ہمیں ہمارے پیشتر راز معلوم ہیں“ وہ بولی۔

”کیا تم مجھے ایک گھنایا آدمی سمجھتی ہو“ میں نے قدرے

تاریخ کے نامور مصنف

اسلامی

کے ایمان افروز قلم سے ایک

نولصورت تحفہ

ایم اے



جسمیں حضرت آدم علیہ السلام
سے لے کر خاتم الانبیا حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
تک دنیا کی مکمل تاریخ پیش کی
گئی ہے۔

آپ کی ذاتی لائبریری کیلئے ایک انمول اور مستند اضافہ
جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
نولصورت سرورق، بہترین کتابت و طباعت
پانچ ہزار صفحات پر مشتمل،

مکمل سیٹ سات جلدوں میں دستیاب اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں!

— ناشر —

مکتبہ القریش، سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور۔

فون: ۴۶۶۸۹۵۸

شاید سہیلی کی مرضی کے بغیر گردہ سے ٹیچہ ہونے کوئی آسان کام نہیں تھا۔

میں ٹپکنے کے سے انداز میں گلی کے موڑ تک پہنچ گیا۔
میں اس وقت جبکہ میں موڑ مڑتا تھا میں نے دوسری سمت سے پولیس کی ایک جیب کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ جیب میرے قریب سے گزر کر گلی میں داخل ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے میں خشک لیکن جیب میں موجود لوگوں میں سے کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی اور میں اسی طرح ٹپکنے کے سے انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ دوسری گلی میں بھی کوئی نہیں ہے تو میں پلٹ کر آیا اور کوئے کے ایک مکان کا نمبر دیکھنے کے بدلے میں نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ میری توقع کے عین مطابق پولیس جیب قاسم خان کے گھر کے سامنے ہی رکھی تھی اور ایک باوردی آفیسر چوکیدار سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک اور باوردی آفیسر اور ایک سدا لباس والا اس کے برابر کھڑا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں بہت ہی مناسب وقت پر گھر سے نکل آیا تھا۔ معلوم نہیں کیا سلسلہ تھا اور پولیس آفیسران کس نیت سے آئے تھے۔

میں تیزی سے آگے چل دیا۔ نسبتاً ایک بڑی سڑاک پر پہنچ کر مجھے ٹیکسی ٹی گئی اور میں ہوٹل لوٹ آیا۔ کچھ دیر تک میں بستر پر لیٹا آنکھیں بند کئے گاڑھ ترین حالات کا تجزیہ کرتا رہا پھر میں سب کچھ ذہن سے جھٹک کر ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔

شام کو میں نے قاسم خان کے گھر فون کیا۔ ریسپور سہیلی ہی نے اٹھایا۔ اس کی آواز سن کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ پوچھا۔ "پولیس کس لئے آئی تھی؟" میں نے دھیمی آواز میں

"پوچھا... تم ہو...۔" اس نے میری آواز پہچان کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پولیس کچھ رکھی ہی پوچھ مجھ کو کہنے آئی تھی۔"

"انہوں نے ہمیں تفتیش میں اپنے مخصوص انداز میں تو نہیں گھسیٹا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے...؟ کچھ بھلا وہ تفتیش میں کیوں نہیں گھسیٹیں گے؟" اس نے بڑی مصیبت سے کہا پھر وہ ایک کھٹک دار قہقہہ لگا کر بولی۔ "تو میں معلوم ہونا چاہئے کہ میں تو ایک شرعی اور وفا شعار بیوی ہوں۔ مجھے تو اپنے شوہر کے اصل دھندوں کا ذرا بھی علم نہیں تھا۔ میں تو اسے ایک ممتاز بزنس مین اور معاشرے کا معزز فرد سمجھتی تھی۔ اس انکشاف سے مجھ پر بجلی سی گر پڑی ہے۔ آسمان ٹوٹ چاہے اور میں یکدم ہی بستر سے لگ گئی ہوں۔ دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ" اس نے ایک اور کھٹک دار سا قہقہہ لگایا۔ "لوہو اگر

تو میں یقین نہیں کرتا تو کل کے اظہارات دیکھ لیتا۔"

"بڑی زبردست چیز ہو تم" میں نے سناٹائی لیتے ہوئے کہا۔ "قدر شناسی ہے تمہاری... ویسے بدی اس سے بھی زیادہ قابل ہے" وہ شرع لہجے میں بولی۔

"قاسم خان کی بجھ خیر خبر ملی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... میں دلہا پہنچنے اور دیکھوں وغیرہ کا بندوبست کرنے کے لئے غلات سے کام لے رہی تھی لیکن اب معلوم ہو گیا ہے کہ غلات کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب میں آرام سے ہی غیار مار جاؤں گی۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"قاسم خان کو گرفتار ہوئے آج پانچواں دن ہے۔ پہلے دن اسے گرفتار کیا گیا۔ دوسرے دن عدالت میں پیش کیا گیا۔ تیسرے روز عدالت نے فیصلہ سنایا اور اسی وقت اسے جیل بھیج دیا گیا۔ آج اسے جیل میں دو سزاؤں ہے۔ اسے سات سال کی سزا ہوئی ہے اب تو مجھے اُم سے ملاقات ہی کہنے پانا ہے۔ اس کے لیے کچھ کرنا تو اب میرے بس کی بات نہیں رہی۔"

میں محض ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

"میں پرسوں امریکا روانہ ہو رہی ہوں" وہ بولی۔ "قاسم

خان کو بتا دوں گی کہ جس ساتھی پر اسے سب سے زیادہ فائدہ ہوا کتنے اچھے موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔"

"اس بیان میں تمہارے کی ضرورت ہے؟" میں نے

جلدی سے کہا۔ "قاسم خان اگر میرے سامنے موجود ہوتے تو اب اب بھی اسے ہاس ہالنے اور اس کے افکات کی قہیل کے لئے تیار ہوں۔ میں نے قاسم خان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔"

"خیر... چھوڑو اس بحث کو" اس نے قدرے اکتاہٹ سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم کب تک اس طرح چپے رہو گے؟" "جب تک میری چھٹی حس مجھے خطرے کے متنبہ دیتا رہے نہیں کر دیتی" میں نے جواب دیا "یہ بتاؤ کہ امریکا سے کب تک واپس آنے کا ارادہ ہے؟"

"آٹھ دس دن تو گنگ ہی جائیں گے" سہیلی نے جواب دیا۔ "میں اب تمہاری واپسی پر ہی تم سے بات کروں گا اور حالات معلوم کروں گا" میں نے کہا۔

"اب اس کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟" وہ طنز سے لہجے میں بولی "تم نے خدا حافظ کہہ دیا۔ ہم نے سن لیا۔ ایک دوسرے کی طرف ہمارا کچھ لین دین بھی نہیں تھا۔ پھر اب کیوں باہر فون کر کے وقت ضائع کرتے ہو؟"

"میں نے بلور ملازم ساتھ چھوڑا ہے" بلور انسان نہیں تھا میں نے ملامت سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد چند دن گزارا میرے لئے خدا مہربان کام

فون اسی نے ریسیو کیا اور میری آواز پہچانتی ہے تبانہ نیچے میں ہولی "ارے... کہاں مر گئے تھے تم؟ میں بہت بے چینی سے تمہارے فون کی خنجر تھی۔"

"لیکن تم نے تو خودی کبہ دیا تھا کہ اب بھلا بات چیت کر کیا ضرورت رہ گئی ہے؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"وہ تو میں بے دل سے کہہ رہی تھی" وہ جلدی سے بولا "خیر... اس وقت ان باتوں کو رہنے دو۔ مجھے تم سے بہت عرصہ ضروری گفتگو کرنی ہے جو فون پر نہیں ہو سکتی۔ اب مجھے اس فون کی طرف سے بھی اطمینان نہیں رہا۔ تم سے کہاں ملاقات

ثابت ہوا۔ اتنی فرست، ایسی بے استعداد تھی کہ بعض اوقات تو جھنجھلا کر کسی درخت سے گریں مارنے کو بھی چاہتا تھا۔ اس دوران ایک مہرہ میں نے رات کو تمام تر اطمینان کی سانس کے ساتھ اپنے گھر کا بھی چکر لگایا اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ میرے مکان کی گرائی میں ہو رہی تھی۔ میں گیٹ تک جا کر اپنا پوسٹ بکس بھی دیکھ آیا۔ اس میں راجیلہ کا کوئی خط موجود نہیں تھا حالانکہ میں گزشتہ دنوں میں اسے کئی خطوط ارسال کر چکا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اب تو اس کے اجتماعات بھی ختم ہو چکے تھے۔ اس سے اگلے روز میں نے ہوٹل سے کال کر کے کراچی فون کیا۔ راجیلہ سے بات نہیں ہو سکی۔ ملازمہ نے بتایا کہ وہ اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی ہے۔

وقت کمزوری کے لئے میں نے آتش دہلی کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ وہ اور ان کی صریح زیب النساء آج کل بہت خوش تھے۔ جس دن میں نے منظور کا مبلغ درست کیا تھا، اس دن کے بعد سے ان کے کسی کرائے دار نے انہیں تنگ نہیں کیا تھا۔ بھرپوری پیکیس بھی جیت گئی تھیں اور وہ لوگ ان کی کوٹھی کا بخلا حصہ خالی کر گئے تھے البتہ جاتے وقت تھوڑی سی تو پھوڑ ضرور کر گئے تھے۔ اس صبح میں اب بڑی بی بی نے ایک سماجی کارکن کے تعلقوں سے لڑکیوں کے لئے دستکاری کا اسکول کھول دیا تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ کوٹھی اسکول ہی کے نام کر جائیں گی۔ اب انہیں کراچی مقبول مل رہا تھا جس سے ان کی گزر بسر عمدگی سے ہو رہی تھی۔

آتش دہلی صاحب کا وہی محل تھا۔ وہی چال بے ڈھنگی... بہر حال ان کے ساتھ وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ان میں اب بھی کیسی زبردست تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں مگر اس شخص نے اپنے آپ کو منی میں ملا دیا تھا۔ میں نے ایک بار انہیں زندگی کی تعمیر نو کے موضوع پر لیکچر بھی دینے کی کوشش کی اور پوچھا کہ آخر وہ کیوں اپنے آپ کو خوار کئے ہوئے تھے۔ جواب میں انہوں نے مسکراتے ہوئے سار کا یہ شعر پڑھ دیا:

تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے
ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا "کبھی کبھی خود کو برباد کرنے میں بھی بڑی لذت محسوس ہوتی ہے۔"

اس روز ان کے ساتھ بہت دیر کی مغز کھپائی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ تپائی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں۔ بہر حال اتنا ضرور تھا کہ جتنی دیر وہ میرے ساتھ رہتے تھے، اتنی سیدھی حرکتیں نہیں کر پاتے تھے اور لوگوں کے ہاتھوں ذیل ہونے سے باز رہتے تھے۔ پورے دس دن بعد میں نے سلی کو فون کیا۔ اس بار بھی

پروفیسر ایم اشرف ایم۔ اے

50/-	شاہ فاروق حاکم مصر
50/-	شاہ فیصل شہید
90/-	ہٹلر کی حیات معاشقہ
75/-	ہٹلر کے آخری دس دن
75/-	ہٹلر اور نازی جرمنی
90/-	سکندر اعظم
75/-	نپولین بونا پارٹ
	رومانی شاعر لارڈ ہاٹن
60/-	کی حیات معاشقہ
	مہاراجہ رنجیت سنگھ
75/-	اور ان کی عیاشیاں
100/-	ہر دور ہٹلر کی کہانی

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ہو سکتی ہے؟

”تم امریکا سے کب آئیں؟“ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں امریکا جا ہی نہیں سکی۔ اسی سلسلے میں تو تم سے باتیں کرتی ہیں۔ بتاؤ میں کہاں آؤں؟“ اس نے بے گلابی سے کہا۔

”جگہ تمہارے شایان شان تو نہیں“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال میری نظر میں وہی مناسب ہے“ میں نے اسے اسی اسٹیک پار کا نام بتایا جہاں آتش دہلوی سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی تھی۔ اسٹیک پار میں مارکیٹ سے قریب تھا اور میں اپنے ہوٹل سے قریب تھا۔ وہاں تک جا سکتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اسی اسٹیک پار سے متصل عمارت دفاتر پر مشتمل تھی۔ اس کی بیڑھیاں چڑھ کر میں کسی بھی فلور کی کھڑکی سے جھانک سکتا تھا اور نظر رکھ سکتا تھا کہ سلیٹی عمارت آ رہی ہے یا کسی کے ساتھ۔ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے یا نہیں؟

”ٹھیک ہے“ میں بچے جاؤں گی“ سلیٹی بولی“ لیکن کم از کم آدھ گھنٹے بعد۔ تاکہ اندر میرا دروازہ کھلا جائے۔ کچھ لوگ کھڑکی کھرا کر رہے ہیں۔ مجھے ان کو عجب دے کر تباہ ہو گا۔“ ”بہت بہتر“ میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

آدھ گھنٹے سے کچھ پہلے ہی میں ہوٹل سے نکلا اور ملتا ہوا اس اسٹیک پار تک پہنچا۔ میں اس اسٹیک پار میں جانے کے بجائے متصل عمارت کی بیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل کی راہداری کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ قریب ہی ایک سینما تھا جس میں چند ہی لمبے پہلے شو شروع ہوا تھا۔ چند لمبے بعد سڑک پر سے جھوم ختم ہو گیا۔ اس کے ٹھوڑی ہی دور بعد میں نے سلیٹی کی سڑک پر سڑک پر چوراسہ سے پھرتی سڑک پر آتے دیکھی۔ وہ تنہا ہی تھی۔ گاڑی اس نے اسٹیک پار سے ذرا دور اور ایسی جگہ کھڑکی کی پہلی روشنی کم تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر اگلیوں میں پس بھلاتی ہوئی لالہلی سے انداز میں اسٹیک پار کے دروازے کی طرف چلی آئی۔ میں نے اس کے عقب میں نہ تو کوئی گاڑی دیکھ سکی اور نہ ہی مجھے شبہ ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کے بازو میں دو تین منٹ تک وہیں کھڑکی میں ہی کھڑا رہا۔ سلیٹی اندر جا چکی تھی۔

بالآخر میں بیڑھیاں اتر کر اس عمارت سے نکل آیا اور اسٹیک پار میں جا پہنچا۔ وہ گیلیز نما ہلائی جیسے میں ایک گوشے میں بیٹھی تھی اور قدرے بے نیازی سے میز کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے مقلد جا بیٹھا۔

”تم تو اب اپنی محنتیں بھی بھولتے جا رہے ہو۔“ وہ میری طرف دیکھے بغیر دیکھی آواز میں بولی ”خواتین کو انتظار نہیں کرایا کرتے۔“

”انتظار تو میں کر رہا تھا لیکن یہاں سے ذرا بہت کر۔“ میں

نے کہا۔

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔“ اس کی ٹھٹھکی دار سی ہنسی ابھری لیکن اسٹیک پار میں کوئی بھی نہ تھی۔ وہی جھنجھٹ میں اس کی ہنسی صرف میں ہی سن سکتا تھا۔

اس نے اپنا کونو گوشہ کنار کر میز پر رکھ دیا اور کھیلے ہاتھوں میں انگلیاں بھیرتے ہوئے بولی ”مجھے یقین تھا کہ تم آؤں گی پس کبھی کھڑے جائزہ لے رہے ہو گے کہ مجھ سے ملنا مناسب بھی رہے گا یا نہیں۔ تمہاری احتیاط پسندی میں کوئی کمی نہیں آ رہی ہے حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ میں اب تک آزاد پھر رہی ہوں اور جن مشکلات میں نہیں گھری ہوئی ہوں ان کا تم تصور تک نہیں کر سکتے۔“

”تم بڑی عورت ہو۔ تمہارے مسائل بھی بڑے ہیں اور مسائل بھی۔ کسی نہ کسی طرح مسائل سے نمٹ ہی لو گی۔ میں ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ حق بھاگ چلنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا ”تم اصل موضوع پر بات کر دو۔“

اسی لمبے دیر ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اسے آدھ روپے کے بعد سلیٹی بولی ”شاید تمہیں یہ جان کر لا شعوری طور پر خوشی ہو کہ تمہارے داہے تمہاری توقعات سے زیادہ درست نکلے ہیں۔ میں چاروں طرف سے اس بری گھر گئی ہوں کہ۔“ ”کاروبار“ کو خیر یاد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ قاسم خان کی گرفتاری کے بعد یہاں وقتی طور پر تو حالات کی سطح بالکل پرسکون نظر آ رہی تھی اور میں بالکل مطمئن تھی کہ بات زیادہ نہیں پھسکی اور میں سب کچھ سنبھال لوں گی مگر اب تو ایک لحاظ ہی سیلاب سا اٹھیا ہے۔ پولیس، ایف آئی، اے، ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن، کنسٹرکشن اور دیگر کئی سرکاری ایجنسیاں ہاتھ دھو کر رہی ہمارے کاروبار کے پیچھے جڑ گئی ہیں۔ جن افسروں سے ہمارے مراسم خوشگوار تھے اب تو وہ بھی آگے نہیں مل رہے۔ لگتا ہے اخبارات میں حوازا کئی دن تک اس سلسلے میں خبریں آنے سے بات بہت بڑھ گئی ہے اور تمام ٹکے یوں حرکت میں آگئے ہیں جیسے دنیا کا سب سے بڑا اسلگر قاسم خان ہی ہے حالانکہ وہ بے چارہ تو کسی شمار قطار میں ہی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ قاسم خان اگر سزا تک کروا دیں آپا تو یہاں بھی اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ ہمارے جائز اور قانونی کاروبار تک کے بارے میں چھان بین شروع ہو گئی ہے۔ اوپر سینہ واحد نے ٹاک میں دم کیا ہوا ہے۔ وہ پچھلے دنوں بھی لاہور میں ہی تھا اور میں ”ایک موبوم سی امپر کے سہارے اس سے ملی تھی۔ بڑے اخلاق سے پیش آیا لیکن رقم کے معاملے میں وہ زیادہ فیاضی دکھانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ صرف اتنا ہوا کہ ایک کدو سے وہ اپنی لاک پر آیا۔“

”پھر تم نے سوچا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سوچا تو میں نے بہت کچھ ہے اور بھلا خراسی فیصلے پر پہنچی

کہا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت کا سایہ کچھ گہرا ہو گیا۔ تو تمہارے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ وہ کوٹھی خرید سکو؟ کہلا ہاتھ مارا کیا؟

”میرے پاس کمال سے اتنی تھی رقم“ میں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا۔ ”جو تھوڑی بہت پونجی ہے وہ بہت وقت کے لئے بچا کر رکھی ہوئی ہے۔ کوٹھی کا تو میں اپنے ایک دوست کے لئے پوچھ رہا تھا جس کے ساتھ مل کر میں کوئی شرفازہ کاروبار شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ مارکیٹ ویلے کے حساب سے جو بھی مناسب قیمت ہوگی وہ دے دے گا۔ منگلی نے تنبیہی انداز میں سر ہلایا۔ وہ میرے جواب سے کچھ زیادہ مطمئن تو نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس نے غلامی اس خیالی سے کوئی جرح نہیں کی تھی کہ اب اس کے لئے اور باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

”میں نے اپنے وکیل سے تجویز لیا تھا“ وہ سرسری سے لہجے میں بولی ”وہ کوٹھی اس وقت کم از کم چھ لاکھ کی ہے۔ تم راکھ وکیل کو ادا کر کے مروجہ طریق کار کے مطابق اپنے دوست نام ترانسفر کروا سکتے ہو۔ وکیل کے پاس پاور آف اٹارنی موجود ہے۔ اس وقت تک میں یہاں رہوں یا نہ رہوں رقم بحال مجھے مل جائے گی۔ جہاں اور اس کا شوہر اس کوٹھی سے جائے گا وہاں رہے وہ اپنا خانا ایلو دس دے گئی ہے۔ اگر تم یا تمہارا دوست اسے اسی کوٹھی میں ملازم رکھنا چاہے تو وہ والیہ آجائے گی۔“

”گویا یہ تم سے آخری ملاقات ہے؟“ میں نے پوچھ ”آخری ہی سمجھو“ وہ بے پروائی سے بولی ”میرا کوئی مجبور نہ نہیں کہ کب موقع مناسب دیکھ کر نکل جاؤں۔“ میں ایک طویل سانس لے کر رو گیا۔ غیر ارادی طور پر میرے اس کی نیم دوا آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں ہلکا سی انصر کی اتر آئی تھی۔ اچانک وہ سرگوشی فرمایا ”میں بولی، افضل! ہم اچھے تھے یا برے..... ہم نے اپنے ساتھیوں میں سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بحال اس سے باوجود غدارانہ سنجی میں اگر کبھی ہم سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا۔ ہم اپنی طرف سے کبھی عذر نہ چاہتے رہیں ہوں اور قاسم خان کی طرف سے بھی۔“

میرے دل میں یک لخت اس کے لئے جیسے اہمیت کا سمندر اٹھ آیا۔ اس کے لہجے میں غلوں تھا۔ بعض اوقات بڑے لوگ بہت سے اچھے اچھے لوگوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔

”تم کوئی روایتی عورت تو نہیں ہو جو ایسی رسمی باتیں کر رہی ہو“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی لیکن یہ محسوس کر کے مجھے حیرت ہوئی کہ میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ہوں کہ مجھے اب ملک سے نکل لینا چاہیے“ وہ گہری سانس لے کر بہت ہی دھیمی آواز میں بولی ”تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ ایف آئی اے نے میرا پاسپورٹ بھی قبضے میں لے لیا ہے لیکن خیر۔۔۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس ایک اعلیٰ درجے کا جعلی پاسپورٹ اور ایک غیر ملکی پاسپورٹ بھی موجود ہے جسے دی نیو کرانے کی ضرورت ہے۔ اب مسئلہ صرف اپنے اثاثے سمیٹنے کا ہے۔ ہمارے پاس کوٹھیاں صرف یہ دو ہی ہیں۔ ایک گلبرگ والی اور ایک ماڈل ٹاؤن والی۔ چند پلاٹس ہیں۔ ان سب کی فروخت کے لئے میں نے اپنے وکیل کو پاور آف اٹارنی دے دی ہے۔ گلبرگ والی کوٹھی فریسٹو واحد ہی خریدنے کے لئے تیار ہے۔ چند رو لاکھ اس نے لگائے ہیں۔ کوٹھی دینے کے بعد اس کے ہماری طرف بیٹھ لاکھ نکلیں گے۔ وہ میں نقد دے دوں گی۔ ہمارے بڑے اکاؤنٹس پر دستخط میرے ہی چلتے ہیں۔ اوائلیوں میں تو کوئی وقت نہیں ہوگی۔ میرے پاس نقد رقم بھی ہے۔ کوٹھی اس لئے بھی سیٹو واحد ہی کو دینا مناسب رہے گا کہ اگر میرے نکل جانے کے بعد کوئی قانونی دشواری ہوئی تو وہ اس سے نمٹ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ساری خرید و فروخت کرنے کے بعد نقد رقم ملک سے باہر پہنچانے میں بھی وہی میری مدد کرے گا۔ روپے پیسے کے معاملے میں اس کی بد گمانی اپنی جگہ لیکن اس بڑے وقت میں اس کا یہ تعاون بھی کچھ کم نہیں۔“

اس دوران دھڑلے سے چپڑیں لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کوئٹہ کالی میں کچھ ہلاتے ہوئے پوچھا ”ملک سے نکل کر تم جاؤ گی کہاں؟“

”امریکا ہی جاؤں گی اور قاسم خان کے رہا ہونے کا انتظار کر دوں گی۔ وہاں کی شہریت حاصل کرنا میرے لئے مشکل نہیں ہو گا حالانکہ میں ایک ایسے اسمگلر کی بیوی ہوں جو ان کی تہ میں ہے اور اسمگلر بھی منشیات کا۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ امریکا میں منشیات کے اسمگلروں کے ساتھ سب سے زیادہ سختی برتی جاتی ہے۔“

”اس کے باوجود تم شہریت حاصل کر لو گی؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں“ وہ بڑا اعتماد انداز میں مسکرائی۔ اس دوران ایک خیال میرے ذہن میں دھیرے دھیرے واضح شکل اختیار کرنا بارہا تھا۔ اچانک میں نے پوچھا ”مال ٹاؤن والی کوٹھی کی تو کسی سے بات نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”وہ کوٹھی تم مجھے دے دو۔ مجھے اس سے اس لئے دلچسپی ہے کہ وہ کسی کی نظر میں نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس کے بارے میں پوچھتا ہے کہ وہ قاسم خان کی ملکیت ہے“ میں نے

”ہر عورت روایتی عورت ہی ہوتی ہے“ وہ بدستور سرگوشی نمائیے میں بولی ”صرف حالات اس پر کوئی مختلف قسم کا خول چڑھا دیتے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میری کتاب زندگی کا ایک اہم باب گویا ختم ہو گیا۔

○☆☆○

سہلی جاچکی تھی اور میں باؤل ٹائون والی کوٹھی میں شغف ہو چکا تھا۔ سہلی کے جانے کے کئی دن بعد اخبار میں چھوٹی سی خبر بھی آئی تھی جس کی سرخی تھی:

اسٹانگک کے الزام میں گرفتار ہونے والے تاجر قاسم خان کی بیوی ملک چھوڑ کر چلی گئی۔

خبر کا متن مندرجہ ذیل تھا اور اس کے بعد اس ضمن میں کوئی ذرا سی بھی خبر نہیں آئی۔ جس کئی مرتبہ قاسم خان کی کلچرنگ والی کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ شروع شروع میں مجھے سی آئی ڈی کی ایک جیپ وہاں کھڑی نظر آئی جس میں دو سادہ لباس والے نیم دراز یا اونچے ہوئے نظر آئے لیکن پھر وہ جیپ غائب ہو گئی۔

سیٹھ وادے نے معلوم نہیں کس مقصد کے لئے یہ کوٹھی خریدی تھی۔ فی الحال تو اس کے گیٹ پر بڑا سا ٹکا لگا ہوا نظر آتا تھا۔ دروازہ پر عجیب و پرانی سی برسنے لگی تھی۔ گیٹ کے نیچے زرد پتوں کا انداز نظر آنے لگا تھا۔ اتنے سے غرض میں یوں لگنے لگا تھا جیسے یہ کوٹھی بھی آباد ہی نہیں تھی۔

باؤل ٹائون والی کوٹھی کی قیمت ادا کرنے کے بعد بھی میرے پاس کچھ رقم باقی تھی اور اب میرا ارادہ مندرجہ ذیل تھا اور تھوڑی سی اپنے کاروبار کو منظم کرنے کا تھا۔ میں فی الحال چھوٹے چھوٹے پیمانے پر اپنا کردہ بنانے کے لئے کوشش تھا۔ قاسم خان نے گروہ کا نظام کچھ اس طرح رکھا تھا کہ ایک کو دوسرے کا کچھ زیادہ پتا نہیں تھا۔ میں بھی کردہ کے سب کارکنوں کو تو تلاش نہیں کر سکا تاہم دو کو میں نے ڈھونڈ نکالا اور وہ میرے لئے کام کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے۔ فی الحال مجھے خود بھی اس سلسلے میں دوڑ بھاگ کرنی تھی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ میں تک باس بن کر آرام سے بیٹھ جائوں۔ تاہم اتنا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ وقت زیادہ دور دور بھی نہیں تھا۔

میں حالات کے اس بیج اور اپنی کارکردگی سے بے حد مطمئن تھا۔ مستقبل کے کئی منصوبے میرے ذہن میں تھے۔ جب ذرا فراغت اور سکون میرا آیا تو راجیلہ کا تھر میرے ذہن میں حاوی ہو گیا جسے میں عام حالات میں اور مصروفیات کے دوران ایک میٹھی کک کی طرح دل میں دبائے رکھتا تھا۔ میں اسے کئی خط لکھ چکا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا جبکہ اپنے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق اسے اب تک گھر والوں کے ساتھ تعلیمات منانے کے لئے لاہور میں

ہونا چاہئے تھا۔ میں اسے یہ خوشخبری سنانے کے لئے بھیجے جہیں تھا کہ میں نے صحیح معنوں میں ترقی کے راستوں پر قدم رکھ دیا ہے اور اپنی جلی ذاتی کو بھی خریدی ہے بلکہ اگر راجیلہ لاہور میں ہوتی تو میں جلی قرمت میں اسے کوٹھی دکھاتا اور اسے بتاتا کہ درحقیقت یہ تو محض ابتدا ہے۔ یہ کوٹھی بھی تمہارے شایان شان نہیں ہے۔ بہت جلد میں اس سے بھی اچھی کوٹھی خریدوں گا اور پھر تمہارے والدین کے سامنے دست سوال دوں گا کہ وہ تمہارا ہاتھ میرے سوالی ہاتھ میں تمہارے اور پھر تم آکر اس کوٹھی کو ”گھر“ بناؤ گی۔ اس کے دو دیوار کو اپنے وجود کی دلکشی سے سجادی گی۔

جب مزید نائب انتظار رہی تو میں نے ایک شام اسے کراچی فون کیا ”دوسری طرف فون راشد نے ریڈ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ راجیلہ نے میری خط و کتابت راشد کے علم میں ہے اور اسے یہ بھی اندازہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں اور اس حقیقت کا اس کی طرف سے کوئی تاثر و رد عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ چنانچہ میں نے رسی پٹوں کے بعد سرسری لیے میں کہا ”راشد! مجھے راجیلہ سے بات کرنی تھی۔“

”راجیلہ.....؟ وہ..... اتنی بھالی! راجیلہ تو اس وقت مہیاہ کے پہلے تھی ہوتی ہے“ وہ کچھ الگ الگ کر بولا ”تھاپا پارل ہے اس کے ہاں۔ وہ رات کو دیر سے گھر آئے گی۔“

میں نے محسوس کیا کہ راشد نے یہ بہانہ فوری طور پر گھڑا ہے تاہم میں نے اپنے اس احساس کا اظہار نہیں کیا اور بدستور سرسری سے لیے میں پوچھا ”مہیاہ کے گھر فون تو ہو گا؟“

”تھاپا ہے تو سہی لیکن مجھے نمبر معلوم نہیں“ راشد ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا ”اور آپ کو معلوم ہے“ راجیلہ کوئی بیز صبح طریقے سے لکھ لکھا کر تو رکھتی نہیں۔ بیشتر فون نمبر اسے زبانی یاد ہیں۔ کوئی ضروری پیغام ہو تو مجھے بتا دیتے۔ میں اسے بتا دوں گا۔“

”نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس بتا دینا کہ میں نے فون کیا تھا“ میرا لہجہ غیر ارادی طور پر ہلکا سا گیا تھا۔

”کاک! راشد جیسے اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچے ہوئے بولا ”اتنی بھالی! میں آپ کو ایک سربراہ دوں؟ میں کل شام تک کسی بھی فلاحیت سے لاہور پہنچ رہا ہوں۔“

”کس فلاحیت سے؟“ میں نے اپنی حیرت کو دہاتے ہوئے پوچھا۔

”جس میں بھی سیٹ مل سکتی“ وہ بولا۔

”گویا اکیلے آ رہے ہو... یہ ایک دم کیا سوچتی؟“

”ایک ضروری کام آج چاہیے۔“

”اگر فلاحیت کا علم ہو تا تو میں تمہیں لینے ایئر پورٹ آ جاتا“

”اس کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس



پراسرار اور خوفناک کہانیاں جنہیں
پڑھتے ہوئے آپ چونک اٹھیں گے
انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے

آسیب زدہ قیمت = 110/
دستک قیمت = 100/

کتبہ المرحوم میرزا محمد اسحاق خان صاحب
فون 7668958

اچانک آمد اور کل روانگی کا پروگرام... یہ اچانک تمہیں یہ
آن پڑا؟

میں نے محسوس کیا کہ اس کی رنگت زرد پڑ چکی تھی اور
کچھ حوش سا تھا لیکن بظاہر پرسکون نظر آنے کی وجہ
کوشش کر رہا تھا۔ بات شروع کرنے کے لئے اس جیسے
نہیں مل رہے تھے اور اس کے اس انداز کی وجہ سے
اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

”آخر تم بولے کیوں نہیں؟“ میں نے تیزی سے کہ
”تمہارے دوسرے نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔“
”میں آپ کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لایا ابھی بھائی
بلآخر وہ پچھلی پچھلی سی آواز میں بولا پھر اس نے گویا
برأت کو بتایا کرتے ہوئے سلسلہ کلام جو ”ا“ مجھے معلوم۔
کہ آپ راحیلہ سے محبت کرتے ہیں اور اس کے بھائی
حشیت سے میرا بول آپ کے سامنے پیش کر اس کے منہ
پاتیں کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن میں کیا کروں... راحیلہ
مجھے بے پناہ محبت ہے اور ایک بس کے ساتھ وہ میری نیا
بھی ہے لیکن آپ کا بھی میری نظر میں جو مقام ہے وہ
سے رشتوں پر بھاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو نئی زندگی
کی عہدہ وہ آپ ہی کے دہلے سے ہے۔“

”اب لمبی باتوں اور دوسلوں کو چھوڑو راشد!“ میں نے اس
کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”جو کچھ کہتا ہے جلدی کو اور سہ
کاوا کا ایک کزن ہے۔ غالباً وہ بھی صنعت کار کا بیٹا ہے؟“ مجھے
خیرت تھی کہ اب میں غلطے رسکوار سے محفوظ رہا ہوں

ناتوا دیتے۔ میں خود ہی بیچ جاؤں گا۔“
میں نے اسے اپنا ہونے میں اور ایڈریس ناتوا دیا اور مزید چند
سیکنڈ کی رسمی گفتگو کے بعد سلسلہ منتقل کر دیا۔ راشد
سے گفتگو کے بعد جانے کیوں میں مضطرب سا ہو گیا تھا۔ میری
جھٹی جھٹی یا شاید کوئی اور ہی جس مجھے چارہ تھی کہ راشد نے
مجھ سے کچھ چھپایا تھا۔ شاید راحیلہ گھر میں موجود تھی مگر راشد
نے اسے فون پر نہیں بلایا تھا۔ لیکن کیوں؟ پھر اسے اچانک
نہ ہوا آنے کی کیا سبب تھی؟ کیا وہ واقعی کہا تھا اس نے
محض میرا حیان بنانے کے لئے اور گفتگو کا رخ موڑنے کے
لئے شوشا چھوڑا تھا؟ میں نے اپنی بے عنوانی سے بے لگی کدول
میں دبائے رکھا اور کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے ایک دن انتظار
کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرا سہ ماہی میں پیار سے چچا میاں کتا تھا، میرے
بلوے پر نگاہوں سے واپس آچکا تھا۔ دوسرے روز شام ڈھلے
میں چند لوگوں سے ملاقات کے بعد واپس آکر لباس تبدیل
کر کے بیٹھا تھا کہ چچا میاں نے آکر اطلاع دی کہ راشد باہر
کوئی نوٹروں ان مجھ سے ملے آیا ہے۔ میں خود لپک کر باہر پھا
میں نے دیکھا، راشد ڈرائیو میں کھڑا تنقیدی نظر سے درد
دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔

کوٹھی پر میں نے رنگ درد غن نہیں کر لیا تھا اور نہ ہی
سرورسٹ آیا کوئی ارادہ تھا۔ اس لئے باہر سے وہ آسیب زدہ سی
لگتی تھی۔ تاہم اندر سے درد دیوار پر ستور شیش کی طرح چمکتے
تھے۔

راشد کے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں۔ وہ ایک ٹانگ پر
وزن ڈالے قدرے بے نیازی کے سے ناظم میں کھڑا تھا۔ اس
کے خشک اور ماتم، بھورے بال ہوا سے بکھرے ہوئے تھے۔
وہ اس وقت بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کلنڈر سا راسا لڑا کبھی
ابھی کلنڈر سے واپس آیا ہو۔

ہم بڑی گرجو جی سے بھل گئے ہوئے تھے کہ راشد چلا اٹھا
کہ اس کی پٹیلیں ٹوٹنے کو ہیں تب میں نے اس سے معاملہ
ختم کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے درد اڑنے کی طرف بڑھتے ہوئے
کہا ”تم تو واقعی آگے پارا اور نہ پیرا خیال کیا تھا کہ تم کسی
صداقت کے تحت مجھے کوئی دے رہے ہو۔“

”میری اتنی برأت کہیں کے میں آپ سے مذاق یا بارے
بازی کی کوشش کروں“ وہ چپکلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
”تمہارے پاس کوئی سلمان نظر نہیں آ رہا؟“ میں نے کہا۔

”سلمان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں کل دوپہر اپنی
چلا جاؤں گا“ وہ دوسری آواز میں بولا۔ میں نے اس وقت تو اس
سے تفصیل پر چھتا مناسب نہیں سمجھا لیکن اندر بیچ کر کچھ
دیر بعد جب وہ ہاتھ منہ دھو کر اور چائے وغیرہ پی کر آرام سے
بیٹھ چکا تب میں نے کہا ”اے! اب بیٹو کا فیصلہ ہے؟ یہ تمہاری

لیکن میرے اندر ہی اندر جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑے گا
بے تاب تھا۔ راشد نے میرے سوال کے جواب میں آہستگی
سے اثبات میں سر ہلادیا۔

"یہ غالباً آگنی اور اٹکل کا فیصلہ ہو گا؟" میں نے طویل
سانس لے کر سونے کے پتھے سے نیک لگاتے ہوئے کہا
"لیکن کیا راحیلہ نے اس پر زور ابھی احتجاج نہیں کیا؟ وہ ایسا لڑکی
تو نہیں کہ اس سے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات آسانی
سے منوالی جاسکے۔"

"مئی ڈیڈی یا کسی بھی دوسرے شخص کا اس میں کوئی قصور
نہیں" راشد جلدی سے بولا "یہ قطعی طور پر راحیلہ کا اپنا فیصلہ
تھا۔ مئی ڈیڈی نے اس سے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا اس کی
شادی بچپن سے کر دی جائے؟ اس نے خوشی اجازت دے
دی۔"

"نہیں" میں میں بے اختیار چلا اٹھا اور ایک تھکے
اٹھ کھڑا ہوا۔ میری رنگوں میں گواہ آتش سیال غمہ بانہا تھا۔
میرے چہرے پر شاید کوئی ایسی بات تھی کہ راشد خوف زدہ رہا
نظر آئے گا۔ دوسرے ہی لمحے میں خود پر ضبط کرتے ہوئے
بیٹھ گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟" میں نے حتی الامکان آہستگی
سے کہا "راحیلہ ایسا کیا کمر کر سکتی ہے۔"

راشد ایک تکی کی ڈھکری میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا
"میں راحیلہ کی لامعلیٰ میں راحیلہ کی یہ ڈھکری میں لے آیا ہوں۔
اس میں آپ کا ذکر صرف دو تین سطحوں پر موجود ہے لیکن
انہی میں آپ کو اپنے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ لیکن ایک
بات کا خیال رکھیے گا مائی بیما! آپ کو یہ سب کچھ بتانے سے میرا
مقصد صرف ایک منگ دھوکے سے آزاد کرانا اور حاکم کی
دنیا میں رہائش لانا ہے۔ مجھے آپ سے بہت عقیدت ہے
محبت ہے لیکن راحیلہ بھی بہر حال میری بہن ہے۔ میں نہیں
چاہوں گا کہ آپ بد عمل کے طور پر اسے کوئی گزند پہنچانے کی
کوشش کریں۔ آپ کو یہ سب کچھ بتا کر میں نے اپنی دانت
میں آپ کے ساتھ بٹھائی گئی ہے۔"

اس کے الفاظ میری سماعت سے یوں ٹکرا رہے تھے جیسے
کسی گندہ میں کسی بد روغ کے قہقہے گرج رہے ہوں۔ میں نے
ہاتھ بڑھا کر وہ تکی کی ڈھکری تھام لی۔ چڑی جلد میں لپٹی ہوئی یہ
ڈھکری نہیں گویا ایک پٹاری تھی جس میں ذہریلے لفظوں کے
سپو لے بھرا رہے تھے۔

صاف کہو۔
"بات اتنی آسان بھی نہیں ہے" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔
"مئی اور ڈیڈی کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ آپ راحیلہ کو
پہنہ کرتے ہیں۔ راحیلہ نے کبھی اس بات کا اشارہ ہی نہیں دیا۔
مجھے بھی شاید علم نہ ہو یا اگر مجھے اس نے خود ہی بتادیا تھا لیکن
اس طرح نہیں جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ نہایت ہی
محکمہ خیر انداز میں۔ اور میں اس وقت سے تشویش زدہ تھا
لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کڑوں ڈکڑا کر۔ مئی
وچ ہے کہ گزندہ دونوں گھروالوں نے جب مجھے شادی کا رد کیا کہ
آپ کو پست کر دوں تو میں نے اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔
پست نہیں کیا۔ بالآخر کل آپ کا فون آنے کے بعد میں نے
فیصلہ کیا کہ میرا ذاتی طور پر آکر آپ سے بات کرنا ہے حد
ضروری ہے۔ کل اگر میں یہ فیصلہ نہ کرتا تو شاید سوچ سوچ کر
پاکل ہو جانا۔"

"کیسا کارڈ... کیا باتیں...؟ تمہاری کوئی بھی بات میری
سمجھ میں نہیں آ رہی" میں نے قدرے ہتھیاریہ سے کہا۔
"راحیلہ کی شادی کے کارڈ کی بات کر رہا ہوں۔ کل راحیلہ
کی شادی ہے۔ ہمارا گھر اس وقت شادی بیاہ کے گیتوں سے گونج
رہا ہو گا" راشد جیسی جیسی آواز میں بولا۔

میں کئی سیکنڈ تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے الفاظ کا
مطلب میں خاص در بعد سمجھ سکا جیسے اس نے کسی اجنبی
زبان میں بات کی ہو۔

بالآخر میں نے کہا "راشد! میں تم اور راحیلہ۔ ہم بیویوں
آہیں میں بے تکلف ہیں لیکن بے تکلفی میں بھی اس قسم
کے تکلیف دہ مذاق نہیں کئے جاتے اور آج تک اپریل بھی
نہیں ہے جو تم مجھے یہ قوف بنائے آگئے ہو۔"

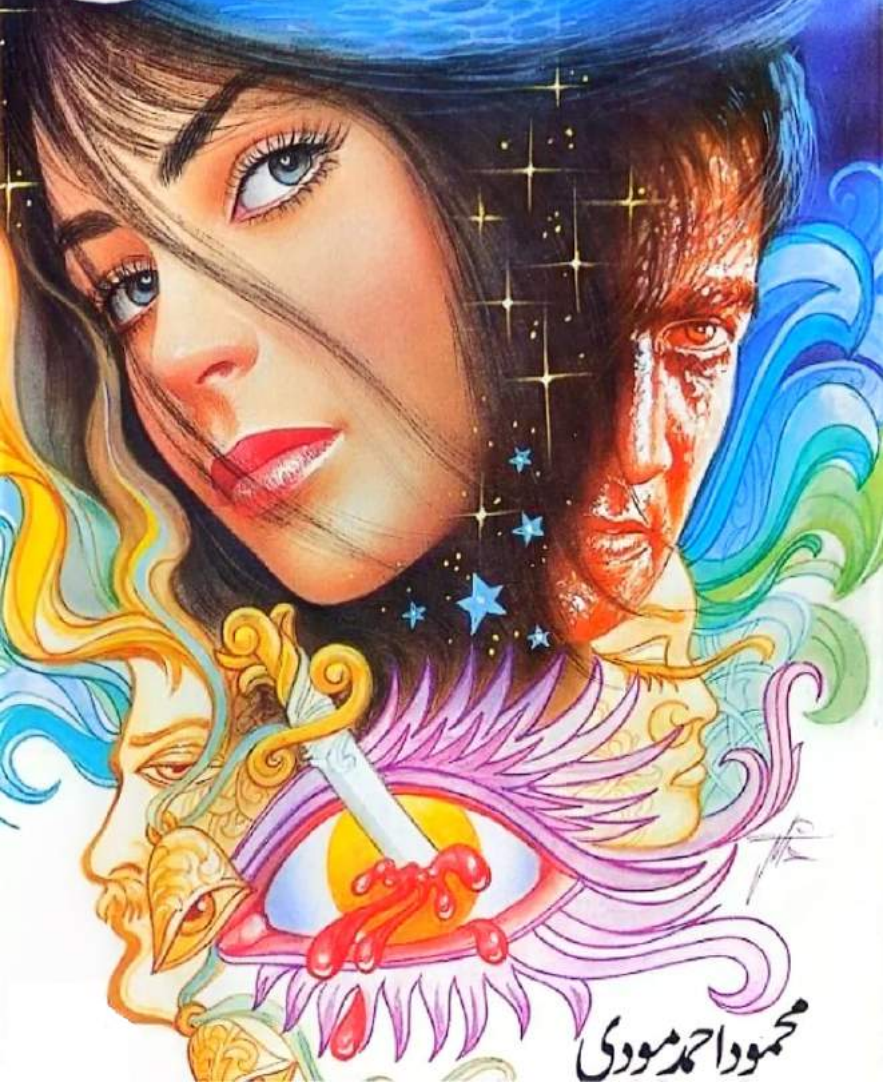
"مذاق آپ سے تو کیا میں کسی سے بھی نہیں کرتا" وہ
افسردہ سے کہنے میں بولا "میں محض مذاق میں اتنی زحمت
کرنے کا قائل نہیں کہ اتنی گھبراہٹ میں بعد مشکل گفت
حاصل کر کے فوری طور پر لاہور پہنچوں۔"

اس امر کا مجھے بھی یقین تھا۔ میں چند لمحے غم سے پیشاب رہا۔
میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے اعصاب اندر ہی اندر لرز رہے
ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں نے اگر فوری طور پر کچھ کہنے کی
کوشش کی تو میرے حلق سے لڑتی ہوئی آواز برآمد ہوگی اور
میں لرزتی ہوئی آواز میں بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔
راشد گویا مجھے قائل کرنے کے لئے لفظوں پر زور دیتے
ہوئے بولا "میں سچ کہہ رہا ہوں راحیلہ کی کل شادی ہے۔"

"کس سے؟" بالآخر میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں
پوچھا۔ میں اپنی درج کی سسکیاں دہانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
"بچیل سے۔ وہ ہمارا کزن ہے" راشد نظر جھکا کر بولا۔
"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ راحیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے

نہایت ہی بڑے اور بڑے "راشد" کے ساتھ ایک بہت سی شادی
میں اس کی شادی ہوئی ہے۔ اس کی شادی ہوئی ہے۔ اس کی شادی ہوئی ہے۔
میں اس کی شادی ہوئی ہے۔ اس کی شادی ہوئی ہے۔ اس کی شادی ہوئی ہے۔

سکس



محمود احمد مودی

کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں مگر میں اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ جانے کیوں؟ لیکن میں سوچتی ہوں کہ دل گلی میں کیا حرج ہے۔ ایسے جذباتی آدمیوں کو اٹھانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ ویسے جب تک میں اس سے ملی نہیں تھی اور صرف غائبانہ طور پر اسے جانتی تھی تو اس کے لئے میرے دل میں مومنیت اور عزت تھی کیونکہ اس نے راشد کو خراہوں کے چنگل سے نکالا تھا اور ایک طرح سے ہمارے گھرانے کو تباہی سے بچایا تھا۔ اس سے ملنے کے بعد بھی گوکہ مومنیت کے جذبات میرے دل میں باقی ہیں مگر نہ جانے کیوں میرا اسے دکھ پہنچانے کو دل چاہنے لگا ہے۔ میں خود بھی اپنی اس نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ شاید یہ بھی اذیت پرستی ہی کی کوئی قسم ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شخص میرا حریف ہے اور میں اسے نیچا رکھنا چاہتی ہوں اور کبھی میں سوچتی ہوں کہ شاید میں اس لئے اس کا دل دکھانا چاہتی ہوں کہ یہ مجھے کوئی اچھا شخص معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خفیہ پہلو ضرور ہے۔ کیس نہ کیس کوئی نہ کوئی بگ ضرور ہے۔ بات بہر حال ملے ہے کہ یہ شخص اتنا بھولا مسید حال اور بے ضرر نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے۔ ابو کو بھی اس کے بارے میں کوئی شک ضرور ہے لیکن ابو بہت گھبرے آ رہی ہیں۔ وہ کسی کے بارے میں اپنی رائے کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ اپنے ہاروں پر بھی نہیں۔

اس سے آگے لکھا تھا۔

"آج تو سو صرف نے افسارِ محبت کر دی دیا۔ میں نے بھی

کافی دیر تک تو میں اس ڈائری کے اوراق پلٹنے کی بات ہی نہ کر سکا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہاتھوں میں لڑش ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ راشد اس لڑش کو سوس کر سکے۔ کئی بار میں دیر ان سرحدی علاقوں میں رنجرز میں گھر کا تھا اور وہ بھی اس عالم میں کہ وہ اندھا دھند گویاں رہا ہے۔ دیتے تھے اور میں جوالی فائرنگ کر رہا ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی کبھی میرے ہاتھوں میں لڑش نہیں آئی تھی۔ میں خود بھی حیران تھا کہ آج کیا میں موت و حیات کی منگول سے بھی زیادہ تنگن مسئلے میں الجھ گیا ہوں جو میری یہ حالت دیکھ رہی ہے کہ دل ڈوبا جا رہا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پڑا ہے۔

میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور بظاہر بڑی بے پروائی سے ڈائری کے ورق اٹھنے لگا۔ ہر صفحے پر مختصری تحریر تھی اور اکثر تحریروں کا تعلق میری ذات سے نہیں تھا۔ بھر وہ تاریکیوں میں گھبراہٹیں جن دنوں میں کراچی گیا تھا۔ ان تاریکیوں میں میرا ذکر شروع ہوا۔ ایک جگہ لکھا تھا:

"آج ساحل پر پانچ بجے معاشروں سے معرکہ رہا۔ بڑا لطف آیا۔ میں نے ہمارا کرانکا بیکس نکل دیا" اے "بھئی اچھا ناظر ہے۔" ہمارا آدمی ہے۔ داؤ پیچ بھی خوب جانتا ہے۔ تعلیم یافتہ زیادہ میں ہے۔ مگر مہنہ ز جانتا ہے۔ ہر طرح کے لوگوں میں اٹھ بٹھ سکتا ہے اور سلیقے کی منگول بھی کر سکتا ہے۔ غرضیکہ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں جو بہت سی لڑکیوں کو اس سے محبت

اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

500/-	سراج منیر (اول و دوم)
200/-	طارق بن زیاد
175/-	مقدس دیو داسی
200/-	سرابوں کے صحرا
300/-	رقص درویش
250/-	دشت کے بھیڑیے
300/-	غریب کا چوپان
300/-	شیر شاہ سوری
250/-	سندھ کا سورما

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

بڑی معصومیت سے اس اہلکار محبت کو قبول کر لیا ہے۔ مدد
میں بھی ہو گئے ہیں اور میں نے بڑی تنہائی میں اس ذرا سے
کو حقیقت کا رنگ دیا ہے۔ مجھے تو یہ محبت وغیرہ بڑی فضول چیز
لگتی ہے۔ آج کی دنیا میں ان افسانوی چیزوں کی منجائش کہاں؟
ہاں، اس افسانہ ضرور ہے کہ کوئی آپ کو اچھا لگتا ہے اور کوئی برا۔

جو اچھا لگتا ہے اس کے بارے میں سوچیں کہ اس کے ساتھ
آپ کی زندگی عمر کی سے گزر سکتی ہے یا نہیں؟ اگر گزر سکتی
ہے تو سیدھی طرح اس سے شادی کر لیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔
فراق میں آئیں بھرتا.... راتوں کو تارے گونا.... یہ سب فضول
باتیں ہیں۔ کئے اور سننے میں تو یہ باتیں اچھی لگتی ہیں مگر عملی
دنیا میں اگر انسان ان پکڑوں میں الجھ جائے تو دیوانہ ہی ہو جائے
۔ اور پھر ایسا حال دیوانی ہونے کا کوئی اور وہ نہیں ت

اس نے اگلے صفحے پر لکھا تھا۔
"میری چھٹی حس عام طور پر مجھے لوگوں کے بارے میں
ٹھیک ہی بتاتی ہے۔ میرا شبہ درست ہی نکلا۔ موصوف اس قدر
معلوم ہوتے ہیں۔ آج "اے" کو سینہ واحد کی گاڑی لینے
آئی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کے مراسم اور
روابطہ انہی بنگلوں پر ہیں۔ یہ لگتا ہے کہ یہ سینہ واحد ہی کا کارندہ ہو۔
مجھے تو اب گھر میں اس کی موجودگی سے ابھرنے لگی
ہے۔ کہیں اس کی وجہ سے ہم بھی کسی سرکاری ایجنسی کی نظر
میں نہ آجائیں۔

"موصوف ہیں تو اس قدر اور خوش فہمی انہیں یہ ہے کہ میں
ان سے شادی کروں گی۔ اور نہ! اگر اسے گلگت کی لائن میں
موصوف دولت کے اہلکار بھی لگائیں تب بھی میں ان سے
شادی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ
میں ایک بہتر اور پُر مسرت زندگی گزارنے کے لئے دولت کو
بہت اہم سمجھتی ہوں لیکن میں ہرگز نہیں چاہتی کہ وہ دولت
اسے گلگت کے ذریعے حاصل کی گئی ہو اور اس کے تحفظ کی کوئی
ضمانت نہ ہو۔ مجھے دولت کے ساتھ ساتھ تحفظ بھی چاہئے۔

یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آج آپ کا شریک حیات لکھ پتی یا
کرور پتی ہو اور کل کو وہ اچانک قانون کی اصلاحات کی گرفت میں
آجائے تو رسوائی الگ ہو اور عین ممکن ہے کہ آپ کو ڈی
کو ڈی کو محتاج ہو جائیں۔ خیر... یہ بحث تو الگ ہے "اے"
مجھے دیے ہی پسند نہیں۔ میں تو جمیل سے شادی کروں گی۔
جمیل ہماری طرح کاروباری خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔
والدین کا کھلو آکر لگتا ہے۔ جو بصورت اور دیر ہے۔ باہر سے
ایم بی اے کر کے آیا ہے۔ دیے بھی کافی پر مالک ہے۔ ہر لحاظ

سے موزوں نوجوان ہے۔ اب بھی اسے بہت پسند کرتے
اور اب کو بیٹیا میرے نیلے سے خوش ہوگی۔ جمیل کے بارے
میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہے وہ یہ کہ اس
آج تک ٹھیک اور افسانوی عاشقوں کی طرح مجھ سے اگلا
نہیں کیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ میر
لئے اس کی طرف سے رشتے کا پیغام ضرور آئے گا اور ا
وقت مجھے ہنسے میں ایک لمحے کا بھی اہل نہ ہوگا۔
اس سے آگے بھی دائری میں میرے اور جمیل

اس طلسم سے آزاد کروا کے میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ میرے روزِ عمل کے بارے میں جنہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر میں راحیلہ کو گزند پہنچاتا چاہتا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی تھی لیکن تم اطمینان رکھو۔ راحیلہ کو میں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ جن سے انسان کو محبت ہو یا محبت دی ہو، انہیں بھلاؤدہ کس سبب سے کچھ کہہ سکتا ہے؟ کس طرح انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے؟

میں نے بہت دھتے اور ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں یہ باتیں کی تھیں۔ پُر سکون اور پُر اعتماد آدمیوں کے ساتھ آزادوں میں۔ ان لوگوں کے سے لمبے میں جنہیں بڑے بڑے صداقتِ خدایتِ خداوشی سے سہا لے کر عادت ہوتی ہے۔ وہ جمیل کی طرح ہوتے ہیں۔ دکھ کا پتھر اس میں چھینکو تو کرب کی چند لہریں پیدا ہوں گی اور بس... اس کے بعد پھر وہی پُر سکون سطح۔ مجھے اپنے بارے میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس قسم کا انسان بننے پر فی الحال قادر تھا۔ میرے اعصاب مضبوط تھے۔

یہ جوہر اور دھچکے سننے کے قائل تھے۔
"آپ واقعی عظیم آدمی ہیں انی بھالی" راشد جذبات سے گلہ کیر آزاد میں بولا "کوئی آپ کو صحیح طور پر سمجھ جائے تو وہ آپ کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ راحیلہ نے آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں نے نہایت سرسری طور پر دیکھا ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھے بہت سخت اور ناروا لگا ہے۔ تاہم میں ایک سچے دوست کے طور پر آپ سے یہی التجا کروں گا کہ اس کی کوئی بات دل کو مت لگائیں۔ مجھے تو وہ کبھی کبھی نفسیاتی مزیدار لگتی ہے۔"

میں نے مسکراتے کی کوشش کی اور شاید اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔ میں نے بدستور دھتے لمبے میں کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میرا نام محمد افضل ہے۔ ذات کے ہم چوہدری تھے لیکن چونکہ ہمارے پاس اپنی زمین نہیں تھی اس لئے نہ ہمیں کبھی چوہدری سمجھا گیا اور نہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ کبھی "چوہدری" لگانے کی جرات کی۔ چوہدری تو ہمارے علاقے میں صرف وہی تھے جن کی زمینوں پر ہم کام کرتے تھے۔ میں کسایہ چاہ رہا تھا کہ گاؤں میں مجھے "ٹا" کہہ کر پکارا جاتا تھا لیکن اس خاصہ دیہاتی اندازِ خطاب کے پیچھے کوئی کبر، غریب یا ریاکاری پوشیدہ نہیں ہوتی تھی۔ شرمیں مجھے "انی" کہا جاتا ہے لیکن مجھے رفتہ رفتہ تجربہ ہو رہا ہے کہ اس "شری" اور بظاہر سلیجے ہوئے اندازِ خطاب کے پیچھے کتنی الجھی ہوئی منافقتیں بھی سیری زندگی میں چلی آئی ہیں۔ میں راحیلہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے زندگی کے ایک اہم تجربے سے روشناس کرایا ہے۔ اب میں شریں دے رہا ہوں اور اپنا تہ بھرے لفظوں سے اتنی جلدی متاثر نہیں ہوا کروں گا۔ بلکہ ان

سے میں کتنی کچھ لکھا ہوا تھا لیکن میرے لئے صورتِ حال کو دیکھنے کی سوجھ کو اور راجحیت میں اپنے مقام کو سمجھنے کے لئے ہی کافی تھا۔ میرے خیال میں اس وقت میرے تین بدن میں۔ قلب باقی چاہتے تھے۔ میری سانسوں میں شعلوں کی آجانی چاہتے تھے اور میری زبان پر لفظوں کا آتش فشاں پڑنا چاہتے تھا لیکن اس کے برعکس میں اپنی ہڈی بند کر کے رات کو تھماتے کے بعد بھی قطعی خاموش رہا۔

میں مندر میں بیٹے ایک بے عنوان سنا اور برف داروں کی بیخ بیلجی بیلجی تھی۔ کبھی کوئی آواز دی تھی نہ کسی سبک کی آہٹ۔ کبھی خواہشوں کی تپش دی تھی نہ کسی لہر خیال کی پکارا۔ ایک آن میں جیسے سب کچھ فنا لیا تھا۔ جیسے کسی بادِ ہاتھ نے کوئی غیر مری سوجھ آف کر دیا اور اندر کی دنیا کی برقی زو متقطع ہو گئی ہو۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھہر رہی ہو۔ ہر پکارا کی طرف ہم گئی ہو۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ شدت نے پہلے پہل اگر جب اس معاملے کی تحدید پاندھی تھی میں بارود کی طرح ہلکا تھا مگر اب یہ یکایک مجھے کیا ہو گیا

! شاید پہلے مجھے بات کا تعین نہیں تھا اس لئے میں روزِ عمل انتظار کر رہا تھا کہ اب یقین آجائے کے بعد میں اندر سے تپ پھوٹ کر رہ گیا تھا اور شاید یہ میری زندگی کی خطرناک ترین ست تھی۔ میں اپنی اندر کی کیفیت سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ بس خاموش بیٹھا خالی خالی نظروں سے راشد کی طرف

نارہا۔
بالآخر راشد تھوک نکل کر بولا "مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ اس طرح میں بیٹھ کر آپ سے اپنی بہن کے بارے میں سو سو بات کروں... لیکن میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں کہ مجھے یہ ناگوار فریضہ کیوں انجام دینا پڑ رہا ہے۔ انی بیٹا! کہہ چکا ہوں کہ آپ کو یہ سب کچھ بتانے سے میرا مقصد آپ کو ایک مسلک دھوکے کے طلسم سے آزاد کرانا اور تھوکتی دنیا میں واپس لانا ہے۔ مجھے آپ سے بہت عقیدت ہے۔" بت ہے لیکن راحیلہ بھی میری بہن ہے۔ میں نہیں چاہوں کہ آپ روزِ عمل کے طور پر اسے کوئی گزند پہنچنے کی کوشش کریں۔ آپ کو یہ سب کچھ بتا کر میں اپنی دانست میں تو میں نے آپ کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ مجھے یہ سوچ کر بھی آپ کے ان تجاؤں پر اگر کسی وقت کسی اور ذریعے سے یہ خبر چاہا کہ آپ کو کوئی تو نہ جائے آپ کا روزِ عمل کیا ہو۔ اور...

"چند منٹ پہلے تم یہ سب کچھ مجھے سمجھا چکے ہو" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نرم لمبے میں کہا "اب یہ باتیں برائے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ مجھے بارے اس اقدام سے خوشی ہوئی ہے۔ تم نے واقعی مجھے

نے پتھریاں کھول کر دکھائی گئے کی ہدایت کردی۔ کھانا کچھ ہی فاصلے میں کھایا گیا۔ راشد بھی خاموش رہا اور میں بھی چائے کے باوجود کچھ نہ بول سکا۔ کھانے کے بعد میں آندھی طوفان کی رفتار سے راشد کو ایئر پورٹ چھوڑ آیا۔

گھر میں حالانکہ میں پہلے ہی تھکایا رہتا تھا لیکن آج جیسے وہ گھر نہیں دیرانہ لگ رہا تھا۔ درود بخوار کھانے کو دوڑتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں "وقت" طرح گزاروں۔ وقت تو گویا ختم کر رہا تھا یا پھر شاید میرے وقت کی سولی پر معلوب ہو گیا تھا۔

میں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ ٹیلی فون میرے پاس ہی سائیل پر موجود تھا۔ بہت دیر تک تو میں بے حس و حرکت فون کو گھورتا رہا اور گھر سے کھوئی کی ان گنت پرچھائیاں ہر نظروں کے سامنے تھیں۔ گزرتی رہیں۔ پھر قطعی غیر ارادی پر میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پکٹنے کے سارے کر رہی پور اٹھا کر راحیلہ کا نمبر داخل کرنے لگا۔

میرے لئے یہ پہلا اتفاق تھا کہ پہلی ہی کوشش پر بلا سے کراچی کا وہ نمبر مل گیا۔ فون راحیلہ کی ای نے رسیو کیا۔ نام سننے ہی پر خوش لیکن شکوہ آمیز لہجے میں بولیں "معدہ ہائی انٹسٹائن سے تو یہ امید نہیں تھی۔ ہم نے تو اتنے جھڑپتے تھے راحیلہ کی شادی کا کارڈ بھیجا اور تم آئے ہی نہیں۔ اب ایسی کیا بے مروتی۔"

"میں نے اسی سلسلے میں فون کیا ہے آئی! میں۔ ایسا بھئی حتی الامکان شکستہ بنانے کی کوشش کی "ڈاک کی گزری کی وجہ سے مجھے آپ کا بھیجا ہوا کارڈ آج ہی ملا ہے۔ شاید اب بھی کم از کم رخصتی کے وقت ہی پہنچ جاتا لیکن کراچی کی صرف ایک ہی ٹائٹل پاتی ہے اور میرے ہر ایجنٹ نے بتایا ہے کہ اس میں بھی کوئی سیٹ ملنا ممکن نہیں اس لئے اب سوئے مہذرت کے کیا کر سکتا ہوں؟ اس میرا تو کوئی قصور نہیں نا؟"

"ہاں بیٹا! اتنا واقف کوئی قصور نہیں" پھر انہوں ڈاک کے چٹکے کو دو چار جلی کی سائیں اور بولیں "تمہارے آئے کاسب کو بے حد افسوس ہے۔ راشد تو بہت ہی پر نظر آ رہا تھا۔ اتنے کوئی بہت ضروری کام یاد آ گیا تھا" اس د حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ ایک گھنٹے میں واپس آجائے گا۔ "آپنا؟" میں نے سادگی سے کہا "خیر... وہ آئے تو سے میرا سلام کہئے گا" پھر میں نے سونہرے لہجے میں کہا میں راحیلہ سے بات کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں" آئی نے بڑے اطمینان سے کہا "وہ کرے میں نے ناچوں میں گہری بیٹی ہے۔ میں فون اس کرنے میں مجبوری ہوں۔"

لنظروں کے پیچھے چھپے ہوئے اصل مفہوم دہنی کو ہر وقت سمجھنے کی کوشش کیا کروں گا۔

"آپ دل شکستہ نہ ہوں انی بھائی... راشد نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔"

میں ہنس دیا لیکن اپنی یہ فہمی خود مجھے ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی تاہم بظاہر میرے روپے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے مرثیہ لہجے میں کہا "میں دل شکستہ نہیں ہوں۔ دکھ بہر حال ضرور ہے لیکن شکست کا لفظ اب میری زندگی سے نکل چکا ہے۔ زندگی کی جنگ میں جتنی شکست مجھے کھانی تھی وہ میں کھا چکا۔ اب میں صرف فتوحات حاصل کرنے کے لئے نکلا ہوا ہوں۔ لفظ "شکست" سے مجھے جڑ ہے۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ راشد گھر جا کر کسی بھی مرحلے پر راحیلہ کو میرے بارے میں بتائے کہ حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد صدمے سے میرا برا حال ہو گیا تھا۔ میں اندر سے خواہ ریت کے گھردنڈے کی طرح دھیر ہو گیا تھا لیکن بظاہر میں تنگ مرمر کے محل کی طرح کھڑا رہنا چاہتا تھا۔

"اجتاو میں اب چلا ہوں۔ آئندہ ملاقات ہوتی رہے گی؟ راشد اٹھتے ہوئے بولا۔

"اس طرح بھلا تم کیسے جا سکتے ہو؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "ابھی تو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس ایک موضوع کے علاوہ ہم نے کسی موضوع پر بات بھی نہیں کی۔ کب شب بھی نہیں کی۔ یہ بھلا کوئی طریقہ ہے آنے اور جانے کا؟"

"وہ... دراصل انی بھائی! میں رائڈر ٹکٹ لے کر آیا تھا اور اب ایئر پورٹ سے آئے وقت اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کر کے آیا ہوں۔ مجھے ساڑھے نو بجے والی ٹائٹل سے واپس جانا ہے اور راحیلہ کی رخصتی کی رسموں میں شرکت بھی کرنی ہے۔ میں تو بہت ضروری کام سے حیدر آباد جانے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلا تھا اور کہہ کر آیا تھا کہ حیدر ہے تنگ ہر حالت میں واپس آجائوں گا۔ میرے انتظار میں راحیلہ کی رخصتی نہیں ہوئی" اس نے بتایا۔

"میں تمہاری ٹائٹل مس نہیں ہونے دوں گا" میں نے گہری دیکھتے ہوئے کہا "پندرہ منٹ کے فون پر کھانا میرے ہاتھ پر جائے گا۔ پندرہ منٹ میں تم کھا لینا پھر میں خود نہیں ایئر پورٹ چھوڑنے چاہوں گا اس لئے پندرہ ہی منٹ میں پہنچاؤں گا۔ ہفت ضرورت میں راحیلہ سے بھی زیادہ تیز رفتاری اور اس کے ساتھ ساتھ مشاق اور مہارت کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔ تمہارے پاس چونکہ سالانہ بھی نہیں ہے اس لئے تیس ایئر پورٹ پر زیادہ جلدی چھپنے کی ضرورت نہیں۔ میری دلیل کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور میں

سے باہر نکال دیا۔"

"مجھے تم سے کوئی زیادہ لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنی ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا "کتنے کے لئے اب رہی کیا گیا ہے۔ مجھے سمجھائی صرف ایک غلط فہمی دور کرنے کی خواہش ہے۔ میں ایک برے بچے سے ضرور وابستہ ہوں لیکن میں مذاکرات خود اتنا برا آدمی نہیں ہوں جتنا تم نے فرض کر لیا ہے۔ اگر خود پرستی کا التزام آنے کا اندیشہ نہ ہو تو میں کہہ سکتا تھا کہ شاید میں ان سیکڑوں بڑے بڑے شخصوں سے بہتر انسان ہوں جو بڑے عالیشان دفتروں میں بیٹھے بظاہر معززانہ دنیا داروں میں مصروف ہیں لیکن جن کی اصلیت سے کوئی واقف نہیں۔ لیکن خیر.... اس بحث کو چھوڑ دو۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس غیر ضروری مذاق سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟"

"ضروری تمہیں کہ ہر کام کچھ حاصل کرنے کے لئے ہی کیا جائے۔ کچھ کام بے مقصد بھی ہوتے ہیں" اس کے لیے میں ہلکی سی غصہ منڈائی۔ "کم از کم تمہیں اپنے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیے؟" میں نے چپھنے ہوئے لیے میں کہا "اب تو میں نہیں نہیں کر سکتا کہ زندگی میں کوئی کام تم نے بغیر کسی مقصد کے بھی کیا ہو گا۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میرے اس سوال کی تردید میں چپے ہوئے کرب سے محفوظ ہوتے ہوئے مسکرائی ہو۔ پھر وہ دھتے سے لیے میں بولی "شاید میں نے اپنی دائری میں بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ غالباً میں اذیت پرست ہوں۔"

"میرے خیال میں تو یہ اذیت پرستی نہیں ہے" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "اور اگر ہے بھی تو ایک لڑکی کو اذیت پرستی کی تسکین کا یہ طریقہ ذیبت نہیں دیتا۔ میرے خیال میں تو یہ بیمار سوچ کی علامت ہے۔ انسان کو اذیت پہنچانے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔"

"بہر حال ہو گا کچھ" وہ بے پروائی سے بولی "اس وقت میں نہ بحث کرنا چاہتی ہوں اور نہ کوئی بیکہر سننے کی ستمل ہو سکتی ہوں۔ میری سہیلیاں دو روز سے اور کھڑکیوں سے جھانک رہی ہیں۔ شاید وہ خیران ہو رہی ہیں کہ آخر میں ایسی کون سی شخصیت سے باتیں کر رہی ہوں کہ جس کے بارے میں ان سے بھی راز و داری برت رہی ہوں۔ انہیں کیا معلوم کہ میں شخصیت کو نہیں بلکہ ان باتوں کوئی افعال راز رکھنا چاہتی ہوں جو ہم اس وقت کر رہے ہیں۔"

"راجیلہ...." میں نے اپنے لہجے کی لڑش پر قابو رکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب رہا "تم نے جو کچھ

چند لمحے بعد ملی جلی نسوانی آوازوں کی جھجھکات سی آئی دی پھر راجیلہ نے دھیمی سی آواز میں "ہیلو" کہا۔

"شادی مبارک ہو" میں نے آہستگی سے کہا۔ دوسری لڑکھن فوراً سناٹا چھانپا۔ شاید آنٹی نے راجیلہ کو یہ نہیں بتایا مگر فون کس کا ہے۔ اور میری آواز پہچانتی ہی اس نے لہجہ میں پراہتہ رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے غالباً کسی نہ کسی طرح سیلیوں کو کمرے سے باہر بھیج دیا تھا کیونکہ چند لمحے بعد وہ دوبارہ بولی تو میں منظر سے کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"کس لئے فون کیا ہے؟" اس نے سخت سے لہجے میں رکوشی کی۔

"صرف مبارک باد دینے کے لئے" میں نے سادگی سے کہا "اتنا حق تو برے آدمیوں کو بھی دے دیا جا کہے کہ وہ خوشی کے موقع پر مبارکباد دے سکیں۔"

وہ گویا میری بات پر توجہ دینے بغیر بولی "میرا خیال ہے میرا وہ بے غیرت بھائی تمہارے پاس پہنچا ہوا ہے.... میری دائری بھی الماری سے غائب ہے۔ شاید اس نے وہ بھی تمہیں کھادی ہے...."

"راشد کو بے غیرت مت کہو" میرے لیے میں قدرے تیزی آئی۔ راشد کے لئے یہ لفظ سن کر حقیقتاً مجھے غصہ آ گیا تھا "تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے تمہیں ایسا کچھ دار اور حاملہ قسم بھائی عطا کیا ہے۔ وہ عمریں تم سے چھوٹا عمر تم سے زیادہ بالغ نظر ہے۔ اس وقت اس نے اپنی عمر سے کہیں زیادہ زبردستی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"وہ ہے کھل؟" اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا۔

"واپس کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں پہنچنے والا ہو گا" میں نے جواب دیا "امید ہے تم اسے کچھ نہیں کہو گی۔"

وہ خاموش رہی۔ اس کی سانسیں کچھ مرتضیٰ سی تھیں۔ میں فون پر اس کی سانسیں کی آواز سن رہا تھا۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے کہا "میں نے تم سے صرف چند مختصر باتیں کرنے کے لئے فون کیا ہے...."

"میں نے فون صرف اس لئے سن لیا ہے کہ تمہیں تمہی سے کوئی اہم سیدھی بات نہ کہنے لگو" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "ورنہ درحقیقت میں اس وقت کچھ بھی سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت لڑکی کتنے لوگوں میں گھری ہوئی ہے جب اس کی رخصتی قریب ہو؟ وہ تو شکر ہے اس وقت صرف میری بے تکلف سہیلیاں ہی میرے پاس موجود تھیں جنہیں میں نے آسانی

میں نے اپنے ملازم بچا میاں کو آواز دی اور انہیں بولنے لگا اس اور دیگر لوازمات میز پر سجانے کا حکم دیا۔ انہوں نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کی اور میں بیٹے بیٹھ گیا۔ آدمی بولنے ختم ہوئی تو میری کمر پڑی گویا کچھ ہلکی ہو کر ہول میں تیرنے لگی۔ لیکن دل کا بوجھ جوں کا توں رہا۔ میں نے بولنے لگا کہ باہر آکر گاڑی میں رکھی اور سن آبدی کی طرف روانہ ہو گیا وہ ہلکی کوپے مجھے یاد تھے جن سے گزر کر کافی عرصہ پہلے میں شرفو کے ساتھ ایک پرانی سی کوٹھی پر پہنچا تھا۔ اب اس کوٹھی پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس کی حالت کافی بدل چکی تھی لیکن چند ایک نشانیوں کی مدد سے میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی کوٹھی ہے۔

میری گاڑی پورچ میں رکتے ہیں ایک شخص نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ یہ دی بھلا ملازم قہانے میں نے پچھلی مرتبہ سیل آمد پر بھی دیکھا تھا۔ میں گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ وہ خود ہی میرے قریب آ گیا اور آنکھیں سکڑ کر... اجنبی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جا کر میڈم سے کہو کہ ٹھیکیدار افضل صاحب آئے ہیں۔ جو پہلے بھی ایک مرتبہ شرفو کے ساتھ آئے تھے" میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"اوہ... آپ شرفو دادا کے دوست ہیں؟" فوجوان کے سانولے چہرے سے انہیں غائب ہو گئی اور اس کی جاکھیں کھل گئیں "آئیے... آئیے... تشریف لائیے۔"

میں اس کے ساتھ اندر پہنچا۔ اب اس گھر میں کافی خوشحالی آچکی تھی۔ ہر چیز بدلی بدلی اور گھری گھری تھی۔ لگا تھا کہ میڈم کا خندہ زوروں پر جا رہا تھا۔ میڈم سے ملاقات ہوئی وہ بھی پہلے سے زیادہ ذرت برق لباس میں نظر آ رہی تھی۔ چو لری بھی خوب لاد رکھی تھی اور میک اپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شباب مگر ٹھنکے کا سراغ اپنے کے لئے کوشش ہے۔

اس نے مجھے جس لڑکی کے پاس بھیجا وہ اتفاق سے وہی لڑکی تھی جس سے پہلے بھی میںیں میری ملاقات ہو چکی تھی۔ مجھے اس اتفاق پر تو حیرت نہیں ہوئی لیکن یہ جان کر میں حیران رہ گیا کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"تم ایک بار پہلے بھی اس کوٹھی خانے پر آئے تھے" وہ ایک جھوٹے سے آہنے میں اپنے بیک اپ کا جائزہ لیتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

"حیرت ہے" میں نے ٹھاس خالی کر کے تباہی پر رکتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا "مجھے مطمئن نہیں تھا کہ تمہارے طبقے کی لڑکیوں کی یادداشت اتنی اچھی ہوتی ہے۔ کیا کوئی دکاندار تو س پہلے صرف ایک بار آئے والے گاہک کی شکل یا

بھی کیا اس پر تمہیں ذرا بھی پچھتاوا نہیں؟" میں نے جانتا تھا کہ جواب دیا "ہاں البتہ یہ ضرور تسلیم کرتی ہوں کہ دائری کھینچنے وقت میں تمہیں تصوری تصور میں جتنا برا آدمی سمجھ رہی تھی اتنے برسے شاید تم نہیں ہو۔ اور شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو کہ تم بظاہر معزز نظر آنے والے بہت سے انسانوں سے بہتر ہو لیکن میں تمہارے لئے اپنے دل میں محبت محسوس نہیں کرتی۔ نہ پہلے کبھی کی تھی۔ بس؟ یا مزید تشریح چاہتے ہو؟"

"نہیں۔ مجھے کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے" میں نے ہموار لہجے میں کہا "بلکہ تمہاری دائری پڑھنے کے بعد تو تم سے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن میں بس یونہی دل کی کلک کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں فون کر بیٹھا ہوں۔ افسانہ ضرور کہوں گا کہ تم نے جو کچھ بھی کیا اچھا نہیں کیا۔ میں خواہ برا آدمی ہی سہی لیکن خدا کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی اس کے برے بندوں کا بھی دل دکھائے۔"

وہ خاموش رہی۔ میں تمہیں بد ما نہیں دیتا۔ لیکن میری یہ خواہش ضرور ہے کہ کبھی تم بھی ٹھنکے جانے کی اذیت کو محسوس کر سکو" میں نے کہا "خدا حافظ۔"

وہ اب بھی خاموش رہی میں نے فون بند کر دیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن گزشتہ برسوں میں میرے شب و روز کچھ ایسی شگدلانہ فضا میں گزرے تھے کہ میں رونا بھول گیا تھا۔ دل کی گھبراہٹوں سے آنسو اگر امٹتے بھی تھے تو انگاروں کی طرح اندر ہی اندر سینے کو جلاتے تھے "آنگھوں تک نہیں آتے تھے۔ یہ آنکھیں سیال اگر آنگھوں کے راستے سر جاتی تو درجہ میں کچھ ٹھنڈی سی پڑ جاتی۔"

بہت دیر تک میں ہسپتال پر ڈاکو میں بدلتا رہا۔ آج سلی بے تحاشا یاد آ رہی تھی۔ وہ بڑی بے مثال عورت تھی۔ اگر وہ اس کا نہ پہلی گئی ہوتی تو آج میں ضرور اس کی زلف کے سائے میں پناہ لینے پہنچ جاتا۔ وہ یقیناً بکھرے ہوئے مردوں کو سمیٹنے کا فن خوب جانتی تھی۔

میں آج ٹوٹ گیا تھا، بکھرا گیا تھا اور پچھتاوا مجھے یہ بورا تھا کہ جب زلف یادم پر مہربان تھی، کسی کا دست طلب ہماری طرف دراز تھا تو ہم اپنی دانست میں کسی کی وفا کی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو خود ساختہ پاکبازی کی سولی پر معلوب کے ہوئے تھے۔ آج پچھتاوا تھا کہ اس وقت اور اس پاکبازی کا صلہ تبدیل اور خود سوزی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب مجھے ہر چیز پر افسوس ہو رہا تھا۔ چند لمحے پہلے میں نے فون پر جو گفتگو کی تھی اس پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ نہایت اعتقادہ گفتگو تھی۔ مجھے بھلا ضرورت ہی کیا تھی فون کرنے کی۔

"تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" دکاندار کو ہچکچاہٹ کی آمد پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اسس نے بے نیازی سے ہر اب دیا لیکن میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی وہ شاید مجھے یہاں آنے سے روکنا چاہتی تھی۔ کیا اسے مجھ سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی؟ لیکن یہ بتلاؤس طرح ممکن تھا؟ صرف ایک ملاقات میں اس قبیل کی عورت کو بتلا مجھ سے کیونکر ہمدردی ہو سکتی تھی؟ پوئل غالی ہو چکی تھی اور میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی بیٹو، میں آن پھنسا ہوں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے ہچکچاہٹ سے پوچھا۔

"افضل" وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"افضل! آؤ مجھے ڈوبنے سے بچاؤ" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور وہ ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے رکھے ہوئے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

علی الصباح جب میں لوگڑا ہوا اگر بچاؤ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ بچا میاں میرے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ اچھے سارے لڑکے اور راستے میں سرکوشی نہایت میں بولے "خدا کا شکر ہے صاحب! آپ خیریت سے گزر رہے۔ آپ کو ایسی حالت میں گاڑی نہیں چلائی چاہئے تھی" مجھے صرف چلنے میں دقت ہو رہی ہے۔ گاڑی میرے بالکل ٹھیک چلا کر لایا ہوں" میں نے اپنی دانست میں پراسرار لہجے میں کہا۔

"اس عالم میں انسان کو یہی لگتا ہے کہ وہ ہر کام بالکل ٹھیک کر رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا" بچا میاں بولے انہوں نے مجھے بیڑ پر لٹاکر میرے جوتے اندر سے "ایئر کنڈیشن" آن کیا لیکن کمرے سے باہر نہیں گئے۔ ہاتھ باندھ کر وہ ایک طرف گھڑے رہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے غصہ کی زد میں لے کر پوچھا "اگر آپ برا نہ سمجھیں تو میں کچھ عرض کروں گی۔"

بچکچاتے ہوئے اور قائلین کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "اس سے پہلے تو آپ کبھی اتنے سادہ اور خلط پہن نہیں ہوئے" میں نے قہر سے سنبھل کر انہیں گھورا۔

"اصل میں.... جو کیفیت آپ کی ہے اس کیفیت میں دل آگینہ ہو جاتا ہے۔ ذرا سی ٹھنسی لگی اور ٹوٹ گیا" وہ ہاتھ لٹے ہوئے بولے "مجھے معلوم ہے آج وہ لڑکا آپ کے کوئی بڑی خبر لایا تھا۔ اس کے بعد آپ کھڑکے رہ گئے ہیں مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ کیا ہو سکتی ہے۔ صاحب بی بی! کسی زمانے میں ایک بچہ.... لیکن اچھا خاصا واپس آیا تو

رکھ سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی "ہمارا کام شکس یاد رکھنا نہیں" رقیس یاد رکھتا ہوا ہے۔ لیکن شاید میں صرف میں ہی ایک ایسی ہوں جسے کچھ خاص شکس یاد رہ جاتی ہیں۔"

"کیا خصوصیت ہے میری شکل میں؟" میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ بچھرا۔ میرا چہرہ پسینے سے تر تھا "تقریباً عام سی صورت ہے میری۔"

"نہیں۔" اتنی زیادہ عام سی بھی نہیں ہے۔ اپنے خاصے وجہ۔ آوی ہو تم" وہ بدستور ہے پروانی سے بولی "یہ میں خواہ مخواہ تمہارا دل پر حملے کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں اور نہ ہی میں تمہاری وجہات کو فہم و صیحت قرار دے رہی ہوں۔ بلکہ تمہارے چہرے کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس پر مصیبت بہت زیادہ ہے۔ اور مصیبت ایک ایسی چیز ہے جس پر ہمارے قبیل کے لوگوں کی نظر سب سے پہلے جاتی ہے۔ میں خاموش رہا۔ دوسرا گلاس تیار کرنا رہا۔

وہ ایک لمبے کے توقف سے بولی "تمہارے چہرے کی اس مصیبت کو دیکھتے ہوئے ہی مجھے شبہ گزرتا ہے کہ تم درحقیقت اس قماش کے آدمی نہیں ہو جس قماش کے بننے کی کوشش کرتے ہو۔ اور درحقیقت تم نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔ پہلی بار تم میں آئے تھے تو درحقیقت خود نہیں آئے تھے۔ شرفو تمہیں ساتھ لایا تھا۔ اس مرتبہ میں لگتا ہے کہ شاید تم کہیں سے ٹکٹ کھا کر آئے ہو۔ شاید کسی عورت سے۔ مزہ کی یہ عجیب فطرت ہے کہ کسی عورت سے ٹکٹ کھا آئے تو پتا نہ لگنے بھی کسی عورت ہی کے پاس پہنچتا ہے۔ عام طور پر کسی ٹکٹ خوردہ اور نوٹی پولی عورت کے پاس۔ شاید اس طرح لاشعوری طور پر اسے کچھ تسکین ملتی ہے۔ کہ ٹکٹ خوردہ صرف وہی نہیں ہے عورت بھی ٹکٹ خوردہ ہو سکتی ہے۔ یعنی وہ صرف تماشا دیکھنے آئے ہے؟ ایک لطیف سا انتقام لینے آئے ہے۔ تم بھی تماشا دیکھنے آئے ہو۔" لطیف سا انتقام لینے آئے ہو۔"

"کیا کو اس ہے" میں خود بخود کے سے لہجے میں بڑبڑایا۔

"میں یہاں اپنے آپ کو بھلائے آیا ہوں۔ تم سے پیچیدہ قسم کے فلسفوں پر بکھر رہے ہیں کیا۔"

"میں نہیں بکھر رہی ہوں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"اور نہ ہی یہ کوئی پیچیدہ فلسفہ ہے۔ یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ میں دراصل یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ تم دو مرتبہ یہاں آئے لیکن دونوں مرتبہ اپنی مرضی سے نہیں آئے۔ مزید یہ کہ آج شروع کر دیتے ہیں پھر روزہ رفتہ اپنی مرضی سے بھی آئے گئے ہیں۔"

لے لیجئے۔ ننگے تلو کو چھو جس کے تو شاک مسلک ثابت ہو گا۔ اسی قوت کو عقید رکھ کر اور صحیح سمت میں چلا کر آپ دنیا بھر کے کام انجام دے سکتے ہیں۔ نفرت بھی بڑا طاقت ور کرنت ہے صاحب جی، ان گنت دولت کا کرنت۔ اسے سینے میں مقید رکھئے اور صحیح سمت میں چلائیں تو بڑے بڑے نامکن کام ممکن ہو جائیں گے۔ میرے شب و روز ایسی پختہ دہی میں تو گزرتے ہیں کہ کاش میں نے ایسا ہی کیا ہو تو آج اس حال میں نہ ہوتا۔ اب میں اس خوف سے بکھ رہا ہوں کہ کہیں آپ نے بھی وہی کمائی تو برائی شروع نہیں کر دی؟ ننگہ ہے یہ سب کچھ نہیں دیکھا جائے گا صاحب جی۔ آپ تو پہلے ہی بہت باصلاحیت آدمی ہیں۔ اگر آپ کو شکست ہو بھی گئی ہے تو آپ نفرت کے کرنت کو سینے میں مقید کر لیں۔ قسم سے آپ کا کل شکست چیز بن جائیں گے۔ ورنہ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں اس کا انجام اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہو گا جو میرا ہوا۔

چچا میاں خاموش ہو گئے لیکن میرے ذہن میں اب بھی ان کی آواز کی بازگشت گونج رہی تھی۔ میں دم بخود ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کچھ بڑی سے بااں والا یہ مٹھی اور بھول سا شخص اپنے سینے میں تجربات کا ایسا خزینہ چھپائے ہوئے ہو گا۔ انہوں نے باتیں بھی کچھ ایسے تراثر انداز میں کی تھیں کہ ہر لفظ جیسے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ مگر جب انہوں نے بات شروع کی تو اس وقت میری کھجڑی گویا غلا میں معلق تھی لیکن ان کے چند جملوں نے ہی میرا نشہ بزن کر دیا تھا۔ نیند، غم، سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ شاید یہ چچا میاں کے انداز بیان کا نہیں بلکہ ان کے لفظوں کی ت میں چھپی ہوئی صداقت کا مکمل تھا۔ گزشتہ شام سے لے کر اب تک کا اپنا طرز عمل مجھے نہایت ہی اعتماد محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں جواب کا شکر ہوں صاحب جی!" چچا میاں ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"جواب....؟" میں نے پتلیں جھپکے ہوئے دہرایا تو اپنا لہجہ مجھے خود بھی غلاما اعتماد محسوس ہوا۔ پھر میں نے سنبھل کر تھوک ننگے ہوئے کہا "آپ مطمئن رہیں چچا میاں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بروقت اور نہایت اچھے پیرائے میں مجھے سمجھایا ہے۔ میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ دراصل انسان زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو گمراہی میں گم کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ کچھ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جنہیں ایسے وقت میں آپ ہمساکوں کی مدد بہتر آجاتی ہے اور وہ اس کی بات پر کلن بھی دھرتے ہیں۔ ورنہ بیشتر قوسیدھے گڑھے میں جاگرتے ہیں۔ بہر حال... آپ مطمئن رہیں۔ اب میں آپ کو قطعاً گمراہی نظر نہیں آؤں گا۔ میں

مجھے بھی ایک روز ایسی ہی ایک خبر سے واسطہ پڑا تھا اور میں بھی بڑی بڑی کڑی مٹی کھڑ کر دیا تھا۔ وہ دو قسمی تھا... جسے میں نے چاہا تھا... زندگی جس کے نام کر دی تھی... اس نے جو کچھ کیا وہ سب اس کے نزدیک ایک مذاق تھا۔ بل لگی تھی۔ اسے اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ پختہ کار نہیں تھا۔ گمراہیوں نے اس کے لئے نئے منتخب کیا وہ شکاریوں کی گونج میں اٹھیں ان سے اس کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں جلتا رہا، گڑھا رہا، اپنے آپ کو برباد کر رہا تھی کہ راستے کا پتھر بن گیا۔ کسی نے ٹھکر ماری تو وہاں جا رہا تھی اس نے ٹھکر ماری تو یہاں آئے کرنا۔ پوچھی عمر تمام ہوئے تو اتنی ہے۔ وہ تو شکرت کہ آپ ہمساک میرے آگیا۔ ابھی دوپٹا ہوں تو پھر محسوس ہوتا ہے کہ کہنے کو نوکر ہیں مگر باتیں جتنی عزت ہے۔ پورا گھریا آپ نے مجھ پر پتھر ڈالا ہوا ہے۔ کبھی نوکریوں والا سلوک نہیں کیا لیکن اس سے پہلے میں نے بہت دھکے کھائے ہیں اور آپ کے ہاں نہ آتا تو شاید ابھی دھکے ہی کھا رہا ہوتا۔ دوسری طرف "وہ" ہے۔ اس نے کیا کہا؟ اس کا کیا پگڑا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس نے ایک بھرور ذہن کی گزرائی۔ آج وہ فوائے نواسیوں والی ہے۔ ایک بڑے ناہوشان ٹھہر میں رہتی ہے۔ اسے شاید یاد بھی نہیں رہا ہو گا کہ کوئی رفاقت علی بھی تھا جس نے اس کی خاطر اپنے آپ کو راکھ کر لیا۔

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے گویا آنسو پینے کی کوشش کی۔ میں دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور فوراً اس کی بات سن رہا تھا۔ میرے خواس یک لخت ہی بیدار ہو گئے تھے۔

"صاحب جی! آپ مجھے بتائیں کہ اس سوئے میں نقصان کس کا ہوا؟" اس نے آنسوؤں میں جھپکی ہوئی آواز میں پوچھا "صرف اور صرف میرا ہی ہوا نا، بڑا صرف میں ہی ہوا نا؟ اگر اس کے ساتھ جبر ہو تو اب بھی میرے اس حد تک دکھی ہونے کا کچھ تا کچھ عوازاں ہوا۔ میری بربادی سے اگر وہ آج بھی ہو جاتی تب بھی اس کے لئے کیا فرق پڑتا؟ شاید غور و حسن کچھ اور بڑھ جاتا۔ اور عالم یہ تھا صاحب جی کہ جب یہ مانے کچھ پڑا تو دل آتش نشاں بنا ہوا تھا۔ اپنے آپ سے اس سے پوچھ رہا تھا کہ نفرت ہو رہی تھی۔ بڑی خوفناک آگ بھڑک رہی تھی سینے میں۔ اور جس طرح محبت بہت بڑی قوت ہے اس طرح نفرت بھی بہت بڑی طاقت ہے۔ جس طرح کسی کی محبت میں انسان اپنے آپ کو اچھے سے اچھا بناتا ہے اور بدلوں کی طرف جانے کی فکر کرتا ہے، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ انسان نفرت کی قوت سے سارے اوپر باکستان ہے۔ ضرورت صرف اس بندے کو صحیح طور پر استہ کرنے کی ہوتی ہے۔ جیسے بجلی کی سی مٹل

راہلہ قائم کرنا تھا اور اگر ہنگامی طور پر ان میں سے کوئی مجھ سے راہلہ قائم کرنا چاہتا تھا تو اس کا ایک الگ طریقہ تھا۔

جس ریستوران میں ہم جمع ہوتے تھے اس میں ایک بے خانہ نمابال بھی تھا۔ عام طور پر کاروباری لوگوں کی یہ منگولچ یا ڈنر اور ۱۰ تا ۱۵ منٹ کی تقریبات یہیں منعقد ہوتی تھیں۔ اسی ہال کے ایک کونے میں الگ تنہا سی میز پر ہم بھی کاروباری لوگوں ہی کے سے انداز میں جمع ہوتے تھے۔ اکثر اوقات تو میرے ساتھی بعض میں ایک آدھ رجسٹرار فائلیں وغیرہ بھی باہر لاتے تھے۔

بعض اوقات ہمیں واقعی حساب کتاب کرنے، روث طے کرنے یا بعض دوسرے معاملات ایک دوسرے کو سمجھانے کے لئے کاغذ قلم کی ضرورت پڑتی تھی اور اس مقصد کے لئے ہم جو کاغذ استعمال کرتے تھے 'جانے' سے پہلے میں ہاتھ روم میں جا کر انھیں پرزہ پرزہ کر کے فلش میں برساتا تھا۔ ہماری میز ہمارے لئے سٹیجر کی شام کو ریزرو رہتی تھی اور دیگر وغیرہ ہمیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اس شام میں میٹنگ کی صدارت کے لئے پہنچا تو معمول سے کہیں زیادہ پر جوش تھا۔ میں اب انقلابی انداز میں اپنے کام کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا اب میرا نصب العین بن گیا تھا۔

میرے چاروں ساتھی مخصوص میز پر موجود تھے اور میرے ہی خطر تھے۔ پہلے کوائڈ ڈرنکس وغیرہ کا دور چلا پھر میٹنگ شروع ہوئی۔ آئندہ کے لئے میں نے دو پروگرام طے کیا اور جو تجویز پیش کیں ان میں سے کر سب خوش تو بہت ہوئے کیونکہ میری ترقی میں ہی ان کی ترقی بھی شامل تھی تاہم وہ میری بے باکی اور جوش و خروش پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ آخر ایک ساتھی جس کا نام شفیق تھا 'بول ہی انشا' 'سرا' آج تو ایسا مظلوم ہو رہا ہے جیسے آپ کے ذہن اور جسم میں کوئی کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ مستند تو ہم نے آپ کو پہلے بھی بار بار کہا ہے لیکن اس مرتبہ تو بات ہی سمجھ اور ہے۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کم بخت نے جیسے میرا ذہن چڑھ لیا تھا۔ چچا میاں کی طرح اس نے بالکل وہی "کرنٹ" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ مجھے اس کا تہرہ نہ کر خوشی بھی ہوئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کرنٹ کو پہننے میں متیہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"تمہارا بہت شکر یہ راجیلہ!" میں نے تصوری نصیر میں بہ زبان خوشی کہا۔ آج اس کی یاد سے دل میں صرف ایک جیسی سی کک ابھری تھی۔ قابل برداشت بلکہ لذت انگیز سی کک۔ دل میں خنجر سانس نہیں اترتا تھا۔

"ہاں۔ کرنٹ تو واقعی میرے دگ وپن میں دوڑ گیا ہے۔"

مگر حاجی کا مشعل نہیں ہو سکتا۔ میں بہت طاقتور آدمی بننے کا عزم لے کر گھر سے نکلا تھا اور فی الحال میں صرف ملازمت کی ایجنڈے سے واقف ہوا ہوں۔ ابھی تو زندگی سے تھک چکا ہوں کہ وقت آیا ہے اور ابھی سے میں اپنے آپ کو ہتھکڑی کرنے چلا تھا۔ اہل ہے مجھ پر..."

چچا میاں مطمئن ہو کر مسکرائے اور جی بجا کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں ہنٹ لیسپ کی مذہم روشنی میں بیٹھ کر لینا بہت دیر تک بہت کچھ سوچتا رہا۔ اپنا انداز فکر تبدیل ہونے پر مجھے برا اطمینان اور خوشی تھی۔ واقعی اگر میں شراب پی لی کر چلا ہو جاتا اور دو سو ڈالر بہت امانت خطہ مسلط طریقوں سے بنایا تھا تو کوئی خافوں کی نذر کر دیتا تو اس سے راجیلہ کی صحت پر کیا اثر پڑتا؟ اسے کیا تم ہو؟ کون سا دھوکہ پہنچتا؟ کوڑی کوڑی کو بھینچ تو میں ہوتا۔ شے میں دھت ہو کر ہائیوں میں تو میں پڑا یا جاتا۔ کسی کا کیا جاتا؟ عین ممکن تھا کہ مجھے تو بچا کی طرح نہیں اٹھنے کی زکری بھی میری نہ آتی۔

"راجیلہ ڈیر!" میں نے تصوری تصور میں اسے مخاطب کیا "زندگی میں کسی موڑ پر اگر ہمارا آسان سہا ہوتا تو مجھے دیکھ کر قسمیں بہت پائی ہوگی۔ میرا نہ تو گریہاں چاک ہو گا اور نہ میری حالت بچوں کی سی ہوگی۔ تم نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی لیکن میری قسمت اچھی ہے کہ جب بھی میں تباہی کی طرف جانے لگتا ہوں مجھے اچانک ہی کوئی جھکا لگتا ہے اور میرا انداز فکر بدل جاتا ہے۔ اپنی خامیاں مجھے صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اب تم لوگ تو میں پہلے سے زیادہ احمک کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم سے بات کروں گا۔ امید ہے کہ میرے حالات بھی پہلے سے بہتر ہوں گے۔ تمہیں مجھ پر ہنسنے، زہر لب مسکرانے یا میری حالت سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ اذیت کو شہی کی حسرت ہی رہ جائے گی تمہیں۔"

تصور میں راجیلہ سے یہ گفتگو کرنے کے بعد میں بڑے سکون سے سو گیا۔ ایک عجیب قسم کی طمانیت اور احساس فتح مندی سے سرشار ہو گیا تھا میں۔

شام کو میں انشا تو بالکل آدھ رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد تیار ہو کر میں گھر سے نکلا اور اس ہوٹل میں پہنچا جہاں میری اپنے گروہ کے ارکان کے ساتھ ہفتہ وار میٹنگ ہوتی تھی۔ میرا گروہ بنیادی طور پر فی الحال صرف چار مستقل ارکان پر مشتمل تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہم عارضی طور پر کچھ لوگوں کی خدمات حاصل کر لیتے تھے۔

ابھی تک تو میں اپنے ان مستقل ساتھیوں سے بھی نہایت محتاط تھا، بالفاظ و لہجہ والی کو بھی کا انھیں بھی علم نہیں تھا۔ ان سب کے نمکالوں وغیرہ کا بہت مجھے علم تھا۔ میں ہی ان سے

شفیع! میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تم سب کمر کر لو۔ ہم لوگ اس میدان میں تھمکے جانے والے ہیں۔"

"اس نے ابھی کیا بات ہو سکتی ہے؟ میرا دوسرا ساتھی سردار علی ہوا "آپ جیسا پاس میسر ہو اور ہم اس کے بارے میں تھمکے نہ چاہیں تو کیا فائدہ ہماری زندگی کا۔"

اس کے بعد اور حراہری باتیں ہوتی رہیں۔ کمانڈے وغیرہ کا دور چلا۔ بالآخر رات کو بارہ بجے کے قریب ہماری میٹنگ ختم ہوئی۔ جن کمانڈوں پر ہم نے حساب وغیرہ کیا تھا اور خاکے یا نقشے بنائے تھے، انہیں نہ کر کے میں نے اپنی جیب میں رکھا اور ہاتھ روم میں جا کر پڑ پڑ کر کے فٹس میں بھلایا۔ کچھ دیر بعد ہم ریستوران سے نکل آئے۔ میری کار ریستوران سے کچھ دور ایک سنیما کی پارکنگ لائٹ میں اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ شفیع کے پاس اسپورٹس موٹر سائیکل تھی۔ وہ کار کو گھنے کا پتھل بھی ہو سکتا تھا مگر اسے موٹر سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا۔ وہ اچھا خاصا موٹر سائیکلسٹ تھا۔ بہت سے کرپ وغیرہ بھی دکھا سکتا تھا۔

میرے مختصرے گروہ میں شفیع بہت کام کا آدمی تھا۔ وہ بہت اچھا لڑا کا تھا۔ ہتھیاروں کے ساتھ بھی اور ہتھیاروں کے بغیر بھی۔ خطرناک ترین صورت حال میں کاریاز کو مضبوط ترین محاصرے میں سے نکل لے جانے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ بے پناہ دلاور اور مصلحت مند بھی تھا۔ اس قسم کے ساتھی عام طور پر سرکش ہو جاتے ہیں۔ اپنے طور پر جلدی بڑھاتے اور ہاتھ مارنے لگتے ہیں یا بعض اوقات ان کے معاملات حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن شفیع میں ابھی تک میں نے اس قسم کے رہنماہت بھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے تمام خانہ جیسے خود غرض آدمی کا بھی آخری وقت تک ساتھ دیا تھا حالانکہ وہ اسے کیٹن بھی اس سے کہیں کم دے رہا تھا۔

شفیع سے مجھے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس وقت بھی ایک طرح سے میرا فیروہ کی نائب ہی تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں اپنی لائن میں کوئی بڑی چیز بن گیا تو شفیع ہی میرا دست راست ہو گا اور میں اسے باقاعدہ نائب کا درجہ دے دوں گا۔

میرے دوسرے دو ساتھی سردار علی اور حنیف خان اکٹھے رہتے تھے۔ یہ بھی نوجوان اور غیر شادی شدہ تھے۔ بظاہر یہ کیزے اور بوزی کے چھوٹے موٹے پیواری تھے۔ بال لائے اور لمبے جانے کی ساری ذمہ داری ان کی ہوتی تھی۔ اب میں نے جرات خود کھپ لائے یا لے جانے کے لئے ساتھیوں کے ہمراہ جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب بہت مشاق ہو گئے تھے اور مجھے ان پر مجبور نہ رہنا پڑا تھا۔

میرے گروہ کا چوتھا خاص ساتھی شبیر شاخ تھا۔ بظاہر مخفی

اور بھول نظر آنے والا یہ شخص بھی بے مثل ملاعیتوں کا مالک تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کتنا پیرانا اور طاقتور ہے۔ اڑبھے کی طرح اگر وہ ایک بار کسی کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تو حیران سے مار کر ہی چھوڑتا تھا۔ اس کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ وہ صرف جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی بے حد پیرانا اور مستند تھا۔ کسی بھی صورت حال میں فوری طور پر فیصلہ کرنا اس کی خصوصیت تھی اور عام طور پر وہ فیصلہ درست ہی ہوتا تھا۔ مال لینے اور بیچنے کے سلسلے میں پارٹیوں سے سودے بازی، معاملات کی چٹکیل، ملہارے کرنا، رابطے پر قرار رکھنا اور ایض بندوں پر نڈر اسے پہنچانا اور اس قسم کی کئی دوسری ذمہ داریاں اس کے سپرد تھیں۔ اس کے علاوہ ہر اس کھپ کے ساتھ بھی شبیر ہی جاتا تھا جتنے ذرا سامانی خطرہ لاحق ہو تھا۔ کسی بھی قسم کا خطرہ۔

میرا گروہ مختصر لیکن نہایت ہی محمل قسم کا تھا۔ ان چاروں آدمیوں کی موجودگی سے میری وہ تمام ضروریات اور توقعات پوری ہو جاتی تھیں جو کسی بڑے سے بڑے گروہ سے وابستہ کی جاسکتی تھیں۔ گویا بہت سے دیگر معاملات کی طرح میں اس معاملے میں بھی خوش قسمت تھا۔

باہر آکر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ میرے ہاتھوں کی گاڑی اور موٹر سائیکل ریستوران کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ وہ تو وہیں سے رستہ ہو گئے اور میں شٹکا ہوا سنیما ہاؤس کی طرف چل گیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں اپنے مال کی طرف چل دیا۔ مال پر نسر والے پل سے میں کلبیرگ کی طرف سڑک کے لئے گاڑی کو دائیں ہاتھ پر لائے ہی لگا تھا کہ عقب سے کسی نے نہایت نصرت نصرت سے میرے لیے میں کہا "ٹھیک... اس کی ضرورت نہیں سیدھے ہی چلے دو" اس کے ساتھ ہی ایک شخص اس کی چیز میری کپٹی سے ہٹ گئی۔

اسیئرنگ وکیل پر ایک ٹائیپ کے لئے میرے ہاتھوں میں لڑوٹی سی آئی اور جسم میں سنسنی کی لہر دوڑی مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور گاڑی کو اسی ٹریک پر رواں رکھا۔

اپنے مال پر اس وقت درانی چھانے لگی تھی۔ انکو ڈنڈا زبوں کی آمدورفت جاری تھی۔ میں نے صرف ایک بار عقب نما آئیے کی طرف دیکھا۔ گاڑی کے اندر ٹھیک اندر میرے میں پیچھے ایک شخص دو بیوے نمودار ہو چکے تھے۔ پتہ سینڈ پیلے ہی میں نے عقب نما آئیے کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت یہ بیوے یقیناً سینوں کے پیچھے دیکھ ہوئے تھے۔

میں نے جب سنیما ہاؤس کی پارکنگ لائٹ سے گاڑی نکالی اس وقت چرکے شروع نہیں ہوئے تھے اس لئے وہ محض دہلی

ایک پراسرار اور ایڈوینچر ناول

تاریک وادی

ایم اے راحت

تاریک وادی سرزمین افریقہ اور زمین کے دوسرے پراسرار گوشوں کی داستان ہے۔
دنیا کے دوسرے پراسرار گوشے اہلیہ کے دامن میں بکھری ہوئی لاناؤں کی پراسرار داستان جہاں توہمات، جادو اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔

دو جلدوں میں مکمل

قیمت: حصہ اول = 150/-

حصہ دوم = 150/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

موجود نہیں تھا جو عام طور پر گاڑیوں کی آمد اور رخصت کے وقت موجود رہتا تھا۔ البتہ جس وقت میں نے گاڑی کھڑی کی تھی اس وقت وہ ضرور موجود تھا اور اس نے مجھ سے پیسے لے کر مجھے گت بھی دیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ اس قسم کے لوگ کتنی مرمی سے گاڑیوں کی نگرانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس کے باوجود۔ جانے کیوں سیمیا کی پارکنگ لائٹ میں گاڑی کھڑی کر کے کسی حد تک اطمینان سا رہتا تھا۔

میں کبھی غیر متعلقہ نہیں رہتا تھا اور میری پیمنی حس ہیشہ بیدار رہتی تھی کیونکہ میرا تجربہ تھا کہ چونکہ رچے ہوئے خواہ میموں خیریت سے گزر جائیں لیکن ابھر آپ حالات کی ہوا ری اور سازگاری سے مطمئن ہو کر ذرا بے فکر ہوئے اور وہیں صبا نے چھاپا مار دیا۔ اس لئے نہایت پر سکون حالات میں بھی چونکہ رہنے کو میں نے اپنا شعار بنایا تھا لیکن آج شاید میں کچھ دیر کے لئے اپنے اصول پر کاربند نہیں رہ سکا تھا۔

جس وقت میں نے تاریکی میں پارکنگ لائٹ سے گاڑی نکالی میری حسیات میں خفیف سا ارتعاش ضرور پیدا ہوا تھا۔ شاید میری کسی حس نے مجھے خوار کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں گاڑی میں اگلا نہیں ہوں مگر میں نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں آج کی مینٹگ سے کچھ زیادہ ہی خوش تھا اور آنے والے چند دنوں کے تصور میں کھن تھا۔ برسوں میں پہلی بار آج میں اس طرح کھن ہوا تھا اور آج ہی صبا نے آن دیا تھا۔

مجھے خوف یا پریشانی سے زیادہ یہ الجھن ستا رہی تھی کہ آخر یہ تھے کون لوگ؟ سرکاری آدمی تو یہ ہو نہیں سکتے تھے کیونکہ انہیں اس طرح آنے کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ وہ عملی زندگی سے بھی جگہ مجھے روک سکتے تھے۔ کسی اور گروہ سے ابھی تک میری رتبات نہیں چلی تھی اور نہ ہی میرے خیال میں کسی گروہ کو یہ علم ہو سکتا تھا کہ میں کس وقت کہاں بیٹا جاسکتا ہوں۔

ایک خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں یہ دونوں افراد کارپس پیسے والے کسی گروہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ میں نے سال ہی میں یہ ہی گاڑی خریدی تھی۔ پھر مجھے اپنا یہ خیال خود ہی مسترد کرنا پڑا۔ اگر کار حاصل کرنا ہی ان کا مقصد ہو تا تو جب وہ تاریک پارکنگ لائٹ میں کار کے کسی دروازے کا قفل کھول کر اندر بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتے تھے تو وہ اسے لے کر بھی جاسکتے تھے۔ اس کے لئے انہیں کار کے مالک کا انتظار کرنے اور اس کی پہنچی پر رعب اور رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پتا خر میں نے یہ سوچ کر پوری توجہ ذرا تھک پر مرکوز کر لی کہ جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ اینٹرٹ سے کچھ پہلے اس شخص نے مجھے بائیں طرف

”بائیں طرف کیے میں موڑ لو“ ریلوور والے نے حکم دیا۔ میں نے اس حکم کی بلا چون و چرا قبول کی۔ اس طرف غیر محسوس طور پر ہم ٹھیک میں اترتے چلے گئے۔ ٹامہوار کے میدان کے اقسام پر بدگل پھیلا ہوا تھا۔ بدگل کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے گاڑی روک کر حکم دیا۔ میں نے گاڑی روکنے وقت بھی ایک لمحے کے لئے سوچا کہ میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاؤں یا نہیں لیکن بھر میں نے کچھ دیر اور انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

”ہیڈ لائٹس بھی آف کرو“ اس نے حکم دیا۔ ”اور پیسے تم اتر کر.....“ دونوں ہاتھ اٹھائے سامنے والے درخت تک جاؤ اور پھر ہماری طرف گھوم جاؤ۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو اس نے میری کینٹی پر ریلوور کی ٹلی کا دباؤ تکلیف دہ حد تک بڑھا دیا اور سفاک لمبے میں کہا ”میں صرف تین تک نکلوں گا۔ ایک.....“

میں فوراً گاڑی سے اتر گیا اور دونوں ہاتھ اٹھائے اس درخت کی طرف چل دیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے اور میرے درمیان زیادہ فاصلہ پیدا ہو کیونکہ اس طرح میرے لئے کوئی کارروائی کا تقریباً ناممکن ہو جاتا اور اندازے کی ذرا سی قطعی جان بھی لے سکتی تھی۔ ابھی میں درخت سے تین چار قدم اوڑھ رہی تھا کہ عقب سے آواز آئی ”بس اب ہماری طرف گھوم جاؤ۔“

میں آٹھنگی سے ان کی طرف گھوم گیا۔ وہ گاڑی سے اتر آئے تھے۔ ایک تو دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور دوسرا ہونٹ کا سمارا لئے ہوئے تھا۔

ہانڈ کی ابتدائی آدرائیں تھیں اور آسٹن پر تارے بھی خال خال ہی تھے۔ ہر طرف ٹھکانا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ نام میری آنکھیں اس قسم کے ماحول میں کافی حد تک بہتر طور پر دیکھنے کی عادی تھیں۔ میں اتنے فاصلے سے بھی ان دونوں کا جائزہ لے سکتا تھا۔

وہ شخص جو تمام راستے میری کینٹی پر ریلوور دیکھ آیا تھا، دروازہ دوڑا تو دونوں ہاتھ اور پیچھے ہٹ کر سا ”معلوم ہوا تھا۔“ بال چیشٹنی پر ہنسنے ہوئے تھے۔ اس کا لباس بھی کھانڈرے اور پٹے پرائے قسم کے نو جوانوں والا تھا۔ گردن کا کھانا اور گلے میں غلامی لاکٹ چمک رہا تھا۔ اس کا جسم درخششی تھا۔ کندھے چوڑے اور کمر باریک۔ ریلوور کا رخ اس نے اب بھی میری طرف کیا ہوا تھا۔

ریلوور اس کے ساتھ کے ساتھ میں بھی سوہوڑا تھا جو مجھے اب نظر آیا تھا۔ وہ ریلوور کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں انگلیوں میں پٹناتے ہوئے تھا گویا اسے اس کی کوئی خاص ضرورت نہ

ہونے کا حکم دیا جس نے میری کینٹی پر ریلوور رکھا ہوا تھا۔ کینٹ ایریا کے تقریباً آخری آبدشت میں پہنچ کر اس نے مجھے دائیں طرف ہونے کا حکم دیا۔ اس راستے پر بھی ہم تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر کے تو مجھے ایک بار پھر تشویش ہونے لگی۔ آبادی کا سلسلہ اب ختم ہو چکا تھا۔ ان کے کہیں کھیت تھے اور کہیں درختوں کے جھنڈ۔

مجھے ان دونوں کی بے خبری پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ تشویش زدہ تو انہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ یہ علاقہ دیر ان سب لیکن بہر حال چھاتی کا علاقہ تھا۔ یہاں مختلف محفوظ مقامات پر فوجی چوکیاں بھی تھیں جو مرکب سے نظر نہیں آتی تھیں۔ کبھی کبھار یہاں فوجی گاڑیاں بھی گشت کرتی رہتی تھیں۔ رات کے اس پیرورنے میں ایک سولین گاڑی کو دیکھ کر وہ مشکوک سمجھ کر روک بھی سکتے تھے۔

اچانک ایک خیال سے میرا جسم سرد سا پڑ گیا۔ کاروں کے بعض ٹیڑھے بالکل خبط الخواس یا اتفاقی مرید قسم کی چیز بھی ہوتے ہیں۔ کبار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خواہ مخواہ اور قطعی بلا ضرورت دبا ہوا جواز مالک کو بھی قتل کر کے لاش کسی دیرانے میں پیچیدہ دیتے ہیں۔ معلوم نہیں اس طرح وہ اپنے کون سے انتقامی جذبے کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ اب مجھے عقب نما آئینے کی طرف بھی زیادہ توجہ دیکھنے کی ضرورت تھی اور کینٹی پر کئی ہوئی ٹلی کے دباؤ پر بھی۔ اس حالت میں جب کوئی ٹرانزیٹر دبانے کا فیصلہ کرتا ہے تو غیر ارادی طور پر ریلوور پر اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ مجھے یہی خیال رکھنا تھا کہ اگر اس مخصوص انداز میں ریلوور پر دباؤ بڑھے تو میں اسی لمحے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاؤں۔

سڑک اتنی تنگ اور ٹامہوار تھی کہ گاڑی ذرا بھی تیز چلانا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ مجھے یوں ہی ڈرائیو تک کے دور ان ہی گولی مار دیتے تب بھی پھرتی سے آگے آکر اور مجھے دروازے سے دھکیل کر ڈرائیو تک سنبھالنا ان کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں حد سے زیادہ مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے اعصاب والٹن کے تاروں کی طرح تڑپ رہے تھے۔

”کیسا عمدہ پارہا پارہا ہے؟“ بالآخر میں نے بے خوبی کا اظہار کرنے کے لئے گفتگو کی۔

ریلوور والے نے بے آواز سا تھک لگایا اور پھیلا ہی کی طرح تپ سکین لمبے میں ہوا ”تھیں ابھی طرح معلوم ہے کہ اس راستے سے سرحد لارٹ کرنا والے کا انجام کیا ہو سکتا ہے“ اب مجھے حیرت سے ہنسا سا لگا۔ اس خط کا مطلب یہی تھا کہ یہ لوگ میری اصل حیثیت سے واقف تھے اور یہ میرے لئے بہت ہی زیادہ تشویش کی بات تھی۔ میں یکدم اپنی جگہ صبر سا ہو گیا۔

جاننا تھا اور جو میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے ؟
 ”ہاں“ بلاخر میں نے کہا ”میں اس قسم کی منشیات ملک
 سے باہر بیچنے میں عام محسوس نہیں کرتا۔ البتہ منشیات کو
 اندرون ملک بیچنے میں کبھی لوٹ ہوتا پسند نہیں کروں گا۔
 چرس باہر بیچنے کے دھندے میں میں نے پہلی مرتبہ ہاتھ ڈالا
 ہے اور وہ بھی مجبوراً۔ مجھے رات بھر جلد از جلد بڑی رقم کی
 ضرورت ہے ؟“
 ”بہت خوب“ ہیرو ٹائپ فوجوان طنز سے مجھے میں بولا۔
 ”لاکن کیا پتائی ہے اور رعب ڈال رہے ہو جب اوطقی کا۔ ہمیں
 ولاہ۔“

”میں حسب اوطقی کا رعب متعلقہ نہیں ڈال رہا ہوں“ میں
 نے خجل سے کہا ”صرف اپنے مزاج کی بات کر رہا ہوں۔ لیکن
 تم اس بحث کو چھوڑو اور اپنا مقصد بیان کرو۔ ظاہر ہے تم میں
 مجھے انکار کے تارے کے لئے نہیں لائے ہو۔“
 ”تمہارا خیال بالکل درست ہے“ فوجوان بولا ”ہم
 دراصل تم سے یہ پوچھنے کے لئے تمہیں یہاں لائے ہیں کہ کیا
 تم یہ کھپ بیچنے کا پروگرام ملوثی نہیں کر سکتے ؟“
 ”نہیں“ میں نے درج پوچھنے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا
 میں جواب دیا ”میں اس منصوبے پر اپنی پوری بوٹی لگا چکا ہوں
 اور مال کے لئے ادا ہو چکا ہوں۔ لیکن تمہیں کیا
 تکلیف ہے جو تم مجھے روکنا چاہتے ہو ؟“
 ”ہمیں بہت سخت تکلیف ہے“ فوجوان سنجیدگی سے
 بولا ”ہمیں ایک بہت سی دور دراز کے ملک سے چرس کا بہت

ہو، صرف مجھے تنبیہ کرنے کے لئے انکار کیا ہو۔ وہ بہت
 قدر تھا اور گیندے کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چرو
 مجھے بہت زیادہ صاف طور پر فو نظر نہیں آتا تھا لیکن جس حد
 تک نظر آتا تھا اس سے بھی میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل
 نہیں تھا کہ وہ بے پناہ سفاک آدمی تھا۔ اتنا سفاک آدمی کہ
 نہایت سرد مہری اور سکون سے کسی کو ذبح کر دے اور پھر اس کی
 لاش پھلانگ کر ایک طرف کھڑا ہو کر نہایت اطمینان سے کسی
 مشروب کی چسکیاں لینے لگے۔ میں اب کافی مردم شناس ہو چلا
 تھا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس قسم کے خاشاں طبع سے
 آدمی کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔

”ذرا کرات کے لئے یہ جگہ کتنی مناسب ہے“ دروازہ
 اور ہیرو ٹائپ فوجوان مسکراتے ہوئے بولا ”فوری صورت...
 پر سکون اور پرفضا مقام ہے نا ؟“
 ”کس موضوع پر ذرا کرات کرنا چاہتے ہو ؟“ میں نے
 پرسکون مجھے میں پوچھا۔

”چرس کے موضوع پر“ فوجوان نے اطمینان سے
 جواب دیا۔ اور بیب سے بیکٹ نکال کر ایک ہی ہاتھ میں رکھتے
 ہوئے اسے کھولا اور بڑے اشتاکی سے ایک سگریٹ نکال کر
 ہونٹوں میں ڈال دی۔ سفاک صورت اور بہت قدر شخص نے اپنی
 بیب سے لاسٹر نکال کر اس کی سگریٹ کو شعلہ دکھایا مگر خود
 سگریٹ نہیں لی۔

شعلہ کی روشنی میں ایک لمبے کے لئے مجھے فوجوان کا چرو
 صاف نظر آیا۔ وہ اتنا کر گھر بھی نہیں تھا تھا مجھے اندھیرے میں
 دکھائی دیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ سفاکی اس کی آنکھوں سے بھی
 عیاں تھی۔ وہ دونوں پیشہ ور قاتل معلوم ہوتے تھے۔ وہ بھی
 بڑے غور سے میرا سر پایا جائزہ لے رہے تھے۔

”چرس“ میں نے دھتے مجھے میں دہرایا ”موضوع تو بہت
 اچھا منتخب کیا ہے تم نے ذرا کرات کے لئے“ ان کی اس بات
 نے مجھے مزہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ اس کا
 مطلب یہی تھا کہ وہ میرے بارے میں فوجوا بہت نہیں بلکہ
 تقریباً کچھ جانتے تھے۔ وہ بھی جو بڑی بڑی سرکاری
 اہلیں تک نہیں جانتی تھیں۔ جن کا کام ہی خفیہ باتوں کا ہونا
 چاہتا تھا۔

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم چرس کی ایک بہت بڑی
 کھپ ایک قریبی ملک کو سپلائی کرنے کے انتظامات عمل
 کر چکے ہو“ فوجوان سگریٹ کا کش لے کر گویا اصل موضوع پر
 آتے ہوئے سری سنجیدگی سے بولا۔

میں فوری طور پر اس پیشہ پر پہنچ گیا کہ اب انہیں بننے کی
 ادائیگی کرنا فصول تھا۔ وہ واقعی سب کچھ جانتے تھے لیکن
 حیرت مجھے یہ تھی کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنہیں میں نہیں

کنی باتیں ضروری رہ گئی ہیں

محسن نقوی

قیمت :- 100

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

ہے چھین مارنے سے معدہ درست رہتا ہے۔"

پست قد شخص نے پہلی مرتبہ ہنسنے میں دخل دیا اور اس کی آواز سن کر ایک لمبے کے میرے جسم میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ اس کی آواز سانپ کی بھکاری سے مشابہ تھی۔ وہ ریلوے کار کو ٹرانسپورٹ گاڑی کی مدد سے اٹھائی میں چھماتے ہوئے قدرے چڑاڑی سے بولا "جی! ایک تو تم بات کو لبا بہت کر دیتے ہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ لٹاؤں کا بحث ہے" باتوں سے نہیں مانے گا۔ قدر ختم کر دو۔"

اس نے ریلوے کار کو کھلونے کی طرح ہوا میں اچھال کر زبردست مٹاؤ سے اس طرح کھینچ کر ایک بل میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

نوجوان دوسرے ہاتھ سے اس کارپورل کو جھکانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "اگر ہمیں تمہاری زبان سے انکار سن کر خاموشی سے چلے جانا ہو تو ہمیں اتنی دور آکر جبک مارنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم وہیں کہیں بل پر ہی گاڑی سڑک کے کنارے رکوا کر تم سے بات کر لیتے۔ اس علاقے میں کئی ایسے آدمیوں کی لاشیں گیارہ چیلپیں، کڑے اور گندہ کھانچے ہیں جنہوں نے ہماری بات ماننے سے انکار کیا تھا۔"

"اگر تم یہ بتا دو کہ تم لوگ کون ہو تو شاید مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے" نوجوان بولا "ہم درحقیقت تم سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ تم زندہ رہنا چاہتے ہو یا نہیں؟

تمہیں صرف ہاں یا نہیں میں اس کا جواب دیتا ہے۔"

میں نے جواب دیا لیکن غیر انسانی زبان میں۔ میں نے دراصل حلق سے اٹھتی آواز نکالی تھی۔ انہیں یہی محسوس ہوا ہو گا کہ تو ان میں ان کے قریب ہی کہیں بولا ہے۔ اس دیرانے میں کسی کے بھی سر پر الو بولے تو وہ بدشگونی کے دہم میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

پست قد شاید زیادہ ضعیف اور لاچار تھا۔ اس نے فوراً الو پر دیکھا اور صرف اسی کی توجہ میں ایک لمبے کے لے خود پر سے بٹانا چاہتا تھا۔ میں فوراً زمین پر گر پڑا۔ بیرونی چپ نوجوان نے ناز کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور تقریباً اس کے ساتھ ہی پست قد شخص کارپورل بھی گر جائیگا میں سانپ کی طرح لہرا کر لوٹنے ہوئے درخت تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ انہوں نے کافی عرصہ مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ مجھے درخت تک پہنچنے کا حکم نہیں دیا تھا اور اس سے دو قدم پہلے ہی روک لیا تھا لیکن زمین پر لوٹ نکال کر میں نے یہ ناسلامہ ایک لمحے میں طے کر لیا تھا۔ یہی سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ گولیاں مجھے چبھتی ہوئی گزری تھیں۔ ریلوے کار استعمال کرنے کے معاملے

بڑا آؤر ملا ہے۔ اس قسم کے آؤر تو ہمارے شاہان شاہان ہوں ہم کبھی نہیں چھوڑتے۔ ہر حال میں انکی تحویل کرتے ہیں۔ آؤر اتنا بڑا ہے کہ شاید یہ ہمارے ملک کی اسلحہ کی سب سے بڑی کھپ ہو۔ جہاں جہاں بھی مال لٹے کے ذرائع موجود تھے ان سب کو نکال کر ہم جتنا بھی مال جمع کر سکتے تھے کر لیا ہے۔ جس طرح ہم تمہیں اپنا پروگرام ملتوی کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں اسی طرح اور بھی کئی چھوٹی پارٹوں کا پروگرام ہم نے کینسل کر لیا ہے۔ ہمارے پاس صرف چاروں ہیں اور ہمیں ان چاروں میں مطلوبہ مقدار پوری کرنی ہے۔"

"اگر تم اتنی ہی بڑی پارٹی ہو جتنا کہ اپنی باتوں سے ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو..." میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "تم نے انہیں کیوں نہیں منع کر دیا ہو مجھے بال دے رہے ہیں؟"

"وہ علاقہ غیر کے لوگ ہیں اور ان سے ہم الجھنا نہیں چاہتے" نوجوان نے گویا غیر ارادی طور پر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"وہ تم سے رقم کچھ لے لیں۔ اور تب تک اپنے وعدے سے نہیں ہٹیں گے جب تک تم خود انہیں منع نہ کر دو۔ تمہیں رقم کی فکر میں دہلے ہوئے کی ضرورت نہیں۔ جس قیمت میں تم سو اکر کچھ ہو وہ تمہیں ہم سے مل جائے گی۔"

"لیکن جہاں میں مل پہنچنے کا سامرا بندہ دست کر چکا ہوں وہاں سے مجھے سارے خرچ نکال کر بھی پانچ گنا رقم حاصل ہوگی۔ اگر تم تین گنا دینے کا وعدہ کرو تو شاید میں تمہاری پیش کش قبول کر لوں" میں نے کہا۔

"ہم سے کاروبار کر رہے ہو؟" نوجوان کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور غراہٹ بھی۔

"ہم میں اور دوسرے کاروباری لوگوں میں تمہاری ساتھ فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مختلف حکومتی اداروں کی اجازت سے کاروبار کرتے ہیں۔ مختلف اداروں میں کائنات میں۔ ان کا اندراج ہوتا ہے، ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ اور ہم کسی سے اجازت نہیں لیتے، کہیں ہمارا اندراج نہیں ہوتا اور کہیں ہمارا ریکارڈ تیار ہو جاتا ہماری موت کے حوالہ دے دیتا ہے۔ زورن بانی معاملات تو ہمارے کافی حد تک ملتے جلتے ہوتے ہیں" میں نے سمجھانے کے لئے انداز میں کہا۔

"خیر... ہمیں سبق چھاننے کی ضرورت نہیں" نوجوان بولا "ہم تمہیں یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ ہمارے سامنے زیادہ کاروباری شے والوں کا انعام خراب ہی ہوتا ہے۔ اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم کون ہیں تو تم انہی خوف سے چھین مارے ہوئے جگہ نکلو گے۔"

"تو پھر بتاؤ دو کہ تم کون ہو" میں نے نیم استہزاء سے لہجہ میں کہا "مجھے بھی کافی عرصہ ہو گیا ہے چھین مارے ہوئے۔ سنا

تاریخی ناول

ایلیس مصر	ایلیس ایم۔ اے -/ 100
حسن بن صباح	ایلیس ایم۔ اے -/ 125
راجکمار	ایلیس ایم۔ اے -/ 150
نور الدین زنگی	ایلیس ایم۔ اے -/ 250
سلطان عادل	ایلیس ایم۔ اے -/ 150

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

جب میں نے ان دونوں کو گھنٹے درختوں کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان کے وجود تقریباً تاریکی ہی کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ یہ میری خام خیالی ہی تھی کہ گھنٹے جنگل میں انہیں کسی عقاب کا شاید تجربہ نہ ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ دراز قد نوجوان تو شاید اس معاملے میں کچھ اناڑی تھا لیکن اس کا ساتھی پست قد اور پتلا عمر شخص ہرگز اناڑی نہیں تھا۔ اس اندھیرے میں گو کہ وہ پیشکل ایک بھلائی دکھائی دے رہا تھا لیکن اس بھولے کی حرکت و سگات سے بھی میرے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ میری طرح اس کے اندر بھی ایک زندہ چھپا ہوا تھا جو اس وقت جنگل کی فضا اس ماحول اور اس صورتحال میں پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ وہ یقیناً اندھیرے میں شخص قواز پر درست نشانہ لگا سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف پھٹ گئے ہوا میں گویا میری سو گھنٹے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

جس درخت پر میں بیٹھا تھا اس سے کچھ دور ہی وہ رک گئے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سمت میں اور کس انداز میں آگے بڑھیں۔

"ہرچ روٹن کرو..." یہ تیز سرگوشی یقیناً لمبے نوجوان کی تھی۔

"ہاں... ناگہ وہ دوسرے میں دیکھ لے" پست قد بھنگارا۔

"اے معمولی آدمی مت سمجھو۔ تم نے اس کے بھانگے اور گولیوں سے بچنے کا انداز نہیں دیکھا؟ تمہاری شہنی خودی کی عادت سے اس نے پورا پورا ناگہ اٹھایا۔ جتنی دیر تم لمبی لمبی باتیں کرتے رہے وہ اس دوران اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا غافل تیار رہا اور موقع ملنے ہی اس طرح بھاگ نکلا کہ ہم جیسے نشانہ بازوں کو بھی بل دے گیا۔"

"خیر... نہ ہو اسو ہوا۔ اب اسے پکڑنے کی فکر کرو" نوجوان نے بد مزگی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ نوجوان

میں ان کی مشافی واقعی بے مثل تھی۔ اگر میری جگہ اوسط درجے کی لڑائی بھائی کا تجربہ رکھنے والا کوئی شخص ہو تو زمین پر گرنے سے پہلے ہی گولیوں کا نشانہ بن چکا ہو مگر میں اب کوئی عام آدمی نہیں رہا تھا۔ انہیں میرے بارے میں یقیناً سب کچھ معلوم تھا لیکن میری صلاحیتوں کے بارے میں انہوں نے شاید غلط انداز سے قائم کیے تھے یا پھر وہ اپنے بارے میں بہت ... ہی زیادہ زعم میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے اب تک انہوں نے میرے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا جیسا اوسط درجے کے بد ماٹوں کے ساتھ بڑے کردہ باز اختیار کرتے ہیں۔

جب تک میں درخت کی آڑ لینے میں کامیاب ہوا تب تک وہ گولیاں اور میرے پاؤں کو تقریباً چھوٹی ہوئی گزر چکی تھیں۔

جس وقت انہوں نے مجھے درخت کی طرف بڑھنے کا حکم دیا تھا اس وقت میں سامنے پہلے ہوئے جنگل کا بھی طرح بازہ لے چکا تھا۔ اس میں پناہ لینے اور روز پوش ہونے کی بڑی گنجائش تھی۔

درخت کی آڑ میں پہنچ کر میں نے صرف ایک لمحے توقف کیا اور یہ لمحہ ان دونوں نے تذبذب کی ہی کیفیت میں گنوا دیا۔ میں درخت کی سیدھ میں جنگل کی طرف دوڑنا چلا گیا۔ وہ بھی میرے عقاب میں دوڑے اور انہوں نے ایک ایک فائر اور کیا لیکن یہ محض گولیاں خانہ کرنے ہی کے مترادف تھا کیونکہ میں اب گھپ اندھیرے میں پہنچ چکا تھا۔

میں جنگل کی زندگی کا بادی تھا اور مجھے بہت سے ایسے کاموں کی مشق تھی جو میری ہی لائن کے دوسرے آدمیوں کو بڑی عموماً تجربے کے باوجود نہیں ہو سکتی تھی۔ میں بھی اب درختوں کو بڑی وقت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب وہ گھنٹے جنگل میں داخل ہوں گے تو ان کی عیش ٹھنکائے آجائے گی۔

دوڑتے دوڑتے ہی میں نے جو تہ انار پیچھے اور پھر بندر کی ہی پھرتی سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ تھا جیسی تھوڑے دم کی ہی تھی اور حقیقت ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ عام طور پر اس قسم کی صورت حال میں دشمن سے بچ کر بھاگنے والے بھاگتے ہی چلے جاتے ہیں اور دشمن بھی ان کو پیچھے ہی تلاش کرتے ہیں اور تلاش کرنے والے اگر تعداد میں زیادہ ہوں اور جنگ کی حکمت عملی سے کچھ واقف ہوں تو کامیاب ہو جاتے ہیں۔

جہاں پہاڑ بھاگنے والے کو درخت پر چڑھنے کا خیال کم ہی آتا ہے اور پھر پٹی یا بندر کی ہی پھرتی سے درخت پر چڑھنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ تلاش کرنے والوں کو بھی کم ہی یہ امید ہوتی ہے کہ ان کا شکار کسی درخت پر چڑھا بیٹھا ہوگا۔ میں اس وقت محفوظ انداز میں درخت پر پناہ لے چکا تھا

بیوست ہو چکا تھا۔ لیکن میری تمام تر کوشش کے باوجود وہ دلدور انداز میں جینے میں کامیاب ہو گیا کہ دوسرے ہی لمحے میرا ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر تم چکا تھا لیکن اس کی اوجھڑی سی چیخ برحال جنگل کے سکوت کو مرتعش کر چکی تھی۔ اس پر چلاٹنگ لگاتے وقت میری کوشش یہ تھی کہ اس کے ہاتھ سے ریلو اور نکل جائے 'خبر اس کے دل میں اتر جائے اور وہ بھی بھی نہ بکھل سکے۔

ریلو اور اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن وہ میرے ہاتھ بھی نہیں آسکا۔ کچھ زیادہ ہی دور جا کر اور اندھیرے میں اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ میں اپنا خنجر اس کے پهلوسے نکال کر اس کی تھیں سے صاف کر کے اسے ہاتھ میں تھا۔ تقریباً چارپایوں کے سے انداز میں واپس اسی طرف۔ جس دیا جرح سے آیا تھا۔

ایک ایک ایک فائر گونیا۔ گولی شاید کسی درخت سے ٹکرائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پست قند نے اپنے ساتھی کی چیخ سن لی تھی لیکن وہ ابھی مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے شخص مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے اندازاً فائر کیا تھا۔ اگر فوجیوں کا رویہ اور میرے ہاتھ آپکا ہوا تو میں ضرور اس پست قند اور دوسرے نامعلوم شخص سے آگے بڑھنے کے لئے رکنا خواہ متعل اور منتظر مجھے اس کی اجازت نہ دیتی۔ کیونکہ میرے اندر کا درندہ نہ صرف بیدار ہو چکا تھا بلکہ اس کی خون کی پیاس بھی کچھ زیادہ سی ابھرتی تھی۔ تاہم خود کشی تو درندہ بھی نہیں کرتا اور ریلو اور کے بغیر اندھیرے میں اس گرگ باران دیدہ سے آگے بڑھنے کی بجائے خود کشی ہی کے مترادف تھی۔

میں جنگل سے نکلنے کے لئے چارپایوں کے سے انداز میں دوڑنا چاہا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنے عقب میں ایک اور فائر کی آواز سنی لیکن اس کے بارے میں بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ فائر بھی انداز ہی کیا تھا۔ اس شخص کو ہرگز اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں واپس جا رہا ہوں۔

جنگل سے نکل کر میں گاڑی کی طرف دوڑا۔ گاڑی کے دروازے کھلے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ چالی اکشن میں ہی موجود تھی۔ حتی الامکان بھرتی سے میں نے دروازے بند کئے اور ڈرائیوگ سیٹ سنبھل کر گاڑی اشارت کر کے پورن لیا اور ایکسپلر ٹرپ دبا کر بھاگنا چلا گیا۔ کافی دور نکل گئے کے بعد میں نے بیڈ لائنس آن کیں۔ پست قند شخص کو اس کے محل پر چوڑیائی کھلی پڑی سزا

تھی۔ رات کے اس پر بغیر سواری کے اس علاقے میں وہ جانے والے کی خیر عاقبت کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا فوجیوں ساتھی تو دنیا کے تمام جھجھکیوں سے ہی آواز ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے پهلوسے خنجر بیست کرنے کے

صلاحیتوں کے اعتبار سے اس پست قند شخص کا ہم پلہ نہیں تھا لیکن اپنے گروہ میں کسی وجہ سے اسے پست قند پر برتری حاصل تھی۔ اس نے مجھے میں تنہا کی جنگ تھی۔

"اس جنگل میں اسے تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے گھاس کے انبار میں مٹی تلاش کرنا" پست قند نے یہ جملہ انگریزی میں بولا تھا جس پر مجھے تھوڑی سی مزید جبریت ہوئی کیونکہ وہ شکل و صورت سے کچھ زیادہ چمکاندا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

وہ ایک تدم اور آگے بڑھے پھر پست قند نے سرگوشی بنا لیتے ہی میں پوچھا "تم نے اطمینان کر لیا تھا کہ اس کے پاس ریلو اور نہیں ہے؟"

"ہاں" فوجیوں نے جواب دیا "وہ پینٹ شرٹ میں ہے اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی کسی جیب میں ریلو اور کی موجودگی کے آثار نہیں ہیں اور نہ ہی وہ بھلی بولشر لگائے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی تلاش نہیں کی لیکن یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پاس ریلو اور نہیں ہے۔" وہ کینت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عام حالات میں جب میں باہر نکلتا تو میرے پاس ریلو اور نہیں ہوتا تھا۔ البتہ میری ہینڈل پر ایک چری نیام بندھی رہتی تھی جس میں ایک بتاؤد وحمادی خنجر موجود رہتا تھا۔ اس وقت یہ خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور مجھے صرف موقع کا انتظار تھا۔

پست قند نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر گویا فیصلے پر پہنچے ہوئے کہا "وہ بالکل ناک کی سیدھ میں دوڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ درختوں سے پتہ بچاؤد سیدھا ہی آگے بڑھا ہو گا اور اب تک زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ میں اور تم درمیان میں کچھ فاصلہ رکھ کر الگ الگ آگے بڑھتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ بھے کا جائزہ لیا جاسکے۔ اگر کامیابی نہ ہو سکی اور واپس کا راولہ ہو تو میں بھاگ کر مجھے تشنگل دے دیتا۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم اس سیدھ میں آگے بڑھو" اس نے اٹھنے کے اشارے سے فوجیوں کے لئے سمت نشین کی اور جواب کا انتظار کے بغیر اسے وہیں چھوڑ کر ایک طرف کوچل دیا۔ وہ غلام کافی دور جا کر فوجیوں کے متوازی پہلے کا راولہ رکھتا تھا۔

چند ہی لمحے بعد وہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا پیلا لائبریری کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کے جانے کا مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اصل خطرہ مجھے اسی سے لاحق تھا اور میں چاہ رہا تھا کہ وہ خواہ چند سیکنڈ کے لئے ہی سہی مجھے متاثر نہ جائے۔

فوجیوں مثلاً انداز میں اوپر اوپر دیکھا ہوا آگے بڑھتا تھا کہ میں اسی درخت کے نیچے آن پہنچا۔ پاس پر میں جیسا تھا۔ میں نے نہایت سچے تے انداز میں اس پر چلاٹنگ لگائی۔ وہ کسی خوفناک درندے کی طرح چلاٹنگ لیکن میں اسے گرفت میں لینے ہوئے زمین پر لڑاچکا تھا اور میرا خنجر اس کے پهلوسے

بعد اسے چھوڑا ہی اس وقت حجاب اس کی دختر نہیں بدو م
توئی تھیں۔

میرا دایہی کا سفر خیریت سے کٹ گیا لیکن جب میں گھر
پہنچا تو میرا طبع دیکھ کر ایک بار پھر چچا میاں کے ہوش اڑ گئے۔
”پریشان نہ ہوں چچا میاں!“ میں نے انہیں تسلی دی
میرا کسی سے بگڑا ہوا تھا۔ اب وہ پکڑ نہیں ہے جو آپ سمجھ
رہے ہیں۔ آپ کی بات میری سمجھ میں آئی ہے اور میں نے
اپنے آپ کو شراب کے سمندر میں غرق کرنے یا شہرت
کندہ کی بھول بھلیوں میں گم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔
آپ اطمینان سے جا کر سو جائیں۔“

میرے لیے سے انہیں میرے بے فانی ہوش و حواس
ہونے کا یقین ہو گیا اور وہ مطمئن ہو کر سروٹ کو اڑ میں چلے
گئے۔ تادم میں کافی، مہر تک چلتا رہا۔ اس پورے واقعے نے
میرے اعصاب پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ مجھے صرف یہ
سوال پریشان کر رہا تھا کہ آخر وہ لوگ کون تھے؟ کس گروہ سے
تعلق تھا ان کا؟ اور ان سوالوں کے جواب حاصل کے بغیر میں
نے ان میں سے ایک کو ٹھکانے لگا کر کہیں غلطی تو نہیں کی
تھی؟ جب میں اس سلسلے میں کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا
تو سب کچھ ذہن سے ہٹا کر یہ سوچ کر سو گیا کہ جو ہو گا سو
دیکھا جائے گا۔

دو دن بعد جبکہ ہماری کھپ جانے کی تیاریاں آخری
سرطوں پر تھیں، رات کے تقریباً بارہ بجے فون کی گھنٹی بجی۔
میں اس وقت سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ میں نے ریسیور
اٹھایا تو قدرے مانوس ی ایک مردانہ آواز سنائی دی ”افضل
”ہی“ میں نے ایک لمحے کی چٹکاپاٹ کے بعد جواب دیا
”کیسے مزاج ہیں؟“ بڑی ملاشت سے پوچھا گیا۔
میں ایک لمحے خاموش رہا۔ ذہن پر زور دیا لیکن فیصلہ نہ
کر سکا کہ ایسا کون شناسا ہو سکتا ہے مجھے میرے گھر کا فون نمبر
معلوم ہو۔

”معاف کیجئے... میں نے آپ کو پہچانا نہیں“ باخبر میں
نے شائستگی سے کہا۔

جواب دہری طرف سے لگا ساتھ سنائی دیا ”کنزور
یادداشت ہمارے پیشے کے لئے بالکل اچھی نہیں ہے ڈیڑ
افضل! ہم جیسے لوگوں کا ذہن تو کبھی بڑکی مانند ہوتا چاہئے۔
ایک بار آواز سنیں تو سماعت میں محفوظ ہو گئی۔ ایک بار چہرہ دیکھنا تو
ذہن پر نقش ہو گیا۔“

اپنا کب میرے ذہن میں چھٹا کا سا ہوا اور میں نے وہ آواز
پہچان لی۔

”سینو واحد...!“ میں نے سرسراہٹ توئی ہی آواز میں کہا۔
”گند“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”اس کا مطلب ہے“

عظیم مدبر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) - 150/-

(قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (زاہد حسین انجم) - 150/-

(پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے حالات زندگی)

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

تمہاری یادداشت زیادہ بری نہیں۔“

میری ریزہ کی بڑی میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی۔ میں تو
اب تک یہی سمجھے بیٹھا تھا کہ میرا ٹھکانا بہت محفوظ ہے اور
میرے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں لیکن یہ محض میری غلام
خیالی تھی۔

”آپ... آپ کیلایا دور سے بول رہے ہیں؟“ میں حیران
سا بھلا گیا۔

”نہیں۔ کراچی سے بول رہا ہوں“ اس نے اطمینان سے
جواب دیا۔

”آپ کو میرا آتا ہے... میرا مطلب ہے فون نمبر وغیرہ...
کہیں سے ملا؟“ میں نے حیرت کے اس جھٹکے سے شبیلے کی
کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بے حد خوشگوار
موز میں مطمئن ہوا تھا۔ ”روشن ایک طویل عرصہ پہلے جب میں
اس سے ملا تھا تو اس کے بارے میں میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ شکار
بارہی ہوتا ہو گا۔“

”ڈرو نہیں“ وہ بولا ”تمہارا آتا ہے... تمہارے ٹھکانے وغیرہ
سب محفوظ ہیں۔ ہمیں اگر کسی کے ٹھکانے کا علم ہو تو ضروری
نہیں کہ وہ غیر محفوظ ہو۔“ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میرا
اپنا ایک شہینہ خبر درمائی ہے جس پر میں ہر ماہ لاکھوں روپے
خرچ کر رہا ہوں۔ اس شہینہ کا کام یہی ہے کہ وہ میرے مطلب
کی ہر بات کا علم رکھے۔“

”بہت خوب“ میں اب شبیلہ چکا تھا ”کتنے کیسے یاد کیا؟
”کوئی خاص کام نہیں تھا“ وہ سرسری لہجے میں بولا ”بس
تمہیں مبارکباد دینی تھی۔ تم اب بہت کام کے آدمی بن گئے
ہو۔ میرے ایک خاص اہم آدمی کا کام ہے اچھی عمر کے ساتھ
صاف کیا ہے کہ میں حیران نہ ہوں بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے پہلے

جاکل نہیں۔ میں نے تو یہ سوچ کر فون کیا ہے کہ چلو اور
بہانے تم سے گپ شپ ہی ہو جائے گی۔ ویسے بھی ہم تو ہر
بڑے اور بڑا صلاحیت لوگوں کے سب سے بڑے قدر دان ہیں۔
کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف یاد کر لینا تم سے میر
بہت خوش ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں اپنا مال بیچنے کا پروگرام برقرار
رکھ سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور۔ ضرور۔" وہ خوش دلی سے بولا "اور اس میں سے
پورے ملک میں ہم دو ہی آدمی ہوں گے جن کا یہ آئٹم باج
جائے گا۔"

"بہت شکریہ" میں نے غیر محسوس طور پر اطمینان کا
سانس لی۔

"مجھے تم اپنے دوستوں ہی میں شمار کرو" سینہ واحد
"یہ تو میری خوش قسمتی ہے جناب! امید ہے آپ جیسے
لوگ ہر ایک کو تو دوست نہیں بناتے" میں نے ممنونیت سے
کہا۔

"ہاں۔ یہ درست ہے" وہ ہلکا ہلکا بولا "لیکن تم جیسے
لوگوں کی مجھے تلاش رہتی ہے۔ خدا نخواستہ اگر کبھی تم محسوس
کرو کہ آزادانہ طور پر کام کرنے کے لئے تمہارے حلال
مہذوں نہیں رہے تو بلا تامل آکر میرے ساتھ مل جانا۔ میر
ساتھ پشتر ایسے ہی لوگ شامل ہیں جن کا کبھی اپنا "کاروبار"
... اب اس نوجوان ریاست خان کوئی لے لو جس کا شمار
ہاتھوں پتہ صاف ہوا ہے۔ بڑا کھانا نوجوان تھا۔ کئی سال امر
میں رہا۔ وہیں چھوٹے موٹے دھندے کرتا تھا۔ وہیں سے ہو
تو استلا لہیو سے آن نکلیا۔ استلا لہیو کا چھوٹے پکانے پر
"کاروبار" تھا۔ دونوں پارٹنر بن گئے بلکہ ایک طرح سے ریاست
خان نے ہی زیادہ تر اختیارات سنبھال لئے۔ یہ دونوں بہت بڑے
اچھے آتے لیکن ریاست خان میں دو بڑی خامیاں تھیں جن
میں نے بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ جلد
نوجوان تھا "دوسرے اس میں مٹی بکھارنے کا مرض کبھی بڑے
بڑے غلام سقوسق پر عود کرتا تھا۔ امریکا کی ایکشن ٹکڑوں۔
اس کا بلاغ کافی حد تک خراب کیا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ان کا کارو
بکھرنے لگا چنانچہ دونوں میرے ساتھ آن گئے۔ میں
انہیں بڑی عزت دی۔"

"آپ کا.... مطلب ہے کہ ریاست خان کے ساتھ؟
بہت قد آدمی تھا وہ استلا لہیو تھا؟" فریاد حیرت سے میں ایک
پھر بھلائے لگا۔

"ہاں۔ لیکن اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا؟
جانتے ہو اسے؟" سینہ واحد نے پرتشیش لہجے میں پوچھا
"نہیں۔ میں اس سے واقف نہیں ہوں" میں۔

ہی معلوم تھا کہ تم آگے چل کر کوئی زبردست چیز ہو گے۔ جس
قدرت سے تم آگے بڑھ رہے ہو اسے دیکھ کر تو میں حیرت کی
سوچنے لگتا ہوں کہ تمہیں اپنا چالشین بنادوں۔ ویسے بھی میری
کوئی ترقیہ اولاد نہیں ہے۔"
"تو.... وہ بیرونی ٹاپ سالو جان آپ کا آدمی تھا؟" میری
زبان ایک بار پھر لڑکھائی۔

"ہاں" وہ تھکے تھکے بے پروائی سے بولا۔
"آپ اس نے اتنی لمبی چوڑی مشکوک کرنے کے بجائے
شریح میں ہی مجھے بتادیا ہو گا کہ وہ آپ کا آدمی ہے تو یہ سب
بچہ بزرگ نہ ہوتا۔ میں بھی اتنی کھینچ آن سے بچ جاتا اور اس کی
جان بچتی نہ جاتی" میرا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ مجھے اگر اس
لائسن میں رہتا تھا تو سینہ واحد جیسے لوگوں سے اس قسم کے
واقعات پر معذرت کے بغیر پارہ نہیں تھا۔ بلکہ میں تو صرف
معذرت کر رہا تھا میری جگہ میری ہی جتنی حیثیت کا کوئی اور
آدمی ہوتا تو شاید وہ اسی وقت ریپورر رکھ کر پہلی فلائٹ سے
کراچی پہنچتا اور سینہ واحد کے قدموں میں گر پڑتا۔

"تمام تفصیلات مجھے معلوم ہو چکی ہیں" سینہ واحد بولا۔
"میں دراصل اس وقت ملک سے باہر تھا جب میرے احکامات
پر عمل درآمد ہوا۔ غلطی میرے آدمیوں کی ہی تھی۔ انہوں
نے گمراہی اور گمراہی سے دونوں ہی کو ایک لاشی سے ہاتھ کی
کوشش کی۔ اس وقت تک مجھے بھی صحیح طور پر معلوم نہیں
ہو سکا تھا کہ لاہور سے جو پارٹی پرس کی اتنی بڑی کھپ کو پینڈل
کر رہی ہے وہ دراصل تم ہی ہو۔ میں نے تمام خان سے
علیحدگی کے بعد تمہارے بارے میں ہر قسم کی معلومات تو رکھی
تھیں لیکن پھر دوسرے بہت سے معاملات کی وجہ سے تم
میرے ذہن سے نکل گئے تھے۔ میرے آدمیوں کو تو تمہارے
بارے میں علم ہی نہیں تھا کہ تم سے ہماری کچھ شناسائی رہی
ہے۔"

"میں واقعی بے حد شرمندہ ہوں سینہ صاحب!" میں
نے حقیقی شرمندگی سے کہا "کیا نام تھا اس نوجوان کا؟"
"ریاست خان" سینہ واحد نے جواب دیا "لیکن تم اس
معاہدے کو ذہن پر سوار مت کرو۔ اگر میں تم سے ناراض ہوتا تو
اس وقت تم سے فون پر بات نہ کر رہا ہوتا۔ پھر تو بات گویوں ہی
کی زبان میں ہوتی۔ میں بیان رہا ہوں کہ غلطی میرے آدمیوں کی
اور خصوصاً ریاست خان کی تھی۔ اس نے ذاتی طور پر مجھ
جھانڈنے کے پتھر میں میرا ہم استعمال کرنے میں تاخیر کی۔ خیر
اسے اپنی غلطی کی سزا مل گئی۔ بڑی غلطی کرنے والے کو
میری طرف سے بھی یہی سزا ملتی ہے جو تم نے اسے دی۔
اس جھمن میں معذرت وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو
اصول کی بات کر رہا ہوں۔ میں خواہ مخواہ کسی پر رعب بھانڈنے کا

رومانی ناول

100/-	اسلم راہی ایم۔ اے	لڑکی اس گلی کی
100/-	اسلم راہی ایم۔ اے	اس جلتے جہاں میں
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے	خدا کہاں ہے
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے	جلتے بچتے لوگ
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے	سمیرا
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے	روٹے کنول

کے مطابق استاد لہجو در حقیقت بنیادی طور پر پھیرا تھا اور یہی کاروبار کرتے کرتے اس گنگ کی لائن میں مہیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے سنا تھا کہ وہ بے پناہ مساف آوی ہے لیکن میرے دل میں اس کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور میں نے اپنی دانت میں اسے سبق دینے کے لئے جوڑا ڈھانڈ کر اس کے ایک ساتھی کو قتل کر دیا تھا اور اس کے لئے پیغام چھوڑا تھا کہ میں اسے بھی بخشوں گا نہیں اور ایک نہ ایک روز اسے ضرور قتل کروں گا۔ میں نے حقیقتاً پورے جوش و جذبہ اور صداقت کے ساتھ اپنے آپ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں استاد لہجو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور مجھے اپنا یہ وعدہ آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔

یقیناً استاد لہجو کو بھی میرا وہ رشتہ ضرور یاد ہو گا کہ اسے اپنے مقتول ساتھی کے قریب سے ملا ہو گا لیکن اسے یہ ہرگز نہیں معلوم تھا کہ رشتہ کھینے والا دراصل کون ہے؟ وہ نہ تو میرے نام سے آتا تھا اور نہ ہی صورت سے۔ اب تک میں بھی صرف اس کے نام سے ہی آشنا تھا لیکن اب میں نہ صرف اس کی صورت دیکھ چکا تھا بلکہ مجھے اس کا واضح سراغ بھی مل چکا تھا۔

اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ میری لائن کے بہت ہی بڑے آدمی کی پتہ میں تھا لیکن کھن اس بنا پر میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا، صاف نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں قتل اور ہوشیاری سے چٹا تو سانپ بھی مر سکتا تھا اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ سکتی تھی۔ میں نے فیصلہ یہ کیا کہ میں مل جینے کی قسم سے قاتل ہو کر اس سلسلے میں سوچوں گا۔ اس ٹکپ کو بحفاظت خزل تک پہنچانا میرے لئے بہت ہی اہم تھا اور اس پر میرے مستقبل کے کئی بڑے بڑے منصوبوں کا ارادہ رہا تھا۔ اس فیصلہ پر پہنچ جانے کے باوجود مجھے بہت دیر بعد فینڈ آئی۔ سینہ واحد نے آج فون کر کے میرے ذہن میں غامبی

مدی سے کہا ”مجھے یہ نام بڑا عجیب لگا تھا۔ آدمی تو وہ اچھا خاسا قتل نظر آ رہا تھا۔“
”دراصل اس نے اپنا نام بدلا نہیں ہے“ سینہ واحد نے ہنس رہا۔ ”بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی بڑے کام کا ہے۔ شاید اسی لئے وہ تمہارے ہاتھ سے بچ گیا۔“
”جی ہاں“ میں نے مجھے لمبے میں کہا ”آدمی بہت ملاحت بھی ہے اور خوش قسمت بھی۔ میں اگر تھوڑا بہت رن زدہ ہو ا تھا تو اسی سے ہوا تھا اور میرا ارادہ اسی کا پتہ صاف لے کر آیا تھا کہ وہ میں یونہی.... غیر محسوس طور پر ہی ہاتھ سے ل گیا۔“
”شاید قدرت مجھے زیادہ نقصان سے بچانا چاہتی تھی“
”شاید“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اچھا... خدا حافظ۔ کبھی کراچی آؤ تو ضرور ملنا“ سینہ واحد لالہ۔

”بہت بہتر۔ خدا حافظ“ میں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ ریسیور رکھنے کے بعد کئی دیر تک میں صبح محلوں میں سکون نہیں ہو سکا۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی پرنسی پی چل رہی تھی۔ ایک تو میرے لئے یہ تھا کہ کچھ کم نہیں تھا کہ ملاحت بھی میں میرے ہاتھوں سینہ واحد کا آدمی بنا دیا تھا اور یہ خالصتاً میری خوش قسمتی تھی کہ اس واقعے کے باعث میرے اور سینہ واحد کے درمیان دشمنی کا آغاز ہونے کے بجائے دوستی کی بنیاد پڑ رہی تھی۔

اس سے کہیں زیادہ زور دار دھچکا یہ جان کر لگا تھا کہ وہ پتہ قد جس پر نظر پڑے ہی میری چپنی جس غیر معمولی طور پر مجھے کچھ ناگاہکی قسم سے متکل دینے لگی تھی... استاد لہجو تھا۔ استاد لہجو کی بدولت ہی میری زندگی اس موڑ پر پہنچی تھی جس کے بعد میرے روز و شب میں زیادہ تر ہنگامہ فیزی کا عمل داخل رہا تھا۔ مجھے زندگی کا پہلا شدید جذباتی صدمہ اسی شخص کی بدولت پہنچا تھا۔ اس کی جھڑکی دوجہ سے میرا اور میرے ابتدائی ساتھی اشرف خان کا حریف الہاک چوہٹ ہوا تھا۔ ہمیں یک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حتی کہ مجھے اپنی محبوبہ زمرہ کو بھی چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔

اشرف خان کوئی کائنات بن گیا تھا اور جاتیر نہیں ہو سکا تھا۔ کچھ عرصے بعد جب میں زمرہ کو لینے پہنچا تھا تو وہ مجھے ہانکتے بہ حالت میں نظر آئی تھی اور اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔

میں نے استاد لہجو کو اس وقت دیکھا نہیں تھا لیکن مناسبتوں کے ساتھ وہ کسی پڑھے لکھے مگر انتہائی بد معاش قسم کے فوٹو ان کے ساتھ مل کر اپنا گروہ چلا رہا ہے۔ میری معلومات

لجلی بڑا کر رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی اس خواہش پر خود ہی ہنسی آجاتی تھی۔ یہ بات خواب کی حد تک تو مجھے ٹھیک لگتی تھی لیکن عالم بیداری میں سچا تھا تو بڑی ناقابل عمل سی لگتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زندگی میں بعض خواہشیں جو کبھی بالکل انسانی سی لگتی ہیں بالآخر پوری ہو جاتی ہیں۔

خواہشات تو میری بھی پوری ہوتی باری نہیں لیکن میں ایک کبھی سی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے کبھی کبھی ایک بے عنوان سی خلتیں بے چین کرنے لگتی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ ٹھیک طریقے سے نہیں ہو رہا۔ بس تو وہی سی گزرتی رہ گئی۔ پھر میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے اور اپنے ضمیر کو ٹھیک دینے کی کوشش کرتا کہ کہاں کہاں! اس گزرتے بغیر یہ سب کچھ اتنی جلدی کہاں ممکن ہو تا؟

”گزرنا“ نہ ہوتی تو ایک قصبے کا ایک مظلوم اللہ لڑکا جوانی ہی میں دی مال کے اس آراستہ و پیراستہ دفتر میں کیسے پہنچ سکتا تھا؟ میں، منظر اور پیش منظر میں وہ اتنے آدمیوں کا پاس کیو کچھ ہو سکتا تھا؟ اس کے پاس بیک اور وہاں مٹی کی صورت میں لاکھوں کی رقمیں کہاں ہو تیں؟ باؤل ٹائون کی کوئی اور یہ رائل سیلون کار کہاں سے آئی؟

پھر میں اپنی لائن کے جن چند لوگوں کو جانتا تھا ان کا ہاتھ لیتا اور ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتا تو دل کو کچھ اور اطمینان ہو جاتا۔ خود ہی سستی سے قطع نظر میں اپنے آپ کو ان سے کچھ بہتر محسوس کرتا۔ ان میں سے بعض میں تو انسانی اور اخلاقی اقدار کا کوئی تصویری نہیں تھا۔ وہ حد درجہ ظالم اور سفاک تھے۔۔۔ بوقت ضرورت تو میں بھی سفاک بن جاتا تھا لیکن کسی ش کسی اصول کے تحت۔ دوسرے یہ کہ مجھے اپنے سے کمزور آدمی پر ہاتھ اٹھانا بہت سی مضبوط لگتا تھا۔ آج تک زیادہ تر میری پنج آزمائی انہی لوگوں سے ہوئی تھی جو اپنے آپ کو بڑی قوت چہرے سمجھتے تھے اور مجھے عموماً اپنے دماغ اور اپنی ہائی خاطر ہی انہیں سبق سکھانا پڑا تھا۔

جبکہ میری لائن کے بعض لوگ بلا ضرورت ہی اپنے سے کمزور لوگوں کو کچل ڈالنے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ میں تو پھر بھی اپنے پیشے کے بارے میں خفیہ سے احساس جرم کا شکار رہتا تھا۔ جبکہ ان لوگوں کو احساس جرم نہ ہو کر کبھی نہیں گزرتا تھا۔ میرے ذرائع آمدن خواہ کچھ بھی تھے لیکن جتنے بھی ضرورت مندوں اور مستحقین کے بارے میں مجھے علم تھا ان کی میں داسے دوسے اور سترے ہر ممکن مدد کرتا رہتا تھا اور اس قسم کی کوئی بھی بھلائی کرتے وقت اپنے آپ کو غرضی رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا جبکہ میرے طبقے کے بہتر لوگوں میں اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لینے کا تصور ہی موجود نہیں تھا۔ معلوم نہیں مجھ جیسے لوگوں کی نیکیاں بار بار ہی انہی میں

اس ایک کیپ نے میرے وارے نیارے کر دیے تھے ایک ہی جھٹکے میں انہیں بہت آگے پہنچ گیا تھا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا کہ اپنے کردہ کو تھوڑا سا دور پیچا کر خود آرام سے بیٹھ جاؤں اور صرف انکلمات جاری کروں یا حکمت عملی تیار کروں۔ کسی بھی قسم پر میرا ساتھ جانا ضروری نہیں تھا۔ میرے وسائل اتنے بڑے تھے کہ میں اس لائن کے بہترین کارندوں کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔

فوری طور پر میں نے ایک کام یہ کیا کہ اپنے وکیل کے مشورے اور مدد سے کچھ رقم کو جائزہ دینے آمدن سے حاصل شدہ ظاہر کر کے مال روڈ کی ایک سڑک پر امپورٹ ایکسپورٹ کا ایک آفس کھول لیا۔ درحقیقت یہ آفس پہلے سے قائم تھا اور خالص آراستہ و پیراستہ تھا۔ فرم بھی انکم ٹیکس اور جی بی آر آف کامرس ڈیویژن میں رجسٹرڈ تھی۔ میں نے اس کے حقوق ملکیت خرید لئے تھے کیونکہ اس کے مالکان مستغلا پاکستان سے باہر جا رہے تھے۔ فرم بھی کوئی خاص چل چلا نہیں رہی تھی۔ مدت سے کوئی آرڈر نہیں ملا تھا۔ دفتر بھی اکثر بند ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لوگ نیم دلی سے کھول لیتے تھے۔ مجھے ایسے ہی کسی دفتر اور فرم کی تلاش تھی۔ مے سرے سے اپنا دفتر قائم کرنے کی نیت اس خریدنے میں میرا کلنی وقت بچ گیا اور زیادہ تر وہی نہیں کرنا پڑا۔ میں نے ابتدا میں صرف تین افراد پر مشتمل اسٹاف رکھا۔

ایک کرپٹ لڑکی تھی کیٹھون۔ جو بیک وقت ریسپنشن بھی تھی، ٹیلی فون آپریٹر بھی اور میری سیکریٹری بھی۔ ایک منظر صاحب تھے جو بیک وقت ہیڈ ٹرک، کلائنٹس اور ٹائیٹس تھے۔ ایک ریاض صاحب تھے جو امپورٹ وغیرہ تھے۔ درحقیقت میرا جائزہ کاروبار سارا کامیابی کا چلانا تھا۔ مجھے تو امپورٹ ایکسپورٹ کا کچھ اتنا زیادہ علم نہیں تھا۔ تاہم خواہش میری یہی تھی کہ میرا جائزہ کاروبار بھی کسی نہ کسی حد تک تو چلی ہی پڑے۔ میں پاکستانی سے آفس چاہتا تھا۔

اپنے اسٹاف کے موبانہ سلاموں کا جواب دیتا ہوا جب میں بیرونی کمرے سے گزر کر دیر قائلین پر چلتا ہوا اپنے ایئر کنڈیشنر کمرے میں داخل ہوتا اور اپنی خاص کرسی پر بیٹھتا اور شاندار میز کے عقب میں رہ کر لوگ بیٹھ کر بیٹھتا تو اپنے آپ کو کافی محترم آدمی محسوس کرتا۔ ذہن میں لائین کے کچھ خواب ابھر آتے۔ اس زمانے میں خوابوں کی رسائی زیادہ سے زیادہ ایسی تھ ہوتی تھی۔ یونہی ہی کبھی سو رہا سا خیال آتا تھا کہ کیا کبھی ایسا بھی ہو گا؟ کیا میں بھی کسی ایئر کنڈیشنر آفس میں گھومتے والی کرسی پر کسی بڑے صاحب کی طرح بیٹھ سکوں گا؟

طلسم زادی

☆ ایم۔ اے راحت

روشنی کی دنیا سے دور پراسرار دنیا کی کہانی، جہاں مافوق الفطرت زندگی کا دور دورہ تھا۔ دو دشمنوں کی عجیب داستان، جنہوں نے جب ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، تو ایک ناقابل یقین کہانی نے جنم لیا۔

حصہ اول قیمت - 150/

حصہ دوم قیمت - 150/

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار لاہور نمبر 2

محرور اسرار کی روٹھے کھڑے کر دینے والی داستان

خبیث

انکا، اقبالہ، سونا گھاٹ کا پجاری، غلام رحمن جیسی لازوال کہانیوں کے خالق انوار صدیقی کی ایک نئی اور چونکا دینے والی کہانی۔
قدم قدم ایک منفرجت اثار، لمحہ لمحہ رنگ بدلتے اطوار
گناہ کی داسیوں کی مستیاں، حرص و حوس کے پجاریوں کے چسکار

پانچ حصوں میں مکمل سیٹ قیمت - 200 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار لاہور نمبر 2

پر طرح سے برہا کرنے کو طبیعت چاہنے لگی تھی مگر جلد سے
کچھ تو بچا بچائیاں کے سمجھاتے پر اور کچھ اپنی افتاد طبع کے باعث
میں سنسنیں کیا تھا۔ ایک آدھ دن کے لئے میرا دل رابا تھا
اب اس کے متعلق سوچ کر ہنسی آتی تھی۔ تاہم راحیلہ کی یاد
اب بھی پرانے ذہن کی طرح دل میں باقی تھی۔ مجھے توقع نہیں
تھی کہ میں زندگی میں بھی اس لڑکی کو بھلا سکوں گا۔ گو کہ میں
یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اب مجھے اس سے محبت ہے یا
نفرت؟

کبھی کبھی میرے دل میں ایک تیز و تند طوفانی قسم کی لہر
اٹھتی جو مجھے مجبوراً سوکھتی کہ میں راحیلہ کو جلد برہا کر دوں لیکن
جب میں اس مسئلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے کا سوچتا تو ایک
معتدل ہی قوت مجھے روک دیتی اور میں اپنے آپ کو مجب بے
بہی کی سی حالت میں پھنسا ہوا محسوس کرتا۔ اس کشمکش سے
نجات پانے کے لئے میں اپنی خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی
کوشش کرتا اور اپنے آپ کو اوپر اوپر کی مصروفیات میں
الجماعا کرتا۔

یہ زندگی کے مختلف مراحل پر اپنا تجربہ کرنے کی کوشش
کر رہا تھا تاکہ خود پرستی سے نفع نظر یہ اندازہ دے کہ میں
کتنے پانی میں ہوں؟ میری خوبیاں اور خامیاں کیا ہیں؟ میں زندگی
کے میدان میں کچھ آگے بھی بڑھ رہا ہوں یا نہیں؟ کس کس
مسئلے پر مجھے اصلاح کی ضرورت ہے؟ میں اپنے آپ سے
مطمئن بھی ہوں یا نہیں؟ زندگی سے میں نے کچھ سیکھا ہے یا
نہیں؟

کچھ نہ کچھ میرے بچے کے بعد میں اپنی قسم کے سوالات پر
ضرور تائیدیں کے ساتھ انداز میں غور کر لیتا تھا۔ اس سے مجھے
اپنی ذات کا وزن متعین کرنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ میرا
چرچہ کوئی مجلس مشیر یا قریبی دوست تو تھا نہیں اس لئے اپنی
زندگی کے ہر اچھے اور برے پہلو کا مجھے خود ہی جائزہ لینا پڑتا تھا۔

سہرست میں اپنے آپ کو کافی مطمئن اور پرامن
محسوس کرتا تھا جبکہ میری لاش میں اس قدر اور اطمینان دونوں ہی
تجزیہ مفق تھا۔ میں اپنی لاش کے ایک صاحب کو جانتا تھا جو
کراچی میں رہتے تھے۔ انھیں میں بہت برا بھلا تھاں کا بڑے
خفا تھا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ بے وقت اگر کوئی باجی دس سینکڑ
کے لئے مسلسل کل تیل بیچتا رہتا تو وہ بیڑے کے نیچے چھپ
جاتے تھے۔ تو کرکٹ پر جا کر دیکھتے تھے کہ آئے والا کون ہے۔
وہ اگر ٹیم صاحب کو بتاتے تھے اور ٹیم صاحب تیل دے کر
میاں کو بیڑے کے نیچے سے نکالتی تھی کہ خطرے کی کوئی بات
نہیں۔

بات ان کی موجودگی میں ہی میرے ایک دوست نے
مجھے بتائی تھی کہ ان کا بھی دوست تھا۔ وہ صاحب ان دنوں کراچی

بولی ہوئی ہیں یا نہیں مگر میرا دل ایسا کرنے کو چاہتا تھا اس لئے
میں کمرکز آتا تھا۔ اور بعض اوقات سوچتا تھا کہ وہ ٹیل چھتری والا
قادر مطلق ہے، کیا مظلوم کب کس گناہ گار پر غصہ کیا ہو جائے
اور کب اپنے کسی نیک بندے کی معمولی سی غلطی پر اس سے
انتقام ہو جائے۔

میری لاش کے چند ایک ٹوکے نور بھی تھے جو میری طرح
بلکہ مجھ سے بھی زیادہ خدا ترس اور فیاض تھے۔ لیکن میں
محسوس کرتا تھا کہ ان کی خدا ترسی اور فیاضی وغیرہ کی وجہ ان کا
احساس جرم ہوتا تھا۔ وہ ایک طرف ظلم سہلہ و خند نہ کرتے
تھے تو دوسری طرف کچھ نیک کام کر کے ترازو کے پلارے برابر
رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور انھیں پورا یقین ہوتا تھا کہ
انہیں ان کے اچھے کاموں کا اجر ملے گا۔ مجھے یقین نہیں ہوتا
تھا، میں بس نفرت سے بیہوش ہو کر اچھے کام کرنا تھا اور محض
ایک سوہوم سی امید ہوتی تھی کہ شاید کبھی میرے کسی اقدام
کو شرف قبولیت ملے۔

میری ایک کوشش یہ بھی ہوتی تھی کہ لوہو لوب سے
بچوں لیکن میں بہت زیادہ پارا بھی نہیں تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا
کہ جب بھی میں کسی معاملے میں روش سے ہٹنے لگتا تھا خود
ہی اپنے آپ کو سرزنش کر لیتا تھا۔

اس زمانے میں ٹائٹ کلب بھی موجود تھے اور بڑے
ہوٹوں میں تقریباً روزانہ ہی غلو شو بھی منعقد ہوتے رہتے
تھے۔ میں ان میں کبھی کبھار ہی جاتا تھا، جب مجھے دھوڑے
سے بھی کوئی اور مصروفیت نہیں ملتی تھی اور جب میں اپنے
آپ کو بہت ہی اداس اور خفا تھا محسوس کرتا تھا۔ بازار حسن
میں بھی مجھے کچھ زیادہ غامض حسن محسوس نہیں ہوتا تھا گو کہ
چند ایک مرتبہ مجھے اس جگہ کو بھی کھانچا پڑا لیکن میں جب
بھی گیا دو سرے لوگوں کے ساتھ ہی گیا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ان
لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اور ان کا ساتھ دینے کے لئے ہی
گیا۔

دور میں اپنے بعض ہم پیشہ لوگوں کو دیکھتا تھا کہ جب
میں بھی چٹنی بولٹ موجود ہے، کھار کے گلوڑ کھار منٹ میں
بھی بولٹ رہی ہے۔ لاکھڑاتے ہوئے ہر اس تقریب گاہ میں بیچ
رہے ہیں جہل رقص و سرود کی محفل گرم ہے اور رات گئے
گرتے پڑتے واپس آ رہے ہیں۔ ان کے کندھوں پر بیٹھ ہی
کسی نہ کسی سینہ دلوانا کی زنجیریں پڑھ رہی تھیں۔ میرے
ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس قسم کی حسینا میں میری نظر میں
چپتی ہی نہیں تھیں اور بے خودی وہ ہوشی میں اوپر اوپر
لوکھڑاتے پھرنا اب مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

مجھ پر جب راحیلہ کی بے وفائی کا انکشاف ہوا تھا تب
ضرور اپنے آپ کو غدار کے سمندر میں غرق کر دیئے اور دل کو

ایک بار انہوں نے مجھے یہ منورہ بھی دیا کہ مجھے اپنا اصل بیڑہ کو اڑ کر اپنی کو بیٹا چاہیے لاہور میں کیا رکھا ہے۔ ایک دو مرتبہ تو میں نے ان کی اس تجویز پر نہایت سنجیدگی سے غور بھی کیا۔ وہاں سینئر واحد بھی تھا جو میرے مرنوں اور قد و دانوں میں شامل تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں کراچی میں بھی ہاتھ پاؤں پھیلانے کی کوشش کروں تو قائم نہیں رہوں گا۔

اس موضوع پر سوچ بچار کرتے کرتے بالآخر چھ ماہ بعد مجھے اپنی فرصت میرا ہی گئی کہ چند دن کے لئے کراچی جا کر حالات کا جائزہ لے سکوں اور اپنے لئے میدان ہموار کر سکوں۔ میں نے فوراً اپنے ٹریول لیجنٹ کو فون کر کے ٹکٹ منگوایا اور دوسرے دن کراچی پہنچا۔

رات کی غلاٹ تھی۔ تقریباً ڈھائی بجے میں کراچی پہنچا۔ ایئر پورٹ پر اترتے ہی دل میں پینے کوئی بھولی بھری میں ابھر آئی۔ جیسے کہیں سے اس فتنے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اس لیے وہاں کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو! اسی ایئر پورٹ پر میں نے پہلی بار راجہ کو دیکھا تھا۔ وہاں کے تاریک الق پر وہ بھولی بھری تصویریں ابھر آئیں۔

اس روز پہلی بار اسے دیکھ کر میں کیا مسرت ہو کر رہ گیا تھا۔ سرودھ "ہازک اندام" رنگت نہایت ہی صاف اور اجلی اجلی ہنس کے لیے لیے بھورے ہاں کسی حد تک شہرے پن کی طرف مائل تھے اور ریٹم کے سلیجے ہوئے تاروں کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ ریٹم کے ٹراؤزر اور سرخ سامان کی شرٹ میں تھی۔

وہ منظر اپنی قہر منہزینات کے ساتھ میرے حاشے پر نقش تھا۔ وہ اتنی گھری گھری لگت رہی تھی کہ اس کے گرد روشنی کا ایک ہلا سا رخص کرنا محسوس ہو رہا تھا اور وہاں اس کے وجود سے جیسے تازگی اور خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اس طرح فرحت کا احساس ہوا تھا جیسے میں نے علی الصبح صاف ستھری ہوا میں چل قدمی کرتے ہوئے کسی سرسبز لان میں شبنم سے نہائے ہوئے نو گلفنگ پھولوں کو دیکھ لیا ہو۔

پھر اس کی رفاقت میں گزرے ہوئے وہ چند دن۔ وہ میری سادہ دے بنا محبت۔ وہ میرا بے گراں خلوص۔ وہ اس کا اقرار محبت۔ وہ ایک طویل عرصے کی خط و کتابت۔ اور پھر انجانک انکشاف ہونا کہ یہ سب کچھ تو اتفاق تھا۔ میں تو اس کی نظر میں بہت عقیدہ ہے وقت تھا۔

دل سے جیسے ایک قدر خون سا پکا لور میں نے یہ سب کچھ ذہن سے نکال دیا۔ مجھے یہ سب کچھ یاد نہیں رہتا چاہیے تھا۔ لیکن جاب۔ کیا نکلت نکلتے نہیں بھولتی۔ آہم اب ذہن جیسے مندر ہو رہا تھا۔

سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "جناب! اگر آپ کو اتنی ڈر لگتا ہے تو آپ یہ کام کرتے ہی کیوں ہیں؟ دولت تو اب آپ کے پاس خاصی ہے۔ کوئی لور بزنس کر لیں؟"

وہ صاحب آہ بھر کر بولے "ارے لنی میاں! اب آپ کو کیا بتائیں۔ ہمیں تو اب ہمارے آدمی یہ دھندہ چھوڑنے نہیں دیتے۔ وہ بولتے ہیں "سینئر صاحب! آپ کا کیا جانا ہے؟ آپ آرام سے بیٹھ رہیں۔ ہم آپ کو کھانا کھلائیں گے۔ سچی بات ہے "میں تو ہاتھ بھی نہیں پڑاتا۔ میرا تو بس روپیہ لگا ہوا ہے جو ہر مرتبہ اسے منافع کے ساتھ واپس آجاتا ہے جتنا دنیا کے کسی اور کاروبار میں ممکن نہیں۔ اس لئے ہم بھی چپ کر کے بیٹھے رہتے ہیں کہ چلے جی جی جب تک دھندہ چل رہا ہے چلے دو۔ ڈر بس یہی لگتا ہے کہ یہ کمینٹ لوگ اگر ڈوبیں تو ہمیں ہم کو بھی ساتھ نہ لے ڈوبیں۔"

بڑا معقول استدلال تھا ان کا۔ آدمی بھی بڑے ہی معقول اور مرتعج مرتعج تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا اصل پیشہ کیا ہے؟

ایک اور صاحب تھے۔ بارش لور بڑے باعمل۔ وہ تو مذہبی کنڈنگ تھے اسے کنگ کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مذہب میں تو اسے کنگ کا کوئی قصوری موجود نہیں۔ یہ تو ایک قسم کی تجارت ہی ہے۔

میں ان کی شکل دیکھا رہا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے کئی دیگر عجیب و روزگار لوگ تھے جن سے کسی کبھی مجھے واسطہ نہ آتا رہتا تھا۔ بہرحال ان سب سے مجھے کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔

ڈنگری کلنی آرام سے گزر رہی تھی۔ دولت خاصی تیزی سے آ رہی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں میرا جائزہ کاروبار بھی غلاسا پھٹنے چھوٹنے لگا۔ میں نے ایک سپورٹ فیکر کے طور پر جس شخص کو رکھا تھا وہ غلاسا کام آ رہی تھا۔ اس کی وجہ سے کاروبار چلنے لگا تھا اور اب تو میں بھی کام کو سمجھتا جا رہا تھا۔ دوسرا دھندہ بھی بیفیکر کسی خاص جدوجہد کے پھیلا جا رہا تھا۔ شاید قسمت کلنی مرنان تھی۔ آج کل مجھ پر وہ مثال صادق آ رہی تھی کہ مٹی میں ہاتھ ڈال رہا تھا تو سونا ہو رہی تھی۔

کراچی میں بھی میرے خائے دوایا استوار ہو رہے تھے۔ وہی صاحب جن کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ مسلسل کلنیل بیٹے پر بیڑے کے بیٹے جانتے تھے "بظاہر بڑے دلیر آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کئی بار فون پر مجھے پیشکش کر چکے تھے "اپنا بیانی بھائی! اور کراچی میں اگر کبھی لائونج و میز کی ضرورت پڑے... اور کسمندری راستے کا کوئی کام ہو تو ہم کنگ مجھے تمام سب انتظام ہو جائے گا" ان کا نام سینئر رمضان تھا اور جیسے کیوں وہ میرے بڑے مداح معلوم ہوتے تھے۔

یقین ہو کہ دنیا میں میرا بھی کوئی ہے۔ قسم سے میں دنیا میں اپنے آپ کو بہت شامسوس کرتا ہوں۔ اپنی بیوی اور بچے مجھے اکثر غیر غیر سے لگتے ہیں۔ تم مجھے بہت دیر پہنچے اور کھرے آدمی لگتے ہو اور میرا خیال ہے تم بہت اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہو۔ اور بات صرف جذباتی سارے ہی نہیں ہم کاروباری طور پر بھی ایک دوسرے کے لئے بے پناہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ تم ملک کے اس سرے پر ہونے والے کاروبار کے بھیدی ہو۔ میں اس طرف کی مارکیٹ کا کیزا ہوں۔ اور خاص طور پر سمندری راستے سے جتنا بھی کاروبار ہو رہا ہے اس میں ہمارا حصہ معمولی سہی لیکن ہمیں علم ہر چیز کا ہے۔ پولو کیا کہتے ہو؟ اس کے نیچے میں داخلی ہے پناہ معصومیت اور سادگی تھی۔ اس وقت تو گویا خود مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تو کہ میں اپنی ہی لائن کے آدمی سے مخاطب ہوں۔

"خمس اصدقہ کی کیا ضرورت ہے ہار" میں نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میر تمہارا دوست نہیں تو اور کیا ہوں؟"

"اے الفاظ پر قائم رہنا" وہ میرا ہاتھ تھکے ہوئے ہوا "میں کیا تمہیں الفاظ سے بیش والا انسان نظر آتا ہوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ تم صحیح معنوں میں جوان مرد ہو" اسی لئے تو سیٹھ رمضان تم سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ کسی عام آدمی کے سامنے ہاتھ پیچھا کر مجھے پروردارہ تعاون کی جھلک دکھانے کی کوشش ضرورت تھی؟" وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

اس دوران ہم آخر کار کلن پہنچ چکے تھے۔ سیٹھ رمضان مجھے میرے کمرے میں پہنچانے کے بعد رخصت ہو گیا۔ ہم نے دوسرے روز شام کو ملاقات کا پروگرام طے کیا تھا۔

دوسرے روز میں تقریباً سہرے کو بیدار ہوا۔ دیر سے بیدار ہونے کے باوجود میں ورزش کا فائدہ نہیں کیا کرتا تھا۔ میں نے کمرے میں ہی کچھ دیر ورزش کی پھر اپنا سونستنگ کاسٹیم لے کر کچھ دیر تھوڑی کرنے کے ارادے سے سونستنگ پول کی طرف چل دیا۔ میرا کرافٹس طور پر ہی تھا۔ نیچے آکر میں کلن پار کے قریب سے گزر کر سونستنگ پول کے قریب بنے ہوئے برآمدہ خانے میں داخل ہوا۔

سونستنگ پول پر صرف تین چار غیر ملکی موجود تھے۔ ایک سفید قام جو ڈاکٹار ہے پر گلی ہوئی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ دراز تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ برآمدہ خانے میں ایک طرف دو خواتین اور تانبا ایک لڑکا کھڑے لیکن میں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ میں غیر ارادی طور پر سونستنگ پول کی طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

میں نے کنویئر بیلٹ سے اپنا چھوٹا سا سونستنگ کیمس اٹھایا اور باہر آیا۔ رات کے اس پیر سیٹھ رمضان نے نفس نہیں مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ میں نے فون پر اسے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اس کے گھر ہی قیام کروں لیکن میں نے اسے خلاف مصلحت سمجھتے ہوئے معذرت کر لی تھی۔ تاہم وہ مجھے لینے ضرور آیا تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے گفتگو ہوا اور دیر تک حال دریافت کرتا رہا۔

اس کے ڈرائیور نے سوٹ کیمس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ہم پارکنگ لٹ کی طرف چل دیے۔ راستے میں ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور دوسرے دن کے لئے ملاقات کا پروگرام طے کرتے رہے۔ سیٹھ رمضان نے میرے لئے انٹر کمان میں کمرہ پرورد کر دیا تھا تاہم اس کا اصرار اب بھی یہ تھا کہ میں اس کے گھر چلوں۔ میں حسب سابق اسے ٹال رہا تھا۔ "یار... اپنے الٹی میٹائی ابھرے آرام سے رات بھر باتیں کریں گے" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ہم کچھ سیٹ پر بیٹھے اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ ڈرائیور صحیح طور پر نہ سن سکے۔ گو کہ وہ دیسے ہی مشینی انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ہم سے قطعی لاشعق اور بے خبر نظر آ رہا تھا۔

سیٹھ رمضان گو کہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑا تھا لیکن اس کے انداز خطاب میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ میرے لئے ایک بے متوں سے احرام کی آمیزش ہوتی تھی۔ "باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی سیٹھ صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں کئی دن کا پروگرام بنا کر آیا ہوں۔ اس چکر میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر کے ہی جاؤ گا۔"

"الٹی میٹائی! تم بھی سوچتے ہو گے کہ میں تمہیں کراچی بلانے کے لئے کیوں آتا پیچھے پڑا ہوں۔ میری اس میں کیا غرض یا مفاد پوشیدہ ہے؟ لازمی بات ہے کہ انسان کسی کا اصرار دیکھ کر اس پتلور ضرور سوچتا ہے" وہ صاف گوئی سے بولا "میں تم سے بہت نہیں بولوں گا۔ میری بھی اس میں غرض پوشیدہ ہے لیکن بڑی سادہ اور معصوم سی غرض۔ دیکھو یار... میرے یہاں پڑوس خالت مضبوط ہیں۔ اثر و رسوخ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں بذات خود ایک گھڑور اور بڑول آدمی ہوں اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی مار نہیں۔ لیکن میرے پاس سخت زبان، سفاک اور ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے والے سختی آدمی موجود ہیں۔ لیکن میں چونکہ ذاتی طور پر ایک ڈرہوک اور پورا آدمی ہوں اس لئے مجھے ہر طرف سے ایک دھڑکا مارا جاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرا ایک سچا دوست ہو۔ سچا، سہرا اور بہت قابل اعتماد دوست۔ جس سے میرے دل کو حملہ نہ۔ میں اپنے آپ کو مضبوط محسوس کروں۔ مجھے

حالات بھی ہو سکتی ہے، 'اچانک ہی کیس سامنا ہو سکتا ہے۔'
راشد نہایت گنجوشی سے ملا۔ 'آئی نے سر پر ہاتھ پھر کر
دعا دی۔ راحیلہ نے سر کی صرف ایک خنیف سی جنبش پر آنکھ
کیا۔ اس کی آنکھوں میں ششاسانی کی رقت تک نہ ابھری۔ سر
بھی اس نے محض سرخونٹا ہلایا تھا۔

رسی جھلن اور کچلے ٹکڑوں کے چالے کے بعد میں نے
پوچھا "انکل کئی ہیں؟"
"امریکا گئے ہوئے ہیں" راشد بولا "ان کا کاروبار آج کل
بہت میندا ہے۔ نیکسٹل ایکسپورٹ کی حالت بہت خراب
ہے۔"

راحیلہ گویا راشد کو تنبیہ کرنے کے سے انداز میں بولی۔
"کیا ضروری ہے کہ تم ابو گئے کاروباری معاملات یوں سرد راہ
کھڑے ہو کر دو سروں سے ڈسکس کرو؟"
مجھے تو کسی بات پر پانچے کی بیگانگی اور صبر سے ہیں پر کوئی
خاص حیرت نہیں ہوئی کیونکہ مجھے اسی قسم کی کسی بات کی
توقع تھی لیکن راشد نے پچھلی پچھلی آنکھوں سے اس کی طرف
دیکھا۔ "آہم وہ بولا کچھ نہیں۔"

اس دوران ایک فوجی جو فیس تراش خراش کے
مکڑے نیلے سوٹ میں تھا، تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آتا
دکھائی دیا۔ وہ انگلی پر کلر کی چابی گھماتا ہوا آ رہا تھا۔ شاید وہ پیچھے
کسی کسی سے بات کرنے کے لئے گیا تھا اور راحیلہ، آئی اور
راشد اسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

راحیلہ نے اس انداز میں قدم بڑھایا جیسے وہ اس فوجی
کے آتے ہی آگے چل دینا چاہتی ہو لیکن آئی اور راشد وہیں
رکے رہے اس لئے اسے بھی رکتا پڑا۔ فوجی ان کے قریب آ کر
تنبیہی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

راشد بے چارہ گویا پوری طرح تذبذب اور شائستگی کے
تھائے بھانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس فوجی کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ تمیل بھائی ہیں... راحیلہ کے میاں"
پھر اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور جمیل

بھائی! ان سے ملنے، 'میرا افضل ہیں، میرے محسن۔"

"اوہ... میں سمجھ گیا" جمیل نے استغاثی طرز سے مجھ میں کہا۔
اس کے چہرے سے شائستگی اور لامنت تصنی مفقود ہو گئی
اور اس کی جگہ کسی حد تک غیر انسانی سا کھردرا پن اور سختی ابھر
آئی جسے محسوس کر کے میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

جمیل بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے راحیلہ نے
تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے" اس نے اب پروردارست
مجھے مخاطب کیا تھا اور بے حد اہانت آمیز لہجہ میں مخاطب کیا تھا۔
"راحیلہ نے اس لئے اتفاقاً پہلے ہی مجھے تمہارے بارے میں
سب کچھ بتا دیا تھا کہ کل کو کہیں تم اس کے خطوط کی بنیاد

میں برآمدے میں کھڑے ہوئے ان میں افراد کے قریب
سے گزرنے لگا تو ایک ششاسا آواز نے مجھے چونکا دیا "اے بھائی؟"
کسی نے مجھے پکارا۔

میں نے ٹھٹھک کر دیکھا اور جانے کیوں میرے ہاتھ سے
سوئمنگ کاسٹیم جسے میں نے گولا سا بنا کر تھا ہوا تھا، گرتے
گرتے پھلے۔ مجھے پکارنے والا راشد تھا اور اس کے عقب میں جو
دو عورتیں دیوار کے قریب کھڑی تھیں ان میں سے ایک اس
کی امی یعنی آئی رحمانہ تھیں اور دوسری راحیلہ۔ ان کے
ساتھ شاید کوئی اور بھی تھا جو ان سے پیچھے کھس رہا گیا تھا اور وہ
اسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

راشد پہلے کی نسبت زیادہ خوش لباس اور کچھ پختہ سا نظر
آ رہا تھا۔ آئی سٹیشنل اور کزور دکھائی دے رہی تھیں۔ راحیلہ
کی شخصیت پر بہت نکھار آیا ہوا تھا۔ میں نے آخری بار جب
راحیلہ کو دیکھا تھا، اس میں اور آج کی راحیلہ میں ہی فرق تھا جو
کچے اور کچے ہوئے پھل میں ہوتا ہے۔

وہ کچلے گلابی رنگ کے فرنیچ گاؤں میں تھی اور پانچواہ
پچھات کی طرح بنی سنوری ہوئی تھی۔ دروازہ تو وہ تھی ہی
لیکن اس وقت خاصی اونچی پیل اور اوپر کی طرف بے ہوئے
بالوں کے جوڑے کی وجہ سے اور بھی دروازہ لگ رہی تھی۔
اس نے غصا کر ایک اپ بھی کیا ہوا تھا اور غصے سے روایتی انداز
میں چو لری بھی پٹے ہوئے تھی۔ وہ کسی جگہ کی سی شان سے
سر اٹھائے کھڑی تھی۔

ایک لمحے کے لئے میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا یہ
روپ مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے اسے ڈیم کی جینز اور کھدو کی
سروانہ تیسوں میں کپٹے بالوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ جب وہ لپ
اسٹک بھی نہیں لگاتی تھی اور لکھ جی پاپ کی بنی ہوئے کے
پلو جو د تلاش غیر ملکی سیاہوں کی طرح چہرہ منہ اتفاقاً چیل دیتی
تھی۔ روایتی اور بنی سنوری پچھات کو دیکھ کر وہ بہت ہنسی تھی۔
... آج وہ خود بے حد سلیٹہ مند لیکن بر حال کسی حد تک روایتی
"بگم صاحب" ہی لگ رہی تھی۔

بر حال اس کی شخصیت کا استخراج بھی اس کے ساتھ تھا۔
آج وہ اک برقی تپاں تھی "آج بھی اک شعلہ رقصاں تھی۔"
بظاہر وہ بڑی بے پردائی "رکھائی اور سرد مری سے گردن ذرا
اگڑائے کھڑی تھی اور اس کی جمیل سی گھری آنکھوں میں ہلا کا
سکون تھا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس نفس و جود میں آج بھی
جلیلیں خفیہ ہیں۔

اس نے مجھے دیکھ کر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ بظاہر
تو میں بھی پوسکون تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس قطعی غیر
مسترح حالات پر مجھے عجیب سا جھکاؤ تھا۔ میں نے سوچا ہی
نہیں تھا کہ میں اس ہرجائی کے خسر آیا ہوا ہوں تو اس سے

کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے باہر آنے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ سونٹنگ پول کے آس پاس سوائے اس ایک چھ سفید خامور کے کوئی نہیں تھا۔

سونٹنگ پول میں تھرتے ہوئے ایک سفید ظام مرد نے سارا دے کر جیل کو رنگ تک پہنچنے اور پول سے نکلنے میں مدد دی۔ اس دوران آخری دو بار سے لگ کر ہانپنے لگی تھیں اور راحیل نے انتظار کی انداز میں ایک قدم آگے بڑھایا تھا لیکن پھر پیچھے ہٹ گئی تھی اور دانت پیستے ہوئے مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی میں اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کیسی مردار لڑکی تھی۔ جزدور کرانے میں مجھ و سڑس رکھتی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید ذوق برق اور عویض ضر کے لہسوں اور جلاؤ زو رات نے اسے کچھ زیادہ ہی سفاویت کے بوجھ سے بلایا تھا یا پھر دیے ہی شاید شادی کے بعد وہ خالفتہ "بیک صائب" بنتی جا رہی تھی۔

سونٹنگ پول سے نکلے ہی جیل ایک بار پھر پھرے ہوئے سڑس کی طرح میری طرف لپکا۔ وہ اپنے لباس سے پانی بھی خشکتا ہوا رہا تھا۔ وہ منہ سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ شاید گالیاں بھی دے رہا تھا لیکن اس کے منہ سے پانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے اور الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

وہ دونوں کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بھانکی دیتے ہوئے اس کی کپٹی پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ ایک بار پھر وہ دور جا کر اور اس مرتبہ اونٹے منہ گراہو اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا جب راحیل میرے قریب آکر ٹانگیں کی طرح پھنکادی۔ "تھیں یہ غنڈہ گردی بہت مٹگی پڑے گی... بہت بڑا بد معاش سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو...؟ لیکن ہم یہی لادارٹ نہیں پڑے ہیں۔ میں تمہیں برابر کر دوں گی اسمگلر کے بیچے!"

اس وقت تک مجھے بری طرح غصہ آچکا تھا۔ میری دمک دپ میں چنگاریاں تھری تھیں۔ اگر آخری ریمانڈ کا احترام اور راحیل کے لیے میرے لاشعور میں کسی ہوئی وہ کینت محبت مانع نہ ہوتی تو میں جیل کی ایسی کتبہ اور پٹائی کا تانہ مگر اتنی ریمانڈ کا ڈھلے ہوئے نظریے کی طرح سفید چروہ اور چھٹی چھٹی آنکھیں دیکھ کر مجھے شرم آنجی۔ تاہم راحیل کی دھمکی نے مجھے مزید ساکڑا دیا۔

"اگر تھیں اپنے اس چھوٹے ہر کی زندگی عزیز نہیں ہے تو ضرور کوئی جوانی کارروائی کرنا" میں نے کھنکھناتی آواز میں کہا۔ اپنی آواز مجھے خود بھی کسی درد نے کی غراہت سے مشابہ محسوس ہوئی "پادر رکھنا" اگر تم لوگوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے ایٹھ یا کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تھیں اس

پر بلیک میل کرنے نہ پہنچ جاؤ۔ دیے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ غلط اس کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ راحیل اپنی کسی دوست سے کھواہی تھی۔ بلاوجہ انہیں سنبھال کر رکھنے کی زحمت نہ کرنا۔"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے کانوں کی لوہیں گرم ہوتی جا رہی ہیں اور لومیری کپٹینوں میں ٹھوکریں مار رہا ہے۔ تاہم میں نے حتی الامکان پرسکون لہجے میں کہا "میرا خیال تھا کہ راحیل کا شوہر کوئی پڑھا لکھا اور مذہب انسان ہو گا مگر جتنی حیرت مجھے اب تک راحیل کے طرز عمل پر ہوتی رہی ہے اس سے کہیں زیادہ اب تم سے مل کر ہو رہی ہے۔ کسی نے تمہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ بزرگوں کی موتوں کی میں اتنی گھٹیا منگتو نہیں کی جاتی" میں نے آخری کی طرف اشارہ کیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ ان کا چروہ سفید پڑ چکا ہے۔ راحیل کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ سوزوہ صورت حال میں اس کا رد عمل کیا ہونا چاہیے۔

"افادہ... تو اب آپ مجھے گفتگو کا سلیقہ سکھائیں گے" وہ پہلے سے زیادہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ صاف نفرت آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے الجھا چلا رہا تھا جبکہ میں اس وقت اور اس جگہ کسی سے بھی الجھنے سے پرہیز کرنا چاہتا تھا۔ وہ حتی الامکان تن کر کھڑا تھا پھر بھی قدم میں مجھ سے کچھ جھوٹا تھا حالانکہ وہ اس وقت اونٹنی نکل کے جوتوں میں خامور میں باجھ دمک سپر پٹے ہوئے تھا۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور دمک دینے کے سے انداز میں میرے سینے پر انگلی مارنے ہوئے بولا "سنو مسٹر افضل چوہدری! میں پڑھا لکھا ضرور ہوں۔ لندن میں بھی کئی سال رہا ہوں لیکن میں خالص شرعی یو قسم کی چیز نہیں ہوں۔ انکوں سے تمہارا خوب جانتا ہوں۔"

"یہ بات تم کسی آپکے کو سنار ہے ہو؟" میں نے انتہائی جھل سے پوچھا۔

"تھیں" اس نے بلاتامل جواب دیا۔

شاید وہ دیکھ بھی نہ سکا ہو کہ کب میرا ہاتھ حرکت میں آیا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ خامے تن و پوش کا آدمی تھا لیکن اس گھونٹنے نے اسے فرش سے غصا اور اچھل دیا۔ وہ سونٹنگ پول کے کنارے پختہ روش پر جا کر لیکن وہیں بھی وہ سنبھل نہیں سکا اور لڑھکتا ہوا سونٹنگ پول میں جا کر۔

تیرا اسے غالباً آہو گا لیکن اس وقت وہ تھری چپس سوٹ اور اس کے لوازمات زیب تن کئے ہوئے تھا اس لئے اسے وقت پیش آ رہی تھی اور وہ غوطے کھا رہا تھا۔ شینے کی ایک دیوار کے عقب میں کھلی بائیں ایک دھریہ منظر دیکھ کر اپنی جگہ رک گیا۔ ٹرے اس کے ہاتھوں پر تھی اور وہ دم بخود سونٹنگ پول

مکہ صے کی لاش کسی دیر ان سڑک پر لے گی اور آواہ کیجے اسے
 بھیجنے پھر رہے ہوں گے۔" -
 راجہ آگے بڑھ کر سارا دے کر جیل کو اٹھا رہا تھا۔ میں
 محکمہ کران کے قریب سے گزرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف
 واپس چل دیا۔ میرا اب ہوسنیکہ کرنے کا موڈ نہیں رہا تھا۔
 اپنے کمرے میں آکر میں نے غسل کر کے لباس تبدیل
 کیا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ پولیس شاید مجھے
 حراست میں لے آئے۔ ظاہر ہے پراچلہ اور جیل دونوں ہی کا
 تعلق معمولی قسم کے غلامانوں سے ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا
 کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ ان کا لٹا تعلق واسطہ ضرور
 ہو گا کہ وہ پولیس وغیرہ کے ذریعے مجھے ہراساں کرنے کی
 کوشش کر سکیں اور کچھ نہ سہی تو مجھ پر مذہب اور شائستہ
 لوگوں کی چار دیواری اور ایک اعلا درجے کے ہوٹل میں ہنگامہ
 آرائی اور مارپیٹ کا لازم قریب ثابت ہو ہی سکتا تھا۔ اس کے توئی
 جینی شاید موجود تھے۔ بانی کوئی بات ثابت کرنا تو بہت دور کا
 معاملہ تھا۔ بہر حال میں ہر قسم کی صورت حال کے لئے تیار
 بیٹھا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ کس قسم کی صورت حال میں
 مجھے کیا کرنا ہو گا۔

میں چاہتا تو ابھن سے بچنے کے لئے فوری طور پر یہ
 ہوٹل چھوڑ کر کسی اور ہوٹل میں بھی منتقل ہو سکتا تھا اور
 سینئر رمضان کو فون کر کے اس تبدیلی کی اطلاع بھی دے
 سکتا تھا لیکن میرے دل نے گواہ نہیں کیا کہ اس طرح اپنا
 ٹھکانا چھوڑ کر جاؤں۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ راجیلہ اور اس
 کے شوہر کو اپنے تیر آزمانے کا موقع دے ہی دوں تاکہ ان کا
 ارمان بھی نکل جائے اور انہیں اندازہ ہو جائے کہ ان کا واسطہ
 کسی چیز تاقینے سے نہیں۔

جیل کا پتہ پاک کرانے کے بارے میں میں بھی نے کوئی
 پڑ نہیں پاگی تھی۔ اس کا پتہ صاف کرانا واقعی میرے لئے کوئی
 مشکل نہیں تھا مگر اس پہلو پر سوچتے وقت مسئلہ پھر وہی آن
 کڑا ہوا تھا کہ راجیلہ کے بارے میں ابھی تک میں کوئی تھی
 روئے نہیں اپنا سکا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے
 اس سے محبت تھی یا نفرت؟

آج کے واقعے کے حوالے سے مجھے اپنا خون کھولنا ہوا
 محسوس ہوا تھا لیکن چشم قصور سے جب میں یہ دیکھتا کہ
 راجیلہ اس فوجیاتی میں بڑھ رہی تھی ہے تو مجھے اس پر ترس آنے
 لگا۔ اسے اس انداز فکر پر مجھے خود بھی جھجھلاہٹ محسوس
 ہوتی تھی لیکن میں کیسے نہیں ہو پاتا تھا۔ دل کے اکتوں بڑے
 بڑے مضبوط آدمی بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔

راجیلہ نے محبت کے نام پر تو میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا
 سونیا تھا لیکن اس کا شادی کے بعد کارڈین تو میرے لئے بالکل

ہی ناقابل فہم تھا۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس باب کو
 جیل کا تہا بن نہ نہیں کر سکتی تھی؟ آج فکر ہمارا سامنا ہو ہی گیا
 تھا تو ہم دسی انداز میں سر راہ چند دسی ہی باتیں کر کے اپنی اپنی
 راہ لے سکتے تھے۔ لیکن اس نے نہ جانے کیوں اپنے شوہر کو
 میرے بارے میں اتنا بھڑکانے رکنا ضروری سمجھا تھا؟ کیا میں
 واقعی اس کی نظر میں اتنا بڑا چڑچاڑی قسم کا لڑکا تھا؟
 اس کی بے وفائی کا انکشاف ہونے کے بعد کسی بھی گنہگار
 ہتکڑیے کے ذریعے اس سے انتقام لینے کی کوشش کر سکتا تھا
 ؟ اور اس لئے اس نے غلط ہاتھم کے طور پر اپنے شوہر کا ہار کو
 سب کچھ بتا دیا تھا؟

میں نے جس طرح ٹوٹ کر اس سے محبت کی تھی اس
 کے بعد اس کے دل میں میرا یہی مقام تھا تو پھر لعنت ہوئی
 چاہئے تھی مجھ پر۔ یہ مقام تاکہ تھامیں اس کی نظر میں اپنا یہ
 سوچ کر مجھے بڑی شرم آئی۔ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے
 آپ کو تسلی دی کہ اس کا اور میرا صرف تین چار دن کا واسطہ
 رہا تھا۔ اگر اس مختصر عرصے میں وہ مجھے صحیح طور پر نہیں
 سمجھ سکی تھی تو میں نے بھی اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔
 ملے پہلے تک بھی ٹھیک تھا لیکن سب سے زیادہ

انہیں تو مجھے اپنی بے لوث محبت پر تھا۔ کیا میری محبت میں
 بھی کوئی اثر نہیں تھا؟ بے غرض اور بے لوث محبت کے اثر کو تو
 سب مانتے آتے ہیں۔ تاکہ راجیلہ پر میری محبت کا کوئی اثر
 نہیں ہوا تھا اور اس نے مجھے تفریح طبع کی خاطر میرے ساتھ
 ڈراما دیکھا تھا لیکن کم از کم اتنا تو ہو سکتا تھا کہ وہ میرے سامنے
 شرمندہ رہتی۔ مجھ سے نظر چراتی۔ لیکن وہ تو گویا مجھ پر
 زبردست غار کھائے ہوئے تھی۔ جیسے میں اس کا مجرم تھا۔
 اس کا حریف تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ جیل نے بھی مدد کر دی تھی۔ وہ
 راجیلہ کا کزن تھا۔ بڑا کھلا اور دولت مند تھا۔ میں نے اپنے
 ذہن میں اس کا جو خاکہ بچھا تھا اس کے مطابق اسے نہایت
 شائستہ روشن خیال اور بردبار نوجوان ہونا چاہئے تھا اور بظاہر وہ
 نظر بھی ایسا ہی آتا تھا لیکن مجھ سے عارف ہوتے ہی اس کے
 وجود پر سے گویا کوئی پتلی سی اثر گزرتی تھی۔

اس کا رویہ کچھ اسی قسم کا تھا جیسے نعلے پہنے لاکڑی اکھڑا اور
 سمجھنڈی قسم کا گھبراہٹی نوبیا بتا دی کے ساتھ کہیں جا رہا ہو اور
 راستے میں اس کی دامن نے گھونٹ کی لوث سے منہ نکالتے
 ہوئے کسی راہبھد کی طرف اشارہ کر کے چلا کے کہ دیا ہو۔
 شیدے! یہ تھا وہ لنگہ جو شادی سے پہلے روز راستے میں مجھے
 چھیڑا کرتا تھا۔ اور اس وقت "شیدے" کا جو روز مل ہو سکتا تھا
 کچھ اسی قسم کے رویے کا مظاہرہ جیل نے کرنے کی کوشش
 کی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجیلہ اور اس کے شوہر

سے میری ان حالات میں ملاقات ہوگی۔

میں بہت دیر تک بیٹھا پریس کا انتظار کرتا رہا اور اخبارات کی ورق گردانی کرتا رہا لیکن کوئی نہ آیا۔ پلاخر اچھ بیچے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اچھ بیچے کا وقت سینہ رمضان کے ساتھ ملے رہا تھا۔ ہمیں کھانا اسی ہوٹل میں لکھنے ہی لکھنا تھا اور بہت سے کاروباری معاملات پر گفتگو کرنی تھی۔

میں نے اچھ کو دروازہ کھلا۔ آئے والا سینہ رمضان ہی تھا۔ وہ اپنے ساتھ دو "کام" کے آدمیوں کو لے کر آیا تھا۔ ان میں سے ایک سوٹ میں تھا۔ وہ ایک خوبصورت بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا اور سٹار کے کٹس لے رہا تھا۔ دوسرا نہیں قسم کی شلوار قمیض اور واکٹ میں تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے ہالوں کی نہیں بتائی ہوئی قمیضیں اور رات کے وقت بھی قدرے آریک شیشوں کی عینک لگا رکھی ہوئی تھی۔ وہ بہت کم پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا مگر اس کے وجود اور پسوانے سے دولت کی خوشبو آ رہی تھی۔

میں نے گرجوٹی سے ان کا استقبال کیا۔ اندر آکر بیٹھنے کے بعد سینہ رمضان نے اپنے ساتھ آنے والوں کا تعارف کرایا۔ سوٹ والے کا نام بلور شاہ تھا اور شلوار قمیض والے کا جلاوید بھٹی۔ یہ ان بیسیوں آدمیوں میں سے تھے جن کی خدمات سے سینہ رمضان استفادہ کرتا تھا۔ بلور شاہ، مل ایسٹ سے الیکٹرانک کا سامان اور پڑے وغیرہ "درآمد" کرنے میں خاصا اہم مقام رکھتا تھا۔ جلاوید بھٹی کی لافچیس چلتی تھیں۔ کچھ باپرداری میں، کچھ مسافر برداری میں اور کچھ ایسی گیری میں۔ سینہ رمضان، بلور شاہ اور دوسرے کئی لوگوں کے کاروبار کا دارومدار اس کی لافچیس پر تھا۔

مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ وہ تقریباً ان پڑھ لیکن بے پناہ دولت مند آدمی تھا اور جتنے خطرناک لوگوں سے اس کے تعلق واسطے تھے ان کا ہم سن کر چھوٹے موٹے لوگوں کے تو ہوش اڑ جاتے تھے لیکن جلاوید بھٹی کی اس خصوصیت نے مجھے بے پناہ متاثر کیا کہ اس میں غضب کی انکساری تھی۔ یوں آپ اور عابثی سے بات کرتا تھا جیسے کوئی معمولی مسافر ہو لیکن ساتھ ہی سمندری جہازوں میں پانچ دس آدمیوں کو اڑا دینے کا قہر بھی یوں سرسریات انداز میں سنا جاتا تھا جیسے گاجر موٹی کٹ کر پینک دینے کی بات کر رہا ہو۔

اچانک سینہ رمضان کو جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چٹکتے ہوئے بولا "ارے ہاں ہاں... جو بات سب سے پہلے پوچھنی چاہیے تھی وہ تو میں بھول ہی گیا۔ تم بھی سوچو گے کہ میں کیا سب پڑا بیڑیاں ہوں۔ میں کی دینر بھی اپنے دوست ہیں۔

کبھی کبھار ان سے کسی قسم کی تجزی کا کام لیتا پڑ جاتا ہے۔ ان میں سے ایک دینر کو معلوم ہے کہ تم میرے سمنان ہو۔ وہ بتا رہا تھا کہ سونمنگ پول پر تھمارا کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا اور تم نے ٹھوٹا مار کر اسے سونمنگ پول میں پھینک دیا تھا۔ پھر اس کی تفسیر پھوڑدی تھی؟ سنا ہے اسے ریل سے سیدھا کسی پرائیویٹ اسپتال میں لے جایا گیا ہے۔ کیا قصہ تھا؟

"کوئی خاص بات نہیں تھی" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ایک شناسائی تھا۔ ذرا بد تمیزی دکھارہا تھا۔ بہرہ ہنسی کی کوشش کر رہا تھا۔"

"تھا کون؟" بلور شاہ نے پوچھا۔ "غالباً کسی کارخانے دار کا بیٹا ہے" میں نے جواب دیا۔ "آج تو رات مجھے تک ہم تھمارے ساتھ ہی ہیں" سینہ رمضان بولا "لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی گزربو کوئی ضرورت پڑے، کوئی تھکنے پھرنے کا معاملہ ہو تو بلا ٹکٹ فون کمر کاٹنا۔ تم میرے سمنان ہو۔ اس شہر میں کوئی آنکھ اٹھا کر تھماری طرف نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کارخانے دار ٹاپ لوگوں کو ہم کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔"

میں نے بلور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے دوشی سے بات کر رہا تھا "حیرت ہے" میں نے آہستگی سے کہا "تھماری باتیں سن کر یقین نہیں آتا کہ تم وہی سینہ رمضان ہو جو اپنے بارے میں خود کہتا ہے کہ وہ رات کو بے وقت کال تل کی آواز سن کر بیڈ کے نیچے گھس جاتا ہے۔"

میں نے ذرا بھیجکتے ہوئے یہی بات کی تھی کہ کہیں سینہ کچھ کھینچا پاتا ہو جائے لیکن اس کے چرے پر ذرا بھی کھسپاٹ گئے، آواز گھروار نہیں ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے، بلور شاہ ٹھری سنجیدگی سے بولا "وہ سینہ کی کوئی

نقصاتی گرہ معلوم ہوتی ہے... کھوپڑی میں کہیں کچھ انکا ہوا ہے۔ ورنہ اپنا سینہ عام حالات میں ایسا بڑیل آدمی نہیں ہے" میں سینہ کو بہت زیادہ قوت نہیں جانتا تھا لیکن بلور شاہ کی بات مجھے متعلق محسوس ہوئی۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا تھا۔ میں نے اپنے کپ سے چائے کی چٹکی لیتے ہوئے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ آج کے واقعے کے سلسلے میں تم لوگوں کو کوئی ذمت کرنی پڑے گی۔ امیں اگر کچھ کرنا ہو تو آپ تک کر چکے ہوتے دیے اس قسم کے لوگوں سے نشنئے کے لئے میں خود ہی کافی ہوں۔ اگر اس شہر میں کسی حد تک نووارد ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی وقت پیش آتی تو ظاہر ہے میں سینہ رمضان کو ضرور تکلیف دیتا۔ اور اگر معاملہ زیادہ ہی بڑھ جاتا تو اس کے لئے بھی میں نے ایک فون نمبر نکال کر رکھا ہوا تھا۔"

"وہ کس کا؟" سینہ رمضان نے دلچسپی آمیز لہجے میں

پوچھا۔
 "سینو واحد کا" میں نے جواب دیا۔
 ایک لمحے کے لئے تو وہ تینوں چپ سے ہو گئے۔ پھر
 سینو رمضان نے سسکراتے ہوئے پوچھا "تو ان سے بھی
 دوستی ہے؟"

○●○

کراچی میں میرا "برنس" میری توقعات سے کہیں زیادہ
 اچھی طرح سمیٹ ہو گیا۔ شفیق کے بارے میں بڑے اندازے
 درست ہی نکلے۔ اس نے نہ صرف کام کو اچھی طرح سنبھال
 لیا تھا بلکہ اپنے طور پر اسے آگے بھی بڑھایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ
 ایک سال کے اندر اندر میری کراچی کی آمدنی لاہور کی آمدنی
 سے کہیں زیادہ ہو چکی تھی۔

بہی بھی تو میں خمیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ میں
 خود بھی کراچی میں سکونت پزیر ہو جاؤں لیکن پھر کسی وجوہات
 کی بنا پر یہ ارادہ ہٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک خاص وجہ تو یہ تھی کہ لاہور کا
 اپنا دو ایک مزارع تھا جس میں کافی عمارتیں تھیں اور یہاں رہنے میں
 تھا۔ دوسرے میرے خیال میں میرے کراچی جانے سے
 برنس میں کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ میری غیر موجودگی
 میں بھی کام اسی نکلن اور اسی سمجھ اوری دہندہ سے انجام دیا
 جا رہا تھا جس طرح میں خود انجام دے رہا تھا۔

کسی مہینے میں کراچی چلا جاتا تھا اور کسی مہینے شفیق لاہور
 آ جاتا تھا اور سارا حساب کتاب ہو جاتا تھا۔ اور میرا جواز برنس
 بھی اچھا ناسا چل نکلتا تھا۔ غرضیکہ ہر طرف سے رویہ آ رہا تھا۔
 کوئی بھی ہاتھ تھا جو میرے لئے راستہ کھولتا جا رہا تھا۔ میرے
 بعض مسائل کو میری کسی خاص کوشش کے بغیر ہی حل
 ہو جاتے تھے کہ میں خود بھی حیران رہ جاتا تھا اور اب مجھے یہ
 یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اپنی کامیابیوں پر اتنا بڑی حماقت کی بات
 ہوئی ہے۔ کامیابیاں خالص اپنی محنت اور ذہانت کی پیداوار
 نہیں ہوئیں۔

ہو سکتا کہ بہت سے لوگ میرے اس نظریے سے
 اختلاف کریں لیکن مجھے میری زندگی اور تجربے نے یہی سکھایا
 تھا کہ کام کی نوعیت خواہ کیسی بھی ہو، بس تک اس کا وقت
 نہیں آتا اور بس تک لوہے والے کو منظور نہیں ہو تا جب تک
 وہ کام نہیں ہو تا۔ اگر تدبیر لڑانے سے درکار مولیٰ پر عمل
 کرنے سے متاخذ ہو رہے ہو سکتے تھے بہت سے کسان کھڑے آج
 آپ کو بہت کامیاب نظر آتے۔ لوگ سب کچھ کتابوں سے
 سیکھ لیتے۔

ہر موضوع پر تو کتابیں موجود ہیں۔ پریشان ہونا چھوڑیے۔
 جتنا شروع کیجئے، لکھ جی جئے، لکھ جئے بلا شائبہ، لکھ جئے
 لانا جئے۔ وغیرہ وغیرہ۔
 اگر بغیر مشیت الہی کے یہ سب کچھ ممکن ہو تا تو ہر

"دوستی کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا" میں نے جواب دیا "میں
 شامانی ضرور سے لیکن کچھ اس قسم کی شامانی ہے کہ اگر کسی
 ذاتی کام کے لئے کہوں تو وہ انکار نہیں کریں گے۔"
 یہ بیان کرتے ہی خوش ہوئی کہ آپ کی ان سے
 شامانی ہے "بنیاد یعنی کھکار کرگھا صاف کرتے ہوئے بولا۔
 "اتم اتنے پتہ نے معاملے میں تو ان جیسے آدمی کو زحمت دینے
 کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس قسم کے معاملات کے لئے تو
 ہم غریب غریب کاٹتی ہیں۔ آپ غم کریں، اس چوکرے کو
 کچھ عرصے کے لئے غائب کرانا ہے۔ بیشک کے لئے اس دنیا سے
 چھٹی کرانی ہے یا پھر بدل ایسٹ کے کسی دیر ان ساحل پر
 پہنچا دیں؟ یہی جیل کٹ کر ہی واپس آئے گا اور دیکھ ہی تک
 ریت الگ بن جائے گا۔"

"تم بہت ہی خمیدہ ہونے لگے یاد" میں نے جس کر کہا۔
 "میرا اس اتنی سخت سزا دینے کا کوئی اور ارادہ نہیں۔ میں اگر اس
 نے بات پر مائل تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو اس بات کو ختم ہی
 سمجھو۔ ہمیں تو اپنے کام کی بات کرنی چاہئے۔"
 "کام کی بات تمہارے کے بعد ہوئی" سینو رمضان اٹھتے
 ہوئے بولا "چلو نیچے ڈائننگ ہال میں بیٹھیں۔"
 ڈائننگ ہال میں کمانے کے دوران بھی پیچھے آوازوں اور
 گول مول الفاظ میں مکرور کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد
 ہم کمرے میں واپس آئے اور مزید ایک نشست جمی جس میں
 بہت سے معاملات طے پا گئے۔

سینو رمضان سے طے ہوا کہ کل وہ دن میں ہی آجائے
 گا اور مزید چند کام کے لوگوں کو ساتھ لے کر آئے گا۔ وہ ایسے
 لوگ تھے جن کے عقائد اور مذہبی مجھے یہاں سے سرے سے
 اپنا کاروبار بنانے کے سلسلے میں اثر ضرورت تھی۔ ان کی
 آئینہ دار کے بغیر یہ کام آتے ہی نہیں سکتا تھا۔
 کاروبار کا جو سلسلہ طے پا رہا تھا، میں اس سے بے حد
 مطمئن اور خوش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کراچی کا میدان میرے
 لئے لاہور سے زیادہ زرخیز ثابت ہو گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا
 کہ کراچی میں کام ضرور شروع کروں گا لیکن خود اچھی لاہوری
 میں رہوں گا۔ اپنے شفیق کو کراچی بھیج دوں گا۔ وہ بخوبی یہاں کام
 سنبھال سکتا ہے اور ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ وہ زبردست
 ملا جلیوں کا ایک تھا اور ساتھ ہی میرا دھارہ بھی۔ مجھے نہ
 صرف یہ یقین تھا کہ وہ تمام معاملات سے نمٹ سکتا ہے بلکہ

تقریبات اور ذر ذر میں اب ہر عمر کی خواہشیں کا میرے گرد
جھینٹا رہنے لگا تھا۔ ان میں سے بیشتر وہ ہوتی تھیں جنہیں
شوہر کے طور پر کسی عقل کے اندھے کی ضرورت ہوتی تھی۔
عام طور پر تمہید تو وہ خود ہی پانچ لکھتے تھیں، باقی مضمون ان۔
شاہد الدین پر ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مثلاً کسی اعلا درجے کے ہوٹل میں ہونے والی ڈنر میں کوئی
لڑکی بیٹھ اٹھائے اپنی دو تین خاص دوستوں کے ہمراہ کتاب
پڑاواں حصہ بڑی بازو اور اسے چٹائی ہوئی قریب آئی اور نماز
پڑھنے کے انداز میں دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے عموماً ناک
میں بو لکھی "ہائے کئی ایسا تو ہے؟ مجھے پچھانا؟" کسی کے ہاں ڈنر
آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں بائیں والا کی لڑکی ہوں...
... آپ کا دور میرا نام کتنا اچھا ہے... ہے؟ آپ نے تو مسرور
والے ڈنر میں ابو سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارے ہاں آئیں گے
مگر آپ آئے ہی نہیں۔"

میں نہایت افساری سے دانت نکال کر کہتا "جی... وہ میر
فرصت ہی نہیں ملی... کاروباری مصروفیات ہی اتنی رہتی ہیں
"وہ تو ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے" محترمہ فنی صاحبہ
اشکارا کرتی تھیں "ہم تو اپنے ابو کی مصروفیات دیکھ کر ہی پریشان
ہوتے رہتے ہیں۔" میں نے چار دن ٹھیک سے گھر رہنے
ہوں گے۔ کبھی ابراہن... کبھی جلیان... کبھی ذیل ایسٹ... کبھی
انگلینڈ... کبھی کبھی تو ہم ان کی صورت دیکھنے کو ترس
جاتے ہیں۔ ایسا بھی کیا کاروبار کہ انسان کی سوشل لائف تو
ختم ہو کر رہ جائے۔"

"ہاں۔ یہ تو آپ نے بالکل درست کہا" میں ان کی تہنیت
میں سر ہلاتا اور ان کا چہرہ جو کسی یونی پارلر کے حسن کار کوئی
چمکا دکھا ثبوت ہوتا تھا اس پر مزید روشنی آجاتی۔ مجرورہ نے
چمکی کے کباب چباتے ہوئے دیکھ کر کابل سے جی آنکھوں
کو پھلاتے ہوئے کہیں "ارے... آپ کو چمکی کے کباب
بہت پسند ہیں؟ کبھی ہمارے ہاں آئیے۔ چمکی کے کباب تو
آپ کو ہم غلو نہیں گئے۔ اور ہاں ابو جلیان سے بائیں والا سیٹ
لائے ہیں۔ قسم سے شرے میں کو سننے کا لطف دوہرا ہو جائے
گا۔ تو پھر کب آ رہے ہیں آپ؟"

میں کوئی گول مول اور غیر حقی سادہ کر لیتا۔
کبھی کبھی کانا پیچھے کا فریڈ کسی محترمہ کی والدہ انعام
دیتیں۔ وہ کسی امپورٹڈ مینے کھر کی بدولت چمکتے دیکتے ہاں
میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑی شفقت سے کہیں "ارے ابو
بیٹا! کبھی گھر آؤ نا۔ اب تو اپنی شلے کے انڈیام بھی ختم ہو گئے
ہیں۔ کچھ دنوں بعد تو وہ مزید تعلیم کے لئے اسٹینس چلی جائے
گی۔ تو کل تو گھر میں خوب روشنی ہے۔ اس سٹوڈے کو تیار
... اور ہاں ہمیں ایک راز کی بات بتاؤں؟ اپنی شلے جو ہے... و

مختص کتابوں کی مدد سے جو چاہتا ہوں چکا ہوتا۔ ایک مغربی
مصنف کی کتابوں کی پوری سیریز لوگوں کی لائبریریوں میں دیکھ
کر تو میں بہت ہی حیران ہوتا تھا۔ مصنف نے کتابوں کے
ذریعے پوری دنیا کے سارے ہی مسائل حل کر دیے تھے۔
پڑھنے والوں کا تو مجھے علم نہیں تھا تاہم میری معلومات کے
مطابق مصنف کے اپنے بیشتر مسائل ان کتابوں کی کرداروں
کی رائے سے حل ہو گئے تھے۔ میرے ذاتی خیال میں ان
کتابوں سے ایک ہی چیز ممکن تھی اور وہ یہ کہ "مکرمہ" لکھ جائے۔

لیکن ہر حال یہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ہو سکتا ہے
بہت سے لوگوں کا تجربہ اس سے مختلف ہو۔ تاہم مجھے شبہ
ایزدی والے نظریے پر پوری طرح تجویز کے بعد یقین آنے
سے ایک طرح کا قرار ساما لگتا تھا۔ پہلے کبھی مجھے اپنے آپ پر جو
کھمبہ سنا ہوتا تھا تھا... اب وہ ختم ہو گیا تھا۔ پہلے کبھی
اچھے ہوئے معاملات کے باعث مجھ پر اصرار تھا سنا ہوتا تھا
تھا "اب میں بالکل مطمئن" آپ سکون اور پُر اعتماد رہتا تھا۔

جوان ہونے تک میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ
زندگی میں میرے پاس کبھی اتنی دولت بھی آئے گی۔ سچی بات
تو یہ ہے کہ میں نے اس وقت کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میں
آگے چل کر کیا ہوں گا اور کس طرح ہوں گا؟ اور اب جو کچھ
میں بن چکا تھا اس کے بارے میں کبھی سوچنے بیٹھا تھا تو مجھے
خود بھی سچ طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ میں اب سب کچھ کب
کس طرح اور کیوں بن گیا تھا؟

دولت کا کوئی مصروف اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
کاروبار کو جس حد تک پڑھا تا میرے بس میں تھا وہ میں بڑھ چکا
تھا۔ زیر زمین و صندوق میں بہت سے صندوق ایسے تھے جن
میں "میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا اور جائز کاروباروں میں میری
سربراہی کاری کے امکانات محدود ہی تھے کیونکہ تمام تر قانونی
پیکر اور دیکھوں کی مدد کے باوجود میری بیشتر دولت بلیک منی
ہی تھی۔ مگر کہ اس کا خلاصہ واپس میں تبدیل ہو کر درست
کاروباروں میں گنتا جا رہا تھا لیکن بلی جو کی توں ہندوؤں کی شکل
میں اور تجویزوں میں محفوظ ہو رہی تھی۔

جائز کاروبار کے سرے اب میرے غائب بات کالی براہ کچے
تھے۔ معززین شر اور خاص خاص سینھوں میں میرا شمار ہونے
لگا تھا۔ چندے مانگنے والے، سانی تنظیموں کی سرپرستی کی
پیشکش کرنے والے، مختلف پروڈکٹ کے لئے اشتہار مانگنے
والے، بغیر کسی خاص دوست یا شناسائی کے مختلف ڈنر یا کسی اور
تقریب میں مدعو کرنے والے اب بے حساب آتے گئے تھے۔
میری حتی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ ان میں سے کسی کی
دل کھنی نہ کروں۔

رومانی ناول

100/-	اسلم راہی ایم۔ اے۔	لاڑکی اس گلی کی
100/-	اسلم راہی ایم۔ اے۔	اس جلتے جہاں میں
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے۔	خدا کہاں ہے
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے۔	جلتے بجھتے لوگ
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے۔	سیرا
75/-	اسلم راہی ایم۔ اے۔	روتے کنول

ہوتے ہوئے بھی رات کے کسی پہر میرے طلق میں کانٹے پڑنے لگتے تھے اور اپنا خوبی و عریض بنگا مجھے بہت سونا سونا لگتا تھا لیکن رابطہ کے بعد آج تک کسی لاڑکی نے اس شدت سے دل کے دروازے پر دھک نہیں دی تھی کہ اسے اپنانے کی خواہش مجھے بے ہوش کر دیتی۔

میری زندگی میں منصف نازک کا میرے ساتھ سلوک اچھا نہیں رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس پر ی چوہا پڑا ہوا تھا مگر وہ صرف ایک بار فواشٹ کی انتہا کر کے یوں لا طلق اور اور پھر ثابت ہو گئی تھی جیسے اسے میرے جذبات سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ باپ نے دولت کے لالچ میں اس کی شادی ایک ایسے شخص سے طے کر دی تھی جس کی بیٹیاں بھی شمع سے بڑی عمر کی تھیں اور اس نے مجھ سے پہلی اور آخری ملاقات پر روتے ہوئے کہا تھا "افضل! تم گواہ ہو کہ میں نے کس طرح اپنے کردار کی حفاظت کی ہے۔ لیکن مجھے اس کا کیا صلہ ملا؟ چنانچہ میں نے سوچا کہ ایک گناہ تو کروں تاکہ دل کو اطمینان رہے کہ زندگی بھر میں جس جنم میں ملیں گی وہ میرے گناہ کی سزا ہے۔"

وہ اپنے اس قلعے کو سینے سے لگائے اس پہلی اور آخری ملاقات کے بعد یوں غائب ہو گئی تھی جیسے گاؤں میں وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ جاتے وقت اس نے مجھے مطلع کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میرے لڑکھن کے معصوم عشق میری بے لوث طوفانی چاہت کی اس کی نظر میں گویا کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے اس کی یاد میں کس طرح جاگ جاگ کر راتیں گزار دی ہیں۔ کس طرح میں ہر روز انتظار کی سوئی پر مصلوب رہا ہوں اور کس طرح دیوانہ وار

پانی بہت مرہ پال ہے۔" اس موقع پر قریب کھڑی محترمہ شلا اپنی پیٹ سے کچھ دیا تے ہوئے حسب توقع شراٹے کی کوشش کرتی تھیں صبح طور پر جانے چنانکہ ان کے رخصتوں کی سرفی حیا کی مرہون بنت ہے یا بلش انک کی؟

میں مسکراتے ہوئے کہتا "آئی، میں تو ذرا رسانی سا آوی ہوں۔ مجھے ان ولایتی کھانوں سے ذرا کم یو دلچسپ ہے۔ اپنی پانی کے بجائے میں بائے زیادہ شوق سے کھاؤں گا۔" اس پر آئی طلق سے ایک معنوی قفسہ برآمد کر گئیں اور اپنی صاحبزادی اور ایک آدھ ساتھی خاتون کی طرف دیکھ کر بڑی محبت سے کہیں "کتنی خوشی کی بات ہے کہ اب ہمارے نوجوانوں میں اپنے کچھ کے بارے میں کوئی احساس کمتری نہیں رہا۔ ہمیں احساس کمتری ہونا بھی نہیں چاہیے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو ہم سب کی جڑیں گاؤں میں ہیں" پھر وہ گویا پراختر محسوس کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہیں "تمہارا کیا خیال ہے کہ شلا کو پاؤں پکائے نہیں آتے؟ یہی وہ قومیں نے اسے سب سے پہلے پکائے سکھائے تھے۔ اپنا کچر پہلے۔ باہر کی چیز بعد میں پک کر آ رہے ہوں؟"

میں ان سے بھی کوئی کول مول سا وعدہ کر لیا۔ مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس خاتون نے اسی روز جا کر اپنے خاندان کو طلب کر کے بائے پکائے کا حکم دیا ہو گا اور ان کا ذائقہ وغیرہ دیکھنے کے بعد خاندان کو اپنی کارکردگی زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی سخت تاکید کی ہوگی۔

جی بات یہ تھی کہ کبھی کبھی میں نہایت عجیبگی سے سوچنے لگتا تھا کہ مجھے اب شادی کر لینی چاہیے۔ جس قبیل کے لوگوں کا میں نے سوچا کہ کیا ہے ان سے مجھے کوئی فتنس نہیں تھا اور نہ ہی میں ان کے ساتھ احساس کمتری میں مبتلا تھا بلکہ اب تو میں ان لوگوں کے انداز و اطوار سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔

مجھے صرف ایک ہی چیز اس طبقے کی کسی لاڑکی سے شادی سے باز رکھتے ہوئے تھی اور وہ یہ کہ مجھے ان میں خلوص کی بڑی شدید کمی محسوس ہوتی تھی۔ ان کا رہن سہن "ان کے طور طریقے، ان کی گفتگو، غرضیکہ ان کی ہر چیز مجھے کھلم کھلا اور مستور ٹھنکتی۔ اس فصیح اور کھولے پن سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ خلوص "محبت" بے غرضی اور سچائی کی کہیں مجھے رحت بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر ان کیس کیس نہیں تھا۔ اسی لئے مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ اگر میں نے اس طبقے میں شادی کر لی تو وہ نہ سکے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایسے کنڈیشنڈ کرے میں

میں اسے چاہتا ہوں مگر اس نے شرمیلے سے پہلے مجھے اوداع
کنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

دوسری لڑکی وہ غاند بدوش لالہ تھی۔ اس سے میرے
عشق میں خوبشوں کی آغوش ضرور بھی مگر اس کے بلوغت
میں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ وہ میرے
لئے کوئی سربست راز نہیں رہی تھی اور اس کا سماجی مقام بھی جو
کچھ تھا وہ ظاہری تھا اس کے باوجود میں اس کے بارے میں
ہذبائی ہو چلا تھا۔ ہانے کیا کیا سہنے لگا تھا، کیا کیا اداوے
بانڈنے لگا تھا مگر مجھ سے رقیس ایشیے کے بعد جب اس نے
دیکھا کہ میں مزید رقیس لانے کی پوزیشن میں نہیں رہا تو یہی
عقارت سے مجھے ٹھوکر ماری، "کس طرح اجنبی بن گئی، کس
طرح آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ
وہ پتھر توڑنے والی، شہر شہر کی خاک پھانٹنے والی جاہل لڑکی اپنی
شاہرہ اتنی سفاک اور بے مہربانی، کسی مجھی ہوئی طوائف
سے بھی زیادہ۔

پھر راجہ میری زندگی میں آئی تھی۔ اس نے تو انسانی
کردی تھی۔ میں اپنے محسوسات کی اس سے زیادہ توجہ نہ کانتور
بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید اب میں
زندگی میں کبھی کسی لڑکی کو چاہ نہیں سکوں گا۔

اپنے میرے پاؤں مضبوط تھے اور میرے گرد جو یہ سماجی
تنبلیاں منڈلا رہی تھیں، کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی
انہیں کھلوں، کھجوں، ان کے جذبات و احساسات سے کھلیوں،
ان کی شکست سے لطف اندوز ہوا کروں۔ اور یہ میرے لئے
کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وقت اور زندگی نے مجھے بہت کچھ
سکھایا تھا۔ یہ سب بہت شاہرہ بہت تجربہ کار اور پل پل روپ
بدلنے والے لوگ تھے لیکن انہیں پکڑ دیتا بھی اب میرے
ہاتھ ہاتھ کا کام تھا لیکن جانے وہ کون سا بندہ تھا، میرا کون سا
دشمن تھا جو مجھے اس قسم کی حرکتوں سے باز رکھتا تھا۔

میں اسی تہذیب کے دور سے گزر رہا تھا کہ ایک روز نیم
غاند میں ایک نہایت رنگارنگ تقریب میں شہانہ سے میری
ملاقات ہو گئی۔

شہانہ کوئی نوعمر، غیر معمولی طور پر حسین یا انسانی عادات
کی مالک لڑکی نہیں تھی۔ وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچی ہوئی
ایک دروازہ اور خوش شکل عورت تھی۔ اچھے رہن سہن کی
بدولت بیشک تیس کی لگتی تھی۔ اس کی شخصیت میں مجب
سی کشش تھی جسے اس نے نہایت عمدہ میک اپ اور
خوبصورت تراش خراش کے لباس سے دوچار کر لیا تھا۔ اس
کے انداز و اطوار میں ہلاکی کھلتی تھی۔ غاند اپنی دولت مند
لگتی تھی۔

اس کے ساتھ اوسط درجے کے لباس میں ایک قبول

صورت سی لڑکی تھی جو منو بانہ انداز میں اس کے پیچھے بھر رہی
تھی۔ اپنے طرز عمل سے وہ اس کی سیکرٹری لگ رہی تھی۔
تقریب میں کئی فوٹو گرافر بھی موجود تھے اور بار بار فلیش لائٹ
سب اسی عورت کے گرد منڈلا رہے تھے اور بار بار فلیش لائٹ
کے جھمکوں سے اس کی آنکھیں چندھیائے ہوئے رہتے تھے۔
... کوئی کسی کرسی پر کھڑا ہو کر اس کی تصویر بنانا تھا کہ ایک لمحے
کے قبل کھڑا ہو کر اور کوئی اس کی تصویر بنانے کی کوشش میں لینا
ہی بار بار تھا۔

کئی دوسری بیگمات بھی کرسیوں کی زد میں آنے کے لئے
اس عورت سے ہاتھیں کرتے ہوئے ہانے ہانے سے اس
کے ساتھ چپکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دو تین مرد اور ایک
خاتون جو میرے انداز سے کے مطابق نکالتے تھے، بار بار اسے
ٹھیکرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بڑے محل سے سکرانے
ہوئے سب سے ہاتھیں کر رہی تھی۔ بعض باتوں کے جواب
میں وہ اپنی سیکرٹری کی طرف اشارہ کر دیتی اور وہ اپنی ڈائری کھول
کر دیکھنے کے بعد اقتدار کرنے والے کو کوئی جواب دیتی۔
میں اس تقریب میں برادر است مدعو تھا لیکن اپنے ایک
دوست مسود کے ساتھ گیا تھا۔ مسود ایک ممتاز کمپیوٹر تھانہ
اور جمیر آف کامرس کا عمدے دار بھی تھا۔

میں نے مسود سے پوچھا "یار! یہ عورت کون ہے؟"
اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تم اسے نہیں
جانے؟ حاکم لاہور تم تو ہر قسم کے اخبارات و رسائل بڑے ذوق و
شوق سے پڑھتے ہو۔ اس کی تصاویر اور انٹرویو زیادہ تر انگریزی
اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ نہایت خاص
خاص اور بہت بڑے آدمیوں کی تقریبات میں شریک ہوتی
ہے لیکن بہت سوشل خاتون سمجھی جاتی ہے۔ تم نے کبھی ٹیم
شہانہ خوانہ کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا؟"

"اوہ...!" میرے ہونٹوں سے بے اختیار سہمی سی نکل گئی۔
"میں اسے اس لئے نہیں پہچان سکا کہ یہ اپنی چھپنے والی
تصویروں کی نسبت کہیں بہتر ہے۔"

"ہاں... بہت سی خواتین کسی یونی سی ہوئی ہیں لیکن
تصویروں میں بڑی غضب کی پتھر نظر آتی ہیں اور بعض جو
حقیقتاً غضب کی ہوئی ہیں تصویروں میں ہنس پڑتی ہو کر رہ
جاتی ہیں۔" مسود بولا "بعض اخبارات و رسائل میں ویسے ہی
رنگین تصاویر کی رپڑھ لگی ہوتی ہے۔ پریس والے معلوم
نہیں ان بے چاری خواتین سے کون سی پرانی دشمنی رکھتے
ہیں کہ وہ کی جگہ پر آنکھیں ایک کی جگہ دو تائیں اور وہ بھی
منہ میں کسی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اچھی بھلی پری چہ عورتوں کی
تصویروں سے بچوں کو ڈرانے کا کام لیا جاتا ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ پریس کی چٹیں مل جانے کی وجہ سے

طرف وہ آنکھ اٹھا کر دیکھ لے لوگ اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہیں۔"

"چھوڑو بار! کیوں بانس پر چڑھا رہے ہو" میں نے سر ہٹک کر کہا "تمہاری طرف دیکھ کر کیا کرتے گی بے چاری! ہم

میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔"

"جی تو جنہیں معلوم نہیں" مسعود مسکرایا "یا شاید معلوم ہے مگر انکساری برت رہے ہو۔ بھائی! تم اچھے بھلے نہیں

... آدمی ہو اور پھر یہ ذوق کاٹھ... یہ درویشی جسمیلا ہے تم نے۔

یہ آج کے دور میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ خصوصاً ہماری

کلاس میں۔ ہماری کلاس کے لوگوں کو تو آرام طلبی اور کاروبار

کے جوڑو ڈو۔ یہ دو چیزیں تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ معلوم نہیں

تم کاروبار اور صحت دونوں کو بیک وقت کس طرح سنبھالے

ہوئے ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی دوران ڈنر شروع ہو گیا اور

ہم دوسرے ہال میں آگے۔ مسعود کو اس کے کچھ دوسرے

شناہال گئے اور وہ کھانے کے دوران ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

... میں ٹھٹھا ہوا کچھ لینے کے لئے ایک میز کے قریب پہنچا۔ میں

نے اسپرٹ بلب پر رکے ہوئے بڑے سے نغز کی برتن سے

چھلی کا ایک ٹکڑا اٹھانے کے لئے بڑے سے پیچ کی طرف

ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی لمحے ایک سرسبز ہاتھ بھی پیچ کی طرف

بڑھا۔ میرا ہاتھ اس ہاتھ سے ٹکرا گیا۔

سوری کہتے ہوئے اضطراری انداز میں 'میں نے ہاتھ

چیچے کھینچ لیا اور نظراٹھا کر دیکھا۔ وہ وہی سرایا تاست شناہ تھا۔

... وہ بھی اضطراری انداز میں سوری کہہ رہا تھا چیچے کھینچ چکا

تھی۔ اپنی اس بے خیالی پر ہم دونوں ہی مسکرا دیے۔ اس کی

مسکراہٹ میں نوازشات کی کنگھٹاں جھلکاری تھیں اور

آنکھوں میں انکساری کی ان کی کمانیاں چل رہی تھیں۔ قطعی

غیر متوقع طور پر یوں اسے سامنے پا کر میں مسود ہو گیا۔

مجھے مسود کی بات باتیں آئیں۔ وہ یقیناً تقریب کی گزشتہ

کارروائی کے دوران میری طرف دیکھتی رہی تھی اور اس منظر

سے مشاہدے میں وہ مجھے اچھی طرح جان چکی تھی۔ وہ

آنکھوں ہی آنکھوں میں میری ذات کے جزیرے کا مکمل

مشاہدہ کر چکی تھی۔ یقیناً وہ ایک نظریں لوگوں کا جان لینے کا ہنر

جانتی تھی۔ یہ وصف دیکھنے والی عورتیں بہت غیر معمولی

عورتیں ہوتی ہیں۔

"بھئیے نا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ڈش کی طرف

اشارہ کر کے انگریزی میں کہا۔

"پہلے آپ پیچے" میں نے بھی انگریزی ہی میں کہا اور وہ

لیڈر فرسٹ والا علامہ بھی جڑ دیا۔

"چٹے میں ہل کر لیتی ہوں۔ کہیں پہلے آپ پہلے آپ

نیا ہوتا ہے" میں نے مسود پر اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔

"اس کا مطلب ہے پریس کی پلٹیں بھی کھانے کی

بلشوں سے کچھ زیادہ غلط نہیں ہوتیں۔ اور اگر وہ اپنی

دیکھا ہیں" مسود سادگی سے بولا۔

میں ہنس دیا اور ایک بار پھر یکدم شناہ کی طرف دیکھنے لگا۔

دفعاً میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ بھی کمری کمری نگاہوں سے

میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

شناہ کے متعلق کئی معلومات میرے ذہن میں محفوظ

تھیں۔ اس کے بارے میں شادی سے پہلے کی کوئی بات منظر

عام پر نہیں آئی تھی کہ وہ کون تھی کیا تھی کہاں سے آئی تھی

اور کس خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ ہاں البتہ اس کی پہلی

شادی کے بعد سے یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس کا خاندانی پس

منظر جاگیردارانہ تھا کیونکہ اس کا شوہر ایک بڑا جاگیردار تھا اور یہ

شادی لندن میں ہوئی تھی۔

شناہ نے بیکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں۔ اس کے

تینوں شوہر سمر اور بے پناہ دولت مند تھے۔ تینوں ہی شادی

کے تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اختلال کر گئے اور شناہ کو ہر

ایک کی دولت اور جاہد اوس سے خلصا خلصا حصہ ملا تھا۔ اس

وقت وہ ذاتی دولت اور اثاثوں کے لحاظ سے شہر کی دولت مند

ترین شخصیتوں میں شمار ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ قبل ہی اس نے جو تھی شادی پھر ایک زمیندار

سے کی تھی جو شادی کے بعد وزیر بن گیا تھا۔ معظم اس کا نام تھا

اور وہ بھی خلصا عرصہ سیدہ آدمی تھا۔ ملک میں ان دنوں خلصا

الزائری کا دور تھا۔ مشرقی پاکستان کو بھلا دیں بے زیادہ دن

نہیں گزرے تھے۔ سا تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے چند

سال قبل شناہ نے مشرقی پاکستان میں کوئی چھوٹی سی انڈسٹری

لگائی تھی جو بظاہر متوسط کے بعد اس کے ہاتھ سے چلی گئی تھی

اور اسے خلصا بھاری مالی صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔

کاروباری حلقوں میں ازورہ مذاق کہا جاتا تھا "بے چاری

شناہ کو اپناوی نقصان پر ادا کرنے کے لئے تو جو تھی شادی کرنا

پڑی ہے" اس کے علاوہ مذاق ہی مذاق میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ

اگر معظم نے شناہ سے شادی نہ کی ہوتی تو شاید دو چار سال

زیادہ جی لیتا مگر اب کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

مسود نے کتنی بار مجھے خیالات سے جو کاڈیا "میں نے

شروع ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ تم اس کی طرف بار بار دیکھتے

جا رہے ہو" وہ سرگوشی نمائش میں بولا۔

"وہ بتے ہی پڑا دیکھنے کی چیز ہمارے!" میں نے طویل

سانس لے کر دھیمی آواز میں ہی جواب دیا۔

"حیرت کی بات ہے کہ وہ بھی بار بار تمہاری طرف دیکھ

رہی ہے" مسود بولا "اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ جس کی

آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو سکتا ہوں؟

"آج ہی" اس نے انتشار اور اطمینان سے جواب دیا۔
"کب اور کس طرح؟" میں نے دھڑکنوں کا اعتدال میں
رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ذکر کے بعد جب میں رخصت ہوئے لگوں تو تم بھی
چل دیتا۔ اپنی گاڑی میں میری گاڑی کے پیچھے چلے آتا۔
بس اتنی ہی بات ہے" اس نے پرسکون لہجے میں کہا اور
پر تکنت انداز میں آگے بڑھ گئی۔ دوپہار قریب آگے جاتے ہی
اسے عورتوں اور مردوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی نے گھیر لیا۔ یہ
عام سے بڑی سن اور ان کی بیویاں تھیں۔ رپ رپوں پر غور
مگر افراد میں سے کوئی اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔
سب بڑے جوش و خروش سے مختلف ڈشوں کے ساتھ دودھ
ہاتھ کرنے میں مصروف تھے۔

میں کھانا پینا بھول گیا تھا اور دم بخود سا اپنی جگہ کھڑا تھا۔
جب میں نے اس عورت کو دیکھا تھا اور مسودے مجھے اس
کے متعلق بتایا تھا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ نکلہ اتنی
آسانی سے فتح ہو سکتا ہے۔ ہماری چند منٹ کی گفتگو کے
دوران کوئی بھی خاص طور پر ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔
کچھ دیر بعد تقریباً سبھی لوگ ڈز سے فارغ ہو گئے۔ ڈز
کے بعد موسیقی کا پروگرام تھا لیکن میں نے دیکھا کہ شائد
الوداعی انداز میں اپنے شاساں سے ال رہی تھی۔ میں بھی
بانے کے لئے پر تڑپے لگا۔ مسودے مجھے ورداؤے کی
طرف دیکھتے دیکھتے قریب آکر حیرت سے بولا "یارے ہو کیا؟"
"ہاں یار! بڑی زبردست زندگی تھی ہے" میں نے خواہ مخواہ
تھلائی لینے کی کوشش کی اور آواز کو بھی بوجھل بنایا۔

"حیرت ہے!" وہ مجھے سر تپا دیکھتے ہوئے بولا "میں
آتے وقت تم نے تو کہا تھا کہ میں خاص طور پر موسیقی کے
پر وگرام کے لئے جا رہا ہوں۔ ویسے بھی آج تو ایک ایڈ ہے۔
سینچر کی رات ہے جو ہم عام طور پر جاگ رہی گزارتے ہیں۔
صبح تو بھٹی ہے۔ دن بھر آرام سے سوئیں گے۔"
"نہیں یار! میرا اذیت منے کوئی عوارہ ہے تو ابھی سوؤں گا۔"
میں نے اس سے باز چمڑاتے ہوئے کہا۔ کچھ کہ میں دیکھ چکا
تھا کہ شائد اہل سے باہر جا چکی تھی۔

مسودہ کو قدرے پریشان جھوڑ کر میں تیزی سے باہر
آیا اور طویل و عریض سرسبز لان سے گزر کر ایک طرح سے
شارٹ کٹ انتشار کرتے ہوئے پارکنگ لائٹ تک پہنچا۔
پارکنگ لائٹ بھی سمجھ کم طویل و عریض نہیں تھی لیکن اس
وقت گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک
شائد اور چمڑ کر رہی گاڑی وہاں موجود تھی۔

میں گاڑی میں نہ نکل جائے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا اور
ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

"آپ کے ہوتے ہوئے کوئی گاڑی کہیں نہیں جاسکتی"
میں نے دھیمی آواز میں کہا "آپ کے ایڈ کا اشارہ پا کر ہر گاڑی
اسی اسٹیشن پر ٹھہر جائے گی۔ شاید آپ کو اپنی جہتیں ایرو کی
حالات کا اندازہ نہیں۔"

"بہت اچھی طرح اندازہ ہے" وہ بہت دھیمی آواز میں
بولی "میں حالات تو نہیں میرے قریب سمجھ کر لائی ہے" پھر
اس نے گھنیرے پلکیں اٹھا کر جھکی نظروں سے میری طرف
دیکھا "ویسے آوی تم تیر بھی ہو اور دیکھی۔ یکدم بہت لمبی
چھلانگ لگانے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ مجھے چھلانگ لگانے میں بہت تاخیر
ہوگئی۔ آپ اب تک نہیں کئی؟" میں نے مسکراتے
ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

"تھیں معلوم ہے میں کون ہوں؟" ایک لمحے کے
لئے اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

"معلوم ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں"
میں نے جواب دیا "مجھے تو صرف اس سے غرض ہے کہ میری
نظر میں آپ کیا ہیں۔"

وہ میرے بہت قریب کھڑی تھی اور خوشبوؤں کے
سلاط میں اس کے وجود سے استغنی ہوئی انوکھی خوشبو کو
میں غلیظہ ہی محسوس کر سکتا تھا۔ گفتگو جس طرح یکدم ہی
اس عجیب سیج پر اپنی تھی اس سے میری رگ دپے میں
گدگدائی ہوئے لگی تھی۔ اب ہم تقابلاً ہمارا انداز ایسا ہی
تھا جیسے ہم نہایت ہی سرسری اور رسمی گفتگو کر رہے ہوں
جیسے کہ اس قسم کی پارٹیز میں عموماً لوگ چلتے ہاتھوں میں لے
کر کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے بعد
کرتے لگتے ہیں۔

وہ بڑے ہموار لہجے میں بولی "تم مجھے میرے گھر آکر بتاؤ
کہ میں تمہاری نظر میں کیا ہوں۔"

"ذہبے نصیب" میں نے فوراً کہا "میں سوچ بھی نہیں
سکتا تھا کہ حضور یوں کسی پر اچانک بھی مہمان ہو سکتا ہے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ حضور تم پر پہلی بار مہمان ہو رہا ہے" وہ
قدرے شرمیلے میں بولی "تم مجھے حضور کا سکندر لگتے ہو۔"

بانے کتنی بار حضور کی مہمانوں سے مستند ہو چکے ہو۔
"یہ آپ کا خیال ہے نا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں تو حضور نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے
کہ آپ کو آج تک میری نظروں سے اوجھل رکھا۔ میں کب

اور بے بسی کو دیکھ کر میرا جسم جیسے مزید سرد ہو گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ مجھے ان پرتوں میں آ رہا تھا بلکہ میں ان سے اپنے آپ کو خوف زدہ محسوس کر رہا تھا جیسے میں ان کا مجرم ہوں۔ میں نے اپنے بوڑھے سے پانچ سو روپے نکال کر بوڑھے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ روپے لو اور فوراً یہاں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میں چند منٹ بعد دوبارہ یہاں سے گزروں گا" اس وقت تک میں تمہیں یہاں بیٹھا ہوا نہ دیکھوں۔"

اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ تھامے۔ بے چینی سے میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولا "اتنے پیسوں میں تو پورا مینہ آرام سے گزر جائے گا مگر... اب مجھے یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے.... لیکن کیا واقعی آپ یہ رقم مجھے دے رہے ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں۔ جسے ہی دے رہا ہوں۔ شاید میں تمہارا مقروض ہوں۔ جن آسانگوں پر میرا قبضہ ہے شاید ان میں سے کچھ تمہارا بھی حصہ تھا" میں نے تیزی سے کہا "بس اب فوراً اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ کھل رہے ہو؟"

اس کی سمجھ میں شاید صرف میرا سوال ہی آیا تھا۔ کیٹ والے پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس پل کے نیچے جتنی ڈال رکھی ہے صاحب جی! وہی ہمارا گھر ہے... میری بیوہ بیٹی اور نواسے تو اسیاں کھانے کا انتظار کر رہی ہوں گی... میں تو خود جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتا ہوں گی.... اللہ آپ کو خوش رکھے..."

میں نے اس کی مزید دہائیں سے بغیر ایک سیلو بیروں دایا اور ٹائروں کی دھندلے دار چرچاہٹ کے ساتھ میری گاڑی سرکش عفریت کی طرح آگے بڑھی۔ شائد کی گاڑی کی عجبی سرخ بتیاں مجھے نہروالے پل کے پاس معدوم ہوتی نظر آتی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی گاڑی گھبرگ کی طرف مڑ چکی تھی۔ چند ہی سیکنڈ میں 'میں نے اسے جابا کیونکہ وہ بہت ہی دھیمی رفتار سے ٹھوکرے لیتی ہوئی جا رہی تھی۔ تاہم عقب نما آئینے میں میری گاڑی کو دیکھنے کے بعد شائد کے ڈرائیور نے رفتار تیزی۔ اس بوڑھے اور بچے کو دیکھ کر میرے ذہن کو جو ہلکا سا کانٹا تھا، اس سے سنبھل چکا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اپنے خیالات شائد پر مرکوز کر دوں۔

چند منٹ کے سفر کے بعد شائد کی گاڑی جس کو کبھی میں داخل ہوئی وہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔ اس کے دروازے پر اوٹنے سے طرے والا ایک پاورٹی اور مسلح محافظ کھڑا تھا جو گاڑی کو دیکھ کر یکدم مستعد ہو گیا لیکن مٹینی سے انداز میں تاک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔

شائد کے ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر نہ صرف اپنی

شائد جدید ترین ڈال اور موٹیکارنگ کی ایک مرسڈس میں بیٹھ رہی تھی۔ ایک معمر اور پورٹی ڈرائیور اس کے لئے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ شائد نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیور کو غائبانہ دیکھا کہ میں ان کے پیچھے آؤں گا۔ ڈرائیور نے سعادت مندی سے سر ہلا کر صرف ایک نظر میری طرف دیکھ کر ڈرائیورنگ سیٹ سنبھل لی۔

آگے پیچھے ہماری گاڑیاں جیم خانہ سے غریب تو ہیں مگر ایک سے کچھ دور جیم خانہ کی دیوار کے ساتھ پھیلی ہوئی بڑے کی بنی پر ایک بوڑھے اور آٹھ دس سال کے ایک بچے کو بیٹھ دیکھا۔ ان کے جسموں پر میلے کپڑے جھڑکے بھول رہے تھے۔ وہ جیم خانہ سے نکلے والی ہر گاڑی کی طرف پر امید انداز میں ہاتھ پھیلا رہے تھے اور اس کڑکڑاتی سردی میں وہ قہر قہر کانپ رہے تھے مگر ہر گاڑی ان کے قریب سے گزرتی چلی جاتی تھی۔

میں بھی ان کے سامنے سے گاڑی نکالے گیا لیکن اس ایک لمحے میں 'میں نے اس معصوم سے بچے کی آنکھوں میں جس طرح امید کے ستارے ٹوٹتے دیکھے اس نظارے نے یکجہتی ہی کر دیا تھی کسی اور بچی کی طرح وہ کھلے دیا۔ میں کار کا ہیئر آن کر چکا تھا مگر ایک ٹخت مجھے پورے محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہیئر کا میں حرارت نہیں پھیلا رہا بلکہ برف کی بوجھا کر رہا ہے۔ میرے ذہن پر تھوڑی سی دھسکی اور نہایت عمدہ کھانے کا جو غماز تھا وہ یک دم کافور ہو گیا۔ میرے حواس میں عجیب سی ٹھنڈک آن گئی۔

اگر وہ پیش در بھکاری تھے تب بھی کھلے دیا تھا۔ رات کا پہلا اور شرم کا یہ کنارہ۔ ایسی غضب کی سردی اور ان کے جسموں پر جموتے ہوئے پیٹیسٹر۔ اور پھر ان کی عمریں بھی تو عجیب تھیں۔ ایک ایتھام سن اور معصوم کہ ابھی اس کی آنکھوں نے شیب و فراز اور محرومی و آسودگی پر حیران یا افسردہ ہونا بھی نہیں سیکھا تھا۔ "دوسرا اتنا ضعیف تھا کہ زندگی کی مزید ناانصافیوں کو سہنے کی اس میں سکت ہی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر جانے کس طرح وہ قرض جان پکانے کے لئے اپنے آپ کو ٹھیکیت رہا تھا۔

ان تمام سوچوں اور ساری کیفیت نے صرف ایک لمحے میں مجھ پر غلبہ پایا اور مجھے خرد احساس نہیں ہوا کہ کب میرا پاؤں ایک سیلو بیروں سے ہٹ کر بریک پر جا پڑا۔ اپنی ہی ذہن کے ٹائروں کی چرچاہٹ سن کر میں چونکا۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی دیوار سے ٹکرائی اس بوڑھے اور بچے تک پہنچ چکا تھا۔

وہ اس مرتبہ پر امید انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکھائے قد سوں سے گاڑی کی طرف بڑھے۔ میں نے گڑبڑ کا شیشہ نیچے کیا اور اتنے قریب سے ان کے چہرے کی چلبلیٹ

دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا ہو گئے؟"

"صرف بلیک کالی" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی بدانت پر میں بھی ایک آرام کر رہی تھم دراز ہو چکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں ایک نغمہ ساز اور بچہ پچکا سا بچہ ہوں اور پرہیزان مجھے ہواؤں میں جھولتا ہوا رہی ہیں ملازم جاچکا تو وہ اپنی جیو لری اندر کرے پر دانی سے نینکوں شیشے کی ایک تباہی پر پیچیدگ کر ہواؤں میں اگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "معلم اسلام آیا گیا ہوا ہے کم از کم ایک پختہ بعد واپس آئے گا۔"

یہ اطلاع گویا خاص طور پر میرے لئے تھی۔ میں نے ٹالی کی گردہ چھلی کرتے ہوئے ایک بار بھر صرف ہنسنے پر اکتفا کیا۔

"اچھا... تو تم پرنس کرتے ہو؟" وہ اپنے خوبصورت ریشمی ہواؤں کا زور ڈھکیں کر انہیں آرام کر کے پختے پر پھیلا کر ہماری سانس لیتے ہوئے بولی۔ میں حمزہ کی نظروں سے ان ہواؤں کو دیکھ رہا تھا جو گدے پختے سے یوں بچنے کو لگے ہوئے تھے جیسے پختے ہوئے سونے کا چھوٹا سا آئینہ گر رہا ہو۔ میں نے ہنسنے کے بدلے اس کے جلووں کے حیرت سے آواز دے دی تھی۔

وہ قدرے چونک کر کہا "میں نے کب کہا ہے کہ میں پرنس کرتا ہوں؟"

"کہا تو ہم نے آج ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں" وہ غور سے لہجے میں بولی "زبان سے کہے بغیر ہی ہم نے ایک دوسرے کی باتیں سمجھی ہیں۔"

وہ ٹھیک کر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی ساری باتیں سمجھ چکے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ ملازم کلنی کے رتن ٹرائی پر رکے "ابازت پارک اندر آیا اور پھر اس کا اشارہ پارک ٹوٹ گیا۔ شاہانہ نے خود میرے لئے کلنی تیار کی۔ کلنی کی پینکلیاں لیٹے ہوئے ہم پھر بار بار خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ کلنی کا کب۔ ٹالی پر رکھ کر اس نے ٹالی بجا دی اور تانوسوں کی روشنی معدوم ہو گئی۔ کمرے میں صرف دیوار گیر رقیق نقوشوں کی مدھم اور خوابناک روشنی باقی رہ گئی۔

کئی گھنٹے بعد جب بیڈ سائز نیل کا کاک خرمن ہی ٹک ٹک کے ساتھ صبح کے سات بجنے کا اعلان کر رہا تھا تو وہ سرشار لہجے میں بولی "محمد افضل چوہدری اتم جاہو تو فرض کر سکتے ہو کہ تمہیں یادیں چتر لگ گیا ہے۔ کچھ استفادہ کرنا چاہو تو کرو۔ کوئی کام کہیں انکا ہوا ہے تو مجھے بتادو۔ کوئی مسئلہ درپیش ہو تو صرف اشارہ کرو۔"

"ہو سکتا ہے مجھے اپنا ایک مسئلہ حل کرانے میں تم سے مدد ملتی ہے..." میں نے ایک لمبے کے وقفے سے کہا۔

گامڑی کا بلکہ میری گاڑی کا بھی دروازہ کھولا۔ جس ڈرائیو میں ہماری گاڑیوں کی تھیں وہ بیڈ مشن کے تین چار کورٹ بیٹے کے لئے کافی تھا اور دائیں ہاتھ پر جو لان پھیلا ہوا تھا وہ کسی چھوٹے موٹے اسٹیڈیم کے برابر تھا۔ کوٹھی کی ساخت بھی عام آدمی کو مبسوط کر دینے کے لئے کافی تھی۔

میر جیوں چڑھ کر ہم برآمدے میں بیٹھے جس کا فرش ماربل کا تھا اور عمدہ پالش کی بدولت دھیمی روشنی میں آئینے کی طرح جھلکا رہا تھا۔ اندر نہ جانے کس طرح ہماری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی کہ شاہانہ کو کوئی تیل وغیرہ بجانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جیسے ہی ہم بلند و بالا منتقل ہوئی دروازے تک پہنچا ایک بار دی ہلنے لگے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے ہی وہ ہاتھ باندھ کر اور نظریں جھکا کر غلاموں کی طرح ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

شاہانہ اس کی طرف دیکھے بغیر ایک لمحہ کی سی حکمت سے سر اٹھائے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس کی رہنمائی میں جس طویل و عریض بیڈ روم میں پہنچا وہ آرامش کے لحاظ سے قدامت اور جدت کا ایک حسین امتزاج تھا۔ شاہانہ اس کی پیست میں قدیم طرز کے دو بڑے بڑے نہایت خوبصورت قالنس آویزاں تھے گردہ ساک کنٹرول تھے۔ تلی بجانے پر روشن ہو گئے تھے۔

بجائے ساز کا چھوٹی بیڈ شاہی انداز میں چاروں طرف سے حریری جالیوں میں گھرا ہوا تھا۔ پائی فرنیچر و کنورس اسٹائل کا تھا مگر ساتھ ہی دیوار پر جدید کتبہ اور مشینی سولتیں بھی موجود تھیں۔ محض یہ ہنست نظیر کراہی اپنی جگہ ایک ٹیچہ دکھاتا تھا۔

آج کل میں خود بھی کسی معمولی کوٹھی میں نہیں رہتا تھا لیکن اس کوٹھی کی وسعت اور آرامش دیکھ کر میں حائر ہوئے بغیر نہ سا۔ ہر حال شاہانہ کا رہن سہن دیکھ کر مجھے کچھ ایسا زیادہ حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا اپنا ازدواجی پس منظر جاگیر، روان تھا۔ اس کا سوچو وہ شوہر بھی نہ صرف بڑا جاگیر دار بلکہ وزیر بھی تھا۔

ایک آرام کر رہی پر پختے شخص ایک نظر دیکھ کر ہی آرام کا احساس ہوا تھا، دھیر دھیر ہوتے ہوئے اس نے شاید کوئی ملکہ جن دیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لئے چراغ کے جن کی طرح ایک اور ملازم ہاتھ باندھے آئے حاضر ہوا تھا۔

"دیکھو... مجھے بیڈ روم میں کوئی فون نہ دینا" اس نے ملازم کو بدانت کی "اسلام آباد سے اگر صاحب کا فون بھی آئے تو کہہ دینا کہ میں سو چکی ہوں۔"

ملازم نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلایا۔ تب شاہانہ نے غور سے نظروں سے میری طرف

والے اصول پر ہی زیادہ چل رہا ہے۔ میں جب کبھی شہرت یا ہر ملک سے باہر جاتی ہوں اور معظم گھر ہو بات تو میں یہ نہیں سے نہیں کہہ سکتی کہ پیچھے میں کیا ہوتا ہے۔ درود پر اور یہ زبان خوشی بہت سی کمائیں سناتے ہیں لیکن میں ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا، "میں کرولی" ویسے جن دنوں میری دوسری شادی کا زمانہ چل رہا تھا اس وقت ایک نوکر نے اس قسم کی حلفت کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی بات پر ہم نے اسے نوکر سے نکال دیا تھا۔ کئی دن اسے کہیں اور نوکر نہیں ملی۔ آدمی ذرا تیز طرار اور تھوڑا سا چالاک تھا اور اسے ہم پر بہت غصہ تھا۔ اس نے ایک اخبار نویس سے مل کر اس کے ہاتھ کچھ تارکیر راتوں کے افسانے فروخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اخبار والوں کو تو وہ اسکیٹل جھانسنے کی جرأت نہیں ہو سکتی البتہ ہمیں علم ہو گیا کہ فلاں سابق نوکر نے اس قسم کی کوشش کی تھی۔ "وہ بات ادھوری چھوڑ کر عجیب سے انداز میں مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے تپش سے پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں" وہ بڑی سادگی سے بولی "سابق نوکر کی لاش ایک گندے ٹالے میں پائی گئی تھی۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ کام میرا نہیں تھا۔ میرا ہاتھ اس میں ہرگز نہیں تھا۔ یہ کام میرے شوہر نے کر لیا تھا" وہ عجیب سے انداز میں نہیں۔
"دیکھو نا... شادی کے بعد تو عورت مرد کی ذمہ داری بن جاتی ہے نا۔ عورت کی رسوائی مرد کی رسوائی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسے زحمت کرنا پڑی" اس نے ایک طویل سانس لی "تو یہ ہے زندگی؟"

"ہاں۔ یہ ہے زندگی" میں نے ہنسنے سے کہا۔
اس روز میں دن چڑھے باقاعدہ اور بڑے کھلف قسم کا ہاتھ کر کے دہلی سے رخصت ہوا۔ ایک ہی رات میں مجھے خود ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں رہتا ہی اسی گھر میں ہوں۔ شانہ مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئی۔ میں گاڑی میں بیٹھ چکا تو وہ کھڑکی پر جھٹکتے ہوئے بولی "میں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ کوئی مسئلہ ہو تو بتاؤ۔"

"بتاؤں گا۔ آئندہ کسی ملاقات پر بتاؤں گا" میں نے کہا۔
"یا تمہارا آئندہ ملے گا کوئی ارادہ نہیں؟"

"ارادے تو نہ جانے کیا کچھ ہیں مگر وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا" وہ لہجہ کی سانس لے کر بولی اور پیچھے ہٹ گئی "بہر حال جیسے تمہاری مرضی۔"

"اچھی ملاقات کے لئے وقت نہیں دیا تم نے" میں نے کہا۔
"آج رات میں آ جاؤ" وہ بولی "لیکن آئے سے پہلے ذہن کر لیا کیونکہ اس وقت تو مجھے خود نہیں معلوم کہ رات

"تمہارے شوہر کے پاس جو منشی ہے وہ میرے لئے بڑی اہم ہے... لیکن فی الحال اس موضوع کو رہنے دو۔ تم مجھے لی ہو... تمہارا اتفاق ملا ہے۔ پہلے مجھے کچھ عرصے تک تو اس خوشی کو محسوس کر لینے دو۔ میری روح میں پاس کا ایک صحرانہ بیلا ہوا تھا۔ اسے کچھ دیر تو اپنی محبت کی شہنم جذب کرنے دو۔"

"اتنی رومینٹک باتیں مت کرو" وہ گویا تڑپ کر بولی۔
"میرے برسوں کے خوابیدہ زخموں سے لوہے تلے گئے گا۔ محبت کو میں نے سترہ سال کی عمر میں الوداع کہہ دیا تھا کیونکہ میری پہلی اور آخری محبت کا انجام بہت دردناک ہوا تھا۔ میں سبکدوش کی رہنے والی ہوں جو خوبصورت عورتوں کی سرزمین ہے..."

"اگر تم سبکدوش کی رہنے والی ہو تو پھر وہ یقیناً خوبصورت عورتوں کی سرزمین ہوگی۔ مجھے اس میں ذرا برابر بھی شبہ نہیں" میں نے اس کی بات کاٹنے سے پہلے کہا۔

لیکن وہ گویا میری سرگوشی نہیں سن رہی تھی۔
کھوٹے کھوٹے لمحے میں بولی "سبکدوش صرف خوبصورت عورتوں ہی کی نہیں، محبت کی سرزمین بھی ہے۔ صرف ایک میں ہی بد نصیب تھی جسے اس کی محبت نہیں مل سکی اور جس کے محبوب کا سرتن سے جدا کر کے اس کی لاش نہیں مہیں پیسٹک دی گئی۔ بس اس کے بعد سے کبھی محبت کا نام لینے کو ہی نہیں چلا۔ معاملہ کچھ اور ہی بن گیا۔ اور بس یوں ہی سنبھلتے سنبھلتے کچھ زندگی گزر گئی اور کچھ گزر جائے گی۔ تم بس ایسی اواس کردینے والی باتیں مت کرو۔ رات بہت اچھی ہے اور جھلات بہت موزوں۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔ دل میں خوشی کے پھول کھلانے والی باتیں۔"

وہ ذرا بھی اواس نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اپنے برسوں میں اپنے اوپر نہ جانے کتنا مضبوط خول چڑھایا تھا۔
"ٹھیک ہے... میں دل کی بات دل ہی میں رکھوں گا۔ مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "اچھا... یہ تو تازہ کہ معظم کی عدم موجودگی میں یوں رات بھر میرا یہاں رہتا... میرا مطلب ہے گھر میں اتنے نوکر دیوہ بھی موجود ہوتے ہیں... کیا نہیں سمجھیں کسی کی طرف سے چٹلی گٹنے یا کوئی اسکیٹل بننے کا خوف محسوس نہیں ہوا؟"

"ہمارے ہاں نوکر اندھوں، گورھوں اور بہروں کی طرح رہتے ہیں۔ صرف اپنے فرائض سے متعلق بات سنتے اور کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں نوکروں کو اچھی بجلی فرسوں اور کمپنیوں کے انگریزوں آئینہ سبز سے زیادہ تنخواہ ملتی ہیں اس لئے ایسی نوکریوں سے ہاتھ دھوا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں" پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی "ویسے بھی یہ دنیا کا کارخانہ اس ہاتھ دو اس ہاتھ نو

ہوری ملاقاتیں جاری رہیں حتیٰ کہ ایک روز شاہانہ نے فون پر مجھے اطلاع دی "کل معظم واپس آ رہا ہے..." "اوہ...." میں نے آسف سے کہا "اس کا مطلب ہے ہماری ملاقاتیں ختم...؟" "تم جاؤ تو یہ مطلب اخذ کر سکتے ہو ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں اس نے حرم ساقیہ لگایا "اس کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں اور میری اپنی۔ پس اتنا ضرور ہے کہ ملاقاتیں اب کچھ کم ہو جائیں گی اور میرے گھر نہیں ہوا کریں گی" اس نے ایک بار پھر حرم ساقیہ لگایا "ویسے زیادہ دل برداشتہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ معظم اکثر شر سے ایک ملک سے باہر پاتا رہتا ہے۔"

"اوہ... پھر ٹھیک ہے" میں نے گویا سکون کی سانس لی اس کے بعد چار پانچ دن اس طرح گزر گئے کہ اس سے سہانا تک نہیں ہوا۔ اس روز میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میری سیکرٹری کیسٹرن نے بڑے پرچوش لہجے میں انٹر کام پر اطلاع دی "سر! اوہ.... منظر معظم صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسٹی! تم یوں خوش معلوم ہو رہی ہو جیسے وہاں اس سے ہمیں صدر امریکا کا فون آیا ہو" میں نے پُر سکون لہجے میں کہا۔

"وہ... سر.... میرا مطلب ہے.... پھر بھی...." وہ گڑبگڑا کر رہ گئی۔

"خبریات کراؤ" میں نے ہموار لہجے میں کہا "اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے معظم نے میری آواز سنتے ہی یوں بے تکلفی سے بھائی میں میری خیر و غایت دریافت کی جیسے میں اس کا پرانا دوست ہوں۔ میں نے حتیٰ الامکان خوش خلقی کے ساتھ محنت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی باتوں کا جواب دیا۔

اور آخر کو سر کی باتوں کے بعد وہ یوں "میری بڑی بھاری سچی کہ تمہیں ایک مسئلہ درپیش ہے.... اندازاً رات تھی ہوگی؟" "ایک بائیس ٹیلی فون پر تو تمہیں ہو تمہیں نا جواب!" میں نے محتاط لہجے میں کہا "اور پھر میرا خیال تھا کہ مجھ سے سوالات کرنے کے بجائے مجھے راستے بتائے جائیں گے کہ مجھے کیا کیا کرنا چاہیے۔"

"بڑے احتیاط پسند معلوم ہوتے ہو یا ر!" اس نے ایک بے ہنگم ساقیہ لگایا "خیر" ایسا کرو کہ اس سٹیج کی شام تم میرے دفتر میں آنا۔" سٹیج کو میں اپنے اسٹاف کو جلدی چھٹی دے دیتا ہوں۔ صرف ایک دو ضروری آدمی ہوتے ہیں اور کوئی انٹرنسٹ بھی نہیں ہوتا۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے؟"

مجھے تک میری مصروفیات کیا ہوں گی۔ میری سیکرٹری آئے گی تو مجھے بتائے گی۔ کل رات چھٹی کرنے سے پہلے اس نے نہ جانے کس کس کو وقت دیا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ "ٹھیک ہے" میں آٹھ بجے کے قریب فون کروں گا۔ اگر تمہاری کوئی مصروفیت نہ ہوئی تو رات کا کھانا ہم انٹر کان میں کھائیں گے" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے" وہ اور میری سی انگوٹھی لے کر پولی اور واپسی کے لئے مزے تھی۔ میں نے گاڑی "آؤٹ" والے گیٹ سے نکالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو بے حد بکا بھکا اور سرشار محسوس کر رہا تھا۔

ایسی رات شاہانہ سے اگلی ملاقات میں کھانے کے کئی گھنٹے بعد میں نے اس کی دوبارہ یاد دہانی پر کہا "ہاں... مجھے ایک کام ہے تو سہی اور مجھے امید ہے کہ معظم کے تعاون سے وہ ہو سکتا ہے"

"ضروری نہیں کہ تم کوئی ایسا ہی کام بتاؤ جو صرف معظم ہی کے تعاون سے ہو سکتا ہو" وہ ایک طعنیہ سگریٹ ہولڈر میں چھنی ہوئی پتلی غیر ملکی سگریٹ کاٹھنوں کش لیتے ہوئے بولی "تم صرف کام بتاؤ۔ یہ میں خود ہی دیکھ لوں گی کہ وہ کس کے تعاون سے ہو سکتا ہے۔"

"میرے پاس کلنی دولت ہے... ایک مٹی ہے..." میں نے دھیسے لہجے میں کہا "میں چاہتا ہوں کہ وہ وہاں مٹی میں تبدیل ہو جائے۔ میرے ذہن میں کئی منصوبے ہیں جن میں سے کسی ایک یا دو بڑے منصوبوں پر میں کام شروع کرنا چاہتا ہوں لیکن مسئلہ صرف یہی ہے کہ میرے پاس اپنی پیشتر دولت کا کوئی جواز موجود نہیں۔"

"یہ کونسا مشکل کام ہے" وہ بے نیازی سے بلوری ایش پڑھتے تھے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولی "ہو جائے گا۔ لیکن اس ضمن میں کچھ جوئے لوگوں سے بھی کام لینا پڑے گا اور ان کے لئے تمہیں اس دولت میں سے کچھ نکالنا پڑے گا۔"

"جی اس کے لئے تیار ہوں" میں نے بلا تامل کہا۔ "ہاں تو سمجھ لو کہ تمہارا کام ہو گیا" وہ بولی "معمولاً آئے گا تو میں اس سے کہہ دوں گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر معظم تمہیں فون کرے یا اپنے آفس بلوائے تو تم میرے دوست کی حیثیت سے نہیں میرے دور پار کے کزن کی حیثیت سے بات کرو گے۔ اور اگر وہ تم سے اس ضمن میں بات ہی نہ کرے تو تمہیں بھی اتنا خود کچھ جھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ بس تم اطمینان سے سیدھی طرح صرف کام کی بات کرنا۔ سمجھ گئے نا؟ بالکل سمجھ گیا" میں نے سعادت مندی سے سر ہلا کر کہا۔ "تم سے ملاقات کے بعد میں ویسے بھی کچھ زیادہ سمجھ رہا ہوں۔"

محسن نقوی کی شعری و شخصی عظمت کی اہم بنیادی شہادت

کئی باتیں ضروری رہ گئی ہیں

محسن نقوی

خوبصورت سرورق۔۔۔ بہترین طباعت

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

قیمت / - 100

اردو کے جادوگر مخنور ساحر کا ساحرانہ کلام

سارے خوابے خاک کے ہوئے

☆ ----- ساحر لدھیانوی

خوبصورت سرورق۔۔۔۔۔ بہترین طباعت قیمت: / - 100 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

مصرف ہے اور دولت بھی ایسی جس کے لئے ہماری جان جھلی پر رہتی ہو۔

"اس پیکچر کو رہنے دو" سینہ رمضان نے بیزاری سے ہاتھ بلایا "میں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم بلیک منی کو اس امید پر محفوظ رکھتے ہیں کہ شاید کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح اسے وراثت میں تبدیل کرنے کا موقع مل جائے۔ دوسری بات یہ کہ دنیا بھر کی آسائشیں حاصل کر لینے کے بعد بھی کوئی شخص دولت کمانا بند نہیں کر دیتا۔ دنیا بھر کے وہ تمام دولت مند جنہیں کسی پرزور کی مدد سے بھی اپنی دولت اور انہوں کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا وہ بھی زندگی کے آخری لمحے تک مزید دولت کمانے کی ننگ دو دیں گے رہتے ہیں۔

بیش باکدگی سے دفتر آتے ہیں 'بیش تے سے' منصوبوں میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں۔ بیش جہاں جو بخت ممکن ہو سکتی ہے وہاں بخت کرتے ہیں۔ اور ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایک خاص حد سے گزر جانے کے بعد دولت کمانا درحقیقت انسان کی ضرورت نہیں رہتا، اس کا محبوب ترین مشغلہ بن جاتا ہے۔ اور اور پھیلا ہوا اس کا کاروبار اس کے لئے خطرناک کیلئے بن جاتا ہے اور اسے نہایت مشاقی اور مہارت سے محروم کو اور اور کھکانے میں سب سے زیادہ لطف آتا ہے، ایک ناقابل بیان لذت حاصل ہوتی ہے۔ کہ اس کے فلاں اقدام سے فلاں جگہ اسٹے لاکھ ڈالر روپے یا ریال اور سے ادھر ہو گئے۔ فلاں جگہ یہ تغیر رونما ہو گیا۔ فلاں جگہ کی معیشت میں پاپل پیدا ہو گئی۔ بس اتنی سی لذت کا کھیل ہے یہ سارا۔"

"تم موضوع سے بہت دور نکل گئے ہو" میں نے ہوا جیسے میں کہا "یہ سب باتیں تو مجھے بھی معلوم ہیں۔" "میں موضوع ہی کی طرف آنے لگا تھا" سینہ رمضان کھنکھاتا ہوا بھر کر ہوا "میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہم کسی طرح اپنے مادی دولت بھی جمو کہ دیں جب بھی قایم اشارہ ہو مل بنائے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سرمایہ داری ہم دونوں صرف اپنے آپ تک محدود رکھیں گے" میں نے ممانعت سے کہا۔ "کبھی پراپیٹو لینڈ ہوگی لیکن اس کے پیچھے سرمایہ کاروں کا ایک ٹولی ہوگی۔ کارپوریشن کی ایک ٹیم ہوگی جو اس منصوبے کے لئے خاطر خواہ سرمایہ فراہم کرے گی۔ ضرورت پڑنے پر انہوں سے قرض بھی لیا جائے گا۔ سرمائے کی فراہمی۔ مطابق سب کے شیئرز ہوں گے۔ اکیڈان فیڈر شیئرز خریدنے کے لئے وائیکٹر بننے کے لئے میں اس پروپیکٹ میں اپنی سارا دولت جمع کئے کے لئے تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے مسرت سے کہا "میں چاہیے حاضر ہو جاؤں گا۔"

○●○

معظم کے توسط سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے اپنی دولت کے تقریباً دس فیصد حصے سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن میرے خیال میں یہ سودا منگ نہیں تھا۔ جو لوگ اس شخص میں مجھ سے تعاون کر رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ آئندہ بھی وہ انہی شرائط پر میری یہ خدمت نبھاتے رہیں گے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سودے بازی میں معظم کا کوئی حصہ تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو کتنے فیصد تھا؟ بظاہر وہ بالکل دوستانہ ہے غرض اور بے لوث انداز میں میرا کام یوں کر رہا تھا جس طرح عام طور پر قریبی رشتہ داروں کے کرائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ مجھے بے غرض دے لوث آدمی لگتا ہی نہیں تھا۔ وہ اویز عرفا اور بہت ہی عرفان قسم کی چیز تھا۔

میری بلیک منی کے وراثت منی میں تبدیل ہونے کا عمل بہت آہستہ آہستہ مکمل ہوا تھا۔ اس میں تقریباً چھ ماہ لگے تھے۔ اس دوران رقم کی دوسری کھپ تیار ہو سکتی تھی اور اس کے علاوہ میں اپنے اس پروپیکٹ کی منصوبہ بندی کر سکتا تھا جو مدتوں سے ایک خواب کی طرح میرے ذہن میں جاگزیں تھا۔ اگلی مرتبہ سینہ رمضان لاہور آیا تو میں نے ڈر کے دوران اس کے ساتھ پورے ہانگ ٹانگ اور خالی لینڈ کے دو دروں کے رقبے نشانے بنے ہوئے اپنا ایک کہا "یار! میں کراچی میں ایک بہت سی چیزیں شہر ہو چکی ہیں جو مکمل تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ قایم اشارہ کیا کیا تم از کم فوڈ اسٹار۔"

سینہ رمضان نے ٹھاس دیکھ کر جبر سے میری طرف دیکھا "تم کبھی تو نہیں چم گئے ہو؟ پانی میں رہا ہوں، بیک تم رہے ہو۔"

"کیوں؟ اس میں ہینکے کی کیا بات ہے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو بھی" اس کی آواز تقریباً سرگوشیوں میں وصل تھی "ہماری زیادہ تر دولت بلیک منی ہے۔ باغیر ہم کسی سبب کے تحت کسی بڑے پروپیکٹ کے لئے اسے باہر لانے میں کامیاب ہو بھی جائیں۔"

"میں ہوتا چاہتا" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں بہت عرصے سے یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم دولت کا کار اپنی پسند کے منصوبوں میں نہیں لگا سکتے، بے دھڑک خرچ نہیں کر سکتے تو ہم اس کا فائدہ کیسے؟ کیا ہم کاغذات کے یہ ٹکڑے محض اس لئے کاتے ہیں کہ انہیں خفیہ مقامات پر

"بس اب تم کراچی واپس جاتے ہی جیندگی سے اس پر دھچکت پر کام شروع کردو" میں نے کمری جیندگی سے کہا۔
 "وہاں شیخ میرے کلادار کو پینڈل کر رہا ہے۔ وہ تمہارے انداز سے تم کیسے زیادہ کام کا آدمی ہے۔ بوقت ضرورت تم کسی معاملے میں اس سے بھی جاؤں خیال کر سکتے ہو۔ اس کام کے لئے تم ابھی سے زمین ہموار کرنی شروع کردو۔ میں انکی مرتبہ کراچی آؤں گا تو تم سے پروگریس رپورٹ لوں گا۔"
 "اوکے سرا!" اس نے ہینٹے ہینٹے مجھے سہلوٹ کیا پھر یکے بعد دیگرے دو تین قابض اپنی طرف کھینچ لیں۔
 دوسرے دن سینہ رمضان واپس کراچی چلا گیا اور میں نے پہلے سے زیادہ جیندگی اور کمزوری سے اپنے منصوبے پر غور و خوض شروع کر دیا۔

اس سے اگلے روز جبکہ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا اور بے پناہ مصروف تھا، انٹر کام کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کیسٹرن دھمکے اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "سرا! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں... انہوں نے نام بھی نہیں لیا ہوا۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ آپ ان سے ضرور مل لیں گے۔ میں نے انہیں بتایا بھی کہ آج آپ بے پناہ مصروف ہیں مگر..." اس کے بعد سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس نے اس نامعلوم شخص کے بے پناہ اصرار پر مجبور ہو کر مجھے اطلاع دی تھی۔

"نام کیا ہے ان صاحب کا؟" میں نے ایک فائل کے تمام کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد اسے ایک طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

"آفاق علی... سر" کیسٹرن نے فوراً جواب دیا۔
 "نام تو کچھ مانوس سا لگتا ہے" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "لیکن مجھے یاد نہیں پڑا کہ میں ان صاحب کو جانتا ہوں۔ یہ ہیں کون صاحب؟ کیا کرتے ہیں؟"
 "سر... انہوں نے بتایا ہے کہ یہ فلم ڈائریکٹر ہیں" کیسٹرن نے جواب دیا۔

"اوہ... مجھے یاد آگیا" میں نے اس شخص کا نام بعض فلمی اشتہاروں یا چھوٹی سونی خبروں میں پڑھا تھا۔ شاید ایک آدھ رسالے میں 'سرسری انداز میں اس کا انٹرویو بھی دیکھا تھا۔ مگر میں اس شخص کو ذاتی طور پر ہرگز نہیں جانتا تھا۔ مجھ کو یوں مجھ سے ملنے آیا ہے؟ یہ کیسی سوجھ بوجھ ہے یا آخر میں نے کیسٹرن کو بدایت کی "اسے اندر بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد جو شخص دروازہ کھول کر میرے آفس میں داخل ہوا وہ پختہ العمر اور فریبی مائل تھا۔ اس کا لباس

سوچنے پر اہل ہوا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "ہم نے جو کہنیاں قائم کی ہوئی ہیں میرے خیال میں تو وہ کسی شمار تقار میں نہیں ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ بین الاقوامی فائبر اسٹار ہوٹلوں کی سرکاری کہنیاں ہمیں کھاس ڈالیں گی؟"

"میں نے کہا تھا" اس پر دھچکت میں ہم اپنے نہیں ہوں گے "میں نے کہا" ہم ایک آدھ ایسی کہنیاں کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں گے جس کی شہرت بین الاقوامی طور پر اچھی ہو۔ خواہ وہ سراپہ برائے نام لگائے۔ اس کے علاوہ مجھے اب تک کی مختصری کاروباری زندگی میں یہ تجربہ ہوا ہے کہ باہر کے لوگ نام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ آپ جو منصوبہ پیش کر رہے ہیں اس کی کامیابی کے امکانات کتنے روشن ہیں؟ سرائے کی فراہمی کی کتنی ٹھوس ضمانتیں آپ فراہم کر رہے ہیں؟ وہ انکیشن کریں گے۔ اور پھر مطمئن ہونے کے بعد ہی آپ کو فائبر اسٹار یا فور اسٹار ہوٹل کا اجازت نامہ دیں گے۔ اس کے بعد آپ آئندہ بھی دو معیار برقرار رکھتے ہیں یا نہیں؟ یہ دیکھنے کے لئے ان کی ضمانتیں نہیں اچانک آئی رہیں گی۔"

"یہ سب کچھ تو مجھے معلوم ہے" سینہ رمضان گویا کھن پر سے کبھی اڑاتے ہوئے بولا "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ... لڑائی تو ہوئی انڈسٹری ٹھیک ہی جاری ہے۔ ہمارا پروجیکٹ مکمل ہونے تک اگر اس کا زوال شروع ہو گیا تو ہم مارے جاتے ہیں۔"

"یہ تو نہایت غیر کاروباری بات کی ہے تم نے" میں نے کہا شروع کرنے کے لئے نصیحتیں گور میں پھیلاتے ہوئے کہا۔
 "اگر ہم لوگ اس طرح ڈرنے لگیں تو پھر کبھی کوئی پروجیکٹ شروع ہی نہ کر سکیں۔"

"میں حالات میں عدم استحکام دیکھ رہا ہوں" وہ منکرانہ لہجے میں بولا۔

"بس۔ بس" میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
 "زیادہ انتشار و بے چینی کی کوشش مت کردو۔ ہوئی نہ بھی چلا تو ہم کوئی قانون تو نہیں مچائیں گے۔ میں تو دیوالیہ ہونے کے بعد بھی جینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ مجھ میں ابھی تک بہن کی گھڑی چارپائی پر سونے اور پیشی 'میں' کے ساتھ روٹی کھا کر بیٹ بھرے لپٹے اور پھر بھی کھن رینے کی صلاحیت باقی ہے۔ اور پھر میں تو ہر معاملے میں مقدار کا قائل ہوں۔ مقدار جہاں بھی ملے جائے گا وہیں میری مقدار کے ساتھ قیام کر لیں گے۔"

"اچھا ہاں... جیسے تمہاری مرضی" سینہ رمضان گویا ہتھیار ڈالنے ہوا بولا "ہم نے تو تمہارے ساتھ دوستی کی ہے۔ اب کسی معاملے میں پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے۔ فی الحال تو کتنا کھاتے دو۔"

غیر ملکی زبانیں سیکھئے مصنف: پروفیسر ایم اشرف

80/-	کورین اردو ریڈر
80/-	رشین اردو ریڈر
75/-	رشین فرہنگ
80/-	چائنز اردو ریڈر

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

شروع کروں.... آپ نہ جانے کیا سمجھیں.... " پھر چپے آداب مجلس کا خیال آگیا، انگلیوں میں دلی ہوئی سرگشت کرتے ہوئے بولا "اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں سرگشتی جاری رکھوں؟"

"ضرور۔ ضرور" میں نے کہا "میں خود سرگشتی نوٹ جاری نہیں ہوں لیکن میں سرگشتی نوٹوں کو نفرت کی سے نہیں دیکھتا۔ آپ شوق سے سرگشتی نوٹ جاری رکھیں میرا خیال ہے ساتھ ساتھ کچھ جانے نوٹ بھی ہو جائے۔ وہ شکر یہ ادا کر کے سرگشتی کے گھرے گھرے کش لے لے... میں نے اکثر کام پر کیتھریں کو دہانت کی کہ جانے آج بھوکوں۔ میں جب دوبارہ آفاق ملی کی طرف متوجہ ہوا پہلے کی نسبت زیادہ مطمئن اور پرسکون نظر آ رہا تھا اور آئینہ نظروں سے دھڑکی آرائش و زیبائش کا جائزہ لے رہا اس کے چہرے سے اب خوراک کی جھلک گئی تھی۔ شا مجھ سے اتنی خوش خلقی کی توقع لے کر نہیں آیا تھا" اور شروع میں کچھ مضطرب سا تھا۔

میں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی قلمیں ایک طر کھسکاتے ہوئے کہا "آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے بلا تکلف! جھجک کئے آفاق صاحب! میں بہت سیدھے سادے انداز بات کرنے اور سننے کا عادی ہوں۔ اگر آپ کو مجھ سے کوئی ہے تو بلا تکلف کہہ ڈالیے۔ میرے بس کا ہو گا تو کروں گا۔"

مستقل اور صاف سمجھا لیکن بال کھرے ہوئے تھے اور ان میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ہان چا رہا تھا۔ انگلیوں میں سرگشت دلی ہوئی تھی۔ اس کی رنگت سائلی اور آنکھوں کے پونے بھاری تھے۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس شخص نے اچھا وقت دیکھا ہوا تھا۔ میں نے کرسی سے قدموں اٹھ کر اس استقبال کیا اور اس نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا۔ میرا اشارہ پا کر وہ بیٹھ گیا تو ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے زری سے کہا "ہی.... فرمائیے.... کیسے زحمت کی آپ نے آفاق صاحب؟" اس نے مضطربانہ سے انداز میں پہلو بدلا اور مسکراتے ہوئے بولا "نام تو آپ کو معلوم ہو ہی گیا۔ شاید یہ بھی معلوم ہو کہ میں ایک قلم ڈائریکٹر ہوں۔"

"ہی ہاں.... مجھے یاد آگیا ہے کہ میں نے قلموں کے اشاروں وغیرہ میں آپ کا نام پڑھا ہے۔ ویسے مجھے قلم دیکھنے کا کافی عرصے سے آفاق نہیں ہوا۔ مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ میں کتنے مسلسل سینا ہاں میں بیٹھ رہے کا حوصلہ نہیں پڑتا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ بڑے توی ہیں.... آپ کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے آپ میں کتنے کتنے ایک بے مقدمہ ہی تقریر میں ضائع کرنے کے متحمل کمال ہو سکتے ہیں" اس نے میری بات پر سر ہلایا "کاش آپ نے میری ایک قلم دیکھی ہوئی "عنائی".... وہ میری ذاتی قلم تھی یعنی اس کا ہدایت کار ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ بھی میں تھا۔"

"اچھا" میں نے گویا افلاک دیکھی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"وہ پچھلے سال کی کامیاب ترین قلم تھی" اس کے لیے میں ہلکا سا غر جھک آیا۔

"بہت خوب" میں نے بدستور زری سے کہا "افسوس کہ ہم ایک انجمن قلم دیکھنے سے محروم رہے۔"

"وہ اب بھی شہر کے دو پرانے سینٹروں میں لگی ہوئی ہے لیکن وہ دونوں سینا آپ کے شاہان شان نہیں ہیں۔ تاہم اگر کبھی آپ کے پاس بہت ہی ناخود وقت ہو اور آپ کا دل چاہو تو میں ایک پرانت مسکرا کر آپ کو یہ قلم اسٹوڈیو کے پردیجیشن ہاں میں دکھا دوں گا۔ یقیناً آپ کو پسند آئے گی" اس کے لیے میں ایک التجائی تھی کہ میں وہ قلم ضرور دیکھوں۔ مگر یہ اچھا! نا کے بڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں ابھی تک اس کی آمد کا مقدمہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

اسے گویا خود بھی اس بات کا احساس تھا۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "میری یہاں آمد کا مقدمہ کچھ عجیب

ہی قہی دنیا میں آگیا اور پھر ایسا دل لگا کہ اور کسی کام میں طبیعت ہی نہ رہی۔

چند لمحے وہ پر خیال انداز میں خاموشی سے چائے کی چٹکیاں لیتا رہا۔ میں بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کپ رکتے ہوئے بولا "میں نے بڑی محنت سے ڈائریکٹر کے طور پر اچھا مقام حاصل کیا تھا اور پھر بڑی محنت سے اس مقام کو برقرار رکھا تھا۔ اس وقت تک میرا فکریاں ہی تھا کہ ہر جگہ ہر شے میں صرف محنت ہی انسان کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے لیکن اب میرا نظریہ تو ہوا سا تبدیل ہو گیا ہے۔ محنت کا پھل انسان کو ضرور ملتا ہے لیکن غیر معمولی اور بے مثل کامیابی انسان کو صرف مقدر سے ہی ملتی ہے اور جب مقدر انسان سے روکتا ہے تو اس کی کوئی چیز نہیں جاتی۔ ساری صلاحیتیں اور تیزی و طراری دھری رہ جاتی ہے اور جب مقدر انسان پر مہمان ہوتا ہے تو اس کے متعلق لوگوں کی سبب متقی چیزیں دھری رہ جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے فلاں کام میں کامیابی کی ایک فیصد بھی امید نہیں بلکہ وہی کام اس کی زندگی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ قہی دنیا میں جا کر تو انسان کا میرے اس نظریے پر یقین بہت ہی پختہ ہو جاتا ہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا "میرا خیال ہے میں نے بات کچھ طویل کر دی۔ دراصل ایک تو میں چاہتا ہوں کہ بات کچھ صحیح طور پر آپ کی سمجھ میں آجائے۔ دوسرے آپ کو اس پر یقین بھی آجائے۔... میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ڈائریکٹر کے طور پر میں اچھا بھلا کام کر رہا تھا۔ عزت اور سفید پوشی سے گزر رہا ہوں اور تھی۔ کچھ رقم جمع ہوئی تو میں نے ذاتی رقم بھی شروع کر دی۔ ڈسٹری بیوٹر بھی اچھا لگایا۔ اس نے مجھے کافی سارا دیا۔ ایک چوتھائی رقم میرے مرلئے سے مکمل ہونے کے بعد اس کی طرف سے تقصیروں میں رقم اتنی شروع ہو گئی اور رقم شیڈول کے مطابق مکمل ہو گئی۔... اور جب ریلیز ہوئی تو پھر ہٹ ہوئی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ قہی دنیا میں ایک چیز ہٹ ہو جائے تو راتوں رات آدمی کی قدر پلٹ جاتی ہے۔"

"ہاں۔ اس کا مجھے اندازہ ہے" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھ پر بھی قسمت بہت مہربان ہوئی" وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "مجھے بطور پداہت کار سامنے کرنے کے لئے بیسیوں فلسفہ میرے پاس آنے لگے۔ دانشوروں کی طرف سے بھی چٹکائیں موصول ہونے لگیں کہ اگر میں فلم بنانا چاہتا ہوں تو وہ سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہیں لیکن میں نے کسی کو گھاس نہ ڈالی۔ فلم سے جو آمدنی میرے حصے میں آئی تھی اس سے میں نے بکری دے کر اسٹوڈیو میں ایک عمرہ قسم کا آنس لیا اور "آفاق فلمز" کے نام سے ایک با...

"شکریہ۔ آپ نے یہ بتا کر میری جھجک دور کر دی" وہ قہی مسکرتہ لگاتے ہوئے بولا "میں درحقیقت آپ کے پاس ایک تجویز لے کر آیا ہوں۔ اگر آپ اسے قبول کر لیتے ہیں تو میرے کچھ مسائل حل ہو جائیں گے اور آپ کو بھی کئی قسم کے فوائد حاصل ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ یہ خیال مجھے یوں آیا کہ تین چار روز قبل میں نے ایک ہوٹل کی ایک تقریب میں آپ کو ایک صاحب سے باتیں کرتے سنا تھا جو غالباً آپ کے خاصے بے تکلف دوست تھے۔ میں اس وقت چند لوگوں کے ساتھ آپ کے قریب ہی کھڑا تھا اور میں محض درخت خولہ ہوں کہ غیر ارادی طور پر میرے کان آپ کی گفتگو پر لگ گئے تھے۔ آپ ان صاحب کو بتا رہے تھے کہ بچپن میں آپ کو فلمیں دیکھنے کا کیا زبردست شوق ہوا کرتا تھا اور فلم اسٹوڈیوز کے بارے میں آپ کیسے کیسے خواب دیکھا کرتے تھے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔" میں دیر سے اس دیا "انسان کا بچپن بھی بس عجیب ہی دور ہوتا ہے۔۔۔۔۔ سنا۔۔۔۔۔ مصوم اور ناقابل فراموش دور۔"

"بے شک" ایک لمحے کے لئے وہ کھسکا کیا لیکن پھر حقائق کی دنیا میں واپس آتے ہوئے بولا "میں نے سوچا شاید اس بچپن کی پرچھائیاں اب بھی آپ کے ذہن میں موجود ہوں۔ شاید آپ کو اب بھی فلموں سے اور اسٹوڈیوز سے وہی دلچسپی ہو اور اس دنیا سے تعلق استوار کرنے کی وہی کھن دل میں موجود ہو۔ شخص اسی امید کے سارے میں اچھی ہونے کے بل بوتہ آپ سے ملنے چلا آیا ہوں۔ میں اپنے شیشوں اور قہی لوگوں کے پاس نہیں گیا کیونکہ انہیں اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص کسی معاملے میں مجبور ہے تو وہ اس کی مجبوری سے شرمناک حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

اس دوران چہرہ اسی چائے اور دیگر لوازمات لے آیا۔ وہ ہائے بے بسی کے بعد ہلکے ساٹے رکھ کر چاچکا تو آفاق نے گریٹ کا کراس لے کر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں بہت مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ کئی برس سے میں فلم ڈسٹری میں صرف ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اچھے ڈائریکٹر نہیں شہر ہوتا ہے میرا۔ کئی حد تک سلیقے سے کام کرتا ہوں۔ بہت تک حالات اجازت دیتے ہیں وہیں تک فلم کو لے جاتے ہوئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک م تاثر یہ ہے کہ قہی دنیا شاید جاہل اور ان پڑھ لوگوں سے بڑی بڑی عین ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہیں پڑھے لکھے، ذہب اور شائستہ لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو اچھی فلمیں بنانے میں حتی المقدور تعاون کرتے ہیں۔ خود آپ کا یہ خاکسار سائیم ہے۔ میں نے قہی سے اور پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا ہوا ہے۔ میں پڑھتا تھا ایک پرائیوٹ کالج میں۔ اتفاقاً

قلمیں شروع کر دیں۔ دونوں قلمیں بنگالی قلمیں کیونکہ بنگالی قلموں کی مارکیٹ اچھی جاری ہے اور میرا ارادہ تھا کہ روایتی انداز کی چیزوں کے ساتھ ساتھ بنگالی قلموں میں کچھ نئے رجحانات بھی دینے کی کوشش کروں گا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرا کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو اور نئی سرگرمی سلگانے کے بعد بولا "چیرے آتا نظر آتا ہے جاتا نظر نہیں آتا۔" لاشعوری طور پر ایک توہم نئی زندگی میں زیادہ خرچ کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے پشہ ورانہ اخراجات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ میری ایک قلم کی کامیابی نے مجھے بہت کچھ دیا تھا لیکن ظاہر ہے دفتر کے قیام اور اتنے زیادہ اخراجات کے ساتھ ساتھ وہ قلموں کی تیاری.... اور بد قسمتی سے میری شوقین بھی کچھ لیٹ ہوئی رہیں حالانکہ سولت کی خاطر میں نے دونوں قلموں میں ایک ہی ہیرو کو کاسٹ کیا تھا۔

... قصہ مختصر یہ کہ دونوں قلمیں تقریباً چوتھائی نئی قلمیں کہ میرے پاس رقم بالکل ختم ہو چکی لیکن خیر... کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا اور میں نے اس امکان کو پہلے ہی یہ نظر رکھا تھا۔ میرے ایک پیغام پر ایک بہت بڑا ڈسٹری بیوٹر نرم لے کر پہنچ گیا۔ شوقین جو جاری رہیں لیکن میں اس وقت جبکہ دونوں قلمیں تقریباً آدھی بن چکی تھیں 'دل کا دورہ پڑنے سے ہیرو کا انتقال ہو گیا' یہ کہنے ہوئے آفاق نے یوں سینے پر ہاتھ رکھا جیسے اس ذکر سے اسے خود بھی دل کا دورہ پڑنے لگا ہو۔ پھر وہ خود استہزائی کے

سے انداز میں ہنس کر بولا "میں جب قلم انڈسٹری میں بنانا آیا تو مجھے کئی بار یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ کسی اداکار کے انتقال کی خبر سن کر قلم ساز یا عادت کارب سے پہلے اس قلم میں پڑ جاتے تھے کہ ان کی قلم میں اس اداکار کا کتنا کام چلے گا۔ مجھے ان کی ذہنیت پر بڑا انوس ہو آتا تھا کہ وہ یہ سوچنے کی زنت بھی نہیں کرتے کہ ایک اداکار کی موت سے ایک پورا خاندان اجڑ گیا ہے۔ اس عورت پر جانے کیا گزر رہی ہوگی جس کا سناگ اچڑ گیا ہے۔ ان بچوں کا نہ جانے کیا عالم ہو گا جن کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ ان کے ہلے حالات نہ جانے کیا ہوں گے اور آگے چل کر ان کا نہ جانے کیا حال ہو گا۔ کوئی بھی یہ سوچنے کی زنت نہیں کرتا۔ سب کو اپنی اپنی قلموں کی فکر پڑ جاتی ہے۔ میں اس انداز فکر پر ان لوگوں کو دل میں نفرت لگاتے تھا کہ کیا کرتا تھا کہ کیسے بے حس اور خود غرض لوگ ہیں۔ لیکن...."

وہ ایک بار پھر خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرایا اور سرگرمی کی راگہ ایش رٹے میں جھازتے ہوئے بولا "جب مجھے اپنی قلموں کے ہیرو مظفر رشید کی موت کی خبر ملی تو سب سے پہلا خیال مجھے بھی یہی آیا کہ میری قلموں کا کیا بنے گا؟ تحت آشور میں کہیں اپنی اس کینیکس پر شرمندگی کا احساس بھی موجود تھا لیکن فکر برعکس قلموں کی تھی اور دل کو بڑا ڈونگا

بارہا تھا۔ میری قلمیں اس مرحلے میں قلمیں کہ نہ تو میں ڈیڑھ گھنٹے سے کام لے کر انہیں مکمل کر سکتا تھا نہ کہانی تبدیل کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اور طریقہ اختیار کر سکتا تھا۔ میں نے مرحوم کی بیوہ اور بچوں سے حتی الامکان ہمدردی کا اظہار کیا "ان کی بے حد دلجوئی کی اور کسی کے سامنے بھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی کہ مظفر رشید کی موت سے میرا اتنا نقصان ہو گیا.... تاہم اس کے جہلم وغیرہ کے بعد میں نے بڑے بڑے فلمی ہتھیاروں سے مشورے کیے اور خود بھی دن رات غور کیا لیکن قلموں کو مکمل کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ یوں میری وہ ٹھکانی ہوئی رہیں جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہو چکا تھا۔ وقت ردی کے ڈپے بن کر رہ گئیں۔ ڈسٹری بیوٹر نے اپنی رات کی دواہی کا قصداً شرع کر دیا کیونکہ معاہدے میں یہی دسٹ تھا کہ میں اسے قلمیں مکمل کر کے دوں گا۔ بس.... خلاصہ میرا آپ جتنی کاغذی ہے کہ یہ دو قلمیں مجھے لے کر بیٹھ گئیں کامیابی ایک غیر متوقع لمحے کی طرح میری دہلیز پر آئی اور کیا تخت ہی روٹے ہوئے دوست کی طرح لوٹ گئی۔ میں اس وقت گویا جھگے میں پھنسا ہوا ہوں۔ تقدیر یکدم کچھ زیادہ سی ہماریاں ہو چکی ہے۔ آج کل یہ بطور ڈائریکٹر بھی مجھے سامنے کر کے لئے کوئی قلم ساز قریب نہیں پہنچ رہا۔ صرف ایک فلم کام ہے میرے پاس۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اسی سے بل بچ کا بیٹ پل رہا ہوں۔ قرض خواہوں نے ناک میں دم کیا ہوا... سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ مجھ جیسے نو جوانوں نے اچھے دن دیکھے ہوئے ہوں اور جن کا اٹھنا بیٹھنا اچھے طبقوں میں ہو وہ ان لوگوں میں زیادہ مگر بات بھی کر سکتے جن کے درمیان انہوں نے شبانہ انداز میں وقت گزارا۔"

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" میں اس کا تہہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میں آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا...." اس کے ہونے پر مجروح سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"وہ تو میں سمجھ رہا ہوں" میں نے اس کی بات کا ہونے ہمدردانہ لہجے میں کہا "ظاہر ہے معزز اور خوددار کسی کے پاس کچھ مانگنے نہیں جاتے۔ میرا یہ مقصد نہیں میرا خیال ہے آپ میرے پاس کوئی پیشکش کوئی تجویز آئے ہوں گے۔"

"آپ کا خیال درست ہے" اس کے چہرے پر ظہر آگئی "میں اب ان مکمل قلموں کی تو آپ سے بات نہ رہا۔ ظاہر ہے وہ اسی طرح آپ کے لئے بھی بیکار ہے طرح میرے لئے۔ لیکن میں یہ چاہ رہا تھا کہ میری قلم جو تھوڑی بہت گزردل.... ساکھ.... پٹی رہ گئی ہے وہ اور نہ

خیال ہے کہ دنیا ایک بہت بڑی لائبریری ہے اور ہم سب اس میں رکھی ہوئی کتابیں۔ چہ ہمارا سرورق ہوتا ہے اور سرورق دیکھ کر کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ورق اٹھتے جاتے۔ ہر صفحے پر ایک یا مضمون ہوتا ہے۔ ایک نئی کہانی ہوگی۔ کبھی کبھی سرورق سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ کرنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً سرورق آپ کو بے حد سادہ و سلیٹ لگا مگر بعد میں اٹھاتا کتاب کوئی تو بے حد دلچسپ و رنگین نکلی۔ یا سرورق دیکھ کر آپ نے سوچا کہ بڑی رنگارنگ کتاب ہے مگر اوراق اٹھتے پر پتلا چلا کہ بالکل بے رونا، غیر دلچسپ اور کھوکھلی ہے۔ بہر حال... ہیں سب کتابیں۔ رنگارنگ اور مختلف النوع کتابیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اپنا ایک ڈھنگ ہے۔ اگر پڑھنے کا سلیقہ ہو، زبان کی شہد ہو تو ہم سب کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔

”مگر کتابوں کو تو موت نہیں آتی اتفاقی صاحب! جبکہ ہم لوگ مر جاتے ہیں“ میں نے کہا۔

”کچھ کتابیں شاید آؤٹ آف ٹیٹ ہو جاتی ہیں۔۔۔ زیادہ پرانی ہو جاتی ہیں۔۔۔ یا پھر وہ زمانے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس لئے قدرت انہیں گودام میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن زندہ رہتے والی کتابیں بہر حال زندہ رہتی ہیں۔ اب آپ دیکھیں تاکہ کتنے لوگ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ بعض کو اس دنیا سے رخصت ہوئے سیکڑوں اور بعض کو ہزاروں سال گزر چکے ہیں مگر ان کا نام زندہ ہے۔ ان کی باتیں آج بھی دہرائی جاتی ہیں یا یوں کہیں کہ ان معدوم کتابوں میں جو کہانیاں دستِ خمیں وہ آج بھی لوگوں کو یاد ہیں“ یہ کہتے ہوئے اس نے کوٹ کی جیب سے ایک تھری ڈی ٹی کا ٹکڑا اور اس میں سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھ لیا۔ اس نے مجھے بھی پان پیش کیا لیکن میں نے شکر ہے کے ساتھ انکار کر دیا۔

اس کی ظاہری شخصیت کوئی ایس سٹارٹس نہیں تھی لیکن آدمی ذہین اور سلیم تھا۔ اس کی گفتگو میں ذہانت کی جھلک تھی۔ میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ پان چباتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بو تنوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”ہم کچھ بڑائی کی بات کر رہے تھے“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے گویا اسے یاد دلایا۔

”بات تو اب آپ کو کرتی ہے۔ جی۔ میں نے تو بڑائی آپ کے سامنے رکھ دیا ہے“ وہ چلو بولتے ہوئے بولا۔

”آپ چاہتے ہیں وہ آفس میں خرید لوں؟“ میں نے گویا تفریق چاہی۔

”آفس ہی نہیں میں تو کمپنی کا کام... اس کی سادہ بھی بیچنا چاہتا ہوں“ وہ مجھ سے انداز میں مسکرایا ”بلکہ میں تو چاہتا ہوں“ آپ ان چیزوں کے ساتھ مجھے بھی خرید لیں۔ میں دراصل کچھ اس قسم کی تجویزے کر آیا ہوں کہ اگر آپ کا

بک جائے۔ گو کہ اس طرح مجھے کوئی بہت زیادہ رقم تو نہیں مل جائے گی لیکن پھر بھی مجھ پر سے قرض خواہوں کا بوجھ تقریباً ہٹ ہی جائے گا اور میں سکون کی سانس لے کر کچھ اور سوچ سکوں گا۔ کوئی کام کر سکوں گا۔ اب آپ سوچیں گے کہ میں کمپنی کا کام اور دفتر فروخت کرنے آپ ہی کے پاس کیوں آیا ہوں؟ میں نے اپنے شکا علقوں میں اس کے لئے کوشش کیوں نہیں کی؟ تو اس کی وجہ بھی میں آپ کو بتانا چلوں۔

کیونکہ۔۔۔ حدیث شریف ہے کہ مال کو فروخت کرتے وقت اس کا کوئی عیب یا نقص چھپانے کی کوشش نہ کرو۔۔۔“

میں حیران ہوئے بغیر نہ سکا کہ ایک فلمی آدمی حدیث کا حوالہ دے رہا تھا۔ وہ نہایت سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے جب وہ آفس لیا تھا اس وقت بھی ایک بہت بڑا غلامانہ ملک عبدالعزیز اپنے کسی دوست کے لئے وہ آفس بیکری پر خریدنا چاہتا تھا لیکن اس وقت ان لوگوں کی یہ خواہش کچھ زیادہ شدید نہیں تھی اور انہوں نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں آفس خرید چکا“ انہیں گویا ایک ہی احساس ہوا کہ وہی آفس خریدنا ان کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔ ملک صاحب کا دوست تو شاید اس سلسلے میں کچھ ایسا زیادہ پرجوش بھی نہیں ہے لیکن ملک صاحب نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ مذہبی ست گواہ چست والا معاملہ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اپنی تمام تر خواہش کے باوجود وہ معقول قیمت بھی دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میں ان کل بیجور ہوں اور وہ میری مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جو کہ دنیا کی پرانی رسم ہے۔ وہ اتنی کم آفر دے رہے ہیں کہ وہ آفر کے بجائے محض مذاق ہی معلوم ہو رہی ہے۔ اور دوسرے لوگوں کو چونکہ معلوم ہے کہ ملک صاحب وہ آفس لیتا چاہ رہے ہیں اس لئے کوئی آگے آنے کی بہت ہی نہیں کر رہا۔ ان حالات میں مجھے ایک شریف مگر مالی طور پر مضبوط اور ذہنی طور پر بے خوف گاہک کی ضرورت ہے جو ان حالات میں بھی نہ صرف چیز کی صحیح قیمت لگا سکے اور اپنی منفعتانہ ذہنیت کا مظاہرہ کر سکے بلکہ ملک صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات بھی کر سکے۔“

”آپ نے کیونکر محسوس کر لیا کہ مجھ میں یہ صفات موجود ہیں اور میں آپ کا مطلوبہ گاہک ثابت ہو سکتا ہوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وقت ہو گئی ہے انسانوں کو پڑھتے ہوئے“ وہ بھی مسکراتا انداز میں مسکرایا ”وہ جو کسی شعر میں کچھ اسی قسم کا مضمون نہ سما گیا ہے کہ مضمون بہت ہی لیتے ہیں لٹافہ دیکھ کر تو میں لی چہرہ دیکھ کر کافی حد تک انسان کو محال پڑتا ہوں۔ شیکسپیر نے کہا تھا کہ دنیا ایک ایسج ہے اور ہم سب اداکار۔ لیکن میرا

جس طرح میں چاہتا ہوں۔ اگر مجھے اس کا امکان نظر آیا تو یہ معاملہ طے سمجھیں۔ روایتی قسم کے برنس میں دیے تو بہت مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس کسی سے ملاقات کے لئے وقت نہیں ہوتا لیکن ان کے ساتھ کوئی تجربہ پیش کی جائے تو اس کے اندر سوچ بچار کرنے کے لئے انہیں ہفتوں درکار ہوتے ہیں۔ اور میں روایتی قسم کا برنس میں اس لئے نہیں ہوں کہ یہ برنس مجھے درست میں نہیں ملتا۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا قائل نہیں۔ میں نے ہنگامی انداز میں سب کام کیے اور ہنگامی انداز میں ہی سب کچھ ہوتا چلا گیا۔

”اسی انداز میں کاروبار کا میری زندگی کی سب سے بڑی حسرت ہے“ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اور اسے خوشامد سمجھتے گا۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ میرے آئیڈیل برنس میں کی جھلک نظر آتی تھی اسی لئے میں بغیر کسی جان بچان کے ”دھماکا کر آپ کے پاس چلا آیا۔“

”ویسے آپ آئے تو کچھ غلط وقت پر ہی ہیں“ میں نے کہا ”اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے قلمی دنیا میں قدم رکھنے“

شرق تھا لیکن پچھلے چند برسوں میں حالات اور مصروفیات کے ایک دہریں کہ میں اپنے اس شوق کی طرف توجہ نہیں دے سکتا اور یہ بات گویا میرے ذہن سے نکل گئی۔ آپ کے آنے کے کچھ ہی عرصہ پہلے میں ایک بہت بڑا پروڈیکٹ شروع کر رہا ہوں جس کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اب زیادہ سے زیادہ سرمایہ میرے ہاتھ ہی میں رہے۔ لیکن آپ نے بھرت انداز میں فلسفہ شروع کرنے کا جو خرچ بتایا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ یہ کوئی زیادہ مرگ ”نسخہ“ نہیں ہے۔“

”گھنچا کس تو نکلی جا سکتی ہے۔۔۔ اور چونکہ آپ نے مجھ کا کاروباری انداز میں بات نہیں کی اس لئے میں بھی آپ کا کاروباری انداز میں باتیں نہیں کر رہا اور نہ ہی مصلحت کو سے کام لے رہا ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اگر میں فلسفہ کا حتیٰ فیصلہ کر لیا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے اچھے ساتھی ثابت ہوں گے۔“

”مجھے بھی کچھ ہی محسوس ہو رہا ہے“ اس کے لیے: طریت کی جھلک تھی۔

”تو پھر آئیے۔۔۔ مجھے ذرا آفس ایک نظر دکھا دیجئے“

نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ میں کچھ کام ادھر موجود کر جا رہا تھا۔ میں نے انٹر کام پر ایک سیورٹ میجر کو ان بارے میں چند ہدایات دیں پھر ہم باہر آ گئے۔

گاڑی میں اسٹوڈیو کی طرف جانے ہوئے راستے میں نے کہا ”اگر آج ہماری بات فائل ہو چلائی ہے تو میں فرض کوئی دن نکال لوں گا اور ہم بیچہ کر فلسفہ کی کاپی کوئی لاکھ تیار کر لیں گے۔“ آواز کے لئے تو میرا خیال ہے ہم انہی د

فلسفہ کی کاپی گرام بن سکتا ہو تو آپ کو ہر چیز تیار مل جائے گی۔ دفتر موجود ہے۔ کبھی موجود ہے۔ قلمی دنیا کا ایک بھیدی آپ کے سامنے موجود ہے۔ میں کوئی بہت غیر معمولی قسم کا انسان ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن ہر حال اس خاکسار کا قلمی دنیا میں خود راہت نام ہے، خود راہت نام بھی آتا ہے۔ میری خدمات جس صورت میں آپ چاہیں گے آپ کے لئے حاضر ہوں گی۔ کٹریکٹ کی بنیاد پر۔ ملازمت کی بنیاد پر۔ یا جس طرح بھی آپ چاہیں۔ اور جب چاہیں آپ مجھے طلب فرما سکتے ہیں۔ میں دوسرے ہر کام پر آپ کے بلاؤے کو ترجیح دوں گا۔“

”شکریہ“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا ”اور کاروبار منتقل کرنے کے لئے آپ کی ذمہ داری کتنی ہے؟“

”مجھے اگر تین لاکھ روپے مل جائیں تو میرے مسائل حل ہو سکتے ہیں“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

”اور اس کے بعد اگر میں معززانہ طریقے سے فلسفہ شروع کرنا چاہوں تو کتنی رقم سے کام چل جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر کوئی ملازمت آوی قلمی دنیا میں داخل ہو تو میں ممکن ہے کہ پچاس لاکھ خرچ کرنے کے بعد بھی وہ پہلی قلم عمل نہ کر پائے“ اس نے جواب دیا ”اور اگر مجھ جیسا کوئی شخص آپ کے ساتھ ہو تو آپ صرف دو لاکھ روپے سے بھی نہایت شان و شوکت سے فلسفہ شروع کر سکتے ہیں اور آپ کی قلم افشاں۔۔۔ بحال بھی ہوگی۔“

”کیا ہم ابھی آپ کا دفتر دیکھنے جاسکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اسی وقت؟“ اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں ”کیا آپ مصروف نہیں ہیں؟“

”مصروف تو میں بہت ہوں“ میں نے جواب دیا ”لیکن کسی نئے کاروبار کے لئے موقع مل دیکھنے جانا بھی ہر حال ایک مصروفیت ہے۔“

”آپ واقعی ایک انقلابی برنس میں ہیں۔ آپ کے متعلق میرے اندازے میری توقعات سے کچھ زیادہ صحیح نکلے ہیں“ وہ اپنی حیرت کو دہاتے ہوئے ستائشی لہجے میں بولا ”آپ کی جگہ کوئی روایتی برنس میں ہوتا تو سوچنے کے لئے وقت مانگتا۔۔۔ پھر محاذ آواز کرتا اور میں ممکن ہے کہ آخر میں انکار کر دیتا۔“

”میرے پاس اس قسم کے چھوٹے سونے معاملات پر خود فروغ کرنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ میں تو صرف ہاں یا، میں فیصلہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد آگے میری قسمت میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ کی تجویز کے معاملے میں فیصلہ تو میں ”ہاں“ میں کر چکا ہوں۔ اب میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کا آفس اس طرح سیٹ ہو سکتا ہے یا نہیں

سید حاساراد ساداتی ما آدمی ہوں۔ میں بھلا بھلے میں رہتا کہیں اچھا لگوں گا۔ تم بس اتنی سرمایہ کرتا کہ اپنے دوستوں وغیرہ کو یہ بتا مات شروع کرنا کہ یہ بڑھا ہمارا نوکر ہے۔ جیسا کہ کئی بڑے گئے اور دوستانہ بیٹے اپنے دیہاتی والدین کے بارے میں کئے گئے ہیں۔ تم مجھے لباہی ہی کہا کرتا۔ اکیلے میں بھی اور سب کے سامنے بھی۔ تاکہ میں جی بھر کے اس خوشی کو محسوس کر سکوں کہ میں ایک لائق، مشہور اور معاملات مند لڑکے کا باپ ہوں۔

میں ایک تک لباہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میرا ذہن ان سے اونچا ہو چکا تھا لیکن وہ مجھے بہت زیادہ بلند قامت دکھائی دیئے تھے۔ بہت ہی اونچے۔ وہ بہت کم باتیں کیا کرتے تھے لیکن جو بھی کرتے تھے وہ گویا دل میں گب کر رہ جاتی تھیں۔ اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ اٹھ کر ان کے بیٹے سے چٹ چٹ جاؤں اور کسی نئے بیٹے کی طرح زور زور سے رونے لگوں لیکن ایک عجیب سی جھجک مانع رہی تھی۔

وہ آنسو جو لڑکھن میں رکنے رہ گئے تھے اس وقت میری آنکھوں میں آگئے تھے جب میں نے آراستہ ویراستہ کو بھی میں قدم رکھا تھا اور اسی رات مجھے اس وقت بھی رونا آیا تھا جب میں فراہمی دولت کی پوشش اور انگلیٹ کی پیرس سے آراستہ ہینڈ پر سونے کے لئے لیٹا تھا۔ مجھے یاد آیا تھا کہ

نہایت جدت پسند ادارے سے کرائی تھی۔ مائل گاؤں والی کوٹھی کو میں نے اپنی زیر زمین سرگرمیوں کا ہیڈ کوارٹر بنالیا تھا۔ اپنی گھبرگ والی کوٹھی کی آرائش و زیبائش مکمل ہونے کے بعد جب میں وہاں منتقل ہوا تو ڈرائیو سے میں قدم رکھتے ہی میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انسان پر اتنے دن آتے ہیں تو اسے اپنے بڑے دن بڑی شدت سے یاد آتے گئے ہیں۔ مجھے لباہی یاد آگئے تھے۔ لباہی نے نہ جانے کہاں سے قرض لے کر جب مجھے کالج میں داخل کرانے کا بندوبست کیا تھا تو میں نے اس خیال سے کہ وہ اپنی جان کو نہ جانے کس عذاب میں ڈال رہے تھے ان سے کہا تھا "ابا آخر آپ مجھے مزید تعلیم کیوں دلانا چاہتے ہیں؟ میں وہ کر یا پھر شرابا کر چھوٹی موٹی نوکری تو میں اب بھی کر سکتا ہوں اور ہم پر کوئی اتنا زیادہ بوجھ تو ہے نہیں کہ ہمیں بہت زیادہ کمائی کی ضرورت ہو۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے بیٹا" انہوں نے پگڑی اتار کر کچھوٹی ہاتھوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا "بات صرف کمائی کی نہیں ہوتی۔ انسان کے کچھ خواب بھی ہوتے ہیں۔ میری تنہا ہے کہ تم رویہ بھی بہت سا کٹھڑ لیکن ساتھ ہی مشہور اور بڑے آدمی بنو۔ رویہ تو بہت سے لوگوں کے پاس ہے لیکن وہ سب بڑے اور مشہور آدمی تو نہیں ہیں نا؟" پھر پیسے ان کی نظر اپنے ذرا بول کی بھول بھلیوں میں جھٹکنے لگی تھی اور انہوں نے مجھے حسرت آمیز لہجے میں کہا تھا "میرا جی چاہتا ہے کہ شراب میں تمہارا بڑا سا بھٹکا ہو۔ تمہاری بیوی کوئی پڑھی لکھی عورت ہو۔"

خود ایک ان پردہ ساداتی ہونے کے باوجود ان کا ذہن شکست خوردہ اور پسماندہ نہیں تھا اور ان کی سوچ بلند تھی۔ ان میں احساس کثرت نہیں تھا اس لئے انہوں نے کبھی اپنی ہم پلہ کسی جاہل لڑکی کو بوسہ بنانے کے حلقے نہیں سوچا تھا۔ اسی موقع پر انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا "فصل کٹنے پر میں تم لوگوں کے لئے کبھی پیاز اور کبھی لسن کی بوری یا پھر گنوں کا گھنڑ لے کر آیا کرتوں گا اور بھٹکے کے باغیچے میں کیلے ہوئے میرے گول منڈل اور سرخ و سپید چروں والے پوتے پوتیاں شور مچایا کریں گی۔ دوا دجی آگئے.... دوا دجی آگئے۔ بھرہ دو ذکر میرا گلوں سے چٹ جایا کریں گے۔"

مجھے انہی طرح یاد تھا کہ اسی سرت آجیں تصور سے لیا جی کے چرے پر کبھی سرخی جھٹی تھی۔ ان کی آنکھیں ہوا میں چلنے کی یاد دہی رہی تھیں۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا تھا "لباہی! اگر میں بڑا اور امیر آدمی بن گیا اور شہر میں میرا بھٹکا ہو تو کیا آپ میرے ساتھ نہیں رہا کریں گے؟ آپ بھلا پھر کس طرح لسن پیاز کی بوری یا گنوں کا گھنڑ لے کر آیا کریں گے؟"

"نہیں بیٹا" لباہی سر کھباتے ہوئے کہا تھا "میں تو بالکل

ایم اے راحت

کے پراسرار اور ایڈوینچر قلم سے

ایک شاہکار ناول

تاریک وادی

جلد اول - 150/-

جلد دوم - 150/-



اردو بازار لاہور

لبائی زندگی بحرین کی ٹھری لور جھانکی چار بالی پر سوتے رہے تھے۔

آج آفاق کے دفتر میں قدم رکھتے وقت بھی مجھے لبائی یاد آگئے تھے میں جب بھی حقی کے کسی زینے پر قدم رکھتا تھا کوئی بڑی آرائش کی چیز یا کوئی بیش قیمت چیز خریدنے لگتا تھا تو مجھے لبائی ضرور یاد آتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ ابھی ان کا ارحا خواب نقشہ تعبیر ہے۔ میرے پاس دولت تو ان کے تصورات سے زیادہ آج بھی تھی لیکن میں کوئی مشہور آدمی نہیں تھا۔ آج میں آفاق کے دفتر کا سانس کرتے وقت سوچ رہا تھا کہ شاید فلمی دنیا میں قدم رکھنا میرے لیے شہرت کا سبب بن جائے۔ میرا بیرو بننے کا کوئی اوروہ نہیں تھا۔ میں ممکن تھا کہ بیرو کے طور پر بھی میں کامیاب ہو جاؤں لیکن فی الحال یہ میری خواہش نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد میں صرف بیرو ہی تو مشہور نہیں ہوتے۔ بڑے ہدایت کار اور فلسفہ ساز بھی تو مشہور ہوتے ہیں۔ اسٹوڈیو لوئر بھی تو مشہور ہوتے ہیں۔

میں خیالات کی دنیا سے باہر آیا اور ایک بار پھر توجہ سے دفتر کا جائزہ لینے لگا۔ درحقیقت میں نے ابھی سے ذہن میں نقشہ بندی شروع کر دی تھی کہ کمال کیا تبدیلی لبائی جائے گی اور سننے سے دفتر کی آرائش و زیبائش مجھے کی جائے گی۔ دو ایروں پر پچھ فریم شدہ فلمی پر سٹریٹس آویزاں تھے۔ ایک ہوسٹر ایک لڑکی کی تصویر کھائی نمایاں تھی۔ وہ جینز جیکٹ میں تھی۔ بیروں میں فل بوٹ تھے اور بال تراشیدہ تھے۔ ہاتھ میں ہتھولہ نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر گہرا اور غافل فلمی قسم کا میک اپ تھا۔ فلم میں اس کا کردار شاید ماڈرن لڑکی کا تھا اور اسے جینز جیکٹ اور کتے ہوئے بالوں وغیرہ کی بد سے ماڈرن لڑکی ظاہر کرنے کی پوری سزا کو شش کی گئی تھی۔ وہ غالباً فلم کی بیرو تھی۔

اسی لڑکی کی غایت خوبصورتی سے فریم شدہ تصویر آفاق کی میز پر بھی موجود تھی۔ عام طور پر نامی جیتی شخصیتوں کی تصویریں اس طرح دفتر میں میز پر سجا کر رکھی جاتی ہیں۔ اس لڑکی کی صورت مجھے کچھ شہسای لگ رہی تھی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے کمال دیکھا ہے۔ میں نے ذہن پر زیادہ زور دینے کی کوشش بھی نہیں کی اور یہی سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ میں نے کبھی اس کے اندر وہ فلمی اشتہار میں اس کی تصویر دیکھی ہوگی۔

اتیم میں نے سرسری سے لمحے میں آفاق سے پوچھ لیا۔
”یہ لڑکی کون ہے؟“
”آپ اتے میں پہچانتے؟“ اس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”نہیں“ میں نے سلامی سے کہا ”لیکن شکل کچھ مانوس سی لگ رہی ہے۔ شاید میں نے پہلے بھی کبھی اس کی تصویر دیکھی ہے۔“

”ضرور دیکھی ہوگی“ وہ گہری سانس لے کر بولا ”اے صاحب! اسے تو اب ملک کا پچھ پچھ پچھتا ہے۔ یہ مشہور فلمی ہیروئن ستارہ ہے جس کی اب تک صرف دو فلمیں ریلیز ہوئی ہیں لیکن دو فلموں نے ہی دھوم مچا دی ہے۔ گلی گلی میں اس کا نام گوجا رہا ہے۔ اور اسے ہیروئن بنانے والا آپ کا یہ خادم‘ یہ خاکسار ہے“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھنجھکے ہوئے کہا ”چلی فلم میں اسے میں نے ہی کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم کا میں ہدایت کار تھا اور اس میں واقعی ایک نئی لڑکی کو کاسٹ کرنے کے لئے نہ تو میرا پر دو پیو سر رضامند تھا اور نہ ہی ڈسٹری بیوٹر لیکن میں نے نہ جانے کیسے کیسے جسٹ کر کے انہیں آمادہ کیا اور جب فلم نے کڑکی تو ڈھنچے مٹائے تو ان دونوں نے تھپکیاں دے دے کر میری کمر توڑ ڈالی۔ وہ فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی میں اسے اپنی ذاتی فلم ”تھانی“ میں کاسٹ کر چکا تھا۔ میری اس فلم نے بھی ڈائنڈ جوبلی کی لور اس سے بہت پہلے ہی ستارہ کے کمر کے سامنے فلسفہ ازل کی لائن لگ چکی تھی۔ اس وقت وہ دوسرے نمبر پر انڈسٹری کی مصروف ترین ہیروئن ہے۔ جلد ہی اس کی دو فلمیں ایک ساتھ ریلیز ہونے والی ہیں۔ میرا خیال ہے اس کے بعد وہ پہلے نمبر پر آجائے گی لور اگر ان دونوں میں سے ایک فلم بھی قلاب ہوگی تو شاید وہ میرے نمبر پر چلی جائے۔ دوسری منڈیوں کی طرح فلم کی منڈی کے بھلا بھی روزانہ ہی کہتے اور بڑھتے رہتے ہیں۔“

دیگر چیزوں کی طرح ستارہ کی فریم شدہ تصویر پر بھی گرد کی ہلکی سی تہ جی ہوئی تھی۔ اس کے شیشے پر اچھی چھرتے ہوئے وہ کھوٹے کھوٹے سے لمبے میں بولا ”میں جب اسے بازار حسن سے فلم انڈسٹری میں لایا اس وقت وہ وہاں کی تمام ترین رقاصہ اور مخفیہ تھی لیکن میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی میں اوالکاری کا زبردست ٹھنٹ ہے اور بظاہر دیکھنے میں اس کا چہرہ کوئی ایسا قیامت خیز نہیں صرف ایک بے نام سی کشش ہے اس میں لیکن اسکرین پر یہ چہرہ حتملک پھولنے لگا۔ جب وہ پہلی مرتبہ میرے پاس آئی تو اس کا خیال تھا کہ میں نے اسے فلم میں کوئی چھوٹا سا ناول دینے کے لئے بلایا ہے اور وہ اسی پر بہت خوش تھی۔ اس وقت میں ایک اور فلم سمیٹی کے دفتر میں بیٹھا کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اسے ہیروئن لے رہا ہوں اور اس کا فلمی نام بھی میں نے ستارہ رکھ دیا ہے تو وہ بدحواس اور پریشان ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں سنجیدہ ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ فلمی لوگ عیاشی کی خاطر اس جیسی لڑکیوں کو اس قسم کے جھانے دیتے رہتے ہیں اور میں

کی عورتوں کا یہ ہر حال ہیں اور طوطا چشمی کوئی نئی یا غیر متوقع چیز نہیں۔“

”نہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ قارمولا بھی پرفٹ آتا ہو۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ اس لائن میں آپ کو احسان مندی اور وقار داری کی بھی حدیم الشعل کمپلیٹ میس کی ”پہرہ سر جنگ کر بولا“ خیر... ان باتوں کو چھوڑیے۔ یہ بڑے لمبے تھے ہیں۔ بڑی طویل کمپلیٹ ہیں۔ یہ بتائیے کہ آفس دیکھنے کے بعد اب آپ کی کیا رائے ہے؟“

”رائے لے کر کیا کریں گے آپ؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بس یہ معاملہ طے ہی نہیں۔ کل آپ میری سیکریٹری کو فون کر چکے گا۔ وہ آپ کو کوئی مناسب وقت بتا دے گی۔ آپ اس دفتر اور اپنی فلم کمپنی سے متعلق تمام ضروری کاغذات لے کر آجائے گا۔ میرا وکیل بھی موجود ہوگا۔ سیل ڈیڈ تیار ہونے کے بعد میں کل ہی آپ کو اوائلی کدوں گا۔ ٹھیک ہے؟“

”بہت شکریہ۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے مجھے دلدل سے نکال لیا ہے اور وہ بھی اس وقت جب میں ناگ تک دھنسی چکا تھا“ وہ طمانیت سے گہری سانس لے کر بولا۔ ”خیر... اب حالات اتنے برے بھی نہیں تھے آپ کے۔ آپ ذرا جلدی گھبرا جانے والے آدمی معلوم ہوتے ہیں“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ میں زیادہ مضبوط اعصاب کا آدمی نہیں ہوں“ اس نے تسلیم کیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا ”آپ کو ایک زحمت کرنا پڑے گی۔ میں اس آفس کی نئے سرے سے آرائش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سارا فرنیچر، کیمین وغیرہ سب ہٹ جائیں گے۔ فرنیچر خالی کرنا اور میں بتا دوں گا کہ کس قسم کا آئے گا۔ گھڑی اور شیشے کا پانی کام بھی جس طرح ہو گا وہ بھی میں آپ کو سمجھا دوں گا لیکن یہ سارا کام آپ کو اپنی انگریزی میں کرنا ہوگا۔ آپ اس دفتر میں میرے ساتھ ہی بیٹھا کریں گے اور میں جس انداز میں کام شروع کروں گا اس سے شاید آپ کو سر کھلنے کی بھی فرصت نہ ملے۔ آپ کو کسی اور کی فلم سنانے کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس طرح گویا آپ اپنی ہی قائم کی ہوئی فلم کمپنی سے ہی وابستہ رہیں گے۔ جب مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ میرا یہ کام کچھ چل نکلا ہے تو میرے کاروبار کا یہ شعبہ تقریباً مکمل طور پر آپ کو ہی سنبھالنا پڑے گا۔ میرا طریق کار یہی ہے کہ جب میں اپنے کاروبار کو چھوڑتا ہوں یا کسی نئے شعبے کو اپنے کاروبار میں شامل کرتا ہوں تو اپنے مجاہد سے کسی آدمی کو اس انسانی حصے کا تقاریر کل بٹھاتا ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ

بھی انہی میں سے ایک ہوں۔“

آفاق نے سراخا کر میری طرف دیکھا اور عجیب سے انداز میں بولا ”انگریز منٹ سانس کرنے کے بعد جب تک شریک شروع نہیں ہو جاتی تب تک اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ بیرون بن چکا ہے لیکن کیرے کے سامنے اس کی کارکردگی نے مجھے ہسوت کر دیا۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ پہلی بار کیرے کا سامنا کر رہی ہے۔ وہ بد اسٹی لو اگلا معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اس پر ذرا بھی منت نہیں کرنی پڑی ورنہ اچھی بجلی اسٹیج اور ٹی وی کی بھیجی ہوئی لڑکیاں بھی جب فلم میں آتی ہیں تو بعض اوقات ہدایت کار کو لڑا رہی ہیں کیونکہ فلم کا اپنا ہی ایک الگ انداز ہے۔ مجھے آج بھی اس بات پر خوشی اور فخر ہے کہ ستارہ کے بارے میں میں نے صرف ایک نظر میں جو فیصلہ کیا تھا وہ خود میری توقعات سے بھی زیادہ صحیح تھا۔ پھر ایک روز اس نے باتوں باتوں میں مجھے اپنی زندگی کی کمپلی شٹل جو نہایت دلچسپ اور دردناک تھی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ وہ ایک معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی تھی اور فلموں میں محض چھوٹے موٹے رول حاصل کرنے کے شوق میں نہ جانے کتنے کتنے فوریازوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی پلا خرچہ ہزاروں حسن بیچ چکی تھی۔ اور جب وہ اپنی تقدیر پر شاکر ہو کر وہاں کے ماحول میں داخل ہوئی اور اطمینان سے شب و روز گزارنے لگی تھی تو میں اس سے جا چکا رہا تھا کہ اس کی فرمائش یا درخواست کے بغیر اس سے کسی قسم کا خراج وصول کیے بغیر اسے بیرون بنانے کے لئے لے آیا تھا۔ اس ستم گر فلم پر اسے جیسی بھی آتی تھی اور

رونا بھی۔“

”اس کا مطلب ہے وہ تو اب تمہاری بے حد شکر گزار ہوگی؟“ میں نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔

”شکر گزار...“ وہ سچ سے انداز میں ہنسا ”ہاں... جب تک میرا کام ٹھیک چل رہا تھا وہ میری بے پناہ شکر گزار تھی۔ اس کی شکر گزاری مجھ سے سنبھالنے نہیں شیطانی تھی۔ اس کا ذریعہ میرے ہی دفتر میں رہنا تھا۔ میں وہ دوسرے پروڈیوسر سے معاملات طے کرتی تھی لیکن جیسے ہی میری سرکٹوں میں اس نے اپنا عسکر گزاری کا بوریا بستر سمیٹا اور نہ جانے کس شایخ پر اپنا آشیل بنالیا۔ اب تو عام یہ ہے کہ اگر کسی سامنا ہوتا بھی ہے تو عام طور پر میں اسے نفرت میں آتا۔ مجھ پر اس کی نفرت اپنی ہوئی کسی اور سمت میں چلی جاتی ہے۔ اگر ناگزیر حالات میں مجھ پر نظر پڑ جائے تو وہ دور سے ہی خالص امر کی انداز میں صرف دو انگلیاں ہلا کر ”ہائے“ کہنے پر اکتفا کرتی ہے اور ایک مصنوعی سی مسکراہٹ میری طرف اچھالتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔“

”بہت خوب“ میں نے آہستگی سے کہا ”خیر... اس لائن

میں اشفاق کی میزبانی خیرصورتی سے سیٹ کی گئی تھی اور جدید قسم کی ٹاکنگ، کینٹین، شیٹ اور دوسرا دفتری سامان آراستہ کیا گیا تھا۔

آفاق نے بلا بابت لوگوں کو بھی میرے متعلق بتادیا تھا کیونکہ وہ مجھے دیکھ کر احترام اٹھ کر رہے ہوئے تھے۔ یہ میرا اشفاق تھا کہ میں آج پہلی مرتبہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ آفاق نے ان سے میرا احوال کر لیا۔ لڑکی کا نام رشوانہ تھا اور وہ ریپنٹنسٹ اور ٹرانسپسٹ تھی۔ ایک صاحب کا نام عبدالوہید تھا، وہ کمشنر اور اکاؤنٹنٹ تھے۔ ایک صاحب جن کا نام لیاقت تھا، کلرک تھے اور تیسرے صاحب افتخار احمد تھے جنہیں جنرل نیجری حیثیت سے رکھا گیا تھا۔ میں نے سرسری نظر میں ہی محسوس کر لیا کہ کارکنوں کے معاملے میں آفاق کا انتخاب برا نہیں تھا۔ دوسرے اس نے مختصر عملے کے ذریعے زیادہ سے زیادہ کام سنبھالے کا بندوبست کیا تھا۔

تعلانی اور دوسری جملوں کے جدول کے بعد میں نے آفاق سے کہا ”ان دونوں جملوں کے اسکرپٹ کے کر میرے پاس ہی آجائے۔ آج کا دن تو میرے خیال میں ضروری معاملات پر جدولہ خیال میں ہی گزر جائے گا۔“

آفاق نے اثبات میں سر ہلایا اور میں اپنے کیمین میں جا بیٹھا۔ کیمین کا دروازہ میں نے کھلایا رہنے دیا۔ اس کیمین کی آرائش بھی میرے ذوق کے مطابق کی گئی تھی۔ چند لمبے بعد ہی آفاق کئی فائلیں اٹھائے میرے سامنے آن بیٹھا۔

فائلیں میرے رکھنے ہوئے وہ مسکرا کر بولا ”سر... آپ کو اپنا آفس پینڈ آتا؟“

”ہاں آفاق! تمہاری اس ابتدائی کارکردگی سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے“ میں نے اسے واو دینے میں کھٹا بھل گیا مصلحت کوئی سے کام نہیں لیا ”میں نے جو کام جس طرح چھپس بیٹا تھا وہ اسی طرح ہوا ہے۔“

”انشاء اللہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا“ وہ سرور بخشہ میں بولا۔ اس کے تاثرات ایسے ہی تھے جیسے میرے الفاظ نے اس کی منت وصول ہو گئی ہو۔

میرا اشارہ پا کر بیٹھے ہوئے وہ غایت طمانیت سے بولا۔

”اللہ عز و جل رکھنے والا ہے سر... ایسا دفتر اس وقت پورے اینڈوژم میں کسی کا نہیں ہے۔ خود اسٹوڈیو کے مالک کا بھی نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے اس ہال کا رقبہ بھی زیادہ تھا۔ آہستہ آہستہ جب آپ کی ریل کے ماحول سے ششمالی ہو گئی تو آپ دوسرے دفاتروں کو بھی دیکھتے گا۔ ریل فہمیں تو بڑی خوبصورت بنی ہیں لیکن دفاتروں میں گویا سلیقہ اور خوبصورتی رکھنے کا بالکل ہی ”دواج“ نہیں ہے۔ دفاتروں میں آپ کو سب سے قسم کے صوفے ملیں گے جن کے اسپرنگ جواب دے

ہیں دن لگ گئے۔ میں اس دوران اپنے دیگر معاملات میں بہت مصروف رہا۔ کراچی کا بھی ایک پکڑ لگا جلی ہوٹل کی تعمیر کے سلسلے میں سیٹھ رمضان نے سرمایہ کاروں کی سیٹھ کیٹ بنانے کے کام میں کافی پھرتی دکھائی تھی۔ چار سیٹھ سرمایہ کاری کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ پانچواں سیٹھ رمضان خود تھا اور چھٹا میں۔ اب ہمیں مزید کسی سرمایہ کاری کی ضرورت نہیں تھی۔

کانڈی کارروائیاں جاری تھیں۔ تمام حلقے سے اداروں کی کیمینوں کے بارے میں تفصیلات ملنے لگیں، تمام ضروری بیوروں کی رپورٹیں اور ضمانت نامے اور دیگر تمام ضروری کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ اب ہمارا ایک باقی مسئلہ تیار ہو رہا تھا جسے ایک اجلاس میں فاضل کرنے کے بعد ہمیں اس پر دستخط کرنے تھے اور پھر ہوٹل تعمیر کرنے کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی کمپنی سے مذاکرات کرنے تھے۔ تمام مراحل بحسن و خوبی طے ہو رہے تھے۔ سیٹھ رمضان بہت اچھا دوست اور درودار شریک کار ثابت ہو رہا تھا۔ اور اس نوجوان شفیق شاہ نے بھی کراچی میں میرا کاروبار عمدگی سے سنبھال رہا تھا۔

میں اپنا فلمی دفتر دیکھنے صرف ایک مرتبہ جاسکا جب وہیں کام ختم ہو چکا تھا۔ آفاق نے سارا کام میری مرضی کے مطابق کر لیا تھا اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی پہلا دلاؤ تھا۔ دروازے سے لے کر پچھلی دیوار تک ہر چیز بدل چکی تھی۔ اب یہ کسی بڑے اور مستحکم ادارے کا دفتر معلوم ہوا تھا اور اس کی ہر چیز سے دفتر کو چلائے والوں کی خوش ذوقی کا اظہار بھی ہوا تھا۔ میں نے آفاق کو ہدایت کی کہ وہ بنیادی ضرورت کے تحت چار آدمیوں پر مشتمل اشفاق بھی رکھ لے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں تقریباً ایک ہفتے بعد دفتر آنا شروع کروں گا۔

ایک ہفتے بعد میں دفتر پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہیں ایک لڑکی اور تین مردوں پر مشتمل اشفاق موجود تھا۔ سب مستعدی سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ پرانا ریکارڈ اور تمام ضروری کاغذات وغیرہ نئی فائلوں میں لگائے جا رہے تھے۔ ہر چیز سے خوبصورتی، سلیقہ اور نیا بین عیاں تھا لیکن ماحول سے یوں لگ رہا تھا جیسے ریل کام کئی عرصے سے اسی طرح مستعدی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

آفاق کو میری آمد کی اطلاع تھی۔ میں نے ابھی آفس میں داخل ہو کر سرسری نظر دھڑو دھڑالی ہی تھی کہ وہ اپنے کیمین سے نکلا آیا۔ یہ تین اوسط درجے کے ایک کمرے کے برابر ہی تھا اور اس کی دیواروں کا بیشتر حصہ نشتہ لگا تھا۔ اس شیشے سے صرف اندر بیٹھ والا باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ باہر والوں کو اندر صرف نیکیوں روشنی ہی نظر آسکتی تھی۔ دوسری طرف ایسا ہی ایک کیمین میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ باقی جگہ

کچے ہوں گے اور نشتوں میں گڑھے پڑ چکے ہوں گے۔ معمولی میزوں میں کی جن پر چائے کی پیالیوں کے نشانات اور سگریٹ سے جلائے جانے کے نشانات ہوں گے۔ سگریٹ کے نوٹوں سے بھری ہوئی اینٹیں ٹرے پر میز پر ہوگی بلکہ ٹرے فریج پر بھی بکھرے ہوئے ہوں گے۔ پیلے پیلے پردے ہوں گے جن سے کچھ لوگ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ بھی پونچھتے ہوں گے۔ ہارڈ بورڈ کے پارٹیشن ہوں گے۔ کوئے کھدروں میں پانی کی پیکوں کے نشانات ہوں گے۔ میں جب اس دفتر میں کام کروا رہا تھا تو کئی شاہدائیں تھیں جو مجھ سے کہا کہ یہ دفتر اتنی رقم کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اگر کہیں سے روپیہ آئی گیا ہے تو رقم شروع کرو۔ دفتر تو بعد میں بھی بچتا رہا ہے گا۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ مجھے اطمینان رکھو، رقم بھی شروع کریں گے اور اسی حالت بات سے شروع کریں گے۔ وہ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں نے کوئی چکر چلا کر کوئی بڑا فائدہ بچا رہا ہے۔

”کس قسم کا چکر؟“ میں نے پوچھا۔
”یہی کوئی لڑکی وغیرہ کو بچ میں ڈال کر“ وہ متاثرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بحران میں پہنچنے ہوئے لوگ کبھی کبھار یہ بھی تو کرتے ہیں۔ غلوں میں کام کرنے کی شوقین یا ویسے ہی کچھ چلتی پھرتی قسم کی لڑکیوں کو آگے کھینچتے ہیں۔۔۔ پیسے پانے کی غلط فہمی ہیں۔۔۔ ہوش و خرد کے سودے ہوتے ہیں۔ سب کو آسانی سے اپنے اپنے مطلب کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ سب بحران سے نکل آتے ہیں۔ بہر حال۔۔۔ لوگ میرے بارے میں خواہ کچھ بھی سوچتے ہوں، میرا خیر مطمئن ہے کہ میں نے اپنی سب سے بڑی گڑبگڑ کا کام نہیں کیا۔ ویسے بھی چند دن بعد اصل بات سب کے سامنے آئی جائے گی کہ درحقیقت میرے توسط سے ایک بڑے فلسفہ نے اس ٹریڈ میں قدم رکھ دیا ہے۔“

”میں تو صرف اپنے بچپن کے ایک خواب کی تعبیر دیکھنے اور چند تجربات کرنے اس میدان میں آیا ہوں اتفاقاً“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”مردودی نہیں کہ میں کوئی بڑا فلسفہ ثابت ہو سکوں۔“

”سر۔۔۔! آپ اسے خوشامد سمجھتے گا۔ آپ آدمی بڑے ہیں تو یقیناً فلسفہ بھی بڑے ہی ثابت ہوں گے“ وہ ہنسی بکھاتے ہوئے بولا۔

”دیکھتے ہیں۔۔۔ وقت کیا دکھاتا ہے“ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”اب ذرا آپ مجھے پہلی قسم کی کمانی سنائیں۔ کل ہم پروجیکشن روم میں اس کی تیار شدہ ریلیں بھی دیکھ لیں گے۔ پھر فیصلہ کریں گے کہ ہم کون سے سرے سے شروع کیا جائے یا مکمل استعمال حصوں کا کام لایا جائے۔“

”یہ دو غلوں کے اسکرپٹ ہیں سر“ اس نے فالتوں کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”پہلی کا نام ہے ”زمین“ یہ کمر طور پر کرکٹل فم ہے۔ بارہ سالوں والی۔ صرف کہیں کہیں اس میں ہم پڑھے لکھے اور سچے ہوئے لوگوں کے ذوق کا جھلک دکھائیں گے۔ گولیاں پٹیں گی لیکن اتنی نہیں چلیں گی جتنی دوسری جنگ عظیم میں چلی تھیں۔ کمانی کچھ یوں ہے کہ ایک لاکھ۔۔۔“

اچانک مجھے آفس کے بیرونی حصے میں کچھ پانچ کا احساس ہوا۔ میں نے رنگین شیشے کے پار دیکھا۔ دو نیم عظیم آدمی دروازے پر کھڑے تھے۔ ایک کے چہرے پر چھوٹی لیکن کھم داڑھی تھی۔ دوسرے کی موٹی موٹی سونچیں بڑے بارے انداز میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں کمرے رنگوں کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ گریبان کھلے ہوئے تھے اور چرواہے خشونت طاری تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے تھے جنہیں ہم قدم دور سے دیکھ کر پہچان جاسکتا ہے کہ وہ بہت بڑے قسم کے بدعاش ہیں۔

وہ میرے اور اتفاق کے کھیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے سرکش ہاتھوں کی طرح آگے بڑھے پلے آ رہے تھے۔ رضوانہ نے مکمل جرأت سے کام لیتے ہوئے نہایت مستعدی سے مصیبت کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر ان کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کی۔

”رنگے جناب۔۔۔! اسے۔۔۔ آپ کو کس سے ملانا ہے؟“ اس نے حتی الامکان ہر امکان کے لیے میں کہا۔ مجھے اس لڑکی کا یہ انداز اس کی جرات مندی اور فرض شناسی بے حد پسند آئی۔ دونوں آدمیوں نے ایک لمحے کے لئے رک کر غالتصا بہ معاشرہ والے انداز میں محو سی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرائے اور ان میں سے ایک بولا۔

”کالی دیوان پھرتیاں تے دیکھن دایاں نیں۔“
دوسرے نے صرف ایک طائفے کے لئے مسکراتے پڑا اکتفا کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے گہرے پڑوی چلی گئی خشونت اور کرکٹل چھاتی۔ اس نے یوں لڑکی کو ایک طرف دھکیل دیا جیسے وہ کوئی نہایت ہی حقیر اور کمزور سی مخلوق ہو۔ میں یہ سب کچھ بخیر دیکھ رہا تھا۔ لڑکی لڑکھا کر کاؤنٹر سے ٹکرائی۔۔۔ یقیناً اسے چہرے بھی آئی ہوگی۔ اور یہ اس سے ہماری کی زندگی کی پہلی ملازمت کا پسلاؤ تھا۔

وہ دونوں نیم عظیم آدمی یوں قدم رکھتے ہوئے میرے کہیں تک آئے گویا بیروں کی دھمک سے زمین کو لانا چاہتے ہوں۔ کمرے میں گھس آنے کے بعد۔ یکے بعد دیگرے انہوں نے مجھے اور اتفاق کو گھورا۔ اتفاق کا چہرہ فری تھا اور آہستہ آہستہ گویا جھپکا بھول گئی تھی۔

موٹی موٹی اور اوپر کو مڑی ہوئی سونچوں والا نہایت

تھے معلوم تھا کہ تجھ میں اتنی جان نہیں کہ ہم جیسوں سے تو کیا استغزوہ کے کسی لگی سے بھی نکلے سکے تو پھر تو نے ملک صاحب کی مرضی کے خلاف چلنے کی جرأت کس طرح کی؟“

آفاق نے کوئی جواب نہ دیا۔ تب داؤڑی والے نے کسی بے وقت تھوڑی کی طرح اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر وہ اسی رعوت سے میری طرف دیکھتے ہوئے زیر لہرے انداز میں مسکرایا اور سر بیان سے انداز میں سر ملاتے ہوئے بولا ”تجھے بھی دیکھ لیں گے ٹھیکو کے شزاوے! پڑا شاندار سوٹ پہن کے سینہ چڑا کر کے بیٹھا ہے.... یقیناً بہت پڑا قلمساز بننے کے خواب دیکھ رہا ہو گا تو“ اس کے واپس غراتے ہوئے کسی بھیڑیے کی طرح ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے۔

”دھرے رہ جاؤ گے تیرے یہ خواب۔ بہت تنگ پڑے گا تجھے یہاں قدم رکھنا۔“

میں بدستور خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب داؤڑی والے نے بھی میز پر پاؤں رکھ لیا تھا۔ اس کے پاؤں میں بھی ہماری جبرک ہینڈری چپل تھی اور اس پر خوب گرد بھی ہوئی تھی۔ صرف اس کا رنگ اس کے سامنے کی چپل سے مختلف تھا۔

سوچوں والے نے بھی گویا کچھ بولنا ضروری سمجھا۔

”تدے آگے کو جھٹکتے ہوئے وہ ہماری آواز میں بولا“ صرف دو چار تماشے دیکھ کر ہی ہماگ جائے پھو۔ ہمیں پتا ہے پرنس میں کا دل کتنا سا ہوتا ہے۔ اتنا سا“ اس نے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے یوں اشارہ کیا جیسے کسی چیز کو چنگی میں پکڑنے لگا ہو۔

”ہاں... یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو“ میں نے گویا تھوک نکل کر مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”پرنس میں لڑائی جھگڑے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

پھر میں نے اکتے ہوئے کہا ”لیکن آپ لوگ ناراض کیوں ہیں؟ ایسا کون سا مسئلہ آن پڑا ہے؟ آپ لوگ یہ آفس لینا چاہتے ہیں تو لے لیں۔ اس میں لڑائی جھگڑے والی کیا بات ہے؟ روپیے پیسے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر میں اس سودے میں لاکھ دو لاکھ کا نقصان بھی برداشت کروں گا تو کون سی بڑی بات ہے۔“

میں نے میز کے عقب سے نکلے ہوئے داؤڑی والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”آؤ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ یہاں میرے دفتر والے خوفزدہ ہو رہے ہیں۔“

داؤڑی اور سوچوں والا بدستور میز پر پاؤں تھکائے ایک لمحے گھور رہا تھا لیکن میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

پھر داؤڑی والے کی کارروائی دیکھ رہا تھا اور مکالمے بازی داؤڑی والا آفاق کو ایک اور ہنسا دیتے ہوئے بولا ”جب

میں سے میری نہایت نہیں۔ شاندار اور صاف ستھری میز اس کا کرکڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں میں نہایت موٹے تلے پتلوری چپل تھی جس پر گرد کی بھجی ہوئی تھی۔ ان دونوں شخصوں سے کچھ اس طرح سون سون کی آواز خارج ہو رہی تھی جن پاؤں سانس لے رہے ہوں۔

اچانک داؤڑی والے نے آفاق کا گریبان پکڑ کر ایک لمبے لمبے اس کی کرسی سے اٹھالیا اور بھیڑیے کی طرح ”کیوں ہے اٹکے! ٹیکو کے نیچے! آخر تو نے آفس کسی اور دے دی دیا؟“ اس نے آفاق کو رعوت بھرے انداز میں جھٹک دیا۔

”میں نے آفس دیا نہیں ہے....“ آفاق کھٹی کھٹی آواز بولا۔ اس کی گردن کی نیلیں ابھرنے لگی تھیں اور سانسوں نے رے پر پینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ بڑی مشکل وہ مزید بول پلا ”میں نے تو پارٹنرشپ کی ہے ان سے“ اس کن انہیں سے میری طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ میں جگ بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

”اب تو ہمیں پکڑ دینے کی کوشش کر رہا ہے؟“ جہاز داؤڑی والے نے آفاق کو ایک زبردور جھٹکاوے کرتے ہوئے مٹائی دینے کے بعد کہا ”ہم تو خود ساری دنیا کو دن پر نہاتے ہیں۔ تو ہمیں بچانے کی کوشش کر رہا ہے؟“

میں خیال میں استغزوہ میں کوئی ایسا کام بھی ہو سکتا ہے جس کا پتا نہ چلے؟ ہم نے تجھے بڑے شرطانہ انداز میں پیغام لیا تھا کہ ”آفس ملک صاحب کے سوا کسی کو موت دینا۔ مگر شہادت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟“

”مگر ملک صاحب تو فریجیئر کی قیمت بھی نہیں دے رہے“ آفاق نے گویا جرأت کرتے ہوئے کھٹی کھٹی آواز لیا۔

”تجھے چاہئے تھا کہ جو وہ دے رہے تھے اسے بھی تحریک ا۔ تاہم! ہم چاہتے تھے ویسے ہی بھگوتے“ پھر جیسے کچھ یاد آگیا ”سنا ہے تو نے پڑوڑی سروں کی ایبوس میں ملک صاحب کی شکایت بھی کی تھی.... ابھی تو ہمیں اس کا بھی جواب لیتا ہے.... تیرا خیال تھا کہ ایبوس میں شکایت کر کے تو کوئی بہت پڑا کارنامہ انجام دے رہا۔ بڑی چپل بچ جائے گی اس طرح؟“

اب دو دن سوچوں والا بدستور میز پر پاؤں تھکائے ایک لمحے گھور رہا تھا لیکن میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

پھر داؤڑی والے کی کارروائی دیکھ رہا تھا اور مکالمے بازی داؤڑی والا آفاق کو ایک اور ہنسا دیتے ہوئے بولا ”جب

... میں کن اگھوں سے اور اور کا جائزہ لے چکا تھا۔ دائیں بائیں جن دفاتر کی قطار تھی ان میں سے بیشتر بند تھے۔ اسٹوڈیو کے اس حصے میں اس وقت کوئی خاص رونق نہیں تھی۔ اکاؤنٹ لوگ اور اور اور آ جا رہے تھے۔ بیٹری لان کے کچھ حصے پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے کھلی ہوا میں کمری سانس لیتے ہوئے دھیسے اور طائفہ لے جے میں کنا۔ دراصل آپ لوگوں کے آنے سے چند لمبے پہلے ہی آفاق دفتری سہنگ وغیرہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یہ سارا کام اسی نے کر لیا ہے۔۔۔ اور سچی بات ہے کہ مجھے بھی بہت پسند آیا ہے۔ چنانچہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہاں شیٹے فونیں - میزیں انہیں - بڑوٹیک ہے۔ چیزیں بند ہوں اور میرے دفتر میں کام کرنے والوں کو کوئی چوٹ آئے۔۔۔۔۔ ان کی گویا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا یہ باتیں کرنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور شاید اپنے مطلب کی بات شروع ہونے کے منتظر تھے۔ میں نے یکدم ہی سونچوں والے کے دائیں پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے یہ پاؤں رکھا ہوا تھا تا میری میز پر؟

اس نے قطعی اعتراضی طور پر اور قدرے اعتدال انداز میں انتہت میں سر ہلادیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے مشینی انداز میں اس کے پاؤں پر پاؤں مارا۔ اسے یقیناً یہی محسوس ہوا ہوگا کہ اس کے پاؤں پر سن محرومی کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ پاؤں پر پاؤں مارنے کی یہ بھی ایک خاص شینگ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاؤں کا ٹھونہ بننے میں قوی سی سی سرورہ گئی ہوگی۔ بے اختیار وہ ایک ٹانگ کے بل دائرے میں تاپتے لگا۔

اس وقت تک داڑھی والا سمجھ چکا تھا کہ میں جیسے لمحے میں بات کر رہا تھا میرے غرائز کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑے خوشخوار انداز میں مجھے رو پتے کے لئے بازو پھیلائے۔ لیکن میں نے اسے اس کی سلت نہیں دی۔ اس کے منہ پر میں نے پوری قوت سے گھونسا رسید کیا جس نے اسے لان کے اوپر گرد مچھنی ہوئی ڈیزہ ودفٹ کوئی دیوار تک پہنچایا۔ اگر وہ کوئی عام سا آدمی ہوتا تو وہیں گرنا اور خاصی دیر گئے کے لئے بے حس و حرکت ہو جاتا لیکن وہ جیسے کی طرح مضبوط تھا۔

مارنے کی بھی انہیں یقیناً عادت رہی ہوگی لیکن اب شاید وہ "خلیفہ" بن چکے تھے اور کٹنی عمر سے انہیں کہیں مار نہیں پڑی تھی۔ غالباً وہ بد معاشی میں نام کما چکے تھے اور اس منزل پر تھے جنہں کسی بد معاش کے نام کی دہشت ہی کٹنی ہوتی ہے اور جیل وہ جا کر کھڑا ہو جائے وہاں کوئی دہ مارنے کی جرأت نہیں کرتا۔ خصوصاً میرے معاملے میں تو انہیں شاید بہت سی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں یقیناً لکان بھی

نہیں رہا ہوگا کہ ایک نفیس اور جھللاتی ہوئی تونسہ عجب میں بیٹھا ہوا اسٹوڈیو بند آدمی جس کے سامنے اور فائوں کا ڈھیر ہوا، اندھ کر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے جو میں کے ساتھ کیا تھا۔ اب بھی شاید انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میں ٹرلر تھا، اصل قلم تو وہی بلی تھی۔

سونچوں والے نے، جس کا پاؤں پکلا جا چکا تھا تکلیف کی پروانہ کرتے ہوئے اور مزید ہاتھ پاؤں کی دھم دھم بچنے کے لئے اپنی ڈھیلی ڈھالی قبضے کے نیچے ہاتھ ڈال جانے کسی خفیہ جیب سے لمبی تل کا ایک کمزور صورت ریل اور نکلا۔ یہ تلخابیر تلخابیر اور تھا۔ خطرناک ترین ریلوں سے ایک۔ اس کھلبلی کے ریلور کی کوئی انسانی جسم ہوتی ہے تو اپنے عقب میں نہایت ہی بھیاںک شکاف جاتی ہے۔

میں نے ریلور کا رخ اپنی طرف ہونے سے پہلے کی کٹنی پر ٹھوکر رسید کی جو اس کی کٹنی کو بیکار کر دینے کے لئے تھی۔ ریلور اور ہوا میں اچھلا اور نہ جانے کہاں جاگرا۔ توجہ بیک وقت دونوں ہی بد معاشوں پر تھی۔ اس داڑھی والے کو نہ جانے کہاں سے ٹکڑی کا ایک چٹا اور تقریباً دو فٹ لمبا ٹکڑا مل گیا تھا جو شاید کسی قسم کے غلط ٹکڑا تھا۔ یہ ٹکڑا کسی بھی ہتھیار سے کم خطرناک تھا۔ خصوصاً ایک پیشہ ور بد معاش کے ہاتھ میں۔

کسی گیندے ہی کی طرح ٹانگ کی سیدھ میں مجھ پر ہوئے اس نے ٹکڑی کا وہ ٹکڑا پوری طاقت سے گھملا دوڑوں جیتے مجھے ہوئے بد معاش تھے لیکن ان کی حرکت تیر معمولی پھرتی نہیں تھی۔ میں جھکا کر دے کر ایک طر بہٹ گیا اور داڑھی والے کا گھملا ہوا وہ متحدہ ٹکڑا "شفا" کی آواز کے ساتھ سونچوں والے کے جڑے پر پڑا۔ یقین کے کان اور کپٹی پر بھی ضرب آئی تھی۔ وہ گئے ہوئے کی طرح دھب سے گرا اور وہیں بے حس و حرکت ہو داڑھی والا ایک لمحے کے لئے قدام بخود گیا اور یہ لمحہ ہی میرے لئے کٹنی تھا۔ میں نے اس کی کٹنی پر کرا۔ ہاتھ رسید کیا۔ ایک اذیت ناک کراہ کے ساتھ چولی کٹ کر کے ہاتھ سے چوٹ گیا۔ وہ مجنوناں انداز میں مڑا لیکن کرنے سے پہلے ہی میرا گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ اب تو انہیں حقیقتاً ہی اس کی شکل بگڑ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ کل تو اس کی صورت پچائے جانے کے قتل ہی نہیں رہے اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے اس کی گردن کراتے کا ایک اور ہاتھ مارا۔ وہ "لور" کی آواز کے ساتھ بری طرح لڑکھڑایا۔ میں نے اسے جیو جیو دہلی ٹیکس ہوا میں اچھل کر زمین پر دے مارا۔ اب وہ چپ پڑا تھا

اس کے بعد میں نے اگاز صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ ایک معروف اور دھانسو قسم کے وکیل تھے جو ہمارے فوجداری معاملات سے منسلک تھے۔ ان سے رابطہ قائم ہونے پر میں نے کہا "اگاز صاحب! براہ کرم چند منٹ کے لئے اسٹوڈیو والے علاقے کے قہانے میں آجائیے۔۔۔ جی ہاں، صرف چند منٹ کا کام ہے۔ بس رکی سی کارروائی ہے۔۔۔ جی ہاں، آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اپنے مسائل سے نمٹنا تو ہمیں خود ہی ہوتا ہے لیکن ضابطے کی کارروائی مکمل رکھنے سے انسان بعد میں بھی سرخوردہ رہتا ہے۔۔۔ جی ہاں۔ میں بھی پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔۔۔ جی ہاں، یہ علاقہ ایس بی نور صاحب کا ہے۔ انہیں بھی فون کر کے میں صورتحال بتاؤں گا۔ تاکہ وہ قہانے والوں کو کہہ دیں اور ہمارا زیادہ وقت برباد نہ ہو۔ وقت تو ہم دونوں کا ہی ہے حد قحطی ہے۔ اور میں تو اس وقت بہت ہی ضروری کام کر رہا تھا لیکن وہ عدد چھ قافیے قسم کے آپکوں نے آکر رنگ میں جھگ ڈال دی۔"

چند لمبے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون پر ہنسنے کے دوران میری نظر باہر کی طرف ہی رہی تھی۔ آفس کے دو دروازے تھے۔ ایک تو باہر کی طرف چربی دروازہ تھا جو درحقیقت حفاظتی دروازہ تھا۔ دوسرا بیٹھے کا دروازہ تھا جس کے عقب میں بلائینڈر لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان سے میں نے دیکھا کہ داڑھی والا بد معاش جو جیت پڑا انھیں پٹ پٹا ہوا تھا، بالآخر منقطع سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

سر جھٹک کر اس نے اوپر اوھر دیکھا پھر اس کی نظر اپنے بے ہوش ساتھی پر پڑی اور وہ تقریباً گھنٹا بوا اس کے قریب پہنچا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ جھگڑا ختم ہونے کے بعد کوئی ان کی مدد کے لئے، حتیٰ کہ انہیں سارا دے کر اٹھانے کے لئے بھی آگے نہیں بڑھا تھا اور نہ ہی ان کے لئے کوئی ٹک ٹکی تھی۔ ان کی پشت پٹنی کرنے والے یا ان کے مزید ساتھی بیٹھے اسٹوڈیو ہی میں کیس موجود ہوں گے لیکن کوئی ان کی مدد کے لئے نہیں پہنچا تھا۔

ایک منٹ ہی سے ٹوکے نے، بولے پکلیے کپڑوں میں تھا، اتنا کرم ضرور کیا کہ کہیں سے ایک گلاس میں پانی لا کر داڑھی والے کو دے دیا اور اس نے اپنے بے ہوش ساتھی کے چہرے پر چھینٹے مارے جس سے وہ چند لمبے بعد ہوش میں آگیا اور اٹھ بیٹھا۔ انہوں نے آپس میں کچھ بات کی اور اس دوران ایک بار بھی مڑ کر آفس کی طرف نہیں دیکھا۔ ایک دوسرے کا سامرا لے کر وہ اٹھے اور زخمی نتوں کی طرح نکلے جاتے ہوئے ایک طرف کو چلے گئے۔

میں نے اپنے دفتر والوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

بچتے ہوئے تیزی سے چلیں جھگڑا رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کے حواس اس کا دھڑکنے والے اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کے کیا ہے؟

دگر دھکی لوگ جمع ہو چکے تھے لیکن ان میں سے قریب سا آتا تھا حالت ایک شخص کو میں نے بہ آواز بلند کہتے سنا، "یہ قسم کی شرٹنگ ہو رہی ہے جی؟" اس قسم کا ہم ہے "سٹوڈیو کی ایک لوہار کی بڑی سٹیج ہے" کسی نے خوشی سے جواب دیا۔ ایسی عمر فلیس بھی کھار ہی بنتی ہیں "کسی دوسرے اگلیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان دونوں بد معاشوں کا کردہ لوگ بہت خوش تھے۔

گرد و پیش کی طرف خاص توجہ دے بغیر ہاتھ بھاڑ کر آفس میں داخل ہو گیا۔ رضوانہ، اتفاق اور دیگر کارکن صے کے وسط میں کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر لمبے، اثرات تھے۔ شاید اس بات پر انہیں خوشی ہوئی تھی کہ دفتر میں آکر بد معاشی بھاڑنے والوں کی درگت بنی۔ شاید اس بات پر حیرت بھی تھی کہ میں یہ کچھ بھی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی شاید انہیں یہ اندیشہ بھی سارا با ب کہیں اور بات نہ بڑھ جائے۔ صورتحال کہیں ایسی نہ کہ میں بھی اسے سنبھال نہ سکوں۔

اس نے اس بات کا کہ وہ اس قسم کے اندیشوں میں مبتلا عمل پار بھیجیں۔ پانچپچ میں نے وہیں رک کر رضوانہ پر رکنے ہوئے ٹیلیفون میٹ کا ریسیور اٹھایا اور اپنے ادنیٰ شیرخ کا نمبر ڈائل کیا۔

"پبل شیر" کیا حال ہے؟ "یہ رکی جملہ میں نے محض اس اتھا کہ وہ میری آواز پہچان لے۔ میں اس وقت کوئی کوڑا نعل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میری آواز پہچان چکا تو میں نے کہا "جس معلوم ہے نا نے اسٹوڈیو میں ایک آفس لیا ہے؟۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ فونی اور فوئل پہنچ دو۔۔۔ بس لوہار کو خر مٹالائے رہیں۔ اندر مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ صرف آفس پر نظر۔ کوئی بھی شخص ہتھیار لے کر یا ویسے ہی جارحانہ انداز اور بات نہ کہانی دے یا کسی قسم کا جھگڑا شروع کرنے کی سار کرے تو بلا تردد اسے آواز کر رکھ دیں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ بعد میں سے گا۔۔۔ ان سے کہہ دینا کہ محض رپو اور تک ہی محدود۔ کوئی زیادہ خطرناک ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہ۔ اور ان کے رپو اور بھی اس وقت تک کسی کو نظر نہیں چاہتا جب تک ان کے استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہے۔ کچھ گئے؟۔۔۔ خدا حافظ۔"

سے دیکھ چکے ہیں۔

آفس میں بھی مجھے اہل بالکل پر سکون نظر آئے۔ کچھ خلطہ چپ کر رہی تھی جو ہمیں مختلف لوازمات پرانی لوگ بدستور حسیات اور ریکارڈ فیروہ درسر مصروف تھے۔ اتفاق میرے ہی کیمین میں موجود کی فائل پر جمکا ہوا تھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ میں اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کمانی کے پار شروع کرنے ہی لگا تھا کہ مجھے اپنے ٹپے کا خیال آیا بدحاشوں سے جھڑپ کے دوران میرا سوٹ ٹھنک تھا اور کیمین پر کچھ دھبے لگ گئے تھے۔ میں۔۔۔ طلب کیا اور اسے حکم دیا "جا کر ڈرائیور سے کہو" میرا جو ایک فاضل سوٹ لٹکا ہوا ہے وہ دے دو۔ چہرہ اسی سوٹ لے آیا تو میں نے ہاتھ روم میں تبدیل کیا اور واپس اپنی نشست پر آ بیٹھا۔

"ہاں..... تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟" یہ سلسلہ کلام جو جیسا کہ کچھ ہو ہی نہیں تھا اور یہ ذرا کسی کام سے چند سیکنڈ کے لئے اٹھ کر کیمین سے تھا۔

"میں آپ کو کمانی بنا رہا تھا" اتفاق فائل سے ہونے پر سکون لیے میں بولا۔ پھر اس نے ذرا نہایت انتقاد کے ساتھ کمانی نکالی۔ میرے کوئی سے پہلے وہ بولا "قلمی دنیا میں کمانی بننا بھی ایک مجھے عیس آتا۔ البتہ کسی کسی کمانی نویس کو آتا ہے کمانی نویس جب کمانی بناتا ہے تو جہاں چہرہ آتے ہیں وہاں قلمی چہرہ کی طرح گرج برس جی جہاں بیرونی کے مکالمے آتے ہیں وہاں ناک پر ٹھک بھی لیتا ہے اور جہاں جذباتی پھوٹن آتی ہے چہرہ کی صاحب کے قدموں میں گرتی ہے وہاں کہ ہدایت کار کے بیروں میں گرجا ہے۔ اس طرح کو کچھ اور ہو جاتا ہے۔ میں نے تو سیدھے اور سیدھے کمانی بنائی ہے۔ شاید آپ کو اس نے زیادہ اہل: یہ میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ اس پر بہت اچھی اس کا بھیجئے اندازہ ہے" میں نے چشم تصور چھوڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے قلم بنانا تو یہ اس میں جب دوسرے لوگوں کے کلمات شامل اس کی شکل ہی کچھ اور شکل آئے گی۔ اس میں ہر مندی شامل ہوگی۔ ڈائریکٹر کی ذہانت شامل ہوگی اس کی قزاق خراش کا ٹھل ٹھل کرنے کا۔ دیگر کوششوں سے اس کے مختلف رنگ ابھر رہے ہیں چیز ہی کچھ اور سن جائے گی۔ کمانی کے اس خلا سے

آپ لوگ اطمینان سے اپنی اپنی میز پر بیٹھ کر اپنا کام کریں۔ کوئی آپ کا ہل بھی بیک نہیں کر سکتا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں بھی آپ لوگوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک آدھ منٹ بعد میرے آدھی باہر موجود ہوں گے۔ آپ خلوا انہیں نہ دیکھ سکیں لیکن وہ آپ کی حفاظت کے لئے پوری طرح مستعد ہوں گے اور کسی سے بھرے ہوئی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا مشران دونوں سے بھی بدتر ہو گا جو ابھی وہاں سے رخصت ہوئے ہیں: میں نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

ان کے چہرہ پر طمانیت پھیل گئی اور نہ جس وقت بدحاشوں نے آفس میں گھس کر بیکو اس شروع کی تھی اس وقت غلبہ میرے کارکن کی سوچ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ تو "سر منڈاتے ہی اگلے پڑے" والا معاملہ ہوا ہے۔ خصوصاً اب اتفاق تو بہت مطمئن بلکہ خوش نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ کہہ سکتا، میں آفس سے نکل آیا۔

اپنا کام کر کے واپس اسٹوڈیو آنے میں مجھے تقریباً آدھا گھنٹہ لگا۔ برآمدے میں پہنچ کر یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہاں کسی قسم کی کوئی گڑبگ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ نوٹی اور ٹیڈی میری توقع کے عین مطابق برآمدے میں موجود تھے۔ نوٹی تو آفس کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ستون سے ٹیک لگائے بظاہر لاشعلی سے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور ٹیڈی کا کھانا کالیک پلندہ ہاتھ میں پکڑے دینا اینٹا سے بے خبر برآمدے میں نہایت ہی ست انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔ سرسری نظر میں دیکھتے والا یہی سمجھتا کہ وہ کوئی چھوٹا سا نوادار ہے اور اپنے مکالمے یاد کر رہا ہے۔ نوٹی اور ٹیڈی درحقیقت میرے خاص آدمی شیر شاہی کے چھوٹے بھائی تھے اور شیر شاہی کی طرح بظاہر نہایت کزور و پہلے اور باہن کی طرح لمبے تھے لیکن تھے شیر شاہی ہی کی طرح بڑے کام کی چیز۔ شیر شاہی کی توجہ خیریت ہی اور مٹی۔ وہ تو ہر قسم کے بحران کا سہا باب کرنے کا بادشاہ تھا۔ کسی بھی قسم کا ہتھیار استعمال کرنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اور جسمانی طور پر بھی وہ بہت نحیف نظر آتا تھا درحقیقت اتنا ہی ناقابل شکست تھا۔ اگر وہ ایک بار کسی کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تو پھر اس کے لئے ہر قسم باہری ثابت ہوتا تھا۔ اس کی گرفت کی نسبت شاید آنکڑیوں کی گرفت سے ٹھنکا آسان ہوتا۔

شیر شاہی کے دونوں بھائیوں میں بھی کمانی حد تک اسی کی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ فرق بس یہ تھا کہ وہ اس جیسے ہاتھ کار نہیں تھے۔ بظاہر انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ درحقیقت وہ مجھے دوری

...آخر انہوں نے اس مہوئی سے مسئلہ کو اتنا تسخیر کیا کہ بتا دیا ہے؟

"آپ اس مسئلے میں ہرگز ذہن نہ کیا پس۔ اس قسم کے سارے مسائل آپ میرے لئے چھوڑ دیں اور اپنی قلمباز توجہ کام پر مرکوز رکھیں۔ آپ اپنے ذہن میں صرف یہ رکھیں کہ ہمیں بہت خوبصورت فلیس بنانی ہیں۔ آپ کی راہ میں جو بھی دشواریاں آئیں گی انہیں دور کرنا میرا کام ہے۔ آج کے واقعے کے بعد آپ کو یقیناً اطمینان بھی ہو گیا ہو گا کہ میں آپ لوگوں کی حفاظت کرنے کا اہل ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں سر! مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں" آفاق مسکرایا۔

"میری پالیسی ہے کہ شریفوں کے لئے میں بے پناہ شریف آدمی ثابت ہوں اور بد معاشوں کے لئے ایک ایسا بد معاش کہ وہ بد معاشی سے توبہ کر لیں" میں نے کرسی کے نشیے سے نیک نکالتے ہوئے کہا "میرا بزنس بہت پھلنا ہوا ہے اور خصوصاً اب جن جن شبیوں میں قدم رکھنے کا میں ارادہ رکھتا ہوں ان میں مجھے کسی بھی قسم کے حلاوت سے واسطہ پڑ سکتا ہے اور پڑنا بھی رہا ہے چنانچہ میں نے کچھ ایسے انتظامات کئے ہوئے ہیں کہ خواہ ٹھوکر میرے مخالف بن جائے والے یا اور اور پھر ٹکڑے ہوئے کرائے کے قاتل اور لٹکتے مجھے پریشان نہ کر سکیں۔"

"سر! ویسے یہ دو آدمی جو ہمارے ہاں ہنگامہ کرتے آئے تھے، کوئی چھوٹے موٹے بد معاش یا لٹکتے نہیں تھے" آفاق بولا "کسی چھوٹے موٹے بد معاش یا لٹکتے کی توبہ برائت نہیں ہو سکتی کہ ایک انتہائی فلسفہ کے سحرے میں یوں دندنا تے ہوئے گھس آئے اور ایک ڈائریکٹر کے گریبان پر یوں چبوتے ہی ہاتھ ڈال دے۔ یہ دونوں غائب ہوئے درجے کے بد معاش ہیں۔ بلو اور جوتی کے ناموں سے مشہور ہیں۔ قتل کی کئی وارداتوں میں ملوث ہیں۔ آج کل ملک ہی ان کا سرپرست خاص بنا ہوا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے کئی دوسرے پیشہ ور بد معاش ملک کے خواری اور مصائبوں کی طرح اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔ پرنسپل سروی یا ڈائریکٹروں کی ایسی ہی ایجنٹری بھی ان کے سامنے گویا بے بس ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔ کسی ایسی ہی ایجنٹری سے ان کی شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ جہاں یہ دیکھتے ہیں کہ عہدہ اہلوں کو خوفزدہ کیا جاسکتا ہے وہاں خوف زدہ کر دیتے ہیں اور یہاں دیکھتے ہیں کہ کچھ بات جگڑنے لگی ہے اور ملک کو فلسفہ سازی میں کوئی برکاتیں پیش آئے گی ہیں تو یہ لوگ مسکین بن کر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سوچ مناسب دیکھ کر چاہو، پنجر اور ہسٹل لہرائے لٹکتے ہیں۔ سیٹ پر کام کرتی ہوئی چھٹی ان اکاراؤں کو کھانسی سے چڑ کر تحسیت

ہی ہے۔ اصل دیکھنے کی چیز تو وہ مکان ہو گا جو اس نقشے پر گا۔"

بالکل درست کہا آپ نے سر! آفاق قدرے پرجوش بولا "اس کا مطلب ہے پانچ لاکھ کو اچھی طرح سمجھتے

میں کسی ٹیڈ کو سمجھوں یا نہ سمجھوں لیکن جب بھی قدم رکھتا ہوں تو پھر میں بہت ہی تیزی سے اسے اہوں۔ کوئی مجھے تربیت دے یا نہ دے، میں بہت ہی نہ میں اس کے خبیث و فراز سے واقف ہو جاتا ہوں" کہا۔ اور یہ سب اوپر والے کا گرم ہے ورنہ جس در جس ماحول میں میں نے آنکھ کھولی تھی وہاں شاید باڑی کے سوا کچھ نہ سیکھا پاتا۔

مجھے امید ہے کہ علم انڈسٹری میں آپ کی آمد نیک نفل ل "آفاق نے دیکھے مجھے بھی یوں بولا "میل آپ جیسے کی سخت ضرورت ہے۔ ماحول بہت خراب ہو گیا۔ کچھ ایسے لوگ میل گھس آئے ہیں جنہوں نے ہر مذہب کی کاغذ پر کھانا شمار پٹالیا ہے۔ وہ اپنا ہر کام غنڈوں کے ذریعے کرائے کی کوشش کرتے ہیں۔ مائی گرائی بد معاش روپے پیسے، شراب، عورت، ماحول، چوروں کے چنگے میں ان کے درپر پڑے جس کی وجہ سے مجھے جیسے لوگوں کو بعض اوقات بڑی بٹل آتی ہے جو بد معاشوں سے مراسم نہیں رکھتے۔ یا کہ جن کے پاس بد معاشوں کو دینے کے لئے کچھ ہے۔ جو خود بے بہت پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں اور بے کلام پر ہی تکیہ کر کے انڈسٹری میں رہنا چاہتے ہیں۔ پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہم کسی معاملے میں کے راستے میں نہ آئیں پھر بھی کسی نہ کسی مسئلے پر جا جاتا ہے۔ اب اس معاملے کو لے لیجئے بھیجی یہ تھا۔ میں جس کو پتا چاہتا رہا۔ ظاہر ہے مجھے اپنا چار پیسے لپٹا تھا لیکن مجھے پورے شامی انداز میں حکم دیا بار بار تھا کہ ہر حال میں ملک صاحب یا ان کے دوست کو دینا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی عام بزنس میں ہوتا تو اس کی عزت، باجالی اور ساتھ ہی میری بھی اچھی خاصی مثالی چلبہ آدمی کی جگہ تھا کہ میں نے اسے مراد دیا مگر تاکہ پھر نہیں تھا کہ یہ لوگ اس معاملے میں اتنا آگے گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ملک یا اس کا ہاتھ اس کے پیچھے کیوں سرے چار ہے ہیں۔ یہ کوئی حلیہ جگہ تو ہے نہیں۔ اسٹوڈیو میں آئے دن کوئی نہ ملتا ہوتا رہتا ہے اور پھر اسی اسٹوڈیو میں آگے بنانا پڑتی نہیں۔ قریب ہی دوسرے دو اسٹوڈیو بھی ہیں۔

بات بھی مانتے ہیں لیکن میں نے ان کے تعاون
باجائز نامہ نہیں اٹھایا۔ ان کی مدد سے کبھی کسی کام
کیا۔ کسی پر حملہ نہیں کیا۔ کسی سے جھگڑا کرنا
نہیں کی۔ ان کو میں نے عام طور پر صرف اپنے وہ
استعمال کیا ہے اور وہ بھی بد معاش قسم کے لوگوں
میں۔ ورنہ شریف آدمی کی تو میں چھوٹی موٹی زیادتی
ہوں۔ فرعون صفت لوگوں کو میں برداشت نہیں
خصوصاً جبکہ وہ اپنے زعم میں مجھ سے آگے
میرے لئے دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ میں نے
کچھ زیادہ آرام وہ ماحول میں پرورش نہیں پائی اس
لئے تو والا نہیں ہوں جتنا نظریاتی ہوں۔ چنانچہ اپنے
قسم کے معاملات میں ذرا بھی گھبرانے کی ضرورت
ہماری پالیسی میں رہے گی کہ ہم پوری توجہ مسکرا
سے اپنا کام کریں گے لیکن جیسے ہی کوئی ہمارے
اڑنے کی کوشش کرے گا اس کی ٹانگ توڑ دی
"جس وقت بلو اور جونی نے دفتر میں داخل
گرمیان پکارا اس وقت میں واقعی بدحواس ہو گیا تھا
میں بالکل مطمئن ہو رہے خوف بریں اس کی وجہ صرف
میں نے آپ کی طاقت کا مظاہرہ دیکھ لیا ہے۔ لگے
کے بعد سے کیا ایک ہی میرے دل سے موت کا
کیا ہے۔"

"یہ تو مت ہی اچھا ہوا" میں نے مسکراتے
"میرے ساتھی خواہ کسی بھی حیثیت میں میرے
رہے ہوں انہیں بالکل بے خوف ہونا چاہیے۔
دوسری کہانی کا جائزہ لے لیں۔ وہ کہانی بھی مختصر
آفاق نے چند منٹ میں کہانی مجھے سنائی۔
ٹھیک ہی تھی اور میرے خیال میں ایک اچھا ذائقہ
بڑی جان ڈال سکتا تھا۔ بہر حال ان دونوں کہانیوں
تو فطرتاً ہی چمکے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اندازہ
آفاق کام کے معاملے میں کتنے پانی میں تھا۔
"میرے کون کون تھی ان دونوں فلموں کی؟"
"دی.... ستارہ" اس نے دھمکے لہجے میں
"اسے مسلسل کلٹ کرنے کی میرے
وجوہات ہو سکتی ہیں" میں نے دوستانہ انداز میں
کہ تم نے پہلی مرتبہ اسے کلٹ کیا اور وہ فلم بہت
اسے خوش بخش کی علامت سمجھتے تھے۔ دوسری
اس پر کچھ مہربان لگتے ہو۔ تیسری وجہ یہ کہ شاید
اواکام ہو۔ ان میں کرن ہی وجہ سمجھ کر ہے؟"
"اس میں تو کوئی شک نہیں بالکل سادہ
لے میرے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔"

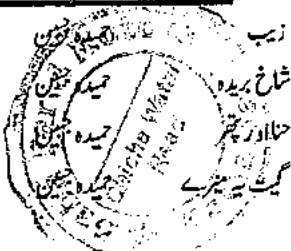
لگتے ہیں۔ سب لوگ چپ کھڑے دیکھتے رہتے ہیں۔ کبھی
کھنکھار زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے شوٹنگ
ایک اپ ہوئی۔ تھوڑا بہت شور مچا ہوا۔ دو چار لوگ اوجھر
اوجھر دوڑے۔ پھر آخر انہوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور چند منٹ
کے قتل کے بعد شوٹنگ دوبارہ شروع ہو گئی کیونکہ فٹساز کو
یہ فکر تھی کہ شفٹ بیکار نہ چلی جائے اور ہزاروں روپے کا
فائل خرچ نہ پڑ جائے اور ہدایت کار کو یہ فکر تھی کہ ٹکٹ
صاحب اس کا نام اپنے دشمنوں کی فہرست میں نہ لکھ لیں۔
تھانہ پھر ان بد معاشوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں..... بند
شاید ان کے کچھ شہساز باقی موجود ہیں جو ان کا تسابب کرنے
کے بجائے ان سے حق دوستی چاہتے ہیں۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں" آفاق نے ایک پھنسل
انہیں میں گھماتے ہوئے بے پروائی سے کہا "بد معاشوں کا
ایک قبیلہ تو یہ ہوتا ہے جس کے لوگ گرمیان کو لے بھرتے
ہیں۔ نیچے میں اتھار رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات کہیں نہ کہیں
ہنگامہ کر کے دہشت پھیلاتے رہتے ہیں۔ جسمانی طور پر بھی
یہ ٹھکڑے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے ڈرتے ہیں اور
بعض اوقات یہ ایک مخصوص علاقے پر ایک مخصوص
حکمت عملی سے گویا حکومت ہی کرنے لگتے ہیں۔ تھانوں میں
ان کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ کبھی کبھار یہ جیل بھی چلے جاتے
تین مگر زیادہ عرصہ اندر نہیں رہتے۔ ان بد معاشوں کا نام خواہ کتنا
ہی کوئی نہ لگے اور کسی علاقے میں ان کی خواہ کتنی ہی دہشت
پھیل جائے لیکن میرے خیال میں یہ جگہ بد معاش ہوتے
ہیں۔"

آفاق ہر تن کو ش تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں
نے سلسلہ کام جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے برعکس کچھ
لوگ ہوتے ہیں جو بظاہر بالکل بے ضرر اور عام ہی شخصیت
کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان میں غیر معمولی صلاحیتیں ہوتی
ہیں تاہم بد معاشی ان کا پیشہ نہیں ہوتی۔ بظاہر بالکل افسانہ
سکون سے اسی معاشرے میں دیگر شرفاء کی طرح زندگی
گزارتے ہیں۔ صرف ضرورت پڑنے پر یہ لوگ تنہا بے نیام
ہوتے ہیں۔ پلک جھپکنے میں یہ لوگ اپنا کام کرکھانے صاف نکلتے
ہیں جو پیشہ در بد معاش ایزی چرنی کا زور لگانے پر بھی انجام
نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں کا کہیں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہوتا
... کوئی انہیں صحیح طور پر نہیں جانتا۔ یہ لوگ بالکل عام آدمیوں
کی طرح رہتے ہیں۔ کسی کو بے جا شک نہیں کرتے، کہیں
ہنگامہ نہیں جاتے۔ کہیں بد معاشی نہیں جھانڈتے۔"

آفاق بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے
ہوئے بات جاری رکھی "خوش قسمتی سے ایسے کچھ لوگوں سے
میری شناسائی ہے۔ وہ میری عزت بھی کرتے ہیں اور میری

رومانی ناول



مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

رضوانہ نے اس بار بھی نہایت مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں پیشکش پر ہی رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس مرتبہ کسی بد معاش نے عداوت سے اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تینوں کاؤنٹر پر رک گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ پولیس والا عہدے کے اعتبار سے اسے ایس آئی تھا۔

دروازہ بند ہونے کی وجہ سے رضوانہ اور اسے ایس آئی کی آواز بھی تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اسے دے گئے اور سامنے صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ بالآخر انہیں بیٹھا پڑا۔ تب رضوانہ نے انٹر کام پر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔

"سر... دہی دونوں بد معاش ایک پولیس آفیسر کے ساتھ آئے ہیں۔ پولیس آفیسر آپ سے ملنا چاہتے ہیں" رضوانہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان دونوں کو سنانے کے لئے واضح طور پر بد معاش کہہ رہی تھی جس پر وہ چیخ و تمب کھا کر رہ گئے۔ لیکن رضوانہ کو گویا ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں ان سب کو صاف طور پر دیکھ رہا تھا جبکہ وہ باہر سے مخصوص رنگین شیشے کے پار نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"ان سے کہو میں اس وقت ضروری گفتگو کر رہا ہوں۔ انہیں چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"بہت بڑھوسا" اس نے انٹر کام کا ریسپونڈ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کنسیال کاؤنٹر پر نکلا کہ اسے ایس آئی کو سیراجو اب سنانے لگی۔ وہ کچھ کھسکا لیکن پھر اندر اندر ایس آئی میرا کر تو ام سے بیٹھ گیا۔ وہ بظاہر سرسری سے انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ مرعوب نظر نہ آئے۔ دونوں بد معاش کھڑے ہی تھے اور کینہ توڑ نظروں سے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اندر آنے والا ایسا ہی تھا جسے وہی دل میں کہہ رہے ہوں "زرا دیکھنا بچا اب پاپے کا شمس"۔ "ہاں تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟" میں نے اتفاق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

یہ کھٹ کر نہ کی وجہ یہ نہیں تھی۔ ہمارے معاش میں بڑا بے عزت ہوں۔ کام اپنی جگہ اور ہستی محسوس اپنی حقیقت یہ ہے کہ دوست اچھی ادا ہے۔ بلکہ یہ گناہ ہے کہ وہ یہ سن کر لڑا کر رہے۔ اس نے اداکاری نہیں سے کبھی نہیں لڑا۔ لڑا کر کے بارے میں اسے شاید ہی میں کبھی بتایا ہو۔ وہ کمان سننے ہی کرار کو اس طرح سمجھ رہے تھے کہ کسی بھی حالت میں اس کے سامنے اس کی زارانی تر بیانیات کا نشانہ نہ کھینچ کر رکھ دیا ہو۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں زندگی کے بارے میں اس کا مشاہدہ بہت کم کرنا نہیں ہے۔ اتفاق نے یہ سب کچھ مجھے قدرے پہلے بخوش بے پایاں دوسرے اس کا چہرہ قلم اسکرین کے لئے بہت ہی بے گارے۔ میں نے پاپے کو اس پر نظر ڈالنے ہی کہہ دیا تھا یہ لڑکی اسکرین پر غصہ ڈھالتی لیکن دوسرے بہت لوگوں نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

"بھی تم نے تو اس کی اتنی تعریف کر دی ہے کہ ایک تو اسے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دوسرے میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم نے قلم کو ہی بھی کیا تو شاید ای لڑکی کو لینا پڑے۔"

"کمانیوں کے لحاظ سے سوزوں ترین تو وہی ہے۔ لیکن اس کے برے خُصے ہیں" وہ قدرے ہلکا پھٹے ہوئے بولا۔ "تم نے اس کے کردار کا ذکر نقشہ کھینچا ہے اس سے میرا ذہن بے خُصے بڑھ جانے کا مطلب اس کا معاوضہ بڑھ جاتا ہے؟" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

اتفاق نے اذیت میں سر ہلایا "وقت سے قاعدہ اٹھانہ وہ کچھ دہی اچھی طرح جانتی ہے۔ سب فلسفہ یکدم اس کی دوزخ سے ہیں۔"

"ہم اسے اس کا نام مانگا۔ معاوضہ دیں گے۔ حتیٰ کہ وہ نہ بھی دے سکتے ہیں جو دوسرے فلسفہ دینے سے انکار کر دیں" پھر میں نے ایک ایک نقطہ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہمیں واقعی اس کی اشد ضرورت محسوس ہو۔ وہ بے گارے ہو رہے۔"

"آپ کل تیار شدہ ریلوں میں اس کا کام دیکھتے تھے۔ پھر کچھ گناہ میں خود اس مسئلے میں کچھ نہیں کہوں گا" اتفاق نے کہا۔

میں کچھ کہنے ہی کا تھا کہ ایک بار پھر مجھے آفس میں کسی بدگواہی ہوا۔ میں نے شیشے کی دیوار کے پار دیکھا۔ ایک نئی پولیس والا آفس میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے پیچھے دس دو تین بد معاش تھے جن کا میں نے حلیہ بگاڑا تھا۔ وہ قتل کر رہے تھے اور فیہو کر رہے تھے اور بالکل کارنوں نظر تھے۔

درجے کے ہوٹلوں وغیرہ میں پریس کانفرنسیں کرتے۔
اغراجات کی پروا نہ کرتے۔ اس میں خرچ کی ہوئی رقم
ضرور ملتا ہے۔ میں ذاتی حیثیت میں پبلسٹی سے بہت دور
رہا ہوں اور ہمیشہ میری کوشش رہی ہے کہ کسی اخبار
میں کسی سلسلے میں میرا نام نہ آئے۔ ذرا راجع البلاغ میری
تقصاوت نہ ہوں۔ اب بھی میں ذاتی طور پر اپنے نام
سائے لانا نہیں چاہوں گا لیکن ہماری قلموں اور
لوارے کو دوسروں سے کہیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔
"اس کی آپ فکری نہ کریں" آفاق مسکراتے
ہوئے بولے "مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کون
کا ہے اور سب سے میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔
شکر ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں اپنی بہی عزت ہے۔
لوگوں کے آڑے وقت میں کام آیا ہوں میں۔"
"بہت خوب" میں نے طمانیت سے سر ہلایا "اگر
تو اس مقدمہ کے لئے کسی اچھے اور سوزوں سے آدمی
ریٹینر منجبر کے طور پر بھی رکھ سکتے ہو۔ معقول
معتدل کام لو۔"

"میرے خیال میں فی الحال تو اس کی ضرورت
آفاق کچھ سوچ کر بولا "کام بہت کٹتی بڑھ جائے گا
پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ اس طرف توجہ دے سکوں
اس مقدمہ کے لئے کوئی ذرا بہت قسم کا آدمی رکھ لیں
"پبلسٹی۔ یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا۔ باقی انہی سب
ہی چھوٹی چیزیں تھیں۔" میں نے فائیکس ایک طرف
ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اب اے ایس آئی صاحب
بلائی لیا جائے۔ بے چارے باہر بیٹھے شاہیں لے رہے
ان سے پوچھیں یہ کیا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔"

"ضرور۔ ضرور" آفاق نے اذیت میں سر ہلایا
دیکھتے ہوئے بولا "یہ دونوں بد معاش بھی بڑی جلدی
کروا کے اپنے پیروں پر چلے ہوئے آگئے۔ کٹتی
معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ انہیں دو چار
آرام کرنے کی ضرورت پڑے گی۔"

"تمہارا خیال درست ہی ہے" میں نے مسکراتے
کہا "ابھی ان کی چوٹیں صحیح طور پر ٹھنڈی نہیں
آج رات یہ سوئیں گے تو کل ان سے انہیں
انہیں واقعی تین چار روز آرام کرایا پڑے گا۔"
پھر میں نے انٹرکام پر رضوانہ کو ہدایت کی کہ وہ
ہوئے تینوں آدمیوں کو میرے پاس بھیج دے۔ میں
کہ اے ایس آئی صاحب اس وقت تک سے نظر
تھے لیکن رضوانہ کی ذہنی میرا پیغام سننے ہی وہ
اٹھے اور پھر موصوف نے اپنے تاثرات بھی تبدیل

"ہم کاشنگ کے مسئلے پر بات کر رہے تھے" آفاق
سنبھلتے ہوئے بولا "ویسے بڑی ہو گا کہ کل آپ تیار شدہ
ریٹینر دیکھ لیں۔ اس کے بعد طے کریں گے کہ ہم کاشنگ
کدام سے دی شہرت کریں گے۔ اسی مناسبت سے ہم کاشنگ
کے بارے میں بھی فیصلے کریں گے۔"

"درست ہے" میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا "اچھا
آفاق! یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ رفتہ رفتہ میرا یہ قلساؤں کا
شعبہ مکمل طور پر تمہیں ہی سنبھالنا ہوگا۔ ابتدا میں کچھ تو اسے
سیٹ کرنے کی غرض سے اور کچھ شوق شرق میں شاید میں کٹتی
وقت دیتا رہوں لیکن آگے چل کر یہ ممکن نہیں رہے گا۔ اس
لئے میں ابتدا ہی سے تمہیں اپنا نقطہ نظر سمجھانا چاہوں گا کہ
میں کن بنیادوں پر اپنا کام استوار کرنا چاہتا ہوں۔ دوسری اہم
بات یہ ہے کہ تم پبلک ریلیشننگ پر بھی خصوصی توجہ رکھنا۔
... پریس سے ہمارے ادارے کے خصوصی تعلقات ہونے
چاہئیں۔ یہ وہ پہلو ہے جس پر دوسرے قلساؤں اور فکری لوارے
زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فکری فوٹو گرافر خصوصاً
لینے کے لئے اور انٹرویو لینے کے لئے ہمارے اور ہماری
کاسٹ کے آگے پیچھے بھرتے ہیں "بس یہی کافی ہے۔ لیکن وہ
اس پاریکھنے کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اس طرح تو پریس
میں زیادہ تردید چھپ پاتا ہے جو پریس والے چاہتے ہیں۔
ہماری زیادہ توجہ اس امر پر ہونی چاہئے کہ پریس میں زیادہ تردید
مجھے جو ہم چاہیں۔ جس کا ہمیں اس انداز میں فائدہ پہنچے جس
طرح ہم چاہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"
"بالکل سمجھ رہا ہوں" وہ مسکراتے کہنا "میں سر ہلاتے
ہوئے بولا "بلکہ اس سکتے کو تو میں نے قسم انداز میں آتے
ہی سمجھ لیا تھا اور تمہیں سے اس پر عمل پیرا ہوں۔ اسی سے تم
مجھے آگے آنے میں مدد ملی ہے۔"

"شو بزنس میں پبلسٹی کی اہمیت کو بہت کم لوگ سمجھتے
ہیں۔ مجھے پچھلے دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کئی ملکوں میں
جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنی دودھ اور اٹنی کی فکری دنیا کو بھی قریب سے
دیکھنے کا موقع ملا اور یہی بات یہ ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی
کھلی رہ گئیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دیگر جڑوں کی طرح
پبلسٹی کا بھی وہاں کیسا منظم شعبہ ہے۔ ہمارا ملک حتیٰ بذریعہ
لیکن بنیادی ضروریات تو ہماری بھی دی ہیں۔ ہم ان سے بہت
کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بہت سے تجربے کر سکتے ہیں۔ دوسری
بہت سی باتوں سے قطع نظر ہمیں یہ ضرور دہن میں رکھنا ہے
کہ شو بزنس اور پبلسٹی کا چوٹی واسن کا ساتھ ہے۔ بلکہ بعض
اوقات تو یہاں بزنس ہو ہی کم ہے 'شرعی شو ہوتی ہے۔ اسی
لئے تم اپنے مطلب کے روبرو دونوں اور فوٹو گرافروں سے
تعلقات بہت خوشگوار رکھنا۔ اکثر و بیشتر میں دفتر میں یا اپنی

لے جاسکا؟" وہ قد رے، جیکھے مجھے میں بولا "آپ بڑے سیٹھ ... بڑے فلسفہ زانچہ اور ہوں گے تو جو اکریں۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ میں ان لوگوں کے سخت خلاف ہوں جو اپنی دولت کے گھمنڈ میں رہتے ہیں ..."

"شاہ اللہ ... شاہ اللہ ... میں نے سنا کئی انداز میں سربایا۔" آپ کے خیالات قابل قدر ہیں ... دیے ایک بات تو بتائیں۔ ان معزز اور بے پناہ شریف فوجوئوں سے کیا آپ کی قریبی رشتہ داری ہے جو انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کسی کی تفتیش کے سلسلے میں کھل گئے ہوئے ہیں؟ اور یہ تھانے جانے کے بجائے سیدھے دوں پیچھے؟"

"یہ ایک اتفاق تھا ... وہ اب کچھ مڑ بڑایا۔ میں پلکیں جھکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور وہ بار بار نظر چڑا رہا تھا۔

"اس قسم کے اتفاقات یقیناً اکثر و بیشتر ہی پیش آتے رہتے ہوں گے؟" میں نے جیھنے ہوئے مجھے میں کہا۔ "آپ اور محروم کرکے باتوں میں میرا وقت ضائع نہ کریں جی ... اور تھانے چلنے والی بات کریں ... وہ آنکھڑے آنکھڑے سے مجھے میں بولا۔

"تو آپ مجھے تھانے لے جانے کے لئے آئے ہیں؟" میں نے اس بار سر دھجے میں کہا۔

"ہاں ... یہ بات کیا میں آپ کو لکھ کر دوں؟" وہ قد رے تیزی سے بولا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے گھوڑے سے رخساروں پر سرفی جھلک آئی تھی۔

"سڑاے ایس آئی ...!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے اور کٹ دار لہجے میں کہا "آپ فرما رہے ہیں کہ میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں۔ وقت تو میرا ضائع ہو رہا ہے۔ آپ نے اپنی دانست میں بڑی بھڑکی دکھائی ہے اور ان آنکھوں کی مدد کرنے کے لئے کافی درد سری مول لی ہے لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں تھانے ہو گیا ہوں۔ آپ بھی کچھ دیر بعد جب تھانے تشریف لے جائیں گے تو آپ کو ایس ایچ او صاحب بتائیں گے کہ آپ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ بہتر ہو گا کہ ان لفٹوں کو آپ ساتھ ہی لے جائیں تاکہ آپ بعد میں انہیں تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جائیں کیونکہ ان کے خلاف میرے دفتر میں گھس کر قاتلانہ حملے کو کوشش، فتنہ گردی اور آفتیں اسلحہ وغیرہ کے استعمال کی مختلف دفعات کے تحت ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔ ایس ایچ او صاحب ان کی گرفتاری کے لئے امکانات جاری کر چکے ہیں۔ میں ایک معزز اور پابند قانون شہری ہوں۔ میں بھی کوئی کالام نہیں کرتا۔ میرا دلجو میرے فوجداری معاملات چنڈل کرتا ہے، تھانے میں موجود ہے اور کو کوشش کر رہا ہے کہ اس کیس

و کوشش کی۔ غائبان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے چہرے سے سخت گیری مٹا دیں۔ مجھے ان حضرت کی اس کوشش پر ہنسی آتے تھے وہ گئی۔

انداز آکر اے ایس آئی مصالحے کے لئے ہاتھ بڑھائے فیر مشین انداز میں اکر کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا "اسسٹنٹ پ انسپکٹر محمد حسن میرا نام ہے۔"

"تشریف رکھئے" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے بے نرمی سے کہا۔ دونوں بد معاشوں کو میں نے قطعی نظر براز کر دیا۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے اور کھا جانے کی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

اے ایس آئی جیٹو چکا تھا لیکن نہایت آرام دہ کرسی میں ہی قد رے بے آرام نظر آ رہا تھا۔ میں نے سر دھجے میں پوچھا۔ "کی ... فرمائیے؟"

"ان دو فوجوئوں نے آپ کے خلاف شکایت کی ہے ... اے ایس آئی نے بالکل رٹے رٹے انداز میں پوٹا شروع کیا۔ کہ یہ آپ کے دفتر میں دفتر کے سابق مالک کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے آئے تھے لیکن آپ ان سے سخت بری طرح پیش آئے۔ جب انہوں نے احتجاج کیا تو آپ نے ایسے ساتھیوں سے انہیں پڑایا اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی دی۔"

"بہت خوب ... اچھی کہانی ہے۔" میں نے آہستگی سے رپڑتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ نظر اٹھ گیا۔

"آپ شاید اس وقت تھانے سے نہیں آ رہے ہیں؟" ماننے جیھنے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ... میں ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں ایک بد جگہ بیٹھا ہوا تھا جب یہ فوجوئوں میرے پاس پیچھے ... پھر وہ روت فاقمانہ سے مجھے میں بولا ... "لیکن میں نے ان کا ہٹل کر لیا ہے ... بڑی شدید ضربیں آئی ہیں ان کو ..."

"یقیناً آئی ہوں گی۔" میں نے کرسی کے پٹے سے ٹپک اٹے ہوئے کہا ... "میں جب کسی چیز کا پلے بد معاش کو مارنا ہوں تو پوری کوشش کرتا ہوں کہ وہ کچھ عرصے اس مار کو یاد رکھے۔" دیکھ کر سیکل تڑک ... آپ نے ایف آئی آر درج کرنے سے پہلے ہی ان کا میٹیکل کر لیا؟"

"ہاں ... بالکل ... ضرورت پڑنے پر ایسا بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کا اہم اثر ابھی تک برقرار تھا۔" ایف آئی آر درج کرنے کے لئے ہی تو میں آپ کو لینے آیا ہوں ... آپ کو میرے ساتھ لے جانا ہو گا۔"

"مجھے ...؟" میں نے قد رے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔ "کیوں؟ آپ کا کیا خیال ہے ... میں آپ کو تھانے نہیں

کی کارروائی حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھے تاکہ میرا اور
کاغذوں کے معاملوں کا قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔"

اپنے ایس آئی کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔
میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا... "اگر آپ اس
وقت جلسے سے آتے ہوتے تو آپ کے علم میں ہو تاکہ میری
ایف آئی آرمی کیا لکھا ہے... میں نے تو تمام تفصیل لکھوادی
ہے کہ مجھے ان دونوں بد معاشوں کو کس طرح بے بس کر کے
اپنا دفاع کرنا پڑا۔ میں نے انہیں کہیں کہیں نہیں لگا میں یہ
بھی ایف آئی آرمی درج ہے۔ اور یہ میرا حق خود خالق تھا
میں نے استعمال کیا۔ ظاہر ہے اگر میں اپنا دفاع نہ کرتا تو یہ
آجکے مجھے مار چکے ہوتے اور میرے آفس میں اس وقت آپ
کو شیشے کی کریچیں اور بیس قیت فرنیچر کے ٹکڑے بکھرے
ہوئے نظر آتے۔ ظاہر ہے کوئی بھی شخص کسی کے ہاتھوں
اپنی جان ذلیل نہ کرنا چاہتا۔ انہیں تو میرا شکر گزار ہونا
چاہیے کہ میں نے اپنا حق خود خالق استعمال کرتے ہوئے
انہیں ہلاک نہیں کر دیا۔ جبکہ انہوں نے مجھے ہلاک کرنے کی
پوری پوری کوشش کی تھی۔ رہو اور بھی کھلا تھا اور لکڑی کا
ایک تختہ بھی بطور ہتھیار استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں چیزیں بھی
میں نے تھامے ہتھیادی ہیں۔ ان پر ان کی انگلیوں کے نشانات
موجود ہیں۔"

پھر میں نے لے لے ایس آئی کی طرف تدریجاً جھٹکے ہوئے
ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "یقیناً آپ سمجھ ہی گئے ہوں
گے کہ آپ کو اب کیا کرنا ہے؟" پھر میں نے اس کی سولت
کے لئے وضاحت کی "آپ کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ
آپ ان دونوں کو حراست میں لے کر جلد از جلد تھامے۔ پچیس
... اگر آپ نے ہاتھ آتے ہوئے تھان کو کسی بھی طرح نکل
جانے کا موقع دے دیا تو خود آپ پر فرائض سے غفلت برتنے کا
الزام آسکتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ میں اس سلسلے میں ایس آئی
صاحب سے آپ کی بات بھی کرادوں..."

میں نے حیران پریشان لے لے ایس آئی کو کچھ بولے کا موقع
دیے بغیر فون پر ایک نمبر ڈائل کیا۔ سلسلہ ملنے پر میں نے کہا۔
منور صاحب! میں افضل بول رہا ہوں... جی ہاں... چند منٹ
پہلے جس سلسلے میں آپ کو فون کیا تھا وہ مسئلہ خود ہی حل ہو گیا۔
... وہ ایک اے ایس آئی صاحب ان دونوں کو ساتھ لے کر
میرے پاس آئے ہیں... جی ہاں ویسی پرانا جھگڑہ کہ اپنا جرم
دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کی جائے... جی ہاں... لیجئے اے
ایس آئی صاحب سے خود بات کر لیجئے۔"

میں نے ریسیور لے لے ایس آئی کو تھما دیا۔ اس نے
چٹکچٹ آمیز انداز میں ریسیور کان سے لگایا اور تھوک لگتے
کے بعد "جی... جی... کرنے لگا۔ میری نظریہ معاشوں پر تھی۔

ان کے چروں پر ہوائیں اڑ رہی تھیں۔ تھامنا انہوں نے کا
بھاگنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گئے تھے کہ ان
قسم کی کوشش کرنے سے بات اور بڑھ سکتی تھی۔ یا پھر شا
انہوں نے میری آنکھوں سے یہ ارادہ پڑھ لیا تھا کہ میں انہیں
بھاگنے پر مگر نہیں دوں گا۔

اے ایس آئی نے کلن دیر تک فون پر "جی... جی...
کرنے کے بعد بلاخر "جی بہت بہتر" کہہ کر ریسیور رکھا اور
دونوں بد معاشوں کی طرف دیکھا جنہیں کچھ دیر پہلے تھکا
کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ
انے ان دونوں کی مزید سرپرستی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ بھاگ
کی طرح بیٹھ چکا تھا اور مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ ان دونوں
بد معاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ مرد سے بے بس میں بولا
"مجبوری ہے... تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا" وہ
کھڑا ہوا۔

میں نے بد معاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے
انسوس ہے کہ ملک نے تھامی مدد کے لئے مزید بد معاشوں
نہیں بھیجا۔ اور مجھے یہ بھی امید نہیں کہ وہ جیل میں تم۔
لے یا تھامی مہلت کرانے کی کوشش کرے گا۔ کرانے۔
بد معاشوں کی بد قسمتی یہی ہوتی ہے کہ جب وہ کہیں
کھا جاتے ہیں تو ان کے آقا انہیں ان کے محل پر چھوڑ دے
ہیں۔ بہر حال اگر تھامی اس سے ملاقات ہو جائے تو اس
دعا کہ میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے... میں اس قبیل
لوگوں کو معاف نہیں کیا کرتا۔ ویسے باقی دی دے... یہ کا
ہے کیا چیز؟"

"تمہیں جلد ہی علم ہو جائے گا..." سوچوں وا
بد معاش سرلاٹے ہوئے بولا۔ تاہم اب اس کی آواز میں وہ
ختم نہیں تھا۔

وہ جلتے تو آفاق نے گہری سانس لی اور مجھے لپٹے میں
"مجھے خود بھی حیرت ہے سر...! جس وقت یہ دونوں بد معاش
آپ سے مار کھا کر لپٹے ہوئے تھے تو ملک نے ان کے۔
ملک کے طور پر مزید بد معاشوں کو کیوں نہیں بھیجا؟ اس
کے آٹھ دس آدمی تو ہر وقت اس کے سامنے حاضر رہتے
"شاید اسے اندازہ ہو گیا ہو کہ اس کا کوئی ناکوہ نہیں
... یا کوئی اور مصلحت اس کے پیش نظر رہی ہو..." میں
خیال ظاہر کیا۔ "ویسے اس کا آفس ہے کہاں؟"
"اوپر کی منزل پر یا میں طرف ہے۔ اگر وہ اپنے آفس
سامنے بالکونی ٹاٹے میں کھڑا ہو تو ہمارے آفس کے سامنے
برآمدہ نما ہے کا آسانی سے جائزہ لے سکتا ہے۔" آفاق نے
"کیا وہ بہت برا غصا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"جب وہ اندر مشی میں آیا تو اسے چند بہت اچھے لوگ

اُداس جنگل کی خوشبو

----- ★ اے حمید

میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے، جس کی یہ ناکام داستانِ محبت ہے۔ وہ غروب ہوتے سورج کی غم زدہ روشنی میں چنار کے درختوں میں سے گزر رہی تھی۔ اس کا چہرہ اُداس تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ رخساروں پر رات کو بہائے ہوئے آنسوؤں کے نشان تھے۔

آنسو خشک ہو گئے، محبت کرنے والے جُدا ہو گئے۔۔۔۔۔

یادیں باقی رہ گئیں۔۔۔۔۔ یہ لڑکی کون تھی؟

”اُداس جنگل کی خوشبو“ اسی اُداس چہرے والی لڑکی کی داستانِ محبت ہے۔

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/100 روپے

ایک عظیم ناول۔۔۔۔۔ ایک عظیم تاریخ

فتح بیت المقدس

سلطان صلاح الدین ایوبی

عظیم ناول نگار الماس ایم۔ اے کے قلم سے

اُردو زبان کا سب سے زیادہ ضخیم و عظیم ناول

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/450 روپے

گئے اور اس نے شروع شروع میں دو تین اچھی قمیصیں بنا لیں جنہوں نے خلا برنس کیا۔ "آفاق نے بتایا" لیکن آدمی چونکہ وہ بنیادی طور پر بد فاش اور بد نیت ہے اس لئے جلد ہی اچھے لوگ اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے اور اس کے گرد اسی جیسے لوگوں کا جھوم رہنے لگا۔ اب وہ ان فلساذوں میں شامل ہے جن کی فلساذی زیادہ تر بد معاشی کے سلسلے میں رہی ہے۔ سلیجے ہوئے ہنرمند اور اداکار اس کے لئے کام کرتا پسند نہیں کرتے۔ اس کی قمیصیں جتنی بھی خاصی ست رفتاری سے ہیں اور برنس بھی کوئی خاص نہیں مگر اسے اس بات کی کوئی زیادہ پروا نہیں ہے۔ روپیہ اس کے پاس بہت ہے۔ خلا بخرا زمیندار ہے۔ اس کی ایک سلطنت تو غالباً اس کی زمینداری ہوگی۔ اس کی دوری سلطنت فلم انڈسٹری ہے جہاں اس کی بہت سی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ آدمی کو کہ خاص عمر کا ہے لیکن بے پیش پسند۔ زیادہ تر نہیں پڑا رہتا ہے۔ زمینوں پر تو کبھی کبھار بی جاتا ہے۔ اپنے قلمی کاروبار کو بھی زمینداری کی طرح ہی چلاتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں یہ بھی محسوس کیا ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی کو ابھرتے اور نمایاں ہوتے دیکھ نہیں سکتا خواہ اس سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچ رہا ہو لیکن اپنے ارد گرد کسی کو بھی اپنے سے برتر ہوتے دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ شاید وہ اپنی بوئیاں نوچنے لگتا ہے۔ ایسا کہ نہ پورا انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ پولیس میں بھی چھوٹے موٹے عہدوں پر اس کے دوست رہتے دار یا پھر شاید اس کے گاؤں کے دو چار آدمی ہیں جن سے اسے بعض اوقات بڑی مدد مل جاتی ہے۔"

"بہت خوب۔" میں نے سب کچھ غور سے دیکھ کر کہا۔ "وہ ہے کس علاقے کا زمیندار؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" آفاق بولا "بلکہ شاید صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں..."

"خیر... کوئی بات نہیں" میں نے بے پروائی سے سر جھٹکا اور اکثر کام پر رضوانہ کو ہدایت کی..." میں اب اپنے دوسرے آفس بار بار ہوں۔ کوئی فون کرے تو اسے بتا دیجئے گا۔ وہاں سے پانچ بجے میں گھر چلا جاؤں گا۔ آپ کی میز میرے تمام فون نمبر وغیرہ موجود ہیں۔"

"لیں سرا!" اس نے مستعدی سے کہا اور میں ریپوررک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آفاق! کل تم پر دیکشن ہال میں وہ تیار شدہ ریلیں دیکھنے کا بندوبست کر رکھا تاکہ کل غنیمت کا شنگ کے بارے میں فیصلہ کر لیں۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر سرا!" آفاق بولا اور مجھے رخصت کرنے پر آمادہ ہوا۔

میں نے کئی اچھوں سے۔ اور دیکھا کہ میرے انداز سے کے مطابق ملک کا آفس ہونا چاہئے تھا۔ اوپر کی منزل کے طویل بالکونی خاصے میں کئی افراد کھڑے تھے۔ دو تین آدمی دیوار پر پاؤں تھکاے بیچے ہی جھانک رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اور آفاق آفس سے باہر آئے تو کسی آدمی تجسس انداز میں ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔

میں نے گپ شپ کرنے کے سے انداز میں آفاق سے کہا "خیر محسوس انداز میں اور دیکھ کر بتاؤ کہ کیا بالکونی میں ملک بھی کھڑا ہے؟ اگر کھڑا ہے تو کونسا ہے؟"

"ملک وہاں نہیں ہے۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں..." آفاق بولا "اس کے آفس کے سامنے کچھ دیر ایسی نظر آتی ہے۔ میرے خیال میں تو اس کا آفس ہی بند ہے۔ بہت مکمل آدمی ہے۔ جب فلٹروں کو پیچھے کے بعد اس نے دیکھا ہو گا کہ وارنٹ کیا ہے تو کھٹک گیا ہو گا۔"

"خیر... کوئی بات نہیں..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب ہم اس دریا میں کود رہے ہیں تو کسی دن گھر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" میں ہاتھ بنا کر باہر کو چل دیا۔

اپنے دوسرے آفس پہنچ کر میں نے ایک آدھ فائنل دیکھی اور چند خطوط سائن کئے۔ اسی اثنا میں میرے وکیل نے فون کر کے مجھے اطلاع دی..." وہ دونوں اچھے حالات میں پہنچ گئے ہیں چودہری صاحب۔ میں کو شش کروں گا کہ پولیس کل ہی عدالت سے ان کا کم از کم دو ہفتے کا ریٹائر لے لے۔ ویسے اگر آپ ڈی آئی بی صاحب سے فون کرویں تو پھر ملک پورا زور لگا کر بھی ان کی مہلت نہیں کرا سکے گا۔ کل دن لگ جائیں گے اسے..."

"اتنے چھوٹے سے معاملے میں میں اتنا اوپر جانا نہیں چاہتا..." میں نے دیکھے لیجے میں کہا۔ "ڈی آئی بی صاحب کی نظر میں میں بہت بڑا اور بہت معزز آدمی ہوں اور ان کی سفارش میں نے اب تک کسی بڑے ہی کام کے لئے بھاری کٹا ہے۔ اتنے چھوٹے معاملے میں ان سے کچھ کہہ کر میں اپنا اثر خراب کرنا نہیں چاہتا۔"

"رائٹ سر" وکیل بولا..." ان کی ویسے ہی کافی کھنچائی ہو جائے گی۔ یاد کریں گے کہ کسی پر ہاتھ ڈالا تھا..." اس نے ہکا ساتھ ساتھ لگایا اور میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون رکھ دیا۔ میں واقعی بہت سے اعلیٰ افسران کی نظر میں بہت معزز آدمی تھا۔

اور یہ تمام میں نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ کسی نہ کسی سامنے سے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں پارٹیاں... دفاتی تنظیموں کو چندے... ملاتی بیورو کے دیگر بہت سے کاموں میں حتیٰ الامکان مدد... یہ سب کچھ میں شخص کام کے لوگوں کی نظر میں تمام حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں کرتا تھا بلکہ واقعی میرا دل

50/-	قرتسکین	اسلام کے نامور مجاہدین
40/-	قرتسکین	اسلام کی نامور خواتین
75/-	قرتسکین	سومسلمان مشاہیر
35/-	قرتسکین	ملک ملک کی عورتیں

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

سے میرا اعتراف کرایا۔ وہ مختلف شعبوں سے وابستہ لوگ تھے۔ جو ان ظلموں کی تیاری کے دوران آفاق کے ساتھ کام کرچکے تھے اور آفاق کا خیال تھا کہ نئے سرے سے ان ظلموں پر کام شروع کرنے کے وقت ہم انہی کے کنٹرول میں رہیں گے اور انہی کی خدمات سے استفادہ کریں گے۔

دروازے بند کر کے جہاں بھجولے گئے اور آپریشنز کے لئے قلم شروع کی۔ میں تنقیدی نظریے قلم کے ایک ایک شات اور ایک ایک پوزیشن کا جائزہ لے رہا تھا ساتھ ہی میں عوامی نقطہ نظر سے بھی یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس میں کون سی چیزیں اکثریتی طبقے کو اپیل کریں گی۔

میری توقعات کے مطابق قلم میں جان تھی۔ کہانی سننے میں جو چیزیں معمولی محسوس ہوتی تھیں، قلم کی صورت میں وہ خاصی دلچسپ اور ڈرامائی محسوس ہونے لگی تھیں۔ پہلی دو ریلیں دیکھ کر ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ آفاق ایک اچھا بلکہ بہت اچھا ہدایت کار تھا۔ میں نے اس نئے میدان کے لئے کام کا آڈیو جتنا تھا اور مجھ پر قسمت کی مزید مرانی یہ تھی کہ وہ صرف کام میں ہی اچھا نہیں تھا بلکہ فطرتاً ہی اچھا آڈیو تھا۔

پروڈ قلم پر میں نے ہیرو مظفر رشید کا کام بھی دیکھا۔ دوبارہ تازہ دم، چمکیل اور پھر ٹالگ رہا تھا۔ زندگی کی توانائی سے بھرپور اس کی حرکات و سکنات، چال وصال، بولنے کا انداز، سب کچھ اتار پکڑ کر تھا، اتار چڑھ کر و خروش تھا اس کی ہر اوڑھن کی نقیہ نہیں تھا۔ آفاق، وہ اس قلم کی چمکیل، بکے دوران مرجکا ہے۔ مجھے اس کے لئے اپنے دل میں کتک محسوس ہوئی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی اتنی بے وفا بھی ہو سکتی ہے۔ فنکاروں کی موت اس اعتبار سے اور بھی زیادہ درد انگیز لگتی ہے کہ وہ تو دنیا سے گزر جاتے ہیں مگر ان کی پرچھائیاں اسکرین پر حرکت رہ جاتی ہیں۔ ان کی جنش ابھرتے سے لے کر ان کی اچھل کود، مکالمے، تاثرات اور ان کے لہجے کے ہزاروں رنگ تک سبھی کچھ محفوظ ہوتا ہے۔ جب بھی دیکھیں گے لگتا ہے جیسے وہ زندہ

بھی چاہتا تھا۔ اپنے اصل وعدے کی وجہ سے میرے دل میں جو خلص ہی رہتی تھی، ان کاموں سے میں اسے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گوکہ مجھے معلوم تھا کہ میری ان نیکیوں کو قبول حاصل نہیں ہو سکتی لیکن مجھ میں سوچا تھا کہ خدا کی ذات بڑی بے نیاز، بڑی غور و ارجم ہے۔ کیا معلوم کس گزری اپنے کس گنہگار بندے پر اس کی نظر کرم ہو جائے۔

اپنی شخصیت کی اس دورنگی سے میں خوش نہیں تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میں پوری طرح اور حقیقتاً ہی اتنا معزز اور بے عیب آدمی ہوتا جتنا لوگ مجھے سمجھتے تھے۔ میرے ساتھ کوئی دیانتاثر ایسی کسی کوئی کمزوری دابستہ نہ ہوتی جس کے میں ہونے کا مجھے خوف رہتا۔

اب بھی میں پوری پوری کوشش کرتا تھا کہ میرے ضمیر پر کم سے کم بوجھ رہے۔ میں کسی کمزور پر ظلم نہیں کرتا تھا۔ بلکہ کمزوروں کی حتی الامکان مدد کرتا تھا۔ خود پرستی سے قطع نظر شاید میں بنیادی طور پر واقعی ایک اچھا آدمی تھا۔ اب تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ اگر میرے دو تین بڑے اور جائز کاروبار مستحکم ہو گئے یعنی وہ دو تین بڑے پروڈیوسر کا بیاب ہو گئے جن پر میں آج کل محنت کر رہا تھا، تو میں اس سنگ بھجور دوں گا۔ اگر میرا سپورٹ انکسپورٹ کا کام کچھ اور بھل جاتا، اور کراچی میں ہوئی وہاں منصوبہ کامیابی سے مکمل ہو جاتا اور دوسرے قسماً بھی چمک اٹھتی تو پھر اس سنگ سے چٹنے رہنا محض میرے زیادہ لاگتی ہونے کی دلیل ہوتا۔

دولت بڑھانے کا بے شک مجھے چمکا چکا تھا۔ اور یہ چمکا درحقیقت ہر انسان میں موجود ہوتا ہے لیکن ان کا بس نہیں چمکا کہ وہ کس طرح دولت حاصل کریں اور کس طرح اس میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔ صحیح معنوں میں درویش صفت کوئی لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ جو بظاہر درویش صفت بھی نظر آتے ہیں، درحقیقت مجبور ہوتے ہیں۔ اپنی مجبوری کو انہوں نے درویشی کا نام دے دیا ہوتا ہے۔ میری نظر میں دولت بڑھانے کا جو چمکا مجھے چمکا تھا وہ اتنا معیوب نہیں تھا لیکن میں اس دنوں میں جتنا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ جیسے کی تو پھر بھی کوئی حد ہوتی ہے، دنوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ میں چاہتا تھا کہ بیش دولت میری غلام رہے۔ میں دولت کا غلام نہ بن جاؤں۔ میرے اشارے پر دولت دوسرے سے دوسرے ہو، دولت کے اشارے پر میں خزاں رسیدہ ہونے کی طرح دوسرے سے دوسرے ہونا چاہوں۔



دوسرے روز میں اسٹوڈیو پہنچا تو آفاق مجھے پروڈیوسر روام میں لے گیا۔... راجک چمکے سے سنبھالی سے مخاطب تھا۔ دیکھیں ہمارے علاوہ ہائے چہ آدمی اور موجود تھے۔ آفاق نے ان

سلامت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ابھی اسکرین سے ابتر نہیں
منظرانے آپ کے پاس آئیں گے۔

فلم کی بیرونی ستارہ کی تصویر میں نے پہلی بار اتفاق کے
آفس میں اس وقت دیکھی تھی جب میں اس کے آفس کا سودا
کرتے آیا تھا۔ بعد میں تو میں نے آرائش کے دوران وہاں سے
اس قسم کی تصویریں اور فلمی پروموتو فریم ہلایے گئے تھے۔
بہر حال مجھے اس وقت بھی فریم شدہ تمام عباد میں ستارہ کا چہرہ
کچھ مانوس محسوس ہوا تھا اور اب فلم کے پردے پر تو اسے
متحرک دیکھ کر کچھ زیادہ ہی مانوسیت کا احساس ہو رہا تھا مگر اس کی
کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اتفاق نے بتایا تھا کہ رنگین تصویروں کے ساتھ اس کے
انٹرویوز ملک کے تقریباً ہر اخبار، رسالے میں چھپ چکے تھے۔
پلاٹر میں ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ میں نے کیں اس کی
تصویریں دیکھی ہوں گی۔

ہماری پہلی فلم میں وہ ایک ماڈرن لڑکی کا کردار ادا کر رہی
تھی اور جتنی ریلوں میں بھی اس کا کام تھا، اتفاق نے اس کے
لبوسات پر مد سے زیادہ توجہ رکھی تھی۔ اسکرٹ، میکسکس،
جینز، میکسکس ہیٹ اور جو جو بھی سنسکر کوڑی کے حدود میں
رہتے ہوئے ممکن تھا، وہ اس نے ستارہ کو پہنایا تھا اور اس
میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہر لباس میں وہ خوب بی تھی اور
اس نے بہت جرم کر کام کیا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ دوسری فلم میں اس کا کردار ایک
ان بڑھ رہا تھا لڑکی کا تھا اور وہ اس میں بھی اسی طرح فٹ تھی
جیسے انکو بھی میں سمجھتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ متنوع قسم
کے کردار کرنے کے معاملے میں وہ کسی بھی مصروف اور بھی
ہوئی اداکارہ سے کم نہیں تھی اور کاروباری نقطہ نظر سے بھی
اس کی دو فلیس بہت ہو جانے کے بعد اس کے نام کی باکس
آفس دیکھو کسی بڑی بیرونی سے کم نہیں تھی۔ اس اعتبار سے
اتفاق کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا کہ فلیس دوبارہ بنانے کی
صورتحال میں بھی بیرونی کے طور پر اسے ہی کاسٹ کیا جائے۔

دونوں فلموں کی دو تین ریلیں ایسی تھیں جنہیں معمولی
کانٹ جھانٹ کے بعد استعمال کیا جاسکتا تھا۔ لیکن میں نے
دیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم فلم کو شروع سے ہی دوبارہ
بنائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ میں کچھ زائد رقم خرچ کر کے ان
میں مزید کچھ رنگ بھر سکتا تھا، مزید خوبصورتی پیدا کر سکتا تھا۔ فی
الحال مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ فلیس اگر بہت نہ
ہوئیں تو میری کتنی رقم ڈوبے گی۔ اول تو زیادہ امکان اسی بات کا
تھا کہ تین سیرکس کے لئے ڈسٹری بیوٹر ہمیں ہماری لامنت
کے مساوی رقم تو دے ہی دیں گے۔ اور دوسرے لئے ہمیں جو
تھوڑی بہت رقم ملے گی اسے ہم اپنا سامع شمار کر سکتے تھے۔

فلم ہٹ ہونے کی صورت میں ہمیں ڈسٹری بیوٹرز کے حق
میں سے حصہ مل سکتا تھا۔

تقریباً تین مہینے بعد ہم روچیشن روم سے نکلے تو میر
دل ہی دل میں اس کی اہم فیصلے کو جکا تھا۔ اتفاق میرے ساتھ
آفس کی طرف جاتے ہوئے ہوا "دوست کی طاقت
میں نے بے شمار کرشمے دیکھے ہیں مگر بھی جانے کیوں نہ
جب کوئی نیا کرشمہ دیکھتا ہوں تو حیران بلکہ مبسوت سا ہو جاتا
ہوں۔ آج صبح ستارہ کا فون آیا تھا۔ خدا کی شان ہے۔۔۔
وہ عجیب سے انداز میں منکر آیا اور سر جھٹک کر بات جاری
رکھتے ہوئے ہوا "میرے زوال کے دن چھٹک بد سے بد
ہو چلے تھے اس لئے پچھلے دنوں تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ اگر میر
ستارہ کو فون کرنا تھا تو وہ گھر پر ہوتے ہوئے بھی اپنی ملازمت سے
کھول دیتی تھی کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ اسٹوڈیو آتا میں نے تقر
چھوڑ دی دیا تھا لیکن اگر بھی آتی جاتا تھا اور اتفاق سے اس سے
سامنا ہوا تو جانتا تھا میں باقی چاہوں کہ اس کا رد عمل کیا ہو
تھا۔ دوسرے ہی دو انگلیاں ہلا کر "ہائے" کہہ کر اپنے چیلے
دانٹوں کی نمائش کرتے ہوئے گزر جاتی تھی۔ اور اگر سیٹ
ہوتی تھی تو اپنے کام میں مصروف ہو جاتی تھی۔ لیکن آج انکو
نے مجھے خود فون کیا تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے بظاہر سرسری سے لے
میں پوچھا۔

"پوچھ رہی تھی کہ میں نے اپنی نامی فلموں کے بارے
میں کیا فیصلہ کیا ہے" وہ ابترانے سے انداز میں منکر آیا "شاید
اسے یہ اطلاع مل چکی ہو کہ میں نے اپنا لوارہ چا رہا ہے مجھے کوئی
فائنل سیر نہیں آیا ہے۔"

"تم نے اسے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔
"میں نے اسے پروگرام پڑھا تھا کہ ہم آج دوپہر تک تیار
شدہ ریلیں دیکھ کر فارغ ہوں گے۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ
کریں گے" اس نے بتایا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ
چٹکاپٹ آواز لے کر میں ہوا "بیراب اس عورت کی صورت
دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا لیکن ہل تک کاروبار کا تعلق ہے
تو جس فلم کے لئے میں کمائی کی سہایت سے اسے سوزو
سمجھوں گا، ہر حال میں اسے ہی کاسٹ کرنے کی کوشش کروں
گا۔"

"مجھے ایسے ہی ساتھیوں کی ضرورت ہے" میں نے
طمانیت سے کہا "جو کام اور جذبات کو الگ الگ رکھیں۔ کیا
در حقیقت پیشہ ورانہ روایت والی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت
ہے کہ آپ اپنے پیشے سے تعلق ہیں۔ اور جو لوگ اپنے پیشے
کے ساتھ تعلق ہوتے ہیں وہ اس پیشے میں ضرور کام پیدا
کرتے ہیں۔"

”میں نے پچان لیا ہے“ میں نے دیکھے لیے میں کہا۔

میں نے آفاق کی میز پر اس کی تصویر دیکھی تھی اور ابھی میں وہ مکمل غلوں میں اس کے دو مختلف رول دیکھ کر آ رہا تھا۔ کیا میں اب بھی اسے نہ پہچانتا؟ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ایئر اسٹائل لباس اور میک اپ وغیرہ کی تبدیلیوں سے اس کی شخصیت یکسر بدل کر رہ جاتی تھی اور فلمی کیریئر میں ایک عورت کے لئے یہ چیز بہت اہمیت رکھتی ہے۔

اسے دیکھ کر میری وہ الجھن ایک بار پھر عود کر آئی تھی کہ میں نے اسے پہلے کیس دیکھا ہے۔ وہ ہمارے ہی آفس کے سامنے رک چکی تھی۔ اس دوران میں اس نے آفاق دوڑاڑے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ستارہ کی لمبی سیاہ پلکیں انھیں اور اس نے غور سے انداز میں آفاق کی طرف دیکھا۔ جیسے ابھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں سامنے سے آتا دیکھ چکی تھی۔ بہرحال ان اوادوں پر اس کا حق تھا آخر وہ اراکارہ تھی۔

آفاق کو دیکھتے ہی وہ چرگی۔ اس کے انداز میں یکفیت بے تکلفی آتی۔ نہایت اچانک سے اس نے آفاق سے ہاتھ ملایا اور جب وہ بولی تو اس کے لیے میں گرجو ش تھی ”میں تمہاری طرف ہی آ رہی تھی آفاق۔“

پھر وہ اس شخص کی طرف مڑی جو دائیں ہاتھ پر تھا۔ وہ پتہ نہ اور فریبی مائل تھا۔ اس کا لباس حلوں آلود لیکن بیش قیمت تھا۔ آنکھیں سرخ اور کچھ متورم سی تھیں جیسے وہ راتوں کو دیر تک جاگتا رہا ہو۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ستارہ سپاٹ لیے میں بولی ”آپ دیکھ رہے ہیں شیخ صاحب کہ آج میری سیکرٹری میرے ساتھ نہیں ہے۔ وہ چلی ہے۔“ کل وہ آئے گی تو ڈائری دیکھ کر بتائے گی کہ میرے پاس کون سی ڈشیں نکالی ہیں۔ زبانی تو مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ پہلے ہم ڈشیں دیکھ لیں اس کے بعد ہی آپ سے بات کچھ آگے بڑھ سکتی ہے۔ اگر آپ ایک مخصوص مدت میں قلم عمل کرنا چاہتے ہیں تو پھر میں ڈشیں کا حساب کتاب لگا کر ہی قلم سائن کر سکوں گی؟ میں کوئی وعدہ خلافی کر کے بدنامی مول لیتا نہیں چاہتی۔ یہ میرے کیریئر کا وہ دور ہے جب میرا نام جو بیٹ کی رفتار سے اوپر جا رہا ہے اور درحقیقت اسی زمانے میں مجھے زیادہ سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں لانچ میں جھلا ہو کر آنکھیں بند کر کے ہر کٹر ٹکٹ سائن کرتی چلی جاؤں اور پھر کام کی زیادتی وعدہ خلافیوں کے رد عمل اور دیگر دشواریوں کی وجہ سے میرے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں۔ مجھے اپنی جسمانی روایتی صحت اور تازگی بہت عزیز ہے۔ ایک ایکٹریس کا یہی تو سب سے بڑا سراہ ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں شیخ صاحب؟“

ہم اس دوران دفاتر کے سامنے والے برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ اچانک میں نے سامنے سے ایک دروازہ عورت کو آنے دیکھا۔ وہ جاپانی عورتوں کے لباس کیونہ جیسی کوئی چیز پہنے ہوئے تھی جس کا رنگ انتہائی بزمیلا تاریخی قاجاس کی طرف خواہ مخواہ ہی نظر اٹھتی ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جاپانی پتھیا بھی تھا جو عام طور پر جاپانی ٹیکنیڈروں پر ٹوکیوں کے ہاتھ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے بال بھی جاپانی اسٹائل میں بنے ہوئے تھے۔

اس کی ہانک جاپانی ٹوکیوں کی طرح مختصر جانی ہوئی سی نہیں تھی بلکہ ٹیکھی تھی اور نہ ہی اس کا تہہ چھوٹا تھا وہ اچھی خاصی دروازہ تھی اور اس کے کندھے بھی چوڑے تھے۔ اس کے بازو اس وقت اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر ایک جاپانی لڑکی کا سہی بن گیا تھا۔ وہ قدرے اونچی اڑی کی ٹیکلیں جو تیاں پہنے کٹ کٹ کرتی برآمدے میں چل آ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت، مراچی دار گردن ایک انہیلے احساس غائر سے پس اٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی ملک اپنی مملکت کے دورے پر نکلی ہوئی ہو۔

فائل آٹھوں پر لمبی لمبی پلکیں یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ ہر چیز کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بازو کسی کو یہ احساس نہ ہونے دینا چاہتی ہو کہ وہ کس طرف متوجہ ہے۔ اس کے رخساروں کی بڑیاں قدرے ابھری ہوئی تھیں اور ہونٹ گویا دست قدرت نے خصوصی توجہ اور اہتمام سے تراشے تھے۔ اس کے پیچھے ایک نور مزلا کا پوئی باکس افغانی تقریباً دو ڈیڑھ اوچل رہا تھا۔ دائیں بائیں دو آری تھے جو چیز تھیں اس کے ساتھ چلے ہوئے باری باری کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ شخص نیم تو جی سے سر ہلاتی جاری تھی۔ وہ فلمی ٹیک اب میں تھی۔ غالباً کسی سیٹ کی طرف جاری تھی۔

اگر اس کا تفصیل اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا تو شاید اسے بہت زیادہ حسین قرار نہ دیا جاسکتا لیکن مجموعی طور پر وہ پھر بھی حسین تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کا تنقیدی اور تفصیل جائزہ لینے کا انسان کو ہوش ہی نہیں رہتا۔ پہلی نظر میں ہی انسان کے حواس پر دھند سی چھانے لگتی ہے۔ انہیں حقیقت دیکھا نہیں محسوس کیا جاتا ہے۔ جیسے خوشبو اور ہوا کو آپ دیکھ نہیں سکتے اس کا تنقیدی جائزہ نہیں لے سکتے مگر محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ کے اعصاب پر یہ سب چیزیں جو اثر ڈالتی ہیں اسے آپ ضرور محسوس کر سکتے ہیں۔ بظاہر نظر نہ آنے والی خوبصورتی آپ کے محسوسات کو جو تماشے دکھائی دے اس سے آپ یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے۔

”یہ ستارہ ہے“ آفاق نے مجھے شو کا دیتے ہوئے سرگوشی کی۔

اس نے بہت قند فحش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
 ... وہ ایک ماٹے کے لئے گویا سا گیا پھر سنبھل کر مسکراتا ہوا
 بولا "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔۔۔ یہ عقل مند کی باتیں اتنی
 جلدی کس نے سکھا دیں تمہیں؟"
 ستارہ کے چہرے پر مسکراہٹ یا غری کی رستہ تک نہ
 ابھری۔

"زمانہ اور وقت نے" وہ بدستور سپاٹ اور سر دھبے میں
 بولی "زمانہ بہت بڑا استاد ہے اور بس بڑی ہونہار شاکر دہوں۔۔۔
 اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" بہت قند فحش آگے بڑھتے ہوئے بولا "کل یا
 پرسوں ملاقات ہوگی۔"

ستارہ دوسرے فحش کی طرف متوجہ ہو گئی جو اس کے
 بائیں ہاتھ پر منودہ انداز میں کھڑا تھا۔ ایک نظر گھڑی کی طرف
 دیکھ کر وہ چٹکی بجا کر بولی "تم اب سیٹ پر جاؤ اور اپنی عمرانی میں
 سیٹ لگوانے کا کام کراؤ۔ مجھے یقین ہے کہ شوٹنگ مزید ایک
 گھنٹے سے پہلے شروع نہیں ہو سکے گی۔ میں تو پابندی وقت کا
 اصول اپنانا چھوڑا ہی ہوں۔ میرے علاوہ گویا کسی کو بھی وقت
 کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں بھی ایک گھنٹے بعد سیٹ پر پہنچوں
 گی۔"

"بہت بستر میڈم!" یہ کہہ کر وہ فحش بھی تیزی سے
 آگے بڑھتا چلا گیا۔

اب ستارہ گویا بیکو ہو کر اتفاق کی طرف متوجہ ہوئی۔
 اپنے ساتھ آنے والے دو تو میوں سے بات کرتے وقت جس
 طرح اچانک اس کے چہرے "آنکھوں اور لبے میں رکھائی ہو
 سرد مہری در تہی تھی وہ اسی طرح ایک ہی ماٹے میں غائب بھی
 ہو گئی تھی۔ جیسے یک نکتہ ہی بلند دھلا چٹوں پر جمی ہوئی
 برف پگھل جائے۔ بلاشبہ اسے اپنے تاثرات بدلنے میں ملکہ
 حاصل تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ بنور تو نہیں لیکن کس آنکھوں سے
 غیر محسوس طور پر ہیرا جائزہ لے چکی ہے لیکن بظاہر وہ میری
 طرف سے بے نیاز نظر آنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔
 میں اپنی جگہ دم بخود کھڑا تھا کہ جیسے ہی میں نے اس کی آواز
 سنی تھی، میرے ذہن میں ایک چمکا کا سا ہوا تھا اور یک نکتہ ہی
 جیسے کوئی چتر میری سوج کے راستے سے ہٹ گیا تھا کوئی گروہی
 مکمل تھی تھی۔ کوئی تھپی سنبھل گئی تھی۔

میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اور اس کی آواز نے اسے
 پہچاننے میں میری مدد کی تھی ورنہ فراموشیوں کی گرد بہت
 گہری تھی۔ تا مکمل فحشوں کی ریلیں دیکھتے وقت بھی میں نے
 اس کی آواز سنی تھی لیکن اس وقت زیادہ توجہ نہیں دی تھی
 اور دیکھتے بھی ساؤنڈ ریکارڈنگ کے لوازمات اور مشینی عمل

سے کچھ نہ سمجھ فریق پڑ جاتا ہے۔ اس کی اصل آواز میں
 گو کہ بہت تبدیلی آچکی تھی۔ اس میں وہ بے ساختگی
 رہی تھی۔ بہت باپ قول کر بولنے لگی تھی وہ۔ الفاظ
 تراش خراش اور جادو کے ساتھ ہونٹوں پر آتے تھے۔
 مگر سر ملے لیے اور گواہ کا اپنا ایک بنیادی رنگ ہوتا
 اس کے لیے اور اس کی آواز کا رنگ میرے ذہن کے
 خانوں میں کیس محفوظ تھا۔

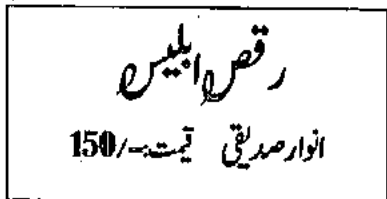
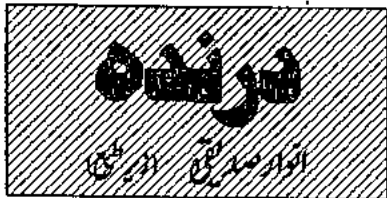
وہ واقعی تحفہ زمانہ کا ایک ایسا شاہکار تھی کہ تصویر
 میں اسے پہچان نہیں سکا تھا تو یہ کوئی حیرت کی بات
 تھی۔ اس کی ذات میں آئے ہوئے انقلابات کو دیکھنے والا تو
 تصویر حیرت بن جاتا۔ ان دونوں کو ہی علم نہیں ہو سکا تھا کہ
 حیرت کا کتنا شدید ہنگامہ برداشت کر چکا ہوں۔ میرے احسا
 میں ابھی تک خفیف سی جھنجھٹا ہٹ اور رگ و پے میں
 مٹی سی سنسنی باقی تھی۔ ستارہ دو ستارہ انداز میں اتفاق
 کدھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے بولی "میں
 اطلاعات کے مطابق تم نے نیا نم لے لیا ہے۔ شاید اس۔
 گردن کچھ اگر مٹی ہے۔ اب ایسی بھی کیا ہے رختی؟ تاکہ تم
 آفس بہت شاندار بنایا ہے لیکن کیا مجھے انداز چلنے کے
 بھی نہیں کو کے؟"

"کیوں نہیں" اتفاق اس کے لئے دروازہ کھولے ہو۔
 سپاٹ لبے میں بولا "اچھا ہوا تم آنکس۔ ورنہ کچھ دیر بعد
 خود تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے۔"

اتفاق کے اس رویے سے غالباً ستارہ کو بھی حیرت کا ہنر
 لگا مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ صرف اس کی آنکھوں
 میں ایک لمبی آنکھ گڑھی۔ شاید اسے توقع تھی کہ اتفاق اس
 سے کچھ شکوے کرے گا، طوطا چٹکی کے طعنے دے گا اور اس
 کے برابر جالی پین پر اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ او
 ان سب متوقع باتوں کے جواب بھی ستارہ کے پاس یقیناً تھا
 ہوں گے مگر اتفاق ایک ذہین آدمی تھا۔ اس نے ایسا کوئی ذکر
 نہیں پھیرا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں
 ہے۔ اس نے یقیناً اپنی زندگی کا یہ باب بند کر دیا تھا۔ وہ اب
 ستارہ کے ساتھ اپنا طرز عمل خالصتاً کاروباری رکھنا چاہتا تھا۔
 ہم دونوں ستارہ کے پیچھے پیچھے آفس میں داخل ہوئے۔
 مصحفین پر رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا، سینی بیٹ
 کے سے انداز میں ہونٹ سیکڑے بھر مسکراتے ہوئے اتفاق
 سے ہی مخاطب ہوئی "واہ۔ واہ۔ یہاں کے درو دیوار سے
 دولت کی خوشبو آتے گی ہے۔"

"اور یہ خوشبو تمہیں بہت پسند ہے" اتفاق کر لیا ہے
 مانتہ بولا۔

"مجھے نہیں، سہمی کو پسند ہے" ستارہ نے گہری خمیدگی



تہنچ کی۔ آفاق کو خاموش دیکھ کر وہ سٹروای پھر اسی
میں درباری نے آنگے بڑھتی چلی گئی۔ دونوں کنبوں کے
وسط میں پہنچ کر وہ رک گئی۔
”کس طرف؟“ اس نے پوچھا۔

”اوجھ“ آفاق نے میرے کنبین کی طرف اشارہ کیا اور وہ
بندوں میں سے کا دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئی۔ اس نے یہ انتظار
نہیں کیا کہ ہم میں سے کوئی اسے پیچھے کے لئے کہے۔ اس
نے خود ہی میری ریو الونگ چیز کے عین مقابلہ میں کی دوسری
طرف ملا تھوں والی کرسیوں میں سے ایک منتخب کی اور اسی
مخصوص حکمت کے ساتھ بیٹھ گئی جیسے کوئی جگہ اپنے
درباروں میں جلوہ افروز ہوئی ہو۔

اس کے ساتھ آنے والا لڑکا جس نے اس کا بیوی کس
اٹھایا ہوا تھا، باہر دھپشن پر ہی سونے پر بیٹھ گیا۔ برا ترتیب
پانز کا تھا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آفاق میرے بائیں ہاتھ پر
تھا۔

میں نے ایک بار پھر ستارہ کی طرف بغور دیکھا کہ کہیں
میں اسے پچھانے میں غلطی تو نہیں کر رہا؟ کہیں میری بے
حس یادداشت میرے ساتھ مذاق کرنے پر تو نہیں تل گئی؟
اسی لمحے اس نے میری طرف دیکھا اور ہماری نظریں جیسے ایک
دوسرے میں الجھ کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی برق سی
کوندی اور جیسے ماضی کے کھنڈر میں بکھرے ہوئے یادوں کے
سارے ہی موتی جھلکا اٹھے۔ ایک ایک نقش کس عیاں
ہو گیا۔ بھولی بھری سب باتوں کی کڑیاں جیسے اسی ایک لمحے میں
ل گئیں۔

وہ بھی حیرت کے اس جھکے سے جلد سنبھل گئی۔ بالکل
اسی طرح جس میں سنبھل گیا تھا۔ آفاق جو ہمارے اتنا قریب
تھا، نہیں جان سکا کہ شناخت کے اس ایک لمحے میں ہمارے
دو دوسرے کس طرح اندر ہی اندر اہل جھل ہوئے،
احساسات پر کیا زلزلہ گزرا اور رگ دوپے میں کیسی قیامت
جگمگا۔ بظاہر تو ہم پر سکون ہی رہے۔ ان پانڈوں کی طرح جن
کے اندر آتش فشاں چھلے ہیں۔

پھر ستارہ کے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ
ظہار ہوئی۔ میں بھی مسکرا ہوا۔

”تو یہ تم ہو“ وہ کرسی کے پٹے سے ٹپک لگاتے ہوئے
کسی سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئی بولی۔

”ہاں... اور یہ تم ہو“ میں نے انگلی سے اس کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس دی۔ زندگی سے بھرپور مٹی
تھی اس کی۔ جیسے وہ اس صورت حال سے بہت محظوظ ہو رہی
ہو۔ ”تم تو بہت ہی غصہ کی چیز ہو گئی ہو لال!“ میں نے دیکھے
لیجے میں کہا۔

”اور جسیں بھی تو وقت نے میرے کی طرح تراش دیا
ہے افضل!“ وہ ترکی بہ ترکی بولی۔
آفاق نے ابھمن آمیز سی نظروں سے یکے بعد دیگرے
ہماری طرف دیکھا پھر پچھلاہٹ آمیز سے لیجے میں بولا ”آپ
دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“
”بہت اچھی طرح“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے
ہوئے کہا۔

”پھر تو آپ ہر بات خود ہی کر سکتے ہیں۔ میرے خراہ خراہ
تاک اڑانے کی کیا ضرورت ہے“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور
اتھ کھڑا ہوا۔ آدمی بلاشبہ ڈپین تھا۔

”میری ضرورت محسوس ہو تو بلا لیجئے گا“ وہ جانتے جانتے
ایک لمحے کے لئے دروازے پر رک کر بولا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے سکوت حاوی رہا۔ پھر ہم
دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے
رہے جیسے گمشدہ رفاقتوں کے خزانے تلاش کر رہے ہوں۔ وہ
ہاتھوں کی غزوئی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسانے لگی
تھی اور اس کی آنکھیں خوابناک سی دکھائی دے رہی تھیں۔
شاید وہ خواب ہی دیکھ رہی تھی۔ ان جنت نشان جزیروں کے
خواب جنہیں ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

میں چشم تصور سے گندی سی رگت والی اس غائب بدوش
لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو پھر تو ذاتی مٹی، مٹی، مٹی یا اسی طرح کا
کوئی اور سخت مزدوری کا کام کر رہی تھی۔ سہلہ کش کش کہنی
جہاں بل تعمیر کر رہی تھی وہاں قریب ہی ایک میدان میں وہ
اپنے تھیلے کے دیگر لوگوں کے ساتھ ایک بوسیدہ سے خیمے میں
مقیم تھی۔

طے کیا ہوگا۔

”ظاہر ہے“ میں نے تسلیم کیا۔ پھر ایک لمبے کے قوت سے میں نے کہا ”تکسا تو تم نے مجھے اس دفتر میں بیٹھے دیکھ لیا۔ لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں کوئی چور دغیرہ قسم کی چیز بھی ہوں؟“

”ظاہر ہے کہ جو باہر کی دنیا سے یکدم بڑے غناٹے سے ٹکری دنیا میں وارد ہوتا ہے وہ کیسے اور سے ہی دولت کا آگیا ہوتا ہے اسی لئے وہ سیٹھ ہی قسم کی کوئی چیز ہو سکتا ہے۔ اپنے چمکدار اور ہموار داخنوں کی غنائش کرتے ہوئے ایسے سوئے تمہارے بارے میں یہ بات میں محض مفروضے پر مبنی نہیں کہہ رہی۔ میں نے بہت اونچے درجے پر کاروباری طبقوں میں تمہارے تذکرے سنے تھے۔ بہت بڑے بڑے تمہارا اور بیشتر ایکڑوں کو شکر کے بڑے دارمندوں کے بارے میں عموماً خاص معلومات ہوتی ہیں۔ خواہ کی... غیر ضروری سی معلومات۔ جو بعض اوقات بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں“ اس نے حرم سابقہ نگاہ ”میں نے تمہاکہ اس شرمیں محمد افضل چوہدری بھی ہے ایک۔ بہت آدمی۔ جو نظروں میں بھی کھج جاتا ہے۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ تم ہی ہو گے“ وہ خود ٹی انگلی سے میرے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر ہنس دی۔

اس کے ہاتھوں پر عثمانی رنگ کی نعل پوش تھی۔ اس ہاتھ اس وقت بھی گداز تھے جب وہ چتر توڑی تھی۔ ان نعلوں کی نسبت کچھ بھرے بھرے سے لگ رہے تھے اور نظروں ہی نظروں میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان نری دگر از میں اضافہ ہو چکا ہے۔

پھر اس نے دینے ایک کھول کر غیر ملکی سگریٹوں کا پکٹ نکالا اور ایک سگریٹ ہولڈر میں لگانے کے بعد اسے مجھے بھی سگریٹ آفر کی۔ میں نے پکٹ سے سگریٹ ہونے کہا ”میں سگریٹ نہیں پیتا۔ لیکن جب کوئی خاص خصوصاً تم جیسی خاتون آفر کرے تو خواہ خواہ ہی پیئے کوئی لگتا ہے۔“

وہ ہنس دی۔ پھر اس نے اپنی اور میری سگریٹ طائی لائٹ سے سافائی اور ایک طویل کش لے کر وہ میرے چہرے پر پھینکتے ہوئے بولی ”عادی میں بھی نہیں لیکن یومی کبھی کبھی اپنی برائیاں میں ایک برائی کا اضافہ کوئی چاہتا ہے۔ دیتے شکر ہے کہ میں عادی کسی بھی نہیں ہوں۔“

”تمہارے گرانڈ فیلڈ قسم کے والد بزرگوار کا کیا حال۔ میں نے سگریٹ کا لٹکا ساکش لے کر مسکراتے ہوئے ”میرا باپ....“ وہ عجیب سے انداز میں ہنس دی۔ ”اے

پھر مجھے اس کا وہ نیم خیم اور خوفناک صورت باپ یاد آیا جو مجھے میں پڑا ایذا آ رہا تھا پھر مرد سری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک ہندوئی کنڈے سے لٹکائے پھر آتا تھا جو نہ جانے کب سے فلز کرنا بھول چکی تھی۔

مجھے وہ لمبے یاد آئے جو میں اور وہ لڑکی زندگی سے چرایا کرتے تھے۔ میں سمجھتا کہ میں لالی کے باپ سے بچ بچا کر لالی سے ملتا ہوں اور اپنی شوہاری کی بدولت ان ملاقاتوں سے من چاہے انداز میں مستفید ہوتا ہوں۔ بہت بعد میں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ باپ تو اس کھیل میں شریک تھا اور بیٹی کے لئے میں محض ایک احمق سا عاشق تھا جس سے وہ پیسے بوڑھری تھی۔ کبھی کے حساب میں گھٹا کر کر کے میں نے انہیں خوب عیش کرائی تھی اور میری بدولت ابھی خاصی پونجی بٹائی تھی انہوں نے۔

مجھے اس وقت اس بات کا مددہ نہیں تھا کہ لالی مجھ سے رقیس لکھتی رہی تھی۔ دکھ تو اس بات کا تھا کہ اسے مجھ سے کوئی عشق و غیرہ نہیں تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ پر مہر ہے مگر جب میرے پاس رقیس آتا ہندوئیں اور انٹا میرے چھٹنے کا شہرہ پیدا ہوا تو اس نے اس صفائی سے مجھ سے واسن چھڑایا اور اس زحمتی سے مجھے دستکارا کہ میں نے اپنے آپ کو نہایت نچلے درجے کے آدمیوں کا جذبہ امید محسوس کیا۔

وہ اس وقت اس لیے کھیلے اور بیوند زدہ تھے میں وہ کراتا کچھ سمجھ سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب تو وہ جانے کیا شے بن چکی ہوگی۔ اس کی ظاہری شخصیت میں بھی بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ رنگت خاصی نکھر آئی تھی، وہ سلوان بن نہیں رہا تھا۔ نوجوانی کی وہ جوش جو اس زمانے میں اس کے گرد دھانیائے رکھتی تھی اور فانی سے اب بھی محسوس کی جاسکتی تھی اب رخصت ہو چکی تھی۔ مگر اس کی جگہ جس طرح وقت نے اس کے نقوش اور خد خد کو تراشا تھا اس سے کچھ اور ہی طرح کی نواہر آتی اور کشش پیدا ہوتی تھی۔ پہلے وہ سربانی دھوپ تھی تو اب کر اکی چاندنی۔

وہ بھی ایک تک میری طرف دیکھ کر ہنسی تھی۔ شاید وہ بھی چشم تصور سے میری جگہ سیوا کسٹرسٹیشن یعنی کے اس شعلہ صفت اور نوجوان ناظم کپہر کو دیکھ رہی تھی جو سب کی آنکھوں پر ”موقع ہے“ یعنی اس کے خیمے میں آگیا تھا۔

”لالی نے ستارہ بننے کے لئے تم نے یقیناً بہت طویل سفر کیا ہوگا“ پھر خرمیں نے مسکراتے ہوئے دیکھتے لیے میں کہا۔

”یقیناً تمہارے اندازوں سے کہیں زیادہ طویل سفر۔ اور صبر آزما بھی“ وہ یادوں کی بھول بھولوں سے نکلے ہوئے

نے نشوں کے سارے اپنی ایک انگ ہی دیا باہلی۔ اور اب وہ اپنی اسی مظلوم دنیا میں گن رہا ہے۔
 ”آفاق نہیں کوٹھے پر دیکھتے ہی تم پر مہربان ہو گیا تھا؟“
 میں نے جھجکے لیے میں پوچھا۔

”تقریباً یہی ہوا تھا“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”یہ مت سمجھنا کہ میں نے اس پر نوازشات کا کوئی سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ میرے کوٹھے پر گنا سننے آیا تھا۔ حالانکہ گانا دلانا مجھے کوئی خاص نہیں آتا تھا پھر بھی اچھے خاصے باذن لوگ میرے کوٹھے پر آتے رہتے تھے۔ آفاق اس روز تھوڑی سی پیسے ہونے لگی تھا۔ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ گانے کے دوران اس نے مجھ سے دوچار باتیں کیں۔ میں نے اپنی علت کے مطابق بڑے بے تلے انداز میں جواب دیا۔ نہ جانے کیوں آفاق کچھ زیادہ ہی چکر اٹھا۔ اچانک ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ نقشے میں ڈھٹ ہے۔ میرا خیال ہے اس پر کوئی تخلیقی دورہ سا پڑا تھا۔ کہ ایک دم اٹھ کر میرے گرد چکر لگاتے لگا۔ انگلیوں کی مدد سے چوکور فریم سانا بنا کر اس میں میرے چہرے کی تصویر کھینچنے لگے۔ پھر اپنے ساتھیوں سے بولا ”یہ لڑکی اسکرین پر تنہا کھانا کھا رہی ہے۔ یہ پیدائشی لڑکا اس سے.....“

”بالکل صحیح کہا تھا اس نے۔“ میں نے لقمہ دیا۔ ”بڑا ذہین ہے کجھنت!“

وہ ہنس دی۔ پھر سکرٹ کا کش لے کر ایک بار پھر مہربان میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے بولی۔ ”اس نے دوسرے دن مجھے اسٹوڈیو بلایا لیکن میں نہیں گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے، شغل کر رہا ہے۔ فلمی دنیا کے چھوٹے موٹے لوگ اس بازار کی لڑکیوں کو اس قسم کے چکر دیتے رہتے ہیں اور اچھی بجلی حرافہ قسم کی لڑکیاں بیرونی بننے کے پکر میں خوار ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ اس ٹھکر میں ہوتی ہیں کہ چھوٹے موٹے دول ہی ملنے لگیں تو ذرا مار کٹ دیو بڑھ جائے۔ زیادہ آسودہ حال قسم کے لوگ ان کے کوٹھے پر آتے لگیں اور وہ انہیں فخر سے بتائیں کہ وہ کوئی معمولی قسم کی سفیدی یا رنگسا میں نہیں بلکہ ”فلم ستار“ ہیں۔“

میں مسکرایا۔ وہ سکرٹ کو ہولڈر سے نکال کر انہیں ٹرے میں سسلے ہوئے بولی۔ ”بعض بے چاری واقعی بیرونی بننے کے خواب دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں اپنی اوقات کاظم ہوتا ہے۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتیں اور ان پیکروں میں نہیں پڑتی۔ بعض اچھی خاصی خوش شکل اور بھلاہٹ ہونے کے باوجود شو بزنس میں دلچسپی نہیں لیتیں۔ اپنے حالات یا کسی مظلوم نفسیاتی وجوہات کے تحت وہ بس خاموشی سے سر جھکائے کولہو کے

بے چارہ کرانڈل نہیں رہا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے۔
 شوں نے اس کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا۔ شراب پوس ”ایم“ راکٹ ”بم“ بھی تو نہیں چھوڑا وہ۔ میں اسے جتنا سمجھا سکتی تھی سمجھا۔ ان بھڑوں سے بچانے کی جتنی کوشش کر سکتی تھی وہ میں نے کی۔ ہریا بھڑی لگا کر دیکھی۔ تنگ آنکھ میں نے اس کے محل پر چھوڑ دیا۔ ہم ایک دوسرے کی زندگی میں کی مداخلت نہیں کرتے۔“

”بہت افسوس“ وہ سن کر۔ وہ بڑا بے مثل قسم کا پاپ ہے۔
 میں نے کہا۔

”تمہارے لیے میں چھپا ہوا خفیف سا طفرہ بنا ہے“ وہ ہموار لیے میں بولی اور میں ایک بار پھر دل ہی دل میں اس کی دیگر دہیوں کے ساتھ اس کی ذہانت کی دلدور دے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو میرے لیے میں پیچھے ہونے لگتا تو یہ ہی محسوس کر پاتی۔

وہ سکرٹ کا کش لے کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”تم نے تجربے کی روشنی میں چاہے اسے بے غیرت سمجھو لاچی لیکن میرے خیال میں وہ نہ بے غیرت ہے نہ لاچی۔ اسے جتنا بہت مشکل ہے۔ وہ بظاہر ایک جاہلی ”ان پڑھ اور سیدھا ما آدمی ہے لیکن درحقیقت اس کا ذہن کسی دانشور ”منکر یا لسنی سے زیادہ گہرا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے ایک مدت ہائے۔ میرے لئے وہ واقعی ہمیشہ ایک عقیم اور بے مثل آپ رہا ہے۔ مجھے اس کو بہاد ہوتے دیکھ کر شدید دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اب میں اس کے معاملے میں تنگ مٹی ہوں۔ میں خود نس تیزی سے اوپر آ رہی ہوں اس سے میرے اپنے تکبر سے اتنے بڑھتے جا رہے ہیں کہ ان سے غصے کے لئے فولاد کے قصاب چاہئیں۔“

”اچھا چھوڑو ان لوگوں کو دینے والی باتوں کو“ میں نے پہلو ہلے ہوئے کہا۔ ”یہ بناؤ آفاق تمہیں کہاں لانا تھا؟“

”بہر امنڈی میں۔ کوٹھے پر“ اس نے اطمینان سے زاب دیا۔ بعض لڑکیوں کو تو حالات اور مجبوریوں کیل ڈال کر شکایتی ہوئی وہاں تک لے جاتی ہیں۔ اور مجھ جیسی بعض لڑکیوں دولت کا تعاقب کرتی ہوئی اپنی تمام تر پہلاکیوں کے باوجود خود بخود ہی وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ ویسے مجھے اس کا کوئی خاص افسوس نہیں ہے۔ ظاہر ہے میں کوئی ایسی پاکیزہ لڑکی تو نہیں تھی۔ جیسی تمہی وہ تم جانتے ہو۔ میں جتنا عمر بھی کوٹھے پر رہی بڑی شان سے رہی۔ افسوس تو مجھے بس اپنے باپ کا ہے۔ جب تک ہم غریب اور غارت بدوش تھے ”دنیا کی غمو کیوں میں“ اور نور لڑکھتے پھرتے تھے تب تک وہ بڑا دھڑلے کا آدمی تھا اور جب ہماری کچھ قدر بڑھتی ”دنیا سے لطف اندوز“ ہونے کا وقت آیا تو وہ اس دنیا سے ہی قائل ہو گیا۔ اس

ہی لی طرح کو صوفیوں پر ہی دولت سمیٹنے میں لگی رہتی ہیں۔
بعض ایسی ہوتی ہیں جو کسی بھی معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں
رکھتیں مگر ان کی باتیں جو عام طور پر ان کی ٹانگہ بھی ہوتی ہیں
انہیں لگے اور کوھر چمکتی رہتی ہیں۔
”تمہارا تعلق ان میں سے کوئی قسم سے تھا؟“ میں نے
پوچھا۔

”میری جنرل فلم لائن ہی تھی لیکن ابھی میں اس کے
لئے کوئی عکس عملی ہی سوچ رہی تھی کہ اتفاق خود ہی مجھ
سے آن لگرایا۔“ اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”دوسرے روز
اس نے پیغام بھیجا کہ وہ میرا اسکرین ٹیسٹ لینا چاہتا ہے لیکن
میں نہیں گئی۔ اسکرین ٹیسٹ کی آڑ میں بعض لڑکیوں کے
ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس کی وجہ سے یہ اصطلاح ایک مذاق بن
کر رہ گئی ہے۔ مجھے جب اتفاق کا پیغام ملا تو میری ساتھی لڑکیوں
نے اچھی لکھ میری ٹانگہ نے بھی مجھے خوب جھجکا کر ”جا... ری
... جا کے اسکرین ٹیسٹ دے آ۔“ ملائکہ ہمیں یہ بھی
معلوم ہو چکا تھا کہ اتفاق کوئی نام نہاد قسم کا فلسفہ یا بد اشتکار
نہیں ہے پھر بھی ہمیں اس کی بات کا یقین نہیں تھا۔ کئی
لڑکیوں کے قصے ہمارے علم میں تھے جو اسکرین ٹیسٹ اور نہ
جانے کون کون سے ٹیسٹ نہ جانے کن کن لوگوں کو دے کر
واپس آچکی تھیں اور ان کے قصے میں صرف دھڑے ہی آئے
تھے۔“

”اور دھڑے بھی مشکوک قسم کے۔“ میں نے لقمہ دیا۔
”مشکوک کیا؟ سمجھو۔“ وہ پلویڈل کر بولی۔
”کئی عرصہ پہلے کا ایک قصہ بھی ہمارے مڑی تھا۔ ایک صاحب
تھے جو ہر عرصے عرصے بعد اخبار میں اشتہار دے دیتے تھے
کہ ایک فلم کے لئے نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ ڈاک کے
ڈھیر لگ جاتے تھے تو ہر سب خواہش مندوں کو مطلع کروا جاتا
تھا کہ ان کا اسکرین ٹیسٹ لیا جائے گا جس کا خرچ انہیں ہی
پرداشت کرنا ہوگا۔ یہ کوئی اتنا زیادہ غیر منصفانہ معاملہ محسوس
نہیں ہوتا تھا اور ہیرو ہیروئن بننے کے خواہش مند ان سستے
زائروں میں بھی دو چار سو روپے کی کس بیچ بڑا کرتے تھے۔ ظاہر
ہے اچھی خاصی رقم جمع ہو جاتی ہوگی۔“

”یقیناً“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ میں توجہ سے اس کی
باتیں سن رہا تھا۔ وہ یقیناً اس دنیا کی بھیری ہو چکی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ صاحب مقررہ
تہنوں پر خواہشمندوں کے گروپ بنا کر انہیں کسی وزیران
مقام پر لے جاتے تھے کہ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں اسکرین
ٹیسٹ لیا جائے گا۔ وہاں امیڈوارے چارے باری باری
کیمرے کے سامنے بڑے جوش و خروش سے ڈانڈا لگ
رہتے رہتے تھے۔ لڑکیوں تو بڑے بڑے متاثر کن رقص بھی

پیش کرتی تھیں۔ ان بے چاروں کو یہ معلوم ہی نہیں
کہ کیمرے میں ریل تک نہیں ہے۔ کرائے کا کیمرا جو
چل رہا ہوتا تھا۔ انہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک
عرصے تک یہی دھندل کرنے والے وہ صاحب آج کل
بڑے فلسفہ اور ہدایت کار ہیں۔ اپنے پاس آئے وار
ٹھار امیڈواروں میں سے تو معلوم نہیں انہوں نے کسی
ہیروئن بنایا یا نہیں تمام خود وہ انہی کے پیسے سے لڑ
میں کامیاب ہو ہی گئے۔“

”حیرت ہے؟“ میں نے پلکیں جھپکائیں۔
”میں بتانے اصل میں یہ لگی تھی کہ کسی زمانے میں
سالوی سی لڑکی بھی اسکرین ٹیسٹ دینے ان صاحب۔
پتی تھی۔“ ستارہ بولی۔ ”اس روز راوی کے کنار
سنان مقام پر ”شوٹنگ“ ہو رہی تھی۔ حسب معر
کیمرا چل رہا تھا اور وہ محترمہ بڑے جوش و خروش سے
کر رہی تھیں کہ حقیقی شوٹنگ کے سلسلے میں ایک ناز
ہیرو صاحب وہاں پہنچ گئے جن کا وہ عرصہ کا زمانہ تھا۔ ا
موصوف رہنا ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں وہ صرف
ہیروئی نہیں تھے، عملی زندگی میں بھی ہیرو نظر آنے کا
کوشش کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ حضرت بد معاش
بھی پاؤں رکھتے تھے۔ اس روز بھی ان کے ساتھ ہیروئن
کے علاوہ دو تین چچے بھی تھے۔ موصوف کی نظر
رقص کرتی ہوئی اس سالوی سی لڑکی پر پڑی وہ اپنی شوٹنگ
کو بھول گئے۔ وہ حضرت اس حد تک جذباتی ہوئے کہ
کو اٹھا کر اپنی کار میں ڈالا اور فرار ہو گئے۔“

”اوہ.....“ میں نے کبھی سی سنی بولی۔
”تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ لڑکی بعد میں
بہت بڑی ہیروئن بن گئی۔“ ستارہ نے یہ کہہ کر تھی
ملائی۔
”وہ کس طرح؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
”دراصل ان صاحب نے جنہوں نے وہ نام نہاد
بنائی ہوئی تھی“ اس واقعے سے ذاتی طور پر بڑی ذہور
محسوس کی۔ تاکہ ہیرو صاحب کے سامنے ان کی کوئی
نہیں تھی لیکن سر حال ان کے پاس اتنا تھی جو عام
ہوئی تھی۔ در ایک اخباروں میں ان کے تھوڑے
تعلقات تھے۔ وہ وہاں جا کر روئے پٹے۔ اخباروں کو
چنگارے وار خبر ہاتھ آگئی۔ دوسرے دن بڑی بڑی سر
گمیں کہ نامور ہیرو صاحب نے دن دھاڑے ایک نو آدم
کو اغوا کر لیا۔ معاملہ کچھ عکین ہو گیا۔ تھانے کچری
آگئی۔ بڑے ہیرو صاحب نے لڑکی سے کہا کہ اگر د
میں کہہ دے کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ خود!

رومانی ناول

75/-	سلی رعنا	دل کا آئین
75/-	سلی رعنا	کالے کنول
100/-	سلی رعنا	اور دیا جلا رہا
100/-	سلی رعنا	موج گرداب

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

تکیے میں منہ چپا کر رونے والی عورتیں سوچو نہیں ہوں گی؟ یہاں کسی کے لئے سب کچھ قربان کر دینے والے مرد نہیں ہوں گے؟ بات صرف یہ ہے کہ تم خود زندگی کے راستے پر بہت آگے نکل گئی ہو۔ وقت سے پہلے تم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ لہذا جذبات تمہاری زندگی سے نکل گئے ہیں۔

"کیا واقعی تمہارا میرے بارے میں یہ خیال ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے اور ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

"فکر تو یہی آتا ہے۔" میں نے محاکمہ لیتے میں جواب دیا۔

"خیر... وہ باتوں میں انگلیاں پھیر کر سر جھٹکتے ہوئے بول۔

"میں فی الحال تم سے اس معاملے میں بحث نہیں کروں گی کہ میری ذات میں جذبات کو دخل ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کس حد تک۔ میں تو اتفاق کی بات کر رہی تھی۔ تقریباً سبھی ہیروئینوں کے ساتھ کام کیا ہے اس نے کسی اور کے بارے میں تو کبھی جذباتی نہیں ہوا۔"

"انسان ہر ایک کے ساتھ تو جذباتی نہیں ہوتا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جذباتی تو وہ بھی ہوتا ہے جب کوئی ایسی ہستی نظر آتی ہے جس کے بارے میں دل گواہی دتا ہے کہ یہی تو ہے وہ جس کی عمر میرے تلاش تھی۔ میرا خیال ہے کہ اتفاق کے لئے وہ ہستی تم تھیں۔ وہ تم پر پہلی نظر میں ہی عاشق ہو گیا تھا۔"

"لیکن میں اس پر عاشق نہیں ہو سکتی" وہ صاف کوئی سے بولی "اس کی ایک خاصی مقبول سی بیوی ہے جنہیں خالص بڑے چہچہے ہیں۔"

"تو کیا بے چارے شادی شدہ آدمی کو کسی پر عاشق ہونے کا حق حاصل نہیں؟" مجھے اس کے انداز پر ہنسی آئی۔

"میں نے یہ کب کہا؟" وہ نہایت معصومیت سے بولی۔

"میری شرف۔۔۔ اسے پوری لاری احاطت ہے کہ وہ مجھ کو روک

بہر صاحب کے ساتھ ایک اور جگہ شوٹنگ دیکھنے گئی تو وہ اسے لازماً فلموں میں کام دلوائیں گے۔ لڑکی نے یہ بڑا اپنے کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے بھی اس نے سوچا ہو گا کہ جو ہونا چاہا وہی چکا۔ اس نے بہر صاحب کی بات پر عمل کیا اور پھر بہر صاحب نے واقعی اسے ایک فلم میں کام دلوا دیا۔ ایک کلب سر کا مول تھا۔ ظاہر ہے اس رول میں لو اکاڑی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی مگر اس چھوٹے سے رول نے ہی اسے اس سے کہیں بچا دیا۔ بعد میں وہ صنف اول کی بہر و گن بنی اور بہر صاحب سے طویل عرصے تک اس کا عشق بھی چلا۔

"بہت خوب" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اس قسم کے واقعات کی وجہ سے ہمارا کسی خوش قسمی چلا ہونے کو بھی نہیں چلا رہا تھا۔" ستارہ اصل موضوع پر جے ہوئے بولی۔ "اور پھر اتفاق نے مجھے بہر و گن لینے کا ارادہ ہر کیا تھا۔ ایک اُردو فلم میں جبکہ اس وقت میرا اُردو کالج بھی سٹ نہیں تھا۔ اس لئے میں کچھ زیادہ ہی بے چینی میں چلا۔" بھلا کوئی اتنا بڑا رسک کیسے لے سکتا ہے؟ لیکن بعد میں ان اندازہ ہوا کہ وہ واقعی اپنی دیکھنے کے بارے میں بے حد بد تھا۔ وہ کئی بار خود آیا اور سمجھا بجا کر مجھے ساتھ لے گیا۔ لی تاکہ بھی شروع میں ساتھ جاتی رہی۔ کچھ عرصہ پہلے کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"پہلی فلم میں اتفاق نے تم پر بہت محنت کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں۔ میں بہت تیزی سے ہر چیز دیکھ لیتی ہ۔" وہ بولی۔ "لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس نے بہت رسک ضرور لیا۔ میری خاطر اپنے فائرسے بھی لڑا اور اپنی ناکوشوں کا کوئی خراج وصول کرنے کی بھی اس نے شش نہیں کی۔ اپنے کام کے ساتھ وہ بہت مختص ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ صرف کام سے ہی نہیں تم سے بھی لیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ظہور میرے دل میں بھی اس کے لئے کافی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ خاصا جذباتی آدمی ہے" وہ طویل کش لے کر بولی "ملا کہ وہ ایک طویل عرصے سے انڈسٹری میں ہے۔ اب تک اسے جذباتیت سے نجات مل کر لگتی چاہئے تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اسے صرف سٹیو لائیڈ کے نیچے پر جذبات کی تجارت کرنی ہے۔ اپنے حقیقی جذبات تو سب نے اپنی ذات سے نکال کر نہ لے کر رکھ دیے ہیں۔"

"خیر۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ہر جگہ ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ یہاں کسی کی محبت میں چلا ہو کر راتوں کو

”اس کا مطلب ہے اس میدان کے لئے مجھے نماز
آوی مل گیا ہے؟“ میں نے غلطی سے کہا۔
”آوی کیا تمہیں میرا مل گیا ہے میرا؟“ وہ بولی۔
”اور یہ میرا خودی چل کر میرے پاس آیا تھا“ میں
”اس معاملے میں تم ہمیشہ خوش قسمت رہے ہو
شر سے انداز میں مسکرائی۔ ”بڑے سے بڑے حالات
تمہیں میرے میسر آ جاتے ہیں۔“ جیسے اس دور آلودہ
کے ایک پیلے کیلے نیچے میں تمہیں میں مل گئی تھی۔
”ہاں، واقعی....“ میں ہنس دیا۔ ”تم تو کچھ زیادہ
حل قسم کا میرا تمہیں لیکن ہاراشیدہ۔ تراش خراش
اب کھل ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تم وہی جانی
اور خانہ بدوش لڑی ہو۔“

”دیکھو.... یہ باتیں تمہاری میں تو ٹھیک ہیں۔ کم
میں بیٹھ کر اور خصوصاً کسی اخبار نویس کے سامنے تو اس
بات کبھی مت کرنا“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”تم۔
ہمت سے اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے
اتر یوز نہیں پڑے۔ ان کے مطابق میرا خالق بدلہ
ایک خامے معزز گھرانے سے ہے جہاں میر
لمبکداری وغیرہ کرتے تھے۔ چھوٹی سولی سڑکیں اور
موٹے ہل وغیرہ تعمیر کرنے کے ٹھیکے لیا کرتے تھے
شوٹک دیکھنے لاہور آئی تھی جہاں ایک فلم کے سیٹ
صاحب نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً اپنی اگلی فلم میں کام
پیشکش کر دی۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”اور.... ہاں....“ میں نے بیٹے ہوئے کہا ”مجھے
کہ میں نے اس قسم کا شمار کوئی اٹریو پڑھا تھا
تصویروں میں بھی دیکھیں تھیں۔ لیکن ظاہر ہے تصور
بھی تم پر زبردست طبع چڑھا ہوا تھا اور تحریر میں بھی
مجھے کمان بھی نہیں گزرا تھا کہ تم لالی ہو۔ بہر حال۔
پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس میدان میں آ
ہوں لیکن مجھے یہاں کے آداب معلوم ہیں۔ زمانے
نے ہی بہت کچھ نہیں سیکھا، ہم نے بھی سیکھا ہے۔
”وہ تو فکر آ رہا ہے“ وہ فوراً بولی۔ ”پھر اس
مخصوص ادارے بے نیازی سے ہاں کو جھٹکا دیا“
کردی تھی۔ شوہر نے اس کے تقاضوں کے مطابق میر
بھی کئی برسوں اور میں نے خواہ اپنا کتنا بھی اچھا بنایا
دوسری ادارہ کاروں کی طرح اپنی اصلیت بے نقاب ہو
اندیشے سے خوفزدہ نہیں رہتی۔ اٹریو کے لوگوں
تک کی کفایت معلوم ہی ہے۔ اگر سب لوگوں کو
معلوم ہو جائے تب بھی مجھے کوئی خاص پروا نہیں
ہو گی۔“

وہاں سے عاشق رہے۔ میں ہرگز برا نہیں مناؤں گی لیکن جواباً
وہ میری طرف سے عشق کی توقع نہ رکھے۔ اگر میرا دل کھتا تو
میں بھی ضرور اس پر عاشق ہو جاتی۔ مگر میرے دل نے ابھی
تک مجھے ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا۔ اور اسے وہ خود اپنے کو بھی
میرا دل نہیں چاہتا۔ اسی لئے میں پچھلے دنوں اس سے دور ہوتی
چلی گئی تھی۔ اور وہ کاروباری طور پر نوٹ پھوٹ رہا تھا۔ مجھے
معلوم تھا کہ اس قسم کے لوگ اس قسم کے حالات میں زیادہ
جذباتی ہوتے رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات سے ان کے دل کو
غصے لگ جاتی ہے۔ ایسے میں اس سے دور رہنا ہی اس کے
حق میں بھی بہتر تھا اور میرے حق میں بھی۔ مجھے معلوم ہے کہ
اس نے مجھے خود غرض ہے جس اور نہ جانے کیا کیا سمجھا۔ اور
کہا ہو گا۔ شاید دل ہی دل میں اور عین ممکن ہے کہ کسی کے
سامنے یہ بھی کہا ہو کہ آخر میں نا طوائف کی طوائف....
”نہیں۔ کم از کم مجھ سے اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی
میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”بلکہ سچی بات تو یہ
ہے کہ میرے سامنے اس نے تمہارے بارے میں کوئی خاص
جذباتیت کا مظاہرہ بھی نہیں کیا بلکہ اس کے رویے سے مجھے تو
اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کبھی تمہارے بارے میں اتنا
جذباتی رہا ہے یا سنجیدگی سے تم پر عاشق رہا ہے۔“
”بھئی وہ تو یوٹی پیچوں کو چھوڑنے پر تیار پھر رہا تھا۔ ستارہ
بولی۔

”حیرت ہے....“ میں نے دھچکے لیے میں کہا۔ ”بہر حال
اب تو یہاں لگتا ہے کہ کام کے سوا اسے کسی بھی چیز سے دلچسپی
نہیں رہی۔“

”میرا اس سے دوری اور رکمان اختیار کرنا اس کے حق
میں بہتر رہا ہے۔ اور اس عرصے میں اس نے گویا دوسرا جنم لے
لیا ہے۔ ستارہ بولی ”مجھے خبر ملی کہ اسے کوئی بہت محظوظ کر ملی
گیا ہے اور وہ بڑے ذور شور سے دوبارہ فلسا سازی شروع کرنے والا
ہے تو میں دوبارہ اس سے ملنے کا پروگرام بنانے بغیر نہ رہ سکی۔
فلموں کی میرے پاس کسی نہیں ہے اور اگر میں ہر امرے
غیرے کی فلم پکڑنا شروع کروں تو پھر میرے دروازے پر
فلسا سازوں کی بہت طویل قطار لگ جائے لیکن آفاق سے میں
نے خودی دوبارہ رابطہ قائم کیا تو اس سے وہ کی سمجھ رہا وہ گاٹیں
زیادہ سے زیادہ فامیں حاصل کرنے کی ہوس میں جھلا ہوں اور
مطلب کی خاطر دوبارہ اس کی طرف آئی ہوں۔ حالانکہ بات
صرف اتنی ہے کہ میں اس کی فلم کو دوسرے بہت سوں کی
فلموں۔ ترجیح دیتا چاہتی ہوں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی۔ اور
ایک چیز یہ بھی ہے کہ اس کیفیت کو واقعی فلم بنانے کا
میل ہے۔ اس کی فلم میں کام کرنے کے بعد انسان کو اپنے

نہ خنزیر ہوتا چھوڑ دیا ہے۔"

"مجھے اندازہ ہو چکا ہے" میں نے سر ملاتے ہوئے کہا۔

اب میں نے گہری دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اپنی اور آفاق کی بات پر اتفاق دیکھ کر اس کرلی۔ کام کی کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔"

"دراصل ہم ایک زمانے کے بعد ملے ہیں۔ نہ جانے

یہ انتخاب سے گزر کر آج پھر ایک دوسرے کے سامنے

پہنچے ہیں۔ جانے اس میں تقدیر کی کتنی مصلحت ہے۔ ہاں کہ

م دنوں کا وقت بہت قیمتی ہے لیکن اسے برسوں کی رو داو

کے لئے اگر ہم نے چند منٹ ضائع کر دیں تو کیا ہوا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" میں نے کہا "مجھے تو اتفاق کا

خیال آیا تھا۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ ہم نہ جانے کن کیمپوں میں

پہنچے۔ ویسے بانی دیوے..... پراسوز اور گھرائی آگئی ہے

مارے لیے ہیں۔"

"ذات میں بھی آگئی ہے لیکن وہ ابھی تم محسوس نہیں

کر سکرے۔" وہ انہی غمور سی آنکھوں سے میری آنکھوں میں

بھاگتے ہوئے بولی۔ "ویسے بانی دیوے..... تم واقعی بڑے

ایک خاک کاروباری آدمی ہو گئے ہو۔"

"دفتر میں بیٹھا ہوں تو کاروبار خود بخود ہی مجھ پر سوار ہو جاتا

ہے۔" میں نے کہا "دفتر سے اٹھنے کے بعد میں کاروبار کو بھول

جاتا ہوں۔ بشرطیکہ کوئی ایمر جیسی نہ آئے۔ پڑے۔ تمہیں

میرے بارے میں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ میں کتنا سوشل

آدمی ہوں؟ مختلف سماجی طبقوں سے کیسے مراسم ہیں میرے؟

"ہاں۔۔۔ کچھ انٹرویو انٹرویو کی خبریں سننا تمہیں" وہ ہنس

تے لہجے میں بولی۔

میں نے فی الحال اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں

سمجھا اور اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ "کام کی بات

شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ

ہم آفاق کی وہ دونوں فائیں نے سرے سے ہمارے ہیں جو

مظفر رشید کی موت اور پھر آفاق کے حالات کی وجہ سے

اوجھڑ رہ گئی تھیں۔ ان میں سے چند طریقیں اگرچہ اب بھی

بیرونی طور پر استعمال ہو سکتی ہیں لیکن میں نے سوچا ہے کہ

فائیں نے سرے سے نیا بیانیہ بنایا۔ دونوں کی بیرونی

لاہر ہے۔ تم ہی ہوگی۔ تمہارا معاوضہ آج کل کیا جا رہا ہے؟"

"معاوضہ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔

ہے۔ میں یہ اعتقاد دعویٰ نہیں کروں گی کہ مجھ میں دولت کی

طلب ختم ہو گئی ہے لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ اب کچھ قرار سا

آگیا ہے۔ اہمیتان سا ہو گیا ہے کہ دولت اپنی دسترس میں ہے۔

رفتہ رفتہ آتی جائے گی۔ جس زمانے کا تصور تمہارے ذہن

میں ہے اس زمانے میں تو پیسہ ایک خواب تھا۔ اس لئے اس کی

ہوس زیادہ تھی۔ اسی لئے ہم اس پر بھوکے کتوں کی طرح

بچنے تھے۔ اس کی خاطر روح، جسم، جذبات اور انفرادیت ہر

چیز کا سودا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اب حالت اتنی بری

نہیں رہی۔ دوسروں کے ساتھ تو میں اب بھی پیسوں کے

معاملے میں بڑی بر لحاظ ہوں لیکن اب تمہارا اور آفاق کا معاملہ

ظاہر ہے بہت مختلف ہے۔ تم جو بھی رقم کنٹریکٹ میں لکھ دو

کے میں اس پر آگے بند کر کے سامن کر دوں گی۔ اگر کچھ بھی

نہیں دو گے تب بھی کام کروں گی اور شاید پیشہ کرتی رہوں

خواہ میری مصروفیات کتنی ہی بڑھ جائیں۔"

"تمہاری ذات میں تو واقعی انقلاب آگیا ہے" میں نے

حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں اس کی غصانہ و شکش

سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بڑے آہستہ سے انداز میں مسکرائی۔

"لیکن ہم تمہاری اس شکش سے کوئی فائدہ نہیں

اٹھائیں گے" میں نے پیچیدگی سے کہا۔ "تم نے اب تک

زیادہ سے زیادہ رقم کا جو کنٹریکٹ سامن کیا ہے ہم تمہیں اس

سے دس ہزار زیادہ دیں گے۔ کیونکہ ہم یہاں ایک بڑا کاروباری

ادارہ قائم کر رہے ہیں" دوستوں کے تعاون سے چلنے والا کوئی

خیراتی ادارہ نہیں۔ گزارش بس اتنی سی ہے کہ دوستی میں

ہمارے کام کو دوسروں کے کام پر تھوڑی سی ترجیح دینا۔ اگر کبھی

معاہدوں سے بہت کر بھی کچھ تعاون کرنا پڑے تو دریغ نہ کرنا

"یہ تو وقت بنائے گا کہ میں تمہیں اور تمہارے ادارے

کو کتنی ترجیح دیتی ہوں" وہ مسکرائی۔

"کمالی تو دونوں فلوں کی تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگی۔

کیونکہ ظاہر ہے تم دونوں فائیں آدمی سے زیادہ مکمل

کر اپنی تھیں۔ اس لئے اپنے کردار وغیرہ کے بارے میں

تمہیں کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں میرا

خیال ہے تم ابھی اور اسی وقت کنٹریکٹ سامن کر سکتی ہو؟"

میں نے کہا۔

"ظاہر ہے" اس نے کندھے اچکائے "اس کے لئے

مجھے کوئی سوچ بچار تو کرنی نہیں ہے۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "ہم اس سے ادارے کی فلم

سینک کا آغاز اپنی دو فلموں سے کر رہے ہیں۔ ویسے میری

کوشش ہوگی کہ ہم ایک وقت میں صرف ایک فلم پر ہی توجہ

دیں اور اسے مختصر ترین مدت میں عمل کر کے ایک ریکارڈ قائم

”ہماری کمائیوں کے لحاظ سے تو مظفر رشید ہی موزوں ترین آدمی تھا اور اس وقت انڈسٹری میں مجھے اس کا کوئی متبادل نظر نہیں آتا۔ ایک نوجوان ہے جو فی الحال ٹائری کر دار اور اگر ہے۔ اگر اسے مسلسل کئی چانس ملیں تو شاید وہ مظفر رشید جگہ لینے میں کامیاب ہو جائے لیکن فی الحال ہم اس پر راز نہیں لے سکتے۔ کیونکہ اس کے بارے میں میں اس طرح بڑا حسد نہیں ہوں جس طرح میں کسی نے یا چھوٹے اور انکار کو بڑے بدل میں کھٹ کرتے وقت ہوتا ہوں۔“ اس نے ”پھر تم نے کیا سوچا ہے“ میں نے غصے لفظ میں سوال دہرایا۔

”اگر مارکیٹ ویلیو کے حساب سے دیکھا جائے تو وقت سلمان سالی ٹاپ پر ہے۔ لیکن اسے ڈائریکٹروں فلسفہ آؤں نے عجیب ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ سوائے بے مارڈاؤ کے اس سے کوئی کام ہی نہیں لیتے حالانکہ وہ بہت ایکٹو ہے۔ بہت ایکسپرینس ہے اس کے پاس بشرطیکہ کوئی سے کام لے۔ ہنپ بہرہ بنادیا گیا ہے اسے۔ میں اسے کاسٹ کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ مارڈاؤ ہماری فلم میں بھی ہے لیکن ساتھ ہی ایکٹنگ اور ایکسپرینس کے بھی زبرد مواقع موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سلمان سالی خود بھی تبدیلی کو پسند کرے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم اسے کاسٹ کرلو“ میں نے کہا ”ہا میری ایک تجویز تھی۔ حتیٰ فیملہ بہر حال تمہارا ہی ہو گا۔ فلم ”مندی“ کی جو کہانی تم نے مجھے سنائی ہے اور جو ما میں نے دیکھی ہیں اس کے لئے تو سلمان سالی مجھے مناسب محسوس ہوتا ہے۔ البتہ دوسری فلم ”چائن ڈیٹو“ ”آئین کا اجلا“ کے لئے میں راشد کو بہت موزوں محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی میں نے ایک دو فلمیں اور بہت تصویریں دیکھیں ہیں۔ بڑا جاندار ایکٹر ہے۔۔۔۔۔ اور پھر اردو پنجابی دونوں ہی فلموں میں بڑی مارکیٹ ہے اس کی۔“

”اس کا مطلب ہے ان معاملات پر انچی خاصی گہری ہے آپ کی۔“ آفاق بخور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا ”آپ اسٹے لاطلم معلوم نہیں ہو تے جتنے نظر آتے ہیں پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”خود میرے ذہن کی کیا تھا۔ خصوصاً ستارہ کے ساتھ راشد کی جوڑی بہت بچہ کی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ راشد بہت ہی لالچی غیر متجربہ اپنے کیریئر کے معاملے میں قطعاً بے پروا آدمی ہے۔“

سالی کے پاس حالانکہ اس سے زیادہ فلمیں ہیں مگر وہ اپنے میں بڑی باقاعدگی رکھتا ہے۔ اپنے اپنے ہونے شینڈل ڈھنڈلان پابندی کرتا ہے۔ جینڈہ راشد کا یہ عالم ہے کہ سینٹ کرتے کرتے کسے کا کہ میں ذرا باہر سرکھٹ پیتے جا رہا ہوں

کریں اور اس کے بعد اسی رفتار سے دوسری فلم مکمل کرنے میں بھرت جاتیں۔ میں بہت تیز رفتاری سے کام کرنے کا عادی ہوں۔ یہ تو محض ابتدا ہے جو میں تمہیں اسٹے آرام سے بیٹھا نظر آ رہا ہوں۔ جب کام کا آغاز ہو جائے گا تب تم مجھے اتنی باتیں کرتے نہیں دیکھو گی۔ اور جب میرے سامھی میری خفا کے مطابق کام کرنے کے عادی ہو جائیں گے تو پھر میں تمہیں یہی شلڈر ہار دی نظر آیا کروں گا۔ مجھے اپنے دو سرے معاملات کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے جن سے مجھے اصل آمدنی ہوتی ہے۔“

پھر میں نے انٹر کام پر آفاق کا نمبر دیا۔ وہ گویا پتھری بیٹھا تھا۔ اس نے فوراً دوسری طرف سے ریسور اٹھایا۔

”آفاق! ستارہ سے میری بات ہو گئی ہے۔ آنکروں قلوب کے کنٹرکٹ تیار کر لو اور ستارہ سے سائن کرالو“ میں نے کہا۔

”بہت بہتر“ اس نے ہوا لہجے میں کہا۔

چھ لہجے بعد وہ دو فارم لئے ہوئے میرے کیمین میں آیا۔ نہایت خوشگوار ماحول میں کپ شپ کے دوران فارم بھرے گئے اور ستارہ نے واقعی اندراجاٹ پر ایک نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی اور سائن کر دیے۔

”خدا انہم سب کو یہ آغاز مبارک کرے۔“ میں نے خود ہی اپنے آپ کو دعا دی۔

”آمین۔“ ان دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

”اب میں چلتی ہوں۔“ ستارہ گھڑی دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے اسے خدا حافظ کہہ دیا اور وہ رخصت ہو گئی۔ کمرے میں ایک مخصوص سبک باقی رہ گئی جو دیر تک اس کی یاد دلاتی رہی۔

اس کے جانے کے بعد آفاق مختلا لہجے میں بولا۔ ”مرا آپ ستارہ کو کس زمانے سے جانتے ہیں؟“

”جب تم نے اسے دریافت کیا“ اس سے بس ذرا پہلے سے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جن گلی کوچوں میں

تمہارا آنا جانا رہا ہے وہیں سے تمہارا بہت گزر تمہارا بھی رہا ہے۔“ اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ ایک لمحے کے توقف کے

بعد میں نے کہا ”اب تم جلد از جلد اپنی کاسٹ مکمل کر لو تاکہ اس کے بعد شرنک کا شینڈل تیار کیا جاسکے۔ تمہارے اندازے کے مطابق کاسٹنگ کا کام کب تک مکمل ہو جائے گا؟“

”ایک ہفتے یا زیادہ سے زیادہ دس دن میں“ آفاق نے جواب دیا۔

”دیئے تو تم جو مناسب سمجھو دی کرنا۔ لیکن اگر ہو سکے تو صرف ہیرہ کے معاملے میں مجھ سے مشورہ کر لینا۔ تمہارے ذہن میں کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

پرسکون تھا۔ اس کے چہرے پر شلوہ بخاری کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ ایک دلیر اور خوش شکل نوجوان تھا لیکن اس میں لڑکیوں کو شاید اس لئے کشش کی کمی محسوس ہوتی ہو کہ اس کے چہرے پر موت کی سی سرد مہری طاری رہتی تھی۔ بعض اوقات تو اس کا چہرہ بالکل کسی مجسمے کا چہرہ محسوس ہوتا تھا اور آنکھیں کسی شفاف بھورے پتھر سے تڑپتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

بابر سینہ رمضان کی سیاہ مریدین موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ شفیع شلوہ نے سنبھال لی۔ ایئر پورٹ کی حدود سے نکلنے ہی میں لے پوچھا ”مسئلہ کیا ہے؟“

”ایک تو یہ سلا کوئی بھی مسئلہ ہو تو فوراً میرے چہرے کی منڈیر سے جھانکنے لگا ہے“ سینہ رمضان نے اپنے آپ کو ایک موٹی سی گلا دی۔

”خیر... اپنی اتنی زیادہ عزت افزائی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے چہرے کی منڈیر سے جھانکنے والے مسائل کو میرے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا پڑھ سکے۔ تمہیں اس مسئلے میں زیادہ فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ مسئلہ بتاؤ“ میں نے اسے شوکا دے کر کہا۔

”میں نہیں چاہتا کہ تمہارے آتے ہی ہم مسائل کا اوجھار کھاد کھول کر بیٹھ جائیں“ سینہ رمضان پہلو بدلتے ہوئے بولا ”تمہارے لئے ہوئی میں کمر ابریز رہے وہاں چلنا ہے تو چلو، ورنہ گھر چلو۔ آرام سے کھانا انا کھاؤ۔ چائے پلاؤ۔ اس کے بعد بیٹھ کر کپ شپ کریں گے اور آخر میں مسائل پر چرچا خیال کریں گے۔“

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ زندگی کے بارے میں میرا فائدہ مولا کیا ہے۔ میں کروا اپنے کھانا ہوں۔ یعنی مشکل کام پہلے کرتا ہوں، میٹھ و آرام بعد میں“ پھر میں نے شفیع کا کانٹا حاشیہ ہونے کا ”ہوئی کی طرف ہی لے چلو۔“

اس نے حذر کر دیکھ بغیر آگے بڑھنے سے انہیں میں سر ہلایا۔ میں ایک بار پھر سینہ رمضان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”راستے ہی میں مجھے سب کچھ بتا دو۔“

”نیک ہے“ سینہ رمضان گہری سانس لے کر بولا ”ہم

لے ہوئی قبر کرنے کی غرض سے یہاں جو ایک نئی پرائیویٹ لینڈ کینی قائم کی تھی اس کا چرچا تھا۔ دار سینہ کرامت دعا دے گیا ہے۔ صورت حال اس وقت یہ ہے کہ میری نیکاشاں طر کا پوسٹل نمبر ہمارے کالڈزات لے کر اس کینی سے مذاکرات کرنے امر کر گیا ہوا ہے جس کے نام سے ہم یہاں ہوئی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کالڈزات میں سینہ کرامت کا نام بھی شامل ہے اور اس کی ایڈمنسٹریٹر وغیرہ کی تفصیل بھی درج ہے۔ خیر نے مجھے ٹینکس کے ذریعے مطلع کیا کہ مذاکرات

ب لوگ سیٹ پر بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہ جائیں گے اور اگلے روز مختلف ذرائع سے پتا چلے گا کہ وہ تو کسی حسین ساتھی کے ہمدردی کے کسی ہوئی میں پڑا ہے۔ جن لوگوں نے بھی اسے ٹکٹ کیا ہوا ہے، ان میں سے بیشتر سر پر ہاتھ رکھ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اس کا بھی عالم رہا تو قسمت کب تک اس کا ساتھ دے گی۔“

”تم اس سے صرف کنٹریکٹ سائن کروالو۔ اس کی پابندی کروانا میرا کام ہوگا۔“ میں نے کہا ”لیکن شرط صرف یہی ہے کہ تم اسے فلم کے لئے موزوں محسوس کرو۔“

”موزوں نہیں“ وہ موزوں ترین رہے گا۔“ اتفاق نے کہا۔

”جی تو پھر تم اسے سائن کر کے باقی ٹکٹ بھی مکمل کرلو اور کام شروع کرنے کے انتظامات کرلو۔ میں اب فلم کی

صورت پر ہی آؤں گا۔“ میں نے کرسی کے پچھلے سے نیک لگاتے ہوئے کہا۔ ”صورت بڑی دھوم دھام سے ہونی چاہئے

اور پبلیٹی کے پہلو کو نظر انداز مت کرنا۔ میں اس دوران چند روز کے لئے کراچی ہو آؤں گا۔ مجھے وہاں اپنے چند کاروباری

مسائل کا جائزہ لینا ہے۔ یہاں تمہیں کسی معاملے میں مگر مٹیا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے دو آدمی

جن کی موجودگی کو کوئی محسوس نہیں کر سکے گا، ہر وقت اس آؤں گے اس پاس موجود رہیں گے۔ قانونی معاملات کے

لئے میرا وکیل موجود ہے۔ مالی معاملات کی صورت یہ ہے کہ ایک اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے موجود ہیں جس پر تمہارے

سائن چلیں گے۔ اس کے علاوہ اگر بنگالی طور پر رقم کی ضرورت پڑے تو تم میرے بل والے آؤں میں جنرل منیجر کو

فون کر کے منگوا سکتے ہو۔ کسی بہت سی ذمہ داریوں میں میری ضرورت ہو تو اسی جنرل منیجر سے میرا کوئی نہ کوئی فون نمبر لے

سکتے ہو۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں کس وقت کہاں موجود ہوں۔ اور کوئی مسئلہ؟“

اتفاق نے ایک لمحے سوچا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میرے خیال میں اب اور کوئی مسئلہ نہیں رہا۔“

”جی تو پھر مجھے اجازت۔“ میں نے انھ کو ریک سے اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں یہیں سے سیدھا ایئر

پورٹ بارہا ہوں۔“



کراچی ایئر پورٹ پر صرف شفیع شلوہ ہی نہیں بلکہ سینہ رمضان بھی مجھے گئے آیا ہوا تھا۔ وہ کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا آہنی خالی از طاعت نہیں تھا جبکہ اس کے چہرے پر بھی بارہا بیٹھ ہوئے تھے۔ مجھے ہوا میں کسی گڑبڑ کو محسوس ہوئی۔ تاہم مجھ سے کچھ ملنے ہی اس کا چہرہ صحیح حالت پر آیا اور اس کے سینے میں گرجوٹی بھی آگئی۔ شفیع شاہ پیش کی طرح

ابلیس مصر	الماس ایم۔ اے۔ ۱/۱
حسن بن صباح	الماس ایم۔ اے۔ ۱/۱
راجہ ماری	الماس ایم۔ اے۔ ۱/۱
انور الدین زنگی	الماس ایم۔ اے۔ ۱/۱
سلطان عادل	الماس ایم۔ اے۔ ۱/۱

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

اپنی بیگم کو بھی نہیں سمجھا "سیٹھ رمضان برا ساندہاں کا
"اور نہایت شرافت سے سمجھا۔ لیکن شاید کسی بہت بڑے
قسم کی ہستی نے اس کے کھن میں چھوٹ کر دیا ہے کہ
انڈیشی میں آئندہ دو چار سال میں ذوال آئے والا ہے کہ
کسی دوسرے چروچیک کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ مگر
اس سے پوچھا تھا کہ اگر اسے میں ذلالت دکھائی تھی تو اس
کے لئے آئندہ کیوں ہوا؟ کہنی میں تھوڑا سا بند لگی سرباب
کیوں والا تھا؟ بڑے اطمینان سے بولا کہ شاید اس کو ملاغ فر
ہو گیا تھا۔ شفیع شاہ تو کہہ رہا تھا کہ اس کا بھٹکا کریتے ہیں مگر
نے اسے باز رکھا کہ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

"ہاں۔ یہ تو تم نے بہت اچھا کیا" میں نے کچھ سو
ہوئے کہا "تم نے اسے یہ بتایا تھا کہ ہم لوگوں کے نزدیک تو
دعوت بھی جتنی دیکھ رہے تھے جبکہ یہ تو ایک تحریری اور
معاہدہ ہے؟"

"اس کی سمجھ میں فی الحال کوئی بھی بات نہیں آ رہی
رمضان نے آکٹائٹ ذہ لیے میں جواب دیا "ہم تمام
انتظار کر رہے تھے کہ جس طرح تم کو اس طرح کہ
تھے۔ اسی لئے میں نے فون پر گفتگو کے دوران بھی یہ
نہیں چھیڑا تھا۔ ویسے بھی کئی تک ہمیں تھوڑی بہت
تھی کہ شاید وہ راہ راست پر آجائے لیکن کل یہ امید ٹوٹ
میں نے ہٹا کر بھرتے ہوئے اپنے کان کی لوتہ نکالی
مسلی تو وہ مجھے معمول سے کچھ گرم محسوس ہوئی۔ کار
وقت زمری کے سٹیل پر پہنچ کر رک جلی تھی۔

"سیٹھ کرامت اس وقت کھلے گا؟" میں نے ہم
"میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ شادی کی
تقریب میں جمعہ خانہ میں ہوگا" ڈرائیونگ سیٹ سے
شاہ نے ہر سکون آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے... تو پھر ہو جس کے بجائے لوحی پا
میں نے ٹھہرے ٹھہرے لیے میں کہا "میں وقت ضائع کر
کا کمال نہیں۔"

تقریباً کامیاب ہو چکے ہیں۔ آج کل میں اگلے مرحلے پر آئے
والا ہے کہ غیر ملکی کمپنی ہم سے مالی استحکام کے ثبوت کے طور پر
چیک گارنٹی مانگے گی جس کے لئے ہم چاروں پارٹنرز نے ملے
کیا تھا کہ یہ مرحلہ آتے ہی اپنے اپنے حصے کا روپیہ اپنی اپنی کمپنی
کے اکاؤنٹ میں ڈال دیں گے اور ساتھ ہی چاروں پارٹنرز چیک
کو بھی تحریری طور پر بھی مطلع کر دیں گے کہ ہم اس منصوبے
پر عمل درآمد کا قطعی اور حتمی ارادہ رکھتے ہیں جس کے بعد
چیک ہمیں گارنٹی لیٹر جاری کر دے گا۔ سیٹھ کرامت کے
ڈنٹے پچاس لاکھ روپیہ جمع کرنا تھا مگر میں اس مرحلے پر آکر وہ
نکرتا ہوا ہے کہ اس نے اس قسم کا کوئی معاہدہ کیا تھا۔"

ایک ٹائپ کے لئے میری پیشانی پر ایک کس پھر بھڑائی
لیکن میں نے حتی الامکان ہر سکون لیے میں کہا "لیکن معاہدہ تو
ہمارے پاس تحریری اور قانونی شکل میں موجود ہے۔"

"اس قسم کے کاروباری لوگ جب وعدہ شکنی پر آتے
ہیں تو انہیں اس قسم کے معاہدوں کی کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔
سیٹھ رمضان بولا "اس نے کہہ دیا ہے کہ ہم چاہیں تو اس
معاہدہ کی بنیاد پر عدالت میں اس پر دعویٰ دائر کر سکتے ہیں۔ اسے
معلوم ہے کہ اس قسم کے معاملات کے فیصلے ہونے میں
برسوں لگ جاتے ہیں جبکہ ہماری پوزیشن اس وقت بہت
نازک ہے۔"

"ہاں۔ اس کا مجھے اندازہ ہے" میں نے کہا "مسئلہ پچاس
لاکھ روپے کا نہیں ہے۔ ابتدائی چیک گارنٹی کے لئے ہمیں جو
دو کروڑ روپے کا قسط ڈیپازٹ ظاہر کرنا ہے اس میں ہم اپنے
اپنے حصے کے علاوہ یہ رقم بھی مل جائے گی کہ اس کے لئے
اس سے ہمارے دیگر کام متاثر ہو سکتے ہیں لیکن بات رقم کی
نہیں اسول اور ساکھ کی ہے۔"

"ہاں۔ اگر ہم اصولی طور پر دیکھیں تو اس نے گویا اپنے
اس بڑے پلن سے ہم سب کی توہین کی ہے اور دوسروں کے
سامنے بھی ہمیں ذلیل کرانے کا بندوبست کیا ہے" سیٹھ
رمضان بولا "لوہر دو چار دن میں ہمیں چیک گارنٹی کے لئے
خط آئے والا ہے۔ ہم خود رقم پوری بھی کر لیں لیکن ساتھ ہی
باہر کی فائین انشور کمپنی کو اس بات سے مطلع کریں کہ ہمارا ایک

پارٹنر اس منصوبے میں شریک نہیں ہو رہا تو ہمارا تاثر کتنا
خراب ہوگا کہ ابتدا میں ہی جن کا یہ حال ہے کہ پہلا معمولی سا
مرحلہ آتے ہی ایک پارٹنر تو ڈنگ لگا لیا ان کا آگے بھل کر کیا ہے
کا؟ اور یہ لوگ پروچیک کا کیا حال کریں گے؟ کہیں قراشا تو
نہیں پھیلے گے؟ ساری پریشانی مجھے اس بات سے ہو رہی ہے
"تم نے اسے سمجھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سمجھا تھا مگر... اتنا تو میں نے پوری زندگی میں

لازوال کمائیوں کے خالق
انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے
ایک نئی سوغات

رقص ابلیس

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی۔
ایک آشفٹہ حال کی داستان عبرت جسے قانون نے مجرم بنادیا
قیمت - 150 روپے

ناشر - مکتبہ القریش سرکلر روڈ اور بازار لاہور 2

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا ہاتھ جس جیب میں ہے اس میں ایک جرمن لیوگر بھی موجود رہتا ہے۔ اس کے بلی ہو لسنر میں ایک چمکا اور چھوٹا سا پتول بھی موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی پٹلی کے ساتھ چوڑے کی نیام میں ایک پلاسٹک خنجر بھی بندھا رہتا تھا۔ ان تین ہتھیاروں کی موجودگی میں وہ آٹھ دس مسلح آدمیوں کی ٹولی سے زیادہ خطرناک تھا اور اگر کسی مہم کے میں اس کے یہ تین ہتھیار ناکاہ ہو جاتے یا چھن جاتے تب بھی آسانی سے قاتل میں آئے والا نہیں تھا۔ وہ بلاشبہ میرا دست راست تھا۔ کراچی میں میرا بے پناہ بھلا ہوا کام اس نے نہایت حسن و خوبی سے نبھایا ہوا تھا۔

میں اس کی طرف سے بالکل مطمئن اور بے فکر تھا۔ اس کی ایک اور بڑی خوبی جو مجھے بے حد پسند تھی یہ تھی کہ وہ بھی میری ہی طرح ”عورت پروف“ تھا۔ وہ نوجوان اور خوبصورت تھا، اونچے لطیفے کا فرد نظر آتا تھا اور جن طبقوں میں اس کا ٹھکانا بیٹھتا تھا ان میں ہر قدم پر ہرمان نگاہیں اس کا استقبال کرتی تھیں مگر وہ کسی کے سر میں گرفتار نہیں ہوتا تھا۔ کسی کی خاطر اپنے آپ کو برباد کرنے پر نہیں تیار ہوتا تھا۔ اس کی نظر میں یہ سب زندگی کی راہ میں بکھرے ہوئے ہر جانی کھلنے تھے۔ وہ ان کھلونوں سے دل بھلا آتا تھا، کھیلتا تھا اور دل بھرتے ہی آگے بڑھ جاتا تھا۔ دل گیر ہوتا، کسی کی زبانوں کا سیر ہوتا اور پابند ملتے ذخیر ہوتا تو اس نے کوئی سیکسای نہیں تھا۔

جب مجھ کو پتہ چلے تو وہاں مدشہیوں اور خوشبوؤں کا گویا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ درودنوار پر رنگین کٹتے جھلکا رہے تھے۔ قمارت کی چار دیواری میں ہی نہیں بلکہ اس سے باہر بھی سڑک کے دونوں طرف چمکتی دکنی کاروں کی قطاریں تھیں۔ ہر طرف رنگین بڑکن لڑا رہے تھے۔ خوش انداز اور خوش لباس خواتین کی ٹولیاں کی ٹولیاں گاڑیوں سے اتر کر اندر جاری تھیں۔ جانے کون خوش نصیب تھا جو حسن کے اس سیلے دواں میں کسی عورت پر غفل کا ہاتھ تھامنے جا رہا تھا۔

گاڑی کمری کرنے کے لئے ہمیں جیم خانہ سے کافی فاصلے پر جگہ میرا آئی۔ گاڑی سے اتر کر ہم تینوں فٹ ہاتھ پر ٹھٹھنے کے سے انداز میں نہایت اطمینان سے جیم خانہ کی طرف واپس چل دیے۔ میرا بریف کیس شفیع شاہ نے اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کے ٹن کے مطابق جیل ڈھالی کی چلون اور ایک خوبصورت جاپانی لیٹ پٹنے ہوئے تھا۔ اس کے لیے اور بے ترتیب پال خوشگوار اسکے جو کچھ سے کچھ اور کچھ کہہ گئے تھے۔

چلا ہر وہ کسی خوشحال گھرانے کا کھنڈر اسلا کا نظر آتا تھا مگر اچھا شکم اور کٹا گھرا اور خطرناک انسان تھا۔ یہ صرف میں مانجنا تھا۔ اس وقت وہ ایک ہاتھ میں بریف کیس نکالے اور سزا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے چلا رہے تھے گری اور بے دلی سے میرے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کی محتاط نظر اس مشائی سے ہر طرف کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔

ہم عمارت کے اندر دلی دروازے پر پہنچے تو ایک صاحب نے جو تھری ہیں سوٹ میں تھے اور کوٹ کے کالر پر گلاب کی ایک گل بھی لگائے ہوئے تھے، یوں دانت نکال کر گرجوٹی سے ہمارا استقبال کیا جیسے ہم ان کے پرانے شناسا ہوں اور اس قریب کے سب سے اہم مہمان بھی ہم ہی ہوں۔ دوسرا سے بھی زیادہ اہم ہم نے رسی سے انداز میں ان سے سلام دعا کی اور آگے بڑھ گئے۔

وہ ایک بہت بڑا اور آراستہ دہراست ہال تھا جو اس وقت روشنیوں سے بھگنا رہا تھا۔ گوکہ بیٹنے کے لیے بڑی ترتیب اور سلیپ سے کرسیاں بھی لگی ہوئی تھیں لیکن بیشتر لوگ ٹولیوں کی صورت میں ادھر ادھر کھڑے کپ شپ میں مشغول تھے۔ چاروں طرف بھینٹا ہٹ کی گوج سی محسوس ہو رہی تھی جس میں سرگوشیوں، حشرم قہقہوں، ٹھکوری آوازوں، دلی دلی ہنسی اور بے حجاب فحشوں، غرضیکہ سبھی طرح کے آہنگ کا امتزاج تھا۔ ہال کے ایک سرے پر بہت خوبصورت اسٹیج بھی نظر آ رہا تھا مگر ٹی ایمان اسٹیج پر کوئی نہیں تھا۔ ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر سیٹھ کرامت کیس نظر نہ آیا۔

شفیع شاہ بولا۔ "اتنے وقت میں نے دیکھا تھا، کچھ مہمان لان پر بھی ٹپکے اندھیرے میں ٹولیاں بنائے کھڑے ہیں۔"

"جلو دیاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ شاید سیٹھ صاحب وہیں ہوں؟"

... میں نے مسکراتے ہوئے دھیسے لیے میں کہا۔ ہم ہال سے نکل آئے اور بیڑھیاں اتر کر لان کی طرف چل پڑے۔

طویل و عریض لان پر لگی سی روشنی تھی۔ سبزے کی باڑھ اور سرد قامت پودوں کے گرد و نگیں، آرائشی بیوں کی جھالریں لپٹی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ادھر ادھر کھڑے کپ شپ میں مشغول تھے۔ کبھی کبھی کوئی ٹھوکر ساتھ ساتھ سنائی دے جاتا تھا۔ باوردی میرے مشروبات پیش کرنے میں سچائے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

ہم بھی مہمانوں ہی کی طرح لان پر ٹپکنے کے سے انداز میں غیر محسوس طور پر ہر چرے کا جائزہ لیتے ہوئے ادھر ادھر پھرانے لگے۔ اتنی کم روشنی میں کسی کو پہچاننے کے لئے خاصا قریب جانے کی ضرورت تھی لیکن میری اور شفیع شاہ کی آنکھیں اس سے بھی کم روشنی میں بہت دور تک دیکھنے کی عادی تھیں۔ ہم دونوں نے ایک طویل عرصے تک راتوں کو گھپ اندھیرے میں دیر انوں کی خاک چھانی تھی۔

بالآخر سیٹھ کرامت ہمیں نظر آ گیا۔ وہ ایک دور افتادہ گوشے میں دو اسٹم سے ٹوہڑوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ تینوں کے ہاتھوں میں گلاس تھے اور گوکہ ان کے آس پاس کوئی نہیں تھا اس کے باوجود وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ باتوں کے

دوران کبھی کبھی وہ ٹوہڑوں ان منہ پر ہاتھ رکھ کر بے ڈھنگے غمازت بچی آواز میں کھی کھی کرتے لگتے سیٹھ کرامت شا کوئی ایسا واقعہ سنا رہا تھا جو ان کے نزدیک بہت ہی بڑا ان میں سے ایک ٹوہڑوں نے بے حد موتا تھا اور سوسٹ شیشوں کی جھلک لگائے ہوئے تھا۔ ہر بار ہنسی کے ساتھ ام قہقہہ نقل کرنے لگتا تھا۔

دوسرا میاں قامت اور خوش پوش تھا۔ دونوں یقیناً دولت مند گھرانوں سے تھا۔ مظہر کا بھلا اس قسم کی میں کیا کام؟ وہ جس انتہاک سے سیٹھ کرامت کی باتیں تھے اس سے ان کے چہرے پر برستی ہوئی محبت اور دھوکہ تھی۔

سیٹھ کرامت ایک اوجیز عمر بڑا تھا۔ اس کے بچے تھے جن میں سے کوئی ابھی جوان نہیں تھا۔ وہ ایک آدمی تھا جس کے سر کے پیشانی جھڑکے تھے۔ اس کی سے نکاری جھلکتی تھی۔ وہ ہمیشہ بے جھم لیاں میں ہوتا تھا تقریبات میں بھی جہاں ڈنر سوٹ پہن کر آنے کی درخواست جاتی تھی، سیٹھ کرامت اس حال میں پہنچ جاتا تھا کہ چلوں اور رنگ کی ہوتی تھی اور کوٹ دو سرے رنگ کا۔ اور تھوڑے طور پر چلوں سے باہر ہوتی تھی۔ پھولوں میں عام طور پر آگے کی چھٹیوں ہوتی تھیں۔ اگر کبھی بہت زیادہ "فیض ایل" کی

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سنگتراش

اقلم علیم

جلد اول :- 150 جلد دوم :- 0/

اردو بازار لاہور

جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے ہی اس کی ٹال سیٹھ کراہت کی پٹلیوں سے پر نکادی ہے۔

”سیلو کراہت!“ میں نے دھتے اور خوشگوار لہجے میں کہا۔

”سیلو... سلاوا ٹیکم... تم... اس وقت... اور یہاں؟“ وہ دو تھڑوں پر زبان بھر کر بولا۔

”تمہارا کیا خیال تھا کہ ہم یہاں نہیں پہنچ سکتے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں... نہیں... میرا مطلب ہے...“ وہ جملہ ادھر اور اچھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”بات کیونکہ بہت ضروری تھی لہذا ہم نے سوچا، تمہیں فوری طور پر اطلاع ملنی چاہئے۔“ میں نے اپنا لہجہ خالصتاً کاروباری بناتے ہوئے کہا ”تمہارے لئے ایک افسوسناک خبر ہے مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا کہ اس خوشگوار موقع پر کپ شپ کے دوران میں تمہارے لئے یہ خبر لے کر آیا ہوں لیکن مجبوری ہے... سیٹھ کراہت! تمہارا سینٹ کا ایک جواز ڈوب گیا ہے تمہیں فوری طور پر کچھ دیر کے لئے دفتر چلنا ہو گا۔ انشورنس کی کارروائی کے سلسلے میں فوری طور پر کچھ ضروری اقدامات کرنے ہیں“ میں نے ان دونوں فوجیوں کی طرف اشارہ کیا ”میرا خیال ہے تمہیں اپنے دوستوں سے معذرت کرنی چاہئے۔“

سیٹھ کراہت کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں تھی۔ ایک والا موٹا نوجوان بول اٹھا ”ہم چلتے ہیں کراہت بھائی! پھر کسی وقت کپ شپ رہے گی۔ اس وقت تو ظاہر ہے یہ میری خبر سن کر آپ کا دل برا ہو گیا ہو گا۔ ہمیں بھی برا انسو ہوا۔“ اچھا... خدا حافظ۔“ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

سیٹھ کراہت چھٹی چھٹی آنکھوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا۔ ان آنکھوں میں ایک خاموش اتحاد توڑی تھی شاید وہ ان نوجوانوں کو روکنا چاہتا تھا۔ گو کہ اسے فائدہ اس طرح کچھ بھی نہ ہوتا۔ ایک بار تو اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے تھے۔ شاید اس نے ان نوجوانوں کو پکارنا چاہا تھا لیکن اسی لمحے غالباً شفیع شاہ نے اس کی پٹلیوں پر ریوڑ لور کی ٹال کا ہوا برسوا دیا تھا۔

”آؤ چلیں سیٹھ کراہت!“ میں نے اس کی کلائی بظاہر نرزی سے لیکن درحقیقت آہنی گرفت میں لینے ہوئے کہا ”ہمیں کچھ ضروری گفتگو کرنی ہے اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کیونکہ مجھے دوسرے معاملات بھی دیکھنے ہیں۔“

”تم لوگ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ بلا اثر وہ پھنسی پھنسی ہی آواز میں بولا۔

”تمہیں کسی خراب جگہ پر لے جانے کا ارادہ ہرگز نہیں ہے۔“ میں نے طماننت سے کہا ”ہمیں تو معمولی سا کاروباری

آغاؤ میٹل ہن لینا تھا۔

اسے دیکھ کر کسی اجنبی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کتنا تندرست آدمی ہے۔ دفتر میں عموماً وہ کرسی پر انگوڑی بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کی میز پر چھ سات ٹیلی فون تھے اور وہ سب کے سب انگوڑی ہوتے تھے۔ کسی پر سوار کے کی بات چل رہی ہے۔ کسی کی جگہ کا ہواؤ بڑھنے کی خبر آ رہی ہے تو کسی پر ہماؤ گھٹنے کی۔ کراہت کا کوئی ایک کاروبار نہیں تھا۔ بیسیوں واعدے تھے۔ جس کام میں بھی چار پیسے کا منافع نظر آتا تھا وہ اس میں رقم لگا دیتا تھا۔

اپنے محلے سے قطع نظر وہ گاڑی ہمیشہ سٹے ہاؤل کی اور خاصی لی رکھتا تھا۔ کبھی بھی اس کی بہت شاندار تھی اور زیادہ تر باہر برلمان سے جی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں ان تھڑوں پر اس نے دھرم رقم خرچ کر لی تھی۔

سیٹھ رمضان کی معرفت اس سے میرا تعارف ہوا تھا اور نہ جانے کس طرح خود بخود ہی ہمارے مراسم بڑھتے چلے گئے تھے۔ میں جب بھی کراچی آتا اس سے ضرور ملاقات ہوتی اور کم از کم ایک وقت کا مکالمہ ہم ضرور رکھ لیتے تھے۔ ہونٹ کی تعمیر کے نام نہ نہیں فائبروں کی جو سیٹھ بکٹ بنائی تھی اس میں شرکت کے لئے اس سے بات چیت سیٹھ رمضان اور شفیع شاہ نے آگے مانی تھی اور وہ کسی خاص رد و قدح کے بغیر اس کے لئے تیار لیا بلکہ اس کے تیار ہونے کے بعد ہمیں دوسرے دو مضمون کو فارمیں جواب دینا پڑا تھا جو ہمارے ساتھ وہ فیکس لگائے جو تیار تھے۔ ہم نے ان دو مضمونوں پر ایکٹیل سیٹھ کراہت کو اس لئے چیلنجی تھی کہ وہ مالی طور پر ان دونوں کی نسبت کہیں زیادہ معکم اور اس وقت تک تمہارا خیال تھا کہ وہ لیکن دین اور زبان کا بھی تکرار ہے۔

ہم کئی مہینے تک کچھ دور کھڑے انتظار کرتے رہے کہ شاید دونوں احمق سے نوجوان سیٹھ کراہت کو تھا چھوڑ کر کسی طرف چلے جائیں مگر ان کی گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آیا۔ آخر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ برہمنے ہوئے ان کے قریب اس طرح جا کھڑے ہوئے کہ میں سیٹھ کراہت کے دائیں طرف تھا اور شفیع شاہ بائیں طرف سیٹھ رمضان سامنے تھا مگر وہ دو قدم ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔

ان تینوں نے باہمی باری باری میں تینوں کو دیکھا۔ نوجوانوں کے بھول پر تو محض خفیف سی بد مزگی کے آثار تھے گویا انہیں بات دھرمی زبانے کی وجہ سے کوفت ہوئی ہو۔ سیٹھ کراہت کو الیہ عزت کا بھٹکا سا لگا تھا۔ یک لخت ہی اسے گویا سانپ سرگھم گیا۔ وہ کسی غارت کم ہونے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ اس کی دھمکتی ہونٹ پر مٹی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ شفیع شاہ نے ریوڑ اور

چند لمبے تھوڑے گاڑی میں کھنٹن روڈ پر فرائے بھرنے لگی۔
کھڑکیوں کے گارڈ کی شیشے چڑھے ہوئے تھے اور گاڑی کے اندر
انجن کی ہلکی سی سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے
رہی تھی۔

”میں نے تم لوگوں کے بارے میں ٹھیک ہی سنا تھا“ بالآخر
سیٹھ کرامت کسی حد تک خود گامی کے سے انداز میں برسرِ پایا
اس کی حالت کافی سنبھل چکی تھی۔ ”کس دیر دھری سے تم
لوگ مجھے ایک شاعر اور پڑھم تقریب سے اغمالے ہو۔۔۔
تمہیں ذرا بھی خوف نہیں کہ بعد میں تمہاری شناخت بھی ہو سکتی
ہے۔ تم لمبے پیکر میں بھی پھنس سکتے ہو۔ میں شہر کا کوئی معمولی
آدمی تو نہیں ہوں۔“

”معمولی آدمی تو ہم بھی نہیں ہیں“ میں نے لافٹ سے کہا۔
”اور پھر یہ کہ ہم کوئی کچا کام نہیں کرتے۔ کوئی عمارت گراتے
ہیں تو اس طرح نہیں کہ لمبے اپنے ہی اوپر تن کرے اور اگر کبھی
ناگزیر حالات میں خلع مول لیتا بھی پڑ جائے تو ایسا کیا کھیرا؟
خفلات کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟ دیسے بانی دی دے۔۔۔
تم نے ہمارے بارے میں کیا سن لیا؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔“

”ہی کہ تم کوئی ایچے آدمی نہیں ہو۔ تمہارے کاہنہ باریک
مشکوک قسم کے ہیں۔ میں نے انٹی انٹی سی بی بات سنی تھی لیکن
یقین نہیں کیا تھا۔ آج یقین آگیا“ وہ بولا۔

”انشاء اللہ۔۔۔ بہت خوب۔“ میں نے طنز سے لمبے میں کہا۔
”رمضان سیٹھ! اچھے سنا تم نے؟ کرامت صاحب کیا فرما رہے ہیں؟
ہمارے کاہنہ باریک پر انہیں شک ہے۔۔۔ اور یہ خود تو بے جا ہڈی
معموم بدیع ہے۔ سیدھا ہنگوڑے سے نکل کر ہمارے درمیان
آ بیٹھا ہے۔“

مجھے حیرت غصے کی ایک ہلکی سی لہر چھو کر گزر گئی تھی۔ میں
نے ناگوار سی سیٹھ کرامت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جب
شر میں تیاروں وہائی شکل میں پہنچتی ہیں تو ہم دو اوس کے اٹناک
ذریعہ پھانسی دیتے ہو تاکہ انہیں اس رگڑے ہوئے سریش منداکی
قیض ادا کرنے پر تیار ہو جائیں۔ بجٹ آنے سے پہلے تم نہ جانے
کن کن چیزوں کے خیموں سے گودام بھر دیتے ہو اور لوگ ذرا
ذرا سی چیزوں کے لئے بازاروں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔
جہاں تمہارا بس چلتا ہے، تم ضرور حسدوں پر چھری چلانے سے
ذرا بھی نہیں بچھپاتے۔ اور ہمیں فرق سمجھا رہے ہو مشکوک اور
صاف ستھرے کاہنہ باریک کا؟“

وہ خاموش رہا۔

میں نے اپنا لہجہ اعتدال پر لاتے ہوئے کہا ”تمہارا خیال
ہے ہم تمہیں نہیں جانتے۔ لیکن ضرورت پڑنے پر ہم تمہارا بھڑا
نہ تک کھوکھلائیں گے۔ تمہاری ہی نہیں تمہارے آباد اجداد
کی نیہرا پھیروں کی بھی پوری فرست تیار کرالیں گے“ ایک لمبے

”میرا برف کس دے دو۔“ سیٹھ کرامت ہونٹوں پر
زبان بھر کر بولا ”بچوں سے کہہ دینا مجھے ایک کاہنہ باریک پریشانی
کے خیل میں اچانک ہی شہر سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ شاید وہ تین
دن تک جاویں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔“

مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے ہماری ہدایت پر خوف بہ حرف
عمل کیا تھا اور ضرورت سے ایک لفظ بھی زیادہ نہیں بولا تھا۔
اس ہدایت پر عمل پیرا زبان نے نہیں ”سیٹھ کرامت کی پسلیوں
پر کھٹی ہوئی روٹو اور کی ٹال نے کرا یا تھا۔ روٹو اور کے دور پر کسی
سے بات منوانا بھی پڑنا تک فح ہے۔ روٹو اور کی اپنی بھی ایک
زبان ہوتی ہے۔ ٹال کا داؤد کب بڑھایا جائے کب گھٹایا جائے“
کب اس کے ذریعے تنبیہ کی جائے اور کب اس کے ذریعے
بتایا جائے کہ شکار کو کس سمت میں مڑنا ہے۔ ان سب باتوں کا
ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اور روٹو اور اگر کسی ماہر فن کے ہاتھ میں
ہو تو انہی سے اتنا ڈی شکار بھی اس کی زبان سمجھنے لگتا ہے۔ اس
وقت روٹو اور شفیق شاہ کی جیب میں اس کی گرفت میں تھا اور شفیق
شاہ خود بہت کم بولا تھا ”زیادہ تر فدا کرامت اس کا روٹو اور ہی کرتا
تھا۔“

ذرا سہارے نہایت مستعدی سے وٹیل بوڑھے کے پیچھے سے
سیٹھ کرامت کا برف کس نکال کر اوپ سے اسے پیش کیا۔
برف کس کچھ ایسا زیادہ برف کس بھی نہیں تھا۔ اچھا خاصا
چھوٹا سا سٹ کس ہی معلوم ہوتا تھا۔

”تم اب گھر چلے جاؤ“ سیٹھ کرامت نے مزید غصہ کی
مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہدایت کی اور وہ سلام کر کے گاڑی میں
بیٹھ گیا۔

ہم سیٹھ کرامت کو گھیرے میں لئے واپس اسی طرف گھوم
گئے ہر دھڑے آئے تھے۔ ہماری گاڑی اس طرف کافی دور گزری
تھی۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر شفیق شاہ نے چاہیاں سیٹھ رمضان کو
پکڑا دیں۔

”ذرا تم کو رمضان“ میں نے خوشگوار لمبے میں کہا ”ہم
اپنے مسز سمان کے پاس جیتیں گے۔“

ہم کچھ سیٹ پر اس طرح بیٹھ گئے کہ کرامت میرے اور
شفیق شاہ کے درمیان تھا۔ میں نے اب کرامت کا ہاتھ چھوڑ دیا
اور وہ اس طرح اپنے ہاتھ کے جوڑ کو سلائے لگا جیسے اس کا ہاتھ
کے کھینچے سے آزاد ہوا ہو۔

”جانا کہ مر ہے؟“ سیٹھ رمضان نے اسٹریک و میل
سنبھالنے کوئے پوچھا۔ ہمارے خاص ٹھکانوں کا اسے بھی علم
نہیں تھا۔

”ڈیفینس میں ہمارا ایک چھوٹا سا سمان خانہ ہے“ میں
نے جواب دیا ”وہیں چلتا ہے۔ شفیق شاہ تمہیں راست بتاتا جائے
گا۔ پہلے تم اس سیٹ لیو اور تک پہنچو۔“

گاڑی واقعی ہمارے ہی عقاب میں تھی۔
 ”ٹھیک ہے۔۔۔ اب کسی دیر ان سڑک کی طرف لے چلو۔“
 میں نے سینہ رمضان کو ہتھ کی۔

”کلفن کے ساحلی علاقوں میں اس وقت بالکل دیرانی ہوئی
 سینہ رمضان گاڑی ایک نیچا چوڑی اور دو طرفہ سڑک کی
 طرف موڑے ہوئے بولا۔ کلفن سے ہم اس وقت بھی زیادہ دور
 نہیں تھے۔

چند منٹ بعد ہی ہم ساحلی علاقے کی طرف نکل آئے۔
 سڑک کے دونوں طرف چترنگٹاں خالی پڑے ہوئے تھے۔ کہیں
 کہیں بازار شیش پر محسوس کی گئی حشر ہمارے سر اٹھائے گئی
 تھیں لیکن وہ اندر جیتے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹ بھی
 کوئی کوئی ہی روشن تھی۔

کار بدستور ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی بلکہ اب کار وافرانی کو
 بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم عقاب سے باخبر ہو چکے ہیں اس لئے وہ
 احتیاط کر بلائے طاق رکھ کر قریب تر آنے کی کوشش کر رہے تھے
 لیکن سینہ رمضان نے رفتار بڑھادی تھی۔ اب تو میں یہ بھی دیکھ
 چکا تھا کہ ہمارے عقاب میں آئے والی کار بچکے براؤن رنگ کی
 ڈورڈ کو رہنا تھی۔

”یہ کون ہو سکتا ہے سینہ صاحب؟“ میں نے سینہ کرامت
 کو کہنی مار کر جھپٹے لیے میں پوچھا۔

”مجھے کیا معلوم“ وہ مضطرب لہجے میں بولا ”شاید پولیس ہو“
 میں اُس دیا ”بہت خوب! تمہارا خیال ہے اس طرح ہم
 لوگ خوفزدہ ہو جائیں گے؟ شاید تم ہمیں زرا کاٹھ کا آلو ہی سمجھ
 رہے ہو۔ ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ ہماری پولیس جمعہ قسم کی
 پرائیویٹ گاڑیوں میں بیٹھ کر اتنی خاموشی اور مستندی سے کسی کا
 عقاب نہیں کرتی۔ پولیس۔۔۔ حتیٰ کہ خفیہ پولیس کی گاڑی بھی
 ایک میل دور سے پہچانی جاتی ہے۔“

”اس کا کیا کیا ہے یاں؟“ شفیع شاہ نے سر رانی بولی سی
 آواز میں پوچھا۔ اسے جب کوئی مختصر جواب مسئلہ دور کش ہوتا تھا تو
 اس کی آواز گویا سرگوشی میں ڈھل جاتی تھی لیکن اس میں خجری
 سی کاٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ عام آدمی اس آواز کو سن کر شاید اپنی
 ریزہ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر محسوس کرتا۔

”اس کا میں ہی سمجھ کر رہا ہوں۔“ میں نے کمری سانس لے
 کر کہا ”تم سینہ صاحب کو ہی قابو میں رکھو۔ مجھے بھی اپنا نشانہ
 آڑے کانوں کا دن گزار چکے ہیں۔“

جس سرسبز زمیں ہم سڑک پر تھے وہ شفیع شاہ کے استعمال
 میں رہتی تھی اور ہماری خاص گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ ہماری
 خاص گاڑیوں میں کئی خفیہ خانوں میں ایسی بہت سی چیزیں محفوظ
 رہتی تھیں جو ہنگامی صورت حال میں استعمال ہو سکتی تھیں اور
 حالات کا پائہ پلٹ سکتی تھیں۔

کے وقت کے بعد میں نے غایت ملاحظت سے کہا ”یقین کر دو سینہ
 تمہارے مقابلے میں ہم بہت زیادہ شریف اور نیک دل لوگ ہیں
 ۔۔۔ جنہیں ہم سے کئے ہوئے اچھے بھلے تحریری معاہدے سے
 منحرف ہونے کی کیا سوچ بھی تھی؟“

”یہی اڑتی اڑتی ہی باتیں سن کر میں نے تمہارے ساتھ
 تعلق واسطہ ڈونا بہتر نہیں سمجھا تھا۔“ وہ مجھے لیے میں بولا۔
 ”علاوہ کچھ غرور نہیں ہونا چاہئے تھا کہ ہم اتنے بڑے

فراڈے کے ساتھ تاج ڈورے تھے“ میں نے عقاب سے کہا۔
 ”اگر تم اتنی ہی باورداشت تھی تو جس پیلے سی ٹکی کر لیتی چاہئے تھی۔
 جس میں کسی نے یہ یقین بنایا کہ ہم لوگوں سے تعلق ڈونا بھی ہر
 ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور جو ذکر توڑنا تو بہت ہی مشکل
 ہے۔ اس کوشش میں کبھی کبھی زندگی کی ڈور بھی ٹوٹ جاتی ہے۔“

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد سینہ کرامت معالمانہ لہجے
 میں بولا ”بات اب یہی سمجھ میں آگئی ہے۔ میں معاہدے پر
 عملدرآمد کے لئے تیار ہوں۔ صبح تم لوگ میرے دفتر آجاؤ، ہم
 بیچہ کر کارروائی عمل کر لیں گے۔ مجھے کہیں لے جانے اور خواہ
 خواہ زیادہ وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بات اب ہماری سمجھ میں بھی آگئی
 ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر کسی پر آنکھیں بند کر کے بخود سانس کیا
 جاسکتا“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اب تو جس طرح بات لے
 ہو رہی ہے اسی طرح ہونے دو۔۔۔ اور پھر ہمیں دفتر آنے کی
 ضرورت بھی کیا ہے۔ تمہارا دفتر تو اس وقت ہمارے ساتھ ہی
 چل رہا ہے“ میں نے اس کے برف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

نہیں کجاہوں والے چور سے شفیع شاہ کی بدایت کے
 مطابق سینہ رمضان نے گاڑی بائیں طرف موڑ لی۔ ابھی زیادہ
 رات نہیں تھی مگر انیشیائی کی سڑکوں پر دیرانی نظر آ رہی تھی
 کہیں کہیں انکار گاڑیوں آتی جالی دکھائی دے رہی تھیں۔

دفعہ شفیع شاہ بولا ”یاں! ایک کار ہمارا پیچھا کر رہی ہے“
 اس نے سڑک نہیں دیکھا تھا البتہ چند منٹ سے وہ عقب نما آئینے
 کی طرف ایک نکل دیکھ رہا تھا۔

”ہاں۔ میں بھی دیکھ چکا ہوں“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
 وہ مخصوص ساخت کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ سینہ کرامت کی گاڑی
 میں دیکھ چکا تھا۔ یہ اس کی ہیڈ لائٹس نہیں تھیں۔ میں نے
 محسوس کیا کہ سینہ کرامت عقاب کی خبر سن کر کھسکا تھا۔ شاید
 اسے کچھ امید بندھی تھی۔

میں نے رمضان کو بدایت کی ”کچھ دیر گاڑی پر نئی اور
 اور پھولی موٹی سڑکوں پر ٹھہراؤ تاکہ پوری طرح یقین ہو جائے کہ
 یہ گاڑی واقعی ہمارے عقاب میں ہے۔“

سینہ رمضان نے میری بدایت پر عمل کیا۔ کچھ دیر بعد میں
 نے کمری سانس لے اور مسکراتے ہوئے شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔

کورٹ مارشل

طارق اسماعیل ساگر

- ★ ہمارے ملی گناہوں کی مستند پوسٹ مارٹم رپورٹ
- ★ جس میں پاکستانی سیاست کے اندر اور باہر کی کمافی لکھی گئی ہے۔
- ★ چونکا دینے والے حقائق اور لرزادینے والی سچائیاں۔
- ★ پاکستان سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک وطن دوست کا بہترین تحفہ۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

قیمت / - 200

آخری گناہ کی مہلت

طارق اسماعیل ساگر

- ★ معروف ناول نگار اور مستند صحافی کے قلم سے معاشرتی کمائیوں کا خوبصورت مجموعہ
- ★ معاشرتی منافقتوں کا پوسٹ مارٹم
- ★ مدقوں یاد رہنے والی تحریریں
- ★ اس کتاب کا مطالعہ آپ پر سوچ کی نئی راہیں منکشف کرے گا۔

قیمت: / - 150 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

حارث اسٹیل ساگر - 60/-	احریکے رے احریکے
حارث اسٹیل ساگر - 25/-	صونیت اور عالم اسلام
حارث اسٹیل ساگر - 200/-	کورٹ مارشل
حارث اسٹیل ساگر - 60/-	آخری گناہ کی مصلحت

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

راستوں کے متعلق سینہ رمضان کو ہدایات دینا شروع کیا۔ ایک گلی میں پہنچ کر شیخ شاہ نے ایک ہاتھ سے اپنا اسکارف کھل کر پیری طرف پڑھایا اور میں نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے اسکارف سینہ کرامت کی آنکھوں پر لپیٹ دیا۔ وہ ایک بار پھر کھسکا کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ آزاد تھے لیکن اس نے اسکارف آنکھوں سے ہٹانے کی کھٹاکھٹاک نہیں کی۔

گاڑی مزید کچھ دیر تک ادھر ادھر گلیوں میں جکراتی رہی۔ کچھ گلیوں کے پتھر بلا ضرورت بھی لگائے جا رہے تھے لیکن درحقیقت اس میں بھی ایک مقصد پوشیدہ تھا۔ شیخ شاہ چاہتا تھا کہ سینہ کرامت آنکھیں بند ہونے کے بعد ہمیں بھی صحیح طور پر یاد نہ رکھ سکے کہ گاڑی کس کس طرف مڑی تھی۔

پاؤں خر کاڑی ہمارے مطلوبہ پتھروں کے سامنے جا رہی۔ یہ ایک مختصر سا ہی پتھر تھا اور طرز تعمیر بھی سادہ سا ہی تھا۔ اس کی ایک "خالی" تھی کہ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے کافی دور دور تک کوئی اور پتھر نہیں تھا۔ اونچے نیچے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ گو میں جو بڑی طرح پانی کھڑا تھا اور کسی میں جہاز جھکاؤ پھیلا ہوا تھا۔

پتھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور سیاہ گیت بند تھا لیکن رمضان نے ہلکا سا ہلکا دیا تو چند لمبے بعد ہی ہمارے خصوصی قریب پائے "گاڑا" نے بظنی گیت کھول کر بار بار ہاتھ اٹھا اور پھر پک کر گیت کھل دیا۔

گاڑی زرا تھوڑے میں چھوڑ کر ہم ایک صاف سحرے پے دوام میں بیٹھے۔ شیخ شاہ نے دروازہ بند کر دیا اور میں نے سینہ کرامت کی آنکھوں سے اسکارف ہٹا دیا۔

"چھوڑ کرامت سینہ! آرام سے بیٹھو۔" میں نے بیڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "گھبرائے بار پڑنا ہونے کی قطع ضرورت نہیں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

وہ بیڑہ چلنے لگا لیکن اس طرح جیسے موقع ملنے ہی اٹھ بھاگے گا۔ احمصالی کشیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ۵۰ نے اس کا برف کس اس کے پاس ہی رکھ دیا اور خود کچھ فاصلے پر بڑی ہلکی گاڑی چڑھا بیٹھا۔ سینہ رمضان پہلے ہی بیڑہ چھوڑ گیا تھا۔

میں نے سینہ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک خفیہ جھنڈا کر میٹ کے نیچے ہی دبا ہوا ایک خفیہ خانہ کھولا اور نکل کر اس میں سے ایک طاقتور رائل ٹیکل نکالی جو دو حصوں میں تقسیم تھی۔ رائل ٹیکل کو جوڑنے اور اس پر سائیکلف کرنے میں مجھے بالکل چند سیکنڈ لگے۔ سینہ کرامت و پشت زدہ سی ٹیکلوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف چہرہ کرتے ہوئے کڑی کاشیش نیچے کیا اور رائل ٹیکل کی ٹال کے ساتھ سر کھڑکی سے نکلتے ہوئے نشانہ لے کر تقریباً ایک ساتھ ہی دو فائر کیے اور دوسرے ہی لمحے میں ایک انتہائی سرت محسوس کرتے ہوئے مسکرایا۔ نشانہ درست ہی رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز تو ٹھیک لگتی تھی "ٹیک" "ٹیک" ہی محدود رہی تھی جو ہوا کی شاں شاں میں مدغم ہو گئی تھی مگر ساتھ ہی دو زوردار دھماکے ہوئے تھے۔ فوڈ کے دونوں اگلے فائر برسٹ ہو گئے تھے۔

دوسرے ہی لمحے کار بری طرح ٹھرائی۔ مرکز کے درمیان بھٹی پٹی پر شجر کاری کی غرض سے بنے ہوئے لگائے گئے تھے اور ان کے گرد اینٹوں کی گول منڈیریں بھی کھڑکی کی گئی تھیں۔ کار ایسی ہی ایک منڈیر سے بری طرح ٹھرائی۔ میں نے سینہ ٹوٹنے کا چھٹا کار پھر کار کی باڑی پر اینٹیں گرنے کی آواز سنی۔ کار وہیں رک چکی تھی اور اٹھنے اٹھنے لگتی تھی۔

میں نے سر اندر کر کے رائل ٹیکل گود میں رکھ لی اور کھڑکی کا شیشہ چھڑا دیا۔

"شکر ہے دینا اسکرین پر فائر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا "اور یہ بھی شکر ہے کہ سحرک چیزوں کا نشانہ لینے کی میری صلاحیت بھی سٹارٹر نہیں ہوئی۔"

"باس۔ آپ بہر حال باس ہیں" شیخ شاہ بولا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اچھی مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر بھی اتنی تھی جب وہ بہت خوش ہوا تھا۔

"ہنس اب ڈیفنس کی طرف ہی چلے چلو" میں نے کہا۔

سینہ کرامت اب بالکل اسی طرح ڈھملا ہو کر بیٹھ گیا تھا جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ تاہم مجھے اب بھی یہ سوال پڑنا تھا کہ کیا سینہ کرامت کا ایسا کون سا ہندو ہو سکتا تھا جو اس کی خاطر انتہائی خطرات میں کود پڑنے کے لئے اس حد تک تیار تھا؟ لیکن فی الحال اس سوال کا جواب حاصل کرنا میرے لیے زیادہ ضروری نہیں تھا اس لیے میں اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سینہ رمضان ایک ایسے راستے سے واپس روانہ ہوا جس پر ہمیں دوبارہ اس مقام سے نہیں گزرنا پڑا جہاں ہم اپنے تعاقب میں آئے والی کار کو چھوڑ کر آئے تھے۔ شیخ شاہ نے ایک بار پھر

بے نیازی سے خٹلے ہی کے سے انداز میں سیٹھ کرامت کے قریب پہنچا۔ سیٹھ کو کھٹکا کوئی انداز نہ ہو سکا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

شیخ شاہ کا ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آیا کہ خود چیری بھی اس پر نظر نہیں ٹھہر سکی۔ "تنگ" کی زوردار آواز کے ساتھ ریو اور کا دست سیٹھ کرامت کی کھوپڑی پر پڑا اور وہ بے اختیار چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بند پڑ گیا۔

"یہ تمہاری کھوپڑی پر پھلی اور نہایت پھلی سی دستک تھی" میں نے ہموار لہجے میں کہا "مصل تمہارے حواس کو درست کرنے کے لئے۔ دوسری دستک پر کھوپڑی چڑ جائے گی اور تیسری دستک پر میجر باہر آجائے گا۔ اس کے بعد ہم تمہاری بے مصرف لاش آس پاس کے کسی خالی ٹاٹ میں دفن کر کے اسے کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ اچھا ڈیکلے آؤی پر تو ہم گولی بھی ضائع نہیں کرتے۔"

اس کی عقل پھلی دستک پر ہی ٹھکائے آجی تھی۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا اور ریٹ کیس بیڈ کی ساتھ ٹیکل پر رکھ کر اس کے آلے کے نمبر ملائے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"اب جبکہ تم ہماری بات پر عمل کرنے کا ارادہ کری چکے ہو تو چند منٹ کے لئے رک کر اپنے حواس درست کر لو۔" میں نے ملافت سے کہا "اگر چیک پر صحیح طور پر دھکا کر سکو۔ اور یہ یاد رکھنا کہ کسی بھی وجہ سے اگر تمہارا چیک ڈس آؤ ہو تو کبھی گھر جانا نصیب نہیں ہو گا اور یہاں تمہاری زندگی کا چیک بھی ڈس آؤ ہو جائے گا۔ بے آئندہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے آؤی کو موت آئے لیکن نہ کیس جتنا زبردستی نہ نماز ہو نہ کیس مزار ہو تو یہ بے آئندہ ہوتا ہی ہوا۔"

میری طرف سے اجازت پا کر وہ سنانے کے لئے لیٹ گیا۔ وہ ایک بیک ٹھکانا تھا سا نظر آئے لگا تھا۔ ایک بار اس نے سر بھی سلایا۔ اس کے سر پر قیتا کو مڑا ہوا تھا۔

"تم نے مجھے برا ڈھیل کیا ہے" وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"آؤی اپنی حرکتوں کی وجہ سے ڈھیل ہوتا ہے" میں نے وجہ لہجے میں کہا۔

وہ خاموش رہا۔ ایک لمبے کے توقف سے میں نے کہا "وہیے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ابھی تو تم نے تمہیں ذرا بھی ڈھیل نہیں کیا۔ ابھی تک تو ہم تم سے حتی الامکان دیباہی سلوک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جیسا کہ کسی بھی معزز کا دیباہی پادشہ سے کرنا چاہئے۔ تھوڑی بہت گستاخی اور جتنی تو تمہارے ڈھیل پن اور وعدہ غلامی کی وجہ سے کرا پڑی ہے ورنہ تم مجھے "پارما" ناجروں کی نسبت ہماری آنکھ میں زیادہ شرم ہے۔ ہمارا برا سلوک تو تم نے دیکھا انصاف۔ اور کوشش کرنا کہ نہ دیکھنا دے گا۔"

میرا سر شمال سے مائل ہوا تھا۔ یہ ہماری محبت کا کمال تھا ورنہ پہلے وہ اس قسم کے حالات میں خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا۔

گارڈ ایک طرف منسوب کھڑا تھا اور شیخ شاہ کمرے میں ٹھل رہا تھا۔ میں نے گارڈ سے کہا۔ "سیٹھ صاحب کے لئے کھانا اور چائے وغیرہ تیار کر دو۔ یہ دو تین روز نہیں رہیں گے۔ ہر طرح سے ان کے آرام کا خیال رکھنا۔"

یہ مخصوص اصطلاحیں تھیں اور تربیت یافتہ گارڈ ان کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جب بھی ہمیں کسی شخص کو یہ غلامی قیدی یا کسی اور حیثیت سے یہاں رکھنا ہوتا تھا تو اس گارڈ کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ شخص نہ تو فرار ہونے پائے اور نہ کوئی اسے چھڑا کر لے جائے اور نہ کوئی گزند پہنچائے۔ وہ تنہا اپنی ذمہ داری بڑی عمر کی سے نبھاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں ایک اور ملازم ہوتا تھا جس کا کام کھانا پکانا اور صفائی ستھرائی وغیرہ تھا۔ گارڈ سعادہ خدی سے سر ملا کر ہر چار چار توں سیٹھ کرامت سے مخاطب ہوا "بھتی دیو میں تمہارے لئے کھانا وغیرہ تیار ہو ائی دیو میں ہمہ مختصر سا کام کر لیں جس کے لیے ہم سب کا جتنی زحمت اٹھانا پڑی ہے۔"

وہ موالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"بریف کیس کھولو۔" میں نے ملافت سے کہا "اور اپنے سب سے بڑے برنس اکاؤنٹ کی چیک بک نکالو اور پچاس لاکھ کا چیک کاٹ دو۔" شاید ہمیں یاد نہیں رہا کہ یہ رقم تم نے ابتدائی طور پر ہمارے منصوبے میں لگانے کا معاہدہ کیا تھا۔

"میں نے کہا تھا کہ میں منصوبے میں شریک ہونا نہیں چاہتا" سیٹھ کرامت گویا اپنی تمام توانائی جمع کر کے زور سے آواز میں بولا۔

"یہ فیصلہ ہمیں ہمارے نمائندے کے نیوٹارک روانہ ہونے سے پہلے کر لینا چاہیے تھا۔" میں نے ہموار لہجے میں کہا۔ "ہم نے ہمیں سوچنے کے لیے بہت وقت دیا تھا۔ ہمیں زبردستی اس منصوبے میں شامل ہونے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اور ہم کوئی نو عمر اور نا تجربہ لڑکا بھی نہیں ہو جو جو بھین اور کم سن کی غلامی کے باعث کسی غلام جگہ شادی کے لیے اپنی بھرتی ہو۔ تم نے غلام ہمارے بارے میں کافی کرید لگائی ہے لیکن ہمیں یہ کہنے نہیں بتایا کہ ہم کسی کے سامنے یا کوئی ہمارے سامنے خوب سوچ کچھ لینے کے بعد کسی معاملے میں ہائی ہمرے تو پھر وہ بات تہرہ لکیر ہوئی ہے۔ اور پھر تمہارے ساتھ تو ہمارا دیباہی نہیں گزری معاہدہ ہے۔ چلو اب باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ چیک بک نکالو۔"

اس نے اب بھی ریٹ کیس کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ شیخ شاہ اس وقت ریو اور لگا لے ہوئے تھا اور اسے کھلونے کی طرح اٹکی میں کھرا ہوا تھا۔ اسے میرا اشارہ نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ بظاہر بڑا

”ہاں مجھے اندازہ ہو گیا ہے“ وہ سر ہلاتے ہوئے قدرے رخ لیے میں بولا۔

”کاش تمہیں پہلے ہی اندازہ ہو جاتا“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”پلو۔۔۔ اب چیک بک نکالو۔“

اب وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ چیک بک نکال کر اس نے ایک چیک تیار کیا اور سائز پینل پر رکھ دیا۔ شفیع شاہ نے چیک اٹھا کر اس کا محتاطہ کیا اور تھپکتی سے بولا ”ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے یاں!“

”ٹھیک ہے۔۔۔ صبح اکاؤنٹ میں جمع کروانا“ میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ”ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ سیٹھ کرامت چڑی اتر دے گا مگر بچاں لاکھ کا چیک سائیں نہیں کرے گا۔“

سیٹھ کرامت جھپکا ہٹ آمیز لمبے میں بولا ”یہ بڑی رقم کا چیک ہے۔ میری ذاتی تصدیق کے بغیر کیش نہیں ہو گا۔“

”ہم اسے کیش کرانے کب جا رہے ہیں“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں نے شفیع شاہ سے یہی تو کہا ہے کہ صبح اکاؤنٹ میں جمع کروانا۔ اس پر اینٹ لینڈ کینی کے اکاؤنٹ میں جو ہم نے مل کر قائم کی ہے۔ ظاہر ہے چیک کراس ہو گا۔ اس کے علاوہ اس معاہدے کی فوٹو کاپی بھی چیک میں جائے گی جس کی مدد سے ہمیں لانا اتنی رقم جمع کرانا تھی۔ چنانچہ ابھمن کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ اور اگر اس کے باوجود کوئی ابھمن ہوئی تو ہم ابھمن سے نمٹنا جانتے ہیں۔“

شفیع شاہ نے چیک جب میں رکھ لیا۔

”ہم اتنی سی بات تھی جس کے لئے اتنا بنگامہ تھا“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور رانچہ کھڑا ہوا ”کل ہی چیک جمع ہو گا اور ہم کوشش کریں گے کہ چھپس کھٹے میں یہ کھپنی کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے۔ اس وقت تک تم یہیں رہو گے۔ یہاں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ اگر تمہارا شرافت کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ ہو اور ہمیں فرصت میسر ہوئی تو ہم تمہیں کہیں سیر و تفریح کرانے بھی لے چکیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارا وقت بورت میں گزرے۔ اب ہم چلتے ہیں، ہمارا اتنی تمہاری ضروریات کا خیال رکھے گا۔ اور وہ سامنے تپائی پر بی دی اور دی سی آر بھی موجود ہے جاؤ تو وقت گزاری کے لئے غامیس بھی لگا سکتے ہو۔“

شب بخیر۔

ہم ات قدرے حیران سا چھوڑ کر باہر آ گئے۔ گاڑی میں کا نام دیا میں تھا، ماہر مددازے کے قریب ہی کھڑا تھا اور بالکل مستعد نظر آ رہا تھا۔ اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری کو خوب سمجھتا تھا۔ اعتبار یہ ہمارا بچ کا ایک رہا اور ہمیشہ اس کی بیش شرت کے نیچے چٹون کی ٹیٹ میں اڑسا رہتا تھا اور اس کے استعمال میں وہ طاق تھا

”پلو یہ کام تو ہوا“ میں نے سکون کی سانس لے کر کہا۔ ہم ذرا تھوڑے میں آن کھڑے ہوئے تھے۔

”کام تو ہو گیا لیکن میں سیٹھ کرامت کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں“ سیٹھ رمضان بولا۔ ”اب ہم حیرا اسے بار تھریا کر ساتھ رکھ رہے ہیں اور ظاہر ہے کاروبار کے لئے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اس سے بہتر ہو گا کہ ہم اس کی جگہ کوئی اور بائلی تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد کوئی بائلی مل ہی جاتی۔“

”میں نے ہر ملو پر سوچا تھا۔ حالانکہ ہمیں یہی محسوس ہوا ہو گا کہ میں نے سیٹھ کرامت پر حیر کرنے کا فیصلہ فوری طور پر کر لیا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میں نے چند منٹ میں ہی ہر زاویے سے اس مسئلے پر غور کیا تھا“ میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

”ایک تو ہمارے پاس دوسری بائلی تلاش کرنے“ اسے آمادہ کرنے اور کاغذات میں ترمیم کرنے نیز غیر ملکی کھپنی کو اس سے آگاہ کرنے کا وقت نہیں تھا، ابکل میں ہم سے چیک گارنٹی کی فراہم آئے والی ہے اور سیٹھ کرامت کا نام کاغذات میں پانچا ہے۔ تم خود ہی مجھے بتا چکے ہو کہ ان ابتدائی مراحل میں ہی اس قسم کی تبدیلی سے غیر ملکی کھپنی میں ہماری سادہ خراب ہو سکتی تھی۔“

”ہاں۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے“ سیٹھ رمضان اپنے پہلے والے منوط پر آ گیا۔

”دوسرے میں نے محسوس کیا کہ سیٹھ کرامت ان لوگوں میں سے ہے جو کسی کی شرافت سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ معاملات اچھے نہیں رکھتے بلکہ جتنے کسی سے دہشت زدہ رہیں اتنے ہی اس کے ساتھ سیدھے رہتے ہیں“ میں نے کہا بلکہ اب تو ہمیں سمجھنا بھی سیٹھ کرامت کو دہشت زدہ ہی رکھنا ہو گا۔ اسے متاثر ملنے لگے گا تو پھر وہ خود بخود سیدھا ہو جائے گا۔ اسے صبر آجائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم معاملت کے کھرے لوگ ہیں اور ہمارے ساتھ کاروبار کرنا گھمٹے کا سودا نہیں۔“

اردو کے شاہکار سفرنامے خیاہ ساجد 200/-

مفت مشہور سفرنامے خیاہ ساجد 250/-

مفت مشہور افسانے خیاہ ساجد 150/-

مفت اعلیٰ افسانے خیاہ ساجد 125/-

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

نے ڈانٹک ہال میں بیٹھ کر کرفٹ کھانا کھایا۔ پھر میں شفیق شاہ کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ ہم نے رات گئے تک بیٹھ کر حساب کتاب کیا۔ شفیق نے تمام اہم واقعات سے مجھے آگاہ کیا۔ بعض ضروری معاملات میں مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ اس کی رپورٹیں بے حد قلم بکس تھیں۔ کراچی میں میرا کام بت چل پھل رہا تھا۔ شفیق شاہ کی کارکردگی بہت زبردست تھی۔ میں نے اسے تقریباً پارٹنر کی حیثیت دے رکھی تھی اور اس نے اپنے آپ کو اس پوزیشن کا اہل ثابت کر دیا تھا۔ رات گئے وہ رخصت ہو گیا۔ اہم ترین کاندھات کی ایک نہایت مختصری فائل اس کے پاس تھی۔ ہم جب کاروباری سٹنگ کے لئے بیٹھتے تھے تو صرف اس فائل کی مدد سے سارا حساب کتاب اور تبادلہ خیال ہو جاتا تھا۔ اس فائل میں نہایت اختصار کے ساتھ ہر چیز کاندھات پر موجود ہوتی تھی۔

شفیق شاہ کے جانے کے بعد میں نہایت طرہیت اور آہستگی کی نیند سو گیا۔ کراچی میں اپنے کاروبار کی تازہ ترین پوزیشن جاننے کے بعد مجھے بے حد اطمینان ہوا تھا اسی لئے مجھے نیند اچھی آئی تھی۔ سیٹھ کرامت دانے مسئلے پر میں زیادہ پریشان نہیں تھا مجھے معلوم تھا کہ میں نے اب انڈیاں تھوڑی سی ٹیڑھی کر لی ہیں تو کبھی نکل ہی آئے گا۔

دوسری صبح میں در تک سوتا رہا۔ سیٹھ رمضان اور شفیق شاہ حسب پروگرام میرے پاس دن چرے آئے۔ دوسرے کھانے کے بعد ہمارا سمندر کی سیر کر جانے کا پروگرام تھا۔ میرے تو ظاہر ہے ہمیں کسی بدچلپی تھی۔ دراصل ہمارے کاروبار کی ایک شاخ جھینگوں کی تجارت بھی تھی۔ جھینگے پکڑنے کے لئے ہمارے پاس دو ڈرائے پہلے ہی سے موجود تھے۔ شفیق شاہ نے پچھلے دنوں ایک نیا ڈرائر خریدا تھا۔ وہ مجھے اس کا معائنہ کرانا چاہتا تھا۔

اس میں بیٹھ کر ہمیں سمندر کی پانیوں کی طرف جانا تھا۔ اس طرح ایک تو میں ڈرائر کو بھی پرکھ لیتا اور اس بہانے کچھ سمندر کی سیر بھی ہو جاتی۔ شفیق شاہ کسی بھی نئی چیز کی خریداری کرتا تھا تو میرے انکار کے باوجود مجھے اس کا معائنہ ضرور کرانا تھا۔ ڈرائر کے معائنے کے سلسلے میں تو خیر میں نے انکار بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ چلو اس بہانے تھوڑی دیر کے لئے ایڈونچر کی دنیا میں ہی جھانک لیں گے۔ کافی عرصے سے ایڈونچر کی دنیا سے میرا رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں تو کافی حد تک فزسی سائی آؤی ہو کر رہ گیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مکمل طور پر دفتری ساپنے میں ہی ڈھل جاؤں۔

شفیق شاہ نے ڈرائر، فخر سے کماڈی منگوایا ہوا تھا۔ ہمیں اس پر کماڈی سے ہی سوار ہونا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہمارے ڈرائر جھینگے کے شکار میں استعمال ہو رہے تھے اور اس کام میں خاطر خواہ منافع دے رہے تھے۔ لیکن رات کی تاریکیوں

مجھے اس کار کا خیال بھی پریشان کر رہا ہے جو ہمارے قناب میں آ رہی تھی۔ "سیٹھ رمضان بولا "معلوم نہیں وہ لوگ کون تھے۔ ظاہر ہے وہ سیٹھ کرامت کے قبیلے کے کاروباری لوگ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے طرز عمل میں تم ہی لوگوں جیسی بے فنی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔"

"تمہاری یہ عادت نہیں گئی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا وقت ہے بہت پہلے ہی پریشان ہونا شروع کر دیتے ہو یا پھر اس وقت پریشان ہوتے ہو جب موقع ہی نکل چکا ہو آجے اور پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بھائی میرے! کبھی صحیح وقت پر بھی پریشان ہونا کر دو۔ جب ان لوگوں کی ہم تک رسائی ہوگی اس وقت انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو ہم انہیں رہائے میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس لئے سرودت ان کا خیال بھی چھوڑ دو۔ لیکن ہے ان میں سے کوئی زخمی بھی ہو چکا ہو اور وہ اسی سے سبق حاصل کرتے ہوئے کچھ عرصے کے لئے اپنی سرگرمی ترک کر دیں۔ آؤ اب چلیں۔۔۔ اور کچھ اپنے کاروبار کا حساب کتاب دیکھیں۔"

"بھئی تمہیں شفیق شاہ کے ساتھ جو حساب کتاب کرنا ہے وہ جا کر بے شک کرلو۔ مجھ سے تو اب کل ہی بات کرنا۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں" سیٹھ رمضان انگڑائی لیتے ہوئے بولا "تمہاری تو بات ہی کچھ اور ہے۔ تم تو یہی جھٹکتے ہی نہیں۔ تمہارے اعصاب بھی لوہے کے بنے ہوئے ہیں اور جسم بھی۔"

"یہی ستمیاں پھیل کر ہم ایسے بنے ہیں سیٹھ صاحب!" میں نے اس کا کاندھا تھپک کر دوستانہ انداز میں اس کا بازو دیا۔ وہ کراہ اٹھا اور بازو چڑاتے ہوئے بولا "دیکھو یار! اپن کو یہ فوڈای ہاتھ مت دکھایا کرو۔ اپن ہیں آؤی دوسری طرح کے جو کچھ کھاتے منہ سے کھو۔"

"اے سیٹھ رمضان!" میں نے آدھر مڑ کر کہا "تمہارے اسی بھو جان پر تو جی چاہتا ہے کہ کبھی تمہیں بازوؤں میں لے کر شفقت اور محبت سے خوب بچھڑوں۔"

"وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو گا" سیٹھ رمضان نے قدرے ترنم سے ایک قلمی گانے کا بول گنگنا نے کی کوشش کی۔ وہ ہمیں مجھ سے کافی دیرا تھا کہ کبھی واقعی مجھے ایک بھولا بھالا سا ڈرائر ان گنا تھا۔ بظاہر اتنا سیدھا سا ہوتا ہے جیسے کبکنت نے معلوم نہیں کیونکر اتنی دولت کمالی تھی اور وہ بھی ایڈوائس ہمارے ہی ملائیں۔

"اچھا چلو۔ ہم تمہیں چھٹی دے رہے ہیں" میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر کے میں اور شفیق شاہ ہوش پلے جائیں گے۔"

سیٹھ رمضان کا گھر ڈیفنس میں ہی تھا۔ اسے اس کے گھر ڈراپ کر کے میں اور شفیق شاہ کچھ دیر بعد ہوش بچھڑ گئے۔ پہلے ہم

ہم اس وقت پارک لائٹ میں ہی کھڑے تھے۔ شفیع شاہ نے ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور خود ڈرائیو تک سنبھل لی۔ پہلے ہم ڈیپنس بنے۔ گاڑی مستحکم سے اپنی ذہنی انجام دے رہا تھا۔ اس نے کمرے کے دروازے پر ہی نہیں مڑا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

اندر سینہ کرامت بیڑ پر گاڑ دیکھے سے ٹھیک لگے "سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ کے کچھ اس انداز میں لینا ہوا تھا جسے اسپتال کے کسی دواؤں میں کوئی جاہلو شاکر قسم کا مریض لینا ہو۔ اس کا چہرہ کچھ احترازا تھا۔

"کون۔ وقت خیریت سے گزرا؟" ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" میں نے لافٹ سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اب وہ نہ تو پریشان نظر آ رہا تھا اور نہ ہی مشکل۔ شاید اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

"تو؟" ہمیں تجویزی سی آؤنگ کے لئے بے چلیں۔ "میں نے اسے باہر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں" اس کے لیے میں خوف جھک آیا۔

"ارے؟" ہمیں کیا ہوا بھی؟" میں نے حیرت سے کہا "کل تک تو تم اچھے بھلے مراثی کر بات کر رہے تھے۔ آج خود وہ کہیں نظر آنے لگے؟ کسی نے ہمیں کچھ کہا ہے کیا؟"

اس نے ٹہنی میں سر ہلایا۔

"تو پھر آؤ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر سے اٹارتے ہوئے کہا "میں تو تمہارے ساتھ دوسروں کی طرح چلی آئے کی حتی المقدور کوشش کر رہا ہوں۔ آج ہم ذرا سیر کے لئے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لیں۔"

وہ بستر سے اٹھ کر ہمارے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

میں نے شفیع شاہ سے کہا "بھئی احتیاطاً چند منٹ کے لئے ایک بار پھر سینہ صاحب کی آنکھوں کو دھو پھا۔ دو۔ ایک تجربے کے بعد اب ہمیں ان پر زیادہ بھروسہ نہیں رہا۔ کیا خبر؟ کل کو ہجران کی نیت بدل جائے اور یہ کسی کو اس مکان کا عمل وقوع سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔"

شفیع شاہ نے ایک سوئی سیاہ پٹی اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔ آنکھوں پر محض سیاہ پٹی کا بندھ جانا بھی نفسیاتی طور پر بے حد خوف کا باعث ہوتا ہے۔ سینہ کرامت میرا ہاتھ تمام کر

دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدرے رزنی آواز میں بولا۔ "دیکھو۔ جہاں تک رقم کا تعلق ہے تو میں نے چیک ہمیں دے دیا ہے۔ وعدہ خلافی مجھ سے ضرور سرزد ہوتی ہے لیکن اس کے لئے میں سخت شرمندہ ہوں اور ہمیں یقین دلانا ہوں کہ آئندہ میں جب بھی کوئی وعدہ کروں گا اسے ضرور پورا کروں گا خواہ کچھ

میں جب بھی ادھر ادھر سے ہمارا کچھ سامان آتا ہوتا تھا تو وہ بھی انہی زاروں پر آتا تھا۔

دوسرے کھانے تک ہم لوگ کپ شپ کرتے رہے۔ کھانا ہم نے ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ہی کھایا۔ شفیع شاہ نے بتایا کہ سینہ کرامت کا دبا ہوا چیک کچنی کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا گیا ہے اور قوی امید ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو دن میں کلیئر ہو جائے گا۔

"چیک کچنی کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ ہو جانے کے بعد ہمیں سینہ کرامت کو دبا کر دینا ہے" میں نے گویا شفیع شاہ کو یاد دلایا۔ اس نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ہوٹل سے نکلنے وقت دفتر فتحی کے ایک خیال آیا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا "یار" سینہ کرامت کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ مجھے تو اس کے بارے میں سوچ کر اس پر ترس آ رہا ہے۔ بے چارہ اس جہلیلی کی طرح اس کمرے میں متحید بیٹھا ہوگا۔ ہر حال وہ ہمارا پارٹنر ہے۔ تو ذرا سا ہلک گیا تو کیا ہوا۔ ہمارے عقل وہ بھی تھوڑی سی قریح کر کے کا درز اس کی زندگی میں قریح کا کیا دخل؟"

"مت بھولو کہ ہم نے اسے جس بے چارے رکھا ہوا ہے۔" رمضان نے گویا مجھے خبردار کیا "اگر اس نے رات میں کیس شور مچا دیا کسی اور طریقے سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کر کے یہ احساس دلا دیا کہ ہم جڑا اسے ساتھ رکھے ہوئے ہیں تو ہمارے لئے انھیں کھڑی ہو سکتی ہے۔ ابھی تو چیک بھی ہمارے اکاؤنٹ میں جمع نہیں ہوا۔"

میں نے نمونہ انداز میں رمضان کا کندھا چھسپایا "سینہ کرامت کو ایک ہی رات میں اندازہ ہوگا ہرگز کہ اس کا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے ہے۔ اور اسے یقیناً اپنی زندگی بھر ہی زیادہ عزیز ہے۔"

"یہ کام تم اپنے رنک ہر کو گے" سینہ رمضان کندھے اچکا کر بولا "اس میں میری اور شفیع شاہ کی رائے شامل نہیں ہے۔ کیوں شفیع؟" اس نے تائبہ طلب انداز میں شفیع کی طرف دیکھا۔ "میری رائے بیشہ صرف وہی ہوتی ہے جو باس کی رائے ہوتی ہے" شفیع دھجے لیے میں بولا۔

"ایک تو یہ تمہاری حد سے بڑھی ہوئی وقار داری کیس جس میں مروان دے۔ اور ساتھ تمہارے باس کو بھی "سینہ رمضان مصنوعی خشکی سے منہ بٹا کر بولا۔

"وقار داری انسان کو بھی نہیں مرواتی۔ بے وقافی مرواتی ہے۔" شفیع شاہ نے دھجے مگر کمرے لیے میں کہا۔

"ایک تو اس فوجانی میں تمہارے جس میں کوئی یو ڈی صلیح طویل کر سکتی ہے" سینہ رمضان گویا مددے کی شدت سے سر پر دو تھرا کر بولا "چھوڑ اس بحث کو" تو چلیں۔"

میں نے اب اسے حقیقت بتا دیا بستر سمجھا۔ مہارادھ غلا
تھی میں جلا ہو جائے۔ جب ہم اسے زلزلہ میں بٹھا کر لے جانے
لگیں تو وہ سمجھ لے کہ ہم اسے سمندر میں گھسی ڈوبے جارہے
ہیں۔ میں ممکن تھا کہ اس غلط فہمی میں جلا ہو کر وہ شور مچانے کی
کوشش کر دیتا۔

”اپنے فنگر کے کارڈر کے سطح میں شفیع شاہ نے ایک
ناٹا زلزلہ خریدی ہے۔ وہ دکھانے لے جا رہا ہے۔ ہم نے سوچا اس
بماتے تھوڑی سی سیر بھی ہو جائے گی“ میں نے ملانت سے بتایا۔
”ہاں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔“ سینہ کرامت نے نیم تو جی سے سر
ہلایا۔

ہجوم سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم بیڑیوں کی طرف
بڑھے۔ مونڈہ تک کرائے پر مونڈہ لوٹ چلانے والے کاکاؤں کی
ملاش میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ اور میرے خواہش مندوں کا
راستہ روک روک کر ان سے بھاڑاؤ کرنے کی کوشش کر رہے
تھے۔ کئی ایک کشمی والوں نے کئی انجیلوں سے ہمیں دیکھا لیکن
ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید ہم ملنے سے ہی
کرائے کی مونڈہ میں بیٹھ کر مونڈہ جانے والے آدمی نہیں
لگ رہے تھے۔

شفیع کو خود ہی ایک مونڈہ لوٹ والے سے بات کرنا پڑی
کیونکہ زلزلہ اس ساحل سے کافی دور کھڑا تھا اور ہاں تک ہمیں
کرائے کی بوٹ میں ہی جانا تھا۔

لکڑی کی بیڑیوں سے اتر کر بوٹ میں بیٹھنا ہوا تھا اور ان
بیڑیوں سے اترتے وقت عام طور پر عورتیں بہت ڈرتی تھیں۔
قالا یہ انگریزوں کے زمانے کی بیڑیاں تھیں جو جری طرح تھیں
جکی تھیں اور ان پر بے تحاشا سیاہی اور کالی جی رہتی تھی۔

ہم نے جس بوٹ والے سے بات کی تھی وہ بوٹ کو
بیڑیوں کے قریب لے آیا اور پہلے سینہ کرامت کو اتار کر ہم
بھی یکے بعد دیگرے بوٹ میں کود گئے۔ ہمارا زلزلہ تقریباً وہ
فرلانگ کے فاصلے پر ایک غیر ملکی بحری جہاز کے زیر سایہ نظر
انداز تھا۔

جس مونڈہ میں بیٹھ کر ہم روانہ ہوئے تھے وہ کرائے پر
چلنے والی دو سری کشتیوں کی طرح تھی مختصر اور نیم شگفتہ سی تھی اور
اسے چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا چلا رہا تھا جس کے بھرے ہال
ہو امیں لہرا رہے تھے۔ پچھلی ہوئی قمیص نے اس کا سائز لاکر مضبوط
جسم جمایا رکھا تھا۔ سمندر کی مرطوب ہوا اس اور تیز دھوپ نے
اس کا بدن جھلایا رکھا تھا۔

اگر مونڈہ چلانا اس کا پیشہ نہ ہوتا تو شاید وہ ایک گورا چٹا
اور خوبصورت لڑکا نظر آتا۔ مگر پھر اس کے چہرے پر شاید وہ خود
احساسی نہ ہوتی جو اس وقت تھی۔ جب بے نیازی سے دوستی
کے اگلے حصے پر کھڑا آتھیں سیکڑے سمندر کو تک رہا تھا تو تاحقہ

بھی ہو جائے۔ اس صورت میں اب تمہیں میری جان کو بخش دینا
چاہئے۔ مجھے مار کر تم لوگوں کو کیا مل جائے گا؟“

وہ واقعی دہشت زدہ ہو چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی
کہا جاسکتا تھا کہ وہ راہ راست پر آچکا تھا۔

میں نے اس کا کندھا چپکے ہوئے کہا ”ہمارا تمہیں مارنے کا
تھکانا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم خونریزی کو پسند نہیں کرتے۔ اگر
خون کا ایک قطرہ بماتے بغیر ہی مقصد حاصل ہو سکتا ہو تو خونریزی
کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہیں واقعی قہر بھی
کرانے لے جا رہے ہیں۔ کل یا زیادہ سے زیادہ پوسٹ تک تمہیں
رہائی بھی مل جائے گی۔ لیکن اب راستے میں کسی غیر زبے داری
یا حادثات کا شوبہ دے کر اپنی اس متوقع رہائی کو موت میں تبدیل
لیتا۔“

”نہیں میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔“ وہ جلدی سے
ہولا۔

باہر ڈرائیو میں آکر ہم نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور
دو تین شیٹے بچھادی۔ ہمارے گاڑی نے مستحکم سے سیلوٹ
کیا اور گیت کھل دیا۔

گاڑی میں کلفٹن روڈ پر پہنچی تو میں نے سینہ کرامت کی
آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ اس نے طویل سانس لی اور سیٹ کے
پچھے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ کچھ مطمئن نظر آ رہا تھا۔
سڑک پر ٹریفک بڑھ چلا تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا اور فضا میں
ایک عجیب سا سکون اور گھبراہٹ تھا۔ میں غیر محسوس طور پر بار بار
کئی آنکھوں سے سینہ کرامت کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا
لیکن اس کے تاثرات سے کیا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چپکے چپکے چلانے یا
کسی کو اپنی طرف کسی اور طریقے سے متوجہ کرنے کا کوئی ارادہ
نہیں رکھتا۔ تاہم شفیع شاہ کا ہاتھ بدستور چپکے کی جیب میں تھا
اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی انگلی ٹرائیگر پر ہوگی۔

کیا ڈی بیج کر ہم نے کار ایک طرف کھڑی کی اور اتر کر
دھنگ کی طرف بڑھے۔ سینہ کرامت ہمارے درمیان تھا۔ اس
جگہ ہم اس کی طرف سے زیادہ ہوشیار تھے کیوں کہ یہاں خاصی
گھبراہٹ تھی۔ بہت سے لوگ پوزی جوں کے ساتھ اور بہت سے
دوستوں کے ساتھ سمندر کی سرے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

میں ممکن تھا کہ اتنی تجیز بھارتیہ کر سینہ کرامت کا ارادہ
بدل جاتا اور وہ چپکے چلانے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا
فیصلہ کر لیتا۔ لیکن اس کے تاثرات مجھے اطمینان بخش ہی نظر
آئے۔ البتہ اس کی پیشانی پر الجھن کی شکلیں نظر آ رہی تھیں
اور وہ کچھ متلاشی سی نظروں سے ادھر ادھر کچھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟ کیا تلاش کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”کچھ نہیں“ وہ دوسرے کوزہ کر لایا ”میں سوچ رہا تھا کہ تم
لوگ مجھے یہاں کیوں لاتے ہو؟“

نظارہ گزار نہیں ہوتے تھے قرآن کے دامن بائیں پہلے بازو سمیت دے جاتے تھے۔

چند لمبے بادی ہمارا نثار سمندر کا سینہ چھو کر مگرے پہنچا طرف چل دیا۔ قاسم نہایت شاق کہیں تھا۔ چھ سال کی عمر اس کے دوزخ شب سمندر کے سینے پر ہی گزر رہے تھے۔ دیکھو سے کارکنوں کی طرح وہ بھی شفیق شاہی کی دریافت تھا۔ آہم دو ایک مرتبے پر پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔

"بہت عمدہ نثار ہے" سینہ رمضان نے انھن کی آواز پر رفتار وغیرہ پر توجہ دینے کے بعد سائنٹی انداز میں سرلاتے ہو کر کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا "تمہیں پسند آیا؟"

"نثار دیکھنے کون گزرتا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے پہلے ہی اطمینان تھا کہ شفیق شاہ نے خرید ہے تو ٹھیک خرید ہوا گا۔" میں نے نیلے آسمان کی دستوں کا جائزہ لیتے ہو کر اور مجھے خودی اپنا لہجہ کھولا سا محسوس ہوا۔

"تو پھر تم کس لئے آئے ہو؟" سینہ رمضان نے مسکرا ہوئے پوچھا۔

"وہ میرے اندر ایک وحشی روح مقید ہے اسے بھلا کے لئے" میں نے جواب دیا "آسمان زمین با سمندر کی بے کرا دستوں میں بہکتے کا مجھے ایک عرصے سے موقع نہیں ملا اور اپنے آپ کو بے چین سا محسوس کر رہا تھا۔ میں دستوں کا کو ہوں گم نہیں نے اپنے آپ کو مقید کر لیا ہے۔"

"مقید کہاں کر لیا ہے؟" سینہ کرامت نے پہلی بار دیا کھولی "تم شریک بندہ ہی عمارتوں میں رہ کر بھی ہم سے آزاد ہو۔ جو جی چاہتا ہے گزرتے ہو۔ آزادی اور کے ہیں؟"

"تم نہیں سمجھو گے۔ یہ ہمارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ میں نے اس کی طرف بٹور دیکھتے ہوئے علامت سے کہا۔ مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب وہ زیادہ بدست نہیں تھا۔ اس چہرے پر روشنی آچلی تھی۔

ہم دیکھ کر پرانی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کھڑے ہو۔ آسمان کی غلاہٹ سمندر کی تپ دہاں اور زندگی بخش حرارت مرطوب ہوا اور سمندر کی اپنی ایک خوشگوار سی خشکی۔ میں سب چیزوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

نثار تیز رفتاری سے ایک سیدھ میں بڑھا جا رہا تھا۔ اس مقام پر پہنچنا ہمارا مقصد ہو جانا سمندر نیلا آبی سے دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے وہ نیلا گویا ہم سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر ادھر کائی فاصلے پر آگے نثار کوئی لالچ موزوں یا بحری جزائر آتا دکھائی دے جاتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اپنی دور کل آئے گا کو آلا نہیں وغیرہ بھی نظر آتی بند ہو گئیں۔ کرائے کی لائسنس

نظر پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بہت کم لوگ اس بے نیازی سے سمندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ انہی کا کام ہے جن کے دوزخ شب سمندر کے سینے پر گزرتے ہیں۔

لاکے نے موزوں کا انجی نثار تک پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی بند کر دیا اور نہایت مہارت سے چپو دھکی کی مدد سے بوٹ کو لہرا دیتے ہوئے نثار کے ساتھ لگا کر دوک دیا۔ یہ نثار واقعی ہمارے پہلے والے نثار سے کہیں اچھا اور بہت بڑا تھا۔ نثار کیا چھوٹا سونا بھری جہاز ہی دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا صرف انجی ہی باہر سے آیا تھا۔ باڈی میں بنی تھی لیکن بڑی توجہ، محنت اور لاگت سے تیار کی گئی تھی اس لئے یہ کسی غیر ملکی نثار سے کم نہیں تھا۔ خشک کے نثاروں پر رنگ و روغن کی کوئی خاص پروا نہیں کی جاتی لیکن اس پر نہایت خوبصورت اور نہایت پیش قیمت پینٹ کیا گیا تھا۔ شفیق شاہ کو معلوم تھا کہ ہر چیز کے بارے میں میرا ایک خاص ذوق بن چکا ہے اور میں معمولی سے معمولی چیز میں بھی ایک حسن دیکھنا پسند کرتا تھا۔ یہ تباہیات پرستی مجھ میں موجود تو شاید لاکھوں ہی سے تھی لیکن اس کی تکمیل کے مواقع اب میرے آئے تھے۔

ہم نثار پر پہنچ گئے تو کرائے کی موزوں دامن چلی گئی۔ نثار کے انجی دوم میں ایک سیاہ نام اور مضبوط جسم کا فوجیان موجود تھا جس کے بال ٹھنڈے اور دانت غیر معمولی طور پر سفید۔ چمکیے تھے۔ وہ میان اور جست پادوں میں تھا اور دھڑ دھڑاتی ہوئی دھوپ میں اس کا سر کی جسم چمک رہا تھا۔ اس فوجیان کا نام قاسم تھا اور یہ بھی ہمارے خاص کارکنوں میں تھا۔ وہ اس نثار کا "کیپٹن" تھا اور اس حیثیت سے ہمارا کوئی خاص آدمی ہی کام کر سکتا تھا جو بہت سے رازوں کا امین بننے کا اہل ہو۔

قاسم ہمارے قدموں میں بچھا جا رہا تھا لیکن ہم اس سے سلام دعا کر کے جلد ہی دیکھ کر آگئے۔ اس نثار پر چار بڑے بڑے کمرے تھے جن میں برف کے ذریعے بجلیوں وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے اختتام موجود تھے۔ ایک کپڑا قیام و طعام کے لئے بھی تھا جس میں دیوار گیر ہسٹریا تھ دوم اور دیگر ضروری چیزیں موجود تھیں۔

نثار جب جیتے وغیرہ چکرنے کی مگر پر نکلتے تھے تو کئی کئی ہفتے سمندر میں دور افتادہ مقامات پر کھینچا جاتوں میں رہتے تھے۔ شکار کے دوران نثار کے دونوں طرف ہوائی جہاز کی طرح دو بازو پھیلے ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے جال بندھے ہوتے ہیں۔ یہ پہلے ہوتے جال سے کہ نثار سمندر میں چلتے رہتے ہیں اور جال میں جیتے، مچھلیاں اور جانے کیا کچھ لاپلاہٹا ہوتا رہتا ہے۔ ہر چند دونوں بعد یہ شکار کو نہ مشورہ میں منتقل کیا جاتا تھا۔ جس وقت

نے کوئی تبدیلی بڑھ لی تھی۔ نہایت آہستگی سے اس نے گردن
سمٹائی اور لوٹ پر نظر ڈالتے ہی اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے ہی لمحے وہ ڈیک سے کود اڑا کر ایک کمرے میں محسوس
کیا۔ واپس باہر آنے میں اسے بمشکل نہیں چار سینکڑے گے ہوں
گے۔ وہ جب دوبارہ ڈیک پر آیا تو اس کے ہاتھ میں اشیانہ کن تھی۔
”یہ یوتھ یقیناً ہمارے قاتل ہیں۔“ وہ سناپ کی طرح
چمکدار۔

”وہ تو میں نے بھی دیکھ لیا ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔
”لیکن فی الحال تم اشیانہ کن چھوڑو۔ پہلے ان لوگوں کو قریب آنے
دو اور اندازہ ہوئے دو کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ کمپن یہ کوٹ
کارڈ والے تو نہیں ہیں؟“

”کوٹ گھڑ والے اتنی چھوٹی اور فنی قسم کی موٹر یوتھ
استعمال نہیں کرتے“ شفیع شاہ آنکھیں میچرے ہوئے بولا ”اور
پھر اس پر کسی قسم کا کوئی نشان وغیرہ بھی نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے
شفیع شاہ نے اشیانہ کن موٹر سے رستے کے اس بہت بڑے لچھے
تے چھپادی جو ڈیک پر ہی پڑا تھا۔

یوتھ کچھ اور قریب آئی تو میں نے دیکھا ”وہ واقعی بالکل
چھوٹی لیکن جدید ساخت کی تھی۔ اس میں کمپن کوئی نہیں تھا۔
ذرا بائیں کسی حد تک کھلی چھت والی کار سے مشابہ تھا۔ وٹ
اسکرین کے پیچھے ایک شخص دھکیل سنبھالے کھڑا تھا۔ اس کے
پچھے چھوٹا سیٹھیل پر دو آدمی موجود تھے لیکن وہ بھی بیٹھے ہوئے
نہیں تھے کھڑے تھے۔ ہتھیار غالباً کسی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔“

میں نے غیر محسوس طور پر سیٹھ رمضان اور کرامت کے
چروں کا جائزہ لیا۔ سیٹھ رمضان اگر تھوڑا بہت خوفزدہ قاتل
بھی غالباً میری اور شفیع کی موجودگی کی وجہ سے مطمئن نظر آ رہا تھا
تاہم مجھے یہ دیکھ کر خاص حیرت ہوئی کہ سیٹھ کرامت کی آنکھوں
میں بالکی سی چمک آچلی تھی۔ موٹر یوتھ میں آئے والوں کے چہرے
تو ابھی صاف نظر نہیں آ رہے تھے لیکن سیٹھ کرامت کو شاید
اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور شاید ان کی آمد سے وہ
خوش تھا اسے کوئی امید بندھ چکی تھی۔

وہ کچھ اور قریب آئے تو پچھلی نشستوں پر کھڑے ہوئے
دونوں آدمیوں میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ استاد بھو
تھا جو آج کل سیٹھ واحد کا خاص آدمی تھا۔ سیٹھ واحد جو ہم جیسے
لوگوں کا بے آنج بادشاہ تھا۔

لاہور میں کافی عرصہ پہلے استاد بھو میرے ہاتھوں مرتے
مرتے بچا تھا اور بعد میں مجھے جب یہ پتا چلا کہ وہ سیٹھ واحد کے
خاص آدمیوں میں سے تھا تو میں نے اس پر شکر ہی ادا کیا تھا کہ وہ
میرے ہاتھوں سے بچ گیا تھا۔ اس وقت میں سیٹھ واحد کی
بارگاہی مول لینے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ہماری اپنی لائن کے بہت کم لوگ استاد بھو کو جانتے تھے

میں یہ کرنے والے یہاں تک آتے نہیں تھے اور شنگ اس
طرف ہوتی نہیں تھی۔

”اس لیے مقصد سفر سے تو اچھا تھا کہ تم مجھے اپنے اس
آرام دہ قید خانے میں ہی لیٹا رہنے دیتے“ سیٹھ کرامت مناسی
لے کر بولا۔

”نہیں قدرت نے وہ حس ہی نہیں دی کہ تم ان عظیم
الشان اور محسوس کر دینے والے نظاموں سے محفوظ ہو سکو“ میں
نے نرم آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس میں محفوظ ہونے والی کون سی بات ہے؟“ وہ سنا کر
ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا ”میں سید حاسادو اساسنہ رہے اور ہم
افضل کی طرح اس نرار میں بیٹھے نہ جانے کہاں پہلے جا رہے ہیں۔“
”شکر کو ہم نے اس سفر کو ہاتھ نہیں بنایا“ میں نے
سکراتے ہوئے کہا ”ورنہ مقصد تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم اس
بڑے سکون مقام پر تیس سو سو بیسک دیتے۔ گھرے پانی میں
چٹائی ہوئی بچیاں یقیناً ہماری شکر گزار ہوتیں۔“

ذاتی میں بھی یہ بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر
گزر گیا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر مسکراتے کی کوشش کرتے
ہوئے بولا ”اب تو ہمیں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ کیونکہ
اب ہمارے درمیان اصل مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو چکا ہے۔“

میں نے اس کی بات سن کر اس کی بات سے کہنے ہوئے کہا ”تم سمندر
کو اس لیے بھی سید حاسادو کہہ رہے ہو کہ تم نے ابھی اس کے
رنگ نہیں دیکھے۔ تم اس کی ہیبت سے واقف نہیں ہو۔“

سیٹھ کرامت نے جواب میں کچھ کہا لیکن میری توجہ اس کی
طرف سے ہٹ چکی تھی۔ میں پیچھے بہت دور نظر آنے والے
اس مٹائی کھلونے کو دیکھ رہا تھا جو درحقیقت ایک خوبصورت موٹر
یوتھ تھی۔ خاص رویہ پہلے بھی اس موٹر یوتھ پر میری نظر پڑی تھی
لیکن اس وقت چونکہ اوپر گرد و سرخی لائی تھی اور کشتیاں وغیرہ بھی
موجود تھیں اس لیے میں نے اسے بھی انہی میں سے ایک سمجھا
تھا اور کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب دور دور تک اس
موٹر یوتھ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ عین ہماری ہی
سیدہ میں چلی آ رہی تھی۔

نرار کی رفتار چونکہ اب بالکل کم ہو چکی تھی اس لیے موٹر
یوتھ کمرے پر کچھ قریب آئی جا رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے
خاص رویہ پہلے ہی خبردار کیا تھا کہ کچھ نظریں خصوصاً طور پر ہم پر
مرکز ہیں لیکن میں نے سرسری نظر سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد
اس احساس کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اب خیال آ رہا تھا کہ
میری چھٹی حس نے کھل نیک ہی دیا تھا۔

شفیع شاہ کی اس طرف بیٹھ تھی جدھر سے وہ موٹر یوتھ
بھاگ اڑاتی چلی آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے میرے آثار تو
تبدیل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن میری آنکھوں میں اب اس

لیکن میں اس کی سفاکی اور درندگی سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب میں کچھ بھی نہیں تھا اس وقت وہ ایک امریکا پلٹ نوجوان کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا موٹر گاڑی چلاتا تھا۔ اسی کی خبری کی بدولت میرا پستلا کاروباری پارٹنر اشرف خان موت کے منہ میں پھنسا تھا اور میری ایک جاں نثار دوست زینہ پر بے تحاشا تشدد ہوا تھا۔

اس وقت میں ایک کنوڑ اور کم مایہ نوجوان تھا لیکن اس کے باوجود استاد بسو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں مل سکا تھا۔ آہم اس کے ایک قریبی ساتھی کو میں نے ضرور موت کی نیند سلا دیا تھا اور استاد بسو کے نام ایک رقد چھوڑا تھا کہ زندگی میں کبھی نہ کبھی اس کا ادھار ضرور چکاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد وہ لاہور میں مجھ سے ٹکرایا تو کراچی کے سینہ واحد کا خاص آدمی بن چکا تھا۔ میں نے اس وقت اس کے پیچھے لگنے کا ارادہ عارضی طور پر ہٹو کر دیا تھا لیکن میں یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ مجھے اس کا ادھار چکانا ہے۔ وہ میرے ابتدائی حالات سے واقف نہیں تھا۔

اسے شاید یہ تو معلوم ہو کہ میں بھی اس کے سینہ ہی کی لاش کا آدمی ہوں لیکن اسے یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ میری کمائی کا آغاز کیا ہے اور اس کے بارے میں میرے دل پر کیا تحریر کندہ ہے۔

”شفیع شاہ! فیروز سیوٹ والے اس کالے سے آدمی کو پہچانتے ہو؟“ میں نے نہایت دھیمی آواز میں پوچھا۔

”جی ہاں۔ میری معلومات کے مطابق اس کا نام استاد بسو ہے اور سینہ واحد کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔“ شفیع شاہ نے بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”اب ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا“ میں نے گویا اسے خبردار کیا۔ وہ نہایت میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ہمارے زرار کا انجن قاسم نے نیمل کر دیا تھا اور زرار ویسے ہی سلیج آپ پر ہولے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ موزیوٹ کو ایک خوش شکل سا نوجوان چلا رہا تھا۔ اس نے انجن بند کر کے بوٹ کو لہرایا دیتے ہوئے نہایت مشاطی سے زرار کے پہلو سے لاجوڑا۔

استاد بسو اور اس کا ساتھی یوں اطمینان سے زرار پر چڑھ آئے جیسے وہ ہمارے پرانے دوست ہوں اور ہم نے ہی انہیں اوپر آنے کی دعوت دی ہو۔ موزیوٹ چلانے والا نوجوان بھی بوٹ کو زرار کے چال والے بازو سے ہانڈھ کر اوپر اٹھایا۔

استاد بسو ایک پرکھ آگیا۔ اس کے دونوں ساتھی کنارے پر کھڑے رہے۔ ان کا مقصد ہمارے ساتھ ساتھ انجن روم پر بھی نظر رکھنا تھا۔ قاسم ان کی نظر میں آئے بغیر انجن روم سے باہر نہیں آسکتا تھا۔

30/-	محرا کا چاند	اے حمید
30/-	پہلی محبت کے آنسو	اے حمید
30/-	اواس جنگل کی خوشبو	اے حمید
30/-	چاند چہرے	اے حمید

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

”بیلو“ استاد بسو ہم چاندل کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر اس کی رحمت سیاسی مائل ”بونٹ سوٹے سوٹے اور بالی تقر کندھوں تک لیے تھے۔ وہ ممکن آلود سوٹ میں تھا مگر ٹائی نیم تھی۔ گہربان کھلا ہوا تھا۔ وہ کسی بین بانس کی طرح مضبوط نظر آتا تھا اور اس کی سفاکی دور درنگی بھی اس کے چہرے سے ہی عیاں تھی۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں تختہ بندی کی چمک تھی اور ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جیب میں ریپو موجود ہے اور بسو کا ہاتھ اس کے دستے پر ہے۔ اس کی نظروں صرف مجھ پر مرکوز تھیں۔

”اچھا... تو یہ تم تھے“ بالآخر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”چلو اچھا ہی ہوا اس ہمارے تم سے ملاقات ہو گئی۔ ہماری ملاقات والی ملاقات کچھ ادھوری ادھوری سی رہ گئی تھی۔ خیر۔ انسان زندہ رہے تو ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔“

”بے شک“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی تائیدی میں کہا۔ ”زندہ رہے تو۔“

”ہاں۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں“ وہ سر ہلے میں بولا۔ ”اے کے ہو نون پر مسکراہٹ کی رحمت تک نہ رہی اور آنکھوں میں ہنسی سفاکی اتر آئی جو اس کی شناخت تھی۔“

”میرے خیال میں تم ضرورت سے زیادہ ذہن لگے ہو گا“ گویا زیر لب بولا پھر اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی لیکن اپنا سینہ کرامت سے قاطب تھا ”تم نے ان لوگوں کو کل ہی کیا نہیں بتایا تھا کہ استاد بسو ہمارا دوست ہے۔ قریبی دوست۔ لوگ تمہیں اسی وقت چھوڑ دیتے۔“

”مجھے یہ امید بالکل نہیں تھی استاد! یہ لوگ بڑے ذہین ہیں۔ بہت حوصلے بڑے ہوئے ہیں ان کے“ سینہ کرامت نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر استاد بسو کے ذرا قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظروں میں ایک بار پھر بدل گئی تھی اور اب اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسکول میں کچھ کمزور بچہ کو کچھ شرر بچوں نے گھیر لیا ہو لیکن اچانک ہی اس

بچ کا باب آن پہنچا ہوا اور اب وہ اس سے لڑا کا بچوں کی شکایت کر رہا ہو۔

”سیٹھ کرامت میرا دوست ہے“ استاد بھو نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا مجھے نہایت اہم اطلاع بہم پہنچائی۔ پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ”اور استاد بھو جس کا دوست ہو اس شہر میں کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔“

”تمہارا انداز کچھ قلمی سا نہیں ہو گیا بھو؟“ میں نے ملائمت سے کہا مگر اس ملائمت میں بھی اس کے لئے حقارت چھپی ہوئی تھی۔

بھو نے اس حقارت کو محسوس کر لیا۔ اس کی بھو میں سکون گئیں اور پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں تاہم جب وہ بولا تو اس کا لہجہ پہلے ہی کی طرح نرم ہو گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔“ وہ سرسراتی ہوئی سی آواز میں بولا ”اور ہم بالکل قلمی ہی انداز میں ان لوگوں کی لاشیں بھی کراہیتے ہیں جو ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”مثلاً۔۔۔ ہم سے کیا گفتافی مرزدہ کی عالم پناہ؟“ میں نے اب واضح طور پر استہزاء لہجے میں کہا۔ میں اسے اشتعال دلانا چاہتا تھا مگر وہ کم از کم ظاہر مشتعل نہیں ہوا۔ شاید وہ اشتعال میں بھی اپنی مرضی کے تحت ہی آتا تھا۔

”ہمارے دوست کو بھری محفل سے اغوا کر کے ہم سے ہی سب بچہ رہے ہو؟“ ہانا کہ کل کے لوٹے ہوئے ہو مگر اب اسے بھولے بھی نہ ہو۔ ”وہ استہزاء لہجے میں بولا ”ہم کل ہی کرامت کو چمڑا لیتے مگر تم ہمیں تھل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ گاڑی اٹھنے کی وجہ سے ہمارا ایک آدمی بھی زخمی ہو گیا۔ مگر ہم یہ سب جرائم تمہیں معاف کر رہے ہیں۔ فی الحال ہم صرف سیٹھ کرامت کو لینے آئے ہیں۔ تم سے پھر کسی ملاقات رہے گی۔“

”میں سمجھ نہیں سکا کہ تم ہم تک کیسے پہنچ گئے؟“ میں نے سادگی سے کہا۔

”ہم کل وہیں موجود تھے جہاں سے تم نے سیٹھ کرامت کو اغوا کیا تھا لیکن تم نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ ہم ذرا محفوظ جگہ پر کھڑے تھے“ بھو خوشگوار لہجے میں بولا ”ہم وہیں سے تمہارے پیچھے لگ گئے تھے مگر تمہاری قسمت اچھی تھی کہ ہم نے کوئی عملی کارروائی کرنے میں تاخیر کر دی اور تم نکلنے میں کامیاب ہو گئے لیکن آج صبح منہ اندھیرے سے ہماری ایک کے بجائے چار کارایاں ڈھینیں اور کلکٹن کے علاقے میں چکرا رہی تھیں اور میری خوش قسمتی تھی کہ آج بھی تمہاری گاڑی سب سے پہلے میری ہی نظر میں آئی۔ آج میں نے کیا ڈی تک اس طرح تمہارا تعاقب کیا کہ تمہیں شبہ نہ ہو سکا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں۔ ہمیں واقفی شبہ نہیں ہوا تھا“ میں نے اعتراف کیا ”جب استاد بھو خود ڈرائیو کر رہا ہو تو کسی کو تعاقب کا شبہ نہیں ہوتا“ وہ غصے لہجے میں بولا ”لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ تم لوگ سمندر کی سر کبے چل دو گے۔ اس لئے ہمیں ذرا بون کا انتظام کرنے میں چند منٹ لگ گئے۔ عکسے پھر بھی ہم ہر وقت پہنچ گئے۔ تم لوگ غالباً کرامت کو سمندر میں پھینکا چاہتے تھے؟“

”نہیں۔ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا ”ہم نے صرف ایک کاروباری وعدہ غلطی کی تلاذ کے لئے سیٹھ کرامت کو درودن کے لئے تحویل میں لیا ہے۔ سیٹھ کرامت نے نہایت پرسکون طریقے سے وہ وعدہ پورا کر دیا ہے جس کے بارے میں غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔ اب یہ صرف چوبیس گھنٹے اور ہماری تحویل میں رہے گا۔ کل اطمینان اور خیر وعافیت سے اپنے گھر چلا جائے گا۔“

”کل کس نے دیکھی ہے؟“ بھو استہزاء لہجے میں بولا ”ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ جانے کا اور اگر تم نے زور اس سے کوئی بات سنوائی ہے یا کسی دستاویز پر دستخط کروائے ہیں اسے کا عدیم سمجھو۔“

”کیا تم اسے سیٹھ واحد کے حکم سے لے جانے کے لئے آئے ہو؟“ میں نے محض قلمی کی خاطر پوچھا مگر یہ انداز تو مجھے ہر دیکھا تھا کہ اس معاملے کا سیٹھ واحد سے کوئی تعلق نہیں ہو۔ ”ضروری نہیں کہ میں جو عدیم بھی اٹھاؤں اس کا تعلق سیٹھ واحد سے ہی ہو“ وہ غزایا ”میں ایک آزاد انسان ہوں۔ میرے کچھ فنی معاملات بھی ہوتے ہیں۔ سیٹھ کرامت ذاتی طور پر دوست ہے۔“ اس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔

”راہ سیٹھ صاحب“ میں نے استہزاء لہجے میں سیٹھ کرامت کو مخاطب کیا ”آپ ہم سے تنگی کی وجہ تو یہ بیا فرار ہے جسے کہ ہماری آہنی کے کچھ ذرائع شاید مشکوک ہیں خود آپ کی دوستیاں بھو جیسے آدمیوں سے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر آپ غالباً فلاحی کاموں میں حصہ لیتے ہوں گے؟“

سیٹھ کرامت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ کچھ زرد سا نظر آ رہا تھا۔ بھو کے پیچھے پردہ ہٹنا خوش نظر آیا تھا اب ہی فکر مند نظر آ رہا تھا۔ شاید ہمارے سکون اور اطمینان کو دیکھ اس کا دل بول رہا تھا۔ غالباً اس نے آج تک استاد بھو سے اسے لوگوں کو بدحواس اور خوف زدہ ہونے ہی دیکھا تھا۔

”تمہیں زیادہ خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں“ غزایا۔ پھر حکمانہ انداز میں سیٹھ کرامت سے مخاطب ہوا ”کرامت چلیں۔۔۔ تم یہاں سے موٹر پڑ آسانی سے چلا کر لو گئے یا نہیں؟“

اس سے پہلے کہ سیٹھ کرامت کوئی جواب دیتا میں نے اٹھا کر بھو سے ہمیں زیادہ حکمانہ لہجے میں کہا ”سیٹھ کرامت

تاریخی ناول

100/-	قر تسکین	دنیا کے نامور فاتحین
100/-	قر تسکین	شیر مصر
100/-	قر تسکین	شمشیر اسلام
100/-	قر تسکین	ترک مرو میدان

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

شفیع شاہ لڑھکا ہوا رہے کے لچھے تک پہنچ چکا تھا۔ میں بھی مسلسل حرکت میں تھا۔ قدرت نے ابھی تک ہمیں گرلوں سے محفوظ رکھا تھا۔ بسو کے گرگوں نے اندھاوند قاز کے تھے لیکن اسی دوران بسو کا ہاتھ بھی جیب سے باہر آگیا اور جس لمحے ہوئے انداز میں اس نے ریو اور تڑپا کیا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایک بھی کوئی ضائع نہیں کرے گا لیکن اس وقت تک میں ایک ذرم تک ہاتھ پھیلانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ذرم چھوڑا اور ہلکا تھا۔ میں نے لینے ہی لینے ایک ہاتھ سے ذرم بسو پر کھینچ لیا۔

ذرم اس کے منہ پر لگا اور اس چوٹ نے ایک لمبے کے لئے اسے چکرایا۔ اس وقت تک شفیع شاہ رے کے لچھے کے نیچے سے اسٹین گن نکال چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اسٹین گن کی تڑپ کے ساتھ دونوں ریو اور بردار نو جوان ہوا میں اچھلے اور پٹ سے ڈیک پر گر پڑے۔

بسو کے ہاتھ سے ریو اور چھوٹ چکا تھا اور اب وہ نیچے موڑوٹ پر چھانک لگانے کے لئے پلٹ رہا تھا جب شفیع شاہ نے اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کیا مگر میں نے بروقت نال پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ نیچے کو کر دیا ورنہ بسو کا جسم بھی فینٹی ہو چکا ہوتا۔

میں نے گولیوں سے اسے بچایا ہی تھا کہ موت ایک اور روپ میں اس پر چھین۔ دراصل قاسم انجن روم سے نکل کر کسی چھتے کی طرح اچھل کر ڈیک پر پہنچا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ہماری تینہ تھا۔

جب ٹرالر ٹکار پر نکلے جس تو جال میں جانے کیسی کیسی حلق ہنس جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی بڑی خطرناک پھیلی یا کوئی اور چیز بھی آپہنسی ہے جس کی دہیں کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ٹرالر پر نیچے اور دوسری کی چیزیں موجود رہتی ہیں

کوئی کھلونا نہیں ہے بسو نے تم اتنی آسانی سے لے جا رہے ہو۔ بلکہ اگر یہ کھلونا ہو آتب بھی تم اسے میری اجازت کے بغیر نہیں لے جاسکتے تھے۔

”مجھے روکے گا کون؟“ اس نے ٹوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”میں“ میں نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”پھر روکو؟“ کہتے ہوئے اس نے ریو اور جیب سے نکالے بغیر ہی قاز کر دیا۔ کسی اور کے لئے شاید اس کا یہ قاز غیر متوقع ہوتا کیونکہ اس کے لیے سے ابھی اس درجہ اشتعال ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن میری نظر صرف اس کے چہرے پر ہی نہیں تھی۔ میں اس کی جیب کے اہار کا بھی جائزہ لیتا رہا تھا جس سے مجھے اس کی انگلیوں کی حرکت کا اندازہ ہوتا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ کب ریو اور کے ٹرا ٹیکر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھا۔ گولی سے بچنے کے لئے مجھے صرف چند انچ ایک طرف کو کھٹکانا پڑا لیکن ایسے بظاہر چھوٹے موٹے کاموں کے لئے بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندازے کی ذرا سی غلطی یا ایک ٹانے کی تاخیر انسان کو اس دنیا سے اس دنیا میں بھیجے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اگر مجھے بھی ایک ٹانے کی تاخیر ہوئی ہوتی تو کوئی میرے پیٹ میں اتر کر کمر سے نکل چکی ہوتی۔ گولی میرے اور شفیع شاہ کے درمیان سے گزری اور ٹرا لری چلی ریو اور میں بیست ہو گئی۔

اس کے ساتھ ہی بسو کے دونوں گرگوں کے ریو اور جیبوں سے باہر آگئے تھے لیکن اس کی بھی مجھے پہلے ہی سے توقع تھی۔ میرا پاؤں اس وقت ایک ڈیک جیز کے نیچے تھا۔ میں نے اسے اس طرح اچھالا کہ چنڈی کی ہڈی پر چوٹ نہ آنے پائے اور کرسی بھی اچھل کر میرے ہدف سے ٹکرائے۔ اس مقصد کے لئے کرسی کے وزن کا اندازہ بھی میں کر چکا تھا۔

کرسی خاصی قوت کے ساتھ بسو سے ٹکرائی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید کرسی پر نہ لیکن وہ صرف ٹوٹا کر رہ گیا۔ کرسی کے اچھلتے ہی دونوں گرگوں کے ریو اور گرج اٹھے تھے۔ میں تو اس کے لئے تیار ہی تھا لیکن شفیع شاہ اور سینہ رمضان کو بھی اس سلسلے میں کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ دونوں سینے کے بل گر پئے تھے۔ خفہ مجھے صرف سینہ کراحت کا تھا کہ وہ گھٹا اس ہمدردی میں اپنے ہی ہمدردوں کے ہاتھوں نہ مارا جائے مگر شاید وہ اتنا گھٹا بھی نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ یا پھر شاید جان کے خوف نے اسے رستہ بچھایا تھا اور وہ بھی اضطرابی انداز میں سینے کے بل گر چکا تھا۔

غیبت یہ تھا کہ ہمیں بحر بھی دوچار چھوٹی موٹی چیزوں کی آزمیصر تھی۔ کرسیاں تھیں، پٹائی تھی۔ نوٹے رستے کا اونچا سا لچھا تھا، لوہے کے دو تین چھوٹے ذرم تھے۔ جبکہ بسو اور اس کے گرگوں کو کسی چیز کی آزمیصر نہیں تھی۔

اسی مقصد کے لئے استعمال ہونے والا ایک تیز اس وقت قاسم کے ہاتھ میں تھا۔
 میں ممکن تھا وہ لمبر کا سرد محصول میں تقسیم کر چکا ہو تاکہ میں چلا آتا "قاسم رک جاؤ۔"

قاسم کا ہاتھ جہاں کا تھاں یوں رک گیا جیسے کسی مشین کا ٹین دایا گیا ہو۔ لمبر نے موقع غیبت جانتے ہوئے ایک بار پھر ڈیک کی دیوار کی طرف لپکے کی کوشش کی لیکن قاسم نے اس طرح اس کی ہانگ میں ناگ اڑائی کہ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔
 چند سینکڑے اندر ہی پائنا پلٹ چکا تھا۔ منظر ہی کسر دل گیا تھا۔ ہم پر روالہ رومان کر کھڑے ہوئے دو نوجوان تو اپنے ہی خون میں لٹرنے آؤے تڑپتے چلے گئے۔ یوت چلائے والا بھی نہتا ہونے کے باوجود مارا گیا تھا اور ان کا پاس اوندھا چڑا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ کسی لومڑی کی طرح منکار ہے اور فرار کے لئے صرف موقع کی تاک میں ہے۔

میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا اور اسے کالر سے پکڑ کے اٹھایا۔ شفیق شاہ بھی اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کیے قریب آگیا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "لمبر پر کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ کوئی حملہ نہیں کرے گا۔ یہ میرا شکار ہے۔ اور اسے اپنی طاقت پر بڑا زعم ہے۔ میں اسے خالی ہاتھ مقابلہ کرنے کا موقع دوں گا تاکہ اس کے دل میں کوئی ارادہ نہ رہے۔"
 میں نے کٹ اتار کر ایک طرف اچھال دیا پھر ٹائی بھی گلے سے نکال بیٹھکی۔ لمبر آنکھیں سکیڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور زخاں کی پٹی پر سے بھی کھال پھٹ چکی تھی۔
 "میں نے تمہارا کیا کیا بکا ہے؟" وہ چیخی چیخی سی آواز میں بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔ تم تو یہاں میرے بگڑے ہوئے کام سنوارنے آئے تھے۔ میں نے طریقہ سمجھ لیا تھا۔ اور اس سے پہلے بھی تم نے میرے بڑے کام سنوارے ہیں۔ لاہور میں بھی ایک بار تم نے میرا کام سنوارنے کی کوشش کی تھی۔"
 "وہ تو سیٹھ واحد کا حکم تھا" وہ کمزوری آواز میں بولا۔

"اب اس مت کرو" میری کنیتاں تپ اٹھیں "تم سیٹھ واحد کے احکامات کی آڑ میں اپنی اذیت پرست فطرت کی تشکیں کا سامان کرتے پھرتے ہو۔ سیٹھ واحد نے جن میں صرف مال کی ایک کپی لٹکے کے لئے کا تھا اور تم مجھے ہلاک کرنے کے لئے جنگ میں لے گئے تھے۔ اس وقت بھی تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم نکل گئے تھے۔ اور بعد میں میں نے یہ جاننے کے بعد کہ تم سیٹھ واحد کے آدمی ہو، تمہارے حیلے میں کوئی خرابی کارروائی نہیں کی تھی کیونکہ میں سیٹھ واحد سے مرعوب بھی تھا اور ان کی عزت بھی کرتا تھا۔ اب بھی تم نے ذاتی مفادات کی بنا پر اپنی

حدود سے براہمنی کی کوشش کی۔ سیٹھ واحد بے چارے کو تو علم بھی نہ ہو گا کہ اس وقت تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔ اور اب بھی شاید میں تمہیں معاف کر دیتا لیکن۔۔۔ میں نے دانت چیس کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
 "لیکن کیا؟" لمبر کی آنکھوں میں امید کی کرن ابھری۔
 "لیکن میرے سینے میں کچھ پرانے زخموں کی ٹیس ابھر آئی ہے" میں نے کہا۔
 "میں تمہیں بہت زیادہ مدت سے تو نہیں جانتا" وہ بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں تو جانتا ہوں" میں نے مضیاں بچھتے ہوئے کہا۔
 تم یہ وہ غیبت انسان ہو جس کی بے مقصد تجزی کی وجہ سے میرا بہترین دوست اشرف خان ذلت کی موت ادا کیا تھا اور ذرت پر اس قدر تشدد ہوا تھا کہ وہ اس دنیا سے زندہ گی سے اور حتیٰ کہ مجھ سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔
 "لوہ۔۔۔" اس کے حلق سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز نکلی۔
 تو تم یہ وہ نوجوان ہو جو اشرف خان کو زخمی حالت میں پولیس کے بزنس سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور جس کا کوئی سراغ ہمارے پاس موجود نہیں تھا؟

"ہاں۔۔۔ میں رہی ہوں۔ میں اشرف خان کو پولیس سے تو بچالے گیا تھا لیکن میں اسے موت سے نہیں بچا سکا تھا" میں نے جواب دیا "میں تمہاری تلاش میں واپس شہر لوٹ بھی گیا تھا لیکن تمہیں نہیں ڈھونڈ سکا تھا البتہ تمہارا ایک خاص کارندہ میرے سینے چھو گیا تھا اور میں اسے قتل کر کے ایک رقعہ اس کی لاش کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ رقعہ تمہارے نام تھا اور میں نے اس میں لکھا تھا کہ ابھی تمہارا اور میرا حساب برابر نہیں ہوا لیکن ایک نہ ایک روز اس تم سے حساب برابر کرنے ضرور آؤں گا۔ بہت اچھا ہوا کہ مجھے تمہاری تلاش میں کہیں نہیں جانا پڑا۔ تم خود ہی آ گئے۔ آج ہمارا حساب برابر ہو ہی جاتا چاہئے۔"
 تب اچانک ہی اس نے ہاتھ جوڑے اور گڑگڑانے لگا۔
 "میں تم سے اپنی ہر خطا کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ بھی ہوا اچھا ہے میں ہوا۔ میں اب تمہارا دوست۔۔۔ بلکہ تمہارا غلام بن کر رہتا چاہتا ہوں۔ لیکن کو تمہیں میری ذات سے بہت فائدے پہنچیں گے۔"

وہ لومڑی کی طرح مکار تھا۔ موقع محل دیکھ کر اپنی ساری اکثر فون بالاے طاقت رکھ کر قدموں میں لوٹنے پر تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اگر ایسے لوگ مجھے یہ خوف بنانے میں کامیاب ہوتے تھے تو میں اس ظالم اور بے مروتیاں چند دن بھی خیر عافیت سے نہیں گزار سکتا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کیا۔ اس کا بگڑا ہوا چہو کچھ اور بگڑ گیا اور گروں ایک طرف کو گھوم گئی۔ مگر وہ اپنی

جگہ سے ہلا نہیں۔ کسی بن فاس کی طرح جھاکڑا رہا۔ میں نے اس کے دوسرے گال پر بھی چمچر رسید کیا۔ میں اسے اشتعال دلانا چاہتا تھا مگر وہ بدستور کسی ستون کی طرح ساکت وہ سامت کھڑا رہا۔

”بہت گھمنڈ ہے نا جی میں اپنی طاقت پر۔۔۔“ میں نے منہ میں چبھتے ہوئے کہا ”تو پھر آؤنا۔“ غار میں زندہ کئے کی طرح مارکیوں کھارہے ہو؟“

”تو تم مجھے معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہو؟“ اس نے مجروح سے کہے میں پوچھا کیا میرے مدینے سے اس کے حساس دل کو بڑا دکھ چکا ہو۔

”جی میں معاف کرنے سے کہیں بھرتے کہ تو ہی اپنی آستین میں دس بیس سانپ پال لے“ میں نے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ اس ٹھوکر سے وہ لڑکھڑایا اور پھر اچانک ہی کسی غصبتابک بیسنے کی طرح اچھلا۔ اگر میں بجلی کی سی تیزی سے ایک طرف نہ ہو جاتا تو اس کا بڑا سا سر قپ کے گولے کی طرح میری ناک سے گرایا ہوتا اور شاید میری ناک پیش کے لئے چپٹی ہو جاتی۔

میں نہ صرف ایک طرف ہٹا بلکہ میں نے اس کے پیٹ پر بوری قوت سے گھونسا بھی رسید کیا۔ وہ ہڑا ہوا چربی فرش پر گرا لیکن دوسرے ہی لمحے یوں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے اس کے جسم میں ہڈیوں کی جگہ اسپرنگ لگے ہوں۔

اس نے میرے منہ پر گھونسا رسید کرنا چاہا مگر میں نے اس کا وار کھائی پر روکا اور اسے ایک لات رسید کی۔ اس بار وہ کمر کے بل کر اگر پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بیسنے کی طرح ہی پھر میری طرف دوڑا۔ میں اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر شیڈنا چاہتا تھا مگر اس بار میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ ایک گت ہی آٹھو بیس کی طرح مجھ سے چٹ گیا۔

اس کے بازو بن فاس کی طرح لمبے تھے اور اس نے میری کمر کے گرد گھنٹہ کس لیا تھا۔ یہ گھنٹہ گویا کسی مشین عمل کے ذریعے لپہ لپہ لپہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بھی لمحے میرے گردے اس کے شکم میں پس جائیں گے اور پڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔

ایک لمحے کے لئے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر میں نے یوگا کی مشق کو کام میں لاتے ہوئے سانس روکی۔ سانس روکنے سے اپنے ذہن کو سنبھالنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ میرے حواس نے بھی ذرا سنبھال لیا تو میں نے ہمو کی کھوپڑی پر کھنی رسید کی۔

گھنٹہ کا سر شاید چمک رہا ہوا تھا۔ میری کھنی جھینٹا کر وہ مٹی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہمو کے بازوؤں کا گھنٹہ کچھ دھیلنا پڑ گیا اور میں نے کھنی ہی سے ایک اور ضرب اس کی پیشانی پر لگائی۔

اس کے بازوؤں کی گرفت مزید دھیلی ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن اس کا جسم درخت کے تنے کی طرح ٹھوس اور بے لچک تھا۔ جبکہ میرے جسم میں لچک تھی جس سے ناکہ اٹھاتے ہوئے میں بالآخر اس کی گرفت سے نکل گیا اور مجھے یوں لگا جیسے موت کے جڑ سے سے نکل گیا ہوں۔

پھر تو میں نے اسے گھونسوں اور لاقوں پر رکھ لیا۔ انتقام کی خوشخواری مجھ پر غالب آگئی تھی۔ میری نظریں اشرف خان کی صورت ابھرتی تھی جس کے گولے میں گولی بیوست تھی اور جسے کار میں ڈال کر میں نے رات بھر ستر کیا تھا لیکن جب اسے ڈاکٹر میسر آیا اس وقت تک اس کا جسم ہلا پڑ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظروں میں ذرہ کا چوہ بھی ابھرتا تھا جو تندو سے سج ہو چکا تھا۔

ذہن کے افق پر ان چوہوں کا ابھرتا گویا میری رگ دپے میں شعلے بھڑک دینے کا سبب بن گیا۔ ہمو اب اپنا دماغ بھی نہیں کپا رہا تھا۔ میں نے اسے کئی بار ہاتھوں پر اٹھایا اور چربی فرش پر پھانچا۔ اسے بار پھینکے جانے پر کسی عام آدمی کی تو شاید ہڈیاں چور ہو جائیں مگر وہ گھنٹہ ہمارا ٹھہ کھڑا ہوتا تھا اور مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ بہت کم لوگ ایسے سخت جان ہوتے ہیں۔ لیکن شاید وہ صرف ترخوئے ہی نگے کا عادی رہا تھا اور میں عام حالات میں کوئی ترخوالہ نہیں تھا جبکہ اس وقت تو انتقام نے مجھے شعلے جسم بنادیا تھا۔

بالآخر وہ اس طرح میرے قابو میں آگیا کہ اس کے دونوں بازو اس کی پشت پر اور میرے ایک بازو کی گرفت میں تھے اور اس کی گردن کے گرد میرے دوسرے بازو کا گھنٹہ تھا۔

”ہمو اب مجھے خوشی ہے کہ قدرت نے تمہاری موت میرے ہاتھوں کھنی تھی“ میں نے کھنی کھنی آواز میں کہا اور اس کی گردن کو ایک خاص انداز میں جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کا سٹکا ٹوٹ گیا۔

اس کی گردن توڑنا کسی سانپ کی گردن توڑنے کے برابر ہی تھا۔ لیکن آواز محض ایک بجلی سی ”جٹ“ تک ہی محدود رہی اور زندگی سے اس دورے کا نانا ٹوٹ گیا جو چند لمحے پہلے تک اپنی طاقت کے زعم میں جھٹلا میرے سامنے چٹان بنا کھڑا تھا۔ جبکہ بات بس اتنی ہی تھی کہ جب قدرت کا اشارہ ہوتا ہے تو زندگی کی ذور محض ایک بجلی سی جٹ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ جاتی ہے۔

میں نے ہمو کو چھوڑ دیا۔ چربی فرش پر گرنے کے بعد اس کے ہمواری بھر کم دھندلے دو تین بجٹے سے جھٹکے لئے اور ساکت ہو گیا۔ میں ہاتھ بجا کر مڑا تو سامنے ہی سیٹھ و مٹھان دم بخود سا کھڑا تھا۔ حالانکہ وہ کالی فاسلے پر کھڑا تھا مگر مجھے مڑتے دیکھ کر گویا ہڑا کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ خوف زدہ نظر آ رہا

قائد شاید اس وقت میرے چہرے سے دردِ زندگی نہک رہی تھی۔

میں نے دو سرئی طرف دیکھا۔ سینہ کرامت اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
لکں اس کا چہرہ زود تھا اور اس کی ٹانگوں میں لرزش دیکھی جاسکتی
تھی۔ وہ کبھی بے حس و حرکت لیمو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی
خون میں گھسے ہوئے اس کے گردوں کی طرف۔

وہاں صرف شفیع شاہ ہی ایسا تھا جس کا چہرہ اس وقت بھی
اڑت سے بھاری تھا۔ اٹھیں گھن گدھے پر لٹکاتے ہوئے وہ
سر سرے سے لیے میں بولا "لاشوں کا کیا کرنا ہے باس؟"

"اٹھیں انہی کی بوٹ میں ڈالو اور بوٹ کو ڈوب دو" میں نے کہا۔

"جیس تو مطمئن ہی ہے کہ سمندر میں لوگوں کو آئے دن حادثات
پیش آتے رہتے ہیں۔ لوگ کشتیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ لاپتہ
ہو جاتے ہیں۔ کچھ مٹی شہرت رکھنے والے لوگ بعض اوقات
کوٹ گاؤں والوں کی گولیوں کا نشانہ بھی بن جاتے ہیں اور کبھی
کبھی ایسے کسی مقابلے کی رپورٹ ملتی کہیں بھی درج نہیں ہوتی
مطلبہ کہ روایتیں ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتی ہیں نا؟"

"نہیں نہیں سر! شفیع شاہ نے گہری سانس لے کر کہا۔
انسانی زندگی حرارت و تجربات کا مجموعہ ہے۔"

اس نے آگے بڑھ کر زرار سے نیچے جھانکا پھر میری طرف
مڑے ہوئے ٹھوڑی کھٹکا کر بولا "موثر بوٹ فائبر گلاس کی ہے۔
اس کی ساخت بھی مخصوص قسم کی ہے۔ ایسی کشتیاں اٹھنے کے
بعد بھی نہیں ڈوبتیں۔"

"ہاں۔ اگر ایک دم الٹی ہو جائیں تو نہیں ڈوبتیں البتہ اگر
خاص انداز میں ترجیحی کر کے دباؤ ڈالا جائے تو ڈوب جاتی ہیں"
میں نے کہا "لیکن تمہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔
لاشوں کو بوٹ میں پیچیک کر بوٹ کو زرار سے الگ کر دو اور اس
کے پینے میں اٹھیں گھن کا ایک برست مارو۔ اس میں سوراخ
ہوگا اور بوٹ میں لاشوں کا وزن موجود ہوگا تو وہ لاشوں سمیت
آہستہ آہستہ سمندر کی سطح میں پہنچ جائے گی۔ اور سمندر کا سینہ
بست گرا ہے۔ بڑے بڑے کادوں کو چھپا لیتا ہے۔ اور پھر
پھیل کر کبھی ان کی خوراک مل جائے گی۔"

"نہیں سر! اس نے پرسکون لیے میں کہا اور زرار کیپٹن
قاسم کو اشارہ کیا جو ابھی تک تینہ اٹھائے کھڑا تھا اور شاید اس
دب سے مفہوم تھا کہ اسے اس جینے کی دھار آزمانے کا موقع
نہیں ملا تھا۔

شفیع شاہ اور قاسم نے لاشیں یکے بعد دیگرے ڈھرا ڈولی
کر کے اٹھائیں اور زرار کے ساتھ بندھی ہوئی موثر بوٹ میں یوں
پیچیک رہی جس طرح بندرگاہ پر بے پروا مزدور سالان کی بوریوں
کا ڈھال میں پیچتے ہیں۔

پھر قاسم زرار سے بندھی ہوئی تھی۔ قاسم زرار پر واپس چڑھ
ڈوبے بوٹ زرار سے بندھی ہوئی تھی۔

آپا تو شفیع شاہ نے بوٹ کے پینے پر ایک برست مارا۔ بوٹ کے
پینے میں خاصا بڑا سوراخ ہو گیا اور اس میں دھیرے دھیرے
پانی بھر لگا۔

شفیع شاہ قاسم کی طرف مڑے ہوئے بولا "بوٹ تو ڈوب ہی
جائے گی تب تک تم ڈیک کا یہ حصہ دھو ڈالو جس خون ہی خون
پھیلا ہوا ہے۔"

قاسم نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور ہاتھ روم سے پانی
کی بوتلیاں لالا کر عرش دھونے لگا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں اس نے ہر
خون آلود حصہ دھو کر پکڑنے سے صاف اور خشک ہو گیا۔ اس
وقت تک بوٹ ڈوب چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لاشیں پھول کر
سطح آب پر نہیں آئیں گی۔ پھیلاں اس کی قوت ہی نہیں آئے
دیں گی۔

قاسم نے ڈیک پر بڑی ہوئی کرسیاں اور تپائی وغیرہ بھی
سیدھی کر دی۔ شفیع شاہ اٹھیں گھن واپس چھپا آیا جہاں سے لایا تھا۔
... ہم سب ایک بار پھر بیٹھ گئے۔ قاسم نے آگسٹس کبس سے
ٹھنڈے مشروبات کی بوتلیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں اور خود
انجن روم میں واپس چلا گیا۔ زرار لٹکے لیے کے بجائے ایک
بار پھر درمیانی رفتار سے مشرق کی طرف چل دیا۔

ڈیک پر ایک بار پھر سیٹل ہی جیسا منظر تھا۔ لگاتار نہیں تھا کہ
کچھ دیر سیٹل ریلا موت اور زندگی کا سفر کر چکا تھا۔ سینہ کرامت
اب بھی کم سم تھا اور اس کے چہرے کی زردی بھی کم نہیں ہوئی
تھی۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" میں نے کولڈ ریک کا کھونٹ
حلق سے اٹارنے کے بعد پوچھا۔ اس نے ابھی تک کولڈ ریک کی
بوٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک تخت گویا بیٹ
درا "تلا ہے تم لوگ اب کچھ بھی مار ڈالو گے۔ میں اس واقعے
کا چشم دید گواہ ہوں۔ تم لوگ مجھے کہاں زندہ چھوڑو گے۔ تم
لوگ درندے ہو۔ درندے۔"

"تم ایک بار پھر ہمیں سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو" میں نے
ملا نکت سے کہا "اگر ہم بلاوجہ تمہیں مار ڈالیں تو پھر یقیناً ہم پر
دردِ زندگی کا الزام آئے گا لیکن فی الحال تمہارا کوئی ایسا ارادہ نہیں۔
البتہ اگر تم واپس جا کر کسی کو اس واقعے کی اطلاع دیتے یا اس
اس معاملے کا معنی شاید بننے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر ضرور ہمیں
تمہارا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ اگر تمہیں خودی اپنی زندگی
عزیز نہ ہو تو پھر کون تمہاری زندگی کی نجات دے سکتا ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے" اگر میں اس سلسلے میں زبان بند رکھوں
تو تم لوگ مجھے کچھ نہیں کوو گے؟" اس نے خشک زور سے لیے میں
پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا کہ میں بلا ضرورت خونریزی کا

ہم منورہ پر اتر گئے اور وہاں سے کرائے کی ایک چھوٹی سی
میں بیٹھ کر سیر کے شائقین میں گھل مل کر واپس آ گئے۔
سیٹھ کرامت کو ہم نے اپنے اسی مکان میں چھوڑا
ابھی اسے ایک رات اور گزارنی تھی۔ اس کے بعد ہم
رمضان کو اس کے گھر چھوڑنے چلے گئے۔

راتے میں وہ بولا "میرا خیال ہے اب تمہیں استاد
موت کے سلسلے میں لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ اس کی بارگاہ
معمولی بات نہیں ہے۔ وہ بیٹھ واحد کا خاص آدمی تھا۔
"ہاں۔ ہمیں اس سلسلے میں سوچنا پڑے گا" میں نے
جواب میں کہا۔

"جو فیصلہ بھی کرو مجھے ضرور مطلع کرنا۔ اور میرے
جو کام چاہو لگادنا" مجھے تم پر کام کے لئے تیار ہونے کے۔ میں
تو ذرا چھوٹے ہی دل کا تھا لیکن تمہارے ساتھ نہ کر مجھے
دوستی کے قاضے بھاننے آ گئے ہیں۔ اگر بیٹھ واحد سے جا
ملیں گی تو تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔"

"شکریہ رمضان!" میں نے حقیقی منہ نیت سے کہا "تمہا
بات سے میرا حوصلہ بڑھا ہے۔"

بیٹھ رمضان کو اس کے گھر آتا کر میں اور شفیع شاہ
ہوٹل میں آ گئے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں
فرنیچ سے کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں نکالیں اور پانی کے پاس
سستانے کے سے انداز میں بیٹھ کر دھیرے دھیرے چسکیاں
لگے۔

"ایک بات تو طے ہے۔" میں نے بلا تشدد بات شروع
کر سمندر سے استاد بسو اور اس کے ساتھیوں کی تلاشیں بالآخر
کی باقیات دستیاب ہوں یا نہ ہوں بیٹھ واحد کو معلوم ہو چکا
گا کہ انہیں ٹھکانے لگایا جا چکا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے
اٹھیں ٹھکانے لگانے والے کون ہیں۔"

"جی ہاں۔ اس بارے میں ہمیں تھکا کسی خوش فہمی میں
نہیں رہنا چاہئے "شفیع شاہ مجھے سنے میں بولا "اس کا نام
ری کا ایک نظام ہے جس کی کارکردگی بعض اوقات اچھے
ادوار سے بہتر ہوتی ہے۔ اسے بہر حال معلوم ہو جائے گا
ہماری کارروائی بھی اور اس کے نزدیک یہ ایک طرح کا اعلان
جنگ ہوگا۔ اگر ہم مقابلے میں نہ اترے تو ایک ایک کر
چوہوں کی طرح مارے جائیں گے اور اگر ہم نے مقابلے کی طا
لی تو خاصی خونخوار قسم کی "ہینگ وار" شروع ہو جائے گی
میں ہماری جانتا تو شاید خطرے میں ہی پڑ جائے لیکن بیٹھ واحد
گردہ کو بھی ناقابل غلامی نقصان پہنچے گا۔"

"اس قسم کی بے مقصد ہینگ وار میں ہرگز نہیں جانا
نے کہا۔" مجھے میرا ماننا ہے تھا تو میری زبان ہے۔ یہ وہی فصول
بات ہو گی کہ اب وہ گردہ اس مسئلے پر نظر نہ لائے تو میرا نہیں

تاکل نہیں ہوں" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا "اب
تم بتاؤ کہ سروس تمہارا وعدہ کیا ہے؟ زبان بند رکھو گے۔
"میں بھول جاؤں گا کہ میں نے کچھ دیکھا تھا۔ قسم سے بالکل
بھول جاؤں گا۔ میں یہ بھی بھول جاؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ
سمندر کی سیر کو نکلا تھا" وہ جلدی سے بولا۔

"اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہمارے ہاں وعدہ خلافی کی سزا موت
تعلیق ہوتی ہے" میں نے کہا "تمہاری پہلی وعدہ خلافی کو ہم نے
اس لئے معاف کر دیا کہ اس کا علاج زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لیکن
تمہاری وجہ سے اگر ہمارے لئے کوئی مشکل کمزوری ہوئی تو وہ
تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ اس وقت اگر تم ہزار پورے
میں بھی ہوئے اور تمہارے گرد بیسیوں مضبوط حفاظتی حصار
ہوئے تب بھی موت تمہیں آن دو پے گی۔ اسے محض مکالمہ نہ
سمجھنا۔ اس بات پر صدق دل سے یقین رکھنا۔"

"نہیں نہیں اب مجھ کو پکا یقین ہو گیا ہے" وہ ہاتھ اٹھا کر
جلدی سے بولا "میں اب تم لوگوں کو انہی طرح سمجھ گیا ہوں۔
میں اب تمہارے ساتھ بالکل سیدھا چلوں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ اس بار وہ سچ کہہ رہا تھا۔ چند لمحوں کی
خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "مجھے یہ سوال کرنے کی کوئی خاص
ضرورت تو نہیں لیکن محض کچھ شب کے طور پر پوچھ رہا ہوں کہ
یہ استاد کس قسم کی دوستی کسی طرح شکل آئی؟"

"اب تم سے کیا چھپانا۔" بیٹھ کرامت قدرے
ہلکا پھٹ کے بعد بولا "اس سے کچھ مال با لیں دیں تھا۔ میری
ایک چھوٹی سی مارکیٹ بھی ہے جس میں میں نے اپنے ہی آدمیوں
کو ڈکانیں کھلو کر دی ہوئی ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ مارکیٹ بسوی
کے دم سے چل رہی تھی۔"

"اگر تمہیں اس مارکیٹ کو چالور کئے سے دلچسپی ہے اور تم
اس سلسلے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو تو اس پریشانی کو
ذہن سے جھٹک دو" میں نے اسے تسلی دی "میں شفیع شاہ سے
کہہ دوں گا کہ وہ تمہاری اس مارکیٹ میں کوئی کمی نہ آنے دے گا۔
"تمہاری بڑی مہربانی" بیٹھ کرامت کچھ مطمئن نظر آنے لگا۔
اس کے ذہن سے یقیناً کچھ بوجھ تو ہٹ گیا تھا۔ البتہ تھوڑی دیر
پہلے کی خونریزی دیکھ کر اس کے اعصاب کو جو جھٹکا لگا تھا اس کے
اثرات ابھی تک دور نہیں ہوئے تھے۔

چند لمحے بعد میں نے قاسم کو آواز دے کر کہا کہ زرار کو
واپس لے چلے۔ میرا وہ لطف نہیں رہا تھا اور کچھ سوالیہ نشانات
بھی سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے اور شفیع شاہ کو مل کر ان
کے جوابات تلاش کرنے تھے۔

زرار ایک بہت بڑے غم وازے میں چکر لگا کر واپس
چلا آیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد میں سمندر کے پاس چھتے میں پہنچ
گئے جہاں اب لگے ہوئے تھے کہ وہ وہاں پہنچ چکے تھے۔

وہ مجھے قصور وار سمجھے گا تو دیکھا جائے۔ ٹینگ وار اگر شروع ہوئی ہے تو اس کے دفتر سے ہی شروع ہو جائے۔ خاموش بیٹھ کر انتظار کرنے سے جو ہم واقعی قصور وار نظر آئیں گے۔
”یہ اقدام کافی حد تک خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“
شفیع شاہ نے خیال لیجے میں بولا۔

”ہماری زندگی کا کون سا لمحہ ایسا ہوتا ہے جب ہم خطرے میں نہیں ہوتے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”میرا اعتقاد تھا کہ یہ اقدام آپ کے حق میں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ اس کے دفتر میں جا کر بات کریں گے۔ اس کا رد عمل کچھ بھی ہو سکتا ہے“ وہ بولا۔

”میری جان میرے ساتھیوں سے زیادہ حساسی تو نہیں“ میں نے کہا ”مجھے یہ ہرگز اچھا نہیں لگے گا کہ تم لوگ میرے گرد حفاظتی حصار بنائے رکھو لگوگیاں کھاتے رہو اور میں خود سب سے آخر میں میدان میں نکلوں۔ اس سے کہیں زیادہ قابل رشک صورتحال میری نظر میں یہ ہے کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرے ساتھی میرا انتقام لینے کے سلسلے میں جاں نثاری کی ناقابل فراموش مثال قائم کریں ورنہ ہوتا تو یہی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد سب کا رکن اور اوپر اور نگرہ جاتے ہیں یا پھر کسی کو اس جہنم لیتے ہیں اور کلشن کا کامیاب سبب سبب چلا دیتا ہے مگر اس کو کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔“

”لیکن ہمارے ہاں صورتحال بہت مختلف ہے ہاں!“ شفیع شاہ بولا ”سینئر واحد دنیا کے شہریت خطرناک آدمیوں میں سے ایک سہی لیکن اگر اس نے آپ کو کوئی گزند پہنچائی تو وہ کم از کم اس ملک میں جہنم سے نہیں بیٹھ سکے گا۔ ہم اس کے ہر اس ٹھکانے کو کھنڈر بنادیں گے جو ہمارے علم میں ہوگا۔“

”تمہاری اس بات سے میرا حوصلہ بڑھا ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ اس دہلے پٹنے نوجوان کا لہجہ بظاہر دھمکیا تھا مگر میں اس کے عقب میں طوفانوں کی گھن گرج سن سکتا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”اور اب میرا یہ فیصلہ مزید مستحکم ہو گیا ہے کہ مجھے ابھی اور اسی وقت جا کر سینئر واحد سے بات کر لی جانی چاہئے۔ صورت یہ ہوگئی کہ تم دو تین آدمی لے کر اسی بلڈنگ میں موجود رہو گے جس میں سینئر واحد کا دفتر ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ پورے ایک قور پر سینئر واحد کے دفاتر پھیلے ہوئے ہیں۔ تم اسی قور پر بیٹھو اور لفٹوں کے قریب موجود رہو گے۔ خطرے کی بو سن گھننے کی صلاحیت تم رکھتے ہی ہو۔ جس میں اگر ذرا بھی گڑبڑ کا احساس ہو تو بلا تامل تم سینئر واحد کے دفتر حملہ آور ہو سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے“ اس نے پُر سکون انداز میں سر ہلایا پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ چلو بڑھتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے استاد

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا ”تمہارے خیال میں کیا سینئر واحد اتنا بے وقوف اور جذباتی ہو سکتا ہے کہ اپنے ایک مردہ ساتھی کے لئے ہم نے ٹینگ وار شروع کر دے؟“
”وہ بے وقوف اور جذباتی ہرگز نہیں ہے“ شفیع شاہ غمی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”اگر ایسا ہوتا تو آج وہ سینئر واحد نہ ہوتا محض ایک کباڑی ہی ہوتا۔ شاید آپ کو اس کے بارے میں زیادہ معلوم ہو سراسر بحال میرے پاس اس کے بارے میں جو معلومات موجود ہیں ان کے مطابق وہ شخص ہمیں کی ایک کھولی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ بندر گاہ پر مزدوری کرتا تھا۔ واحد کو اس نے لڑکپن ہی میں ایک بحری جہاز پر غلامی کے طور پر بھرتی کر دیا تھا جہاں وہ دن رات وزن ڈھونڈتا تھا اور ملاخوں سے ٹھنڈے کھانا تھا۔“

”اور آج اس کے اپنے کئی بحری جہاز ہیں“ میں نے لہجہ دیا۔
”لیکن اس نے اپنی شہنگ کبھی کا ہیڈ کوارٹر رائلٹی میں بنایا ہوا ہے۔“
”جی ہاں۔۔۔ آپ یقیناً مجھ سے زیادہ جانتے ہیں“ شفیع شاہ بولا ”میں بھی عرض کر رہا تھا کہ اگر وہ یہ قوت اور جذباتی ہوتا تو آج بھی محض ایک کباڑی ہی ہوتا تو کنگ پاکستان آنے کے بعد کافی عرصے تک وہ بندر گاہ کے قریب ہی کباڑی کا کام کرتا رہا ہے۔“
”ہاں۔۔۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے“ میں نے کہا ”لیکن تم کہتے ہو کہ اسے کراچی میں ہو۔“
”جیسے اس کے قریبی حلقوں سے اس کی ذات کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوئی ہوں گی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے اندازے کے مطابق اس واسطے پر سینئر واحد کا رد عمل کیا ہوگا؟“

”سینئر واحد شہریت حقیقت پسند اور بے حد لحظے دماغ کا کوئی بے گھر ساتھی ہی ساتھ شہریت مسافک اور دیوانیت پرست بھی ہے“ شفیع شاہ بولا ”قبائلی سے انداز میں بعض عداوت پر بڑی گہنی سے عمل کرتا ہے“ چاہے اس سلسلے میں اس کی عقل اور شعور اسے کوئی بھی مشورہ کیوں نہ دے۔ مثلاً اگر اسے یہ محسوس ہو گیا کہ استاد لہجو کو مار کر دراصل اس کی غیرت کو لٹکا رہا ہے تو اس کے جواب میں وہ یقیناً ٹینگ وار شروع کر دے گا۔ حالانکہ اسے ابھی طرح معلوم ہوگا کہ اس میں اس کے آدمیوں کی بھی جائیں مصلحت ہوں گی اور لہجو کی مدد کو بھی کوئی خاص ”قائدہ“ نہیں ہوگا۔ مگر وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ ضرور کرے گا۔ اسی طرح بعض دوسرے معاملات میں بھی وہ قبائلی سا آدمی معلوم ہوتا ہے حالانکہ اس کا قبائلیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔“

”پھر تو میرے خیال میں سید حاسدا راستہ ہی مناسب رہے گا“ میں نے کہا۔

”وہ کیا؟“ شفیع شاہ نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔
”جیسا کہ میں خود اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”میں اسے صاف صاف ساری بات بتا دوں گا۔ اس کے باوجود اگر

بصرے سینہ کراست کو جمال پلائی کرنے کا چکر چلایا ہوا تھا وہ اس کا سائیڈ پرنس تھا۔ سینہ واحد کے کاہلدار سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہو گا۔

”ہاں۔ میرا اندازہ بھی یہی ہے“ میں نے اس کے خیال کی تائید کی ”جن لوگوں کے سیدھے اور ٹیڑھے دونوں ہی قسم کے کاہلدار کافی پھیل جاتے ہیں ان کے خاص خاص کارندے اپنے طور پر بھی کچھ نہ کچھ دھندے شروع کر دیتے ہیں۔ میں خود کسی زمانے میں قاسم خان کے لئے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا مال بھی ادھر سے ادھر کرتا رہتا تھا۔ اسی لئے اب میں نے اپنے خاص خاص کارکنوں کو ایک طرح سے کاہلدار میں اپنا کچھ فیصد حصے کا پارٹنری بنایا ہوا ہے تاکہ انہیں الگ سے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ وہ جتنا اس کاہلدار کو پھیلانے کے لئے ہی زیادہ خود بھی خوشحال ہو گئے۔ اور اس کے باوجود میری طرف سے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر وہ چاہیں اور انہیں وقت بھی میرے ہوتو وہ میرے علم میں لا کر بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں۔“

”لیکن وہ ایسا کریں گے نہیں“ شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔
ان کے ایسا نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ آپ کے ہاں ٹار ہیں۔ آپ سے بہت خوش ہیں۔ اور جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں آپ ہی کے لئے کرنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں۔ یہ بات مجھے ابھی طرح معلوم ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اسی لئے تو میں اپنے آپ کو اتنا طاقتور محسوس کرتا ہوں کہ سینہ واحد سے بھی ٹکر لینے کے لئے تیار ہوں۔“
”ساتھیوں پر اس اعتماد کا شکریہ“ شفیع شاہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”سینہ واحد سے میری بات کراؤ۔ اگر وہ ملک میں ہی ہے تو اس وقت اپنے دفتر میں ہی ہو گا۔“ میں نے کہا۔

شفیع شاہ نے ٹیلیفون اپنی طرف کھسکایا اور نمبر ڈائل کیا۔
سینہ واحد کا نمبر اسے مجھ سے پوچھنے یا کسی نوٹ بک میں دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بیشتر اہم چیزیں اسے زبانی ہی یاد رہتی تھیں۔

سلسلہ ملنے پر وہ پردہ دار لہجے میں بولا ”سینہ واحد صاحب سے بات کرا رہے سہی؟“ ان سے کہنے کے لاہور کے مگر افضل چوہدری صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ کام کی نوعیت صرف انہیں ہی بتائی جاسکتی ہے۔ آپ صرف چوہدری صاحب کا نام انہیں بتا دیجئے۔ وہی کافی ہو گا۔“

پھر وہ ماترہ خیز چہرے پر ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ اس نے مزید صرف چند سیکنڈ انتظار کیا پھر ریسر میری طرف بڑھا دیا۔

”ہیلو“ دوسری طرف سے سینہ واحد کی آواز سنائی دی جس میں ہلکی سی غصہ کی جھلک تھی۔ آہم اس کا موزا خاصا خوشگوار

معلوم ہوا تھا کیونکہ میرے سلام کے جواب میں اس نے فوراً ہی تھکوت لہجے میں جوابی بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”لوئے سوئے منڈے ابی حال اسے تیرا؟“

”ٹھیک ہوں سینہ صاحب!“ میں نے نمونے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا حالانکہ آپ سے پچھلی ملاقات کو کئی برس گزر چکے ہیں۔ میں آپ کی یادداشت کی یاد دہتا ہوں۔“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”یادداشت کے ساتھ ساتھ میری افکار پیش مروری بھی بہت اچھی ہے۔ ویسے تو میں اس چٹڑم نوجوان کو بھی نہیں بھولا جو پر جوش ہونے کے ساتھ ساتھ باطلتہ بھی تھا اور اپنے باس قاسم خان کے نمائندے کے طور پر میرے پاس آیا تھا۔“

”اور یہ آپ کی قوازش تھی کہ آپ نے اس نوجوان کو باپوس نہیں لٹوایا تھا۔ اور اس کے باس کا ہاتھ تمام لیا تھا“ میں نے کہا۔

”بھئی بیچ پچھو تو ہم نے تم سے متاثر ہو کر تمہارے باس کا ہاتھ تھا تھا۔ ہماری جو ہر شناس نظروں نے اس وقت ہی نہیں تیار کیا تھا کہ یہ نوجوان ضرور آگے چل کر بہت کچھ کر کے دکھائے گا۔“ سینہ واحد بدستور خوشگوار لہجے میں بولا۔

”سینہ صاحب! مجھے تو اندیشہ محسوس ہوا ہے کہ آپ جیسے آدمی کے منہ سے ایسی تقریریں سن کر میں اپنی اوقات ہی نہ بھول جاؤں“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ تم اوقات بھولنے والے آدمی نہیں ہو۔ تم بہت اونگھی چیز ہو“ سینہ واحد نے ایک اور قہقہہ لگایا ”تمہارا سابق باس البتہ کافی تلافی آدمی ثابت ہوا۔ جسے معلوم ہے آج کل وہ کہاں ہے؟“

”ہی نہیں۔ میرے خیال میں اسے امریکا کی کسی جیل میں ہونا چاہئے“ میں نے کہا۔

”ہے تو وہ امریکا میں ہی لیکن جیل میں نہیں ہے۔ سزا کاٹ کر رہا ہو چکا ہے“ سینہ واحد ہنسنے لگا ”وہاں طریقہ یہ ہے کہ منشیات کی اسمگلنگ کے سلسلے میں پکڑے جانے والے غیر ملکی جیسے ہی سزا کاٹ کر رہا ہوتے ہیں انہیں پہلی تلاش سے ان کے ملک بھیج دیا جاتا ہے جہاں عام طور پر ملکی پولیس بھی انہیں گرفتار کر لیتی ہے لیکن قاسم خان کے سلسلے میں ایسی کوئی بھولائی نہیں ہوئی۔ جانتے ہو کیوں؟“

”مجھے اندازہ نہیں“ میں نے کہا۔

”تھیں اس کی بیوی سلی کی وجہ سے۔ وہ بہت ہی کمال کی عورت ہے“ سینہ واحد بولا۔

اس کی باتوں نے مجھے اصل بات بھلا دی جس کے لئے میں نے اسے فون کیا تھا۔ میں بائیں کی بھول، بیلوں میں بیٹھنے لگا

”آپ کی معلومات کا واقعی جواب نہیں“ میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ میری انفارمیشن سروس بتا چکی ہے“ وہ ہنس کر بولا ”اب تم اپنا معاملہ ہی دیکھ لو۔ برسوں پہلے تم سے ایک ملاقات ہوئی تھی اور پھر بس لاہور میں فون پر بات ہوئی تھی جب تم نے وقت کی بساط پر ہمارا ایک مہرہ پیش دیا تھا۔ لیکن اس دوران ہم نے تمہارے بارے میں تھوڑی بہت ضروری معلومات رکھی ہیں اور تمہاری ترقی سے باخبر رہے ہیں۔“

”باتوں باتوں میں اصل بات درج جاری ہے“ میں نے کہا۔
”مجھے فوری طور پر آپ سے ملنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہئے۔“
”ابھی...؟ اسی وقت؟“

”جی ہاں۔“

”میں رات ہی اٹلی سے آیا ہوں اور صبح سے لے کر دوپہر کے کھانے تک لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آرام کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ اب میں آرام کرنے کے لئے گھر جا رہا تھا۔ لیکن خیر... تمہیں تو انفارمیشن کیا جاسکتا تھا۔ آجائے۔ لیکن کیا کوئی بہت ضروری بات ہے؟ کوئی تحسین مسئلہ ہے؟“ اس کے لہجے میں سنجیدگی آئی۔

”بس یوں سمجھ لیجئے کہ کسی کی موت کا مسئلہ ہے“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے.... آجائے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں“ اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

شفیع شاہ فخر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”اس نے ملنے کے لئے بلایا ہے“ میں نے شفیع کو بتایا ”تم دو بہترین لڑکوں کو طلب کرلو۔ ایسے آدمی جو ہجوم جگہ پر اسے سے بھی اور خالی ہاتھ بھی لڑنا جانتے ہوں۔ ہجوم سے خود بھی نکل لینے میں ماہر ہوں اور بوقت ضرورت کسی اور کو بھی نکال کر لے جاسکتے ہوں۔ اس کے علاوہ سینئر رمضان کو بھی مطلع کر دو کہ ہمارا یہ پروگرام ہے ورنہ وہ شہو کرے گا کہ ہم اس سے بالا بلادی گا ورنہ ایسا کرنے لگے ہیں۔“

”ٹھیک ہے“ اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”میں اب تک تیار ہوا ہوں“ میں نے کہا۔

میں نے وارڈ زوہب کھول جس میں بیگر پر سب، ایک نہیں سوٹ منگا ہوا تھا۔ سوٹ نکال کر میں نے باہر نکلا اور خود ہاتھ دوم میں جاگسا۔ مجھے معلوم تھا کہ شفیع شاہ کو آدمی طلب کرنے میں چند منٹ تو لگیں گے ”اس کے علاوہ سینئر رمضان بھی شاید آدمی بھیجنا چاہے۔ اتنی دیر میں میں شارڈ لے سکتا تھا۔ سمندر کی سیر اور چند منٹ کی مارڈ ہاؤس کے بعد نہانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد ہم کمرے سے اٹکے تو میں گویا کسی

جان ان مکت کہانیاں کھری پڑی تھیں لیکن جلد ہی میں نے اپنے آپ کو شبیلا اور باضی کے خواب خواب جزیروں سے۔ ال کی روٹی مائی دنیا میں آگیا۔

”حیرت ہے؟“ میں نے دھیمی آواز میں کہا ”سلیٹی اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے چھوڑ چکی ہوگی وہ تو بت ملاں تھی اس سے۔“

”ہاں تو وہ اب بھی ہے“ سینڈ واہد ہنس کر بولا ”نظالی کی طرف اسے لھو کر لے اسے لڑھکاٹی پھرتی ہے لیکن اب بھی ساتھ رکھا ہوا ہے۔ شوہر شاید اب بھی اس کی ایک سلاخی ضرورت ہے اس لئے اس نے قاسم خان کو ابھی تک اپنے ساتھ باندھا ہوا ہے ورنہ وہ اپنے روز و شب تو اپنی مرضی سے ہی گزارتی ہے۔“
”ان کے حالات کیسے ہیں؟“ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ انہوں نے گرین گارڈ بھی اصل کر لئے ہیں۔ ایک سزا یافتہ غیر ملکی... اور وہ بھی منشیات کا اسمگلنگ کا سزا یافتہ... اس کا وہاں گرین گارڈ حاصل کر لیا لیکن کام ہوتا ہے نئے سلیٹی نے ممکن کر دکھایا... اور جہاں تک آلات کا تعلق ہے تو وہ لاس اینجلس میں پورے لہزے کے قریب ہم اشارہ کی طرح ایک پیش قیمت اپارٹمنٹ میں ٹھات سے رہ رہے ہیں۔ وہاں کی ذیر زمین دنیا سے ان کی لائن سیٹ ہو چکی ہے۔ میں نے کہا تاکہ وہ عورت سلیٹی بہت ہی غضب کی عورت ہے کبھی کبھی تو میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں کہ اسے اپنے ساتھ لے لے۔ لیکن دو وجوہات کی بنا پر یہ جاتا ہوں۔“

”کیا ہیں دو وجوہات؟“ میں نے اسے پوچھا۔

”ایک تو میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ عورت قابل اعتبار نہیں۔ دوسرے میرا اندازہ ہے کہ میں اس کے مبالغہات پورے نہیں رکھ سکا۔ میں اگر اس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے خود ل کی طرف بڑھوں گا تو وہ کچھ زیادہ ہی پھیل جائے گی“ سینڈ واہد نے جواب دیا۔

دو ٹیلیفون پر ہی اتنی بے تکلفی سے یہ سب کچھ بتائے جا رہا کہ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا مگر وہ اس معاملے میں کئی بے خوف معلوم ہوتا تھا۔ قاسم خان اور سلیٹی کے ذکر نے کئی رنگ دینے میں ایک منشی سی دی وڈراڈی تھی اور میں ان کے سے میں ہی کئی ایک بے نام سے جنس کے تحت زیادہ سے زیادہ نا جانتا تھا مگر مصلحت اور احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں فون پر اور وہ بھی ایک ہونے کے فون پر اس محسوس کو زیادہ طول نہ دوں۔

سیلو رامد کہہ رہا تھا ”قاسم خان نے کئی بار پاکستان آنے کا ارادہ کیا مگر پھر اسی خوف سے اس نے ارادہ بدل دیا کہ یہاں سے کس دھڑلے لیا جائے... دوسرے وہ فی الحال تو وہاں بہت سے کس ہیں اس لئے اسے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

وقت موسم ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے ائیر کنڈیشنرز بند تھے۔
دبیر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔

دواؤں کے ساتھ دونوں طرف دھندلے شیٹوں
دواؤں کے بوتھ سے بے ہوئے تھے۔ بہت کم دقاتر میں
اتنے خوبصورت بوتھ بنے ہوئے دیکھے ہیں۔ ان میں
غور میں مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ کوئی مستعد
ٹائپ کر رہا تھا تو کوئی فالکون میں غرق تھا۔ کوئی رجسٹر الپ
تھا اور کوئی کسی سیکولر لیریا کسی چھوٹے کمپیوٹر پر حساب
میں مصروف تھا۔ پورے ہال میں دودھیا دھندلی جھلی ہوئی
سیٹھ واحد کے دفتر کابینت اپ کانی تبدیل ہو گیا تھا۔ پھر
خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس میں حیرانی کی کیا بات
اتنے برسوں میں تو ہر چیز میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آتی ہی ہے۔
سیٹھ واحد کے دفتری ترتیب و آرائش بدل گئی تھی اور اس
دست آگئی تھی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

میں ابھی زیادہ دور تک کا جائزہ نہیں لے پایا تھا کہ
طرف سے آنے والی ایک مقررہ آواز نے مجھے چوکاوا
تکی ولپ پھر؟

”آف کورس“ میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کا
ایک کمرے میں نہایت خوبصورت کاؤنٹر کے پیچھے
نہایت ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ رنگت اور نفوذ
ایکوا انڈین معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہر
مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہائیں ہاتھ پر ٹیلیفون کے انٹر
کا بورڈ نظر آ رہا تھا اور سامنے کاؤنٹر پر تین چار رنگوں کے
ایک رجسٹر ایک فائل اور ایک خوبصورت ٹرے رکھی تھی
لڑکی بلاشبہ اتنی خوبصورت تھی کہ ایک لمحے کے لیے
میں بھول گیا کہ میں یہاں آیا کس لیے تھا۔ پھر میں
مسکراتے ہوئے اس کی طرف برسا۔

”اے بیٹی فل گرل لائیک یو کین اوکے ولپ۔
لائک می“ میں نے کاؤنٹر پر پہنچ کر کہا اور وہ شرمیلے اند
نہیں دی۔ اس کا طبع ہرگز مشرقی نہیں تھا مگر جس انداز
کے گال کھائی سے سرخ ہوئے اس سے وہ خود ضرور غالباً
لڑکی نظر آتے تھی۔

مجھے سیٹھ واحد کی قدر تائیسویں پر افسوس بھی ہوا
خوبصورت لڑکی کو اس نے رہنمائی جیسا معمولی سیٹھ
لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ خود ہی
وہ رہنمائی نظر آ رہی ہے تو واقعی رہنمائی ہو۔

”میکس فادر اکیلا بیٹھیں۔“ وہ سجدہ ہوئے
ہوئی۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور وہ سامنے رکھے ہوئے
رائٹنگ پیپر پر نظر ڈالتے ہوئے بولی ”مسز زاہد آپ کا
کر رہے ہیں۔“

تقریب میں جانے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔ ہم بوسے سے باہر
آئے تو ذرا آگے میں ایک سیاہ کار کڑی نظر آئی۔ اس سے کچھ
نی فاصلے پر ایک عٹائی کار فورسے کے نزدیک کھڑی تھی۔
”یہ سیاہ کار اپنی ہے۔ اس میں ریاض اور مرید علی ہیں“
شفیع شاہ نے بتایا۔ ”اور عٹائی کاٹش سیٹھ رمضان کے آدمی ہیں۔“
میں نے انھیں سب کچھ سمجھا دیا۔

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ریاض اور مرید علی کو میں
جانا تھا۔ شفیع نے ٹھیک ہی تو میں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ سیکڑوں
کے مجھے میں اپنا کام کر کے نکل جانے والے آدمی تھے۔ مجھے
امید تھی کہ سیٹھ رمضان نے بھی ٹھیک ہی کوئی بھیجے ہوں گے۔
میں سوچ رہا تھا کہ سیٹھ واحد نے فون پر تو مجھ سے بہت ہی شفقت
اور خوشدلی سے بات کی تھی لیکن میں ٹھنکن تھا کہ استاد لیسو اور
تین دوسرے کارکنوں کی موت کا سن کر اس کی ساری شفقت اور
خوشدلی ہوا ہو جاتی۔

جب میں پچھلی مرید سیٹھ واحد سے ملے گیا تھا اس وقت
بھی میرے اندازے کے مطابق وہاں کم از کم چھ سات گھنٹوں
موجود تھے جن میں سے پانچ تو بظاہر بے ضرر سے دفتری کارکن نظر
آ رہے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ اب شاید گھنٹوں میں اس سے بھی
زیادہ ہو چکے ہوں۔

بر حال ایک بات طے تھی کہ اگر وہ غصے میں آ کر وہیں کوئی
کارروائی کرنے پر تشریف لایا مجھے پریشان بنانے کی کوشش کرتا تو یہ
کارروائی اس کے لئے اتنی آسان ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس
کے دفتری پتہ ایڈس سے ایڈس جاتی اور بعد میں وہاں سے
کچھ لاشیں ضرور اٹھائی جاتی جن میں شاید میری اور سیٹھ واحد
کی لاشیں بھی شامل ہوتیں۔

میں شفیع شاہ کے ساتھ مریدز میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔
دونوں کار میں بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ہمارے پیچھے تھیں۔
نار کے قریب ایک عالی شان عمارت کے نیچے تین کار میں
قریب قریب رکیں اور ہم کاروں سے اتر کر بظاہر ایک دوسرے
سے لائق کے ساتھ لفٹوں کی طرف بڑھ گئے۔ سیٹھ رمضان
کے چار آدمی عٹائی کار میں آئے تھے۔ کوئی ٹھیک ہی معلوم
ہوئے تھے۔

پانچویں فلور پر پہنچ کر سب لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔ اس
فلور پر سیٹھ واحد کے دفتر میں بہت سے لوگوں کی آمد رفت جاری
تھی۔ صرف شفیع شاہ اس دروازے کے قریب رہا جس سے گزر
کر ملاقاتی سیٹھ واحد کے کمرے کی طرف جاسکتے تھے۔ شفیع بظاہر
ایک کتا بچے کے دونوں الٹ پلٹ رہا تھا جیسے کوئی ایڈریس وغیرہ
تلاش کر رہا ہو۔

میں خدای آگے بڑھا اور فیٹے کا بھاری بھر کم دودھ کھول کر
اندہر چلا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا سینٹری ائیر کنڈیشنر ہال تھا۔ اس

اپنا تعارف بھی کرا دیا۔

”خوش ہوئی آپ سے مل کے“ میں نے اپنا نام بتائے بغیر
ٹھک لہجے میں کہا۔

اس نے میرے لئے دوداؤہ کھولا۔ کمرے میں بال کے
تالین سے بھی کہیں زیادہ نرم اور درخت تالین بچھا ہوا تھا اور طویل
دعریض کمرے کی آرائش اور فرنیچر قابل دید تھا۔ کمرے میں
نمایت لیکن دودھیا مدھنی چھیلی ہوئی تھی۔ ایک گوشے میں ترچھی
رکھی ہوئی ایک نمایت تھیں اور پیش قیمت میز پر ایک نیل لپ
موشن تھا جس کے نیچے میز کی سطح شیٹ کی طرح جھللا رہی تھی۔
میز پر بہت کم سامان تھا جس طرح عام طور پر نمایت اونچے قسم کے
دفاتر میں اطلاع دینے والوں کی میزوں پر ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ نمایت خوبصورت اور متحرک تھا لیکن چھیلی
کے عطری کی تیز خوشبو اس داخل کو بوجھل بنا رہی تھی۔ مختصر قد
قامت کا مالک سیٹھ واحد اپنی خوبصورت میز کے عقب میں ایک
نمایت شاد اور ریو الونگ چیئر پر نیم دراز تھا۔ اس کے بال سیٹھے
سے جے جے ہوئے تھے لیکن شاید چھیلی کی کے تیل میں تر تھے اور
خوب چمک رہے تھے۔

وہ اب بھی ویسای تھا جیسا میں نے اسے کئی برس پہلے دیکھا
تھا۔ اس کی شخصیت میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہاں
اتنا ضرور تھا کہ اس وقت وہ کچھ تھکا تھا سا لگ رہا تھا۔ دو بھاری
بھرم سے آئی گئی کہ رسید پر اس کے مقابل بیٹھے تھے اور ان
کے درمیان صرف ایک کرسی خالی تھی۔

سیٹھ واحد کے عین پیچھے ایک نیم ٹیٹا شخص ستون کی طرح
استادہ تھا۔ وہ غائی چٹون اور چڑے کی ڈھیلی ڈھالی جیکٹ میں تھا۔
اس کا چہرہ پھولا پھولا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ یہ آنکھیں ہر قسم
کے تاثر سے اس حد تک عاری تھیں کہ چہرے کی معلوم ہوتی تھیں۔
وہ دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے کھڑا تھا اور مجھے تعین تھا کہ
جیبوں میں جدید ترین ساخت کے ہسٹل بائریا اور موجود ہوں گے۔
کمرے کے آدھے حصے میں نشست کا انتظام تھا اور اس کی
آرائش ذرا رنگ مدام کی طرز پر تھی مگر سیٹھ واحد اٹھ کر اس
طرف نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے اس کے عین
مقابل ان دو بھاری بھرم توہینوں کے درمیان ہی بیٹھنا تھا جو کچھ
عجیب پراسرار انداز میں خاموش بیٹھے تھے۔

سیٹھ واحد نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس بے پناہ
طاقتور آدمی کا ہاتھ نمایت مختصر مگر چمکی طرح سخت تھا۔

”جینو بھی سوچے منڈے!“ اس نے خالی کرسی کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے گرجوٹی سے کہا ”بڑی کثرت کے بعد تلے کی
زحمت کی ہے تم نے... ہاں جینی اب کیوں ملو گے۔ اب تو بڑی
اوپرچی چیز ہو گئے ہو۔“

”آپ جیسے بڑے لوگ ہم غریبوں کا اسی طرح مذاق اڑاتے

سیٹھ واحد کا پورا نام واحد زاہدی تھا۔ میں لڑکی کا شکریہ ادا
کر کے آگے بڑھا۔ بیٹوں کے درمیان کشادہ راستے سے گزرتا
ہاں میں سامنے نظر آنے والے سفید دوداؤہ کی طرف بڑھا جس پر
بیل کے حوت سے آراستہ سیٹھ واحد کے نام کی تختی نظر آ رہی
تھی۔

دوداؤہ سے ذرا پہلے دائیں یا میں جودو کہیں تھے بظاہر
ان میں بھی دو دو آدمی میزوں پر غائیں وغیرہ لئے بیٹھے تھے۔
میں نے بیک وقت سر اٹھا کر کمری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور
لے ان کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ کرنے میں ذرا
مردت نہیں ہوئی کہ وہ بظاہر منڈب اور شائستہ نظر آنے کے
دور دراز آدمی نہیں تھے۔

انہم میں نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور بے نیازی
سے دوداؤہ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسی لمحے دوداؤہ خود سی
مل لگا اور پتہ کر کے ایک دروازہ آوی سکر آتا ہوا باہر آیا اور
تنبلی انداز میں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھا۔ اندر گویا پہلے
کسی نے میری آمد کی اطلاع کر دی تھی۔

وہ شخص مان نہ مان میں تیرا اسمان کے صداق مجھ سے
نیا نظریہ ہو گیا جبکہ میں ظاہر ہے اسے پہچان بھی نہیں تھا
لیکن چونکہ اس بیکراں غلوں کے اظہار کا مقدمہ معلوم تھا
ن میں نے کسی قسم کے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس
مگر جوئی کا جواب اس سے زیادہ گرجوٹی سے دیا۔ گویا دوداؤہ واقعی
راکھی کھڑا ہوا جیسی بار تھا جسے قریہ قریہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے
تھا جھکا تھا۔

میری اس مصنوعی گرجوٹی پر وہ کچھ کھینچا تا سا ہو گیا۔ ہر حال
اپنا فرض تو ادا کر چکا تھا جینی اس نے اخلاق کے اس
اہرے کے دوران میرے لباس پر ہاتھ پھیر کر اچھی طرح تسل
لی تھی کہ میرے پاس نکلی ہو لٹری میں جیب میں کوئی ریو الونگ
ہو تو نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا احتی نہیں تھا کہ ریو الونگ جیب
دھک کر سیٹھ واحد سے ملے آتا۔ اس کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔
میں نے پہلی سے ایک مختصر ضرور بندھا ہوا تھا اور مختصر جینی چڑ
اٹھیں کوئی پروا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سیٹھ واحد کے کمرے
کا کوئی ایکسچینج ساتھ لے بھی جاتا تو اس کے استعمال کی فہمت
نہیں تھی۔ قسمت آزمائی کرنے والے کو خیر نکالنے سے
میں اصرار کیا جاسکتا تھا۔ نمایت ماہر انداز میں اپنا کام انجام
پتے والے اس شخص نے منڈاؤہ انداز میں مجھے کمرے میں ملنے
ٹھان کیا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک کرخت صورت آدمی تھا۔
کا چوٹا تھا کہ اس نے دنیا کے بہت سے رنگ دیکھے ہیں
ی صورتیں سہی ہیں اور بڑے تجربوں سے گزرا ہے۔ وہ ایک
مذاق سے سوت میں تھا۔
”علامہ کہ فیوض کہتے ہیں“ میرے ساتھ چلے ہوئے اس نے

نظر مجھ پر ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خاموشی سے دورانہ طرف چل دئے۔ وہ شخص بھی انہی کے ساتھ یا ہر چلا گیا۔ کمرے میں لایا تھا لیکن سینہ واحد کے عقب میں کھڑا ہوا۔ غما شخص بدستور اپنی جگہ استاء رہا۔ اس کا جواب بھی اس سے عاری تھا۔ وہ گویا کمرے میں ہونے والی کوئی بھی بات نہیں رہا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ واحد بولا "یہ کمرے میں موجود رہے گا لیکن اس کی وہ تمہیں ذرا بھی اچکا یا بت محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم کو کٹا اور ہراسی ہنس۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر دیر سے دھیرہ الا مکان مٹا کر اندر اڑ میں بات شروع کی۔ تمام واقعہ کے دوران میری کوشش درحقیقت یہی تھی کہ اس معاملہ اپنا بے قصور ہونا ثابت کر سکوں اور یہ اشارہ بھی دے رہا استاء ہنس اس کے ساتھ کچھ ایسا زیادہ غلبہ بھی نہیں درحقیقت اس نے خود ہی اپنی موت کو دعوت دی تھی۔

جب میں نے استاد ہنس کی ہلاکت کا ذکر کیا تو تیلو آنکھوں میں پانی کچھ خوش خلقی کے آثار بھی مشدود ہو گئے کی رحمت ایک لمحے کے لئے متیر ہوئی لیکن وہ بظاہر قائم اور حلق سے میری بات سن رہا۔ اس کے ذہن میں اگر کچھ رہا تھا تب بھی اس نے اس کا انکار نہیں کیا۔ اس نے کسی لفظ پر مجھے ٹوکا نہیں۔

میں خاموش ہوا تو وہ اٹھ کر کمرے میں شلے لگا۔ ہی اسے گویا سانپ سو گھر گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کی میں نیند کا جو ہکا سا شمار نظر آ رہا تھا وہ اب غائب ہو چکا۔ پوری طرح چو کنا اور مستعد تھا۔ اس کا خاص اہتمام بدستور اپنی جگہ جاکر تھا اور اس کی پتھر کی سی آنکھ تک میری ہی جانب مگر اس تھیں اور وہ گویا کسی اشارہ تھا۔

میں بھی اس وقت گویا بیٹھا نہیں تھا بلکہ درحقیقت سنے ہوئے نادیہ رستے پر چل رہا تھا اور اس رستے کا میرے اعصاب بھی سنے ہوئے تھے۔ کسی اشارے کا باڈی گاڑ ہی نہیں "میں بھی تھا۔

شلے شلے سینہ واحد اپنی سائڈ ٹیبل کے قریب پر رکے ہوئے ایک خوبصورت مگارس سے اس نے نیت جسم کا مگارس نکال کر لٹائی لائٹ سے سٹکایا اور ایک لیا۔ وہ غالباً تمباکو نوش کا عادی نہیں تھا "صرف اعضا لمحات میں چند نکش لگایا تھا۔ میری نظر اس پر بھی تم کے خاص باڈی گاڑ پر بھی اور میں یہ ظاہر بھی نہیں کر کے میں بالکل چو کنا ہوں۔

ہیں جناب! "میں نے جیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے چروں پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا اور وہ گویا غیر محسوس طور پر میری حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ "تا بے قانع اشارہ ہوئی بٹانے کے پکڑیں ہو "سینہ واحد نے میز پر کنیاں نکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ کچھ زیادہ ہی پکڑیں "گیا ہوں "میں نے کہا "ابھی ارادہ ہی کیا ہے تو مجھ پر عجیب پکڑ چلے گئے ہیں۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "کبھی میں نے بھی اس کا ارادہ کیا تھا لیکن ہوئی اندر سڑی کا مستقبل مجھے روشن نظر نہیں آتا۔ میں نے یہ خیال ترک کر دیا اور سنگاپور میں ایک ایئر ٹیکسٹ ہوئی کے شیراز خرید لئے۔"

"آپ تو بڑے آدمی ہیں جناب! کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہم تو اپنی جگہ پوچھی کا بیشتر حصہ صرف اپنی بقاء کے لئے داؤ پر لگا رہے ہیں "میں نے کہا۔

"انسانی باتیں چھوڑو بر خودار "سینہ واحد سر ہلاتے ہوئے مسکرایا "مجھے معلوم ہے تمہارے پاس بڑا مال ہے۔" "شلے آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ میرے لئے فخر کا ہی مقام ہے" میں نے کہا۔

اس دوران وہ شخص جو مجھے اندر لایا تھا "ایک دیوار کے قریب جا کر اٹھ ہوا تھا۔ دیوار پر بظاہر آرائش کے لئے لکڑی کا کام کیا گیا تھا مگر اس آرائش کا ایک حصہ درحقیقت ایک چھوٹا سا دورانہ تھا جو ایک غیر نمایاں سے سوچ کو دلانے پر مکمل کیا تھا۔ ردوائے کے عقب میں ایک چھوٹی سی الماری تھی جس میں شیشے کے جھللاتے شیلوں میں کچھ خوبصورت بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ "سر! آپ کچھ پینا پسند فرمائیں گے؟" اس شخص نے نہایت منہ بان انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"میں عام طور پر صرف ٹھنڈا پانی پیتا ہوں "میں نے جواب دیا۔

سینہ واحد نے قہقہہ لگایا اور اپنے آدمی سے مخاطب ہوا۔ "بھئی یہ اپنا سونا منڈا بڑا شریف آدمی ہے۔ تم اپنا ہی شراب خانہ بند ہی رکھو تو اچھا ہے" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں بھی نہیں پیتا۔ مسائروں کے لئے رکھا ہوں۔"

اس شخص نے وہ خفیہ خانہ بند کر دیا اور کمرے میں ایک لمحے کے لئے سکوت سا بھا گیا۔ سینہ واحد گویا جیتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھی یہ وہ کیا بات تھی جس کے لئے تم یہیں اچانک دوڑے چلے آئے ہو؟"

"وہ بات میں تجھ سے کہنا چاہوں گا "میں نے کہا۔

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور میرے

ہونے لگے تو تمہارے آدمی تمہیں اور میرے آدمی مجھے مطلع کریں۔ ہم خود میرے بیٹے کو اس معاملے کا تفتیش کریں گے۔
 ”اول تو مجھے یقین ہے کہ آئندہ ایسی کوئی صورت پیدا ہی نہیں ہوئے پائے گی“ میں نے کہا ”پھر بھی ازراہ احتیاط اس قسم کا معاہدہ کرتے ہوئے مجھے خوش ہوگی اور میں اسے آپ کی خصوصی نوازش اور شفقت سمجھوں گا۔ میں اور میری تنظیم تو سختی سے چور اور چینیہ دو کے اصول پر کاربند ہے۔“
 ہم لوگ اپنے آدمیوں کے لئے گروہ کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر آج سے یہ معاہدہ رہا“ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے گرجوٹی سے اس سے ہاتھ ملایا۔
 ہمارے بیٹر معاہدے اسی طرح زبانی طے پاتے تھے۔
 ”اس کے ساتھ ہی میں اجازت چاہوں گا“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”اس ملاقات سے میرے اعصاب پر بہت برا بوجھ ہٹ گیا ہے۔“
 ”لیکن میرے اعصاب پر تم بوجھ بڑھا کر جا رہے ہو“ سینٹ واحد بولا۔

”استاد لہو کی موت سے اگر واقعی آپ کے لئے کوئی ایسا غلا پیدا ہو گیا ہے جسے جلد پر نہیں کیا جاسکتا تو کچھ عرصے کے لئے میں خود آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں“ میں نے غلہ سنانے کے لئے کہا ”میری یہ پیش کش آئندہ چند ماہ کے لئے یوں برقرار رہے گی کہ کسی بھی سلسلے میں آپ کو کوئی ایسا مرحلہ درپیش ہو جس کے لئے آپ سمجھتے ہوں کہ کسی خاص ہی آدمی کی ضرورت ہے تو آپ مجھے یاد فرمائیں۔ میرے پاس کئی بے مشل قسم کے آدمی موجود ہیں۔ اور اگر میں نے ان میں سے بھی کسی کو سوزوں نہ سمجھا تو میں خود آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہو جاؤں گا بشرطیکہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔“

”اس پیش کش سے تم نے میرا دل خوش کر دیا“ وہ واقعی کل اٹھا ”مجھے تو ایک نقصان کا سا احساس ہو رہا تھا میں اسے بھول گیا ہوں۔ اپنا یہ وعدہ یاد رکھنا۔“

”کیا ہم لوگ بھی کبھی اپنے وعدے بھول سکتے ہیں“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے ایک بار پھر گرجوٹی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر باہر گیا۔ دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک کیمپ کے قریب ڈھیلے ڈھالے سوٹ والا وہی قد آور اور بڑا بڑے حد خلقی و ملسار آدمی کھڑا تھا جو غالباً سینٹ واحد کا غیر رسمی پروٹوکول آفیسر تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکینی سے انداز میں ملسارانہ مسکراہٹ اٹھی اور وہ گردن کو خم دیتے ہوئے بولا۔
 ”آئیے۔۔۔ میں آپ کو دروازے تک چھوڑ دوں۔“
 ”اس وقت کی ضرورت نہیں۔ ہم چلا جاؤ گا“ میں نے

پھر میری کسی مظلوم حس نے گویا مجھے احساس دلایا کہ فضا میں پہیلی ہوئی اعصابی تاؤ کی لہریں ختم ہو گئی ہیں۔ شاید سینٹ واحد کی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ میری طرف مڑا تو اس کے ہونٹوں پر سختی سختی مسکراہٹ تھی۔
 ”استاد لہو کو مار کر تم نے میری تنظیم کا توازن توڑا سا خراب کر دیا ہے“ وہ دماغ سے بولا ”وہ بہت کام کا آدمی تھا“
 ”مجھے اس کا بخوبی اندازہ ہے“ میں نے متاسفانہ سے انداز میں کہا۔

”اس میں بس ٹھوڑی سی جمالت باقی تھی جسے میں بھی نہیں نکال سکا۔۔۔ دیئے مجھے حیرت ہے کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے مارا گیا“ اس نے پُر خیال انداز میں ٹھوڑی پر ہاتھ بھیرا۔
 ”شاید وہ اپنی جمالت کے انھوں ہی مارا گیا“ میں نے دیکھے لمبے میں کہا ”بہر حال اتنی آسانی سے نہیں مارا گیا۔ اسے مارنا معمولی آدمیوں کا کام نہیں تھا“ میں اشارتاً سینٹ واحد کو یہ بتا رہا تھا کہ ہم معمولی آدمی نہیں ہیں۔

اس نے میری اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا ”اس حادثے سے مجھے ایک جھٹکا لگا ہے کہ کوکہ اب میں کافی حد تک ”جھٹکا پروف“ ہو چکا ہوں۔ بہر حال۔۔۔“ اس نے کندھے اچکائے ”اس حادثے کی اطلاع ملے کہ تمہارا خود میاں چلے آنا اور بلا کم و کاست ہر بات بیان کر دینا مجھے اچھا لگا اور درحقیقت تمہارے اسی اقدام سے مجھے تمہارے بے تصور ہونے کا یقین آیا ہے۔ اگر تم مجھ سے رابطہ قائم نہ کرتے اور میرے اپنے تفتیشی ذرائع سے یہ بات مجھ تک پہنچتی تو شاید بات بگڑ جاتی اور ہمارے درمیان غلط فہمیوں کا دور ہونا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں ایک بار پھر تمہاری دور اندیشی اور معاملہ فہمی کی داد دیتا ہوں۔ پہلی بار تم اس وقت بھی مجھے دور اندیش اور معاملہ فہم معلوم ہوئے تھے جب تم قائم خان کے لٹا کدے کی حیثیت سے میرے پاس آئے تھے۔“

”یہ آپ کی عنایت اور شفقت ہے“ میں نے اعکاسی سے کہا ”میں اپنے معاملات دراصل حتی الامکان سیدھے رکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہوں۔۔۔“ اس نے ہنسا کر ابھرتے ہوئے سگرائیں ٹرے میں رکھ دیا اور پھر گویا اسے بھول ہی گیا۔

چند لمبے بعد جب کہ میں اس سے اجازت طلب کرنے کا ارادہ کر رہا تھا ”وہ گویا چھوٹے ہوئے بولا ”ازراہ احتیاط آئندہ کے لئے میں ایک قسم کا معاہدہ کر لیتا جاؤں گا میں اپنی تنظیم کے معمولات کو تمہارے اور تمہاری تنظیم کے بارے میں ضروری کوئی فراہم کرنے کے بعد یہ بدایت جاری کر دیتا ہوں کہ میرا کوئی آدمی تمہارے کسی آدمی سے کسی بھی مسئلے پر لینچ نہ پائے اور اگر کسی وقت کسی بھی وجہ سے تصادم کا کوئی صورت پیدا

کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔

”بے شک“ شفیع شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بھی اب خوش نظر آ رہا تھا۔ کراچی میں تنظیم کو اس قدر مطلوب بنانے کا سرور حقیقت اسی کے سر تھا۔

”تمہیں اس مسئلے میں اپنے تمام آدمیوں کو ہدایات جاری کرنی ہوں گی“ میں نے کہا۔ پھر میں نے سیٹھ رمضان کے آدمیوں کو مخاطب کیا ”آپ لوگوں کو بھی چونکہ ہم اپنی ہی تنظیم میں شمار کرتے ہیں اس لئے یہ ہدایات آپ اور آپ کے دیگر تمام ساتھیوں کے لئے بھی ہوں گی۔“

”بہت بہتر“ ان میں سے ایک منہ بانہ لئے میں بولا۔

”دیسے میں باضابطہ طور پر سیٹھ رمضان کو بھی بتا دوں گا“ میں نے کہا۔ ابھی الفاظ میرے ہونٹوں پر ہی تھے کہ کوئی میرے قریب آگھڑا ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سیٹھ رمضان ہی تھا۔

”یار تم نے تو شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ دیا“ میں نے کہا۔ ”کس معاملے میں؟“ اس نے ایک کرسی کھسکا کر اطمینان سے بیٹھنے ہوئے کہا۔

”عمر کے معاملے میں اور کس معاملے میں“ میں نے پتھر سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد کہا ”ابھی تمہارا نام ہی لیا تھا کہ شیطان کی طرح آن موجود ہوئے۔ یقیناً شیطان سے لسی مہربانی“

شک لہے میں کہا۔ اس کے باوجود وہ مجھے دواڑے تک چھوڑنے آیا۔ میں بھی اس کی روانہ کے بغیر جاتے جاتے ایک بار پھر ریشمٹ لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جو اب وہ بھی مسکرائی مگر ہر ایک لخت اس نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں سر جھکا لیا۔ شاید اس شخص کی وجہ سے اس کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی جو مجھے دواڑے تک چھوڑنے آیا تھا۔

اس شخص سے پیچھا چھوڑنے کے بعد میں اس غور کے تیرس نماصے میں آیا۔ اوپر اوپر بھگے ہوئے اپنے آدمیوں کو میں نے سٹیل دیا کہ سب خیریت ہے۔ دیسے تو میرا زندہ سلامت باہر آ جانا ہی خیریت کی دلیل تھا لیکن میرا اشارہ پا کر انہیں مزید اطمینان ہو گیا اور ان میں سے کوئی سیڑھیوں کے راستے اور کوئی لٹ سے نیچے روانہ ہو گیا۔

نیچے پہنچ کر ہم ایک بار پھر کادوں میں آگے پیچھے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے شفیع شاہ سے کہا ”ان سب کو رستوران میں بلا لو۔ کسانا ہم اکٹھے ہی کھائیں گے۔“ شفیع نے جا کر انہیں میرا پیغام دیا اور وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے رستوران میں آگئے۔ اس وقت وہ سب نہایت معزز اور شریف آدمی معلوم ہو رہے تھے۔ بیٹھنے کے لئے میں نے ایک الگ تھلک سی میز منتخب کی۔ سینور کچھ کرب اپنی اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دے چکے تو میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی کی وجہ سے وہ سب مذہب سے نظر آ رہے تھے۔

”بھئی آپ لوگ اس طرح زبان کو آلا لگا کر مت بیٹھیں۔ نہ تو میں کوئی سخت گیر نیچر ہوں اور نہ آپ کسی پرائمری کلاس کے بچے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ آزادی اور بے تعلقی سے گفتگو کریں۔“

ان کے چہروں پر مسکراہٹ ابھی لیکن اب بھی وہ محض ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ دہڑنے ہمارے سامنے مشروبات سجاوئے تھے۔

”میں اس وقت بہت خوش ہوں“ میں نے شروب کی چمکی لیتے ہوئے کہا ”کیونکہ ایک بہت ہی سنگین مسئلہ نہایت ہی خوش اسلوبی سے اور پُر اس انداز میں طے پا گیا ہے اور صرف یہی نہیں، آئندہ کے لئے بھی خاصا بہتری کا سامنا ہو گیا ہے۔“

شفیع شاہ نے سوالیہ سے انداز میں بھوسا اچکا میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”سیٹھ واحد نے ہمیں ایک معاہدے کی پیش کش کی ہے جسے سیاسی زبان میں پُر اس بنائے جا بھی گا معاہدہ کیا جاتا ہے۔ آئندہ دونوں تنظیموں کا کوئی بھی آدمی کسی بھی حال میں ایک دوسرے سے نہیں الجھے گا اور اگر کوئی ناگزیر صورت حال پیدا ہوئی جائے تب بھی اپنے اپنے پاس کو اخلاص دے گا۔ سیٹھ واحد جیسے آدمی کا ہمیں اس قسم کی پیش کش کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے ہمیں ایک اہم اور طاقتور تنظیم

لازول کمٹیوں کے خالق

انوار صدیقی

کالیک پراسرار ایڈیٹر ناول

برہمچاری

قیمت :- 150 روپے

اردو بازار لاہور

کے لئے جس انٹریکٹل کمپنی کے پاس اپنا تھکدہ بھیجا ہوا تھا وہ ہمیں اجازت دینے کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔ اگلے ماہ ان کا تھکدہ سرورے کرنے کے لئے ہمارے پاس آئے گا۔

”بہت خوب“ میں نے ہرجوش لہے میں کہا ”یہ تو واقعی بہت اہم خبر سنائی تم نے۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ہوٹل تعمیر کرنے کا میرا خواب ضرور شرمندہ تعبیر ہوگا۔ حالانکہ یہ صرف ابتدائی مرحلہ ہے مگر جانے کیوں مجھے یہی سب سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا۔“

”یونہی باقی سب مراحل بھی طے ہوتے جائیں گے سر!“ شفیع شاہ یقین سے بولا۔

”تم جیسے ساتھیوں کی موجودگی میں مجھے کوئی فکر نہیں“ میں نے کہا۔

چند لمبے کی خاموشی کے دوران ہم نے ناشتا ختم کیا۔ پھر میں نے گھر کی میں تیار کیجئے ہوئے کہا ”آج میں واپس چلا جاتا ہوں“ اب یہاں میرا کوئی کام نہیں رہا۔ میرا کلٹ اوپن تھا ”تم زبول ایجنٹ کو فون کر کے میرے لئے ساڑھے بارہ بجے والی فلائٹ میں ایک سیٹ کفرم کرادو۔“

”بہت بہتر“ اس نے کہا اور وہیں فون پر زبول ایجنٹ سے بات کرنے لگا جس کا دفتر نیچے اسی ہوٹل میں تھا۔

چند منٹ بعد شفیع شاہ نے بتایا ”سیٹ مل جائے گی سر!“

”میں تو پھر میں چلنے کی تیاری کر رہا ہوں“ میں نے کہا ”تم لاہور میرے دفتر میں فون کرنا کہ ڈرائیور مجھے لینے ایئر پورٹ آجائے۔ فی الحال سامان اٹھلک سیٹھ رمضان کی طرف چلے ہیں۔ کچھ دیر اس سے گپ شپ رہے گی۔ پھر وہیں سے ایئر پورٹ چل دیں گے۔“

”ٹھیک ہے سر!“ اس نے خود ہی میرا ہلف کیس اور وہ چمبی کیس جس میں صرف ایک میلا سوٹ لٹا ہوا تھا، بند کر دیا اور اوٹلیگ و فیو کوئٹ کے بعد کچھ دیر نیچے زبول ایجنٹ سے بات کر کے ہم سیٹھ رمضان کی طرف چل دیے۔ وہاں کچھ دیر گپ شپ اور کچھ دیر کام کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر شفیع مجھے ہی آف کرنے ایئر پورٹ چل دیا۔

جہاز نے ٹھیک وقت پر ٹیک آف کیا اور جس وقت میں نے بیٹل کھول کر نشست کے پچھتے سے سر نکال کر آنکھیں بند کیں اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھسکا محسوس کر رہا تھا اور گویا جہاز کی تہ کے بغیر ہی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ کراچی کے اس تازہ ترین دورے سے میں بہت مطمئن اور سرور واپس جا رہا تھا۔

میں لاہور ایئر پورٹ پر اترا تو لاڈ لک سے باہر میرے ڈرائیور کے ساتھ اتفاق علی بھی موجود تھا۔

”بھئی واہ! تم بھی بادشاہت کو رہیو کرنے آئے ہو۔ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم تشریف لا رہے ہیں؟“ میں نے گرم جوشی

”اہمیت بولو۔ شیطان نے من لیا تو برامان جائے گا۔“ سیٹھ رمضان خمیدگی سے بولا۔ پھر اس نے ہنسی بھرا کردار کو متوجہ کیا اور اپنے لئے اسے شروب کا آمڈور دینے کے بعد بولا ”میں سیٹھ واحد کے دفتر کا ایک پکڑ لگا کر آیا ہوں۔ میں نے یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ ادھر خیریت ہی خیریت تھی۔ یہاں آکر میں نے دیکھا اب کی کار میں پارکنگ لٹ میں کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر تم اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ میں سمجھ گیا کہ تم کھانے پینے کے لئے یہاں آئے ہو۔“

”کیونکہ تمہارا محبوب مشغلہ کیا ہے۔ اور میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا مگر تم آکر میدان میں ڈنٹ لگئے ہو اور ساتھ ان لڑکوں کو بھی لے آئے ہو“

”بھئی کھانے کا وقت وہی ہے جب بھوک لگ جائے“ میں نے کہا ”پہلے تو کھانے میں وقت دیکھنا نہیں آتا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ رہ کر اپنی عادت کا ڈیڑا ہوں۔ میرے لئے بھی کچھ منگواؤ“ سیٹھ رمضان نے گویا بڑی مجبوری کے عالم میں کہا۔

کھانے کے دوران میں نے اسے سیٹھ واحد سے ملاقات کا احوال بتایا۔ معاملے کا ذکر سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”سیٹھ واحد کی تحظیم ملک میں پہلے نمبر ہے“ وہ بولا ”اس نے ہمیں اپنی اہمیت دی ہے کہ اب ہم اپنے آپ کو غمخوار سمجھ سکتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے وہ دن دور نہیں جب ہم فیملی ایک ہوں گے۔“

”دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں دیکھ گیا کہ کتنا قائل نہیں“ میں نے کہا۔ ”وقت بڑی عالم چیز ہے۔ دعوے کرنے والوں کے دعوے بعض اوقات اس طرح ان پردے مارتا ہے کہ شکل بھی نہیں پہچانی جاتی۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے“ سیٹھ رمضان نے خمیدگی سے سر ہلایا۔ کھانے کے بعد میں نے سب کو رخصت کر دیا اور اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔ دوسری صبح میں بھی دیر تک بستر میں پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر روزنی کی اور کچھ دیر بیہوش ہوا مگر دم سروس کے ذریعے کمرے میں ہی ناشتا منگوا کر بیٹھا ہی تھا کہ شفیع شاہ آگیا۔

”وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ میرے اصرار پر ناشتے میں ٹھیک ہوتے ہوئے بولا“ سر! سیٹھ کرامت کا چیک کمپنی کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ ہو گیا ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے طمانیت سے کہا ”اسے اب رہا کرو لیکن اس کے بیچے ایک ماہر قسم کا آدمی ضرور لگائے رکھنا۔ ماہر سے یعنی مراد ہے کہ وہ قریب رہ کر عمرانی کرنے میں ماہر ہو۔ سیٹھ کرامت کے بارے میں ایک ایک لمبے کی رپورٹ رکھنا۔“

”ابھی اس کے بارے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔“

”دوسری خوش خبری یہ ہے سر۔ کہ رات لاس اینجلس سے ٹیکس آیا ہے“ شفیع شاہ بولا ”ہم نے ہوٹل کی اجازت لینے

”میں اس کے بغیر بھی اسی تندی اور لگن سے آپ کے لئے کرتا رہوں گا۔“

”وہ تو مجھے یقین ہے لیکن اب میں اپنے کاروبار کا اٹھارہ ایک بار باہر ہوں کہ نئے نئے پروڈیکٹ شروع کرنا چاہیے اور جو ان مشوروں کو متاثر بخش پائیں ان میں شریک کرنا چاہیے تاکہ ان کے مفادات پیش کے لئے ان اداروں سے وابستہ ہو جائیں۔ اداروں کو شروع کرنے اور ان میں ابتدائی سرمایہ کاری کرنے کا ریسک میں لوں گا۔ آگے لوگوں کی مدد اور قدرت کی فضا ہے کہ کون سے ادارے ترقی کرتے ہیں اور کون سے ٹھکے بند کرنے پر مجبور ہیں“ میں نے غلط فہم کی۔

”آپ کی چونکہ نیت ٹھیک ہے اور قدرت بھی فی الحقیقت آپ پر مہربان ہی نظر آتی ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ کام کیا ہوا کوئی ادارہ آپ کو بند نہیں کرتا جسے گا“ اتفاقاً دو لوگوں پر یوں آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے کی عادت اور دوسرے پیسے سے اس قدر بے نیازی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی۔

”جی بات ہے کہ یہ دونوں عادتیں مجھ میں اس وقت ہی ہوئی ہیں جب میں ان کا متحمل ہو سکتا ہوں“ میں نے کہا۔ میں اس پوزیشن میں ہوں کہ میری ان عادتوں کی بدولت اگر دو چار لاکھ کا نقصان ہو جائے تو میں برداشت کر لوں گا اور ایک تجربہ حاصل ہو جائے گا۔ کوئی ذات تھا کہ میں کسی روپے کی رقم کے سلسلے میں بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ

سے اس سے ہاتھ ملا کر گفتگو کیے میں کیا۔

”میں اس وقت آپ کے ایکسپورٹ والے آفس میں بیٹھا تھا جب آپ کے آدمی کا فون آیا کہ آپ ساڑھے بارہ والی فلائٹ سے گراچی سے روانہ ہو رہے ہیں“ اتفاقاً نے اپنے مخصوص مہینانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ”میں اس وقت درحقیقت آپ کو فون کرنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ آپ آج ضرور پہنچ جائیں۔“

”کیوں۔۔۔ خیریت؟“ میں نے پوچھا۔

”کل ہماری فلم کی صورت ہے سر! میڈم سرور جہاں کے گانے سے فلم کا آغاز ہو رہا ہے۔ تمام اخباری نمائندوں کو بھی مدعو کیا ہوا ہے میں نے۔ اچھی خاصی شاندار تقریب ہوگی“ اس نے بتایا۔

”اودہ۔۔۔ بہت خوب“ میں نے تمہیں آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا ”تم تو بہت تیز دوڑ رہے ہو۔“

”جا کی اچھا ہونے سے بھی ٹھوڑے کی رفتار میں فرق پڑتا ہے“ وہ بولا۔

”تم نے کاسٹ فائل کر لی؟“ میں نے پوچھا۔

”خاص خاص کرداروں کے لئے تو میں نے سب سے کنٹریکٹ بھی سامان کر لئے ہیں۔ ہیروئن کا معاملہ ہمارے میاں پہلے ہی سے طے ہے“ وہ بولا ”صرف چھوٹے موٹے آرٹسٹوں کا معاملہ رہ گیا ہے“ ان سے بعد میں بات ہوتی رہے گی۔ ان کے معاملے میں تو رد و بدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس دوران کام تو شروع کر دیا جائے۔ صورت میں میڈم سرور جہاں کے گانے سے ہی کرنا چاہتا تھا اور ان کے پاس کل کی آواز میں ہی ہمارے لئے کھانچا تھی۔ پرسوں وہ چند دن کے لئے لندن جا رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم جو کچھ بھی کر رہے ہو ٹھیک ہی کر رہے ہو گے“ میں نے کہا ”مجھے صرف یہ بتا دو کہ تمہیں کسی معاملے میں کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہے؟“

”ابھی تک تو کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا“ وہ مطمئن لہجے میں بولا ”بلکہ مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر حالات میں کام کرنا شاید مجھے اور کسی بھی طرح نصیب نہ ہو۔“

”خیر اب یہ بھی ضروری نہیں ہے“ میں نے اس کا کدھا تھمکتے ہوئے کہا ”وقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب کس پر کس حد تک مہربان ہو جائے اور کب کسی کا سب کچھ چین لے۔“

اس دوران ہم باہر آچکے تھے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے کہا ”اگر مجھے اپنا یہ فلسفہ سازی کا پروڈیکٹ کچھ چٹا نظر آیا تو تم اس میں ایک طرح سے میرے پار نہ ہو جاؤ گے اتفاقاً!“

”اس کی کیا ضرورت ہے سر!“ وہ گہری سجدی سے بولا۔

معروف مصنف

ایم اے راحت کا پر اسرار ایڈوکیٹ

ناول

طلسم زادہ

جلد اول :- 150 جلد دوم :- 150

اردو بازار لاہور

پھر میں نے اضافہ کیا "میں مال" سے مراد سڑک ہے۔ ویسے تم چاہو تو دو سڑک مال، بھی سمجھ سکتے ہو کیونکہ فی الحال وہی ایک آنس ہے جس سے میں سب سے زیادہ مال کا رہا ہوں۔ باقی سب جگہ تو فی الحال مال خرچ ہی ہو رہا ہے۔ تم سہ پہر کے بعد مجھے فون کر کے بتاؤ تاکہ میرا کس وقت اسٹوڈیو پہنچنا ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے" اتفاق نے سر ہلایا۔

اس دوران ہم گھر پہنچ چکے تھے۔ چونکہ ارنے گیٹ کھولا، میں نے ذرا تیر کو دہائی کی کہ اتفاق کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔ خاناساں نے کہا ناگایا اور کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کر کے میری وہ بیٹیاں وغیرہ دیکھنے لگا جو میری عدم موجودگی میں ملازم نے نوٹ کئے تھے۔ پھر میں نے چند ضروری فون کئے۔ دفتر بھی میں۔ صرف فون ہی کرنے پر اکتفا کیا اور آدھ ترین معلومات حاصل کرنے اور چند ضروری ہدایات دینے کے بعد شام کو وقت گزارنے کے لئے میں سو ٹھیک پول چلا گیا اور رات کو ہوٹل سی میں کھا کھا کر رات گئے گھر آکر سو گیا۔

دوسرے روز علی الصباح ہی تیار ہو کر میں ماڈل ٹاؤن والا کوٹھی میں پہنچا۔ اس کی مکمل عمرانی 'کام کاج' حتی کہ تنظیم۔ چھوٹے موٹے معاملات نمٹانا بھی مس ٹرپ کے ذمے تھا۔ درحقیقت مس نہیں، مسز حتی اور اس کا اصل نام جولی تھا۔ تنظیم میں سب اسے مس ٹرپ ہی کے نام سے جانتے اور معاملہ کرتے تھے۔

مس ٹرپ تقریباً ساڈھ نام حتی عمر اس کی موٹی موٹی آنکھوں اور لمبے رنگت میں غصہ کی متا طبعی کشش تھی۔ اس بہت کا ڈی سراپا بھی کچھ ایسا تھا کہ بڑے بڑے پارساؤں کو پیش قدمی سونپنے لگتی تھی عمر اس کے قریب پہنچنے والوں کو عموماً زمین چاڑھ پڑتی تھی۔ ہماری تنظیم میں تو سب ہی اس بات سے واقف اس لئے اس کے سامنے سب اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ہر ہوا تو ہلکا جھکا مذاق کر لیا۔ وہ بھی کسی سینئر سائیڈ نے۔ ہر ایک تو اس کی بھی جرات نہیں ہوتی تھی۔

وہ اب دو بچوں کی ماں تھی اور اس کا شوہر نہایت خوبصورت آدمی تھا مگر اس جلدور عورت نے اسے نہ جانے بنایا ہوا تھا۔ وہ گھری ہی رہتا تھا اور گھر کے سارے کام کا کرتا تھا، بچے بھی سنبھالتا تھا۔ ان لوگوں کا کوارڈر کوٹھی کے بیچ حصے میں تھا۔

ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کو ہم دو نمبر کہتے تھے۔ میں جب نمبر پہنچا تو علی الصباح بھی مس ٹرپ جیٹر، جیک اور پالشڈ چیلنے جوتے پہنے بالوں کا خوبصورت جوڑا بنائے بالکل تیار ہو تک گئی مستعدی سے دو دفاتر تک آئی اور اس نے ایک مخصوص من موہنے انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔ یہ اس عورت کی خوبیوں میں سے ایک قابل ذکر خوبی تھی

اس کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔"

"صاحب حیثیت ہونے کے باوجود کسی پر مجبور سا کرنے کے لئے برا حوصلہ چاہئے صاحب!" اتفاق ہماری سانس لے کر بولا۔ رات میں نے زیادہ تر میز پر کھانا کھا کر جوں جوں دولت برصتی جاتی ہے آدمی کا دل چھوٹا ہوتا جاتا ہے" ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "شکر ہے آپ کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔"

"شاید اسی لئے میں دوسروں کی نسبت زیادہ تیز رفتاری سے تیار رہا ہوں۔"

"یقیناً کیونکہ ہے" اتفاق بولا۔

اس وقت ہم میان میری لابی عبور کر کے گلبرگ کی طرف ٹھہر چکے تھے۔ چند لمحے کے توقف کے بعد اتفاق بولا "کل مسورت کے وقت پر میں کے نمائندے اسٹوڈیو میں موجود ہوں گے۔ کچھ تصویریں دیکھو وہیں بیٹیں گی۔ پھر انہیں انٹرکان لے جایا جائے گا۔ جن کے پاس کوئی سواری نہیں ہوگی ان کے لئے ہماری اسٹیشن وگن اسٹوڈیو میں موجود ہوگی۔ انٹرکان میں آپ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے اور اخباری نمائندوں کے سوالوں کے جواب دیں گے۔ ہماری ہیروئن ساتھ اور ہیرو وغیرہ بھی موجود ہوں گے۔ اس کے بعد کھف ڈیز ہو گا۔ امید ہے ہمیں بہت اچھی کو رینج ملے گی۔ ہو سکے تو آپ پریس کانفرنس کے لئے جگہ جاری کر لیجئے گا۔"

"تجاری کی تو کوئی خاص ضرورت نہیں۔ وقت پری دیکھا جائے گا کہ کیا ہونا ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" اس نے مجھے پچھانے دیکھ کر پوچھا۔

"دراصل میں نہیں چاہتا کہ میری ذات کو شہرت ملے" میں نے دھچھے لیے میں کہا "میں زیادہ لوگوں کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ صرف ان قلوں کو شہرت ملے جو ہم شروع کر رہے ہیں اور وہ بھی صرف اس لئے کہ یہ شو بزنس کی دنیا ہے۔ اس میں ہم جو پروڈکٹ بھی دیں گے اس کی کامیابی کے لئے معیار کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت بھی اہم کرنا ادا کرے گی۔"

"لیکن سر۔۔۔ پروڈکشن کو شہرت بھی تو چھٹی ملے گی جب پروڈکٹر سر آگے آئے گا" اتفاق بولا "آپ کو شہرت سے گھبراہٹ نہیں چاہئے۔ شہرت کچھ فائدہ ہی دیتی ہے۔ نقصان نہیں۔"

شاید وہ درست ہی کہ رہا تھا مگر مجھے جانے کیوں ایک انجانا ماحوف محسوس ہوا تھا۔ اس بات سے کہ میں بہت زیادہ لوگوں میں پہچانا جاؤں، بہت زیادہ تنگدلی پر میرے تذکرے ہوں۔ مجھے ایسا اندیشہ محسوس ہوا تھا جیسے میرا کوئی راز افشاں ہو جائے گا میری کوئی حقیقت عیاں ہو جائے گی۔

"خیر۔ دیکھا جائے گا" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ کل میں اپنے آفس میں مصروف رہوں گا۔ مال والے آفس میں۔

قلم کا کارڈ لکھ کرانے کے بعد بچنے والی ہیں۔ اس لئے مجھے بھی بچ بچانا چاہئے۔

میں جب اسٹوڈنٹ کے ریکارڈنگ ہال میں پہنچا تو وہاں دوایں مدفن تھی۔ اتفاقاً بہت سے ہارے دواڑے پر ہی گھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑی محبت سے مجھے ہار پکڑا دئے۔ اس کے بعد اور بھی کئی لوگ ہار لے آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے ہار پکڑا دئے گویا مجھے ہال میں مدفن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔

اتفاقاً ان لوگوں سے میرا تعارف کرا تا رہا۔ انڈسٹری سے ہی متعلق جانے کون کون لوگ تھے۔ مجھے صرف دو آدمیوں کے نام یاد رہ گئے۔ ایک تو ہماری قلم کا موبیٹر تھال حسین تھا اور دوسرا ہماری قلم کا مسٹف سلیم سید۔

سلیم سید سے پہلی بار مکمل طور پر کہانی لکھوانے کا کام اتفاقاً علی نے ہی لیا تھا اور یکے بعد دیگرے اس کی دو قسمیں ہنٹ لکھی تھیں۔ آج کل اس کے پاس کہانیاں لکھوانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی لیکن اتفاقاً کوہ اب بھی سب سے زیادہ ترجیح دیتا تھا۔

مجھ سے ہاتھ ملائے ہوئے وہ بولا ”میرا یہاں کوئی کام تو نہیں تھا لیکن اتفاقاً نے آپ کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں اشتیاقی اور تجسس سے مجبور ہو کر ملے چلا آیا۔“

”بھئی اگر اتفاقاً نے ہماری تعریفیں کی ہیں تو پھر شاید ہم

صبح نہ اندھیرے سے لے کر رات مجھے تک خواہ کوئی کام ہو یا نہ ہو بالکل مستعد اور خوش لباس نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں سوتی کس وقت تھی۔

میں ڈانٹک دم میں جا بیٹھا جہاں کبھی قاسم خان کے ایک کارندے کی حیثیت سے بیٹھا کرتا تھا۔ کس ٹرپ میری فرمائش پر میرے لئے خانہاں سے کافی بولا لائی۔ اس نے بتایا کہ اس وقت میری تنظیم کے دو اہم آدمی ضیف خان اور شیر شیخ کو طعی میں مقیم تھے اور سوتے ہوئے تھے۔

باقی حالات کی رپورٹ دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ جس روز میں کراچی گیا اسی روز زلزلے کے پچھلے پھر سرحدی علاقے میں ہماری ایک چھوٹی کھپ پکڑی گئی۔ ہمارے آدمیوں کو ٹرک اور مال چھوڑ کر فرار ہونا پڑا اور اس کوشش میں ہمارا ایک آدمی رنجبر کی گولیوں سے مارا گیا۔

اس خبر نے چند لمحے کے لئے مجھے اداس کر دیا۔ مجھے مال کا غم نہیں تھا بلکہ اپنے ایک کارندے کی موت کی خبر نے مجھے اداس کر دیا تھا حالانکہ وہ ایک غیر اہم اور نو آموز کارندہ تھا مگر اب اپنے کسی بھی ساتھی کی موت سے گویا میرے دل کو پکے ہوئے لکڑا تھا۔ مجھے اپنے نو آموز کی کہ وہ نہ یاد آجاتے تھے جب میں بھی یونسی جان پھٹنے پر لے پھرتا تھا۔

ہر انسان اپنی جگہ ایک کائنات ہوتا ہے۔ اس میں ان گنت خوابوں کے گھر بنے ہیں۔ اس سے جانے کتنی اور بھی ہستیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اس کے مرنے سے پورا ایک گھر اجڑ جاتا ہے۔ ایک کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

دشمن اور خصوصاً بدھیت دشمن کی موت پر تو میرے دل کو کچھ نہیں ہوا تھا مگر وہ لوگ جو میرے لئے کام کرتے تھے ان کی موت پر اب میرے دل کی جو کیفیت ہوتی تھی اس سے ایک بات ظاہر ہونے لگی تھی اور وہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ کہ اب میں اپنی لائن کے لئے موزوں آدمی نہیں رہا تھا۔

اس لائن میں تو کارندوں کی اہمیت ظہور کے مترتے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایک پٹ گیا تو دوسرا آگے بڑھا دیا۔ لیکن میری افسردہ دل بتاتی تھی کہ اب میں اس طرح سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کے بعد میں نے بمشکل مس ٹرپ کی باقی باتوں پر دھیان دیا۔ ضیف اور شیر کے لئے ضروری ہدایات چھوڑیں۔ مجھے مس ٹرپ نے بتایا تھا کہ وہ رات کو دو بجے اٹھ سوئے تھے۔ اس لئے میں نے مس ٹرپ کو اسیں جگانے سے منع کر دیا اور وہاں سے نکل کر آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔

آفس میں اتنی مصروفیت رہی کہ وہاں پر جو وہ سا تھا وہ جو ہو گیا۔ پانچ بجے کے قریب اتفاقاً کافون آگیا کہ تمام تاریخیں مکمل ہیں۔ میڈم سرور یہاں بھی ایک دوسرے اسٹوڈنٹ سے کسی دوسری

معروف مصنف

ایم اے راحت

کا ایک خوبصورت اور شاہکار ناول

کائنات

جلد اول :- 45 جلد دوم :- 45

ناشر: مکتبہ القرآن پش

اردو بازار لاہور

میں ایک آدھ غریب موجود ہی ہو ورنہ تو ہماری اپنے بارے میں رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ اتفاق اور سلیم سید نے ہم آہنگ ہو کر قند لگایا۔

اور امداد حرمیت سی ایک شرا لڑکیاں کھڑی تھیں۔ جن پر میری نظر پڑی ان میں سے کسی نے ادب کسی نے انکساری اور کسی نے اڑا سے مجھے سلام کیا۔ میں نے ان کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے اپنے گنگے میں پڑے ہوئے سارے پارا نار کر ایک لڑکے کو چھوئے اور اتفاق وغیرہ کے ساتھ اندر پہنچا۔

ریکارڈنگ ہال کا حال کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ہر چیز سے رانا بن اور بوسیدگی عیاں تھی۔ ہال کا بیشتر حصہ سازندوں کے بیٹے بنے لئے مخصوص تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار سازندے اپنے سازوں پر مشغول کرتے قطار و قطار بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

ایک طرف وہ بوجھ بنا ہوا تھا جس میں کھڑی ہو کر گھوکا رہ گا ریکارڈنگ کرائی تھی۔ جس حصے میں ہم کھڑے تھے وہاں ایک طرف ریکارڈنگ کے آلات کا مائیکریک بوڑھو رکھا ہوا تھا اور اس کے عقب میں ایک صاحب بیٹھ فون کانوں پر چڑھائے بیٹھے تھے اور مختلف سیگنل سے چیز چھاڑ کر رہے تھے۔

اسی حصے میں ایک صوفے پر میڈیم سرور جہاں ذوق برق ساری میں لباس پہنی تھیں۔ ان کے گلے میں بیرون کا نیگلے ہاتھوں میں ہیرے کے ٹکڑے اور انگلیوں میں بیرون کی انگوٹھیاں بیگاری تھیں۔ میں نے قدرے جھک کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اٹھ کر میرے کندھے پر چھکی دی اور قسم کی کاسیانی کی دعا دی۔ ان کے آگے پیچھے کئی آدمی اور ادھر عمر کی ایک عورت بڑے منوہات انداز میں کھڑی تھی۔

اتفاق مجھے ایک طرف بٹے ہوئے مستطیل سے کہیں میں لے گیا جہاں ہمارے بیٹھے ہی کوئلہ ڈرگس آگئیں جو چائے سے ذرا سی کم گرم تھیں۔ کہیں میں چند لمبے کے لئے صرف میں اور اتفاق ہی دو گئے تو میں نے اتفاق سے پوچھا۔ ”کیا ہر قسم کی صورت پر ہی اتنی رونق اور جوش و خروش دیکھنے میں آتا ہے؟ اتنے ہی لوگ جمع ہوئے ہیں؟“

”نہیں۔“ اتفاق نے بلاتامل جواب دیا ”جی بات یہ ہے کہ آپ کے بارے میں اسٹوڈیو میں ایک افسانوی سی قصہ بن چکی ہے کہ آپ پانی کی طرح صوفیہ ہمارے کارادہ لے کر قلعا سازی کی طرف آئے ہیں۔ اور وہ جو آپ نے ملک کے آدمیوں کی پٹائی کی اور انہیں اندر بھی کرا دیا اس سے یہ تاثر بھی عام ہو گیا ہے کہ آپ محض پیسے والے ہی نہیں، آپ کے ہاتھ بھی لمبے ہیں۔ اس لئے ہر کوئی آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔“

میں مسکرایا تو اتفاق بولا ”بڑی بڑی باتیں کہنے والے تو یہاں بہت آتے ہیں اور شروع شروع میں بعض بڑے غماٹ بھی دکھاتے ہیں لیکن اندر سڑی کے لوگ ایسے بھولے نہیں۔ وہ

اندازہ کر لیتے ہیں کہ کس میں کتنا وزن ہے۔“

اس دوران باہر سے کئی آوازیں سنائی دیں۔ ”میڈم ستاہ آگئیں۔ میڈم ستاہ آگئیں۔“

”دوسرے ہی لمحے ستاہ ریکارڈنگ روم کا دروازہ کھول کر خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح اندر آگئی۔ میڈم سرور جہاں سے ہاتھ ملاتے اور چند لمبے بات کرنے کے بعد وہ کہیں نماصے میں آگئی۔ وہ تاریخی رنگ کے نہایت خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھی جس کی تراش خواش جاپانی لباس کیونو سے ملتی جلتی تھی۔ کچلے، ریختی اور چمکیلا بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ بیرون میں فل بوت تھے اور اس کے وجود سے ایک مصور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص نظیلا پن تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں باہر دوڑ کر آنکھیں ملتی تھیں۔“

مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولی ”بڑی رونقیں ہیں بھی“ بڑے لوگ جمع کر کے ہیں۔“

”یہ سب اس آدمی کا کمال ہے“ میں نے اتفاق کی طرف اشارہ کیا وہ ستاہ کی موجودگی میں قدرے نروس سا ہو چکا تھا مگر حتی الامکان ہم سکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دفعہ ایک لڑکا اندر آکر منوہات سے لمبے میں اتفاق سے مخاطب ہوا۔ ”سر! وہ میڈم سرور جہاں کہہ رہی ہیں کہ ان کے پاس وقت کم ہے۔ جلدی کام نہ لائیں۔“

”بالکل۔ بالکل“ اتفاق اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”آئیے۔ پہلے دعا کر لیں۔“

ہم باہر آئے۔ اتفاق نے دعا کا اعلان کیا اور لوگ نہایت سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے گئے۔ میں نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دل ہی دل میں کہا ”اے رب عظیم! بے تو بڑی مشکلک خیر سی بات۔ کہ ہم تجھ سے اس چیز کی کاسیانی کی دعا مانگ رہے ہیں جس کی تیرے احکامات میں گنجائش ہی نہیں مگر ہم کیا کریں؟ تو صرف صالح لوگوں ہی کا خدا نہیں، ہم گناہ گاروں کا خدا بھی تو ہی ہے۔ تیرے سوا ہم کس سے دعا مانگ سکتے ہیں؟“ دعا ختم ہوئی تو میڈم سرور جہاں گانا ریکارڈ کرانے کے لئے بوجھ میں چلی گئیں۔ ایک مرتبہ ناقص تر سہل ہوئی اور دوسری مرتبہ میں گانا ریکارڈ ہو گیا۔ بچاپانی گانے کی اس دھن کو میں نے کئی مرتبہ دل ہی دل میں دہرایا اور میری کسی حس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ گانا بہت ہو جائے گا۔

گانا ریکارڈ ہونے کے بعد مطائی حتمیم ہوئی۔ اتفاق نے ایک جھونکے ٹرک میں کئی نوکرے مطائی کے منگوائے تھے۔ وہ آدمیوں کو سامور کیا گیا کہ وہ پورے اسٹوڈیو میں مطائی حتمیم کریں اور ہر فرد کو دیں۔

اس دوران فوٹو گرافروں نے کئی گروپ فوٹو وغیرہ بنائے۔ بالآخر اتفاق غصی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب انٹرکان چلنا چاہیے“

پریس کا فرنس کا وقت ہو چکا ہے۔

تقریباً آٹھ بجے ہم انٹرکان پہنچے۔ ستارہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ کچھ اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر اسٹوڈیو سے ہماری دیکھ میں اور کچھ اپنی ساریوں پر ہمارے ساتھ ہی پہنچے اور کچھ براہ راست وہیں آئے تھے۔

میں نے ہال میں اپنی نشست سنبھالی۔ میرے دائیں ہاتھ پر ستارہ تھی اور بائیں پر اتفاق علی۔ یہ میری زندگی کی پہلی پریس کانفرنس تھی۔ میں نے کھانکھار کر گھٹا صاف کیا اور پریس کے نمائندوں سے اپنے تفسیلاتی کے ادارے کا مختصر سا تعارف کرایا پھر مختصری میں ان دونوں قلموں کے بارے میں بتایا جو ہم شروع کر رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ وہ جو بھی سوالات کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

ایک نمائندے نے کرسی کے پیشے سے ٹیک لگا کر ٹھوڑی سمجھائی ہوئے نہایت غبرانہ لہجے میں کہا ”چوہدری صاحب! کچھ اپنے متعلق بھی بتائیے۔ کچھ اپنی ذات کا میں منتظر۔ اور یہ کہ آپ قلم لکھنا کی طرف کیسے آگئے؟“

میں نے اسے بوجھل اور جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ بتایا کہ میں کوئی خاندانی بزنس میں نہیں ہوں، بہت معمولی سرمائے سے میں نے کاروبار شروع کیا تھا جس میں مجھے ہر وقت ہر کامیابی نصیب ہوتی۔ قلم لکھنے سے مجھے شروع سے دلچسپی تھی، اب حالات مناسب نظر آئے تو میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ بات میں کربا تھا لیکن توجہ سب کی ستارہ کی طرف تھی جو خاموش بیٹھی تھی۔

میں خاموش ہوا تو ایک اخبار نویس نے عینک درست کرتے ہوئے میرے آگے جھک کر پوچھا۔ ”چوہدری صاحب! تفسیلاتی کے ضمن میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟ آپ آرٹ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں یا محض کاہنہ؟“

”دیکھیے صاحب! میں نہ تو اس بات کے حق میں ہوں کہ آپ ایسا کامیں بنائیں جنہیں صرف آپ اور آپ کے احباب ہی ہفتہ دس دن تک فری پاس پر دیکھیں اور اس کے بعد انہیں ہمیشہ کے لئے ڈھونڈ میں بند کر کے رکھ دیا جائے۔ اور نہ ہی میں اس کے حق میں ہوں کہ محض چار پیسے کمانے کے لئے عوام کی ممکن ذہنیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلم میں بے مقصد نقل وعات اور جنسیت بھری جائے۔“

پھر میں نے وہی نقطہ نظر دہرایا جو میں ایک بار اتفاق کے سامنے بھی بیان کر چکا تھا۔ ”مغنا میں۔ نہیں کہتا کہ قلم میں نقل نہ لکھایا جائے۔ نقل وعات عہری، ڈاکا ڈنی اور دیگر ہر طرح کے جرائم ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں اور قلمیں معاشرے کی عکاس ہوتی چاہئیں۔ لیکن قلم میں نقل اتنے نہ ہوں جتنے کسی ملک میں خانہ جنگی کی صورت میں ہی ممکن ہو سکتے ہوں۔ گولیاں ضرور

چلیں لیکن اتنی نہیں جتنی دوسری جنگ عظیم میں چلی تھیں۔ چڑھ میں ایک اعتدال اور برعکس حد تک حقیقت پسندی کی محک برکھنے کی کوشش کی جائے۔ کچھ عوام کی پسند کا بھی خیال رکھا جائے اور کچھ اپنے ذوق کی ترغیبی بھی کی جائے اور جہلی تک مشروہ والے اجازت دین وہاں تک عوام کو خفاقی سے دو ٹوٹ کرانے کی پالیسی اپنائی جائے۔ اگر کسی تفسیر کو خدا نے تم توفیق دی ہے کہ وہ کسی ایسے متعدد کے لئے دو چار لاکھ کا تفسیر قلم میں برداشت کر سکتا ہے تو اسے کر لیتا چاہئے۔“

ایک نمائندے نے کھانکھار کر گھٹا صاف کرتے ہوئے نور کی غنودگی سے چہ خستے ہوئے انگریزی میں سوال کیا ”آپ کا قلم کتنا کا تجربہ کتنا ہے؟“

”تقریباً پندرہ سال“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن ہماری معلومات کے مطابق تو آپ قلم انڈسٹری میں نووارد ہیں۔ کیا آپ کہیں اور قلمیں بناتے رہے ہیں؟“ نمائندے نے حیرت سے پوچھا۔

”میرا تجربہ اصل میں یہ پیشہ ہے“ میں نے اتفاق کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ایک اجتماعی تشہیر پڑا۔

میں نے مسکراتے ہوئے مزید وضاحت کی ”جی جی! صرف ایک پالیسی طے کرنی ہے۔ کام تو سارا اتفاق صاحب کو کرنا ہے۔“

جب سکون ہوا تو ایک دہلے پتلے نوجوان نے نا انصران لہجے میں کہا ”چوہدری صاحب! اب آپ قلمی دنیا میں آئی گے ہیں تو ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ قلم انڈسٹری نے قلم تک عوام کو کیا دیا؟“

”بالی دی وے آپ قلم انڈسٹری سے کیا لینا چاہتے تھے؟“ میں نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ اس پر ایک تشہیر پڑا۔

میں نے شہیدہ برتے ہوئے نمائندے نے اکثر اخبارات میں قلمی سفارشات اور انٹرویوز وغیرہ میں یہ سوال پوچھا ہے اور میں براہِ اجازت ہوتا ہوں کہ اس سوال کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ قلم کا سب سے بڑا اور سلا مقصد لوگوں کو تفریح فراہم کرنا ہوتا ہے اور وہ اس نے ہری یا مٹی کسی نہ کسی حد تک کی ہے۔ البتہ ایسے بڑے معیار کی قلموں کا سوال اٹھایا جاسکتا ہے۔ تو اس ضمن میں بھی میں یہی عرض کروں گا کہ یہ ہر انڈسٹری اور ہر شعبہ میں ہوتا ہے۔ کپڑے کی انڈسٹری کو لے لیجئے۔ کوئی کارخانہ اچھا کپڑا بناتا ہے تو کوئی کارخانہ اسی قیمت میں اچھا کپڑا نہیں بناتا لیکن ان سے کوئی جا کر یہ نہیں پوچھتا کہ فلاں انڈسٹری نے فلان کپڑا کیا دیا ہے؟ کیونکہ وہ سیدھی طرح کہہ سکتے ہیں کہ جی ہم نے کپڑا بنایا۔ اس صنعت میں ملک کو خود کفیل بنانا۔ اب رہا یہ سوال کہ کچھ بہت اچھا کپڑا کیوں نہیں دیا؟ تو وہ آپ کو اپنے مسائل بتانے کے لئے فلاں فلاں مشکلات اور رکاوٹیں پیش کریں۔ اسی لیے

رقم انڈسٹری سے یہ سوال کیا جائے کہ اس نے عوام کو کیا دیا تو ہرے خیال میں اس کا اولین اور سیدھا سادہ جواب تو یہی ہونا چاہیے کہ یہی علم انڈسٹری نے عوام کو سکھایا دیں۔ اصل میں یہ وال کرنا اب پیش ہو رہا ہے اور اس انڈسٹری کی طرف زیادہ دلچسپی لے رہی ہے کہ یہ عوام کی دلچسپی کی چیز ہے۔ اس سے جتنی لوگ ہر وقت عوام اور پریس کی نظروں میں رہتے ہیں۔ یہی ہے وہی لوگوں کے ایکٹو فرم بھی سب سے زیادہ بنتے ہیں۔ یہی وہی کو چیک بھی آجائے تو اس کی خبر بادی جاتی ہے۔ اور انہی وجوہات کی بنا پر اس انڈسٹری کی خامیاں اور برائیاں عوام کی نظر میں سب سے زیادہ رہتی ہیں ورنہ خامیاں اور برائیاں کہاں نہیں ہیں؟ بلکہ مہذرت کے ساتھ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ بعض چیزوں کے مسئلے میں اس مطعون انڈسٹری کو داد نہیں دی جاتی۔ چند دن پہلے میں نے اسٹوڈیوز کا دورہ کیا تو سامان کی فست حالی دیکھ کر زبان نہ گیا۔ دیکھا رنگ کے ٹانگ بجاس سال پرانے ڈیزائن کے تھے اور ان میں سے بعض کو ڈنگ لگا ہوا تھا۔ مگر سے اب بھی ٹرائیوں پر دھکیلے جاتے ہیں۔ جی پوچھتے تو جیسے ہمس لائن میں دم رکھنے کے بعد انڈسٹری پر ترس آنے لگا ہے۔

ماضی میں چند لمحے کے لئے سکوت چھایا پھر ایک نمائندہ بننے ہوئے بولا "جی ہاں... اب آپ فلم لائن میں آگئے ہیں تو آپ اسی قسم کی باتیں کریں گے۔ انسان اپنے کا دوبارہ کا واقعہ تو کرے گا۔"

اس پر بلی کی بی بی بلند ہوئی۔ میں نے کہا "بے شک... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک آپ کسی بھی کا دوبارہ انڈسٹری یا کام کو قریب سے نہ دیکھیں تب تک اس کے مسائل کا اندازہ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد بھی مجھ سے بہت سے سوالات کیے گئے اور میں ان کے حتی الامکان تسلی بخش جوابات دیتا رہا جس کے بعد سوالات کا رخ ستارہ کی طرف ہو گیا۔

ایک سالو لا ساٹھ ہوا "مس ستارہ! اویسے تو آپ کے کئی انٹرویو چھپ چکے ہیں لیکن جو اخبار نویس آپ کو زیادہ بہتر طور پر نہیں جانتے ان کی معلومات کے لئے اپنے متعلق کچھ بتا دیجئے کہ آپ کس طرح علم انڈسٹری میں آئیں؟"

ستارہ نے ایک ادا سے بالوں میں انگلیاں پھیریں "موتیوں جیسے آدا اور ہرمارا انٹوز کی نمائش کی پھر قدم سے شریعلے اور حرم لیکس میں بیٹا "ہی۔ وہ۔ میں تو کالج میں پڑھ رہی تھی اور میرے والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن میں ابھی انٹری میں تھی کہ ایک مرتبہ چند سیلیوں کے ساتھ شریعلے کیلئے اسٹوڈیو گئی تو وہاں اتفاقاً صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ پتا چلا کہ یہ تو ہمارے دور پار کے عزیز ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں ان کی فکرمیں گھر میں بیرونی کاموں کروں۔ میں تو کھیرا تھی۔ کیونکہ میں

نے بھی سووی کیرے کا سامنا نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کہ میرے گھر والے اس کی اجازت ہرگز نہ دیتے لیکن اتفاقاً صاحب نے ان سے بات کی۔ سمجھا بھلا کر قلمی دنیا اپنی بری نہیں ہے بتانا سمجھا جاتا ہے۔ بالا خر وہ قائل ہو گئے اور پھر اتفاقاً صاحب نے مجھے اداکاری بھی سکھائی دی۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اتفاقاً صاحب کو یہ سہارا دیا ہے۔"

وہ اسے خوبصورت اور بے تے انداز میں بول رہی تھی اور ہر ہر لفظ پر آواز کا اتار چڑھاؤ اس قدر دلکش تھا کہ سب ہمس تن گوش تھے۔ کئی شپ دیکھا رزور کے ٹانگ اس کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق کے چرے پر بدستور حیات طاری تھی۔ ستارہ کے بیان پر وہ ذرا بھی چون نہیں چڑھا تھا۔ اسے اس سفید جھوٹ پر ذرا بھی حیرت نہیں تھی۔

اس کے بعد اخباری نمائندے ستارہ سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے اور وہ بڑے اعتماد سے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ سکرپٹ کی بجلی گرائی رہی۔

بالاخر اتفاق نے اعلان کیا "ہیرا خیال ہے باتیں کافی ہو چکیں اب ہمیں کمانے کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔"

ڈیز کا انتظام چیکوٹ ہال میں تھا۔ سب لوگ اٹھ کر اس طرف چل دیے۔ ستارہ مجھ سے دو قدم آگے تھی۔ دیکھا اور گرد کی تمام جہاں بچھ گئیں اور گپ اندھیرا چھا گیا۔ یک وقت اسی قسم کی بہت سی جلی جلی آوازیں بلند ہوئیں جیس کہ ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں۔ مگر میرے اعصاب کوئی اور سی آواز سن کر جھنجھٹا اٹھے تھے۔

میں نے تاریکی میں ستارہ کی چیخ سنی تھی۔

وہاں موجود کسی بھی شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میری آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے کی بناوی ہیں۔ عمر عزیز کی جانے کتنی راتیں تاریک دیرانوں میں بٹائے حیات کی جنگ لڑتے ہوئے گزری تھیں۔

میں نے دیکھا کہ ایک بیولے نے ستارہ کو اس کی نشست سے کھینچ لیا تھا اور چند قدم دور لے گیا تھا۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی حرکات و سکنات مجھے نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس کے ہاتھ میں خنجر کی جھلک دیکھی۔ وہ ستارہ کی گردن ایک بازو کے پٹنے میں بٹا کر خنجر والا ہاتھ بلند کر رہا تھا۔ وہ ستارہ کی پسلیوں میں خنجر کھپنے لگا تھا۔

اگر مجھے ایک ثانیہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو خنجر ستارہ کے پسلی میں اتر چکا ہوتا۔ میں نے کمان سے نکلے ہوئے تیر کی رفتار سے آگے بڑھ کر اس شخص کی کھائی آنکھوں میں لے لی تاہم خنجر کی نوک نے ستارہ کے لباس کو تو چھو ہی لیا۔

تا معلوم شخص نے فوری طور پر ستارہ کو چھوڑ دیا۔ میں نے

اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

25/-	صلیب و حرم
50/-	نیشاپور کا شاہین
50/-	بابل کا بت شکن
75/-	ظلم کدہ
50/-	آتش فشاں
200/-	آخری حصار
125/-	بنت نیل
50/-	سائبریا کا طوفان
50/-	آتش و آہن
50/-	ظلمات
مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2	

دوسرے ہی لمحے میں نے ایک پردیس میں کی طرح سوچا کہ چل
اس وقت مل جائے گی لیکن علم عمل ہونے اور رہنے ہونے
جائے کشادہ عمل لگ جائے۔ اس وقت تک لوگ اس واقعے
تعمیل طور پر بھول چکے ہوں گے۔ اس لیے اس بات سے
انتہا پرہیز کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔
خیر مجھے اب بھی دروازے کے قریب قائلین پر برا نظر
تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور دروازے کے قریب
قائلین کے پیچھے رکھ دیا۔ اب شاید یہ قائلین کی صفائی کے وقت
دریافت ہو جائے۔

میں نے واپس ستارہ کے قریب پہنچ کر کوئی آواز میں کہا
مشورہ دیتی ہے کہ تم کسی کو علم نہ دے دو کہ تم تہلہ دو آقا
نواب کی نقیض شروعات ہو چکے ہو گی۔ سوطر کی باتیں نہیں کی
حاصل شدہ بھی نہیں ہو گا۔

اس کی کھائی کو جھٹکا دیتے ہوئے اس کی کپٹی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ
کمر کے بل کرا لیکن پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹے جسم کا
ہونے کے باوجود وہ زبردست قوت برداشت کا ہلکے معلوم ہوتا
تھا۔ فخر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا تاہم اس کی کھائی اب
بھی میری گرفت میں تھی۔

میں نے اس کی ہڈیوں پر گھنٹا مارا۔ وہ لڑکھڑایا لیکن اس
عالم میں بھی اس نے میری کھائی پر کمر کرنے کی چاب ماری۔ چاب
صحیح نہیں پڑی تاہم میری کھائی کی گھنٹا اٹھی۔ میری گرفت ایک
لے کے لئے ویشلی پڑی تو اس نے جھٹکے سے اپنی کھائی چھڑائی اور
چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ میں نے اسے دروازے کی طرف
ٹپکے اور راہ میں حائل چند آدمیوں کو دھکیلتے ہوئے ضرور دیکھا
اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہ چلا۔

میں اس کے پیچھے دھاڑا لیکن دروازے سے باہر تارک
راہ آدمی میں پہنچے اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کمر کیا ہو گا۔ میں
ماپوئی ہو کر ٹوٹ آیا۔ بال میں اب بھی دلی آوازیں سنائی دے
رہی تھیں۔ میں نے اندھیرے میں ستارہ کو تلاش کیا۔ وہ ایک
دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اس خوفزدہ خرگوش کی طرح کمری
کمرن سانس لے رہی تھی جو شکری کتوں سے جان بچانے کے
لئے کسی کمرہ میں چھپ گیا ہو۔

”ستارہ اگھوا نہیں۔ وہ بد معاش بھاگ گیا ہے“ میں نے
اس کا کدہ جھٹک کر اسے قتل دئی۔

وہ اندھیرے میں غائب ہو گئے دیکھ نہیں پاری تھی لیکن جس
انداز میں اس نے طویل سانس لی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ
اس کا خوف دور ہو گیا ہے۔ بال میں بدستور طرح طرح کی
آوازیں گونج رہی تھیں۔ کوئی ہوش کی انتظامیہ کو برا بھلا کہہ رہا
تھا کوئی بجلی کے نظام کو کھنٹ و مارت کا نشانہ بنا رہا تھا اور کوئی یہ
جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اندھیرے میں کون کیا کر رہا ہے۔

میں نے ستارہ کے قریب دیوار ہی سے ٹیک لگا کر کھڑے
ہوئے ہوئے کہا ”مجھے سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہو جی ورنہ وہ
نکل نہ پاتا۔“

اندازے کی غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ میں نے یہ توقع
نہیں رکھی تھی کہ وہ کرائے سے بھی واقف ہو گا ورنہ میں اسی
حساب سے اسے قابو میں کرتا۔ بال میں موجود دوسرے لوگوں کو
شاید اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ ستارہ پر کاٹانہ حملہ ہوا تھا۔
اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ ہمارے مسلمانوں اور خصوصاً اخباری
نمائندوں کی یہ لاعلمی برا قرار دی رہے تو اچھا ہے۔ اس واقعے کے
متعلق اخبارات میں سرخیاں لگیں گی تو ہمارے ساتھ اس وقت
اور آئندہ کام کرنے والوں میں خواہ مخواہ ہراس پھیلے گا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے یہ لالچ سامنے بھی محسوس ہوا کہ اس
طرح ہماری فلم کو بہت زیادہ پیشی حاصل ہو سکتی ہے لیکن

خود ہلاکت آتی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور جبر عریض ہو گیا۔ لیکن نریت ہی ٹھہرایا ہوا اور خیالت زدہ سا کوئی بال میرا داخل ہوا۔ اس نے متوحش سی نظروں سے اوپر اوپر دیکھا اور خاص طور سے کسی کو مخاطب کے بغیر بولا "معاف کیجئے گا خاتین دحضرات! آپ کو خاصی دیر دھت اٹھائی ہوئی۔ کسی نے میں سرکچ نف کر دیا تھا اور کت ٹوٹ بھی نکال کے فرش پر مار کر توڑ دیا تھا" وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے دھت کیجئے میں کہا "کیا آپ کے ہاں میں الیکٹرک بورڈ کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے؟" "الیکٹرک پلائی کے لئے ہمارا اپنا چھوٹا سا سب اسٹیشن ہے جو ہر وقت مشغل رہتا ہے" وہ منظرانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "اور میں الیکٹرک بورڈ پر نیچے تہ خانے میں ہے۔ وہ بھی گرل میں بند ہے اور گرل میں تار لگا رہتا ہے لیکن کسی نے نہ جانے کس طرح تار کھول لیا تھا۔۔۔ اور صرف یہی نہیں ہمارے جزیئر کی تار بھی کاٹ دی تھی" ایک بار پھر وہ پیشہ ورانہ لہجہ سے بولا "ہوئی کی انتظامیہ بے حد معذرت خواہ ہے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے آہستہ سے کہا اور وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

سب نے دوبارہ اپنی پیش چلیں سنبھال لیں اور معدے کی خدمت میں جو کسر رہ گئی تھی وہ پوری کرنے لگے۔ وغیرہ بھی مستعدی سے چیزیں لانے لے جانے لگے تھے۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے چلیں گریزی تھیں۔ ایک آدمی نے وہ انٹائم اور کالین صاف کیا۔ چند لمحوں بعد یہ اندازہ لگا سکن نہ رہا کہ یہاں کوئی گریز ہوئی تھی۔ ستارہ کے چہرے پر بھی رونق لوٹ آئی تھی تاہم وہ میرے قریب ہی رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس خیال سے مجھے خوشی ہوئی کہ میری مودودی سے اسے تھکا کا احساس ہو رہا تھا۔

بالا خر خود نوش کا سلسلہ ختم ہوا اور اخبار نویس ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ اتفاقاً ہر ایک کو رخصت کرنے باہر راہداری تک جا رہا تھا۔ بال میں صرف میں ستارہ اور اتفاق رہ گئے۔ ہم تینوں ایک چھوٹی میز کے گرد بیٹھ کر اور میں نے کافی کا آؤر دیا۔ ستارہ کے چہرے سے اب اندرونی خوف اور تباہی کے آثار دور ہو چکے تھے اور مصنوعی اور نہی کلی مسکراہٹ سے بھی اس نے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ اپنی مخصوص فطری مسکراہٹ اور بے پردہ سی حرکات و سکنات کے ساتھ وہ کم از کم مجھے پہلے سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔

کافی نوشی کے دوران اتفاقاً میری طرف دیکھتے ہوئے حسین آئینہ میرے میں بولا "آپ نے تو کمال کر دیا۔ حیرت انگیز اور عملی طور پر تو آپ ابھی فلمی دنیا میں آئے ہی نہیں لیکن تمام مسائل کا آپ کو بخوبی اندازہ ہے۔ پریس کا انٹرسٹ سے آپ کے خطاب کرنے کے انداز سے کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ یہ محض فلم انڈسٹری میں

ستارہ کا لہجہ اب سنبھل چکی تھی۔ ہلکا ہلکا آئینہ میرے میں ہوا "لیکن اس طرح حملہ کرنے والوں یا گروانے والوں کے دھتے نہیں بڑھ جائیں گے؟ وہ آئندہ بھی اس قسم کی کوشش کریں گے۔"

"نہیں۔ بلکہ ہماری خاموشی انہیں خوفزدہ کر دے گی" میں نے وثوق سے کہا "اور انہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم میری فلموں کی بیرونی دہ اور میں نے خود ہی فرش کر لیا ہے کہ ہماری حفاظت آپ میری ڈسٹے داروں بن چکی ہے۔ پولیس تو شاید اسی معاملے کو اتنی اہمیت نہ دے لیکن میرے لئے چونکہ یہ ایک مسئلہ ہے اس لئے میں ان سے زیادہ تندی اور سرگرمی سے اس کے بارے میں مناسب انتظامات کروں گا۔ تمہیں شاید اندازہ ہو ہی چکا ہو کہ اس قسم کے معاملات میں ہم کمزور لوگ نہیں ہیں۔"

"ہاں۔ وہ تو مجھے اندازہ ہے" اس کے لئے میں اطمینان بخلت آیا "اور اگر تم میری حفاظت کی ڈسٹے داری لے رہے ہو تو میں زیادہ مطمئن ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟ میری تو کسی سے ایسی خطرناک حد تک دشمنی بھی نہیں ہے۔۔۔ اور پھر یہ دیکھو کہ ایک ایسے مجھے ہوئی ہے۔۔۔ اسنے لوگوں کی موجودگی میں حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کوئی اور بہتر موقع بھی تلاش کر سکتے تھے۔ میں تو آنکھوں پر دست باندھی آتے جاتے وقت راستے میں اکیلی ہی ہوتی ہوں۔ ایسے کسی موقع پر مجھ پر حملہ کیا جاتا تو کامیابی کا امکان زیادہ ہوتا۔"

"ہاں" میں نے تبسم لیتے میں کہا "لیکن شاید یہاں حملہ کرنے میں کوئی مصلحت رہی ہو۔"

اس مصلحت کو میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا لیکن ستارہ پر اس کا انکار کر کے اسے مزید خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس لئے کہ یہ واقعہ صرف ستارہ کی جان لیوا سی نہیں بلکہ مجھے یہ احساس دلانا بھی تھا کہ حملہ کروانے والے جہاں چاہیں اُنہی وقت چاہیں اور وہ چاہیں گروا سکتے ہیں۔ اس سے ان کی مخصوص نفسیات کا بھی انکار ہوا تھا۔ یہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے انداز ہوتے ہیں اور یہ شوق کچھ خاص قسم کا پس منظر رکھنے والوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر یہ قاتل قسم کے لوگوں کو جب کوئی اس طرح کا کام کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے لئے اپنا موقع تلاش کرتے ہیں جب کہ اسے کم خطرات لاحق ہوں۔

اسی بار مجھے کافی حد تک اندازہ تھا کہ حملہ کروانے والا کون ہو سکتا ہے لیکن میں اس سلسلے میں بہت زیادہ یقین بھی نہیں تھا۔ میں ابھی فلمی دنیا میں نیا آیا تھا یہاں کے قیاس و فراز کو بہت اچھی طرح نہیں سمجھتا تھا۔ کوئی بعد نہیں تھا کہ ستارہ نے ہی انجانے میں کسی کو دشمن بنا رکھا ہو اور اسے خود احساس بھی نہ ہو۔

نورادے۔

ب زیادہ ممکن مت نکاؤ۔ میں ممکن پر دھم ہوں۔
میں نے مسرت سے بولے کما۔

"اگر مجھے ممکن لگتا ہوتا تو میں اس سے کہیں زیادہ تعریف کرتا۔ یہ تو میں انسانی محتاط رہتے ہوئے صرف کر رہا ہوں۔" پھر وہ کمری سانس لے کر بولا "میں لگانے والے تو ابھی آپ نے دیکھے نہیں۔ شاید آگے چل کر تجھ پر ہوجائے۔ چہرہ غمازہ و مودت پر بدلے ہوئے بولا "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتائے کہ آپ نے ستارہ پر جسے کیا بات کیوں چھپائی؟"

"اوہ! تو تم نے وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا؟" میں نے کمری سانس لے کر پوچھا۔

"کسی حد تک۔ میں آپ کے سب سے زیادہ قریب تھا لیکن گھپ اندھیرے میں مجھے بھی صحیح طور پر سب کچھ نظر نہیں آیا تاہم اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ اور بھی بات یہ ہے کہ میں بے حد خوشنود ہوتا تھا۔ نصیحت یہ ہے کہ میں نے شر شر نہیں شروع کر دیا۔"

"پھر تو واقعی اندھیرے، بھگدڑ اور افزائش میں ستارہ کو کوئی نقصان پہنچا جاتا؟" میں نے ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس قصہ سے اس کی رحمت ایک لمحے کے لئے چمکی اٹھی۔

"لیکن.... میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ نے اس بات کو کیوں خفیہ رکھا؟" اتفاق قدرے ابھمن زدہ سے مجھے پوچھا۔ میں نے اسے دھجھکاہٹ سے کوشش کی۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ "وہ قطعی انداز میں سمجھتے ہوئے بولا "حیرت ہے! اس خطرناک صورت حال میں آپ نے صرف جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی اس قدر مستعدی کا مظاہر کیا۔"

"میں ذہنی یا جسمانی کسی بھی قسم کی ایک لمحے کی سستی کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔" میں نے کہا "ایک لمحے کی غفلت مجھے میرے مقام سے بلوں پیچھے وکیل سکتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر قطعی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے ابھمن پہنچنے میں کہا "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ کسی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ وہ شخص بہت خوش قسمت تھا نہ میرے ہاتھوں سے بچ کر بھاگ گیا۔" میں اپنے چہرہ پر زہرے اور شہیدانہ ہاتھوں کا جائزہ لیتے گا۔

"اگر آپ است پکڑنے میں کامیاب ہوجاتے تو پھر یہ خطرہ راز نہ رہتا۔" اتفاق بولا۔

"ہاں۔ لیکن اس صورت حال میں آپ کا کہنا تو ہوتا۔ کچھ سراخ تو تھا کہ وہ اس کا بونی تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ سب کچھ نہیں اس سے یہ بات مطمئن کرنے میں ناکام رہتی۔" اتفاق نے خیال ظاہر کیا۔ "تو پھر ہم خود مصمم کر لیتے۔" میں نے مسرت سے بولے کما۔

"میرے خیال میں تو یہ مسئلہ ملک صاحب ہی نے کرایا ہوگا۔" اتفاق کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا اس نے اسٹوڈیو والے واسطے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا ہوگا؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "اس کے دونوں آدمی جیل میں ہیں۔ انہیں جپ چاہا کی سزا ہو چکی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اتفاق قدرے تلخ لہجے میں بولا "اس جیسے آدمیوں کے لئے تو ان کے کارنامے کے شرطنے کے سرے ہوتے ہیں۔ ایک پٹ گیا تو دوسرے کو آگے بڑھا دیا۔ ملک کے بارے میں آپ اپنے اندازے کترتہ رکھیں۔ وہ بے حد خطرناک آدمی ہے۔ دولت اس کے پاس بے شمار ہے۔ اسی حساب سے وہ سب کچھ بھی بے شمار ہیں اور اگر ایسے آدمی کی ذہنیت بخرام ہوجائے تو وہ برا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اور ملک تو اس کے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ وہ بے پناہ طاقتور ہونے کے باوجود بیضی اوقات موقع مناسب دیکھ کر سانس کی طرح مل میں گھس جاتا ہے اور جب حالات موافق ہوتے ہیں تو دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس وقت بھی وہ ننگار کرتی تمل کرے۔ کسی کو ڈک پھانسنے کے لئے وہ کسی بھی وقت کوئی بھی حربہ اختیار کر سکتا ہے۔"

"تم تو میرے تجسس کو ہوا دے رہے ہو کہ میں ان ملک صاحب سے ملاقات کا اہتمام کری لوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بلکہ میں آپ کی کل دیگر سلسلوں میں اتنا مصروف ہوں کہ اس قسم کی باتوں میں الجھتا نہیں چاہتا۔"

"خیر۔ آپ جب تک اسے نظر انداز کرتے ہیں جب تک کرتے رہیں۔" اتفاق بولا "جب پانی سر سے اٹھا ہو گا تو دیکھا جائے گا۔"

"اور پانی سر سے اٹھا جب ہوگا؟ جب میری روح قطعی غصہ سے پرواز کر جائے گی؟" ستارہ نے اتنی دیر میں پانی پلے "انتھرو میں دھل دیا۔"

"ضروری نہیں کہ آئندہ بھی تم پر ہی حملہ ہو۔" اتفاق بولا۔ "اور اگر ہوا بھی تو خدا اپنے بھروسہ رکھنے کے علاوہ تھوڑا بہت بھروسہ تم پر بھی کر سکتا ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" وہ کمری سانس لے کر بولی "گفتا میں ہے کہ اب تم پر بھروسہ رکھنا ہی پڑے گا۔ میں تو ابھی بھی ایسی ہوں۔ اہا! کاتھو میں بونا یا نہ ہونا برابر ہی ہے۔ وہ تو جسے میں دوست دیتے ہیں۔"

"میں تمہیں ایک باڈی بگاڑ دے دوں گا جو چاہے جسے ملے سانس کی طرح تمہارے ساتھ رہے گا۔" میں نے کہا۔

"جو میں لیتے والی بات تو قائل ہے۔" وہ مسکراتی "چہرے پر بحال مجھے تمہارے لئے بھی درکار نہیں ہے۔" مظاہر ہوا۔

کہ اب اس کا خوف دور ہو گیا تھا اور اس کی حس مزاج

بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی بی بی دیکھ رہا تھا۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا اور کوئی بونے فاسٹ میٹھا شامیاں لے رہا تھا۔ ستارہ کو دیکھ کر کئی پاکستانی مرد اور عورتیں چوکنے نظر آئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ تین چار غلطیوں کی ریلیز کے بعد ہی اس کا چہرہ لوگوں کے لئے ایک بابا پچھا ناچہ بن چکا تھا۔ نو دس سال کی ایک بچی تو اسے دیکھ کر کچھ زیادہ ہی اشتیاق سے اپنی ماں سے سرگوشی میں کچھ کہنے لگی۔ ہم اس دوران لابی عبور کر کے شیشے کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔

"سنئے... سنئے کس" "نہت ایک باریک سی آواز سن کر میں اور ستارہ رک گئے۔ وہی نو دس سال کی بچی ہمارے پیچھے کھڑی تھی جسے ہم ایک لمبے لمبے اپنی ماں سے سرگوشی کرتے دیکھ چکے تھے۔

"آپ مشہور قلم اشارہ س ستارہ ہیں نا؟" بچی نے شریلے سے لمبے میں پوچھا۔

"مشہور تو معلوم نہیں میں ہوں یا نہیں ہوں۔ لیکن میں قلم اشارہ ستارہ ضرور ہوں" ستارہ نے جواب دیکھ کر باری سے بچی کا کمال تحسین کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں آؤ گراف دے دیجئے پلیز" بچی نے آؤ گراف بک اس کی طرف بڑھائی۔

"کیا آپ آؤ گراف بک ہر وقت ساتھ رکھتی ہیں؟" ستارہ نے آؤ گراف بک اور بچہ اس کے ہاتھ سے لینے دے مکرار پوچھا۔

"ہر وقت تو نہیں" بچی نے بھولہن تمیز سمجھتی سے جواب دیا۔ لیکن جب میں اس بول میں آتی ہوں تو آؤ گراف بک ضرور ساتھ لاتی ہوں کیونکہ یہاں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی مشہور شخصیت نظر آجاتی ہے۔"

"بہت خوب" ستارہ نے گویا بچی کی ستائش اور ذہانت کی داد دی۔ پھر اس نے انگریزی میں آؤ گراف بک میں ایک نسل لکھا جس کا مفہوم یہی تھا کہ ہر چھٹی بولی چیز سوتا نہیں ہوتی۔ اس نسل کے نیچے خط لکھ کر اس نے آؤ گراف بک بچی کو واپس کر دی اور وہ شکرے ادا کر کے سرور انداز میں دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ اس دوران اتفاقاً بھی ملی کا معاملہ نثار کے ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہم تینوں باہر آگئے۔

ستارہ کا ڈرائیور گاڑی لے کر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ آج ستارہ کے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی نوبت ہی نہیں آ رہی تھی۔ ڈرائیور گاڑی لے کر گیا ہمارے پیچھے پیچھے پھر رہا تھا۔ میں نے اس وقت بھی ستارہ کا اس کی اپنی گاڑی میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ "تم ہمارے ساتھ ہی چلو تو اچھا ہے" میں نے کہا "میں جنہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دوں گا۔ اپنے ڈرائیور سے کہہ دو کہ گاڑی ہماری گاڑی کے پیچھے پیچھے ہی لے آئے۔"

پہنچ جی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہئے۔ کل میرا شنگ کا شذر دل بہت ہنس رہا ہے۔ بے حد مصروفیت رہی ہے۔ اگر آج مجھے آرام کے لئے زیادہ وقت مل جائے تو اچھا ہے۔"

"تم نے کوئی سیکرٹری وغیرہ نہیں رکھا؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکی رکھی ہوئی ہے لیکن وہ آؤ گراف چھٹی پر کھڑی ہوئی ہے۔ پانچ روز میں آجائے گی" اس نے بتایا۔

"اب بٹیس وغیرہ کا حساب خود رکھتی ہو؟" میں نے پوچھا۔ "میرا حافظہ بہت اچھا ہے۔ مجھے زبانی سب کچھ یاد رہتا ہے۔" "سکرانی" ویلے ابھی میرے پاس اتنی زیادہ فائیں بھی نہیں ہیں۔ اگلے ماہ میری ایک فلم سنسکر میں جاری ہے۔ اس کی ریلیز کے بعد مجھے امید ہے کہ میرے پاس یکدم کام بہت بڑھ جائے گا۔"

"اس کے بعد تم ہمیں اپنے گھر کے چکر لگوانے شروع کر دو گی؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں مجھ سے ایسی امید ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے لیکن قدرے مجروح سے لمبے میں پوچھا۔ "کچھ کم تو نہیں پاسکتا" میں نے اس کی آنکھوں میں برائے ہوئے کہا "اس دنیا کا کوئی مجروح نہیں کہ کب کس کو کیا پائے... اور تمہارا اپنا بھی کچھ مجروح نہیں۔ تم پہل پل رخ بدلتے رہا ہو۔"

"جی جی اب تمہیں دہی" وہ دھتے لمبے میں بولی۔ میں نے دیکھا "اس کی آنکھوں میں دھواں سا پھیلا ہوا تھا" تم مجھے اس زمانے کے بچی منظر میں مت دیکھو جب ہماری نئی نئی شامیائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک بڑے اٹھکات گزرے ہیں۔ بڑے تغیرات کا سامنا رہا ہے۔ ان گنت تجربات کا زہریلا سہ میں نے۔ میرے اعمال کے پشاورے میں زیادہ نیکیاں نہیں ہیں کہ کچھ بھی میرا من پہلے سے زیادہ اجلا اجلا سا ہو گیا ہے۔ میں بہت اچھے ہونے لوگوں میں رہی ہوں لیکن خود بہت سلجھ گئی ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی خود غرض کتنا ہی چالاک اور کتنا ہی موقع بہت کیوں نہ بن جائے لیکن دنیا میں اس کا ایک آدھ دست ضرور ہونا چاہئے۔ بالکل شہادہ کہ مضبوط سے مضبوط انسان بھی دنیا میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ چنانچہ میں نے ہمیں اور اتفاق کو اپنے ایسے دوست شمار کرنا شروع کر دیا ہے جو حاصل حیات ہوتے ہیں۔"

اتفاق اس وقت مل پر دھکا کرنے کے لئے اکاؤنٹنٹ کے گھر پر رک چکا تھا اور ستارہ میرے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی۔ وہ اتنی جی آواز میں بات کر رہی تھی کہ میرے دوسرے ہاتھ پر اگر اتفاق سو دھکی ہو تو شاید سن نہ پاتا۔ ہم اس وقت لابی میں سے گزر رہے تھے۔ لابی میں کئی مکی اور کئی غیر مکی افراد صوفوں پر

بھی سختی تھی لیکن ابھی میں نے کچھ عرصہ اور کرائے پر بی
کرنا بہتر سمجھا۔

میں اس کی رہنمائی میں ایک آراستہ دیراستہ ڈارنگ
میں پہنچا جہاں لائسنس اس طرح فٹ کی گئی تھیں کہ
رواؤں سے چھوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں
خواباک سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”تمہارا ذوق بہت اچھا ہے“ میں نے کمرے کا جائزہ
ہوئے کہا۔

”ہی۔۔۔ سب کچھ زمانے سے سیکھا ہے“ وہ اپنا پتلا
ایک تھلیس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ میں بھی بیٹھ چکا
”تمہیں ایک مڑے کی بات بتاؤں۔۔۔ میں کو کبھی ایک فلسفہ
کرکچھ متنازعہ پیش کرنے کے لئے تیار تھا۔“

”شرط کیا تھی؟ میں نے سرسری سے پوچھا۔
”کوئی خاص نہیں۔ صرف یہ کہ میں اس کی آواز
فلوں میں کام ضرور کروں گی“ ساتھ صوفے پر ہم دونوں
ہوئے بولی ”دیے اپنی مرضی سے خواہ میں اس کی باتوں کے
دس فلوں میں کام کرتی اور طے شدہ معاوضے کے علاوہ
نہ لیتی لیکن اس بات کو جب اس نے شرط کے طور پر رکھا
تحت برا لگا اور میں نے فوراً انکار کر دیا۔ میں شرط طو
کام نہیں کر سکتی“ خواہ اس میں میرا کتنا ہی فائدہ ہو۔ میرا
بڑی آزادی پسند ہے۔“

میں نے ہلے سے ہٹکارا بھرا اور بغیر اس کا جائزہ
اس کی غزالی آنکھیں مخمور سی نظر آ رہی تھیں اور اس وقت
وہ صوفے پر سناکت بھی مگر اس کے ضد خال گویا شاعری
تھے۔ بلاشبہ وہ اب بھی ایک محرومہ کر دینے والی لڑکی تھی
کے ساتھ ساتھ اس کا باطن بھی عجیب اور حیران کن تھا۔
دن تھا اس نے پلو بلا اور مجھے یوں لگا جیسے حسین
کے کسی جیسے نے ہلکوارا سالیما ہو۔ میرے ذہن میں دحوالیا
رہا تھا۔ وہ گویا میرے اندر کے عقیدہ تبدیل سے آگاہ تھی
انجمن بنی ”ایک زہد شکن مسکراہٹ کے ساتھ بات جاری
ہوئے بولی“ ایک اور فلسفہ نے ذہن اس سے بھی بڑی
قیمت کو غمی متنازعہ دینا چاہی تھی مگر اس کا مسئلہ بھی میں تو
نے بھی ایک شرط رکھ دی تھی۔

”کیا؟“ میں نے سرگوشی نما پوچھا۔
”کہ وہ میرے میں تین چار مرتبہ میرے ہاں آیا کہ
عجیب سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ
بھی تھی اور تصدی کی جھلک بھی۔ وہ بات باری رکھی
بولی ”اس فلسفہ کی یہ بات کچھ ایسی انوکھی بھی نہیں تھی
ایکڑیوں کا دو تندرل سے یہ سلسلہ ہوتا ہے۔ میں
پارہ سچ تو ہوں نہیں۔ باز افسان میں بھی رہی ہوں اور

ستارہ نے اپنے ڈرائیور کو یہی ہدایت دی اور میرے ساتھ
گاڑی میں آ بیٹھی۔ اتفاق دہیں رکتے ہوئے بولا ”اندر میرا ایک
دوست مل گیا ہے۔ میں کچھ دیر اس کے ساتھ گپ شپ کرنے
کے بعد گھر جاؤں گا۔ ویسے بھی آپ دونوں گلبرگ بارے ہیں
جب کہ مجھے کمن آباد جانا ہے۔“

وہ اپنی گاڑی اسٹوڈیو ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ ہم نے اسے
خدا حافظ کہا اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے کہا ”ستارہ“
جس میں ڈوگراف بک میں انگریزی لکھتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشگوار
سی حیرت ہوئی۔ زمانے نے تمہیں واقعی بہت کچھ سکھایا ہے۔“
”اور میں جس میں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی ہوں“ وہ میری
طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی ”تم بھی واقعی بہت کم مدت میں بڑی
زبردست چیزیں سمجھ گئے ہو۔ دیے خود بہت سی سے قطع نظر یہ خیال تو
میں سے کہ میں تم سیکھنے کی صلاحیت تھی اس لئے زمانے نے ہمیں
اتنا کچھ سکھایا۔ جن میں سیکھنے کی صلاحیت نہ ہو انہیں زمانہ بھی
کچھ نہیں سکھاسکتا۔“

”میں کچھ سمجھ سچے سوچے اپنے بارے میں کبھی نہیں جانتا
ہو جانا ورنہ میں سے زوال شروع ہو جائے گا“ میں نے غمناک
پوچھ میں کہا۔

”میں صرف ضرور تا کبھی کبھی شکر نظر آتی ہوں لیکن صرف
ظاہری طور پر۔ اندر سے میں بڑی افسردہ پرست لڑکی ہوں“ وہ
سیت کے پٹے سے سر نہکا کلاں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔
وہ جب اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتی تھی تو اس کے وجود سے
امنٹی ہوتی خوشبو کچھ اور گرمی ہو جاتی تھی۔

”اتنے وقت سے اپنے بارے میں کچھ مت کہو“ میں نے
دھمکے لیے میں کہا ”میں اور تم دونوں ہی ایسی شخصیتیں ہیں کہ خود
اپنے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اندر سے کیسے
ہیں۔“

”تم اپنے بارے میں کہو نہ کہو“ وہ قدرے عرصے کے لیے
بولی ”میں اپنے بارے میں تو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اندر
سے بڑی اچھی اور انجلی لڑکی ہوں۔ بس ویسے ہی کبھی کبھی بڑی بن
جاتی ہوں۔“

اس دوران ہم گلبرگ میں داخل ہو چکے تھے۔ اس نے مجھے
راستہ بتاتا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر بعد میں نے گاڑی اس کی
رہائش گاہ پر پارک کی۔ یہ اوسط درجے کی ایک چھوٹی لیکن خاصی
خوبصورت گھنٹی تھی۔ باؤن سن کر ایک ملازم نے انگریز کھوا
اور میں نے گاڑی روک میں لے جا رکھی۔

”خوبصورت کو غمی ہے“ میں نے گاڑی سے اتر کر ادھر
ادھر کا جائزہ لینے ہوئے کہا ”کب خریدی تھی؟“
”خریدی نہیں“ کرائے کی ہے“ وہ برآمدے کی میز صیال
چڑھتے ہوئے بولی ”ویسے میرے حالات ایسے تھے کہ چاہتی تو خرید

تھی کیونکہ وہ اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آمد سے کمرے میں ہلچل مچ گئی ہوئی خواب گاہ کی خوشبو و مسک کی بو سے مجھ کو بے ہوش کرنے لگی۔ وہ غصا مٹھ کر آئی تھا۔ اس کے جسم پر بہترین کپڑے کا کھلوار سوٹ تھا مڑمٹل اور سنسنوں سے اس کی حالت بجاہ تھی۔ وہ دھندلی دھندلی آنکھوں سے پول کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اسے دیکھنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہو۔

ستارہ یک لخت اٹھ بیٹھی اور غصیلے لیے میں بولی "بابا! میں نے کتنی مرتبہ آپ کو منع کیا ہے کہ صرف اپنے کمرے میں رہا کریں، کسی دوسرے کمرے میں مت گیا کریں اور اگر آج بہت ضروری ہو تو دستک دے کر اجازت لے کر آیا کریں۔"

بوڑھے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ستارہ کی طرف دیکھا گویا پچھاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہاتھ خود اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی گیا اور معذرت خواہانہ طبع سے میں بولا "مم۔۔۔ صاف کرتا ستارہ جی۔۔۔! میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول گیا تھا۔" اسے ایک زوردار ہنگامی آواز تھی جس سے اس کا تحیف و زوار جسم ٹانپ کر رہ گیا پھر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔ جاتے وقت وہ حتی الامکان مختلط انداز میں دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا لیکن ستارہ نے اسے گویا ٹانپائی سمجھتے ہوئے اٹھ کر دروازہ منقل بھی کھولا۔ ایک بار پھر میرے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ ہالوں میں اٹھایا پچھرتے ہوئے محو سے انداز میں مسکرا دی گراب اس مسکراہٹ میں تحقیر بھی شامل تھی۔

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحوں پہلے میں نے جس بھول اور تحیف و زوار شخص کو دیکھا تھا وہ ستارہ کا باپ تھا جس کی دہشت سے میں کسی زمانے میں لرزہ بر اندام رہا کرتا تھا۔ جب ستارہ 'لالی' ہوا کرتی تھی اور خانہ بدوشوں والے بچے میں رہتی تھی اور میں دقت کے دامن سے چند حسین ساتتیس چڑا کر اس سے ملنے جایا کرتا تھا تو اس کے باپ کی آمد کے ذریعے میرا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگتا تھا۔ اس زمانے میں وہ کسرا کرانڈل اور دہشت ناک سا ہوا کرتا تھا اب محض ایک قابل رحم ڈھانچا تھا۔ جب انسان پر منشیات غالب آجاتی ہیں تو وہ تصویر عبرت بن جاتا ہے، یہ بات سمجھ کر معلوم ہے اور عبرت کی یہ تصویر میری سمجھنے کا بجا بجا رہی ہوئی ہیں اس کے بارہو دہشت سے انسان کسی نہ کسی طرح منشیات کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔ میں جب بھی کسی ایسے آدمی کو دیکھتا تھا، مجھے اس پر بے حد رحم آتا تھا۔ بعض اوقات نشے کے مارے ہوئے لوگ ایسی حرکتیں بھی کر رہے ہوتے ہیں جن پر رحم کے بجائے غصہ آتا ہے لیکن اگر میں کوئی ایسا منظر بھی دیکھ لیتا تب بھی میری پوری پوری کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ شخص جو پہلے ہی اپنے آپ سے بچا نہ ہے، میرے غصے کا نشانہ نہ بنے۔

یہ بھی ہر بار ایسی کچھ ایسا قابل رشک نہیں رہا۔۔۔ تم تو جانتے ہی ہو۔۔۔ لیکن میں نے اس شخص کو کمرے کی دروازے پر کھڑے کر دیا۔ اور اگر میں اس کے مقابلے میں کمزور نہ ہوں تو شاید میں اس کے منہ پر ٹھاپے بھی مارتی۔"

"اچھی بہ بھئی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ بات بھی کیا صرف شرط ہونے کی وجہ سے تمہیں باگوار مگر ضروری تھی؟"

"ہاں۔۔۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ شخص مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ جو لوگ مجھے پہلی ہی نظر میں برے لگیں وہ اکثر مجھے کوئی فائدہ بھی پہنچا چاہیں تو شاید مجھے قبول نہ ہو۔" وہ غموں لہجے میں بولی "اگر وہ شخص پہلے مجھے دوست بناتا اور روز روز مراسم کو اپنی مطلوبہ سبج پر لانے کی کوشش کرتا تب بھی مجھے اتنا برائے لگتا لیکن اس نے جس طرح دو ٹوک انداز میں بات کی، اس سے وہ مجھے اور بھی زبردگ۔ جیسے میں کوئی بہت ہی سستی قسم کی فالتو چیز ہوں۔"

"گویا بزنس میں بھی تمہاری ذاتی پسند شامل رہتی ہے؟"

میں نے تھکے ہوئے چہرے پر جواب دیا۔ "بے شک۔۔۔ بلکہ اگر ذاتی پسند غالب آجائے تو میں بزنس کو ہی پشت ڈال سکتی ہوں" اس کی محو رنگا ہوں کا تقسیم کچھ اور ہو گیا۔

"شو بزنس کے لوگوں کے لئے تو یہ کوئی اچھی عادت نہیں" اس نے کہا۔

"میں تمہیں اپنی تمام تر عادتوں کے ساتھ ہی شو بزنس میں باباب ہو کر دکھاؤں گی۔ خواہ وہ عادتیں اچھی ہیں یا بری" وہ اپنے کپڑے میں سے میں بولی۔

"کامیاب تو تم ہو چکی ہو" میں نے کمری بخیدگی سے کہا۔

ٹاٹا کا بیٹا جسے میں نے پہلے ہی میں اتنے کم عرصے میں اپنی مایاں آنکھوں سے دیکھ کر اپنی آنکھوں کی کھینچ کر غصے میں آئی تھی۔ مگر اب اس کی بات سے کہ تم ابھی سے اپنی پسند کی اور اپنی دھمکے لوگوں کی قلمیں ہی سناٹ کر رہی ہو ورنہ اب تار میں کسی کو نہیں ملے گی۔" اس نے کہا۔

"میں نے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائے اور دھڑا دھڑا کر کر کے لے لے۔" اس نے کہا۔

"میں نے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائے اور دھڑا دھڑا کر کر کے لے لے۔" اس نے کہا۔

"میں نے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائے اور دھڑا دھڑا کر کر کے لے لے۔" اس نے کہا۔

نہارو اور دھڑا دھڑا کر کر کے لے لے۔" اس نے کہا۔

نہارو اور دھڑا دھڑا کر کر کے لے لے۔" اس نے کہا۔

نہارو اور دھڑا دھڑا کر کر کے لے لے۔" اس نے کہا۔

نہارو اور دھڑا دھڑا کر کر کے لے لے۔" اس نے کہا۔

ہر وقت کھلے ہیں۔

"بالکل اسی طرح جیسے تھمارے بوسیدہ و شکستہ خیمے کا۔ میرے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا؛ کو کہ اس میں کوئی دشمن نہیں تھا" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ دھیرے سے نفس دی "بالکل اسی زمانے کا" تم اب بھی میرے ہاں آتے ہو۔ لہذا اس زمانے میں تو پھر بیک روک ٹوک تھی۔ اب نہیں ہوگی۔ اور اب مجھے اس زمانے کی طرح محک کر تم سے کوئی لالچ بھی نہیں ہے۔ میں اب تمہیں یا طرح محک کر تم سے آئینیں پہنچا دوں گی۔ مجھے اب تم کوئی غرض نہیں ہے۔ تم یا تو مجھے اپنی ایک بھی فلم میں مت کرو۔ تم سے میرے لفظی خاطر میں کوئی فرق نہیں کرو کیونکہ اب میری دوجی ہے غرض ہے۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم واقعی مجھ پر اتنی مہربانی کرنے صاف ہو گئی تے کہا۔

"کم از کم اب تو تمہیں یقین آ جانا چاہیے" اس۔

"اب" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر ایک لمحے کے وقفے

"اگر تم میرے لفظوں کی سچائی کو محسوس کر سکو تو میں نہیں ہوں کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ شروعاتی سے اچھے

لیکن شروع میں میں نے اس احساس کو لالچ کی کالی چادر لیا تھا۔ تھمارے اندر تھماری قہار چالاکوں کے باوجود

طرح کا شرمیلا پن اور ایک طرح کا کھرا پن ہے وہ اچھا

مجھے۔ اور۔ اور اس کے علاوہ تم دلیر بھی ہو۔ کسی کے

تامن کر لیتے ہو۔ یہ بات تو شاید ہر عورت کوئی اچھا

لیکن مجھے کچھ زیادہ ہی اچھی لگتی ہے۔ شاید اس لئے کہ

آپ کو بے حد کمزور اور غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں

ایسا ہیوز میں منڈلانے والے کئی اونچے درجے کے

میرے اشارے پر بہت کچھ کر دیتے ہیں شاید خوشی سمجھا

لیکن شاید میں بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ان میں سے

مدد کے لئے پکارا پسند نہ کروں۔ لیکن جس میں شاید بلا ضرور

پکارنے کوئی چاہے۔ تم اپنے اپنے سے لگتے ہو۔

"ہیں۔۔۔ ہیں۔ اب اتنا کم سن مت لگاؤ کہ میں

پاتال کی گمراہیوں میں جاگروں" میں نے مسکراتے ہو

"ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہیں اتنی خوشبو ملے

کرنی اچھی ہے کہ سننے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور

دوسری خوبی جو مجھے پسند آتی رہی ہے کہ تھماری طبیعت

لالچ نہیں دیا۔ بڑی دوسری ہی اچھی ہے اب تھمارے

"شاید پہلے میں اس لئے لالچی تھی کہ بھوک

دولت سے میرا پیٹ بھرنے لگا ہے اس لئے لالچ ختم ہوا

چونکہ مزید دولت فیضی طور پر اپنی طرف آتی نظر آتی

لے کر سوچتا ہوں کہ خواہ مخواہ رشادیں ہونے اور

کمرے میں چند لمحے پوچھ لی خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا "تھمارے بابا کو کچھ کراؤں" ہوا۔

"پہلے مجھے بھی پوچھا تھا" وہ ایک بار پھر صوفے پر نیم دراز

ہوتے ہوئے بے پروائی سے بولی "لیکن اب نہیں ہوتا۔ انسان

چاہتے تو اپنے آپ کو غریب دینے کے لئے کسی بھی بات کا کوئی بھی

بجائے گھر سٹکا ہے۔ میں نے بھی گھڑ لیا ہے کہ بابا کم از کم اس لحاظ

سے تو خوش قسمت ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنی مرضی کی زندگی بسر

کر رہا ہے۔ اچھا برا جو بھی چاہتا ہے وہی کھاتا پیتا ہے۔ جیسا

اس کا دل چاہتا ہے وہی ایسا لباس پہنتا ہے۔ مقصد یہ کہ انتخاب

کا حق اس کے پاس ہے۔ کوئی اسے مجبور نہیں کرے گا غلام کام

کرنے یا غلام کام نہ کرے۔ نشہ بھی اسے کسی نے نہیں لگایا

۔۔۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو لگائے ہیں۔ وہ تو عمر بھر

نوجوان تو قابلِ رحم ہوتے ہیں جنہیں منشیات کی تباہ کاریوں کا

اندازہ نہیں ہوتا اور وہ کسی کے بھلائے بھلائے سے یا اپنی

ناوائی کے سبب ان پیکروں میں پھنس جاتے ہیں لیکن بابا کے

ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ وہ اپنے برے بھلے کو خود سمجھتا

تھا۔ اس کے باوجود اگر اس نے اپنے لئے یہ راستہ منتخب کیا تو

اس کا مطلب ہے کہ یہ اس کی حسرت تھی اور وہ ابھی تک اپنی

حسرت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ آج کے

دور میں جو شخص اپنی حسرتیں پوری کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ

بڑا خوش قسمت ہے۔ یہ بعد کی بات ہے کہ حسرتیں اچھی ہیں یا

بری۔ چنانچہ اب میں نے بابا کے بارے میں فکر نہ ہوتا پھوڑ دیا

ہے۔

"ہاں" میں نے پوچھ لیا "سائنس لینے ہوئے کہا" یہ تم نے

ٹھیک کہا کہ خود کو مطمئن کرنے کے سو طریقے ہوتے ہیں

بشرطیکہ انسان کو ان سے مطمئن ہونے کا ہنر آجائے۔"

وہ خاموش رہی اور پھر خیال سے انداز میں مسکراتی رہی۔

میں اس کے ہاں سے دوسری صبح ناشتے کے بعد رخصت ہوا۔

۔۔۔ وہ خود بھی شوٹنگ پر جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ وہ مجھے

چھوڑنے پر سچ تک آئی اور کار کی گھڑکی پر ٹھٹھٹے ہوئے بولی۔

"انسان جب بہت خوش ہوتا ہے تب بھی اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ

ان نجات کو کسی کے ساتھ شیئر کرے اور جب وہ شکستہ دل و

مایوس ہوتا ہے تب بھی وہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کا دکھ بھائے۔

جب کامیابیوں کے شمار سے وہ اپنے آپ کو نہایت لگا پھنکا اور

بیکریاں فساد میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہے تب بھی اس کی

خوابش ہوتی ہے کہ کسی کے ہمدرد ہاتھ اسے سنبھالے دیکھیں اور

جب وہ زمانے کی دوڑ میں محک بار کر یا کسی احمقانہ صدمے سے

چرچر ہو کر گر پڑے تب بھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اسے

سار دے" اس کے ریزہ ریزہ وجود کو سینے۔ ایسے کسی بھی لمحے

میں تھمرا آتے ہو۔ اور کچھ کے دروازے نہیں اسنے لئے

محسوس ہوتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری ذات کے سمندر کی حوس میں خواہ کتنے ہی طوفان اٹھیں لیکن سطح بالکل پرسکون رہے۔ کوئی صحیح طور پر نہ جان سکے کہ میں کیا چاہتا ہوں کیا سوچتا ہوں۔ کوئی میری کمزوری نہ بین سکے کوئی مجھے مخلوق نہ بنا سکے اور کوئی مجھے جذباتی درجہ کار نہ پہنچا سکے۔

گو مجھے یقین تھا کہ ستارہ کی باتوں میں اب میرے لئے خلوص اور سچائی کی خوشبو ہے وہ واقعی مجھ سے متاثر ہے اور جس طرح مجھ پر مہمان ہے اس طرح کسی اور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود میں اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر نہیں ہوتا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سے میرے دل کا کوئی ایسا قطع استوار ہو جائے کہ کل کلاں کو جب وہ مجھ سے دور نہیں جاتے تو میں اپنے دل میں کوئی گھاڑ محسوس کروں۔ میں شاید اب کوئی گھاڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دل زیادہ سے زیادہ کسی تک یا کسی مٹیسی غلط کا متحمل ہو سکتا تھا۔ بات قوت برداشت کی بھی نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ اگر میں چاہتا ہوں اور محرومی کے کسی حد سے بے حال ہو کر دل تمام کر بیٹھ جاتا تو مجھے اپنا وجود نہایت ہی بے کار اور بے تصرف محسوس ہوتا جبکہ میں اپنی زندگی کے لئے بڑے اور اونچے مقاصد کا تئیں کر چکا تھا اور ان کی تکمیل کے بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔



میری بھائی قلم کی شونگ شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی عجیب و غریب واقعات کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ پہلی شونگ سے ایک روز قبل اتفاق نے مجھے فون کیا ”سر“ کل سے شونگ شروع ہو رہی ہے۔ اس موقع پر اگر حمودی دیر کے لئے آپ بھی آجائیں تو اچھا رہے گا۔“

”بھئی میرا رہاں کیا کام؟“ میں نے دھت لے کر کہا۔

”ہلور قل ساز آپ کو فنی دنیا اور وہاں کے معمولات سے تھوڑا بہت آشنائی ہو نا چاہئے“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

”شونگ کس نوعیت کی ہے اور کہاں ہوگی؟“ میں نے معمولی دلچسپی سے پوچھا۔

”ستارہ پر چند شاٹ پکچر اتر کرنے کا پروگرام ہے۔ اسی حصے کے چند شاٹیں ہیں جب ستارہ شکار پر جاتی ہے اور چند ڈاکوؤں سے اس کی ٹڈ بھیل ہوئی ہے۔ مار دہار کے منظر کا کچھ حصہ شوٹ ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔“ اتفاق بولا۔

”لیکن یہ منظر تو کمائی میں کافی آئے یا کر آتا ہے اور تم شونگ یہاں سے شروع کر رہے ہو؟“ میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ پھر جواب کا انتظار کے بغیر میں نے خود ہی کہا ”اوہ... میں سمجھ گیا۔ تمہیں جس جس سے ڈنٹ مل رہی ہے اس سے تم شونگ کا سے تمہیں نوکریزہ میسر آتی یا نہیں کی اسی حساب سے تم شونگ کا

کمرے چننا کو پہنچنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ دولت سے کبھی بچت نہیں پڑا۔ انسان ایک مرحلہ سر کر لیتا ہے تو پھر اس سے اونچے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اور پھر اس سے اونچے... اور یوں یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو دنیا میں اس وقت بے شمار دولت مند ہیں جن کے پاس دولت ان کی ضرورت سے کہ زیادہ گنا زیادہ ہے وہ سب آرام سے بیٹھ جاتے۔ مگر وہ سب مزدور کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔“

”اے اس“ اس نے ایک گرمی سانس لی ”میں نے کسی ٹافل یا انسانے میں اس کی توجیسہ دہی تھی اور وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی کہ انسان کی تمام خواہشات پوری ہو جانے کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے جب دولت کمانا انسان کے لئے محض ایک دلچپ مشغلہ رہ جاتا ہے۔ جس طرح شطرنج کے کھلاڑی خوب دماغ لڑا کر ہار پر مہوں کو آگے پیچھے کھسکانے ہوئے محفوظ رہتے ہیں اسی طرح دولت مندوں کے لئے کاروبار کی ہار پر لاکھوں کروڑوں کی رقمیں ادھر سے ادھر کرتے رہنا بھی ایک مشغلہ بن جاتا ہے۔ ایک دلچپ مشغلہ۔ لیکن میں چونکہ ایک عورت ہوں اور خاصی مختلف عسری عورت“ اس نے مجھ پر ہنسنے دوسرے محسوسات غالب ہیں۔ لیکن شاید آگے چل کر مجھ میں بھی دولت کی ہوس عود کر آئے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی“ اس نے جو عجیب معصومیت آمیز بے بسی سے سر ہٹا کر اور پھر جانے کیوں ہنس دی۔ اس نے جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی تھی۔

”نانے میں جانے کیا کچھ دیکھا تھا۔ بے صورت کا جانے کس کس ہلو سے سامنا کیا تھا مگر اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں اب بھی غصہ کی معصومیت تھی۔ اس کے رسا دلوں پر اب بھی اچھوڑتے پن کی شکستگی تھی اور اس کی آنکھوں میں اب بھی شرمیں مسکراہٹ اچھی تھی۔ بہت عجیب لڑکی تھی۔ جب سراپا ملا کیا تھا قدرت نے اسے۔ شاید وہ ایک سدا بہار وجود لے کر دنیا میں آئی تھی۔“

شب رفتہ کے سائے ایک بار پھر میرے ذہن کو دھندلانے لگے اور اس سے پہلے کہ میری کینفیوں میں چنگاریاں ہی تیرنے لگیں میں نے جلدی سے کار اشارت کرتے ہوئے کہا ”اچھا میں چتا ہوں۔ پھر کسی خوش قسمت لہجے میں تم سے ملاقات ہوگی۔“

گنگا بات یہ تھی کہ میں اس لڑکی سے خوف سا محسوس کرنے لگا تھا کیوں کہ ایک انجانی ہی کشش مجھے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں بالکل اسی طرح جذبات کی متاثر شدہ قوتوں سے اس کی دھنکے۔ ”میں چاہتا تھا جس طرح بھی نوعمری اور عقلی کے دور میں ہوتا تھا۔ اس قسم کا جذباتی دروازہ اب مجھے اپنے لئے پڑھ کر

اردو کے شاہکار سفرنامے	ضیاء ساجد	200/-
منتخب مشہور سفرنامے	ضیاء ساجد	250/-
منتخب مشہور افسانے	ضیاء ساجد	150/-
منتخب طبی افسانے	ضیاء ساجد	125/-
مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2		

شکل نہیں تھا۔

"میں پتہ جانوں گا" میں نے وعدہ کیا اور رہیور رکھ دیا۔ ہماری قلم میں ستارہ ایک جاگروار کی بیٹی تھی۔ ایک چمک اور مردار قسم کی لڑکی جو زیادہ تر مردانہ لباس پہنتی تھی اور عمر کے زیادہ تر مشاغل خالصتاً مردانہ قسم کے تھے۔ وہ باقاعدہ شکار بھی جاتی تھی۔ مصنف سلیم سید نے بڑی خوبصورتی سے اس کردار تخلیق کیا تھا۔ تحریر کے طور پر اس کردار میں قدرے متنازعہ چیز کی جھلک نظر آتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ جب ستارہ میرا پیشہ ورانہ صلاحیتیں اس کو نکھاریں گی تو یہ بڑا غصہ زمانے میں چشمِ قصور سے اس کردار کی مقبولیت دیکھ سکتا تھا۔

ستارہ سے گزشتہ رات بھی اس کے گھر میری ملاقات ہوا تھی اور ہم نے دو رنگ قلموں ہی کے بارے میں باتیں کی تھیں جب میں آتے لگا تو اس نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کل اس کی جو شرنگ ہونے والی تھی میں اس پر ضرور پہنچوں اور اب اتفاق نے بھی امرار کیا تھا تو میرا جانے کا ارادہ ہی میں گیا ورنہ مجھے معلوم تھا کہ شرنگ دیکھنا بڑی ہونت کا کام ہے۔ یہ انقلابات تھے زمانے کے۔ کہ سوچ میں ایسی تبدیلیاں آنی لگی تھیں ورنہ ایک دو لڑکھن کا دور بھی تھا جب شرنگ دیکھنے کے مارے جاتے تھے۔

دوسرے روز میں ملک کے باغ پہنچا تو دروازے پر ہی پوٹ کا ایک آدمی میرے اشتہار میں کھڑا تھا۔ میں تو نہیں جانتا تھا کہ پوٹ کا آدمی ہے لیکن اس نے ہاتھ ہلا کر بڑی دھڑلے سے کہا کہ تعارف کرانے کے بعد خانا لے لیجئے میں ہوں "سر! اتفاق صاف نے مجھے یہاں کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا کہ جب آپ قشرباغ آئے تو آپ کو ساتھ لے کر لوکیشن پہنچیں گے۔ آپ کو دھمکا دیا جگناتھ نہ پڑے۔"

میں نے اسے ساتھ بنالیا۔ باغ میں ایک خاصی چمک چمکاتی موجود تھی وہ دل کشاں کی ہوتی نہ جانے کہاں تک جا رہی تھی۔ اس شخص کی رہنمائی میں میں لوکیشن تک پہنچا جہاں

شیددل بناتے جاؤ گے۔ اداکاروں کو ایک دوسرے کی ڈش کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا پڑا ہو گا؟"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں اتفاق طویل سانس لے کر بولا۔ "میں کام لے سب سے مشکل لگتا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ کسی اداکار سے ملتی ہوئی ایک بھی ڈش ضائع نہ ہو اس لئے میں ترتیب کی پروا کئے بغیر شرنگ کرتا چلا جاتا ہوں۔ ترتیب کی پروا تو شاید ہی کوئی ڈائریکٹر کرنا ہو لیکن میں تو بعض اوقات بالکل اتنا بھی چل پڑتا ہوں۔ کسی سین کے آخری شائے پہ پکچر انٹر کر لیتا ہوں اور شروع کے شائے بند میں۔"

"اس سے اداکاری کا معیار متاثر نہیں ہوتا؟" میں نے

پوچھا۔

"میں تو ایک ہدایت کار کی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے سر" اتفاق ہنس کر بولا "کہ اداکاروں کو خواہ کتنی نیکی سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن وہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے لے۔ کیونکہ اس کے سامنے تو پوری قلم اپنی ساری جزئیات سمیت شطرنج کی سیما کی طرح کھیل ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کس سرے سے کیا کام لیتا ہے۔"

"شرنگ ہے کہاں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"ملک صاحب کے باغ میں۔ اس قسم کی زیادہ تر آؤٹ ڈور شو ٹنگز وہیں ہوتی ہیں۔ اور وہ جو آپ نے اکثر پنجابی قلموں میں ایک محراب دار سا چھوٹا سا پل دیکھا ہو گا جس پر کھڑی ہو کر عینا ہیر دکن ہیر کے فراق میں درد بھرے گیت گاتی ہے وہ پل بھی وہیں ہے" اتفاق نے بتایا "لیکن یہ مت سمجھو گا کہ میں بھی گلیڈ کہ فیئرین کر انی جگہوں پر شرنگ کروں گا۔ باغ بہت طویل و عریض ہے اور اس میں ہمارے مطلب کی نہایت ہی خوبصورت لوکیشن موجود ہیں۔ اس کے علاوہ جو جگہ وہاں شرنگ کے لئے کسی سوسائٹس بھی میسر رہتی ہیں اس لئے میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔"

دفعہ میں نے چونکتے ہوئے کہا "کیا بتایا خاتم نے؟ ملک کا باغ؟" اسی ملک کا جو انجانے میں آگ سے کھیل رہا ہے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ یہ ایک اور ملک صاحب ہیں۔ یہ تو بڑے شریف آدمی ہیں" اتفاق ہنس کر بولا۔

"اچھا" میں نے گہری سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے پوچھا "میں کل کس وقت اور کہاں پہنچوں؟"

"آپ باغ ہی میں پہنچ جائیے کیونکہ اسٹوڈیو سے ہمارے پوٹ کے روانہ ہونے اور پھر وہاں شرنگ شروع ہونے میں کافی وقت ضائع ہو گا۔ ظاہر ہے آپ اتفاق ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے آپ میں وقت پر ہی آجائیے گا" اتفاق بولا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے باغ کی لوکیشن سمجھا دو" میں نے کہا۔

اتفاق نے مجھے لوکیشن سمجھائی تو اندازہ ہوا کہ وہاں پہنچنا کچھ زیادہ

کرے کی توجہ فوراً ریشہ قطعی ہو جائے گا، مرغ بھل کی طرح وہیں لوٹنے لگے گا۔

اب نالایاں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب سمجھا اور لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”ارے بیٹھ صاحب! آپ نے اسے نہیں پہچانا؟ اپنی سی بچی ہے۔“ وہ اس طرح بات کر رہی تھی جیسے خود میری بڑی پرانی شاسا ہے اور سفارش کے لئے کسی کو ساتھ لے کر آئی ہے۔

”آپ بچی کی بات کر رہی ہیں۔ میں نے تو ابھی آپ کو بھی نہیں پہچانا“ میں نے خشک لمحے میں کہا ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس نہیں سالہ بچی کا تعارف کرادیں۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ میں سینہ صاحب کو کھانا پسند نہیں کرتا۔ یہ لقب مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

اب بڑی لی بھی کچھ کھیا نی سی ہوئیں لیکن اپنی خوشامدانہ خوش خلقی پر تڑا رہ کر کہنے کی جتنی الامکان کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ ”سینہ... میرا مطلب ہے سر... یہ بتی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اندر ہی اندر وہ کچھ خردس سی ہو گئی تھی... شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح آگے بڑھائے۔ پوتے کے ازاد ہوتے سے کچھ قائل رہتے لیکن اب ان کی نظریں بھی ہماری ہی طرف تھیں۔ سب سے زیادہ غور سے شرارت ناچ رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ میری حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی یا ان ماں بیٹی کی کیفیت سے۔

بڑی لی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں ”میری بیٹی ہے یہ... شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو۔“ قلم جوانی دیوانی میں اس کا بڑا اچھا کلب و انس تھا مگر... اگر سنہرا والے اس کا بڑا غرق نہ کرتے تو صرف اس ایک و انس کی وجہ سے پورے ملک میں سنی کے نام کا زکا کج رہا ہوتا۔ بڑی لی کی آواز میں افسردگی سی جھلک آئی ”بہر حال... جو کچھ بچا تھا اس نے بھی خاصی دھوم مچائی تھی تھی... لیکن انڈسٹری میں میری بچی کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں۔ پرانی و انسز اور وہ بیرونی جن کا زیادہ دامن دار و انس رہی ہے انہوں نے سنی کے پاؤں نہیں ہٹنے دئے اور یہ دوبارہ کسی قلم میں گامٹ نہیں ہوئی۔ میں آپ سے بس اسی سلسلے میں ملنا چاہتی تھی کہ آپ اسے ایک بار آزما کر تو دیکھیں... چائیں تو اسے گرد دیکھیں۔ روپے پیسے کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ بس بچی کو شوق ہے۔ میں اس سلسلے میں کئی بار آپ کے وائیکٹر صاحب سے ملی ٹکر وہ بیش مال دیتے ہیں۔ ویسے تو بہت اچھے ہیں یہ بے چارے آپ کے اتفاق صاحب۔ لیکن اتنا میں ضرور کہوں گی کہ پروڈکشن میں ذاتی پسند پائند کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ مارکیٹ ویلو اور کام کو زیادہ نہیں دیکھتے۔ میں نے ان سے کئی بار کہا کہ اچھا نہیں سینہ... میرا مطلب ہے صاحب نی سے نی

پنچس افراد موجود تھے۔ ایک طرف دو کاریں اور ایک دین مونی تھی۔ اتفاق علی ہی کیپ پٹے انگیرے کے پاس کھڑا کمرہ میں سے اٹھ کر رہا تھا۔ ملنے کے اعتبار سے وہ اس وقت وائیکٹر کے دروازے پر تھیں۔

ہیزے کے اس طویل و عریض قلعے پر لوگوں کے درمیان ٹھوکی کی ایک بے ہنگم کڑی پر ایک اداس بے نیازی کے ساتھ ٹانگہ ٹانگہ پر ٹانگہ رکھے بیٹھی تھی۔ وہ شکاریوں والے لباس میں تھی لیکن یہ لباس صرف تراش خراش کے اعتبار سے شکاریوں والا تھا۔ رنگ اس کا سرخ تھا۔ سرخ سامن کا ایسا لباس پہن کر اگر کوئی شکاری حقیقتاً جنگل کی راہ لیتا اور اس کا سامنا کسی تیل سے ہو جائے تو وہ آہستہ آہستہ مرنے کی عملی تفسیر بن جاتا۔

ستارہ کے چہرے پر اس وقت ہیوی میک اپ تھا۔ یہ سب ظلم کی ضرورت تھی۔ اس کے سر پر بڑی خوبصورت کیپ تھی لیکن اس کی لمبی و لمبی زلفیں اس ٹوپی کے نیچے سمٹی ہوئی نہیں تھیں بلکہ پشت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ لالک بونٹ پٹے ہوئے تھے۔ کیٹی کوئی اس کے اوپر گرو مونڈا نے اسے انداز میں کھڑے تھے اور اس کے قریب ہی گھاس کے فرش پر ایک نو عمر لڑکا اس کا میک اپ مکمل لے بیٹھا تھا۔

ایک طرف ہیزے کی بازو کے قریب مجھے ایک مونی سی لورت بیٹھی نظر آئی جس نے بے تحاشہ سرمئی اور ناخود آہوا ہوا تھا۔ وہ خاصا زرق برق اور قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی مگر بے ہنگم نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ سٹائی سی ایک لڑکی بھی دوپٹے تو عامے بلیک کا میک اپ کئے ہوئے تھی اور ویلٹ کی پتلون پہنے ہوئے تھی مگر پھر بھی اس کے خدو خال سے سمجھ کر ان میں سا جھلک باخا۔ شاید وہ ماں بیٹی تھیں۔ دونوں ہی پر اشتیاق سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں ان کے قریب سے گزر کر اس طرف جانے کا جدھر کرکھو میں کھڑا تھا کہ لڑکی نے اٹھ کر بڑی لوات میرا راستہ روک لیا۔ اس کی ساتھی عورت بھی قریب آگئی۔ لڑکی اتنی دھیمی آواز میں بولی کہ وہ سرت لوگ نہ سن سکیں ”ہم آپ سے ملنے کے اشتیاق میں مارے جارہے ہیں اور آپ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے۔“

اس کے لباس سے ایک عام سے کلون کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ میں نے کمری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ سرپا دولت تھی اور گستاخا کہ اسے اور گرد موجود لوگوں کی چند زیادہ پڑا تھا۔

”کیا کام ہے؟“ میں نے سرد لمحے میں پوچھا۔

میرے سبب کی سرد مہر کی محسوس کرتے ہوئے شاید اسے تھکاوڑ دار دھم کا کا۔ ناخود آہوا کی سوچ کر آئی تھی کہ اس لباس میں اس کے لیے میں اور اس طرح اٹھلا کر وہ کسی مرد سے بات

پتھر کر مڑ کر دیکھا۔ وہ ماں بیٹی ایک اچھی اور تقریباً بی گنا بیوی تھی۔

میں کمرے کے قریب پہنچا تو ستارہ نے مخموری آنکھوں ایک لڑکے کے ساتھ میری طرف دیکھا اور شرعاً لہجے میں بولی کہ جب بارے ہو جی کے کمرے؟

”جب ستارا حکم ہو۔ کو تو ابھی چلا جاؤں؟“ میں سادگی سے کہا۔

”ہاں۔ دل تو کی جا رہا ہوگا“ اس کی محترمہ بھی ابھی بے شک۔ بلکہ دل تو کی جا رہا تھا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر چلا جاؤں“ میں نے بیٹھنے کی کما۔

تب وہ حقیقتیں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”جج جج جج...“ سے ملاقات طے نہیں ہوئی؟“ میں یہ محسوس کر کے حیران کہ اس کے لہجے کی یہ میں روایت کی خفیف سی کات تھی۔

اس سے کوئی عہدہ پیا نہیں تھا اس کی عیادت میں چھ تھیں لیکن میں نے کبھی نہ نہیں دیکھی تھی کہ میرے علاوہ وہ نکاحات کس کس پر ہے؟ اس کے شب و روز کس پر اے ہیں۔ وہ بہت پہلے کی بات تھی جب اس کی محبت اور قربت میری کل کائنات تھی اور جب یہ ایک اس کی خود غرضی برائی بن کر سامنا کرنا پڑا تھا تو دل پر قیامت گزر گئی تھی

لاہور کی باتیں تھیں جب سہوچ میں اچھوتے بن کی توجہ اور ذرا ذرا سی بات پر دو تھیں دو تھیں میں سننے اور جاننے اس وقت عشق میں شکست کے مدد سے نے مجھے اندر سے پھونک کر رکھ دیا تھا، سننے میں بہت وقت لگا تھا۔ محراب و اور میری ذات پر جانے کیا کیا اختلاطات گزر گئے تھے۔ یہ

پاس اس کے لمحوں کا کوئی حساب نہیں تھا اور نہ ہی میں اسے زندگی کا کوئی حساب رہا چاہتا تھا۔ اور اس بات سے دور واقف تھی۔ تو پھر یہ روایت کیسی؟

میں اب کبھی اگر خود کو تھا محسوس کرتا تھا تو اس کے جا تا تھا یا اس کا دل زمانے سے ہزار ہوا تھا تو وہ مجھے فون تھی۔ ان ملاقاتوں کی کوئی حدود و حدود نہیں تھیں۔ ہونگا کہتی تھیں۔ ہم اب جس دنیا کے پاس تھے وہاں وہ دب بانجہ قدس کے تھے۔ وہ اچھوتے بن کی کمائیاں ہوتی چکا۔ کی تھیں۔ اور وہیں پہلے ہماری تو ملاقاتوں کا آغاز ہی ہمارے لئے کچھ ایسا قابل رشک نہیں تھا۔ اب تو ہماری راہیں

جد اچھیں۔ بس دور تھی ہماری زندگی کے داہمیں سے خوشیوں چاند لہجے کے لئے ہم مل جیتے تھے۔ ایک بگڑا ہوا تھی جس تھا محراب خیال ہے اس تعلق خاطر میں بھی روایت صحیح تھی تو نہیں تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ کچھ چوکا جیسے میں نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا ہو۔ فوراً اس نے

لوہاں لیکن انہوں نے یہی جواب دیا کہ صاحب کے پاس لوگوں سے ملنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ آج تو بی بی اسحاق سے بی بیس چاہیے گا کہ آپ بذات خود شوٹنگ پر تشریف لارہے ہیں۔ تو ہم نے سوچا۔ چلو آج دیں چل کر قسمت آزمائی کر لیتے ہیں... اور آخر آج آپ کے نیاز حاصل ہوئی گئے۔“

میں نے اب صحیح طور پر اس لڑکی کا سراپا جانزہ لیا جسے اس کی ماں ابھی کہہ رہی تھی۔ وہ ایک سرورق لڑکی تھی۔ رعیت بے شک سامانی تھی لیکن میں نقش برے نہیں تھے بلکہ اسکرین کے لئے تو خاصے موزوں تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اسکرین پر اس کا چہرہ اچھا خاصا پشیش معلوم ہو سکتا تھا۔ اس کے خاصہ خود حال جانتے تھے کہ رقص کے میدان میں بھی اس نے خاص جان ماری ہوئی تھی۔ اس بات کا خاصا امکان نظر آتا تھا کہ وہ اسکرین پر دھوم مچا سکتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اتفاق اس سے رکھائی برت رہا تھا۔ تاہم میں اس ضمن میں اتفاق سے یہ گمان ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اتفاق سر حال اپنے کام سے مخلص تھا۔ وہ اگر ذاتی پسند ناپسند کو ترجیح دیتا تھا تو اس میں بھی سر حال کام کی ہنسی اس کے پیش نظر ہوتی تھی۔ ذاتی پسند کا خیال رکھتے ہوئے وہ کام کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔

اپنی امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اپنے خاصہ سے ہیں کے باوجود وہ سر حال تھوڑی بہت عزت و ہمدردی کی مستحق تو تھی۔ اس کا انداز اور اس کا میدان عمل دو سرے کے لئے ناپسندیدہ تھی لیکن خود خود وہ سر حال وہ بھی کر رہی تھی۔ اس کا رخاں جہاں میں اپنا خون تو وہ بھی جاری تھی۔

ابن بار میرے لہجے میں خود بخود نرمی آگئی ”اتفاق کے پاس آپ کا ایڈریس وغیرہ تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی۔ ان کے پاس ایڈریس فون نمبر سب کچھ ہے۔ کچھ گ میں کو فنی ہے جی اپنی۔ آپ کبھی تشریف لائیں نا؟“ اپنی بی بی خاطر اہمیت کرنے والی لگی ہے ”بی بی نے دوش و خروش سے کہا اور آخری الفاظ ادا کرتے وقت غیر ارادی طور پر ان کی ایک آنکھ معنی خیز انداز میں ابھری لیکن پھر غالباً انہیں یاد آیا کہ اچھی وہ میرے مزاج کے بارے میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتی ہیں اس لئے فوراً سنبھل کر تنبیہ کی ہے ”تو پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے؟“

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

”حکم کیا؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”اب اسٹیشن سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں اپنی کام ڈکن میں دھون گا اور پتے بی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا“ میں نے ماتحت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طعنے تھا اور نہ ہی میرا انداز رخاں والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے فون کے افراد کے قریب

اس بار بولی تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اداکارہ تھی۔

"میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ ماں بیٹی بڑی خوش خوش تھیں ہیں۔ وہ رقایت سے عاری لیجئے میں بولی "حالا نگہ بات کرتے وقت تمہارا چہرہ تو خاصا پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا جبکہ کسی اور سے جتنی اس طرح اٹھلا کر بات کرتی تو اس کی آنکھوں میں ہزار ہزار دانت کے بلب روشن ہوجاتے۔"

"وہ خوش خوش اس لئے تھی کہ میں نے آخر میں ان سے ذرا احرام اور شائستگی سے بات کر لی تھی "میں نے کہا "اور جہاں تک آنکھوں میں قہقہے روشن ہونے کا سوال ہے تو اب میری آنکھوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر قہقہے روشن نہیں ہوتے۔ اتفاق میرے قریب ہی خاموشی کھڑا تھا۔ میں نے سرسری سے لیجئے میں اس سے کہا "یہ لڑکی جتنی کیا قلموں میں بالکل نہیں چلی سکتی؟"

ایک لمبے کے تذبذب کے بعد وہ وہی توازیں بولا "چل تو سکتی ہے۔ بلکہ اچھا خاصا حملکہ چا سکتی ہے۔ اس سے کہیں کمزور اور وہی لڑکیوں نے لہلہ چائی بولی ہے۔ یہ تو پھر بھی رقص کے میدان میں حیثیت داخل رہ سکتی ہے۔ محض اچھا لکھو دیکھ کر نہیں آتی لیکن بات صرف اتنی ہے کہ میں اس لڑکی سے ذرا ہوں۔"

"ذرا ہوں...؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں" وہ بدستور تذبذب سے لیجئے میں بولا "آپ کو یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہو گا کہ موصوفہ نوح تک صرف ایک ہی قلم میں آتی ہیں اور اس میں بھی ان کا کام صرف ایک کھب والٹس تک محدود تھا لیکن آپ نے دیکھا ہو گا کہ محترمہ کسی شاندار گاڑی میں آئی تھیں۔ اس کے علاوہ شاید انہوں نے آپ سے اپنی کوٹھی وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ محترمہ کبیر گ کی ایک خاصی شاندار اور ترانہ دہراندہ کوٹھی میں رہتی ہیں۔ نوکر چاکر بھی ہیں۔ صرف ایک قلم میں معمولی سا کام اور یہ شہادت بات ابیری کچھ میں نہیں آتا۔"

"تکلف برطرف اتفاق" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا "مجھے تو تمہارے منہ سے یہ باتیں نہایت ہچکچاتہ لگ رہی ہیں۔ قلم اندہ سڑی میں تم اچھے خاصے پڑائے آتی ہو۔ تمہارے لئے یہ باتیں حیرت کا باعث نہیں ہوتی چاہئیں۔ جہیں تو ان عورتوں کے سلسلے معلوم ہی ہوں گے۔ پھر حیرت کی کیا بات ہے؟"

"میں دہی بنانے لگا تھا" وہ دانا منہ سے بولا "سلسلے تو ہمیں معلوم ہی ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ تمہا سر سلسلوں کے باوجود جتنی جہتیں عورت کے اتنے فحاش بات نہیں ہو سکتے۔ وہ کوئی ایسی غیر معمولی عورت نہیں ہے کہ اسی پر بہت زیادہ دوانتہ لوگ صبران ہو سکیں۔"

میں نے ایک بار پھر اتفاق کی بات کائی "میں نے آپ بھی ستر اور لم در عورتوں پر بڑے بڑے سینھوں کو مہیا کیا "میں اس امکان کو بھی تسلیم کرنے لگا تھا لیکن ساتھ ساتھ میں آپ کو کچھ اور بھی بتانے لگا تھا "اتفاق" اور وہ یہ کہ ایک زمانے میں بڑے عرصے تک سی آئی ڈی کے پیچھے لگی رہی۔ اس زمانے میں وہ ایک جتدول پر دھماکے ہوئے تھے۔ بڑی اہم نوعیت کی عمارتوں میں۔ نقصان ہوا تھا۔ سرکاری ایجنسیوں کو شبہ تھا کہ یہ لڑکی دھماکوں میں ملوث تھی۔ اسے شاید تفتیش میں خاصا لگن سنا ہے کہ صوبے کی ایک نہایت با اثر شخصیت نے بچایا تھا۔ اس کے بعد یہ کچھ عرصے تک بالکل غائب ہو گئے۔ پھر پتا نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ پھر اچانک دوبارہ نمودار قلموں میں کام حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا روپے پیسے کی بھی اسے کوئی پروا نہیں بلکہ انا کنکور فلساذوں کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ کچھ عرصہ نے مجھے پیش کش کی تھی کہ اگر میں اسے اپنی قلم میں شامل کر دوں تو وہ معاوضہ لینے کے بجائے تجھے ہزاروں دے سکتی ہے۔ اس وقت میرے جو حالات تھے ان میں یہ بڑے عرصے لئے بہت دل کش تھی لیکن میرے ضمیر نے گواہ دیا۔ شاید میں اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوئے ہوں۔ شاید میں اتنا ضمیر ہوں نہیں جتنا خود کو سمجھتا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر تعجب سے انداز میں مسکرایا "میں تو تک اس لڑکی کی جدوجہد کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ اگر لڑکیاں اگر قلموں میں آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی ہیں؟ کا مقصد مارکیت ویلو بنانا ہی ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں؟ گھبراندہ انداز میں دولت مندوں کی نظریں آجائیں کیوں کہ شکل و صورت کی بھی کوئی لڑکی اگر امریکین کے ذریعے نظریں آئے تو اس کی شخصیت کا تاثر ہی کچھ اور ہوگا اس کی تندر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس لڑکی کا منہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے پاؤں تو پہلے ہی بہت مہیا روپے پیسے کی اس کے پاس کوئی کمی معلوم نہیں ہوتی۔ باوجود یہ چھوٹے چھوٹے کروادوں کے لئے دھکے کھائے ڈائریکٹر اور پڑا سر اس سے کھڑاتے ہیں۔ یہ درست ہے؟ ٹیڈ میں سارے کے سارے کوئی شریف زادے اور نیک نہیں ہیں لیکن بہر حال جن میں کوئی بد معاشی یا بے راہی بھی ہے تو وہ خاصی بے ضرر اور ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ طور پر وہ زیادہ خطرناک یا ملک و قوم کے بد خواہ نہیں ہوتے اس لڑکی سے مجھے خوف آتا ہے۔ میں تو اس سے رگ بھی اخلاق سے پیش نہیں آتا۔ اب شاید آپ میرا منہ منے ہوں گے۔"

"ہاں۔ میں سمجھ گیا" میں نے اس لڑکی کا نام اور شکل و صورت
 کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہم نے تو اس لڑکی کے
 نام نہیں کرتے میں کچھ زیادہ ہی دقت متاع کر دیا" میں نے
 نام لکھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس لڑکی کے بارے میں
 کچھ سوچ رہا تھا "شکر ہے تمہیں وقت کا خیال تو آیا" ستارہ
 نے ہلکے علاؤشی بھٹی بھٹی تھکی تھکی سانس لے کر بولی "اور
 صرف تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی وقت ہے۔ تمہاری اور اتفاق
 طم نے ہوئی تو میں کب کی پابندی ہوئی۔ آدھے گھنٹے سے بھٹی
 لے شرع ہوئے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اوپر سے تم آئے ہو تو
 ی اس پر اصرار حسینہ میں الجھ کر رہ گئے" اس کے لیے میں
 انتہائی نہیں تھی۔

"سید تو خیر وہ نہیں تھی" میں نے مسکراتے ہوئے اس کا
 ہاتھ لایا "میں تو آج تم لگ رہی ہو۔ سر آپا شعل دکھائی
 رہی ہو۔"

"اس قسم کے بدلے مجھے تقریباً ہر سٹ پر ہی سننے کو ملتے ہیں
 تم کہہ رہے ہو تو واقعی میرے لئے اعزاز ہے" وہ مسکراتی
 ہیں اس کی مسکراہٹ۔ کچھ کر حیران رہ گیا۔ اس مسکراہٹ
 فوج اور نہایت سادہ لوح لڑکیوں والا شرمیلا پن تھا۔ سبک
 دل نہیں میں اس کی اصل رنگت تقریباً چھپی ہوئی تھی پھر بھی
 بیان لگائیے اس کے رخساروں پر حیا کی شعل لہرائی ہوئی۔ ایک
 نئے کے لئے تو میں بخود رہ گیا۔ کیا اس میں گھماں تھا
 اور سرور گرم پیشہ عورت یوں بھی مسکرا سکتی ہے؟ میرا دل
 رہا تھا کہ یہ اداکاری بھی نہیں تھی۔ کوئی بڑی سے بڑی
 تھریگی یہ اداکاری کری نہیں سکتی تھی۔ اداکاری الگ سے
 لی جاتی ہے۔ بات شاید صرف یہ تھی کہ عورت خواہ کتنے ہی
 بات سے گھر لے گئے۔ کتنے ہی طرفداروں کے عجیبے سے لے
 تے زمانہ سے اس کی شکل تھی ہی بدل جائے لیکن وہ تو اس
 اندر ایک سادہ و معصوم اور نہانے کے بیچ و خم سے نا آشنا
 بدلتی ہوئی ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی جھلک دکھاتی ہے۔
 ناشاید خصوص حالات میں۔ اور خصوص انسان کے ساتھ
 مجھ پر تک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ ستارہ کہ
 "میں وقت کی بہت پابندیوں اور سب لوگ میری اس
 شکیات تہریف کرتے ہیں لیکن کبھی بھی اپنی اس عبادت کی
 سے کٹتے بہت گھٹ اٹھانی پڑتی ہے۔"

"اگر شوٹک صرف میرے انتظار میں رہی ہوئی تھی تو میں تو
 اب اس سے اتفاق کی طرف مڑتے ہوئے تھا۔

"اب ہمیں ایک اور شخصیت کا انتظار ہے جو اس وقت
 سے لے کر آپ سے بھی زیادہ اہم ہیں جی ہے" اتفاق بولا۔
 "کون ہے وہ خوش نصیب جس کے انتظار میں ایسے ایسے ماہ
 ایسے ہیں؟" میں نے ستارہ کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ ایک سائیں ہے" اتفاق بولا "سائیں سمجھتے ہیں آپ؟
 وہ تو گھوڑے پالتے ہیں ان کی گھمڈاشت کرتے ہیں یا اسٹبل
 کے ٹکران وغیرہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ہمیں ایک سائیں
 کا انتظار ہے جو صرف ایک ہر گھوڑے کا مالک ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ایک اسٹنٹ بول اٹھا "دیو
 آپا سر" وہ ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔
 شلوار ٹیچس میں لباس ایک نیم سائیں سا شخص نہایت خوبصورت
 اور بگے جیسے سفید گھوڑے پر سوار نہایت تیز رفتاری سے چلا
 آ رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل سوار اس کے آگے آگے تھا۔ گھوڑا
 کچھ سرکش سے انداز میں دوڑ رہا تھا اور بار بار ہنستا رہا تھا۔ گھر
 سوار دیو یقیناً وہی سائیں تھا جس کا یہاں بے چینی سے انتظار
 ہو رہا تھا۔

"بڑے ٹھٹھ ہیں بھی دیو کے" میں نے نوٹشیل سے کہا۔
 "اس کے آگے آگے تو ایک پالکت بھی چلا ہے۔ جس طرف بڑے
 لوگوں کی سواری کے آگے چلتا ہے۔ کیا یہ موٹر سائیکل سوار اس
 کا ملازم ہے؟"

"نہیں سر! وہ ہمارا ملازم ہے" اتفاق مسکرایا "اسٹنٹ
 پروڈکشن منیجر ہے۔ اسے میں نے سمجھا تھا کہ ہائر دیو کو ملائے
 کیونکہ دیو نے خلاف معمول فن وقت دے کر لوکیشن پر پہنچے
 میں بہت تاخیر کر دی تھی ورنہ اس کا ریکارڈنگ کہ جہاں بھی ایسے
 طلب کیا جاتا ہے یہ بالکل صحیح وقت پر اپنے گھوڑے کو لے کر پہنچ
 جاتا ہے۔"

اس دوران موٹر سائیکل سوار اور دیو دونوں ہی اس طویل
 و عریض سڑک زار پر پہنچ چکے تھے جہاں ہمارا علمی یونٹ موجود تھا۔
 دیو کو گھوڑے کو روکنے اور ایک درخت سے باندھنے میں قدرت
 دشواری پیش آئی۔ پھر وہ اگر گھر کا میرے اور اتفاق کے قدموں
 میں تقریباً اونٹنے لگا۔

"معافی چاہتا ہوں سرکار کہ آپ کو مجھے بلانے کے لئے ہندہ
 بھیجا پڑا" وہ نہایت عاجزانہ لہجے میں بولا "آپ کو تو معلوم ہے"
 میں دھڑکے کا پورا پابند ہوں لیکن آج میری گھر والی کی طبیعت کچھ
 ٹھیک نہیں تھی۔ میں اس کے لئے دوا دار دولا نے میں الجھ گیا تھا"
 پھر وہ گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "بکلی نے بھی
 تھوڑا سا ناگم شائع کیا۔ اسے بھی تھوڑا بہت سمجھا اور پکارا
 بڑا۔ لگا تھا کہ آج اس کا شوٹک کا سوز ہی نہیں ہے" بکلی اس
 کے گھوڑے کا نام تھا اور وہ اس کا ذکر بالکل اسی طرح کر رہا تھا
 جیسے وہ کوئی ذی فہم انسان ہے۔

"کوئی بات نہیں" اتفاق ملاحت سے بولا "اب کیسی
 طبیعت ہے تمہاری بھئی کی؟"

اس نے گویا ناگنکی میں دیو کی کوئی دھکتی رنگ چھینڈ دی۔
 وہ یکدم ٹھانی اردو سے خالص پنجابی پر آگیا اور قدرے بے زاری

چاک سے اس پر گھٹے چلے جاتے ہیں۔

فی الحال ستارہ کو گھوڑے پر سوار ہو کر گھاس کے مرکز طویل و عریض نقشے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک تھا۔ پس منظر میں کچھ درخت بھی تھے جن سے جنگل کا نظارہ تھا۔ گیمرو وغیرہ سیٹ ہو چکا تو یہ سین بٹیرے سرکل کے شمال کو گھوڑے پر سوار ہوتا مرحل ستارہ کو آتا تھا اور وہ بیٹی لوار سوار ہوئی۔ اس عمل کو اس نے چند ایسا یاد کیا کہ میرے انداز کے مطابق سینٹ پر موجود لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں لگی تھیں۔ اتنی تھیں اور ان لوگوں میں ظاہر ہے میں بھی شامل تھا۔ گھوڑا بدستور بندھنا رہا تھا۔ زمین پر بے چینی سے گھر گھرا۔ گیمرو اشارت کی آواز سن کر جیسے ہی ستارہ نے کام کیا جھنکا دیا، گھوڑا مطلوب رفتار سے چلنے کے بجائے تپ سے بڑھنے لگا۔ گولے کی طرح دوڑ پڑا۔ گیمرو میں نے جو فریم دیکھا رکھے تھے، اتفاق کے زہن میں جو زائے تھے اور ستارہ کی نگاہ انداز نے ابھی لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے کا جو ملا کر تھا وہ سب کچھ حرا کا دھرا کر گیا۔

سب لوگ چکا بکا کھڑے ہوئے۔ گھوڑا ہوا ہو گیا۔ باجمعتے میں اس نے گھاس کا وہ طویل و عریض قطع عبور کر لیا۔ بیٹیکنی حساب سے اس نے نہ جانے کتنے مرحلوں میں عبور کر لیا ہوا کہ روش پر ستارہ کی پیچ میری سماعت سے نکل آئی۔ سب نے بے وقوفی کی طرح کھڑے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں تھا کیا کیا جائے۔

مجھے چونکہ گھوڑے کی حالت پہلے ہی کچھ قلعی بخش تھی لگ رہی تھی اس لئے میں اندر ہی اندر مضطرب تھا لیکن اظہار کر میں نے اپنے اضطراب اور عدم اطمینان کا اظہار ہوتا نہیں کیا تھا۔ میں اتفاق وغیرہ کی وجہ سے بظاہر مطمئن رہا تھا کہ ٹیڈ کے لوگ ہیں انہیں اپنے معاملات کا مجھ سے زیادہ علم ہے کہیں میں خواہ مخواہ کے خدشات کا اظہار کر کے ان کا وقت ضائع نہ کروں۔

میں گھوڑے کی پہلی رفتار دیکھتے ہی اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا لیکن حقیقت یہ تھی کہ فوری طور پر میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ گھوڑا سب سے زیادہ عبور کر کے اس کی لیکن کشیدہ راستے پر چلا گیا کہ چکا تھا جو باغ کے درمیان اور اوپر چل گیا تاہم ابلاغ کے گیت کی طرف بار بار تھا۔

میری کا ذی بھی سامنے اسی راستے پر گھڑی تھی۔ میں لانا تیزی سے گاڑی تک پہنچا اور پچھم زون میں اسے اشارت کی گھوڑے کے مقابل میں روانہ ہوئی۔ کا ذی کسی غصہ کی طرح کی سی فراہم کے ساتھ آگے بڑھی۔ گھوڑا ویسے ہی برقی رفتار معلوم ہوتا تھا اور اس وقت تو اس کی رفتار میں ایک تیز رفتاری اور دھندلہ سی تیزی آچکی تھی۔ وہ اس وقت خاصی دور

سے ہوا "صاحب جی! تمناؤں سے پتا ہے کہ غریباں دی زبانیاں دنی ہمیشہ ای کوئی نہ کوئی چل رہی رہندی ہے۔"

"کل کے تری ٹھیک اسی ہے" اتفاق پس کر ہوا۔

"خیر جی... چنچروا... سنس گھلاں... تیر شرنک نیزو۔ میں ذرا سیر کے سونا لاناں والں " وہ ایک طرف باہینچا اور سگریٹ سلاگنے لگا۔ اتفاق اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ سین کی تیاری کرنے لگا۔ اسگریٹ کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھے جانے لگے۔ گیمرو میں کھڑے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک گھوڑے کے آہانے سے گویا پورے پونٹ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں ستارہ کے قریب ہی ایک فوٹو تک چپڑے بیٹھا تھا۔ جہاں تک میں کچھ سکا تھا اس سین میں ستارہ کو خاص گھر سوار کی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جبکہ گھوڑا مجھے خاصا مضطرب اور بے چین نظر آ رہا تھا۔

"کیا یہ گھوڑا ہمیشہ اسی طرح بے چین، مضطرب اور سرکش سا نظر آتا ہے؟" میں نے ستارہ سے پوچھا۔

"مجھے تو معلوم نہیں" ستارہ مسکرا کر بولی "مجھے تو پہلی مرتبہ اس سے کام لینے کا اتفاق ہو رہا ہے۔ ویسے سنا ہے، اندر سنی میں بڑا مشہور و مقبول گھوڑا ہے۔ تقریباً سبھی نامور سیروئیں اس پر سوار کی چکی ہیں۔"

"تمہیں گھر سوار کی آتی بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے تو صرف چند ایک قریب کے شائش پکھراؤ کرانے ہیں جو بیچ بیچ میں ایڈیٹنگ کے دوران جوڑے جائیں گے۔ زیادہ تر کام ٹولاک شائش میں ہو گا جو میرے ڈپٹیکٹ پر پکھراؤ کے جائیں گے۔"

"مجھے تو یہاں سے کوئی ڈپٹیکٹ نظر نہیں آ رہا" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ اس کو غری میں کٹ اپ کرے گیا ہوا ہے" ستارہ نے کافی دور واقع ایک کھانا کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کچھ دیر پہلے میں نے چھوٹے جسم کے ایک سانولے سے نوجوان کو ایک تھملا اٹھا ہے اس کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔"

وہ تھا اس کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے سانولی ہی ایک لڑکی کو کمرے سے برآمد ہوتے دیکھا جو بالکل ستارہ جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی نہیں بلکہ اتنا تہنہ درحقیقت وہ وہی سانولا سا نوجوان تھا جو کچھ دیر پہلے تھملا اٹھا ہے کمرے میں آیا تھا۔ وہ گ اور چند دوسری چیزوں کی مدد سے وہ کافی حد تک لڑکی نظر آنے لگا تھا۔ قریب آکر وہ ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

بالآخر سین ستارہ کو سمجھایا گیا اور پھر کیمپ دی گئی۔ یہ صرف ایک تھنہ کمرے کے سامنے لانے کا عمل ہوتا ہے جس پر فلم کا نام "سین نمبر اور شائش نمبر لکھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شات بشٹنگ ٹیکس میں اوکے ہوتا ہے وہ نمبر بھی ترتیب وار

زیر ہی نظر ہے اور جمل ہو رہا تھا۔

راستہ ایسا نہیں تھا کہ میں زیادہ تیز رفتاری سے گاڑی چلا سکتا، میں اس وقت گھوڑے سے کافی پیچھے تھا جب میں نے اسے بارش میں سے نکلنے دیکھا اور جب تک میری گاڑی گیت سے نکلی، یہی گویا اور بھی آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب پتہ سڑک پر رہا تھا جس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔

مناہ اب گھوڑے پر بھی نہیں تھی بلکہ ایک طرف کو اس کی ایک ٹھکی تھی کہ اس کے دونوں بازو رکاوٹوں میں جھپٹے ہوئے تھے اور ایک ہاتھ زمین کی کسی بندش میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ گھوڑے کی گردن کے گرد پیچھے کی طرف سے زبانی کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی وہ گردن کو پھرنے میں باہر ہو جاتی تھی اور کبھی گھوڑے کی گردن اس کے بازو کے نیچے سے نکل جاتی تھی اور وہ ذرا زیادہ پیچھے کو جھولنے لگتی تھی۔ اس کے لیے زمین بالی سڑک پر گھٹنے لگے تھے۔ قیمت یہی تھا کہ یہی پوزیشن زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ اگر وہ یہی سڑک پر پہنچا یا اس طرح گھوڑے کے ساتھ گھٹن رہی ہو تو کسی سرباگ کا کوئی اور حصہ سڑک سے ٹکرا رہا ہوتا تو اس کے پیچھے کی پریم تھی۔ وہ اب چٹنا بھی بھول چکی تھی۔ یہی خاموشی سے دوسرے سے پیچھے رہنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ گویا اس نے اس کے حواس شردہ پر قرار دے کر وہ کچھ کتنی تھی کہ یہی ملاستی کے زیادہ امکانات کس چیز میں ہیں۔

گھوڑا روانہ دار بھاگ رہا تھا۔ قیمت تھا کہ وہ سیدھی لپکتی ہوئی بھاگ رہا تھا اور اس نے جنگل میں گھسنے کی کوشش کی کہ وہ میرے لئے گاڑی میں اس کا تعاقب بھی تقریباً ممکن ہو آئے اور ساتھ کہ بہت جلد گزند پہنچنے کا امکان بھی زیادہ

میں جلد ہی گاڑی گھوڑے کے قریب لے جانے میں باہر ہو گیا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر میری گاڑی اور جنگل ہو تو میں کبھی چھت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے پر جھلاٹنگ لگانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن میں اس نیند چھت کی سرینہ پر نہیں تھا۔

میں گاڑی گھوڑے سے آگے نکالنے لے گیا اور اس وقت اس کی رفتار اتنی تھی کہ اگر سامنے سے کوئی گاڑی آ جاتی تو نہ ملنے کاوش پیش آ سکتا تھا لیکن خدا کا شکر تھا کہ سڑک میں پانی تھی اور دوسری قابل اطمینان بات یہ تھی کہ اس نے گاڑی کو آگے نکلنے دیکھ کر بھی رخ تبدیل نہیں کیا بلکہ اسی طرح ٹانگ کی سیدھ میں سریت دوڑا چلا جا رہا تھا۔ گاڑی آواز بھونکنے لگی تھی۔ شاید اسے گرد پیش کا کچھ ہوش ہی رہتا۔ میرے ذہن میں اب قسمت آزمائی کی ایک ہی تھوہر رہتی تھی تیز رفتاری سے گاڑی گھوڑے سے بہت آگے لے

گیا۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے گاڑی کچے میں اتار کر روک دی۔ گرد و غبار کا ایک بادل اٹھا اور میں گاڑی کا انجن اشارت اور دورانہ کھلا چھوڑ کر اترا اور دوڑ کر ایک سوزوں درخت تک پہنچا۔ جو توں سمیت تھے پرچہ حصار شوار تھا اور جوتے اتارنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے بندر کی طرح الجھ کر ایک شاخ پکڑی اور جسم کو ڈبیرا کرتے ہوئے مزید ایک دو شاخوں پر منتقل ہونے کے بعد پلٹ کر ایک سوزوں شاخ پر جم کر بیٹھ گیا۔ یہی موقع کے مطابق گھوڑا بدستور اسی سیدھ میں دوڑا چلا آ رہا تھا اور کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ مزید تھوڑا سا قاصلہ اسی طرح طے کرنا تو میں اسی شاخ کے نیچے سے گزرتا جس پر میں ہاتھیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

گھوڑے نے رخ نہیں بدلا۔ میں نے حواس مجتمع کئے اور مناسب ترین لمحہ آتے ہی شاخ سے چھلانگ لگا دی۔ میری کامیابی کا سب سے زیادہ اہمکار مناسب ترین لمحے پر ہی تھا ورنہ ممکن تھا کہ گھوڑا مجھے دھونڈتا ہوا گزر جاتا یا میں اس کی گردن کو گرفت میں نہ لے پاتا اور اس کے جسم کے کسی اور حصے سے ٹکرا کر حصہ سڑک پر گر جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں گھوڑے کو چھو بھی نہ پاتا۔ وہ جو گولے کی طرح نیچے سے گزر جاتا اور میں سیدھا سڑک پر جا کرتا۔ فلوں میں ہیرو وغیرہ اس قسم کے کام بڑی آسانی سے سرانجام دیتے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ بڑا مشکل اور صارت طلب کام ہے۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے انسان دو برسے کی جان بچاتا تو درکنار خود بھی موت کے منہ میں جا سکتا ہے۔

مجھے عرصے سے اس قسم کی کسی سرگرمی سے واسطہ نہیں رہا تھا لیکن میرا اندازہ درست ہی رہا۔ گھوڑے کی گردن کو دائیں بازو کے پھٹے میں لیتے ہوئے میں کچھ دور اس کے ساتھ گھسنا چلا گیا۔ جو توں نے میرے پیروں کو ڈھکی ہوئے سے محفوظ رکھا۔ گھوڑا بھی ایک انداز میں ہنسٹایا اور اس نے گردن کو تھکاوے کر دوڑتے ہی دوڑتے مجھے گرانے کی کوشش کی لیکن وہ گردن کو زیادہ حرکت دینے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔

اس دوران میں اپنی قوت مجتمع کر چکا تھا۔ میں نے پاؤں سڑک پر تھکا کر گھوڑے کو روکنے کی کوشش کی۔ اگر وہ کوئی عام سنا گھوڑا ہو تو کیا کم از کم اس وقت اس پر دیوانگی طاری نہ ہوتی تو شاید میں اسے روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن دیوانگی نے اسے معمول سے کچھ زیادہ طاقتور بنا دیا تھا۔ اس کے منہ سے بھاگ اڑ رہا تھا۔

اب گھوڑے کو روکنے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔ میں نے اسی پر عمل درآمد کی کوشش کی پوری طاقت ... اسے دائیں بازو پر مرکب کرتے ہوئے میں نے ٹھیکہ مزید سخت کیا اور پھر ایک خاص انداز میں ہٹکا دیا۔ لکڑی ٹوٹنے کی سی ایک دوزدار آواز

آئی اور دوسرے ہی لمحے گھوڑے کا غیر معمولی اڑنا ہوا جسم بھلا
 پڑ گیا جیسے برقی رو متعلق ہو جانے پر یک لخت کسی مشین کھلنے
 نے کام چمڑا ہوا۔

میں نے اسے اپنی طرف ایک اور ہٹکا دیا تاکہ کہیں وہ اس
 پہلو پر نہ گر جائے بد حال ستارہ لگی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف گرنے
 لگا تو میں یکدم اسے چمڑا کر ایک طرف کوبھٹ گیا۔

وہ غیر معمولی جسمات کی کسی مردہ چھلکی کی طرح چٹ سے
 مڑک پڑ گیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے جھٹکے کھارہا تھا اور
 آنکھیں ڈراؤنے انداز میں اٹل آئی تھیں۔ گردن برقی طرح
 ایک طرف کو مڑ چکی تھی بلکہ ذیلی ڈھالے سے انداز میں تقریباً
 ڈھری ہو چلی تھی۔ اس کے منہ سے جھاک اب بھی بھر رہا تھا۔

ستارہ بدستور اس کے ساتھ انجھی ہوئی تھی اور کمزور سے
 انداز میں اپنے ہاتھ پاؤں آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن
 اس میں شاید فی الحال اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ اس
 کوشش میں کامیاب ہو سکتی۔ مجبوری طور پر یہ غاصول خراب
 کرنے والا منظر خاتمہ میں نے اطمینان کی سانس لی کہ جس بات
 کا اندیشہ تھا وہ عملی نہیں۔

میں نے ستارہ کا پاؤں رکاب سے اور ہاتھ زمین میں ابھی
 ہوئی لگام سے نکالا اور اسے سارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش
 کی لیکن اس نے مجھ سے ہاتھ چمڑا لیا اور کچے میں اتر کر لڑکھائی
 ہوئی ایک چمڑا جانیجی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر حام لیا۔
 اس کی حالت ایسی ہی تھی جیسے اسے کسی بھنوسن غرقاب ہوتے
 ہوئے جنازے آخری لمحوں میں اتار گیا ہو اور اس کے حواس
 اس کا ساتھ نہ دے رہے ہوں۔

اسی اثنا میں عقب میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں نے مز
 کر دیکھا فلم بوٹ کے افراد اپنی بیڑی میں دس بیٹھے کر آن بیٹھے
 تھے۔ سب سے پہلے اتفاق علی دین سے اتر ا اور گھڑائے ہوئے
 انداز میں قریب آکر سر ہاتا میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "آپ ٹھیک
 تو ہیں سر؟"

اس کے سوال پر میں نے خود بھی اپنا سر تپا جائزہ لیا۔
 میرے سوت کی ملائیاں کئی جگہ سے اڈھڑ چکی تھیں۔ کونٹ کی
 آئینیں تو تقریباً الگ ہی ہو چکی تھیں۔ جو تون کی ایزان نوٹ بھی
 تھیں۔ مانی کا رخ بدل چکا تھا۔ شکر ہے وہ میرے لئے چند انیس
 بنی تھی۔ شکل و صورت اور بالوں کا کیا عالم تھا "اس کا بھی میں
 کافی حد تک اندازہ کر سکتا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں" میں نے حتی الا مکان ہر سکون لمحے
 میں کہا "تب وہ ستارہ کے قریب پہنچا۔ ستارہ سے بھی اس نے وہی
 سوال کیا جو مجھ سے کر چکا تھا۔

ستارہ نے سراسخا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب کافی حد
 تک سنبھل علی تھی تاہم چہرے پر اب بھی وحشت باقی تھی۔ وہ

قد سے بدحوشی سے ہنسی اور بازو اور مخنے سلاتے ہوئے لگا
 "ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس دوران دوسرے سمت سے لوگ بھی زمین سے اتر
 تھے۔ سب میری اور ستارہ کی خیر و عافیت ہی کے بارے میں پوچھ
 رہے تھے۔ اتفاقاً ستارہ سے کہہ رہا تھا "گاڑی میں چمڑا چمڑا
 ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔"

"میں... ڈاکٹر کے پاس جانے والا کوئی مسئلہ نہیں تھا
 نے مسکراتے کی کوشش کی "میں بہت زیادہ خوفزدہ ہو چکی تھی
 کچھ بچوں میں بھڑاؤ آیا ہے۔ اس کا علاج میں خود ہی کر چکا
 ڈاکٹر سے بہتر کروں گی۔ اور کوئی مسئلہ نہیں ہے" پھر اس نے
 کمری ہانسی لے کر بھر پوری سی لپٹے ہوئی میری طرف دیکھا۔
 "اگر تم نہ آتے تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔"

"شاید وہی جو اب گھوڑے کا ہوا ہے" میں نے ہر
 گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی لمحے میری نظروں پر چمڑا
 گھوڑے کے قریب ہی کھڑا پھلی پھلی آنکھوں سے اسے دیکھ
 رہا تھا۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر
 آنکھوں کے بل بٹھا اور وحشت زدہ سے انداز میں گھوڑے کے
 مردہ جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا "جیسے اس میں زندگی کی رسی غلام
 کر رہا ہو۔

"سر... کیا یہ خودی گر کر مر گیا ہے؟" اتفاقاً نے گھوڑے
 طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
 "نہیں۔ اسے روکنے کے لئے مجھے اس کی گردن توڑنی پڑی
 میں نے دیکھے لمحے میں کہا۔

"اس کی گردن... آپ نے... میرا مطلب ہے؟" اتفاقاً
 علی کبھی گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی میری طرف۔
 عالم باقی سب کا بھی تھا۔ انیس گویا یقین نہیں آ رہا تھا کہ
 انسان اور خصوصاً مجھ جیسا سڈ بولڈ اور ایک اسٹین پینڈ
 میں نظر آنے والا انسان کسی سرکش اور برق رفتاری سے دوڑ
 ہوئے گھوڑے کی گردن توڑ سکتا ہے۔ یقین اور۔ یہ یقینی کی کیا
 کیفیت ان کے چروں سے علیوں تھی۔

ستارہ نے گویا میرے بیان پر مرتعہ بیت بیت کرتے ہوئے
 کہا "آج تو افضل صاحب نے شہری ٹارن ہونے کا شیوہ
 دیا ہے" پھر وہ قدرے جھٹکے سے انداز میں ہنس کر اتفاقاً
 مخاطب ہوئی "کاش! اتم یہ سارا منظر ٹیچر اتر کر سکتے۔ یہ سب
 تہیاری فلم کا سب سے شاندار اور حقیقی سین ہوتا۔ کیا وہ
 سے گردن توڑی ہے افضل صاحب نے گھوڑے کی۔ مجھے تو
 ان سے کچھ کچھ خوف بھی تنے لگا ہے۔ اگر کسی انسان کی گردن
 ان کے ہاتھ میں آجائے تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوگا"

وہ پھر بھی کافی مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ بسے کا
 خاتمے شین ذہنی و جسمانی دھچکے سے سنبھل گئی تھی اور اب

بارہ سالہ لڑکیوں سے دور کھڑے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن پھر جب تک گنت ہی اسے کچھ یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اسے غصہ بھی آیا۔ وہ نہ مڑ کر طرف اشارہ کرتے ہوئے نہ ہی سے بولی۔
 ”یہ سب اس روضے کے بچے کا کیا حرام ہے۔ کیا اسے احساس نہیں ہو سکا تھا کہ آج گھوڑا گریز کر رہا ہے؟ یہ تو اس پر بیڑہ کر آیا تھا۔ یہ پتہ اپنے گھوڑے کی دگ دگ سے واقف ہو گا۔ اس کی حرکات و سکنات کو اس سے زیادہ کون سمجھتا ہو گا؟ اس کے باوجود اس نے ہمیں ذرا بھی خبردار نہیں کیا۔ مجھے تو یہ کوئی سازش ملتی ہے اور یہ سنا اس سازش میں شریک ہے۔“

اسے غالباً ہوش میں اپنے اوپر ہونے والا حملہ یاد آیا تھا۔ میں پہلے ہی خود بھی ان خطروں پر سوچ رہا تھا۔ روضہ اس وقت گھوڑے کی کروں سیدھی کر کے عجیب سے انداز میں اس کے منہ پر ہاتھ بھر رہا تھا۔

میں نے پوت کے آدمیوں سے کہا ”گھوڑے کو کھینٹ کر بچے میں ڈال دو۔ کہیں کوئی گاڑی وغیرہ ادرھن آئے۔ ہم لوگوں نے تو پوری سڑک ہی مدد کی ہے۔“

سب سڑک چھوڑ کر ایک طرف ہو چکے تو میں نے روضہ کو تواڑ سے کر قریب بلایا۔ وہ گویا ڈرتے ڈرتے میرے قریب آیا۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا مگر دونوں کے گوشے پتھر پتھرا رہے تھے۔

”نہو! تم گھوڑے کو کیا کھلا کر لائے تھے؟“ میں نے ذہت کر پوچھا۔

”صبح میں اسے وہی کھلایا تھا۔ جو یہ بیشہ کھاتا تھا۔۔۔ لوگوں اور بدوہ میں بیچگی ہوتے بچے کی دال۔۔۔“ روضہ گھوگھیر کر تواڑ میں بولا ”ابھی جب میں بیڑی کی دوا لینے گیا تھا تو اسے اپنے گھر کے قریب کھلا چھوڑ گیا تھا۔ ہمارے گھر سے قریب بہت بڑا خالی پلاٹ ہے۔۔۔ اس پر اچھی ٹھاس لگی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی میں اسے چرنے کے لئے وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے تم سچ نہیں بول رہے“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”گھر کہاں ہے تمہارا؟“

”اسنو دیو سے قریب ہی کتنی ہستی میں رہتا ہوں۔“ وہ بیٹھی بیٹھی آواز میں بولا۔

”تو تم سچ نہیں بولتے؟“ میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سرتو کاٹے گھڑا رہا۔ میں نے اسے ایک پتھر سے سید کیا۔ زیادہ دور سے نہیں۔ بس ان کا کہ وہ ادھر گزر گیا اڑال کر گھڑے ہوئے لوگوں کے قدموں میں جا گرا۔“

ایک آدمی نے اسے گھربان سے پکڑ کر اٹھایا اور دوبارہ پھر سے سامنے لکھڑا کیا۔ اس کا ایک ہاتھ رخسار پر تھا اور وہ خیر خیر کہتا رہا تھا۔ اس نے بھڑوں ہی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ”وہ کسی سازشی آدمی کی

آنکھیں نہیں تھیں۔

وہ جیسے اپنی ہڈی کچی توڑا مٹی جمع کر کے جینے جینے ہی تواڑ میں بولا ”صاحب جی میں ایک غریب اور دیوانی سا آدمی ہوں۔ سازشیں کرنا اور ان میں حصہ لینا مجھے تو ان کے بس کی بات کہیں۔۔۔ اور پھر یہ جو موتی تھا مٹی، میرا گھوڑا۔۔۔ اس کے لئے تو کوئی مجھے لاکھ دے دے بھی دیتا تو میں اس کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔۔۔ آپ اندر سفری میں سے لے آئے ہیں صاحب جی! آپ کو نہیں معلوم کہ میں بے اولاد ہوں۔ میری اولاد یہ موتی بنی تھائی۔ ہم میاں بیوی کا لکھنا ہیچ۔ اور پھر بھی کوئی تمہارا تالا کن قسم کا نہیں۔ یہ تو ہمارا کماؤ پتھر تھا۔۔۔“

اس کی تواڑ آسودوں میں تھمیل ہوئے لگی ”یہ ہمارے لئے کھانا تھا جی۔۔۔ ہم میاں بیوی ہو گئے ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے بڑھاپے کا سارا تھا جی۔۔۔ اسی کے سر پر تو گھر کی دال روٹی چل رہی تھی۔ اتنا سارا تھا جی۔۔۔ جب ہم نے اسے پلا تھا۔۔۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا ”صاحب جی! آپ خودی دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں۔۔۔ کوئی کسی لاف میں انکار اپنے بچے کی زندگی بھی داؤ پر لگا تا ہے بھلا؟ کوئی اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے کوئی خطرناک چیز کھلا سکتا ہے کیا؟ آپ کو تو پتا بھی نہیں صاحب جی کہ موتی کے مرنے سے مجھ پر کیا گزری ہے۔۔۔ اور جب میری بیوی نے خبر سے کی تو اس پر کیا گزری گی۔ آپ کو کیا پتا صاحب جی۔۔۔ ہم تو ٹٹ گئے ہیں۔۔۔ ٹٹ گئے ہیں“ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر ہلکے ہلکے رونے لگا۔

اس کے بچے کی صداقت نے مجھے سُن کر دیا تھا۔ میرے اندر چھپے ہوئے مشاق منصف نے اپنے تجربے کی بنا پر فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ بظاہر میں اسی طرح پُر سکون گھڑا ہوا تھا لیکن اندر سے ایک لمحے کے لئے میں ہل چکا تھا۔ مجھ سے غلطی مرزد ہو چکی تھی۔ میں نے ایک بے قصور اور غریب شخص کو مارا تھا جو پہلے ہی کسی کے ظلم کا نشانہ بن چکا تھا۔ تاہم میں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا اور لوگوں کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں ذرا گھوڑے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔“

لوگوں نے میرے لئے فوراً راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے گھوڑے کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیڑہ کر اس کا معائنہ کیا۔ اس کی جلد سامنے مٹی کی طرح تلام ہو رہی تھی۔۔۔ وہ بلاشبہ ایک خوبصورت گھوڑا تھا لیکن اب اس پر مہنت کی ہر صورتی غالب آچکی تھی۔ اس کا ایک پتلو بری طرح مٹی میں گھس چکا تھا لیکن اس کے جسم کا جو حصہ صاف نظر آ رہا تھا اس پر مجھے وہ نشان نظر آیا جس کی موجودگی کا مجھے پہلے ہی خطرہ تھا۔

ہاتھ پھیرنے پر مجھے اس کے کولے پر ایک ننھا سا انبار محسوس ہوا تھا اور جب میں نے ذرا اور قریب سے اس جگہ کا

تائید کی کی پر چائیاں معدوم ہو گئیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور میں نے تمیں جو چھڑا اس کے لئے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ اندازے کی غلطی انسان سے ہوئی جاتی ہے۔ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔"

"آپ مائی باپ ہیں سرکار" وہ ہاتھ دوڑ کر بولا "دو چھڑ اور مار لیں۔ ہماری قومی میں خوش ہو گیا سرکار کہ آپ کے دل میں خرمیوں کا دور اور احترام تو ہے۔ آپ نے میری عزت بڑھادی ہے جی۔ اب تو آپ پیسے نہ بھی دیں تب بھی میرا دل آپ کی طرف سے صاف ہے۔"

اس کے لمحے میں واقعی مسرت جھلکے لگی تھی۔ کبھی کبھی ایک انسان کا ذرا سا سرخ ہونا ذرا سی فرائض کا مظاہرہ کرنا کبھی دوسرے دل شکستہ و آزرده انسان کے لئے کتنی خوشی کا باعث بن جاتا ہے۔

"نہیں۔ تم رقم ضرور آکر لے جانا" میں نے ملائمت سے کہا پھر احتیاطاً براہ راست اتفاق کو بھی ہدایت کردی کہ وہ دوسرے دن دن کو دس ہزار روپے ضرور دے۔

جاتے جاتے ایک بار پھر میں نے ستارہ کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا "خمس فیس ہے کہ تم آج شوٹنگ کر سکو گی؟" "ہاں" وہ مسکرائی "میں اس حادثے سے منسلک چکی ہوں۔ میں انجی کروڑ نازک مزاج عورت نہیں ہوں جو اس قسم کے حادثوں سے سناڑ ہو کر ستر جانیوں۔"

"بہت خوب" زندہ باہر عورت "میں نے اسے سیلٹ کیا اور وہ ہنس دی۔ میں سب کو خدا حافظ کہہ کر اپنی کار میں آ بیٹھا جس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا اور دو واڑہ کھلا ہوا ہی تھا۔ وہ اپنی پر تمام راستے میرا ذہن اسی واقعے میں الجھا رہا۔ معاملہ کچھ قاطل قوجہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن گھر پہنچنے تک مجھے وہی طور پر اس مسئلے کو ذہن سے جھٹکانا پڑا۔ دوسری بہت سی باتیں بہت سے کام اس سے زیادہ قوجہ طلب تھے۔ اس سے کہیں زیادہ بڑے اور زیادہ اہم کام۔ اگر میں چوبیس گھنٹے کے مسائل میں الجھ جاتا تو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا خطرہ تھا اور فی الوقت میں اس دوڑ میں سست ہونا نہیں چاہتا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے غسل کے بعد لباس تبدیل کیا اور ایک بار پھر اپنے آئینہ کا جائیجا۔ چار بجے میری نیپولی سے آئی ہوئی ایک پارٹی سے ملاقات ملے تھی۔ یہ سستے کپڑوں کی خرید واری تھی اور اس سے مجھے بہت بڑا آموز لگنے کی توقع تھی۔ رات کو انہی کے ساتھ ڈنر تھا۔ چار بجتے ہی والے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ملاقات سے پہلے میری سیکرٹری مجھے اس خط و کتابت کے بارے میں خود سا ساریف کر دے جو اس پارٹی کے اور ہمارے دو میان دونوں ہی تھی۔ چنانچہ دفتر جاتے ہی میں ایسا مصروف ہوا کہ وہ واقعہ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا۔

معائنہ کیا تو مجھے ایک نہایت نھا سا سوراخ بھی نظر آیا۔ گھوڑے کو پیش کسی سوئی سے انجکشن لگایا گیا تھا۔ میں ایک گرمی ماس کے لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دیکھتا تھا کہ جب وہ بیوی کی دوا لینے گیا تو گھوڑے کو گھر کے قریب کھلے سبزہ زار میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ گھوڑے کو انجکشن لگانے کا کام غالباً اسی دوران انجام دیا گیا تھا۔ موٹی کو انجکشن لگانے کے لئے ویسے بھی صرف دو تین سینکڑہ درکار ہوتے ہیں۔

جیران کن بات یہ تھی کہ جس کسی نے بھی یہ قدم اٹھایا تھا اسے ہمارے مکمل پروگرام اور شیڈول کا علم تھا اور اس نے لمحہ بہ لمحہ وقت کا تعین کرتے ہوئے یہ سب کچھ کیا تھا جی تو وہ مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کی توقع رکھ سکتا تھا۔ ورنہ تو وقت ذرا سا آگے پیچھے ہونے سے اس کی ساری محنت ضائع ہو سکتی تھی۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟ اس سلسلے میں اب میرا تعین بھی کچھ متزلزل ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے اتفاق کی طرف مڑتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آج شوٹنگ کینسل ہی کر دو۔ بد شگونی ہی ہو گئی ہے۔ میں اب جا رہا ہوں مقیم جس طرح مناسب سمجھو شوٹنگ کا کوئی دوسرا شیڈول بنالیا۔ میں کو شش کیا کروں گا کہ ہر شوٹنگ کے آغاز پر یہ گماز کم چند منٹ کے لئے ضرور آجایا کروں" یہ اب ضروری معلوم ہونے لگا ہے "پھر میں نے ستارہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا "اگر تم میرے ساتھ چنا چاہو تو چلو۔ جہاں کوئی میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔"

وہ فنی میں سر ملاتے ہوئے بولی "باش میں میرے گاڑی کھڑی ہے۔ پیچھے اسی میں جانا پڑے گا۔ اور پھر ابھی اسٹوڈیو میں میری دو سیٹیں ہر شوٹنگ بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے سر سر سے لیے میں کہا اور دھوکے طرف دیکھا۔ وہ بظنوں میں ہاتھ دے کھڑا تھا اور محزون اور اسورد نظروں سے اپنے مزہ گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے قریب بلایا۔ وہ جھپٹتا ہوا آیا۔ وہ غالباً پوری کو شش کر رہا تھا کہ اس کی آنکھیں ہر ناثر سے عاری رہیں لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں میرے لئے تائید کی کے سامنے تھے۔

"دیکھو" میں نے ملائمت سے کہا "تم نے جو کچھ کہا مجھے اس پر اعتبار آ گیا ہے۔ موٹی تمہیں جتنا عزیز تھا اس کا اندازہ کرتے ہوئے تمہیں موٹی کا کوئی قسم تبدیل تو نہیں دے سکتا لیکن تمہارا مالی مسئلہ کسی حد تک حل کرنے کے لئے تھوڑی سی کو شش کر سکتا ہوں۔ تم کل میرے اسٹوڈیو والے دفتر میں آکر اتفاق صاحب سے دس ہزار روپے لے لینا اور روزگار کی کوئی تدبیر کر لینا۔ ٹھیک ہے؟"

اس کے اثرات بدل گئے۔ آنکھوں میں چھپی ہوئی

نے بیسوں والے انداز میں ایک سرخ پی بھی لیٹ رکھی تھی۔ عام بیٹ کی جگہ اس نے ہاتھ گریوں والی پٹی اور بوسٹر لینا ہوا تھا جس میں رو اور بھی جھول رہا تھا جو غالباً نقل تھا۔

اتفاق کے کسی اسٹنٹ نے میرے لئے ایک سوئے کی جھاڑو پتھر کی اور دو دو کر میرے لئے کیس سے کوئڈز نکالے آئے۔ ابھی میں نے کوئڈز نکالنے کی پہلی ہی پتھر کی تھی کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ سیٹ پر موجود تقریباً سبھی افراد چونک پڑے۔ ستارہ کی توجہ بھی ٹپک ٹپک ہو گئی کہ دھماکے کی ”وجہ“ اس کے عین قریب ہی آکر گری تھی۔

دراصل اسٹنٹ آئرن کی ایک پوری ہی فوٹ کر چپے تھیں مگر تھی جس کے دونوں سروں پر دو بڑی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ لائٹس کافی وزنی معلوم ہوتی تھیں اور پھر ان کے ساتھ اسٹنٹ آئرن کا جو تقریباً ایک فٹ چڑھا جال سا تھا اس کا بھی وزن تھا۔ بالیوں سے مسلک فاضل تھوڑا بھی نیچے تک لائٹس کے ساتھ ہی کھینچ آئی تھی۔ لائٹس کے شیشے اور بلب دھماکے کے ساتھ چٹنا چڑھ رہے تھے۔

یہ جی ستارہ سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر آکر گری تھی۔ ستارہ مثل مثل کر مائل یا د کرتے ہوئے اگر مزید ایک قدم بھی بڑھا چکی ہو تو شاید یہ پٹی اس کے ہر ہی گرتی اور میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن اتنا ضرور تھا کہ ستارہ کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ ورنہ اسے خطرناک حد تک چونک ضرور آتی۔

میں غالباً واحد شخص تھا جو دھماکا سن کر چونکا ضرور لیکن اچلا نہیں۔ میری نظر فوراً اوپر تھی۔ لائٹ میں دم بخود اور بیٹھا تھا جال کی ایک پٹی گرنے سے جو خلا پیدا ہوا تھا لائٹ میں کی ایک ٹانگ اس خلا میں سے نیچے جھول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف گویا مجید ہو کر رہ گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایک ٹنگ نہیں کر رہا تھا۔

کیا ہوا کیوں ہوا... کیسے ہوا؟ کی صدا میں ہر طرف سے بلند ہوتے لگیں۔ اتفاق نے ستارہ کو بازوؤں سے پکڑ کر ایک طرف کرسی پر بٹھایا۔ وہ میری طرف دیکھ کر چپکے سے ”اے“ میں مسکرائی اور چپسی چپسی سی آواز میں بولی ”آج پھر جال بال چکی ہوں۔“

”اٹھیں ان رکھو“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا ”قدرت نے تمہاری جتنی زندگی لکھ دی ہے کوئی اس میں ایک لمبے کی بھی کمی نہیں کر سکتا۔“

میں اٹھ کر آگے بڑھا اور اپنی جال کے نوٹے ہوئے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ اتفاق اس دوران لائٹ میں کو بیٹھے باقی تھا اور اس سے دو چور کچھ کر رہا تھا ”کیوں بے... کیا کیا تھوڑے تو تھے تو لائٹس نیچے گر پڑیں؟“

دوسرے دن سے کچھ بڑے تھے اور نئی مصروفیات۔ تیسرے دن ذرا سانس لینے کی فرصت ملی تو پھر اتفاق کا فون آیا۔ وہ کسی اور سین سے شریک شروع کر رہا تھا اور میری ہی ہدایت کے مطابق اس نے مجھے اس لئے مطلع کیا تھا کہ میں خواہ چند منٹ کے لئے ہی سی لیگن سیٹ پر ضرور پہنچ جاؤں۔ اس بار شریک اسٹیج میں ہی تھی۔ میں جا چکا۔

اس بار جو واقعہ پیش آیا اس سے جو کچھ بھی قصصان پہنچ سکا تھا اسے مدائے میں میرا کوئی کردار نہیں تھا لیکن پھر بھی میرا سین پر پہنچا اچھا رہا۔ کم از کم وہ واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے تو دیکھ لیا۔ یہ دعویٰ چوتھی باتیں میرے لئے اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ کرنا بہت ضروری تھا تاکہ جب کبھی حساب کتاب کا وقت آئے تو سارا حساب صحیح طرح نکالیا جاسکے کوئی کمی نہ رہ جائے۔

سیٹ ایک حوالی کا تھا۔ یہ حوالی ستارہ کے قلبی باپ کی تھی جو کسی بہت بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ مگر کسی دربار یا پتلیات کا سا تھا۔ قبیلے کے کچھ لوگ اپنے سردار کے جس شکایت سے کر آئے تھے کہ ان کی سرکشی اور جھگڑا قسم کی جی ٹھوڑے یا چپ پر سوار ہو کر ہر نفل جاتی ہے ہادی پھیلا دیتی ہے۔ کچھ تو کوئڈز لائی ہے اور جنگلی جانوروں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے پلو جانوروں کا بھی شکار کرتی ہے۔ کوئی ذرا بھی اسے سمجھانے کی کوشش کئے تو چابک سے اس کی پٹائی کر دیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس شکایت پر سردار وضاحت اور جواب طلبی کے لئے اپنی بیٹی یعنی ستارہ کو دربار میں بلا تا ہے۔

میں جب سیٹ پر پہنچا تو سرسل ہو رہی تھی۔ ستارہ اوسر اوپر مل کر اپنے مکالے یاد کر رہی تھی۔ سیٹ آخری مراحل سے گزر چکا تھا لیکن سیٹ ذرا انرا بھی اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن میں وہ اپنے آؤمیں کو ایک آؤہ کیل غصے تھوڑا بہت رنگ بچھرنے لگیں کاغذ پچانے کی ہدایت کر رہا تھا۔ جتنی بلندی پر عام طور پر کسی کمرے کی چھت ہوتی ہے اتنی بلندی پر لوہے کی بیلیں کا جال سا پھیلا ہوا تھا اور اس جال کے مختلف گوشوں میں بڑی بڑی لائٹس فٹ تھیں۔ ایک لائٹ میں اس جال پر چڑھا بیٹھا تھا۔ وہ اسٹنٹ آئرن کی بیلیوں پر بندر کی طرح پاؤں رکھتا ہوا کبھی ایک طرف جاتا اور کبھی دوسری طرف۔ وہ مختلف لائٹوں کے زاویے درست کر رہا تھا۔

کبھی وہ ایک تخت لغو ستارہ کے سے انداز میں آواز بلند کرتا ”لائٹ“ اور نیچے موجود کوئی شخص لائٹ آن کرتا۔ اوپر والا لائٹ میں روشنی باز اوپر چپک کرتا اور بائیں لگا ”لائٹ آف“۔ میرے چپے پر سیٹ پر قدرے خاموشی چھا گئی۔ ستارہ نے ایک اداسے خام سے دور ہی سے مجھے سلام کیا اور خوش انداز میں مسکرائی۔ اس وقت وہ نیویو بلو جینز میں تھی۔ پیشانی پر اس

"مجھے تو کچھ پتا نہیں چلا سرتی۔" لائٹ میں پوچھا
ہوئے لیٹے میں بولا "میں نے تو ابھی اس پنی پر ایک سی پاؤں کا
وزن والا تھا کہ یہ پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ میری تو کچھ سمجھ
میں نہیں آیا!"

میں نے ان کے سوال جواب کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔
مجھے معلوم تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لائٹ میں اگر
مفلوک آتی ہوتا تو میں حادثے کے وقت اس آہنی جال پر تنکا
نہ رہتا اور اگر وہ واقعی کسی سازش میں شریک تھا تو پھر اس کا دار
غالی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ دیکھ بھال کر عین موڑوں وقت پر آہنی پنی
گراتا جب ستارہ اس کی زد میں ہوتی۔

میں نیچے کمری ہوئی پنی کا جائزہ لے چکا تو اشارے سے
اسٹول نما میز صحن اپنے قریب مگھوٹی اور اس پر چڑھ کر اس جگہ
کا جائزہ لیا جہاں سے پنی ٹوٹ کر گری تھی جائزہ کے بعد کم انداز
... یہ تصدیق ہوئی گئی تھی کہ آہنی پنی کا کرنا محض اتفاق نہیں تھا۔
وہ پنی دونوں طرف ویلڈ ٹنگ کے ذریعے جال سے جڑی ہوئی تھی
اور دونوں طرف صرف ایک ایک انچ حصہ ویلڈ ٹنگ شدہ تھا۔
اس سے کوہا کائے دالی آری کے ذریعے تقریباً پورا کا پورا کالٹ
دیا گیا تھا۔ جس برائے نام بزارہ نے دیا گیا تھا۔ لائٹ میں کا پاؤں
چڑھتی ہوئی مکمل طور پر پلیدہ ہو کر گر پڑی تھی۔

جس کئی نے بھی یہ طریقہ سوچا تھا وہ بہت دور کی کوڑی لایا
تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ آہنی پنی اور لائٹس ستارہ کی سر
مگر جس سے یہ حال جس پر بھی گرتیں، زیادہ امکان بھی تھا کہ وہ
تیار ہی قلم کھینچ کا آوی ہو تا اور اس قسم کے چاروں سے کئی
کے کام اور ساتھ دونوں کو دو نقصان پہنچا کرتا ہے وہ ہمیشہ اٹھاتا
پڑتا۔

میں اسٹول نما میز صحن سے اتر آیا۔ اتفاق اب بھی سخت لمبے
میں لائٹ میں سے چھوٹ کر رہا تھا۔ میں نے اتفاق کے کندھے
پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس کے ساتھ مفر کھپانے کا کوئی فائدہ
نہیں۔ یہ کسی اور کا ہی کام معلوم ہوتا ہے۔"

میری یہ بات سن کر لائٹ میں نے گویا اطمینان کی سانس لی۔
... اسٹوڈیو پھر اس وقت شاید کسی قریبی سی موڈ تھا اور اسے
اس واقعے کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ کچھ گھبرا ہوا سا لگو رہا تھا۔
میں تو اسے بچاتا نہیں تھا، اتفاق نے مجھے بتایا "سر! یہ قسم
صاحب ہیں۔ اس اسٹوڈیو کے منبر۔"

"کیا وہ اتفاق صاحب؟" اس نے تشویش زدہ جہے میں پوچھا
اتفاق نے اسے بتایا اور جب وہ بات ختم کر کے تھیں نے
کہا "اس پنی کو آری کے ذریعے کاٹا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ اس اسٹوڈیو میں شوٹنگ کرنا کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔
کسی بھی وقت کسی قلم کی کاسٹ سازش کا شکار ہو سکتی ہے اور
کسی وقت بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے" میرے لیٹے میں

غیر ارادی طور پر بے پناہ سختی اور سرد مہری دور آئی تھی۔

سیخڑ بول تو خاصا درشت مزاج اور چٹا بڑا بڑا معلوم ہوتا تھا
لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تو کچھ
گنیزا سا گیا اور معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کر کے ہوئے بولا۔

"میں جیڑا ہوں کہ ایسا کیونکر ہوا۔ اسٹوڈیو میں آج تک ایسا
حادثہ نہیں ہوا۔ لوہے کا یہ جال اتنا پوسیدہ بھی نہیں ہے" اس
نے اوپر دیکھا "اور اگر اسے آری سے کاٹا گیا ہے تب بھی اس
کے بارے میں کوئی اندازہ ظاہر کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ کسی کا
کام ہو سکتا ہے۔ اسٹوڈیو میں سیکڑوں ملازم ہیں اور سب ہی
آزادانہ انداز اور ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں۔" وہ انجمن زدہ سے
انداز میں چاک لیٹے کے لئے خاموش ہوئے کے بعد بولا "لیکن
آخر کسی کو اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ ایسی کیا دشمنی
تھی کسی کو آپ لوگوں سے؟" انداز خود کا می کا ساقا۔ اس نے
کسی کو خاص طور پر مخاطب نہیں کیا تھا۔

"میں بھی یہی جاننے کا اشتیاق ہے۔ اور ہم اپنے طور پر
جاننے کی کوشش بھی کریں گے" میں نے خشک لیٹے میں کہا۔

"اگر آپ پسند کریں تو اس واقعے کی پولیس میں رپورٹ
درج کرا دی جائے" سیخڑ بولا۔

"نی افال ہم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے" میں نے
بدستور خشک لیٹے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں لائٹ میں سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ اچھی
طرح پورے آہنی جال کے تمام جوڑوں اور ٹنٹ بولوں وغیرہ کا
جائزہ لے لے۔ اس کے بعد اگر آپ مناسب سمجھیں تو شوٹنگ
جاری رکھیں۔ آپ کو جتنا بھی ایکسٹرا ٹائم درکار ہو، آپ کا نہیں
... ہم اس کا کرایہ چارج نہیں کریں گے" سیخڑ نے حاکم طعانی کی قہر
پر لاث بازی اور لائٹ میں کوہا بات اپنے کے بعد رخصت ہو گیا۔
"شوٹنگ جاری رکھنی ہے؟" میں نے اتفاق سے پوچھا۔

"ہاں۔ آج تو ہم یہ سین کر کے ہی چھوڑیں گے۔ البتہ
ستارہ سے پتہ چڑے گا" وہ ستارہ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"کیوں میڈم! آپ کی بہت جواب تو نہیں دے سکتی؟" وہ مسکرایا
"میڈم اتنی کم بہت نہیں ہیں۔ یہ بات حسین اچھی طرح
معلوم ہے" ستارہ شجیدگی سے بولی "البتہ جو ڈائریکٹ میں نے
اتنی مشکل سے یاد کئے تھے وہ ایک دم داغ سے نکل گئے ہیں۔
اب تھوڑا وقت اور گنگے گا۔ اور اب میں شل شل کر نہیں
آرام سے ایک کونے میں بیٹھ کر یاد کروں گی" وہ اسکرین سے ہٹا
کریں ایک کمرے پر بیٹھ گئی گویا اسکول کی کوئی طالبہ سبق یاد
کر رہی ہو۔

دو لائٹ میں اور چھ کر آہنی جیڑا کا معائنہ کر رہے تھے
کئی دیر بعد جا کر بالا خر شوٹنگ شروع ہونے کی نوبت آئی تو جیڑا
میرے لئے براہِ رو کام تھا۔ بار بار می ٹیکس ہوتی تھیں۔ ایک

صہونیت اور عالم اسلام

طارق اسلمیل ساگر -----

- ☆ خلیج کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی عبرت انگیز تحریر
- ☆ صہونیت کے مکروہ عزائم کا کچا پٹھہ
- ☆ عظیم تر اسرائیل کے ناپاک ارادوں کا احوال
- ☆ یہودیوں کے مستقبل کے گھٹاؤ نے منصوبوں کا تفصیلی تذکرہ

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

قیمت / - 125

امیر تیمور گورگاں

☆ ----- الماس ایم - اے

امیر تیمور اور امیر حسین کی خانہ جنگی اور وحشیانہ قتل و غارت کے پس منظر میں
حسینہ تاتار دلشاد آغا کی قید و بند کی زندگی اور سرائے خانم کے درجے تک پہنچنے
کی دلچسپ داستان -----

دو حصوں میں مکمل قیمت: / - 300 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

ایک مکان کے لئے کچھ بھی اسٹارٹ ہو آتا تھا، کبھی بند۔ کبھی انہوں کے زاوے تبدیل ہوتے تھے اور کبھی کبھار کی جگہ۔ کبھی ساتھ مکان میں کوئی چھوٹی موٹی لٹھی کر جاتی تھی اور کبھی کوئی دوسرا اداکار۔ کچھ دیر بعد میں پور ہو گیا۔ ویسے بھی اب جسے اطمینان ہو گیا تھا کہ شو بنگ بھیرے کسی گزیر کے جباری رہ سکے گی۔ چنانچہ میں نے اتفاقاً ساتھ اور دیگر لوگوں کو خود حافظہ کما اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ظہور سے باہر آتے وقت میں سوچ رہا تھا کہ میں وہ شو بنگ نہیں دیکھنے کی حسرت میں لا کین میں ہم گویا مرے جاتے تھے۔

اگلے ایک ماہ میں میں بے حد مصروف رہا۔ میرا صورت ایک سپورٹ کا بزنس بہت تیزی سے چمک رہا تھا۔ ٹیکسٹائل کے دو 'نیا' کارخانے بھی میں نے پچھلے دنوں خریدے تھے جن کے مالکان ہرجن کر کے تھک گئے تھے مگر وہ چل کر نہیں دیتے تھے۔ لیبر نے ان کا ٹاک میں دم کیا ہوا تھا۔ میں نے یہ کارخانے خریدنے سے پہلے ان کے حالات کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا۔... اپنے ساتھوں سے مشورے کئے تھے۔ بالاخر میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بعض جگہ سینئر لوگ مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اور ہر طریقے سے ان کے حقوق سے محروم رکھتے ہیں لیکن بعض جگہ ورکر بھی زیادتی کر رہے ہیں اور مالکان کو کمزور پائزا نہیں ٹھک کرتے رہتے ہیں اور درحقیقت مزدور لیڈروں کے ہٹکاوے میں آکر اپنا ہی نقصان کرتے رہتے ہیں 'اپنے ہی پاؤں پر کھڑی مارے رہتے ہیں۔

ان دونوں کارخانوں میں بحیرہ شہر زد بھائیوں کے تھے اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کارخانوں کے معاملات کو تھوڑی سی سختی اور طاقت سے چلانے کی ضرورت ہے اور کوئی خاص خرابی نہیں ہے چنانچہ یہ دونوں بھٹ میں نے خرید لئے تھے اور کچھ سی عرصے میں سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ ان کارخانوں کی وجہ سے بھی میری مصروفیت میں اضافہ رہا تھا۔ اور کراچی میں بھی پہلے بہت چمک چمک گئے تھے۔ وہاں دو ٹی کا کام بھی بہت پور گیس میں تھا۔۔۔ سینئر کمرٹ ہمارے ساتھ بہت سیٹ چل رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہم شریفوں کے ساتھ حد سے زیادہ شریف ہیں اور ہم سے بدعاشی کر کے کوئی بچ کے نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ہمارے ساتھ شرافت سے چلنے میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔

وہاں دو ٹی کی تعمیر کے سلسلے میں ابتدائی مراحل بڑی تیزی سے طے ہو رہے تھے۔ اوپر سے سینئر رمضان نے شپ بریکنگ کے کام میں میرا کچھ سرمایہ پھنسا دیا تھا۔ میری طرف سے قائم ہونے والی لپٹی نے یونان سے جو پہلا ہی ٹاکارہ جہاز خرید اس کی بریکنگ کے دوران ہی دو جہاز اور آگے اور ان میں زبردست منافع ہوا۔ اور اور کراچی دونوں جگہ میرے گروپ آف کپینرز کے چھوٹے بڑے کبھی بھٹ ٹانڈا اور منافع دے رہے تھے اور سب

سے اتنی بات یہ تھی کہ میرا تمام کاروبار بغیر قرضوں کے چل رہا تھا۔ ورنہ کاروبار دنیا میں ہو آئے جہے کہ بعض بہت بڑے اور مستحکم نظر آتے والے کاروباری ادارے اندر سے بالکل سوسے ہوتے ہیں اور ان کی کوئی سیل ویلو نہیں ہوتی، یعنی اگر انہیں فروخت کیا جائے تو ان پر قرضے اور سودی اٹا نکل آتا ہے کہ فروخت کرنے والے کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ لیکن میرا گروپ آف کپینرز بہت سے دوسرے گروپس کے مقابلے میں چھوٹا ہونے کے باوجود مستحکم اور محسوس تھا۔ ضرورت پڑے تو کچھ چیزوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے بہت بڑے قرضے بھی مل سکتے تھے۔ کاروباری دنیا میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس سولہ سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے بلکہ بہت بڑے بڑے بہت بڑے جن کا پائریز ہو چکے۔ کہڑوں میں تھا اپنے کاروبار پرانے بھگت قرضوں پر چلا رہے تھے۔ اس میں ان کی اپنی بہت سی شخصیت اور ناگفتنی شخصیات تھیں جن کے ذکر سے بات خود بخود غول ہو جاتی گی۔

قصہ مختصر یہ کہ میری خواہش کے مطابق کاروبار اتنا چل چلا گیا تھا کہ میں نے زیر زمین دھندے تو کیا کمال طور پر ہی سمیت دئے تھے حالانکہ کبھی کبھی دل میں لالچ آتا تھا کہ میں بہت بڑی آمدنی کا دروازہ خود پر بند کر لیا تھا جبکہ اب میرے لئے وہ کام نہایت بہت آسان ہو گیا تھا کہ اب وہ بالکل زیادہ تھے راپٹ زیادہ تھے 'اثر' سوخ زیادہ تھا اور کئی طرح کی آڑیں تھیں... مال کی قدر اور ترسیل میں اب بڑی آسانیاں ہو چکی تھیں۔ ایک مٹی کو دہانت مٹی میں تبدیل کرنے کے کئی ذرائع میسر تھے۔ غرضیکہ پہلے کے مقابلے میں بہت آسانیاں تھیں لیکن پھر بھی اب دل نہیں مانتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ جب خدا جابر ذرائع سے اٹا دے رہا ہے تو خواہ مخواہ اپنے خمیر کے ساتھ سرگرم رہنے کی کیا ضرورت ہے۔

حالانکہ میں بہت سے ایسے بڑے بڑے سینئروں کو بھی جانتا تھا جن کی دولت کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کی ہوس دن - دن بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ کالے دھندوں میں لوٹ تھے بلکہ موقع ملنے پر وہ منشیات جیسے کمزور اور ملک چھڑوں کی زیر زمین تجارت اور اسمگلنگ میں بھی ذرا نہیں ہچکچاتے تھے اور بہت سے اختیار لوگ ان کے شریک بن گئے تھے ان سے حصہ وصول کرتے تھے۔

منشیات کے دھندے میں تو خیر میں نے کبھی ہاتھ نہ لایا نہیں تھا لیکن اب باقی سلسلے بھی بہت آہستہ آہستہ ختم کر دئے تھے۔ آہم میرے بھتر سا بھی اب بھی وہی پرانے لوگ تھے۔ میں نے انہیں بڑے بڑے اہم عہدوں پر رکھا تھا۔ بعض مقامات پر خود بالکل خود مختار تھے۔ روپے پیسے کے معاملات میں وہ خود چلنے کرتے تھے لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ میں نے جب

بالکل ہٹ گیا تھا حالانکہ اس دوران ہماری کئی شو گنگز
بھی روغایت ہو چکی تھیں۔ اتفاق بہت خوش تھا۔ وہ شو گنگ
بھی روغایت ہو جانے کی اطلاع فون پر دستاب بندھے یاد آکر ہماری
کوئی فلم کہنی بھی ہے۔ اسٹوڈیو میں ہماری شو گنگ کے دوران
لائٹ گر جائے گی خبر اخباروں میں اپنی غمی جس کی سرخیاں پچھ
اس قسم کی فلمیں کہ مشہور فلم اسٹار ستارہ خضر تاج عارٹ
سے بال بال بچ گئیں۔ ہماری کہنی کا نام بھی تمنا تھا اور میں یہ
محسوس کر کے قدرے حیران بھی ہوا تھا کہ اخباروں کے فلمی
ایڈیٹروں میں اس چوٹے سے واقعے کو گویا خاص طور پر اچھالا
گیا تھا اور بڑے لمبے چوڑے تبصرے اور قیاس آرائیاں بھی کی
گئی تھیں جن میں غمی طور پر یہ ذکر بھی کیا گیا تھا کہ اس سے پہلے
بھی اسی فلم کی ایک اور شو گنگ کے دوران فلم اسٹار ستارہ بی
ایک جان لیوا حادثے کا شکار ہوئے ہوتے ہوئے کہنی ہمیں جب گھوڑا
پاگل ہو کر انہیں پیچھے پرلا سے نہ جانے کس طرف بھاگ نکلا ہوا
تھا۔

وہ واقعہ مہم انداز میں تحریر کیا گیا تھا لیکن اس میں قلم اور
کہنی کے نام کا بار بار ذکر کیا گیا تھا۔ گویا تبصرے وغیرہ لکھنے
والے یہ ذہن نشین کرنا چاہتے ہوں کہ اس فلم یا شاید اس کہنی
کے ساتھ کوئی نہ کوئی پیکری کوئی نہ کوئی نعمت ہے۔ حالانکہ جس
وقت وہ گھوڑے والا واقعہ پیش آیا تھا اس وقت کسی اخبار میں
اس کا ذکر نہیں آیا تھا اور میرا خیال یہ تھا کہ وہ واقعہ کسی اخبار
نویس کے قلم میں نہیں آسکا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ ان واقعات
کے پیچھے جو باتچہ کار فرما تھا وہ اس کے تشہیریں پہلو کی طرف بھی
خصوصی توجہ دے رہا تھا۔

میری مصروفیات نے مجھے اس پہلو پر زیادہ سوچ بچار کرنے
کی سہولت نہیں دی تھی۔ میں تو اس دوران ستارہ کے گھر بھی
نہیں جاسکا تھا۔ فلم دوران نے غم جاباں بھلا دیا تھا۔ دو تین مرتبہ
اس کا فون بھی آیا لیکن میں دونوں تینوں مرتبہ دفتر میں ہی نہیں
تھا اور اس کا پیغام ملنے کے بعد جب میں نے اس کے بال فون کیا
تو وہ گھر پر نہیں تھی۔

ایک دن جبکہ میں کراچی کا ایک روزہ دورہ کرنے کے بعد
واپس آکر سہ پہر کے وقت دفتر پہنچا ہی تھا 'میری سیکرٹری نے
اطلاع دی کہ اتفاق اور ستارہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں سمجھ
گیا کہ کوئی خاص ہی بات تھی جو وہ دونوں اکٹھے میرے دفتر آئے
تھے۔ میں نے فوراً انہیں بلا بھیجا اور جب وہ میرے کمرے میں
پہنچے تو انھیں کراں کا استقبال کیا۔

اتفاق ملنے کے اعتبار سے تو مجھ تھا کہ ٹک ربا تھا لیکن اس
کا شیوہ بڑھا ہوا بال بکھرے ہوئے اور کپڑے شکن آلود تھے۔
لیکن حرکات و سکنات سے وہ بڑا پرجوش اور مستعد لگ رہا تھا۔
معلوم ہوتا تھا کہ آج کل وہ بہت محنت کر رہا تھا اور اپنے کام سے

بھی انہیں چپک کیا ایماندار اور وفادار رہی پایا۔ ضمیر نام کی چیز
ان کے اندر بھی زندہ تھی اور مواقع میسر ہونے کے باوجود انہوں
نے بھی ناجائز دھندلوں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ کسی نے لالچ میں
جلا پور اپنے طور پر بھی کوئی دھندہ جاری رکھنے کی کوشش نہیں
کی تھی۔ ان کا کہنا بھی یہ تھا کہ جب انہیں ویسے ہی تمام میسر و
آرام میسر تھا تو خدار اور راستوں پر چلنے کی کیا ضرورت تھی۔

میرے ساتھ ان کی بااں شامی اب اور بھی پختہ ہوئی تھی
اور زندگی کے بارے میں ہمارا ایک مشترکہ سالانہ عمل بن گیا
تھا کہ حتی الامکان ایماندار رہی سے چلو کسی کے لئے تکلیف کا
باعث نہ بنیں کوئی اگر ہمارے لئے تکلیف کا باعث ہے
بد معاشی، بکھارے، کوئی ناجائز بھگتہ استعمال کرے تو اسے ہرگز
مت بخشو بلکہ اگر کہیں اور بھی کسی اور کے ساتھ زیادتی ہو رہی
ہو کسی کمزور کے ساتھ ظلم ہو رہا ہو تو اس کی مدد کرنے کی کوشش
کو۔

ایسا یہ نصب العین بنانے کے بعد ہم بہت مطمئن تھے۔
وقت ضرورت ہم اب بھی ایک سٹوڈیو کی طرح ایک گروہی
کی طرح اپنا کام کرتے تھے۔ کوئی مسئلہ آن پڑتا تھا تو فوراً ملک
کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک میرے آدمیوں کے
درمیان رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ ٹیلیفون، ٹیکس، واٹر لیس
ہونے ترا سیر غرضیکہ رابطے کے لئے ہمیں ہر چیز میسر تھی۔
ضرورت کے مطابق جیسا بھی میرے تھے لیکن اب ان کے
استعمال کی فوج کم ہی آتی تھی۔ میرے آدمیوں میں ہر طرح کی
ملا جھٹکیں رکھنے والے شامل تھے اور ہر ایک اپنی جگہ بے مثل
فان۔

یہ سب باتیں تو ضمنی طور پر درمیان میں آگئیں۔ میں بتا
رہا تھا کہ وہ مہینہ بہت ہی مصروف گزرا۔ مجھے سوئے کے لئے
بھی بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس دوران امریکا کا بھی ایک پیکر کا نا
پڑا۔ یورپ کے بلز میں اس کہنی کا دفتر قیام کے نام پر ہم ہوش
ہلا رہے تھے۔ میں کیا تو پھر اجازت مانگ کر بھی گیا کہ یہ
اجازت مانگ کر شرمایا ہوتا ہے۔ ہوش کی تعمیر کے بعد کہنی کا وفد
اگر معائنہ کرتا ہے کہ ہوش کا معیار کیا ہے۔ پھر اس کی
سکینٹ اور معیار کے مطابق ہی اسے نیا یا ستارہ یا فوراً ستارہ کا
گروہ بنایا ہے۔ ہر حال اصل مرحلہ تو ملے ہوئی کیا تھا۔ باقی
توہل کا انھار تو خود ہم پر تھا۔

ہوش کے لئے ساتھ پہلے ہی موجود تھی۔ زمین کا بیانا ہم
دست پر تھے۔ اجازت ملنے کے بعد ہم نے سودا فاسٹل کر دیا اور
تعمیر کے انتظامات شروع کر دیے گئے۔ مختلف کمپنیوں سے مختلف
کاموں کے سلسلے میں سفید طلب کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور ہر
مذاہب پر رات کو مجھے فون پر ملتی تھی۔

ان حالات میں ظاہر ہے، قلم کی طرف سے میرا دھیان

کر لیا آئے۔ میں نے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے سرمایہ دار کے بارے میں بھی نہیں سنا کہ اس نے زندگی کے کسی بھی مرحلہ پر دولت کا نام کی جدوجہد ترک کر دی ہو۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں بہت قاعد پسند ہوں یا کہ اس لئے دولت کا تعاقب چھوڑ دوں گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں ایک ایسا نظام پسند کروں گا جس میں مجھے آپ کل کی طرح بہت زیادہ ہمارے دوستی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ایک خاص حد تک دولت خود ہی میں کر میری طرف آتی رہے گی۔ مجھے صرف اتنی قیامی دینی پڑے گی کہ اس خاص حد پر قاعد کرلوں۔ اور میرا خیال ہے یہ میرا ہی چل جائے گا۔ اتنا مؤصلہ اور توجہ ارادی مجھ میں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس پر قابو پاؤں گا کیوں کہ اس وقت مجھے اور بہت سے ضروری کام کرنے ہوں گے جنہیں میں نے فی الحال دھورا چھوڑا ہوا ہے۔"

ستارہ صوفیہ پر نیم دراز اوڑھ کھلی سی آنکھوں سے... ایک لمحے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میرے مستقبل میں بھلائی کی کوشش کر رہی ہو پھر وہ جیسے ممکن سے چھپا چھڑا کر سر ہٹ گئی ہوئی اور مستقبل کر سیدھی جھپٹتے ہوئے ہوئی "ہم یہاں دولت فلسفے اور تمہارے مستقبل کے منصوبوں پر تبادلہ خیال کر نہیں آتے۔ ایک تو قیامی بات ہے۔ دوسرے تو حیران کن باتوں کا الجھا لیتے ہو۔ میں نے بھی کسی ایسے پرنسپل مین کو اتنا باتنی نہیں دیکھا۔"

"میں نے پرنسپل مین ہونے کا دعو اکب کیا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں صرف مین ہوں۔ پرنسپل تو خود بخود میرے ہاتھوں میں سٹ آیا ہے۔ خیر... تم بتاؤ کیا جانتا رہا تھا میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم دونوں نے بے نفسی سے اپنے اپنے کام کی زحمت کی ہے تو کوئی خاص بات ضرور ہوئی ستارہ اتفاق کی طرف دیکھتے ہوئے شریعہ میں ہوتی رہی۔ اب تم لوگوں تمہاری باری ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ دونوں کے ہوتے ہوئے مجھے کو موقع میسر آیا" اتفاق نے سکرٹ ایجنٹ کے سر سے جھپٹتے ہوئے کھانک کر گھٹا صاف کیا۔ اس کے انداز پر ہم دونوں ہی کو ہنسی... اتفاق خود بھی مسکرا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہوئے بولا "آج ستارہ پھر ایک خوفناک حادثے سے دوچار ہوتے پائی ہے۔"

"اور..." میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اتفاق بھی سکرٹ سٹاک کرکٹ لینے کے بعد بولا "تو شرفک میں سین کچھ اس قسم کا تھا کہ چند غائب پولیس افسران کو ان کے ادارے سے اس کی خواہشوں میں داخل ہونے لیکن ستارہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ تجھے کے پیچھے

پڑا۔ طعن اور سرور خاص۔ ستارہ کسی نہایت ہی نفیس کپڑے کی بہت ہی خوبصورت سیکس میں تھی اور پیش کی طرح حسین اور پُرکشش نظر آتی تھی۔ اس کی آمد سے گویا ماحول بھوکا اٹھتا تھا اور فضا کسی نہ کسی مسکوک کن کھون کی ملک سے خوابناک سی ہو جاتی تھی۔ کنوینٹ کو بلوسات، میک اپ اور خوشبوؤں کے استعمال کا سلیقہ آ گیا تھا۔ اس کے نہیں نقش، حسن کے کسی بلند بالا معیار پر پورے نہیں اترتے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ پچاسوں حسین عورتوں سے بہتر نظر آتی تھی۔

میں ایک لمحے کے لئے اسے دیکھتا رہ گیا پھر میں نے حمزہ سے سبے میں کہا "آج تمہیں میرے دفتر میں آنا چاہئے تھا... آج تو یہ حسن بلا غیر میرے حق میں بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے" میں نے اس کے سرمایہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب سن دیکھنے کی باتیں ہیں" وہ منہ بنا کر بولی اور ایئر کنڈیشنر کے سامنے صوفیہ پر جھڑو گئی۔ اتفاق بھی بیٹھ گیا۔ میں نیز کے عقب سے نکل کر ان کے مقابل بیٹھ گیا اور ایک بار پھر حساسی انداز میں اس کا بازو لیے ہوئے میں نے کہا۔

"مہ کی طرف تو منہ دیکھ کر ہی جاتی ہے۔"

وہ تجھے تجھ سے انداز میں آہستہ سے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "مجھے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بڑے آدمی بن گئے ہو لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اتنے بڑے آدمی بن گئے ہو" اس نے لفظ اتنے پر خوب زور دیا "تم تو ملتان ہی مشکل ہو گیا۔ ایک دنیا ہم سے ملے کو ترستی چمکتی ہے اور ہم تم سے ملنے کی آرزو لے پھر رہے ہیں۔"

"انہیں میں اپنی زندگی کے انتہائی بد نصیب لمحے شمار کروں گا جب تم نے مجھ سے ملنا چاہا لیکن میں بد بخت نہ جانے کہاں دھکے کھانا پھر رہا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایسی مصنوعی باتیں مت کیا کرو" ستارہ نے ملاحت سے مڑ کر مجھے مشورہ دیا "تمہاری زندگی میں اب جذبات و احساسات کا گزر کم ہی رہ گیا ہے۔ تم تو بس مدیہ کلاش کی مشین بن ہوئے ہو۔"

"مدیہ کلاش میں میں نے شک کیا ہوا ہوں لیکن مشین ہر حال میں بنا ہوں" میں نے تھوکی "میرے محسوسات میری انسانی مشقات اپنی کے میرا ضمیر بھی بدستور زندہ ہے" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "اور میری یہ بھانگ دوڑیہ انرا تقریب بھی کچھ عرصے کی ہے۔ میرے کچھ ستارہ ہیں وہ پورے ہو جائیں گے تو میں دولت کا تعاقب کرنا چھوڑ دوں گا۔"

"سب کوئی کتنے ہیں" ستارہ منہ بنا کر بولی "لیکن دولت کا تعاقب انسان بھی ترک نہیں کرتا۔ دولت کی ہوس بھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک نشہ ہے جو انسان کی دگ دپے میں سرایت

”نوجوان ہے۔ اپنا ہی بچہ ہے۔ دکھایا جلال اور پرکھا ہوا اثر کا ہے۔ تقریباً بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ کسی لالچ میں نہ آکر کسی خطرناک کام میں ہاتھ ڈالنے والا نہیں ہے۔ میں اس کی فطرت سمجھتا ہوں۔ اسے انکشاف کے بعد تو اس بے چارے کی حالت ہی خراب ہو گئی تھی۔ انہیں نے اسے قتل دی۔“

ستارہ بولی ”کسی اور کی فلم ہوتی تو اب تک میں چھوڑ کر ایک طرف ہو چکی ہوتی۔ معلوم نہیں میں نے کسی نیکی کام اتنی دہی ہے جو اب تک میں بچتی رہی ہوں ورنہ میرا خانہ خراب ہونے میں تو کوئی کرشمہ نہیں رہی تھی۔“

”وہ شخص ایک تیرہ سے کسی ٹکار کر رہا ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اب تک اس نے جو کوششیں کی ہیں ان میں تمہاری جان بھی جاسکتی تھی۔ تمہارا مستقبل بھی تباہ ہو سکتا تھا۔ فلم بھی مکمل ہونے سے وہ بھگتی تھی اور ہماری کمپنی کی ریپوٹیشن ایسی ہو سکتی تھی کہ آئندہ شاید کوئی ہیروئن ہماری فلم سائن میں نہ کرتی اسی لئے ان معاملات کو اخبارات میں اچالنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس میں اس شخص یا اشخاص کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید وہ زیادہ اخبار نویسوں کو خرید نہیں سکے یا انہیں ان خبروں کو پبلش کرنا نہیں آیا۔“

”میری جان کو خطرہ لاحق ہے اور تم یہاں بیٹھے مسکرا کر اس مسئلے کا تجربہ بے جا رہے ہو“ ستارہ دوڑنے والی آواز میں بولی لیکن یہ لہجہ مصنوعی تھا۔ وہ بے چاری مجھے مسئلے کی حقیقت کا احساس دلانے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

”خدا نے جتنی تمہاری زندگی لکھ دی ہے وہ تو ہر حال میں پوری ہوگی۔ اس سے پہلے کوئی تمہیں نہیں مار سکتا“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”کوئی بعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری بے برداری دیکھ کر زندگی مختصر کر دے مگر بھی ان لوگوں کو تو زندگی کی کوئی قدر ہی نہیں ہے انہیں زندہ رکھنے سے کیا فائدہ“ ستارہ ترکی بہ ترکی بولی ”اس لئے بہتر ہے کہ ہم اپنے قحط کی کوئی تدبیر کر لیں۔ میں آج تم سے حتمی طور پر یہی معلوم کر گئی تھی ہوں کہ تم اس سلسلے میں کچھ کر دے گے یا نہیں؟“

”ہاں۔ میرا خیال ہے اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”مجھے اب تک مصروفیات نے صحیح طور پر اس مسئلے کی طرف توجہ دینے کی سلت نہیں دی تھی لیکن ان واقعات کے پیچھے جس کا بھی ہاتھ ہے وہ میری خاموشی سے مجھے کوئی کمزور آدمی سمجھنے لگا ہو گا۔ اب اسے کچھ بددوست کرنا ہی پڑے گا۔“

”جی بات یہ ہے کہ اگرچہ حتمی مرتبہ کوئی حادثہ پیش آیا یا آتے آتے رہ گیا تو میں فلم چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گی“ ستارہ نے بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ شبیہ کی بھی

بہل کر ان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ خنجر وی مخصوص سرافت کا تھا جو عموماً شوٹنگ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی نوک جب کسی بھی چیز سے ٹکراتی ہے تو پورا پھل دستے میں چلا جاتا ہے۔ شوٹنگ میں عام طور پر ہوتا ہے کہ بظاہر اس خنجر کو کسی کے سر میں گھونسا جاتا ہے لیکن درحقیقت پھل دستے میں چلا جاتا ہے اور جس شخص پر وار کیا جاتا ہے اس کے لباس کے رنگ سے بظاہر دوبارہ چھپا ہوتا ہے جسے تین اسی وقت پھوڑنے کا انتظام ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا لباس خون میں تر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔“

آفاق نے ایک اور طویل بحث لینے کے بعد سلسلہ حکام جوڑا۔ ”اس وقت ریسرسل چل رہی تھی اور سین میں استعمال ہونے والی مصنوعی بندوبستیں اور وہ خنجر ایک طرف میز پر رکھا تھا۔ ریسرسل کے دوران ہم ذرا سناٹے گئے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ میں آفاق سے اسی میز کے قریب کھڑا چائے پی رہا تھا۔ چائے ختم کر کے ٹپ رکھ کر میں نے پوچھی غیر ارادی طور پر خنجر اٹھایا اور باتیں کرتے کرتے بے دھیانی میں ایک انگلی سے اس کی نوک پر یاد ڈالا تو اس کا پھل دستے میں بیانیے کے تباہی میں انگلی میں اترتے اترتے رہ گیا۔“ اس نے بیاں بانٹتے اٹھا کر انگلی مجھے دکھائی جس پر چھوٹا سا زخم نظر آ رہا تھا۔

آفاق بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے گہرا کر خنجر کو میز پر مار کر دیکھا۔ اس کی نوک تقریباً آدھ انچ تک ٹکڑی میں دھس گئی۔ وہ خنجر بالکل اصلی تھا۔ نہ جانے کس وقت کس نے قتل خنجر بنا کر اس کی جگہ بالکل دیسا ہی اصلی خنجر رکھ دیا تھا۔ ستارہ نے بھی مجھے خنجر چیک کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس تصور سے ہم دونوں ہی کی حالت غیر ہو گئی کہ اگر ستارہ نے بے دھڑک وہ خنجر استعمال کر لیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ ستارہ تو اس کی طرف سے بالکل مطمئن تھی کیوں کہ وہ اس سے پہلے بھی ایک شوٹنگ میں اسے استعمال کر چکی تھی۔“

”خنجر کیا اس سے تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اسٹوڈیو کے پراپرٹی روم سے“ آفاق بولا ”میرا ایک اسٹنٹ می لے کر آیا تھا۔ پراپرٹی انچارج نے اسٹاٹاٹا خنجر چیک کرنے کے بعد اسے دیا تھا اور اسٹنٹ نے تسلیم کیا ہے کہ وہ جب وہ میری چیزوں کے ساتھ وہ خنجر لے کر آیا تھا تو اس کا پھل اندر دھس رہا تھا۔ اس نے ساری چیزیں شوٹنگ سے بہت دیر پہلے لے کر سیٹ پر رکھ دی تھیں۔ اس دوران وہاں بہت سے لوگ آئے اور مجھے ایسا کہ عام طور پر سینوں پر ہوتا ہے۔ کچھ کو ہم نے دیکھا تھا اور کچھ پر توجہ نہیں بھی دی تھی۔ گزشتہ دو تین روزہ خنجر حادثہ ہو جانے کے بعد ہم تھوڑے سے بے پروا ہو گئے تھے کہ شاید اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔“

”وہ اسٹنٹ کیسا آدمی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

مصنوعی ہے۔

"بس۔ اتنی ہی حوصلہ تھا ساتھ دینے کا؟" میں نے ہانکا سا تشہہ لگایا۔

"نہیں بار جان پر کھیل گئے یہ کیا کم ہے" اس نے بدستور سنجیدگی سے کہا "تمہیں زندگی میں کوئی ایسا بھی ملا ہے جس نے ایک بار بھی تمہارے لئے جان کو خطرے میں ڈالا ہو؟ افسانوی باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن عملی طور پر جان سے گزر جانے کے لئے جس حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم ہی کسی میں ہوتا ہے۔ اور پھر مجھے تو کوئی افسانوی سا دعوا بھی نہیں ہے۔ میں تو حقائق کی دنیا میں رہنے والی ایک عام سی لڑکی ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ جس طرح تمہارے کچھ اراکے ہیں پیر و کرام ہیں اسی طرح میرے بھی کچھ خواب ہیں۔"

وہ کم بخت بات کرنے پر اتنی تھی تو دل کے پتے اچھوڑ کر رکھ دیتی تھی۔ انسان کی سب کمزوریاں اسے معلوم تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ دنیا میں بہت کامیاب بہت کامران اور آسودہ حال نظر آنے والوں کے دامن تنہائی اکثر خفی ہوتے ہیں۔ میں جو اتنے رنگ و رنگ، متوجہ اور بیکان خبر تجربات کا خزانہ سینے میں چھپائے پھر رہا تھا واقعی یہ دعا تو نہیں کر سکتا تھا کہ کسی کی خاطر ہم نے جان کو روگ لگایا تھا یا کوئی ہماری خاطر جان سے گزر گیا تھا۔ شاید تمام چیزوں کی شدتیں وقتی اور نجاتی ہوتی ہیں۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی مدت ہوتی ہے۔ کسی کی کم، کسی کی زیادہ۔ لیکن تمام شدتیں بالآخر گزر جاتی ہیں اور انسان انہیں بھول کر وہی عام ہموار، سپاٹ اور بے کیف سے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ یہ بھی تو ایک قسم کی تھی دماغی اور نفسی سی ہے کہ آپ کے پاس فکر کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔

لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ جو دعوا کر رہی تھی کہ وہ حقائق کی دنیا میں رہنے والی ایک عام سی لڑکی ہے۔ تو وہ حقیقت وہ بھی اپنے آپ کو بھلا رہی تھی۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں تاکہ وہ بہت حقیقت پسند ہیں۔ درحقیقت سب سے زیادہ خواب وہی دیکھتے ہیں۔ وہ نہ تو حقیقت پسند تھی اور نہ ہی عام سی عورت۔ وہ بہت خاص عورت تھی لیکن بظاہر عامیاناہ جن کے جنگل میں بیٹک رہی تھی۔ اگر وہ حقیقت پسند ہوتی تو اس دن ہی قلم کا کنٹرولیک مندرجہ کردیتی جس دن پہلا حادثہ پیش آیا تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی سازش کا نتیجہ تھا۔

میرے ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں اداسی کی سرسری لہر بہرے محسوسات کو چھوٹے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ اداسی ہر دنگہ جاں میں نہ بہن کر پہنچتی تھیں نے ہنسنے ہوئے کہا "تم ہمیں چھوڑ کر تو بھاگ جاؤ گی لیکن اگر یہ باریدہ اور نامعلوم دشمن درحقیقت تمہارے ہی پیچھے لگا ہوا ہے تو پھر یہ کہیں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

میرے وہ جیسے بچ بچ فکر مند ہو گئی۔ سنبھل کر بیٹھنے لگی۔ "میرا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ اور کیوں؟"

"یہ تو بالکل بے کار سوال ہے" میں نے جھینڑنے کے سے انداز میں کہا "اس ملک میں بے شمار لوگ تمہارے چاہنے والے اور تمہاری دوستی کے خواباں ہوں گے۔ ایسی شخصیتوں کے دشمن بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ خود وہی ہوں گی کی طرح۔"

ایک لمحے کے لئے وہ بالکل خاموش ہو گئی، جیسے چوکر ہی بھول گئی ہو لیکن پھر ہنسنے ہوئے گویا خود کو تسلی دینے کی خاطر بولی "نہیں۔ نہیں۔ میرا بھلا کون دشمن ہو سکتا ہے۔"

"خیر۔۔۔" میں نے گہری سانس لے کر صوفے کے پٹے سے ٹھیک لگاتے ہوئے کہا "اب بہت جلد سب کچھ سامنے آجائے گا۔ تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو اور اطمینان سے کافی دو۔"

وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگی۔ کالی کی چند چٹکیاں لینے کے بعد میں نے اتفاق سے پوچھا "قلم کی کیا پوزیشن ہے؟"

وہ سرگرمی کا کھرا کش لے کر مسکرایا۔ "قلم اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ سرگرمی کی راہ ایل ٹریس میں بھاڑتے ہوئے تھا۔" ابتدا میں تو میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آسیب ہمارے پیچھے لگ گیا ہے جو کبھی صحیح طرح شوٹنگ شروع نہیں ہونے دے گا لیکن ایک بار جب کام شروع ہو گیا تو پھر کچھ قلم کو پر لگ گئے۔ اگر رفتار کی دبی تو مجھے یقین ہے کہ جو بادشاہ ہم اپنی پہلی قلم عمل کر لیں گے سب کہ یہ بڑی کاسٹ کی قلم ہے۔ "ہمارے یہ دو قلم قلمیں تو فارمولا غائب ہیں" میں نے کہا۔

"ان سے کتنی ملی طور پر کچھ مربوط ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں اس کے بعد تم بڑی ہی کاسٹ کی ایک نہایت خوبصورت سوٹنگ قلم کی تیاری کرو۔ بہت اچھی کمائی ہو۔ یادگار پفارمنس خوب اداکاروں کی۔ اور پکارا زینشن میں کوئی نیا ہیں۔ اس قلم کو بڑے پمارے بڑے دیکھنے چن سے بے شک آگے وقت میں عمل کرو۔ لاگت کی پروا مت کرنا۔ اور مجھے اس بات کی بھی زیادہ فکر نہیں ہو گی کہ وہ قلم منافع دیتی ہے یا نہیں۔ لیکن بس یادگار قلم ہو۔ کوئی اس کی برائی نہ کر سکے۔ اسے ایک بڑی عام پفارمولا قلم کہہ سکتے لیکن وہ خالصتاً کوئی آرت قلم بھی نہ ہوئے جس پر عام لوگ اور چند ہزار خواص بھی بیخبر کر دیکھیں اور وہاں کرتے رہیں۔ وہ قلم بہت معیاری ہونے کے باوجود نہایت عام آدھی لئے گئے بھی ہو۔ ولایت ایٹ لوگوں کے ساتھ ایک آگے والا ریز می والا بھی اسے دلچسپی سے دیکھ سکے۔ میرا خیال ہے الگا قلم بنانا کالی مشکل کام ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں" اتفاق پڑا مال بولا "مگر زائر کیسٹ میں ڈا ہی بھی اہمیت ہو لاگت کی اسے کوئی پروا نہ ہو منافع کا بھی ہے کوئی لاگت نہ ہو اور قلم کی تکمیل کے لئے کوئی جلد بازی بھی نہ ہو پھر ایسی قلم بنانا قطعی مشکل نہیں۔ ہمارے ٹرڈ میں ایسی

اپنے ڈاکٹر لائن والے ٹیلیفون کا ریسرور انڈیا اور ایک نمبر لایا۔

"سردار علی شاہ!" رابطہ قائم ہونے پر میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں جنمیں یکدم واقعات مختار شاہ ہوں۔ غور سے سنا" میں نے اسے گزشتہ شہر میں ستارہ کے ساتھ پیش آنے والے تینوں واقعات سنائے جن میں ستارہ ہلاکت و تباہی سے بال بال بچی تھی۔

"یہ باتیں تم نے ذہن نشین کر لی ہیں؟" میں نے واقعات سننے کے بعد پوچھا۔

"میں سر! آپ سمجھیں کہ آپ نے ایک ایک لفظ کسی کمپیوٹر کی میموری والے خانے میں بھرا ہے" دوسری طرف سے مودبانہ لہجے میں کہا گیا۔

"اسٹوڈیو میں میرے دفتر کے تقریباً مقابل، پہلی منزل پر ملک کے نام سے مشہور کسی شخص کا دفتر ہے۔۔۔ پورا نام مجھے معلوم نہیں۔۔۔ دفتر ملک ظفر کے نام سے ہے۔ اس شخص کی شکل بھی میں نے نہیں دیکھی لیکن مجھے شبہ ہے۔۔۔ بلکہ کافی حد تک یقین ہے کہ ان تمام واقعات کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ ہے" میں نے بدستور دہیے لہجے میں کہا "جنمیں صرف تصدیق کرنی ہے کہ کیا واقعی یہی شخص ان تمام سازشوں کا ذمہ دار ہے؟ کہیں میں غلط تو نہیں سمجھ رہا اور کسی دوسرے نامعلوم شخص کی حرکتیں اس کے کھاتے میں تو نہیں ڈال رہا۔ فی الحال صرف اسی مقصد کے لئے یہ تحقیق ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! یہ کام ہو جائے گا" سردار شاہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کسی کو احساس نہ ہونے پائے کہ کسی قسم کی چھان بین ہو رہی ہے" میں نے ہدایت کی۔

"سر! اس سلسلے میں تو آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت ہی نہیں" سردار شاہ نے گویا مجھے تسلی دی "میں ذہن ترین آدمیوں کو اس کام پر لگاؤں گا۔"

"مجھے جلد از جلد رپورٹ چاہئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور کو شمش کر گزرسے" میں نے کہا۔

"تاخیر نہیں ہوگی سر!" سردار شاہ دوشنبہ سے بولا "جب انسان کے پاس خرق کرنے کے لئے رویہ، استعمال کرنے کے لئے اعلا ذہن کے کارکن اور وقت ضرورت حتیٰ کرنے کے لئے طاقت بھی موجود ہو تو پھر کون سا کام رک سکتا ہے؟ کوئی سی معلومات ہیں جو ہم حاصل نہیں کر سکتے؟ اس سے پہلے بھی ہمیں جس قسم کی معلومات کی ضرورت پڑی ہے ہم نے وہ حاصل کر لی لی ہیں سر!" اس کے لئے میں داد کی طلب تھی۔

"ہاں۔۔۔ اس میں تو کوئی شک نہیں اسی لئے تو میں اس قسم کے معاملات میں تم پر زیادہ انحصار کرتا ہوں اور ایسی سمات کا

پائے کے اہل لوگ بھی کئی موجود ہیں اور کئی خواہشمند بھی ہیں۔ لیکن جن مجبوریوں سے آپ مجھے آواز کر رہے ہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ وہ ان سب چیزوں کو نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ آپ تحمل ہو سکتے ہیں اس لئے میں آپ کے لئے ایک نہیں کئی ایسی فائیس بنا سکتا ہوں کہ آپ سینا ہال میں بیٹھ کر دیکھیں مگر تو آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ لیکن اس میں شرط یہی ہوگی کہ اس فلم کو آپ مکمل ہونے کے بعد ہی سینا ہال میں دیکھیں۔ اس کی تیاری کے دوران اس کا ذرا سا بھی حصہ نہ دیکھیں اور نہ ہی شو ٹنگ 'ورش' ہنٹ یا اسٹوڈیو غور دیکھیں۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے بلکہ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ اس طرح میرا وقت بچے گا۔ لیکن اگر فلم میری توقعات کے مطابق نہ ہوئی تو میں تم پر جرات نہ کروں گا" میں نے کہا۔

"میں بخوشی ادا کروں گا" اتفاق مسکرایا "لیکن مجھے امید ہے کہ اس کی فیت نہیں آئے گی کیونکہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں اس لئے میں آپ کی خواہشات کے عین مطابق فلم بنائوں گا۔"

"لو بھئی۔۔۔ یہاں تو مستقبل کی منسوب ہندیاں شروع ہو گئیں۔ ہم تو چلیں۔ ستارہ ایک قیامت خیز انگڑائی لے کر اٹھتے ہوئے ہوئی۔ اتفاق بھی اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ اپنا ہریٹ کیس کھول کر وہ ایک بڑا سا انڈیو صورت لٹاف ڈالنے ہوئے بولا "یہ دعوت نامہ شاید کل پرسوں تک آپ کو ڈاک کے ذریعے بھی مل جائے لیکن ایک میں نے بھی آپ کے لئے لے لیا تھا کہ اعتیاداً آپ کو خود ہی دے دوں گا۔"

"کس قسم کا دعوت نامہ ہے؟" میں نے لٹاف کھولے بغیر پوچھا۔

"پروڈیو سرز ایسوسی ایشن کا سالانہ زمرے انٹر کان میں" اتفاق بولا "فلم انڈسٹری کے تقریباً سبھی سرکردہ لوگ موجود ہوں گے۔ نامین چن چکے دن بعد کی ہے۔ آپ کو شمش کریں تو وقت نکال سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں چند ایک خاص خاص لوگوں سے تو آپ کا تعارف ہی ہو جائے۔"

"تم کہہ رہے ہو تو میں آجاؤں گا" میں نے کہا "لیکن یہ کارنامہ میری سیکرٹری کو دیتے جاؤ مگر وہ اپنی اپنا منصف بہک میں ٹوٹ کر لے۔ نہیں میرے ذہن سے نکل نہ جائے۔ وہ مجھے صحیح وقت بتا دے گی۔"

اتفاق نے کارڈ انڈیا۔ ستارہ نے ایک محوور مسکراہٹ کے ساتھ خدا حافظ کہا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دفتر کی فائیس ایک طرف کھسکی اور درجہ تک سینہ سرور حرکت اور خاموشی بیٹھا رہا۔ میں اپنی سوچوں کو صرف ایک سانس کے پر منحصر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر میں نے

خاندان ساجد دیا گیا، دس ہزار روپے۔ کیونکہ اس میں رنگ زیادہ تھا۔ نقلی خنجر کی جگہ اصلی خنجر رکھنے کے معاملے میں ایک برہمن کو استعمال کیا گیا جو سیٹ پر کلڑی کی چیزیں تیار کرتے تھا۔ وہ خنجر اپنے اوزاروں کے خیلے میں رکھ کر لایا تھا۔ اس کا اسٹونڈیو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سیٹ ڈراماٹر نے اچانک ہی ضرورت پر جانے پر اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور ملک کے کسی آدمی نے پیسوں ہی کا لالچ دے کر اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کر لیا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

”بہت خوب“ میں نے آہستگی سے کہا ”رپورٹ بہت قلیل بخش ہے اور یہ معلومات بہت کم وقت میں حاصل کی گئی ہیں۔ میں اپنے آدمیوں کی کارکردگی سے خوش ہوا ہوں۔“

”شکریہ سرا“ سردار شاہ سردار لہجے میں بولا۔

”زیادہ وقت تو پیش نہیں آئی اس کام میں؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”آپ ہی نے تو ہمیں رشک دی ہے سر... کہ مقصد کے حصول میں اگر دشواری پیش آئے بھی تو اسے دشواری نہیں سمجھنا چاہئے، وہ حقیقت وہ ملا میٹوں کا امتحان ہوتا ہے۔“ سردار شاہ بولا ”اس کام میں تو ویسے بھی کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی... بس روپیہ خرچ ہوا اور ایک جگہ ہمارے آدمی کو خفیہ پولیس کے عہدے دار کا روپ دھارنا پڑا لیکن وہ بھی میک اپ میں تھا۔“

”ایک لمبے کے وقت کے بعد وہ بولا ”اس سلسلے میں آگے کیا کرنا ہے سر؟“

”میں دو ایک دن میں بتاؤں گا“ میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوسرے دن آفاق نے دوپہر کے قریب فون کر کے مجھے یاد دلایا ”سر“ آج آپ کو پروڈیو سرز ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر مینا آتا ہے۔“

”مجھے کیسے ترس نے یا دولا یا ہے اور میرا آنے کا ارادہ برقرار ہے“ میں نے جواب دیا۔

”میں نے سوچا احتیاط میں بھی یاد دلا دوں“ وہ بولا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

شام کو میں مقررہ وقت سے خاصی تاخیر کے ساتھ انٹر کال پر تھجا تو بال میں خاصی روٹی نظر آئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ کوئی خشک سی تقریب ہوگی مگر شرعاً میں صرف پروڈیو سرز ہی نہیں تھے بلکہ معروف میوزیئن اور کچھ نامعلوم لیکن ہیروئنوں کی طرح چمکنی دیکھی خواتین بھی موجود تھیں۔ بعض مونے اے بیگم اور بدینہ سمبھوں کے ساتھ ساتھ حسن و ستاب اور دلکشی و نزاکت کا خوبصورت توازن نظر آتا تھا۔

آفاق نے کئی پروڈیو سرز، ہیروئنوں اور دیگر لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ سب حالت اشتیاق سے

انجمن تھیں ہی بتا رہی ہوں ”میں نے گویا اسے ہلکی سی شاباشی دی“ اس معاملے میں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ شاید یہ شخص کچھ زیادہ خطرناک ہو۔ جس انداز سے اس نے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چالاک بھی ہے اور کافی حد تک بے خوف بھی۔ ہمارا کوئی آدمی اس کی نظر میں نہیں آتا چاہئے۔“

”ایسا ہی ہو گا سرا“ سردار شاہ سعادت مندی سے بولا۔

”کتے دن میں مجھے رپورٹ ملے گی؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے چار دن میں کام مکمل ہو جائے گا سرا“

سردار شاہ نے ایک لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا ”اگر مزید مصلحت کی ضرورت پڑی تو میں آپ کو مطلع کروں گا۔“

”ٹھیک ہے“ خدا حافظ“ میں نے ریمپور رکھ دیا حصار ایک بار پھر فائلیں اپنے سامنے کھسکا لیں۔

اس سے اگلے روز مجھے کراچی جانا پڑا۔ ایک دن بعد واپس آیا تو بارہری در خریداریا میٹوں سے طویل ملاقاتیں رہیں۔

چوتھے دن شام کو جبکہ میں دفتر سے اٹھ کر فائلیں کے ایک سیو رنڈل کی ایک میٹنگ میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا ”فون کی کھنٹی بجی“ دوسری طرف سردار شاہ تھا۔

”مکمل رپورٹ حاضر ہے سرا“ وہ ہمارے لیے میں بولا ”اس قلم ساز کا نام اسلم ملک ہے۔ ستارہ کو ہلاک کرنے کی دو مرتبہ اور اسے قتل کے الزام میں پھانسی کی ایک مرتبہ جو کوشش کی گئی تھی اس کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ ریو کے گھوڑے کو خطرناک روکا کا انجکشن لگانے کے لئے سلیم نامی ایک بد معاش کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کام کا اسے ایک ہزار روپیہ ادا کیا گیا تھا۔ جس وقت ریو کا گھوڑا اس کے گھر کے قریب رابع سبزہ دار میں چر رہا تھا اس وقت گھوڑے کو انجکشن لگایا گیا تھا۔ ایک اور بد معاش سڑک کے قریب کھڑا تھا کہ اگر کوئی آتا دیکھائی دے تو وہ سلیم کو خبردار کرے۔ انجکشن سنت گھر کے ایک شخص عبدالمالک سے حاصل کیا گیا تھا جو حیوانات کا ڈاکٹر ہے اور اپنی کلنی میں ڈیگر ڈاکٹر کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ایک ضرورت مند سا آدمی ہے“ اس کی آمدنی بے حد قلیل ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکھا۔ اس کے انداز سے میں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کبھی ہوئی رپورٹ پر حیران رہا ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ زبانی ہی اس طرح بول رہا تھا۔ اس قسم کی چیزیں ہم کبھی تحریری شکل میں لانے کی زحمت ہی نہیں کرتے تھے۔

تدریجاً وقت کے بعد وہ بولا ”اور وہ جو شوٹنگ کے دوران ہماری لائشیں اور آہنی پٹی گرنے کا واقعہ پیش آیا تھا اس کے پیچھے بھی اسلم ملک کا ہاتھ تھا۔ اس کے لئے ایک لائش میں کو استعمال کیا گیا تھا لیکن وہ لائش میں ان میں سے نہیں تھا جو آپ کی شوٹنگ کے وقت کام کر رہے تھے۔ اس لائش میں کو

ماتجی مجھ سے ملنے کے منتظر تھے۔ ستارہ بھی موجود تھی۔ لوگوں سے ملنے لگے اور دھکی باتوں کے تبادلے کے بعد میں اور ستارہ ایک طرف جا بیٹھے۔ تقریریں وغیرہ شروع ہو چکی تھیں۔ پہلے مسلمان خصوصاً جو کہ وزارتِ خفایت کے ایک اعلیٰ افسر تھے، پاس آئے۔ پیش کیا گیا جس میں برسوں پرانے مخاطبات دہرائے گئے تھے کہ قلمی صنعت کے لئے یہ کیا جائے، وہ کیا جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ مسلمان خصوصاً اس کے جواب میں بڑی حوصلہ افزا تقریر کریں گے، تھوڑی سی تنقید کریں گے، کچھ حوصلہ دیا جائے گا۔ پتہ بندے کریں گے، بنیادیں وہ کل دھڑکتے ہی بھول جائیں گے۔ حتیٰ کہ ایسوی ایفیشن کے اگلے سالانہ ڈنر کا دن آجائے گا جس میں کوئی اور مسلمان خصوصاً آئے گا جس میں ایک یا پھر اسی قسم کی تقریریں اور جوابی تقریریں ہوں گی اور پرمانہ رہیں۔ ستارہ بے گام۔

پاس آئے کے بعد ایسوی ایفیشن کے بعد سے وادوں نے تقریریں شروع کر دیں۔ ہم بول کر میں گئے، ہم وہ کریں گے، ہم یہ کرنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پتہ اسی قسم کی باتیں دہری تھیں۔ میں بھی بڑا اڑی۔ ستارہ بھی تقریریں سننے لگا تھا اور کبھی ان کی طرف سے دھیان ہٹا کر اپنے بعض معاملات کے بارے میں غور کرنے لگا تھا۔ اکابر کا مسلمان اب بھی آ رہے تھے اور جہاں جگہ مل رہی تھی بیٹھ جاتے تھے۔

اسی دوران کمرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں ایک خاصا دراز قد اور بھاری بھر کمز آدمی ہالی میں داخل ہوا۔ ستارہ نے مجھے کسی مار کر اس کی طرف متوجہ کیا لیکن اس وقت تک وہ اگلی قطار میں نظر آنے والی ایک خالی کرسی کا رخ کر چکا تھا اس لیے میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔

میں نے سوائیل نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے سر کوٹھی میں بولی "میں نے اپنی زندگی کی کمائیاں تمہیں سناتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ جب میری پہلی فلم ویلیز اور کامیاب ہوئی تو ایک خاصے بیٹے فلسفہ دان نے مجھے پیش کش کی تھی کہ اگر میں اس سے اس کی مرضی کے مطابق رسم و رواج دیکھوں تو وہ مجھے بہت اچھی کوٹھی اور کار خیر دے گا۔ پھر ایک معقول رقم بابتہ بھی دے گا۔"

"ہاں... مجھے یاد ہے کہ تم نے ایسی کوئی بات کی تھی" میں نے سر کوٹھی میں کہا "تم نے غالباً اسے بے سخت انداز میں فرمایا جواب دیا تھا۔"

"ہاں... لیکن کم از کم بظاہر تو اس نے برا نہیں مٹایا تھا کیونکہ ہماری دنیا میں اس قسم کے اقرار اور انکار چلنے ہی رہتے ہیں۔" ستارہ سر کوٹھی میں بولی "یہ جو انجی سیاہ سوٹ میں ایک شخص اندر آیا تھا یہی تھا وہ فلسفہ دان۔"

"اور...." میں نے ہنسنے سے کہنا اور غیر محسوس طور پر اس

مجلس کی صورت دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا رخ متوجہ اسٹیج کی طرف تھا اور ہم اس سے کئی قطاریں پیچھے تھے۔

"آج کل کیسے مراسم ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رہی ہے۔ جیسے ہر ایک سے ہوتے ہیں" ستارہ نے جواب دیا "بھی سامنا ہو جاتا ہے تو جس کرنا ہے حالانکہ میں اس کی دو فکروں سے انکار بھی کر چکی ہوں۔ اس نے بہت زور دیا تھا۔ کہتا تھا "یہ دونوں فکروں کا کیا ہے؟ اس وقت تو تمہیں فکروں کی ضرورت رہی ہوگی" میں نے کہا۔

"پہلے تو یہ شخص مجھے صرف پابند تھا کیونکہ اس کے مزاج میں بڑی فروغیت تھی، پتہ وہ دنیا کی ہر چیز کو خرید لینے یا تھپ کر لینے کی طاقت رکھتا ہے" ستارہ پلٹ رہے ہوئے بولی "لیکن پھر مجھے اس سے کچھ کچھ خوف بھی محسوس ہوتا تھا جادو نامہ میں زندگی کے کسی بھی معاملے میں آسانی سے ڈرنے والی عورت نہیں ہوں۔ یہ شخص مجھے ان لوگوں میں سے محسوس ہوتا ہے جس سے کسی بھی قسم کا کوئی قتل نامہ لکھنے کو بل نہیں ماننا۔"

"دلچسپ شخصیت، معلوم ہوتی ہے۔ ڈنر کے دوران اس سے میرا تعارف کرنا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خدا خدا کر کے تقریریں اور جوابی تقریریں ختم ہو گئیں اور ڈنر کے لئے مسلمان، دوسرے اپنی اپنی طرف چلے گئے۔ ڈنر کے دوران عورتوں اور مردوں کی ٹوئیاں پلٹیں، سنبھلے اور اوجھر بکھر گئیں۔ خوش گپیں ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی طرف سے کوئی مترنم قہقہہ سنائی دے جاتا۔ اتفاق اپنی برادری میں خاصا مقبول آدمی معلوم ہوتا تھا، اوجھر جاتا لوگ اسے گھیر لیتے۔ میں اور ستارہ اپنی ٹائیں سنبھالے ایک طرف کھڑے تھے۔ بہت سے لوگ بار بار کنگ انھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران ستارہ اوجھر اور دیکھنے لپڑ بولی "مڑ مڑ کر دیکھنا.... وہ شخصیت ہماری طرف ہی آ رہی ہے جس سے تعارف کرانے کی تم نے فرمائش کی تھی۔"

"اوہ...." میں نے صرف اتنے کہا اور بظاہر اپنی بیٹھتے کی طرف متوجہ رہا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ کوئی ہمارے دائیں طرف آنے لگا ہوا تھا جس میں جے اور ستارہ نے بیک وقت چوکنے کی اداکاری کی اور گردن کھٹک کر دیکھا۔ یہ وہ سوٹ میں ایک کچھ ختم، سرور، مضبوط اور جڑھر شخص ایک ہاتھ پیٹا اٹھا کے ہمارے قریب کھڑا تھا۔

"ارے.... ملک صاحب.... تم کیا حال چال ہیں؟" ستارہ نے مصنوعی جوش و خروش سے کہا۔ "اپنے حال چال تو بیشک ٹھیک ہی ہوتے ہیں ستارہ، کچھ دھمک دھمک بھاری اور گونگوار سی آواز میں بولا "آپ اپنی سائیں۔"

میں ہال کی مدھم دھن میں ایک ٹھک اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن سنا رہا تھا اور میں دم بخود سا کھڑا سوچ رہا تھا کہ میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں؟ میں اپنے آپ کو کیسی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ستارہ نے گویا تصدیق کر دی کہ میں جو کچھ سمجھ رہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔

ستارہ کہہ رہی تھی ”اُن سے ملو اُنی یہ ملک اسلم صاحب ہیں۔۔۔ بہت بڑے فلساز۔ بنیادی طور پر زمیں دار ہیں مگر کالی۔ عرصے سے قلم اندسڑی کو بھی بڑا وقت دے رہے ہیں۔ بہت سی کامیاب فلمیں بنائی ہیں انہوں نے“ ستارہ نے دو تین فلموں کے نام بھی لائے لیکن وہ میں نے نہیں سنے۔

پھر ستارہ نے اس سے پیر اتعارف کرایا ”اور ملک صاحب! یہ ہیں محمد افضل چمہری۔۔۔ بہت بڑے پرنس ہیں۔ کچھ عرصے سے خود اہمیت ان کا بھی قلم اندسڑی سے تعلق استوار ہو گیا ہے“ ”ارے ملک صاحب! یہ چاہے ہمیں نہ جانتے ہوں لیکن ہم تو غائبانہ طور پر انہیں بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ بڑے چرچے ہیں ان کے قلم اندسڑی میں۔ ہر بیرونی دل ہی دل میں ان سے ملنے کی آرزو لے پھر رہی ہے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے ہیں یہ اندسڑی میں“ وہ اپنے لیے کو خوشگوار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا لیکن میں اس لمحے میں چپے ہوئے حسد اور طنز کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے ججے پلیٹ میں رکھ کر مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے گویا اپنی طاقت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ اس کا ہاتھ بھی اس کے تن و توش کی مسابقت سے خاصا لمبا چوڑا اور آہنی سا تھا۔ میں نے بھی نہایت آہستگی سے اسے احساس دلایا کہ وہ کسی کمزور آدمی سے مصافحہ نہیں کر رہا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آئے سانسے کھڑے تھے۔ وہ قدم میں مجھ سے ذرا نکلتا ہوا ہی تھا۔ میں نے دیکھے لمحے میں کہا ”اس خوبصورت اطلاع کا بہت بہت شکر ہے ملک صاحب کہ ہر بیرونی مجھ سے ملنے کا ارمان۔۔۔ دل میں لئے پھر رہی ہے۔ اگر یہ اطلاع مجھے کچھ پہلے مل جاتی تو میں خود باکران معزز خواتین سے مل لیتا۔۔۔“

اس نے ایک گونجدار سا قہقہہ لگا کر میری بات کاٹ دی اور بدستور زہریلے سے لہجے میں بولا ”لیکن اب تو آپ کو واقعی اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اندسڑی کی حسین ترین عورت آپ پر صبا ہے“ اس نے آنکھوں سے ستارہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”جن پر ان کی نظر نہایت ہو ان کی نظر کسی اور طرف انہی نہیں لگتی۔“

میں نے اس کے نظریے کی تردید کی مگر بھی ضرورت نہیں

سمجھی اور بدستور اس کی آنکھوں میں مجھانگے ہوئے کہا ”ہے ٹھک۔ لیکن آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ ستارہ سے میرا تعارف قلم اندسڑی میں نہیں ہوا۔ اتفاق سے ہم دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ اور جہاں تک میرے قلم اندسڑی میں آنے کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ میں قلم اندسڑی میں آیا ہی نہیں ہوں۔ میرے پاس اب بذات خود کوئی نئے پرنس پر عملی توجہ دینے کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔ قلم اندسڑی میں تو میں نے صرف اپنا ایک نمائندہ چھوڑا ہے لیکن بہر حال۔۔۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس زمانے آپ جیسے لوگوں سے ملاقات ہونے لگی ہے۔“

وہ ایک بار پھر زور سے ہنسا۔ اسی دوران اسے غالباً کوئی شٹل سائیکل نظر آئی تو زور کھڑی منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ہم سے معذرت کر کے اس کی طرف بڑھ گیا اور ستارہ نے گویا سکون کی سانس لی۔ میں کئی لمحے تک ملک اسلم کی طرف دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ عورت سمیت سہانوں کے جھوم میں میری نظریں اور قلم ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ ملک صاحب نے تم پر بادلوں کو دیکھا؟ ایک ٹھک اسی طرف دیکھے جارہے ہو جدھر وہ گئے ہیں“ بلاخر ستارہ بولی۔

میں جب بولا تو اپنی آواز مجھے ٹھک جھانپوں میں سانپ کی سرسراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی ”ستارہ! انہیں معنوم ہے یہ ملک اسلم ہی وہ شخص ہے جس نے اس گھوڑے کو بچھل لگوا دیا تھا۔ جس پر سوار ہو کر تم سوت کے منہ میں جاتے جاتے پتی تھیں۔ اسی نے اس بات کا اہتمام کرایا تھا کہ شوٹنگ کے دوران تم پر ہماری لائسنس اور پنی گریزے اور اس نے معنوی خنجر کی جگہ اصلی خنجر رکھ کر تمہیں قتل کے الزام میں پھنسانے کا بندوبست کیا تھا۔ ان سب سازشوں کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔“

”نہیں۔۔۔“ ستارہ کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے پٹی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں ”لیکن یہ تو مجھ سے بیش بہا بڑی خوش ظنی سے مل رہا ہے۔“

”تمہارا خیال ہے کہ سب لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہو آئے وہ ان کے چہروں سے نمایاں ہو جاتا ہے؟“ میں نے استہزاء سے لہجہ میں کہا۔

”لیکن پھر بھی۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ بھلا اسے اتنے لمبے چہروں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ بدستور حیرت زدہ تھی اور مجھے اس کی حیرت پر حیرت ہو رہی تھی۔

”تم نے اس کی پیش کش ٹھکرائی تھی۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تم نے اسے ہی ٹھکرایا تھا۔ تمہارا خیال ہے کہ تمہارا جانی دشمن بننے کے لئے یہ دھوکا نہیں تھی؟“ میں نے پلیٹ قریبی میز پر رکھ کر ٹھک سے ہاتھ پوچھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تاکہ ہماری دنیا میں اس قسم کے انکار اور اقرار
 پہلی بار رہتے ہیں۔ ایک عورت سودے بازی پر تیار نہیں ہوتی
 ذہن مند لوگ تو نہیں اور سہی ہنگامے ہوتے دوسری کی
 طرف چل دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کوئی دھکی چھین بات نہیں کہ
 دولت مند لوگ ایک سے ایک بڑھ کر حسین عورت مل بھی جاتی
 ہے۔ ستارہ دھتے لیے میں بولی "میرا یہ تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہ
 اگر اتنی ہی بات کے لئے کوئی اتنی لمبی سازشوں اور چکروں میں
 مبتلا ہے۔ اس میں رسک بھی تو اچھا خاصا تھا۔ اب میں ایک
 خاص نامور بیرونی ہوں۔ اگر میں عوامانی طور پر سریانی تو نشی
 اچھی خاصی باریک بینی سے ہوتی اور میں ممکن تھا کہ پولیس کوئی
 سراپا کا بلا غراس تک جا پہنچتی۔"

میں نے قدرے ترحم آمیز سے انداز میں ستارہ کی طرف
 دیکھا اور ملامت سے کہا "تو تم بہت چالاک اور ہوشیار ہو لیکن
 کبھی کبھی جوں کی طرح مصدوم لگتی ہو۔ تم شاید ان معاملات کو
 نہیں سمجھ سکتیں۔ اس نے تجھ سوچ کر کوئی بندہ دوست کر کے ہی
 ہر دم اٹھایا ہو گا۔ دوسرے تم بے شک ہر قبیل کے مردوں کی
 نفسیات کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو گی لیکن ضروری نہیں کہ
 تم ملک اسلام کو بھی سمجھنے کا دعوہ کر سکو۔ شاید وہ اپنی بات کے
 جواب میں انکار سننے کا عادی ہی نہ ہو۔ شاید انکار سننا اس کے
 لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔ وہ ایک برا زمیندار ہے اور
 ایسے لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر ان کی فطرت میں بھلائی اور
 نیک طبیعت کا پلڑا بھاری ہو جائے تو یہ اپنے حلقہ اثر اور اپنے ارد
 گرد کے لوگوں کے لئے فزیت رحمت اور ان کی ذات دوسروں
 کے لئے بلاء گاہ بن جاتی ہے لیکن اگر ان کی فطرت میں منفی
 خاموشی کا پلڑا بھاری ہو جائے تو پھر یہ قہر و تشدد اور سازشیت
 کے ایسے پیکر ہیں ذہل جاتے ہیں کہ ان کے کرمات کچھ کر انسان
 نہیں نہیں کہنا کہ یہ اسی دنیا کے لوگ ہیں۔ تم جن باتوں
 پر جبران ہو رہی ہو وہ تو بالکل معمولی سی باتیں ہیں۔ اس کے نوشتہ
 اعمال میں تو بات کیا کچھ درج ہو گا۔"

ستارہ کے ہونٹ نیم وا تھے۔ وہ بس حیرت سے میری طرف
 دیکھ رہی تھی۔ شاید میرے چہرے سے کچھ عیاں ہو رہا تھا۔
 میرا نہ کوئی شش کی کہ میں اپنے آپ کو بالکل تاریک ظاہر کروں
 نہ کہ میری نابت بھی تھی۔ شاید فیہ اراہی طور پر میری آنکھوں
 میں فطرت سے اس الود کی جھلک نظر آتی تھی جسے میں نے سینے کی
 مضبوط چادر پر اراہی میں مقید کیا ہوا تھا۔ شاید یہی جھلک دیکھ کر
 ستارہ زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔

میں مسکرایا تو اس کے چہرے پر قدرے طمانیت نظر آنے
 لگی۔ میں نے ملامت سے کہا "ملک اسلام کو خوار تم یہی نہیں سمجھ
 رہی ہو۔ اسٹوڈیو میں ہمارا جو دفتر ہے وہ اتنے اہمیت کے لئے شاید
 اپنے کسی جیسے کے لئے لینے کا خواہش مند تھا۔ اس نے وہ گویا

ایک تیرتے کی شکار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم خوش قسمت
 تھے کہ اب تک اس زہریلے سانپ سے بچتے رہے ہیں لیکن میں
 یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم کب تک بچ سکیں گے۔"
 "تم میرے ساتھ ہو اور جب تک میرے دوست ہو تب
 تک مجھے کوئی فکر نہیں" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

کافی دیر کا انتظام ایک الگ میز پر تھا لیکن میں نے ایک
 دیر سے کہا تو وہ ہمارے لئے کافی بنا کر دینے لے گیا جہاں ہم
 کھڑے تھے۔ کافی کی چمکیاں لیتے ہوئے ستارہ نے ایک بار پھر
 ملک اسلام کی کوئی بات شروع کی لیکن میں نے ملامت سے کہا۔
 "چلو اب دفع کو ملک اسلام کو... یہ اتنی خوبصورت شام ہے۔
 یہاں تم موجود ہو۔ اتنے بہت سے دوسرے حسین اور ہنرمند
 لوگ موجود ہیں۔ ابھی ہم نے بہت اچھا کھانا کھایا ہے۔ اب تو
 ہماری آنکھوں میں ستارے اور ہماری رگ و پے میں شمار ہونا
 چاہئے۔ ایسے موقعوں پر اتنی بد صورت باتیں کرنا بڑی ناشکری
 ہے۔ کھڑا نہفت ہے۔"

وہ ہنس دی۔ وہی حیرت منی تھی جس کے لئے جنت تک کی
 تشبیہ بھی کچھ ناموزوں سی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے چہرے سے
 ناز و دور ہو گیا تھا اور ایک بار پھر وہی ملامت دہی دکلائی اور وہی
 ٹھنڈا ہٹایا تھا جس کا میں کبھی کبھی اس پر نہ لگتا تھا۔ میں جب
 اس کے گھبراتے دایں آتا تھا تو ہنسنے لگتا تھا کہ آپ کو اس کے سحر
 سے آزاد کرنا تھا۔

ابھی وہ کسی خوبصورت بات کی تمہید بنی پاندھے لگی تھی کہ
 اتفاقاً کئی آدمیوں کو ساتھ لئے میری طرف آگیا۔ ان سے میرا
 تعارف کراتے ہوئے وہ بولا "یہ سب ہماری انڈسٹری کے اہم
 سہیون ہیں اور انہیں آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا" پھر وہ قہر و تشدد
 ان سب کا نام اور کام کا پتا لگاتا تھا۔ میں جی الامکان خوش خلقی سے
 ان سب سے ملا اور دیر تک ادھر ادھر کی کچھ رسمی اور کچھ غیر
 رسمی سی باتیں ہوتی رہیں۔

بالآخر لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے تو میں اور
 ستارہ بھی نیچے آئے اور دو گلی سے باہر نکل گئے۔ ستارہ کا
 ذرا میوہ رات لینے کے لئے موجود تھا۔ دو گلی کے برآمدہ نمائش
 میں روک کر ستارہ نے ہم دونوں آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔
 اب اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔
 "اگر تم چاہو تو میری طرف چلو" وہ دھیمی آواز میں بولی۔
 "میں آج فارغ ہوں۔"

"لیکن آج میں بہت مصروف ہوں" میں نے جواب دیا۔
 "تھماری یہ حسین دعوت مجھ پر ادھر دہی ایک احسان کی طرف ہے"
 اس نے قدرے مایوسی سے گردن کو خفیف سا بٹکا دیا اور
 ذرا پیچہ کی طرف چل دی جو کچھ فاصلے پر گاڑی لئے کھڑا تھا۔ میں
 پارکنگ لائن کی طرف چل دیا۔ اتفاقاً وہ ہم دونوں ہی خدا حافظ کہہ

آئے تھے۔ وہ ابھی تک وہیں لوگوں سے باتوں میں الجھا ہوا تھا۔
میں نے پارکنگ لائٹ سے گاڑی نکالی اور نہایت سست
رفتاری سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے ستارہ سے غلط نما
تھا کہ میں بہت مصروف ہوں۔ درحقیقت مجھے کوئی مصروفیت
نہیں تھی۔ لیکن میری رگ دپے میں ایک الگ بگڑک رہی تھی۔
وہیں نہیں جانتا تھا کہ اس عالم میں کوئی میرے قریب آئے۔
مجھے تنہائی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

میں رات گئے گھر پہنچا تو تنہائی کی بے کراں جمیل میری منتظر
تھی۔ میں اسی تنہائی کی طلب میں گھر آیا تھا۔ اس طویل و عریض
کوٹھی میں صرف چار پانچ نوکر رہتے تھے جس کی موجودگی کا
احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت ویسے بھی سب نابالغ
سرونت گوارڈز میں جا چکے تھے۔ صرف چوکیدار کٹ کے عقب
میں اپنے چھوٹے سے سین میں موجود تھا۔ اس نے کیت گولا
اور میں گاڑی پورس میں چھوڑ کر اوپر کی منزل پر واقع اپنے خاص
کمرے میں جا پہنچا۔

زندگی میں بہت کم چیزیں مجھے پریشان کرتی تھیں اور میرے
سکون میں ظلمی ذاتی تھیں۔ میرے حالات نے مجھے اپنے
اعصاب اور جسم دونوں کو فوڈائی بنانے میں بڑی مدد دی تھی۔
میں نے اس چیز کی بھی بڑی مشق کی تھی کہ مجھ پر بھی افسردگی کا
غلبہ نہ ہو۔ لیکن شاذ و نادر اگر مجھ پر شکستگی، بے سکونی، افسردگی یا
معمول سے بہت کم کسی اور کیفیت کا حملہ ہوتا تو میں اس خاص
کمرے میں آجاتا تھا۔

یہ کمرہ خاص طور پر میری فراکش پر ڈیزائن کیا گیا تھا۔ اس
کی آرائش اور سافٹ اس قسم کی تھی کہ اس میں چنچ کر دنیا سے
کٹ جانے کا احساس ہوتا تھا۔ یہ ساؤنڈ پروف بھی تھا۔ سامنے
کے دروازے پر اس کی دیوار میں ایک بڑا سا تاریک شیش لگا ہوا تھا۔
اگر مجھے باہر کی دنیا کو دیکھنا مقصود ہوتا تو میں اس شیش کے بلاسٹرز
بنا دیتا تھا۔ وگرنہ میں مقید ہو کر بیٹھ رہتا تھا۔

اس کمرے میں داخل ہو کر میں نے دروازہ مقل کر لیا۔ میں
کوئی غادی پینے والا نہیں تھا لیکن اس کمرے میں ایک باریبی
موجود تھا۔ میں نے نہایت مدغم لائٹ جلائی، اپنے لئے ایک
ڈرنک تیار کی اور صوفے میں دھس گیا۔

چند لمحوں میں گویا دنیا سے واقعی میرا راجہ ٹوٹ گیا۔
میں کسی اور ہی دنیا میں ہلکے سے لے رہا تھا۔ یہ شاید میرا باطنی تھا
... ایک سمندر جس کے علاطہ میں میرا نام تو اس وجود بھی گھر رہا تھا
بھی سمٹ رہا تھا۔ یا شاید یہ ایک جھلٹا صرا تھا جس میں میں آئینہ
پاؤں سے اور حرم کدہ راہ، بے منزل دے نشان گرتا یا پھر برا
تھا۔ اس صرا میں میرے سر پہ ایک ہی سائبان تھا جو مجھ سے
چھین لیا تھا۔

وہ سائبان میرے باپ کی شخصیت تھی۔ میرا "مسموم باپ"

ایک سیدھا سادا سادہ سادہ انسان، مگر بے پناہ محبت کرنے والا
جس نے مجھے باپ کی شفقت ہی نہیں، ماں کی مست بھی دی تھی۔
لاہور میں ایک وی تو میری پناہ گاہ تھی۔ کیا محظوظ و ماضی
محسوس کرتا تھا میں اپنے آپ کو اس کے سامنے۔ اور پھر
مسموم سے انسان کو کاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کر پیسنگ دیا گیا تھا۔
کسی نے اس کے قتل کی صحیح طرح سے تفتیش کی بھی نہ تھی۔
کی تھی۔ کیونکہ یہ ایک مطلق اور نادر رسائی تھا۔ بے حلا
بے وسیلہ اور اس معاشرے کے مذمت خانے میں بالکل بے اثر
وفا اور بے مقام۔

اپنے چلنے والے چہرے پر فنی محسوس کر کے میں نے چہرے پر
باتھ پھیرا تو احساس ہوا کہ میں رو رہا تھا۔ مجھے اپنی ہلکی
آنکھوں کا لمس بہت اچھا محسوس ہوا۔ محبت کرنے والے باپ
کی یاد میں رہنے والے آنسو میرے موتیوں سے زیادہ قیمتی
قیمت تھے۔

آج مجھے ابا کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔

جب میرا میٹرک کارڈ مل گیا تھا تو وہ کیسے اشتیاق سے
پکڑی سنبالے اخبار کی تلاش میں مجھ سے بھی آگے آگے بھاگی
کی گلیوں میں دوڑے دوڑے پھر رہے تھے اور جب انہوں نے نا
تھا کہ میں نے تھراڈ ڈیزائن میں میٹرک پاس کر لیا ہے تو ان کے
چہرے پر کیسی آسودگی اچھی تھی۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے
امتحان میں باپ کر لیا ہو۔ کیسے فکرتے انہوں نے دونوں ہاتھ
انکار انسان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا "اندھیرا شکر ہے کہ
تو نے آج ہمیں عزت اور کامیابی سطا فرمائی۔ خدا یا! اختیار ابراہیم
ہے کہ ہمارے خاندان میں بھی کوئی لو کا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔"
انہوں نے کئی مرتبہ میری پیشانی چومی تھی اور ان کی
آنکھوں سے فکرت کے آنسو چھٹک رہے تھے جو ان کی عشق
دار وحی میں جذب ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے صدری کی جیب
ٹٹولی کر اپنی کل پونجی دو روپے آٹھ آنے نکال کر مجھے دینے ہوئے
کہا تھا "جاؤ بیٹا، تم کو طوائف کے ہاں سے کچھ لٹو لے کر اپنے
دوستوں کا منتھنا کرو" ان جیبوں سے کسی کام نہ بیٹھا کرانے
کے بجائے میں نے اور میرے لشکر نے دوست راجو نے قلم دیکھی
تھی۔

پھر مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب مجھے انٹر کا امتحان دینا تھا اور ابا
نہ جانے کیا چیزیں کر میرے لئے امتحان کی فیس اور دیگر واجبات
کا بندہ دست کر کے آئے تھے۔ میں نے کہا تھا "ابا! انٹر آپ مجھے
مزید تعلیم کیوں دلانا چاہتے ہیں؟ ہمیں وہ کیا پھر شہر باکر میں
چھوٹی مولیٰ نوکر تو اب بھی کر سکتا ہوں اور ہم پر کوئی اتنا زیادہ
بوجھ بھی نہیں ہے کہ ہمیں زیادہ کمائی کی ضرورت ہو۔"

ابا نے جڑی اتار کر چھوٹی ہاتھوں میں انکیاں پھیرتے ہوئے
کہا تھا "بیٹا! بات صرف کمائی کی نہیں ہوتی۔ انسان کے سچے

کر اپنے دشمنوں کے غمزد و غصب کا نشانہ بننے کے لئے بھیج دیا تھا۔ ایک میرے ابائی نہیں ان جیسے نہ جانے کتنے سارے، موصوم اور بن سول کہے ہوئے انسان ان بڑے زہیں داموں کی تہیں کی لڑائیوں میں جا کر سری کی طرح ٹٹ جاتے تھے اور انہیں احساس تک نہیں ہوا تھا کہ ایک انسان کے مرنے سے کتنے انسانوں پر پڑے یا کیا فائز میں ٹوٹ پڑتی ہیں اور جانے کتنی کمائیاں اور سوری وہ جاتی ہیں۔

اور آج اپنے باپ کے قاتل سے میری ملاقات ہو گئی تھی! آج میں جس ملک اسلام سے مل کر آیا تھا یہ وہی تھا جس نے مجھ سے میرن عزیز ترین ہستی جیمین لی تھی اور اس کی نظر میں اس ہستی کی اہمیت و رخصت سے ٹوٹ جانے والی شاخ جتنی بھی نہیں تھی۔ یہ وہی ملک اسلام تھا جس کی حویلی کی بلند و بالا دیوار سے کھڑے ہو کر سترہ افراد برس کے ایک مظلوک اٹھال "بے بس اور تاردار لڑکے نے قسم کھائی تھی "ملک! اگر زندگی نے وفا کی تو میں تجھے کتنے کی سوت ماروں گا۔ میں ایک روز ضرور تیرے لئے فرشتہ اہل بن کر واپس آؤں گا۔"

یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ مجھے اس کے اصل گھر کی چار دیواری تک نہیں جانا پڑا تھا۔ وہ خود ہی اس زندگی کی تماشاکار میں مجھ سے آکر آیا تھا۔

میں نے سنا کہ تو صرف یہ بتایا تھا کہ اس شخص نے اسے مروانے اور مجھے کا دیواری اور جیڈائی نقصان پہنچانے کی سازش کی تھی۔ میں نے اسے تعذ نہیں بتایا تھا کہ اس شخص کے ذمے میرا کتنا پرانا اور کیسا ناقابل معافی قرض نکل آیا تھا۔ میں نے ملک اسلام سے مصافحہ کرتے ہی اسے پہچان لیا تھا اور اس وقت اپنے تاثرات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ پر قیامت سی جیت تھی۔ لیکن اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ وہ بھلا پہچان بھی کیسے سکتا تھا؟ ایک بے وقعت مزاح کے روئے ہلکے لڑکے کی تصویر بھلا اس کے حانٹے میں کہاں محفوظ رہ سکتی تھی؟ انہی نہ جانے کتنی زندہ تصویریں آئے دن اس کی نظروں سے گزرتی تھیں۔ اگر میری وہ تصویر اس کے ذہن میں محفوظ رہی بھی ہوتی جب بھی مجھے آج وہ نہ پہچان پاتا۔ کیونکہ گزرا۔ ہوئے گنتی کے کچھ برسوں میں انقلابات و تغیرات کا ایک سلسلہ تھا جو میں پہلا تک کر آیا تھا۔ ایک طویل صراحتاً جو میں نے عبور کیا تھا۔ وہ لڑکا جسے گاؤں والے "جیو کہہ کر پکارتے تھے اور آج کا کھڑا افضل چوہدری عرف الی۔ ان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ملک اسلام اس انقلاب کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے نکاس خانی کر کے ایک طرف رکھ دیا اور اندر چل کر دیوار میں نصب شیشے کے پاس قن کھڑا ہوا اور اس کے اندر نظر بند بنے۔ اس شیشے کے عقب میں اگر بدانت ذہن ہوت تب بھی باہر سے کچھ نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ اندر سے البتہ باہر کی طرف سے

زباب بھی ہوتے ہیں۔ میری تنہا ہے کہ تم رہیہ بھی ضرور کھاؤ لیکن ساتھ ہی کوئی بڑے اور مشہور آدمی بھی جو۔ لوگ تھماری عزت کریں، تھیں جانیں، تھیں پچائیں۔ دوسرے تو بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے لیکن وہ سب مشہور و تھیں ہوتے تھے "پھر جیسے ان کی نظریں اپنے خوابوں کی بھول حلیوں میں بھٹکتی گئی تھیں۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ شرمیں تھمرا کوئی بڑا سا بھگا ہو" تھمرا ہی ہوئی کہ پڑھی تھیں، "میں قسم کی عورت ہو۔ فصل آنے پر ہی تم لوگوں کے لئے کبھی پیاز، لکسن کی بونی یا مگوں کا ٹھکرے کرنا کروں اور پچکے کے باغیچے میں کھیتے ہوئے میرے گول منول پڑے پوچاں شور مچایا کریں "دادا دانی آگئے۔ دادا دانی آگئے "پھر وہ دھڑک میری ہانگوں سے چٹ جایا کریں۔"

میں نے وہ جیسی آواز میں کہا تھا "ابائی! اگر میں بڑا اور امیر آدمی بن گیا اور شرمیں میرا بھگا ہو تو کیا آپ میرے ساتھ نہیں رہیں گے؟"

ابائی نے سر کھجاتے ہوئے کہا تھا "نہیں بیٹا، میں تو بالکل بد حال وادیاں ہی قسم کا آدمی ہوں۔ میں بھلا پچکے میں رہتا کہاں اچھا لگتا گا۔ میں تو تھیں گاؤں میں رہا کروں گا۔ بس مینے دو مینے بدلتے آجیا کروں گا۔ تم بس اتنی مہربانی کرنا کہ اپنے دوستوں کو یہ غلامت شروع نہ کرونا کہ یہ بڑھا ہمارا نوکر ہے۔ بیساکہ کئی دولت مند اور بڑے کھسے بنے اپنے وصاتی اور ان پر وہ والدین کے بارے میں کتنے کہتے ہیں۔ تم مجھے ابائی ہی کا کہنا۔ ایکٹ میں بھی اور سب کے سامنے بھی تاکہ میں جی بھر کے اس خوشی کو محسوس کر سکوں کہ میں ایک لائق، مشہور اور دولت مند بنے گا باپ ہوں۔"

اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ انھ کر ان کے سینے سے چٹ ہاؤں اور کسی نیچے بیچے کی طرح زور زور سے روئے لگوں۔ لیکن ایک عجیب سی جھجک مانع رہی تھی۔ شاید وہی آئسو آج برسوں بعد برسرِ ہے تھے۔

آج میں اس طویل و عریض پچکے کے اس بلائی کرے میں تھابھٹا تھا اور غیر ارادی طور پر رو رہا تھا۔ یہاں میری کوئی مہم تھی نہ بونی یا گول منول بچے نہیں تھے جو دو زکرواد کی ہانگوں سے چٹ جاتے۔ لیکن خود ابائی جی تو اس دنیا میں نہیں تھے جو کھوں کا ٹھکرے! اگر اس پچکے میں آتے۔

ایک حویلی کے طویل و عریض صحن میں چاؤدائی پر رکھی ہوئی ان کی لاش میری آنکھوں میں ابر آئی۔ کھانڈیوں سے ان کے دست و پاؤں تو تھابھٹا پرے کٹ چکے تھے اور پھر ہندوئی کی گولیوں سے ان کی توجہ کی گویا ڈھنگی تھی۔ میرے خیال میں وہ لوگ ان کے قاتل نہیں تھے جنہوں نے انہیں ہلاک کیا تھا۔ ان کا اصل قاتل وہ زمین دار تھا جس نے انہیں اپنا مزاح ہونے کی وجہ سے ایک زور خرید غلام اور قربانی کا ایک بے وقعت بکرا سمجھ

محرواسراہ کی ایک روزگرفنے کھڑی کر دینے والی راستی

حبیب

انوار صدیقی کے قلم سے

550 روپے میں مکمل - 200 روپے

ماہنامہ شمع

اردو بازار لاہور

میں جانتی تھی کہ وہ کوئی ضروری ٹیلیفون کال سننے یا کسی کام میں موصول ہونے کے بعد چند لمحوں کے لئے معذرت کر کے باہر گئے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آتے۔

”وہ تو نمک ہے۔ لیکن اس معاملے میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے“ میں نے ملامت سے کہا ”یہ کوئی چھوٹا سا آدمی نہیں ہے۔“

”میں نے اس معاملے میں جو باتیں کہیں وہ سب سچ ہیں۔“ وہ میرے سے بولا۔

”وہ تو نمک ہے“ میں نے ایک بار پھر اس کی تائید کی۔ لیکن میں اس معاملے سے محفوظ ہونا چاہتا ہوں اس لئے میں نے اپنے نہیں کون کا کہہ کر کسی بھی معمولی سی بات پر احتیاطی یا خوشحالی کے باعث میرے اس چھوٹے سے تقریبی ذرا سے میں کوئی بات نہ کر کر رہا ہوں یہاں پر اس لئے میں سردار شاہ کے ذمے یہ کام نہیں لگا رہا کیونکہ میرے لئے یہ بہت سی زیادہ اہم فوجیت ہے۔“

”آپ مطمئن رہیں سر! اب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا۔ ایک ہفتے بعد میں آپ کو رپورٹ دوں گا“ شیر نے کہا اور

جاسکتا تھا۔ اس وقت گئی کہ وہیں ہو گا عالم تھا۔ عظیم الشان جنگی اور کوششیں آپ کی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کس کس کے لئے تھے لڑا رہے تھے۔

بہت دیر تک میں اندھیرے میں ٹھٹھاتے ہوئے ان قسموں کو دیکھتا رہا۔ نہ جانے کب میں نے راسٹنگ ٹیبل پر سے ایک آواز کی آواز خیر ارادی طور پر اٹھایا تھا۔ یہ پیش کا ایک چمکیلا اور ذوقی شمع دان تھا اور بارہ گنگے کے بیگنوں سے مشابہ تھا۔ میں بے خیالی میں اسے ہاتھوں میں اٹ پلٹ رہا تھا اور ملک اسلام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کب شمع دان پر میری گرفت نخت ہوئی تھی۔

چند لمحوں بعد میں نے ہاتھوں میں معمولی سا درد محسوس کرتے ہوئے ہتھ دے چوٹ کھائی۔ شمع دان میرے ہاتھ میں ہوں تو مزہ کر رہا تھا جیسے وہ محض کوئی کاغذ کی ہی چیز تھی۔ اس بھاری بھرپور شمع دان کو اس حالت تک پہنچانے کے لئے شاید کسی انتہائی شعلے کی ضرورت پڑتی لیکن میرے ہاتھوں میں جانے کب اور کس طرح اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔ کبھی تو مجھے خود بھی اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی کہ کیا میں واقعی اتنا طاقتور ہوں؟ یا پھر کسی موقع پر میری خواہش انتقام اور کسی موقع پر کوئی اور جذبہ میری روگ و پے میں ایسی ناقابل تسخیر قوت بھر دیتا تھا؟

میں نے سزاوارتہ شمع دان راسٹنگ ٹیبل پر آہستگی سے رکھ دیا اور کمرے میں سانس لے کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرے آنسو تنگ ہو چکے تھے اور ہنسنے میں دیکھنے والا کی اذیت کچھ ہو چکی تھی۔ چند لمحوں بعد میں اس کمرے سے نکل کر بیٹے اپنے بیڈ روم میں آ گیا لیکن اس رات میں سو نہیں سکا۔ نیند مجھے صبح کے قریب آتی جب میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

دن چڑھے میں سہرا اٹھا دیا اور کمرے میں نے ناشتا کیا اور آنسو جانے سے پہلے فون پر ایک ٹھہرا کر کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر میں نے دھتے لگے میں کہا ”شیر! ایک شخص کا نام پتا چلا۔“

ذہن نشین کرلو۔ ”میں نے اسے ملک اسلام کا نام دفتر کا پتا اور طریقہ بتایا اور اس کے بعد کہا ”میں چاہتا ہوں کہ اس شخص کی بازگرم ایک ہفتے مکمل نگرانی کی جائے۔ اس کے تمام معمولات کا بے حد احتیاط اور باریک بینی سے جائزہ لیا جائے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ شام ڈھلنے کے بعد اسے اغوا کرنے کے لئے کونسا وقت مناسب ترین رہے گا۔ وقت ایسا ہونا چاہئے جب اس کے اغوا کی کسی کو شک نہ ہو سکے۔“

”آپ حکم کریں سر“ دوسری طرف نے شیر شمع کی توازن بنائی دی جس کی بھیڑ بڑے کی غزابت سے مشابہ تھی ”آپ جس وقت چاہیں“ سے اغوا کیا جاسکتا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ اگر اس کے ارد گرد لوگ بھی موجود ہوں گے تو وہ صرف

نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوبند میں نے معمول کی مصروفیات میں گزارا۔ عام طور پر اپنے توہین کو کسی کام کے لئے کہہ کر اس وقت تک کے ذہل بانا تھا جب تک اس کا موقع نہیں آ جاتا تھا لیکن جو میں نے شیر شیخ کے سپرد کیا تھا اسے میں ذہن سے نہ جھٹک سکتا تھا۔ میری تمام مصروفیات کے دوران وہ میرے تحت الشہور کے کسی نہ کسی گوشے میں رہ جاتا تھا۔ اس دوران میرا اپنے ملازموں کے دفتر میں بالکل جانا نہیں ہوا۔

تک ایک ہفتے بعد سر پیر کے وقت دفتر میں میرے ایک فرد والے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف شیر شیخ تھا، وہ اسے ایک ہفتے بعد فون کر رہا تھا کہ اس نے بات کچھ اس طرح کی تھی کہ میں نے پہلے تک مصروف منقطع نہ ہو سکا تھا اور وہاں میں ذرا دیر کے لئے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ "سر! اس کے مہلات لگے بندھے نہیں ہیں" وہ بولا "اس کی روزانہ مصروفیات تو تقریباً ایک جیسی ہیں لیکن ان کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ وہ اسٹوڈیو والے دفتر جاتا ضرور ہے لیکن کبھی صبح چلا جاتا ہے۔ کبھی دوپہر میں اور کبھی شام میں کبھی بھی وہ اپنی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے بھی چلا جاتا ہے۔ شہر سے باہر اس کی ایک چھوٹی سی ٹھکانہ ہے۔ کبھی کبھی اس کا مکان بھی کرتے جاتا ہے۔ اس کا زیادہ تر مصروفیات عیاشانہ ہوتی ہیں۔ دفتر میں کبھی چھوٹی موٹی لکچرنگ اور دو سو سرائیکان آتی رہتی ہیں۔ وہ خود بھی بعض کے فرائض کرتا ہے۔ شیخ کو وہ اپنے ایک دولت مند دوست کی طرح ہر رات کے وقت گیا تھا رات گئے تک وہ وہیں رہا۔ وہاں کی کاریں پہلے سے موجود تھیں اور رات میں سڑک اکاڈا کاریں لٹی رہیں اور جاتی رہیں۔ اندر کی سرگرمیوں کی صحیح رپورٹ تو عاصی کوئی نہیں دے سکے لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہاں عیاشی کا کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کوئی شخص ہر شیخ کی رات کو یہ اطلاع ہوتا ہے۔ ملک اسلام وہاں سے رات کے پچھلے پہر نکلا تھا اور نئے میں معلوم ہوتا تھا لیکن اس نے اپنی کار صحیح طرح ڈرائیو کی۔ وہ اپنی کار میں اکیلا ہی گھر والوں آیا۔ ہمارے ایک آدمی نے صبح میں اس کو غشی کی گھرائی کی۔ گناہ پہنچنے تک وہاں سے کئی عہدوں کے مزید کچھ ضرور اور ایک خاص فٹاش کی بڑی طرح دار قسم کی چند عورتیں بھی کاروں میں رخصت ہوئی دیکھی گئیں۔ سر! ایسا لگتا ہے کہ یہ کئی عہدوں کے تمام دولت مندوں کا ٹولہ ہے جن کی زندگی کا مقصد کس عیاشی کے ہوا چاہے نہیں۔ دولت سب کے پاس خاص ہے اور بیٹھے بٹھائے آتی ہے۔ سب بس کچھ اسی قسم کی سرگرمیوں میں لگے رہتے ہیں۔ اگر آپ غم دہی تو اسے شیخ کو بھی چیک کر لیا جائے کہ وہ لوگ اس کو بھی پر جتے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ملک اسلام جب وہاں سے واپس آ رہا ہو تو وہی وقت اسے انکار کرنے کے لئے ہر روز

ترین ہے۔ اس دوران اگر وہ غائب ہو گیا تو ہزاروں قیاس آرائیوں کی جاکسیں گی۔ بات الجھ کر رہ جائے گی۔ کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلے گا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے آہستگی سے کہا "بلکہ اس کے شیخ کو اسے صرف چیک کر دو۔ اگر وہ واقعی وہاں جاتا ہے تو وہاں ہی اسے غائب کر دو۔ یہ کام تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدمی ساتھ رکھنا۔ جب تم اسے لے کر روانہ ہو جاؤ تو ایک آدمی کی ڈیوٹی لگانا کہ وہ کہیں سے مجھے فون پر اطلاع کر دے کہ کام ہو گیا ہے۔ میں رات بھر اس فون کا انتظار ہوں گا۔"

"ملک کو لے کر جانا کہاں ہے سر؟" شیر نے ہمارے لیے کہا۔ "میں وہی بتانے لگا تھا" میں نے کہا "جناگیر کے مقبرے کی طرف سے جو سڑک کمال کی طرف جا رہی ہے اس کے دونوں اطراف میں دروازے ہیں۔ مقبرے کے عقب سے سڑک پر پہنچنے کے بعد جو پلاسٹک میل آتا ہے اس طرف بہت تھکے درختوں کا جھنڈ ہے۔ اس جھنڈ کو عبور کر کے اگر ہم بائیں ہاتھ پر ہی مزید آگے دوڑیں تو بہت بڑے میدانی سے ملائے میں پہنچ جائیں گے۔... تمہیں ملک اسلام کو لے کر وہاں پہنچنا ہے۔ گاڑی ختم درختوں کے جھنڈ میں چھپاؤ گے۔ ملک کی گاڑی تو وہیں چھوڑ دو گے جہاں سے اسے قابو میں کر دو گے۔ رات ایسے اختیار کرنا جہاں عیشی پولیس وغیرہ سے سامنا ہونے کا کوئی امکان نہ ہو۔"

"لیس سر۔۔۔ آپ کا یہ چھوٹا سا ایڈوچر آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا" شیر نے جواب دیا۔ "ضرورت محسوس کر دو تو تم ٹرانسپیر بھی استعمال کر سکتے ہو" میں نے کہا "میں ٹرانسپیر بھی سٹیل کا انتظار ہوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ دینے شاید اس کی ضرورت پیش نہ آئے" یہ کوئی ایسی خطرناک قسم نہیں ہے "شیر نے کہا "لیکن بہر حال... مجھے آپ کی جدایت یاد ہے سر۔۔۔ کہ چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی نہایت اہم سمجھ کر سرانجام دینا چاہیے۔"

"بالکل" میں نے طمانیت سے کہا "بہترین نتائج اسی طرح حاصل ہوتے ہیں۔ خدا حافظ۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

امید مجھے یہی لگتی تھی کہ ٹرانسپیر کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آتی گی۔ ہمارے پاس خاص وسیع دائرہ عمل والے ٹرانسپیر موجود تھے لیکن ایک عرصے سے ان کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ان کا زیادہ تر استعمال انہی دنوں میں ہوا تھا جب ہمارے زیر زمین کاروبار عروج پر تھے۔ اب تو وہ دھند سے ختم ہو چکے تھے جن میں ہنگامی ضرورتیں رہتی تھیں۔ میں اس وقت ایک عجیب سی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ جب شیر کسی شکار کی کھات میں بیٹھا ہوتا ہے اور شکار بے خبری کے عالم میں اس کے سامنے سے گزر رہا ہوتا ہے اس وقت شاید شیر کی بھی یہی کیفیت

دوئی، دوئی۔

وہ ہفتہ بھی معمول کی مصروفیات میں گزر گیا اور کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سچہ کی رات کو میں نیم خانہ سے واپس آکر اطمینان سے سو گیا۔ ٹینٹون لی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ فیملی یس جہاں کسب سے پہلے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تقریباً دو بج رہے تھے۔ یہ یقیناً میری مطلوب ٹینٹون کال تھی۔ میری غنودگی ایک دم کا فوراً ہو گئی۔

”کیس...؟“ میں نے رینیور انٹرا کر بشت سے کہا۔
 دوسری طرف سے کوڈورہ سٹائی دیا۔ میں نے جوالی کو ڈورہ بولا تو
 عمری سافس نے کر دوسری طرف سے کہا ”کیا“ سر اور شاہ بول رہا
 ہوں... شبیر نے پارسل اٹھایا ہے اور تھامے ہوئے ایڈریس کی
 طرف روانہ ہو گیا ہے۔ فونی اس کے ساتھ ہے۔ میں وہیں ان
 سے الگ ہو گیا تھا جہاں سے پارسل اٹھایا گیا تھا۔ شبیر نے مجھے
 بدایت کی تھی کہ آپ کو اطلاع کروں۔“

مجھے کچھ ہنسی بھی آئی۔ اور شاید بالکل اسی انداز میں بول رہا تھا جس طرح ہم اپنے دوسرے کاروبار کے زمانے میں بولتے تھے۔
 - بے حد محتاط اور مضبوط۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا کام ختم" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

بند سے نکل کر میں نے نہایت چھپتی سے لباس تبدیل کیا۔
 نائٹ گاؤں وغیرہ کی جگہ سوٹ پہنا، ٹائی گاٹی تاکہ راستے میں اگر
 کوئی دیکھے مجھے تو اسے دور سے ہی اندازہ ہو جائے کہ ایک محرز
 آدمی کسی جنگی ضرورت کے تحت رات گئے کہیں جا رہا ہے۔ چند
 منٹ بعد میری سرسبز رات کی تاریکی اور شانے کا سینہ چیرتی
 مردوں پر فرمائے بھر رہی تھی۔ اس رات اکثر سڑکوں پر اسٹریٹ
 لائٹس تک روشن نہیں تھیں۔

میں جب مظلوم سڑک پر پہنچا تو چاندی ہڈیوں کی آواز سے
 نکل آیا تھا اور چپکے چپکے ہی چاندی نے ماحول کو یکدم منور کر دیا
 تھا مہر یا سیت اور شاٹے میں گویا کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ اس
 دیرانے میں کبھی کبھار صرف جھینگڑوں کی آواز سنائی دے جاتی
 تھی یا چرودور کہیں کوئی گلیہ زلفیادی سے انداز میں چلا اٹھتا تھا
 اس کے بعد بھردی گھرا سکوت۔

سنگ میل نظر آنے کے بعد میں نے کار کچے میں موڑ لی۔
تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد سامنے جمناؤ جمنکار کا سلسلہ
پھیلا دکھائی دیا۔ اس سے آگے ذرہ نٹوں کے جمنٹ تھے۔ جمناؤ
جمنکار کے ایک حصے سے مجھے نامتج جلیقی دکھائی دی اور میں
نے کار کا رخ اسی طرف کر لیا۔ ادھر مجھے جمناؤ جمنکار کے
دو میدان اس حد تک خلا نظر آیا کہ گاڑی جمناؤیوں وغیرہ سے
بچتی ہوئی اندر جا سکتی تھی اور تھوڑا سی آگے جانے کے بعد انہی
جمناؤیوں میں اس طرح چھپ جاتی کہ اگر کچے میدان خالی تھے

کوئی آجھی لکھا تو گاڑی کا نام و نشان بھی اسے نظر نہ آتا تھا۔
اس دیرانے میں دن میں بھی کوئی نہیں آتا تھا، پھر رات آتا۔

جھاڑیوں میں گھستے ہی مجھے فونی نظر آیا، جو ایک باغیچہ
ریوالور اور ایک ہاتھ میں تاج لے کر تھا۔ وہ سیاہ چٹنا
سیاہ پیٹ میں تھا اور جھاڑیوں ہی میں تقریباً چھپنا کر رہا تھا۔
کاڑی کا دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گیا اور ہاتھ کے اشارے
سے بتا نہ گا۔ "کاڑی اوپر لے چلے۔" جھاڑیوں کو روکنا
ان سے ابھی ہوئی کاڑی کافی آگے تک آگئی تو اس نے روبرو
اشارہ کیا۔

آگے دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ ایک سیاہ فورا شخص کی پسندیدہ گاڑی۔ میں اور ٹونی اتر کر اس گاڑی کے پیچھے بڑا کے اندر کی لاسٹ آن ہو گئی۔ اعلیٰ سیٹ پر مجھے ملک الملک مل گیا۔ آیا۔ اس کے عقب میں شیر بڑے دھیلے ڈھالے انداز میں پریم دراز، قیصر چیمبرہا، حاکم، اس کا ہاتھ ایک راکفلز، جس کی ٹال ملک الملک کی بچی کو چھو رہی تھی۔

ملکِ اسلام کے چترے پر یوںیاں اڑ رہی تھیں اور آنکھیں
ہر کی طرح پھیل ہوئی تھیں۔ ممکن ہے جس وقت شیر اور لڑکی
اسے اس کی گاڑی سے اتار دیا ہو اس وقت وہ نشے میں نہا ہو
اس کا نشہ نہ جانے کب کا ہرن کو چکا تھا بلکہ اس وقت تو وہ
ایک دباؤ اس باندھ ہرن نظر آ رہا تھا۔

ملکجی روشنی میں مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں کچھ اندر
 نہیں۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان بکھیری اور اس کے
 سے سرگوشی نما آواز نکلی۔ "افضل چہ بدری... تم...؟ تو تم
 خواہا کرنا ہے مجھے؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دے بغیر کہا "نہیں!"
 اے آواز۔ ہمیں جنگل عبور کر کے آگے کیلے میدان لگا
 ہے۔"

شہیر نے راکٹل کی نال سے ملک کو شہ کا دیا اور خودی کا
تھوڑا سا کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ ملک و مسلم خاموش
رہے۔ اتر آیا..... شیر چیتے کی، پھر جیتی سے تازہ سے اڑا
ایک لڑکا لایا تو میں نے اس نے ملک کو درختوں کی طرف دھکیلا۔
ملک لڑکا لایا تو میں نے شیر کو اشارہ کیا "ختم نہیں"
کے ذمے صرف میرا قرض واجب الادا ہے۔ کوئی اور مل
تکلیف نہ پہنچائے" میں نے ملک کو آگے بٹکنے کا اشارہ کیا
اس کے تقریباً ساتھ چلتے دکھا۔ شیر اس کی کر سے راکٹل کا
بائے اس کے پیچھے تھا۔ کوئی سب سے پیچھے تھا اور ہاتھ
میں راستہ دکھا رہا تھا۔ جنگل میں جہاں کسی جاندار پہنچ
ہاں مارنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو“ میں نے مامی کو

منظوم

الماس ایم اے قیمت: 50/-

ابلیکا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی
تاریخ پیش کی گئی ہے

کتاب: ابلیکا میں تاریخ کی ساری باتیں 1950ء روپے

ناشر: مکتبہ القرآن پبلیشنگز

اردو بازار لاہور

ملک اسلم ایک سرخ و سپید آدمی تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اس کی طرف دیکھا تو وہ ہونٹوں پر زبان بچیر کر رہ گیا۔

"آؤ ذرا آگے چلیں" میں نے دوستانہ لمبے میں کہا اور شبیر نے رائفل کی نالی سے اسے آگے دھکیل دیا۔

میدان کے وسط میں پہنچ کر میں نے رکتے ہوئے کہا "یہ بڑی پرسکون جگہ ہے، دُغل درمقولات کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں انصاف کے ان ٹھیکیداروں کی آمد کا بھی کوئی خطرہ نہیں جو درحقیقت معاشرے میں سب سے زیادہ بے انصافی پھیلانے کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس جگہ کو میرا ن عدل کا نام دے رکھا ہے۔ ہمارے ہمارے اس معاشرے میں حالات اکثر کچھ ایسے ہو جاتے ہیں کہ مظلوم کی وادری نہیں ہوتی اور ظالم اپنے قاتل مظلوم کے باوجود حق لکھا ہے اور بڑے غائب باث اور عزت و آبرو سے اس سوسائٹی میں زندگی گزارتا رہتا ہے۔ نہ صرف زندگی گزارتا ہے بلکہ اپنی فطرت کے مطابق... پرہیز... علی الاعلان ظلم کا بازار بھی گرم رکھتا ہے۔ وہ قانون کی کزوریوں اور اپنی طاقت سے باہر تاقادہ اٹھاتا ہے۔ قدرت نے اسے جو حیثیت بخشی ہوئی ہے وہ اس کا بے حد تاباں استعمال کرتا ہے۔ خصوصاً کزوریوں کی تودہ زندگی اجیرن کئے رکھتا ہے جبکہ اپنے ہم پلے یا اپنے سے زیادہ طاقتور لوگوں سے وہ کڑا کر گزارتا ہے یا ان سے بنا کر رکھتا ہے۔ یا بس پھر ان سے زبانی کھائی دھکی ظاہر کرتا رہتا ہے، عملاً کبھی ان سے نہیں ٹکراتا۔ یہ ایک عام رویہ ہے جو آج کی سوسائٹی میں چل رہا ہے۔"

اسلم دم بخود میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "شاید تم حیران ہو رہے ہو کہ میں نے کیا تقریر شروع

کر دی۔ میں کوئی منگلیا مقرر نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے تو کوئی اچھا آدمی ہونے کا بھی دعوئی نہیں ہے۔ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں ایک نہایت انصاف پسند آدمی ہوں لیکن میرا انصاف ذرا پرانے زمانوں کے اصولوں اور قواعد کے مطابق ہے جب انسان فطرت سے قریب تر زندگی بسر کرتا تھا۔ آج کے دور کے قانون کی موٹی موٹی کتابوں اور طویل طویل مضامینوں میں قانونی نکتے تو بے شمار سمٹ آئے ہیں "قانون پر بلاشبہ بہت کام ہوا ہے لیکن انصاف کہیں گم ہو گیا ہے، کھو گیا ہے۔ بے جاہ اتنی بہت سی بھول جاتیں میں راست بھول گیا ہے۔"

میں نے ایک لمبے کے لئے خاموش ہو کر ٹائی کی گرہ دھکی کی اور بدستور ملاحت سے کہا "اس لئے مجبوراً مجھے اسی پرانے سیدھے سارے اور نہایت متواثر نظریے انصاف کا قائل ہونا پڑا ہے۔ یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان اور جان کے بدلے جان۔ میں جب کزور اور بے بس تھا تو معاشرے کے

کئی طبقوں اور کئی افراد نے مجھ پر بہت سے قلم کئے، بہت زیادہ تیاں کیں جن میں سے سب سے بڑا قلم یہ تھا کہ مجھے معصوم اور محبت کرنے والے باپ کے سائے سے محروم نہ "لیکن مجھے نہیں یاد کہ میں نے بھی تمہارے باپ کی اسلم بھائی۔"

"کی تو مزید علم کی بات ہے" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہ جس میں یاد بھی نہیں "تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا۔ ہم بہت سی حقیر لوگ تھے۔ چونیوں سے بھی زیادہ حقیر۔ آج میرے پاس اتنی طاقت ہے میرے اتنے دسائل ہیں کہ میں نے تمہیں بھرے پڑے شرکی ایک سڑک سے اٹھوایا ہے اب میرے آدمی صرف میرے اشارے کے منتظر ہیں۔ جاہوں تو یہ ابھی جس میں گولی مار دیں اور ہم تمہاری لاش دیر سے میں چھوڑ کر چلے جائیں۔ ذیل، آؤ اور گدہ نہ

معقولیت کی بات ہے۔ اس سے زیادہ فرزند الائنہ پیشکش شاید دنیا میں تمہیں کوئی نہ کر سکے۔

”ذات ہوگی۔۔۔ میں خود کبھی کسی سے نہیں لڑا“ اسلم بولا۔
 ”یہ تو بہت بڑی بات ہے“ میں نے کہا ”لڑا میں بھی عزت سے کسی سے نہیں ہوں لیکن تم تم جیسے آدمیوں کو لڑنے کے قابل تو رہنا چاہئے۔ یہ تو کوئی اچھی بات سمجھ کر تم صرف کارندوں پر عسکرانی کرتے رہو۔ بیشک انکامات ہی باری کرتے رہو کہ فلاں کو اغتالیا جائے، فلاں کو قتل کر دیا جائے اور فلاں کا علیہ بکاڑو دیا جائے۔ تو آدمی اس قسم کے انکامات دینے کا عادی ہو اسے خود بھی کسی قابل ہونا چاہئے۔ آدمی میرے پاس بھی بہت ہیں اور میں ان سے بڑے بڑے کام لیتا ہوں۔ بڑے ہاں ٹار ہیں میرے۔۔۔ اور وہ میرے ایک استاد سے بے شمار بھی ہیں تباہی پھیلاتے ہیں۔ تمہیں یہاں تک بھی میرے یہ دو ساتھی اسے ہیں لیکن ایسا میں نے صرف وقت اور غیر ضروری پیکروں سے بچنے کے لئے کیا ہے تاہم ضرورت پڑنے۔۔۔ کام میں خود بھی کر سکتا ہوں جو میرے ساتھی کرتے ہیں۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو اس چیز کا مستحق بھی سمجھتا ہوں۔ ان دنوں میں یہ سرداری میں نے خود اپنی صلاحیتوں سے دن رات حاصل کی ہے۔ یہ مجھے ورثے میں نہیں ملی۔ تم اسے آدمیوں پر علم چلاتے ہو اتنی زندگیوں سے ٹکڑوں کی طرح کھینچتے رہے ہو۔ تمہارے اپنے بازوؤں میں۔۔۔ بھی دم ہونا چاہئے۔ آؤ میدان میں آؤ“ میں نے اسے آگے تھکے کا اشارہ کیا۔

پھر میں نے نوٹی سے پوچھا ”اس کی تلاشی اچھی طرح لی تھی؟“ اس کے پاس ہتھیار تو نہیں ہے؟“

”اس کے پاس صرف یہ ریوالت تھا۔ کوئی اندرونی جیب میں“ نوٹی نے مجھے اپنی چالوں کی جیب سے تین دو کایک ریوالت نکال کر دکھایا۔ ملک اسلم بدستور اپنی جگہ ہٹا کھڑا تھا۔
 ”اب میدان میں آجھی جاؤ بار! تم تو شریلی دہسن کی طرح وہیں گزے کھڑے ہو۔“ میں نے کہا ”یہ بات طے ہے کہ تمہارے لئے مجھ سے مقابلے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ کلا میدان ہے اور میں تمہارے سامنے ہوں۔ مجھے مار کر ہی اب تم اپنی دنیا میں واپس جا سکتے ہو۔ مجھے شکست دے دو میرے آدمی خود تمہیں عزت و احترام سے چھوڑ آئیں گے۔“

وہ ایک عظیم عظیم آدمی تھا۔ ذلیل ذلیل میں مجھ سے کچھ ڈگتا ہوا۔ جبکہ میں بھی عام سے قد کاٹھ کا مالک نہیں ہوں۔ اس نے میرا سر ہٹا پنازہ لیا، گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے قتل ہوا۔ پھر شاید اس کی کچھ بہت بندگی اور وہ آگے بڑھ آیا۔

چند لمحوں تک ہم ایک دوسرے کے سامنے دائرے میں گھومتے رہے۔ شیر اور نوٹی خامسے ناسطے پر ایک ٹیلہ نما ابھار پر جا بیٹھے تھے اور سات نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

لاش کو فوج کر کہا جائیں گے۔ شاید کئی دن بعد مسخ شدہ حالت میں تسماری لاش دریافت ہو سکے بلکہ عین ممکن ہے۔ صرف اہم نامی دریافت ہو۔ اور تم اس کے مستحق بھی ہو۔ تمہارے ساتھ اگر ایسا کیا جائے تو یہ کوئی زیادتی نہیں ہوگی لیکن میں پھر بھی ایسا نہیں کروں گا۔ میں تمہارے ساتھ بہت رنات کر رہا ہوں۔ تمہارے لئے اپنی بہت ازہی اور بہت وقت ضائع کر رہا ہوں مگر تمہیں یہ شکوہ نہ رہ جائے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی یا تمہیں اپنے دفاع کا موقع نہیں دیا گیا۔“

میں نے ٹائی ڈھیلی کر کے گلے سے نکالی اور پھر کوٹ بھی اتار کر دونوں چڑیوں کی طرف اچھال دیں۔ نوٹی نے احتیاط سے انہیں بازو پر لٹکالیا۔

”تم جی ٹائی اور کوٹ سے نجات حاصل کر لو“ میں نے کہا۔ ملک اسلم نے ایک نظر اپنے سر پر ڈالی اور تھوک دھل کر بولا ”تم چاہتے کیا ہو؟“
 ”کمال ہے! تم ابھی تک نہیں سمجھے؟“ میں نے حیرت سے کہا ”بھئی“ تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنا ہے۔ بالکل خالی ہاتھ۔ دیکھ لو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میں نے اسے اپنی چالوں کی تہیں چھتیا کر دیا کہ تمہیں ”اور میرے آدمی اس مقابلے میں قطعی برکات نہیں کریں گے“ خواہ تم مجھ پر غالب ہی کیوں نہ ہو۔ اگر تم نے مجھے شکست دے دی تو تمہیں اقتدار پر کاکہ چاہو تو مجھے ہلاک کر دو اور چاہو تو معاف کر دو۔ اگر تم نے مجھے ہلاک کر دیا تب بھی میرے آدمی اپنے طور پر یا قانونی طور پر تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے“ اس لئے تم بالکل بے خوف ہو کر مقابلہ کرنا۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ بڑھیم کوئی نہیں ہو سکتا۔“

وہ حوش سی نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا تھا اور کبھی نوٹی اور شیر کی طرف۔

”غالبا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا کیونکہ تسماری زندگی میں بڑھیم کا شاید کبھی کوئی تصور نہیں رہا“ میں نے کہا۔ لیکن میں تمہیں اپنے سردم باپ کی قسم کیا کر نہیں دلاتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی ہوگا۔ میرے وعدے پر حرف بے حرف نکل نہوگا۔ کوٹ اور ٹائی اتار دو۔“

چٹپٹا بہت تیز سے انداز اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ نوٹی نے اس کا کوٹ اور ٹائی بھی سنبھال لی۔ لیکن ملک اسلم کے دل میں شاید صرف ایک لمحے کے لئے سنبھال لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خوفزدہ سے انداز میں بول اٹھا ”یہ کیا بچوں دالی باتیں ہیں۔۔۔ جی نہیں ہو سکتا۔“

”میں مجبور نہ کر کہ ہم دونوں کی طرح ایک نئے آدمی کو کوئی مار کر دیر لانے میں پھینک جائیں“ میں نے کہا ”اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بچوں والی نہیں“ نہایت سمجھدار آدمی اور

ملک اسلم نے مجھ پر حملہ کرنے میں پہل کی۔ وہ نہایت پھرتی سے مجھ پر چھینا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر ہوا کہ لڑنے کے معاملے میں وہ اتنا بھی اتنا ہی نہیں تھا جتنا ظاہر کر رہا تھا۔ میں نے جنگائی دیتے ہوئے اس کی کینچی پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ زمین چاٹنے لگا مگر اپنے ماتر بھاری حق و قوش کے باوجود استائی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا پورا موقع دیا اور فوری طور پر اس پر حملہ نہیں کیا۔

اس بار اس نے اپنی دانت میں خاصی چالاک کا مظاہر کیا مین ظاہر ہوئے کیا کہ وہ میری گردن پکڑنے کی کوشش کرے گا لیکن درحقیقت اس نے یکدم جھک کر مجھے گرانے کے لئے ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس قسم کے داؤد چھ میرے لئے پکڑا نہ تھے۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھہر رسید کی اور وہ الٹ کر ڈکرائتا ہوا پیچھے جاگرا۔ میں نے اس بار بھی اسے اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع دیا۔

اس نے سر جھکا اور منہ صاف کیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور شاید سامنے کے کچھ دانت بھی ٹوٹ گئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ پکڑا سا گیا تھا۔ یہ قواسے شروع سے ہی اندازہ تھا کہ میں کوئی ترغواں نہیں ہوں اسی لئے اتنی بے فکری سے لڑنے کا بیڑی دے رہا ہوں۔ تاہم اب وہ ضرر میں کھاکر شاید اسے میری طاقت کا کچھ صحیح طور پر اندازہ ہوئے گا تھا۔

اس بار اس نے غالباً بہتر طور پر اپنی توانائیاں جمع کیں اور یک لخت بھڑے ہوئے سانپ کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن شاید وہ خود بھی یہ سمجھتے تھے کہ قاصر رہا ہو کہ میں نے کس طرح اسے ہوا میں اچھالا اور وہ دھب سے زمین پر چٹ آگرا۔ خاصی مٹی ہوا میں اڑی۔ جس طرح وہ گر تھا اگر زمین بچ نہ ہوتی تو شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔

مٹی لے کر وہ زمین پر ہی پڑا لیکن جھپکا تھا۔ اس دوران میں نے اسے چھو ایک نہیں اور اس کے قریب کھڑے ہو کر اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اب اس صورت حال سے محفوظ ہونے لگا تھا۔ شاید مٹی بھی چھ سے سے کھینچنے وقت ایسی ہی لذت محسوس کرتی ہوگی لیکن پھر میں نے سوچا کہ وہ چھو چاہتا نہیں تھا۔ اگر اسے تھوڑی سی ذمیل مٹی اور اس موقع ملتا تو وہ مجھ سے نہ جانے کتنے آدمیوں کو پس وائتا کر دیتا۔

اس بار وہ اٹھا تو اس کے چہرے پر موت کا خوف نمودار ہو چکا تھا لیکن چند لمحوں کے بعد وہ اپنے متقابل نیم دائرے میں گھومنے کے بعد جب وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تو انداز ایسا ہی تھا جیسے میں نے غل و غرغ کو بلائے طاق رکھ دیا ہو اور سوچ لیا ہو کہ مرنا تو ہے ہی اس لئے اب بالکل بے فکر ہو کر وحشیانہ انداز میں ایک آخری کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔

اس کا یہ حملہ بہت شدید تھا اگر میں ذرا بھی غافل ہوتا تو

میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے کسی غصیلگر درندے کی طرح مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ میری کمراس کی گرفت میں آگئی اور اس نے خالصتاً کسی انداز میں مصلیٰ ہزارہ کر مجھے گرانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے چہرے پر ہزار طاقت سے کھنی رسید کی۔ اس کے مقل سے کرناک کی چال کی کیونکہ اس کی ٹانگ یوں پچک گئی تھی گویا کسی نے اس پر دھلی جھوڑا دے مارا ہو۔ ایک ہی لمحوں میں اس کا چہرہ اور قمیص خون میں تر ہونے لگی۔ خون یکدم ہی گر گیا اہل پر اٹھا۔

وہ تکلیف کو بھلا کر اندھوں کے سے انداز میں گھبرا اور اچانک ہی اس کا گھونسا میرے جڑے پر پڑ گیا۔ اب تک میں کوشش یہی رہی تھی کہ میں اس سے ایک ہاتھ بھی نہ کھائے پاؤں اور یہ بھی گویا ایک طرح کا ریکارڈ ہی رہے۔ میری اپنی یادوں کے خزانے کے لئے۔ مگر اس نے یہ ریکارڈ قائم نہیں ہونے دیا تھا۔

اس کے گھونسنے سے ایک لمحوں کے لئے میرا دماغ جھجکا رہ گیا لیکن اس گھونسنے نے گویا میرے غیظ و غضب کے اس سیلاب کو بے قابو کر دیا جس پر میں اب تک بند باندھے ہوئے تھا اور حسب ضرورت توانائی استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اس کے دونوں کندھوں پر بیک وقت دونوں ہاتھوں سے کرانے کا وار کیا۔ اس کے مقل سے ایک بار پھر چٹ پھٹ ہوئی اور دونوں بازو بے جان ہو کر جھول گئے۔

اس نے لات چلانے کی کوشش کی لیکن میں نے پیچھے ہٹے ہوئے جوڑو کا ایک داؤد چھاپ سلی آٹایا۔ پھر اس کی ٹانگیں گھوم کر ٹک رسید کی۔ وہ گر پڑا تو میں نے اسے حدود ٹھوکر پر رسید کیں جو اس کی کئی پٹلیاں توڑنے کے لئے کافی تھیں۔ بالکل ڈرامہ کی طرح اوپر اوپر اڑھک رہا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر وہ دھبوش شرابی کی طما کرنے لگا تو میں نے اس کی گردن بازو کے شکبے میں جکڑ لی۔ دوسرے ہی لمحوں میں چٹ کی زوردار آواز آئی اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ مردہ جھپکی کی طرح زمین پر گر پڑا۔

میں چند لمحوں میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ ساکت ہی رہا۔ شیر پھر سے اٹھ کر آگے آیا۔ اس نے اسلم کی بنش دیکھی مٹا کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی اور اٹھتے ہوئے کسی فرض شناس ڈاکڑ کی سی متانت اور بردباری سے بولا "مرہا ہے مرہ"۔ "بس اتنی سی جان ہوتی ہے انسان کے بدن میں" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا "مردہ نہ جانے کتنے انسانوں کی جان عذاب میں کئے رکھا ہے۔"

میں نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ میرے صرف چوتھے گرو میں لٹ گئے تھے۔ لباس جن کا توں تھا۔ قمیص البتہ چادوں سے باہر آگئی تھی۔ میں نے اپنا حلیہ درست کیا۔ کت پستا، ڈاکائی لگائی

میں نے مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک فاسا مختلف قسم کا آفسر نظر آ رہا تھا۔

”انسپکٹر فیملی احمد“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”تشریف رکھئے“ میں نے کرہی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے آراستہ و ہراستہ آنسو پر ایک نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سرعیت نہیں تھی اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ کم از کم میں اسے حق میں اچھا نہیں سمجھتا تھا۔

”کیا بیٹا پسند کریں گے آپ ‘چائے یا کافی؟‘ میں نے پوچھا۔

”شکریہ۔ میں اس وقت کچھ نہیں پیوں گا، تفتیش کی غرض سے میں جس کے ہاں جاتا ہوں اس کے ہاں کچھ کھانا پینا نہیں“ اس نے ملانت سے جواب دیا۔

”حیرت ہے“ میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا ”یہ میں کیا مٹ رہا ہوں کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا۔“

”کیوں سر! اس میں یقین نہ آنے والی کیا بات ہے؟“ اس نے ملانت سے پوچھا۔

”انسپکٹر! میں نے گاؤں میں پورڈش پائی ہے اور مجھ سے میں نے یہ دیکھا ہے کہ اگر گاؤں میں کسی نقل بھی ہو جاتا تو تفتیش کے لئے آنے والے تھے دار صاحب اور ان کے ماتحتوں کے لئے مرٹیاں پکی تھیں ‘پرائیٹ تیار ہوتے تھے۔ لاش پھار سے اٹھل ایک طرف چلی رہتی تھی ‘دوسری طرف، سڑ

اور ایک بار پھر وہی معزز اور آرام طلب سا آدمی نظر آنے لگا ہے اگر کوئی بظاہر دیکھتا تو یہی سوچتا کہ اس شخص کو تو آرام وہ کر ہی بیٹھ کر فائلوں پر دستخط کرنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا ہو گا۔“ اس کا کیا کرنا ہے سر؟“ شیر نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا فیصلہ میں تم پر چھوڑ رہا ہوں“ میں نے مانی کی کرہ درست کرتے ہوئے کہا ”تم چاہو تو اسے وہی چھوڑ دیتے ہو۔ کچھ ہڈیوں اور کپڑے کوڑوں وغیرہ کا بھی اس پر کچھ حق بنتا ہے۔ وہ ‘داروں‘ آرام سے بیٹھ بھر لیں۔۔۔ اور اگر تمہارا دل چاہے تو اسے دفن کر دو لیکن میں اب چلوں گا“ مجھے بندہ آ رہی ہے۔“

شیر نے ایک نظر کوئی کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کچھ سوچا پھر بھٹکے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے سر۔۔۔ اسے دفن کر دینے میں کیا یاد کرے گا بے چارہ۔“

”تمہاری مرضی۔“ مجھے کوئی اعتراض نہیں ”میں نے کہا اور اوروں کی انداز میں ہاتھ ہلا کر واپس چل دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر کی گاڑی میں ایک کدال موجود ہوگی تو نوٹہ ہونے کے بعد گاڑی کے چیک کا کام دیتی تھی اور اس حالت میں اسے دیکھ کر کوئی سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ بلور کدال بھی استعمال ہوتی ہوگی۔

دو دنوں میرے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی تک واپس آئے۔ میں گاڑی گاڑی میں بیٹھ کر دہاں سے روانہ ہو گیا۔ انیس میں نے ڈکی سے کدال نکال کر واپس میدان کی طرف جاتے دیکھا۔ واپسی پر مجھ اپنے آپ کو بے حد ہکا بھکا محسوس کر رہا تھا۔ برسوں سے ان کے ایک گوشے میں گویا کسی کڑی نے جالا سا بن رکھا تھا۔ آفتاب جالا ہٹ گیا تھا۔ ذہن کچھ صاف سا ہو گیا تھا کچھ دیر کے لئے غیر ارادی طور پر میں ہلکے شروں میں کھینچی بھی بھاگنے لگا۔ گاڑی چوک پر ایک جگہ مجھے تین پولیس والے بھی بندوقب لے لئے نظر آئے لیکن انہوں نے مجھے روکا نہیں۔ گھر آکر لباس تبدیل کر کے میں آرام سے سو گیا۔

اس کے ایک ہفتے بعد میں اپنے مال والے آفس میں بیٹھا تھا کہ ٹیکہ ٹی کے انٹر کام پر اطلاع دی ”سر! ایک پولیس انسپکٹر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”پولیس انسپکٹر...؟“ میں نے قدرے حیرت سے ڈہرایا ”لوگ مجھے حیرت برکتر نہیں تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”ٹھیک ہے... بھیج دو۔“

چند لمحوں بعد ہی باوردی انسپکٹر دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا وہ میرے انداز سے تھیں کم عمر تھا۔ وہ ایک چاقو و پٹیل اور اساتذہ تو تھے ان تھا۔ اس کی دوری نہایت صاف ستھری تھی۔ اسے اسٹی شدہ اور اس کے چہرے جسم پر پائیکل فنٹ لہ۔ جنرل فوہل کے بیچے اس کی سرخ و پید رحمت بہت بھلی لگتی تھی۔ اس کی بٹل میں ایک نائل دہلی ہوئی تھی۔

پنس ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
درخشاں

انوار صدیقی

ایک عشق گزیدہ نواب زادے کی ہنگامہ خیز
سرگذشت

حصہ اول :- 45 / حصہ دوم :- 45 /

پاشا مکتبہ القوریہ

اردو بازار لاہور

خواب نہ ہوتے تھے۔ مستقبل کے ورثہ کو وہی کام ہوتے تھے۔ یعنی نئے کمانے تیار کرنا اور جب ان سے فرصت ملے تو آدھ زاری کرنا، روہا بیٹنا۔ تفتیش کی کئی دن جاری رہتی تھی اور پولیس پارٹی روزانہ باقاعدگی سے آتی رہتی تھی۔ بالاخر جب کچھ مشتبہ افراد کی فرسٹ تیار ہو جاتی تھی تو پھر پولیس پارٹی کی آمد و رفت ان کے ہاں شروع ہو جاتی تھی اور مستقبل کے ورثہ آنسو پونچھ کر رنج کا اظہار کرتے لگتے تھے۔ کم و بیش یہی سب کچھ میں مختلف بندوں پر مختلف انداز میں مختلف لوازمات کے ساتھ دیکھتا آیا ہوں۔ ماحول، صورت حال اور بیٹھوس کے مطابق قیوسی بہت تہہ لیاں ہوتی رہتی ہیں۔ میں بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا ہوں۔

اس کے چرے کی سرخی معمولی سی تھی۔ تاہم وہ گویا جھل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ تو ہمارے مہمانے سے کام لے رہے ہیں تاہم میں پھر بھی آپ کی بات کو عملی طور پر درست تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ہر طبقہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ میں اس عزم کے ساتھ اس ڈیپارٹمنٹ میں آیا ہوں کہ جو چیزیں یہاں کی روایت بن چکی ہیں انہیں کچھ بدلنے کی کوشش کروں۔“

پھر وہ ٹوٹی درست کرتے ہوئے ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ”شاید اسے آپ اپنے منہ میں مٹھو بیٹے کے مترادف سمجھیں لیکن میں یہ باتیں محض تعارف کے طور پر بتا رہا ہوں سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق چھوٹے موٹے زمیندار گھرانے سے ہے۔ کئی سال گزر چکے ہیں میری سروس کو لیکن ابھی تک خدا کا کرم شامل حال رہا ہے کہ میں نے رشوت کا ایک پیسہ بھی نہیں کھایا اور اس وجہ سے ابھی وہ شرمیلیاں مجھ پر پڑیں انہیں بھی میں آسانی سے گھٹا۔ اور خدا کا ایک کرم یہ بھی ہے کہ اپنی ایمانداری کی وجہ سے مجھے والوں کی نظر میں گندی چھٹی ہوئے کے باوجود اس نوجوانی میں ہی اسے ایسے آئی بھرتی ہونے کے بعد انسپکٹر کے عہدے تک ترقی پانچا ہوں۔“

”بہت خوب“ میں نے سنا کئی انداز میں سر ہلایا۔ ”بریکمیل تھو کہ ایک اور بات کی وضاحت کرتا چلوں۔“ وہ بولا ”میں آپ کو سہرا کر اس لئے مخاطب نہیں کر رہا کہ آپ ایک دولت مند انسان ہیں، شرمیں آپ کا بڑا نام ہے بڑی عزت ہے اور میں آپ سے سرکوب ہو گیا ہوں یا مجھے آپ کی خوشنودی عزیز ہو گئی ہے۔ ایسا کوئی خیال دل میں مت لایے گا۔ ان میں سے کوئی بات درست نہیں ہے۔ ہر شریف آدمی کا یہ قانونی حق ہے کہ اس وقت تک اس کی عزت کی جائے جب تک وہ مجرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس لئے دوران تفتیش یہ واسطہ چاہے مزور سے چرے باطل اور سے میں اس کے سامنے میرے پر غور کئے بغیر اسے سہرا کہتا ہوں۔“

”انسپکٹر..... کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟“ میں نے نہرا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”انسپکٹر نعیم احمد۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”انسپکٹر نعیم احمد“ میں نے ریوالتک جیسے پہلو بدلے ہوئے کہا ”تم مجھے خواب و خیال کے آدمی لگ رہے ہو۔ مجھے جین رہا ہو رہا ہے کہ ابھی کوئی نکلتا ہوگا اور میری آنکھ کھل جائے گی۔ تم میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو چکے ہو گے“ خواب ٹوٹ رہا ہوگا۔ تم پیسے کرو اور صرف انگریزی کمانڈوں میں ہائے جاتے ہیں اور وہ بھی ہر انگریزی کمانڈ میں نہیں، جرم و سزا کی کسی کمانڈ میں۔ تم اس فطرت زمین کی طرف کیونکر آئے گے؟“

”میں کبھی کبھی قدرت کو یوں بھی منظور ہوتا ہے“ وہ مسکرا اور دھیرے دھیرے اپنی چمڑی دوسرے ہاتھ پر مارنے لگا۔ ”برحال آپ یقین رکھئے، میں خواب و خیال کی دنیا کا آدمی نہیں ہوں۔ ٹھوس حقائق کی اسی دنیا سے تعلق ہے میرا اور میں خود بھی ایک ٹھوس حقیقت ہوں۔ اس ٹکڑی کی طرح“ اس نے اپنی چمڑی تھوڑے پلے کر کے مجھے دکھائی۔ میں چمڑی کی طرف دیکھنے کے بجائے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا۔ پھر اس نے نظر چرائی لیکن اگر وہ اتنی دیر بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا تھا تو یہ اس کی جرات مندی کی دلیل تھی۔ ”فرمائیے.... کیسے تشریف لانے کی زحمت کی؟“ میں نے انتہائی دھیمے لہجے میں انتہائی ملا نیت سے پوچھا۔

اس نے دن اور تاریخ بتاتے ہوئے کہا ”ایک ممتاز طسار“ منگھار اور بڑے زمیندار مسٹر اسلم ملک تھو اور چودہ تھری درمیانی رات سے غائب ہیں۔ ان کا ایک دفتر آپ کے ایک دفتر کے مقابل قلم اسٹوڈیو میں واقع ہے۔“ ”اسلم ملک....“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پڑناں لہجے میں ڈہرایا۔ ”مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ اس نام کے کسی شخص سے کسی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی لیکن یہ یاد نہیں رہا کہ وہ کون تھا اور اس کی شکل صورت بھی ذہن میں نہیں رہا۔ میں معذرت خواہانہ سے انداز میں مسکرا دیا۔ ”روزانہ سے لوگوں سے ملتا پڑتا ہے۔ صرف خاص خاص لوگوں کے ہم اور شیشیں ہی ذہن میں رہ جاتی ہیں یا پھر ان لوگوں کی جن سے ہمیں کوئی خاص کام ہو یا جن سے ہمارا کوئی خاص تعلق ہو۔ اور میرا خیال ہے اسلم ملک ان لوگوں کی فرسٹ میں شامل ہیں ورنہ مجھے اس کے بارے میں ضرور کچھ یاد ہوتا۔ اور جہاں میرے اسٹوڈیو والے دفتر کا تعلق ہے تو شاید یہ جانتے سے ان کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو سکے کہ اس سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بس میرے گروپ آف کینیڈا کا ایک چھوٹا حصہ ہے اس لئے میں نے کبھی یہ جانتے کی کوشش نہیں کی کہ وہاں آس پاس کس کس کا دفتر ہے۔“

پھر میں نے نہایت سادگی سے کہا ”ویسے بائی واو۔“

آج سے قریب قریب ڈھائی ہزار سال پہلے اپنی تاریخ دیوتاؤں کے شریا بل کی کہانی
جسے مصنف نے 35 سال کی طویل ریسرچ کے بعد قلم بند کیا۔

چاہ بابل

----- قمر اجٹالوی

دنیا کی سب سے بڑی داستان محبت جو ایک سرپا جمال عورت اور ایک سرپا عشق نوجوان کے
تکراؤ سے پیدا ہوئی اور محبت کی تاریخ بن گئی۔ چاہ بابل تاریخی ناولوں کے ذخیرے میں ایک
بہت روشن اور بہت اہم اضافہ ہے۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

بڑا سا 800 صفحات قیمت /- 300

اسلامی تاریخ کا ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا

ابلیکا

----- اسلم راہی ایم۔ اے

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک
دنیا کی مکمل تاریخ پیش کی گئی ہے۔
سات جلدوں میں دستیاب ہے۔

مکمل سیٹ -/ 1850 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

"جیہ اور چودہ ستمبر کی درمیانی رات کو۔ وہ اپنے دوست رات ملی کے پاس نکلتے ہوئے تھے۔" انسپکٹر نے پراسیدہ کے لیے میں کہا "وہاں سے وہ رات کے گھر روانہ ہوئے تھے لیکن گھر نہیں پہنچے۔"

میں نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کی 'پھر انٹر کام کا ریور انٹر ایکٹو بن دیا "کیسٹریں..." میں نے اس حد تک بلند آواز میں کہا کہ انسپکٹر آسانی سے سنے۔

"جیہ ستمبر کو تو میں اسٹین سے آئے ہوئے کچھ تاجروں اور خریداروں کے گروپ سے ملاقات کے لئے کراچی گیا تھا؟؟؟" پھر جبر کی شام دواہیں آیا تھا اور نورای اسلام آباد گیا تھا؟ وہاں سے سولہ ستمبر کو واپس آیا تھا۔ یہی تاریخیں تھیں؟؟؟ ذرا اگلی تاریخ دیکھ کر بتاؤ۔"

میں نے انٹر کام کا وہ ٹیپ دیا جس سے کیسٹریں کی آواز انسپکٹر بھی سن سکتا تھا۔ صرف ایک لمحے کے توقف کے بعد کیسٹریں کی آواز انٹر کام کے ایکٹر پر ابھری "میں سر! آپ کو بالکل ٹھیک یاد ہے، یہی تاریخیں تھیں، یہی شیڈول تھا۔"

"اور میں چونکہ اس وقت کمپنی کے کام پر تھا اس لئے جنازے کے نکلوں کی گاڑیٹر فائل اور وہ ٹیپوں کے ٹیپ وغیرہ بھی اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کی فائلوں میں محفوظ ہوں گے؟" میں نے سرسری سے لمحے میں پوچھا۔

"یقیناً سر" کیسٹریں نے انگریزی میں مستحضر سے کہا "کیا آپ دیکھنا پسند کریں گے؟ آپ کے کمرے میں بیجو اہن؟"

"میں تو نہیں" البتہ ہمارے مہمان انسپکٹر فیم شاید دیکھنا پسند کریں، پھر دیکھتے ہیں میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

مطمن انداز میں رولنگ جیٹر کے پٹے سے ٹیک لگا کر میں نے انسپکٹر فیم کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بظاہر بات تھا لیکن وہ بڑبڑالہ نظروں سے ایک دیوار گیر فنی لائن کو دیکھ رہا تھا۔

جیٹر کے بعد دستک دے کر اور اجازت پا کر چوٹ لہا اور محل نوچوں والا ایک باڈی بلڈر ٹائپ 'بارداری چیرا سی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو کھلی فائلیں تھیں۔ نہایت خاموشی سے اس نے فائلیں انسپکٹر کے سامنے رکھ دیں۔ ان میں جنازے کے ٹکٹ اور وہ ٹیپوں کے ٹیپ وغیرہ لگے ہوئے تھے۔

انسپکٹر نے بغور ان کا معائنہ کیا "تاریخیں وغیرہ دیکھیں اپنی فائلیں میں کچھ نوٹ کیا اور فائلیں میز پر ایک طرف کو کھینچیں۔" چوٹی میرا اشتاہ باکر خاموشی سے فائلیں لے گیا اور انسپکٹر فیم کی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کا ہونٹوں کا حصہ زیادہ سیاہ تھا۔ اس کی یہ کیفیت مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ جن لوگوں کے چہروں پر مجھے ان کے محسوسات کا کراہی نہیں ملتا تھا وہ مجھے قدرے تشویش میں مبتلا کر دیتے تھے۔

انسپکٹر معافی کے لئے ہاتھ پر بھرتا ہوئے بولا "افضل بھادری صاحب! فی الحال میں جا رہا ہوں اور شاید دوبارہ نہ آؤں

لیکن ایک بات بتا رہا ہوں بہتر سمجھتا ہوں "اگر مجھے کسی کے بارے میں مکمل یقین ہو جائے کہ وہ مجرم ہے لیکن میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے عدالتیں حلیم کرکیں "تو میں کبھی کبھی خفیہ طور پر اپنی حد سے بھی تجاوز کر جاتا ہوں اور ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ مجرم کو اس کے کئے کی سزا ضرور ملے۔"

"تقریباً یہی حال میرا ہے" میں نے ملا تامل کہا "مجھے لگتا ہے ہمارے خیالات بہت ملتے ہیں۔"

اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں خاصا چمکا اور کمزور لگ رہا تھا لیکن درحقیقت یہ ایک مضبوط ہاتھ تھا کیونکہ یہ قانون کا ہاتھ تھا۔ ایک ایماندار آفیسر کا ہاتھ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے انسپکٹر فیم سے مل کر خوشی ہوئی تھی۔

میں نے اس کے لئے احزانہ اٹھتے ہوئے کہا "اگر میں آپ کے آتے ہی آپ سے معافی کر کے وقت کہتا کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی تو وہ ایک قطعی رسمی اور جھوٹی بات ہوتی۔ میں آپ کے رخصت ہونے وقت کہہ رہا ہوں کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بہت مدت بعد ایک آئیٹل بل پولیس آفیسر سے ملاقات ہوئی ہے اور ایک مرسے تک شاید اس شخصین اتفاق کی خوش محسوس ہوئی رہے۔"

"شکریہ" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف اتنا کہا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے ہی میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور فائلیں دیکھنے لگا۔

جنازے کے نکلوں اور وہ ٹیپوں کے ٹیپوں والی اعتبارات اچھی رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ جیہ اور چودہ ستمبر کی درمیانی رات کو میں نے نہیں ہمارے ایک آدمی نے میرے نام سے کراچی اور پھر اسلام آباد کا سفر کیا تھا۔ قد کاٹھ اور صورت شکل میں معمولی حد تک مشابہت تو اس میں موجود تھی "تھوڑی سی مزید مشابہت چھوٹی موٹی چیزوں کے ذریعے پیدا کر دی گئی تھی۔ وہ غیر ملکیوں اور انڈیوں سے ملتا تھا۔ ان سے شناخت کی تصدیق کرانے کی قوت مشکل سے ہی آسکتی تھی اور اگر کبھی ایسی بات تو ان کے لئے کسی چیز کی تردید کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اول تو میں اس حد تک نوٹ آنے کی اجازت ہی نہیں دے سکتا تھا۔ فیم تو بے چارہ ایک نوآموز اور پرجوش انسپکٹر تھا میرے پاس بڑی بڑی گھاگ چیزوں سے مننے کے لئے تپ کا ایک نہیں بکٹی تھی بے موجود تھے۔

مجھے کام کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کیسٹریں نے اطلاع دی کہ سیٹھ عالم شیرجھ سے ملے آئے ہیں۔ سیٹھ عالم شیر میرے اس زمانے کے پرانے شناسا تھے جب میرے زیر زمین دھندے جاری تھے۔ وہ اسی لائن کے آدمی تھے اور ابھی تک ان کا اسٹاکنگ کا دھندا زوروں پر تھا لیکن وہ تھے بہت عجیب و غریب قسم کی شخصیت۔

میرا ان کی پیاس سے اوپر تھی۔ بارش تھے نمازی بہرہ کار آدمی تھے "ما تھے پر عراب تھی اور انہیں دیکھنے والا اگر یہ سوچ

ہیں "میں نے گمری سنجیدی سے کہا۔

"دو چار راتوں کے لئے ایک ہزار ہمارے کام کے لئے مخصوص کر دو۔ اور یہ مدت سمجھنا کہ ہم پونہسی دوستی میں کام کر رہے ہیں۔ معاوضہ جو در سروس سے ملے ہے وہ تمہارے کو بھی کو بھی ملے گا۔ اور اس کے باوجود ہم احسان مند بھی ہوں گے۔ دیکھو یہ ٹرانسپورٹ کا مسئلہ اب اکثر ہی سرانجام نہ لگے ہے۔ سروس چل رہا ہوں کہ ذرا دو چار خاص خاص کاموں سے فرمت ملے ایک دو ہزار لے کر ڈال دیں ہوں۔" انہوں نے سگاری را کو اٹھائے ٹرے میں بھاڑی اور گمری سانس لے کر بولے "خیر۔ یہ تو بھلا ہاتھ ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ہزار کب مل سکتا ہے؟"

"میں معذرت خواہ ہوں سینہ صاحب۔" میں نے طائر سے کہا "میں نے یہ لائن ہی چھوڑ دی ہے۔ اسے لگاتار کسی بھی سطح پر میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ چنانچہ جب اسے لائن میں خود اس کام کے لئے استعمال نہیں کر رہا تو کسی اور کو اس مقصد کے لئے کیونکر دے سکتا ہوں؟ اس کے لئے تو آپ نے معافی ہی فرمائی۔"

"چھوڑو مار۔" وہ گویا میری بات پر تعجب نہ کرتے ہوئے "اس قسم کی باتیں تو سمجھ کر رہتے ہیں کہ جواب ہم لائن چھوڑ رہے ہیں، چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑ دینے کے لیکن حقد یہ ہے کہ چھوڑ چکی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔"

"یہ آپ اپنے بارے میں کہہ سکتے ہیں" میں نے سروس بولے لائن سے کہا "اپنا تو یہ معاملہ ہے کہ جب جس شخص کا منہ لگایا اور جب ہی چلا چھوڑ دیا۔ آخر اپنی لائن کے آگے سے تو کوئی بات بھیجی نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر میں کہہ کر دیا آپ کو ضرور خبر ہوئی۔ ایک عرصے سے آپ کو میرے بارے اور حواہی دہر تے جانے یا فروخت ہونے کی کوئی خبر ملی ہے؟"

"نہیں" انہوں نے تسلیم کیا "لیکن یہ کوئی اڑھائی یا نو روپے بات نہیں۔ ایسے دور تو ہم سب پر آتے رہتے ہیں جب خاصے لمبے لمبے عرصے کے لئے کسی نام کو سوجاتے ہیں۔ کل کوئی ایسی وجہ ہو جاتی ہے لیکن حالات مناسب ہونے یا انکار والے لے کر اپنے خواص پر سے سستی جھک کر ایک بار میدان عمل میں آجاتے ہیں۔ بعض اوقات تو سال سال میں کچھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پڑا ہے اور بعض اوقات دو چار مہینوں یا برسوں کی کسر نکال جاتی ہیں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن میں نے عرض کیا کہ ہمارا معاملہ نہیں ہے۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پاس چاروں طرف سے دولت آ رہی ہے" میں نے انہما بات کا تعین دلانے کی کوشش کی۔

"کیسی بے وفائی کی باتیں کر رہے ہو؟ خود دار" وہ بولا "دولت تو خواہ ایک ہزار راستوں سے آ رہی ہو۔ بھلا کوئی راستہ بند کر کے کوئی چاہتا ہے؟"

بھی بیٹھا کہ وہ اس سطر دیکھتے ہیں تو شاید سوچنے والا اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرے کہ اس کے دل میں یہ بے ہودہ خیال کیونکر آیا لیکن وہ بہر حال اس سطر تھے اور بڑے دھڑلے کے اس سطر تھے۔ اس معاملے میں ان کے نظریات بڑے کمال کے تھے۔

اس وقت بھی وہ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو تنہا سے اونچی کھدڑ کی شور اور قیاس میں تھے لیکن یہ کھدڑ ریشم سے زیادہ مشکل تھی۔ ان کے وجود سے فرانس کی ایک نہایت اعلیٰ اور بیش قیمت پر فریم کی منک پھوٹ رہی تھی۔ ان کے سرخ و پید چہرے پر چوڑی چٹکی اور گھنی واڑھی خوب لگتی تھی۔ ان کے بال بھی لمبے لمبے تھے اور ان پر ایک تیس قسم کی گول سفید ٹوپی لگی رہتی تھی۔ کشادہ پیشانی پر سمجھوں کا نشان دور سے چمکتا تھا۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت بڑی پرکشش اور صحرا نگیز تھی۔

وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کا کلف کئے بغیر کمرے کے اس گوشے میں چلے گئے جہاں صوفے وغیرہ پڑے تھے اور صافوں کو غیر رسمی انداز میں بٹھایا جاسکتا تھا۔ اپنے خوب صورت اور سبک غیر ملکی جوتے آدا کر وہ بڑے اطمینان سے ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولے "خود خور ادائی، اتھ تو عید کا پانڈ ہو گئے ہو۔" مانا کہ تم اب بہت بڑے آدمی بن گئے ہو لیکن تمہیں ہم بزرگوں سے قریب ملاقات کا سلسلہ نہیں توڑنا چاہیے۔"

"سلسلہ ٹوٹا کہاں ہے صاحب! آپ کی نوازش ہے کہ آپ اکثر اس سلسلے کو جوڑتے رہتے ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میری مصروفیت کا تو واقعی کچھ نہ پوچھیں۔"

انہوں نے داستان کی ذیبت سے زمانا کا ایک موٹا سا سگار نکال کر بیش قیمت طلائی لائٹ سے ساگایا اور ایک طویل کش لے کر بولے "میں ایک بہت ضروری کام سے تمہارے پاس آیا ہوں لیکن پہلے کافی شکوہ۔"

کالی آجکل تو وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرے کے بعد بولے۔ "انی اچھے دراصل ٹرانسپورٹ کا مسئلہ درپیش ہے۔"

"آپ کو ٹرانسپورٹ کا کیا مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے؟" میں حیرت سے بول اٹھا "کئی گاڑیاں ہیں آپ کے پاس۔ ابھی چھپکے دونوں بھی میں نے آپ کو ایک نئی فورڈ بی بی میں دیکھا تھا۔"

"پوری بات تو سن لیا کرو بے وقوف" انہوں نے مزید شغف سے مجھے زانا "میں ذاتی ٹرانسپورٹ کی بات نہیں کر رہا" مجھے مال کی ٹرانسپورٹیشن کا مسئلہ درپیش ہے۔ نل ایسٹ میں ایک ساحل پر میری گھڑیوں کی بہت بڑی کھپ لادارٹ پڑی ہوئی ہے۔ جو لالچ والا میرا مال لایا کرتا تھا اسے کوٹ گاڑ والوں نے پکڑ لیا ہے اور اس کی بالی لالچیں بڑی شرافت سے سیدھے اور قانونی کاروبار میں لگ گئی ہیں۔ کسی کے مال کا ایک کارٹن بھی نہیں اٹھا رہی ہیں۔ کوئی دوسری پامٹی بھی نہیں مل رہی۔ تمہارے ہزار آج کل کس علاقے میں پھر رہے ہیں؟"

"صرف پاکستانی علاقے میں" اور وہ صرف جھک کر رہے

اُردو کے منفرد اور صاحب طرز ادیب قمر اجٹالوی
کا ایک انتہائی پُر اسرار سنسنی خیز اور تھیر خیز ناول

مقدس مورتی

وہ جیون بھید کیا تھا۔ جس کی خاطر ساؤ خاندان تین صدیوں تک نسل در نسل بودھ کی ایک
مورتی کو تلاش کرتا رہا؟

تھاگت بدھ کے فلسفہ نروان اور بودھ تاریخ و آثار کے پس منظر میں بودھ گیانی تھارو کلیپ
کی لرزہ خیز آب جی جیسے پڑھ کر آپ رائیڈ ریگرڈ کی کہانیوں کو بھول جائیں گے۔ دو شیزہ ایوارڈ
یافتہ شاہکار قیمت: حصہ اول - 200/- حصہ دوم - 200/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

بغداد کی رات

قمر اجٹالوی

الف لیلٰی کی ایک ہزار ایک راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات، دجلہ اور نیل کے دامنوں
میں لپٹی ہوئی رات، آسمان کی پسائیموں میں بکھرے ہوئے ستاروں سے آراستہ رات۔ جسے
صاحب طرز ادیب قمر اجٹالوی مستند تاریخوں اور بے شمار کتابوں کے حوالوں سے آراستہ کر کے
آپ کے لئے پیش کرتے ہیں۔

1200 سے زائد صفحات قیمت حصہ اول - 300/- حصہ دوم - 300/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

”مجھے دوسروں کا نہیں معلوم لیکن میں نے سہ ماہی دہراستہ بند کر دیا ہے۔ اس راستے سے آنے والی دولت کے بارے میں میرا دل اور شیر کچھ زیادہ اطمینان یا خوشی محسوس نہیں کر رہا تھا۔“

... میں نے جواب دیا ”بلکہ آپ کو بھی خبر مشورہ کی ہے کہ آپ یہ لائن چھوڑ دیں۔ دولت کی آپ کے پاس کی نہیں۔ کچھ بلیک منی آپ نے وراثت بھی کر لی ہے اور بالائی کو بھی تھوڑی سی قربانی دے کر وراثت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد آپ کے سامنے سیکڑوں راستے کھلے ہوں گے۔ جہاں جہاں آپ کا دل چاہے گا دوبارہ پھیلا لیجئے گا۔“

”کیا خوب کمرے پروردگار نے والا مشورہ دے رہے ہو“ وہ گویا جوش میں آکر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے ”ہر برس میں سر پر ہاتھ رکھ کر دعا ہے۔ ذاتی سرمایہ کاری کر کے کوئی کاروبار کسے کو تیار نہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں کا بیشتر کام بینکوں کے قرضوں اور پبلک کے شیئرز پر چل رہا ہے۔ سب نے اپنا سرمایہ محفوظ کیا ہوا ہے یا دھڑا دھڑا ہر منتقل کر رہے ہیں اور تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں عمل طور پر روشنی میں آکر اپنی گردن کے لئے پسند اتار کر کے کا آؤ دوں؟“

بہرہ سمجھانے کے سے انداز میں بولے ”اس ملک کے بارے میں تم جیسے یہ قرضوں کا دل اور ضمیر اس لئے اے اطمینانی کا شکار رہتا ہے کہ تم نے دنیا طور پر یہ تسلیم کر رکھا ہوتا ہے کہ یہ کوئی ناجائز دھندا ہے جبکہ میں نے اس قسم کی کوئی پیار سوچ نہیں پالی۔ میرا نتیجہ ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں یہ کوئی ناجائز دھندا نہیں بالکل صحیح اور جائز کاروبار ہے۔ یعنی پرانے زمانے میں تو بڑی تجارت بھی تھی کہ قافلوں کے قافلے سامان تجارت کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے تھے۔ اس وقت کون سا اسپورٹ ایکسپورٹ لائسنس لینا پڑتا تھا؟ کون سی ایسی کھولنا پڑتی تھی؟ کون سے دوسرے کھڑاگ ہوتے تھے؟ یہ سب انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں اور میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو نہیں مانتا۔ ہمیں معلوم ہے میں اچھا بھلا مذہبی آدمی ہوں۔ اگر میں اپنے نظریات کے بارے میں مطمئن نہ ہوتا تو ضرور اس لائن کو چھوڑ چکا ہوتا۔“

”لیکن مملکت کے قوانین کو ماننا تو مذہبی کٹھن فھر سے بھی ضروری ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں“ وہ بلا تاہل بولے ”صرف ان قوانین کو ماننا جاسکتا ہے جن کا کوئی معقول انسانی یا اخلاقی جواز موجود ہو۔ اب مثال یوں سمجھ لو کہ میں رشک کے شکل پر گاڑی دوں گا ہوں۔ اور میں انسان کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی کرتا ہوں کیونکہ یہ سبھی انسانوں کے فائدے کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ نہ تو کسی کو کمزور نہ پہنچے۔ لیکن دوسرے ملکوں سے مل لانے کے سلسلے میں میں اس لئے قوانین کی پابندی نہیں کر سکتا کہ یہ انسانی غیر معقول ہیں۔ ان کے ذریعے بے تحاشہ اور نامراد قسم کے ٹیکسوں کا بوجھ تو

مجھے اور غریب اور کو برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن فائدہ صرف ایک مخصوص مشینری کو پہنچتا ہے۔ سارا نظام مگر ان کی عیاشیوں کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے کہ ان کی لمبی لمبی ائیر کنڈیشننگ گاڑیوں کے ٹیٹ در آمد ہوتے رہیں۔ ان کے لئے بڑے بڑے آرٹسٹ پیراستہ بنگلے تعمیر ہوتے رہیں اور وہ پچھلک آجائے رہی ہوتی علاج لندن اور تھیرن جاتے رہیں اور وہاں ہی پر ان کی بلیک سامان جنس کی زالیوں بھر کر لائی رہیں۔ ان تمام ٹیکسوں کا بوجھ آخر میں جا کر وہ حقیقت جس پر پڑتا ہے وہ ہے عام آدمی۔ اور اس بے چارے عام آدمی کی حالت یہ ہے کہ کہیں اس کے بچے کو اسکول میں داخلہ میسر نہیں اور کہیں داخلہ میسر ہے تو اس کے بچے کے سرے اسکول کی پھت گردی ہے۔ کہیں اسے اچھل سے دو اکے نام پر لال پائی بھی دستیاب نہیں اور کہیں وہ بٹے کے پائی کو ترس رہا ہے۔ زندگی کی بنیادی سولتیں جو اس کا حق تھیں اس کے لئے وہ بھی خواب ہیں بہت بڑی عیاشی ہیں۔ وہ سماں غیر مشغولانہ بات یہ ہے کہ با اختیار ملنے کو تو اختیارات حاصل ہیں کہ بڑے سے بڑے سیٹھ یا کسی عزت دار آدمی نے ان کے کمرے میں ٹیکس ادا نہیں کئے تو اسے اندر کر دیں اس کی قوتی کے اشتہارات اخباروں میں چھپا دیں لیکن ایک عام آدمی کو یہ اختیار حاصل نہیں بلکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کسے پکڑ کر بیٹھے کہ جناب یہ سڑک نہ توں سے کیوں ٹوٹی ہوئی ہے؟ یہ آدمی بس کی کڑکیوں تک میں لوگ کیوں ٹپکے ہوئے ہیں؟ یہ کیوں کو چوں میں خاک کیوں اڑ رہی ہے؟ لوگ ذرا آواز سے کاموں کے لئے دفتر دھڑکے کیوں کھاتے پھر رہے ہیں؟ علاج کے لئے کیوں سسک رہے ہیں؟ ان کے بچے اسکول جانے کے بجائے گھبراہٹ سے سڑکوں میں اپنے قدم سے بھی بڑے دیکھ کر یوں ناچ رہے ہیں اور بالکل کی غلط گالیاں کیوں سن رہے ہیں؟ ٹھنڈے کیوں کھا رہے ہیں؟ جناب! ان کا جرم کیا ہے؟ آپ کے پاس کوئی ایسا نظام نہیں ہے کہ جس میں آپ کسی سے یہ سوالات نہ ٹیکیں یا کسی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا سکیں۔ مشینری کا ہر ٹرڈ اس کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالے گا۔ برسوں سے اس مسئلے کی لاوارث قائل ہوئی اور نہ اسے دھر پھر رہی ہے۔ ٹھوکر میں کل رہی ہے۔ کسی پلیٹ فارم سے بہت شور مچا ہے تو جہاں کسی افسر اعلیٰ کی طرف سے امداد و شمار کا ایک پلندہ ”ایک کروڑ دھندا جاری کر دیا جاتا ہے“ جسے کوئی صحیح طرح سمجھ نہیں سکتا۔ چیلنج نہیں کر سکتا اور پھر ان اس بات پر اگر کوئی ہے کہ ہمارا ملک ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے۔ جب بھی لوگوں کو کچھ دینے کی پوری آتی ہے تو ملک غریب اور پسماندہ قرار پاتا ہے لیکن نہ تو ہمارا ٹیکسوں کا نظام غریبانہ اور پسماندہ ہے اور نہ ہی ہماری مشینری کا رہن سہن اور طور طریقے غریبانہ اور پسماندہ ملکوں والے ہیں۔ جب کہ ہم تعلق اس مذہب سے رکھتے ہیں جس میں ایک بد مذہبی غلیظہ کا دامن پکڑ کر سر کھل پوچھ لیتا تھا کہ

تم نے یہ ریاضی چنڈ پستا ہوا ہے تو اس کے لئے پیسے کہاں سے حاصل کئے؟ تقریروں میں حوالے ہم آج بھی اسی درجہ کے دیتے ہیں جبکہ عملی طور پر حالت یہ ہے کہ سڑک پر اگر دو پاسبی کسی کو پتھر کرانے سے باز کرتے ہوئے تھمیت کر لے بارے ہوں تو ایک عام آدمی آگے بڑھ کر نہیں پوچھ سکتا کہ یہی اتے کہاں لے بارے ہو۔ اس کا جرم کیا ہے؟ جبکہ طاقتور کے آگے قانون کی نہ ہی کا یہ عالم ہے کہ ایک آدمی اگر رات کو قلم دیکھ کر در سے گھر جا رہا ہو تو راستے میں چار بجے اسے پولیس روکے گی، کچھ جڑیاں لٹکا کر کچھ بے عزت ہو کر اور کچھ نہ کچھ گھوڑا کر وہ گھر پہنچے گا جبکہ کسی روز گاڑی میں لوگ کسی کو اغوا کر کے قتل کر کے ویش پھیلی سیٹ پر ڈالے شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سڑک جا میں تو انہیں کہیں رکنا نہیں پڑے گا۔ مثلاً یہ اس لئے کہ ان کی گاڑی کی کمزریوں سے گتوں کی ہٹلک نظر آ رہی ہوگی۔ تو جناب! میں ایسے غیر متصفانہ نظام کے غیر متصفانہ قوانین کو اپنے اوپر لا کر کیا نہیں چاہتا۔ میرا اپنا ایک ضابطہ اخلاق ہے۔ میں منشیات کی اسمگلنگ نہیں کرتا، میرے آدمیوں نے کبھی کسی کو بلاوجہ قتل نہیں کیا، میں کو شش کرتا ہوں کہ میری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے وغیرہ وغیرہ۔“

وہ خاموش ہو گئے۔ اس دوران ان کا سارے بوجھ گیا تھا۔ وہ اسے دوبارہ سلگانے لگے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”حاجی صاحب! آپ کی تقریر دہلیز میں کر اور آپ کے افکار و نظریات سے آنکھیں حاصل کر کے بڑی خوش ہوئی۔ گو کہ آج سے پہلے بھی دو ڈھونڈنا آپ اپنے خیالات زندگی کے گوش گزار کرتے رہے ہیں لیکن آپ کا انداز زبان کچھ ایسا دلچسپ ہے کہ بات پرانی محسوس نہیں ہوتی۔“

وہ سارے کا شش لے کر مجروح سے لمبے میں بولے ”تم مذاق کچھ دے ہو؟ قسم سے میں اپنے نظریات میں بالکل مخلص ہوں۔ میں محسوس دل سے جو کچھ محسوس کرتا ہوں اس کے مطابق عمل کرتا ہوں اور مجھے اپنے طرز عمل پر کوئی احساس جرم و شرمندگی یا گتہوار نہیں ہے۔ اگر تم ہی زیادہ خطرات لاحق نہ ہوتے تو میں علی الاطلاق تسلیم کر لیتا کہ ہاں میں اسمگلر ہوں لیکن ملک و قوم کے بہت سے ٹھیکیداروں سے بہتر ہوں۔“

”فیہ... انسان کو خود اپنے بارے میں دعوے نہیں کرنے چاہئیں“ میں نے دھیمی آواز میں کہا ”اس ضمن میں میری گزارش پس پس کی ہے کہ... میرے اب اپنی برادری سے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ اور آپ کی معلومات کے لئے بتانا چاہوں کہ میں نے جس طرح دھیرے دھیرے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت برقی زندگی اختیار کی ہے تو اس میں مجھے کوئی خاص دشواری نہیں پہلی۔ چہوتے موٹے مسائل اور دو توڑ جی کاموں میں ہوتے ہیں۔ وہ مجھے اس میں بھی کرنے پڑے لیکن ہر حال اس میں خطرات کم ہیں۔ مجھے یہ نئی زندگی راس آگئی ہے۔“

”یوں کہو کہ عافیت کی خاطر بھینچا، بھینچ کر کمال پہن کر بیٹھ گیا ہے اور شکار کرنے کے بجائے آرام سے نرم نرم گھاس چر رہا ہے۔“ انہوں نے گویا مجھے چایا بیگن میں فی الحال جوتے پر تیار نہیں تھا۔

”جو بھی سمجھ لیجئے“ میں نے اطمینان سے کہا۔ پھر گویا انہیں اصل بات یاد آئی۔ سارے کھیلوں میں گھماتے ہوئے بولے ”یہ سارے سکاٹے اور تقریریں خواہ مخواہ سچ میں آگئیں۔ میں تو تم سے چھوٹی سی بات کرنے آیا تھا۔ تم ٹرا دے سکتے ہو یا نہیں؟“ ان کا کچھ قطعی دوڑک سا گیا تھا۔

”مجھے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کرنا تھا“ چکا ہوں ”میں نے شائستگی سے کہا۔“ میں عام طور پر اپنے پہلے ہی جواب پر قانع رہا کرتا ہوں۔“

وہ یکدم سی، جھٹکتے سے اٹھ کھڑے ہوئے گویا صوفے میں گئے ہوئے کسی طاقتور امیر ملک نے انہیں اچھال دیا ہو۔ ان کی آنکھیں کچھ بدل سی تھیں۔ خشک اور کھردرے لمبے میں بولے۔

”ہاں کہ تم بڑے آدمی بن گئے ہو ابی، لیکن جس برادری سے انسان کا اصلی تعلق ہو اس سے یوں بے رخی اختیار کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ اور تمہیں تو شاید معلوم ہی ہو گا کہ ہماری برادری تو اس معاملے میں خصوصی طور پر کچھ زیادہ سی حساس ہے۔ ساتھ چھوڑ جائے والوں اور وقت پر کام نہ آنے والوں کو ہمارے ہاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔“

ان کے لمبے میں دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ بلکہ چھپی ہوئی بھی نہیں تھی، اچھی خاصی نمایاں تھی۔ یکبارگی مجھے اپنے کانوں کی لوہیں جھٹی ہوئی محسوس ہوئیں جو کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ میں نے اپنے لمبے کو ہموار رکھنے کی سخت کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”حاجی عالم شیر صاحب! میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں اور ماضی کی شیشا سانی کے حوالے سے آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ کو شش کریں کہ میرے دل میں آپ کا یہ احترام برقرار رہے۔“

میرے لمبے کی سرزمینی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے کچھ اور ترجمہ ٹھکروں سے میری طرف دیکھا اور سارے کا ایک طویل کش لیا۔ وہ فیڈل کا سترودالے انداز میں کچھ تم کر کھڑے تھے۔ سگار ان کے بوٹوں میں دبا ہوا تھا اور اس سے دھوئیں کی ایک چلی سی لکیر ہوا میں بلند ہو رہی تھی۔ میں اپنی جگہ کرسی کے نیچے سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا کچھ جھپکائے بغیر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے نظر چرائی اور کچھ عجیب پراسرار سے انداز میں ایک کانچے کے لیے مسکرا کر دوڑانے کی طرف مڑ گئے۔

وہ چلے گئے لیکن میرے ذہن میں مجاہد سی چھوڑ گئے۔ ایک بار پھر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ انسان واقعی خدا کی عجیب ترین مخلوق ہے۔ انسان دھمکے دے کر آتا ہے تو حرکت کو شرمندہ کرتا ہے۔ حاجی عالم شیر صاحب کے بارے میں میں نے

بھی سوا بھی نہیں تھا کہ اتنی سی بات پر کم از کم ان کی نظرید
 بنائے گی۔ بات صرف اتنی سی تو تھی کہ میں نے انہیں اس
 کام کے لیے نزاری کی سولت مینس کی تھی جواب مجھے پسند
 نہیں رہا تھا۔ میرا نظریہ حیات اب بدل چکا تھا لیکن معلوم
 ہوا تھا کہ اس دنیا میں بیشتر لوگ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ
 دوسروں کو ان کی مرضی سے زندگی گزارنے دی جائے۔ یہاں ہر
 کوئی بے اختیار و حیثیت اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ دوسرے اس کی
 مرضی سے زندگی بسر کریں۔ اور جس کا جس حد تک بس چل رہا
 تھا اس حد تک وہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کو بھی خود
 بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حاجی عالم شیر صاحب کے انداز نے مجھے خوفزدہ تو ہرگز نہیں
 کیا تھا البتہ خفیف سا رنج ضرور پہنچایا تھا۔ جہاں تک کوئی نقصان
 پہنچانے کا تعلق تھا تو نقصان انسان کو چوٹی بھی پہنچا سکتی ہے
 خواہ بعد میں انسان اسے چنگی میں مصلیٰ دے۔ اس لیے میں
 اس خوش فہمی میں تو نہیں تھا کہ حاجی صاحب مجھے کوئی نقصان
 نہیں پہنچا سکتے لیکن اب کسی قسم کے نقصان کی باتیں مجھے خوف
 زدہ نہیں کرتی تھیں۔ میری زندگی میں خوف کا عمل و عمل بہت کم
 رہ گیا تھا۔ تاہم اس قسم کی طاقتیں ذہن کی پرسکون جہیل میں
 دوچار لوگوں کے لیے لہریں ضرور پیدا کرتی تھیں۔

حاجی صاحب کے جانے کے بعد ان کے ناگوار آثار کو ذہن
 سے جھٹکنے میں مجھے چند لمحے ضرور لگے۔ اس کے بعد میں نے چند
 ترک کاڑکیں اور ایک بار پھر فاکوں کی طرف متوجہ ہوا لیکن
 شاید آج میرے مقدرمیں ناگوار ملاقاتیں ہی لگتی تھیں۔
 ابھی مجھے ضروری کاغذات دیکھتے ہوئے چند ہی منٹ گزرے
 تھے کہ اختر کام کا بزمِ رنج اٹھا۔ دوسری طرف کیسٹرن تھی۔

"مر!" وہ پرسکون لہجے میں بولی تاہم میں نے اس کے لہجے
 میں جھپکا ہوا خفیف سا اضطراب محسوس کر لیا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "ایک اجنبی نوجوان دفتر
 میں موجود ہے۔ اس نے رے سینٹن پرستے کی رحمت بھی نہیں کی
 تھی۔ کچھ شکوک لگ رہا ہے اور کچھ غصے میں بھی معلوم ہوتا
 ہے۔ رشید اور جعفر نے اس کا راستہ روکا تو بد معاشری دکھانے لگا
 فریجیر کو فوکر کیں ماریں اور ریزالود نکال لیا۔ رشید اور جعفر نے
 اسے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ پوچھ رہے ہیں اس کا کیا کرنا ہے۔ وہ
 بد تیزی سے آپ کا نام لے رہا ہے۔ کہہ رہا ہے آپ سے ہر
 حال میں ملے گا۔ اور سر۔۔۔" وہ بڑی چٹکچٹک ہاتھ کے ساتھ بولی۔
 "وہ گندی گالیاں بھی دے رہا ہے۔"

اس کی چٹکچٹاہٹ پر مجھے جلی سی نہی اچھی لگ کر یہ ہچکچاہٹ
 بجا تھی۔ کیسٹرن کو معلوم تھا کہ اس دفتر میں اگر گالیاں دینے کی
 جرأت کہنے والا بہت بد نصیب بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اتنا
 بد نصیب کہ زندگی بھی اس کا ساتھ جھوڑ کر رخصت ہو سکتی تھی۔
 "وہ اسکا نہیں آتا ہوگا۔ مابقی بقیہ کوئی گاڑی بھی موجود

ہوگی جس میں شاید اس کا کوئی ساتھی وغیرہ بھی موجود ہو۔ شہر
 سے کمبو کہڑکی سے چائیز لے اور انہیں نشانے پر لے لے۔
 میں نے دیانت کی۔

"شہزاد پہلے ہی ایسا کر چکا ہے سر" کیسٹرن نے بتایا "اس
 نے کہڑکی میں پوزیشن لے لی ہے۔ باہر سڑک کے دوسری طرف
 ایک درخت کے نیچے ایک چپ کہڑی ہے۔ یہ نوجوان بیٹھا ہے
 چپ میں آتا ہے۔ اس میں وہ بد معاشری قسم کے آدمی موجود ہیں۔
 جو ہماری بلڈنگ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ بظاہر تو ان کے پاس
 کچھ نظر نہیں آتا لیکن انداز ہے کہ چپ میں انہیں وغیرہ بھی
 موجود ہیں۔ وہ منتظر انداز میں بیٹھے ہیں"

"ٹھیک ہے۔ شہزاد کو پیغام بھیجو کہ وہ ڈکروہ لوگ بھی
 وغیرہ لیکر بلڈنگ کی طرف ہیروں تو ان کی کھوپڑیاں اڑا دے۔"
 میں نے جانتا۔ دیانت کی۔ "رشید اور جعفر سے کہو کہ اس
 نوجوان کو میرے کمرے میں پہنچا دیں۔ میں اس سے بات کر
 چاہوں گا۔"

"میں سر" کیسٹرن نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

رشید، جعفر اور شہزاد بظاہر دفتر میں چہرے ہی تھے لیکن
 درحقیقت یہ تینوں تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ دفتر میں ٹھیک
 الماریاں اور شیٹ وغیرہ فاکوں اور دفتری سامان سے بھر
 پڑے تھے لیکن ان میں دو چار خانے ایسے بھی تھے جن کے خفیہ
 حصے کھولنے پر دروازہ راکٹیں بھی اٹھ آتی تھیں۔ ضرورت
 پڑنے پر یہ دفتر ایک چھوٹا سا قلعہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میری
 زندگی میں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری کوشش یہی ہوتی
 تھی کہ ہر چیز کے لیے تیار رہا جائے۔ اپنے ساتھ ہر آدمی بھی
 چھانٹ کر میں نے اسی۔۔۔ نظریے رکھا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ
 فوراً جون بدل کر میرے شانہ بہ شانہ چل سکے۔

چند لمحے بعد وہ انداز نکلا اور رشید اور جعفر ایک نوجوان کے
 دونوں بازو اس طرح قابو میں کیے ہوئے اندر دو داخل ہوئے کہ اگر
 وہ ذرا بھی مزاحمت کی کوشش کرے تو اس کے کندھوں کے جو ڈاڑھ
 سکتے تھے اور غالباً اسی لیے وہ نوجوان ان کے ساتھ گھسٹا بھی آتا
 تھا ورنہ وہ لڑنے لڑنے کے بجائے کھاسی اچھی طرح اہل معلوم ہو جاتا تھا۔
 وہ ایک لمبا ترخا اور کرسی جسم کا بالک سرخ و سپید نوجوان
 تھا۔ ٹیس جسم کی شلوار قمیص اور واسٹ میں تھا جواب جگ جگ
 سے ٹھکانا کھود ہو چکی تھی۔ گریبان کے مٹن ٹوٹ چکے تھے اور
 سینے کے گتے بال نظر آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ تنہا رہا تھا اور بیان
 خیزی کے باعث سانس پھٹی ہوئی تھی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی
 ۔۔۔ مجھ سے بھی کچھ کم عمر ہی تھا اور اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے
 مجھے اپنی دھڑکن تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی کیونکہ وہ بالکل
 ملک اسلام زماں کی تصویر معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے ملک اسلام زماں کو اس عمر میں تو نہیں دیکھا تھا لیکن
 بقیہ نوجوانی کے عالم میں وہ بالکل اساعاد رہا ہوگا۔ اس کے بارے

میں کم از کم مجھے کسی سے یہ پہنچنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ کون تھا۔ وہ یقیناً ملک اسلام کا بیٹا قیصر ملک تھا۔

رشید اور جعفر نے یوں غیبی کی "نوشی اور لعلقی سے اسے کمرے کے وسط میں دھکیلا جیسے جھڑور کیس سے بوری اٹھا کر لائے ہوں اور گرد و ماں میں ڈال کر دو سرا پھیرا لگانے جارہے ہوں۔ اگلے قدموں کمرے سے نکل کر انہوں نے دروازہ آہستہ سے بند کر دیا اور ان کی کوشش ہو کہ دفتر کے پرسکون ماحول میں ذرا بھی ٹھنڈ نہ پڑے۔

"خوش آمدید قیصر ملک۔" میں نے ریو الونگ چیئر کے پٹے سے ٹپک لگاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"تم..... تم..... سور کے....." اس نے اپنے ہونے ڈرامائی انداز میں انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے کالی سے بات شروع کرنا چاہی۔

"مثلاً آپ۔" میں نے ایک گت غیر ارادی طور پر اٹھادی ہوئی آواز میں کہا کہ اس کی زبان کو بیک لگ گئی۔

"اگر آپ تم نے اس طرح میرے لیے کوئی کالی استعمال کرنا چاہی تو میں تمہاری زبان گڈی سے کھینچ کر اس سڑک پر پھرتے ہوئے کسی توارہ لٹکے کو کھادول گا۔" میں نے سر دھیمے میں کہا۔

چند لمبے ہم ایک ٹنگ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہڑا ہوا تھا اور محسوس میں بھی کچھ ایسا ہی کر رہا تھا جیسے میری آنکھیں کسی انجمنی چشم سے لگ رہی ہیں۔

"بیکار اس کی مصلیٰ پہنچ گئیں اور وہ شاید دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کر کے یکدم میری سڑک کی طرف لڑکا۔

"خبردار....." میں نے اپنا ہاتھ میرے گچھے سے نکال کر میرے پر رکھ لیا۔ اس ہاتھ میں خوفناک سی ساخت کا ایک ریو الوور موجود تھا جس پر سا..... یہی لگا ہوا تھا۔ میرا لہجہ اور اس ریو الوور کی شکل اسے اپنی جگہ پر روک دینے کیلئے کافی تھی۔

"میں نئے آدمیوں کو ریو الوور دکھانا پسند نہیں کرتا۔" میں نے ریو الوور کی نال اس کے بیٹھ کے سیدھ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے خدا نے اتنی طاقت دی ہے کہ نالی ہاتھ بھی تم جیسوں کی گردن توڑ کر سناڑ جیسی دہنی لاشیں گڑی کے راستے باہر پھینک سکتا ہوں لیکن ضرورت میں اس کمرے میں دھنگا مشتق پسند نہیں کروں گا۔ یہاں کا فرنیچر بہت قیمتی ہے اور میری نظر میں اس کی قدر و قیمت تم جیسے نطفہ نا تحقیق قسم کے لوگوں سے زیادہ ہے۔"

وہ ایک لمبے کے لئے خاموش کھڑا رہا۔ اس کی مصلیٰ یاں بار بار کھل رہی تھیں اور بند ہو رہی تھیں تاہم وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے چہرے سے بے بسی کا اظہار نہ ہونے پائے۔ چند لمبے کے لئے کمرے میں صرف اس کی سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی جو کسی درندے کے خرخرات سے مشابہ تھی۔

"آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟ کیوں تم ہلانا۔" وہ بے یہاں آن مجھے ہو؟" ہانی خرمیں نے قدرے ملاحت سے پوچھا۔

"بھولے مت ہو۔" وہ بھی گویا اپنے بے شرفی اور بھان پر قابو پاتے ہوئے بولا "تم نے یا تو میرے ابا کی کو اغوا کر لیا ہے یا شاید..... شاید انہیں قتل کر دیا ہے۔" اس کی آواز ایک لمبے کے لئے ٹوکڑا لگی لیکن فوراً ہی اس نے اس پر قابو پالیا اور گہری سانس لے کر اپنے آپ کو باوصلہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہوئے بولا "قتل و نثار تمہارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔"

"یقیناً یقیناً" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "مجھے پتا چلا ہے کہ موصوف بہت بڑے زمیندار ہیں۔ یا شاید تھے۔ معلوم نہیں ان کے لئے کون سا سبب استعمال کرنا مناسب رہے گا۔ بہر حال نو ذراں میں سے کا انداز ظاہر کر رہا ہے کہ باپ کے لئے بھی قتل و نثار کری اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر انسانوں کو جاگیر مولیٰ کی طرح کنواڑنا محبوب مشغول رہا ہو گا۔

پھر اس لوگوں پر بندوبست لے کر چڑھ دوڑنا بھی شاید انہیں پسند رہا ہو۔ محض زبان بلا کر اپنے کارندوں کے ذریعے کچھ بھی کر لیا ان کی عادت رہی ہوئی۔ زمیندار اور توکل میں بہت سے موجود ہیں اور ان میں سے ایک سے براہ کرا ایک طاقتور اور صاحب حیثیت ہے لیکن کچھ لوگ اپنی طاقت و حیثیت اور وسائل کو اچھے کاموں میں استعمال کرتے ہیں لیکن تم ایسے باپ کے بیٹے معلوم نہیں ہوتے۔"

"زیادہ تقرر کرنے کی ضرورت نہیں" وہ غرایا "اور اتنا معصوم اور انبیا بننے کی بھی ضرورت نہیں جیسے تم ابا کی کو جانتے ہی نہیں۔ اگر تم ان سے اتنے واقف ہوتے تو میری شکل دیکھتے ہی مجھے یوں نہ بچاتے۔"

"وہ تو ایک اندازہ تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آج دوپہر ایک انسپکٹر آیا تھا۔ وہ تمہاری اس ٹنگ دوڑ کے بارے میں بتا رہا تھا جو تم اپنے والد کی گمشدگی کے سلسلے میں میرے خلاف کر رہے ہو۔ چنانچہ اب جب مجھے تمہاری آمد اور آؤ کے انداز کے بارے میں اطلاع ملی تو میرے لئے یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں رہا کہ تم کون ہو سکتے ہو۔"

ایک لمبے کے وقف کے بعد میں نے گویا بھد مشکل حمل اور رسامیت سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں سمجھ نہیں سکا کہ اپنے والد کی گمشدگی کے سلسلے میں تمہاری فکر کرم کچھ پڑی کیوں پڑی ہے؟ تم جیسے لوگوں کے ڈسے ہوئے بیسیوں انسان اور احوال و عمر بھرے ہوتے ہیں۔ جبکہ میری تمہارے والد سے کوئی ملاقات..... کوئی دوستی یا دشمنی..... کوئی لین دین..... کوئی بھی تو تعلقی واسطہ نہیں رہا۔ ماں شاید ایک مرتبہ کسی ڈنر میں چند سیٹوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی نے ہمارا تعارف کرایا تھا لیکن میں ان کی سبوت تک بھول چکا تھا۔ اب تمہیں دیکھ کر یاد آیا ہے کہ شاید ان کی شکل ضرورت تم جیسی ہی تھی۔ بہر حال۔ تم مجھے یہ جانتے کا سوچ دو کہ آخر انہیں اغوا کرنے یا قتل کرنے کی مجھے کیا ضرورت پیش آسکتی تھی؟ کوئی بڑا قدم انسان کی وجہ

تہی اٹھاتا ہے تا کوئی تو نہ یاد ہونی چاہئے۔

”وہ بات بظاہر ہیسمی ہیں۔ شاید کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ کام تمہارے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔“ شاید مجھے دیکھ کر اب وہ بھی جذباتیت سے بالاتر ہو کر بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم پولیس کے قابو میں نہیں آسکتے۔ اور آج تمہارے آتش آگے کے بعد یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کس قسم کی چیز ہو۔ بے فکر رہو۔ ہم تم سے تمہارے ہی انداز میں نہیں گے۔ چھوڑیں گے نہیں ہم نہیں۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں نے غلطی کی ہے جو سوچے سمجھے بغیر زمینداروں والے روایتی انداز میں ہوں تم سے آنکھرانے کی کوشش کی ہے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ ہمیں دوسرے طریقے نہیں آتے۔“

”نہیں میں تمہیں اتنا کرڈٹ ضرور دوں گا کہ تمہاری یہ پہلی کوشش بھی زمینداروں کی روایات سے مختلف تھی“ میں نے ریوالور کو ہلکی جھنجھٹ دے کر مسکراتے ہوئے کہا ”زمیندار بھلا خود کہاں دھت کرتے ہیں۔ سستے داموں خریدے ہوئے ان کے کارندے ہی اکثر کڑے کھڑوں کی طرح مرتے ہیں۔ تم نے بڑی بہت دکھائی جو یہ شخص نہیں دھت کی۔ میں تمہاری اس جوانمردی کی قدر کرتا ہوں اور اسی جوانمردی کے صدقے میں تم یہاں سے زندہ سلامت واپس جاؤ گے۔ بشرطیکہ تم نے کوئی ممانعت نہ کی“

وہ ایک لمحے کھڑا گویا اندر ہی اندر غلی کھاتا رہا۔ پھر منظر یہ انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم ایسے ہی جوانمردوں کی قدر کرنے والے ہو تو کم از کم یہ تسلیم تو کر لو کہ میرے ابا جی کی آغوش میں تمہارا ہی ہاتھ ہے۔ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کے ذمے دار تم ہی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارے اس اعتراف کا ذکر کسی پولیس والے سے نہ کی بھی سرکاری آوی سے نہیں کروں گا۔ یہ مسئلہ میں اب قانون پر نہیں چھوڑ رہا۔ یہ اب صرف تمہارے اور میرے درمیان ہے۔ یہ جنگ صرف میری اور تمہاری ہے اور اس میں اب ہر حربہ استعمال ہو گا۔ تم صرف اعتراف کر لو۔“

میں ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا۔ بے چارہ بڑی مشکل میں تھا۔ ابھی اس کے دل میں شک کی پچائش تھی۔ ایک بار تو میرا خیال تھا کہ اس کی مشکل دور کر دوں۔

وہ دستور منظر یہ لمحے میں بولا۔ ”اگر تم نے ابا جی کو قتل کر دیا ہے تو صرف اتنا بتا دو کہ ان کی لاش کہاں ہے؟ اگر اس کی کچھ بیاناتی مل سکتی ہیں تو وہی ہمیں حاصل کر لینے دو۔ ہم کم از کم باہر تہ طریقے سے ان کی تدفین تو کر سکیں گے۔ دل میں گھماؤ تو بڑی کیا ہے لیکن اس طرح کچھ تو تسکین مل سکے گی۔ اگر ان کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تو یہ گھماؤ زیادہ اذیت دے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔

کہ لاش مجھے تمہارے توسط سے ملی ہے۔ تم جو قسم کوشش کروا رہے ہو۔ اس کے لیے میں انتہائی جھٹک آپٹلی تھی۔

ایک لمحے کے لئے تو میرا دل چاہا کہ اسے ہٹا دیں کہ اس کا باپ شہر سے دور ایک ورانے میں دفن ہے اور اب تک شاید اس کی لاش کو خطرناک کیزے کوڑے کھا چکے ہوں گے جو وہاں سکڑتے پائے جاتے ہیں۔ لیکن پھر میں نے اس خواہش کو دل میں ہی دبا لیا۔

”بت محبت تھی تمہیں اپنے باپ سے؟“ میں نے کڑی ذرا اٹھائی لیکن اس پرستہ نظر میں ہٹائی۔

”ہر سنیے اپنی کوہوتی ہے“ وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”مجھے اس لئے زیادہ ہے کہ ابا جی کو بھی مجھ سے بہت زیادہ محبت تھی اور پھر یہ کہ... ابا جی نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ دولت، طاقت، اور اور وہ سب کچھ جس کی اس دنیا میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”لیکن تم نے دیکھا کہ ہر طاقت کس نے ہمیں بچا کر لے لی ہو جاتی ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جیسے اس وقت تم میرے سامنے بے بس کھڑے ہو اور اپنے باپ کے بارے میں جاننے کے لئے زپ رہ رہے ہو۔“

”اس ایک لمحے کی برتری پر زیادہ کھال سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں“ وہ تمہارت سے منہ ہٹا کر بولا۔ ”اس وقت کو زیادہ دور نہ جھٹکا جب تم میری شو کوں کی زد پر ہو گے۔ میرے جوتے چاٹ رہے ہو گے۔“

میں مسکرایا۔ اس نوجوان میں طرمان عقیدہ تھے۔ اس کی طرف سے بے پروا رہنا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ پھر ایک لمحے کے لئے میرے اندر میرے دل کے کھڑے میں وہی رخ بستہ سا سناٹا پھیل گیا جو یک نیت مجھے اس کی گردن تھا۔ جیسے غلی کا شاک بعض اوقات کسی کو یکدم شل کر دیتا ہے۔

وہ ایک طاقتور باپ کا بیٹا تھا۔ بچپن سے انہوں نے لوگوں پر حکم چلایا تھا۔ گھر میں گھر سے باہر اکثر جنگوں پر اپنی دولت اور طاقت کی عکاسی دیکھی ہوگی۔ کتنا اعتماد تھا اسے اپنے ورثے پر کتنا تکبر تھا اس کے لیے میں۔ وہ اپنی بے بسی کو تسلیم کرنے یا شاید اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

پھر مجھے چودہ چودہ سال کا یاد آیا جس کے سامنے اس کے باپ کی لاش پڑی تھی، قاتل بھی اس کے سامنے قہر مند کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور جب اس نے آگے بڑھ کر قاتل کے گردیاں پر ہاتھ ڈالنا چاہا تو قاتل نے دار نے اس کے ہاتھ پر پیہ رسید کیا تھا۔ وہ لڑکا تھا۔

میں۔ جسے غرت، کمزوری اور بے بسی ورثے میں ملی تھی لیکن بہر حال مجھے بھی اپنے مصوم اور سادہ لوح باپ سے محبت تھی اور شاید اس سے زیادہ تھی جتنی قہر ملک کو اس کے خیال میں اپنے باپ سے تھی۔ کیونکہ باپ کے سوا صحیح معنوں میں دنیا میں میرا کوئی تھا ہی نہیں۔

شور و برپائی کرتے کے لیے بچے اپنے ساتھ لائونج میں لے گئے وہاں ایک بار پھر کافی کا دور چلا اور باتیں ہوئی رہیں۔ جب یہ نشست پر غصہ ہوئی تب بھی وہ لوگ ہوش سے نہیں نکلے۔ آٹھ کر کسی دوسرے ہال میں چلے گئے۔ جس ان سے اجازت لے کر باہر آگیا۔ رات خاصی بیت چکی تھی اور سردی کی وجہ سے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پارکنگ لٹ کے علاوہ ایک دو گاڑیاں ذرا کچھ دے میں بھی کھڑی تھیں اور وہ اوس میں دھندلائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ باہر اس وقت دریاں یا پارکنگ لٹ کا اسٹینٹ بھی موجود نہیں تھا۔ غالباً کسی بھانے اور حاصر کہیں کھسکے ہوئے تھے۔

میں نے اندر کے پڑ حرات ماحول سے یکدم باہر آتے پر جو ٹھنڈ محسوس کی وہ مجھے بڑی خوشگوار لگی۔ گرمی گرمی سانسیں لیتا میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے، مٹھنے کے سے انداز میں پارکنگ لٹ کی طرف چلا۔ دفعتاً... برآمدے کے آخری ستون کے عقب سے ایک بیلا سا نکل کر میرے سامنے آگیا۔

میرے اعصاب یکدم تن گئے۔ اٹھتا ہوا قدم رک گیا اور اس ایک ماہ میں میں نے اپنے آپ کو ہر طرح کے خطرے کے لیے تیار پایا لیکن مجھ پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ وہ شخص حملہ کرنے کا تو کیا ہاتھ بلانے کا بھی اہل معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ برآمدے کی روشنی وہاں تک بہت کم پہنچ رہی تھی جہاں اس شخص سے میرا سامنا ہوا تھا لیکن یہ روشنی کم از کم میرے لیے کافی تھی۔ میں نے ایک نظر میں اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ کوئی مشکوک الحال اور نشہ باز دھمکائی معلوم ہوتا تھا۔

اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں حلقوں میں اتاری ہوئی تھیں اور ٹم دا ہوتوں کے عقب سے پیلا رانٹ جھانک رہے تھے۔ وال برہہ کر جہاز چمکا ڈرا ڈھی میں جذب ہو رہی تھی۔ جسم پر ایک لمبا سا بوسیدہ اور دو کوٹ تھا جس کے ٹخن کھلے تھے اور نیچے جو کچھ بھی تھا وہ تقریباً زمینوں ہی کی شکل میں تھا۔

میرے اعصاب کو جو جھپٹکا تھا اس کا اثر بھی اسی تیزی سے معدوم ہو گیا لیکن جانے کیوں پھر بھی میں نے اپنے آپ کو مکمل مطمئن محسوس نہیں کیا۔ جب سے انداز میں اس نے ہاتھ پھیلایا اور کھر کھرائی آواز میں بولا۔ "ہاؤ اوزر ناما جس تو ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ میں دہلی ہوئی مڑی تری سی سگریٹ موئے موئے بوتلوں کے درمیان پھنسلای۔ معلوم ہو آ تھا کہ اسے اس وقت بجیک نہیں چاہئے تھی۔ میں اس بات پر خفیہ سی حیرت محسوس کے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ ہونٹوں کی چادر پوری میں داخل کیسے ہوا تھا؟ تعقیروں کو یا اس طے کے دیگر لوگوں کو غالباً شان ہونٹوں کی حد میں کون سمجھنے دیتا ہے۔ لیکن شاید وہ نظر بچا کر کھس گیا تھا۔

مزید حیرت مجھے اس کا ہاتھ دیکھ کر ہوئی تھی۔ میرے سامنے بیٹھا ہوا وہ ہاتھ ٹھنڈ یا استخوانی نہیں ایک چڑا چکا اور

نہایت آہستگی سے میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ ریوالتور میں نے باتیں باتیں میں منتقل کیا اور زیادہ تر قائلین پر نہیں بلکہ کسی تنگی سی دیوار پر چلنا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ میرا بازو ایک لذت یوں حرکت میں آیا جیسے کوئی طاقتور اسپرنگ ٹوٹا ہو۔ میرا گھونٹا آس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ کافی مشہور اور ہماری بھر کم ہونے کے باوجود قیصر ملک ہوا میں کچھ اچھلا اور ایک دیوار سے ٹکرا کر قائلین پر ڈیر ہو گیا۔

چند لمحوں کے لئے وہ سر جھٹکتا اور یوں آنکھیں جھپکتا رہ گیا اس کی پٹائی ضائع ہو چکی ہو۔ لیکن بالآخر سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹھوڑی کی کمال چھٹ گئی تھی۔ رستے ہوئے فون کو ہاتھ سے صاف کر کے وہ ٹھہرے سے انداز میں مسکرایا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز ساپ کی ہلکی سی چھٹکار سے مناسبت محسوس ہوئی۔

"تم اپنے جرائم کی فہرست طویل اور اپنی زندگی مختصر کئے جا رہے ہو" یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹ کچھ اس طرح کھینچ گئے تھے جیسے اس نے ہنسنے کی کوشش کی ہو مگر حلق سے کوئی آواز برآمد نہ ہو سکی ہو۔

"یہ میری طرف سے اعلان جنگ ہے" میں نے پڑ سکون لیے میں کہا۔ "اب تم جاؤ اور جو بھی تمہارا دل چاہے اور جو کچھ بھی تمہارے بس میں ہو وہ کرو۔"

اس نے صرف دھمکی آمیز سے انداز میں سر ہلایا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا اور داہنی کے لئے مڑ گیا۔ اس کے دو اونٹے تک پہنچے پہلے ہی دو اونٹہ کل گھل گیا، باہر سے کوئی ناویدہ آنکھ اسے دیکھ رہا ہو۔ دو اونٹے پر رشید اور مختصر اور باتیں کھڑے تھے وہ بظاہر تعلق سے نظر آ رہے تھے لیکن پلک جھپکاتے بغیر قیصر ملک کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ قیصر ملک ان کی طرف دیکھتے بغیر تاک کی سیدھ میں لٹکا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور دیر تک ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہئے۔ ابھی میں اسے "لینا بزم" بھی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ انکی اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ وہ چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس کی تصدیق دو دن بعد ہوئی۔

○●○

میں گاڑی میں غماز خود چلا آ ہوں۔ جب سے قیصر ملک میرے دفتر کو گیا تھا تب سے میں اسے گرد و پیش کے بارے میں بہت مشکوک رہنے لگا تھا۔ تاہم ابھی تک کوئی ایسا موقع نہیں آیا تھا جب مجھے شہر ہوا ہو کہ میرا حقائق ہو رہا ہے۔

اس روز میں ایک ڈنر سے فارغ ہو کر سٹن سے لٹکا تھا۔ ڈنر وقت دیر پہلے ختم ہو چکا تھا اور سبھی صمان جا چکے تھے لیکن اس سے نکلے رات مجھے چند کاروباری شاساں مل گئے تھے جو چند

مضبوط ہاتھ تھا۔ اس ہاتھ کی اس کے گلے سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں تھی۔

”میں سرگٹ نہیں چتا“ میں نے اس کی آنکھوں میں جماتے ہوئے کہا۔ میں گو کہ عادی سرگٹ نوش نہیں تھا لیکن میری جیب میں ایک خوب صورت سرگٹ لاٹز ضرور موجود رہتا تھا جو صرف لاٹزی نہیں تھا اس کے اور بھی کئی استعمال تھے لیکن میں نے اس لاٹز سے اس شخص کی سرگٹ سلکا ضروری نہ سمجھا۔

وہ میرے راستے سے ہٹ گیا اور میں نے اس کے قریب سے گزرنے کے لئے قدم بڑھایا۔ اسی لمحے میرے پولیس بریق سی چکی۔ اگر میں اس شخص کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن ہوتا تو یقیناً وہ خنجر میرے پولیس ہاتھ پر اتر گیا ہوتا لیکن میری جھمی من نے مجھے اس شخص کو بھکاری تسلیم کرنے سے باز رکھا تھا۔

میں ایک بے اطمینانی کام آگئی۔ میں لو کی طرح ایڑی پر گھوم گیا اور خنجر میرے قریب سے نکل گیا۔ وہ شخص مجھ سے ٹکرایا۔ ہم دونوں ہی لڑکھائے لیکن اس نے سینے میں مجھ سے بھی زیادہ پھرتی دکھائی۔ خنجر بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا بازو ایک بار پھر بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔

اس بار اگر میں اتنی ہی تیزی سے اپنا سر پیچھے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوتا تو شاید خنجر کی نوک میری ایک کچلی میں بیوست ہوتی اور دوسری کچلی سے نکل آتی۔ خنجر اتنی تیزی سے میری آنکھوں کے سامنے سے گزرا تھا کہ مجھے شخص ایک مدھن لگی ہوئی طرح دکھائی دیا تھا۔

وہ بھکاری جو ایک لمحے پہلے تک مجھے بھولے ہٹے باز نظر آ رہا تھا اسے یوں بجلی کی طرح حرکت کرتے دیکھ کر میں یقیناً محفوظ ہوا تاثر طیکے میں خدا اس کی نوک خنجر کا دفن نہ ہوتا۔ وہ دارغالی جانے کی وجہ سے اپنی جھونک میں تھوڑا سا ترچھا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی پسیوں پر گرانے کا ارادہ کیا۔ اس کا اور کوٹ بے حد دھیر تھا اور پھر ہاتھ بھی تدرے اچھٹا ہوا رہا تھا۔ اسے نالایا ملک چوٹ تو نہیں آئی تھی اور نہ ہی شاید کوئی پہل فوٹی تھی تاہم وہ پشت کے کل خاصی دور ہاگرا۔

تاہم اس کی کوششوں میں ایک ٹانے کا بھی قتل نہیں آیا اس کے دودار خالی گئے تھے لیکن سڑک جیسی پختہ دوش پر بھی گر کر وہ تیسرا وار کرنے سے باز نہیں آیا۔ وہیں پڑے پڑے اس نے خنجر ہوا میں ذرا سا اچھالا اور ہوا ہی میں اسے نوک کی طرف سے چنگی سے پکڑا اور اسی لمحے اگر میں چمک نہ گیا ہوتا تو یقیناً خنجر میرے حلق میں بیوست ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ جھٹکنے کے بعد وہ سستا ہوا میرے بالوں کو چھوتا ہوا پیچھے اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

اس شخص کو قابو میں کرنا تو درکنار اس کے حملوں سے بچنا ہی بہت بڑی بات تھی۔ کم بہت کی دگ دپے میں بجلی بھری ہوئی

تھی اور جیسا متنازعہ ہو رہا تھا اس نے گویا اسے زیادہ خطرناک بنا دیا تھا۔ زندگی میں کئی خنجر پیچکنے والوں سے مجھے واسطہ پڑا تھا اور خود سنا سنی سے قطع نظر میں اپنے آپ کو بھی اچھا خاصا ماہر خنجر زن سمجھتا تھا لیکن اس شخص نے مجھ پر مجھے حیران کر دیا تھا۔ ایسا ماہر اتنا پھرتا اور ایسا بے خطا وار کہ نہ الا میں نے آج نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ کسی اور طرح کے حالات میں مجھے ملا ہوتا تو شاید میں اسے اپنے ساتھیوں میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ سرپرست تو وہ میرے لئے فرشتہ اجل بنا ہوا تھا۔

خنجر ہاتھ سے نکل جانے کے بعد شاید وہ اتنا ترچھا ہو گیا تھا۔ مثنی زاندا میں وہ اچھل کر اٹھا اور ہوٹل کی بلی ریواری کی طرف لپکا۔ میں نے لمبی چلا تک لگائی اور اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کے اور کوٹ کا پچھلا حصہ میرے ہاتھ میں آگیا۔ اسے ایک جھٹکا لیکن اس نے فوراً ہی پلٹ کر ہاتھ کھپا اس کا گھونسا میری گردن پر پڑا اور مجھے یوں لگا کہ وہ کوئی انسانی ہاتھ نہیں بلکہ دہشتور ہاتھ تھا جس نے میری کھوپڑی ہلا دی تھی لیکن میں نے اس کا اور کوٹ نہیں چھوڑا۔

اس نے اور کوٹ اتار پیچنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ ایک بار اگر وہ صحیح طرح میری گرفت میں آجاتا تو پھر کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی قاتل کوشش بھی ختمی کہ نہ تو میں اسے صحیح طور پر گرفت میں لے پاؤں اور نہ ہی اس پر کوئی بھروسہ وار کر سکتوں۔

گردن چمڑنے کے لئے اس نے میرے پیٹ میں پیٹھ کھوپنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی یہ ٹیک پٹنے نہیں دی۔ اس کی گردن پر گرفت برقرار رکھتے ہوئے میں نے اس کی کھوپڑی یوں گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی جس طرح دسمانی لوگ کھانا خور و زور چھوڑتے ہیں لیکن وہ بھی بری طرح ٹپ کر اپنے آپ کو اس وار سے بچا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میرے گلے پر ٹپ کر رسید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پاؤں میں اس نے نجانے کیا پسنا ہوا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا گویا وہ لوہے کا کوئی ٹھوس جوتا تھا۔ اس کی گردن پر ایک لمحے کے لئے میری گرفت دھتلی ہوئی اور وہ گردن چھڑا کر دواڑک پھٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بندر کی طرح اچھل کر دواڑ پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔

میں نے سوٹ میں ہونے کے باوجود دو بار چڑھنے میں ناکام نہیں کی اور اس کے تعاقب میں دوسری طرف کود گیا۔ میں نے اسے آٹس کوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔ آٹس کوٹل کی کئی عمارت زیر تعمیر تھی۔ ہر طرف اینٹوں اور پلے کے ڈھیر تھے اور کتبے اندھیرے میں کوئی چیز متحرک نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں سے نکل جانے کے کئی راستے تھے اور یقیناً اس نے مجھے ڈانٹ دینے کے لئے ہی سڑک عبور کر کے یہاں آن گھٹنے کی دھت کی تھی۔

دروازے سے نکلا اور درمیانی سڑک عبور کر کے واپس چلے گئے۔

اب میں اس چیتے کی طرح چڑھتا تھا جس پر اندھیرے میں قاز
نہ چکا ہو اور گولی اس کے کان کو چھوئی ہوئی گزرتی ہو۔ میرے
ساتھ کم و بیش یہی ہوا تھا۔ اب سن کے ذرا اندر سے میں کوئی
کاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اونچے طرے والا دربان اندھونی
دروازے پر واپس آچکا تھا اور آنے جانے والوں کے لئے مڑبان
انداز میں دروازہ کھول رہا تھا۔ اس کا طبع مثل سپاہیوں والا تھا
۔۔۔ حتیٰ کے کمرے کے گوار بھی بند ہی ہوئی تھی۔ پہلے میں نے اس
سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کیا مگر پھر فوراً ہی ملتوی کر دیا۔ اب ان
پاتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے خود جا کر پارکنگ لائٹ سے گاڑی نکالی اور قدرے
بڑھتی کے عالم میں نال پرلے آیا۔ حالات کچھ عجیب سے ہو چلے
تھے اور میری بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ میرے پاس اس وقت
ریوالور تک نہیں تھا۔

میں نے گلبرگ کی جانب جانے کے لئے مال روڈ پر گاڑی
موڑی تھی کہ کچھ فاصلے پر درختوں کے قریب ایک لمبی سی سیاح
گاڑی اس طرح زچہ کی گئی نظر آئی کہ سڑک کا بیشتر حصہ ہلاک
نہ کر رہا تھا اور اس کے سامنے سے گزر کے جانا بھی خطرے
سے خالی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ جب میں آؤس کونسل سے نکل
کر چلے میں واپس گیا تھا اس وقت یہ گاڑی یقیناً یہاں موجود
تھیں تھی۔ چندی گھنٹوں میں کہیں سے آئی تھی۔

میں نے گاڑی جب اس گاڑی کے سامنے سے گزاری تو میں
اس بات کے لئے بالکل تیار تھا کہ میری گاڑی پر فائرنگ ہوگی
لیکن اس وقت میں حیران ہوئے بغیر نہ رہا۔ جب مجھے نہایت
اس پنہانہ انداز میں نکل جانے دیا گیا۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ
اس گاڑی میں کتنے لوگ موجود تھے کیونکہ گاڑی کے پیشے تاریک
تھے اور وہ دیر سے بھی تقریباً اندھیرے ہی میں گئی تھی۔ اس کی
تمام باتیاں بجھی ہوئی تھیں لیکن انجن بیدار تھا۔

میری گاڑی کے آگے بڑھتے ہی اس گاڑی کے بازو چڑھائے
اور وہ نیم دائرے میں گھوم کر ایک طرف کی طرح میرے تعاقب
میں آئے گی۔ میں کسی سانس نہ کر رہا تھا۔ آخر کھیل شروع
ہو گیا تھا۔ میں ان کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ پہلے مجھ پر بھکاری
کے بیروپ میں جس شخص نے حملہ کیا تھا اس کے انداز سے تو
صاف ظاہر تھا کہ اس کا مقصد ہر حال میں مجھے ہلاک کرنا تھا۔
لیکن ان گاڑی والوں نے میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیا
ان کا مقصد مجھے زندہ ہی قابو میں کرنا تھا؟ توڑی ہی دیر میں
پر گرام بدل لینے میں کیا مصلحت تھی؟ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں تھا
کہ بھکاری کا قتل میرے کسی اور دشمن سے تھا اور یہ گاڑی
والے کوئی اور لوگ تھے؟

ان سوالوں کا سہرا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

آؤس کونسل کی پرانی عمارت قریب ہی تھی اور وہاں بڑی
مدتی اور چل چل نظر آ رہی تھی۔ لان پر بھی قاتلین لگی ہوئی
تھیں۔ شاید کوئی ڈراما فٹم ہوا تھا یا انٹرول ہوا تھا۔ چند لمبے لمبے
اندھیرے میں اور ادھر کا جائزہ لینے کے بعد میں پرانی عمارت کی
طرف چل دیا۔ یہاں بھی روشنی کم ہی تھی۔ قریب پہنچ کر ہی
لوگوں کی شکایں دیکھی جاسکتی تھیں۔

یہاں بہت سے لوگ اور ادھر آ جا رہے تھے۔ کچھ لوگ
ایک جھونپے سے کہیں کے قریب کھڑے کوئلہ ڈھکس لپی رہے
تھے اور سگریٹوں کے کش نکال رہے تھے۔ برآمدے کی میزچوں پر
درختیں لڑکیاں اور دو تین مرد کھڑے تھے۔ مردان سے باتیں
کرنے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ لڑکیاں منظر نامہ سے انداز
میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ وہ سب ہی گرامیک اپ کئے ہوئے
تھیں۔

ان میں سے ایک لڑکی میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا کر
ہولی "واہ شیخ صاحب! اچھی گاڑی بھیجی آپ نے۔ اس سے تو
اجنبازیں کشہ نکلیں گی چلی جاتی۔"

اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دو سری لڑکیوں اور مردوں نے بھی
ہراکیری طرف دیکھا۔ میری آنکھیں کیوں کہ کم روشنی میں بھی
بہتر طور پر دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اس لئے میں نے قدرے
تلاش سے بھی اس کی صورت اچھی طرح دیکھ لی تھی۔ وہ فربہ
بالکل ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر قابل ذکر چیز
اس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں ایک طائر ذریعہ
دام کی سی دشت تھی۔ ان حیران حیران سی آنکھوں نے مجھے
پچانے میں غلطی کی تھی۔

میں میزچوں کے قریب پہنچا تو اس کے تاثرات بدل گئے۔
وہ کچھ شرمندہ سی نظر آنے لگی لیکن اس کے ساتھ کھڑی ہوئی
لڑکی بڑی شرع معلوم ہوئی تھی۔ اس کی شکل و صورت کوئی خاص
نہیں تھی لیکن اس کی شہری مسکراہٹ میں بڑی جان تھی۔ وہ
بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی کو شوکا دے کر بولی "گولی مارو شیخ
صاحب کو۔ یہ شیخ صاحب سے بہتر چیز معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے ایک لمبے لمبے کے لئے ان کے سامنے رک کر گردن کو
خفیہ سا ٹھہر دیتے ہوئے شرع لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتے
ہوئے کہا "اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں آپ کی سنارٹش سے
مضموار استناد کرنے کی کوشش کرتا لیکن افسوس کہ میں اس وقت
کی اور پچھ میں ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ لڑکیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے مرد
میں طرف چاہنے کی بی نظیروں سے دیکھ رہے تھے لیکن میں ان
کی طرف توجہ دے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔
قاتلوں کے قریب ایک دو بھکاری موجود تھے مگر وہ کہیں نظر
نہیں آ رہا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ ہر گوشے کا جائزہ لینے اور
بڑھ کر سے نظر ڈالنے کے بعد میں آؤس کونسل کے بظلی

اوپر مال سے واپس لوڑ مال کی طرف جاتے ہوئے میں نے
تھوڑی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس واقعے کو ذہن سے جھٹک
کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے کوئی اہمیت دوں
لیکن میری یہ بے نیازی زیادہ در پر قرار نہیں رہ سکی۔

میں رفتار غیر ارادی طور پر کچھ کم کر چکا تھا اور اب عقب نما
آئینے میں ایک کاری کی بیڑ لائیکس نظر آئے تھے جو خاص
تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ یوں تو وہ آئینے پورٹ کی طرف
سے آنے والی کوئی بھی عام سی کار ہو سکتی تھی لیکن وہ جو میری
چھٹی جس سے بھی دو قدم آگے کوئی نامعلوم حس تھی 'ذہنی
بتاری تھی کہ گاڑی میرے عقاب میں آ رہی ہے۔ تاہم میں یہ
دیکھنے سے قاصر رہا تھا کہ وہ کب اور کہاں سے میرے عقاب میں
چلی تھی۔

میں نے یکدم پھر رفتار بڑھائی لیکن دونوں گاڑیوں کا
درمیانی فاصلہ برقرار رہا۔ مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ کب میں
چیرنگ کر اس سے آگے نکل گیا 'اس دوران گاڑی میرے کچھ اور
قریب آ گئی تھی۔ اب تو میں اس کی ساخت کا بھی اندازہ کر سکا
تھا۔ وہ تے ماڈل کی نورڈیگر تھی۔

وہ تھامیری گاڑی کے پچھلے شیشے پر چھٹا کا سا ہوا۔ میں نے
صرف ایک نظر شیشے کی طرف دیکھا۔ شیشے پر ٹپکی طرف ایک
سورخ نمودار ہو چکا تھا اور دوسرے شیشے پر ٹپکی کا جال ہا نمودار

میں ہر سکون انداز میں ڈرائیو کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا
طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ میری گاڑی میں ٹیلیفون موجود تھا جو
تقریباً پچیس میل کے دائرے میں کارآمد تھا۔ اس پر میں ماڈل
ٹاؤن والی کوٹھی سے رابطہ قائم کر سکتا تھا جو میرے لئے بیڈ کوارٹر
کا کام دیتی تھی۔ وہاں فونی اور شیر شیخ معنا موجود رہتے تھے۔
میں ٹرپ تو چو میں کھینچے وہیں ہوئی تھی اور اسے باقی تمام لوگوں
کے بارے میں معلوم ہوتا تھا کہ کون کس وقت کہاں ہوگا۔

اگر میں اس گاڑی کو چند منٹ اپنے عقاب میں لگائے رکھتا
اور اس دوران فون پر مرس ٹرپ سے رابطہ قائم کر کے اسے چند
ضروری ہدایات دے دیتا تو موت کے فرشتے اس گاڑی کے
عقاب میں آسکتے تھے لیکن یہ مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا کہ
ایک عرصے کے بعد اچانک اگر میں کسی خطرے سے دوچار ہو گیا
ہوں تو فوراً مدد کے لئے اپنے ساتھیوں کو طلب کرنا شروع کر دوں۔
... میں اپنے آپ کو ساتھیوں پر انحصار کرنے کا زیادہ عادی نہیں
بنانا چاہتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ میری صلاحیتوں کو تنگ بھی لگ
سکتا تھا۔

گورنر ہاؤس کے قریب پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار اچانک
بڑھائی۔ سیاہ گاڑی کی رفتار بھی اتنی ہی بڑھ گئی اور درمیانی فاصلہ
اتنی ہی رہا۔ میں انیسویں سٹریٹ پر پہنچا تو آئی چلا گیا۔ سٹیشن سڑک
پر گاڑی کمان سے ٹکے ہوئے تھر کی طرح جاری تھی۔ میں نے
انہیں اتنی مثالیں کا ایک چھوٹا سا نمونہ دکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

سڑک دو طرفہ تھی۔ سینٹ کی درمیانی رکاوٹ اور گرین
بلینٹ کے درمیان جیسے ہی جگہ نظر آئی میں نے ایک خاص ٹیک
لے دو پہیوں پر گاڑی اچانک موڑی۔ اس ٹیک پر عمل کرنے
کے لئے جبرق مشاق ڈرائیو رسی کی نہیں 'ایک نہایت شاندار'
خاتون اور منبوط گاڑی کی بھی ضرورت تھی۔

میرا عقاب کرنے والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ
میں اس رفتار سے جاتے جاتے اچانک مڑنے کا فیصلہ بھی کر سکتا
ہوں۔ یہ ایک انتہائی خطرناک پوزیشن تھا اور اس کا تجربہ میں پہلے
بھی کئی مرتبہ کر چکا تھا۔ عقاب کرنے والے بھی عموماً اضطرابی
طور پر اسی طرف مڑنے کی کوشش کرتے تھے اور حادثے کا شکار
ہو جاتے تھے۔ اس وقت جو لوگ میرا عقاب کر رہے تھے ان کے
ساتھ بھی یہی ہوا۔

اس کار کے بریک بہت بری طرح چرچائے اور ان لینے کی
کوشش میں اس کے پچھلے پینے دور تک سڑک پر ٹھہرے
گئے اور پھر وہ سڑک کی درمیانی رکاوٹ سے ٹکرا کر الٹ گئی۔
میں نے نہ صرف وزن لیا تھا بلکہ عقب نما آئینوں میں یہ سب کچھ
دیکھا بھی تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے حلق سے ایک تھکا تھکا سا
قہقہہ برآمد ہوا۔ کسی کو تباہ ہونے دیکھ کر خوش ہونا میری فطرت
نہیں تھی لیکن دشمنوں کو تباہ ہونے دیکھ کر میں ضرور مسکراتا ہوتا
تھا۔

پراسرار ہولناک اور ناقابل فراموش کہانیاں

کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

زندہ جسمہ

70

اردو بازار لاہور

اس وقت وہاں کی رات بھی تنگ پکی تھی۔ کسی کسی کو بچے سے ہارسونیم کی تونڈ کسی صندوقی بچے کی روں روں کی طرح سنانے دے رہی تھی۔ میں بازار میں دیرانی قدم بٹانے لگی تھی۔ بارہ بیچنے والے بھی تنگ بار کراڑا دھر عمروں پر بیٹھ چکے تھے۔

اکا کا دکھاؤں بین یا راہ گیر ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے لیکن جس انداز میں میری گاڑی شاہی بازار میں داخل ہوئی اس سے وہ لوگ بھی بڑبڑا کر راستہ چھوڑ کر دیواروں سے چپک گئے۔ شاہی بازار کوئی زیادہ چوڑی چنگی شاہراہ نہیں اور پھر عموماً یہ سڑک نیم شکستہ اور نامور بھی رہتی ہے لیکن میں اس پر بھی تیز رفتاری کے قیام سامنے دیکھاڑ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں کی گلیاں بہت سی تنگ اور نیم تاریک تھیں۔ گاڑی لے کر گھٹنے کے لئے تو بالکل ہی ناموزوں تھیں اور پھر مجھے ان سے بچ کر زیادہ واقفیت بھی نہیں تھی لیکن گلیاں کے فیصلے کے تحت میں ایک گلی میں ٹھکس گیا۔ یہاں کا فرش اینٹوں کا تھا۔ میں وسط میں گدے سے پانی کی مٹی مٹی تھی اور دونوں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ پانی کے گئی کی ٹیڑھے میڑھے پائپ بیچے ہوئے تھے۔

میری سرسبز ہتھی بڑی تھی اتنی بڑی گاڑی لے کر کوئی دیوانہ ہی ان گلیوں میں ٹھکس سکتا تھا۔ دونوں طرف پانی کے پائپ ٹانگوں سے کھڑکھڑا رہے تھے اور گاڑی کے دونوں طرف کے دروازے دیواروں کو تقریباً چھو رہے تھے۔ اس گلی میں دھنپ یار کی طرح بیچ و خم تھے لیکن میں کسی نہ کسی طرح گاڑی کو کھڑا کر دیا۔ بہت دور تک لے گیا لیکن ایک سوڑا آخر کار ایسا کیا جہاں میری مشائی بھی جواب دے گئی۔

وہ سوڑ تو میں نے عمری سے کات لیا لیکن تین چار فٹ اونچے اس ٹونے ہوئے پول سے نہ بچ سکا تو گلی کے تقریباً وسط میں نہ جانے کیوں گاڑ دیا گیا تھا۔ گاڑنے والوں کو شاید عرفان ہو گیا تھا کہ ایک روز کوئی شامت کا مارا ان گلیوں میں داخل ہو گا اسے آگے نہ جانے دیا جائے۔

تھر خاصی زور دار ہوئی تھی۔ ہیڈ لائٹ ٹونے کا جھنک سٹائی دیا۔ میں نے گاڑی وہاں سے نکالنے کے سلسلے میں کوئی تدبیر لڑانے یا کسی اور چکر میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ عقاب کرنے والی گاڑی وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

میں تاک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا۔ ٹکٹے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے سالخورہ کمالات اپنے سینوں میں نہ جانے کتنے انجانے بچے چھپائے خاموش کھڑے تھے مگر وہ بد بخت کتا خاموش نہ رہ سکا۔ شاہ فہم جاہاں سے تنگ اگر سائے دیوار میں پلٹا ہوا تھا۔ میرا پاؤں اس کی دم پر پڑ گیا تھا۔ سوئے وقت جو کتا اپنی دم کو سمیٹ کر نہ سوئے وہ عملاً اسی انجام سے دوچار ہوا ہے۔ میرے پاؤں سے اگر اس کی دم چاچے سیدھی نہ ہوئی ہو لیکن آئندہ کے لئے قابل استعمال شاید ہی نہ ہو اور کتا چون کہ اپنی

ہڈی کا تھا۔ ناز بقیہ سنا پلنڈر لگی ہوئی کسی گھر سے کیا تھا۔ میں نے وہاں کا نہیں سنا تھا۔ شیشے کے درمیان اگر ٹراپ نہ پٹا سنگ کی حفاظت نہ ہوئی تو شاید برا شیشہ کی کچھوں میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔ گلی شاید تڑپتی آئی تھی اور سیٹ کی پشت میں کہیں اتر گئی تھی۔

یکبارگی میں نے پھر جھری سی لی، کچھ سنبھل کر بیٹھا اور رنڈ مزید بڑھا دی۔ اب سڑک کے کنارے کی کوئی چیز مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صبح سے گلیوں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ اب تو ایک گھر یا پلنڈر والی بھی استعمال ہو رہی تھی۔ ان کی دیدہ دلیری قابلِ داد تھی۔ شکر کی سب سے بڑی سڑک پر وہ بول دھڑلے سے ایک گاڑی پر غارتگر کر رہے تھے۔ یہاں نمازات کے اس پھر کبھی کبھار پولیس کی کوئی گاڑی گشت کرتی نظر آتی تھی لیکن آج دور دور تک ایسی کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔

غارتگر کرنے والوں کی پیشگوئیاں ضائع جاری تھیں تاہم برا اندازہ تھا کہ گاڑی کا پچھلا حصہ خاصا تباہ ہو چکا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ گاڑی کے ٹانگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن انہیں کامیابی نہیں ہو رہی تھی تاہم ٹانگوں کی طرف سے مجھے کوئی زیادہ پریشانی بھی نہیں تھی۔ ٹانزٹ پروف تھے اور اب مجھے افسوس ہوا تھا کہ میں نے گاڑی کی دھڑاں اور اب مجھے افسوس بھی ہات پروف کیوں نہیں لگوائی تھی۔ جرنی میں موزوں میرے ایک کاروباری دوست نے بار بار مجھ سے کہا تھا کہ وہ گاڑیاں جو خاص طور پر میرے استعمال میں رہتی ہوں، اگر میں ان کے ٹانزٹ ٹیڈر فوراے تھکوا دوں تو وہ میرے لئے بہت پروف ٹیڈے تیار کر کے بھیج دے گا جو ابھی کرشل پلانے پر تیار ہونے اور فروخت ہونے شروع نہیں ہوئے تھے۔ لیکن میں نے اس پیشکش پر بھی توجہ نہیں دی تھی کیونکہ میرے خیال میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔

ٹانزٹ کے سرے پر بیچ کر میں نے بلا سوچے سمجھے گاڑی بھائی کی طرف مڑ لی۔ آگے جس قسم کے راستے آنے والے تھے ان پر جانے کا مجھے فائدہ بھی ہو سکتا تھا اور نقصان بھی۔ میرے عقاب میں آنے والوں نے اب نازنگ بند کر دی تھی لیکن ان کا انداز ہمارا تھا کہ وہ قبر تک میرا پیچھا کرنے کا تہہ کئے ہوئے ہیں اور اس قسم کے معاملات میں اس گاڑی کا زاریور بھی بلا کا ناہر معلوم ہوا تھا۔ ہر موزوں گاڑیوں کے ہار بڑی طرح جڑا رہے تھے۔ بالکل قہمی انداز کی چیز تک ہو رہی تھی۔

گھسیٹا پیچ کر میں نے صرف ایک ٹانزٹ کے لئے سوچا اور گاڑی اندازہ حسن کی طرف مڑ لی۔ یہ بات جتنی تھی کہ انہیں ٹانزٹ سے بچنے میں ان سے چھٹکارا نہیں پاسکتا تھا اور کئی سڑکوں پر انہیں دانی نہیں دیا جاسکتا تھا۔

بازار حسن کے دن سوئے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں لیکن

دوڑتے قدموں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ میں چلنے کے بل دوڑتا ہوا اس مکان تک پہنچا یا تو بلند کر کے دو بار پرچاؤ بنائے اور دوسرے ہی لمحے بندر کی طرح اچھل کر دو بار پرچاؤ کیا۔ اس دوران قدموں کی آوازیں کچھ اور قریب آچکی تھیں۔ میں بلی کی طرح بے آواز طریقے سے بچوں کے بل اندر گھس گیا۔ مکان کا پیرنی حصہ ایک مختصر اور تنگ سی بالکنی سے مشابہ تھا جہاں ایک کونے میں کچھ کاٹھ کباڑ سا پڑا تھا۔ دوسری طرف دروازہ تھا۔ اس جگہ چھپنا محفوظ نہیں تھا۔ کمزری زیادہ بلندی پر نہیں تھی۔ میں نے آہستگی سے کمزری کا پٹ کھول کر بچوں کے بل کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔ قیمت تھا کہ اس کمزری میں ملازمین وغیرہ نہیں تھیں لیکن یہ دیکھ کر مجھے خفیف سی حیرت ہوئی کہ کرا بالکل خالی تھا حتیٰ کے اس میں فرنیچر کے نام پر بھی ایک کرسی تک موجود نہیں تھی۔ فرش پر گرد کی پٹی تھی۔ یہ بھی موجود تھی۔ کمرے میں دو درگیر الماریاں موجود تھیں جھڑان کے پتے کھلے تھے اور وہ بالکل خالی تھیں۔ لگتا تھا کہ کمین نہایت بے پروائی سے مکان خالی کر کے چھوڑ گئے ہیں۔

گوکہ باہر سے پانی گرنے کی شرور جاری تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں قدموں کی آوازیں پہلے سے زیادہ واضح طور پر سن رہا تھا۔ اب وہ کھلے حصے میں پہنچنے والے تھے۔ ایک بار پھر میں نے کمزری میں لٹک کر بندوں والا انداز اپنایا اور اندر جا پڑا۔ یہ بھی شاہی بازار کے بیشتر مکانوں کی طرح پرانی طرز کا ایسا مکان تھا جس کا فرش بہت اونچا تھا، اسی لئے کمرے کی کھڑکی بھی بلندی پر تھی۔

بے آواز طریقے سے اندر گھسنے کے بعد میں نے تھوڑے سکون کی گہری سانس لی اور کمزری کو نہایت احتیاط سے بند کر کے پورٹ چڑھا دیا۔ اسی لمحے میں نے اس بات پر توجہ دی کہ اگر مکان خالی تھا تو اس میں لاش کیو کر آئی تھی؟ اس کمرے کے ساتھ ہی غالباً دوسرا کمرہ تھا جس کا دروازہ ایک گونے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ دروازہ نیم کھلا تھا۔

میں اپنی راست میں قطعی بے آواز قدموں سے ملنا دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ میں دروازے کو چھو "ایک خوابناک سی آواز گویا ہوا کی کہوں کے پھٹنے کی جھلک ہوئی موسیقی کی مدھم لے کی طرح میری سماعت سے گزرا۔ "آواز... اندر آجائے... یہ دروازہ آج بھی تھمارے انتظار میں آکا طرح کھلا ہے جس طرح تم چھ برس پہلے اسے کھلا چھوڑ گئے تھے۔ آواز نسوانی تھی۔

دو حوں اور بھرت پریت پر مجھے ذرا بھی یقین نہیں تھا لیکن یہ آواز سننے ہی سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں آئی تھی۔ ہوئی مدھم ہی کا تھا۔ کیونکہ آواز ایک ایسی سرگوشی سے آئی تھی جیسی عام طور پر فلموں میں رومنوں کی موجودگی کا خبر کرنے کے لئے مدھم کی اثرات کی مدد سے سنائی جاتی ہے۔

گو کہ دروازوں کے سامنے بلائے کے لئے استعمال کرتا ہے اس لئے وہ اس کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر وہ نہایت بری طرح چٹا کر بہت اونچا اچھل پڑا تھا تو اس کی یہ حرکت بے جا نہیں تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ انتقام میری ٹانگ روچھا میں نے اسے ایک ٹھوکر رسید کر کے دوبارہ ہوا میں اچھلا اور اپنی اس زیادتی پر دل ہی دل میں اس سے معذرت کرتے ہوئے زیادہ تیزی سے آگے کی طرف دوڑ پڑا۔ گلی کے مزید کچھ پیچ دوخم طے کرنے کے بعد جب میں تقریباً ایک فلائنگ کا فاصلہ طے کر چکا تو اچانک ہی میں نے اپنے آپ کو کھلی جگہ میں پایا۔

یہاں چاندیوں طرف دینی پرانی طرز کے اونچے اونچے سالنورہ مکانات تھے اور درمیان کی جگہ خالی تھی۔ یہ جگہ کسی بہت بڑے کنوئیں سے مشابہہ نظر آ رہی تھی۔ میں وسط میں کارپوریشن کا ٹیگ ہوا تھا جس کی ٹوٹی کسمپرسی کے سے عالم میں آدمی کھلی ہوئی تھی اور پانی شرور شرور کی سی پر شور آوازیں اس وقت بھی بر رہا تھا۔

یہاں پہنچ کر گویا اس گلی کا اختتام ہو گیا تھا جس سے میں آیا تھا اور آگے مزید کوئی گلی نہیں تھی۔ بس ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مکان ہی مکان تھے۔ بند کواڑوں والے مکان۔ کسی کسی کمزری میں دوشی نظر آ رہی تھی اور ایسی کمزریاں گویا شک زدہ سی آنکھوں کی طرح مجھے کھوکھری تھیں۔

میرے پاس شائع کرنے کے لئے تو کیا استعمال کرنے کے لئے بھی وقت نہیں تھا۔ سناٹے سے چھیڑ چھاڑ کرتی چند بسم ی آواڑوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرے خون کے پیاسوں کی گاڑی میری گاڑی کے عقب میں رک چکی ہے۔ میں وہ قدم آگے بڑھا لیکن تذبذب کے عالم میں رک گیا۔ اسی لمحے مجھے فاصلے پر کھلی میں کہیں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انہوں نے مجھے سامنے پایا تو چھیڑے اڑا دیں گے۔ اب ان کا غالباً مجھے اغوا کرنے کی ذمت کرنے اور کسی قسم کی پوچھ گچھ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور گویا بہر حال انسان سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ مجھے کہیں نہ کہیں بچائے پناہ تلاش کرنی تھی۔

یہاں کے بیشتر مکانات اونچے اونچے بند زبوں کی طرح تھے۔ سامنے صرف ایک مکان ایسا نظر آ رہا تھا جس کی الگ ایک بیرونی دیوار تھی اور وہ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس سے ذرا ہی نیچے اصل عمارت تھی اور اس میں سامنے ہی ایک مدھم کمزری نیم کھلا نظر آ رہی تھی۔ مکان زیادہ عرصہ معلوم نہیں ہوا تھا اور یہ بھی غالباً کسی طوائف ہی کی رہائش گاہ تھی۔ شاہی بازار میں بیشتر عمارتوں کی رہائش اور تاج گاہ کے نمکائے الگ الگ تھے۔ دیگر کا دھاری لوگوں کی طرح وہ بھی کچھ زندگی میں ایک حد فاصل پر قرار دینے کی تا کہ معلوم ہوتی تھی۔

سہ پہلے میں۔ ذات کمال دیکھا ہے۔

میں نے مڑ کر اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور اس کے دونوں بولت چڑھا دیے۔ لڑکی کے انداز سے اب بھی کسی قسم کی تشویش ظاہر نہ ہوئی، وہ اسی طرح جاکھینے سے ٹپک لگے بھی رہی۔ البتہ دروازہ بند ہونے پر اس کی آنکھوں میں مدھم نوکے ساتھ جلتی ہوئی انتظار کی شمع یکدم بجھ گئی۔

اب اس نے گویا مجھے میری ذات کے حوالہ سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک متعلیٰ مسکراہٹ آگئی۔ قدرے جھکے جھکے سے انداز میں اس نے پہلو ہٹا دیا۔

”آئیے چوہدری صاحب! ذہن نصیب۔ ایسی طرح بھی سہی آپ ہمارے دروازے پر آتے تو کسی ”اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ شرف لب اسٹک سے رستے ہوئے تھے مگر ان ہونٹوں سے برآمد ہونے والی یہ آواز گویا کوئی نوحہ گہرا رہی تھی۔ بہر حال اس نے مجھے چوہدری صاحب کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے پہچانتی تھی۔

اسی لمحے میرے ذہن میں اٹکا سا چمکا ہوا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ توڑی عرصہ پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ جب ملک کے بارگ میں سین فلم ان شوٹنگ ہو رہی تھی تو وہ اپنی ٹائیکہ ٹاپ ماں کے ساتھ وہاں آئی تھی اور اس کی ماں نے مجھے راستے میں روک کر کہا تھا کہ ”بے لکھی اپنی قسم میں چانس دیتے۔ مجھے اس وقت وہ عورت بھی اور اس کی تیس سالہ ”بے لکھی“ کوئی نیپ نظر آتی تھی۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے انہیں کوئی بہت افراہو اب نہیں دیا تھا۔

میری سہی کسر اتفاقاً نے پوری کر دی تھی۔ جب میں نے اس سے مشورہ کیا تھا کہ اس لڑکی کو چانس دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ تو اس نے اسے کچھ پراسرار اور کچھ خطرناک سی چیز قرار دے دیا تھا اور میں نے اس کا خیال وہاں سے بانٹل ہی جھٹک دیا تھا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ پراسرار حضور تھی۔ اس وقت بھی میں اسے ایک پراسرار روپ میں دیکھ رہا تھا۔

”تاہم کوئی آپ کے تعاقب میں ہے۔ اور وہ یقیناً کوئی بہت خطرناک دشمن ہو گا جس سے گھبرا کر آپ جیسا آدمی بھاگ رہا ہے۔“ وہ مسرے سے اتر کر میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آواز اب بھی سرگوشی سے مشابہ تھی۔ اس کے ڈیڑھے بھالے بلکہ کسی حد تک بے بیٹم عروسی لباس نے بارود اس کی جسمانی ساخت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ وہ دروازہ اور بے حد مضبوط جسم کی مانگ نظر آتی تھی۔ میں اس لمحے یہ بھول چکا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں آ رہا ہے۔

”تم ہمیں دوتا۔“ میں نے غیر ارادی طور پر اس کے چہرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لئے میں تعجب کے عالم میں کھڑا رہا۔ میرا غماز ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ دوسرے کمرے میں نہ جانے کون ہے اپنی بیٹی پتھر بھی جس کے خیال میں میں چھ برس پہلے میاں سے رخصت ہوا تھا۔ ایک ٹائٹ کے لئے میرے دل میں نوٹ ہانے کا خیال بھی آیا لیکن اس وقت تک ہر سکوت چھاپکا تھا اور یہ سکوت ہنگاموں سے زیادہ خطرناک محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بیٹا فکاری کنوں کی طرح میری بوسہ گھٹنے پھر رہے تھے۔ جس شخص کے قدموں کی آہٹ محدود ہو جاتی تھی اس سے میں زیادہ ڈنڈا ہو جاتا تھا۔ میرے لئے آگے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

نہایت غیر محسوس انداز میں ایک عروسی سانس لے کر میں نے ہم دروازے کو تھوڑا دھکیل کر یوں قدم اندر رکھا جیسے کوئی دھم دیا مگر پہلے بار بھوم کے سامنے تار پٹنے کا مظاہرہ کرنے کے سلسلے میں سہلا قدم افراہو ہو۔ انہم میں کسی قدر تھچا اور بکشت کے قریب ہی رہا تھا۔ کچھ اس انداز میں کہ اگر مجھ پر غار لپا جائے تو مجھے کارکن زیادہ رہے۔

لیکن سامنے مجھے کوئی بندوٹی یا مخمخ نظر نہیں آیا۔ سامنے اب سے پہلے مجھے صرف وہ آنکھیں نظر آئیں۔ لیکن یہ آنکھیں کی قابل آنکھیں تھیں۔ گو اس دت وہ آنکھیں نہیں ”اور اسی در آنسوؤں کا سمندر تھیں۔

وہ ایک فرسورت لڑکی کی فرسورت آنکھیں تھیں۔ وہ ماننے ہی ایک معمولی سی مسرے پر عروسی لباس میں بیٹھی تھی۔ بہت پاؤں تک بھی جی جی، جھپٹل کرتے زور پٹتے، سرخ بڑھکیلا اور ہلکیلا جوڑا زیب تن کئے مگر ایک اب کئے کوئے کٹناری لادیت سر پر ڈالے۔ وہ ایک عمل دہن تھی۔

میں صرف ایک چیز کی وجہ سے وہ دروایتی دلن سے مختلف برکتی تھی۔ اور وہ چیز تھی اس کی آنکھیں۔ ان آنکھوں میں نوحے جنوں نے اس کا کابل پھیلا دیا تھا۔ اس کے نادر ہر آنسوؤں کی لکیریں خشک ہو چکی تھیں۔ مگر آنسو بھی بے غیر حلق چیز نہیں تھے۔ ساگ رات کو بہت سی دلیلوں کی غول میں آنسو ہوتے ہیں۔ مختلف چیز دراصل وہ دشت ”وہ دلی تھی جو اس کی آنکھوں میں جاگزیں تھی۔ ان غارتوں کی دروایتی تو کسی کے انتظار میں کھنڈر ہو گئی ہوں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کس قسم کی ”حزن میں نے کسی کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر یہ ”ویرانی“ یہ ششگلی اور یہ حزن پتھر اور بڑھ گیا۔

اور وہ کس سے نہ تھے وہ بولیں مجھے دیکھنے لگی تھی جیسے در حقیقت نہ تھوڑے دیر ہی ہو گیا۔ میں کوئی شفاف شیشہ ہوں اور وہ میرے پار ہی اور کوئی دہی ہو یا دیکھنا چاہ رہی ہو۔ شاید اس کے انتظار کا لعل صبر ایک ٹائٹ کے لئے لڑتا تھا اور اب وہ بارہ دہی غار صوب ہو گیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی مسرت مجھے خوشامی ٹک رہی تھی لیکن غریب طور پر مجھے یا نہ آتا کہ اس۔

ٹامسڈی کے باوجود انتظار کر رہی ہوں۔ کیا خیال ہے "میں ابھی اچھی رسم کی بنیاد نہیں رکھ رہی؟"

"یقیناً" میں نے دھتے لیجے میں کہا "میں نے کبھی سوجا ہی نہیں تھا کہ ان ننگی کوچوں میں بھی اس طرح وفا کا بھرم رکھنے والے پائے جاتے ہوں گے۔"

"یہ تو بخت بخت کی بات ہے" وہ ایک ننگ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "بعض ہندوؤں اور بد معاشوں کو یاد زار حسن میں طوائفوں سے وفا ملتی ہے اور بعض شریفوں اور مسکینوں کو اپنی پردے دار بیویوں سے بھی وفا نہیں ملتی۔ یہ سب تمہارے اس دنیا میں ہوتے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا گونا گونا کاروبار والا درہ اتارا اور اسے حفاظت سے کر کے مسمری پر رکھنے لگی۔ دریاں وہ میری طرف مڑی تو گویا اسے کچھ یاد آیا۔

"تم تو اپنے دشمنوں کو گویا بھول ہی گئے۔ یقیناً ایک سے زیادہ آدمی تمہارے تعاقب میں ہیں۔ کیا سوجا ہے تم نے؟" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لیجے میں پوچھا۔

"تم نے مجھے سوچنے کی مسلت ہی نہیں دی" میں نے گہری سانس لے کر کہا "جہیں دیکھ کر تم سے مل کر مجھے حیرت کا کچھ ایسا بھوکا لگا کہ میں سب کچھ بھول گیا حالانکہ میں بہت کم جبران ہوتا ہوں۔"

"ابھی تم نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہوگا" وہ ضربا نہ بے میں بولی۔

میں اس کے خیال سے متفق نہیں تھا لیکن میں نے ہم لیجے میں کہا "شاید۔"

"مسئلہ کیا ہے؟" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بے ٹٹے لیجے میں بولی۔ اس کے بال خوبصورت تھے۔

"معلوم نہیں کتنی قد او میں" غامضہ خنک قسم کے لڑکے میرے تعاقب میں ہیں۔ ان کے پاس غامضہ خطرناک ہتھیار بھی ہیں اور ارادہ ان کا غالباً یہی ہے کہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں سے میرے پرچے اڑا دیں۔ اور میں بالکل ہنسنا ہوں" میں نے غائب دھتے لیجے میں انتشار سے اسے مورد تھان تادی۔

وہ ایک ننگ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک لے کے توقف سے کہا "کاش میرے پاس ایک رہاؤری ہو جاتا۔ اور مصیبت یہ ہے کہ میری گاڑی بھی ان بوجہدہ گلیوں میں پھنس گئی ہے۔"

"ہوں" اس نے بنگاہ بھرا اور پھر خیال انداز میں اپنے رخسار پر انگلی پھیری۔ اس وقت وہ بلاشبہ بڑکار اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ شونگ کے موقع پر جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا تو نہ جانے کیوں وہ مجھے چسپ لگی تھی۔ اس وقت اس کا ایک اب اس کا لباس اور اس کی حرکات و سکنات میری نظر میں کچھ عجیب غریب تھیں جبکہ وہ انداز انسانی ہوں گے کہ قلم انہیں

اس نے میری بات کاٹ دی "ہاں۔ میں وہی ہوں جو انہی میں کے ساتھ آپ سے ایک چھوٹے سے دل کی جھپک مانتے آئی تھی۔ شکر ہے کہ آپ کو یاد آیا ورنہ آپ مجھے بڑے لوگوں کو ہم جیسی جھپک مانتی لڑکیوں کے چرے کہاں یاد رہتے ہیں۔"

"بڑا ذہیر ہے تمہارے لیجے میں" جانے کیوں میں مسکرا دیا۔ "تم ہی مجھے لوگوں کا یاد ہوا۔" اس نے دھتے ٹھہرے لیجے میں کہا۔

"مجھے یاد دہانے کے تمہارا نام۔" میں ایک بار پھر ایک گیا۔ "آپ کو میرا نام یاد نہیں آئے گا" وہ ایک بار پھر مضطرب انداز میں مسکرائی "میرا قلمی نام اسی ہے۔ اصل نام بتانے کی میرا خیال ہے ابھی ضرورت نہیں۔"

"لیکن تمہاری ماں نے تو کہا تھا کہ تم لوگوں کی گھبرگ میں کوٹھی ہے۔" مجھے یاد آتا جا رہا تھا کہ ٹھک کے باغ میں شونگ کے موقع پر وہ ملاقات کبیں طرح ہوئی تھی اور اس مختصر سے وقت میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس وقت اپنی یقیناً اس دن۔ سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

"ہاں۔ اسی نے جھوٹ نہیں کہا تھا" وہ انسروہ سے لیجے میں بولی "لیکن یہ ہمارا پرانا کھربے۔ ہم یہیں کی پیداوار ہیں۔ میرا خیال ہے تفصیل بتانے کی تو ضرورت نہیں اور نہ ہی آپ کو تفصیلات سے کوئی دلچسپی ہوگی۔ آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ ہم کوئی زیادہ سبز لوگ نہیں ہیں۔ پیسہ آیا تو گھبرگ چلے گئے تھے۔ اور گو کہ مجھ جیسی لڑکیوں کو یہاں سے گھبرگ یا کسی اور اچھے علاقے میں بیچ کر بہت خوش ہوتی ہے لیکن مجھے نہیں ہوتی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا سب کچھ ہمیں یاد گیا ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا ہے یہاں آتی ہوں اور ہر سال آج کی تاریخ میں تو ضرور آتی ہوں۔ میں نے ہی اسی کو آج تک یہ مکان پیچھے نہیں دیا۔"

"لیکن کیوں آتی ہو ہر سال تم یہاں آج کی تاریخ پر۔؟ اور یہ سب کیا ہے؟" میں نے اس کے عموں لپاس کی طرف اشارہ کیا۔

"چھ سال پہلے اسی تاریخ کو اسی لباس میں کوئی مجھے یہاں پہنچی چھوڑ کر صرف یہ کہہ کر رخصت ہوا تھا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ اور اس کے بعد وہ آج تک لوٹ کر نہیں آیا" اس کی آواز جیسے خاموش سسکیوں میں ڈھل گئی "مہ نے زمانے سے بہت لڑکر۔۔۔ بلکہ یوں سمجھو کہ جان کی بازی لگا کر ایک دو سرے کو پایا تھا۔

چند منٹ بعد ہمارا نکاح ہوئے والا تھا۔۔۔ مجھ کو وہی اور دواڑے سے باہر گیا اور اس کے بعد اس کا کوئی پتا نہیں چلا کہ اس کو زمین کہا گئی یا آسمان نکل گیا۔ تب سے ہر سال اسی تاریخ کو میں اسی طرح ولسم بن کر یہاں پہنچتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ نہیں آئے گا لیکن میں نے یہ ایک رسم بنال ہے۔۔۔ رسمیں انسان ہی بناتے ہیں نا؟" وہ جھٹکتے جھٹکتے لیکن نام نہ طلب سے انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی "امید ہو تب تو سب ہی انتظار کر لیتے ہیں۔ میں

زید غلطی ہو جاتے ہیں۔ اس میں شاید جی کا اپنا زیادہ قصور نہیں تھا۔ اصل میں وہ کسی اور ہی طرح کی عورت معلوم ہوتی تھی۔

بالآخر جسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
"میرا خیال ہے اب تک تمہارے دشمن تمہاری تلاش میں ناکام ہو کر واپس نہیں چلے گئے ہوں گے؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے آج وہ واپس جانے کے مؤامسے میں ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ان کا انداز کچھ ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ مجھے بائبل سے بھی دھمکا کر لائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس سے کوئی نہایت فاسوشی سے نکال رہے ہیں اور کسی بھی لمحے اس مکان تک پہنچنے والے ہیں۔"

تب جی جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔ مگر اس نے مسی پر رکھا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا ہاتھ ہینڈ بیگ میں گیا اور جب وہ ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک بم لٹکاتا ہوا مائیکرو جرس لیمو گر دبا ہوا تھا۔ یہ اشاریہ چار پانچ کا ریلوے اور فائر کی نہایت ہی جدید اور خوبصورت ساخت کا جس میں اس کا حجم بے حد کم کر دیا گیا تھا مگر قاعدہ ہر حال بڑے کلیر کاربو الور۔ اس کے ساتھ ہی جی کے ہاتھ میں کسی گاڑی کی چابیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

دونوں چیزیں میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی "جن دو چیزوں کی تم کی محسوس کر رہے ہو وہ میں تمہیں بتا کر رہی ہوں۔ آگے تمہارا مقدر۔ میں گاڑی مکان کے سامنے والے دروازے پر کھڑی ہوتی ہے۔ ادھر بھی جی گاڑی چڑھی ہے۔ سفید رنگ کی ٹوبو گاڑی دروازے کے قریب ہی کھڑے نظر آجائے گی۔ اب تم نکلو۔"

"تم کیسے واپس جاؤ گی؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کا آپ سے تم پر آجانا اچھا محسوس ہوا تھا۔

"تم میری فکر مت کرو۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"اور اگر میرے جانے کے بعد وہ لوگ یہاں آئیں گے؟" میں ابھی تک متذبذب تھا۔

"تم اس کی بھی فکر مت کرو۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی۔ مجھے اس کے بارے میں اتفاق کی رائے یاد آنے لگی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کچھ پراسرار اور خطرناک لڑکی ہے۔ اتفاق کی بات مجھے کافی حد تک درست تو معلوم ہو رہی تھی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے پراسرار اور خطرناک ہونے کی نوعیت کیا تھی؟

میں نے ریلوے اور چابیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ وہ پلکیں جھپکاتے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی ایک بے عنوان سے اداسی باقی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر سات کی چائنیز مگر ٹینی راتوں کا خیال آتا تھا۔

اس لمحے وہ مددگار کی بجائی گی اس آواز میں سنائی دینا جیسے وہ جن

دوڑتی بلیاں مقبلی بالکونی نما پر آگئے جس کو دی ہوں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ بلیاں نہیں، بٹے تھے جو بجے بیروں سے زیادہ خطرناک تھے۔

"جاؤ۔" میں نے گویا لب لہے بغیر سرگوشی کی۔ میں کوئی ایسی حکمت عملی سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جس کے تحت میں صرف اس ریلوے کی مدد سے میں سے منٹ سکوں مگر اب کوئی حکمت عملی اختیار کرنے کے سلیبا میں تاخیر ہو چکی تھی۔ یہ بھی طے تھا کہ جی کے پاس ریلوے کی فاضل گولیاں نہیں تھیں... درنہ وہ ضرور مجھے دے دیتی۔ جس ریلوے لورڈ تھا جیسے کہ عموماً کچھ خاص قسم کی لڑکیاں اپنے پرستار میں رکھتی ہیں۔ انٹران کے پاس فاضل گولیاں نہیں ہو تھیں۔

"لیکن تم۔" میں ایک بار پھر جی کے بارے میں تھوٹوٹو کا شکار ہو گیا۔ اس سے مدد کے کاردار اسے یوں غیر یقینی حالات کے غلطی میں چھوڑ کر چلے جاتا مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسا نہیں کیا تھا، کبھی اس طرح کی مدد نہیں لی تھی۔ "جذباحت کی زنجیر مت پٹو" وہ پکاکے سر لہجے میں بولی اور اسی لمحے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ فطرات سے مننے کی صلاحیت رکھتی تھی اور اس کے لئے بھی چند لمحوں کی مصلحت کافی تھی۔

دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بدستور سرگوشی کے سے انداز میں بولی "اس دروازے سے نکل کر تاک کی سیدھ میں دوڑتے چلے جاؤ۔ تم سامنے والے دروازے تک پہنچ جاؤ گے۔ بڑے بولٹ کو ذرا تک لگا ہوا ہے۔ احتیاط سے کھولنا، آواز پیدا نہ ہو۔"

"میں تمہاری یہ حمایت بھولوں گا نہیں۔" میں نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جانے کیوں اپنے آپ کو ہوا کے جھونکے کی طرح ہلکا ہلکا محسوس کرتے ہوئے دروازے سے نکل گیا۔ کمرے کے آگے پر آمد تھا۔ دائیں بائیں بھی نکلنے کے بعد دروازے نظر آ رہے تھے۔ سامنے مختصر سا صحن تھا اور پورا سادہ اور قد رے فضا میں تھا۔

جس وقت... میں بیرونی دروازے پر پہنچا، وہ عقی دروازہ دھڑ دھڑاتے جانے کی آواز سنائی دینے لگی تھی جس سے گزر کر میں اس مکان میں داخل ہوا تھا۔ جیابا کوئی آواز سنائی نہ دی اور دوسرے ہی لمحے آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ دروازہ توڑے جانے کی کوشش شروع ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ میں اس مکان میں داخل ہوا ہوں ورنہ انہوں نے پاس پڑوس میں بھی کہیں اس قسم کی کوئی کوشش ضرور کی ہوتی اور اس کی ٹھوڑی بہت آواز مجھ تک پہنچ جاتی ہوتی۔ لیکن یہ محض ایک امکان تھا۔

میں نے حتی الامکان آہستگی سے اونچے اور مضبوط چینی دروازے کا موٹا سا بولٹ کھولا اور ذرا سی درز پیدا کر کے باہر

جھانکا۔ گلی میں گھبا اتر چلا تھا۔ دروازے کے قریب ہی سفید ٹیوب گاڑی تھی۔ روک روک کی حالت میں گاڑی تک پہنچ کر میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسٹریمک سنبھالتے ہی اسٹریشن میں چابی لگائی۔ گاڑی اچھی تھی۔ تقریباً بے آواز طریقے سے اشارت ہوئی لیکن اسی لمحے گلی کے ایک مکان کی دیوار پر ایک انسانی سایہ نمودار ہوا۔ دکھائی دیا اور جب تک گاڑی حرکت میں آئی تب تک وہ سایہ اچھی خاصی اوپر اس دیوار سے نہایت مشابہت انداز میں سڑک پر کود چکا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں رانگل تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ رانگل کا رخ مٹھ کر پاتا میں نے ایک ہاتھ سے اسٹریمک وھیل سنبھالتے ہوئے دو سر ہاتھ کمر کی سے نکال کر دیوار کی گولی اس کے پیٹے میں اتار دی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا اور اس کی رانگل اندھیرے میں نہ جانے کہاں جا گری۔ ایک ٹانے کے لئے مجھے خیال آیا کہ رات کو وہ گمن تلاش کر کے اغالوں۔ میرے پاس ایک ڈھنگ کا ہتھیار ہی ہو جائے گا لیکن ایک تو یہ کوشش خطرے سے خالی نہیں تھی اور دوسرے گاڑی کو گتیا ست ہاتھی کی طرح لڑائی ہوئی خاصی آگے پہنچ چکی تھی۔

میں نے بستر سمجھا کہ لٹکائی چلا جاؤں۔ ہٹی کے دیوار کی ٹال میں نے غیر ارادی طور پر چوم لی۔ اس دیوار نے اپنے کام کا آغاز نہایت عمدگی سے کیا تھا۔

ہنگامہ میرے عقب میں رہ گیا تھا۔ ایک لمحے بعد ہی میں نے اپنے آپ کو چٹائی بازار کے مین روڈ پر پایا۔ گاڑی میں نے دائیں طرف موڑی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اسی سمت جا رہا ہوں۔ جدھر سے آیا تھا اور پیسے ہی میں اس گلی کے قریب سے گزرا جس سے میں بھول چکیوں میں داخل ہوا تھا ایک فٹ ہی اندھیرے میں کھڑی ہوئی ایک کار کی ہیڈ لائٹس کسی عفریت کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں اور پھر میں نے انجمن کی غیبی غراہٹ سنی۔ میں نے اس طرف دیکھنے کی ذمت نہیں کی۔ مجھے ویسے ہی کچھ اندازہ سا ہوا کہ یہ وہی سیاہ گاڑی تھی جو یہاں تک میرے تعاقب میں آئی تھی لیکن میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کتنے آہی تھے اور کس طرح اتنی تیزی سے کبھی آگے پہنچ رہے تھے اور کبھی واپس اس جگہ پہنچ جاتے تھے جہاں سے میں نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔

آگے نکلنے نکلنے میں نے ایک اور گاڑی کو بھی اپنا تک تعاقب کی طرح اپنے تعاقب میں چھپتے دیکھا۔ اسی لمحے آگے دوڑ کہیں پولیس والوں کی دھمکانی دینے لگی۔ پولیس والوں میں سے بڑی اچھی بات ہے کہ وہ دوسرے ہی لوگوں کو جبراً روک دیتے ہیں کہ ہم آ رہے ہیں۔ نہتے جھانکا ہے براگ لے۔

شاہی بازار کا مین روڈ بھی کچھ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ میں اپنا نوکڑا راہ کو چھوڑا گاڑی کو لہراتا اس رفتار سے گزرا کہ وہ راہ غیر دشت زدہ سے ہو کر اودھر اودھر پتے نظر آئے۔ راستے

میں مجھے کہیں پولیس والے یا ان کی گاڑی نظر نہیں آئی۔ شاید مین روڈ پر نہیں اودھر اودھر کہیں گلیوں میں تھے اور معلوم نہیں اس گڑبگڑ سے سرگرم تھے جو میری اور میرا تعاقب کرنے والوں کی وجہ سے پھیل رہی تھی یا پھر کسی اور پکر میں تھے۔ سرگرم روڈ پر پہنچ کر میں نے سٹپل کی دیوانہ کرتے ہوئے چوراہے پر گاڑی دو پہیوں پر چھائی اور اس طرف روانہ ہو گیا۔ جدھر کچھ آگے جا کر یہی سڑک راوی روڈ کھلتی تھی۔ رات کے اس پہر اس سڑک پر ٹریفک برائے نام قابلہ اب ٹرکوں کی آزدانہ آمدورفت کا وقت ہو چکا تھا اور طرح طرح کے ٹرک کو کھڑے دھناتے دو طرف سڑک پر رواں دواں تھے۔

اس سڑک پر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میرے تعاقب میں اب دو گاڑیاں تھیں۔ یہ چیز بھی میرے لئے ناقابل فہم تھی کہ جوں جوں تعاقب کا سلسلہ طویل ہو رہا تھا ان کی تعداد میں کچھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا؟

وہ ٹرک جو اسی سمت جا رہے تھے جدھر میں جا رہا تھا میں نے ان کے درمیان گاڑی کو نہایت خطرناک انداز میں لہراتے ہوئے اپنا تعاقب کرنے والوں کو یہ آثر دینا چاہا کہ میں انہیں ڈان دینے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ وہ مجھے ایک ٹانے کے لئے بھی نظر سے اوجھل نہ ہوں۔ دس اور اس مقدمہ کے لئے ضروری تھا کہ بھی میری ہی طرح ٹرکوں کے درمیان سے گاڑی کو زنگ نہ بک کرتے ہوئے نکالتے۔ اس دوران میں کوئی کوشش کر سکتا تھا جس سے ان کی کم از کم ایک گاڑی تو کسی ٹرک سے ٹکرائی یا الٹ جاتی۔ لیکن وہ اس پکر میں نہیں آئے۔ وہ ٹرک تقریباً سیدھی قطار میں سڑک پر تھے۔ تعاقب کرنے والی ایک گاڑی اس قطار کے ایک طرف ہو گئی اور دوسری گاڑی دوسری طرف۔ اب میں ٹرکوں کے درمیان انہیں فجد دیتے ہوئے پھونک لیتے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال وہ مجھ پر قازم نہیں کر رہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ جس انداز سے اس وقت تعاقب جاری تھا اس میں وہ قازم کر کے مجھے کوئی حقیقی نقصان پہنچا سکیں گے۔ اس لئے انہوں نے بستر ہی سمجھا کہ ایو میٹن شائع نہ کیا جائے اور لوگوں کو بھی اپنی طرف متوجہ نہ کیا جائے۔

چند ہی لمحوں میں میں نے اپنے آپ کو راوی چوک کے قریب پایا۔ اس چوک۔ مختلف سمتوں میں مختلف شوروں کے لئے سرگرم تھکتی ہیں۔ اس وقت ان شوروں کو جانے والی آواز کا نہیں سمجھتا تھا تو دے قاصطے پر کھڑی تھیں۔ ان کی آواز کی جہاں بل بھی رہی تھیں۔ بریٹراں اور ایو میٹنل ہارن بجائے جا رہے تھے اور کنڈیکٹر مختلف شوروں کے نام لے لے کر آوازیں دے رہے تھے حالانکہ وہاں دور دور تک کوئی مسافر نظر نہیں آتا تھا۔ مسافر جتنے بھی دستیاب تھے وہ ان بھول میں پہلے ہی چھپ چکے تھے۔ میں نے شہر سے نکل لیا ہی بستر سمجھا۔ ایک ٹانے کے لئے مجھے خیال بھی آیا کہ اس جگہ چوک قدرے دھنکی تھی اس لئے

ہاں ان سے اچھے انہیں کسی طرح چکر دینے کا فطرہ مول لیا جا
سکتا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں تھا
کہ وہ یہاں بھی اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتے۔ اس طرح
مجھے بے گناہ لوگوں کی جان بھی چاہتی تھی۔

اس چوک میں بھی سنگل انہی تک کام کر رہے تھے لیکن میں
نے ان کی پروا نہ کرتے ہوئے دو پیوں پر گاڑی شاہدہ کی سمت
گھائی۔ پیوں اور بریکوں کی چرچاہٹ کے ساتھ ہی چوک میں
پہاڑوں پر ایک گشت بگم گیا۔ پیوں کے ہارن خاموش ہو گئے اور
کنڈیکٹر بھی جانے کیوں آوازیں لگاتا بھول گئے۔ میرے عقب
میں ان دونوں گاڑیوں کے پیوں اور بریکوں کی چرچاہٹ سنائی
دی اور وہ بھی بالکل میرے ہی انداز میں چوک سے مڑیں۔ میں
عقب نما آئینوں میں دیکھ رہا تھا کہ اب وہ گاڑیاں مجھ سے زیادہ
بچے نہیں رہی تھیں۔

میں نے اس سیر طر پر دیا تو کچھ اور بڑھا دیا اور ٹول ٹیکس کی
غراموں تک پہنچنے پہنچے انہیں ذرا زیادہ پیچھے چھوڑ دیا۔ ٹول ٹیکس
وصول کرنے والے لڑکے کا ہاتھ ہوا میں اٹھا کا اٹھادی رہ گیا اور
میری گاڑی دن سے اس کے بازو سے سب ہوتی ہوئی گزر گئی۔

کچھ دیر بعد میں جی ٹی روڈ پر مڑ گیا۔ دونوں گاڑیاں بدستور
میرے قریب ہی چلی ہوئی تھیں۔ تاہم جی ٹی کی گاڑی اس اعتبار
سے بہت اچھی تھی کہ میری مرضی کے مطابق میرا ساتھ دے
رہی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلہ بدستور جارہا تھا۔ جی ٹی روڈ پر
اس وقت ٹریفک برائے نام تھا۔

پھر شاید انقباب کرنے والوں نے یہ اندیشہ محسوس کرتے
ہوئے کہ میں ان کی دسترس سے نکل جاؤں گا عقب سے اچانک
پھر فائرنگ شروع کر دی۔ گنوں کا سن زمین کی طرف تھا۔ میں
کچھ کیا کہ وہ گاڑیوں کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے گاڑی کو
لڑا شروع کر دیا۔ اس رفتار پر گاڑی کو گونا گونا غارت گاہ تھا
لیکن اس وقت میرے آس پاس خطرات کے سوا کچھ ہی کیا؟ ایک
خطرے سے بچتا تو بہر حال دوسرے خطرے کا سامنا تھا۔

گاڑی آگے بڑھتی جیسے گولیاں لگوانے کی آواز سنائی
دے رہی تھیں۔ عقبی جتیاں وغیرہ یقیناً چمکنا چور ہو چکی تھیں اور
ڈکی وغیرہ میں بھی شاید سوراخ ہو چکے تھے۔ آوازوں سے یہی
اندازہ ہوتا تھا۔ غیبت تھا کہ باز اچھی تک گولیوں کی زد سے
بچے ہوئے تھے۔ یہ تو تھے بھی عام سی گاڑی کے عام سے ٹائر۔

بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ سڑک پر ہم راڑے کا
سلاک موڑ آیا اور یہ موڑ کاٹنے وقت بالآخر ایک یا شاید دونوں
ہی پچھلے ٹائر گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ اس رفتار سے موڑ کاٹنے
ہوئے گاڑیوں کا غلبہ ہو جانا موت کے منہ میں چلے جانے کی کا
دوسرا نام تھا لیکن مجھے قدرت نے اتنی ملت دے دی کہ گاڑی
فلٹراؤں کھانے سے پہلے بری طرح لڑائی اور اسی دوران مجھے
اندہ ہو گیا کہ وہ کس طرف پہلی فلٹراؤں کھائے گی۔ اسی لئے

میں دوسری طرف کا دائرہ کھول کر یوں باہر گوا جیسے کسی طاقتور
اسپرنگ نے مجھے اچھال دیا ہو اور یہ میری مزید خوش قسمتی تھی کہ
میں سڑک سے نیچے کیے میں گرا اور خسیب میں لڑھکنا چلا گیا۔

گاڑی اسی رفتار سے چند گز آگے جا کر لڑھک گئی اور خاصی
دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ بری بات یہ ہوئی کہ خسیب میں لڑھکتے
وقت ریموڈر میرے ہاتھ سے گر گیا۔ اور اچھی بات یہ تھی کہ ان
لوگوں کو جانتا تھا اس وقت اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں لڑھکتی ہوئی
گاڑی سے خسیب میں چلا گیا لگے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

دونوں گاڑیاں آگے گزرتی چلی گئیں۔ پھر ان کے ٹائروں
کے چرچانے اور روانے کھلنے بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔
وہ غالباً میری اٹنی ہوئی گاڑی کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس
دوران میں نے اٹھ کر تاک کی سیدھ میں دوڑنا شروع کر دیا تھا۔
میں لمحہ بہ لمحہ سڑک سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

کھلنے اندر میرے میں کچھ دور قد آدم گھاس پر اسرار ہونوں کی
طرح لڑائی نظر آ رہی تھی۔ دور دور تک جھاڑ جھکاڑی پھیلنا ہوا
معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھیں کھلیے اندر میرے میں جہاں تک دیکھ
پا رہی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آگے زمری زمینیں ہیں
البتہ شروع کی کچھ زمین کسی وجہ سے خالی پڑی تھی اور شاید چراگاہ
کا کام دیتی تھی۔

گھاس کے قریب پہنچ کر میں نے سڑک دیکھا۔ ان لوگوں کو
اس وقت تک معلوم ہو چکا تھا کہ میں کار سے نکل چکا ہوں کیونکہ
مجھے سڑک پر کسی انسانی بیوے کے نظر آئے اور وہ سب یقیناً خسیب
ہی کی طرف توجہ تھے۔ ان میں سے تخمین کے پاس ٹارپس بھی
تھیں جن کی روشنی ادھر ادھر پکرا رہی تھی لیکن میں بہت تیز
دوڑنے کے باعث اس روشنی کی رسائی سے کافی آگے نکل آیا تھا۔

ان کی غالباً سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ طویل وعرض کھلی
جگہ میں کس طرف مجھے تلاش کریں۔ پھر انہوں نے غالباً چند ہی
سیکنڈ میں حکمت عملی تیار کر لی۔ ٹارپس جگہ گئیں اور میں نے ان
ہیڈلوں کو سڑک سے اتر کر اندر میرے میں مدغم ہوتے دیکھا۔ میں
نے زیادہ تیزی سے گھاس کی طرف دوڑ لگا دی اور چند سیکنڈ بعد
نیر کسی پدے کے ہوئے موسیقی کی طرح گھاس کے سمندر میں اتر گیا۔

اسپے اس فیصلے پر ایک لمحے کے لئے مجھے ہچکچاہٹ بھی محسوس
ہوا کیونکہ گھاس کچھ اس قسم کی تھی کہ اگر کسی خاص زاویے
سے جسم کا کوئی کھلا حصہ ان لمبی پتیوں سے ٹکرا جاتا تھا تو وہ
قدرے کمزوری و حساس ہوتی کسی ٹکراؤ کی طرح کانٹے لگتی تھی۔
تاہم گھاس میں پناہ لینے کے سوا چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔ کھلے
میدان میں یوں تو فوج کی طرح دوڑتے رہنا تو کچھ زیادہ ہی فرائضی
سے موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

قد آدم گھاس کو چیرتے ہوئے اور ذرا جھک کر دوڑتے
ہوئے میں نے خاصا فاصلہ طے کر لیا۔ گھنی گھاس میں کچھ پناہ تو
مجھ جیسے خاصے جسم آدمی کے دوڑنے سے بھی ہوتی تھی اور کچھ

شاید میراں جھوٹے موٹے جانور بھی بنا کر بیٹے تھے جو میرے یوں
 در آئے سے گھبرا گئے۔ کچھ اہل ان کی وجہ سے بھی بھی ہوئی تھی۔
 ... اگر اس وقت وہ لوگ گھاس کے قریب پہنچ چکے ہوتے تو اس
 اہل کی وجہ سے میراں پانا ان کے لئے بہت آسان ہوتا۔

خاصا قافلے کے بعد بلا خر میں رک گیا اور غیر
 محسوس انداز میں سانس لیتے ہوئے اور حراہر کی آوازیں سننے کی
 کوشش کرنے لگا۔ میرے رکنے کے چند لمحوں بعد گھاس میں ادھر
 ادھر بھاگتے ہوئے چھوٹے موٹے جانور بھی گویا سکون میں آگئے
 اور چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ میں کسی بھی ایسی آواز پر کان
 لگائے ہوئے تھا جس سے ان لوگوں کی نقل و حرکت کا اندازہ ہو
 سکا مگر مجھے کسی طرف سے کوئی ایسی آواز سنائی نہ دی۔

یہ عجیب اعصاب شکن سکوت تھا۔ کبھی کبھار کسی دور
 سے مویٹار شب غم بیٹھی جھینگر کا راگ سنائی دے جاتا تھا۔ میں
 اپنے آپ کو خوش کن خیالات اور شکستہ تشبیہات میں الجھانے
 کی کوشش کر رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ برسوں بعد ایسا موقع
 آیا تھا جب میں صحیح معنوں میں اپنے آپ کو اعصابی تناؤ میں مبتلا
 محسوس کر رہا تھا۔

کئی منٹ بے بسی گزر گئے۔ چھٹی حس تو خطرے کا احساس دلا
 ہی رہی تھی لیکن وہ جو میری ایک ماسٹوم سی حس تھی وہ مجھے بتا
 رہی تھی کہ خطرہ میرے گرد بھڑکی طرح پکڑ کاٹ رہا ہے لیکن
 حیرت مجھے اس پر بھی کہ میں ذرا سی آہٹ بھی سننے سے قاصر تھا
 حالانکہ میری سماعت بھی غیر معمولی تھی لیکن شاید بات یہ تھی کہ
 جن لوگوں سے مجھے واسطہ پڑا تھا وہ بھی اس قسم کے معاملات میں
 غیر معمولی مصلحت رکھتے تھے۔

دھنسا آواز تو ڈھماکوں سے نفاذ کرتی ہو کر رو گئی اور اس
 کے ساتھ ہی گھاس میں کوئی شہین سی چلنے لگی۔ وہ دراصل
 گولیوں تھیں جو پوجھاڑ کی صورت میں گھاس کو کاٹتی ہوئی
 گزر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے میری مٹائی بننے میں آگے
 لگی۔ وہ لوگ کافی بڑے رقبے میں پھیل گئے تھے اور گولیوں کی
 آوازیں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نیم دائرے میں رہتے
 ہوئے دائرہ ایک اسکاڑ کی طرح گولیاں چلا رہے تھے۔ گویا ان کا
 ہدف ان کی نظروں کے سامنے ہو۔

قیمت یہ تھا کہ میں اب بھی ان کا خوف نہیں بن سکا تھا۔ یہ
 اتفاق تھا یا شاید انداز نہیں کہ میں سرخ بدلتی ہوئی ان گولیوں کی زد
 پر نہیں تھا۔ میں چپائے کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر جھک گیا
 اور دھیرے دھیرے گولیوں کی پوجھاڑ سے بچھ اور دور کھینکے لگا۔
 جھاڑوں میں چھپا ہوا وہ خرگوش جسے کئی شکاریوں نے گھیر رکھا ہو
 شاید اسی طرح جان بچانے کی فکر میں ہوتا ہو جس طرح اس
 وقت میں تھا۔ مجھے اپنا آپ بے حد قابل رحم محسوس ہوا۔ بڑی
 شان سے بیٹھے بٹھائے حالات کے ایک عجیبے نے مجھے کہاں
 سے کہاں دھکیل دیا تھا۔

سلطان نور الدین زنگی

الماس ایم اے قیمت:- 250/-

نواب حیدر علی

الماس ایم اے قیمت:- 200/-

اچانک گھاس کے درمیان گلیبی سی روشنی نظر آنے لگی۔
 ان لوگوں نے نارچیں روشن کر لی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر اپنی جگہ
 سناٹا ہوا پڑا۔ گولیوں کی تڑا تڑکے درمیان پرندوں کی چچا دیکار
 بھی جاری تھی۔ دور نہیں فریادی سے انداز میں دو چار گیدڑ بھی
 بولنے لگے تھے۔ سوہت تو میں بھی ایک گیدڑ ہی بن کر رہ گیا تھا
 جس کی شامت اتنی تھی تو اس نے احتیاطی تدابیر اور حفاظتی
 انتظامات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

میں بظاہر ایک محفوظ اور پرسکون زندگی گزار رہا تھا لیکن
 درحقیقت میرے ارد گرد قدم قدم پر غیر متوقع اور عادیہ خطرات
 پھیلے ہوئے تھے۔ اگر میں احتیاط اور حفاظتی انتظامات کا خیال
 نہ کرتا تو یہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی لیکن جانے کیوں میں اتنا
 زیادہ بے پروا یا بھروسہ سے زیادہ خود اعتماد ہو گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اب خود کو
 اتنی زیادہ لعنت و ملامت کرتے رہنے سے بھی کچھ حاصل نہیں
 اپنی غلطیوں سے نمٹنا اور غیر متوقع حالات کا سامنا بھی ضروری کی
 ہے۔

دھنسا گولیوں کی تڑا تڑا بہت تھم گئی۔ شاید انہیں احساس ہو
 گیا تھا کہ وہ بے تحاشا ایونیٹیشن ضائع کر رہے ہیں یا پھر شاید
 انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ انہوں نے گولیوں سے پوری گھاس کو
 کھال لیا ہے۔ نارچیں بجھ گئیں اور پتہ لگے بعد پھر وہی پتلا
 سا سکوت چھا گیا۔ مجھے باہر اڑتی ہوئی دل میں ان لوگوں کو وار دینا
 پڑ رہی تھی۔ وہ لوگ چپے لگی کے کھیل میں خوب ماہر تھے۔ کبھی
 یکدم ہی بنگامہ ہوا کر دیتے تھے اور کبھی گویا دم سا دھکے دینا
 تھے۔ کبھی ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت پر مجھے
 گولیوں سے چھلنی کرنا چاہتے ہیں اور کبھی یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے

زورہ پکڑا جاتے ہیں۔ اعصاب شکن جنگ کی نکتہ عملی یہی تھی کہ مخالف کو صحیح طور پر اندازہ نہ ہونے پائے کہ آپ درحقیقت چاہتے کیا ہیں اور کس لئے کیا قدم اٹھائیں گے۔ لیکن شاید ان لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت ان کا واسطہ بھی ایک ایسے شخص سے ہی ہے جس کی زندگی کے کسی قیمتی برس انہی کتب عظیم کے ساتھ اسی قسم کی محاذ آرائیوں میں گزر رہے تھے۔ جس کے اعصاب برسوں کی تربیت اور خدا واد ملا جیوں کی بدولت فولاد ہو گئے تھے۔ صورت حال خواہ کچھ بھی تھی لیکن میں زورہ بر حال نہیں تھا۔

میں نے نہایت آہستگی سے ایک طویل سانس لے کر بہت سی سرد ہوا کو کچھ حروں میں چھانے کے لئے متید کیا اور قطعی طور پر سکون ہو کر ایک بار پھر ہموار انداز میں سانس لیتے ہوئے دھیرے دھیرے ایک طرف کو کھٹکا شروع کیا۔ میرے ہاتھ اب بھی کھردرے اور مضبوط تھے۔ کیلی گھاس اور زمین کی تمام باہروں کو برداشت کر رہے تھے۔

چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک نکتہ مجھے رکنا پڑا۔ کبیں دور سے گھاس میں سرسراہٹ کی خفیف سی آواز سنائی دی تھی اور یہ ان آوازوں سے بہت مختلف تھی جو گھاس میں چھوٹے موٹے جانوروں کے حرکت کرنے سے پیدا ہو سکتی تھیں۔ یقیناً کوئی انسان گھاس میں ڈھل چکا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ پھر ابھی ہی سرسراہٹ ایک اور سمت سے سنائی دی۔

شاید وہ سب ہی مختلف سمتوں سے گھاس میں داخل ہو چکے تھے۔ میں گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا۔ ٹائی جو ڈھیلی ہو کر میرے گلے میں جھول رہی تھی اسے اتار کر میں نے گھاس میں ہی پیچیک دیا۔ میرا کوٹ بھی نقل و حرکت میں کچھ دشواری پیدا کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی وہ کچھ چیزوں سے تھوڑا بہت محفوظ بھی رہے گا۔ اس لئے میں نے اسے اتار کر نہیں پھینکا۔ کندھوں پر سے اس کی آتشیں فاسی اُڑھ چکی تھیں جس کی وجہ سے بازو ہلانے چلانے میں خاصی آسانی ہو سکتی تھی۔

میری مضامیں سمجھتی ہوئی تھیں اور خفیف سے خفیف آواز پر کان لگے ہوئے تھے۔ سرسراہٹ کی آواز میں کبھی سنائی دے جاتی تھی اور کبھی مدھم مدھم ہو جاتی تھی۔ وہ لوگ چھوٹے چھوٹے کر قدم رکھ رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب ان میں سے کوئی بھی ناسخ روشن نہیں کر رہا تھا۔

میں ساکت بیٹھا رہا۔ سرسراہٹ کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ ان میں سے کوئی ایک میری ہی سیدھ میں آ رہا تھا۔ میرے دل میں بہترین تھا کہ میں کسی سے اچھے کے بجائے وہاں سے نکل بیٹنے کی کو ششیں جاری رکھتا لیکن مجھے کسی اختیار کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ میں غصہ مول لے کر کسی سے کوئی کمن چھینا چاہتا تھا۔

سرسراہٹ کی آواز بالکل قریب آگئی تو میں نے سانس

رودک لی۔ پھر میرے سامنے گھاس چپ کر ایک نہایت دھندلا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ٹالیاں اٹھیں گمن تھی۔ اگر مجھے ایک ثانیے کی بھی تاخیر ہوتی ہوتی تو شاید اسے میری موجودگی کا احساس ہو جاتا لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

میں نے پیٹے کے سے انداز میں اچھل کر اس کی گردن دروچ لی تاکہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے لیکن اس دوران اضطراری طور پر اس سے اٹھیں گمن کا ڈھنگ دب چکا تھا۔ گولیوں کی ترتر میں میرے کان کے قریب گونگی۔ گمن کا رخ اس وقت آسمان کی طرف ہو چکا تھا۔ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی اس شخص کو یہ عقائد انہ احساس ضرور رہا کہ اس کے ہاتھوں میں موجود گمن میرے لئے بہت اہم ہے کیونکہ میں نہتا ہوں۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ گمن مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتی۔ گولیاں آسمان کی طرف گئی تھیں لیکن وہ شخص گمن دور نہیں اندھیرے میں پھٹکے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران چاروں طرف بلا کسکوت چھا گیا۔ اس سکوت میں ”کوک“ کی صرف ایک بلی سی آواز ابھری اور یہ اس شخص کی گردن ٹوٹنے کی آواز تھی جو میری گرفت میں آگیا تھا۔ بازو کے کھٹنے میں یادوں ہاتھوں کی گرفت میں گردن پھنسا کر ایک مخصوص ٹرک اور کچھ طاقت کے استعمال سے اسے ایک پل میں توڑنا میرے لئے بہت آسان تھا۔

میں نے دم توڑتے ہوئے اس شخص کو گھاس میں پھینکا اور سر جھکا کر ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ گمن کو تلاش کرنے کا بہت وقت نہیں رہا تھا کیونکہ ایک لمحے کے سکوت کے بعد کئی اطراف سے بے تحاشہ نازنگ شروع ہو گئی تھی اور تاراج کی روشنی بھی اُدھر اُدھر بکرا نے لگی تھی۔ میں گولیوں اور روشنی کی زد سے بچتا ہوا چہرہ بھی راستہ لے رہا تھا اور دوڑ رہا تھا۔ بہر حال اپنی طرف سے قاتل احتیاط کے باوجود کچھ بعد نہیں تھا کہ میں دوڑتا ہوا سیدھا کسی سے جا کر آتا ہوا گمن لئے گھاس میں میرا ہتھکڑا ہوتا۔

”ہیسا تو میں ہوا لیکن جو کچھ ہوا وہ اس سے بھی کچھ بری تھا۔... ہوا یہ کہ وحشت زدہ درندے کی طرح سر جھکا کر گھاس کو چیرتے ہوئے میں نے کچھ دور تک بھاگنے کے بعد اچانک ہی اپنے آپ کو کھلے میدان میں پایا۔ کچھ آگے بانی کا ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ میں اپنی جھونک میں اسے بھی بھلا گیا۔“

کھلے میں آکر میں نے اپنے آپ کو قطعی غیر محفوظ محسوس کیا۔ ”آہم اب رکنا یا بہت تہل کرنا بھی مجھے مناسب نظر نہ آیا۔ میں دیوانہ وار دوڑنا ہی چلا گیا۔ نازنگ بدستور جاری تھی بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایک شخص تو کبیں قریب سے ہی نازنگ کر رہا ہے لیکن وہ مجھے دیکھ نہیں پایا ہے۔“ کھلے اندھیرے میں کچھ دور مجھے دو رشتوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ درختوں کی اوٹ میں ذرا ٹرک کر مودر حال کو سمجھنے اور کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا لیکن جو کچھ میں جھنڈ کے قریب پہنچا میری نظروں کے سامنے ہوا میں ایک جال سا لہرایا۔ فوری

طور پر مجھے یہ خیال آیا کہ شاید یہ مراد ہم سے اور کافی دیر سے میں جس صورت حال کا شکار ہوں اس کی وجہ سے میری نظر عارضی طور پر دھندلا سی رہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے جب میں اچھ کر گر پڑا میرے پاؤں زمین پر نہ رہے اور میں خود بخود ہی گویا سمٹ کر رہ گیا جب مجھے احساس ہوا کہ وہ جال حقیقی تھا اور مجھ پر ہی پھینکا گیا تھا اور میں نہایت ہی آسانی سے کسی بے ضرر جانور کی طرح اس میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

تھوڑا سا زحمت کے بعد میں سنبھلا تو کچھ قاصدے پر دائیں بائیں دو آدمی چہروں کی طرح کھڑے نظر آئے۔ وہ غالباً قریبی درختوں سے کودے تھے اور ان کے ہاتھوں میں جال کی بندشیں تھیں جنہیں انہوں نے مخالف سمتوں میں کھینچ کر جال کا شہ بند کیا تھا۔ یہ جال بھی عجیب سی ساخت کا تھا۔ تلی پکڑنے والے جال سے ہی مشابہ معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا منہ بند کرنے والی بندشیں دو مخالف سمتوں میں تھیں جنہیں کھینچنے سے نہ صرف جال کا منہ بند ہو گیا تھا بلکہ جال ستر کر بھی رہ گیا تھا اور میں بھی اس میں سمٹ کر رہ گیا تھا بلکہ یوں کسنا چاہئے ایک بڑا سا گولا بننے میں کچھ ہی کسر رہ گئی تھی۔

خاصی منٹھہ خیر سی صورت حال تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں یوں منٹھہ خیر سے انداز میں بھی کسی کے قابو میں آسکتا ہوں اور جب میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا تو مجھ پر چند لمحے کے لئے جنوں سا طاری ہو گیا۔ میں نے جال کا منہ کھولنے یا اسے توڑنے کے لئے ہتھوڑانہ سے انداز میں ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جال ٹوٹا یا اس کی بندشیں کھلتا تو درکنار میں اس میں صحیح طور پر سیدھا کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ ہوسکا۔

دونوں آدمی عمرگی سے جال کو سنبھالے ہوئے تھے۔ میری ہتھوڑانہ اچھل کود سے انہیں جو جھٹکے لگتے تھے انہیں بھی وہ برداشت کر گئے تھے اور جال کی بندشیں ان کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک نے حلق سے نہایت بلند اور گرمیدہ آواز نکال۔ ابھی تک دور کسی جو اکاؤ کا فائر ہو رہے تھے وہ ختم ہوئے اور چند ہی لمحوں بعد دوسرے آوازیں قریب آئے لگیں۔ پھر میں نے ارد گرد سے بیولے نمودار ہوتے دیکھے۔ پھر چند غار جیسی دوبارہ روشن ہو گئیں اور وہ سب دوڑتے ہوئے ادھر آئے لگے جدھر میں ان کے لئے تماشہ راحت اور خود اپنے لئے درس عبرت بنا ہوا تھا۔

وہ سب میرے ارد گرد جمع ہو چکے تو میں ان کی تعداد کچھ کر تیراں رہ گیا۔ صرف ایک شخص کو قابو میں کرنے یا شاید ہلاک کرنے کی غرض سے پوری فوج کی فوج جمع تھی۔ یہ لوگ صرف دو گاڑیوں میں تو نہیں ہو سکتے تھے۔ معلوم نہیں کب اور کس طرح یہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔ شاید یہ بھی زبردست منظم گروہی انداز میں کام کر رہے تھے۔ شاید ان کے پاس نر سیر و غیرہ موجود تھے

یا راپٹے کا کوئی اور ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ دو یقیناً ایک باقاعدہ حکمت عملی بنا کر چلے تھے۔ شاید انہوں نے میرے معمولات کا بھی کسی نہ کسی طرح جائزہ لیا تھا اس لئے ایکشن میں آئے کہ نہایت مناسب وقت منتخب کیا تھا۔

کچھ حیرت مجھے ان کے چلنے دیکھ کر بھی ہوئی تھی۔ اب تارچوں وغیرہ کی وجہ سے داخل خاصا منور ہو چکا تھا۔ کھر تارچوں کا رخ میری ہی طرف تھا اور میری آنکھیں چند ہی داری تھیں پھر بھی میں خاصی حد تک گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے حلیوں میں بڑا فرق تھا۔ ان میں سے کوئی جینز جیکٹ میں تھا تو کوئی ایسی شلوار قمیض میں جس پر پورا تھان پکڑنے کا لگ جاتا ہے۔ کوئی پستہ قد تھا تو کوئی بے تحاشہ جسم۔ کسی کے چہرے پر زمانہ غار کے سے انسانوں والی وحشت تھی تو کسی کے چہرے پر مذہب شرلوں والی ملافت۔ کوئی شخص ایڈیڈنر کا شوقین شکاری معلوم ہوتا تھا تو کوئی قلمی قسم کا زاکر جو سیاہ شلوار قمیض میں تھا سر پر پگڑی تھی اور منہ پر باقاعدہ ڈھانچا بھی بندھا ہوا تھا۔ کمرے گولیوں کی چٹنی بندھی ہوئی تھی۔ ان میں طرح ایک ایک نمونے کے دو دو تین تین آدمی موجود تھے۔ مشترک ان میں صرف ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ ان سب کے پاس جدید ساخت کی گتھیں تھیں۔ اگر کسی کے پاس ریو اورنگی تھا تو وہ بھی جدید ترین ساخت کا تھا۔ حتیٰ کہ ایک شخص کے پاس ہکی مشین گن بھی موجود تھی۔ لگتا تھا کہ وہ لوگ کوئی چھوٹا سا شہر فتح کرنے کے ارادے سے نکلے ہیں۔ میں عمری سانس لے کر

جاء بائبل

ویو تائوں کے شر بائبل کی کہانی

جے مصنف نے 35 سال کی ر سرج کے بعد

قلندر کیا۔

800 سال

400 سال

اردو بازار لاہور

”ہم دوستوں کے دشمنوں کو اپنا بھی دشمن سمجھتے ہیں۔“

اس نے خیریت سے مجھے میں جواب دیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کن دوستوں کا ذکر کر رہا ہے کہ اس نے شہین ہٹل کا دست میرے سر پر سید کرنے کے لئے نہایت خودخوارانہ انداز میں اسے ہوا میں بلند کیا۔ انداز بتا رہا تھا کہ اگر وہ ضرب میرے سر پر پڑتی ہوتی تو میری کھوپڑی خطرناک حد تک سچ ضرور ٹھنی ہوتی لیکن اس سے پہلے ہی ڈاکوؤں کے سے ٹپنے والے ایک دروازہ اور جسم شخص نے آگے بڑھ کر اس کی ٹکائی مضبوطی سے گرفت میں لے لی۔

”انہوں نے ہوا تھا کہ اگر زندہ باقی آجائے تو پھر اس کو ہر حال میں زندہ ہی لایا جائے۔“ ڈاکو کو شخص نے کھوپڑی آواز میں کہا۔ جھاڑو جھکا رہا تھا وہ ڈاکو جس نے اس وقت اپنے چہرے سے ڈھانکا ہٹایا تھا مجھے پتا خوش شکل اور بھلا آدمی معلوم ہوا۔ اس نے مجھے ایک خطرناک ضرب سے بچایا تھا۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ انہوں نے اس کی کیا مراد تھی۔ اور اس وقت میں غور کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

فلمی وطن نما شخص کڑی نظروں سے ڈاکو کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا ”میں تم سے بستر جاتا ہوں کہ آندڑز کیا ہیں۔ میں اسے بے ہوش کر رہا ہوں۔ اسے ہوش و حواس میں ساتھ لے جانے کا خطرہ میں مول نہیں لے سکتا خواہ یہ جال میں ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ ہے کیا چیز۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی کو اشارہ کیا اور وہ قیامت جو ایک لمحے کے لئے گئی تھی بالآخر سر پہ ٹوٹ ہی پڑی۔ عقب میں کھڑے ہوئے کسی بد بخت نے کن کاہٹ میرے سر پر دے مارا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی ایک ٹائٹ کے لئے میری آنکھوں کے سامنے کچھ زیادہ ہی بھیل گئی مگر دوسرے ہی لمحے مجھ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنے حواس کو بیدار رکھنے کی بہت کوشش کی مگر ذہن اندھیروں میں ڈوبا چلا گیا۔ دوبارہ جب میری حیات نے انگڑائی کی تو سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ کوئی مجھے دھیرے دھیرے جھولے دے رہا ہے لیکن یہ جھولے کچھ تکلیف دہ سے تھے۔ ہر جھکولے کے ساتھ گویا کوئی سر کے پچھلے حصے پر بھاری ہتھوڑے سے ہولے ہولے دھک دے رہا تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں بھی کھول لیں لیکن چاروں طرف گھٹا ٹپ اندھیرے کی دھندل بدستور موجود رہی۔

ایک ٹائٹ کے لئے یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح ذہن میں لپکا کہ کہیں ضرب اتنی شدید تو نہیں تھی کہ میں بیٹائی کھو بیٹھا ہوں؟ مگر دھیرے دھیرے جھڑوں کے سرمئی خدو خال واضح ہونا شروع ہوئے۔ کچھ ساعت کے بعد بھی صحیح طور پر کام شروع کیا اور کھڑکھڑاہٹ اور کڑکڑاہٹ کی آوازوں کی نوعیت سمجھ میں آنے لگی۔

یہ سب دلچسپی آمیز سی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے لیکن ان کے چہرے تاثرات سے ماری تھے، اس کچھ خوش و خروش اور کچھ بھگدڑ کی حسیں باقی تھیں جو اب فح کی طمانیت میں بدلتی جا رہی تھی۔ مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ وہ فوج مجھ پر... ایک خا اور غیر مسلح شخص پر قابو پا کر قدرے شرمندہ نظر آنے کے بجائے مطمئن نظر آ رہی تھی۔

چہرے کی جھٹک اور شکاریوں والی ٹاکا پینٹ میں بیوس ایک دروازہ نو جوان جو اس بھان سنی کے کنبے کا سربراہ معلوم ہوا تھا۔ اپنے شہین ہٹل کو اٹھلے پر گھماتے ہوئے آگے آیا۔ میرے قریب پہنچ کر فلمی انداز میں ایک جھٹکے سے ٹکا۔ تخت سے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے ہاتھیں ریشا پر ایک تازہ ڈھم فاجس سے خون برس رہا تھا۔ تخت بھرے انداز میں ہی اس نے اُلے اُتے سے اس ڈھم کو پونچھا اور پھر اچانک ہی نہ جانے کیا سوچ کر پوری قوت سے مجھے ایک ٹھوکری سید کی۔

وہ شکاریوں والے فل بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹھوکہ مارنے میں اس نے قوت بھی بڑی صرف کی تھی۔ ٹھوکہ میری ران پر پڑی تھی اور ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا تھا جیسے اس جگہ سے کوشت چھٹ گیا ہے۔ تکلیف تو بہت ہوئی لیکن میں برداشت کر گیا۔ میں نے آنکھ تک نہیں جھپکی۔ ایک تک اس کی طرف دیکھا لیکن افسوس کہ اس وقت میں آنکھوں ہی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت میں اسی کی طرح سراخا کر اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بڑا ایک بھرپور گھوڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن بہت وقت اس کے ساتھ تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں بدستور جال میں بری طرح بکڑا ہوا تھا اس لئے کامیاب نہ ہو سکا۔

”خلفہ تباہ ختم“ میں نے بلند اور ٹھہری ٹھہری آواز میں کہا ”تم کی ماں نے مجھے انہی لوگوں کو ٹھوکریں مارنا سکھایا ہے جو بدستور میں جکڑے ہوئے ہوں؟“

اس کے انداز و اطوار فلمی تھے لیکن وہ فلمی وطن کی طرح خوش میں نہیں آیا۔ بالکل اسی طرح نے تھے انداز میں اس نے مجھے ایک اور ٹھوکری سید کی اور بڑے مطمئن لہجے میں بولا ”ہاں۔ میری ماں نے تو کیا میرے باپ نے بھی مجھے ہی سکھایا ہے کہ دشمن کو زیادہ سے زیادہ بے بس کر کے مارو۔“

بے بسی، غصے اور جھنجھلاہٹ سے میرے جسم میں خون کی گردش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ اس مرحلے میں ٹھوکہ کی تکلیف بھی محسوس نہ کر سکا۔ میری کنہیاں سنسنار رہی تھیں اور اپنی آنکھوں سے خود مجھے شیلے سے پھونکنے محسوس ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے جی لامکان ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا ”کیا دشمنی ہے مجھ سے تم کی؟“

کئی منٹ بعد میری کچھ میں آسکا کہ میں درحقیقت اسی جال میں متبہ ہوں اور اسے اب پہلے سے بدتر انداز میں کس دیا گیا ہے اور شاید گرہیں وغیرہ بھی لگا دی گئی ہیں۔ اس وقت میں ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں تھا۔ ٹرک بالکل خالی تھا۔ اس کا واحد "لوڈ" اس وقت میں تھا۔ یہ ٹرک شاید مویشیوں کی باروداری کے لئے استعمال ہوتا تھا کیونکہ اس میں چاروں طرف ناقابل برداشت سی بدبو رہتی ہوئی تھی جسے برداشت کرنے پر میں مجبور تھا۔ مجھے بھی ایک مویشی سی کی طرح ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا بلکہ میں مویشی سے کچھ بدتر حالت میں ہی تھا کیونکہ مویشی کو جال میں جکڑنے کی ذمّت نہیں کی جاتی۔ انہیں تو پس پاس پاس گزرا کر کے ٹرک کے دروازے پر رسیدوں سے جال سا آنا دیا جاتا ہے۔ اس ٹرک کا پچھلا حصہ اوپر تک پتھوں سے بند کر دیا گیا تھا تاہم اوپر کی طرف نہ تو تڑپال لگی ہوئی تھی اور نہ ہی کسی اور قسم کی جھت موجود تھی۔ اوپر تاریک آسمان نظر آ رہا تھا جس کا نظر آنا نہ اتنا برابر ہی تھا۔

کئی منٹ تک تو میں ساکت ہی بیٹھا رہا۔ ٹرک خاصی تیز رفتار سی تھی تا معلوم منہل کی طرف رواں تھا اور سڑک کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی اس لئے پتھروں "پتھکوں" اور کھڑکھڑاہٹ کا سلسلہ جاری تھا۔ میرے سر کے پچھلے حصے میں ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ تاہم رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میری توانائی راجس آ رہی ہے اور خوابیدہ اعصاب بیدار ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تکلیف کا احساس کچھ کم ہونے لگا۔

جال میں میرے لئے کچھ زیادہ لمبے جگے کی تنہائیں تو نہیں تھی لیکن پھر بھی میں نے کھسا کر اپنے آپ کو قدرے آرام دہ سے جھکا کر کے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ رفتہ رفتہ ایک چیز یاد آئی اور اگر اس وقت مجھ تکش ہوئی تو میں ضرور خوشی سے اچھل پڑتا۔ اچھلنے کے بجائے ایک بار پھر میں صرف کھسا کر رہ گیا۔

مجھے یاد آیا کہ میرے پاس چھوٹی چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا موجود درہتا ہے۔ اور اسی لمحے میں چابیوں کے ساتھ ایک ٹھنسا سا ٹیل کڑ بھی موجود درہتا تھا جو بھلا ہر کسی ملک کا چھٹکا دھکا تک معلوم ہوتا تھا۔ اس ٹیل کڑ کی مدد سے ٹائیلوں کے جال کی ایک ایک ری کٹ کر کچھ دیر میں اتنی جگہ بنائی جا سکتی تھی کہ مجھ جیسی جسامت کا آدمی اس سے نکل سکے۔

میں ٹھوڑی سی بنا ہوا تھا۔ بمشکل ہاتھ کو اندرونی جیب تک لے گیا لیکن اندرونی جیب میں چابی کا گچھا تو کیا کچھ بھی موجود نہ تھا بلکہ میری ہمتیں خالی تھیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری تمام چھوٹی موٹی چیزیں بھاگ دوڑ کے دوران کیس گر گئی تھیں یا میری بے ہوشی کے دوران نکال لی گئی تھیں۔

ایک گھری سانس لے کر میں نے فیصلہ کیا کہ آخر مجھے قدرت ہی کے عطا کردہ ہتھیار استعمال کرنا پڑیں گے۔ اس میں

ذمّت ذرا زیادہ تھی اس لئے میں پہلے انہیں استعمال کرنے سے کھڑا رہا تھا۔ کسی چیز کو کھڑے کے لئے دانت اندھ قبائلی نے صرف چوہے کو ہی نہیں دے ہوئے انسان کے دانتوں میں کھ جاوڑا دانت ایسے ہوتے ہیں جنہیں وہ چوہے کی طرح استعمال کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے کچھ مشق اور ٹھوڑی سی ڈسٹ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے تو خبر ڈسٹ کی مدد کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ مشق میں نے خاصی کی تھی اور ایک بار اس قسم کے کام میں ان دانتوں کو استعمال بھی کر چکا تھا۔ اس وقت میرے ہاتھ ایک موٹی سی ری سے بندھے ہوئے تھے اور مجھے ایک بے خانے میں قید کر دیا گیا تھا۔ غیبت یہ خاک میرے ہاتھ پشت پر نہیں باندھے گئے تھے۔

آج غیبت یہ تھا کہ میرے ہاتھ سرے سے بندھے ہوئے ہی نہیں تھے اور اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو براہیوس محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ایک جگہ سے جال کو در کھانوں میں دبا کر کھڑا شروع کیا اور چند ہی سیکنڈ میں اسے کائے میں کامیاب ہو گیا جسے طاقت سے توڑنا بے حد مشکل تھا۔ پھر میں جال کے ایک ایک چوکور خانے کو کھڑا چا گیا۔ اس کام کے دوران میرے ہونٹ اور سوزھے دو ٹکڑے ہو گئے اور چار دانت گویا گھسنے سے گئے لیکن نتائج بڑے فحشی تھے جلد ہی جال میں سوراخ اٹھنا پڑا ہونے والا تھا کہ میں اس سے کھا سکتا تھا اور اس جال سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ میں حتی الامکان پرسکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اعصاب سا بیجان طاری ہو چلا تھا۔ جال سے چھٹکارا پانے کی امید آگئی تھی تھی تو لی کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

ٹرک اس دوران شاید کسی اور بدتر سڑک پر چڑھا تھا کیونکہ جھٹکے اور پتھکے پہلے سے زیادہ محسوس ہونے لگے تھے ٹرک کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا اب تک کوئی دوسری آواز سنا نہیں دی تھی۔ بڑی کیسوی سے سفر جاری تھا۔

بالآخر وہ خوشگوار لمحہ آن پہنچا جب میں نے اپنے آپ کیئر سمیٹ کر جال سے نکال لیا۔ اس فحشی چیز کو سمیٹ کر نے ایک کونے میں بیٹھا اور نہایت محتاط انداز میں پیٹھ سے ٹرک کے عقبی حصے تک پہنچا۔ گو کہ ایک کے پرے ہی پچھلے میں اندھیرا تھا اور اگر ڈرائیور راہ کیس سے کسی سداہم ذریعے کوئی ادھر دیکھ بھی رہا ہوتا تو اس کے لئے جھٹکا و حرکت دیکھنا مشکل ہی ہو لیکن میں پھر بھی احتیاط برتا ہوا تھا۔ ٹرک کے عقب میں نہ تھنے گے ہوئے تھے ان کی آواز دور مانی دوز سے آنکھ لگا کر بارہر دیکھتی ہی میں طویل سانس لے رہا گیا۔ میرا اندیشہ درست ہی تھا۔ میں پہلے ہی سوچا ہوا تھا ٹرک کے پیچھے پیچھے کوئی گاڑی ضرور آ رہی ہوگی جس نے ٹرک کو روک لیا ہو گا کہ میں انہوں نے مجھے ٹرک میں جھپٹنے کے بعد سے زیادہ غافلگی انتظامات نہیں کئے تھے۔ اب طویل سانس

وہ میرے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ اس کے پیشے تاریک تھے۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ اس میں کتنے آدمی تھے۔

چند لمبے بعد اسی طرح دوسری کار بھی میرے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ یہ اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ ٹرک کے آگے بھی کوئی نہ کوئی گاڑی ضرور تھی بلکہ شاید ایک سے زیادہ ہی رہی ہوں لیکن انہیں میں دیکھ نہیں سکا تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی آسانی سے ٹرک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ اس احساس نے میری دھڑکنیں کچھ تیز کر دی تھیں۔ میں نے چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے آپ کو پرسکون رکھتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں کہیں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر میرے فرار سے لاعلم نہیں ہو سکیں گے۔ میرے لئے اہم سوال یہ تھا کہ کس سمت میں ہمارا گنا میرے لئے مفید رہے گا؟

بہتر تو یہی نظر آتا تھا کہ میں اسی سمت میں سڑک کی طرف ہمارے لوگ جدھر سے ٹرک آیا تھا۔ سڑک پر رستے ہوئے یہ امید کی جاسکتی تھی کہ شاید مجھے قفٹ لینے کے لئے کوئی سواری مل جائے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ میری عدم موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ لوگ بھی اسی راستے کی طرف چھین گئے جدھر سے وہ آئے تھے۔ پھر وہ قد آدمی اسے زیادہ تھے ان کے پاس گاڑیاں تھیں وہ بہت کم وقت میں بڑا علاقہ کھٹکال سکتے تھے۔

پھر میں نے کسی خاص استدلال کے بغیر اس طرف منہ پھیرا جدھر میں چہنچہ کہتا تھا "اور بگنٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ درختوں سے بچ کر دوڑتے ہوئے میں نے سو قدم کا فاصلہ طے کیا تو آگے ایک پشٹہ سا آگیا۔ میں اسے بھی چھلانگ کیا۔ اس سے آگے کوئی درخت نہیں تھا۔ زمین نرم اور بھرپوری تھی۔ زری زمین معلوم ہوتی تھی شاید یہاں تازہ تازہ گودزی کی مٹی تھی اور اب پانی کا انتظار تھا کہ کب پانی پھلائی کرے والا ٹالاکھ بڑا تھا۔

مٹی اتنی نرم تھی کہ میرے جوتوں میں گھسنے لگی تھیں اس میں دوڑنا رہا۔ اسی دوران مجھے احساس ہوا کہ تاریکی اب پہلے جیسی گہری نہیں رہی۔ صبح کازب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کرنے کی کوشش کی۔ زری زمین ملدی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ٹھوس اور غیر زمین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کا ہوا ر میدان سے ملاتے میں کچھ دوڑ دوڑنے کے بعد میں پھر ایک پشٹے پر جا پہنچا جو خاصا اونچا تھا۔ اس پر چڑھا تو پتا چلا کہ وہ سر کا پشٹہ تھا۔

سر زیادہ چوڑی نہیں تھی اور ٹلپے اندھیرے میں سب خرابی سے بہت ہوا پانی سرمئی سیال معلوم ہو رہا تھا۔ پانی کی بجلی بجی سرسراہٹ سرکوشیوں سے مشابہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اوپر اوپر نظر دوڑائی تو آدمی ہاتھ پر کچھ ہی دیر مجھے چھوٹی سے پلایا نظر آئی جس سے سر کو پار کیا جاسکتا تھا لیکن نہ جانے کیا وہ اس طرف سے بڑھ سکا۔

بچہ کھلی تھی کہ ٹرک کے عقب میں ایک نہیں دو گاڑیاں آ رہی تھیں۔ اگلی گاڑی تو ٹرک سے بالکل چھین نہیں گز کے پلے رہی تھی۔ دوسری گاڑی اس سے مزید اتنا ہی پیچھے تھی۔

گاڑی کی روشنی میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی چھوٹی سی ٹرک تھی جس کے دونوں طرف چھوڑے چھوڑے درخت نظر آ رہے تھے۔ اگر میں ٹرک کے پیچھے تھے اتارنے کی کوشش کرتا تو پتلا ٹیس کی زد میں آتے ہی پتیا کوئی گولی میرا مقدر ہوتی۔

اب ایک ہی طریقہ تھا کہ میں ٹرک کی سائڈ کی دیوار پر چڑھ کر باہر چھلانگ لگنے کی کوشش کرتا لیکن اس صورت میں بھی گاڑیوں کی نظر میں آنے کے امکانات خاصے قوی تھے البتہ اگر میں بین اس وقت چھلانگ لگتا جب ٹرک کوئی سوڑکاٹ رہا ہوتا اور اس سے پہلے کہ پیچھے آنے والی کار بھی اس سوڑکاٹ پہنچتی ہی دو درختوں کے درمیان خاصا دور نکل کر اندھیرے میں پناہ لینے میں کامیاب ہو جاتا تھی میرے بچ نکلنے کا کوئی امکان تھا۔

لیکن کوئی ضروری نہیں تھا کہ اس سڑک پر کوئی سوڑکاٹ آئے۔ میں ممکن تھا کہ یہ میلوں تک اسی طرح سیدھی چلتی رہتی اور کوئی سوڑکاٹ سے پہلے ہی کوئی واقعہ رونما ہو جاتا۔ بہر حال میں دیوار سے لگ کر کھٹکا ہوا داپس اگلے حصے کی طرف آیا۔ ٹرک کی دیوار میرے قد سے خاصی بلند تھی تاہم میں نے اس پر لٹک کر زرا باہر چھلانگ۔ کار کی روشنی اس طرف بھی تھوڑی بہت پہنچتی تھی اور کبھی نہیں لیکن چھلانگ لگنے کی صورت میں خطرہ بہر حال موجود تھا۔

میں اسی لمحے شاید قسمت نے مجھ پر مہربانی فرمائے کا فیصلہ کیا اور میں نے محسوس کیا کہ ٹرک سوڑکاٹ رہا ہے۔ میں نے سوچا ہمارے وقت ضائع نہیں کیا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ دوبارہ کھٹا ایسا موقع کب ملے۔ ٹرک ٹالنا کسی بچے کے رستے پر مڑنا تھا کیونکہ اگر وہ دیکھا کہ کچھ زیادہ مٹی اڑتی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے جسم کو بندھوں کی طرح سکڑا "اچک کر ٹرک کی پہلی کی چوڑی دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف لٹک گیا۔ اس دوران ٹرک سوڑکاٹ چٹکا تھا اور کار پیچھے رہ گئی تھی۔ جس وقت میں ٹرک کی پہلی دیوار پر چڑھا، ٹرک اس بری طرح ڈنگا رہا تھا کہ شاید میں درخت سے جدا ہونے والے بچے ہوئے بھل کی طرح کہیں جا کر آ لیکن آرام وہ زندگی کا دور شروع ہونے کے بعد میں نے مشتیں اور تربیت ترک نہیں کی تھی۔ یہ مشتیں اور تربیت زندگی کے ہر سو موڑ پر کام آتی تھی۔

ٹرک کے گھومتے ہی میں نے چھلانگ لگادی۔ وہ کوئی پلنگڑی نما راستہ تھا۔ پاؤں زمین پر لگتے ہی میں دوڑ پڑا۔ پلنگڑی کے اس طرف بے تربیت سے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ کچھ دور پہنچ کر میں ایک تار دور درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں اسی لمحے پہاڑ کا گراؤ نمودار ہوئی اور پتھروں کے کھائی ہوئی کے راستے پر اتر آئی۔

در حقیقت پانی کی سرگوشیوں نے مجھے بے خود سا کر دیا تھا۔
مجھے یوں لگا جیسے پانی یہ سرگوشیاں مجھ سے کر رہا ہے۔ یہ
سرگوشیاں میرے لئے شہساز تھیں۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ زمین
وہ علاقہ گرد و پیش کی ہر چیز میری شہساز ہے۔ اس وقت روشنی
نہیں تھی کہ میں گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا لیکن ہر جگہ کی اپنی
گویا ایک خوشبو ہوتی ہے۔ یہاں کی بھی اپنی ایک خوشبو تھی جو
میرے لئے شہساز تھی۔ مجھے ایک عجیب بھولی برسی اور گرم کشت
اپنایت کا احساس ملا رہی تھی، معلوم نہیں کیوں میرے دل کو
چسپے کچھ ہونے لگا تھا۔

میں نے اس کی وجہ سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب
نہ ہو سکا۔ پلاٹ غرض پلانی کی طرف چل دیا۔ پلانی پرانی اور سانچورہ
تھی لیکن جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس کے گرد گویا ایک
سُرخالہ روشنی ہو گئی۔ یہ یادوں کا ہالہ تھا۔

بچپن اور لڑکھن کی یادوں نے ایک فٹ میرے ذہن پر
پلانا کر دی۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ اس پلانی
کے آس پاس میں نے ادو میرے دوست ریاض عرف راجو نے
بے شمار غلوں کی شو گھڑی تھیں۔ مجھے ہاتھ میں پکڑ کر شمشیر زنی
کی تھی۔ جب فرصت میری ہوتی تھی، جب شو گھڑی کرتے
تھا جاتے تھے، جب دل کسی انجانے دکھ سے بوجھل ہوا تھا تو
میں اسی پلانی پر آ بیٹھا تھا۔ اس وقت یہ علاقہ اور قریبی قصبہ ہی
میری کل کائنات تھا۔

وقت نے مجھے کہاں لاکھڑا کیا تھا۔ اور کیسے عجیب حالات
اور غیر متوقع انداز میں۔ میں سمجھنے والا انسان نہیں تھا لیکن
اچانک ہی میں تھک سا گیا۔ آہستگی سے میں اس پلانی پر بیٹھ گیا۔
میرے اعصاب میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ میرا دل چاہا کہ ابالا
ہونے تک بیٹھ بیٹھا رہوں، ابالے میں گرد و پیش کے ہر ذرے
کا چہرہ قریب سے دیکھوں، ہر شجر اور ہر برگ و شہرے پر چھوں، تم
نے مجھے بچاؤ؟

جہاں انسان کا بچپن بیٹے، اچھا بیٹے چاہے برا بیٹے، وہ جگہ
شاید مرتے دم تک وہ گھس ہی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ کسی کو جبراً
ایسی جگہ سے دور نہیں لے سکتے، انسانی سر زمین کی طرف دھکیل دیا جائے
تو یہ اس کی بدعت پر ظلم کے حروف ہے، اس کی جڑیں گویا زمین
میں پھیل رہیں، زمین سے اس کا آنا توٹ جاتا ہے۔ زندگی بھر
بلکہ شاید نسل در نسل وہ بے زمین ساری پھرتا رہتا ہے۔ اس کی
شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ نئی سر زمین کے لوگ اس کے وجود کو
حکیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

میں اس اعتبار سے پھر بھی خوش قسمت تھا کہ جہاں میرا
بچپن چھا تھا وہ علاقہ کسی دوسرے ملک کی سرحدوں میں شامل
نہیں تھا۔ میرے اپنے ہی وطن میں تھا، میری رسائی میں تھا، کوئی
لبا سفر بھی نہیں تھا، میں جب چاہتا یہاں آ سکتا تھا اور کچھ بات یہ
تھی کہ بابا میں نے سوچا بھی۔ لیکن زندگی نے گویا کبھی سلت ہی

تاریخی ناول

ابلیس مصر	الماس ایم۔ اے۔ -/100
حسن بن صباح	الماس ایم۔ اے۔ -/125
راجا جکمار	الماس ایم۔ اے۔ -/150
نور الدین زنگی	الماس ایم۔ اے۔ -/250
سلطان عادل	الماس ایم۔ اے۔ -/150
مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2	

نہیں دی۔ آج دشمن ہی گھیر کر کہاں تک لائے تھے۔
چند لمحے بعد میں بادلِ ناخاست وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نواز
در وہاں بیٹھے رہتا تھا، نہیں تھا۔ یہاں تک تو میں اندھیرے میں
بھی اپنے قصبے تک جا سکتا تھا اور قصبے میں کہیں نہ کہیں مجھے پلا
مل سکتی تھی۔ مجھے اس وقت پناہ کی تلاش تھی۔ سب سے نواہ
اس وقت جو چیز مجھے پریشان کر رہی تھی وہ پاس تھی۔ پلا شاید
پاس لگی ہوئی تھی مگر میرے پلانی بیٹے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔
صاف اور ٹھنڈے پانی کی طلب تھی اور طلب شاید ابھی اس
مرحلے سے نہیں گزری تھی کہ جو کچھ بھی سامنے آتا میں پلا جا۔
قصبے میں کسی نہ کسی کا گھر تو مل سکتا تھا۔ میں ممکن تھا کہ
میرے دونوں چچا اس آبائی گھر میں ہی دوسرے ہوں جو صرف
ڈیوڈ کرے پر مشتمل تھا اور اسے وہ ہر وقت فروخت کر کے لے
خارجے کر کے پرستے رہتے تھے۔ میں ممکن تھا کہ میرا دوست
ریاض عرف راجو بھی ابھی اسی قصبے میں ہو اور اپنے باپ کی
پرچند کی دکان چلا رہا ہو۔

ایک عجیب سے احساس نے میری دگ دوپے میں نئی نئی
بھردی۔ میں تیر تیر قدموں سے قصبے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تھا
ایک طرف کاٹی فاسلے پر مجھے روشنی کی ایک چوڑی سی پٹی سی نظر
آئی۔ میں ایک لمحے کے لئے خشکا پھر اسی طرف بڑھنے لگا۔
کاٹی آگے جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک جمو پڑی تھی۔
اس کی کھڑکی کا پٹا غالباً نیم وا تھا جس سے روشنی باہر آ رہی تھی۔
اس دیرانے میں رفتوں کے ایک جھنڈ کے پاس موجود
جمو پڑی کچھ عجیب اور انسانی سی لگ رہی تھی۔ جیساکہ عمارت
پرانے قصبے کمانیوں میں ہوتا ہے کہ شہزادہ دیرانے میں جھٹکا ہوا
جا رہا تھا کہ سامنے اسے ایک جمو پڑی نظر آئی۔
فرق صرف یہ تھا کہ میں کوئی شہزادہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی

کے کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے سیدہ قہار رکھا تھا۔ اس پر بھی اس کی خود اذیتی کا عالم یہ تھا کہ جو کئی کھانسی تھی، اس نے اپنا میلہ سا نکالے استخوانی ہاتھ سے ذرا اوپر کواٹھایا، وہاں سے سستی سی سگریٹ کی ایک بجلی ہوئی اُڑا اور ماہس نکالی اور ایک مزی تری سی سگریٹ نکال کر لینے ہی لینے نہ دے توجہی ہو کر کاہتے ہاتھوں سے ساگنی اور دوبارہ سر تینے پر نکال کر ماساژ لے کر یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے بے پناہ سکون ملا ہو، تکلیف و حواس اس کے چہرے پر چکر رہا تھا۔

یہ دحوان چمنا تو جیسے میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند بھی ایک لمحے کے لئے صاف ہو گئی اور ابدوں کے افق پر ایک چہرہ چاند کی طرح جھلکا اٹھا۔ میں نے اس عورت کو پہچان لیا۔ وہ تاجاں تھی!

مگر اتنی خوب صورت کمانی کا انجام اتنا دردناک بھی ہو سکتا ہے، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس بات کو کوئی زیادہ برس تو نہیں بیٹے تھے جب میں جوانی کی حدود کے آس پاس بھٹکتا ہوا ایک نوخیز لڑکا تھا اور وہ مجھ سے عمر میں خاصی بڑی، بحر پور جوان، دراز قد اور چہرے کی ایک مدافعتی لڑکی جس کی شخصیت، ہیر کے تصور کے بہت قریب تھی۔ بچپن کے اپنے کچھ رومانی تصورات، کچھ عجیب آمیزہ ہوتے ہیں۔ میں اس کی طرف اس وقت سے رشک کی نظر سے دیکھتا تھا جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ مگر سے ہماڑ کر کے ایک قریبی گاؤں میں اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ وہ میری فکر میں جراتوں کی علیحدہ تھی۔ پھر وہ اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور پورے گاؤں میں مطمئن و مطمئن قرار پائی تھی۔

پھر میں نے کئی برس بعد اسے اس وقت دیکھا تھا جب میں ہیر شعل شاہ کے ہاں جلی ہوٹل کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ اپنی اندھی عینوں کا نہ جانے کیا کیا تکان ادا کر کے لوٹ آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ مجھے بہادری نظر آتی تھی مگر اتنی نہیں، بعض لوگوں کو تو ماہ و سال بالکل ہی چل کر گزر جاتے ہیں، دیریزہ دیریزہ کر دیتے ہیں۔

کئی لمحے تک میں وہیں مبہوت سا کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ ملے کیلے تھکے پر ہر ٹکائے وجرے سے اس کھٹیا سگریٹ کے کش لیتی رہی۔ چند منٹ لینے کے بعد اسے پھر کھانسی اٹھی لیکن اس نے سگریٹ بیٹھتی نہیں۔

میں کھڑکی سے بہت کرودرازے کی طرف بڑھا۔ دوازاہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہولے سے دھک دی۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر لپٹی ہوئی تاجاں نے سانس بھی روک لی ہو، پھر اس کی کمزور سی آواز ذات کے کھنڈر میں گونجنے والے نوسے کی طرح ابھری، "گوں ہے؟"

یہ وہی آواز تھی جس کی غلہ، جس کا میلان بھی میرے نوخیز دل کو اٹھل چھل کر دیا تھا اور میں بڑے رشک سے سوچا

فیوادی کی تلاشی میں نکلا ہوا تھا۔ میں محتاط انداز میں اس جھوپڑی تک پہنچا۔ وہ کچی اینٹوں، کھڑکی کی بلین اور گھاس پر بس و غیرہ کی مدد سے بنی ہوئی خاصی بڑی جھوپڑی تھی اور اس درانے میں انسانی لہرواؤں کی واحد علامت تھی۔

جھوپڑی کا میز یا میزھا چوبی دوازاہ بند تھا۔ میں چند لمحے مذہب سے انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ ویرانے میں سکوت اتنا گہرا تھا کہ میں جھوپڑی کے اندر کسی کے سانسوں کی سرسراہٹ سن سکتا تھا۔ یعنی یہ تصدیق تو ہو گئی تھی کہ جھوپڑی میں کوئی آدمی موجود تھا۔

میں دس قدموں کچی دیوار میں بے ہوئے اس کھڑکی نما ٹیلف تک پہنچا جس میں سلاخوں کی جگہ ٹیڑھی میز بھی لکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسی کھڑکی کا سا خوردہ سا پتہ آدھا کھلا ہوا تھا اور تیری مدد سے باہر آ رہی تھی۔

میں نے اس کھڑکی سے اندر جھانکا اور ایک سی لمحے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر چیز کا جائزہ لے ڈالا۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چلہ، چند برتن اور صراحی وغیرہ پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور دو تین پرانے رنگ اور پیچھے رکے تھے۔ سب میں گڑھے بڑے ہوئے تھے اور ایک رنگ میں سے لہو رنگ سے کپڑے باہر کھلے ہوئے تھے۔ مگر یہ ضروریات کی دہری جھولی موٹی اور معمولی سی چیزیں اور ادر اور لڑھک دہی تھیں۔ لڑکی کا اور ہموار تھا۔

پہلی دیوار کے ساتھ ایک جھلکا سی چار پائی چار پائی اور درگ سا ٹیلف ٹانگوں پر ڈالے ایک عورت لپٹی ہوئی تھی اور ایک ٹک جھت کو گھور رہی تھی۔ اس کی چار پائی سے ذرا ہی دور دیوار میں لڑکی ہوئی ایک کپڑے پر لٹائیں لگی ہوئی تھی۔

وہ عورت جاگ رہی تھی اور شاید اس کی ساری رات ہی جاتے ہوئے گزری تھی۔ وہ عورت نہیں، محض ایک کھنڈر معلوم ہوئی تھی۔ ایک ایسا کھنڈر جس سے عمارت کی خوبصورتی کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے رخساروں کی ڈھانچا لہری ہوئی تھیں۔ تنکھی اور ستواں ہانک اس کے چہرے پر گویا لہنا تھیں کہ وہ کئی تھی۔ اس کے چہرے پر شاید صرف آنکھیں ہی زیادہ ہونے سے کسی حد تک بچ گئی تھیں۔ تاہم وہ انہاں ان موٹی موٹی حسین آنکھوں میں بھی نہ جانے کب سے جاگزیں تھیں۔

یہ آنکھیں اس وقت نہ جانے کون سی گم گشتہ رفاقتوں کا نوحہ چھو رہی تھیں۔ اس کی رنگت آج بھی شاید کبھی سانولی رہی ہو اور اس سانولے پن میں زمانے بھر کی ملاحات سم آئی ہو۔ مگر اب سب کچھ بیت چکا تھا۔ شاید وہ ایک کمانی تھی جو ختم ہو چکی تھی۔

لینے لینے اسے ایک دم کھانسی آئی مگر اب جیسے اس میں کھانسی کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس کے مہیمہ ٹھٹھکے تھے۔ کھانسی کی آواز بہت کمزور تھی لیکن تکلیف دینے زیادہ تھی

کرنا تھا کہ نہ جانے وہ کون خوش نصیب ہو گا جس کے کانوں میں یہ حذر سرگوشیاں رس گھونٹتی ہوں گی۔ وقت اور حالات نے اس آواز کا رس اس کی غلغلہ بھی چھین لی تھی۔ عجب کھرکھرائی ہوئی سی آواز تھی۔

”دوا آواز کھولتا جاں“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اندروں ایک لمحے کے لئے پھر سکوت چھا گیا۔ پھر کپڑوں کی سرسراہٹ اور سلیر چھینے کی آواز سنائی دی اور بالآخر کھنکھناتے کی آواز آئی۔ بالکی سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ دوا آواز دھیرے سے نکلا۔ آجائیں لائیں اور اچھی کے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے سر چھائے ہوئے استخوانی چرسے پر حیرت تھی کیونکہ وہ مجھے پہچان نہیں پاتی تھی جبکہ میری زبان سے وہ اپنا نام سن چکی تھی۔

اس کے بازو میں شاید زیادہ دیر اونچا رہنے کی سکت نہیں تھی۔ لائیں چلی کرتے ہوئے وہ عرض سی آواز میں بولی ”کون ہو تم؟“ اس کے بے کیف سے ہوئے بات کرتے وقت خزاں رسیدہ ہنسن کی طرح کانچے نظر آتے تھے۔

”پلے مجھے اندر آجائے دو“ میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے بلا تامل مجھے راستہ دے دیا۔ شاید اس کے پاس آب ایسا کچھ رہا ہی نہیں تھا جس کے چھین جانے کا اسے خوف ہو اور جس کی وجہ سے وہ اجنبیوں سے ڈرتی شاید جان بھی اس کے لئے کوئی متاع مگر اس مایہ نہیں رہی تھی۔ اس کا لباس سیلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک قابل رحم معلوم ہوتی تھی اسے قریب سے دیکھ کر میرے دل کو جھکا سا لگا تھا۔

وہ کچھ پیچھے ہٹ گئی۔ دوا آواز میں نے اپنے عقب میں بند کر دیا اور ایک نلک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟“

اس نے لائیں کیل پر ٹانگ دی اور دھیرے سے نفی میں گردن ہلائی۔ تب میں نے اسے یاد دلایا کہ خوب صورت زمانوں میں جب وہ نمبر کے پار کسی سے ملنے جاتی تھی تو وہیں آس پاس جھاڑ جھکاڑوں میں یا نمبر کی پیلا پر جو دو لڑکے قلموں کی شونگ کیا کرتے تھے ان میں سے ایک میں تھا ”فضل چوہدری“ تھے اس زمانے میں گاؤں کی روایات کے عین مطابق نام لگانے کے بعد بھما کہا جاتا تھا۔ مگر آجائیں نے درخت پر چھپ کر ہماری شونگ دیکھی تھیں۔ اس زمانے میں وہ ملی کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھ جاتی تھی۔ اور اب شاید اس کے لئے ہوا زمین پر بھی چند قدم چلنا محال تھا۔ جبکہ وقت اتنا زیادہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس حال کو پہنچ جاتی معلوم نہیں اسے کیا چیز کھن کی طرف پات تھی تھی۔

میرے یاد دلانے پر اسے فوراً یاد آ گیا کہ میں کون تھا۔ پلے تو حیرت اور بے یقینی سے اس کی اجڑی اجڑی سی آنکھیں پھیل گئیں مگر اس زمانے ان میں زندگی کی رقت نظر آئے گی، پھر اس کے اچانچا نما جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ سرگشتہ اس کی

آنکھوں سے نکل کر فرش پر گر گئی اور اسے شاید پتا بھی نہیں چلا۔ بے اختیار اس نے آگے بڑھ کر منظر نامہ سے انداز میں ہیرا بازو تمام لیا اور کسی انجانے اشتیاق سے لرزتی آواز میں بولی۔ ”تم... تم واقعی افضل ہو...؟ کتنے خوب صورت... کتنے جھوٹے جوان لگے ہو تم... بچپن میں تو یونہی بوٹے سے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت تو تم یقیناً کسی معیشت سے گزر کر آ رہے ہو... تمہارا حال خراب ہے مگر پھر بھی اچھے لگ رہے ہو... ماشاء اللہ... لگتا ہے بڑی چیزیں مجھے ہو... اور تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ آجائیں کا گھر ہے؟“ میں وہاں سے نہیں دیکھ رہا تھا ”میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”اور صرف یوں دیکھ کر تم نے مجھے پہچان لیا۔ کیا واقعی؟“ اس کی آواز بے یقینی سے کانپ رہی تھی ”میں تو تمہیں اتنی اچھی طرح دیکھ کر... ذہن پر اتنا زور دے کر بھی نہیں پہچان سکتی تھی۔“

”یہ اصل میں نظر فطری بات ہے... کہ کب کس نے کس کو کتنی گہری نظر سے دیکھا تھا“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”انسان کی زندگی میں جن کی اہمیت نہیں ہوتی، جنہیں وہ سرری

پر اسرار ہولناک اور ناقابل فراموش کہانیوں کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

خون آرزو



اردو بازار لاہور



تقریباً 70

میں بیٹھ کر کسی اور قسم میں چلی جاتی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک درویش قسم کے ضعیف آدمی نے یہاں یہ جھونپڑی بنوائی تھی۔ کچھ عرصے وہ اس میں رہا تھا لیکن چند دن سے نہ جانے کہاں گیا ہوا تھا۔ اس پر ایک معمولی سا تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ تالا توڑا اور آکر اس میں رہنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب فقیر یا آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ میں اس سے بات کر لوں گی۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ ہی رکھ لے۔ یہاں تو ڈا سارا راتیں بانی بھی موجود تھا۔ چند دن تو آرام سے گزری گئیں۔ بابا لوٹ کر ہی نہیں آیا۔ میں کوئی شریف زادی تو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ مجھ جیسی عورت کے لئے اگر سب راستے بند ہو جائیں تب بھی ایک راستہ ہر حال کھلا رہتا ہے۔ میں نے وہ راستہ اپنالیا۔ بہت جاگ بجاگ آنے لگے اور میں حیران رہ گئی کہ شہر ہوا گاؤں پر چڑھ کتنی بھوک ہے مگر یہ سلسلہ زیادہ لمبے عرصے نہیں چلا۔ مجھے بڑی بری سی بیماری لگ گئی۔ لوگوں نے آنا چھوڑ دیا۔ کبھی کبھار پرانے مہمانوں میں سے کوئی ترس کھا کر تھوڑے بہت پیسے دے جاتا تھا۔ کبھی تکلیف بڑھ جاتی ہے تو حکیم صاحب کے پاس جا کر چند دن کی دوا لے آتی ہوں۔ وہ بھی ترس کھا کر مفت دوا دے دیتے ہیں۔ چند دن آرام سے گزر جاتے ہیں۔ بس یوں ہی زندگی کی سانسیں پوری کر رہی ہوں۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے عینا دہر کر دیا تھا۔ مجھے یہاں سے نکال بھیجنے کی ہڈی کو ششیں ہوئیں لیکن میں ذہنی رہی۔ بڑے مکالمے بازی، بحث و مباحثہ اور دلیل باذیل ہوئیں لیکن برائی کے پاؤں ایک مرتبہ جم جائیں تو اسے اکھاڑا مشکل ہوتا ہے۔ اپنی بھائی خاطر میں بھی ایک برائی بن گئی تھی۔ اب تو سب گویا مجھے بھول سے گئے ہیں۔ کسی دودھ یونشی یہاں پڑی موت کی آغوش میں جا سوئی گئی۔

اس نے سب کچھ بڑے سرسری سے لیے میں کتا تھا لیکن میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ میں نے اپنے لیے کچھ ہوا اور رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نہیں، تم اپنی کسپیری کی موت نہیں مڑو گی۔ میں تمہیں شہر لے جاؤں گا۔ بہت اچھے ڈاکٹروں سے تمہارا علاج کراؤں گا۔ تمہیں بہت اچھے مگر میں رکھوں گا، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

اس نے بے اعتباری سے میری طرف دیکھا "تم کیوں کہدے میرے لئے ایسا؟ اس دنیا میں کوئی بغیر غرض کے کسی کے لئے زیادہ زحمت نہیں اٹھاتا۔ اور میں اب کسی کی بھی کوئی غرض پوری کرنے کے قابل نہیں رہی۔ لوگ تو میرے سامنے سے بھی بھاگتے ہیں، تم کیوں اپنی تکلیف اٹھاؤ گے میرے لئے؟"

"صرف اس لئے کہ تم میرے بچپن کی یادوں کا ایک حصہ ہو۔ اور مجھے اپنے بچپن کی یادیں بہت عزیز ہیں۔" میں نے دیکھتے لیے میں کہا۔

نکھرے دیکتا ہے وہ اسے یاد نہیں رہتے۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کیو نہ کر لیا؟ کیا کر رہی تمہیں؟

"وہ مجھے مجھ سے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ اور ہاتھوں پر عجیب سی منگراہٹ تھی۔ جیسے اسے وقت مالات اور دنیا کسی سے بھی کوئی شگہ، کوئی جھگڑا ہو۔ نیچے کے نیچے سے بچکا ہوا چمکت نکال کر اس نے پھر ایک سگریٹ سلاگائی اور طویل کش لے کر کمانسی کو دبائے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میری کمانی میں کوئی ٹاپا نہیں ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے" اس دنیا میں ہزاروں لاکھوں لوگ آئے دن میری ہی طرح برباد ہوتے رہتے ہیں، صفحہ ہستی سے مٹتے رہتے ہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ" میں نے اصرار کیا "وہاں تک تو مجھے معلوم ہے کہ مگر سے فرار ہونے کے بعد تم ایک طویل عرصے کا۔ نہ باغے کہاں کہاں دھکے کھانے کے بعد واپس آ گئی تھیں۔"

"اس کے بعد کا قصہ کچھ زیادہ طویل نہیں ہے" اس کی دھڑلائی ہوئی آنکھیں کچھ اور دھندلا گئیں "بابا دن رات مجھ پر لعنت بھیجتا تھا، کھلی کوپے میں ملتی تھی تو لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے۔ مجھے برا انوس ہوتا تھا کہ کیوں واپس آ گئی۔ اس سے تو اچھا تھا میں اور ہر اور دھکے ہی کھاتی رہتی۔ میں تو بڑے مان سے آئی تھی کہ جہاں انسان جہنم لے وہ جگہ "وہ گاؤں" وہ شہر تو اس کی طرح بن گیا ہے۔ شہر واپنی گود میں پناہ دیتا ہے مگر یہاں تو ہر چیز مجھ پر ہمارا ہو چکی تھی۔ پھر ایک نونہا مارا اور مریاں گویا بک بک بک بک ہو کر ختم ہو گئی۔ زندگی کے آخری دنوں میں بابا مجھے بہت برا لگے لگتا تھا لیکن جب وہ مریاں تو اس کی کئی بہت شدت سے محسوس ہوتے تھے۔ بابا جن کا مزاج رہا تھا، مکان بھی انہی کا تھا، انہوں نے چلم کے بعد ہی مکان لے لیا اور دو سرے حرا سے گود لے دیا۔ میں بالکل جیسے سر راہ کھڑی رہ گئی۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لوگوں کہاں جاؤں اور کہاں سے واپس کھاؤں۔ اور قیسم میں شاید کسی کو بھی اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے زیادہ بڑے شہر، کیے تو نہیں لیکن سنا ہے کہ بڑے شہروں کی زندگی بڑی مشقی ہوتی ہے، بے حسی کا راج ہوتا ہے۔ کسی کو کسی کا پتا نہیں ہوتا، پڑوسی کو پڑوسی کے دکھ سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ خود غرضی، بے حسی یا مشقی زندگی اب صرف بڑے شہروں کی خصوصیت نہیں رہی، یہ تو شخص بڑے شہروں پر ایک الزام ہے۔ بے حسی، خود غرضی اور مشقی طرز عمل تو اب ہموں سے چھوٹی بستیوں میں بھی ذہر کی طرح پھیل چکا ہے۔ اصل میں بستیاں یا شہر تو نہیں بدل رہے، تبدیل تو ہم انسان ہو رہے ہیں۔ الزام ہم لوگ وقت زمانے اور شہروں کو دیتے رہتے ہیں۔ میں نہیں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میں کیا محسوس کر رہی تھی۔ میری جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ میں بس

قائلاً پر جا چکا تھا۔ باہر اب بھی جنگی انداز پر چلا رہا تھا۔ آہ
نیچے اتنا اندازہ ہو گیا کہ جسمی تیزی تک وہ اکیلا ہی پہنچا تھا۔ باہر
لوگ شاید لوہرا دھڑک رہی، غلغلہ میں بکھرے ہوئے تھے۔
وہ قاتلاً فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ شاید مجھے ہٹل کی نوپڑی دے
ہوئے اگلا قدم کیا اٹھائے سوچے بھی اس پر وحشت سی سوار تھی
... شاید میرے تعاقب، سفر اور رات بھر کی بے رحمی سے آرائی نے اس
کے اعصاب ہلکا کر دیے تھے۔ نہ جانے یہ اس کی ضرورت تھی یا
حمایت کہ اس نے اپنے باقی ساتھیوں کو اپنی کامیابی سے مطلع
کرنے کے لئے ہوائی فائر کرنے کی غرض سے ہٹل کا رخ ڈراما
بدلا۔ میرے لئے اتنی ہی صلت کافی تھی۔

میں اس وقت جب کہ اس نے ہوائی فائر کیا، میں اس کے
دوسرے ممکنہ فائر سے بچنے ہوئے ہٹل کی سی تیزی سے اس پر
جھپٹ چکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر کرانے کا وار کیا۔ معلوم
میں اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹی یا نہیں، سر حال مشین ہٹل اس کے
ہاتھ سے دور جا کر لا اور اس کا بازو بے جان سے انداز میں اٹھی
تیزی سے گھوما کہ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی توڑا سا گھوم گیا۔
میں نے اس کی کتیش پر ایک بھری ہوئی گھونسا رسید کیا، وہ اونٹ سے نہ
دور جا کر لا اور وہیں ساکت ہو گیا۔
اس دوران کہیں قریب ہی کوئی نامی گمن ترخانے لگی۔

معلوم نہیں کیوں یہ الفاظ سن کر اس کی کھنڈر آنکھوں میں
آنسوؤں کی چشم پھیل گئی مگر اس نے جاری سے آنکھیں پونچھ
لیں اور مضبوطانہ اشتیاق کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی "میں
نہیں آ رہا کہ کسی کو مجھ سے اتنی ہمدردی ہو سکتی ہے۔ میں تو بہت
پری غور ہوں۔ اور پھر میں نے زندگی میں ابھی تمہارے لئے
کچھ نہیں کیا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "تم بہت بڑے
آدمی بن گئے ہو نا؟ بہت دولت ہو گی تمہارے پاس؟"
"کچھ ایسی زیادہ نہیں، اور پھر دولت زیادہ ہونے سے آدمی
بڑا تو نہیں بن جاتا،" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ہاں۔ لیکن خوشی تو ہوتی ہے۔" اس نے مسکرایا۔ پھر جیسے
یکدم اسے یاد آیا کہ اس نے سب سے ضروری بات تو بھٹی سی
نہیں۔ قدرے بڑھانے کے ساتھ انداز میں بولی "لیکن اس وقت
تم کس مشکل میں گرفتار ہو؟ تمہارا حال اتنا خراب کیوں ہو رہا
ہے؟ کیا مصیبت آن پڑی ہے تم پر؟"
اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا "مصیبت" خود ہی
دردناز سے پر آن کھڑی ہوئی۔

میں شاید باتوں میں کچھ زیادہ ہی محو ہو گیا تھا جو میری جمشی
حس بھی مجھے خطرے سے خبردار نہیں کر سکی تھی۔ میں نے
دردنازے کی ڈھنگ بھی نہیں چھائی تھی اور خود کو کچھ زیادہ ہی
محفوظ مقام پر محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ دردنازہ اتنی زوردار
تواڑ کے ساتھ کھلا کہ ایک ٹانے کے لئے مجھے اندیشہ محسوس
ہوا کہ شاید وہ زمیں بوس ہو گیا ہے۔

دردنازے پر ایک وحشت زدہ سادرا زقدہ نوجوان کھڑا تھا۔
جس کے بال جھانچکاڑ کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کھنٹی
واضحی بھی منتشر تھی اور اس میں تنگے پختے ہوئے تھے۔ اس
کے ہاتھ میں مشین ہٹل تھا جس کا رخ میری طرف تھا۔ یہ
نوجوان انہی لوگوں میں سے ایک تھا جو مجھے پکڑنے میں ایک بار
کامیاب ہو چکا تھے لیکن میں ان کے جال سے نکل رہا تھا۔
"آؤ۔ آؤ۔ باہر آ جاؤ میری جان!" وہ رانت قدرے بھیج
کر گئے گئے مگر نہ ہرلے لہجے میں بولا "زیادہ پھلا کی دکانے کی
کو شش مت کرنا ورنہ تڑپنے کی سلت بھی نہیں ملے گی۔"
میں نے مسکرا کر آباں کی طرف دیکھا اور مجبوری کے
اظہار میں کندھے اچکا دیئے۔ وہ بے جاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے
بھی میری طرف اور بھی اس نوجوان کے ہاتھوں میں دبے
ہوئے مشین ہٹل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں آہستہ سے
دردنازے کی طرف بڑھا۔ اسی رفتار سے نوجوان نے پیچھے ہٹنا
شروع کر دیا۔ وہ ہلک جھپٹائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آباں
کی طرف اس نے ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی۔
میں دردنازے سے باہر آیا تو وہ مجھ سے چھ سات قدم کے

پراسرار ہولناک اور قاتل فراموش کمائیوں
کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

بدن کا قیدی

70/

ناشر مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

میں فیصلہ نہیں کر رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ صرف دوڑتے رہنا سیکھے کا حل نہیں تھا۔ چکی بات یہ تھی کہ میرے حواس میں اب وہ تیزی و طراری نہیں رہی تھی جو ایک نازم و انسان کے حواس میں ہو سکتی ہے۔ اس عالم میں بھی جو کہ میں دو چار آدمیوں سے تو مت ہی سکا تھا لیکن اس وقت میرے تعاقب میں غول کا غول تھا اور وہ بھی جدید ہتھیاروں کے ساتھ۔ میں نے اپنی حالت کچھ درست کرنے کے لئے دو چار گہری گہری سانسیں لیں۔ رفتاً مجھے یاد آیا کہ اس حویلی کے گرد سنگ خانہ گشت کیا کرتے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اسی لئے کوئی محافظ حویلی کے کونے سے نمودار ہو گا کھائی دے جاتا۔ میں نے فوراً کرنے کی طرف کھٹکا شروع کر دیا تاہم گریڈوار سے ہی لگائے رکھی۔

کونے پر پہنچ کر میں نے نہایت محتاط انداز میں دوسری طرف جھانکا اور اسی لئے اپنی سانسیں سینے میں ہی مدک میں محافظہ والی بات مجھے بردت ہی یاد آئی تھی۔ دوسری طرف سے واقعی ایک محافظ ٹھٹکے کے سے انداز میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ وہ بڑی بے پروائی سے سگریٹ کے کش لیتا ہوا آ رہا تھا اور اس کی توجہ اس کونے کی طرف نہیں تھی جدھر سے میں جھانک رہا تھا۔ وہ ڈھیلی زحالی سیاہ یا شاید کسی اور گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے کندھے پر کوئی گن لگی ہوئی تھی۔

میں نے سر جھپکے ہٹایا اور بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ دیوار کی اوٹ سے برآمد ہوا میں نے پوری قوت جمع کرتے ہوئے اس کے خرخرے پر چاب رسید کی۔ وہ ادراغ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اچھل کر اٹار کرنے لگا مگر آدھی جا رہا تھا۔ سمجھ گیا۔ لیکن اس وقت تک میں جھپٹ کر اس کی گردن اپنے بازو کے گھٹنے میں لے چکا تھا۔ وہ کوئی آواز نہ نکال پایا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن پٹ سے ٹوٹ کر رہ گئی۔

اس کی گن زمین پر میرے سامنے پڑی تھی۔ وہ بہت شاندار اسٹین گن معلوم ہوئی تھی۔ میں نے اس کے بے جان جسم کو دیوار کی طرف دھکیلا اور گن اٹھانے کے لئے جھکا۔ مگر شاید اس مختصری کارآمدائی میں الجھ کر گرد و پیش کی خبر نہیں رکھ سکا تھا۔ حواس میں وہ مخصوص مستندی نہیں رہی تھی اس لئے بدقت خبردار نہیں ہو سکا۔ یا پھر شاید کوئی ہتھیار حاصل کرنا آج میری قسمت میں ہی نہیں لکھا تھا۔

اسٹین گن کی طرف جھپٹے ہی مجھ پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔

میں ایک بار پھر اندھا دھند بھاگا۔ ایک ٹائٹ کے لئے مجھے تمباکو کا بھی خیال آیا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ میں دوڑنا چلا گیا۔ نازاب بھی کئی سستوں سے میرے تھے۔ وہ لوگ غالباً صرف مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے انتہائی حربے کے طور پر نازنگ کر رہے تھے۔ ان کا کوئی ہدف نہیں تھا اور اس بات کا مجھے کافی مدد تک یقین ہو چکا تھا کہ وہ مجھے ہانک کر نہیں چاہتے تھے۔

مجھے اب مت کا اندازہ نہیں رہا تھا۔ بس میں کسی طرح ہانک کرنے والوں سے دور نکل جانا چاہتا تھا لیکن آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے بھی ایک دو آدمی ضرور اسی سمت میں بڑھ رہے تھے جدھر میں جا رہا تھا۔

گالی دور نکل آنے کے بعد مجھے سامنے ایک بہت بڑے حویلی نما مکان کا بیولا نظر آیا۔ میں اس کے قریب جا پہنچا کہ شاید وہاں کوئی جائے پناہ میرا آسکے۔ لیکن جب میں اس حویلی کے قریب پہنچا تو گھبراہٹ میں بھی وہ مجھے کچھ جانی پہچانی سی نظر آئی اور دوسرے ہی لمحے میرے اعصاب کو جھٹکا سا لگا۔

یہ تو ملک اسلم زماں کی حویلی تھی۔ اس حویلی کی اسی بلند دیواروں سے کھڑے ہو کر میں نے برسوں پہلے عہد کیا تھا کہ میں ملک اسلم زماں سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔ اس وقت میں ایک کمزور، حقیر اور بے حیثیت لڑکا تھا۔ بے شک میں نے اپنا عہد پورا کر لیا تھا۔ ملک اسلم زماں سے میں نے انتقام لے لیا تھا لیکن اس صورت حال کو نہ جانے کیا نام دیا جاسکتا تھا کہ آج میں اسی اسلم ملک کے بیٹے قیصر ملک کے آدمیوں سے بچنے کے لئے دوڑتا ہوا اسی حویلی کے سامنے دیوار میں آج پہنچا تھا۔ ہانک مجھے ظاہر میں کرنے کے بعد یقیناً میں لارہے تھے لیکن مجھ قیصر کے قریب پہنچ کر ان کے چکل سے نکل بھاگا تھا۔ مگر قسمت کو مجھے کچھ کروہیں لاری تھی۔

ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ انتقام کوئی ایسی نامی اچھی چیز بھی نہیں ہے۔ شاید سلسلہ در سلسلہ پتا ہے۔ مجھ سے ملک اسلم زماں کو انجام کو پہنچایا تھا۔ اس کا بیٹا اب مجھ سے انتقام لینے کے لئے اپنے تمام تر وسائل استعمال کر رہا تھا۔ لیکن میں کہہ سکتا تھا کہ یہ سلسلہ اب کہاں ختم ہوگا۔

میں حویلی کی دیوار سے چپک کر کھڑا ہوا۔ اس کا ایک نازم قیصر کے ہوا کہ میں تاریکی کا ہی ایک حصہ بن کر رہ گیا۔ ٹھکی جگہ

نہیں پھر بھی مجھ جیسی بھری صلاحیت رکھنے والا کوئی انسان قیصر سے مت فاصلے سے میرا پیلا دیکھ سکتا تھا۔

اب مجھ پر بھی تحسین طلبہ پانے لگی تھی۔ پیاس سے میرا برا حال تھا۔ دوڑ بھاگ سے ایک بار پھر سر میں اس جگہ دھمکی سی لگنے لگی تھی جہاں ضرب لگی تھی۔ نازنگ اب ختم نہیں تھی۔

لاڈو

قمر اجنالی قیمت: 90/-

جوالا مکھن

خاور صدیقی

○ انسانوں کے جنگل میں بسنے والے

ان درندوں کی داستان جن کے منہ

کو انسانی خون لگ گیا تھا۔

○ ایک کفن بردوش نوجوان کی کہانی

موت جس کے ہم رکاب تھی

○ آتش انتقام نے اسے جوالا مکھی

بنادیا تھا

○ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کا ایک

ایڈووچر سلسلہ دو حصوں میں شائع

ہو رہا ہے۔

پبلشرز: اردو بازار، لاہور 2

فون: 7224665

اس بار کسی چیز سے وار نہیں کیا گیا تھا بلکہ جن چار یا شاید اس سے بھی زیادہ آدمی مجھ پر پل پڑے تھے۔ ایک نے یکدم ایک موٹے اور کمزورے کپڑے کا تھپتھاپا شاید بوری میرے چہرے پر ڈال دی جو میرے کندھوں سے بھی کچھ نیچے تک چلی گئی تھی۔ ہاتھوں نے ناقابلِ یقین پھرتی سے مجھے رستوں میں جکڑ دیا تھا۔ ایک لمبے کے اندر اندر میں اندھیرے اور بے کسی کی دنیا میں نخل ہو گیا تھا۔ میرے بازو میرے پلو سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ناقص ایک دوسرے سے جڑ گئی تھیں۔ کندھوں سے لے کر ٹخنوں تک انہوں نے اس پھرتی سے رسی لپیٹی تھی جیسے کسی مشین نے نیگلے پر سوت لپیٹا ہو۔ دو لوگ بلاشبہ اپنے کاموں میں ماہر تھے۔۔۔ مجھ جیسے آہوئے وحشی کو قابو میں کرنا عام سے لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

منہب نے سب جان شیر کی طرح مجھے اٹھایا اور نہ جانے کس طرف لے چلے۔ بہر حال سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ دور چلنے اور کئی بار اوپر آدھر مڑنے کے بعد آخر کار انہوں نے مجھے میرے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ مجھے وہاں کئی آدمیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ہڑواہٹ کے سے انداز میں کچھ لوگوں کی باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دی۔ جن ہی میرے پاؤں زمین پر رکے ایک بلند آہنگ قصبہ بھی سنائی دیا۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ یہ قصبہ بلاشبہ قیصر ملک نے لگایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے اسی کی جوبلی میں پہنچایا گیا تھا۔

”بھئی واہ۔۔۔!“ میں نے قیصر ملک کی آواز سنی۔ گنا تھا کہ وہ اس صورت حال سے بہت ہی محظوظ ہو رہا تھا۔ نہایت ہی مسرور لمبے میں وہ نہ جانے کس سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگوں کی کارکردگی کا واقعی جواب نہیں۔ وہ تم کو تو تمسارا ہونا چاہئے۔ باکمال لوگ۔“

تاریخی ناول

خالد بن ولید الماس ایم۔ اے۔ 200/

سلطان شیخ شہید الماس ایم۔ اے۔ 200/

نواب حیدر علی خاں الماس ایم۔ اے۔ 200/

سلطان صلاح الدین ایوبی الماس ایم۔ اے۔ 450/

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

جواب سروس: جن لوگوں کے پاس نہ کوئی کمال ہے نہ کوئی سروس انہوں نے اس قسم کے سلوک کو اپناتے ہوئے ہیں۔
اس کے جواب میں ایک گھروسی اور سفارشی آواز سنائی
دی "جانی صاحب! ہم جس مال کا وعدہ کرتے ہیں اس کی ڈیوری
مردود دیتے ہیں۔ بہترین دام بہترین کام۔"

"اس کا دیدار تو کراؤ۔ میں اس حالت میں اس کی شکل
دیکھنا چاہتا ہوں۔" قیصر ملک کی آواز سنائی دی۔ کسی نے میرے
دہ چڑھتے ہوئے تھیلے سے زور آزمائی شروع کر دی مگر اس کا
کچھ رستوں میں ہی پلٹ گیا تھا اس لئے وہ اتر نہ سکا۔

"اسے کھول دو۔ یہ ہمارے ٹھکانے پر آگیا ہے" اب کہیں
نہیں جا سکتا۔ بس اس کے پاؤں بندھے رہنے دینا۔ دو تکیاں
ارٹنے والے گدھوں کی ٹانگیں باندھ کر رکھی جاتی ہیں "قیصر
ملک صورت حال سے زیادہ سے زیادہ محفوظ ہونے اور خطرے
زیادہ سے زیادہ تھیر برساتے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اس
وقت وہ اس پوزیشن میں تھا۔ کون اس کی زبان روک سکتا تھا؟

میرے جسم سے تقریباً ساری رتی کھول دی گئی تھی میرا
دوران خون بحال ہوا اور نہ ہی محسوس ہوا تھا جیسے مجھے شے میں
بکڑا دیا گیا ہے۔ ہاتھ آزاد ہو جانے کے بعد بھی میں سہکتا
رہا۔ میں نے اپنے چہرے پر چڑھا ہوا وہ گنداسا تھلا اتارنے کی
کوشش نہیں کی۔ میرے ٹخنوں پر رتی کا حلقہ رہنے دیا گیا تھا اور
وہاں مضبوط کر رہیں لگادی گئی تھیں۔ اپنی رتی بھی پاس ہی لپچے کی
شکل میں پڑی تھی۔ پھر یکدم کسی نے وہ برقی نما تھیلہ میرے
پیر سے کھینچ لیا۔

قیصر ملک مجھ سے کافی فاصلے پر لیکن عین میری سیدھ میں
بیٹھا تھا۔ تاریخ کے بہت پرانے ادوار کے بارے میں ہم صرف
انوار سے ہی لگا سکتے ہیں کہ قلائ زمانے کے بادشاہوں کے طور
پر لیتے کیا تھے اور ان کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز کیا تھا۔ قلمروں کے
جائیت کار بھی چشم تصور ہی کی مدد سے یا کبھی کبھار محققین کے
قلمروں سے قلمروں میں پرانے زمانے کے بادشاہوں کی نشست
وہ غارت دکھاتے ہیں۔ میری چشم تصور بھی مجھے بتا رہی تھی کہ
مکھڑا عظیم شاہی اسی انداز میں اپنے تخت پر براجمان ہوتا ہوگا
جس طرح اس وقت قیصر ملک میرے سامنے بیٹھا تھا۔

وہ اس وقت ایک اونچی اور چامھی بڑی قلعی کرسی پر براجمان
تھا جس کے پائے موٹے موٹے اور رنگین تھے۔ قیصر اس پر کچھ
زیادہ ہی پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ جسم ہٹا پھیلا ہوا تھا "آئیں اتنی
علیٰ ٹکڑی ہوئی تھیں۔ اونٹوں پر بڑی طرز سے مسکراہٹ تھی۔

میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے سے کسی بھی تاثر کا
انکار نہ ہونے پائے۔ بے پروائی کے اظہار کے لئے میں اپنے
کپڑے ہچکچاتے دکھاؤں گا۔ اب وہ ہچکچاتے کے نہیں بلکہ
ہچکچانے کے قابل نہ گئے تھے۔ زیادہ توجہ سے اور ہر آواز دیکھنے بغیر

بھی میں ارد گرد کا جائزہ لے چکا تھا۔ میں ایک طویل و عریض
پر آمدے میں کھڑا تھا۔ یہ غالباً ملک کی پرانی ٹرڈ کی حویلی کا ہی
عقبی حصہ تھا۔ سامنے لان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ اس سے
آگے روشنی نہیں جا رہی تھی لیکن ادھر غالباً عقی دوار تھی۔
آپس پاس بہت سے آدمی موجود تھے اور تقریباً بھی مسلح تھے۔

ان میں سے دس باہر تو بڑی مختلف مجلسوں کے لوگ تھے جنہیں
میں اپنی فراہم کردہ وعدہ کے دوران دیکھ چکا تھا۔ یہ لوگ حویلی
کے ماحول سے متعلق نہیں لگتے تھے۔ کہیں اور ہی کی مخلوق لگتے
تھے۔ ان کے ہٹلے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے لیکن ہر
بھی ان میں کوئی نا دیوہی قدر مشترک تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ وہ
ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ وہ تمام اسلحہ ان کے پاس اب
بھی موجود تھا جس کی جھلک میں پہلے بھی اس دیرانے میں دیکھ چکا
تھا جہاں انہوں نے جال کے ذریعے قاپوس کر لیا تھا۔ وہ
اب بھی اسی انداز میں اپنی اپنی ٹھیس و ٹیوہ سنبھالے کھڑے تھے
جیسے ایک فرد کا نہیں "ایک شہر کا خاصہ کئے کھڑے ہوں۔ ان
سب کے چہرے اب بھی ہر اثر سے عاری تھے لیکن تقریباً پوری
رات کی بھاگ دوڑ کے باعث محسوس اور دماغی ان کے چروں
سے ضرور عیاں تھی۔ حالانکہ حالات یہی بتاتے تھے کہ ان کی
راتیں اسی انداز میں گزرتی ہوں گی۔ انہیں تو اس کا عادی ہونا
چاہئے تھا۔

چڑنے کی جھٹک اور شکریوں والی خاکی چٹت میں لباس وہ
دراز قد نوجوان جرمیان متی کے اس کپڑے کا سربراہ معلوم ہوا تھا
ایک طرف کھڑا پہلے ہی کی طرح قلمی انداز میں اپنے مشین پہل
کو انگلیوں پر گھمرا رہا تھا۔

"اوہو۔ کپڑے بھانڑے جا رہے ہیں" قیصر ملک طرز سے
میں بولا "گویا یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ ہمیں اسی
صورت حال کی کوئی پروا نہیں۔ خیر۔۔۔ بے نیازی تو اجماعی و حری
رہ جائے گی۔ ذرا نظر تو اٹھاؤ" یہ شرمیلی بازیوں ماہ جینوں کی
طرح آنکھیں کھلیں چمکائی ہوئی ہیں۔ ادھر وادی طرف تو دیکھو۔
ہم اب ایسے بھی گئے کر رہے نہیں۔"

میں نے کھسی سامنے لے کر سر اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
"تمہیں اگر کوئی کیا کرنا گئے تو میں اس سے لڑ پڑوں گا۔ لاکھوں
میں نہیں تو کم از کم ہزاروں میں ایک تو ضرور ہو۔ یہ بتاؤ کہ اب
تمہاری فرمائش کیا ہے؟ تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنے آپ کو
خود قہر ظاہر کروں؟ اچھا۔۔۔ یہ لو۔۔۔ خود قہر ہو جاتا ہوں۔" میں
نے ٹھنوں کو ذرا سا خم دے کر ٹانگیں یوں ہلاتیں جیسے میں قہر قہر
کانپ رہا ہوں۔

"بس۔۔۔ اب تو خوش ہو؟ قہر قہر کانپ لیا میں" میں نے
معموسیت سے پوچھا۔

قیصر ملک گئے چہرے سے طرز سے مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی

مشکل نہیں تھا کہ وہ اس ساری صورت حال سے ذرا بھی غور نہیں تھا۔ تاہم قیصر ملک کا حکم پا کر اس نے سوزیائے انداز میں ہلایا اور اس پر ہجوم سی جگہ میں لوگوں سے چٹا ہوا دیوار کے ساتھ چٹا کانی پیچھے چلا گیا جہاں دیوار میں ایک ہماری ہرگز نہ سنا دواؤہ نظر آ رہا تھا۔ تاب گھرا کر اس نے دواؤہ کھولا اور اس کے عقب میں غائب ہو گیا۔

چند لمحوں کے لئے مائل پھر مائل ہو گیا جیسے کچھ لقمہ چلنے لگ رہا ہو اور پوسے پر ایک ہی منظر سامنے ہو گیا۔ قیصر ملک ملک جھپکے انہی میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے آنکھوں میں سرخ زور سے تیر رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ غار کے دوسرے تھے یا بے غزالی کے۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت غلغلہ لیکن اتنا نہ سکر اسٹ تھی۔ وہ دیکھ میری طرف ہاتھ تھام رہا تھا۔ گاؤں شاید کیس دور پہنچا ہوا تھا۔ آخر کار میں نے ہی سکون توڑا کیونکہ مجھے یہ سکوت بہت سی گراں گزرنے لگا تھا۔

”تم نے یہ اتنا زیادہ تردد کس لئے کیا برا در عزیز؟“ میں نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

”ہم نے سوچا تھا کہ اگر اس میں کوئی تعزیر ہوئی ہے۔۔۔ اتنے بڑے آدمی ہو تم۔ شہر میں اتنے چرچے ہیں تمہارے۔ جس جگہ میں فون کو وہاں پہنچا جاتی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم جیسے بڑے زمیندار ہی ملک کے طاقتور اور اثر زریں لوگ ہیں لیکن اب ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ ہمیں تم جیسے نیچے سے بڑی بزرگوں کی آشیرواد بھی حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ بس صرف اسی لئے زحمت دی ہے حضور کو۔“ کبوتر کا لہجہ حد سے زیادہ زہریلا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے اپنی کنوینشن میں سرسراہٹ محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اول حالات میں ایک تو ایسے ہی کمزوری کو ٹھنڈا رکھنا ضروری تھا۔ جنگ صرف اسلئے اور فوری کی جنگ نہیں، اصرار کی جنگ ہوئی ہے اور بعض اوقات وہ لوگ کمزور پوزیشن میں ہونے کے باوجود فائدہ اٹھا جاتے ہیں جو پکیان خیز اور اضطراب کا شکار نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ سوچ کر بھی اپنے کچھ تسلی دے لی کہ وہ دراصل اسی لئے اتنا ہنکار رہا تھا کہ اس کی کڑی پر میرا پاس تھا۔ زندگی تو جب تک کی خدا نے لکھ دی تھی اس سے کم یا زیادہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن برصورت تو مجھے اس بات سے محفوظ ہونے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔

اس دوران پہلی والا منظر شخص ایک خاصا سا سا بارف کیس اٹھا لے لوٹ آیا۔ بریف کیس میں یقیناً کوئی جھٹی مولیٰ نہیں تھی۔ اس نے بریف کیس میں شیشیں مائل والے نوجوان کو دیا۔ نوجوان نے ایک ہاتھ سے بریف کیس تھامے ہوئے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں وہی غصہ جگمگا رہا جو بدلت سے بیاہ کرنے والوں کی آنکھوں میں ہوتا

اور ہوٹ سفاکانہ انداز میں کھینچ کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، شیشیں مائل والا نوجوان اس سے مخاطب ہوا ”ملک صاحب جیوے یہ بندہ ہے جی دار۔ زبان بھی خوب چلتی ہے اور ہاتھ پاؤں بھی۔ ہم نے آج تک پچاسوں مشکل مشکل کام کئے ہیں لیکن اس ایک بے بد بخت کو قابو میں کرتے ہوئے ہمارا بڑا نقصان ہوا۔ بڑی محنت کرنی پڑی۔ وہ آدمی بھی کام آگئے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ آپ ہم سے کوئی آدم خور شیر پکڑ کر لانے کا کنٹرول کر لیتے۔“

”ایسا... تو یہ کنٹرول تھا“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ملک کانی ترقی کرتا جا رہا تھا۔ اب قتل، اغوا وغیرہ جیسے معاملات کے لئے کنٹرول کمزوری کا قاعدہ مضبوط حقیقتیں بننے لگی تھیں۔ ”بات کو برا چڑھا کر بیان کرنا تم لوگوں کی عادت ہوئی ہے تاکہ خدا سے بے نیلہ سے زیادہ اضافہ کرایا جاسکے“ قیصر ملک قدرے بد مزگی سے بولا ”بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں یہ کام اپنے آدمیوں سے کرانا نہیں چاہتا تھا ورنہ یہ ان کے لئے کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔“

شیشیں مائل والا نوجوان خطرے سے انداز میں مسکرا رہا لیکن بولا کچھ نہیں۔ البتہ اس کے پاس کھڑا ہوا ایک اوجیز عمر شخص جو طے سے قلمی قسم کا ڈاکو معلوم ہوا تھا ”اپنی جھاڑو جھکاؤ اور اسی میں اٹکیاں پھیرتے ہوئے مضطرب لہجے میں نوجوان سے مخاطب ہوا ”پاس آؤ تم وصول کرو اور پورا بستر کرلو۔ کام ختم ہونے کے بعد زیادہ دیر رکنا اپنے اصول کے خلاف ہے۔“

شیشیں مائل والا نوجوان گویا اپنے ساتھی کی تاکید کرتے ہوئے قیصر ملک سے مخاطب ہوا۔ ”ساتھ لے۔ کوئل بادشاہ کیا کہہ رہا ہے؟ باقی رقم ہمارے حوالے کر دو۔ ہم جائیں۔ اب تم باؤ اور تمہارا کام۔“

”رقم تیار ہے“ قیصر ملک نے قدرے ناگوار سی سی جواب دیا۔ اس نے ان لوگوں سے کام ضرور لیا تھا لیکن شاید کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر وہ اس سے زیادہ خوش نہیں تھا یا شاید اسے اس معاملہ سے کی باقی رقم نہ مانگا اور گزر رہا تھا۔

وہاں موجود آدمیوں میں سے چند آدمی قیصر ملک کے معلوم ہوتے تھے۔ قیصر ملک نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا ”شیشیں خان کو رقم لاؤ۔“

جس شخص کو یہ حکم دیا گیا تھا وہ وہاں موجود لوگوں میں سب سے بڑی عمر کا تھا۔ اس کی موٹی موٹی اور اوپر کراٹھی ہوئی بارف سونچوں میں بہت کم بال سیاہ تھے۔ ناک پر موٹے فریم کی عینک لگی ہوئی تھی۔ سر کھٹ لگی ہوئی اونٹنی طرحے والی پائی تھی۔ وہ اپنی اور شرار میں تھا۔ وہ بجائے خود کوئی چھوٹا سا زمیندار نظر آتا تھا۔ غالباً وہ کوئی میجر یا ٹیپ چڑھا تھا۔ اس کے ماتھے پر موٹی موٹی ٹکٹوں تھیں۔ اس کی شکل دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ذرا بھی

پاس اٹھیں گے۔ یہ یقیناً قیصر ملک کے اپنے آدمی تھے۔

"یہ دیکھ کر معلومات میں بڑا اضافہ ہوا کہ ہمارے ملک میں بھی اب سناٹے پر قتل و غارت اہل انوار کرنے والی سختیاں بننے لگی ہیں۔" میں نے سرسری سے لے کر کہا۔

"یہ کوئی آج نہیں بنے گئیں۔" قیصر ملک نے طنز سے لے کر میں گویا میری معلومات میں مزید اضافہ کیا "چھوٹی موٹی لڑکیاں یا

انفرادی طور پر کام کرنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اب وہ ذرا زیادہ مضبوط اور منظم ہو گئے ہیں۔ بڑے کی رفتار کے

ساتھ ان میں بھی بدلتے طرازیاں آگئی ہیں۔ انہیں عقل چھٹی ہے اور اب ان میں ہر قبیل کے لوگ شامل ہیں۔ حتیٰ کہ اشتا

پسند قسم کے طالب علم بھی جنہیں خاطر خواہ طور پر اپنے جوش و خروش کے اخراج کے راستے نہیں ملنے یا پھر وہ جنہیں ان کی

ناپسندیدہ سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیمی اداروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ بھی اشتا پسندی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اپنے

گروہوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے لیکن ان کے رابطے صرف خاص خاص لوگوں سے ہی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں سے "اس

کے لیے میں فخر شک آیا" بعض سیاسی جماعتیں بھی انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ کبھی یہ خود ہماری آوازوں

وصول کرنے کے لئے کسی بھی شخصیت کو اغوا کر لیتے ہیں اور کبھی ہماری معاونت لے کر آؤں رہے ہیں اس قسم کے کام کر دیتے ہیں۔

قیصر ملک یہ سب کچھ بڑے خوشگوار انداز میں سمجھتا رہا تھا جیسے کچھ دیر کے لئے وہ بھول گیا ہو کہ ہم کن حالات میں ایک

دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے گلاں گزرا کہ کوئی تو جوان مسلم مجھے حالات حاضرہ پر پیکر چڑھ رہا ہے۔

جن گروہوں کی وہ بات کر رہا تھا ان کے بارے میں میں نے اتنی اتنی سی باتیں سنی تھیں لیکن کبھی انہیں اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس قدر منظم اور بے خوف

ہوتے ہوں گے۔ آج ان سے واسطہ بھی پڑ گیا تھا اور ان کی دسترس کا بھی اندازہ ہو گیا تھا تاہم اب بھی اس قسم کے لوگ ہمارے لئے کوئی زیادہ بڑا مسئلہ نہیں تھے۔ میں تو صرف بے

پردائی اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے باعث مارا گیا تھا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ قیصر ملک اتنے اطمینان سے مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہا تھا؟ یقیناً اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ

خیال موجود تھا کہ مجھے اب یہاں سے واپس تو جانا نہیں ہے جو

میں ان معلومات سے کوئی استفادہ کر لوں گا یا کسی اور تک یہ باتیں پہنچا سکیں گا۔

میں نے غیر محسوس طور پر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ قیصر ملک کے

آدمی مستند سے مجھے تجویز دینے کی زور پر لئے کھڑے تھے۔ اس

دوران قیصر ملک کا وہ پیچھے پٹاپٹ آدمی بھی لوٹ آیا۔ وہاں موجود

لوگوں میں میرے علاوہ غالباً وہ واحد آدمی تھا جس کے پاس کوئی

دیکھ کر آئی ہے۔ تاہم وہ تمام صحیح پیشہ ور۔ اس کی نظر مجھ پر سے نہیں ہٹتی اور جنہیں ہٹل بھی گو کہ بار بار اس کی انگلی پر گھونستا رہا لیکن اندازاً یہی تھا کہ کسی بھی لمحے وہ اس کی گردن پر ہلک کر چڑھ کر کھڑا تھا۔ اس کا اندازہ تو دوسرے علمی سہی اور وہ کچھ شہنی خور بھی نظر آتا تھا لیکن گمن کے استعمال میں وہ بلاشبہ باہر نظر آتا تھا۔ اس معاملے میں میں اس کی طرف سے کسی خوش فہمی کا

ظاہر نہیں تھا۔ "مگر تم گناہاں تو احرار سے بچنے کر گمن لو۔" قیصر ملک نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی انتہائی احمق انسان ہی ہمیں دوسرے سے کم رقم دینے کی حثیت کر سکتا ہے اور جنہیں ہم احمق انسانوں میں ہرگز شمار نہیں کرتے۔" نہیں خان مسکرا پھر اس نے تنقیدی سی نظر سے

گردن ہٹا کر جائزہ لیا اور بخیرگی سے بولا "اب ہم جائیں؟ ہماری ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔" تم اب جا سکتے ہو۔ میں نے کہا تاکہ ضرورت تو ہماری پہلے بھی اتنی شدید نہیں تھی لیکن کچھ مصلحتیں تھیں۔"

قیصر ملک نے ایک بار پھر جھٹایا۔ وہ یقیناً بڑی شدت سے چاہتا تھا کہ ایسے معاملات میں اسے ضرورت مند نہیں بلکہ "خود کفیل"

سمجھا جائے۔ "خیر۔" نہیں خان ایک بار پھر طنز سے انداز میں مسکرایا "آئندہ بھی کبھی مصلحتیں تنگ کریں تو ہم کو یاد رکھنا۔

ہمارے وسائل تو تم نے دیکھ ہی لئے۔ شہر ہو یا گاؤں، جنگل ہوں یا پہاڑ، ہماری رسائی سب جگہ اور بڑی تھیک ٹھاک ہے۔"

قیصر ملک کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوا "میں لیا شہری پر ہمو؟ شہر میں ہمارا

بلی انورٹی اڑائیں ہیں لیکن ہمارے علاقے ہی میں ہمارے پر کرنے کے کیسے کیسے دعوے دار پڑے ہیں۔"

"دنیا اسی کا نام ہے" میں نے نہایت مسکینی سے حلیم کید

نہ کہ میرا کسوا میر تو موجود ہی ہوتا ہے۔ بہر حال اس واقعے سے

میرے کافی سبق حاصل کیا ہے۔

"لیکن یہ سبق صرف اسی صورت میں ہمارے کام آئے گا

کہ تم اپنے لئے زندگی کا راستہ منتخب کرو۔" قیصر ملک نے گہری

نہجی کے ساتھ کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، نہیں خان نے اپنے

ساتھ لوگوں کو اشارہ کیا۔ تقریباً دس بارہ آدمی اسی دروازے کی

طرف ہل دے ہر کچھ دیر پہلے قیصر ملک کا پیچھے گیا تھا۔ پیچھے

ان کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ وہ سب لوگ ایک ایک کر کے

دروازے کے عقب میں غائب ہو گئے۔ ہال نمادہ طویل و عریض

نمادہ جیسے خالی خالی سا ہو گیا لیکن چہ آدمی اب بھی میرے ارد

گرد موجود تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس رائفل تھی کسی کے

ہتھیار نہیں تھا۔ قیصر ملک کے پاس بھی کم از کم ایک روپہ لاور ضرور موجود تھا جس کا وہ اس کی داسکت سے بھاگ رہا تھا۔

”کیا مجھے دان چڑھے تک اسی طرح اپنے دربار میں کھڑے رکھنا ہے؟“ میں نے بڑا سی سے کہا ”اگر مجھے ہلاک ہی کرنا ہے تو کر چکو۔ جس شخص کو تم ہلاک کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو اور وہ تمہارے قابو میں بھی ہے اس کے لئے اتنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کس نے کہا کہ میں تمہاری جان لینا چاہتا ہوں؟“ اس نے معصومیت سے آنکھیں پھیلانیں ”مجھے کیا فائدہ ہو گا تمہاری جان لے کر؟“

”تو پھر کیا واقعی تم نے میرے اعزاز میں جشن بپا کرنے کے لئے یہ ہزار وقت مجھے اغوا کر لیا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ تو میں مذاق کر رہا تھا“ وہ سنجیدگی سے بولا ”تم سے کام صرف وہی ہے جو میں ایک مرتبہ تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اب ابھی زندہ ہیں۔ یہ سب آخر وہ تم مجھے ان کا پادشہ ہو۔ اور بس۔ اس کے بعد تم جا سکتے ہو۔“

مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ کیا وہ مجھے اتنا ہی معصوم سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی بات پر یقین کر لیتا کہ اپنے زندہ یا مرنے کا پتہ پانے کے بعد وہ واقعی مجھے جانے دے گا۔

”اس کے جواب میں تمہیں شرمیں ہی رہے چکا ہوں“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”تمہارا کیا خیال تھا کہ اس طرح اغوا کر کے یہاں لائے جانے کے بعد میرے جواب میں کوئی تبدیلی آجائے گی؟“

”ہاں۔“ اس نے بلا تامل کہا ”ہا۔ اے علاقے میں آنے کے بعد۔ اور خاص طور پر ہمارے قابو میں آنے کے بعد لوگ عموماً اپنے بیانات پر نظر ثانی کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس اب اتنا وقت بھی نہیں کہ تمہیں فوراً غرض کے لئے سزا دے سکیں۔

میرا مضبوط اور تپاں انتظار پہلے ہی جواب دے چکی ہے۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہو گا۔ اگر تم اب ابھی کو ہلاک کروا دیتے ہو تب بھی میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ صرف ان کی لاش کا تفتہ کہ وہ کہاں ہے۔“

”اب تم مجھے حسرت کی محسوس ہونے لگی ہے کہ کاش یہ بات واقعی مجھے معلوم ہوتی۔ اگر تم مجھے خدمت کا موقع دو تو میں باہر کی کسی سرائی میں کبھی کی خدمات حاصل کر کے تمہارے باپ کی لاش تلاش کروا دیتا ہوں۔“

”میرے پاس اب کوئی فضول بات سننے کا بھی وقت نہیں ہے۔ اگر تم مجھے اب ابھی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے تو پھر مجبوراً مجھے تمہاری ہلاکت کی ذمہ داری پڑے گی لیکن یہ شرط اتنا آسان نہیں ہو گا۔ اس سے پہلے اور بہت سے شرطیں آئیں گے جن کے دوران تم موت مانگو گے مگر وہ تمہیں نہیں ملے گی۔

یہاں ایک مقام پر یہ خانے میں ہمارا ذاتی قید خانہ ہے۔ اس کی چھتری کو ٹھہریاں درمیانے ساڑھے صد فٹوں سے ہیں ذرا سی ہلکی ہیں۔ ان میں عام جسامت کا آدمی تو سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے نہ سیدھا حالت سکتا ہے۔ ان کے فرش اور دیواروں میں سلیں اسی قدر ہوتی ہے کہ رات کو کھنکھانے کی طرح قطرے پھونکتے ہیں۔ مختلف قسم کے حشرات الارض حتیٰ کہ مکھیچھوڑے بھی خاصی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ہماری بیلوں کے چکر دار زبنت مشور ہیں اور بڑے بڑے پختے خال بخرم چکر دار کے نام سے کاٹتے ہیں لیکن چکر دار کے قیدی کو اگر ہمارے قید خانے میں لایا جائے تو وہ چکر دار کو یاد کر کے اس سے بخودی پر آئیں، مجھے گاہ۔

میں خاموش کھڑا قیصر ملک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اسی ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس قید خانے میں تمہارے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ مطلقاً اللہ تعالیٰ کے ہوشیار ہاتھوں کے زمانے کی کوئی ہمتا ہے۔ لڑنے خیر اور نا کھلی یقین کمائی معلوم ہوگی۔ تم جائدار اور مضبوط قوت ارادی کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ان مراحل سے گزر کر بھی اگر تم نے زبان نہ کھولی تو پھر ہمارے پاس ایک آدمی ہے جو آخر سے زندہ آدمی کی صحیح سالم کمال اس معافی سے آواز آئے کہ چہرے کے ایک شخص تک میں فرق نہیں آتا۔ اس کے بعد ہم اس پر ایک خاص ٹیکنیک کا اہرے کرتے ہیں اور اسے کھولتے ہوئے تیل کے ایک بہت بڑے گڑا میں ڈال دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض روٹانوں پر پھولی چلی جاتی ہے۔ کئی گھنٹے تک میں پک کر وہ انسان یاد کرنے کا سا پتلا بن جاتا ہے لیکن اس عالم میں بھی تھوڑی سی کوشش سے اس کی شکل پہچانی جاسکتی ہے۔ جس ٹیکنیک کا ہم اس پر اہرے کرتے ہیں وہ اسے زیادہ تر ہونے نہیں دیتا۔ کوئی جیسے اس سے پہلے کو ہم نے خانے میں ایک الماری میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ وہ بھی خراب نہیں ہوتا۔ دہشتی کی ایک یادگار ہوتی ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا اور سناکانہ انداز میں مسکرایا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس کے تصور سے یقیناً بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ میں ساکت کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا ”دریائے ایرون کے کنارے آباد بعض افریقی قبائل کے بارے میں تم نے پڑھا ہو گا اور شاید کچھ فلموں میں دیکھا بھی ہو کہ وہ دشمن کی کوہ پیڑی کو تسلیم لیتے ہیں اور ایسی کئی کوہ پیڑیاں بنتے ہو جہاں تو ان کا بار بار کھڑے ہیں ڈالے رکھتے ہیں۔ وہ بھی دراصل کوہ پیڑی نہیں ہوتی۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گا۔ درحقیقت گردن تک انسان کے چہرے اور سر کی کمال باتوں سمیت نہایت حفاظت سے آٹاری جاتی ہے اور اسے کسی گلولہ میں پکایا جاتا ہے تو وہ مسکراتا ہے۔ نام اس کے نفوش اسی طرح محفوظ رہتے ہیں۔ وہ گریا منتول کے چہرے

ایک چہرہ یا داخل ہوتا ہے، دشمنی کی ایک یادگار ہوتی ہے۔ اسی روایت سے متاثر ہو کر ابا جی نے بھی دشمنی کی یادگاریں محفوظ کرنے کا طریقہ سوچا تھا لیکن یہ طریقہ بہت ہی خاص الخاص دشمنوں کے لئے تھا۔ عام سے اور جاگیر مولیٰ کی طرح کات کر پیٹ دیے جانے والے دشمن قوت مت ہوتے ہیں ۲۔ ان کا تو صاحب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ ہمارے یہ خانے میں صرف چار یا پانچ سو موجود ہیں۔ پانچواں شمارا ہو گا بشرطیکہ تم نے زبان نہ کھول۔

میرے لئے یہ اعزاز کہ مشکل نہیں تھا کہ وہ محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے یہ سب کچھ "ہانک" نہیں رہا تھا۔ تکبر کی مدد تک خود اعتمادی میں جلتا ہو کر وہ بچ بول رہا تھا اور اپنی دانست میں مجھے خوفزدہ کر رہا تھا جبکہ میرے لمبوں خوف سے نہیں بلکہ ایک غامض غیظ و غضب کی وجہ سے چنگاراں سی تھرنے لگی تھیں۔

جب بھی میں کسی بد فطرت اور شقی القلب انسان کی اپنی سی زبان اس کے "کارنامے" سننا تھا تو میری یہی کیفیت ہوتی تھی۔ اس تصور سے میری کچھیلیوں میں آگ سی دیکھنے لگتی تھی کہ اس طرح کے لوگ اپنے قابو میں آئے ہوئے انسانوں کو کس طرح سسکا سکا کرتے تھے۔ انسان کی جان آسانی سے نہیں ٹھٹی اور اس انسان کی اذیت اور ذہنی حالت کا صحیح اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا جسے دنیا والوں کی نظروں سے دور کسی عقوبت خانے میں اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جا رہا ہو اور وہ جی بھی نہ سکتا ہو اور اگر جیج سکتا ہو تو کوئی اس کی اذیت بھری جچیں سن کر دے کے لئے نہ آسکتا ہو۔

خدا کی اس بیکراں سلطنت میں ان گنت بے رحم لوگوں نے اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بنا رکھی تھیں۔ جس کا جہاں تک زور اور اختیار چلتا تھا وہاں تک حکم و تشدد کرنے میں لگا ہوا تھا۔ کہیں کوئی صرف اپنے آپ کو راہ راست کا مسافر سمجھ کر اپنے سیاسی مخالفین پر بلا واسطہ یا بلا واسطہ حکم و تشدد کے پاؤں ڈھکتا تھا، کہیں کوئی مذہبی جنون میں جلتا ہو کر اپنے سوا باقی سب کو لائق گردن زنی قرار دے کر نئی نوع انسان کے لئے قہر کا پیا بہرہ بنا ہوا تھا۔

کہیں کوئی بچ فطرت زمیندار تھا، کہیں کوئی دُور اجس نے اپنی زمینوں کی حدود کو اپنی سلطنت سمجھا ہوا تھا، جہاں اس کی ذات میں چمپا ہوا اور دہرہ مختلف طریقوں سے اپنی حیوانیت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ کہیں کوئی تھانے دار تھا جس کے نزدیک اس کا تھانہ ہی اس کی سلطنت تھا۔ اس سلطنت میں ذیہ قہیش کوئی نوبی تشدد سے سے مرجی جاتا تھا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر متعل بہت خوش قسمت ہوتا تھا تو اخبار کے کسی کونے کھدے سے کچھ سڑکوں کی ہسم سی خبر آجاتی تھی۔ پھر اسی تھانے میں اس

کی کول سول بہت رنج ہوتی تھی اور وہی لوگ اس کی "قتیش" پر باور ہوتے تھے جن کی "قتیش" کی وجہ سے وہ بد نصیب ٹھہر سکتے تھے مرا تھا۔ چنانچہ وہی قاتل وہی منصف والا ڈرلا ہوا پھرائے جانے کے بعد آخر کار ایک دن فاکل داخل دفتر ہو جاتی تھی اور تھانے دار صاحب کسی اور تھانے میں جا کر کسی اور سلطنت کے فرمانروا ہو کر اپنے شوقِ قہیش کی تکمیل کرنے لگتے تھے۔

اس طرح ہر گلی، ہر محلے، ہر گاؤں، ہر شہر میں ان گنت سلطنتیں بکھری ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک موٹر کی ٹک کا کیرن بھی اس کی چھوٹی سی سلطنت تھی جہاں وہ چھوٹے چھوٹے مسموم شاگردوں کے تختوں پر لوہے کا دریا جاری کرنا میں سوتی سوتی چالیاں دے کر اپنے اندر چھپے ہوئے بد فطرت حیوان کے لئے لاشعوری طور پر تسکین کا سامان کرتا تھا۔ ان سب سلطنتوں میں "ان سب فرمانرواؤں کے ہاتھوں صرف عام آدمی، غریب آدمی یا کمزور آدمی کی زندگی اذیتیں تھیں۔ ہر جگہ صرف عام آدمی اذیتوں میں گھرا ہوا تھا۔ عام آدمی ہو گا تو ایک جرم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر جگہ صرف طاقتور یا اہل اختیار رو دیتا پھر رہا تھا۔ دنیا کی یہ شکل کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میں دنیا کو خوبصورت دیکنا چاہتا تھا۔ لیکن انسانوں کی یہی تھا کہ میں اپنی جگہ خاصا طاقتور ہوتے ہوئے بھی دنیا کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کی حالت بھی شاید نہیں بدل سکتا تھا۔ اور اس وقت تو یہی سی میں خود نہایت بے بسی کے عالم میں ایک چھوٹے سے فرعون کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

لیکن اس عالم میں بھی مجھے اپنے انجام کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ میرا تصور اب بھی ان مظلوم "ان دیکھے اور اذیتاں لوگوں کے انجام میں تنگ رہا تھا جو قیصر ملک اور اس کے باپ کے احکامات پر نہ جانے کیا کیا اذیتیں اٹھا کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ کا شاید کوئی تصور کوئی جرم بھی رہا ہو لیکن انصاف اور مزا کے نظام کا کوئی پیمانہ، کوئی اصول، کوئی قاتل قسم طریقہ کوئی سند تو ہونی چاہئے۔

میں نے ایک تک قیصر ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جو کچھ تم بتا رہے ہو اس کی بددستی میں تو اگر تمہارا باپ کسی کے ہاتھوں کسی برے انجام سے دوچار ہو چکا ہے تو یہ بہت ہی اچھا ہوا ہے۔ اب تک تو باپ کے بارے میں تمہاری تشویش اور پریشانی دیکھ کر مجھے کچھ کچھ آسف ہو رہا تھا لیکن اب میں بہت خوش ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی کسی ایسے ہی انجام سے دوچار کرے"

قیصر ملک نے خوش دلی سے بلند آہنگ قہقہہ لگایا "ابھی سے دلی جلی بوڑھیوں کی طرح کونے دیکھتے پڑا کرتے۔ ابھی تو تاشا شروع ہی نہیں ہوا۔"

"میں نے اپنے ہاتھ بندھ کر تین آدمیوں کی نمرت میں تمہارا

نام لکھ لیا ہے۔ زندگی نے ملت دی تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ میرے ہاتھ بندھ کر میں تو میں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں نے اس کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

”زندگی یقیناً تمہیں ملت دے سکتی ہے“ وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے اور اپنے لیے میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”اور میں ایک دوسرے کے انجام کے بارے میں بھی اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ آخر تم اباحی کے بارے میں کچھ بتاؤں نہیں دیتے؟“

اس بار میں نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نے ایک لمبے خاموشی سے انتظار کیا پھر تائبانہ کلیں طور پر ابوس ہو کر وہ یکدم ٹپش میں آگیا۔ گرگٹ کی طرح یک لخت اس کی حرکت بدل گئی۔ چروال بھسوکا ہو گیا اور اس نے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے پھٹی پھٹی سی آواز میں اپنے تو میں کو مخاطب کیا ”بہت ہو چکی رعایت۔ اس کے ہاتھ بھی باندھ دو اور رانگول کے بٹ مارا کر اسے گلے ہوئے خروڑے کی طرح پھٹا کر دو۔“ اس کے آوی بھی ایسے معاملات میں کافی مجھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک دم پیش میں آکر میری طرف نہیں بڑھا بلکہ وہ آوی نہایت مختار انداز میں میری طرف بڑھے۔ بائی چار تو میں نے تحفہ ڈائیوں سے مجھے نشانے پر لئے رکھا۔ اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ وہ دونوں آوی جب میرے ہاتھ پائے کے لئے میرے قریب پہنچیں گے تو میں کوئی آخری واؤ نکھیلنے کی کوشش کروں گا کیونکہ فی الحال یہی غیبت تھا کہ کم از کم میرے ہاتھ تو آزاد تھے۔ ہاتھ دو ہاتھ بندھ جانے کے بعد تو میرے چاؤ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ سرت کی آہٹ تو سنائی دے ہی رہی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ سرت کو دردناک جانے کے بجائے کچھ کر گزرنے کی کوشش کی جاتی۔

میں نے کوشش کی کہ چرسے سے پوری طرح ابوس دل کر فہم نظر آؤں لیکن درحقیقت میں پوری مستحی سے شکر تھا کہ وہ دونوں میرے بالکل قریب پہنچ جائیں۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ انہوں نے اپنی تمہیں منہج کو تھما دی تھیں۔ وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھے کہ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ جوتی میں جیتے کوئی بم پھٹ پڑا تھا۔ بلکہ یہ فٹیسہ کی قوت اب ی نہیں تھی۔ جیتے تباہ ہو چکا تھا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ میری طرف بڑھنے والوں میں سے ایک اونٹ سے منہ گر پڑا۔ جسے دانیس ہاتھ پر گھڑے ہوئے ایک شخص کے ہاتھ سے رانگول چھوٹ کر گر پڑی۔ خود قیصر ملک بوکھا کر کرسی سے تھم گیا گر پڑا۔ جس دیوار کے قریب ہم کھڑے تھے اس میں دروازہ نمودار ہوئی نظر آئی۔ اس کے عقب میں آخری کی اصل غارت میں ہی دھماکا ہوا تھا۔ دودھ فضا میں یکدم باہر اور مٹی کی بو پھیل گئی۔ چھتوں اور دیواروں کے زین بوس ہونے کی گونگناہٹ سنائی دی تھی اور

50/-	قرتسکین	اسلام کے نامور مجاہدین
40/-	قرتسکین	اسلام کی نامور خواتین
75/-	قرتسکین	سومسلمان مشاہیر
35/-	قرتسکین	ملک ملک کی عورتیں

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

اسی کے ساتھ کھٹی کھٹی سی انسانی جینیں بھی سنائی دی تھیں۔ یہ سب کچھ گویا ایک ٹائٹل میں ہو گیا تھا اور اسی ایک ٹائٹل میں میں گویا سب کے رویے کا جائزہ لینے میں ہی خود کو گھمسا گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو قدرت نے مجھے موقع فراہم کیا تھا۔ سب لوگ حواس پاش ہو چکے تھے صرف ایک رانگول ہزار کی رانگول میری طرف اٹھی مٹھی تھی اور اس کی بھی عاتق کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اسکول کے زمانے میں آپ نے شاید اس ملک میں حصہ لیا ہو جس میں دونوں ٹائٹل باندھ دی جاتی ہیں۔ بالکل اسی انداز میں میں نے جست لگا کر رانگول والے کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا۔ وہ اس وقت تک بھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ مجھ پر گولی چلائے یا نہیں جس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑا۔ گھونسا کھاکر وہ اس اچھلا رانگول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ جاموں خانے کے پتے لٹان پر جا کر گرا۔

”اسی لئے قیصر ملک شاید حواس میں آیا اور پھٹی پھٹی آواز میں چلایا ”جانے نہ پائے۔“ پھر اسے زور کی کھانسی آئی۔ اس نے ریور اور نکال کر مجھ پر ناز بھی کیا لیکن شاید بد حواسی میں وہ آسمان نشانے بھی نہیں لے سکا۔ اس کے ساتھ ہی کڑا کا سا ہوا اور برآمدے کی چٹیاں بھی بچھ گئیں۔ شاید آئیں بھی دھماکے سے ٹوٹ کر شارت ہو چکی تھیں۔

اس اندھیرے میں قیصر ملک دیوانوں کی طرح چپخٹے لگا۔ وہ گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ معلوم نہیں مجھے یا اپنے آدمیوں کو۔ فوری طور پر قوی محسوس ہوا تھا کہ کپ اندھڑا چھا گیا ہے لیکن درحقیقت طویل درمیان لان پر آدمیوں کی نہایت قدم دھنشی موجود تھی اور میں کھینکھو کی طرح اچھلتا ہوا آٹھ دیواری کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔

شاید وہ لوگ اپنی قاتل حواس اور انفرقہ کے بارے

خجیت سے تھی یا نہیں اور میرے پکارے جانے کے بعد اس پر کیا گزری تھی۔

جنگل میں داخل ہونے کے بعد میں تاروں کی برائے نام روشنی سے بھی محروم ہو گیا تاہم میری آنکھیں اب بھی کسی نہ کسی حد تک میرا ساتھ دے رہی تھیں اور وہ قدم آگے بڑھتے ہی میں نے دیکھا کہ مجھ سے چند قدم آگے تاریکی میں ایک زیادہ تاریک انسانی ہیرا کرتا ہوا درختوں کے درمیان دوڑا چلا جا رہا ہے۔ شاید وہ کسی اور سمت سے جنگل میں داخل ہوا تھا۔

مزید دو قدم آگے بڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بیولا لہوانی تھا۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ میں اس کے پیچھے آ رہا ہوں۔ بلکہ شاید اسے گرد و پیش کا تقاضا کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے بے حال ہو چکی تھی۔ میں اس سے خاصا پیچھے ہونے کے باوجود دھوکے کی طرح چلتی ہوئی اس کی سانس کی آواز سن رہا تھا۔ میں اس وقت اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھا جب وہ غالباً بالکل ہی بے دم ہو کر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس وقت تک میں نے اسے پہچان لیا تھا اور مجھے حیرت کا شدید جھٹکا تھا۔ پھر وہ کراہی اور اس کی کراہ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میں اسے پہچانتے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ وہ بلاشبہ تاجاں تھی!

لیکن وہ اتنا دل ہیار اور لب گور عورت یہاں قیصر ملک کی حویلی کے قریب دوچار میں کیا کر رہی تھی اور جتنا خیر میں نے اسے دوڑتے ہوئے دیکھا تھا اتنا تیز دوڑنے کی اس میں توانائی کہاں سے آتی تھی؟

اسی لمحے شاید اسے میری موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے بالکل ہی ایک جھج کے ساتھ ہڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

”گھبراؤ مت تاجاں! یہ میں ہوں“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اوہ۔ افضل۔“ وہ ڈونٹے لہجے میں صرف اتنا کہہ سکی اور

بے جان سے انداز میں پائو وار زمین پر دو بار چت ہو گئی۔ میں نے ٹکٹوں کے بل بیٹھ کر اس کا ہاتھ تمام لیا۔ اس کا استخوانی سا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور اڑتے ہوئے برقعے کے پیچھے چھڑاتے ہوئے پروں کی طرح اس کے دل کی دھڑکن اس کے ہر سانس میں سنائی دے رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے گویا ہنسل تمام اپنی سانسوں کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”افضل! تم بالکل ٹھیک ہوتا۔ بالکل ٹھیک۔۔۔؟“

”ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں تاجاں!“ میں نے اس کا سر سلاتے ہوئے کہا۔ اس کے کھڑورے ٹھیک اور اٹھتے ہوئے بالوں میں تنکے جیسے ہوتے تھے۔

”تم زخمی تو نہیں ہوئے نا۔ کوئی جرح تو نہیں آئی جیس؟“ اسے جیسے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اس کے

مجھے پکڑ لینے یا گولی کا نشانہ بنادینے لیکن اسی لمحے ایک اور دھماکی زوردار دھماکا ہوا۔ دونوں دھماکوں کے درمیان میں چار سیکنڈ کا ہی وقفہ رہا ہوگا۔ یہ دھماکا غالباً اس دیوار اور اس سے ملحقہ چیزوں کو بھی لے بیٹھا تھا۔ میں نے عقب میں ملے گرنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کئی چیخیں بھی سنائی دیں۔ شاید وہ بلند دھماکا چلی دروازہ بھی ٹوٹ کر گر گیا تھا جس سے میں نے چند لمحے پہلے لوگوں کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ فضا میں مٹی اور بارود کی بو پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ مجھے بھی کھانسی آنے لگی تھی مگر میں نے اسے دایا اور سانس بھی روک لی۔

میں دیوار تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے مرکز دیکھا۔ ایک لمحے پہلے جہاں میں اور دوسرے کی آوازیں گھڑے تھے وہاں اب لہجے کا خاصا ادنیٰ اور گہرا نظر آ رہا تھا تاہم برقعے کا کچھ حصہ اب بھی سلامت تھا اور اس کے عقب میں حویلی کی اصل غارت گاہ بھی زیادہ تر حصہ محفوظ ہی تھا لیکن درمیان سے میندھ میں ایک پوری پٹی ہی مندم ہو گئی تھی۔ کچھ بولے کرتے پڑتے اور دوسرے بھاگتے دکھائی دے لیکن میری طرف کوئی نہیں آ رہا تھا اس لئے میں نے حتی الامکان بھرتی سے رسی کی گرہ کھول اور رسی کا وہ بڑا سا الجھا ہوا لچھا ایک طرف پھینکا جو ابھی تک میرے ساتھ گھسٹا رہا تھا۔

پاکستان آزاد ہونے ہی میرے جسم میں بجلی سی بھر گئی۔ ساری ٹھکن اور درد مائیدی دور ہو گئی۔ دیوار پر ہاتھ جھاکر میں نے جسم کو کھینچتے ہوئے جیتے کی طرح زبردستی لگا لگا اور دوسرے ہی لمحے میں دیوار پر ہلاک چکا تھا۔ لیکن میں اس حویلی کے گرد میں نے بہت بکر لگائے تھے۔ اس زمانے کی یادیں ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اندازاً اس سمت کا انتخاب کیا پھر میں گاؤں کے مکانات وغیرہ کے قریب سے گزرے بغیر اس کی حدود سے نکل سکا تھا۔

تکلیف اندہ میرے میں کسی سرسختی گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے میں دوڑنا چلا گیا۔ اسی تیزی سے میرا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ کئی بار میں نے مرکز دیکھا لیکن کوئی میرے مقابلے میں نہیں تھا۔ گویا میں واقعی موت کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ تاہم صحیح طور پر محفوظ میں اپنے آپ کو کبھی محسوس کر سکتا تھا جب میں قیصر ملک کے علاقے سے نکل جاتا۔

جلد ہی میں درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچ گیا جو میری سمتوں کی نشان دہی میں سے ایک تھا۔ یہ ایک طرح کا نہایت مختصر سا جنگل تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اب تک قیصر ملک یا اس کے باپ نے یہ مختصر سا جنگل کٹا کر اس کی جگہ کچھ اور نہ بنایا ہو لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ جنگل اسی طرح موجود تھا۔

اب مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ تاجاں کی چھوٹی کس طرف ہوگی۔ جاتے جاتے میں یہ بھی دیکھتا ہوا پاسکا تھا کہ وہ

میں یکدم خاموش ہو گیا۔ اجڑے ہوئے لوگوں کو ماضی کی ذرا بھرتی زیادہ دکھ دیتی ہے۔ میں نے ایک خاص ٹیکنیک سے دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ ٹیکنیک میں نے ایک مشائخ جاپانی فنی سے سیکھی تھی۔ یہ دوڑی سپاہیوں کو کمر پر لا کر دوڑنے کی ٹیکنیک تھی۔ اس میں ذخیوں کو تکلیف کم ہوتی تھی اور خون بھی کم سے کم بہتا تھا۔ مجھے روز بروز زندگی میں جو بھی جمادیدہ آدمی ملتا تھا میں اس سے کہتا تھا کہ یہ کچھ سیکھنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔

”تمہیں کسٹ معلوم ہے؟“ چند لمبے بعد آجیاں نے پوچھا۔ اب اس کا لہجہ قدرے پرسکون تھا۔

”اے۔ اب تو اندازہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
منقرضہ جنگل سے نکلنے کے بعد میں ٹاک کی سیدھ میں ہی چلتا رہا اور آخر کار آجیاں کی چھوٹیڑی تک جا پہنچا۔ چھوٹیڑی میں فطمانی ہوئی لائینیں اب بھی روشن تھیں اور دو واہ اسی طرح چوہت کھلا تھا جس طرح اس وقت تھا جب انورا کسٹے والوں میں ایک فوجوان نے ریلوے کے بل پر مجھے یہاں سے نکالا تھا۔

چھوٹیڑی میں داخل ہو کر میں نے آجیاں کو اس کی چارپائی کے قریب کمرے اتارا۔ وہ اترتے ہی صرف ایک لمبے کے لئے اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی پھر دسم سے چارپائی پر گر گئی اور کمری کمری سانس لینے لگی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

”خمس مجھ کو یوں بیٹھ پر لا دلاتے ہوئے ذرا بھی کراہت محسوس نہیں ہوئی؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ کئی بار اس کے لمبے میں مجھے یہی بے یقینی رہتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ شاید دنا پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ جھوٹی جھوٹی باتوں پر بھی اسے مشکل سے یقین آتا تھا۔

”کراہت کیوں محسوس ہوئی؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔
”مجھے چھوٹ کی بنا رہی ہے نا“ اس نے گویا کس جرم کا اعتراف کیا۔

”اگر تم تیار ہو تو یہ کوئی تمہارا جرم تو نہیں ہے“ میں نے سرسری سے لمبے میں کہا ”اور پھر میرے ذہن نے تو ابھی تک تمہاری اس حالت کو قبول ہی نہیں کیا۔ میں جب بھی تم پر نظر ڈالتا ہوں تو میری چشم تصور مجھے وہی بارہ سال پہلے والی آجیاں دکھاتی ہے۔ لمبی تڑکی حسین تھی۔ دور سے دل چھین لینے والا۔“
”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے ماضی کی آجیاں یاد یاد دلانا“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی ”یہ میرے سوال کا صحیح جواب نہیں ہے۔“

”تمہارے سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں اکثر وہ چیز ایسے لمبے آتے ہی رہتے ہیں جب وہ حقائق کے اصولوں سے بالاتر ہو کر کوئی عمل کرتا ہے۔ جو لوگ دل سے اچھے لگتے ہوں ان کے سامنے لمبی لمبی دھری نہ جاتی ہیں۔“

اسرار میں اس قدر اطمینان تھی ”اس قدر تشویش تھی اور ایک بے عنوان سائنسی خاطر تھا کہ میرے دل کو چسپے کچھ ہونے لگا۔“

”نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا سی بھی چوٹ نہیں آئی تھی۔“ میں نے حلق میں جھپٹتی ہوئی نمی کو نکلتے ہوئے کہا۔

”خدا تیرا شکر ہے۔ میری صحت کام آئی“ اس نے کمری سانس لی اور یکدم جیسے اسے قرار سا آیا۔

”تمہاری صحت؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ ”تو کیا جوابی پر گریز کرتے چکے تھے؟“

”ہاں۔“ اس نے طمانیت بھرے لمبے میں کہا۔
ایک لمبے کے لئے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

آجیاں جھوٹ بولنے والی عورت بھی نہیں تھیں لیکن میری کچھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک راندہ درگاہ مفلوک الحال اور عرصے سے بیمار عورت کے پاس گریز کیاں سے آئے؟ اور ایسی عورت کے پاس گریز کیا کیا کام؟

اس سے پہلے کہ یہ سوال میری زبان پر آتا تھا جاں اپنے ہوئے بولی ”خدا کے لئے اب تم تو بھاگ جاؤ۔ مجھ میں تو اب ایک قدم بھی چلنے کی طاقت نہیں رہی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں خمس یوں جنگل میں بے بارود و گار پڑا چھوڑ جاؤں گا؟“ میں نے حیرت سے کہا ”میں خمس اپنی کمر پر لا کر لے چلوں گا۔“

”کہاں تک؟“ اس نے گویا بے یقینی سے پوچھا۔
”کسی بھی محفوظ جگہ تک“ میں نے جواب دیا۔

”میرے لئے تو میری چھوٹیڑی ہی محفوظ ترین جگہ ہے۔ اس چھوٹیڑی اور اپنے دکن سن کی وجہ سے میں کئی نامانی مصیبتوں سے محفوظ رہی ہوں۔“ وہ کزور سی آواز میں بولی ”تم مجھے بس دیں تک پہنچاؤ اور خود کسی بھی طرف نکل جاؤ۔ تمہارا اس علاقے میں زیادہ دیر رکنا بہت خطرناک ہے۔“

وہ اٹھ بیٹھی۔ میں نے اسے کمر پر لا دیا اور ایک بار پھر دوڑ پڑا۔ وہ محض ایک مثبت استخوان ہی تو نہ تھی۔ میرے لئے اس کا وزن ہی کیا تھا لیکن ابھی میں کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ وہ کراچے ہوئے بولی ”خدا کے لئے آہستہ دوڑو۔“ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میری پڑی پڑی انگ ہو جانے کی۔ تم نے دیکھا نہیں... میں بس ایک کزور سا ڈھانچا ہی تو ہوں۔“

”چھوٹا اب میں رفتار کم کرتا ہوں اور ایک خاص ترکیب سے دوڑتا ہوں۔ اس طرح خمس ذرا بھی جھٹکا نہیں لگے گا۔“ میں نے کہا ”میں بھول گیا تھا کہ میں جس آجیاں کو کمر پر لا کر بھاگ رہا ہوں وہ بارہ سال پہلے والی آجیاں نہیں ہے۔“

”مجھے کبھی غلطی سے اس آجیاں کی یاد بھی مت دلانا۔“ میرے دل سے کہو سا اٹنے لگا ہے ”وہ فوٹے ہوئے لمبے میں بولی... اس لمبے کی میں درد کا سمندر تھا۔“

پاس تو نہیں آئی۔ اس کے بعد کسی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی کاکب فرمائش کرتا۔ اری تاجاں! تیرے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے؟ بڑی بھوک لگی ہے۔ تو میں کہتی ڈرا ٹھہر۔ میں تجھے بپا کر کھلائی ہوں۔ وہ مذاق سمجھتا اور بات مذاق میں ہی آئی گئی ہو جاتی اور اب ایک عرصے سے تو میں انہیں بالکل ہی بھول گئی تھی۔ وہ خاموش ہو کر سانس درست کرنے لگی پھر مکرراتے ہوئے بولی "وہ جو کہتے ہیں تاکہ رکھی ہوئی چیز کبھی نہ کبھی کام ضرور آتی ہے۔۔۔ تو آج مجھے اس بات پر دہرا لیتیں آگیا۔ یہاں سے جب اس نوجوان نے ہسپتال دکھا کر تمہیں باہر نکالا اور تم اسے بے ہوش کر کے بھاگ گئے تو میں بڑی خوش تھی کہ تم نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہو لیکن پھر کچھ دیر بعد ایک آدمی اپنے اس ساتھی کو ڈھونڈنے آیا جسے تم بے ہوش کر کے ڈال گئے تھے۔ میں اس وقت چھپ گئی تھی۔ وہ آدمی پانی کے جھینے وغیرہ دے کر اپنے ساتھی کو ہوش میں لایا اور بڑے سرور سے اسے اسے بتاتے لگا کہ شکار کھیرے میں آ رہا ہے اور خود ہی حویلی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ دونوں بھانجہ بھانجہ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ میں کچھ دیر جھونپڑی کے پیچھے چھپی سوچتی رہی کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ مجھے اپنی بے بسی اور کمزوری پر رونا آ رہا تھا۔ میں کسی قابل بھی تو نہیں تھی لیکن میرے اندر کوئی جذبہ تھا جو مجھے جین سے نہیں بیٹھنے دے رہا تھا۔ پھر مجھے وہ دوسری بات یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ شیش کر دیکھتی ہوں شاید میری کو شیش کسی کام آتی جائے۔ میں دونوں ہم اٹھا کر اندر سے میں گرتی پڑی اپنی اپنی کانپنی ان کے پیچھے پیچھے ہی حویلی پہنچ گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ قیصر ملک کے حکم پر ہی ہو رہا ہو گا۔ وہ اور اس کا باپ ہی ایسی کاہلیاں کراتے رہتے ہیں۔ میں جب حویلی کے سامنے پہنچی تو بہت سے آدمی جھیس رہے۔ وہ سب باندھ کر کندھوں پر لاد کر اندر لے جا رہے تھے۔ بہت دیر تک تو میں درختوں کے پیچھے چھپی دہشت زدہ سی کھڑی رہی۔ وہ منظر بہت ہی خوفزدہ سا کر دینے والا تھا۔۔۔ رات کے اندر میرے میں اتنے بہت سے سرج آدمی ایک فحش کو رہیں سے باندھ کر اس کے منہ پر بوری پڑھا کر لے جا رہے ہوں۔ یہ منظر مجھے جیسی کمزور عورت کو دہشت زدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ سب لوگ اندر چلے گئے۔ بڑا سا دروازہ بند ہو گیا اور بے حد مہیب سا سکوت چھا گیا۔۔۔ باہر بس دو کاریں اور ایک ٹرک کھڑا تھا۔ ان میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر میں ہم جھیلوں کی تونہ جانے اس سے کتنی تباہی پھیلے اور پھر تم بھی تو اندر ہی تھے۔ ظاہر ہے ہم یہ تو میں دیکھ سکتا تھا کہ کس کو نقصان پہنچا ہے اور کس کو محفوظ رکھا ہے۔ میں نے دعا کی کہ اگر ہم واقعی پھٹ جائے تو کچھ اس طرح تباہی پھیلے کہ ہمیں نکل بھاگنے کا موقع مل جائے۔

"تمہاری دعا قبول ہوگئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے میرے لئے زندگی داؤ پر لگائی۔ میں تم سے کہن کتا؟ مجھے ہزار سوال بالکل اچھا نہیں لگا۔

"میری زندگی کا کیا ہے۔ یہ بے وقت اور بے مصرف زندگی ہے۔ کچھ بیکاری سانسوں کا مجموعہ جو موت کے انتظار میں فرج ہو رہی ہیں۔ یہ زندگی کوڑے کے ڈھیر پر پڑے ہوئے روٹی کے باقی کھڑے کی طرح ہے جسے کتے سونگھ کر چھوڑتا ہے۔ اس کے الفاظ ڈھیر تلے پڑے تھے مگر اس کے لیے میں ڈبر نہیں تھا۔ مجھے لوٹے انسانوں کے لیے میں ڈبر نہیں ہوتا۔" ایک عرصے سے لوگ میرے قریب آتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

"ایک وقت آئے گا کہ لوگ پھر تمہارے قریب آنے کو تمہیں گے" میں نے وقتوں سے کہا۔

"بس اب تم جاؤ" اچانک وہ جھجھکی سی لے کر بولی "تم انسان کو باتوں میں بہت بری طرح الجھا لیتے ہو۔ خوبصورت خواب دیکھنے لگتے ہیں لوگ۔ لیکن یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ جلد از جلد یہاں سے دور نکل جاؤ۔"

"جانتا تو مجھے ہے ہی لیکن میں سوالوں کی بجائے ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتا۔ جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں خود ہی سی دیو اور کسی" میں نے بے پروائی سے کہا "یہ بتاؤ تمہارے پاس کرنیڈ کلس سے آئے تھے؟"

وہ جیسے کچھ یاد کر کے عجیب سے انداز میں انہی "ایک بار ایک گھبرا ہوا سا کاکب آیا تھا میرے پاس۔" اس نے سچے سچے مسکرتی ہوئے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر سگٹ سگٹا کی اور کینڈ دھواں نکلتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا "بہت پریشان تھا۔۔۔ کہنے لگا میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے، مجھے ایک رات کے لئے چھپاؤ بہت پیسے دوں گا۔ مجھے تو عرصے سے کسی بات کی پروا ہی نہیں رہی۔ بیسیوں کی ضرورت لب کر انسان کو بھی برائی ہے۔ بیسیوں کے بغیر تو انسان کو کتنی دفن بھی نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے اسے ٹھہرا لیا۔ رات کو اس نے اپنے پیگ سے دو انسان اس سے لٹائے اور کہنے لگا 'انہیں کہیں چھپا دو۔ میرے پاس بھلا چھپانے کے لئے کوئی تجویزیاں رکھی تھیں۔ میں نے انہیں پتیل کی اس دیگی میں ڈال دیا۔' اس نے کارنس پر رکھی ہوئی بڑی کلاہ کی طرف اشارہ کیا۔

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی "چا نہیں کون تھا اور کیا پکڑ تھا اس کے ساتھ۔ لیکن تھا سچا آدمی، ہم ازم میرے ساتھ اس نے لکھی محبت نہیں بولا۔ آتے ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ پھر میں نے پوچھا یہ انسان سے کیا ہیں تو اس نے صاف بتا دیا کہ ہم ہیں۔ میں نے یو جی پوچھا کہ کیسے چلے ہیں تو اس نے وہ بھی سمجھا دیا کہ کیسے ہیں لٹائے ہیں اور کیسے بیٹھتے ہیں۔ پھر میں انہیں دیگی میں رکھ کر بھول گئی۔ وہ بھی کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ پولیس بھی اس کے تعاقب میں کم از کم میرے

سربار کر کے کچھ حاصل ملے کرنے کے بعد میں چھٹی سڑک پر پہنچ سکا تھا لیکن ایک چیز مجھے پریشان کر رہی تھی کہ اس سڑک پر بسوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ کھٹے دو گھنٹے بعد کوئی بس آتی تھی اور اتنی دیر میں اس کے انتظار میں کھڑے ہونا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ سڑک تقریباً تین میل آگے جا کر پہلی سڑک سے ملتی تھی جس پر سیا گلوٹ اور لٹا ہوا وغیرہ جالے والی بسوں اور دیگر گاڑیوں کی کافی آمد و رفت رہتی تھی۔ اگر میں وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر مجھے سواری کے لئے انتظار قطعاً نہ کرنا پڑتا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مجھ میں اب تین میل مزید دوڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی اور سب سے زیادہ ترس سے چٹائی تھی خطرے کو دعوت دینے والی بات تھی۔

اسی اوجڑ میں میں سر حال میں چھٹی سڑک پر پہنچ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور صبح کی تازہ اور فرحت بخش ہوا میں سانس درست کرنے لگا۔ اب تک اعصاب پر اتنا بوجھ بڑھا تھا اور اس تیزی و تندی سے ہر چیز کا مقابلہ کرنا پڑا تھا کہ اب ذرا آرام سے فرحت بخش ہوا میں کھڑا ہوا تو کیا یکدم سارا تازہ اور پرجان تازگی رخصت ہو گئی اور ذہن پر غم کی کا سا حملہ ہونے لگا۔ ہر گز بھی بڑے زور کی لگ رہی تھی۔ سب کر دینے والے کئی عمارت ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے۔

میں نے سر جھک کر اپنے آپ کو مستعد اور چمکا رکھنے کی کوشش کی اور اسی لمحے میری نظر دور سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار پر پڑی۔ صبح صادق کے سرمئی اجالے میں وہ دھیرے دھیرے سب سے انداز میں پیدل مارا آ رہا تھا۔ میرا سب سے پہلا ہوا ذہن دوبارہ کچھ مستعد ہو گیا۔ پیدل چلنے سے تو سائیکل پر بھی قیمت تھی۔

سائیکل سوار میرے گاؤں کی طرف نہیں مڑا بلکہ سیدھا جاتا آ رہا۔ شاید وہ بڑی سڑک کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اب میں صاف طور پر اسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک عام سا ڈھلا ڈھلا اور منلوک الجال و برساتی تھا۔ ٹھنڈوں سے ذرا نیچے دعویٰ لٹا سا ڈھلا ڈھلا کرتا، سر پر مختصر سی پگڑی اور کندھے پر دو بال۔ انجانے نظرات میں کچھ کمپن پیدل کی حرکت کے ساتھ اوپر اوپر اٹھ رہا اور میرے خاصا قریب آ کر پہنچا تب اچانک ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ یوں پوچھا کہ سائیکل سے گرتے گرتے پہنچا ہے اس نے کیا کرکے کو ذہنی پر پتھرتے دیکھ لیا ہو۔

میں نے اسے رکنے کے لئے ہاتھ دیا تو وہ بریک لگاتے بغیر ہی سائیکل سے اتر پڑا اور کچھ دور تک سائیکل کے ساتھ ہی دوڑتا رہا۔ اگر میں ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو وہ یقیناً سائیکل میں سے اٹھوں میں گھسیڑتا۔ سائیکل کو قریب سے دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ ذہن اب بھی اس سائیکل کے انچ بھر جاملے ہی معلوم ہوتے تھے لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ زندگی میں ایک بار پہلے

”ہاں۔ ایک نئے سرے سے اللہ تعالیٰ سے امید ہی بدلہ مٹی ہے کہ وہ گناہ گاروں کی بھی شفا ہے۔“ اس نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے طویل سانس لی ”بس میں نے بونہی آنکھیں بند کر کے پن نکال کے... ہم پریک تو رہا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی مجھے کا اور جب وہ پست کیا اور میں نے حویلی کے دروازے پر منہم ہوتے دیکھے تو ایک لمحے کے لئے تو پہلے سے بھی زیادہ وحشت زدہ ہو گئی۔ دھماکے سے میں گر پڑی تھی۔ پھر میں نے سوچا ہو گا سوچا کیا جائے گا۔ تمہارے حق میں اچھا ہوا برا میں نے اس کی پروا کئے بغیر دو سراسیمہ پریک دیا۔ اور اس بار تو مجھے اتنا زور لگا پڑا کہ مجھے کچھ میرا بازو ہی کندھے سے الگ ہو کر دور جا رہا ہے لیکن بس کسی نہ کسی طرح میں نے فوراً ہی واپس کے لئے دوڑنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں کونسا جذبہ کوئی طاقت تھی جس نے مجھ سے اتنا مشکل کام کرا دیا۔“

”یہ طاقت شاید ایک بے نام تعلقی خاطر کی تھی“ میں نے دھجے لیے میں کہا۔

وہ نہ جانے کس تصور سے خوفزدہ ہو کر جھرمجھری سی لے کر بولی ”بس اب تم جاؤ۔ بہت باتیں ہو چکیں۔ سب کچھ معلوم ہو گیا نہیں۔ گاؤں میں تو پٹیل جی چکی ہوگی۔ معلوم نہیں کون کون مرا ہو گا دھماکے میں۔“

”یہ تو میں بھی نہیں دیکھ سکا۔“ میں نے کہا ”اور ہاں میرا جیسے چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ کس تم پر کوئی بات نہ آجائے تم کسی کے غیظ و غضب کا نشانہ نہ بن جاؤ۔“

”میں اتنی کمزور اتنی مسکین اور اتنی بے ضرر نظر آتی ہوں کہ میری طرف کوئی زیادہ دھیان نہیں دیتا۔ ابھی مجھ جیسی چیونٹی کو چکنا پند نہیں کرتے۔ اسی لئے کبھی کبھی اپنی بے وقعتی مجھے ناکہ مند محسوس ہونے لگتی ہے۔ تم بالکل بے فکر ہو کر جاؤ۔ صرف اپنی جان کی فکر کرو۔“ اس کا لہجہ ان بے غرض اور جاں نثار دوستوں کا سا تھا جو صرف خوش نصیبوں کو ہی میرے آتے ہیں۔

”میں جلد از جلد یا تو خود تمہیں لینے آؤں گا یا میرا کوئی آدمی آئے گا۔ تم بلا جھجک اور بلا تاخیر اس کے ساتھ چلی آؤ۔“ میں نے دو دواڑے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے بلایا تو میں ضرور آؤں گی۔“ اس کی دھندلی آنکھوں میں مشکوک سی مسرت کی کرن لہرائی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ میں واقعی اسے بلاؤں گا۔

جھوپڑی سے نکل کر میں نے سر کی پلایا کی طرف دوڑنا لگا دی۔ اس وقت سویدہ محرم حور دار ہو چلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت گاؤں کے لوگ یا تو قیصر ملک کی حویلی کی طرف جا رہے ہوں گے یا پھر کچھ توں کی طرف۔ قیمت یہ تھا کہ دونوں کے راستے اس طرف سے نہیں تھے۔

کدھر گیا ہے۔ سائیکل والا بے معنی سے انداز میں 'اے۔ ہو' کر کے رہ گیا۔

مزید تھوڑی دور جانے کے بعد کموں کے گھنے لے ہم کو اوارس کما اور اتحاد و اتفاق کی تمام روایتوں کو توڑتے ہوئے ایک ایک گنا الگ الگ ہو کر سڑک پر بکھر گیا۔ میں نے سڑک صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور سائیکل کی رفتار میں کئی فرق نہ آنے دیا۔

دوسری دروازہ پر سے انداز میں چلایا "بھائی! میرے گئے۔" "چھوڑو! کموں کو۔" میں نے یہ آواز بلند کہا "تم گندہ پریوں کی پوری ریزمی خرید لیتا۔ بلکہ جاہر تو جمنی کی پوری خرید لیتا۔"

اسی لمحے ہوا کی تیزی کی وجہ سے اس کی مختصر اور ڈھلی ڈھالی گیزی اڑی اور وہ یکدم اسے پکڑنے کی کوشش میں گرے کرتے بنا۔ میں نے اس کے دائیں بائیں اپنے بازوؤں کا قلعہ کچھ ٹھک کرتے ہوئے کہا "آرام سے بیٹھو یا! اگر تم ڈنڈے سے بھل پڑے تو مجھے بھی مرواؤ گے۔"

"اگر تم۔ اتنی تیز چلاؤ گے۔ تو ہم ویسے بھی ضرور مارے جائیں گے۔" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا "خدا کے لئے آہستہ چلاؤ۔ مجھے چوٹ لگ رہی ہے۔"

"آوی کے دل پر چوٹ نہیں لگتی چاہئے۔ باقی سب چوٹوں کا علاج ہو جاتا ہے۔" میں نے گویا اسے تسلی دی اور سائیکل کی وہی رفتار برقرار رکھی۔ میں سائیکل سے موٹر سائیکل کا کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں تو۔" ہمیں سائیکل پر۔ بھٹا کر بچتا ہوں "وہ شخص کے بغیر نہ رہا۔"

"لیکن جب میں تمہاری سائیکل سے اتاروں گا تو تمہارے سارے بچھتاوے دور ہو جائیں گے۔" میں نے ایک بار پھر اس کا دل بڑھانے کی کوشش کی۔

آخر کار وہ مقام نظر آ گیا جہاں یہ جھوٹی سڑک بڑی سڑک سے مل رہی تھی لیکن اس سے راہ بے راہی اس وقت وہ حق نظر نہیں آ رہی تھی۔ صبح کے آثار کچھ اور واضح ہو چکے تھے۔ میں نے سے راہ سے کچھ پہلے ہی سائیکل بھد کو شش دو گئی۔ بعد کوشش اس لئے کہ اس میں دیگر کئی چیزوں کی طرح ہریک بھی گئے گزرے ہی تھے اور جس رفتار پر میں نے انہیں استعمال کیا اس کے بعد تو وہ شاید آئندہ استعمال کے قابل ہی نہیں رہے ہوں گے۔

سائیکل سے اترنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ شخص دو دینے کے قریب تھا۔ اس میں یقیناً اتنی صحت بھی نہیں تھی کہ اپنے نقصان پر وہ میرا گریبان ہی پکڑ لیتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی اور میری صحت میں ذہن آسمان کا فرق تھا اور

میں ایسی ہی ایک کھٹارا سائیکل صحت اہم موقع پر میرے کام آتی ہے۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی؟" میں نے اس کو سارا دے کر ہٹائے ہوئے ملاحت سے پوچھا۔

"وہ۔" شکر گڑھ موڑ تک۔ "اس نے سنبھل کر اپنی بات برقرار دے رہے ہیں۔"

"اگر تم مجھے بھی ساتھ بھٹا کر وہاں تک لے جاؤ تو تمہاری صحت ہی مرنے والی ہوگی۔" میں نے درخواست کی لیکن مجھے خیال

نہ تھا کہ وہ بے چارہ خاصا ناواقف سا آدمی تھا۔ وہ تو کبھی لاریسٹوں کی سی رفتار سے آ رہا تھا۔ مجھے بھٹا کر تو شاید پھل کو حرکت دینا

نہ اس کے بس میں نہ رہے اس لئے میں نے جلدی سے کہا "بلکہ خالق کا قضا تو یہ ہے کہ تم آرام سے آگے بیٹھو میں چلا تا ہوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی بھائی صاحب۔" اس نے کچھ اس براؤ سے کہا گویا میں نے بہت اصرار کیا ہو اور وہ میرے اصرار

کے سامنے بیٹھ کر ہو گیا ہو۔ شاید وہ خود بھی تھکا ہوا تھا۔ اس کی سائیکل پر بیٹھے دو دھ کا ایک دور میں نے سارے کا ڈرم لٹکا ہوا تھا اور

کیچڑ گھون کا خاصا بڑا ٹھکانہ لٹکا ہوا تھا۔

میں نے سائیکل سنبھالی تو وہ اچک کر آگے بیٹھ گیا اور फिर

وادی طور پر اس نے سکون کی سانس لی۔ دل ہی دل میں وہ یقیناً

ڈنڈی تھا کہ اسے سائیکل چلانے سے نجات مل گئی تھی۔

لیکن جب کچھ دور تک آرام سے چلانے کے بعد میں نے

اپنی مرضی کے مطابق سائیکل رفتار بڑھانے شروع کی تو اس کے

دل میں آواز شروع ہوئی۔ میری کوشش تھی کہ میری پکی کچی تمام

زنگھالی میری ٹانگوں میں سٹ جائے۔ ذرا سی دیر میں وہ کھٹارا

سائیکل ہوا سے ہاتھیں کرنے لگی تو اس کا مالک بے چارہ میری طرح

لٹکا گیا۔

سائیکل بھی شاید اپنی تیاری کے دن سے لے کر آج تک

اور رفتار سے نہیں چلی تھی اور اب اس عالم مصیبت میں بیکہ اس

کے تمام اعصاب اور اجزائے ترکیبی کھڑکھڑانے لگے تھے اسے

اور رفتار سے چلنے کی بالکل ہی طاقت نہیں رہی ہوگی چنانچہ اس

ایک تھوڑی دیر کی طاقت سے آواز داری کر رہا تھا وہ کہنے کو ایک

انگل تھی مگر شوق تقریباً ایک ٹرین جتنا جارہی تھی۔

پچھلے کچھ بڑے دو دھ کا ڈرم میری طرح کھڑکھڑا رہا تھا۔ کموں کا

ڈرم اور دھڑک رہا تھا۔ سائیکل کا الگ الگ اپنی جگہ ہر جگہ

ڈنڈے پر اچھل رہا تھا اور گرا رہا تھا۔ ایک بار دو دھ کے ڈرم

ناکڑ کھڑا ہٹ رہی تو وہ چلایا "بھائی! آئیے ڈرم گرجاؤ گے۔"

تو پروا نہ کر۔ تم دو دھ کا ڈرم لے لیتا۔" میں نے چلا کر

سے لکڑی "بلکہ ایسے چار ڈرم لے لیتا۔"

اسی لمحے ڈرم کی پکڑ کے کچھ میں سے ٹکڑا اور لٹکا ہوا کہیں

لٹکا گیا۔ میں یہ دیکھنے کے لئے رکتے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ وہ

دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا گریبان پہلے ہی پھٹ چکا تھا۔ قبض کے دو تین بالائی بٹن بھی غائب تھے۔ کوٹ کی آستینیں کندھوں پر سے تقریباً پانچھوٹی ہو چکی تھیں۔ ہر چیز مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ سائیکل والا حسرت بھری نظر سے پیچھے اسی طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ میرے جانے کے بعد وہ غالباً اس راہ پر واپس جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس کا کھرا ہوا اعلائیہ اس کی کچھ باقیات دستیاب ہو سکیں تو سمیٹ کر لائے۔

میرا پہلے ہی ارادہ تھا کہ اس کے نقصان کی تلافی کی ضرورت کو محسوس کروں گا۔ میں نے جب میں ہاتھ ڈالا لیکن جب کسی آجڑے ہوئے مکان کی طرح سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس میں تو چھٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ میرا پر س نہ جانے کب اور کہاں کر چکا تھا۔ ظاہر ہے اسے گرنای تھا۔ جن مراحل سے میں گزر چکا تھا ان میں تو یہی غنیمت تھا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ علیحدہ ہو کر کہیں نہیں گر گیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو میں ہاتھ جب سے نکال ہی نہ سکا، شرمندہ سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا جبکہ سائیکل والا برا سامنے بنائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے دلی دلی میں یہ شکر ادا کرتے ہوئے جب سے ہاتھ نکال لیا کہ میں اپنے برس میں رقم کے علاوہ کوئی اہم چیز نہیں رکھتا تھا۔ سائیکل والے نے میرا ہاتھ جب سے خالی باہر آتے دیکھا تو اس کے چہرے پر قدرے مایوسی جھلک آئی۔

دفعتاً میری نظر اپنی کلائی کی گھڑی اور میرے کی انگوٹھی پر پڑی۔ گھڑی کو دیکھ کر تو مجھے بے جا طور پر حیرت ہوئی۔ معلوم نہیں عکس طرح وہ میری کلائی سے لپٹی رہ گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا ہجڑہ ہی تھا۔ اس کی جین سوئے کی تھی۔ انگوٹھی میں چھوٹا سا ہیرا لگا ہوا تھا اس لئے وہ بھی خاصی پیش قیمت تھی۔

میں نے انگوٹھی نکال کر سائیکل والے کی طرف پڑھاتے ہوئے کہا "لویار! اسے بچ کر اپنا نقصان پورا کر لیتا۔" خالص سوئے کی ہے اور اس میں ہیرا لگا ہوا ہے۔"

اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں انگوٹھی لے لی اور پھر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ پہلے تو شاید اسے یہ یقین نہیں آیا تھا کہ میں میرے کی انگوٹھی کا مالک ہو سکتا ہوں تاہم میرا سر ہٹا جائزہ لینے کے بعد غالباً اس نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا لیکن اب شاید اسے اس بارے میں شک پیدا ہو گیا تھا کہ میں انگوٹھی واقعی اسے دے رہا ہوں۔

"کیا واقعی یہ میں لے لوں؟" اس نے تصدیق چاہی۔ اس کی آواز میں بالکل ہی لرزش آگئی تھی اور وہ انگوٹھی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے جا رہا تھا۔

"ہاں ہاں واقعی تم لے لو۔ تم نے مجھ پر احسان کیا اور میں نے انا تمہارا نقصان کیا۔ میرے پاس نقد تو گھڑی میں ہے۔"

نہیں۔ اس لئے یہ ایک حیرتی چیز تمہارا خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ تمہارا نقصان پورا ہو سکے اور میں بھی اپنی نقصان میں سرخرو ہو سکوں۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔ ساتھ ہی میں ہڈی سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن ابھی کسی بس کی آمد کے ہمارے نہیں تھے۔

اس شخص کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے خوشی کی چمک ابھری لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ مایوسی کے اندر مرسے نے لے لی۔ وہ انگوٹھی واپس میری طرف پڑھاتے ہوئے بولا "اگر واقعی اصلی ہے تو میں نہیں لے سکتا۔ میں اگر اسے بیچے کیا تو پولیس مجھے پکڑے گی کہ میرے پاس اتنی قیمتی چیز کہاں سے آئی؟"

وہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نکتے کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ غریب آدمی تو بے چارہ کسی سے غیر متوقع انجام بھی نہیں لے سکتا۔ میں نے اس کا کندھا جھٹکتے ہوئے کہا۔ "تم کو تو لو۔ جب بھی حالات مناسب نظر آئیں یا بغیر کسی خطرے کے اسے فروخت کرنے کا موقع میرے آئے تو کر دو۔ اب اور کیا کیا جاسکتا ہے؟" میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔

اس شخص نے قدرے تذبذب کے ساتھ عالم میں انگوٹھی جب میں رکھی۔ اسی اثنا میں مجھے سڑک پر بس آتی دیکھ لی۔ وہی اچانک مجھے خیال آیا کہ کرائے کے لئے بھی تو پیسے درکار ہوں گے۔ اب میں کندھ کھڑے تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ بھائی میں ذرا گھٹا کر

طنز و مزاح

100/-	اگر کھٹے ہیں	اعتبار ساجد
80/-	غالب کی آبرو	اعتبار ساجد
80/-	ایمر جنسی وارڈ	اعتبار ساجد
75/-	منہ شکافیاں	اعتبار ساجد
75/-	جائیل اسے مار	اعتبار ساجد
80/-	اس طرح تو ہوتا ہے	اعتبار ساجد
100/-	غالب ہمیں بھی چھیڑ	اعتبار ساجد

ہو گئے، ہم کندہ کفر بھی کھار مڑ کر میری طرف دیکھ لیتا تھا لیکن یہ مجھے یقین تھا کہ اس نے ڈرائیور کو میرے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس شخص کا بے حد شکر گزار تھا۔ بات بظاہر کچھ بھی نہیں تھی لیکن درحقیقت اس شخص نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کیا تھا۔ حالات کا کچھ پتا نہیں ہوا۔ بعض اوقات صرف پانچ دس روپے کی وجہ سے انسان سختی مشکل میں پھنس جاتا ہے، اس کا صحیح معنوں میں اندازہ مجھے آج ہوا تھا۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ کندہ کفر ڈرائیور کو مار بیٹھ کر یا کسی اور طریقے سے مجبور کر سکا کہ وہ مجھے بس میں سڑکرنے دیتے۔ اور اس سڑک سے بس کے علاوہ کوئی اور سوا میری آتی مشکل تھی۔

سفر بخیر و عافیت ہی گزر گیا۔ دن چڑھنے تک تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ بس گویا سڑک کے کنارے نظر آنے والے ہر درخت اور ہر جھاڑی کے پاس رکتی ہوئی جاری تھی کیونکہ ہر درخت اور جھاڑی کے پاس کوئی نہ کوئی مسافر ٹھہری، پوٹلی یا ٹرک اٹھائے کھڑا ہوا تھا۔ یہ لوگوں کے اپنے ہی مقرر کردہ بس اسٹاپ تھے۔ دس بجے تک تو یہ عالم ہو گیا کہ بس تو مجھے کہیں ٹھہری نہیں آ رہی تھی، 'دائیں بائیں اور نیچے بس مسافری مسافر تھے۔ میں کوئی کے پاس بیٹھا تھا لیکن کفر کی سے باہر دیکھنے سے ہمارا۔

میں اس وقت اپنے آپ کو دوسرے بہت سے تیزروں کے انبار تلے دبا ہوا ایک تیزرو محسوس کر رہا تھا۔ موسم ملائکہ سردیوں ہی کا تھا لیکن بس کے اندر موسم تبدیل ہو چکا تھا۔ یہاں تو ابھی خاصی گرمیاں آگئی تھیں۔ اندر کو کھول دھرنے کی جگہ نہیں رہی تھی لیکن بس ڈانگائی، ڈولتی اب بھی جگہ جگہ رکتی جا رہی تھی اور ہر جگہ کندہ کفر کی آواز لگا رہا تھا۔ اندر لے گاڈ پاء کی۔ بڑی جگہ اسے بدل اچ جگہ ہونی چاہی اے۔"

میں اسے دیکھ نہیں پایا تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اب بھی مزید مسافروں کو اندر ٹھہرنے جا رہا تھا اور اپنے اس کمال کے لئے وہ بلاشبہ کسی نہ کسی ایوانہ کا مستحق تھا ورنہ میں تو بس سوچ کر رہتا تھا کہ جو مسافر اب تک اندر ٹھہرنے جا چکے ہیں انہیں مجھے باہر نکالا جائے گا، چہ جائیکہ اس میں مزید مسافر ٹھہرتا۔

بس کے اندر کی محنت اور مختلف لوگوں کے پیسے کی ہلک سے میرا دل خراب ہونے لگا۔ اوپر سے میں بہت تنگ کی جگہ میں پھنسا بیٹھا تھا۔ دو سیٹوں کے درمیان جگہ اتنی کم تھی کہ مجھ جیسے لمبے ترنگے آدمی کے لئے تو اس جگہ میں اپنی ٹانگیں "ڈٹ" کرنا ہی ایک مسئلہ تھا۔ مزید یہ کہ آٹے تریتے کھڑے ہوئے لوگ ہر طرف سے مجھ پر بچکے ہوئے تھے۔ ایک بار تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس سے تو بہتر تھا میں پیدل لاہور کی طرف سفر شروع کر دیتا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ شاید میری آرام دہ زندگی

اور ایک عرصے سے میرے ارد گرد پھیلی ہوئی آسائشوں نے مجھ پر اثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ورنہ ایک عام انسان کی زندگی تو کیا ہے۔ ہمارے ہاں کم از کم ستر فیصد لوگ تو انہی تمام سامان اور انہی تمام معمولات کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اور میں چاہتا تھا کہ میں ان تمام چیزوں سے مانوس رہوں۔ خواہ میں کتنا ہی مزید دولت مند ہو جاؤں لیکن ایک عام آدمی کی زندگی گزارنا میرے لئے کبھی بھی مسئلہ نہ ہے۔ اب بھی روزِ موت کی قلق و درخشاں اور مختلف فنونِ حرب کی مشق کی بدولت میرا جسم تو تمام شخصیات، صورتیں اور سختیاں برداشت کرنے کا عادی تھا لیکن مزاج میں شاید کہیں قویٰ بہت نزاکت آگئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اب اس طرف سے بھی خبردار رہوں گا اور مزاج میں اس نزاکت کو جڑ نہیں پکڑنے دوں گا۔

اس عزم کے ساتھ ہی میری طبیعت سے ناگوار ہی ختم ہوئی اور میں نے اپنے آپ کو اس ماحول کا ایک حصہ محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے ایک اور مسئلے نے ستانا شروع کر دیا۔ جھوک پاس بڑی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ میں اچھا تھا کہ خوش خوراک آدمی تھا اور خاصا طویل وقت میں نے کڑی مشقت اور دوڑ بھاگ میں گزار دیا تھا۔ اس دوران ایک تھکیل بھی اذکر منہ میں نہیں گئی تھی اور ایک ہونہ پانی بھی نہیں پیا تھا۔ اب حالات کا تاؤ کچھ کم ہوا تھا تو معدے و دفیوے بھی بڑی شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا بلکہ اب تو کما معدے میں ٹیسی سی اٹھ رہی تھیں۔

راستے میں زیادہ تر اسٹاپ قیصے و سوات کے تھے۔ بس جہاں بھی رکتی یا بہت سے لہجہ افوں اور بچوں کی بھات بھات کی آواز یا سنائی دیتی تھیں۔ میں بمشکل انسانی بازوؤں و گردنوں اور کپڑوں کے درمیان کوئی جسمی ہی پا کر کھڑکی سے باہر دیکھتا۔ مختلف عروں کے لڑکے مختلف چیزیں فروخت کرنے کی کوشش میں دیوانہ وادیوں کے گرد چکر لگاتے نظر آتے۔ کوئی قاتل میں بکڑے جھانے ہوئے تھا اور کوئی کینو، مالے اٹھائے ہوئے تھا۔ کسی نے کندہ کفر کی تحلیاں اٹکیوں میں پھنسا رکھی ہوئی تھیں تو کسی نے دھل موٹھ اور سوکھ چلی کی۔ کوئی قلیوں کا تھراس اٹھائے یا بھاگا پھر رہا تھا اور نمونے کے طور پر دو قلیاں ہوا میں لڑا رہا تھا۔ بکڑوں پر خواہ کتنی ہی دھمکی ہوئی تھی اور دال موٹھ خواہ کتنی ہی باہمی تھی، سوکھ پھل یا خواہ کتنی ہی ناقص تھیں اور قلیوں پر چاہے کتنی ہی کھیاں تھیں ساری تھیں مگر اس وقت چہ چیزیں تھیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ بھی طرح کھڑکی سے باز نکال کر کچھ نہ کچھ چیزیں تو چھین ہی لوں کیونکہ میں خیر تو سکتا نہیں تھا، بسبب میں پھولی کوڑی نہیں تھی۔ مگر اس خواہش کی تمام تر شدت کے باوجود میں مضبوطی سے بندھے کے اور اپنے آپ کو سیکڑے سے اپنے اسی طرح بے حس و درک

سے پرس نکال کر اس نے سوسو کے پانچ کرارے نوٹ گنے اور واپس بس کی طرف بڑھ گیا۔ میں ایک بس کی آڑ میں ہو گیا تاکہ کنڈیکٹر نہ دیکھے۔

چند لمبے بعد شیر شیخ لوٹ آیا اور سرسری سے لمحے میں بولا۔ ”وہ لے نہیں رہا تھا۔ کہہ رہا تھا“ میں نے کسی صلے کے لالچ میں احسان نہیں کیا، میں پہچان گیا تھا کہ وہ کوئی شریف اور بڑا آدمی ہے، آخر ہم بھی دوڑ بڑاڑوں آدمیوں کی شکل دیکھتے ہیں، آدمی آدمی کو پہچانتے ہیں لیکن میں نے ایسا کسی بدلے کے لالچ میں نہیں کیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بڑی باتیں کر رہا تھا لیکن میں ہر حال پیسے اسے دے آیا۔“

گڈ“ میں نے ایک بے عنوان سا اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر شیر شیخ کے ساتھ چل دیا۔ چند قدم دور سڑک کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں شیر کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مولاناؒ انداز میں اس خوبصورت، چھپائی گاڑی کا ردائو میرے لئے کھولا اور میں اپنے جسم پر جمو لئے ہوئے چھتروں اور خاک میں لتھڑے ہوئے سراپے کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔

گاڑی سڑک پر آگئی تو میں نے بظاہر سرسری سے لمحے میں پوچھا ”یہ کیا قصہ ہے بھئی؟ تم یہاں کیسے موجود ہو؟“

”ہم سب لوگ آپ کی تلاش کے سلسلے میں حرکت میں آچکے تھے سرا!“ اس نے پرسکون لمحے میں جواب دیا ”یہ ایک اتفاق تھا کہ فنی نے شاہ بازار کی ایک گلی میں آپ کی کار بھٹی کھڑی دیکھ لی۔ آپ کو غالباً کار درہاں چھوڑے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ آثار ہمارے تھے کہ وہاں کچھ دیر پہلے کچھ بنگلہ ہوا ہے۔ پولیس ابھی نہیں پہنچی تھی۔ فنی کو یہ اندازہ لگنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ آپ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ وہ فوری طور پر آپ کی گاڑی وہاں سے نکال لایا۔ اس کے بعد ہم نے آپ کی تلاش شروع کی۔ آپ کی سیکرٹری کیسٹرون کو ہم نے رات گئے اس کے گھر فون کر کے بنگالہ۔ اس سے پتا چلا کہ گزشتہ دو روز آپ کا آخری پرگرام ایک ڈنر میں شرکت کرنا تھا۔ فوراً ہی یہ بھی تصدیق ہو گئی کہ آپ نے ڈنر میں شرکت کی تھی اور رات گئے ہوئی سے اگلے تھے اس کے بعد سے آپ کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں نے فوراً تمام کارکنوں کو الٹ کر دیا۔ ہم شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں اور ریلوے اسٹیشن پر تعینات گئے۔ ضیف خان اور سردار علی نے تو فوراً اردو آدمی ساتھ لے کر فوری طور پر اپنے آپ کو خفیہ پولیس کے آدمی قرار دے دیا اور بمیٹی نوڈ اور ناہور شیوہ نوڈ پر عام کادل میں بھی جھانک کر دیکھنا شروع کر دیا لیکن آپ کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ہمیں امید بھی کم ہی تھی۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ آپ شہر میں ہی ہیں یا پھر ہمارے حرکت میں آنے سے پہلے ہی شہر سے باہر لے جائے جا چکے ہیں۔“

بیٹا رہا۔ وہ دھمدکی بھی آخر کوئی چیز ہے۔ خدا خدا کر کے مجھے آوازوں سے یہ اندازہ ہونے لگا کہ ہم باہر کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اس دوران بس میں بے جھوم بھی چھٹنے لگا تھا اور مسافر اس حالت میں واپس آنے لگے تھے کہ اس نے آپ کو تیز رو کے بجائے انسان محسوس کر سکتے۔ نول ٹیکس کی کراہٹ سے گزرنے کے بعد تو بس میں بہت سی کم مسافروں گئے۔ بیشتر بیس واپس میں بھی کچھ دیر کے لئے راوی چوک پر رکتی تھیں۔ یہ بس بھی رک گئی۔ لگاؤ کا مسافروں کو یہاں بھی اترنا تھا۔ ان کے اترتے ہی سیاہ چنڑ اور چڑے کی جیکٹ میں ایک امارت سانو جوان لی کیپ پٹائی پر قدم سے جھکائے بس میں چڑھا اور باندھان پر کھڑے ہی کھڑے حلاشی سی نظروں سے تمام مسافروں کا جائزہ لیتے لگا۔

آخر کار اس کی نظر مجھ پر آن گئی اور میں گہری سانس لے کر دیکھا کہ شیر شیخ تھا۔ مجھے بس میں موجود ہا کر اسے یقیناً بہت خوشی ہوئی تھی اور اس نے سکون کی گہری سانس بھی لی ہوگی لیکن اس کے تاثرات میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ یوں لگتا چاہے کہ اس کے چہرے پر کوئی تاثر ہی نہیں ابھرا۔ اس کا چہرہ چرو ہستور سپاٹ رہا۔

میرے قریب آکر وہ بڑے اطمینان سے نہایت دھیمی آواز میں بولا ”کیٹھے سرا“

انداز ایسا ہی تھا جیسے میں طے شدہ پروگرام کے تحت رپورٹ یا ریلوے اسٹیشن پر اترنا تھا، شیر شیخ کو بذریعہ خط یا ٹیکرام میری آمد کی اطلاع بھی اور وہ مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ میں گہری سانس لے کر تدریسے مشکل سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مشکل سے اس لئے کہ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں جس پوزیشن میں بیٹھا تھا اسی حالت میں میرے ہاتھ حیدروں کے جوڑے تمام ہو گئے ہیں۔

نہایت خاموشی سے ہم دونوں آگے پیچھے بس سے اتر آئے، ابھی نے ہماری طرف فوج نہیں دی۔ حتیٰ کے اس بس کے کنڈیکٹر نے بھی۔ وہ اس وقت بس سے اتر کر ایک دوسرے کنڈیکٹر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

بس سے اتر کر شیر شیخ کی رضائی میں چند قدم چلنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”شیر! جس بس سے میں اتر رہا ہوں اس کے کنڈیکٹر کو کچھ دے آؤ۔ اس سے کہنا جن صاحب کو تم نے بلا کر منتر کرنے دیا تھا یہ ان کی طرف سے ہیں، شکر کے ساتھ“ میں جانتا تھا اس کا یہ جذبہ آئندہ بھی برقرار رہے اور اگر وقت کی شریف پر خاموش ہو اور سڑک اس کی مجبوری ہو تو کنڈیکٹر شاید کچھ سوچ کر اس کے ساتھ بھی مہربانی ہی کا سلوک کرے۔

”اد کے سرا“ شیر شیخ نے بلا تامل اور بلا تجسس کہا۔ جب

"میں در سرے امکان کا شکار ہوا تھا۔" میں نے گویا اس کی قلمی کے لئے بتایا۔

"بہر حال صبح کے قریب میں نے اذرا و احتیاطاً۔ یا شاید اپنی کسی نامعلوم جس کے گھنے پر بیویوں شہر سے آنے والی بھول کو بھی چپک کر شروع کر دیا اور اب نہایت غیر متوقع طور پر آپ اس کھٹار اسی کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے مل گئے۔"

"میں خود بھی اس وقت خاص کھٹار ا حالت میں ہوں۔" میں نے پلو بدلتے ہوئے کہا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر ہی بیٹھا تھا کہ باجی کہنے میں آسانی رہے۔

اس نے اس پر کوئی تبصرو نہیں کیا بلکہ پُر خیال سے لمبے میں بولا "بہر خیال ہے میں ٹرانسیر استعمال کر ہی لوں میں حنیف خان کو اطلاع کر دیتا ہوں کہ اس کی جو عافیت واپس آگئے ہیں۔ وہ تمام پرائفٹس پر سے آدمیوں کو ہٹالے گا۔"

ہماری کلاں میں عام ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈری کی صورت میں ٹرانسیر فٹ تھے۔ ان کے ہائیگ بھی الگ نہیں تھے۔ محض ایک سوچ کے استعمال سے یہ مختلف فریکوئنیز پر کام کر سکتے تھے لیکن ہمیں ان کے استعمال کی ضرورت شاید ٹاڈری پیش آنی تھی۔

کاڈری انٹر کنٹریکٹوری اور پیشے چڑھے ہوئے تھے۔ شبیر شیخ پلٹی گاڈری میں ہی ٹرانسیر پر حنیف خان کے لئے پیغام نشر کرنے کا۔ پیغام جلد ہی رسیو کر لیا گیا۔ شبیر نے اسے میرے مل جانے کی خبر سنائی۔ میں نے ٹرانسیر پر ہی حنیف خان کا قاتل سنا۔ حنیف خان کم از کم میرے معاملے میں خاما جو شیلا آدمی تھا۔

۔۔۔ وہ ایسے موقعوں پر اپنے جذبات کا تھوڑا بہت اظہار کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جبکہ شبیر شیخ بھی اندری اندر بہت جذباتی آدمی تھا لیکن بظاہر وہ جمیل کی طرح پرسکون رہتا تھا۔ شبیر نے اس کے جو شیلے کمرے کے جواب میں کچھ کے بغیر ٹرانسیر کا سوچ آف کر دیا۔

مجھے اپنے آدمیوں کی مستندی پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے گرد پ آف کپڑے میں کام کرنے والے تمام کارکنوں کی تعدادیں تو کئی ہزار کو پہنچتی تھی لیکن ظاہر ہے وہ سب میرے سامنے عام کارکن تھے۔ اپنا اندری یا ٹیکنیکل کام سرانجام دیتے تھے اور تنخواہ لیتے تھے لیکن میرے پرانے اور خاص آدمیوں کی تعداد صرف چالیس کے قریب تھی جو کوئی غلط سلاہ عندا نہیں کرتے تھے لیکن اب بھی میرے لئے ایک گروہ کی ہی صورت

میں کام کر رہے تھے۔ وہ سب میرے جائز کارڈز میں کسی نہ کسی عہدے پر فائز تھے لیکن سب اپنی جگہوں پر ان وقت ملامتوں کے مالک تھے وقت پڑنے پر ان میں سے ہر ایک نہ جانے کیا کچھ بن سکتا تھا۔

شر میں جب بھی اس عادت سے متعلق کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا تھا تو میں کسی نہ کسی بڑے افسر کا یہ بیان پڑھتا تھا کہ شر میں آبادی کے لحاظ سے پولیس کی تعداد کم ہے۔ میرے صرف چالیس

آدمی ضرورت پڑنے پر پورے شہر کو کھنگال سکتے تھے جبکہ اس میں پولیس جیسے اختیارات بھی حاصل نہیں تھے۔ سوال دراصل صرف یہ تھا کہ آپ جو کچھ بھی کہنے جارہے ہیں اس کام سے کس حد تک تعلق ہیں؟ اور آپ کا کردار کیا ہے؟ اگر اطلاعات اور کردار نہ ہو تو تعداد کتنی ہی بڑھاتے باہرے کوئی قاعدہ نہیں ہو گا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا کوئی مقصد حاصل نہیں ہو گا بلکہ مسائل بڑھتے ہی جائیں گے۔ مقصد بھی حاصل نہیں ہو پائے گا۔ لیکن یہ بات میں کسی کام کے آدمی کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اور پھر سمجھتا تھا کہ باجی کون تھا؟ یا شاید سمجھتے سب تھے لیکن سب کی اپنی اپنی جگہاں تھیں یا اپنی تھلکتیں۔

میں نے اپنے خیالات سے جوڑتے ہوئے کہا "میری یہ کہ میں نہیں کیا کہ کوئی شاہی بازار میں کیا کہنے گیا تھا؟" شبیر بلا تامل بولا "سرا وہاں ایک راقصہ ہے ٹیڈ۔ اس سے اس کا زوردار عشق چل رہا ہے۔"

کوئی ایک وجہ نہ جان تھا لیکن میری معلومات کے مطابق وہ "عورت پردہ" تھا۔ کسی سے متاثر ہوا بھی تھا تو صرف اپنا مطلب نکالنے کی حد تک۔ عشق محبت جیسے الفاظ اس کی کوشش میں نہیں تھے لیکن اب نیکامی سو صرف کے عشق قربانی کی اطلاع بھی ملی تھی تو ایک راقصہ سے ملوا رکھتے۔ مجھے معمولی سی حیرت ہوئی۔

کوئی کو ایسی عورتوں کے پکر میں نہیں پھنسا چاہئے۔ یہ آدمی کو بے وقوف بنانے اور لوٹنے کی کوشش کرتی ہیں اور اگر آدمی ان کے ساتھ سمجھد ہو جائے تو اسے آخر میں عذاباً کرا

جذباتی دھچکا برداشت کرنا پڑتا ہے "میں نے ٹیڈ سے کہا۔ "کوئی بے وقوف بننے والی چیز نہیں ہے سرا" شبیر اپنے مخصوص منطق کے لیے میں بولا "وہ آج کل کی ٹوکیوں میں سے کسی کے ساتھ ایسا لے تو سمجھد نہیں ہو گا کہ ان میں اسے غلط نظر نہیں آتا۔ وہ عموماً اپنی اپنی غرض کا پتہ لے بھر رہی ہوتی ہیں۔" اسی سے انسان کو پانی ہیں اور جو اس پر پورا اترتا ہے اس کو

میراں ہو جاتی ہیں۔ اس میں اندر سے امنڈنے والے کسی جذبے یا کسی بے ساختگی کو دخل نہیں ہوتا۔ "اوہ۔۔۔ تم تو اب مجھے خاصے فلسفی ہو گئے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سرا یہ میں اپنے نہیں، کوئی کے خیالات بیان کر رہا ہوں" شبیر موڈ ہانے لگے میں بولا "اس راقصہ ٹیڈ میں یقیناً اسے کچھ غلطوں کی جھلک نظر آئی ہے جو وہ اسے اتنی اہمیت دیتے لگا۔ ورنہ وہ اس صنف کو اتنی اہمیت کمال دیتا ہے؟ ٹیڈ کی ہائیگ ٹائپ ہاں نے وہ ایک مرتبہ اس سے حقائق دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹوکی نے خود ہی اکیلے میں کوئی منع کر دیا کہ اس کے لئے کسی قسم کی کوئی چیز لانے کی ضرورت نہیں" اسے کچھ نہیں

کو شش کرتا تھا جب تک وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ہر ماہ اس دینائے حرص و ہوس میں میں نے لوگوں کو جس طرح بدلتے ہوئے دیکھا تھا اس کے تجربات بھی میرے پاس کچھ کم نہیں تھے۔ ایک شخص کے اگر آپ سے کچھ عمارات دیکھ تو قوتات وابستہ ہوتی ہیں اور آپ کسی مجبوری کے تحت یکدم ان عمارات، ان قوتات کی زنجیر توڑ دیتے ہیں تو پھر اس شخص کی اصل شکل نظر آتی ہے۔ اس وقت پہنچتا ہے کہ وہ اندر سے کیسا آدمی ہے۔ فطرتاً وہ جیسا بھی ہو گا ویسا ہی بدو عمل ظاہر کرنے لگا۔

کوئی بھید نہیں تھا کہ میرا انکار سن کر سینہ عالم شیر نے بھی اپنا خوش نما دخل انداز کیا ہو لیکن گزشتہ رات کے واقعات میں اس کا کردار کیسے فٹ ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے انکار کرنے والے تو سیدھے قیصر ملک کی حویلی پر ہی لے گئے تھے اور ان کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی خدمات صرف قیصر ملک نے ہی حاصل کی تھیں، سینہ عالم شیر کا تو کہیں اشارہ نام تک نہیں آیا تھا۔ تو پھر اس کا ان واقعات سے کس طرح کا اور کس حد تک تعلق ہو سکتا تھا؟ بظاہر تو کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن میں شیر خوک کے محسوسات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بہت سے محاللات میں اس کی حیات بھی میری ہی طرح غیر معمولی پرہیزگاریوں سے سر حال سردست میں نے اس معاملے کو ذہن سے جھٹک دیا۔

شیر بولا "سرا مجھے ابھی یہ تو نہیں معلوم کہ گزشتہ رات آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا لیکن میں نے جو بات کی ہے کیا آپ کو اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے؟"

"فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم تو سینہ عالم شیر سے مل آئے ہو۔ ایک بار میں بھی مل لوں تو پھر کوئی رائے قائم کر دوں گا"

میں نے بے پروائی سے کہا "سردست تو میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا چاہتا ہوں کہ کیا ہوا تھا، کیوں ہوا تھا؟ جس حد تک گاڑی میں گناہ تھا جس میں نے ناخنیں بھیلالیں اور سیٹ کے پٹے سے سر اٹھا کر آنکھیں بند کر لیں۔"

شیر قدرے ہچکچاہٹ آہر لیجے میں بولا "مستافی حائف سرا آپ ضرورت سے کچھ زیادہ بے پروا ہو گئے ہیں۔ میرا مطلب ہے ہر جگہ خرابی ہے رونا اور کسی بھی قسم کا کوئی اطمینان دہیہ وہاں نہ رکھتا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے سرا"

"وہ دراصل میرا خیال تھا کہ میرا کوئی قابل ذکر دشمن نہیں ہے۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا "اور پھر اب میں نے لائن بدل لی ہے تو میرا خیال تھا کہ اب مجھے کم خطرات لاحق ہوا کریں گے۔ میں ایک عام اور شریف آدمی کے سے اعزاز و اطوار اپنانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"آپ بے شک شریف آدمی بن کر رہیں سرا بلکہ ہمارے

پاپے اور ان کے ہاں کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے۔ بہت دلتند لوگ ہے۔ سرا مجھے لگا ہے کہ کچھ لڑائی ہو رہی ہے۔"

"میری میں اپنے ساتھیوں کی فنی زندگی میں مداخلت تو نہیں کرتا لیکن جو مشورہ بہتر سمجھتا ہوں وہ دے دیتا ہوں" میں نے لافٹ سے کہا۔

"اسی لئے تو میں آپ کے جاں نثار ہیں سرا کہ آپ نے ہمیں آزادی دی ہے، عزت اور محبت دی ہے۔ خوشحالی دی ہے۔" وہ شاید ہم سب بہت معمولی لوگ ہوتے "پہلی بار اس کے لیے میں کتنی ہی جذباتیت کی جھلک محسوس ہوئی۔"

"یہ سب خدا کی مہربانیاں ہیں۔ میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں تو بڑا گناہ کار سا آدمی ہوں" میں نے حیرت سے حد مان کر دیکھا۔

"اللہ تعالیٰ بھی کسی کو سیدھا بنا دیتا ہے نامی۔" شیر نے دیکھ کے منتقل پر گاڑی روکے ہوئے کہا۔ "ہمارے لئے اللہ نے آپ کو سیدھا بنا دیا۔"

میں خاموش رہا ایک لمحے کے لئے گاڑی میں بے حد ناموشی چھا گئی۔ انجین اور ایئر کنڈیشنر کی خفیف سی سرسراہٹ کے سوا کچھ سناٹی نہیں دے رہا تھا۔ شیر کو یہ موضوع بدلنے کی فرس سے بولا "آپ کی تلاش کے سلسلے میں میں سینہ عالم شیر کے پاس بھی گیا تھا۔ وہ مشکوک حالات میں آپ کے غائب ہونے کا سن کر کچھ عجیب معنی خیز سے انداز میں مسکرایا تھا۔ ہم اسے "دستور" بہر مدلل اور سابق ہم مشرب لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ مگر سرا مجھے اس کی مسکراہٹ کچھ اچھی نہیں لگی۔ مجھے اس میں کسی گڑبڑ لگنے کی جھلک محسوس ہوئی۔ معلوم نہیں مجھے کیوں شے ہو کر وہ آپ کی تشدد کے راز سے واقف نہ تھا اگر یہ میری غلط فہمی تھی تو وہ یہ خبر سن کر خوش تو ضرور ہوا تھا۔ دل ہی دل میں۔ مگر ظاہر تو توہین زدہ ہو کر سوالات کرنے لگا۔ سرا اس میں کوئی تبدیلی ضرور آئی ہے۔"

میرے ذہن کے کسی گوشے میں مدھم سی گھنٹی بجی۔ سینہ عالم شیر بھی اس روز مجھ سے خفا ہو کر گئے تھے جس روز قیصر ملک مجھے دھمکیاں دے کر آیا تھا اور ذلیل و خوار ہو کر گیا تھا۔ سینہ عالم شیر نے اس بات پر پوری طرح یقین نہیں کیا تھا کہ میں ان کی لائنیں چمڑچکا ہوں۔ میں نے ان کا کام کرنے سے انکار کر دیا تھا تو ان کے تاثرات "ان کی آنکھیں یک وقت بدل گئی تھیں" تاہم میں نے اس وقت سے نہیں سوچا تھا کہ عملی طور پر میرے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں۔

وہ لازمی پرہیزگار آدمی تھے۔ دھندا ان کا خواہ کچھ بھی تھا اور نظریات چاہے جو بھی تھے لیکن میں نے ان میں بیشہ اچھی عادتیں دیکھی تھیں۔ ویسے بھی میں خوش گمان آدمی تھا۔ ہر آدمی کے بارے میں اس وقت تک اچھے خیالات رکھنے کی

خیال میں تو آپ پہلے بھی بہت شریف ہی آدی تھے۔ آپ نے صرف اپنا کاروباری سیٹ اپ ہی تھوڑا سا تبدیل کیا ہے اور آپ کی وجہ سے ہمیں بھی مزید مدد کرنے کا موقع مل گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم لوگ احتیاطی تدابیر ترک کر دیں۔ احتیاطی تدابیر کی ضرورت تو شریف آدی کو بھی ہوتی ہے بلکہ آج کے دور میں تو شریف آدی کو زیادہ ہوتی ہے۔

”میں اب خیال رکھوں گا“ میں نے وعدہ کیا۔
 ”ہم بھی خیال رکھیں گے۔ اس کا برا مت مٹائیے گا اور ہمیں منع بھی مت کیجئے گا سراسر! وہ دیکھئے لیجئے میں بولا ”زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ لوگ ہمیں ہمارے رجعت پسندانہ خیالات اور نظریات کے ساتھ زیادہ عرصے ذمہ نہیں رہنے دیں گے۔“
 میں کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ کار خفیف سے دھچکے کے ساتھ رک گئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ گاڑی میری کوٹھی کے سامنے رک چکی تھی اور چہ کیدار گیٹ کھل رہا تھا۔ ہماری گاڑی ڈرائیو سے میں داخل ہونے لگی تھی کہ ہمارے عقب میں ایک اور گاڑی نمودار ہوئی۔ وہ بھی ہمارے پیچھے ہی ڈرائیو سے میں داخل ہوئی۔ یہ پہلی طرف میں ٹپ کی چھوٹی سی خوب صورت کونڈیخیل تو کم دیکھ سکتی تھی۔

میں اور شیر گاڑی سے اترے۔ میں نے سزا کر دیا۔ اسی لمحے میں ٹپ بھی اپنی گاڑی سے اتر رہی تھی۔ وہ سفیدی شرٹ اور نیوی بلو جینز میں تھی۔ تراشیدہ ”ریٹی“ اور کمرے سیاہ بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ گھٹے میں سادھوں جیسے موٹے موٹے سکوں والی مالا تھی۔ وہ گویا ایک ہی ذوق بھر کر کچھ تک پہنچی۔

اس کا ساتھ ساتھ چوڑا شہت جذبات سے ہنسا رہا تھا اور موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں جیسے آنسو جھلکے کو بے تاب تھے۔ اس نے والمانڈ انداز میں میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس کے ہونٹوں میں خفیف سی لرزش اور ہاتھوں میں محبت کی گرمی تو دیکھنا اور اس کے ساتھ ہی نہایت طاقتور انسانوں والی مضبوطی بھی تھی۔

”سرا! مجھے چند منٹ پہلے ہی ٹرانسفر پر اطلاع ملی ہے کہ آپ واپس آگئے ہیں۔ میں آندھی طوفان کی طرح ہیڈ کوارٹر سے یہاں پہنچی ہوں۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ خیریت سے تو ہیں نا“ وہ عرض سے لیجئے میں بولی۔ ”ہاں، وہ ایسی عورت تھی جس کے لیجئے میں ارقاش شازدہ اور ہی آتا تھا۔“

میں نے ایک نظر اپنے خراش زدہ اور مٹی میں تھکے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا ”میں بالکل تھک ہوں، جلدی اور تھک رہا ہے۔ حد شکر گزار ہوں کہ تم نے میرے لئے اس قدر تشریف کشی کی۔“

مجھ سے پسندیدہ قاسم خان کی ملازم تھی اور اس میں کوئی شک

نہیں تھا کہ وہ اس کے اچکامات کی قلیل اور اس کے سخاوت کی حفاظت میں تھک چکی تھی۔ لیکن یہ بس پیشہ دارانہ غلط تھا۔ اور ایک محدود پیمانے پر تھا۔ جب سے جلدی اور وہ سرے لوگ میرے سامنے آئے تھے تب سے ان کا غلط صرف کا دہرائی حدود میں مقید نہیں رہا تھا۔ یہ غلط ہے کہاں ہو گیا تھا۔ مجھ سے ان کی وابستگی میں ایک بے عنوان سی محبت بھی شامل ہو گئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے اپنے گھر میں بھی دفتر خانہ کی کی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ان سب لوگوں کی محبتیں بہت دقت میرے گرد ایک ہالہ سا بنائے رکھتی تھیں۔

جلدی نے میرے ہاتھ چھوڑ دئے اور ایک قدم پیچھے ہٹے ہوئے بولی ”بس اب میں چلتی ہوں۔ آپ آرام کیجئے۔“
 بات آپ سے تب ہی ہو گئی جب آپ مجھے یاد فرمایاں گے۔
 ”یہ کیا آقا ہوا بھی؟“ میں نے حیرت سے کہا ”تم میری فکر نہ کرو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور جہاں تک آرام کا سوال ہے تو بس اب گھر پہنچنے کے بعد تو آرام ہی آرام ہے۔ تم کچھ دیر تو چھوڑو۔“
 ”نہیں سرا!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا ”ہوئے بولی“ ہیڈ کوارٹر میں برا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے نا۔ میں کسی اور کو ہدایت بھی دے کر نہیں آئی۔ آپ کی خیر دعائیت جاننے کے لئے ٹرانسفر پر دو حواجز منتقل موصول ہو رہے ہوں گے۔ ان کا کوئی فوٹی ہی نہیں آئے گا۔ کسی کو باہر نہیں چلے گا۔ ٹیلیفون تو پلو مراب علی انڈیکر کے کا لیکن آپ کے بارے میں وہ بھی کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔“

اے حمید کے ایڈو پنر قلم سے

شب و سہنا کے

دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ = 700 روپے

ناشر: مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

دعا کے سے قیصر ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اس کے فوراً بعد ہی وہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے دوڑا تو تاریکی میں منہم شدہ ایک ستون سے ٹکرا ہوا غلٹہ سیرا اس کی پینٹی میں گھس گیا۔ یوں گویا اب اسے بھی کچھ دن بستر میں لیٹ کر گزارنے تھے۔ دوسرے دو تین قوی بھی معمولی زخمی ہوئے تھے۔ خبر پڑ کر میں مسکرا دیا۔ قیصر ملک نے دانستے کو یہ رنگ دے کر گویا اپنے اس دعوے کی لاج رکھی تھی کہ جنگ اب صرف میرے اور اس کے درمیان تھی۔ لیکن اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب وہ پولیس کو یہ توہتا نہیں سکا تھا کہ وہ مجھے اغوا کر دے کہ اپنے ذاتی قید خانے میں ڈال دے۔ کچھ ٹوٹے کی طرح ٹکرائے اور نہ جانے میرا کیا کیا ہوادیے کی دھمکیاں دے رہا تھا جب کسی مظلوم شخص نے حویلی پر دو طاقتور گریڈ پینک مارے۔

اخبار میں ایک اسپتال کے پڑ پڑے ہوئے زخمی قیصر ملک کی تصویر بھی چھپی تھی۔ اس چھٹی سی تصویر کو بخور دیکھ کر میں نے مسکراتے ہوئے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور دلی دلی میں کہا، "اب میں تھماری طرف سے ہو شیار ہو گیا ہوں قیصر ملک! اب تم شر ڈو گے کہ تمہارا شانیاں شان استقبال ہو گا پارے!" قیصر ملک کے بارے میں خبر صرف ایک ارد اخبار میں قدرے تفصیل سے چھپی ہوئی تھی۔ باقی ارد اخبارات میں نہایت اختصار سے چھپی تھی اور انگریزی اخبارات میں تو بالکل ہی غیر نمایاں طور پر چند سطروں میں ایک کونے میں اندرونی سنے پر بھی تھی جہاں چھوٹے موٹے شروں کی خبریں چھپی تھیں۔

اخبارات ایک طرف ڈالنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ وہ ایک ضروری کام کرتے تھے۔ میں اس وقت آفس میں تھا۔ اپنے ڈائریکٹ فون پر میں نے ضیف خان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ آج کل سرکریڈز پر واقع میرے ایک دفتر کا میجر تھا جہاں سے اعلیٰ قسم کے پیش قیست قائلین انکسپورٹ ہوتے تھے۔ لیکن اس نے بھی میرے کئی دوسرے خاص کارکنوں کی طرح پولیس اس طرح سیٹ کیا ہوا تھا کہ اسٹاف کی دوسرے وہ خود کار انداز میں چلتا رہے اور خود اسے اگر میرے کاموں سے کئی دن بھی غائب نہ پڑے تو اس سے کاروباری معاملات میں کوئی فرق نہ پڑے۔

"میں سر! کیا حکم ہے؟" اس نے اپنے مخصوص مستند لہجے میں کہا۔

میں نے اسے اپنے گاؤں کا حدود ازبہ اور پھر آجہاں کی جموینڈی کا محل وقوع بتانے کے بعد کہا "اس جموینڈی میں آجہاں نام کی ایک تیار اور غلٹہ حال عورت موجود ہوگی۔ اس سے کہنا چاہیں شہر لایا گیا ہے۔ میرا نام لیتا۔ اسے ساتھ لے آنا لیکن کوشش کرنا کہ تم کسی کی نظر میں نہ آؤ اور نہ ہی کوئی آجہاں کو تمہارے ساتھ رخصت ہوتے دیکھے۔ خطرے والی کوئی بات

"اچھا۔ جیسے تم مناسب سمجھو" میں نے کندھے اچکائے اور کوٹ کی آستینیں تقریباً غلٹہ ہو لے کر دھڑک دھڑک کر زانوہی ایک "تھی" تو چھٹی تم آؤ گے اس طرف ان کی طرح۔ لیکن اب واپس باز ہماری کی طرف جانا" وہ میری اس صہیت پر زندگی سے برہور انداز میں ہنس دی۔

شیر ہوا میں بھی جہل کے پیچھے پیچھے ہر کار لڑتا ہوا۔ اپنے توہین کو کچھ ضروری ہدایت دینی ہو گئی۔ وہیں سے دے دلا گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں جلد ہی تم سے رابطہ قائم کروں گا" میں نے کہا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر برآمدے کی طرف پڑھ گیا وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔



دوران میں گویا حالات معمول پر آ گئے۔ میں آفس چلے گا۔ اس دوران اخبار میں دو خبریں بھی آئیں جن کی مجھے توقع تھی۔ ایک تو شاہی بازار کی ایک کھین میں ایک لاش پائے جانے کی خبر تھی۔ لاش کی شناخت نہیں ہو سکی تھی تاہم پولیس نے اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص تھا اور ملکی عدلیہ یا کسی جھگڑے کے باعث اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ خبر سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس سلسلے میں رکھی ہوئی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ یہ بیحد ہی مضمون تھا جو میری گولی کا نشانہ تھا۔ پولیس پہلا اندازہ تو درست ہی تھا کہ وہ جرائم پیشہ تھا لیکن یہ جان کر مجھے بالکل ہی ہوئی تھی کہ پولیس اس کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں کر سکی تھی۔

جس گروہ سے وہ وابستہ تھا وہ ایک طرح سے کرائے کے ہمسائری ہی کا گروہ تھا۔ اور براہ راست مجھ سے ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی پھر بھی میں ان کے حلقے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اگر کبھی فرصت میرے آئے اور حالات اجازت دیں تو انہیں بھی تھوڑا سا کھلا جائے اور بتایا جائے کہ وہ محض ہمدردی کی خاطر ہر شخص پر آنکھیں بند کر کے ہاتھ نہ ڈالا کریں تو بہتر ہے۔ ہر سال قیصر ملک تو میرے سامنے موجود تھا۔ جس نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر کسی نہ کسی طرح اس گروہ کا سرواڑہ تھوڑا ہی سکتا تھا۔

دوسری خبر گاؤں کی تھی اور خاصی نمایاں سرفی کے ساتھ چھپی تھی۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ علاقے کے ممتاز زمیندار قیصر ملک کی حویلی پر ڈاکوؤں نے دستی بموں سے حملہ کر دیا۔ وہ کچھ لوٹ کر لے جانے میں تو کامیاب نہیں ہو سکے تاہم حویلی کا خاصا حصہ منہم ہو گیا اور جانی نقصان بھی ہوا۔ قیصر ملک کی رشتہ کی کوئی خالہ مسان آئی ہوئی تھیں۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ کرا چھوڑ کر گھر میں سوتی ہوئی تھیں۔ ان کے تو پچھلے اڑ گئے۔ وہ خانقاہ اور ایک نوکر بھی لٹا اہل بنے۔

کے ساتھ تنگ شروع ہوئی۔

اس کے بعد میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ ”جہاں ایک مرتبہ ملک کے باغ والوں کو شہنشاہ پر ہتھی نام کی لڑائی لڑانیوں کے ساتھ آئی تھی اس کا ایڈریس یا فون نمبر وہی ہو گا۔“

”شاید ہونا نام جنوں والی فونٹ بک دیکھنا پڑے گی۔ مجھے یاد تو پڑتا ہے کہ جب وہ ملی پار آئی تھیں تو ان کے بے حد اصرار پر میں نے ان کا ایڈریس دیکھو فونٹ کیا تھا۔“ اتفاقاً بولا پھر اس کے لیے مجھے بالکل سی عقلی تھی ”سر! کیا آپ نے اسے کسی فلم میں سائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”نہیں۔ یہ مسئلہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو مجھے اس سے کوئی اور کام ہے“ میں نے کمری سنجیدگی سے کہا ”تم اس کا فیروغیو تلاش کر کے مجھے فون کرلو۔ میں منتظر ہوں“ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ دو منٹ بعد ہی اتفاقاً کا فون آگیا۔ اس نے ایک ایڈریس اور فون نمبر مجھے ترث کرایا اور میں نے اسے مزید باتیں کرنے کا موقع دے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

پہلے میں نے سوچا کہ فون کے مکالمہ کرلوں کہ ہتھی گھر پر ہے بھی یا نہیں۔ لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اچانک ہی اس کے گھر پہنچ کر اسے سر از روئے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میں جب مطلوب ایڈریس پر پہنچا تو مجھے یہ فیکہ کہ حرکت ہوئی کہ وہ ایک اچھی خاصی بڑی اور عریض کمری تھی۔ میں نے ہارن دیا تو چونک کر اس نے بلی کی گیت گھولا۔ اس نے یہ ایکٹ نہیں کھولا کہ میں گاڑی اندر لے جاتا۔ وہ خود ہی باہر آکر کمری پر بیٹھتے ہوئے موبائل پر لیسے میں بولا ”ہی صاحب! اس سے ملنا ہے آپ کو؟“

”ہی بی بی! موجود ہیں تو ان کو میرا کارڈ دے دو۔“ میں نے اپنا ڈرائیونگ کارڈ آگے بڑھایا۔ وہ واپس اندر چلا گیا اور جاتے وقت بلی گیت ناچتے ہوئے میرے چہرے کا رنگ۔ خاصاً عینا کوئی معلوم ہوا تھا یا پھر اسے یہ بات اسی قسم کی تھی۔

چند ہی لمحوں بعد گیت کے حسب میں چونک کر اس کے ہماری جوتوں کی دھجی دھجی ہو چکی تھی۔ وہ وہ ڈاؤنڈا ڈاؤنڈا تھا۔ اس نے بے تحاشی سے انداز میں گیت گھولا اور کورٹس بھلائے گئے۔ اسے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا ”آئیے۔ آئیے۔“

صاحب! تعریف لائے۔“ میں نے دیکھا تو اس میں دو تقریباً سی کاٹیاں پہنے ہوئے تھیں۔ میں نے ان کے عقب میں گاڑی لے جا کر رکھ دی اور دیکھا کہ ہتھی بھی تقریباً دوڑتی ہوئی راہ راہی سے نکلی اور یہ آدھے میں آکر رک گئی اسے پیچھے رہنے دیتے دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

اس کے گھٹاؤں جیسے لمبے سیاہ ریشمی بال اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ ایک آپ سے بے نیاز اس کی نکلی نکلی حرکت

نہیں ہے لیکن گاؤں کے لوگ یو سی بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر تجسس ہو جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے افسانے گھڑنے شروع کر دیتے ہیں۔ پھر کو افسانے نہیں چاہئیں۔“

”میں سمجھ گیا سر! آپ فکر نہ کریں۔ افسانہ تو کیا کوئی سرگوشی بھی ختم نہیں لے گی“ اس نے پریقین لہجے میں کہا۔

”شرمیں ہماری جہر اپنی ہے اس میں کوئی غلطی و فیروغی پڑا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”صحیح ریکارڈ تو کوئی کے پاس ہے سر!“ وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا ”لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ گلیگرم میں ہماری ایک عمارت میں ایک ٹیلیٹ خالی تھی۔ اس میں صرف ہمارے کارگو ریکارڈ کے کچھ رجسٹر اور پرانی فائلیں وغیرہ پڑی ہیں۔ وہ وہاں سے ہٹائی جا سکتی ہیں۔ وہ بہت اچھا ٹیلیٹ ہے سر! آج کل وہ کسی مسافر میں نہیں آ رہا۔“

”میں تو پراسی کو بالکل ٹھیک خاک کر رہا۔ یہ عورت آج اب اس میں رہے گی۔ اس کے پاس ایک معقول اور خوبڑی بہت پر مچی کمری کوئی خاصہ ہوئی چاہے جو ہر وقت اس کا خیال رکھے اور اس کا ہر کام کرے۔“ پرائیویٹ طور پر ایک ڈاکٹر کا بھی بندوبست ہونا چاہئے جو دن میں کچھ عورتیں بھی ضروری سمجھے اس عورت کا معائنہ کرے آئیے اور پوری توجہ سے اس کا علاج کرے اور اس عورت کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا جائے۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اسے ایک نئی زندگی کی طرف لے آئے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

”میں سمجھ رہا ہوں سر! اب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں اپنے کومیس کی مستوری اور فرض شناسی کے لئے ان کا شکریہ ادا کر کے میں کوئی قیامت محسوس نہیں کرتا تھا۔

ان انتظامات کو جب ایات دے کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس تصور سے مجھے ایک عجیب ناگہانی بیان سی خوش محسوس ہو رہی تھی کہ ہمیں زندگی میں پہلی بار ایک صاف شہرے اور آسودہ دوش دھات مل چکی ہوگی تو اس کے محسوسات کیا ہوں گے وہ رانڈر وہ گاہ اور نہ ہی فکر میں بہت سی عورت کیسی معلوم خوش محسوس کرے گی!

ایک لمحے کے لئے میں میں عجیب سے تصور سے محروم سا بیٹھا رہا پھر وہ کمری کی دھاتیں داہیں آگیا اور انٹرکام پر میں نے کیرئیر کو ہدایت کی کہ وہ اسٹوڈیو والے آفس سے رابطہ قائم کر کے آگاہ سے پہلے بات کر لے۔

اتفاق کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ میں اس دوران ایک رات کے لئے غائب بھی ہو گیا تھا اور اس رات مجھ پر کیا گزری تھی۔ اس لئے اس سے حسب معمول فیروغی غایت کے رکھی سے جلوں

اتنی رحمت کیوں کی؟ آپ نے کسی سے خون کرا دیا ہو۔ ہم خود آجاتے۔ سرکے مل آجاتے۔"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ اتنا خوبصورت سر چلنے میں استعمال ہو" میں نے آنکھوں سے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا "اب یہ بتاؤ کہ یہیں کھڑی کھڑی شرمندہ کئی رو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی؟"

بہت آہستگی سے "اور گویا بادل خواستہ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا "کیا اس گھر میں اندر جانے کے لئے آپ کو مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟" یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کی ماں جلدی سے آگے چلتی ہوئی بولی "یہ آپ کا اپنا گھر ہے گی۔ دن ہو یا رات۔۔۔ جس وقت جس لمحے آپ کا دل چاہے بے شریف لائے۔ چرکیدار آئندہ آپ کو دیکھتے ہی کیٹ کھول دیا کرے گا۔ آج تو پہلی بار اس نے آپ کو کھٹکھا تھا۔"

ہم کو ریڑھ درمیں داخل ہوئے۔ وہاں میرا ہاتھ پر پلا سیال لٹا کر اور انک دم قہار شاہانہ انداز میں آراستہ ویراست تھا۔ ہنی میرے پاس ڈرائنگ روم میں آٹھنچی جبکہ اس کی ماں اندر کہیں چلی گئی۔ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ غالباً وہ خانساں کو چاہنے اور دیگر لوازمات کے سلسلے میں ہدایات دینے گئی تھی۔

"مجھے تمہارے بارے میں تشویش تھی" میں نے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "کیا میرے نکل جانے کے بعد وہ لوگ اندر آئے تھے؟ انہوں نے تم سے کوئی بدسلوکی تو نہیں کی؟"

"میں نے خود ہی ان کے لئے دروازہ کھول دیا تھا" ہنی نے بڑے اطمینان سے بتایا "ظاہر ہے انہوں نے پلا سوال آپ ہی کے بارے میں کیا۔ میں نے آنکھوں میں آنسو لائے ہوئے کہا کہ ہاں ایک نامعلوم شخص اچانک ہمارے ہاں کھس آیا تھا" وہ سنگھار بیز پر پڑی ہوئی میری کار کی چابیاں بھی لے گیا اور جب میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے میرے منہ پر پھینچ مارا۔ اپنی بات میں صداقت کا رنگ پیدا کرنے کے لئے میں نے خود ہی اپنے گال پر زور سے تھپتھپا کر انگلیوں کے نشان ثبت کر لئے تھے۔ شاید اب بھی ہوں "اس نے انگلی سے اپنے رخسار کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ ظلم کے وہ نشان مٹ چکے ہیں" میں نے اس کے آتشیں رخسار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ویسے جسیں خود پر اتنا ہی ظلم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"وہ سخت بچان زدہ تھے۔ ایک ٹائٹ کے لئے بھی ان کا ذہن ادھر ادھر بھٹک جاتا تو وہ نہ جانے کیا کر گزرتے۔ کوئی بھی بات فوراً انہیں شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ اور اگر میں انہیں یہ بتانے کی کوشش کرتی کہ یہاں کوئی نہیں آیا تھا تو یہ میرے حق میں بہت برا ہوتا" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "میری بات

بھرے بھرے نیم دا ہونٹ اور نیند کا غمار لئے موٹی موٹی سیاہ آنکھیں بہت دلکش دکھائی دیتیں تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ ہر کا وقت تھا مگر وہ شب خولی کے لبادے میں تھی۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر بے چینی کے ساتھ ساتھ ایک معصوم سی مسرت کا پرتو تھا۔ وہ اس وقت کسی کم سن اور خوش لڑکی سی کی طرح معصوم دکھائی دے رہی تھی۔

اس لمحے اس کی تانیکہ ٹانپ ماں بھی سلیپر تھیں، قفل قفل کھلی "راہداری سے برآمد ہوئی دکھائی دی۔ وہ عنی کے پاس۔۔۔ انگریز ہوئی اور ہانپنے لگی۔ ہنی کی وجہ سے اس بے چاری کو بھی چند قدم دوڑنے کی زحمت کرنا پڑی تھی۔

میں گاڑی سے اتر کر برآمدے کی دو تین بیڑھیاں چڑھ کر ان تک پہنچا اور غیر ارادی طور پر میں نے مصالحتے کے لئے ہاتھ ہنی کی طرف بڑھا دیا۔ اپنے اس انداز پر خود مجھے ہنسی بھی آتے آتے ہو گئی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ائیر پورٹ پر جہاز سے اترنے والی اہم شخصیات اپنے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے لوگوں سے ہاتھ ملاتی ہیں۔

ہنی نے خواب کا یک سے انداز میں دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ قلم لیا پھر اس کی آواز جیسے بہت دور سے آئی ہوئی محسوس ہوئی "آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ کو بالکل صحیح سلامت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں بہت پریشان تھی۔ دور اتر میں میں نے جاگ کر گڑا میں۔ دہلی پر رواج اس لئے زیادہ تھا کہ میں کسی کو غائب نہیں کر سکتی تھی کہ بات کیا ہے۔ بات خود مجھے بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھی۔"

اس کے لیے میں غلط تھا، حقیقی تشویش تھی لیکن اس کی ماں غلط سے خالی اور پیشہ ورانہ سے لہجے میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی "ہاں جی۔ اس کا تو کمانا پنا چھوٹ گیا تھا لیکن اس نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ بات کیا تھی۔"

"اور اس وقت مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آتا" ہنی بدستور میرا ہاتھ تھامے مسکرائی۔ "آنکھیں دیکھ رہی ہیں مگر انہیں تسلیم نہیں کر رہا ہے کہ آپ بیسا بڑا آدمی ہیں جس نے اس کو غیب خانے تک لایا ہے۔"

"ایک تو ہمارے معاشرے میں انکساری کا بہت غلط استعمال ہوتا ہے" میں نے چستے ہوئے کہا اور کوشی پر چاروں طرف نگہ دوڑوائی "اگر غریب خانہ اسی کو کہتے ہیں تو میری دعا ہے کہ میرے ملک کا ہر غریب ایسے ہی خانے میں رہنے لگے۔"

"آپ کے آنے سے پہلے واقعی یہ غریب خانہ تھا لیکن اب اس کے مقدور چاکر گئے ہیں۔ اب ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ اب یہ کارور نامی غریب خانہ نہیں رہا" وہ بدستور خواب کا یک سے لہجے میں بولی اور خواب کا یک ہی سے انداز میں مسکرائی "لیکن آپ نے

سننے ہی وہ آپ کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔
 ”یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس بازار میں مجھے نہ مل سکیں۔“
 میں نے سوئے کی پشت سے ٹپک لگا کر گہری سانس لیتے ہوئے
 کہا ”وہ ایک عجیب رات تھی۔“

اس رات وہ جس طرح مجھے اس مکان میں بیٹھی ہوئی ملی تھی،
 شاید اس کے تصور سے اس کے چہرے پر کرب کی ایک ہلکی سی
 پرچھائیں آکر گزر گئی۔ شاید اس تصور کو ذہن سے جھٹکنے ہی کی
 خاطر وہ بولی ”اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو میرا تجسس دور کر دیں کہ
 اس رات آپ پر کیا کڑی اور معاملہ کیا تھا؟“
 ”فی الحال اس تجسس کو برقرار رکھئے۔“ میں نے مسکراتے
 ہوئے کہا ”زندگی میں تو خواہ امت تجسس بھی تو ہونا چاہئے۔“

”میری زندگی میں تجسس تو قسطنطنیہ میں موجود ہے لیکن
 اگر آپ کہتے ہیں تو خواہ امت اور کسی بھی اس نے فوری طور پر
 گویا اس معاملے کو ذہن سے جھٹکا دیا اور بے پروائی سے سر کو
 خفیف سا جھکا دے کر مسکرا کر کہہ گئی لیکن اس بار اس کی
 مسکراہٹ میں نہ جانے کیوں افسردگی کی آمیزش تھی۔

دفعاً اسے جیسے آداب میزبانی یاد آگئے۔ پانی پر رکے
 ہوئے خوبصورت منقش سکرٹ باکس کی طرف ہاتھ بڑھاتے
 ہوئے بولی ”آپ کوئی سکرٹ وغیرہ چاہتے ہیں؟“ لیکن لگتا
 تھا کہ آپ تمباکو نوشی نہیں کرتے؟“ اس نے ساتھ ہی
 اندازہ ظاہر کر دیا۔

”تمہارا اندازہ درست ہی ہے۔ لیکن میں اتنا پارسیابی
 نہیں ہوں۔ مختلفانِ صحت کی پھولی موٹی خلاف ورزیاں کرتا رہتا
 ہوں۔ تاہم اس وقت دل نہیں چاہ رہا“ میں نے ہالی کی بات ذرا
 زچہلی کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی ذریعہ وغیرہ؟“ اس نے سرسری سے لیجے میں
 ہاتھ چھوڑا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی موٹی موٹی سیاہ
 آنکھوں میں جیسے ان گنت بھد چھپے رہتے تھے میں نے محسوس کیا
 کہ ان آنکھوں کو قریب سے دیکھتے ہر ذہن کے کسی گوشے میں بے
 عنوان سا اضطراب جاگ اٹھتا تھا۔

”نہیں۔ اس وقت اس کا بھی سوز نہیں“ میں نے نفی میں
 سر ہلایا۔

میں اسی وقت اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے
 پیچھے ایک ملازم ٹرائی دھکیلتا ہوا لاربا تھا جس پر جانے کے برتن
 اور اس کے لوازمات کی نہ جانے کتنی چٹیں تکی ہوئی تھیں۔

بڑی بی ایک سوئے میں دھنس کر مسکرانے کی کوشش
 کرتے ہوئے بولیں ”بس سی۔ آپ تو اس طرح اچانک بغیر
 اطلاع کے شریف لانے کے ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کچھ
 سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کی کیا خاطر قوا میں کریں؟“ پھر وہ گویا خود
 ہی فرما رہی ”خیر فی الحال تو آپ جانے اور ان ہلکی

پھلکی چیزوں سے فاصلہ فرمائیں گھانا تیار ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ
 جو بھی آپ کا سوز ہوا کلفٹ حکم فرمائیں۔ یہ آپ کے خدمت
 گاہوں کا گھر ہے۔“

”آپ کی اس قدر محبت و حمایت مجھے مسلسل شرمندہ کرنے
 جاری ہے۔ نوازشات کا بوجھ مجھ پر اس قدر نہ ڈالیں کہ میں اپنا
 بھی نہ سکوں“ میں نے حقیقی کمینیت سے کہا۔ فی الحال میں
 صرف ایک بیانی جانے بیوں گا۔ اور کھانے کے کلفٹ کی توقع
 ہی کوئی ضرورت نہیں۔ میں زیادہ دیر میں لھووں گا۔ آپ مجھے یہ
 احساس بھی دلانے کی کوشش کر رہی ہیں جیسے میں بہت بڑا آدمی
 ہوں اس سے بھی مجھے شرمندگی ہو رہی ہے۔ میں تو بہت معمول
 سا آدمی ہوں۔“

”یہ تو ہم ہی زیادہ بستر جانتے ہیں جناب!“ وہ ہنسی
 عورت مجھے پیٹنے لگیں۔ مارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
 ”جنہیں آپ سے محض ایک منٹ کی ملاقات کا وقت لینے کے
 لئے نہ جانے کتنے پتھر لگانے پڑے مگر ملاقات ممکن نہ ہو سکی۔
 آخر کار ہمیں ایک طرح سے آپ کے راستے میں دھرمنا مار کر
 بیٹھنا پڑا۔“

”اس کے لئے میں شرمندہ ہوں“ میں نے معذرت خواہانہ
 لہجے میں کہا ”لیکن آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب آدمی کے کاروبار
 اس قسم کے ہوں جیسے میرے ہیں تو سیکڑوں لوگ ملاقات کے
 خواہشمند رہتے ہیں لیکن ہر ایک کے متعلق تو اندازہ کرنا مشکل
 ہوتا ہے کہ کون کیا ہے۔ اب مثلاً آپ ہی کی مثال لے لیجئے۔
 ملک کے باغ میں شونگ کے موقع پر جب آپ سے گویا سربراہ
 ملاقات ہوئی تو آپ دونوں ہی کی شخصیت کا میں نے کوئی اچھا تاثر
 نہیں لیا تھا۔ اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ آپ
 لوگ اس قدر سلیکے ہوئے انسان اور محبت کرنے والے ہیں۔“

”آپ کا تصور نہیں ہے جی“ ہنسی کی ماں میرے لئے چائے
 بناتے ہوئے بولی ”یہ بات تو مجھے خود بھی معلوم ہے کہ میرا
 اہمیشن کچھ اچھا نہیں پڑتا۔ میں کسی خوش قسمی میں مبتلا نہیں
 رہتی جی۔ مجھے پچھن مارنے کی بھی عادت نہیں۔ بات دراصل یہ
 ہے کہ تعلیم کی طرف سے میرا تاثر تک ہے۔ لیکن میں نے اپنی
 اس بیٹی کو بڑے شوق اور لگن سے پڑھایا ہے جی۔ ایم اے پاس
 کیا ہوا ہے اس نے۔ اب آپ سے کوئی بات بھی ہوئی تو ہم
 نہیں۔ جہاں سے ہم آئے ہیں۔ جس ماحول سے ہمارا تعلق رہا
 ہے تعلیم کا ماحول تو وہاں بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ ہمیں نے اتنا
 کچھ پڑھایا۔ اسے خود بھی بڑا شوق تعلیم حاصل کرنے کا۔ کچھ
 کتنی لیس کے آپ؟“

باتیں کرتے کرتے یکدم بڑی بدل کر اس نے جو یہ سوال کیا
 تو میں چونک گیا۔ وہ جرم سلور کا شکرانہ اور چچا انھوں میں
 تھامے سالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”فریادہ گج۔“ میں نے جواب دیا۔

”اٹھ کالاکھ لاکھ ٹکڑے جی کہ آپ کو شوگر نہیں ہے ورنہ آج کل تو ہریے والے کو شوگر ضرور لاحق ہے۔ پھر کیا آتا ہے لی بس شوگر بھی ضرور ساتھ لاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پیسے اور شوگر کا چوڑا دامن کا ساتھ ہے“ شوگر مل کر کے چائے پیچھے دیتے ہوئے وہ بھٹکل ایک لمبے کو سانس لینے کو رکی اور میرے کپ تھانے ہی سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی ”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ اپنی کوڑھنے کا خود بھی بہت شوق تھا۔ اور یہی اس کا حوصلہ تھا کہ اس نے باقاعدہ ریگولر اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے ایم اے کر لیا حالانکہ کالج اور یونیورسٹی میں طے سن کر اس کا کچھ پھلی ہو گیا۔ بات چھی نہیں رہتی تھی۔ کالج یونیورسٹی میں سب جگہ پتا چلی جاتا تھا کہ اس کا قتل اس بازار سے ہے۔ کچھ لڑکے لڑکیاں تو اپنی طرف اور سمجھدار ہوتے ہیں جی۔ وہ تو اس بات پر اس کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ یہ ایسے خاندانی ہی منظر کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن زیادہ تر چمچوروں اور کم ظرف ہی ہوتے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں اردن ہی تو انہیں کہتے تھے مذاق اڑاتے تھے ذلیل کرتے تھے۔ ان حالات میں میری بیٹی نے تعلیم حاصل کی ہے جی۔ بڑے جملے والی لڑکی ہے“ سہی ہی اس عورت نے قربان جانے والی نظروں سے اپنی کی طرف دیکھا۔ اس لمحے اس کے بھدے سے چہرے پر ماسک کی جو روشنی تھی اس کی وجہ سے وہ مجھے بہت بھلی دکھائی دی۔

اس لمحے اپنی بول اٹھی ”ای! آپ یہ کیا کہتے ہیں کریڈٹ لگیں“ یکدم ہی اس کے لمبے میں بے پناہ شکنجہ سر دور آئی تھی۔ ”چھوڑی صاحب آج پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے ہیں جی“ اس کی ماں سمجھانے سے کہ انداز میں بولی ”معلوم نہیں اور ہاں آگاہ ہوا بھی کریں یا نہیں۔ بڑے لوگ ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس ملاقات میں اچھی طرح تعارف ہو جائے۔ اس کے بعد یہ خریف لائیں یا نہ لائیں یہ ان کی مرضی ہے لیکن شاید یہ کم کو خود زامت یا وہی رکھ لیں۔“

وہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہو گئی ”میں یہ کہہ رہی تھی جی کہ مجھے اپنے بارے میں تو کوئی دعویٰ نہیں کہ میں بڑی باادق خانہ دار ہوں۔ میں تو جی بے غمی پینہ دہی عورت ہوں لیکن اپنی بیٹی کے بارے میں میرا دعویٰ ہے کہ اس کا ذوق بڑا اچھا ہے لیکن جی رقم اسٹوڈنٹ میں ذوق کو کون پوچھتا ہے؟ وہاں کے لوگوں کو تو لڑکوں کے چروں پر رنگ برنگے میک اپ اور جھسوں پر بھڑکیے کڑے اچھے لگتے ہیں جو ہر شیب و فرزا کا بھی ٹھیک ٹھیک پتا دے سکیں۔ اس لئے اپنی وہاں دیکھی ہی بن کر جاتی تھی۔“

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ جی کو آخر ایسی مصیبت ہی کیا پڑی کہ وہ چھوٹے موٹے کرداروں کے لئے یوں دھکے کھاتی بھرتی

تھی؟ لیکن پھر اس سوال کے وسیلہ جواب خودی میرے ذہن میں آگئے۔ یہ بڑی لمبی بحث تھی۔ اور پھر یہ اکیلی اپنی ہی کا مسئلہ نہیں تھا۔ تقریباً ایسے ہی بس منظر کے ساتھ بہت سی ایسی لڑکیاں اسی طرح فلمی دنیا میں ہاتھ پاؤں مارنے آتی تھیں۔

بہر حال وہ ان سب سے کچھ مختلف ضرور تھی۔ جوں جوں اس کی ماں باتیں کر رہی تھی وہ دونوں ماں بیٹی مجھے کسی دلچسپ کہانی کے کردار وار معلوم ہونے لگی تھیں۔ ایسی دلچسپ کہانی کے کردار جس میں کہیں نہ کہیں خود زامت کوئی پراسراریت کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ لیکن وہ کیا تھا؟ یہ میں ابھی نہیں جان پاتا تھا۔ اس بازار والے مکان میں میں نے اپنی کا جو روپ دیکھا تھا وہ بھی حیران کن تھا اور آج جو کچھ بھی میں اس کے متعلق سن رہا تھا وہ بھی میرے لئے کچھ نہ کچھ حیرت کا باعث ضرور تھا۔

اس کی ماں کہہ رہی تھی ”میں آپ سے جب پہلی مرتبہ ملی تو فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کوئی دعوتی اور عام قسم کے سینئر نہیں ہیں۔ اور میں آپ سے بہت علائقہ میں ملی ہوں۔ ہمارا امپریشن آپ پر غلط پڑا ہے۔ اور تب سے ہی میری خواہش تھی کہ آپ سے ایک مرتبہ اور ملاقات ضرور ہو تاکہ ہم کچھ بہتر نظر آنے کی کوشش کر سکیں۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں رہی“ میں نے کہا ”جی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اور جس طرح یہ وہاں مجھے ملی تھی اس سے میری نظر میں اس کا بیچ بالکل بدل گیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس احسان کے جواب میں اپنی کے لئے کچھ کر سکوں۔“

”وہ کوئی احسان نہیں تھا“ اپنی جلدی سے بولی ”وہ آؤسے وقت میں آپ کے کام آنے کی ایک چھوٹی سی کوشش تھی اور وہ میں نے قطعی سوچ سمجھ کر یا منصوبے کے تحت نہیں کی تھی کہ اس کے بدلے میں آپ سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گی۔ اب تو مجھے آپ سے قطعاً کچھ نہیں چاہئے۔ بس آپ کا اتنا ہی کرم کہانی ہوگا کہ کبھی کبھار وقت میرا آئے تو ملے رہے گا۔ آپ مجھے اچھے لگے ہیں اور اچھے لوگوں سے میل ملاقات کی خواہش رکھتا میرا کہلیکس ہے مگر میں اس کہلیکس پر شرمندہ نہیں ہوں۔“

”اچھا خیر۔ فی الحال تو میں اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کروں گا“ اپنی کی ماں اس دوران مجھے کچھ نہ کچھ کھلانے پر تکی ہوئی تھی۔ اس کی قاصر کوششوں کو ناکام بنانے کے بعد میں نے گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا ”جی! اور اصل میں جہیں یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ تمہاری کار تو اس رات کی بیگانہ بازی میں چاہ ہو گئی۔ میں تم سے مستعار لی ہوئی اس چیز کی حفاظت نہیں کر سکا۔“

”مجھے معلوم ہے کہ وہ تھوہو چکی ہے“ اپنی اطمینان سے بولی۔ اس کے چہرے پر آنسو یا پچھتاوے کی کوئی علامت نہیں تھی

جس سے اندازہ ہو تاکہ اسے ایک چھوٹا سا اور منگنی چیز کے شائع ہونے کا احساس ہو رہا ہے حالانکہ میرا تجربہ تھا اور سنا بھی یہی تھا کہ اس قسم کی عورتیں اپنا مالی نقصان برداشت نہیں کرتیں وہ تو خود دوسروں سے اس قسم کی منگنی چیزیں مختلفا حاصل کرنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ ظاہر ہے ایسی کسی چیز کا شائع ہو جانے کے لئے شہرہ مندے کا باعث ہوتا ہے۔ میری حیثیت دیکھتے ہوئے بتی کو ان کے یقین بھی تھا کہ میں اس کی غلطی کروں گا تب بھی کم از کم سرور سے ہی کوئی تلافی ظاہر نہ کرنے کے لئے بھی خاص حوصلے کی ضرورت تھی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ تباہ ہو چکی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہائی وے سے گزرتے وقت کسی پولیس پارٹی نے اسے دیکھ لیا تھا اور فورسپرینٹ دیکھ کر لاہور پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کی رپورٹ میں میرے ہی نام تھی۔ حالانکہ گھر میں جو دوسری دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ان کی رجسٹریشن میرے نام پر نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح پولیس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے کہہ دیا کہ ہماری وہ گاڑی تین چار روز سے شاہی بازار والے مکان پر ہی کھڑی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ وہاں کیسے پہنچی جہاں پولیس نے اسے دیکھا تھا۔ ممکن ہے کوئی چراکے لے گیا ہو۔ مجھے چونکہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ چوری ہو چکی ہے اس لئے میں رپورٹ بھی درج نہیں کرا سکی۔ اس علاقے میں رات کو چونکہ کوئی پراسرار سی گزیر رہی ہو چکی تھی۔ اس لئے پولیس کو میرے بیان پر یقین کرنا ہی پڑا۔“

”گھڑ۔“ میں نے غماز سے کہا ”جس بات کو سمجھا لیا آتا ہے“ پھر میں نے اٹھنے کے لئے برتو لے کر کہا ”تم ذرا آگے بڑھنے کے لئے میرے ساتھ چل گئی ہو؟“

بتی کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کی ماں بول اٹھی۔ ”اے آپ کے ساتھ جانے سے کیا انکار ہو سکتا ہے بیٹی! یہ تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھے گی۔ لیکن آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔“

بہتکل تمام میں بتی کی ماں کو اس بات پر آمادہ کر سکا کہ میں پھر کسی وقت ان کے ہاں کھانا کھاؤں گا۔ فی الحال وہ مجھے جانے دینے کی بجائے دو بجے ایک ہوٹل میں میری ایک کاروباری ملاقات ملے۔

بتی اٹھ کر اپنے سر پا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”میلے کو تو میں اسی میلے میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں لیکن شاید آپ کو شرم آئے اس لئے میں اپنا میلہ تمہارا سادہ دست کر آئی ہوں“ وہ مسکرائی اور خیم عری کے جوئے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ وہ چلتی تھی تو اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں رقصاؤں والی مخصوص جگ تھی۔

اس کے جانے کے بعد اس کی ماں مجھ سے اوپر اوپر کی

جاتی کرتی رہی اور یہ محسوس کرتے ہوئے مجھے خفیہ سی حرکت ہوئی کہ اس نے میرے کا دربار میری دوڑتندی کے متعلق مجھے کرپنے کی تلقین کو شش نہیں کی جبکہ اس قسم کی عورتوں کی زیادہ دلچسپی انہی باتوں میں ہوتی ہے۔ نہ ہی اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں بتی کو اپنے ساتھ کہاں لے جا رہا ہوں اور نہ ہی اس نے یہ اندازہ لگانے کے لئے کہا پھر اگر کوئی سوال کیا کہ میں بتی کو کسی فلم میں کاسٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یا نہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے اس مرتبہ وہ عورت مجھے بہت مختلف اور بہت بڑبڑا ہوتی۔ بانی دلوں کے بھید تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم کتنے ہی مومن شناس بن جائیں لیکن بھر مکی ہر انسان کی نہ کو پہنچ جانے کا کوئی نہیں کر سکتے۔

بتی چند ہی منٹ میں تیار ہو کر آئی۔ اس نے غماز سے جدید تراش خراش کا اور بابائی کیونو کی طرز کا لباس پہنا تھا۔ بال غماز سے برش کر کے اس نے سیدھے ساوے انداز میں جوڑا بایا تھا اور بہت ہلکے شاکانہ میک اپ کیا تھا۔ اب اس کی شخصیت میں ذرا بھی ستے پن کی جھلک نہیں تھی۔ وہ اچھے طبقے کی، عالمی بولی اور باڈی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ اس لڑکی سے بہت مختلف قسم میں نے شوٹنگ کے موقع پر دیکھا تھا۔

ہم تینوں باہر آئے۔ بتی کی ماں کا نام اب مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ خورشید جہاں کھاتی تھی۔ مجھے یاد پڑا تھا کہ اس نام کی شاید انڈیا میں کوئی مشہور ایکٹریس بھی گزری تھی۔ خورشید جہاں نے برآمدہ میں ہی رک کر ہمیں خدا حافظہ کہا۔ آج تو وہ گویا مجھے خاص حد تک حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس قسم کی عورتیں اس وقت تک اپنی بیٹیوں کو کسی مرد کے ساتھ ایک لمبے کے لئے بھی ایسا نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں جب تک کسی قسم کی کوئی سودے بازی نہ مکمل ہو جائے۔ لیکن اس نے تو گویا اس پہلی قدرے باقاعدہ ملاقات میں ہی آنکھیں بند کر کے مجھ پر بھروسہ کر لیا تھا۔

بتی میری گاڑی میں میرے برا آئینے اور گویا خورشید کا ایک جھونکا میرے پہلو میں سٹ آیا۔ خورشید جہاں نے ہاتھ لاکر ہمیں خدا حافظہ کہا اور میں گاڑی دیوڑس کر کے باہر لے آیا۔ پھر میرے بے آواز آئینے والی گاڑی کیبرک کی سڑکوں پر چلنے لگی۔ کبھی کبھی میں گردن موڑ کر ایک نظر بتی کی طرف دیکھ لیتا اور وہ بے سنی سے انداز میں مسکرا دیتی۔ اس نے اب بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

آخر کار کچھ دیر کے سفر کے بعد میں نے کاروں کے ایک بہت بڑے شوروم کے قریب گاڑی لے باروکی۔ اندر جانے کے لئے تو راستہ ہی نہیں تھا۔ شوروم کی گاڑیاں فٹ پاتھ تک پہنچ چکی ہوئی تھیں۔

بتی گویا چونک کر بولی ”یہاں آپ کس لئے آئے ہیں؟“

حسن بن صباح

☆ شہنشاہ حبش اور ابلیس وقت

جو چھتیس (36) سال تک قلعہ الموت میں ایک نظر فریب جنت ارضی بنا کر بیٹھا رہا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے جید علماء کرام اور محدثین، مفسرین، مقررین اور ارکان سلطنت کے خون سے ہولی کھیلتا رہا۔۔۔۔۔ مسلمان دایان ریاست اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔۔۔۔۔

ایسی ساحر اور مژند کی رنگین اور خوفناک داستان
الماس ایم۔ اے کے سحر انگیز قلم سے۔۔۔۔۔

ناشر: مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2 قیمت: -/125 روپے

برصغیر کا سپوت۔۔۔۔۔ آزادی کا متوالا

مسلمانان ہند کا رکھوالا۔۔۔۔۔

شہید سلطان ٹیپو

جس کی دہشت سے انگریز سوتے سے جاگ پڑتے تھے
اور انگریز بچے سلطان ٹیپو کا نام سن کر چپ ہو جاتے تھے۔

☆ ایک بہادر

☆ ایک مجاہد

☆ ایک شہید

ایک ناول۔۔۔۔۔ ایک تاریخ

الماس ایم۔ اے کے ایمان افروز قلم سے۔۔۔۔۔ قیمت: -/200 روپے

دوستوں میں شاساں میں شمار کرنا شروع کر دوں؟ کیا میں اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل سمجھنے لگوں؟

"پرائمری اسکول کے زمانے میں تم نے تو عمارت میں رہا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اے فرزند انڈیا اڑا سے فریڈ ان ڈیڈ۔ دوست وہی ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے۔ تم ضرورت کے وقت میرے کام آئی ہو" اب اپنے آپ کو میری دوست شمار کرنے کے سلسلے میں اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" مجھے اس بات پر بھی قدرے حیرت تھی کہ جتنی اور اس کی ماں دونوں ہی میرے سامنے اس قدر اگسٹاری کا اظہار کیوں کرتی تھیں؟ یہ تو ٹھیک تھا کہ میں معاشرے میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہو چکا تھا لیکن اب ابھی ایسی نہیں تھا کہ جتنی جیسی لڑکیوں کے لئے میری ایک سائنسی جنٹیل اہم بھی ایک اعزاز ہوتی۔ اس کی ماں جیسی گھاگ عورتیں اگر ایسا محسوس ہی کرتی ہیں تو اس کا برا اظہار نہیں کرتیں۔

وہ اب بھی حمزہ کی نظروں سے میری طرف دیکھے جارہی تھی۔

"اس میں اتنی بے چینی کی کیا بات ہے؟" آخر کار میں نے پوچھا۔

"مجھے دراصل اپنی حقیقت کا احساس ہے" وہ نظریں جھکا کر ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے بولی "آپ کے طبقے کے لوگ ہم جیسی لڑکیوں کو داشت بنانے کی بات تو کر سکتے ہیں لیکن دوست بنانے کی بات میں نے پہلی بار سنی ہے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے منہ سے جو مجھے عام دولت مندوں سے بہت مختلف اور بہت بلند نظر محسوس ہوا تھا۔ مجھے اس اعزاز کی توقع نہیں تھی... اور جہاں تک ضرورت کے وقت کام کرنے کی بات سے تو اس کا دور حقیقت ابھی تو کوئی سو قریب ہی نہیں آیا لیکن اگر واقعی کبھی صحیح معنوں میں ایسا کوئی مرحلہ آیا تو شاید میں جانے گزر جانے میں بھی قطعاً تاخیر نہ کر دوں۔ لیکن یہ باتیں محض گفتگوں میں شاید کچھ اچھی نہیں لگتیں" وہ جیسے خود ہی اپنے الفاظ پر کچھ ناموس ہو گئی۔

اس کی باتوں نے میری رنگ و پے میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا۔ میرا دل جو بہت کم ہی کسی بات سے متاثر ہوتا تھا، اب اس کے لیے میں یقیناً اس کا غلوس شامل تھا اور غلوس بڑا جادو اثر چڑھ ہے۔ ایک پہل میں آپ کے وہ نہیں مدد نہیں ملتا سرائیت کر جاتا ہے۔ یہ جو دن رات بڑے بڑے لوگ آپ کے سامنے لمبی چوڑی تقریریں کرتے رہتے ہیں، ان کے نہ جانے کتنے لمبے چوڑے پیشہ ور اسٹاف نے انہیں گلے کر دی ہوئی ہے۔ اسی لئے یہ تقریریں آپ پر اثر نہیں کرتیں، آپ کو ابھی نہیں لگتیں کہ ان میں کسی کا بھی غلوس شامل نہیں ہوتا۔ نہ کہ اگر

"میں چاہتا ہوں تم یہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کوئی بھی پسند کرلو۔ وہ تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔ بلکہ اگر تمہیں کوئی اور گاڑی پسند ہو لیکن وہ اس وقت یہاں موجود نہ ہو" اس کا نام اور مال و غیرہ شرمندہ والوں کو لکھوا دو۔ چند دن کے اندر اندر ہمیں وہی گاڑی مل جائے گی۔ قیمت کا قطعاً کوئی خیال نہ کرنا" میں نے ٹھمرے ٹھمرے لیے میں کرنا۔

وہ چند لمبے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ حقیقتاً اسے میری بات سے خوشی نہیں ہوئی۔ آخر کار وہ مجروح سے لیے میں بولی "میں نے اگر آڑے وقت میں آپ کو وہ حتمی گاڑی دی تھی اور وہ تیار ہو گئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کا بدلہ ضرور اتارنے کی کوشش کریں۔ میرے لئے تو بس یہی خوشی کافی ہے کہ آپ اس خطرناک صورت حال سے بچتے نکل آئے۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ آپ کی پیشکش سے مجھے خوش ہوئی ہوگی لیکن میں آپ کو بچ بتا رہی ہوں، مجھے قطعاً خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ لیکن اگر آپ اسے احسان ہی سمجھتے ہیں تو اسے برقرار رہنے دیجئے۔"

"اگر تم کوئی گاڑی پسند کر لو گئی تو احسان اس کے بعد بھی برقرار رہے گا۔ مجھے تمہارے غلوس میں کوئی شبہ نہیں لیکن میرا نظریہ یہی ہے کہ میری وجہ سے اگر کسی کا کوئی نقصان ہو تو اس کی تلافی ضرور ہونی چاہئے" میں نے غصہ سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ کوئی نقصان نہیں تھا" وہ حتمی سے بولی "ایک گاڑی کے ہونے یا نہ ہونے سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی وہ تمہارے لئے فالتوی تھی۔ آپ نے دیکھا ہی ہو گا کہ گھر پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں اور امی عمو ایک ہی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔ رشتے کے ایک ماموں تمہارے ہاں رہتے ہیں۔ دوسری گاڑی کبھی کبھار ان کے استعمال میں رہتی ہے۔ نہیں تیسری گاڑی نہ ہونے سے... ایک لمحے کے لئے بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اور اگر ضرورت پڑی بھی تو میں خود خرید لوں گی۔ آپ سے مجھے گاڑی نہیں چاہئے" اس کے کہنے میں شدت کا آثار تھا اور اس میں تسخیر نہیں تھا۔

"تمہارا انکار اب میرے دل کو مجروح کرنے لگا ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا "تم اس گاڑی کے بدلے نہ سہی... بس میری جانب سے ایک نشانی، ایک ختمہ سمجھ کر کوئی گاڑی قبول کرلو۔ ہماری اس شاساں اس دوستی کے نطفہ آنا پر ایک نیک شگون کے طور پر کچھ تو دینا چاہئے۔"

ایک لمحے کے لئے اس نے بغور میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں نمی پھٹک آنے کو بے تاب ہو۔ پھر اس کے ہونٹ کپکپائے "کیا میں واقعی اپنے آپ کو آپ کے

دینے والوں کا اور نہ ہی بولنے والوں کا۔ غلوں نیت شامل ہو تو دو لفظ ہی بدل کی گایا پلٹ دیتے ہیں۔

”میں تمہارے خوب صورت جذبات کے لئے تمہارا بہت شکر گزار ہوں ہنسی“ میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا ”آؤ۔۔۔ میری طرف سے غلوں کی نشانی کے طور پر کوئی گاڑی پھندہ کرلو۔ اب انکار نہ کرنا۔“

”اگر آپ مصر میں تو کوئی چھوٹی سی۔۔۔ کم قیمت کی گاڑی دلا دیجئے۔ نشانی اور تحفہ تو معمولی سا بھی ہو تو انمول ہوتا ہے“ اس کے لیے میں اب بھی گریز تھا۔

”لیکن تحفہ لینے والے اور دینے والے دونوں ہی کے شایان شان بھی تو ہونا چاہئے“ میں نے کہا ”پلو خیر۔۔۔ یہ بحث چھوڑو اب میں خود ہی کوئی گاڑی منتخب کروں گا اور تمہیں اس پر کوئی اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔“

میں فیصلہ کن انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھا کر گاڑی سے اتر آیا۔ ہم ایک ساتھ شوروم کے آفس میں داخل ہوئے۔ چھوٹے سے دفتر میں کئی آدمی بیٹھے تھے۔ سووے بازیاں اور بحث و مباحثہ جاری تھا۔ ہمارے دہان چپختے ہی جانے کیوں خاموشی سی چھا گئی۔ شوروم کا مالک احمد بھی دفتر میں موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور گرم دوپٹے سے مصافحہ کرنے لگا۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ہم نے اپنی کینوں اور ذاتی ضروریات کے لئے زیادہ تر گزائیاں اسی کے شوروم کے توسط سے خریدی تھیں۔ اسی دوران دو ایک آدمی گویا بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے باہر چلے گئے تاہم دو آدمی ہیں موجود رہے۔ میں نے ان کی طرف دیکھتے کی زحمت نہیں کی۔

ہم بیٹھ چکے تو احمد انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے بولا ”کیا چاہنا ہے زبانی نہیں کے؟“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔“ میں نے ہنسنے سے کچھ مٹکانے سے باز رکھا اور اصل موضوع پر آیا۔ اس وقت تک میں فیصلہ کرچکا تھا کہ مجھے ہنسی کے لئے کوئی سی گاڑی لینا ہے۔ میں نے اس کا نام اور ماڈل بتاتے ہوئے احمد سے پوچھا ”اس وقت اس کی کیا قیمت ہوگی؟“

احمد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اپنی انتہائی سے لیے میں بول اٹھی ”دو قیمت مہنگی ہوگی۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔۔۔“

وہ بے چاری اپنی دانست میں غلوں سے مجبور ہو کر بولی تھی۔ وہ میری زیادہ دہم فوج کرانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے اس وقت اس کا بالواسطہ ضروری محسوس ہوا۔ میں نے تنہا غلوں سے اس کی طرف دیکھا اور دھیسے لیے میں کہا ”یہ طے ہوچکا تھا کہ اب اس معاملے میں تم نہیں بولو گے۔“

”اوہ۔۔۔ سو رہی۔۔۔ میں بھول گئی تھی“ وہ حقیقتاً شرمساری سے بولی اور ہاں خاموش ہو گئی گویا اب اس کا ایک نمونہ تک

ہوتے پلانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

احمد نے مجھے گاڑی کی قیمت بتائی۔ میں نے بریف کیس سے چیک نکال کر چیک لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہنسی کے گھر کا پتا مجھے یاد ہی یاد ہو چکا تھا۔ ایک چٹ پر وہ ایڈریس لکھتے ہوئے میں نے احمد سے کہا ”گاڑی کی ابتدائی رجسٹریشن وغیرہ اس نام سے کروا کر اس ایڈریس پر بھیج دینا۔“

”پرسوں پہنچ جائے گی سر“ احمد نے چٹ لے کر حفاظت سے دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔

”میں شیڈ سے نکل کر بھیجواؤں گا۔ یہاں تو ایک ہی پیرس موجود ہے۔ ٹکر کے بارے میں کیا حکم ہے سر؟“

”ٹھیک ٹھیک۔“ میں نے ہنسی سے پوچھتے بغیر گویا عمل اپنی مرضی چلاتے ہوئے کہا۔

احمد نے ایک لمبے کے لئے ہینڈل سے سر کھینچتے ہوئے گویا ذہن پر زور دیا پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہے سر اس ٹکر کا بھی ایک پیرس موجود ہے۔“

میں اٹھنے کے ارادے سے بریف کیس بند کر رہا تھا کہ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے ٹھنکار کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”سر! گستاخی صاف۔۔۔ اگر آپ جلدی میں نہیں ہیں تو ایک آدھ منٹ کے لئے ہمیں بھی بھگلائی کا شرف عطایت فرمائیے۔“

میں نے سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑا ڈبلا ایک سا قزاق سا ذرا بڑا تھا۔ جس کی بتلی پٹلی مونچھیں بے وقوفانہ سے انداز میں نیچے کو لٹکی ہوئی تھیں لیکن اس کی بیٹھنی جھوٹی آنکھوں میں قدرے شاطراتانہ چمک تھی۔ وہ سفید عرقبہ شکن آنکھوں قیص پر عنابی سوئیر پہنے ہوئے تھا۔ ساتھ پرانے فیشن کی سیاہ ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گویا منکرانہ مزاح کے اظہار کے لئے مسکرایا۔ اس کے دانتوں پر اپاں خوری اور چائے و سگریٹ نوشی کی وجہ سے مختلف رنگوں کی نیس جھی ہوئی تھیں۔ سفیدی ذرا آلم ہی تھی۔

میں نے نہایت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا استخوانی سا ہاتھ تھام لیا اور وہی سامصافحہ کرنے کے بعد کہا ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”پہچانیں گے کیسے چہ پوری صاحب! جبکہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے“ اس نے شاید خرد اعتمادی کے اظہار کے لئے یا پھر شاید اپنی بات میں مزاح کا کوئی پہلو محسوس کرتے ہوئے ہلکا سا تشدد کیا۔

”میں بدستور ایک تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بات کرتے وقت زور ہے لیکن اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہے۔ جلدی سے سگریٹ کا کش لگا کر وہ بولا۔۔۔ ہم جیسے غریب غریاء اور گناہم سے لوگوں کو تعارف

کچھ اکڑا اکڑا سا ہوا۔ ”خود تو وہ ہم سے کچھ تھوڑے بہت اخلاق سے مل لیتے تھے جب سے انہیں آپ کی سرپرستی حاصل ہوئی ہے جب سے خود ہمیں تمہاری نہیں والے اور نہ ہی ہمارا اخبار ان کی نظر میں چلتا ہے۔“

”میں ان سے آپ کی سفارش کروں گا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے برادر کم میرے کاروبار میں بیسیوں شعبے ہیں اور کسی نہ کسی شخص کو میں نے وہ شعبہ سونپا ہوا ہے۔ وہی اس کے ساتھ ہونا چاہیے۔ میں بزنس کا اصل مالک ہونے کے باوجود اکثر ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ وہ اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوتے ہیں۔ بہر حال... آپ ایک بار پھر آفاق سے مل لیجئے گا۔ میرا حوالہ دیجئے گا۔ شاید وہ از سر نو آپ کی بات پر غور کرے۔“

”بہتر ہے۔ آپ کہتے ہیں تو میں آج ہی ان سے مل لوں گا۔“

وہ ایک مڑے تڑے سے چمک سے نئی سگریٹ نکالتے ہوئے ہوا۔ اس کے لیے میں اب پہلا سا جوش و خروش نہیں رہا تھا۔ شاید آفاق نے کبھی اس کی بہت افزائی یا اس کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا اور اگر آفاق نے اسے درخشاں نہیں سمجھا تھا تو یہی وجہ اس کا مل رہا نہیں ہوگا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ ہی تیزی سے اُٹھی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ابھد سے رکھی“ اودھائی جلوں کے تھولے کے ہند ہم باہر آگئے اور جی نے گویا سکون کی سانس لی۔

”شکر ہے اس نے مجھے پہچانا نہیں“ وہ مطمئن لہجے میں بولی

”یا شاید آپ کی موجودگی کی وجہ سے اس نے مجھے مخاطب نہیں

کے بغیر کون پہچانتا ہے جناب ایہ تو آپ جیسے بڑے لوگ ہوتے ہیں جنہیں لوگ غائبانہ طور پر بھی جانتے ہیں اور کبھی کبھی دور سے دیکھ کر سرگرمیوں میں ایک دوسرے کو جانتے ہیں وہ دیکھو سیدھے لمحہ افضل چن بڑی صاحب جا رہے ہیں۔“

میں نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے برابر بیٹھی ہوئی بتی شاید کچھ مضطرب تھی۔

نودان کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا ”سر! خاکسار کو رحمت علی رشک کہتے ہیں اور میں ہفت روزہ ”علم نگر“ کا نمائندہ خصوصی ہوں۔ خاصی بڑی اشاعت کا ہفت روزہ ہے۔ خاص طور پر فلمی دنیا میں اور فلم کے شائقین میں بڑی دلچسپی سے چرچا جاتا ہے۔ شاید کبھی آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ ہمارا کاروباری نمائندہ بڑی باقاعدگی سے آپ کے اسٹوڈیو والے آفس میں اس کی دو کاپیاں پہنچاتا ہے۔“

”میں مسرت خواہ ہوں... اور شاید یہ میری بد نصیبی ہے کہ آپ کا ہفت روزہ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا“ میں نے ملاقت سے کہا ”میں اسٹوڈیو والے آفس میں کم ہی جاتا ہوں اور جب جاتا ہوں تو بہت سے دوسرے کام ہوتے ہیں۔“

”میرا بھی یہی اندازہ ہے سر“ وہ جلدی سے بولا ”اسی لئے میں بذات خود کئی بار آپ کے دوسرے آفس بھی حاضر ہوا لیکن آپ سے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ آپ... اب کسی نہ کسی انداز میں فلمی دنیا میں داخل ہوئی چکے ہیں تو ہم بھی اپنے ہفت روزے کو آپ سے متعارف کرا سکیں...“ پھر اس نے کھٹکار کر دوبارہ گھا صاف کیا گویا گفتگو کے اہم حصے کی طرف آنے لگا ہو ”آپ کی پروڈکشن بھی زور و شور سے جاری ہیں۔ تو ہم چاہ رہے تھے کہ آپ کی فلموں کے اشتہارات کا بھی کچھ سلسلہ بن جائے۔ ہمارے ہفت روزے کے لئے اشتہارات دے کر آپ بہت فائدہ میں رہیں گے سر! ہم آپ کی فلموں پر ایجنے قسم کے تمبرے بھی ساتھ ساتھ شائع کرتے رہیں گے۔“

”آپ کی اس غلطانہ پیشکش کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں برادر دم رحمت علی رشک صاحب!“ میں نے ملاقت سے کہا۔ ”لیکن اس معاملے میں براہ راست مجھ سے معاملات کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ خاص معلومات نہیں۔ میں نے آفاق صاحب کو اس شعبے کا مختار مقرر کیا ہوا ہے۔ وہ اس ضمن میں جو مناسب سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔ میرے پاس ان معاملات کے لئے وقت نہیں ہے۔ آپ انہی سے رابطہ رکھئے۔ وہ اگر آپ کی تجویز کو فائدہ مند سمجھیں گے تو ضرور آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔“

”ان سے تو ہم ملنے ہی رہتے ہیں سر“ اس کا لہجہ یک لخت

بغداد کی رات

قمر اجٹالوی

الف لیلیٰ کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات، وجہ اور غزل کے دامنوں میں لپٹی ہوئی رات، جسے بے شمار کہیوں کے حوالوں سے آراستہ کیا گیا ہے

600/

1200 سے زائد صفحات

ماہنامہ الفریش

اور مولانا لکھنوی

عقب میں سوڑ پر نمودار ہوئی تو ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

عقب نما آئینے میں عکس بے شک بہت چھوٹا نظر آتا تھا لیکن پچھلی گاڑی کے ڈرائیور کو ہر حال اب میں پہچان سکتا تھا اور اسے پہچان کر میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ٹہلی تھا۔ گاڑی بھی اپنی ہی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ شیر شیخ نے میری عمرانی اور حفاظت کے سلسلے میں اس کی ڈیوٹی لگادی تھی یا پھر اس نے خود اپنے طور پر یہ فریضہ سنبھال لیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی اور نہ ہی ایسی کوئی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ ان لوگوں کی اپنی ہی مستعدی یا پھر مجھ سے محبت کی علامت تھی۔

میں نے اس سلسلے میں ٹوٹی کو کچھ کما مناسب نہیں سمجھا اور ایکسپلرٹر دیا۔ میری گاڑی کسی طیارے کے ٹیک آف کرنے کے سے انداز میں تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میرے ساتھیوں کو یقیناً اب بھی مجھ سے بے پروائی کا ہی اندیشہ تھا لیکن میں اب اتنا بے پروا بھی نہیں رہا تھا۔ میری ذاتی اٹلیجنس سروس کی اطلاعات کے مطابق قیصر ملک ابھی تک شرادہ میں قید تھا تاہم اس کا اسٹریو دالا آؤس باقاعدگی سے کھل رہا تھا اور اس کے باپ کے زمانے سے قتلوں کے جو شیڈول چل رہے تھے انہی کے مطابق شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ہر حال شرمش قیصر ملک کے موجود نہ ہونے کے باوجود میں نے احتیاطی تدابیر شروع کر دی تھیں۔

میری گاڑی میں ڈیش بورڈ کے نیچے ایک خصوصی خانے میں ایک بہترین قسم کا مشین موجود رہتا تھا۔ جس کی مار بہت دور تک تھی۔ میرے کوٹ کی اندر کی جیب میں ایک پٹا ہسٹل اور دو سری جیب میں مختصر سائینسز موجود رہتا تھا۔ ہڈی کے ساتھ ایک مخصوص سافٹ کی ٹیام میں نہایت بڑا دو دھاری خنجر بندھا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ میری جیب میں نکالوں کی ایک نہایت باریک ڈوری موجود رہتی تھی جس کے دونوں سروں پر بھاری دھات کے دو موٹے موٹے چھلے بندھے ہوئے تھے۔ میرے لئے یہ بڑے کام کی چیز تھی اور اس سے میں بڑے خطرناک قسم کے کرب دیکھا سکتا تھا۔ ان تین چار چیزوں کی موجودگی میں میں اپنے آپ کو کسی بہت بڑے اور پیشہ ور بد معاشرین پر مشتمل گروہ کے مقابلے کے لئے بھی تیار رہتا تھا۔

اس کے بعد میرے ہندوں بے حد مصروفیت میں گزرے۔ اس دوران مجھے کراچی بھی جانا پڑا جہاں میرے ہوٹل کی تعمیر کے سلسلے میں مختلف کاموں کے لئے شہرت یافتہ کمپنیوں سے فیڈر طلب کیے جا چکے تھے اور مجھے کچھ خصوصی مسائل کے سلسلے میں ان میں سے چند کمپنیوں کے نمائندوں سے انگریز کرنا تھے۔ کراچی کے اس ہنگامی دورے سے واپس آکر مجھے دو دن کے لئے

کیا دہشتہ بہت بڑا کرتا۔

”تم بچے ہو اس سے؟“ میں نے پوچھا۔

”جیہاں میری پہلی قسم رہا ہے وہی جیہاں میں ہر طرف ایک بے ہنگم سا رقص شامل تھا، ان دنوں اخباروں، رسالوں میں میرے خاصے انٹرویو چھپے تھے۔ یہ بھی انہی دنوں انٹرویو لینے گھر آیا تھا اور انٹرویو چھاپنے کے بعد بھی آتا رہا، کھل ہوتا تھا بہت بڑا کرتا تھا۔ آخر کار میں نے ہمارے کر کے اس سے کڑوا شروع کر دیا۔ کافی پرانی بات ہو گئی۔ میں نے تو اسے پہچان ہی نہیں تھا۔ جب اس نے یوں شروع کیا تب میں نے اسے پہچان لیا۔ اتنے عرصے میں اس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی۔“

”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہر شخص میں نہیں آتیں“ میں نے کہا اور پھر موضوع بدل دیا ”میں نے جو گاڑی تمہارے لئے پسند کی ہے، تمہاری دیکھی ہوئی ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تمہیں پسند ہے نا؟ میں نے پوچھا۔

”اگر بات دوستی اور شہی کی آگئی ہے تو آپ اگر گلدھا گاڑی بھی لے دیتے تو وہ بھی مجھے روڈ رائس سے زیادہ عزیز ہوتی۔ وہ مسکراتے ہوئے ہوئی۔

میں نے اسے اس کے گھر پر اندازاً دو سو ترقی فکروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”آپ اندر نہیں آئیں گے، کچھ دیر تمہیں گئے نہیں؟“

”اس وقت نہیں۔۔۔ پھر کبھی سی“ میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور گاڑی ریورس کر کے باہر نکالی۔ گیٹ بند ہونے تک وہ مجھے برآمدے ہی میں کھڑی اور ایک تک باہر کی طرف دیکھتی نظر آئی۔

میں گلیوں سے نکل کر میں بلڈ رڈ پر آیا تو نہ جانے کیونکر مجھے احساس ہوا کہ سفید رنگ کی ایک گاڑی خاصا مناسب فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آ رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی یوں ہی دو ایک مرتبہ سرسری سے انداز میں نظر نہ پڑنے پر ذہن کے کسی گوشے میں خفیہ سا احساس ابھرا تھا کہ میرا مقابلہ ہو رہا ہے لیکن اس وقت میرے عقب میں کئی گاڑیاں تھیں اس لئے میں واضح طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا اور پھر سفید رنگ تو بہت عام ہے۔

لیکن اس وقت میرے پیچھے وہ ایک سی گاڑی تھی اور فاصلہ کو کہ خاصا تھا لیکن میری نامعلوم حس مجھے بتا رہی تھی کہ وہ میرے ہی مقابلہ میں ہے۔ میں نے رفتار کم کی تو اس کی رفتار بھی کم ہو گئی اور یوں فاصلہ برقرار رہا۔ میں عقب نما آئینے میں اس کے ڈرائیور کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلے نوادے سے موڑ مڑنے کے بعد میں نے گاڑی دو تین سیکنڈ کے لئے روک دی لی اور جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سفید گاڑی بھی موڑ تک پہنچ چکی ہوگی تو میں نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب وہ گاڑی میرے

اسلام آباد جانا پڑا۔

ان کا سوں سے ذرا فرصت پا کر میں اس دن معمولات بحال ہونے پر آفس پہنچا۔ چند ایک ضروری ٹیلیفون کالز سے فارغ ہونے کے بعد میں گزشتہ روز کی ڈاک دیکھنے لگا۔ میری ذاتی ڈاک میں ایک رنگ پرٹکا سا بڑا شہدہ اخبار بھی موجود تھا۔ پہلے تو میں اسے کھول کر دیکھنے بغیر ہی ایک طرف رکھنے لگا تھا لیکن پھر اس کے نام پر نظر مرکزی "مقام ٹائمز" مجھے یاد آیا کہ اس ہفت روزے کے حوالے سے ایک صاحب چند دن پہلے مجھے اتفاقاً کاروں کے شہود میں ملے تھے۔

میں نے یوں ہی غم تو جی سے اخبار کھولا تو ایک صفحے پر ہن کے ذریعے ایک پمپل سی چٹ منسلک نظر آئی۔ شاید میری توجہ مبذول کرانے کے لئے اس صفحے پر خصوصی طور پر فلیک لگایا گیا تھا۔ میں نے وہ صفحہ کھول کر نظر دوڑائی تو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس صفحے پر فلیک کیوں لگایا گیا تھا۔

اس صفحے پر عین کالی اور خاصی جلی سرخی کے ساتھ میرے بارے میں خبر چھپی ہوئی تھی اور اس کی طرف بھی توجہ دلانے کے لئے سرخ قلم سے حاشیہ لگایا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت علی رنگ نے بذات خود اخبار مجھے بھیجنے کے لئے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ سرخی تھی:

"ملک کے ممتاز صنعت کار اور تاجر محمد افضل چوہدری نے قلمی دنیا کی تیسرے درجے کی ناکام رقاصہ ہنی کو نئی پیش قیمت کار لے لی۔"

بچے خوب لنگ مرتج لگا کر اس واقعے کو بیان کیا گیا تھا کہ بچلے دنوں کس طرح سیٹھ محمد افضل چوہدری صاحب ناکام اور بدنام رقاصہ ہنی کے ساتھ کاروں کے ایک بڑے شہود میں آئے اور انہوں نے بازو ادا دکھائی ہوئی ہنی کو بڑے بارے ایک پیش قیمت کار خرید کر دی۔ شہود میں ہونے والے تیسرے اور ہنی کے محض دو تین مکالموں کو بنیاد بنا کر خبر کو طول دینے کی حتی الامکان کوشش کی گئی تھی۔ تاثر کچھ ایسا ہی ملتا تھا جیسے میں کوئی بڑا عیاش سا آدمی ہوں۔

انتہائی گھبرورے الفاظ کے ذریعے ہنی کی کھجائی کرنے کی بھی چوری کوشش کی گئی تھی۔ قلمی غیر ضروری طور پر خبر میں یہ حوالہ بھی گھونسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ واضح رہے کہ رقاصہ ہنی کا شاہی بازار سے پرانا خاندانی تعلق رہا ہے اور اس نے خود بھی خاصا عرصہ وہاں گزارا ہے۔

خبر پڑھ کر ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی کہنیوں میں ہلکی سی چٹ محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی میں پرتکون ہو گیا تاہم ایک خفیہ سی حیرت برقرار رہی کہ میں تو حتی الامکان معقولیت سے رحمت علی رنگ کے ملا تھا لیکن اس نے یہ تکلیف دو سا انداز کیوں اختیار کیا تھا؟ کیا اس کے خیال میں یہ مجھ پر یاد دلانے کا

طریقہ تھا؟ اور مجھے قریب سے جانے بغیر کیا اس بے وقوف / امید تھی کہ میں اس قسم کے دباؤ میں آجاؤں گا؟ یا پھر بس اسے محض سنسنی خیز خبروں سے اپنے اخبار کا پیٹ بھرنا ہوا تھا؟ خواہ وہ خبریں کہیں سے بھی ملیں، کسی بھی ذریعے سے ملیں، خواہ کتنی ہی غیر معتد ہوں اور خواہ ان میں کتنا ہی مرج مسالہ لگا کر پڑے؟ مجھے یہ غور و خوض قطعی بیکار محسوس ہوا۔ میں نے اخبار بھاڑ کر روزی کی نوکری میں بیگ بکھ دیا اور باقی ڈاک دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں اس بات کو بالکل بھول گیا۔

لیکن لوگ شاید نہیں چاہتے تھے کہ میں اس بات کو بھولوں... تقریباً ایک مہینے بعد اتفاقاً کاغذ "سرا" آپ کو ڈاک میں ہفت روزہ قلم گھر تو نہیں ملا؟ اس نے سرسری سے پہلے میں پوچھا۔

"ملا ہے" میں نے سرسری سے ہی لمبے میں جواب دیا۔ "مجھے یہی توقع تھی" اس نے ہکا ساقفہ لگایا "اس شخص کا طریقہ ادارات یہی ہے۔"

"میں تو اس سے خاصے دوستانہ انداز میں ملا تھا اور میں نے اسے ایک بار پھر تم سے ملنے کی بدایت کی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے تم نے اس بار بھی اسے گھاس نہیں ڈالی جس کی غار اس نے مجھ پر نکالی ہے" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"گھاس تو ہم اسے ڈالتے رہے ہیں سرا! لیکن شاید اپنی نہیں ڈالتے جتنی وہ چاہتا ہے" اتفاقاً "میں اسے خاصے مرے سے جانتا ہوں سرا! اس کے اخبار کی قطعاً کوئی قابل ذکر اشاعت نہیں ہے۔ معمولی سا اخبار ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ بزدلیہ ڈاک قلمی دنیا کی ہر قابل ذکر شخصیت کو جاتا ہے چنانچہ جب کسی ایک شخصیت کے متعلق اس میں کوئی خبر چھپتی ہے تو ملاقات ہونے پر دوسرے بہت سے لوگ اس کا تذکرہ کرتے ہیں" اشتہار کرتے ہیں۔ اس سے مذکورہ شخص گھبرا جاتا ہے کہ معلوم نہیں وہ دنیا میں کتنا بدنام ہو گیا ہے۔ آپ پریشان تو نہیں ہوئے خبر پڑھ کر؟"

میں جس را "اگر میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہونے لگوں تو پھر میں کرچکا ہوں۔ وہ اخبار پر ہڈوں کی صورت میں میری ریزی کی نوکری میں پڑا ہے۔"

"بہت خوب" وہ مطمئن لمبے میں ہوا "میں آپ کو بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ اس اخبار میں اپنی قلموں کے اشتہار دے کر ہمیں کوئی خاص فائدہ تو ہوا نہیں اور ابھی ہماری قلمیں ملیں گے مرے سے بھی بہت دور ہیں اس کے باوجود ہم محض اس اخبار کی سرپرستی اور بلا امتیاز ہر چھوٹے بڑے اخبار اور رسالے سے تعلقات بھڑکنے کی پالیسی کے تحت اسے بھی تھوڑے بہت اشتہارات دے کر دیکر کرتے رہے ہیں لیکن رحمت علی رنگ کچھ یاد" ی لمبے فائدہ چاہتا ہے۔ اس کے مصالحتات کچھ زیادہ ہی بڑھتے

”اچھا! تباہ کاری پہنچ گئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہی! ان۔۔۔ مل گئی تھی اور میں نے شوق ہی شوق میں اسے
 ڈھائی تین سو میل چلا بھی ڈالا ہے۔۔۔ آپ کو شاید اس گاڑی کی
 رسید نہیں ملی؟“

”رسید۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے پوچھا ”کیسی رسید؟“
 ”بھت روزہ ٹھہر گھر میں اس کی رسید چسپ گئی ہے تا اس
 کے لیے میں بکلی ہی کنگنی تھی مگر آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ یہ
 چھوٹے سونے اخبار آپ کی نظر سے کھان گزرتے ہوں گے۔
 ویسے پڑھتی تو میں بھی نہیں ہوں لیکن یہ شاہہ خاص طور پر مجھے
 ڈاک میں بھیجا گیا ہے۔ میں رشتہ جلی رنگ کا شوروم میں دیکھ کر
 ہی کلک گئی تھی کہ اب ضرور کوئی نکل کھلے گا۔“

”اور۔۔۔ تو تمہارا اشارہ اس خبر کی طرف ہے“ میں نے گہری
 سانس لی ”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ میں پچھ چکا
 ہوں۔ اخبار مجھے بھی ارسال کیا گیا تھا۔ لیکن تم اس بات پر اتنی
 پریشان کیوں ہو؟“

”کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے؟“ وہ افسردہ لہجے میں ہل۔
 ”اس قسم کی غلط سلا اور اتنی سیدھی خبروں کی وجہ سے میرا بیچ
 بیلے ہی بہت خراب ہو چکا ہے۔ میں اپنے آپ کو بار بار ساقط ہر
 گناہ میں جانتی لیکن اس ایک خبر سے ہی آپ اندازہ کر سکتے ہیں
 کہ بات کا پس منظر کیا ہوتا ہے اور وہ لوگوں کے سامنے کس انداز
 میں آتی ہے۔ دکھ مجھے اسی بات کا ہوتا ہے کہ جب لوگوں کو
 حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔۔۔ تو وہ محض سرسری نظر سے دیکھ کر
 اندازے قائم کر کے افسانے کیوں لکھتے بیٹھ جاتے ہیں؟“

”دنیا کا کام یہی ہے۔ کچھ لوگ افسانے لکھتے ہیں، کچھ
 افسانے بولتے ہیں۔ اور میرا مشورہ یہ ہے کہ دنیا کو اپنا کام کرنے
 دو۔ تم اپنا کام کرتی رہی۔ اگر تم ان باتوں میں الجھو گی تو ان کا
 مقصد پورا ہوگا۔ وہ تمہیں الجھانا ہی تو چاہتے ہیں۔ فضا میں جتنی
 زیادہ گرما گری پیدا ہوگی اسی میں اتنی ہی خوشی ہوگی۔ تمہاری
 طرف جتنی خاص شے جتنا سکوت رہے گا اتنی ہی اتنی ہی ہوا ہوگی۔
 اور یہی بہترین روز عمل ہے“ میں نے نہایت گہرے گہرے لہجے
 میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ جیسے لوگوں کا کچھ نہیں مجزتا اس لئے آپ ایسی باتیں
 کر سکتے ہیں۔ مجھے سمجھا سکتے ہیں“ وہ گویا روئے کو کھنٹی ”لیکن
 میں آپ کو بتاتی ہوں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے میرے لئے کتنا
 فرق پڑتا ہے۔ فانی دنیا کے دروازے مجھ پر اس قسم کی قیاس
 آرائیوں نے بھی بند کئے ہیں۔ پہلے تو ایک عرصت تک لوگوں کے
 پیٹ میں یہ دور اعتبار کہ ظاہر میرا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تو میں
 اتنے لمحات بات سے کیسے رہتی ہوں۔ اس ضمن میں بھی حقیقت
 گو کہ کسی کو معلوم نہیں تھی مگر مختلف قیاس آرائیوں کی جاتی
 رہیں۔ لیکن خبر۔۔۔ اس بات سے مجھے اتنا نقصان نہیں پہنچا کیوں

جائزے تھے اور ان کا تعلق اب اخبار کے بجائے اس کی اپنی
 ذات سے ہوتا جا رہا تھا اس لئے میں نے اسے نظر انداز کرنا
 شروع کر دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ جو تم مناسب سمجھو وہ کرو“ میں نے قدرے
 نرم دلچسپی سے کہا۔

”آپ اگر مناسب سمجھیں تو اس کا داغ درست کرنے کا
 کچھ بندوبست کیا جائے؟ آپ کا تو ایک اشارہ ہی کافی ہوگا“
 اتفاق پر تجسس سے لہجے میں بولا۔

”ارے نہیں بھئی۔۔۔ مجھے ہنسی آگئی“ ہمارے معمولات
 میں ان چھوٹے سونے کاموں کی گنجائش نہیں۔ اس مسئلے سے
 آدمی کا کیا بندوبست کرنا۔ اسے اپنا کام کے جانے دو۔ ہم اپنا کام
 کرتے رہیں گے۔ البتہ ایک کام ضرور کرنا۔ اب تک نہ کھوڑے
 بہت اشتیارات اس کے اخبار کے لئے ریلیز ہوتے رہے ہیں یا
 آئندہ جو کچھ بھی دینے کا ارادہ تھا وہ سب بند کر دو۔ آئندہ کے
 لئے اس اخبار کو اپنی تفسیری قسم کی فرسٹ سے قطعی طور پر
 خارج کر دو۔ میری کوشش اور خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ ہمارے
 اداروں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فیض پہنچے کسی کو بھی کوئی
 فائدہ نہ ہو۔ لیکن اس شخص سے اگر اب بھی ہم نے مہربانی کا
 سلوک جاری رکھا یا نوازشات میں اضافہ کیا تو اسے یقین
 ہو جائے گا کہ ہم بیک میل ہو گئے ہیں۔ اسے یہ تاثر کسی قیمت پر
 نہیں ملنا چاہئے۔“

”اوکے سرا“ اتفاق مستدی سے بولا ”میں تو خود ہی چاہتا
 تھا آپ سے اس کی تصدیق ہوگئی تو اور بھی اچھا ہوگا“ یہ گویا
 اس کے دل کی بات تھی۔

سلسلہ منقطع کر کے میں نے باہر کی پارکوں کے مزے صرف
 ”ہی خلد پڑھے“ تھے کہ انٹر کام کا ہر ایک بار پھر بول اٹھا۔
 کترین نے بتایا کہ اپنی نام کی کوئی خاتون مجھ سے بات کرنا چاہتی
 ہے۔

”لاماز“ میں نے طویل سانس لینے ہوئے کرسی کے پٹے سے
 نکل لگا کر کہا۔ میں نے لیل فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو
 اپنی کی حشر تو آواز سنائی دی ”کیسے ہیں آپ؟“

”بالکل ٹھیک۔ تم سناؤ۔۔۔ لیکن پہلے میں معذرت کر لوں کہ
 زبردست مصروفیت کی وجہ سے میں تم سے ملنا تو دور کار فون بھی
 نہیں کر سکا“ میں نے حیرت سے معذرت خواہی کے جذبے کے ساتھ
 کہا ”تم سے کزشت ملاقات کے بعد قاعدے قریب سے میں آج
 ہی آؤں گیا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میں فون کرتی رہی ہوں اور مجھے آپ کی
 مصروفیات کا پتا چتا رہا ہے“ اس کے لہجے میں نہ جانے کیوں بکلی
 کی افسردگی کی جھلک تھی ”ویسے مجھے اتنی جلد آپ کی آمد یا فون
 کی توقع بھی نہیں تھی۔“

کہ قلمی دنیا کے لوگوں کو اس بات پر زیادہ تشویش نہیں ہوتی کہ ایک لڑکی کا اگر بظاہر کوئی خاص زور پڑے آگنی میں ہے تو وہ غلط ہے بات سے کیوں رہتی ہے۔ ان کے گرد ایسی ہستی لڑکیاں موجود رہتی ہیں، قلم اندیشی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کوئی ان کے بارے میں زیادہ باریکیوں میں نہیں جاتا۔ سب کو تقریباً سبھی کچھ پتا ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ نقصان مجھے اس بات سے پہنچا کہ میرا بیٹا ایک خطرناک لڑکی کا باندھا گیا۔

"خطرناک لڑکی؟" میں نے پوچھی ذرا سی حیرت ظاہر کی مالا نکہ یہی بات مجھے اتفاقاً بھی پتا چکا تھا۔

"ہاں۔۔۔" وہ جیسے سسکی سی لے کر بولی "بات یہ قلمی کہ ایک بہت بڑا سرکاری افسر کچھ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ غداری کا شریک ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم کہ وہ کس حد تک تصور دار تھا۔ میرا جرم صرف اتنا تھا کہ میں اس بات سے بالکل بے خبر تھی اور اس شخص کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ جب قانون کا ہاتھ اس شخص تک پہنچا تو وہ تو اپنی خفیہ دولت نہ جانے کون کون سے وسائل اور پرانی شناسائیاں استعمال کرتے ہوئے صاف بچ نکلا۔ ملک سے فرار ہو گیا۔ تحقیقاتی ایجنسیوں نے ان تمام لوگوں کو دھریا جن سے اس کا چاہے کسی بھی سلسلے میں مختصر سا بھی رابطہ رہا تھا۔ بھی اگر اس نے دو آدمیوں کی موجودگی میں سربراہ کسی سے مصافحہ بھی کیا تھا تو اسے بھی دھریا گیا۔ ان دن کا اندول تک کو طلب کر لیا گیا جن سے وہ سرگرم ہاں، شید کا سامان یا کچھ اور خرید آتا تھا اور ایک آدھ منٹ کے لئے ان کے پاس کھڑے ہو کر ہنس بول لیتا تھا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہوتا ہے ہمارے ہاں" میں نے آسٹ سے کہا۔

"بات اگر صرف پوچھ کچھ اور تحقیق کی ہو تب بھی ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ ہمارے ہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے" وہ دھک سے بولی۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے" میں نے دھیسے لیے میں کہا۔

"میں بھی ایک بار دو دور سے گزری۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں تو کسی کو جاکر سنا بھی نہیں سکتی کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ تحقیقاتی افسروں میں سے کسی نے میرے ساتھ کیا کیا اور کس نے کیا کیا۔ میں وہ سب لرزہ خیز داستانیں سننے ہی میں متغیر رکھنے پر مجبور ہوں۔" اخبار والے اسس ڈانے میں بھی میرے بارے میں شخص ہنس مٹا اظہار کیا مختلف اداروں کی فراہم کردہ معلومات کے سارے اور کچھ اپنی قیاس آرائیوں کی مدد سے خبریں چھاپتے رہے۔ کچھ میرا چہرہ بھی فوٹو بینک ہے۔ اخبار میں تصویر اچھی آتی ہے اس لئے اگر قارئین تک پہنچانے کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی تھی تب بھی لغائی پر مشتمل کوئی نہ کوئی خبر بنا کر ساتھ تصویر ضرور لگا دی جاتی تھی۔ درحقیقت کسی بھی لکھنے والے کی مجھ تک رسائی ہونے ہی نہیں دی گئی تھی کہ کوئی مجھ سے بھی پوچھ

سکتا کہ آخر مجھ پر کیا گزری اور اگر کوئی آج بھی جاتا تو میں یقیناً اسے کچھ بتا سکتی ہوں پانی اور اگر بعد میں بتاتی بھی تو چھاپ کون سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ سب کو اسی معاشرے میں رہنا ہے۔ لوگ بھی کوئی کتنی ہے، بدلتی بھی کتنی ہے۔ بچوں کا پیٹ بھی پانا ہے اور زندہ بھی رہنا ہے۔"

اس کی باتوں نے ایک لمحے کے لئے مجھے ہنس سا کھلا۔ پہلی ملاقات میں سطحی اور سستی سی نظر آئے والی وہ لڑکی اپنے سینے میں جانے کیا کیا بھید کیا کیا تلخیاں، کیسے کیسے انکار سے چھپائے بیٹھی تھی۔

"پھر تمہارا چٹکارا کیوں کر ہوا؟" میں نے سرگوشی نما لیے میں پوچھا۔

"اس دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی باقی ہیں اور خصوصاً ہمارا معاشرہ تو شاید انہی کی وجہ سے قائم ہے ورنہ ہمارا یہ سلمی ڈھانچا شاید بہت پہلے زمیں بوس ہو چکا ہوتا۔ ایسے ہی ایک آدمی نے مجھے اس عذاب سے نجات دلائی۔ وہ شخص اب اس نظام میں نہیں ہے۔ میں مرتے دم تک اس کی شکر گزار رہوں گی حالانکہ وہ بھی اسی مشینری کا ایک پرزہ تھا" اس کے لیے میں دلی فکرت جھجک آیا۔

"لگتا ہے تمہاری زندگی نہایت دلخراش واقعات سے بھری پڑی ہے" میں نے کہا۔

"بے شک۔ اگر کوئی میری سوانح عمری لکھے تو نہایت منفی خیز اور بھیاک قسم کی انکشافاتی کتاب تحریر ہو سکتی ہے لیکن یہاں چھپ نہیں سکتی۔ ویسے میں انہی نہیں ہوں۔ مجھ کیسے بہت سی لڑکیوں کے پاس ایسی بہت سی داستانیں ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے پاس کم عمری میں ہی زیادہ سوانح ہو گیا ہے اور وہ بھی مختلف النوع" اس نے یقیناً اپنے آنسوؤں کو پانی جانے اور اپنے لیے میں خوش دلی لانے کی کوشش کی تھی۔

"تم جیسے لوگوں میں مجھے بہت کشش محسوس ہوتی ہے" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کمال ہے!" اس نے اب قدرے شکستہ لیے میں کہا "دنیا کے مزید اصولوں کے مطابق تو آپ کو ہم جیسے لوگوں سے نفرت کرنی چاہئے۔ کھن کھائی چاہئے۔"

"بیکار بائیس مت کرو۔ میں رواجی اور فرسودہ آدمی نہیں ہوں" میں نے کہا۔

جانے کیوں وہ دیر سے نہیں دی۔ میں نے مسیحتی سے کہا "تمہاری شخصیت۔ ذکی طرح نہ دور تہ ہے۔"

"اور اندر کچھ بھی نہیں ہے" اس نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا "اور اگر کائنات جانتا تو آنکھوں میں پانی ہی پانی" وہ شاید اب اگلی تلخی کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

سائنس لے کر رہ گیا۔

"گنا ہے آج پورے شہر نے وہ خبر سنا ڈالی ہے اور سب لوگوں کو اس پر تبصرو کرنے کے سوا کوئی کام نہیں رہا" میں نے حتی الامکان نرمی سے کہا۔

"اوہو۔۔۔ معلوم ہوتا ہے اس بات کا عام ہو جانا بہت ناگوار گزر رہا ہے" وہ چپچپے ہوئے لیے میں بولی۔ ایک بار پھر اس کے لیے میں رقابت کی جھلک محسوس کر کے میں حیران ہونے لگی۔ وہ سکا۔ ہمارے ایک دوسرے سے کوئی عہد و پیمان نہیں تھے اور وہ کوئی تخیل پرست عورت بھی نہیں تھی کہ خیالوں ہی خیالوں میں کچھ اچھوٹے سے کل تخیل کر لیتی اور انہیں آندھیلوں کی زد پر دیکھ کر متحش ہو جاتی۔ وہ تو عمری سے ہی بہت پریکٹیکل تھی۔ مغربی لڑکیوں سے بھی زیادہ پریکٹیکل۔ تو پھر اس رقابت کے کیا معنی تھے۔ ہر حال وہ مجھے ابھی بھی بہت گنتی تھی۔ میں اس کے...

ڈیڑھ گھنٹہ پر ناگوار کی نگاہ کر کے اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے طاقت سے کہا "تم اب صبح اول کی بیوی بنو ہو۔ کیا ابھی تک جنہیں تجھے نہیں ہوا کہ چھوٹے موٹے اخباروں میں بھیجی ہوئی خبروں کی؟ میں بھیجی ہوئی حقیقت کتنی مختلف ہوتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے اخباروں میں جو کچھ چھپا ہو حقیقت بھی لفظ بہ لفظ اسی طرح ہو۔ خبروں کی صداقت اور درستی کا خیال تو ہی اخبارات رکھتے ہیں جن کا معاشرے میں کچھ مقام ہو آجے کچھ روایات ہوتی ہیں اور کوئی ساکھ ہوتی ہے۔ براخبار تو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے اتنا دوسری مول نہیں لیتا۔"

"ہر حال بائیں ہی بے بنیاد بات تو نہیں چھپتی نا" اس کے لیے کا جھکا پن کچھ کم ہوا "ذرا سن تو ہی مجھے ملتا ہے جہاں آگ لگی ہوتی ہے۔"

"اے۔۔۔ یہ میں ضرور تسلیم کرتا ہوں" میں نے بلا تامل کہا۔ "اس بات کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی کو کاڑھی دلائی ہے لیکن جو تاثر خبر میں دینے کی کوشش کی گئی ہے میری کمائی اس سے بالکل مختلف ہے۔"

"اور وہ کمائی مجھے ملانی نہیں جاسکتی ہوگی؟" اس کے لیے کی۔ میں تجسس اور اشتیاق کرنا نہیں لے رہا تھا۔

"اس میں فی الحال تمہارے لئے تو کوئی دلچسپی ہوگی اور نہ ہی فی الحال ان طویل باتوں کو بھرانے کا کوئی فائدہ ہے" میں نے بدستور طاقت سے کہا۔

"اچھا۔۔۔" وہ طویل سانس لے کر بولی "جیسے تمہاری مرضی۔ ذرا میری باتوں کا برا مت مٹانا۔ کبھی کبھی مجھے خود بھی احساس ہوتا ہے کہ اس قسم کی جلی جلی باتیں کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ میں... دل کے باتوں مجبور ہی ہو جاتی ہوں۔ حالانکہ یہ میری فطرت کے بھی خلاف ہے۔ جنہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ہر باتیں بن کی حد تک

میں ایک لمحے کے لئے خاموش رہا تب وہ جیسے چرکتے ہوئے لی "بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں نے آپ سے یہ پوچھنے کے لئے فون کیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"کس مسئلے میں؟" میں نے چمک کر پوچھا۔

"ارے... آپ اتنی جلدی بھول گئے! وہ حیرت سے بولی۔

"یہ خبر کے مسئلے میں"

"کرنا کیا ہے؟" اس بار میں نے حیرت کا اظہار کیا "ارے ہیں اس اخبار کو یہ کر کے ایک طرف رکھو بلکہ مجھ کو کہ میری طرف اس کے پڑے کر کے روکی کی فوکی میں ڈالو اور جو کام پہلے لڑی تھی، آرام سے دوبارہ اسی میں مصروف ہو جاؤ۔ اس کو بھول جاؤ۔ وہیں سے جھٹک دو۔"

"اچھا۔۔۔" وہ جیسے میرے لیے سے تعزیت پاتے ہوئے بولی۔

"آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ" میں نے سلسلہ منتقل کر دیا اور کافی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا اس کے بارے میں سوچا رہا۔ مجھے گمان تک نہیں گزرا تھا کہ کبھی یہ لڑکی مجھے اس درجہ دلچسپی اور قابل توجہ محسوس ہونے لگے گی۔ کبھی کبھی انسان کے اندازے کیسے غلط لگتے ہیں۔

اپنے خیالات سے چونک کر میں نے مزید تھوڑا سا ہی کام نپٹا تھا کہ ایک بار پھر انٹر کام پر کئی برسوں کے اطلاع دی کہ میرے لئے فون ہے۔ اس بار فون پر ستاہ تھی۔

خلاف معمول اس کے لیے میں کچھ جھکا پن تھا جسے میں ابتدا میں محسوس نہ کر سکا۔

"کچھ زیادہ سی مصروف ہو گئے ہو تم" وہ بولی "بچپنے دنوں مجھے خاصی فرصت میرے کئی میرا خیال قائم فون کر گئے۔ میں نے۔۔۔ باتیں ہوں گی۔ شاموں کی صورت کچھ سنو رہا ہے گی۔ تمہارے لئے تو کچھ بدل جائیں گے۔"

"اوہو۔۔۔ آج تو شام ہی کر رہی ہو" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن جنہیں شاید کافی دنوں سے میری شاعرانہ رفاقت کی محسوس نہیں ہوئی۔ مصروف جو بہت تھے۔"

"مصروف تو میں بہت عرصے سے چلا آ رہا ہوں" میں نے طاقت سے کہا۔

"لیکن اب مصروفیات کی نوعیت کچھ بدل رہی جاتی ہے نا۔ اب کچھ نئی مصروفیتیں بھی پیدا ہوتی جاتی ہیں نا۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تیسرے درجے کی ناکام اور بھولی بھری اداکاراں... بلکہ رفاقتوں کو عموماً قسم کی کاروں دلوں" اس نے جھٹکا ہر نعمت سرمی سے لیے میں کہا۔

اس نے میرا دل چاہا کہ ریموڈ اپنی پیشانی پر بارہوں۔ لیکن میں بالکل اس خواہش پر ضبط کرتے ہوئے ایک طویل اور فطرتی

حقیقت پسند ہوں۔"

"ہاں۔ انسان اپنے اوپر کتنے ہی تجربے ڈھل چکا ہے لیکن اندر نہیں دیکھیں کہ کس نرم و نازک جذبوں کی کونپلیں سرافرازی رہتی ہیں۔" میں نے کہا۔

دوسری طرف ایک لمحے کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی جیسے میرے لفظوں نے اس کے لئے سوچوں کی بھول چلیں گے۔ دردانے بھول دئے ہوں۔ پھر وہ بہت سی دھیمی اور کھپکھاتی سی آواز میں بولی "انی! اب تو میں یہ بھی سوچنے لگی ہوں کہ تم جب کسی سے شادی کرو گے تو میرا کیا حال ہو گا؟ کہیں حسد کے مارے مجھے کچھ ہو تو نہیں جائے گا؟"

"ہوتا ہوا ناگہم بھی نہیں۔ یہ سب انسان کے خود ساختہ جذباتی ڈرامے ہیں۔ اب ہم لوگ جس اسٹیج پر ہیں وہاں تقریباً ہر چیز کو ہی ہنس کر سنے کا ہم میں حوصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ وہ عمر گزر گئی جب کسی کی بے وفائی راتوں کو بجاتی تھی، خون کے آئینوں پر لائی تھی" میں نے ہنس کر کہا۔

"ابھی ہم کوئی بوڑھے تو نہیں ہو گئے۔ ابھی تو ہمارا شمار نوجوانوں ہی میں ہے" اس کو یکدم گویا عمر کے اندیشے نے آن گھیرا۔

"ہاں۔ ہیں تو نوجوان ہی" میں نے کہا "لیکن ہم نے زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ سوچ میں چٹکی آگئی ہے۔" "سوچ میں چٹکی آنے سے آدمی کوئی جذباتی صدموں سے محفوظ تو نہیں ہو جاتا" وہ حسب معمول عقل کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ عام فلمی عورتوں کی طرح سطحی نہیں تھی۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سے کم از کم انسان میں صدموں کو آسانی سے سننے اور خود پر ہنسنے کا سلیقہ آ جاتا ہے" میں نے کہا۔ "وہنا اسے جیسے ایک اور خیال آیا۔ چونکے کے سے انداز میں بولی "انی! ویسے تم شادی تو کسی بہت حسین ذہین 'فائدانی' خاتون پر ہوتی اور پاکیزہ بلی، جسم کی لڑکی سے کرو گے نا؟"

"یہ تم سے کس نے کہا؟" میں نے حیرت سے کہا "انی! تو میں اس سلسلے میں پُر یقین ہی نہیں ہوں کہ میں شادی کروں گا بھی یا نہیں۔ اور یہ بتانا تو تقریباً ناممکن ہی ہے کہ اگر کروں گا تو کسی لڑکی سے کروں گا۔ جس سے تو معلوم ہی ہے کہ میرا کچھ پتا نہیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" وہ قدرے مبہم لہجے میں بولی پھر جیسے اس نے سارے اچھے اچھے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا "اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ کبھی رقت لے تو آنا۔ تمہارا انتظار سار جاتا ہے۔"

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے لیے میں کوئی بات تھی جس نے ایک لمحے کے لئے مجھے غالی الفزن میں سا بٹایا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں یا محسوس کر رہا ہوں۔

ستارہ کا میرے ساتھ جو روئے تھا وہ کبھی کبھی مجھے جذباتی کشش میں مبتلا کر دیتا تھا جب کہ میں کبھی کبھی سم کی جذباتیت میں مبتلا ہوتا نہیں جانتا تھا۔

میرا دل کام سے اُچاٹ سا ہو گیا تھا لیکن بہت سے غلطیوں کی ناکل دیکھنا بہت ضروری تھا اس لئے میں نے ہر شکل اپنے آپ کو دوبارہ کام کی طرف متوجہ کیا۔ ابھی میں نے باہر کی باتوں کے چند ہی غلطیوں پر غصے تھے کہ کیتھرین نے ایک بار پھر گلی فون کال کی اطلاع دی۔ اتفاقاً دوبارہ کسی اہم سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

لائن لی تو اتفاقاً بولا "دوبارہ آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں سر! بات کچھ زیادہ اہم نہیں لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کی رائے ضرور معلوم کر لوں۔ ہماری پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر ہیں، سعید اللہ سعید صاحب۔ پچھلی مرتبہ ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر میں میں نے آپ سے ان کا تعارف کرایا تھا۔"

"ہاں۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ ہماری بحر کم سے سرخ و سفید سے آدمی تھے نا؟" میں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا۔

"جی ہاں۔ وہی" اتفاقاً قدرے پُر خوش لہجے میں بولا "بہت اچھے اور بہت کام کے آدمی ہیں سر! آپ سے مل کر وہ خوش بھی بہت ہوئے تھے وہ خود بہت بڑے آدمی ہیں جی۔ بہت دولت مند بھی ہیں۔"

بازی

ایم اے راحت

کے ایڈو پنچر قلم سے

ایک شاہکار ناول

چار حصوں میں

مکمل سیٹ -/280 روپے

ناشر: مکتبہ القرآن پبش

اردو بازار لاہور

اس سے بے پناہ پرائیمکی کا احساس ہوتا تھا۔ مظلوم کی ہوتا تھا کہ اندر رہا ہوئے والے جشن اور ہنگامے کا باہر کی کوڑا سا بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔

میں یہ سوچ کر اذیت خور پر خاصی تاخیر سے آیا تھا کہ لوگ کبھی تقریبات میں صبح و وقت پر نہیں پہنچتے اور ہر وقت پہنچ جانے والے شرمندہ شرمندہ سے پیچھے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں شاید حقیقتاً مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ گیت بند ہو چکا تھا اور دیوار کے ساتھ لپٹے اندھیرے میں قطار میں کھڑی گاڑیاں جھللا رہی تھیں۔ میری گاڑی بند کر کے سامنے رکی تو فوراً ہی گیت کھل گیا اور ایک لمبا ترنگا، بارعب اور بارودی مسلح چرکیدار باہر آیا اور میری طرف جھٹکتے ہوئے غلاب توفیق بڑے شائستہ لہجے میں بولا۔

”سر! آپ افضل چرمدی صاحب ہیں نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مستعدی سے بولا ”آپ گاڑی اندر لی لے آئیے“ اس نے گیت کھول دیا۔

دراستہ سے بت لیا چڑھا اور وہاں بھی بہت سی لمبی چوڑی، جھلک کرتی پیش قیمت گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ شاید خاص خاص مسافروں کی گاڑیاں تھیں۔ میں نے اپنی گاڑی ایک کڈنگ کے عقب میں پارک کی اور روش پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بٹلر نمودار ہوا اور منو بانہ انداز میں جھٹکتے ہوئے بولا ”تشریف لائیے سر!“

کوٹھی واقعی قلعے سے مشابہ تھی اور چاروں طرف سفید سے درختوں نے پردہ سا مان رکھا تھا۔ سامنے کی طرف بھی بہت کشادہ لان تھا جس کے درمیان سے مرمرین ٹائیلوں کی روش لہرائی ہوئی گزرتی تھی۔ رنگارنگ پھولوں کی یکاڑیاں بڑے سلیقے سے بنی ہوئی تھیں اور فضا میں ایک بوجھل مگر مسرور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

بلتر کی رہنمائی میں میں معنی لان پر پہنچا۔ یہ سامنے والے لان سے کہیں کشادہ اور خوب صورت تھا اور اس کے وسط میں ایک چھوٹا لیکن نہایت خوب صورت اور تمام لوازمات سے آراستہ سونٹک پول بھی موجود تھا۔ پارٹی کا اہتمام یہیں کیا گیا تھا۔ تمام مہمان یہاں موجود تھے۔ ناخن لائٹس لگا کر گئی تھیں تاہم پھر بھی روشنی میں دھیمپا بن تھا اور ماحول کی روانیت برقرار تھی۔

چاروں طرف حسن و آرائش اور خوشبوؤں کا ایک سیلاب تھا۔ سورتوں کے ستارے جھللا رہے تھے۔ کالی مرے سے میں نے کوئی فلم نہیں دیکھی تھی تاہم بہت سے فلمی چہروں کو میں نے پہچان ہی لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ لان پر میرے قدم رکھتے ہی تقریباً سبھی کی نظریں ایک لمحے کے لئے میری طرف محکوم ہو گئیں۔

چیلے ڈھالے سوٹ میں ایک بیماری بھر کمزور پستہ قد

”کیا اپنی دولت انہوں نے فلم سازی میں ہی کائی ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں سر! ان کے اور بھی کئی بزنس ہیں۔ کئی سینما ہاؤس ہیں۔ ٹیلیوژن ہیں۔ بڑی زبردست چیز ہیں۔ اور پھر ایسوی اینٹن کے صدر بھی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ کے ان کے ساتھ اچھے مراسم ہونے چاہئیں۔ وہ خود بھی آپ سے راہ رسم پرمانے کے بڑے خواہش مند ہیں۔ چند دن بعد ان کے ہاں ایک بہت بڑی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ ان کے لئے کئی خوشیاں تیار ہو چکی ہیں۔ حال میں ان کی فلم ”رُتِ مستانی“ نے پلاٹینم جڑی کی ہے۔ اور ان کے ہاں شادی کے تقریباً دس سال بعد پہلی اولاد ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ اس سال وہ دوسری مرتبہ ایسوی اینٹن کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ ان کے لئے یہ سب خوشیاں بے انتہا اہم ہیں اور ان کا خیال ہے اب تو انہیں ایک زوردار تقریب ضرور منعقد کرنی چاہئے۔ اور ان کے ہاں منعقد ہونے والی تقریبات اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس تقریب میں ضرور شرکت کریں۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں آپ سے کہوں۔ ویسے کل وہ خود بھی آپ کو فون کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک تو آپ اس تقریب سے محظوظ ہوں گے دوسرے سعید صاحب کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ تیسرے یہ کہ بہت سی اہم اور ”کارآمد“ شخصیتیں سے آپ کی ملاقات رہے گی۔“

”مجھے تم اتنا زور دے رہے ہو تو میں تمہی جاؤں گا“ میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا ”کوکہ مصروفیات تو ابھی کئی دنوں تک فراہم ہیں مگر میں سوچ رہا ہوں کہ زندگی میں تقریبات کی کچھ زیادہ ہی کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرف بھی کچھ نہ کچھ توجہ دیتے رہنا چاہئے کہیں اعصاب بے چارے ناراض ہی نہ ہو جائیں کہ یہ کیا ایک ہی قسم کی مشقت لئے جا رہے ہیں۔“

”جی ہاں“ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا ”ایک یہ خیال بھی میرے پیش نظر تھا۔ تو پھر میں یقین رکھوں کہ سعید صاحب آپ کو فون کریں گے تو آپ کا جواب اثبات میں ہو گا؟“

”ہاں“ میں نے جواب دیا ”میرا خیال ہے میں حاضری بھری دن کا۔“

○●○

سعید صاحب کا گھر کارڈن ٹاؤن میں تھا اور میری توقع سے کہیں زیادہ شاندار تھا۔ کوٹھی کی ایک چھوٹا سا مٹا تھا۔ اس کی چار دیواری کنگریٹ کی معلوم ہوتی تھی اور خاصی بلند تھی لیکن اس کے اندر کی طرف اس سے بھی بلند گویا ایک اور چار دیواری تھی اور یہ چار دیواری سفید سے درختوں پر مشتمل تھا۔ ان درختوں کی تنہاں قطار چار دیواری کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اس نے اصل عمارت کو تقریباً چھپا ہی رکھا تھا لیکن

"اچھا۔ آپ ہیں افضل صاحب! بسنی آپ سے لئے کا تو پیرا اشتیاق تھا۔"

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نوک مجھے غائبانہ طور پر جاننے لگے تھے۔ میں تو اپنے آپ کو حتی الامکان گماں ہی رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

بادری بیرے ڈرکس لئے مہمانوں کے درمیان ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ مردوں عورتوں کی فوٹیاں ادھر ادھر مہرہ ہنسنے لگیں تھیں۔ سعید صاحب بیسیوں مہمانوں سے میرا تعارف کرائے اور میرے ہاتھ میں اپنی پسند کی ڈرک تھامنے کے بعد نہ جانے کہاں الجھ چکے تھے۔ اتفاق بھی کچھ دیر تک تو میرے ساتھ رہا تھا پھر ایک فلمی مسنف سے زندہ جاوید کامیوں کے موشوں پر اس کی بحث شروع ہو گئی تھی اور میں ان دونوں کو یہ "گیمبر" مسئلہ حل کرنے کے لئے گفتگوں کے میدان میں برسرِ بیکار چھوڑ کر ایک طرف کو ہو گیا تھا۔

میری نظریں دراصل اپنی کوتاہی کر دی تھیں۔ ایک دن پہلے ہی سنی سے فون پر میری بات ہوئی تھی تو اس نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا تھا کہ سعید صاحب کی پارٹی میں وہ بھی مدعو ہے۔ اتفاق نے مجھے یہی تاخیر کا تھا کہ سعید صاحب کی پارٹی میں ہر چیز کے لئے مجھ کے خاص کاموں کوئی مدعو کیا جاتا تھا جب کہ فلمی کیریئر کے لحاظ سے ظاہر ہے اپنی خاص کاموں کو لوگوں میں ہرگز شمار نہیں ہو سکتی تھی اور اتفاق نے تو مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ لوگ اس سے روادار م رکتے ہوئے اور اسے قریب بلاتے ہوئے جھگڑتے چھوڑتے تھے۔

لیکن ظاہر ہے سنی سے میں اس بات برحیرت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں یہ سوچ کر چپ رہ گیا کہ انسان کے غبی مراسم تو نہ جانے کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً اپنی جیسی لڑکیوں کے۔ اور ضروری نہیں کہ اتفاق کے انداز سے اور محسوسات اس کے بارے میں درست ہی ہوں۔ اویسے بھی بہت زیادہ غلط بلکہ قدرے دہی سا آدمی تھا۔ فلم لان میں اس چھے غلط اور اصول پرست آدمی نے کی توقع مجھے کہی تھی۔

میں نے جب اپنی کوتاہی کا خاکہ میں بھی سعید صاحب کی پارٹی میں مدعو ہوں تو وہ گہری سانس لے کر بولا: "میں کسی پر چھنے والی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ تو ضرور مدعو ہوں گے۔ تو پھر آپ سے وہیں ملاقات ہوگی۔ اگر آپ کو وہاں بڑے بڑے لوگوں پر

فضلی میری طرف لگا۔ اس کی رحمت سرخ و سپید تھی۔ ناک پر مونے سے سیاہ فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا اور ہموارے بے ترتیب بال کندھوں تک آئے ہوئے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ میزان سعید احمد سعید صاحب تھے۔ ان کے ہونٹوں پر دلکش دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ بہت خوش خلق اور ہنسار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ اتفاق ان کے ساتھ تھا۔

"میں تو آپ کی آمد سے واپس ہو چکا تھا" وہ مجھ سے بغل گیر ہونے ہوئے ہوئے۔ ان کے وجود سے انہنی ہوئی خوشبو فراہم ہوئی معلوم ہوئی تھی لیکن وہ کچھ زمانہ ہی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔

مہمانوں سے فارغ ہو کر وہ پردوش معائنہ کرتے ہوئے ہوئے۔ "بہر حال دیر آید درست آید۔ آپ ٹھیک ہی آئے۔ صبح سنوں میں روٹی ہی اب ہوئی ہے۔ میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ شریف لائے۔ پیرا اشتیاق تھا کہ کہیں خوشگوار ماحول میں آپ سے گپ نہ ہو۔"

"آپ کی ذمہ داری ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا" میں نے حقیقتاً ممنونیت سے کہا کیوں کہ اس شخص کے لیے میں مجھے غلوں کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔

اتفاق بولا "سعید صاحب آپ سے صرف ایک مرتبہ ملے ہیں اور تو زیادہ امت آپ کے متعلق غائبانہ طور پر جانتے ہیں لیکن صرف اسی بنیاد پر آپ کو بہت پسند کرنے لگے ہیں۔"

"محبت ہے ان کی" میں نے مزید ممنونیت سے کہا۔ "برادر عزیز!" سعید صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "ہم تو ان لوگوں کے قدر دان ہیں جن کی مداخلت میں کوئی حیثیت ہو اور جو اس کے ساتھ ساتھ زندہ دل بھی ہوں۔ آپ میں ہمیں صرف یہ دونوں ہی نہیں اور بھی بہت سی خوبیاں محسوس ہوئی ہیں۔"

سعید صاحب کو یقیناً مہم شامی کا دعویٰ رہا ہو گا بھی ایک مختصر ملاقات میں انہوں نے میرے بارے میں اتنے اندازے لگا لئے تھے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے لے جاتے ہوئے ہوئے۔ "آئیے میں آپ کو شہر کے خوب صورت، معروف اور پُرکشش لوگوں سے ملواؤں۔"

انہوں نے کئی بیرونیوں، بیرونیوں، پردوشوں، مسنگروں سے میرا تعارف کرایا۔ حتیٰ کہ تین چار روز پر بھی وہاں موجود تھے۔ پشترائیکڑ میں اپنے خوب صورت اور جدید تراش فراش کے بیوسات طرح کے میز اسٹائل میں اچھی لگ رہی تھیں۔ پشترے میک اپ بھی اچھا ہی کیا ہوا تھا یا شاید بیرونی پارکرز سے کرایا ہوا تھا۔

اس بات پر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ پشتر مہمان مردوں اور عورتوں نے مجھ سے تعارف کے دوران یہی کہا۔ ...

فرنیچ اردو ریڈر

پروفیسر محمد اشرف قیمت: -/90

طرف دیکھا گویا یہ زبان خوشی کہ رہا ہو "دلی میں کچھ کالا ضرور ہے۔۔۔ باتیں تو نہیں نہیں" لیکن پھر گویا وہ اپنی سوچ پر قابو پاتے ہوئے بولا "کیا اپنی یہاں مدعو ہے؟"

"میری معلومات کے مطابق تو وہ مدعو ہے" میں نے کہا۔
 "میں اپنی داستان میں ایک ایک صمان کی صورت دیکھ چکا ہوں۔ بتی مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ بعد صاحب نے اس کا کوئی ذکر بھی نہیں کیا۔"

"ظاہر ہے اب وہ ایک ایک صمان کا ذکر تو نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ میں نے طاقت سے کہا "خیر۔۔۔ تم کتنگو باری رکھو" قطع کلامی کے لئے میں پہلے ہی مذرت کر چکا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا جہاں ایک نہایت خوب صورت خاتون گلاس ہاتھ میں تھا۔ بڑی دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے ان کی صورت کچھ شاسا لگ رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ وہ وزارت تجارت کے ایک بہت بڑے افسر کی بیگم تھیں۔ میں صرف ایک مرتبہ ان کے گھر گیا تھا۔ میاں بیوی سے بہت خوشگوار ماحول میں کمانے کی سیر پر گھمپ رہی تھی۔ خاتون کا حافظہ یقیناً بڑا اچھا تھا جو انہوں نے ایک طویل عرصہ پہلے کی ملاقات کے حوالے سے مجھے ابھی تک یاد رکھا تھا۔

ان کے قریب پہنچ کر ابھی دلی جہلوں کا تبادلہ ہی ہوا تھا کہ قہقہوں کا زخم اور باتوں کی جھنجھٹا ہٹ جیسے ٹھم گئی تھی۔ میں نے مزہ کر دیکھا کہ شاید اس کی وجہ جان سکوں۔

بڑی ایکڑ۔۔۔ یا بڑے بڑے معزز گھرانے کی خواتین کے ہنسی سے فرصت ملے تو ذرا اس حقیری لڑکی سے بھی چند منہ بات کر لیجے گا۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"تم نے تو کیا مجھے خوابوں کا شہزادہ، گنگناہ پارٹس چارنگ ہاٹ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے" میں نے ہنسنے ہوئے کہا "میں ابھی اپنی مٹلون میں اتنا بھی مقبول نہیں ہوا کہ جدھر بھی جاؤں تمام ہاتھوں کی طرف میرے گرد ہی پردانوں کی طرح جمع ہو جائیں۔ میں ذہن گنگناہ سالور اپنی دنیا میں غرق آ رہی ہوں۔"

"آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے یوں رہنا بد رہنے سے آپ کی شہرت کے انسا نے اور زیادہ پھیل چکے ہیں" وہ بولی۔
 "نہیں ہے" میں نے بے یقینی سے کہا "بہر حال مجھے تو قطعاً احساس نہیں کہ مجھے چار لوگ جانتے ہوں گے خیر۔۔۔ اس بحث کو بھولنا۔ تم کیا کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مجھ سے کوئی ضروری کام ہے؟"

"ہاں۔ لیکن کام کل ہی بنانا ہو گی۔ کل تک صورت حال کچھ اور واضح ہو جائے گی" وہ ہنس سے لیے ہوئی بولی۔ ویسے وہاں داخل تو بہت حسین ہو گا۔ آپ برا تو نہیں سنا میں گے اگر میں کوئی بکیر لے کر بیٹھ جاؤں؟

"یہ تو وہیں دیکھیں گے۔ ابھی تو نہیں بتا سکتا کہ میں برا سناؤں گا یا نہیں" میں نے خوشگوار لیے ہوئے کہا۔

"خیر۔۔۔ آپ برا سناؤں یا اچھا سناؤں، ہم نے تو مسئلہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ آپ سے امید ہے کہ اس مسئلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے" وہ بڑا امید سے بولی۔ ایک لمبے کے لئے میں نے قدرے الجھن محسوس کی کہ آخر ایسا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ پھر میں نے یہ سوچ کر اس الجھن کو ذہن سے جھٹک دیا کہ کل تک کی تو بات ہے کل خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا تو خواہ خواہ ذہن کو تھکانے کی کیا ضرورت ہے۔

اور اب یہاں میری نظر میں اپنی کو تلاش کر رہی تھیں لیکن وہ کیس نظر نہیں آ رہی تھی۔ لائن پر ایک طرف چہوٹا سا ایجنٹ بھی بنا گیا تھا۔ اتفاق نے مجھے بتایا تھا کہ ڈزے کے بعد رقص موسیقی اور مزاحیہ خاکوں پر مشتمل درانی پروگرام بھی پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد دلچسپی کے مزید دو ایک پروگرام تھے۔

آخر کار میں اتفاق سے پوچھنے بغیر نہ رہ سکا "بتی نظر نہیں آ رہی۔ تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

وہ اس وقت اپنی بے نتیجہ بحث سے فاصلہ ہونے کے بعد ایک بڑھی ٹکسی اور ٹاک میں اٹھ رہی ہوئے دلی دلی پتی کی لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تارے ہاں ہاں ڈکے مہیار کی ٹائیں کیوں نہیں بن سکتیں؟ اس کی ٹاک پر پیسے کے قطرے بہک رہے تھے۔

میرا سوال سن کر اس نے پہلے تو عجیب سی نظروں سے میری

ماہنامہ "سچی کہانیاں" کا

ایک مقبول ترین ایڈیٹر سلسلہ

دہشت گرد

سلیم فاروقی کے ایڈیٹر پنجر قلم سے

چار حصوں میں

ناشر: مکتبہ القریب

اردو بازار لاہور

لازوال
کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کے

شاہکار ناول

نجیشت (۵ حصے) ۲۰۰/-

برہم چاری ۱۵۰/-

درخشاں (۲ حصے) ۹۰/-

رقص ابلیس ۱۵۰/-

آسیب زدہ ۱۱۰/-

دستک ۱۰۰/-



مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

فون ۲۲۳۶۶۵

دج مجھے خورای نظر تھی۔ تمام سمان اپنی باتیں بول کر اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ بٹر کی رہنمائی میں وہ شاہانہ حکمت کے ساتھ مرمریں روش بر قدم الخاقانی چلی آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر کسی عجیب سے، بے مثل جھلسل کرتے کپڑے کا خوب صورت لباس تھا۔ بڑوں میں غل غل اور نکلیوں پر ہنسنے کی ہلک والے سچے مسکراتوں کی ہلاکتیں لپٹی ہوئی تھیں اس کا بیڑ اسٹائل فلوئید و لائفا تھا اور وہ فلوئید ہی لگ رہی تھی۔ وہ ستارہ تھی۔ میں نے نہ تو ظلم کی اسکرین پر اور نہ ہی حقیقی زندگی میں کبھی اسے اتنا خوب صورت محسوس کیا تھا۔

ایک لمحہ پہلے تک میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ستارہ جیسی سلوانی ہی لڑکی کی آمد سے ایسے ایسے حسین چہروں کے چراغ ٹھٹھانے لگیں گے۔ میں ڈپٹی آوارہ کا مالک نہیں ہوں پھر بھی ایک لمحہ پہلے تک میری نظر بے اختیار اور حراہر بھٹک رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس کیلئے بلائے گئے تھے۔ نظر کو میرا بکروں۔ مگر اب ستارہ کو دیکھا تو اس کے چہرے سے نظر ہٹا دیا اور محسوس ہوا۔

ستارہ کو اپنی حرکات و سکنات اپنی جنبش اور اپنے تہہ نظر کے بر محل استعمال میں ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ وہ صحیح معنی میں شو بزنس کی عورت بن چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب ساری محفل اس کی طرف دیکھ رہی ہو تو اسے کسی کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے۔

چنانچہ وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن صرف ظاہری حد تک۔ ورنہ مجھے معلوم تھا کہ حقیقت میں وہ سب کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میزبان کہاں کھڑا ہے۔ وہ سیدھی سید صاحب کی طرف بڑھی۔ اس کے بر قدم کے ساتھ پیچھے مردوں کے دل اٹھل پھٹل ہو رہے تھے۔

میرے لئے اس لمحات کی بھول بھلیاں کچھ زیادہ بڑا سراپا ایسی ان دیکھی بھی نہیں لیکن ایک لمحے کے لئے میری رنگ و پے میں بھی وہ سستی دوڑ گئی جو شاید ان بیاہوں کے جسم میں دوڑی ہوگی جو کسی نادریافت شدہ جزیرے کے قریب جا چکے ہیں۔ ستارہ اور سید صاحب نے ہاتھ ملایا۔ بہت قریب ہو کر۔ بے تکلف دوستوں کی طرح۔ لیکن ستارہ کی تمام تر کربوشتی

عقاب

اسکریما ایم اے قیمت ۱۰۰/-

مسکراہٹ اور تماشہ دوستانہ انداز کے باوجود اس کے طرز عمل سے جانے کیوں وہی قہقہہ ظاہر تھا جسے عام لوگ محسوس نہیں کر سکتے اور جو شوہر کسی کی غورتوں کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔

سعید صاحب سے ملنے کے بعد وہ سید میاں کی طرف آئی اور یوں میرے بازو میں بازو ڈال کر کھڑی ہو گئی جیسے اس قریب میں ہم اکٹھے ہی آئے تھے اور مجھ سے ہی اس کا قریبی رشتہ تھا۔ ہمارے درمیان کسی رسمی جملے کا تبادلہ نہیں ہوا کچھ نہیں پوچھا کیا کچھ نہیں بتایا گیا۔ بس اس نے میرا بازو حاتم کے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے عمالی ہونٹوں کے عقب میں موتیوں جیسے دانت جھلکے۔ میں بھی مسکرایا۔ اور بس۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں ایک عجیب فضا پر آمیزہ احساسِ ملکیت بھی شامل تھا جیسے وہ وہاں موجود سب لوگوں پر نہایت لطیف ہیرائے میں یہ جفا چاہتی ہو کہ مجھ سے اس کے خصوصی مراسم ہیں بلکہ میں تقریباً اسی کا ہوں۔ میں خاموش تھا لیکن مجھے ہنسی کی فکر ضرور تھی۔

اگر وہ آن پہنچی تو ساتھ کوئی اپناہیت سے میرے ساتھ نہی دیکھ کر کیا محسوس کرے گی؟ یہ سوال مسلسل میرے ذہن میں بچھ رہا تھا لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہنسی سے ابھی کوئی ایسا تعلقی خاطر تو استوار نہیں ہوا تھا کہ وہ رقابت محسوس کرنے لگتی۔ ویسے بھی وہ پختہ ذہن کی لڑکی تھی۔ اس سے کوئی عمدہ پٹاں نہیں ہوا تھا۔ امید تو یہی تھی کہ وہ اس انداز میں نہیں سوئے گی۔

امید تو خیر کچھ دن پہلے تک مجھے ساتھ سے بھی یہ نہیں تھی کہ وہ بلا شعور کی طور پر میرے بارے میں ایک خفیف سے احساسِ ملکیت کا شکار ہو جائے گی۔ ہمارے مراسم کی نوعیت خواہ کچھ بھی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ ہمارے راستے کم از کم فی الحال تو الگ الگ ہیں ہی اور مستقبل قریب میں بھی ان کے ایک ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ بہر حال وہ ابھی لڑکی تھی۔ میرے دل میں اس کے لئے اپناہیت تھی۔ اس کا ہاتھ جھٹکنے کا میں سوچ بھی نہیں کرتا تھا۔

ساتھ کا جھلکا آ لہا لہا کندھوں تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو چکا تھا اور صرف دو سیارہ کی دوریوں کے سادے کندھوں سے لگا ہوا تھا۔ جب کوئی مرکز اس کی طرف دیکھتا تھا تو میں فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ وہ ساتھ کا چہرہ تک رہا ہے یا ان دوریوں کی کہیں دیکھ رہا ہے اور پھر میری پوریوں یا سامنے غورتوں کی موجودگی کے باوجود مرکز اس کی طرف دیکھنے سے باز نہیں آ رہے تھے۔

ساتھ کے ساتھ ساتھ وہ میرا بھی جائزہ ضرور لیتے تھے۔ شاید یہ دیکھتے تھے کہ یہ چلتی پھرتی قیامت کس کے گلے کا رہے۔ تاکہ اس وقت خوشبوؤں اور حرارتِ حیات کا منبع تھی۔ اس کے سراپا کی کشش تو اپنی جگہ تھی لیکن عمر کے اعتبار سے بھی وہ

ایک عجیب سی موڈ پر تھی۔ نوخیزی و دو شہزادی کی وادیوں کو وہ بلاشبہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی لیکن پختہ کاری یا زوال کی منزلوں بھی ابھی اس سے بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی ہر اداس اس کے ہر جلوے "اس کی ہر جنبش پر شائب تھا۔ وہ اس وقت ایک ایسا گلاب تھی جس کی ہر پتی اپنی جگہ خوشبوؤں کا ایک انگ جہان تھی۔ وہاں اس سے کہیں بڑھ کر حسین عورتیں موجود تھیں لیکن نہ جانے کیوں اور کیسے اس کے آئے ہی سارے آفتاب مایہ ناز لگے تھے۔

بارداری میرے مختلف مشروبات کی کشتیاں اٹھائے سناڑوں کے درمیان چکرارے تھے۔ میں نے ایک ہیرے کو روک کر بے رنگ و بے بو سیال کا ایک گلاس فطرتی سے اٹھایا اور احتیاطاً ہیرے سے تصدیق کر لی۔ "یہ سادہ پانی ہی ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن ساتھ ہی حیرت سے میری طرف دیکھا گویا "بہان خوشی کہہ رہا ہو۔" کیا اس محفل میں تم جیسے بد وقت بھی موجود ہیں؟

جبکہ میرا مسئلہ یہ تھا کہ پہلے ہی گلاس روک رہا تھا "رگ و پے میں چنگاریاں ہی تیر رہی تھیں۔ میں تو مطلق ترک کرنا چاہتا تھا" رگ و پے میں تیرتی ہوئی چنگاریوں کو سمو کرنا چاہتا تھا۔ آتش سیال مطلق میں اُڑ ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ساتھ نے آتشیں مشروب کا جام اٹھایا۔ معلوم نہیں اس آتش پہ چال کو اپنی رگ و پے میں مزید آگ دوڑانے کی کیا ضرورت تھی۔

ہم نے خاموشی اور آسکلی سے اپنے اپنے گلاس خالی کر کے ایک ہیرے کی فطرتی میں رکھ دئے۔ شاید دونوں ہی کو اپنے اپنے مشروب سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ میرا مطلق بدستور خشک تھا اور ساتھ کی جھلکا آئی آنکھوں میں بدستور پلاس تھی۔ اس نے ہلکے مٹائی سیال سے لبریز ایک اور چھوٹا سا فیسی گلاس اٹھایا۔ میں نے سادہ پانی کا دوسرا گلاس اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

ہاں تو وہاں قسموں کا ترنم اور باتوں کی جھنجھٹا خاصیت تیزی تھی لیکن میرے اور ساتھ کے درمیان ابھی تک سکوت کی جو دیوار ماحول تھی وہ اب کراں محسوس ہونے لگی تھی۔

میں نے پونہ سی منٹوں کے برائے منٹوں شروع کرنے کی غرض سے کہا "ابھی پانی ہے۔"

وہ گھبراہٹ سے مسکرائی۔ "سعید صاحب کی پارٹیاں بیشہ خوبصورت ہوتی ہیں۔"

میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اوپر اُڑھ کر دیکھا۔ وہاں بہت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے لیکن جو بھی تھے وہ یقیناً شہر کے اہم ترین اور خوبصورت ترین لوگوں میں سے تھے۔

ساتھ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جن اخبار نویسوں سے سعید صاحب کی ذاتی دوستی ہے اب تو انہیں بھی سعید صاحب نے اپنی غیر رسمی پائٹل میں مدعو کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

ہوں، کھیل کر رہی ہوں، کس کے لئے کر رہی ہوں؟ اب شاید میں
 کسی عورت، بچہ، خیمہ، دیسی، کسی دلیپپوں کے خورد مر کرتے
 دن حسب سہولت اور حسب ضرورت بدل جاتے ہیں۔“
 میں خاموش رہا حالانکہ میں کچھ نہ کچھ کما ضرور چاہتا تھا۔
 دوستی، تعلق اور اخلاص کی کوئی بات۔ مگر جانے کیوں مجھے مناسب
 لفظوں کے انتخاب میں دشواری پیش آ رہی تھی اور اسی لئے ایک
 بار پھر مجھے اپنی کاہلی خیال آ گیا تھا۔ جانے وہ کیوں نہیں آتی تھی
 ایک لمحے کے لئے شاید میں ستارہ سے کہیں دور پہنچ گیا تھا۔
 ”جیسے کسی کا انتظار ہے؟“ اس نے ہولے سے میرا بازو
 ہلا کر تھپس چڑھا۔

”نہیں“ مجھے کسی کا انتظار نہیں ”میں نے غیر ارادی طور پر
 کہا حالانکہ میں اسے بچ بچ بتا رہا تھا کہ مجھے اپنی کا انتظار
 ہے۔ اس کا مشاہدہ غصہ کا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں
 انتظار پڑھ لیا تھا۔

اس نے میرے جواب کا پوسٹ مارغم نہیں کیا۔ میرے
 لفظوں کی سچائی کو چیلنج نہیں کیا۔ شاید اس لئے بھی کہ اسے اس
 کی سہمت بھی نہیں ملی۔ بہت سے مرد اور عورتیں ہمارے پاس
 آن کھڑی ہوتی تھیں۔ ستارہ مجھ سے زیادہ لوگوں کو جانتی تھی۔ وہ
 ان سے میرا تعارف کراتے گی۔ وہ بھی مشہور گھرانوں کے
 افراد تھے یا پھر خود مشہور تھے۔ کوئی کسی سرمایہ دار خاندان سے
 تھا۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی پروڈیوسر اور کوئی میریویا ہندوئیں اور حیرت
 کی بات یہ تھی کہ تقریباً سبھی مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔

بیشتر کے ہاتھوں میں ڈرگس تھیں۔ شوخ خیلوں کے تبادلے
 ہونے لگے۔ ہر کھلف سے قیمتی اہم کرنے لگے لیکن پھر میرے
 دھیرے دھیرے اس قسم کی باتوں میں ہوتا ہے ”بہسی اور دھڑک
 بکھرنے لگے۔ کوئی کسی اور کے ساتھ کسی گشت کی طرف پیچھا
 کسی کو کسی نے آواز دے لی اور کوئی محض ہنر ازم کا مظاہرہ
 کرتے ہوئے کسی طرف کو کھٹک گیا۔

ایک بار پھر دم و دھڑکیں ہی وہاں کھڑے رہ گئے۔ میں نے
 محسوس کیا کہ لوگوں کی موجودگی میں ستارہ نے کچھ اور اضافہ
 میرا بازو قلم لیا تھا ”جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس چھوٹے سے
 جھوم میں سے کوئی اس کی متاع عزیز کو آپک کر لے جائے گا۔“

اس لمحے نہ جانے کیوں مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا جب ستارہ خانہ
 بدوش ”نوخیز لکھی“ میں اور اپنی رانست میں اس نے مجھے یہ وقت
 بنائے اور میری کل پوچھی رنڈ رنڈتھنے کے بعد نہایت سفاکی۔
 مجھے حکم دیا تھا کہ آئندہ میں اس کے خیمے میں نہ آیا کروں۔
 سے اس کی کوئی شکایت نہیں رہی۔ اس وقت اس کا گرا پٹیل
 باپ بھی اپنی پہلی جنگ عظیم کے زمانے کی بددلتی اٹھائے پاس
 کھڑا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ نوخیز اور کم سنی کے زمانے میں

”وہ کیوں؟“ میں نے مسرتوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔
 جتنے مسرتان مجھے نظر آ رہے تھے ان میں سے نہ تو کسی کے پاس گیمو
 تھا اور نہ ہی شکل و صورت یا حرکات و سکنات سے کسی پر اخبار
 نویس ہونے کا شبہ ہو رہا تھا۔

”جن چیزوں کی سید صاحب پہنچی کرنا چاہتے ہیں ان کی تو
 مفت پہنچی ہوتی نہیں۔ اس کے لئے انہیں اشتیارات دینے
 پڑتے ہیں۔ ان بارشوا، وہ بالکل پہنچی نہیں چاہتے لیکن ان
 میں کوئی فنوگر، نر یا پرورز آئیے تو اس کے دن بڑی بڑی رنگین
 تصویر بسا کے ساتھ گزرتھری رپورٹ آ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی
 آف دی ریکارڈز آ جاتی ہیں۔ اس لئے سید صاحب نے اندازہ کچھ
 بدل دیا ہے۔“ ستارہ نے رضاحت کی اور اپنا گلاس ہونٹوں سے
 لگا لیا۔

چھوٹا سا گھونٹ بھر کر وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز میں غماز کا
 نہایت بکا سا رنگ تھا۔ ”کیا تمہاری مصروفیات ابھی تک کم
 نہیں ہوئیں؟“

”نہیں“ میں نے اختصار سے جواب دیا۔
 ”کب کم ہوں گی؟“ اس نے سرگوشی کی۔
 ”کہہ نہیں سکتا۔“ جیسے مطمئن سے میری مصروفیات اتنی
 مختلف النوع ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی جھگڑکی نہیں کی
 جاسکتی ”میں نے بھی دیکھے لمحے میں کہا۔
 ”اور نہ ہی تمہارے بارے میں کوئی جھگڑکی کی جاسکتی
 ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”شاید یہ بھی صحیح ہے۔“ میں نے ہنس لیا۔
 ”لیکن میں تمہارے بغیر خود کو بہت خراب محسوس کرنے
 لگی ہوں۔ ایک دنیا میری نوازشات کو ترستی ہے اور میں تمہاری
 نوازشات کو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ میں شو بزنس کی تمام
 مصطلحوں اور رویوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی اس کمزوری
 کا اظہار بھی کر رہی ہوں۔“ وہ مجھ سے بڑی کھڑی تھی لیکن اس
 کی آواز گویا دور سے آ رہی تھی۔

”نہایت اور محبت ہے تمہاری۔ میں تمہاری دوستی کا
 قدر دان ہوں۔“ میں نے طلوع سے کہا۔
 ”لیکن تم کچھ دس سے نہیں ہو گئے؟ بچے نکلے اور منتخب
 الفاظ بولنے والے؟“ اس نے میری آنکھوں میں بھانکا۔
 ”میں تو اپنے آپ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرتا۔“ میں
 نے کہا۔

”بہر حال۔۔۔“ اس نے قدرے بے پروائی کے اظہار کے
 لئے گردن کو نہایت خفیف سا ہلکا دیا۔ اس کے کانوں میں
 جھولنے ہوئے ہیرے کے آؤرے جھلکا کر رہ گئے۔ ”پلے تم چار
 چھ دن میں ملنے کے لئے آجائے کرتے تھے تو زندگی بڑی دلچسپ سی
 محسوس ہوتی تھی۔ اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کر رہی

”میرے پاس فلاس کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں بہت بڑی ہیروئن نہ ہونے کے باوجود ابتداء ہی سے انتخاب پسند رہی ہوں۔“ وہ بڑی طمانیت سے مسکرائی۔ ”میں آنکھیں بند کر کے فلاس سائیں نہیں کرتی۔ فلاس میرے پاس آئی تو بہت ہیں لیکن موضوع جاننے کے بعد میں بیشتر کو انکار کر دیتی ہوں اور سیری شائبے نے نیا ذی پر سرمایہ کاروں اور ہدایت کاروں کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔“

”کیا تم صرف لوگوں کو حیران کرنے کے لئے فلم ایڈیٹری میں آئی ہو؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ میں روپیہ کمانے بھی آئی ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں بہت بڑی اداکارہ کے طور پر بھی معروف ہونا چاہتی ہوں۔ تم تو کامیاب اداکارہ اور بڑی اداکارہ کے درمیان فرق کو سمجھتے ہو؟“

”بہت اچھی طرح۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ تیرہ چودہ فلمیں مجھے ایک بڑی اداکارہ کے طور پر تسلیم کرالیں گی۔“ اس کے لہجے میں اعتماد اور طمانیت تھی۔

”میری اور تمہارے بہت سے دوسرے چاہنے والوں کی دعایں تمہارے ساتھ ہوں گی۔“ میں نے کہا۔

”مجھے صرف تمہاری دعاؤں کی نیاں فکر ہے۔ خیال رکھنا، تمہاری دعاؤں میری زندگی کے سفر میں مجھ سے پیچھے نہ جا سکیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دینا اسے چاہے کچھ یاد آگیا۔۔۔ اور وہ شاید کوئی چاللف بات تھی۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ ”میں بڑی انتخاب پسند ہوتی ہوں لیکن کچھ دنوں میں نے ایک عجیب و غریب فلم سائن کر لی، جسے شاید کوئی بھی سنجیدہ اداکارہ نہ کرے۔“

”کون سی فلم؟ کیا موضوع ہے اس کا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”موز۔“ اور چل کر بیٹھنے لگی۔۔۔ پھر میں جس اس فلم کے حلقہ بتاتی ہوں۔ ”ستارہ نے سرو کے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ اس گوشے میں روشنی اور بھی کم تھی اور درخت کے قریب پتھر کی ایک چھوٹی سی کھجور موجود تھی۔

ستارہ نے قریب سے گزرتے ہی سرے کی ٹرے سے ایک اور گلاس اٹھایا۔ میں نے ایک بار پھر سادہ پانی کا گلاس منتخب کیا اور ہم سرو کے درخت کے قریب جا بیٹھے۔ فضا میں کھنکی تھی اور ماحول بے حد خوب صورت تھا۔ آسمان پر چاند بھی موجود تھا اور خوب صورت اداکار کے ماتھے کا جو سر ہٹا ہوا تھا۔

ستارہ نے جھرمسری لے کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”سب کچھ کتنا دو ٹھیک لگ رہا ہے سوائے تمہارے، تم آج

جیکہ انسان کا دل ویسے ہی بڑا لالچم اور محبتیں کا تلاشی ہوتا ہے اور جیکہ ستارہ نے زیادہ دنیا بھی نہیں دیکھی تھی اس وقت وہ اتنی سناک اور ہلکے بھر میں بدل جانے والی تھی اسے خود پر اتنا چاہو تھا۔ اور اب جیکہ وہ میرے خیال میں گرگ پاواں دیدہ بن چکی تھی اس کے دل میں کیسے نازک ہڈے کو نیلوں کی طرح سر اٹھانے لگے تھے۔ جیکہ میرے خیال میں اس وقت اس جیسی عورت کی نظر میں زندگی اور دو چار کے سوا کچھ نہیں رہتی چاہئے تھی لیکن انسان بھی بس عجیب ہی گورکھ دھندلا ہے۔ مقصد منات کا مجموعہ۔

میں نے اس بولے بسرے دور کی دھندلی دھندلی یادوں کو دہن سے جھٹکا اور ستارہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”اوس کرنے والی اور احسان خانی کو بڑھانے والی باتیں چھوڑو۔ اور یہ بتاؤ آج کل مصروف کتنی ہو؟ کتنی فلمیں ہیں تمہارے پاس؟“

”مصروف تو بہت ہوں لیکن تمام تر مصروفیتوں میں سے تمہارے انتظار کی گھنٹا کش نکال ہی گئی ہوں۔“ وہ سراٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ اس نے دو سراٹھاں گالیں خالی کر دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں معمول سے زیادہ نمی کی سی جھلک رہی تھی۔

پھر وہ جیسے دلی دل میں گنتی کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری دو فلموں کے علاوہ اس وقت میرے پاس تیرہ چودہ فلمیں ہیں۔“ ”بہت خوب“ میں نے کہا ”پھر تو واقعی ابھی خاصی مصروفیت ہوگی۔“

”ہاں۔ ان ہیروئنوں سے زیادہ مصروفیت ہے جن کے پاس اس وقت پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ فلمیں ہیں۔ کیونکہ ایک تو میری ساری فلمیں سیٹ پر ہیں۔ سب کی شوٹنگ زور و شور سے چل رہی ہیں اور میں ایسی ہی فلموں کو ترجیح دیتی ہوں جن کے متروک شیڈول میں مکمل ہو جانے کی امید نکلتی دے رہی ہو۔ میرے زیادہ مصروف رہنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اپنے کیریئر کو بہت سنجیدگی سے لے رہی ہوں۔ بہت محنت کر رہی ہوں۔۔۔ پریسٹ پر دقت پر پہنچی ہوں بلکہ اس وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوتا ہے کیونکہ میرے سوا کوئی بھی وقت پر نہیں پہنچتا۔“

”لیکن یہ عادت تمہیں بہت فائدہ پہنچائے گی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”پہنچانے کی نہیں بلکہ پہنچا رہی ہے۔“ اس نے تسلیم کیا۔

”نی انال تو میرا کچھ وقت کا نیاں اور ہاں لیکن میری ایک ساٹھ فی جی ہے۔ اس چھوٹی سی بات سے ہدایت کاروں کے رویے میں میرے لئے بڑا احترام پیدا ہو گیا ہے۔“

”اگر آوی واقعی کچھ اصول لے کر چلے تو پھر وہ بہت زیادہ فلمیں نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

تک میری سمجھ میں نہیں آسکے۔ کبھی تو تم اتنے دو مینگا اور افسانوی لٹے ہو کہ اس دنیا سے تمہارا کوئی نا آہی نظر نہیں آتا۔ خوابوں کے آوی معلوم ہوتے ہو۔ اور کبھی اتنے پتھر لیے کہ چھوٹنے کی بہت نہیں پڑتی۔

"تم ابھی کچھ کو سمجھنے میں وقت ضائع مت کرو۔ ابھی تو زندگی بڑی ہے، رشتہ رشتہ میں خود بخود تمہاری سمجھ میں آجاوگا"

... میں نے گویا اسے تسلی دی۔

"یہ تمہارا خیال ہے تاکہ زندگی بہت طویل ہے؟ یقین کرو یہ تو ایک خواب کی طرح بیت جائے گی۔ بہتر سرگ پر ہم بڑی حیرت سے سوچیں گے۔ بس... یہ بھی زندگی! تم کو دیکھ لو کہ اب تک جتنے برس بیت گئے ہیں کیا وہ خواب معلوم نہیں ہوتے؟ ساری باتیں تمہاری یادیں خواب ہو چکی ہیں۔"

"یہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اس کی باتوں نے ایک ٹانے کے لئے میرے اعصاب میں خوف کی لہری دوڑا دی تھی۔

اس نے ایک کھونٹ بھرا اور میں نے اسے اس موضوع سے جانے کے لئے کہا۔ "تم مجھے اس فلم کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

"ہاں..." وہ ایک بار پھر متر متر انداز میں ہنسی اور میرے دل کے آگن میں گویا نرکی گھنٹیاں بجا اٹھیں۔

گلاس بیچ پر رکھ کر اس نے اپنے خوبصورت بیک سے اسپورٹنگ سکرٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سکرٹ نکال کر اپنے خوبصورت ہونٹوں میں ڈالی۔ میں نے ٹلائی لائنز نکال کر اس کی سکرٹ کو شلہ دکھایا۔ زرد روشنی میں ایک لمبے کے لئے چمک اٹھنے والا اس کا پستانورا چھو مجھے کسی مصری شہزادی سے مشابہ نظر آیا۔

"تم واقعی عجیب آوی ہو۔" وہ ایک طویل کش لے کر دھواں میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے بولی۔ "سکرٹ نہیں پہنے مگر لا نگر رکھتے ہو۔"

میں نے اسے نہیں بتایا کہ وہ جھٹلا سکتی نہیں ہے۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولی۔ "میں تمہیں اس فلم کے متعلق بتا رہی تھی جو میں مذاق مذاق میں سائیکرٹ کر رہی ہوں۔ اس کا نام "جنگل گرل" ہے"

"اوہ... مجھے یاد آیا۔ اس کے متعلق تو میں اخباروں میں پڑھ چکا ہوں۔ اس کی تو شاید شوٹنگ شروع ہو چکی ہے؟" میں نے کہا "مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی ہیروئن تم ہو۔"

"ہاں ہیروئن میں ہوں اور شوٹنگ خوب زور شور سے جاری ہے۔ ڈائریکٹر کا اعلان ہے کہ وہ اسے تین مہینے میں ختم کر کے چھوڑے گا۔ رانیل صاحب ہیں اس کے ڈائریکٹر۔ وہ بھی اس بارانی میں موجود ہیں۔" اس نے بتایا۔

ایک لمبے کے وقف سے وہ بولی۔ "ہالی ووڈ اور یورپ کی فلم ٹریڈ میں جو رجحانات چلتے ہیں وہ چار پانچ سال بعد انڈیا میں پہنچتے ہیں اور وہاں سے ایک کچھ سال بعد ہمارے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ہارن ٹائپ کے کرداروں والی فلمیں کسی زمانے میں صرف بچوں کے لئے بنی تھیں مگر تھوڑے سے روز بدل کے بعد بچپن دنوں ہالی ووڈ اور یورپ میں دوبارہ ان کا سلاطین آیا تھا اور اسی بار ان میں بچوں سے زیادہ بڑوں نے دلچسپی لی تھی کیونکہ ان میں کسی نہ کسی قبائلی سردار کی شلہ جولا اور نشتہ خیز قسم کی بیٹی ضرور موجود ہوتی تھی جو عموماً ہارن کی محبوبہ ہوتی تھی اور وہ بیٹے کی نہیں بلکہ بیٹے کے بچے کی کمال پسند کرنا تجربے کے دلوں پر بکلیاں گراتی پھرتی تھی۔"

"اور ہارن کے دوش بدوش نشتوں کے پٹے لگاتی تھی۔"

میں نے قہہ دیا۔

"بالکل" وہ ہنسی "دنیا بھر میں اس قسم کی فلموں کا رخاں ختم ہونے کے بعد اب ہمارے ہاں قدم رکھ رہا ہے۔ رانیل صاحب اس کی ابتدا کر رہے ہیں۔ وہ ہنگامی انداز میں فلم بنارہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ تین ماہ میں اسے مکمل کر کے چھوڑیں گے۔"

"تو تم اس میں جنگل گرل ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں بھی بچپن میں انتقال کر جانے والے کسی بیٹے کی کمال پسند کر اور پھر آخر درختوں پر جمو لیتی پھرنے کی اور جس حد تک مشہور و اجازت دے گا اس حد تک فلم بیٹوں کے دلوں پر جولو کی بکلیاں گراتی گی۔" وہ بخور سے انداز میں مسکرائی۔

"یہ تو واقعی تمہاری فلموں کی قطار میں ایک مختلف قسم کی فلم ہوگی۔" میں نے کہا

"رانیل صاحب ہاتھ دھو کر میرے پیچھے بڑھے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگل گرل کے تصور پر میرے علاوہ کوئی لڑکی ہونی نہیں اترتی۔ ان کے خیال میں اس رول کے لئے لڑکی نہ تو بعض فلموں کی ہیروئنوں کی طرح بھاری بھر کم ہونی چاہئے اور نہ ہی بہت قد یا ڈاک اندام بلکہ ان سب کے بیچ بیچ کی کوئی چیز ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ "چہرے صبرے اور جسمانی ساخت سے بیک وقت نزاکت اور مضبوطی کا اظہار ہونا چاہئے اور اس کی حرکات و سکنات میں چھپنے کی چمک اور پھرتی نظر آنی چاہئے۔ اور نہ جانے کیونکر انہیں یہ سب خصوصیات صرف مجھ میں جمع نظر آ رہی تھیں۔"

"خیر۔ ان کے انتخاب سے تو اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے ایک نظر اسے سر ہاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے یہ جان کر حیرت ہو رہی ہے کہ تمہارے درایت کار ہیروئن دنیا کے انتخاب میں اس قدر تردد کیوں کرتے لگے ہیں اتنی بار ایک بیٹی سے

معدرت خواہان نہیں ہوتا چاہئے۔ اس میں نیا ہرج ہے؟ زندگی میں تجربے تو ہوتے رہتے چلتے ہیں۔“

”ہاں۔ میں نے یہی محسوس کیا جیسے میں کسی شہر میں حصہ لے رہی ہوں۔ شاید میں زندگی کی یکسانیت سے بھی بہتر ہوں۔ میری جو تھیں میرا بیچ ایک بہت پیچیدہ اور جذباتی اور اداکارہ کا بیانیہ کی جنگ کرل ان سے پہلے ریلیز ہو جائے گی۔ شاید میں واقعی کم ہیوں کہ حیران کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ میں کتنی مختلف نظر آسکتی ہوں۔ پیسے بھی بچھے اے کلاس ہیرا، دوالے ہی مل رہے ہیں۔ بس شاید اس قسم کی کچی وجوہات ہو گئی نہیں بہر حال..... میں بہت خوش ہوں۔ بہت لطف آ رہا ہے اس فلم میں کام کرتے ہوئے۔ زیادہ تر شوٹنگ آؤٹ ڈور ہوتی ہے۔“

”خوشی بہت اہم چیز ہے۔ جہاں سے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میری اصلی خوشی کس دور..... بہت دور ہے..... اور مجھے یہ بھی سمجھ معلوم کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔“ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے تقریباً بند ہو گئیں اور لہجہ خوابیدہ سا ہو گیا۔

پھر اس نے پیسے چومک کر اپنے قریب رکھا ہوا گلاس اٹھا کر آخری جرہ حلق میں اٹھلا اور خالی گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”تم بہت بڑے آدمی ہو لیکن چونکہ میرے دوست ہو..... اس لئے یہ بات حفظ مراتب کے خلاف نہیں ہوگی اگر میں تم سے کہوں کہ بالآخر مجھے ایک ڈرنک اور لادو۔“

”تمہارے لئے کچھ لانے سے میری شان میں ہرگز کوئی فرق نہیں آئے گا۔“ میں نے خالی گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر دوسری طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں نہیں چاہتا تم اور پیو۔ تم تمہارے ہی طرف اتنی مائل کیوں نظر آ رہی ہو؟ اس سے پہلے تو میں نے بھی تمہیں اس طرح پہچنے نہیں دیکھا۔ ابھی تمہیں یہاں آئے زیادہ دیر نہیں گزری اور یہ تمہارا تیسرا گلاس تھا۔“

”معلوم نہیں کیوں آج دل چاہ رہا ہے.....“ وہ پاش میں چھپے ہوئے اپنے غور محضی مافوق کا بازو لیتے ہوئے بولی ”بہت سی چیزیں اور بے خود ہو جانے کو دل چاہ رہا ہے۔ اس وقت میں وہیں ٹھکڑے لے رہی ہوں جہاں میں چاہتی تھی۔ لیکن میں اس سے کچھ آگے جانا چاہتی ہوں۔ میں جب یہاں آئی تو بہت ادا اس تھی۔“

”حالانکہ بظاہر تمہارا چہرہ خوشی سے دیک رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ ایک سنگ ای کی کہتے ہیں۔“ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

”اداسی کی کوئی وجہ؟“ میں نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔ ادا ہی بس ایک خود بخود ہونے کی طرح اندر

کام لینے لگے ہیں ورنہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ہاں ہیروئن کا انتخاب کس طرح ہوتا ہے۔“

”ہاں..... مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے۔“ وہ مجھے لیے میں بولی۔

”ہیروئن کا یا تو نام یک رہا ہو یا پھر وہ فائرسٹریڈیوڈز کو ذاتی طور پر بہت پسند ہو وہ ایک دوسرے سے بہت خوش ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”وہ نہ کہ ادا کی موزونیت پر تو کسی غور ہوتا ہے۔ خصوصاً راجیل صاحب کے بارے میں تو یہ جان کر اور بھی حیرت ہو رہی ہے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ یوٹی وی..... بہت کم پڑھے لکھے آدمی ہیں۔“

”ہاں۔ وہ تقریباً ان پڑھ ہی ہیں لیکن بہت سے بڑے لکھوں سے بہتر ہیں۔ وہ اپنی ٹریڈ میں اپنے کام میں پیکتا ہیں۔ کمال آدمی ہیں۔ میں ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔“ وہ لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”کیا واقعی؟“ میں نے اس کی جھلٹاتی آنکھوں میں جانکا۔

”جو تم سمجھ رہے ہو وہ بات نہیں ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔ ”میں صرف پیشہ ورانہ سطح کی بات کر رہی ہوں۔ جو حالات اور دسائل ہمارے ہاں میر ہیں ان میں وہ شخص جس طرح کام کرتا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ متنی یافتہ ملکوں کے ڈائریکٹرز کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے تردد کرتا ہے۔ ہر فعل، واہنگ اور ذاتی پسند و ناپسند سے چلاتا ہو کر کاسٹ کا انتخاب کرتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے کردار میں موزوں ترین اداکار کو لانے کی کوشش کرتا ہے، خواہ اس کے لئے کتنی ہی دشواری اٹھانی پڑے۔“

”بہت خوب“ میں نے کہا۔

”لیکن ہماری انٹرسٹی کا بیج ایسا بن چکا ہے کہ اچھے آدمیوں کی اچھی باتوں کو بھی نہ قوت دیا جاتا ہے اور نہ کوئی انہیں سراہتا ہے۔“ وہ مسکرتہ کا ہلکا سا سٹیل لے کر بولی۔

راجیل صاحب کی خوبوں پر بھی شاد و نادر ہی کسی کی نظر جاتی ہے۔ یہ ابھی کا کام تھا کہ انہوں نے مجھے اس فلم کے لئے سائن کر لیا۔ تم خود سوچو کہ میں درجنوں کی شاخیں پکڑ کر دوسرے دوسرے بھونکتی ہوئی کسی لکھوں گی؟ لیکن راجیل صاحب کا کہنا ہے کہ وہ لی کردار کو بھی یادگار بنا دیں گے۔ ان کے ساتھ کام کرتے رہنے مجھے کچھ کچھ یقین ہونے لگا ہے کہ شاید وہ واقعی ایسا کردار بن سکے۔“

فلم کے معاملات میں وہ بہت منجھ مٹی تھی۔ میں نے پانی کا یک کونٹا پیر اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنا رہا۔ باتوں کی ایک کمری رنگ دینے کی پیش کچھ کچھ ہو رہی تھی۔

آخر کار میں نے کہا۔ ”یہ فلم سائن کرنے پر تمہارا ردیہ

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

ناگے بھون

اقلیم علیم

جلد اول: 150 جلد دوم: 150

ناشر: مکتبہ القریب

اردو بازار لاہور

کہیں سے خود بخود پھوٹی تھی اور زہری طرح رنگ و پے میں پھیل گئی تھی۔ "وہ قدرے مشعل انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہوتا ہے، ابھی بھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔" میں نے اس کا کدھا چھینکتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اس کا طالع یہ نہیں۔"

"یہ بہت پرانی نصیحت ہے۔" وہ میرا انداز میں مسکرائی۔

"یہ شراب بھی تو بہت پرانا ہے جس کا نام شراب ہے۔"

میں نے کہا۔

"اور انسان کے ورد اس سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔" وہ سلتی سگریٹ کا ٹوٹا ایک طرف اٹھاتے ہوئے بولی۔

"پھر خدا ان باتوں کو تو لوگوں سے لٹے ہیں اور اپنے آپ کو بھلاتے ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم واپس بکھرے بکھرے جھوم تک پہنچے تو مجھے ہوں لگا جیسے کئی لوگ کئی اگلیوں سے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں کہ ہم سب سے الگ تھلگ کیوں جا بیٹھے تھے۔ ذلیلے دھالے سوٹ میں ایک پست قد آدمی اس پر سکون مائل میں بھی نہ جانے کیوں آندھی طوفان کی طرح ایک طرف کو جا آ نظر آیا۔ وہ ہمارے قریب سے گزرا تو ستارہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ جھٹکتے سے یکدم ہوں رک گیا جیسے کسی موبائل کی برقی رو قطع ہو گئی ہو۔

پھر وہ اوپر ہوں کے قریب ہماری طرف گھوما۔ وہ گول منہ ہوں سے چرے والا ایک اوجیز عمر آدمی تھا۔ اگر اس کی بیویں سوئی اور آپس میں تقریباً جڑی ہوئی نہ ہوتیں تو اسے خوش منہوں میں ہی شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس قسم کی بیویں شخصیت کا کوئی اچھا اثر نہیں دیتیں لیکن وہ بھر بھی اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ خوش خلق، ہنسدار اور بے پناہ مستند۔ اس کے دو بیٹے روئیں میں گویا تو نامی موزن تھی اور وہ جیسے ہر لمحے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے لئے بے چین تھا۔

"یہ راجل بٹ صاحب ہیں۔ دنگل گرل کے ڈائریکٹر۔"

ستارہ نے بتایا۔

اس شخص نے ایک جھٹکے سے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھادیا۔ میں نے اس کا مختصر سا ہاتھ زری سے تھامتے ہوئے کہا۔ "آپ سے غائبانہ تعارف تو تھا" آج ملاقات بھی ہو گئی۔

"اور اس سے پہلے کہ ستارہ آپ کا تعارف کرائے" میں جاسکتا ہوں کہ آپ افضل چوہدری صاحب ہیں۔" اس نے مختصر سا قہقہہ لگایا۔ "افضل چوہدری کے علاوہ کوئی ہماری میردن جنگل گرل کو انعام کے وہاں نہیں لے جاسکتا۔" اس نے سرو کے اس درخت کی طرف اشارہ کیا جس کے قریب ہم چند لمحے پہلے بیٹھے تھے۔

اس کی بات میں معنیت تھی لیکن فی الحال میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ملائمت سے کہا۔ "میردن کے رول کے

لئے میں آپ کے حسن انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ میں نے آپ کی کوئی شے گن نہیں دیکھی لیکن میرا اندازہ ہے کہ اسکرین پر ستارہ سے بہتر جنگل گرل کوئی نظر نہیں آسکتی۔"

"میں منہ دیکھے کی بات نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی میں کولر بہت پرانا نامی گرامی ڈائریکٹر ہوں۔ میں تو سیدھا سادہ ان پڑھ آدمی ہوں۔ کوئی دعویٰ نہیں کرتا لیکن وقت ثابت کرے گا کہ ستارہ کے روپ میں ہماری انٹرنی کو ایک سر ستارہ ہی کہا ہے۔ آئے والے دس سال اس کے ہیں۔ یہ ہر رول میں شے کی۔ کم از کم میں تو اسے جدا اپنی سے لے کر ماریا تک ہر رول میں لینے کے لئے تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہر رول میں دھو جائے گی۔"

"میں آپ سے متفق ہوں۔" میں نے خمیگی سے کہا۔

"لیکن میں نے یہ بات بھی ستارہ کے منہ پر نہیں کی کیونکہ انٹرنی میں سامنے بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کرنے روانہ عام ہے اور ان پر بہت کم اعتبار کیا جاتا ہے۔"

ستارہ نے کسی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرا بازو تھامے خاموش کھڑی مسکرائی رہی۔ اس دوسرے ہاتھ میں بن سلتی سگریٹ تھی اور وہ غیر ارادی طور آہستہ سے اسے اگلیوں میں چھماتے جا رہی تھی۔

اچانک راجل بٹ کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ چمکتے ہوئے ہوں میں اس وقت اپنی بیوی کی تلاش میں جا رہا تھا جب آپ۔

میری برکیں دبا دیں۔

”آپ کی بیوی کون سی ہے کیا؟“ ستارہ نے ہولے سے اس پر بوجھا۔

”وہ دراصل ہم لوگوں میں بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔۔۔ لوگ تفریح کو بھی غاص نہیں رہتے۔ میں اچھا بھلا بچائے کر رہا تھا، یعنی یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بیوی کی بوجھ کی باوجود انوائے کر رہا تھا۔ اسنے میں مجھے اپنے ایک بڑی بیوی صاحبہ نظر آگئے۔ بہت دنوں سے ان کی اور میری اہمیت ملتی آ رہی تھی۔ میں فارغ ہوتا تھا تو وہ مصروف یا ملک سے اپار ہوتے تھے۔ وہ فارغ ہوتے تھے تو میرا شیڈول غائب چل رہا ہوتا تھا۔ آج نظر آئے تو میں نے فوراً بیوی سے کہا۔ بجلی اس کی تو یہاں ایک طرف کو کھڑی ہو۔ میں چار پیسے کا بزنس کرلوں۔ میں منسل منسل کر سیٹھ صاحب سے ہاتھیں کرتا رہا اور اب فارغ ہوا تو بھول گیا کہ بیوی کو کہاں کھڑا کیا تھا۔“

”آپ قصوری دیر اور ستارہ سے ہاتھیں کرتے رہے آپ کی فلم خودی آپ کو تلاش کر لیں گی۔“ میں نے مشورہ دیا۔ راجیل بیٹ نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔ ایک طویل عرصے سے فلم جیسے بزنس میں رہنے کے باوجود اس کے چہرے پر مصیبت تھی۔

”مشورہ اچھا ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن پھر غیہہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہم فلم انڈسٹری والوں کی بیویوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ معلوم نہیں، میں کیا کچھ کرتے دیکھتی ہیں لیکن مجھ پر بظاہر آنکھیں بند کر کے ہمارا انتظار کرتی ہیں، خاص اور فلمی ہیرو کی بیوی ہونے کے لئے تو بڑا جگرا چاہئے گی۔“

وہ ستارہ انداز میں میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھنے لگا تھا کہ اردک گیا کیونکہ اسی لمحے گڑے رنگ کے سوٹ میں ایک ثابت دروازہ قہقہے ہمارے قریب آن کر رہا تھا۔ وہ سرخ و سفید عیوضہ جوان تھا۔ اس کے ہونٹوں کے قدرتی گلابی پن کو ہان کی لال نے گمراہ کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خار کے گلابی ڈورے تھے اور وہ یقیناً ہوش و بے خودی کے درمیان درمیان کہیں کسی اذک سوز پر ہی تھا تاہم بظاہر خود کو اچھی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔

تھری جیس سوٹ میں جسمانی ساخت کا زاوہ صحیح انداز میں ہوا، اس کے باوجود اسے سر تا پا کچھ کڑم کڑم کر رہے تھے یہ بات مشکل نہیں تھا کہ وہ کوئی ٹھیک ٹھاک باڈی بلڈر تھا۔ اس کے چہرے کے عضلات کھینچے ہوئے تھے اور لباس کے نیچے یقیناً لوگوں نے پھیلیاں پھیل رہی تھیں۔ کندھے چڑاے تھے۔

اس نے کوئی بات نہیں کی کوئی تمہید نہیں بنا دی، کسی قسم کی رسمیات کی ضرورت محسوس نہیں کی اور یکدم ہی اس طرح مجھ سے ستارہ کی کلائی پکڑ لی کہ اس کی آنکھوں سے سگریٹ نکل کر لباس پر گر پڑی۔

اسے گویا اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ ستارہ نے دو سرے ہاتھ سے میرا بازو تھما ہوا ہے اور وہ میرے ساتھ کھڑی ہے۔ اس نے ستارہ کو اپنی طرف تقریباً کھینچے ہوئے غمور سے لیے میں کہا ”ارے“ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میری بیوی وہاں کھڑی ہوئی ہے۔ بھی اصولاً تو ہمیں میرے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔“

مجھے اس کا انداز بہت ہی برا لگا۔ میں نے اسے آپ کو آگے بڑھ کر اس کے منہ پر گھونسا رسید کرنے سے بے دخل باز رکھا۔ ستارہ کے چہرے پر بھی غمور اور برائی کے آثار نمودار ہو گئے۔ مجھے ہوں لگا جیسے میرے ارد گرد سکوت چھا گیا ہو حالانکہ میرا خیال ہے لوگ بدستور اپنی اپنی باتوں میں ہی مشغول ہوں گے۔

میں محفل کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر میرے ہاتھ کا ٹکڑہ اس قدر سخت ہو گیا کہ اس کے ہاتھ سے ستارہ کی کلائی خود بخود چھوٹ گئی۔ میں نے اتنے سختی سے اس کا بازو پھینچے کیا اور ایک قطعہ کے بغیر ایک قدم پیچھے ہٹ کر یوں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا کہ کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

اسے بہتر طور پر دیکھنے پر مجھے احساس ہوا کہ اسے نوجوان نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اچھا خاصا پختہ العمر آدمی تھا لیکن اپنی ممتداشت و نمونہ کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے خاصا کم کا نظر آتا تھا۔ جس انداز سے میں نے اس کی کلائی کو پھینچنے کے لئے کھینچے میں جگرا تھا، اس کی جگہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو وہ یقیناً کلائی تمام کر کر رہا ہوا زمین پر بیٹھ جاتا لیکن وہ سرحال باڈی بلڈر تھا۔

وہ شیطانی رنگوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت کم لوگ سرا دینا کے بغیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں کیونکہ میرا قد سوا چھ فٹ ہے لیکن وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ قد میں مجھ سے ایک آدھ انچ ہی کم تھا۔

اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ تڑپے ہی گئے تھے کہ راجیل بیٹ نے ایک عقلمند ثالث کی طرح آگے بڑھ کر ہاتھ بلند کر کے گویا اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ارشد! تمہارا شاہی ان سے تعارف نہیں۔ یہ شہر کے بہت بڑے آدمی ہیں افضل چہدری صاحب، چہدری گروپ آف کمپنیز کے ڈائریکٹر ہیں۔“

پھر وہ اسی طرح غلت کے سے عالم میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اور یہ ارشد موتی ہیں۔ شہر کے مشہور باڈی بلڈرز میں سے ایک رہے ہیں۔ چار پانچ سال پہلے مشہور ہو رہے ہیں۔ مسٹر پاکستان کے لئے بھی مقابلوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ معمولی پوائنٹس سے وہ مجھے تھے۔ کافی عرصے سے اداکاری کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک فلم بنی تھی جس کا

ستارہ، اچھا بڑا پس کیا تھا اس نے۔ ارشد موتی اس کے ہیرو تھے۔
... آج کل یہ ہماری فلم میں کام کر رہے ہیں۔ جنگل گرل میں ستارہ
کے مقابل ہیرو ہیں۔"

ارشد موتی کو غالباً اس سے غرض نہیں تھی کہ اسے میرے
بارے میں کیا بتایا گیا ہے۔ اسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی
کہ اس کا تعارف متاثر کن انداز میں کرایا گیا ہے یا نہیں۔
رائیل نے جس طرح اس کا تعارف کرایا "اس سے اس کے
چہرے کا تاؤ کافی حد تک کم ہو گیا لیکن خوشگوار موڑ میں بھی شاید
اسے نہ قدرے شیرازہ کر کے بولنے کی عادت تھی۔

اپنے اسی مخصوص انداز میں وہ قدرے استہزائیہ لہجے میں
بولی۔ "بٹ صاحب! انا لہا تعارف کرانے کی کیا ضرورت ہے۔
بس اتنا ہی کہہ دیں کہ اگر یہ بڑے آدمی ہیں تو چھوٹے آدمی ہم
بھی نہیں ہیں۔"

"ہاں، وہ تو تمہارے انداز و اطوار سے ہی معلوم ہو گیا ہے۔"
... میں نے جگ جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے
سر دیکھ لیا۔

وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بھر پوری نظروں کی تاب نہ
لا کر اس نے نہ پھیر لیا اور سر کو عجیب سے انداز میں جھکا دیا
کہ آگے بڑھ گیا۔

رائیل بٹ نے یوں طویل سانس لی جیسے کوئی مصیبت ٹل
گئی ہو۔ ستارہ کا احوال تاؤ بھی جیسے دور ہو گیا۔ وہ قدرے
عزت آئیز لہجے میں بولی۔ "اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے
مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ چھچھورا آدمی ہے مگر سیٹ پر یا
شوٹنگ کے دوران اس نے کم از کم میرے سامنے چھچھورے پن
کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ آج اس کو کیا ہو گیا تھا بٹ صاحب؟"
رائیل بٹ نہایت آئیز انداز میں سیکٹی پر انگلی مارتے
ہوئے بولا "گنبت کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔"

"دماغ ہے اس کے پاس؟" ستارہ نے مصدمیت سے
پوچھا۔

"بس میں مروتاً فرض کر لیتا ہوں کہ شاید ہو دو جا رہی دماغ
اس کے پاس۔" رائیل نے مختصر اور مضطرب سانس لے لیا۔

ستارہ سنجیدگی سے بولی "میں نے تو شوٹنگ کے دوران کبھی
اپنے کسی عمل سے اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ اس کے
باوجود یہ یکایک اسے کیا سوچتی تھی جو فری ہوئے لگا تھا؟"

"میں نے کہا تھا کہ اس کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔" رائیل
ہاتھ ملتے ہوئے بولا "ویسے بھی اس قسم کی پارٹیاں ایسا ماحول
اس کے لئے ایسی ہی چیزیں ہی ہیں۔" اس نے ہمدردانہ سے
انداز میں سر ہلایا "انسان کبھی غلط نہیں اور کبھی خوش نہیں میں جتنا
ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ کم ظرف ہو۔ معمولی ماحول سے آیا
ہو۔ ایسے انسانوں کو معاف کرنا چاہئے۔" وہ ہٹا ہر ستارہ سے

غالب تھا لیکن یہ بات گویا اس نے مجھے سنانے کے لئے کہی تھی۔
ستارہ بھی سگریٹ سٹاک کر ایک شش لیتے ہوئے بولی "میں تو
معاف نہیں کروں گی بٹ صاحب! یہ درست ہے کہ میں نے
آپ کی فلم سائن کر لی ہے اور آپ کی شخصیت، عادت و اطوار
اور کام کرنے کا انداز مجھے بہت اچھا لگا ہے لیکن میں ارشد موتی
کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گی کہ وہ مجھے کوئی ایگزٹنگ کرل
سمجھ کر فری ہوئے کی کوشش کرے۔ آئندہ اگر اس نے کبھی
شوٹنگ یا کسی پارٹی کے دوران یوں اچانک ہی مجھ سے چھپتا آئی
کی کوشش کی تو میں کوئی چیز اس کے منہ پر مار کر رات باہر نکال
دوں گی۔ اور اس سلسلے کا باقی کام چوبدری صاحب مکمل کرادیں
گے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میں نے کہا تھا کہ ایسے لوگوں کو معاف کرنا چاہئے۔"
رائیل بٹ نے ایک بار پھر مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے۔
"انہیں کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بس اپنے آپ کو پھرتے پھرتے
ذہم میں ہوتے ہیں۔ خیر اس موضوع پر ہم بھر بات کریں گے۔
بشرطیکہ ضرورت پڑی۔ اب اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں
اپنی بیوی کو تلاش کرلوں؟ اس عرصہ میں اپنی بیوی کو کھوئے کا
مختل نہیں ہو سکتا۔"

"آپ ضرور انہیں تلاش کیجئے۔ پلیز" میں نے سحرانے
ہوئے کہا۔ رائیل بٹ آگے بڑھ گیا اور لوگوں کی فلیوں کے
درمیان ہماری نظر سے اوٹ ہو گیا۔

ستارہ کا ذہن اب بھی ارشد موتی میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ وہ خود
کلائی کے سے انداز میں بڑھاؤ کی۔ "آج تو اس گدھے نے مجھے
جیراں کر دیا۔"

"اس کا خیرافیہ کیا ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں
پوچھا۔

"بٹ صاحب نے کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے بھی کچھ زیادہ نہیں
معلوم۔" وہ ٹٹلنے کے سے انداز میں ایک طرف بڑھتے ہوئے بولی
... بعض باڈی بلڈر اور پیلوان، کسرت گاہوں اور اکھاڑوں کو
چھوڑ کر ان کے تقدس کو بھول کر عشرت کدوں کی طرف تامل
ہو جاتے ہیں۔ بد معاشی میں پاؤں رکھنے لگتے ہیں۔ ان کے پاس
جسمانی طاقت بھی ہوتی ہے اور آئندہ دس انہی جیسے پلے پلانے
چلے جائے بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں بیشتر
عشرت اور بد معاشی، دونوں کا چکا چڑھا جاتا ہے۔ ان کی دھاک بھی
جلدی بیٹھ جاتی ہے۔ بہت سے دولت مند لوگ انہیں اپنے غیر
رسمی بازی کارڈز کے طور پر استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس
لئے وہ کچھ اور بھی زعم میں جلا ہو جاتے ہیں۔ ارشد موتی بھی
ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ اکھاڑے اور تن سازی کے
کلبوں سے اس کا تعلق نا آئینہ نگہی برس پیلے ٹوٹ چکا ہے۔
"فلم انڈسٹری میں اسے کون لے آیا؟" میں نے سادہ پائی

بڑے قلم ساز اور دوسرے سینہ کسی نہ کسی مشکل مرٹے پر کسی نہ کسی کھن کام کے سلسلے میں یا اپنے کسی مخالف کا داغ درست کرانے کے لئے خفیہ طور پر اس کی خدشات حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن ظلوں میں پھر بھی اسے برا بدل نہیں دیتے۔ اور ان حالات میں راجل بیٹ صاحب کی نظر کرم اس پر پڑتی۔ انہوں نے ایک بار پھر دیوارزن والا سبیکٹ پکڑا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اب پھر اس تجربے کو دہرانے کا وقت آیا ہے۔

"بہت خوب" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تاہم راجل صاحب کبھی پرکھی مارنے والے قوی نہیں ہیں۔ انہوں نے جو کمائی خبب کی ہے اس میں کچھ آگے چل کر سے موز آتے ہیں۔ مثلاً ہیرو تارزن اور ہیرو کا کسمیر بن جانا ہے۔ اسی طرح ہیرو نہیں بھی دو ہیں۔ میں تو تارزن نراس ہیرو کی جنگی مجبور ہوں لیکن ثانوی ہیرو کی ایک کمزوری برنس میں کی جی ہوگی۔ ہیرو صاحب درختوں کی شاخوں پر چبھنے جھانے آخر کار شرم کی چٹکتی دیکتی سڑکوں پر بھی پیچھے گئے لیکن لمبے چوڑے پکڑوں کے بعد آخر کار وہ اپنی جنگلاتی عبت کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اس میں عوامی دلچسپی کے سارے سالے ہوں گے۔"

"کاروباری نقطہ نظر سے تو سبیکٹ اچھا ہے لیکن کیا بیٹ صاحب کو ارشد موتی کے علاوہ کوئی دوسرا ہیرو نہیں ملا تھا؟" میں نے سرسری سے لمبے میں کہا۔

"ہاں واقعی نہیں ملا تھا" ستارہ نے جواب دیا "انہوں نے بہت سے ہاڈی ملڈرز کا اسکرین ٹیسٹ لیا تھا۔ کوئی فوٹو بینک نہیں تھا کسی کی آواز اچھی نہیں تھی اور کمرے کا سامنا کرنے کے معاملے میں تو بیشتر کام تھے۔ اس لئے بیٹ صاحب کو مجبوراً ارشد موتی کی طرف ہی رخ کرنا پڑا۔ اس کے کریڈٹ پر کم از کم ... ایک کامیاب قلم تو موجود تھی۔ فوٹو بینک بھی ہے۔ کمرے کے سامنے کام کرنا اچھی طرح جانتا ہے۔ آواز بھی پرکشش ہے حالانکہ عمر کے اعتبار سے وہ مصنف کے تصوراتی ہیرو سے کچھ زیادہ عمر کا ہے لیکن ایک آپ سے اس خالی کو چھپایا جائے گا۔" پھر وہ ایک لمبے کے توقف سے بولی۔ "آوی بے شک گھٹیا ہے لیکن کم از کم میرے اور بیٹ صاحب کے ساتھ اس نے بھی گھٹیا پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔"

"ہرگز کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر توئی کا داغ اُٹھنے لگا دیر لگتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی دوران اسٹیج پر گئے ہوئے ٹائیک کے ذریعے اعلان کیا گیا کہ اندر ہال میں مسافروں کے لئے رخص کا انتظام ہے جو بھی جوڑے رخص سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اندر جا کر اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ اور یہ کہ کھانے کے بعد درانی پروگرام شروع ہونے سے پہلے سونگ ونچو کے چند دلچسپ حقائق سنئے۔ اس کے بعد اعلان کرنے والے نے غالباً ذرا مزاح پیدا

کلاس کو انگلیوں میں مچھاتے ہوئے پوچھا۔
"صحیح طور پر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ سنا ہے ایک بہت اچھے بازو تھے یونس صاحب۔ انہوں نے کئی ٹکلی پھٹکی رومانی لکھ لی تھیں۔ تاہم لیکن ایسی ظلوں کا برنس کچھ نرم ہونے لگا لوگ غالباً وہی گئے تھے چرے دیکھ دیکھ کر تنگ آنے لگے تو یونس صاحب نے یکدم ہی کروش بدلی اور ایک نیا تجربہ کیا۔ اس نے ارشد موتی فوجوان تھا۔ یونس صاحب نے اسے ہاڈی کی کلب سے اٹھا کر اسٹوڈیو میں پہنچا دیا۔ وہ بھی ہیرو بننے کے نہیں خوش خوشی چلا آیا اور پھر لوٹ کر نہ جاسکا۔"

ستارہ نے ایک لمبے کے لئے خاموش ہو کر سرگرت کا شل لیا ہوا ریسے میں بات جاری رکھی۔ "یونس صاحب کا تجربہ نیا وہ ہانگے چیلے اور تنگ تنگ کر چلنے والے ہیرو کی جگہ ایک "مندیو" جسمانی طور پر خوبصورت اور مضبوط ہیرو کو اسکرین سے تھے جس کے رنگ بھوں کی نمائش کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو نہ وہ صرف پیتے کی کھال کا ایک ٹکڑا پست تھا اور دراز تنگ اوہیرو میں ڈانڈی لگ بولنے کے بجائے پہاڑوں اور جنگلوں آبیروں پتیلیں اور باغیچوں کے ساتھ دوڑا پھرتا تھا۔ چڑیا گھر ان جانوروں پر بھی خاصی منت کی گئی تھی۔"

"مجھے کچھ یاد تو پڑتا ہے کہ اس قسم کی بھی کوئی فلم بنی۔ کیا وہ تجربہ بھی کامیاب رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"خاصا کامیاب رہا تھا۔" ستارہ نے بتایا "اور قلم اندر سڑی حالانکہ روایت ہے کہ ایک طرح کی فلم بہت ہو جائے تو پھر قسم کی ظلوں کی لائن لگ جاتی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر جنگلی شہزادے والے سبیکٹ پر نہ جانے کیوں دوبارہ کسی نے نہیں ڈالا۔ شاید اس لئے کہ اس طرح کی فلم بظاہر آسان لگتی ہے لیکن درحقیقت اس میں محنت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا راجن موت ڈور شرٹنگ میں ہوتا ہے۔ سندھے ہوئے جانور ہمارے ہاں زیادہ تعداد میں دستیاب نہیں ہوتے۔ یعنی خاصا ت کا کام ہے۔ اس میں سب سے کم محنت کمائی پر ہوتی ہے بلکہ کمائی خاصی حد تک چھانڈی ہوتی ہے۔ ساری خوبصورتی اس کے لئے اور ڈائریکشن کی ہوتی ہے۔"

سرگرت کو انگلیوں میں مچھاتے ہوئے وہ ایک لمبے کے توقف سے بولی۔ "بہر حال لوگ اس تجربے کو بھول بھال گئے۔ ارشد موتی کو قلم اندر سڑی کا ایسا چسکا لگا کہ وہ مسلسل اسٹوڈیو میں ہی رہا مگر دوبارہ اس کو کسی نے ہیرو کے طور پر کاسٹ نہیں کیا۔ لی ظلوں میں البتہ اسے دلن یا ٹینک لیڈر ٹائپ کے کرداروں پیش ہوئی مگر اس وقت تک اس کی امید پر قرار تھی اس کو وہ انکار کرتا رہا لیکن آخر کار اس نے ان سے بھی چھوٹے کردار قبول کرنے شروع کر دیے۔ لیکن اسی دوران وہ حقیقی زندگی میں خاصا مضبوط ٹینک لیڈر بن گیا۔ اب بھی بہت سے

کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بدایات دینا شروع کیں "جو لوگ ان مثالوں میں حصہ لینے میں دلچسپی اور آمادگی ظاہر کر چکے ہیں ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ کھانا ذرا ہاتھ دھو کر کھا لیں تاکہ تیار کی اور غوطہ خوری وغیرہ کے قائل رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں ان کو کھانا اٹھا کر سونگ پول میں پھینکنا پڑے۔ کھانے سے پہلے ان کو اس لئے زحمت نہیں دی جا رہی کہ کہیں بھوک کے مارے وہ ہاتھ پاؤں ہی نہ ملا سکیں اور سیدھے سونگ پول کی تہ میں جا بیٹھیں۔"

اس پر کئی مہمانوں نے قہقہہ لگایا۔ میں اور ستارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ستارہ نے گویا وضاحت کی۔ "بیشتر مہمانوں کی چونکہ میزبان سعید صاحب سے بے تکلفی ہے اس لئے اس قسم کے اطلاعات کا برا نہیں منایا جاتا۔ ان کی پارٹیز میں لوگ کھل کر انجوائے کرتے ہیں۔ سونگ، غوطہ خوری اور اس سلسلے کے دوسرے کتب و مکانات کا جو مقابلہ ہو گا اس میں کئی خواتین بھی حصہ لیں گی۔ ان مثالوں میں جیتنے والوں کو حیران کن قسم کے تحائف دئے جائیں گے۔"

"خاصے زندہ دل آدمی ہیں سعید صاحب! میں نے ستارہ کا ہاتھ تمام کر دیکر بہت سے مہمانوں کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ میری نظریں ابھی تک غیر محسوس طور پر اسی کو تلاش کر رہی تھیں کہ وہ اب میں اس کی آمد سے باخبر ہو چلا تھا۔

اندر جس ہال کو رقص کے لئے استعمال کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا وہ واقعی کسی بڑے ہوٹل کے ہال دوم سے کم نہیں تھا۔ اس طویل و عریض ہال کا داخلہ پائش شدہ فرش آئینے کی طرح چمکلا رہا تھا اور اس میں لوگوں کے دھندلے دھندلے عکس تک دیکھے جاسکتے تھے۔ یہاں تیز روشنیوں کا سیلاب تھا اور ان روشنیوں میں جہاں حسن کے جلووں کی جھلک بکھیرا گئی تھی وہاں بہت سے ایسے چروں کا کھانا بھی عیاں ہو گئی تھی جو فلکی روشنی میں بہتر لگ رہے تھے۔ ملبوسات کے رنگ کچھ اور کمرے ہو گئے تھے "زرا ملبوسات کی جھلک بکھیرا گئی تھی اور بھی بکھیرا گئی تھی۔ بیروں کی خیواری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تھی۔ آکر سٹرا ٹال کاغذی کمرے میں تھکا لیکن دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں گویا ہر شخص کو اپنے ہی پہلو سے پھوٹی محسوس ہو رہی تھیں۔

کئی کمرے اسی ہال سے ملحق تھے اور ان کے دروازے ہال ہی میں کھلتے تھے۔ اس وقت بھی دروازے کھلے تھے۔ کسی کمرے میں تالپن پر صرف خوبصورت گاؤں گئے اور اونچے کنکشن رکھے نظر آرہے تھے۔ غالباً رقص کے دوران مہمانوں کے سستانے کے لئے ایک کمرے میں میزوں پر پینے پلانے کا سامان بھی سجا نظر آ رہا تھا جہاں غالباً اپنی مدد آپ کے تحت ڈرکس تیار کی جاسکتی تھیں۔ یہاں کوئی بڑا میز نہیں تھا۔

سازندے غالباً ابھی اپنے ساز درست کر رہے تھے اور

انہیں آزادی سے انداز میں بجا رہے تھے۔ اسی دوران ایک خاصا خوبصورت جوڑا ہمارے قریب آکر دکا۔ مرد قدرے فریبی مال دروازہ اور پیشانی سے اور کا تھا۔ عورت ہمیں سے اوپر کی نہایت گوری اور خوبصورت تھی مگر اس کے حسن میں عجیب سا پیکا پن تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہر پرش پرشوں کا خیال آتا تھا۔ اس کی آنکھیں شرقی تھیں اور وہ دھیر ساری خیواری بننے ہوئے تھیں۔ وہ بھی قدرے فریبی مال تھی اور کسی جمیل کی طرح ہر سکون تھی۔

مرد کی رحمت حالانکہ زیادہ صاف نہیں تھی مگر اس کی آنکھیں نئی تھیں اور ان آنکھوں سے بے پناہ جلال کی میاں تھی مگر اس نے بڑی کامیابی سے اپنی شخصیت پر لاؤ بلی بین کا لہرہ چڑھایا ہوا تھا اور ظاہر بڑے ذہیلے ذہالے انداز میں پتلے پتلے کاغذی معلوم ہو آتا تھا۔ تاہم اس وقت وہ اپنا مطلوب تھا یا پھر اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی کیونکہ اس نے مجھ سے صاف کہا تو مجھے اس کے ہاتھ میں غیر معمولی حرارت اور نہایت ہی خفیف سی لرزش محسوس ہوئی۔

عورت نے نہایت بے تلے انداز میں مسکراتے ہوئے ستارہ سے ہاتھ ملایا اور اسی دوران ستارہ نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ نصیر نواز ہیں۔ قلمی دنیا کے مشہور اور معروف ترین مصنف۔ سلیقے کی کامیابی لگتے ہیں لیکن میری طرح تجربے کے طور پر انہوں نے جنگل کرل گھنے کی بھی ہائی بھلی تھی وہ شخص پہلی ہی غیبی کے ساتھ بولا "ایک کامیاب مصنف کو ہر طرح کی کامیابی لگتی چاہئیں گی، خصوصاً جب معاوضہ بہترین مل رہا ہو۔"

میں نے صرف مسکرائے پر اکتفا کیا۔ اس کی تردید یا تائید نہیں کی۔ ستارہ نے اس کی ساقی عورت کی طرف اشارہ کر "اور یہ ان کی دوست ہیں ظاہرہ خانم۔"

میرزا اعجاز علی دہا تھا۔ وہ نصیر نواز کی دوست تھی میں نے اس کی بیوی سمجھا تھا۔ نصیر نواز سے بھی میں غائبانہ طور پر واقف تھا۔ ملاقات آج ہوئی تھی۔ قلمی کامیابی کے فکس میں اس نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اس کی دو ٹوٹی تھی دیکھی تھی نصیر اور میرزا خیال تھا کہ اس کی کامیابی اتنی اچھی نہیں ہوتی جتنا اچھا اسکرین لے ہوتا ہے۔ کامیابی کو پیش کرنے کا انداز اس کی کامیابی کی بنیاد تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھرا ڈرامائی مہرے کے ساتھ پیش کرنے میں ماہر تھا۔

ستارہ نے اس سے میرا تعارف کرانے کی غرض سے میرا طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور یہ ہیں۔"

نصیر نواز اس کی بات کاٹنے ہوئے بولا۔ "محمد افضل چہدری۔ انہیں کون نہیں جانتا مجھے خوشی ہے کہ آج ان ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔"

”تو گویا ظاہرہ خانم کا قلم انگریزی سے کوئی تعلق نہیں؟“
میں نے پوچھا۔

”نہیں، ہرگز نہیں“ ستارہ نے جواب دیا ”وہ خالصتاً ایک غیر فلمی عورت ہے۔ اس کے پاس شوہروں کی چھوڑی ہوئی کچھ زمینیں ہیں۔ کادو بار ہیں۔ کالی مصروف عورت ہے۔ لیکن اب شاید اس کا فلمی دنیا سے عملی تعلق بھی ہو جائے۔ ستارے آج کل نصیر نواز اپنی ایک ذاتی فلم کی کمائی پر کام کر رہا ہے۔ وہ قلم غالباً ظاہرہ خانم ہی کے سرے سے ہے گی۔“

اس دوران رقص کے لئے موسیقی شروع ہو چکی تھی۔ ہم بھی دوسرے جوڑوں کے ساتھ موسیقی کے زیرِ دم پر ہلکے ہلکے لینے لگے۔ آرکسٹرانے اس قسم کی باتوں کی عمومی روایت کے مطابق جاز سے موسیقی کا آغاز کیا تھا۔ ابتداً عام طور پر یورپی دھبے اور قدیم روانوں سے انداز میں ہوتی ہے لیکن دھیرے دھیرے ماحول حرارت پذیر ہوتا ہے تو دھبے بدلتی جاتی ہیں۔ تیز تیز ہوتی جاتی ہیں اور جدید ترین دور میں تو اصلاً بھلا سنجیدہ طبقہ بھی آخر کار بریک ڈانس تک پر طبع آزمائی کی کو پیش کرتا ہے۔

رقص کے دوران بھی جانے کیوں میرے ذہن میں نصیر نواز ہی پھنسا رہا۔ میں نے بظاہر سرسری سے لیجے میں کہا ”جانے کیوں میرا دل نہیں مانا کہ نصیر نواز ابھی تک غیر شادی شدہ ہوگا“

”میں نے کب کہا کہ مجھے اس بات کا یقین ہے؟“ ستارہ میری باتوں میں مسکراتی ”لیکن ظاہرہ حالات اور اطلاعات کے مطابق تو وہ غیر شادی شدہ ہی ہے اور ظاہرہ سے ہمیں وہی حکم کرنا چاہیے جو بظاہرہ رکھنا دے رہا ہو اور جو کچھ مختلف شخص نے خود ذکر کیا ہو۔ ٹھیک ہے؟“

”ہاں! ٹھیک۔ ہمیں کوئی حق نہیں کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”لیکن میں تو توہمی‘ نیت پیش چالو رکھنے کے لئے تمہاری ذاتی رائے جانتا چاہ رہا تھا“

”میری ذاتی رائے؟“ اس نے جھٹ میں توڑ دیاں فالوں کی طرف دیکھتے ہوئے پُر خیال لیجے میں کہا ”مجھے یقین نہیں مگر میرا دل کہتا ہے کہ جس کاغذ یا چھوٹے موٹے شے سے وہ تیار ہو گا وہاں ضرور اس کی کوئی گھڑیلو سی پڑی موجود ہوگی۔ فلمی دنیا میں عموماً یہی ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ چھوٹے چھوٹے شوہروں یا رسات سے اس دینار لینڈ کا رخ کرتے ہیں۔ قسمت اگر ان پر مہربان ہوتی ہے تو وہ عزت، دولت، شہرت سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں اور وہ بے چاری اور سنجیدہ میرج کی شکار‘ سیدھی سادی‘ وناشعار عورتیں ان کا انتظار کرتی رہ جاتی ہیں۔“

”میرا خیال ہے اکثریت کی نہیں بہت کم لوگوں کی یہ کمائی ہوتی ہوگی۔“ میں نے خنیاں ملا کر کیا۔

”کم لوگوں کی سہی لیکن بہت حال کوئی ابھی کمائی نہیں

مجھے اب واقعی حیرت ہونے لگی تھی کہ اتنے بہت سے اور نام سے معروف کامیاب لوگ مجھے مانجانہ طور پر کیسے جانتے تھے! میری تو تصویر ہی کسی آنے والی اخباروں میں نہیں چھپتی تھی۔ فلمی دنیا میں شاید دولت بہت بڑا تعارف تھی۔ دولت مندوں کو لوگ بغیر ملاقات کے بھی جانے لگتے تھے۔ میں صرف چند مرتبہ سڑکوں پر گھومنا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ پچاسوں آدمی مجھے جاننے لگتے تھے۔

”آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔“ میں نے رسم بھائی۔
”خوش نہیں ہے ہماری“ نصیر نواز گردن کو خفیف سا خم کے سرکراتے ہوئے بولا۔ اس کی مسکراہٹ روح سے خالی فی کر بھر بھی خاصی دلکش تھی۔ اس کی عمر اگر کچھ کم ہوتی اور نصیت تھوڑی سی بے زل ہو نا شروع نہ ہو چکی ہوتی تو وہ خود ہی گزرائے لائن تیرہ کے طور پر فلموں میں چل سکتا تھا۔ بلکہ مجھے نہ جانے کیوں شبہ ہو رہا تھا کہ شاید ابتداً میں وہ بیرونی دنیا کی آرزوئے قلم انگریزی میں آیا ہو مگر اس طرف دال نہ لگی ہو اور پھر حالات نے اس کی کوششوں یا پھر صلاحیتوں نے اسے مصنف بنادیا ہو اور اس میدان میں اسے کامیابی نصیب ہو گئی ہو۔ فلمی دنیا میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ جانے کتنوں کے ماتھے یہ ہونچا تھا کہ وہ بچے بنے اور آئے تھے مگر نہ گئے کچھ اور۔ اس کی ساتھی عورت ظاہرہ خانم فلمی فلمی نظروں سے ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی لیکن اس کے بارے میں یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے۔ وہ بغیر کی طرح پُرسکون ہی نہیں بلکہ سمندر کی طرح گہری بھی سلوم ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنی ساتھی کے برعکس نصیر نواز ہمارے سامنے پُرسکون نہیں کھڑا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کاؤ اور اضطراب کا شکار تھا۔ میں نے گویا اس کی سولت کی خاطر اسے اجازت دیتے ہوئے کہا ”پلیز انجوائے یور سیلف“

وہ گویا ایسے ہی الفاظ کا شہر تھا۔ فوراً اپنی ساتھی کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ظاہرہ خانم گویا بادل غمات اس کے ساتھ آگے بڑھی۔ وہ شاید کچھ دیر اور ہمارے قریب۔ رکنا چاہتی تھی‘ کوئی بات کرنا چاہتی تھی لیکن شاید فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ کیا بات کرے۔

”یہ کیا کیس ہے بھی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے ستارہ سے پوچھا۔ ”ابھی سبکی عمر ہے دونوں کی اور ابھی تک غیر شادی شدہ ہی محسوس رہے ہیں؟“

”ظاہرہ خانم کی تو دو شادیاں ہو چکی ہیں۔ دونوں شوہر ابھی ناممصر کے تھے۔ دونوں ہی شادی کے تھوڑے تھوڑے عرصے پر انتقال کر گئے اور ظاہرہ کے لئے دونوں ہی بہت دولت چھوڑ گئے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ظاہرہ بیٹا ایک جوان آدمی پر مہربان ہوئی ہے یا شاید اس میں نصیر نواز کا کمال پوشیدہ ہے۔“

ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ مرد کو فاکا بکیر بن کر رہنا چاہیے۔ ٹھیک ہے، خواہشوں کی غلامی اپنی جگہ ہے لیکن وعدہ بہر حال نبھانا چاہئے۔ شادی میرے خیال میں ایک مقدس وعدہ ہے۔ اسے نبھانا مراد لگتی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ جو لوگ بہت سی بلند عزائم رکھتے ہوں، بہت آگے جانا چاہتے ہوں، انہیں شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔ ”وہ باز کی ٹوہنیں ہی کی طرح ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی۔

”اسی لئے تو میں نہیں کرتا ہوں“ میں نے جلدی سے کہا۔ اس نے معنوی حیرت سے اپنی خواہشوں سے آنکھیں پھیلائیں ”تم آخر اور کتنا آگے تک جانا چاہتے ہو؟“ ”یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔“ میں نے راست گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”ویسے اس زاوے سے قطع نظر ابھی تو یہی عمر میں بھی گنجائش موجود ہے۔ کیا خیال ہے؟“ ”ہاں گنجائش تو موجود ہے۔“ اس نے گویا تنقیدی نظر سے میرا جائزہ لیا ”تمہاری اصل عمر بھی کچھ زیادہ نہیں جبکہ تمہیں یہ فائدہ بھی حاصل ہے کہ تم اپنی اصل عمر سے بھی کم کے نظر آتے ہو۔“

”تعریف کا شکریہ“ میں نے کہا ”اور تم بھی سوا بارہا عورت ہو، غموت بانا سہل حالات کی خواہشوں نے تمہاری شخصیت کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔“

”میرا خیال ہے اس وقت ہم من تر حاجی کو یوم تو رالمال کو والے فارمولے پر عمل کر رہے ہیں۔ تمہیں فاری کے اس محاورے کا مطلب آتا ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”بالکل آتا ہے، لیکن میں ہی چڑھ لیا تھا اس کا مطلب لیکن میرا خیال ہے کہ ہم خوش فہم نہیں ہیں بلکہ بہت مار کھائی ہے زمانے کی ہم نے۔“

”خیر کچھ بھی سہی“ وہ بے پروائی سے سر جھٹک کر بولی۔ ”یہی شخصیت ہے کہ ہم دوسروں کی باتیں جھوڑ کر اپنی طرف متوجہ تو ہوتے۔ کیا تمارے ذات اس قابل نہیں کہ کچھ دیر ہم اس کے بارے میں بھی بات کر سکیں؟“

”ایک دوسرے کے بارے میں تو ہم سب کچھ جانتے ہی ہیں۔۔۔ حالات سے بھی واقف ہیں اور جذبات و احساسات سے بھی۔“ تجسس تو دوسروں کے بارے میں ہوتا ہے نا۔ ”میں نے کہا۔“ ”ویسے تمہیں صدق دل سے ایک بات بتاؤں۔ مجھے قلمی دنیا سے دلچسپ لگی ہے۔ اگر میں بنایا جاسکے یہاں تو دم رکھنے میں کامیاب ہو چکا ہوتا تو شاید میں اس میں غرق ہو جاتا۔ ہمیں ٹھپ جانا، ہمیں کاہو رہتا۔ لیکن اب میرے مفادات دوسرے شعبوں سے زیادہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان میں میرے لئے زیادہ دولت ہے اور سردست میرے پاس اتنا قلعہ وقت نہیں ہے کہ مجھے شغل کے طور پر قلم اٹھانے میں روز و شب گزار سکوں۔ ویسے میرا دل

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہر رنگ
خود نوشت

دہشت گرد
سليم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود
دہشت گرد کہلاتا تھا۔

○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے
ہاتھ لہو لہان ہو گئے تھے۔

○ ”سچی کہانیاں“ کا ایک مقبول
ترین ایڈوینچر سلسلہ چار حصوں میں
شائع ہو رہا ہے۔

ناشر: مکتبہ انظرین سرگرم روزانہ بازار لاہور 2

فون: 7224665

"شاید ہو چکی ہوں لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو آزما یا نہیں۔" وہ غیر چٹکی لیے میں بولی "لیکن فی الحال تو بطور اداکار ہی میری ضروریات اتنی ہیں کہ میں کسی اور کام میں دلچسپی لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس لئے مجھے تو ان معاملات میں مت گھبرنا۔"

"اوہ" میں مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مجھے اس کے جواب سے ہلکی سی ایوی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے گویا کچھ سوچ کر رہ بولی۔ "دیے بھی وہ انگریزی کا متقول ہے نا... ڈونٹ ڈو یز دو۔ اسے فریضہ۔ یول کو زبوتھ۔ تو میں اس کی قائل ہوں۔ واقعی دوست کے ساتھ کاروبار نہیں کرنا چاہئے۔ دونوں ہاتھ سے جاتے ہیں۔ دوست بھی اور کاروبار بھی۔"

میں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا نہ کیا۔

"مجھے واقعی حیرت ہوئی ہے۔" میں نے دیکھے لمحے میں کہہ "وقت نے تمہیں کیا کچھ سکھا دیا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی بس عجیب سے انداز میں قہقہہ لگا کر رہ گئی۔

دھیمی موسیقی کی لہروں پر ہم بلکورے لیتے رہے۔ آخر کار جاڑی ڈھن ڈھن ہو گئی اور کوئی وقت دے بغیر ہی آرکسٹرا یکدم جاز سے راک اینڈ رول پر آگیا۔ لوگوں کو اپنے قدم اس ڈھن سے ملانے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس کے ساتھ ہی موزیک ماحول کی حرارت بڑھ گئی۔ گرد و پیش گویا پڑنگام سا ہو گیا۔

ستارہ میں بھی یکدم تیزی آگئی تھی۔ چہرے لمبے پلے تک اس کا وجود گویا دھیمی ہوا میں بلکورے لیتا ہوا ریشم تھا کراب وہ ہلکی کھلونے کی طرح ٹھکر رہی تھی مگر جب وہ بولی تو اس کی آواز مرسش نہیں تھی۔ "کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

"میں پہلے بھی شاید باتوں سے اپنے آپ کو بھلا رہا تھا۔ لفظوں کی مدد سے اپنی توجہ بنا رہا تھا۔" میں نے موسیقی اور قہقروں کے شور میں کہا۔

"کیوں بھلا رہے تھے؟ کیوں توجہ بنا رہے تھے؟" اس نے آنکھیں پکڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"میں ڈرامائی اعصاب کا مالک ہوں۔ یہ مصل خود پرستی نہیں، بہت سے تجربات کی بنا پر بات کہہ رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری حسیات بہر حال بہت تیز ہیں۔ میری کمپوزی پر جیسے کوئی غیر مرئی اثبات ہے جو ماحول میں پھیلے ہوئے نہایت خفیف سے سنگل رہس کر رہتا ہے۔ اکثر اوقات جبکہ ماحول بظاہر پرسکون ہوتا ہے تو میرے اس غیر مرئی اثبات پر موصول ہونے والی لہروں مجھے مضطرب کرتی ہیں۔"

"اوہ۔ خدا کے لئے کوئی بری بات نہ کرنا۔" وہ طویل سا مائنس لے کر بولی "میں اس وقت بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔ میرے سامنے تم ہو، 'تھر'۔ موسیقی ہے، 'تھیر'۔ دو خدائیں ہیں اور کل نیکی کوئی شرنگ نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں، مجھے انجوائے کہتے دو۔"

ت چاہتا ہے کہ کونکہ جن شعبوں میں اس وقت میں الجھا ہوا ہوں ان میں لوگ دلچسپ نہیں ہیں۔ بہت خشک شخصیتیں ہیں۔ بہتے صرف اس وقت ہیں جب ڈرنک ہوتے ہیں۔ جس وقت یہ ٹانگی دس دو اس ہوتے ہیں اس وقت تو انہیں کوئی لطف ساؤتو لطف نہ تم ہونے کے بعد بڑی سنجیدگی سے پوچھتے ہیں۔ اچھا اس کے بعد لیا ہوا؟ ایسے لوگوں کے ساتھ وہ کر انسان نہیں بن کر جاتا ہے۔ اندرونی طور پر میں اس قسم کے لوگوں میں خوش رہنے والا آدمی نہیں ہوں لیکن بی فی الحال میں اپنے چند بڑے پروڈیوسر سکھ لسنے کے لئے ان لوگوں کے درمیان گزر رہا ہوں۔"

"اگر بات صرف دولت کی ہے تو بے تحاشہ دولت کمانے کے امکانات تو ہم انڈسٹری میں بھی کچھ کم نہیں۔ کتنے بہت سے تو نیچے ہیں؟ آپ اپنے کام کو جتنا چاہیں پھیلا سکتے ہیں۔ نفساڑی ہے 'ڈسٹری بیوشن' ہے حتیٰ کہ ابھی تو اس شہر میں مزید کی اسٹوڈیوز بنانے کی گنجائش بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک بہت بڑا کام ہے اور نئے انسان چاہے پھیلا سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کے پاس پیسے کی کمی نہ ہو۔" ستارہ نے کہا۔

"شاید میں کبھی اس حد تک اس طرف توجہ دوں۔ فی الحال تو میں دوسرے کانوں میں الجھا ہوا ہوں اور اس شعبے میں پروڈکٹ میں نے صرف تجربے کے طور پر اتفاق کو آگے بڑھا رکھا ہے۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کام کو کس حد تک پھیلا سکتا ہے۔"

"وہ دہانت کار بہت اچھا ہے۔ ایماندار بھی ہے لیکن اس میں وہ سب صلاحیتیں نہیں ہیں جو ایک کامیاب بزنس مین میں ہونی چاہئیں۔" اس کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ شخصیت اور حالات کا تجزیہ کرنا بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ معلوم نہیں کیسے سکھ گئی تھی وہ یہ سب کچھ؟ یا شاید اس میں پیدا ہونے کی طور پر اس قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں لیکن ظہر انڈسٹری میں آکر انہیں انکار کا راستہ ملا تھا۔

اتفاق کے بارے جو رائے اس نے ظاہر کی تھی کم و بیش وہی رائے میری اپنی بھی تھی۔ اس موقع پر میں خود اپنے بارے میں بھی سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ آخر میں خود کہاں سے یہ سب کچھ سکھ گیا تھا؟ لوگوں کا اور حالات کا تجزیہ کرنا، کامیابیوں کے امکانات کا جائزہ لیتا اور سارے کاروباری گرو فیو؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے وقت بے سکھا تھا یا حالات نے؟ یا پھر یہ صرف تقدیر کی مروتانیں تھیں۔

میں نے ستارہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تھیرا ناؤڈ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا تم ظہر انڈسٹری میں میرے کاروبار کو پھیلانے کے لئے کام نہیں کر سکتیں؟ میرا خیال ہے تم میں کم از کم ظہر سے متعلقہ کاروباروں کو چلانے کی صلاحیتیں ضرور پیدا ہو چکی ہیں۔"

"میں نے کب کہا کہ میں کسی بڑی بات کے احساس سے مضطرب ہوں؟"

"یہ جو چھٹی سائیکس، انھوں نے اسی قسم کی دوسری نامعلوم حسرت ہوئی ہیں نا، اور یہ جو نامعلوم مسئلہ ریمو کرنے والے غیر ملکی انڈیا ہوتے ہیں، یہ سب بری خبریں ہی لاتے ہیں۔" اس نے بڑے دانشورانہ لہجے میں کہا۔ "خیر تم کہ بات کیا ہے؟"

"ماحول میں ایک عجیب 'بے عنوان' سے تازہ کا احساس ہو رہا ہے اور یہ احساس بھی کچھ واضح نہیں ہے۔ بس جیسے ذہن کے کسی تاریک حصے میں کوئی چوٹی رہ چکی ہے۔" میں نے اسے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لوگ یہاں نہیں رہ رہے ہیں، قفسے لگ رہے ہیں۔ یہ آواز بلند باتیں کر رہے ہیں۔ بہت مسرور ہیں لیکن لگ رہا ہے جیسے کسی چیز کو بھلانے، کسی تھکن کی کو چھپانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور شاید اسی لئے ضرورت سے کچھ زیادہ اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ ضرورت سے کچھ زیادہ گرجش بھی نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھ اور تم سمیت ہر شخص پر گویا کوئی نامعلوم سادباؤ ہے۔ ہوا میں یہ جو بے عنوان سناٹا ڈبے گاؤہ گویا چھوٹ کی بنیادی کے جڑا جموں کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ جراثیم جو فطر نہیں آتے مگر اپنا اثر دکھاتے رہتے ہیں۔ جب تک سب لوگ لان پر تھے تو وہاں شاید کم روشنی کی وجہ سے یہ احساس بھی تقریباً معدوم تھا لیکن یہاں کی تیز روشنیوں نے مجھے ایک پارک سی = نامردی ہے لیکن اصل چیز اصل سبب اب بھی نہیں بہت دور ان گت تھوں کے اندر ہے۔"

"شاید تمہارا خیال درست ہو۔" ستاد نے ہمیں سانس لی۔

"... دراصل یہاں مختلف طبقوں کے مالک اور مختلف حالات کے پروردہ بہت سے لوگ موجود ہیں اور ہر ایک کے ساتھ اس کے خاصی حال اور مستقبل کی الجھنیں لگی ہوئی ہیں۔ انجینئرز تو دنیا میں سبھی کو لائق ہوتی ہیں لیکن جب لوگ بڑے بن جاتے ہیں ان کے کام اور نام اونچے ہو جاتے ہیں تو ان کی الجھنیں بھی بڑی ہو جاتی ہیں۔ خیر خیال ہے جتنے بھی لوگ یہاں موجود ہیں ان سب کے احصاب پر کسی نہ کسی چیز کا تاؤ ہے اور اسی تاؤ کے اثرات ہوا میں مخر رہے ہیں جنہیں تم جیسے لوگ جن کی کھوپڑی پر بھول تمہارے 'انڈیا ٹاٹ ہو گا' محسوس کر لیتے ہو۔"

"وضاحت تو تمہاری قابل قبول ہے۔ تم تو ابھی فاسی عالم و قاضی ہوئی جا رہی ہو۔" میں نے عین آئینے میں کہا۔

"میں ان لوگوں کو اور بھی دنیا کے ماحول کو توخوڑا سا جان گئی ہوں نا، اس لئے کچھ باتوں کی توجیہ کر سکتی ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لئے مجھ سے ہاتھ جھڑا کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "یہاں اس وقت کسی کو یہ سوال ڈس رہا ہو گا کہ اس

لئے جب وہ خود کسی اور عورت کے ساتھ مجھ پر قہر ہے اس کی بیوی نہ جانے کہاں ہوگی؟ کیا اس شرمیں بھی ہوگی یا نہیں؟ کسی کی اس کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے اور عدالت میں حضور چل رہا ہے کہ کچھ کسی کی تحویل میں رہیں گے۔ کسی کالا کھلا کا بدن چل رہا ہو گا مگر پھر بھی اسے بالی پریشانیاں لاحق ہوں گی۔ کسی کی قلم عمل حالت میں اسٹوڈیو میں پڑی ہوگی مگر جین آفری دفن میں وہ دیوالیہ ہو چکا ہو گا اور اس کے پاس اپنی رقم بھی نہیں ہوگی کہ اسٹوڈیو کے بنایا جات ادا کر کے قلم اٹھا سکے۔ کوئی سوچ رہا ہو گا کہ سٹریوڈ کے کسی رکن پر کس طرح ڈورے ڈالے جاسکتے ہیں۔ کسی کو اس کی راشی بلیک میل کر رہی ہوگی۔ غریب ہر ایک کی اپنی پریشانیاں ہوں گی 'اپنا مسئلہ ہو گا۔"

"اور تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" میں نے قطعی غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔

"میرا مسئلہ؟" اس نے سراخا کر میری طرف دیکھتے ہوئے یوں لمبی لمبی چٹکیں جھپکا کیں کہ میرا دل اقل چل ہو کر گیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ سرگوشی مٹا لیتے میں بولی۔

"میرا مسئلہ صرف تم ہو۔ اور یہ مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا۔"

اس سے پہلے کہ میں اس بات کی وضاحت چاہتا تھا کہ سر جھٹ کر بولی۔ "چھوڑو ان سب باتوں کو کوئی سوچ بھی نہیں سکا کہ اس قریب کا خوبصورت ترین جوڑا اتنی بیکار تھک رہا ہو گا۔" تو کہیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم اس قریب کا خوبصورت ترین جوڑا ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس قسم کی باتوں کو محسوس کرتے رہنا چاہئے۔ دل خوش رہتا ہے۔" وہ دل کو بیڑی سے منکرائی۔ "تم بھی اسی قسم کی باتیں کو نہ۔ وہ سینگ اور خوش کنی۔"

"خیر خیال ہے مجھے بھی اپنے گھر اس قسم کی ایک قریب کا اہتمام کر کے متناہی حسن منقہ کرنا چاہئے تاکہ جہیں بنا طرز پر کم از کم کم لاہور خوش کر لی لیا جائے اور آج پتا چلا جائے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارشاد مونی یقیناً اس مقابلہ حسن کے جوں میں شامل ہونا چاہے گا۔" ستاد نے منکرائے ہوئے کہا۔

"جج صرف انسانوں میں سے لئے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"یہی نہیں اس حد کے پروردہ کیوں یاد آگیا؟"

"اس کی اصل فکر آگئی ہے اس لئے یاد آگیا۔" ستاد بولی۔

"وہ اس وقت تمہارے عقب میں ایک خاصی خوبصورت اور کم عمر لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔"

میں نے رقص ہی کے انداز میں قدرے ترجہا ہو کر دیکھا۔ وہ واقعی مجھ سے زیادہ قاطع رہ نہیں تھا۔ اس کی تیز حرکات و سکنات کے ساتھ اس کے چست سوٹ میں جسم کے پٹے پٹے محسوس ہو رہے تھے۔ تراشیدہ بالوں والی ایک کم عمر نہایت گوری

دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی نے رقص کے دوران ہاتھ سرسنگ میوزک کے باوجود دو تین مرتبہ اس کے کندھے پر سر تکانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش بے سود بلکہ کچھ اشتعال سی تھی کیونکہ ارشد موتی کا کندھا لڑکی کے سر سے بھجڑا ہندی پری واقع تھا۔ دوسرے ارشد موتی کی توجہ بھی صحیح طور پر اس کی طرف نہیں تھی۔

میں نے ستارہ سے کہا "ارشد موتی کی ساتھی لڑکی مزید صابر و شاکر ہے۔ زیادہ تر آنکھیں بند کیے ہی رقص کے جاری سے اس سے شکوہ بھی نہیں کر رہی کہ آخر وہ اس کی طرف توجہ کیوں نہیں دے رہا۔"

"اس بے چارے کو بھی صحیح طور پر پتا نہیں ہے کہ اس کے اوپر گرد کیا ہو رہا ہے۔" ستارہ ہلے سے ہنس کر بولی۔ وہ لڑکی ایرانی ہے۔ نہ جانے کون کون سے ملک گھومتی ہوئی کالی انگوٹھ سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ کسی فلم کی شوٹنگ کے دوران فلمی لوگوں سے آکر لڑکی تھی اور کالی دوستانہ وغیرہ ہو گئی تھی۔ جس کے جھگل کرل میں ساتھی بھی ہو چکی ہے لیکن چونکہ اس کا بیزار قیام مزید طویل نہیں ہو سکتا اس لئے اس کا کام مختصر رکھا گیا ہے... کمانی کے ابتدائی حصے میں ہی اسے شیر کھانا ہے۔"

"واہ!" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "وہ کیا باذن اور قدر شناس شیر ہو گا جو اس حسینہ کو کھائے گا۔ بالکل انسانوں کی طرح۔"

"کھائے گا نہیں بلکہ کھا چکا ہے، ظلم کا وہ نصیر شوت ہو چکا ہے۔ شیر چرا کر کھا تھا۔ بے چارے کی پٹلیاں ٹپکی ہوئی تھیں اس کی پٹلیاں کبیرے سے چھپانا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ آخر کا ایک صاحب نے ٹپکی دی کہ کوئی بات نہیں، جھگل کے شیر کا صحت بھی کمزور ہو سکتی ہے۔ تماشائی سوچ لیں گے کہ بے چارہ بیمار رہا ہو گا۔" ستارہ نے کہا۔

میں فحش راہ چار میں نے سادگی سے کہا۔ "اگر اس حسینہ کھانے کے بعد بھی شیر کو کمزور دکھایا گیا تو یہی زیادتی کی بات ہوگی۔"

"اس بے چارے کو تو اس لڑکی پر سنہارے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ سدھا ہوا شیر تھا۔ نیز اس کے ہمراہ تھے۔ ذلت پس لڑکی پر جھلاٹک لگاتے ہوئے دکھایا گیا۔ پھر کچھ کمزور کر ڈالی گئیں۔ آخر میں ایک آپ کے کلمات کے ذریعے لڑکی کو اوجڑی ہوئی لاش دکھا کر شیر کو قریب ہی خون آلود گچھے چائے ہوئے دکھادیا گیا۔ پھر شیر کے دو چار کلوز اپ ڈال دئے گئے۔ چہ زور دیا زوروں کی ریکا رڈنگ کے ساتھ۔"

"چلو اتنا ہی کافی ہے۔ تمہارا بہت تردد تو کرنے لگے ہیں ہماری نظروں والے۔" میں نے کہا۔

"تردد تو خیر بہت کرتے ہیں۔" ستارہ نے مستحکم لہجے میں

اور ہانڈک اینڈ ایم سی لڑکی اس کے متعلق تھی جو اس کے بازوؤں کے مٹلے میں ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے کوئی بن ماس کسی چٹنی لگایا سے کھیلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ بن ماس کی طرح بد صورت نہیں بلکہ خاصا وجہ انسان تھا۔ وہ شاید میرے دیکھنے سے پہلے ہی شط بار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اسے تکلیف کیا ہے؟" میں نے ستارہ سے کہا لیکن میری نظر ارشد موتی پری رہی اور میں مسکراتا رہا۔ چڑانے والے انداز میں۔

ستارہ میرے کان کے قریب بولی۔ "میرا خیال ہے کہ وہ مجھ پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے آج پہلی بار اس پارٹی میں ہی ہوا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر چیز کو قابل حصول سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی چیز قابل حصول نظر نہ آئے تو اسے طاقت یا سازش کے ذریعے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس وقت شاید قدرے بے بسی کے احساس نے اسے زیادہ بے چارہ باب کھانے پر مجبور کیا ہو گا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہے جیسے تم نے اس کی کسی چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"کیا اس کا یہ خیال صحیح ہے؟" میں نے ستارہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"آدھا صحیح ہے۔" ستارہ کی نمود آنکھیں مسکرائیں مگر بظاہر وہ سنجیدہ رہی۔ "یعنی یہ تو صحیح ہے کہ تم نے قبضہ کر دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ چڑا اس کی ہے۔"

"کینت بڑی غیر مذہب اور بد اطوار آدمی ہے۔" میں نے ایک بار پھر ارشد موتی کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہا۔ میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم اسی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں "دیکھو؟" اب یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ آدمی اچھی بھلی خوب صورت۔ "مگر مرادور پڑھی لکھی نظر آنے والی لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا ہو لیکن دیکھو کہ ایک دوسری عورت کی طرف۔ اس شخص کو تو چڑا گھر میں ہونا چاہئے تھا۔"

"وہ اس بات پر زیادہ کھل رہا ہو گا کہ تم اس سے خوف زدہ یا محروم نہیں ہوئے۔ اس کا خیال یا شاید تجربہ یہی ہے کہ سیٹھ جپ کے لوگ ذاتی طور پر بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کا سارا انحصار اپنے پالے ہوئے آدمیوں پر ہوتا ہے اور جس نے آدمی نہ پالے ہوئے ہوں تو بالکل ہی بیروز سے اکھڑا ہوا ہوتا ہے۔"

"اسے کم از کم میرے قد کاٹھ کا ہی کچھ خیال کر لیتا چاہئے تھا" میں نے اس شخص کے سے لہجے میں کہا جو معاشرے میں صحیح مقام نہ ملنے کا شکوہ کر رہا ہو۔

"ہاں ہے اس کی بے وقوفی ہے۔ شاید نشے میں اسے لوگوں کے قد کاٹھ صحیح نظر نہ آ رہے ہوں۔ اپنے سامنے سب اسے بونے لگ رہے ہوں۔" ستارہ نے خیال ظاہر کیا۔

ارشد موتی اب بھی مڑ مڑ کر خود بخود نظروں سے میری طرف

ہی اس نے اپنا ٹکڑا ٹھوڑی یا شاید لاشوری خواہش بیان کر دی۔
 ”تم میرا قصور ذہن میں رکھا کرو۔ اس قسم کے آپکوں سے
 نینے کے لئے تیرا قصور ہی کافی ہوگا۔“ میں نے شور مچا۔
 ”کلیئر مسئلوں سے جان چھڑائی تو نہیں خوب آتی ہے۔“
 وہ معنوی تھکی سے بولی۔
 ”اور تمہیں مسئلوں کو کلیئر بنانا خوب آتا ہے۔“ میں نے
 اسے چھیڑا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی ”ایک جھٹکے کے ساتھ
 موسیقی نے دم توڑا اور لوگوں کے رگ و پے میں روٹی ہوئی رہتی
 رو جیسے یکدم منقطع ہو گئی۔ سب ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں
 کھڑے رہ گئے۔ فریہ انداز لوگ تو باقاعدہ ہانپ رہے تھے۔ تاہم
 خواتین کے چہروں پر نازکی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ عورتیں
 اس محفل اور میاں کے بٹے لگے سے زیادہ لطف اندوز ہو رہی
 تھیں۔ ان کے چہرے بھان آئیز سرسرت سے ہنستا رہے تھے یا
 شاید اس میں میک اپ کی بھی کچھ رنگ آمیزی شامل تھی۔

اچانک معید صاحب کی آواز ابھری۔ ”خواتین و حضرات!
 میرے خیال میں آج کے لئے اتنی ہی دروزش کافی ہے۔ کھانا
 انتظار کر رہا ہے۔ آئیے کھانے کا حق ادا کریں اور بامداد کی
 طرح اس پر نوٹ پڑیں۔“

سب نے ہم آہنگ ہو کر غولگایا اور باہر کو نکلے۔ میں اور
 ستارہ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ بیشتر لوگ نکل چکے تھے تب ہم
 سکون انداز میں دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے کے
 قریب پہنچ کر میں نے دیکھا ”ارشاد موتی ہماری طرف پشت کے
 ستون کی طرح راستے میں جا کھڑا تھا۔ دوسرے لوگ ایک ایک
 کر کے اس سے کھڑتے ہوئے قدرے دقت کے ساتھ دروازے
 سے گزر رہے تھے۔ مجھے اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے شاید اس طرح
 گزرنے میں ٹھوڑی ہی زیادہ دقت پیش آتی۔

میں نے اس کے کندھے پر انگلی مار کر اسے اپنی طرف متوجہ
 کرنے کی کوشش کی۔ اسے یقیناً معلوم تھا کہ اس کی پشت پر کون
 ہے۔ اس نے کھوم کر دیکھنے کے بجائے بڑی بے نیازی سے گردن
 معمولی سے ترچھی کی اور تیز ہی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔
 ”تم راستے سے ہٹ کیوں نہیں جاتے؟“ میں نے بلا امت
 سے کہا۔ اس کی ہر نفس ہیروئن اسے چھوڑ کر باجی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ دروازہ میرے گزرنے کے لئے چھوڑا
 ہے۔“ وہ خالصتاً قلمی و لسانی خوت کے ساتھ بولا۔

”تم آئے بھی تو ای دروازے سے تھے۔“ میں نے اسے یاد
 دلایا۔

”اس دقت شاید میں نے دروازے سے سمجھو کر لیا تھا“
 وہ بے پروائی سے بولا۔

”اور مردیمو“ میری طرف۔ ”میں نے اس کے کندھے پر

کہا۔ ”بیتے وسائل اور جیسا مادل یا حالات انہیں میر ہیں
 ان میں وہ غیر معمولی محنت کرتے ہیں۔ کوئی اکیڈمی کوئی ٹرنگ کا
 ادارہ نہیں۔ جو کچھ سیکھتے ہیں خود ہی سیکھتے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر یا
 ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ رنگ آنسو سازد سامان کے ساتھ
 کام کرتے ہیں۔ سرکاری اداروں کو بس لگیں کھوئے اور تیار
 شدہ فلم کی جائز یا ناجائز تصویبات کرنے کے سوا اس اعزسری
 سے کوئی واسطہ نہیں جو خود روپے کی طرح چلتی پھرتی یا سکرٹی
 منشی رہتی ہے۔ لیکن بس اسے برا کھانا فیشن سا ہو گیا ہے۔“

”اورہ! تم نے تو تقریر کر ڈالی۔ میں تو پہلے ہی ان باتوں کا
 قائل ہوں۔ مجھے کیا بتا رہی ہو۔“ میں نے سکر اتے ہوئے کہا
 ”بس۔ ایسے ہی کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے ان باتوں کا۔
 دراصل انسان جب کسی کام میں عملی طور پر ہاتھ ڈالتا ہے تب
 اس کے شیب و فراز کا پتا چلتا ہے۔ دوسرے کو تنقید کرنا بہت
 آسان کام ہے۔ ستارہ کمری سانس لے کر بولی۔

”میں تمہارے اس خیال سے بھی متفق ہوں۔“ میں نے
 کہا۔

رقص کی تیسری دھن بج رہی تھی۔ تیرا دور چل رہا تھا۔
 ارشد موتی کی ہر نفس بدل چکی تھی لیکن وہ اب بھی مڑ مڑ کر ہماری
 طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک مشہور ہیروئن اس کی ہر نفس تھی۔ میں
 نے ستارہ کو چیلنے کے لئے کہا۔ ”اتنی مشہور ہیروئن کے ساتھ
 رقص کر رہا ہے لیکن اب بھی مڑ مڑ کر تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔“
 وہ بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”اس سے تم
 ہماری قدر و منزلت کا اندازہ کر سکتے ہو۔“

”دیکھئے مجھے اب اس کی نظرس ناگوار گزرنے لگی ہیں۔ میں
 سوچ رہا ہوں کہ ایک جھٹکا دے کر اس کی گردن مستقل طور پر
 دوسری طرف موزوں۔“ میں نے بخیدگی سے کہا۔

”اس کی گردن موزوں اور کسی ساٹھ کی گردن موزوں تقریباً
 ایک برابر ہوگا۔“ ستارہ ہنس کر بولی۔

”تم اسے ساٹھ سے تھپتھپ دو۔ کسی ساٹھ نے سن لیا تو برا
 مناجا ہے گا۔“ میں نے بخیدگی سے کہا۔ اس بار ستارہ کھل کر
 ہنسی۔ گردن پیچھے کو جھکا کر نہایت بے ساختگی کے ساتھ میں نے
 جان بوجھ کر ایک بار پھر ارشد موتی کو دیکھا لیکن اگر میں اس کی
 طرف نہ بھی دیکھتا تب بھی اسے اندازہ تھا کہ ہم اس کے بارے
 میں ہی باتیں کر کے ہنس رہے ہیں۔

دھن ستارہ بخیدہ ہوتے ہوئے بولی ”بجی تم اسے احساس
 مت دلاؤ کہ ہم اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ مجھے تو اس سے خوف
 آنے لگا ہے۔“

”میرے ہوتے ہوئے بھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں
 جھانکا۔

”تم کو ناچ میں گھنے میرے پاس ہوتے ہو۔“ متوجہ پاتے

سجھا دوں گا۔ دراصل وہ اتنی طاقت اس لئے کر بیٹھا کہ وہ لی کو جانتا نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں سعید صاحب! میں نے مسکراتے ہوئے ملائت سے کہا۔ آپ نے بھی زحمت کر لی تب ہی میں خود ہی اسے سجھا دوں گا۔ مجھے معلوم ہے اس قسم کے لوگ کون ہی زبان سمجھتے ہیں۔"

"اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی ہے کہ آپ کو وہ زبان بھی آتی ہے۔" سعید صاحب آنکھیں سے ہلے۔

"دنیا میں سرخا کر زندہ رہنے کے لئے بہت کچھ سیکھنا پڑا ہے ورنہ ہر ایرا غیر آپ کو پاؤں تلے چل کر آگے بڑھ جائے۔"

ہم بظاہر یوں باتیں کرتے ہوئے لان کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے موسم پر ہاتھ ڈال کر خیال کرتے ہوئے ٹل رہے ہوں۔ ستارہ کے ہاتھ کی گرفت میرے بازو پر اب بھی سخت تھی لیکن وہ دیکھ اس سمت میں رہی تھی بد حال لوگ ارشد موتی کو کھینچ کھانچ کر لے گئے تھے۔

"خیر چوری صاحب! آپ اسے معاف کر دیجئے گا۔" سعید صاحب نے نہ جانے اپنی نرم دلی کے تحت یا کسی اور وجہ سے

ارشد موتی کی سفارش کی۔ شاید ان کی اپنی بھی کوئی مصلحت ارشد موتی سے وابستہ رہی ہو لیکن بہر حال وہ مردم شناس آدمی

تھے۔ مجھے زیادہ جانے بغیر ہی انہیں اندازہ تھا کہ ارشد موتی جیسے لوگ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

"اس کا دروازہ اس کے اپنے طرز عمل پر ہے سعید صاحب" میں نے تنبیہ سے کہا۔ "میراں کا حساب کتاب ا

بھین ختم ہے۔ آئندہ اس نے اپنے آپ کو پہنے خان سمجھتے ہو۔

کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں نے کھانچا کہ سنا کہ میرا دماغ عمل کیا ہو

سعید صاحب مزید کچھ نہیں بولے۔ وہ ہر خیال سے انداز میں مسکراتے رہے۔ خوش مزاج آدمی تھے۔ کسی فکر میں بھی

غظاں ہوتے تھے تب بھی مسکراتے رہتے تھے۔ پھر وہ میرے

کھانے کی ایک میز تک پہنچا کر خود معذرت کر کے ایک طرف اچھلے گئے۔ میں اور ستارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اب ستارہ نے بھی گواہی دے کر اس واقعے کو ذہن سے جھٹک دیا

... کھانا بہت اچھا تھا۔ بہت زبردست اہتمام کیا تھا سعید صاحب نے میں اور ستارہ اپنی پلیٹیں لے کر ایک طرف کو ہو گئے اور

کھانے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اسی دوران بدایت کار دراجیل اور اس کی بیوی چلے گئے۔

اپنی پلیٹیں سنبھالے ہمارے قریب آ گئے۔ وہ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے بالکل الٹ معلوم ہوتے تھے۔ راجیل پتہ ذرا

اور ساٹھلا تھا۔ اس کی بیوی دراز قد اور بے حد گوری۔ راجیل ایک بے پناہ متحرک آدمی تھا۔ اس کی رنگ و پے میں گویا جلیاں

بھری ہوئی تھیں لیکن اس کی بیوی اتنی ہی سکوت پسند معلوم ہوا تھی۔ اسے اپنی جگہ سے جھنک بھی کرنا ہوتی تھی گویا خوب سو

ہاتھ رکھ کر غیر محسوس طور پر دباؤ ڈالا۔ وہ بڑے انسان کے سے ایڑیوں کے بل پیری طرف گھوم گیا اور تاک بیکر کر ہوا۔ "تم بھی تمہارا ساما ادھر ادھر ہو کر گزریں نہیں جاتے؟ دوسرے لوگ بھی تو گزر رہے ہیں۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور پلک جھپکاتے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراہی سی

آواز میں پوچھا۔ "تو دروازہ تھما لے لے پھر آئے؟"

اس لئے ستارہ کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔

"میں بات کو دہرایا نہیں کرتا۔" وہ مجھ سے ٹھہر پڑا

ہوئے بدستور بے پروائی سے بولا۔

میں نے خاصی قوت جھجک کے بجلی کی سی تیزی سے اس کی

ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ اتنی تیزی کی اسے یقیناً توقع نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کر سکا اور اچھل کر اسی

دروازے سے ہوا ہوا ابھر آئے میں جا کر انہیں اس نے اپنے لئے چھوڑا ترادیا تھا۔

ایک لمبے کے لئے تو شاید اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا

چھایا تھا اس لئے وہ وہیں ساکت پڑا رہ گیا۔ میں ستارہ کے بازو

میں بازو ڈالے ہوں بے پروائی سے آگے بڑھا جیسے میں نے اپنے

راستے میں پڑا ہوا کیلے کا چھلکا جوتے کی نوک سے ایک طرف ہٹایا ہو۔

دوسرے ہی لمحے ارشد موتی کے حواس بحال ہوئے تو وہ

چپتے کی سی بھرتی سے اچھل کر کھڑا ہوا لیکن اس وقت تک

دوسرے سمت سے سمان پلک کرچ میں آچکے تھے بلکہ ان میں

میزبان سعید صاحب بھی شامل تھے۔ کئی آدمیوں نے ارشد موتی

کو گھیر لیا بلکہ ہون گئے کہ کابو میں کر لیا اور ڈانٹنے کے سے انداز

میں سمجھانے لگے "موتی! یہ کیا جاہلوں والی حرکت ہے۔ تم کیوں

چوہدری صاحب سے پنگا لینے کی کوشش کر رہے ہو؟ نہیں تو

اپنے لوگوں سے سلام دعا رکھنی چاہئے۔ اور کم سے کم موقع محل

تو دیکھا کہ وہ۔ میراں نہ تو کسی قسم کا سیٹ لگا ہوا ہے اور نہ یہ کوئی

ایسی جگہ ہے جہاں تم جگہ ٹیکس وصول کرنے کے لئے آئے ہو۔"

کوئی کہہ رہا تھا "یار! ہم میراں زندگی کو انجوائے کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ لڑائی جھگڑے ویسے بھی کیا زندگی میں کم ہیں؟

کیوں مزاحمت کر رہے ہو۔"

اسی دوران سعید صاحب پلک کر میرے قریب آئے۔ میں

برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولے "آپ

اس کے منہ نہ لگیں چوہدری صاحب! میں اس بد مزگی کے لئے

معذرت خواہ ہوں۔" پھر ان کی آواز سرگوشی میں داخل گئی۔

"یہ غلطے درجے کے آدمیوں کو دعوت دے کر دراصل انسان

بد مزگی کو ہی دعوت دیتا ہے۔ پتا نہیں کس کی سفارش پر میں نے

اسے بلا لیا تھا۔ بہر حال آپ اب زحمت نہ کریں۔ میں اسے

آپ نے بہت سے سفر نامے پڑھے ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔۔
 مگر ایسی لرزہ خیز کہانی آپ پہلی بار پڑھیں گے۔
 جسے اردو کے صاحب طرز ادیب اور الفاظ کے جادوگر
 قمر اجٹالوی نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا۔۔۔۔۔۔۔۔

دھرتی کا سفر

انسانی تاریخ و آثار کے پس منظر میں ایک ہولناک سرگزشت

قیمت: حصہ اول /- 300 حصہ دوم /- 300

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

نئی دنیا

★ ----- ایک اخباری رپورٹر کی حیرت انگیز اور سنسنی خیز کہانی جسے ظہور میں آنے والے واقعات کی خبر پیشگی مل جاتی تھی۔

★ ----- کائنات کے اسرار و عجائبات کا وہ نقشہ جسے آدمی سمجھ نہیں سکتا ایک نرا ہوا آدمی جو شہاب کو پیشگی اخبار فراہم کرتا رہا کون تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ ★ ----- ایک سنسنی خیز ناول جسے صاحب طرز ادیب قمر اجٹالوی نے تحریر کیا۔

----- بہترین طباعت قیمت: /- 200 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

میں ہمارا بہت وقت ضائع ہو گا۔ فلم ایذا ہی سے اور ریٹ ہوئی شروع ہو جائے گی۔"

"چلے میں کسی غرض اور دلچسپی کے بغیر اس ضمن میں ہونے والا تمام خرچ اور تین ریلوں کی ری شوٹنگ کے اخراجات تو اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ اس صورت میں میرا خیال ہے کہ آپ کے فنانسر کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا کیونکہ اس کی حیثیت تو متاثر نہیں ہوگی۔" میں نے کہا

"بہت بہت شکریہ۔ آپ کی اس پیشکش نے مجھے حیران بھی کر دیا ہے اور میرا حوصلہ بھی بڑھا دیا ہے۔" راجیل قدرے مضطربانہ سے بے میں بولا۔ "میں نے دولت والوں کو کبھی بغیر کسی خاص وجہ کے ایسی فراخ دلانہ پیشکش کرتے نہیں دیکھا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ خواہش کے باوجود شاید میں اس پیشکش سے استفادہ نہ کر سکوں۔ کیونکہ اس فلم کے سلسلے میں وقت کی کچھ زیادہ ہی اہمیت ہے۔ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ میں نے اسے تین ماہ میں مکمل کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ اگر میں اپنے وعدے پر عمل درآمد میں کامیاب ہو گیا تو یہ پاکستان کی پہلی فلم ہوگی جو تین ماہ میں مکمل ہوگی اور وہ بھی پچاس لاکھ سے زیادہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے ساتھ۔"

"ہاں۔ یہ تو سنا ہی مجھے بتایا تھا۔" میں نے کہا۔
"یہ دعویٰ کہنے میں گو کہ میرا ایک ریکارڈ قائم کرنے کا شوق بھی شامل ہے لیکن اس سے زیادہ درحقیقت ایک مجبوری کا دخل ہے جس کا میں مضطرب بھی نہیں ہوں۔ آپ کو بتاؤں گا۔" اس کے لیے میں اضطراب پر قرار تھا اور وہ کہانے میں شاید ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ یہ نئی ہیلت اور مجھے سے مکمل رہا تھا۔
"گوئی بہت بڑی مجبوری ہے کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بے چین آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں۔ مجھ جیسے ایک ہدایت کار کے لئے تو بہت بڑی مجبوری ہے۔" وہ طویل سانس لے کر بولا "آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ اچھے بھلے کامیاب ہدایت کار جنہوں نے کبھی ذاتی فہم نہ بنائی ہو "فوقحال" پر ضرور ہوتے ہیں لیکن بہت زیادہ دو تہند لوگ نہیں ہوتے۔ ہمارا سب سے بڑا سرا یہ ہمارا نام ہی ہوتا ہے۔ ہم کسی زیادہ بڑے مالی نقصان کے تحمل نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔" میں نے غصہ سے کہہ دیا۔ "میں میں ایسی ہی ایک مجبوری میں پھنسا ہوا ہوں۔ میرے لئے وقت بہت قیمتی ہے۔ میں اس فلم کا ایک فنٹ بھی ری شوٹ کرنے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ سنا ہے پوچھ سکتے ہیں کہ اس کی شوٹنگ کس طرح ہو رہی ہے۔" اس نے تائید طلب انداز میں ستارہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" ستارہ نظر اٹھاتے ہوئے مسکرائی۔ "میں اتوار کی

صبح کرکٹی تھی۔ جدھر بھی دیکھتی تھی اور اس کی نظردیر تک کئی رہتی تھی۔ فریڈک اس کی حرکات و سکنات اور شخصیت میں بڑا فہم رکھتا تھا۔

قابل ذکر بات یہ تھی کہ وہ سلاں پوری ایک دوسرے سے خواہ کتنی ہی مختلف نظر آتے تھے لیکن انہیں دیکھ کر پھر بھی جانے کیوں فوری طور پر احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک خوش و خرم جوڑا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی زندگی خوب گزر رہی ہے۔

اپنی بیوی سے ہمارا تعارف کرانے کے بعد وہ کہانے اور گفتگو کا مکمل ایک وقت جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کام تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ یہ وہ گونسا تھا جو میں بہت دنوں سے ارشد موتی کے منہ پر سید کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکا تھا کیونکہ مجھے اپنا یہ مختصر سا وجود خاصا عزیز ہے۔ آپ کے اس اقدام پر میں کچھ خوش بھی ہوں اور کچھ شکر بھی۔ مجھے کچھ نقصان کا اندیشہ محسوس ہونے لگا ہے۔ کیسے ارشد موتی "ستارہ کے ساتھ کام کرنے سے انکار نہ کرے۔ بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ فلم کی تین ریلیں شوٹ ہو چکی ہیں۔"

"اس کو ایسی ناشکری کرنی تو نہیں چاہئے" میں نے ہموار لہجے میں کہا "ستارہ کے مقابلے میں وہ بہت خال ایک ٹیٹ پو نیما ایکڑ ہے۔ کسی بھی وجہ سے اگر وہ ستارہ کے ساتھ کام کرنے سے انکار کرنا ہے تو اس میں تو بہت ستارہ کی ہے اور میں اسے اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"لیکن۔۔۔ بالفرض اگر ایسا ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟" راجیل گویا اپنی تشویش کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"کرنا کیا ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "فوری طور پر اسے کٹ کر کے دوسرا ہیرو تلاش کر کے وہ تین ریلیں ری شوٹ کر لیجئے گا۔ تین ریلیں ری شوٹ کرنے کا تمام خرچ میں دے دوں گا۔ اس کے علاوہ نئے ہیرو کی تلاش پر جو خرچ آئے گا وہ بھی میرے ذمے ہو گا۔ اس سلسلے میں اگر بھرپور فہم کی پیشگی کی جائے کہ آپ کو کس فہم کے ہیرو کی ضرورت ہے اور تھاگ دوڑ پر بھی خرچ کیا جائے تو ضرور اس سے بھی اچھا ہیرو میرا پاس ہے۔ اتنا بڑا ملک ہے ہمارا۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہیرو پڑا ہے ہمارے ہاں۔ مسئلہ صرف اس تک پہنچنے کا ہے۔ اکثر اوقات وہ بے چارہ خود ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ تلاش آپ نے پیچھے چلے بھی کی ہوگی مگر بھرپور وسائل کے ساتھ نہیں کی ہوگی۔"

"جی ہاں۔ یہ تو درست۔" راجیل نے تسلیم کیا "اشتہار تو ہم نے کوئی دایمی نہیں تھا۔ یہ نئی زبان ایک دوسرے سے کہا تھا۔ چند ہیلتہ کلون کسرت گاؤں اور اکھاڑوں وغیرہ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ہمارا فنانسر زیادہ رقم بھی خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے اسے یہ اعتراض بھی تھا کہ اگر ہم نے پیشگی کی تو امیدواروں کی لائن لگ جائے گی اور انتخاب وغیرہ کے مرحلوں

ستارہ ایک لمبے کے لئے مسمیٰ نظر سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر لپٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد آخر کار بھی کھانے سے فارغ ہو گئے۔ ایک بار پھر سعید صاحب کی آواز ابھری۔ "خواتین و حضرات! توجہ فرمائیے، جن صاحبان نے نیاوا کی کے مقابلوں میں حصہ لیتے اور پانی میں کربت دکھانے کا وعدہ کیا تھا وہ لباس تبدیل کر کے، سو ٹنگ کاسٹیوم میں سو ٹنگ پول پر پہنچ جائیں۔ اور جن لوگوں نے پہلے سے اپنے نام نہیں دئے، اگر مقابلے دیکھنے کے دوران ان میں جوش چڑھ جائے اور وہ سوئیں کہ اس نے بہتر کربت تویم دکھا سکتے ہیں، تو بھی ان مقابلوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے پاس سو ٹنگ کاسٹیوم موجود ہو۔ یا پھر وہ کسی اور شرط نامہ لباس کے ساتھ سو ٹنگ پول میں اترنا چاہے ہوں۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں کو اس منٹ دئے جاتے ہیں۔"

مصافحوں نے تالیاں بجاائیں۔ تالیوں کا شور دم پرانے سعید صاحب ایک بار پھر آواز بلند ہوئے "ایک ضروری بات اور بتانا چاہوں۔ جن صاحبان نے ٹٹ کر کھایا، وہ ان سے میں گزارش کروں گا کہ وہ مقابلوں میں حصہ نہ لیں تو بہتر ہے۔ ہم نہیں چاہے کہ وہ سو ٹنگ پول کی۔ میں بیچ کر لیت جاؤں اور واپس پہنچ کر آپ پر آنا قبول جائیں۔"

مصافحوں نے قہقہے لگائے اور ایک بار پھر تالیاں بجاائیں۔ پھر کچھ لوگوں کو میں نے مصافحوں کی فلیڈوں سے نکل کر بنگلے راستے کی طرف جاتے دیکھا، شاید وہ اپنی گاڑیوں سے اپنے سو ٹنگ سوٹ لینے جا رہے تھے۔

سعید صاحب ایک بار پھر اعلان کرنے کے سے انداز میں بولے "آپ تک آپ لوگوں کو کھڑے رکھ کر آپ کی ٹانگوں کی مضبوطی کا امتحان لیا جا چکا ہے اور آپ اس میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ جب تک ہمارے تیار اک لباس تبدیل کر کے آتے ہیں تب تک آپ کرسیوں پر شریف رکھ کر ذرا سنا سکتے ہیں۔ اپنی مظلوم ٹانگوں کو قہقرا سا ٹھک دے سکتے ہیں۔ اس دوران خوبصورت آؤ اور خوبصورت ڈیو والی ایک گلوکارہ یعنی جس کی آواز بھی حسین ہے اور چو بھی، آپ کو ایک بار اسافزہ سنائے گی تاکہ آپ لوگ ایک بار پھر سو ٹنگ پول کے کنارے کھڑے ہونے کے لئے تیار ہو سکیں۔ صرف ایک نمونہ اصل دراصلی پردرگام آخر میں ہو گا۔"

سب لوگ لان کے اس حصے پر آ گئے جہاں کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور سامنے اسٹیج بنا ہوا تھا۔ میں اور ستارہ سب سے پیچھے بیٹھے، ستارہ نے کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک طویل اور آسودہ سی سانس لی، وہ یقیناً ٹھک سی گئی تھی۔

آرکسٹرا نے دھیمی دھیمی سویتی بکیرا شروع کر دی تھی۔ پھر میں نے گلوکارہ کو ایک تاریک گوشے سے نکل کر اسٹیج کی

کے میں اپنی اتوار کی چھٹی بھی ان کی غور کر رہی ہوں حالانکہ ظلم مجھے اتنی ہی وقت نام لگ رہی ہے کہ شوٹنگ کے دوران اکثر مجھے ہنسی آتی رہتی ہے۔"

"یہ وقت نامہ چیزوں کو پبلک آرتھ کل زیادہ پسند کرتی ہے۔" راضیل بٹ نے سنجیدگی سے کہا، پھر میری طرف دیکھ کر گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وقت کی میرے لئے کیا اہمیت ہے۔"

"خیر میری دعا تو یہی ہے کہ آپ کے لئے کوئی مسئلہ سر ہی نہ اٹھائے۔" میں نے غلو سے کہا۔ "بہر حال اگر کوئی ایسا مسئلہ درپوش ہو جس میں مدد یہ کچھ کام آسکا ہو تو میں حاضر ہوں۔ اور اگر ارشد موتی کچھ زیادہ ہی پہلے آپ کو مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آئے تب بھی مجھے مطلع کو بتیجئے گا۔" یہ خیال ہے، میں اس کے انکار کو اقرار میں تبدیل کرانے کے سلسلے میں بھی بچو نہ کچھ ضرور کر سکوں گا۔"

راضیل بٹ پہلی مرتبہ بخور میری طرف دیکھتے ہوئے مجھے لیے میں بولا۔ "ہاں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ سے میری شناسائی ہو گئی۔"

اس کی بیوی بھی ایک ٹنگ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ راضیل اس کا بازو تھامتے ہوئے بولا۔ "تو بیکم اور میری بڑوں پر بڑی عمدہ قسم کی چیزیں ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ ذرا انہیں بھی ٹولیں۔ چہرہ دہری صاحب بہت گفتگو کے بعد میری بھوک کچھ مکمل گئی ہے۔ ورنہ میں تو قریب یونہی کھانے کے ساتھ جیڑ چھاڑی کر رہا تھا۔"

اس کی بیوی رخصت ہوتے وقت میری اور ستارہ کی طرف ایک نظر دیکھ کر بہت سی دھیمے انداز میں مسکرائی۔ اس کی مشترکہ ہٹ کچھ ایسی ہی تھی جیسے برف پوش چٹھوں کے عقب سے سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی ہو، مگر جلد ہی معدوم ہو گئی ہو۔

وہ میاں بیوی جا چکے تو ستارہ مسمیٰ سانس لے کر بولی "ظلم کا پرنس انسان کو بڑے اصرار نامہ میں جلا رکھتا ہے۔ اس کی انجینئرس کہیں بھی مختلف لوگوں کا بیچا نہیں چھوڑتیں۔"

"اصول نامہ پرنس میں ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ آپ کے اصرار پر منحصر ہے کہ آپ کتنا تازہ برواشت کر سکتے ہیں اور یہ آپ کے حوصلے کی بات ہے کہ آپ کتنے مطمئن نظر آ سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" ستارہ نے حلیم کیا "دراصل سب تھوڑی طرح فلوادی اصرار کے مالک تو نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں۔ اس قسم کی خصوصیات بعض مخصوص حالات میں چلا ضرور پائی ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ عطیہ خداوندی ہی ہوتی ہیں اور مجھ پر اللہ برعالمے میں بہت سی مہربان ہے، بہت زیادہ۔ میں الفاظ میں اس کی مہربانیوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔"

نے نی وی پر دو چار مرتبہ گایا تھا لیکن نی وی والوں کے لئے وہ نیم کلاسیکل گایا کرتی تھی اور وہ بھی روزانہ بیچ کر ساری کا پلو سر پر رکھ کر۔ اچھے کھاتے بیٹے گھر کی ہے۔ اس کی والدہ بھی شاید آج کی تقریب میں آئی ہوئی ہوں گی۔"

ستارہ نے یہ سب سنا کر ایک لمحے توقف کیا پھر شرری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اب میں تمہیں اس کے بارے میں سب سے اہم بات بھی بتا دوں؟"

"ضرور" میں نے خواہ مخواہ اشتیاق ظاہر کیا۔

"وہ شادی شدہ ہے۔ اس کا شوہر امریکا کی می رہتا ہے" ستارہ نے ذرا ناگہانی لہجے میں کہا اور میرے چہرے پر گویا کوئی دھڑکن تلاش کرنے لگی۔

میں نے چپٹے ہوئے کہا "تم سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کیا اس میں دلچسپی لینے لگا ہوں اور اس کی شادی شدہ ہونے کی اطلاع میرے لئے صدمے کا باعث ہوگی؟"

"ہاں۔ مجھے کچھ کچھ شبہ ہوا تھا" اس نے اعتراف کیا۔ "تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ میں کیا کیا دلچسپی لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میرے ہاں کھائی اور دینی دلچسپی کا تصور ہی نہیں ہے۔ میرے ہاں تو اچھا خاصا کرا فکشن فائلر ہوتا ہے جس کا کالج دل کی زمین سے پھوٹا ہے اور دھیرے دھیرے تدار درخت بنتا ہے۔ وہ بھی اگر موسم ساز گار رہیں تب" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں... مجھے اندازہ ہے... لیکن مرد کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا نا..." وہ ہنسیکھنٹ آئینے کے لیے بولی۔

"اگر تم کسی اور طرف میری نظر اٹھتے ہوئے دیکھتی ہو تو کیا واقعی حد محسوس کرنے لگتی ہو؟" میں نے تنبیہ کی ہے پوچھا۔

"ہاں" ایک بار میرا اس نے گویا کسی جرم کا اقرار کیا "مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اعتراف کے بعد تم میری طرف سے کھٹک جاؤ گے لیکن میں بچ بولنے پر مجبور ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں نہ تو ایسے دوستوں کی ضرورت ہے جو تمہارے بیروں کی ڈیجیٹل کی کوشش کریں اور نہ ہی تم ایسے دوستوں کو پسند کرتے ہو۔ تم آزاد روی پسند انسان ہوں۔ لہذا لہذا میری طرف جانا چاہتے ہو۔ پیچھے مڑ کر یا بیچے جھک کر دیکھنا تمہیں پسند نہیں۔"

میں نے اس کے تجزیے کی تردید یا تصدیق نہیں کی۔ اس کا کڑوا چھپکنے ہوئے صرف اتنا کہا "تم میری دوست ہو اور دوست رہو گی۔"

اچانک سعید صاحب کی خوشگوار آواز ایک بار پھر ابھرئی۔ "بیچے خواتین و حضرات! اسٹیک پول میں اپنی اپنی ملا میٹوں کے جوہر دکھانے کے خواہشمند تیار ہو کر آگئے ہیں۔ اب آپ لوگ بھی ذرا ارحہ کوئی کھٹک آئیے۔"

سوائف پول قریب ہی تھا۔ سب لوگ اس کے ارد گرد جمع

پیز میوں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک جھللا رہی تھی۔ وہ اس طرح کے اس کے بال سنہری ڈائلی کے ہوئے تھے اور اسٹیج کی رنگ برنگی روشنیوں میں چمک رہے تھے۔ اس کا ڈھیلنا ڈھال اور کندھوں پر جمونٹا ہوا بالیاد گویا ستاروں سے بنا ہوا تھا۔ وہ بھی جھل جھل کر رہا تھا۔ بیروں میں سنہرے سینڈل تھے۔ اس کے رخساروں پر بھی افشائ چمک رہی تھی۔ اس کی چال میں بڑی مستعدی تھی۔ مگر وہ ایک نامعلوم احساسی تقاریر سے ذرا اوپر گواٹھی ہوئی تھی۔

اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ اندازاً مغرب کی اوپر اسٹار کا سا تھا۔ خاص ماڈرن لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ صورت بھی اچھی خاصی دکھائی تھی کم از کم اسے فاصلے سے رنگ برنگی روشنیوں میں اور بڑی محنت سے کئے گئے میک اپ کے باعث تو دکھائی گئی تھی۔ وہ دیکھے مجھے امید تھی کہ قریب سے دیکھنے پر بھی میری رائے زیادہ تبدیل نہیں ہوگی۔

اس کے اسٹیج پر پہنچنے ہی موسیقی تیز ہو گئی۔ جس انداز سے اس نے جبکہ کراٹک اسٹیج سے اٹھایا اس سے یقیناً بہت سے دلوں کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی ہوگی۔ پھر ایک لمبا سائے کر بائوں کو جھکا دے کر ایک ہاتھ ہوا میں بلند کر کے اس نے جس طرح تان لگائی اس سے مسالوں کی سرگرمیوں کی جھنجھٹ بھی ختم ہو گئی۔ سب بھرتی گور اور بھرتی چشم ہو گئے "لڑکی کا گانے کا انداز بھی مغربی تھا۔ اردو شاعری کو پاپ بھرتی پر گارہی تھی لیکن سرور وغیرہ سے اتنی بے خبری نہیں تھی جتنا کہ عام طور پر اس قسم کے گھر ہوا کرتے ہیں۔

بلاشبہ اس نے سال باندھ دیا۔ جب اسٹیج کی بتیاں گل ہوئیں اور وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو میں نے دوسرے مسالوں کے ساتھ چند لمحوں کے لئے تائیاں بجاتے ہوئے ستارہ سے کہا "اچھا خاصا کاری تھی۔ بے جاری کے نام تک کا اعلان نہیں کیا گیا۔ کون تھی یہ؟"

"فرہین اس کا نام ہے اور اسے اپنا نام مشہور کرانے کا زیادہ شوق نہیں ہے ورنہ اب تک ملک میں تھلک مچا چکی ہوتی" ستارہ نے بتایا۔

"اگر مشہور ہونے کا شوق نہیں ہے تو کافی کیوں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کا شوق بس یہیں تک محدود ہے کہ چیدہ چیدہ لوگوں کی مٹھل میں گار کر انہیں دم بخود کر دیا جائے۔ وہ اپنے جلوے اپنا فن ہر اچھے فیرے تک پہنچانا نہیں چاہتی۔ یہ اس کے اپنے الفاظ اور اپنے نظریات ہیں۔ ویسے بھی اب وہ پاکستان میں رہتی نہیں ہے اس لئے سوچتی ہوگی کہ یہاں شہرت حاصل کرنے کا کیا فائدہ۔ امریکا میں میٹل ہے۔ کبھی کبھار تھوڑے دنوں کے لئے یہاں آتی ہے۔ کالی عرصے پہلے یہاں رہتی تھی اور اس وقت اس

سعید صاحب نے اعلان کیا "ارشاد موتی سب سے پہلے پانی میں جیت لیت کر جسم کو حرکت دے بغیر حیرنے کا مظاہرہ کرے گا۔ اس کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ درنگ پانی کی سطح میں نہ کر دکھائے گا۔ اس کے بعد کوئی بھی صاحب اس کے قائم کئے ہوئے ریکارڈ کو توڑنے کے لئے آئے آسکتے ہیں۔ اگر کوئی بھی اس دو مظاہروں کے سلسلے میں آئے نہ آیا یا اس ریکارڈ کو نہ توڑ سکا تو ان دونوں کر جیوں کا انعام ارشد موتی کو دے دیا جائے گا جو ایک ڈبے میں بند ہے۔ مقابلوں کے اختتام پر سب انعام یافتگان اپنے اپنے ڈبے اسٹیج پر مسمانوں کے سامنے کھول کر دکھائیں گے۔ اس مقابلے کے بعد ایک ہاتھ سے "زیادہ سے زیادہ حیر رکاری سے حیرنے کا مقابلہ ہوگا۔ ارشد موتی کا کتا ہے کہ وہ تمام مقابلوں میں حصہ لے گا اور اگر اس نے تمام مقابلوں کے انعامات جیت لئے تو پھر چاندی کا ایک بڑا سا تاج بھی اس کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ جو آج کی تقریب کی خوبصورت ترین خاتون اسے اپنے ہاتھ سے پہنائیں گی۔ اور یہ فیصلہ بھی ارشد موتی خود ہی کرے گا کہ تقریب کی خوبصورت ترین خاتون کون ہیں۔ ٹھیک؟"

سب مسمانوں نے تائیدیں بجا کر سعید صاحب کی تائید کی۔ اس وقت تک ارشد موتی ڈائیوٹک بورڈ تک پہنچ چکا تھا اور اچھے مخصوص انداز میں سارے کھڑا تھا۔ وہ بالائی بلڈر تھا اور لا شعوری طور پر بالائی بلڈروں والے انداز میں پوزے رہا تھا۔ ڈائیوٹک بورڈ پر وہ عمیق طور پر چاندنی کے رشتے میں تھا اور کسی یوٹائی ویو

سے گئے۔ سعید صاحب کا مکان بقیہ کسی بہت ہی اچھے آرکیٹیکٹ نے ڈیزائن کیا تھا۔ ہر جگہ اس نے مشرقی اور مغربی طرز تعمیر کو یکجا کر کے ایک نئی راہ نکالی تھی "ایک نیا اثر تخلیق کیا تھا۔ شفا سوٹنگ پول کے ڈائیوٹک بورڈ اس کے کنارے اسیل کے فرش پر چڑھے ہوئے اتر بیڑیا رنگ برنگی چمچوں کو دیکھ کر جہاں مغربیت جدیدیت یا تصنع کا تاثر ملتا تھا وہیں ایک طرف فطری حسن کا تاثر بھی موجود تھا۔ پول کے ایک طرف کچھ فاصلہ چھوڑ کر چھوٹے بڑے سرمئی اور نسواری ہامواری چھوڑ کر بظاہر بے ترتیب سے انداز میں رکھ کر کسی نیم شکستہ چٹان کا تاثر دیا گیا تھا۔ ان کے عقب میں درختوں کے چھوٹے کھمبے تھے بے ترتیب سے انداز میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ چھوڑ کے آس پاس رنگ برنگے پھولوں سے لدے رنگباز پودے تھے۔

ان چھوڑ پر سے شفاف پانی یوں پھیلتا ہوا سوٹنگ پول میں آکر گرنا تھا جسے کو جھوٹا سا آبشار مگر رہا ہو۔ گویا سوٹنگ پول میں "آبشار" ہوا اسے اسے سبب خواہش گردش میں لایا جاسکتا تھا۔ اس سے نظر ڈالنے پر کسی خوبصورت پھاڑی مقام کے کسی گوشے کا کمال گزرتا تھا۔

میں نے دیکھا کچھ لوگ سوٹنگ کاسٹیم میں پول کے کنارے پر کھڑے تھے۔ ان میں کوئی سوٹھاسرا تھا اور کوئی تھیل تھیل کرتا۔ کوئی دو میلانے جسم کا تھا مگر اس کی توند ابھری ہوئی تھی۔ صرف ایک آدمی ایسے مناسب جسم کا مالک تھا جسے دیکھ کر یقین آسکتا تھا کہ حیرانی اس کا مشغلہ رہی ہوگی۔

پول پر زیادہ حیر روشنیوں کا انتظام نہیں تھا اور اس وقت تو شاید جان بوجھ کر روشنی اور بھی کم کر رکھی گئی تھی۔ اس کے اندر کا آسانی پنٹ اس وقت گہرے رنگ کا دکھائی دے رہا تھا اور پول کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ خصوصاً اس کے زیادہ گہرے حصے کی طرف روشنی اور بھی کم پہنچ رہی تھی۔ تاہم چاندنی کا احراج موجود تھا اور بالائی تھیلی روشنی میں اس طرف پانی پھیل ہوئی چاندی کی طرف جھلکا رہا تھا۔

سوٹنگ پول کا جائزہ لیتے وقت جب میری نظر دوبارہ ڈائیوٹک بورڈ پر پڑی تو میں نے سوٹنگ کاسٹیم میں ارشد موتی کو اس کے قریب کھڑے دیکھا۔ مقابلوں میں حصہ لینے والوں میں وہ جتنے کہ اس وقت سب سے نمایاں تھا اس لئے احساس قاصر سے کچھ اور اگرا ہوا تھا۔ مذہم روشنی میں بھی اس کے کسرتی جسم کے نشیب و فراز نمایاں تھے۔

سعید صاحب اسباب و اوج لئے اس کے قریب کھڑے تھے۔ سعید صاحب ان مقابلوں کے اکرے جیتے تھے۔ ایک صاحب ان کی مدد کے لئے کافی جھٹل لئے قریب کھڑے تھے۔ ارشد موتی نے قدرے جھک کر سعید صاحب سے کچھ بات کی اور ڈائیوٹک بورڈ کی بیڑیاں چڑھنے لگا۔

چاہ بابل

دیوتاؤں کے شہر بابل کی کہانی

جنہے مصنف نے 35 سال کی عمر سرج کے بعد

قلب بند کیا۔

قیمت 400/-

800 صفحات



اردو بازار لاہور

زیادہ دیر تک زیرِ آب نہ سکا ہے؟

سب لوگ پچھتے ہیں انہوں میں حرکت پانی کو دیکھ رہے تھے۔ ارشد موتی غالباً زیادہ گہرائی کی طرف چلا گیا تھا کیونکہ کہیں اس کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک لمبے کوڑے کو لے کر وہاں بھی مہموں نے سانسوں کو دیکھ لی تھی کیونکہ انہوں نے سمجھا تھا کہ اسٹاپ وایج کی تک تک بھی صاف ستائی دے رہی تھی۔ لیکن یہ تجسس یہ اشتیاق تو صرف ایک لمبے ی رہا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب ارشد موتی پانی سے برآمد ہونے میں کچھ نہ کچھ دیر لگے گا اس لئے وہ ایک بار پھر اپنی خوش گہلیوں میں مشغول ہو گئے۔ لیکن یہ جھنجھٹ بھی چند سیکنڈ سے زیادہ نہ رہی۔

پانی میں یکدم الجھل ی ہوئی اور ارشد موتی کا سرا ہرما دکھائی دیا۔ سر پانی سے نکلتے ہی اس نے خوفزدہ انداز میں چیخ ماری۔ شاید وہ چار کچھ کھانا پاتا تھا مگر غیر ارادی طور پر اس کے الفاظ چیخ و زعل تھے۔

پھر وہ کسی دہشت زدہ نکلنے کی طرح ہاتھ پاؤں مارا۔ کنارے پر پہنچا۔ باہر آنے کے لئے اس نے کسی میڑی یا ریلنگ کا سہارا لینے کی بھی زحمت نہیں کی بلکہ ماربل کے پتھر کنارے پر ہاتھ ٹکا کر بندروں کی طرح ایک کراہا رہ گیا۔ اس کا سرستی جسم خوف سے کانپ رہا تھا اور خوف ہی کے باعث اس کا چہرہ بڑا بڑا سا لگ رہا تھا۔ چہرے سے پانی پونچھتے ہوئے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اوپر دیکھ رہا تھا۔

چند لمبے لمبے وہ ڈائیو تک پورڈر کھڑا کسی یونانی دیوتا کی طرح خوبصورت لگ رہا تھا مگر اب اس پر کھلا ہٹ نے اس کی شخصیت کا سارا حسن غارت کر دیا تھا۔ وہ بالکل ایک خوفزدہ چڑا لگ رہا تھا لیکن ذرا چلا ہوا۔

سعید صاحب لپک کر اس کے قریب پہنچے۔ شاید وہ اسٹاپ وایج بھی بند کر لی ہوں گے تھے۔ ارشد موتی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے شاید انہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔ ان پر نظر پڑنے ہی پر بلا "سعید صاحب! پول کی ہیں۔ وہاں۔ ایک تلاش پڑی ہوئی ہے۔" وہ کانپتے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کر رہا تھا جس طرف پانی کھڑا تھا۔ میں ایک کمری سانس لے کر وہ گیا۔ یہ بات سمجھنے پر ہی عجیب لگی تھی کہ ارشد موتی اچھی خاصی اٹھنے دہرنے کی بدستیا میں پاؤں دھرا تھا لیکن ایک تلاش کی موجودگی کے انکشاف نے اسے بری طرح جھوٹا دیا تھا۔

ایک لمبے کے لئے اچول پر گھرا سکوت چھا گیا۔ آخر کار سعید صاحب نے تھوک نکل کر کہا "لاش۔" کسی لاش...؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لاش ہے؟" انہوں نے یوں سرکاری پر نظر دوڑائی جیسے ابھی کوئی ریلنگ پر غور وار ہو گا اور ہاتھ ہلا کر کہے گا "ارے بھئی... وہ لاش نہیں تھی۔" وہ تو میں تھا۔ لیکن ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور انہیں دوبارہ ارشد

کے جیسے کی طرح خوبصورت نظر آیا تھا لیکن اس کے جسم کی پھلیاں یونانی دیوتا سے کچھ زیادہ نمایاں انداز میں ابھری ہوئی تھیں۔ مگر ساتھ ہی ایک خفیف سی بد نمائی یہ تھی کہ اس کا پیٹ باڈی بلڈروں والے مخصوص انداز میں کھپا ہوا نہیں رہ گیا تھا بلکہ کسی حد تک "تور" نکالنے کی طرف مائل نظر آیا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہ بیچتا سانس کھینچ کر کھڑا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اب کسرت کی طرف اس کا دوبارہ رخان نہیں رہا ہو گا جیسا لڑ جوانی میں رہا ہو گا۔ بے احتیاطی سے کھانے اور پینے کے مشاغل بھی زندگی میں غائب ہو گئے تھے اس لئے بے چارے پیٹ پر کچھ اثرات قریب ہونے ہی تھے لیکن پھر بھی اس کا جسم قابلِ تعریف تھا کہ پانی مشق کے نتیجے میں اب تک اپنی شکل برقرار رکھے ہوئے تھا۔ میں نے غور سے کیا کہ کسی خواتین قریب موت ہی ہو کر سراٹھائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جس قسم کے لوگ مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے کھڑے

ہوتے تھے "ان کے بارے میں یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس میں کیا اثر ہو شید ہو" پھر مجھے اندیشہ غور ہو رہا تھا کہ ارشد موتی سارے مقابلوں میں جیت جاتے گا۔ اس نے یقیناً ان مشقوں کو بھی زیادہ دقت دیا تھا۔ تمام نتائج دینے کے بعد اسے اختیار ہو گا کہ وہ کسی بھی خاتون کو قریب کی خوبصورت ترین خاتون قرار دے کر اس سے تاج پہنا۔ اور میرا دل کہ رہا تھا کہ وہ ستارہ کو خوب صورت ترین خاتون قرار دے دے گا۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا ستارہ اسے تاج پہنانے سے انکار کر دے گی؟ اور اگر اس نے اسے سانسوں کی موجودگی اور سعید صاحب کی محبت میں لئے شدہ باتوں کا احترام کرتے ہوئے تاج پہنانے کا ارادہ کر بھی لیا تو کیا میں اسے منع کر دوں؟ میرے اس اقدام کو تنگ نظری یا پختلے دہرنے کا احساسی رقابت تو نہیں سمجھا جائے گا؟ جیسے اتنے مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے ستارہ کو منع کر دیا تو وہ ارشد کو تاج پہنانے نہیں جائے گی۔

میں ان سوچوں کے تانے بانے کو سلجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور پھر ارشد موتی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈرامائی انداز میں دھیرے دھیرے بازو ہوا میں بند کئے۔

"دن۔ نو۔ قمری" سعید صاحب نے آواز لگائی اور ارشد نے نہایت خوبصورتی سے پانی میں چلا تک لگا دی۔ صرف ایک لمبے کے لئے پانی میں غائب ہو کر وہ سطح پر ابھرا اور جسم کو اکڑا کر جت تیرنے لگا۔ یہ کوئی خاص کرتب نہیں تھا۔ میں بھی دیکھ سکتا تھا۔

کالی دیر تک وہ اسی طرح دھیرے دھیرے تیرتا رہا پھر عام انداز میں تیرنے لگا۔ اس کا نام نوٹ کر لیا گیا۔ چند لمبے سانس درست کرنے کے بعد اس نے غوطہ کھینچا اور اس کے ساتھ ہی میں نے بھی سانس روک لی۔ میں دیکھتا پاتا تھا کہ کیا ارشد مجھ سے

جواب ملا کہ ہم خود لاش لے کر، بلکہ اگر ہو سکے تو قاتل کو بھی ساتھ لے کر تھانے پہنچ جائیں تو شاید کچھ کارروائی ہو سکے۔ اس لئے میری جان! اہم سراغ دینے کی فکر چھوڑو۔ کوئی سراغ ضائع نہیں ہوگا۔ پولیس سے ہم خود بات کر لیں گے۔ تم لاش کو پانی سے نکال لاؤ۔

”جب میرا پاؤں اس سے گر گیا تھا تو میں نے پاؤں سے اس کو کھکھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ وہ کیا چیز ہے۔ مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔ میرا خیال ہے اس کے ساتھ کچھ بندھا ہوا بھی ہے۔ اسے اوپر لانا مشکل ہی ہے۔“ ارشد موتی ایک ایک کر کے لاش کو باہر نکالنا چاہتا۔

میں نے اجازت طلب کی نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے دھکے کی کوشش کرتی، میں نے اس سے بازو چڑا کر سعید صاحب کے قریب پہنچے ہوئے کہا ”میں لاش کو باہر لے آتا ہوں۔“

پھر میں نے غبان اور انڈو تیر میں سو تنگ پول میں چھلانگ لگائی اور جلدی اس جگہ جا پہنچا جہاں میرے خیال میں لاش ہونی چاہئے تھی۔ جلدی میرا پاؤں لاش سے ٹکرایا۔ میں نے جھک کر اسے چمک کر دیکھا۔ وہ یقیناً لاش ہی تھی۔ اس میں زندگی کی کوئی رقی نہیں تھی۔ وہ ڈوری غالباً نائیلون کی تھی جس سے اس کے بازو اس کے جسم کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اسی ڈوری کے سرے سے ایک بڑا سا پتھر بندھا ہوا تھا اور درمیان میں بالکل ذرا سی ڈوری فاضل تھی اس لئے پتھر لاش سے تقریباً بڑا ہوا ہی تھا۔

میں نے ایک بازو پر لاش کو اٹھایا اور دوسرے بازو پر پتھر کو۔ پانی میں بے جان جسم کو اٹھا کر تیرے خاصا مشکل کام ہے۔ انہم میں اوپر اٹھایا۔ سعید صاحب نے لاش اور پتھر کو کنارے پر ٹکائے میں میری مدد کی۔ پھر میں بھی باہر آیا۔

کئی صمان کچھ بہت کر کے لاش کے قریب آگئے تھے۔ میں نے کسی نظر سے اس کا جائزہ لے کر اس بات پر قدرے اطمینان محسوس کیا کہ وہ اہلی نہیں تھی۔ لیکن وہ جو کوئی بھی تھی اس کے لئے دل میں دکھ اور آسف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ لاش کو پانی میں یقیناً بہت زیادہ دیر نہیں گزری تھی کیونکہ اس کی حالت بگڑنا شروع نہیں ہوئی تھی۔

لڑکی فوجوہی تھی۔ بہت شکل تھیں چوبیس سال عمر ہوگی اس کی۔ وہ اتنی مختصر الطوور اور نازک اندام تھی کہ بالکل گڑھا لگتی تھی۔ اس کے تراشیدہ بھروسے بالوں کی نہیں اس کے سفید رخساروں پر چمکی ہوئی تھیں۔ اس کے نقش میں بڑی نزاکت تھی۔ چمکی لڑکیوں کی طرح چھوٹی سی ناک، پہلے پہلے مختصر سے ہونٹ اور نازک سی ٹھوڑی۔ اس کا لباس بے حد معمولی تھا۔

موتی کی طرف متوجہ ہوا پڑا۔ ارشد اب اپنی ہولکھاٹ اور کچھ بے ہوشی حد تک قابو پا چکا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بدحواس ہو گیا ہے اور اسے لوگوں کے سامنے بالکل ہی کارٹون بن گیا ہے جب کہ اس سے پہلے وہ اپنی شخصیت سے مزہ آتیں قسم کی چیز کا اثر دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

اب وہ قدرے سنبھلے ہوئے لمبے میں ہوا ”میرا پاؤں اس سے گر گیا تھا۔ میں سمجھا کوئی چیز پانی میں گری ہوئی ہے۔ میں نے ٹٹل کر دیکھا۔ وہ یقیناً لاش ہے۔ کسی لڑکی کی لاش۔“ ”لڑکی کی۔؟“ کئی صمانوں نے بیک آؤڈز دے کر کہا۔ ”کئی صمان ذرا پیچھے کو ہٹ گئے کیونکہ وہ سو تنگ پول سے دور ہی رہنا چاہتے ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کچھ تو شاید وہاں سے ٹھٹھکے کے بارے میں بھی سوچنے لگے تھے مگر شاید مردانیا پھر مصلحت انہیں نکلتا رہا تھا۔

ستارہ نے تشویش زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بہت بہت حد حالے والے انداز میں اس کا کندھا چھو پتہ پایا اور ایک بار پھر ان لوگوں کے رد عمل کا مشاہدہ کرنے لگا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ پریشان تو سعید صاحب کو ہونا چاہئے تھا کیونکہ وہ میرا تھے۔ لاش ان کے گھر میں ان کے سو تنگ پول میں موجود تھی لیکن وہ پھر بھی کئی حد تک پر سکون تھے۔ ارشد موتی سے گھبراہٹ زدہ انداز میں یہ خبریں کر وہ پہلے پریشان اور پھر متحش نظر آئے تھے لیکن اب انہوں نے کالی حد تک اپنے آپ کو قابو پایا تھا۔

یہ سن کر کہ لاش لڑکی کی تھی، نہ جانے کیوں میرے ذہن میں فوری طور پر یہی کا خیال آیا۔ اس نے اس پانی میں آنے کا وعدہ کیا تھا مگر نہیں آئی تھی۔ کہیں۔؟ میں گھبر بھری سی لے کر وہ گیا۔ اور میں نے فوری طور پر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

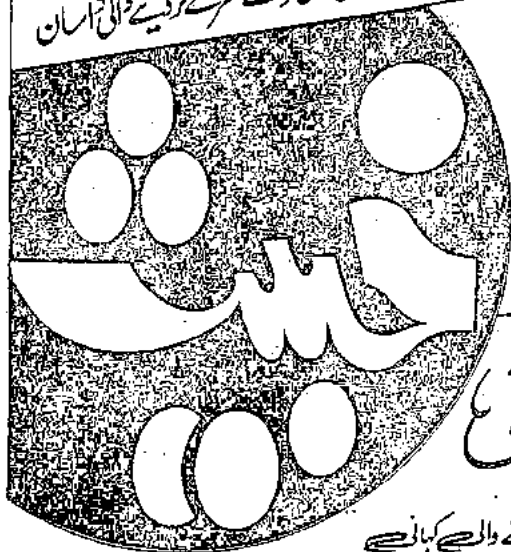
سعید صاحب ”ارشد موتی کا بازو تھامے ہوئے بولے ”تم لاش کو باہر ہی لے آتے۔ پولیس کو بلائے سے پہلے ہمیں کم از کم یہی معلوم ہو جانا کہ لاش ہے کسی کی؟“

”کیں۔ نہیں۔“ ارشد موتی کے لمبے میں اب بھی گھبراہٹ تھی ”میرا خیال ہے ہمیں پولیس کے آنے سے پہلے کسی چیز کو چھیننا نہیں چاہئے کوئی شہادت، کوئی سراغ ضائع ہو سکتا ہے۔“

”تک ہے تم جاسوسی کمائیاں پڑھنے لگے ہو“ سعید صاحب منہ پتا کر بولے ”تم شہادت اور سراغ کی بات کر رہے ہو۔ بھائی!۔۔۔ جہاں اگر پولیس کا موڈ ہو تو اسے پوری لاش بھی نظر نہیں آتی۔۔۔ ہم تو خیر پھر بھی جہاں چار ایسے لوگ جمع ہیں جن کی وہ چار ٹوہدیں سے دعا سلام ہوگی۔ ہمارے بلائے پر تو پولیس آج بھی جائے گی رورن میں لیکن تھا کہ اگر ہم فون کرتے تو آگے سے

ایک پراسرار مورتی کے حصول کی خاطر یوں بولے خوفناک
معجزے کا احوال

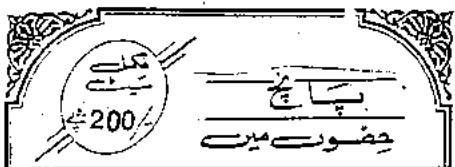
سحر و اسرار کی روگئے کھڑے کر دینے والی داستان



الحارِ صَلَی

کے ایک نئے پراسرار اور خوفناک دینے والے کہانی

حجاب آئینہ قریشی ہیں شہال کے حجاب
قریشی کا آواز ہے کے نام میں دوست کا
مٹی آواز ہے اس سال تم کو شہال
حجاب آپ کو
سحر و اسرار کے پراسرار اور خوفناک دینے والے کہانی



خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرگرم روڈ، اردو بازار، لاہور، فون ۶۲۲۶۶۵

سہلایا۔ اور میر عمر سمان جو غالباً کوئی صنعت کار تھا اپنی ٹائی کی گھر درست کرتے ہوئے تدرے آگے آکر بولا "چوہری صاحب! آپ شاید ہماری پولیس کو نہیں جانتے... بہت پریشان کرتے ہیں وہ لوگ... اور بہت وقت ضائع کرتے ہیں۔"

"پولیس کو مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی جانتا ہو" میں نے ملاٹ سے کہا "آپ لوگ مطمئن رہیں۔ مجھے جرت ہے کہ آپ لوگوں کو خود اپنی پوزیشن کا احساس نہیں۔ ہم سب کوئی اہم غیرہ نہیں ہیں۔ شہر کے ممتاز ترین لوگ ہیں ہم۔ کوئی پولیس آفیسر ہم سے بد تیزی سے پیش نہیں آسکتا۔ خصوصاً جب کہ ہم بے گناہ ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کوئی ایسی پریشانی والی بات نہیں" سعید صاحب نے بھی گویا سب کو قہقہہ دی "ڈی آئی بی صاحب جگ سے بھی آپ کے اس خادم کی جان بچانے سے اور رملاتے کے ڈی ایس بی صاحب سے تو ابھی بجلی کپ ٹپ ہے۔ آپ لوگ ذرا بھی فکر نہیں کریں۔ بس رسی کی کارروائی ہوگی۔ ضابطے کی پوچھ چکھ۔ پولیس بالکل اسی طرح تفتیش کرے گی جس طرح اسے کرنی چاہئے۔ اس طرح نہیں کہے گی جس طرح کرتی ہے۔"

"ڈی آئی بی صاحب کو فون کریں تو انہیں میرا بھی سلام کہہ دیجئے گا" میں نے آہستہ سے سعید صاحب سے کہا۔ انہوں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بات میں سہلانے لگے۔

"اعراض کرنے والے سمان جو اس وقت غالباً باقی مسانوں کے لئے کھڑے بن چکے تھے، میرا باول درخواست بولے "اچھا... اگر آپ لوگ اصرار کرتے ہیں تو ہم رک جاتے ہیں۔"

"پہلے... آئے سے پہلے میں نے یہ طور پر بھی تھوڑی بہت تفتیش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے" میں نے مسانوں کا جائزہ لینے ہوئے کہا "کسی کو اس واقعے کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ کوئی ایسا ایکسپلٹ جو پہلے معمولی اور غیر اہم لگی ہو مگر اب یہ لاش سامنے آنے کے بعد یاد آ رہا ہو کہ اس بات کا اس وقت سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ اپنے زہنوں پر زور دیجئے۔ شاید ایسی کوئی بات یاد آجائے۔"

میں نے متوقع نظروں سے باری باری سب کی طرف دیکھا لیکن سب ہی نے نفی میں سہلادیا۔

"کوئی اسے بچاتا ہے؟" میں نے پوچھا "براہ کرم فوراً اس کی صورت دیکھئے۔"

سامنے کھڑے ہوئے مسانوں نے تو فوری طور پر نفی میں سہلادیا۔ جو سمان جیسے کھڑے تھے میں نے ان سے بھی درخواست کی کہ وہ آگے آکر ابھی طرح لاش کا جائزہ لیں۔ پتاکر نفیس سوٹ میں "دور مین" سے قد کا ایک نوجوان جو اس وقت بھی ہاتھ میں ڈرک اٹھائے ہوئے تھا لاش کا بغور جائزہ لے کر تدرے چلے گئے ہوئے بولا "ارے... یہ تو وہ ایکسپلٹ اگمل

جرتی صرف ایک پاؤں میں تھی اور وہ بھی بے حد سستی اور معمولی سی معلوم ہوئی تھی۔

زندگی سے محروم ہونے کے بعد تو اس کی شخصیت سے دلکشی حرارت اور گداز رخصت ہو چکی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ کافی عرصے سے وہ زندہ حالت میں بھی اجڑی اجڑی سی نظر آتی ہوگی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ طعنے تھے اور ان حلقوں کی سیاہی اس وقت بھی کم نہیں ہوئی تھی جب آکسیجن ان حلقوں سے باہر کو نکلتی تھی۔

اس طرح ابھری ہوئی آنکھوں کی وجہ سے ہی وہ اس وقت ایک باری اور گریزا لیڑکی کے بجائے کوئی ذرا کوئی حلقوں تک دی گئی۔ اس کی گردن پر سیاہی مائل سرخ دائرہ موجود تھا۔ شاید اس کی گردن میں اسی ٹائلیوں کی ذوری کا پھندا ڈال کر اس کا گھٹا گھونٹا کیا تھا جس سے بعد میں اس کے جسم کے ساتھ پتھر باندھا دیا گیا تھا۔

میں نے ایک کمری سامنے لے کر سب سے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کے چروں کا جائزہ لیا۔ سب ہی کے چہرے بالکل نشان چنے ہوئے تھے۔ سعید صاحب نے کھسکار کر کا سا فاف کرتے ہوئے "آواز بلند" کا "معاف کیجئے گا خواتین و حضرات! پارٹی ہو گئی... اب رات اس مسئلے سے نمٹنے میں ضابطہ ڈی آئی بی... لیکن تیرے زندگی اس کا نام ہے... حادثہ تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ناگوار حادثے کا... ناگوار ہو گیا ہے تو ہر سوکھن سے بچئے... مجھے دل ہی دل میں براہملاست گا۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔"

مجھے ان کا یہ اعلان غیر ضروری سا محسوس ہوا لیکن شاید انہیں اطلاعات کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ مسانوں میں کچھ جھنجھٹا ہٹ سی ہوئی پھر اوپر عمر کے ایک صاحب "آواز بلند بولے" "بھئی... اپنے سعید میاں! یہاں موجود ڈیٹر سمان اس معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم سب اپنے اپنے کمرے چلے جائیں۔ آپ خود ہی پولیس سے نمٹتے رہئے گا۔"

سعید صاحب نے قدرے بے بسی سے مٹی طرف دیکھا۔ ماحول کی تمام تر تھنڈک کے باوجود ایک لمبے لمبے مجھے اپنے کانوں کے قریب تپش کی محسوس ہوئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے قدرے سرد مری سے کہا "کوئی اپنے گھر نہیں جائے گا۔ معلوم نہیں اس گریزا لیڑکی کا کوئی قصور یا گناہ تھا یا نہیں... لیکن اسے یوں قتل کر دیا جاتا ہے جیسا کہ انصاف نہیں کلا سکتا... یہ جو کوئی بھی ہے، ہر حال زندگی جیسی نعمت سے محروم ہوئی ہے۔ کیا اس کی خاطر ہم تو خود اس وقت ضابطہ نہیں کر سکتے؟ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

سعید صاحب نے گویا غیر ارادی طور پر میری نامید میں

سی تخت نہاں تھی۔ البتہ اس ایکسٹرا سلاز کا نام مجھے معلوم ہے جس نے اس کی سفارش کی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ میں بتا سکتا ہوں۔"

میں نے ایک بار پھر لاش کا جائزہ لیا۔ غفلت سے ابھری ہوئی اس کی آنکھیں خوابوں سے خالی اور دشت سے پر تھیں۔ لاش کے ساتھ بندھا ہوا پتھر نسواری اور گھوڑا ٹکر گئیں کہیں سے "موسلی سا کالی ڈھ تھا۔ یہ یقیناً انہی پتھروں میں سے ایک تھا جو پناہی منظر کا تاثر دینے کے لئے سو تنگ پول سے کچھ دور سجائے گئے تھے اور جن پر سے پانی پھلتا ہوا سو تنگ پول میں آتا تھا۔

میں نے سعید صاحب سے کہا "پتھر تو آپ نے بچاں ہی لیا ہو گا۔ اس دوری کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"میں ممکن ہے کہ یہ دوری بھی وہیں کہیں سے اٹھائی گئی ہو" سعید صاحب نے پتھروں کے عقب میں پہلے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا "مجھے یاد ہے کہ مالی بعض پردوں کو سیدھا رکھنے کی غرض سے اس قسم کی دوریوں سے باز رہتے ہیں۔" تب تو زیادہ امکان ہی نظر آتا ہے کہ اس لڑکی کو یہیں کہیں اس پاس ہی قتل کیا گیا ہے۔ کہیں اور سے اس کی لاش لا کر سو تنگ پول میں نہیں بھیجی گئی تھی" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ممكن ہے۔۔۔" سعید صاحب نے بے یقینی سے کہا "دیئے ہمارے بارگ کی دیوار بھی زیادہ اونچی نہیں۔ ہم نے اس پر غار دار تاریں تو لگوائی ہیں لیکن پھر بھی کوئی پھلانگ کر اندر آ سکتا ہے۔

اس لئے رات کو ہم اور اصرار اپنے کتے چھوڑ دیتے ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ قاتل کہیں اور دھڑھرے پھلانگ کر گیا ہو گا۔ دینے بھی ہمیں حلقے کے بارے میں فور کرنے سے پہلے

مقتول کے بارے میں غور کرنا چاہئے کہ یہ یہاں کیسے آئی تھی۔"

میں نے کہا اور اسی لئے میری نظر لڑکی کے بائیں ہاتھ پر پڑی۔

اس کا ہاتھ تختی سے ملنے کی شکل میں بند تھا۔ انگلیوں کے درمیان کوئی سفید سفید سی چیز چبکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں نے لاش کے قریب بیٹھ کر جائزہ لیا۔ لڑکی کی منہ میں

یقیناً کوئی کاغذ کا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ اس کا ایک ذرا سا کالہ لکھن کے درمیان سے نکلا ہوا تھا جو بیگ کر اور تقریباً محل کر انگلیوں

سے چپک گیا تھا لیکن لڑکی کی منہ اتنی تختی سے بند تھی کہ میرا

اندازہ تھا "اندرا نہ پانی مشکل سے ہی پٹا ہو گا۔"

میں نے تقریباً غیر ارادی سے انداز میں لڑکی کی منہ کھولنے

کی کوشش شروع کر دی۔ کوئی صاحب مختلاند انداز میں بولی

اٹھے "جو بدی صاحب! آپ کہیں کوئی سراغ ضائع نہ کریں۔"

کہیں پولیس والے ناراض نہ ہوں۔"

میں نے ان صاحب کی طرف دیکھے بغیر کہا "میرا خیال ہے

میں تو پولیس کے آنے سے پہلے اس کے ہٹے کا کچھ کام کر کے رکھ

معلوم ہوتی ہے۔۔۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں آتا۔۔۔ شکل اس لئے یاد رہ گئی کہ ایک بار ایک ایکسٹرا سلاز اسے میرے پاس لے کر

آیا تھا کہ میں اسے ہیروئن کا چالس روے دوں۔ میں ان دونوں اپنی

قلم لہرس کے لئے نئے چہرے تلاش کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

"لیکن ظاہر ہے آپ نے اسے چالس میں دیا ہو گا۔ اگر یہ

ہیروئن آئی ہو تو ہم لوگوں نے اسے ضرور پہچان لیا ہوتا" سعید

صاحب سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"نہیں۔ میں نے اسے اور ایکسٹرا سلاز "دونوں کو بھگا دیا

تھا۔ لڑکی میں اس بار ک بالکل نہیں تھا۔ قلم میں ایسی لڑکیاں بالکل

نہیں چلتیں۔ لی دی پلے کے لئے۔ وہ بھی کسی جھوٹے سونے

مدل میں ٹھیک رہتی۔ ویسے بھی میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو

لڑکی زیادہ عرصے تک ایکسٹرا دھ چکی ہو اسے ہیروئن نہیں لیا

جاسکتا۔ ایسی لڑکی کی کامیابی کی حمارے ہاں صرف ایک ہی مثال

موجود ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے" سعید صاحب نے انہماک میں سر ہلایا پھر

قد سے چونک کر میری طرف دیکھا اور سوٹ والے شخص کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ان سے لئے چھوڑی صاحب!

یہ مشہور قلم ساز اور بدانت کار و دلاز قریبی ہیں۔"

میرے لئے یہ نام شناس تھا۔ میں نے اس شخص سے معافی

کیا۔ صورت حال خاصی عجیب لگ رہی تھی۔ ہمارے دائیں

ہاتھ پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ پر اتنے سارے

مہمان تھے جن میں خواہیں بھی شامل تھیں۔ سامنے دلاز اور

سعید صاحب مجھ سونوں میں کھڑے تھے اور میں پیچھے ہوئے بنیان

اور اندازہ میری کھڑا دلاز سے ہاتھ لگا رہا تھا۔

سعید صاحب ایک لمحے کے لئے گویا لاش کو بھول گئے اور

دلاز سے مخاطب ہوئے "لہرس" میں تو پھر آپ نے نئے چہرے

نہیں لئے تھے؟"

"نہیں۔ مجھے رسک ہی محسوس ہوا تھا۔ میں نے نئے چہرے

لینے کا ارادہ ہی بدل دیا تھا۔" دلاز قریبی ایک نظر لاش کی طرف

دیکھ کر حقائق سے بولا "ہم نے اپنی دی پڑائی پیرا اشارہ ساتھ بیگم

کو لے کر کام چلا لیا تھا۔ ان کا قہر چھوٹا ہے اور عمر بھی کم ہی

گنتی ہے۔ ہم نے ان کی دو پٹیاں وغیرہ کر کے کام چلا لیا تھا۔ کچھ

بیک آپ سے اچھے اربیکس لے لئے تھے۔"

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ دونوں صاحبان قلموں کے

غیب و فراز پر تیار نہ خیال شروع نہ کریں اس لئے میں نے ہتھکڑی

میں مداخلت کرتے ہوئے دلاز کو مخاطب کیا "تو آپ کو صرف یہ

یاد ہے کہ یہ کوئی ایکسٹرا کرل ہے۔ نام وغیرہ یاد نہیں آتا۔؟"

"نہیں۔ وہ دراصل ایکسٹرا کرل کے نام اور شکلیں وغیرہ

تو زیادہ تر اسٹینٹ ٹائپ کے لوگ ہی یاد رکھتے ہیں۔" دلاز نے

معدرت خواہانہ سے انداز میں کہا لیکن اس معدرت میں بھی ہلکی

چھوڑ دیں

”لیکن میں اپنی یہ جبرانی ضرورت دور کرنی چاہتا ہوں کہ یہ کس راستے سے ہمارے پاس آئی تھی۔ یہ کسی بھی طرح مدعو مسلمان تو لگ نہیں رہی۔ چوکیدار نے اسے اندر کیسے آنے دیا ہوگا؟“
سعید صاحب خورکلائی کے سے انداز میں بولے۔ پھر انہوں نے ایک نوکر کو آواز دے کر حکم دیا کہ وہ گیٹ سے چوکیدار کو بلا لائے۔
چوکیدار اپنی راکٹل سنبھالے آیا۔ وہ جوان العراور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ سعید صاحب نے اسے سید حالات کے پاس بلا لیا۔ لاش دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا اور اس کی مونچھیں ایک لمحے کے لئے پڑ پڑا کر رہ گئیں۔

”یہ لڑکی سامنے والے گیٹ سے اندر آئی تھی؟“ سعید صاحب نے پوچھا۔

”ہاں صاحب...!“ چوکیدار غالباً سعید صاحب کا مطلب سمجھ گیا اور خودی تفصیل بتانے لگا۔ ”یہ رستے میں آئی تھی صاحب! ہم سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی بڑا لوگ نہیں اے۔ مگر صاحب! اس کے پاس کاربڑ موجود تھا۔ ام سمجھا ٹھیک اے... صاحب نے کسی وجہ سے بلایا ہوگا۔ یہ سب سے پہلے کیا تھا... ام سمجھا اس کو بوت شوق اے پانی میں آنے کا...“

”ایک تو تم ساری باتیں خود بخود ہی سمجھ لیتے ہو“ سعید صاحب قدر سے چڑ کر بولے۔

”ام نے اس کو بولا صاحب کہ ابھی کوئی مسلمان نہیں آئی اے... مگر یہ بولا کہ ام جا کر بیٹھے گا اور انتظار کرے گا۔ اس نے پوچھا کہ مسلمان کے بیٹھے کا انتظام کدہ رائے۔ ام نے اس کو بتایا کہ بیٹھے بائیں میں... یہ سروٹ کو اور ڈرائی سائڈ سے بائیں کی طرف چلا گیا... بس اس کا بعد ام اس کو بھول گیا۔“

”کیا اس وقت کیٹرنگ سروس والے میرا مطلب ہے کھانا لگانے والے آچکے تھے؟“ سعید صاحب نے پوچھا۔

”نہیں صاحب! ان کو تو ام نے رات نو بجے کا کام دیا تھا... آج کھانا بالکل نازہ نازہ تھوے...“ چوکیدار نے جواب دیا۔
کھانے کا انتظام دیوے بھی سائڈ والے لان پر تھا۔ مسلمانوں کے لئے انتظام بیچنے والے لان میں نہائے کے آداب ہیٹھے پاس تھا۔
تاہم سعید صاحب نے تمام نوکروں اور کیٹرنگ سروس کے دیڑوں کو بلا کر لاش دکھائی اور ان سے پوچھا کہ کیا انہوں نے سو ٹھنک پول کے آس پاس یا اسٹینج کے سامنے لگی ہوئی کرسیوں میں سے کسی پر اس لڑکی کو بیٹھ دیکھا تھا؟ لیکن سب کا جواب نفی میں تھا۔

”مجھے نہیں چڑہا کہ کون مسلمان سب سے پہلے آیا تھا... میں اس وقت کھینچنے کے آس پاس تھا بھی نہیں...“ سعید صاحب پیشانی مسٹے ہوئے بولے۔ ان کی یکم جو ایک خوبصورت اور بادقار خاتون تھیں، کچھ دور کھڑی تھیں۔ وہ ان سے کچھ کہنے کے

رہا ہوں۔ یا ممکن ہے ہم اپنے کسی دوست کو غیر ضروری شرمشکی سے بچالیں۔“

لاش شاید پانی میں رہنے کی وجہ سے زیادہ بری طرح نہیں اٹڑی تھی۔ خودی سی طاقت صرف کر کے میں نے مٹی اس حد تک کھول لی کہ مڑے مڑے کانڈ کو بحفاظت نکال سکوں۔ وہ کسی ڈائری سے پھاڑا گیا تقریباً آدھا ورق تھا۔ کچھ تو پانی مٹی میں زیادہ نہیں پینچا تھا اور کچھ کانڈ بھی عمدہ تھا، مکمل طور پر کھائیں تھا۔ میں نے حفاظت سے اسے کھولا۔ اس پر غالباً نہایت گلت میں پال پواخت سے چند الفاظ مھپٹے گئے تھے۔ ”اگر یہ فاضلین ہیں کی تحریر ہوئی تو شاید اب تک بڑے کے قاتل نہ رہی ہوئی۔ ایک لمحے کے لئے دیکھو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ مختصر سا وہ پیغام میرے ہی نام تھا۔“

افضل صاحب!

مجھے افسوس ہے کہ میں پانی میں نہیں آسکوں گی۔ میں اپنے ارد گرد بہت خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن خیر۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لڑکی کو شاید آپ کی اخلاقی مدد کی ضرورت پڑے۔ ضرور کہہ دیجئے گا۔

نقطہ

ہن

میں چند لمحے کے لئے ساکت کھڑا رہا۔ کانڈ اچھی حالت میں ہوا تو یقیناً سعید صاحب اسے میرے ہاتھ سے جھپٹ لیتے۔ آخر کار... میں نے خودی مضمون پڑھ کر انہیں سنا دیا۔ دیکھ تو سب پہلے بھی میری ہی طرف رہے تھے لیکن اب کچھ اور زیادہ توجہ سے دیکھنے لگے۔

”... تو اسے کسی اخلاقی مدد کی ضرورت تھی...! سعید صاحب لاش کی طرف دیکھ کر کسی سانس لے کر بولے۔

”اور کوئی ایسا شخص بھی تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی اخلاقی مدد میرے آگے“ میں نے بھی ایک نظر لاش کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس لمحے مجھے اس پر بڑا اثر آیا۔ وہ نبھائے کیا امید لے کر یہاں پہنچی تھی۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہن نے اس کے ہاتھ مذرت کا پیغام بھیجا تھا اور ساتھ ہی کسی مظلوم خطرے کی بھی نشان دہی کی تھی۔ لیکن ہن کی تحریر میں پیغام سمجھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہ سعید صاحب کے ہاں فون نہیں کر سکتی تھی؟ پانی کے دوران فون کر کے وہ مجھ سے بھی بات کر سکتی تھی۔ کیا یہ لڑکی بھی اسی خطرے کی پلٹ میں آگئی تھی جس کی طرف ہن نے اشارہ کیا تھا یا یہ اس کی ذاتی زندگی کے کسی اندازِ حیا کا شائبہ تھا؟

سوال سے سوال نکل رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر سعید صاحب کی طرف دیکھا اور سزاوارتہ کانڈ سڑو لڑکی کے ہاتھ میں ہی پھنسائے ہوئے کہا ”بستر ہے کہ ہم برج پور پائیس کے لئے ہی

نہیں کبھی اور میرے ساتھ ہی اندر کی طرف چل دے لیکن پھر رک کر انہوں نے مڑ کر بہ آواز بلند سمانوں کو مخاطب کیا۔ ”بھئی.... جس کا جہاں جی چاہے بیٹھ جائے۔۔۔ اور خواتین و حضرات بالکل ریٹیکس رہیں۔۔۔ پارٹی چاہے ہو گی۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ جلدی اس کی طلالی کر لیں گے۔“

سمان اوپر اوپر کھڑے گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ان میں سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ لیکن میں نے اب ان کی پروا چھوڑ دی تھی۔ میرا ذہن بہت سے سوالات میں الجھا ہوا تھا۔ میں جب ایک باجھ دوم غلامی پار اور اپنا علیہ درست کر کے نکلا تو راہ پار کی کے اختتام پر ہال کی طرف سے مجھے معید صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ ابھی فون پر ہی باتیں کر رہے تھے۔ میں ہال ہی میں جا پہنچا۔ وہ ہال بھی ایک طرح کا ڈرائنگ دوم سائی تھا۔۔۔ دیوار کے قریب صوفے پر معید صاحب بیٹھے تھے۔ فون ان کے سامنے پائی پر رکھا تھا۔ اس پاس صوفوں اور دور سری نشستوں پر کئی سمان موجود تھے۔ معید صاحب کی بیگم ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

معید صاحب نے مزید کئی منٹ فون پر بات کی پھر ریسیور رکھ کر خاصی دیر کے بعد پہلی مرتبہ مطمئن انداز میں مسکرائے۔ ”لو بھئی.... اب ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ اب پولیس جانے اور اس کا کام۔“

میں نے ان کے مقابل چالیں پر پڑے ہوئے ایک سوئے سے کشن پر بیٹھ کر فون اپنی طرف کھینکے ہوئے کہا۔ ”ذرا بتی کہ بھی فون کر کے اس کی خبر دریافت معلوم کرنا چاہئے۔ اور اگر وہ مل جائے تو اسے ابیں افسوسناک واقعے کی اطلاع دے دینی چاہئے۔“

اسی دوران میں نے اپنے قریب کپڑوں کی سرسراہٹ اور ایک مخصوص شناسا خوشبو محسوس کی۔ سرزرا اٹھا کر دیکھا تو ستارہ دوسرا کشن کھسکا کر میرے قریب بیٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں افسردہ ناخار تھا۔ مضمون سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ”مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ لڑکی تمہارے لئے ریٹائڈ کا باعث بنے گی۔۔۔“ وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر اس نے ان لفظوں کو ہونٹوں کے پیچھے ہی مقید رکھا ”اگر وہ کچھ اور بولتی تو شاید اس کا انداز بیڑیوں والا لگتا۔“

میں نے لامنت سے کہا ”ستارہ! مجھے اس لڑکی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔۔۔ لیکن اتفاقاً بس کچھ ایسا ہوا ہے کہ مجھ پر اس کا ایک احسان چڑھ گیا ہے۔۔۔ اور انسان جن کا احسان منہ ہوا ان کا خیال تو رکنا پڑتا ہے نا۔“

ستارہ خاموش رہی۔ معید صاحب نے اس موقع پر شاید کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ایک نظر ہی کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے بنی کا تہذیباً اکل کیا لیکن دور سری طرف عمل سکوت طاری

ارادے سے آگے بڑھیں لیکن اس سے پہلے ہی سمانوں میں سے ایک شخص نے کھٹکار کر کھانا صاف کیا اور پچکا ہٹ آئینے سے لیے میں بولا۔ ”میرا خیال ہے سب سے پہلے میں اور میری دوست طاہرہ خانم پہنچے تھے لیکن ہمیں لان پر نہیں ڈرائنگ دوم میں بٹھایا گیا۔ پھر جب وہاں کئی سمان جمع ہو گئے تو ہم یہاں بھی لان پر آئے تھے۔ اس وقت اندر جہاں گہرا ہو چکا تھا اور میرا خیال ہے ہم بیٹھے بھی لوگ یہاں آئے تھے ان میں سے کسی کو یہاں کوئی لڑکی بیٹھی دکھائی نہیں دی تھی۔“

”جی ہاں۔۔۔ یہ درست ہے۔“ جبکہ وقت کئی آوازیں سنائی دیں۔ یہ غالباً وہ سمان تھے جو اس شخص اور اس کی دوست طاہرہ خانم کے ساتھ لان پر آئے تھے۔ یہ شخص نصیر نواز تھا۔ جنگل کا راکب۔ دروازہ اور خاص حد تک دبیرہ مکر تیزی سے بے ڈھنگے پن کی طرف گامزن۔

معید صاحب کی بیگم قدرے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھیں مگر بدستور خاموش تھیں۔ شاید وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں وہ نصیر نواز اور دوسرے سمانوں نے خود کہہ دیا تھا۔ سبز معید کی موٹی موٹی آنکھوں سے تشویش جھانک رہی تھی۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”معید صاحب! آپ پولیس کو فون کریں۔ تب تک میں اور یہ دوسرے صاحبان جن کو تھرا کی دفترو کے متابلوں میں حصر لیا تھا“ اپنے طے درست کر آئیں۔ کم از کم میں تو یوں کہتا اپنے آپ کو کہ محسوس کر رہا ہوں۔ اور اب سبزی بھی لگنے لگی ہے۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ سو ٹھنک کاسٹوم میں کھڑے ہوئے آدمیوں نے میری تائیدی۔ ہم نے پول کے کنارے چڑی ہوئی خوبصورت آرام کرسیوں پر سے اپنے اپنے سوٹ اٹھائے اور اندر کی طرف چل دے تاکہ اپنے طے درست کر کے آسکیں۔

اچانک معید صاحب آواز دے کر مجھے روکتے ہوئے ہوئے۔ ”یہ دعوت نامے والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ دعوت ناموں کے لئے میں نے خود اپنے ٹیکڑی کو نام لکھوائے تھے۔ اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی ایکسٹرا گارل کے لئے دعوت نامہ بھیجے کو کہا ہو۔“

”اس کا جواب پہلے ہی میرے ذہن میں آچکا ہے۔ میں نے ذرا دیر کے لئے روکتے ہوئے کہا۔“ وہ دعوت نامہ یقیناً بنی کا دگا۔ چونکہ ارے سمانوں سے جو دعوت نامے لے کر جمع کیے ہوں گے آپ جا کر ان میں دیکھ لیجئے گا۔ ان میں ضرور اپنی کے نام کا دعوت نامہ موجود ہو گا۔ وہ جو کچھ خود نہیں آ رہی تھی اس لئے اس نے لڑکی کو اپنا دعوت نامہ دے کر بھیج دیا ہو گا کہ اسے اندر آنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔“

معید صاحب نے تقبی انداز میں سر ہلایا۔ انھیں میری بات پر یقین آ گیا تھا اس لئے انہوں نے تھوہین کی بھی ضرورت

مجھ سے مصافحہ کیا۔

"لیکن لاش کی موجودگی کا پتا چلے ان کو چلا تھا۔" میں نے ارشد موتی کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ہم نے وہ سب کچھ اے ایس آئی کو بتایا جو ہم اب تک معلوم کر سکتے تھے۔ اے ایس آئی سب کچھ اپنی ڈائری میں نوٹ کر آتا اور آخر کار ڈائری بند کرتے ہوئے بولا "آپ لوگوں نے تو اچھی خاصی تفتیش کر ڈالی ہے۔ میں تو اتنا کہہ رہا تھا کہ پڑھے لکھے ہونے کا۔ لیکن اصل کچھ ابھی آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔"

پھر اس نے لاش کو ہلا جلا کر دیکھا۔ ایک لفافہ منگوا کر وہ پرچی اس میں محفوظ کر لی جو لاش کی منہ کی بڑ آمد ہوئی تھی۔ پھر اس نے لاش کی छाغي لینے کی کوشش کی لیکن اس کے لباس میں کوئی جیب دیکھ نہیں سکی۔

"شاید اس کے پاس کوئی پرس وغیرہ موجود رہا ہو۔ نیسے قاتل نے غائب کر دیا ہو۔ یا شاید وہ سو تنگ پول کی تہ میں پڑا ہو" اے ایس آئی خود کھائی کے سے انداز میں بولا۔ شاید وہ بہ آواز بلند سوچ رہا تھا۔

"اگر آپ ضرورت محسوس کریں گے تو کوئی شخص سو تنگ پول میں اتر کر اچھی طرح یہ کھال آئے گا۔" سعید صاحب نے اسے تسلی دی۔ اور اگر آپ ضروری سمجھیں گے تو سو تنگ پول خالی کروا دیا جائے گا کہ آپ فرش کا معائنہ کر سکیں۔"

"اس پینڈ میں اپنے انسپکٹر صاحب سے منظور کے بعد کہوں گا۔" اے ایس آئی نے سادگی سے کہا "فی الحال میں صرف ابتدائی تفتیش کے لئے آیا ہوں۔ اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لڑکی کو ہلاک کہاں کیا گیا ہو گا۔"

حقی لان کی طرف کی ساری جہاں روشن کردی تھیں پھر بھی مصنوعی آفتاب کے عقب میں پہلے ہوئے جھنڈ تک پہنچنے کے لئے روشنی ڈالنی تھی۔ ہر حال دیکھ لائنیں بھی ساتھ لے کر پولیس والوں نے پیچھے جا بڑھ کر لیتا شروع کیا لیکن کہیں کسی قسم کا کوئی سراغ نظر نہ آیا۔

آخر کار میں نے کہا "اے ایس آئی صاحب امیر خیال ہے کہ زیادہ دور تک ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے ہمیں پہلے اسی جگہ کی طرف دیکھنا چاہئے جہاں سے غالباً پتھر اٹھایا گیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ اگر کوئی سراغ ہو گا تو ادھر ہی چروں کے پیچھے درختوں کے جھنڈ میں یا اس کے آس پاس ہو گا۔" اے ایس آئی اطمینان سے بولا "لیکن ضابطہ کی کارروائی کے لئے مجھے سارے لان کا جائزہ لینا ہی ہے۔ اس لئے پہلے میں فاتحہ کام ننگا رہا ہوں۔" وہ اتارے وقف میں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا البتہ ان لوگوں کا کام کرسنہ کا پانی ایک انداز تھا۔

سب سے آخر میں اس نے اس جگہ کا سرخ کیا بعد میں جانا چاہا رہا تھا۔ آخر کار میں سو تنگ پول سے کچھ ہی فاصلے پر ایسے

رہا۔ کسی بھی قسم کی کوئی ٹون ٹالی نہ دی۔ میں نے ایک بار پھر نمبر ڈائل کیا کہ شاید پہلی بار صبح نہ ملا ہو لیکن دوسری طرف پر متور سکوت رہا۔

"ایسا لگتا ہے کہ لاش کئی ہوئی ہے۔" میں نے ریموڈر دکھ کر خاص طور پر کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔ دور ایک کونے میں مصنف نصیر نواز اور اس کی دوست طاہرہ خانم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اب ہمیں پولیس کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

لاٹھیں میرے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھیں لیکن جانے کیوں باہر کھیلے آج ان تلوے سو تنگ پول کے کنارے پڑی ہوئی اس مختصر البودھی لڑکی کا قصور میرے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ اس میں ضرور کوئی بات تھی جو میرے محسوسات کو متغیر بنا کر رہی تھی۔ شاید وہ اس کی خاموشی بے کسی کی پکار تھی۔ شاید اس کے بے جان سراپا میں کہیں اس کی مظلومیت بول رہی تھی۔ نہ جانے اسے کس معاملے میں میری اخلاقی مدد کی ضرورت تھی؟ شاید یہی مجھے یہ بات بتا سکتی تھی مگر اس کی طرف بھی عملی سکوت تھا۔ ہر حال میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے فاتحہ ہو کر گھر جانے وقت میں حق کے گھر کا پتھر بھی ضرور لگاتا جاؤں گا۔ شاید اس سے ملاقات ہو ہی جائے۔ یا شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔

پولیس نے آئے میں در نہیں لگائی۔ صرف ایک اے ایس آئی اور دو کاٹشیل آئے تھے اور وہ پہلے ہی اپنے کسی افسر سے پوچھ باتیں کر آئے تھے۔ ان کا رویہ کچھ دوستانہ اور کچھ متوجہ تھا۔

سب سے پہلے انہوں نے جا کر جائے واردات کا معائنہ کیا۔ لاش کا جائزہ لینے ہوئے اے ایس آئی بولا۔ "پولیس کے آئے تنگ جائے واردات پر کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے لیکن آپ لوگوں نے تو پوری واردات کو ہی سو تنگ پول سے نکال کر باہر رکھا ہوا ہے۔" اس کے کمرے چرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ لاشیں اور تشدد کے مظاہرے دیکھنا ان کا روز کا معمول تھا۔

سعید صاحب نے حیرت سے کہا "ہم نے لاش اس لئے باہر نکالی تھی کہ اور کہ ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ یہ لاش ہی ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ شاید اس میں زندگی کی کوئی رشتہ بانی ہو۔ شاید فوری طور پر طبی امداد میرے آنے سے ہی بچ سکے۔ لیکن باہر نکالنے پر اندازہ ہوا کہ اسے مرے ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے۔" "مقتول بات ہے" اے ایس آئی نے آئینہ میں سر ملایا۔ اس کی مشتاق نظروں نے چند لمحوں میں لاش اور سو تنگ پول کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اٹھ کر ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "لاش نکال کس نے تھی؟"

"انہوں نے۔" سعید صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اور میرا تعارف کرایا۔ میرا نام سن کر اسے ایس آئی نے گرجوٹی سے

صحرا کا چاند

اس کا معصوم حسن صحرائی راتوں میں چمکنے والے چاند کو شرماتا تھا۔
دوسری جنگ عظیم ایک پاکستانی نوجوان کو صحرا کے اس درخشاں چاندنی میں لے آئی تھی۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی روح میں محبت کی ملک بن کر ساگے۔ لیکن زندگی صرف محبت کی خوشبو ہی نہیں۔
زہریلے کانٹوں کا جنگل بھی ہے۔ انسانی محبت اور نفرت کے صحرا میں طلوع ہونے والے چاند کی سچی داستان جسے اے حمید کے رومان پرور قلم نے لکھا۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/80 روپے

صاحب طرز ادیب قمر اجٹالوی کا نام تاریخی ادب میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔۔۔۔۔

ولی عہد

افکار حویں صدی کے برصغیر کی ادبی تصویر
★ جب کمپنی سرکار والیان ریاست کا شکار ہیل رہی تھی۔
★ جب انگریز حکمران اعلیٰ کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔
★ ایک خانہ بدوش جو ولی عہد بن گیا۔
★ ایک شہزادی جو خانہ بدوش بن گئی۔
آزادی کی محب و غریب لڑزہ خیز داستان۔۔۔۔۔ جسے قمر اجٹالوی کے تاریخ ساز قلم نے لکھا۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/150 روپے

نشانات ملی گئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ لاش کے ساتھ چہرہ
 بانہ منے کے بعد وہاں اسے چہرہ سمیت گھسیٹا گیا تھا لیکن لاش کا
 ایک سینڈل انیس درختوں کے جھنڈ میں پڑا ہوا ملا۔ میرا خیال تھا
 کہ لڑکی کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ وہ اتنی ہلکی پھلکی تھی کہ اوسط
 جسامت کا بھی کوئی شخص اسے آسانی سے اٹھا کر لے جاسکتا تھا۔
 قاتل بھی اس کی لاش کو مصنوعی آتشبار خف تو ڈالنا اٹھا کر ہی لایا
 تھا لیکن یہاں رک کر لاش کے ساتھ ایک چہرہ باندھنے کے بعد
 اس نے اسے چہرہ سمیت گھسیٹ کر سر ٹنگ پول میں دھکیل دیا
 تھا۔ تقریباً چالیس سال کا ایس آئی نے بھی اٹھ کئے تھے تاہم وہ
 قیاس کا کھوڑا پتہ اور آگے تک دوڑاتے ہوئے بولا "ممكن ہے
 وہ جب یہاں آکر دوسرے صباؤں کے انتظار میں اپنی بیٹی ہو تو
 پر ہو کر ادھر ادھر مٹنے لگی ہو۔ درختوں کے جھنڈ تک چلی گئی ہو
 اور وہاں کسی نوکر کی اس پر نیت خراب ہو گئی ہو۔ اپنے ارادے
 میں کامیاب نہ ہونے پر اس نے مہنگا ہت اور دھشت میں
 ٹائیلوں کی ڈورلی سے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔" اس نے یوں
 سید صاحب کی طرف دیکھا تو اس میں موضوع پر ان کی رائے جاننا
 چاہتا ہو۔

سید صاحب قدرے تھکے تھکے لیے میں بولے۔ "اتفاق
 سے میرے ہاں چوکیدار کے ساتھ بھی نوکر بوڑھے ہیں۔ خاص
 معمر اور قابل اعتبار۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی پر اس
 قسم کی دھشت اور خون طاری ہو سکتا ہے۔ اور جہاں تک
 چوکیدار کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں مجھے سو فیصد یقین ہے
 کہ وہ بے چارہ آج دوسرے ایک لمحے کے لئے بھی گیت سے
 نہیں ہٹا۔ (یہ بھی میرے خیال میں میڈیکل رپورٹ آنے سے
 پہلے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس پر مجرمانہ ملے کی کوشش کی
 گئی تھی یا نہیں۔"

"میں بھی صرف اندازے ظاہر کر رہا ہوں۔ بی۔ میں کوئی
 بات یقین سے تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ حالانکہ عدالت میں پیش
 کرنے تک ہم کوئی بات یقین سے نہیں کہتے۔ کم از کم بلیک کے
 سامنے نہیں کہتے۔" اے ایس آئی نے سوچہ کوئی کہتے ہوئے
 بڑی بخیدگی سے کہا۔ پھر وہ اشارے سے گویا ان کے کچھ ہمے کی
 مدد کی کرتے ہوئے بولا۔ "غیر جناب" تب تک ہماری طرف
 سے نہ کہا جائے اس وقت تک اتنے میں گھر کا کوئی فرد یا نوکر
 قہر نہ رہے۔"

پھر ہم سب واپس اندر ہال میں آگئے۔ اے ایس آئی نے
 اپنے بار بار آئی اور ہال پر اٹھ نہال لیا لیکن کچھ لٹنے سے
 بیت رہا۔ اس نے کہنے کے لئے انداز میں بولا۔ "بھیس صاحبان!
 آپ بے شمار کے لئے معزز آپرے تھے اچانک پچھانے اور
 اثر و رسوخ والے لوگ ہیں۔ ہمیں باطل قریح نہیں ہے کہ آپ
 نے سے کوئی بھی کسی قسم کی خفیہ دولت کرنا ہے۔ ہم کہیں

آنے سے پہلے اوپر سے ہدایت ملی تھی کہ ہم یہاں اپنے خاص
 طور طریقوں کا مظاہرہ بالکل نہ کریں اس لئے آپ نے دیکھا ہی
 ہو گا کہ میں نے نہ تو کسی پر شبہ ظاہر کیا ہے نہ کسی کو درست میں
 لے رہا ہوں لیکن ظاہر ہے ہم کو اس کیس کا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔
 قتل کے کیس کو ہم آسانی سے داخل دفتر نہیں کر سکتے۔ اس
 لئے میری آپ صاحبان سے دوستانہ گزارش ہے کہ اگر کسی کو
 کوئی معمولی سی بھی بات معلوم ہے یا کوئی اس سلسلے میں کچھ کتنا
 چاہتا ہے کچھ تسلیم کرنا چاہتا ہے وہ اس وقت کر لے۔ میرا وعدہ
 ہے ہم اس کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آئیں گے لیکن بعد میں
 اگر ہم نے اپنے طور پر اپنی کوششوں سے کچھ معلوم کیا تو پھر ہم
 رعایت نہیں کریں گے۔ پھر مندرجہ بالا اور اس طرح بھی کام نہیں
 آئے گا۔" اس کی عقلی نظرس فرماؤ ہر ایک کے چہرے کا
 جائزہ لینے لگیں۔ اس نے بڑے پرامن اور دو دو ٹوک لیے جیسے بات
 کی تھی پھر مجھ پر جانے کیوں مجھے اس کے لیے بھی کھوکھلے پن کی
 جھلک محسوس ہوئی۔ مسلسل مشق سے اس کے لیے جیسے میں گھن
 کرتی تو اتنی تھی لیکن مجھے اس کے عقب سے عمل کی جھلک
 ملتی نہیں دے رہی تھی۔

سب خاموش رہے۔ کوئی ایک لفظ بھی نہ بولا۔
 "چھا ٹھیک ہے۔ جیسے آپ صاحبان کی مرضی۔" اس نے
 بے پروائی سے کندھے اچکاتے اور اپنی جیب سے پگٹ نکال کر
 ایک سگریٹ ساگنی حالانکہ اس کے سامنے تباہی پر خوشحورت
 سگریٹ باکس اور سگریٹ باکس سما ہوا تھا۔ سنرا بیٹری لا سگریٹ
 رکھا تھا۔ اس کی یہ ادا مجھے اچھی لگی۔ اس وقت تک اس کے
 لئے کوئی اور درگزر وازات آچکے تھے مگر اس نے ان کی طرف بھی
 توجہ نہ دی۔

وہ ایک بار پھر ٹوٹنے والی نظروں سے سب کا جائزہ لینے
 ہوئے بولا "کسی کو اس بارے میں بھی بالکل کوئی اندازہ نہیں کہ
 وہ یہاں کیوں آئی تھی؟"

ڈائریکٹر راجیل بٹ سر سمجھاتے ہوئے بولا "جب یہاں کوئی
 اسے جانتا ہی نہیں تھا تو کسی کو اس کے متعلقہ کا کیا اندازہ ہو سکتا
 ہے؟ میں پندرہ سال سے علم انڈسٹری میں ہوں اور اسٹونوڈ کی
 دیواروں کی ایک ایک اینٹ کو پچھانوں مگر میں بھی اسے نہیں
 پہچان سکا تھا۔ اسی نے آپ اندازہ لگا دیا ہے کہ ہمارے لئے وہ
 کس قدر غیر اہم تھی۔ بلدا کر تیشی صاحب نے یاد دلایا تب مجھے
 بھی یاد آیا تھا کہ شاید وہ ایک مرتبہ میں نے اسے کیس ایکسٹرا
 کر کے درمیان دیکھا تھا۔"

"چند ہی صاحب! آپ کو بھی کچھ اندازہ نہیں؟" اس نے
 ایس آئی نے میری طرف مڑتے ہوئے پوچھا "آپ کی تو اسے
 اطلاع دی گئی ضرورت تھی۔"
 "مجھ سے اس کی واقعات کی فہم آتی تھی کچھ کچھ جانتا

نہا "میں نے ملاٹھ سے کہا۔
 "ٹھیک" اے ایس آئی نے کمری سانس لی۔ "اس کا
 مطلب ہے کہ وہ مسافر تھی صاحب ہی اس کے بارے میں کچھ
 جان سکتی ہیں جنہوں نے اس کو آپ کے پاس بھیجا تھا لیکن ان کے
 بارے میں بھی آپ متاثر ہے ہیں کہ ان کا ٹیلی فون ہی شاید ڈیڑھ پرا
 ہے۔ دیکھیں میں ان کو تھوڑا سا جانتا ہوں۔ ان کا گھر بھی معلوم
 ہے۔ میں یہاں سے ٹھننے کے بعد ان کے گھر جاتا ہوں۔" اس نے ایک لمحے
 "آپ اپنی کارروائی منٹا لیں، پھر میں بھی آپ کے ساتھ
 چلوں گا۔" میں نے کہا۔

تب اس نے ضابطے کی باقی کارروائی منٹا کر شروع کر دی۔
 اس نے فرما دیا سب کے نام ہے، "میشینیں، فون نمبر اور ہر ایک
 کا پتہ میں پہنچنے کا وقت وغیرہ نوٹ کیا۔ اس کا میں خاص دیر
 لگ گئی اور اس دوران اس نے مظلومانہ انداز میں کئی سنگ شیں
 پھونک ڈالیں تاہم اس کا قلم خاص تیز رفتاری سے نوٹ بک کے
 صفحات پر پھسلا رہا۔

آخر کار وہ تمام اندراجات سے فارغ ہو کر نوٹ بک بند
 کرتے ہوئے بولا۔ "آپ تمام خواتین و حضرات سے گزارش
 ہے کہ ہمارے انسپکٹر خالد حیات صاحب سے اجازت لئے بغیر شہر
 سے باہر نہ جائیں اور دورانِ تحقیق اگر کسی صاحب سے فون پر
 تھوڑی بہت پوچھ بچھ کی جائے یا تعانے آنے کی زحمت دی جائے
 تو پورا پورا تعادلوں کریں۔"

"آپ فکر نہ کریں" ایسا ہی ہو گا۔ "سعید صاحب نے اسے
 تسلی دی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی سب ممان یوں
 کمری سانس لے کر اٹھے جیسے کسی معیت سے جان چھوٹی ہو۔
 سب نے سعید صاحب سے ہاتھ ملا کر تیزی سے رخصت ہونا
 شروع کر دیا اور سعید صاحب ہر ایک سے معذرت کرتے گئے۔

آخر کار ہال میں میزبانوں اور پولیس والوں کے علاوہ صرف
 میں اور ستارہ رہ گئے۔ اے ایس آئی نے اپنے ماتحتوں کو دیالیا
 دیں کہ لاش کو گاڑی میں رکھ کر کون سے اسپتال لے جاتا ہے۔
 پھر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا "میں آپ کے ساتھ آپ کی
 گاڑی میں سہارا ہوتی کے گھر چلوں گا۔"
 بہرہ چشم "میں نے کہا۔

ستارہ میرا بازو چھوتے ہوئے بولی۔ "میں بھی اب چلتی
 ہوں۔"
 "تم میرے ساتھ نہیں چلی رہیں؟" میں نے اس کی
 آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں جھکن اتر آئی تھی۔
 "میں ضرور چلتی لیکن میں بہت تھک گئی ہوں۔ اور اس واسطے
 نے دل بھی خراب کر دیا ہے۔ تم بعد میں مجھے بتاؤ کہ بات کہاں
 پہنچی۔" اس کے لیے میں بھی جھکن تھی۔ میں نے اسے روکے
 کی کوشش نہیں کی اور ہم اس کے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ اس کی

بات کرتا ہوں۔ وہ متوکل لڑکی مجھے کچھ معلوم ہی تھی ہے۔
 "نہیں۔ کوئی ایسے خاص نہیں تھے۔" میں نے اس کی
 بات کاٹتے ہوئے کہا۔
 "نہیں" یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس صورت میں
 آپ ذرا غیر متنبہ رہا ہوں کہ میری بات سن سکتے ہیں۔ یہ آپ کی بات
 ہے۔ میں آپ کو ان سب لوگوں کے خلاف استعمال کرنے کی
 کوشش نہیں کر رہا۔ بس یونہی آپ کو ایک بہرہ و انسان سمجھ کر
 بات کر رہا ہوں۔ وہ متوکل لڑکی مجھے کچھ معلوم ہی تھی ہے۔

آسیب زدہ

انوار صدیقی

آخری لمحوں میں اس کا چہرہ کچھ بڑکھڑکھایا تھا اور اس پر صرف موت کا خوف غالب تھا۔ پھر بھی مجھے اس خوف کی یہ میں کوئی عجیب سی بات چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی سمان نے ننھے میں دمت اور اسے ہلاک کر ڈالا ہو؟ باقی لوگ اس کی پردہ پوشی کر رہے ہوں؟ پتے ہوئے تو وہاں کی لوگ تھے نا؟ میں دھیرے سے اسے دیا۔ ایک لمحہ وہ مجھے بے حد جین و فطین لگتا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے کچھ کوزہ مشراور مولے باغ کا معلوم ہونے لگا تھا۔

میں نے نہایت کم رفتار سے ذرا نیچے جاکر دیکھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اے ایس آئی صاحب! کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا ورنہ قاتل کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے ہاتھ میں دینے والا سب سے پہلا شخص میں ہوتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پتے ہوئے وہاں بے شک تقریباً بھی تھے لیکن آپ نے کسی کو ہلکا ہوا یا بدست دیکھا؟ لی پکارا اتنا بدست تو ان میں سے شاید کوئی بھی نہ ہوا ہو کہ کسی کو قتل کر سکے۔ یہ کہانی بچہ اور سی لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے وہاں موجود لوگوں میں سے کبھی ایک شخص کے سوا کوئی اس لڑکی کو جانتا تک نہیں تھا پاور وہی ایک شخص قاتل ہے۔"

"میں نتیجہ میں نے بھی اٹھ کیا ہے چوہدری صاحب! وہ سوچہ کوئل دیتے ہوئے مسکرایا۔ "لیکن میرا طریقہ کار ہے کہ ہر اہل پرچار کو خیالی ضرور کر لیتا ہوں۔ چاہے وہ ایشیالک کتائی ہے وہ تو قاتل کیوں نہ لگتا ہو۔ دراصل ہمارا کام اتنا آسان نہیں ہے۔ یہ کوئی بات سے بات نکلتی ہے۔ اور پھر بعض اوقات واقعات جی جی اٹنے سے بد وقتانہ انداز میں رد ہوتا ہے ہیں کہ ہم جاسوسوں والی باریکیوں میں ہی الجھے رہے ہیں اور جب حقیقت سامنے آتی ہے تو محض دھجک رہ جاتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔
 "اب دیکھیں نا۔ ایک شخص قتل کر کے پھیر میں گم ہو گیا ہے۔ اس کو تلاش کرنا آسان تو نہیں ہے۔ بلکہ عالم یہ ہے کہ ابھی ہم جائے واردات کا سامنا کرنے کے لئے روانہ ہونے لگتے ہیں تو افسروں کے فون آنے شروع ہو جاتے ہیں۔"

مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ دوائی انداز میں پولیس والوں کی دشواریوں کا رد ہوا دے گا۔ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔
 "حالات کچھ ایسے ہیں اور کچھ آپ پولیس والوں کا سٹیٹ اپ ایسا ہے کہ جو شخص واردات میں ملوث نہیں ہو تا وہ زیادہ زرا ہے۔ یہاں تو لوگوں کو غیر ضروری پریشانی سے محفوظ رہنے کے لئے فون کرنے پڑے تھے۔"

"بس ہی پولیس والا کوئی چاہے صحیح ہے یا غلط لیکن انج سب کا ایک میسا ہے اسی لئے کبھی کبھی تک انہر صحیح پولیس والے بھی دوسروں جیسے ہو جاتے ہیں کہ کیا تا کو وہ اتنی نگہیں

انہارے کا ٹیک نائی تو پھر بھی مجھے میں اتنی نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا! ہمیں کوئی شوق تو نہیں ہے کہ قاتل آزاد پھر آ رہے۔ اب مثال کے طور پر آپ اسی واردات کو لئے لیں۔ قاتل مجھے رشوت کے طور پر کوئی تحفیلیاں تو نہیں دے گیا ہے کہ میں جان بوجھ کر اس کو کھلا چھوڑے رکھوں گا۔ لیکن اب ہمیں کوئی ایسا تو نہیں ہوا نا کہ اتنے سارے آدمیوں میں سے ایک دم قاتل پر انگلی رکھ دیں۔ لوگوں کے عقائد کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی کو کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو وہ ہم کو بتانا نہیں ہے۔"

"وہ بات پھر کیس کی کارروائی میں شامل ہو جاتی ہے نا۔ اور کس بے چارے میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ دو جھلوں کی گواہی دینے کے لئے برسوں بعد الت کے چکر کاٹنا رہے اور مخالف اپنی کے غیظ و غضب کا سامنا بھی کرے۔ اسی لئے تو ہمارے ہاں تمام ملٹی فون کالوں کا رد ان زیادہ ہے۔ جب کسی کا ضمیر اسے زیادہ سی مجبور کرتا ہے اور اس کے پاس کوئی کام کی اطلاع ہوتی ہے تو وہ پولیس کو کام فون کرتا ہے۔ اب یہ پولیس کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اس اطلاع کو قانون کے کام میں لائے یا اپنے کام میں لائے اور اسے کیش کر لے۔ ہر حال یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ نہ جانے کب سے چل رہی ہے اور نہ جانے کب تک چلتی رہے۔" میں نے گویا بات ختم کر دی۔

وہ بے چینی سے سلو بدل کر رہ گیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا کوئی گاڑی مسلسل میرے عقاب میں تھی لیکن یہ یقیناً میرے اپنے تو میوں کی گاڑی تھی۔ وہ میری حفاظت کے سلسلے میں بدستور مستعد تھے۔

اچانک میں نے فیصلہ کن لمبے میں کہا۔ "اے ایس آئی صاحب! میں کہہ کر اس معاملے میں آپ سے غیر معمولی عقائد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے کچھ وسائل ہیں جنہیں میں آپ کی مدد کے لئے استعمال کر سکتا ہوں۔ لیکن بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو آپ صرف اپنی وردی اور اختیارات ہی کی وجہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔ تو ہم ایسا کرتے ہیں کہ ایک شرط نامہ معاہدہ کر لیتے ہیں۔ جو بات آپ معلوم کر سکیں گے وہ آپ مجھ کو بتا دیجئے گا۔ جو میں معلوم کر سکوں گا وہ میں آپ کو بتا دوں گا۔ مفید ہم دونوں کا یہی ہو گا کہ قاتل کو سزا ملے اور قرار واقعی سزا ملے۔ اور اس کا تمام تر کیٹ آپ لے لیجئے گا۔ میں بہت مصروف آدمی ہوں لیکن میں خود اس معاملے میں دلچسپی لوں گا۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر تھری ہی میاگ دوڑ کر لوں گا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ میرا دل کتا ہے کہ آپ اس معاملے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔" اے ایس آئی نے ہلکا سا نال کہا۔ "میرا نام ویڈیو تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ آپ کسی وقت بھی متعلقہ قاتل میں فون کر کے مجھ سے آواز کریں صورت حال معلوم کر سکتے ہیں۔"

کھا پڑا تھا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس دوران میں چور گھپے کو اس شہری موقع سے استفادہ کرنے کی توجہ نہیں ہوئی تھی ورنہ جتنی اشیاء وہاں ہیں ایک طرف وہ اس بھرتے پرے گھر کے سازد سامان پر ہی ہاتھ صاف کر کے بڑا عرصہ پیش و آرام سے گزار سکتا تھا۔

”عجب بات ہے!“ شریف سیال بڑبڑایا۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے تو میری نظر ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ پر پڑی۔ میں نے ریمیورڈ تھا کر کان سے لگا کر دیکھا۔ ٹیلی فون ڈیڈ تھا۔ اچانک کہن کے بند دروازے کے عقب سے آواز... آواز کی آوازیں سنائی دیں۔ ان تمام آوازوں کو سن کر شریف سیال یکدم دوپارہ چوڑا ہو گیا۔ رہو اللہ اس نے ہوں تان لیا جیسے معمولی سی حرکت نظر آتی سی گولی چلا دے گا لیکن اس کے برعکس میں نے کسی سانس لے کر رہو اللہ ٹیلی فون پر لپٹ کر رکھ لیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ آواز جن انسانوں کی ہے وہ کس پوزیشن میں ہوں گے۔

شریف سیال نے ٹھوکر مار کر کہن کا دروازہ کھولا اور اچھل کر ایک طرف کو ہو گیا جیسے کسی موقع چلنے سے بچ رہا ہو۔ لیکن اندر کی صورت حال میری توقع کے مطابق تھی۔

چوکیدار کے علاوہ جی کے گھر میں دو میاں بیوی ملازم تھے۔ میں جب جی کے ہاں آیا تھا تو جی نے یہ تمہیں ملازم دیکھے تھے اور وہ تینوں اس وقت کہن کے ٹائلیوں والے فرش پر آڑے تڑپے پڑے ہوئے تھے۔ کہن میں صفائی وغیرہ کے کام آنے والے کپڑے ان کے منہ میں گھسے ہوئے تھے۔ تینوں کے ہاتھ پاؤں ڈوروں سے بندھے ہوئے تھے اور صرف جی نہیں بلکہ ان میں ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے کسی کے ہاتھ تک کے پائپ سے کسی کے الماری کے کڈے میں اور کسی کے اودن کے پائے کے ساتھ بھی باندھ دئے گئے تھے۔

شریف سیال ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اب اس نے بھی رہو اللہ پر لپٹ کر رکھ لیا۔ ہم دونوں نے کہن کی چھوٹی تلاش کر کے ان کی بندشیں کاٹیں کیونکہ ان کی گرہیں کھولنا خاصا وقت طلب مسئلہ نظر آ رہا تھا۔

ان کا دوران خون اور جواس بحال ہونے تو ہم نے ان میں لاؤنج میں لاکر بٹھایا۔ پوچھ گچھ کا کام میں نے شریف سیال پر چھوڑ دیا۔ اس کے تاہم تو سوالات کے جواب میں تینوں لوگوں کی زبانی جو باتیں ہمارے علم میں آئیں ان کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ سر شام ایک ڈاک اندام سی لڑکی جو کافی پریشان معلوم ہوتی تھی یہی سے لئے آئی تھی۔ دو ایک مرتبہ وہ اس سے پہلے بھی گھر آئی تھی لیکن کوئی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ چوکیدار کی زبانی وہ اپنی آمد کی اطلاع صرف یہ کہہ کر بھجوائی تھی کہ بے بی آئی ہے۔ بے بی ناٹا اس کی عزت تھی۔

آج بھی اس کے ساتھ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں

”میں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس کے سینے پر شریف سیال کے نام کا کاج آؤڑاں تھا۔ میں نے یہ نام ذہن نشین کر لیا۔ میں اپنا کاڈز اسے پہلے ہی دے چکا تھا۔

اچھی لگی کا موڈ مرکز میں نے گاڑی جی کی کوٹھی کے سامنے لے جا دی۔ کوٹھی بجلی طور پر تیار کی میں ڈولی ہوئی تھی۔ ویسے تو خیر یہ شرفا کے سونے کا وقت تھا مگر میرے خیال میں اس وقت تو شاید وہ لوگ بھی آرام کرنے لگتے ہوں جنہیں کچھ زیادہ شریف نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جی کی کوٹھی جس انداز میں تیار کی میں ڈولی ہوئی تھی وہ گڑ بڑ کا احساس دلانے کے لئے کافی تھا۔ ایسے گھروں میں سب لوگ سو جائیں تب بھی دو ایک بھڑک کی بجائیں جلتی رہتی ہیں۔ اور پیر گیت پر پڑ کر اندر بھی موزوں نہیں تھا۔

میں نے بقیان بھجوا دی اور انجی بند کر دیا۔ انجی کی خفیف سی سرسراہٹ بھی منظور ہوئی تو ساڈنڈ پروف گاڑی میں بالکل ہی سکوت چھا گیا۔ میں اور اے ایس آئی شریف سیال محتاط انداز میں گاڑی سے اترے اور ہم دونوں نے ہی بے آواز طریقے سے دروازے بند کئے۔ گاڑی سے باہر بھی سناٹا اور سکوت ہی تھا۔ صرف کبھی کبھار جیمنگز کا تڑا سنائی دے جاتا تھا۔ باقی گھروں سے تمام تمام سی روشنیاں جھانک رہی تھیں لیکن پھر بھی چاروں طرف اندھیرا ہی غالب تھا۔ جی کے گھر کے عین سامنے پھونسا پارک تھا۔ میں نے دو آڑا کتوں کو اس پارک کے ایک سرے سے داخل ہو کر کافی بھرے انداز میں دوسرے سرے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ کبھت بھی نہیں دیکھ کر نہیں بھڑکے۔ ملاؤ کچھ زیادہ ہی سکوت کا مارا ہوا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر گیت کو ڈر ساڈھکیلا۔ وہ بجلی کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ پورج اور لان پر بھی اندھیرا تھا۔ شریف سیال نے اپنا سر گاڑی رہو اللہ پر لپٹ کر رکھ لیا۔ میں نے بھی رہو اللہ نکال لینا ہی ہنسنے سمجھا۔ ہم چوڑا رہے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ محض احتیاط تھی ورنہ میری نا معلوم جس نے تو مجھے بتا دیا تھا کہ وہاں کوئی ہماری کھات میں نہیں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی نہیں کھلا ہی ملا۔ میں نے نڈول کر سوچ کر بورڈ تلاش کر کے لائٹ بان کر دی۔ شریف سیال نے رہو اللہ چاروں طرف گھماتے ہوئے کوئے کھدروں کا جائزہ لیا مگر وہاں سکوت کے سوا کوئی چیز ہماری فطرت نہیں تھی۔ ڈرائنگ روم میں کسی قسم کی بے ترتیبی نہیں تھی، تمام سامان اور آرائش و زیبائش جوں کی توں تھی۔

ہم کے بعد دھڑکے دوسرے گھروں میں پہنچے۔ سب کے دروازے کھلے تھے اور بقیان روشن ہونے پر کہیں بھی کسی قسم کی بے ترتیبی نظر نہیں آئی۔ سازد سامان یوں کھلا پڑا تھا جیسے کہیں احتمالی بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی بھی دروازہ مشتعل کے بغیر اٹھ کر کہیں چلے گئے ہوں۔ نہ جانے کب سے گھر بونی

کرتی رہی۔ چائے اور لوازمات وغیرہ کا دور بھی چلا۔ پھر اپنی اسے
لاؤنج میں لے آئی۔ وہاں اس نے اپنی دائری سے ایک ورق پھاڑ
کر اسے کچھ لکھ کر بھی دیا اور وہ چلی گئی۔ چونکہ اس نے اسے پیدل
ہی میں روڑ کی طرف جاتے دیکھا۔ طے وغیرہ کی عدت سے اس بات
کی تصدیق ہو گئی کہ یہ سب لے اس لڑکی کے سوا کوئی نہیں تھی جس
کی لاش سعید صاحب کے ہاں سو ٹنک پول سے ملی تھی۔
سے لے کے جانے کے کچھ ہی دن بعد اپنی نے چونکہ ارکا بایا
تھا۔ وہ ٹیلی فون کارپوریٹ ہاتھ میں لے گئی تھی اور بہت پریشان
معلوم ہوتی تھی۔ اس نے چونکہ ارکا کو ہدایت کی کہ وہ کچھ لکھی میں
جا کر ٹیلی فون کی آدروالا پول چیک کرے۔ اسے شبہ ہے کہ کسی
نے فون کا تار کاٹ دیا ہے۔

چونکہ ارکا چند جلدی میں پونجی اٹھ کر چلا آیا تھا اس لئے
اس نے سوچا کہ پہلے گیت کو متھل کر آئے پھر پونجی دروازے
سے کھینچ لگی میں جائے گا۔ مگر جب وہ پورے میں پہنچا تو اس نے
دیکھا کہ گیت کھل چکا تھا اور لٹی سی ایک سیاہ گاڑی پورے میں
داخل ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ شیشوں پر اڑنا
باندھے ایک شخص کھلی کی سی تیزی سے گاڑی سے اترا اور اس
نے اپنی راتقل کا بٹ چونکہ ارکا کی کینٹی پر رسید کیا وہ وہیں دھیر
ہو گیا۔

اس کے بعد کی باتیں ان سیال ہدی نے بتائیں جو گھر کے
دیگر کام بچن کرتے تھے۔ عورت اس وقت بچن میں تھی۔ ہر
ایک ٹنک ٹھیل صاف کر رہا تھا جب وہ لوگ دھناتے ہوئے لاؤنج
میں آئے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں کے چہرے چھپے ہوئے
تھے۔ انہوں میں راتقل تھیں۔ نوکر اور نوکرانی کو تو بے ہوش
کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انہوں نے ان دونوں کو تو
پونجی باندھ کر منہ میں کچڑا ٹھونس کر بچن میں ڈال دیا۔ ایک
شخص اپنی اور اس کی ماں پر راتقل آئے کھڑا رہا۔ پھر انہوں نے
چونکہ ارکا کو بھی بچن میں لا بیچا اور بچن کا دروازہ بند کر دیا۔ اس
کے بعد انہوں نے بس اپنی کی ایک کھنی کھنی سی بیج سی پھر سناٹا بچھا
گیا۔

یہ واقعہ اس وقت کا تھا جب شام کا سرسعی اندھیرا پھیل چکا
تھا۔ جرت کی بات تھی کہ ہر شام اس علاقے کے ایک گھر میں
گھس کر تین مسلح افراد دو عورتوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور
کسی کو گاڑوں کاں خبر نہیں ہوئی تھی! شاید کسی کو خبر ہوئی ہو
تو وہ خبریں کیا ہو۔

شریف سیال نے بہت سے سوالات کے ذریعے ہر ممکن
کوشش کی کہ اغوا کرنے والوں کے بارے میں کوئی سراغ مل
سکے مگر اسے ناکامی ہوئی۔

آخر کار وہ مہری سانس لے کر میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔
"لیس جی! اس کو کتنے ہی نماز بخشنا ہے جانا اور روزے کئے

پڑ جاتا۔ ہم یہاں اس لئے آئے تھے کہ سعید صاحب کے ہاں نقل
ہونے والی لڑکی کے بارے میں کوئی سراغ ملے گا لیکن یہاں ایک
اور سی ایف آئی آر بتا رہی ہو گئی ہے۔"

میں خاموش رہا تو وہ افسردگی سے سہلاتے ہوئے بولا۔
"اب آپ ایسا کر سکیں کہ مجھے اور ان تینوں نوکر صاحبان کو اپنی
گاڑی میں تھانے تک چھوڑ دوں۔ میں ان کے باضابطہ بیانات
قلب بند کروں گا۔ ایف آئی آر درج کروں گا۔"

تینوں ملازموں کے چہروں پر خوف کی پرچھائیاں نظر آتے
گئیں۔ میں نے شریف سیال سے پوچھا۔ "ان کے ساتھ وہ
خاص ایلمنٹس آفیش تو نہیں ہوگی جس کے سلسلے میں ہماری پولیس
مشہور ہے؟"

"نہیں" شریف سیال مہری سانس لے کر بولا۔ "اس کی
ضرورت جوئی نہیں آئے گی۔ مجھے ان کے بیانات پر یقین ہے۔"
میں نے چونکہ ارکا سر نزل کر نہیں دیکھا مگر مجھے اس کی کینٹی پر بڑا
ساگور نظر آ رہا ہے۔ میری نظر ایک پولیس والے کی نظر ہے۔
"بے شک" میں نے تائید کی حالانکہ وہ گورنر اس سے پہلے
شاید میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی بات سن کر نوکروں کے چہروں پر
تدبرے اطمینان بھٹک آیا۔

شریف سیال بولا "ہائی پاس پڑوس والوں سے میں کل ہی
معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت تو شریف
شرقا نوگوں کی نیند خراب کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے کوئی
کام کی بات معلوم ہونے کی امید نہیں ہے ورنہ کسی کے آرام
وغیرہ کی تو میں اتنی پروا نہ کرتا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر کیسے چلیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
میں اس وقت بظاہر ہر سکون تھا لیکن درحقیقت بہت پریشان
تھا۔ یہ زہریلا سوال مجھے مسلسل ڈس رہا تھا کہ وہ مجلس سی لڑکی
اس وقت نہ جانے کس حال میں ہوگی؟ میں اپنے تاترہ وسائل
کے باوجود اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا
تھا کہ میرے آدمی میری حفاظت کے لئے تو سائے کی طرح میرے
پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کاش میں نے انہیں اپنی کی گھرائی کی ہدایت
بھی کر دی ہوتی۔ لیکن اس طرف میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ مجھے
اندیشہ ہی محسوس نہیں ہوا تھا کہ اپنی کو اس قسم کا بھی کوئی خطرہ
لاحق ہو سکتا ہے۔

یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سعید صاحب کے ہاں
اس ایکسٹرا گرل کا نقل اور اپنی کا اغوا کسی ایک ہی سلسلے کی لڑکی
تھی یا یہ دو الگ الگ واقعات تھے جو محض اتفاقاً تقریباً ایک
ساتھ پیش آئے تھے۔

چونکہ ارکا نے بتایا تھا کہ جس وقت اس نے پورے میں گاڑی
آتے دیکھی تو سب سے پہلی کوشش یہی کی تھی کہ گاڑی کا نمبر
دیکھ سکے لیکن گاڑی پر سرے سے کوئی نمبر لپٹ ہی ہو چکا تھا

دستک

انوار صدیقی

تھانے پر ڈراپ کیا تھا۔ مزید کارروائی کرتے کرتے لڑکی اذان میں ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے گھر جاکر مشکل سے دو گھنٹے کی نیند لی اور روزی دے بغیر ہی چند منٹ پہلے ہی انگریز فیس قدم رکھا۔ اس کے آپ کا ٹیلی فون آیا۔ چوہدری صاحب! ہمارے حال پر رنج تھائیں۔ کام کا ایسا جھگڑا ہے کہ پتے پتے ہر صبح طرح پانی سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ غرض اتنی کم ہے اور لانا ایسا ہے جیسے شہر کا ہر کوئی واردات کرنے پر تیار ہو ہے۔ شاید سب لوگ بڑی جلدی میں ہیں کہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے اس لئے جلد از جلد ایک توجہ کا ہتھ مارلو۔ اب آپ دیکھیں۔ نہ چوہدری صاحب! انتیش تو نہروار ہی ہوگی نا۔ ہر حال۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں کرتا ہوں کچھ نہ کچھ۔ اور پھر ہی کوئی کام کی بات معلوم ہوگی میں آپ کو فون کروں گا۔ آپ کو کیا معلوم تھی کہ شریف سیال کی جان تھتے کھینچوں میں پھنسی ہوئی ہے۔

پھر شاید وہ ادھر ادھر دیکھ کر ایک لمحے کے وقف کے بعد رازدارانہ سے کہیں بولا۔ "اس تھانے میں صرف ہم دو تھیں ہی آوی ہیں جو جان لڑا کر کام کرتے ہیں ورنہ بقیوں کو کوئی پروا نہیں۔ ہم نے ہوتے تو شاید اس سے بھی برا حال ہوتا۔" تھانہ شاید داخل دفتر کیسوں کی فائلوں کے انبار میں دب چکا ہوتا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟

"ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی تقریر کو مزید طول دیتا، میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں خود ہی دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں اس مسئلے میں؟" "ہاں جی، آپ باطل کریں" بے فکر ہو کر کہیں۔ میری طرف سے آپ کو کوئی اجازت ہے۔ آپ پولیس سے تعاون کریں، پولیس آپ سے تعاون کرے گی۔" اس نے فرائضی سے کہا۔

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ فون پر اس کی دوسری جمالی کی آواز سن کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں نے اپنے اسٹوڈیو والے آفس فون کیا۔ آفاق دفتر پہنچ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "تھیں یاد ہو گا، کل رات والے واقعے کے بعد تھلسا ز اور ہدایت کار دلدار قمری نے ایک ایکٹرا سیلار کا ذکر کیا تھا جس نے ایک وارنٹ سے متعلقہ سبیل بھی ایکٹرا سیلار سے تھا مگر عبد الواحد نے اپنی فطری نرمی کی بناءً اس سے کچھ ہمدردی رکھنا تھا۔ لیکن اب اسے انٹرنیشنل

تھی۔ کم از کم آگے کی طرف تھیں تھی۔ گویا اس مسئلے میں کوئی سراغ ہمارے سامنے نہیں تھا اور یہ میرے لئے بڑی تعجب کی بات تھی۔ شریف سیال کا اس صورت حال سے کوئی جذباتی شعل نہیں تھا۔ یہ اس کے پیش درانہ معمولات کا ایک حصہ تھا۔ اس لئے اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ پہلے کی نسبت ذرا زیادہ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

انفرادی کرنے والے جی سے نہ جانے کیا سلوک کر رہے ہوں گے؟ اگر ہم کوئی سراغ نہ پاسکے تو کیا وہ اسی مذہب میں گرفتار ہمارے نظروں سے اوجھل رہے گی؟ اس قصہ سے میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

میں نے ان چاروں کو تھانے کے سامنے اتارا اور غیر ارادی طور پر نہایت تیز رفتاری سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ویران سرکوں پر گویا ان گنت سوال و آرمے تھے اور مجھے بٹنے کے لئے چاروں طرف سے لپک رہے تھے۔ میں جلد از جلد کہیں منہ چمپالیا جانتا تھا۔

لیکن گھر پہنچا تو ہسٹرنے بھی صحیح معنوں میں مجھے تباہ نہ دی۔ شب خواب کے لباس میں "استانی آرام دہ بستر" استانی پڑ سکون کرے میں بھی میں بے چینی سے کہ نہیں بول رہا اور بار بار چست کو گھور رہا تھا، جیسے اس کی بے دروغی پر میرے سوالوں کے جواب ابھر آئیں گے۔ کبھی کبھی میں چاہتا تو بے حس کا لبادہ اوڑھ کر کبھی بھی قسم کے حالات میں سو جاتا تھا لیکن آج یہ قصہ میری زندگی کا کام نہیں آ رہا تھا۔ یہ صلاحیت جیسے مجھ میں باقی نہ نہیں رہی تھی۔ یہ شاید اس لڑکی جی کے غلوں کا کمال تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس رات میں سوایا نہیں۔ ہر حال صبح اٹھ کر میں معمول کے مطابق آفس پہنچا اور بے دلی سے چند ضروری کام کرنا۔ دس بجے کے قریب میں نے اسے ایس آئی شریف سیال کو فون کیا۔

"بے نی کے قتل کے مسئلے میں آپ کے پاس ایک سراغ تھا نا۔" میں نے کہا۔ "اس ایکٹرا سیلار کا نام جس سے بے نی کی رہائش وغیرہ کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔ دلدار قمری صاحب نے بتایا تھا کہ اس کا نام عبد الواحد تھا۔ آپ نے اس سے رابطہ قائم کیا؟ بے نی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

دوایا فون پر پہلے ایک ایسی آواز سنائی دی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شریف سیال نے ایک غلطی جمائی تھی۔ ہمدرد گویا خوش مزاجی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں چوہدری صاحب! کل میں نے ایک طرف سے ڈنل ڈیوٹی دی۔ فجر کے وقت سے ذرا پہلے تو آپ نے مجھے

کی سفارش کی تھی؟

"جی ہاں۔ عبد الواحد کا ذکر کر رہے تھے تاہم؟ میں جانتا ہوں اسے۔ یہاں اسٹوڈنٹس کے قریب ہی مکان روڈ پر رہتا ہے۔ یہ تو وہ ایکسٹرا پلاٹر مگر جفا شریف تو ہی ہے۔ پریشانیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

"تم فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کرلو۔ اس کے ہاں ٹیلی فون ہو تو فون کرلو۔ اگر فون نہیں ہے تو خود چلے جاؤ یا کسی ٹوی کو بھیجو۔ اس سے معلوم کرنا ہے کہ بے بی کہاں رہتی تھی۔ اس کا مکمل ایڈریس۔ اس کے علاوہ خود عبد الواحد کا بھی ایڈریس چاہئے مجھے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہاری دیر میں فون کرتا ہوں آپ کو۔" اتفاق نے کہا۔ "آپ اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"ہاں" میں نے اسے اتنی کے انوا کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "میں اپنی صرف یہ ابھن دور کرتا چاہتا ہوں کہ ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی تعلق تو نہیں؟ اور کیا ایک واقعے کی مدد سے دوسرے کے بارے میں کچھ سراغ مل سکتا ہے یا نہیں؟ میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میری دو اور سیز کالز آئیں اور میں خاصی دیر تک فون پر ہی مصروف رہا۔ اس وقت میں انٹرکام پر اپنے ایکسپورٹ میجر کو چند ضروری ہدایات دے کر ایک فائل کی طرف متوجہ ہی ہوا تھا جب اتفاق کا فون آیا۔

"بے بی رائل پارک کی ایک بلڈنگ میں رہتی تھی سراسر اتفاق نے بتایا۔ پھر بلڈنگ کا نام اور نمبر وغیرہ نوٹ کرانے کے بعد وہ بولا۔ "دیئے بے بی کا اصل نام مثلاً تھا۔ عبد الواحد اس کے قتل کا سن کر مت پریشان ہے۔"

"کیا اس کا اس لڑکی سے کوئی جذباتی تعلق نظر آتا ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں، نہیں سراسر! اتفاق بولا۔ "عبد الواحد تو اوجیز عمر تو ہی ہے۔۔۔"

"تو کیا ایک اوجیز عمر تو ہی کا ایک نوجوان لڑکی سے جذباتی تعلق نہیں ہو سکتا؟" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"وہ۔۔۔۔۔ عبد الواحد کو چرچہ میں خاصے عرصے سے جانتا ہوں اس لئے کہ رہا ہوں۔ بڑے بڑے بچے ہیں اس کے۔ جذباتیت کے جراثیم کاٹی حد تک قسم و پکے ہیں اس میں۔ دیئے بھی سراسر یہ جو ایکسٹرا پلاٹر اور ایکسٹرا کرٹ ہوئی ہیں یہ سب اپنی اپنی جگہ پر فیشنل بڑے غیر جذباتی سے لوگ ہوتے ہیں۔"

"تو پھر اسے پریشانی کس بات کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی بات کی کہ کہیں پولیس اسے اس معاملے میں زیادہ تھکنے کی کوشش نہ کرے۔ حالانکہ بے بی کا کاروباری تعلق تو

یہ ہے کہ اسے تو بے بی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں سوائے اس کے کہ اس کا اصل نام مثلاً تھا اور وہ رائل پارک کی ایک بلڈنگ میں کرائے کے کمرے میں رہتی تھی۔"

"میرا خیال ہے اسے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے قتل دے دو۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس لڑکی کی موت۔۔۔ میرا مطلب ہے اس کے قتل کو پولیس یا کوئی اور زیادہ اہمیت دے گا۔ وہ ایک غریب اور غالباً پریشان حال لڑکی تھی۔"

"لیکن مجھے لگتا ہے کہ آپ اس کی موت کو کافی اہمیت دے رہے ہیں۔" اتفاق اچانک ہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"مثلاً" میں نے قسم لیجے میں کہا کیونکہ یہ بات ابھی خود مجھ پر بھی واضح نہیں تھی۔ پھر میں نے خدا حافظہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ دفتر کے باقی کاموں کے سلسلے میں ایکسپورٹ میجر جنرل فیجور اور تیرن کوہ اپات دے کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

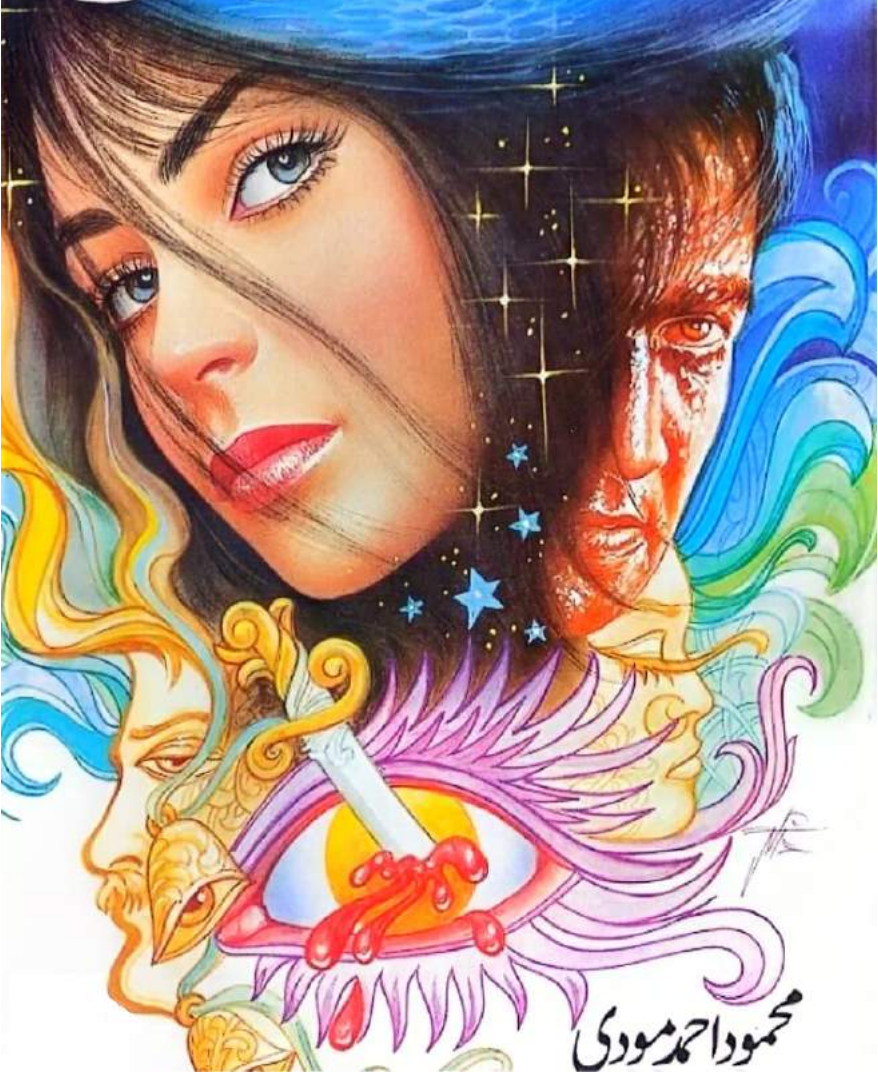
گاڑی میں بیٹھ کر میں رائل پارک پہنچا۔ یہاں کی بیشتر عمارتیں قیام پاکستان سے پہلے کی تھیں۔ ان میں سے بیشتر میں قلمی دفاتر قائم تھے لیکن بعض میں رہائش بھی تھی۔ ہر طبقے اور ہر مزانہ کے لوگ آباد تھے۔ جہاں زیادہ کشادہ نہیں تھیں۔ جس کچی میں میری مطلوب عمارت واقع تھی وہ تو خاصی تنگ تھی۔ اگر میں گاڑی وہیں کھڑی کر دیتا تو راستہ تقریباً مکمل طور پر ہی بند ہو جاتا۔ اس لئے میں آگے نکال لے گیا اور نسبتاً ایک کشادہ جگہ پر گاڑی کر کے وہاں آیا۔ ٹوٹی کی گاڑی جو میری حفاظت کی غرض سے میری نگرانی پر مامور ہو چکی تھی کچی کے کونے پر سوجھو تھی۔

تین سیزیاں چڑھ کر میں عمارت کے پرانے اور سونے موئے تنہوں والے چوبی دروازے سے اندر پہنچا۔ یہ قدم طرز کی تین منزل عمارت تھی۔ نیچے نیم دائرے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے کئی کمرے تھے۔ تقریباً اسی انداز میں اوپر کی منزلوں پر کمرے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے سامنے آہنی پتکے والی لمبی سی مشینز بالکلنی بھی تھی۔ بائیں ہاتھ پر سیزیاں تھیں اور پوری عمارت میں ناگوری بو پھیلی ہوئی تھی۔

تنگ سی سیزیاں چڑھ کر میں پہلی منزل پر پہنچا تو ایک کمرے کے دروازے پر چمکی ہوئی موٹی سی اوپوزر عورت نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا اور اچانک اٹھ کر چلتی ہوئی مجھ پر چمکی۔ "آخر تم آئی گئے۔ تو آؤ" اس کی کرخت آواز سے میرا ذہن جھنجھٹا اٹھا۔

زندگی کے آخری لمحے پہنچے راستہ میں ایک سڑک پر
مکسافرن کی سڑک پر آئی تھی جہاں باقی واقعات
تینس کے حصے میں آئے ہیں۔

سکس



محمود احمد مودی

چھپنے اور اچانک اٹھ کر جھپٹنے کی وجہ سے نظروں کی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک سگریٹ سلگ رہی تھی جس سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی نو معمول سے کچھ زیادہ دھواں نکلتا تھا۔
جوانی میں وہ یقیناً ایک حسین عورت رہی ہوگی۔ مگر اب محض ایک کھنڈر تھی۔ اس کے کچھ بڑی بال منتشر تھے۔ لباس کا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے دن سے وہ اس کے تن پر تھا۔ اس

ایک تانے کے لئے تو میں گھبرا سا گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی دوران غیر ارادی طور پر میرا ایک ہاتھ جیب میں پڑے ہوئے ریوالتور کی طرف چلا گیا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس عورت کو مزید آگے بڑھنے اور اپنے آپ پر جھپٹنے سے باز رکھا۔
وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہی رگ گئی اور میں نے ریوالتور نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ اتنی غرناک نہیں تھی جتنی

کہ چند لمحوں بعد خودی پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ یعنی احساس ہو جاتا ہے کہ آنے والا وہ نہیں ہے جس کا اسے انتظار تھا۔ ”اوہ...“ میں نے مسافرانہ سے انداز میں کمری سانس کر عورت کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑاؤ سے ایک چوکت سے ٹکرا رہی تھی۔ اب وہ ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا وا آٹھیں بظاہر بالکلنی کے خشک کو دیکھ رہی تھیں لیکن اس نظر میں یقیناً اس سے بھی کس دور مرکز تھیں۔ ان دو افراد پارہ یا پھر شاید وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

”آپ اسی عمارت میں رہتے ہیں؟“ میں نے نوجوان پوچھا۔

”جی ہاں۔ میں پیدا ہی اس عمارت میں ہوا تھا۔“ اس مسکراہٹ میں افسردگی کی آمیزش کچھ بڑھ گئی۔ ”اور شاید عمارت میں مریں گا۔“ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گویا اپنی افسردہ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ ہم میں سے بھی نہیں جانتا کہ اس عمارت کو کس کا انتظار ہے۔“ ان دو نظروں اس عمارت پر اس نے کچھ زور دیا تھا۔ قدرے جھپٹتے ہوئے انداز میں یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

پھر وہ خودی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اس کے اس عمارت کے الفاظ آپ کی طرف سے انتظار کر رہا ہوں۔“ اس عمارت میں ہم کم از کم اتنے پچھانے ضرور ہیں اور اس کی آواز بھی عمارت میں ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے آپ نے اسے نہیں پہچانا ہوگا۔ آپ کی نظر میں یہ ایک عام سی باگلی عمارت ہوگی۔ بہت کم تو اب اسے پہچانتے ہیں۔“

”کون ہے یہ خانوں؟“ میں نے علامت سے پوچھا۔ ”اپنے وقت کی ملکہ جذبات شکیلہ بیگم۔“ نوجوان نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ ”کبھی لوگ پردہ نہیں پر اس اداکاری دیکھ کر رو پڑتے تھے۔ آج اس کی حقیقی زندگی دیکھ کر کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ شاید یہ دنیا میں صرف دو نے رلا کے لئے ہی آئی تھی۔“

میں اپنی جگہ سن سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے کمری نظروں اس عمارت کی طرف دیکھا۔ اس کھنڈر میں واقعی مجھے ایک پہچانی سی عمارت کے مسخ شدہ خدوخال نظر آئے۔ اپنے بچپن لڑکھن میں میں نے اس کی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں جو میرے بچپن یا لڑکھن سے بھی پہلے کی تھیں ہوتی تھیں اور بڑے بڑے شہر میں چلنے اور کھس پٹ جانے کے بعد ہمارے قصبے یا قریبی یا کوٹ میں آکر لٹتی تھیں۔

میں نے ایک فلم میں اسے جوان کردار میں بھی دیکھا تھا۔ پناہ خواہ عورت عمارت میں تھی۔ لیکن جوان کرداروں میں بہت آئی تھی۔ جوانی میں ہی مستقل طور پر اس کے بالوں پر سفید طر گیا تھا۔ وہ ملکہ جذبات کھلانے لگی تھی۔ بہت سے افراد نے

کے ہونٹ کچھ سوچے ہوئے سے لگ رہے تھے اور ان پر بناوٹ کی ناپاہت سی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ طے تھے۔ چہرے پر بھانیاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں جو یقیناً کبھی بے حد خوبصورت رہی ہوں گی وحشت سے پُر تھیں۔

مجھ پر بچپن دقت تو وہ چلائی تھی۔ ”آخر تم انہی مجھے آؤ۔“ لیکن جب میں نے ہاتھ سے اسے دوڑھائی فٹ کے فاصلے پر روک دیا تو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوں میری طرف دیکھا جیسے اسے نہ پہچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس کے اثرات یکدم ہلا گئے۔ وحشت زدہ چہرے پر ایک لذت شکست خوردگی پھیل گئی۔ ہونٹ لرزنے لگے اور سرخ سرخ وحشی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس کا سر دھیرے دھیرے لمبی میں ہلا اور پھر وہ خود کھائی کے سے انداز میں بڑھائی۔ ”نہیں... نہیں... تم تو وہ نہیں ہو۔“

اس کی آواز معدوم ہو گئی لیکن ہونٹ دھیرے دھیرے لرزنے رہے۔ ... پھر وہ شکست خوردہ سے انداز میں خودی پیچھے ہٹی اور اسی کمرے کی دالیز پر جا بیٹھی جہاں سے اٹھ کر آئی تھی۔ آنسوؤں کی دو ٹیکریں اس کے رخساروں پر نمودار ہو چکی تھیں اور وہ قدرے متواتر سے انداز میں اس مڑی مڑی سکرٹ کے کٹ لپٹے لگی جیسے اسے آن کی آن میں ختم کر دینا چاہتی ہو۔ فضا میں جس کی باکوروں پھیل گئی۔

اپنے عتب میں کسی کے کمری سانس لینے کی آواز سن کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ دھلا ہلا سا ایک سا نوجوان نہ جانے کس وقت میرے عتب میں بیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔ اسے غالباً آگے جانا تھا لیکن میں اس کی راہ میں مائل تھا۔ تاہم وہ قطعی غلط میں نہیں تھا۔ میری اس سے نظریں تو وہ قدرے افسردگی سے مسکراتے ہوئے ملائم لہجے میں بولا۔ ”آپ پریشان نہیں ہوئے؟“ اس وقت تک میرے اثرات یقیناً معمول پر آچکے تھے۔

”ہوا۔ لیکن زیادہ نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ عمارت پاگل ہے تو اسے پاگل خانے کیوں نہیں پہچانایا گیا؟“ ”جن پاگلوں سے لوگوں کو بھر دیتی ہوئی ہے انہیں عموماً پاگل خانے نہیں پہچایا جاتا۔“ نوجوان بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ وہ بے حد نرم و نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اس میں نوجوانوں والی تندی و طراری نہیں تھی۔ وہ معمولی سی قیص چٹون اور سویر میں تھا اور اس کی مدد پر کسی بے عنوان سی اداسی کی ترنہ بھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی ہلکی سی افسردگی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”اور پھر یہ کوئی ایسی خطرناک پاگل بھی نہیں ہے۔ یہ کسی کو نہیں ستائی۔ اپنے آپ کو مختلف قسم کے نشوں میں غرق کئے اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ اس کا پاگل پن بس اتنا ہے کہ آپ جیسے کسی خوش پوش اور خود آوی کو آنے دیکھتے ہیں تو بے اختیار اٹھ کر چلائی ہوئی بھانپتی ہے۔ تم آگے... تم آگے... لیکن یہ اس کی صحیح الدماغی دلیل ہے

ہم نام نہاد تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ آپ اس کی توجہ سے غور ہو کر شروع ہوا تھا اور کب وہ عمل میں آئی تھی۔ میرے پاس بھی کئی تھی۔ مگر زندگی میں آنے کے بعد ویسے ہی اس میں میری دلچسپی کم ہو گئی تھی۔

”یہ اس حال کو کیونکر پہنچ گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو شاید اسے خود بھی معلوم نہ ہو۔ ہمیں بھی معلوم نہیں ہے۔ اسے یہاں آتے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔“ نوزاد انہیں لے کر آیا۔ ”دو سال پہلے تک یہ لیڈن مارکیٹ کے ایک غلیٹ میں رہتی تھی۔ اور اس سے پہلے ایک اچھی بھلی کوٹھی میں رہتی تھی۔ شاید کوئی پانچا بیلا نوزاد تھا جس کو اس سے محبت کا کافی تھا۔ اس کا سب کچھ بچ بچ کر ملک سے باہر چلا گیا۔ کچھ عرصہ اور اس میں رہتا تو شاید وہ اسے بھی بچ جاتا۔“ نوزاد نے اپنے

خصوصی انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کے وقفے سے والا۔ ”قلمی عورتیں بہت چالاک کبھی بناتی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ چالاکوں میں انہیں بھی بات دے جاتے ہیں۔“

مجھے اس نوزاد میں ذرا کشش محسوس ہوئی۔ وہ بالکل ہی عام سا نوزاد نہیں تھا۔ اس میں یقیناً کچھ صلاحیتیں موجود تھیں جو شاید مناسب حالات میں نہ آنے کی وجہ سے چھپ چکی تھیں۔

”اگر یہ اندازہ غلط ثابت بھی اس میں کم از کم انسانی انداز اور اس کے سینے میں ایک درمندی ضرور موجود تھا۔“

”تم کہتے کیا ہو نوزاد؟“ میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

”وہی جو اس ملک کے بیشتر نوزاد کرتے ہیں۔“ اس کا جواب دیا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“

”اس کا بے وقعت سرٹیکٹ ہاتھ میں لئے، چاں

چٹکا پھرتا ہوں۔“ اس نے اپنے مخصوص دھبے لہجے میں جواب دیا۔

”مگر والوں کے کانے کے لئے وال دیکھ لے کچھ سامان

لیتے گیا تھا۔ یہ انہیں دے کر میں اپنے سرٹیکٹس اور حلقہ چیموں

فائدہ اٹھاتی کہ مولیٰ سی فائل اٹھاؤں گا اور حسب معمول دفتروں کے

پیکر لگائے اور ان افسروں کے سامنے پیش ہونے کے لئے نکل

جائیں گا جو اپنے اتر کھڑے دفتروں میں بیٹھے ”انڈر واپٹریو“ لکھیں

رہے ہوں گے۔ اس وقت تو میں آپ کو کافی حد تک انسانی طے میں

نظر آ رہا ہوں لیکن واپس پر آپ مجھے دیکھنے کے لئے یہاں موجود

نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک برسوں اور دیکھوں میں مرغا بن کر نہ

جانے کہاں کہاں تک کا سفر کر کے اور نہ جانے کہاں کہاں تک

پہل پہلے اور معمول میں چھانچے کے بعد حالت بہت بدل چکی ہوگی

لیکن پھر بھی ان سب چیزوں سے زیادہ تکلیف وہ اور تھا دینے والی

تجربہ و ناگاہ کی شرمندگی ہوگی جسے چہرے پر لے مجھے اپنی اہل اور

اس نے دو سرئی حسی کی بالکل کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں ایک کمرے میں ہم بچ افراد رہتے ہیں۔“ جس کمرے کی طرف وہ اشارہ کر رہا تھا اس کا سفید دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔

میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نوزاد! تم کو کون سے فون پر وقت ملے کر کے مجھ سے ملو۔ شاید میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔“ اپنے نوزاد مجھے کارڈ محسوس ہوتے ہیں جن کے سینے میں رکھ لی۔ میں کوئی نہ کوئی چنگاری کی

سنگ دہی ہو نام کیا ہے تمہارا؟“

”محسن علی۔“ وہ کھنکھارنے لگی۔ یہی طرف دیکھتے ہوئے بلی

بار قدرے واضح انداز میں کھنکھارنے لگی۔ لیکن میں کبھی کسی پر کوئی

احسان کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ بلکہ کسی محسن کی تلاش میں

ہی رہا ہوں مگر وہ کبھی مجھے نہیں ملا۔

”لیکن ہے آپ تمہاری اس تلاش میں کامیابی کا وقت آیا

ہو۔“ میں نے کہا۔

”شاید۔“ وہ بے یقینی سے مسکرایا۔ میرا کارڈ بھی اس نے

خود رسے بے یقینی ہی کے سے عالم میں دو انگلیوں میں دایا ہوا تھا۔

شاید اس کم عمری میں ہی اسے اپنی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ

اب اسے لوگوں کی باتوں کا زیادہ اعتبار نہیں رہا تھا۔ خصوصاً یوں

سرراہ مل جانے والے لوگوں کی باتوں کا۔

”تمہارے قوس سے شاید میں اس کے لئے بھی کچھ کرنا

چاہوں۔“ میں نے ٹکلیہ بیکم کی طرف اشارہ کیا جو اپنی سگرت

نہیے انداز میں تقریباً قطر تک فیم کر کے اٹھ کر کمرے میں جا رہی

تھی۔ اس کی چال میں لڑکھائیت تھی اور اسے اپنے گرد پیش سے

اب گویا تھکا کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

نوزاد نے ایک بار پھر گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے تو لے

کی کوشش کی۔ میں نے ٹکلیہ بیکم کے کمرے کے پس پردہ سے

دروازے کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ”میرے لڑکھن میں

یہ میری پس پردہ ترس فکاراؤں میں شامل تھی۔ میں سوچا کرتا تھا

کاش میں کبھی اس کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو سکوں۔

قلمی دنیا واقعی ہجرت کی جگہ ہے۔“

”ساری دنیا ہی ہجرت کی جگہ ہے جناب“ محسن علی جلدی سے

ہوا۔ ”قلمی دنیا کے ہجرت آسوز تھائے نظروں کے سامنے کچھ زیادہ

ہی آتے ہیں اس لئے وہ زیادہ زبان زد عام رہتے ہیں۔ ورنہ ہجرت

کا سامنا کس جگہ نہیں ہے؟ دیکھتے والی نظر جاتے۔“

وہ درست کہ رہا تھا مگر پھر وہ گویا خود ہی اس بحث کو بیکار سمجھتے

ہوئے موضوع بدلے ہوئے ہوا۔ "کوئی رعایا ادا نہ ٹھیکہ بیگم کی مدد کرنا موزوں نہیں سمجھتا۔ حتیٰ کہ پلٹنے کے خطہ نظر سے بھی نہیں۔" شاید اس لئے کہ معاشرے کے موجود معیار اور پیمانے کے مطابق اس کا شمار اچھی عورتوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کی فکر اس کی مدد کا ارادہ کر رہے ہیں؟

"اچھے لوگوں کے لئے تو اس دنیا میں کوئی بھی کسی بھی وقت کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ میں بھی حسبِ موقع کر رہا ہوں۔ لیکن معاشرے کی نظر میں بڑے آدمیوں کے لئے کچھ کرنے کے لئے ذرا زیادہ حوصلہ اور ذرا زیادہ کشادہ دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ ہاندی رکھ دی ہوئی کہ وہ صرف اچھے پارسا اور نیک لوگوں ہی کو رزق دے گا تو دنیا کتنی دیرانی ہو جاتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور پھر میں تو عملاً انہوں کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں جو کبھی اچھے تھے یا کبھی جن کے اچھے ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔"

"بے شک۔" وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ "پھر وہ جسے کسی خیال سے چرٹا اور سر کو خفیف سا ہلکا دیتے ہوئے بولا۔ "یہ بتائیے آپ یہاں کس سے ملنے کے لئے آئے ہیں؟ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

"مجھے کسی سے ملنا نہیں ہے۔ صرف ایک کمرے کے ساڑوساں پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ تیسری منزل پر ہے وہ کمرہ۔ میرا خیال ہے میں رہنمائی کے بغیر بھی آسانی سے وہاں تک پہنچ جاؤں گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں اسے ساتھ لے جاتا نہیں جاہتا۔ سوہانہ انداز میں سلام کر کے بولا۔ "تو پھر مجھے اجازت۔ میں آپ کو فون ضرور کروں گا۔ میرا نام یاد رکھیے گا۔ حسن علی۔"

"مطمئن رہو۔ اس نام کو میں نے اپنے ذہن کے اس خانے میں ڈالا ہے جہاں یاد رکھی جانے والی چیزیں موجود ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی اور آگے بڑھ کر دوسری منزل کی میز میاں چڑھنے لگا۔ حسن علی کو جیسے کچھ یاد آیا۔ تیزی سے میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "سر! میں ایک بات اور بتا دوں۔ شاید اس کا بھی بتا دینا اچھا ہو۔ میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے بارے میں کوئی بات چپا نہیں سکتا۔ سر! ہمارا خاندانی میں منظر کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔"

"میرے دفتر میں کوئی تم سے ہمارے خاندانی میں منظر کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔" میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر بے پروائی سے کہا۔ اس نے ایک آدھری طویل سانس لی اور میں مزید میز میاں چڑھنے لگا۔ میں کئی میز میاں چڑھ چکا تھا اس نے آہستگی سے میرے عقب میں میز میاں پر قدم رکھا۔ میں اس وقت تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا جب میں نے اسے پیچھے والی بالکونی میں اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ میں کچھ آگے بڑھا اور تیسری

منزل کی بالکونی میں داخل ہو گیا۔ غیبت تھا کہ عمارت کی تر بوسیدگی سے بازو دھیر کر کے کی بیٹانی پر غبر موجود تھا۔ میرے مطلوبہ نمبر والے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں اندر جمنا گئے کی کوشش نہیں کی اور ایک انگلی سے دروازہ دنگ دی۔

"کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔" ایک ہنسی ہنسی اور قدر لرزاں سی آواز سنائی دی۔ آواز نسوانی تھی۔ اس کے ساتھ مدھم مدھم ایسی آواز بھی سنائی دی جیسے کوئی چرخی میں رو رہا ہو۔

میں نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں دروازہ کھول کر قدم رکھا۔ وہ بڑے دروازوں اور بڑی کمریوں والا ایک طویل عریض کمرہ تھا جیسے پرانی طرز کی کئی منزلہ عمارتوں میں عام طور پر ہوتے ہیں۔ فرش ٹائلوں کا تھا۔ کمرے کے دوسری طرف بھی ایک کونکلی ہوئی ایک چھوٹی سی بالکونی موجود تھی۔ کمرے میں دیوار الماریاں بھی موجود تھیں۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا دیکر مختصر سالن موجود تھا جیسا جگہ میں ہوتا ہے۔ وہ گوشہ بقیانہ ہی کا کام دیتا تھا۔

کمرے میں دائیں بائیں دونوں دیواروں کے ساتھ پراسٹنٹ ہی کی دو مسکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک خالی تھی اور ایک سانلی سی ایک عورت گندی سی رکھتے کے ایک چھ سات سالہ۔ کونے لگی تھی۔ بچے کا چوہا تھا یا ہوا تھا اور وہ آنکھیں بند۔ مہر کی سانس لے رہا تھا۔ اس پر نظر پڑے ہی مجھے شہ سا کہ وہ نیند میں نہیں بلکہ فحشی کی کیفیت میں تھا۔

خود عورت بھی کوئی اچھی حالت میں معلوم نہیں ہوئی تھی وہ ایک مڑے مڑے سے نیچے کے سارے شہمراز تھی اور تھام سے انداز میں سانس لے رہی تھی مگر اس کا ایک بازو بچے کے پیچھے اور دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر تھا۔ مہر کے قریب ایک پرانی سی تپائی پر وہ اس کی ہمت کی شیشیاں وغیرہ انٹی سید پڑی تھیں۔

عورت کے ہونٹوں پر پٹیاں جی ہوئی تھیں اور آنکھوں۔ گرد سیاہ ملتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھابھک دیرانی تھی۔ جانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پلوں میں لٹا ہوا بچہ اس کا بیٹا تھا دونوں ماں بیٹی یا بیٹے۔ شاید یہاں بھی کوئی کمانی میری کھنکھرت... غصہ و افلاس کی ان گنت کمانیوں میں سے ایک اور کمانی افلاس کی بھی اپنی ایک ہو جاتی ہے جو اس کمرے کے ہر گوشے پرچی ہوئی تھی۔

اس عورت میں تپائی اتنی سخت نہیں تھی کہ میری دنگ دروازے تک آئی لیکن اب مجھے سامنے دیکھ کر اس نے سیدھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

"لمنی رہو۔۔۔ لمنی رہو۔" میں نے بچی آواز میں جلدی

کالی دنیا

ایم اے راحت کے ایڈیٹر

قلم سے

قیمت - 200 روپے

پبلشرز مکتبہ القرآن پبلیشنگ
لاہور

”میں جیسے آرام کرنے نہیں آیا۔“ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے نہایت آہستگی سے بچے کے سر کے نیچے سے بازو نکالا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس بیٹے کے بڑے اور بستر کی چادر وغیرہ سبھی کچھ سیلا سیلا تھا۔ نہایت دھیمی آواز میں وہ بولی۔ ”بے آرام تو انہیں کیا جاتا ہے جن کی زندگی میں کوئی آرام ہو۔“ بظاہر وہ ان پڑھ سی عورت لگتی تھی لیکن اس کا لہجہ بے حد شائستہ تھا۔ ”غالباً آپ دونوں اس جتنا بٹار ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ پہلے صرف میرا بچہ بٹار تھا۔ اس کی تباداری کرتے اور اس کی فکر میں تھکے چند دن سے میں بھی بٹار ہو گئی ہوں۔“ وہ سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز میں بولی۔

”بچے کو بٹاری کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈاکٹروں کو پتا نہیں چل پاتا تو میں ان پڑھ سی عورت کیا بتا سکتی ہوں گی۔“ اس کے لیے میں سختی سختی ”نہن بھونے“ سونے ڈاکٹروں کے پاس جانے کے ہم عمل ہو سکتے تھے ان کے پاس جاتے رہے ہیں۔ اب دو تین دن سے تو ان کے پاس بھی جانے کی طاقت نہیں رہی۔ بہت نہیں پڑی کہ کسی ڈاکٹر سے جا کر کہا جائے کہ وہ میٹر فیس کے ہمیں دیکھ لے۔ مفت دوا دے دے۔“

”اوہ۔“ میں کبھی سانس لے کر رہ گیا۔ ”اس بچے کا باپ میرا مطلب ہے آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟“ میں غیر ارادی طور پر سوال کے جا رہا تھا۔ جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا تھا وہ درست جیسے ہی منظر میں چلا گیا تھا۔

”بچے کا باپ۔“ اس نے استہزائیہ سے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہنسی مجھے ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ ”آپ میرے لئے ابھی ہیں۔“ مجھے نہیں معلوم آپ کس طے میں یہاں آئے ہیں لیکن بہر حال آپ ایک شریف اور معزز آدمی معلوم ہوتے ہیں اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ مجھے برا بھلا نہیں کہیں گے کوئی فتویٰ صادر نہیں کریں گے۔ اس لئے بتا دیتی ہوں۔“ لیکن پھر وہ یکدم خاموش ہو گئی اور اجڑی اجڑی آنکھوں سے ہوا میں نہ جانے کس چیز کو گھورنے لگی۔

ایک لمحے انتظار کے بعد میں نے طاقت سے پوچھا۔ ”آپ کیا بتانے لگی تھیں؟“

”ایک عجیب بات۔“ وہ سرسراہٹ آواز میں بولی۔ ”لیکن پھر ذرا مٹی۔“

”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

تب وہ پہلے سے بھی زیادہ دم جم لہجے میں بولی۔ ”جی بات ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم اس بچے کا باپ کون تھا۔ اور اگر

معلوم بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ بہر حال مجھے یا اس بچے کو ڈاکٹروں کے پاس لے جانے یا ہماری دیکھ بھال کرنے کا بند نہ ہوتا۔ چند لمحوں کی سوجے بازی کے شر کو کوئی عمر بھر کے لئے گلے میں لٹکائے تو نہیں بھرتا۔“

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ کبھی فرش کی طرف دیکھنے لگتی اور کبھی اپنے بچے کی طرف۔ میں سوچ رہا تھا۔ بڑی باحوصلہ ہوتی ہیں یہ مائیں جو ان بچوں کو بھی دیکھنا دس کی طرح بیٹے سے چٹا کر اپنا ذہن چلا کر پاتی ہیں جو ان کے ماتھے پر ٹھک کا ٹیکہ کھاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ معاشرے میں قدم قدم پر ملعون ہو سکتی ہیں۔

”تم کون ہو؟“ مجھے اب اس کو اجنبیت آمیز لہجے میں پکارنا اچھا نہیں لگا۔

”ایکسٹرا گرل ہوں۔“ بلکہ حتیٰ ہی کہنے۔ خاصا طویل عرصہ ہو گیا ہے اب تو اسٹوڈنٹ گئے ہوئے بھی۔ لگتا ہے کچھ زیادہ ہی ایکسٹرا ہو گئی ہوں۔ کسی کو بھی میری ضرورت نہیں پڑی۔ ”انکا کچھ بول کر گویا اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا اور وہ ذرا چمک کر قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ مجھے نہیں جانتے اس لئے زیادہ امکان تو یہی ہے کہ آپ مجھ سے ملے نہیں آئے ہوں گے۔ اخلاق مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے تھا کہ آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہئے ہیں لیکن میں آپ کو اپنے دھڑکنے سناتے بیٹھ گئی۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے طاقت سے کہ

”اس دنیا میں دیکھنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے اور دیکھنے والے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی کے پاس بھی کسی کے دیکھنے والے کا وقت نہیں ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی بتاؤں گا اور اپنی آمد کا متعہ بھی بیان کر دوں گا۔ لیکن اس سے پہلے تم قریا کرو۔“

میں نے اپنا پرس نکال کر دیکھا۔ اس میں تقریباً دو ہزار روپے تھے۔ نیچے گاڑی میں بریف کیس موجود تھا اور اس میں میری چیک بک اور کچھ نقد رقم بھی موجود تھی لیکن فی الحال میں نے وہ دو ہزار روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سروسٹ قریہ رکھو اور آج ہی خود کو اور اپنے بچے کو کسی ایجنے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ ایک دو دن میں تمہارے لئے مزید کچھ رقم بھجواؤں گا۔ اتنی رقم تم کو تمہی طرف لانا اور بچے کا مکمل علاج کرا سکو اور اس کے بعد اپنے بیویوں پر کھڑی ہو سکو۔ تم یقیناً بابت عورت ہو۔ ایک بار سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہو نہیں تو جلد ہی سنبھل جاؤ گی اور دوبارہ زندگی کے راستے پر چل پڑو گی۔ بس میں اتنی ہی تمہارے کام آسکوں گا۔ کبھی کبھی بیمار لوگ بھی زندگی کی جنگ میں گر پڑتے ہیں۔ انہیں صرف اتنی ہی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے کہ سنبھال لے سکیں۔ اس کے بعد وہ خود ہی سب کچھ کر لیتے ہیں۔“

اس نے میری بات قریہ سے سنی لیکن اس کا ہاتھ نوٹوں کی طرف نہیں بڑھا بلکہ اس نے ہاتھوں کی انگلیاں مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسائیں اور بھروسے سے لہجے میں بولی۔ ”نہیں جی۔ بہت بہت شکریہ۔ میں نے کبھی کسی ایجنے سے ایسا رقم قبول نہیں کیا جو ترس کھا کر دی جا رہی ہو۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ مجھ پر ترس یا رحم کھایا جائے۔ اسی خواہش نے تو مجھے زیادہ قابل رقم بنا دیا ہے۔“

”تم میری توہین کر رہی ہو۔ میرے جذبے کی توہین کر رہی ہو۔ میں نے تمہارے گھر سے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ رقم تم پر ترس کھا کر نہیں دے رہا۔ اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اپنے متعلق جو بھی خواہش بتایا ہے وہ میری ہمدردیاں حاصل کرنے یا میرے جذبہ ترس کو بیدار کرنے کے لئے نہیں بتایا۔ وہ سب کچھ بالکل غیر ارادی تھا۔ اور میں اگر تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو اسے بیک وقت سمجھو۔ یہ ایک شخص انسان کا دوسرے انسان کے لئے حقیر سا تحفہ ہے۔ جب تم سنبھل جاؤ زندگی کے منہ زور گھوڑے کی لگام دوبارہ تمہارے ہاتھ میں آجائے تو تم بھی میرے لئے کوئی غلط بھراؤ خد بھیج دینا۔ خواہ وہ بازار سے خریدنا ہو ایک گھنٹہ سی ہو۔ میں سمجھوں گا غلطی کا قرض غلطی سے ادا ہو گیا۔“

میں نے ایک بار پھر نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اس بار اس نے اپنے ہاتھ سے نوٹ تھام لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بہا رہے تھے۔ میں نے دیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ملکہ۔“ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے استہزائیہ لہجے

میں کہا۔ ”والدین بھی بعض اوقات اولاد کے نام ایسے رکھ دیتے ہیں کہ آگے چل کر تم کو خلیفہ محسوس ہوتے ہیں۔ بے چاری ملکہ بیمار بچے کے ساتھ اس افلاس زدہ پرانی عمارت میں بڑی سسک رہی ہے۔ مالک مکان نے عمارت میں رہنے والے سب لوگوں کو بے دخلی کے نوٹس دے رکھے ہیں کیونکہ وہ ہماری گھڑیاں لے کر بے کمرے قلمی دفاتر کے لئے دنا چاہتا ہے۔ بے چاری ملکہ۔“

”یہ کوئی ایسی انمولی بات نہیں۔ بعض کمائیوں میں کسی ملک یا شہزادی پر ایسا وقت بھی آجاتا ہے۔“

وہ نوٹ نیچے کے نیچے رکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن سر۔! مجھے بھی عورتیں۔۔۔ بچے اور مرد اس معاشرے میں ملکہ ساری دنیا میں قدم قدم پر ٹکرتے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ان گنت تو ہم سے بھی کہیں بڑے حال میں ہوں گے۔ آپ کس کس کی مدد کریں گے؟ کس کس کو اپنے غلطی کا نذرانہ پیش کریں گے؟“

”میرا ایک خواب ہے ملکہ۔ میں نے مجھے لہجے میں کہا۔

”کہ دنیا میں حد سے زیادہ پریشان حال مظلوم“ انہوں اور انہوں کے بارے لوگ نہ ہوں۔ یہ دنیا سبھی کو رہنے کے قابل نظر آئے۔ لوگ زندگی کو محض سزا سمجھ کر نہ کٹیں۔ لیکن ظاہر ہے میں اکیلا اس خواب کی تعبیر نہیں دھڑکتا۔ اگر کسی طریقے سے میری حیثیت کے دو سارے سوا ہی بھی نکلا ہو سکتے اور ہم خیال ہو کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل سکتے تو شاید ہم دنیا کے نہیں تو کم از کم اپنے ملک کے کسی چھوٹے موٹ گوشے میں تو کوئی چھوٹا سا انتخاب لے لی آئے۔ لیکن فی الحال چونکہ یہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے بس سرراہ چلتے چلتے جو کچھ میں آسانی سے کر سکا ہوں کر چلا جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کے دیکھوں میں اس سے کوئی کمی نہیں آسکتی لیکن چند گھنٹوں کے لئے میرے ضمیر کو اپنے جس زور خیز سے نکل کر فرست بخش ہوا میں چند سانس لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر لوگ انسان کی فلاح کی طرف سے اتنے ہی مایوس ہو جائیں تو بڑی مشکل ہو جائے۔ تمام خلاقی ادارے بند ہو جائیں اور تمام نیک طبع لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قیامت کے انتظار میں بیٹھ جائیں۔ دنیا اور بھی زیادہ بد صورت ہو جائے۔“

ملکہ ایک جلیبی سی چادر اپنے گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”آپ نے اپنے نظریات اور خیالات کے بارے میں تو مجھے اتنا کچھ بتا دیا۔ اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دیجئے۔“

”بتاؤں گا۔ لیکن وہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ زیادہ اہم وہ کام ہے جس کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے بھی چونکہ کبھی کبھی اپنے دل کی باتیں کہنے کا موقع میرے آج ہے اس لئے میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول بھال جاتا ہوں۔“

”میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ابھی تک آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ مجھے یہاں آپ کے شاہان شان کوئی کرسی نظر نہیں

لڑکی سے زندگی میں کبھی نہیں ملا۔ میں نے اسے صرف مردہ حالت میں دیکھا۔۔۔ اور یہ کوئی پہلی لاش نہیں تھی جو میں نے زندگی میں دیکھی۔۔۔ لیکن میرے دل کو نہ جانے کیا ہو گیا۔۔۔ وہ بہت کم عمر مسکون اور پھول کی طرح نازک معلوم ہوتی تھی۔

"پھول سے بھی زیادہ نازک اس کا دل تھا۔۔۔" "لکھ آتوںوں سے بھیگے آواز میں بولی۔" "لیکن اپنے ارادوں کے معاملے میں وہ فولاد کی طرح مضبوط تھی۔ اس نے اپنے ارادوں کی شکست کو تسلیم کرنا یا کسی معاملے میں ہار ماننا نہیں سیکھا تھا۔ اور ایسی شائیں جو جھٹکا نہیں جانتیں، محض ٹوٹ ہی جایا کرتی ہیں۔۔۔ وہ بیرونی بننے کا عزم لے کر اڑھائی میں آئی تھی۔ اور اس خواہش کے لئے اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ بابا بھلی، بابا بکی۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار نہیں تھی کہ وہ بیرونی نہیں بن سکتی۔ ہونے کو تو اس دنیا میں خیر کیا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مجھے یہ کام اس لئے بھی مشکل نظر آتا تھا کہ جس تو آواز اور تان لڑکی کو اڑھائی کے گر کے ابتدا میں ہی کھلونا بنانے میں کامیاب ہو جائیں اس کے بیرونی بننے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ باقی سوال یہ تھا کہ اسے یہیں۔۔۔ وہ خاموش ہو گئی۔

"میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے ہی یہاں آیا تھا۔" "میں نے کہا۔" "کبھی انسان بلا وجہ ہی کوئی کام اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ میں نے بھی اس کے قاتل کی گردن تک ہاتھ پہنچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ مدد کی طلب میں میرے پاس آئی تھی۔ میں اس کی زندگی میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکا۔ اگر اس کا قاتل ہی میری وجہ سے کیفر کو ادا کر دیتا تو پہنچ جاتے تو شاید اس کی مدد کچھ ٹھیکیں لے۔"

"عجب بات یہ ہے۔۔۔" وہ حلقہ سے انداز میں بولی۔ "کہ مجھے ہی صبح ایک اور شخص بھی آیا تھا۔ اس نے کہا کہ نشاط اپنے ایک 'دوست' کے گھر ہے اور اسے اپنی ایک ڈائری کی ضرورت پڑ گئی ہے جو الماری میں ہے۔ اس نے وہ منگوائی ہے۔ نشاط کا سامان بہت مختصر سا ہے اور وہ سارا کارڈ ای میری نظر میں رہا ہے۔ میں نے اس کے پاس کبھی کوئی ڈائری نہیں دیکھی لیکن معلوم ہوا تھا کہ وہ شخص ہر حال میں نشاط کے سامان کا جائزہ لے کر رہے گا۔ میری طبیعت بھی اس وقت کچھ زیادہ خراب تھی۔ میں نے اس سے ایجنے کی کوشش نہیں کی۔ نشاط کا کل سامان بس اس الماری میں ہے۔۔۔ اس نے ایک دیوار گیر الماری کی طرف اشارہ کیا۔ الماری اس وقت بند تھی۔

لکھ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس شخص نے الیہاں ڈر کھول کر ہر جگہ کا جائزہ لیا۔ ہر جگہ کو کھنگال کر دیکھا سوٹ کیس مجھے ذرا نشاط کا چھوٹا سا سوٹ کیس پڑا ہے۔ اسے بھی یہیہ نشاط کے ساتھ ساتھ پلٹ کر دیکھا لیکن اسے کوئی نشانہ اس کی خوبصورتی اور عمر کی برقرار تھی۔

زور سے کرکئی مرتبہ مجھ

آہی۔۔۔ میری کچھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو کہاں نکالوں۔ اس کے لیے میں واقعی انتہائی محذرت اور انتہائی احساسِ محرومی تھا۔

"میں کوئی ایسا شان و شوکت والا آدمی نہیں۔" میں نے قریب ہی موجود ایک پرانی اور نیم شکستہ سی کرسی بچھنے ہوئے کہا۔

میں اس پر بیٹھ چکا تو وہ پہلو بہ لٹے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے کس کام آ سکتی ہوں؟"

"نشاط صرف بیٹے ہی نامی ایک ایکسٹرا گرل غالباً اس کمرے میں تمہارے ساتھ رہتی تھی؟" میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"رہتی تھی نہیں۔۔۔ رہتی ہے۔" اس نے گویا جھجکی۔ "نکل سے وہ کہیں غائب ہے۔ لیکن ہم جیسی لڑکیوں کا چکر ایک دو راتوں کے لئے اپنے نمکناؤں سے غائب ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں اس لئے مجھے اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں۔"

"اب تمہیں تشویش ہوتی ہی تو کوئی فرق نہ پڑا یہ تو کدو باب اس دنیا میں نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس کی آنکھیں کچھ پٹیٹیں۔

"اے گزشتہ رات قتل کر دیا گیا ہے۔" میں نے اسے بتا دیا۔

بہر سمجھا۔

"نہیں۔" اس کے حلق سے سرسراہٹ ہوئی سی تو آواز نکلی اور وہ گویا مسمیٰ سے گرے گرے پہنچی۔ اس کے اس طرح بڑوانے سے بچ ایک بار پھر پینڈا فٹھی میں کھسکا اور کراہنے کے سے انداز میں ایک لمبے کے لئے دھاوا۔ اس کی آواز افسردہ کر دینے والی تھی۔ لکھ اس پر یوں جھک گئی جیسے کوئی مرنے والی اپنے چوڑے کو ہونٹے چھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اس کی پیشانی پر سلائے در اسے چھونے لگی مگر اس دوران اس کی آنکھوں سے آنسو چھپنے لگے۔

بچہ ذرا چکا تو وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی اور غماز ماموشی سے مدنے لگی۔ چند لمبے بعد اس نے خودی سراغ دیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ بخار کی پیش نے اس کے جسم کو دھکا دیا ہوای تھا اب آنسوؤں کی آگ نے یقیناً اس کے دل کو بھی آتش کو دھکا دیا تھا۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ شاید اس میں بولنے کی سکت نہ کہہ گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ میں نے اسے مختصر آہٹا دیا کہ دوا کس طرح پیش آیا تھا۔

وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن جس تو میرے پاس نہیں آئی۔ ابھی تک مجھے اس قیامت کی اطلاع نہیں ہوئی۔"

"پولیس بھی پیچھے کی لیکن ذرا آرام سے پیچھے کی۔ زیادہ امکان ہے کہ وہ محض حنا بیگ کی کارروائی کرے گی۔" میں نے کہا۔

"اپنے احساس کے انہوں مجبور ہو کر پولیس سے زیادہ مستعد ہو ال اور اس معاملے میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں اس

ہوئے پھرنے سے نچی قسم کے ہوٹل میں رہتی تھی جہاں چند ملازمت پیشہ عورتیں رہتی تھیں۔ اس نے خود کو بھی وہاں ملازمت پیشہ ہی بتایا ہوا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ اب وہاں کے اخراجات کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ مجھے معلوم ہے، بے یار و مددگار عورتوں کے لئے رہائش کا مسئلہ کتنا سنگین ہوتا ہے۔ میرے کمرے میں جبکہ تھی۔ میں نے اسے آنے کے لئے کہہ دیا اور وہ دوسرے دن ہی آگئی۔ میرے ساتھ رہنا اسے ہر لحاظ سے سستا پڑا لیکن اس نے خود ہی اسے بھی اپنے لئے منگایا ہے رکھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ بے چاری میرے اور میرے بچے کے مسائل سے لا تعلق نہیں رہتی تھی حالانکہ اگر وہ لا تعلق رہتی تب بھی مجھے اس سے کوئی شکوہ نہ ہوتا کیونکہ اس کے اپنے مسائل ہی تھے کہ نہیں تھے۔ لیکن وہ تو ہماری ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی۔ ہماری ہر ملامت پر ہراسی بہیم سے زیادہ پریشان ہو جاتی۔ جو کما کر لاتی وہ زیادہ تر ہم پر ہی فوج کر دیتی۔ وہ ان ناپاک لوگوں میں سے تھی جو خود بھوکے رہ کر اپنے منہ کا ٹوٹا دوسرے کو کھلا دیتے ہیں۔ وہ مجھے بسوں سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگی تھی۔"

"اس کے باوجود تم اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔" میں نے ملازمت سے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ وہ ساتھ رہتی تھی تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ شاید ملت بھی نہیں ملی اگر وہ مزید کچھ عرصہ ساتھ رہ جاتی تو شاید کچھ اور جانے کا موقع۔۔۔ ہر وقت تو وہ سرگرداں ہی رہتی تھی۔ صبح نکلتی تھی تو کھسکا ہار رات گئے آتی تھی۔ جو تو روزا بہت دقت میسر ہوا تھا اس میں اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ میری باتیں سنتی رہے، مجھ سے کچھ نہ کچھ معلوم کرتی رہے۔ اور کچھ نہیں تو اڑی سڑی میں کرا کرنے کے گری معلوم کرنے لگتی تھی۔ میرا چہرہ ہر چیز پر۔ اعتبار اٹھ چکا ہے اور صرف مقدر پر اعتبار رہ گیا ہے اس لئے اسے کوئی کام کی بات بتانے سے قاصر رہتی تھی۔ میں بس یہی کہ بات ختم کر دیتی تھی کہ اگر تقدیر میں کچھ ہو تو وہ جو ہے انہو طریقوں سے پورا ہو جاتا ہے۔ سارے گری ساری کوششیں وہ رہ جاتی ہیں۔ میری باتیں سن کر شاید اسے کچھ مایوسی ہوتی تھی۔ "ہر حال تم نے مجھ سے بھی نہ بھی اس کے بارے میں جاننے کوشش تو کی ہوگی۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی۔۔۔ خاندانی پس منظر کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ دو ایک مرتبہ میں نے سرسری انداز میں کچھ جانا کوشش کی ہو گی لیکن کبھی دور سے کر پوچھنے کی کوشش نہیں وہ بہت مضطرب بہت بے چین معلوم ہوتی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی معلوم ہوا تھا جیسے کہ وہی ہو کہ بس مجھے کچھ بن جا پھر میں اپنے متعلق سب کچھ تمہیں تو کیا پورے زمانے کو ہی

نہیں رکھا؟ آخر کار وہ سارے ہی کمرے کا نظروں ہی نظروں میں جائزہ لے کر یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ شاید نشاط نے ڈانسی کے بارے میں صحیح طرح نہیں سمجھا۔ میں اس کے بارے میں مطمئن نہیں تھی لیکن میں اس سے اچھے یا کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔"

"وہ شخص تمہارے لئے قطعی اچھی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"تو کس قسم کا طبع خاص اس کا؟"

"جینز جیکٹ میں تھا۔ درمیانے قد اور مضبوط جسم کا تھا۔ سانولی رنگت اور موٹی موٹی مونچھیں تھیں۔ کچھ بد معاش سا معلوم ہوا تھا۔" ملکہ نے بتایا۔

"ممکن ہے ڈانسی کا صوف ہمانہ رہا ہو۔ وہ یہاں کچھ اور تلاش کرنے آیا ہو اور وہ چیز تلاش کر کے بھی لے گیا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں۔" ملکہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اس کے بارے میں اور کسی بھی بات کا یقین نہیں لیکن اس بات کا یقین ہے کہ وہ یہاں سے لے کر کچھ نہیں گیا کیونکہ جتنی دیر وہ کمرے میں رہا میری نظر اس پر رہی۔ میں اپنی جگہ لینے لینے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے بھی اپنی حرکات و سکنات مجھ سے چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ اس کا انداز بتاتا رہا تھا کہ اسے میری کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اگر اس کی مطلوبہ چیز اسے نظر آجاتی تو وہ ہر حال میں اسے لے جاتا۔۔۔ اس کے سرواٹھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ میں کچھ خوفزدہ بھی تھی۔ وہ اگر کچھ لے جانے کی کوشش کرتا تو میں جیتنا اسے منع نہ کرتی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اطمینان محسوس کیا تھا۔"

"خیر۔۔۔ تم مجھے نشاط کے بارے میں بتاؤ۔۔۔ اس کی شخصیت۔۔۔ عادت۔ اس کے لئے چلنے والے۔۔۔ کوئی ایسی بات جو تمہارے خیال میں اس کے قتل کا سبب بن سکتی ہو؟"

اس کی پیشانی پر سوچ کی چٹنیں ابھر آئیں۔ "وہ ساتھ رہتی تھی تو محسوس ہوا تھا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔۔۔" وہ غصہ فصر کر پڑی۔ "لیکن اب یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس کے بارے میں کوئی خاص بات۔۔۔ کوئی کام کی بات شاید نہیں جانتی۔"

اس نے قدرے بے بسی سے میری طرف دیکھا تاہم بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس سے میری ملاقات چار پانچ ماہ پہلے استوڈیو میں ہوئی تھی۔ وہ غالباً استوڈیو میں میرا اب تک کا آخری ملازمتی تھا۔ اس کے بعد سے میں کچھ ایسی اچھی ہوں کہ آج تک نے کاپیٹے کچھ سے اسے۔۔۔ وہ نشاط سے میری پہلی ملاقات تھی اور پہلی ملازمت رہی تھی۔ میں نے مجھے سب کچھ اچھی لگی۔۔۔ ہمارے درمیان اتنی دوستی۔۔۔" ملکہ۔۔۔ اس نے اپنے آنسو پوچھتے ہوئے بچے کی دعوت دے دی کیونکہ وہ کسی عورت کے گھر میں بنے

کی۔ ویسے بھی وہ مجھے اتنی بے ضرر اتنی معصوم معلوم ہوتی تھی کہ میں اسے کر دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی۔
 "اس کے لئے چلے والوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہے... کسی سے کوئی خاص ٹیکل ملاقات رہی ہو اس کی؟" میں نے پوچھا۔
 "جب سے اس نے یہاں رہنا شروع کیا تھا تب سے مجھے اس کے ساتھ اسٹوڈیو جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ ویسے بھی اسٹوڈیو والے عوام کے بارے میں کچھ کما نہیں جاسکتا۔ ہم جیسے لوگوں کو تو وہاں ہر ایک سے ہی ہنس کر بات کرنی پڑتی ہے۔ بہر حال وہ کبھی کسی کو یہاں لے کر نہیں آتی اور نہ ہی کبھی کوئی اسے پوچھتا ہوا یہاں تک آیا۔ ایکسٹرا اسٹارز عبدالواحد سے اس کی ذرا زیادہ جان چکان معلوم ہوتی تھی۔ تاہم ان کے درمیان رشتہ صرف احترام اور ہمدردی کا معلوم ہوتا تھا۔ عبدالواحد بہت اچھا آدمی ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ وہی اسے زیادہ سے زیادہ کام دلوانے کی کوشش کرتا تھا۔ بغیر کسی غرض اور لالچ کے۔ عبدالواحد تو خیر سبھی کے ساتھ حتی الامکان ہمدردی سے پیش آنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو لڑکیاں زیادہ ضرورت مند ہوتی ہیں بعض اوقات ان کے پیسوں میں سے کیش بھی نہیں کاٹتا بلکہ اگر کوئی زیادہ سی شکل میں گرفتار ہو اور عبدالواحد کے پاس گنجائش ہو تو بچے سے بھی دے دیتا ہے۔ وہ عموماً چشم نہیں ہے اس لئے اس کے مالی حالات بھی بہت زیادہ اچھے نہیں ہیں۔"

"نشا کے بارے میں کوئی خاص بات؟" میں نے ایک بار پھر کچھ جاننے کی کوشش کی۔

"خاص بات... وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے ہوتی۔" مجھے بس یہی بات کچھ خاص معلوم ہوتی تھی کہ وہ ہمارے داخل کی پروردہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس میں جو کچھ "جو توڑی بہت چالاکی" جو توڑی بہت بچنے یا بچنے کی عادت پیدا ہوئی تھی وہ بالکل نئی ہی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس میں کوئی گھٹاپا نہیں تھا۔ ایکسٹرا گرل کے طور پر وہ مجھے بہت عجیب بہت مختلف معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر بار بار احساس ہوتا تھا کہ اسے کم از کم فلمی دنیا میں نہیں ہونا چاہئے تھا اور خواہ وہ کیس بھی ہوتی۔ "اس نے نسکی کے سے انداز میں ایک گہری سانس لی اور ایک لمبے کی خاموشی کے بعد بولی۔
 "... میری عمر اچھی خاصی ہے۔ میں نے زمانے میں بہت عرصہ ٹھوکریں کھا کر بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس مختصر عرصے میں میں نے اس لڑکی سے بھی بہت اچھی اچھی باتیں سیکھیں۔"

"نشا، دلوں میں اس میں کوئی تبدیلی محسوس کی ہو؟" میں نے جانا چاہا۔

"معلوم ہی ہوتا تھا کہ اس کم عمری میں اس نے دل پر بہت بوجھ سہا سیکھ لیا تھا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "لیکن پچھلے چند دنوں سے اس کے رویے میں تبدیلی ہر حال میں محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ میں نے پوچھا لیکن اس نے سب بات نہیں

کر چلا دیا۔ البتہ ایک بار اس نے مذاق ہی کے سے انداز میں اتنا ضرور کہا کہ اگر مجھے کوئی خاص مسئلہ درپیش بھی ہو تو آپ کو بتانے سے کیا فائدہ؟ آپ تو خود اتنی کمزور و زلیخا میں ہیں کہ اپنے ہی مسائل حل نہیں کر سکتیں، آپ سے کچھ کہا آپ کے بوجھ میں اضافہ ہی کرنے والی بات ہے۔ مگر اس کے سامنے دے دیا جائے جو اس کا کچھ نہ کچھ دوا کر سکا ہو ہر ایک کے سامنے اپنے دکھوں کی پرتی کھول کر بیٹھنے سے کیا حاصل؟ پس اس قسم کی باتیں مگر کے اس نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔"

"میں ذرا اس کے سامان کا جائزہ لے سکا ہوں؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
 "میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ اس کا کل سامان بس اس الماری میں ہے۔ باقی ضرورت کی تمام چیزیں وہ میری ہی استعمال کرتی تھی جو اس کمرے میں پہلے سے موجود تھیں۔"

میں نے اٹھ کر الماری کھولی اور کھولتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی ہر چیز کو پہلے ہی کنگالا جا چکا ہے۔ اس کے آدھے حصے میں کچھ سستے قسم کے لمبوسات لٹے ہوئے تھے اور کچھ بے ترتیبی سے نیچے ڈیرے تھے۔ دوسرے حصے میں کئی شیفٹ تھے۔ ان میں بھی زیادہ تر معمولی قسم کے لمبوسات اور نسوانی ضروریات کی دوسری چیزیں تھیں۔ ایک شیفٹ میں بہت سی تصویریں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مختلف سائز کی رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں۔

میں نے سرسری نظر سے ہر تصویر کا جائزہ لیا۔ وہ سب کی سب تصویریں نشا کی تھیں اور ہر تصویر میں وہ خمای تھی۔ تصویریں اسی قسم کی تھیں جس طرح کی عموماً ایکٹنگ کے شرفین لڑکے لڑکیوں کی ہوتی ہیں۔ کہیں ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے خیالوں میں گم۔ کہیں ہاتھ اٹھا کر معنوی فتنہ لگاتے ہوئے۔ کہیں بڑے فائدہ دار اسے مرکز دیکھتے ہوئے۔ کوئی تصویر بھی ایسی نہیں تھی جس سے نشا کے بارے میں میری معلومات میں کوئی اضافہ ہوتا۔

میں نے نشا کو صرف مردہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں غلطوں سے اٹھی ہوئی تھیں اور کرب ناک موت نے اس کی صورت صبح کر دی تھی لیکن پھر بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی میں وہ خوش شکل اور گوری جتنی رہی تھی لیکن اس کی تصویریں بتاتی تھیں کہ اس کا چہرہ زیادہ فوٹو جنیک نہیں تھا۔ تصویروں کی نسبت وہ عام زندگی میں کیس بہتر معلوم ہوتی ہوگی۔

الماری میں چھوٹا سا ڈسک کالہ کباز تھا۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جس سے نشا کی شخصیت کے بارے میں کوئی قابل ذکر معلومات حاصل ہو سکتی۔ البتہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس مجھے ذرا غیر معمولی لگا۔ اس سوٹ کیس نے بھی یقیناً نشا کے ساتھ ساتھ خاصے دھکے کھائے تھے لیکن اس کی خوبصورتی اور عجمی برقرار تھی۔

یہ ایک جیٹ قیمت غیر ملکی سونٹ کیس تھا۔ کوئی غریب لڑکی ایسا سونٹ کیس خریدنے کی تحمل مشکل سے ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا، ممکن ہے وہ ننگا کو کسی نے مختار بنا دیا ہو۔

میں نے ہر چیز اسی طرح چھوڑ کر تدریس باہوی کے عالم میں الماری بند کر دی۔ تاکہ نے جس ماحول میں کسی ننگا کو کرنا تھا وہ بھی شاید میری ہی طرح باہوی ہو کر یا پھر شاید مطمئن ہو کر گیا تھا۔ ننگا کا قفل غیر اہم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص یقیناً کسی ایسی چیز کی تلاش میں آیا تھا جس سے حفاظت کا کوئی سراپا تھا۔ آسما تھا۔

میں نے لکھ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "میں اس آکر مجھے ننگا کے افسوس ناک کتلے کے سلسلے میں کوئی خاص سراغ تو نہیں ملا لیکن کم از کم اس کی شخصیت کے کچھ نکتے ضرور واضح ہوئے ہیں۔ شاید ان سے ہی کچھ دولے۔"

"مکن ہے قدرت نے آپ کو ننگا کے ساتھ ساتھ در حقیقت میری درد کے لئے یہاں بھیجا ہو۔" لکھ نے دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے غالباً مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے مسی سے اترنا چاہا لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ "تم سکون سے بچے کے پاس بیٹھی رہو۔ غفلت کی ضرورت نہیں۔ صرف اس وقت انصاف تم محسوس کرو کہ بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس لے جا سکتی ہو۔ خدا حافظ۔"

میں تیزی سے کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت تک میں اس کی آنکھوں میں آنسو ٹپک نہیں ہوئے تھے۔ عمارت سے باہر آکر میں نے چند گہری گہری سانسیں لیں۔ ہر عمارت اپنے بننے میں نہ جانے کتنی کمائیاں چھپائے ہوئی ہے۔ میں اپنے ذہن میں سب سے اچھے سوال لے کر میں جہنم کے بلی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بلی کی تلاش کے سلسلے میں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرے سامنے کوئی سراغ نہیں تھا اور اس کے بارے میں مجھے تشویش بے پناہ تھی۔ وہ شخص لڑکی نہ جانے کس حال میں تھی؟

بلی کے تینوں ملازم گھر موجود تھے۔ چوکیدار گیشہہ اپنی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا اور بانی دونوں مہاں ہو کر چھوٹے سونے گھریلو کاموں میں مصروف تھے۔ تینوں اداس تھے اور اپنی ہانگوں کے بارے میں فکر مند تھے۔ کسی حد تک خوفزدہ بھی تھے لیکن ہر حال ان کا گھر چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس نے ملنے اور کچھ دیر اس مکان میں گزارنے کے بعد بھی کوئی نئی بات میرے سامنے نہیں آئی۔

میں تدریس باہوی کے عالم میں ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ میں نے اب اسٹوڈنٹ کا ایک پتھر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں بلوار پر پہنچنے ہی مجھے احساس ہوا کہ ایک گاڑی میرے تعاقب میں ہے۔ ایک سفید گاڑی تو پہلے ہی میرے تعاقب میں تھی۔ وہ میرے اپنے آوی تھے جو اپنے طور پر میری حفاظت کے لئے میرے تعاقب میں رہنے لگے تھے۔ وہ دوسری گاڑی ان کے پیچھے

تھی۔

وہ پرانے مائل کی ایک سرخ شیورلٹ کنورٹبل تھی۔ اس قسم کی گاڑیاں اب شاید باری دیکھنے میں آتی تھیں۔ اس کی کیڑوں کی چمت اس وقت مکمل تھی اور اس میں جس شخص کی جھٹک مجھے نظر آئی تھی وہ بھی خاصا عظیم الشان ہی معلوم ہوتا تھا۔ خاصے قدیم زمانے کے بوڑھے انگریزوں کی طرح اس کے کانوں کے آس پاس بھروسے ٹھکرایاے بالوں کی جھار تھی اور باقی چند بالکل صاف اور چمکیلی تھی۔ اگر ڈاؤن کی تھیوری کو درست مان لیا جائے کہ بندر ہمارے آباؤ اجداد تھے تو اس میں اپنے آباؤ اجداد کی بہت زیادہ مشابہت موجود تھی۔ جس انداز میں وہ اس بڑی سی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ میں دھنسا ہوا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصا مختار اور جود آدمی ہے۔

جب بھی مجھے حجب لہا آئے ہیں میں اس کی جھٹک نظر تکی وہ اپنے گرد و پیش بلکہ تمام دنیا سے بے خبر سا نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خواب کے سے عالم میں گاڑی چلا رہا ہے لیکن جوں ہی میں زار رفتار دیکھتا ہوں اور میرے ساتھ سفید گاڑی کی رفتار بدستور فوراً ہی اس سرخ شیورلٹ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ سرخ شیورلٹ میرے یا ہمارے سفید گاڑی کے تعاقب میں ہے تو مجھے تشویش کے بجائے ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً کسی بلی گھر کے آس پاس سے ہی ہمارے پیچھے چلی گئی ہو گی کہ جب میں رائل پارک گیا تھا اور وہاں آیا تھا تو ہماری اپنی سفید گاڑی کے علاوہ کوئی گاڑی میرے تعاقب میں نہیں تھی۔ آج کل میں جو بھی گاڑی حد تک مٹکا رہنے لگا تھا اور کہیں آتے جاتے وقت اپنے گرد و پیش پر نظر رکھتا تھا۔

مکن ہے وہ بندر نما شخص بلی کے گھر کی نگرانی کر رہا ہو اور مجھے وہاں آتے اور پھر رخصت ہوتے دیکھ کر میرے پیچھے لگا ہو۔ اگر یہ قیاس درست ہو تو اس سے یقیناً بلی کے اغوا کے سلسلے میں کوئی سراغ پتا آ سکتا تھا۔ اس معاملے میں یہ امید کی جلی کرنا نظر آتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس شخص کو احساس ہو کہ میرے تعاقب سے باخبر ہو گیا ہوں۔ اس لئے میں نے بے مقصد اور حراہ جھٹکے کی کوشش نہیں کی اور اسٹوڈنٹ کی طرف سڑ جا کر رہ گیا۔

شہر کے کنارے پہنچ کر میں نے کار کی رفتار دو سو میلان پر رکھ دی۔ خفیہ خانے سے ڈائریکٹر نکلا اور میرے محسوس انداز میں سفید گاڑی میں موجود کوئی سے رابطہ قائم کیا۔

"جس اندازہ ہو گیا ہے کہ سرخ شیورلٹ ہمارے تعاقب میں ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"میں سر! مجھے کلچرنگ میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" کوئی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"لیکن تم اسے احساس مت ہوئے دو کہ تم میرے تعاقب میں ہو۔" میں نے ہدایت کی۔

"کیسپس والے مولر پر تم سید کیسپس کی طرف نکلتے چلے جانا۔ میں علامہ اقبال ڈاؤن کی طرف

تھے۔ بائیں طرف قدرے خلیب میں سڑک چٹنی سی چڑی کچی پٹی تھی اور اس کے بعد بارگ کی کچی سی کچی دیوار تھی جس کے عقب سے گھڑوں سے لدے ہوئے درخت جھانک رہے تھے۔

میں نے یکدم ہی اس الجھن کا حل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا کہ آخر وہ بندر نما شخص جہاں کیا تھا۔ میں نے گاڑی کو تڑپا کر تے ہوئے ایک لخت بریک لگا لگا۔ میری دیرینہ سیریز کے گاڑوں نے سڑک پر بری طرح رگڑ کھائی محروم سرے ہی لمحے گاڑی گریا سڑک سے چپک کر رو گئی۔

سرخ شیورلیٹ زیادہ قریب پر نہیں تھی۔ اگر بندر نما انسان گاڑی ڈرائیور ہو تو اس کی گاڑی میری گاڑی سے کچھ بھی سکتی تھی لیکن اس کے بارے میں میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ وہ گاڑی ڈرائیور ہرگز نہیں تھا۔ اس نے گاڑی کو زبردست لہرا دیتے ہوئے کچے میں اندر کا ٹکڑا نکال جانے کی کوشش کی لیکن میں اسے چھوڑنے کے موزوں نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تیزی سے میری گاڑی ریورس ہو کر اس کے راستے میں حائل ہو گئی اور سرخ شیورلیٹ یوں بارگ کی دیوار کے ساتھ جا کر رک گئی کہ ایک لمحے کے لئے گرد و غبار کے طوفان میں چھپ کر رہ گئی۔

قرنی نے بھی گاڑی نہایت سہانگی سے شیورلیٹ کے عقب میں تڑپتی کر کے لا دو کی تھی۔ سب سے پہلے میں گاڑی سے اترا۔ میں نے کوئی ہتھیار نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن مختصر مابعد شخص بڑا بے فکر معلوم ہوا تھا۔ میں نے اسے دھل کے بادل میں گاڑی کا دروازہ کھولے بغیر اچھل کر کھلی چھت کی گاڑی سے کودتے دیکھا۔ اس کے مختصر سے بازو کے سرے پر مجھے لمبی بال والے پتوں کی جھلک نظر آئی۔

میں فوراً اپنی گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ بغیر کسی دھماکے کے گولی میرے سر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ میں سکرانے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جو گولی بھی تھا بحال اس قسم کے حالات سے اچھا خاصا ہاتھس معلوم ہونا تھا لیکن شاید ہمارے بارے میں اس کے اندازے کچھ غلط رہے ہوں۔ اسے دو سرفاز کرنے کی مصلحت نہیں تھی۔ کوئی کے پاس بھی سائینڈر والا رہا اور تھا۔ اس کے خاموش رہا انداز نے مجھے اس طرح گولا اگلی کر مٹتی شخص کے ہاتھ سے حرکت پھیلانے کی گھبراہٹ میں دور جا کر۔ مجھے امید تھی کہ اس کے ہاتھ غلاش بھی نہیں آئی ہوگی۔

لیکن وہ شخص ہتھیار کی جدم موجودگی میں بھی 'خاموش' ہتھیار ڈالنے کا قائل معلوم نہیں ہوا تھا اور فیصلہ شاید ہم سے بھی کہیں تیزی سے کرتا تھا اور پھر صرف اس کا ذہن ہی نہیں جسم بھی پہلی کی سی تیزی سے حرکت کرتا تھا۔ پتوں ہاتھ سے جاتے ہی میں نے اسے کسی راکٹ کی طرح ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔ وہ بارگ کی دیوار پھانک کر اندر جا رہا تھا۔

میں اس کی چھلانگ کی بلندی دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ

گاڑی کا لیکن چند لمحے بعد تم اس طرح داپس آجانا کہ سرخ گاڑی کے پیچھے رہ سکو۔ اس بندر کو نکلنے نہیں دیتا ہے۔ یہ بہت اہم سرفاز ثابت ہو سکتا ہے۔

"اور کے سرفاز" قرنی نے مستحضری سے کہا۔

اس ہدایت پر عمل ہوا اور چند لمحے بعد سفید کار در میان سے ہٹ چکی تھی۔ اس کے چند لمحے بعد وہ شیورلیٹ کے پیچھے نظر آنے لگی لیکن اب درمیانی فاصلہ کافی تھا۔ بندر نما شخص سب سابقہ بظاہر دنیا فانیسا سے بے خبر، ختم خوابیدہ سے انداز میں میرے تعاقب میں گاڑی لے کر رہا تھا۔

مکان روڈ پر مڑتے وقت مجھے ایک لمحے کے لئے گاڑی روکی پڑی اور اس دوران میرے عقب میں شیورلیٹ کا فاصلہ کچھ اور کم ہو گیا اور مجھے عقب نما آئینے میں اس شخص کی ایک اور جھلک ستر طور پر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس کی آنکھیں نیم دھکیں اور اس کی نظر صرف سڑک پر تھی۔

وہ سفید قلع اور دھاری دار کوٹ کے ساتھ سرخ بولگائے ہوئے تھا۔ اس کی شخصیت کا اثر بڑا عجیب تھا۔ وہ ایک وقت جو کہ بھی معلوم ہوتا تھا اور نہایت عجیبہ و غریب تھی۔

میں نے اسٹونڈی کی طرف سرفجاری رکھا لیکن اسٹونڈی پہنچ کر میں رکنا نہیں بلکہ اس سے آگے نکلا چلا گیا۔ اسٹونڈی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بڑی گھما گھمی تھی۔ یہاں ذرا سی بھی گڑبڑ کی صورت میں فوراً سیکورٹی لوگ ہماری طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

ان دنوں مکان روڈ پر اسٹونڈی سے آگے کوئی خاص تباہی نہیں تھی۔ تقریباً دو میل آگے نکلنے کے بعد ویرانی شروع ہو گئی۔ کبھی کبھی مخالف سمت سے کوئی بس آتی دکھائی دیتی اور ہمارے قریب سے گزر جاتی۔ پھر گریباہوں کی آمد و رفت میں بھی قفل واقع ہو گیا۔ حد نظر تک پہنچی ہوئی تیز چلی دھوپ میں بس تین کاروں آگے پیچھے یوں فراتے بھرتی جاری تھیں جیسے انہیں کہیں پہنچنے کی سہولت ملے ہو۔

وہ شخص بڑی دل جی سے میرے پیچھے چلا رہا تھا۔ اسے کوئی شوش نہیں تھی اور اس بات کی بھی گویا کوئی پروا نہیں تھی کہ ایک گاڑی اس کے عقب میں بھی چلی آ رہی تھی۔ اس کا کام تو بس میرے آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے آتے رہنا تھا۔ اس کے علاوہ سے دنیا کی کسی چیز سے شاید کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیس وہ کوئی سنگی یا پتھر تو نہیں جو اپنی ہی مدد سے جانے کی وجہ سے نہ جانے کیا سوچ کر میرے پیچھے لگ آیا ہو۔ لیکن یہ خیال میرے دل کو نہیں لگا۔ سنگی اور پتھر تو کبھی نا سستل سڑکی سے شاید ہی کسی کا تعاقب کرتے ہوں۔ عجیب تھی کہ وہ درود نزدیک کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دھار سمجھا جاسکتا۔ اس کے ہاتھوں بالکل مطمئن اور ہوا تھا۔

لیکن درختوں کے درمیان سے تھوڑی سی دھوپ اس پر پڑی تھی جس کی وجہ سے وہ خود ہی سری نظر میں آ گیا تھا۔

ابن بکھ غیر معمولی سا تھا۔ میں نے جب کراہے اٹھالیا۔ اس کی سوائی بھی دھات کے روپے سے کچھ زیادہ ہی تھی اور اس کے پیچھے کچھ غماصے میں تازہ نوٹے ہوئے دھانگے بھی لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جس وقت میں نے اس مظلوم شخص کو باغ کی دیوار سے اوپر ہوا میں بلند ہوتے دیکھا تھا تو اس کے کوٹ کے ٹخن بند مظلوم ہوتے تھے لیکن جب ہم نے اسے سودہ حالت میں چپٹ پڑے دیکھا تو اس کے کوٹ کے ٹخن کٹے ہوئے تھے۔ شاید کرنے وقت اس کا کوٹ کسی درخت کی شاخ میں انکا تھا جس کی وجہ سے یہ ٹخن ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے فوراً ہی پلٹ کر لاش کے کوٹ کا اٹھا حصہ الٹ کر دیکھ لیا اور میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے کوٹ میں ایک ایک ٹخن تھا جو نوٹ کر گر چکا تھا۔ اس تصدیق کے پکر میں ان دو مظلوم آدمیوں کی آواز میں بچہ اور قریب آگئی تھیں۔ تاہم درختوں کی قطاہوں کے درمیان وہ کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ ہم تینوں دیوار پہلانگ کر تیزی سے نوٹی کی گاڑی کے قریب جا پہنچے۔

میں نے پرسکون جگہ میں کہا۔ ”تم نے صورت حال کو سمجھنے میں تھوڑی سی غلطی کی۔ میں اس شخص کو زندہ سلامت پکڑا جاتا تھا۔“

”مجھے آپ کے کہنے سے پہلے ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو چکا ہے سر!“ نوٹی کے نیچے میں شرمندگی تھی۔ ”میں نے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی حیرت انگیز بھرتی کی وجہ سے میرا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔“

”تم کچھ دیر کے لئے میری بھرتی ملاتی کر کے ابھی واپسی میری جہاز میں آؤ۔“ میں نے سخت شیورٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”غیرتھیں یاد ہوئی کیا ہو گا؟“

”اتنی دیر نظر کے سامنے رہا ہے سربادہ تو بڑا اہل چند سینڈیہ ہی اڑ رہا ہو گیا تھا۔“ نوٹی مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد ہم اپنی گاڑیوں میں بٹھ کر تیزی سے واپس روانہ ہو گئے۔ اس وقت باغ میں دیوار کے عقب میں کوئی ایسی آواز نہیں ابھری تھی کہ سے اندازہ ہو تاکہ لاش دریافت کر لی گئی ہے۔ میں ممکن تھا لاش مدت دیر تک دریافت نہ ہو پائی۔

چند لمبے بعد میں نے نوٹی کو آگے نکل جانے دیا اور خود را بالکل کم کر لی۔ مجھے امید تو کم ہی تھی کہ گاڑی کے نمبر کی مدد اس مختصر الخود شخص کے بارے میں کوئی سراغ میرا آئے گا۔ چیک کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ ٹخن میں نے رکھ لیا تھا۔ جانے کیوں وہ مجھے بکھرے معمولی سا تھا اور میں چشم تصور سے کی کو شش کر رہا تھا کہ اس بھول سے شخص کے ویلے ڈھالے کو

کہیں زیادہ اونچائی تک ہوا میں بلند ہوا لیکن اسی لمحے نوٹی کے دیوار کی گولی اسے چاٹ گئی۔ میں نوٹی کو رد کر بھی نہ سکا۔ مجھے نوٹی کو یہ بتانے کی سلت ہی نہ تھی کہ میں اس شخص کو زندہ سلامت پکڑا جاتا ہوں۔ نوٹی سے بھی غار شاید اضطراری حالت میں ہوا تھا۔ اسے غالباً یہی احساس ہوا تھا کہ وہ شخص ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

دیوار سے کچھ بلند پر ہوا میں ہی میں نے اس شخص کے مختصر وجود کو ڈھیل پڑتے دیکھا جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ مجھے اس وقت یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا کہ گولی اسے کہاں لگی ہے لیکن یہ اندازہ سر حال ہو گیا کہ وہ اس کے لئے ملک ثابت ہو چکی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دیوار کے عقب میں باغ کے اندر دھپ سے اس کے گرنے کی آواز سنی۔

میں نے کاری کاٹ سے نکل کر نوٹی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کار کے قریب ایک گھٹنے کے بل کھڑا تھا۔ دیوار ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ شیر دیوار کے گاڑی کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ میں نے انہیں اشارہ کیا۔ دونوں نے دیوار جیروں میں رکھ لئے اور ہم نے ایک ساتھ دیوار پہلانگ کی۔

اندھ قطار در قطار درختوں کے درمیان کچی زمین پر وہ چپٹ پڑا تھا۔ سودہ حالت میں اس کے چہرے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا سوائے اس کے کہ نیم وا آنکھیں اب مکمل بند ہو گئی تھیں۔ اس کے دھاری دار کوٹ کا ٹخن مکلا تھا اور ہیلوں کے قریب سے اس کی سفید قمیص خون سے سرخ ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کی بغیر دیکھی اور نوٹی نے ناک کے سامنے ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ نہیں قسم پکی تھی۔ زندگی میں وہ جتنا پھر پڑا تھا صحنے میں بھی اس نے اتنی ہی پھرتی دکھائی تھی۔

میں نے اور نوٹی نے پھرتی سے اس کی جیروں کی تلاشی لی۔ اس کے کوٹ کی جیروں سے صرف ایک پرس اور ایک کھلے دار چاقو برآمد ہوا۔ پرس میں صرف رقم تھی۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی۔ میں نے دونوں چیزیں واپس اس کی جیب میں ڈال دیں۔

باغ میں قریب ہی کہیں سے دو آدمیوں کے تیز چز ہونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو کہ یہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ شاید وہ باغ کے رکھالے تھے جو کسی بات پر بحث کرتے ہوئے دوسرے سے آڑے تھے۔ کوئی اچھی بات نہیں تھی کہ ہمیں کسی لاش کے سرہانے بیٹھا ہوا دیکھا جاتا۔ اور لاش بھی ایک ایسے شخص کی جسے لاش میں تبدیل کرنے کے ذمے دار ہم ہی تھے۔

میں نے نوٹی اور شیر کی طرف اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر دیوار کی طرف لپکے لیکن اسی لمحے میری نظر ایک قدرے چمکی سی چیز پر پڑی۔ یہ دھات کے روپے سے بھی کچھ زیادہ بیل کا ایک ٹخن تھا جس

اپنی راجست اور خوش پوشی کی وجہ سے دور دور سے ہی نمایاں نظر آتا تھا لیکن شاید وہ اکثر منظر بھی رہتا تھا۔ گزشتہ روز سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں بھی میں نے جب اسے اس کی دوست اور ایک دولت مند خاتون کا ظہور عام کے ساتھ دیکھا تھا تب بھی وہ مجھے کچھ منظر ہی معلوم ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تخلیق کار قسم کے لوگوں پر اس وقت قدرے اضطراب اور یحسان طاری ہوتا ہے جب وہ کچھ تخلیق کر رہے ہوں لیکن وہ شاید ہر وقت ہی تخلیقی موزاں رہتا تھا۔

چند لمحے بعد بالآخر ان کے درمیان بحث شاید ختم ہو گئی۔ اس وقت تک سب سے آگے والی آدمی بس نے رنگنا شروع کر دیا تھا۔ مگر اور قدرے مفلوک الحالی شخص مگر تاہم اس کی طرف لپکا اور جلدی سے بس میں چڑھ گیا۔ نصیر نواز ایک لمحے دیکھ کر دبا ہوا ہوا اس نے شاید قدرے سکون محسوس کرتے ہوئے سر اٹھا کر کمری سانس لی اور کیے ہی میں آگے بڑھ گیا۔ پچھلے ذرا آگے خیب میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ وہ پھنسے ہوئے ٹریفک سے آگے گاڑی سڑک پر لا کر اطمینان سے روانہ ہو سکا تھا۔

اس نے ایسا ہی کیا اور چند لمحے بعد میری نظر سے اوچھل ہو گیا۔ اس کی گاڑی نے مال کی فوٹو کھینچی تھی۔ خاص متنی گاڑیوں میں سے ایک۔ مگر نصیر نواز ایک کامیاب فلمی مصنف تھا لیکن میرا خیال تھا کہ شخص کمالی نویسی کے بل بوتے پر اس کے یہ فحاشیات نہیں ہو سکتے تھے۔ شاید اس کی دولت مند دوست کی عنایات بھی شامل حال تھیں۔ آخر وہ اس کی فلم بھی تو فحاش کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کہاں کہاں اس کا فحاش کام میں آتا تھا۔

میں اسٹوڈیو پہنچا تو چھوٹے سے کپڑوں میں نصیر نواز کی گاڑی بھی کھڑی نظر آئی۔ میں گاڑی پارک کر کے اپنے آفس میں چلا گیا۔ اس آفس میں اب مبینہ بددیہی پورا پکر لگتا تھا لیکن ایک کرا میرے لئے مخصوص تھا۔ میں اس میں جانے کے بجائے آٹان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ خون پر کوئی نمبر لکھا کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ریسپور دیکھ دیا اور مودبانہ انداز میں اٹھ کر مصانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سر! میں آپ سے ہی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

اس کے متقابل شلوار قمیض میں ایک اوجڑ مرمر فریبی ماسک سا شخص بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی مودبانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چہرے پر مونی مونی مونی کی موجودگی کے باوجود بچنے کا سا بھروسہ تھا۔

آٹان اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سر! یہ عہد الوادہ ایک میٹر اسپلاز ہے۔ میں نے اس خیال سے اسے بلوایا تھا کہ شاید آپ براہ راست اس سے بات کرنا پسند کریں۔ میں آپ سے پہلے آفس کا نمبر ہی ملا رہا تھا۔"

اس وقت میں اسٹوڈیو سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا جب ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ دیر کے لئے سڑک کے کنارے گاڑی روک دینی پڑی۔ سڑک کے درمیان کوئی رکاوٹ تھی نہیں تھی اور ٹریفک دو طرفہ تھا۔ یہاں سے کچھ آگے تک ہر قسم کی گاڑیوں کی بہت آمدورفت رہتی تھی اور بد قسمتی کی وجہ سے کبھی کبھار ٹریفک جام ہو جاتا تھا۔

میرے ہاتھ ہاتھ پر خیب میں غاصا طول و عرض گزار تھا جس میں گندہ پانی کھڑا تھا۔ اسی گڑھے سے شعل ایک جڑ بولتا تھا۔ جس پر بہت براہیم پلٹ چھپر ڈال کر کسی نے عوامی قسم کا ریسٹوران کھول رکھا تھا جس کی بے ہنگم کرسیاں میری سڑک کے کنارے تک تکی ہوئی تھیں۔

میرے آگے شان سے آنے والی ایک بس کھڑی تھی جس کا ڈرائیور مسلسل پریشان رہا تھا کہ کوئی اس کی بھانک توڑ پر کان نہیں دھر رہا تھا۔ اس سے آگے ایک آدھ کار، ایک آدھ ہانگ، ایک ٹھیلہ، مائٹوں سے لدی ہوئی ایک بہت بڑی گھوڑا آؤٹ، چند سائیکل سوار اور چند اسکوٹر سوار فرض کے ہر طرح کی سواہیاں چھوڑ رہے تھے۔

سب سے آگے ایک آدمی بس تھی جس میں کوئی نہایت اطمینان سے چڑھ رہا تھا اور کوئی اتر رہا تھا جبکہ کنڈکٹر زانے کے قریب کھڑا چند برقع پوش رقبوں سے جھکوا کر رہا تھا۔ انہیں گردو پیش کی گویا کوئی پروا نہیں تھی۔ صبح طور پر کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ٹریفک پھنسا ہوا کہاں ہے۔

میرا ذہن اس وقت کئی معاملات میں الجھا ہوا تھا اس لئے میں مبرور سکون سے ٹریفک رواں ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران میری نظر دو آدمیوں پر پڑی جو پچھلے دے ریسٹوران سے نکلے تھے ان میں سے ایک کا طیلہ ایسا تھا کہ اس کا اس قسم کے ریسٹوران میں جانا کچھ عجیب سا ہی لگ رہا تھا۔ وہ پیش قیامت سوٹ میں ڈھارور اس کے سر سے پاؤں تک آسٹوڈیو کی چمک نظر آ رہی تھی۔

وہ قدرے ترچھا ہوا تو فاصلہ کافی ہونے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ معروف فلمی مصنف نصیر نواز تھا۔ اس کے ساتھ پچھلے سے باہر آنے والا شخص ہر لحاظ سے اس سے بہت مختلف تھا۔ وہ مگر اور مفلوک الحال تھا۔ نہایت معمولی سی حسن آلود نوار قمیض، پیروں میں کیپس کے گرد آلود جوتے، سر پر پرائیوی سٹیا جیکپ اور آنکھوں پر سوئے سوئے عہد سول کی عینک اس کی ٹیڈی بڑی ہوئی تھی۔

ان کے درمیان کسی مسئلے پر بحث و جھگڑا گویا آخری مرحلے میں تھی۔ مگر شخص بے بسی تھیرا انداز میں بار بار دونوں ہاتھ بھلا بھلا کر کچھ کہ رہا تھا۔ نصیر نواز کے انداز سے ظاہر تھا جیسے وہ اس دانت میں دبا ہوا لیکن گردو پیش کا خیال کرتے ہوئے خود پر نیند کر رہا ہو۔ کچھ منظر بھی معلوم ہوا تھا۔ بار بار غیر محسوس انداز سے اوپر اوپر جھک رہا تھا۔

جاتے ہیں۔

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "ہمارے بیٹے کو یا ہم کو کچھ زیادہ اچھی نظر سے دیکھا جاتا سرہی! ایکسٹرا گر گر کو کوئی عزت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا لیکن جناب! وہ کس کس ہمارے بھی دوسرے لوگوں جیسے ہی ہیں۔ ہمارے بھی مسائل ہیں۔ ہمارے بھی جذبات ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اُمی قد میں 'ایجنٹس ہڈے' چھوٹی چھوٹی کینکریاں پڑی پڑی ضرور تھیں سب کچھ دوسروں ہی کا طرح ہے۔ ہم بھی بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی کمانے کے چکر میں صبح شام سرگرداں رہتے ہیں۔"

اس نے بے چینی سے آرام دہ کرسی پر چلو دیا۔ ”اب اگر میں کسی سے کہتا ہوں کہ فلاسفہ اچھی لڑکی تھی تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ کم از کم دل میں یقین نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں کہتا جی کہ اہل سائنس اچھے ہیں۔ بھولی تھی اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں تھا اسے تو کچھ بتایا نہیں تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی کوئی اچھا ہو سکتا ہے؟ دلدل میں پھنسے ہوئے لوگ بھی تو اچھے کہتے ہیں نا؟ یہ سارا نظریہ ہے۔ آپ چاہے اس سے متفق ہوں۔“

وہ اب بسا کی طرح ایک ایک کر نہیں بول رہا تھا۔ جذبات
سے اس کے لہجوں میں روانی آگئی تھی وہ کسی مسخ نہ تھی۔ کمزور
کر مجھے فٹافٹ سے بغیر کسی غرض کے ہر روز تھی کوئی یقین نہیں
کرے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں جی کہ ہمارے ماحول میں تو ایسے جہ
پنپ ہی نہیں سکتے۔ میں اب اس عمر میں اس سے کیا غرض رکھ
تی۔ بڑے بڑے بچے ہیں۔ بیس سال ہو گئے ہیں انہی عمر میں وہ
کھاتے ہوئے بہت کچھ دیکھ لیا ہے جی۔ بہت کچھ برکت
ہے۔ اب دل بھہ سا گیا ہے۔ بس وہ لڑکی ابھی لگتی تھی۔ اس
نے دل میں شفقت ہی تھی۔ اس کی مدد کرنے کوئی چاہتا تھا۔

جی بات ہے، ہم جیسے لوگ کسی کی کیا درکرتے ہیں؟
 "مختصر یہ کہ اس کے بارے میں آپ جاننے کچھ نہیں تھے
 میں نے دمجے لیے میں کہا۔"

”جی ہاں۔ اب یہی سوچ کر تو حیرت ہوتی ہے“ اس نے
 جتنی سے سر ہلایا۔ ”حالانکہ ہمارا زیادہ تر واسطہ لڑکیوں سے نہیں
 کی حد تک ہی رہتا ہے لیکن بھر بھی ہم زیادہ تر لڑکیوں کے پوچھ
 شجر و تنب سے واقف ہوتے ہیں۔ کون کمال سے آتی ہے، کون
 ماں کون ہے۔۔۔ کون بال بچہ دار ہے اور کون چھڑی چھانٹ
 سب ہمیں زبانی یاد ہوتا ہے لیکن نشاط کے بارے میں بھر
 معلوم ہے کہ وہ چیلے کسی ہوٹل یا کپ رہاں میں رہتی تھی
 کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ ہمیں اسٹوڈیو میں مجھ سے ٹکرائی
 ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں
 سے اسے جانتا ہوں۔ اس نے پہلی ملاقات میں ہی صاف بتا
 کہ وہ اتنی تو عبور و فن بننے کے لئے کئی لیکن اس نے بتا
 لئے ہر اور اسے وہ ایک شرا کے طور پر بھی کام کرنے کے۔

تعارف ہونے پر عبدالواحد نے دوبارہ مجھے سلام کیا اور کچھ زیادہ سی انکساری سے بیٹھنے کوئے صاف فرمایا۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر کویشتر زبانِ علق 'خاتہ' خدای عایت ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اب تک جس قصص نے بھی بات کی تھی 'اے ایک اچھا آدمی ہی قرار دیا خاتہ اور وہ جہے مے سے حقیقتاً اچھا آدمی ہی مطلق ہوتا تھا۔

میں نے اسے بچنے کا اشارہ کیا اور خود بھی آفاق کے مقابل
بڑھ گیا۔ آفاق کے سامنے قہم کا سرکرت رکھا ہوا تھا۔ وہ اس نے
ایک طرف کھسکا دیا اور یوں میرے قدمے جگ گیا جیسے کوئی اہم
کاغذ شمع ہو لے والی ہو۔

”اوہ۔۔۔ تم تو مت سنجیدہ ہو گئے اتفاق! میں نے تو خود بخود مار لیجے میں کہا۔“ میں یہاں کوئی میٹنگ طلب کرنے پر گرج نہیں آیا۔ میں تو ایک کام سے اس علاقے میں آیا ہوا تھا۔ سوچا زار دفتر میں بھی جھانکنا چاہوں۔۔۔ ہو سکے تو اچھی سی کافی پلاؤ۔“

آفاق نے فخر کام پر رہنمائی لڑکی کو کافی بھروسہ کی کیا ہے
 کی۔ وہ رہنمائی رکھ چکا تو میں نے عبدالواحد کی طرف دیکھتے ہوئے
 کہا۔ ”وہ مجھے امید نہیں ہے کہ معتزل نظام کے بارے میں کوئی
 کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے بارے میں
 آپ بھی کوئی خاص بات نہیں بتا سکتے۔“

ابن جناب! تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ "وہ ہنگامہ
آئینہ مجھے میں ہوا۔" جب وہ ذمہ جی اور اس سے واسطہ رکھتا تھا
کبھی اسے کپڑے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ بالکل کمال
کتاب گئی تھی وہ۔ ہر وقت ہنسی مسکراتی ہوئی۔ اور اپنی جھول
چھوٹی ہانسی بھی سب کو تار سینے والی۔ لیکن اب احساس ہو
ہے کہ صحیح معنوں میں ہم تو اس کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں
جاتے تھے۔"

نظام کے بارے میں کم و بیش یہی بات اس کی عدم مینٹ
نے کسی حقیقی مفیدالواد بات جاری رکھنے ہوئے بولا۔ ”درحقیقت
اسی وجہ سے میں زیادہ پریشان ہوں۔ کون اس بات پر یقین کرے
کہ جن لوگوں سے چہرے میں گھٹنے نظام کا واسطہ پڑا تھا وہ اس
بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“ اس کے لیے سے واقعی پریشان
بھٹک رہی تھی۔

”میں اس بات پر یقین کر چکا ہوں عبدالواحد!“ میں
 لا منت سے کہا۔ ”ہمارے معاشرے میں جہاں اور بہت سے
 مسائل پیدا ہو گئے ہیں وہاں ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے
 ہاں لوگ ایک دوسرے کا اعتبار کھوئے جا رہے ہیں۔ کوئی کس
 یقین ہی نہیں کرتا۔ ہر کوئی دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہے اور ہر
 کوئی دوسرے کی بات میں ہیرا پھری نظر آتی ہے“

”اللہ آپ کی عمر دوڑا کرے گی۔ آپ نے میرے بارے
 میں کہا: ”عبدالواحد جلدی سے بولا۔“ ایسے میں ان لوگوں

میں آئے ہوئے ہیں تو میں نے سوچا، چل کر نیاز حاصل کر دو۔
اشٹوری میں آپ کی آمد بھی ایک خبر ہوئی ہے۔ اس نے سنا لے
کے بعد اب تک میرا ہاتھ تھا ہوا تھا۔

"بس۔ محبت ہے آپ کی۔ اور دوسرے لوگوں کی۔ میں
نے سکرانے ہوئے ملاقت سے کہا، تشریف رکھیے گا۔"
دوسرے سے کہی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا بلکہ ڈبیر ہو گیا۔ پھر وہ غیر
کسی بات کے بلکہ ساقیہ لگا کر بولا۔ "مجھے جیسے لوگوں کو تو آپ جیسے
لوگوں سے دیے بھی ملتے رہتا چاہئے کیا چاہ کب آپ لوگوں کی نظر
کرم ہو اور کب آپ میں خدمت کا موقع دیں۔"

"نظر کرم۔ اور خدمت کا موقع۔" اتفاقاً اپنے سے
انداز میں نہیں کر بولا۔ "اب کی بات تو میں نہیں کر سکتا لیکن کچھ
عرصہ پہلے تک کم از کم مجھے جیسے آدمیوں کے لئے تو سارے پاس
دقت نہیں ہوا تھا۔ یاد ہے میں نے پچھلے سال تمہارے گھر کے
کچن چکر لگائے تھے۔ حالانکہ جیکبٹ بھی میرے پاس تھا۔ صرف
اسکریں بچے اور ڈائیکٹری کی بات تھی اور میں مکمل طور پر برجنز
کے کڑیٹ پر تمہارا نام دینے کو تیار تھا۔ بس میرے پاس پیسے ذرا
کم تھے۔ تمہارے پاس بات کرنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ اتفاقاً
نے اپنے لمبے میں زیادہ خطر جھلکے نہیں دیا تھا۔ وہ کافی حد تک
ملاقت کے ساتھ ہی گویا کسی شخص کو محض کوئی بھلی بات یاد
دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ضمیر نواز ذرا بھی شرمندہ پارشان ہوئے بغیر ٹھہرے ٹھہرے
لمبے میں بولا۔ "بات کرنے کا وقت تو میرے پاس اب بھی نہیں ہے
میری جان! لیکن تم دراصل بات کو سمجھتے نہیں ہو اسی لئے ہر
تھوڑے عرصے بعد تم پر نوازل آجاتا ہے۔ ابھی اس وقت میں ہر وہ
چیز لکھ رہا تھا جس کے لئے مجھے پہلے ہی کہہ چکے تھے۔ کوڈاکرٹ لکھ
رہا تھا میں۔ ہر ایک سے پیسے بکڑے ہوئے تھے میں نے۔ لوگ
میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ چل سو چل کا زمانہ تھا۔ برا بھلا
گائے کے لئے "اشٹوری" لکھ رہا تھا میں۔ میرے پاس واقعی دقت
نہیں تھا۔ میں تم جیسے شریف آدمی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔
ورنہ ایسی کیا بات تھی میری جان! اچھا پیسے کہا زیادہ۔ اس سے کیا
فرق پڑتا؟ اب میں کم کام کرتا ہوں۔ سخر اکرا ہوں۔ اسکرٹ پر
گاہک لگاتا ہوں اور لمبے پیسے لیتا ہوں۔ اب میں چالوکام نہیں کرتا۔
خاص خاص پارٹیوں کے لئے کرتا ہوں اور خاص خاص پارٹیاں ہی
اصل میں میرا کام الفونڈ کر سکتی ہیں۔ اللہ کا پاؤ کرم ہے۔ اب میں
آسودہ ہوں۔ اب میں آنکھیں بند کر کے کٹرکٹ سامی نہیں کرتا۔
اب تو صرف چھوٹی صاحب جیسے لوگوں کے لئے کام کرنے کا سوچا
ہوتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ جب خاموش ہوا تھا تو
یہ کہہ کر کہہ کر اور تین آدمی مطوم ہوا تھا لیکن میں نے اب پہلی مرتبہ
اسے صحیح معنوں میں بولنے سنا تو اندازہ ہوا کہ وہ زبردست لفظ اور
چرب زبان تھا۔

اتفاق نے اس موضوع کو آگے نہیں بڑھایا۔ بحث نہیں

ہے۔" اس کے کسی سے کسی خاص تعلق کا اندازہ نہیں ہوا ابھی
آپ کو؟ میں نے بظاہر سرسری سے لمبے میں پوچھا۔
"جی نہیں۔ میں نے خود اس بل پر دست سوچا لیکن میں کسی
نیچے پر نہیں پہنچ سکا کسی! وہ دورے بے کسی سے سہلے ہوتے
تھے۔ وہ ہر ایک سے ہی نہیں کر لیتی تھی لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ
کسی سے اس کا تعلق خاص تھا یا نہیں۔ ویسے۔ ایک بات میں
نے چند دن پہلے محسوس کی تھی لیکن۔ شاید وہ میرا دوسرا ہی ہو۔"
وہ تھوڑے لمبے سے عالم میں خاموش ہو گیا۔ پھر میرے کچھ کہنے سے
پہلے خود ہی بولا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ بار بار مجھے کچھ
بتانے یا شاید مجھ سے کچھ پوچھنے کا ارادہ ہوا جی ہو اور پھر تو وہ جی
ہو۔ میں ان دنوں اپنے کچھ بیکول میں پریشان تھا۔ اس کی طرف
زیادہ توجہ نہیں دے سکا اور شاید اسی لئے وہ بھی کہتے کہتے نہ گئی کہ
میں تو پہلے ہی اپنے بیکول میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہ خیال شاید اب
زندگی بھر کانٹے کی طرح ذہن میں جھٹکنا رہے کہ اگر میں نے اسے
کر دیا ہوتا تو ذرا اصرار کیا ہوتا تو شاید کوئی کام کی بات مطوم ہو
جاتی۔"

کافی آہستہ تھی۔ کافی پینے کے دوران بالکل ہی خاموشی چھائی
رہی۔ ہم تینوں ہی گویا اپنی اپنی جگہ خیالوں میں اٹھے ہوئے تھے۔
دفعتاً اکثر کام کا بڑا سہما اتفاقاً نے دیکھو اٹھا کر بات سن کر ہوا تو
چپن پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سر ضمیر نواز آیا ہے۔ کیا
اسے یہیں بلواؤں؟"
"ہاں۔ بلواؤں" میں نے بلا آواز کہا۔

اس نے دیکھتے دیکھتے کوہدایت کی اور دیکھو رکھ کر چنپی آواز
میں بولا "اس سے پہلے تو یہ کبھی یہیں نہیں آیا۔ آج کیسے آیا۔"
"ہر کام کا کوئی نہ کوئی پھلان ہوتا ہے۔" میں نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ضمیر نواز۔ آواز بلند
سلام کرتے ہوئے اندر چلا گیا۔ میں نے اندر اس کا استقبال کیا اور
وہ عید الوادہ کی طرح جب کہ مجھ سے ملا حالانکہ وہ مجھے سمجھنے والا
آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"آپ سے ملنے کا کافی دنوں سے اشتیاق تھا۔" وہ گرجوٹھی
سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "گزرز رات آپ سے تعارف ہوا ابھی
نوسید صاحب کے ہاں پارٹی کی ہر جگہ کے دوران ہوا۔ اور پھر
وہ اس لڑکی والا ناگوار واقعہ پیش آیا۔ کیا نام تھا اس کا۔" اس
نے گویا اپنی یادداشت کا دروازہ کھٹکاتے کے لئے کینٹی پرائنگی
باری۔

"نشا؟" میں نے پرسکون لمبے میں کہا۔

"ہاں۔ نشا۔ سو ٹھیک پہل سے اس بے چارہ کی لاش
برآمد ہونے کے بعد تو پارٹی چلی ہو کر رہ گئی۔ آپ سے مزید بات
جیت کا شرف ہی حاصل نہیں ہو سکا۔ اب بچا چلا کہ آپ اسٹوڈیو

ایک طویل کش لے کر نصیر نواز میری طرف دیکھتے ہو۔
 "سکرایا۔" ہر حال میرا اندازہ درست رہا تھا۔ آپ اس لڑکی کا
 کی موت میں دلچسپی لے رہے ہیں؟"
 "ہائیل نہیں لٹلا" میں نے تصحیح کی "اور میں اس کی سو
 میں نہیں اس کے قتل میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ نصیر نواز صاحب
 اس کے چہرے پر دراصل فریادِ رگم تھی۔ اور فریادِ چہرے میر
 لاشوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"لیکن چہرہ ہی صاحب! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔۔۔!۔
 کا دہار پچھلے ہوئے ہیں آپ کے۔۔۔ کتنی مصوفیت رہتی ہوگی آپ
 کو۔۔۔ آپ۔۔۔ ایسے چھوٹے موٹے معاملات میں پولیس والوں
 طرح تفتیش کے لئے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟" اس کے لمبے
 حیرت بھی کبھی سنا کش بھی، جنس بھی اور بے چینی بھی۔ لیکن
 اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا جذبہ حقیقی تھا۔

"میرے کا دہار مشینی انداز میں چل رہے ہیں۔۔۔ میں۔
 کہا۔" میں جاؤں تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے اور نہ چاہوں
 چہرے میں گھٹنے بھی مصوفہ رہ سکتا ہوں۔"

"خیر جی۔۔۔ آپ کا جذبہ لائقِ تحسین ہے۔" اس۔
 امریکیوں والے انداز میں کندھے اچکاتے، پھر گویا موضوع بد
 ہوئے بولا۔ "کل آپ نے وہ بھی بڑا کمال کیا۔۔۔ چارے؟
 صاحب کو ایک ہی گھنٹے میں زمین چٹا دی۔ بے چارے کا
 رعب تھا اسٹوڈیو زمین۔۔۔ بچ بچ گا کارزن سمجھا جاتا تھا۔"
 "بہت بے وقوف سا آدمی ہے۔" میں نے بے پروائی۔

کہا۔ "بے وقوف نہیں ہے جناب! اس بے چارے کے انداز
 ملا لٹھے آپ کے بارے میں۔" نصیر نواز کے لمبے میں ایک بار
 سنا کش جھلک اٹھی۔ وہ مجھ سے ساڑھن خور تھا لیکن اس کے اند
 میں غلوں نہیں تھا۔ وہ درحقیقت بڑی ہوشیاری سے یہ اند
 کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھ پر خوشامد کا ہوا اثر انداز ہوتا
 یا نہیں۔ میں نے اپنا رویہ بہم ہی رکھا۔ میں اسے کوئی بھی
 اندازہ لگانے کا زیادہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔

کافی ختم کر کے میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھنے کا ارادہ کر
 لیکن اسی لمحے اتفاق کا اعتراف ہوا کہ ریشپنسٹ نے اطلاع دی کہ
 فون ہے۔ میں نے دیں بیٹھے بیٹھے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف
 تھا۔

"سر! اس سرخ شیورلٹ کی فہرلیٹ جعلی تھی۔" اس
 اطلاع دی۔ "تاہم گاڑی چوری کی تھی۔"
 "مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔" میں نے کمری سانس لے کر کہا
 "۔۔۔ ایس کی کوئی بات نہیں۔ انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں
 ہوتا۔" میں نے سلسلہ متعلقہ کر دیا۔ میرے آدھیل
 کار کوئی قتل پیش تھی۔ کم سے کم وقت میں وہ مطلوبہ معلو
 حاصل کر لیتے تھے۔

چیزی بلکہ اس کے لئے کافی جگہ تھی۔ نصیر نواز نے عبدالواحد
 ایکسٹرا پلاز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے ہاتھ
 بھی نہیں ملایا تھا بلکہ وہ گویا اسے نظری نہیں کیا تھا۔
 کافی آئی تو پائی اٹھانے سے پہلے نصیر نواز نے اپنا دھوپ کا
 پیش قیمت اور تین چہرہ اتار دیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی
 اور ان کے گرد ملتے پڑے ہوئے تھے۔ شاید کام کی زیادتی کی وجہ
 سے وہ سوناہٹ کم تھا۔

کچھ دیر غلوں کی کمانوں کی اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی
 رہیں۔ زیادہ تر نصیر نواز ہی بول رہا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ سرسری
 سے لمبے میں بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس لڑکی کی موت
 میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 "مجھے گزشتہ رات آپ کے اثرات سے ہی اندازہ ہو گیا
 تھا۔" وہ کافی کی پیالی رکھ کر اپنے پائپ میں تباہ کر بھرتے ہوئے
 بولا۔ "لمبے میں بے پروائی سی تھی۔"

"یہ تو ہی افسوسناک اطلاع دی آپ نے۔ کہ مجھے اب اپنے
 اثرات پر قابو نہیں رہا" میں نے بدستور غور لہجے میں کہا۔
 "قابو تو یقیناً ہو گا لیکن جناب! نازنے والے بھی قیامت کی
 نظر رکھتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر بے وجہ ساقطہ لگایا۔ "اور
 پھر ہم تو سب ہی اثرات کی دنیا میں ہیں۔ اسکرین پر تاثرات پیچھے
 ہیں۔ اثرات کی کمالی کھاتے ہیں۔"
 "معنوی اثرات کی۔" میں نے گویا صحیح کی۔

"جی ہاں۔ معنوی اثرات کا کاروبار کرتے کرتے اصلی
 اثرات کو پرکھنے کا بھی سبب بنتا ہے۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ وہ
 گویا کسی لڑکی کی موت کا نہیں بلکہ اس سے میرے حسین معاشقے کا
 تذکرہ کر رہا تھا۔

"تو آپ نے اندازہ لگا لیا کہ میں اس لڑکی کی موت میں دلچسپی
 لے رہا ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 "پچھل رات تو محض شبہ ہوا تھا کہ آپ دلچسپی لیں گے لیکن
 اب انہیں یہاں دیکھ کر یقین ہو گیا ہے۔" اس نے پائپ سے
 عبدالواحد کی طرف اشارہ کیا۔

"تو آپ انہیں جانتے ہیں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
 "کیوں نہیں۔ بہت پرانے ایکسٹرا پلاز ہیں یہ اسٹوڈیو کے۔"
 یہ کہتے ہوئے اس نے ایک خوبصورت لائسنس پائپ کو شعلہ
 دکھایا۔

اس لمحے عبدالواحد بھی بول اٹھا۔ "شکر ہے نصیر نواز صاحب!
 آپ نے اس خادم کو بھی پہچان لیا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا میں آپ
 کو نظری نہیں آیا۔"
 "جگہ میں نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی سب کو سلام کیا
 تھا۔ ان میں آپ بھی شامل تھے۔" نصیر نواز نے لافٹ سے کہا۔
 عبدالواحد چپ ہو گیا۔

دیکھنے کے لئے رک سکے ہوں لیکن میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی اور آفس سے نکل کھڑا ہوا۔

مال پر پہنچ کر میں نے پہلے انٹرکان میں کھانا کھا لیا پھر اپنے آفس میں تین بیٹھا۔ چند ایک دفتری کام نمٹانے کے بعد رات فرمت ہوئی تو میں نے وہ ٹیبن جیب سے نکالا جو ٹولی کے ہاتھوں مارے جانے والے اجنبی کے کٹ سے ٹوٹ کر گر ا تھا۔

ابھی میں نیپل بسپ کی دوشی میں اس کا جائزہ لینے ہی لگا تھا کہ کمرے میں کبھی کی جھنجھٹ سے مشابہ نہایت ہلکی سی آواز گونجنے لگی۔ میں نے ادھر ادھر محض تصدیق کی خاطر دیکھا ورنہ مجھے احساس ہو چکا تھا کہ آواز میرے ہاتھ میں موجود ٹیبن ہی سے ابھری ہے۔ کمرے میں کوئی کبھی موجود نہیں تھی۔

میں نے ٹیبن کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پچھلے حصے پر مجھے مسور کے دانے کے برابر ایک تھمسا اہمار نظر آیا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ تاخن سے اسے ذرا دایا تو قندوق سے ابھرنے والی معمولی سی جھنجھٹ قسم ہو گئی اور اس کی جگہ تیز سرکشی سے مشابہ ایک تیز آواز ابھری۔ یہ انداز کا مشکل نہیں تھا کہ کسی کو مخاطب کیا جا رہا تھا لیکن زبان میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

میں نے ٹیبن میز پر رکھ دیا اور تذبذب و خاموشی کے عالم میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے سین وسط میں سرخ رنگ کا جو ایک گول دھبہ تھا وہ درحقیقت نہایت ہی باریک قسم کی جالی تھی جس کے سوراخ انسانی جلد کے مساموں سے شاید ہی کچھ بڑے رہے ہوں۔

آواز زیادہ بڑھ چلائی نہیں تھی۔ جلد ہی خاموشی چھا گئی۔ میں نے ٹیبن کو الٹ کر ایک بار پھر اس نئے سے اہمار کو تاخن سے دیکھا۔ دوبارہ ذرا سا ابھر کر اپنی اصلی حالت پر واپس آ گیا۔ میں نے ایک بار پھر ٹیبن کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ آخر کار مجھے اس کے کناروں پر وہ خفیف سی گلیمر نظر آئی جو کسی جود کی نشاندہی کرتی تھی۔

میں نے میز پر سے اپنی چابیوں کا پرس اٹھایا۔ اس میں چابیوں کے ساتھ چھوٹی سونے کی کام کی چیزیں تو بڑی ہیں۔ میں نے بلیڈ کی طرح تیز لیکن نہایت مضبوط ایک نئے سے چاقو کے ذریعے تھوڑی سی کوشش کی اور آخر کار وہ ٹیبن ڈیا کی طرح مکمل مٹ گیا۔ اس کے اندر بال سے زیادہ باریک نادرل اور خود بخود پتی پڑوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ انگریزوں کی جڑی بھی موجود تھی۔ میں نے اس کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا۔ میری چھٹی جس نے ابتدائی میں مجھے احساس دلا دیا تھا کہ وہ محض کٹ کا ٹیبن نہیں ہے۔ وہ بہت عمدہ قسم کا ٹرانسپیر تھا۔ ٹرانسپیر ہمارے پاس بھی تھے لیکن انہیں اور اتنے کم حجم کا ٹرانسپیر ہم آج تک بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے حالانکہ رسائی ہماری بھی بہت دور دور تک تھی۔ حجم کم ہونے کے باوجود اس کا وزن کارخانہ ساز سے معلوم ہوا تھا۔

میں ریلوے کی چیز پر تقریباً نیم دراز ہو گیا اور میز پر رکھے

نصیر نواز کافی قسم کے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب اجازت ہے۔" پھر وہ آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں "آفاق! میری جان! اتم جب بھی میری ضرورت محسوس کرو" رف ایک فون کر کے مجھے بلا سکتے ہو۔" بڑے اسٹائل سے اس پندروپ کا چشمہ اٹھا کر ایک پر ہتیا اور رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمبے خاموشی رہی پھر میں نے آفاق سے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں نصیر کیسا آدمی ہے؟"

"میرا اس سے واسطہ کم رہا ہے۔ میں اسے زیادہ سمجھ نہیں سکتا۔" آفاق غصے غصے لہجے میں بولا "تاہم میرا خیال ہے کہ یہ نالگوں میں سے ہے جو دنیا میں لامحدود ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آگے جانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ کوئی بھی دم اٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی کوئی اخلاقیات یا اصول نہیں ہوتے۔ بس اپنا کام نکالنا ان کے لئے ہر چیز سے مقدم ہوتا ہے۔ ہمارا تعلیم سید بھی اسی کے درجے کا مصنف ہے بلکہ اس کی بعض کتابیں اس سے بھی بہتر رہی ہیں اور اس نے اکثر و بیشتر نظروں کو ایک نیا ٹریڈ دینے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ شریف، سلجھا ہوا اور قاعدہ پسند آدمی ہے اس لئے وہ اس جتنا دولت مند آدمی نہیں ہے۔ وہ اپنے اسٹائل سے مصنف لگتا ہے۔ نصیر نواز نہ جانے کیوں مجھے رائٹر نہیں لگتا۔ کوئی تیز طرا اور شاطر قسم کا بڑا سن من لگتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تیار سازی رائے اس کے بارے میں! چینی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر کبھی وہ مجھے آپ کے کسی بھی پروجیکٹ کے لئے کارآمد نظر آیا تو میں اس کے پاس ضرور چلا جاؤں گا کیونکہ یہاں میں آپ کے مفادات کی نگرانی کے لئے بیٹھا ہوں۔ ذاتی پسند اور نا پسند کو مقدم سمجھنے کے لئے نہیں۔" آفاق بلا تاہل بولا۔

"اچھی کوئی بات نہیں آفاق ڈیر! میں نے مانتے سے کہا کہ میرے مفادات کے سلسلے میں تم اپنے آپ کو اتنا پابند ہرگز مت سمجھو۔ کہیں اپنی پسند اور نا پسند کو بھی معقول حد تک اہمیت دینے کی آزادی ہے۔ آخر تم ایک معقول آدمی ہو۔ ظاہر ہے تمہاری ذاتی پسند اور نا پسند اتنی ناقابل معقول نہیں ہوگی۔"

"یہ شکر ہے سر! یہ آپ کی مدام شامی بھی ہے اور کشادہ دلی بھی۔" آفاق کے لہجے میں حقیقی ممنونیت تھی۔

عبدالواحد اٹھتے ہوئے بولا۔ "سری! اچھے اب اجازت۔"

آپ سے مل کر طبیعت پڑی خوش ہوئی ہے سری! بہت مدت بعد ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی ہے جس کا دل سنا ہے سنا۔"

"جتنی آج تو شاید میرے لئے اپنی تعریفیں ہی تعریفیں بننے کا ملکا ہے۔" میں نے حیرت منانہ طور پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

عبدالواحد نہایت اگھاری سے ایک بار پھر جھک کر اٹھا اور رخصت ہو گیا۔ آفاق نے بتایا کہ کچھ دیر بعد اسٹوڈیو کے ایک

طوبہ پر ہماری فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ میں چاہوں تو

ہے ہمارے علاوہ دوزانہ ایک نرس بھی دیکھنے کے لئے یہاں آئی ہے اور تیرے چوتھے دن ڈاکٹر صاحب بھی تاجاں بیگم کو دیکھنے آئے ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے طہانیت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تاجاں ہے کلاس؟"

"اپنے بیڈروم میں ہیں صاحب! "مرثاء نامی اس قبا نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ایک کمرے کے دروازے پر ہونے سے دھجک دی اور دروازہ کھول کر اندر بھاگتے ہوئے بڑے سرور سے لہجے میں بولی "تاجاں بیگم کچھ دیکھ کر تو کون آپ سے ملنے آئے ہیں؟"

وہ ایک نہایت صاف ستھرا کمرہ تھا۔ آرائش میں سادگی تھی مگر وہاں ضرورت کی ہر معیاری چیز موجود تھی۔ صاف ستھرے بے داغ بستر تاجاں نہایت آرام دہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں بستر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی اور کلمی رسالے اس کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ وہ اس تاجاں سے بہت خائف تھی جسے میں نے کچھ عرصہ پہلے گاؤں کی اس چھوٹی سی علیحدہ بستی باری کی حالت میں سیکھنے اپنے دیکھا تھا۔

اس کے بل جی اس وقت گھاس پھوس کی طرح الجھے ہوئے تھے۔ اب صاف ستھرے برش کے ہونے اور ریشم کی طرح چمکیلے نظر تھے۔ تھے اور بڑی خوبصورتی سے اس کی کمر گتھوں اور رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے گندی رخسار جو اس وقت دھنسنے لگے تھے اور جس پر موت کی زردی نے قدم جمائے تھے اب ان پر زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھیں جو ابوی اور مصائب کے دھو میں سے دھندلا چکی تھیں اب ان میں امید اور بے عنوان جذبوں کے ستارے جھلکانے لگے تھے۔ اس کی جوانی کسی نہ کسی حد تک لوٹنے لگی تھی۔ بہت کم عرصے میں اس کی حالت میں خاصی بہتری آگئی تھی۔ اس پر یقیناً بہت توجہ دی گئی تھی۔ بہت مہم کی ہے اسے موت کی دہلیز سے واپس لایا گیا تھا۔

اسے اتنی بہتر حالت میں دیکھ کر میرا دل ایک عجیب بے نام سی خوشی سے بھر گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ وہ بھی یکدم بے اعتباری ہو کر بہتر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "افضل! میرے چندا... میرے دوست... میرے گھر!"

الفاظ اس کے منہ سے صحیح طرح نہیں نکل رہے تھے شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کس القاب سے پکارے مجھ سے کون سا رشتہ استوار کرے۔ وہ عرصے میں مجھ سے صرف چند سال بڑی تھی اور وہ حقیقت ہمارے درمیان کوئی رشتہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس میرے گاؤں کی تھی اور میری یادوں کا ایک حصہ تھی اور جب وہ خود لب گور تھی تو میری جان بچانے کا سبب بن گئی تھی۔ بول اس کے اور میرے درمیان کوئی رشتہ نہ ہونے ہوئے بھی ان گت رشتے تھے۔

وہ کبھی غیر ملکی دھارے میں پھنسی ہوئی میرے قریب آئی تو میں

ہوئے اس زمانہ میں کہیں دیکھا رہا جیسے ابھی اس میں سے کوئی مہذب و شائستہ توازن برپا ہے اور میری تمام انجینس ہند مجھے میں دور کو لے گی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے کبھی ہی زبان سے میرے ذہن میں ان گت سوالوں کا دواخانہ کھول دیا تھا جبکہ انجینس کا ایک پینڈورا کبھی پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔

اس قسم کے زمانہ میں بہت منظم قسم کے لوگوں کے پاس ہی ہو سکتے تھے۔ وہ لوگ کون تھے اور کس پلک میں میرے پیچھے لگ چکے تھے یا آنکھ زیادہ دوردور سے نکلے والے تھے؟ یہ کونسی زبان تھی جو میں نے چند لمحے پہلے زمانہ میں پرستی تھی؟ وہ شخص کون تھا جس نے میرا قاتل کیا تھا اور فنی کے انھوں مارا کیا تھا؟

ایک تو یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا تھا کہ میں اس شخص کے بارے میں بھی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کئی قبا میں لگی؟ وہ پاکستانی بھی ہو سکتا تھا اور غیر ملکی بھی۔ کسی مخصوص قسم سے بھی ہو سکتا تھا اور وہ علی نسل کا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کی محکمہ خیر سی شخصیت کے ساتھ اس پرانی کار میں دیکھ کر زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب اس زمانہ میں کو دیکھنے اور اس پر ایک انجینی زبان میں چند الفاظ سننے کے بعد مجھے نہایت سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنا پڑا تھا بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے تشویش لاحق ہو چلی تھی۔

کسی سوال کا تو مجھے کوئی جواب نہ ملا البتہ انٹرکام کے بڑے مجھے چھٹاوا۔ دوسری طرف کی طرف سے بھی وہ خط و کتابت کی کچھ قلمیں ایک نظر دکھانے کے لئے میرے پاس بھیجنا چاہتی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اگر سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل رہا تو خود اس دافتری کام ہی کر لیا جائے۔

دافتری کام میں الجھا تو پھر شام ہی ڈھل گئی۔ مگر جا کر لباس تبدیل کر کے فریش ہو کر میں ایک بار پھر باہر نکلا۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا تھا لیکن اس میں ابھی دیر تھی۔ میں نے سوچا راستے میں تاجاں کو دیکھا چلوں کہ میرے آدمیوں نے اس کی رہائش اور علاج معالجے کا کیا بندوبست کیا ہے اور اتنے عرصے میں اس کی حالت میں کتنی بہتری ہوئی ہے۔

اس صاف ستھری بلڈنگ کی دوسری منزل پر پہنچ کر میں نے مطلوبہ فلیٹ کی بل بجائی۔ راہدار میں میں سنا تھا۔ یہ بلڈنگ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بس چند کٹھاد اور آرام دہ فلیٹوں پر مشتمل تھی جس میں سفید پوش اور تدریس آسودہ حال لوگ آباد تھے۔

دروازہ اوپر عری ایک سنجیدہ صورت عورت نے کھولا۔ وہ صاف ستھری شوٹی ساری میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک کر سوجھانے انداز میں ایک طرف کو ہٹ گئی۔ معلوم نہیں کس طرح وہ مجھے پہچانتی تھی۔

"آپ...؟" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا نام مرثاء ہے صاحب! " وہ میرا ان کا سوال سمجھتے ہوئے بولی "میں تاجاں بیگم کی خدمت کے لئے رکھا گیا

بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لئے۔
”ریڈ ذات میرا نام نہیں ہے۔“ وہ فرمایا۔

”تو پھر؟“ میں نے مادی سے پرچھا لیکن وہ سری طرف۔
کوئی جواب نہیں ملا بلکہ ہلکی سے کلک کے ساتھ رابطہ منتقل ہو گیا۔ کئی لمبے تک میں ریسیور کو گھورتا رہا۔ آخر کار مجھے یقین ہو گیا کہ اب اس سے فون کے علاوہ کوئی آواز نہیں ابھرے گی۔ میں نے آہستگی سے اسے دائیں کرپل پر رکھ دیا۔ بظاہر معمولی سے انداز میں شروع ہونے والے واقعات جھلک ہوتے جا رہے تھے۔

اپنی کے افوا کے سلسلے میں سکوت کچھ ٹوٹا تو تھالین بات اور ادا الیہ علی تھی۔ اس شخص نے یہ تو بتایا تھا کہ ریڈ ذات اس کا نام یا عرفیت نہیں تھی لیکن اگر یہ کسی عقیم کا نام تھا تو اس کی نوعیت۔ کس قسم کی تھی اور اپنی کو افوا کرنے میں ان کی کیا غرض پوشیدہ تھی۔ ان باتوں کا کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا اور کیا مجھے اس سلسلے میں دلچسپی لینے سے باز رکھنا ان کی نظر میں اتنا ضروری تھا؟

آخر کار میں نے ان سوالوں پر غور کرنے کی نیت سوچا تاہم سب کچھ ذہن سے جھٹک کر میں سو گیا۔

سوئے تھی اگر اچانک آنکھ کھل جائے تو انسان کو فوری طور پر توجہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ کتنی دیر سو رہا ہے۔ سوئے سوئے پکایا ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ جیسے اچانک کسی مشین کا سوچ آن ہو جائے۔ وہ جس درندہ میں موجود ہوتی ہے جو فینڈ میں بھی انیس خطرے سے خبردار کر دیتی ہے اور کوئی کتنا ہی دیر فون ان کے قریب پہنچے وہ عملاً ہڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ وہ جس کسی نہ کسی حد تک مجھے میں بھی موجود تھی۔ اس جس نے گویا مجھے سوئے میں اطلاع دی تھی کہ کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میرے حواس یک لخت بیدار ہو گئے تھے لیکن تب بھی کسی نہ کسی حد تک تاخیر ہو چکی تھی۔ نہایت ہلکی سی تک کی آواز کے ساتھ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی اور غائب بلب کی مدھم اور رنگین روشنی گویا معدوم ہو گئی۔

سب سے پہلے میری نظر سرخ پوروی کے قریب کھڑے ہوئے شخص پر پڑی۔ وہ سیاہ پتلون اور چڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ تیس گھرے سرخ رنگ کی قمیص اور داؤد اور نوجوان تھا مگر عام سی جاسات کا مالک تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر پینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی کمرے کیوں کا ایک چھوٹا سا تھیلا بندھا ہوا تھا۔ جس وقت میری نظر اس سے ملی اس کا ایک ہاتھ سوچ پور پر اور دوسرا ایک دیوار کے دے پر تھا جس کی ٹال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک گورا چٹا، خوبصورت نوجوان تھا مگر اس کی آنکھوں میں کینٹکی اور گھٹیا پن کی جھلک تھی۔

طویل و غریب بیڈ روم کے دو کونوں میں دو سرے دو کوئی بھی موجود تھے جو بڑی مستحکم سے گویا پوزیشن سنبھالے کھڑے

میں بہت جلد وہاں پہنچے دیکھتے آؤں گا۔“ میں نے جھوٹی دھانڈے پر رکتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تجھے اور بہتر ہونا چاہئے“ نئی صحت اور اچھی ہونی چاہئے۔“

”دینا بھری دوایاں پہل فزٹ ملکات کی چیزیں تو کھا رہی ہیں میں سڈا کڑے سکرٹ بھی چڑا دی ہے میری۔ اب میں نے اپنا نہیں ہوتا تو اور کیا ہوتا ہے۔“ وہ اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

میں اسے دھانڈے پر کھڑی چھوڑ کر بیڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت تک وہیں کھڑی رہی جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

وہاں سے میں ہٹن میں پہنچا۔ پانی، پٹھن میں چھوڑاں میرا دن اچھا گزرا۔ رات گئے واپسی ہوئی اور میں فوراً ہی طلب خواتین کا لباس پہن کر بستر پر لیٹ گیا لیکن اسی لمبے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ فینڈ سے میری آنکھیں بند ہوئی جاری تھیں۔ میں نے بے جاہے ریسیور اٹھایا۔

”حق تم نے اسے قتل کر دیا سترجہ دہری!“ وہ سری طرف سے ہر کسی عقید کے انگریزی میں کہا گیا۔ آواز بہت بھاری اور گونجی تھی۔ مجھے اس میں غبار کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ بولنے والے کی زبان انگریزی معلوم نہیں ہوتی تھی اور وہ پاکستانی بھی معلوم نہیں ہو تھا۔

میری فینڈ یک لخت کافور ہو گئی اور میں بالکل چمکنا ہو گیا لیکن میں نے اپنی آواز حتی الامکان فینڈ کے غبار سے اوجھل بناتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا۔ ”سری! راتک نرسو۔ یہاں کوئی فون گولی مثالی گولی سترجہ دہری نہیں رہے۔“

”ٹٹ اپ۔“ گونجی آواز نے مجھے ڈانٹا۔ ”یہ ایک قتل ہم نہیں صاف کر رہے ہیں۔ سترجہ صرف یہی ہے کہ تم ہی کی تلاش میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دو۔ بھول جاؤ اسے۔ آئندہ تمہیں اس کے گھر کے آس پاس یا کہیں بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے ہوئے نظر نہیں آنا چاہئے سمجھ گئے؟“

”جی سے اگر آپ کی مراد یہ ہے تو میں ملٹیہ بیان دے سکتا ہوں کہ میں نے ایک گھر سے اس میں دلچسپی نہیں لی۔“ میں نے ہاتھ دھو کر کہا۔ ”اب اگر آپ اجازت دیں تو میں فون بند کر کے تھوڑی دیر سو لوں؟“

”زیادہ شوخ بننے یا زیادہ اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں۔“ گونجی آواز میں ناگوار سی در آئی۔ ”یہ پہلی اور آخری وارننگ ہے۔ اگر عمل کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو خود کو توج سے ہی مر دھ کر کھانا شہر کر دو۔“

”جیت بھر میں نے سعادت مندی سے کہا۔“ آپ کی تعریف؟“

”ریڈ ذات“ وہ سری طرف سے ہنس جواب ملا۔
”سترجہ ذات! میں نے آپ کے حسب ہدایت اپنے آپ کو مر دھ فرض کر لیا ہے اور آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ مردوں کو فون پر

تھے ان کے ہاتھوں میں خود کار رافٹیں تھیں سو گھرے رنگ کی لٹورہ قیعوں میں تھیں۔ دونوں ہی بھاری بھر کم اور مضبوط تھے اور دونوں ہی چپے ہوئے بد معاش معلوم ہوتے تھے۔ ان کی ٹھیکیں اور پلے پلے جلتے تھے۔ نمایاں فرق یہ تھا کہ ان میں سے ایک کی موٹی موٹی موٹھیں تھیں جبکہ دوسرا ٹھیکیں شیوہ تھا۔ موسم لہذا ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی گرم کپڑا پہنا ہوا انہیں قصاصہ دونوں قہر اور نظروں سے اچھے یوں گھور رہے تھے جیسے ان سے میری بہت پرانی دشمنی چلی آ رہی ہو۔

سائڈ پر وٹ کر کے گاؤں واڑہ پلے ہی کی طرح بند تھا۔ کہیں کسی جسم کی توڑ پھوڑ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے حالانکہ میں پیش کی طرح کراہتا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ وہ کالا کھول کر یا کسی اور پرانے طریقے سے اسے کالا بنا کر اندر آئے تھے۔ میں نے بظاہر ایک سرسری سی نظر ہی ڈالی تھی لیکن تمام چیزوں کا مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ میری جس نے حسیتاً مجھے خاصی تاخیر سے خبردار کیا تھا۔ ان کے اندر آئے اور یوں پوزیشن سنبھال کر کھڑے ہوئے میں کچھ دیر تو قیغ ہی ہوئی۔ شاید مجھ پر خند کا غلبہ زیادہ تھا جو میں جلدی خبردار نہیں ہو سکا تھا۔

رافٹل والے دونوں بھاری بھر کم آوی پشہ در لڑا کے اور جرم پیش معلوم ہوتے تھے۔ سوچ بڑھ کے قریب کھڑا ہوا تو جو ان لڑائی جھگڑے میں زیادہ ماہر معلوم نہیں ہوا تھا تاہم یہ اور کے دے پر اس کی گرفت مشتاکانہ تھی۔ شاید ریڈ ڈاٹ والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں اپنی کلاش سے باز نہیں آؤں گا اور انہوں نے فوراً ہی اپنی طاقت اور رسائی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔

یہ بھی گویا ایک ستم گر بی بی تھی کہ اور کدھر آتے جاتے وقت تو ٹوٹی اور فیر یا کوئی نہ کوئی دوسرے دو آدمی میری حفاظت کے لئے سامنے کی طرح ساتھ لگے رہتے تھے لیکن میرے گھر کے جہاں مجھے ساری رات گزارانی ہوتی تھی۔ حفاظتی انتظامات اتنے تسلی بخش نہیں تھے جیسے عام حالات میں میں بھی اپنے گھر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں فکر مند نہیں ہوا تھا۔ گھر میں چار بلند پاؤں کتے تھے جو نہ صرف لان پر رات کو خاموشی سے چلتے رہتے تھے۔ سن اور رات کے لئے الگ الگ چوکیدار تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی ذمہ داری کے دوران ریکٹ کا بھی خیال رکھتے تھے اور چار دیواری کے اندر اندر کوٹھی کی اصلی کمات کے گرد بیکر بھی لگاتے تھے۔ دونوں بظاہر عام سے چوکیداری معلوم ہوتے تھے لیکن در حقیقت وہ گورنر فوجوں سے کم نہیں تھے۔ مزید چند چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر بھی میں نے اختیار کر رکھی تھیں اور میرے خیال میں اتنا ہی بندوبست کافی تھا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی میں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میرا سراسر اس وقت خامسے اونچے چکے پر تھا۔ میں نے کبیل بناتے ہوئے آٹھ کر پینے کی کوشش کی لیکن موٹی موٹی موٹھیں والا ڈونڈک رافٹل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "بس بس" لینے ہی رہو

سینہ ہی ہم نے تو پوری پوری کوشش کی تھی کہ تھماری آنکھ نہ کھلے پائے تاکہ تھماری سوت تھماری لئے کم سے کم تکلیف نہ ہو۔ اس کا بعد اسٹیز ایسے بھی تھا اور اس میں برسوں کی نگرانی بھی رہی ہوئی تھی۔ شاید یہ نگرانی سب ہی دولت والوں کے خلاف تھی اس لئے اس کے اندر کا غلبہ میں مجھے زیادہ زہر چا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے کافی حد تک مجھے اس قہمی بیرونی طرح سینہ ہی کہا تھا جو قہم کے آخری سین میں اس سینہ سے حساب کتاب برابر کرنے آیا ہو جس نے پوری قہم میں نہایت ہی گھٹیا قہم کے دلن کا رول ادا کیا ہو۔

میں نے نری سے کہا "مگر تمہیں میرے آرام کا اتنا ہی خیال تھا تو تمہیں لائٹ آن نہیں کرنی چاہئے تھی تاکہ میری آنکھ نہ کھلی۔"

"مجھوری تھی" وہ سنائی سے زیر سوچہ مسکرایا "میں شکل بھی اچھی طرح دیکھتی تھی۔ ہم ملا آوی پر کولیاں ضائع کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔ ریمپ نیشن خراب ہوتی ہے۔"

"تم لوگوں کو اندر آئے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "میرے کتوں کو کیا ہوا؟ وہ ذرا بھی نہیں بھونکے؟"

"کتوں کا کیا ہے سینہ ہی! موٹھوں والے نے ہلکا سا تھپہ لگایا۔ کتوں کو خاموش کرانے کے بہت سے نسخے ہیں ہمارے پاس۔"

"کیا تم نے ان کو مار دیا؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اپنی کپڑیوں میں فیلڈ و غصہ کے آتش فشاں کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ وہ کیا ب نسل کے انتہائی جاں نثار قہم کے تھے۔

"مکن ہے وہ بچ جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مر جائیں۔" سوٹھوں والے نے ہم جواب دیا۔

"کیا تم نے ان کو زہر دیا ہے؟ مکر وہ تو کھروالوں کے علاوہ کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھاتے" راستے میں پڑی ہوئی بھی کوئی چیز نہیں کھاتے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا تاکہ ہمارے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اور پھر آخر کتے ہی ہوتے ہیں۔ غلطیاں تو انسان سے بھی ہوتی ہیں وہ تو پھر جانور ہیں۔" سوٹھوں والا بولا۔

"اور چوکیدار؟"

"وہ بھی آرام سے سوتا ہے۔"

میرا بڑبڑ بوم بالائی خیل پر تھا۔ میں نے سوٹھوں والے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اور تمہیں راستے میں تمام نالے کھولنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آئی؟"

"اس قسم کے کاموں کے لئے یہ جو ہمارا یار ساتھ تھا۔ سوٹھوں والے نے گورے بڑے فوجوان کی طرف اشارہ کیا جو ریلوے کے قریب کھڑا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ

وہ حقیقت نہایت اعلیٰ درجے کا قتل جنک اور نقب زن گنا تھا۔
شاید یہ اس پیشے کی کینکلی تھی جو اس کی آنکھوں میں رنج بس گئی
تھی۔

موجوں والا گویا اسے خراج حسین پیش کرتے ہوئے
۱۳۳۱ء میں جیسا فنکار پورے ملک میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ آٹے
تو اس کی شکل دیکھ کر خود بخود کھل جاتے ہیں۔ دیکھیں ہوں ولایتی
ہوں یعنی ہوں بلجائی ہوں۔ چاہے کسی بھی قسم کے آٹے ہوں۔
لیکن شیوہ شخص کے چہرے پر پہلی مرتبہ خیف ہی مسکراہٹ
نمودار ہوئی اور وہ اپنے سامنے سے ملے جلتے ہیں بولا۔ "بیٹہ!
تم تو ہمیں اپنے کمرے میں دیکھ کر کچھ زیادہ ہی حیران پریشان ہو گئے
ہو۔ تمہارے گھر میں تو کچھ بھی انتظام نہیں تھا۔ ہم تینوں اگر اکٹھے
ہو جائیں تو ان بیٹوں پر بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں بیوی نہیں بھی اپنی
شناخت کرانے بغیر داخل نہیں ہو سکتی۔"

موجوں والے نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے
چہرے کی توازن کسی دور اندازہ مقام سے سنائی دینے والی باروں کی
گزراہٹ سے مشابہ تھی۔ سوہ قابلاً اپنے فنکار کی زندگی کے آخری
لہات سے بہت لطف اندوز ہوا تھا۔ رانگل کے ٹھیکہ پر اس کی
انگلی کا بازو دھرتے دکھا تھا۔

میں نے آنکھیں پون بند کر لیں گویا مجھ میں موت کا سامنا
کرنے کی ناپ نہیں ہے لیکن درحقیقت میں دو چار سینکڑ کی اس
حالت میں اپنی آنکھوں کو دوشنی سے یکدم اندھیرے میں دیکھنے کے
قابل بنا رہا تھا۔ اندھیرے میں یوں تو میری فکر قابل رنگ حد تک
کام کرتی تھی لیکن تجز دوشنی سے یکدم اندھیرے میں فوری حرکت
کرنے کے لئے تھوڑی سی پیش بندی ضروری تھی۔ خصوصاً جبکہ
ذرا سا بھی غلط اندازہ جسم پہنچنے کرانے کا باعث بن سکتا تھا۔

میرا پاؤں کھٹکے کے دوران غیر محسوس طور پر کھٹکا ہوا یا اسکی
کی چوٹی پٹی تک پہنچ چکا تھا اور وہاں خاصا ایک پہل بنی ہو بودھا
جو بڑھاپے کی پٹی ہی کا ایک حصہ معلوم ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے
میں نے پاؤں کے انگوٹھے کا بازو پھیلا دیا اور کراکھ اندھیرے میں
ڈوب گیا۔ نہایت بلب تک بچھ گیا۔ یہ ان چھوٹی چھوٹی اعتباری تالی تالیہ
میں سے ایک تھی جو میں نے اپنے گھر میں قدم قدم پر اختیار کر رکھی
تھی۔

اندھیرا ہوتے ہی میں بیٹے سے قائلین پر گر چکا تھا۔ کمرے میں
درعدوں کی غرائض اور پھر رانگل کی ترخاہٹ گونجی۔ غیر ارادی
طور پر ان کی گتوں کا رخ بیک کی طرف ہی رہا تھا اور میں نے اسی
نفسیاتی پیلو پر ٹکے کیا تھا۔ وہ یقیناً یہی طرح ندوس ہو گئے تھے
کمرے میں گھپ اندھیرا ہو جانا ان کے شیدول میں شامل نہیں
تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ان میں سے ہر ایک صرف قتل جنک
نوجوان کے پاس ہوگی اور وہ وہاں آتا ہے کیونکہ اس کی تھیلے میں رکھ
چکا تھا جو اس کی کمرے بندھا ہوا تھا۔ اسی تھیلے میں شاید اس کے

ضروری اوزار تھے۔ حاصل کے اعتبار سے بھی وہ مجھ سے نزدیک
ترین تھا۔ اس لئے میں بیٹے سے لڑھکتے ہی ایک لمحے میں اس کا
پہنچ چکا تھا۔ میں اندھیرے میں سب کچھ کم از کم اس حد تک مہر
دیکھ رہا تھا جتنا شاید وہ ناٹ بلب کی روشنی میں دیکھ پاتے۔

قفل جنک نوجوان سب سے زیادہ ندوس ہوا تھا۔ ہر سچ کا
تور درکار وہ ہاتھ میں موجود روپو اور کو بھی فوری طور پر استعمال نہیں
کر پاتا تھا۔ وہ اندھیرے میں اسے گھمانے ہی کا تھا کہ میں نے اسے
جایا۔ ایک بازو سے اس کی گردن رو پنے ہوئے دوسرے ہاتھ سے
اس کی کلائی محو کر میں نے روپو اور اس کے ہاتھ سے قائلین
کرنے دیا اور پھر اس نوجوان کو ہی اٹھا کر میں نے موجوں والے
پر دے مارا جس نے اندھا دھند فائرنگ سے کمرے کا فریج پور
کلائی حد تک تباہ کر دیا تھا۔

ان دونوں کے کرنے کی دھمک کے ساتھ ان کی خوفزدہ
غرائض ہی ابھریں اور ایک گمن کم از کم دقتی طور پر خاموش
ہو گئی۔ اسی دوران میں لیکن شیوہ شخص کی کلائی قابو میں کر کے اس
کا سر دیوار سے ٹکرا چکا تھا۔ اسے بھی میں نے جوڑو کی ٹیکنیک
استعمال کرتے ہوئے ان دونوں پر اچھال دیا جو کمرے کے دوسرے
کونے میں ڈھیر تھے اور اندھیرے میں وہ موجوں والے کے ہاتھ
سے گمن ایک لمحے کے لئے چھوٹ چکی تھی مگر وہ فوراً ہی اسے
دوبارہ تلاش کر چکا تھا لیکن اس کا اسے کوئی ناکہ نہیں ہوا کیونکہ
اسی لمحے لیکن شیوہ شخص پھاڑی طرح ان دونوں پر جا کر اور وہ
تینوں ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئے۔

میں نے انہیں اس لئے یکجا کیا تھا کہ اس طرح ان پر قابو پا
جیسے لئے زیادہ آسان تھا۔ لیکن شیوہ شخص کی گمن میرے ہاتھ میں
آجکی تھی لیکن میں انہیں قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نہایت ایک لمحے میں
تینوں کا قصہ پاک ہو سکتا تھا۔ تاہم میں انہیں گمن کے
اشارے سے بھی حکم دینا نہیں چاہتا تھا انہیں تھوڑی سی سزا دینا
بھی میرے خیال میں ضروری تھا۔

میں نے گمن کو نال کی طرف سے پکار کر ان کی کلائی شروع
کدی وہ تینوں ایک دوسرے پر ڈھیر تھے اور میں انہیں اٹھنے کی
حالت نہیں دے رہا تھا۔ رانگل کا ہاتھ ان کے جسوں کے مختلف
حصوں پر برس رہا تھا لیکن میری کوششیں بیکار تھیں کہ ان میں سے کسی
کی بھی ٹھوہڑی یا کوئی دوسری ہڈی فریج پر نہ ہونے پائے۔ یعنی میں
ہاتھ لگایا رکھ رہا تھا۔

ہماری ہر کم بہ معاشوں کے خلق سے تو غراہٹ آمیز گمن گمن
ی چیخیں ہی برآمد ہو رہی تھیں لیکن قفل جنک نوجوان نے غامض
دو دو شور سے چپنا شروع کر دیا تھا۔ چند لمحے پہنچا پکار کے بعد وہ تو
باقاعدہ رونے لگا اور رحم کی فریاد کرنے لگا۔ معافی مانگنے لگا۔ اس
وقت تک دونوں بد معاشوں نے بھی اٹھنے اور کسی طرح صبر تحمل کا
مقابلہ کرنے کی جدوجہد ترک کر دی تھی کیونکہ ان تینوں میں سے
کسی کو بھی اپنا دفاع کرنے یا وار سے بچنے کی سلت ہی نہیں مل

انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سزا ان کا قدر ہو چکی ہے وہ انہیں برداشت کتنی پڑے گی۔ آخر کار میں نے محسوس کیا کہ اب ان میں آسانی سے اٹھنے بہت نہیں رہی یا اب وہ کم از کم مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت ہی نہیں گے تب میں نے ہاتھ دھوک لیا۔ میں نے رانٹل پیٹک یا اور قتل چکن نوڈل ان کا دیو اور اٹھایا۔ دونوں رانٹل میں نے انڈس سے بند کے نیچے کھسکا دیں اور صرف دیو اور ایک ہاتھ لے رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بند کی چوٹی پر چھاپا ہوا پیش لہن دیا۔ کمرہ دار بہ طور ہو گیا۔

میں قازمگ سے ہونے والی تباہی پر ایک نظر ڈالے بغیر نہ رہ سکتا لیکن تباہی میری توقع سے کم ہی ہوئی تھی۔ انہیں زیادہ گولیاں مارنے کی صلت نہیں ملی تھی۔ پھر بھی یہ نہیں اوجڑ کر رہ گئی تھی۔ در بند کے ساتھ والی دیوار کا کھڑکی سے نیچے کھلے سڑاؤ مڑ کر دیا تھا۔ دروازے پر سے میری گڑھے میں گڑھے سے بڑھ کر گئے تھے۔ لیکن ان تینوں کی حالت دیکھ کر میری گوفت کچھ کم ہو گئی۔ ان کے چہروں سے وہ رعونت و اذیت پسندی اور وہ خشونت غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ان کے چہروں پر اب خوف اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ قتل چکن نوڈل ان تو آقا و سہ سکیاں لے رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون اور آنسوؤں سے تر تھا۔ ان کی آنکھوں میں کافی حد تک بے چینی بھی تھی۔ شاید ان کی اب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس طرح آقا فاکس طرح پانچا پلٹ سکتا ہے؟ جیتھنا پانا بچہ ہی سیکھ میں پلٹ چکا تھا زیادہ دیر تو ان کی پٹائی میں ہی مل گئی تھی۔

میں نے بند کے ایک قدمے محفوظ کٹاؤ سے پریشانی سے جھپٹتے ہوئے حتی الامکان پُر سکون لیجے میں کہا "کس نے بھیجا تھا جیسے؟" تینوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نو جوان کی سسکیاں کمرے میں ابھرتی رہیں۔ مجھے اٹھ کر ایک بار پھر ان کے قریب جانا پڑا۔ سب سے آگے سوچوں والا ذہیر تھا۔ میں نے اسے سوچوں ہی سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ بری طرح جھپٹتے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے پیٹ میں کھنڈا رسید کیا۔ اس نے اورنگی آواز کے ساتھ جھٹکا جاپا لیکن اس کی سوچیں میری سطحی میں ٹھک رہی تھیں۔ اس کے دماغ ہاتھ آزاد بھی تھے اور بظاہر سلامت بھی نظر آ رہے تھے لیکن اس نے انہیں کام میں لانے یا مزاحمت کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔

مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وقتی طور پر ان کی قوت اور جرأت سلب ہو کر رہ گئی تھی لیکن زبان کو لئے کے لئے وہ ابھی تیار نہیں تھے۔ قوت برداشت ان میں یقیناً کافی تھی۔ اور پیٹ سینے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے کس مل تو ڈھیلے ہو چکے تھے لیکن ان کے اندر جیسے مضبوط جسموں میں ہر حال ایک ذمیت مدح موجود تھی۔ میں ان پر اپنا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اسے اس کے دونوں ساتھیوں پر دھکیل دیا اور اس کی پسلیوں میں ٹھوکا رسید کیا۔ وہ ڈر کر گر رہ گیا۔ میں نے دیو اور سے اس کے دل کا ٹٹا نہ لیتے ہوئے پوچھا "تم ریڈ ڈاٹ کے تولی ہو؟" اس نے خوفزدہ سی نگہوں سے میری طرف دیکھا اور کراہنے کے ساتھ انداز میں پوچھا "وہ کیا چیز ہوئی ہے؟"

مجھے اس کے انداز میں بے ساختگی ہی محسوس ہوئی۔ شاید وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا لیکن سروسٹ میں اتنا پریقین نہیں تھا۔ میں واپس بند کے کونے پر آ بیٹھا۔ دیو اور ایک ہاتھ میں رکھتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے دیوار گیر انٹر کام کار پیسورک سے اندازہ اور اسی ہاتھ کی انگلی سے ایک نمبر کا نم دیا۔ ناظر میری ان تینوں پر ہی رہی۔ وہ خواہ کتنے ہی غرض حال تھے لیکن ان کی طرف سے بے پروا نہیں ہوا جاسکتا تھا۔

دوسری بار پھر جیسے پُر دوسری طرف میرے سوئٹ کو اور میں ریسیور اٹھایا کیا اور رشید کی قدر سے خود کی ذمہ داری آواز بنائی دی۔ رشید ایک رانٹل اور اور مختصر فوجیوں کا قہر میرے کمرے کے تمام معاملات کی نگرانی اور ہر چیز کا انتظام اس کے ذمے تھا۔ "رشید!" میں نے ہوا پر لیجے میں کہا لیکن وہ علی الصبح چار بجے کے قریب میری آواز سن کر یکدم گویا مست ہوا گیا۔ اس کی آواز سے خود کی اور رشید کا شمار غائب ہو گیا۔

"میں سر! وہ مستدی سے بولا۔ رات کو جاگنا اور گھر کی خانگت کرنا اس کی یاد دوسرے گھڑے نوکروں کی ذمہ داری نہیں تھی اس لئے میں نے اسے فی الحال یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ ان کے سوتے ہوئے گھر میں کیا کچھ ہوتے ہوئے رہا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں رات کے اس پُر زہمت دن میں لیکن مجبور ہی تھی۔ سوئی میں وہ اپنے اپنے کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند کئے بیڑوں میں کبے خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔

میں نے معذرت خواہانہ سے لیجے میں کہا۔ "رشید! جیسے خود بھی زہمت کتنی پڑے گی اور نیک محمد اور بے دماغ کو بھی اٹھانا پڑے گا۔" یہ ڈرامہ اور دل دیکھ رہے تھے۔ "خیر سر؟ کیا میں ادھر آؤں؟" وہ گویا اور زیادہ مست ہوا گیا۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں" میں نے پُر سکون لیجے میں کہا۔ "تم سن! ان پر چاروں کتوں کو اور پکیر کر دو کچھو۔ اگر ان کی حالت ذرا بھی تشویش کا ہو تو کتوں کو ڈاکٹر خادق کے پاس لے جاؤ۔" وہ جانوروں کا ڈاکٹر تھا۔ اس کا کلینک اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔ "اسے گھر جا کر بگاڑ لیا۔ میرا نام لینا" وہ فوراً کتوں کا معائنہ کر لے گا۔ پکیر کر کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال میں جہاں بھی لے جانا ضروری محسوس ہو وہاں لے جاؤ۔ تم اور بڑا ایک گاڑی میں کتوں کو لے جاؤ۔ نیک محمد اور پُر دوسری گاڑی میں پکیر کر لے جائیں۔ نیک ہے؟"

”آپ فکر ہی نہ کریں سر! اس نے غیر ضروری سوالات میں وقت ضائع نہیں کیا اور خودی سلسلہ منقطع کر دیا۔“

وہ تینوں اب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے ان کی آنکھوں میں تکلیف اور خوف کی پرچھائیاں کچھ دم پڑی تھیں اور ان کی جگہ ذہنی کلکشن کا عکس جھلکے لگا تھا۔ شاید وہ اس فیصلے پر غصے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔

میں نے اب ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”اب بھی وقت ہے تم جاؤ تو تباہو کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ اگر تم جی جی تباہو کہ تو برا دھو ہے کہ تمہیں جانے دوں گا۔“

وہ بس ہلکتا خود وہ درندوں کی طرح میری طرف ایک ٹک دیکھتے رہے کچھ بھی نہیں بولے۔ انکار نہ اقرار۔ شاید انہیں میرے دھوے کا بھی اعتبار نہیں آیا تھا۔

میرا روبرو والا ہاتھ اس سائیز ٹیبل پر تھا ہوا تھا جس پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ قیمت تھا کہ ٹیلی فون میٹ کر لوں کی زد میں آنے سے بچ گیا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کندھے اور کان کے درمیان چسایا اور پھر اسی ہاتھ سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس لمحے میں نے ان کی آنکھوں میں قدرے غماضیت کی لہر ابھرتے دیکھی۔ آنکھیں گہر کی بھیدی ہوتی ہیں لگا ڈھاتی ہیں۔ شریک کسی کو آنکھیں پڑنے کا فانی آتا ہو۔

”تم لوگ شاید اس لئے اطمینان محسوس کر رہے ہو کہ میں پولیس کو بلا رہا ہوں اور یہ تمہارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی۔ پولیس کے چکر سے تو تم نٹ ہی لا گے۔“ میں نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کساد دوسری طرف پھل بچتے گئی تھی۔

وہ اب بھی خاموش رہے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ”لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں پولیس کو نہیں بلا رہا ہوں۔“

اس دوران دوسری طرف ریسیور اٹھایا جا چکا تھا۔ ریسیور جولی نے ہی اٹھایا تھا۔ اس کی آواز میں خند کے خماری کی بجی جھلک تھی۔ میں عام طور پر اسے اس کے اصل نام سے ہی مخاطب کرتا تھا لیکن اس وقت میں نے ان تینوں بد معاشوں کے سامنے اسے اس کی عزت سے ہی مخاطب کرنا بہتر سمجھا۔ ”مس زیبا! تمہیں زحمت تو ہوگی لیکن فوری طور پر یہاں آکر تین پارسل اپنے ساتھ لے جاؤ۔ حنیف خان کو بھی ساتھ لے آنا وہ پارسل لوڈ کرانے میں تمہارا ہاتھ بٹارے گا۔“

”اوکے سر! میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“ جولی نے مستعدی سے کہا۔ اس کی آواز سے غزوہ کی یک لخت کافور ہو گئی تھی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ تینوں اب بھی ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر کار سو پٹھوں والا کرانے کے سے انداز میں بولا۔ ”یہ نہ صاحب! آپ ہمیں معاف کر دیں“ اس کی ساری

اکڑوں رخصت ہو چکی تھی لیکن اس کا معافی طلب کرنا اور نگارشی کا مظہر تھا۔ جی طور پر نہ تو اس نے شکست تسلیم کی تھی اور ہی وہ اپنے عمل پر شرمندہ تھا۔ انہیں اگر دوبارہ موقع ملتا تو وہ بار بار پھر مجھ پر حملہ کر کے قسمت آزمائی کرنے سے ہرگز باز نہ رہے۔ ”تم تو بہت ہی بڑے بد معاش نظر آ رہے! میں نے روبرو دھوے دھیرے دھیرے حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”درا ہی مار پڑی تو معافا لگتے تھے۔“

”ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے صاحب!“ بلیں بد معاش نے اپنے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ غلطی کی ہی تھی؟“ میں نے ملافت سے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکانے ایک مہرے سانس لے کر وہ گیا۔ میرے لئے جولی کا انتظار کرنے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے سیدھا مہرے پٹیتے ہوئے کہا۔ ”اب تم سے کچھ بھی نہیں پوچھوں گا۔“

جولی دس منٹ میں تو نہیں البتہ چند منٹ میں پہنچ گئی۔ حوا نہ سلیپنگ سوٹ میں تھی۔ اس کے تراشیدہ چمکیلے اور ربال کندھوں پر لہر رہے تھے اور سانو لے چہرے پر گولڈ کریم کی مع سی چمک نظر آ رہی تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں گادورے تیر رہے تھے اس کی آنکھیں ویسے ہی بڑا غضب ڈھ تھیں۔ لگا ہی ڈوڑوں کی سوجھتی میں تو یہ آنکھیں قائل آگے دکھائی دیتی تھیں۔ جولی کی سانولی سلونی شخصیت میں بڑی کشش لیکن آنکھیں تو اس کی شخصیت کا نمایاں ترین حصہ تھیں۔

حنیف خان اس کے ساتھ قاصدہ بارش آ رہی تھی۔ سید گول فونی رکھا تھا۔ عام طور پر بڑی نفیس قسم کی شلوار قمی میں رہتا تھا۔ اس کے چہرے پر غایت مہرے جگہ اداسی آمیز سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ کوئی بہت ہی سنجیدہ متین قسم کا استاد یا سوشل ورکر نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مارشل آرٹ میں ماہر اور ہر قسم ہتھیاروں کے استعمال میں یکساں گواہ بہت کم کو اور قدرے۔ نظر آتا تھا لیکن جب وہ ایکشن میں ہوتا تھا تو اس کے جسم بجلیاں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ تاہم اپنی تماشہ ملا جیٹوں باوجود وہ ٹوٹی یا شیر شاہ کے مقابلے کا تو ہی نہیں تھا اور نہ ہی میرے کراچی والے بڑے بیکس کے انعامات فصیح شاہ کی برابری کر سکتا لیکن ہر حال وہ کسی میری تحقیر کے اہم آدمیوں میں شمار ہوتا تھا زیادہ تر اہل قانون والی کو بھی پڑی رہتا تھا جو ایک طرح سے لا میں میرا خفیہ ہیڈ کوارٹر تھی۔ وہ جولی کے ساتھ ضروری معاملات سنبھالتا تھا۔

جولی نے بظاہر بے پروائی سے تینوں بد معاشوں کا جائزہ لیا سرسری سے لہجے میں بولی۔ ”لگتا ہے کہ میری غامضی گزربڑھ گئی۔ آپ پر حملہ ہوا تھا؟“ میں نے صرف اثبات طبع سہلانے پر آ

میری نظران تینوں پر تھی۔ وہ میرے حکم کے بغیر ہی اٹھ گئے تھے۔

میں نے اس وقت تک نہیں دیکھا تھا کہ ایک عورت کو اس قدر سزا دی جائے۔ اس نے کہا کہ یہ سزا اس لیے دی گئی ہے کہ اس نے اپنی زندگی بھر اس طرح کی زندگی بسر کی ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اپنی زندگی بھر اس طرح کی زندگی بسر کی ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے اپنی زندگی بھر اس طرح کی زندگی بسر کی ہے۔

حیف خان کو تو انہوں نے شاید درخور احتیاجی نہیں سمجھا
 بعد انہیں غالباً بالکل بے ضرر نظر آیا تھا۔ جولی کو بلائے جانے کا
 اہم مقصد ہی ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”جہاں میں پارساں؟“ بھولی نے ان کی طرف اشارہ کرتے
وئے گویا مجھ سے رسی قصہ دین چاہی۔ جس نے ایک بار پھر اثبات
درا لگانے پر اکتفا کیا۔

دار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اور ہاتھ پشت پر کرلو۔ مجھے

اس کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کہ رسی ہو ذرا مانوس
پانچ بجے سگریٹ سناگانی ہے۔

وہ ان کے قریب بھی جا پہنچی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر میں آ رہا تھا اور وہ بہت حال ایک عورت تھی۔ اس کے اچھے منہ اکیلے کی ڈوہڑی کا پتھا تھا جو اس نے حنیف خان سے لیا تھا۔ حنیف خان کے پاس ان کے ہونٹوں پر چپکانے کے لئے شیبہ بھی موجود تھی۔

انہیں یقین ہو گیا کہ اگر وہ اسی طرح سناکت کھڑے رہے تو ان کے ہاتھ پاؤں بندھ ہی جائیں گے۔ انہوں نے اپنی تمام شہنائیاں گالی کے باوجود غائبانہ پر تھکیل کر ایک آخری کوشش کرنے کیلئے کیا۔ یہ فیصلہ غالباً صرف سوچوں والے کا تھا لیکن ان کے زریں گویا ایک طرح کا ذہنی رابطہ چل رہا تھا اور اسے ان دونوں ساتھیوں کی تائید حاصل تھی۔

طریقہ بھی اس نے اپنی دانست میں صورتحال کے مطابق
نوٹ اختیار کیا تھا لیکن اس پر غصیب کو شاید ذرا بھی اعزازہ نہیں
کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے ہے کسی نے ان بے چاروں
معلّٰمات کے بغیر آگے دھکیل دیا تھا اور کسی کو ہمارے بار
میں معلومات ہو جس طرح سخت تھیں؟

جہلی جو نئی ان کے قریب پہنچی، سو گھوڑوں والے نے انہی کو
ہمسائی ٹوٹ پھوٹ کے بازو و حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کر
اُس کے بازو دوسرے سے پکڑ کر اپنے سامنے وصال بنانے کی کوشش
کی۔۔۔ تاکہ مجھے غائر کرنے سے باز رکھا جاسکے لیکن اس بے چارے

— 1954 —

جولہ نے عجیب کی سے پوچھا۔

"اصل میں ان سے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ انہیں کس نے جھپٹے حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اگر یہ بتائیں تو پھر ان کا جہول چاہے بھانڈا اور جو کچھ بھی ہے اسے راوی میں بھادنا۔"

میں نے شک ہے زامی سے کہا۔

حنیف خان نے انہیں باری باری نیچے اپنی اسٹیشن دیکھیں میں پہچاننے کے لئے سب سے پہلے مہر جھوں والے کو کندھے پر اٹھایا۔ جولہ نے اس کے کندھے پر پکا سا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا "وہ بچہ ایسا پیش ہیں تمہارے۔" ہوش میں ہونے کے بعد خود کندھے پر سوار ہو کر جارہے ہو۔

آخر وہ سب رخصت ہو چکے تو میں بالائی منزل پر ہی دوسرے بیڈروم میں آکر ٹکرت گیا۔ یہ میرا خاص کمر تھا۔ میرا گوشہ تنہائی۔ جب میں بہت اداس ہوتا تھا تو اس کمرے میں آکر بند لیٹا تھا اور اس وقت تک میس ریتہ تھا جب تک میری اداسی اور ذہنی طور نہیں نہیں ہو جاتا تھا۔ بعض لوگ اداسی اور ذہنی طور دور کرنے کے لئے پڑھتے اور ایسی جگہوں کا رخ کرتے ہیں جہاں رنگ و بو کی چیزیں موجود ہوں لیکن میری اداسی اور ذہنی طور تنہائی میں ہی دور ہوتا تھا تاہم اس قسم کا دورہ مجھ پر شاید دیر ہی پڑتا تھا اور آج تو میں یہاں ٹھہر سونے کی غرض سے آیا تھا۔

چند لمحوں تک گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا حنیف سا اوصالی ارتعاش دور کیا اور پھر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر دیکھا۔

دوسرے دن وہ دن چڑھے تک میں سو نہای رہا۔ آخر کار دوسرے بجے کے قریب اٹھا اور کافی آہستہ انداز میں تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کر میں نیچے ڈانگ میں دم میں پہنچا تو خانساں نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی بتایا "کون کو پہچانایا گیا ہے صاحب! جلدی خبر ہو گئی ورنہ ان کا پہنچنا مشکل تھا۔ ابھی وہ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ہی ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ چرکیو اور بھی ہوش میں آگیا ہے۔ ڈاکٹر کا صاحب کے کلینک میں داخل ہے۔ اس کے سر پر شاید کچھ دے دے یا کسی اور بیماری اور محسوس چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔ غامضی دور واد چلتی تھی لیکن اب خطرے والی کوئی بات نہیں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے ذہن سے کہا۔ "کون کو کہا تھا؟"

"جی ہاں۔ لان پر باہر سے ذہر بکود کوشت کے ٹکڑے پیچھے لگے تھے اور ان پر ایک ایسی دوا لگائی گئی تھی جس کی ٹوک دوج سے کوئی بھی کتا ان ٹکڑوں پر مت مارے بغیر بدھی نہیں سکتا تھا۔" پھر خانساں میرے لئے ناشتے کے برتن سجاتے ہوئے بولا۔ "مہر حال رشید نے سب کچھ سنبھال لیا صاحب! ہر چیز کنٹرول میں ہے۔"

"بہت خوب" میں نے طہایت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

پھر پورا ناشتا کرنے کے بعد میں اخبارات کی طرف متوجہ سیاسی فیوضات اور جرائم کی دیگر خبروں کے ساتھ اندر کے ماحول تقریباً بھی اخبارات میں غیر نمایاں انداز میں نشاطا عرفیہ قتل کی مختصری خبر موجود تھی۔ دو اخباروں میں اس کی تصویر بھی موجود تھی۔ تصویر مردہ حالت میں لی گئی تھی۔ اس کا پہچانا جانا بھی مشکل تھا۔ شاید خبر ریلز کرنے تک بھی نے باکر اس کمرے کو چیک نہیں کیا تھا جہاں نشاطا رہتی تھی اس کی زندگی کے دوران کی کوئی تصویر اخبارات میں دینا، تاکہ اس کے اگر کوئی درنا سوجھو تھے تو انہیں پہچاننے میں رہتی کہ کون کون کی خبریں ہیں۔ ابتداء میں موجود تھی کہ اگر اس سے موجود ہوں تو پولیس سے رابطہ قائم کریں ورنہ وہ دن بھر لاوارث قرار دے کر دفن کر دی جائے گی۔

خبریں ایک سطر ایسی بھی تھیں جسے پڑھنے کے بعد میں نہیں کر سکا کہ مجھ پر اس کا پڑاؤ کیا ہوا تھا۔ معلوم نہیں صدمہ پہنچا تھا یا حیرت ہوئی تھی یا بس دل خراب سا ہوا تھا کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا اور تک میں ساکت بیٹھا رہا۔

اس سطر میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ پست مار ٹم پر رہا۔ مطابق متواتر نشاطا اس سے تھی۔ گو اس کے ماں بننے کا بہت دور تھا لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت تھی جو مدافعتی انداز چند لفظوں میں بیان کر دی گئی تھی۔

میں نے اس فیئر اور معصوم صورت لڑکی کی زندگی پھر پورا کرنا کونک تصویریں بھی دیکھی تھیں اور کہتے ہو۔ چہرے کے ساتھ مردہ حالت میں بھی دیکھا تھا۔ ایک بار پھر چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھبرنے لگا۔ میں نے وقتی طور ذرا مائلے کے لئے دوبارہ اخبارات کی ورق گردانی شروع کر دی کسی اخبار میں کہیں کسی ایسی لاش کی دستیابی کا ذکر نہ ہونے میں اس عجیب سے شخص کی لاش سمجھ سکتا ہوں توئی کے بارغ میں مارا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی لاش شاید اب پولیس کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوگی لیکن ابھی اس کی خبر رپورٹوں تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کے اخبارات اس سلسلے میں کوئی خبر نظر آنے کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔

اس کا خیال آیا تو میں ایک بار پھر اپنے کمرے کی جیب ٹرانسپیر ٹھال لایا جو کمرے کے فرش میں فٹ تھا۔ ڈانگ نیلر دوبارہ اسے کھول کر دیکھا لیکن ظاہر ہے اس کے اندر کوئی موجود نہیں تھا۔ کل دوسرے صرف ایک بار اس پر سٹیل ہونے کے بعد سے ٹرانسپیر ٹھانوشی رہا تھا حالانکہ ظاہر لوگوں کے پاس اس ساخت کے اور بھی ٹرانسپیر رہے ہوں لیکن شاید ہر ایک کی فریکوئنسی مختلف تھی یا پھر ان میں فرق تبدیلی کرنے کی مہارتیں موجود تھیں اور انہوں نے اب فرق تبدیلی کر لی تھی۔ فریکوئنسی تبدیلی کرنے کا حکام مجھے اس سے

لیجے میں پوچھا "فون کس نے کیا تھا؟"

وہ صرف ایک لمحے خاموش رہا پھر ذرا ہنسی تو اڑا میں بولا۔
"مجھے بتانا ہوں۔"

پھر اس نے ماذتہ میں پر ہاتھ رکھے بغیر کسی کو مخاطب کیا
"اللہ دے! تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ چل جا کے بیڑہ خمر صاحب
کے پاس بیٹھ کر گاسے صفا کی والے کیس کی رپورٹ تیار کر کر قاتل
مکمل کر۔ آج مجسٹریٹ صاحب کو پیش کرنی ہے۔"

بالا تکلیف سیر آجانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "میں
نے سوچا آپ کو بتا دیوں۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اور پیسے
بھی ہمارے درمیان باہمی تعاون کا معاملہ ہو چکا ہے۔ فون تقریباً
تو وہ گھنٹا پہلے ہی آیا تھا۔ پوٹے والے نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن
تو اڑے سے وہ بہت غمزہ لگ رہا تھا۔ شاید بہت پرہیزگار آدمی رہا ہو۔
مجھ سے جب اس کا رابطہ قائم ہوا تو اس نے پہلے اچھی طرح
تصدیق کی کہ قاتل کی حیثیت میں ہی کر رہا ہوں۔ پھر وہ التجا کے سے
اواز میں کہنے لگا۔ بھائی صاحب! یہی آپ سے صرف اتنی
گزارش ہے کہ آپ باقی ہر کام کو بھول کر اس کیس کی حیثیت
پوری سرگرمی اور ترقی سے کریں اور ہر حال میں قاتل کو
کیڑ کر اور تک پہنچائیں۔ میں آپ کی نکت کے اعتراف میں ایک
بڑی رقم انعام کے طور پر آپ کے لئے بھجواؤں گا۔ یہ یہی طرف
سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہو گا اور یہ بات صرف میرے
اور آپ کے درمیان رہے گی۔ لگتا ہے اس آدمی نے اعتبار پڑھنے
ہی فون کیا تھا۔"

"آپ نے پوچھا نہیں کہ وہ کتنی رقم انعام میں بھجوائے گا؟"

میں نے وضاحت کیا۔

"پوچھا تھا جناب! میں پوچھی غیر منجیدگی سے ہی پوچھا تھا۔
اس نے کہا کہ کم از کم دو لاکھ۔ اور اگر میں قاتل کو میرٹ ٹاگ سزا
دوانے میں کامیاب رہا تو اس کے بعد مزید انعام بھی بھجوا دیا جاسکتا
ہے۔ یہ سن کر دل میں گونج گئی تو بھئی! لیکن ظاہر ہے اس
قسم کی باتوں پر اعتبار تو نہیں کیا جاسکتا۔ اگر میں اس آدمی کی بات
کو کچھ بھی سمجھ لوں تو سمجھیں کہ قاتل کے پکڑے جانے کے بعد اس
کا کام تو ختم ہی گیا تھا۔ اور کام مکمل جانے کے بعد کون کس کو
پوچھتا ہے۔ اس قسم کی باتیں مذاق ہی ہو سکتی ہیں جی۔ ویسے بھی
میں لاچ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو ہر حال اپنی بیوی کی سزا انعام دینی
ہی ہے۔ اپنا فرض ادا کرنا ہی ہے۔ قاتل کو تلاش کرنا میرا تو فرض
ہی ہے جناب!"

"ظاہر ہے آپ نے یہ جاننے کی کوشش تو کی ہوگی کہ وہ کون
تھا؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں جناب۔ میں نے اس سے بہت پوچھا کہ وہ کون
ہے متھو سے اس کا کیا رشتہ ہے اور وہ اگر متھو کی لاش کیوں
نہیں لے جاتا؟ لیکن وہ اسی بات پر اڑا کہ متھو سے اس کا کوئی
رشتہ نہیں اس لئے وہ لاش وغیرہ لینے نہیں آسکتا۔ وہ تو جس انسانی

آرٹا تھا لیکن زرافسیر کا قصصی آپریشن کرنے کے لئے نہایت
میں قسم کے اوزاروں کی ضرورت تھی جو فی الحال میرے
موجود نہیں تھے۔

میں نے زرافسیر بند کر دیا۔ اس پر وسط میں چھوڑا سا جو سرخ
لٹان موجود تھا غالباً یہی ریڈ ڈاٹ تنظیم کا شناختی نشان تھا۔
سیر کو میں نے دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور فون اپنی طرف کھسکا۔
خاموشی خراب بھی میرے ذہن میں اٹھتی ہوئی تھی۔

میں نے کلیئرنگ خانے کا نمبر لایا اور اسے ایس آئی شریف
کا فون پر بولایا۔ دسی جلیوں کے چاروں کے بعد میں نے کہا۔
ہاں صاحب! آپ نے مجھے کل صبح نشاط کے امید سے ہونے
بات نہیں بتائی تھی۔"

"بتا کیسے جناب! اس وقت تک تو خود مجھے بھی معلوم نہیں
ہوئی بات۔" وہ اپنے مخصوص ہنگامے دار لہجے میں بولا۔ "پوسٹ
نم رپورٹ اتو چکی تھی لیکن وہ انسپکٹر صاحب کی سیر پر پڑی تھی۔
انہوں نے پڑھی تھی نہ میں نے۔ آپ سے بات ہونے کے کچھ
بعد میں نے پڑھی تھی میرے لئے یہ کوئی حیران کن بات نہیں۔
ایک خیال ہے کہ اس قسم کی لڑکیوں کے بارے میں ایسی ہی باتیں
سنے آسکتی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تو معلوم ہونے سے پہلے کہ
سیر پڑی یا سارو پاک باز خاتون تھیں! پانچ مرمود ملوڑے تھیں۔"
"خیر جھڑپیں" میں نے کہا "یہ بتائیں تحقیق کچھ آگے
کی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میں نے وقت
ساکر اس لڑکی کی سلام سیٹ ملکہ لی لی سے اور اس ایک شہر اسٹارٹ
تمام سے اس کا۔ ہاں عبدالواحد سے بیان لے لیا ہے۔ دونوں
بہنیں لگتی ہیں۔ اور میرا خیال ہے انہوں نے جو کچھ کہا ہے
بہنیں ہی کہا ہے۔ ہر حال میں نے احتیاطاً دونوں پر تھوڑا سا
سب شوب ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ مجھ سے
"ہی ان دونوں سے مل چکے ہیں۔ آپ بہت تیز جارہے ہیں
ب! لیکن خیر ہماری بھی تحقیق اپنے حساب سے آگے بڑھ رہی
۔۔ متھو کا سامان وغیرہ میں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔
مارٹیا کے دو چار اور لوگوں کے نام سے ہیں نے نوٹ کئے ہیں جن
پوچھ کچھ کرنی ہے۔ آپ فکر نہ کریں جناب! کچھ نہ کچھ ضرور
جائے گا۔ شریف سیال جس کام کو ہاتھ میں لیتا ہے اس کا کچھ نہ
نہ کر کے چھوڑتا ہے۔ اس کیس کے اصل تحقیقی افسر انسپکٹر
مر صاحب تھے لیکن انہوں نے خود ہی یہ کیس میرے سپرد کر دیا
۔۔ آج صبح اس سلسلے میں ایک صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ وہ
پہرے رہے تھے کہ اس کیس کی تحقیق کون کر رہا ہے۔ انسپکٹر
سب نے میرا نام ہی لیا اور فون مجھے پکڑا کہ خود مطلع پکری چلے
ن۔" اچانک وہ پھر خاموش ہو گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ
الٹیں اس کے منہ سے کوئی غیر ضروری بات نکل گئی ہے۔
میرے کان کھڑے ہوئے۔ تمام میں نے ظاہر سرسری سے

گازی میں بیٹھ کر پہلے میں ماڈل ٹاؤن دہلی کو غمی میں پہنچا
بالکل سکون تھا۔ وہ پیش ہی ایک ایسا پرسکوت گھر معلوم ہو
پہلیں تنہا میں سے کہیں کم افراد رہتے ہوں اور وہ بھی بے حد
لینڈ ہوں۔ حالانکہ یہاں بڑے بڑے اہم اور بنگلہ خیر قسم
بھی بنائے جاتے تھے اور تھوڑا سا ریت و فنی قسم کا کام بھی
جولی لان پر بھی اپنے ناخن تراشنے اور انہیں سنوار
معروف تھی گویا اسے دنیا میں اور کوئی مصروفیت ہی نہ ہو۔
خاؤز اور ڈھیل ڈھالی ٹرٹ میں تھی۔ آستینیں چڑھی
تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ سب کچھ چمور چماڑ کر مسکراتے ہو۔
کھڑی ہوئی۔

”وہ تینوں مسلمان خانے میں ہی ہیں؟“ میں نے پتو پتو۔
پوچھا۔

”ہیں سر! آپ دیکھیں گے؟“ اس نے پوچھا۔
”ہاں“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا ”کچھ زیادہ
تو نہیں کرنا پڑی ان پر؟“

”نہیں سر! کوئی ایسی خاص محنت نہیں کرنی پڑی۔“ جوا
بے پروائی سے کہا ”دیئے وہ عام بد معاشوں سے خاصے
درجے کے بد معاش ہیں۔ بڑا منظم قسم کا ایک باقاعدہ گروہ
کا۔ اسلئے بھی ان کے پاس کافی ہے۔ لیکن مشینیں انہیں تک ہیں
طرح کی وارداتوں پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ خود اپنے طور پر
آمدور بھی کام کرتے ہیں۔“

اس دوران اندر سے ضیف خان بھی ہمارے ساتھ ہو
اور ہم غمی ہال کی طرف جا رہے تھے۔ جولی بات جاری
ہوئے ہوئی۔ ”میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اگر
تھک دوس تو ان کے گروہ کا مقنا کیا جائے؟“

”نی الحال تو صرف انہیں سبق سکھانا اور اصل بات
کرنا ہی میرا مقصد تھا۔ اگر انہوں نے سبق نہ سیکھا اور آئندہ
نکرانے کی کوشش کی تو پھر دیکھا جائے گا۔“ ہمیں معلوم
کسی وجہ کے غمزہ پر ہماری پالیسی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے پ
”ہیں سر!“ جولی مسکرائی ”میں نے تو اسقاطا پوچھا تھا۔
اس دوران ہم میز چایاں اترنے لگے تھے۔ ہم بدھا
طرف جا رہے تھے۔ ضیف خان خاموشی سے آگے ہل رہا تھا
”ان کے گروہ کا نام ریڈ ڈاٹ ہے کیا؟“ میں نے پوچھا
”نہیں سر!“ جولی نے نفی میں سر ہلایا ”کوئی نام وغیرہ
ہے ان کے گروہ کا۔ بس پونہ دس آدمیوں کا گروہ ہے۔
دھڑلے سے بد معاشی کرتے ہیں۔ جوئے کے اڈے وغیرہ
ہیں ان کے۔ لیکن کوئی ایسی بڑی ٹکسی قسم کی چیزیں نہیں
گروہ کا انگریزی میں نام دنیوور کھئے کا سوچنے لگیں۔“

میں نے ابھی تک اصل بات نہیں پوچھی تھی۔ وہ
خانے میں پہنچ کر ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ میز چایاں بھابھ ایک
ردم کی معلوم ہوئی تھیں جو بائیں ہاتھ پر تھا۔ دائیں طرف

ہمدردی کی بنا پر مجھے وہ چٹکس کر رہا ہے۔ اسی لئے تو جناب مجھے یہ
بات زیادہ کھٹکلی لگی اور میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا۔ ویسے
باتوں باتوں میں میں نے اس شخص کو آپ کے بارے میں بھی بتا دیا
تھا۔“

”میرے بارے میں کیا بتا دیا تھا؟“ میں نے قدرے حیرت سے
پوچھا۔

”میں نے کہا کہ ایک بہت بڑے سینئر صاحب جو ہمارے بڑے کرم
فرا ہیں وہ بھی میں نے خانے میں ذاتی دلچسپی سے رہے ہیں۔ وہ بھی
چاہتے ہیں کہ قابل کو محبت ایک سزا ملے اور وہ بھی شخص انسانی
ہمدردی کی بنا پر سب سے پہلے چاہتے ہیں۔“ شریف سیال نے بتایا۔
”پھر اس کا بدلہ لیں کیا؟“

”یہ بات اس سے بھی دلچسپی سے سنی اور مجھ سے آپ کا خون
غیر بھی لے لیا۔ شاید وہ آپ کو بھی انعام کی چٹکس کرے گا۔ وہ
دھڑلے سے بڑا پھر فوراً ہی کھار کر کھا صاف کرنے لگا۔“

”یہ تو بڑی دلچسپ بات بتائی آپ نے سیال صاحب! لیکن
افسوس کہ اس سے بھی تو قابل کی تلاش میں کئی بدلہ ملتی ہے
اور نہ شادی کی اصلیت پر کوئی روشنی پڑ سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں جناب! یہ بات تو ہے۔“ اس نے سہمہ سہمہ
دیکھ لیں کہ میں آپ سے کوئی بات چھا نہیں رہا۔ پرسل اور
کافیڈ لٹکل ”دونوں طرح کی باتیں آپ کو بتانا جا رہا ہوں۔ یعنی میرا
آپ سے تعاون جاری ہے۔“

”میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں سیال صاحب!
پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بہت سے جھوٹے بڑے ایسے افسران
میرے کرم فرا ہیں جو دل کے بڑے اچھے اور نہایت انسان دوست
ہیں۔ میں ان کا بڑا قدر دان ہوں۔ انسانی بھلائی کے کاموں اور
خاتونوں اور بد معاشوں کو سبق آموز انجام تک پہنچانے میں وہ
تائون سے بہت کرم بھی خاموشی سے میری مدد کرتے ہیں۔ ان میں
آپ آپ کا کام بھی شامل ہو گیا ہے۔“

”مہربانی ہے جناب آپ کی۔“ وہ خوش دلی سے بولا ”لوگ
کہتے ہیں پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی۔ لیکن ہم
نے تو جناب ایچے آدمیوں کو بہت دوست رکھنے کی کوشش کی ہے۔“
”ایک تکلیف اور پیچھے کا سیال صاحب!“ میں نے کہا ”اگر
رسوں تک بھی شادی کا کوئی وارث لاش لینے نہ آیا تو آپ کو شش
مجھے چھوڑ کر اس کی بھینیں دہن نہیں بہت ایچے اور موزوں طریقے سے
ہو جائے۔ کوئی کمی نہ رہے۔ ہر کام باعزت طریقے سے ہو۔
اخراجات کے لئے میں رقم اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔ میرا
مطلب ہے کہ اگر وہ وارث بھی تھی تو اس کی لاش لاوارثوں کی
طرح دفن نہیں ہونی چاہئے۔“

”ٹھیک ہے جناب! ایسے آپ کہتے ہیں ویسے ہو جائے گا۔“
شریف سیال نے مستعدی سے کہا اور میں نے خدا حافظ کہہ کر
سلسلہ منتقل کر دیا۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

تحت تھا۔

جولی نے سوچوں والے بد معاش کے بال پکڑ کر اسے بٹھایا مگر وہ اوجھڑا کر جھولنے لگا۔ جولی کے اشارے پر بدو نے اس کے منہ پر ٹھٹھ سے پانی کے پھینٹے مارے اور کچھ پانی اسے پلایا بھی۔ تب وہ ذرا چپٹنے کے قابل ہوا لیکن اس کی گردن اب بھی گھریا ڈھکی جابری تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" جولی نے اس کے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دے کر پوچھا۔

"محمد طارق" اس نے سرگوشی نما آواز میں لیکن بغیر کسی جمل جمت کے فوراً جواب دیا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے فوری جواب دینے کے لئے سوچا گیا ہے۔

"تمہیں کس نے بھیجا تھا اور کیوں بھیجا تھا؟" جولی نے مزید پوچھا۔

"قیصر ملک نے... سینہ صاحب کو قتل کرنے کے لئے۔"

اس نے چرمی چرمی آکھوں سے میری طرف اشارہ کیا۔

"کتنی رقم دی تھی؟" جولی گویا کسی بچے سے اس کا سبق سن رہی تھی۔

"پانچ لاکھ تھی... کام مشکل تھا۔ ہم نے ساری رقم ایڈوانس لے لی تھی۔" اس کی توڑا سرگوشی سے یہی مشاہدہ رہی۔

"تم نے بہت کم رقم پر ہائی بھلی تھی چنڈا!" جولی نے اس کے ہاتھ جھوڑ دیے۔ وہ ہاتھ چھوڑے پر ٹکائے اس طرح بیٹھا رہا کہ اس کی ٹھوڑی سینے کو تقریباً چھوئے تھی۔

میں ایک طرف مل سانس لے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے بڑی بایوسی ہوئی تھی اور جب میں بولا تو یہ بایوسی غیر ارادی طور پر پیچھے لے جانے میں جھٹک آئی۔ "کھوا پناڑ نکلا چڑا۔ یہ تو اسی اتو کے

پچھے قیصر ملک کا چکر تھا۔ اس بد بخت کا راز ابھی ٹھکانے پر نہیں آیا۔ وہی کھتا رہے۔ وہی کرائے کے قاتل۔"

مجھے اپنی کپٹیوں میں تپش سی محسوس ہو رہی تھی۔ جولی کمری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی بے زاری کو کنٹرول کرنے اور مکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے ملک بحر کے جرائم پیشہ گروہوں سے اس لعنتی کی شناسائی ہے اور وہ میرے قتل کے لئے کیے ہوئے دیکر سب کی خدمات حاصل کر کے رہے گا۔ اس کی زندگی کا گویا مقصد صرف یہی رہ گیا ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے سارا!" جولی سنجیدگی سے بولی۔ وہ تقریباً تمام حالات سے آگاہ تھی۔ "یہ اس کے لئے زندگی موت اور انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کا ہمیں سے بیٹنا بہت مشکل ہو گا۔ اس قسم کے لوگ حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔"

اسی دوران محمد طارق نامی اس بد معاش میں شاید زندگی کی کچھ لمبا بھیڑ یا وہ بعد کوشش اپنی ہی بھی ڈھانکی جیت کر کے چھوڑے

۱۔ اس کے قریب ہی سوچ بوز موجود تھا۔ خیف خان نے نرائک کنٹرول کے تین سوچ ایک خاص ترتیب سے کئی مرتبہ لے اور دوبار ایک طرف ہٹ گئی۔

ماننے محسوس اسٹیل کا ایک ساؤڈ پر فوہ و دواہ موجود تھا۔ اس کے کنٹرول کے سوچ الگ تھے۔ خیف خان نے انہیں بھی ایک خاص ترتیب سے دیا۔ وہ بظاہر نظر بھی نہیں آتے تھے۔

نیل سی کی ایک پٹی کے نیچے چھپے ہوئے تھے اور پٹی کو ہٹانے کی بل الگ ٹرکب تھی۔

سیاہ اسٹیل کا دواہ وہ ہے آواز طریقے سے کھل گیا اور ہم بل دھڑکنے سے ڈھانے میں جا پڑے۔ یہ وہ خاندانی حصوں پر مشتمل

۱۔ اس میں قیدیوں کو رکھنے کے لئے مختلف ساخت کی کوٹھریاں تھیں اور خارجہ تیل بھی۔ یہاں تک پہنچنے کی نیت صرف انہی

لوگوں کی آتی تھی جو انسانیت اور معاشرے کے لئے مامور سے کم نہیں ہوتے تھے یا پھر جو ہمارا جینا دہر کرنے کی کوشش کرتے تھے

رکشی طرح بھی باز نہیں آتے تھے۔ یہاں بھی ان کو سیدھا کھانے کے مختلف مراحل ہوتے تھے۔ ہماری کوشش یہی ہوتی تھی کہ

خفی مرے تک کوئی نہ جائے۔

وہ تینوں کنٹرول کے ایک چوتھے پر لینے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر قمیصیں نہیں تھیں۔ جسموں پر بظاہر نشانات بھی

مطلوع سے تھے لیکن ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ وہ بغیر کسی رشتوں کے چت لینے ہوئے تھے۔ لیکن شیو بد معاش کے جسم کو تو

نئے وقتے سے یوں جھٹکے لگ رہے تھے جیسے اس پر نزع کا عالم رہی ہو۔ سوچوں والے کی آنکھیں نیم کھلا تھیں اور ہاتھوں سے

فہم رہا تھا۔ قتل ممکن، آنکھیں بند کئے لینا تھا اور پٹکیاں سی لے رہا تھا۔

۲۔ خانے میں بدو بھی موجود تھا اور خاموشی سے بعض چیزوں دان کی کچھ جگہوں پر رکھ رہا تھا اور دوبارہ گیر الماریوں کے آٹالے

نیو پیک کر رہا تھا۔ بدو بھی ہمارے خاص آؤس میں سے ایک تھا۔ وہ بہت زیادہ ذہین یا پھر بھلا نہیں تھا مگر پھر بھی بہت کام کا آدمی

۱۔ ہمیں ادب سے سلام کر کے وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف نہایا۔

وہ تقریباً ساڑھے چھ فٹ کا ایک سیاہ فام آدمی تھا لیکن اس کے موٹے موٹے ہونٹ قدرتی طور پر خون کی طرح سرخ معلوم

آتے تھے۔ اس کا جسم ساڑھے زیادہ مضبوط تھا۔ طبعی الصباح جسم ایک خاص تیل کی مائش کر کے وہ جب باغیچے میں درختوں کے

ریان کرت کرتا تھا تو اس کے جسم میں پھیلیاں اسی طرح ترتیب میں جس طرح کچ کی پھیلیاں بانی میں چلتی ہیں۔ وہ ہاتھوں سے

سے کی سولی سولی سلاخیں سوز دیتا تھا اور محسوس دواہوں پر نہیں مارنے سے بھی اس کے زہر دھما سر کا کچھ نہیں جھڑکتا تھا۔

۱۔ ہم گواہ کچھ بھی ہوتا وہ پیشہ نگار غیاں اور کیڑوں کے جوتوں میں نظر آتا تھا۔ وہ اس خانے کا انچارج تھا اور خیف خان کا

"میں... میں اسے ضرور آپ کا پیغام دوں گا۔ بلکہ اسی طرف سے بھی سمجھاؤں گا۔" رہائی کی امید نظر آتے ہی عمر خان کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی ہاتھیں بری طرح کلاپ گئیں اور وہ دوبارہ دھپ ڈا چوڑے پر بیٹھ گیا۔ کھین شید بد معاش اور قفل شکن نوجوان بھی یہ خوشخبری سن کر آنکھیں کھول دی تھیں اور کانپتے بازوؤں کے سارے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے عمر خان سے کہا "فیصل ملک تو ڈھکی تھا۔ اسپتال داخل تھا۔ کیا وہ صحت یاب ہو گیا؟"

"نہی ہیں" عمر خان نے نحیف آواز میں جواب دیا "مگر ابھی چمڑی کے سارے لنگڑا کر چلے ہیں۔ مگر صاحب... چلی جا رہے ہیں اس پر بخون طاری ہے آپ کو قفل کر دالے گا... اس کا نہیں چل رہا کہ وہ کیا کرے... اور معلوم نہیں وہ کیا کر گزرے اسے سو فیصد یقین ہو جائے کہ کوئی آپ کو قفل کر سکتا ہے تو شاید اس مقصد کے لئے اپنی ساری دولت بھی دے دے..."

صاحب! میں اس کا بخون آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور ضیف خان سے کہا "اس کی گاڑی میں محفوظ طریقے سے کیس بھجواؤ۔"

"بہتر" ضیف خان نے دیکھتے دیکھتے کہ میں کہا اور ان آنکھوں پر ہنسیاں بانٹنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ میں اور جولی دا چل دئے۔

لان پر پہنچ کر میں نے جولی کو خدا حافظ کہا اور گاڑی سے بیٹھا۔ وہ دوبارہ لان چیمبر پر چڑھ کر سامنے تالابی پر رکھی ہوئی ٹیل باؤس میں افسر سپنچا کو کیسٹرن نے بتایا کہ محسن علی شاہی نوجوان مجھ سے ملاقات کے انتظار میں بہت دیر سے بیٹھا ہوا۔

مجھ اس نے فون کر کے اپنا منٹسٹ لینے کی کوشش کی تھی لیکن یہی چلا آیا۔ وہونگ دوم میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ چند منٹ بعد اسے میرے آفس میں بھیج دیا گا۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا اور اندر جا بیٹھا۔

چند لمحے بعد محسن علی کو میرے پاس بھیجا گیا۔ وہ بیٹھا امیدوں کے ساتھ تیار ہو کر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ معمولی مگر سحرے کپڑوں کو اس نے بیٹھ بڑی محنت سے استری کیا تھا۔

میں ٹیل بھی لگایا ہوا تھا اور انیس شاید چند منٹ پہلے بھی کیا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں امید اور ناامیدی کی کلکتہ سا تھپتھپاؤ تھا اور وہ بار بار ہلکے ہونٹوں پر زبان چھیر رہا تھا۔

"سراہو آپ نے نوکری کے لئے؟" اس نے گویا دلائے کی کوشش کی۔

"مجھے یاد ہے" میں نے اسے اطمینان سے چمٹے رہنے کا کرتے ہوئے کہا۔ چند ضروری خطوط پر سرسری نظر ڈالنے میں نے فائل ایک طرف کھینکی اور انٹر کام پر اپنے ایکپیو

سے کھینکا اور ایک دم لڑکھ کر میرے قدموں میں اگرا۔ سسکیں اور ہنچکیوں کے امتزاج کے درمیان وہ اسی عجیب سی سرگوشی بنا تو ازاں میں بول رہا تھا۔ "صاحب... بڑے صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ فیصل ملک نے ہمیں بتایا تو تھا کہ آپ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ کام بہت مشکل ہے، لیکن ہم اس کی بات کو صحیح طرح سے سمجھ نہیں تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ... بہر حال ہوں گے تو دوسرے بڑے سبھوں ہی کی طرح زیادہ سے زیادہ بس یہی ہو گا کہ آپ نے کچھ بد معاش پال رکھے ہوں گے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا صاحب کہ آپ تو چیز ہی کچھ اور ہیں۔ خدا کے لئے ہمیں معاف کر دیں۔"

"آواز داری کہنے اور پاؤں پکڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر واپس چوڑے پر بٹھا دیا۔

"جیسں اتنی تکلیف ہی نہ اٹھانا پڑی اگر تم مجھے میرے گھر پر ہی بتا دیتے کہ جسں فیصل ملک نے بھیجا ہے۔ میں جسں اسی وقت چھوڑ دیتا۔ مجھے تم جیسے کرائے کے قاتلوں سے بھلا کیا لینا تھا۔

اصلی مجرم تو وہ ہوتے ہیں جو ان کو بھیجتے ہیں۔ سزا کرائے کے قاتلوں کو بھی ملنی چاہئے لیکن اس کی پرورش کرنے والوں کو زیادہ

کڑی سزا ملنی چاہئے۔ اب بھی جیسے ہی میں نے تمہارے منہ سے سنا کہ جسں فیصل ملک نے بھیجا تھا تو میں نے اسی لمحے جسں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

اس کے گفت و دو میں گریبا زندگی کی لہر عود آئی۔ اس کی سوتی آنکھیں جن کے گرد نیلے ملتے پڑے تھے قدرے ٹھیک نظر آنے لگیں اور اس نے امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی سے زیادہ بلند آواز میں بے چینی سے پوچھا۔

"صاحب! کیا آپ واقعی ہمیں چھوڑ دیں گے؟ بالکل معاف کر دیں گے؟"

"ہاں۔ اب سے کچھ دیر بعد تم آزاد ہو جاؤ گے اور مجھے اس بات کی بالکل پروا نہیں ہو گی کہ تم باہر جا کر کیا کرتے ہو" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن فیصل ملک کو ایک پیغام ضرور دے دینا کہ زندہ رہنے کا اس کے پاس اب صرف ایک راستہ ہے کہ آئندہ وہ خود یا کرائے کے قاتلوں کے ذریعے میری جانب

ایک انچ بھی پیش قدمی نہ کرے۔ یہ آخری موقع تھا کہ میں اسے معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ ایسی کوئی بھی کوشش اس کی زندگی کی آخری کوشش ہو گی۔ تم ابھی طرح سن رہے ہو؟ کچھ رہے ہو؟"

میں نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی لیکن کراہ کر گردن

تھام لی۔

"جیسں یہ پیغام اسی طرح لفظ بہ لفظ... اسی مفہوم کے ساتھ

فیصل ملک کو دینا ہے۔ بس یہی تمہاری رہائی کی واحد شرط ہے۔" میں نے غصے سے کہا اور ایک لمحے کے لئے غیر ارادی طور پر

میرے دانت بچھنے لگے لیکن پھر میں نے فوراً ہی جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

افسوس کہ قدرت نے مجھے اس قاتل ہی نہیں بنایا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں تو خود دوسروں کی مدد کا محتاج رہا۔ اس کے لیے میں آسف ضرور تھا مگر احساسی عموماً کی جھلک نہیں تھی۔

"اس آسف کو دل سے نکال دو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ قدرت کو نہ جانے کیا منکر ہے۔" میں نے کہا "دوسری عورت جس کا میں ذکر کرتا ہوں وہ تھا۔ وہ تمہاری بلڈنگ کی تیسری منزل پر رہنے والی ایکسٹرا گرل ملکہ ہے۔ جانتے ہو اسے؟"

"جی ہاں۔ ابھی طرح۔ آج کل اس بے چاری کا بچہ بہت بیمار ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں دی۔" میں نے طہانیت سے کہا "میں نے ان کے لئے تھوڑا بہت انتظام تو کیا تھا۔ لیکن لگتا ہے ان دونوں ہی ماں بیٹے کو ایچے اور خاصے خوراک ملانے کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس وقت تک ان کے علاج معالجے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھو جب تک ملکہ اور اس کا بچہ عمل طور پر تندرست نہیں ہو جاتے اور ملکہ دوبارہ کوئی کام کاج کرنے کے قابل نہیں ہو جاتی۔ ٹیکلیبلہ بیگم اور ملکہ جب دوبارہ حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں تو پھر ان کی مدد جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے محسن علی اگر معاشرے میں جو زیادہ تر محتاج، بچے، مسکے ہوئے اور ناکام لوگ نظر آتے ہیں وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو زندگی کی اس قیامت خیز دوڑ میں کبھی ٹھوکر کھا کر گر پڑے تھے اور اس کے بعد کسی نے انہیں سارا رے کر نہیں اٹھایا۔ انہیں دوبارہ ان کے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں بنایا۔ وہ زمانے کے قدموں تلے روندے جاتے رہے اور آخر کار اس قاتل ہی میں رہے کہ کسی بھی طرح دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس دوران اگر ان میں سے کسی خوش نصیب کی مدد بھی کی گئی تو وہ بس اس طرح تھی جیسے بھوک اور پیاس سے مرے ہوئے کسی انسان کے حلق میں محض ذرا پر سے پانی کے دو چار قطرے پڑا دیے جائیں اور مدد کا ایک تھوڑا نوالہ منہ میں ڈال دیا جائے۔ اس مدد کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ لیکن جذبہ برہم حال اس کے پیچھے بھی نہیں ہو تو اس کو بھی سراہنا ہی چاہئے۔ برہم حال میری نظر میں زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک بار کسی کو سارا دینے کے لئے اس کا ہاتھ تھما جائے تو اسے دوبارہ زمانے کی بے رحم دوڑ میں حصہ لینے کے قابل بنانے کی کوشش کی جائے۔ اسے بیشہ واد کا محتاج نہ رکھا جائے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ مجھوت سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یکدم گھبرا کر چمک کر بولا۔ "بہت اچھی طرح سرا"

"امدادی کاموں کے سلسلے میں تم جس وقت بھی چاہو براہ راست انعام پر یا فون پر مجھ سے بات کر سکتے ہو۔ میں اسی وقت کیشیئر سے کہہ دیا کروں گا اور وہ تمہیں مطلوبہ رقم دے دیا کرے گا۔ ان کاموں کے لئے میرا ایک الگ چھوٹا سا تنخوازی نظام کام کر رہا ہے۔ دفتری کاموں کے سلسلے میں آئندہ تمہارا رابطہ زیادہ تر

سے رابطہ قائم کیا۔

"مجھے یاد رہتا ہے کہ چند دن پہلے آپ ذکر کر رہے تھے کہ ہمیں کارگو سپروائزر کی آسانی کے لئے ایک ایماندار نو جوان کی ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔" میجر بولا "کارگو میں قاتر احتیاطوں کے باوجود ہیرا پھیری کا اندیشہ رہتا ہے۔ کوئی بھروسے کا نو جوان چاہئے۔ اسی لئے میں ابھی تک اخبار میں اشتہار دیتے ہوئے ہنگامہ رہا تھا کہ کوئی جاننے والا مل جائے تو بہتر ہے۔"

"میں ایک نو جوان کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ فی الحال اسے آزمائشی بنیادوں پر رکھ لیجئے گا۔ بعد میں مشغل کر لیجئے گا۔"

میں نے کہا۔

آخر کام کارنیورر رکھ کر میں نے محسن علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ملازمت بھی تمہیں ایسی دی جا رہی ہے جس میں اولین شرط صرف دانتہ اور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں تمہیں دو ایک کام اور ایسے سونپ رہا ہوں جن میں دانتہ اور کی اشد ضرورت ہوگی۔ میرے کسی بھی کا دیار کسی بھی پرائیکٹ سے وابستہ ہونے والے وہ لوگ بہت ترقی کرتے ہیں جو بنیاد ٹھکانہ ایماندار اور میرے ساتھ قلمب ہوئے ہیں۔"

"سرا! آپ مجھے ضرور آزمائے۔ کل از وقت میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا۔" وہ بے دے بے جوش کے ساتھ بولا۔

"دعویٰ کرنے والے لوگ مجھے متاثر بھی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "تو کسی میں تمہیں جو کچھ کرنا ہو گا وہ تو تمہیں ایک سپورٹ میجر صاحب سمجھا دیں گے۔ میں تمہارے ذمے جو دو کام لگا رہا ہوں وہ یہ ہیں کہ تمہیں اپنی ہی بلڈنگ کی دو خواتین کی مدد نہایت رازداری اور نہایت ظلم سے کرنی ہے۔ ایک تو تمہیں ٹیکلیبلہ بیگم کو کسی ایسے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرانا ہے جہاں اس کی نظروں کی عادت چھرائی جاسکے اور ضروری علاج کیا جاسکے۔ صحت یابی کے بعد بھی اسے جس حد تک مدد کی ضرورت ہوگی وہ تم فراہم کرو گے۔ وہ اپنے زمانے کی بہت اچھی اداکارہ تھی۔ اور اس سے قطع نظر میں نے سنا ہے کہ وہ بہت نیک دل عورت تھی۔ اپنے خرچ پر اس نے کئی غریب لڑکیوں کی شادی کرائی اور کئی بوائے کی وہ مشکل مدد کرتی تھی۔ معلوم نہیں آسمان اس پر کیوں اتنا مہربان ہوا کہ آج وہ اس حال میں ہے۔ لیکن ہے اسے تمہیں کی محبت نے برباد کیا ہو یا پھر اس کی اپنی ہی ذات کے کسی غفلت نے۔ برہم حال ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ ہماری غرض صرف اتنی ہونی چاہئے کہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے اور معاشرے کی ایک کارآمد رکن بن جائے۔ کیا تم تو کسی کے علاوہ اپنے فاضل وقت میں یہ کام کر لو گے؟"

"کیوں نہیں سرا! وہ بلا تامل بولا۔ "یہ کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔ مجھے تو خود بہت شوق رہا ہے دوسروں کے کام آئے گا۔ کسی کے لئے کچھ کرنے کا۔ جذبہ خدمت بہت تھا مجھ میں۔ لیکن

دوسرے لوگوں سے رہے گا۔ امید ہے تنخواہ اور دیگر مراعات تمہارے لئے قائل قبول ہوں گی۔“

”سر! میری قبولیت کی آپ کیا پوچھتے ہیں؟ وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے ذرا منکرایا۔“ میں تو کچھ دنوں سے چڑاسی کے طور پر بھی کام کرنے کے لئے تیار تھا۔ ایک دو جگہ اس اسامی کے لئے انتظار دینے بھی جا چکا مگر انہوں نے معذرت کہی کہ یہ پالی اسے کی ڈگری کی توہین ہوگی۔ عجیب ستم عرفی تھی۔ ایک طرف تو وہ مجھے ڈگری کے مطابق بھی کوئی نوکری نہیں دے سکتے تھے اور دوسری طرف اگر میں اپنی تعلیمی سطح سے نیچے ٹھکر کوئی کام کرنا چاہتا تھا تو وہ بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ آئندہ کے لئے میرا ارادہ یہ تھا کہ اگرچہ اسی کی اسامی کے لئے درخواست دوں تو اس میں اپنی تعلیم صرف میٹرک بتاؤں گا۔“

”بہر حال۔۔۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ مدت بھولنا کہنی اچانک تمہیں آزمانی بنیاد پر رکھا جا رہا ہے۔“

”مجھے جب تک بھی یہاں رہنا نصیب ہوا میں اپنے آپ کو آزمانی بنیادوں پر ملازم سمجھوں گا سر!“ وہ اٹھتے ہوئے بولا اور اجازت پا کر رخصت ہو گیا۔ میں اسے آزمانے سے پہلے ہی اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ میں لوگوں کی آنکھوں میں ایماندار سی دُعا اور غلوں کے جو گشہ خزانے تلاش کیا کرتا تھا۔ محسن علی کی آنکھوں میں مجھے ان کی جھلک نظر آتی تھی۔ خزانے عموماً غراہوں ہی میں ملتے ہیں۔ خوبصورتیاں عموماً کھنڈروں ہی میں دفن ہوتی ہیں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی ترجیحات پر غور کیا۔ سرفہرست مجھے ہائی اسکول کا سلسلہ اہم نظر آیا۔ شریف سیال پبلی سنگ کالج لیسر، آفیسر خاور اس کی جان بہت غمبھیں میں پھنسی ہوئی تھی۔ تفتیش جو کہ ہر حال میں اسی تھانے کو کرنی تھی لیکن میں آخر کار اسی نتیجے پر پہنچا کہ اگر ذرا اور سے تمہارا سا دباؤ ڈلوایا جائے تو بہتر رہے گا۔ مجھے اپنے طور پر نوکوش کرنی ہی تھی لیکن پولیس بہرہ لی اپنی جگہ ایک جگہ تھی۔ اس کے اپنے انداز طور طریقے اور رسائیں تھیں۔ اگر وہ بھی اس سلسلے میں تمہارے سے سرگرم رہے تو کوئی حرج نہیں تھا۔

ایس بی جہاں زیب میرا دوست تھا۔ میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کر کے تفصیلی بات کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ فوری طور پر متعلقہ نوکروں کو خیمزی سے حرکت میں آنے کی ہدایات جاری کر دے گا۔ اس سے خاصی طویل گفتگو رہی۔ کپ شپ بھی ہوئی۔ آخر کار میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے سلسلہ منقطع کیا اور دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر جہاں زیب کے کہنے سے بھی تفتیش کی رفتار کچھ تسلی بخش نظر نہ آئی تو پھر ڈی آئی کی صاحب سے بھی کھلوادوں گا۔

دفتر کے کاموں میں اچھے کریمے مزید دیکھنے گزر گئے۔ اس دوران ضروری ٹیلی فون کالز بھی آتی رہیں۔ دفتر کے سب لوگ کھانے کا وقفہ کرنے کے بعد واپس بھی آئے لیکن میں کھانے کے

لئے بھی نہیں اٹھا۔ آخر کار گھڑی دیکھنے کے بعد میں کچھ دیر کے اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کیتھرن نے بتایا ایک صاحب مجھ بات کرنے کے لئے بہت اصرار کر رہے ہیں مگر اپنا نام نہیں بتا رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ نام وہ صرف مجھے ہی بتائیں گے۔ اس انداز فون کرنے والوں کو کیتھرن ٹال دیتی تھی۔ انہیں بھی ایک مز ٹال چکی تھی لیکن انہوں نے فوراً ہی دوبارہ فون کیا تھا اور یہ منت مانت کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے بات کرو۔“ میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا اور فون کار بیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے جس شخص نے ٹھہری آواز نے سلام کیا وہ میرے لئے اچھی تھی۔ پھر اس نے یہ انداز سے میری خیر دعائیت دریافت کی اس سے یوں لگا جیسے وہ یہ کوئی غائبانہ جاننے والا ہو۔ بہر حال اس لمحے میں سدا کی اور شرافت کی جھلک تھی۔

”جوہری صاحب! میں آپ سے ملنے کی صرت لے کر کچھ دیر پہلے ہی گوجرانوالہ سے یہاں پہنچا ہوں۔ میں آپ میرا بڑا آوا تو نہیں لیکن بہر حال ایک کاروباری آدمی ہوں۔“ پھر اس نے ایک شناسا براؤز نام بتاتے ہوئے کہا ”اس نام کے بنگھوں کا کارخانہ۔ میرا۔ میرے بیٹوں کے بھی الگ الگ چھوٹے موٹے کارخانے ہیں۔ انڈیا کا کرم ہے۔ اچھے آسودہ مال لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے کاروباری نہیں اخلاقی دودر کار ہے مجھے معلوم ہے کہ مجھے آپ کا قیمتی وقت خراب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں لیکن میں بس ایک سوہوم سی امید کے سارے چلا آیا ہوں۔ شریف سیال نے آپ کے متعلق جو کچھ کہا اور میاں کے کاروبار معلومات سے میں نے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ جتنے بڑے آدمی ہیں اتنے ہی بڑے دل کے بھی مالک ہیں۔۔۔ اور دل بھی ایسا جس میں دوسروں کے لئے درد مند بنائی جاتی ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ میری مدد کے لئے وقت نکالیں گے؟ میں یہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔۔۔ اگر آپ مجھے یہاں ملاقات کا اعزاز بخشا جائیں تو یہاں شریف لے آئیں مجھے اجازت دیں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟“

میں نے خاموشی اور توجہ سے اس کی بات سنی تھی۔ بظاہر اس کا لہجہ ٹھہرا ٹھہرا تھا لیکن پھر بھی اس کے لفظوں میں جیسے جذبات ایک ہماؤ سا تھا۔ وہ بہت بے تاب بھی معلوم ہوتا تھا اور کسو حد سے نہ حال بھی۔ مگر وہ گویا بہت جرأت اور بہت سے کام لیے ہوئے اپنے آپ کو نبھالے ہوئے تھا۔

”لیکن آپ کو کس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت آتی پڑی؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”نظام کے قتل کے سلسلے میں“ اس نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ان لفظوں کے عقب میں گویا سسکیاں کھل رہی تھیں۔

”اچھا۔۔۔ تو آپ ہی نے غالباً آج صبح شریف سیال کو بھی فون

تھا؟" میں نے مہری سانس لے کر کہا۔

"جی ہاں" اس نے جانتا تھا کہ "اسے میں نے جو جرنالہ
دون کیا تھا۔ اس نے جب آپ کے بارے میں بتایا تو مجھے امید
ایک کرن نظر تھی۔ میں فوراً گاڑی نکال کر جرنالہ سے چل
پہلے میرے ذہن میں شک بھی تھا کہ آخر آپ نشاد کے قتل
پر دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ لیکن پھر میں نے معلومات کیوں اور
آپ کے بارے میں اطمینان ہو گیا کہ آپ کی دلچسپی بے
نازعہ ہے اور کسی نے نشاد کو آپ کے پاس دے جانے کے لئے ہی
ہا تھا کہ اس سے پہلے ہی۔۔۔" اس کی آواز ایک لمحے کے لئے
روم ہو گئی مگر پھر اس نے گویا خود کو سنبھالا۔ "مجھے معلوم ہوا کہ
آپ کے لئے بالکل ایسی تھی مگر آپ کو اس کی دردناک موت کا
ہوا۔ اس دکھ کے ماتے کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

"مگر آپ کی اس معاملے میں دلچسپی کی بنیاد کیا ہے؟ کیا صرف
عاطفی ہمدردی؟" میں نے غلامت سے پوچھا۔

"یہ میں آپ کو فون پر نہیں بتا سکتا۔ میں آپ سے ملاقات
لے لے بے آپ ہوں۔"

میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "میں ہی آپ کے پاس آیا
ہ۔ لیکن تو مجھے بعد۔ آپ مجھے اپنا نام اور کرا کر سہرتا دیتے
"اس عزت افزائی کے لئے میں آنے لگا کہ آپ کا شکر گزار
ہوں گا۔" اس کے لمحے میں حقیقی ممنونیت تھی۔ "میرا نام وحید
ہے۔" پھر اس نے اپنا کرا کر سہرتا دیا۔ میں نے سلسلہ منقطع
کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد چپ میں ملٹی بی میں کھاؤ وغیرہ کھا کر ڈانٹنگ
سے اوپر مطلوب کرے تک پہنچا تو وحید صاحب مجھے کمرے کے
درازے پر ہی کھڑے ملے۔ شاید وہ خاصی دیر پہلے ہی ماہر آؤ
فرسے ہوئے تھے اور بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

وہ کمرے تک کے ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں تھے۔ قدرے
بے اندام آدمی تھے اور برصا پہ کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے۔
انی میں وہ خامے و جبر رہے ہوں گے۔ عام حالات میں ان کے
بے پر بخت گیری بھی جھلکتی ہوگی لیکن اس وقت وہ غلغلہ دل اور
فصل نظر آ رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے
درازے سے مجھے پہچان لیا اور خودی آگے بڑھ کر گرجوٹی سے
نہ کرتے ہوئے بولے "چوہڑی صاحب! آپ نے یہاں
لیٹ لاکر مجھے بڑی عزت بخشی دی ہے اور میرے دل کو براحوصلہ
بخشا ہے۔"

انہوں نے میرے لئے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر پہنچ کر
لے "میں کس منہ سے آپ کا شکر یہ ادا کروں"

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "مری باتوں کو
نہیں وحید صاحب! کاس کی بات کیجئے۔ نشاد آپ کی بیٹی تھی؟"
ان کی آنکھیں بلوری تھیں۔ نشاد کی آنکھوں کا رنگ بھی ایسا
تھا لیکن میں نے انہیں ڈراؤنے انداز میں سطوں سے نکلے

ہوئے دیکھا تھا۔ وحید صاحب کی آنکھوں میں بھی جھلک آئی۔ ایک
لمحے وہ بالکل خاموش رہے۔ کمرے میں پورے ماحول ساکت چھا گیا
"آپ ٹھیک سمجھے" آخر کار وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے
اور نشاد پھر سے آنکھیں شک کرنے لگے۔ "وہ میری سب سے
بھائی اولاد تھی۔ انکوئی بیٹی۔ خود سر اور لاڈلی۔ دھن کی پکی
ہم دونوں ابھی کمرے ہی تھی۔ میرا بیٹھنے کو دل بھی نہیں چاہ
رہا تھا۔ انہوں نے بیٹکی بیٹکی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر ان
کی آواز گویا بہت دور سے آنے لگی۔ "ہم کاروباری لوگ ہیں۔
ہمارے گھرانے میں تعلیم زیادہ نہیں ہے۔ لڑکے واجبی ہی تعلیم
حاصل کر کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں لیکن رخشہ کو تعلیم دلانے
کا ہمارا ارادہ تھا۔ نشاد کا اصل نام رخشہ تھا۔ مجھے بہت بعد میں
پتا چلا تھا کہ لاہور آکر اس نے اپنا نام نشاد رکھ لیا تھا۔ کیونکہ وہ
ہمارے حوالے سے بچائی جاتا نہیں جانتی تھی۔"

انہوں نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں کمرے
میں بیٹھنے لگا۔ آخر کار وہ خود مجھے تھکے انداز میں ایک صوفے پر
ڈھیر ہو گئے اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے "وہ اس وقت
صرف انٹری طالبہ تھی جب اس پر قلمی ہمدردی بننے کا جنون سوار
ہوا۔ ہمارے گھرانے اور ہمارے خاندان میں کسی نسلوں سے دولت
ہونے کے باوجود ہم لوگ زیادہ آزاد خیال نہیں ہیں۔ وہ انہوں کی
محنت پابندی ہے ہمارے ہاں۔ کسی حد تک قدامت پسند بھی کہہ
سکتے ہیں آپ نہیں۔ لیکن رخشہ کے معاملے میں ہم نے بھی
زیادہ قدامت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہم دیکھتے تھے کہ وہ قلمی
رسالے شوق سے پڑھتی ہے۔ اور اکاؤنٹ کو خط لکھتی ہے۔ ہمیں یہ
بھی معلوم تھا کہ وہ کانچ کے ڈراموں وغیرہ میں پیش پیش ہوتی ہے۔
انہیں کے سامنے الٹنگل کرتی ہے۔ ایک بار اس کا بھائی لندن سے
وڈیو پر کیرہ لایا تو اس نے باقاعدہ خود اسکرپٹ لکھ کر تنہا اداکاری
کر کے ایک لڑکی کی مدد سے اپنی بیس بیٹیس منٹ کی ایک فلم بھی
تیار کی۔ جس پر ہم سب نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس نے وہ
تکس چھپا کر رکھ دی یا شاید ضائع کر دی۔ ان سب چیزوں کو ہم نے
کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ بچکانہ شوق ہیں۔
وقت کے ساتھ ساتھ خودی ختم ہو جائیں گے۔ بے شمار لڑکے
فریوں کو ہوتے ہیں یہ شوق۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے
پڑ جاتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر ایک لمحے کے خاموش ہو گئے۔ ان کا سر
جھک گیا اور لہجہ خود گامی کا سا ہو گیا۔ "انٹر کے بعد ہم اسے پڑھنے
کے لئے گئے جو جرنالہ کے بھائے لاہور بھیجتا چاہتے تھے۔ اس صوفے
پر اس نے اعلان کر دیا کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ لاہور میں سطوں
میں بھی کام حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کا انداز فیصلہ
کن تھا اور اس کے لمحے میں غیر حوصلہ عزیمت کی جھلک تھی۔ ہم
نے محسوس کیا کہ اب اپنی اختیار کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اب
ہمیں اس کے سر سے یہ بھوت اتارنا پڑے گا۔ چنانچہ ہم نے سختی

بھائی بھی چپ چپ رہتے تھے۔ اور اب جو کچھ بھی ہم متعلق معلوم ہو سکا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی اپنی زندگی غفلت و نادانی ہے۔ ہم وہاں عایشان کو ٹھیکوں میں ایئر کنڈیشنر میں سوتے رہے اور وہ میری پھول کی بیٹی۔ ضد اور انانیت نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکوں میں رکتی رہی۔ کن کن ہاتھ کھلوا رہی رہی۔ صرف معاشرے میں ناک اونچی رکھنے کے کتے ٹھوک رہے جاتے ہیں۔ اور اب بھی ہیں۔ اب بھی ہر جہ انسانی جرات نہیں کہ آگے بڑھ کر اس کی سوت کے بعد وہ اپنا کیس اور عزت ہیو سے اس کا جائزہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ وہ اسپتال کے مردہ خانے میں لاوارث لاش کی حیثیت ہے۔ معلوم نہیں اسے ڈھنگ سے کنکن بھی نصیب ہو گا یا نہیں۔ اس کی آپ ٹکڑ نہ کریں۔ نہایت اچھے طریقے سے تدفین کا میں نے بندوبست کر دیا ہے۔ میں نے ان کے ہاتھ چھو کر اس کا ایک قطرہ کانے کی کوشش کی۔

”میں آپ کا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گا جو ہدیہ میں دیا۔ وہ بھیجی بھیجی آنکھوں سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر۔“

”اس کے بھائی کم سم ہیں۔ وہ اپنے آپ سے بھی خفا ہیں اور اب بھی۔ اور اب میں سوچتا ہوں۔ واقعی بات تو کوئی ایسی بھی نہیں تھی کہ جس سے ہم اتنے متغیر ہوتے چلے گئے۔ اس کی کوئی تیز سوت کے راستے پر بھیج دیا۔ اگر؟“

”میں خود اسامیجک بھی کہتے تھے۔ میں تو اس کے شوق کی کے لئے خود اس کے لئے قلم ہمارا کریمت میں بیٹھ سکتا تھا دس لاکھ روپے کی کیا بات تھی۔ لیکن اب یہ سب بچہ تھوڑے ہیں۔ خاتمی ہیں۔ جو اس دھم کو نہیں بھ... اب ہمیں توڑی بہت تسکین شاید صرف اس طرح ملے کہ ہم اس کے قاتل کو تلاش کریں اور اپنے ہاتھوں سے عبرت ناک انجام تک پہنچائیں۔ لیکن ہم ہی ہی بے کار لوگ۔ اس معاملے میں بھی ہم بے دست و پا ہیں۔ سمجھ میں نہیں کیا کریں۔ ویسے تو میں نے پولیس والوں کو بھی تحریک د۔ کوشش کی ہے لیکن اول تو مجھے ان کی کامیابی کی امید کم۔ اگر اتفاق سے قاتل ان کے ہاتھ آجی گیا تب بھی ضروری وہ قرار واقعی سزا پا سکے۔ میں ممکن ہے وہ قانونی موٹا فائدہ اٹھاتے ہوئے بری ہو جائے یا توڑی بہت سزا ہو جائے۔ میں جانتا ہوں کہ پولیس کو اپنی جگہ معروف عمل کسی اور طریقے سے بھی قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے میں ذرا سی امید پا کر آپ کے پاس دوڑا آیا ہوں۔ چہ ہدیہ صاحب! کیا آپ میری مدد کریں گے؟“

وہ آنکھوں میں ان گنت التجا میں لے میری طرف دیکھ اور میں خاموش تھا!

اختیار کی۔ اسے لاہور بھیجا تو درکنار ہم نے اسے گورنر ہاؤس کا بجے بھی اٹھایا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ اگر اسے مزید چھاننی دے تو پرائیویٹ چھاننی گے۔ اس پر دوسری پابندیاں بھی لگائیں۔ کانی خشتی کی۔ شاید ہمارا طرز عمل غلط تھا۔ شاید ہم چھاننی کو صحیح طور پر پینڈل نہیں کر سکے۔ اس مسئلے کو زیادہ وقت نہیں دے سکے۔ ہم سب معروف بھی بہت رہے تھے۔ کسی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہی میری تقریباً دس سال پہلے اللہ کو پیار دی ہو چکی ہے۔“

ایک نیا نشوونما لے کر انہوں نے ایک بار پھر آنکھیں خشک کیں۔ ”ہم نے دن بہ دن سختیاں بڑھائیں اور اس کے دل میں دن بہ دن بےادبیت طاقتور ہوتی گئی۔ ہم نے اس کے لئے ہر راہ مسدود کر دی۔ لیکن اس نے آخری راہ اختیار کر لی اور ایک رات گھر سے فرار ہو گئی۔“

انہوں نے ایک سسکی سی لی اور ان کی آواز پہلے سے بھی مدھم ہو گئی۔ ”بہت عزت دار لوگوں میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے افراد کی خبر کو گھر سے باہر نہیں پہنچنے دیا۔ یہی مشہور کر دیا کہ ہم نے اسے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا ہے۔ ہم نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کوئی کوشش نہیں کی۔ ہمیں مدد بھی بہت تھا اور غصہ بھی۔ بلکہ کانی عرصہ تو ہم پر غفلت غالب رہی۔ وہ گھر سے معمولی سی رقم کے علاوہ کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ اپنی سونے کی چڑیاں وغیرہ تک ادا کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی شناخت بھی گھر پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ وہ کوئی ایسا فائدہ کار نہ ہو سکا تھا جس سے ہمارے ساتھ اس کے تعلق کا کوئی رد ہوتا۔ ایک بہت طویل جذباتی خط چھوڑ گئی تھی کہ اگر اس کے شوق کی وجہ سے ہماری ناموس کو خطرہ لاحق ہے تو وہ ہماری خوشنودی کی خاطر اپنے آپ کو ہم سے لاتعلقی کر رہی ہے اسے کسی شناخت کسی سارے کی ضرورت نہیں۔ اور ایک روز وہ اتنا نام لکھ لے گی کہ ہم خود اس سے تعلق جوڑنے کے لئے دوڑے آئیں گے اور اس سے فاتحانہ طور پر کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس اسی قسم کی بہت سی بھگت اور جذباتی باتیں۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”ایک طویل عرصے بعد اس کے بارے میں جو پہلی خبر ہماری نظر سے گزری وہ اس کے قتل کی خبر تھی۔ اور ہم نے اس کے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل کیں وہ آج ہی کی ہیں۔ اب بھی ہم نے سب سے پہلے تو اسی بات پر شکر ادا کیا کہ کسی نے اس کو ہماری بیٹی کی حیثیت سے نہیں پہچانا۔ بہت خود غرض بہت متغیر ہیں ہم۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے اس کی یاد میں بہت سی باتیں کو نہیں بدلتے مزاری ہیں۔ ہم نے اپنے جذبوں پر غم دھنے کا آئینہ خول بن لیا تھا لیکن اس رشتے کی کوئیل تو ہر حال میں ہری رہتی ہے۔“

ہے کسی کو نہیں معلوم اس کی منزل کیا ہے۔ اسی طرح دوزے دوزے ایک روز انسان ختم ہو جاتا ہے۔

"میں اب چلا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے فلسفے سے بور ہو گئے۔" وہ افسردگی سے مسکراتے "رشتہ کی موت نے کیا کی ہی مجھے قفس سنا دیا ہے درندہ میں تو ایک سیدھا سادا کھردرا سا بڑا شخص تھا۔"

"انداز سے میں بھی خاصا فلسفی ہوں۔" میں نے ان سے معافی کرتے ہوئے کہا "لیکن میں زیادہ تر خیال میں اپنے فلسفے اپنے آپ سے ہی ڈسکس کر کے زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہوں۔"

میں دروازے کی طرف چل رہا۔ سیٹھ وحید اپنا وزنگ گاڑ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "اس پر میرے ٹیلی فون نمبرز اور گھر، دفتر، ٹیکسٹی کے ایڈریس موجود ہیں۔ میں آپ کی طرف سے کسی اطلاع کا شکر رکھوں گا۔" وہ مجھے لفت تک چھوڑنے آئے۔

بچے بیچ کر میں جیسے ہی لفت سے نکلا، فنی سائے کھڑا نظر آیا۔ فنی اور شیر شیخ آج کل ایک سفید گاڑی میں ہمہ وقت میرے خاقب میں رہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو میری حفاظت کے لئے اسور کر لیا تھا۔ میں گاڑی سے اتر کر کھینچا جاتا تھا تو ان میں سے ایک میرے پیچھے رہتا تھا۔ دوسرا اپنی گاڑی میں بیٹھ بیٹھ میری گاڑی پر نظر رکھتا تھا۔

"سرا" وہ بلا حمید سرسری لہجے میں بولا "ایک گوری فنی" احاطہ اور بہت خوب صورت لڑکی آپ کی گاڑی میں کبھی ہے۔"

"گنگ ہے بہت فور سے جائزہ لیا ہے تمہارے اس کا؟" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"آج بھی چوری طرح مکمل رکنا تو ضروری ہے؟" سرا "اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ نہایت چلبھے نعرش کا مالک اور گورا چٹا نوجوان تھا۔ جب وہ ایشی میں ہوتا تھا تو اس کے پتلے پتلے ہونٹوں سے سفائی جھلکتی تھی لیکن عام حالات میں وہ بہت نرم خور و مہذب نظر آتا تھا۔ وہ بات چاری رکھتے ہوئے بولا "آپ شاید گاڑی کو لاک کر باہر چلے گئے تھے۔"

"قفس کو کبھی کبھی اسی طرح چھوڑنا چاہئے۔ کوئی نہ کوئی آواہ بھیجی تو ہی پھرتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس بھیجی کو کتنی دیر ہو گئی گاڑی میں داخل ہوئے؟"

"تقریباً بیس منٹ ہو گئے ہیں۔" فنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ انداز سے ہے اور غالباً پچھلی سیٹ کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ وہ سلیٹی رنگ کی ایک پرانی سی بیٹ میں آپ کے آفس سے ہی آپ کے خاقب میں روانہ ہوئی تھی۔"

"اگر وہ بیس منٹ سے پچھلی سیٹ کے پیچھے چھپی چھپی ہے تب

میری مسلسل خاموشی کے باعث آخر کار سیٹھ وحید کی اس میں باہری کے سامنے اتر آئے وعدہ نوٹتے لہجے میں۔ "مجھے معلوم ہے میری یہ فرمائش میرا یہ اصرار ہے یا جب ہم چھپے چھوٹے سونے سنکا روں کی معصوفیات کا یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کے لئے ان کی زندگی میں "خاطر خواہ وقت" بیکال پاتے تو آپ جیسا بڑا آدمی کسی کی مری ہوئی ہوتی کے لئے وقت کس طرح نکال سکتا ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔" میں افسردگی سے مسکرایا۔ مزید ایک لمبے کے توقف کے بعد انے دھیمے لہجے میں کہا "وقت بے شک بہت قیمتی ہے لیکن دم کے لوہے زیادہ قیمتی نہیں۔ اگر میں اس معاملے میں کچھ بے کارا رہا تو رکنا تو آپ سے لئے کی زمت بھی نہ کرنا کہ میں تو اصل یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے آپ سے کوئی وعدہ کر لیا تو میں شرمندگی نہ اٹھاتی رہے۔"

"آپ صرف ہائی بھر بیٹھ میرے سینے میں بڑکتے آتش ناں میں کچھ ٹھنڈک ہی اتر آئے گی۔" وحید صاحب بولے "اور نہ یہ بھی نہیں ہے کہ نیک مقاصد میں اوپر والے کی تائید بھی مال ہوئی ہے۔"

"میں بھی اسی یقین کے سارے آپ سے وعدہ کر رہا ہوں کہ ایک بیٹے کے اندر اندر قافل کو آپ کے قدموں میں لا بیٹھوں گا۔" میں نے صبر سے لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ افضل صاحب! وہ میرا ہاتھ تھامے ہوئے گویا آواز میں بولے "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"آپ بار بار احسان کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ کئے جا رہے ہیں۔" میں نے حسیٹنا شرمندگی سے کہا "میں اس قسم کا بھی کوئی چھوٹا سونا کام کرتا ہوں" اپنے دل کی تسکین کے لئے کرتا ہوں۔ ایک عجیب بے عنوان سی تعجب ہے "ایک فیرواضح سی بے اطمینانی ہے جو ایک مدت سے میری ہم سفر چلی آ رہی ہے۔ صرف اسے بھلانے کے لئے میں کسی کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا مجھے کوئی اجر ملے گا یا نہیں۔ میں تو بس اپنی غرض کے لئے کرتا ہوں۔ آپ کو احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے ایک لمبے میری طرف دیکھتے رہے۔ ان کے ہونٹ دھیرے سے کانپے ٹھنڈے کچھ بولنے سے قاصر رہے۔ آخر کار وہ گویا بڑی مشکل سے بول پائے "تب بہت عجیب آدمی ہیں افضل صاحب! اور جہاں تک بے اطمینانی اور تعجب کا تعلق ہے تو وہ آج کے دور کے ہر چھوٹے بڑے آدمی کا مشترک ہو چکی ہے۔ کیوں کہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اس مادی دور کے پگھلاؤ میں پھنسا ہوا ہے۔ انگریزی میں "بیسے رٹ دیس" کہتے ہیں اسے ہر شخص چوہوں کی اس دوز میں شریک ہے اور بس دوز

پہچان لیا۔

مجھے یاد آگیا کہ میں نے اسے مسجد احمد سعید صاحب پارٹی میں دیکھا تھا۔ وہ جگل کرلی کے پیر اور مارون نما غنم سوئی کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی اور منانے مجھے بتایا اے اپنی تھی اور قہمی دنیا کے بہت سے لوگوں سے اس کی دوستی تھی۔ قہمی قہمی قہمی میں اسے جگل کرلی میں جموہ سا کو بھی دے دیا گیا تھا جو شوٹ بھی ہو چکا تھا۔ قہمی میں کام کر لے تک تو ٹھیک تھا لیکن ایک سال قہمی کی کام از کم یہ نہیں ہوتا چاہئے تھا کہ ہسپتال کے زور پر ہی کو کس لے جا کو شش کرنی پھرے۔ لگتا تھا کہ اس کی تین بھی شاید کہیں میں تھیں۔ یاد آئیں گمراہی میں لے جانے کی کو شش کر رہی شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کو شش اس کی جڑ تک سکتی تھی۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے طاقت سے کہا "تمہارا ایمان واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے جو تم نے اس حوض سے شروع کر کے ہے؟" "اوہ... تو تم نے مجھے پہچان لیا۔" "میری سانس لے کر یادداشت بہت اچھی ہے۔" "بھیر بھڑا میں دیکھو ہوئے چوب یاد رکھتے ہو۔"

"ہر چو نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "صرف چو یاد رہتا ہے جو یاد رکھنے والے کے قابل۔" "سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں عورتاں تھیں۔" "نہ جانے کیوں اس نے تقدیر ہی چاہی۔"

"ہاں" میں نے جلتا ہوا کہا "وہی بن جانا تم جیسی آ خوب صورت اور نوجوان لڑکی کی لاش سڑک پول سے نکل تھی اور تمام مسافروں کا لطف و سحر قمارت رہا تھا۔" "تمہیں کس نے میرے متعلق بتایا؟" "وہ گویا لڑکی لاش والی بات ان سنی کرتے ہوئے بولی۔"

"ایک مریبان نے" میں نے جواب دیا "تمہیں کس نے بھیا ہے؟"

"ایک مریبان نے" اس نے گویا تڑپا کر کہا "جواب دینے کو شش کی۔"

"تمہارے بھی ہیں مریبان کیسے کیسے؟" میں نے اردو میں "چہ کر لھنڈی سانس لی۔"

"کسا مطلب؟"

"انگریزی میں اس کا صحیح معلوم سمجھنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اتنا بتا دوں کہ لوگوں کی مریبانوں میں بھی جان بھی لیتی ہیں۔" میں نے نہایت سنجیدہ اور مریبانہ لہجے میں کہا "تم کم اور حسین ہو۔ ممکن ہے ایک حسین مستقل تمہارا فخر ہو۔ واقعی تمہیں لہان واپس نہیں جانا ہے جو ان چکروں میں پڑ

تو کافی تکلیف دہ پوزیشن میں ہوگی۔ حسینوں کو اتنی تکلیف دینا کوئی مناسب بات نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے جگ کر فوراً گاڑی میں بیٹھنا چاہئے۔" میں نے لابی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ رسک لیں گے؟ معلوم نہیں اس کا ارادہ کیا ہو؟" فونی ہچکچاتی ہوئے لایا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔ ایسی تشریش کی کیا بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تم اپنی گاڑی میں تقاب جادی رکھو اور جب تک میری طرف سے کوئی مسئلہ نہ ملے یا فخر ہو پھٹا ہوا محسوس نہ ہو تب تک دعا غلط نہ کرو۔"

"اوکے سر!" وہ اشارت میں سر ہلا کر دوسری طرف چلا گیا تاکہ ہمیں ایک ساتھ لابی میں داخل ہوتے اور پھر ہوٹل سے نکلنے نہ دیکھا جاسکے۔

میں نے پارکنگ لٹ میں آکر بظاہر بے خیالی کے سے عالم میں گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگر فونی نے مجھے خبردار نہ کیا ہوتا تب بھی بیٹھتا مجھے احساس ہو جاتا کہ گاڑی میں کوئی لڑکی موجود ہے۔ گو اس نے شاید اپنے طور پر احتیاط کر رکھی تھی کہ کوئی کلون دیکھو نہیں لگتا ہوا تھا مگر ہر عورت کے وجود کی اپنی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ اس لڑکی کے وجود کی بھی سحر ال ایک خوشبو تھی جو کم از کم مجھے ضرور خبردار کر دیتی۔

بظاہر بے پروائی سے سکتی مچاتے ہوئے میں گاڑی مال پر لایا۔ آئرش کوئل کے سامنے پہنچ کر میں واپس جانے کے لئے گاڑی سڑک کی دوسری سائیڈ پر موڑنے لگا تھا کہ عقب نما آئینے میں میں نے اپنی سیٹ کے عقب سے ایک سرگوداد ہوتے دیکھا۔ اس کے بال اخروٹ کے رنگ کے تھے۔ فونی نے اس کے بارے میں مچانے سے کام نہیں لیا تھا۔ خوب صورت وہ بلاشبہ تھی مگر اس کی خوب صورتی محض آنکھوں کو بھلی تھے والی تھی۔ دل کو کراتے والی نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے پلاسٹک آف پیرس کے مجسمے بہت حسین ہو سکتے ہیں مگر انہیں دیکھ کر رگ و پے میں چنگاریاں نہیں تھری سکتیں۔

اس کے سپید سر میں آنچھ میں پھوٹا سا ہسپتال دیا ہوا تھا جو اس نے اپنی دانست میں میری بے خبری میں میری کینٹی پر رکھ دیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی "گاڑی موڑنا مت۔ سیدھے چلتے رہو۔"

حکم اس نے انگریزی میں دیا تھا تاہم مجھے سے وہ ایٹالیائی سی معلوم ہوئی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ ڈرائیو تک سیٹ پر ڈرائیو سا اچھل کر خود لڑکی کا اگلا درکوں مگر پھر میں نے ہلکی سی آواز میں محض "اوہ" کہنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ مجھے شناسا محسوس ہوتا تھا۔ گاڑی صحیح سائیڈ پر لے آنے کے بعد میں نے ایک بار پھر عقب نما آئینے میں اس کی صورت پر نظر ڈالی۔ عقب نما آئینہ ہر چیز کو بہت چھوٹی کر کے دکھاتا ہے تاہم میں نے خاصی آسانی سے اسے

بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ کون ہو سکا
خاور مجھے انہی کے لئے انکار کرنے کا اس کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس کا رخصتہ
عرف بے بی نشاط کے قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا؟

ایک لمبے کے لئے مجھے اس نازک اندام سیڑھی پر لڑکی پر ترس بھی
آیا جو میری کچن پر ہسپتال رکھے بیٹی تھی اور اس خوش قسمتی میں
تک تھی کہ وہ مجھے انہی کے لئے جاری ہے۔ اسے شاید ذرا بھی
اندازہ نہیں تھا کہ اگر میں چاہتا تو اس کا ہسپتال مجھے اس کی خوب
صورت سی کروں مولنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس بے
جاری کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کی صورت حال کے لئے
میری گاڑی میں کئی طرح کے میکانیزم بھی موجود تھے۔ میں چاہتا تو
پاؤں کے قریب ہی موجود ایک غیر نمایاں سا بٹن دباؤں اور میری
سیٹ کے عقب سے تقریباً چار انچ لمبا بھینڈو سے کا پتلا سائیک زہر
اگر خنجر تقریباً گولی کی سی رفتار سے برآمد ہو اور اس کے سینے میں
پوست ہو جائے۔ وہ بالکل ایسی سیدھ میں بیٹھی تھی جسی وارنٹ گن
کے اصول پر کام کرنے والی وہ گن پر مشبہ تھی جو خوب صورت
ساخت کا مسلک خنجر پہنچتی تھی۔ اور بھی دو تین چیزیں تھیں جن کی
زومیں آکر وہ ہلاک ہو سکتی تھی۔ بے دست و پا ہو سکتی تھی۔ اور اگر
میں خود بھی ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت کرنا چاہتا تو وہ میرے لئے۔۔۔
کوئی ایسا برا مسئلہ نہیں تھی۔ لیکن میں بخوشی اس کے ساتھ باہر
تھا۔ کیوں کہ آج کل میرے چاروں طرف اچھے ہوئے معاملات کا
ایک عجیب سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں سے کسی معاملے کا کوئی سرا
ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یہ لڑکی ان میں سے یقیناً کسی نہ کسی معاملے کا
سراغ تھی۔ میں اس کے سامنے کسی بڑی چمکی تک پہنچنا چاہتا
تھا۔

مزید کچھ دیر کے سفر کے بعد اس نے مجھے گاڑن ٹاؤن کے
ایک دور افتادہ حصے میں ایک ویران "بازار اور مکمل سی کوٹھی کے
سامنے رکنے کا حکم دیا۔ اس کے پس پاس کالی پلاٹ خالی پڑے تھے
اور بعض کو تو جھانپوں یا بے ہنگم گھاس پھوس نے اضعاف رکھا
تھا۔

"میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔" میں نے اترنے سے
پہلے کہا "ہو سکتا ہے میرا آخری وقت قریب ہو۔ مرنے سے پہلے
مجھے کم از کم تمہارا نام تو معلوم ہو ہی جانا چاہئے۔"

"مہ پانہ مشدی" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ وہ بالکل
محسوس اور بے خوف نظر آ رہی تھی۔ ہسپتال ایک لمبے کے لئے
کچنٹی سے ہٹا کر اس نے مجھے گاڑی سے دو قدم دور جانے کا حکم دیا
پھر خود بھی پھرتی سے اتر آئی۔ وہ ہسپتال لئے میری پیچھے رہی اور مجھے
آگے بڑھنے کے سلسلے میں ہدایت کرتی رہی۔

کوٹھی میں دو دروازے نہیں کھے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ کسی وجہ سے اس کی حیر کا کام بہت عرصہ پہلے ہو گیا تھا
اور کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں رہا تھا۔ برآمدے سے

وہ میں نے اٹھنے سے ہسپتال کی طرف اشارہ کیا۔

"اب ان میں میرے لئے اب کیا رکھا ہے۔ مجھے خدمت ہو چکی
ہاں سے نکلے ہوئے۔ ہاں باپ گولیوں کا نشانہ بن چکے مگر نڈر
پیش ہو گیا۔ بھائی کو چھائی لگ گئی۔ بن کو کوئی انصاف کرنے گیا۔
میں تو نہ جانے کس طرح جان بچا کر ملک و ملک پہنچی ہوئی یہاں
تک پہنچی ہوں اور ابھی نہ جانے کہاں کہاں جانا ہے۔ کوئی گھر
کوئی سہرا مستقبل میرا منتظر نہیں ہے۔ اور اگر وہ بھی تو مجھے اب
اس کی پروا نہیں رہی۔ میں اب دنیا کی ہر چیز سے بے پروا ایک من
سوتی لڑکی ہوں۔ جو میرے دل میں آئے کئی ہوں۔ جس میں میری
نگہیں مڑتا ہوئے یا زیادہ حافی صاحب بننے کی ضرورت نہیں۔"
اس کا دل برف کی قاش معلوم ہوتا تھا۔ بعض لوگ بہت زیادہ
صدمات سے گزر رہے کے بعد ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔

"اوہ!" میں نے متاثرانہ سے انداز میں طویل سانس لی "کیا
نہانہ آگیا ہے۔ ہر دروں اور خنجر اداوں کی اس طرح طبیعت صاف
کر کے انہیں ایک طرف بٹھا دیا جاتا ہے۔ خیمہ تمہاری مرضی!"
میں نے بے پروائی سے کندھے اچکارے اور عقب نما آئینے میں
ایک بار بھر اس پر نظر ڈالی۔ اس نے پتلا ہونٹ دانوں میں دبا رکھا
خاور اس کی بھوری آنکھوں میں نہ جانے کس خون آشام لہروں کی
پرچھائیاں تھیں۔ ایک لمبے کے لئے وہ مجھے بہت سفاک اور بہت
زہریلا دکھائی دی۔

میں کار بہت سست رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے
رفتار تیزی کرنے کی فراغ نہیں کی۔ چند لمبے کی خاموشی کے بعد
وہ بولی۔ "مجھے حکم ملا تھا کہ جسیں ہٹا دیا کر تم پر ڈوسے ڈال کر
ناز و ادا رکھا کر ساتھ لے آؤں لیکن نہ جانے کیوں میرے دل نے
کہا کہ شاید یہ جادو تم پر نہ چل سکیں۔ میں نے سید صاحب کے
ہاں پارٹی میں جسیں ستاد کے ساتھ دیکھا تھا کہ میں تمہارے
بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ میرا دل تمہارے بارے میں
بیک وقت متضاد رائے دے رہا تھا۔ ایک لمبے کے لئے تم بہت
عاشق مزاج اور دل پریمک لگتے تھے اور دوسرے ہی لمبے دل کٹتا تھا
کہ تم عورت کے معاملے میں بہت بے حس اور بے نیاز ہو۔ اس
ابھن کی وجہ سے میں نے بہتر سمجھا کہ ہسپتال ہی استعمال کیا
جائے۔"

"اپنے بارے میں تو میں خود بھی ابھن میں رہتا ہوں۔ تم
مصلح ایک بار دوسرے دیکھ کر کیا اندازہ لگا سکتی ہو۔" میں نے کہا اور
کڑی پر لگے ہوئے عقب نما آئینے پر ایک نظر ڈالی۔ فنی اور شبیر
سفید کار میں بدستور پیچھے آ رہے تھے۔ لڑکی عاقب وغیرہ کی طرف
سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ وہ دیا تو ان معاملات میں زیادہ
منجھی ہوئی نہیں تھی یا پھر اس نے میرے بارے میں بالکل ہی غلط
اندازے لگائے ہوئے تھے۔ میں اس کے بارے میں ابھن میں
تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے جس نے بھیجا تھا وہ بھی میرے

سے ہی کہیں ناراض رہتی ہو؟ ہمارے میں کیا کانٹے لگے ہو۔
 ہیں؟
 غالباً نہ پانہ کی کچھ میں اس کی کوئی بات نہیں آتی تھی۔
 ہسپتال میں اس لئے لڑائے ہوئے ہوئی "کسی دن تمہاری اس سربو جہ
 کھوپڑی میں میرے ہی ہسپتال کی گولیوں سے روشن دان بننے
 لگے۔"

میں خاموش تھا اور اس صورت حال سے کسی حد تک محظوظ
 بھی ہو رہا تھا۔

"بھینٹے کا بچہ!" نہ پانہ پاؤں پٹختے ہوئے پیدائی پھر اس نے
 ہسپتال میں کمر میں چھوٹے ہوئے مجھے آگے دھکیلتے کی کوشش کی
 اور بیڑے کے حصے کا پانی حصہ مجھ پر اتارتے ہوئے چلائی "تو
 چلو۔ تم یہاں کیوں جم کر کھڑے ہو گئے غیبت!"

اس کی آنکھوں میں شیطانی رقصاں تھیں۔ میں نے ایک لمحے کے
 لئے اس کی آنکھوں میں جھانکنا تو ان شیطانی گویا پانی سا پڑ گیا اور
 اس نے فوراً نظر ہرائی۔ پھر پہلے سے بہت غلغلہ اور سرخوشی سے
 لیے میں ہوئی "چلو۔ چلو۔ چلو۔"

میں گہری سانس لے کر مڑا اور بے گتے انداز میں بیڑہ چار
 اونٹن لگا۔ بیڑیوں کے اختتام پر بھائی بہر کم آتی گیت لگا ہوا
 تھا۔ اس اجازت اور ناخاکل مکان میں یہ واحد دروازہ تھا جو فی الحال
 مجھے نظر آیا تھا۔ گیت اندر سے بند تھا۔

"دھنک دو" نہ پانہ نے بدستور میرے پیچھے رہتے ہوئے علم
 دیا۔ میں نے نہایت سلاطنت مندی سے آگاہی بولت سے گیت کو
 نکھٹایا۔ گیت بجی ہی گھر گھبراہٹ کے ساتھ تھوڑا سا کھلا اور
 بیڑے ہی جیسی ایک شخصیت نے باہر جھانک لیکن یہ شخصیت سیاہ
 پوش تھی۔ اس نے سر پر بھی تھوڑی سیاہ چٹائی لٹائی ہوئی تھی۔
 اس کے ہاتھ میں بھائی بہر کم کی رولر تھا۔

باہر کی صورت حال دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر قحطانہ سی
 مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کی موٹھیں میں میں تھوڑے جاتے
 کہیں اس نے اپنی خیالی موٹھوں پر ناؤ دیا اور گیت تقریباً پورا
 کھول دیا۔

اندر پہنچ کر میں نے خانے کی وسعت اور کشادگی دیکھ کر حیران رہ
 گیا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ جتنے رہتے پر کسی نے کوئی تعمیر کرنا
 شروع کی تھی اسے ہی رہتے پر پوری ایک خطی زہر زمین بھی جڑا
 چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس کا مقصد کیا تھا اور اب کون لوگ اس پر
 قابض تھے یہ لوگ بہر حال اصلی مالک تو معلوم نہیں ہوتے تھے۔
 خانے میں بھی بھیر دھانڈوں کے کئی کمرے نظر آ رہے تھے۔ یہاں
 کافی خیراتی تھی مگر کچھ عجیب سیلن آمیز ہی پھیلی ہوئی تھی جو کسی
 قسم کی بجلی کی بدبوؤں کا آمیزہ معلوم ہوتی تھی۔

ہال میں سوئے سوئے شہتیر لگا پڑی والی دو بڑی بڑی
 چارپائیاں پڑی تھیں۔ ان پر تین چار سوئے سوئے آوی آتی پانسی

گزر کر ہم اس کمرے میں پہنچے جسے غالباً ڈرائنگ روم ہونا چاہئے
 تھا۔ فرش پر گرد و غبار کی تہ تھی مگر اس میں بہت سے جوتوں کے
 نشانات بھی گڑھے نظر آ رہے تھے۔ کونے کھدوں میں جالے لگے
 ہوئے تھے۔ کہیں کہیں جانوروں کی پھیلائی ہوئی غلغلہ بھی نظر
 آ رہی تھی۔

ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم ایک کشادہ ہال میں پہنچے۔ یہاں
 کچھ صفائی نظر آ رہی تھی۔ ہال کے ایک سرے سے ناخاکل
 بیڑیاں بچے جاری تھیں۔ بیڑیوں کے قریب ایک نیم شکستہ
 چارپائی پر ذیلی ڈھالی شلوار قمیص میں ملبوس غیر معمولی طور پر
 بھاری بھر کم ایک شخص نیم دراز تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور چل
 کی بالٹن کی وجہ سے خوب چمک رہا تھا۔ گردن سائے کی طرح موٹی
 تھی اور اس پر پٹلی پڑے ہوئے تھے۔ وہ سگٹ کے کمرے کمرے
 سٹل لے رہا تھا اور کشیف دھواں پڑی ہی ادا سے فضا میں بکیر رہا
 تھا۔ ہوا میں چھیلی ہوئی بو تھاری تھی کہ سگٹ میں چرس پھری
 ہوئی تھی۔ اس کی چارپائی کے سارے سیون ایم پی کی ایک گھن
 کھڑی ہوئی تھی۔ چارپائی پر سرہانے کی طرف ایک فاضل میگزین
 بھی رکھا ہوا تھا۔

میں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کی عمر کا تھا اور اندازاً
 تھا کہ باقی قریب میں وہ بیڑہ در پہلوان تھا۔ بلکہ کوئی بھید نہیں تھا
 اب بھی بیڑہ در پہلوان ہی ہو۔ رشادوں پر چڑھے ہوئے گوشت
 کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں اور
 ان میں لو کی سی سرخی تھی۔ سوئے سوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ
 تھی۔ بڑی رنگ میں معلوم ہوتا تھا۔

اس نے گھن اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور استقبالیہ
 انداز میں ہاتھ پھیلا کر بیڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیم
 استہزائیہ سے لیے میں بولا "آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔ میرے شہزادے۔ آؤ۔
 شریف۔ آؤ۔۔۔ تمہارے بھتیجے گھرا نکل سونا بنا ہوا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گہری نظر سے صرف اس کا
 سر تاپا جائزہ لینے پر اکتفا کیا۔ نہ پانہ نے مجھے بیڑیوں کے راستے
 مجھے پٹنے کا حکم دیا۔ وہ خود جب اس پہلوان کے قریب سے گزرنے
 لگی تو میں نے اس کی زوردار مسکراہٹ کی سی توانائی میں نے مڑ
 کر دیکھا۔ وہ ایک جگہ سے اپنا جسم سلا رہی تھی اور اس کا چھو
 نیسے سے سرخ تھا۔

"بیڑے! میں نے تمہیں سختی مرچ منع کیا ہے کہ میرے
 ساتھ بے ہوشی مت کیا کرو۔" وہ ابھی سے چلائے ہوئے انگریزی
 میں بولی۔

"سازے ہال پھالی یا اردو دج کل کیا کرو بادشاہو!" بیڑا
 اپنا پھولا پھولا سا کال سمجھتا ہوا قریب جاتے والے انداز میں
 مسکرا کر بولا "انگریزی فکری زنی ساتوں نہیں آ رہی۔" پھر وہ لہجہ
 بدل کر قدرے سنجیدگی سے اردو میں بولا "وہیے شہزادی! صرف ہم

شکر آغا ابی کا نام یا معرفت تھی جس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ وہ مخمور سے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر باجمیں بھلا تے ہوئے ٹوٹی بھوٹی انگریزی میں بولا "اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں حسین چڑا! اب یہ توئی ہماری ذمہ داری ہے۔ تم اپنے نازک ہاتھوں کو مزید تکلیف مت دو اور اپنا ہسپتال پر اس میں رکھ کر جہر ہر تیار کی جا ہے بیٹہ جاؤ۔ بلکہ ضرورت محسوس کرو تو لیٹ جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

لاڑی نے گہری سانس لی۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ رہا تھا مگر میرا اندازہ تھا کہ اس کے جیسے پر ناکواری کے آثار تھے۔ وہ ان پتلونوں سے خوش معلوم نہیں ہوئی تھی مگر نہ جانے کس شخص کی خاطر یا کس مفاد کے لئے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے شکر کی بدایت پر عمل کیا اور ہسپتال میری کمر سے ہٹالیا۔ پھر میں نے اسے اپنے قریب سے گزرو کر اس چارپائی کی طرف بڑھتے دیکھا جس پر ایک پتلون ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

اب میں نے چلی بار صحیح طور پر مدیاہ مشدی کا سراپا جانہ لیا۔ وہ سرخ رنگ کے چست ٹراؤزر اور نیلی سفاری شرٹ میں تھی۔ کمر سے چوڑی بلیٹ بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کمر کی نزاکت اور دیگر اعضاء کی سرکشی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ چال کچھ اور غضب زحار سی تھی۔ ان پتلونوں کے درمیان اس کا عالم کچھ ایسا ہی تھا جیسے بندوؤں کے درمیان ایک ریلی لالی باپ پچھلک دی گئی ہو۔ معلوم نہیں کون سی طاقت انہیں اس لالی باپ پر جینا جھینے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ شاید وہ طاقت نامعلوم پاس کی تھی۔ لیکن کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی وقت جینا جھینا ہوتی ہی ہو۔

مدیاہ چارپائی پر اس پتلون سے حتی الامکان دور ہٹ کر بیٹھ گئی جو ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس پتلون نے بھی باجمیں بھلا کر اس کی طرف تھکیے ہوئے اس کی کمر میں بازو ہانک کر کرنے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی مدیاہ پر رال پکڑنے کے معاملے میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مدیاہ نے اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کا پتلون کو دھکیلتا ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہرنی کسی ہاتھی کو دھکیلنے کی کوشش کرے۔ اس نے برہمی کے عالم میں چیخ کر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ پتلون تیزی سے دور ٹھک گیا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مدیاہ کے پیچھے کے اندیشے سے خوف زدہ ہو گیا بلکہ اس کی وجہ غار و غلاب غلاب پوش تھا جو اندر ہی کے کسی کمرے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔

وہ سیاہ تری جیکٹ اور سیاہ جٹون میں تھا۔ شرٹ بھی سیاہ تھی اور چو بھی گردن تک سیاہ نقاب میں ہی چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ دو سوراخ نظر آ رہے تھے۔ وہ دروازہ زد اور کسلی جسم کا مالک تھا۔

وہ ہال میں داخل ہوتے ہی بیٹھ گھونٹنے والے پتلون پر برس پڑا۔ "تم نے ابھی تک رسہ نہیں لٹکایا۔" اس نے پتلون کے غصے

پر بیٹھے تھے کوئی بوتل اور گلاس تھا سے ہوئے تھا۔ کوئی چرس سگریٹ کے کسل لگا رہا تھا اور ایک ایسا ہی قخل قخل کرنا ہوا کہنے میں بیٹھا بیٹھ گھوٹ رہا تھا۔ اس کے جسم پر صرف میلی پان اور مختصر سی دھوئی تھی۔ چارپائیوں پر تھیں رانٹلیں بھی تر چھپی پڑی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ کچھ کارٹن بھی اوپر رکھے تھے معلوم نہیں غالی تھے یا بھرے ہوئے۔ اچھا بھلا کسی میں کا سا منظر تھا۔

چارپائی پر اتنی پانچ راکر بیٹھا ہوا ایک پتلون مجھے دیکھتے ہی کر بولا "تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔ آؤ آؤ چوہری ب! اتنی تباہ نور۔" اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے ٹیف دھوئیں کا سرخولا ہوا میں چھوڑا۔ "نا ہے بہت بڑے ہیں آپ۔۔۔ کدوڑ پتی، بلکہ شاید اوب پتی ہیں۔ خبر۔ کوئی نہیں۔ ہمارے اس خیرانہ ذریعے پر بڑے بڑے کدوڑ پتی دی دیتے ہیں۔ کچھ اپنی مرادیں پاتے ہیں اور کچھ کے کسل مل لے جاتے ہیں جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے سیدھے ہو جاتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ عرصے کے لئے عین مسمان نہ ہیں لیکن ان کی آنکھوں پر پتی باندھ کر لایا جاتا ہے۔ ایک مسمان یہاں ایسا بھی قایم ہے جس کی پٹیاں باہر کے کسی غالی میں دفن ہیں۔ افسوس! مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ کاشاکرون سے مسمانوں میں ہوتا ہے۔"

اس کی گفتگو میرے لئے خاصی بے ربط اور تقریباً ناقابل فہم تھی۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کچھ پر نظر پڑتے ہی قخل قخل اٹھا پکا تھا اور کھولنے کی طرح اسے تھا سے ہوئے تھا۔ کارٹن میری طرف ہی تھا۔ دو سرا پتلون اپنی ران قخل قخل اور گلاس چھوڑ کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے یوں نشانہ لے رکھا تھا جیسے کہیں سے کوئی اشارہ ملے ہی مجھے چٹخی سے گا۔ تیسرے پتلون کا ایک ہاتھ ران قخل پر تھا کہ اس نے لٹکائی نہیں تھی۔ وہ چارپائی سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور ہادیمرے دھیرے دھیرے ہلاتے ہوئے کچھ ٹٹٹٹا رہا تھا۔ وہ سب سے اترنگ میں معلوم ہوتا تھا۔

چو تھا پتلون جو کونے میں بیٹھا بیٹھ گھوٹ رہا تھا ایک نظر اٹھ کر دیکھنے کے بعد بدستور جوش و خروش سے اپنے کام میں نہ رہا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا گویا اس کے نزدیک دنیا کا اہم کام بیٹھ گھونٹنا ہی ہو۔ بظاہر میری نظر صرف اس پتلون پر جس نے میری آمد پر ایک طرح کی استقبالیہ تقریر بھاڑی تھی۔ درحقیقت میری نظر اس ہال کی ہر چیز اور وہاں موجود ہر شخص پر تھی۔ میں صرف مدیاہ کو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ میرے عین عین تھی اور اب بھی میری کمر سے ہسپتال لگائے کڑی تھی۔ میں نے اسے بے زاری آمیز صوبے میں کہتے "سرسر شکر!" لوٹاؤ۔ میں کیا یہاں اس طرح شام تک کھڑی رہوں گی؟"

ہڈیاں رستے سے لٹکی رہ جائیں گی۔ تمہارا وجود صرف فرش ہونی غلامت کی ہی صورت میں باقی رہ جائے گا۔ پھر یہ غلام صاف کردی جائے گی۔ حقوہ ہستی سے نام و نشان مٹ جائے گا۔ تمہارا۔ بس اتنی ہی کمائی ہوگی تمہاری۔ بہت کمٹھڑ ہے خود پر؟

”میں بھلا کمٹھڑ کس بات پر کر سکتا ہوں؟“ میں نے نہ ہوئے غلامت سے کہا ”میں تو خالق کائنات کا ایک بہت عہدہ بندہ ہوں۔ کمٹھڑ تو تمہارے لیے میں بول رہا ہے۔ اور شاید بھی کیا بکاڑا ہے میں نے تمہارا؟ کیوں اتنا آؤ کھائے ہو۔“

اس نے گویا میرے سوال کا جواب دینے کی ضرورت اور اس پتلوان کی طرف دیکھا جو مستعدی سے رانگل کوٹنے میں کھڑا تھا۔ اس نے ہنگی بجا کر پتلوان کو حکم دیا ”سے رستے میں نہیں لٹکے گا۔ اس کی ٹانگ میں گولی ماددہ کار قسم کی اچھل کو نہ کر سکے۔“

غلاب پوش کے پاس غالباً اس وقت کوئی ہتھیار نہیں زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ فریضہ وہ خود انجام دیتا۔ پتلوان کی کی ٹانگ ذرا نیچے کو ہونی اور زیر پر اٹھل کا دباؤ پڑنا۔ میں اپنی ہی ٹانگوں کو گولی کی زد سے بچانے کے لئے تیار تھا لیکن کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ خانے میں فائر کی آواز اور رانگل پتلوان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دیوار سے ٹکر پڑی۔ ہنگی سی چیخ کے ساتھ پتلوان اپنا ایک ہاتھ چہرے لگا کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

مجھے نے بیک وقت آہنی دوازے کی طرف دیکھا۔ آٹے کے بعد کسی نے اس کا اندر کا بولٹ چڑھانے کی وجہ کی تھی۔ اس وقت گیٹ صرف اتنا کھلا ہوا تھا کہ ایک کم سی ٹائی اندر جھانک رہی تھی۔ دوسرے پتلوان نے جیہ رانگل سیدھی کسی نے کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ رانگل دور جا گری۔ اس کے بھی صرف ہاتھ میں ہی سورا محسوس چیزوں پر ہی درست نشانہ لگانے میں ٹوٹی کا جوا تھا۔

تیسرے پتلوان کی جڑ چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے : ٹانگیں بالکل سادہ ہو چکی تھیں۔ اس کا جوا تھ رانگل وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اس نے نہ تو رانگل اٹھانے کی کوشش نہ ہی اس پر سے ہاتھ ہٹایا۔ بھگت گھونٹنے والا پتلوان ہال میں رستہ خانے کھڑا تھا اور حیرت سے ٹانگیں جھپکا رہا تھا تو نہ تیزی سے بھول چک رہی تھی۔

ٹوٹی نے ٹھوکر مار کر گیٹ کھولا۔ شیر خوار اس کے تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گس تھی۔ مہربانہ شعلہ چار : کبھی میری طرف اور کبھی اپنی دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی

نسب میں چند شرمناک سی تراجم کیں پھر بولا ”بھگت گھونٹنے کے علاوہ بھی کبھی کبھار کر لیا کر سالتے!“

”رستہ لٹکانے میں کون سی دیر لگتی ہے پاس! ابھی لٹکا رہا ہوں۔ میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ ذہن آجائے تو لٹکانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔“ پتلوان بڑی بے پروائی سے بھگت گھونٹنے کا سوار کا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے میرا سر تاپا جائزہ لیا پھر گویا دل ہی دل میں محفوظ ہوتے ہوئے مسکرا دیا اور ہال کی ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا جس کے قریب سونے سے رستے کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا۔

اس نے رستہ اٹھایا اور ہال کے وسط میں آگیا۔ تب میں نے سراٹھا کر دیکھا۔ چھت کے وسط میں ایک بڑا سا کنڈا لگا ہوا تھا۔ پتلوان نے بڑی صارت سے رستہ اوپر پھینکا اور وہ کندے میں ٹپک گیا۔ اس نے بڑی صارت سے ہی اس کے دونوں سرے پکڑ کر موٹی سی ڈھیلی کرہ لٹائی پھر ایک سرے کو پکڑ کر کھینچا شروع کیا۔ دوسرا سرا اس طرح اوپر جانے لگا کہ میں کندے پر جا کر گرہ لگ گئی۔ وہ اس کام میں بہت مشاق معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں آج تک کتنے لوگوں کو اس طرح رستے سے لٹکا کر ان پر کس کس انداز سے تشدد کیا گیا تھا۔ میں خاموشی سے کھڑا یہ کاروبار دیکھ رہا تھا۔

میں غلاب پوش کی تواضع پر بھی غور کر رہا تھا اور اس کی جسمانی ساخت پر بھی۔ لباس میں انسان کا جسم چھپ جاتا ہے اور ہر لباس میں اس کا بھری تاثر مختلف ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اگر کوئی باریک بینی کی ملاحظیت رکھتا ہو تو اسے ہر انسان کی جسمانی ساخت اسے پہچاننے میں مدد دے سکتی ہے۔ دست قدرت کا یہ کمال بھی ہے پناہ حیران کن ہے کہ اس نے ان گنت انسانوں کو تخلیق کیا ہے مگر ان کی جسمانی ساخت ”ان کی آواز“ رنگ روپ“ خود خال میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابتداء سے آفرینش سے آج تک پیدا ہونے والے اربوں کھربوں انسانوں میں شاید ہی کوئی دو انسان ایسے پیدا ہوئے ہوں جنہیں مکمل طور پر یکساں کہا جاسکے۔ جن میں کوئی معمولی سا بھی فرق نہ ہو۔ میں قدرت کی اس ضابطہ پر غور کر رہا تھا اور بہت جلد بڑے عجیب عجیب بعد پالیتا تھا۔

غلاب پوش اپنی آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب تھا لیکن میں نے اس کے آثار چھانڈ پڑھا سوراخ کیا تو یاد آ گیا کہ یہ آواز اصل میں کیسی تھی اور کس کی تھی۔ غیر محسوس طور پر میں ایک گرمی سانس لے کر رہ گیا۔ اس غصے کو پہچان کر مجھے قدمے مایوسی ہوئی تھی۔ میرا سارا جنس ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

وہ فراہٹ آمیز لمحے میں مجھ سے مخاطب ہوا ”جیس اس رستے کے ذریعے چھت سے اٹا لٹکا کر اس وقت تک تمہارے جسم پر لٹھیاں برسائی جائیں گی جب تک تم لٹھوے میں تبدیل نہیں ہو جاتے۔ آخر میں لٹھوے بھی نہیں رہے گا“ صرف چند ٹوٹی پھولی

اسے سمجھانے کی کوشش کی "تم اپنے اس قسم کے نہ خانوں اور
دوسرے اقدار پر اپنے دھنوں میں مصروف رہو۔ پولیس کو جبر
جانا رہتا اور گلشن کا کاہنہ اور چن رہتا لیکن میرے ساتھ بچا لے کر
مطلوم نہیں تم اپنے لئے کہیں سمیت سہل لینا چاہتے ہو۔"

"تم نے سید صاحب کے اہل پادری میں بیسیں سوز سوز
اور غور غور کے سامنے مجھے گھونسا مارا تھا۔ میرا بچا بچل گیا تھا
اس لئے میں دور جا کر اقلہ دہندہ میں کوئی ایسا کیا گزرا تو ہی نہیں
ہوں۔ آج تک کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ میں
تمہاری اس حرکت کو بھل نہیں سکتا۔ صاف نہیں کر سکتا۔"

مجھے اس کی "پاؤں پھیلنے" والی بات پر ہنسی آئی۔ میں نے
خوشگوار لہجے میں کہا "وہاں بھی تم نے خود ہی بچا لیا تھا۔ میں تو
تمہیں جانتا ہی نہیں تھا اور نہ ہی جانتا چاہتا تھا۔"

"لیکن میں تمہیں ضرور جان کر رہوں گا۔" وہ بے خوفی سے
بولتا "میں نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے
بہنی بھاگ دوڑ کی ہے۔ مجھے احزاف ہے کہ میں تمہارے بارے
میں کچھ زیادہ نہیں جان سکا ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھی تمہارے
بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن نہ جانے کھیل لوگ تم سے زور
ہے۔ تمہیں پراسرار سا سمجھتے ہیں۔ میں تمہیں بے غائب کے
پتہ ڈوں گا۔"

"میں نے کوئی غائب نہیں چڑھائی ہوئی ہے جو تم مجھے بے
غائب کرنے کا شوق پورا کر سکو۔" میں نے اس کے انداز ٹھکڑے
ظہور ہوتے ہوئے کہا "غائب وہی تو جیسے ظلم زدہ لوگ چڑھاتے
ہیں اور اس شوق میں کبھی کبھی کمال تک اتھو بیٹھتے ہیں۔ میں تو
اس شہر کا ایک عام سا "تھوڑا سٹریٹ" تھوڑا شریف سا کوئی
ہوں۔ بس ادا ضرور ہے کہ تم جیسے اپنے مجھ سے اچھے سے بہتر
کریں تو قاعدے میں رہتے ہیں۔ سید صاحب کے اہل پادری میں تو
گھونسا کھا کر تمہارا پادری پھیل گیا تھا۔ چلو۔ میں تمہیں یہاں پورا
پورا موقع دیتے گا چار ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں کو ایک طرف
بٹاؤ۔ میرے ساتھی بھی سورت حال میں مدد ملت نہیں کریں
گے۔ آؤ ہم دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔ طاقت کی آزمائش کا وہی
مددیں راہ طرف۔ تم اسی وقت اسی جگہ اپنے اسان ٹال لو۔"
میں نے سٹکاراٹے ہوئے دونوں افسوں سے اشارہ کر کے اسے اپنے
اوپر حملہ کرنے کی دعوت دی مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں
کی۔ پچھلا ہوش داخل میں دیا۔ مجھے گھورنا پڑا۔

"شاید تمہاری کھوپڑی میں حکمرانی عی توڑی بہت محل
سراپت کر گئی ہے۔" میں نے بدستور چڑانے والے انداز میں
سٹکاراٹے ہوئے کہا "اچھا ہی ہوا تم جوش میں نہیں آتے۔ میں
تمہارا چوہا بگڑا نہیں چاہتا لیکن کہ تم "جنگل کرل" کے ہیرو ہو اور
اس فلم کا شیلڈ پلے ہی بہت مختصر ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ واقعی کم
سے کم مدت میں مکمل ہو جائے۔ تمہارا چوہا اگر میرے ہاتھوں بگڑا تو

"بیڑے۔" دھنسا غائب ہونے میں عرض ہی تو اڑ میں پکارا
بر کوئی جواب نہ پا کر تھکے غائب ناک سے لہجے میں ٹپکی کو
غائب کیا "کیا تم نے بیڑے کو اڑا لیا ہے؟"

"اگر بیڑا اسی طرفی کا نام ہے جو اوپر بیڑیوں کے قریب
ہو دے رہی تھی تو وہ زندہ ہے۔" ٹپکی نے طاعت سے جواب دیا۔
پتہ اس کی تیز دھڑا کھوپڑی شاید جھجکتی ہو۔ وہ اپنی چارپائی پر ہڑا
ی بیڑے رہا ہے۔ ایک ٹوہ دن میں ہوش میں آجائے گا۔"

"تم لوگ یہاں سے زندہ نہیں جاسکو گے۔" غائب ہوش گیا
کسی امید کے سارے بولا۔ شاید یہاں اس کے کچھ اور ساتھیوں
کی آمد متوقع تھی۔

"تم میرے بارے میں مسلسل فلا اندازے لگاتے جا رہے ہو
رشد سولی" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے
کہا۔ میں اس کے اثرات نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں نے محسوس کیا
کہ وہ جھجکتی ہی لے کر رہ گیا تھا۔

"تم تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ میری سانس لے کر بولا "میرا اس
نے اپنے چہرے سے ٹھیک لہا غائب کھینچ کر اٹار دیا۔ اس کے
پیشکش چہرے پر پیسے کے قطرے تھے اور خوب صورت بال بچہ
ہوئے تھے۔"

"مگر حاشیر کی کمال پہن کر آجائے تب بھی پہچان جاتا ہے۔"
میں نے ہموار لہجے میں کہا "تم عملی دنیا کے کوئی بہت زیادہ پرانے
اوی نہیں ہو مگر معلوم نہیں کیوں عملی انداز و اطوار تمہاری فطرت
میں صاف بس گئے ہیں۔ یہ اس طرح کے ڈیرے بنا کر جیسا "ان ذیل
بلا اٹوں کے سر پر مدد عافی چلائے" مجھے کوئی عام سا بیڑہ سمجھتے ہوئے
اس طرح اغوا کرنا۔ اور میرا محبوبہ اور نہ جانے کیا کیا بیڑوں کی
باتیں کرنا۔ مجھے تو شہد سا ہونے لگا ہے کہ تمہاری کھوپڑی کا کوئی اہم
پتہ گرا ہوا ہے۔"

دعا خواہش کرا مجھے گھورنا پڑا۔ میں نے زری سے بات جاری
رکھتے ہوئے کہا "میری کچھ میں نہیں آتا تم میرے پکڑ میں کیوں
پڑ گئے ہو۔ تمہاری یہی کوئی دشمنی نہیں۔ اور تم جیسے "دو اپنی"
فرسودہ ذہن کے مالک اور زیرے وادید معاشوں سے دشمنی رکھنا میں
اپنے شایان شان بھی نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے تمہارا کچی
شراب کا دھندلا بھی ہو گا۔ جوئے میں سے جتنی بھی لیتے ہو ڈکے
کھیں گے اس سے بچا لیں بھی بیچ کر آتے ہو ڈکے کسی کے آؤ پر
شریف شرفلو اغوا بھی کر آتے ہو ڈکے۔ سارے پڑے کبھی کبھار قتل
بھی کر آتے ہو ڈکے اور کا مال اور بھی کرتے ہو ڈکے اس
فیل کے قہر کا اس بد معاشوں سے الجھنا میں پسند نہیں کرتا۔"

"میں تمہاری ایک اکر تو کھانا چاہتا ہوں۔ تم اپنے گپ کو
مطلوم نہیں کیا سمجھتے ہو۔" رشد سولی کی جرأت گویا عود کر آئی۔

"یہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کی نہیں بلکہ اپنے اپنے حقے" اپنے
اپنے بیڑے اور اپنی اپنی لاش کی بات ہے۔" میں نے عریانہ لہجے میں

لے فوری طور پر گولی نہیں چلائی۔

اسی دن اپنے ارشد موتی بھی حیرت انگیز بھرتی کا مظاہرہ کر ہوئے میری آڑ میں ہو چکا تھا۔ پتلوان نے مجھے عقب سے باز کے کھٹے میں لینے کی کوشش کی اور ارشد موتی نے جھک کر ہاتھیں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس دوران موتی اور شیر کی سیور ایم کی گھنٹیں گرجیں۔ شاید موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پتلوان نے راکٹل اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ارشد موتی کے منہ پر الٹی لگک رسید کی اور پتلوان اپنی کمر لاد کر سامنے فرش پر دے مارا۔ فرش چوں کہ میٹھا گارڈن اسکوائر کے رنگ کا نہیں تھا جس پر نفوس ریڑ کی مو پھیں ہوتی ہے اس لئے پتلوان کسی ریلنگ چھیننے کی طرح طور پر نہیں اٹھ سکا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ گویا کھروے نفوس فرش سے چپک کر رہ گیا۔

اس دوران ارشد موتی سنبھل کر دوبارہ مجھ پر بھڑکتا رہا اس کے ہاتھ میں لہسا باختر تھا۔ موتی یا شیر نے اب بھی ہاتھ لئے تھے نہیں کیا کہ میرے بھی گولی کی زد میں آنے کا اندیشہ تھا باقی نوگوں کو یقیناً انہوں نے گور کیا ہوا تھا کیوں کہ کسی اور نے حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ارشد موتی نے غالباً جھلت اور بدعوا سی میں نہایت اڑ طریقے سے باختر میری ہڈیوں میں گھونپنے کی کوشش کی۔ یہ جھانکی دینے ہوئے اس کی گردن پر ہکا سادھ رسید کیا۔ وہ ساتھی پتلوان پر جا پڑا جو اس دوران اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے چارہ دوبارہ ڈھیر ہو گیا اور ارشد موتی کا باختر اس کی پسلی پر پست ہوتے ہوئے رہ گیا۔

میں نے ان دونوں کو دو چار قتل پش قسم کی ٹھوکریں کہیں جنہوں نے ان دونوں ہی کو اٹھنے سے باز رکھا لیکن اب ہی ارشد موتی سانپ کی طرح پھنکار کر چلا اور پوری طرے کھڑے ہوئے سے پہلے ہی اس نے امداد ہند باختر ہوا میں میں نے اس کے وار سے بچتے ہوئے یکدم اس کی کلائی گر لے لی۔

دوسرے بازو کا قلعہ میں نے اس کی گردن کے گرد اس کی کلائی پر میں نے پتھر تاج بازو بڑھانا شروع کیا اور باختر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ وہ کھسکا رہا تھا رہا تھا اور میری گرفت سے نکلنے کے لئے پوری طاقت مر تھا۔ وہ بلاشبہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن میری گرفت سے کے پس کی بات نہیں تھی۔

میں اسے سمجھ کر فرش پر پڑے ہوئے پتلوان سے زور مچا تھا تاکہ کہیں وہ میری ٹانگ نہ سمجھ لے۔ پتلوان جرات اور ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک بار بھر اٹھنے کی لیکن اب چوں کہ اس پر غارت کرنے کی صورت میں یہ

تم بڑے سے بڑے میک اپ میں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے بعد بھی کمرے کے سامنے تباہند نہیں کر دے گا۔

”تمہیں ”جنگل کرل“ کے حمل ہونے یا نہ ہونے سے کیا دلچسپی ہے؟“ ارشد موتی آنکھیں میکرتے ہوئے بولا ”تم تو اس کے فائدہ اٹھائے نہیں ہو۔“

”انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے پارے قلمی ٹارڈن!“ میں نے گرمی سانس لے کر کہا ”اس کا ڈائریکٹر راجیل بٹ مجھے شریف آدمی لگا ہے۔ اگر قلم جلدی حمل نہ ہوئی تو اس کا نقصان ہو جائے گا۔ اس کی ہمدردی ستارہ میری دوست ہے۔ قلم کی تکمیل میں تاخیر ہوئی تو وہ بھی خواہ مخواہ اپ سیٹ ہوگی۔ وہ کم قلمیں سائن کرتی ہے اور اپنی قلموں کے بارے میں بڑی حساس ہے۔ وہ دوسری ہمدردیوں سے بڑی مختلف ہے۔“

ہماری گفتگو کچھ طویل سمجھ سکتی تھی۔ اس دوران میرا پتلوان جو چار پائی پر بیٹھا تھا اور جس کا ایک ہاتھ راکٹل پر ہی تھا غالباً اس قلعہ قلمی میں جھلا ہو گیا کہ سب کا دھیان اس کی طرف سے ہٹا ہوا ہے۔ اس نے نہایت بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راکٹل اٹھانے اور ٹیکہ دہانے کی کوشش کی مگر اس کی بھی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکی۔ راکٹل اس کے ہاتھ سے بھی نکل گئی اور اس کے بھی دائیں ہاتھ میں میں اسی جگہ سوراخ ہو گیا جہاں پہلے وہ پتلوانوں کے ہوا تھا۔ موتی آج شاید باقیوں میں سوراخ کرنے کا کوئی دیکھا تو قائم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اس بار گولی سے پامہ مشدی کے عین قریب سے گزری تھی اور وہ ہشت زدہ سی ہو کر چار پائی پر پتھر دراز ہو گئی تھی۔ اس کے قریب بیٹھے ہوئے پتلوان نے اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں دبا کر بری طرح کرابتنا شروع کر دیا تھا۔ ارشد موتی ایک بار پھر اپنا چھلا ہوٹ واٹوں میں دبائے ہوئے تھا۔ میں نہیں سے نہیں کہ سکتا تھا کہ اسے اپنے ساتھی پر زیادہ قصہ آ رہا تھا یا موتی پر؟

”میرا خیال ہے آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اب ہم چلے ہیں۔“ میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ اسی انداز سے یہ الفاظ ادا کئے تھے جیسے ہم کسی نئی بات میں آئے ہوئے تھے، جہاں بہت اچھا وقت گزرا تھا اور اب میں میزبانوں سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

میں بے پردائی سے عزا اور میزبانوں کے دواڑے کی طرف چل دیا۔ ارشد موتی کی طرف سے مجھے ایک آخری کوشش کی توقع تھی لیکن میرا اندازہ اس وقت غلط ثابت ہو گیا جب ارشد موتی کے بجائے اس پتلوان نے اچانک مجھ پر پھلانگ لگائی جس کے ہاتھ پر سب سے پہلے گولی لگی تھی۔ ہاتھ زخمی اور جسم کسی پلے ہوئے ساڈ کی طرح ہماری بھرم ہوئے کے باوجود اس نے حیرت انگیز بھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے درحقیقت مجھے زحمال بنانے کی کوشش کی تھی اور اس حد تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا کہ موتی یا شیر

کے پلوٹان تھے جو پلوٹانی کی اعلیٰ و ارفع روایات کو ترک کر کے
بھگت، انیم اور چرس کے رسیا بنے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے توکی
پلوٹانوں کو دیکھا تھا جو اس قسم کی بیڑوں کے دھندے چلاتے
تھے۔ اپنے زیرے پر طرح طرح کے لاد بار کراتے تھے۔ سادے
پر مختلف خدمات انجام دیتے تھے لیکن وہ عموماً خود منشیات کے رسیا
نہیں ہوتے تھے مگر یہ لوگ تو مگر باطل کی گئے گزرتے تھے۔
مہا پاہ مشدی کو دیکھ کر یہی مجھے خفیف کی حیرت ہوئی۔ وہ نہ
جانے کب چارپائی سے اتر کر اکرول بیٹھ چکی تھی۔ چوڑا تھا۔
عائلاً اس کا ارادہ یہی تھا کہ زیادہ زور شور سے گولیاں پلے لگیں تو
چارپائی کے نیچے گھس جائے گی۔ اس کا چری بیگ چارپائی پر بڑا تھا
مگر اس نے اس میں سے ہتھول نکالنے کی قطعاً کوشش نہیں کی
تھی۔

میں نے ارشد موتی کو بلی کی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔
”ایک آدھ دن میں تم شوٹنگ میں حصہ لینے کے قابل ہو جاؤ گے۔
اس دوران تمہیں سب سے ضروری کام یہ کرنا ہے کہ یہاں سے یہ
اڈھ قسم کرنا ہے۔ کل سے یہاں نہ تو تسمار کوئی آدمی موجود ہوتا
چاہے اتنے دن ہی تسمار کو ایک دھندلا چاہئے۔ برسوں میرے آدمی
آکر چیک کریں گے۔ اگر یہاں تم لوگوں کی موجودگی کے کوئی آثار
ہوئے تو اس جگہ کو ہم سے اڑا دیا جائے گا۔ جس کسی کی یہ اپنی
ہوگی اس کا نقصان میں خود پر اکرولوں گا۔“

میں بیڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ٹوٹی اور شہیر نے اس وقت
تک اپنی جگہ نہیں چھوڑی جب تک میں ان کے درمیان سے گزر
کر اوپر نہیں آگیا۔ بیڑا اپنی چارپائی پر اوٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک
بازو چارپائی سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اس کی ٹنگ سائز کھوپڑی پر کان
کے قریب خالصاً نمایاں اجمار نظر آتا تھا اور کمال تھوڑی سی چٹائی
اڑی تھی۔ اس کی رائفل بدستور چارپائی کے سارے کھڑی ہوئی
تھی۔ ٹوٹی نے اسے بھی وہاں سے ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھی
تھی۔

میری مرید پر اس کا مکمل کوٹھی کے قریب ہی کھڑی تھی جبکہ
ٹوٹی اور شہیر بیڑا اپنی سفید فورڈ کیپڑن وہاں سے کافی دور درختوں کے
ایک چھوٹے سے جھنڈ کے عقب میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ مکان
سے نکل آئے تو میں نے انہیں انہی کی گاڑی کی طرف جانے کا
اشارہ کیا اور خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اچانک ٹوٹی تیزی سے
چیتے کی طرح چلا اور ایک بار پھر اس نے گن سیدھی گولی میں نے
خز کو دیکھا۔ مہا پاہ مشدی مکان سے نکل رہی تھی مگر وہ پہلے ہی
دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے اور اس کا بیگ بھی اس کے پاس
نہیں تھا۔

”سرا!“ اس نے دور سے ہی جتا کر مجھے مخاطب کیا ”میں کچھ
بھی نہیں کھوں گی۔ مجھ میں تو اتنی بڑاٹی ہی نہیں ہے۔ میں تو بس
آپ سے ایک منہ بات کرنا چاہتی ہوں۔ بہت ضروری بات۔“

ہونے کا اندیشہ نہیں رہا تھا اس لئے ٹوٹی نے اس پر ٹھوس وارننگ
کے طور پر ایک گولی چلا دی جو اس کی ٹانگ کو چھوئی ہوئی گزری۔ وہ
یکدم اپنی جگہ پر دوبارہ پت ہو گیا اور مٹھکے خیز سے انداز میں
آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

میری گرفت میں ارشد موتی کے چہرے کی رگیں بری طرح
پھیل چکی تھیں اور اسے سانس لینے میں سخت دشواری پیش آرہی
تھی۔ اس کا چہرہ اس بڑے سے چند رتے مشابہ نظر آنے لگا تھا جو
کسی نامعلوم وجہ کے تحت پینے کے قریب تھا۔ اس کا بازو آزاد
تھا اس سے اس نے میرے بازو کا قبضہ ڈھیلنا کرنے کی ہر ممکن
کوشش کی تھی۔ طاقت بھی صرف کی تھی، مٹھکوں سے میرا بازو
اور جڑنے کی بھی سہی کی تھی اور اگلے رخ سے میرے پیٹ میں کسی
سے ضربیں لگانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوششیں
اسی طرح بے سود رہی تھیں جیسے کوئی بھانپنے کسی بڑے کی گرفت
میں آنے کے بعد اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے چلاتا ہے، ہاتھ
پاؤں مارا ہے مگر کام نہ رہا ہے۔

چند لمبے بعد ہی اس کی طاقت جواب دینے لگی اور وہ بے دم
سا ہونے لگا۔ میں نے اس کی گردن پر دواؤ ذرا سا اور بڑھاتے
ہوئے کہا ”اسی حالت میں کھڑے کھڑے تمہارا انتقال بھی ہو سکتا
ہے۔ اور اگر تمہیں عالم بالا پر جانے کی جلدی ہو تو اسی لئے ایک
تینٹے سے تمہاری گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے
مستحق بھی ہو لیکن میں ایک بار پھر تمہیں قیام دلا دوں گا کہ صرف
وہ معمولی سی ظلم ”جنگل گرل“ تمہارے زندہ رہنے کا بھانہ بن گئی
ہے۔ اگر اس ظلم میں تمہارا کام مکمل ہو چکا ہو تو شاید آج تمہاری
زندگی کی ظلم کی بھی آخری ریل چل جائے۔ ایک بار پھر تمہیں محض
اس لئے چھوڑ رہا ہوں کہ تم ”جنگل گرل“ میں اپنا کام مکمل
کر اسکو۔ ورنہ آدمی تم بہت کہتے ہو اور زندہ رہنے کے مستحق نہیں
و۔ میں اچھا بھلا تمہیں چھوڑ کر جا رہا تھا مگر تمہیں اپنی طاقت کے
ظاہرے کا جو شوق چڑھا ہوا ہے وہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں
آتا۔ اگر میں یا میرے ساتھی بھی غیر ضروری خونریزی کے شوقین
ہوئے تو اس وقت یہاں تم سب کی لاشیں پڑی ہوئیں۔“

میں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے کسی عمل کی نکل چکے ہیں
اور وہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کے قابل نہیں رہا تو میں نے اسے
چھوڑ دیا۔ وہ دھب سے فرش پر گر پڑا اور نہ چاڑ کر گمری گمری
سانس لینے لگا۔ ہال میں گرا سکوت طاری تھا۔ اس کی سانسیوں
کے سوا کوئی تواؤ نہ سنائی نہیں دے رہی تھی۔

تینوں زخمی پلوٹان عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے
تھے جو تھا پلوٹان بدستور ہال کے وسط میں رستہ تھا سے ساکت و
سامت کھڑا تھا۔ وہ ایک مٹھکے خیز بہت نظر آتا تھا۔ اس کی توند
بھول چکے نہ رہی ہوئی۔ اس نے اب تک کی چھوٹی موٹی سی تکفیل
میں ہاتھ تک ہلانے کی ذمہ داری نہیں کی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس قسم

میں نے فنی اور شیر کو اٹھایا کہ وہ اپنی گاڑی کی طرف چلے جائیں۔ وہ لڑکی کو لایا جیسا مسئلہ نہیں تھی۔ وہ بیٹے کو ذکر آرام سے انہیں میں باتیں کرتے ہوئے چل دے اور وہ پانچ صفوں میرے قریب آگئی۔ میں گاڑی سے ٹھیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ گلابی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اچھا ہنسنے لگی۔ بولی "سرا! میری ایک درخواست تھی۔ آپ مجھے اپنے گینگ میں شامل کر لیں۔ میں آپ کے بہت کام آسکتی ہوں۔"

"شٹاپ!" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنا۔ اہم سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کو مٹھی میں کرنا۔ اس کے علاوہ میں گینگز کے خزانے بھی انجام دے سکتی ہوں۔ باہر سے کوئی مال لے کر آسکتی ہوں یا یہاں سے لے کر جاسکتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں فائرنگ کے طور پر بھی اتنی ٹھیک نہیں ہوں جتنی آج آپ کو نظر آئی ہو۔ آج تو مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا تو میں تو میں خاصی کام کی چیز ہوں۔ اور بھی جو خدمت آپ کیس کے میں بھلا دے گی۔ تب کچھ عرصے کے لئے مجھے آزما کر تو دیکھیں۔"

وہ بڑے جوش و خروش سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ وہ مزید جوش ملیں میں بولی "سرا! آپ یہ مت سمجھیں کہ میں کوئی پکر چلائے کی کوشش کر رہی ہوں یا ارشد موتی نے مجھے سکھا پڑھا کر سمجھا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب موتی تو ایسی تک وہیں پڑا ہے۔ انہی کے قاتل بھی نہیں ہو سکا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک منٹ آپ کی گرفت میں نہ کر اس کا یہ حال ہو جائے گا۔ سرا! میں نے اپنے طور پر ہی آپ سے یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ مجھے ایک بار ضرور آزما لیں۔ مجھے بہت تجربہ ہے ہر قسم کے کاموں کا۔"

میں ایک بار پھر اپنے بغیر نہ سکا۔ میں نے اس کے انداز سے محفوظ ہوتے ہوئے کہا "تمہیں کیوں کر خیال آیا کہ تم میرے کام آ سکتی ہو؟"

"سرا! ظاہر ہے آپ ذہن دنیا کے کوئی بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت مضبوط گینگ ہو گا آپ کا۔ مجھی تو آپ نے موتی اور اس کے آدمیوں کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور انہیں محض انگلیوں کے اشاروں سے بے بس کر کے رکھ دیا۔ ظاہر ہے آپ جیسے لوگوں کے ہاں مجھ جیسی لڑکیوں کی تنہا فنی تو نکلتی ہی رہتی ہے گا۔ بلکہ تنہا کٹن نہ ہو جب بھی پیدا کرنا جاتی ہے۔"

"دیکھو بے بی!" میں نے ٹھیک ٹھیک لہجے میں کہا "ممکن ہے تمہاری باتیں اپنی جگہ درست ہوں لیکن تمہارے میرے بارے میں اندازے درست نہیں ہیں۔ میرا کسی ذہن دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا کوئی گینگ نہیں۔ میں تو اس شر کا ایک عام معمولی اور شریف سا آدمی ہوں۔"

"عام" معمولی اور شریف تو میں کے پیچھے اس طرح باہر اور

ساحل قسم کے علاقہ پر چکے آتے ہیں کیا؟ اس نے فنی اور شر طرف اشارہ کیا جو ابھی اپنی گاڑی تک نہیں پہنچے تھے۔

"وہ پیش در حفاظت نہیں میرے جیسا کار دوست ہیں۔ ان کو دنیا میں صرف دوست بنانے چاہئیں۔ جو کام دوست کر سکتے وہ گروہوں کے پیش در کار کن نہیں کر سکتے۔ ہمیں نہ افسوس کہنا۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ تم ابھی دقا اور وہ اننگز لڑی تو اننگز سے گزر کر کھیل نہیں دیتی ہو۔ میں نے تم جیسی بھرتی لڑکیوں کو اہم لوگوں کے پاس بھیج کر بھی اپنے کام کھلا۔ کوشش نہیں کی۔ اول تو میرے کام کھیل ان کے ہوئے ہی ہوئے اور اگر ہوں بھی تو اپنے کام کھلانے کے میرے اپنے ہی طریقے ہیں۔ ہر حال یوں گئی پٹی رکھے بغیر اگلا دھکا تر انداز مجھے پسند آیا۔"

"سرا! آپ مجھے اور اور حری باتوں میں مت شامل نہ کرنا۔ یہ سکرانی" مجھے ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے میں تکلیف تو نہیں ہے۔" وہ پیچھے کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "معاذ بھی بہت اچھا مال دیا ہے معاملہ ارشد موتی کو۔ تاکہ وہ ٹھیک ہے لیکن میں ان بھلاؤں سے بڑی شک ہوں۔ ہر ذرا چور میں بھلاؤں پر مشتمل ہے اور یہ سب کے سب گم ہیں۔ مگر میں چری ہوگئی۔ اپنا طبع تک ٹھیک نہیں دیکھتے۔ ان سے بعض کے جھوٹے تو کھیل جیسی لڑتی ہے۔"

"تم انہیں اتنے قریب قریب کا موقع مت دیا کہ تاکہ اس محسوس کرنے کی قوت آئے۔ ہمیں نے سکرانے ہوئے کھل۔"

"میں کب موقع دیتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی "لیکن ان کا چلنے تو ان میں سے ہر ایک میری زبان تک چاہا ہے۔ ارشد کے اشارات کی بھی وہ کوئی خاص پوچھا نہیں کرتے۔ ان کے ہاں دلچسپی نہیں ہے۔"

"حیرت کی بات ہے! تم انہیں میں ڈیلن ڈھنڈی وہ میں نے جیتنا حیرت سے کھل۔"

"مے سے مے سے کام کو بھی سرا انجام دینے کا کوئی طریق کچھ اصول ہونے چاہئیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میری نظر باطل کوٹھی کی طرف بھی گئی لیکن ابھی تک سے کوئی برآمد نہیں ہوا تھا۔ کسی نے نہ باہر کی تلاش میں بھی آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ باہر مجھے کوٹھی کی طرف حوجہ بولی "یہ کوٹھی بھی ارشد موتی کی اپنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہ ٹھکانا چھوڑنے کا حکم دے دیا ہے۔ بہت بہت پریشان ہو گا کہ وہ مقرب اسے عمل کرانے کا پورا کرنا چاہتا تھا۔"

"اچھا ہوا تم نے بتاوا۔ اسے تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں نے اسے اتنی سزا نہیں دی جتنی سزا کا مستحق ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے فنی اور شیر و فنی کے صوب میں قاب ہو چکے تھے۔

ہمیں بچے تھے۔

میرا دم بخود رہا وہیں کڑی دھمکی۔ اس کی خوب صورت
نہیں تھی یہی تھوڑے لمبے تھے۔ وہ بھولتی ہوئی نواز میں ہوتی۔
— اسی جلی خوار تھی کہ میں آپ کے ساتھ چلتی۔

میرا پہلا ایسی نے پہنچنے سے اس کا حال چسپاں "ہم ذرا
کی طرح کے لوگ ہیں۔ میں نے گاڑی اشارت کی اور پہنچنے
نے کے بعد چلائی۔ کچھ آگے نکل آئے کے بعد میں نے سڑک نکال۔
میں میں ہاتھ دے وہیں کڑی تھی۔ اس کے بعد سے ہل ہوا
زب سے تھے اور اس کے چہرے پر نہانے بھری اداسی تھی۔ میں
باغداد میرا حتی الحاضر اس کو دیکھنے میں کسی چہرہ نمود کو ٹھوکر
بہی "مختار سے زمین پر تھوکر کے اور پانی چلتی ہوئی راہیں
پہلے جانے کی گھبراہٹ میں تھی کڑی تھی۔ جیسے لڑکی تھی۔
نے مجھے تھوڑا سا حیران کر دیا تھا۔ تاہم میں رہا نہیں۔

ایک سوز گانے کے بعد میں نے صوبہ نما آئیے میں دیکھا۔
اور شیر کی گاڑی کافی حاصل رکھتے ہوئے میرے پیچھے آ رہی
تقریباً ایک میل کے بعد گاڑیوں گاڑی کا تباہ علاقہ شروع
جس کا وہ خوب صورت اور خوب و مریض بنگلوں کی
ہی تھیں تاہم سڑکوں پر دہرائی تھی۔

کبرک کا علاقہ شروع ہونے سے کافی پہلے میں نے سڑک کے
طرف کے میں ایک شخص کو متعلق سے انداز میں چلتے دیکھا۔
اور قدرے متعلق الحال ساتویں تھا۔ تاہم اسی طرح سڑک
ناتوا کے کافی دور سے کچے میں ہی چلا آ رہا تھا۔ کہیں کہ
کے ہم سڑک جوتے سے بھی ذرا اوپر تک وصل بھی ہوئی تھی۔
بار سڑک پیچھے دیکھا ہوا جا رہا تھا۔ شاید اسے بس یا دیکھن کی
تھی کہ کسی ایک زمانہ پورٹ کا دور دور تک نام و نشان نہیں
کر میں کے موسم کے ابھی "دور دور تک آثار نہیں تھے کمرہ
میں میں نہ جانے کتنی دور سے پہلے چلا آ رہا تھا کہ اس کے
پر پختہ دور سے چلتا نظر آ رہا تھا۔ وہ چلا "ساترہ اور دور از
— چہرے پر پریشانی اور باہمی رات تھی۔ یہ چونکہ کچھ شناسا
نہیں تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس چہرے کو یاد رکھنے کے لئے اس
میرا اپنے ذہن کے کچھ نہیں نہیں ڈالی تھی۔ میں نے رفتار
آپاٹ کر کم کر لی اور ذہن پر ذرا انداز دیا۔ کہیں بڑے کسی نہیں
نے سے گھٹ سے وہ تصویر پر آدھ ہو گئی۔ مجھے یاد آ گیا۔ میں نے
میں کو علمی صفت تصویر نواز کے ساتھ ملان دوڑ کے ایک
رستہ راہ سے نکلے دیکھا تھا اور دونوں کے درمیان کسی
دراپر کا گرم بٹ ہو رہی تھی۔ پھر میں ایک میں ایک
دور تصویر نواز اپنی خوب صورت گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا
اور تصویر نواز ایک ایسا شخص تھا جو پہلی ملاقات سے ہی میرے
ایک ٹھکانہ تھا۔

میں نے گاڑی اس شخص کے قریب لے جا رکھی۔ وہ بری
طرح ٹھک کر رہ گیا۔ گاڑی کے پیچھے رہ گئیں تھے اور وہ آنکھیں
کھولے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی
نقصیت سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ ان آنکھوں میں کو کہ باریت
تھی مگر اس باریت کی یہ میں ذہانتوں کے ہمارے غم نے بکھرے ہوئے
تھے۔ — آنکھیں ابھی ہی تھیں جیسے اس کی ذات کے گھڑ میں وہ
کچھ کچھ جلی جلتے ہوں اور کچھ بچھ جاتے ہوں۔

میں نے سنجیدہ کا دوا دوا کھول کر قدرے جھکتے ہوئے اس
کی طرف دیکھ کر کہا "آپ کو کھل جاتا ہے؟ آپے میں آپ کو
چوڑوں لگا۔"

اس نے میرے چہرے پر شناسائی کی کوئی رشتہ تلاش کرنے کی
کوشش کی اور اس میں ناکام ہونے کے بعد قدرے خوف زدہ سا
نظر آنے لگا۔ وہ خاصا اصحاب زدہ اور کزور سا آدمی نظر آ رہا تھا۔
پیشانی اور گردن کی نیس ابھری ہوئی تھیں۔ نئی میں سر ملاتے
ہوئے وہ تھوکر لگ کر ہلا "نہیں۔ نہیں شکریہ۔ میں چلا جاؤں
گا۔ ابھی بس آجائے گی۔"

"ارے حضور! بیٹھ جائیے ان علاقوں میں بس خوش
نصیبوں ہی کو ملتی ہے۔" میں نے "ساتھ لے لیے میں کہا "آپ اتنا
خوف زدہ کیوں نظر آتے گئے ہیں؟ قبل! انہ میں ڈاکو لیزا یا چور
اچکا ہوں اور نہ ہی آپ کوئی ایسے سراپہ دار نظر آ رہے ہیں کہ
راستے میں میرے ہاتھوں آپ کے لٹ جائے کا اندیشہ ہو۔ میں
آپ کو چین دلا تاہم کہ میں کوئی جنونی قاتل بھی نہیں ہوں اور نہ
ہی آپ کوئی ایلی حینہ ہیں کہ میں آپ کو اغوا کر کے قتل کر دوں
گا۔"

"نہیں۔ نہیں جناب! یہ بات نہیں۔" وہ قدرے کھپا
نظر آنے لگا۔ پھر اس نے ایک نظر اپنے سراپہ اور ایک گاڑی پر
ڈالی اور بہت دیر سے لے میں ہوا "میرا جلد اس قاتل نہیں ہے کہ
میں اتنی شاندار گاڑی میں سڑ کر دوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں میرے
جوتے مٹی میں تھڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی گاڑی کے خوب
صورت کاہٹ پر نشان نہ پڑ جائیں۔ میں پیسے میں شراہوں ہوں۔

آپ کی گاڑی کی گھٹلیں سیٹ پر نشان نہ پڑ جائیں اور اس کے اندر
کے ٹھک اور سطر داخل میں میرے پیسے کی بوندی نہ پیدا
کر دے۔" اس نے اپنے لیے میں تزیین و شائستگی کی ملاکت
پر ذرا رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن اس ملاکت کی یہ
میں کسی ذہری کردار ہٹ چکی ہوئی تھی۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ
یہ کتنی "یہ ذہن پختہ میرے لئے تھا کسی اور کے لئے یا ہر سارے
دولت مندوں کے لئے

"بعض لوگ ان پھٹی ہوئی چیزوں پر پڑنے والے داغوں کی
بروا نہیں کرتے لیکن وہ دھڑ پڑے ہوئے داغوں کا جائزہ لینے کی
کوشش ضرور کرتے ہیں۔ میں نے اب بھی خوشگوار لے لیے میں کہا۔

”آپ نصیر نواز سے اپنی شناسائی کے معاملے میں بہت
یا پھر شاید بہت خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔“ میں نے ملا کر
کہا ”کیا اس میں کوئی عیب ہے؟ کوئی راز ہے؟“
”مجھے جان لینا چاہئے تھا کہ آپ نے مجھے خواہ مخواہ
نہیں دی۔ اس دنیا میں کوئی چھوٹا سا بھی احسان بے حد
کرنا۔“ وہ خود کلائی کے سے انداز میں ہنسیا۔

”آپ کوئی بات کریں یا نہ کریں میں آپ کی حوصلہ
کو ضرور چھوڑ کر آؤں گا۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے
نصیر نواز کے ساتھ آپ کو دیکھنے کی بات تو مجھے ہی یاد آئی
میرا آپ کو کریدنے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے اور نہ ہی
سے زبردستی کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک غیر متعلق
ہوں۔ میں تو بے نی دوستانہ اور قدرے بے تکلفی کا ماحول بنا
کے لئے یہ یاد رکھنا چاہئے تھا۔ بلکہ آپ کے انکار نے
جتنی کڑوا ہے۔ آپ مجھے کچھ پریشان حال معلوم ہوتے
آپ مجھے دوست سمجھ کر کچھ کھل کر بات کریں تو شاید میں
کچھ کام آسکوں۔“

میرے الفاظ سے اس کا کچھ حوصلہ تو تیز ہاں لیکن
جلدی کسی پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ معلوم
کس کا ڈسا ہوا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا ”کچھ پتا نہیں
کون کس کا دوست ہے۔ کوئی عیب نہیں کہ مجھے آپ
سمجھیں وہ کسی دشمن جاں کا دوست ہو۔“
”ہاں یہ تو یقین ممکن ہے۔“ میں نے حلیم کیا ”لیکن
ایک ایسے اور بڑے آدمی ہیں تو آپ مجھے اپنے ایسے
دوستوں میں شمار کرسکتے ہیں۔“

وہ ہنسنے سے نیک لگائے چند لمبے گہری گہری سانس
میں بہت ہی سست رفتاری سے ذرا رخ کر رہا تھا۔ اس نے
بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کس طرف چلنا ہے
میں نے کچھ پوچھا تھا۔

”مجھ سے پہلے آپ بتائیے کہ آپ نصیر نواز کو
جس؟“ آخر کار وہ بولا۔ وہ اب زبان کھولے پر کچھ آمادہ
”میں اسے کچھ زیادہ نہیں جانتا۔“ میں نے آہستہ
”اس اتفاقاً ہی علم اندیشی سے میرا کچھ غائبانہ سا تھا
ہو گیا ہے اور اتفاقاً ہی اس شخص نصیر نواز سے میری
آشنائی ہو گئی ہے۔ اور نہ جانے کیوں میں اس کے بارے
کچھ جاننے کے لئے جتنس ہو گیا ہوں۔“

”کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے جناب! انسان بڑے
بارے میں جتنس نہیں ہو جاتے۔“ وہ ہنچکاتے ہوئے
دل مجھ پر اعتبار کرنے کو بھی جا رہا تھا لیکن ساتھ ہی
ہو اسامی تھا یا پھر شاید وہ حد سے زیادہ محتاط تھا۔
”بات یہ ہے عزیز محترم!“ میں نے کسی سانس

”اب بحث چھوڑیے اور آجائے۔ اتنا اصرار اگر میں تھا جاتی ہوئی
کسی سینڈ سے کرتا تو وہ بھی گاڑی میں آن بیٹھتی۔“

اس کے خشک لبوں پر پچیس کی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ
مدھم مدھم آواز میں بولا ”جی ہاں۔۔۔ بلکہ جس قبیل کی حیناؤں کی
طرف آپ کا اشارہ ہے وہ تو اصرار کی نوبت بھی نہیں آنے دیتیں۔
گاڑی رکھنے ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ گاڑی مدھم دھم
سیسا خیر ہو اور تھا بھی۔“ وہ پاؤں سرک پر بھانسنے کی کوشش
کرنے کے بعد گاڑی میں آ بیٹھا۔

”تعریف کا بھی شکریہ اور لغت قبول کرنے کا بھی۔“ میں نے
گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے ہنسنے سے نیک لگا کر ایک
طویل سانس لی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا ”آپ زندگی میں پہلے آدمی
ہے جن جو میرے لئے کا بھی شکریہ ادا کر رہے ہیں۔“

”زندگی باقی رہتی چاہئے لوگ تو ہر طرح کے ہی مل جاتے
ہیں۔ اچھے بھی بُرے بھی۔ مہیاں بھی نامہیاں بھی۔ ہاں اتنا ضرور
ہے کہ کچھ لوگ جلدی مل جاتے ہیں اور کچھ لوگ تاخیر سے۔“ میں
نے سرسری سے لمحے میں کہا۔

”دوست کہا آپ نے لیکن شاید کچھ لوگ بہت جلدی مل
جاتے ہیں اور کچھ بہت ہی زیادہ تاخیر سے۔“ وہ مسکرایا۔ اب وہ
کچھ پوچھنے لگا تھا۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر ذہن پر زور دینے کی
اراکاری کرتے ہوئے کہا ”مجھے یاد ہے کہ میں نے آپ کو نصیر
نواز کے ساتھ کبھی دیکھا ہے۔ غالباً دوست ہے وہ آپ کا؟“

میں نے محسوس کیا کہ گاڑی میں بیٹھ کر اس کے اصرار کو جو
تھوڑا بہت سکون ملا تھا وہ یک لخت رخصت ہو گیا اور اس کے جسم
میں ایک عجیب سا تڑپ اٹھ اٹھ اٹھا۔

”کون نصیر نواز؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ انجان بننے کی یہ
کوشش خاصی اچھی تھی لیکن میرے سامنے بے اثر تھی۔ میں نے
مسکراتے ہوئے ایک ٹانگے کے لئے اس کی آنکھوں میں بھانکا۔
اس نے فوراً نظر ہرایا۔

میں نے نظر دوبارہ سڑک پر مرکوز کرتے ہوئے کہا ”نصیر نواز
کے ساتھ نظر آتا کوئی جرم تو نہیں ہے چھپانے کی کوشش کی
جائے۔“

وہ ایک لمحے خاموش رہا۔ وہ پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ
اس کے اندر جو ماحول سی گھٹن باری ہے اس کی جھلک چہرے پر
نہ آنے پائے غالباً اس نے لغت قبول کرنے پر مجبورتا بھی شروع
کر دیا تھا۔ شاید اس کا بس چلن تو چلی گاڑی سے چلا نیک لگا رہا کر
اس میں اس کی بھی جرات نہیں تھی۔ وہ ان شریف آدمیوں میں
سے معلوم ہوا تھا جن کی شرافت اور بڑائی کے درمیان بہت سی
باریک سی گھیر مائل ہوتی ہے۔

میں اپنے دوست سے بات کر رہا ہوں یا نصیر نواز کے دوست سے۔
 اچھا یہ بتائیے میرے بارے میں آپ کا دل کیا کہتا ہے؟
 بڑوں ہیں اور طویل عمر سے کسی تکلف کسی مصیبت میں گرفتار
 ہیں۔ چوں کہ میں آپ کو نصیر نواز کے ساتھ دیکھ چکا ہوں اور آپ
 کے درمیان کچھ بحث و محیص سی بھی ہو رہی تھی اس لئے مجھے کافی
 امکان نظر آیا کہ شاید آپ کی مصیبت کا قلع نصیر نواز کے ساتھ
 بھی ہو۔ ویسے میرا وجد ان میں کہتا ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے
 ہیں جن پر زندگی پیش ہی نامولان رہتی ہے۔ جو پیشہ طریح کے
 مصائب میں گرفتار رہتے ہیں اور حالات کی بچتی سی کمی نہ کسی
 زاوے سے بچتے ہی رہتے ہیں۔ تاہم میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا
 ان کی اپنی کمزوریوں اور حقائق کی وجہ سے ہوتا ہے یا ان کی تقدیر
 ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ میں ابھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا
 کہ ان معاملات میں کوئی فتویٰ صادر کر سکوں۔

”آپ کا وجدانی تجزیہ بالکل درست ہے۔ اور اگر آپ مجھ
 سے میرے بارے میں رائے لیں تو میں یہی کہوں گا کہ اپنے بیشتر
 مصائب کا زے واز میں خود ہوں۔ قدرت نے مجھے بہت سی
 صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن نہ جانے کب اور کیوں کر میں
 حقائق کمزوریوں اور بزدلی کا ایک الجھا ہوا سا جال بن کر رہ گیا۔
 بالکل ناگاہ سا آدمی بن گیا۔ دلی کے بندے کی طرح۔“ اس نے
 ایک لمبی سانس لی اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
 ”وہاں سے موڑ لیجئے۔ انترکان کی بلند دالا اور شاندار عمارت
 کے عقب میں ایک کچی بستی چھپی ہوئی ہے۔ وہیں میں رہتا ہوں۔
 آپ مجھے باہری آثار دیتے گا۔ کھن میں تو یہ گاڑی نہیں جاسکے
 گی۔“

”کوئی بات نہیں“ میں نے گاڑی موڑتے ہوئے کہا ”میں تو

میرے سے مجھے احساس ہوا شروع ہوا ہے کہ قدرت نے
 مجھے وہ بچے سے نوازا ہے وہاں کچھ غیر معمولی ذہن اور
 سانی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے جن سے ابتدا میں میں خود بھی
 بہرہ بردار ہوں۔ ہسانی طاقت کے معاملے میں قدرت کی مہربانی مجھ
 یہ ہے کہ جتنا ہر جو لوگ مجھ سے بھی کہیں زیادہ جیم اور طاقت ور
 رہتے ہیں ان کے لئے بھی مجھے مطلوب کرنا ممکن نہیں ہوتا۔
 ان کے برعکس اگر میں انہیں گرفت میں لے لوں تو چند ہی لمحے میں
 ناکی حالت بخیر ہوئے آسم کی ہو جاتی ہے یا وہ میرا ایک آدھ
 ٹوٹا کھا کر ہی زجر ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے
 ہے میرے اندر کوئی جن عقیدہ ہے ذاتی صلاحیت کے معاملے میں
 عالم ہے کہ میں ایک بار جس شخص سے ملتا ہوں چند ہی گھنٹوں میں
 اس کے باطن کی ایک تصویر سی میرے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ تصویر
 تو کہ زیادہ واضح نہیں ہوتی، وضاحت ہی ہوتی ہے لیکن پھر بھی مجھے
 اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص بنیادی طور پر کیا ہے۔ خواہ اس نے
 اپنی شخصیت پر کیسا ہی ایادہ کتنی ہی عمر کی ہے چڑھا رکھا ہو۔ آپ
 میری باتوں کو محض ان ترائی سمجھ کر تو نہیں سن رہے؟“ میں نے
 سکرانے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

وہ گویا کسی خیال سے چٹکتے ہوئے بولا ”آپ میری آنکھوں
 میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں بے اعتباری کے سائے نہیں
 ہیں۔“

مجھے اس کی آنکھوں میں بھی جھانکنے کی ضرورت نہیں تھی۔
 مجھے معلوم تھا وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں نے محض رہائی اس سے
 پرہیز کیا۔ اگر مجھے احساس ہوتا کہ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کر رہا
 تو میں اس موضوع پر بات جاری ہی نہ رکھتا۔ میں کسی سے بھی اپنی
 ذات کے بارے میں باتیں کرنا زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ قدرت جن
 جن خرافوں سے مجھے نواز رہی تھی انہیں میں اپنی ذات کے خل
 میں ہی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا لیکن اس شخص کی زبان کھلوانا مجھے
 بہت مشکل نظر آتا تھا۔ اس سے اس کے دل کی بات انگوٹے کے
 لئے اس کے سامنے خود بھی خود ثابت کھانا پڑتی تھا۔

میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا ”میں جو نصیر نواز سے
 متعارف ہوا تو میرے دل نے کہا کہ یہ شخص ٹھیک نہیں ہے۔ اس
 کی شخصیت کی عمارت کے کونے کھد ہوں میں ضرور کچھ کھود
 مید چھپے ہوئے ہیں اور یہ نہ جانے کن کن چکروں میں الجھا ہوا
 ہے۔ ایسے لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے جو اندر سے زہریلے سے
 دلدہ ہیں صرف اسی لئے میں اس کے بارے میں جتنس ہوں اور
 زیادہ کچھ باننا چاہتا ہوں تاکہ میرے ذہن میں اس کے باطن کی جو
 حقیقت ہی تصویر ابھری ہے وہ کچھ اور روشن کچھ اور واضح
 ہو جائے۔“

وہ غمگین سی لے کر بولا ”بہت ہی خوش ہوا آپ کی باتیں
 ان کہ دراصل کوئی بات کرنے سے پہلے میں یہ باننا چاہتا تھا کہ

رومانی ٹائول		
75/-	سلی ریٹا	دل کا آئین
75/-	سلی ریٹا	کالے کنول
100/-	سلی ریٹا	اور دیا جٹا را
100/-	سلی ریٹا	مون گر واپ

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

یہ چاند چو او اس تھا۔ اس کی مولی مولی آنکھوں میں لامبیدی
دھندلا پنیں پھیلی ہوئی تھیں سرسکی شاموں سے لبر اڑلا ہوا
اس چہرے کی چاندنی کچھ دزد دزدی تھی۔ او اس چاندنی تھی۔
اور دروہ ان راتوں کی چاندنی!

اس کے بال بیدے سادے انداز میں بنے ہوئے تھے
ان میں چاندی کے تار جھللا رہے تھے لباس نہایت معمولی
سادہ تھا مگر خدخال کا حسن اس میں بھی نمایاں تھا۔ شاید وہ
شطر رہی ہو مگر اب اس پر سب کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ اگر وہ
تھی تو اب اس پر راکھ کی بٹھنے لگی تھی۔

سجاد کے ساتھ ایک اجنبی کو کچھ کہہ ایک لمبے کے لئے
بہرہ رو بہ درست کرتے ہوئے ایک طرف کھٹ گئی۔

"یہ... میری بیٹی سادہ ہے۔" سجاد جیم کے لمبے میں نہ
کیوں اور تعارش سا گیا۔ جیسے وہ کسی جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔
کے چہرے پر صرف پانچھیں سجاد کی نہیں۔ مولی مولی
آنکھیں۔ اور کسی بھی شخص میں سجاد کی کوئی مشابہت نہیں
وہیے بھی سجاد سا نازا تھا اور لڑکی حد سے زیادہ گوری۔ لیکن یہ
کی ماں ایسی رہی ہو اور وہاں پر ہی گئی ہو اور یہ بھی کچھ بچہ
تھا کہ خود سجاد رنگ دھوپ کے معاملے میں نوجوانی میں بہتر رہا
بعض لوگ جوانی میں بہت کچھ کچھ کچھ ہوتے ہیں مگر مصائب کی
دھوپ میں نامیساں کلی کچھوں میں دھکے کھاتے کھاتے ان
خدخال پر ایسے رنگ چڑھ جاتے ہیں کہ اصل صورت پھوٹتی
جاتی ہے۔

لڑکی نے سر سر ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا اور جلدی سے
چلی گئی۔ سجاد نے اسے میرے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت
نہیں سمجھی۔ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑے تھے جو پتہ
کے طور پر استھان ہوتا تھا۔ اس میں چند کرسیاں اور چائے
تھی۔ اسی میں ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ سادہ
دروازے سے اندر لگی تھی۔

"تشریف رکھئے" سجاد نے ایک بہتر کرسی کی طرف اشارہ
پہرا تھ کھتے ہوئے بولا "میری بیوی کئی برس سے بیمار ہے۔
مرے سے وہ بہتر ہے۔ میرا معمول ہے کہ باہر سے آتا ہوں
سب سے پہلے اسے دیکھنے جاتا ہوں۔ اگر آپ برا محسوس نہ کر
میں پہلے ایک نظرا سے دیکھ آؤں۔ پھر آپ کے پاس بیٹھتا ہوں
"ضرور۔ ضرور" میں نے کرسی پر بیٹھ کر اطمینان سے
پہارتے ہوئے کہا۔

وہ مومنیت مجھے انداز میں سر ہلا کر اندر چلا گیا اور
میں سکوت چھا گیا۔ باہر گلی میں کہیں دور دھڑکتے جھکڑے پتوں
سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن مکان کے اندر سے
کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید مکان خاما کشا
سجاد سرگوشیوں میں اپنی بیوی اور بیٹی سے بات کر رہا تھا۔

تپ کے ساتھ جاسکوں گا۔ کیا آپ مجھے اپنے کمرے جانا پسند
کریں گے؟

"آپ بہت عجیب ہوں گے جناب!" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے
میں بولا "وہاں کئی بنائیاں ہیں۔ کچے کچے گھر ہیں۔ گھروں میں کھیتے
ہوئے کندے بندے بنے ہیں۔ ویسے ہمیں خوش خبی خدای مٹی
ہے کہ جلد ہی وہ ہستی کی ہونے والی ہے۔ پھر اس کی حالت بدی حد
تک سدھر جائے گی۔ لیکن اس قابل شاید وہ پھر بھی نہ ہو سکے کہ
تپ وہاں تشریف لاسکیں۔"

"میں تو خیر ایک طویل انتظار بھی نہیں کر سکتا۔" میں نے
مسکراتے ہوئے کہا "اور مجھے تو یہ تک کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی
جس کے بارے میں مجھے یہ خیال آیا ہو کہ وہاں میں تشریف نہیں
لے جاسکتا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں نے زندگی کو ہر رنگ ہر
پلو سے دیکھا ہوا ہے۔ اور ابھی تو اصل موضوع پر آپ سے بات
ہی نہیں ہوئی۔ وہ باتیں آپ کے گھر پر ہی بیٹھ کر ہوں گی۔ مگر
بات کرنے کا اپنا ایک لطف ہے۔ مگر چاہے کیا بھی ہو بہر حال گھر
ہے۔"

اعز کان کے عقب میں پہنچ کر کئی گلیوں کی بھول بھلیوں میں
گھومنے کے بعد آخر کار اس نے ایک ایسی جگہ گاڑی رکوائی جہاں
سے آگے پہلے ہی جایا جاسکتا تھا۔ میں نے اتر کر دیکھا کچھ کے موڑ
پر نوئی اور شہر کی گاڑی بھی پہنچ چکی تھی تاہم وہ اترے نہیں تھے۔
میں نے غیر محسوس طور پر انہیں اشارہ دے دیا کہ انہیں میرے
پیچھے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ گاڑی میں بیٹھ بیٹھے رہے۔

میں اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ وہ خاموش اور مگر منہ سا
نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ
دیکھتا چاہتا تھا کہ میں گرو پش کو دیکھ کر ہلک ہوں چڑھا ہوں یا
نہیں۔ میں اطمینان سے چلا جا رہا تھا۔ مجھے ایسی جگہوں پر جانے میں
حیثیتا بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ میرا بھین اور لڑکی جس
گلی کچھوں میں گزرا تھا وہاں ان سے ذرا زیادہ کشادگی اور سبزہ
ضرور تھا کیوں کہ وہ گاڑی کی گلیاں تھیں لیکن احوال یہاں سے کچھ
زیادہ مختلف نہیں تھا۔

"میں نے ابھی تک آپ کا نام ہی نہیں پوچھا۔" میں نے کہا۔
"سجاد جیم۔" اس نے ایک لمبے کی خاموشی کے بعد جواب
دیا "اور... کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ اس نے مزید کچھ جاننے کی کوشش
نہیں کی۔ مزید چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ اس کا مکان دیگر
مکانوں کی نسبت بہتر بھی کچھ بہتر تھا۔ ہونٹوں پر زبان بھیرتے ہوئے
اس نے یوں دروازے پر دستک دی گویا اپنے نہیں کسی اور کے گھر
تھا ہو۔

دروازہ کیا کھلا گیا تو ایک بادلوں کے عقب سے چاند طلوع
ہو گیا۔ آگاہ میں چو کم از کم نہاں دیکھنے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ مگر

ہند نے بعد وہ لوٹ آیا۔ اب قدمے ملنے نظر آ رہا تھا۔
مقابلہ پہنچے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے میری بادی اس وقت
تکلیف میں نہیں ہے۔"

"انہیں کیا پتا ہے؟" میں نے ہر روزانہ لیجے میں پوچھا۔
"غربت بجائے خود سب سے بڑی پتا ہے۔" وہ قدمے
سے مسکراتے ہوئے بولا "سو تباہیوں کی جڑ ہے۔ جس طرح
ایک وجہ سے معمولی سے زخم میں بھی انفیکشن ہو جاتی ہے اور
وہ میں جاتا ہے اسی طرح غربت کی وجہ سے بھی معمولی سے
نا تباہیوں طویل تکلیف کر کے دیکھ رہا ہو جاتی ہیں۔" خیر۔ "اس
سرکھلا سا دمکھایا "آپ ان باتوں کو چھوڑئے۔ یہ بتائیے میں
کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں آپ سے صرف نصیر نواز کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا
ہے اور اس سے آپ کے تعلق کے بارے میں بھی۔" میں نے
لیجے میں کہا۔

اس نے ٹوپی اتار کر گود میں رکھی اور سفید بالوں میں اٹھکیاں
نے ہوئے چہرے کو گھومنے لگا۔ چند لمبے بعد وہ بولا "نصیر نواز
آسیب ہے جو کئی سال پہلے مجھ پر مسلط ہو گیا تھا۔ یا پھر شاید
یہ خود ہی، اسے اپنے آپ پر مسلط کر لیا تھا۔ ہم کس طرح
ت ہوئے اور کس طرح ہمارے مراسم بڑھے۔ یہ ایک طویل
سہ ہے میں اس کی تفصیل میں جا کر آپ کو بور نہیں کروں گا۔
انہیں یہ سمجھ لیجئے کہ اس کی فلمی دنیا میں شہنائی تھی اور اسے
لوگوں سے محبت کرنے کا ہنر آتا تھا۔ شاید آپ کو اندازہ ہو
لگی لوگوں سے محبت کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے
ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا، فلمی دنیا سے متعلق کوئی بھی
اسے نہیں آتا تھا مگر نہ جانے کس طرح فلم والوں سے اس کی
تیاں تھیں اور وہ ان سے معاملہ کرنا جانتا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اسے فلمی کمائی دنیو بھی کھنی نہیں
آتی؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" اس نے لٹی میں سر ہلایا "وہ پڑھا لکھا ضرور ہے مگر
ان کے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نے فلمی دنیا میں
نویں کمائی اپنے نام سے دی تھی اور جو سہرت ہوئی تھی وہ
ملی میری گھسی ہوئی تھی۔"

"اور!" میں گہری سانس لے بیٹھ رہا تھا۔

"تقسیم ہند سے قبل بھی میں 'میں نے فلمی دنیا میں چند ایک
نہیں کی زبان و بیان دنیو درست کرنے کا کام کیا تھا۔" وہ
اگلے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس زمانے میں
ہفت پرست محنت کی جاتی تھی۔ بہت سے لوگ اس پر پانی
یا کام کرتے تھے اس کی نوک چمک منواتے تھے اور اس کی
کو بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنی اپنی رائے دیتے تھے لیکن وہ
الہا بہتر ہوتے تھے یعنی فکر کاٹوں کو بہتر بنانے کے سلسلے میں

مشورہ لیا جاتا تھا تو کسی شاعر سے ہی لیا جاتا تھا۔ زبان و بیان بہتر
بنانے کا کام کسی فنکار سے کیا جاتا تھا۔ سب کچھ کی زبانوں کی
فلمی دنیا میں بھی اسکرپٹ میں بڑی اگلاؤں بجاؤں ہوتی ہے مگر غیر
متعلق لوگ کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ فلم میں ان کی اہمیت
ہوتی ہے مثلاً ہیرو کو کوئی مکالمہ پسند نہیں تو وہ اسے تبدیل کر دیتا
ہے۔ ہیروئن کو کوئی بچہ پسند نہیں تو وہ اسے تبدیل کر دیتی ہے
ڈسٹری ہیرو کو کوئی کردار پسند نہیں تو وہ اسے ٹھکرا کر وہاں اس ٹکی کو
شامل کر دیتا ہے جو اسے ذاتی طور پر پسند ہوتی ہے یا جو اس کے
عشرت کے لئے درکار ہو گا پھر لگا لگا لگا ہوتی ہے۔ اس طرح اسکرپٹ کا
طیہ پڑتا ہے سنو رائٹس۔ اس کے باوجود بہت حال عیسیت ہوتی
ہیں کیوں کہ بنیادی کمائی کی بجائے کچھ جان ان میں ہوتی ہے۔ اور
کچھ اب فلم بینوں کے ذوق بھی بدل چکے ہیں۔ رجحانات تبدیل
ہو چکے ہیں۔"

روانی سے بات کرتے کرتے وہ یکدم کچھ چٹکا اور گرا سنبھل
کر بولا "اوہ۔" معاف کیجئے گا۔ میں تو غیر ضروری تفصیلات میں چلا
گیا۔ یہ باتیں تو آپ کو معلوم ہی ہوں گی۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ
بہت سی فلمی دنیا میں 'میں نے معمولی سی تنخواہ پر کچھ اسکرپٹس پر کام
کیا تھا۔ وہیں میں نے اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر اسکرپٹ کی ٹیکنگ کا
کمری نظریے معاملہ کیا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ لیکن اس سے
کوئی فائدہ اٹھانے کی فورت نہ آئی اور ملک تقسیم ہو گیا۔ میں
میں چلا آیا۔ جب ہجرت کے زخم کچھ مندمل ہوئے تو میں نے کئی
بادی محنت سے ایک اسکرپٹ لکھا۔ میں ان دنوں گھر کا چھوٹا بچہ
رکھنے کے لئے ایک آدمی کے پاس مٹھی گیری کر رہا تھا۔ وہ
اسکرپٹ لے کر میں نے فلمی دنیا میں کافی دھکے کھائے۔ کہیں تو
میری خدمت مالی دیکھ کر اسٹوڈیو کے چکر دار نے مجھے گیٹ سے ہی
بھگا دیا اور کہیں فلم ساز یا ڈائریکٹر نے میری فائل کا ایک ورق
اٹنے بغیر مجھے اپنے دفتر کے دروازے سے ہی چلا کر دیا۔ یا بہت
سربانی کی تو ایک بیانی جانے پلا دی اور سفارت کے اپنے سیٹ پر
چلا گیا۔ آخر کار بدول ہو کر میں نے اس اسکرپٹ کو اسی گھر کے
ایک کونے میں پھینکا اور کیسلی سے اپنے ہی کھاتوں میں ہی دل
لگایا۔"

ایک لمبے کے لئے خاموش ہو کر اس نے میری طرف دیکھا
اور مجھے جہد تن گوش پا کر سلسلہ کلام جوڑا "مگر نصیر نواز سے میری
ملاقات ہو گئی۔ شاید اس نے کہیں مجھے اسٹوڈیو میں دھکے کھاتے
دیکھ لیا تھا۔ بہر حال۔۔۔ ملاقات بظاہر اتفاق ہی ہوئی تھی۔ چند
ملاقاتوں کے بعد باتوں باتوں میں اس اسکرپٹ کا ذکر نکلا۔ نصیر نواز
نے وہ اسکرپٹ مجھ سے لے لیا اور غائب ہو گیا۔ چند دن بعد وہ
دوبارہ ملاقات اس کے ایک بڑا روپے میرے ہاتھ پر رکھ دئے اور فریہ
شادی کہ اس اسکرپٹ پر رقم بنے کی لیکن مصنف کے طور پر نام اس
کا آئے گا کیوں کہ بتوں اس کے 'پروڈیو سر میرا نام سن کر شاید

"نہیں، نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" میں شرمندگی سے کہا "میں تو صرف اپنی حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔" کبھی کبھی مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے۔" سجاد ہراسے سے قہمی دنیا کی جڑوں میں اترتا ہوا ہے۔ اتنی کمایاں اس کے ہاتھ سے گزری ہیں۔ غلوں کی کار ناما میں پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر چاہتا تو اب بھی طبع آزمائی کرنا چاہ سکتا تھا۔ اتنا عرصہ قلم اندر مٹری بیٹ لگانے والے مزدور اور لائٹ جن تک مختلف شعبہ مارنے لگتے ہیں لیکن اس نے آج تک ایک صفحہ کو شش نہیں کی۔"

"شاید وہ دوسرے زیادہ آسانی پسند ہے۔ اسے جب بنی بنائی چیز آسانی سے دستیاب ہے تو پھر دماغ کم ضرورت ہے۔"

"جی ہاں۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو مکمل طور پر بنائے رکھا۔" سجاد افسردگی سے بولا "مجھے یہ بھی معلوم ایک اسکریٹ کا چالیس سے پچاس ہزار کے درمیان لیکن میں پھر بھی خاموشی سے ایک ہزار لیتا رہا۔ کیوں کہ اچھی قسمی کہ میں اس سے خوف زدہ بھی رہنے لگا تھا۔ وہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کے دل میں رحم یا غلامتہ نہیں۔ آپ اسی سے اندازہ کر لیں کہ اگر اس میں اد کوئی چیز ہوتی تو وہ اتنا ضرور سوچتا کہ جس چیز سے وہ بچا پچاس ہزار کا رہا ہے اس کا ایک ہزار معاوضہ تو بہت وہ اس میں خود ذرا بہت ہی اضافہ کرتا تھا اس نے کبھی اپنی بات بھی کرنا پسند نہیں کی بلکہ جب میں نے اپنی ضرورت بھجور ہو کر خود ذرا بہت چوں چاہاں شرمندگی کی تو اس نے میں کہہ دیا کہ زندگی کے معاملات میں اس کے نظریات ہیں۔ اور ان میں سے ایک نظریہ یہ ہے کہ اگر سونے دینے والی مرنے بھی زیادہ کر کر کرنے لگے تو اسے ذرا کدے سے تالے میں پھینک دو۔ اگر تم مقدور کے تھے ہو۔ دوسری مرنے والے جانے کی یہی تھا اس کا جواب۔"

"بہت خوب۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آہوہ حال تو میں کبھی بھی نہیں رہا۔" سجاد جوڑتے ہوئے بولا "لیکن پیوی کی بیاری نے مجھے کچھ درست تلاش اور بھجور کھڑا۔ اوپر سے بنی کا بوجھ بھی تھا۔ غریب آدمی کی بنی تو خوب صورت ہو تب بھی اسے سے ہی میرا آنا ہے۔"

بنی کی شاید عمر لمبی قسمی کہ جو نمی اس کا ذکر کیا ٹرے اٹھائے کرے میں داخل ہوئی۔ اس نے صرف میری طرف دیکھا پھر اس کی نظریں پہلے ہی کی طرح بوجھ سے جھک گئیں۔ ورنہ اس نے کس کر بائوں اور چ

اسکرٹ کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ عجیب بات ہے اس وقت مجھے نام آنے یا نہ آنے کے مسئلے سے ذرا بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں تو ایک ہزار روپے دیکھ کر ہی سب کچھ بھول گیا تھا۔ میرے حالات کچھ ایسے تھے اور ضروریات نے مجھے ایسا بھجور کر رکھا تھا کہ ایک ہزار روپے مجھے کسی خزانے سے کم نہیں لگے تھے۔ فیروز خان نے فرمائش کی کہ میں قلم رہ لے کر ہونے سے پہلے ہی ضرورت محنت سے ویسے ہی تین چار زوردار اسکرٹ اور کچھ دوں۔ میرے لئے تو کیا یہ ایک بہت بڑا وسیلہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑے دل و جان سے تین چار اسکرٹ اور کچھ ڈالے۔ اسکرٹ لیتے ہی فیروز خان ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ رہا تھا۔ مجھے تو اپنی منشی گیری کی نوکری بھی غیر اہم لگنے لگی کیوں کہ وہاں سے مجھے جو روپے ماہوار ملتا تھا۔

اپنے خالی ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتے ہوئے وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا "پھر وہ پہلی قلم رہ لے کر ہو گئی جس کی کمائی میری قہمی ہوئی تھی۔ قلم پر ہٹ گئی۔ قہمی دنیا کا چلن تو آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ جو قلم ہٹ ہو جائے اس سے قفل رکنے والی پوری ٹیم کی قسمت راتوں رات پلٹ جاتی ہے۔ فیروز خان بھی ایک پر ہٹ مصنف کے طور پر سامنے آیا اور راتوں رات اس کے دو ڈاؤن سے پڑاؤں کھڑے پڑوؤں پر سڑکی لائن لگ گئی۔ ذرا وقت کے لئے اس نے پہلے ہی مجھ سے تین چار کمائیاں لے کر رکھی تھیں۔ اس نے سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو کمائیاں تھما دیں۔ اور اس کے بعد تو میں سلسلہ چل نکلا۔ کمائیاں میں لگے کر رہتا رہا۔ ان میں چچا رہا۔ پھر اس نے اور کاموں میں بھی ہاتھ ڈال دیا۔ ڈسٹری بیوشن۔ پڑوؤں کشن۔ اور نہ جانے کیا کچھ۔ سنا ہے آج کل ایک کھڑی چٹنی خاتون بھی اس کی منشی میں ہے۔ اسے وہ پڑوؤں سر اور فائنکس کے طور پر اندر مٹری میں لایا ہے۔ معلوم نہیں اس بے چاری کا انجام کیا ہو گا۔" وہ ایک آدھی بھر کر خاموش ہو گیا۔

"اتفاق سے میں اس عورت سے بھی مل چکا ہوں۔" میں نے کہا "وہ ہماری بھوریوں کی کچھ زیادہ سختی معلوم نہیں ہوتی۔ ضرورت عیاش اور سٹاک عورت معلوم ہوتی ہے۔" فیروز خان سے زیادہ عیاش اور سٹاک شاید وہ نہ ہو۔" سجاد نے خیال ظاہر کیا "اس جیسا سٹاک اور بے حیت شخص میں نے ذہنی میں نہیں رکھا۔"

"سجاد صاحب! میں بہت کم باتوں پر حیران ہوتا ہوں لیکن یہ سب کچھ سنا کر آپ نے واقعی مجھے حیران کر دیا ہے۔ لیکن نہیں آہا۔ کیا واقعی اس نے آج تک ایک بھی کمائی نہیں قہمی اور اتنا کامیاب اتنا معقول مصنف بنا ہوا ہے؟"

"نہیں جو قسم کہیں میں وہ کھانے کے لئے تیار ہوں۔ دنیا میں اپنی بنی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اس کی قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔"

”میں اپنی کمائی کے اسی اہم موڑ کے بارے میں آپ کو بتانے لگا تھا۔“ وہ پلوہ لے ہوئے بولا ”تقریباً دو سال پہلے ایک جگہ خدا خدا کر کے سامہ کی بات کہی ہوئی تھی۔ میں ایک باپ کی نظر سے دیکھتا تھا تو لڑکا مجھے کسی اعتبار سے بھی سامہ کے لائق نظر نہ آتا تھا لیکن سامہ کی برستی ہوئی عمر سن مجھے وہ رشتہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا مگر یہ بھی شاید قسمت کی قسم عمری تھی کہ مٹھی کے کچھ دن بعد لڑکے کو قطعی غیر متوقع طور پر دی جانے کا موقع مل گیا۔ دو سال کے کنٹرول پر وہاں ملازمت کر کے وہ کچھ رقم کما لایا اور گھر کے حالات ذرا بدل گئے۔ آج کل بھی وہ دوبارہ باہر جانے کے لئے ہمارا دوڑ میں لگا ہوا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ بجائے اس کے کہ حالات کی اس تہدیلی پر وہ قدرت کے شکر گزار ہوئے اور جلد از جلد لڑکے کی شادی کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے“ انا ان کی تو نظریں ہی بدل گئیں۔ لڑکے کے والدین صاف طور پر بتائے گئے کہ ان کے لڑکے کو رشتوں کی کیا کمی ہے۔ کئی اچھے گھروں کے متھے موجود ہیں۔ فلاں گھرانہ جینز میں ہے کچھ دینے کو تیار ہے اور فلاں نے وہ کچھ دینے کی بات کی ہے۔ کچھ عرصے اس قسم کی باتوں کے بعد آخر کار انہوں نے مکمل کر دل کی بات کردی کہ انہیں فلاں فلاں چیزوں پر مشتمل چیز چاہیے باقاعدہ فرسٹ ہانڈ کر کے دی انہوں نے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر ہم ان کے مطالبات پورے نہ کر سکیں تو رشتہ ختم سمجھا جائے۔“

”اور... کھٹیا قسم کی خود غرضی اور ہوس کی دی پرانی کمائی!“

میں نے تاسف سے کہا۔

”میں ہاں دی پرانی کمائی جو ہر روز نہ جانتے سکتے والدین کے دلوں پر پڑنے زخم لگاتی ہے۔“ وہ افسردگی سے بولا ”ہر حال... ان کے اس مطالبے کے بعد پہلی بار میں نے نصیر نواز سے اپنے لیے دین سے بڑھ کر کچھ مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے پھر بھی اسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ میرا اس پر کچھ حق بنتا ہے یا میری وجہ سے اس نے جولا گھول دیا ہے عزت اور شہرت کمائی ہے، میں اسی میں سے معمولی سا حصہ مانگ رہا ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس سے فرض یا بیک کی طرح رقم مانگی تھی۔“

”کتنی رقم؟“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے پوچھا۔

”لڑکے والوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے مجھے کم از کم ایک لاکھ دو سو پندرہ سو روپے درکار تھا۔“ وہ دھمکے لیے میں بولا ”اور ایک لاکھ کا سن کر نصیر نواز کی آنکھیں یوں پھیل گئیں جیسے میں نے اس سے ہفت اقصیٰ کی دولت مانگ لی ہو۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ میں کوئی نشہ وغیرہ کر کے آیا ہوں اور میرے ہوش و حواس ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں نشتے میں نہیں ہوں تو اس نے سمجھا کہ شاید میں اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کا آغاز کر رہا ہوں۔ یہ سمجھ کر وہ آپ سے باہر ہو گیا اور اس نے مجھے عکسین ملانے

داغ۔ شاید اس کا مقصد دلوں کی چاندی کو چھپا بھی تھا۔ چائے رکھ کر وہ خاموشی سے وہاں بیٹھ گئی۔ چائے کے ساتھ بھی تھے۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی۔ نہ جانے پچھاری سامہ کی طرح اور کس کے ہاتھ منگوائے ہوں گے۔“

”آپ کو یہ تکلف نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ بات میں محض نا نہیں کر رہا۔ مجھے حقیقتاً شرمندگی اور ہی ہے۔“ میں نے

”مجھے معلوم ہے“ یہ آپ کے شایان شان نہیں ہیں۔ شاید ان دیکھ کر آپ کو اپنا کئی آدمی ہو لیکن اگر آپ انہیں کچھ لیں تو میرا دل بڑا ہو جائے گا۔ سامہ کو بھی یقیناً خوشی ہوگی۔ انسان کو بان کر ضرور خوشی ہوتی ہے کہ کسی بڑے آدمی نے اسے اور اس چیزوں کو حقیر نہیں سمجھا۔“ وہ فہرے فہرے لیے میں بولا۔

”اگر میرے ان بیکٹوں کو کھانے سے آپ کو کوئی خوشی ملے تو میں یہ سامہ کے سارے بڑے بڑے کر سکتا ہوں۔“ میں نے رائے ہوئے کہا اور بیکٹوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

ان فریبوں کو دیکھ کر دل کی حالت واقعی عجیب سی ہو جاتی ہے۔ وہ خواہ فاقے سے ہوں مگر کسی کی تواضع کے لئے پڑوسی سے ادھار لے کر مٹائی منگوا لیں گے۔ یہ جذبہ اب دنیا سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں مگر جن نظر آتے ہیں دل کو پانی کر دیتے ہیں۔

میں نے چنگا ہوا کہ افسوس کھانے کی چٹنی لی اور مجھے حقیقتاً لطف آیا۔ اس چائے میں طلوع کی حرارت اور وضع واری کی ماس تھی۔ سیار نیم اپنا کپ تھا اسے افسردگی سے بھرت کی طرف بٹنے ہوئے بولا ”سامہ کی عمر پینتیس سال ہے اور کبھی کبھی رات کو اچانک کر سوتے سے اٹھ بیٹھتی ہے۔ اس کے ناخن پتیلیوں میں رز جاتے ہیں۔ بہت دیر تک وہ ہوش و حواس میں نہیں آتی اور ان کا جسم تھک رہتا ہے۔ ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد بھی ایک دو دن تک وہ کم قسم سی رہتی ہے۔ اگر میں جاں بال یا حد سے زیادہ سادہ لوح آدمی ہوتا تو یہی سمجھتا کہ لڑکی پر کوئی سادہ وغیرہ ہے۔ تصویر گنڈے والے بیروں فقیروں اور خالوں کے پاس جانا لیکن یہ بھی بہت بڑا عذاب ہے۔ میں بھی عذاب آگئی میں گرفتار رہا۔ مجھے اصل مرض معلوم ہے علاج میری دسڑی سے باہر ہے۔ میں اپنی مصروفیتی کا بھرم ہوں۔ وہ جی جو خاموشی سے جس برس کی مگر کچھ جی مگر جس نے کبھی گھر کی بھرت پر چڑھ کر لڑنے کے بار نہیں بھاٹکا۔ میں نے کبھی چوری چھپے دواؤں کی دلی سے غلے میں نظر نہیں ڈالا۔ میں اس کا بھرم ہوں کہ اسے اس مرض بھیج سکا جہاں اسے ہونا چاہئے تھا۔ شہنائی کی گونج میں سے رخصت نہیں کر سکا۔ مگر وہ اپنے آپ کو بھرم محسوس کرتی ہے۔

روشنی ہے کہ وہ مجھ پر بوجھ بیٹھ رہی ہوئی ہے۔ اسی احساس سے اس کی لپک لپک جلی رہتی ہیں۔“

”لڑکی کی کس بات میں نہیں جلی یا روپے پیسے کی وجہ سے...؟“

کا۔ فوراً ہی درحوم دھام سے اس کی شادی کر دیا۔ کیا زکا۔ اس نے یہ سب کچھ کما اور میں نے سن لیا۔ ۱۳ رندہ سی گئی۔

غیر ارادی طور پر میرا سر جھک گیا۔ وہ ایک لمبے کے بعد جھنسی جھنسی ہی آواز میں بولا "میں نے کسی ایسی کو نہیں جن میں لڑکیوں کے باپ یا پھر ہم کے ہیرو ایسے معمولی معمولی باتوں پر دل کو قفل کر دیتے ہیں۔ گنڈا سے کھڑے کر دیتے ہیں۔ لاشیں سے اس کا بچہ مر نکال دے گا۔ لاشوں سے اس کا جسم چلتی کر دیتے ہیں لیکن میں ہاتھ نہیں دے رہا۔ آپ نے دیکھا؟ قہقی یا کتالی؟" حقیقی زندگی میں کتنا فرق ہوتا ہے؟ غم دھبے کا سانپ، کنڈی مارے بیٹھا ہے اور اندری اندر دیکھ کر گھول رہا ہے جس میں زہر پھیل چکا ہے مگر شاید ابھی اس میں اتنی قور کہ یہ کسی اور کو مار سکے فی الحال تو یہ صرف مجھے دھجے ہلاک کر رہا ہے۔"

سادہ کی معصوم اور افسردہ صورت میری ٹاپور تھی۔ اگر یہ بات اسے معلوم ہو جاتی تو اسے نہ جانے صدمہ پہنچتا، قہقی تخیل کا احساس ہوتا۔ میں نے بچہ پوچھا "آپ نے مجھے میں یا کسی جذباتی کیفیت میں اپنا ان باتوں کا تذکرہ نہیں کیا؟"

"تو یہ مجھے صاحب! وہ طویل سانس لے کر بولا ایسی ذلت کی کہانی اسے کیوں کر سنا سکتا تھا۔ بلکہ آپ کو حیرت ہوگی کہ میری بیوی اور بچی کو تو یہ بھی علم نہیں کہ میں کو قہقی کہانیاں کہہ کر دیتا ہوں یا اس سے میرا کوئی معاملہ بھی سمجھتی ہیں کہ میں معمولی معاملے پر غصہ ادا اور اسکرپس کی تصحیح کا کام کرتا ہوں۔ برسوں گزر گئے مگر کامیابی سے اس معاملے کو راز رکھا ہوا ہے۔"

"میرے خیال میں یہ آپ نے اچھا ہی کیا ہے۔ قدرے طمانیت سے کہا۔

"میری بیوی کی تو حالت ہی ایسی نہیں کہ اسے کو کوئی اشتغال انگیز بات سنانی جائے۔ بچی کو بھی میں تو خوش خبری تو سنا نہیں سکا۔ اس لئے کوئی بری خبر بھی اسے حوصلہ نہیں پڑتا۔ میں باہر کی باتیں باہری رکھتا ہوں انہیں بتائے بغیر ایک پرانے شمسارے لئے کاراوارہ۔ ٹاؤن کیا تھا۔ کبھی وہ بھی میری ہی طرح غلطی سے او غامی گمراہی شمسالی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ قسمت ان پر مگنی۔ ان کا چھوٹا سا کامیاب پیلہ چلا گیا اور اسی رفتار سے دور ہوتے گئے حتیٰ کہ گاؤں ٹاؤن کی ایک بہ کو قہقی میں پہنچ گئے بہت مدت سے ان سے ملاقات تھی۔ ایک آدھ مرتبہ سہرا لے بھی تو انہوں نے بیڑی

بچنے کی دھمکیاں دیں۔ مجھے معلوم ہے وہ اس قسم کی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک اٹھارہ سال کے لڑکے کو اس نے جھنسی اس لئے کھلی کر دیا تھا کہ نوجوانی کے جوش میں اس نے نصیر کے ساتھ کبڈی کھینچ لی تھی۔ ایک اور شخص پر اس نے رنجیت کے کسی پکڑ میں پیشہ ورا قاتلوں سے حملہ کر لیا۔ وہ جان بچانے میں تو کسی طرح کامیاب ہو گیا لیکن عمر بھر کے لئے سفید ہو گیا۔ ستم طرہ یہ ہے کہ وہ شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس پر حملہ نصیر نے کرنے کر لیا ہے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔"

"اوہ۔ خاصا خطرناک چیز معلوم ہوا ہے یہ شخص! میں نے اس موقع پر قدرے حیرت کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔ "کم از کم مجھ جیسے ممکن آدمی کا اس سے رشتہ ذرا دھماکا ہے۔ میری حیثیت ہی کیا ہے؟ ایک طبقہ ہستی میں رہنے والا حیرسا کیزا مجھے ذرا سماجی طاقتور کوئی شخص نہیں کر بکھڑ سکتا ہے۔ جس کے بعد میری بیوی اور بچی جو پہلے ہی ایک کہنا کا زندگی گزار رہی ہیں بالکل ہی بے آسرا ہو جائیں گی۔ اس لئے میں نے نصیر نواز کے سامنے اکرے کی کوشش نہیں کی بلکہ صحت حاجت کے انداز میں ہی اپنا مسئلہ اسے سمجھایا مگر اس نے میری ضرورت پوری کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ دو ٹوک انداز میں کہہ دیا کہ وہ اتنی بڑی رقم پر گز مجھے نہیں دے سکتا۔ جس نے میری دن رات کی محنت سے لاکھوں کا کارجب میں ڈالے تھے اس کے لئے ایک لاکھ مجھے دینا عید از تصور تھا۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے ایک ایسی بات کہی کہ ایک باہت باپ کی حیثیت سے مجھے اس کو وہیں قفل کر دینا چاہئے تھا مگر میں بڑل۔ نالی کا کیزا یہ بھی نہ کر سکا۔ صرف تھلا کر دیا۔ اور آج تک اپنے آپ کو کوس رہا ہوں۔"

"اس نے کیا کہا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا "اس سوال سے میرا مقصد آپ کے ذہنوں پر غلبہ چڑکانا نہیں ہے بلکہ میں نصیر نواز کی تصویر اپنے ذہن میں بالکل واضح کر لینا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک لمحے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں موڑتا ہوا پھر سر کوئی سے ذرا ہی بلند آواز میں بولا "وہ مجھے سمجھانے لگا۔ بڑے سلاں! یہ کیا شرافت؟ عزت اور تقدس کے فرسودہ پھلوں میں پڑے ہوئے ہو۔ اگر چینی کی شادی کرنا تمہارے خیال میں بہت ہی ضروری ہے اور اس کے لئے ایک لاکھ مدد یہ حاصل کرنا بھی ضروری ہے تو میں ایک آسان سی ترکیب بتا دیتا ہوں۔ میرا ایک بہت بڑا سیٹھ جاننے والا ہے۔ ایک ہفتے کے لئے بچی کو اس کے پاس بھیج دو۔ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔ خوب صورت لڑکی ہے۔ سیٹھ ایسی لڑکیوں کا قدر دان ہے۔ رنڈوا ہے۔ اپنے حاشیائوں بچنے میں خوار رہتا ہے۔ سادہ بہت پیشہ و شہرت سے آٹھ دس دن اس کے گھر مہمان رہے گی اور غاموشی سے ایک لاکھ مدد یہ لے کر واپس آجائے گی۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہیں چلے

پُراسرار
ہولناک

اور ناقابل فراموش
کہانیوں
کا حسین

استزاج

معروف مصنف

ایم اے
راحت
حکے
طلسماتی قسم

نہ ہرگز
70/-

بدن کا پیری
70/-

خون اورو
70/-

جسٹاب اپنے مریخی ایک سال کے طلب
قریباً میں یا آواز کے کام کو کیفیت کا
میں آواز کے سال کے کیا میں
جسٹاب آپ کو
بند رہے کہ جسٹاب کے سال کے کیا میں

اپنے
آرڈر سے
مطلع فرمائیں

کتابیں
خوبصورت سرورق
کے ساتھ
پیسے بیک پر
شائع کی گئی ہیں

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرگروڈ، اردو بازار، لاہور، فون ۶۲۳۶۶۵

ہاری اس ملاقات کا یا اس چپکے فیوہ کا کوئی ذکر نہ کریں۔
وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہا تھا پھر چپکے لے کر او
اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھیل ہوئی تھیں۔ پھر وہ ٹٹو
پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "سر! آپ مجھ سے مذاق تو
کرسے؟"

"میں احساسات کو مجموعہ کرنے والے مذاق پر گزرتا
کرتا۔" میں نے اپنا وزن شک کاڑا اس کی طرف بڑھاتے
کہا۔ "چند دن بعد آپ مجھ سے رابطہ قائم کیجئے گا۔ ہم دوسرے
کے کے چند ضروری باتیں کریں گے۔"

"سر! مجھے یقین نہیں تھا۔" وہ توحش سے لمبے میں
"قدرت بڑے عجیب عجیب انداز میں انسان سے کام لے
اور بڑے ناقابلِ چین انداز میں بعض لوگوں کے مسائل حل
ہے۔ آپ اس سلسلے میں اب ذہن نہ کھپائیں اور ایک سیٹ
میری بھی تھوڑی سی مدد کریں۔ یہ بھی خدا مستحقِ شکر ہے کہ
ایک کڑی ہے۔"

میں نے جیب سے رشتہ عرف بے بی نکالا کی ایک تو
نکال اور سجاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ کی نصیر نواز
بہت ملاقاتیں رہی ہیں۔ آپ نے کبھی اس لڑکی کو تو اس کے
نہیں دکھا؟"

اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لے کر ایک نظر دیکھی
چپک کر بولا "یہ لڑکی کہاں ہے؟ اس کی تو مجھے تلاش ہے
صرف ایک بار مجھے ملی اور حیران کر گئی۔ کیا آپ اس کے متعلق
جانتے ہیں؟ کچھ اتنا پتا معلوم ہے اس کا؟ الوس! مجھے تو اس
بھی نہیں معلوم۔"

مجھے اس کا اشتیاق دیکھ کر قدرے حیرانی ہوئی۔ میں
آہستہ سے کہا "جی ہاں۔ اتنا پتا تو معلوم ہے لیکن افسوس کہ
کوئی اس سے ملنے نہیں جاسکتا اور نہ ہی اب یہ کہہ سے ملے آ
ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ گویا اس معلوم کو قبول کرنا نہیں چاہتا
میں نے اس تک پہنچا جانا تھا۔

"کیا آپ نے اخبار میں اس کے قتل کی خبر نہیں پڑھی؟"
نے پوچھا۔

"میں اخبار باقاعدگی سے نہیں پڑھتا۔ کبھی کبھار کسی جا
خانے وغیرہ میں سامنے رکھا ہوا نظر آجائے تو پڑھ لیتا ہوں۔
عدوانی میں بولا۔ پھر یکدم جیسے اسے بھٹکا سا لگا۔ اصل قضیہ کی
اس کا ذہن ذرا تاخیر سے گہا تھا "آپ نے کیا کیا؟ قتل۔" اس
حلق سے سرسراہٹ سی آواز نکلی۔

"جی ہاں۔ اسے چند دن قتل ہوئے پھر اسرار سے انداز
قتل کر دیا گیا ہے۔ یوں تو ہر قاتل ہی سفاک ہوتا ہے لیکن اس
کے قتل میں کچھ زیادہ ہی فحشی القبی کا مظاہرہ کیا گیا۔" میں

بھانا۔ پھر بھی میں ایک سوہم ی امید کے سارے ان کے پاس
چلا گیا تھا کہ... شاید وہ مجھے برے پرانے حلق کے حوالے
سے میری کچھ مدد کریں۔ لیکن وہ ملک نے باہر گئے ہوئے تھے۔
ان کی بینک بھی پرانے وقتوں سے بند جاتی ہے۔ وہ گھر نہیں۔
انہوں نے اتنی ذمت ضرور کی کہ ایک آنکھیں لیکن انہوں نے
مجھے اندر بلا کر انہیں کیا۔ کین پستے ہی بتا کر رخصت کر دیا
کہ صاحب ملک سے باہر گئے ہیں۔ وہیں سے اگلے قدموں واپس
آنا تھا جب آپ نے مجھے لفت دی۔"

"دینا اسی کا نام ہے سجاد صاحب! میں نے مسکراتے ہوئے
کہا اور چائے کا کپ خالی کر کے تپا کر رکھ دیا "اچھا یہ تاجے"
جہاں آپ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے ہیں کیا آپ کو امید ہے
کہ وہ وہیں خوش رہے گی؟"

"مستقبل کے بارے میں میں نہیں سے تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔
خصوصاً انسان تو ایسی ناقابلِ اعتبار شخص ہے کہ اس کے بارے میں
تو کما ہی نہیں جاسکتا۔ کوئی نہیں جاسکتا کہ کس کا لاد یہ کیا
ہو جائے۔ بہر حال مجھے کافی حد تک یقین ہے کہ اگر ان لوگوں کے
ملاقات پورے ہو جائیں تو وہ لڑکی کی قدر کریں گے۔ ساتھ خود بھی
بہنی ساہ لڑکی ہے۔ وہ ان کے قریب رہے گی تو انہیں اس کی
غریبوں کا پتا چلے گا۔ دوسری بات یہ ہے جناب... کہ ساتھ کے
سامنے کوئی چرائس نہیں ہے۔ لڑکی خوش ہو "اس کے سامنے
رشتوں کی بہتات ہو تب تو سب باتیں سہی جاسکتی ہیں۔ ایک عالمی
ضرورت ہے وہ پوری تو کوئی ہے اور شادی تو کہیں بھی کی جائے
بہر حال ایک بچہ ہے۔ آپ خوشیاں بہت بھی سکتے ہیں اور ہر بھی
سکتے ہیں۔ رستہ تو لینا ہی پڑتا ہے۔"

"درست کہا آپ نے۔" میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں
ہاتھ ڈالتے ہوئے اہانت میں سر ہلا کر کہا۔

"اگر آپ شادی شدہ ہیں تو میری بات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے
ہیں۔" وہ بولا۔

"میں شادی شدہ نہیں ہوں پھر بھی آپ کی بات کو بہر حال بہتر
طور پر سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کوٹ کی
جیب سے چپک بک اور ہم نکال کر ایک چپک لکھنے لگا۔

سجاد سمجھا کہ بیٹھے بیٹھے مجھے کوئی دوسری کام یاد آیا ہے اور
میں اسی سلسلے میں چپک لکھنے لگا ہوں لیکن جب میں نے چپک نکال
کر اس کی طرف بڑھایا تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار
ہوئے "یہ کیا ہے؟"

"یہ سارا لاکہ کا چپک ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "میرا
خیال ہے لڑکے والوں کے ملاقات کے علاوہ شادی کے دیگر
اخراجات بھی پورے ہو جائیں گے۔ آپ اطمینان سے شادی کی
تاری کر دیں اور باقی تمام باتوں کو بھول جائیں۔ سب ٹھیک ہو جائے
گا۔ نصیر نواز سے اگر ملاقات ہو تو تمہارا سا بھائی ضرور بھیجیں لیکن

یہ بچکانہ طور طریقے چھوڑ دو۔" وہ جسے بھی ڈانٹ رہا تھا اس کی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ میں بہت دلبرداشتہ ہوا کہ میں تو پہلے ہی کسی کو جھاڑ پڑھ رہی تھی میرے ساتھ تو شاید اس سے بھی بدتر سلوک ہو گا۔ میں ابھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ مجھے نصیر سے ملنا چاہئے یا واپس چلے جانا چاہئے کہ اچانک گیٹ کھل گیا اور چادر لپیٹے ایک لڑکی نے باہر قدم رکھا۔ وہ لڑکی لڑکی تھی۔ نصیر نواز کے خوف اور کچھ اپنی عادت کے باعث میں نے اس کی طرف زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ تاہم ایک نظر دیکھ کر ہی اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ بہت خوب صورت اور معصوم سی تھی۔ اس وقت بہت فاصلے میں نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لئے کھلے گیٹ سے مدھنسی پڑی تھی اور مجھے وہ لال سمجھ کر نظر آیا تھا۔ بہر حال یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ میں تو کہ نصیر کے گھر وہ ایک مرتبہ ہی گیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہاں لڑکیوں اور عورتوں کی آمد و رفت رائج ہے۔ ایک کامیاب علمی معصفت کے ہاں ان کی آمد و رفت کوئی ایسا عجیب خیز بھی نہیں تھی۔ اسی لمحے نصیر نواز کی نظر مجھ پر پڑی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ ارے! انہیں بھی آج ہی مرنا تھا لڑکی نے صرف ایک لمحے میں سر تاپا میرا جاتے دیا اور ایک قہقہے بولے بغیر وہاں سے رخصت ہو گئی۔ "بھاد خاصوش ہو گیا۔"

"ہاں یہی ملاقات تھی؟" میں نے قد سے حیرت سے کہا لیکن کہ چلوئے لڑکی کے بارے میں تبصرو کچھ زیادہ کیا تھا۔
 "نہیں۔۔۔ میں بتا رہا ہوں۔۔۔ بلاشبہ وہ میرے لئے ایک عجیب ملاقات تھی۔" وہ گویا اپنے خیالات سے بے چارے ہوئے بولا "نصیر نواز طبعاً و کراً مجھے اندر لے گیا۔ اس وقت کی یہی ضرورت معمولی تھی وہ تو اس نے پوری کر دی لیکن یہ بڑا مسئلہ اپنی جگہ برقرار چلا آیا تھا۔ اس رات بھی اس سے یہی کسی حد تک متعلقہ ہوئی۔ میں نے اسے جتاوا کہ میں گناہ میں پڑ رہا ہوں کہ اس کے لئے کھینچ لیتے تھک چکا ہوں۔ تھک چکا ہوں کیوں کہ اس نے مجھے کوئی اچھا مسئلہ نہیں دیا۔ چنانچہ میں اب اس مسئلے میں کچھ نہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔ وہ میری دھمکی سے قطعاً مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے کہہ دیا کہ اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس نے تھیں تھیں بددست کر لیا ہے۔ میرا جو جی چاہے کہ آج بچوں کو اور اگر میں نے اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ بھی کیا تو وہ مجھے ٹھکس آپ کر دے گا۔ وہ فیوڈ و فیوڈ کچھ دیر بعد میں اس کے گھر سے رخصت ہوا تو پہلے سے زیادہ دلبرداشتہ اور اندر ہی اندر خوفزدہ بھی تھا۔ گھر گھر کی گلیوں میں غیم تاریکی تھی۔ میں رستے کی تلاش میں تھوڑی سی دور گیا تھا کہ عقب سے کسی کی لڑائی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لڑکی لڑکی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی میرے برابر آئی۔ چادر اب اس کے گلے میں مڑھ کر طرح لپٹی ہوئی تھی اور ذرا دور سے وہ لڑکی کے بجائے کوئی خوش سالو کا نظر آ رہی

تھی۔ وہ جھل جھل میں کما "بہر حال۔۔۔ اگر آپ اس کا نام نہیں لیتے تب تو شاید اخبار میں اس کے قتل کی خبر دیکھ کر بھی اس بارے میں جان نہ پائے کیوں کہ خبر کے ساتھ اس کی لاش کی لٹی کی تصویر بھی چھپی تھی جو اس کے زخمہ سراپا سے بہت مختلف تھی۔"

"اور۔۔۔ تو ہے جاری جاری ہی مچی۔" وہ بڑبڑایا۔ اس کے بے کی دماغی ایک لخت چمک گئی۔ بڑبڑاتا وہ تھا ہی لیکن اب بڑبڑاتا نظر آئے گا۔ چہرے پہلے اسے اپنا مسئلہ حل ہو جانے پر جو شئی حاصل ہوئی تھی شاید وہ اسے بھی بھول گیا۔ سر جھٹکے تم مسم بخار رہا۔ کسی کسی سوچ میں تھا۔
 آخر کار میں نے کہا "آپ کو اس کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہے یا کم و کثرت مجھے بتا دیجئے۔ اس لڑکی سے اپنی ہمدردی بت کرنے کا اب بھی ایک طریقہ ہے۔"

"کیسی معصوم، مجرم اور باحوصلہ نظر آتی تھی یہ مجھے۔۔۔ یہ کسی کے دل کا قہقہہ ہو گا۔۔۔ میری سادہ کی طرح! وہ خود کلائی کے سے انداز میں بولا۔ وہ ایک نیک اس تصویر کی طرف ہی دیکھے رہا تھا جو میں نے اسے دی تھی۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر برخواستے ہوئے بولا "بہت عجیب انداز میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ غالباً یہ باہر سے وہاں پہلے کی بات ہے۔ میں ایک اشد ضرورت کے تحت نصیر نواز سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر آئے سے منع کر رکھا تھا۔ میرے ہاں بھی وہ وہیں مرتبہ ہی کیا ہے۔ زیادہ تر میں اس سے فون پر ملاقات ملے کرتا تھا اور ہم کسی بھی ایسی دور افتادہ جگہ پر ملنے جتے جہاں دونوں ہی کے کسی شناسا کے ملنے کا امکان نہ ہو۔ حالانکہ میں تو مکمل طور پر اس کی مطیع میں ہی تھا۔ اس کے حکم کے خلاف کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت محتاط رہتا تھا۔ میرے ساتھ کسی بھی ایسے مقام پر دیکھے جانا پسند نہیں کرتا تھا جہاں اس کے کسی شناسا کے نظر آنے کا امکان ہو لیکن اس بار ضرورت کچھ ایسی تھی کہ میں اس سے پیشی رابطہ قائم کئے بغیر اس کی کوئی بھی پہنچ گیا۔ میں جس وقت گیٹ پر پہنچا رات کی تاریکی چھل چکی تھی۔ نصیر کے ہاں کوئی چرکہ اور فیسو نہیں ہے۔ وہ خاموش رہتا ہے۔ ایک خانہ سالوں اور پچھونے موئے کاموں کے لئے ایک نوکر رکھا ہوا ہے۔ گیٹ بند تھا لیکن آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اندر سے نصیر کسی کو بھونڈے گیٹ تک آیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس کو سخت برہی کے عالم میں ڈانٹ بھی رہا تھا۔ مجھے ابھی تک اس کے الفاظ یاد ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا "تھیں مجھ کو بتاتے بغیر یہیں نہیں آنا چاہئے تھا۔ میں نے جب ملاقات کا طریقہ مقرر کر رکھا ہے تو تھیں اس کی خلاف ورزی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آج اس طرح اطلاع دے بغیر ہرگز مت آنا۔ اپنے مسئلے کے سلسلے میں اتنا بڑبڑاؤ اور بھولکھانے کی ضرورت نہیں سب کچھ ہو جائے گا لیکن خدا کے لئے تم

حق۔

وہ بلا تہید بولی "آپ بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ نصیر نواز سے آپ کا کیا پتہ ہے؟"

میں خنزیرہ سا ہو گیا۔ میں نے کہا "کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں تو کام سے اس کے پاس آیا تھا۔"

وہ گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولی "آپ ڈری نہیں مجھے اپنے دوستوں میں ہی شاکر کریں۔ میری ذات سے آپ کو کوئی فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے، نقصان نہیں۔ میں نے آپ کی اور نصیر نواز کی کچھ باتیں سنی ہیں، کچھ نہیں سن سکا۔ تاہم اتنا ضرور اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ اسے کہاں لکھ کر دیتے رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا انکسٹل ہے اگر یہ منظر عام پر آجائے تو وہ تباہ ہو سکتا ہے اور میں اسے تباہ کرنے کے ورے ہوں۔"

میں سدا کا ہر دل اس کسین سی لڑکی کے لیے سے خنزیرہ ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور میں بے چینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے شک زدہ لہجے میں پوچھا "تم نے ہماری باتیں کس سے سن لیں؟ نصیر جب مجھے اپنے ساتھ اندر لے کر گیا تو اس نے گیت اندر سے بند کر لیا تھا اور تم بھی وہاں سے رخصت ہو گئی تھیں؟"

وہ بے پروائی سے بولی "میں آج کل اس کی فوٹو میں ہوں اس لئے کوئی موقع پا تھا سے جانے نہیں دیتی۔ میں چند لمبے بعد لوٹ کر آگئی تھی اور یقینی طور پر ہلاک کر اندر پہنچی تھی مگر بہت اچھی طرح میرا دیکھا ہوا ہے میں نے ذرا تنگ دھام کی ٹھوکی سے لگ کر آپ کی باتیں سنی تھیں۔"

نصیر کے مکان کی دیوار خاصی اونچی تھی لیکن اس لڑکی کے انداز و احوال بتاتے تھے کہ اس سے کچھ بھی بعد نہیں تھا۔ وہ دیوار میں بھی ہلچل مچاتی تھی اور شاید اونچے اونچے درختوں پر بھی چڑھ سکتی تھی۔ پھر وہ گویا میرے خیالات کی تصدیق کرتے ہوئے بولی "میں بہت ضدی لڑکی ہوں۔ جس کام کا تہیہ کرتی ہوں وہ کر کے چھوڑتی ہوں اور اب میں نے نصیر نواز کو تباہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میرا خیال ہے میں اسے ضرور اس کے گروٹوں کی سزا دے سکتی ہوں۔"

ضدی وہ جیتھ تھی۔ اس کا لہجہ گواہی دے رہا تھا۔ جتنی زیادہ وہ بات کر رہی تھی اتنی زیادہ میں اس سے خنزیرہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "تم نصیر نواز کو تباہ کرنے کے ورے کیوں ہو؟"

وہ بولی "یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی کیوں کہ آپ بھی مجھے کچھ نہیں بتا رہے۔ بہر حال مناسب وقت پر سب کچھ بتاؤں گی۔"

میں نے سنبھل کر کہا "لڑکی! تم ابھی کم عمر نواں اور نا تجربے

کچی ہو تو اس پر مبرکباد اور آنکھ کے لئے اپنی حالت کو دیکھو۔ اپنی دانت میں، میں نے اسے درست ہی خود بخود خنث خنث خنزیرہ تھا۔ اس کے ساتھ چلے ہوئے مجھے خنث ہو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ کئی ساتوں میں لوٹ نہ چاہتا تھا۔ اسی دوران مجھے ایک رکت نظر آیا اور میں ایک میں سار ہو کر اسے وہیں چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ جیسے مجھے تک اس کا خیال آتا تھا۔ کبھی میں سوچتا تھا شاید اس طرح انہوں نے ایک دوسرے کے لئے تھک کی ہے۔ مجھے اس کے کم بات تو کرنی چاہئے تھی۔ اس کے عزائم کے بارے میں اس کے ساتوں کے بارے میں کچھ تفصیل جاننے کی کو خوش کن تھا۔ خواہ میں اس کا ساتھ نہ دیتا اس کی بات نہ مانتا لیکن کم کچھ جان تو لیتا۔ مجھے اس پر شک بھی آیا۔ وہ کس، کس، کس کچھ بھی تھی لیکن کچھ جیسے جیسے وہ لاکھ روپے بھر تھی کیا اس میں بوسل ظاہر کرنے کا حوصلہ تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے ملی۔ میں نے نصیر سے اشارہ بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ کبھی نہ ہو جائے اور اس لڑکی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے لیکن اب آپ کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پہنچ چکا ہے۔ میری احتیاط کارہی تھی۔ "سجاد نصیر ایک سسکی لے کر غامض ہو گیا۔"

میں نے کئی ساتوں لیتے ہوئے کہا "میں نے جب آپ کے میں بٹھایا تو نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے آپ سے لڑکی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہو گا جہاں کہ ظاہر سے اس کا کوئی قتل نہیں آتا تھا لیکن میری اگلی سی تو نے میری درست سمت میں ہی رہنمائی کی تھی۔ اور اسے شہید اور نیت میں غلوں میں شامل ہو تو تمہیں خود بخود ہی پہنچتی ملی۔ یہ سبھی بھی تقریباً سچ ہی گئی ہے۔ اب مجھے صرف چھوٹا چھوٹا چھوٹا جزیات پر کام کرنا ہے۔ میں اب چلا ہوں۔" میں نے اس کے ہاتھ سے قصور سے کراٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے چھوڑنے کا زور تک آیا اور ایک بار پھر لمبے چوڑے الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا لیکن میں نے اسے اس موقع پر بات کرنے سے روک دیا اور اس علاقے کے بچہ فم کا قصہ بتا دیا۔ میں نے اسے روک دیا اور اس علاقے کے بچہ فم کا قصہ بتا دیا۔ میں نے اسے روک دیا اور اس علاقے کے بچہ فم کا قصہ بتا دیا۔

مگر آکر میں نے شکور لیا اور لباس تبدیل کیا۔ اس دوران تک رات نے اپنا سیاہ دامن پھیلا لیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ آ رات کا کھانا مجھے ستارہ کے ساتھ اسی کے گھر کھانا تھا۔ ہر گرام کے پتلے طے تھا پھر بھی میں نے سحر سمجھا کر فون کرنے کے بعد کھانا لیا تھا۔ گھر پر موجود بھی ہے یا نہیں۔ ان بھی ستارہ کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ دعوتی تو ستارہ کا بھی تھا کہ میرے ساتھ میں وہ بے نیازی رہتے کا سچ بھی نہیں سکتی لیکن بہر حال وہ سڑا نام کی ستارہ میں گج کا بھی ستارہ تھی اور اسے زکی سمجھتا تھا۔

میں ہی جاؤں گا۔ تم دونوں باہر ہی ایسے زادوں پر کھڑے ہو جاؤ
کوٹھی کی کسی بھی سمت سے کوئی نکل کر بھاگے تو تھوڑی دیر میں
آجائے اور پتہ لگا کر جانے پائے کوٹھی کی جائے کہ وہ زندہ ہاتھ
آجائے ورنہ گولی مار دی جائے۔

”نیک سے سراہتی ہے ہمارے لیے میں جواب دیا۔
ستارہ کی گلی میں پہنچ کر میں نے گاڑی ستارہ کے کمرے کے
دوری چوڑی اور چھٹی گلی سے پھل ہی آگے بڑھا۔ چھٹی گلی میں
نارنگی تھی۔ ستارہ کے کمرے میں پچھلی طرف بھی لان تھا اور مشین
پچاس کی پینک دو آدموں سے باہر کوٹھی ہوئی جس پر وہ غصے سے ہنسنے
تھی لیکن میرے لئے اسے پھلانگنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

دو بار ہاتھ ہمارے گھر میں نے نہایت آہستگی سے جسم کو اوپر اٹھایا
اور پہلے صرف سر دو بار کی اوٹ سے نکال کر اندر بھاگا۔ میرا
خیال تھا کہ شاید کسی طرف سے کوئی گولی سنائی ہوئی آئے گی مگر
وہاں یہ شور سکوت رہا۔ کوٹھی اندر میرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ
کوئی اچھا لگن نہیں تھا۔ یکساں تو اس احساس سے میرا دل گواہ
دھڑکتا بھول گیا کہ کہیں مجھے ناخبر تو نہیں ہوگئی؟ گھمکی نارنگی اور
سکوت میں نہ جانے کون سا میرا ہوا بھتر تھا۔

نہایت آہستگی سے کچھ اور اونچا ہو کر آخر کار میں نے دو بار
بھلا گئی اور بے توجہ طریقے سے اندر لان پر کود گیا۔ مشین
بائل اب میرے ہاتھ میں رہا ہوا تھا اور میری آنکھیں نارنگی میں
دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں مگر دیکھنے کے لئے وہاں کچھ قاضی
نہیں۔ بس وہی چیزیں تھیں جو کسی کشادہ اور خوب صورت لان پر
ظہر آتگی ہیں۔ کہیں کوئی ہاتھ؟ انہیں پھولوں بھرے پورے دو بار
کے ساتھ مشین چٹان کی پینک اور ہاتھ پر کے درختوں کی صرف ایک
جڑی۔

اپنا کمرے کان کے صحن قریب ایک پائا سا پتلا کوئی
لٹری کی چیز میری ناک کو چھوئی ہوئی گڑی اور بھر شاید وہی چیز
کچھ دور گھاس پر جاگری۔ محسوس کچھ بھی ہوا گویا وہ کسی سیال کی
تھری و حار تھی۔ دوسرے ہی لمحے گھاس پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ میں
بچنے کے بل لپٹ پکا تھان میں نے اندھا اندھ قاز نہیں کیا تھا۔
مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ حرکت کس طرف سے ہوئی
تھی؟ پائاس کا کمرے قریب پتلا تھا اور یہ سیال چیز کس طرح
ایسی تیز رفتاری سے پہنچی گئی تھی اور کیوں کر گھاس پر گرتے ہی
بھڑک اٹھی تھی۔ کسی بھی چیز کا اندازہ کئے بغیر قاز کرنے کا کوئی
قائد نہیں تھا۔

میں بچنے کے بل کر کے کے بعد بھی ایک جگہ تھا میں تھا ایک
دھیرے دھیرے ایک طرف کو ٹھک رہا تھا۔ میری ٹھہری لان کے
پچے پچے کا باجھ لے رہی تھی مگر کہیں خفیہ سی حرکت کے بھی
آواز نہیں تھی۔ بھڑکنا ہوا شعلہ، بھٹکنا ایک بالٹ اونچا تھا اور
قریب تین انچ کے ٹھہریں پیلا ہوا تھا آہم تیزی سے سنبھا جاتا تھا

کبھی کبھی ایسی صورت اختیار کر جاتی ہیں کہ وہ بڑے بڑے اہم
وجہ سے ہٹا نہیں کیا جاتے۔

میں نے فون پر اس کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف دیر تک
مٹی بجتی رہی مگر کسی نے ریسپونڈ نہ کیا۔ میں ایک طویل سانس
لے کر نہایت آخر میں اور دست ہی نکالا تھا۔ ستارہ چن کر خفا
رہتی تھی اس لئے مولا کوٹھ پر کچھ زیادہ مجھوسا نہیں کرتی تھی۔
ایک چیز یاد آ رہی ہے مجھ پر آگیا ہوا تھا۔ بالی تمام کاسوں کے لئے
”لو جیڑ مگر وہ نہیں تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دونوں
مردوں میں سے بھی کسی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ شاید وہ ٹیلی فون
سے دور کسی اپنے کام کا رخ میں مصروف تھیں۔ میں بایں ہو کر
ریسیور رکھنے کی جگہ تھا کہ اچانک دوسری طرف سے ریسپونڈ اٹھایا
گیا۔

”ہیلو۔ ستارہ! اہلی تھیں؟ میں تو اب ریسپونڈ رکھتی
ہوں۔“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ دوسری طرف سے کوئی
جواب نہ آیا۔ صرف کسی کے سانس لینے کی جگہ سی توازن ثانی دی
پھر وہ بھی صدمہ ہو گئی۔ میں نے کچھ ریسپونڈ اٹھانے والے نے
سانس دو گئی۔ پھر نہایت آہستگی سے ریسپونڈ کر دیا گیا۔

میں چہرے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریسپونڈ کر دیا۔
میری کمر پڑنے کی کسی نیم تاریک کمرے میں اندام بچا شوخ ہونے
تھا۔ میں نے کسی کو مطلع کرنے کے بکریں بھی چہرے لئے ضائع کیا
مناسب نہ سمجھا اور گاڑی نکال کر تھوڑی دور طرفان کی طرح ستارہ
کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سڑاں میں نے اطمینان
کی سانس لی تھی کہ فون اور شہر کی گاڑی اب بھی میرے پیچھے تھی۔
یہ دونوں بھی نہ مجھے والے جنگل قسم کے فوجان تھے۔ ہاتھ گئے
کے لئے یہ میری گمانی کے فرائض انجام دیتے تھے اور اس دوران
سانے کی طرح پیچھے لگے رہتے تھے اس کے بعد ہاتھ گئے کے لئے
یہ ڈسٹرو ایٹ خفیہ خان اور سڑاں علی جمیل لیتے تھے۔ اگر میں
اس دوران اطمینان سے کمرے میں سو رہا ہوا تھا تب بھی ان کی گاڑی
گھر کے قریب موجود رہتی تھی۔ جب سے میرے گھر میں مجھ پر
تاکڑ نہ ملے ہوا تھا تب سے میرے ساتھیوں نے از خود ہی یہ
انتظام کر لئے تھے اور میری ایک نہیں سی جگہ میں کس اس
کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔

فون اور شہر نے چیتا محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گڑبگ نہیں کہیں
ان کی کار بھی تیزی سے حرکت میں آئی تھی اور چھری منٹ بعد
مجھے بیڑی کا ٹھکنا سنائی دیا۔ میں نے کار کا خیر تانہ کھولا اور ایک
ہاتھ سے ٹھہرنا سانس سے ایک ٹھک۔

فون جانے پر فون کی توازن ثانی دی ”سر۔“ اس نے اور کچھ
بھی نہیں کہا۔ سوال اس کے لئے نہیں تھا۔
”فون! ستارہ کی کوٹھی پر کوئی گڑبگ۔“ میں نے آواز بھگ
ہاتھ مرکز رکھتے ہوئے جی ٹھکان پر کون لہجے میں کہا ”اندرو

دوست قدر محض یا تو صحیح سلامت نکل گیا تھا یا پھر ٹوٹی اور شہید
 سے کہنے اسے قہر کر لیا تھا۔

میں چاندل ہاتھ بیروں کے بل چل ہوا مگر کے دووازے پر
 پہنچا۔ دووازہ کھلا ہی تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے اندر دیکھا
 شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی باہر گھاس کے قطعے پر روشنی
 ایک مستقبل پھیلنے لگا۔ مگر کے اندر روشنی تھی جو دووازہ کھلنے
 کے ساتھ ساتھ باہر آتی تھی مگر یہ روشنی بہت کم تھی۔

دووازہ کالی کسل چکات بھی اندر سے کوئی مدد مل
 ہوا۔ آخر کار میں نے سر پیچا دیکھا ہوا تھا۔ گنگ
 ایک چوہا روشنی تھا اور گیس کا شعلہ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔
 اس کی وجہ سے کشادہ مگن میں قہوڑی سی روشنی تھی ورنہ وہاں
 لائٹ تو آف ہی تھی۔

ستارہ کی موتی سی سانولی ملازمہ آڑی ترمیمی فرش پر پڑی تھی۔
 چوہا چلانے کا انداز اس کے ہاتھ میں تھا وہاں ہوا تھا۔ باہر سے ہی
 اسے دیکھ کر مجھے کم از کم اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ زندہ تھی۔ اس
 کے ہماری بھرم سراپا کامیاب سے پھولنا چکنا چتا رہا تھا کہ سانسوں
 کی آمد و رفت جاری تھی۔ شاید اس وقت اس نے چوہا روشنی کیا
 ہی تھا کہ جب اسے بے ہوش کھڑا کیا۔

مگر میں اور کوئی نہیں تھا۔ اندر پہنچ کر سرسری طور پر دیکھنے
 سے ہی مجھے ملازمہ کی کھوڑی چوہا سا کوڑا نظر آیا۔ مگر سے ہی
 غالباً اسٹیل کا ایک ڈنکا اٹھا کر اس کے سر پر دھک کیا گیا تھا۔ چینی
 کے دو تین برتن بھی قریب ہی ٹوٹنے پڑے تھے روشنی کے لئے لگا
 ہوا گھوب بھی بلب سمیت ٹوٹا ہوا تھا۔ ایسا لگا تھا کہ مگر میں کسی
 نے قہوڑی سی انچل کو دھچکا کی تھی۔

میں ملازمہ کو دیکھ کر اس کی طرح کھڑا انداز میں لاؤنج میں
 پہنچا۔ وہاں بھی تاریکی اور سکوت نے میرا استقبال کیا۔ لگتا ہی تھا
 کہ جن لوگوں نے بھی یہاں آکر کاروبار کیا کی تھی ان میں سے اب
 کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لاؤنج سے گزر کر میں ستارہ کے بندہ
 کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دووازے کے قریب ہی پڑی مل گئی۔ وہ بھی
 بے ہوش تھی۔ اس کی کپڑی پر وار کیا گیا تھا۔ ضرب زیادہ خطرناک
 نہیں تھی۔

میں نے اطمینان کی سانس لی اور اسے اٹھا کر بیڈ پر ڈالا۔ اس
 وقت تک وہ خود بھی کھسکے ہوئے تھی۔ میں نے لائٹ جلائی اور
 فریج سے پانی لاکر اس کے منہ پر چھینے مارے۔ ہلکی سی کراہ کے
 ساتھ وہ جلد ہی ہوش میں آگئی۔

میری صورت دیکھتے ہی اس نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا
 اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہی "خدا کا شکر ہے تم آئے ہو!"
 پھر اس نے خوف زدہ سی نظروں سے اوپر اُڑھ کر دیکھا اور تھوک
 نکل کر کہی "وہ کہاں ہے؟ کیا وہ چلا گیا؟"
 "کون؟" میں نے اس کا سر ہلاتے ہوئے قہل سے پوچھا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ معدوم ہو گیا۔ فضا میں گھاس جلنے کی معمول
 کی بو بانی رہ گئی۔

میں کھینچے کھینچے ایک بازو کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بازو مگر
 کے قہقہے دووازے کے سامنے تھی۔ ایک بار پھر کوئی چیز سنائی
 ہوئی میرے سامنے سے گزری۔ مگر میرے چہرے کی سیدھ میں کچھ
 فاصلے پر چڑھا سا پناہ اور گھاس پر شعلہ بڑا لگا تھا۔ یہ چیز جو کچھ بھی
 تھی یا قاعدہ قاز کی جالی تھی۔ تاہم اس بار مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا
 کہ یہ چیز کس طرف سے آئی تھی۔ کوئی باہر کے درخت پر چھپا ہوا
 تھا اور یہ میرے لئے مزید حیرت کی بات تھی کیوں کہ باہر کے
 درخت کی شاخیں ایسی نہیں ہوتیں کہ کوئی انسان ان پر پناہ لے
 سکے اور نہ ہی وہ اتنا گھنا ہوا ہے کہ صحیح طور پر کسی کو چھپا سکے۔

میں نے سائینسٹر کے مضمین پڑھنے سے باز کیا۔ درخت میں
 پھر پڑا ہٹ سی ہوئی۔ پھر تاریکی میں عجیب سی ہنسی ابھری۔ کانی مد
 تک یہ غیر انسانی ہی ہنسی تھی۔ اس میں ہندو کی خلیا ہٹ سی شامل
 تھی مگر کچھ اثر ایسا بھی تھا گویا کوئی نیم خونئی اور اذیت پرست
 انسان کسی کو تکلیف میں دیکھ کر محفوظ ہوا ہو۔ اس تاریکی اور
 سکوت میں اس ہنسی نے مجھ جیسے فوادی اعصاب کے مالک کو بھی
 ایک بار بھر جھری سی لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے بازو کی طرف مزید قہوڑا سا کھسک کر درخت کی
 شاخوں پر غار کیا۔ اس بار بہت سے پتوں کے ٹکڑے بھڑکے اور
 ساتھ ہی کسی نے درخت سے ہار دو ٹوک پر چلا ٹھک لگائی۔ گلچے
 اندر میرے میں اس کا صرف پھولا نظر آیا اور وہ بے حد عجیب مسموم
 ہوا۔ شاید وہ عجیب سی جسمانی ساخت کا کوئی بھول اور بہت قدر
 انسان تھا۔ وہ غالباً بھدی پر درخت کے ستنے سے ہی پھیلنے لپٹا
 ہوا تھا۔ اس کے چھلانگ لگانے کا انداز بندوں کا سا ہی تھا اور پھر
 بندوں سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ میں نے ہوا میں اس کا پھولا
 نمودار ہونے ہی نماز کیا تھا کہ وہ نہ صرف اس سے بچ گیا تھا بلکہ
 دیوار پر پہنچتے ہی میرے ہاتھوں سے بلا تاخیر ٹکلی ہوئی ایک اور گولی
 سے بھی بچ کر باہر کود گیا۔ ایک بار پھر وہ کدو سی ہنسی ابھری لیکن
 فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

میں فوری طور پر اس کے خائبہ میں لان عبور کر کے اور دیوار
 چھان کر نہیں جاسکتا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ابھی کسی تاریک
 گوشے میں اس کے کتنے ساتھی چھپے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ اس
 کی پھرئی کا لمبائی مظاہرہ دیکھنے کے بعد مجھے اندیشہ بھی تھا کہ میرے
 باہر پہنچتے تک وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ بس ایک سوہم سی
 امید تھی کہ شاید ٹوٹی یا شہر میں سے کوئی اسے پکڑنے میں کامیاب
 ہو گیا ہو۔ ان کے پاس گھنٹی بھر سائینسٹر کی تھیں۔ ان گھنٹیوں پر
 سائینسٹ کھسکے سے گرنے کے جام ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ تاہم
 ان کی ساخت ہی ایسی تھی کہ قاز کی آواز بہت کم ہوتی تھی مگر میں
 نے قاز کی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ

پر ذرا سادہ ذال کر دیکھا اور کراہ کر مٹی "میرا خیال ہے اس اجانک افتاد نے مجھے خوف زدہ زیادہ کر دیا تھا۔ دیکھ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟ وہ پیٹری خود تو ظاہر ہے نہیں کیا ہو گا۔؟ وہ گن بھی عجیب تھی۔ اس نے اس سے لالچ میں فاس کیا تو ایک پانچا سچا اور لالچ کے فرش پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ شکر ہے اس نے کمرے میں فاس نہیں کیا ورنہ قاتلین ملک پکڑ سکتا تھا اور یوں سارے گھر میں آگ لگ سکتی تھی۔ آخر۔ آخر اس کا تشدد کیا تھا؟"

"اس قسم کے بیسیوں سوالات تو اس وقت میرے ذہن میں بھی پکڑا رہے ہیں لیکن کسی کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "نی ٹالال تم آرام سے لیو۔ میں ذرا بے چاری ملازماں اور جو کچھ ارکی بھی خبر لے لوں۔"

میں نے پوری کو مٹی کی بتیاں روشن کیں۔ وہ سری ملازمہ مجھے لان پر ہی پڑی لی گئی۔ وہ شاید اگلی سے سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے آئی تھی۔ چونکہ ارکیت کے قریب ہی اندر کی طرف دوش پر پڑا تھا۔ دوش میں آئے پر اس نے بتایا کہ وہ آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھا چوکی انارک ہاؤس میں کھینچ کر رہا تھا کہ وہم سے کوئی دوشی چیز اس کے سر آکر لگی۔ ساتھ ہی کسی جانور کی خوشامی سی خالی دی اور وہ کرسی سے لڑھک کر بے ہوش ہو گیا۔ وہ دوشی ہی چیز ایک گلابا جو قریب ہی دوش پر گر کر ٹوٹ چکا تھا۔ چونکہ ارکیت کو بھی افسوس ہوئے جارہا تھا کہ اس نے پکڑی کیوں اتاری۔ سرے ویز پکڑی ہوئی تو وہ اچھی خاصی چوٹ سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ بزرگوں کی اس حکمت بھری نصیحت کو یاد کر کے سر دھن رہا تھا کہ مجھے سر نہیں رہنا چاہئے۔ شیطان ضرور دیکھ نہ بکھ مار رہا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "خان صاحب! اب آپ پکڑی ہاتھ سے ہیں تو پھر آپ کو بال سنوارنے اور ان میں کھینچ پٹی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بال کون سا کسی کو نظر آتے تھے؟" خان صاحب اپنی چوٹ سلا کر قدم سے شہا کر لے "پکڑی اپنی جگہ اے صاحب! بالوں میں کھینچ اپنی جگہ اے۔ کھینچ مٹکی کر کے ذرا ہل پھوڑی ہو جانا اے۔ اور کوئی امارے بالوں کو نہیں دیکھا۔ مگر خود تو شیشے میں دیکھا اے۔ اور ام سمجھتا اے کہ نور جان ام کو دیکھتی اے۔"

"یہ نور جان کون ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "وہ امارا گھر والی ہے اور بڑوں میں اے۔ جب نیک صاحب اجازت دے گا تو ام نور جان کو بھی اور بلا لے گا۔" خان صاحب کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ میں نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت دوا دوا کر کے بعد انہیں ان کی جگہوں پر بھیج دیا۔ قیمت تھا کہ کسی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ کوئی فریج پر دیکھو نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو ڈنم آیا تھا۔

حالات معلوم ہر آپ کے تو ساتھ ہوئی "میں سمجھتی ہوں کہ یہ

"وہ بندہ۔۔۔ وہ جیمس کا چہینری۔ اف خدایا! کیا بے باک اور کھود صورت تھا۔" اس نے جھرمجی سی لی اور مجھے اپنے کچھ اور زیادہ قریب کر لیا۔

میں کمری سانس لے کر رہ گیا۔ تو وہ بولا اسی لئے مجھے کچھ غیر انسانی محسوس ہوا تھا کہ وہ حقیقت وہ انسان تھا ہی نہیں۔

ستانہ کمزوری آواز میں بولی "میں نے زندگی میں خاصے جانور دیکھے ہیں اور خاصا طویل عرصہ جنگوں میں بھی گزارا ہے۔ شری زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی بہت سے جانوروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اب جب سے "جنگل کرل" سائن کی ہے تب سے بھی بہت سے جانوروں سے واسطہ پڑا ہے۔ بعض جانور چہینری سے بھی زیادہ بد شکل ہوتے ہیں لیکن کسی کی آنکھوں میں اور صورت پر آج تک میں نے خیانت اور شیطانت کی یہ انتہا نہیں دیکھی جو اس شخص میں دیکھی۔ میرا خیال ہے وہ گھر میں داخل تو چھل طرف سے ہوا تھا لیکن دونوں ملازماؤں کے علاوہ شاید گیت پر جا کر چونکہ ارکیت کی طرح بے ہوش کر دیا تھا۔ کیوں کہ میں ان تینوں کو بھارتی رہی گھر کسی کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس کمرے کے دروازے پر پہنچتا تھا وہ عجیب و غریب انداز میں اچھلنے کودنے لگا۔ وہ انسانوں کی طرح نچھلنے لگنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی توازن کمرے کے کمرے ہو رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں عجیب سی گن تھی اور دوسرے ہاتھ میں۔ اب میں نہیں کیا بتاؤں۔ بہت شرمناک حرکتیں کر رہا تھا وہ۔" ایک بے باک عورت ہونے کے باوجود ساتھ لے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔

میں نے اس کی کھینچ کی چوٹ سلاتے ہوئے کہا "وہ بس یکدم۔ اچانک تھارے سامنے آ گیا تھا؟"

"مجھے گھر میں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ پھر کچن کی طرف سے پھرنا کا خالی دیا۔ میں کبھی شاید ملازمہ سے کوئی برتن توڑ دیا ہے۔ میں تھارے انتظار میں تھا کہ وہ ڈورنگ ٹیبل کے سامنے جھکی تھی۔ ابھی میں یہ دیکھنے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ کیا پکڑ ہے؟ اچانک وہ چلا گیا کہ وہ دروازے پر گیا۔" ایک لمحے کے لئے وہ پھر خاموش ہو گئی۔ اس کے دلکش چہرے پر سرخی کمری ہو گئی "مجھے تو اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ وہ مجھ پر دوشی حملہ نہ کر دے جسے اخباری زبان میں بھارتیہ حملہ کہا جاتا ہے۔ مگر پھر اچانک ہی اس نے حیرت انگیز پرتی سے اچھل کر اپنی اس عجیب سی گن کا دست میری کھینچ پر رسید کر دیا۔ میں پکڑا کر گر پڑی۔ آخری منظر میں سے میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ قاتلانہ انداز میں اچھلتا ہوا کمرے سے رخصت ہوا تھا۔ اس کے جسم میں گویا جلیں بھری ہوئی تھیں۔"

"تم اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟" میں نے ساتھ کو آرام سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہوں۔ بس اس جگہ خاصا درد ہے۔" اس نے کھینچی

کام کو حلقہ سمجھ لیتے ہو۔ خصوصاً وہ مشن کے بارے میں بہت جذباتی ہو جاتے ہو۔ اب مثلاً آج اگر تمہاری اس علمی حبیبت سناہ کوئی کچھ ہو جاتا تو اسے تم اپنا مسئلہ سمجھ لیتے۔ حلال کہ تم نے کوئی سناہ کی صلاحتی کا ٹیکا تو نہیں لے رکھا۔
 "لے رکھا ہے نا" میں نے پہلے سے بھی زیادہ عجیبگی سے کہا۔ "اس کے بارے میں کوئی خیال بھی دل میں مت لانا۔ ورنہ تمہارا اور تمہاری عظیم کا انجام جبریت ناک ہو گا۔ ظاہر ہے تم لوگ ساری عمر تو مجھ سے پیچھے نہیں رہ سکو گے۔"

نہ جیتے ہیں کہ ہمیں ہم لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ خیر۔
 "اب باتوں کو یہ بتاؤ ہمارا بلک بڑھتا ہے کیا؟"
 "بلک بڑھتا ہے۔" میں نے سمجھ کر ہلکا ہلکا بلک بڑھتے ہوئے ان کی مراد کو سمجھ لیا۔ لیکن یہ بھی صدقہ کے لئے ذرا انہماک میں تھا۔
 "ہمارے پیچیزنی۔" وہ مسور سے لہجے میں بولا۔ "ایک ماہر نبات کی کئی سال کی محنت کا شاہکار ہے۔ وہ دیکھو تو انھیں پتہ کر تپہ کھانے کا تار ہے گا۔"

میں ایک گہری سانس لے کر وہ کیا "مجھے پہلے ہی شبہ سا دس ہو رہا تھا کہ یہ بے گئی حرکت تم لوگوں کی نہ ہو۔ اگر تمہارا تجربہ کی قوت کا شاہکار ایک تودہ مٹ اور میں فہم کیا ہوتا تو اس سرف فرم ہی تم کو پہچانتا۔ پتہ تک صائب ہو چکی ہوگی۔"
 "خوش تھی ہے تمہاری۔" اس نے تھک لگایا۔ اس کا قصہ ی کو بچھا لیا تھا جیسے کوئی خالے میں فہم ہو رہا ہو۔ وہ تو گہری کی زور بھی نہیں آتا۔ بڑے کام کی جڑ ہے۔

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم لوگوں کا جو قوی ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا اس کی صورت شکل اور شخصیت بھی ہمارے بہت ملتی جلتی تھی۔ تم لوگوں کی عظیم کسب وکار پر ہی تو مشتمل نہیں ہے۔"
 "اس اعتبار سے بھی ہم تمہارے آباؤ اجداد ہوتے۔" وہ آج بہت خوشگوار سوز میں معلوم ہوتا تھا۔

"ہم لوگ ڈاؤن کی جھڑکی کو نہیں لہنتے ہمارا نظریہ بات دو سرا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم چاہو تو خوشی سے اسے اپنا برا بھلا قرار دیتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
 "وہ چار ملاقاتوں کے بعد تم بھی اسے اپنا برا بھلا مان لو گے۔" وہ بولا۔

"یہ تو ملاقات کے بعد ہی پتہ چلے گا۔" میں نے بے زاری سے کہا۔ "لیکن یہ تو یاد رکھو آخر ان حرکتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"
 "ہمیں صرف یہ بتانا کہ تم اور تمہاری عزیز ترین بہنیاں کس حد تک ہماری دوسری میں رہتی ہیں اور ہمیں تمہارے معمولات کا کس حد تک علم رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں جیسے جیسے غور بھگ گیا۔

"چلو مان لیا کہ تم مجھ پر یہ سب کچھ جتانے میں کامیاب دینگے اس کے بعد۔" میں نے لالچ سے کہا۔ "کیا کیا ہو گا نہیں اس سے؟"

"ہمیں اوقات پر رکھنے میں مدد ملے گی۔ ورنہ ہمیں معلوم ہے تم ضرور ہمارے کچھ کاموں میں ناگہاں آؤ گے۔" وہ بولا۔

"سچی باتیں اتنی فارغ نہیں ہیں کہ میں انہیں غیر حلقہ کاموں میں آنا ناچھو۔ میں ایک مصروف آدمی ہوں اس لئے ظاہر ہے میری ناگہم بھی مصروف ہی رہتی ہیں۔" میں نے عجیبگی سے کہا۔

"ات تمہارے موڑ کی ہے۔ تم جب چاہو کسی بھی غیر حلقہ

"اس خیال کو تو دل سے نکال دو کہ تمہارے ہاتھ عظیم کی پہنچ سکتے ہیں۔ یا اگر ہاتھ پہنچ بھی جائیں تو تم عظیم کا کچھ بگاڑ سکتے ہو۔" وہ تھک لگا کر بولا۔ "ہی کے سلسلے میں تم نے اب تک کیا کر لیا؟ لے دے کہ ایک وہ بے چارہ لے ایس آئی شریف سیال ہے۔ اسے یاد دہانی کے فون کرتے رہتے ہو۔ ایک معمولی اے ایس آئی بے چارہ ہمارے محلات میں کیا کرے گا۔ اسے تو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔"

"تو پھر آئی بی صاحب سے کہہ دوں؟" میں نے کہا۔ "اگر تم محض عہدے کی وجہ سے اے ایس آئی کو حقیر سمجھ رہے ہو تو کوئی بات نہیں۔ آئی بی صاحب سے بھی تمہاری بہت مدد تھی ہے۔" وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے لیکن اتنا مصمم بننے کی کوشش نہ کر رہا تھا۔ "تم میرا مطلب بخوبی سمجھ رہے ہو۔ یعنی یہ کہ ہم لوگوں کے محلات میں پولیس بے چارہ کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ ان کی ذہنیت ان کا طریقہ کار سب کچھ سوز و گداز سے سہل ہوتا ہے۔"

"چلو پھر میں کسی مازنات ایجنسی کی خدمات حاصل کر لیتا ہوں۔ مثلاً اسکاٹ لینڈ یا رڈ۔ سی آئی اے۔ کے جی بی ڈی وغیرہ۔ میں کوشش کروں گا تو امید ہے ان میں بھی کہیں نہ کہیں تعلق داخل ہا رہی ہو جس کی شکل ہی آئے گی۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔
 "نی انکال تو ہمیں مذاق سوچ رہا ہے نا۔ لیکن جلد ہی تم عجیبگی سے ان خطوط پر سوچنے پر مجبور ہو جاؤ گے اور افسوس کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہوگی۔" وہ گویا میری حالت پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو بار۔! میں بہت عجیبگی سے کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہاری عظیم اتنی ہی طاقتور ہے اتنے دساکل ہیں تم لوگوں کے پاس۔ تو پھر یہی فون پر اس قسم کی مکالمے بازی میں وقت ضائع کرتے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کچھ موانعت ہو تو سواوا۔ او۔ علی الاطلاق مقابلہ حضور ہے تو پہنچ دے کہ سامنے آجاک فرمیک جو بھی کرنا ہے خدا کے لئے کر کر دو۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ کل ہوتا ہے والا آدمی نہیں ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ کل ہوتا ہے وہ آج ہی ہو جائے۔ اندھیروں میں ناک تو نہیں مارنا مجھے پسند نہیں۔ کب تک تم لوگ پرانی فون پر دھمکیاں دیتے رہو گے؟ یہی جی باتیں کرتے رہو گے؟" میرے لہجے میں تندی آئی۔

اجی حسین عمارت لیے کا ڈھیر بن جائے اور کوئی بھروسہ
تقریباً انتشار پر آئے ہوئے بیکوں صمان بھی اسی لیے
ہو جائیں۔ کسی کیسی حسین اہم اور مصروف شخصیات شامل
کی مصانوں میں۔ حسین تو معلوم ہی ہے جو لوگ کا دوبار کی
کوئی مقام رکھتے ہیں وہ شخصوں کے تحمل نہیں ہو سکتے۔
ہم جیسے لوگوں سے۔

میرے جسم میں ایک خفیف سی سرور دوڑ گئی۔ اس میں
فلک نہیں تھا کہ وہ لوگ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے
اگر وہ لوگ کراچی میں میرے کا دوبار و فروغ کے بارے میں بہت
جانتے تھے تو کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ کی
چیتوں سے بھی واقف رہے ہوں۔ گو کہ ہم لوگ ایک عرصہ
غلام زہر زین دھندے ترک کر چکے تھے اور ہمارے تمام کار
اب کسی نہ کسی طرح جائز کاروباروں کی مدد میں آچکے تھے
قانونی طور پر کسی قسم کا کوئی خلاف واقع نہیں تھا۔

میرے تمام ساتھی مقرر عام پر ہی رہتے تھے لیکن اس
باجوہ اپنی اپنی جگہ ان کی ایک خیر حیثیت بھی تھی۔ جن
محالات میں ایس جلد شہوانی یا انصاف لئے کی توقع نہیں
تھی انہیں ہم خود ہی نشانے تھے۔ کبھی کبھار کسی ذریعہ
مزاحمت بھی تصور ہوا تھا۔ کسی سے کوئی حساب بھی چکا ہوا تھا
ظاہر ہے یہ سب کام خیر انداز میں انجام دے جاتے تھے۔ ان
بارے میں کسی کا آگاہ ہو جانا ہمارے لئے الجھن کا باعث ہو
تھا۔ خصوصاً ایسے لوگوں کا آگاہ ہونا تو بہت برا تھا جو خود
ظہور سے اور جمل تھے۔ ہوش کے بارے میں اس شخص کی
میرے لئے کچھ نہ کچھ قبولیت کا باعث تھی۔ اس ہوش پر یہ
کہ وہ دہریہ لگ چکا تھا۔ وہ بے سے قطع نظر یہ کچھ زیادہ توجہ
تھا کہ اگر میں افتتاح کے دن فشر کی بلکہ ملک بھر کی کچھ
شعبہ تیس کسی ماہی کا شکار ہو جائی اور میں خود کسی طرح
ماہی سے بچ جاتا تو کراچی یا لاہور میں منہ دکھانے کے قابل
رہتا۔

تاہم میں نے پُر سکون لیے میں کہا "اس قسم کے حالات
میں نہ لانا۔ ورنہ یہ سرزمین ہمارے لئے جہنم بن جائے گی۔ آ
نقش جب تک پھتا نہیں بہت بے ضرر نظر آتا ہے۔ میرے
ضرر نظر آنے سے دعا کا مت کھاؤ۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بڑے مطمئن و مسرور لہجے میں
"خالی گیدڑ بیکوں سے کیا ہوا ہے۔ تم بھی میں ہوں، ہم بھی
ہیں۔ وقت ہمارے کا کسی کی کیا حیثیت ہے۔ خدا حافظ۔" اس
اچانک ہی سلسلہ متعلق کر دیا۔ میں چند لمبے ریپر کو گھور آرا
کارا سے کھینچ کر رکھ دیا۔

اسی لمحے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ یہی اس منظر
دوران ساتھ ہال میں چلی گئی تھی۔ دراصل اس شخص سے

"دوسری پری جان!" وہ نہایت ملامت اور رسام سے بولہ
"میں بھی تو تم دیکھنا کیا کچھ ہوگا۔ تمہارے ارمان بھی پورے ہوں
گے۔ اتنی جلدی کسی بات کی ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا اس سے تم
جیسے لوگ بھی پناہ مانگنے لگیں گے لیکن تمہارے ساتھ ہمارا رویہ
ایک ہی دستور اس لئے ہے کہ تم جیسے لوگوں کے ہم قدر دان
ہیں۔ کیا معلوم کہ تم ہماری مشینری کا بڑھ چنے پر آگاہ ہو جاؤ۔ ہم
جو ہری ہیں۔ میرے کو بہت دور سے دیکھ لیتے ہیں۔ تم پر ہماری
صورتیں بے سبب نہیں ہیں۔"

"ایک مہربانی مجھ پر اور کرو۔" میں نے التجائیہ سے لہجے میں
کہا "کبھی آکر اپنی محسوس صورت دکھا جاؤ۔ چیتا بندر سے مشابہ
ہوگی۔ میں صرف اپنے اندازے کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"
"چیتے رہو یا رہے!" وہ بدستور غرور لہجے میں بولا "فی
الحال جیسے ہماری طرف سے چیتے کا لائنس لا ہوا ہے۔"
"لائسنس کی تجدید کی فیس بتا دو۔ میں باقاعدگی سے جمع کرانا
رہوں گا کہ لائنس منسوخ نہ ہونے پائے۔" میں نے کہا۔
"فیس صرف یہی ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔" وہ ملامت
سے بولا۔

"ہنی کی بازوئی کو بھی میں اپنا ہی کام سمجھتا ہوں۔" میں نے
کہا۔
"تمہاری کیا سوچ تو بھلا ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ فشر میں اور
بھی اس سے کہیں زیادہ حسین فزیکس موجود ہیں جو تمہارے
انتقادات کی فشر بھی رہتی ہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔
"بات حسن کی نہیں مطلقاً خاطر کی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔
"کم از کم ستارہ کے پاس بیٹھ کر تو ایسی باتیں مت کرو۔ بے
ہماری کا دل ٹوٹ جائے گا۔" اس کے لہجے میں پھر شرعی جھلک
آئی۔

"اچھا صرف یہ بتاؤ۔ تم لوگ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک تو
نہیں کر رہے؟" سے کوئی ذہنی یا جسمانی اذیت تو نہیں پہنچا رہے؟
"نہیں۔ اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ان اقدامات کی
ضرورت پڑے۔ اب تو مطمئن ہو؟"

مجھے اس کے لہجے میں صداقت کی جھلک محسوس ہوئی اور دل
کو قدرے اطمینان ہوا ورنہ میں اس لڑکی کی طرف سے بہت فکر
مند تھا۔

میں ایک لمحے خاموش رہا تو دوبارہ "میں نے تم سے جو باتیں کی
ہیں وہ محض کپ شپ یا وقت گزاری نہیں تھیں۔ ان میں
خود غرض کے بہت سے پہلو ہیں اور میرا مشورہ ہے کہ خود غرض
خود گرفت اور ہاں۔ کراچی میں تمہارا جو قایم اشارہ ہوئی تقریباً
مکمل ہو چکا ہے بہت خوب صورت ہے۔ یونہی باتوں باتوں میں یاد
آگیا تو سوچا کہ ہمارا کادوے دلوں۔ دیکھنے خیال رکھنا کوئی ایسی
حکمت نہ کہ نہ کہ میں افتتاح کے دن ہوش و ذہن میں ہو جائے۔

تفصیلی میٹنگ کرنی چاہئے اور اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل طے کر کے انہیں ضروری ہدایات دینی چاہئیں۔ اس معاملے میں اب ہوشیار ہو جانا ہی بہتر تھا۔

"میں پہلی بار تمہیں کچھ فکر مند سا دیکھ رہی ہوں۔ کیا یہ بہت خطرناک لوگ ہیں؟" ستارہ نے ساوکی سے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اصل میں میرے معاملے میں کئی سہولتوں سے کئی مختلف طرح کے لوگ مصروف عمل ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذرا کچھ مرے کے لئے کاروبار سے توجہ کم کر کے ان سب کا ہی بندوبست کروں تاکہ سکون سے زندگی کے کچھ انجوائے کر سکوں۔ ہر جگہ ہی کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی قسم کی غیغ اڑانے آ جاتا ہے۔ مثلاً آج ہی کی بات لے لو۔ دہن بھر گئی کہ کسی قسم کا دورہ سری لانکا رہا۔ سوچا تھا شام کو بالکل ہکا بھکا ذہن لے کر تھما رہے ہوں آجائوں گا اور اس آستان میں محبت سے گدگداتی یادوں کے کچھ خوش رنگ پھول واسن میں سمیٹ کر لے جاؤں گا مگر افسوس! یہاں بھی رنگ میں بیگ۔"

میں ایک لمبائی سانس لے کر رہ گیا۔
"رنگ میں تو جتنی بیگ پڑی تھی پڑھ لیں۔" ستارہ مسکراتے ہوئے بولی "باغیاں تو تم پر اب بھی مہیاں ہے گدگداتی یادوں کے خوش رنگ پھول جن کر لے جانے سے تمہیں کس نے روکا ہے؟"
"مجھے باغیاں کی طبیعت کے بارے میں تشویش ہے۔ کیا باغیاں اب واقعی بالکل ٹھیک ہے؟" میں نے اس کا سر تاپا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنوارنے کے لئے رنگ و بو کے استخراج سے جو حشر آرائی کی تھی اس کے نعوش کچھ زیادہ نہیں بگڑے تھے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں مظلوم ہی ہے میں کسی نہ کسی حد تک تو سخت جان ہوں۔" وہ دل آویزی سے مسکرائی۔ تکلیف دہ لے اس کی آنکھوں سے اپنی بانگواریاں لے کر رخصت ہو چکے تھے اور اب ان آنکھوں میں جھڑوں کے جتنو جھللا رہے تھے۔
"باغیاں کو چاہئے کہ پہلے اس بھوکے کو کھانا کھلانے کا بندوبست کرے۔ بھوکے پیٹ تو پھول کلیوں کی باقیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پیچھے ہٹے ہوئے گراہ کر کہا۔
"بھئی بھئی تو تم بہت ہی فیروز دانی آدمی بن جاتے ہو۔ جذبات پر برائی تو درہم انداز مل دیتے ہو۔" ستارہ تو بھر کر بولی پھر اس نے ملازمہ کو بلا کر کھانا لگانے کی ہدایت کی۔
"دوسری ساج میں اس کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو وہ عجیب سے لمبے میں بولی "انی! ایک فرمائش کروں پوری کرو گے؟"

"کوئی میرا نظر اٹھایا ہے جو تمہاری قوتِ غریب سے باہر ہے؟" میں نے موزے پہنتے ہوئے پوچھا۔
"تمہیں مظلوم بے مدد ہے۔ میرے جواہر اور اس قسم کی دوسری چیزیں اب میری کمزریاں نہیں رہیں۔"

نورجی ہوتے ہی میں نے ستارہ کو ایک چٹ لکھ کر دی تھی۔ اس پر اس نے ایک فون نمبر کے ساتھ لکھا تھا "اس نمبر پر ملی فون ایکسیس لیں۔ فون نمبر ایک شخص موجود ہوگا۔ اسے اپنا فون نمبر بتا کر کوئی کوئی فون اس نمبر پر بات کر رہا ہے۔ فوری طور پر معلوم کیا جائے کہ وہ کس نمبر سے بات کر رہا ہے۔ یہ پیغام اسے میری طرف سے دینا۔ وہ فوراً جواب دے گا۔"

ستارہ کے ہاں دو سرائون موجود تھا جو ہال میں رکھا تھا۔ ستارہ میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے اس فون پر چلی گئی تھی۔ میں نے اس دوران اسی لئے اس نامعلوم شخص سے فون پر اپنی گفتگو کو حتی الامکان طویل دیا تھا۔ چٹ لکھتے وقت بھی میں نے اس سے بات جاری رکھی تھی۔

ستارہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دی چٹ تھی جو میں نے دی تھی۔ چرسے پر مایوسی تھی۔
"کیا حفیظ نہیں ملا؟" میں نے پوچھا۔

"حفیظ تو مل گیا تھا لیکن بات کرنے والے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔" ستارہ بولی "حفیظ نے بہت اچھی طرح چیک کیا اور وہ خود بھی یہ جان کر حیرت زدہ بلکہ کسی حد تک دہشت زدہ ہو گیا کہ وہ کال ایکسیس کے تصور نہیں آ رہی تھی۔"
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ستارہ؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہی یہ تمہارا حفیظ کہہ رہا تھا اور یہ کیسے ممکن ہے یہ خود اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اب یا تو تمہارا حفیظ جھوٹ بول رہا تھا، یا میں غلط رہا تھا۔ یا پھر حقیقتاً کوئی چکر تھا۔"

"حفیظ میرے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بھروسے کا تو یہی ہے۔" میں نے کہا۔ امید کی جو مہم وہی کرنا میرے ذہن میں ابھی تھی وہ بھی معدوم ہو گئی۔ وہ آج سے کئی سال پہلے کا زمانہ تھا۔ جاپان الیکٹرانکس کی دنیا میں اس وقت بھی بہت آگے تھا مگر پھر بھی ترقی کی رفتار وہی انقلابی نہیں تھی جیسی آج ہے۔ آج تو روزانہ ایک نئی دھماکا خیز ایجاد مارکیٹ میں آتی ہے اور کم سے کم وقت میں ہمارے ملک تک بھی اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت یہ عالم نہیں تھا۔ ترقی کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ میرے لئے بھی یہ بات خاصی حیرت کا باعث تھی کہ ایکسیس کے توسط سے بھریا قاعدہ گمنامی بننے کے بعد ایک ملی فون سیٹ پر کال دیکر ہوئی تھی۔

میں نے ابھی تک ریڈ واٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب مجھے کچھ بھی یقین ہونے لگا تھا کہ یہ کوئی خاصی مضبوط تنظیم تھی اور اس کے مقاصد بھی یقیناً چھوٹے موٹے نہیں تھے۔ میں نیچو کی سے سوچنے پر مجبور ہو چلا تھا کہ جلد از جلد مجھے کراچی اور لاہور میں پہلے ہونے والے تمام ساتھیوں کو بلا کر ایک خفیہ اور

"تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔" میں نے کہا "اب اصل بات ماناؤ۔"

"آج دو سہم لوگ جنگل گراہی شوٹنگ کے سلسلے میں رائے دینا روڈ کے راستے ایک جنگل میں جا رہے تھے۔ بہت خوب صورت لوکیشن ڈھونڈی وہ راتیل بٹ لے۔ بہت سی باری جگہ ہے۔ دو مرتبہ پہلے بھی وہاں شوٹنگ ہو چکی ہے اور دونوں مرتبہ وہاں مجھے تم بہت یاد آئے۔ بڑا ہی خوب صورت جنگل ہے۔ ہرے بھرے درخت ہیں۔ عجیب و غریب رنگارنگ پھولوں سے لگنے ہوئے جنگلی پودے ہیں۔ کچھ فاصلے سے ایک شہر گزر رہی ہے جس کے دونوں کناروں پر کچھ عرصے میں بڑا خوب صورت گھاس کا فرش ہے۔ وہاں اتنا سکون، اتنی خاموشی اور اتنی خوب صورتی ہے کہ کئی بار میں نے سوچا اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو میں ہمیشہ کے لئے وہیں رہ پڑتی۔"

"نا بابا!..." میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا "مانا کہ ہم تمہارے چاہنے والوں میں ہیں مگر اب میں تمہاری خاطریں پاس نہیں لے سکتا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں تم سے کب ایسی فرمائش کر رہی ہوں۔ پوری بات تو سن لو۔" وہ بدستور محسوس سے لہجے میں بولی۔

"جیسے یاد ہے جب میں جہاد ایجنڈا لکھتی تھی مزدوری کرتی تھی اور تم وہاں پر داخل ہوئے۔"

"جیسے ابھی تک اس کہانی کا نام بھی یاد ہے!..." میں نے حیرت سے کہا "وہ ہمارا تعویذ لا لکھی گئی اور تمہارے خاتمے کم محرتے ہم دونوں۔"

"لیکن تم نے بچے بد معاشرہ۔ مجھے تو اس زمانے کی ہر بات یاد ہے۔" اس کے رخساروں پر سرخی کھڑی ہو گئی۔

"تم زیادہ جملہ نہیں۔ میں تو یونہی بد معاشرہ تھا۔" میں نے اس دور کی یادوں سے دل میں گدگدائی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے بد معاشرہ محسوس کرتی ہوں۔" اس اعتراف میں بھی فخر کی جھلک نمایاں تھی۔

"یہ وقت وقت کی... یا پھر شاید بخت بخت کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"میں جیسے بتا رہی تھی کہ جہاں کہیں سوک اور بھل بھاری تھی وہاں کچھ دور سائٹ سے بٹ کر ایسا ہی منظر تھا جیسی لوکیشن پر آج میں شوٹنگ کے لئے جا رہی ہوں۔" جیسے یاد ہے میں تمہارے لئے کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز بنا کر لاتی تھی اور یہی ظاہر کرتی تھی کہ میں بابا سے چھپ کر آئی ہوں۔"

"ہاں۔" تم اس وقت بھی ایک کامیاب اداکارہ تھیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کالی۔

"لیکن اب جبکہ میں اداکاری کا پیشہ اختیار کر چکی ہوں تو میں درحقیقت اداکارہ نہیں رہی۔" وہ فوراً بولی "اور میں نے اس دور کی خور غریبوں کی بڑی حد تک خلائی بھی گودی ہے۔ اب میں

تمہارے لئے سلقی ہوں اور تم اپنی راہوں پر گھومتے جا رہے ہو۔" خیر... میں بیٹے دونوں کی بات کر رہی تھی۔ ہم کنارے گھاس پر بیٹھ کر وہ کئی سو کچی چیزیں کھا کر کھتے غ کرتے تھے۔

"کبھی کبھی کپڑوں سمیت نہریں کود کر پانی کا شوق پڑ کرتے تھے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"بعد میں کپڑے سکھانے کے لئے گھاس پر دوڑے تھے۔" وہ مجھنی، مجھنی ہی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"بالکل اٹو لگتے ہوں گے۔" میں نے ہنسنے سے روک کر کہا۔

"میں جانتی ہوں اب ایک بار پھر اٹو لگیں۔" جانے کیوز ہی اس کے لہجے میں افسردگی کی در آئی "یہ جو خوب صورت میں نے دیکھی ہے وہاں میں تھوڑی دیر رہنا جا کر بیٹھی تو پھر میں دو سو ماہوئے لگا۔ ایک عجیب سی ٹیس بار بار اٹھ رہی تھی کسی کو بتاتے بغیر وہاں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ پونٹ والے کافی دیر مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہوتے رہے اور میں بس گرد و چوڑ بے نیاز بیٹھی رہی۔ بہت شدت سے دل چاہا کہ تم میرے ہوتے۔ ہم وہاں بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے ایک دوسرے کے بھانجے بھینجی جیسی حرکتیں کرتے۔"

"اور کپڑوں سمیت سو تنگ بھی۔" میں نے لقمہ دیا۔

"وہ تو اب ہم سو تنگ کاشیوم میں بھی کر سکتے ہیں۔" کون منع کر سکتا ہے۔" وہ افسردگی سے مسکرائی "اصل بابا،

احساس کی ہے کیا وہ معصوم سنسنی... دلوں میں وہ موج زرد محسوس کیا جاسکتا ہے؟ کیا ان گندہ لہجوں کا لمس ایک بابا متعارف کر سکتا ہے؟ کتنا اچھا لگے گا۔ گو یہ سب کچھ بھی عارضی بالکل لمبائی ہو گا مگر کھلی ہوئی روح کو کتنی تازگی ملے گی۔ وہ ایسی باتیں کرتی تھی تو میرے دل پر چڑے ہوئے پتھر خول میں بھی دمک سی ہونے لگتی تھی۔ میں نے جلدی۔

"جی جیسے تم کہتی ہو کر لیں گے اس میں اتنی لغائی اتنی تمہید ضرورت ہے۔ لیکن اس کی صورت کیا ہوگی؟"

"تھیک ہو۔" اس نے میری ٹانگی کی بات درست کرتے ہو دم لہجے میں کہا۔ پھر ایک لمبے خاموشی نہ کر بولی "میں تو پونٹ ساتھ جاؤں گی۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ تم بھی ساتھ چلے چلو۔ تم اپنی گاڑی لے لیتا یا میں اپنی لے لوں گی اور ہم ہی گاڑی میں پونٹ کی گاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلے چلیں گے۔"

"اور دوسرے دن اخباروں میں ایکشنل چھپ جائے گا اب تو میڈم سناہ اپنے عاشقوں کو شوٹنگ پر بھی ساتھ لانے ہیں۔" میں نے ٹھٹھا لگایا۔

وہ کبھی انہی سن کر کہتے ہوئے بولی "لیکن شوٹنگ ختم ہو کا انتظار کرنا تمہارے لئے بڑی بھرت کا باعث ہو گا۔"

”ارے۔ میں تو ذائقہ کر رہا تھا۔“ میں نے جلدی سے کہہ کر اس شخص پر ہنسنے سے روک دیا۔
”اس شخص پر ہنسنے سے روک دیا۔“ میں نے جلدی سے کہہ کر اس شخص پر ہنسنے سے روک دیا۔

اس کا سوا دواہر غمور سا ہو گیا تو میں نے کہا ”لیکن یہ پروگرام آج شوٹنگ والے دن ہی رکنا کیا ضروری ہے؟ اتنی بھیڑ بھاڑ کے ساتھ جانے کے بجائے کیا تم کسی اور دن اکیلے وہاں نہیں جا سکتے؟“

”کل کس نے دیکھی ہے۔ ایک تو زعمی کا کچھ اعتبار نہیں۔ دوسرے تمہارا کوئی بھروسہ نہیں کہ تمہاری مصروفیات کا کیا عالم ہو۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کسی چیز کے لئے دل تو تنہا رہا ہو اور اس کے میرے آنے کی امید ایک ماہ بعد ہو۔ اس کا کیا فائدہ؟ تمہیں معلوم ہے؟“ خواہشوں کے معاملے میں میں ایک عجیب عورت ہوں۔

”میرا خیال ہے تم ہر معاملے میں ہی ایک عجیب عورت ہو۔ اسی لئے مجھ جیسا سیلابی تمہارا امیر ہے۔“ میں نے کہا ”تمہاری رگ دوپے میں بھی ختم ہونے والی دھانیت رہی ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ شب رفتہ کے ساتھ ساتھ تمہاری شہ دھانیت کی نو بھی دھانیت کی جس بھی ختم نہیں ہوگی۔“

”عورت میں اگر دھانیت کی جس ختم ہو جائے تو میرے خیال میں وہ عورت کھلانے کی مستحق نہیں رہتی۔“ ساتھ ہی جھپکی سے بولی۔
”میں قلعے میں تم سے نہیں جیت سکتا۔“ میں نے احتیاط ڈالتے ہوئے کہا ”پروگرام کچھ یوں رکھتے ہیں کہ میں ہمارے ہی لوکیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ اس دوران کچھ ضروری دفتری کام بھی انجام دے لوں گا۔ مگر یا کہ لباس بھی تبدیل کر لوں گا اور تھراپی کا لباس بھی ساتھ لے لوں گا۔ لگتا ہے تم سر کے کندے سندے اور گدے بالی میں غوطے کھلا کر ہی چھوڑ دو گی۔“

”اب اپنی اوقات مت بھولو۔“ وہ شونی سے مسکراتی ”سو ٹھیک چل تو بعد بعد آخہ دن سے نصیب ہوئے ہیں ورنہ تو ایسی ہی گدلی سروں میں دیکھاں کھا کر پھر لے نہیں ساتے تھے بلکہ نہ تو خاص معززانہ چیز ہے، قصیب تو کس برسائی جوڑ بھی نظر نہ جاتا تھا تو۔“ ایک آدھ غوطہ لگانے پر مل جاتے تھے۔

”میری شوٹنگ دیکھنے کے لئے مرے جاتے تھے۔“ میں نے لے کر کہا ”اب عالم یہ ہے کہ چندہ سٹاک کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے ہزاروں جگہوں کو کل جانے کوئی چاہتا ہے۔“
چنانچہ دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم شوٹنگ ختم ہونے پر تقریباً تین بجے شوٹنگ ختم کرنے کا وارنٹ ہے۔ میرا اندازہ چار بجے تک تو وہی جائے گی۔ وہ بھی اس لئے کہ ہمارے میں سب وقت کے بہت پابند ہیں۔ ورنہ تو شوٹنگ اپنے اسے کمزور لیت ہوتی ہے۔ وہ بولی ”پونٹ والے شوٹنگ کے وہاں آجائیں گے ہم دونوں وہیں رگ بائیں گے اور وہی جی جگہ مٹا کر وہاں آئیں گے میں لوکیشن تمہیں سمجھا رہ۔ تم آسانی سے وہاں پہنچ جاؤ گے۔“

”اس صورت میں زیادہ بڑا اسکیٹل میچے گا کہ پونٹ تو شوٹنگ کر کے وہیں آگیا مگر میری اپنے عاقبتی زاد کے ساتھ جھل کل اور رگ دیاں وغیرہ دیکھنا مٹائی رہی۔ مسکور لوگوں کے تو انسان تفریح کے چند لمحے بھی نہیں گزار سکتا۔“ میں نے لڑکھا۔

”تم اسکیٹل سے ڈرتے ہو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے میری زبان میں جھانکنا۔ حالانکہ ڈرنا تو مجھے چاہئے۔
”تم اب کہاں کسی چیز سے ڈرتی ہو۔ میں تو بے جا نہ ایک اسارا، معمول سا نو جوان ہوں۔“ میں نے نہ لٹکاتے ہوئے

وہ غمی ضبط کرتے ہوئے بولی ”بس۔ بس۔ اب فیڈر یا چوٹی لے خند نہ شروع کر دیتا۔ تم مطمئن رہو کوئی اسکیٹل نہیں گا۔ دراصل اسٹوڈیو کے جو چھوٹے سونے اور کن یونٹی اپنی تہہ پانے کے شوق میں دوڑے دوڑے اخبار نویسوں کے پاس لے ہیں یا کسی غرض کے تحت ان کے آڈ کار بے ہوتے ہیں اور بھرتی سے چھوٹی بات بڑھا چڑھا کر انہیں بتاتے ہیں۔“ وہ میرے سے میں ایسا نہیں کرتے۔ کیوں کہ میں ان سے غارت کا سلوک نہ کرتی۔ ایک انسان کی حیثیت سے انہیں برابر سمجھتی ہوں۔

”تو دیتی ہوں۔ آؤں وقت میں ان کے کام آئی ہوں۔“
”اس کا مطلب ہے اسکیٹل تو ہوتے ہیں گھر تم نے میں اخبار والوں سے چھپانے رکھنے کا بندوبست کیا ہوا ہے؟“

”میں اس کی طرف جھکتے ہوئے تو چھپتی سے کہا۔
”میرا اسکیٹل تو بس تمہارے ساتھ ہی بن سکتا ہے اور کسی نہ تو ابھی دھیان ہی نہیں گیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ”کہم ہی سمجھتا ہوں ہوتے ہوئے میرے کوٹ کا ڈرامی میں جکر کہ بہت جگہ دیتے ہوئے بولی ”چچ چچاؤ کیا میرے ساتھ اسکیٹل سے تم اتنی ڈرتے ہو؟ اس معمولی ایکسٹرا ہٹی کے ساتھ ہمارا اسکیٹل بنا تھا تو تمہیں قصہ نہیں آتا تھا۔“ لگتا تھا وہ تیار آنے سے وہ یکدم چچ ہی سمجھتا ہو گئی تھی۔

قلب

"ایک تو فرحت کے زمانے کے ثناساؤں میں یہ بڑی بری عادت ہوئی ہے۔ ایک منٹ میں سارا پول کھل کر رکھ دیتے ہیں۔" میں نے آہ بھر کے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا "اچھا میں چلا ہوں۔" ارے ہاں۔ ذرا مجھے لوکیشن اچھی طرح سمجھا دو۔" اس نے کانڈ قلم لے کر لوکیشن مجھے سمجھائی۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میرا وہاں پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔

ستارہ کے ہاں سے میں سیدھا دلفری چلا گیا۔ وہاں دوسرے کھانے تک مصروف رہنے کے بعد میں نے باہر سے آئے ہوئے ایک سو فڈ کے ساتھ انٹرکان میں کھانا کھایا اور پھر انہیں اپنے منبر کے ساتھ انٹرکان رخت کر کے خود گھر گیا۔ کچھ دیر بعد میں تیار ہو کر گھر سے نکلا تو فونی اور ٹیوی کی کار ایک بار پھر سائے کی طرح میرے پیچھے تھی۔

جنرل اسپتال سے آگے نکل آئے کے بعد میں نے ریڈیو پر فونی سے رابطہ قائم کیا اور بلا تہید ایک شعر سنایا۔
بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی پھوڑے

فونی غالباً کچھ حیران سا ہو گیا۔ ایک ایک کر بولا "سر...! آپ آج شعروں میں بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں فونی ڈیر! میں نے لفظی معائنہ لے کر کہا "میں تو جنہیں معلوم نہیں کہ اندر سے میرا مزاج بڑا شاعرانہ ہے۔ شفاک بننے پر تو بعض لوگ مجھے مجبور کر دیتے ہیں۔ اچھا سنو۔ دس بارہ میل بعد کا ہانا نام کا جو گاؤں آئے گا۔ اس سے تقریباً ایک میل آگے میں کیے راستے پر مڑنا ہو گا۔ بس وہاں سے تم وہاں آ جاؤ۔" مجھے آج میں ایک بھونٹی سی چٹک مٹانے جا رہا ہوں اور یہ خالصتاً ایک غی سرگرمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہاں بھی تمہاری آنکھیں میری گھراں رہیں۔"

"ایز پویش سر! فونی بولا "وہی بہتر یہی ہے کہ گھر سے باہر آپ کسی بھی وقت ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو کریں۔"

"معتن رہو فونی! اگر خدا کو میری زندگی منکور ہے تو کوئی بھی مجھے نہیں مار سکا۔ اور اگر اوپر والے کے بھی کھاتوں میں میری زندگی کے دن ختم ہو جائیں گے تو کوئی میری زندگی کا ایک پل بھی نہیں بڑھا سکا۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر درود شائد ہو گیا۔

"وہ تو درست ہے سر! فونی اپنے مخصوص دھمے لیے میں بولا۔
"لیکن احتیاط کی تلقین بھی تو خدا نے کی ہے۔"

"اسی لئے تو تم لوگوں کو اس حد تک زحمت اٹھانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ورنہ میں تو اتنی گرائی کا قائل نہیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر! اگر آپ اجازت دیں تو ہم لوگ بائی وے پر رک جائیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو آپ ریڈیو پر رابطہ قائم کر کے اور لوکیشن بتا کر ہمیں طلب کر لیجئے گا۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی تجویز سے اس کی محبت اور غلغلہ قہار کے میری مخالفت کے میری خواہش سے زیادہ مستعد رہنا چاہتا تھا۔
ذکوہ سوڈ پر پہنچ کر انہوں نے ایک سایہ دار جگہ گاڑی روک لی اور میری گاڑی کے راستے پر دھل اڑا دی۔

لوکیشن تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں۔ میں روڈ سے تقریباً چھ میل دور تھی۔ واقعی بہت خوب تھی۔ کتنے کچھ جنگل خالیکن بہت سے باغات سے کہیں صورت۔ یہاں بھاڑ بھکا ڈھبھی تھے اور پھولوں سے لہجہ بھی۔ اونچے نیچے درخت بھی تھے اور سانپوں کی طرح زہریلی بلیں بھی۔ بعض درخت تو اتنے بلند تھے کہ مجھ سے بھی زندگی میں اتنے اونچے درخت نہیں دیکھے تھے۔ درختوں کے درمیان ایک صاف اور کشادہ قطعے پر بونٹ ڈالے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی سوجھ بوجھ کے آثار دور آگئے تھے۔

ڈائریکٹر راجیل بٹ سمیت بونٹ کے سبھی افراد وہاں جا کر حیران رہ گئے۔ انہیں میری آمد کی اطلاع نہیں ایک لمپل سی جگہ تھی "چندری صاحب آئے ہیں۔ صاحب آئے ہیں۔" کوئی میرے لئے فونک چیر بھاڑا تھا۔ کوئی آکس بکس سے لفظی بوقی کپڑے سے لئے چلا آ رہا تھا۔ بلکہ میں ان سب کا شکریہ ادا کر کے تلفات سے باز رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ارشاد موتی بھی وہاں موجود تھا اور اتنے لوگوں میں محض تاجو خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے مصافحہ بھی نہیں کیا تاہم اس کی آنکھوں میں اب پیا نفرت، نفوس یا خونخواری نہیں تھی بلکہ مجھے دیکھ کر اس پر ہلکے سے خوف کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ اس کا مایہ میری طرف سے دوسری مرتبہ ذرا معقول ڈوڑل جانے کافی حد تک سحر چکا تھا۔ شاید اسے یہ دھڑکنا گھبراہٹ آد خالی از علت نہیں ہے۔ وہ جیتنے کی معنوی کمال کے سے لباس میں تھا۔ گہرا ایک اپ کئے ہوئے تھا۔ اس نے بھی کہیں کہیں ایک ایک کا ہلکا چادر کے کرک چمچے لپٹا کر کوشش کی گئی تھی۔

وہاں سے کچھ دور بلند درختوں میں ایک دوسرے فاصلے پر اوپنی اور مضبوط شاخوں میں کچھ رسیاں بھی لٹکا لیکن ان پر بنایا کپڑا وغیرہ لپٹ کر انہیں ان جڑوں کی شکل کا مایہ کوشش کی گئی تھی جو گرگ کے پرانے درختوں رہتی ہیں گو کہ درخت گرگ کے نہیں تھے ایک بہت اور چھلنا تک میں مدد دینے کے لئے ارشد موتی کے لئے ایک

صحرا کا چاند

اس کا معصوم حسن صحرائی راتوں میں چمکنے والے چاند کو شرماتا تھا۔
دوسری جنگ عظیم ایک پاکستانی نوجوان کو صحرا کے اس درخشاں چاندنی میں لے آئی تھی۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی روح میں محبت کی مسک بن کر
ساہمے۔ لیکن زندگی صرف محبت کی خوشبو ہی نہیں۔
زہر پلے کانٹوں کا جھل بھی ہے۔ انسانی محبت اور نفرت کے صحرا میں طلوع ہونے والے چاند کی
جی داستان جسے اے حمید کے رومان پرور قلم نے لکھا۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/80 روپے

صاحب طرز ادیب قمر اجالوی کا نام تاریخی ادب میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔۔۔۔۔

ولی عہد

انھار حویں صدی کے بزمگیر کی لہو لہو تصویر

★ جب کہنی سرکار والیان ریاست کا شکار کھیل رہی تھی۔

★ جب انگریز حکمران اعلیٰ کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔

★ ایک خانہ بدوش جو ولی عہد بن گیا۔

★ ایک شہزادی جو خانہ بدوش بن گئی۔

آزادی کی عجیب و غریب لرزہ خیز داستان۔۔۔۔۔ جسے قمر اجالوی کے تاریخ ساز قلم نے لکھا۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/150 روپے

کس کوئی تو بیک گن گرج اٹھی۔ گولیاں سنسنائی ہوئی
میں قریب سے گزرے۔ ستارہ خود بخود ہی دھشت کے
گھنٹوں کے بل زمین پر گر پڑی۔ میں نے خود بھی رک کر اس
میں جاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اُسے قدموں
کی کوشش کی تاکہ درختوں کی اوٹ میں ہو سکے۔ لاکھ آٹا
مجھے فوری طور پر اندازہ ہو گیا تھا۔

لیکن یکدم نکلنے والے اوصالی جھٹکے نے ستارہ کو ٹھار
تاکارہ سا بنا دیا تھا۔ وہ فوری طور پر اپنی جگہ سے حرکت کر
قابل نہیں رہی تھی۔ ایک تباہ درخت نے ہمیں گولیوں
برست سے محفوظ رکھا تھا۔

میں نے ستارہ کے اوسان خلا دیکھ کر اسے ایک بازو
اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب سے اپنا مشین پستل
ہوئے رکوع کی سی حالت میں ہی دوڑا۔ نازک کارنچ ہوا
کوئی ہمارے تعاقب میں تھا۔ ستارہ کے تحفظ کی غرض سے فوری
مجھے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ پوزیشن لے کر مقابلہ کر
کوشش کرنا یا اندازہ کرنا کہ حملہ آور کہاں چھا ہوا ہے۔

میں درختوں کے درمیان دگ دیک کرنا دوڑنا چلا گیا
مجھے اپنے سامنے ہلکی ہوئی ایک رسی نظر آئی جس کا دوسرا
کسی شاخوں میں جم گیا تھا۔ میں نے اچھل کر اسے تھما اور اکی
ستارہ کو سنبھالے پورے جسم کی قوت دوسرے بازو سے
کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک لمبی زد بھری۔ یہ ایک
کام تھا۔ قلم کا کوئی شات نہیں تھا جسے کیمرہ رنگ کی مدد سے
کچھ بنا کر دکھایا جاسکتا۔

میں نے اپنے اندازے سے بھی لمبی زد بھری اور
رسائی ختم ہونے پر جہاں میں نے چھلانگ لگائی وہاں جین سا۔
کچھ فاصلے پر کیمرہ موجود تھا جو آہ تھا اور ہلکی سی گھر گھر کی
کے ساتھ چل رہا تھا لیکن اس کے عقب میں کوئی کیمرہ نہیں
تھا۔ نازک کی آواز سن کر پونٹ کے لوگ ادھر ادھر بھاگ
تھے۔ کوئی سینے کے بل زمین پر لیٹ گیا تھا۔ کوئی درخت کے
جاگرا تھا۔ حتیٰ کہ ارشد موتی بھی وہاں نہیں تھا۔ لمبی نازن
کسی درخت کی آڑ میں پناہ لے چکا تھا اور اس کی جگہ کیمرہ
شاہ میری چھلانگ کا منظر طلبہ کر گیا تھا۔ اگر یہ منظر کسی سینہ
میں چھپا تو یقیناً تماشائی بہت حیران ہوتے کہ یہ کیسا نازن تھا
کے ایک بازو پر بیرونی تو موجود تھی مگر تو قریب نہیں سوٹ میں
نازک ابھی جاری تھی اس لئے میں یہاں بھی رک نہیں
تھا۔ میں نے ستارہ کو بازو پر اٹھائے رکھا اور مزید آگے دوڑ
گیا۔

اچانک مجھے درختوں کے جھنڈ سے ذرا آگے منظر میں
کاڑی کھڑی نظر آئی۔ میرے دل کو قدرے اطمینان ہوا۔

لمبی شاخوں میں چھان بھی لگا لی تھی۔ راجیل بٹ نے بتایا کہ
ارشد موتی ان رسیوں کی مدد سے ادھر ادھر بھول کر اپنے بیٹے
کرتب شوٹ کر دیا تھا۔ تاہم ابھی اس کے چند شاخیں باقی تھیں۔
ستارہ کا کام ختم ہو چکا تھا۔

"بھئی میں تو یہاں ستارہ کا سامان ہوں۔" میں نے ان لوگوں
کی حیرانی کسی حد تک رفع کرنے کے لئے بتایا "اس نے اس علاقے
کی اتنی تعریف کی کہ مجھے ضرور یہاں گھومنا پھرنا چاہئے۔ کچھ وقت
گزارنا چاہئے۔ ہم جیسے زندگی کی مصروفیتوں کے مارے ہوئے
لوگوں کو یہاں بڑا سکون مل سکتا ہے۔ دنیویو وغیرہ۔ میں تو اس کی
تعریفوں سے متاثر ہو کر چلا آیا۔ ویسے بھی ستارہ جیسی طاقتور کسی کو
دعوت دے تو انکار کر کے گھراؤلو نعمت کا مرکب نہیں ہوتا
چاہئے۔"

"ہاں یہ آپ نے لاکھ روپے کی بات کی۔" راجیل بٹ نے
اثبات میں سر ہلایا۔

"ویسے ستارہ نے آپ سے غلط تعریف نہیں کی۔ ہم لوگ
جتنی مرتبہ بھی یہاں آئے ہم نے کام بھی بہت خوب صورتی سے
کھل کیا اور انجوائے بھی بہت کیا۔ اعصاب کو بہت سکون ملا۔
خصوصاً میرے کنارے جا کر طبیعت میں بڑی فرحت آتی ہے.....
میں تو اس سارے کھڑے کو ہر ذرا سے اپنی غلوں میں استعمال
کر چکا ہوں۔ ورنہ ابھی مزید دو چار مرتبہ آؤت زور شوٹنگ یہاں کی
رکھتا۔"

"بٹ صاحب! ہم ابھی نہر کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ جب
آپ لوگ روانہ ہونے لگیں تو ہمیں بلوائیچے گا۔" ستارہ نے میرا
ہاتھ تھام کر اٹھے ہوئے کہا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک خوب
صورت ٹھن ٹھن کیمرہ تھا۔ پونٹ کے لوگوں نے ہمارے پاؤں جانے کو
کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ہم
ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے دو بے فکرے بچوں کی طرح کھوٹے کھاتے
درختوں کے درمیان سے گزرتے ایک طرف کو چل دئے۔
ہم ان لوگوں سے کافی دور نکل آئے لیکن سہرا بھی نظر نہیں
آئی تھی۔ پونٹ کے لوگوں کے دور دور سے برتنے کی آوازیں
معدوم ہو چکی تھیں۔

"تم نے آج میرے بلاوے پر یہاں آکر میرا مان رکھ لیا
ہے۔" ستارہ والہانہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"یہ تو بہت خوب صورت جگہ ہے سرکار! آپ تو اگر صحرائے
کوئی میں بھی بلا نہیں گی تو آپ کے اس خادم کو آنا پڑے گا۔" میں
نے بازو اس کی گردن کے گرد مائل کرتے ہوئے کہا۔ اس کا گداز
ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا اور میں ایک دوسرے کے سہارے دھیرے
دھیرے قدم پر بھاننا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ واقعی میرا دل چاہئے لگا کہ
یہ سفر کچھ طویل ہو جائے۔

مگر ان خوب صورت اوپر سکون لمحوں میں اچانک قریب ہی

75/-	حیدہ جبین	زیب
75/-	حیدہ جبین	شاخ بریدہ
75/-	حیدہ جبین	حنا اور پتھر
75/-	حیدہ جبین	گیت یہ میرے

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

"وہی جو دوسرے کر رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم میں اور دوسروں میں کیا فرق رہے گا؟"

"یہ میں بعد میں سمجھوں گا۔"

"بعد میں سوچنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔"

"یہ فلسفہ بھانٹنے کا وقت ہے کیا؟" میں نے نرمی سے اس سے قہقہے بھڑاتے ہوئے کہا "تم صرف اتنا کہہ کر جب میں تمہاری نظروں سے اوچل ہوا جاؤ تو دو چار ہوائی فائر کھٹا کر ان لوگوں کو گنگن کر رہے کہ میں یہاں ہوں۔ انہیں صرف چند لمحوں کے لئے غلط فہمی میں رکھنا تمہارا کام ہے۔ اس دوران میں ان سے نہٹ لوں گا۔"

"یہ امکان بھی تو ہے کہ ان چند لمحوں میں وہ یہاں آکر میرا تاج پانچا کر دیں؟" اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

"مت بھولو کہ چند لمحے پہلے ہی تم نے ہزاروں بے خوف رہنے کا فرسٹ نمبر کیا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ خاموش ہو گئی اور ششیں ہلنے لگی۔

میں نے چلتے چلتے اسے بتانا بستر سمجھا "یہ عام ہسپتال یا ریورسے ذرا مختلف ہے۔ فائر کوئی تو مسلسل جھگٹے لکھیں گے گرفت مضبوط رکھنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ فائرنگ بند ہو چکی تھی لیکن آخری فائر جہاں سے ہوئے تھے اس جگہ کا مجھے اندازہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ حملہ آور ابھی اس جگہ کے آس پاس ہوں گے۔

درختوں کے درمیان میں نے حتی الامکان تیز رفتاری سے قافلے میں کیا اور وہاں جا پہنچا جہاں سے میری دانست میں آخری فائر کے گئے تھے۔ وہاں مجھے ہلکی ششیں گنگن کا ایک خالی میگزین بھی چڑا دکھائی دیا۔ گھاس بھی بری طرح سسلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا جیسے وہاں چند لمحوں پہلے تک انسانوں کی ذہن پرست نقل و حرکت رہی ہو۔

میں کھلے میں نہیں آ رہا تھا بلکہ درختوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے ہی چھلاؤں کی طرح انتہائی تیزی سے اُدھر اُدھر حرکت کرتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

کسی چہرے سے اسے کارخانہ گلاب سے کم نہیں تھی۔ فائرنگ کی آواز میں قدرے مدھم مدھم گونجی تھی۔ فائرنگ کرنے والے پتیلے کٹنی پیچھے رہ گئے تھے اور شاید میں ان کی نظر سے اوچل گیا لیکن نہ جانے کہاں وہ دھنکے دھنکے سے فائرنگ کئے جا رہے تھے۔ شاید مجھے خوفزدہ کرنے اور سگے رکھنے کے لئے۔

میں تیزی سے گھوم کر گاڑی کی دوسری طرف پہنچا۔ ستارہ کو نے بازو سے اتار دیا اور میرا اشارہ پا کر وہ گاڑی کی اوٹ میں کے بل لیٹ گئی۔ اب وہ خوفزدہ نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس تو میں جہاں ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب وہ میری طرف دیکھتے تھے شہر سے انداز میں مسکرا دی۔ گویا یہ فائرنگ بھی اس کے عادیوں کا ایک حصہ رہی ہو۔

"بہت خوش ہو رہی ہو۔" میں نے سرگوشی میں کہا "قدرت بجالاؤ نہ ابھی پرچے اڑ گئے ہوتے۔"

"میں نے تو اب سوچ لیا ہے کہ تمہارے ساتھ رہتا ہے تو نہ ایک ہزار پرچے ہی اڑتے ہیں۔ اس لئے اب بریٹان نے اور گھبرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے سرگوشی میں ہی کہا۔

"اچھا کیوں مت کرو اور یہ سنبھالو۔" میں نے گھٹنوں کے جھگٹے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے ششیں ہلنے نکال کر اس طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ہسپتال چلاؤ تو آنا ہو گا جیسے؟"

"تمہارا بہت سیکھا ہے۔" وہ ہسپتال سنبھالتے ہوئے بولی۔ اسی پر فخر زندگی گزار رہی ہے میں نے اور اپنی حفاظت خود نے کا شرف بھی ہے اس لئے اس قسم کی چیزوں کا استعمال سیکھنے اور کوشش کرتی رہتی ہوں۔ لیکن نکلنے کے بارے میں کچھ نہیں رہ سکتی۔" وہ گویا صدفرت خواہ تھی۔

"نکلنے کے بارے میں تمہیں کون کم بہت کچھ کہہ رہا ہے۔" اکون سا یہاں مارکٹ شوٹنگ کے مقابلے میں ڈرائی بیٹے آئے تھے۔ "میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اتنی سی۔ کے نیچے ایک خیرہ غریب نے ایک لمبوتر سا خانہ مولا۔ اسٹین کی سیاہ پلٹ سے ڈھکے ہوئے اس خانے کی موجودگی کی کو احساس نہیں ہو سکتا تھا۔

"دوسرے ہی لمحے سیاہ رنگ کی سیون ایم ایم کی ایک خاص قسم کا توٹوکہ داخل میرے ہاتھ میں تھی۔ ستارہ کے چہرے پر ششوں کے آثار قدرے کم ہو گئے اور آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھلک آیا۔

نکل دیکھنے میں بہت خوب صورت تھی لیکن ہتھیاروں کی خوب روٹی جیب ہوتی ہے اس کی دھمکوت کی خوف ناک اور بد روٹی پٹن ہوتی ہے۔

میں سنبھال کر میں دوسری طرف بڑھتا تو عقب سے ستارہ میری پس کاٹو کھینچ کر خوفزدہ سی سرگوشی میں بولی "تم کیا کرنے جا رہے

تو سر کے کنارے ٹپکے میں جاتے تھے اور اگر بائیں طرف مڑے
اور خوشی کا سلسلہ گھٹا ہو جاتا۔

میری توقع کے مطابق وہ دائیں طرف ہی مڑے۔ میں بد
ایک خاموشی و رندے کی طرح اس جگہ تک ان کا تعاقب کر
جہاں سے سر نظر آنے لگتی تھی۔ یہاں سے سو ذرا سو قدم
فاصلے پر سر پر ایک چھوٹا سا محل موجود تھا اور اس محل کے قریب
کے دوسری طرف ٹھکی چھت کی ایک سرخ شیدر لٹ اسیلا کہ
ہوئی تھی۔ یہ گاڑی بھی میری دیکھی نہ تھی۔ میری حیرت
بڑھنے لگی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ سرخ شیدر اور
لوہی والا شخص مجھے زندگی میں دوبارہ بھی نظر آئیں گے یہ سو
میری سمجھ سے باہر تھا!

بہر حال اتنا ہی ضرور سمجھ چکا تھا کہ وہ واقعی دائیں جا رہا
تھے۔ سر کے دوسری طرف سے بچے راستے سے اپنی دے تک
جاسکتا تھا۔ وہ یقیناً آئے بھی اسی طرف سے تھے۔ پہل اور گا
ابھی بہت دور تھی لیکن میرے خیال میں اب انہیں روک لینا
بہتر تھا۔

میں نے ان کے قدموں سے ذرا سی آگے زمین پر ایک پر
بار۔ گولیاں دھول اڑاتی ہوئی زمین میں پڑت ہو گئیں۔ وہ
اپنی جگہ بت بن گئے۔ اہر اور حقائق لوگ تھے انہیں معلوم تو
کس صورت حال میں کیا کرنا چاہئے۔ شین مکن والے نے
مکن سیدھی کہنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ
کوشش کا انجام اس کی موت کی صورت میں سامنے آسکتا تھا۔
"مکن ذرا اور پیچیدہ دو چند آ۔!" میں نے یہ آواز بلند
اور میری طرف گھوم جاتے۔ میں ذرا نظروں والی سرکار کے در
کرنا چاہتا ہوں۔"

چوڑے چلے آوی کے ہاتھ میں کوکر سب شین مکن تھی،
بھی اتنی ہلکی نہیں تھی۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہو
مکن پیچیدہ تو یہ محروم زیادہ دور جا کر نہیں گری۔ وہ دونوں آ
سے میری طرف گھومے۔ میری زیادہ تو یہ صرف لیے ہالوں وا
کی طرف تھی۔ اور اسے دیکھ کر واقعی میرا سر گھوم گیا۔ ایک
کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کیا۔

میرا شہ درست ہی تھا۔ وہ وہی بندر تھا جسے چائے چند
پلے مکان روڈ کے ایک باغ میں لٹنی نے میرے سامنے گولی مار
تھی۔ وہ سب کچھ غیر ارادی طور پر اضطرابی انداز میں ہوا تھا۔
میرا تعاقب کر رہا تھا اور جب ہم نے اسے روکنے کی کوشش آ
اس نے رعب اور کھال لیا تھا۔ لٹنی نے اس پر اس صارت سے
کیا کہ رعب اور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسے کوئی گزند نہیں
محروم سے ہی لے اس نے باغ کی دیوار چلا گیا کہ فرار ہوئے
کوشش کی اور لٹنی نے اس پر سرفراز کر دیا۔

ہم نے اسے باغ میں چت پڑے دیکھا تھا۔ اس کی لیں۔

خفا سے بامداد کی بوجھم ہو چکی تھی۔ تو سوچنے کی مجھ میں
دور ندوں کی ہی جو صلاحیت موجود تھی، آخر کار اس نے میری مدد کی
اور مجھے بتایا کہ انسان کس طرف تھے انسانوں کی بولہ بہ لمحہ دور
ہوئی جا رہی تھی۔ میں تجزی سے اس سمت میں بڑھا۔

آخر کار وہ مجھے نظر آگئے۔ تعداد میں وہ صرف دو تھے اور
نصابت اطمینان سے بچی آواز میں بائیں کرتے جا رہے تھے۔ ان کی
آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ صرف حرکات و سکنات سے
اندازہ ہوا تھا کہ وہ بائیں کر رہے تھے۔

دہلی درخت پھدے تھے اور وہ دونوں مجھے صاف دکھائی
دے رہے تھے۔ غالباً وہ سر کی طرف جا رہے تھے اطمینان کا یہ عالم
تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی سر اٹھا کر آدھرا کر دیکھنے کی کوشش
نہیں کر رہا تھا۔ جس طرح انسانوں نے مجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے
دیکھا تھا، اس کے بعد انہیں غالباً ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ میں ان
کے تعاقب میں دائیں بھی آسکتا ہوں۔

چند لمبے پہلے ستارہ میری ہدایت کے مطابق چند فاصلے پر چکی تھی
لیکن انسانوں نے شاید انہیں بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ تو گویا
کوئی کام نہایت عمدی سے مکمل کرنے کے بعد پورے اطمینان
قلب کے ساتھ دائیں جا رہے تھے۔

شکار پر نکلے ہوئے دور ندوں کی طرح کچھ دور ان کا تعاقب
کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ان کا کوئی اور ساتھی اس پاس
موجود نہیں تھا۔ انہیں کسی کا انتظار بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں ہی پست قدم تھے مگر ایک خوب چڑچڑا چلا اور گھٹے
ہوئے جسم کا مالک تھا۔ جبکہ دوسرا مختصر، بھول اور مختصر الجھو
دکھائی دیتا تھا۔ چوڑے چلے شخص نے ہلکی شین مکن لٹ کی طرح
کندھے پر اٹھائی ہوئی تھی۔ بھول آوی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار
نہیں تھا لیکن میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں
تھا کہ وہ واقعی نہ تھا۔

وہ چیلے ڈھالے سیاہ کوٹ اور خاکی پنٹ میں تھا۔ سر پر گمرے
رنگ کی ٹی شیرٹ تھی۔ اس پلے میں اسے عقب سے دیکھتے ہوئے
کوئی اندازہ قائم کرنا مشکل تھا لیکن نہ جانے کیوں اس پر نظر پڑے
ی مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ میرا پیرا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا
کہ اس شخص کو میں پہلے بھی کہیں اچھی طرح دیکھا تھا لیکن یقین
سے جھکی کچھ کہا جاسکتا تھا جب میں اس کے مزید قریب جانا
سامنے سے اسے دیکھا۔

اس کی ٹی شیرٹ کے نیچے لے ہالوں کی ٹینس بھول رہی تھی۔
یہ ٹینس اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں مجھے ہوئے خدو خال کچھ جانے
پچانے سے لگ رہے تھے۔ لیکن یہ وہ شخص نہیں ہو سکتا تھا جس کا
خیال میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ وہ شخص اب اس دنیا میں نہیں
تھا۔ میں اسے مرے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

ہم بھگ میں اس جگہ پہنچ چکے تھے کہ اگر دائیں طرف مڑتے

یہی تھی اور بغیر سناکت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اس کے دل کی دھڑکنیں بھی سننے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے اس دل سناکت ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ سارا منظر میری آنکھوں میں بزم رہا تھا لیکن وہ بد بخت زندہ سلامت میری آنکھوں کے سامنے آکر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے برسوں سے اسے خراش تک بھی نہ تھی۔ اگر ہمیں اس کی موت کا محض دھوکا ہوا تھا اور وہ صرف غشی ہی ہوا تھا تب بھی اتنی جلدی وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ تو صرف چل پھر رہی تھی رہا تھا کہ بارہا حاضری میں بھی جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس طرح نیم اوڑھیں اور چہرے پر کچھ ایسی بے نیازی دے پڑانی تھی جیسی دیکھنے والوں کو چڑا ہوا ہو کہ اسے تو کسی بھی صورت حال کی ذمہ داری پورا نہیں۔ میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی موقع پر حیرت کا اظہار نہ کروں لیکن اس وقت میں یہ کہنے بغیر نہ رہ سکا "تم زندہ ہو۔"

"یہ کب اور امید ہے کہ ابھی غیر معینہ مدت تک زندہ رہوں گا۔" اس نے نہایت کمزور لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے کسی ہنسنے والے کی برس کی صحت کے بعد آخر کار خاصی کامیابی سے انسانوں کی طرح بولنا تھا لہذا وہ۔

"لیکن میں نے خود تمہیں مرہونہ کیا تھا۔ تمہاری قیاس خون میں ترقی اور بغیر سناکت تھی۔" میں نے کہا تاہم میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے آثار سے حیرت کا اظہار نہ ہو۔

"اس قسم کے تو مت سے شیعہ میری جیوں میں پڑے رہتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "کچھ دیر کے لئے دل کی دھڑکن روک لینا بھی میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ میں مینڈیکل سائنس کے لئے جانا پھرنا چاہتی ہوں۔"

"مینڈیکل سائنس کے لئے تو تم بے فکر پہنچ رہے ہو، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن تم میرے لئے بھی پہنچ رہے ہو۔ یہ میرے لئے بڑی تکلیف کی بات ہے۔" میں نے غصہ سے کہا۔

"اب میں کیا کروں۔ میں تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گناہ گونہ کر چکی نہیں مگر وہ میری عمر بڑھ سو سال ہے۔ میری چار ناکوں کے بعد دیکھ کر میرے مرنے کے انتظار میں خود راہی ملک ہو رہی ہیں۔" اس کے لہجے میں جگہ جگہ اس قدر کڑواہٹ تھی جیسے وہ خود بھی اپنی درازنی مرے پریشان ہو۔

"میں نے اس کے چہرے پر تھوڑا سا اشتہار کی علامات تلاش کئے کی کوشش کی لیکن وہاں جگہ ہی غیر جمیدگی کی بھی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ بالکل جمیدہ تھا۔ مگر یہ کوئی قابل اعتبار نشانی نہیں تھی۔ بعض لوگ انتہائی جمیدگی سے مذاق کرتے ہیں۔"

میں نے بھی اسی جمیدگی سے کہا "جس چیز کسی نیا ہی ہوا کہ انہیں نے اس حیات کی کوئی چیز یاد دی ہوگی۔"

"تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔" اس کے لہجے میں اس قدر ذرا کمری ہو گئی "مگر میں مذاق نہیں کر رہا۔ جو کچھ کہ رہا ہوں اس کے لئے کوئی ہی بھی قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔ مدتوں پہلے کی بات ہے۔ میں افریقہ کے جنگلوں میں بھگ رہا تھا۔ راستہ بھول گیا تھا۔ بالکل ویسی ہی پھوٹن تھی جیسی آج کیوں اور قلموں میں ہوتی ہے۔ میں اپنا ہسٹریا سا تھا کہ اپنے نیکے بھائی کا گوشت کھانے کے لئے تیار تھا۔ جنگلوں سے بھی کہیں دور نکل آیا تھا۔ لہذا وہ حق محرامیں گھس رہا تھا۔ وہاں مجھے ایک پورا نظر آیا۔ تاہم نظر پیلے ہوئے محراموں میں صرف ایک ہی پورا سراغ ملے گا تھا اور اس پر چھوٹے انٹاس جیسا بس ایک ہی پھل لگا ہوا تھا۔ میں نے بغیر سوچے کچھ اسے توڑا اور بڑبڑ کر گیا۔ اسے کھاتے ہی میرے جسم میں گویا آگ لگ گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ کوئی زہیلا بھل کھا گیا ہوں اور مر رہا ہوں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یہ احساس بھی پورا قدرت کا عجیب تھا کہ اب ساری تکلیفوں سے نہایت نکلے والی ہے۔ لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میں بالکل تازہ دم اور بھلا چنگا تھا۔ میں پھر بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ اسی پھل کا کمال تھا۔ اس وقت میری عمر تیس سال تھی۔ تب سے لے کر آج تک بھلا چنگا ہوں۔ اڑبھ سو سال مر رہی ہیں لیکن کبھی بیمار بھی نہیں ہوا۔ چند سال پہلے میں نے اپنے بچہ کی شادی کی ہے۔ چار بیٹے ہیں میرے۔ دوبارہ کسی اس مقام تک رسائی نہیں ہو سکی جہاں وہ پورا نظر آیا تھا اور نہ ہی دیکھا ہوا یا پھل دوبارہ کبھی نظر آیا۔ وہ بقیہ شریات قسم کی کوئی چیز تھا۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ میرا خون سیاہ ہو گیا ہے۔"

"اصل میں دل کالا ہو گیا ہوگا۔" میں نے لقمہ دیا۔ وہ گویا اس صورت حال میں بھی اپنی کامیابی کے لئے بہت بے قرار تھا کہ میں ایک آئینہ نکال کر اس کی اس طرف دیکھ کر دیکھتا تھا۔ وہ میرے الفاظ پر قطعاً توجہ دے بغیر بولا "بلڈ شٹ سے رہا چلا ہے کہ میرے خون میں آئینہ آتا ہو گیا ہے کہ اگر کسی اور کے جسم میں ہو تا۔"

"تو وہ تو ذرا ہی کھلی لپکتا۔" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں۔ وہ فوراً مر جائے گا۔" اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ اس کی جمیدگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کے علاوہ میرے خون میں ایک اور مادہ بھی پایا گیا تھا جسے لیبارٹری والے کوئی نام نہیں دے سکے۔ اس کے بعد میں گول ہو گیا کہ کہیں لیبارٹری والے زیادہ آگے نہ بڑھ جائیں۔ لہذا پھر شروع نہ ہو جائیں اور مجھے ستر عام پر نہ تیار کرے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" میں نے کمری جمیدگی سے کہا "موت کی زندگی انسان جتنا بھی پیچ کر گزارے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"کیا تم بھی کسی کی بات جمیدگی سے نہیں سنتے؟" اس نے گویا بڑے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا میں جس میں غیر جمیدہ نظر آ رہا ہوں؟" میں نے مصوبہ

کے اچانک گرج اٹھنے پر وہ اچھلتا تو درکنار اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔

اپنے محسوس لیے میں وہ بلا "اس کی کیا ضرورت تھی اسے خوار کر کے گن افغانے سے روک بھی سکتے تھے۔" انداز پرکھ ایسا ہی تھا جیسے کہ دہا ہو "جناب! اس بچے کو لگانے کی کیا ضرورت تھی" آپ اسے صرف ڈانٹ کر بھی کاہ سکتے تھے۔

"یہ میں نے خوار ہی کیا ہے۔ اسے نہیں، تمہیں۔" میں خشک لیے میں کہا "اب تم اس طرف چل دو۔" میں نے ایک بھر را نقل سے اشارہ کیا۔

اسی لمحے وہ اس طرح اچھلا جیسے اس کے جسم میں ہزار امپرک فٹ ہوں۔ پچھلی بار جب اس سے سامنا ہوا تھا تب میں نے اسے اسی طرح اچھلنے دیکھا تھا۔ اسی انداز میں اچھل کر ایک بار گئی کائی اونچی دیوار پر ہلاک کر اندر کود گیا تھا۔

غصا میں ہی لڑکی طرح کھڑا پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ کائی فاصلے پر زمین پر تھا اور گولی کی سی رفتار سے سر کی طرف ہ تھا۔ اس کا دوڑنے کا انداز پرکھ ایسا تھا کہ اسے نشانہ بنانا مشکل تھا تاہم میرے لئے ناممکن بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے ہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ زندہ ہی قلم کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اس کے دائیں بائیں فائر کے کردہ رکائیں۔ مختصر الوجود تھا تاہی بے خوف تھا۔ میں اس بندہ رما غصے پر قاشق ہو چکا تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے انسان کے جاے میں آجوبہ نظر آیا تھا۔ میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے زندہ میں کرنے کے لئے اس کا حاقب کرنا ضروری تھا اور یہ بلاشبہ بہت ہی مشکل کام تھا۔ اسے ہلاک کرنے سے بھی زیادہ خطر کا وہ حیثیت ایک چھلاوا تھا۔ اور اسے خود بھی اس کا طرح اندازہ تھا۔ لیکن میں نے سہا کر اسے تھپی دیا جا۔ بادولت بھی چھلاؤں کے بڑا چھو ہیں۔

میں نے گن پیمیک دی۔ کیونکہ گن سمیت بھاگنے سے را میں بڑا فرق پڑتا تھا۔ وہ گولے کی طرح دوڑا جا رہا تھا لیکن میں جلد ہی اسے جالیا۔ اور یہ ایک کارنامے سے کم نہیں تھا۔ لیکن تھا کہ وہ چار سیکنڈ بعد میں سمیت کر اس چھلاؤں کے کچھ لیکن کسی لمحے میری آنکھوں نے ایک اور حیرت انگیز ظاہر دیکھ دیا۔ بندہ رما انسان ایک ہی قدم میں سر کو پھلانگ لگا۔ ایک لمحہ کوئی چیمپین بھی ایک قدم میں اس سر کو نہیں پھلانگ سکتا تھا۔ میں اگر ایک ثانیے کے لئے بھی جھجک جاتا یا سوچ میں پڑ تو شاید میرے لئے بھی سر کو پھلانگ لیکن نہ رہتا۔ میں بھی آج مجبوزہ دوڑ گار غصے کو سر اندر دینے پر تھا ہوا تھا۔ اسی رفتار دوڑتے ہوئے میں بھی سر پھلانگ کیا۔ وہ سر کے دوسرے کنار

سے اچھلا۔ وہ نہ ہلا کر گندھے اچھا کر رہ گیا۔ اس کے چرے پر دل تکلیف کے آثار تھے۔

میں نے گری سانس لے کر گویا مذاکرات کا یہ دور ختم کرتے ہوئے کہا "بہت ہو چکی اسے بندر نما انسان۔۔۔ یا انسان نما بندر! تمہیں اندازہ نہ ہو گیا ہو گا کہ میں کوئی داستان ہو شرما سننے کے لئے یہ را نقل لے کر تمہارے حاقب میں نہیں آیا تھا۔ لیکن پھر بھی چو گن میں موت کا مارا انسان ہوں اس لئے میں نے اتنی دیر تمہاری لمن ترانی سن لی۔ اب خاموشی سے اس طرف چل پڑو۔" میں نے انہیں اذھر پیلے کا اشارہ کیا بعد عرصے میں خود آیا تھا اور بد عرصہ میری گاڑی کھڑی تھی۔

میں اب تک بظاہر صرف بندر نما انسان ہی کی طرف متوجہ رہا تھا۔ اس سے شاید اس کا سامنی غلط فہمی میں جلا ہو گیا تھا۔ مگر یہ غلط فہمی اس کے حق میں ملک ثابت ہوئی۔ میں نے اسے خوار کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ مجھے اس پر دل ہی دل میں بہت خار آ رہی تھی۔ پھر پر اور ستارہ پر اندھا عند فائرنگ اسی نے کی تھی۔ مصلحت کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں اسے زندہ بچا کر لے جانے کی کوشش کرنا تاکہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں لیکن اس وقت میں نے مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ویسے بھی مجھے بندر نما انسان اس سے زیادہ اہم نظر آ رہا تھا۔ وہ تو محض ایک ماہر مشق اور پیشہ ور قاتل معلوم ہوتا تھا۔ شکاک خون کا بیا سا اور زبان بند رکھنے والا۔ محض ایک بیٹی جاگتی مشین۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ جب سے میں بندر نما انسان کی طرف متوجہ تھا اس کا سامنی کسی چیز سے بھی کم رفتار کے ساتھ اگلے قدموں اپنی سب مشین گن کی طرف کھٹک رہا تھا جو اس نے میرے جسم پر پیمیک دی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ وہ یقیناً اس وقت اپنے آپ کو بہت ہلاک محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اسے گن تک پہنچنے کا موقع دیا لیکن اسے چھوٹا اسے نصیب نہ ہو سکا۔ جو نہی وہ جھکا میری را نقل سے اس کا جسم چھلی کر گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ گولا ساہن کر گڑھلکا ہوا اور جا کر ابھر ہاؤں خانے جیت ہو گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں اور کھلم پتا دے رہا تھا کہ زندگی کے آخری لمحے میں اس نے شدید حیرت محسوس کی تھی جو اس کے چرے پر تجلہ ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اس نے زندگی بھر صرف دوسروں کے جسموں میں گولیاں آزاری تھیں۔ وہ خود ان کی ازیت سے نا آشنا تھا۔ زندگی کے آخری لمحے میں شاید اس پر اسی حیرت نے حملہ کیا تھا کہ یہ کیسے انکار سے ہیں جو اچانک اس کے جسم میں اتر گئے ہیں۔

بندر نما انسان بلاشبہ ایک عجیب مخلوق تھا۔ اس نے کمال ہے تہازی سے گردن زد اسی سوزیوں اپنے سامنی کی طرف دیکھا جیسے کسی شر پنے کی گیند را حلقی ہوئی اس کے پیچھے جا کر ہو۔ را نقل

پتھر کر رکھا تھا۔ شاید اسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ کوئی اس کے خائب میں نہر کو بھی بھلا کر چلا سکتا ہے۔

جاننا تھا نہ انداز میں میری طرف دیکھنے کے لئے وہ گھبرا اور اسی لمحے اس نے مجھے اپنے سر پر پایا۔ میں نے اس کی آنکھیں جھپٹے دیکھیں لیکن اسے فزادہ درخیزان ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں اسے لپٹے ہوئے زمین پر گررا اور ہم دو ایک دوسرے کے خائب میں بے پروا ہو چکا تھا اتنی ہی کالی تھا۔ اب اس کی خاطر میں اپنی جان کو مزید ذمت نہیں دینا چاہتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں اس شخص تک پہنچ گیا ہوں تو اب آسانی سے اس کو کاہوں کر لوں گا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی صرف پھرتی ہی غیر معمولی ہوگی۔ طاقت اس میں کوئی خاص نہیں ہوگی اور ایک بار کسی طاقتور آدمی کی گرفت میں آنے کے بعد وہ جلد ہی مجھے بے بس ہو جاتا ہوگا۔

وہ مختصر اور ہوشیار تھا۔ میں نے ایک گھڑی کی طرح اسے بازوؤں میں سیٹھنے کی کوشش کی لیکن اس وقت میری جھرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے کھل کی سی تیزی سے ایک چیز کو حرکت میں آتے دیکھا۔ وہ اس کا استخوانی بازو تھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس استخوانی بازو کے ایک سرے پر ایک آہنی گھونسا بیٹھا جاتا ہے۔ جیسے مجھے اس وقت آیا جب وہ گھونسا ایک ہتھوڑے کی طرح میری گھڑی پر پڑا۔

میری آنکھوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے بھی محسوس ہوا جیسے میرے سب دانت ایک دوسرے میں سیو ہو کر ہو گئے ہیں۔ جڑا شاید دہرا ہو کر حلق میں جکھن گیا ہے اور گھڑی پیش کے لئے خائب ہو گئی ہے۔ میرے پیچے رہا ہوا وہ پہلے ہی پارے کی طرح چل رہا تھا۔ اس گھونے کے بعد تو میری گرفت سے تقریباً نکل ہی گیا۔

یہ شخص ایک انتہائی قہار یا دوسرے لفظوں میں میری خوش قسمتی کہ اس کی ہانک میرے ہاتھ میں آگئی ورنہ اس بار وہ نکل جاتا تو بیشک گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی ہانک ہاتھ میں آنے ہی میں نے زور سے پھینکی۔ وہ دھب سے گرا لیکن کرتے ہی اس نے دوسرے پاؤں سے میرے سر پر ٹھوکر ماری۔ میری کھوپڑی وہاں بھجھکا اٹھی۔

معلوم نہیں اس غیبی نے اس معنی سے جسم میں اتنی طاقت کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ یہ اسرار اپنی جگہ خالص حیرت اس سے میرا مشت ہوا ہو گیا۔ وہ جو میرے ذہن کے کسی تاریک خانے میں ایک خوف ناک جھلکا ہوا خرابیہ رہتی تھی، یکدم جاگ اٹھی۔ میرے دل میں اس کے لئے بے وجہ جو ایک نرم سا کوشش تھا، ایک لذت یا اجر گیا۔ میرے سارے جسم کا لہو کھڑا ہوا تھا۔ لاؤسنس دھل گیا اور صرف کپڑوں میں مرکز ہو گیا۔

میں نے زور سے سر جھکا۔ جھٹلاتے ہوئے مٹھر میری نظروں میں صاف ہو گئے۔ اس وقت تک وہ چھلدا اٹھ چکا تھا اور گو کہ اس کی ایک ہانک اب بھی میری گرفت میں تھی لیکن وہ دوسری ہانک سے مجھے دوسری ٹھوکر رسید کرنے لگا تھا۔ اور یہ ٹھوکر شاید میری آہنی کھوپڑی کو بھی بچاؤ تھی۔

یہ وقت میرا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کی دوسری ہانک بھی یکدم اس طرح میری گرفت میں آگئی جیسے کسی گول کپڑے گولی کی رفتار سے آئی ہوئی بال کو یہ وقت ہاتھ سے روک لیا ہو اور قید کن گول پچایا ہو۔ دونوں ہاتھیں میری گرفت میں آ جانے کے بعد وہ دھب سے پیٹھ کے بل زمین پر گررا اور میں اسی لمحے بالکل مشتعل انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ کسی بڑی سی جھلی کی طرح میرے ہاتھوں میں اٹھانکا ہوا تھا۔ اس کا وزن محسوس کرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر جھرت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کم بہت ہڈیوں کا مجموعہ تھا کہ یہ ہڈیاں شاید خالص اور ٹھوس فولاد کی بنی ہوئی تھیں۔ جتنی طاقت صرف کر کے میں نے اس معنی انسان کو اٹھایا تھا اتنی طاقت سے تو ایک صحت مند بچہ کو بھولا جھلایا جاسکتا تھا۔

صرف یہی نہیں اس کی فولادی ہڈیوں میں چمک رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں لٹکے لٹکے وہ سانپ کی طرح دہرا ہو کر اپنا سر اوپر لایا اور اپنے دونوں استخوانی ہاتھ جیسا کہ اس نے میری گردن پر پڑنے کی کوشش کی۔ اگر وہ میری گردن پر پڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید میری زندگی کی کمائی اس دیرانے میں ہی نہایت اہتلاف انداز میں ختم ہو جاتی۔

اس کی ملا جلی ہڈیوں کے پارے میں میری عاشقی تو ٹھنڈی ہو ہی چکی تھی۔ اور اب مجھے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ وہ زندہ رہتا ہے یا مر جاتا ہے۔ صبح سالم میرے ہاتھ لکڑے ہاتھوں میں اس کی باقیات ہی ہاتھ آئی ہیں۔ پہلے تو دل کی ہانک کہ اسے اسی طرح زمین پر دے مادیوں جس طرح دھلی گھاٹ پر دھلی کپڑوں کو بھڑکی بل پر پھینکتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں غیر ارادی طور پر میں ایسا کرنے سے باز رہا۔

میں نے اسے مٹھن کپڑوں کی طرح بھینکنے پر اکتفا کیا۔ یہ ایک خاص ٹپک تھی۔ اگر میرے ہاتھ میں سانپ ہوتا اور میں اسے دم سے پکڑ کر اس انداز سے جھٹک دیتا تو اس کے جسم کی اگلی ہڈی درمیان سے ٹوٹ جاتی۔ لیکن اس شخص کے جسم میں شاید ربڑ کی ہڈی کی جگہ بھی کوئی انتہائی چمک دار اسپرنگ فٹ تھا۔

اس جھینکے کی بدولت میری گردن تو اس کی گرفت میں جانے سے بچ گئی لیکن اس کی کوئی ہڈی ٹوٹنے کا کڑوا کھچے خالی نہیں رہا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ایک لمحے کے لئے وہ کچھ دھبلا سا پڑ گیا اور یوں میرے ہاتھوں میں بھول گیا جیسے اس کے حواس حقل ہو گئے ہوں۔ میں نے اس کی گھریں ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور اسے

میں ان کی نظروں سے بچنے کے لئے تھوڑا سا پکرکات کر گاڑی تک پہنچا۔ ستابہ بڑے اطمینان سے پھیل سیٹ پر سرزرا نچا کئے بیٹھی تھی۔ دو واہ تھوڑا سا کلا تھا اور شیش پھل ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا تھا۔ وہ گویا انتظار کرتے کرتے پور ہو چکی تھی۔

"مکان نہ گئے تھے تم؟" وہ جھکے جھکے انداز میں پوچھی۔
"شکر کہ میں وہاں نہیں رہ گیا جہاں سے واپسی بھی ممکن ہی نہیں ہوئی۔" میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا۔

"اتنی دیر عتاب رہے اور پکڑ کر صرف یہ نمونہ لائے ہو؟
حمیس کوئی ڈھنگ کا آؤی بھی نہیں ملا؟" اس نے کھوکھو کیا۔
"یہ بھی آؤی ہی ہے۔ بس بقول خود اپنے۔ ذرا شخصیت سے مار کھانا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بندر لہا انسان پر اور راست ستابہ سے غائب ہوا۔ بلکہ میں بے شمار انسانوں سے بہرہ یوں بھی آنا کر رہ گیا۔

ستابہ گاڑی سے اتار آئی۔ شیش پھل گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہی چموز کر اس نے دانت پیچے ہوئے بازو بلند کیے۔ وہ بندر لہا انسان کے منہ پر گھونسا رسید کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کا گھونسا ہاتھ پر روکتے ہوئے کہا "اسے ست مارنا۔ عورت کے ہاتھوں مار کر کہا اس کے جذبات بھرنے نہ ہو جائیں۔"

وہ مجھ سے ہاتھ چمڑاتے ہوئے پوچھی "گھوڑا ہاڑ نکلا چڑا۔ وہ بھی بندر سے ملتا جلتا ہے۔ تم کیا بکلا لائے ہو؟ اتنے زوروں کی قازنک ہو رہی تھی۔ میں تو سمجھی تھی تم نہ جانے کیسی خوف ناک چیزوں کو کاٹو گے کہ لاؤ گے۔"

"اسے چپا کر کر تم اس کا ہی نہیں، میرا بھی دل تو زری ہو۔ یہ بہت سی خوفناک چیزوں پر ہماری ہے۔ تم نے انگریزی کا وہ علاوہ تو پڑھا ہی ہو گا جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ ابھی چیزیں پیشہ چھوٹے دیکھوں میں آتی ہیں۔ یہ شخص اس عمارت کی مکمل تصویر ہے۔ میں اسے دست مٹا چاہتا ہوں مگر یہ دشمنوں کی نوکری کئے جا رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر میں نے پروردگار سے اسے غائب کیا "بزرگوار! میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔"

"کیا کہو گے نام پوچھ کر؟ حمیس کون سا مجھ کو اسکول میں داخل کرانا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر ہوا۔ اب وہ دیکھی آہستہ نظروں سے ستابہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اسکول میں نہ سہی۔ لیکن ہو سکتا ہے مجھے تم کو اسپتال میں داخل کرانا پڑے۔" میں نے کہا۔

"انسان کے دل میں کیسی کیسی سرخس ہوتی ہیں۔" وہ لٹھڑی سانس لے کر ہوا "تمہاری ٹھیکو ٹھپ کے لئے تیار ہوں۔ میرا نام امین امین ہے۔"

"میں نے تخف نہیں میرا نام پوچھا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"
"میں حمیس نہیں بتا سکا۔" اس نے ہلکا سا جواب دیا۔
"اچھا۔ ذرا ایل کی طرف چلو۔ ہمیں واپس چلنا ہے۔ اب ہم دوسری اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ دوبارہ شہر چلا سکیں۔"

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لیے میں خوف کا شانہ تک نہیں تھا۔

"بھال گیٹ۔" میں نے جواب دیا "وہاں میں حمیس لٹھڑے پلے رس گلے کھاؤں گا۔"

"مگر مجھے تو رس گلے بالکل پسند نہیں ہیں۔" وہ مسمی جھپکی سے ہوا۔

"جو رس گلے میں کھانا چاہتا ہوں وہ حمیس بہت پسند آئیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے کندھے اچکائے اور آگے آگے چل دیا۔ میں نے اس کا روبرو جیب سے نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ اب اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتا تو اسے گولی مارنے میں مجھے ایک لمبے کا بھی تامل نہ ہوتا۔

ٹپل پارک کے ہمراہیں اسی جگہ آئے جہاں اس کے ساتھی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے وقت وہ جذبات سے عاری مجھے بے ہوا "اگر تم اجازت دو اور میرے ہاتھ کھل دو تو میں اسے بھی اٹھا کر ساتھ لے چلوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

میں نے اسے پلٹے رہنے کا اشارہ کیا اور لاٹھ سے کہا "تم وعدہ نہ کہہ جب بھی مجھے تمہارا اعتبار ہے۔ تم اتنے ایماندار اور سچے آدمی ہو کر اگر پرانا زمانہ ہوتا تو یقیناً تم کسی عدالت کے قاضی ہوتے جہاں تک اس لاش کا تعلق ہے تو میں اسے اٹھا کر لے جانے کی اجازت تم کو نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے اپنے گھر میں پکڑا بیٹھ کھانے کا بالکل شوق نہیں ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی لاشیں جنگل میں ہی پڑی زیادہ جتنی ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو سچہ ناکہ کیڑے کو ذلیل اور خجل کو کوس دھوکے بھی آخر ہم پر کچھ حق ہیں۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ کبھی کبھار انہیں بھی اپنی دائرہ اختیار میں پھنسانے پڑتے ہیں۔"

اس نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر سیدھا ہو کر غامضی سے پلٹے گا۔ ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ شوٹنگ کی لوکیشن سے یہ جگہ کچھ قاصد پر تھی۔ ٹھیک ٹھیک لوگ لوکیشن پر واپس پہنچ چکے تھے لیکن ایک ٹولی کی شکل میں کھڑے ہاتھی کرسپ تھے شاید میرے اور ستابہ کے پاس سے ہی انہیں اسے لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم کہاں ہیں۔ حالانکہ ستابہ ان سے فواد قاصد پر نہیں تھی لیکن کسی کو دھرم کو دھرم جاننے کی بہت نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ مختلف نہیں ہے۔ میں این این نہیں کہہ رہا ہوں۔ اسے
نن کہہ رہا ہوں۔" اس نے غصے کے بتایا۔
"جیسا نام ہے اس نے اسے گھورا۔

"بعض اوقات عجیب آدمیوں کے نام بھی عجیب ہوتے
ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ وہ ستارہ کو مسلسل گھورتے جا رہا تھا
اور میں محسوس کر رہا تھا کہ ستارہ کے چہرے پر سرخی بڑھتی جا رہی
تھی۔ میرے لئے اچھا ہی تھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں
نے اچانک ہی اس کے سر پر ریو اور کا دست دوز سے رسید کیا۔ یہ
ضرب کسی اور کے سر پر پڑی ہوتی تو شاید اسے اسٹریکچر ڈال کر
اسپتال لے جانا پڑتا۔ لیکن وہ صرف ٹوکڑا کر رہ گیا۔

سر جھٹکتے ہوئے اس نے خشکیوں کی نظموں سے میری طرف
دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے راہ چلنے کسی بزرگ کو کسی نوجوان نے
کندھا مار دیا ہو۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے خشکی سے پوچھا۔
"میں نہیں بے ہوش کرنا چاہتا ہوں اسے نن ڈیڑا اور
میرے پاس گھور دھارم نہیں ہے۔" میں نے صاف گولی کا مظاہرہ
کیا۔

"میں جب سعادت مندی سے تمہارے ہر حکم کی تعمیل کر رہا
ہوں تو پھر بے ہوش کرنے کے کھڑاک کی کیا ضرورت ہے؟ اگر
تم پر میری غیر معمولی مضبوطی کا راز فاش ہو ہی گیا ہے تو تم میرے
جسم میں اتنی تو پھوڑ پھوڑاؤں کیوں نہیں گئے ہو؟" اس نے شکوہ کیا۔

"اچھا تو پھر خاموشی سے ناگھیں بھی بندھالو اور ہوشوں پر
لیپ لگالو۔" میں نے کہا۔ اس نے کندھے اچکا دے۔ یہ گویا
رضامندی کا اظہار تھا۔ میں نے اپنی پیش قیمت راتھل گاڑی کے
خفیہ خانے میں فنٹ کی اور گاڑی سے ہی ٹائیلوں کی ڈوری اور چٹکتے
وادی لیپ نکال کر اسے نن کی ناگھیں باندھیں اور منہ بند کیا۔ اس
نے یہ کام واقعی نہایت سعادت مندی سے کرایا۔ اس کی یہ
سعادت مندی مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے
گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھوں کے درمیان پھنسا کر لٹا دیا۔

"میں اسے اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ تمہارا آخری
علاقہ یعنی گولی استعمال کرنے میں اب میں دیر نہیں کروں گا۔"
میں نے کہا اور گاڑی کے چاروں دواڑوں سے لاک کر دی۔

ستارہ بارہری کھڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا۔
"آؤ میں تمہیں لوہیوں پر واپس چھوڑ دوں۔ اگر تمہارے ڈائریکٹر
رائیل بٹ صاحب کے اعصاب نے ساتھ دیا تو شاید وہ باقی شوٹنگ
کھل کر لیں۔ تم انہی لوگوں کے ساتھ واپس آ جاؤ۔ میں تو اب
فوری طور پر اس جگہ کو لے کر روانہ ہو رہا ہوں۔" میں نے گاڑی
کی طرف اشارہ کیا۔ میرے لئے یہ بندر نما انسان بہت اہم ثابت
ہو سکتا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا تم کن جگہوں میں ہو۔" وہ سر

جھٹک کر میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا
اس کے رخسار گویا دھبہ اٹھے۔ "تم نے ذرا دیکھا۔ اس شوٹر
آنکھوں میں کسی بدحاشی تھی؟ مجھ جیسی عورت بھی ایک بار تو
اسے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ یہ شخص اور وہ ٹیچنری جو ایک را
میرے کمر میں کھس گیا تھا یہ دونوں مجھے ایک ہی نسل کے
ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اس کی ذرا اتنی یافتہ شکل تھی ہے
"نہیں خیر۔ نسل تو ایک نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر
"ہم اذکم ہم لوگوں کے نظریات کے مطابق تو نہیں ہے۔ اگر
ڈاؤن کے نظریہ حیات کو تسلیم کر لیں پھر تو ہمیں بھی ان دونوں
اپنے آپواچہ آدمی شمار کرنا پڑے گا۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہے
کہ یہ ان دونوں کا تعلق کسی ایک ہی گروہ یا تنظیم سے ہے۔"
"اب گروہوں اور تنظیموں میں اس حکم کی چیٹھی بھی
جانے لگیں؟" ستارہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کار آمد ہونے کی بات ہے۔ یہ دونوں ان کے لئے نہ جا
کتے انسانوں سے زیادہ کار آمد ہوں گے۔ تمہیں ابھی ان
ملاہمتوں اور افادت کا اندازہ نہیں ہے اس لئے تم ان کا
فحار سے کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"کچھ کچھ اندازہ ہو چلا ہے۔" وہ دھتکتا بولی اور ساتھ
اس کے چہرے پر ایک بار پھر اسی سرخی آئی۔ میں ہنس دیا۔
اس دوران ہم لوہیوں پر پہنچ گئے۔ پونٹ کے افرو شو
پیک اپ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ڈائریکٹر رائیل بٹ
دونوں کو دیکھتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا "یہ لو۔ جن کی فکر
ہمارا آدھا خون سوکھ گیا وہ بیٹے چلے آ رہے ہیں۔"

سب نے آنکھیں جھانکنا چھوڑ کر ہمارا سرٹا ہوا جائزہ لیا۔ جو
ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پر تعجب نہ آتا ہ
پھر رائیل بٹ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا "اللہ جی!
کس سوسے مال تمارا شکر ادا کران۔ ساڑی بیرونی جے چوہدر
صاحب۔ دو ہویں ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"چوہدری صاحب! اے کی تر تر شروع ہو گئی سی؟" میرا
نے آگے آتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی جب آدمی کے کاہنہ پھیلتے ہیں تو اس قسم کے جھنکر
رگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر بات کو ل
ہوئے کہا۔ "ہر حال میں آپ کی بیرونی کو کسی قسم کی توڑ پھوڑ
بغیر واپس آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنی
شوٹنگ مکمل کر لیں۔"

"شوٹنگ کہاں سے ہوگی چوہدری صاحب! رائیل
لٹنڈی سانس لے کر بولا "بیرونی چلا گیا۔"

"کیا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ارشاد موتی چلا گیا؟"

"جی ہاں۔" رائیل بٹ مسکراتے ہوئے بولا "کہہ دیا
وہ اپ سیٹ ہو گیا ہے۔ صحیح ہمارے شخص نہیں دے سکے گا۔ در

وہ دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کے اس طرح فرار ہونے کا مطلب یہی تھا کہ کسی نے اس کی مدد کی تھی۔ اور وہ مددگار شاید اس پاس ہی کسی موجود تھا۔ میری کوئی حس مجھے اس کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

میں دوڑ کر ایک بار بھر گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا اور اس دوران میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ اسے نن گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ ستارہ سے واپس لیا ہوا مشین ہینڈل میرے ہاتھ میں آچکا تھا اور میری نظریں درختوں کے جنگلک لسلے میں بلک رہی تھیں۔

و فضا فضا میں ایسی ہنسی ابھری جیسے کوئی میری حالت دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہو۔ مگر یہ غیر انسانی ہنسی تھی۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا مگر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ میں نے پہچان لیا تھا کہ یہ ہنسی کس کی تھی۔ یہ وہی منحوس چیمینزری بلک برڈ تھا جس سے مجھے ستارہ کے گھر واسطہ پڑ چکا تھا۔ اکثر فیشل کی طرح اس کی بھی سر ملٹی معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کا ذکر ہو رہا تھا اور وہ آج موجود ہوا تھا۔ بلکہ کوئی عید نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی اس پاس ہی کہیں موجود رہا ہو اور کسی پناہ گاہ سے ہماری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہو جس وقت ستارہ اس کا ذکر کر رہی تھی۔

وہ ایک بہت اونچے اور گھنے درخت کی بالائی شاخوں پر پتوں کے درمیان چھپا ہوا تھا اور کسی جھری سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر شاید بالکی سی جھلاہٹ طاری تھی۔ میں نے اندازہ اس جگہ پر کئی بار کر ڈالا۔ بہت سے بچے ٹوٹ کر ہوا میں لہراتے ہوئے اُڑ رہے تھے مگر گھنے لیکن شاخوں کے درمیان ہونے والی کمزراہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ گولیوں سے بچ چکا تھا۔ شاخوں ہی شاخوں کے درمیان کسی اور درخت پر پہنچ چکا تھا۔

گولیاں ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے مشین ہینڈل جیب میں رکھ لیا اور تن بہ نقد ہو کر گاڑی کی اوٹ سے نکل آیا۔ تب وہ بھی پتوں کی پناہ گاہ سے نکل آیا۔ ایک بار بھر مدی خوشیا بہت نما ہنسی ابھری اور میں نے دیکھا وہ کافی دور ایک درخت کی اونچی شاخ پر ایک سی بازو کے سارے جھل رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ذرا اٹھک ساخت کی ایک گن تھی۔ وہ یقیناً اس کی وہی فلینٹر گن تھی جو میں اس رات تاریکی کی وجہ سے صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا جب ستارہ کی کوٹھی پر اس سے سامنا ہوا تھا۔

لیکن آج ہلک بڑی شخصیت میں ایک بہت بڑی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ اور وہ یہ کہ شاید اندازہ فاشی کے کسی پروگرام سے متاثر ہو کر اس نے عاکی رنگ کی ایک ڈاگمیری پٹی ہوئی تھی۔ آج وہ اپنے فطری لباس میں باہر نہیں آیا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ڈاگمیری ہی نہیں تھی بلکہ گاڑی پر اندازہ لگائے اسٹاک میں باقاعدہ ہولسٹر میں گولیوں کی بیلت کے ساتھ ایک روٹا اور بھی بھول رہا تھا۔ سینے پر

میرا ہٹ میں اسی طرف بھاگ اٹھا تھا جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ پللی ایل بجا۔ گولیاں اس کے سینے قریب سے گزری تھیں۔ وہ گولیاں لیکن بے چارے کی حالت غیر تھی۔ اچھا یہ ہوا چلا باٹاری تھی دینا کا مارزن۔

”ویسے مبادلت کا بھی مارزن اسٹاک کا ایک شاٹ آپ کے سرے میں محفوظ ہو گیا ہے۔ اسے ضائع کر دیجئے گا۔“ میں نے لہ۔

”کیا واقعی؟“ راضی ہٹ کی آنکھوں میں شرارت کی چمک بھرا آئی۔ ”وہ تو دیکھنے کی چیز ہو گی۔ تم تو اسے ڈیو پ کر دیا کر دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کریں گے کہ ضائع کرنا ہے یا کچھ اور کرنا ہے۔“

”وہ میرا شاٹ ہے۔ اس کے بدلے حق میرے نام محفوظ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے ستارہ کی طرف توجہ ہوتے ہوئے پوچھا ”تم اپنے پونٹ کے ساتھ آؤ گی یا میرے ساتھ چلا پناہ کر دو گی؟“

”میں پونٹ کے ساتھ ہی آیا ہوں گی۔“ وہ ایک لمحے سوچ کر دلی ”ویسے میرے پاس اپنی گاڑی بھی ہے۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے ان سب کو خدا حافظ کہا اور ابھی کے لئے گھٹنے ٹیک کر ترائیل ہٹ پہ آواز بلند یولا ”چوہہ مری صاحب! دعا کیجئے گا“ یہ قسم تین سینے میں کھل ہو جائے ورنہ میں لنگال ہو جاؤں گا۔“ فائنل سے میری شرط لگی ہوئی ہے۔ اگر تین آدمی غم کھل نہ ہوئی تو اس کا سارا پیسہ بھی واپس اور جتنی قسم تین لگی ہوئی وہ بھی مفت میں اس کی ملکیت ہو جائے گی۔ یہ باقاعدہ معاہدہ ہے۔“

میں نے جاتے جاتے مڑ کر اسی طرح یہ آواز بلند کیا ”آپ بے فکر ہو کر کام کریں بہت صاحب! ہم پاؤں کے بار ہیں۔ آپ کا فائنل سے آپ کو لوٹ کر بھاگ گیا تھا۔ ابھی ہم آپ کو لنگال نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کا ہر نقصان ہم بھریں گے۔ جنگل گول ضرور کھل ہو گی اور ضرور ریلیز ہو گی۔“

پونٹ کے تمام لوگ زور و شور سے تالیاں بجانے لگے اور میں نیز تھوڑے سوں سے اپنی گاڑی کی طرف واپس چل دیا۔ چہرہ منہ بعد جب میں اس مقام پر پہنچا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی تو ایک لمحے کے لئے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں گاڑی کے کادل دو اونے لاک کر کے گیا تھا لیکن اس وقت گاڑی کا پھیلا ہوا اندازہ کھانظر آ رہا تھا۔

گاڑی میں بھاگتے بھیدور سے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اسے ان گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ ایک انجانے خطرے کے احساس سے میرے اعصاب تن گئے۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود سے نن گاڑی کا دو اونہ فائر کی طرف سے کھل سکتا تھا لیکن جس حالت میں میں نے اسے چھوڑا تھا اس حالت میں وہ فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ شہیر کی طرح لڑا سکتا ہوا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

نوح ان تھے۔

بکھ دوڑنے کے بعد میں نے ریڈیو پر ٹوٹی سے رابطہ اور دوران سفر ہی اسے نصیر نواز کا ایڈریس بتاتے ہوئے کہا۔ دو تو میں کی ڈیوٹی لگاؤ کہ آج رات یا کل کسی وقت ایسا کریں کہ یہ شخص مجھے گھر پر اکٹلا لے۔ مجھے اس سے ایک بار مذاکرات کرنے ہیں۔ جب بھی میٹنگ کے لئے ماحول چارہ مجھے فون کر دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سارا" ٹوٹی صہب عادت دیکھ لے کر میں نے مذاکرات زیادہ ضروری نہ ہوں تو ہمیں صرف کر دیں؟ کر لیں گے۔" وہ میرا مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔ "نہیں میں نے کسی سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود مذاکرات کر دوں گا۔" میں نے کہا اور سلسلہ متقطع کر کے ریڈیو کا ٹائیک خیر میں واپس رکھ دیا۔

گھر پہنچ کر میں نے غسل اور کھانے کے بعد باہر جانے تیار ہونا شروع کیا تو مجھے ایک اور کام یاد آیا۔ میں نے گوجرانوالہ کا ایک خبردار لکھ کیا اور رابطہ قائم ہونے پر اسے سہیلہ وحید سے بات کرنا تھی۔

چند لمبے کے انتظار کے بعد مجھے ایک جانی بھائی اور آواز سنائی دی اور میں نے دیکھ لے کر میں کہا۔ "سہیلہ ساد افضل چوہدری مول رہا ہوں۔" "اوہ۔" اس نے ایک طویل سانس لی اور دہو

ایک سچ بھی ہوتا تو شاید وہ بندوں کا شریف معلوم ہوتا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسے سن کر فرار ہونے میں اس نے مدد دی تھی۔ میرا قصہ ایک بار پھر محدود کر دیا اور گو کہ اس نے اپنی فلیئر مین سے مجھ پر قابض نہیں کیا تھا لیکن میں نے انتہائی پھرتی سے جب سے مشین پائلٹ کمال کراس پر قابض کئے۔ میں نے اسے چلاوے کی طرح ہوا میں تلا بازیوں کھاتے اور پتوں کے درمیان دوبارہ غائب ہوتے دیکھا۔

لائسنس آف فائر کا اندازہ کرتے ہوئے گولیوں سے بچنے کی ٹینک مجھے بھی آتی تھی اور میں نے بڑی محنت سے سیکھی تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ شاید وہ بھی اس ٹینک کا مطالعہ کرے گا اس لئے میں نے اس کا توڑ کر کے ہونے کاڑھ کئے تھے۔ لیکن اس جہاز کی ٹینک مجھ انسان سے بہتر تھی۔ اس نے انسانی نفسیات کو دھکا دے دیا تھا۔ میرے خیال میں اسے گولیوں سے بچنے کے بجائے فاصلے تک چلا کر لگائی تھی میں نے وہیں فائر کیا تھا۔ انسان عموماً اس سمت میں چلا کر لگتا ہے کہ وہ اس کا چہرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اس نفسیاتی اصول کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور اپنی جہت لگائی تھی۔ شاید چھینٹری ہونے کی وجہ سے بھی اس کی ملامتیں اور نفسیات مختلف تھی یا پھر اسے تربیت میری نسبت بہتر ملتی تھی۔ اس کا مسئلہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہ مزید کارآمد ٹینک تھی۔ میں نے اسی لئے سوچ لیا تھا کہ میں اس کی بھی مشق کروں گا۔ انسان چاہے تو بندوں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

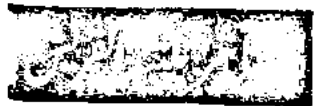
میں دل ہی دل میں چھینٹری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے دوبارہ گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی جواباً فلیئر مین یا ریلوے اور سے فائر کرے گا۔ یا کوئی اور درمیان میں توبینیت ظاہر کرے گا۔ مگر وہ کم بخت آج میرے سامنے اندازے غلط ثابت کرنے اور میرے پورے علم نفسیات کو چکروں پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کیا اور ایک لمبے بعد مجھے بہت دور سے پتوں کی بجلی سی کڑکڑاہٹ سنائی دی۔ میں گری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بدحاشا یقیناً درختوں ہی درختوں پر جنگل کے کچے حصوں کی طرف نکلا چلا گیا تھا۔ وہ غالباً مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے اور یہ بتانے آیا تھا کہ اسے سن کر اس نے فرار کر لیا ہے۔ شاید وہ مجھے یہ احساس بھی دلانا چاہتا تھا کہ میں انہیں قابو میں نہیں کر سکتا۔

میرے خیال میں اب اس کی تلاش میں اپنے آپ کو تھکانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اب اس طرف جانے کی کوشش نہیں کرے گا پھر حرقمی پونٹ کے افراد موجود تھے۔ اس کے اندازے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی اور روانہ ہو گیا تھا۔ میں بھی گاڑی میں بیٹھا اور دائیں شری طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں جہاں میں نے ٹوٹی اور شیر کو چھوڑا تھا وہیں درختوں کے جھنڈ کے عقب میں سڑک سے کچھ دور بکے میں موجود تھے۔ وہ دوبارہ میرے پیچھے آنے لگے۔ بڑے ہی مستحل مزاج

اے حمید کے ایڈوینچر قلم سے شیو سینا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ = 700 رو



اردو بازار لاہور

حکم کی دوسری چیزوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں ان سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میری نظر میں یہ سب فضولیات تھیں۔

بعض سیٹھوں پر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اگر وہ تقریبات کو انجوائے نہیں کر سکتے تھے تو ان میں آتے کیوں تھے لیکن اس سوال کا جواب بھی مجھے معلوم تھا۔ وہ بے حارے یہاں بھی صرف کامیاب کو دعوت دیتے آتے تھے۔ بہت سے کام کے لوگوں کو ایک ہی جگہ پر جمع دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے چلنے لگتی تھیں اور باچیس کھل جاتی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ملک الموت سے بھی منڈی کے بھاؤ ضرور ڈر سکتے کریں گے۔

اس پارٹی میں قلمی دنیا کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ قلمی دنیا کی پارٹیوں کا اپنا ایک الگ ہی مزہ تھا۔ ہر حال میں پارٹی سے واپس آنا تو خاصی ترنگ میں تھا۔ میری عدم موجودگی میں قلمی فن کا جواب دینے والی مشین پر دو ایسے ریکارڈ شدہ بیانات موجود تھے جن کا مجھے انتظار تھا۔

ایک بیٹام تو سیٹھ وحید کا تھا۔ وہ گوجر انوار سے لاہور آچکا تھا اور حسب معمول بیٹن میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے اپنا فون نمبر اور کمرہ نمبر فیو ریکارڈ کرادیا تھا۔ دو سرائیام کوڑو رڈ میں ایک کارکن کا تھا۔ فونی نے اس کی بیوی لکائی تھی کہ وہ نصیر نواز سے میری ملاقات کے لئے سازگار ماحول تیار کرے۔ اس کارکن نے اطلاع دی تھی کہ بیٹنگ کے لئے صبح آٹھ بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ نصیر نواز رات کو در سے گھر آتا تھا اور صبح دیر تک سوتا تھا۔ اس بات کا بندوبست کر لیا گیا تھا کہ صبح اس کے ملازم بھی دیر تک سوتے رہیں۔ کوئی ہماری سختی میں مداخلت کرنے یا ہماری ملاقات کا چشم دید گواہ بننے سے آگے میرے آدمی کام چلے کر تھے اور تیلی بلش کرتے تھے۔ میں مطمئن ہو کر لمبی آن کر سکیا۔

رات کو تقریباً دو زمانہ میں بھی در سے ہی سوتا تھا لیکن صبح چلے گی۔ صبح ایک دو سالہ والی عمر خیزی کی عادت نہیں تھی تھی۔ علی الصباح میں نے بیٹن فون کر کے سیٹھ وحید کو بگایا اور اسے اطلاع دی کہ فلاں وقت میرا ایک آدمی اسے لینے آئے گا۔ وہ اسے جہاں بھی لے چلے، سیٹھ کو بے چوں و چرا چلے آنا چاہئے اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا فون بھی اس کے ساتھ ہے۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر بے پروائی سے کہا "آپ اسے بھی ساتھ لاسکتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے فونی اور شبیر کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور خود معمول کے مطابق تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کر میں نے ناشتا کیا اور صرف کچھ اٹھا کر گھر سے نکل کر آ ہوا۔ گاڑی میں بیٹھے وقت میں نے گزری دیکھی۔ بچے آٹھ بج رہے تھے نصیر نواز کے گھر پہنچنے کے لئے پندرہ منٹ کافی تھے۔

ایک تراز کاتب بھی "چودری صاحب! مجھے یقین نہیں آتا کہ مجھے یاد فرما رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے میرے کان مجھے بے رحم ہیں۔ چودری صاحب! کیا یہ واقعی آپ ہیں؟" میں نے جواب دیا "میں نے سید میں ہی ہوں۔" میں نے شبیر کی سے کہا "آپ! میں نے آپ سے جس کام کا وعدہ کیا تھا، میرا خیال یہی ہے کہ پہنچے والا ہے۔ اگر آپ اپنی آنکھوں سے آخری بار دیکھیں تو آج ہی لاہور پہنچ جائیے اور مجھے اپنے فون پر مطلع کر دیجئے۔"

مہنت میر چودری صاحب! "اس نے سعادت مندی سے کہیں بھر گیا کچھ سوچ کر ہلکاتے ہوئے بولا "اگر آپ نے فون کو تلاش کر لیا ہے تو اسے ہمارے حوالے کر دیجئے۔ میرے اور میرے بیٹے نوید کے جذبات کی بھی کچھ تسکین۔ کسمپرسی اور دولت کے عالم میں بسن کا کٹل ہونا نوید کے لئے برا محکامات ہوا ہے۔ اس کے ذہن پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ اگر ہم رہنے لگا ہے۔ وہ برا جذباتی اور جو بیلا جوران ہے۔ اور جذباتیت میں ہم نے پہلے ہی کو ہاتھ سے کھو دیا۔ اب کچھ غلط قدم اٹھائے۔ وہ بھی اپنے آپ کو بگڑ چکے ہیں۔ اگر اسے خرابیات کو کچلنے میں اس وقت وہ بھی میرے شانہ بہ شانہ چاہئے۔ پھر اسے کاہر اسے مجھ سے فضاں کھا رہا ہے۔ اگر اس کا ذہن دار ہمارے ہاتھوں میں آجائے تو شاید ہم اپنا بچتا ہوا لے سکیں۔"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "نہیں سیٹھ صاحب! جذباتیت نام کاڑھتی ہے۔ اور پھر آپ لوگ ان معاملات میں کافی پگھلتے ہیں۔ جو کچھ میں آپ کو دکھائیں آپ کی جذباتیت کی آگے کے لئے وہی کافی ہو گا۔"

جیسے آپ کی مرضی چودری صاحب! اس نے فوراً ہی اپنی ش دایمیں لے لی "ہمارے لئے تو میں بہت پورا احسان ہے کہ جیسے بڑے آدمی نے۔ یہ نفس نہیں ہمارے لئے اتنی زحمت کی۔ آپ کا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گا۔" اس کی تراز گھوٹ کر نے لگی تھی اس لئے میں نے جلدی سے اسے خدا اعانہ کہہ کر لے حلقہ کر دیا۔

مجھے ایک رگ رگ تقریب میں جانا نا۔ وہاں جا کر میں نے منہ آگوار بائیں بھلانے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک ناپ بہا۔ وہاں ایک سے ایک بڑھ کر زمین چرے تھے جن میں بہتر سے گرومنڈ لاتے رہے اور پور پوری عزت افزائی ہوتی تھی۔ سائنس کے قہرے تھے، لہو کو گناہ والی بائیں تھی، "مہنت! تمہارا کیا تھا۔ سب کچھ میرے ذوق کے مطابق تھا۔" وہ کہنے لگے میں نے ساری انجی الجوائتیں بھلا کر خود کو اس ل میں لگا دیا۔ اس دوران وہ تین سیٹھوں نے حسب عادت مجھ کو سب کے بھاؤ، پھلے کے جوازوں، اس کے پ، کانٹن اور اسی

ہے مسٹر نصیر نواز۔ کہ میں جب کسی سے اپنے طور پر
کرتا ہوں تو عام طور پر ملازموں و رفیقوں کے تحفہات
تبادلہ کرتا ہوں۔ میں نے ڈرینگ ٹیبل کا اسٹول کھینچا
کہا۔

وہ قدم سے متنبہ کر دیا۔ "پھر بھی آپ نے کچل
آپ فون کر دیتے۔ اتفاق سے کہہ دیتے۔ میں خود
کیا کوئی نئی فلم شروع کر رہے ہیں؟ میرے لائق کوئی
آئی ہے؟"

"میں جس فلم کے سلسلے میں آیا ہوں وہ تم اپنی
تقریباً پوری لکھ چکے ہو نصیر! میں نے لاٹت سے کہا
اس کا آخری سین لکھوانے آیا ہوں۔"

میں نے نشاط کی ایک تصویر اس کے سامنے
زندگی سے بھرپور ہنستی مسکراتی ایک خوب صورت
پہچانے ہوئے؟ میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں کی کمرائیں میں خوف کی پرچھائیاں
لیکن وہ کہانی کارنہ سہی "اداکارست اچھا تھا۔ بڑی کام
پرچھائیاں کو مصمصیت کے پردوں میں چھپا گیا۔ اس
شکلیں ابھر آئیں گویا ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی
کوشش کر رہا ہو کہ اس لڑکی کی کس دیکھا تو نہیں؟

بہتر میری طرف دیکھتے ہوئے وہ سادگی سے بولا
بکھتی ہوئی سی توگہ رہی ہے لیکن یاد نہیں آتا کہ
کسی سے وہی لڑکی تو نہیں جو سعد صاحب کے ہم پارٹی
سہ تنگ پول میں مردہ ہائی گئی تھی؟ اس کی شکل تو
تھی۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ اس تصویر میں اس کی کچھ کم
ہے۔"

"بہت خوب" میں نے بھی سی ٹی بیہا کر اسے دار
بڑا قیمت ہے کہ نہیں اس تصویر میں متوالہ نشاط عرو
جھلک تو دکھائی دے گی۔ ورنہ تم ہا ہے تو اس جھلک
ہو سکتے تھے بے شک نشاط کی صورت اس وقت کافی بڑ
جب اس کی لاش سہ تنگ پول کی = سے نکالی گئی۔ ا
پرورش پانے والی ایک نازک اندام مگر ضدی لڑکی جو
ان گھٹ تباہیوں کی بیخست چہرہ چلی ہو جس کے ساتھ
دھماکا ہوا ہو۔ محبت اور شادی کے وعدوں کے نام پر جو
صرف عیش و نشاط کی راتیں بسر کی گئی ہوں جس کے
بچے کو بچے کا باپ اپنا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہو
مگر کھلی کے حالت میں نائیلون کی ڈوری سے جس کا گلا
ہلا کر کھلا گیا ہو جس کی لاش کمر از کم دو ڈھائی گھنٹے
کی = میں رہی ہو۔ اس کی شکل تو بکثرت ہی تھی نصیر نواز!
وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ا
دیکھتے ہوئے کہا "جھلک ہے کہ وہ ایک بلوان لڑکی تھی

گازی میں نے نصیر نواز کے گھر سے کافی دور ایک پمپنی
بارکٹ کے قریب چھوڑ دی اور ملتا ہوا آگے روانہ ہوا۔ اس کی
ٹی میں دریائی سی تھی۔ انکار کا لایاں گزر رہی تھی۔ اس ملائے
کے بیشتر کھنوں کے نزدیک آٹھ بجے کا وقت تقریباً اندازہ میرے ہی
کا وقت تھا۔

چلتے چلتے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد میں یکدم ہی نصیر نواز کے گھر
میں داخل ہو گیا۔ گیٹ بظاہر بند تھا لیکن اندر سے کھلتا ہوا
نہیں تھا۔ میں نے اندر پہنچ کر کھولتے چڑھا دیا۔ نصیر نواز کی کوٹھی
شاندار تھی اور اس کے ذرائع و سے میں دو پیش قیمت کاریں کھڑی
ہوئی تھیں۔ ایک کامیاب فلمی مصنف خاصا خوش حال ہوتا ہے مگر
انہی نہیں جتنا نصیر نواز نظر آتا تھا۔ اور جتنا وہ نظر آتا تھا مجھے
تین تھاکہ اس سے بھی زیادہ دوست مند تھا۔ وہ صرف فلمی مصنف
کے طور پر ہی نہیں اور بھی نہ جانے کن کن پیشیوں میں کتنا
کامیاب تھا۔

گھر کا لان شاندار تھا۔ دروازے امارت لٹک رہی تھی۔
میں ایک ایک کمرے میں جھانکنا آتے پرمتا گیا۔ اس گھر میں نواز
روشنی تو کھوں ہی کے دم سے رہتی ہوگی جن میں سے کوئی بھی اس
وقت مجھے روکنے روکنے کے لئے موجود نہیں تھا۔

آخر کار مجھے نصیر نواز کا بیدار مہل گیا۔ اس کا دروازہ بھی غیر
مخل تھا۔ میرے آگے کسی سے لئے کے لئے جب میرا رات
صاف کرتے تھے تو پھر راستے میں کوئی پمپنی سی رکاوٹ بھی نہیں
رہنے دیتے تھے۔

نصیر نواز اپنے شاندار بیڈ پر آواز چما ہے خبردار سو رہا تھا۔
لٹکے بلکے خراٹے بھی لے رہا تھا۔ میں برف کیس اٹھائے ہوں اس
کے قریب جا کر ہوا چھپے کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کا معائنہ کرنے آیا
ہو۔ برف کیس ساؤنڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے میں نے اس کا کندھا
کراسے بگایا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد آخر کار وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ
بیٹھا۔ اس کی آنکھیں اور چھوٹا رہا تھا کہ پچھلے رات پینے پلانے کا
مخل رہا تھا جس کا اثر ابھی تک باقی تھا لیکن پھر مجھے بچان کر اس
کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور وہ سیدھا جا کر کمر بند گیا۔

"چھوڑی صاحب! آپ یہاں۔۔۔ اور اس وقت؟ میں کیس
خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" اس نے ایک بار پھر آنکھیں ملیں۔
"نہیں یہ خواب نہیں ہو سکتا۔" میں نے گویا اسے نہیں
ایا۔ "کیوں کہ میں مردوں کے خوابوں میں اتنا ہرگز پند نہیں
لراتا۔"

"آپ کی آمد کی کوئی اطلاع۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کو کسی
نے۔" اس نے جلتے ادھر سے چھوڑ دئے۔

"مٹا نام یہ کتنا چارہ ہے ہو کہ میں سیدھا تھارے کمرے میں
کیونکر پہنچ گیا؟ کیا مجھے کسی ملازم و رفیقوں نے نہیں روکا؟ تو بات یہ

تاریک وادی

مصنف
ایم اے
راحت

سرزمینِ افریقہ کے پراسرار گوشوں کی داستان ہے جہاں آج بھی تہذیب کے قدم نہیں پہنچے، اور علم کی روشنی نہیں پھیلی۔ اسی وجہ سے وہاں توہمات، جادو اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اور ہزاروں سال سے وہ لوگ اپنے عقائد کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بھی سرزمینِ افریقہ کے پراسرار گوشوں کی داستان ہے جس میں روئنے کھڑے کر دینے والے واقعات اور ہمالیہ کے دامن میں بکھری ہوئی لاماؤں کی داستان اس کہانی میں ایک خوبصورت اضافہ کرتی ہے۔

تاریک وادی

خوبصورت سرورق © بہترین کتابت و طباعت

جہاں آپ نے قریبی ایک سال سے طلب
دیکھائیں یا ادا کرنے کے نام تک قیمت کا
مقررہ آؤں سال کے مابین
جہاں آپ کو
بذریعہ پختہ آؤں سال کے پختہ کرنا

دو جلدوں میں مکمل

جلد اول : ۱۵۰/- روپے
جلد دوم : ۱۵۰/- روپے
مکمل سیٹ : ۳۰۰/- روپے

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرگرم روڈ، اردو بازار، لاہور، فون ۶۲۲۴۶۶۵

کوش انسان تھا۔

"چوہدری صاحب! کیا آپ واقعی مجیدہ ہیں؟" اس عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"بہت زیادہ مجیدہ ہوں۔" میں نے جواب دیا "میں کھساری زیادہ مجیدہ ہوں تو اور جو لوگ کبھی کبھار مجیدہ ہیں ان کی مجیدگی کسی نہ کسی کو بہت ہماری پہنچی ہے۔"

"آپ بالکل صاف صاف اور سلیس انداز میں بات کی آپ کس لئے آئے ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ گرا طور پر کچھ تیار ہوتے ہوئے بولا۔

"میں کیا اب تک قاری میں مصنفہ کر رہا تھا؟" میرا لہجہ سے کہا "میری مصنفہ ہمارے لئے بالکل صاف اور تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سب کچھ بہت اچھی طرح سمجھ رہے ہیں جانتے ہو جیسے ہی انجان بنے رہنے کا اگر تمہاری نظروں

فائدہ ہے تو بنے رہو۔ میں تو جہاں کہہ کر آتا ہوں وہ کہہ کر آتا ہوں۔ تمہاری فروغ میں ہمیں سنا چکا ہوں۔ تم جیسے خوش انسان ہو" اندر سے اتنے ہی گھٹانے ہو۔ ایک غریب تلو

ہزار ہزار روپے پر قلمی کتابیں لے کر تم چالیس پچاس ہزار میں بیچ رہے اور سر ہٹ مصنف بنے رہے اس غریب آدمی کو بڑھائی ہوئی ہوئی بیٹی کی شادی کے لئے تم سے تھوڑی

مدد طلب کی تو تم نے اسے کسی بیٹھ کے حضرت کدے کی ہاتھ کا شوشہ دیا۔"

اب جیسے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے نمودار ہو گئے ہیں بے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا تم نے گہا کی ہوئی اس شاندار لڑکی شادی کو محبت کے جھانے دے

بیرونی جوانے کا وعدہ کیا۔ اس سے شادی کا وعدہ کیا اور ان پھلا کر اپنی راتیں رنگیں کرتے رہے وہ تمہارے کتابوں

راز سے کبھی انکا ہو گئی۔ وہ تم سے فیصلہ کن جواب لینے پر کہہ کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس نے شاید کتابوں والا راز بھی فاش کرنے کی دھمکی دی ہو۔ چنانچہ

انتہائی سناکی سے اسے لٹکانے لگا دیا۔ یہ تو تمہارے وہ جہاں جو میرے علم میں آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے جہاں فرست اس سے کہیں زیادہ لمبی ہوگی۔"

"قلمی دنیا میں اس قسم کے معاملے ملتے رہتے ہیں۔ صاحب! آپ کیوں اتنے سیرکس ہو رہے ہیں؟ آپ مجھ چاہتے ہیں؟"

"کیا تم حلیم کر رہے ہو کہ ایسا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

حلیم تو میں کچھ بھی نہیں کر رہا۔ میں تو آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ تمام پرانے پھولوں میں فاک اڑا کر خواہ خواہ انہیں چلانا چاہئے۔" وہ اب سنبھل چکا تھا اور پر اٹھو نظر

حفاظت کرتی ملی آئی تھی لیکن اس کی ہڈیوں کی اسے اتنی بڑی سزا نہیں ملتی چاہئے تھی۔ اسے کم از کم زندہ رہنے کا حق تو حاصل رہنا چاہئے تھا۔ میں اس حسین تصویر کو اتنی بے دردی سے مس نہیں کرنا چاہئے تھا۔

"میری کچھ میں نہیں آ رہا آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں! منہمیرہ نواز غیر محسوس طور پر قہر کو نکل کر بولا۔

"یہ بہت گھسا پٹا مکالمہ ہے عام طور پر ایسے موقعوں پر یہی بولا جاتا ہے۔ لیکن تم اتنے بڑے قلمی مصنف مشہور ہو کہ کم از کم تمہیں تو اس موقع کے لئے کچھ اور سوچ کر رکھنا چاہئے تھا۔ خود

تمہیں سوچ سکتے تھے تو سہاؤ جسم سے ہی نکھرا لیتے۔" اسے حیرت کا جو دم چاکا اسے بھی وہ بڑی مثال سے چپا گیا۔

بدستور مصروف ہونا اور سکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب! آپ جیتنا آج صبح ہی صبح مجھے حیران کرنے کی مہم پر نکلے ہیں۔ آپ کی باتیں واقعی میری کچھ میں نہیں آ رہیں۔ آج قلم اپریل بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں یہی کہتا کہ آپ نے اپریل فول

ہٹانے کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔" میرے لئے نہ اپریل فول کی رسم اتنی اہم ہے اور نہ تمہاری شخصیت جس کے لئے میں اپنا ان کا وقت خراب کرنے آتا۔ میں

لے خفا سے کہتا "میں نے تو ایک شرط پاپ اور ایک مصوم روح سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لئے اتنی ذمہ داری اٹھائی ہے۔"

"چوہدری صاحب! میں آپ کو انتہائی مجیدہ اور کافی حد تک غیر قلمی سا آدمی سمجھا تھا۔" وہ زرا سیدھا ہوا کر بیٹھے ہوئے بولا۔

"تم بالکل ٹھیک کہتے تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹھ ہوئے تقریر کیا۔

"لیکن آج آپ کی باتوں سے ظاہر ہوا ہے کہ آپ ڈرامائی پوچھنے پیرا کرنے میں بھی اچھے خاصے ماہر ہیں۔" وہ جیکسی سی

سکرابٹ کے ساتھ بولا "آپ نے مجھے واقعی خاصا حیران پریشان کر دیا ہے۔ میں اس وقت دیے بھی کافی پا کر آتا ہوں۔ لیکن آپ

کی باتوں کے بعد تو کافی کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آپ بھی جیتنا کافی پناہ پند کریں گے۔ میرا شیفت بہت صدمہ

کافی بنا ہے۔" اس کے بڑے کے سہارے کال ٹیل کاٹھ موجود تھا۔ میرے جواب کا انتظار کرتے بغیر اس نے فون دیا اور دبا دبا سی چلا گیا۔ کافی فاصلے پر قابو لیکن میں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ امید بھری نظروں سے دو درازے کی طرف دیکھا رہا لیکن گھنٹی کے جواب میں کوئی نہ آیا۔ اب وہ اپنی آنکھوں میں تشویش کی پچھانچوں کو چھپانے میں کچھ ناکام ہو رہا تھا۔

وہ اٹھنے کے لئے آگے تھکتے ہوئے بولا "یہ لازم چاہئیں

کہاں سرگے ٹھہرنے میں خود دیکھا ہوں۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ یہ ایسی گرفت تھی جو ایک تیل کو

بھی اس کی جگہ پیٹنے رہنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ وہ تو کھنکھایا

یہاں اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے راجرات سے اس کا مقابلہ کیا جائے لیکن اسے صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ ہونا کیا ہے۔

"میں یہاں خون جلائے نہیں خون کا حساب لینے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔ "جو یہے نکلا واقعی جی بہت ہے وقت۔ اگر وہ جیسے تیار ہی کہ وہ کتنے دولت مند باپ کی بیٹی ہے تو تم اس کے ساتھ کبھی بہ سلوک نہ کرتے جو تم نے کیا۔ شاید تم اس کے ساتھ شادی کے ارے میں سنجیدگی سے غور کرتے لیکن بشرطیکہ ظاہرہ خانم کا پلہ بھاری نہ ہو۔" آج کل تیسری نظر ظاہرہ خانم کی دولت ہے لیکن تم اس سے جتنا استفادہ کر چکے ہو اتنی ہی کافی ہے زندگی اب جیسے مزہ ملت نہیں دے گی۔

اس کی آنکھوں میں ایک غلام سا اُتر کر رہ گیا۔ شاید اسے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ نکلا ایک دولت مند آدمی کی بیٹی تھی۔ شاید یہ بات بھی اس کے لئے حیرت کا باعث تھی کہ میں اس کے ارے میں آتا کچھ جانتا تھا۔

"آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟" اس کی آنکھوں میں اب خوف کی ہر چھائیاں واضح ہو چکی تھیں۔

میں نے ایک خوفناک سیاہ رخ اور نکال کر اس میں سامعشہ فٹ کرتے ہوئے کہا۔ "میری ذاتی عدالت انصاف نے جہیں موت کی سزا سنائی ہے۔"

رخ اور رکھ کر اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں محروم سرے ہی لئے وہ کچھ سنبھل گیا۔ اس نے اپنا خوف چھپانے کی کوشش کی اور توکھ نکل کر بولا۔ "چودری صاحب! آپ تک آپ دولت مند آدمی ہیں۔ لیکن ہے آپ کے ہاتھ بھی لپے ہوئے۔ لیکن آپ کو اتنا احساس تو ضرور ہونا چاہئے کہ میں کوئی گھسیار اتھو خیر نہیں ہوں۔ میں انگریزی کا ایک اہم آدمی ہوں۔ میرا ایک نام ہے۔ مجھے کل کے آپ کی راتوں کی فیکس میں حرام ہو جائی گی۔ آپ بچ نہیں سکیں گے۔"

میں سہرا دیا۔ رخ اور سیدھا کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "دلی کے پھلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ جیسے اس قسم کی باتیں کہنے کا حق حاصل ہے کیونکہ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ تم میرے لئے کسی گھسیارے یا تنویر سے بھی کم اہم ہو۔"

اس نے یہ جہر بھی نکال دیا کہ وہ دیکھا تو اپنی دانست میں متلائی بھائی سے کام لیتے ہوئے نیچے کے پچے ہاتھ والا اور چھوٹا سا ایک ہتھول نکالیا۔ میں ہاتھ تو ہتھول اس کے ہاتھ میں آئے تک اس کا جسم گرلوں سے چھلی کر سکتا تھا لیکن میں نے اسے یہ امان دینے کا موقع دیا۔۔۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں اس کی طرف سے غافل ہو گیا ہوں یا پھر میں اس جتنی بھائی کا مظاہرہ نہیں کر

ہتھول ہاتھ میں آتے ہی اس نے بدحواسی میں اندھا دھند نہر

دہا شروع کیا۔ اگر ہتھول میں واقعی سیکڑیں موجود ہوتی ہیں تو میں سے زیادہ گرلیاں قضا کی ہو جی لیکن افسوس کے سیکڑیں ہتھول میں نہیں تھا۔ سیکڑیں میری جیب میں تھا۔ اسے جگانے سے پہلے میں نے احتیاطاً لیچھے کے نیچے ہاتھ مار کر دیکھا یا تھا۔ میرے اندیشے کے عین مطابق وہاں ہتھول موجود تھا۔ میں نے ہتھول غالب کرنے کے بجائے صرف اس کا سیکڑیں نکال لینے کی کوشش کی۔ وہ کی ہار نہ کر دیا چکا تھا اسے احساس ہوا کہ میری سے گرلیاں نہیں صرف کلک کلک کی آوازیں برآمد ہو رہی ہیں۔ اس کی حالت عجیب ہو گئی۔ وہ بھی ہتھول کی طرف دیکھا اور بھی میری طرف۔ اس کے ان اثرات کچھ کرکھے بھی آئی۔

اس نے دھشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اس کا ارادہ پڑا لیا اور ایک نکتہ رخ اور سیدھا کرتے ہوئے "دے دے ہوئے ہے میں کہہ۔" اتھو کر بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ زندگی مزید چند منٹ کم ہو جائے گی۔ ویسے بھی انسان موت سے کہاں بھاگ سکتا ہے؟ مجھے ابھی تم سے چند ضروری باتیں کہنی ہیں۔ ہو سکتا ہے تیسری موت کے کل جانے کی کوئی صورت نکلی ہی آئے۔"

اس نے اتھو کر بھاگنے کا ارادہ ہٹا کر کہا۔ "چہرے پر امید کی ایک لہری بھی آئی۔ اس بار اس نے توکھ لگا تو ہاتھ کاغذ (حق) کی بجلی کی آواز سنائی دی۔ وہ عرض آواز میں بولا۔ "چودری صاحب! آپ دولت مند آدمی ہیں۔ ویسے چہرے آپ کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔ ویسے چہرے کی اہمیت تو کسی کے لئے بھی ختم نہیں ہوئی۔ اگر اس طرح معاملہ رفع دفع ہو سکتا ہے تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔ میرا مطلب ہے کوئی جرمانہ۔ تاوان دفع ہو۔ میں خاصی بڑی رقم آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔" اس نے ہر امید نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "شکایت کتنی بڑی؟" میں نے اپنے لیے سے دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"ہانچ لاکھ۔" اس نے بتا دیا۔ "دولت عجیب چیز ہے اور انسان عجیب تر۔" میں نے کہی مانس لے کر کہا۔ "سچا کہ ایک غریب آدمی ہے۔ اس کی بیٹی گھر بیٹی بوزمی ہو رہی ہے۔ اس شخص کی وجہ سے تم نے لاکھوں روپے عزت اور شہرت کما لی ہے۔ اس نے تم سے ایک لاکھ روپے مانگا تھا تو تم نے نہیں دیا۔ مجھے تم یکدم ہانچ لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہو گئے ہو حالانکہ میں ضرورت مند نہیں ہوں۔ میں سلیبی ہتھول تیسارے دولت مند ہوں۔ اور میں نے زندگی میں کبھی نہیں کوئی کاغذ بھی نہیں دیکھا۔ ہے ہا عجیب بات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"قلندہ چھوڑیں چودری صاحب! کام کی بات کریں۔" وہ مضطربانہ لیے میں بولا۔ "ہانچ لاکھ کم ہیں تو میں سات لاکھ دے سکتا

ہوں۔" اس نے یک دم دو لاکھ پڑھا دیے ملاحظہ اس زمانے میں پانچ لاکھ بھی بہت بڑی رقم تھی۔

"میں نہیں اس سے کہیں سستا چھوڑ سکتا ہوں" میں نے کہا "میرا سلاسلہ صرف بیگ کا ہے۔ سب سے پہلے تم مجھے بیگ بتاؤ کہ تم نے سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں نٹاؤ کو مارا کیسے تھا؟" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بتایا اسی نتیجے پر پہنچا کہ بات تو اب مکمل ی پچھائی ہے، مجھے سب کچھ معلوم ہے اور وہ خود بھی بہ زمان ٹیوشی اپنا جرم تسلیم کر چکا ہے اس لیے یہ ایک بھتہ بیان کہنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

وہ سر جھکا کر قد سے شرمندگی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سب کچھ بالکل غیر ارادی طور پر اور اچانک ہو گیا۔ میں سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں اتفاق سے سب سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ سعید صاحب نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور تواضع کے لیے میرے سامنے کچھ چائیں رکھوا کر خود اوپر اوپر کہیں مصروف ہو گئے۔ سعید صاحب کے ڈرائنگ روم سے گیت ایک کڑی کے راستے نظر آتا ہے۔ اچانک میں نے بی بی کو۔ میرا مطلب ہے نٹاؤ کو اندر آتے دیکھا اور میں اچھل پڑا۔ مجھے معلوم تھا وہ بہت خاص خاص لوگوں کی پارٹی تھی۔ نٹاؤ وہاں مدعو نہیں ہو سکتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں آرمیا

پہنا ہوا کارڈ نظر آتا تھا۔ تو حواچہ کیسے مارنے لگا ہری رکھ لیا تھا۔ یقین تھا کہ وہ کسی اور کے کارڈ پر آئی ہوگی۔ اس پارٹی کا کارڈ کم کسی ایکسٹرا گرل کو جاری نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اتنا تردد کر کے آئی ہے تو کسی خاص مدعو آئی ہے اور اس مقصد کا حقیق میرے سوا کسی سے نہیں ہو سکتا۔ وہ اندر آکر ڈرائنگ روم کی دیوار کے قریب کھڑی ہو کر حلقوں سے اوپر اوپر دیکھ رہی تھی۔ سعید صاحب کا کمر میرا اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ میں جلدی سے ڈرائنگ روم سے نظر کسی کی نظر میں آنے بغیر بھلی راستے سے اسے باغ میں لے گیا۔ سعید صاحب کا باغ آپ نے دیکھی ہی لیا ہے کتنا بڑا ہے۔

سر تنگ چل کے قریب جہاں مصنوعی آبشار سا بنا ہوا وہاں کھڑے ہو کر میں اسے ڈانٹنے لگا کہ وہ وہاں کیوں آئی تھی بہت خفیہ ٹری تھی۔ اس وقت مجھ سے بھی زیادہ غصے میں اسے میرے کماتیں والے چکر کا بھی پتا چل چکا تھا۔ ہونے والے بچے کے قصور سے بھی پریشان تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ رات پارٹی میں سوسائٹی اور علمی صنعت کے بہت بڑے بڑے رج ہورہے تھے۔ وہ بکا ارادہ کر کے آئی تھی کہ ان سب کے سامنے وہ ہر بات کھول کر رکھ دے گی۔ وہ میرے چھوٹے دھڑولے تک آجلی تھی کہ اس وقت میں اس کی ہر بات ماننے کے لیے

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خود نوشت

دہشت گرد

سلیم فاروقی

- وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
- وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہو لہان ہو گئے تھے۔
- "جی کماتیاں" کا ایک مقبول ترین ایڈوینچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

تم کھو گے کہ حمیر کی غلطی آپ جس ایک بی کے لئے بھی نہیں
 سے نہیں رہے دیتی اس لئے تم خود کٹی کر رہے ہو۔ میرا وعدہ ہے
 کہ یہ غریب میرے پاس محفوظ رہے گی۔ اس کی طرف وہ شرافت
 ادا کی۔ ایک تو تم جواد جسم کو آئندہ ہر کمائی سے لئے والے
 سعادتمند میں سے آجودا کر دے اور مصنف کے طور پر اپنے
 ساتھ اس کا نام بھی دلا کر دے۔ کمائی بے شک پوری دے لیتا
 رہے گا۔ دوسری شرافت یہ ہے کہ تم کسی لڑکی کے ساتھ نکاح والا پکر
 نہیں چلاؤ گے۔ اگر کوئی جس میں پسند آئی جاتی ہے تو سیدھی طرح
 اس سے شادی کر لے گا۔ شرافت اور شرف تو یہی کی طرح زندگی گزارو۔
 عیاشی کی کوئی ہے تو اس کے لئے آواز دہیم آواز عورتیں بہت
 ہیں۔ کسی معصوم لڑکی کو جو لئے وعدوں کے سارے موت لوٹا۔
 جس دن بھی تمہارا اس قسم کا کوئی انکسٹریبل میرے علم میں آیا اس
 دن تمہاری وہ غریب میرے کام آئے گی اور میں جی جی جس "خود
 کٹی" کرادوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔ وہ کچھ سوچ کر دلا۔"

"بس تو میرا شوق ہو جاؤ۔" میں نے راجہ اور سے اشارہ کیا۔
 اس نے سائیڈ بیل سے رائفنگ پیڑ اور قلم نکالا اور تجھے
 سے ٹپک ٹپک لکھنے لگا۔ چند سطریں لکھ کر اس نے کاغذ چھڑا دیا اور
 بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے لکھا نہیں
 جا رہا۔ کچھ میں نہیں آتا کیسے لکھوں۔ کوئی دیکھا ہی نہیں بن رہا۔"
 "شرم کرو۔" میں نے مانت سے کہا "تم قسم اندہ سڑی کے
 سب سے بڑے مصنف ہو تمہاری تحریر کی بڑی دھوم ہے۔"

اس کے چہرے پر ہلکی سی غایت کے آثار نمودار ہوئے لیکن
 مجھے معلوم تھا کہ وہ ادوار کی کر رہا تھا۔ وہ کسی بات پر شرمندہ ہوا
 نہیں جانتا تھا۔ اس دنیا میں بعض لوگ ایسی بات سے زیادہ ڈھٹائی
 بے خمیری اور بے حسیتی کی وجہ سے بھی بہت زیادہ کامیاب
 ہو جاتے ہیں لیکن عموماً ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

میں نے اس کا جواز کر پینا ہوا کاغذ بھی اٹھایا خاور اس
 کے ٹکڑوں پر اسیٹھا ٹھہر دوڑائی تھی کہ اس نے میری ہدایت کے
 خلاف تو کوئی بات نہیں لکھ ڈالی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس سے
 چند بے ربط الفاظ کے سوا کچھ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ میں نے کہا
 "لکھو۔۔۔ میں لکھتا ہوں۔"

میں نے لکھنا شروع کیا اور وہ سعادت مندی سے لکھتا چلا
 گیا۔ خط مکمل کر کے وہ حیرت سے کبھی خط کی طرف اور کبھی میری
 طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ نے تو اچھا بھلا دائیوں جیسا خط
 لکھو ادا۔"

"کیا کریں؟ جب تم جیسے لوگ راستہ ہوتے ہوئے چار بیٹے
 ڈھک سے نہ لکھ سکیں تو پھر کچھ جیسے بد وقت اور کم پڑے کئے لوگوں
 کو اس قسم کی خدمات انجام دینی پڑتی ہیں۔" میں نے کہا اور اتر
 بڑھا کر خط اس سے لے لیا۔ اس پر اس کے دھما مودہ تھے مجھے

لے اس میں جین کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔
 ان پر اس وقت کوئی خاص خاور اس دور انڈیا کو شے سے
 باری بٹو جیس کی توازیں نہیں بن سکا تھا۔ اسے اندازہ
 تھا کہ جیسے خطرناک موڈ پر لکھتی تھی۔ ہمارے میں نے
 کی ایک ڈوری اٹھائی اور اس کا کام تمام کر دیا۔ میرے
 میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ پردوں کو باندھنے کے
 میں اپنی باتوں کی اور بھی کئی ڈوریاں پڑی تھیں۔ میں نے
 ہاتھ سے ایک چھاری چھڑا لیا اور اس کی لاش کے ساتھ
 اسے ٹپک پل میں پیسہ بکھڑا۔ میرا خیال تھا کہ لاش بد میں
 نہ ہوگی اور سعید صاحب خود ہی سمجھتے پھرے گے۔ مجھے نہیں
 تھا کہ پانی میں سعید صاحب ترنگ میں آکر تیراکی کے
 کا بھی اعلان کر دیں گے۔ اور۔۔۔ اور مجھے یہ بھی
 نہیں تھا کہ نکلا کی طبی میں کوئی کاغذ دیا گیا ہے جس پر
 کے نام مدد کی درخواست تحریر ہے۔ وہ شرمندہ سے انداز میں
 بھاگ گیا۔

"اصل میں جس بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔" میں
 "نہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قدرت کی بھی آنکھ بھی
 بند کر دیتی ہوتی ہے۔"

"اب طالب کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟" اس نے رحم طلب
 سے میری طرف دیکھا۔

"دیکھو۔" میرا لہجہ دوستانہ ہو گیا۔ راجہ اور بھی میں نے
 ا۔ میرا جس ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں جب
 آیا تو تم نے خبر سوچے تھے۔ اگر جس ہلاک کرنا ہی میرا
 ہو تو اس وقت خاموشی سے گولی مار کر دیا جاسکتا تھا۔
 بل دیکھا کہ کسی کو ہلاک کرنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں

اس نے اثبات میں سہلایا۔ دلیل اس کے دل کی تھی۔
 لے بات باری رکھتے ہوئے کہا "لیکن میرا مقصد محض تمہارا
 سائنسنگ کرنا بھی نہیں تھا۔ میں اصل میں تمہاری
 نہایتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ تمہارے اچھوں کوئی
 ٹھکانہ انجام کو پہنچے جس ہلاک کرنے سے تو نکلا کو
 ادا اس کے آپ کو کوئی ہوئی عزت دیا نہیں میں لے جائے گی۔
 مجھے ایک بگڑتی لکھ کر دے دو تو میں جس کم از کم اس وقت
 سہانہ کرنے کے لئے تیار ہوں جب تک تم وہ بات کوئی ایسی
 اعلیٰ نہ کرکو۔"

"میں آپ کو ہر طرح کا وعدہ لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں"
 کی سے بولا۔

"نیک۔" گارنٹی میرے اپنے انداز کی ہوئی "میں نے کہا۔" مہم
 سعادت سے لکھ کے کہ جواد جسم سے کس طرح کمائیاں لیتے
 کس طرح تم نے نکلا کو دھوکے دئے اور اسے ہلاک کیا۔ پھر

امید نہیں تھی کہ اس عمار آوی اتنی آسانی سے میرے پکڑیں آجائے گا۔

میں نے خلا حفاظت سے نہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اس دوران میں نے ریو اور بھی گود میں رکھ لیا تھا لیکن اس نے کوئی چالاکی دکھانے یا مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ آوی بہر حال قتل منہ تھا۔ اسے اندازہ ہونیکا تھا کہ اس قسم کی کسی کوشش سے بنی بانی بات بگڑ سکتی ہے۔ لیکن اسے میں معلوم تھا کہ اس کی بات تو بگڑی چکی تھی۔

میں نے قتل سے ایک مخصوص آواز نکالی۔ دوسرے ہی لمحے شیر اور ٹولی بے آواز طریقے سے دوا زادہ کھول کر دوا سرا ساہوں کی طرح اندر آئے۔ ٹولی کے ہاتھ میں پرانی رسی کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے کمرے میں آتے ہی بولٹ چڑھا دیا اور رسی کا پھندا اتار کرنے لگا۔ شیر نے بیڑ پر چڑھ کر نصیر نواز کے دونوں ہاتھ پشت پر لے باکر اسے اس طرح قابو میں کر لیا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یہ سب کچھ گویا چشمِ دزدن میں ہو گیا۔ نصیر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے اور جب اس کی سمجھ میں آیا تب تک وہ بے بس ہو چکا تھا۔ ٹولی نے اس وقت تک پھندا اتار کر کے پچھلے کے کٹڑے میں لٹکا دیا تھا اور دزدن تک فیمل کا اسٹریل بیڈ کے قریب مین پھندے کے نیچے رکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے چوہہ ری صاحب؟ نصیر نواز ڈینا۔

"اپنا چینی کا شوق بھی پرار کر لو میری جان! میں نے کائنات سے کہا "میں دیکھ چکا ہوں کہ تمرا اثر کھینچا اور ساؤنڈ پروف ہے۔ شاید تم نے احتیاطاً اسے ساؤنڈ پروف بنوایا ہو گا۔ شاید یہاں تمہارے جال میں پھنسنے والی وہ ایسی لڑکیاں بھی آئی ہوں گی جنہوں نے تمہاری خواہشات کی جھٹ چڑھتے وقت تمہاری ہمت چوں چاں کی ہوگی مگر ان کی آواز اس کمرے سے باہر نہیں جاسکتی ہوگی۔ تمہاری آواز بھی نہیں جاسکتی گی۔ جلی بھی جاتی تو ہم جیسے لوگوں کے لئے کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔"

وہ خامسے تن و قوت کا آوی تھا لیکن شیر نے اسے بچوں کی طرح اچھال کر بیڈ پر کھڑا کیا پھر اسٹریل پر لٹکا دیا۔ ٹولی نے اس وقت اسٹریل پکڑا ہوا تھا۔ نصیر نواز کا چہرہ ہشت سے چٹا چڑکا تھا۔ میں نے یک دم اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے شٹل کے گلے میں ٹائیلوں کی زوری کا پھندا ڈال کر اسے ہلاک کیا تھا۔ تمہیں اس سے ملتی جلتی موت کو سامنے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"لیکن میں نے تو آپ کی ہر شرط مان لی تھی چوہہ ری صاحب! آپ نے وعدہ کیا تھا۔" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"تم جیسے لوگوں کے منہ سے لفظ وعدہ "اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے تمہارے سامنے آکر میں بھی بھول گیا ہوں کہ اس کے معنی کیا

ہوتے ہیں۔ اچھا نہ اچھا نہ۔"

ٹولی نے پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا اور اسلحہ ہتھوں سے نکال دیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ ی لکھوں میں آنکھیں قفلوں سے اٹلی پڑیں۔ جب تک ڈھیلہ نہیں پڑ گیا شیر نے عتب سے اس کے ہاتھ نہیں اس نے ہاتھ چھوڑ دئے نصیر کے جسم کو دو چار ٹکڑوں میں بکھردہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں رسی میں جھولنے لگا۔ کسی حد تک مسخ ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کا دھڑکنے نکیل پر رکھ دیا جس میں اس نے اپنے دو چراغ کر کے ہوئے لٹکا تھا کہ وہ نصیر کی انست سے ٹک کر گرے۔

میں نے ٹولی کو اشارہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں وحید اور اس کے بیٹے کو اپنی گاڑی میں ساتھ لئے ہوئے ہیں۔ وہ ایک مارکیٹ کے سامنے موجود تھا۔ میرے اشارہ پر تھا کہ اسے ریڈیو پر پیغام دے دیا جائے گا کہ وہ یہاں کریمل آجائے۔ ہمارا وہ توئی پیغام ہی کا شکر تھا۔ ٹولی کے ریڈیو کے ذریعے پیغام دے کر چند لمحوں میں ہی وہاں اس کے قہوڑی درپردہ ہی دوا زادے پر دستک ہو کر خود آگے بڑھ کر دوا زادہ کھولا اور بیٹھ وحید اپنے بیٹے کے اندر آ گیا۔ سامنے ہی بھٹ کے کٹڑے میں رسی سے لٹک کر وہی نہیں اس کا جذباتی اور جھٹکا جاتا ہی خوفزدہ رہا۔ "وحید صاحب! یہ ہے رشتہ کا قاتل۔" میں۔

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور مجھے خود بھی عجیب ہوا۔ میرا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں کسی پامانی میں شخصیت سے بیٹھ وحید کا تعارف کر رہا ہوں۔ ان کی اصل نام رشتہ تھا۔ نکلا اس نے اپنا علمی نام بھی اسٹوڈنٹ میں مشہور ہے لی کے نام سے ہو گئی تھی۔ لڑکی کے نام تو تھیں تھے مگر قلمی دنیا میں وہ تھیں میں، تھیں۔ "آپ نے اسے تلاش بھی کر لیا اور اس کے آثار پائے؟" بیٹھ وحید کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ بھی دیکھا اور کبھی میری طرف۔ لاش کی گردن کچھ لمبی ہو گئی تھی۔ "ایسا باتیں نہیں کرتے وحید صاحب! میں۔

ہوئے کہا "انسان خود اپنے اعمال کے ہاتھوں انجام دے اس بے چارے نے تو نصیر کی جھٹ سے مجبور ہوا ہے۔" میں نے نصیر نواز کا نام نہ خود کبھی اٹھا کر بیٹھ دیا تھا۔

اس نے بڑی قوت سے خلا چڑھا۔ اس کا بیٹا بھی گردن آگے کے خلا پر ہی ہٹا رہا۔ کمرے میں مگر اسے اور لاش پر متور کر کے وسط میں بھول دی تھی۔ بیٹھ وحید نے لٹکا چڑھ کر ادراہیں ڈرنے لگی۔

لے ہم سب عجم وائرے میں لاش کے گرد کھڑے رہے اور اس کے
سرخ شدہ سے چہرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے سب کو باہر پھیلنے کا
اشارہ کیا۔ ذرا دیر دے میں پہنچ کر سینہ وسیع یکدم رنگ کر میرا ہاتھ
خام کر دیا۔ انداز میں چہرے ہوئے بولا "میں آپ کو مان گیا
چند ہی صاحب! آپ ہر لحاظ سے بہت بڑے آدمی ہیں۔ میرا آپ
پر جان قربان کرنے کوئی چاہتا ہے۔ آپ مجھے کسی خدمت کا موقع
مہیا کر دیجئے گا۔"

"مہیا ضرور۔ میں آپ کے جذبات کے لئے آپ کا شکر
گزار ہوں۔" میں نے مکانہ انداز میں اس کا کندھا جھٹکتے ہوئے
کہا۔

"میں اسے ایسا آئی شریف۔ خیال کو معتدل انعام دل کا جس
لے اور حقیقت آپ سے حصار رکھ کر آیا۔" وہ بولا۔

"مجھے آپ کی مرضی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "دیئے
وہ بے جاہہ داخلی انعام کا مستحق ہے۔ میرا بھی بڑی بلا ہے اسے
کہ فواز نے کو دل چاہتا ہے۔ میں اس کے انداز و اطوار دیکھ کر
اس کی باتیں سن کر مست مفلطہ ہوتا ہوں۔ پولیس میں ہے مگر
شریف آدمی ہے۔"

"پولیس میں شرقا کی بھی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ مجھے تو
اکثر شریف آفیسرز سے ہی بلا پڑا ہے۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو خوش قسمت ہی کہوں گا۔ مگر کہ اس حلقے میں
تجربہ میرا بھی کچھ ایسا برا نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
پھر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ سب
گوا اپنا اپنا ضروری کام انجام دے کر مطمئن و مسرور واپس
جار رہے تھے۔

واپس میں میں نے اپنی گاڑی انٹرکان کے عقب میں واقع کچی
بستی کی طرف موڑ لی۔ گاڑی ایک جگہ چھوڑ کر کچھ قاطع پیدل لے
کر کے میں ایک گھر کے دروازے پر پہنچا۔ وہ سہا نسیم کا گھر تھا جس
کے کام سے ضمیر نواز کا نام برسوں چمکا تھا۔ میری دستک کے جواب
میں دووانہ تھوڑا سا کھلا اور انہی دو اداس آنکھوں نے باہر جھانکا
جس میں ہلاکی کشش تھی۔ ان آنکھوں میں اب ستارے جھللا
اتھے جسے مگر اداسی کا رنگ پھر بھی اپنی جگہ برقرار تھا۔ یہ اداسی ان
آنکھوں کا ایک حصہ تھی۔ اور یہی ان آنکھوں کا حسن بھی تھی۔
بعض آنکھوں میں اداسی اسی طرح بیکل گئی ہے جس طرح اداسی
پھتوں والی پرانی، معیوم اور پر شکوہ عمارتوں کے عمارتوں میں رکھے
ہوئے مجھے دیکھ جیسے جھللائے ہوئے چراغ۔

مجھے دیکھ کر اس کی پلکیں کی جھلکیں گرجیں اور گھر کا دووانہ
کل گیا۔ رخساروں پر عشق اتر آئی۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر
مجھے راستہ دیا۔ ان کی بیشک میں جانے کے لئے حق میں ہی داخل
ہو کر اگلے ہاتھ مڑنا پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے مجھے
سلام کیا۔ ہونٹ لڑنے سے مگر توازن برآمد نہ ہوئی۔ وہ شاید سلام کے

طاہر بھی کچھ کتنا چاہتی تھی مگر کہ نہ سکی۔ شاید شکر یہ ادا کرنا چاہتی
تھی۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی شادی کے لئے میں نے
اس کے باپ کو سو لاکھ روپیہ دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا اس کے منہ سے
کوئی توازن نہیں نکلی۔ میں اس کے منہ سے شکر کے کا کوئی لفظ نہ سنا
بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ واقعی ایک حد درجہ شریف اور شرمیلی لڑکی معلوم ہوئی
تھی۔ اس کے رخساروں پر عشق اتر آئی تھی۔ اندر قدم رکھنے سے
پہلے میں نے پوچھ لیا مگر سمجھا "سہا نسیم صاحب گھر موجود
ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چھٹی چھٹی سی توازن میں
بیشکل بول پائی "آپ بیٹے۔ میں ابھی انہیں بھیجتی ہوں۔" اس
نے بیشک کی طرف اشارہ کیا۔

مجھ سے گزرتے وقت میں نے دیکھا وہاں چار بانیوں پر
رنگ بگنے اور زرق برق جوڑے پہلے ہوئے تھے۔ وہ شاید اس
وقت جوڑوں پر کچھ ناگ رہی تھی جب میں نے دستک دی۔ بے
جاری واپسی خودی اپنا جینز تار کر دی تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی معلوم
ہوئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ اسے ایک خوشگوار
ازدہائی زندگی دیکھنا نصیب ہو۔

میں بیشک میں جا کر بیٹھایا تھا کہ سہا نسیم گوا اپنا کاپتا سا
وہاں پہنچا اور مجھ سے معاملہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیرا ہو گیا۔ انتہائی
ممنونیت سے وہ بولا "آپ خود کیوں زحمت کرتے ہیں چند ہی
صاحب! کسی ملازم کو بھیج کر مجھے بلوایا کریں۔ میں حاضر ہو جانا
کروں گا۔ فون میرے ہاں ہے نہیں ورنہ آپ فون کر کے مجھے
طلب فرما سکتے تھے۔ اب آپ خود تشریف لائے ہیں۔ سختی بڑی
زحمت کی ہے آپ نے!" وہ ہوا ہاتھ لے لگا کر اس کی سمجھ میں نہ
آ رہا ہو کہ میری بدادرت کے لئے کیا کرے۔

"ان باتوں کا چھوڑے سہا صاحب!" میں نے لافٹ سے
کہا "میں آپ کو ایک ضروری اطلاع دینے آیا تھا۔ نصیر فواز نے
خود کٹی کر لی ہے۔"

میں اپنی بات جلد سے جلد کہہ کر وہاں سے رخصت ہونا چاہتا
تھا جین سہا تو اتنا ہی سن کر تانے میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر
دشمت زدگی کے سے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ ہنس دہم سے ایک
کرسی پر ڈھیر ہو گیا جیسے اس کی ہاتھوں کی جان نکل گئی ہو۔ اس لئے
مجھے مزید کچھ کہنے کے لئے توقف کرنا پڑا۔

"انہار میں تو نہیں آئی۔ یہ خوب خاصی بڑی اور اہم شخصیت تھا
وہ۔" آخر کار سہا کے حلق سے سرسراہٹ ہوئی سی توازن نکلی۔

"انہار میں تو کل بارہوں آئے گی یہ خبر۔" میں نے کہا "میں
تو آپ کو اس سے پہلے خبردار کر کے آیا ہوں کہ اب آپ ظم
انہار میں اس کی جگہ لینے کے لئے تیار رہیں۔"
"کیا مطلب؟" وہ کچھ اور چٹکا۔

لوگ آپ کو تلاش کرتے ہوئے آپ کے پاس پہنچیں اور آپ کو گھلاٹ میں نہ جانے کیا کہہ دیں۔ میں ممکن ہے کہ آپ اخباری کہیں کہ میں صاحب 'میں' تو میرے نواز کو کہتا ہوں کہہ کر میں دنا

”ہاں مجھ سے یہ بھی عید میں تھا۔“ اس نے تسلیم کیا۔
 ”یوں آپ اپنی دلدل سے نکلنے کا ایک اور موقع ضائع کر رہے ہیں اور ایسے شہری مبالغہ انسان کو بار بار نہیں ملتے۔“ میں نے کہا۔
 ”آپ ایسا کیجئے گا کہ نصیر خوازی کی خودکشی کا معاملہ منظر عام پر آئے۔“ اسٹوڈنٹ میں میرے علم پر جس کے انجمن اہل آفاق امور سے مل بیجے گا۔ وہ آپ کے لئے باقاعدہ کسی پریس کانفرنس وغیرہ کا ہتھیار کر کے مناسب وقت پر آپ کو پریس کے تمام لوگوں اور ریڈیو سوں، انٹریکٹوں وغیرہ سے متعارف کرا دے گا اور اس کییکشنل کا پس منظر بھی جس حد تک مناسب سمجھے گا بتا دے گا۔
 ”بہن! جانتی ہوں۔“ میں گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ خصوصاً وہ میرا ہاتھ چاٹتے ہوئے اور
 عقب میں شرف پیرائی بخشے ہوئے کیے جا چکے ہیں۔ ساتھ ساتھ
 فیوجن کارڈ کر دی ہوگی۔ آپ کے شلمان شان تو نہیں ہوگی لیکن
 اس طرح آپ نے پہلے ہمارا نام رکھا تھا اسی طرح بحرِ عزت افزائی
 دلا کر ہی جائیگے۔ اس کے لیے میں بڑا اطمینان محسوس کرتا ہوں۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”ایک آپ اپنے احکاماتے مجھ پر اور ظلم سے جو مجھ لائق استعمال کرتے ہیں کہ انسان شرمندہ ہو جاتا ہے۔ لیکن تاثر شرمندگی کے فائدہ خود اس وقت میں رکوں گا نہیں۔ میں آپ کی چاہنے سے ضرور فائدہ مند ہوتا لیکن میں نے آفس میں کچھ لوگوں کو بچنے کے لئے مت دیا ہوا ہے۔ ویسے خواہ میں آپ کے لئے کتنا ہی بات جاؤں، آج ہی دنوں کے لئے مناسب ہو جاؤں لیکن کسی کو وقت کے میں ایک منٹ لیت ہوا بھی نہیں کرتا۔“

میں اس کے مزید اصرار پر صفحہ ترک کر دئے آخر کار وہیں سے نکل ہی آیا۔ آنس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ہماری آفس لڈیک بچے ہال میں ہمارا ایک پروازر اور چند کارکن کسی چیز کے گرد براؤن لے کھڑے ہیں۔ ذرا قریب جا کر اندازہ ہوا وہ تقریباً چھ فٹ اور دو دو ذیاتی فٹ چھ ذیاتی فٹ سا تھا۔ اس پر سفید کیٹس چڑھا تھا۔ بڑی عمر کی سی بیک کبا کا تھا۔

مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ حامی آفس بلڈنگ میں اتنا بڑا
سل کلاس سے آیا تھا۔ مال وصول کرنے یا ارسال کرنے کے
دو شرکے دو سے ستائیس ہمارے گودام اور ہال وغیرہ موجود
تھے جو اس قسم کے کاموں کے لئے مخصوص تھے۔ آفس بلڈنگ میں
کوئی کام نہیں ہوتا تھا اس لئے یہاں بھی اس قسم کے بارسل
رٹن وغیرہ نظر نہیں آتے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ سب لوگ مہربانہ انداز میں سلام کے پادھر

”مطمئن رہو کہ پاپس کو اس کی تلاش کے قریب اس کا آخری
 خط بھی ملے گا۔ اس میں اس کا یہ اصرار بھی شامل ہو گا کہ وہ کس
 طرح قریب سے اپنی تلاش کے راز آپ کا انکشاف کرنا چاہتا ہے۔“

”جی ہاں۔“ نے ایک بار پھر خوف زدہ ہوئے میں میری بات کا
 مدد کی کہیں پاپس کو مجھ پر تو اس کی موت کے حلقے میں کوئی شہ نہیں
 کرے گی۔“

”ایسا کیا کریں گے؟“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”اس کی اپنی تحریر میں اس کے حلقہ کے ساتھ احرف نامہ موجود ہیں کہ وہ خود بھی کہتا ہے۔ آپ پر کیا کوئی کیوں شبہ کرے گا؟ آپ تو مستحقِ ذمہ دار کہ کوئی جیس پتھر صاحب!“

چند ہی صاحبِ اہل بیتؑ کی طرف سے ہوا ہے۔
 اپنے اہل بیتوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیجئے۔ آپ کا
 خوف باطل ہے۔ اگر کوئی بات ہو بھی تو بھلا میں کس نے
 مشاہیرؑ

ابھی چھٹی تھی کہ یہ تو میں بھولی گیا تھا کہ اب مجھے
 یہ بھی قصیدہ کی سررہی حاصل ہے۔ اس نے طمانیت کی
 لہری سانس لے۔ اس کے چہرے سے ایک لخت ہی خوف تائب
 گیا۔ عجیب ہی تو یہ قادیان تھی۔

میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں اصل میں آپ کو بتانے آیا تھا کہ جو نبی بھی خیر سامنے آئے گی کاپی اپیل بے گئی کی طور پر نبی اپیل دروازمہ کی ہم دیکھ رہی تھی آپ کی تلاش میں جوڑنے کی۔" فیضیہ نواز کے کسی پروردہ رہنے والی اصل شخصیت کو تلاش کیا ہے کہ ایک تو اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ

اس کام کی لڑائی کی وجہ سے بھی جو آپ اب
ایڈمنسٹری کو دے رہے ہیں۔ دوسرے اس لئے بھی کہ ایڈمنسٹری
ایک نئے ہی عہدے مضمنوں کے شعبے میں ایک ایسا نظام ہوگا
جو فوری طور پر کوئی بھی دوسرا مصنف پر نہیں کر سکتے گا۔ یہ کسی
کو خود ہی پوری کٹنی ہوگی۔ آپ کی اپنی کی۔ اس کے لئے تیار
ہے کہ فیروز خان نے جن نئی چیزوں کے لئے کنٹریکٹ کے ہوں گے
جن کے لئے آپ نے ابھی اسے کمانی نہیں دی ہوگی۔ ا
کمانوں کے صرف ایڈوائزمنٹائے گئے ہوں گے ان سب پر
تجزی سے کام شروع نہ کیجئے۔ باقی اور مل کر قتل کے دور
کل آئے آپ کا مانتا نقصان ہوتا تھا ہوگا۔ اب ایک ہنگامہ
مستقل آپ کا خطرہ ہے۔ ہاں سمجھ لیجئے کہ اب آپ ہی فیروز

”کیا واقعی؟“ اس کی دھندھلائی ہوئی آنکھوں میں ان کے
 لیے بڑے خواب، بیاں اٹھے۔ مجھے چین نہیں آتا۔ کیا واقعی
 ہی دنیا کا ستارہ اس کے ہواؤں کا؟

”بے فکر۔ اب آپ کو چین کری لیا جائے۔“ میں نے کہا
اصل میں اسی۔ لے تو آپ کے پاس احتیاطاً پہلے ہی تیار کر

حسن بن صباح

★ شہنشاہ شیش اور پلیمس وقت

جو چھتیس (36) سال تک قلعہ الموت میں ایک نظر فریب جنت ارضی بنا کر بیٹھا رہا اور مسلمانوں کے بڑے بڑے جید علماء کرام اور محدثین، مفسرین، مفکرین اور ارکان سلطنت کے خون سے ہولی کھیتا رہا۔۔۔۔۔ مسلمان دلیان ریاست اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔۔۔۔۔

ایسی ساجر اور مرید کی رنگین اور خوفناک داستان
الماس ایم۔ اے کے سحر انگیز قلم سے۔۔۔۔۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2 قیمت -/125 روپے

برصغیر کا سپہ سے۔۔۔۔۔ آزادی کا متوال

مسلمانان ہند کا رکھوالا۔۔۔۔۔

شہید سلطان ٹیپو

جس کی رہشت سے انگریز موتے سے جاگ پڑتے تھے
اور انگریز بچے سلطان ٹیپو کا نام سن کر چپ ہو جاتے تھے۔

★ ایک بہادر

★ ایک مجاہد

★ ایک شہید

ایک ناول۔۔۔۔۔ ایک تاریخ

الماس ایم۔ اے کے ایمان افروز قلم سے۔۔۔۔۔ قیمت -/200 روپے

وقت کا حساب لینے پر اگیا تو آپ کو لینے کے دے رہے تھے۔
 "آپ ایک سرکاری آفیسر کو دیکھ لیں۔ وہ رہے ہیں۔ اس پر
 بھی آپ کے خلاف مقدمہ درج ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"اس قسم کی بیکانہ باتوں کے جو آپ دینے کے لئے میرے
 گرد پ آف کپنز کو دیوں گی ایک بہت بڑی سینڈیٹ کی خدمات
 حاصل ہیں جس میں بڑے مای گرامی وکیل اور ریٹائرڈ جج و فیو
 شامل ہیں۔" میں نے کہا "اس لئے اس بات کو تو ایک طرف اٹھا
 رکھیں۔ آپ سے میں جو اصل بات کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے الیکٹر
 صاحب۔!" میں نے ایک گرمی سانس لی "مگر آپ سے میری
 پچھلی ملاقات بھی کچھ زیادہ غلطوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔
 اس کے باوجود میں نے آپ کے بارے میں بہت اچھا تاثر لیا تھا۔
 میں آپ جیسے معاون اور اور جرات مند پولیس آفیسروں کا قدردان
 ہوں۔ لیکن دانتہ آری کو دانتہ آدمی کے خلاف ہتھیار مت
 باندھیں۔" میں نے کہا "اگر آپ ایک معاون آدمی ہیں تو میں بھی
 اصول پرست آدمی ہوں۔"

وہ خاموش تھا۔ میں نے اپنی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری
 عمر آپ سے زیادہ نہیں ہے الیکٹر! لیکن تجربات شاید زیادہ ہوں۔
 ہماری سوسائٹی بڑی عجیب ہے۔ اس میں آپ کو بہت سے لوگ ملیں
 گے جو بہت اچھے ہوں گے لیکن آپ کو کسی وجہ سے وہ فلوک و
 شہادت کی دھند میں لینے دکھائی دیں گے۔ کچھ لوگ ہوں گے جو
 بہت برے ہوں گے لیکن وہ آپ کو کسی بہت اونچے سطح پر
 پہنچے ملیں گے۔ لوگ ان کے ہاتھ چرم رہے ہوں گے، پاؤں چاٹ
 رہے ہوں گے لیکن اگر آپ ان کا اصل روپ جان لیں تو آپ
 کو تے آجائے گی اور آپ کا دل چاہے گا کہ ان کی ٹکا ہوئی کہ کے
 چیل کوئی کو کھادیں۔ اور یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔
 لیکن کم از کم ان دونوں قسموں کے انسانوں میں امتیاز کرنا تو
 سیکھیں۔"

وہ بدستور خاموش تھا۔ میں تیزی سے بول چلا گیا "میری بڑی
 خواہش ہے کہ آپ جیسے آفیسروں کی فوکر لی ہو۔ لیکن اگر آپ
 ملحد نمبر کی بینک لاکر چلیں گے تو قدم قدم پر ٹھکر کھائیں گے اور
 آخر کار آپ کا سفر مختصر ہو جائے گا۔ کسی موڑ پر ٹھکر کر بیٹھا پڑے
 گا۔ میں اس ملک کے چند برنس سیکرٹس میں سے ایک ہوں۔ اور
 اس وقت میرے آفس میں جاپان کی ایک بہت بڑی کمپنی کے
 نمائندے بیٹھے ہیں۔ میں نے اس بات کا مت سخت برائیا ہے کہ
 ایک پولیس الیکٹرکٹھن ایک گام اطلاع پر بغیر کسی سرچ وارنٹ
 کے 'بغیر پتلا دم' کے اس وقت میرے ہینڈ آفس کی ملاشی لینے کے
 ارادے سے چلا آیا۔ میں آپ کو صرف قانون کے احرام کے نام
 پر معاف کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ آپ ایک کرپٹ
 آفیسر نہیں ہیں۔ لیکن صرف آپ کے اپنے فائدے کے لئے کہ
 یہاں کہ پلیز آئندہ ایسی کوئی ملاقات مت کیجئے گا۔"

میں اس بات کی دادرے بغیر نہیں ہو سکتا تھا کہ
 ضمانت محل سے میری تقریر سنی تھی۔ وہ اب بھی خاموش
 اس نے ریسرور بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک لمبے کے وقفے
 کا۔ "آپ سنا لیں میں تھے۔ اگر مجھے بھی اپنی طرح ایک
 کوئی کچھ کرو ستانہ انداز میں آئے۔ ہوتے تو میں بھی
 دل کی تلی کے لئے آپ کو پوری بلڈنگ کا معائنہ کر دیتا
 انداز میں نہیں کہ کسی کو شہ ہو تا تب ملاشی نے میرے
 آپ میں شکوت کے اس مظاہرے کی ضرورت محسوس نہیں
 آپ جانتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

"نئے۔ نئے۔" وہ جلدی سے بولا۔ اب اس کا لہجہ
 تھا۔ اس میں اصرار تھا کہ میں تھا "میری ملازمت زیادہ
 نہیں ہے۔ تاہم کاری کی وجہ سے مجھ سے کچھ کھسار غلطی
 ہو جاتی ہیں لیکن اس میں میری بدعتی کا دخل نہیں ہوتا۔ اگر
 میری قدامت کو اور گوری ہے تو اس کے لئے میں معذرت خواہ
 لیکن فرض کر لیجئے میں دو ستانہ انداز میں آیا ہوں اور اصل
 تلی دنا چاہتا ہوں۔ دل کی تلی کے لئے مجھے اس عمارت
 غرق زالی لینے دیجئے۔"

وہ فوجانہ قائلین ضرورت پڑنے پر ہڈیاں ت اور جو
 سے گریز کرنے کا ہنراتے خوب آتا تھا۔ وہ ہر حال میں اپنا
 پورا کہے جانا چاہتا تھا۔ اس نے اب جو انداز اختیار کیا
 میرے لئے قابل قبول تھا۔ میں نے ایک لمبے سو جا پر کھسکا

معروف مصنف

ایم اے راحت کا پر اسرار ایڈیٹر

ناول

طلسم زادہ

جلد اول - 150 جلد دوم - 150



اردو بازار لاہور

کی جگہ صرف مڈ واٹ کے اتفاقاً استیجی کرنا تھا۔

اس نے مجھ سے وعدہ پی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں کون بول رہا ہوں۔ بلکہ میرے رویہ پر اٹھانے کی کہا "ہمارا بیٹھا ہوا تختہ پلندہ نہیں قیام پر ذرا ہی غائب کھڑا؟"

"مجھے تمہارے ہی فون کا انتظار تھا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی لٹ پوٹیا حرکت کرنے کے بعد تم فنی خروں والے انداز میں فون سنو کر گیا کرتے ہو۔"

"کیا کریں؟ ہم جیسے گھٹیا لوگ جب تک تم جیسے کسی اعلیٰ حضرت سے بات نہ کر لیں، جن سانس آتے۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولا "کھلیں بیچ رہا پارسل؟"

"جی نہیں یہ معلوم ہے کہ میں نے اسے غائب کھڑا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کھلیں بیٹھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اسے کھلیں بیٹھا جائے گا۔ ہم صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ الیکٹریکسیم اسے دریافت کر پاتا ہے یا نہیں۔ اور اسے ہم نے تمہاری لڑکھ سے خالی جانتے دیکھا۔"

مجھے اس کی بات کا پوری طرح چھین نہیں تھا۔ میں ممکن تھا کہ ریڈ واٹ کے کسی آدمی نے فونی اور شیرو فیو کا تعاقب کرنے کی کوشش کی ہو لیکن جب میں فنی کو ہدایت کرتا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب نہ کرنے جائے تو اس کا تعاقب کرنا سوت کا تعاقب کرنے کے مترادف ہی ہوتا تھا۔

"کیا الیکٹریکسیم تمہارا آدمی ہے؟" میں نے اچانک ہی پوچھا۔ "کاش وہ ہمارا آدمی ہو سکتا۔" وہ آہستہ کر بولا "کم بہت بالکل بھی بگاڑ نہیں ہے۔ اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسے اس کی ایمانداری سبب ہی تمہاری دم میں پانے کی طرح باندھ دیں تاکہ تم بالکل بچو، بچاؤ ہو۔"

"اتنے چھوٹے سوتے پناؤں سے میں دوڑتا چلوں گا؟" میں نے گویا براہ راست ہونے کہا "مجھے دوڑنا ہی ہے تو میری دم میں کوئی ہم و فیو باندھو۔"

"وہ بھی باندھ دیں گے وقت تو آئے دو۔" اس نے جی شفت سے کہا "ابھی تو تم سے عارف کے ابتدائی مراحل بتل رہے ہیں۔"

"یار۔ دیکھو۔ یہی بات سنو۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "تم بہت باتیں کر چکے۔ میں بھی بہت عرصہ ہو چکا۔ کافی جیس بھی پیدا ہو چکا۔ اب بتائی دو آخر تم کون ہو؟ یہ ریڈ واٹ کیا ہے؟ تمہارے مقاصد کیا ہیں؟ میرے ساتھ یہ بے قصدی چھوڑ چھاڑ جاری رکھنے سے نہیں کیا حاصل ہو رہا ہے؟ خدا کے لئے کسی سوال کا جواب تو دے دو۔ اب تو مجھ پر تجسبات طاری ہونے لگی ہے۔"

میں رکھنے کے لئے اس کی فرمائش پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ فریڈمان اور جانسن اور تھا۔ معاشرے کے بارے میں بیٹھا کچھ اچھے خواب دیکھا تھا۔ ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے لئے کوکر وہی اسے مناسب راستہ نہیں مل رہا تھا لیکن پھر بھی۔ ایسے فوہ انوں کی بدل گئی کرنا مجھے زیادہ پسند نہیں تھا۔

"اگر یہ ایک دوستانہ درخواست ہے تو میں اسے مان لیتا ہوں۔" میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا "مخفی اس لئے کہ تمہیں احساس ہو جائے، تم اپنے ذہن میں میری جو تصویر تیار کر رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے۔ تم میرے وقت پر ایک نظر ڈال سکتے ہو لیکن کسی کو قطعاً یہ احساس نہ ہونے پائے کہ تلاش لے رہے ہو۔ خصوصاً میرے کمرے میں آتے وقت تمہارا رویہ ایسا ہونا چاہئے جیسے کوئی بے وقوف دوست اور اسے گزرتے وقت بس خوشی دیا سلام کرنے آیا ہے۔"

"آپ مطمئن رہتے۔ آپ کو قطعاً کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یہ ایک درمیانی راستہ ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی کوئی کشیدگی نہیں رہے گی اور میرا ضمیر بھی مطمئن ہو جائے گا۔" وہ اس صل سے بھی مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

میں نے رویہ روک دیا اور وائس انکریٹ جیت میں مصروف ہو گیا۔ الیکٹریکسیم کالی ریور بعد میرے کمرے میں آیا۔ اس نے دف بے دف میری ہدایات پر عمل کیا۔ کسی کوشش تک نہیں ہو سکا کہ اس کی تھکاؤ کا شہد کیا تھا۔ چند کیلکس میں ہی وہ کمرے پہنچا وائس چاہا۔

فوریڈ جلی کی لاش کے بارے میں میری ساتویں حس نے مجھے بدقتی خبردار کیا تھا اور اسے دفتر سے روانہ کر دینے کا میرا فیصلہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ کوکر پارسل کی شکل میں اس کی موجودگی میرے لئے کوئی ایسی خاص الجھن پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اسے روانہ کرنے میں مصلحت اس لئے اگت کی تھی کہ ایک کامداری توئی کے دفتر میں کسی بھی لاش کا پایا جانا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔

کچھ دیر بعد جاپانی بائلی رخصت ہو گئی۔ ان سے دوسرے روز مصلحت میں کچھ ملاقات کے لئے وقت مقرر ہوا تھا۔ اس ملاقات میں مزید تفصیلات ملے ہوئے تھیں۔ انہیں رخصت کر کے میں دوبارہ آفس میں ڈگر بیٹھا تھا کہ میرے انٹرکٹ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ ٹیلی فون کیتھرین نہیں ملائی تھی۔ اس کا انداز انٹرکٹ کی میں بھی نہیں تھا۔ اس کا نمبر چند خاص خاص لوگوں ہی کے پاس تھا۔

میں نے رویہ رانڈا تو دوسری طرف سے ایک ششما تواز ٹائی ڈھک دی پھر اسرار اور کیمپلی کی تواز جس کے بارے میں میں فیصلہ کرنے سے قاصر رہا تھا کہ کسی غیر ملکی کی ہے یا اپنے ہی کسی ہونے کی۔ بہر حال اندوہ بالکل صحیح خطہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ نام

مل نہیں کھا۔

"ماہوں میں کیا رکھا ہے۔ نام تو اکثری لوگوں کی مختصر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اب تم اپنے نام کو عی و کبریا افضل چوری۔ نام سن کر ذہن میں گاہوں کے کسی چھوٹے موٹے زمیندار کا تصور آتا ہے۔ گمان کرتا ہے کہ شام کو اونچی سی بکری بانہ کرانی، خشک میں بڑی سی چارپائی پر بیٹھ کر حذر گزارتا ہوگا چڑواؤں کے مسائل سنا ہوگا۔ سہلاتے ہوئے اور گرجو اور ادا میں کھائے ہوئے انہیں قلیل دنا ہوگا اور کسی حمار سے ناگہم دنا ہوگا۔ لیکن تم اس تصور سے کتنے غلط ہو۔ بلکہ تم سے لے والے کو اچھا نامسا ہنکا لگا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔ لیکن کم از کم میں نے کسی کو ہنکا کتنے نبھایا۔"

"تمہاری کیا بات ہے۔ تمہاری شخصیت میں بے نیازی اور بے پروائی غلط فہم تک پائی جاتی ہے۔ نیز میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر آنکھ تمہاری طرف سے تھامے پاس پائی کی طرح کوئی اور لاش آئی۔ اور تھامے پاس جواب میں تمہیں بھجوانے کے لئے کسی یا کسی لاش کا بندھنا نہ ہو سکتا تو پھر شاید مجھ پر اپنی کوئی لاش تبدیل کرنا پڑے۔ حالانکہ اسے لاش میں تبدیل کرتے وقت امت السوس ہوگا۔ وہ امت کام کی چیز ہے۔ بڑے ہنریں اس پاس۔ بڑے گن ہیں اس میں۔ اور پھر وہ حقیقت وہ اس سے زیادہ خوب صورت ہے جتنی باہر سے نظر آتی ہے۔"

"جی۔ اتنی امت ہی کہ اس کرنے کے لئے ہی فون کیا تو میں نے بے زاری سے پوچھا۔"

"تم ان باتوں کو نکال سکتے ہو۔ تمہیں دور اصل امرا نہیں ہے کہ جب میں تمہیں فون کرتا ہوں تو تھامے درمیان اہم گفتگو ہوتی ہے۔ وہ گفتگو سانس لے کر ہوتا ہے۔ اس میں کم از کم یہ احساس تو ہوتا ہوگا کہ ہم تمہارے پاس سے کتنے ہیں۔"

"باخبر بے خبر کا تو مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن ادا ضرور۔ تم میرا وقت مت ضائع کرتے ہو۔ میں نے بے زاری سے کہا۔ "شکر کرو کہ ابھی صرف وقت ہی ضائع کرتے ہیں۔" وقت نہیں کیا کہ تمہیں ضائع کرنے کے پاس میں۔"

"اگر تم مجھے ضائع کرنا نہیں چاہتے تو پھر یہ قازقہ وغیرہ سلیطے میں کراتے ہو؟ ساتھ یہ یہ بھی کہتے ہو کہ اگر میں لاش بھجوائی تو خدایا تمہیں ہی لاش بھجوا دے۔ تو کیا تمہارا یہ ہے کہ آنکھ تمہارا کوئی توی بھجھ کر گولہ کی بوچھاڑ کرنے تو میں اسی طرح سعادت مند سے سر جھکا کر بیٹھ جایا کروں۔ طرح لوگ جام کے سامنے بیٹھے ہیں؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وقت میں تم کی حفاظت ہم کی دینی کرتے ہو۔"

"میں تو کم چاہتا ہوں۔" وہ بڑے مسرور انداز میں ہنس کر کہتا ہے۔ "تمہیں کو بھجلا ہٹ میں جلا کر آسان کام نہیں۔ اور تم بے لوگوں کی بھجلا ہٹ ہم جیسے غریب مسکینوں کے لئے ہوائی لایا ہوا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر الجھا ہوا جواب دے کر مجھے چلنے کی دھش کی تھی۔ میں نے کہا "اچھا توڑی سی سولت کے لئے ادا بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟ ریڈ ڈاٹ تو تمہارا نام نہیں ہے؟" "میرا نام ایڈم ہے۔ جیسے ادا میں قوم بولا جاتا ہے۔ تم مجھے رفاہی کی کہہ سکتے ہو۔" اس نے کم از کم میرے ایک سوال کا اب تو بلا تامل دے دیا۔

"غیر فیکل ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا۔ اور اب ملک جن کے اپنے ہوتے ہیں۔" وہ مدانی سے بولا۔ "ادھ مالی گاڑ۔! میں گراوا تھا۔" تم نے پھر میرے منہ پر خرد دے مارا۔ اچھا خبر۔ اصل بات تو تھامو۔ تم نے اس بے ادبی بے ضروری عورت خورشیدہ جلی کو کیوں مار ڈالا؟" "تک بہت کر رہی تھی۔ ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ ویسے پھر ایسی بے ضروری نہیں تھی۔ جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ خاصی بچی دلی چیز تھی۔ اسے ہلاک کرنا اس لئے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ نالی لاش کے جواب میں تمہیں کوئی لاش بھجوائی تو ضروری تھی۔"

"نالی؟ تمہارا۔ لب ہے وہ کرنا جس نے جنگل میں مجھ اور تھامہ کا قازقہ کی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں دے۔ ناما کام کا آدمی تھا تھامے لئے شکر کہ ہم نے اس کے جواب میں تمہیں خاصی بھلاہی عورت کی لاش بھجوائی ہے۔ صرف اس لئے کہ تمہارے دل میں ان ہاں بچی کے لئے برا درد پایا جاتا ہے۔ ہم نے سوچا۔ دیکھیں تم ان دو بچوں کے لئے کیا کرتے ہو۔" وہ گویا اعزاز کرنا چاہتا تھا کہ مجھے سختی دینی تکلیف ہوئی تھی۔ اور پھر اس احساس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

"کیا بلی سے بھی تمہارا اسی قسم کا سلوک کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نی الحال تو نہیں۔ سروسٹ تو وہ بڑے مزے سے مدد و شب گزار رہی ہے۔ صرف کبھی کبھی توڑی سی اداں ہو جاتی ہے۔ شاید تمہاری یاد میں۔ اس کے علاوہ اسے کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن اس کا وادہ اور تمہارے طرز عمل پر ہے کہ اسے آنکھ بھی کوئی تکلیف ہوگی یا نہیں۔ اگر نالی کی طرح۔۔۔۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا "تم بار بار اس مجاز جھکاؤ اور دھشت ناک قسم کی شخصیت کو نالی کہتے ہو تو مجھے بوا عجیب محسوس ہوتا ہے۔ کم از کم اب تو تم اسے اس کے اصل نام سے یاد کر سکتے ہو۔ یہ پکا نام اس کی شخصیت کے ساتھ کچھ

مکراتے ہوئے پڑھا۔

"وہ۔۔۔ مئی۔۔۔ اللہ نے جو کرم کیا تھا۔ ایک کبیر تو بیٹھے بٹھائے مل ہو گیا تھا۔" وہ ٹوٹی آنکھوں سے سر کھاتے ہوئے بولا "وہی نشانہ عرف بے بی والا۔" چوہدری صاحب! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ بڑے معزز آدمی نے اس کو قتل کیا تھا۔ جو مشہور آدمی تھا جی۔ نصیر نواز نام تھا اس کا۔ قلمی اسٹوریاں وغیرہ لکھتا تھا۔

"اچھا۔۔۔" میں نے انھیں تھوڑی سی پھیلائی۔ اس موقع پر تھوڑی سی حیرت ظاہر کرنا مجھے اپنا اخلاقی فریضہ محسوس ہوا تھا۔

"ویسے مئی۔۔۔ انہیں کی بات ہے۔ یہ ظلموں میں بھی بڑی کمالی ہے۔ کیا شاندار بھلا تھا اس نصیر نواز کا۔" وہ ایک اور معذری سانس لے کر بولا۔ پھر اس نے ہاتھوں طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن خیر۔ آپ کے بچے جیسا شاندار نہیں تھا۔ کافی عرصے سے میری تقریری اور کلمے گلاب میں ہی ہے۔ بڑے بڑے صاحب لوگوں کی کوفیاں دیکھی ہیں۔ لیکن آپ کی کوٹھی جیسی کوٹھی نہیں دیکھی، لگتا ہے آدمی کسی مازن بادشاہ کے محل میں آیا ہے۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "چوہدری صاحب! یہ کوٹھی اور بچے میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم دارا! میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "کوٹھی شاید زیادہ طویل و عریض مکان کو کہتے ہیں۔ یاد ہو سکتا ہے کوٹھی بھلا ایک سی چیز کو کہتے ہوں۔ میں نے بھی اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ تم نصیر نواز کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

"ارے ہاں۔۔۔" اس نے جلدی سے ٹوٹی ایک بار پھر اتنی سر پر رکھی "میں یہ بتا رہا تھا کہ اللہ نے جو کرم کیا۔ نصیر نواز کو اللہ نے قتل دی۔ اس کی غیرت جاگی۔۔۔ نہیں۔۔۔ شاید اس موقع پر یہ کہنا چاہئے کہ اس کا خمیر ماگا اور اس نے خود کٹی کر لیا۔ مجھے زیادہ مغز ماری نہیں کرنی پڑی۔ اس کے لوگوں نے ہمیں اطلاع دی۔ میں موقع پر پہنچا۔ اس کا رتہ بھنے میں لیا۔ تلاش مرہ خانے بھوکالی اور کبیر داخل دفتر کیا۔ جان پھول۔ لیکن صاحب! پولیس والے کی جان کہاں پھوٹ سکتی ہے۔۔۔" وہ مفہوم انداز میں سر جھکا کر ایک لمبے کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ واقعی سیدھا آدمی تھا۔ جس کام میں اسے صحت نہیں کرتا پڑتی تھی اس کا کرپٹ لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور دہلیس والا ہوتا تو شاید نصیر نواز کی خودکشی کے ساتھ بھی کوئی اس قسم کی کمانی مارتا کہ اس نے مجرم کے گرد حقیقت کا دائرہ دودھ بڑھ چک کر دیا۔ مجرم کو احساس ہو گیا کہ اس کی شخصیت کے نقاب ہو کر رہے گی۔ اس کے سامنے کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی "اس لئے آخر کار اس نے خودکشی کر لی۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شریف سیال کے ذہن میں ایسا کوئی خیال

"آجائے گا۔ آجائے گا۔ رتہ رتہ سب کچھ میں آجائے گا۔" وہ عین انداز میں بولا۔ پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریلوے رکھنے کے بعد بھی کافی دیر تک میں سوچا رہا۔ اس شخص کے بارے میں "ان حالات کے بارے میں" اس نے اپنے کے بارے میں جو میرے گرد بنا جا رہا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی سراپا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں کافی دیر انہی خیالات میں الجھا رہا۔

اپنا کبیر قریب ہی رکھے ہوئے انٹرکام کے بزرگ مجھے چلاؤ۔ میں نے ریلوے راٹھارٹا۔ نیچے ریسپنڈنٹ سے کوئی بول رہا تھا۔ وہ اپنا کام کر کے واپس آ گیا تھا۔

"سر! ہم نے مینیجمنٹ سے پارسل لان میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے بتایا۔

"بس ٹھیک ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی اسے دریافت کرنی لے گا۔" میں نے دیکھے کیسے میں آ گیا اور ریلوے روک دیا۔ کمری سانس لے کر میں چند قاتلوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو میرے سے میری سیر پر رکھی ہوئی تھیں۔

اس کے دو دن بعد کا ذکر ہے "میں گھر سے آفس آنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اے ایس آئی شریف سیال اپنا کپڑا آٹن پہنا۔ وہ ایک بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا لیکن کچھ یوں ایک طرف کو بٹکا جا رہا تھا جیسے وہ بریف کیس نہیں "سازو سامان سے بھرا ہوا بہت بڑا صندوق ہو۔"

چونکہ ارلے انٹرکام پر مجھ سے اجازت لے کر اسے اندر بھیجا تھا اور میں نے ڈانٹک دم کی کھڑکی سے اسے ڈرائیو میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹک دم میں ہی بلوایا۔ وہ کچھ بولا یا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ٹوٹی اتنی پتلی ہوئی تھی۔

میں نے اسے ڈانٹک ٹیکل پر ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی سرے پر بیٹھ گیا جو اس کے زیادہ قریب تھا لیکن پھر میری کھانسی نکالوں سے ناپے ہوئے بولا "اوہ! میں تو آپ سے کچھ زیادہ ہی دور ہو گیا۔ مجھے کچھ راز کی باتیں کرنی ہیں۔ مجھے تو آپ کے قریب بیٹھنا چاہئے۔"

اس نے بریف کیس بغل میں دبا دیا اور میرے برابر والی کرسی پر آکر کمری سانس لینے لگے ہوئے بولا "ایک تو یہ آپ امیر لوگ کھانے کی میز پر بھی اتنی جی جی بڑی خواہتے ہیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے کے لئے اچھا بھلا سفر لے کر پڑتا ہے۔"

"مگر انکم ٹوٹل تو سیدھی کرلو۔ پولیس والے کے سر پر اتنی ٹوٹی اچھی نہیں لگتی۔" میں نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا کراؤں چوہدری صاحب۔" وہ معذری سانس لے کر ٹوٹی میز پر گئے ہوئے بولا "ایک کام سیدھا کرتا ہوں تو وہ سراسر اٹا ہو جاتا ہے۔ سراسر سیدھا کرتا ہوں تو تیرا اٹا ہو جاتا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے؟" ہو کھلائے ہوئے کیوں ہو؟ میں نے

سنگتراش

اقلیم علیم

دنیا سے الگ تھلک روپوشی کی زندگی
گزارنے والے اوہام پرستی کے نت نئے میں
رنگے ہوئے جبرین قبیلے کی طلسماتی داستان
آتش کدے کا مقدس پروہت مانینی
پراسرار اور ماورائی طاقتیں اس کی غلام
تھیں۔

جس سے جبرین کا سردار جو با بھی خائف
رہتا تھا۔

ایک سنگتراش کی محبت کا دگداز فسانہ جس
کی محبوب کی روح پروہت کے قبضے میں تھی۔
سحر اور اسرار کے پردوں میں لپی ہوئی ایک
پراسرار داستان نیکی اور بدی کا خوفناک
تصاوم

دو جلدوں میں مکمل

قیمت: حصہ اول =/150

قیمت: حصہ دوم =/150

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

نہیں آیا تھا۔

میں بھتر نکلوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر کار وہ سر
اٹھا کر بولا "لیکن میرے لئے دسرا ملے تیار ہے جی پہلے ہی میں
کام کے ذمہ دے دیا رہتا ہوں۔ اوپر سے افسروں کے سامنے بیکار قسم
کے کام میرے اوپر لا دیتے ہیں۔ سوچو کچھ دن پہلے میں اور آپ
اس قسمی ایکٹس قسم کی چیز کے کمر گئے تھے۔ وہی جس کا نام بنی
تھا۔ آپ کو یاد ہے؟"

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا۔ اس دوران
خانہ ماں نے شریف سیال کے سامنے ناشتہ سجا دیا تھا۔

"ناشتہ تو میں کھانا اچھی کے ہوٹل سے کر کے آیا تھا۔ لیکن خیر
۔ اب اتنی اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر انکار کرنے کو بھی دل نہیں
چاہتا۔" وہ آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ تم جی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" میں نے
اسے یاد دلایا۔

"جی کے بارے میں کہاں جی۔ میں تو آپ کو اس کی بات کے
بارے میں بتانے لگا تھا۔" وہ سر جھٹک کر بولا "میں جب ان کے ہاں
پہنچے تو وہ دونوں میں اپنی انوا ہو چکی تھیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔
"آج میں اس کی بات کو دفن کر کے آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" مجھے ایک بار پھر حیرت زدہ ہونے کی اداکاری
کرنی پڑی۔

"ہاں نہیں کہاں سے اس کی لاش تک چڑی۔ ایک نوکرانی کو
اس کی لاش جیسے والے لان پر رکھی ہوئی ملی تھی۔ باقاعدہ میت
میں تھی۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم، کہاں سے آئی وہ لاش۔ کب
آئی وہ لاش۔ کیوں آئی وہ لاش۔" وہ عمر کے ہاتھ کا منہ
کرتے ہوئے بولا "افسراں کو اس قسم کے کاموں کے لئے میں ہی
سب سے اچھا آدمی نظر آتا ہوں۔ ویسے بھی اس کیس کا تعقیب
افسر شروع سے میں ہی ہوں۔ حالانکہ میرا عہد چھوڑا ہے۔ یہ کل
دفعہ کے کیس میرے کھاتے میں آئے تو نہیں چاہئیں لیکن افسراں
بھی دیکھ لیتے ہیں کہ کس معاملے میں جان ناری زیادہ ہے۔ میں اُدھر
شریف سیال کو لگا دیتے ہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے کہ مسافر
خورشید جیل کو کس نے مارا اور لاش اس کے گھر کیوں بھجوائی۔"

"پوسٹ مارٹم ہوا تھا لاش کا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ لاش اگر ہمارے ہاتھ آجائے پھر کارڈ والی تو پوری
ہوتی ہی ہے۔" وہ فریج ٹرسٹ چناتے ہوئے اور ساتھ ہی کافی کا پڑا
ساکھٹ بھر کر تیزی سے نلکے کے بعد بولا "اپنے میڈیکل افسر کی
سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ نشانیوں تو بارت لیل
والی ہیں۔ اور بارت لیل ہونے کی وجہ کوئی بڑا صدمہ بھی ہو سکتا
ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے داغ پر قانع نہ ہو۔ اب تا کہیں
بھلا یہ بھی کوئی رپورٹ ہے؟ اس قسم کے ڈاکٹروں کی قابلیت دیکھ

طرف جا جا تھا کہ سانیکل ہر ایک کم عمر سا لاکا آیا اور یہ برف کیس
مجھے دے کر ہوا کہ گاڑی میں کوئی وہ توئی سامنے والے سونے پر
موجود تھے انہوں نے دیا ہے میں نے اس طرف دیکھا ہر طرف کے
نے اشارہ کیا تھا ہر ایک کار تو واقعی موجود تھی لیکن میرے
دیکھنے تک وہ تیزی سے ایف سی کالج کی طرف روانہ ہو چکی
تھی۔ مسئلہ کلنی تھا میں نے تو یہ دیکھ سکا کہ گاڑی میں کتنے لوگ تھے یا
ان کی شکلیں کیسی تھیں اور نہ ہی کار کا نمبر دیکھ سکا۔ سانیکل والا
لڑکا ایک طرف چلا گیا۔ کار دوسری طرف چلی گئی۔ میں کچھ میں
ہو نفوس کی طرح کھڑا رہ گیا۔

وہ ابھی تک ہوشی معلوم ہوا تھا لیکن یہ بات میں نے اس
سے نہیں کہی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "برف کیس" ونگا
صیں لگا ہوا تھا میں نے تو دوسرا کھول کر دیکھا تو تھوٹ بھرے
ہوئے نظر آئے۔ قسم سے میرا تو دل بیٹھ گیا چوہری صاحب! میں
نے اپنے تپ سے کمالے بھی شریف سیال! اتیرے شاندار گہریر کا
تو غائب ہو گیا۔ آج تو ذلیل کر کے مجھے سے بچا جائے گا اور ڈی
ایس بی بننے کی مسرت میرے دل میں ہی رہ جائے گی۔ میں نے تو
وہیں کھڑے کھڑے اپنی نوکری کو خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

"کیوں بھئی! اپنی پریشانی کی کیا بات تھی؟ میں نے اس کے

انداز سے ملحوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔
"کلام ہے جی۔ سوک پر کھڑے توئی کو کوئی راہ چن آوی
یوئی تو برف کیس میں ٹوٹ بھر کر میں پکڑا جاتا۔" وہ میاں نہ لے
میں بولا "پتہ خیال تو میں کیا کہ کسی نے مجھے رشتہ خوری کے
کیس میں پھنسلے کا بکا بعد دست کیا ہے اور میں اب کسی بھی لمحے
ایف آئی اے، سی آئی اے، ڈی آئی اے، آئی آئی اے اور جانی اے قسم کی ایجنسیاں میں
میں کون کون سی آئی اے اور جانی اے قسم کی ایجنسیاں میں
گردن ہانپنے کے لئے چلی آری ہوں گی اسٹیشن وائے تو شاید
فوز کر افروں کو ساتھ لیے کر آئے ہوں گے کہ برف کیس
سمیت میری قصوریں کبھی بائیس۔ قریب ہی ایک گز کا نہ کھلا
نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا برف کیس اس میں بیٹھ سکتا ہوں۔ لیکن
یہ کم بہت توں میں جی جیب ی کشش ہوئی ہے۔ خواہ وہ ان کی وجہ
سے ہی توئی کی جان پر مبنی ہو مگر پھر بھی انہیں بچنے کو نہ سکا
چاہتا۔ چنانچہ میں بھی خوفزدہ فرخوش کی طرح ہانکا چلا گیا۔ برف
کیس بغل میں ہی رہا۔ رکھنا کل سے اس کو چھپا کر بھاگ رہا ہوں۔
مجھ میں نہیں آ رہا کیا کول گیانا کھلا۔"

میں کچھ گیا تھا کہ برف کیس اسے سینہ دھیرے بھجوا دیا تھا
لیکن سینہ دھیرے چمکے اندر میرے میں یہ کہ شریف سیال کو نوازا
چاہتا تھا اس لئے میرا اس ضمن میں زبان کھلنا مناسب نہیں
تھا۔ شریف سیال نے ایسا کوئی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا لیکن
سینہ دھیرے جیتا فیاض معلوم ہوا تھا۔ چمکے اس کی دلی تسنا
پوری ہو گئی تھی اس کی جینی کا قاتل کبیر کواد کو پہنچ گیا تھا اس

کر تو میں سوچا ہوں کہ میں بھی تو وہی بہت محنت کرتا اور ڈاکٹر
میں جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔"

"ڈاکٹر! سرجن نے ٹیکہ ہی کھسا ہے۔ بعض کیسوں میں
بہت اسی طرح ایسی ہوتی ہیں۔ سر مل۔ اس صورت پر تشدد
کی کوئی علامات نہیں دلی تھی؟"

"نہیں۔ ایسا تو کوئی ذکر نہیں ہے رپورٹ میں۔" وہ منہ
پلاتے ہوئے بولا "رپورٹ میں دفتر میں ہی فائل میں لگا دیا ہوں
وہ تب کہ کھانا تھا۔"

پاشا قسم کے اس نے ڈاکٹر اور ڈاکٹر کے ساتھ ہی وہ یکدم
اچھا خانا اچھا پڑا "واہ چوہری صاحب! میں بھی بالکل ہی پودھ
ہو جا رہا ہوں۔ یادداشت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ جس مسئلے پر تپ
سے سب سے پہلے بات کرنی تھی اسے بغل میں ہی دبائے بیٹھا
ہوں۔"

وہ اپنا برف کیس ہاتھ کرتے وقت بھی اپنے پلوں میں رکھے
بیٹھا تھا اب اس نے اسے میرے رکھ دیا اور اس کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے بولا "یہ جی اصل مسئلہ جس کے بارے میں میں
تپ سے مشورہ کرتے آیا ہوں۔ فکر ہے تپ جیسا چوہری توئی مجھ
جیسے مجھے اس طرح کا دست بن گیا ہے ورنہ میری تو کچھ میں ہی
نہیں آ رہا تھا کہ مشورے کے لئے کسی کے پاس جاؤں۔"

"اس میں کیا ہے؟ میں نے برف کیس کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے پوچھا "کوئی بہ فریو ہے؟"

"ہم ہو آ تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوئی چوہری صاحب! وہ
ایک اور ڈاکٹر لے کر ہوا "اس میں ہم سے زیادہ خطرناک چیز
بے حد سنا کے سامنے فساد کی جڑ تھوڑے جس سے ہم بھی خریدے
چاہتے ہیں اور ہم چلانے والے تھے۔"

"شریف سیال! تم تو اچھے خاصے قفسی ہوتے جا رہے ہو۔"
میں نے معنوی تشویش سے کہا "مجھے ڈر ہے، میں پولیس کی
نوکری سے نکل نہ دیا جائے۔ تمہارا مطلب ہے اسی برف کیس
میں رہا ہے؟"

"ہاں جی۔ پورے دو لاکھ دو پچیس ہیں۔ میں نے تقریباً دو ہزار
زبردستی کیے ہیں۔" اس نے برف کیس کھول کر میرے سامنے
کھولا اس میں سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں سلپتے سے رکھی ہوئی
تھیں۔ ان نوٹوں ہزار اور پانچ سو کے نوٹ جاری نہیں ہوئے
تھے اس لئے سو کا نوٹ اتنا بے وقعت نہیں لگتا تھا اور دو لاکھ
دو پچیس خاصی بڑی رقم معلوم ہوتی تھی۔

"کیا پریشانی ہے۔ اور اس رقم کی کیا کہانی ہے؟ میں نے
سکراتے ہوئے پوچھا۔"

"واہ چوہری صاحب! آپ نے تو برف تانے میں بات
کر لی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "کہانی اس کی یہ ہے کہ کل میں
فائل سے نکل کر دیکھنے کی تلاش میں فلتا ہوا میں مارکیٹ کی

ہو۔ اور کسی حوصلے کی وجہ سے وہ خود سامنے کرنے سے بچا ہوا۔
ہو۔ میں نے کہا۔

”چوہری صاحب! آپ تو ہو سکتا ہے کسی آزمائشی میں میرے سارے مسئلے حل کئے جا رہے ہیں۔ آپ کی باتوں سے مجھے مل جل کر حوصلہ قوت مل رہا ہے لیکن پھر بھی مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے مجھے پھانسنے کے لئے یہ چاہا پیٹا گیا ہے۔ کوئی ذرا مار دھلا دیا۔ پھر میں خود بھی اپنے آپ کو سخت طاقت کہتا ہوں کہ اگر پورے دوائے کو اٹا ڈروں کہ بھی نہیں ہوتا چاہئے۔ اس کی اواز اچنی پھونکی بھی نہیں ہوتی چاہئے۔ لیکن خود میرے سمجھانے کا توڑ ہر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے آپ سے شوق کرنے چاہتا ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”بھئی! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ مدد ہے تو آپ چھتاری کھیت ہو رہی تھی۔ یہ تمہاری کھیت نہ کچھ ضروریات تو ہیں گی کہ چوہری کرو اس رقم سے۔“ میں نے کہا۔

”ضروریات کا کیا ہے چوہری صاحب! وہ طول سانس لے کر بولا۔“ انسان کی ضروریات چوہری کرنے کے لئے تو کاغذ کا خزانہ بھی نکالتی ہے کہ پانی میں چل کر ضروریات نکال کر ہوتی ہیں اور خواہشات نکال کر شروع ہوتی ہیں۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا شاید وہ اتنا سادہ فطرت میں قابض نہیں سمجھتا تھا۔ میری بات بھی کر سکتا تھا۔ ایک کے وقت کے بعد میں نے کہا۔ ”بھئی! اگر تمہارے پاس ذاتی مکان نہیں ہے تو کوئی اچھا سا مکان دیکھ کر خرید لیا۔ رقم تم پر بے گار میں دے دیا۔ گھر بچوں کے حق میں کی سب سے اچھا کام ہے۔“

”گھر ہے قدرت مجھ پر مہربانی نہا۔ مرزا ہاں ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ کھل گئیں۔“ یہ رقم تو چھپو بھاڑ کر تنگی تھی اب آپ اور بھی دینے کو تیار ہیں۔ اور آپ جو یہ مکان کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تو اس دفعہ کی ذمہ داری سب سے پہلی حیرت ہے۔ لیکن مسئلہ پھر وہی تن پڑتا ہے جی ساگر میں نے اس قسم کا کوئی کام کیا تو اغشی کرشن والے تو میرے پیچھے لگ جائیں گی۔ آپ کو معلوم ہے۔ اغشی کرشن میں ایک شیعہ ہوتا ہے جس کا نام سرکاری ملازمتوں کے رہن سہن کا سوئے گا ہوتا ہے اس کے کاروبار کو نئی دستانہ سے انداز میں کسی سے ملے آتا ہے ہیں۔ باتوں باتوں میں پچھلے ہیں مکان ذاتی ہے یا کرائے کا۔ اگر کرائے کا ہے تو کرایہ کتنا ہے۔ دستانہ انداز میں سرکٹ ایک لیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ توئی کون سا راز دیتا ہے۔ فریج دیکھتے ہیں کسی قسم کا ہے۔ گھر کی جھلوت دیکھو کیسی ہے۔ کھانا پکانا کیا چاہئے۔ پچھلے ہیں ایک دستانہ سی اور اختیار سی طاقت ہوتی ہے لیکن اس میں وہ سب کچھ نوٹ کر کے لے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اس کاربن سن اس کی تحفہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کی رپورٹ کرتے ہیں۔“

تھے وہ اس باب میں کسی نہ کسی کو ضرور نوازنا چاہتا تھا۔ مجھ سے تو وہ بچے کی بات کرنے کا اس کی حوصلہ میں چسکا تھا۔ میں چیتا اس قسم کی بات کا برا سا جا بگ چنانچہ اس نے شریف سیال کو منتخب کر لیا تھا جو اسے مجھ تک پہنچانے کا ذریعہ تھا۔ ممکن ہے قدرت نے ہی یہ شریف سیال جیسے سیدھے کوئی کو نوازنے کا بہانہ بنایا ہو۔ اس بھی ہاتھ کے کام پڑے۔ عجیب ہوتے ہیں۔

میں نے پتے ہوئے کہا۔ ”زمین کی میں پہلی بار ایسا پولیس والا دیکھا ہے جو اس لئے پریشان ہے کہ اسے رقم دے دی گئی ہے۔ ورنہ پولیس والاں کو تو معنی اسی بات پر پریشان دیکھا ہے کہ انہیں رقم کیوں نہیں دی گئی۔“

”چوہری صاحب! اب آپ سے کیا پتہ۔ بات اوقات کی بھی ہے کہ۔“ وہ سر جھٹکاتے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے جو ان کی تک نہیں نے فریسی فریسی دیکھی ہے۔ پولیس کی تو کسی میں آنے کے بعد بھی تو تک میں نے کسی کیس میں ہزار پانچ سو سے زیادہ کا معاملہ نہیں کیا ہے۔ ایک دم دلا کہ وہ بچے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھل گئے ہیں۔ کچھ میں نہیں آتا یہ نکال سے نکھ پڑے۔“

”بھئی! ہو سکتا ہے کسی نے تمہاری کسی بات سے خوش ہو کر تمہیں انعام سے نوازنا ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن اس طرح انعام اور پراسرار طریقے سے؟“ اس نے بے چینی سے سر ہلایا۔ ”چوہری صاحب! آج کل تو کوئی کسی کو دس روپے بھی دیتا ہے تو دس مرچہ بنا کر دیتا ہے۔ اور پھر میں نے تو ان دنوں کسی کا کوئی خاص کام بھی نہیں کیا۔ کسی کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ سارے شکار قتلے کا وہ سراسر حملہ ہی مارے جا رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے تم سے لاٹری میں کوئی ایسا چھوٹا سا کام سرزد ہو گیا ہو جو کسی کے لئے نہاد اہمیت رکھتا ہو۔“

”اگر کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے خلو کا کام مجھ سے اٹلی میں سرزد ہوا ہے تو پھر وہ اتنی جلدی رقم خالص کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کرنا؟ جب مطلب ہی اٹل گیا تو ایسی کوئی بیوری نہ گئی۔ مطلب اٹل جانے کے بعد تو آج کل بھائی بھائی کو نہیں پوچھتا۔ اولاد میں باپ کو نہیں پوچھتی۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو باپ میں ہانپنے کے لئے کون سا بیورو لے کر بلا ہوا سپاہیں شکاری ہوتے ہیں وہ انہیں لات مار کر اس وقت لگ جا کر رہنے لگا جب انہیں سارے کی ضرورت پڑی۔ مطلب لگ گیا تا اس لئے۔“

شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اور شاید اس کے پیچھے اس کا اپنا وہی کیس تھا جس میں ہوا تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں نے مجھے نوازنا ہی تھا تو مجھ سے مل کر مجھے ساری بات بتا کر ہی تو رقم دے سکتا تھا۔ اس صورت میں مجھے اطمینان تو جاتا۔ رقم مجھے ہضم تو ہو جاتی۔“

”ہو سکتا ہے وہ شخص دولت مند ہو طبیعت فاضل پائی

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔ کسی لمحے تک میں ہنستا رہا۔ شریف جال جیت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو وہ تشویش زدہ سے مجھے میں بولا "چوہدری صاحب! اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟"

"تمہاری باتیں سن کر کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ تم پولیس میں ہو۔" میں نے کہا "بھئی، تمہوں کو کیا ہے۔ مجھے تو ہمارے ملک میں دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہیں۔ کیا کسی مجھے نے آج تک وہ مسئلہ حل کیا ہے جس کے لئے وہ قائم کیا گیا تھا جس نے تو اس مسئلے کو دنیا "ہمارا" دس گنا کیا ہے۔ حسبِ توقع ہوا ہے۔ مجھے ہمارے ہاں مساکل کا پولیڑی قارم ہیں۔ وہاں ان مساکل کی اندرونی نسل ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، اس وقت ہر چیز کی پراکسی زیادہ کنٹرول میں تھی جب پراکسی کنٹرول کبھی نہیں بنی تھی۔ اس وقت کرپشن کم تھی جب اخقی کرپشن کا محکمہ نہیں تھا۔ اس وقت بجلی کی کمی کا شور سننے میں نہیں آتا تھا جب واپڈا نہیں تھا۔ اس وقت جرائم کم تھے جب پولیس کم تھی۔"

"دراصل۔۔۔ چوہدری صاحب! پہلے آپ لوگوں بھی تو کم تھے، شراعت پہلے نہیں تھے لوگوں کا سمیاد زندگی اتنا بلند نہیں تھا۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ مساکل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ پہلے چلے جاتے ہیں۔" اس نے دلیل دی۔

"تو میرے بھائی! مجھے اسی لئے تو قائم کئے جاتے ہیں کہ وہ آبادی کے پھیلاؤ، زمانے کی ترقی وغیرہ کو بر نظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ اپنے حصے کے مساکل کو حل کرنے کے لئے اقدامات کرتے رہیں۔ منصوبہ بندی کرتے رہیں اور جو اقدامات بھی ضروری سمجھیں، کرتے رہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کے لئے وساکل کہاں ہوتے ہیں جی۔" اس نے ایک بار پھر تمہوں کا دفاع کیا "ہر لمحہ ہمارے خیامی خاندان کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس کے لئے خدو نہیں ہوتے۔ اگر کوئی تجاویز پیش کرتا ہے تو اوپر بیجا ہوا کوئی رنجیت حکم قائم کا ہو سکتا نہیں مسترد کر دیتا ہے اس لئے مجھے بھی سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر اصرار سے لوٹنا میں لگ جاتے ہیں۔"

"یہ سب تمہیں ہیں۔ بے کار باتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن کہ ہم سب نے مل کر کوشش دے دی ہے کہ ہمارا ملک ایک خوب ملک ہے اس لئے ہر کام کے سلسلے میں ہمارے پاس بہترین غرض موجود ہوتا ہے کہ جی خدو نہیں ہیں۔ ہمارے پاس افران کے لئے مایانیاں بچھے خیر کرنے کا دل کے قیث خریدنے اور سرکاری مشینری کی خیاہیں پر خرچ کرنے کے لئے خدو ہوتے ہیں۔ نقل اور گیس کی تلاش کرنے کے لئے خدو میں ہوتے۔ جرائم کو کنٹرول کرنے کے لئے خدو نہیں ہوتے۔ پاس سے مرتے ہوئے انسانوں کو بچانے کے لئے خدو نہیں ہوتے۔ اگر لوگوں کا خون چوس کر یا بکے لئے لیکن اگر کسی منصوبے کے لئے خدو فراہم بھی کئے جاتے

ہیں تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے جس کو ڈکا منصوبہ ہوتا ہے تو کو کو ڈ خیر بود ہوتا ہے۔ ایک کو ڈ اس پر لگتا ہے جس سے منصوبے کا اتحاد وہیں پسندہ جاتا ہے۔ صرف اس کی دم باہر آتی ہے جو ہمارے کسی کام کی نہیں ہوتی۔ خدو کی کمی کا دوا دوا کرانی مافی کو چھوٹا ہوا دیوانہ دیوانہ بن چکی ہے۔ اصل بات یہ ہے بھائی کہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتا، کوئی قربانی دینا نہیں چاہتا کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی میاہیں میں فرق پڑے۔ دوسری بیوی وجہ ہمارے ہاں کا عدم استحکام ہے۔ آئے دن نت نئے انداز سے اقتدار کی رسا کھلی، نت نئی حکومتیں، نت نئے قانون۔ اس مریض صحت کی پرئس کا بے دوسری سے آپریشن ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود جو سرخس آتا ہے دھتے سرے سے اس کی چپہ میاڑ شروع کر دیتا ہے۔ پرانے آپریشن کو نئے لگنے کی قیمت نہیں آتی کہ نیا آپریشن شروع ہو جاتا ہے۔ لہذا مریض کا یہ مشرہ تو ہوتا ہی تھا جو رہا ہے۔"

"واہ چوہدری صاحب۔۔۔ دانا۔۔۔ یہ تو از بندہ بولا۔" آپ تو اچھی خاصی غور کر لیتے ہیں۔ آپ میں تو سیاسی لیڈر بننے کے جرائم خاص تھے ادنیٰ بائے جاتے ہیں۔"

"یہ ایک اور غلط فہمی ہے جو ہمارے ہاں لوگوں میں پائی جاتی ہے۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا "کہ قوی مساکل پر کسی نے ذرا دودھندی سے بات کی تو فوراً اسے سیاسی لیڈر سے تشبیہ دے دی۔ حالانکہ قوی دودھ جن کے دل میں سب سے کم پایا جاتا ہے وہ ہمارے لیڈر ہیں۔ لیکن معیبت یہ ہے کہ لیڈر کے کم از کم وہ چرے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اخباروں میں نظر آتا ہے اور ایک وہ جو اس کے صرف چند انتہائی قابلِ احمہ رفقا کو نظر آتا ہے۔ ہمارے ساتھ لوح لوگ صرف اخباری چرے کی وجہ سے لیڈروں کو پوچھتے ہیں۔ اگر وہ ان کے حقیقی چرے دیکھ لیں تو انہوں میں بھی تجلیں ماریں۔ لیکن دیکھو بات کہاں سے کہاں ملی گئی۔ مجھے تمہاری ساتھ لوجی پر ہنسی آتی تھی اور کھنگھ کا رخ کرنا دیکھنے والی باتوں کی طرف۔"

"بے کار ہیں جی یہ باتیں۔" وہ سر ہل کر تاحمانہ انداز میں بولا۔ "ہمارے معاشرے میں دوزانہ کوڈوں آدمی کرہوں میں بند پھنسے اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"میں سمجھ کر تو میں خاموش رہتا ہوں۔ یہ تو آج تم نے دانا رنگ میں دوسری رنگ چھیندی۔ میں اصل بات کیا کر رہا تھا؟ میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے تسلیاں دے رہے تھے کہ تمہوں وغیرہ سے کیا ہونا ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں۔ تم بتا رہے تھے کہ سرکاری ملازموں کا سوسہ وغیرہ کرنے آتے ہیں لوگ۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہیں اس شرم میں مت سے ایسے پولیس افسروں کو

دار میں کس کے پاس ہے سوچا کرتی کس کے لئے وقت اور
انہی پر مہر دیتی تھی۔ یہ بھی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ رشتہ دار
کے سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے جو راکھی سرائی ہاتھ آئے لگا کر
فوری راضی ہو چلی کی طرف ہاتھ سے بھل جاتا تھا۔

سوہت میں نے اس افسوس کو ذہن سے جھٹکی کی کو شل
اور تیار ہو کر آئیں پہنچ گیا ابھی میں نے اشیاء کو افر کو پتہ نہ ہوا
ظہور کے لئے اہم پر اٹھتی فوت کرائے تھے کہ اطلاع ملی کہ راکھی
سے بیٹہ کرامت مجھ سے لئے گیا ہے میں نے اسے فوراً لایا
اور اس کے استقبال کے لئے اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازہ
تک پہنچا۔ آخر وہ کھل کے پرد چٹکت میں میرا پار خرقہ تھا۔

وہ اندر تھا تو مجھ سے صاف کرتے وقت یوں جھکا جاتا تھا
مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ کس میرے بیٹوں میں نہ
چرے میں نے بدل پار اسے تھی جی سوٹ میں دیکھا تھا
غلاما سٹیل توئی فک رہا تھا چرے پر کینٹین بھی کچھ تھا
نہ جانے کیوں حد کچھ سوکا سوکا فک رہا تھا اور مسکراہٹ
معنوی معنوی ہی تھی۔

رہسبات ختم ہو چکی اور کافی دفیو کا دور چل پکا تو میں
پرچھا "تازہ سینہ کیسے آتا ہے؟"

کافی دیر سے آئیں کی نشست مجھ میں ہم دونوں کے سوا
نہیں تھا اس کے باوجود اس نے اور مرد و دیکھ کر کھڑا اٹھیا
کہ نہیں تجھ میرے پاس نہیں۔ پھر وہ ہتھوں پر زبان پھر
ہوئے بولا "چودری صاحب! مجھے لاہور میں اور کوئی کام نہیں
میں صرف آپ سے لئے گیا ہوں۔ لیکن اب آپ کے سامنے
ہوں تو وہ بات کہنے کی عت نہیں چڑی جس کے لئے آیا ہوں
"ہم بات کرنی ہے کل کر کو بیٹہ کرامت آیا۔ احتیاط
امراز اختیار کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اس قسم
امراز کھنگرے مجھے انھیں ہوتی ہے توئی کو جو بھی کتا ہو یہ
طرح کر رہا چاہئے۔" میں نے کھل

"آپ ناراض ہو جائیں گے اور میں آپ کی ناراضی
محمل نہیں ہو سکتا میری آپ سے راجح تھا ہوتی ہے۔" اس
چوہے پر حیرت مندی زد تھی۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے تھوڑے سا تھ کوئی
نرا سلوک تو کسی نہیں کیا کہ تھوڑی تھ سے مدد نہ ہونے لگے
میں نے لاف سے کہا "ابنہ ایک بار میں صرف ایک بار
کو بچنے کے سلسلے میں بھی کی تھ جسی ضرور ہوئی تھی۔ بات
کی تھی اور میں اصل پرست توئی ہوں میں نے صرف اس
جی کو دور کیا تھا۔ اور شکر ہے وہ آسانی سے دور ہو گئی تھی۔
کے بعد سے تم بھی یہ دے چل رہے ہو۔ اور امید ہے ہم
جہیں کوئی شکایت نہیں ہوئی ہوگی۔"

"اسی لئے تو بات کہنے ہوئے زیادہ مشکل پیش آ رہی۔

جانتا ہوں جس کے لاکھوں کے کاہ پار ہیں کاکھی کی کو بھی ہیں۔
ابھی پر سولی میں نے اسلام آباد میں خشتی تھ انہی سڑکیں
ایک ششام میں آئیں کو دیکھ کر نیکتا کی طرف گئے کے لئے اپنی
اوسی لینے آیا ہوا تھا۔ در خواست ہے فک اس کے ایک رشتہ دار
کے نام سے دی گئی تھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ رشتہ دار کا اس
کارخانے سے کتنا متعلق ہو گا۔ خیالی سوائے کا ذریعہ کیا تھا ہر کیا گیا
ہے اور اصل میں سوائے کس سے کیا ہے؟ یہ باتیں مجھ سے بھی
بیلے خشتی کو معلوم ہوں گی لیکن اسے ہر حال اپنی اوسی ل جانے
کی گئے اپنا کام کر رہے ہیں ختم اپنا کام کے جاؤ میرے دوست۔"

"تمیک ہے۔" وہ قد سے طمانیت سے سر ہاتھ ہونے
بولا "آپ جیسے بڑے تری نے اپنی تعلیم دی ہیں تو میرا بھی مل
یاد ہو گیا ہے میں کوئی مکان ٹھکان خرید لیتا ہوں گرو والی کے نام
سے اب مجھے بھی نہیں چاہی ہے کہ یہ رقم آپ جیسے کسی سوائے
میں کسی چھوٹی سوائے بات سے خوش ہو کر انعام کے طور پر بھیجی
ہے آپ نے میرا اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ شکر ہے مجھ کو جس نے
ذکر کے نام سے یہ برف کیس کیس پر بیک نہیں دیا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ قد سے
چٹکیا ہٹ کے ساتھ بولا "جو آپ نے فرمایا تھا کہ مکان کی
خریداری کے سلسلے میں اگر رقم کچھ کم پڑی تو آپ بھی حمایت
کریں گے تو مطلب یہ ہے کہ میں ذرا ڈھنگ کا مکان دیکھ
لوں۔"

"بالکل دیکھ لو۔ میں جہیں ذرا ڈھنگ کے مکان میں ہی رہے
دیکھتا ہا ہوتا ہوں میں اچھے تو میں کا پتہ درواں ہوں۔" میں نے
اسے ٹھکرای۔

دھشت ہونے وقت اس نے صاف کرنے کے لئے ہاتھ پھیلا
اور میرا ہاتھ تمام کر چکے ہوئے نہایت حقیقت مندانہ انداز میں
چوم لیا اور وہی توازن میں بولا "آپ بہت سی کھل توئی ہیں
چودری صاحب! میں سمجھتا تھا آپ جیسے توئی دنیا میں ختم ہو چکے
ہیں۔"

"دنیا میں کسی بھی قسم کے توئی ختم نہیں ہوئے۔ صرف تھوڑا
کھلی ہوئی رہتی ہے۔ دوسرے اس اخلاق کے بارے میں کچھ نہیں
کہا جا سکتا کہ کب کس کو کس قسم کا توئی مکر رہا جائے۔" میں نے
اس کا کدھا چھینکے ہوئے کھل۔

اس کے دھشت ہونے کے بعد وہ بھی سی افسوس کی طرح بر محل
آور ہو کر بیٹھے اب تک میں ذہن کے کسی تاریک گوشے میں دھکیلے
بیٹھا تھا۔ افسوس کی خوردبین جہاں کی موت کے باعث تھی۔ شریف
سیال نے بتایا تھا کہ اس کے جسم پر تشدد کی کوئی ملامت نہیں تھی
اور نہ ہی اسے کوئی مار کھاکہ کیا گیا تھا نہ جانے نہیں نے اسے
کیسے ہلاک کیا تھا اور اس سے انھیں کیا حاصل ہوا تھا۔ ان کی
تسلی حریفیں بے سوچا تھیں لیکن کچھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کے

برج پاری

انوارِ صدیقی

خوبصورت سرورق
بہترین طباعت

قیمت
۱۵۰/- روپے

کتاب اپنے قریبی جہاں سال کے طلب
قرآن میں یا ادارے کے نام کی قیمت کا
میں آدھار کے سال کے قریبی
کتاب آپ کو
بند رہے ہیں، اگر کسی اور کو دیا گیا ہو

ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو پراسرار علوم کے حصول میں
تارک الدنیا تو نہیں ہوا لیکن اتنا طاقت ور ہو گیا کہ خود کو سب سے
زیادہ قد آور اور حرف آخر سمجھنے لگا۔

انسان جب غرور اور تکبر کے نشے میں سرشار ہو تو پھر دوسری قوتوں
سے مکرنا بھی اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتا ہے۔ بڑائی کا دعویٰ کرنے
والے فرعون ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن جہانی قوتوں کے
سامنے ان کی فرعونیت پانی کے بلبلے سے زیادہ ناپائیدار ثابت
ہوتی ہے۔

انکا۔ اقبالہ۔ سونا گھاٹ کا پجاری، غلامِ روحیں۔
امربیل اور نجیہ ش کے بعد انوارِ صدیقی کا ایک اور
پراسرار ناول، نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرگرم روڈ، اردو بازار، لاہور، فون ۲۲۳۶۶۵

شکر گزار ہوں گا آپ کو دعا میں جوں گا۔

"جی راج تیار۔" میں نے اس کے چہرے سے غم ہونے کا وقت سے کہا کیونکہ اس کی طرف مجھے دیکھ کر اس کی جان ٹپکی جاتی تھی۔

"وہ کوئی ایسی خاص نہیں ہے چوہری صاحبہ"

ہمت کر کے ہوا "ہی۔۔۔ ویسے ہی مجھے دل میں خوف ہے۔"

جب سے پارٹرشپ ہوئی ہے میرا دل ڈھوا ڈھیا سا ہے

آپ بڑے قوی ہیں اور خطرناک بھی ہیں۔ مجھے لگا

آپ کے ساتھ نہیں چل سکیں گا۔ یہ خوف بھی کتنا

کسی دکنے میں نہ آجائیں۔ میں اپنے خوف کی وضاحت

کر سکتا ہوں اس خیال سے کیا ہوں کہ شاید آپ میری

سکھیں اور مجھے صاف کر سکیں۔" میں نے ایک بار بھر تھکا

"بار بار تھکا مت خود مجھے گڑگڑاتے ہوئے اور

نہیں گتے۔" میں نے دھیمی توازی میں کہا "تو میں ہا

ہوں اور خطرناک بھی اس لئے تم مجھے ساتھ نہ

سکتے اس سے پہلے کیا تمہارا فعل واسطہ صرف حائضیں

اور نہایت نیکو پارٹنر لوگوں سے ملتا ہے بھلا اسٹوڈنٹ

میں سے ایک خاص کی فہم پرست ہی حاصل تھی؟"

"نہیں۔۔۔ سر! میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے۔"

تو وہ ہنسنے کی کوشش کی، لیکن حلق سے صرف ایسی توازی

چبے کسی پرے کا ٹکڑا نکلتا جا رہا ہے۔

"اسٹوڈنٹ سے مدد تو کی تو میں اب تک!

ہوں صاف آئی اے اور کراؤں رانج میرے پیچھے لگی ہ

ہی شکل سے ان کا بندھ رکھا ہوں سی لئے میں آج

تلاش ہو کر اٹھا چاہتا ہوں ساپے ہاتھ بالکل صاف رکا

ہوں۔"

"اور تمہارے ساتھ وہ کر سکتا ہے ہاتھ کدے ا

کے؟" میں نے اسے گھورا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا"

صاحبہ! وہ کچھ اور ہو سکتا ہے۔" میں نے دہرا کر

کا دبا کر صیٹ دیا ہوں۔ میں صیٹ ہاتھ پاؤں میں پھیلا

۔۔۔ برا آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔۔۔ میری بات

کوشش کریں۔"

میں چند لمے اس کی طرف دیکھا، اب آخر کار میں

سائنس لے کر صوفے کے چپے سے تھکا کتے ہوئے کہا:

جیپ قوی ہو سینگے کرامت! میرا خیال تھا کہ انسانوں کو

مجھے کلن نہ تک آجاکے لیکن تمہیں میں نہیں کچھ سنا

تمہیں تاک کر کئے کی ضرورت محسوس نہیں کر آکر میرا

صاف ستر اور سترم پہننے ہی میں تمہیں یہ بتانا چاہتا

کا دبا کر دنیا میں میری کیا سادہ ہے۔ تم یہ سب کچھ

مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" وہ تھوک گل کر ہوا "آپ

مجی سر مجھ کے کیا تھی ہے۔۔۔ بچوں کی طرح کبھی کوئی فراموش

لے کر آتا ہے۔ کبھی کوئی اراکہ کر لیتا ہے۔ لیکن میں آپ کو اپنا

بیمہ کر آپ کی منت کرنے آیا ہوں۔ وہ کہیں کہ آپ ناراض

نہیں ہوں گے۔"

میں نے ایک لمے سچا بھر کر کہا "بلکہ وہاں میں ناراض نہیں

ہوں گا۔"

وہ شیشے کی پٹائی پر کچھ آگے کو جھک گیا۔ اس کی انگلیوں میں

انجلی پکلی لڑزش تھی۔ ہنسی ہنسی توازی میں وہ ہوا "چوہری

صاحبہ! میں دیکھا کہ مدیہ دے چکا ہوں وہ بے شک آپ

دکھ لیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ہوٹل میں میری پارٹرشپ

ختم نہ کریں۔"

اس سے آگے وہ کہنے نہ ہوا۔ توازی کو حلق میں ہی اکٹ

کے۔ میں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ ہر وقت وہ

سے انداز میں سر ہٹنے کے چپے سے لگا جا رہا تھا جیسے میں تھوڑی سی

تھوڑی میں اسے قتل کھیل گیا۔ پھر وہ مجھے دیکھ لے کر سے پہلے ہی

دونوں ہاتھ پاتے ہوئے ہوا "دیکھیں چوہری صاحبہ! ناراض نہ

ہوں۔ اگر آپ۔"

میں نے ایک طویل سانس لے کر اس کی بات کاٹنے ہوئے کہ۔

"میں ناراض نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ نیا

خیال تمہیں کیوں آگیا؟ کسی طرف سے دباؤ پڑا ہے کیا؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں چوہری صاحبہ! وہ تھی یہ ہوا "ایسی

کوئی بات نہیں ہے۔ دباؤ ہر اس کی طرف سے چلتا تھا آپ کے

ظاہر کون مجھ پر دباؤ ڈال سکتا ہے۔" میں نے کوئی بات نہ کہی تو

مجھے لئے آسانی ہو جاتی۔ میں آپ کو بتاتا کہ کھان مجھ پر دباؤ

ڈال رہا ہے۔ آپ خود ہی اس سے منت لیتے۔"

"ہو سکتا ہے دباؤ ڈالنے والا ہم سے زیادہ طاقتور ہو۔" میں

نے کہا۔

"میری نظریں تو آپ ہی سب سے طاقتور ہیں۔" وہ دونوں

ہاتھ جوڑ کر ہوا۔

"نہیں لگنے کی چپ اور مدداتی قسم کی کوششیں نہ

کرنا بالکل جی بات کر۔ بعض اوقات صرف جی بات کی وجہ سے

میں اپنے دشمنوں کو بھی صاف کدوا کر آتا ہوں۔ تم تو پھر بھی کم از کم

فی الحال دوستوں میں شامل ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں

جھانکے ہوئے کہ۔

"میں زندگی بھر آپ کے دوستوں میں ہی گزار رہا چاہتا

ہوں۔ چاہے آپ مجھے اپنے قدموں میں ہی جک دیں۔" وہ بدستور

ہنسی ہنسی اور عرض توازی میں ہوا "اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ

رقم بھی بے شک آپ دکھ لیں۔ میں میری پارٹرشپ ختم

کریں گے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بلکہ میں آپ کا

اے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ میں حسین یہ یقین دلانا بھی نہیں
 اپنا کہ آج تک کسی ایسی کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی
 جرات نہیں ہوئی۔
 مجھے یقین ہے سراجھے یقین ہے چوہدری صاحبہ! وہ جلدی
 سے بولا۔

"اب سب باتوں کا آپ کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن تمہارا ریکارڈ
 درست رکھنے کے لئے میں تمہیں ایک بات ضرور بتانا چاہتا ہوں
 کہ تمہارے مدھے کی مجھے اس وقت بھی ضرورت نہیں تھی جب
 میں نے ہوئی کا پود جیکٹ شروع کیا تھا۔ اور اب بھی ضرورت
 نہیں ہے جب میرا ہوش مکمل ہونے والا ہے۔ مجھے اپنے دوست
 سینو رمضان کے مدھے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ بات
 اسے بھی معلوم ہے۔ میرے پاس پود جیکٹ شروع کرتے وقت بھی
 انہ مدھے تھا کہ سول پود پانچ انچ کے طور پر ہوئی بنوا سکتا تھا۔ اور
 اب تو یہ میرے لئے بالکل معمولی بات ہے۔ لیکن صرف کا دھاری
 مصلحتوں کی وجہ سے میں نے پارٹنرشپ میں یہ پود جیکٹ شروع کیا
 تھا۔ میں ان مصلحتوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تم کا دھاری
 آدمی ہو ان باتوں کو کہتے ہو گے لیکن تمہاری حالت کچھ کرشم
 نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کا دھاری مصلحتوں کو ہلانے خالق رکھ دوں
 گئے۔ اب سول پود پانچ انچ بھی بننا پڑا تو میں جاؤں گا۔ تمہارے
 شیر زمین خرید لیں گا۔ تمہاری رقم حسین وہاں مل جائے گی۔"
 اس کے چہرے پر ذرا مدق آئی۔ میں نے بات جاری رکھتے
 ہوئے کہا "میرا تیسرا پارٹنر سینو رمضان حالانکہ میرا بھائی یا
 ہے اور ہوئی میں مدھے کا کرسمٹ خوش ہے۔ اس نے تو آج تک
 پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ ہوئی کس مرحلے میں ہے۔ حالانکہ وہ
 بھی کراچی میں ہی رہتا ہے اور ہوئی کے سامنے سے اس کا ٹیکسوں
 مرتبہ گزر ہوا ہے لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے کبھی آکر جھاٹا
 تک نہیں کہ کنسٹرکشن کسی ہو رہی ہے۔ کام کی رفتار کیا جاری ہے
 جب قدر رسا تو یہ ہے اور مجھ پر معلوم نہیں کہ انھیں بند
 کسے بھروسہ کرتا رہتا ہے۔ اپنی ساری دولت میرے حوالے
 کئے گئے تیار رہتا ہے اور اس کی طرف سے مجھے مستقبل
 پر بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں سوچ رہا ہوں
 کہ اس کی پارٹنرشپ بھی ختم کدوں گا۔ اس کے شیر زمین خرید
 لیں گا۔ حالانکہ وہ بھی کبھی کبھی اس کی حرکت کر کے اس پر
 بدگمانی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ اور اس بات پر وہ بہت دانا لگا ہے
 کہ مجھ سے مل جائے گا۔ خود کشی کی دھمکیاں دے گا۔ لیکن میں
 اسے متاثر نہیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ پارٹنرشپ والا
 سلسلہ ٹھیک ہی نہیں ہے۔ ٹیکسوں میں بچت کے لئے اگر کبھی بہت
 ہی زیادہ ضرورت پڑے تو آدمی جس کاغذی قسم کی پارٹنرشپ
 کسٹمسری کی بجائے پارٹنرشپ تو محض دوسرے۔ میں اس سے
 جان ہی چھڑاؤں تو بہتر ہے۔"

"چوہدری صاحب! آپ تو ناراض ہو گئے میرا قصد آپ کو
 ناراض کرنا نہیں تھا۔ اسی لئے تو میں کہہ رہا تھا کہ رقم بے فک
 آپ رکھ نہیں سکتے میری پارٹنرشپ ختم کر دیں۔" وہ تیزی سے بولا۔
 "رقم آپ کی خزانہ ہے۔"
 سینو کراست! میں غدارانے نہیں چلتا۔ تمہارا خیال ہے کہ

مفت میں پچاس لاکھ مدھے! اتھ آئے پر میری خوشی کا لٹکا نہیں
 رہے گا۔ میں نے سڑکے میں کہا "کوئی زمانہ تھا کہ مدھے میری
 بچھوڑی تھا۔ اب نہیں رہا مجھے مدھوں کی نہیں 'آدھوں کی
 ضرورت ہوئی ہے۔ اور تم ان آدھوں میں سے نہیں ہو جن کی مجھے
 ضرورت ہوئی ہے۔ جب مجھے تمہاری ہی ضرورت نہیں تو تمہارے
 مدھے کا میں کیا کروں گا۔ میں نے تو ناخوش آدمی کو ساتھ رکھنا چاہتا
 ہوں اور نہ ہی اس کے مدھے کو۔"

اس نے کچھ بولنے کے لئے نہ کھولا لیکن میں نے اسے اس کا
 موقع دے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں ابھی اپنے ڈائریکٹر
 فائنلس اور ڈائریکٹر منیجر کو تم سے ملوانا ہوں۔ انہیں بتا دو کہ تم
 رقم کس اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرانا چاہتے ہو۔ وہ آج ہی ٹرانسفر
 کرادیں گے۔"

وہ نہایت آہستہ سے انداز میں ایک لمبے خاموش رہا پھر بولا۔
 "لیکن میں شیر سرٹیکٹس تو ساتھ نہیں لاؤ ہوں۔ وہ تو میں آج
 دلیں نہیں کر سکتا۔"
 "کوئی بات نہیں رقم اس کے باوجود آج تمہارے اکاؤنٹ
 میں ٹرانسفر ہو جائے گی۔ شیر سرٹیکٹس تم کراچی دلیں جا کر جب
 چاہو بھجوانا۔ مجھے معلوم ہے تم ہماری کوئی چیز دنا نہیں سکتے۔ میں
 نے پُر سکون لمبے میں کہا۔
 "میری یہ جرات کہیں چوہدری صاحب! وہ گھمبائے
 ہوئے سے انداز میں بولا "وہ تو ایک بار غلطی ہوئی سو ہوئی۔ مجھے
 آج ہی دلیں جانا ہے۔ کل باقی انہیں شیر آرڈر سال کر دوں گا۔"
 اس کے بعد کی کارروائی چند منٹ میں ہی طے پا گئی۔ وہ جب
 رخصت ہوا تو اس کی آنکھیں ابھرائی ہوئی تھیں۔ اسے یقین نہیں
 آ رہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا ہے۔ لیکن رخصت ہونے
 وقت اس کے پاس زمین پر گڑے جارہے تھے۔ آخر کار وہ کے بغیر
 نہ رہ سکا "میں نے آپ کو مجھے میں غلطی کی۔ آپ کی پارٹنر
 شپ کے اعزاز سے محروم ہو کر اس سے کبھی پوری غلطی کی۔ اب
 میں آپ کا سادھی 'آپ کا دوست۔ بلکہ آپ کا قلم بننا چاہتا
 ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے آپ مجھے قبول نہیں کریں گے۔"
 "تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" میں نے نرمی سے بیوی کی سے
 کہا۔

اس نے ایک نہایت سستے براؤز کی جلی سی سکرٹ نکال کر
 لٹائی تو اس کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے پٹائی سے
 سکرٹ ہائس اٹھا کر اس کی طرف پھیلایا جس میں میں بیٹ

صرف انجن ہی نہیں بلکہ وہ پورا کارا پورا ایئر رینیٹ تھا۔ میں نے
منگوایا تھا۔ اس کے ذریعے جدید ترین جہاز نے ہر خشک کی جا
تھی۔ گزار کیا تھا، چھوٹا مگر عری جہاز تھا۔ وہ گولا جیسے
زاروں کے دے کا سردار تھا۔

شفیع شاہ مجھے لیے بھی بولا "وہ اٹھائیں دن کے خشک
کے بعد واپس آتا تھا۔۔۔"

"پھر تو پچھلیوں سے بھی لدا ہوا ہوگا؟" میں نے اس کی
کاٹے ہوئے پرچھا۔

"جی ہاں۔ کئی لاکھ کال تھا اس پر شفیع شاہ نے ہزار
"ایک لاکھ سے بھر کی وجہ کے اس پر کئی گریڈ پیچھے لگے
ہری طرح ٹوٹ پھوٹ کیا۔ انجن میں آگ لگ گئی۔ ہمارے کو
نے پانی میں کود کر جان بچائی لیکن ارشد یعنی گزار کو بحال
کوشش میں۔۔۔ اس کی آواز ایک لمحے کے لئے مرقع ہو گیا
"مطمون نہیں ہو سکا لاکھ کس کی تھی؟" میں نے اہ
پڑ سکون رکھا۔

"سب کچھ مطمون ہو گیا ہے سر! ہمارے آدمیوں نے
را۔ ٹینک کا حق ادا کر دیا" شفیع شاہ کی آواز سے ارتعاش
ہو گیا "انہوں نے پانی میں غوطہ کھانے کی خاطر ہیرا کہ وہ وہم
ہیں لیکن بچے ہی مجھے وہ لاکھ کے قریب پہنچ کر اس طرح
چڑھے کہ حملہ آوروں کو احساس ہی نہیں ہو سکا۔ وہ خدا
صرف دو تھے۔ ہمارے تو میں نے انہیں قابو میں کر لیا اور

سکرٹیں بھری ہوئی تھیں "ان میں سے پی کر دیکھو۔" میں نے کہا۔
"شکریہ۔۔۔ شکریہ۔۔۔" وہ مضطرب لیے جی بولا "میں کسی
زمانے میں مدی کا پھوپھی تھا۔ اس زمانے سے یہی براہی پی رہا
ہوں۔ اب میں کوئی سی بھی سکرٹ افورڈ کر سکتا ہوں لیکن یہ براہی
پھوڑی نہیں سکتا۔"

"میں کی جواب سنا چاہتا تھا مجھے مطمون تھا" تم کی جواب
"دو گے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں ابھی
سکرٹ اس لئے آفر نہیں کی تھی کہ تم افورڈ نہیں کر سکتے تھے
تمہاری حیثیت مطمون ہے اور تمہاری حیثیت کے کسی لوگوں سے میں
نے کسی نہ کسی چیز کے بارے میں اسی قسم کا جواب سنا ہے۔ اور
مجھے حیرت ہوئی ہے۔ یہ ابھی بات ہے کہ تم ماضی کا ذکر کرنے اور
اپنی پرانی حیثیت کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں
کرتے لیکن میرا مشورہ کیا ہے کہ جہاں تم نے ماضی تبدیل کی
ہے، پستاد تبدیل کیا ہے، "نئے نئے کپڑے کے ٹھکانے تبدیل کئے ہیں"
دوست تبدیل کئے ہیں، مسواری تبدیل کی ہے، "فریڈک ہرچر تبدیل
کی ہے۔ وہیں سکرٹ کا براہی بھی تبدیل کر لو۔ اب اگر تم اپنے
سوت میں ایک پیوٹنگ لگا کر آجاؤ اور کو کہ یہ میرے قربت کے زمانے
کی یادگار ہے، تو تمہارا رنگ لگا۔ اس لئے سکرٹ میں ہے کہ یہ سکرٹ
کا پیوٹ بھی ملتا۔ اس سے ظاہر ہو آئے کہ وہیں کے کسی کو نے میں
ابھی تک کرو جی ہوئی ہے۔ اور وہیں کے کسی ایسے ہی کو نے کی وجہ
سے تم میرے ساتھ نہیں چل سکے۔ خدا حافظ! میں اسے اپنے
کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنا ذہن کچھ بھلا محسوس
کیا۔ لیکن آج کا دن شاید کراچی سے باخبر اور خبریں آنے کے لئے
مخصوص ہو گیا تھا۔ اس وقت میں دھیر کا کھانا کھانے کے لئے انہیں
کا ارادہ کر رہا تھا جب میرے ڈائریکٹ فون کی تھنٹی بجی۔ ریسیور
اٹھانے سے پہلے ہی نہ جانے کیوں میرے دل نے کہہ دیا کہ فون
کراچی سے ہے۔

میرے دل کا کام درست ہی نکلا۔ دوسری طرف کراچی سے
شفیع شاہ تھا۔ نہایت مضمر و مکی جملوں کے چاٹنے کے بعد وہ بولا۔
"سراخوڑی سی بری خبر ہے۔"

"سادہ۔۔۔ میں آج ہر بری خبر سننے کے لئے تیار ہوں" میں نے پڑ
سکون لیے جی کہا۔

"ہمارا سب سے بڑا گزار "وکرزی" ڈوب گیا ہے۔ اس پر
ہمارے جو آدمی خشک کے لئے مجھے ہوئے تھے ان میں سے ایک
آدمی ارشد بھی ہلاک ہوا ہے اور بعد میں اس کی لاش ڈوب
چکی اس نے رک رک کر بتایا۔

"کس طرح؟" اب سب کچھ "میں نے اپنے آنکھ خبر کے دھچکے
سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وکرزی" میرے نہیں سو
زاروں کے قریب میں سب سے بڑا اور خوبصورت گزار تھا۔ اس کا

ایم اے راحت

کے پراسرار اور ایڈوینچر قلم سے

ایک شاہکار ناول

تاریک وادی



اردو بازار لاہور

ہمیں اتنا ہوا نقصان کیوں پہنچایا تھا؟

میں نے اس سوال پر غور کیا تو مجھے فوراً یاد آگیا کہ اس نے ایک بار اپنا اسٹگ کابل منگوانے کے لئے مجھ سے زائر متعارف کیا تھا لیکن میں نے اس قسم کے کام کے لئے زائر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے زائر کا تعلق لائسنس کے تحت صاف تحریک اعزاز میں فننگ کا جائز کامدار کر رہے تھے۔ پرانے دھندے میرے لئے تھکا پھرتا ہو چکا تھا۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے پاس جائز طریقوں سے اس سے زیادہ دولت آ رہی تھی۔ لیکن یہ بات سینہ عالم شیر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ زائر نہ دینے پر وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ میں نہیں تھا کہ وہ اتنی بڑا ت کے گا اور اتنا کینہ بدور ثابت ہو گا۔

میں جو کچھ سن رہا تھا میرا اس پر یقین کرنے کوئی نہیں تھا۔ وہاں تھا۔ میں نے تصدیق چاہی "شفیع شاہ! تم نے ابھی طرح یقین کر لیا ہے کہ وہ کچھ بول رہے ہیں؟ ہمیں جان پہچانے کے لئے وہ خواہ مخواہ کسی پر غلبہ تو نہیں ڈال رہے؟"

"نہیں سر! میں نے اندازہ کر لیا ہے۔ ان کے بیان میں کچھ نشانیاں ہیں۔ کچھ حوالے ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ یہ عالم شیر کی حرکت ہے "شفیع شاہ! وہ فرق ہے جو اب رہا۔"

"مست ہی عجیب حرکت ہے ہمیں نے متاثر نہ کیے ہیں۔ کمال مجھے تو اب شبہ ہونے لگا ہے کہ عالم شیر کی کھوپڑی کا کوئی انکم ہونہ کر رہا ہے۔"

"سر! ان دونوں تو میں کا کیا کرتا ہے؟" شفیع نے پوچھا "میں نے سوچا کہ اس معاملے کا اصل تعلق لاہور سے نکل آیا ہے اس لئے آپ کے حکم کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔"

"ان میں سے جو لالچ چلا رہا تھا اسے ابھی قبضے میں رکھو۔" میں نے ایک سادہ کانڈ کو اٹکیوں میں سٹپے ہوئے کلمہ "دوسرا" جس نے گریڈ پیچھے ہوں گے اسے وہیں پہنچا دو جہاں ارشد بھی گیا ہے۔ پھلیاں ابھی اور بھوک ہیں۔ کی۔ مزید ہدایات کا انتظار کرو۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے سر! اس نے مستعدی سے کہا۔"

"خدا حافظ ہمیں لے گا اور رہیمور رکھ دیا۔"

کچھ دیر میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سوچا رہا۔ میری بھوک قسم ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں کانڈ کی گولی ی بن گئی تھی۔ آخر کار میں نے اسے روکی تو فرسکی میں پیسک دیا اور انٹر کام کی طرف ہاتھ پھرایا۔

انٹر کام پر میں نے کیسٹرن سے کہا "نیچے ریسیشن پر آیا ہر گاڑی میں ٹوٹی اور شیر خج ہوں گے انہیں ذرا میرے پاس بھیج دو۔"

ڈالنے کے لئے کھانچ کر ہم نے قبضے میں کر لیا ہے۔ وہ گڈالنی سے لکھ رہا ایک ویران مقام پر کھڑی ہے۔ ہمارے توئی ان دونوں دھیل کا کام میں کر کے اپنے ٹھکانے پر لے آئے تھے۔ ہم نے ان سے "تفتیش" کی۔ پہلے تو انہوں نے زبان نہیں کھولے۔ کالی تخت ان تھے۔ لیکن آج رات چوتھ پرے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سینہ عالم ہر کے توئی ہیں اور اسی نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہمارے زائر کو تو نہیں سمجھتا ہو۔"

"سینہ عالم شیر۔" میں بے اختیار مری سانس لے کر وہ لکھ رہی ہیں۔ لے کر کے چنے سے ٹپک لگاتے ہوئے مت دیکھو۔ نیچے لکھا "شفیع شاہ! ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا اور لوگ اتنی ترقی کر گئے کہ وہ "ہم" پر غلبہ کرنے لگے۔"

"میں سر نہ تو ہنگل سے بڑا۔ سینہ عالم شیر کو ابھی طرح پتا تھا کہ وہ عالم شیر لاہور میں رہتا تھا لیکن اس کے "کامدار" کا زیادہ وعدہ کر رہا تھا۔ ابھی وہی لائن کا توئی تھا جسے ہم ایک حصر ہوا ترک کر چکے تھے۔ ہمارے توئی تھا۔ دو مرتبہ ج کر پکا ٹھکانہ چوتھ لڑائی تھا۔ اسٹگ کو قطعی جائز "کامدار" سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پرانے زمانے میں۔ بلکہ سینہ اسلام کے دور میں ہی قلعے پر طرح کا ساز و سامان لے کر جس ملک میں چاہے لے جاتے رہتے تھے۔ اور جن چیزوں میں بھی فائدہ دیکھتے تھے ان کی فروخت کرتے رہتے تھے۔ یہ سب سے معزز تجارت تھی۔ کسٹم، کوسٹ گارڈ، ٹیکس، ڈیوٹیاں، سپورٹ لائسنس، باغیاں، گالے سفید قوانین، یہ سب تو بعد کی پیداوار تھی۔ غیر مسلم بد کرداری اور سو خود قہوں کی اخراجات تھیں جنہیں سب نے آنکھیں بند کر کے اپنا لیا تھا۔ وہ انہیں نہیں مانتا تھا۔ لیکن ہوں کوئی الحال اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کھو جاتے۔

کر لے سکے اس لئے وہ بھول خود "پہنچا چھپا کر یہ کامدار کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن اس کا ارادہ تھا کہ جب اس کے پاس خاطر خواہ دھانچے ہو جائیں گے تو وہ ان بین الاقوامی قوانین کے خلاف ٹپک چلانے کا کہیں کہ انہی کی وجہ سے دنیا کا معاشی نظام درہم برہم تھا۔ انہی کی وجہ سے دنیا میں کرپشن کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی اور انہی کی وجہ سے امیر "امیر تر اور غریب" غریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی کھنگڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ بڑی دلیلوں اور اعداد و شمار کے ساتھ بات کرتا تھا اور اس کا دھوی تھا کہ اگر پرانے زمانوں کی طرح پوری دنیا میں مال کی نقل و حرکت اور تجارت سے

باغیاں ہمالی جاسیں تو رتن رتن دنیا کی معیشت خود بخود متوازن ہو جائے گی۔ کسی ملک میں حد سے زیادہ دولت اور کسی ملک میں حد سے زیادہ غربت نہیں رہے گی۔

مجھے اس کے نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بات سے "اس کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے اور ہمارے راستے قطعی جدا تھے۔ اس کے باوجود اس نے

مجھے اس کے نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بات سے "اس کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے اور ہمارے راستے قطعی جدا تھے۔ اس کے باوجود اس نے

مجھے اس کے نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بات سے "اس کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے اور ہمارے راستے قطعی جدا تھے۔ اس کے باوجود اس نے

مجھے اس کے نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بات سے "اس کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے اور ہمارے راستے قطعی جدا تھے۔ اس کے باوجود اس نے

مجھے اس کے نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بات سے "اس کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے اور ہمارے راستے قطعی جدا تھے۔ اس کے باوجود اس نے

جاموسی ڈاٹجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سنگتراش

اقلم علیم

جلد اول/- 150 جلد دوم/- 1

اردو بازار لاہور

”عالم شیر کو آج رات دو فیر ہونا چاہئے مجھے
ذرا کرات کرتے ہیں۔“ میں نے سرسری سے لہجے میں
سے میری مراد ازل کاؤن والی کو ٹھنی ہوئی تھی اور میری
معلوم تھا کہ جب کسی کو وہاں بلوایا جاتا تھا تو اسے کس
تھا۔

”پتج جائے گا سرا آپ بالکل مطمئن رہیں۔“ فلا
سے بولا۔

”تم جاہو تو میری حفاظت کی اسے داری کم از کم آ
کے لئے تو چھوڑی سکتے ہو۔“ میں نے کہا ”بلکہ بہتر تو یہ
خواہ خواہ کی مشقت چھوڑی دو۔ میں اب خود اپنے
خامسا مستعد اور ہوشیار رہنے لگا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سرا“ وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔
”میں حفاظت آپ خود کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ
میں سے مجھ پر ہو کر، محض ایک اضافی احتیاطی تدبیر کے
تحت۔ آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں کہ کس وقت آپ
داری انجام دے رہا ہوگا۔ میں نے اس کا سب انتظام
اتنے بہت سے ساجھ ہیں ہمارے ہم جاہیں تو آپ۔“

”ہم کدیں کہ آپ تک کسی کی نظر بھی نہ پہنچ سکے۔“
کی صورت میں نہیں آئی۔ دوسرے ہمیں یہ اطمینان
خود کسی فواد دی دوار سے کم نہیں۔ یہ ہمارے ہمیں
تسل کے لئے آپ کی کمرانی کرتی ہیں۔ آپ اس معا
چھوڑے رکھئے۔ میری آپ سے ہمیں یہ ایک ہی خواہ

”میں سرا“ کی بہترین جواب دیا۔
ایک منٹ سے بھی پہلے وہ دونوں میرے کمرے میں تھے۔ ٹوٹی
بیش کی طرح ایک فیشن ایبل لالہ ابلی اور خود کی زدہ ساتو جوان نظر
آ رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر سے وہ مجھے کی طرح مستعد رہتا
تھا۔ میں نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ماہی عالم شیر کو جانے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”میں نہیں سرا“ ٹوٹی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ
نمودار ہوئی ”میری عمر بے شک کم ہے لیکن میں اسے اس زمانے
سے جانتا ہوں جب وہ پڑوسی ملک سے کوٹا کناری کی بوسیاں خود کر
برلا کر کھوڑوں اور اونٹوں پر لادا کرتا تھا۔ پھر انہیں سرحد پار لایا
کر آتا تھا لیکن دین کا وہ اس وقت بھی اچھا نہیں تھا۔ اپنے فائدہ
داروں کو ہیرا پتی کھپانے کے وعدے پر رزنا کرتا تھا۔“

”اں۔۔۔ اچھا یاد دلایا تم نے ٹوٹی! میں نے جنگی جہازے ہوئے
کہا“ میں تو یہ باتیں بھول ہی گیا تھا۔ میں غیر اہم باتیں اپنے ذہن
کے کپڑے سے نکال بھیجتا ہوں۔ اسی پر دو گرام کرتا ہوں۔ لیکن
کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ غیر اہم باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔ خیر۔۔۔
جیسے یہ سن کر خوش ہوگی کہ وہ عالم شیر بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔
اس کے آدمیوں نے ہمارا ماہی گیری کا جائزہ اور قانونی کاغذ یاد کرنے
والا بہترین زرار کر نیڈ پھیک کر ڈیا ہے۔ ارشد بھی اس سلسلے
میں کام آیا ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ ٹوٹی کے ہونٹ سہلی بھانے کے سے انداز میں مسکرو
میں اور چٹکی شریقی سی آنکھوں میں مسکائی کی ایک لہر آکر گر گئی۔
شیر خٹ نے بھی بے چینی سے کرسی پر پھلو بدلا۔

”بہر حال ہمارے آدمیوں نے ان کارندوں کو پکڑ لیا ہے۔“
میں نے گویا انہیں تسلیم دی ”یہ تاؤ کہ ہمیں عالم شیر کے حفاظتی
انتظامات کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔“

”تمی اں۔۔۔ تمی آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔“ ٹوٹی بلا
نابل بولا ”ایک کے پاس لائنیں یافتہ مکن ہوتی ہے۔ وہ ہانڈل
گاڑے گا۔ گاڑی کی طرح عالم شیر کے ساتھ رہتا ہے۔ دوسرے دو
عام لباسوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے لباسوں میں ہی اسلحہ چھپا ہوا
ہے۔ ان کا اسلحہ بلا لائنیں ہوتا ہے۔ وہ دونوں پیشہ ور بد معاش
اور قاتل ہیں۔ ہانڈل گاڑے کے طور پر ساتھ رہنے والا ایک رطانا
کمانڈو ہے۔“

”بہت خوب ٹوٹی! مجھے خوشی ہے کہ تم آنکھیں اور کان کھلے
رہتے ہو۔“ میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

”سرا زندگی کی دوڑ بہت سخت ہے۔ یہ دنیا عالم شیروں سے
بھری پڑی ہے۔ ذرا آنکھیں اور کان بند نہ کرو۔۔۔۔۔ یہ لوگ کچلتے
ہوئے گزر جاتے ہیں۔“ ٹوٹی اپنے مخصوص دھبے سے لہجے میں
بولا۔ پھر ایک لمحے کے وقفے سے بولا ”کرنا کیا ہے سرا؟“

تھ

وہ چھوٹے قد اور معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی مگر ایک دھماکے کے ساتھ انڈسٹری میں وارد ہوئی تھی۔ ہوا اس کے ساتھ بھی وہی تھا جو انڈسٹری میں اکثر ہوتا ہے۔ یعنی پہلی قلم پیرہٹ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد قلموں کی لائن ٹنگ گئی تھی۔ ورنہ میں نے سنا تھا "اس سے پہلے وہ خود کما کرتی تھی کہ اسے شاید کوئی ایکسٹرا کے طور پر بھی کاسٹ نہ کرے۔ میں نے اس کی وہ پہلی فلم نہیں دیکھی تھی جس نے اسے راتوں رات پراسٹار بنایا تھا۔ اتفاق بتا رہا تھا کہ اس کے حق میں سب سے اچھی بات یہ رہی تھی کہ وہ اس کردار میں نیچے کی طرح فٹ ہو گئی تھی۔ قلم باہر کی ایک فلم کا اردو انڈیٹن تھی۔ اس میں بیرونی کاکم مر نظر آتا ضروری تھا۔ اور ہماری کوئی بیرونی کمن نظر نہیں آتی تھی۔ نئی لڑکی کمن نظر آتی تھی۔ قلم ٹنگ کر گئی تھی۔

میں اس کے حق میں نہیں تھا کہ ایلا اتفاق دو فلمیں کرتے کرتے وہ اور شروع کرے۔ لیکن میں نے اپنے اس خیال کا اعہار نہیں کیا۔ وہ اس لائن کا آدمی تھا اور میں نے اسے اس شے کا خیال کل بتا دیا تھا۔ بڑے بچلے کاب وہی ڈسے وار تھا اس لئے میں کچھ نہیں بولا۔ اس کے اکاؤنٹ میں رقم ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اسے دس لاکھ کا چیک کاسٹ دیا۔

میں نے نئی فلموں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا، کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی گویا وضاحت کرتے ہوئے بولا "آپ شاید حیران ہوں گے کہ وہ فلمیں ابھی آدھی بھی نہیں ہوئیں اور میں نے وہ نئی شروع کر دی ہیں۔"

"نہیں" میں بالکل حیران نہیں ہوں۔ "میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کا "تم لڑکے آدمی ہو۔ کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کیا ہو گا۔"

"ویسے تو ہر کا دیوار میں ہی ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ پہچان کر جس نے بدوقت سمجھ سمجھ میں صحیح قدم اٹھالیا وہ کما گیا۔ لیکن قلم انڈسٹری میں تو یہ اصول کچھ زیادہ ہی لاگو ہوتا ہے۔ اس وقت جو بھی اس لڑکی کو صحیح کمائی کے ساتھ سائن کر کے جلد از جلد فلمیں مارکیٹ میں پیچک دے گا وہ کما جائے گا۔ بسا تو آپ نے مجھے بچھا دی ہے" اب میں کو شش کر رہا ہوں کہ مرے ٹھیک ٹھیک چلتا رہوں۔"

"کمائی کی مجھے اتنی زیادہ فکر نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ ہمارا ادارہ ایک بہت بڑا، مضبوط اور باعزت ادارہ بن جائے۔ غیر اشتراذ بھی ہمارے لئے کام کرنے میں فخر محسوس کریں۔"

"سال زیادہ سال میں آپ ہی اسے فخر کو ای مقام پر لائیں گے اور میرا خیال ہے اتنا بڑا مقام حاصل کرنے کے لئے یہ عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"میں تم سے متفق ہوں۔" میں نے کہا "اسی اے فخر میں ہی"

"اور میں پیشہ تھاری خد کے سامنے مجبور ہو جاتا ہوں۔" نے میری سانس لے کر کہا "اس بے قاعدہ کام کی اجازت دے دیں۔"

"اس کا کوئی قاعدہ بھی نہیں نہ کبھی سامنے آئی جائے گا سراسر" کراتے ہوئے بولا "میں ہم با کس ہیں؟"

"ہیں" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "عالم شیر دالے کام میں بد بازی یا جذباتیت کا مظاہرہ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آج کل کے بڑے تو یہ کام کل یا برسوں ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے آج کی شام ڈیٹ لائن نہیں ہے۔ بس کام کیا نہیں ہوتا ہے۔ یہ میں نے محض احتیاطاً کہا تھا ورنہ مجھے معلوم تھا کہ کوئی پروڈکشن کام کرنے کا مطلب یہی تھا کہ کام کیا نہیں ہو گا۔

وہ دونوں جانکے تو میرے ذہن سے دھند سی چھٹ گئی اور میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے پر انٹرکان میں اتفاق خیر تھا۔ اس سے میری ملاقات طے ہو گئی اور میں چند منٹ بعد میں نے اس سے معذرت کی تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

درا صاحب! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مجھ جیسے اپنے چھوٹے دے لاکھوں سے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر معذرت کرتے ہیں تو اسے اپنی شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ کو ذرا بھی غلط محسوس نہیں آکر ان باتوں سے آپ کی حاکمانہ شان میں فرق آسکتا ہے؟"

"میں اپنے کام حاکمانہ شان کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے بہن کی جاں نثاری کے ذریعے چلتا چاہتا ہوں۔ اور جاں نثاری میں کبھی کسی کی جب انہیں مجھ سے محبت ہوگی۔ میں یہ ہرگز ہی چاہتا کہ میرے آدمی مجھ سے ڈریں" مرعوب ہوں "میرے اپنے سراپا تعظیم بنے رہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے محبت کریں۔ مجھے ان کے وہ جذبات زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں انہی بچے میرے بارے میں رکھتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ان باتوں کو چھوڑو۔ جن معاملات پر بات کرنے کے لئے یہ تے پالی تھی وہ شروع کر دے گئے گئے کے ساتھ ساتھ وہ نہٹ نہ تو ہر ہے۔"

مجھے آج کل استیلاؤ جانے کا وقت نہیں مل رہا تھا اس لئے اپنے اپنے قلم نویس کے ضروری معاملات پر بات کرنے کے لئے ٹانگی کی مرتبہ کی یاد دہانیوں کے بعد اسے کھانے پر ہی بلا لیا تھا۔

اس نے چند فلمیں ریٹ کیس سے نکال کر میز پر رکھ لیں۔

ان کی خاص نہیں تھیں۔ بس جب تک وہ اپنی کارگزاری سے گوش گزار نہیں کرتا تھا اسے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔

خدا قلمیں ابھی تو آدمی بھی نہیں ہوئی تھیں لیکن اس نے وہی نئی شہرہ کوئی تھیں۔ ان میں بیرونی ستارہ نہیں تھی۔ اس ایک کی بیرونی کو سائن کیا تھا جس کی آج کل انڈسٹری میں "محم" کہہ بھی "ڈائریکٹر" پروڈیو سراس کی طرف پک رہے

سے محراب چوہدری اور اُسے سے مراد اتفاق تھی۔ یہ اداہ میرے
بھولے برے خوابوں کی تسکین کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن اب یہ مجھے
انہی اہم نہیں لگتا تھا۔ یہ میں نے یونہی محض شغل کے طور پر اور
کچھ اتفاق کو کو موڑتے کرنے کے لئے قائم کر لیا تھا۔ اگر یہ بھی
خوب چل پھول جاتا تو یہ میری خوش قسمتی کا ایک اور ثبوت ہوتا۔
جب قسمت آدمی پر صبر ہو تو زیادہ ہاتھ پاؤں ہلانے بغیر بھی کام
سیدھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اتفاق کو خدا حافظ کہا اور ہم
اپنی اپنی گاڑی میں الگ الگ کھانوں میں روانہ ہو گئے۔ میرا دفتر
واپس جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن ابھی میں دفتر سے کچھ دوری تھا کہ
کار کے خیر ریڈیو پر کھل موصول ہوا۔ میں نے خیر خانے سے
ریڈیو کا ٹھکانا مانگ نکال کر کار کے پیچھے لگایا اور ڈرائیونگ
جاری رکھتے ہوئے بات کرنے لگا۔

دوسری طرف ٹوٹی تھا۔ اس نے اپنے مخصوص غنودگی زدہ سے
مجھے میں اطلاع دی "پارسل دو نمبر پہنچ گیا ہے سہرا"

"کیا؟" حیرت کا اظہار نہ کرنا میری عادت تھی لیکن اس وقت
غیر ارادی طور پر مجھے میں کچھ حیرت چھلکی سی آئی۔ مجھے یقین نہیں
آتا تھا کہ ٹوٹی اور شیر نے اتنی جلدی عالم شیر کو اٹھایا تھا اور دو نمبر
پر پہنچا دیا تھا۔ عالم شیر ان بے ضرر لوگوں میں سے نہیں تھا کہ
جنہیں گھڑے کی چھلی کی طرح دب سی جا یا ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔
اس قبیل کے آدمی کو اٹھانے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑتی
تھی۔ میرا خیال تھا کہ ٹوٹی اور شیر ابھی تو اسے تلاش ہی کر رہے
ہوں گے۔

"ٹوٹی! تم زبان تو نہیں کر رہے؟" میں نے کار کی رفتار بالکل کم
کر دے ہوئے پوچھا۔

"سہرا! انکار ہمیں آپ سے مذاق کرنے کی بھی آزادی حاصل
ہے لیکن ان محالوں میں مذاق کیسا۔" ٹوٹی بولا "یہ محض اتفاق ہی
ہے کہ جو بھی ہم نے اسے تلاش کیا وہی موقع مناسب ترین نظر
آتا۔ ہم نے سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا۔ ہاتھ سیدھا پڑ گیا"
کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ بس ذرا گاڑی کو گھوڑیاں تھوڑی سی
چٹکنی پڑیں۔ بڑی خاموشی اور مٹائی سے کام ہو گیا۔ میں نے سوچا
آپ کو فوری اطلاع دے دوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ دل ڈن۔۔۔ مجھے تم پر فخر ہے ٹوٹی!"
"تھیک ہے سہرا! سو کاٹھ آف ہو۔" وہ یقیناً اپنی کار کوئی کی
دار پارک خوش تھا۔

میں نے سلسلہ متعلقہ کھوا اور گاڑی واپس موڑی۔ میں جب
ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچا تو عالم شیر خانے میں موجود تھا۔ ابھی
اس کی آنکھوں سے پانی بھی نہیں کھولی گئی تھی۔ مس ٹپ اس کے
پاس کھڑی تھی۔ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ میں وہاں پہنچنے والا
ہوں وہ میری ہی بھڑک تھی۔

عالم شیر ایک نیم نیم عجم قد تور اور بارش آدمی تھا۔
اسے بیٹھ نہایت نہیں اور ہمیشہ قیامت کپڑے کی شلوار زیب
دیکھا تھا۔ شلوار قبض اور وائٹ کے ساتھ وہ بھی کچھ غیر
تھا۔ بیروں میں نہایت شاندار اور جم جم کرتی پٹاری پہنا
تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی طے میں تھا۔ بس ذرا لباس ظم
تھا۔ چلو سا بر تھوڑی سی گرد لگی ہوئی تھی اور بال ٹھیک
تھے۔ وہ سکڑی کی ایک غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ
بندھے سوئے تھے۔ وہ بڑے سکون نظر آنے کی پوری پوری
کر رہا تھا۔ تاہم اس کا ایک پاؤں دھیرے دھیرے فرش پر
کر رہا تھا جو اس کے اندر مٹی اشٹراب کا مسٹر تھا۔
"رہ۔۔۔ مس ٹپ! اسمان کے ساتھ اتار اس لوگ!"
نے سنا سنا انداز میں کہا "خود ان کو لو ان کے ہاتھ۔ اور!"
سے پانی بھی مٹاؤ۔"

عالم شیر کی چوڑی پیشانی پر چٹکیں ابھر آئیں۔ شاید
آواز تو بچپن گیا تھا لیکن پھر بھی کسی الجھن میں تھا۔ مس ٹپ
میری دانت پر عمل کیا۔ آنکھوں سے پانی بہنے ہی اس کی غم
سے پہلے مجھ پر پڑی اور وہ اچھل پڑا۔ عام حالات میں بھی
چرے سے خون چھٹکتا محسوس ہوتا تھا لیکن اب تو حکم ہی
چوہلال بھسوکا ہو گیا۔

"وہ۔۔۔ تو یہ تم تھے!" وہ غرایا "کل کے نوٹوں کے
کتنے لپٹے ہو گئے، کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر۔"
"وہ تو تم جیسے استادوں کے کوہ ارتقا تھے پست ہو گئے۔"
ہوتا ہے مجھے یہ دیکھ کر۔" میں نے ترکی بے ترکی جواب دیا۔
اسپانک اس کی نظر مس ٹپ پر پڑی اور وہ گویا اپنا ہاتھ
کیا۔ مس ٹپ اس وقت نیلی جینز اور سفید شرٹ میں
دیپے تو وہ ہر طے میں ہی غصہ کی عورت تھی لیکن بعض
میں تو وہ اپنے سانولے سلوٹے دھوکے کے ساتھ قیامت خو
تھی۔ عالم شیر نے سر سے پاؤں تک ایک ایک انچ کے حاکم
بھری کھلیوں سے اسے پس گھورا جیسے کوئی ترسا ہوا شہزادہ
ایک ٹھونٹ کر کے جام حق سے انار رہا ہو اور اس اندر
چلا ہو کہ اس ایک جام کے سوا اسے کچھ نہیں ملے گا۔

جیسی عورت بھی ایک لمحے کے لئے کھسا کر نہ گئی۔ وہ ان
میں سے تھی جو فوراً نظر ہر کسی کی طرف دیکھ لیتی ہیں تو
پانی ہو جاتا ہے۔
"کچھ شرم کرو عالم شیر!" میں نے تنبیہ کے
کہا۔ "حاجی نمازی اور بارش آدمی ہو لیکن اس وقت
تاثرات دیکھ کر کچھ جیسے گناہ گار کو شرم آ رہی ہے۔"
"وہ جیڑس اپنی جگہ ہیں اور یہ جیڑ اپنی جگہ" موہ
مراد تو رہنا ہی چاہئے نا۔" وہ مس ٹپ پر سے نظر مٹانے
سوئے مسخ ہو نکل پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

محنت اور ذہانت تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اس گوشہ کشائی سے نکل کر بڑا نام بڑی دولت کما سکتی تھی لیکن وہ عجب بے نیاز عورت تھی۔ اپنی اس محدود دنیا میں مگن تھی۔ اور جب سے وہ میرے ساتھ وابستہ ہوئی تھی تب سے تو بہت سی مطمئن رہتی تھی۔ اب تو یہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز رہتی تھی۔

عالم شیر کسی بن مانس کی طرح مس نرپ پر جھپٹا تھا لیکن وہ نہ صرف اپنی جھوک میں آگے کر بلکہ اس کی پیٹھ پر ایک ایسی طاقت بھی پڑی جس نے اسے ایک بہت بڑے گولے کی طرح لٹکا دیا۔ وہ طویل و عریض نہ خانے کی دیوار سے جا کر لایا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا لیکن اس کا وہ عمل یہی توقع کے بالکل برعکس تھا۔ وہ تو گویا فیسے سے پاگل ہو گیا، گچ اپنے بال نوچنے لگا۔

اس کے منہ سے گندی کالیاں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ اس کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس قسم کی کالیاں دیتا ہو گا۔ آج اس کی فطرت کا اصل رنگ میرے سامنے آیا تھا۔

وہ اب باقاعدہ بن مانس ہی کی طرح دونوں بازو پھیلا کر فیسے سے شل شل کرتا مس نرپ کی طرف بڑھا۔ اپنی دانست میں وہ مس نرپ کو نرپ کر رہا تھا۔ اسے گھیر کر نہ خانے کے ایک کونے میں لے جا رہا تھا۔ میرے اور میرے آدمیوں کے لئے اس قسم کے لوگوں سے نسبتاً زیادہ آسان ہو جاتا تھا جو غیظ و غضب سے اندھے ہو جاتے تھے اور جنہیں اپنی طاقت کا بہت زخم ہوتا تھا۔

ابھا قلعہ گھڑ رکھا ہے۔ اس کی آڑ میں تم نے ہر گناہ لے لئے جائز کر رکھا ہے۔ چھوڑا تو کچھ بھی نہیں ہے تم نے اللہ کو ہم کا رہے ہو اور اس کے بندوں کو بھی۔" میں نے کہا۔

"مفضل بیکر مت دو۔" وہ گویا کان پر سے کوئی تابیدہ کھسی اٹے ہوئے بولا "میں نے معاملات کو میں خود بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ یہ سائل کی قیامت ہے کون؟ آغا عرصہ تم سے میل ملاقات رہی۔" رنجی آنا جانا۔ لیکن اس کے تو کبھی درشن ہی نہیں ہوئے تھے۔

اب معاملہ گویا مس نرپ کی برواشت سے باہر ہوتا گیا، پہلی کے لئے کی طرح اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ عالم شیر کے چہرے پر بڑے زور کا گھون پڑا کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اندیشہ محسوس ہوا۔ اس کے چہرے کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ وہ وہاں کم از کم ایک لہ اچھا اور بوسا چاندوں خانے چپٹ گرا جیسے کسی مشین نے رت کا بھاری، سرگرم خا اچھا ل کر کچھ دور پھینک دیا ہو۔

وہ چپٹا آٹھمیں پٹ پٹاتے ہوئے چپٹ کو تک رہا تھا۔ اب اس کی کچھ میں نہیں رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ یہ جیسے تو قوت و قوت کے قوی کایوں اچھا ل کر در در جا کر تا خود اس کے لئے بھی ناقابل فہم تھا۔ اس کے رخسار پر گوشہ پھٹ چکا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ اس کی گھنٹی واڑھی میں جذب ہو رہا تھا۔ ہر حال نوئی بہت جائز تھا، سر جھٹکتے ہوئے جلدی اندھ گھڑا ہوا۔

اس بار اس نے آٹھمیں بیکر لے ہوئے گویا ایک سنے زاویے نگاہ سے مس نرپ کا جائزہ لیا۔ وہ گویا اس کے ہاتھ سے لگی ہوئی نرپ سے بھی لذت کشید کر رہا تھا۔

"مٹکی ہو بھئی! وہ اب ایک تک اسے گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تھمائی اسیا بیاں کسی کو ہلاک کرنے کے لئے کاٹا ہیں۔ اور لہائیاں کو کونہ جانے کیا ہے کیا بنا دیتی ہوں گی۔ غلطی میں۔"

اس بار اس نے شاید کسی حد تک اندازہ کر لیا تھا کہ مس نرپ کی زاوئے سے حملہ کرے گی اور کیا داؤ آزمائے گی۔ اس سنے نہ صرف پہچنے بلکہ مس نرپ کو قابو میں کرنے کی بھی کوشش کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک طاقتور اور مضبوط آدمی تھا۔ بظاہر کسی مضبوط ہوتا تھا کہ اگر مس نرپ اس کی گرفت میں آجائے تو وہ خون کی طرح اسے درمیان سے توڑ کر رکھ دے گا لیکن ایسا ہو سکتا تھا۔ یہ بھی محض عالم شیر کی خوش خیالی تھی کہ وہ مس نرپ کے داؤ بچ کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کے داؤ بچ کو سمجھنے میں تو یہ ایک عرصہ لگ گیا تھا۔ اور اس کی خاطر مجھے مختصر عرصے کے لئے اس کی شاگردی بھی کرنا پڑی تھی۔

وہ شاید ایک سنے اسٹائل کی شہد تھی جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ اس سنے ادرغل آڑ میں اور مشرقی داؤ بچ کو ایک دوسرے میں غافل ملامت سے مدغم کر دیا تھا اور اس کے لئے اس بے مثال اورت نے کسی کی شاگردی نہیں کی تھی۔ یہ خالصتاً اس کی اپنی

لازوال کتابوں کے خالق

انوار صدیقی

کالیک پراسرار ایڈوینچر ٹول

برہمچاری

قیمت: -/150 روپے

دارالعلوم

اردو بازار لاہور

کی "جس میں شرب سے کما ہوا ہے کہ جس میں بیہوشی کو شش مہکی پڑے گی۔ میں نے تو جس ایک ہاتھ میں دیکھا۔ میں ذاتی طور پر اس انداز میں مذاکرات کی ابتدا کرنا لیکن تم جیسے لوگ مجھے یا میرے ساتھیوں کو مجبور ہیں۔"

"مذاکرات؟" وہ قدرے چوٹا "کیسے مذاکرات؟"

"اے۔ اب مجھے ابھی ابھی پڑھ کر سنا پڑے گا۔ یہ قدرے بے زاری سے کہا "میں نے۔" قدرے کچھ یوں ہے کہ بھائے جس میں کسی بد اطوار قسم کے کیزے کے کاٹا اور قلم میں اپنے توہین کو میرا سب سے عمدہ زائر ڈال دینے کا حکم دیا۔ کو شش توان کی یہی رہی ہوگی کہ زائر تمام توہینوں کو ڈوب جائے لیکن میرے قوی اخلاق سے محض پچھلے ہوئے ایک قوی ضرور زائر کو بچانے کی کو شش میں ڈوب گیا۔ دوسرے نہ صرف بچ گئے بلکہ انہوں نے تمہاری طالع اور توہین بھی قابو میں کر لیا۔ لیکن وہ ایک معمولی قسم کی لالچ ہے۔ زائر کا قلم اہل نہیں ہو سکتی۔ اب جس امتحان شرافت داری کا سنا ہو کرتے ہوئے زائر اور مال کی قیمت کے علاوہ والے ساتھی کے لئے تھوڑے سے ذرہ طمانی کی ادائیگی کرنا کہ یہ ناگوار ہے۔ میں قلم جو اپنے معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھے۔ "تمت خوب۔" اس نے استہزاء سے بچے میں کہا لیکن یہ چکا تھا کہ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر حقیر سا لڑکھا تھا۔ "اور یہ ساری رقم ملا کر کتنی ہوگی؟"

"ہاں لاکھ دو سو پچاس زائر اور مال کے دس لاکھ روپے خرچ ہوئے اور بچوں کو دینے کے لئے۔" میں نے باقاعدہ حساب کر دیا۔ "موسمی جان کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ اور جاں نثاران کے غلوں اور جاں نثاری کی تو کوئی قیمت ہی نہیں لگائی جائے لیکن بے جا رہی ہوئے اور اس کے بچوں کے ذہن کے بھر کے کام سامنے مل کرنے کے لئے میں دس لاکھ میں مزید کچھ رقم ان کے لئے کوئی سلسلہ بیٹ کر دوں گا۔ ان کی ذہنی آرام جائے گی۔ یعنی جس میں کل بائیس لاکھ روپے کی ادائیگی کرنی۔" "انشاء اللہ!" وہ ذہریلے لہجے میں بولا "تمہارا جواب حاتم طائی سے ملتا ہے۔ تم زائر پر کام کرنے والے ایک تھا مرنے پر دس لاکھ میں مزید کچھ رقم ڈال کر اس کے گھر بھجواتے "ہاں۔ رقم خاصی کم ہے لیکن فی الحال اتنی ہی سہاوت حاصل ہو سکتی ہے۔ میں جس زیادہ تکلیف میں رہا ہوں۔ "تمہا" مجید کی سے کہا "میرے بعض ساتھی تو ایسے ہیں جن کے باب میں سوچنا ہوں کہ اگر خدا انہما سے انہیں کچھ ہو جائے تو میں انہما کو مال کی طور پر بھی کس طرح طمانی بہم پہنچانے کی کہ کون گا؟ جذباتی طمانی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" چھا۔ "نیک ہے۔ ہم پھر بھی بیٹھ کر یہ حاتم طائی انہما

میں اطمینان سے ایک کونے میں کھڑا تھا دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال میں عالم شیر کو اس قسم کی کچھ خوراک مل جائی مناسب تھا۔ اس کے بعد مجھ سے مذاکرات کرنے کے لئے آؤں زیادہ مناسب حالت میں آجائے گا۔

میں شرب بظاہر بالکل پرسکون تھی لیکن اسے اس شخص پر یقین بہت فائدہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیرینی کی سی چمک تھی اور اس کی نظر ایک خانے کے لئے بھی عالم شیر سے نہیں اٹھتی تھی۔ عالم شیر نے اس بار دھوکے سے میں شرب کو لات رسید کرنے کی کوشش کی لیکن اس نا اہلی جیسا پاؤں دیوار سے ٹکرایا اور ساتھ ہی میں شرب نے انہی بے رحمی سے اس کی گردن پر چاب رسید کی کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا "اس کی ساتھ جیسی گردن ٹوٹ نہ سکتی ہو۔"

وہ لہرایا اور کئے ہوئے شیر کی طرح ڈھیر ہونے لگا۔ اس لمحے میں شرب نے ایک اور کمال دکھایا۔ اس نے ہلکی سی تیزی سے دھاتی تین من ڈزنی اس دشت زہد میں ماس نما انسان کو بالکل اس طرح اٹھالیا جیسے وہ نظر اٹھاتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ اسے فرش پر پٹخ چلی ہوئی "اگر میں بروقت نہ چلا "جلی اسٹاپ۔" قیمت ہمارے مجھے یہ وہ الفاظ ادا کرنے کی سلسلہ مل گئی۔ اگر عالم شیر فرش پر پٹخا جا چکا ہوتا تو نہ جانے اس کا کیا مشر ہوگا۔ میں ممکن تھا کہ کھوپڑی کی جگہ سے چل جاتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ زبردہ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ باقی ٹوٹ پھوٹ تو شاید قابلِ مرمت ہوتی لیکن ان دو چیزوں کی ٹوٹ پھوٹ کا علاج ذرا مشکل تھا اور میں نے اسے مذاکرات کے لئے اٹھوایا تھا "طالع معالجے کے لئے نہیں۔"

جلی حرف میں شرب نے بے مشکل اپنی روانی کو کھنکھول کیا اور چٹنے کے بجائے ذرا آہستہ سے عالم شیر کو فرش پر ڈال دیا لیکن یہ بھی کچھ دیر کے لئے اس کے حواس کھل کرنے کو کافی تھا۔ وہ وہیں پڑا رہا "اٹھ نہیں سکا۔"

میں شرب نے قدرے عداوت سے میری طرف دیکھا "آئی ایم سو ری سرائیج سے کافی تکلیف غلطی ہوئی۔ میں تو کبھی تھی کم لوگ اپنے اس قسم کے معاملات میں جذباتی ہونا بھول چکے ہیں لیکن لگتا ہے ابھی کچھ جراثیم باقی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں! نہیں باقی ہی رہتے۔" میں نے طمانیت سے کہا "میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگ انسانوں کے بجائے بدوٹ بن جاؤ۔ مجھے بدوٹوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اپنا لباس درست کرنے لگی۔ میں نے عالم شیر کو گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور ٹکڑی کی ہماری بھر کم کر سی پٹخ دیا۔ اس کے کس بل نکل چکے تھے۔ وہ اب بالکل پرسکون تھا کہ تھا تھا سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ اپنی لمبی سی قمیص کے دامن سے اپنا چہرہ پوچھے ہوئے بولا۔ "جس میں بیہوشی کی یہ کو شش مہکی پڑے گی۔"

"تمہارا روئے غن کی اور طرف ہونا چاہئے۔" میں نے صحتی

باران دیدہ دودھ چتا پڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تم اپنا اور میرا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو۔ اپنی جان بکان کر رہے ہو اور صورت حال کو مشکل سے مشکل بن رہے ہو۔ اپنے لئے مزید الجھنیں مول لے رہے ہو۔ مسئلے کو مختصر کرو۔ بائیس لاکھ کی ادائیگی کا بندوبست کرو اور اپنے گھر جاؤ۔

حسنت خوبصورت: وہ ایک بار پھر ٹھہرے سے لمبے میں بولا "بائیس لاکھ روپے کی فراکش تو تم اس طرح کر رہے ہو جیسے بائیس لکھے ہیں جو میں تمہارے سامنے بیچوں اور گھر چلا جاؤں۔ بغیر کسی مستقل وجہ کے تو میں بائیس لکھے بھی اس طرح نہیں بیچ سکتا۔ مانا کہ تم نے بے اندازہ دولت کمائی ہے لیکن پھر بھی روپے پیسے کو اتنا حقیر سمجھنا مت شروع کرو ورنہ جلد نکال ہو جاؤ گے۔"

"تم میری فکر میں مبتلا ہونا چھوڑو۔" میں نے زکھائی سے کہا۔ "میں نکال رہوں یا ادب جی ہر حال میں زندگی گزار لوں گا۔ تم اصل بات کا جواب دو۔" جس بائیس لاکھ کی ادائیگی کئی ہے۔ جتنی جلد کرو گے اتنی جلدی گھر ماسکو گے۔"

"بھئی یہ تو ابھی نظر آتی ہے۔ انسان ان میں حیرا مسمان۔ یہ تو تم نے بہت اچھا وعدہ شروع کر دیا۔" خواہ برائے آواں۔ کیسی یہ بھی تمہارا سائیز بڑی تو نہیں ہے؟ خوار، ملے آوی کو انھو الیا اور میں تیس لاکھ کا مطالبہ لیکن گئے سرے وار دیا۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"اگر تمہاری پہلے ہی اتنی پائی نہ ہو جی ہوتی تو اس بات پر میں تمہارے منہ پر کم از کم ایک چمچ ضرور رسید کرتا۔ لیکن اس وقت مجھے اندیشہ ہے کہ تم میرا چمچ بھڑا اشت نہیں کر سکو گے۔ مر مر جاؤ گے اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم بائیس لاکھ کی ادائیگی کرنے سے پہلے مر جاؤ۔" میرے بارش کا اندازہ اغوا برائے توان نہیں ہے۔ زور بازو اپنے نقصان کی حلائی کرانے کا ایک طریقہ ہے۔ اب بار بار یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ تم اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم نے ممان کی ہے۔ جرمانہ تمہارے سر پہنچا ہے۔ رقم دے بغیر اب تمہاری جان نہیں چھوٹ سکتی۔" میں نے غصے سے غصے سے کہا۔

"کیا کرو گے تم؟" میں نے مجھے گھورا۔ "تم عالم شیر ہو۔ یعنی عالم کے شیر۔ میں جس عالم کا ملک بنادوں گا۔ تمہارے گلے میں ڈنڈا زال کر اس ستون سے باندھ دوں گا۔ پھر تم ساری زندگی میں بندے رہو گے اور یہ زندگی بہت مختصر ہوگی۔ صرف چند دن کی۔ اس لئے کہ جس کمانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت نہیں چھڑا کر نہیں لے جاسکے گی کیونکہ کوئی تمہارا سراغ ہی نہیں پاسکے گا۔ ادائیگی کے بغیر اب یہاں سے تمہارا ڈھانچا ہی باہر جاسکے گا۔ اور دولت و جائیداد ڈھانچوں کے کسی کام نہیں آتی۔ بہت دولت کمائی ہے تم نے بھی۔ بائیس لاکھ روپے کے لئے کیوں زندگی داؤ پر لگا رہے ہو؟"

میں نے فی الحال مجھے جانے دو۔ میں کوشش کروں گا کہ اس ملک کو بھول سکوں۔" وہ جیغ کپڑے جھاڑ کر اٹھنے لگا۔ میں نے کچھ اس طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ دیا کہ وہ وہاں بیٹھ گیا۔ تاہم اب وہ مس ٹیپ کی طرف بالکل توجہ نہ دیتا تھا۔

"نیکو۔" انی ابرو دار "وہ گویا قتل سے کام لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔" مگر کسی غلط فہمی میں جتا ہو کر میرے ساتھ یہ کی کر رہے ہو تو میں جس میں معاف کرنے کے لئے تیار ہوں۔

اب تم مجھے جانے دو۔" "معاف تو میں بھی نہیں کر ہی دوں گا۔" میں نے گویا بادل سے کہا۔ "لیکن اس معاملے کا کم از کم مالی پلوس سے تو تعین ہاں۔"

"مگر سامعہ؟ تم کیا بائیس کر رہے ہو؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" وہ بے پناہ حیرت کی کامیاب ادائیگی کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں جوہ زار و فیو کی بات کر رہا تھا تو دراصل کسی ایڈوکیٹ اسٹوری سے اقتباس بنا رہا تھا؟" میں نے غصے سے کہا۔

"میں تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔" وہ منہ بنا کر بولا معلوم تو میں ہوا تھا کہ تم مجھے کوئی کمائی بنا رہے ہو لیکن مجھے اس کا کوئی سرا نہیں نظر آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا چیز میرے سر فوسنے کی کوشش کر رہے ہو ایسے آوی۔ کیا سازاں ہے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم "کراچی میں تمہارے کتنے خاں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔"

"وہ صرف فشنگ کرتے پھر رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات انہ سے کہانی۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے کسی خاں کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم تاج کل کراچی میں کیا ہوا ہے۔ وہاں میری تمام سرگرمیاں بالکل بند پڑی ہیں۔ میرے آوی ہاتھ پر انھو دھرتے بیٹھے ہیں۔"

"خدا ہی اعلم کہ تم نے سوچا ہو کہ فرصت کے ان لحاظ سے کہ انھو اٹھائے جانے اور اپنے جذبہ کینہ بددی کی تسکین کر لی جائے۔ پھر شاید تم نے سوچا ہو کہ مجھ جیسے پھر خود اہل کو اس حکم کا دوز سے رہنا چاہئے تاکہ وہ سرکشی اقتدار نہ کھائیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ الفاظ دہرا رہے ہوئے بولا "آخر تم اپنی ہی کیوں باتیں جا رہے ہو؟ میری بات کو کیوں کوئی اہمیت نہیں دے رہے؟"

میں نے اس کے لئے جو میرا غیر ارادی طور پر سو مری تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "عالم شیر! جب تم جیسے کر گہر

خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کے خیال میں یہ اقدام تھا۔

میری بھی قویں نے کہا "عالم شیرا تم واقعی آوی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں انتہائی احتیاط یا انتہائی شاطر۔ ایک لمحے میں تم نے پتہ شاطر معلوم ہو اور دوسرے ہی لمحے انتہائی احتیاط۔ میرے بارے میں اطلاعات بہت ہی پرانی ہیں۔ یا پھر تمہارا ذہن بس کسی دور میں ہی نکلا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے ابھرنے والے لہجے میں پوچھا۔
"میں نے پہلے بھی باتوں باتوں میں کئی بار اشارتاً جس شخص شاید تمہاری انہی کو ذمہ منتری کے درجے سے بات کیا میں نہیں آتی۔" میں نے کسی سانس لے کر کہا "میرے ہر ایسی کوئی کمزوری و اہمیت نہیں جس کا سامرا لے کر تم اس دھمکیوں سے مجھے ہلک سلا کر سکو۔ میرے تمام کامدادی قاتلی ہیں۔ تمام مختلفہ ٹھکانوں میں رہنمائی ہیں۔ میں تمام اقسام کے ٹیکس یا نقدی سے ادا کرتا ہوں۔ میرے تمام آؤٹ ہوتے ہیں۔ میرا تمام سرمایہ ڈاکو سٹیٹش کے تحت کر ہے۔ میرے بارے میں کسی مجھے میں کوئی ایسی فائل کل نہیں ہے جس کے خوف سے مجھے راتوں کو نیند نہ آتی ہو۔ اور نہ کوئی فائل کل سکتی ہے۔"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے پلکیں جھپکا رہا تھا کے چہرے پر دورم سا آنے لگا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے کہا "وہ میرا ڈانوائی کا ایک مختصر سا دور تھا جو تمہارے ذہن ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد نہیں۔ یا شاید معلوم نہیں کہ میں نے جلد اس دور کراہی سے بچا ہوا تھا۔ میں نے اپنی اصل اپنے جائز کامدادیوں سے خیر کی ہے۔ میں کسی قسم کے خوف سائے میں زندگی نہیں گزار رہا ہوں۔ تمام ایجنسیوں سربراہوں تمام ٹھکانوں کے سیکرٹریوں اور اکثر اہم و ذہن ان کے دفاتر میں ہو چکے ہیں اور تقریبات میں ملاقاتیں رہتی وہ مجھے بھی جانتے ہیں اور میرے کامدادیوں کو بھی۔ سب سے اچھے مراسم ہیں۔ کبھی کسی نے اشارتاً بھی مجھے کوئی دھمکی دی۔ میں بہت حساب کتاب سے چل رہا ہوں عالم شیرا مجھے تمہارے ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ میں قدم قدم پر ہینگ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔"

"اور تم ٹینگ دار سے بھی نہیں ڈرتے؟" عالم شیرا نے مجھے لہجے میں پوچھا۔ "جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہے ہو اس کے ہمارے درمیان ایک خوف ناک ٹینگ دار بھی چھڑکتی ہے۔" "ٹینگ تمہارا ہو گا۔ میرا کوئی ٹینگ نہیں ہے۔" میں نے فحاشی کی "بہت سے شریف اور سحر زدہ لوگ میرے ساتھ ہی ہیں۔ یہ لے کام کرتے ہیں۔ بس جب کہیں سیدھی انگلیوں سے کسی

اب شاید اسے چین سا آنے لگا کہ وہ واقعی بری طرح چسپ کیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر اداکاری کی جو دھول اڑ رہی تھی وہ میرے دھمکے بیٹھے گئی۔ اب تک وہ بڑی کامیابی سے انجان بنا ہوا تھا کہ اب اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس سامنے واقعے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ مگر آوی ضدی اور جھپٹا تھا۔ مزید ایک کوشش سے پڑنے نہ سکا۔
"مکانہ انداز میں گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولا "تمہیں ضرور کسی نے بھڑکایا ہے یا پھر واقعہ اس طرح پیش آیا ہے کہ تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"مجھ تک کوئی رپورٹ صرف اس وقت ہی پہنچی ہے جب اس میں سے افواہوں اور غلط فہمیوں کی ساری مادوث چھان چٹک کر نکال لی جاتی ہے۔ وہ سو فیصد خاص حقیقت رہ جاتی ہے کیونکہ مجھے فیصلہ کن قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ اور میرے ساتھیوں کو معلوم ہے کہ میں کیا قدم اٹھاؤں بالکل پتہ نہیں کرتا۔" میں اب بھی اسے غل سے سمجھا رہا تھا۔

"مگر میں تمہاری دھونس دھاندلی سے مجبور ہو کر تمہارے الزام کو درست تسلیم کر گئیں تب بھی باتیں لاکھ بہت بڑی رقم ہے۔ اس میں کی ہوتی چاہئے۔" میں لاکھ تو میں نے پچھلے پورے سال میں بھی نہیں کمایا۔ یہ سال بھی مندرای جاتا دکھائی دے رہا ہے۔ "سودے بازی بالکل نہیں ہوگی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں تمہارے ہاتھ اس تک فروخت نہیں کر رہا ہوں جس کے رٹ ادب چنے کرتے جانتے۔ تم نے میرا ایک نقصان کیا ہے جس کی تمہیں اطلاع کرنی ہے۔ اور بس۔ تم سے پرانے مراسم تھے اس لئے تمہاری اتنی بکواس سن رہی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے ساتھ میں اتنا وقت ضائع نہ کرتا۔"

"چھا۔ تو باتیں لاکھ لے کر تم مجھے چھوڑ دے؟" اس نے تھوڑی سی ہنسائی۔

"بالکل۔ میری تم سے کوئی دشمنی توڑی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم واقعی بہت اونٹنی چیز ہو گئے ہو۔" اس نے جیس ہی نظروں سے میری طرف دیکھا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بے خوف ہو گئے ہو۔ عام طور پر تو زیادہ دھمکے آوی کو بھل جاتا ہے۔ تمہیں اس کا بھی خوف نہیں کہ میں باہر جا کر کوئی جوابی کارروائی شروع کر سکتا ہوں۔"

"مثلاً؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"مثلاً۔" وہ نظریہ اٹاتے ہوئے بولا "میں حکومت کو غبی کر سکتا ہوں کہ تم درحقیقت کیا ہو۔ تمہارا اصل کامدادی کیا ہے۔ میں مختلف ایجنسیوں کو تمہارے پیچھے نکال سکتا ہوں۔" مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔ وہ بیٹانی پر غلٹیں لے میری طرف دیکھ رہا۔ شاید اسے حیرت ہو رہی تھی کہ میں اس کی دھمکی سے

طارق انجیل ساگر - 150/-	امریکہ سے امریکہ
طارق انجیل ساگر - 125/-	صومیت اور عالم اسلام
طارق انجیل ساگر - 200/-	کورٹ مارشل
طارق انجیل ساگر - 150/-	آخری گناہ کی مہلت

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے اپنے لئے آواز دی۔ خانے میں ایک طرف چھوٹے چھوٹے کمرے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور بدو اس طرح باہر آیا جیسے کوئی باغی اپنے آپ کو سیکڑا سیٹھا ہوا کسی ڈربے سے برآمد ہوا ہو۔

بدو کسی باغی سے کم نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ باغی کو دیکھ کر کوئی انداز خوف نہ نہیں ہو سکتا تھا بدو کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ وہ بلاشبہ غلوں میں کسی کیراڑک کے بغیر ہی جن بحوت کا کردار نہایت آسانی سے ادا کر سکتا تھا اور ڈانڈیکٹر کو بے پناہ دلاؤ دلا سکتا تھا۔

وہ انفریقوں کی طرح سیاہ قام تھا لیکن موٹے موٹے ہونٹ یوں سرخ رہتے تھے گویا ان پر لپ اسٹک لگی ہو اور ان ہونٹوں کے عقب سے جمائے والے بڑے بڑے دانت نہایت سفید اور تیز تھے۔ یہ دانت اس کی سیاہ رنگت کے ساتھ جو قدرتی کنٹراسٹ پیش کرتے تھے وہ کوئی پتلا ایک اپ میں بھی بڑی مشکل سے پیدا کر سکتا تھا۔

اس کا قد تقریباً سات فٹ تھا۔ بازو اور ٹانگیں شہتیروں سے شاید تھیں۔ عام طور پر اس وضاحت کے توئی چلتے ہیں تو فصل فصل کرتے ہیں لیکن بدو کا جسم فولاد کی طرح مضبوط تھا۔ اس کی چھڑا دوشنی میں جھللاتی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور دائیں رخسار پر آنکھ سے لے کر ٹھوڑی تک زخم کا گہرا نشان تھا جس نے آگے چہرے کو گہرا بدو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ چہا تھا تو زمین میں ہلکی سی دھمک محسوس ہوتی تھی۔ اسے اچانک دیکھ لینے والا تو اپنی جگہ کو مشکل سے ہی ہلکے پاتا تھا۔

عام شیر جیسا غر اور جمادیدہ توئی بھی اسے دیکھ کر سسم کر رہ گیا کیونکہ بدو مسکراتا ہوا اسیدھا اس کی طرف آ رہا تھا۔ اور بدو کی مسکراہٹ تو بہت سی غصہ ڈھاتی تھی۔ موسم خواہ کچھ بھی ہوتا، بدو سال کے بارہ مہینے اسی قسم کی ذلیل ڈھالی ٹیکر پہنتا تھا جیسی پرانے زمانے میں سیاہی پہنتے تھے لیکن اس ٹیکر پر عام توئی کے سوٹ سے زیادہ کپڑا تھا۔ تب بدو کے لئے ذلیل ڈھالی اور پتول اس کے آرام دہ رہتی تھی۔ اگر کوئی باغی ٹھوڑی سی بے

جاگھیاں ذرا ٹیڑھی کر لیتے ہیں۔ ہمارا ٹھہرنا حیات یہ ہے کہ کے ساتھ فزائی مت کرو اور اپنے ساتھ کوئی زیادتی ہونے نہ ہو۔ اس کی بات ہے۔ اگر تمہیں ایسا کوئی سلسلہ شروع نہ کا شق ہے جسے تم ٹینگ دار کا نام دے رہے ہو تو وہ بھی نہ سہارا یہ امان بھی نکل جائے گا۔ لاشیں اٹھائے اٹھائے

جاؤ گے۔
میری سمجھ میں نہیں آیا تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ وہ بے بسی سے عالم میں سر ہلاتے ہوئے بولا "تم نے اپنے لئے بہت اک راستے منتخب کر لئے ہیں۔ ان طریقہ طور طریقوں کے ساتھ زندگی میں گزارا نہیں ہوتا بلکہ رازا اب بھی وقت ہے تم اپنی وقتانہ تکرار چھوڑو اور مجھے رہا کرو۔"

"تمہیں یہ طور طریقے بھی نظر آ رہے ہیں؟" میں نے اسی سے کہا "میری طور طریقے اتنے مضبوط طے نہیں ہوتے ہیں زیادہ پیش ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس بھی طور طریقوں کو بھی بھارت۔ میرے توئی تمہارے گھر بھی چھائی کر سکتے۔ تمہاری اینٹ سے اینٹ جاسکتے تھے۔ تمہارے گاڑو کو ہلاک کر سکتے تھے۔ تمہارے گھر میں موجود تمام نقدی اور زیورات وغیرہ نہ کر سکتے تھے شاید مجھے میرے مطالبے سے زیادہ ہی مل جائے۔ غلوں کے گھر میں کافی نقدی اور زیورات وغیرہ پائے جاتے۔ لیکن میں اچھے گلیا طور طریقے اختیار کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ ایک معزز اور امن پسند آدمی ہوں۔ اکثر معاملات میں بڑے رٹے لٹا پسند کرتا ہوں۔ بس بعض قومیں کو میرے لالچ کے لئے تمہارا اشارت کرتا رہتا ہوں۔ تم سے بھی نہایت آرام دہ لون سے تمام معاملے پاسکتا تھا۔ یہ جو ٹھوڑی سی تمہاری توڑ ڈال ہوئی ہے یہ تمہاری اپنی بد نظری اور بد گالی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور ذرا کرات میں آخر بھی تمہاری وجہ سے ہو رہی ہے۔ تم اپنے آزمائش با عزت طور پر میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ مختصر انگور کرتے، دوا نیکی کا طریقہ لے کرے اور ادا نیکی ہونے ہی اپنے کرچے جاتے۔ کتنا آسان تھا یہ سب کچھ۔ تم نے اسے مشکل بنایا ہے۔ میں نے انکی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چہلے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا رہا۔ شاید اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہی میرا طریقہ حیات ہے۔ ہمارے طور طریقے یہی ہیں۔ ہر حال اسے غالباً یہ یقین آ گیا تھا کہ ادا نیکی اسے کرنی ہی پڑے گی۔ اور یہ اس کے لئے بلاشبہ بہت بڑا عرصہ تھا۔ شاید اسے اپنے جسم پر چھنے والی اچھی ہلکی خطرناک ضربات سے انکی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی اس ہضم کی طرف آ رہے ہوئے پیڑی رہی تھی۔ اس کے کندھے تک دم بالکل اچیلے ڈھالے انداز میں جھک گئے۔

"میں رقم کا بندوبست کیسے کروں؟" اس نے گفت غورہ کیے میں پوچھا۔

آرامی ہوا تھا کہ پند کرنا تو وہ بھی اسے زیب تن کر سکتا تھا۔ بدو اپنے بچے لانا تھا پر ایک ٹیلی فون سیٹ اٹھائے ہوئے تھا جس کی آواز بچے گھنٹی آ رہی تھی۔ وہ ایک جھکے سے عالم شیر کے سامنے رکا تو عالم شیر کرسی سمیت اٹھنے اٹھنے چلا۔ بدو نے بچہ بولنے بلیر بدستور مکرانے ہوئے ٹیلی فون عالم شیر کی گود میں رکھ دیا۔

”ہمت اپنے وقت پر تم نے معقولیت سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔“ میں نے عالم شیر سے کہا ”ورنہ تمہاری خدمت سے شک آخر اب میں تمہیں اس کے حوالے کرنے کا سوچ رہا تھا۔“ میں نے بدو کی طرف اشارہ کیا اور عالم شیر تھوک ٹھک کر گیا۔ غالباً اسے خود بھی اپنے فیصلے پر خوشی ہوئی تھی۔ بدو فوراً ہی کمرے میں واپس چلا گیا تب عالم شیر کی جان میں جان آئی۔

”مجھے کیا کہنا ہے؟“ اس نے ہنسی ہنسی تو اڑ میں پوچھا۔ ”فون کرو۔“ میں نے اس کی گود میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا ”کسی بھی ایسے آدمی کو جو تمہاری ہدایت پر بائیس لاکھ روپے کیس کا انتظام کر سکتا ہو۔ اس سے کم ورت کم کل شام تک اپنے پاس تیار رکھے کل اسے بتایا جائے گا کہ رقم کب اور کہاں کوئی اس سے وصول کرنے آئے گا۔“

ایک لمحے کے توقف سے میں نے ہدایت کی ”کوئی فالتو بات مت کرنا۔ سمجھو اور توی ہو۔ فی الحال یہ صرف روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ اسے زندگی اور موت کی بازی مت مانا۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پیشانی سلاتے ہوئے چند لمحے کچھ سوچا رہا پھر ریسیور اٹھا کر خبردار کل کرنے لگا۔ مجھے اس کی طرف سے تقویٰ نہیں تھی۔ مس ٹپ اس کے سر پر کھڑکی تھی۔ اس کی نظروں کی اگلیوں پر اور کان بقیہ اس کی آواز پر تھے۔ عالم شیر نے نہایت شرافت سے فون کیا۔ بات اب اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کا مطلوبہ آدمی پہلے خبر نہیں ملا تھا۔ اس نے ایک اور جگہ فون کیا تو وہ مل گیا۔ اس نے اپنی خیریت کی اطلاع دی ”رقم کا انتظام کرنے کے لئے کہا اور کوئی غیر ضروری بات کے بغیر خودی سلسلہ منقطع کر دیا۔“

”اب تم ہمارے صمان ہو۔ اب تمہارے ساتھ باعزت سلوک ہو گا۔“ میں نے مکرانے ہوئے کہا اور مس ٹپ کو ایک طرف لے جا کر اس کے بارے میں دریافتیں دیں اور کہا ”رقم وصول کرنے کا معاملہ اب میں فون کے سپرد کر دوں گا۔ وہ خودی سارے انتظامات کر لے گا۔“ اس نے تھمکی انداز میں سر ہلایا اور میں نہ جاننے سے کل آیا۔

دوسرے روز بدو ہر کے قریب ہی فون ایک برف کس اٹھائے میرے آفس میں پہنچا۔ نہایت سرسری سے مجھے میں اس نے مجھے اطلاع دی ”رقم وصول ہو گئی ہے سہرا“

”گھر“ میں نے چند کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کہا ”کوئی

دشمنی تو پیش نہیں آئی؟“

”بالکل نہیں سہرا“ فون نے جواب دیا ”میں نے رات والے کو پہلے ایک جگہ پہنچنے کی ہدایت کی۔ پھر فون پر اسے جگہ پہنچنے کا حکم دیا۔ پھر تیسری جگہ پہلے میدان میں بلایا۔ دوران میں نے اس پر نظر رکھی۔ اس کے ساتھ کوئی سادہ لباس یا کوئی مشکوک آدمی نہیں تھا۔ نہایت پرسکون انداز میں یہ اس سے رقم وصول کر لیا۔ اس نے ہدایات پر حرف بہ حرف اٹھا۔ وہ عالم شیر کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے تمام کاغذات و شریک ہے۔“

”کچھ پوچھا تو نہیں اس نے؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”وہ کالی خوف زدہ نظر آ رہا تھا سہرا“ فون نے جواب دیا دیتے وقت اس نے صرف اتنا پوچھا کہ حاجی صاحب کو کب چھوڑ دیا جائے گا۔“

”تم نے کیا جواب دیا؟“ ”ہی کہ رقم چیک ہونے کے صرف ایک یا دو گھنٹے بعد چھوڑ دیا جائے گا۔ رقم میں نے چیک کر لی ہے۔ پوری ہے۔ تم بھی اسلی ہیں۔“ فون نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے قائل سے نظر ہٹائے بغیر کہا ”یہ جزیل غیر کو دے دو اور بتا دو کہ یہ کراچی میں سفر ہوگی۔ تم دو غیر بازا اور حاجی صاحب کو صحیح طریقے سے کسی مناسب جگہ پر پہنچا دو۔ آخر کینہ پور ہے۔ اس کی طرف سے ابھی بھی ہوش رعبی کی ضرورت ہوگی۔“

”میں کچھ حوصلے کے لئے ایک آدمی کی فون لی لگا دیتا ہوں اس پر نظر رکھے گا۔“ فون نے جواب دیا۔

”خیر۔ اب اتنے بھی تردد کی ضرورت نہیں۔ اٹھ اٹھ جا۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ”مگر اس نے آئندہ کو بدحاشی کی قوائے زیادہ سخت سزا دیں گے۔“

”فون رخصت ہو گیا تو میں نے شفیع شاہ کو کراچی فون کیا اور ہدایت کی ”عالم شیر کے آدمیوں اور لالچ کو چھوڑ دو۔ ارشد علی کے گھر دس لاکھ روپے پہنچا دو اور آئندہ بھی اس کی بیوہ اور بچوں کو خبر رکھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ جہانہ وصول ہو جائے تم چاہو توئے زار کا آدمی بھی دے سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے سہرا“ شفیع شاہ نے جواب دیا ”اب سے دو نمہ بہت ضروری باتیں کرنا چھیں۔ باتیں بہت اہم اور تفصیل طلب ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ لاہور کا ایک چکری لکڑیوں۔ لیکن کا اتنے پہلے ہوئے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں مل رہی۔“

”مقرر فون پر ہی کر لوں گا باتیں۔“ میں نے کہا ”تفصیلات دن میں بیڑہ کر کے کر لیں گے۔“

”سہرا ایک تو ہوئی کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ہوئی کے سب کام مکمل ہو چکے ہیں۔ اسلاف تک رکھ لیا گیا ہے۔ اگلے پانچ

”میں نے اس کی بات کانتے ہوئے پوچھا۔
 ”اس کا اشارہ زراعوں کے ذریعے مای گیری کے کاہدبار کی
 طرف تھا۔“ فتح شاہ نے جواب دیا۔

”مگر حاکم نے اس سے تو ہر شرع کاہدبار چھوڑا
 اور کذا نظر آتا ہے۔ یہی زرار اگر اس پاس کے کھلیں سے دھڑ
 و حزال اسکل کر رہے ہوتے تو وہ ان میں ہی رہی لیتا۔ اس نے
 اسی قسم کے کسی کام کی پیشکش تو نہیں کی؟“

”نہیں سرائے فتح شاہ بولا ”تو کچھ بڑے کاہدباروں کی بات
 کر رہا تھا۔ اس نے مجھے حاکم مصطفیٰ سے ملوایا۔ وہ بتی خاص زرا
 تھا۔ اس میں صرف چار توی ی مدعو تھے۔ سمان خصوصاً حاکم
 مصطفیٰ ہی تھا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟“ اس نے تصدیق
 چاہی۔

”جیہیں نہیں۔ کہ وہ یہاں یعنی اپنے ملک میں کسی مائی جانا چاہتا
 جاتا ہے لیکن میں ہر حال اسے جانتا ہوں۔ لندن میں ایک بار اس
 سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ یہی شہر چنگ کہتی ہے اس کی سٹالیا
 چار سو۔ بحری جہاز ہیں اس کے پاس۔ لیکن پاکستانی ہونے کے باوجود
 اس نے اپنی کھیتی باڑی میں قائم کی تھی اور وہیں اس کا بیٹا کواریزما
 رکھا ہے۔ وہ یہاں کے نظام پر بددھرم کسی اور اس قسم کی دوسری

اس کی تشریح میں شروع ہو رہی ہے۔ اس کی اوہنگ کا
 رام نے کہا تھا۔“ فتح شاہ بولا ”جس ایڈورڈ نریک انجی کے
 جمانی پلیٹی کہیں ہے“ افتتاح کی تقریب کے انتظامات کا شکا
 یہی اسی کو دے رہا ہوں۔ اس سلسلے میں اگر آپ کی کچھ خاص
 بات ہوں۔“

”جیہی مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔“ میں نے اس کی بات کانتے
 نے کہا ”یہ کام تم مجھ سے بہتر طور پر آدھار کر لیتے ہو۔ جس
 راجل چاہے کرتے رہو۔ اس اوہنگ کی نامیخ نے کے کے مجھے
 مانگے رہے۔ میں اس کے مطابق اپنا شیڈول ماناں لگ۔ اس
 رات صرف انا چاہتا ہوں کہ اوہنگ ہو تو شرمیں دھرم کے
 یک ہر شعبہ زندگی کے مشورہ ترین لوگ اس روز زرا زمین موجود
 نے چاہیں۔ ملک کے سب سے اوہنے ہتے کے سب سے اوہنے
 راکو اپنی طرف کھینچنے کے لئے جیہیں جو بھی طریقہ اختیار کرنا
 ے کہو۔ جس کی بھی خدمات حاصل کرنی چاہیں کہو۔ وہ یہ پالی کی
 راج ماناں کسی بات کی ہر دامت کہو۔“

”مگر تو پالی کی طرح برہی رہا ہے سرائے فتح شاہ بولا ”ہر حال
 دھرم تو شرمیں اس کے افتتاح سے پہلے ہی جی چکی ہے۔ افتتاح
 کی تقریب کو بھی میں آپ کے خیالات کے میں مطابق ماناں کی
 روش کوں گا۔ اس پر کام تو شروع ہو چکا ہے۔ ہر بڑے شرمیں ہر
 شعبہ زندگی کی اہم ترین شخصیات سے رابطہ قائم کیا جانا
 ہے۔ ایڈورڈ نریک انجی نے اس سلسلے میں مختلف کاموں کے لئے
 نوڑے نوڑے آدمیوں کی کئی کیشیاں بھاری ہیں۔ سائل رپورٹ
 تیار ہوتے ہی میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ جب آپ اس کی
 منظوری دے دیں گے تو صرف نامیخ لے کرے کا کام رہ جائے
 گا۔ اس میں بہت اعلیٰ درجے کے ایک درائی ہو کر ام کی تیارواں
 کی ہو رہی ہیں جو ہم اپنے ہوٹل کے ٹیڈورم میں پیش کریں
 گے۔ افتتاح کی تقریب پوری رات چلے گی۔ اگر ہو کر ام زیادہ پیلا
 تو ہم ان تقریبات کو دوا ٹیم راتوں تک لے جائیں گے۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے نامیخ کی ”تو سب کچھ جیہیں ی
 کرنا ہے۔ جیہیں معلوم ہی ہے کہ بڑے پوہ پیش میں مومناں ماناں
 ہے۔ ہمارے تو میں مھر میں ی رہتے ہیں۔ ان کا کام تو وہی ہے۔ فرام
 کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہمارے لوگ کام کرتے رہتے ہیں۔ تم بھی جتنے
 لوگوں کی چاہو خدمات حاصل کرو۔ اس ان کو کمان کرنا ہمارا کام
 ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں موجود ہو تو مجھے کوئی نقصان نہیں
 پہنچ سکتا۔ سرائے کیا مسئلہ ہے؟“

”میں سینہ داند لے مجھے اپنی کوٹھی پر ایک پرائیوٹ ڈائری
 لایا تھا۔ سب طویل مشکو رہی اس سے۔“ فتح شاہ بولا ”تو کہہ رہا
 تھا تم لوگوں کے پاس اتنی میں باور ہے“ انا دیتے ہے۔ پھر تم نے
 بڑے اور صاف تحفے کاہدباروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اور
 گدے گدے کاہدبار کیوں شروع کر رکھے ہیں۔“

ہمارا جہ رنجیت سنگھ اور ان کی عیاشیاں

☆ ---- پروفیسر ایم اشرف

ہمارا جہ رنجیت سنگھ کے متعلق تحریر کی
 مئی ایک مکمل حوالہ جاتی کتاب جو قاری
 کے لئے دلچسپی کا باعث بنے گی۔

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

چیزوں سے مت ہے زار تھا۔ اس نے یہاں پاؤں نہالنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آواز ہی باہر سے کیا تھا۔

”بالکل ٹھیک ہے سرائے دی توئی ہے۔“ شفیع شاہ بولا اس کے پاس چار سو نہیں پانچ سو بکری جاز ہیں۔ ایک انڑا لٹن میں بھی اس کے شیر ہیں۔ ریل اسٹیشن کی اس کی ایک ٹین الا توئی ابھی ہے جو دنیا کے سب سے ترین مقامات پر جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتی ہے۔ معزول اور سرسراہٹ پر ہر طرح کے بادشاہ، شیوخ اور دنیا کے امیر ترین افراد اس انجینی کے توسط سے محلات، حویلیاں اور ولاز خریدتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس انجینی کے پیچھے اصل شخصیت کون ہے اس کا وہاں میں دنیا کا ایک بہت مشہور بینکر اس کا پارٹنر ہے اور بھی بہت سے کاہدار ہیں ان کے۔

”بہت خوب! مجھے معلوم نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ باتیں بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں سرائے“ شفیع شاہ بولا اس نے گویا کمال معیاری سے ہمیں اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہوئے اور بھی کئی باتیں بڑے خوشگوار مواضع میں بھی بتائیں۔ دنیا کی کئی بڑی مشہور اداراں میں جائیداد کے کام میں اس کی مدد کرتی ہیں اور اس سے کیشن لیتی ہیں۔ وہ خود سے عرصے کے لئے کوئی جائیداد خرید لیتی ہیں۔ بعد میں چھوڑ دیتی ہیں لیکن اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ سہاوت میں جاتی ہے۔ مثلاً یہ وہ کھیل ہے جس میں آخرتہ نیر رہتی تھی۔ یا یہ وہ حربہ ہے جسے انگریزوں نے اپنا پیسہ بگاڑنے کے لئے خرید لیا تھا۔ انجینی اس کے علاوہ بھی کئی طرح کے تفسیری حربے استعمال کرتی ہے جس سے جائیداد کی قیمت میں لاکھوں ڈالر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

”کون کتا ہے کہ پاکستانی لوگ ٹین الا توئی سرائے کاہدار کرنا نہیں جانتے۔“ میں نے ہنسنے ہوئے کہا ”نہیں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملے تو یہ دنیا کے کان کوڑیں۔ خیر یہ بتاؤ کہ وہ ہم پر اتنا مہمان کیوں ہو رہا ہے؟“

”میرا اپنا اندازہ ہے سرائے“ شفیع شاہ غصا سے انداز میں بولا۔ ”کہ پاکستانی دنیا میں کیس بھی چلا جائے“ کتنا ہی بڑا آدمی بن جائے“ اسے اپنے ملک سے اور یہاں کے نظام سے خواہ کتنی ہی شکایتیں ہوں لیکن اس کا دل یہاں ضرور اٹکا رہتا ہے۔ حامد مصطفیٰ کو بھی اب یہاں حالات ذرا سا زگار نظر آ رہے ہیں تو وہ یہاں بھی پاؤں پھیلانا چاہتا ہے۔ جس کی ایسی باتنی کو ساتھ لانا چاہتا ہے جس کے پاس صرف دھبہ اور ساکھ ہی نہیں بلکہ بہت سی جرات بھی ہو۔ جو ہر سید سے بائیزمے طریقے سے اپنا کام کر لیتا جانتے ہوں جن کا کوئی کام انکار نہ ہو جنہیں کوئی تنگ کرنے کی جرات نہ کرے ہو۔“

”شفیع! ہماری شہرت کیا یہاں ملک بھی پہنچے گی ہے؟ جس سے خیریت سے کہا“ ٹھیک ہے کہ ہم بڑی پارٹیوں میں شمار ہوتے ہیں

لیکن اتنی بڑی پارٹی بھی نہیں ہیں۔ اس ملک میں بڑی بڑی چیزیں پڑتی ہیں۔“

”میں نے جو اندازے قائم کیے ہیں سرائے“ شفیع بولا اس سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری سفارشی سینٹو واحد نے کی۔ آپ کی اصول بندی اور دو سرے طور طریقوں وغیرہ سے متاثر ہے۔ سدی آپ کو زیادہ بہتر طور پر جانتا بھی ہے۔ وہ اکثر سے بہت زیادہ خیران بھی ہے کہ آپ نے کم سے کم عرصے میں سے زیادہ ترقی کرنے کا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔“

”شفیع! خیر! میں اس میں اپنا کوئی خاص کمال محسوس کرتا ہوں تو نہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود ہونا چاہیے۔ اب تم کسی دیکھ لو کہ حامد مصطفیٰ کو ہم نے ابرویں نہیں کیا“ نے ہمیں ابرویں کیا ہے۔ چنانچہ توئی مل کر چھوٹے آدمیوں کے آگے ہے۔“ میں نے کہا ”جس اسی طرح میرے اکثر کام خود ہوتے چلے گئے ہیں۔ میں نے ان کے لئے دن رات ایک ایک کیا۔ میں نے اگر شدید محنت کی ہے تو وہ صرف اپنی زندگی۔ ابتدائی دور میں کی ہے۔“

”یہ آپ کی انکساری ہے سرائے“ شفیع بولا ”ہم تو آج بھی دن رات کے کسی بھی لمحے میں آپ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں آپ کو مستعد ویدار پاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہر وقت جگہ ہماری پشت پناہی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ کبھی آرام نہیں کرتے اور گویا کبھی سوتے بھی نہیں۔ آپ کے اس طرز عمل کا وجہ سے ہمیں کبھی لاہور اور کراچی کے درمیان واسطے کا احساس نہیں ہوا۔“

”یہ تو حساسی محبت ہے کہ تم لوگ ایسا محسوس کرتے ہو۔ میری آنکھیں اور میرا دل تو دراصل تم لوگ ہو جو ہر وقت بیدار رہتا ہے۔“ میں نے غلامی دل سے کہا ”ورنہ میں تو آرام بھی کرتا ہوں۔ زندگی کی ہر تقریب، ہر آسائش سے لطف اٹھوا ہوتا ہوں۔ میں نے کاہدار اور اس کے تفکرات کو بھی اپنے سر پر سوار نہیں ہونے دیا۔ میں کاہداری مسائل سے نمٹنا ضرور ہوں لیکن ان کی فکر میں بلان نہیں ہوتا۔ کسی وجہ سے کہ میں جھیلے کی سال سے دیکھ چک اپ کے لئے بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑ دینا کہ حامد مصطفیٰ نے کھل کر کوئی بات کی؟“

”اصل باتیں تو وہ آپ سے ہی کہے گا سرائے“ شفیع بولا ”میرے ذریعے تو اس نے صرف تمہید باغی ہے۔ سچ وہ دم واپس جا رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد زیادہ وقت کے لئے آئے گا۔ میرا خیال ہے تب وہ آپ سے ملاقات ملے کہے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے ہوئی کے انتخاب پر بھی مدد کروں اور وہ واقعی آئندہ شاید کبھی باتیں ہو جائیں۔ دیکھو یہ بہت ہنگامہ خیز دن ہو گا۔ شاید اس قسم کے مذاکرات کے یہ وقت نہ نکل سکے۔“

”مجھے اگر کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو میں اس کے لئے ضرورت

"مجھے یاد ہیں وہ سب باتیں سراسر" فطیح شاہیلا ۳۳ دقت ہم لوگ بہت کم مراد رانا بازی تھے سر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم پر مہمان ہے۔ مہمان نہ ہوتا تو حامد مصطفیٰ سے ہمارا معاملہ کرانے میں یوں پیش پیش نہ رہتا۔"

"اور کون سے مسائل تھے جن کے بارے میں تم بات کرنا چاہ رہے تھے؟ ہمیں لے کر چلا۔"

"ہمیں... اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ باقی مسائل کے بارے میں میں خود ہی فیصلہ کر لوں گا۔ میں نے آپ کا کافی دقت لے لیا ہے۔" فطیح شاہیلا "شاید مجھے جلد کراچی سے لاہور کے درمیان فٹیل ٹاک بننا پڑے۔ لگتا ہے بہت سے کاموں کے سلسلے میں بہت آنا جانا رہے گا۔"

"میں بھی تم سے ملاقات کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "تیرے کے علاوہ بھی کچھ معاملات میں مشورے کرنے ہیں۔ اگر تم جلد نہ آئے تو شاید مجھے ہی کراچی کا پتہ لگانا پڑے۔"

"کوئی خاص مسئلہ ہے تو ابھی حکم دے دیجئے سراسر" وہ فوراً بولا۔

"نہیں۔ وہ فون پر کرنے والی باتیں نہیں ہیں۔ فون پر جتنی باتیں کر لی ہیں وہی کافی ہیں۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ سراسر" اس نے کہا "میں نے سلسلہ متعلق کر دیا۔ اسی شام مجھے لکھنؤ روانہ ہوا۔ آٹھ دس میل آگے ایک جگہ زمین دیکھنے جانا تھا۔ میری کہنی کے بالی مشیروں نے کہنی کو چھ بزارا کر یہ زمین خریدنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ کسی زوال پذیر زمیندار کی زمین تھی۔ کسی زمانے میں زری تھی۔ اب بھروسہ ہو چکی تھی اور بہت سستی مل رہی تھی۔"

"فی الحال اس کا کوئی استعمال نظر نہیں آتا تھا لیکن مشیروں کا کہنا تھا کہ کچھ عرصے میں اس کے بہت سے استعمال لگ آئیں گے اس پر کوئی بازنگاہ اسکیم بھی بن سکے گی کوئی انڈسٹری بھی لگا لی جاسکے گی یا قارنگ کی جاسکے گی۔ اس دوران بہت بہت اس کے خاص دور کرنے اور اس کو یوٹلپ کے کام بھی مکمل ہو جائے گا۔"

"کہنی تمام معاملات طے کر چکی تھی۔ آج مجھے صرف ایک نظر زمین کو دینے اور ایک طرح سے سودے کی حتمی منظوری دینے کے لئے جانا تھا۔ زمیندار کا نام انضال شاہ تھا اور اس سے میری ملاقات زمین پر ہی طے پائی تھی۔ فٹش و فیو میں نے دیکھ لیا تھا۔" لکھنؤ میں کچھ لی تھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ تنہا جا کر ایک نظر دیکھ آؤں گا۔ زیادہ دیر کا کام نہیں تھا۔ رات کو مجھے مجیر آف کامرس کے ایک دفتر میں شرکت کرنی تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ وہاں سے واپسی پر سیدھا ہو کر ہی چلا جاؤں گا۔"

"آفس سے اٹھ کر میں اس کام کے لئے روانہ ہو گیا۔ فٹنی اور شیر شاہ ایسی عالم شیر کو محفوظ طریقے سے واپس پہنچانے کے

لیا ہوں۔ کوئی کام کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو تو بات دوسری میں نے کہا۔" یہ بتاؤ تمہیں وہ کیا آوری لگا؟"

"آوری محفوظ ہے سراسر" فطیح شاہیلا نے رائے دی۔ میں اس پر مزاح رائے کا مطلب سمجھتا تھا۔ یعنی وہ حامد مصطفیٰ کے کسی قسم کا اشتراک کرنے کے حق میں تھا۔

"مگر تمہاری رائے اس کے بارے میں اچھی ہے تو پھر اس باوجود بل کر کام کرنے کے بارے میں ضرور کچھ سوچیں گے۔"

"نہیں" کہا "دوپہرے سینہ واحد خود اس کے ساتھ کسی قسم کی پارٹنر یا کہیں نہیں کر رہا؟ سینہ واحد ہم سے چھوٹی پائی تو نہیں؟"

"میں ایک بار پھر اپنے اندازوں ہی کی بات کروں گا۔" فطیح شاہیلا نے ہونے بولا۔

"تم بلا جھگ اپنے اندازے سے بات کرو۔ مجھے معلوم ہے" ان کے معاملات میں تمہارے اندازے ہی درحقیقت بہتر رہنا ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اندازے نہیں بناتے۔ فیصلہ حقائق ہی لے ہیں۔ تم محض ازراہ کساری انہیں اندازے کہتے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹنے ہونے لگا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ کراچی میں بے گار دیوالوں کو سنبھالنے کے سلسلے میں فطیح شاہیلا درست ترین رائے ثابت ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے سینہ واحد کی تو حامد مصطفیٰ کے ساتھ لے کر آئی خواہش تھی لیکن حامد مصطفیٰ ہی اس سلسلے میں تکی کرتا رہا۔ اور میرے اندازے کے مطابق اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ سینہ واحد کی یہاں ساتھ کچھ اچھی نہیں ہے۔ حامد مصطفیٰ ایسے کسی آدمی سے ہی بہت زیادہ تعارف کا مطلب گار ہو سکتا ہے لیکن اس سے کوئی پابندی نہیں کی جا رہی تھی۔ صرف اس کے خلاف سمجھتا ہے۔ حالانکہ دیے میرے اندازے کے مطابق سینہ واحد کرنی و فیو کے معاملے میں حامد مصطفیٰ کی مدد کرتا رہتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے برنس میں کو بھی اس زمانے کی تمام تر سرگوشیوں کے باوجود کسی وقت بھی دنیا کے کسی بھی حصے میں کرنی کا کوئی مسئلہ پیش آسکتا ہے اور سینہ واحد یہاں بیٹھے بیٹھے چکی بجائے میں اس کا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔ کرنی اس کی خصوصی لپٹ ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے" میں نے کہا "خود میری بھی اس لئے ایک مرتبہ مدد کی تھی۔ اور پھر کسی محتاج یا لالچ کے کی تھی۔ ایک ٹاک میں اس نے ایک پائی کو دو ملین ڈالر فراہم کئے تھے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ میری مدد کر رہا ہے۔ وہ دیکھ کر ہلکا ہوا کہ وہ ایک وزیر کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہم پر براہ راست مہمان نہیں۔ میرے ساتھ اس کا سلوک شہر سے اچھا رہا ہے۔ بلکہ جب ہم اس کے معاملے میں کچھ بھی نہیں تھے تب مجھ سے اس کے معاملے میں وہ ایک سنگین غلطی بھی ہوئی لیکن اس نے بڑی فراخ روی سے ہمیں صاف کر دیا۔"

ی آجائیں گے۔ وہ حضرت خواجہانہ سے لمبے میں بولا۔
 ”ب کام صرف میرا ہی نہ کیا ہے اس لئے میں اگر
 آیا۔“ میں نے ایک نظر اس کے بندوں ہمدانوں کی طرف
 ہوئے کہا۔ وہ اپنی پرانی ہی بندوقیں منجائے پاٹ چرس
 کرنے تھے۔

پھر میں نے ہمدانوں طرف دیکھا اور کہا ”آپ بس مجھے
 نظر زمین دکھا دیجئے۔“

”اکی جلدی بھی کیا ہے چوہری صاحبہ آپ چنے کر
 سکون کی سانس تو لیں۔ زمین بھی دکھائیں گے۔“ وہ میرا کو
 تھک کر بولا۔ پھر وہ ہمدانوں طرف ہاتھ کھماتے ہوئے گویا کہ
 ”کسی زمانے میں یہ ساری زمینیں ہی ہماری ہوا کر
 تھیں۔“

اور گرد جو زمین نظر آ رہی تھی اس میں سے پشتر غیری
 حالات اس میں معمولی سا تصور تھا جسے فکر کیا جاتا تھا۔ اس
 علاج کی کوئی نہ کوئی تدبیر کا جاسکتی تھی۔ پھر وہ سر جھٹک کر
 ”آپ میری جیب کے پیچھے پیچھے آجائے پھر بے پر پیٹھ کر رہا
 کرتے ہیں۔ پھر زمین دیکھنے نکلیں گے۔“

میں نے گھڑی دیکھی۔ ”اکی ڈنر میں غاسا وقت پانی قہار
 گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس کے آوی اس کے ساتھ جیب میں چنے کر
 اور جیب ایک گیند بڑی پر مڑ گئی۔ میں نے گاڑی اس کے پیچھے
 لگی۔ نہ محل اڑاتی جیب کے پیچھے دو دھائی لڑا تک چلنے کے بعد
 مجھے اس دیرانے میں ایک طرف چند کچے کچے مگر نظر آئے ”دھواں
 سونٹا بھی درختوں کے نیچے بندھے ہوئے تھے چند بچے اور ادر
 کھیل رہے تھے۔ وہ ہماری گاڑیوں کے پیچھے لگے کے بجائے افضال
 شاہ کو دیکھ کر کھروں میں گھس گئے۔“

افضال شاہ نے جیب ایک بت بڑے پائے کمرے کے سامنے
 لے جا دو کی جو سب سے الگ تھلک چند خٹخٹ درختوں کے
 درمیان کھڑا تھا۔ وہ دوا نہ کھای تھا اور وہاں بھی ایک بندوق ہوا
 موجود تھا۔ ہم گاڑیوں سے اتر کر اندر بیٹھے۔ کرا چھا بھلا آراستہ
 ہواست تھا۔ قائلین اور موسفے تک موجود تھے۔ حالت تارسی غمی
 کر دیے تو مدتوں سے یہ کرا استہال میں ہوا تھا لیکن آج غامض
 طور پر اس کی جھاڑ پھونکی گئی تھی بہت میں کھڑی کے تنھیں اور
 ہماری کپڑوں سے بٹے ہوئے وہ بچے بھی لگے ہوئے تھے جنہیں رتی
 سمجھ کر ہلایا جاتا تھا۔ یہ بچے میں نے ایک طویل عرصے کے بعد
 دیکھے تھے۔ شاید کسی زمانے میں اس ڈیرے پر خوب دو تھیں وہی
 ہوں۔

آج نئے سرے سے کچھ دو تھیں بیدار کرنے کی کوشش کی گئی
 تھی۔ کئے میدان میں عارضی چولے وغیرہ بنا کر دو تھیں تو ہی مرغیاں
 دھست کر رہے تھے۔ اور بھی نہ جانے کیا کیا کارے تھے پانی کا
 ایک بڑا سالو بے کا کر بھی ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ فضا میں بہت

مٹن سے قاصر نہیں ہوئے تھے لیکن میری مگرانی کے کام سے
 غافل نہیں ہوئے تھے۔ سردار اور حنیف کی ڈیوٹی لگا گئے تھے۔
 سفید گاڑی بدستور میرے قاقب میں تھی۔ میں طوفانی رفتار سے
 روانہ ہوا۔ میرے پاس وقت زیادہ نہیں تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ
 زمیندار جو میری اطلاعات کے مطابق خاما شریف آدمی تھا سڑک
 کے کنارے اپنی جیب میں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔

استونو ز کا سلسلہ بھی بہت پیچھے چھوڑنے کے بعد دور ان ہائی
 وے پر کئی میل کا قافلہ میری طاقتور اور ہماری بھر کم سرینڈر نے
 گویا کھوں میں طے کر لیا۔ مطلوبہ لوکیشن پر پہنچنے میں مجھے کوئی
 دشواری نہیں ہوئی۔ اندازاً اس جگہ کے قریب پہنچنے پر میں نے
 رفتار کم کی۔ سو رہی سے میں نے سڑک کے کنارے خلیب میں ایک
 کھلی جیب کھڑی دیکھ لی تھی جس کے قریب تین مقامی قسم کے
 بندوق بردار کھڑے آٹھیں بیکڑے خطرناک ہوں سے سڑک کی
 طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے گاڑی ”جیب کے قریب لے جا دو کی۔ اس سڑک
 وکیل پر تقریباً چالیس کی عمر کا ایک گورا چٹا اور پندھم شخص موجود
 تھا۔ اس نے جیب سے اتر کر نایت کر گھوٹی سے مجھ سے مصافحہ
 بلکہ مصافحہ بھی کیا۔

”آپ یقیناً افضل چوہری ہیں۔“ اس نے شہزادہ مگر بڑی میں
 کہا ”اس وقت اس جگہ آکر کئے والے کو افضل چوہری ہی ہونا
 چاہئے۔“ مجھے افضال شاہ کہتے ہیں۔ ”اس کا لہجہ آکسفورڈ کے پڑھے
 ہوئے پاکستانیوں والا تھا۔ اب میں اس لیے کہ وہ صرف پچھاننے لگا
 تھا بلکہ اسے اپنانے پر بھی قادر تھا۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ لیکن زیادہ خوشی اس وقت ہوگی
 جب زمین کا سوراٹے جا جائے گا۔“ میں نے اسی لیے میں جواب دیا
 حالانکہ مجھے آکسفورڈ تو کیا اپنے ملک کی بھی کسی یونیورسٹی میں جانے
 کا موقع نہیں ملا تھا۔

”چوہری صاحبہ! سو اتو آپ کی کہنی کے ذمے دار لوگوں
 سے تقریباً طے ہی ہو چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی اس میں
 امراض کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئے گی۔“ وہ احواس سے بولا۔ پھر
 اس نے سڑک پر ادر ادر دیکھتے ہوئے کہا ”آپ کے ساتھ کوئی
 نہیں ہے کیا؟“

حنیف اور سردار گاڑی آگے لے جا کر یقیناً کسی چیز کی آزمائش
 بھسپ چکے تھے۔ میرے آوی بھی کسی کو یہ محسوس ہونے کا موقع
 نہیں دیتے تھے کہ وہ میرے ساتھ ہیں یا میری مگرانی کر رہے ہیں۔
 ”یا میرے ساتھ کسی کو ہونا چاہئے تھا؟“ میں نے مسکراتے

ہوئے پوچھا۔
 ”دور اصل آپ پہلی بار یہ زمین دیکھنے کے لئے آ رہے تھے
 اور پھر اتنے بڑے پائے میں ہیں آپ تو۔“ مجھے امید نہیں تھی کہ
 کالج کے لوگوں کی طرح بے فکری سے کئے بجائے ہوئے آپ اکیلے

لف انداز کی اشتہار خوشبو نہیں پہلی ہوئی تھی۔ میرے
کاروبار میں لکھن میں نے اسے دو چار چھپکیاں دے

ہم صوفیوں پر بیٹھ چکے تو میں نے باہر کی طرف اشارہ کرتے
ہو کر کہا "یہ سارا اہتمام کس کے لئے ہوا ہے؟"

"آپ ہی کے لئے ہوا تھا۔" انضال شاہ مسکراتے ہوئے
میں نے کہا "اگر مجھے اندازہ نہیں تھا، آپ اکیلے آئیں
مجھے واضح طور پر کہہ بتایا نہیں گیا تھا۔"

"دراصل واضح طور پر میں نے ہی کسی کو کہہ نہیں بتایا تھا۔
نت چاہتا ہوں۔ میں کچھ دوسرے معاملات میں غیر متعلقہ طور پر
چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔"

جبر حال مجھے امید ہے کہ آپ اس ذرا عطفِ قسم کے اثر
لف انداز ہو گئے۔ "وہ یوں" ہلکے کے انداز میں کہا "کچھ
ی لطف ہوتا ہے اگر آپ پسند کریں تو کھانے سے پہلے چنے
نے کا بھی انتظام ہے۔ دسکانہ وائٹ ٹیبلز بک موجود ہے سب
کریں گے آپ؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے لطف سے کہا "یہ شوق میں نے
لیا ہے اور کھانے کے چکر میں پڑنے کا میرے پاس وقت نہیں
ہے کہ خوشبو نہیں سو گھر کر میرا شدت سے دل چاہ رہا ہے کہ
ٹائی آؤں اگر آئینہ چھا کر ان سب چیزوں پر ٹوٹ پڑوں
ان دھڑے کی مجبوری آن پڑی ہے۔ دوسرے کہیں انداز کھانے کا
پہا بھرے کھانا چاہئے کہ اور والے نے سر کیس اور کے رزق پر لگا
لی ہے۔"

اس کے چہرے پر باغی کی ایک لہر اتر گئی تھی، "جیسے اسے
پے انتظامات ضائع جانے کا قدرے افسوس ہوا ہو۔ وہ غور سے
رف دیکھتے ہوئے یوں "آپ میرے اندازوں سے بہت عطف
دلی ہیں چھوڑ دی صاحب! آپ کی عمر بھی میرے اندازے سے
لیس کم ہے۔ اور میں چوٹ کے ایک طویل عرصے سے لگے سے باہر
نا ہوں اس لئے یہاں کے بڑے لوگوں کے بارے میں ہمیشہ
طعامات اپ ٹوٹ نہیں ہیں۔"

"اگر آپ کو مجھ سے مل کر باغی ہوئی ہے تو میں ضرورت خواہ
ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔" اس نے کمری جمیدگی سے
کہا۔

"تو پھر اسی خوشی میں زمین ایک نظر مجھے دکھا دیجئے۔" میں نے
کہا۔

"مٹاؤ تو لیجئے، ابھی بیلے ہیں۔" وہ یوں۔ اس دوران اس کے
کئی سال تھوڑے عرصے میں ہونے والی چیز اور سلیف سے کوئلہ دار کھس
لے آئے۔ یہ انہوں نے اچھا کام کیا تھا۔ موسمِ خالص سہ ہونے
کے باوجود میں کوئلہ ڈرک کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کوئلہ دار تک

قسم کے ہم انداز کھڑے ہوئے اور باہر آگئے۔
"آپ میرے ساتھ جپ میں بیٹھنا پسند کریں گے یا میں آپ
کے ساتھ گاڑی میں آ جاؤں؟" انضال شاہ نے پوچھا۔

"آپ ہی میرے ساتھ گاڑی میں آجائیں۔" میں نے کہا۔
اس نے جپ کی چابی اپنے گود میں کو دے دی اور میرے ساتھ
گاڑی میں آ بیٹھا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اوپنچے
راستوں پر گاڑی چلانا شروع کر دی۔ اس کے توی:۔ میں بچے
بچے آ رہے تھے۔

وہ کچے کچے گھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں "ایک
دھڑت ہوئی ہماری زمینیں آج بھی ہیں لیکن ہم نے اپنے کچے
مزارعوں کو ابھی تک فارغ نہیں کیا۔ یہ اسی طرح یہاں رہتے
آ رہے ہیں۔ اپنے اپنے کام کرتے ہیں لیکن ہماری طرف سے کئی
انہیں مالی امداد ملتی ہے۔ بس یہ ایک طرح سے زمینوں کے لحاظ
ہیں۔ بہت اچھے بہت جاں نثار لوگ ہیں۔ اگر آپ نے یہ زمین
خرید لی تو خواہ اس کا کوئی بھی مصرف نکالیں لیکن کوشش کیجئے کہ
ان لوگوں کو بھی اس میں اپنے حصے کر سکیں۔ یہ آپ کا مجھ پر ذاتی
احسان ہو گا۔ ہمارے بے شمار مزارعوں میں سے بس یہ تھوڑے
سے لوگ رہ گئے ہیں جنہیں نہ تو میں آجرتے دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ
فی یہ خود اس زمین سے ٹائٹل کر سکیں چاہتا ہے ہیں۔"

"آپ کو ان کے محسوسات کا قرائع خیال ہے؟" میں نے
مسکراتے ہوئے کہا "لیکن آپ خود کیوں اس زمین سے ٹائٹل ذکر
جاری ہیں؟"

ایک لمحے کے لئے وہ جپ ہو گیا۔ اس کا ذہن جیسے کہیں دور
بھٹکے گا۔ پھر بہت دیر بعد مجھے لمحے میں وہ یوں "اس ملک میں رہنا میرے
بس کی بات نہیں رہی۔ میں اس سوسائٹی میں مس فٹ ہوں۔" وہ
اشادوں سے مجھے زمین بھی دکھانا جاری تھا کہ فلاں جگہ سے شروع
ہوئی ہے۔ فلاں مقام تک جاری ہے۔ وہاں سے میں فم کھاری ہے

تاریخی ناول

100/-	قر تسکین	دنیا کے نامور قاتعین
100/-	قر تسکین	شیر مصر
100/-	قر تسکین	شیر اسلام
100/-	قر تسکین	ترک فرد میدان

مکتبہ القرآن اردو بازار - لاہور 2

80/-	اے حمید	محرر کا چاند
250/-	اے حمید	پہلی محبت کے آنسو
100/-	اے حمید	اداس جنگل کی خوشبو
200/-	اے حمید	چاند چرے

کہہ چھوڑا جھاڑ کر بیٹے جانا مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا ہمیں
ہر مقدور ہر کوششیں کرتے رہتا ہے اسی تجربے سے
پڑھنا دیکھنا ہے۔
ہر ایک کو اپنے اپنے حالات اور اپنے اپنے مزاج کے
فیصلے کا حق حاصل ہے۔ "وہ امریکیوں والے انڈاز میں
بانا چکا کر رہا۔"

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

نکالتے ہوئے ہوا کہ آپ کا بھی سولٹر لینڈ کی طرف پلنگے تو
مجھے ضرور میزبانی کا موقع دیجئے گا۔ اس کاڈ پر میرا دہاں کا ایچ مرس
موجود ہے۔"

"آپ کا دہاں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں۔ میں بس اسٹاکس خریدتا اور بیچتا رہتا
ہوں۔ اب بھی کیا کروں گا۔ زندگی بڑی مختصر ہے۔ میں تمام نعمتوں
سے لطف اٹھاتا ہوں۔ چاہتا ہوں۔ دنیا کے جھیلوں سے آزاد رہ کر
اس کی خوبصورتیوں سے محفوظ ہونا چاہتا ہوں۔ کچھ نہ کرنے کے
باوجود میرے اطوار میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ میری آنکھ
فطریں بہت کچھ لٹا بھی دیتی ہیں۔ تب بھی انہیں پریشانی نہیں ہو سکتی۔"
میں نے اسے خدا حافظ کہا اور واپس روانہ ہو گیا۔ تاریکی
ابھی خاصی گہری ہو چکی تھی۔ میں نے ابھی دھکیل کا سلسلے طے
کیا تھا کہ ایڈلٹس کی روشنی میں سڑک کے عین پچیس ایک چار
سائیکل آئے۔ "جائے دکھائی دیا۔"

یہ ایک مخصوص قسم کی نل گاڑی چپ کی چیز ہوتی ہے۔ ہر
اس میں بیلوں کی جگہ ساڑھ جوڑے جاتے ہیں اور یہ ٹیم میں نکل
گاڑی سے کہیں بڑی ہوتی ہے۔ گاڑی کیا اچھا بھلا بھری جاز دکھائی
دیتی ہے جو ٹھٹھی سے سڑک پر آکر گھٹنے لگا ہو۔ گاڑی پر کلوہوں کا
ایک بڑا سا زحاج چاروں طرف پھیلا کر اس پر ٹاٹ لپیٹ کر نفاذ
سے نفاذ بچائیں پیدا کی جاتی ہے۔

گڈے آج بھی جناب کے اکثر علاقوں میں دکھائی دیتے
ہیں۔ زیادہ تر یہ کپاس اور کٹی ہوئی تنگ کپاس کی ٹھل و ٹھل کے
تھے استعمال ہوتے ہیں جسے توڑی یا پرائی کہا جاتا ہے۔ جب ملک
میں ٹرکوں کی کمی تھی تو یہ کھانڑوں کا قبول تھے۔ بعض گڈوں میں تو
ٹرک سے زیادہ مال آجاتا تھا۔

یہ عام طور پر کسی شہر یا سات سے مل لاد کر لیے سڑ پر مل
پڑتے تھے۔ کئی کئی دن سڑ کرتے تھے۔ زیادہ تر رات کو سڑ کرتے
تھے۔ دن میں ساڑھ اور گڈے کو چلانے والے لوگ کہیں درختوں
کے نیچے آرام کرتے تھے۔ قطار کی صورت میں یہ گڈے سڑک کے
ایک طرف "کے پیس" دھیرے دھیرے اپنی حوصلوں کی طرف گامزن

بلدی اس کی زمین کے گرد حصار پکڑ رہا ہو گیا اور ہم واپس
کے قریب آکر کے گاڑی سے اتر کر ہم ایک درخت کے
باکڑے ہوئے افضل شاہ طویل سانس لے کر رہا۔ آسمان
زمین آپ کی کہنی کے لوگ اس کا ہر طرح سے جائزہ لے
رہا اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے میں نے انہیں آگاہ
ہے حالانکہ حصارے ہی اپنی چیز کی خامیاں بتانے کا مدراج
ہے۔ حتیٰ کہ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ زمین کے نیچے
لی سطح توڑی سی بلندی ہو چکی ہے جس کی وجہ سے یہ بعض
ن کے لئے موڈوں میں رہی اور بعض فصلوں کے لئے بہت
دل ہو چکی ہے۔ اور یہ مسئلہ ابھی زیادہ سنگین ہو چکا ہے۔
پانی آسانی سے اس کے کئی علاقہ ہو سکتے ہیں اور آپ اس
نا کو دوسرے مقام کے لئے بھی قابل استعمال بنا سکتے ہیں۔
کچھ پوچھا چاہیں تو پوچھ لیتے۔ اس زمین کے ساتھ کہ میں آپ
دیکھ چکا ہوں گا نہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ مجھے معلوم ہے میرے آدمیوں نے
لی ایک بات چھوڑی نہیں ہوگی جو پوچھنا ضروری ہو۔ وہ تین روز
بازیل ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔ زمین آتہ نظر میلی
لی محسوس ہو رہی تھی۔ اور یہ سوچتے ہوئے ایک لا شعوری سی
رت کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ تین روز بعد یہ زمین میری
کے ایک عجیب سی رخ مندی اس احساس میں شامل تھی۔ شاید
لی احساس سے لذت اٹھاتا ہوئے کے لئے انسان دن رات تک
دیکھ لگا رہتا ہے۔ بڑس کو پہچانتا رہتا ہے۔ منہ کا ایک کے بعد
وہی منت خرید لیا جاتا ہے۔ مگر اس ایک ملک کے بعد
دوسرے کو جس کے کی منصوبہ بنایا کرتے لگتے ہیں۔

میں نے مصالحت کے لئے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ آپ
اباوتہ نیچے شاہ صاحب ابھرتے تو جاتے سے پہلے ایک بار مجھ سے
ضرور ملے گا۔ کھانے پر ملاقات اور کپ شپ رہے تو مت اچھا
ہو گا۔ آپ جیسے لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے جن کے پاس
صرف سری نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بھی کچھ ہوتا ہے۔"

"خواہد اگلی کے جراثیمی سیسی" وہ مسکرایا۔
"بلکہ خواہد اگلی کے سیسیسی۔" میں نے سہلایا۔ "بعض
دماغی فراڈوں سے بھر ہوئے ہیں۔"
قدر انفرادی کا مت شکر ہے۔ میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش
کوں گا۔ ہم دہری صاحب۔" پھر وہ جیب سے ایک دزیننگ کارڈ

رہے تھے ترک کھانہ کو مزہب نہیں کرتے تھے۔

گڈے والا اکثر گڈے پر لینا سوتا رہتا۔ ساڑھ سرحکائے جنگلی کرتے خود ہی تاک کی سیڑ میں چلے رہے تھے۔ راستے میں ان کے لئے مانوس ہوتے تھے کیونکہ ہر گڈے والے کا کوئی نہ کوئی لگا بٹہ حاوث ہوتا تھا جس پر وہ ایک طرف سے کھلا دکر جاتا تھا۔ دوسری طرف سے بننے والے پختے بعد کچھ اور لادکر واپس آجاتا تھا۔ گڈے کے نیچے لائین ہلی جمواتی رہتی تھی اور ساڑھوں کے گلے میں پڑی ہوئی کھینچوں کی دھیمی دھیمی نین ویرانوں میں ایک عجیب سی دوہان انگیز موسیقی بھیرتی رہتی تھی۔ ہائی ویز پر سڑک کے والوں کے لئے یہ ایک مانوس سا مقام تھا۔ دھیرے دھیرے معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ تیز رفتار گاڑیاں ان گڈوں کی جگہ لیتی جا رہی تھیں۔

میں بھی کسی دن تک عداوت پرست اور باغی میں زندہ رہنے والا آدمی تھا۔ مجھے اس قسم کی چیزیں پسند تھیں لیکن اس وقت نہ جانے کیوں وہ گڈا مجھے بھلا نہیں لگا۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی کہ گڈے پر کھلا ہوا نہیں تھا اور وہ اکیلا ہی تھا۔ ایسا مضمون ہوتا تھا جیسے اسے جان بوجھ کر سڑک کے بچوں سے چلایا جا رہا تھا اور گڈے والے کو پیچھے آنے والی گاڑیوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

میری گاڑی اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کا پچھلا حصہ روشنی میں نہا گیا۔ پھر میں ایسے آثار پیدا نہیں ہوئے کہ گڈے والا میرے لئے راستہ چھوڑے گا۔ وہ مجھے ہی کے میں اتارنا چاہتا تھا۔ کئے کو تو وہ ہائی وے تھا کہ سڑک تو کھلی چند گری پڑی تھی اور وہ بھی کتابوں پر سے ٹولی پہلتی تھی۔

اچانک مجھے گڈے کے پچھلی طرف دیوار کی طرح پھیلے ہوئے ڈاک کے پردے کے عقب میں کسی اچھل کا احساس ہوا۔ میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا کہ اس پردے کے عقب سے کوئی آنکھ میری گاڑی کا جائزہ لے رہی تھی۔ گاڑی اگر اندر سے میں جا رہی ہو اور اس کی ایندلیس روشن ہوں تو وہ سامنے والے چیز کو روشنی میں نہلا دیتی ہے لیکن خود اندر سے ہی میں رہتی ہے تاہم میری گاڑی کی نمبر پلیٹ تو دیکھی ہی جا سکتی تھی۔ اس پر ایندلیس کی روشنی بھی پڑی تھی اور نمبر پلیٹ کی ایلی لائٹ بھی موجود تھی۔

میری چھٹی حس نے تو مجھے صرف کسی گڑبڑ کا احساس دلایا تھا لیکن میری وہ حس جسے میں ساتویں حس کہتا تھا، زیادہ کار آمد ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے ایک سینکڑے کے ہزاروں میں سے فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور میں نے گاڑی پوری قوت سے کچے میں موڑ دی۔

اگر مجھے ایک لمبے کی بھی آنکھ ہو جاتی تو شاید اس دیر الے میں میری زندگی کی کمانی ختم ہو جاتی۔ سب مشین کن کا برست میں میرے سامنے سے آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی گڈے کے پیچھے کی طرف کا ڈاک کا پردہ چھلکی ہو گیا تھا۔ اسی پردے کے عقب میں گڈے پر چھٹا کئی آدمی موجود تھے۔ یہ محض میرا اندازہ تھا۔ میں ان کی جھلک نہیں دیکھ سکا۔

میری گاڑی شاید کچے میں اتر کر اٹھ گئی ہوئی کہ کھانے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں اچھا خاصا چوڑا پلا سارا تھا۔ اس میں پانی نہیں تھا۔ سامنے کے بعد بھی زمین بھرا تھی۔ مٹی کے دوپے، بھانڈاں، خیمہ و فراز، کچر، کچری، لیکن گاڑی ہر حال اٹھنے سے نفی تھی اور حلاطم میں پھنسی ہوئی طرح پھولنے لگی تھی۔

سب مشین کن کا برست دھڑا کر میں پر پڑا ہوا تھا۔ میں بھی دیکر تمام پیشوں کی طرح ہلٹ پوٹ گئی لیکن پھر پڑھین نہیں تھا کہ اتنے قریب سے اور میں سامنے سے سر گن کا برست سر کھتی تھی۔ میں نے اپنے اوسان بحال رہے گاڑی کی ایندلیس آف کر دی۔ یہ اپنے آپ کو قن پہ چھوڑنے والی بات تھی کیونکہ گاڑی کی درست سے بھی کچھ تھی۔ کسی بڑے توپے میں بھی جا کر دھس سکتی تھی اور کسی گڑے میں بھی کر سکتی تھی۔ وہ علاقہ کچھ ایسا ہی تھا۔ ناں پھاؤں میں بھی اس وقت کوئی خاص مدد نہیں کر رہی تھی۔ چلتی میں ہر طرف اندھیرا ہی محسوس ہوتا تھا۔ گاڑی سے اتر کر قدرے سکون کی سانس لے کر شاید مٹھ کر بہت نظر آتا۔

میرے عقب میں بے مقصد انداز میں دھنکے دھنکے سے بارے جا رہے تھے لیکن آواز ہر بار سمت کے تھوڑے بہت کے ساتھ آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ گڈے اتر آئے تھے اور دیوانے کنوں کی طرح بہت تیزی سے میری میں ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ اندر سے میں گاڑی کی رفتار خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میری گاڑی پہنچل اور پہنچل دونوں سے چلتی تھی۔ اس پہنچل پر تھی۔ اگر وہ لوگ بہت زیادہ جاہد مشاق ہوتے تو ہر میں چلتی ہوئی چیز ہوا کے باوجود پہنچل کی پو اور انجن کی لنگ سرسراہٹ کا سراغ پکڑ کر کھل کھل مسرت میں آسکتے تھے۔

اگر میری گاڑی کسی حادثے کا شکار نہ ہوتی تو میں ادھر سے لہسا پکڑا کر کافی آگے دوایا بھی سڑک پر پہنچ کر قرار ہوا تھا کہ اندر سے میں رسک اتاری تھا جتنا حملہ تو وہوں کا سامنا کر میں۔ اور پھر کچھ دل نے گوارا نہیں کیا۔ یہ کوئی ایسی بات تھی کہ کسی نے میں سامنے سے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں دم ہوا جا گیا۔

میں نے گاڑی ایک جگہ روک دی لیکن انجن بند نہ کیا۔ وہ اندھ کھلا چھوڑ کر میں باہر رسک آیا۔ میں نے گاڑی خفیہ خانے سے راتھل بھی نہیں نکالی۔ وہ لوگ زیادہ دور تھے۔ میں صرف اپنا تقری مشین مسلسل ہی سنبھال کر کھانے کی حال میں دوڑنا چلا گیا۔

اس طرح گمات لگا کر ہونے والے حملوں کے سلسلے تجربات نے مجھے سکھایا تھا کہ بیت اس کی ہوتی ہے جو دنا

اور دشمن کی وفات کے خلاف عمل کرتا ہے۔ اسلئے اس کی ہرادرشمن سے فوری طور پر یکہ دور نکل آنا درست تھا لیکن مجھے چہرے کی سلسلہ مل چکی تھی، میں اس کی توقع کے خلاف چل رہا تھا۔

طے تو رہ گیا ہے کہ اس نے کسی پر اچانک حملہ کر دیا جو اس کرنا ہے اور اس کا پہلہ ہماری ہے تو وہ بھی توقع ہے کہ اس کا ہماگ نکلے والا شکار مزید آگے ہی ہماگا جا رہا ہے۔ مگر حملہ تو اس سے زیادہ دور ہونے کی فکر میں ہو گا۔ لیکن یہ معاملہ تو اس کی طرف جا رہا تھا۔ اب اس کی سمت بڑھ کر دھرم سے فوج کی تو آڑ میں ٹائی دی تھیں۔ ایک لمبے پٹے بے شکن گن کی ترتر کے علاوہ دھرمی تھری را نکل کی گرج بھی کی تھی۔ لیکن جوش میں نے اس سے بڑھتا شروع کیا "تمام یں بکلت خاموش ہو گئی تھیں۔ گویا کسی غیبی طاقت نے بتا دیا ہو کہ میں ان کی طرف آ رہا ہوں اور انہوں نے میرے مات لگائی ہو۔

یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی مجھے یکہ ہوشیار ہونا پڑا۔ دھرم کی سی حالت میں رہے ہوئے میں پھونک پھونک دم دیکھ لگا۔ کہیں کوئی جھاڑی "تو یا لگا منظر درخت نظر آیا تو ایک لمبے گن میں اس کی آڑ لے لیا اور ہر بار سے سب سے لڑو چش کا جائزہ لیتا۔

ہر طرف ایک ایسا سکوت طاری تھا جس کی بہت سی موت چھپی تھی۔ سب میں کافی بہتر طور پر اور خاصا دور تک دیکھ سکتا تھا کہ ہر حرکت فکر نہیں آوری تھی۔ ایک بار پھر میرا دی احساس آیا کہ انسان بنیادی طور پر دھرم ہے۔ جب کسی کے لئے کلمات اسے تو باطل روئے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے کے خون کا پیا سا" رہے کی زندگی کا دشمن۔

ہر دھرمی کا کٹھن ایک بہت سی بے ضروری چیز تھی۔ چھین میں نے بہت سی کٹھن دیکھے تھے۔ ان پر چڑھ کر پھیل کود بھی کی انسان کی آڑ میں لگن پٹی، بھی پھیلی تھی لیکن آسمان حالی کے دور بھی میں نے پایا۔ انہیں سڑکوں پر دیکھا تھا اور پڑی بے نیازی کا گائی ان کے قریب سے گزرتے دیکھا تھا۔ کبھی میں نے ان کے سامنے یکہ سوچا تک نہیں تھا۔

لیکن آج ایسے ہی ظاہر بے ضرور نظر آئے والے ایک کٹھن نے بہت مجھ پر چھینی تھی۔ جب چڑھ پر انہوں نے میرے لئے مات لگائی تھی۔ اگر کچھ بھی میں بے نیازی سے ہی اس کے قہم میں گاڑی رکھا اور راستے لے کا پھر بتاؤ نہ جانے کیا ہوتا! ایک وقت اور دھرمی کے واسطے محل اتفاقاً پھر خوش قسمتی اور طبیعت ابدی سے بچ نکلا تھا کہ اب دھرمے پھر ایک دوسرے کی کلمات میں تھے۔

میں تجوی سے یکہ اور آگے بڑھا۔ نتیجہ تھا کہ دوسرے ہی

لے مجھے چپائے کی طرح چاٹوں ہاتھ دیوں کے بل کر چپنے کے لئے مٹی کا ایک بڑا سا توڑا میرا گیا۔ کیونکہ اسی لئے مجھے کافی فاصلے پر خبیث سے ایک بیلا سا مردار ہوا تو کھائی دیا تھا۔ فرشتہ اجل کی طرح وہ گن لے لے ہون گزرتے کے کنارے پر ابھرا جیسے زمین نے ہی اسے اپنے حکم سے اگلا ہوا۔ ایک کے بعد دوسرا "تیسرا اور پھر چھ بیلا بھی باہر آیا۔ سب کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

فاصلہ کافی تھا اور وہ مجھے محض بیلاؤں کی طرح دکھائی دے رہے تھے پھر بھی ان کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ چاٹوں ڈیلے ڈھالے سیاہ لباسوں میں تھے غالباً شلوار جیسے تھیں۔ کمر کے مقام پر وہ سب دپے دپے نظر آ رہے تھے۔ پتھان ان کی کمروں پر یکہ لپٹا ہوا تھا۔ غالباً گولیوں کی پٹیاں تھیں۔ انہوں نے پتھان ڈھالے بھی ہاتھ سے ہوئے تھے۔ اندازہ ڈاکوؤں والا تھا کہ ان کا ڈاکو ہونا یکہ بہرہ از قیاس نظر آتا تھا۔

ڈاکوؤں کے میں سوار ہو کر سست رفتاری سے عین سڑک کے چھین چھ سڑکیں کر سکتے تھے۔ دوسرے اگر میں انہیں ایک مستقل دشمنی دکھائی دیتا تو وہ یکدم مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے بجائے مجھے روک کر لوٹنے کی کوشش کرتے۔ اگر انہیں صرف ایک اچھی گاڑی ہی کی ضرورت تھی، ایک خواہ ان کی طرف سے جسم میں یا جاتا تب بھی وہ اس طرح گاڑی پر برسے نہ مارے گا۔ گاڑی کو کوئی ایسا نقصان پہنچ سکتا تھا اس کا بازو برست ہو سکتا تھا جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر کہیں لے جانے کے قابل نہ رہتی۔ اس طرح تو ڈاکوؤں کا مستعد ہی فوت ہو جاتا۔ پھر کہہ لو رہی تھا۔

وہ چاٹوں اسی سمت میں بڑھ رہے تھے۔ چہرہ میں گاڑی پھوڑ کر آیا تھا۔ گویا اس قسم کی آگ پھیل میں وہاں ہر تھکے کر ساتھ ہی ان کے انداز میں ایک چھوٹا سا گاڑی بن بھی نظر آ رہا تھا کہ سب "پناہ" "میری تلاش میں بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پھر کر اور زیادہ دور تک پھیل کر مجھے ایک طرح سے گھیرے میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے اپنے حساب سے اس میں بھی کوئی صلحت رہی ہوگی۔ تاہم وہ ایک دوسرے سے یکہ دور دور تھے اور چاٹوں کے چہرے تلفک متعل میں تھے۔ یعنی وہ چاٹوں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

میں محض کی دیکھ کافی تھی۔ اس کے باوجود میں نے چہرے لئے انتظار کرنا مناسب سمجھا کہ وہ ذرا "محظوظ" کاٹلے تک آجائیں لیکن اس انتظار کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ وہ درحقیقت میری طرف میں بڑھ رہے تھے۔ یکہ میرے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ مجھے ان چاٹوں کا تقریباً ایک ساتھ ہی نشانہ بنانا تھا۔ وہ نہ میرے لئے انہیں پڑا ہو سکتی تھی۔ خواہ خواہ زیادہ ہماگ دوڑ کر پڑی۔ اور میں اس وقت زیادہ لمبی آگ پھیل کے موڈ میں نہیں تھا۔ شکار جب عین نشانے پر آیا ہوا تھا تو خواہ مخواہ اس موقع کو گنوا کر اپنے آپ کو نہ لے کی کیا ضرورت تھی۔

نہیں پر لڑھک کر غائب ہوا تھا۔ باقی نہیں بیاہوا تھا
جہاں کرے تھے وہیں ساکت تھے۔ ماحول پر ایک بار
فکرت سکوت چھا گیا تھا۔

مجھے آگے بڑھنے میں بہت زیادہ احتیاط کرنا پڑی
یہ تھا کہ میرا بیوہ لادیکر کر حریف اور سردار مجھ پر
دیں۔ اندھے میں ان کی نظر بھی مڑی سے کام کرتی
جیسی تیز بہر حال نہیں تھی۔ اور سردار میان سے اس چہ
کے غائب ہونے سے بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

میں نے سوچا 'حریف اور سردار کو کھل دے دیا
ہے۔ تاکہ وہ میری موجودگی سے توجہ خیز رہیں اور کوئی چلا
احتیاط نہ کریں۔ میں نے مقل سے پکڑ کر توجہ نکال
آئین پر دور دور تک جانے کا نام دیکھا تک نہیں تھا
ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ پکڑ ہر وقت چاند کے
نہیں لگا آ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی درخت و دریا پر آرام
اور اپنے پس پاس قازنگ کی آواز میں سن کر صدمے
بلند کر سکتا ہے۔

حریف اور سردار میں سے کسی بھی لے جوا ہوا
نکلی۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئے تھے اور اب ہم نہیں کہ
ہوئے چوتھے غائب پوش کو تلاش کرنا تھا۔ میں نہیں
خفازی کی آڑ لیتے ہوئے اور حتی الامکان بچا رہے ہوئے
آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک میں جینے کے مل زمین سے چپک گیا۔ مجھے
تھا کہ آس پاس کوئی موجود ہے اور وہ حریف اور سردار
نہیں ہے۔ میرے ننھے خود بخود ہلکا اٹھے تھے۔ دھڑ
کیس موجود تھا۔ میں بالکل ساکت ہو گیا۔ زمین کا ایک
گیا۔ سانس بھی میں نے روک لی۔

چھ لے اسی طرح گزرتے۔ ان چھ لمحوں کے دور
بھی ساکت ہو گئی تھی۔ پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کم
گڑھے سے نہایت سونے اڑھپے کی طرح رنگ کر رہا
اس کے جسم میں بالکل اڑھپے کی طرح تلی بھی پڑھاتے
وہ سیاہ پوش ہی تھا۔ وہ میری طرف نہیں آ رہا تھا
طرف بڑھ رہا تھا۔ میرا رخ تھا۔ اس کے پاس
تھے۔ بہت مڑی سے ابھی خاصی رفتار سے مٹی میں
تھا۔ اسے جیتا اندازہ ہو گیا تھا کہ خاموش رانکوں سے
ست سے آئی تھی۔ وہ سردار اور حریف کی تلاش
تھا۔ اس کی سب مشین گن شاید کیس گر چکی تھی۔ اور
میں صرف وہی اور تھا۔ شاید اسی لئے وہ گولیاں خالی
تھا۔ کسی حکمت عملی کے تحت اپنے آگے وہ دشمن کو خلا
رہے اور وہ صحیح طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

ایک جگہ رک کر اس نے سرزد اور چھانکے اور

جب میرے اور ان کے درمیان فاصلہ کھٹنے کے بجائے بڑھا
دکھائی دینے لگا تو میں نے اپنے کے لیے اپنے دشمن پہل زرا بلکہ
کیا سہ حاصل۔ فکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح ذرا سی بھی
آواز میرا بے خبر حتی الامکان تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے
اور بالکل صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ صرف انہیں یہ توقع نہیں تھی
کہ میں وہاں سے واپس آ گیا تھا۔

میں نے تیز کر دیا۔ بڑھانے والا تھا کہ یکدم ٹپک ٹپک کی کئی
تیز تو آوازیں ابھریں اور ان میں سے تین آوازیں اچھل کر اوپر
اوپر جا کر۔ ان میں سے کسی کی کرب ناک جی سے ماحول کا
سکوت بھی چھ لے کے لئے مرتضیٰ ہو گیا۔ ماسطوم سمت سے
گولیاں آئی تھیں جو جیتا سا لینئر لگی رانکوں سے چلائی گئی
تھیں۔ سا لینئر بھی خاص قسم کے تھے جو مسلسل قازنگ سے بھی
جام نہیں ہوتے تھے۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گولیاں چلا لے والے جیتا
حریف اور سردار تھے جو میرے پیچھے خامسا فاصلہ چھوڑ کر گاڑی میں
آ رہے تھے۔ انہوں نے دور سے یہ صورت حال دیکھ لی ہوگی۔ بڑی
مڑی سے اور بڑے صحیح موقع پر اگر انہوں نے معاملے میں دخل دیا
تھا۔ ان کی حکمت عملی کی خوب مڑی سی تھی کہ نہ تو وہ مجھے ابھی
تک کیس نظر آئے تھے اور نہ ہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ کس سمت میں
موجود ہیں۔

چوتھے سیاہ پوش کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گولیوں کی برچھاڑ سے
بچ گیا تھا اور اس نے حیرت انگیز بہتری کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین
پر قلابازی دکھائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہو گیا تھا۔ زمین
اوپر چلی تھی۔ کسی جگہ خائے اوپر ابھار موجود تھے لیکن کوئی ابھار
ذرا بھی متحرک نہیں تھا۔ وہ بد بخت سیاہ پوش گویا زمین سے چپک کر
زمین میں ہی جا گیا تھا۔

میں پہل پر صدمے اندھے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا
رہا لیکن کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کس طرف کو نکل گیا تھا۔ مجھے
نہیں تھا کہ حریف اور سردار جہاں بھی تھے ان کی نظریں بھی اسی
طرح جڑھاں ہوں گی۔ جگہ فاصلے پر جھاڑوں بھی نظر آ رہی تھیں۔
یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کی آڑ میں چلا گیا ہو۔ حریف اور سردار نے
بھی جیتا ہی سوچا تھا کہ وہ دوسرے ہی لئے جھاڑوں پر بہت سی
گولیاں برسیں۔ کچھ شامیں بھی ٹوٹ کر ہوا میں اڑتی نظر آئیں
اور کچھ چھوٹے سونے جنگلی جانوروں کی چوہاں بھی سنائی دی جو
شاید اسی جھاڑوں میں چپے ہوئے تھے مگر کوئی انسانی آواز سنائی
نہیں دی اور نہ ہی جواہر کوئی قازنگ ہو۔ میری حیات کی کہ نہی
تھیں کہ وہ جھاڑوں کے عقب میں نہیں تھا۔ لیکن حیات یہ
رہائی نہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ کدھر چلا گیا تھا۔

میں نے چاندوں ہاتھ بیوں پر ہی دھیرے دھیرے چلے ہوئے
اس طرف نیم دائرے میں بڑھتا شروع کیا جہاں چوتھا سیاہ پوش

باندھ کر تین آدمی ساتھ لے کر مجھے شکار لگانے کے لئے اس انداز میں نکل کھڑا ہو گیا۔ وہ بھلیاں سی لے رہا تھا اور ہر ہنگامی کے ساتھ اس کے حوصلے بھل کر کے خون آ رہا تھا۔ شاید ایک یا دو نواری گولیاں اس کے پیچھے سر میں اتر گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بار بار اذیت تک انداز میں کھل اور بند ہو رہی تھیں۔ وہ زکریا جان تھا۔ اس نے میرے ساتھ خواہ مخواہ بھی کیا تھا پھر بھی میرا سے ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

آخری بار اس سے میرا تصادم ہوا تھا تو میں نے اسے پتھریں کی تھیں کہ وہ اس سلسلے کو روک لے اور اگر آئندہ اس نے مجھ پر کوئی قاتلانہ حملہ کر لیا تو وہ اس کی زندگی کی آخری کو خوش ہو گی۔ اس کے باوجود کم از کم اس وقت تک میرا سے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اس کی اعتقاد ختم مزاحیہ کو صاف بکے جا رہا تھا۔ ہر بار میں اس سے نرمی برت جاتا تھا۔ اس بار بھی وہ غیر ارادی طور پر ہی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ وہ قیر ملک ہے تو شاید ایک بار پھر مجھے اس کی جوانی پر ترس آ جاتا۔ میں اس کے ہاتھوں سے خود کو بچانے اور اسے زخمی چھوڑنے کی کوئی تدبیر کری لیتا لیکن وہ احمق تو ایک عرصے سے گویا موت کو کھٹیت کھٹیت کر اپنے سر پر مسلط ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔

موت اس کی رگوں میں پہنچے گا جیسی تھی اور اندر اندر میرا بھی پھیلا ہوا تھا اس کے باوجود اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے متاسفانہ لیے میں کما کما کر کہہ دیا کہ تم نے خود اپنی جیسی زندگی بے مقصد ضائع کی ہے۔ پھر میں نے چور کی ایک آواز میں حریف اور سوار کو شکل دیا کہ سب ٹھیک ہو چکا ہے اور اب وہ سامنے آتے ہیں۔ جیب سے ایک خنجر اور پتھر سی خارج نکال کر میں نے اس کے چہرے پر دھنسی والی وہ پتھیا پھرنے لگے کسان تھا۔

اذیت کے ان لمحات میں بھی اس نے جیب سے انداز میں مسکرائے کی کو خوش کی اور لوگوں کے چہینے منہ سے اڑاتے ہوئے ہٹتی جیسی آواز میں بولا "تم بہت گلی آدمی ہو افضل چوہدری! اب۔ اب۔ اب تو تھو تو تم نے میرے باپ کو کس طرح ہلاک کیا تھا۔ کہاں قاتل کیا تھا۔ تھو تو بلینے کہیں اس کی قبر سے اٹھیں۔ اب جان کر کیا کہو گے احمق!" میں نے طویل سانس لے کر کہا "اب کون سا تم اس کی قبر پر فخر پڑھنے جا سکو گے۔"

"پھر بھی۔ پھر بھی۔ وہ بڑی شکل سے سرکشی کے سے انداز میں بولا کہ اسے جملہ کھل کرنے کی سلت نہیں ملی۔ اس نے بھی کھلا دیا اور آنکھیں بھی۔ اس دوران حریف اور سوار بھی دوڑتے ہوئے قریب آ گئے۔ راتھیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ حریف کے پاس ایک بڑی سی ناقص بھی تھی۔ اس نے نامزد دوشن کی اور قیر ملک تیز دوشن میں خنجر کیا۔ وہ واقعی مر چکا تھا۔

اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ ڈھانچا اس کے چہرے پر ابھی تک جا ہوا تھا۔ اس وقت وہ بالکل میرے نشانے پر تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ موت اس کے تقاب میں تھی۔ میں چاہتا تھا اس کی دکان میں گولیاں اتر سکا تھا لیکن میں اسے زخمی کھڑا چاہتا تھا۔

اب اس طرح کی منفی معلومات ہو سکتیں۔ "میں نے اسے لگا دیا لیکن وہ اور پھینک دو دھرت گئی۔" میں نے اسے لگا دیا لیکن اس نے مجھے جملہ پورا کرنے کی سلت نہیں دی۔ وہ کسی آڈیو کی طرح ہی رنپ کر پڑا اور اس نے یکدم تین گولیاں جھونک دیں۔ کبوت کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے میں اس جگہ فائر کیا تھا جہاں سے اس نے میری آواز سنی تھی۔

اتنی پہلی کے ساتھ کھینچے ہوئے میں اس مقام پر فائر کرنا اس بات کی نشاندہی کرنا تھا کہ وہ ایک ماہر لڑاکا تھا۔ شاید بات صرف اتنی تھی کہ قسمت اس کے ساتھ نہیں تھی۔ میں محض احتیاطاً اسے لگا دیا تھی پوزیشن تبدیل کر چکا تھا۔ گولیاں میرے قریب ہی زمین میں دھنسیں اور ان سے اڑنے والی دھول میں نے اپنے ہاتھوں میں گھسی محسوس کی۔

اس کا اندازہ جاتا تھا کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چڑھا فائر کرنا مجھے گولی چلاتا رہی۔ وہ گولیاں اس کے جسم میں بیٹھتے ہو گئیں۔ وہ اور اس کے ہاتھ سے پھرت گیا اور وہ سانپ کی طرح ڈرنا ہوا دھیرا ہو گیا۔

میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو وہ زخمی کے سے عالم میں جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بالیں کے نیچے تھا۔ میں نے ٹھوکر مار کر اس کا روبرو رکھ دیا اور وہ پھینکا پھر جھک کر اس کے چہرے سے ڈھانچا نکھینچا۔ وہاں تقریباً اندر میری تھا لیکن میں اسے پہچان سکا تھا۔ اور اسے پہچان کر مجھے بلاشبہ حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ قیر ملک تھا!

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ قیر ملک میرے خون کا پاپا تھا اور مجھے سوانے کے لئے ہر حربہ اختیار کر چکا تھا لیکن یہ بس اوپر والے کا کرم ہی تھا کہ ہر بار میں فائر نکالتا تھا۔ مجھے قتل کرانے کے لئے اس نے اوپنے سے اوپنے درجے کے بد معاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ راہ چلے سرنگ پر گھر۔ سوتے میں پاتے میں جی کہ دفتر میں بھی اس نے مجھ پر بڑے منظم انداز میں بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ حملے کرانے تھے۔ مجھے شکار لگانے کے لئے ایک خاصے غلغلاک دہشت گرد گروہ کی خدمات بھی حاصل کی تھیں اور اس وقت تو اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہی ہو گیا تھا لیکن قدرت کی کنکال میں ابھی میری زندگی کا کھانا بند نہیں ہوا تھا اس لئے میں اس رات بھی نکل آیا تھا۔

ایک بڑے اور عیاش زمیندار کے ختم مزاج بیٹے کی حیثیت سے اس کی یہ کوششیں میرے لئے غیر حتمی نہیں تھیں لیکن مجھے یہ لگن بھی نہیں تھا کہ وہ خود کالے کپڑے پہن کر ڈھانچا منہ پر

جس سے نوا تھا۔

دراوی در میں اس کے جسم سے بہت خون بہہ گیا تھا اور مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔

”یہ تو قیصر ملک ہے۔ لیکن اس ملے میں؟“ ضیف حیرت سے بولا۔ قیصر ملک واقعی ڈاکو ملک تھا اور وہ بھی علمی ختم کا۔ اس کی کمر سے سب مشین گن کی کولیوں کی پلٹ بھی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کالی پگڑی سے دو بارہ اس کے چہرے پر ڈھکا ہاتھ دیا اور پکڑے ابھی طرح بھاڑ کر سیدھا ہوتے ہوئے کہا ”آؤ پلٹو۔“

ضیف اور سردار بھی یوں اطمینان سے سر ہلا کر میرے ساتھ چل دئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ راستے میں ہم ان میں سیاہ پوش کے قریب بھی دسکے جو پہلے ہی مر چکے تھے اور ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہی آؤے ترمیمے پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کے چہرے بھی محول کر دیکھے لیکن وہ تینوں ہمارے لئے اجنبی تھے شاید کرائے کے بد معاش یا ہرجی مج کے ڈاکو تھے۔ انہیں کئی کئی گولیاں لگی تھیں۔ مرنے کے بعد ان کے چہروں پر کرب و غم اور خوف و ہراس نمایاں تھی۔ ان کے غم و غل بتاتے تھے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگوں یا پالوں میں ہی گزارا تھا۔ ہم نے ان کے چہروں پر بھی دو بارہ ڈھکا ہاتھ دئے اور اس طرف چل دئے ہر میری گاڑی کھڑی تھی۔

ضیف اور سردار اپنی گاڑی سڑک سے یکدم دور چھوڑ کر آئے تھے سیاہ پوش میرے تعاقب میں تھے لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ ضیف اور سردار کی شکل میں موت ان کے تعاقب میں تھی۔ میری گاڑی میں بیٹہ کریم تینوں کچے ہی کچے میں اس طرف دوڑا ہوا ہے ہر میری ضیف اور سردار نے گاڑی چھوڑی تھی۔ ”خائزنگ کی آواز میں سن کر سڑک سے گزرنے والی ایک ڈاکا بٹیں یا گاڑیاں رک نہ گئی ہوں؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”سرا ان دیر انوں میں خائزنگ کی آواز میں سن کر تو سڑک سے گزرنی گاڑیوں اور بھولے الٹی رفتار پر چڑھا رہے ہیں۔“ سردار بولا۔ اس کا خیال درست تھا، میں اس حقیقت کو بھول گیا تھا۔

ہم دوسری گاڑی تک پہنچنے سے پہلے گڈے تک پہنچ گئے جو سڑک سے اتر آیا تھا اور خیب میں کھڑا تھا۔ دونوں ساڈ پورے اطمینان سے کھڑے بیٹھ کر رہے تھے۔ ان کی گردنوں پر جال بچا رکھا جاتا تھا وہاں ہمارے وزن کی مسلسل رگڑ سے گوشت پھول پھول کر تیشوں کی طرح تنک گیا تھا۔ ذم بھی پڑے ہوئے تھے ان گڈوں میں جوتے جانے والے ساڈوں کی گردنوں کا یہی حال مستقل رہتا تھا اگر کسی طرح گردنوں پر بچا کر کے دھڑائی بلکہ سوسو سن دہنی گڈا کھینچتے رہتے تھے گاڑی کی دھڑکی ساڈوں پر ہی تو انہوں نے ایک عجیب و غریب بے نیازی سے سراٹھا کر ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھا اور دراوی اس تیرے انداز میں کانوں کو حرکت دے کر دو بارہ سر جھکایا اور بھگائی کا سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا

میرا اشتباہ پاکر سردار نے گاڑی سے اتر کر گڈے پر ایک نظر اس کا جائزہ لیا اور واپس آکر بولا ”گڈے آپا کل ملکا ہے اس پر دو سیلے گڈوں اور ایک لفاف کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ میں نے اطمینان سے سر ہلایا اور ضیف کی رہنمائی میں آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی وہاں سے زیادہ دور نہیں گئی۔ ابھی انجن اسٹارٹ تھا اور دو واہ کھلا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں ہو کر داخل چھپا چکے تو میں نے تیزی سے گاڑی سولی اور مناسب سی جگہ آنے کے بعد سڑک پر چڑھا دی۔

گڈی ابھی تک میری کلائی پر موجود تھی اور میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ میری کوئی اور چیز بھی اس ساری گڈوں کے دوران نہیں گری تھی۔ اس ساری کارروائی میں صرف اٹھا کھینچ صرف ہوئے تھے چار زندگیوں ختم ہو گئی تھیں اور میری زندگی ایک اہم باب ختم ہو گیا تھا۔ قیصر ملک کا باب ملک اسلم میرے کے گل کاڑے دار تھا اور میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔ قیصر ملک اپنے باپ کا اکھوٹا بیٹا تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ گوا ملک اسلم کا خاندان ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں کوئی مجھ سے اپنے کی خواہش میں جھلنے والا باقی نہیں رہا تھا۔ میں قریب آ سے نکلا تھا تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ وہاں پہلے یوں اچانک یہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ قیصر ملک کو کس نام معلوم تھا؟ میں انضالی شاہ سے مل کر اس وقت اس راستے واپس آ رہا ہوں گا۔ ابھی تو وہ گھات لگائے راستے میں موجود یہ محل ایک اتفاق تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کس نے میرا پودہ گرام سے مطلع کیا تھا؟ میرے ساتھیوں اور کارکنوں میں تو غدار کی موجودگی جلد از امکان تھی۔ اس پہلو پر تو میرا ذہن سوچنے کے لئے آمادہ ہی نہیں تھا۔ تو پھر؟

اس سوال کو میں نے اپنے ذہن میں مصلحت چھڑا دیا۔ سوالوں کے جواب وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سامنے آجائے۔ میں طوفانی رفتار سے گھر پہنچا۔ غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور چیمبر آف کامرس کے ڈرنس میں مل جا پہنچا۔ میں نے اس راستے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

دو دن بعد افضل شاہ زمین کی قیمت کی ادائیگی کے سلسلے دفتر آیا تو مجھ سے بھی اس کی ملاقات ہوئی وہ کچھ بجا بجا ملاحظہ تھا۔ باتوں کے دوران بولا ”میں شاید آج رات تم کو سزا سنائے گا۔“ سلسلے میں نہ آتا لیکن کینی والوں کا اصرار تھا کہ انہوں نے سزا کارروائی مکمل کر لی ہے۔ پھر میں آپ کے دفتر کے سامنے سے گزری رہا تھا۔ سونچا چلو و سٹو کر رہی جاؤں۔ آپ جیسے توی ساتھ یہ ذہن مکمل ہونے پر مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن ایک المیہ ناک دہانے نے ساری خوشی کر کر لی کر دی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے ہر دو دن کے لیے سوچا۔

لا تا میں رہتی تھیں لیکن ہمیں جس چلا گیا تھا تو لا قاتوں کا سلسلہ کافی عرصہ متعلق رہا تھا۔ ذرا عیاش سا نوجوان تھا لیکن میرے خیال میں اتنا برا نہیں تھا جتنی بری اس کی تصویر اب سامنے آئی ہے۔

میں ہمدردانہ انداز میں سر ہلاتا رہا۔ وہ بولا "جس روز آپ کو میرے پاس آنا تھا اس روز بھی اس بد نصیب سے میری ٹیک فون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا کہ آپ سے میری زمین کا سودا قائل ہو رہا ہے اور آج آپ زمین دیکھنے آئیں گے بلکہ اس نے پوچھا بھی تھا کہ میں کس وقت تک اس پکڑے قاصر ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے اپنے اہل بلا ناچا رہا تھا۔"

میرا خیال درست تھا کہ بعض سوالوں کا جواب وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی مل جاتا ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا پروگرام قیصر ملک کے علم میں کس طرح تھا۔ اس کے سازشی ذہن نے نہ جانے کیوں اس انداز میں ایک بار پھر میری جان لینے کی تدبیر کی تھی اور خود جان گوا بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی جواں مرگی کا افسوس تھا۔ لیکن ایک لحاظ سے یہ اجماعی ہوا تھا کہ یہ باب بند ہو گیا تھا۔ میرے پاؤں سے گویا پھانس سی نکلی تھی۔ ابھی کھار یہ پھانس خواہ خواہ ہی زیادہ تکلیف دینے لگتی تھی۔

ادائیگی کی کارروائی مکمل ہو چکی تو انضال شدہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کیئرٹن نے اکثر کام پر بتایا کہ سینٹر عالم شیر مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

بار ایک پرانا جاننے والا زمیندار تھا "قیصر ملک۔ نوجوان ہے۔ باپ کی اس کے باپ سے شاسانی رہی تھی۔" وہ مفہوم میں بولا۔ میرے کان گھڑے ہوئے۔

ابت جاری رکھتے ہوئے بولا "شاید آپ اسے جانتے بھی ہیں نے سنا ہے آپ کا علم پرنس سے بھی تو ذرا بہت تعلق اس کا بھی باپ کے زمانے سے قلمی دنیا سے تعلق چلا۔ بہت سی فلمیں پروڈیوس کی تھیں انہوں نے۔ جن میں کامیاب بھی رہی تھیں۔"

اے۔ کچھ یاد تو پڑتا ہے۔ نام تو کچھ مانوس سا ہے۔ "میں نے زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "اصل میں قلم پرنس نے توجہ دینے کا مجھے کچھ زیادہ وقت نہیں ملا۔ میرا ایک اتنی فائن امرو۔ وہ سارے معاملات پنڈل کرنا ہے۔ وہی سب کو ہے۔ ہر حال آپ کیا بتانے جا رہے تھے؟"

"میں نے شاید اخبار میں پھولی سی خبر پڑھی ہو۔" وہ لٹھڑی ہائے گریو بولا "پولیس کو روڑے میں تین بدنام ڈاکوؤں کے اس کی لاش ملی ہے۔ تینوں ڈاکو قتل اور ڈیکینوں کی کئی توں میں پولیس کو مطلوب تھے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ۔ قیصر ملک بھی ڈاکوؤں والے ملے میں تھا۔ پولیس کو کافی حد تک نہیں ہو چکا ہے کہ وہ نہ صرف ڈاکوؤں کی سرپرستی کرتا تھا بلکہ انکی سرپرستی پر خود بھی وارداتوں میں حصہ لیتا تھا اور وہ چاروں باکلاف گروہ کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے آنکھیں تھوڑی سی پھیلا کر ذرا حیرت کا اظہار کیا "اس قسم کی افواہیں تو خیر اکثر سننے میں آتی ہیں کہ بعض بزار ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سنا کہ بزار خود بھی انکی کے سے ملے میں ان کے ساتھ واردات میں۔ لیٹے چل پڑا ہو۔ جب اشتباہ پر مرگی سے چپٹے والی کھ بان موجود ہوں تو اتنی ذہمت کرنے اور اتنا خطو مول لینے کی کوئی نہ فکر نہیں آتی۔"

"جی ہاں۔ کیا میں نے بھی پولیس کو سمجھانے کی کوشش کی نہ۔" وہ لٹھڑی سانس لے کر بولا "لیکن پولیس تو پولیس ہے نا۔ سامنے جو رائے قائم کر لی ہو سکتی۔ میں نے زیادہ زور اس لئے لگا دیا کہ کہیں وہ مجھے ہی شامل تحقیق نہ کر لیں۔ ان کے تھوڑے کچھ بے یقینی ہو چکے تھے۔"

"اوہ!" میں نے متاسفانہ انداز میں سر ہلایا "یہ تو آپ نے اسکی بری خبر سنائی۔ میں نے اخبار میں نہیں پڑھی۔ مجھے اخبارات زیادہ تفصیل سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ خاصا گمراہ دست تھا آپ کا؟"

"نہیں۔ اسے گمراہ دست تو نہیں کہا جا سکتا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا "میریں وہ مجھ سے کافی چھوٹا تھا لیکن ہر حال پرانی شاسانی کہ ملاقاتیں کم ہی رہیں۔ کبھی کبھار وہ لندن آتا تو خاصی لمبی

عظیم جرنیل بونا پارٹ کی زندگی
اور کارناموں پر مشتمل
ایک دلچسپ کتاب۔۔۔۔۔

نیولین بونا پارٹ

قیمت: -/75 روپے
★ پرو فیسر ایم اشرف

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

کے؟ کسی نہ کسی نوڈ کوئی کوئی تم تک پہنچنے کے لئے کاغذ ملتے میں بھی راست تلاش کرنے گی۔" چیتے چیتے اب غویہ آواز بگم ہو گئی تھی۔

"اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ تمہارا ذہنی توازن ہونکا ہے۔" میں نے سر ہلے میں کہا "میں پاگل خانے والا فون کرتا ہوں۔ چاہیں تم کن کی لاشوں اور کن کاغذوں کی کر رہے ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم زیادہ خطرناک بائبل نہ بن میں جیسے ابھی پاگل خانے بھوانے اور کہیں بھجوانے کا بند نہیں کر سکو گئے؟" وہ زہریلے لہجے میں بولا "اب تو سب بددوست میں ہی کول گا۔ خیریت چاہتے ہو تو میرا بائیں لاکہ واپس کر دو۔"

"میری کچھ میں نہیں آتا وہ کون سی بائیں لاکہ کی رہا جس کے صدمے سے تم ذہنی توازن کو بیٹھے ہو۔ میرا تو تم سے قسم کا کوئی لین دین بھی نہیں ہے۔" میں نے بے زاری سے کہا "سب کچھ میں آجائے گا بچے! اب کچھ میں آجائے" وہ گویا پچکاوتے ہوئے بولا "تم نے ابھی صرف اپنا ہاتھ دکھایا۔ ابھی تم نے عالم شیر کا ہاتھ میں دیکھا۔"

"مامی صاحب! میں نے قصے قصے لہجے میں کہا "سلطون سے تم کو میرے فون کے ساتھ رکھا رنگ سسٹم شک کر میری کھٹکوں کا رنگ کر رہے ہو لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض کر ادھر میرے فون سے بھی کھٹکوں کا رنگ ہوتی ہے اور تم نے اب تک جو بھی بکواس کی ہے وہ ساری کی ساری دھمکی اور ہراس پھیلانے کی کوشش ہے۔ اگر یہ کیٹ میں آتی جی صاحب بھجوا دوں تو فوری طور پر تمہارے خلاف سخت قانونی کارروائی ہو سکتی ہے۔ تمہارے وارنٹ بھی نکل سکتے ہیں۔"

"یہ رکھا رنگ شکا رنگ۔ یہ کیٹ۔ یہ وارنٹ۔ قانونی کارروائیاں۔ یہ سب تمہارے مشغلے ہیں برخواستہ! پھکارا۔ ہمارے طور طریقے تو بالکل سیدھے سادے اور نوڈ پراخت ہوتے ہیں۔ اب تمہیں واسطہ دے گا تو سب کچھ بھجوا جائے گا۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ کسی نے تمہیں ظلم بھرا ہوا تھا۔ اب ہماری تمہاری کھلی جگہ ہے جو بددوست چاہ کر لے گا۔"

"ایک بددوست تو میں فوری طور پر کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" میں نے غالباً غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"کئی کہ میں فون بند کر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور دبیج کیڈل پر ہنسا۔ اس وقت دوسری طرف اس کی حالت پتہ چلا دیا ہوگی۔ ایسے ہی مقولوں پر انصاف بھی فون کی ضرورت شدت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے شرعاً عالم کو کھٹکوں کو کہہ دیا۔ اسے زیادہ

"اسے بتادو کہ اس وقت میں مصروف ہوں پھر کسی وقت بات کرے۔" میں نے ریموٹر رکھ دیا اور فائلیں دیکھنے لگا۔ ان میں زیادہ تر باہر سے آئی ہوئی ڈاک تھی۔ تو مجھے کھٹکے کے بعد کی سب سے خود دنگ دے کر کمرے میں آئی اور بھگپاتے ہوئے بولی "سربراہ عالم شیر نے برا ٹاک میں دم کر رکھا ہے۔ پہلے آرام سے بات کر رہا تھا پھر رعب ڈالنے لگا "اب منت مانت کر رہا ہے۔ وہ صرف چند سیکنڈ بات کرنا چاہتا ہے۔"

"اسے ڈانٹ پلائی ہوئی۔" میں نے کہا۔
 "ڈانٹ تو بت پلائی ہے سربراہ! وہ اگلیں میں پینل کھاتے ہوئے بولی "اس کے بعد ہی تو منت مانت کرے لگا ہے۔"
 "اچھا مانت۔" میں نے بے زاری سے کہا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نے ریموٹر اٹھالیا۔

لاٹن ملتے ہی دوسری طرف سے عالم شیر بلا تمہید چپچہ "تم نے اچھا نہیں کیا جو پری؟"
 "کیا بد فیزی ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا "اگر اتنے زور سے ہی چپچہا تو فون استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ایسے ہی اپنے آفس کی کوئی سے سر نکال کر گھاس چاڑھ تو آواز بگم تک بچ کر جاتی۔"

"بائیں کرنی بہت آگئی ہیں جہیں۔" اس کا والدیم کہ نہیں ہوا "لیکن میں جہیں بتا رہا ہوں تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نہیں بچتا ہے پر مجبور کروں گا۔"

"کیا اچھا نہیں کیا؟" میں نے غلامت سے پوچھا۔
 "یہ جو تم نے مجھے افواہوں کے بائیں لاکہ صدمہ بتاواں وصول کیا ہے یہ میں جہیں ہضم نہیں ہونے دلاں گا۔" قصے کی شدت سے اس کی توازن چلی جا رہی تھی۔
 "یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے برہمی سے کہا "میں اس قسم کا بے ہودہ مذاق پسند نہیں کرتا۔"

"مذاق؟ تمہارے خیال میں میں مذاق کر رہا ہوں؟ جس کی تم نے اتنی بے عزتی کی۔ جس سے بائیں لاکہ صدمہ جیسا اسے مذاق سونے گا؟" اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس وقت اس کی بائیں سے کف بہہ رہا تھا۔

"شیر عالم!" میں نے بدستور غلامت سے کہا "میرا سلطون ہوتا ہے کہ تمہیں کسی قسم کا دودھ پڑا ہے۔ جہیں شاید کسی نے تمہیں بتایا کہ اس حالت میں شہر کے سبز لوگوں کو فون کر کے اوپر ادھر کی بکواس کرنے اور اہل فول بکے کے بجائے کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا کرتے ہیں؟"

"ڈاکٹر سے تو میں رجوع کر چکا ہوں! اپنے زخموں اور چٹوٹوں کا طمان کروا رہا ہوں۔ لیکن تمہیں مغربیہ گورکن سے رجوع کرنا پڑے گا۔ قحوک کے حساب سے لاشیں اٹھیں گی تمہارے ساتھیوں کی۔ اور تم خود بھی کاغذوں کے گھیرے میں کب تک بچ

ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں قائم کر رکھی تھی۔ یہی مذاق کی باتوں کے دوران میں بار بار کوئی کا دھاری کھ اٹھا تو وہ بے زاری سے ہاتھ ہلاتے۔ "نہی" "اوتھ"۔ سرشوشی (چھدری) اٹ اٹھ کر رات گئی۔ پورا رات انہی تھک تھک آنی دل سناں اٹھ۔ اس سے میری آنکھ پھٹ پھٹ گئی کالیں پانچ سالانہ کالیں دین تھا۔ وہ ہماری وی آنی پی لٹ میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس سے ملنے وقت مجھے خواہ مخواہ معنوی خوش اگلائی سے سکرانا اور اس کی برہات کی آئینہ میں سر ہلانے پڑے گا جو میرے لئے ایک مشکل کام تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہو گیا تھا۔ اس کے اثاثات کو سنبھالنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

دوسرے روز وہ بغیر کسی اپنا ٹھنڈ کے میرے ہوٹل کے سوٹ میں آگئی۔ گاؤبار کی تو اب کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی اب تو اسے صرف یہ جاننے کی فکر رہتی تھی کہ میں کب فارغ ہوؤں گا کب ہم واپس کے لئے جاسکتے ہیں کب ہم جھیر جاسکتے ہیں اور کب سفارشات میں لمبی ڈرائیو کے لئے نکل سکتے ہیں۔

میں نے اسے اشاروں کنایوں میں بتانے کی کوشش کی کہ میں ان کاموں کے لئے لندن نہیں آیا تھا۔ سوٹ کے اندر تک کی دوستی تو ٹھیک تھی لیکن اب میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالنے دنیا جہان کی خاک جھاننا نہیں پھر سکتا تھا۔ اور اس کے اندر کی جھانک اور روح کی اندر کی دنیوی خوشی ہونے میں نہیں آتی تھی۔

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اسے ساری دولت و جائیداد اور جی جی جی جی اس کے آنجنابی شوہر سے ترکے میں مل گئی۔ جوڑی کی وہ پہلی اور اس کے شوہر کی تیسری شادی تھی۔ جوڑی کی عمر اس وقت چوبیس سال اور اس کے شوہر کی بیاسی سال تھی۔ شادی کے صرف دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

یہ سب کچھ سن کر میرے ذہن میں نوجوانی کی بڑھی ہوئی بزم و سزا کی وہ ساری کمناہیاں گانہ ہو گئی تھیں جن میں نوجوان بیواں عمر رسیدہ دولت مند شوہروں کے قتل کی سازش کئی تھیں۔

اس نے گویا میرے خیالات بڑھ لئے اور مجھے جھنجھوڑ کر میرے بال بکھیرتے ہوئے بے حاشہ ہنستے ہوئے بولی "مجھے کوئی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مجھے صرف دو سال دلچسپی سے انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہ انجانا کا مریض تھا۔ بلڈ پریشر تقریباً ہر وقت بائی رہتا تھا۔ شراب پی کر اس کے گردے ٹھکانا ہو چکے تھے۔ مٹی بھریدنگ پلڑے کھائے بغیر اسے چند نہیں آتی تھی۔ اعصاب نوٹ پھٹ چکے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے تو حیرت تھی کہ میرا انتظار اتنا طویل کیوں ثابت ہوا۔"

مجھے ان لوگوں کے خصلے پر جواہر تک آتا تھا جو بلڈ پریشر اور امراض قلب و نیو میں مبتلا ہوتے تھے جن کے گردے اور پیچھے و رفیو تقریباً ٹھکانا ہوتے تھے مگر جو اتنی توڑے سال کی عمر میں پچھتر، تیس سال کی لڑکی سے شادی کر لیتے تھے۔ انتقال بلند

ت نہیں دی تھی تاہم کچھ دیر بعد میں نے محض احتیاطاً اپنے جن کو معمول سے ڈرائیو ہو شیوار بننے کا سٹاپ دے دیا۔

"دوسرے روز سے میری کاؤباری مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ دس بارہ روز کے لئے لندن بھی جانا پڑا۔ وہاں بھی مصروفیات بڑھ رہیں۔ کئی پانچوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ڈنرے تھے۔ بے سائل لے کر آتے تھے۔ اور ان بارہوں میں ایک کوڑی انگریز جوڑی فوسٹر بھی شامل تھی جو پہلی بار مجھ سے ملی تھی۔ اس سے اس نے صرف کہنی کی طرف سے آنے والے غلوں پر میرے مذاق کیے تھے۔ مجھے نہیں دیکھا تھا۔

میرے بارے میں اس کے ذہن میں یہی تاثر تھا کہ سوئی سی والا کوئی امیر خاں ہو گا جو پنجابی لہجے میں انگریزی بولے ہو گا۔ یہ سنے مجھے بعد میں بتایا۔

میں نے تو خبر اس کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا بلکہ ذرا صبح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ ہماری بارہوں میں شامل ہے۔ مجھے تو بس لندن روانہ ہوتے وقت میرے ایک پورٹ پیجر نے۔ فائل تصدیق تھی جس میں کچھ لوگوں کے ناموں کی فہرست جوڑی تھی کہ مجھے ان سے ملنا ہے۔ کچھ کاغذات پر انہم نکلت اور قات کی تار نہیں دینیو دین تھی۔ ان سب سے ملاقاتیں پہلے ہی ہو چکی تھیں۔

جوڑی فوسٹر ایک نوخیز اداکار کا نام بھی تھا لیکن ایک بہت ناگہمی کی تاہم اس کا یہ نام بڑھ کر میرے ذہن میں بھی کچھ ایسا ہی نہ آیا تھا کہ وہ کوئی بڑی خزانہ اور قدرے سنگی قسم کی بڑھیا لکھ نام طور پر کسی بہت بڑی کمپنی کی مالک بننے کی نوبت آئے تھے عورت عمر کی اسی منزل کو پہنچ چکی ہوتی ہے تب ہی اسے دوبارہ چلانے کا سلیقہ آتا ہے۔

لیکن ایک خاص اشارہ ہوٹل میں پرنس پرنس سے ملاقات کی تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ سترے بالوں کی ایک دراز قد عورت تھی جس کی عمر شاید تیس کے قریب رہی لیکن وہ بمشکل بائیس چوبیس کی لڑکی نظر آتی تھی۔ وہ بے پناہ سن گئی لیکن وہی لڑکیوں کی طرح اس کے حسن میں وہی پیکا نا اور وہی ٹھنڈک تھی جو شفاف برف پرش چٹنوں میں ہوتی ہے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر اچھی طرح حیران ہو چکے تو دونوں ناگواری اختیار نہی آگئی۔ ہم اپنا اپنا کاؤباری رکھ رکھاؤ اور سرور علی بالکل معمول گئے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی اونچے طبقے کے انگریزوں والڈنس واری بھی بلانے طاق رکھ دی۔ چند منٹ بعد ہی ہم وہ بے فکرے نوجوان دوست نظر آنے لگے۔ مجھے تو کاؤبار پھر بھی کچھ اڑھا لیکن اس نے دیکھا کہ ہر چیز بالکل ہی بھلا دی۔

میں نے ایک دوسرے کو صاف گویا کہ وہ راتے بھی بتادی جو

بات کرتی ہو۔ کوئی بدانتہائی ہو۔

”اسے بھی ایسی کوئی بات نہیں۔ بدانتہا کا تم ہو بڑا۔ بس اب تم ہی دیکھ رہا کرو۔“ میں نے اعتراف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”ابھی بلوا لیتے ہیں اسے بھی اندر۔ مجھے یہ اچھا لگا ہے۔ شریف آدمی ہے۔“

”جی ہاں۔ لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔“ اتفاق نے تائید میں نے کیتھرن سے کہہ کر نسیم سجاد کو اندر بلوایا اور اس انتظار کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جبکہ اس انداز سے اندر آکر آکھیں نہ تھیں اور وہ میرے پیروں میں گرا جا رہا تھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کسی کی مدد سے زیادہ اکھساری اور مومنیت مجھے شرف کھلتی تھی۔

اس کے انداز نے بھی مجھے کھینسا سا کر دیا۔ میں نے اسے سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں صاحب؟ خدا کے لئے اپنے پیروں پر ذرا تھ کر کھڑے ہونا چاہیے۔ وہ گھو کر میری آواز میں بولا ”بس اب آپ کی نظر کرم میرا ہے چہ درہی صاحب! اب میں سب کچھ سیکھا جاؤں گا۔ میں مٹی آپ نے مجھے سونا بنا دیا ہے۔“

میں نے بدستور شرمندگی سے کہا ”ہمارے والی ذات تو حرا اور والے کی ہے جسم صاحب! ہم تو کسی کو بھی کچھ ہمارے کی قدر نہیں رکھتے۔ ہم انسان تو زیادہ تر ایک دو سوسے کا کچھ بگاڑنے ہیں ہمارے ذرا کم ہی ہیں۔“

”مجھے لگتا ہے“ آپ کی یہ اکھساری اور اوپر والے پر آپ کا زبردست اعتقاد ہی آپ کو دل و دماغ اور رات چو گئی تھی دے ہے۔“ وہ میرا اشارہ پا کر جیسے ہوئے بولا۔

”میں تو اس بارے میں کوئی رائے دینے سے بھی قاصر ہوں میں بہت گناہگار انسان ہوں“ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربان ہے تو صرف اس کی صفت ہے ورنہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں کہ وہ پر مہربان ہو۔“ میں نے حیرت سے اپنے دل میں عاجزی کا ایک جھم سوز محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”سمان اللہ!“ وہ گویا جھوم کر بولا۔ اتفاق خاموش اور بدخود بیٹھا تھا، وہ جیسے کیس کھو سا گیا تھا۔

”تم کیا سوچ رہے ہو اتفاق؟“ میں نے پوچھا۔

وہ جیسے چوتھے ہوئے بولا ”سرا! میں سوچ رہا تھا کہ دنیا آج جیسے دولت والوں کو اور ہم جیسے غم والوں کو مت برا سمجھتی ہے یہی سمجھتی ہے کہ ہم تو گناہوں کی دلدل میں گردن تک غرق رہے ہیں اور شاہد بھی بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتے۔ ہم شاید فنا میں فروغوں کے پیو کا رہیں لیکن کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ہمارے دلوں میں کتنا گناہ اور کتنا خوف خدا ہے۔ ہمارے ارادے کتنا ہیں۔ ہم گناہگار ہیں۔ ہر قدم پر ہم سے کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے لیکن ہمیں کم از کم اس کا احساس ہے۔ اس دنیا میں ہے۔

حوصلے کے بغیر اس قسم کے کارنامے انجام نہیں دے جاسکتے۔ لندن سے میں واپس آنے لگا تو یہ جان کر میرے ہوش اڑ گئے کہ بڑا ہی فخر میرے ساتھ پاکستان آنے کے لئے گئی تھی تھی۔ اس کا حسن اس کی نوازشات اور اس کی شخصیت کی کشش اپنی جگہ تھی اور لندن کی حد تک ساتھ عمر کی سے بچ گیا تھا لیکن میرا دل کتنا حقا کہ میں اسے پاکستان لے جانے کا قائل نہیں ہو سکا تھا۔ اور اگر وہ کرے ہمارے بنا کر بڑی مشکل سے میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے سے باز رکھا۔

میں واپس پہنچا تب بھی بے شمار مصروفیات میری فہم تھیں۔ انہی مصروفیات کے دوران اتفاق مجھ سے ملنے آیا۔ وہ خاصا خوش اور پرجوش نظر آ رہا تھا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی بولا ”آپ ملک سے باہر تھے۔ آپ کی عدم موجودگی میں فہم انڈسٹری میں تو پے در پے کی انتظامات آگئے۔ قیصر ملک مارا گیا اور پولیس اس کے ڈاکو ہونے کے بارے میں تحقیق کر رہی ہے۔ نسیم نواز نے خودکشی کر لی اور نسیم سجاد نے راتوں رات اس کی جگہ لے لی۔ آپ کے حوالے سے وہ میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اس کے لئے پولیس کا نفرنس کا اہتمام کر دیا تھا۔ اچھا خاصا اسکینل تھا۔ اخباروں کے قلمی ایڈیٹروں میں تو بڑی بڑی سرخیاں لگی تھیں۔ آپ کو تو کچھ پتا نہیں ہو گا؟ آپ تو شاید اس وقت روانہ ہو چکے تھے۔“

”نہیں۔ نصر نواز کی خودکشی اور قیصر ملک کی ہلاکت کی خبریں نے جب اخبارات میں پڑی تو میں یہیں تھا۔ قصیدات کا ہر حال علم نہیں ہو سکا اور قصیدات سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں۔ میرے لئے یہ کوئی اہم واقعات نہیں ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اس طرح کے لوگوں کا انجام ایک نہ ایک روز ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے علامت سے کہا ”تم یہ سناؤ کہ اپنا قلمی کاروبار کیا جا رہا ہے؟“ اس کا جوش و خروش کچھ گھٹا پڑ گیا نام مسرور جیسے میں ہی بولا ”سمت اچھا جا رہا ہے۔ لگتا ہے ہمارا ستارہ بہت سچ راستے پر چل پڑا ہے۔ تمام رکاوٹیں گویا خود بخود دور ہوئی جا رہی ہیں۔ مصروف سے مصروف انداز سے بھی ڈش و دھڑا دھڑل چاری جا رہی ہیں۔ ہر گھنٹہ نکلنے پر بلا بیٹھا ہے۔ ڈسٹری بیوٹرز رقیس لئے چلے آ رہے ہیں۔ سلیم سید کہتا ہے کہ وہ اپنے بہترین اسکرپٹ صرف ہمارے لئے مخصوص رکھے گا۔ اور نسیم سجاد کو سارے پروڈیوسروں نے گھیر لیا ہے۔ اسے زبردستی رقیس بھی تصاویر ہیں۔“

اس کے لئے سب کچھ کر رہے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے کامیاب لکھی شروعات کرے۔ لیکن وہ تو بس جیسے آپ کا ٹھہر ہے، آپ ہی کے نام کی گردن کر رہا رہتا ہے۔ کتا ہے چہ درہی صاحب کے غم کے بغیر کسی کے لئے کچھ نہیں لکھوں گا۔ وہ اس وقت بھی آپ سے ملنے کی خواہش لئے میرے ساتھ آیا ہوا ہے۔ کیتھرن نے اسے باہر بٹھا رکھا ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ پہلے میں ہی عثمانی میں چہ درہی صاحب سے مل لوں، شاید انہیں علیحدگی میں مجھ سے کوئی

میں گزار دے بلکہ گزار دے۔ میں نہیں چاہتا کہ باقی عمر آپ غیر ضروری محنت میں ضائع کر دیں۔ جس کے لئے دل چاہے کام کیجئے اور اپنی پوری توانائی سے کام کیجئے زیادہ سے زیادہ کام کیجئے۔ بٹنے کنزیکشن پر دے کر سکتے ہیں اتنے ضرور سائن کیجئے۔ آپ کے حصے کا ہوتا بھی حرج کا دورہ کیا ہے اس سے ضرور استفادہ کیجئے کیا میری خواہش ہے اور کیا میرا مشورہ۔

"ہمیں تو آپ کے حکم پر چلنا ہے چودری صاحب۔" وہ دو ٹوک لمبے میں بولا "آپ اجازت دے رہے ہیں تو وہ سبوں کے لئے بھی کام شروع کر دیں گے۔ آپ منع کریں گے تو وہیں ہاتھ روک لیں گے۔"

"نہیں، میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے نسیم سہا کو دلچسپ کرنا تھا۔ خوشی ہو رہی تھی۔ وہ عمرہ قسم کی سیاہ شیروانی اور سفید باجے میں تھا۔ خوشحالی کی چھاؤں میں قدم رکھنے کے لئے چند ہی دن ہوئے تھے لیکن پہلے سے بہت عطف آوی رکھائی دینے لگا تھا۔ صاف سحر اور کھرا کھرا سا۔ چہرے پر عجیب سی چمک آگئی تھی۔ خود غافل سے خود اعتمادی جھلکے لگی تھی۔ یہ نظیر مجھے بارہا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور ہر بار میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

غرت میں آوی ڈنگ لگے برتن کی طرح ہونا ہے مگر کے کوٹے میں پڑا رہتا ہے۔ نظروں کو بھلا نہیں لگتا۔ گرہن لگا جائے ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے لوگ گرد میں اونچی نہیں کستے۔ نظر بگڑاتے ہیں۔ خوشحالی اس ڈنگ آلود برتن پر پاش کوئی ہے۔ اس میں چمک رکب آجاتی ہے۔ چاند کا گرہن دور ہو جاتا ہے۔ خوشحالی اور عروج زیادہ ہی آتا ہے تو تواری عید کے چاند کی طرح ہو جاتا ہے۔ لوگ چھتوں پر چڑھ چڑھ کر دیکھتے ہیں اور بڑے اہتمام سے دیکھتے ہیں۔

"آفاق مجھ سے مخاطب ہوا۔" ہر حال نسیم صاحبہ وہ قسمیں تو ہمارے لئے بھی لگے رہیں۔ وہ دونوں ایکشن تھیں ہوں گی۔ "نسیم صاحب سے ایکشن تھیں گھوڑاؤ کے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہ دیکھو اور میرا ہاں منع قسم کے تواری ہیں۔ ان سے تو سوشل میڈیکل اور بوڈیٹنگ قسم کی قسمیں گھوڑاؤ۔"

"میں تو آپ کو معلوم نہیں ہے چودری صاحب۔" آفاق جلدی سے بولا "دیکھو اور میرا ہاں منع قسم کے آوی ایکشن تھیں بہت اچھی لگتے ہیں۔ نسیم صاحب تو کئی کامیاب ایکشن تھیں لگے چکے ہیں لیکن وہ بھی اسی دور میں رہے ہوئی ہیں جب ان کی جگہ نصیر نواز کا نام بدل رہا تھا۔ ویسے بھی شاید آپ ہماری اندر مشی کے سب سے بڑے ایکشن رائٹر سے نہیں ملے ہیں جن کا ہیرو سب سے اونچا ہوتا ہے۔ بیش بہا قاتل گھٹ رہا ہے اور جس نے اعلیٰ اور گندا سے سے سختوں کے پٹنے کا دے دیں؟"

اویسے ہیں جو گناہوں اور خباثتوں کو بھی نیکیوں کی طرح نظر نہ آجیام دیتے ہیں اور دنیا میں معزز و سربلند بنے بیٹھے ہیں۔ "یہ تم سے مزید ایک گناہ سرزد ہوا ہے آفاق؟" میں نے جے ہوئے کہا۔ "دوسروں سے اپنا موازنہ کرنا اور اپنے آپ کو بائس قسم کی سوچ خود پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ دنیا میں ہر ایک لوگ موجود ہیں۔ انہیں اپنا کام کئے جانے دو۔ ہم اپنا کام بائیں گے۔"

پھر میں نے نسیم سہا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "آپ نے نسیم صاحبہ ایسی گزری ہے؟"

"ہاں کیا تاؤں چودری صاحبہ۔" وہ پلہ پلہ لے ہوئے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہر لمحے دھڑکا سا کہ ہے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ کل تک قسم اندر مشی میں کوئی مجھے انہیں تھا۔ آج سب میرے گھر حاضری دے رہے ہیں۔ کل میں کسی سے ملنے کی کوشش کرنا تو شاید وہ وقت کے لئے مجھے بدتر نہیں بھی نہ جاتا۔ آج ایک قسم سائے مجھے اپنے بچکے میں بیٹھ موم کا بڑا پیارا اور سا سجایا پرشور دے رہا ہے۔ ایک بڑے سرے اپنی پرانی گاڑی میرے حوالے کر دی ہے۔ ایک لے پڑ خرقہ پر ڈرائیور میرے ہمراہ کر رہا ہے۔ اور یہ سب اس رات میں ہے کہ میں نے کسی کے لئے کام کی ہائی نہیں بھری۔ ہائے تو سب سے کہہ چکا کہ جہی میں تو چودری صاحب کا اعلیٰ ام ہوں۔ میرا قسم تو بس انہی کے لئے وقف رہے گا جنہوں نے عزت اور گناہی میں عزت دی۔ میرا ہاتھ تھا اور ہر طرح سے مدد کی جبکہ انہیں مجھ سے کوئی فرض نہیں تھی۔ میری خدمات ضرورت نہیں تھی۔ انہیں آج بھی میری خدمات کی ضرورت تھی ہے۔ میری خدمات کے بغیر بھی ان کا سفر ملے سے بلند تر مقام با طرف جاری رہے گا۔ لیکن خود مجھے مروتیت کے اعداد کا اس نے سہا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ میں جس قاتل بھی ہوں اپنی رات ان کے لئے وقف کر دوں۔ لیکن میں اس تقرر سے بھی دلچسپی نہیں ہوا۔ سب کی فواشبات کا سلسلہ جاری ہے۔ علی کچھ میں نہیں آتا نہیں کیسے دکھوں۔ ویسے خوشی بھی ہو رہی ہے۔ بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں رہے۔"

"نسیم صاحبہ! آپ جو کچھ کر رہے ہیں بالکل فلاح کر رہے ہیں۔" میں نے گہری سچوئی سے کہا میں نے اگر آپ کے لئے کچھ لایا ہے تو وہ اس لئے نہیں کیا کہ میں آپ کو احسان کی ذخیرے سے اندر کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے فیصلوں میں بالکل آزاد رہنے اور ہر وقت متحمل کام کیجئے جس سے آپ کی بھلائی کی کوئی صورت ملے گی۔ آپ کسی کے لئے بھی خواہ کتنا ہی کام کریں کسی کو کتنی ہی ترسائیں اس سے ہمارے آپ کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آپ نے اپنی عمر کے سترے سال پہلے ہی اعتقاد قسم کی غلامی

"نہیں، میرا خیال ہے مجھے ان سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔" میں نے ذہن پر غور فرما کر دیکھ کر کہہ دیا۔

"وہ بھی بڑے دھمچے، مرنے والے اور دھان پان سے آدمی ہیں۔" اتفاق نے بتایا۔ بہرہ ور خلیانہ سے مجھے میں ہوا۔ "کھینے والے اپنے احوال سے خواب کھینے ہیں چہرہ میں صاحب! وہی کچھ زیادہ کھینے ہیں اور اچھا کھینے ہیں جس کی ان کی اپنی زندگی میں کمی ہوتی ہے۔ فکروں میں تو خیر، بیڑ چال کا مسئلہ بھی آتا ہے۔ پر وہ دوسرے حکم اور پیک کے ذریعہ کے مطابق بھی کھینا پڑتا ہے لیکن انسانوں اور کمانیوں کی دنیا میں تو آپ کو میرے فکروں کے بہت سے ثبوت ملیں گے۔ اگر آپ نے بہت پڑھا ہو اور آپ کو کھینے والوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا ہو تو شاید آپ کو معلوم ہو کہ کھینے والوں کی زندگی میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے اس کے متعلق وہ خوب لکھ لکھ کر اپنے دل کو غیر شعوری طور پر تسکین پہنچاتے ہیں۔ لیکن بہر حال یہ کوئی محبوب بات نہیں، کسی قسم کا احساسِ محرومیت ہی انسان کو فکرا رہتا ہے۔ بہ صورتِ ظہن ہمارے تحریر میں بڑا حسن ہوتا ہے اور محبت سے محروم مصنف کی تحریروں میں محبت ہی محبت بکھری ہوتی ہے۔ جن کی تحریروں میں انسانی قدروں کا پورا پورا ہوتا ہے اور معاشرے کی بڑی ذہنیاتی دی جاتی ہے، وہ ملتی زندگی میں انسانی قدروں کے کچھ ایسے زیادہ امین نہیں ہوتے۔ جن کا ہیرو بڑا شریعہ، پتیل اور سوشل ہوتا ہے، وہ خود عام طور پر بڑے شریعے اور کوٹ نہیں ہوتے ہیں۔ میں اس خیال سے کچھ زیادہ متفق نہیں ہوں کہ تحریر میں کھینے والے کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس بیان میں صحیح کر کے کچھ بول کر لکھا جائے کہ اکثر تحریروں میں ان کے کھینے والوں کی تشہیر، تخیل، تماشوں کا عکس نظر آتا ہے۔"

"بھئی میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں نے بہت پڑھا ہے۔" میں نے اٹھکلی سے کہا۔ "لیکن مجھے یاد ہے نوجوانی میں میں دنیائے ادب کے ایک بہت بڑے مزاح نگار کی کمانیاں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ گئے بندھے ان کے کہہ رہے تھے جن کا تعلق ہیروہ حال عمر انوں سے تھا۔ ان کا ہیرو ہیرویشور اور آؤڈیہ کھنڈہ ڈاؤنڈہ اور وہ سینک ہوا تھا بہت لطف آتا تھا ان کی کمانیاں پڑھ کر کچھ حیرت پلے اسلام آباد میں ایک اپنی میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے لگا کہ نوجوانی میں وہ بالکل ویسے ہی رہے ہوں گے جیسا ان کا ہیرو ہوا تھا۔"

"ایسی مثالیں بھی ہوتی ہیں لیکن بہت کم ہوتی ہیں۔" ادا کا کھینے والوں کی شخصیت ان کی تحریروں سے مشابہ نظر آتی ہے۔" اتفاق احمد ہوا۔ "ویسے میں کچھ گیا ہوں۔ آپ کسی مزاح نگار کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں انہیں غور فرما رہا ہوں" ان کے الفاظوں اور شخصیت میں صرف یہی سماکت ہے کہ ان کا ہیرو دروازہ ڈھکھنڈا اور خوب ہوتا ہے اور وہ خود بھی اسرار ہیں۔ لیکن اور

بہت سے تشادات موجود ہیں۔ مثلاً ان کی کمانیاں پڑھ کر کہہ آتی ہے۔ حل میں پھیلایاں ہی چھوٹے لگی ہیں لیکن وہ خود لکھ رہے ہیں۔ اور جہاں تک ان کے الفاظوں کے متعلق ہے تو میں کا قتل ہے تو مجھے یقین ہے کہ انہیں زندگی میں ایک سی لڑکی سے ملا نہیں کیا ہو گا جو آج کل ان کی اور ان کے جوان بچوں کی والدہ ہوں گی۔"

سچو نیم ہوا۔ "چہرہ میں صاحب! اجتماعی مسائل میں بھی یہ تک اتفاق صاحب کے خیالات سے متفق ہوں۔ اصل میں تخلیق کار لوگ اپنے پیارے خوابوں کے یوہاں ہوتے ہیں چھ پیارے خواب صرف ہمارے ہی نہیں ہوتے۔ وہ اس کھنڈے تو بے لحد لوگوں کے خواب ہوتے ہیں۔ لوگ بالکل انصاف کی کمانیوں پر بیٹے ہاں۔ ہمیں چہرے ہیں لیکن آپ نے بھی کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی اکثریت انہیں ذوق و شوق سے پڑھتی ہے؟ ہمارے ہاں بیشتر محفلوں میں لکھی اور گزشتہ۔ فکروں کے بچے لکھنے والے بھی ہیرو کا پورا مذاق اڑایا جائے۔ لیکن آپ نے بھی سوچا کہ ایک بڑی اکثریت اس کی فہمیں غور شوق سے کیوں دیکھتی ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" میں نے دھمچے مجھے میں کہا۔ "یہ دراصل کچھ ہوئے اور محروم لوگوں کے ہیرو ہیں۔ اور وہ سوسائٹی میں کچھ ہوئے اور محروم لوگوں کی اکثریت ہے کہ لوگوں کی اکثریت ہے۔ ان کے ان محبت خواب ہیں مگر وہ ایک بھی تعبیر نہیں پاسکتے ان کے ساتھ قدم قدم پر زیادتیاں ہوتی مگر وہ ایک کا بھی بدلہ نہیں لے سکتے چنانچہ وہ اپنے ہیرو کو سارے کامیاب انجام دیتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ لاشعور تسکین محسوس کرتے ہیں ہیرو کی شخصیت میں انہیں اپنی تشہیر عکس نظر آتا ہے۔"

"بالکل۔" کیا بات ہے۔ آپ بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔" اور یہ صرف ہماری ہی سوسائٹی کی کا نہیں۔ تھوڑی بہت کی پیشی کے ساتھ یہ تقریباً ہر سوسائٹی کی کا ہے۔ امریکا میں بھی فکروں کے بچے لکھنے والے ہیرو بہت مشہور ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ یہ کام لکھی اور گزشتہ کے جلا ہولناک قسم کی کموں اور دوسرے آؤڈیہ تھیماں سے آتا دیتے ہیں۔ بلکہ وہاں تو اگر ڈاکٹر کڑکڑاں پلے تو وہ ہیرو کے کدے ایک ہیرو تو پڑھ کر دے۔"

"ویسے بھی دراصل کمانی یا ظہر کے ہیرو کا تصور ہی کچھ ہے کہ لوگ اسے مار کاتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔" میں نے کہا۔ "وہ لاشعوری طور پر محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہیرو کی جگہ پر کمانی کا نقشہ ہیرو ذہن میں آتی ہے ایک ایسے آدمی کا تصور آتا ہے جو مسئلہ حل کر سکتا ہے، ہر مشکل پر قابو پاسکتا ہے، بہت کا جواب دے سکتا ہے اور ہیروئی جس کے آگے بچے پہلی ہے۔"

یکن سجدہ ادلوگ ان باتوں میں چین نہیں رکھتے انہیں
 وہ اپنے حقیقت کماں لٹم ہوئی ہے اور فسانہ کماں سے
 واقعہ "اتفاق ہوا۔
 جس میں ان کی خدمت کو کم ہے ان کے سرے کوئی چیز
 نہیں ہو سکتی۔" چاروہم ہوا۔
 سرماں ہمارے ادوار سے ہر جسم کی ہمیں جی ہا نہیں۔
 اتفاق سے کہ۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ خواہ کسی بھی طبقے
 ہر ماں میں وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک شاندار قسم
 کی بردار نہ کریں۔ دے تو خیر محض زیادہ دیتے تھے خیر کرنا
 کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ زیادہ
 کے ساتھ ساتھ اگر ذات سمیت اور بے پناہ گلن بھی شامل
 اہ آدمی بھی ہو گی۔ وہ قسم کھائے گا سو انہیں ہو گی۔"
 میں نے اسے طنزاً کو انہی خطوط پر چلا دیا ہوں چہ دہری
 "اتفاق ہوا۔ "اور اگر حالات اسی طرح حواقی اور سازگار
 جس طرح اس وقت ہیں تو اس سال کے آخر تک ہم کے لیے
 ہر ماں ہمیں ملے کر دیں گے چاروں ایک سو سرے سے
 خیر یہ خاصی اچھی کارکردگی ہو گی۔ ایک سال میں ایک سو
 سے ایک سو وائز کرنزی وائز کشن میں کے بعد دیگرے بڑے
 کی چار قسموں کا طریقہ ہو جائے امت اچھا آغاز ہے۔ جبکہ اگر
 ہماری مزید چار قسمیں بیٹ پر ہوں گی۔"
 "یہ تو اب تمہارا شب ہے جی۔ تم اچھا کروا برا۔ میں تو
 سے بے فکر ہوں۔" میں نے کہ۔ "قلینے اور خطبات پر تو
 ہمتی کر چکے اب اگر کام کے سلسلے میں کوئی مسئلہ روٹیں۔
 ہر سال اپنے سے مل ہو سکا ہے تو وہ مجھے بتاؤ۔"
 دیا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لئے توڑی دہر بعد وہ رخصت
 لے اس کے بعد غاصتہ کا دورانی لوگوں سے انتہائی خشک
 نہیں اور۔ "تمیں شوہر ہو گئی۔
 کہ اسی قسم کی جلی می مصروفیات میں تقریباً ایک ماہ گزرتا
 راجا میں تک نہیں ہو سکا مصروف لوگوں کے لیے وقت وا
 کا کرنا ہے۔ ہر ایک روز سناہ کا فون کیا۔ اس سے
 بل صرف فون پر ہی ٹھکھ ہوئی تھی۔ ملاقات کی نوعیت
 ہی تھی۔ مجھے توڑی بہت ذمہ دہر توئی تھی فون مصروف
 لی تھی۔ وہ بلانے کے لئے فون کرتی تھی تو اتفاق کے ایسا ہو
 لیں کہیں اور بار بار ہوتا تھا۔
 اپنے مخصوص کئے ٹھیکوں کے بعد وہ ہوتی۔ "تمیں تو شہر
 کی مصروف نہیں ہو گا کہ راجہ میں تمہارا ہو گی عمل ہو گیا ہے
 نسلو لکم کو اس کا اختتام ہے؟
 "نہ۔ مجھے واقعی معلوم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔
 صحت خیر لوگوں کو وصیت دے ہو وصل ہوتا شوہر
 لیا اور لوگ کہ معلوم ہی نہیں۔" وہ بے چینی سے ہوتی۔

”جیسے معلوم ہے میں جسٹس میں ہوں۔ تم از کم تمہارے سامنے نہیں ہوں۔ اور اس قسم کے معاملات میں نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے واقعی معلوم نہیں۔ اس اخبارات میں اشتہارات دیکھ رہا ہوں جن میں عتقرب شاہ اور افتخار کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے۔“

”بہر حال یہاں تو تمام سیر انٹارڈ کو دعوت نامے مل چکے ہیں۔ آتے جاتے کا فرسٹ کلاس کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ“ دی ٹیلی فنی یا ٹیکویری سوئٹ میں جب تک دل چاہے تب تک قیام اور خانے میں قیمت خانک کی دیکھش کی گئی ہے۔ بہت مدد یہ خرچ کر رہے ہو۔“ وہ بولی۔

”مجھے نہیں معلوم۔ شفیق شاہ کہا ہے۔ اور وہ کر رہا ہے تو پھر ٹھیک ہی کہا ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ یہ کہانے کے لیے پہلے مدد یہ خرچ تو کثرتی پڑتا ہے۔“

”تمہاری بے نیازی دیکھ کر بڑا دلچسپ آتا ہے۔“ وہ لفظی سانس لے کر بولی۔ ”وہیے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لوگ ان پیش کشوں کی وجہ سے نہیں جا رہے۔ بلکہ اس وجہ سے جا رہے ہیں کہ دعوت نامے تمہاری اور آفاق کی طرف سے ہیں۔ اور تم دونوں کے نام اب انٹرنی میں ایسے ہو گئے ہیں کہ ان کی طرف سے لینے والی دعوت کو کوئی رد کر ہی نہیں سکتا۔“

”چلو یہ تو ابھی خبر سنائی تم نے۔ اس کا مطلب ہے افتتاح کے موقع پر عہد والا خانہ خالی نہیں رہے گا۔“ میں نے کہا۔

”خانہ تو تمہارا صرف ایک ہی خالی رہے گا۔“ وہ بولی۔

”کوئی؟ اوپر والا؟“ میں نے کھڑکی پر پوچھا۔

”نہیں۔ خانہ دل۔“ وہ بولی۔

”پر دماغ میں تو مت۔ وہ خانہ دل میں تو ایسے ایسے حسین آباد ہیں کہ اگر دیکھ لوگی تو جل کر کباب ہو جاؤ گی۔ اور کباب بھی ایسا جس نے آپ اسٹیک نگار کی ہوگی۔“

”جن کے دلوں میں فدا حسین آباد ہوتے ہیں آخر میں انہی کے دل سب سے زیادہ دردناک جاتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”کیوں؟ پھر وہ۔ یہ تاؤ تم کب کراچی جا رہی ہو؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں تو تمہارے ساتھ جانا چاہتی تھی۔“ وہ بولی۔

”تم میرے پتھر میں مت رہنا۔ میرا کچھ پتا نہیں ہے۔ میں تو شاید انٹرویو سے سیدھا مین افتتاح کے وقت پر ہی ہوگی۔“

”پہنچیں۔ اسی لئے تو شفیق شاہ مجھے ہر روز کے پتھر گرام سے آگاہ نہیں کر رہا۔ میں نے ہی اسے منع کر رکھا ہے کہ اس تردد کی صورت نہیں۔ بس مجھے تو افتتاح سے صرف ایک تودہ دن پہلے اطلاع دے دی جائے۔ میں تو اسی طرح ہلکے ڈیس جاؤں گا۔ جبکہ تم فہم اشارے کے سہ رخے ہوتے ہیں۔ تم اپنے بھی لوگوں کی چین میں سے ہی کسی کے ساتھ پتھر گرام بنا لیتا۔ وہیں کراچی میں ہی ملاقات

ہو گی۔

”بھائیں جاؤ تم۔“ وہ مل کر بولے۔

”ملاقات کے لیے بھائیں کوئی مناسب جگہ تو نہیں ہے۔“
نے کہا۔ ”دوسری طرف سے سٹاپ دینے والی آواز سے اندازہ
اس نے ریسپرینخ ڈا تھا لیکن مجھے معلوم تھا یہ مصنوعی غصہ
میں مکرار کیا۔ ستارہ جیسے دوست واقعی خوش نصیبوں میں
آتے تھے۔

”کچھ دن بعد شفیع شاہ کا فون آیا۔ اس نے تمام ملازمین
بارے میں رپورٹ دی۔ تمام کاروباری معاملات ٹھیک ٹھاک
ہوئی کے سلسلے میں بھی معاملات ٹھیک ٹھاک جا رہے تھے۔

”آپ کا کیا پروگرام ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”میں بین الاقوامی کے دن ہی ہفتوں گا۔ فون کروں گا۔“
نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے سراجاڑی آپ کو لینے کے لیے موجود ہو گی۔
خوشامد از رپورٹ حاضر نہ ہو سکوں۔“ وہ بولا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے لیے
کیا مصروفیت کا دن ہو گا؟“ میں نے ملاغت سے کہا۔

○●○

کئی کئی شام جب میں کراچی انٹرپورٹ پر اتارنا تو موسم بے
خوشگوار تھا۔ میں لاہور سے چلا تو وہیں خشکی تھی لیکن کراچی
خوشگوار ہوا کے تیز جھونکوں میں ڈرا بھی خشکی نہیں تھی۔ انٹرپورٹ
پر سلیم بائی ایک آئس میٹینر مجھے ریسپرینخ کے لیے موجود
پارکنگ لائن میں ٹیلی مرینیٹر کے قریب دو مسلح گاڈز بھی ہوا
تھے۔ شاہ شفیع شاہ نے محض احتیاطاً بھیج دئے تھے۔

کئی سال پہلے میں پہلی بار اس انٹرپورٹ پر اتارنا تو ایسا
کی ایک مرینیٹر مجھے لینے آئی تھی۔ قرن صرف یہ تھا کہ وہ مرینیٹر
میری ملکیت نہیں تھی لیکن اس میں آنے والے لوگ مجھے
اپنے سے لگے تھے۔ اس وقت دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا اور ہر
سادہ و معصوم سے دل میں بھی اچھوتی محبت کی کرنیں سی پھیلی
تھیں۔ آج شام کا سرسختی انداز کراہ رہا تھا اور زندگی کی تازہ
ہنگامہ خیزوں، مسرتوں اور کامیابیوں کے باوجود دل کے کسی گوشہ
میں بے اس آمیز سی تاریکی پر پھیلائے بیٹھی تھی جو ہماری محظوظ
مجھے تھما کر رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ یادیں میرے رگ و پے میں اداسی کا
پھیلا تھیں، میں نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ سوچنے کے لیے
ہمت کی باتیں تھیں۔ ہوئی کے اقتراح کے علاوہ بھی بہت
کا دہاری مصروفیات میری بھر تھیں۔ شفیع شاہ نے بلاشبہ کراچی
میں کاروبار کو بہت پھیلا دیا تھا۔ بیشتر معاملات میں وہ بے پنا
بامصلحتی نوجوان تھا لیکن پھر بھی مجھے اس سے کاروبار کے میدان
میں اتنی اچھی کارکردگی کی امید نہیں تھی۔ میں اگر خود بھی کراچی
میں رہتا تو شاید اتنے کم وقت میں اتنی عمر کی سے کاروبار کو پھیلا

”ہاں جی۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔“ وہ غصہ سی سانس
لے کر بولی۔ ”تمہارے پاس فلم انڈسٹری کی صف اول کی ہیروئن کے
ساتھ سڑک کے کا وقت کہاں ہے۔ ہم تو اب تمہارے لیے کتتری
چڑھ چکے ہیں۔“

”بات کتتری اور برتری کی نہیں ہے بلکہ دم“ میں نے اسے
ڈانٹا۔ ”بات موقع محل کی ہے۔ میرا یہ پورا مینڈ بہت زیادہ
مصروفیت کا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر میں کسی پنڈم سے ہیرو کے ساتھ
جانے کا پروگرام بناتی ہوں۔ اسی کے سوئٹ میں ٹھہر جاؤں گی۔“
انہی دانت میں دئے مجھے چرانے کے لئے بولی۔ ”تمہیں کوئی اعتراض
تو نہیں ہو گا؟“

”ہرگز نہیں۔ مجھے تو بہت خوشی ہو گی۔“ میں نے بلا تامل
جواب دیا۔

وہ کچھ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”لیکن انڈسٹری میں
پنڈم ہیرو ہے ہی کون؟ جو مجھے سب سے زیادہ پسند تھا اور پنڈم
لگا تھا۔ وہ اب پچاس کی عمر کو پہنچ رہا ہے۔ ایک فلم میں اسے
میرے آبا جی کے دل میں کاسٹ کیا گیا ہے۔ وہ سراجاڑی تھوڑا
سا پسند ہے اس کی بیوی انہی خوشگوار ہے کہ اگر میں اس کے شوہر
کے ساتھ چلی گئی تو وہ اپنے شوہر کو جہن سے مار دے گی۔ تیرا بھی
مجھے تھوڑا سا پسند تھا لیکن اس کی تو پہلی ہی تین بیویاں ہیں لیکن اس
احسانی تین ہیرو ہیں انڈسٹری میں۔ تمہیں شگ دینی کا عالم ہے۔
انسان کسی کو سفر میں ساتھ بھی نہیں لے جاسکتا۔ اور یہ تو ابھی چار
قدم کے سفر کی بات ہو رہی ہے۔ زندگی کے سفر کی نہیں۔“

”جسے جسے۔۔۔ مجھے بھی ترس آ رہا ہے تم پر۔“ میں نے
کہا۔ ”بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے مشکل لے کر کشی چوک
میں کھڑی ہو اور صدارت کا رے ہو۔ ایک پنڈم سے ہیرو کا سال ہے
بچا، کیسی کیسی فکسب کی لڑکیوں کو کیا دن دیکھنا پڑتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ زیادہ ملاحظہ میں جلا ہونے کی ضرورت
نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”تمہیں کیا معلوم یہاں کیسے کیسے لوگ
صرف ایک نگاہ واقعات کے انتظار میں عمر گزارتے ہیں۔ یہ تو میں
ایسے ہی ذرا جس میں پانس پر چڑھانے کے لیے کبھی کبھی گری تھی۔“
”کیوں اس میں اس وقت تم اس عمارت کی تعمیر پیش کر رہی
ہو؟ تو دیکھتے ہیں۔ یہ عمارت بالکل ایسے ہی سو قیوں کے لئے تخلیق
ہو تھا۔“ میں نے کہا۔

”اچھے اس انجام پر تو عمارت بھی زار و قطار رہ رہا ہو گا۔“ وہ
بولے۔

”دراصل مجھے انکو بھی چھوٹی چیز سے اپنے آپ کو تشبیہ
رہا اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے کہا۔ ”مختص۔ تو طے پایا کہ تم سے
کراچی میں ہی ملاقات ہو گی۔“

گاڑی سے زکر پند لئے تک میں سر اٹھائے ہوتے اس عمارت کو دیکھا رہا۔ حتیٰ کہ میری آنکھیں تفکر کے آنسوؤں سے دھندلانے لگیں۔ بہت سے لوگ مجھے رہیو کرنے کے لیے آگے آچکے تھے۔ ان میں سب سے آگے شفیع شاہ تھا۔ جدید تراش خراش کے سوٹ میں وہ نہایت اسٹارٹ اور پنڈ کم لگا رہا تھا۔ ”سر اپنڈ آیا آپ کو اپنا ہوٹل؟“ اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ ”بہت پسند آیا۔ لیکن یہ میرا نہیں تم لوگوں کا ہوٹل ہے۔ میرے دوستوں، اساتذہ اور جاں نثانوں کا۔“

شفیع شاہ کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لان پر لے گیا اور مہمانوں سے ملوانے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں ہر شعبے زندگی کے اعلیٰ ترین طبقے کے لوگ موجود تھے۔ شہر پرئس کے لوگ تھے، سیاست دان تھے، سفارت کار تھے، پرنس، مینگیٹس تھے۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ دکنش چروں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ دکنش ہی بن تھے۔ حشرم تھتے تھے۔ خوشبودوں کا ایک سیلاب تھا۔

مہمانوں میں سے بہت سے ذاتی طور پر میرے شناسا تھے۔ بہت سے مجھے قایمانہ طور پر جانتے تھے اور بہت سوں کو میں قایمانہ طور پر جانتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو میں جانتے کا خواہشمند رہا تھا اور بہت سے مجھے جاننے کے مشتاق رہے تھے۔ مجھ سے ملنے کے بعد ان سب کا وہ عمل مشترک تھا۔ سب کو میری نوجوانی پر حیرت تھی۔ ان سب کے ذہنوں میں نہ جانے کیوں میری شخصیت کا تصور یہی تھا کہ میں اگر محروم پیدا نہیں ہوتا، کم از کم اوجیز محروم ضرور ہوں گا۔ کیونکہ سب کو معلوم تھا، میں کوئی خاندانی دولت مند نہیں تھا۔ اور اگر آدمی کو دولت میں دولت نہ ملے تو پھر ذریعوں دولت کمائے کمائے کافی محنت گزاری جاتی ہے۔

آخر کار وقت مقررہ سے ایک گھنٹا تاخیر کے ساتھ وزیر صنعت و تجارت بھی آئی گئے۔ اصل عمارت کے ارد گرد کی کھلی جگہ ساری کی ساری مہمانوں سے بھر گئی تھی۔ ان میں ستارہ بھی تھی۔ وہ ابھرتی ہوئی ایک ہیروئن کے ساتھ آئی تھی۔ دونوں میں اس خصوصی غامت و نزاکت کی کمی تھی جو اپنے درجے کی پڑوسی نکلیں تو یکدیگر میں دور سے نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود دونوں قیامت زحما رہی تھیں۔ ان کی شخصیت کی اپنی ایک الگ طرح کی کشش تھی۔ اس سے میری ملاقات مختصر اور رم کی رہی۔ ہم دونوں ہی کو بہت سے لوگوں سے ملنا پڑا تھا۔ بار بار مجھے بھی آہٹ نہ کہ لوگ گھیر لیتے تھے اور اسے بھی۔ تو زکر افزہ تو تھی لوگوں کی طرف زیادہ ہی متوجہ تھے۔

ایک مولانا نے نہایت خوش الحان انداز میں طواوت کی اور وزیر

پر تک میں سر جھکا کر ایک ہی دھن میں لگ جانے والا آدمی تھا۔ میں غفلت میں بھی جاتا تھا، گپ شپ بھی کرتا تھا، تھوڑی جاتی تقریبات میں بھی جاتا تھا۔ ہر رخوں سے رسم روا بھی تھی۔ اور اگر کسی کام سے دل اُٹھتا ہو جاتا تھا تو میں اسے وہی دیتا تھا۔ لیکن شفیع شاہ میں یہ خصوصیات بہت ہی کم تھیں۔ تو کسی کام کو پکڑنا تھا تو اسے جن کی طرح چبنا تھا۔ گاڑی نے بہت تیز رفتار سے فاصلہ طے کیا اور آخر کار پندرہ سالہ عمارت کے سامنے جا کر ایک جو رنگ برنگی دھندلیوں سے ڈھائی تھی۔ ایک چوڑی چمکی مصروف شاہراہ کے کنارے دو تھی۔ عمارت گویا غوث سے سر اٹھائے کھڑی تھی اور اس کے سر پر پین لینڈ ہوٹل کا ایک بہت بڑا نئون سائن آج کی طرح جھلکا رہا۔

ہوٹل کی یہ خوبصورت اور پُر شکوہ عمارت گویا راتوں رات ہی ان کے سینے سے سر اٹھ کر میرے سامنے آگئی تھی۔ کم از کم مجھے احساس ہو رہا تھا۔ درحقیقت میں اسی احساس سے لذت اندوز ہونے کے لیے میں اس کے افتتاح کے موقع پر آنا چاہتا تھا۔ میں ہائی فیر کے دوران بھی اسے دیکھنے نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے اپنا بڑا جبر اور مضار رکھتے ہوئے اسے دیکھنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ اسے بالکل اسی طرح مکمل حالت میں سجا سجا کر دیکھا جاتا تھا۔ یہی میرے خوبصورت خوابوں میں سے ایک خواب تھا۔ میں نے قضا کی مکمل حالت میں دیکھا نہیں جاتا تھا۔

یہ میرا ہوٹل تھا۔ اس احساس کی لذت ہی عجیب تھی۔ اس کا مکمل کچھ اسی طرح ہوئی تھی جیسے کسی مصور نے بے خبری اور شور کی کے علم میں کوئی شاہکار تخلیق کر ڈالا ہو اور مجمع طور پر راز ہونے کے بعد جب وہ تصویر اس کے ہاتھوں میں کھمبائی تھی اور اسے یقین نہ آتا ہو کہ وہ شاہکار اسی سے سرزد ہوا ہے۔

ذرا دیر سے اور بارنگ لائٹ میں جم جم کرتی پیش قیمت کڑیاں لڑی تھیں اور آدمی تھیں۔ بہنو زار پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ لے کر مرکزی دروازے کے آگے پاس بھی کھڑے تھے جو گہرے رنگ کے شیشے کی ایک اونچی سی دیوار سی مشابہ تھا۔ دروازے کے سامنے سڑک کا ایک خوبصورت فیسٹ ہاؤس تھا۔ یہ محض رسم نبھانے کے لیے تھا۔ ورنہ مجھے معلوم تھا کہ عملی طور پر تو ہوٹل کا افتتاح دینا تھا۔ دوسرے شعبوں سے آئے ہوئے اہم مہمانوں کو حسبِ راتب کمرہوں میں ٹھہرایا جانا تھا۔ ہوٹل کے تمام کچن مصروف تھے تمام اشیاء مصروف تھا۔ عمارت کا ہر طرح کا پیشینی نظام کام لگ رہا تھا۔ آمد رفت دوسرے دو دروازوں سے جاری تھی۔ صرف حمایت پسندی کرنے کے لیے مرکزی دروازے پر فیسٹ کٹنا باقی تھا۔ جس کے لیے مرکزی وزیر صنعت و تجارت کو آنا تھا۔ دروازے سے ملے کر سڑک تک سبز قالین بچھا ہوا تھا۔ اخباری فوٹو گرافر اور محررین منڈلا رہے تھے۔

صاحب نے غصہ کی دھجی قعر کے بعد فخر کاٹ دیا۔ ہر گل کے
دورانے مسافروں کے لئے کھل دئے تھے جسے جبر مسلمان طویل و
عوض لالہ میں پہنچا دیکر وہ کہہ رہے تھے کہ یہ گلی خواتین
کی تو بچیوں ہی کھل گئی۔ لیکن ایک لمبے بعد سب کو احساس ہوا کہ
کھلی کے حکام نے میں موقع پر قیامت نہیں ڈھائی تھی بلکہ انہیں
تھوڑا سا سر باز دینے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔

فدائی لابی میں وہ میسج بھیجی کہ تم نے کسی شخص کو فدایت پہنچا کر دیا ہے۔ یہ تو تمہاری جہاد تھی۔ پھر کلاؤنز کے سامنے اگلے ایمر سے ملے۔ یہی نہ جانے کس سے ایک جہاد سائنس دان سے دیر سے نمودار ہوا۔ اس پر رگبار کی اپنا ناقص کچھ اس طرح تیزی سے حرکت کر رہی تھی کہ قرض کا سامان از بین گیا تھا۔ یہ صرف وہ شیوں کا قرض تھا۔

جین پھر جیسے ہر مدد خفی ایک خوبصورت لڑکی کا روپ دھارنے لگی۔ اندھیرے کی ککھ سے نہ جانے کس طرف سے ایک ایک لڑکی نمودار ہو کر ہر رنگ کی مدد خفی کے دائرے میں چھٹی چھٹی اور مدد خفی ہی کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگی تھیں۔ وہ دس یا پانچ لڑکیاں تھیں اور نجات ہی ان کے اور اچھڑے انداز میں دھس کر دی تھیں۔ وہ مدد خفی اور فرسہ قسم کار خفی نہیں تھا۔ ان کے لباس بھی ایک دھڑلے سے علق اور ان کے قسم کے تھے۔ وہ خفی نہیں کر دی تھیں گویا سوستی کے دھبے ٹھوں کے ساتھ دھڑلے سے ہوا میں بکھڑے لے رہی تھیں۔ اور ان کے ہوت ڈانک انداز میں بل مپ تھے۔ انہیں نہ ہوا تھیں۔

لوہنیوں سے بہت سی خوبصورت آثارِ دِیاجا چکے۔ کبھی ایسا
 سنو سیڑیاں ایک دوسرے کے منہ پر لگی ہیں اور کبھی
 دیا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوہی لگی ہوئی ہیں۔

رخص اور سوستی جو کہ پرانی تو لوگوں کو اماندہ ہوا کہ وہ
 ایک غیر دینی قسم کا دلچسپ ڈانس تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں راکہ
 ننگ قسم کے پھولوں کے پار تھے۔ جو ان کے گلے چاہوں کے ساتھ
 لارہے تھے۔ لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ جو لوگ مالی میں داخل
 میں ہو سکے تھے وہ بیٹھے کی دیوہ اصل کے پار سے اسی طرح بیسوت
 سے ہو کر یہ دلچسپ ڈانس دیکھنا ہے تھے۔ اب میں نے رخص کرنے
 کی جگہ خیر کوئی کوچاں لیا تھا۔ وہ لک کی ٹاپ کی باؤٹھ تھیں۔

اپنی سوسائٹی کے اس دواغ کو دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا
 احساس ہوا تھا کہ کوئی ایسا مسلمان تقویات میں حارے ہیں پہلے
 اوت کی بات کی اور اس کے بعد فرض ہو سکتا یا اسی قسم کے
 سرے پہلے شہر ہو جاتے تھے یعنی ہم ان چیزوں کا تقاضا بھی
 دے کے نام سے کہتے تھے جنہیں اللہ نے منوعات قرار دے
 یا حلال قرار دیا ہے ایک دواغ تھا اور میں بھی دواغ کے اس
 سلسلے میں ایک تھا تھا۔

رقص تماطویل قاضی میراخی

کو بھی وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا آخر کار سو سستی نہ رہ
گی۔ اچانک لائنوں دو جہتی چلتے چلتے غائب ہونے لگیں اور
کے ساتھ ساتھ لڑکیوں بھی ایک ایک کر کے غائب ہونے لگیں
حتیٰ کہ اندر جہاز بھلا کون سا بیج بھی دھیرے دھیرے ایک طرف کرا
ہوا غائب ہو گیا۔

یکدم چاروں طرف پیلے سی کی طرح تیز و شیاں بکریں اور لوگوں کی آنکھیں چڑھایا گئیں۔ اب سامنے کچھ بھی نہیں صرف مختلف قسم کے گاؤں نظر آتے تھے۔ تب لوگوں کو آہلیاں بیل خیال آیا اور وہ دیر تک آہلیاں بجاتے ہی چلے گئے۔ میں بھی شلوک کے انتظامات کی بدولت غریب نہ رہا۔

اس کے بعد خط کشیں کی ڈیاں مساموں کو عطف سے دکھا گئیں۔ پورے ہوئی میں گھما گئی ہو گی۔ کچھ لوگ سو رنگ دیکھ کر مہے تھے تو کچھ جھکوت ہاں کا جائزہ لے رہے تھے۔ تو تو ہم دیکھ رہے تھے تو کچھ عطف حوٹوں پر عطف ہاں رہا رہا رہے تھے کچھ لوگ ہوئی کی فرخنگ اور آوازیں دینے کی تحقیر کی غصوں سے جائزہ لے رہے تھے انہیں ہوئی میں نہ جانے کوالی سواریات سے فیکو کے اوسے میں بتایا جاتا تھا۔

معاذ حق کہ بہت زیادہ تھے اس لئے جو محل میں ہمارے
ملائے ہوئے ملک پہلے پر بھی گمانے کا انتظام تھا۔ گمانے کے
وقت تو دسم میں ایک دروائی پود گرام بھی تھا جو سامی رات چڑ
ہی میں خاص خاص مہمانوں کو محتاج بھی دے جاتے تھے
کنچ پر چٹنی کھے جاتے والے بعض آئینے میں انھیں بھی شریک
تھا۔ تھا۔ اس سوتے پر مہمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے آ
تشلی خرمہورت اور ختمیم سو نیز بھی چھاپا گیا تھا جس میں
کے بارے میں ہر تحصیل اور علقہ حصول کی خوبصورت تصویر
کی مثال تھی۔ فوجی شہدائے بے شمار کہیں اور ادا
کاتر میں یہ سو نیز زبردہ ڈاک بکھرانے کا بھی بندوبست کیا
س کی ذیاتی تمام خصوصیات سن کر مجھے اطمینان ہوا تھا کہ
میں ہرگز اس مطلوبہ جگہ میں جو محل کا قیام کرانے میں حق
میں ہرگز ہرگز ہرگز

اسی دوران میں نے ایک دھڑے پتے کو خوب صورت نوجوان
دیکھا۔ وہ صحت میں تھا۔ پر لگاتے ہوئے تھا اس کے کہ
نے کا رہا ہو کسی کی انتظام کا خصوصیت لگا ہوا تھا۔ بھی
پیس کی تنگ فخر آئی اور بھی وہ کہیں اور دکھائی دیتا
تھا۔ مگر بڑی میں سمجھوں کہ ہو کسی کے بارے میں کچھ بتانے کا
میں اس کی رہنمائی کرتے۔ بھی جا کر شیفت کو ہدایات دینے کا
میں ہنر کو احکامات سن رہا۔

مجھے ابھی تک پوری طرح اس کی عقل نظر نہیں آتی تھی۔
 اس حد تک بھی لوحِ لوح سے تک نظر آ رہی تھی اس سے
 بے شمار لگ رہا تھا۔ پھر جب دُور شہر اور ایک سرے پر

کا سامنا ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بالکل سامنے
ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے تھے۔
راشد تھا۔ میں نے جب آخری بار اسے دیکھا تھا تو اس کی
ایک سی جیسی اور میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے
ماچھو ہاتھ لیکن ہر حال اب ایک وجہ سے نوجوان تھا۔
میں ہی ہے وہ سچیدھار کا تھا لیکن اب تو اس کے چہرے پر
بہت سی گرمی ہو گئی تھی۔ جیسے اسے اپنی عمر سے کچھ زیادہ
بوجھ اٹھانا پڑ گیا ہو۔

میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے کالر پر گئی
چاہے گی اور میں نے نہایت آہستگی سے پوچھا "راشد! تم
یا کر رہے ہو؟"
"ہی۔۔۔" وہ جیسے چونک کر خیالات کی دھڑ سے باہر آیا۔
پہلی پرسل نیچر ہوں افضل بھائی! پھر ایک لمحے کے وقف
پھر "تپ بیٹیا میں دو دو ہوں گے میرے ہاتھ کوئی
نہ ہو تو حکم فرمائیے۔ سویت میں یہاں مسافروں کی
تپ رہا ہوں۔"

"مشر راشد۔۔۔! اپنا کئی میرے قریب سے ہی غم
نہ اور تنگ لیجے میں ہوا۔" یہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ ہندی
پتھ کپیز کے شینگہ ڈانڈ کٹر۔۔۔ طارے تمام کاٹ دیے
دو اس ہوئی کے مالک۔۔۔ طارے اس افضل چودری
میں نے مڑ کر دیکھا۔۔۔ شیعہ شاد تھا وہ راشد کو میرے بارے
بہا تھا۔۔۔ اوروں کو ایسا ہی تھا جیسے اسے خیوا کر دیا ہو کہ میں
خود میں کوئی گستاخی نہ کرتا۔۔۔ انجانے میں کوئی غلطی نہ
تھی۔

پھر وہ میری طرف دیکھ کر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ہوا۔
"آپ اس نوجوان کی کم عمری پر نہ جائیے۔ گہرے مت چننی اور
ایت نوجوان ہے میں نے اس کا طبعی اور ظاہری میں مسر
کر اسے دیکھا ہے۔ اس عرصے کے اڑتالیس امیدواروں میں
اس کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے خواہے ہوئے وہ دن صرف
کے ذاتی طور پر امیدواروں کے اعتماد پر گئے تھے۔" وہ گواٹھے
جہاں وہ نے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے انتخاب کی طرف
نہ کی بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔

"تم نے مت اچھا کیا جو ان کا انتخاب کر لیا شیعہ۔ میں نے
ٹاکا کو دیکھا ہے۔" وہ "کما" ہمارا انتخاب ہر معاملے میں ہے
لہذا آپ اب تم دوسرے مسافروں کی طرف توجہ دو اور مجھے
پتہ ہوئی کے پرسل نیچر سے کچھ پرسل ہی باغی کرنے لگا۔
شیعہ شاد کے چہرے پر طمانیت کی مسکراہٹ آگئی اور وہ آگے
ہو گیا۔ میں اور راشد ایک ایک ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
انہوں کی آنکھوں میں ان گنت سوال تھے۔ میری آنکھوں میں
ایک لمحے کے لیے دو دو شب کی یادیں کا دھواں بھی تھا اور ناخام

مشرق کی برکت بھی۔
یہاں تو اس نے سکوت توڑا۔ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ
ہوا۔ "زمین کے اس موڑ پر بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی
افضل بھائی! آپ واقعی تو کوئی کویران کوہ پتہ کی مٹا جیٹوں سے
بھاگ رہے ہیں۔ تپ نے جیت اگلی ترقی کی بہت سی دل خوش ہوا
بہ سب کچھ جان کہ مجھے یہاں تو کوئی شہر ہے۔ وہاں ہر کچھ
ہیں۔ بعض مکانوں میں مجھے اپنے شہر کا خاص خوشی غلوں دینے کا
انتقال ہوا جو لاہور سے "ہیڈ آفس" سے آئے تھے۔ ان میں سے
بعض پر ایم اے چودری کے خطا ہوتے تھے۔ لیکن میں نے سچا
بھی نہیں غما کر ایم اے چودری۔۔۔ اور افضل چودری تپ ہیں
کے۔"

"پلو۔۔۔ یہ تو ہوا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مگر یہ
تو یاد کہ تم یہاں تو کوئی کرنے کیسے چلے آئے؟ تم اچھے بھلے دولت

پروفیسر ایم اشرف ایم۔ اے

50/-	شاہ فاروق حاکم مصر
50/-	شاہ فیصل شہید
90/-	ہٹلر کی حیات معاشرہ
75/-	ہٹلر کے آخری دس دن
75/-	ہٹلر اور نازی جرمنی
90/-	سکندر اعظم
75/-	نپولین بونا پارٹ
	رومانی شاعر لارڈ بائرن
60/-	کی حیات معاشرہ
	ہمارا اجر و نجات سنگھ
75/-	اور ان کی عیاشیاں
100/-	ہر دور ہٹلر کی کہانی

ہوا "آپ جن دنوں ہمارے گھر آئے تھے آپ نے دیکھا
ان دنوں بھی وہ مستقل بیمار رہتی تھیں۔ راجہ کی شادی کے
بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔"

ایک تو یہ اطلاع افسوس ناک تھی۔ دوسرے یہ ہمارا
سن کر دل پر پیسے بر بھی سی گئی تھی۔ راشد سے سامنا ہونے
سے وہی چوبارہ بارہن کی لہجہ پر ابھر رہا تھا جسے میں سب سے
ذہن کے تاریک ناناں خانوں میں دخیل رکھا تھا۔ فوجیوں کی کار
ٹاکسوں پر ہی دل خراش ہوتی ہیں خصوصاً صحت کی ٹاکسیاں۔
اپنے خوابیدہ زخموں کو کھڑپنا نہیں چاہتا تھا لیکن اب یہ با
سامنے ہی آیا تھا۔ اب اور نہ جانے کیا کچھ سامنے آتا تھا۔

میں زبان سے اظہارِ افسوس نہ کر سکا۔ آسٹ شاپر
چہرے پر لکھا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راشد سلا
جوزے ہوئے ہوا "مئی دنیا سے تمہیں تو گویا اپنا تقدیر بھی ساتھ
گئیں۔ ویسے تو پوری پینٹاگل اینڈ سٹری میجران کا فکار تھی
ڈیڈی کو تو کچھ زیادہ سی شکلات نے آن گھرا۔ انہوں نے کہ
یکے بعد دیگرے کئی بڑے کاروباروں میں ہاتھ والا لیکن ہر ایک
اس بری طرح ٹاکسی کا سامنا کرنا پڑا کہ تقریباً ساری پر اپنی
گردی رہ گئی تھی۔"

مجھے شاید سمان زیادہ ہونے کے باعث ہل میں محو
محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے میں نے راشد کی بات کا
ہونے کہا "آؤ باہر چلے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ چل تو پڑا لیکن نہایت سنجیدگی سے ہوا
میں آپ کے حکم کی قیل میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس سے
لازمت پر حرف نہیں آتا چاہئے یہ ملازمت مجھے بڑی محنت
ملی ہے۔ میں اسے کھوٹا نہیں چاہتا۔ ابھی ملازمتیں آج کل
سے نہیں آتیں۔"

"یہ جو تم نے ملازمت ملازمت کی رٹ لگا رکھی ہے۔
مجھے اپنے ہوٹل کی ریجمنٹیشن کا خیال نہ ہوا تو کھوٹا مار کر تھار
رانت باہر نکال دتا۔ ویسے میں اس خیال سے بھی اپنے آپ
روکے ہوئے ہوں کہ مجھے پوری بات سنی ہے۔ میرا کھوٹا کما
کے بعد تم جیسادھان پان اور تمہیں ذوالح کی دن تک بات کر
کے قاتل نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔ وہ فحش دیا۔ شاید گئی دن
ہذا تھا کہ فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا "جیسے کوئی قطعی سرزد ہوئی ہو۔"

ہم باہر سوٹنگ پول کے کنارے آن کھڑے ہوئے
سوٹنگ پول کے کنارے بھی سمانوں کے لئے کھائے کا انتظام
اور وہاں بھی بیچرہ بھاڑ تھی۔ لیکن وہاں محض ہمیں تھی اور
ایک نینتار سکون کوٹ بھی میسر آ گیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد راشد ہوا "ڈیڈی ایک جیسے
کے مریض بن کر رہ گئے تھے۔ نہ جانے کون کون سی بیماریاں
لاحق ہو گئی تھیں۔ ہر وقت ان پر جھنجھلاہٹ سوار رہتی تھی۔"

مند اور صنعت کار باپ کے بیٹے ہوئے۔ تم خود بہت سوں کو پرسل
نمبر رکھ سکتے۔ جیسے تمہیں نوکری کی کیا ضرورت آن پڑی؟ مگر سے
باراض ہو کر ننگے ہوئے ہو گیا آجکل؟"

"جی نہیں۔" وہ افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہوا۔ "میں
کسی سے کیا ناراض ہوں گے۔ تم سے تو ایک مدت ہوئی تقدیری
باراض ہو چکی ہے۔ جیسے انتظامات آپ کی طرف آئے ہیں انہیں
ہی ہماری طرف بھی آئے ہیں۔ فرق صرف نوعیت کا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔
"آپ نیچے سے اوپر آئے۔ ہم اوپر سے نیچے چلے گئے۔ دنیا
اسی کا نام ہے۔"

"لیکن پھر بھی کیسے؟ کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ سہی۔" میں شاید
دوری سے بے گامی کا اظہار کرتا تھا لیکن اس وقت میں اپنے لیے کی
بے گامی پر قابو نہ رکھ سکا۔

"یہ کبھی باتوں کا سوچ نہیں۔" وہ اور کرداروں کے جھوم پر
ایک بے چین سی نظر ڈالتے ہوئے ہوا۔ "میں آپ کا لازم ہوں
اور آج خاص طور پر میری بڑی ذمہ داریاں ہیں۔"

"بھائو میں گئی نوکری۔ اور تمہاری یہ فرض شناسی۔" میں
نے تیزی سے کہا۔ "میں جو چہ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"تمک کچھ سہرا میں آپ کو جواب دو ہوں۔ آپ کی برات کا
جواب دتا میرے فرائض میں شامل ہے۔ آپ میرے ہراس کے
باس ہیں۔ جب باس۔ اس لئے۔"

"یہ تم طر کر رہے ہو یا حالات نے واقعی اتنا فرائض بڑا بنا دیا
ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"آپ پر بھڑکنے کی تو مجھ میں پہلے بھی کبھی جرأت نہیں تھی۔
آپ میرے محسن ہیں۔ اور اب تو میں طر و فیو کرنے کے بارے
میں بھی سوچ نہیں سکتا۔ اب ضرورت حال بہت سی تنگ ہے۔"
وہ کمری سنجیدگی سے ہوا۔

اس کی نگاہیں ہمت میں توڑیاں خانوں میں الجھ گئیں۔
ایک لمحے وہ بالکل خاموش رہا "جیسے اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ
لفظوں کی زور کا سرا کمال تلاش کرے۔ آخر کار وہ نظر بھٹکاتے
ہوئے ہوا "آپ کو شاید یہ اندازہ تو ہمارے گھر میں قیام کے دوران
ہی ہو گیا ہو گا کہ ڈیڈی جو کچھ بھی بنے تھے مئی کے پیسے سے ہی بنے
تھے۔ ڈیڈی خود خاندانی طور پر خوشحال تو ہی نہیں تھے۔ مئی ہی اس
خاندان میں دورے کی دولت لے کر آئی تھیں۔ میں اب ہمدرد پر
یقین رکھنے لگا ہوں۔ ہر فرد کا یقین کوئی ہمدرد ضرور ہونا ہے۔ اسی
یقین خوش بخت تھیں۔ جب تک ذمہ داریں ڈیڈی کو کوئی بڑا
تھکان نہیں پہنچا۔"

"تو کیا اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں؟" میں نے اس کی بات
کاٹنے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ لہجے میں سرہلا تے ہوئے لہجہ سی سانس لے کر

پوری بلڈنگ گرگہ رت کے گھونڈے کی طرح جھنجھی۔ ایک انجینئر ذرا سی غلطی سے ایک پارے ہوئے سلاہ جنگ کا آخری جہاز بھی ڈوب گیا۔ دسویں مزدور مر گیا۔ بیسیوں زخمی اور معذور ہو گئے۔ ڈیڑی کے۔۔۔ اور کھیتی کے نہ جانے کتنے لوگوں کے وارنٹ نکل گئے۔ ڈیڑی کو پارٹ انک ہو گیا۔۔۔ اور یوں سودو زیاں کی ایک کہانی ختم ہو گئی۔

”اوہ۔۔۔ یعنی زاپہ انکل بھی۔۔۔!“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ زاپہ انکل کی شبیہ میری آنکھوں میں محو م گئی۔ کیسے جیڑ سم تری تھی!

راشد خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا۔ ارد گرد خاصا شور شرابا تھا لیکن میرے اندر ایک لمحے کے لئے گہرائیاں اٹھ چکی۔ راشد بہت دھیمی آواز میں بولا ”وہ تو اچھا ہوا میں نے ڈیڑی کے زوال کے آخری دنوں میں یونہی نہ جانے کیوں۔۔۔ شاید کسی لاشعوری احتیاط کے تحت امریکا جا کر ہوئی جھجست کا ایک کورس کر لیا تھا جو یہ نوکری حاصل کرنے کے سلسلے میں میرے کام آگیا۔ ورنہ ڈیڑی کے جانے والے صنعت کاروں کے ہاں تو شاید مجھے کلر کی بھی نہ ملتی۔ وہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ امیر زادوں سے نوکری نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے کاروبار میں تواضع محنت کر سکتے ہیں لیکن دوسرے کی نوکری میں محنت نہیں کر سکتے۔“ وہ خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرا دیا ”آپ بھی اسی نظریے کے قائل ہو کر مجھے نوکری سے مت نکال دیجئے گا۔“

”تو کراس مت کرو“ میں نے دھیمی آواز میں اسے ڈانٹا۔ ایک سوال دہرے سے میری زبان پر پھل رہا تھا۔ جب وہ ہونٹوں تک قیام تو میری دھڑکنیں قدرے تیز ہو گئیں۔ ”راجیلہ کن کل کہیں ہے؟ کہیں ہے؟“

”اس کی زندگی پر تو جی کے سائے ڈیڑی کے زوال سے پہلے ہی پڑنا شروع ہو گئے تھے“ وہ ہاتھ ملنے ہوئے بولا ”دولت کی ہوس مجیب جڑ ہے۔ یہ ہوس آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کیوں کر انسان کو ایسا دیوانہ بنا دیتی ہے۔ راجیلہ کے شوہر جمیل کا خاندان، آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ لکھنؤ کا خاندان تھا۔ لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد ہی راجیلہ کو اور ہمیں احساس ہوا کہ انہوں نے مزید دولت کے لالچ میں ہم سے رشتہ جڑا تھا۔ شادی پر بھی ہم سے جو ہو سکا تھا، لیا تھا لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد جمیل کی بڑی بڑی فراخ نشیں شوہر ہو گئی تھیں۔ اس وقت تک تو ڈیڑی کا باقاعدہ زوال بھی شروع نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس کی کوئی فراخ نشیں پوری بھی کیس لیکن اس کے بعد ایک توہ خود انجمنوں میں بیٹھے رہنے لگے۔ دوسرے خود راجیلہ کو یہ سلسلہ بہت برا محسوس ہونے لگا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی محبت اس کی شخصیت اور اس کے غلوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سارا سلسلہ

واقعہ نقصان کو انہوں نے اپنی مدح پر مسلط کر لیا تھا۔ زیادہ غرت انہیں اس بات سے تھی کہ کبھی کبھار کوئی بے سے یہ تاثر دے گا کہ ان کی مرحوم بیوی بڑی فنی۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید لوگ انہیں احساس دلانے کی روپے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی تھے بیوی کے مقصدوں کی وجہ اور خود ان میں ذاتی طور پر کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ سارا کر دینے والا کیلیکس تھا۔“

نان کی سوچیں ابھی عجیب گورو کہ دھندلاہوئی ہیں“ میں نے بے کلام۔

نہ ہوئی کی جھگڑائی غارت پر ایک نگر ڈال کر بولا ”میں اعراض کی کوئی فہرست بنائیں تو اس میں کاروبار کا نام دن گا۔ کاروباری لوگوں کے لئے کاروبار بھی بڑا منگ ہے۔ سیاست اور اقتدار کی طرح یہ بھی شیر کی سواہی کے ہے۔ جب تک آپ اس پر سوار رہتے ہیں اور یہ سیدھا ہے تب تک ہی آپ ٹھیک رہتے ہیں۔ جو نی ہے آپ کے باہر ہوتا ہے، فوراً آپ کے سینے پر سوار ہو جاتا ہے۔ آپ دماغ کو مایوس کر دیتا ہے۔ حواس کو جڑے جھاڑ ڈالتا ہے اور کوچا جاتا ہے۔ شمع و نقصان کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لینے ہرے خیال میں بڑے گماتے میں رہتے ہیں۔ وہ بہت کچھ ہوتے بھی زندگی کی کسی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔“

انوجانی اور نا تجربے کاری کے دور میں بھی بڑے پتے کی بات تھا۔ مجھے اس نظریے کا قائل ہونا پڑا کہ تجرہ اور عقل و فکر محتاج نہیں ہوتی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اے انا سب کچھ جان کر“ اور دوسرے ایک ایک پائی کے اپنی دانست میں ایک آخری داؤ کے طور پر اسی سوک پر آپ کا یہ ہوئی قبر ہوا ہے۔۔۔۔۔ یہاں سے ڈیڑہ دو میل لے کر ایک میں خزلہ کر شل بلڈنگ تعمیر کرنی شروع کی۔ اس شہر لیا تھا“ سرائیہ ڈیڑی کا تھا۔ انہوں نے کوئی بلنگ نہیں بنی کہیں سے لون نہیں ملا۔ حالانکہ وہ ایک بے پناہ متابع و بیکٹ نظر آ رہا تھا لیکن ان کی ساتھ خراب ہو چکی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے بلنگ کے ذریعے یانوں کی۔ میں کوئی عدا نہیں لی ورنہ شاید انہیں اور بڑھ جاتیں۔“

”اے انا سب کچھ جان کر“ اور دوسرے ایک ایک پائی کے اپنی دانست میں ایک آخری داؤ کے طور پر اسی سوک پر آپ کا یہ ہوئی قبر ہوا ہے۔۔۔۔۔ یہاں سے ڈیڑہ دو میل لے کر ایک میں خزلہ کر شل بلڈنگ تعمیر کرنی شروع کی۔ اس شہر لیا تھا“ سرائیہ ڈیڑی کا تھا۔ انہوں نے کوئی بلنگ نہیں بنی کہیں سے لون نہیں ملا۔ حالانکہ وہ ایک بے پناہ متابع و بیکٹ نظر آ رہا تھا لیکن ان کی ساتھ خراب ہو چکی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے بلنگ کے ذریعے یانوں کی۔ میں کوئی عدا نہیں لی ورنہ شاید انہیں اور بڑھ جاتیں۔“

گز رہا ہو رہی ہے۔ توئی مطمئن نہ رہتا ہے تو کسی بھی طرح
مطمئن نہیں رہ سکتا۔ لیکن ہم دونوں بہن بھائیوں نے یہ
مطمئن رہنا سیکھ لیا ہے۔

ایک طویل لمحے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ آخر
نے دھڑکتے دل سے کہا۔ "راشد! مجھے اپنا ایڈریس دے۔
راہیل سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ابھی۔۔۔ اسی وقت؟" اس نے قدرے حیرت
پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اسی وقت۔" میں نے جواب دیا۔
"لیکن۔۔۔ یہاں آپ کی ایک اہم تقریب جاری ہے
وہ گروڈیش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میری نظر میں اب یہ کوئی خاص اہم نہیں رہی۔" میں
کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے جیب سے اپنا وزنگ
نکل کر مجھے دیا جس پر اس کے قہقہے کا پتہ بھی روشن تھا۔ سا
بولا "میں نہیں کہہ سکتا کہ راہیل سے آپ کی ملاقات نہ
رہے گی یا نہیں۔ بہر حال اگر اس کا رویہ آپ کے ساتھ ملد
ہو تو اس کی میں جتنی محذرت چاہتا ہوں۔ وہ سرکاری ٹرکی
میں اس کے معاملات میں بھی دخل نہیں دے سکتا اور اہم
محادثات میں بھی۔ ہم سب اپنے اپنے معاملات میں خود مختار
میں دوسروں کے جیسے کی محذرت ضرور کرتا ہوں لیکن وہ
زندگی میں دخل نہیں دیتا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں دیتا
تک میری زندگی اس سے متاثر نہ ہونے لگے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے وہاں سے ا
لیا۔ میں نے شعیب شاہ سے اس مرشد کی چابیاں لیں جو اب
میرے لئے ان پورٹ بھیجی تھی۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ میں
جا رہا ہوں لیکن میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا
نے کوئی توئی بھی اپنے ساتھ نہیں لیا اور کانٹنن دوانہ ہو گیا۔
اس چھٹی سی عمارت میں واقع اس پوٹھی حلقے کے قہ
ہنچا زرا دشوار ثابت ہوا لیکن جب حلقے میں طلب کا شعلہ نہ
تو سودا کی حلق تک پہنچی جاتے ہیں۔ میں بھی اس کے درم
ی گیا جس نے کئی برس پہلے کا سٹول کو ٹھوکر ماری تھی اور
آگے سرخوں کا برہمچل اسی کے قدموں کی پھول ہو گیا تھا۔
میں نے کال تھل کاٹن دیا۔ اندر کس کھنٹی پوں کھٹکا
جیسے برسوں کے سکوت کے بعد کسی نے آواز دہن کے کھنڈر
رکھا ہو اور کسی ٹھکر مد کی تقریباً کل ٹھک دھن ہو!

میری اور حزن کنیں شاد وادری تیز ہوتی تھیں لیکن اس
پینے میں دل ہی طرح دھڑک رہا تھا۔ بے بے بے بے سا
صدا۔

بہن یوں کہنے کے صرف لیمن ہی لیمن کا تھا۔
اسے راہیل نے صریحاً اپنی توہین محسوس کیا۔ اس نے ڈیڈی کو سختی
سے منع کر دیا کہ وہ جھیل کی کوئی خواہش پوری نہ کریں۔ اس کے
بعد ہی ہم پر ہفتہ نکلا کہ وہ کتا یا بڑھا ہوا تھا۔ اس نے محسوس
لوگوں کو پھانسنے کی حد تک اپنے اوپر ترقیب و شائستگی کا خول چڑھا
ہوا تھا۔ راہیل سے اس کا رویہ تو شادی کے چند دن بعد ہی بدل گیا
تھا۔ اس کا اصل روپ سامنے آنے لگا تھا جو بے حد مکروہ تھا۔
لیکن جب اس کی بڑی بڑی قرآنیں پوری کرنے کا سلسلہ بند ہوا
تب تو اس نے راہیل کو باقاعدہ اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ شرابی
عجائیب اور بد اطوار وہ پہلے ہی تھا اس کے بعد تو اس نے بہت ہی
پچھلے پچھلے کے جاہلوں کی طرح راہیل کو مارا جینا بھی شروع کر دیا۔ وہ
جسم پر اذیت رسانی اور زخموں کے نشانات لے کر واپس آتی۔ شوہر
کے ہیں اس کے دن کم گزرتے اور بیکے میں زیادہ۔ معلوم نہیں
جھیل ذہنی طور پر تیار تھا یا کیا بات تھی۔ میں آپ کو اس کی
اذیت پرستی کی ایک مثال بتاؤں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ گویا اس کی کچھ میں نہ
آہا ہو کہ وہ مثال بیان کرنا مناسب نہ ہے گا نہیں۔ میں خاموشی
سے اس کی طرف دیکھ رہا۔ آخر کار وہ بولا "وہ جب شیونہ آ تھا تو
داش بیکس میں شیو کا جو جھاک اور ہالوں والا پانی جمع ہوتا تھا
راہیل کو وہ پیے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ نہیں مانتی تھی تو اس کی گردن
کچک کر زبردستی اس کا منہ اس پانی میں ڈالتا تھا۔ بلڈوز سے چر کے
لگاتا تھا۔ آخری دنوں میں تو مجھ ایسا ہونے لگا جیسے راہیل
دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی اتحادی فوجی ہے اور نازی کیمپ
میں پھنسی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے اس کا تمام طلاق ہی ہو سکتا تھا۔
صرف ڈیڑھ سال میں یہ کہانی بھی ختم ہو گئی۔ شادی کے صرف
ڈیڑھ سال بعد وہ طلاق لے کر گھر آئی تھی۔"

اس نے ایک طویل سانس لی اور کھٹک کر گلا صاف کرتے
ہوئے بولا "ہم دونوں بہن بھائی آج کل ساتھ ہی قریب ہیں۔
کھنٹش پر دینے دم کے ایک چھوٹے سے قہقہے میں ہم دوسرے ہیں
جو کرائے کا ہے۔ راہیل مجھ سے بھی پہلے سے جا ب کر رہی ہے۔ وہ
ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں قریب ہے۔ آپ کا یہ ہو سکتا ہے
اسی ایجنسی کا کلائنٹ ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ بات معلوم نہ ہو۔
اسی لئے تو راہیل کی ذہنی مجھے پہلے ہی بتا گیا تھا کہ ہوش کے
لئے نکال نکال سامیوں کا اشتہار اخبارات میں آنے والا ہے۔ مورد
میں نے پہلے ہی اپنے آپ کو اتروچ کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا
تھا۔ اب ہم دونوں ملازمت کر رہے ہیں۔ پرانے دنوں کو یاد کر کے
آہیں نہیں بھرتے۔ دلائے پینے نہیں۔ کسی نوچر دم سلطان پور کے
تھے نہیں مانتے۔ نہانے کو اور ٹھک کے رفتار کو برا بھلا نہیں کہتے۔
اس لئے سکون اور خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔ ٹھک ٹھاک ی

شاہ فیصل شہید

☆ ---- پروفیسر ایم اشرف

شاہ فیصل شہید کے کارناموں اور ان کی
ذاتی زندگی کے متعلق ایک دلچسپ
کتاب ----

قیمت: -/50 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

دواخانہ میرے سامنے پوچھی بند رہے گا۔ دواخانہ ڈاکا ایک عام سامان
اور کنویر سا دواخانہ تھا۔ جیسے عمارت فیلڈ میں ہوتے ہیں۔ میں
کدھلے کی ایک حرب سے اسے توڑ سکا تھا لیکن بے اتفاقی کی
اس غیر معمولی دواخانہ کو نہیں دھا سکا تھا جو شاید اس کے حجب میں
بھی میری نظر نہ تھی۔

راجیلہ آج کل ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آرٹسٹ تھی۔ اپنے
آرٹسٹ ہونے کا ثبوت اس نے دواخانے پر ہی چاہا کیا ہوا تھا۔
کاڈیوٹا پڑھا ہوا ایک بڑا سا رنگین کارٹون دواخانے پر چاہا
تھا۔ ایک بچہ تھلاپ میں گرا ہوا تھا۔ اس کے ہوش اڑے ہوئے
تھے۔ وہ مدد کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ ایک بچی پھولوں کی
ڈکری لئے پھول اور ڈکری پٹنے کنارے پر کھڑی تھی اور اس کا ہتھ
ری تھی۔ کارٹون پر آرٹسٹ کا نام نہیں تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ
راجیلہ کی بنایا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی لگا کہ حسرتوں
کے تھلاپ میں گرا ہوا وہ بچہ میں تھا اور کنارے پر کھڑی ہوئی وہ
شرر اور شعلہ بچی راجیلہ تھی۔

سکوت سے گہرا کر میں نے دواخانہ بلی دی۔ تب چند لمحے بعد
دواخانے کے حجب سے دی جالی بچائی کھٹکی تو آواز سنائی دی۔
”کون؟“ لفظ ایک تھا لیکن اس میں جانی بچائی بیسیوں نشانیاں
پناں تھیں۔ وہی جلی سرگشتی دی دھیماسا حکم۔ جب تک نہ سکتے

ی اور قاتل پیدا نہیں ہوتے۔ تھا لیکن اس نرم و نازک لڑکی کا
رہنے کے تصور سے دگ و پچے میں ایک عجیب سا پہچان برپا
سام جاں سے شرارت سے بھوت رہے تھے۔ اپنے آپ پر
ناشر اور ہوا تھا۔

ایک بار تو شدت سے دل چاہا کہ واپس بھاگ جاؤں۔ آخر
ن کس لئے آیا تھا؟ مجھ سے تو کبھی بھی اس مشکل کا کوئی
پاس نہیں رہا تھا۔ مجھے تو اس نے کبھی اچھا نہیں سمجھا تھا۔
ریاستی اور سامان دل محض کی محبت تو کبھی بھی اس کے لئے
فرغیں دی تھی۔ اس نے تو نہ صرف میرا دل توڑا تھا بلکہ
یت کاغذاتی بھی اڑایا تھا۔ وہ محبت جو ممانعت اور دیا لاسی
لی تھی۔

بائیں ایک بار پھر اپنی محبت کو ذلت سے دوچار ہوتے دیکھنے
بہرے دل پر تو کسی کی پھرتی سی بات، کسی کا چہرہ سا مل
الطرح ہوا رہتا تھا۔ کیا محبت میں انسان کی یہ صفت برقرار
ہتی؟ کیا محبت انسان کی خودی اور انا کو کھجاتی ہے؟

براہِ دل کہہ رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری
کی میری انا کے حجب اپنی تھک چکے صحت کے لئے ایک
بے ممانعتی محتا بیست یہاں بھیج کر لائی تھی۔ میں جیسے
زخموں میں کسی کی پکار پر آیا تھا۔ جیسے کسی دست فیلڈ نے
نت پر راشد سے میری ملاقات کرانی تھی اس کا ایڈریس مجھے
فادر میں الجھوا ہوا تھا۔

لڑاپے اس خیال پر مجھے خودی نہیں آتی۔ یہ یقیناً میری خوش
نہی۔ یہ کفایت محبت ہی ہی خوش گمان ہوتی ہے۔ اپنی ہر
کے لئے خواہ کر لیتی ہے۔ اپنے ہر فیصلے کا ایک خوشنما میں
الٹی ہے۔ بھلا یہاں کس کے دل میں میرے لئے ایسی جاہ تھی
الہیت میں داخل جاتی؟ یہاں کون بیٹھا تھا جس کی مدد مجھے
؟ تو یہاں رہتی تھی اس پر پائی نے تو برسوں پہلے ہمیں اس
نہیں سمجھا تھا۔

میں نے بھی اس کی یاد کو ذہن کے کسی نزدیک گوشے میں
کی اپنی سی سہکی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں اپنی اس
نہیں کامیاب رہا ہوں لیکن آج راشد سے ملاقات ہوتے
دراپیل کا ذکر آتے ہی جیسے سارے خوابیدہ ذہن بیدار ہو گئے
”ہو خدا لایا ہوا“ افسوس بھرے روشن ہو گیا تھا۔ اسی شخص نے
پہلی سرگشتی کھک کو ایک بار محسوس کرنے کے لئے دل بے
ہو گیا تھا۔

اندر چند لمحے کے لئے سکوت ہوا اور یہ چند لمحے اپنی زندگی
کا محسوس ہوئے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں وہیں کھڑے کھڑے پھر
لگا کر گزرتے والے نہیں آئے گا۔ آوازوں کی محل مرا کا

والی شاخوں کا سادی گرا رہا ہے۔

میں نے دیکھا وہ اذہ میں جھک آئی نہیں جیسا کہ اور سے مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ وہ گلیٹ میں تھا جی۔ کہ کراچی ان دنوں شہر آشوب نہیں تھا۔ گلی کوئلوں میں درندوں کا راج نہیں تھا۔ مگر بھی میرا خیال تھا کہ رات کے اس ستائے میں اس آلود "پامان" میں کسی خاموش اجنبی کی دستک پر کوئی تلاش کی وہ اذہ میں کھل سکتی تھی۔

اور میں بولنا چاہتا تھا کہ زبان جیسے چمکی ہو گی تھی۔ شاید لا شعوری طور پر مجھے وہ تھا کہ میری آواز سن کر وہ وہاں کھلے گا اور وہی ترک نہ کرے۔

"کون ہے؟" اس نے دوبارہ قدرے تیزی سے پوچھا۔ "کیوں نہیں؟" مجھے بھی وہی تھی، وہی برہمی، وہی "خمس" جو اس کے پہلے جیسے سراپا کے ساتھ مجھے بہت ہلکا لگتا تھا۔ وہ دیکھنے میں جتنی نازک اندام نہیں اور بدلتی کا گلا سی نظر آتی تھی، خصوصیات میں اس کے کافی برعکس تھی۔ اس کی شخصیت کے اسی تضاد میں میرے لئے ایک انوکھی کشش تھی مگر پچھلے چند برسوں میں اس میں نہ جانے کیا کیا تبدیلیاں آئی ہوں؟ میں نے سہانہ خصوصیات پر جبکہ یہ برس خوشگوار نہیں گزرے تھے۔

"یہ میں ہوں۔" غیر ارادی طور پر میرے حلق سے جھپ جھپ جھپ سی آواز نکلی جو خود میرے لئے بھی ناقابل شناخت تھی مجھے یقین نہیں تھا کہ اس نے آواز پہچانی ہو گی مگر شاید یہ مجھے کی مسکین کا اثر تھا کہ اس نے ایک جھٹکے سے دوبارہ کھل دیا۔

ایک مدت بعد وہ چاند چوہا ستارہ آنکھیں ماسنے جھپ جھپ جھپت سا ہو گیا۔ وہ سفید رنگی سلیڈ جھپک سوت میں تھی اس کے بوسے بال جن میں لپکا سا سنہرا پن بھی تھا اس وقت بے ترتیب تھے مگر اس بے ترتیبی میں بھی ایک حسن تھا۔ اس کی رعیت آج بھی چاندنی کی طرح تھی۔ وقت کی ناگواریاں اسے دھندلا نہیں سکی تھیں بلکہ وہ سر سے پاؤں تک دھکی رہی تھی جیسی میری یادوں کے قسم خانے میں اس کی تصویر آدھراں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پہلے تو خیر تھی، کبھی کبھی دکھائی دیتی تھی "اب پیچیدہ ہو چکی تھی۔ نگل جاں نے ہمار بھی دیکھ لی تھی، خزاں بھی سوچو کا شریک بنا تھا۔

جیسا بات یہ تھی کہ اس کی شفاف بلوری آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے اور یہ ڈورے نیند کے چیتا نہیں تھے کیوں کہ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کوئی سونا کاغذ سا تھا۔ میرے لئے اس کا بڑا مل قدرے غیر متوجہ سا تھا۔

میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ لڑکھائی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود سونا سا کاغذ یا کاغذ پر مزہ ہو کر اس کی نظمی میں دب گیا۔

"وہ۔۔۔ تو۔۔۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور اس نے

رومانی ناول

زیب	حمیدہ جبین	1-
شاخ بریدہ	حمیدہ جبین	1-
حنان اور پتھر	حمیدہ جبین	1-
گیت یہ میرے	حمیدہ جبین	1-

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

"دوسرے ہاتھ سے جلدی سے اپنی آنکھیں پوچھنے کی کوشش نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کے آنسو دیکھوں۔ شاید وہ اس اپنی زندگی کے تھکے و تار کا رباب کا کوئی ورق پلٹ رہی تھی۔ بد لے کال بیل کا بزن دیا۔ شاید اس کے ہاتھ میں جھیل کی تھی مجھے اس کی صرف سفید سا بڑا نظر آتی تھی۔ بعض لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ اپنے چاہنے والوں کو ہر اذیت و مکر کھاتوں میں چھپ چھپ کر انہی کی تصویریں دیکھ کر ہیں، انکھوں کے موتی بدلتے ہیں۔

ایک لمحے کے لئے وہ موت سی ہو گئی پھر سرسراہٹ سی میں بولی "مجھے یقین نہیں آتا۔"

"مگر کوئی اتنا وحشت بھی ہو سکتا ہے" میں نے جملہ عمل کر "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں ہے" وہ لافٹ بولی۔ "میں سو سوئی، سفائی اور درشتی کی میں توقع لے کر تھا اس کے لیے میں نہیں تھی۔ شاید حیرت نے ان جہڑوں کو آدھرا دیا تھا۔ میرا دل کچھ سنہیلے گا۔

"تم۔۔۔ تم یہاں ایک دم کیسے پہنچ گئے؟ تمہاری بیٹیا سے ملاقات ہوئی ہو گی" اس کی آواز اب بھی سرگوشی۔ نہیں تھی۔ شاید کچھ اتنا ابھی اس کے حلق میں اٹکے ہوئے "ہاں" میں نے اذیت میں سر ہلایا "راشہ سے ملاقات تھی" مگر میں نے ایک طویل سانس لے کر اپنا حوصلہ بچھا "انداز آئے کے لئے بھی نہیں کوئی؟ جو لوگ تو وہاں آئے؟ ہوئے دشمن کو بھی ایک بار تو خوش غلطی سے انداز آئے کی دہرے دیتے ہیں۔ ہمارے درمیان وہ سنی نہ سکی۔ لیکن کچھ دھکی بھی تو نہیں۔"

اس نے ایک طرف ہٹ کر میرے لئے راستہ چھوڑ دیا اس کے قریب سے گزر کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے

دعائے پڑھنے والی پر اسرار غریبہ آج بھی بے قرار تھی۔

وہ دوا نہ بند کرتے ہوئے بولی "بڑے لوگ کا فیضانِ استمال
ہم نے ٹھہرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ راشد نے یقیناً تمہیں اپنے
ایک داستانِ شادی ہوگی۔ تم سے تو وہ کوئی بات چھپائی نہیں
لے۔ تمہیں موقع مناسب دکھائی دے گا۔ آگے ہو گے مذاق
ہے۔"

مڑبڑی مکی ہے کہ تم نے مجھے بیش از حد ایشیہ میں کیا
"! میں نے آسف سے کہا "میرے خیال میں تو تمہاری پہلی
دلی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے جس کا مذاق اڑایا جاسکے۔
نہ کا اور بچے ہو جانا میری نظر میں کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہے
آئی قطع نقصان البتہ قابلِ ذکر ہے۔"

وہ خاموشی سے وہیں کھڑی رہی طرف دیکھ رہی۔ یہی آواز
اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے کہا "راشد نے مجھے
ت سے آگاہ کر دیا تو کوئی برا نہیں کیا۔ سب بات عروج و زوال کی
ہوتی۔ دوست ملتے ہیں تو ایک دوسرے کا حال تو پوچھتے ہی ہیں
بارے ہیں تو کچھ کلام بھی ہے۔" اور سنا دیا حالِ حال ہیں؟
تعلق کوئی واسطہ ہوتا ہے کچھ انسان دوسرے کا احوال جانا
ہے اور جسے تم عروج و زوال کہہ رہی ہو یہ عروج و زوال
انسانی کے شیب و فراز ہیں۔ آتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے
رہنا چاہئے۔"

ہم ایک تنگ سی راہِ ادبی میں گزرتے تھے۔ میں نے ایک
بہد شایا آنکھوں کی ان شفاف جھلکوں میں جھانکتے ہوئے
اکر کا "مکیا مجھے اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے؟"
اس کا ذہن گویا اب بھی کہیں اور تھا۔ قدرے چمکتے ہوئے
"ذرا صل مجھے حیرت کا جو جھٹکا لگا ہے اس سے میں ابھی تک
ل نہیں پاتی۔ اس کے علاوہ تمہارے وجود سے دولت کی
یا آری ہے۔ تمہارے ہاتھ میں مرشدِ بزرگ کی چابیاں ہیں۔ یقیناً
نے مزید رفتی کرنی ہے۔ میری کچھ میں نہیں آتا۔ تمہیں کہاں
اکسٹینس محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جگہ تمہارے شانِ شان
ہے۔" اب اس کی پھیلنے آنکھوں میں دھیرے دھیرے
راہِ طلوع ہو رہی تھی سبارش کے بعد بارشوں کے عقب سے
نہا ہوت رہی تھیں۔

حضر کے تیر و اصل میں تم چلا رہی ہو۔ الزام مجھ پر دھر رہی
ہے۔" میں نے کہا وہ مجھے چھوٹے سے ایک صاف شہرے
تک لایا۔ میں نے آئی۔ اس کے دھن سن کو قربان یا غم
اور حال نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہی جوت وہ کچھ بھی تھی اس کے
پہلے میں یہ غرت ہی تھی۔ شروع شروع میں شاید اسے یہاں اپنا
گھر محسوس ہوا ہو۔

اس کا اشارہ اگر میں نے ایک صوفے پر بیٹھ کر ادھر ادھر
نے ہوئے کہ "یہ جگہ تو میری اوقات سے بہت اونچی ہے۔ میرا تو

اب بھی کبھی کبھار کسی قہرے پر بیٹھ کر بچپن کے کسی دوست کے
ساتھ ہنسنے کوئی چاہتا ہے۔ لیکن گفت بچپن کا کوئی
دوست کبھی کہیں خطری نہیں آتا۔ حالانکہ میں نے شاید انسان
کے پاس چار بچے آجائیں تو ادھر ادھر سے کہنے کہہ دیا ہے
بچپن کے دوست۔۔۔ بلکہ معمولی شایا کبھی اہل پڑتے ہیں۔ کوئی نہ
کوئی کامِ تعاون کی کوئی نہ کوئی درخواست ملے کر آتے ہیں اور
اگر کسی وجہ سے ان کی فرض پوری نہ ہو سکے تو پڑ پڑ کر لوگوں
سے کہتے ہیں "درا دیکھ تو سہی" کیسے دماغ آسان تو پہنچ گئے
ہیں۔ کل تک پاؤں میں دھبے کی جوتی میں تھی۔ میں سات
سات سلام کر آتا تھا۔ آج سیدھے منہ بات نہیں کی۔ ذرا سا کام
نہیں ہو سکا ہمارا مجھے تو کوئی یہ کہنے بھی نہیں آیا۔ کوئی ٹھٹھہ دینے
بھی نہیں آیا۔ ہاں میں کھل مر گئے کیئے۔"

اس کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے سکرابٹ روشن تر
ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اصحاب کا جو کم ہو رہا تھا۔
میں کی چاہتا تھا۔ کچھ ایسی نظر آتی تو میرے اصحاب سے بھی
یو جرم ہو گیا۔

"تم نے اپنے گاؤں جا کر انہیں تلاش کیا ہوتا؟" وہ مجھے لمبے
میں بولی۔

"کیا تھا ایک مرتبہ گاؤں بھی" میں نے کہا "کل دو تین ہی
دوست تھے۔ وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ گلی ہی آج بھی تھی جس
میں ہم رہتے تھے۔ شہر کی کشش سب کو گل گئی تھی۔ سب مختلف
شہروں کو کوچ کر گئے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کون کہاں گیا۔"

"دکھائی تو کی رہا ہے کہ ابھی اک مرانی ہی ہے؟" وہ اپنی
ی نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی "زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر
کوئی نہ کوئی لی جاتے گا۔"

"مجھے تم کی ہو؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ انگریز کے ناخن سے "دوسرے
ناخن کی پالش کر رہے ہوئے بولی "راشد تمہیں کہاں ملا تھا؟" اس
نے سوال سے مبالغہ کا رخ پھیر دیا تھا۔
"نہوہر میں" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔ آج اس ہو کل کا افتتاح تھا جس میں اسے پہل
میجر کے طور پر نوکری ملی ہے۔" وہ مجھے لمبے میں بولی "کتنی ہی نوکری
ہے۔ بڑی مشکل سے ملی ہے۔ بہت سخت کر رہا ہے۔ وہ تم کی شاید
اسی اختیاتی قریب میں آئے ہو گے۔ میں نے راشد سے کہا تھا کہ
ایک کارڈ مجھے بھی لا دو۔ اس نے صاف منع کر دیا۔ کہنے لگا "کارڈ
بہت ہی خاص القاسم لوگوں کو دینے جارہے ہیں جن کی آمد پہلی کے
نقطہ نظر سے مفید ہو" خواہ ان پر پلے سے بہت کچھ خرچ کیا
چلے۔ غرام لوگوں کو "اور خصوصاً ملازمین کے اہل و عیال اور
رشتے داروں کے لئے تو کارڈ بالکل جاری نہیں کئے جارہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر ہنس سے انداز میں مسکرائی اور طویل

رومانی ناول

1/-	سلی رعنا	دل کا آئینہ
1/-	سلی رعنا	کالے کنول
3/-	سلی رعنا	اوردیا جلتا رہا
3/-	سلی رعنا	سون گر داب

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

”میں نے کہا کہ اب یہ اچھا محسوس نہیں ہوا
سراٹھائے بغیر ہولی تم خواہ زبان سے نہ کہو۔ شعوری طور
محسوس نہ کرو۔ لیکن لاشعوری طور پر ضرور محسوس کرو گے
لوکی اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ ہندوؤں کی طرف پرواز کرے
شوق میں دھڑام سے نیچے اتری ہے۔ اور میں اب بہت
ہو گیا ہوں اس لئے اس نے اب مجھے ترجیح دینے کا فیصلہ کر لیا
اب میں اس کی نظر میں اچھا ہو گیا ہوں۔ بروٹم سوچے گی کہ
بالوں کی جتن سے آنکھوں کے ستارے جھلکائے۔
”تم کیوں خواہ خواہ فیصلے دیتی ہو کہ کون کیا سوچے گا
نہیں؟“ میں نے لٹاٹتے کہا۔
”انسان کو اندازہ تو ہوتا ہے۔“

”انسان کے اکثر اندازے غلط ہوتے ہیں۔ جذبات اور
کی ڈوریں کھینچیں اور سے بٹی ہیں۔“ میں نے کہا ”مثلاً اس وقت
اندازہ غلط تھا جب میں سمجھ رہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرنا
۔۔۔ تمہارا اندازہ اس وقت غلط تھا جب تم نے سوچا تھا کہ
تمہارے شوق میں دیوانہ ہے اور تمہارے لئے زندگی کا سب سے
ثابت ہو گا۔ اندازوں کی قیادت ہی مت کرو۔ محض اندازہ
زندگی کے بڑے فیصلے نہیں کرنے چاہئیں۔“

”شاید تم درست کہہ رہے ہو۔“ وہ ابک کر بولی
اس وقت بھی میرا اندازہ غلط تھا جب میں سمجھ رہی تھی کہ
تمیں دھوکا دے رہی ہوں۔ تم سے فطرت یا دل لگی
ہوں۔ میں اس وقت تمیں میں شاید اپنے آپ کو دھوکا
دے رہی تھی۔ دل کو شاید اس وقت بھی تمہاری طلب تھی۔
چاہ تھی۔ لیکن میں اسے کس گائیڈ کر رہی تھی۔ اسے غلط
دیکھا رہی تھی۔“

یہ سب کچھ سننا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ رگ دے پش
جینی سی لٹھک پہنچتی جا رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ام
چہرے سے بالوں کی چمکنی مٹائی۔ میں اس چہرے پر چمک کا پورا

سائنس لے کر بولی ”جی ہاں۔ ہم کھینچتے ہیں۔ ہم غیر اہم بھی ہیں اور
ہوٹے کے ملازم کے رہتے دار بھی۔“
”میں نے حقیقی آئینہ سے کہا۔“ اگر مجھے معلوم ہوتا
کہ تم اس تقریب میں جانے کی خواہش مند ہو تو کوئی ایسا ہندوستان
کہہ نہ کہ افتتاح ہی تمہارے ہاتھوں سے ہو گا۔“
”میرے ہاتھوں سے؟“ وہ خود استغرائی کے سے انداز میں
ہنسی۔ گو کہ انہی میں تلخی کی آمیزش تھی لیکن ایک جیسے ہوا اس کی
انہی سنا سناوت کے لئے ایک پیا پی دھن تھی۔ تھا۔ اجنبیت کے
دھڑکنوں کے عقب سے دیر سے دیر سے اس کی اصل کیفیت
طلوع ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کے وقف سے وہ بولی ”تمہارے ہاتھوں سے تو اب
کوئی جیم خانے کا افتتاح کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ یہ تو نایاب
انثار ہوٹل کا معاملہ ہے۔ دیکھو جس انداز سے تم بات کر رہے ہو
اس سے لگتا ہے کہ کالی انڈور سوچ ہے تمہارا اس ہوٹل کے مالک
پر۔“

”ہاں۔ میں کچھ تھوڑی بہت شناسائی ہے۔ سر حال بات مان
لینے ہیں بے چارے۔“ میں نے ہنس سے لمبے میں کہا ”خصوصاً
جذباتی رشتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔“

”محبت ہے!“ وہ جھیل سی آنکھوں کو معنوی حیرت سے
پھیلاتے ہوئے بولی ”عدالت مندوں کے ہاں جذبات کا احترام کمال
سے اچھا؟“

”سب دولت مند تم جیسے یا جھیل جیسے تو نہیں ہوتے نا۔ میں
نے بے ساختہ کہا۔

اس کی چاندنی جیسی رنگت میں شوق کی سرفی جھلک آئی۔
”تمیں ایسی باتیں کہنے کا۔۔۔ دل کا غبار نکالنے کا حق حاصل
ہے۔ میں تمیں اس سے نہیں دوں گی لیکن خدا ارادہ میرا اور جھیل
کا موازنہ مت کرو۔ وہ میرا انتخاب نہیں میرے فرائض کی ایک
بھول تھی۔ تو عمر لوگ جب زیادہ ہو شیار بننے کی کوشش کرتے ہیں تو
معملاً کچھ میں ہاتھ مار لیتے ہیں۔ میرے واس میں بہت سے
پہنچتا ہے۔ میں لیکن میں ان کا اعتراف نہیں کروں گی۔ اب یہ خود
فرضی اور مصلحت کوئی محسوس ہو گی۔ اب تو یہ سوچنا بھی اچھا
محسوس نہیں ہوتا کہ زندگی کا ایک تجربہ نام ہو گیا اپنا انتخاب غلط
ثابت ہو گیا تو اس کی طرف لوٹ آئے جس کا بھی مذاق اڑایا تھا۔
جس کا بھی دل توڑا تھا۔“

اس کا سرمہ جھک گیا۔ اس کے ریشمی بالوں نے اس کا چہرہ
تقریباً اوجھلایا۔ اس کی آواز جیسے بہت دور سے آئے گی ”میں
میں تم سے شرمندہ ہوں۔ لیکن میں اس کا پاتھہ اجڑاؤ
نہیں کر سکتی۔ میں تم سے سب سے زیادہ شرمندہ ہوں گی۔“
”وہی تمہاری انہی خدی طبیعت۔“ میں گہری سانس لینے
ہوئے مسکرایا۔

بچا وہاں آنسوؤں کی صورت میں موجود تھا۔ میں یہ دیکھ کر
نے غیبت نہ سکا کہ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی
س کے رخساروں پر سے پھلتی ہوئی رہنمی میں شربت میں
رہی تھی۔

ہائے اس کے آنسو پچھ دے گرد وہ ڈاک سیل وہاں قہار
آہٹا تھا۔ وہ میرے بازوؤں میں سٹ کر بلک بلک کر رونے
سوؤں کے اس سیلاب کو روکنا میرے بس کی بات نہیں
ہائے اسے ہنسنے لگا۔ خود میرے دل کے تپتے صحرا میں نمی کی
آخر کار وہ بھی ہوئی فاقہ کی طرح اپنے لگی۔ جھوٹ
لے اس طرح نہیں رو سکتے تھے۔

میں نے انہوں کو اس کی ہینکل آنکھوں کی طرف
دے ہوئے تپتی جینٹی بی تو انہیں کہا کہ یہ حقیقت ہے تو
پلے کی کہ وہ شکلی کیا تھی؟

میں نے کہا تو ہے۔ وہ ایک خود فریبی تھی۔ شاید میرے
اور غیر حقیقت پسند ذہن کا ایک ایڈوگر تھا۔ بہت کم پسند
آئی تھی تاہم نے عشق کو بھی ایک قسم بتایا تھا اور راستہ
منتخب کیا تھا۔ "پھر وہ کدو جھنگے سے اپنے آپ کو بٹھو
ہوئے بولی "لیکن تم بتاؤ۔ تم کس لئے آئے ہو؟ میری
ن کا نشانہ دیکھئے؟ میری کتابیں کا ڈانق اڑا لے؟"

میں تمہارا مذاق کیسے اڑا سکتا ہوں؟ کیا میں بھاد نہیں ہوں؟
آج بھی ایک بھاد کھڑ ہے۔ پہلی شکست کا مدد بہت
تھکا بھلائے نہیں بھولا۔ اور یہ دل پھر بھی تباہ نہیں ہو سکا۔
نے اس کے پاس بیٹھنے ہوئے کہا۔

تم میری طرح کہتے ہو "وہ بھولیں میں اگلیاں پھرتے ہوئے

"موا اور عورت کی یہ انہی بحث مت چھیڑو۔ عورت یہ کہتی
اور سوچے کہتا ہے۔ ہر عورت اور ہر عورت کی کہانی الگ
کہانیاں ایک جیسی نظر آنے کے باوجود الگ الگ
محسوسات الگ الگ ہیں" میں نے تجویز سے کہا اس کے
اچھی کی تھی ابھی تک بند تھی جس میں اس نے تصویر چھپانے
دشمن کی تھی۔

میں نے ملٹی کمرے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ اب اگر
آخر سے کی بولیں گے تو کم از کم اب تو اس شخص کی تصویر
ڈکھائی دے گی۔

میں نے اس کے ملٹی فزیاں سختی سے جھپٹے ہوئے
پلے۔

"جیل ہی کی ہوگی۔ تمہاری میں بڑھ کر انسان اپنی ڈاک میں
لہا اور آسوں کی تصویر ہی یاد رکھتا ہے اور دوتا ہے" میں
اپنی بھی طاقت صرف کے بغیر اس کی ملٹی کمرے کی کوشش
ماتھا۔

"بات تم نے بالکل ٹھیک کی ہے۔ وہ ملٹی کمرے ہوئے ہوں۔
لیکن تصویر جیل کی نہیں ہے۔"

وہ تجھ سے تصویر اس کی جھیل پر تھی۔ میں نے جلدی سے
اسے اٹھا کر سیدھا کہا اس کی شکلیں نکالیں اور دوسرے ی کے
جیسے میرا دل دھڑکتا بھول گیا۔ یہی اپنی تصویر تھی۔ سیدھا اس
میں میرے ساتھ تھی۔ یہ اس وقت کی تصویر تھی جب میں جیل اور
آخری بار ان کے گھر گیا تھا اور ہم ٹھگ مٹانے ساحل سمندر پر
گئے تھے۔

مجھے ابھی طرح یاد تھا کہ وہ ہم دونوں کی اسٹیل ایک سی تصویر
تھی اور راجہ کی امریکی دوست نے کینیڈا میں اس وقت ساحل
سمندر پر رخصت ہوئی تھی۔ تصویر بھی دھندلائی ہوئی سی
تھی۔ ایک عجیب سی مصویر تھی اس تصویر میں چند برسوں میں
ہماری قضیتوں میں ظاہری طور پر کچھ ایسا فزادہ فرق نہیں پڑا تھا
لیکن مداح پر تجوأت کچھ ایسی تیز رفتاری سے گزرے تھے کہ تصویر
بھی پرانی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً پچیس کی سی لگ رہی
تھی۔ یہاں کے سارے گرد آلود موتی اور موٹے ٹھکڑے لگے۔

"تم نے۔ تم نے اس تصویر کو اب تک سنبھال کر رکھا ہو
تھا؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ اپنی تو انہیں خود بھی وہی شکل
سے سن پلا۔

"ہاں۔ اور آج جب میں تمہاری میں اسے نکال کر بھی تو
پہلی بار اس شدت سے مجھے دھنسا گیا۔ شاید یہ بچہ تودے اور
ندامت کے آنسو تھے۔ پچھتاوا اس بات کا تھا کہ میں تو تمہیں
حفاظت کرنے "تم سے مددرت کرنے بھی نہیں پاسکتی تھی لیکن مجھے
کیا معلوم تھا کہ یہ قیامت کی گھڑی ہے اس دوران میں جی
اور میں نے دودھ نہ کھولا تو تمہیں سامنے کڑا ایلا۔ اسی لئے تو
میں اتنی زیادہ حیران ہو گئی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ بالکل جین
نہیں آتا تھا۔ خواب لگ رہا تھا یہ سب کچھ۔ میں سوچتی تھی کہ
سکتی تھی کہ میں قدرت کی اتنی بڑی نوازش کی مستحق بھی ہو سکتی
ہوں۔"

"اب تو تمہیں جنہوں کی مددافت کو مان لینا چاہئے" میں نے
کہا۔

"اتنی تو میں پہلے بھی تھی لیکن اب کچھ اور سی طرح کا جین
ہوا ہے۔"

ایک لمحے کسی خاموشی رہی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ کے ساتھ
بیٹھی تھی۔ میں نے اور اور دیکھتے ہوئے کہا "کیا سکوت ہے
میاں ہوا شدہ لگے بتاؤ ہے کہ جیل سے تمہاری رفاقت ڈیڑھ
سال رہی۔ مجھے یہاں کسی بچے کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔"
"وہ رفاقت نہیں" میری حماقت اور جھیل کی نہایت تھی۔
اس کی تم آنکھوں میں ایک بار پھر نگاہوں ہی حیرت گئی۔ "وہ شادی
شاید اس کا پہلے سے سچا سمجھا منصوبہ تھا اس لئے وہ ہر معاملے

ہو۔ شاید لاہور کے اخباروں نے لٹ فیس کی کمی یہ خبر بھی ہو تو شاید غیر نمایاں اعداد میں لٹ کی ہو۔ اس کا کافی شہرت پائی ہوگی تم نے؟ میں نے سنا ہے کہ اسے سچے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اب بھی نوخیزی کی صورت تھی۔

”ہاں۔ لیکن کافی فنی جسم کی شہرت تھی۔ وہ بھی ہوئے پہلی حرکت کی بھی شکل ہوئی تھی بعد میں مجھے اسی لئے بعد میں بھی کوئی رشتہ بھی نہیں آیا۔“

”مجھے جو یہاں آنا تھا رت جو کئی ہے بہتری کر میں نے کہا۔“

اس کے چہرے پر ایک لٹ گہری بنی ہوئی۔ بلکہ چہرہ سا چمکا گیا۔ خوب صورت آنکھیں دھشت سے نکلی گئیں۔ سامنے ہاتھ ہاتھ جوڑے ہوئے سرخوش سے لہجے میں تھا کہ تم مجھ سے شادی کی درخواست نہ کرنا۔ لیکن اس کے تاثرات میرے لئے حیرت کا باعث تھے۔

”انت سے کہا“ مجھے ایسی جلدی نہیں ہے۔“

”نہیں۔ آج بھی نہیں۔ کل بھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ تم کبھی بھی شادی کے لئے نہ کہنا“ وہ بدستور دھشت زدہ تھی۔

”تم تو کچھ اس طرح خوف زدہ ہو گئی ہو جیسے مجھ سے نہ کسی رچھ نہیں باقی باغز بگنے سے شادی کا تصور تمہارے ذہن میں ہے“ میں نے ہلکی سی نکتہ سے کہا۔ ایک طرف ایسا لگتا تھا جیسے کی باتیں ہوں، دوسری طرف شادی کے نام سے ایسا اور دھشت ہو تو انسان کو سخت تو ہوتی ہے۔

”نہیں۔ نہیں۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ وہ بے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی ہلکی ہلکی آنکھوں سے لگاتے ہوئے پہلی دیکھے بھی تمہارے قدموں میں بیٹھ کر زندگی گزار سکتی ہوں۔ اس طرح عورت کے دل داخل کیسے لیکن جس تم مجھ سے نا خیال دل میں نہ لانا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے حیرت سے کہا کیا حسیہ کیسے کیسے ہو گیا ہے؟ ایک شادی کی فکری کے بعد شادی سے بیٹھ گیا ہے دل میں؟“

”نہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے۔“ وہ پہلی بار سے کہتے ہوئے ابھرنے لہجے میں پہلی تھی۔ تم سے شہ میں تصور نہیں کر سکتی۔ شاید یہ عورت کی انتخاب میں آپ کو تمہارے قابل محسوس نہیں کرتی۔ میں اب وہ رابطہ ہوں جس پر تم فدا تھے۔ خود غرضی ہی گنتی ہے کہ آج جب کہ ایک ٹھکانا لگتی۔ سستو شعری چیز ہوں۔ اور تم عورت کی جا رہے ہو تو میں تمہارے بچے بندہ جاؤں۔ مصلحت اس لئے تمہارے دل میں تو لیکن کے اس عشق کی چنگاری آج بھی

میں نے شہری حدود میں چل رہا تھا۔ بڑا اس کے وہ اتنی جلدی زیادہ آنکھوں میں پھرتا نہیں چاہتا تھا۔ احتیاط اسی کی طرف سے تھی۔ مجھے بھی پتہ نہیں تھا۔ وہی باپ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اولاد ازدواجی زندگی کی ذخیرہ ہوتی ہے۔ یہاں یہی رشتہ توڑنا بھی پاپوں کو بعض اوقات صرف اولاد ہی کی وجہ سے پہلے مانو اسات بھی اس بندہ میں بندھے رہتے ہیں۔ وہ ایسی کوئی جذباتی کمزوری پانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے شعور سے ہی معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے جو کچھ ہوا وہ کھنٹا تھا۔ یہ غیر ارادی نہیں تھا۔“

میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”تم نے اس کے اپنے علم و حکم کس طرح سہ لئے؟ تم تو جوڑو کرائے بھی جانتی تھیں؟“

مجھ پر بٹنے کے بعد جوڑو کرائے و چراغہ جاتا ہے۔ اگر براہ راست صرف مو اور عورت کا مسئلہ ہو تب بھی کوئی بات نہیں۔ شاید عورت نہ لے۔ لیکن عورت بہت سے رشتوں کے جال میں پھنس جاتی ہے۔ بندہ جاتی ہے، بے دست دبا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر گلابی تھیلیوں کا بازو لپٹے ہوئے پہلی۔ ”جوڑو ازدواجی بندہ جن کو توڑنے میں توفیق دیا ہو سکتی ہے جوڑے میں نہیں بھر بھی جتنی میں نے مراحت کی“ اتنی شاید کوئی اور لڑکی نہ کر سکتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ شادی کے نہ جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ نہ بھی سکتی تھی۔ اگر میں بالکل بیخبر نہ ہوں کہ سب کچھ سستی چلی جاتی۔ ہر مطالبہ پورا کرتی چلی جاتی اور اپنے والدین کو بھی میرے دم تک بلیک میل ہونے دیتی تب شاید نہ جانی۔ لیکن میں نے دولت کی آخری حدوں تک سمجھنا نہیں کیا اور اچھا ہی کیلئے کہ عورت نہ گئی۔ سورنڈری کے منسلک ہونے کے بعد بھی ہر حال یہ بندہ من ٹوٹ ہی جاتا تھا۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ قدم سے شہر سے اعداد میں پہلی۔ لیکن جب بندہ من کا رخنا سو فیصد چھٹی ہو گیا تھا تب تو ایک بار میں نے اس کے والدین اور بھائی بنوں کے سامنے اس کی ٹھیک ٹھاک پائی کی تھی۔ اتفاقاً اگر تھا تب وہ دانت توڑ دے تھے ایک چنگار ہو گیا تھا۔ ان کے گھر میں دو صف نامہ بچہ بھی تھی۔ جیل کے اہلے میرے خلاف قاتلانہ ملے کی بہت درج کراوی تھی۔ قاتان بکری بھی ہوئی تھی۔ اخباروں میں خبریں بھی آتی تھیں۔ یہی نے حیرت ناک اعداد میں شوہر کی پائی کوئی اور اسے اسپتال پہنچا دیا۔ اس پر پہلی لے دے پہلی کئی سیانات کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ پھولی سی ایک سیای پائل جسے مذہبی ہونے کا دعویٰ ہے اس کے سر اوپر تو فتنی دے دیا تھا کہ ایسی ناخوشیوں کو بھائی دے رہی ہے۔“

”نہیں۔ میں نے قدم سے حیرت سے کہا“ فوس۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس جسم کی کوئی بحث اخباروں میں دیکھی

اپنے کچھ لوگوں سے میرے حرام ضرور ہو گئے تھے لیکن میں خود
 کبھی اس حد سے نہیں چلا۔
 تو پھر کیا کر رہے ہو؟
 مٹی چموتے مرنے کا دوا ہیں۔ قسمت نے کچھ ہاتھ پکڑ لیا
 ہے۔ میں نے جواب دیا۔

خیر۔۔۔ ان باتوں سے مجھے اب کوئی دلچسپی بھی نہیں
 رہی۔ میں اب خواہ خواہ ان قہقہے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ توڑی
 بہت ہیرا پھریاں اور چالاکیاں تو ہر گناہ دار میں پھٹی ہیں۔ آدمی کو
 توڑا بہت چالاک تو ضرور ہونا چاہئے ورنہ وہ زندگی کی دھڑکیں
 توڑا بہت آگے تو بڑھ سکتا ہے۔ بہت زیادہ آگے نہیں بڑھ
 سکتا۔ خالص سونے سے توڑا رہی نہیں بنتا۔ اسے زہر کے قابل
 بنانے کے لئے اس میں بھی توڑی بہت ملاوت کرنی پڑتی ہے۔ وہ
 بے پروائی سے بولتا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ میں نے ملاوت سے کہا۔ یہ دنیاوی ترقی
 کے پکڑ کچھ عجیب سی ہیں۔ خود میری کچھ میں آج تک نہیں
 آئے۔ کس قدر جو اس کا ہاتھ تمام لئے۔ وہ خواہ بالکل سیدھا ہو۔
 توڑا بہت چالاک ہو یا معمولی ہو یا صلاحیت ہو یا خواہ چند ہو۔ کس
 وہ کچھ نہ کچھ بن جاتا ہے۔ میرا تو اب قدر پر ایمان ہو گیا ہے۔“
 ”یعنی صلاحیت ختماری نظر میں کوئی چیز نہیں؟“ اس نے
 حیرت سے میری طرف دیکھا۔

صلاحیت ختمی چیز ہے۔ اس کا کردار قانونی ہے۔ قدر بہت
 نہ دے تو صلاحیتیں دینو سہجی نہ جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔
 وہ قسم سے انداز میں کھدے اپنا کردار کئی گونا گویا اس موضوع
 پر بحث سے بچنا چاہتی ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔
 ”جبر مال۔۔۔ اب تم اپنی حرکات و سکنات اور خود احمادی سے
 خاندانی دولت مند بن گئے ہو۔ ایک خاص غلٹ آگئی ہے ختماری
 شخصیت میں۔ دوسرے بھی پہلے سے زیادہ بن گئے ہو۔ تو کچھ تو بہت
 منڈلاتی ہوں گی اور گرد؟“ اس نے شرری نظروں سے میری
 طرف دیکھا۔ شخصیت کا پرانا رنگ دھیرے دھیرے مزید نمایاں
 ہو رہا تھا۔

”اے کچھ زیادہ تو نہیں منڈلاتیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پتا تو
 وہ عالم ہے کہ۔۔۔ جو شمار نے کہا ہے۔ نا۔۔۔
 کسی کو کچھ بھی یہاں حسب آراء نہ ملا
 کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا
 اپنے ساتھ تو بس یہی معاملہ چل رہا ہے۔“

”اور۔۔۔ دردناک قسم کے شعر پڑھنے بھی آگئے ہیں اب تو؟“
 وہ بولے سے نہیں۔
 ”آگئے ہیں۔۔۔ کیا مطلب؟ پہلے زیادہ آتے تھے حساب پرورد
 جا رہا ہوں۔ کوئی کئی شہری یاد رہ گیا ہے لیکن جب زیادہ آتے تھے
 اس وقت ہمیں ملنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“ میں نے اس کے

چہرہ پر مسکراتے ہوئے شہرے میں نہ جانے کس طرح
 چہچہاتا تھا۔ میں نے صبح کی ”ایک تو میں تم جیسے بچہ سوچوں
 پر انسانوں سے جدا ہو جاتا ہوں جو کبھی کوئی غصہ گڑبڑ نہ
 نہ ہیں اور کسی کوئی۔ ان کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہوتا
 ہے۔ خوشیاں آکر ان کے دودھ دے پر دیکھ دوں تو دودھ کے دے
 کر انہیں واپس کر دیں۔ تم لوگ زندگی کو سیدھے سادے
 زمین کیل نہیں لیتے؟ کبھی جو ہو اسو ہو۔ اب اسے بھولنے کی
 نئی کار اور زندگی کا جو نیا سوز سانسے فکھر ہے اس سے اذ سر
 اتنا کر کہ میں نے اسے ذات ہی پائی۔

”یہ آواز آسمان نہیں ہوتا۔“ وہ بھیگی بھیگی آنکھیں پھیلاتے
 پہلی ”اور یہ تم جمع کے بیٹے میں بات کر رہے ہو۔ تو کیا اور
 رک میں نہیں جیسے؟ اور بھی ہیں تسمار اہل چلانے والے؟“
 ”اے۔۔۔ میں تو کسی“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن تمام فکھر ہے کہ
 سے عشق کا رشتہ نہیں ہے۔“ پھر میں نے ایک طویل سہاوی لیتے
 ”کہا۔۔۔ تسمارے اہل اپنی دور سے آئے ہوئے دن بھر کے
 ہارے صمان کو کچھ کھلائے پلانے کا رواج نہیں ہے؟“
 ”آئی ایم سوری۔“ وہ کچھ مانتے ہوئے بولی ”تسمار اتنا میرے
 انجیرت انجیر واقعہ ہے کہ میں سب کچھ بھولی گئی تھی۔“

وہ کچھ میں چلی گئی۔ مجھے بھی تواؤز سے کر اس نے وہیں بلا لیا
 ”میں وہاں اکیلے چھوڑ کر آتا تھا۔ اچھا نہیں لگ رہا۔ میں
 نے پینے کے لئے کچھ پانی ہوں۔ تم کھڑے بائیں بنائے رہو۔“
 پھر وہاں کچھ دھڑے سے مشابہ تھا لیکن صاف ستم اور چمکا
 تھا اس میں کام کرتی ہوئی وہ مجھے اور بھی زیادہ ابھی لگ رہی
 ”میرے لئے کافی اور سینڈ ویج تیار کر دی تھی۔ میں دل ہی
 ہی حالات کے اس دلچسپ پلور سے محفوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔
 تھے تھوڑے دیر میں دفعتی اور دیگر کاموں میں مصروف رہا تھا اور
 نہ کوئی سیدھا ہوئی کے احتیاج میں پہنچا تھا۔ آج اتفاق
 مجھے دیکھ کر کھانا کھانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ کراچی آکر
 ہوئی میں بھی میرے کچھ کھانے پینے کی فہمت نہیں آئی
 میں تو دفعی کھانا کھائی اور عمدہ انتظامات دیکھ کر پانی کا کلاس
 کی بھلی لگا تھا۔ ہزاروں افراد وہاں بہترین آؤز کے لوازمات
 تھا اتنا دھڑے ہو رہے تھے اور میں خود اس چھوٹے سے فلیٹ کے
 لئے سے کچھ میں کافی کی ایک پیالی اور ایک سینڈ ویج کا فکھر
 تھا۔

راہیل ایک نظر میری طرف دیکھ کر اپنا پتہ پتہ پچھتے ہوئے
 ”آج کئی کیا کر رہے ہو؟ وی؟ پرانا حد اسے کوئی کا دوا دینو
 چاہتا ہے؟“
 ”میں تو کچھ خواہ خواہ خواہ ہی شہ ہو گیا تھا مجھ پر“
 ”ہاں۔۔۔ سے فکھر گل کر کہا۔“ اس نے ملے ملائی میں

دیکھا۔

قربان اگر اس کے وجود اور کافی کی خوشبو ایک ساتھ سوجھتے ہوئے

کھا۔

"سب بھی مت سنا" وہ یکدم جھپکی سے بولی "میرے دل کو

کچھ ہونے لگا ہے۔ میرا دل بہت نازک ہو گیا ہے۔"

"دل کو نازک ہی رہنا چاہئے" میں نے کہا "ورنہ بہتر ہے

انسان دل کی جگہ سبک دھرم کا کوئی اچھا سا کثیف کر لے۔"

کافی اور سینٹو چرنے کر ہم واپسی ڈرائنگ روم میں ہی کمری

کے قریب آ بیٹھے۔ راجیل نے کمرے میں مذہم دو شئی رہنے دی اور

ہر دے ہٹا دے اس کمری سے سڑک نظر آتی تھی جس پر دونوں

طرف کیسی کہیں درخت لہرا رہے تھے گرین ہلٹ پر اوس چمک

رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی ویران سڑک سے گزر جاتی۔ بلندی

پر اس چھوٹے سے کمرے میں، ٹنگے اندھیرے میں ایک ہوم ویریہ

کے ساتھ بیٹھ کر بکلی سی خنکی میں باتیں کرتے ہوئے اس سڑک کا

نظارہ کرنا دل کو بہت سی خوشی دے رہا تھا۔ بعد چھپے آج بکلی چسکی

ی ہو گئی تھی۔ زندگی میں جیسے اصل دلکشی ہی آج پیدا ہوئی تھی۔

ہم دیر تک نو عمرو نوخیز، محبت کرنے والوں کی طرح باتیں

کرتے رہے اور وقت گزرنے کا پانی نہ چلا دہی باتیں جو برسوں

پہلے تشدد سی رہ گئی تھیں۔ آج ہم مل بیٹھے تھے تو جیسے درمیان سے

برسوں کی تلخ تاب ہو گئی تھی اور سلسلہ دہیں سے مل گیا تھا جہاں

سے نوا تھا۔ محبت محبت چیز ہے اور انسان محبت تر۔

ہم اس وقت چوکنے جب کال بلی تھی۔ اس وقت شاید سپید

سر لہو دار ہونے کو ہی تھا۔ راشد لوٹ آیا تھا۔ وہ تھا ہوا بھی تھا

لیکن پرجوش بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں چھ لے پہلے

آئے ہوئے صمان کی طرح نازم دیکھنے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" وہ حیرت سے بولا۔ پھر

راجیل سے مخاطب ہوا "ہم انہیں میرے بیڈ روم میں ہی سلا دیتیں

۔۔۔ میرا کوئی سیلینگ سوٹ ہی نہ دیتیں۔"

"تمہارا سیلینگ سوٹ؟" راجیل نے اسے گھورا "ہم جیسے

نازک اندام اور مختصر الودو تو جوان کا سیلینگ سوٹ انہیں دے

کر میں ان کا دم کٹنے کا خلوہ مول نہیں لے سکتی تھی۔"

راشد میری طرف دیکھ کر بڑی شرمندگی سے بولا "صاف بچنے

کا افضل بھائی! یہ جگہ۔۔۔ اور ہمارے حالات۔۔۔ آپ کے شایان

شایان نہیں ہیں۔ آپ کو کافی بے آراہی اٹھانی پڑی۔"

"کارڈاؤک راشد! میں نے جلدی سے کہا یہ حالات

۔۔۔ اور شایان شایان قسم کی اصطلاحیں میرے سامنے مت استعمال

کیا کہ۔۔۔ مجھے اگر سوتا ہوا تو میں بیس کیس میں ہونے پر۔۔۔ قالین پر

۔۔۔ بتاتی رہے۔۔۔ کیس بھی سو جانا۔ لیکن میں تو تم لوگوں سے جدید

مراہم کی خوشی میں رت چکا رہا تھا۔"

"یعنی آپ کو اپنے ہوٹل کے افتتاح سے نواہ ہم سے مل

بیٹنے کی خوشی ہے؟" راشد نے قدرے حیرت سے میری طرف

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دے "راجیل نے

کر اس کی طرف دیکھا "کیا کہا؟ ان کا ہوٹل؟"

"ہاں" راشد نے سر ہلایا "کیا انہوں نے تمہیں نہیں

جس ہوٹل میں میں ملازم ہوا ہوں وہ انہی کا ہے؟"

"نہیں۔ انہوں نے تو مجھے نہیں بتایا" راجیل نے مجھے

"میرے بھی۔۔۔ افضل بھائی تو بہت بڑے قوی ہو گئے

راشد مجھے مجھے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا

معلوم ہی نہیں تھا کہ میں درحقیقت کس کا ملازم ہونے جا رہا

اور اب ان کے بارے میں مزید معلومات کر کے آیا ہوں۔

کا دوبارہ بولا اور اور کرانی دونوں جگہ پہلے ہوئے ہیں۔ لیکن

را انپورٹ۔۔۔ انپورٹ ایک پورٹ۔۔۔ قسم میکنگ۔۔۔

ایلیٹ۔۔۔ کسٹمر کسٹمر۔۔۔ خشک۔۔۔ اب قانع اٹار

بھی۔۔۔ اور نہ جانے کیا کچھ گمان کمان پہلایا ہوا ہے۔

وہ چہرے ہیں جو ایک صاحب گلت میں ایک طرف کو جاتے

مجھے بتاتے ہیں۔ انہوں نے خود تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ کہہ رہے تھے میں بھی ذرا اختیار میں رہو تو

نے پوچھا "آج کل آپ کیا کر رہے ہیں۔ تو شرماتے ہوئے

میں ایسے ہی دو چار چھوٹے موٹے کا دوبارہ ہیں" راجیل۔

نقل آتارے ہوئے مجھے گھورا۔

"آخر اکساری بھی کوئی چیز ہے" میں نے لٹری سار

کر کہا پھر سادگی سے پوچھا "دیسے بانی داوے۔۔۔ آپ لوگ

ہاں کیا بڑا قوی صرف اسی کو سمجھا جاتا ہے جس کے پوتے

کا دوبارہ ہوں؟"

"مظفر فرمائے کی ضرورت نہیں ہے" راجیل مسکراتے

ہوئے "تمہیں معلوم ہے ہمارا یہ کپیکس نہیں ہے۔ بے شک

تم جیسا مودع نہیں دیکھا لیکن زندگی کی ہر آسائش تو

ہے۔ اور نہ بھی دیکھی ہوئی تب بھی شاید ہم میں سرور

کپیکس نہ ہوتا کیوں کہ ہر انسان کی اپنی اپنی سائیکالوجی

ہے۔ ہماری سائیکالوجی ایسی نہیں ہے میں تو صرف عمل

جاننے کے لئے پوچھ رہی تھی۔ تم خود بھی کہہ چکے ہو بات

ذوال کی نہیں ہوئی "ایک دوسرے کا حال جاننے کی ہوئی ہے۔

صاف۔۔۔ اتنی لمبی تقریر کی کیا ضرورت تھی" میں۔

تھکتے ہوئے کہا "میں طرکب کر رہا تھا۔ یو جی ذرا تم لوگوں

رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم دونوں میں کوئی کپیکس نہیں پایا۔

ختم۔ اب تم جان چمڑائے کے لئے ایسا بھی نہ

را جیل فوراً بولی "ہر انسان میں کپیکس تو کوئی نہ کوئی ضر

ہے۔ لیکن اب ہم تم سے بحث نہیں کریں گے اب تم برا

جگہ پاس ہو گئے ہو بلکہ ہماری چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ کمپ

سب سے بڑے کلائنٹ بھی تمہاری ہو۔ ہم تمہیں ناراض کر

"ہاں۔۔۔ احوال تو کرسی شہوں کرنے سے پہلے ہی تھا۔۔۔
قدے ضرب ہی انہی کے ساتھ ہوئے۔

"جس تو قبر تمہاری ایڈورڈا رنگ ایک اجنبی کھل لو۔ ایڈو والی طور پر
اسے چلانے کے لئے ہمارے اپنے کاروباروں کی پیلٹی کا کام ہی
کافی ہو گا۔ شہوں میں یہ گویا ایک اہم اجنبی شے ہوگی لیکن تم اسے
جتنی بھی دست دے سکو دے دے یہ تمہاری اپنی محنت اور
ملا جاتے پر منحصر ہو گا۔ مالی مسئلہ تمہیں کوئی نہ ہو گا۔"

راجیل نے ایک بار پھر مالی کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے
کہا "مالی! ہمیں ہماری اوقات پر ہی رہنے دو۔ ہم بہت کم کم میں
ہیں۔ ہمیں بڑی بڑی چھلانگیں لگانے کا بالکل شوق نہیں ہے۔"
"تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟ گلف کیا ہے؟" میں نے
اسے گھورا۔

"ہمیں۔۔۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔۔۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرنے
ہوئے بولی "کچھ ایسا محسوس ہو گا جیسے ہم پرانی شناسائیں سے پورا
پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"کیا اس 'جرم' پر تمہارے خلاف تحقیق ہوگی کہ تم
شناسائیں سے فائدہ اٹھا رہے ہو؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں
کہا۔

"بات اپنے احساس کی ہوتی ہے" راجیل سر جھکاتے ہوئے
بولی۔

"تمہاری قلمی کے لئے بتا دوں کہ اس میں شناسائیں سے
فائدہ اٹھانے والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اس اجنبی میں
سلیپنگ پارٹنر ہوں گا۔ محنت تمہاری ہوگی، 'ورم ہیرو'۔ فتح
قتضائیں قلمی کو شش کرنا کہ وہ نقصان میں نہ جائے تاکہ
تمہارے حضرت خمیر مطمئن نہ کیوں۔ ہم مہمانوں اور نوازشات
کی بات نہیں کر رہے۔ دو کا وہ باہمی افزائش کی طرح ایک کا وہ باہمی
منصوبے کی بات کر رہے ہیں۔ جس میں میں منافع کی امید پر سہارہ
کاری کر رہا ہوں یا ایک نیا پروجیکٹ ہے اور حدودش بڑھتی
ہے۔ تمہیں اس میں جان تو زحمت کرنا پڑے گی۔ کوئی احسان نہیں
ہو گا تم پر۔"

"تب ہم بار بار افکار کرتے رہیں گے تو تم کو کہے کہ غریب
دکھا رہے ہیں۔ لیکن فی الحال ہمیں افکار کے سوا کچھ سوچ بھی نہیں
رہا۔ سڑکیاں ہے کہ ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ ہمیں کوئی نام
اپنے موجودہ حالات سے بہت مطمئن ہیں۔ ہمیں کوئی حسرت یا
پریشانی نہیں ہے۔ لیکن اگر تم ہندو تب بھی ہمیں کچھ عرصہ سوچنے
دینے کا موقع ضرور دو۔ ابھی تو ہم اس اچھا کھانا ملاقات سے ہی
بوکھلائے ہوئے ہیں" راجیل ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"یہ جواب مناسب ہے" میں نے طمانیت سے سر ہلا دیا "ابھی
طرح سچو" سمجھو۔ اگر کچھ بلوا سڑاوا قسم کے دوست ہنر ہوں تو
ان سے بھی مشورہ کروں۔ ویسے مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا ساتھی

میل نہیں لے سکتا اور بگ باس کا کوئی پانچ نہیں ہو گا کہ وہ
ہمیں بات پر ناراض ہو جائے۔"

"ہاں۔۔۔ تو ٹھیک ہے" میں نے معنوی سنجیدگی سے سر ہلائے
"کچھ خیال میں ناراض ہونے کے لئے یہی موقع سب
زیادہ مناسب ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت ناراض ہو جاتا
ہو اور اشد کو تو کرسی سے برخواست کر دیتا ہوں۔"

کمرے میں ایک لمبے کے لئے سکوت چھا گیا۔ دونوں بہن
پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے مناسب وقت
دیکھا تاکہ یہ کوئی زنجیر کا کام کر سکے۔"

"دونوں منگروئے میں نے براہ راست راجیل کو مخاطب کیا۔
"راجی میں میرا کنسرکشن کا کام زیادہ اچھا نہیں چاہتا۔ قبیح
اور کام کا جو جو محنت زیادہ ہے وہ بہت سے شہوں کی عمرانی کر رہا
ہے۔ کنسرکشن کا شعبہ محض اوپر کی عمرانی کے لئے ہی بہت وقت
لا ہے۔ کنسرکشن کبھی چل تو رہی ہے لیکن اس طرح نہیں چل
سکتی جس طرح میں چاہتا ہوں۔ اس کے لئے بہت زیادہ رقم کی ضرورت ہے
کام کرنے والے ایک ایسے شخص کی جیسے بہت دنوں سے
موجود ہے جس پر میں آنکھیں بند کر کے احوال کر سکوں۔"

"ہوگی تو وہ بھی تو کرسی" راجیل نے سر ہلا دیا۔

"ہاں۔۔۔ تمہاری حیثیت لازم دائرہ کنسرکشن ہوگی لیکن تم تقریباً
تو عارضی ہو گے۔ صرف مجھے جواب دو کہ وہ کس اور میں لا اور میں
ملا گا۔"

"لیکن مجھے تو کنسرکشن کا کوئی تجربہ نہیں ہے" وہ بولا۔
"جس مقام پر میں تمہیں متعین کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے
غریب کی ضرورت نہیں۔ کام کرنے والی تو ساری مشینری موجود ہے۔
تمہیں صرف اس مشینری کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ اسے چالو رکھنا
ہو گا۔ تمہاری زیادہ جی ڈی ڈی ویاں صرف دو ہوں گی۔ باقی سب
انہی چھنی ہوں گی۔ ایک تو تمہیں صرف یہ دیکھنا ہو گا کہ کس کوئی
لگلا نہ ہونے پائے۔ دوسرے کس کام کرتے نہ پائے اصل میں
تم صرف مالک کے لئے کام کر رہے ہو گے۔"

"مجھے کنسرکشن سے خوف بھی نہ لگا ہے" راجیل کھڑے سے
لہجے میں بولا "کوئی آخری داؤ کے طور پر جس بلڈنگ کو اپنی ایریڈر
کچھ کر قیام کر رہے تھے وہی ان کی قبریں تھیں۔ تب سے میرے ذہن
میں خوف بند ہو گیا ہے۔"

"خیر۔ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے" میں نے
طولی سے کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان کے والد مرحوم کا ذکر کرتے پر
بہل ہو جائے۔ نہ ہو جائے میں نے راجیل کو مخاطب کیا "تمہیں
ایڈورڈا رنگ ایک اجنبی میں کام کرنے ہونے کا عرصہ ہو گیا؟"

"دو سال" اس نے جواب دیا۔
"1968ء تو آئی کیا ہو گا کہ اپنی ایڈورڈا رنگ ایک اجنبی چلا
کر ہے۔"

بننے کے لئے بھی جس اتنی سوچوں میں الجھا رہے گا۔
"تم سے ہوئے لوگ ہیں۔ سے ہوئے بھی اور قات پند
بھی" راشد ہوا۔

"چلو خیر میں نے جو تجربہ ہی پیش کیا ہے ان پر عمل در آمد کا
فیصلہ اگلی ملاقات کے لئے اخذ رکھتے ہیں" میں نے کہا "جلد ہی میں
خود دوبارہ کراچی آؤں گا تم دونوں کو لاہور بلاؤں گا پھر ہم
تفصیلات طے کریں گے یہ بات ہر حال طے ہے کہ تمہارا جواب
انتظار میں نہیں ہونا چاہئے۔"

راشد ہوا "آپ نے افتتاح کے بارے میں تو کچھ پرچہ جاری
نہیں۔"
"تم تو کوں سے تجویز مراسم کی جس عمل مرا کا افتتاح ہوا ہے
اس کے بعد میں ہوئی کے افتتاح کو بھل گیا ہوں" میں نے کہا۔
"تانا ہے تو خد ہی بتا دو کہ کیا ہوا؟"

"جست شاندار" راشد خوش و خوش سے ہوا "میں اس اعزاز
میں توجہ تک کسی ہوئی کا افتتاح نہیں ہوا۔" فتح شاہ نے دہی پانی
کی طرح ہنسا ہوا اور اس کا مہر خون ضرور طے گا۔"

پھر ایک لمحے کے وقف سے ہوا "لیکن آپ کی مدت کی
محسوس ہو رہی تھی۔ خصوصاً درانی پو گرام کے ساتھ ساتھ جو
تھانہ سے ملے پہل رہے تھے ان میں آپ کا بھی بار ذکر آپا سے
سے لوگ جو آپ سے تائبانہ واقف تھے وہ آپ سے ملنے کے
مشاق رہنے اور جو آپ کو جانتے تھے وہ آپ کو تلاش کرنے
رہے۔ کیوں کہ وہاں یہ خبر تو پھیل چکی تھی کہ آپ آئے ہوئے
ہیں۔ ہر کوئی پریشان تھا کہ آپ اس موقع پر کہاں تائب ہو گئے۔
خصوصاً ہم اشارستانہ آپ کو مدت پر چر رہی تھی اور تلاش کر رہی
تھی۔"

راشد نے فوراً ترجمہ فصول سے میری طرف دیکھا۔ راشد
اپنی دھن میں سادگی سے بات جاری رکھتے ہوئے ہوا "بلکہ ایک
ستانہ ہی کیا تین چاروں ہی ہو سکتی ہیں کئی ہوئی ہیں" بھی آپ کے
بارے میں بھی گرم خوشی سے پوچھ رہی تھی۔"

راشد نے سنی خیر انداز میں ہنسی سے ہوں سر ہلا کر راشد
دیکھ نہیں پایا۔ میں نے مثالی پیش کرنے کے سے انداز میں ہلکی
سے کہا "ستانہ کے سوا میری تو کسی سے شامانی نہیں۔ ستانہ سے
بھی اس لئے ہو گئی ہے کہ وہ کئی ایسی ظہن کی بددوش ہے جنہیں
میں قائل نہیں کر رہا ہوں بددوش میں تو اسٹوڈنٹ آجائے بھی نہیں۔ پس
آپ تائبانہ طور پر لوگ ذرا جانتے گئے ہیں اور تم مجھے کہہ دو سٹوڈنٹ
کی سوا کیا ہیں کہ ایسے انداز میں جانتے گئے ہیں۔"

راشد سادگی سے ہنسنے لگے میں ہوا "لیکن آپ خاص طور پر
خواتین میں کاغذ پائے معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے طویل سانس لے کر کہا "معمالی! اگر تم بھی خواتین
میں پام لہو نے کی بات کر رہے ہو تو وہاں ہر دھن پام لہو آ رہا ہے

جس کے پاس پیر ہو۔ اگر وہاں کسی کی دولت مندی کے قے
ہو جائی تو وہ کسی سے ملنے سے پہلے ہی پام لہو جانا چاہے
اصلی مقاصد کو جانچنے کا تائبانہ عزم یہ ہونا ہے کہ اس نے
بیرونی کو کو خوشی لے کر دی ہے۔ کس پھوٹی موٹی مکر خوش
اور اکادہ کو پیش قیمت گاڑی لے کر دی ہے۔ کس کی خدمت
ڈائمنڈ کا کوئی سینڈ فوٹو پیش کیا ہے۔"

"ایک بے چاری قسم اندیشہ کا کیا ذکر ہے۔" را
مر جھک کر ہوئی "توجہ کل تو میری دھنا کا تقریباً ایک چلن ہے
ذرا مراسم کی نوعیت کا فرق آجائے بددوش سے ملنے تو کیا ہیں۔"
"یہ بھی تم نے ٹھیک ہی کہا" میں نے سر ہلا کر ہنسی
اٹھتے ہوئے کہا "میں میں چلا ہوں۔ فتح شاہ خیر ان ہو گا کہ
کھل تائب ہو گیا ہوں۔"

"میں آپ کھل جائیوں گے" راشد نے پوچھا۔
"میں سوچ رہا ہوں اب جا کر ذرا اپنے ہوئی میں بھی مل
دیکھ لیں۔ آرام بھی ہو جائے گا اور ہوئی کے سیارہ سوس
کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

راشد مسکراتے ہوئے ہوا "وہاں کئی کرا تالی
ہے۔ ایمر جی کے لئے بھی جو چار پانچ کرے رکھے جاتے ہیں
بھی بیورو کسی نہ کسی کو دینے چکے ہیں۔ توجہ ہی سے آگلی
شروع ہو گئی ہے اتنی ہی بعد تو دوسرے فصول سے آئے ہو
امرا ذی صمان ہیں۔ میں خود کرے کرانے پر بھی گئے ہیں۔
کہ وہاں جگہ ملتی مشکل ہے۔ اگر آپ واقعی آرام کرنا چاہتے ہیں
آپ کے حق میں بہتر یہ ہے کہ میں غصے رہوں۔"

میں غصہ ہی سانس لے کر نہ کیا۔ راشد کو بھی وہی خیال تم
ایک لڑ پہلے مجھے آجکا تھانہ میں کرولی "انسان جیت پکڑا پکڑا
اس قسم کے واقعات سے کافی قائل بنی طور پر پکڑا سکتا ہے۔
کے ایک کو نہ تو ہوئی میں کھانا نصیب ہوا اور نہ دیر رہا۔
"میں نے تو میں اپنی اٹاک کو بھی۔ اپنی اٹاک تم
بھگتا۔ ہر وقت دونوں ہاتھ بھاڑ کر ایک مجلس کی طرح ازم
زندگی کے میدان میں کورے کو تیار رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"یعنی تم نے پہلے ہی بددوشت صبرت پکڑی ہوئی ہے
جیسا کہ کو کو کر" راشد ہلکی۔

"تم بات پھر اپنی طرف لے آؤ" میں نے اب واقعی چلا ہوا
میں نے دودھانے کی طرف دھرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے دھ
کی مدت کو خوش کی لیکن مجھے اب واقعی شفیق سے ملنے ہوئی
مازہ لینے اور مدت سے کا دھاری معاملات پر چارہ خیال کرنے
لے جاتا تھا اس لئے میں نے مایانہ لے لی۔

دوسرے روز شام کو کراچی سے میری واپسی ممکن ہو سکی
اس دوران مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی۔ اندر بددوش
شاہ کے علاوہ راشد اور سیلہ رمضان بھی مجھے چھوڑ

میں ایک شخص آپ کے لئے دے گیا تھا۔ یہی وہی چمک آپ میں نے کر لیا ہے اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ صرف ایک ویڈیو ریٹ ہے۔"

"ہون تو وہ؟" میں نے پکٹ لیتے ہوئے پوچھا۔
"اس نے ان میں سے کچھ اس قسم کا نام بتایا تھا" طارق خان نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔" میں مری سانس لے کر رہ گیا۔ اس بندہ نما، مختصر الوجود اور بڑا سرا انسان کی صورت میرے ذہن میں ابھر آئی۔

"اس کی تصویر دیکھا میں نے؟" میں نے پوچھا۔
"جیسے ہی یہ پکٹ دے کر آگے چلا گیا تھا" طارق خان بولا اور اس نے جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

کوئی کے گیت میں دونوں طرف دو کمرے فٹ تھے جن کے اینس گیت کے آرائشی دائروں میں نظر میں آتے تھے۔ بے توازن مودی کمرے تھے گیت ی میں گئے ہوئے ایک شخص سے

پہلے بن کو چھوٹے ہی کام شروع کر دیتے تھے کوئی بھی شخص جو طارق خان کے لئے آجی ہوتا کسی سلسلے میں اختصار کرتا ہوا

گیت تک آتا یا کوئی کے آس پاس منڈلا تا نظر آتا کوئی چیز دینے آتا یا مجھ سے لے کر خرابی ظاہر کرتا، مودی کمرے میں کسی نہ کسی زادی سے اس کی تصویر اور کچھ نہ کچھ نکل و حرکت محفوظ

ہو جاتی تھی۔ طارق خان اسی کے ذریعے تیار کیا گیا ایک پرنٹ میری طرف بڑھا رہا تھا۔ مجھے تصویر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لئے نام ہی کافی تھا۔

نام میں نے طارق خان سے تصویر لے لے۔ وہ اسے نہ ہی تھا۔ ایک کیدنگ کی کڑی سے سرنگھل کر وہ پکٹ طارق خان کی طرف بڑھا رہا تھا اور اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے یوں

استراحت سے انداز میں مسکرا رہا تھا جسے اسے علم ہو کہ کبیر اس کا عکس محفوظ کر رہا ہے اور یہ اس کے لئے ایک پکٹ نہ ہی حرکت ہو۔

"کوئی پیام تو نہیں دیا اس نے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں سراسر" طارق خان بولا "جیسے ہی پکٹ دیا اور کہا کہ اپنے صاحب کو دے دیتا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا۔"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "طارق خان اتم نے اس شخص کی تصویر غور سے دیکھی ہے؟"

"جس کی شکل ذہن میں رکھنا۔ آئندہ یہ قسمیں یہاں کہیں آس پاس بھی نظر نہ آئے۔" میں نے کہا۔
"اس مقصد کے لئے ناک و ناک میں کئی ہی مانی پڑے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اسے جان سے نہیں مارنا ہے۔ زعمہ پکڑا ہے اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ جتنا حقیر، کمزور اور مختصر الوجود نظر آتا ہے

تو ہے۔ قلمی لوگوں کا فائدہ مجھ سے پہلے ہی واپس روانہ ہو چکا اور ساتھ انہی کے ساتھ چلی گئی تھی۔

شیخ شاہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ راشد اور راجہ سے میرا پرانا قلمی لکھ لیا گیا ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ راشد بھی ویسے

کیا پ لوگوں میں سے ایک تھا جن کی ہمیں تلاش رہتی تھی۔ ہم پر ہم آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتے تھے اور جو ہمارے

بازار ثابت ہو سکتے تھے میں نے شیخ کو یہ بھی بتایا تھا کہ راشد نے ایسا بڑا کام ایک شون ثابت ہو سکتا تھا اور میں کنسرکشن کا

بے اس کے سپرد کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میں نے شیخ شاہ کو بت کر دی۔ چھی کہ اس سلسلے میں ابھی سے اسے ضروری رہنمائی

میں کر رہا تھا۔ شیخ شاہ نے شیخ کو یہ بھی بتایا تھا کہ راشد نے شیخ کی طرح

ارت بندی سے سر ملایا تھا۔ کسی بڑے عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں مگر پچھتاوا محسوس کرتا تھا۔ ناکر میں سونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ان کام پر طارق خان اجازت لے کر اندر گیا۔ طارق

ایک لمبا بڑا "ادب" سرخ و سفید توئی فسادہ زیادہ تر

پریا گت ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ سلسلے سے ایک عام سیدھا سا

ان پڑھ سا مادیاتی چیز کیدار نظر آتا تھا جیسے عام طور پر کوئی نہیں

گیت پر بیٹھے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت وہ ایسا عام سا توئی

ہو گیا۔ ایک سابق کمانڈر تھا۔ گیت پر بھی وہ گیت کی ہاؤس میں ایک

آئی ہدیہ دہشت درختہ راکٹ رکھ کر بیٹھا تھا جو انتہائی قریب

لے کر تقریباً چار سو سو گز کے فاصلے تک یکساں خطرناک

ہاؤس کے علاوہ گیت ہاؤس میں اس کے پاس بھی مشین گن

وہی رکھی رہتی تھی۔ اکثر کام پر اس کا کوئی کے دوسرے

بہل سے اور بڑا سر پر بانی تمام ساتھیوں سے رابطہ رہتا تھا۔

دست کے وقت وہ قریب ترین لوگوں کو فوری طور پر طلب کر سکتا

اسی طرح کا وہ مرا توئی ظاہر علی فسادہ دونوں بڑوں بھائی

نہ تھے لیکن درحقیقت وہ صرف گھر سے دوست تھے۔ ظاہر علی بھی

نہ پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ ایک دن میں رہتا تھا اور دو مرا رات

بہل دونوں کا بندوبست میں نے اس دن کے بعد سے کیا تھا

پہلے ساتھیوں کے ایک بڑے خطرناک گروہ کا سردار اپنے

نیکل کے ہمراہ میرے کتوں کو ڈیر اکو گوشت کھلانے اور

لیڈا کو بلاک کرنے کے بعد گھر میں داخل ہونے میں کامیاب

ہوا تھا۔ قیصر ملک نے صحت ہماری معاونہ دے کر اس کی خدمات

میں کی تھیں۔ اتفاق سے اس کا نام محمد طارق تھا۔ اور اس کے

لئے طارق خان نامی یہ کام کا توئی مل گیا تھا۔ ظاہر علی کو وہی

ڈاکر آتا تھا۔

طارق خان کو میں نے اسٹڈی میں بلالیا۔ وہ ایک چھوٹا سا

نیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "ہر! یہ آپ کی غیر موجودگی

ہوئی تھی۔ فلم انڈسٹری کے ساتھ تجارت کی گئی تھی۔ اس نوجوان
جیتنے کی کوشش کی تھی اس مذہب میں گزرا ہے تھے تب اس کی جان کو
زندگی سے ہٹا دیا تھا۔

اس قسم کی اذیت کے تو چند لمے گزرائے کا تصور ہی ملتا ہے
ہوتا ہے۔ اس نوجوان پر وہ چند کھینے کس طرح گزرتے ہیں۔
اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ شاید ہرمل اس نے موت
دعا کی ہوگی لیکن موت اسے صدیوں کے قافلے پر کھڑی نظر
ہوئی۔ موت اس وقت اس کے لئے ایک حسین نعت ہوئی
سے ہم زندگی بھر بھاگتے رہے ہیں جس سے بچنے کی تدبیر کر
رہے ہیں۔

میں اپنے آپ کو بہت مضبوط اعضاء کا مالک سمجھتا تھا۔
خود میرے اشارے پر کسی درود صفت اور سفاک انسانوں کو سید
کرنے کے لئے ان کی پٹائی کی گئی تھی لیکن تشدد اور اذیت در
کے اس انداز اور ان ہتھیاروں کی میں نے اپنے کسی آدمی کو
اجازت نہیں دی تھی حالانکہ جو لوگ اس شخص میں پڑ کر میر
ہیں لائے گئے تھے وہ تو اپنے اعمال کے پیش نظر اس سلوک
مستحق بھی قرار پاتے تھے۔ پھر بھی میں نے اپنے کسی آدمی کو ان
ساتھ اس قسم کے سلوک کی اجازت نہیں کی کی اجازت نہیں
تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ بیشک اس حد
جائے بغیر ہی کام چل گیا تھا۔

دور وہ اپنے شکار کو اذیت نہیں دیتا۔ فطرت نے اسے جو
طریقہ سکھایا ہے "اسی سیدھے سادے انداز میں وہ اسے ہلاک
کرتا ہے اور اگر وہ اس کی خوراک ہے تو اسے کھا لیتا ہے۔ وہ ان
رسالی کے نت سننے "زادہ سے زیادہ کرب انگیز طریقے نہیں
اور انہیں اپنے ہم جنسوں پر نہیں آزماتا۔ انہیں بے بس کر
ان طریقوں سے لذت اندوز نہیں ہوتا۔ یہ منات صرف انسان
میں ہی پائی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود دور وہ خواہ مخواہ بدنام
نہیں جہاں کہیں بھی ظلم و تشدد اور برکت و سفاکی کی مثال
ہوتی ہے ہم عمر دور زندگی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

میں نے اپنے آدمیوں کو اس لئے بھی بھی اس طرف را
ہونے کا موقع نہیں دیا تھا کہ اکثر انسانوں میں اذیت رسالی کی
ہم سے ہی پاس چھپی ہوتی ہے۔ اگر انہیں اکڑو پیشتر کسی کو اذیت
دینے کے مواقع پیشتر آنے لگیں تو ان میں یہ پاس باقاعدہ طور
جاگ اٹھتی ہے ان کی طلب اور ضرورت بن جاتی ہے۔
فل میں انہیں تسکین ملتی ہے۔ اگر انہیں اس کا موقع ملے
بھیجلائے ہوئے اور بے چین رہتے ہیں۔ شکار کی تلاش میں
ہیں۔ ایک غیر انسانی قسم کی خورکاری ان کی فطرت کا حصہ بن
چکا ہے۔
فلم ختم ہوئی تب بھی میں دیر تک تم سمجھا رہا تھا
تھیلیاں پیسے میں تر تھیں اور کینیاں سنسنی دہی تھیں۔

حقیقت میں دیکھا ہرگز نہیں ہے۔ بہت سی پراسرار سی چیز ہے اور
ہریت انگیز طور پر طاقتور اور پھر تپتا ہے۔ اس کے بارے میں قطعاً
کسی خوش قسمی میں جھٹلنا نہ دینا اور اسے بالکل اسی طرح قابو میں
کرنے کی کوشش کرنا جس طرح شیر "چیتے یا کسی اور خطرناک
دور سے کو قابو میں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کچھ کے "اگ
"بالکل کچھ کچھ کچھ" طارق خان نے جواب دیا اور میرا اشارہ
باکر مستعدی سے غالتفنی انداز میں سیلوٹ کر کے رخصت
ہو گیا۔

میں گو کہ بہت تھکا ہوا تھا۔ دو رات سے سو نہیں سکا تھا اور
اب تیسری رات بھی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود
محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر سہ پہر کیسٹ دی سی آتش لگا کر
بند کیا۔

وہ کیسٹ کیا تھی "گزہ فیزی کا ایک ایسا عجیب ذریعہ تھی جس
کے آثار کو الفاظ میں صحیح طور پر بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ ایک
انسان پر تشدد کی بڑی صاف اور تفصیلی عکاسی تھی جس میں اس
کی اذیت ناک آوازیں بھی تمام تر جزئیات کے ساتھ ریکارڈ کی گئی
تھیں۔

تشدد کے بہت سے مظاہرے میں نے بھی دیکھے تھے۔ شاید
آپ نے بھی دیکھے ہوں۔ تھانوں "ذیر زمین حکومت خانوں اور دنیا
بر کی تھیر پولیس کے مراکز میں انسانوں پر ہونے والے تشدد اور
اذیت رسالی کے قہقہے بھی منظر عام پر آتے رہے ہیں لیکن اس قسم
کے واقعات مکمل مول انداز میں پڑھ لیا اور بات ہے "نما
اتہام سے تجارت کی گئی ایک فلم دیکھنا اور بات۔

فلم میں ماہرانہ فلم بندی کی تمام تکنیک استعمال کی گئی تھی۔
نام زادے پر گوز کے گئے تھے۔ لاش اور سلاخ کے تمام آثار
سے پورا پورا کام لیا گیا تھا۔ جس طرح اس شخص کے جسم کے ایک
ایک ریشے کو مرحلہ وار اذیت دی جا رہی تھی وہ منظر گویا میں
حقیقت میں دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ جیسے میری آنکھوں کے سامنے ہو
رہا تھا۔

وہ ایک جوان رہتا تھا جس کے بدن سے ایک ایک بال نوجوان
میا۔ اس کے ناخن کھینچے گئے اسے بجلی کے جھکے دئے گئے۔ اس
کا جسم دھتکتے تھانوں سے چھیدا گیا۔ اس کی ہڈیوں کے جوڑ توڑے
گئے اس کے اعضا کو جھڑیوں سے آہستہ آہستہ پھل کر گودے
میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے بچے کچھ بدن میں بھیجیں گاڑی گئیں۔
آنکھوں میں سلاخیاں گھونسی گئیں۔ پھر تشدد کے کچھ ایسے شرمناک
فریقے ادا کر کے گئے کہ اگر کسی مجبور کے تحت اس کے سارے
زخم بھر جاتے اور وہ زندہ بچ جاتا تب بھی شاید وہ دنیا کو نہ دکھانا اور
اپنی زندگی گزارنا پسند نہ کرتا۔ پھر اس کے چہرے پر ہلڈے سے چمکے
کا کر ان میں مر جیس بھر دی گئیں۔ آخر کار وہ سک سک کر مر گیا
اور اس کے ساتھ ہی فلم ختم ہو گئی۔ ان دنوں کیسٹ ایک گھنٹہ کی

اس کی شخصیت میں وہ کشش اور تمام خیالیں موجود تھیں جو ہمارے ہاں محض کسی کو کامیاب سیاستدان بناتی ہیں۔ لیکن وہ تو اپوزیشن میں شمار ہوا تھا اور نہ ہی صحیح معنوں میں اسے حکومت کا حامی کیا گیا سکا تھا۔ شاید وہ اپنی کوئی انگلیسی لائن بنانا تھا۔

اس طرح بظاہر نادر انگلی کی سیاست کرنے والے کا ہماری سیاست میں کیا مستقبل تھا اس کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تاہم ایک امکان یہ نظر آتا تھا کہ شاید پہلے وہ اپنا وزن بنانا تھا کہ پھر جس پلڑے میں بھی کرے وہاں اس کی نمایاں حیثیت اور اہمیت ہو۔ شاید وہ مرحلہ زیادہ دور نہیں تھا جب اسے قتل کر دیا گیا۔

اس کا قتل ایک معاہدہ کر رہا تھا۔ آئندہ اور کمرے رنج کا اعلان بھی لے گیا تھا۔ کوئی اس کے قتل کا الزام کسی پر رکھ رہا تھا اور کوئی کسی پر۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے حکومتی پائلٹ نے قتل کر لیا تھا کہ نیک مستقبل میں وہ سیاسی میدان میں اس کے لئے بڑا خلوص بنے والا تھا جبکہ دوسروں کے بیانات آتے تھے کہ مستحل کا تو ذہنی جہاد حکومتی پائلٹ ہی کی طرف تھا لیکن وہ اس کے اعلان کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر اسے حکومتی پائلٹ نے قتل نہیں کر لیا تھا تب بھی ذمے داری اسی پر آتی تھی۔ یہ اس حکومت کی باہلی تھی کہ ایک ایسے اہم تجربے ہوئے سیاستدان نوجوان کو اس پر اصرار اور ہیمنڈ انداز میں قتل کر دیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اس پائلٹ پر جابر تھا جس سے وہ ماضی میں علیحدہ ہوا تھا۔ حکومتی سطحوں کا دینے سخت معذرت خواہ تھا۔ شاید شوکت کے قتل کی تحقیقات کے لئے ایک خصوصی ٹریبونل بھی تشکیل دیا گیا تھا۔ چند گرفتاریاں بھی عمل میں آئی تھیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا تھا۔

بمردی ہوا تھا جو ہمارے ہاں اکثر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے واقعات پر رفتہ رفتہ وقت کی دھمیل جم جاتی ہے۔ اس پر بھی جم گئی۔ لوگ اسے بھی جلد ہی بھول گئے۔ بنگلے بنگلے ہو گئے زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ گلشن کا ادوار چلا رہا۔ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ گلاب کی موت سے جو غلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ مظلوم نہیں غلام واقعی پیدا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اگر پیدا ہوتا ہے تو وہ پتیلیاں کسی نہ کسی طرح پُر ہو جاتا ہے مگر تو رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پر آ جاتا ہے۔ دنیا شاید ایک سنہرے رہے۔ جب اس میں پہلے جتنی ہے تو لگتا ہے سب کچھ اس میں رہ جاتے گا لیکن رفتہ رفتہ یہ صفت پر سکون ہو جاتا ہے۔ سسے ہوئے شیخے کو لے کھدروں سے نکل کر اپنی حوٹوں کی طرف رواں ہو جاتے ہیں۔

چند ماہ میں ہی لوگ اس واقعے کو تقریباً بھول گئے تھے لیکن اب یہ کیسٹ مجھے بھجوا دی گئی تھی۔ وہ بھی اے ن کے ہاتھ جو پہلے ہی میرے لئے ایک سما ہوا تھا۔ میرے لئے پریشان کن سوال یہ تھا کہ یہ کیسٹ مجھے کیوں بھیجی گئی تھی؟ میرا تو سیاست سے

بائی کی وہ ہولناک کارروائی باغی حکم تو میں نے انجام دی ہے۔ جن کے چوں پر اگلے تھیلوں کی طرح کے سیاہ خاب چڑھے تھے۔ صرف آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے۔ ان کے چوں کی ایسی بھی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے کچھ احساس ہوتا تھا کہ وہ انسانی منہات سے عاری ہستی لب ختم کے جلا تھے اور ان کے لئے یہ ساری کارروائی ایک نئی کا حد تھی۔ نوجوان کو بچے میں کر کے جس سکون اور پاک سے انہوں نے سب کچھ کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے لئے یہ کوئی نیا کام نہیں تھا۔ انہیں اس کا طویل تجربہ تھا۔ باجگے سارا عمل کیا گیا تھا وہ کوئی طویل و مرضی بال مظلوم ہوا جس کی ہمت بہت نیچی تھی۔ وہ ایک ضرورت قسم کا حقارت نہ مظلوم ہوتا تھا۔ وہاں انہیں رسانی کے نہ جانے کتنے نکات روانہات موجود تھے۔ قسم میں سے ایسی چیزوں کی جھلک بھی ملتی رہی تھی جن کی اس نوجوان پر آئندہ جانے کی نوبت ہی نہ آ سکی تھی۔ صرف کیا نہیں وہاں شاید عہدہ کی بھی غفلت انتظامات موجود تھے۔

لیکن میری جہتوں سے پیچھے چھوٹے یا کینیاں سنسانے کی جھلک بھی سوچیں نہیں تھیں۔ میں تو اس لئے بھی دم بخود رہ گیا کہ وہ نوجوان ایک جانی بچائی سیاسی شخصیت تھا۔ مجھے سیاست کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں سیاستدانوں کے بیانات وغیرہ بھی لی خاص توجہ سے نہیں پڑھتا تھا۔ میرا ان لوگوں پر بے اعتبار نہ چکا تھا لیکن اس نوجوان کو میں نے اس لئے پہچان لیا تھا کہ چند پہلے کچھ دن کے لئے اخبارات اس کے ذکر سے بھر گئے تھے۔

ایک موزنڈ اند میرے اس کی سرخ شدہ لاش شہر کی ایک رات قریبی سڑک پر پائی گئی تھی اور اس کے بھونک کے کئی پہلے بڑے شہلوں میں ہنگامے شوع ہو گئے تھے۔ جن پر جلی نکلے سے قابو پایا جاسکا تھا۔ وہ دولت مند والدین کا بچہ تھا۔ ایک لٹ اپنے شاندار مکان میں اپنے بیڈ روم میں سوئے گیا اور صبح نہ بلیا گیا۔ اس کے دو دن بعد ہی سڑک پر اس کی سرخ شدہ لاش پڑی۔

اس کا نام شاہد شوکت تھا۔ وہ ایک اہم تجربا ہوا نوجوان سیاستدان تھا۔ تعلیمی اداروں میں ہر سیاسی جماعت کی ذیلی تنظیم اور موجود ہوتی ہے۔ کالج کے زمانے میں شاہد شوکت بھی ایسی ہی کی تنظیم کا سرگرم لیڈر تھا۔ بعد میں اس کے اپنے سیاسی دوسروں سے کچھ اختلافات ہو گئے اور اس نے اپنی ایک انگلیسی پائلٹ

پر کئی سال پہلے کی بات تھی۔ تب سے وہ میری سے اپنے کام لگا ہوا تھا اور اس نے اپنی نو فیز سیاسی پائلٹ کو کافی منظم اور عمل بنایا تھا۔ نوجوان تیزی سے اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

"چہ۔ چہ۔" میں نے معنوی تانت کا اظہار کیا اور
محبت اور منگائی کی جنگ میں پیش منگائی جیت جاتی ہے۔ اسی نے
میں نے جنہیں پار تشریب میں اپنی انجی کھلنے کا شوق ملا
حالات کچھ تو متروک ہو جائیں گے۔ محبت میں انسان کو دن میں کم از
دو چار ٹرک کا انفرانت کرنے کے قابل تو ہونا چاہئے۔"

"اور جو دو چار ٹرک کا انفرانت کر سکے اسے محبت کا
حق نہیں؟"

"حق تو اسے بھی حاصل ہے جس نے اسے جانے کہ گلابی
ظہروں سے بار بار ٹیلیفون کی طرف نہ دیکھے بلکہ صرف ٹھنڈی
ٹھنڈی آہیں بھرنے پر اکتفا کہے۔ غم ناک قسم کے اظہار
بڑے درد ناک قسم کے اظہار جمع کہے۔ سلائی کڑھا
کرے۔ کچے پر پوتے پوتے پھول کاڑھے جن کے درمیان تو
کم" لگتا ہو۔" میں نے شوق دیا۔

"میرا اب زیادہ مت چکو اور سوجاؤ۔ تمہاری تو آواز میں
بول رہی ہے۔ میں نے خواہ تو ادا ہی جسیں ڈسٹرب کیا وہ بولے۔
"اگر دن میں دو تین مرتبہ اسی طرح بات کرنا تو ڈسٹرب
ہوگا تو تمہاری بیوی سہائی ہوگی" میں نے درخواست کی۔
"نہر کا سارا سارا سالانہ بک جانے کا فون کاٹل لو اور
میں۔"

"کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد میرے ہو گئے کسی بھی
پنی سوٹ میں بھٹل ہو جانا۔ وہاں ہر چیز پنی پانی اور مفت
گی۔ ٹیلیفون بھی خواہ وہ بھر کر پنی رہا۔"

"میں نہیں۔ اپنے پاس ہی رکھ اپنا ہو گئے۔ ہم اپنے گرا
کے کلیٹ میں ہی اچھے ہیں۔" وہ فوراً ہی "کی" چمچا ادا ملا۔
"مے سنو تو کسی۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "تھوڑی
اور باتیں کرو۔ میرا دل بہت ادا ہے۔"

"اسی لئے اتنا چک رہے ہو؟"
"بعض لوگ اداسی کو جانے کے لئے بہت زیادہ بولتے ہیں
بعض لوگ بہت زیادہ بولنے کی وجہ سے اداس ہو جاتے ہیں
لے کہا۔

"یعنی یہ بات ملے ہے کہ بیشتر لوگ بہت زیادہ ہی بول
ہیں۔ کسی بھی بولنے۔"
"ہاں۔ اور میرا شوق ہے کہ تم بھی زیادہ بولا کرو۔ کم
میرے ساتھ۔"

"میں نہیں۔ میرے پاس کھوپڑی کاٹو نہیں ہے۔ میں فون
کڑی بولے۔ تم بھی واقعی اب سوجاؤ۔"
"بھولنے کے لئے کھوپڑی کی ضرورت کہاں پڑتی ہے؟ میں نہ
بلائے رہنا چاہتے۔" میں نے شوق دیا۔

"ہر ایک کو اپنے طور طریقے مت بتایا کرو۔" وہ حرمی
کے ساتھ ہوئی۔ "چمچا ادا ملا۔ اگر جسیں تو تھی ہو تو بھی کھا

کوئی تعلق نہیں تھا۔ شہر شوکت سے میری دور کی بھی ملائی
نہیں تھی۔ مجھے اس کی سیاست اس کے ضلوات سے بھی کوئی
سودا نہیں تھا۔ مجھے نہ تو اس سے کوئی ہمدردی رہی تھی اور نہ ہی
پر غاش۔ البتہ یہ کیسٹ دیکھنے کے بعد مجھے انسانی بنیادوں پر اس
سے ضرور ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا
گیا وہ کسی بھی اعتبار سے قابل معافی نہیں تھا۔ خواہ اس کا جواز
کچھ بھی دیا ہو۔ اسے سیدھے سادے انداز میں گولی مادی گئی ہوئی
تو شاید یہ میری فکریں ایسا غیر معمولی واقعہ نہ ہو۔ ہر دور کے
انسانوں کی باتیں اس دنیا میں آئے دن کسی نہ کسی رقبہ کی
بیسٹ چڑھتی ہی رہتی ہیں۔

میں نے اس سلسلے میں بتنا بھی سوجا۔ "بھنسن چڑھتی ہی گئی۔ تنکا
ہوا ذہن مزید تھکتا چلا گیا۔ آخر کار میں نے سوالوں کو ذہن سے
جھٹکنے کی کوشش کی اور سونے کے لئے بیڈ روم میں چلا گیا۔ بیڈ
ڈانٹ کی طرف سے اس قسم کی کوئی حرکت ہوئی تھی تو مٹھا اس کے
فوراً بعد میرا بدمعاش مل جانے کے لئے انیم حرف انڈی کا فون آجاتا
تھا اور وہ مجھے کپڑے کے لئے مکالمے بازی شروع کر دیتا تھا۔ لیکن
آج اس کا بھی فون نہیں آیا۔

میں اس وقت جب پینڈ کی دیوی بے میری طرف ایک توجہ
قدم ہی بڑھایا تھا۔ فون کی غشی بج اٹھی۔ انیم حرف انڈی کی عمر شاید
بہت لمبی تھی۔ شیطان کی عمر لمبی ہی ہوتی ہے۔ اور انیم کسی شیطان
سے کم نہیں تھا۔ نگر میں نے ریمو ر اٹھا یا تو رگ دوپے میں ایک اور
ی طرح کی سنسنی پھیل گئی۔ سدری طرف راہ چلے تھی۔

"میں بہت دور سے سوچ رہی تھی۔" اس کے لیے میں
شرملا پین بھی تھا اور جھپکا ہٹ بھی۔ "کہ اب تم لاہور پہنچ گئے
ہو گے۔ اب تم نے شکار لیا ہو گا۔ اب کھانا کھایا ہو گا۔ اب
سونے کے لئے لیٹ گئے ہو گے۔ ہر لمحہ دل چاہتا رہا کہ جسیں فون
کدوں لیکن ایک عجیب سی جھپکا ہٹ انج رہی کہ کہیں تم جاتے ہی
سوز گئے ہو۔ تم کچھ ہوئے ہو گے۔ کہیں میں تمہارے لئے مزید
بے آرامی کا سبب نہ بنوں۔"

"وہ جسکے تو انداز ہی نہیں ہو سکا کہ تم اتنی باکلف قسم
کی چیزیں کرتی ہو۔" میں نے خوش دلی سے جینکے کی کوشش کی "تم تو کما
کرتی نہیں کہ محبت میں ایک دوسرے کو قبر سے بھی بھیج کر نکال
لیا جاتا ہے۔"

"میں تو نہ جانتے کیا کچھ کہا کرتی تھی۔ کیا اس کرتی ہیں تم؟
ہوئے سے نہیں تو پیسے تمہاری بے آرامی کے علاوہ اپنی اوقات کا
بھی خیال تھا۔ ایک ملازمت پیشہ لڑکی کو ڈاکٹر ڈانٹا کھا پر ٹرک
کل کرتے ہوئے ذرا سوچنا پڑتا ہے نا۔ خصوصاً جب کہ یہ بھی
اندیشہ ہو کہ لائن ختم کے بعد فون بند کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔
نہ چاہئے ہوئے بھی خیال آجاتا ہے کہ جب مل آئے گا تو آنکھوں
کے سامنے آئے بچے نکلیں گے۔"

یہ بڑی زندگی بھر تب کی تیز رہے گی۔ کیا آپ اس گناہ گار پر یہ احسان فرما سکتے ہیں؟

گنہگار واقعی اچھی اداکار ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی گنہگار کا یہاں ملتا تھا۔ ایسا زندہ دست طرح سوسا تھا لیکن میں کبھی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔

میں نے توازد بدل کر کہا ۳ گناہ گار فرادی! تم نے اب ٹیلیجن پر زنجیر بدل دلائی ہے تو ہم تمہاری فریاد ضرور حل اٹھی تھیں۔ پتھر میں کے کہیں ازراہ تو ازراش میں جلا ملاقات کا مروج مطالکا جاتا ہے گا۔ ایسا کہ کہ مذہب سوسا بعد آج آج۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اس نے سکون سے پوچھا۔
"کیا کبھی ہو گا کہ فرادی! میں نے بدستور بارگاہِ نبی میں
کا محل اٹھی ہزاروں سال سے زندہ ہیں۔ اور ہر دور میں زندہ
رہیں گے۔ آجنا کہ کہ لیتا۔"

"دو تھے نہ" "کدم وہ اپنے اصل لیے میں بولی صاب اپنی
اصلی توازد میں بھی بول لو۔ کان ترس گئے ہیں سننے کو۔ تم تو واقعی
بہت بڑے توی ہوئے جا رہے ہو۔ فلم کے پراشار سے بھی
جو حق جاری ہے تمہاری مصروفیت ہم وہاں تمہاری خاطر تمہارے
ہو گئی کے افتتاح میں گئے اور تم اس طرح لے چھے سر راہ کسی
ڈاکٹر کو اپنا مریض لیا گیا ہو۔ اور مریض بھی ایسا جس نے کچل چھ
ملا قاتوں کی فیس ادا نہ کی ہو۔ اور پہلی رات تو تم سلام دعا کے بعد
ی عتاب ہو گئے تھے میں نے سوچا تھا اس کے بارے میں تو تم سے
لاہور چل کر ہی پوچھوں گی۔ کہاں عتاب ہو گئے تھے؟ کس سے لے
چلے گئے تھے؟"

"ہم چھ بے جا رہے کس سے لے جاسکتے ہیں؟ کسی اعم
فکس والے سے، کسی ایکساٹو والے سے، کسی وکیل سے، کسی اور
حکم کے بیٹھ سے۔ اور بھلا ہمیں کون بلا سکتا ہے؟ میں نے
ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہم کوئی فلمی ہیرو تو موزی ہیں کہ ایک
گنہ گار فریڈ کو ہو جس کی لابی میں کئی ہیرو جھڑک رہے ہوں۔ لے
سو ٹنگ پول پر چلے جائیں۔ تیری گھر پر انتظار کر رہی ہو اور نہ کسی
مری یا ایٹ آباد میں راہ دیکھ رہی ہو۔"

"ہیں۔ کس" "رہنے دو۔ مجھے اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ تم فلمی
ہیرو سے زیادہ بدعاش ہو اور تمہاری زیادہ مقامات پر راہ دیکھی
جاتی ہے۔ کم از کم میرے سامنے تو بھرے اور مصوم بننے کی
کوشش مت کیا کہ وہ خاصی سنجیدگی سے بولی۔

"چما سہمیں تمہارے سامنے گلے شکوے دور کرنے کے
لئے فوری طور پر تمہارے پاس آتا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر بیٹھ کر اداس
اداس ہی باتیں کریں گے۔ تجر۔ بتاتا ہے کہ اچھے بیٹھ کر اداس کی
باتیں کرنے سے اداسی کم ہو جاتی ہے" میں نے کہا۔

"میں کیا صرف اداسیاں شیر کرنے کے لئے نہ گئی ہوں؟" وہ
گھبراہٹ سے ہونے بولی "میرا مصروف کیا میں ہی نہ گیا ہے کہ

نہ فون کر لیا کہ "اس نے میری مزید کوئی بات مجھے بغیر فون بند کر
میں نے فوراً ہی اس کا نمبر ڈاک کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر ہلکی
بل اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے دل میں واقعی اداسی اور خوشی کی گنگ جھاگلے ل رہی
تھی۔ خوشی راجہ کے ل جا نے کی تھی۔ میں نے کسی سوچا بھی
ی تھا کہ زندگی کے کسی سوز پر وہ یوں اچانک دوبارہ سامنے
ہائے کی اور اس بار اس کے دل کی کائنات ہی بدل ہوئی
تھی۔ کئی بار میرے دل کے کسی اندر میرے گوشے سے شک کے
پہلے لے سر اٹھا کر کہیں اس بار بھی وہ کسی نئے زاویے سے
نئی تھیں کر رہی؟ جذبات سے کھلنے کا کوئی نیا ہنر تو میں آتا رہی؟
لیکن دل سے ہی اس کا جواب نگہی میں ملا۔ شاید حقیقت یہی
تھی۔ پھر محبت بے جا رہی۔ یہی خوش گمان رہتی ہے۔

اداسی میرے دل میں کیسٹ دیکھنے کی وجہ سے جاگزیں تھی۔
ان کے بارے میں ابجسٹ ذہن میں ایک نگہی تھی۔ کیا میں اسے
ام کے بہرہ کھوں اور تباہوں کہ وہ کس شخص کے ہاتھ میرے گھر
نہ لگتی تھی؟ اس شخص کو کبھی کبھی پتا نہیں تھا جو اس طے میں
تم کیا کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ ابھی تک قائم تھا یا ختم کر دیا گیا تھا۔
ابھی اس کے بارے میں معلومات کون؟

لیکن محض کیسٹ کسی کے حوالے کرنے کا کیا قاعدہ تھا؟ اپنی
بھینوں کی کارکردگی کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ یہ ایک حساس
ماتہ تھا۔ کیسٹ کی بات ستر عام پر آجاتی تو ان پر سننے سرے سے
اچھٹا تھا اور ان سے دیگر کچھ نہ ہوتا تو ان کے شکوک و
مات کے سامنے میری طرف بھی پھیل سکتے تھے۔ میری اس بات
بھلا کون نہیں کہہ کر کہ مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ کیسٹ مجھے کیوں
بھی گئی تھی؟ وہ مسکا تھا کوئی ایکسی کوئی نہ کوئی تعلق کوئی نہ کوئی
ہو ملافت کرنے کی تھیں وہ میں لگ جاتی۔ ایسے معاملات میں تو
میں اوقات لوٹنے جانے کی شناسائی اور اثر و رسوخ بھی دھراہ
آئے جن میں عوامی سطح پر کوئی اہل اٹھ جانے کا اندیشہ
نہیں تھا۔ ابھی بھی ایسے معاملات کو سلجھانے کے بجائے
دانگ میں الجھا دیتا ہے۔

آخر کار میں نے خاموش رہنے اور انتظار کرنے کا فیصلہ کر
لیا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد مجھے قرار سا آیا اور میں اطمینان سے
دیکھ

لا کر وہ میں دفتر میں شام ڈھلے تک مصروف رہا۔ جب
لے کا ارادہ کر رہا تھا تب ساتھ کا فون آگیا۔ میری توازد سننے کے
درنگت سنجیدگی سے بولی "وہ جو ایک بہت بڑے بیٹھ صاحب
لیا اسے عمر افضل چودری صاحب۔ مجھے ان سے بات کرنا
لگتا ہے آج کل وہ بہت مصروف ہیں۔ کسی سے سیدھے نہ
تک کہنے کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اگر تب چند
پلاکے لے ان سے بات کرادیں تو کب کامت پڑا احسان ہو گا۔"

جیسے میں پرہ خوار بھی آئے گے۔ وہ مجھے چڑانے کی کمریں تھیں
 ”آج جو مل چاہے کہ لو۔ آج تمہیں آزادی ہے“ میں
 کما پھر ایک لمبے کے قوت سے کہا ”ہاں۔ تو کب تامل ہو رہی
 مگر کب بچ رہی ہو؟“

”آج صبح اٹھ کر پتا نہیں کس کام نہ دیکھا تھا۔ آج ہر شے
 میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئے باری ہے۔ دیر پر دیر ہوئے چاہے
 ہے۔ مالاں کہ میں رات کی شرنگ بالکل نہیں کر لی۔ اس
 باوجود آج کم از کم دس بجے گھر پہنچوں گی“ وہ بولی۔

”میں کہیں تازہ دم ہونے کے لئے صرف تو اٹھتا ہوں گا
 سارے دس بجے میں آن دھکوں گا“ میں نے ڈرانے کے انداز
 میں کہا۔

”دن تو اچھا نہیں گزرا۔ اب تم چاہتے ہو رات بھی اچھی
 گزرے“ اس نے دودھ دینے والے لیے میں کہا۔

”یہ تو میرے آنے پر ہی بتا چلے گا“ میں نے کہا اور فون پر
 دیا۔

میں نے دس بجے تک دوسرے چند کام نٹائے اور ساڑ
 دس بجے ستارہ کے ہاں جا پہنچا۔ میں نے یہ تعہد ہی کہنے کی؟
 زحمت نہیں کی تھی کہ وہ گھر پہنچ چکی ہے یا نہیں۔ مالاں کہ کیا
 معلوم تھا کہ شرنگوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوگا۔ یہ تو ستارہ کا
 جملہ تھا کہ کام نٹانے کے لئے رات کی شرنگیں نہیں کر
 تھی۔ صاف انکار کر دیتی تھی۔ گو کہ اس درجہ سے اسے
 نہیں چھوڑنا پڑتی تھیں مگر وہ اپنا رات کا آرام اور قہر
 شریعت میں چھوڑتی تھی۔ اس کا کتا تھا۔ اگر میں نے راتوں
 بھی کام کر کے مزید کچھ دولت کا بھی لی تو وہ بچا ہے میں مجھے
 جوانی کی راتیں اور ان راتوں کی کوئی ہوئی نیند واپس نہیں ملا۔
 کی۔

میں اس کے ہاں پہنچا تو وہ ایک خوبصورت گاؤں اور بچی
 چھوٹی پٹے ”تم تھو بال کدھوں پر بکھرائے لان میں بیٹھی تھی
 بالکل تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ چائے کے لفافے اندر دھری تھی
 صبح کے اخبار اب رات کو بیٹھ کر دیکھ رہی تھی۔

وہ بالکل اسی طرح لی میں طرح برسوں کے چھڑے ہو
 دوست تھے ہیں۔ اس عورت میں یہ بڑی خوبی تھی۔ کم از کم میرے
 لئے اس کا خضر معنوی ہوا تھا۔ فون پر خواہ کچھ بھی کہہ سکتی
 پیغام خواہ کیسے بھی بجا دیتی تھی لیکن جو کسی میں اس کے مل
 پہنچتا تھا وہ جیسے سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اس کی دوستی میں
 گرجو شئی تھی مجھے آج تک کہیں نصیب نہیں ہوئی تھی۔

بجب بات یہ تھی کہ اپنے ماضی کے برعکس وہ اب شئی
 غرض نظر آتی تھی اتنا بے غرض بھی میں نے کسی کو نہیں ملا
 اس کی دنیا کا ہر درد اندہ ہر وقت میرے لئے کھلا تھا اور وہ
 کسی سلیے کی طلب کار نہیں تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے کچھ

جب دنیا بھر کے مسائل نے ذہن کو بوجھل اور مل کو اداس کیا تو
 میرے کندھے پر سر رکھ کر اداسیوں کی لڑائی لڑنے کے آگے؟
 مجھے نہیں چاہئے ایسی دوستی اور ایسی ملاقاتیں۔ اپنے پاس ہی رکھ
 اپنی اداسیاں۔“

”کس قدر مشکل ہو گئی ہو تم۔“ میں نے تو بھر کر کہا ”گناہ ہے
 فلک کج رفتار سخت نامرمان ہوا جا بجا ہے جو تم جیسے دوست بھی
 آنکھیں پھیرتے جا رہے ہیں۔“

فلک کج رفتار کا تو مجھے پتا نہیں مجھے اس سے ہولناک خیال کا
 موقع نہیں ملا لیکن میں ضرور تم سے آنکھیں ٹاک ”تم سب کچھ
 پھیر لوں گی“ وہ بولی۔

”میں سے پہلے ظلم کو صفائی پیش کرنے کا موقع ملنا چاہئے ہے
 میری پُر زور اپیل ہے اس وقت تم کہاں سے بولی رہی ہو اور کیا
 کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس وقت تو اسٹوڈنٹ سے بولی رہی ہوں۔ اپنے ڈرننگ روم
 سے سائنٹ چلی گئی ہے۔ شرنگ کرک ہوئی ہے۔ میں اس وقت
 فقیرنی کے گیت اپ میں ہوں۔ پیسے پرانے کپڑوں میں بیٹھی
 ہوں۔ کپڑے کچھ زیادہ ہی پٹے ہوئے ہیں کیوں کہ ان میں میرا ایک
 ڈانس بیکر اتار ہوا ہے۔“

”فقیرنی ڈانس کرے گی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہاں۔ بڑا ٹھیک خاک قسم کا ڈانس کرے گی۔ تمہیں شاید
 معلوم ہی ہو کہ ہماری اور پردی ملک کی اکثر فلموں میں یہ پتھر
 ضرور ہوتی ہے کہ ”دن“ ہیرو کو کسی مقام پر قید کر لیتا ہے تب
 ہیروئن بیس بدل کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جاتی ہے۔ دن کے
 اڈے پر وہ سب مل کر ڈانس کرتے ہیں۔ گانے کی صورت میں وہ بار
 بار دن اور اس کے ساتھیوں کو گاتے رہتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور
 کس طرح اس کی ایسی بھی کہنے آئے ہیں مگر وہں باجیس پھیلا
 پھیلا کر جو مارتا رہتا ہے اسے اس وقت تک کچھ پتا نہیں چلا جب
 تک ہیروئن اور اس کے ساتھی ہیرو کو مہا کرا کے نہیں لے
 جاتے۔ اس کے بعد دن منہ سے جھاگ اڑاتا ہے اور ان کے
 نقاب میں جاتا ہے۔“ ستارہ نے قدرے تفصیل سے بتایا۔

”وہ بالی گاؤں؟“ میں نے سسے سے لیے میں کہا ”کیا یہ
 ہماری کسی فلم کی پتھریشن ہے؟“

”نہیں“ نہیں۔ تمہیں اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
 تمہارے اداسی کی کسی فلم کی پتھریشن نہیں ہے۔“ وہ نہیں کر
 بولی۔ اس کا مہو خفگوار ہو چکا تھا ”آفاق کم از کم اب اس قسم کی
 فلموں کے دور سے نکل آیا ہے۔“

”دیکھ مجھے اتنا غم نہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں“ میں نے
 اطمینان سے سانس لیتے ہوئے کہا ”میرا کون سا ان فلموں پر کسی
 بھی حیثیت سے نام آئے گا۔ میں تو جیسے ہی پردی رہوں گا۔“
 ”ہاں۔ لیکن پرہ گھوڑا تو ہوتے تھے تمہارے ہاں۔ اب تم

رستوران پہنچ گئے۔ خبر میں کہیں نہ کہیں یہ بھی دیا جائے گا کہ
موصوفہ غالبانے میں تھیں۔

میں نے ایک کرسی پر زبیر ہوتے ہوئے لٹھڑی سانس لے کر
کہا "ایک تو تم جیسی عورتیں بھی اسکیڑوں سے بول ڈرتی ہیں
جیسے کسی باپو پر پریزگار خاتون کو کسی بیک اور سختی محض سے اپنی
مٹکی ٹوٹ جانے کا قطعہ ہو۔"

"جانتے تو تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جن کی نظریں قلمی
عورتوں کی گویا کوئی عزت ہی نہیں ہوتی۔" وہ ایک دم تن کر کھڑے
ہوتے ہوئے بولے۔ شاید وہ آئینہ چھانے کا ارادہ بھی رکھتی
تھیں۔

میں نے ہاتھ جڑتے ہوئے کہا "جاؤ! تم چار ہو کر
تو۔ میری نظر میں تمہاری جتنی عزت ہے اتنی خود اپنی بھی نہیں
ہے۔"

اس کی سکر اہٹ دابھی اپنی اور وہ اندر جا گئے۔ لے کر
گئی۔ تب میں نے یہ آواز بلند کہا "لیکن میرے چائے ختم کرنے
تک تیار ہو کر آنا۔ یہ سمجھ کر مت تیار ہونا کہ تم شوگر پر جاری
ہو۔"

وہ حیرت انگیز طور پر پانچ منٹ میں تیار ہو کر آئی۔ موسم غسا
سودھا گین اس نے نہایت ہلکا ہلکا لباس پہنا تھا البتہ ایک کیمیری
شال کہ صحن پر ڈال لی تھی۔ ان چند منٹوں میں اس نے برائے نام
ایک اپ بھی کر لیا تھا اور اس معمولی بیک اپ میں وہ قلمی میک
اپ سے زیادہ پُرکشش لگ رہی تھی۔

چند منٹ بعد ہم رستوران جا پہنچے۔ کونے میں مجھے اپنی
پسندیدہ میز بھی خالی مل گئی جس کے پاس کیئرس کا ایک خوبصورت
پارٹیشن بھی کھڑا تھا۔ اس پر دھارنگ جتنی تصویریں لگی ہوئی تھیں
جن کے عقب میں نہ ہم وہ خیاں جھلٹاتی تھیں تو وہ مت بلی گئی
تھیں۔

ہال میں مدہش مت کم تھی اس کے باوجود ہمارے داخل
ہوتے ہی کئی گردنیں یکے بعد دیگرے ہماری طرف گھوم
گئیں۔ ظاہر ہے مجھے کم اور ستارہ کو زیادہ دیکھا جا رہا تھا۔ ہم اسٹار
ستارہ کو پہچان لیا گیا تھا۔ ہمیں اس کونے میں بیٹھنے زیادہ دیر نہیں
ہوئی تھی کہ آؤ گراف لینے کے کئی شوقین جتھو گھومنے لگے۔ ان میں زیادہ
ترنیم انجوز اور بچے تھے۔ جن کے پاس اس وقت آؤ گراف
یک نہیں تھیں وہ کوئی نوٹ "اے بابا جان کاؤنٹرنگ کاؤنٹر سچے
اکوٹی اور کاؤ بھی بھڑا کر لے لے آؤ ہے تھے۔

سولہ سترہ سال کی ایک گولی مٹھی سی لڑکی نے ستارہ سے آؤ
گراف لینے کے بعد میری طرف حرم ہوتے ہوئے کہا "تپ بھی
شاید قلمی بہرہ ہیں لیکن ابھی آپ کی کوئی قلم رلیز نہیں ہوئی؟"
مجھے ہنسی آئی۔ میں نے شکایت کیے میں کہا "نہیں چہ! ایس
تھوں میں کام نہیں کرتا۔ میری کوئی قلم بھی رلیز نہیں ہوئی۔"

قلم بھی موعوم سے انداز میں بھی اس خیال کا اظہار نہیں کیا
۔۔۔ مجھ سے شادی کی امید رکھتی ہے۔ کبھی اس نے یہ جانا
نہ تھا کہ وہ جو اپنے تپ کو میرے لئے وقف ہے دامن ہائے
نہ ہے تو میرے ساتھ اس کا مشق کیا ہے۔

وہ تو میرے اس طرح کی سوچوں میں الجھا قلمی غیر ضروری
نہ تھی۔ اندر ہی رکافت پر یقین رکھتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچا
۔۔۔ مجھے کسی بندھن میں باہر سے بغیر میری زندگی کا اہم حصہ
نہ تھی۔ شاید میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کہیں کسی دوس کی
نہ ملتی تھیں کبھی؟ جو عورت خود کو کسی سو کی ذات میں گم کر
ہے اور اس کے عوض کچھ بھی نہ چاہتی وہ کیا عمو کو خرید سکتی

اب راجیلہ کے دل جانے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ کیا ستارہ
میرا بے عنوان حلقہ جاری نہ کرے گا؟ کیا مجھے اس کو جاری
اچاہئے؟ ان دونوں ہی سوالوں کے جواب میں میرے دل میں
نہا چھایا۔ ایک بات بہر حال طے تھی کہ اس سے شک
بمیرے لئے بہت بڑی آزمائش بن سکتا تھا۔ بات ستارہ میں
وہ راجیلہ میں نہیں تھی اور جرات راجیلہ میں بھی وہ ستارہ میں
نہ تھی۔

میں نے اس وقت تک کہا نہیں کیا تھا اس لئے کھڑے
ہے کی کہا "پلو کہیں باہر ملے ہیں۔ آج چائیز کھانا کھانے کو
ہوا ہوا ہے۔"

ڈور اسکون کی سانس تو۔۔۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ "وہ ایک
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "دیسے میں نے کمر بچتی
اٹھا کھانا دیکھا ہے مجھے ایک بہت اچھا کھانا مل گیا
ماٹکس پاکستانی کھانے کی پیکل اور چائیز سب طرح کے کھانے
ہاتھ پالیتا ہے۔ کڑیلا ڈیسے سے زیادہ محظوظ ہو کر کھا ہے۔ آج
اس کی کارکردگی تو زائد کیوں۔"

"آج کمر کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ آج اپنے گھر نہ ہمارے
۔۔۔ یہاں سے کچھ دیر دور کئی میاں قلم کا ایک نیا چائیز
آؤٹ کھلا ہے۔۔۔ چار خوبصورت مدینک ماحول ہوتا
۔۔۔ پھولوں پر دھیمی مدہش کی چینی لائٹیں مدہش ہوتی ہیں۔ اور
اچل کر نیا کھلا ہے اس لئے وہاں زیادہ بیگز نماز نہیں
ہوئے بھی ایک چینی وہ باقاعدہ فرائز کے کدوں لے گیا
۔۔۔ ہم اس ملک میں اس طے میں رہے ہیں اور ہمیں یہاں
نہ والے اس رستوران کا طم نہیں تھا۔۔۔ جن سے آئے ہوئے
لوگوں کا طم تھا۔ آؤ چلیں۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام۔

"تو اس لئے اتنی اچھے تو خیال کو؟" وہ ہاتھ چمڑاتے ہوئے
میں کیا اسی طرح ایک تنگ گاؤں میں رستورنٹ چل دوں گی؟
انٹرنل میں خبریں آجائیں گی۔ موصوفہ قلمی اداکار ستارہ
تک گاؤں میں شری کی ایک ممتاز کامیابی شخصیت کے ساتھ

ہولی عافیت دیکھ کر مجھے اپنا خیال مستور کرنا پڑا۔ وہ طرک اور
شاہ طرک کھنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔

شاہ نے شاہ جان جڑانے کے لئے جلدی سے اس کی
بک میں آکر افسوس دئے لیکن وہ محض آکر افسوس پر موقوف
ہوا۔ تقریباً گزرتا دئے ہوئے ہوا کہ ہولی شمعیں لگ رہی تھیں۔

شاہ ذریعہ لب تک پہنچا ہوا تھا اس لئے یہ شعر کہہ دیا۔

ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تھنا نہ کرو

ماتے پھر ساتے ہیں کچھ دور میں داخل جائیں گے

شعر یہ کہ نوجوان رعب اور پھر اک افسانہ ہم پارہ سے ہے

وہ جلدی ہو ابھی چلا جائے لیکن وہ ابھی ہماری جان بھروسے کے

میں نہیں تھا۔ اسے ترسے اور پھر کتے سے فرست لی تو میری راز

حوجہ ہو گیا تاکہ پر میک درست کرتے ہوئے وہ ایک دم ابا

پر آکر اسے سسٹے لے کر اب آپ کو پچھلا آپ تو اصل چہرہ

صاحب ہیں۔ آپ تو بہت بڑے تاجر اور صنعتکار ہیں۔

خوش قسمتی ہے کہ میں ایک ہی جگہ پر رہا اتنی بڑی بڑی شخصیت

سے ملاقات ہو گئی۔

مجھے کیے جانتے ہو تم؟ میں نے اسے گھورا۔

وہ اپنے استخوانی ہاتھ لٹے ہوئے گزرتا ہوا کہ آپ میرا

میرا مطلب ہے آپ کے بارے میں میرے ابا نے مجھے

تھا۔ ابا ابھی ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے پلاسٹک کے ہاتھ

رہے کے ٹیلر بنے۔ کارخانے تو اصل میں چار ہیں لیکن وہ

بڑے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں صنعت کا دھول کی ایک ہیلنگ

ڈیز تھا۔ اس میں آپ بھی آئے ہوئے تھے بہت بیزنس

آپ نے دور سے اشتادہ کر کے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔

تقریباً کہہ رہے تھے آپ کی وہ بھی آپ سے ملنا چاہ رہے تھے

سوچ رہے تھے عارف و فیوہ ہو جائے لیکن کسی نے میں آپ

نزدیک ہی نہیں آئے۔

گلیا انہیں کوئی کام کا محو سے؟ میں نے ہاتھ لیے

پوچھا۔

”نہیں۔ انہیں تو کوئی کام نہیں تھا۔ بس دیے ہی۔“

لے دانت ٹالے پھر قدوسے شریکے لیے میں ہوا۔ لیکن مجھے

سے کام بہت ضروری مشورہ کرنا ہے۔ کسی خوش قسمتی

بات ہے کہ آپ سے پہلے ملاقات ہو گئی۔

بچی انگریزی میں ہولی ڈونٹ بی سو فیوہ۔ بڑے بڑے

فیس۔ ایڈ آفٹر کالج آراے فریز آف میڈم شاہ۔

بچی دین ہی نہیں بلکہ تقریباً مسکرم ہولی تھی۔ شاہ ہر دور

کے بچے بھولے سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ میں انگریزی سیکھتا تھا کہ

آج کل کے بچے بڑے تیز ہو گئے ہیں۔ میں نے بچی کا کندھا

تھپتھپاتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا میں اس لئے یہ نہیں

ہوں کہ مجھے غموں میں کام کرنے کا پائلنگ بھی شوق نہیں ہے۔

اس کی دین آکھیں بتادی تھیں کہ وہ میرے جواب سے

مطمئن نہیں تھیں لیکن ہر حال امریکوں کے سے انداز میں کندھے

اپکا کر دیا میں گلی تھی۔ چھ منٹ بعد مجھے اپنے اس خیال میں ترمیم

کرنا پڑی کہ ہر دور کے بچے بھولے سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ اس

میں یہ اضافہ ضروری تھا کہ اس حق بھی ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔

میں ابھی سکون پتھر آئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی اور ہم سوپ

سے لفٹ اٹھنے والے گئے تھے کہ میں بائیس سال کا ایک ہوشی

نوجوان اپنی کوئی کوئی سی آنکھیں کھاتا ہوا یوں پارٹیشن کے عقب

سے نمودار ہوا جیسے کوئی ریڈ انڈین درختوں میں چھپا انتظار کر رہا تھا

کہ اس کا شکار ذرا آتا ہو تو وہ اس پر حملہ کرے۔ شاہ وہ طارے

گرد بیزنس کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ ٹھنسا خوش شکل تھا لیکن چہرے پر عافیت برس رہی

تھی۔ کپڑے ریڈی میڈ اور اچھی کپتے کے تھے لیکن اس کے اصل

سائز سے کم از کم ڈیڑھ کتا بڑے تھے اور شاہ ایک تودہ پختے سے

مسلل اس کے جسم پر جھول رہے تھے تاکہ پر مونے مونے

شیشوں کی میک تھی۔ اس کا چوکھی اندرونی بیان سے تھما ہوا تھا

اور وہ بار بار تھوک نکل رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی مرنے جیسی

گردن میں زخروں کی ہڈی مسلسل اوپر نیچے حرکت کرتی دکھائی

دے رہی تھی۔

اس نے ایک نوٹ بک اور پین شاہ کے ماتھے رکھ دیا اور

چہرے دان میں سینے ہوئے چہرے کی سی توازن میں یکدم ہی ہوا۔

”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں راتوں کو آپ کو خوابوں میں

دیکھتا ہوں۔ آپ میری بہن بن جائیں۔“

میں دونوں اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ مجھے ابھی بھی آتے

آتے تھے کہ انور ایک خفیف سے ترمیم کا بھی احساس ہوا۔ میں نے

ملاحظہ سے کہا۔ ”ہر دور عزت مندوں میں سے ایک جڑ چھوڑ دیا تو

انہیں راتوں کو خواب میں دیکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن جانے کا خیال چھوڑ

دیا۔“

معلوم نہیں اس کی کچھ میں میری بات تو گلیا میں لیکن وہ تیز

کرمات سلوات منہ سے سہلاتے ہوئے ہوا۔ ”کسی بہت اچھا۔

میں اپنی ہی کو خوش کہوں گا۔“

پہلے تو میں سمجھا تھا کہ وہ میرے مشورے کے جواب میں شفا

ساغر کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن پھر اس کے چہرے پر برستی

باپ کو شاید یہ دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو کہ اس کا بیٹا کس ذہنی حالت کے ساتھ پرورش پا رہا ہے میرے دل میں اس کے لئے ہر روز کی گراہی آتی۔ ستارہ کے چہرے سے بھی خستہ کے آثار غالب ہو گئے۔ ساتھ ہی ہمارا سوپ بننے کا لطف بھی عارت ہو گیا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“ میں نے اب طحری ملاوٹ کے بغیر حقیقتاً ملاوٹ سے پوچھا۔

”وسم احمد“ وہ ناک پوچھتے ہوئے ہوا۔

”وسم میاں! جب تمہارا باپ اتنا کجس ہے اور بیویوں کے لئے تمہارے گھر میں اتنی جو تم بیزار ہوتی ہے تو تم اس دستوران میں کیسے نظر آ رہے ہو؟ یہ کوئی عام جائیز دستوران بھی نہیں ہے یہ تو ان کی نسبت بہت مرکا ہے۔ جب کہ تمہارا باپ تو ہمیں کسی عام جائیز میں بھی دیکھ لے تو شاید وہیں سے جوتے آ رہا ہو لے جانے کے تم نے پیسے ضرور چرائے ہوں گے“ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی بات بالکل سچ ہے“ وہ گویا میرے انداز سے پر خوش ہوتے ہوئے ہوا ”سب تو زیادہ سے زیادہ کسی ٹھکے پر بیٹھ کر چائے پانی کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن دراصل ایسی عمارتیں ہوتی ہیں۔ انہیں اب اسے بچے کے اچھے کے طریقے آگئے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح کچل کھینچتی ہیں۔ اس کے علاوہ اب ہر قدر تم گھر میں چھپا کر دیکھتے ہیں“ ایسی اس میں سے بھی کسی نہ کسی طرح کچل پار کھینچتی ہیں اور ہم دونوں بھائیوں کو دیکھتی رہتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ دوسرے خوشحال گھرانوں کے بچوں کی طرح ہمارا بھی ایسی جگہوں پر جائے“ انہیں بچنے اور ایسی چیزیں استعمال کرنے کو بھی چاہتا ہے۔ انہی کی سوائی سے اگلے پاس اکثر توڑی بہت رقم موجود رہتی ہے“ اس نے اپنی ذہنی زحالی قیاس کی بڑی سی جیب سے چند نوٹ نکال کر مجھے دکھائے۔ ستارہ مگر ادا۔

مگر وہ اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے ہوا ”سی سی سی کی وجہ سے میرے پاس ایک پرانی سی فونکسی موجود ہے۔ درجہ اب اتنا کہتے ہیں کسی کماڑی سے سوز سائیکل کا زحانچا خرید لو اور پلاٹل منجے سے پر اسے خرید کر اس میں نکالو۔ ساتھ ہی وہ اپنا زمانہ یاد دلاتے ہیں جب ان کے پاس سائیکل بھی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے پی کارخانے میں ٹائٹ چمڑا زور کے طور پر ملازم رکھا ہوا ہے۔ آٹھ سو روپے تنخواہ دیتے ہیں جس سے میں کالج کی فیس دیتا ہوں اور پھر بچوں کا خرچہ پورا کرتا ہوں۔ دن میں کالج جاتا ہوں۔ شام کو سوتا ہوں۔ رات کو بڑی دینا ہوں۔ اگر کتے ہیں میں اس طرح منت کھوں گا، تنخواہ پر کام کھوں گا تو مجھے تو کچھ سے ہی بہتر کمانے کا پلچہ آئے گا اور پچھے سے محبت پیدا ہوگی۔ محنت کی عادت بھی پڑے گی۔“

”بہت روشن خیالات ہیں ان کے“ میں نے کہا ”لیکن اس سلسلے میں“ میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ تمہارا اور تمہارے باپ کا آپس

ذہنی گھر میں تھا۔ میں نے اسے گری کی طرف ہاتھ پھیرا۔ مگر وہ جلدی سے اس کے پچھے پر اس طرح بازو رکھ دیا کہ اسے بچنا اس کے بس کی بات نہ رہی۔ دوسری گری پر ستارہ نے اپنا رنگ رکھ دیا۔

فوجان نے اس پر بھی بحث نہیں پاری۔ کھڑے کھڑے ہی وہ ٹیڑھا مزاج سا ہونے لگا۔ ”مجھے اپنے ابا کے بارے میں وہ کیا تھا۔“

”کیا وہ تمہارے ابا ہیں کہ تمہارا ہے؟ میں نے ملاوٹ سے پوچھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس فوجان پر اب خیر آئے گا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بیک مقامات پر انسان اس قسم کے چندوں پہنائی بھی نہیں لگا سکتا۔ خصوصاً جب کہ وہ ایک طور اور آواز کے ساتھ ہو۔ اس نے ستارہ سے میری ملاقات کا لطف عارت کر دیا۔

”میں بچہ پوری صاحب! یہ بات نہیں ہے“ وہ خوف زدہ سی لہجہ سے دوسرا دھڑکتے ہوئے ہوا ”بات دراصل یہ ہے کہ میرے ابا بھی جب میری طرح فوجان تھے تو در کی چیزیں ہٹانے والی بل پھرتی سی ٹیکسی میں کام کرتے تھے۔ اسی بتائی ہیں کہ وہ شروع سے ہی بہت کجس تھے۔ پانی پانی جوڑ کر کسی طرح چھوڑا ہوا کام نوحہ کر کے رخصت کارخانے دار میں گئے لیکن خوشحال آنے کے بعد بھی بیٹھ ہمارے گھر میں بیٹھے پر لڑائی ہوتی رہی ہے۔ اب تو فک کے فضل سے ہمارا اندر ٹھیک ٹھاک لوگوں میں ہے۔ لیکن اب ان کی کجی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ ہم صرف دو بھائی ہیں۔ دوسرا تو سے بھی چھوٹا ہے۔ ہم نے ان اسکولوں میں پڑھا ہے جن میں بچے ہٹ پر بیٹھے ہیں۔ اب بھی ابا سے دس روپے ٹانگ لیں تو ان سے بچائی ہوئی ہے۔ بہت بات پر وہ بیٹھے گتے ہیں۔ ان کے کھوتے دے پتھر اسی دن رات خون نیند ایک کر کے اس لئے دھیر نہیں کیا کہ تم لٹاتے پھرتے ہو۔ عذاب میں ہے زندگی ہائی۔“ اس کی کواز بھرا گئی اور آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آگئے۔ چہرہ انداز کر آتے ہیں سے آنکھیں پوچھتے لگے۔

ایک لمحے کے لئے تو مجھے لگے کہ گزرا کہ وہ کسی قسم کا زراعت نہیں کر رہا؟ کبھی وہ کسی خاص مقصد کے تحت تو ہمارے سر پر سوار نہیں ہوتا؟ لیکن اس کی صورت دیکھتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اپنا خیال مسترد کرنا پڑا۔ وہ کسی بھی مکاری اور منصوبہ سازی کا اہل ہی نہیں تھا۔ آقا تھا۔ وہ اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ بتاتا تھا وہ کوئی بڑے از اسکان باتیں نہیں۔ جسے اپنے کدوا کہیں نہ کہیں دیکھنے کی آئے ہیں۔ وہ سے زیادہ کجی بھی ایک غیبیاتی بیماری ہے اور غیبی ملاوٹ ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے کہنے پر اس کے عجیب عجیب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کوئی بعد نہیں تھا کہ اس لڑکے کے اتنی طرح پر کچھ ہمسازہ سا نظر آنے کی وجہ بھی اس کے باپ کا وہی لڑکپن ہوا جو وہ بچپن سے دیکھتا تھا۔ آقا تھا۔ ستارہ آقا تھا اور

رہے ہو جیسے تمہارے پیچھے کوئی بھوت لگ گیا ہو۔"

میں نے اس کی غلط فہمی دور کی "وہ سم کے عذاب میں طارے بچے
بجوت سے جی کوئی جگہ لگی ہے"

میں نے اپنے بچے کو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ اور میں دس روپیہ کو بائبل بھول
کر۔ ساتھ کے گھر پہنچ کر تو میں ساتھ کے سوا دنیا کی ہر چیز کو بھول
گیا۔

دو گھنٹے بعد جب میں اس کے ہاں سے نکلا تو رات تو میری سے زیادہ بیت بچی تھی۔ اپنے رگ و پے میں اس کے وجود کا نشہ اور اپنے ہر مسام جاں میں اس کے سانپوں کی مسک ہنسنے میں اپنے تپ میں مگن چلا جا رہا تھا کہ ایک کشادہ مکدہ ان گلی میں مڑنے ہی بجھے اچانک گاڑی روک کر پڑی۔

جیسے ایک گاڑی کی ہڈی پر ایک
گلی میں مدھنی کسی کسی جین اگلے موڑ پر دسائے ایک
دوسرے سے الجھتے جیسے تسمانی سے تھر تو ہے جسے ایک جیم جیم
موتھا اور ایک دوسری سووند لڑکی جس کے خود خال اتنی کم
مدھنی میں اتنی دور سے بھی ہے مدھن دکھائی دے رہے
جسے ایک گاڑی بھی تھوب ہی کھڑی کسی جس کے دونوں اگلے
ریڈازے کھلے ہوئے تھے

دہراڑے سے ہوئے تھے۔
 میں نے سوا کوڑی کے کوئی چوکری سیاہ جڑ چھینے نہ کہا۔ شاید
 وہ کوئی برف کیس تھا۔ لڑکی اسے واپس لینے کے لئے اس سے الجھ
 رہی تھی۔ مرنے پر وردی سے اسے کہنے، تمہیں اور لائٹس مارٹی
 شروع کر دیں۔ لڑکی خاصی مٹاتی اور صاف سے ان سے بچ رہی
 تھی اور ساتھ ہی وہ برف کیس سوا سے واپس لینے کی کوشش بھی
 جاری رکھے ہوئے تھی لیکن اس کوشش کے دوران کچھ کہنے
 ٹھہر اور لائٹس اسے پڑی گئیں۔

چراور لائیں۔ اسے چھٹی گئی۔
 وہ دہری ہو گئی اور پھر زمین پر گر گئی۔ اس وقت تک میں گاڑی
 سے اتر کر ان کے پاس پہنچی تھا۔ مودود کر گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا
 تھا۔

[illegible]

قادر اس نے قاز کرنے میں ذرا بھی اہل میں کیا۔
 مہلی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت میں غیر آزادی طور پر ایک
 لمبے کے لئے جک کیا تھا۔ کوئی میرے ہاتھ کو چھوئی ہوئی گزر چکی
 تب میں نے بھی یہ جانتا ضروری نہ سمجھا کہ وہ کون قادر معاملہ کیا
 تھا۔ میں نے بھی میں اس کے بیٹے پر کوئی چلائی لیکن اس نے
 حیرت انگیز طور پر مہلی کے رخ کا اندازہ کر کے ہوئے بلات
 رخصت کیس نہا چڑھائے تھے پر کوئی اسے ڈھال نہ پایا۔

وہ واقعی بڑی عمدہ وصال ثابت ہوئی۔ شاید وہ ٹھوس دھات کی
بست ہوئی چلوں کا کوئی ڈھانچا شاید دھات کا کوئی ٹھوس کھڑائی

باوجود کہتے ہیں۔
 اطول سانس لے کر سر ہٹا کر دے گئی۔ سوپ لٹھا ہوا
 کم نے دے سراسنکا پھر اپنی باتوں میں گھن ہو کر کم نے
 لٹ لٹا لٹا ہونے کی کوشش کی۔ ساتھ بہت کم کھائی
 اپنے فکر کی بہت غور رہنے کی خاصی۔ اندیشی میں
 چہ سال بعد ہی دوسری کئی عورتوں کی طرح بھاری بھر کم
 کا اتنی تھی۔ اسی لئے ابھی سے قحط ہو کر چل رہی
 تھی۔ ان قحط کا ان پڑھ ہونے کے باوجود اسے سوپ باتوں کا
 لئے چکا تھا۔

یہی وہ تھا۔
 اچانک زیادہ باتم کھانے سے کچھ مجزبانہ سوراخیں
 بننے لگیں۔ مگر وہ کہہ کھانا تھا۔ خصوصاً ہانڈی کھانے چوں کہ
 میں ہوتے تھے اس لئے ان پر تھیں کچھ زیادہ ہی اچھے صاف
 تھے۔ انہیں مجھے عادی بسیار خود نہیں کھا جاسکتا تھا۔ کبھی ایسے
 آٹا کھانے میں پورے پورے دن کچھ نہیں کھا تھا۔ کھانے
 جتنی خوشے کا درد چلا کچھ دیر پہلے لوگوں کی بھڑبھار آواز
 دیکھ کر آتے تھے جو بد مزگی پیدا ہو گئی تھی وہ رفتہ رفتہ

میں نے جب رستوران سے نکلے تو کوئی رنگ والی چیز ہے بغیر
 رنگ میں تھی۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم باہر آئے تو
 فی وسم دودھ آ کر موجود تھا۔ شاید ہمارے ہی انتظار میں
 کوئی میں بک رہا تھا۔ عہدہ سٹاؤ کی طرف کچھ کر کوڑا نے کے
 ڈانسیں لگا کر تھپ تھپ سے من ہی گئی ہیں۔
 "اگلے سال، سٹاؤ ٹکڑے لیتے ہوئے چلی ہے۔"

”بالکل بالکل“ سنا۔ مثال دیتے ہوئے جلدی سے کہیں۔
”تپ مجھے اپنا فون خبر دے دیجئے۔ میں آپ کو فون پر اپنے
ساتھ آگاہ کر دوں گا۔“ وہ طویل و عریض پارکنگ لائن میں
سے ساتھ چلتے ہوئے سننا۔

سے رات بچے ہوئے نہ تھا۔
 میں ابھی ذرا غریب بیرونی ہوں۔ ابھی میرے پاس فون نہیں
 تھا تو نے میری سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”تپ مجھے اپنا ایڈریس دی تاکہ مجھے میں تپ کو باندھ دے۔“
 اگلا کہا، ”اگلا“

اسلام آباد۔
 ستان نے اسے ایک اسٹیجیو کا نام بتاتے ہوئے کہا کہ اس کا
 پتہ تم مجھے دلا کہہ سکتے ہو۔ مجھے فوراً مل جائے گا۔ مکان
 اس کا ہے۔ کیا پتہ۔ کل بدل لیا۔

محنت بہتر، دسم خوش ہو گیا اور میری طرف دیکھ کر سلیٹا
 طرے سے وہ ساری طرف کو پڑھ گیا اور شاہابہ میرے پاس
 آئی کہ کارکنی گھر میں نے سنا کہ کوٹلی میں شہانہ کی
 بھتیجی سے وہاں سے گاڑی نکالی کہ باؤ بھائی کے گیت پر کہنا
 پڑا اور میری اہل کرا ایک طرف کو ہٹ گیا۔ مجھے شاہابہ نے
 دوست کوئی خود تیار کیا سمجھا دیا۔

نکاح بے اختیار ہوتے ہوئے پہلی قسم تو اس طرح ڈر کر بھاگ

طرف کو چل دی تھی۔ مہنی جس کے لئے ہم نے جان کر
دلا تھا اس نے عکریہ ادا کرنا تو درکنار مرکز پر دیکھنے کی
نہیں کی تھی کہ دھل در سحلات کرنے والا اسی زندہ
مرگ۔

میں اس کے پیچھے لپکا تو اس نے باقاعدہ دوڑنا شروع
اسی طرف کو جاری تھی جو صحر میں نے اپنی گاڑی
تھی ایک چلا تک گا کر میں نے اس کا ہاند پکڑ لیا اور
طرف تھمایا۔ میرا ہر می سے کہہ کئے کا ارادہ تھا لیکن ام
دیکھ کر الفاظ میرے منہ میں نہ گئے۔

اس کے رشتہ میں پر آنسو بہ رہے تھے۔ شانی پر
بلا سائل نمودار ہو چکا تھا۔ چاہا گوئی کی ضرب سے
بڑی پر اہمار سایدا ہوئے گا تھا۔ کچھ شاید دو مری چون
شا کر وہ بچیاں سی لے رہی تھی مجھے اس پر ترس آ
واٹنے کے بجائے میں نے طاقت سے پوچھا لیکن تھا
تھار کیا بچیں کر ماکا ہے؟

"کچھ بھی نہیں۔" وہ سسکیاں لینے کے بعد انازم
اس کی اپنی چیز تھی۔ مجھے دینے کے بعد واپس مانگ
میں واپس دیا نہیں ہوا تھی۔

وہ بلاشبہ ایک نہایت خوب صورت لڑکی تھی۔ صحت
ہیکسی اور بچوں جیسے گلے پھلے رنگ برنگے جوتے پہ
تھی۔ اس کے خود خالی نہایت ہی پر کشش تھے۔ لگا تھا
ہی خاص قسم کی روز شیں کٹی تھی اس کی آنکھوں میں
گلابی ڈورے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ آنکھیں
نظر میں مجھے شامسا عکس ہوئی تھیں۔ مجھے جیسے تھا کہ او
میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا لیکن ان آنکھوں کی
مانویت مجھے ابھی میں ڈال دیا تھا۔

"کیا چیز ہے؟" ہمیں اس کی آنکھوں میں جمائے
پر چھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ وہ نظر
ہوئے اور اپنا ہاند چڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ہوئی۔
ہوئی صوفائی۔ کہ تم میری مدد کر آئے۔ لیکن اب تم جا
خاص بات نہیں تھی۔ ستارا آئیں کا مسئلہ تھا۔ کوئی آئینہ
تھا۔ میرا جاننے والا تھا۔

"میں نے پوچھا ہے وہ کیا چیز تھی۔ ہمیں نے سخت بے
اور اس کے بازو پر گرفت نہت کردی۔ وہ گراہ اٹھی۔

"کچھ زہرات تھے۔" وہ جلدی سے ہوئی میں کہہ رہی
چلے جاؤ۔ بس اب بات ختم ہو گئی ہے۔"

بقول اس کے "بات ختم ہو گئی تھی لیکن وہ خوف زدہ
سے اوپر اور دیکھے جاری تھی۔ اس میں کوئی شک نہ
زہرات کے لئے عورت سرور مرکز بازی لگا سکتی ہے لیکن

تھا۔ کوئی آج دھات سے گرانے کی واضح توازن میں نے سنی
چنگاریاں اڑیں اور کوئی نہ جانے کس سمت کو پھیل گئی۔

اس وقت تک میں گاڑی کے مین قریب پہنچا تھا۔ وہ شخص
گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ یہاں سے پڑ کر کھینچنے کے
لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے اب ہلاک یا زخمی کرنے کا ارادہ
بدل دیا تھا۔ میں چاہا تھا کہ وہ زندہ دھج سلامت میرے ہاتھ
آجائے لیکن میں اسی لئے اس نے پوری قوت سے گاڑی کا وردانہ
بڑھایا۔ میرا ہاتھ دوڑانے میں آگیا۔

تکلیف سے میری چٹکل گئی جو در حقیقت کبھی ہی چٹکی نہیں
میں نے جالیا تھا۔ میں نے ہاتھ کھینچا تو وردانہ فوراً ہی بند
ہو گیا۔ گاڑی کا انجن اشارت ہی تھا۔ ستم ہلائے تھے کہ گاڑی کو
جھٹکا تو سڑک کے ٹوٹے ہوئے پتھروں پر میرا پاؤں پھسل گیا۔ اسی
وقت گاڑی میرے جسم سے رگڑ کھائی آگے بڑھ چکی تھی۔ میں گرا تو
دی ہاتھ جو گاڑی کے دوڑانے میں آگیا تھا گاڑی کے پھیلے
چڑھاتے ہاتھ سے بھی آگیا۔ پتھر اس پر سے گزر گیا۔ تن پہ
چاہے اس ہاتھ کی شامت ہی آگئی تھی۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر پتھر کی اینٹوں کے تین ہاتھ
کئے۔ گاڑی کا شیش ٹوٹنے کی توازن کئی گروہوں کی نہیں اتنی ہی سے
آگے بڑھتی چلی گئی اور موڑ میور کر گئی۔ موڑ پر اس کے ہاتھوں کی
رگڑ سے ہوا میں رہنے کی بو محسوس ہوئی۔

اسی لئے ایک سفید کار کو میں نے اسی رفتار سے "اسی انداز
میں اس کے پیچھے غائب ہونے دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔ ٹوٹی آنج
ایکلا ہی گاڑی میں میرے پیچھے تھا۔ شہر خ کو میں نے ہی دو تین
ضروری کاموں کے سلسلے میں سمجھا ہوا تھا۔ ٹوٹی اس وقت اس شخص
کے قریب میں دوڑانہ ہو چکا تھا جو گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہونے میں
کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے خود آج اپنے آپ پر حیرت ہو رہی
تھی۔ میں آج اپنی دوائی پہلی اور چابکدستی کا مظاہرہ نہیں کر سکا
تھا ورنہ وہ شخص کل کر نہیں پاسکتا تھا۔ شاید یہ سب کچھ اپنی
اچانک اور اتنے غیر حوالہ طور پر میرے سامنے آگیا تھا کہ میری
قوت فیصلہ صحیح طور پر ہر سمت میں کام نہیں کر سکی تھی یا پھر شاید
اس وقت میرے احصاب اور حواس عمل طور پر بیدار نہیں
تھے۔ ان پر کوئی خفیہ ماسور طاری تھا۔

میرے ہاتھ میں اٹھنے والی دود کی لہریں پورے ہاند میں بلکہ
کدھے تک پھیل رہی تھیں۔ سارا شور ہوا ہو گیا تھا۔ اور حواس
نہ صرف بیدار ہو چکے تھے بلکہ خود بخود سے فرار کر رہے تھے۔ میں
نے اٹھ کر کپڑے بھاڑے اور ہاتھ کو بلا کر "ملی بند کر کے اور
کھل کے دیکھا۔ کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔ خاص و صحت ہڈیاں
تھیں۔

پہلے جیب میں رکھ کر کش لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تو یہ دیکھ کر
میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ اٹھ کر تیز تیز قدموں سے ایک

یہاں نہیں مان رہا تھا کہ اس بڑے میں زیورات تھے
کچھ دیر پہلے نکلتی ہوئی تھی۔ زیورات تمہارا قسم
اور آہنی زینوں میں نہیں رکھے جاتے۔

بچے کا سوچ نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کی طرف اشارہ
کیا۔ "آؤ میں تمہیں گھر لے کر پہنچا دوں۔"

"نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ
پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہے جس میں جلدی سے چلی۔
چلیں۔ چلے جاؤ۔"

ابھی بھی کسی اس کے باوجود تھا گھر جانا چاہتی تھی۔ یہ
جی ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی
جی صورت حال میں پھنسی ہوئی ہے۔ کوئی مددگارین
ہے لیکن بعد میں وہی بلیک میل کرنا شروع کر دیتا
ہے۔ لڑکی کا خوف بجا بھی ہو سکتا تھا لیکن یکدم مجھے
اکہانت یہ نہیں تھی۔ لڑکی اپنے لئے نہیں شاید سب
تھی۔

فانی سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں
وہی خاص بات نہیں تھی۔ ایک نئی سا جھڑا
نیک ہو جائے گا۔ لیکن تم جاؤ۔"

یہ نتیجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ نہ تھا میں نے اس کی آنکھیں
باندھیں۔ میں تیزی سے گھبرا گیا لیکن مجھے تاخیر ہو چکی
تھی۔ میں ایک تاریک کوٹھی کے سامنے جھانک رہی
تھی۔ بلی ہوئی بازو تھی۔ یہ بازو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔
دونوں کوٹھیں کے سامنے مختصر سا بیرونی لان کی زانے
کاٹھے بازو کی چار دیواری میں محسوس کیا گیا ہو گا لیکن نہ
سے سب کچھ ہے۔ ہوائی سے چھوڑ دیا گیا تھا۔ تینوں ی
کے سامنے جھانک رہا تھا۔

بازو کے عقب سے گویا کسی پتے پر چلا گیا تھا
فانہ انسان ہی لیکن گولی کی رفتار سے آیا تھا۔ میں صرف
بائیں ی ی دیکھ سکا۔ میں شاید اسے جھانک دے جاتا
تھا۔ اچھا میں کوئی لمبی چیز تھی اس کی زور سے میں نہ جھج
نا چکی۔ پھر زور سے پانچواں زونہ کی چیز تھی اور وہی قوت
تھی۔

فانی قزاق جی میں نے کبھی نہ شاید کسی قسم کے سازش کی
تھی۔ محسوس ہوا کہ شاید وہ میری زندگی کی آخری آواز
کا خیال کیا تھا کہ میری کھڑکی کے پرچے اڑ چکے
تھے۔ اس لئے میں ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا۔

میں آؤں گے اس طرح مکمل جیسے میرے پوتے کسی بیماری
سے بڑھ رہے تھے۔ پہلا احساس یہی ہوا کہ شاید میں اپنی
نہیں بلکہ میرا لڑکا مبتلا نہیں تھی۔ میرا جسم کچھ پشیمان

پھر مطلق حواس میں دھیرے دھیرے کہیں دو کا احساس
پیدا ہوا لیکن یہ بھی کچھ طور پر تھا نہیں چل رہا تھا کہ وہ خدا کا
پھر احساس ہوا کہ قبر خاصی گدی بی تھی اور میرا سر بھی کسی گڑبڑ
گداڑ کی طرح تھا۔ میں نے گردن پیش کو محسوس کرنے کے لئے ہاتھ
اوپر اٹھ کر گھمایا۔ اور گردن پیش میں زہر دھار تھی۔

محسوسات نہایت آہستہ سے تھے اس طرح یہ ادھر سے تھے
جیسے کسی انتہائی رنگ تھوڑی سی کو تھل دے کر اشارت کرنے کی
کوشش کی جا رہی ہو۔ پھر کسی کی گرم سانس میری پیشانی سے
گھرائی۔ خود سورت ہلوں کے چلتے میں گھرا ہوا ایک چوڑھ پر جھکا
ہوا تھا۔ ان شش آٹھوں میں بے پناہ تشویش تھی۔ مجھے احساس
ہوا کہ وہ قبر نہیں ہو سکتی تھی۔ قبر میں ایسی گداڑ نہیں نہیں پائی جا
سکتی تھی۔ اور اس لڑکی کو مگر کبھی بھی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔
قوی تھی جس کی وجہ سے مجھ پر آج کی رات ہماری گزری تھی۔

اپنے سر میں ابھرتی ہوئی دھبہ اور ادھر گرد چلے ہوئے تھیں
اندھیرے سے میں کچھ باتیں ہوا تو اندھیرا ہوا کہ میں اپنی ہی کار کی
میں سیٹ پر لیٹا ہوا تھا اور میرا سر اس لڑکی کی گردن میں تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟ سڑکی کی آواز مجھے دھڑ سے آتی محسوس
ہوئی۔

"ہاں میں نے جواب دیا اور سر گردن میں بائیں جھک کر اپنی
دانت میں سر کا پھیل پھیل پن کم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بڑی غلطی
 ثابت ہوئی۔ میں نے گویا دھڑ کے ہیڈ کو اوڑھ کر پھینک دیا تھا۔ محسوس
سے ہرے جسم میں بھگت گئیں۔ میں نے سانس روک کر بھگت کی
سے انہیں کھینچ کر لے کر کوشش کی۔ پھر لڑکی کی مدد سے اندھ کر
بچھڑ گیا تو۔ میں نے اپنے آپ کو ہر محسوس کیا۔ سر ٹھٹھ کر دیا
کھینچنے سے ذرا اوپر ایک گڑبڑ محسوس ہوا۔ لیکن خون بھی نکلا تھا۔
ہلوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا۔ سر کی چوٹ زیادہ
بڑی ثابت ہوئی ہے جس میں خون نہ نکلا۔

میں نے کار کی کھینچنے سے باہر دیکھا تو اندھ ہوا کہ ہم وہاں
نہیں تھے جہاں میں بے ہوش ہوا تھا۔ گاڑی وہاں سے کم از کم ایک
میل دور ایک سوڑے دوڑ پر درختوں کے عقب میں کھڑی تھی۔

"ہم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" میں نے پوچھا۔

"میں لاتی ہوں" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ اس
کے چہرے سے ابھی تک خوف کے سامنے چلے نہیں تھے اور یہ
سامنے اس کے محسوس چہرے پر ایسے نہیں لگ رہے تھے۔

"کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"کس طرح؟" اس نے ہلوں میں سے الفاظ پھرائے گویا
میرا سوال اس کے نزدیک نہایت غیر ضروری بلکہ شاید اعتقادہ دیا
ہو میں نے نہیں سمجھا کچھ بڑی مشکل سے گاڑی میں ڈالا اور
ڈرائیو کر کے یہاں لے آئی۔ یہ جگہ مجھے کچھ محسوس نظر آتی تو یہاں
رک کر ہمیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ کافی دیر سے

کو خوش کر دی تھی۔

اگر اس لڑکی نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں سمجھ کر کماج کر گاڑی میں ڈال لیا تھا تو یقیناً اس نرم دنازک سراپا میں بہت سی طاقتیں چھپی ہوئی تھیں۔

لیکن جس شخص نے مجھے بے ہوش کیا اس نے ہمیں اتنی آسانی سے کیسے آئے دیا؟ ہمیں نے پوچھا۔ لیکن اس نے صرف سوالات کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس کے جوابات پر کھدوے کا اظہار کرنے کا میرا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”اس شخص کو فوراً ہی وہاں سے بھاگنا پڑا تھا کیوں کہ پولیس کی گاڑی کا سائرن بھی سنائی دینے لگا تھا اور چرکیداروں کا پھر شاید پیدل گشت کرنے والے پولیس والوں کی بیٹیاں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے بھی وہاں سے اسی لئے جلد از جلد نکل جانا بہتر سمجھا کہ میں پولیس کے پتھروں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی لیکن ہمیں بھی وہاں بے ہوش پڑا چھوڑ کر آنے کو میرا دل نہیں مانتا۔ حالانکہ پولیس اگر ہمیں اغوا کرتا تو شاید اسپتال لے جاتی جو تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔“

”نہیں ہمیں نے ایک تک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں میری آنکھ کھلی وہ جگہ زیادہ بہتر تھی۔“

اس کی آنکھوں میں حیا کی لہر ابھری لیکن چہرے پر کوئی خاص تغیر نہ آیا۔ میں نے پوچھا ”وہ شخص کون تھا؟“

”مجھے کیا معلوم“ وہ تیزی سے بولی۔

”میرا وہ اس شخص کا دوست تھا جو ہمیں مار رہا تھا؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں“ وہ مجھ سے نظر نہیں ملادی تھی۔

”ویسے بھلا اس کی مجھ سے کیا دشمنی تھی جو وہ یکدم اندر میرے سے نکل کر میری کمر بڑی توڑنے پر نکل گیا“ ہمیں نے کہا۔

”اس سلسلے میں میں بھی بھلا کیا کہہ سکتی ہوں“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”چھ! وہ کس قسم کا توہی تھا؟ اس سلسلے میں بھی تم کچھ کہہ سکتی ہو یا نہیں؟“ ہمیں نے دریافت کیا۔

”میں اس کا چو نہیں دیکھ سکی“ وہ بولی ”وہاں روشنی کوئی خاص نہیں تھی۔ اور پھر وہ بے پناہ پھر پڑا تھا۔ چھلاوے کی طرح آیا اور ہمیں بے ہوش کر کے چھلاوے کی طرح قابو ہو گیا۔“

وہ کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ بہت تھستہ دو آنے کے پینڈل کی طرف ٹھک رہا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے محبوب ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ وہ کافی سوچ چکا تھا۔

”کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟“ وہ وہنا تشویش سے بولی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے لمبے میں میرے لئے ہمدردی اور اپنائیت تھی لیکن وہ مجھے کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ انسان اگر کسی

کے لئے اپنائیت محسوس کرتا ہے اس سے اظہار ہمدردی ہوتا ہے اس کی ہمدردی کا مطلب کار ہوتا ہے تو اسے اپنے صاحب کے بارے میں بتانے سے انکار ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہاتھ پہلے تمہارے اس مہوش کی گاڑی کے دروازے پر پڑے تھے کہ مجھے آگیا میں نے بتایا۔

”اے... میرے خدا... اس نے دھشت زدہ میں کہا اور فوراً میرے حوزہ ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے لیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس واضح تکلیف تھا۔ وہ ہاتھ ہونے بولی ”کوئی بڑی نہ ٹوٹ گئی ہو۔“

”نہیں سڑاں سلامت ہیں میں نے کہا۔

”ایکسرے کے بغیر تم اتنے وقتوں سے کیسے کہہ سکتے ہو؟

”درد سب سے بڑا ایکسرے ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے لڑنے کا درد ہی کہہ کر اس طرح کا ہوا ہے۔“

”تمہارا تو بہت خوش قسمت ہو یا بہت سخت جان“ وہ بولی۔

”دونوں ہی باتیں درست ہیں“ میں نے جواب دیا۔

اپنے آپ کو کافی ہنر محسوس کر رہا تھا۔

”اس شخص نے تمہارے سر پر راکھ سے وار کیا تھا

طرف سے لاشی کی طرح پڑ کر“ تمہارا کمر پر پوری قوت سے

تھا“ وہ بولی ”میں تو سمجھ رہی تھی تمہاری کمر بڑی کے کھدوے ہوں گے لیکن شاید وار اپنا ہوا پڑا یا پھر تمہاری کمر بڑی

طرح ہے۔“

”دونوں ہی باتیں درست ہیں“ میں نے ایک بار پھر کہا

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

یہ محسوس ہو گئی وہ تیزی سے دوبارہ کھل کر اترنے پر

”میں اب چلتی ہوں۔“

مٹی کی طرح بے توازن قدموں سے وہ درختوں کے سارے

پتے جاری تھی۔ میں اتر کر اس کے پیچھے پکا تو سر میں خند

ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا گرما ہونے لگا کہ میں نے

پروا نہیں کی۔ اس نے دوڑنے کی کوشش کی کہ میں نے ہاتھ

جلدی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”مگر اس نے جواب دیا۔

”جہیں پیدل چلنے کا اتفاق کہیں ہے؟ میں جیسے

میں چھوڑ دیتا ہوں میں نے کہا۔

”مجھے نہیں جانتا ہے تمہاری گاڑی میں تمہارے ما

کر کا پتہ پڑی“ ”تم میرا بیچا چھوڑ دینا میں ریتے ہو ہوا

چکا۔ اب تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”مجھ سے اگر انکاری کر پڑا تھا تو تم نے مجھے میرے

چھوڑ دیا ہوا“ ”مجھے بے ہوش چھوڑ کر پکڑ لی تھی میں نے

”ہاں“ مجھ سے بس یہی جڑی نکلی ہوئی کہ میں نے!

میں ہوئی جان کے خاکہ میں چڑھ گئی ہوں۔ اس وقت تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ معلوم نہیں میں اس گاڑی کو ڈرائے بھی کر سکیں گی یا نہیں لیکن شکر ہے ڈرائے تک آسان ہی ثابت ہوئی۔

”یہ ماڈل شہر میں صرف میں چار لوگوں کے پاس موجود ہے ہمیں نے کہا ”شوقین لوگوں کے رکھنے کی چیز ہے۔ میں نے براہ راست سرسبز کھیتی سے منگوائی تھی۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ اس میں دو واڑے بھی چھوٹے لیکن کھیتی نے انکار کر دیا۔ انہوں نے لکھا کہ چھ دو واڑوں والی گاڑی وہ صرف سردارانِ ملک کے لئے تیار کرتے ہیں۔ مجھے مبرا کرنا پڑا۔“

”حکومت دولت مند ہو۔“ وہ مزید تھرتھرتے میری طرف دیکھ کر بولی۔

”کوئی ایسا خاص نہیں ہمیں نے حسبِ عادت انکساری سے کام لیا۔“ دیکھو اچھی چیزیں رکھنے کے لئے صرف دولت ہی کی نہیں شوق کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس شہر میں مجھ سے کہیں زیادہ دولت والے بہت سے لوگ موجود ہیں لیکن ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جن کے ملازموں کے پاس ان سے بہتر گاڑیاں ہیں۔“

دھنساٹے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کھیں خیر کر دینے والے انداز میں چلیں۔ وہ دن دسے سڑک تھی لیکن سامنے سے ایک گاڑی دن دسے ٹوٹی ہوئی سٹ با تھی کی طرف مجھ کو چلی آ رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس گاڑی کی رفتار جو بیٹ سے بکھری کم تھی۔

وہ گاڑی گاڑی پر چڑھتی چلی آئی۔ لڑکی بوکھلائی لیکن شاید ہماری قسمت اچھی تھی کہ وہ بدلت گاڑی کو روک کر گرین لائٹ میں دو درختوں کے درمیان آگئے جس کا سایہ ہو گئی۔ یہ بھی قسمت تھا کہ اس گرین لائٹ کے گرد منظر نہیں تھی اس میں پانی کی لڑکا تھا جو ایک چمپا کے ساتھ فوٹے کی سی صورت میں ادھر ادھر اچھلا اور گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔ لڑکی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی اسٹینڈرگ وکیل پر اس کے ہاتھ ہوئے ہوئے کانپ رہے تھے۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان آتے سامنے کا خوف بیک تسلیم ہونے میں بیل برابر کر رہ گئی تھی۔

”دوسری گاڑی چشمِ زون میں درجہ چابی تھی فاس کے پنے ہوئے سائینسری گزرا ہوا تھا بھی محسوس ہو چکی تھی۔ لڑکی دھشت زدہ ہی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”یہ دسی تھا؟“

”دسی کون؟ ہمیں نے ہر سکن بچے میں پوچھا۔

”دسی جو مجھ سے لڑ رہا تھا۔ جس نے مجھے مارا تھا۔“ وہ بولی۔

”کمال ہے! اس سے تو تمہارے اپنے بیان کے مطابق تمہارا کوئی غی خلق تھا اور تم اس کی گاڑی بھی نہیں پچانتی؟ ہمیں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”وہ سیاہ رنگ کی بیک میں فرار ہوا تھا اور یہ محتال رنگ کی فوڈ کوڑھتا تھی۔ میں نے ڈرائیو

رہنے میں دیکھی۔

”میں غلطی کے لئے میں تو دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ غلطی کر لی لیکن ہو تو اسے ذرا اور بادل۔“ آؤ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ اسے بچے کھیلہ گرفتاری تھی کہ وہ باندھا گیا نہیں سکتی تھی۔

”میں غلطی سے میں بولی تھی اسی حیثیت سے تمہیں وہاں لے گئے انکار نہیں لائی تھی کہ مجھے تم سے بہت بھروسہ ہی تو ہے یہ پتا تھی کہ تم پولیس کی تحویل میں نہ جاؤ اور دل کو میرے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔“

”میں بولی ہو تم پولیس سے گاڑی کریم کیا ہے تم نے؟“

رات کے پچھلے پھر شکوک سے حالات میں مار کرائی اور کے دوران ایک جوان لڑکی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو کیا کر لئے کوئی کریم کا مندرجہ کریم جاتا ہے؟ پتھر کی کریم کے لڑکی کی مٹی پلایا ہو سکتی ہے۔“ وہ بولی۔

”میں تو اب بھی پولیس کو کچھ بتانے نہیں چاہتا۔“ ہمیں کم از کم ن سٹیل میں مجھ سے کوئی خوف محسوس کرنے کی ضرورت نہ تو چلیں ہمیں نے کہا۔ وہ گویا بیل ناخواستہ میرے ساتھ لگا۔

گاڑی میں چڑھ کر میں نے ڈرائیو تک سیٹ اسی کے سر کی اور ہمیں تک چلا کر لے آئی ہو تو آپے گھر تک بھی نہیں لے

اس نے خاموشی سے اسٹینڈرگ وکیل چمپا لیا اور گاڑی ہڈ پر لے آئی۔ اسی دوران ڈیش بورڈ پر ایک نچھاسا بیلنے لگا اور کبھی کی جھجکاہٹ سے مشابہت تو آواز دھتے وقت سے بڑھ گئی۔ یہ ریڈیو کا سگنل تھا سگنل فنی مجھ سے ریڈیو پر رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ جس کار کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا شاید کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا۔ لڑکی ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں ریڈیو کی موجودگی سے آگاہ نہیں لے میں نے وہ خانہ نہیں کھولا۔ چر سیکڑ بول سگنل بند لپٹا کر وہ فنی تھا تو یقیناً تشویش میں مبتلا ہوا ہو گا۔ میں نے ہاتھ لیکن سروسٹ میں لے اسے اس کے حال پر جموڑا۔

”یہ کیا سگنل تھا؟“ بولی نے پوچھا۔

”بھول چکے ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن فنی کا ڈاٹس تو یہ ہے اس نے ایک ڈاٹس کی رفتار اشارہ کیا۔

”یہ اس کے علاوہ ایک قائل اثر کی طرح ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس ڈاٹس کے بھی کچھ پہلے یہ خوار کرنا ہے۔“

”تمہاری گاڑی بہت پیچیدہ قسم کی ہے۔ اس میں بہت سی ٹکنیکی چیزیں ہیں۔“ وہ بولی ”میں جب ہمیں گاڑی کو ڈرائے کر ڈرائے تک سیٹ پر آکر بیٹھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے

کی جھلک بھی دیکھی ہے یہ کوئی فرجوان تھا۔ شاید نقشے میں دھست تھا۔

کوئی سواری مل جاتی۔ وہ خگل سے بولی۔

”رات کے پچھلے پرستان سڑکوں پر تھا مجھے دہائی کی
کو سڑاواں عمارت پرستان لے جاتی ہیں۔“ میں نے کہہ دیا
ایک آراستہ وچراغ ڈانگ دم میں کڑے تھے۔

میں بات اس سے کر رہا تھا لیکن میرے کان کسی بھی چیز
آہٹ نہ لگے ہوئے تھے نہ میری طرف خڑے ہوئے تھے نہ
"جھے اپنی نہیں، تمہاری فکر تھی۔ میں تمہارا پہلا چاہویں
لیکن لگتا ہے، تمہیں کسی کی بددعا کی کوئی ضرورت نہیں۔
میں تم سے تمہیں اپنے پاس سے۔"

”تمہاری ہمدردی کا شکر ادا کرنے کی قومیں تمہارے ساتھ لایا ہوں۔ تمیں کیا سلوک کہ میں اپنے محسنوں کا کیا قدوم ہوں۔“ میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہل ۳۳ صلیں کر استعجابی عادت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ لڑائی بھی عادت ہے۔“

پہلے سے کہتا تھا کہ میں نے اس کو بھڑکایا ہے۔
 وہ مجھے میں مقابل خاموش کھڑی تھی مجھے گھورتی رہی۔ میں نے
 اپنے سر کو ہولے ہولے ہلاتے ہوئے مٹکا کر کہا۔ میں نے ایم
 بک تھمارا نام بھی نہیں بولا۔

”میں نے میرا نام ”اس نے تجوی سے کہا۔“
 ”عین ہو تو زیادہ اچھا کہ۔“ وہ غصے سے بڑھ جانے لگا۔
 ”مارے حسن کے ہم وزن ہو جاؤ۔“ میں نے صحتی کے لئے
 تھوڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”عین خیر۔“ ہمیں میں کیا رکھا ہے
 جس اوقات تو نام شخصیت کے بالکل ہی اُلٹ ہوئے ہیں۔ تمہ
 کر خوشی ہوئی۔“

اس نے صانع کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ مگر کئی
 سے گھورتی رہی۔ ہر صبح بائیں ہاتھ کو دیکھنے لگی ہوا چاند
 بچ بچاتا تھا۔ وہ سب کھول کی جیاں روشن کر چکی تھی۔ میں نے
 صانع کا ارادہ لغوی کر کے دوسرے کمرے کی طرف چلے جاتا
 تھا۔ صحت اچھا لگتا ہے۔ اور بڑی مٹکی سے فرش کیا گیا ہے۔
 ظاہر آرائش دیکھنے کے بجائے میں نے ہر کمرے میں جماد
 میرے پیچھے تھی۔ میں نے کچن اور ہاتھ دھو رکھ کر پچھلے کمرے
 میں تھا۔ ہر جی اسے چلے کر کے کسی کو نہ کہہ رہے ہیں اس لیے
 پہلے کوئی کاچھنا یا سوخ مسابہ کچر کھل جاکا نانا شکل ہے۔
 میں تھا۔

”تم ہی ہو گئی؟ یہی کوئی نہیں ہے۔“ وہ بے سکتے سے ادا

”ویسے ہی مجھے وہم سا ہوا تھا کہ جب ہم یہاں پہنچے تو ایک
مڑکی میں مدھنی تھی۔“ میں نے کچ بٹایا۔ ”میں تو ساری
ہی کے لئے چکا کر رہا تھا۔“

میں بھی تھوڑی سی بھڑکی کے لئے کہہ رہی ہوں 'تم مجھے
بے حال پر چھوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے؟' اس کے لیے میں

۳۔ وہ جس نے طویل سانس لے کر محض اتنا کہا۔ شاید یہ
طمانیت کی سانس تھی۔ گاڑی راجوس کے دو دیوانہ من مدو پر
لائی اور اگلے چار بجے سے گارڈن ہاؤس کی طرف مڑ گئی۔

تین چار میل کے سفر کے بعد اس نے ایک پتھلے کے سامنے گاڑی روکی جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر آگیا بھول رہا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ایک کھالی ٹالے میں لگے گی۔ میں بھی جلدی سے اتر کر اس کے پاس جا پہنچا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ پتھلے کی ایک کمری میں دو بھنی خسی ٹھیک جو خسی ٹکی نے ٹالے میں کھالی کھائی وہ بھی بچھ مٹی تھی۔ باہر آگیا لگا ہوا تھا لیکن کیا اندر کوئی موجود تھا؟ اور اس نے لاش کیوں تھک کر دی گئی؟ کبھی دہی شخص اس سے پہلے یہاں آکر تو نہیں بیٹھ گیا تھا؟ میں بظاہر بچہ ہوا سی رہا لیکن اب میں پوری طرح ہوشیار تھا۔

میں نے مجھے کمرہ چھوڑ دیا جب اب تم چلے کہیں میں
اتے؟ تالا کھولنے کے بعد میری طرف نہڑتے ہوئے بولی۔ وہ
نیکی آنکھوں میں رُکھالی اور اوجھیت سونے کی پوری پوری کوشش
کر رہی تھی۔

”بد اخلاق کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“ میں نے اپنا لہجہ رنجیدہ
 کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے مجھے ان حالات میں میرے گھر پہنچایا
 تو تو میں تمہیں کم از کم چھ ماہ اپنے ہی قیام کی دعوت دیتا۔ اور تم
 اے پاکستان کی ایک بھالی گوی بھی نہیں پوچھ رہیں۔ میرا سرگرم رہا
 ہے۔ شاید میں صحیح طور پر اپنے گھر تک ذرا تیر تک بھی نہ
 رسکوں۔“

وہ کچھ نہ بولے۔ اس کا چوبید ستور چمرا ہوا اسامبا لیکن اس نے گیت کھل دیا اور پورے عرس داخل ہوتے ہوئے بولے۔ ”گازی در گزی کہو۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس وقت تک وہ پورے ہی
نٹ آن کر چکی تھی اور اندر کا دواؤں کا کھول چکی تھی۔ گھر میں کما
موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ہر طرف متاع
مراۃ تھی۔ لان صاف ستھرا اور سرسبز تھا۔ وہاں پتائی اور لان
سرسبز بھی پڑی تھی۔ کسی ایک خشک پتہ بھی پڑا دکھائی نہیں دے
تھا۔

میں نے اس کے پیچھے پیچھے اندر گھبتے ہوئے کہا۔ "خدا مرچہ تم
مجھ سے پیچھا پھرا کر گھر کی طرف روانہ ہونے کی کوشش کی

بیل بی بی چل رہی تھی اور دونوں مرتبہ تم نے یہی کہا تھا کہ
اے ادا کمرہ زادہ! اور نہیں ہے۔ میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں
بیل بی بی بچے وقت میں چار میل کا مسلہ تمہارے لئے کوئی وقت
نہ رکھتا۔

ہمیں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں پیدل ہی جاؤں گی۔ مجھے آگے

اس لئے میں آرام سے سوئے پر بیٹھ گیا۔ وہ ہاتھ دھو بیٹھ گئی اور
دواؤں کی دکان سے چند چیزیں نکال کر دواؤں میں ڈال دی۔ بڑی جلدی
صارت سے اس نے ہاتھ سے خون صاف کر کے دوا کا کچھ پی
کی۔ پھر دھیرے دھیرے ہاتھ پر دوا کی مالش کرنے لگی۔ چوڑوں کو ذرا
سا بھی جھونے سے بڑا درد ہوتا تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں سمیٹائی
کی لذت بھی تھی۔ میں سوئے پر تھا وہ آہنی پائنتی مارے قالین پر
بیٹھی تھی۔ ابتدائی طبی امداد کے لوازمات اس کے قریب ایک
چھوٹی سی ریس میں رکھے تھے۔

اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ لے انھیں کا پائنتی ہوئی
جھین میں نے ایک پار پیرانی میں جھانک کر اپنی انھیں کا محل
تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے انداز میں بڑی
مشاطی و صارت ہے۔ کیا تم بھی نرس بھی رہی ہو؟"

"نہیں ہو۔ میں اب بھی نرس ہی ہوں۔ میں تو جہان ہوں کہ
تم نے ابھی تک یہ پوچھا ہی نہیں تھا کہ تم کیا کرتی ہو؟" وہ استرا
سے لیجے میں بولی۔

"تمہارے ہاں خواتین سے یہ پوچھنا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا کہ
تم کیا کر رہی ہو۔" میں نے جواب دیا پھر اوروں کو ڈرنا جاننے لیتے
ہوئے کہا۔ "ماشاء اللہ! یہ پیشہ کافی تنہا کر رہا ہے۔ اگر اس شہر کی
لوگوں نے تمہارا دین سن دیکھ لیا تو سب کی سب نرس بننے پر تیار
جائیں گی۔"

"میرا یہ دین سن میری عزت و کرامت میں ہے۔ میں اپنی
احسن نہیں ہوں جو ایسا دعویٰ کروں گی۔ میرا خاندان کافی خوشحال
تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد بہت کچھ میرے حصے میں آیا تھا۔
میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔"

"تو پھر تمیں نرس بننے کی کیا سوچیں؟ دنیا میں کوئی اور کام
نہیں نہ کیا تھا تمہارے لئے؟" میں نے لانا غصے سے پوچھا۔
"نہیں۔ کیا یہ اچھا کام نہیں ہے؟" اس نے پوچھتے ہوئے

لیجے میں پوچھا۔
"بہت اچھا ہے مگر جب روئے میں اتنا کچھ ملا ہو تو اس پیشے کی
طرف وہ جان کھاتا ہے۔"

"تعلیمات بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "مجھے
ذاکر بننے کا شوق تھا۔ مارکس کم دے گا، میں ہی سگی۔ میں نے
سوا نرس بننے میں بھی کیا حرج ہے۔ صحت تو بڑھنے سے لوگوں کی
خدمت کرنا تھا۔ ذاکر بھی میں پیسے کے لئے تو بنا نہیں چاہ رہی
تھی۔"

"خیر کرنے سے پہلے سب کا بیان کیا ہوتا ہے۔" میں نے تو
بھر کر کہا۔

بہت سی دوا میرے ہاتھ میں جذب ہو چکی تھی۔ کافی راحت
محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ ہوئے بولی۔ "میں تمہارے
مائی ہوں۔"

برے چارگی آگئی۔ میں دوبارہ تساری کو پڑی نوٹے یا تم
لیجے نہیں دیکھنا چاہتی۔"

میں نے دل پر ہاتھ رکھتے
"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں بھی ہرگز نہیں چاہتا
پر تم سے کچھ چھیننے آجائے اور بہ دودی سے تم پر چھینز
رکھنے چلائے۔ میں نرم دل قوی ہوں۔ اتنے صہین
خیز بننے نہیں دیکھ سکتا۔"

ہاں کو کہ عیاش قوی ہو۔ اچھی صورت دیکھتی ہی اسے
کی گھر میں لگ جاتے ہو۔ "اس کے لیے میں نرس تھی۔
نہیں۔ ابھی اتنی قابلیت مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ عیاش کی
میں پورا نہیں آتا۔" میں نے افساری سے کہا۔

تمہارے معزز قوی نظر آتے ہو تمہاری حرکتیں اتنی معززانہ
ہیں۔

مجھے خیال میں معزز بننے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں
قوی تیز کی طرح نہ چلا کر لوگ چھینز پر بیٹھ جائے اور
بیتے وقت یہ دیکھ رہے کہ سوٹ میں کیس کیس کی حرکتیں
انسان کو بیٹھنے پر لے اور ہاتھ پاؤں ملائے جلائے رہتا چاہئے۔
وہ دوسروں کے معاملات میں غائب اڑانے کا کچھ زیادہ ہی
ہے۔" میں نے کہا۔

خداوند کا ٹوٹ ہی جائے؟"

میں بھی تک تو نہیں ٹوٹی۔ اگر ٹوٹ گئی تو شاید باز آجائوں۔"
نہ غراب دیا پھر اوروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں بالکل
آئی ہو؟"

"ہاں بالکل آگئی۔" وہ چہچہتے ہوئے لیجے میں بولی۔
"تمہارے کام کاج بھی خود کرتی ہو؟ آجائے بڑے گھر کو صاف
گئی خودی رکھتی ہو؟ اتنی جلدی شکاری لگے جان ماری تم نے
اسے بھی؟"

"میں پارٹ قائم کام کرنے والے آئے ہیں۔ اپنا اپنا کام
لیجے جاتے ہیں۔ میں کسی کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتی۔" اس
دلیل دیا۔

"ایک پارٹ قائم شوہر بھی رکھ لو۔ کیا حرج ہے۔" میں نے
دست دیا۔

"میں تم امیدوار ہو گئے ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

"دو فراسات تو میں بھی قیج کل ہاتھ میں لئے گھوم رہا ہوں
ابھی اتنا جلد باز نہیں ہوں۔ میں ملاقات جاری رہی تو شاید
بھی آجائے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ کوفتہ ہو کر میری زبان بند کرانے کے لئے بولی "تم یہاں
ابھی تمہارے سر پر بیڑا لگائی ہوں اور ہاتھ پر بھی دوا لگائی
ہے۔"

اس کی اس جھلک سے فائدہ اٹھالینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

وہ لیکن میں چاہتی تھی کہ میں نے انھیں کرفون پر مائل ٹاؤن والی
کوٹھی کا خبردار کر دیا۔ دوسری طرف جیسی موجود تھی۔ میں نے بچی
تواڑ میں اور کوڑو روڑ میں اسے ہدایت دی۔

حقانی جہاں کہیں بھی ہو اسے ویڈیو یا فون پر میرے بارے میں اطلاع دے دو کہ میں خیریت سے ہوں۔ وہ پشیمان نہ ہو اور جس گاڑی کا وہ تعاقب کر رہا تھا اس کے بارے میں دوپٹا روٹ یا تو میرے فون پر ویڈیو رکھ دے یا میں سوچ لے لی اس سے طہوات کر لیں۔ گاہقی الحال میں اس سے بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

میرے آخری الفاظ ادا کرنے تک وہ دوڑنے میں کان کھڑی ہوئی تھی اور فضیل فکروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ لیکن میرے الفاظ کچھ اور تھے۔ وہ ان سے کوئی مضموم اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ریسور رکھ دیا۔

”کسی کو یہاں بلا ہے؟ پولیس کو اطلاع دی ہے؟ تمہاری اطلاع کے لئے یہاں کہ پولیس میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرے۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”کھارہے“ نہیں کو شرفاء کے معاملات میں مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ”میں نے مصیبت سے کہا۔“ ”قیس یہ کہیں کیونکر گزرا کہ میں کسی کو بلا رہا ہوں یا نہیں کو اطلاع دے رہا ہوں۔“

سچا کہہ رہے تھے۔ یہی گھنٹی گھنٹی تو ازمیں ٹیلی فون پر نوازے کی
یسا ضرورت آن پڑی تھی؟ وہ بدستور مجھے گھوڑی تھی۔

”کاروباری آدمی ہوں۔ وقت بے وقت منظمی کے بجائے معلوم کرتا رہتا ہوں۔“ میں نے حتی الامکان سادگی سے کہا۔

رات کے اس پرتو صرف ایک ہی منڈی کھلی ہوئی ہے۔
 دور اس کے بجائے مضموم کرنا خاصا میوب کام سمجھا جاتا ہے۔
 نامی اول۔

”چھوٹا! کہاں ہے وہ منٹری؟ کیا تمہیں اس کے بارے میں
 اسی معلومات ہیں؟ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ کبھی کبھی میسج بھی کرتی
 نے تو بڑا دل چاہتا ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ بچا ہونٹ دانتوں میں دبائے گئے گھبراہٹ میں۔ پھر
وہ بے جا ماری آمیز سے لہجے میں بولی "تم سچ ہی بتاؤ گے نہیں
ہے۔۔۔ کے فون کر رہے تھے؟ مجھے اب کچھ نہیں ہے؟" ذہن میں غصہ
سے کہ۔۔۔

میں نے حسد کی اتنی باتیں کہیں کیا۔ تم میری ایک بات پر
 مین کہنے کے لئے چار نہیں ہو۔ یہ تو میری زنادانی ہے۔۔۔

اسے بھی قنوتیں ہوگی۔ اسے اپنی خیریت کی اطلاع دے دیا تھا۔

مظلوم نہیں وہ میرے چرواہے سے مطمئن ہوئی یا نہیں۔ سرِ مغل
 نام میں دایکس جلی گئی۔ اس کے گھنٹے میں جدید ترین ساز سازمان
 جو دھما۔ فوراً ہی کھلی ہمارے آئی۔ اب میں نے دیکھا وہ اپنے

چہرے کی چروٹوں پر بھی دو ایک ہالٹ کرکھی تھی۔ کان ٹوٹی کے
خاموشی رہی۔ یہ شہزادہ ہم پر خیال انداز میں ایک دو سرے
رہے۔ جیسے نظروں ہی نظروں میں ایک دو سرے کوکل رہے۔
پھر شاید ہم ایک دو سرے کی مدد سے کوئی کوکل رہے تھے
جوئی میں نے کالی ٹانگ خالی کر کے ٹرے میں دو ایسی راک
بول اٹھی۔ "تم اب چلے کیوں نہیں جاتے؟"

۳۴ مگر تم دو منٹ پہلے کہہ دیتیں تو میں کافی کام کا اجر نہ
 ہی رخصت ہو جاؤں۔ خواہ علاوہ ہی تم نے دو منٹ مزید مجھے برا
 کیا۔" میں نے کہا۔ "اب تم جانے کو دل ہی نہیں چاہا۔
 بہت اچھی تھی۔ اسے پہنے کے بعد میرے خیالات میں ہلکی
 تبدیلی آئی ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر دوہنے والے ایسے میں ہوتی تھیں کہ
جمہور کی سہ کمرہ وی ہوں۔ خدا ان کے لئے اس وقت بڑے جائز
مست پر نشان ہوں۔ مجھے اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔
کہ میرے سر پر سوار ہونے کا اتنا ہی شوق ہے تو جگر کی
آفتاب۔ مگر تو تم نے رکھی لیا ہے۔

”پھر بھی آنے کا ارادہ رکھتے والوں کو مصیبت نواہ
 ہو جائی کہتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کا دوبارہ آنے کا یہی
 ہے۔“ میں نے اطمینان سے کچھ اور جھل کر بیٹھے ہوئے
 نواہ اہم تو جی ہی کی رات ہے۔ دراصل مجھے شبہ ہے کہ
 رات کر ضرور آئے گا۔ پھر وہ نہ جائے تم سے کیا سلوک کرے
 ”تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اس کے آنے کے ضرور
 روبرو ہوں؟“ یہ فیصلے انداز میں بولے۔ ”ہو سکتا ہے مجھے از
 بد کا انتظار ہو۔“

”میں تو میں دیکھتا چاہتا ہوں کہ کس کو کس کا انتظار ہے۔
 وہ کس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔“ میں نے کہا ”جیسے ا
 بے کہ تم نے اسے گھر کی چابی دی ہوگی ہوگی تاکہ وہ جسر را
 ہے کل کل جالے کی دھڑکتے ہوئے اندر آ سکے؟“

”ہاں دی ہوئی ہے۔ تم سے مطلب؟“ ”تقریباً چالیس۔“

چلائے ہوئے کما لیکن سرپلانے سے دودھ دار بھی آگھوں
سے خود بخود اچھے لگے۔ میں نے فوراً ہی سر کو مزید اچھے
کرایا۔ اسی میں عافیت تھی۔ پیڑنچ کر کے وقت گھنٹے
انے کے لئے دو گولیاں بھی دلی تھیں۔ اب میری حالت نا
رہی تھی لیکن ابھی چوٹ کے اثرات تو بہر حال باقی تھے اور
ل قاع کہ وہ تین دن تک اس سے بھی زیادہ تکلیف برداشت
نہی پڑے گی۔

تیس شخص تو میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا: ”اے گھر کی چابی ہے! اس شخص سے کوئی خاص غرض ہے، لیکن مجھ میں ایک بڑی غرابی ہے۔ اگر کوئی ایسا کاری ہے“

نہیں۔ اور وہ ایسا نہ ہو تا تب بھی اس سے تمساری شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا میں نے ملائت سے کہا میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اس سے دوبارہ جلد از جلد کہاں اور کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے؟

”میں ملنا چاہتی ہوں“

”میرے ہاتھ کی درم اور سر پر بندھی ہوئی پٹی اپنا حساب لگے دی ہے۔“

”کیوں؟“ ”مجھے مجھے انداز میں مری سانس لے کر بول رہا تھا کہ تم حساب لینے کی فکر کو نقصان میں رہو۔ یہ کوئی علمی بحث نہیں ہے اور نہ یہ دینی یا تمہارے کہیں تمہارے ساتھ کچھ ہو گیا تو تم لاٹھی لگاتے ہوئے انتقام لینے کے لئے نکل کھڑے ہو گئے۔ اسے ایک حادثہ سمجھ کر معمول باز انسان کو سرورہ جاتے جاتے ہی تو چوتھ تک جاتی ہے ابھی کچھ دیر پہلے ہم اس سے بھی زیادہ خطرناک حادثے سے بچے ہیں۔ وہ شرابی اگر ہماری گاڑی سے گاڑی ٹکرائی ہوتا تو تم کیا کرتے؟“

”مگر میں زندہ بچ جاتا اور وہ بھی کسی نہ کسی حالت میں زندہ رہتا جاتا تو میں اسے ضرور سبق سکھاتا کہ یہ محض اتفاقیہ حادثہ نہ ہوگا۔ اس کی شراب نوشی کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آتا۔ میری ذاتی ذرا لے اسے ضرور سزا دیتی ہیں لے جواب دیا۔

”تمساری ذاتی ذرا لے؟“ ”اس نے قدرے چمک کر کہا۔

”میرا مطلب ہے میں اپنی ذات کی حد تک اسے قابلِ صفائی نہ سمجھتا ہوں لے جلدی سے کہا۔

”تم تو واقعی زبردست ہو رہے ہو؟“ ”کچیاں ملنے ہوئے ہوئی“ ”مگر شجاع کا تو تم نے بچھا پکڑ لیا ہے لیکن جس نے تمہیں زیادہ شدید چوٹ لگائی؟ تمساری گھبراہٹ پر راکھ کے بٹ سے وار کیا اسے تم بھول گئے ہو۔ اس کے بارے میں کیا کہو گے؟“

”تم نے کس نے کہہ دیا کہ میں اسے بھول گیا ہوں میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میرا دل کہتا ہے کہ جب مجھے احمد شجاع مل جائے گا تو اس دوسرے شخص کا سراغ بھی خود بخود ہی مل جائے گا۔“

”جو کیا اب تم زندگی بھر یہاں بیٹھے احمد شجاع کا انتظار کرتے رہو گے؟“

”جو کیا تمہارے خیال میں وہ اب میری زندگی میں یہاں نہیں آئے گا؟“ ”میں نے جواب دیا ”پوچھا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ پوچھ رہی تھی تم تک اس کا انتظار کو گے؟“ ”جلدی سے بول۔

”بھل کر مجھ پر گولی چلا کر اور میرے سامنے کسی سے کچھ جین کر جاتے تو عام طور پر مجھے واقف کو نیند نہیں آتی۔ اسے تلاش اچھے لئے ادا ہی ضروری ہو جاتا ہے جتنا خرگوش کے لئے رکھتا۔ صاف کرنا اس وقت کوئی مناسب تشبیہ نہیں سوجھ

”وہ ایک تک مجھے گھور رہی تھی۔ اس وقت اسے میرا خوش دلی بات کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے اسے پوچھا۔ ”وہ تھا کون؟“

”عبدالرشید۔“ ”اس نے جواب دیا۔

”کیا بڑی سنڈی کا کوئی آؤ جی تھا؟“ ”میں نے دریافت کیا۔

”نہیں، بکرا سنڈی میں بکے بچا تھا۔“ ”وہ جل کر بولی۔

”یہی انداز میں بات کر کے کی کو شش کر رہی تھی۔

”بکے نہیں، کہاں بچا ہو گا۔“ ”وہ انگوٹھی والی خوش شکل مالہ۔“ ”میں نے خیال ظاہر کیا۔ اس کی آنکھیں پتائی تھیں کہ وہ میں اور مجھنا ہٹ کا شکار تھی لیکن اس کی رحمت خیر نہیں لی تھی۔

”ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے حتی الامکان عجیبی سے لہ میں دراصل یہ جانتا چاہ رہا تھا کہ اس سے تمہارے مصلحت کی بات کیا ہے جو تم اس کی اتنی بدسلوکی بھی مہو سکون سے داشت کرنے کے لئے تیار ہو؟“

”وہ بھی ظاہر عجیبی سے ہی بولی۔ ”وہ میرا بھتیجہ ہے۔“

”وہ میرے خدا!۔“ ”میں صوفے سے کرتے کرتے بچا۔ بیٹیا

”میں آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔

”اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟“ ”وہ غلی سے

”اس سے میری ملاقات بے شک خوشگوار ملاقات میں نہیں

”دلی تھی۔ وہاں بددینی بھی کم تھی۔ میں اسے صحیح طور پر نہیں دیکھ

”کا لیکن پھر بھی مجھے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اس کی عمر پچاس

”سے کم نہیں تھی۔“

”تب بھی حیرت کی بات کیا ہے اس میں؟“ ”وہ بولی ”کیا اس

”ماٹھے میں بڑی عمر کے مردوں کی شادیوں جو ان لڑکیوں سے

”نہیں ہوئی؟“ ”کیا یہ کوئی انسانی بات ہے؟“

”نہیں۔ انسانی بات تو نہیں ہیں لے حلیم کیا ”مگر نہ جانے

”کیل دل کو نہیں لگ رہی لیکن خیر۔ کیا اس کا نام عبدالرشید

”ہے؟“

”نہیں۔ وہ میں جل کر کہہ رہی تھی۔ اس کا نام احمد شجاع

”بھگوانی میں ملے علی علی علی پوچھا خاصا نامور بکرا تھا۔ اس عمر میں

”کی عمر ستر“ ”خاطر اور چال و چل چل رہا ہے“ ”اس نے جواب دیا۔

”مجھے تو میری گرفت میں آنے سے بچ گیا۔ اس کے

”عورت“ ”خاطر اور چال و چل رہا ہے“ ”وہ بولے میں تو مجھے کوئی شک

دل و لپاٹ گئے ہو وہ فیصلہ کن لمبے میں بولی۔

و غصہ فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ اسی ٹیلیفون سیٹ کی طرف ہم جو درانگہ دم میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھکا ہوا کاغذ اڑا کر کچھ ایسا بے تابانہ تھا جیسے اسے بہت دیر سے فون کال انتظار رہا ہو۔ رہیور اٹھا کر اس نے صرف ہمیں ہلکا اور ہلکے خاموش کھڑی رہی۔ میں نے اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ اس کا چہرہ ہلکی طرح پات تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے رہیور رکھ دیا۔

ہلکا وہ خیریت سے گھر پہنچ گیا ہے۔ ہمیں نے پوچھا۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے واقعی عذر کر لیا تھا کہ اب میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔ وہ ایک بار بار کمرے سے نکل آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچن کی طرف جائے گی لیکن وہ انہیں طرف حذر کر دیکر بیڈ روم میں کھس گئی اور دوکان اس نے منتقل کر لیا۔

میں نے یہ تو ازبندہ کہا ہمیں نے تو ابھی تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو ہمیں یوں اندر کھس کر دوکانہ بند کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

اب تو سپیڈ سحر بھی نمودار ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے اب نہ پلے باز۔ اس کی کھنٹی کھنٹی تو ازبانی دی۔ اس میں تمہاری بھلائی بھی ہے۔ میری بات مان لو۔ کبھی کبھی کسی ایسی کا مشورہ بھی مانا جا سکتا ہے۔

میں نے اہل کے دوکانے سے چھٹک کر دیکھا۔ واقعی پیچھا سحر نمودار ہو رہا تھا۔ پر عیوں کی چھٹا ہٹ سٹائی دینے لگی تھی۔ میں چند لمبے وہیں تھکڑب کے عالم میں کھڑا رہا۔ آخر کار میں نیلے رنگ کی لباس بہت ہو چکی تھی۔ مجھے پلے ہی جانا چاہئے تھا۔ خست کے لمبے میں کوئی بات تھی جس نے مجھے شرمنا سا کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی اب میں اس کی صورت اور لکھنا اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ مجھے کئی حد تک یقین تھا کہ وہ کہیں نہیں جاسکے گی۔

میں نے اسے خدا حافظ بھی نہیں کہہ کر اور خاموشی سے اپر اٹھا ٹھک ہوا صبر سے چہرے سے گھرائی تو اپنی فرحت محسوس ہوئی۔ پر عیوں کی چھٹا بھی بہت جلد ٹھک رہی تھی۔ چوتھوں میں اس کی فوط پھری کھڑی تھی۔ گاڑی چھٹی لیکن میں قیامت تھی۔ میں نے اس کا ہنر نہیں دیکھا اور اس کے عقب سے اپنی گاڑی نکال لی۔ وہ گیت بند کرنے بھی نہیں آئی۔ میں نے بھی نکلی رہنے دیا۔

میں روڈ پر پہنچ کر میں اپنی توڑی ہی دور گیا تھا اور گاڑی کی رفتار بھی معمولی ہی تھی کہ کوئی سڑک کے صحن چھ میں آگیا اور زور زور سے دونوں ہاتھ ہلانے لگا جیسے سخت سمیت میں ہو۔ وہاں وہ طرف سڑک کے درمیان گرین پلٹ تیار کی جا رہی تھی۔ مجھے لگے گئے یہوں کے گرد انٹینس کی چھٹی چھٹی جالی دار حاشی

جلدی۔ اس دو تین سائیکل کا خفیہ ہونا باقی ہے۔ وہ بولی۔

اس سائیکل میں کہیں اس کی پہلی پیری اور جوان بچے وغیرہ شامل نہیں ہیں۔ ہمیں نے سادگی سے پوچھا۔

وہ مجھے گھور کر کہہ گئی پھر کات کھانے والے انداز میں بولی۔
”ہمیں اس سے مطلب؟“

”ایسے ہی۔ سزا جزیل مانج کے لئے پوچھ رہا تھا ہمیں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

”میں ذرا یہ برتن دھو لوں۔“ وہ ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ شاید برتنوں کو نئے ہوئے پھونکا اس کی عادت نہیں تھی۔ یا پھر اپنے اضطراب کو چھپانے کے لئے اس وقت وہ کوئی مصروفیت ڈھونڈ رہی تھی لیکن جس محبت اور اٹھاک سے وہ برتن دھو رہی تھی اس سے اس کی غفلت کے کسی اور ہی پہلو کا پتہ چلا تھا۔

”لگتا ہے گھر بوائے کی بہت آوند تھی ہمیں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

”تم پر یہ انکشاف کیسے ہوا گیا؟“ وہ جارحانہ لمبے میں بولی۔ حالانکہ میں دیکھ چکا تھا میری بات سن کر اس کے ہاتھ ایک ٹانے کے لئے لرز کر رہ گئے تھے جیسے کسی نے دل کی گرائیوں میں مد فون ہونے کے آرم پیڑ دئے ہوں۔

”ویسے ہی۔ تمہارا برتن دھونے کا انداز دیکھ کر احساس ہوا۔“

”بہت عجیب ہے اس چھوٹی سے عمر میں۔ سختی شایاں کی ہیں اب تک؟“ اس نے سڑک میری طرف دیکھا۔ پہلی بار اس کے کچے میں تازہ کچھ کم محسوس ہوا۔ اس نے مجھے یوں چھوٹی عمر کا قرار دیا تھا جیسے خود کوئی بزرگ خاتون ہو حالانکہ وہ زمانہ سے نواہ میری ہی ہم عمر ہو سکتی تھی۔

”ابھی ایک ہی کس نے کی بہت نہیں پڑ رہی۔ اور تم اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے یہ بھی درشت سے نارنگیاں توڑنے کے حرافہ ہے کہ اب تک کتنی توڑ چکے ہو۔“

”بھئی لوگوں کے لئے یہ اس سے بھی آسان کام ہوتا ہے۔ وہ برخل کو کھٹکا کر ایک کینٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔

”مظاہرہ شمار۔“ ہمیں نے پوچھا۔

”یہ تم ہر بات پر اس کو کیوں سچ میں سمجھ لاتے ہو؟“ وہ پھر کہنے لگی۔

”آج وہ میرے ذہن پر سوار ہو گیا ہے۔ میں اپنی بزدلی پر مغرور خواہوں کہ ذہن پر سوار ہو اسی لوگوں۔“

اس پر وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے سرسری سے لمبے میں کہا۔
”تیک میں تھا۔ کھا آچا تو ہی ہو گا؟“

”لے گا تو خود ہی پوچھ لیا۔ میں اب تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دلیں گی۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ اب یہ سے تم میرا

لے تھوڑی سی چلی۔

"تمی ہاں۔ میں اندر سے میں ایک دہار سے چپکا کر تھوڑا سا
سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ دھڑکی سے بولا۔

خندہ میرے سینے پر تھی مگر اس کا کھٹا کھٹا کہ وہ اس شخص
کی جھلک دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتی
تھی۔ وہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب کہ اس کا حق
لڑکے کے دور سے اسے دیکھ کر اس کے بارے میں کام کی بات
بتا دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خندہ اس بندر نما شخص کے بارے
میں یقیناً کچھ جانتا تھا۔ خندہ خندہ خندہ خندہ خندہ خندہ خندہ
سکتا تھا۔ اس کا دور سراسر مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خندہ کا لے
سے کوئی تعلق تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ اب وہ احمق مجھے انداز نہیں
لگ رہا تھا۔

"شاید پولیس کے آنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس بندر
نما شخص اور لڑکی نے لی کر جلدی سے آپ کو آپ کی گاڑی میں
ڈالا۔"

"تم نے ابھی طرح دیکھا تھا کہ اس شخص نے اس کام میں
لڑکی کا ہاتھ بنایا تھا؟" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کالی۔

"تمی ہاں۔ اور اس کے فوراً بعد وہ دو چھلانے کی طرح معلوم
نہیں کلاں غائب ہو گیا اور لڑکی آپ کی گاڑی ڈرائیو کر کے آپ کو
لے کر چل دی۔" تو سم نے بتایا مجھے پہلے ہی شہر تھا کہ مجھے ...
پھر لڑکی کی حالت میں خندہ عمارت کیٹ کر گاڑی میں نہیں ڈال سکتی
تھی جبکہ میرے سوٹ یا جسم پر بھیٹے جانے کے نشانات بھی نہیں
تھے۔

دس بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میری روح تھوڑی
تھی مجھے لگ رہا تھا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا لیکن میں نے سوچا
لڑکی آپ کو پتا نہیں کلاں لے جا رہی ہے اس لیے میں آپ کے
چپچپے لگا رہا ہوں ایک مضمون جگہ پر رک گیا۔ کافی دیر بعد خندہ
سے آپ کی بھی پوچھا نہیں دیکھا دی اور میں سمجھ گیا کہ آپ ہوش
میں آگئے ہیں۔ تب میرے دل کو کچھ اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد
میں آپ کے خاقب میں یہاں تک آیا اور تب سے یہاں چھا
آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔"

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔ میں نے گاڑی سے اتر کر
یہ سوچتے ہوئے اس کی بیٹھ چکی کہ کبھی کبھی کچھ ہنسنے کا کام آتا
ہے۔ سب مجھے تمہارے بارے میں رائے بتاتی ہے۔ گی۔ میرا
خیال ہے تم اتنے احمق نہیں ہو جتنا میں سمجھتا تھا۔"

"میں کتنا ہے؟" میں نے احمق ہوں؟" میں نے قدرے خشکی سے
کہا "میں آپ کو میری فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ
سب کچھ میں اس لیے کر رہا تھا کہ مجھے جاسوسی کا پڑا شوق ہے۔ میں
تو ایک جاسوسی ڈائل بھی لکھ رہا ہوں۔ کیا وہ سوچنے لگ چکا ہوں؟

دہار میں لڑکی کی مٹی جھس۔ ایسی ہی ایک چار دیواری کے
پے نکل کر وہ سامنے آیا تھا۔ صبح کا اجالا ابھی واضح نہیں
تھا اس لیے میں نے ہینڈ لائٹس روشن رکھی تھیں۔ ان کی
نئی میں میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا اور بے اختیار گہری
س نے کر گاڑی ہو کہ میں اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا تو
ابید نہیں تھا کہ وہ گفت گازی کے نیچے ہی آجاتا۔ وہ اتنی ہی
بیا ہوا نظر آتا تھا۔

وہ سم احمد تھا۔
"تم یہاں کیسے پہنچ گئے احمق؟" میں نے گاڑی ایک طرف
لے کے بعد لڑکی سے سر نکل کر پوچھا۔

"میں تو جائیز دستوران سے ہی آپ کے خاقب میں ہوں
لیکن میری گاڑی شور بہت کرتی ہے اس لیے میں نے قافلہ
رکھا تھا۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر جواب دیا۔

میں ایک لمبے کے لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ واقعی
نہ احمق تھا جتنا نظر آتا تھا؟ میں سمجھ رہا ہوں تو جا رہا تھا وہ
نارات سے میرے خاقب میں تھا اور مجھے علم نہیں تھا۔ میں
دیکھا تو سری طرف کی سڑک کے کنارے ایک دیوار کے قریب
دیکھ کی ایک فوکی لڑکی تھی۔ یقیناً وہ اسی کی تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا "کیا ضرورت آپ نے لڑکی خد
کے خاقب کی؟"

"پہلے تو میں میڈم سٹان کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ قدرے
پلے سے ہے میں بولا "پھر اس امید پر باہر موجود رہا کہ شاید آپ
نہیں تو آپ کا موٹر فلوگوار ہو اور آپ مجھ پر ترس کلاں
میرے سنے کا کوئی حل تجویز کر دیں۔ لیکن جب آپ میڈم
اکے ہاں سے نکلے تو مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں
پایا کہ میں کہہ سکتا تھا۔ میں نے پھر آپ کے چپچپے
لیا۔ اتفاق سے وہ صبح آپ جا رہے تھے اور میرے ہی مجھے بھی
کھڑا تھا۔ لیکن آپ کے ساتھ تو راستے میں مجھ ہی پھر
- میں تو ڈر گیا۔ دوری سے چپ کر دیکھا رہا۔ جب اس بندر
نما نے آپ کو بدھتی کاٹ مار کر بے ہوش کیا۔"

"بندر نما انسان نے؟" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے
نہ چاہی۔

"تمی ہاں۔ وہ چھوٹے تھے نہ کاٹا۔ لمبے لمبے جھل تھے۔ ملاں
لی ملاں سے کافی دور چھا۔" اور وہاں دو فوکی بھی تھی
جب سے میں نے یہ دیکھ لیا ہے "میری نظر بہت شاندار
تھی کام کرنے کی ہے۔" اس نے ٹیک کے موٹے موٹے
سائے عقب میں گول گول آنکھیں کھائی تھیں "میں نے اس کی
لیکس کی دیکھیں ان سے ہی اندازہ ہوا کہ وہ بالکل بندر جیسا
میری نظر آتا تھا۔ بندر سے بھی زیادہ۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اسی نے میرے سر پر بٹ مارا تھا؟" میں

یولا "وہ بے لوثیاً یہ بھی خوبصورت تھی جو آپ کو اٹھا کر لے آئی تھی۔ کانی دیر ہے آپ اس کے ہنگامے میں کیا کر رہی تھی؟" "مگر رہی تھی وہم بھائی سے میرا سلام کہنے کا۔" "میں جواب دیا۔

اس کی ہانک سڑکی اور باجیس مزید جھل جھل گئیں۔ مجھ کو جسم کو ہلکے ہلکے جھکے گئے تھے۔ حق سے عجیب سی توازن ہوئی۔ بالکل ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کوئی گاڑی ہینڈول ختم ہونے کے بعد سے جھکے لے لے کر رکنے لگی ہو۔ دراصل وہ شریطہ انداز میں ہنس رہا تھا۔

"مذائق مت کریں چوہری صاحب! اچھی چینی تائیں! وہاں کر لیا۔

"دیکھو... میری حبیبیت ہے کہ اس لڑکی کو بہن بنا کے پھر میں مت پڑتا اور نہ ہی اس کی سرائی کی کوٹھیا کٹائیے خطرناک معاملات ہیں۔ کس اپنی جان کو خطرے میں ڈال لیا۔" "مجھ گئے؟"

"سمجھ گیا؟" اس نے اپنی جھلی ہوئی باجیس سڑکی لیں۔ سر دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بند کر دیا۔ ہو گئے۔ اگلے چار ماہ دونوں الگ الگ سمتوں میں چلے گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد میں گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے آخر کار اسے ایک جگہ روک لیا۔ میرے ذہن میں بھڑکی سی پک رہی تھی۔

مجھے اس لڑکی کو ایک بار پھر کرینے کی کوشش کرنی چاہی۔ مگر کو تو وہ میری نظر میں پہلے ہی تھی۔ اس کی کئی بات میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ سم کے بیان کے بعد تو اسے نہ بھی اس کا کوئی تعلق محسوس ہونے لگا تھا اور میں وہ خطرناک تک مگر ہو گئی تھی۔ چند لمبے سوچنے کے بعد میں نے گاڑی واپس سونڈ۔

جب میں دوبارہ اس جگہ پر پہنچا تو اس پر بڑا سادی تاج پہنا تھا اور صبح کی ٹپکی روشنی میں وہ دروازہ کھولے سکوت میں ڈھونڈتے تھے۔ میں نے گاڑی سے اتر کر ایک لمبے سوچا اور حرا دیکھا پھر چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک بار چلا گیا۔ میں نے غلط اعتماد سے بچوں کے بل چلا گیا۔ کئی تھی اس کے باوجود اس کی دھمک ہوئی کہ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ وہ دونوں اہتوں سے تمام کر دوں۔ بیڑہ جاؤں لیکن میں نے صرف ایک لمبے کے لئے کے ستون کا سامنا لینے پر اکتفا کیا۔

پورے میں کھنڈے جو بھی اس کا اصل نام تھا۔ اس کی بھی اب موجود نہیں تھی۔ اب وہی دورانہ بھی منتقل تھا۔ میں قنارت کے چاند طرف پھر گیا۔ تمام کوڑیاں وہاں سے منہ سے بند تھیں۔ یہی میری حیات تھی۔ اب وہاں سے اب موجود نہیں تھی۔ شاید میرے جانتے ہی نکل چکی تھی۔

"میرا سوچنے؟" میں نے حیرت سے کہا "اسے چھاپے گا کون؟"

"یہ تو میں بعد میں سوچوں گا۔ پہلے اسے مکمل تو کر لوں۔" وہ بے پروائی سے بولا "میں تو دنیا بھی پراپیٹ سرائی میں چاہتا تھا لیکن اب لے جیسے ڈانٹ پر وائز ہو گیا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ میں پراپیٹ سرائی میں چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے ہی کارخانے کی بنی ہوئی چیل اٹھا کر مجھے رسید کی اور کہنے لگے "مار کر کمال اوچڑوں کا" ساری سرائی رسائی اور جاسوسی نکال دیں گا۔ مجھے یہ روت ہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر میرے جاسوسی ناول کا مسودہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو کس پھاؤں دیں۔"

"چھاپے گا؟" میں نے ملافت سے کہا "میں بھی جب میں اس جگہ کے اندر تھا تو تم نے کسی کو باہر آتے یا اس پاس منڈلاتے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں؟" اس نے ٹپکی میں سر ہلا کر پھر شکوہ آمیز سے لمبے میں بولا۔ "لیکن آپ نے واپس آنے میں بہت دیر لگادی سرائی تو اب بالکل ہی مارا گیا۔ میں تو آپ سے مسئلے کا حل پوچھنے کی گھر میں تھا لیکن آپ کی اطلاع تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ میں گھریا کر آیا تو کیا جواب دیا؟"

"میں سہلے میں؟" میں نے جانتا چاہا۔ "مگر میں تمام رات کہاں قاب رہا۔ وہ تو میری جڑی اوچڑوں کے "وہ خوف زدہ سے لمبے میں بولا۔

"تو دن کا تم بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے اور یہی بڑا غیرت ہے کہ تم گھر واپس پہنچ گئے؟" میں نے کہا۔

"وہ اس قسم کی باتیں سننے کہاں ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے بلکہ وہ خود سب سے بڑی مصیبت ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "خیر۔ اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔" "میں مصیبتوں کا سامنا کرنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہتی تھی۔" "حال تو تم گھر جاؤ؟" میں نے اس کا کدھا چٹکا۔

"وہ سر کھاتے ہوئے بولا "اور وہ میرا مسئلہ؟" "میرا مستقبل؟" میری تو ٹپکی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

"میں کہہ چکا ہوں نا کہ اس کے بارے میں طبیعتان سے بیڑہ کر بات کریں گے۔ ایسے اہم اور سنگین مسائل کے بارے میں سربراہ کوڑے ہو کر کیا بات ہو سکتی ہے؟" میں نے ملافت سے کہا۔

"چھاپے گا؟" ایک قدم پیچھے ہٹے ہوئے قدمے اپنی ہی سے بولا۔ اس کا منہ ٹھک گیا تھا۔ اس کے لئے بھان ٹپکی اور ایڈیٹر کی مختصری صلت ختم ہو چکی تھی۔ اب اسے واپس گھر کی طرف جانا تھا جہاں بورت گئی "اولاد کے مزاج سے نا آشنا اور سخت دل باپ تھا اور وہ شہر تعمیر خواب تھے۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ گاڑی کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا۔ اپنے مخصوص امتحانہ انداز میں باجیس پھیلاتے ہوئے

طلم زادی

☆ ---- ایم - اے راحت

روشنی کی دنیا سے دور پڑا سرار دنیا
کی کہانی جنہاں مافوق الفطرت زندگی کا
دور دورہ تھا۔ دو دشمنوں کی عجیب
داستان جنہوں نے جب ایک
دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ
بڑھایا۔ تو ایک ناقابل یقین کہانی نے
جنم لیا۔

ایم - اے راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت: حصہ اول -/150

قیمت: حصہ دوم -/150

مکتبہ القرآن اردو بازار لاہور 2

یہ اس نے میں نے کوئی تالا کھولنے کی کوشش نہیں کی
چلا گیا کروا میں باہر گیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ خدا اب
اس گھر میں نہیں لے گا۔ میں ممکن تھا کہ یہ اس کا گھر ہی
لیکن جس انداز میں وہ گھر میں چل پھر رہی تھی اور چیزیں
پر استعمال کر رہی تھی اس سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ کم از کم
بہ خوب انہی طرح مانوس ضرور تھی۔
اگر وہاں گیا اور اپنے پیڑمدم میں بیٹھ ہی میں نے ٹیلی
ملک رہا ایک دشمن کا سوچا کہ آئی کیا۔ ٹیلی کا رہا مارا شہد
وہ تھا۔

راہیں نے اس سیاہ پوک کا تعاقب کیا۔ وہ شخص یا تو وہ
بہ حواس تھا یا پھر شے میں تھا۔ بہت خطرناک ڈرائیو تک
۔ وہ شہر باز بہت کی طرف مڑا تو میں اس کے بالکل قریب
الیکٹرانک شاہد آپ کو مطمئن ہو رہا تھا کہ ایک جگہ حاضری چنگا
ہوا ہے۔ چند دن پہلے ایک ٹرک کی اس جگہ سے چلی
کر ہوئی تھی تاہم ٹرک چنے کرنے سے بچ گیا تھا۔ جگہ کی
ت میں ہو سکتی ہیں شاید سڑک پر کچھ آگ بھی پھیلا
ایک تو وہ شخص بہت خراب ڈرائیو تک کر رہا تھا۔ مجھے
کڑھنے کی کوشش میں ہر قسم آقا رہا تھا۔ دوسرے اس
پر آگ کی چمک بھی نہیں دیکھی۔ وہاں شاید اس نے
رگازی صوب سے میری گاڑی سے کرائی گاڑی تھی لیکن
قیلے اس کی گاڑی ہی طرح پہنچی ہوئی ٹوٹے جگہ کو
نا ہوئی بچے ریلے لائن پر جا گری۔ گاڑی نے کسی
ایک کھالی نہیں۔ فوراً ہی اس میں آگ لگ گئی۔ ریلے
آپ پاس ہی غیر قانونی ٹیکسوں پر مشتمل جو ہستی ہے وہاں
لوگ آتے ہیں۔ آگ بھی بجھائی گئی لیکن وہ شخص مر گیا
ایک کالی خراب حالت میں لی۔ اسے سرکاری اسپتال میں
لیا۔ ہسپتال چڑھے تک آپ کو مزید مطوعات فراہم
کیے۔

ل کے علاوہ ANSWERING اور رہا ایک دشمن میں
اسعد نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر سوچا کہ آف کر
نہاں ہو گیا۔

بجائے ایک شخص سوچا تھا جب میرے مخصوص ٹیلیفون کی
نہ مجھے بگاڑا۔ گہری دیکھتے ہوئے میں نے رہنمائی

ایک طرف ٹیلیفون تھا میرا احوال جاننے کے بعد وہ پولا "سڑ
فیل کا نام اس شخص تھا اور وہ رہا گاڑی آگ کی تھا۔ کہ
اس نے خود رہا سڑت لے لی تھی حالانکہ اس کی
کے کار باج سال بانی تھے۔ حادثاتی موت تھی تلاش اس
کے حوالے کر دی گئی ہے۔"

گاڑی آگ کی تھی۔ ہمیں نے قدم سے حیرت سے سوچا

اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کا "تمہارے پیغام میں اور
تمہاری تازہ رپورٹ میں بھی ایک جگہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جس کے
بارے میں میں کافی تجسس ہوں۔ تمہیں مطمئن ہے اس شخص کے
پاس سیاہ رنگ کا لوہے کی کسی اور دھات کا ایک باکس ماسجود
تھا؟"

"میں سرا میں نہیں دیکھ سکا تھا حتمی نے جواب دیا میں
جب سوڈا تک اس کی میں داخل ہوا اس وقت وہ گاڑی میں بیٹھ
کر فرار ہو رہا تھا اور آپ کہہ چکے تھے۔ تاہم میں نے دیکھ لیا تھا کہ
آپ زیادہ دیکھی نہیں ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کے پاس رکے
کے بجائے اس کا تعاقب کرنے کو ترجیح دی۔"

"وہ ذخیرہ نے لے لیا کیا میں نے خند سے بوجھل تو اڑ میں کہا۔

”لیکن حادثے کے بعد تم نے اس قسم کی کوئی چیز اس گاڑی سے برآمد ہوتے تو نہیں دیکھی؟“

”نہیں سر! کوئی نے جواب دیا“ حادثے کے فوراً بعد لوگوں نے آگ بجھانے اور گاڑی ٹھنڈی ہونے کے بعد گاڑی کی تلاشی لی تھی لیکن کہ ایک تو انہیں ایسی کوئی چیز نہیں مل رہی تھی جس سے اس شخص کی شناخت میں مدد مل سکتی ہو سکتے ہو۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بے چارے کی کوئی قیمتی چیز چھاپہ شدہ گاڑی میں رہ جائے اور بعد میں کوئی بار کھلے سہ اس کی ہر چیز لاش کے ساتھ ہی اسپتال پہنچا دیا جائے۔ تاکہ جب اس کے لواحقین لاش لینے آئیں تو چیزیں بھی وصول کر لیں۔ پھوٹی مٹی کی چیزیں چھاپہ شدہ سی حالت میں گاڑی سے برآمد ہوئیں لیکن اس قسم کا کوئی باکس یا بریف کیس وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ میں نے خود تلاشی لینے والوں پر نظر رکھی تھی۔“

”اور وہ شخص حناقب کے دوران بھی تصدیقی طور سے قطعاً اور جمل نہیں ہوا تھا؟ ہمیں نے دریافت کیا۔“

”صرف ایک سوڑ پرچہ سیکڑ کے لئے اس کی گاڑی میری نظر سے اور جمل رہی تھی۔ پہلے سوڑ عبور کر گیا تھا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس نے راستے میں کہیں کوئی چیز چھپائی ہوگی کوئی ہوا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ سوچا کہ اس نے جان پر حمل کر اپنے قبضے میں رکھی تھی اسے وہ کیسے پھینک سکتا تھا۔“

لیکن سوال یہ تھا کہ وہ باکس پر کہاں کیا؟

ایک لمبے کی خاشاکی کے بعد میں نے کہا ”مجھے ذرا اس کا ایڈریس لکھواؤ۔ میں خود جا کر دیکھوں گا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔“

کوئی نے ایڈریس مجھے لکھوا دیا۔ وہ کینٹ کے علاقے کا ایڈریس تھا۔ میں نے اس خیال سے ایڈریس لے لیا تھا کہ شاید بعد میں کار کے لمبے سے وہ دعوات کا باکس برآمد ہو گیا ہو اور احمد شجاع کے گھر پہنچا دیا گیا ہو مثلاً اس کے گھر کے کسی فرد سے مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔

دل میں یہی امید لے کر میں سوئم والے دن احمد شجاع کے پاس

جا پہنچا۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا موقع تھا جب حقانی سے اپنی تعلیق داری کے بارے میں کوئی بھی دعویٰ کیا جا سکتا تھا اور اس کے اہل خانہ کے زیادہ سے زیادہ قریب جانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ احمد شجاع کے گھر پہنچ کر مجھے خاصی حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کیا تھا ایک اچھا بھلا قلعہ تھا۔ کینٹ جیسے مکے علاقے میں اتنا طویل و عریض اور عالی شان مکان ہونا کوئی معنی رکھتا تھا۔ گلی میں دونوں طرف چھٹی گادوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈی آئی جی جی جی چیز ہو آ ہے سرکار کی طرف سے جائز ذرائع سے بھی اسے بہت کچھ ملتا ہے لیکن

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لمبرگ
خودنوشت

دہشت گرد
سلیم قار

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود
دہشت گرد کہلاتا تھا۔

○ وقت کی راسیں تھاتے اس
ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔

○ ”بچی کمائیاں“ کا ایک مہتر
ترین ایڈوینچر سلسلہ چار حصوں
شائع ہو رہا ہے۔

بائیں: مکتبہ انٹرنیشنل سرگرم روز اردو بازار لاہور

فون: 7224665

جاسکا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا اور چکا۔
”لوئے کپٹے لے۔۔۔ ایتھے تے اپنے چہدری صاحب دی آئے
ہوئے نہیں۔۔۔“

میں نے ہونٹوں پر اٹھ کر اسے غامض رہنے کا اشارہ
کیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ زیادہ لوگ میری طرف حوجہ ہوں۔ میں
حتی الامکان غیر نمایاں نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک طرف
کو دھکا بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود کئی افراد نے بار بار سر کر میری طرف
دیکھا۔ شریف سیال تو اپنی جھگے دار چکار سے چھوٹا سا بچہ لگا سکا
تھا۔

میرا اشارہ پا کر وہ میرے برابر والی کمری پر آ بیٹھا۔ میں نے
طویل سانس لے کر بچی آواز میں کہا۔ ”تو تم بھی احمد شجاع صاحب
کو جانتے تھے۔“ میں نے اپنے لیے کوسوالیہ بنانے کی کوشش نہیں
کی تھی۔

”میرے تو وہ لپٹا رشتہ کے آدمی تھے چہدری صاحب!“ وہ
قدرے غصے سے لیے میں بولا ”تھے تو وہ بہت بڑے افسر لیکن مجھے
ڈائریکٹ جانتے تھے۔ میں اس وقت ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ بڑے دل
والے آدمی تھے۔ غور اور افسرانہ آکرا بالکل نہیں مں ان میں۔ کئی
بار انہوں نے چھوٹی موٹی باتوں پر انعام سے نوازا۔ جگے کی طرف
سے نہیں بلکہ اپنی جیب خاص سے۔“ اس کے چہرے پر عجیب سی
چمک تھی۔ بے شک اس کے لیے میں عقیدت اور محبت تھی
لیکن اس کی یہ میں کوئی اور تاثر بھی چھپا ہوا تھا جسے میں کوئی نام
دینے سے قاصر تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”آپ کے کب واقف
بنے تھے؟“

شریف سیال ایسا آدمی تھا جس سے کم از کم مجھے جھوٹ بولنے
کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور میں اسے بلا تکلف کرید بھی
سکتا تھا۔ میں نے وہی آواز میں کہا ”میری ان سے کوئی خاص
شائستگی نہیں تھی۔ میں پہلی بار ان کے گھر آیا ہوں۔ کیا مرحوم
خاندانی طور پر غامض کھاتے پیچے آدمی تھے؟ رہن سہن بڑا خفا
دار دکھائی دے رہا ہے۔“

وہ عجیب سے انداز میں بے آواز طریقے سے بٹھا اور ادھر
اُدھر دیکھ کر گردن میری طرف جھکا تے ہوئے نچلی آواز میں بولا۔
”کسی کے سوچ پر اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں“ اچھا نہیں
لگتا۔ لیکن آپ میرے زیادہ غریب و محسن ہیں“ آپ سے کیا
چھپاتا۔ آپ تو ان کا یہ ایک سی گھر دیکھ کر شاید اندر ہی اندر کچھ
حیران و پریشان سے ہو رہے ہیں۔ ان کی جائیداد کا تو کچھ پتہ ہی نہیں
ہے کمال کمال کس کس طرح کی کوٹھیاں اور بنگلے بکھرے ہوئے
ہیں۔۔۔“ وہ ایک بار پھر گویا سائیکس لگا رہنے لگا۔

”جیسی آدمی تو وہ سرگوشی میں بولا۔“ شجاع صاحب بڑے دھڑلے

کا دھمکی کی شان و شوکت میری آنکھ میں کچھ کھل چکی۔
روبو اور دیکھ کر ہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس
آرامت و وسعت ہوگی۔ دیواروں سے کئی کئی انڈر کینٹر
بچے تھے۔ طویل و عریض پورٹ میں باؤنڈیشن قیست کاریں
بیب کھڑی تھیں۔ یہ کاریں اور جپ اس کیڈلک کے علاوہ
دارنے میں تیار ہو چکی تھیں۔ باہر کھڑی کاریں تو مسانوں کی
پارٹ میں کھڑی ہوئی کاریں بیٹھا اعلیٰ خانہ کی تھیں۔
پارٹ شامیانے لگے ہوئے تھے۔ پورے ٹیبلرنگی ہوئی
میں باردی بیرے مستعدی سے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔
تے چارہ تھے۔ دو تین نوجوانوں سے انعام افسوس
رہے تھے اور کمالی کر رخصت ہوتے چارہ تھے۔ فضا
کمانوں اور ان کے لوازمات کی خوشبو نہیں پھیلی ہوئی
وڑی تھوڑی دیر بعد ایک مشہور کیرنگ سروس کی گاڑی
در کمانے پینے کی پیڑیں پھینکا کھلی جاتی تھی۔

ان بھی بس انعام افسوس کرنے تک سمجھید اور جو بھل سی
نے نظر آتے لیکن جو کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی مذاق
جاتا تھا۔ سوخا کیا تھا اچھا بھلا شادی کا سا سماں دکھائی
دیا۔ عجیب زمانہ آگیا تھا۔ شادی اور سرگ میں کوئی خاص
فرق نہیں آتا تھا۔

تین نوجوان بیٹھے احمد شجاع کے بیٹے تھے جن سے لوگ
دور رہے تھے۔ ان کی عمروں میں تھوڑا تھوڑا ہی فرق تھا۔
بڑی شہادت تھی اور ان تینوں کی ٹھنڈیوں میں احمد شجاع
دل تھک تھی۔ احمد شجاع کو میں نے کبھی اندھیرے میں چند
لے دیکھا تھا اور وہ چند لمحے بھی زندگی اور موت کی کشمکش
رت تھے لیکن اس کا سراپا میری نگاہوں میں محفوظ ہو گیا
۔ مدت بعد کوئی شخص مجھے اس طرح دکھ پھینکا کہ بھانسنے
باب ہوا تھا۔ اگر وہ مر نہ گیا ہوتا تو میرے دل میں خواہ خواہ
طبعی غل سی بیٹھ جاتی۔

لی فوری طور پر ان نوجوانوں کے پاس تعزیت کرنے نہیں
ایک طرف کو بیٹھ کر ایک بیرے سے کوک لے کر دھیرے
پھینکال لینے لگا۔ میں یونسی ذرا گرد و پیش کا جائزہ لے رہا
ہے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی دوران مجھے وہاں
نئی نئی شریف سیال نظر آگیا۔

لی کمری نظر سے دیکھ کر تو شاید اسے پہچان ہی نہ پاتا۔ وہ
اب میں تھا جبکہ میں نے اسے جتنی بار بھی دیکھا تھا اور دی
دیکھا تھا۔ سادہ لباس میں تو وہ بہت سی مختلف نظر آتا تھا۔
بالے عام طور پر سادہ لباس میں بھی پہناے جاتے ہیں کہ وہ
بالے ہیں۔ لیکن شریف سیال پر تو کوئی شبہ تک نہیں
ناتوا کہ وہ پولیس والا ہے۔ اسے گاٹھوائی ٹیٹا بانی یا شیدا
ناتوا کہ وہ بھی سمجھا جاسکتا تھا پولیس والا نہیں سمجھا

لے قرآن فتم کے بارے تھے۔ پوسج کی طرف سے ذخیرہ رفت جاری تھی۔ وہ اندر رکس جاری تھیں۔ مردوں میں جنہیں قرآن خوانی میں شرکت کرنا تھی وہ ذرا انگ دم جاتے تھے۔

شریف سیال ایک نظرمسج کی طرف دیکھ کر دم بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شجاع صاحب تو بڑے انیس تو بیسے بھی چھوٹے موٹے آدمی تو پوجی نہیں کیے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ بہت بڑے لوگوں کو ان سے بڑے بڑے کام پڑتے رہتے تھے سب سے بڑی بات یہ تھی چوہدری صاحب! اس۔ لھنڈی سانسلی کہ شجاع صاحب سے ویسے بھی کوئی کچھ نہیں سکتا تھا۔ قانونی طور پر ان کے سارے کام یکے کے پر ایسے انشروں کی دو چار انکلی بھی خاندانی زمین ہوتی ہے تو زمیندار مشہور ہوتے ہیں۔ اور اگر نہیں بھی ہوتی تو وہاں دیتے ہیں۔ خواہ اسوں نے جا کر ان زمینوں کی شکل بھی نہ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ انیس بڑی آمدنی دیتی رہتی ہے۔ سارے غلات باغ زمینداری کے مہربان منت نظر آتے۔ شجاع صاحب کا بھی یہی سلسلہ تھا۔ پہلے زمینداری کی آڑ دی۔ پھر اس کی "تمنی" اور کچھ خرچے وغیرہ کا کار لے۔ آپ کو پتہ ہی ہے ایک بار آدمی کی لائن سیدھی ہو جا چل سوجلی۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔
"لوگ بڑی تعریف کرتے ہیں کہ شجاع صاحب نے کی اپنے وسائل کو بڑے صحیح طریقے سے استعمال کیے۔ واقفان حال جانتے ہیں کہ سارا یہ کاکھیل ہے اور وہ سے آیا تھا یہ بھی جانتے ہیں۔ لیکن چوہدری صاحب! روپیہ ہی ہوتا ہے اس کی کوئی قسم کوئی ذات کوئی تعلق ہوتی۔ روپے کو سلام ہوتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں ان کے بعد بھی کیسے کیسے لوگ ان کے روپے کو سلام کرتے ہیں۔" اس نے آنکھوں سے گرد پیش کی طرف اشارہ کیا، پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور سر ہٹک کر وہ اپنے کا سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "توبہ! کتنے کتنے لوگ کسی کے سوئم پر کسی اتنی کر رہے ہیں۔ درختوں کا لکڑیا کر کے انفاق سے سوغی اب میسر آیا ہے۔" اس سے پہلے بھلا ہم آخر شجاع کے بارے میں کب اور کر سکتے تھے؟

"نامہ یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ اب میں مرحوم کی عمر ڈی سی قریب بھی کر لیتی جا رہی کوئی شک نہیں کہ مرحوم تھے بہت اچھے آدمی۔ ان کی فاضل بھی کیا مطلب؟ میں تو ان غامضوں سے کوئی قصص

کے آدمی تھے۔ ہمارے ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یعنی ورثہ کھانے کے معاملے میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ بے خوف دخل کھاتے تھے اور بے حساب کھاتے تھے ظاہر ہے ان کا مدد بھی کچھ ایسا تھا۔ بیکروں اور بڑاؤں کی باتیں تو ان سے ہو نہیں سکتی تھیں۔ لیجے ہی معاملات ان کے پاس جا کر جھپٹتے تھے۔ لاکھوں کے بکر ہوتے تھے چھوٹے موٹے خزانوں والے معاملے تو پیچھے ہی بیچے ہو جاتے ہیں۔ لوگ حسب مراتب اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ شجاع صاحب میں سے دو تین شکار کر لیتے تھے۔ باقی دن آرام سے پیٹ پر ہاتھ بچھ کر دکھائیں لیجے مگر جاتے تھے۔"

"کیا تو کسی کے دوران بھی موصوف اسی شان و شوکت سے رہتے تھے؟" میں نے ایک بار بھراؤ بھرا دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"زیادہ شان و شوکت تو رتار منٹ کے بعد آتی تھی۔ بہر حال دور بلا زمت میں بھی کچھ کم نہیں تھی۔ لڑکوں کو تو اسی زمانے میں کام سے لگا دیا تھا۔ کارخانے لگوا دیے تھے ہر ایک کو الگ الگ۔" اور کوئی انہیں نہیں پوچھتا تھا کہ یہ کیا سلسلہ ہے؟ کہاں سے آ رہی ہے اتنی دولت؟ میں نے پوچھا حالانکہ اس سوال کے تمام مکمل جوابات مجھے معلوم تھے۔

"پوچھنے والوں کے کمر بھی بڑے بڑے خزانے اچھے تخائف جاتے رہتے ہیں جی۔ ایک بار جب میں کسی گناہم شخص کی طرف سے تجھے میں آئے ہوئے دو لاکھ دوپے کا بریف کیس لے کر سخت گھبرا ہوا آپ کے پاس پہنچا تھا تو آپ ہی نے تو مجھے بتایا تھا اور تسلیاں دی تھیں کہ لوگ کیا کچھ کر رہے ہیں لیکن کوئی انہیں کچھ نہیں کہہ رہا۔ مجھے لگتا ہے آپ کو ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ کو ہوشی سیدھے اور مصوم بن کر سب کچھ پوچھتے رہتے ہیں۔" وہ غور پوری طرف دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم تو بہت کچھ ہوتا ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔
"پھر بھی پوچھتے رہتے سے کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہی رہتی ہے۔ کوئی نہ کوئی تلف کچھ سامنے آتا ہی رہتا ہے۔ تم بتاتے رہو۔ بتانے میں کیا سرج ہے۔"

یہی ہاں۔ آپ تو ایسے ہی آدمی ہیں، آپ سے تو ساری گپ شپ نکلی رہتی ہے۔" وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ جو کھانے پینے کا سلسلہ ہے یہ بھی اوپر سے نیچے تک ایک مربوط نظام ہے۔ میں تو ایک ڈرپوک آدمی ہوں اس نظام میں پوری طرح داخل نہیں ہو سکا۔ لیکن ایک مرتبہ آدمی اس میں گھس جائے تو اس بڑی سی مشین کا ایک پرزدہ بن جاتا ہے۔ آرام سے اپنا کام بھی کرتا رہتا ہے۔ اور اس کی مدد سے وہ مردوں کا کام چھڑا رہتا ہے۔"

اندھ سے قرآن خوانی کی آواز آ رہی تھی۔ دم مہم سی یہ اجنبی آواز بھی بالکل معدوم ہو جاتی تھی۔ مرحوم کو ایصال ثواب کے

ہو رہا ہوتا۔ تینوں نوجوان کچھ مفہوم اور کچھ تفکر بھرے انداز میں سر ہلاتے رہے۔ حتیٰ کہ کچھ دیر میں نے مرحوم کی اعلیٰ مقامات پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ وہ اعلیٰ مقامات جن کا مجھے ذرا بھی علم نہیں تھا۔ جب خاص دہر اس طرح کی باتیں ہو گئیں تو چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ ”شجاع صاحب سے میری شناسائی زیادہ پرانی نہیں، اس لئے آپ لوگوں سے بھی ملاقات کا موقع نہیں آسکا تھا۔ لیکن کادھاری طور پر ہمارا تعلق بہت مضبوط ہو رہا تھا اور مستقبل قریب میں اس کے مزید مضبوط ہونے کے امکانات تھے۔ ان کی بے وقت موت نے جہاں وہ سلسلہ خطرے میں ڈال دیا وہیں ایک ابھرنے والی کڑی گڑبگڑ پیدا کر دی۔ لیکن چلے چھوڑیے۔ اس موقع پر اس قسم کی باتیں کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔“

بڑا زکامی کا نام سرور تھا۔ دوسرے چوتھے ہوئے ہوا۔ ”نہیں! نہیں! آپ کھلف نہ کریں۔ اطمینان سے باتیں کریں۔ ویسے تو ڈیڑی کے سارے کادھاری معاملات ہمارے ہی اہموں میں تھے۔ وہ تو صحیح معنوں میں رنڈا رنڈ کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ گھوٹیں پھریں میٹھیں کریں۔ زندگی بھر آپ نے محنت کی ہے۔ اب ہر ذرے داری ہم پر ڈال دیں۔ لیکن انہوں نے کبھی آپ سے کسی کادھاری تعلق کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ آپ سے تعلق ہمارے لئے فخر کا باعث ہو گا۔ ڈیڑی سے اگر آپ کی کوئی بات ہوئی تھی تو ہم اسے نہیں جانتے تھے۔ ہم نے بیٹھ ان کے تمام کاموں کا نام دے دیا۔ واپس کو ان کا کیا ہے۔ اگر ان کی طرف کوئی پسینہ تھا تو ہم اسے بھی پورا کر دیں گے۔ آپ بلا کھلف بات کریں۔ موقع کی فکر نہ کریں۔ جو انجی کل ہوئی ہیں وہ اگر آج ہو جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔“

سرور بڑا شرمیلی زبان نوجوان تھا۔ میں نے پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہم ذرا ایک خاص قسم کے پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ ابھی تو اس کی کوئی شکل ہی نہیں بنی تھی اس لئے کسی سے اس کے بارے میں بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔“ میں نے اپنے لیے کوئی خیر نہایت کی کوشش کی۔

سرور نے تھیں انداز میں سر ہلایا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”معاذ لین دین کا نہیں، صرف ایک چھوٹی سی امانت کا ہے۔“

اس کے چہرے پر قدرے طہایت ابھرائی۔ شاید اس لئے کہ میں کسی رقم وغیرہ کا دعوے دار ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے نظر اس کے چہرے پر جمائے رکھی اور کہا۔ ”وہ لوہے کا ایک سیاہ رنگ کا باکس تھا، چھوٹی سی ایک تجوری سے مشابہ۔ لیکن وہ چاروں طرف سے بند تھا۔ اس کا کوئی حصہ کھلنے والا دکھائی نہیں دیتا تھا۔“ میں نے انجی طرح وضاحت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کس قسم کا باکس تھا۔ باقہوں کے اشاروں کی مدد سے میں نے اس

میں ان کے سامنے ایک سمت ہی اونٹنی آدمی تھا لیکن مجھے سامنے بیٹھ کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ انعام دے کر نوازتے رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ہم ایک سیارے کے تھے۔ میں جب چھوٹا تھا تب سے انہیں جانتا تھا۔ باپ دادا ان کے باپ دادا کو جانتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہم ان کی کوئی زمین وغیرہ نہیں تھے۔ اور وہ کوئی ایسے اہل آدمی نہیں تھے ان کا خاندان ہمارے خاندان سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ شاید وہ بھی چاہتے ہوں کہ میں کسی سے ان نامیالی میں منظر کا ذکر نہ کروں۔“

وہ میرا آدمی تھا لیکن سمجھتا ہر سال سب کچھ تھا۔ میں نے دور کھڑے ہوئے تین ہم شکل سے نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ”یہ تینوں شجاع صاحب کے بیٹے ہیں۔“

”مٹی ہال۔ آپ ان سے نہیں ملے؟“ شریف سیال ہوا۔ ہم لڑکے ہیں۔ لڑکچن میں ہی منگوا رہے تھے۔ سرکاری نام سے بعض لوگوں کی توسات نہیں سنو جاتی ہیں۔ اسی لئے تو ہم سرکاری نوکریوں کے لئے اتنی کھینچا تانی، بلکہ قتل و خون لے رہے ہیں۔ ہمارا تو سیاسی نظام بھی سرکاری نوکریوں کے گرد گھوم رہا ہے۔ ہر ماہی اپنے چال ٹانگوں سے وعدے کرتی ہے کہ وہ ارمی میں آئے ہی انہیں نوکریوں سے نوازے گی۔ اور یہ بات گویا فاسٹ ملے شدہ ہوتی ہے کہ نوکری سے مراد صرف نوکری ہے۔ بلکہ ”سرکاری نوکری“ ہوگی۔ اور وہ بھی کچھ اس قسم کی نہیں ہیں۔ تنخواہ اگر ہزار روپے ماہوار ہوگی تو اوپر کی آمدنی ہزار روپے روزانہ۔ اسی لئے تو سرور کو باجی لگی رہتی ہے۔ تو انہیں ہوں کہ اگر ہماری ہوس کا یہی عالم رہا تو ہمارا انجام کیا ہے؟

”ہم کرم شرمیں بن کر ریت میں منہ نہ چھپائیں تو انجام کا اندازہ کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا ”خیر۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ہمارے مرحوم کے لوگوں نے تو مل لوں! میں نے تو ابھی تک ضرورت انہیں کی۔“

”آپ پسند کریں تو میں ان سے آپ کا تعارف کرا دیتا ہوں۔ ہمارے اپنے بڑی عزت کرتے ہیں۔“ شریف سیال اٹھتے ہوئے ہوا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کے کندھے پر دھکا کر کے بھاگتے ہوئے کہا ”میں خود ہی مل لوں گا۔“

ان تینوں نوجوانوں کے پاس پہنچ کر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ شجاع صاحب کی نامانی موت پر افسوس کا اظہار کرنے لگا۔ ایسے شخص کی موت پر افسوس افسوس مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ سامنے بصر کی دشمنی کے نیچے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ہلاک کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو آج اس کی جگہ میرا سرم

ہیں۔ وہ مجھے شامہانے سے باہر لان کے ایک گوشے میں لے
جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ باقی دونوں بھائی شاہد
میں ہی رہ گئے۔

ایک بار مجھ کو خطاطی فنکوں سے ادرہ ادرہ دیکھ کر
”مجھے ذرا تھاکہ کوئی عزیز رشتے دار اس قسم کی بات نہ سنا
میں نے کان میں نہ ڈال دے۔ اس میں اس قسم کی بات نہ
ظاہر ہے مگر کسی کی سائیکالوپی پر کچھ ایسے اثرات مرتب نہیں
کے۔“

مجھے تعجب تھا کہ ایسے اثرات تو خود اس کی اپنی سائیکالوپی
بھی مرتب نہیں ہوئے تھے تاہم میں نے اس مسئلے میں کچھ نہ
کہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”مکون ہے وہ لڑکی؟“
”حسنہ اس کا نام ہے۔ ویسے مجھے شبہ ہے کہ یہ اس کا
نام نہیں ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا ”میں اس کے بارے
میں زیادہ نہیں جانتا تاہم مجھے اس کا ایڈریس معلوم ہے۔“ میں
اسے گاڑن گاڑن کی اس کو کھنی کا نام بتایا جس میں حسنہ مجھے
ملتی تھی۔

وہ قدرے چونک کر بولا ”یہ کوئی تو ہماری ہی ہے۔ ڈیڈ
کھانا تھا کہ انہوں نے کسی کو کرائے پر رہے رکھی ہے۔“
”اس مسئلے میں شاید ”کرائے“ کا لفظ قاضی ہو۔ حسنہ کی
رکھی ہوگی۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ میں تو یہ بھی کہنا چاہتا
تھا کہ یہ شاید وہ کسی اور محل میں وصول کرتے ہوں گے۔ مگر
نے اپنے آپ کو یہ جملہ کہنے سے باز رکھا۔

وہ ایک لمحے الجھن آمیز انداز میں ہاتھ ملتے کے بعد
”دیکھیں چودری صاحب! اب آپ سے کیا چاہنا۔ ڈیڈی نے
بھرپور زندگی گزار دی۔ جوانی میں تو وہ عورتوں کے معاملے
..... میں زور تھے ہی۔ لیکن جوں جوں بڑھاپا آ رہا تھا
انگیزہ طور پر وہ اور بھی دھرتے جارہے تھے۔ کیا کہنا چاہتا
تھا۔ وہ گویا کوئی موزوں لفظ تلاش نہیں کر رہا تھا۔ آخر باپ کا۔“

”عیااش۔“ میں نے تنبیہ کی سے اس کے جیلے میں خالی
کردی۔ اس نے یوں مجموعی فنکوں سے میری طرف دیکھ
اسے مجھ جیسے شریف آدمی سے اپنے باپ کے بارے میں
موقع پر ایسے لفظ کے استعمال کی توقع نہیں تھی۔

تاہم اس لفظ کو اس نے گریباؤنی طور پر قبول کر لیا اور
میں سر ہلاتے ہوئے قدرے غبات سے بولا۔ ”ہاں۔ بس یہ
لیجئے اس میں بھی ایک سے ایک خوبصورت اور خوش لڑکی
کے حرام رہتے تھے۔ لیکن یہ سب چوتھیں وہ تھی سے جس
کرتے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ تھی سے ڈرتے تھے یا
قسم کی چیز تھے۔ ڈرتے تو شاید وہ کسی سے بھی نہیں تھے۔ بس
ہی انہوں نے تھی کا وہ مان اور احرام پیٹھے قائم کر رکھا۔ ایک

کا سائز بھی واضح کرنے کی کوشش کی۔
اس کی سانس کے بارے میں سمجھانے کے بعد میں نے کہا۔
”حادثے سے کچھ دیر پہلے جو باکس شجاع صاحب کے پاس تھا۔ وہ
میری امانت تھا۔ شاید پولیس یا اسپتال والوں نے وہ آپ کو دیا ہو۔
یا آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم ہو۔ وہ مجھے واپس چاہئے تھا۔“
تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بھرپور سی
بولا۔ ”اس قسم کا تو کوئی باکس ہمیں کسی ذریعے سے نہیں ملا۔ اور
نہی ہمیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔ کیا تھا اس باکس
میں؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔“ میں نے رانداری سے کہا۔
”میرے پاس بھی دیر حقیقت وہ کسی اور کی امانت تھا۔ شجاع صاحب
کے انتقال کے بعد اسے واپس پہنچانا ہے وہ ضروری ہو گیا ہے۔
یوں سمجھ لیں کہ وہ باکس جس شخص کا تھا اسے ہمارے پرودیکٹ
میں ہمارا تیسرا پارٹنر تھا۔ وہ باکس کسی اور شخص کے لئے بالکل
بے کار ہے۔ یہ مجھے اس کے اصل مالک نے بتایا ہے۔ اب شجاع
صاحب کے بھتیجے پروگرام پر عملدرآمد نہیں ہو سکے گا سارا منصوبہ
منسوخ کر دیا گیا ہے۔“

سرور بے بسی آمیز سے لمحے میں بولا۔ ”لیکن ہم اب اس
مسئلے میں تو آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہمیں تو اس باکس کے
بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تباہ شدہ کار کو بھی ہم نے خود جا کر
دیکھا تھا۔ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈیڈی نے اشارتاً بھی
کہی اس قسم کی کسی چیز کا ہم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر ہمیں کچھ
معلوم ہوتا تو میں ضرور اس کے بارے میں عرض کرتا۔“ اس کا
چہرہ تباہ تھا کہ وہ وحشی بول رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے گھڑی سانس لے کر کہا۔
”غیر۔ جیلے کوئی بات نہیں۔ لیکن اسے ذہن میں ضرور رکھئے گا۔ اگر
اس مسئلے میں کوئی بات سامنے آئے تو مجھے ضرور مطلع کیجئے گا۔ خواہ
وہ آپ کو کتنی ہی غیر اہم محسوس ہو۔“ میں نے اپنا ڈرائنگ کارڈ سرور
کو دے دیا۔

کارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے وہ چٹکاپاٹ آمیز سے لمحے میں بولا۔
”آپ کو کیسے تعجب نہیں ہے کہ حادثے سے کچھ دیر پہلے وہ باکس ڈیڈی
کے پاس تھا؟ آپ نے باکس ڈیڈی کو دیا تھا یا آپ خود ان کے ساتھ
تھے؟“

”نہ تو میں ان کے ساتھ تھا اور نہ ہی باکس میں نے ان کے
حوالے کیا تھا۔“ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”بلکہ مجھے یہ بات ایک
لڑکی نے بتائی ہے جس سے وہ شادی کرنے والے تھے۔“
تینوں کو بیک وقت خامساؤں دار جھٹکا لگا اور تینوں نے ایک
ساتھ ہی دزدیہ فنکوں سے ادرہ ادرہ دیکھا۔ گویا اس خیال سے
سمجھ گئے ہوں کہ یہ بات کسی نے سن نہ لی ہو۔
سرور تھوڑے گھل کر بولا۔ ”آپ نے ادرہ ادرہ جیلے کی بات کرتے

چنے تھی کے سامنے انہوں نے کبھی دھنکائی کا مظاہرہ کرنے یا دل توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا مطلب ہے وہ شادی کے بعد بھی نہیں بدے۔ اس معاملے میں وہ بڑے ٹھیک آدمی۔ اپنے طور طریقوں کا اثر انہوں نے اپنے گھر پر بھی پڑنے والا۔ ان کی گھریلو زندگی میں کبھی کوئی غلطی نہیں آئی۔" میں نے "میں وہ عشرت کے بھی کچھ اصول ہونے چاہئیں۔" میں نے اسے سر ہلایا۔

"وہ ہر معاملے میں بڑے با اصول آدمی تھے چودری صاحب۔" سرور نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ وہ واقعی فرزندِ کافق کر رہا تھا۔ باپ اس کے لئے دولت و جائیداد چھوڑ کر مراعات و مزدوم کی برادری میں اصول پسندی نظر آ رہی تھی۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "میں گارڈن ٹاؤن والی راکوٹھی میں جا کر دیکھوں گا کہ وہ لڑکی کون ہے اور ڈیڑی سے اس کا معاملہ تھا۔ بائس کے بارے میں اگر کوئی بھی بات معلوم دے گی تو میں ضرور آپ کو اطلاع دوں گا۔"

"بہت شکریہ۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں نے معاملے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ سنہ اپ اسے کوشی ہی نہیں ملے گی۔

"آپ نے کھانا وغیرہ کھایا؟" سرور کو وہ غنا تو اب میرانی کا خیال آیا۔

"نہیں۔ بس بہت شکریہ۔ یہ سوئم وغیرہ کے اتنے بڑے کھٹک اور بڑے اجرام کھانے میرے مقل سے مجھے نہیں اترتے۔" میں نے کہا۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے جانے کے لئے سر گیا۔

واپسی میں میں شریف سیال سے ملنے کے لئے ذرا رک گیا۔ وہ اس وقت ہونے نیکل پر تھا اور ایک چرنے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

"اپنے کپڑے اتار کر دیکھو کہ کچھ کچھ کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ وہ مجھے جانتے دیکھ کر چمک کر بولا۔ "میں آپ کو یہ بتانا تو بھولی ہی گیا کہ میں نے آپ کے حضور پر عمل کرتے ہوئے اس رات میں مکان خرید لیا تھا جو کسی نامعلوم میاں نے مجھے بھجوا دی تھی۔ خود اس سافرہ بھی پکڑ لیا تھا۔ بڑا اچھا مکان مل گیا تھا۔ پوری پینچے بڑے خوش ہیں۔ آپ کو دن رات دعا میں دیتے ہیں۔ میں بھی آپ کو بہت دعا میں دیتا ہوں۔"

"لیکن میں نے تو تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے تو صرف مشورہ دیا تھا۔" میں نے حقیقتاً زرا حیرت سے کہا۔

"چودری صاحب! مشورہ بھی اگر کسی بڑے آدمی کا ہو" کچھ اور آدمی کا ہو۔ اور اس میں اس کا ظہور بھی شام شامل ہو تو اس مشورے سے بڑھ کر کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ حقیقی ممنونیت سے بولا "دیے بھی میں تو محسوس کرتا ہوں کہ جب سے میری آپ سے شہسائی ہوئی ہے میرے حالات کچھ بدلنے جا رہے ہیں۔"

مجھے تو لگتا ہے کہ آپ سے صرف شہسائی رکھن بھی مجھے جیسے غرا کے لئے بہت آور ثابت ہو آ ہے۔"

"اب اتنا بھی شرمندہ مت کرو شریف! میں نے اس کا کدھا چھینکے ہوئے کہا۔ "غالی خلی مشوروں کے بدلے دعا میں کیا لیتا۔ ایسا کہ مکمل شام گھر پر ہی رہتا۔ میرے دفتر سے کوئی آدمی اگر تمہارے مکان کا جائزہ لے جائے گا اور اسے مقبول طریقے سے فرس کر اڑے گا۔ اب مکان ہو گیا ہے تو اس کی سجاوٹ بھی تمہاری خوشی کے مطابق ہو جانی چاہئے۔ تم صرف اتنی زحمت کرنا کہ میرے آفس فون کر کے میری سیکریٹری کو اپنا ایڈریس لکھوا دینا۔ میں ابھی آفس ہی جا رہا ہوں۔ اسے اس سلسلے میں ہدایات دے دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں گیٹ کی طرف چل دیا۔ وہ چرچا چھوڑ کر میرے پیچھے لپکا اور سرکش لہجے میں بولا۔ "چودری صاحب! ایمان نال! اللہ دی تھے اس موہانی کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے تو یہی بڑا اعزاز ہے کہ آپ جیسا بڑا آدمی میرا صیوان میرا شہسار اور دوست ہے مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔ آپ کی دعاؤں سے مکان ہو گیا ہے تو مرضی کا فریج پر بھی ہو جائے گا۔ مجھے تو تو جلدی ہے اور نہ ہی لالچ۔"

"اسی لئے تو میں یہ انتظام کر رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کا بڑا قدر دان ہوں جنہیں نہ تو اپنی خواہشات کی تکمیل کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی لالچ۔" میں نے رکے بغیر کہا۔

وہ میرے ساتھ ڈگ بھرتا آ رہا تھا۔ چرنے کی بوٹی اس کے منہ میں ہی پھنسی رہ گئی تھی۔ کھنٹی کھنٹی آواز میں اس نے مزہ کچھ کھتا چلا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "کیوں اس بندے کو اور جا کر کھانا کھاؤ۔ بالکل اسی طرح کرنا جس طرح میں نے کہا ہے ورنہ یاد رکھنا کہ میں اپنا بات نہ ماننے والے دوستوں کو بھی "پیشانی" لگا دیتا کرتا ہوں۔"

میں اسے وہیں دم بخود کھڑا چھوڑ کر آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اس بائس کی چار سرائے میں میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا جو میں یہاں بھی چلا آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا میں ممکن ہے وہ بائس اتنا اہم نہ ہو جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بے شک احمد شہار نے اس کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی لیکن میں ممکن تھا کہ وہ صرف اس کی اپنی ذات کی حد تک ہی بہت اہم رہا ہو۔ لیکن مجھے اس بائس سے ریڈ ڈاٹ کا بھی کوئی تعلق نظر آ رہا تھا۔ اور اگر احمد شہار اس کے لئے سرحد کی بازی لگا رہا تھا تو یہ بھی ممکن تھا کہ ریڈ ڈاٹ سے اس کا بھی کوئی تعلق رہا ہو اور ریڈ ڈاٹ جیسی ایک انتہائی مشکوک قسم کی تنظیم سے ایک رطانہ ڈی آئی جی کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ یہ ایک خاص قابلِ غور بات تھی۔

پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میں اس معاملے میں خواہ خواہی

ہوا ہے۔ اس نے گویا بہت سے کام لیے ہوئے تیزی سے پورا کی کوشش کی۔ "سارا کیش و فیوہائی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ انتہائی چالاک اور چرب زبان تو ہی ہیں۔ اب ان پر بہت زیادہ انظار کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات مانتے ہیں لیکن اپنی اولاد پر محمود سائبر کرتے اور نہ ہی اولاد کی بات مانتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر غامض ہو گیا۔

"چھاتو پھر؟" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"بعض ہول سیل مال خریدنے کے لئے کارخانے میں آجاتے ہیں اور نقد ادائیگی کرتے ہیں۔" وہ ہانپنے کے سے انداز میں بولا۔ "اصولاً چھوٹے بچا کو ہر شام تنک کی وصول شدہ رقم دوسرے روز صبح ہی بینک میں جمع کرا دینی چاہئے لیکن وہ ہفتہ بند کیش بینک میں جمع نہیں کراتے۔ رقم ان کی میز کی درازوں میں بھری رہتی ہی ہے۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں اپنے لیے کی بڑائی کو چھپانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ "لیکن بے شمارے اب انہیں کیا ہدایت کر سکتی ہو۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "وہ ابابو بھی پکر دیے رکھتے ہیں۔ اکاؤنٹنٹ، سیکرٹری جنرل سمجھ دی ہیں۔ انہیں سب کو پکر دینے کے طریقے آتے ہیں۔ اب تو ویسے بھی آنکھیں بند کر کے ان پر اقتدار کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کیش میں مستقل طور پر ٹھکانا کرتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن اب ان کے بارے میں ایک قطعہ سننے کو تیار نہیں۔ جو خفیہ ان کے سامنے چھوٹے چچا کا نام میری زبان پر آتا ہے وہ زبان بند کر دیتے ہیں۔ مجھے بے نقطہ سناتے ہیں۔ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ میں خود تو ملاقاتی ہوں کچھ کر نہیں سکتا چھوٹے چچا نے اگر ایسا کام سمجھا ہوا ہے تو میں ان کے خلاف سازشوں کی فکر میں لگا رہتا ہوں۔ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ابابو۔"

"اباؤ کیا واقعی وہ تمہارے گئے ابابو؟" میں نے تصدیق پائی۔

"جی ہاں چوہدری صاحب! اس کی آواز یکدم بھرا گئی۔ لیکن انہیں سن کر کوئی یقین نہیں کرتا۔ اس طرح کی باتیں تو سونپیل باپ بھی نہیں کرتے۔"

"تو پھر تم کیوں فکر میں دے ہو رہے ہو؟" میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"یہ بے باپ کا مال جا رہا ہے تو جانے دو" اس کی صرف آواز ہی نہیں بھرائی آنکھوں سے آنسو بھی جھٹکے گئے تھے۔ وہ ذرا صلیبے لیے میں فوراً یوں "مال کی فکر کس نسبت کو ہے میری طرف سے تو چاہے ابا کا سارا مال لالچک جائے ہم کون سا اس مال سے پیش کر رہے ہیں۔ مجھے اس کی فکر نہیں۔ فکر تو مجھے اس بات کی ہے کہ چھوٹے چچا مستقل مال کا وہ ہے ہیں لیکن زمین کے پکر میں مجھے پھنسا چاہتے ہیں۔ زمین کے

مجاز اسراریت تلاش نہیں کر رہا؟ ابھی تک تو مجھے صحیح طور پر یہی معلوم نہیں تھا کہ ریڈ ڈاٹ کیا چیز تھی؟ یہ واقعی کوئی عظیم شے یا وہ چار پرے گئے بد معاشوں نے پوری ذرا آناڑھانے کے لئے اپنی فلی کا ایک دم رکھا تھا؟

اسی سوچوں میں الجھا ہوا میں آغوش پنجابو عمارت کے صدور دوازے پر ایک اور ابجمن میری منتظر تھی۔ اور اس ابجمن کا نام دسیم احمد تھا۔ وہ دوازے کے قریب ہی ایک ستون کا سارا لئے کھڑا تھا اور بینک کے عتب میں اپنی گولی گولی آنکھیں کھمسا رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں گھڑی سانس لے کر نہ گیا۔ اگر وہ مجھے دیکھ نہ چکا ہوتا تو شاید میں اگلے قدموں لوٹ جاتا اور عمارت کے گرد گھوم کر پچھلے دوازے سے اندر چلا جاتا۔ مگر قدرت کو یوں میری گھوٹلاسی منظور نہ تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکا چلا آ رہا تھا۔

"سرمی۔ چوہدری صاحب۔!" اس کے انداز میں اتنی لجاجت تھی کہ اگر میں اس کا ہاتھ نہ تمام لیتا تو شاید وہ میرے پیروں میں ہی گر پڑتا۔ اس نے دیر تک مجھ سے مصافحہ کیا اور دیر تک باجیں ہیلیاں۔ پھر بولا۔ "میں دواؤں سے آپ کے دفتر کے پکر لگا رہا ہوں۔ ریلپشن والے مجھے آپ سے ملنے ہی نہیں دیتے۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ مصروف ہیں۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ آفس میں نہیں ہیں۔ فون کرنا ہوں تب بھی کسی جواب ملتا ہے کہ فون کرنا ہوں تو وہاں بھی آپ موجود نہیں ہوتے۔ ریلپشن والے عام طور پر مجھے ہر شخص کی آمد کی اطلاع ضرور دیتے تھے۔ اس سے ملنے نہ ملنے کا فیصلہ میں ہی کرتا تھا۔ لیکن پچھلے دواؤں میں واقعی میں بہت مصروف رہا تھا اور شاید ریلپشن والوں نے دسیم کی شکل دیکھ کر کبھی فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ میرا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔"

میں نے اسے اندر لے جانے کا قطعہ کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا اور وہیں کھڑے کھڑے قدرے ساٹ لیے میں پوچھا۔ "کس لئے ملنا چاہتے تھے کوئی خاص کام تھا مجھ سے؟"

"وہی مشورہ کرنا تھا نا آپ سے۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بے چارگی آئیز سے انداز میں بولا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی چکيا۔ مشورے کا ایسا سچا طالب میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ذرا ملالمنت سے کہا۔ "ہاں۔ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟"

وہ تھوکر نکل کر بدستور ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ابابو نے مجھے اپنے کارخانے میں ٹائٹ سپروائزر کے طور پر ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے" میں نے تیزی سے کہا۔ "بلا تہید اپنا اصل مسئلہ بتاؤ۔"

"ابابو نے اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے چچا کو بھی ملازم رکھا

کرنے سے ہانی کی دھار رک جاتی ہے۔ جبکہ اس نے دوبارہ لگائی اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا۔ عام حالات میں بھی اس کی آنکھیں پھلکی پھلکی سی رہتی تھیں لیکن اس وقت تو مجھ اس طرح پھلکی گئی تھیں جیسے وہ کانوں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے میری بات سنے گا۔

”تمہیں تو بڑی سی ہمت سے کام لینا پڑے گا“ میں نے کہا۔
 ”تمہارے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ چھوٹے چچا کی سازش کو انہی برائے دور۔ ان کے کچھ کرنے سے پہلے تم ہی کچھ کر گزرو۔ تم جب ڈیوٹی پر پہنچے ہو تو کیا کرے میں کوئی ہوتا ہے؟“
 ”نہیں۔“ اس نے پُر امید انداز میں نفی میں سر ہلایا۔
 ”کمرے کا آئینا ہی جا کر کھولنا ہوں۔ چوکیدار کیٹ پر ہوتا ہے اور دور کر مٹینوں پر ہوتے ہیں۔“

”تم جانتے ہی ان درازوں کا آئنا توڑ دو جن میں رقم ہوتی ہے اور رقم کی گڈیاں اس طرح میز پر بچاؤ جیسے کوئی چور ان کو لے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ یہ کام اس دن کرنا جس دن تمہیں تعین ہو کہ پختہ بھر کاش درازوں میں ہی جمع ہے۔ اس بات کا تو تمہیں اندازہ رہتا ہے؟“

”بہت اچھی طرح۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں دن میں بھی اکثر دوشیزہ دفتر جاتا رہتا ہوں۔ اسی لئے تو چھوٹے چچا کی نظر میں زیادہ کھٹکے لگا ہوں۔ میں سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔ ابادہ سرے کاسوں میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اس آفس میں کبھی آکر نہیں جھانکتے۔“

”میں تمہارے چھوٹے چچا کا فراز سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”چھوٹے کارخانوں کے حسابات زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے۔ درازیں توڑنے سے پہلے تم اس پختہ کی کشیل کار جسد دیکھ لیتا۔ اس میں مجموعی طور پر کم رقم کا اندراج ہوگا جبکہ درازوں میں زیادہ رقم موجود ہوگی۔ بینک میں جمع کرائے وقت چھوٹے چچا فاضل رقم اپنے پاس رکھ لیتے ہوں گے۔ تم رقم جوں کی توں میز پر رکھ دینا اور گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے ابا کو فون کرنا کہ جب تم کمرے میں داخل ہوئے تو کوئی شخص درازوں سے رقم نکال نکال کر میز پر جمع کر رہا تھا۔ تم نے اسے لٹاکا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔“

”تو بڑی ہمت اچانک تو تم کر لیتے ہو؟“
 ”ایچانک تو میں انہی خاصی کر لیتا ہوں سر!“ وہ تھوڑے نکل کر بولا۔ اور ایک لمحے کے لئے مجھے گمان سا گزرا کہ کہیں اس کا دھ سے زیادہ بے وقوف نظر آجائے ایچانک ہی تو نہیں تھی؟ ”میں تو پھر یہ ڈراما کر گزرتا۔“ میں کسا ”اس سے کم از کم دو فائدے تو ہوں گے۔ رقم چمکے ہر حال میں بھی ضرور جائے گی اور حساب کیا جائے گا کہ چور کچھ لے تو نہیں گیا۔ اس سے ایک تو یہ انکشاف ہو جائے گا کہ چھوٹے چچا پختہ پختہ بھر کشیل بینک میں جمع نہیں کراتے۔ دوسرے وصولی کے رجسٹری رقم اور کشیل میں فرق ہوگا۔ چھوٹے

بھی نہیں۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ چوری کا الزام لگاتا ہے۔ مجھے چوری کے پکڑ میں پھنسا کر وہ اپنے راستے کا یہ اٹا بنا بھی جاتا ہے میں کامیاب ہو جائیں گے اگر ان کی یہ کامیاب ہوگی تو شاید رفتہ رفتہ مجھے ابا کی نظر میں اتار دینا ہم چھوٹی سولی سولہوں اور وراثت وغیرہ سے بھی محروم

نہارا کشیل سے کوئی تعلق ہے جو وہ تمہیں چوری کے الزام لانے کی کوشش کرے؟“ میں نے دریافت کیا۔

میں رات کو جا کر اسی کمرے میں بیٹھا ہوں جہاں وہ اپنی میزوں میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے کافی دور لگی ہوئی ہیں۔ رات کو میں تین چار پکڑ لے لگاتا ہوں لیکن زیادہ تر وقت میں ہی بیٹھا ہوں۔ میرا زیادہ تر ہی قسم کا ہی ہے۔ چھوٹے چچا کی حرکات و سکنات سے مجھے دیکھا ہے کہ وہ مجھے چوری کے پکڑ میں پھانسنے کی تیاریاں

پہنچتے ہیں۔
 ”جس۔ اتنے سے مسئلے کے لئے تم میرے پیچھے لگ گئے ہو؟“
 ”نہ ہنڈی سانس لے کر کہا۔“ تمہیں کچھ کھینچن ہو گیا ہے کہ مارا مسئلہ حل کر سکتا ہوں؟“

میرا دل کہتا ہے کہ آپ انسانوں کے کام آتے ہیں۔ اتنا بڑا ہونے کے باوجود اپنی مصروفیات میں سے لوگوں کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ ”وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”اور جسے آپ ”اتنا سا“ کہہ رہے ہیں، کچھ غریب کے لئے وہ زندگی اور موت کا مسئلہ مجھے تعین ہے کہ آپ ضرور میری مدد کریں گے اور تو کوئی بات سننا ہی نہیں۔“

”ابن میرے بھائی! میں ہی من کر چھن گیا ہوں۔“ میں نے کی سانس لے کر کہا۔

وہ شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”مجھے معلوم ہے آپ مذاق الیکٹریٹ میں کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں تو آپ کو مجھ سے دلی دلی ہے۔“

”شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ میں نے ایک اور ٹھنڈی لٹ لے کر کہا ”چاہتا تو میں یہی ہوں کہ تمہیں انکار کر کسی ایسی بینک دیں جہاں سے مجھے دوبارہ تمہاری صورت دکھانی نہ دے۔ لیکن تمہاری صورت دیکھتا ہوں تو ترس آ جاتا ہے۔“

”آپ مجھ پر رحم کرنا کہ میں نے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا صلہ دے گا چور کی صاحب!“ وہ بینک انار کر چمک چمک زار دھتار موندنے

”سے۔ اسے۔ یہ کیا کر رہے ہو! موندنے کی ضرورت کہ۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ”میں تو تمہارے مسئلے کا حل بتانے لگتا۔ تم نے دونا شروع کر دیا۔“
 اس کے آنسو تقریباً اسی طرح رک گئے جس طرح ٹوٹی ہوئی

چٹائی پر بیٹھ لانا مشکوک ہو جائے گی۔ بس اتنی ہی بات ہے۔ ذرا
مہلت کو کے تو اتنی چال چھوٹے چٹا پر پڑ جائے گی۔ لیکن پہلے ابھی
طرح سوچ لیا کہ یہ کام تمہارے بس کا ہے یا نہیں۔“

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آگئی تھی اور یہ حماقت کی
چمک سے مختلف تھی۔ وہ ذرا تامل کے بعد اثبات میں سر ملاتے
ہوئے بولا ”میرا خیال ہے میں یہ کام کر لی لوں گا۔ کم از کم چھوٹے
چٹا کو سبق سکھانے کے لئے تو کڑی کر دوں گا۔“

”بس تو اب جاؤ۔ فی الحال تمہارے لئے میرے پاس یہی
مشورہ ہے۔ معذرت چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ دفتر میں نہیں
لے جا رہا۔ مجھے کچھ ضروری کام کہنے ہیں جن کے لئے مجھے تھائی
اور کیسکی کی ضرورت ہے۔ پھر کبھی موقع مناسب ہوا تو چند منٹ
بیشیں گے۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ ہر امنائے بغیر بولا۔ ہر امنائے کی خوشایہ
اس میں حسرت نہیں تھی۔ ”مجھ پر تو آپ کا یہی احسان کافی ہے کہ
یہاں کھڑے کھڑے آپ نے مجھ سے اتنی باتیں کر لیں۔“ مصافحہ
کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر تقریباً ڈوہرایا ہو گیا۔ اس بار میں نے اسے
کندے سے پکڑ کر سیدھا کھڑا اور خدا حافظ کہہ کر عمارت میں
داخل ہو گیا۔

اپنے آفس میں جا کر بیٹھے ہوئے مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے
کہ کیتھرن نے بتایا، ”کسی مسٹر ایڈم کا فون ہے۔ میں نے ملائے کے
لئے کہا۔ دوسرے ہی لمحے دیو انوس اور کچھ نمکوس ی آواز سنائی
دی۔“ احمد شجاع کے ہاں سے ہو آئے؟“

میں اندازہ نہیں کر سکا کہ یہ سوال کیا بیان۔ یا پھر محض یہ
بتانا مقصود تھا کہ وہ ہر وقت میری نقل و حرکت سے واقف رہتے
تھے۔

”ہاں۔ ہو آیا۔“ میں نے ملافت سے جواب دیا۔
”اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے لئے تھے کہ وہ کس قسم
کا آدمی تھا؟“ ایڈم عرف ایڈی نے اپنے مخصوص پراسرار سے لہجے
میں اردو میں ہی پوچھا۔

”جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں وہاں گیا تھا تو پھر یہ بھی
معلوم ہونا چاہئے کہ کس لئے گیا تھا۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔

”نہیں۔ ہمارا توئی تمہارے اتنا زیادہ قریب نہیں ہو سکا۔“
وہ بولا ”بہر حال یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ
باکس ہمیں چاہئے۔“

”گوں سا باکس؟“ میں نے حیرتنا حیرت سے کہا۔ اس نے
گمو یا نقل سے کام لیتے ہوئے اس سیاہ باکس کی ساخت کی وضاحت
کی جو ابھی تک میرے لئے معما بنا ہوا تھا۔

”مگر وہ تو فرار ہوتے وقت احمد شجاع ہی کے ہاتھوں میں تھا۔
میں تو اسے بریف کیس سمجھا تھا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”مجھے تو
اس کے بعد شاید تمہارے ہی کسی نمکوس آدمی نے حسب معمول

گید ڈول کی طرح پیچھے سے حملہ کر کے بے ہوش کر دیا تھا۔ یہ
پاس وہ باکس کہاں سے آسکا تھا۔“

”احمد شجاع کے فرار ہوتے ہی ایک مفید گاڑی تھائی
اس کے تعاقب میں روانہ ہوئی تھی۔ اس میں دیو انوس اور
تمہارے سیکورٹی گاڑی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ہر وقت سارے
طرح تمہارے پیچھے لگا رہتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا ہم
تمہیں پہچانتے؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میرے بارے میں واقعی
بھی کچھ جانتے تھے۔ ایڈی کی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ہم
یہ نہیں جان سکتے کہ جب تمہارا آدمی احمد شجاع کے تعاقب
میں روانہ ہوا اور جب اسے حادثہ پیش آیا اس کے درمیان کیا
اور اس کی درمیانی وقفے میں وہ باکس کیس غائب ہو گیا۔ اس کے
سے اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ
شودہ کار ہے برآمد نہیں ہوا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہ ہے
راستے میں تمہارا توئی اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو کر
اور وہ تم تک پہنچ چکا ہے۔ اب وہ کوئی ایسا چیز تو تھی نہیں کہ اس
شجاع اسے چپا کر نگل جائے۔ اسے تو کوئی دھیل پھیل بھی نگل کر
سے نہیں رہ سکتی۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کیل پھیلی اسے نگل
سکے کہ وہ کتنی ہے یا بعد کے اسرار اور وہ تو قریح میں جتنا ہو
ہے۔“ میں نے تنگ لہجے میں کہا ”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ
باکس مجھ تک یا میرے کسی آدمی تک پہنچا ہے اور نہ ہی مجھے اس
کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ مجھے اس قسم کے کسی باکس کو
سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی لیکن اب تمہاری تنوکیل دیکھ
دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔ اب شاید میں بھی اسے تلاش کرنے
کو شش کر دوں۔“

”تم امت اگلی چیز ہو۔ ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہ
ہیں۔ ایڈی کسی سنجیدگی سے بولا۔ وہ زیادہ تر بات کرتے وقت
”ہم“ کا مینڈ استعمال کرتا تھا۔ شاید وہ بات کرتے وقت غیر شعور
طور پر اپنے تمام ساتھیوں کی ترجمانی کر رہا ہوا تھا۔ پھر اس کے
کی سنجیدگی میں سفاکی کی آمیزش بھی ہو گئی اور وہ ایک ایک
پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں آخری بار کہہ رہا ہوں باکس ہم
واپس کر دو۔ وہ تمہارے کام کی چیز تو ہے نہیں۔“

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں بھی آخری بار کہہ رہا ہوں
کہ تم اب باکس کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔
وضاحتیں کرنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی یہ بات میرے لئے قابل
برداشت ہے کہ کوئی میرے کے پر نہیں نہ کرے اور مجھے مجھ
”مجھے۔“

اس کے لیے میں دوبارہ نرمی آگئی اور وہ سمجھانے کے
انداز میں بولا ”مگر کسی نے غلط طریقے سے اس باکس کو کھولنے آ

ہوا ہے۔" میں نے ذریعے لیے میں کلا۔ "میرا وقت خاموشی ہوتا ہے اور تم ہر بار فون پر بڑی بڑی باتیں کی طرح اور دھر دھر کے قصے چھیڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔ میرا خیال ہے اب بات ختم ہو چکی ہے۔ خدا حافظ۔"

"بات تو اب شروع ہوئی پیارے! وہ ایک دم بدلے بدلے لیے میں بولا۔

"اگر تم نے ہاں کہہ دیا تو ایک ایسی کامیابی شروع ہوگی جس کا انجام کم از کم تمہارے لئے بڑا المیہ ہوگا۔"

"بھئی اوقات میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری باتوں کا کیا جواب دوں۔" میں نے بڑا اصرار سے کہا۔

"ہم عام طور پر صرف وہ باتیں سننے کے عادی ہیں جو ہمارے حق میں جاتی ہوں۔" وہ بولا۔ "تم نے وہ کیسٹ دیکھی؟"

"ہاں۔" تم لوگوں کی خیانت کا وہ ثبوت میں نے بغور دیکھا تھا۔ تمہا اور مجھ پر وہ بس انسانوں کے ساتھ جو لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں، انہیں ایک نہ ایک روز اس کا حساب دینا پڑا ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟"

"اکثر غیبت اپنی خیانتوں کے کوئی نہ کوئی جواز گزرتے ہیں۔" وہ گویا میری بات سے نفرت بولا۔ "وہ بھی ہم سے اکثر اسی لیے میں

بات کرتا تھا جس طرح تم کرتے ہو۔ وہ بھی ہماری بات نہیں مانتا تھا۔ اور جب سامنے پر تیار ہوا اس وقت بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ اس

وقت ہم اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ کامیابیوں کی فہرست سے اس کا نام کاٹ چکے تھے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔"

"میرا نام اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ کامیابیوں کی فہرست سے کب کاٹ دیے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بہت جلدی ہے تمہیں کسی کرنا خیر انجام سے دوچار ہونے کی؟" وہ چہچہاتے ہوئے مجھ میں بولا۔ "اصل میں تم اس لئے مجھ سے

ایسے لیے میں بات کرتے رہتے ہو کہ ابھی تمہارے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو۔ تمہیں ذرا بھی علم نہیں

ہے کہ میں جن کی نمائندگی کرتا ہوں وہ کون ہیں۔"

"تم پھر تم بتاؤ تاکہ میں تمہارے کچھ لوگوں۔" میں نے لاشعور سے کہا۔

"تمہا میں گے تمہا میں گے۔" وہ مزید انداز میں بولا۔ "انہی بھی کیا جلدی ہے۔ تمہارا نام اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ کامیابیوں کی

فہرست سے کاٹنے کے مراحل بھی ابھی دور ہیں۔ لیکن تم کو کتنی بھی کہو اور دعا بھی کہو ان مراحل تک نہ پہنچو کیونکہ تم بہت جلدی انسان ہو۔"

"اور تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہم تمہیں بن مول خریدنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے تم پر اتنی

نہی کی تو وہ دھمکے سے بھٹ کر تپا ہو جائے گا اور کھولے کے سب سے بچے اڑ جائیں گے۔"

"پھر تو تمہیں اس کی کوئی فکر ہونی ہی نہیں چاہیے۔" میں نے اس میں کوئی جتنی چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی راز محفوظ ہے تو

کو کھولنے کی کوشش کرنے والا یقیناً مارا جائے گا اور پاس کے راز سے تپا ہو جائے گا کیونکہ "ہر چار کتب استعمال" تو

کے ساتھ ہے نہیں۔ لہذا تمہیں اس کے بارے میں تشویش نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہم اس کی طرف سے بے نیاز ہونے کا خطوط مل نہیں لے رہے ہوں۔"

"یہ سوچ کر کہ کہیں کوئی اسے صحیح طریقے سے نہ کھول لے؟" نے پوچھا۔

"جو چاہو سمجھ لو۔" وہ ہنس میں بولا۔ "لیکن پاس لڑا نہیں کرو۔"

"خدا کی پناہ! میں نے جھنجھلائے ہوئے لیے میں کہا۔ "تم یا میری بات پر یقین نہ کرنے کی قسم کھا رہی ہے؟ تمہارے

ایسی اگر وہ میرے پاس ہے تو جب اور جس طرح چاہو مجھ سے نہ کرو۔ تمہاری معلومات تو ایسے ہی لاکھروں ہیں۔ تمہیں

ہی ہو گا کہ میں نے پاس کہاں رکھا ہوا ہے۔ مجھے بھی بتا دو۔ خود انہی تمہاری خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اس سے زیادہ

انہی چٹکائی کیا ہو سکتی ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ تم ہمارے پسندیدہ بلکہ مطلوبہ کامیابیوں کی

ت میں شامل ہو۔ ورنہ یہ جب چاہو اور جس طرح چاہو ہر دلی

نا استعمال کرنے کی توقع نہیں آتی۔" وہ طویل سانس لے لاکر ہم پر ہر صبران نہ ہوتے تو نہ جانے اب تک تمہارا کیا

ہو چکا ہوتا۔"

"اپنی ہی کوششیں ذکر کیجئے ہوں۔ اگر میرا خدا مجھ پر صبران نہ

آتا شاید ان میں سے کوئی کامیاب ہو چکی ہوتی۔" میں نے کہا۔

"اکھیرانہ انداز مجھے بہت برا لگتا تھا۔ اگر وہ شخص میری رسائی

ہو تاں مجھے امید تھی کہ میں اس کا کھیر نکال دیتا۔ وہ اپنا کھیر کسی

بہت زیادہ ہوشیار کامیابیوں کی کوشش کرتا تھا۔

"مگر۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تم تم مجھے ہو کہ وہ

شخص تمہیں نکالنے لگانے کے سلسلے میں تمہیں؟" وہ میرے

انزال سے گویا بہت محفوظ ہو رہا تھا۔ "یہ بھلا خیال ذہن سے

ماہر چننا! تمہیں نکالنے لگانا ہمارے لئے ایسا ہی ہے جیسے

اپر بھی ہوئی کسی کھمی کو اڑا دینا۔ تم پر جو حملے ہوتے وہ تو

دلی اہلیت اور قابلیت کے چھوٹے موٹے امتحان تھے۔ انہی

بھوتو تمہیں زیادہ عزیز ہو گئے ہو۔ اس سے پہلے ہم فیصلہ نہیں

کرتے تھے کہ تمہیں اہلیت دی جائے۔"

"یہی تو دانش ہے تمہاری کہ تم نے مجھے سائے طاقت میں لیا۔"

ڈرائیو سے گاڑی سے اتار تو کھڑی کے سیکرڈی اچانک طارخ خان نے سر کھاتے ہوئے قدرے غدا مت آئیز انداز میں دیر جھنجھٹایا "سرا آپ کے بیڑوم سمیت چند کمرلوں میں آپ کو کچھ بونظر آئے گی۔ یہ مت سمجھئے گا کہ یہ میری سستی کی وجہ سے ہے۔ میں نے اس شخص کو کمر میں داخل ہونے دیکھ لیا تھا۔ ہم میں دیکھا جاتا تھا کہ اسے کس چیز کی تلاش تھی۔"

"وہ کمر میں داخل کس طرف سے ہوا تھا؟" میں نے اس بات کاٹنے ہوئے پوچھا۔

"مقبلی لان کی دیوار چاند کر۔" طارخ خان نے جواب دیا "اور اس کا خیال غالباً یہی تھا کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں ہے لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

طارخ خان کی ڈاؤنی زیادہ تردید میں ہوتی تھی اور وہ و گیسٹ ہاؤس میں ہی رہتا تھا لیکن کبھی کبھار کسی آسیب کی طرح غایت غیر محسوس انداز میں اصل عمارت کا چکر لگاتا تھا یعنی کسی کو کسی نظر آتا تھا۔ کمر میں گھومنے پھرنے کا اس کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ کہیں بھی کسی کے سامنے اچانک نمودار ہو سکتا تھا۔

کوٹھی کی چار دیواری کالی اونچی تھی اور اس کے اوپر باریک مینواری آئیں چھٹی ہوئی تھیں جو دیوار کے اوپر چڑھتے بعد بھی غور سے دیکھنے پر ہی نظر آسکتی تھیں۔ رات کے باہر بے بعد صبح کی سپیدی نمودار ہونے تک ان بیرونی آدموں میں گزروں تھا۔ جو آئیں دیوار پر بازو کی طرح لٹکائی جاتی ہیں یہی

توجہ دی جا رہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے کام آؤ۔۔۔ اس طرح تم اور بھی جتنی آویں جاؤ گے بہت مہونے کا جیس۔"

"میرے لئے اتاری صحن کالی ہے جتنا مجھے مل چکا ہے۔ میں قاعدت پسند آویں ہوں اگر مجھے مزید صحن کی خواہش بھی ہوگی تب بھی میں اس کے لئے کسی کی مدد نہیں چاہوں گا۔ خصوصاً تم جیسے لوگوں کی۔"

"خیر۔ یہ سب کچھ قوت قوت آنے پر دیکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت تک بھی تم قاعدت پسندی کی باتیں مت کرو۔ آج کے دور میں قاعدت پسند تقریباً نایاب ہو گئے ہیں۔ اب تو دودھل اور ملاوٹ بھی قاعدت پسند نہیں رہے۔ ہاں اگر تم فیشن کے طور پر اپنے آپ کو قاعدت پسند کہہ رہے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کوڑیوں میں اپنے آپ کو دودھل سمجھو اور قاعدت پسند وغیرہ کہنے کا فیشن ہے۔ جس سال کوڑوں کا مبالغہ ہوتا ہے اس سال بھی اگر کوئی پوچھ لے کہ کامد بار کیا جا رہا ہے؟ تو یہی جواب دیتے ہیں کہ بس دال دھنی چل رہی ہے۔ اس فیشن کے مطابق تمہاری قاعدت پسندی پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"جس اعتراض ہو بھی تو میری صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دیے تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم کون ہو ٹیڈ ڈاٹ کیا ہے۔ اور مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے اس امید پر کہا کہ شاید اس بار وہ مکمل ہی جائے۔

"یہ باتیں اتنی آسانی سے بتائی جانے والی تو نہیں ہیں۔ اور ابھی یہ سب کچھ جانا تمہارے لئے اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ جان ہی جاؤ گے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"لیکن مجھ پر ہی تمہاری نظر انتخاب کیوں ہے؟ اس شخص میں اس ملک میں مجھ سے کہیں بڑے بڑے سرمایہ دار پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا کہ ہمیں کسی سرمایہ دار کی ضرورت ہے؟" وہ گویا میری ناگہی پر قدرے حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"سرمایہ تو تم ہم سے جتنا چاہو لے لو۔ بیٹھوں سے ہمیں دلچسپی ضرور ہے لیکن وہی نہیں جیسی تم سے ہے۔ تم صرف سرمایہ داری نہیں اور بھی بہت کچھ ہو۔ تمہارے اندر بے شمار صلاحیتیں ایسی ہیں جن کا ابھی شاید تمہیں خود بھی علم نہ ہو۔ ہمارے لئے تم سرمایہ دار نہیں بلکہ خود ایک سرمایہ ہو۔ ہم نے تمہیں اپنے ریزرو بینک میں ڈالا ہوا ہے۔ بیٹھوں کا کیا ہے۔ سینہ تمہارے لئے گاجر سولی کی طرح ہیں۔ جس کو چاہے ہیں انھا کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔"

"عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ اور خدا حافظ۔" میں نے کہا۔

"بائسک واپس کرنے کے بارے میں ضرور غور کرو۔" اس نے ایک بار پھر تاکید کی۔ اس بار میں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس شام میں گھر پہنچا تو ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ میں

غیر ملکی زبانیں سیکھئے

پروفیسر ایم اشرف

فرنج اردو ریڈر 90/-

فرنج اردو ڈکشنری 90/-

جاپانی اردو ریڈر 90/-

جاپانی اردو ڈکشنری 60/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

”شکر کرو اس سے قاتل کے چارے یا باغیالی کی فوت نہیں آتی۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ شاید کمانڈو ہونے کے باوجود تمہیں مزید بچھڑانا پڑتا۔ محض اندازوں کی غلطی کی وجہ سے۔ بلکہ غلطی اصل میں میری ہی ہے کہ میں نے تمہیں اس کو قابو میں کرنے کا حکم تو دے دیا لیکن صحیح طور پر اس کے بارے میں خبردار نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے تم نقصان بھی اٹھا سکتے تھے اُسے سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہے کہ اس کا مختصر سا وجود اور مضحکہ خیز شکل دیکھ کر ہر کوئی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے بارے میں انتہائی غلط اندازے لگاتا ہے۔“

”میں سرباہ تھیجے تجربہ ہو گیا۔“ طارق نے تسلیم کیا۔
 ”آئندہ اگر کبھی اسے دیکھو اور قابو کرنے کا ارادہ کرو تو یہ سوچ کر کہ تمہارا مقابلہ کسی آسانی بلا سے ہے جو محض آنکھوں کو دھوکا دینے کے لئے مختار اور مضحکہ خیز سا ہرپ و حمار ہے ہونے ہے۔ اس بھڑے سے دجود میں شاید کوئی شیطان عقیدہ ہے اس سے تم کسی بھی حرکت کی، کسی بھی بات کی توقع رکھ سکتے ہو۔ یہ سوچ کر ہاتھ ڈالو گے تو شاید کچھ کامیابی ہو سکے۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا سرباہ! وہ مستعدی سے بولا۔
 ”آئندہ اگر وہ نظر آگیا تو آپ ضرور کوئی اچھی خبر سنیں گے۔“
 اندر جا کر میں نے کمروں کا جائزہ لیا۔ ساز و سامان الٹ بلیٹ پڑا ہوا تھا۔ باہم تلاش کا انداز بتاتا تھا کہ ڈھونڈنے والے کو کسی بہت چھوٹی چیز کی تلاش نہیں تھی اس لئے بہت زیادہ اکھاڑ بھڑا نہیں چائی گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ اسی سیاہ باکس کی تلاش کا شاخسانہ تھا۔ بلاشبہ وہ اس کی تلاش کے سلسلے میں بہت مستعدی دکھا رہے تھے۔ لیکن یہ سوچنا ان کی بے وقوفی تھی کہ اگر باکس واقعی میرے پاس تھا اور میں اسے چھپانا چاہتا تھا تو وہ اسے اس طرح تلاش کر سکتے تھے۔

میں نے گھر کے منتظم کو کمروں کی حالت درست کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے میرے معائنے کے لئے چندوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا تھا۔ میں خود لاؤنج میں بیٹھ کر کوئی نوکون کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ گھر واپس پہنچ چکا ہو گا۔

”ٹوٹی!“ میں نے سلسلہ لئے پر کہا ”میں تمہیں ایک انتہائی ضروری کام بتا رہا ہوں۔ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر تمہیں صرف اسی کی فکر کرنی ہے۔ اپنے علاوہ تمہارے جن لوگوں کو اس کام پر لگایا ہوا ہے انہیں بھی ہٹاؤ۔ میری نگرانی اور حفاظت کی فکر بالکل چھوڑ دو۔ اللہ نے میری زندگی جتنی کمسی ہو گی ۲۴ گھنٹوں میں ضرور جیوں گا۔ اور اگر اوپر سے بلاؤ آگیا تو محافضوں کی بہت بڑی فوج بھی مل کر مجھے نہیں بچا سکے گی۔ اس لئے خدا وارا تم یہ برداشت میرے پیچھے دو آؤ گی لگائے رکھنے کی ضد چھوڑ دو۔“

وہ دیر سے سے ہنس کر بولا۔ ”سرباہ تمہیں کیوں کر رہے ہیں۔ آپ بائیں ہاتھ دیکھتے۔ جس طرح آپ حکم دیں گے اس

طریق خاص فائدہ نہیں تھا۔ دیر اوریں چاند گرہوں میں نہ والے انہیں دور سے ہی دیکھ کر ان کا کوئی بندوبست کر ابان میں کتنے ہی دولت کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ لیکن طارق نص کا ذکر کر رہا تھا وہ دن میں کسی وقت دیر وار پر چڑھا ہوا چار دیر اوریں کی آندوں میں کرنٹ نہیں ہوتا تھا۔ یہی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

لے کا آؤ تھا وہ؟ کوئی نقاب وغیرہ چڑھا لی ہوئی تھی اس نے اپنے لیے کی بے آبی چھپانے کی کوشش کرتے

سرا نقاب وغیرہ کہاں۔ وہ تو ہی بندر نما شخص تھا جو کر گیا تھا۔ جس کے بارے میں آپ نے حکم دے رکھا۔ پکڑنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے اسی لئے اسے دیکھ کر نہ تو آندوں میں کرنٹ آن کیا اور نہ ہی اس میں چاہتا تھا وہ زندہ ہی ہاتھ آجائے۔ زخمی بھی نہ ہو اس کے انداز سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی چیز کی تلاش میں نے اسے گھیرنے کے لئے دو تین کمروں کی تلاش دیا۔“

ی سانس لے کر رہ گیا۔ اس مردود اے زن نے مجھے کوا تھا۔ وہ واقعی میرے لئے دو سرخنا چار رہا تھا۔

خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے وہ اور آپ میں چلا گیا۔ میرا اسے وہیں گھیرنے کا ارادہ تھا کیونکہ مانگے کا درد اندازے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کمزری کی بھڑکی کم از کم ہیں فٹ ہے۔ اس سے چلائیے لگائے۔ دیر ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اسے تیار نہیں کیا۔

وہ اسی سے کوڑ کر ہماگ گیا ہو گا؟ میں نے اس کی بات لے لیا۔ طارق خان نے بدامت آمیز انداز میں اپنی

کہ وقت بڑے کیپے سے نکل رہا تھا جب میں نے کمرے اور کمرے میں دو اندازہ بند کر لیا۔ ”اس نے دو جیو المی میں نے کمن دکھائے ہوئے اسے سیدھا کھڑا ہونے وقت تک وہ غالباً کمرے کی اچھی طرح تلاش لے چکا ہے تو ایک لمحے بھی توقف نہیں کیا کوئی بات نہیں۔ میں تو اس کی شکل بھی صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ اس انداز کی کمانی اور بالکل اس طرح کمزری سے باہر نکل گیا۔ اندازہ ہوا کہ میرے سے باہر چلا گیا ہو۔ کسی انسان سے بہت لگائے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کرتے تو دکھا گیا ہے لیکن اب ٹانگہ واک واک لگی میں پڑا ہو گا۔ میں نے دو ڈر کمزری سے جھانک کر اس کی طرح چلی کے سو ڈر قاتل ہو رہا تھا۔“

ساتھی فوراً اس کی مدد کو پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک بار دوں کر وہ مجھے مودہ نہیں چاہئے۔ میں اس سے بہت زیادہ معلومات حاصل کرتی ہیں۔ خاموش حالت میں وہ ہمارے کم نہیں۔

میں سمجھ گیا سر! آپ مطمئن رہئے۔ "نونی" اکلوتے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں حیرت میں ہو گیا تھا۔ مجھے اس سے ہمارے مختصر مگر نہایت مستند و ضابطہ مشین میں آجائے گی تو جلد یا بدیر کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔ ملازمین کمرے درست کر چکے تھے اور میں اس دروازے پر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب ایک ملازم نے مجھے وزٹنگ کارڈ لا کر دیا۔ میری کسی سے ملاقات ملے نہیں۔ نے کارڈ لے کر دیکھا وہ نہایت خوبصورت "نہیں" اور کارڈ تھا اور اس پر نہایت خوبصورتی سے ہی صرف ایک ہوا تھا۔ ملاحظہ خانم!

نام کے سوا اس پر کچھ نہیں تھا۔ نہ تو حیثیت کی کوئی اور نہ ہی کوئی فون نمبر یا ایڈریس وغیرہ۔ مجھے غیر ممالک کی ایسی شخصیات کے وزٹنگ کارڈ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وزٹنگ کارڈ پر نام کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ ان نہایت اہم اور معروف شخصیات میں شمار ہوتی تھیں۔ میں نہ آیا کہ ملاحظہ خانم کس شمار گزار میں تھی جو اس کارڈ کے سلسلے میں یہ انداز پایا تھا۔

مجھے یاد پڑا تھا کہ اس عورت کو میں نے صرف پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر کے پاس اس پائلٹ میں جس میں بے بی نشاط کی لاش سوٹنگ ہل سے، تھی۔ اس قتل کا سرانام مذاقہ مصنف نصیر نواز سے اور میں نے اسے اس کے بھائی کے سوا کسی دوسری شخصیت میں نے نصیر نواز کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔ وہ اس کی باغیچہ والے مستقل اسی کے ساتھ تھی۔

میں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت دور تھوڑی عورت جو بہت بڑی فائنا نسر کے طور پر ہم ایڈریس میں داخل ہو کر رہی تھی۔ بتانے والے کے انداز سے مجھے یہی اندازہ نصیر نواز کی دریافت تھی اور وہی اسے ہم ایڈریس تھا۔ ملاحظہ خانم سے اسی پائلٹ میں میرا ٹھکانہ رہا تھا۔ اب نصیر نواز کی "خودکشی" کے بعد وہ مجھ سے تھی؟

میں نے ہال میں آکر تارک شیشہ والی ایک کونڈ دیکھا۔ جہر چم کئی ایک خوبصورت نقش کے پاس ڈرا کڑی تھی اور تنقیدی نظریے کو بھی کا جائزہ لے رہی تھی۔ خان نے نظروں ہی نظروں میں اس کا اور گاڑی کا چاہا تھی اسے ڈرائیو سے میں اتار آئے گا مونس

طرح ہو جائے گا۔

"نہیں" جو کام میرے ساتھی "میرے دوست میری محبت میں کرتے ہیں ان کے بارے میں مجھے ان کی منت کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔"

"سر! ہمیں قراب یوں لگتا ہے جیسے ہم ہر کام ہی آپ کی محبت میں کرتے ہیں۔" "نونی" بولا۔

"جس تو میرے کچھ نوکر میں ہر کام کے سلسلے میں تمہاری منت کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ ہمارے پاس اس اور راحت کا مدد جی پکڑ نہیں ہے اس کے باوجود ہمارا ڈسپینر مثالی ہے۔"

"بے اصولی دنیا میں کتنی ہی عام سہی اس کے باوجود ہماری جتنی اصولوں میں ہی ہے۔ بے اصول لوگ بہت جلد فنا ہو جاتے ہیں۔" "نونی" انتہائی سنجیدگی سے بولا۔ "سر! آپ حکم کیجئے" وہ ضروری کام کیا ہے؟

"تم نے اس بندہ کا شخص کو تو دیکھا ہی ہے جسے ہم نے اپنی دانست میں بارود کا قاتل بھی وہ زندہ ہی تھا۔ اس کے بعد کئی بار میرے سامنے آپکا ہے۔ وہ اپنا نام اے سن بتاتا ہے۔ اسے ہر حال میں پکڑنا ہے۔ زندہ یا کم از کم نیم زندہ۔ جان سے نہیں مارنا ہے ورنہ اس کے "فوت" ہونے کے ساتھ ساتھ اسے پکڑنے کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا۔"

"آپ مطمئن رہیں سر! آپ جانیں گے تو اسے اس طرح پکڑا جائے گا کہ اس کے جسم پر ایک خراش تک نہیں ہوگی۔" "نونی" بڑے اکلوتے سے بولا۔

"اس کام کو اتنا آسان بھی مت سمجھو۔" میں نے اس کی معصوم خود اعتمادی سے محفوظ ہونے ہوئے کہا۔ "تم خود بھی خیال رکھنا اور تمام ساتھیوں کو بھی ہدایت کرنا کہ جب بھی اس پر ہاتھ ڈالا جائے" یہ کچھ کر ڈالا جائے کہ وہ کسی بلا یا کسی چھلاوے کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر ہمارا کوئی بھی توجہ قلعہ خوش قسمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہ کرے۔"

"ٹھیک ہے سر!" "نونی" فوراً بولا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں یہ ہدایات ذاتی تحریکات کی بنا پر دے رہا تھا۔

"تم نے تو اسے اچھی طرح دیکھ ہی رکھا ہے۔" میں نے مزید کہا۔ "لیکن باقی ساتھیوں میں تقسیم کرنے کے لئے طارق خان سے اس کی تصویر کے پرنٹ لے لیتا۔ اس کے پاس تصویر موجود ہے وہ مزید پرنٹ نکلا دے گا۔ سب ساتھیوں کو اس کام پر لگا دو۔ اسے بالکل اسی طرح سرگرمی سے تلاش کرنا ہے جس طرح والدین اپنے گمشدہ بچے کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اچانک ہی نظر آسکتا ہے۔ سب کا زانیہ سر پر ایک دوسرے سے رابطہ رہنا چاہئے۔ اگر کسی کو مدد کی ضرورت پڑے تو قریب ترین

سائنس کا کوئی ذایا گرام تھا جسے اس کے ذہن کی کہیں زائزاد فوٹو
لا بھری اپنے اندر محفوظ کر رہی تھی۔

میں نے پہلی بار جب اسے نصیر نواز کے ساتھ دیکھا تھا تو مجھے
اس میں ہلکی سی "وسایت" کی جھلک محسوس ہوئی تھی لیکن اس
وقت وہ اپنے میک اپ لباس اور رک رکھاڑ سے مکمل طور پر اس
طبیعیاتی نمائندہ عورت دکھائی دے رہی تھی جن کی زندگی کا بیشتر حصہ
فرانس امریکا اور سوئٹزر لینڈ وغیرہ میں بسر ہوا ہے۔ شاید میں ہی
پہلی ملاقات پر صحیح طور پر اس کا جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اس کی وجہ
شاید یہ رہی ہو کہ اس وقت میرے ساتھ شط روٹھ ستانہ بھی جو
... بہت خاص موڈ میں تھی۔ وہ مجھے کسی اور طرف متوجہ ہونے کی
مصلحت ہی نہیں دے رہی تھی۔

"صاف کہتے گا ظاہر خانم!" میں نے اشتعال شائستگی سے
کہا۔ "خواتین کوسے... اور خصوصاً خوبصورت خواتین کو انتظار کرانا
انتہائی بدذوقی کی دلیل ہے لیکن مجھے بیچوراً چند منٹ آپ کو انتظار
کی زحمت دینا پڑی۔ دراصل میں اس حالت میں نہیں تھا کہ آپ
کی آمد کی خوشخبری سن کر فوراً آپ کے سامنے آسکا۔ ورنہ شاید میں
خود باہر آکر آپ کو روک بیٹھ کرتا۔"

اس کے چہرے کا برف زار دھیرے دھیرے تھوڑا سا پگھلا اور
مسکراہٹ کی کرن جھلکائی۔ اسی دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ
پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھنے ہوئے نہایت حترم آواز میں
بولی۔ "ہو سکتا ہے میرا شمار ان لوگوں میں ہو جو آپ کو کسی بھی
حالت میں دیکھ کر خوش ہوتے ہوں۔"

اس کے الفاظ سے زیادہ معافی اس کے لمبے میں پوشیدہ
تھے۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ "نزع کی حالت میں دیکھ کر بھی؟"
"بدشگولی کی باتیں مت کیجئے۔" وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے
بولی۔ "یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔ ایسے ہی ذرا زبان بھسل گئی تھی۔" میں
نے جلدی سے کہا۔ "لیکن کیا واضح مجھے عالم نزع میں دیکھنا آپ
کے لئے خوشی کی بات نہیں ہوگی؟"

"میں نے تو اسی آپ کو زندگی کے عالم میں صحیح طور پر نہیں
دیکھا۔" آپ نزع کی باتیں کرنے لگے۔ میری سطوات اور میرے
قیانے کے مطابق تو آپ اسے قوتیبت پسند نہیں ہیں۔ آپ تو
بدترین حالات میں بھی شکست انداز میں سوہنے والے اور بے خوف
انداز میں بولنے والے ہیں۔" وہ اسی حرم تل فیس اور کھمرے
کھمرے لمبے میں بولی۔ میں حیران ہونے لگی۔ وہ سکا۔ وہ میرے
بارے میں سطوات بھی رکھتی تھی اور قیانے بھی لگاتے تھے۔
جو تقریباً درست ہی تھے لیکن یہ کیونکر ممکن ہوا تھا؟ یہ میں کبھی
نہیں سکا۔

میرا دست میں نے اسے کریدنے کے بجائے شکر گزارانہ سے
لمبے میں کہا۔ "آپ میرے بارے میں حسنو عن کے لے کر آئی

رہاں میں شامل خواتین کو خصوصاً یہ احساس ہرگز نہیں
جاتا تھا کہ میرے گھر میں سیکرٹری کا کوئی نظام کام کرنا
حال ایسی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ میں اس نظام کو
زیادہ تفصیل بتاؤں۔ یہ شخص ہلکی ہلکی احتیاط کی اور
نہ والا پراسرار اور ناقابل فہم سلسلہ سامنے نہ آتا تو
اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ میں خالصتی انتظامات
پہن نہیں رکھتا تھا۔

اسے کمری نظریے کا ظاہر خانم کا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ ایک
فنی عورت تھی۔ دروازہ قد خوبصورت اور خوش لباس۔
اس کی شخصیت کا وہی تاثر آپ بھی برقرار تھا جو میں نے پہلی
محسوس کیا تھا۔ یعنی اس کے چہرے سے اور شخصیت
بجانب ہی سرد مہر کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے تاثر میں
اس کی رحمت کی وجہ سے بھی اضافہ ہوتا تھا۔ اس کی رحمت
بڑا وہی گوری تھی۔ پھاڑوں پر جی ہوئی برف کی طرح سفید
تھی۔ شاید اسی لئے وہ خود بھی ایک برف پوش چٹان ہی
تی تھی۔ اس میں اپنی ایک الگ ہی طرح کی کشش تھی جو
کو اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر لیتی تھی۔ لیکن اس
نے اس کی چراسرار سی شخصیت کے دواڑے بند معلوم
تھے کہ از کون کی الحال!

ی نے لازم کو ہدایت کی کہ اسے ذرا تنگ دم میں
۔ اور خود تیار ہونے چلا گیا۔ میرا صرف تائی لگا نا اور جوتے
اپائی تھا اس کے باوجود میں غلاب محمول عورتوں کی طرح
انفصالت اور دست ہدای سے تیار ہوا۔ درحقیقت میرا ذہن
اس عورت میں ہی الجھا ہوا تھا۔ اس کی آمد کا کیا مقصد
تھا؟ مجھے اس سے کس طرح پیش آنا چاہئے تھا اور کس
میں شکوکہ کرنی چاہئے تھی؟ پھر میں نے دل ہی دل میں اپنے
دیکھا کہ ان سب باتوں کا فیصلہ تو اس کا وہی دیکھنے کے بعد
اپنے تھا۔

میں ذرا تنگ دم میں داخل ہوا تو وہ ایک ٹکے کی سی شکست
مہلت میں دھنسی بیٹھی تھی اور گرد و پیش کے جائزے سے
ہی ہوئی تھی۔ وہ ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرنے کی عادی معلوم ہوتی
تھی جس چیز کو بھی دیکھتی تھی نہایت کھمرے کھمرے انداز میں
گتے لگوا اس کی تصویر حاضر جزئیات کے ساتھ ذہن کے
لنگھانے میں داخل ہوتی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ کھل کر ذرا سنے گئے سے انداز میں مسکرائی
جسے کے برف زار پر اس کی آنکھوں میں بہت گہرائی میں
لا کھوسات کی مٹھی سی چنگاری جھلکائی لیکن وہ سرے ہی لمبے
ام ہو گئی۔ شاید اس نے مجھے بھی سرے پا پس تک متاثر
بات کے ساتھ ذہن کے مخصوص نفاں خانوں میں محفوظ کرنا
لگا لگا تھا۔ میں شاید اس کے لئے جیہ میز کی کوئی تصویر تھا۔

میں سے سرزد ضرور ہو جاتا ہے لیکن اس پر میں نے غرضی محسوس نہیں کیا۔ بیٹہ بچتا دای محسوس کیا ہے۔ میرے ذہن یہ اس بات کی چمکی دہل ہے کہ میرا خیر غراب نہیں ہے۔ ہر برائی کو صرف چمکا ہے اور کچھ کر چھوڑا ہے۔ جسے میرا حسنی ہے کہ میں کسی بھی شے، کسی بھی برائی کا مستقبل پر ہوسکتا۔

”بہت۔۔۔ خوب۔۔۔ بہت خوب“ اس نے کرنا بدیدہ حاضرین کو تالیاں بجانے کا اشارہ کیا پھر غالی ہوئے گلاس کو میری طرف پڑھانے پہنچے بولی ”غرض کہ کچھ یہ ہے اور میں فی دی پر آپ کا اندر لے رہی ہوں۔ ہاں ہاں صاحب! یہ بتائیے آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟“

میں نے اپنی حیدر میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور باز رکھتے ہوئے کہا ”میں اس سلسلے میں بھی آج تک کسی نیچے پہنچ سکا۔ کبھی کبھی مجھے اپنی زندگی کی کمالی بے مقصد ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے خانوے بعد ا طرح میری زندگی بھی مقصد سے محروم ہی رہے گی۔ دوسرے لوگوں کی طرح میرا معاملہ بھی یہی رہے گا کہ! ہوئے ”راؤدر اوچر بھگتے“ کا دوبار کیا“ وہ یہ کہنا ”کچھ ام برائیوں میں اچھے اور بالآخر مر گئے یہ کوئی زندگی نہیں۔ ایسا ہوا تو مجھے اس پر افسوس ہو گا۔ لیکن کبھی کوئی مجھے اطمینان دلاتی ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ مقدر میں کوئی بڑا کام لکھا ہے۔ قدرت مجھ سے کوئی بہت لیتا چاہتی ہے۔ اسی لئے وہ اتنی تیزی سے مجھے اوپر لارہی۔ میں تو مستی حقیر اور بے وسیلہ سا انسان تھا۔ دو وقت کی لالے پڑے رہتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس طرح کے کر میں۔ اس طرح کے ڈرانگ دوم: آپ جیسی کسی حسین خاتون سے اس بے تکلفی سے کہہ ہوں گا۔“

”صرف ایک خاتون سے ہی نہیں بلکہ اچھے طبقے کی کتنی خواتین سے۔“ طاہرہ خانم نے صحیح کی۔

”آپ میرے بارے میں حسن ظن ضرور رکھیں مگر مت رکھیں۔“ میں نے افساری سے کہا۔

”یہ حسن ظن کی نہیں حسن دن کی باتیں ہیں۔“ وہ گلاس خالی کر کے اس نے داہیں میز پر رکھتے ہوئے کہا ”ایک ہٹا لیا ہے“ اندر بولے ”اب آف دی ریکارڈ بنائے ہیں۔“

”میں بے حد ممنون ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“ وہ بلا ”شپیننگ منگا لیجئے۔ طبیعت بڑی بے کیف ہو رہی ہے۔“ وہ بلا نال بولی۔ مجھے اندر ہی اندر اس فرائش پر خفیف سا جھٹکا لگا لیکن میں نے اس کا اہتمام نہیں ہونے دیا۔ میں اب جس طبقے میں شامل تھا وہاں کسی عورت کے منہ سے اس قسم کی فرائش حیرت کا باعث نہیں بنی چاہئے تھی۔ لیکن پھر بھی ہر حال یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ طبقہ خواہ کچھ بھی ہو۔ پہلی ملاقات کے اپنے کچھ تقاضے کچھ مشکلات ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ تمام تقاضوں کو فصول سمجھ کر تمام مشکلات کو ہلائے ملاقات رکھ کر آئی تھی۔

”لازم شپیننگ اور لوازمات کی رٹے سجا کر لے آیا تو میں نے کہا۔“ ”ہلپ یور سلپٹ پلیز۔ آپ کو خودی زحمت کرنا پڑے گی۔“ اس نے دو ڈرکس تیار کیں۔ میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جب اس نے ایک گلاس پیری طرف بڑھایا تب میں نے کہا۔

”شکریہ۔ میں چتا نہیں ہوں۔“ اسے گوا حیرت کا خاصا زور دار بھٹکا لگا۔ حیرت کے اہتمام کے طور پر اس نے بخاری سے چپکلیں جھپکاتے ہوئے طویل و عرض ڈرانگ دوم کی ایک دیوار کی طرف دیکھا۔ اس دیوار پر لکڑی کا خوبصورت آرائشی کام تھا جس کے عقب میں بار موجود تھا۔ ملازم نے طاہرہ خانم کے سامنے ہیں سے سب کچھ نکالا تھا۔

وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اس اہتمام میں تو ذاتی دلچسپی اور زندگی کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ ویسے تو اب ہمارے طبقے میں بار زیادہ تر کمروں کے لوازمات میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ خوبصورتی اور وسعت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔“

”ذاتی دلچسپی تو میں عموماً ہر کام میں شامل کر لیتا ہوں۔“ میں نے کہا ”میں اس نظر سے قائل ہوں کہ انسان برائی کو بھی اپنائے تو سلیقے سے اپنائے۔“

”آپ اسے برائی سمجھتے ہیں۔“ اس نے شپیننگ کا خوبصورت فرا نہیں اپنی ہال بلند کرتے ہوئے کہا جس سے وہ ایک گھونٹ بھر چکی تھی۔

”ہاں۔ برائی تو برائی ہے۔“ میں نے بلا نال کہا۔

”او۔۔۔“ وہ ساٹھانہ انداز میں خوبصورت ہونٹ سکڑتے ہوئے بولی۔ ”میں میرا اندازہ غلط ہو گیا۔ میں آپ کو اتنا پارسا بھجھ کر آپ کے پاس نہیں آئی تھی۔“

”میں نے کب کہا کہ میں پارسا ہوں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”مجھے پارسی کا دعویٰ ہرگز نہیں۔ لیکن میں رند خرابات بھی نہیں۔“ ”تو پھر آپ کیا ہیں؟“ اس نے ایک اور گھونٹ بھر کر گلاس کو ایک اداسے خاص کے ساتھ اٹھلیوں میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میں خود بھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے دوا متزاری سے کہا۔ ”شاید میں کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن اچھا آدمی بننے کے لئے کوشاں ضرور رہتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی غلط کام بھی کھار

وہ ایک پراسا گوشت بھر کر بولی۔ ”آپ نے پوچھا نہیں کہ میں
کی خاص مقامی کے بھیر کی دعوت کے بھیر کسی اطلاع کے
کے ہیں کیوں چلی آئی؟“

”آپ چلی آئیں یہی کافی ہے۔ آپ کی لوازش ہے۔ اب
کو سوالوں کے خار دار میں کھینچتے پھرنا تو بڑی بے وقوفی اور
ان کی بات ہوگی۔“ میں پہلے اسے اچھی طرح خوش کرنے پر محکا
فاکر شاید اس طرح اس کی اصلیت کو سمجھنے میں کچھ مدد مل

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک بالکل نیا تجربہ ہے
ی سرزد ہو چکی ہے کہ جب سعید صاحب کے ہاں پابلی میں
اسے تعارف ہوا تھا تو میں نے آپ کو دعوت نہیں دی کہ بھی
اسے ہاں تعریف لاکر اس قریب خانے کو در وقت بخشیں شاید میں
استیلا ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ آپ نصیر نواز کے ساتھ تھیں۔
نے سوچا وہ قصد اور رقابت میں جھلنا ہو جائے“

”ہاں۔ یہ یقین ممکن تھا۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”شاید میں
بھی اس وقت زیادہ توجہ سے آپ کی طرف اس لئے نہیں دیکھا
کہ ساتھ آپ کے شانہ بہ شانہ تھی۔“ اس نے صاف براہ

روا۔
میں نے بعد قہر سے مفہوم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”نہ نصیر نواز نے خود کئی کئی تھی اور کوئی اعتراف نہ قسم کی
بھی چھوڑی تھی جس میں نہ جانے کن کن گپیں کا ذکر تھا؟“

وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی سو دو سرا دیکھ بھی
نہ سے آثار چکی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خوار کا شانہ تک
ی تھا۔ البتہ اس کی برف جیسی سفید رنگت میں ذرا دھڑکی کا ہلکا سا
ار بھینکے گا تھا۔ ایک دھڑکنے کے لئے مجھے ہون لگا جیسے اس کی
زرہ میری روح کی گہرائی تک میں اتر جاؤں گی۔ میں نے پوری
دکھش کی کہ میرے باطن کے دو دروازے بند ہو جائیں۔ کہیں کوئی
وزن بھی پانی نہ رہے۔ میں چہرے پر حتی الامکان معصومیت طاری
کے بیٹھا رہا۔

”آپ۔۔۔ خود کئی تو اس نے کر لی تھی۔“ وہ بدستور میری
گہلوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے جیسے میں بولی۔ ”لیکن نہ
اسے کہیں اس کی خود کئی میرے لئے ایک معائنہ تھی ہے۔“
”اور آپ کو سوتے حل کرنے کا شوق ہو گا۔“ میں نے بظاہر

مانگی سے کہا۔
بات شوق کی نہیں ’افسوس کی ہے۔“ وہ پلٹو بدلتے ہوئے
کہ۔ ”آپ کو یقیناً بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ وہ میرا کس قسم کا
ہست تھا۔ مجھے تنگ پردین نظر آنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں
ہے۔ میں جو کچھ کرتی ہوں اسے چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں
کرتی اور جو کچھ کہتا چاہتی ہوں اسے بھی دل میں دبائے رکھنے کی
فانی نہیں ہوں۔ مثلاً میں آپ کو یہ بتا دینے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ

محسوس نہیں کرتی کہ آپ مجھے پہلی ملاقات میں بہت اچھے لگے
تھے۔ اسی کے نتیجے میں آپ آج مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔“
”بہت شکریہ۔ یہ صرف آپ کا حسن نظر ہے ورنہ مجھے اپنے
بارے میں کوئی خوش قسمی نہیں۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔

”اور۔۔۔ خدا کے لئے یہ روایتی قسم کی غیر ضروری افسانہ کی
اظہار کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم سیدھی اور سچی باتیں کریں تو
دوستی میں زیادہ لطف رہے گا۔“ وہ نہایت اظہاری میں بولی۔
یہ بھی خوب تھا کہ وہ اپنی طرف سے ہی دوستی کا پردہ گرام طے کر کے
آئی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہیں؟“ میں نے پھندہ کی
سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلی بار کسی حسین عورت نے
پہلی ملاقات پر اس صاف گوئی سے ایک عمو کی تعریف کی ہے
پھندہ کی کا اظہار کیا ہے۔ عام طور پر صرف عورت ہی یہ اپنا حق
سمجھتی ہے کہ اس کی تعریف کی جائے اس سے خلق جنایا جائے“

”آپ مردوں نے ہی اسے ایسا بنایا ہے۔ اس کی زبان بند
کردی ہے۔ وہ بے چارہ صرف جھوٹی سچی تعریفیں سن سن کر ہی
خوش ہوتی رہتی ہے۔ خوشی سے پھولی نہیں مانی۔ اس بچہ میں وہ
اپنے جذبات کو بھول ہی جاتی ہے۔ انہیں لفظوں کی شکل دینا
اب اس کی مرشد میں ہی شامل نہیں رہا۔ لیکن میں مو کے ہاتھ
ہوئے اس نزل میں متبیہ نہیں رہی۔ میں اپنے جذبات کے اظہار
میں اپنے آپ کو لاشعور کی محفل میں جھلا نہیں رکھتی۔ مجھے اگر ایک
مرد اچھا لگتا ہے تو میں بھی اس سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے اچھا
لگ رہا ہے۔ اور کہیں اچھا لگ رہا ہے میں بھی اس سے افسانہ
خلق میں پہل کر سکتی ہوں۔“

”بے شک۔ بے شک۔“ میں نے سعادت مندی سے اثبات
میں سر ہلایا۔

”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح نسوانیت کا شاعرانہ
تصور بخروج ہوتا ہے۔“ وہ خود ہی بولی۔ ”وہ جو ایک شہنائی ’لمائی‘
سکڑی سنی بیٹھی ہوئی لڑکی کا تصور ہے۔ جو بات بات پر لال گال
ہو جاتی ہے۔ اس تصور کو دھکا لگتا ہے۔ کہتے ہیں مو کے حوصلے بلند
رکھنے کے لئے یہ تصور ضروری ہے۔“ ورنہ کہیں وہ نہ سکڑا سٹھا
شروع کر دے۔ لیکن میرے خیال میں یہ سب بیکار باتیں ہیں۔
زمانے اور وقت نے جہاں دوسرے تصورات کی جزا مار دی ہے۔
وہاں اس تصور کو بھی سنبھال کر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ؟ میں تو کہتی
ہوں عورت کا افسانہ خلق اس کی جرات مندی مرد کو زیادہ جارح
بنا سکتی ہے۔ سمجھو دے سکتی ہے۔ اس کے بہت سے نامعلوم جذبے
بھی بیدار ہو سکتے ہیں۔ کیا کہو ڈراما کرک صاف دیکھ کر زیادہ تیز نہیں
وہ نہ؟ کھنکھن کا سطر منتوں میں طے ہوا ہے۔ ہم لوگوں کے پاس
ضائع کرنے کے لئے اتنا بہت سا وقت کہاں ہے۔“

میں نے کھنکار کر کھکا صاف کیا۔ ”جی ہاں۔ شاید آپ درست ہی

”زادہ تکلیف دہ اور زیادہ ذلت آمیز طریقے سے مرہی گئے۔“
”یہ آپ اس کی تعریف کر رہی ہیں یا برائی؟“ میں نے تو
حیرت سے پوچھا۔

”تعریف نہ برائی۔ میں تو اس کی شخصیت کا صحیح تجزیہ
کر رہی ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”اس کے باوجود وہ آپ کا گرام دوست تھا؟“ میں نے پوچھا
سے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے بلا تامل جواب دیا۔

”آدی اپنے دوستوں سے بچا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔
”مجھے اس معاملے سے اتفاق نہیں۔“ وہ بولی۔ ”انسان

حال میں دی رہتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔ آج کے مشکل زمانے
کا مالی سے زندگی گزارنا ایک بھروسہ ہو گیا ہے۔ ایک بھروسہ کہ
طرح کے اوزار اپنے ساتھ رکھنا پڑتے ہیں۔ انسان کے وہ
دراصل اس کے اوزار ہوتے ہیں۔“

”بہت خوب!“ میں نے صرف اتنی ہی کہا۔ میں اس انو
قلے سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن میں نے اپنے آ
پنے سے بازار رکھا۔

”ضمیر نواز زندگی کے کئی مرحلوں میں فیضی ضرورت تھا۔
فصرے فصرے لمحے میں بولی۔“ اور پھر وہ چند کم بھی تھا۔ چند
میری کڑوری ہیں لیکن ہر چند کم مرو نہیں۔ مائتہ اٹھ۔“

”اوسے۔“ میں ہونٹ سیکنے کر رہ گیا۔ وہ خفیف سی سکرابت
ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بات کرتے وقت وہ ہلکی
جھپکاتی تھی۔

”چند درمی صاحب! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ضمیر نواز
آدی بھلا کیونکر خود کشی کر سکتا تھا؟“ وہ یک دم ذرا آگے کو
ہوئے بولی۔

”اگر میں اسے ذرا بھی قریب سے جانتا تو شاید اس لمحے
کوئی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔“ میں نے قدرے ڈرا
سے کہا۔ ”میں آپ کے اس باصلاحیت دوست کی شناسائی

بالکل ہی محروم تھا۔ میں بھلا کیا اندازے لگا سکتا ہوں۔ مجھے تو
کی موت کی خبر بھی اخبارات کے ذریعے ہی ملی تھی۔“

”میں نے اس کے کردار کا جو خاکہ کھینچا ہے اس کی مد
د میں آپ کچھ تو رائے دینی کر سکتے ہیں کہ کیا ایسا آدمی خود کشی کر
تھا؟“ اس کے لمحے میں ہلکا سا اصرار تھا۔

”یہ کیسے تجھے کیوں کہہ رہی ہے؟ کیا اسے کسی قسم کا
ہے؟“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ منطقی طور پر ایسا ممکن تو
تھا۔

”میں نے بھاری سے کہا۔“ خانم! اس فصرے میں طبی اور فیر
طا کر چھوٹیں تھیں اموات روزانہ ہوتی ہیں۔ بعض کے بارے
م جان پاتے ہیں اور بعض کے بارے میں نہیں۔ بعض کے بارے

کہہ رہی ہیں۔ دراصل میرے تجربات کچھ اتنے زیادہ نہیں ہیں۔“
مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ اتنی سلی عورت نہیں تھی جتنی میں
اسے سمجھا تھا۔ میں اس سے بحث میں الجھتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلے
ی مجھے کافی الجھائے دے رہی تھی۔ ابھی تک اس کی شخصیت کا
دراصل میرے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ابھی تک اس کی آمد کا مقصد حیرت
واضح نہیں ہوا تھا۔

”آپ اب چنے کی کوشش مت کیجئے۔“ وہ دوسرا جھک خالی
کر کے رکھتے ہوئے بولی۔ اس کے پہلے پہلے اور تھکے سنک سے ہونٹوں
پر خفیف سی سکرابت نمودار ہوئی۔ ”آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ
آپ کی عمر زیادہ نہیں مگر یہ مت کہئے کہ آپ کے تجربات زیادہ
نہیں۔“

”میں نے بظاہر سسے سے سے انداز میں چرے پر ہاتھ پھرنے
ہوئے کہا۔ کیا تجربات میرے چرے پر لکھے نظر آنے لگے ہیں؟“

وہ میرے انداز پر بے ساختہ دھیرے سے ہنس دی۔ ”نہیں۔
اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تجربات چرے پر دکھائی تو نہیں دے
رہے۔ اگر دکھائی دیں تب بھی انہیں پڑنے کے لئے خاص ہی
نظروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کے چرے پر تو بڑی مصعوبیت
ہے ابھی آپ برسوں تک ان گنت تجربات اس مصعوبیت کی
میں چھپا سکتے ہیں۔“

”تو پھر آپ نے کیونکر کہہ دیا کہ میرے تجربات زیادہ ہیں؟“

”یہ بھی میرا قیادہ ہے۔“

”آپ کے قیادے بھی آپ کی طرح حسین ہونے چاہئیں۔“

وہ میٹھا ہے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو کھنگو
کا شیڈ کس نے سکھایا؟“

”وقت نے۔“ میں نے بلا تامل جواب دیا۔ ”میں نے بطور
خاص کسی سے بھی کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وقت جیسے خود بخود
ی سب کچھ سکھاتا چلا گیا۔“

”لگا سا پنکارا بھر کر وہ بولی۔“ بہت مہیاں ہے وقت آپ پر۔“
ایک لمحے خاموشی رہی پھر وہ جیسے کسی خیال سے چمکتے ہوئے بولی۔
”بات ہو رہی تھی ضمیر نواز کی۔ مجھے اس کی موت کا خلاصہ انٹوس
ہوا تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ وہ خود کشی کرنے والا آدمی نہیں
تھا۔ اس کے پاس سے لٹے والے خط میں جو باتیں لکھی ہوئی تھیں
وہ اسے خود کشی پر مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔ بدنامی، بے عزتی،
روسائی، کسی جرم کی سزا کا خوف۔ یہ تو اس کے لئے نہایت معمولی
باتیں تھیں۔ وہ زندگی سے چٹا رہنے والا آدمی تھا۔ ان لوگوں میں
سے تھا جو اپنی زندگی کے لئے ہزاروں زندگیوں کی قربان کر سکتے
ہیں۔ اپنے فائدے کے لئے ساری دنیا کو نقصان میں دیکھنا گوارا
کر سکتے ہیں۔ ایسے آدمی خود کشی نہیں کیا کرتے۔ وہ صرف ایک
صورت میں خود کشی کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت جب انہیں پکا نہیں
ہو جائے کہ اگر انہوں نے خود کشی نہ کی تو وہ کسی اور کے ہاتھوں

ایسی میں خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ اس کی کوئی بات کر سکوں۔ اس لئے میں دعا و نصیحت نہیں کرتا۔ اگر کسی میرے اعمال اس قابل ہو گئے تو میرا شاید یہ جرات کہوں مگر فی الحال تو میں واقعی لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں، محفوظ ہوتا ہوں۔“

”اچھا چلے ان باتوں کو چھوڑے۔ میرا خیال ہے اس مختصری ملاقات میں ہم ایک دوسرے کو بہت بھرپور جانتے گئے ہیں۔“ وہ یکدم جیسے سارے مسائل کو بلائے طاق دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب ذرا کچھ تفریح کی باتیں کرتے ہیں۔ اترکان میں آج رات ایک زبردست ڈانسر کا شر ہے۔ شے میں تین دن شہر آنا ہے۔ مرد ٹوٹے پارے ہیں۔ گھٹ بلیک میں جکتے ہیں۔“

”ایسی کیا خاص بات ہے اس میں؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

وہ ایک آنکھ کو خفیف سا دبا جے ہوئے بجلی سی منکرا ہٹ کے ساتھ بولی "تم مرد ہو۔ یہ تو تمہیں بہتر طور پر معلوم ہونا چاہیے۔ ستا ہے یورپ اور یہی موت وغیرہ کے بڑے کامیاب دورے کر کے آئی ہے۔"

”اس قسم کے ڈانس شو میں بھی کھسار اٹھاتا ہی جانا ہوا ہے۔ بلور خاص ارادہ کر کے میں بھی نہیں کیا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اس میں تو چلنا پڑے گا۔ میرے پاس دو دھڑکی آئی لی نکلت ہیں۔ مجھے امید ہے آپ پور نہیں ہوں گے۔“ اس کے لہجے میں اسرار تھا۔ میں حیران ہوں بغیر نہ رہا۔ مرد عورتوں کو اس قسم کی دعوتیں دیتے رہتے ہیں لیکن کسی عورت کے منہ سے سوکے لئے اس طرح کی دعوت نہ سنی۔ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ اس قسم کے ڈانس شو میں میں نے ان مردوں کے ساتھ ان کی بیویوں یا دوست عورتوں کو دیکھا تھا انہیں کافی بد مزہ ہی پایا تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھی مردوں کی تمام تر توجہ ڈانسر کی ہوشیار حرکات پر ہوتی تھی۔ بعض کے منہ سے تو صرف رال بننے کی کسر ہوتی تھی۔ ظاہر ہے ساتھی عورتوں کے لئے یہ کوئی قابل رشک صورت حال نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ظاہرہ خانم یقیناً ایک مختلف عورت تھی۔ یا پھر وہی میں مگر مجھ کو لانے کے لئے اس کا طریق کار مختلف تھا۔

مجھے ایک لمبے کے لئے خاموش رکھے کہ وہ بولے: ”ویسے ہی میں
دیکھ رہی ہوں کہ آپ شاید کہیں باہر ہی جانے کے لئے تیار ہو کر
آئے تھے۔“

”جی ہاں۔ اسی لئے تو میں ڈانس شر کے بارے میں محضرت
چاہوں گا۔ میری ایک اور ہوٹل میں باہر کی پائلی سے کاروباری
ملاقات ملے ہے۔“ میں نے حقیقتاً محضرت خزانہ کیسے میں کہا۔
وہ قدرے مایوسی سے بولی۔ ”جنہدری صاحب! میرے قیافے
عام طور پر غلط ثابت نہیں ہوتے۔ لیکن آپ کے بارے میں تو میرا
علم قیافہ کچھ کچھ غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اُن

نے کی ہمیں کوئی خزاہش بھی محسوس نہیں ہوتی۔ قصہ نواز بے نزدیک انہی لوگوں میں سے ایک قصاصہ میرے لئے بنی تھا۔ مجھے اس کی موت کا آسف ضرور ہوا تھا کیونکہ میں وری خنیش کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کے ذہن میں عرصہ میں کوئی سوال کوئی غلط فہمی ہے تو آپ پولیس کے قہور اسالہ میں جلائیں، شاید کوئی کام کی بات معلوم

س کے چہرے پر مسکراہٹ اب پوری طرح طلوع ہوئی اور وہ
پیلے بدلے سے لمبے میں بولے۔ "اور ہوس۔۔۔ آپ تو شاید
ہو گئے چودری صاحب! اب مجھ میں دراصل یہی خرابی ہے کہ
مجھے اچھا لگتا ہے اس سے پہلی ملاقات پر ہی میں فرض کر
لیں کہ اس سے میری برسوں کی دوستی ہے۔ اس سے اپنی
باد اور اپنی انجینئیں اس طرح زور و شور سے اڑسکی کہنے لگتی
ہیں وہ بھی ان پر میری طرح خرابی کا اور ہر قسم کی
نے کے لئے پہلے جان ہو جائے گا۔ میں بھول گئی تھی کہ نصیر
صرف میرا دوست تھا۔" آپ کا نہیں۔ آپ جو رہے ہوں، میں
س کے اچھے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔"

اب اس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع کا اثر بدل دیا تھا۔ اب ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ درحقیقت مجھے کرید رہی تھی۔ تاہم میں نے اپنا لمحہ دھوکارا دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ رازوں کے جن میں اچھا ہوگا۔ پہلی ملاقات پر ایسے ناکار اور بدلے والے موضوع زبردستی نہیں آتے چاہئیں۔“

”بالکل درست کہا آپ نے۔“ اس کے لمحے میں اب ایک شرم کی مٹاس ہی مٹاس تھی ”وہیے بھی مجھے اندازہ تھا کہ نہ ایک روز نصیر نواز کسی افسوسناک انجام سے ہی دو چار لے گا۔ اس میں ایک بڑی خرابی یہ بھی تھی کہ اپنی ہر طرح کی ہٹات کی تکمیل کے حلقے میں وہ نتائج کی بالکل پروا نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوتا تھا ہمیں کر کر رہا تھا۔ یہ نہیں سوچتا تھا کہ کوئی بھلا بلا غرض نہ والی چیز گلے بھی دے سکتی ہے۔“

میں نے شہسپن کی بوتلی اور سوڑے کے سافٹن وغیرہ کی طرف سے
 ادا کرتے ہوئے کہا "اور بچے نا۔ تب رک کیوں کریں؟"

”جس“ وہ اچھا اچھا ہوئے ہوں۔ ”طبیعت کی بے نیکی و
سے کے لئے اتنی ہی کافی تھی۔“ چہرہ کھنکھاتی تو آوازیں اور مضمین
انہی کے ساتھ ہوتی ”آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خود پتے نہیں
کھولتے تو فرمائش کرتے ہیں کہ اور نہیں۔“ شاید آپ وہ سہول
چکر کر محظوظ ہوئے ہوں۔“

”میرے ہاں ہر ذوق کے لوگ آتے ہیں۔ کاغذ کے لیے غیر ملکی پائیاں بھی آتی رہتی ہیں۔ ہونٹوں کے علاوہ کبھی ناکا میں بھی قیام و طمان با کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہوا کرتی ہے۔ ہمیں ان سب پر اپنے نظریات و افکار کو تسخیر کرنے کا ارادہ ہوتا ہے۔“

ہوں۔

میں نے جب مزید کہہ اتو وہ اسی بے نیازی سے اچھے مشورہ برائے کے ایک کھی صاحبان اور پینٹ کا نام بتاتے ہوئے ان تینوں چیزوں کے کارخانے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخوپورہ پچھلے سال گارمنٹس اور ہوزری کے دو بڑے پلانٹس ہیں۔ اسی سال ان کی پروڈکشن شروع ہوئی ہے۔ میٹر اور کی بھی ایک ایک فیکٹری تھی۔ وہ دونوں میں نے بچاؤ کیا۔ حالت اچھی نہیں تھی۔ یونینوں نے انہیں ڈوبنے کے قریب تھا۔

”بہت خوب!“ میں نے سر لایا۔

”یہ“ ”بہت خوب“ ”آپ کس بات پر کہہ رہے ہیں؟“

”کہ یونینوں نے فیکٹریوں کو ڈوبنے کے قریب پہنچا دیا تھا؟“

”شکراہٹ میں بگلی سی شرارت پر قرار دے رہی۔“

”نہیں۔ اس بات پر کہ آپ ڈوبتے کاروبار کو بچا لے، کاروبار شروع کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ فلم انڈسٹری میں بھی قدم رکھ رہی ہیں۔“

”وہ تو بس ایسے ہی۔“ وہ بے سنی سے انداز میں ”دراصل وہ میں تصویر نواز کی خوشنودی کے لئے آ تھی۔ کاروباری مقصد بھی اپنی جگہ تھا لیکن تصویر نازی کی خوشنودی۔“

”عزیز تھی۔ آخر وہ دوست تھا۔“

میں نے اب تک دولت مند مردوں کو اپنی ”خاص“ دوستوں کے لئے اس طرح کی سرمایہ کاریاں کرتے دیکھا تھا۔ عورت تھی جس کے منہ سے میں ایک مرد کی خوشنودی۔ سرمایہ کاری کی بات میں رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ سے کیا دراصل پچھلے کچھ برسوں میں میرے کچھ ملازموں اور اگر دیرہ کے کچھ دیکھوں نے اپنی دانست میں میری ہمدردی

لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کاروبار کو سرسوار کر لیتے ہیں۔ دن رات کاروبار کے سوا انہیں کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ زندگی کی آسائشوں اور طرب و نشاط سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور بالآخر وہ مردوں کے لئے بیگنوں میں اٹائش کی صورت میں ڈھیروں دولت چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔“

اس میں شک نہیں تھا کہ میرے بارے میں اس عورت کے تمام اندازے درست تھے لیکن میں جان بوجھ کر انہیں غلط ثابت کرنے پر رکھا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے یہ تمام اندازے مجھے محض ایک بارانی میں دیکھنے کے بعد قائم کئے تھے۔ اگر اس سے ملاقاتیں شروع ہو جاتیں تو اس کے اندازوں کا جانے کیا عالم ہوتا!

وہ مجھے خاموش دیکھ کر گویا قائل کرنے کے لئے بولی۔ ”انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کماؤ ہے۔ اگر وہ اس دولت سے کوئی لطف نہ اٹھائے تو کیا فائدہ؟“

میں نے اسے نہیں بتایا کہ یہ باتیں تو میں خود لوگوں سے کرتا رہتا تھا۔ اس کے بجائے میں نے کہا۔ ”لطف، آسائشوں اور لذتوں کے بھی اپنے اپنے معیار ہوتے ہیں۔“

وہ میرے الفاظ پر توجہ دے بغیر بولی۔ ”میں خود بھی ایک کاروباری عورت ہوں۔ اور عورت کو تو پیسے کا لالچ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن میں نے کاروبار کو کاروبار کی جگہ رکھا ہوا ہے۔ چار بیٹے کے بعد میں ایک لڑکے میں نہیں بیٹھتی اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کاروباری مصروفیت رکھتی ہوں۔ میں بھی اگر وہ مردوں کی طرح چاہوں گئے کاروبار کی فکر میں جیسی رہوں تو اسے مزید وسعت دے سکتی ہوں لیکن میرا دل نہیں اٹتا۔ اس پکر میں اگر پچیس ہزار تو پھر اس کی کوئی اتنا نہیں۔ جبکہ میں تو اپنے کاروبار کے سوجھ بوجھ یاد سے ہی تنگ ہوں۔ مجھ سے کسی نہیں بچھڑتا۔“

”کیا کاروبار ہے آپ کا؟“ یہ میری مالا تھی کہ بے شرکیہ پیشتر بے جھگم قسم کی کاروباری شخصیات اور ان کے کاروبار سے تو واقف ہوں لیکن اس شک اور بے کیف میدان میں ایسے حسین چہرے کی موجودگی سے بے خبر رہا۔“

وہ دلچسپ انداز میں مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ میں خفیف سی شرارت بھی نمایاں تھی۔ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو۔ ”... میں خوب سمجھ رہی ہوں جنہیں بڑی شے ہو تو تم بھی۔ ایک طرف بے نیازی بھی جتا رہے ہو۔ دوسری طرف شریف کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔“

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ قدرے بے نیازی سے بولی۔ ”چھوٹی موٹی کچھ اندازیں ہیں۔ دوسری یوں شے کا کچھ کام ہے۔ وہ سہیا ہیں۔ لیکن ہمارا شمار زیادہ بڑے لوگوں میں نہیں ہے۔ دوسرے میں جیہر آف کامرس کی سرگرمیوں میں بھی بالکل حصہ نہیں لگتے۔ شاید اسی لئے آپ ہمارے وجود سے بے خبر رہے

اسلام کے نامور مجاہدین	قمر تسکین
اسلام کی نامور خواتین	قمر تسکین
سومسلمان مشاہیر	قمر تسکین
ملک ملک کی عورتیں	قمر تسکین

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

سے خفیف سے خستہ کے آثار غائب ہو گئے اور وہ پولو بولنے لگے ہوئے
ہوئی "اگر کبھی کوئی بڑا پروگرام بنے تو مجھے یاد رکھئے گا۔ اپنی حیثیت
کے مطابق میں بھی آپ کے ساتھ بیٹے میں خوش محسوس کروں گی۔
لیکن آپ کی قسم پروڈکشن والی بات پر میری حیرت اب بھی برقرار
ہے۔ میرا خیال تھا کہ فلم انڈسٹری میں تو شاید نادری کوئی دہشت
منی لے کر جاتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ ہر کامیابی میدان کی طرح اس
میدان میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ میں فلم انڈسٹری کو
زیادہ قریب سے تو نہیں دیکھ پایا لیکن جتنا دیکھ پایا ہوں اس سے کافی
باتوں کا اندازہ ہو گیا ہے۔ ہر طرح کا آدمی آتا ہے۔ ہر طرح کا پیسہ
لے کر آتا ہے۔ کچھ لوگ صاف ستمیاریہ لے کر آتے ہیں اور
صرف کمانے کی کوشش لے کر آتے ہیں۔ دوسرے تمام کامیابیوں
کی طرح اسے بھی ایک کامیاب سمجھتے ہیں۔ کچھ بلیک منی بھی لے کر
آتے ہیں۔ کچھ شوق کے تحت آتے ہیں۔ کچھ شرمیلے بوری کسے
آتے ہیں۔ اس نژاد کے رنگ و عنک تھوڑے سے مختلف ضرور
ہیں لیکن بنیادی باتیں تو وہی ہیں جو کسی بھی کامیابی میدان میں
ہوتی ہیں۔"

پچھلے ایسا کہتے "وہ بڑا خیال انداز میں بولی۔" کہ نصیر فرازی
غیر متوقع موت سے میرے جو بڑے کام اور حوسرے نہ گئے ہیں انہیں
جاری رکھنے میں آپ ہی میری کچھ مدد کیجئے۔ اتفاق کے زریعے سے
میرا بھی کچھ مدد ہے۔ فلم انڈسٹری میں لگوا دیجئے۔ میں تو بہت سے لوگ
بہت سے منصوبے لے کر میرے پیچھے لگے رہتے ہیں لیکن میں
جانتی ہوں جو بھی کام ہو کسی صحیح آدمی کے ہاتھوں سے ہو۔ پیسے کی
مجھے کچھ زیادہ پروا نہیں۔ لیکن میں بالکل ہی رت کے گمرو نہ
بھی بنانا نہیں چاہتی۔"

وہ کچھ کچھ مجھ سے ملنے ملنے نظریات کا اظہار کر رہی
تھی۔ اتفاق کے ساتھ کام کا آغاز کرتے وقت میں نے بھی کچھ اسی
قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ظاہر خانم کی سرمایہ کاری کی پیش
کش میں میں دل ہی دل میں وقت اور حالات کی بوجھ میں کچھ
جبران بھی ہوا اور کچھ محفوظ بھی۔ میں بزنس کی دنیا میں آگے آیا
تھا تو ہر طرف سے سرمایہ چلا آ رہا تھا۔ جب مجھے ضرورت نہیں تھی
تو بیک "شرقا" سکر بلیک مارکیٹ پر فرسٹ سٹی مجھے مدد دینے کو
تیار تھے تو ہی جب غریب ہونا ہے تو کوئی اسے دس روپے بھی
اُدھار نہیں دیتا۔ اپنے پلے پلے بیرونی مدد سے تو بیک تک بھی مزید
مدد دینے کو تیار رہتے ہیں۔ اور وہ بھی دسروں کا مدد ہے۔ پھر اگر
اثر رسوخ ہو تو صاف بھی کر دیتے ہیں۔ بھول بھی جاتے ہیں۔ دنیا
واقعی بڑی عجیب جگہ ہے!

میں نے ملاکت سے کہا "اپنی فلم سمجھتی ہیں نصیر؟ پارٹنر کو
شامل کرنے کے بارے میں تو فی الحال میں سبوتاژ چاہوں گا۔ البتہ
میں اتفاق سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔ شاید وہ آپ کو کئی سمجھتی

لی کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے کہ میرے پاس کافی بلیک
لی۔ دوسرے تو بلیک منی خیر زیادہ تر بڑے کامیابی لوگوں کے
دلی ہی ہے۔ لیکن میری کچھ ایسی ہے کہ سبباً مشکل ہو رہا
ہوں اور وہ کیوں نے کام کیا نہیں کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں
ما کر کیا کروں۔ میں بلیک منی مل ہوتا نہیں جانتی تھی۔ اسی
نصیر فراز سے دوستی بہت گہری ہو گئی اور اس نے ہمیں
ما کر کے بلیک منی کو دہشت کرنے کا بہت اچھا فارمولا پیش
کیا۔ میں نے ہائی بھری۔ لیکن اب اس کی موت کی وجہ سے
کچھ میں نہ گیا۔"

"اوہ۔ یہ تو بہت برا ہوا!" میں نے رسی سے لیے میں کہا۔
"وہ بظاہر سرسری سے لیے میں بولی۔" آپ نے بھی تو اتفاق کو
شن شروع کر کے دی ہے۔ ابتدا میں آپ کا کشی بلیک منی
لے کا ارادہ ہے؟"

"پورا سی بھی نہیں۔" میں نے تجویز کی سے کہا۔ "میں نے
منی کا ایک دوسرے بھی فلم انڈسٹری میں نہیں لگایا۔ اور نہ ہی
نکارا وہ ہے۔ میرے پاس بلیک منی ہے ہی نہیں۔"

وہ نہ بہت باتوں کہ کر ٹھکرانوں کے سے انداز میں بیٹنے لگی۔
میں نے کوئی ناقابل یقین بات کہہ دی ہو۔ میری تجویز کی میں
الفاظ نہ آیا۔ اس کی بھی تو وہ بولی۔ "یہ تو یقین کرنے والی
ہی نہیں۔ ہمارے ٹیکسوں کے نظام میں اگر کوئی کامیابی
ما سو فیصد صحیح ملے تو وہ آپ کی طرح بزنس ایسا بنانا تو دور کی
نکارا رہا بھی نہیں کر سکتا۔ میں ممکن ہے وہ دیوالیہ ہی
ہو۔"

"نہیں۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔" میں نے محنت سے کہا۔
میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے شروع سے ہی کچھ ماہرین معاشیات
ہم کے لوگوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ ہم نے بہت سے راستے نکال
کے جن پر چل کر دانتہ ادی سے بھی بہت حیرت انگیز تھی کی جاسکتی
ہے۔"

"ایسے غائب لوگوں سے تو ہمیں بھی ملوایے گا۔ ہماری بھی
کچھ مشکلیں آسناں ہو جائیں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ بعد
میں سا شہر ایسے تھا۔

میں نے بڑا متاعے بغیر کہا "ضرور۔ ضرور۔ ویسے اب تو میں
کی ان سب لوگوں سے اتنا کچھ سیکھ چکا ہوں اور اتنے تجربات سے
گزر چکا ہوں کہ اگر میرے پاس معاشیات کی کوئی بڑی ڈگری ہوتی
اور میں کامیاب میں اتنا نہ سمجھ چکا ہوتا تو شاید بہت بڑا شکر
ہوتا۔ لوگوں کے سرمائے کو اس ہی طرح الٹ پلٹ کر تاکہ دیا ہر
نہ نہ جانے کتنی ایسا بڑا کمزری لگتا۔ میرے موجودہ کامیاب تو اس
کے سامنے اونٹ کے منہ میں زیرے کے معدان دکھائی دیتے۔"
یہ حقیقت تھی۔ میں اب کچھ ایسا ہی محسوس کرنا تھا۔
میرے لیے کی تجویز کی سے متاثر ہوئے بغیر نہ سکی۔ اس کے چرے

ہوں تاکہ تم بڑی ذہنی شرکت کر سکو۔"

وہ ایک سردودھ عورت تھی جس کے سراپا میں زلف و راز سے کرائے نازک تک کچھ عجیب سے عید چھپے ہوئے تھے۔ وہ نہ تھی تو خوبصورت لکھی تھی لکھڑی ہوتی تھی تو خوبصورت نہ۔ میں نے شاید یہی کسی اس کے چکر سے توجہ ہٹانے کے لئے چاہا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنی دولت خود کمالی ہے یا کوئی فائدہ دینے والا سلسلہ ہے؟

کچھ تو فائدہ دینی طور پر بھی میں ٹھیک ٹھاک سی تھی۔ اس کے بعد شوہروں نے مجھے نہایت حسین قسم کی بیوی سے دوچار کیا۔ یعنی مرگے لیکن میرے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے ت نہیں کی تھی لیکن باقی ہر طرح سے میرا بہت خیال رکھا تھا۔ ان کے ساتھ مجھے دنیا گھومنے اور بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ اس لئے ان کے بعد میں نے اس دولت اور بڑی میں اضافہ کیا۔ بالخصوص عورت اور وہ بھی خواہ عورت ہونے کے باوجود اسے برباد ہی کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ میں نے خود کو بھی برباد نہیں کیا۔ بڑوں کے زمانے میں میں نے بڑی ٹھنکی کی زندگی گزارا۔ کچے روکھے دوں ہی مجھے ایک جیسے ملے۔ لیکن اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کو انجوائے کروں گی۔ سو وہ میں کر رہی ہوں۔ میں مر رہی ہوں۔ لیکن میرا دل شاید تم سے زیادہ رازان ہے۔"

میں گاڑی پر جھکا تو کھڑکی کے فریم کے قریب مجھے ایک خاصا مگر اچھٹ نظر آیا۔ وہاں سے پینٹ بھی اگڑ گیا تھا۔ خوبصورت اور چم چم کرتی گاڑی پر یہ کڑوا اور داغ کوڑھ کے نشان کی طرح چمک رہا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی مگر حسن پرستی میری فطرت کا ایک حصہ تھی۔ میں طاہرہ خانم کی توجہ اس طرف دلائے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ کہاں مار دی تھی گاڑی؟ ٹھیک نہیں کرایا اس ڈینٹ کو؟" میں نے دوواڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خوبصورت چیزوں میں عجیب میری آنکھ میں کلکتا تھا۔ خصوصاً ایسا عجیب سے دور کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا۔

اس نے دوواڑے سے سر نکال کر جھک کر اس ڈینٹ کو دیکھا اور پوچھا "ارے ہاں۔ گاڑی کو ڈینٹر پینٹر کے ہاں بھجوانا یاد ہی نہیں رہتا۔ دراصل یہ میری پسندیدہ قرین گاڑی ہے۔ ہر وقت میرے استعمال میں رہتی ہے۔ ایسا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسے ایک دو دن کے لئے چھوڑ دوں۔ اور تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے گاڑی کیس ماری نہیں تھی۔ میں بڑی زبردست ڈرائیور ہوں اور میری خوش قسمتی ہے کہ وہ سروں کی غلطیوں سے بھی زیادہ تر محفوظ رہتی ہوں۔ یہ ڈینٹ تو بس عجیب سی انداز میں پڑ گیا۔ بس یوں سمجھو کہ کسی جہانے جو کار کا نقشہ تم ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کسی خاص دلچسپی کے بغیر وہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"کسی نہ کسی پارٹی، کسی نہ کسی تقریب کی وجہ سے میں اکثر رات کو دیر سے گھر پہنچتی ہوں" وہ بتاتے لگی۔ "یہ تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ اس رات بھی میں بہت دیر سے گھر پہنچی تھی۔ میں گیٹ کے سامنے چند سیکنڈ کے لئے رکی تھی۔ ابھی چوکیدار نے گیٹ نہیں کھولا تھا۔ اچانک ایک سیاہ کیکڈ گاڑی اتنی تیزی سے میرے قریب سے گزری کہ میں سمجھی "شاید اس کا ڈرائیور مگر اس پر ہی" تب میں حصہ لینے کی مطلق کر رہا ہے۔ معاملہ یہیں تک ہوتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس شخص نے اتنی طرحان کی طرح جاتے جاتے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر وحالت کو کوئی سیاہ باکس

"بے شک۔ بے شک۔" میں نے یہ بات تسلیم کرنے میں ہی اذیت سمجھی۔ سو دوواڑے کی طرف چل دی تھی۔ میں اس کی لڑائی کے لئے اسے رخصت کرنے کے باہر اس کی گاڑی تک لایا۔ میرے طویل و عریض لان پر پہنچی ہوئی دنیا بھر کے رنگارنگ پھولوں کی کیاریوں کی وجہ سے فصاح میں سمجھنی خوشبو کی تہیزش تھی۔

وہ چاروں طرف دیکھ کر "آہاں کی طرف منہ کر کے ایک بہت طویل سانس لے کر بولی۔ "کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے" ساری خوشبو نہیں، ساری وہ خوشیاں، ساری لذتیں اور ساری خوشیاں اپنے رنگ و بو سے انار بولیں۔ میں واقعی ایک بے مبری اور بے قناعت عورت ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ میں اس کے الفاظ اور اس کی شخصیت میں الجھا ہوا تھا۔ سو کچھ بھی تھی لیکن ایک عجیب اور مختلف عورت ضرور تھی۔ جبر جبری ہی لے کر وہ اپنے محسوسات کی دنیا سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "اب کسی دن تم میرے گھر آؤ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ شاعرانہ زبان میں تمہارے لئے ہام و در جاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہی نہیں ہے کہ ہام و در کیسے جانے جاتے ہیں۔ ہاں البتہ میں یہ ضرور کروں گی کہ میرا لگت تمہارے لئے دنیا کے بہترین مکانے بنائے گا۔ میں تمہارے لئے دنیا کی بہترین موسیقی کی کیشش جمع کروں گی۔ دنیا کی بہترین ڈرنکس اور وائن کا انتظام کروں گی۔"

سامری طرف اچھال دیا۔

”وہ؟“

”وہ انبات میں سر ملاتے ہوئے قدرے حیرت سے بول رہا تھا۔ لیکن تجھیں کیسے معلوم ہوا؟“

”وہ میرا ہی باکس ہے۔“ میں نے ذہن میں کوئی خاص بندھن کے بغیر کہا۔ ”اس میں میری کچھ نہایت قیمتی چیزیں ہیں۔ اس میں دستاویزات ہیں۔ بہت خطرناک قسم کے کچھ ہتھیار لوگوں نے اسے چڑھایا ہے۔ میں تو اس کی طرف سے ہراس ہو چکا تھا۔ لیکن پچھلے بھائی کے ایک دم ہی تسادی طرف سے یہ خبری سننے کو مل گئی۔ تم نے اسے حنبال کر تو رکھا ہے؟“

”ہاں، میں نے اسے دھڑلے سے دھکیں دیا، پھر اس کی کمرنگ سے اسے اپنے لیے لے کر آئی کہ کھل کر دیکھ لوں۔“

”وہ ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر ہراس میں آ گیا۔ میں نے کہا کہ وہ میں نے اٹھالیا تھا؟ میں تو بتانے لگی کہ وہ وہیں پڑا تھا جس پتے پر پہلے میری گاڑی کھڑی تھی۔ وہ میں ہی کچھ عجیب سا لگا رہا تھا جیسے کسی بڑی مشین کا کوئی حصہ تھے اس سے خوف محسوس ہوا کہ کبھی کوئی خطرناک چیز نہ ہو جائے کیوں مجھے وہ دم سا ہوا تھا کہ اگر اس کے ساتھ غلط طریقے سے زیادہ جبر چھڑاؤ گی تو کبھی وہاں سے پھرتے جائے۔“

مجھے دل ہی دل میں اس عورت کو داد دینا پڑی۔ اسے اس کی سچ رہنمائی کرنی تھی۔ میں نے بے غالی پوچھا۔ ”اگر تم نے اسے اٹھالیا نہیں۔ تو پھر کیا کیا؟“

”میں نے ذرتے ذرتے اسے پاؤں سے تھوڑا سا کھسکا کر اسے غاصا دینی تھا۔“ طاہرہ بولی ”پھر میں نے چوکیدار کو حکم دیا کہ اسے اس طرح احتیاط کے ساتھ پاؤں سے آہستہ آہستہ کھسکاتے ہو کچھ دور ایک پتنگے کی دیوار کے ساتھ رکھ دے۔ وہ بھلا کالی کو سے خالی پڑا ہے۔“ وہ سانس لینے کو روکی۔

”پھر؟“ میں اپنی چٹائی کو چھاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں۔۔۔ چوکیدار کے ذریعے اسے اپنے کمرے سے زرا دور لے گیا۔ میں اندر آ کر سو گئی۔ چوکیدار کو بھی میں نے سختی سے منع کر دیا تھا اسے اپنی جگہ سے اٹھانے یا چھوٹنے کی کوشش نہ کرے۔ پھر اس چیز کو بھول گئی۔ صبح میں ذرا دور سے آہٹ جانے کے لئے آ گیا تب وہ مجھے دوبارہ یاد آیا اور میں نے جانے جاتے اسے خالی پتنگے دیوار کی طرف کھسکا۔ باکس وہاں نہیں تھا۔“

”وہاں نہیں تھا؟“ میں نے مراد سے لیے میں پوچھا۔ ”نہ لے گیا تھا اسے؟“

”مجھے کیا معلوم۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”شاید چوکیدار کو معلوم ہو۔“ میں نے ایک سوہوم سی اس کے سامنے کہا۔

”شاید معلوم ہو۔ میں نے تو اس سے پوچھا نہیں تھا۔“

میں یکدم چڑھ گیا۔ میرے ذہیلے پڑے ہوئے اعصاب گویا ایک جگہ سے بیچارہ ہو گئے۔ طاہرہ خام میرے اس نتیجے سے بے خبر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ شاہ سے اگر میری گاڑی کی اس کھڑکی سے نکلا۔ اچھا غاصا دینی معلوم ہوتا تھا۔ جس نے کھنکھسی گاڑی میں اچھا غاصا دینے والی دیا۔ شکر ہے اس وقت کھڑکی کا شیشہ چڑھا ہوا نہیں تھا ورنہ شاید یہی ٹوٹ جاتا۔ اس گاڑی کی کھڑکی پر کہ غاصا دینی ہے اس لئے اس شخص نے شاید وہ باکس کھڑکی کے راستے اندر ہی بیٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن طرفائی رفتار کی وجہ سے اندر اڑھٹا ہو گیا اور باکس نیچے کیس جا گیا۔“

میری ماضی تقریباً رک گئی تھی اور میں بمشکل اپنے آپ کو کسی سوال سے باز رکھتے ہوئے تھا۔ میں طاہرہ خام کی بات بھی سن رہا تھا اور ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے حالات کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ طاہرہ خام کی میرے پاس آمد قطعی غیر متوقع تھی اور وہ اپنے دامن میں میرے لئے غیر متوقع سی ہی نوادشات بھی سمیٹ کر لائی تھی۔ اور اب اس نے مجھے ایسا سیاہ باکس کی کمانی بھی مٹانی شروع کر دی تھی۔ کیس یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تو نہیں تھا؟ کیس اس کے سرے کیس اور جا کر تو نہیں لے گئے تھے؟ کیس طاہرہ خام کی اصل شخصیت کچھ اور تو نہیں تھی؟ لیکن اس سب سے معاملہ بیان کرنے سے اس کا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا؟ میں ان سب پلوں پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دوسری طرف یہ سب محض اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ قسمت کبھی کبھی عجیب سی انداز میں کچھ پر مہمان ہوتی تھی اور بالکل غیر متوقع طور پر کسی چیز کا سراغ آتا تھا۔

طاہرہ خام کہہ رہی تھی۔ ”میں نے کینڈلک والے کو بے آواز بلند وہ تین گالیاں دیں اور گاڑی سے اتر کر دیکھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اس نے کیا پینچا تھا؟“ اچانک سڑک کے موڑ سے ایک دوسری گاڑی نمودار ہوئی۔ وہ سفید رنگ کی کوئی نامعلوم سی گاڑی تھی۔ سیاہ کینڈلک اس وقت تک کالی آگے نکل چکی تھی لیکن سفید گاڑی کی رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی اور وہ یقیناً کینڈلک ہی کے مقابل میں تھی۔ میں نے گاڑی سے اترنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سفید گاڑی بھی میرے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ اس وقت تک چوکیدار نے کینٹ کھل دیا تھا۔ میں اسے والی عورت نہیں ہوں لیکن اس وقت ذرا خوفزدہ ہی ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں کیا پھر تھا۔ میں فوراً گاڑی اندر لے گئی۔ گاڑی ذرا آگے دے میں کھڑکی کھولنے کے بعد میں چوکیدار کے ساتھ دوبارہ باہر آئی اور درحقیقت تب ہی میں نے دیکھا کہ میری طرف اچھالی جانے والی وہ چیز سیاہ رنگ کا ایک عجیب سا باکس تھا۔

وہ غالباً باکس کی ساقبت بیان کرنے لگی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے اس کی نشانی بیان کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ایسا ہی تھا“

کوئی سرپرست تلاش کرنے پر مٹا ہوا تھا۔

”میں تو تفریق کی تلاش میں تمہارے پاس آنی چھو لیکن مجھے لگ رہا ہے جیسے کوئی جاسوسی کمپنی شروع ہو چکی ہے۔“

”جاسوسی کمپنی میں کیا کم تفریق ہوتی ہے؟ ہمیں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ میں اب اپنے اندرونی بیگانہ پر قابو پا چکا تھا اور ہر سکون نظر آنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

”تمہارے ساتھ رہنے کا سوچ ملا تو شاید اس قسم کے چکروں سے بھی لذت اندوز ہونے کا ہنر سیکھ لوں۔“ وہ بولی۔

وہ حقیقتاً بڑی خوب صورت اور عمارت سے ڈرا نیچہ جگہ کر رہی تھی۔ جہاز کی قسم کی گاڑی اس کے سر میں اٹھوٹا ہوا کھلو کا مٹھلومٹھلا ہوا رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے فون پر مجھ سے باتیں کرنے والا ایڈم عرف ایڈی جب بھی رابطہ قائم کرنا تھا، یہی آواز دیتا تھا کہ وہ لوگ میری تمام نقل و حرکت سے واقف رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ان کا کوئی نہ کوئی آدمی ہر وقت میرا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جب بھی ایسے کسی شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تو مجھے کم از کم اپنے تعاقب میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ صرف ایک آدھ بار اسے سننے میں آتا تھا۔ لیکن وہ بات پرانی ہو چکی تھی۔ اب تو کافی دنوں سے وہ بالکل ہی غائب تھا۔ مجھے تو اس کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

اب بھی احتیاطاً میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ میرے اپنے آدمی تو میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میری نگرانی کا سلسلہ متعلق کر چکے تھے۔ لیکن مجھے شبہ ہوا کہ کوئی اور گاڑی میرا تعاقب کر رہی تھی۔ کمرے سے رہک کر وہ ٹوی گاڑی دور تھی بڑک پر اور بھی گاڑیاں دواں تھیں لیکن اس پر نہ جانے کیوں مجھے تعاقب کا شبہ ہوا۔ اس میں اسے تنہا ہرگز نہیں تھا۔ گاڑی میں صرف ڈرائیو کرنے والا ہی تھا اور وہ کوئی معزز قسم کا بزنس میں مٹھلومٹھلا تھا۔ غالباً سٹوٹ میں تھا، کوٹ گاڑی کی جھلک نظر آنی تھی۔ وہ وہنوں میں سرگٹ دباؤں بٹا رہا اپنے خیالوں میں گمن ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں مرکز گاڑی کے عقبی شیشے سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے انداز و اطوار میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ گرد و پیش سے اس کی لاشعلی معنوی سی لگ رہی تھی۔

میں نے طاہرہ خانم سے کہا۔ ”تم اپنی ڈرائیو تک کی بڑی تعریف کر رہی تھیں۔ تمہاری اہلیت کا امتحان لینے کی ضرورت پیش آئی ہے۔“

پھر میں نے عقب نما آئینے میں اسے وہ گاڑی دکھائی اور کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ یہ گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ بے توجہ اور ہمارے سڑکوں پر اسے لیے لیے دو چار بے متعدد قسم کے چکر دے کر تھک چکی ہو کہ یہ واقعی ہمارے ہی پیچھے ہے۔ اس کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا ہے۔ کر لو کی یہ کام؟“

پہلیاڑی، ”قرار دے دو“ گزرتی اور دن چڑھ گیا تو مجھے وہ غیر اہم سا لگنے لگا تھا۔ ویسے بھی میں اس قسم کی باتوں میں سر نہیں لگتا تھا۔ جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔“

”چلو! چکر دے اور اسے چل کر پوچھتے ہیں۔“ میں نے جلدی سے رد اس کے برابر بیٹھنے کے لئے گاڑی کے دوسرے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

وہ گاڑی سے اتر آئی اور حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے ”تم میرے ساتھ چلو گے؟ میرے گھر؟“

”اگہ۔ کیوں؟ اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟“ میں نے

”جیس تو بہت ضروری بزنس ڈرائیو میں جانا تھا۔ تم تو فانس شو بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔“ اس نے جگہ سے کھڑے

میں مجھے یاد دلایا۔

میں نے اس کے کھڑکا پر اٹھائے بغیر کہا۔ ”یہ کام بزنس ڈرائیو ضروری ہے۔“

”وہ آہ بھر کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں اس کے برابر جا

ا۔ وہ وہ اسکرین سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”واہ! اتنی ہی اس دنیا میں ہر کوئی غرض کا بندہ ہے۔ اپنا کام پڑتا ہے تو

پھر میں کیسے پروگرام بدل جاتے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ اسے یہ باتیں کرنے کا حق تھا۔ ویسے بھی

راڈن باکس میں الجھا ہوا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والے مجھے زندہ کی اور

ت کا مسئلہ ہمارے تھے وہ چہرے میں لاوارث بڑی نہ تھی

کے لئے اس کی اہمیت تھی ان میں سے کسی کی بھی نظر اس پر

لی پڑی تھی۔

”طاہرہ خانم! ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

”میں حق حاصل ہے کہ اس عاجز و مسکین پر کھڑے جتنے تیر جاو

ہو لیکن مجھے جلد از جلد وہاں لے چلو جہاں تم نے باکس چھوڑا

ا۔“

”عاجز و مسکین! وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر اپنے

نرمی ٹھٹھکتے انداز میں ہنسی ”مزاحیہ لگتے ہیں تمہاری شخصیت کے

باتر یہ الفاظ۔“

”میری شخصیت میں کون سا محرراب کا پر لگا ہوا ہے۔ میں تو

یک عام سا گناہ گار۔ انسان ہوں۔ ویسے بھی یہ عام بات ہے

کہ جب کوئی انجمن میں ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر دوسروں کو ہنسی آنی

ہے۔“ میں نے طاہرہ سے کہا۔

وہ تھوڑے عجیبی سی بولی۔ ”کیا واقعی وہ باکس تمہارے لئے

مت اہم ہے؟“

”اگہ۔ بہت زیادہ۔“ میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے ابھی

نہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے لئے کیوں اہم تھا۔ شاید اس لئے

کہ ریڈ ڈاٹ اس میں بہت دلچسپی لے رہی تھی اور میں ریڈ ڈاٹ کا

”کل ای کوئی نہیں بادشاہ۔“ وہ جنگی جہاز کو بولی۔ پاکب ی
اس میں نو عمر لڑکیوں والا وہ چلبلا پن نظر آنے لگا تھا جس کی مجھے کم
از کم اس کی طرف سے ہرگز توقع نہیں تھی۔

اس نے گاڑی کی رفتار یکدم بڑھائی اور اسے لہراتے ہوئے
دوسری گاڑیوں کے درمیان سے نکالتے ہوئے بولی۔ ”میں وقت
بے وقت ہر طرح کی سڑکوں پر تھا گاڑی دوڑاتے پھرتی ہوں۔ کبھی
کبھار نو دو لیتروں کے شدے سے لڑکے کا ریا اسپورٹس سوئر
سائیکل وغیرہ پر میرے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ انہیں پکڑ دینے اور
زوج کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے بھی بیشتر
ڈرائیونگ یا رائیڈنگ میں بڑے بد سہاش ہوتے ہیں لیکن میں
انہیں بھی جب چاہتی ہوں پچھ دے دیتی ہوں۔ ڈانچ دینے میں بڑی
ماہر ہوں۔ تم فکرت نہ کرو۔“

”حسن کے ایسے خوشخبر قدر دانوں کو حمیس ڈانچ نہیں دینا
چاہئے۔ ان کی قدر والی سے تو استفادہ کرنا چاہئے۔“ میں نے کہا۔
وہ مصنویٰ نکلی سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”میں
تفریح پسند اور پیش کوش ضرور ہوں لیکن کھلونا نہیں ہوں۔ میرا
معیار نظر اب اتنا گرا ہوا بھی نہیں ہے کہ ہر راہ چلتے سے ہر لوہر
لفٹے سے ہر انجانے سے ہر اچھیں کھلاتے ہوئے چند سے وقتیں
بڑھانے لگوں۔ میں ایک نیسٹ فل عورت ہوں۔ میرا کوئی ذوق
ہے۔“

”خیر نواز تو مجھے کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہوا تھا۔“ میں
نے کہا۔

”وہ کم از کم پنڈت سم تو تھا۔ اور سوسائٹی میں اس کا کوئی مقام
تھا۔ وہ کوئی راہ چلتا حکام اور باپ کی دولت پہ اڑنے والا لنگھا سا
نوجوان تو نہیں تھا۔ اس پکڑ میں البتہ میں نہیں پڑتی تھی کہ اسے
اعلیٰ انسانی اقدار کے پیمانے سے ماپوں۔“ وہ باتیں بھی کرتی جارہی
تھی اور اس گاڑی پر نظر بھی رکھے ہوئے تھی۔

بڑی ہوشیاری سے اس نے اوپر اور کمری سڑکوں پر چند میل کا
پکڑ کا اور یہ بات طے ہوئی کہ کمرے رنگ کی ٹوپیاں ہمارے
عقاب میں تھی۔ وہ شخص غالباً سمجھ گیا تھا کہ ہم عقاب کی تعقیب
کر رہے ہیں اور اب جبکہ یہ بات ظاہر ہوئی تھی تو اس نے
اصطلاح چھوڑ دی تھی اور فاصلہ بھی کم کر لیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا
تو میں اسے گھبرنے کی کوشش کرتا۔ آج کل مجھے ریڈ ڈاٹ کے
بارے میں کسی سرائی کی شدت سے تلاش تھی اور شاید وہ ایک
سرای ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میرا ذہن صرف سیاہ باکس
میں الجھا ہوا تھا۔ فی الحال اس کے سوا مجھے کوئی چیز اہم نہیں لگ
رہی تھی۔

”یہ نہ مڑنا کچھ ہے تو ہمارے ہی عقاب میں۔“ ظاہرہ خام بولی۔

”کون ہے یہ؟“
”کاش مجھے معلوم ہوتا۔“ میں نے فحشی سانس لے کر کہہ

”کیا کرنا ہے اس کا؟“ ظاہرہ نے بالکل اس انداز میں
جیسے کسی خاندان کے سامنے ہجو وغیرہ رکھے ہوں اور وہ ہم
ہو۔ ”کیا کرنا ہے ان کا؟“ پچس پائے ہیں یا بھرتا؟“
”فی الحال تو اس سے صرف پچھا بھڑاؤ۔ میں نہیں پا
اس بات سے آگاہ ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا
ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

چند لمحے بعد بالکل قلمی قسم کی کار چرنگ شروع ہو گئی۔
اس شخص کو ڈھکا چھپا نہیں بلکہ علی الاعلان قسم کا ڈانچ رہنے
ہوئی تھی۔ شر کے راستوں سے بھی وہ خوب واقف تھی ان
”علم“ سے حاکم و داعی کے ساتھ ساتھ فائدہ اٹھانے میں بھی ا۔
جواب نہیں تھا۔ عقاب کرنے والا شاید ایک عورت سے ام
کی ڈرائیونگ کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ شروع میں شاید وہ کچھ
گیا تھا لیکن اس نے ہر حال ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔

ظاہرہ بالآخر گاڑی فیروز پور روڈ کی طرف نکال لے گئی
وہاں اس نے دن دسے کا نہایت خوبصورتی سے فائدہ اٹھاتے۔
اس طرح ٹیویٹا والے کو ڈانچ دیا کہ وہ سر ہٹاتا گیا ہو گا۔
ٹیرمز می میز می گلیوں میں ڈرا سا پکڑانے کے بعد ظاہرہ چلتا
دائیں فیروز پور روڈ پر نکل آئی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ نہ
کرنے والا یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ ہم چند منٹ بعد وہیں
آجائیں گے جہاں سے ہم نے اسے چھوڑا تھا۔ مجھے امید تھی
اچھرو کی گلیوں میں ہماری تلاش میں جھک رہا ہو گا۔ جبکہ ظاہرہ
جہاں کے راستے آندھی طوفان کی طرح دائیں گھبرگ کی
دوانہ ہو گئی تھی۔

ضرر کر اس کرنے کے بعد جب اسے اطمینان ہو گیا کہ خا
کرنے والے کا کس دور دور تک پتا نہیں تو وہ حسین طلب کا
سے میری طرف دیکھتے ہوئی بولی۔ ”کیا ہے؟“

”ہمت اچھا ہے۔“ میں نے ہلے سے اس کا کدھ حاشیہ
”اطمینان رکھو اگر کبھی ڈانچ دینے کے سلسلے میں کوئی ایوانڈہ
ہو تو وہ یقیناً جھینسی ہی لے گا۔“

”تمہاری جھینسی میرے لئے ایوانڈہ ہے۔“ وہ مسرور رہے
بولی۔ ”فیروز پور روڈ تو ذرا خفیت قسم کی سڑک ہے اگر میں ا
کسی اور جگہ اور یا کادھ قسم کے ہائی دے کی طرف لے جاتی تو
نہ کہیں اسے کبھی لڑھکیاں بھی کھلا سکتی تھی۔ اس کے
شاید وہ گاڑی سے زندہ سلامت برآمد نہ ہوتا۔“

”خیر۔ اب اتنے تردد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔“ میں
کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ تم جو فلمیں فائنل کس کو کی ان میں
چترنگ کے ساتھ خود ہی پکڑا کر مارا کرنا۔ جھینسی تو کیرازنگ
بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

وہ دھڑکے سے ہنسی اور بولی۔ ”قلمی کار چرنگ تو بہت سی
گتی ہے مجھے۔ ہنسی آتی ہے دیکھ کر۔ ٹکڑے جوڑو ڈرنا غم

اپنے ساتھ ایک دیوار کے قریب لے جاتے ہوئے بولی۔ "میں نے یہاں تک کھسکایا تھا اس باکس کو۔ اور آخری بار میں نے لکھے اندھیرے میں اسے نہیں پڑے دیکھا تھا۔"

"تمہارے چوکیدار کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"عبدالرشید راجپوت۔ اسے پورے نام سے مخاطب کر دو بہت خوش ہوتا ہے۔" ملا ہوئے جواب دیا۔

میں نے وہاں آکر چوکیدار کو دوستانہ لہجے میں مخاطب کیا۔
"عبدالرشید راجپوت! تمہیں معلوم ہے وہ کالا باکس جو اس رات تم نے بھی رکھا تھا اور جسے یکم صاحب نے ہاؤس سے کھسکا کر ادھر دیوار کے ساتھ چھوڑا تھا کہاں گیا؟"

"ہاں جی۔ معلوم ہے۔ اسے نین ڈبے والا لے گیا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میری دھڑکن جو ایک لمحے کے لئے تیز ہوئی تھی دوبارہ سست پڑ گئی۔

"نین ڈبے والا..... وہ کون ہے؟" میں نے ایک لمحے کے لئے خود کو چند محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نین ڈبے والا تو بس نین ڈبے والا ہی ہوتا ہے صاحب جی!" عبدالرشید عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
اسے گویا معلومات عامہ میں میری کمزوری دیکھ کر غاصد صدمہ بچھا تھا۔ پھر وہ ذہن پر زور دے کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہی لوگ جی وہ جو ٹیلیوں پر کانٹھ کباڑاڑے آواز لگاتے پھرتے ہیں۔ دزدی اخبار غالی پر تھیں۔" نین ڈبے وغیرہ لے لیتے ہیں۔"

"اوہ! اچھا۔" میں کمری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید یہ اتفاق ہی تھا کہ میں نے اپنے علاقے میں آج تک کوئی نین ڈبے والا نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اس قسم کے علاقوں میں مجھے کوئی سے بھی ٹھیلے اور خزانچے والے شازدہ نوری دیکھائی دیئے تھے میں سمجھتا تھا شاید وہ اس لئے ان علاقوں میں نہیں آتے کہ ان کی صدا ایسا صدا ہے صغریٰ ثابت ہوتی ہوگی۔ اتنے بڑے بڑے گروہوں میں تقریباً ساؤنڈ پروف گروہوں میں ان کی آوازیں کہاں پہنچتی ہوں گی۔

عبدالرشید بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ادھر کو بھی بنگلوں میں جو نوکر چاکر ہیں وہ ان ٹھیلے والوں کو کانٹھ کباڑ بیچتے رہتے ہیں جی۔ انہیں چار پیسے مل جاتے ہیں۔"

اب میری سمجھ میں آیا کہ ٹھیلے والے تو آتے تھے لیکن ان سے خرید و فروخت اب نوکروں کے شیعہ میں جلی گئی تھی اس لئے مجھ جیسوں کو ان کے وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں تو ان لوگوں کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔

"تم تو اس ٹھیلے والے کو جانتے ہو گے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں بھلا کیسے جانتے گا صاحب جی! میں نے تو آج تک اس کے اچھ کوئی چہرہ نہیں دیکھا۔" یہ کام گویا اس کے مقام و منصب کے خلاف تھا اور یہ پوچھ کر میں نے گویا اسے ڈی کر بیڑ کر دیا تھا جس کا

وقف ہاتھ ہیں۔"

"میں نے کہا۔" میں نے حیرت سے چہچہا۔
"میں لوگوں کو بے وقف بنانا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک بار پھر دھڑے سے ابھی اتنے قریب سے اس کی یہ سانس اور جلتی سی جھنسی سن کر دل میں گدگد سی ہوتی۔ جلد ہی اس نے گاڑی پر مال سے ملحق علاقے کی ایک کٹھاہ لے کر چلے جا دی۔

جو جی یہ آگیا۔ گھر پیارا گھر۔ میرا گھر میری جنت وغیرہ۔ وہ انجن بند کر کے دونوں ہاتھوں سے اپنے کٹے بال سینچتے بولے۔ سامنے ایک خاصا اونچا آہنی گیٹ نظر آ رہا تھا۔ بظاہر گیٹ پر لوہے کی ٹیکوں سے بے معنی سے پٹریں بنے دکھائی دے رہے تھے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ مل مرغیام کی وہی خیالی اور غلطی تصویر تھی جو کہیں کہیں نے میں آئی ہے۔ وہی ایک شاعرہ ہوش و بیدار خیال۔ وہی جاہل وہی اس میں سے نمودار ہوتی ہوئی ایک سرمست و بڑبڑاہٹیں۔ وہی ایک ساز۔ وہی فضا میں بکھرتے ہوئے سروں

اطلاقیہ تصویر بہت پرانی تھی۔ عام ہو چکی تھی۔ کیٹھرو والوں نے اسے چھپ کر دیا تھا۔ مگر بھیجی نہ جانے کیوں ایک خاص موڈ یا کوئی کوتاہی کرتی تھی بہت سی دوسری پرانی چیزوں کی طرح۔

"ملا ہو غافل! تم واقعی ایک خاص سچ کی ہڈوں عورت" میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ "صرف تصویر نواز کی اپنی دوست ہونے کی وجہ سے مجھے تمہاری خوش ذوقی پر شک اسے لگتا ہے۔"

"تم تو کہتے ہو کہ تم تصویر نواز کو جانتے تھے؟ پھر اس کے بسے میں اتنے بدگمان کیوں ہو؟" اس نے ترمیمی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"میں بھی تمہاری طرح انسان کے بارے میں قیامت اور سوسائٹی کی بنیاد پر کوئی نہ کوئی رائے رکھنے کا عادی ہوں۔ اور تصویر ناز کے بارے میں وہ رائے کچھ اچھی نہیں۔ اور پھر اس نے اپنی نوکری کے سلسلے میں جو غلط چھوڑا تھا اس سے بھی تو اس کا کتنا لگاؤ تھا کہ وہ سامنے آتا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی سے اتر آئی۔ اس کی کمری کی دیوار سے اتنی بلیں اور اتنے بہت بے گتھے درخت ہلکا رہے تھے کہ اصل عمارت ان کے عقب میں ہی چھپ کر رہ گئی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھل دیا تھا۔ وہ ایک لمبا ترنگا سیاہ قلم لہواں تھا۔ کندھے پر بڑی شاندار قسم کی چاکا راتھل لٹکائے ہوئے تھا لیکن شکل سے کچھ بے وقوف سی دکھائی دے رہا تھا۔

ملا ہوئے اسے گیٹ پر ہی کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے

ملا ہوئے اسے گیٹ پر ہی کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے

میں بیٹھ چکا تو وہ مضطرب انداز میں ہاتھ لے ہوئے بولے۔
 شوق تھا مجھے تساری آمد پر ڈیڑھوں اجتماع کرنے کا۔ لیکن تیرا
 یہاں آمد یوں اچانک لکھی ہوئی تھی۔ کچھ میں نہیں آتا تھا
 کیا وزارت کروں۔"

"تم میری صرف یہ وزارت کہو کہ میرے لئے ٹھہرے
 کا ایک جگہ بھر کر سکو آؤ۔ اس کے بعد تقریباً جگہ ہی بتاؤ
 گرم گرم ایک کافی کا سکو آؤ۔"

"اچھی ٹھنڈی چیز کے بعد یکدم اتنی گرم چیز؟" وہ مسکرائی۔
 "کبھی کبھی میں تو ان اسی طرح برقرار رکھتا ہوں۔" میں
 جواب دیا۔

"اس کے بعد کیا رو گرم ہے؟" اس نے بڑھ کر طلب کر
 دونوں چیزوں کا حکم دینے کے بعد چمچا۔

"اس کے بعد وہی ڈانس شروع کیجئے جیسے جس کے
 تھامے پاس ہیں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور تھامہ رو بڑی ڈنر۔" اس نے ایک بار پھر یاد دلایا
 "بھاد میں کیا بڑی ڈنر۔" میں نے کہا۔

"جب میں کہہ رہی تھی اس وقت تم بڑی ڈنر کو بھار
 پیچھے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے۔" وہ مسکرائی۔

"میں نے کہا کہ میرا کچھ نہیں ہوتا۔"
 "عجب آدمی ہو تم بھی۔"

"میں تساری رائے سے سو لیفٹ منتقل ہوں۔"
 "وہیے کہا تھا کہ میں بھی تیار رہے۔" وہ بولی۔

"وہیں ڈنر بھی کر لیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ وہ
 خوش نظر آئے لگی۔

کچھ دیر بعد جب ہم کمرے روانہ ہونے لگے تو میں نے
 "کل صبح سے میرا ایک قوی تھامہ گیت کے پاس موجود۔"

اور جوئی وہ شخص ذہن والا نظر آئے گا کسی اور ذریعے سے
 سیاہ باکس کے بارے میں کوئی سراغ ملے گا۔ وہی اس سلسلے

ضروری کارروائی کرے گا۔"
 "وہ کیا گیت کے پاس کھڑا رہے گا؟" ظاہر نے حیرت

پوچھا
 "نہیں۔ گاڑی میں ہو گا۔ میرا مطلب ہے صرف ایک

نہیں ہو گا۔ ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔ چہ میں سمجھنے کوئی نہ کوئی موجود
 گا۔ میں نے اس لئے تیار ہوا ہے کہ اپنے کمرے کے قریب مستحق

موجود دیکھ کر تم پریشان نہ ہو جاؤ۔"
 "میرے کمرے میں ایک الگ ایسی موجود ہے جسے میں

ہاؤس کے طور پر استعمال کرتی ہوں۔ تھامہ کوئی بھی آدمی اور
 آکر کھڑے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے تم

کہہ دیا ہے کہ میں ضرور اس سلسلے میں اطلاع مل جائے گی۔
 نے یقین دلایا۔

اس نے یقیناً دل ہی دل میں براہ راست تھا لیکن میں چو کہ اس کی پیچیدگی
 صاحب کے ہمراہ تھا اس لئے وہ ازراہ موت بات جاری رکھتے
 ہوئے بولا "یہاں سے چار پانچ ٹھیلے والے گزرتے ہیں۔ وہ بھی
 انہی میں سے ایک ہے لیکن وہ کبھی کبھار آتا ہے شاید اس نے
 ملاقات کی باری باندھ رکھی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو صبح ہی صبح سب
 سے پہلے آتا ہے۔ میں اس وقت درود والے کے لئے گیت کھول
 رہا تھا اس لئے اتفاق سے میں نے اسے وہ ڈنر اٹھا کر ٹھیلے پر رکھتے
 ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا بھی کہ تم سے ام اسے خود اسی
 کروں کہ اسے اعتقاد سے ایک طرف رکھے۔ کہیں کوئی خطرناک
 چیز نہ ہو پیچیدگی صاحب نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ لیکن پھر میں نے
 سوچا مجھے کیا پڑی ہے۔ ویسے بھی ڈنر اتنا بھر دینا پڑا ہوا تھا۔ کچھ
 نہیں ہوا تھا۔"

میرے چہرے پر یقیناً خاصی مایوسی پھیل گئی تھی۔ صبحی ظاہرہ
 خانم نے چو کیدا کو اپنی جگہ واپس جانے کا اشارہ کیا اور تیلی آئیز
 انداز میں میرا کندھا چھتکتے ہوئے بولی۔ "اتنا پریشان ہونے کی
 ضرورت نہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اب جہاں اتنا سراغ مل
 گیا ہے وہاں آگے بھی سراغ ملتا چلا جائے گا۔ کمانڈوں میں بھی اسی
 طرح ہوتا ہے۔ میں دوسرے فکروں 'ٹوکرائیوں سے پوچھ کچھ
 کروں گی۔ ذہن والے کا ضرور کچھ پتا چل جائے گا۔ جو بھی وہ
 دو بارہ اس گلی میں آیا اسے پکڑ کر وہاں بٹھا لیا جائے گا اور ہمیں
 فوری اطلاع دی جائے گی۔ میں اس سلسلے میں تساری پوری مدد
 کروں گی۔ تساری تشریف دیکھ کر مجھے یقین آیا ہے کہ وہ واقعی
 تھامہ کے لئے کوئی اہم چیز ہے۔ لیکن فی الحال اس کی تکرار میں سے
 اتنا دو اسے بھول جاؤ۔ میرے گھر آئے ہو مجھے یاد رکھو۔ آؤ
 میرے ساتھ۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر اندر چل دی۔ اس کے لیے
 اور لفٹوں میں خلوص تھا۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ اب وہ باکس
 واقعی مل جائے گا۔ میرے دل کو قرار سا آیا۔

چند لمبے بعد میں اس کے خوبصورت اور آراستہ و بے آراستہ
 ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کو یقیناً کسی بہت
 اچھے انٹیریئر ڈیزائنر نے ڈیزائن کیا تھا۔ دیواروں میں شیشے کے بڑے
 بڑے کیس اس طرح نصب تھے کہ دیواروں ہی کا حصہ معلوم
 ہو رہے تھے۔ ان میں معنوی چیز، عموماً دے اور پھول لٹا رہے تھے
 اور انہی کے اندر خفیہ روشنیوں کا کچھ ایسا انتظام تھا کہ رات کے
 وقت بھی دن کا سماں تھا اور کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک
 شاپاٹ ڈرائنگ روم کے لوازمات کسی سبزہ زار میں رکھ دیئے گئے
 ہیں۔ ظاہرہ خانم کو یقیناً ہیرائی اور پھولوں سے پیار تھا۔ اس کی
 کوشش کی اصل غارت کے گرد بھی ایک خوبصورت اور گھٹا بلٹ
 موجود تھا جس نے غارت کو اپنے دامن میں تقریباً چھپا رکھا تھا۔
 کمرہ اور راہ دروازوں میں بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح اس
 نے پھولوں اور سبزیوں کو جگہ دے رکھی تھی۔

اداس جنگل کی خوشبو

-----★ اے حمید

میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے، جس کی یہ ناکام داستان محبت ہے۔ وہ غروب ہوتے سورج کی غم زدہ روشنی میں چنار کے درختوں میں سے گزر رہی تھی۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ درختوں پر رات کو بوائے ہوئے آنسوؤں کے نشان تھے۔

آنسو خشک ہو گئے، محبت کرنے والے جدا ہو گئے۔۔۔۔

یادیں باقی رہ گئیں۔۔۔۔۔ یہ لڑکی کون تھی؟

”اداس جنگل کی خوشبو“ اسی اداس چہرے والی لڑکی کی داستان محبت ہے۔

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/100 روپے

ایک عظیم ناول۔۔۔۔۔ ایک عظیم تاریخ

فتح بیت المقدس

سلطان صلاح الدین ایوبی

عظیم ناول نگار الماس ایم۔ اے کے قلم سے

اردو زبان کا سب سے زیادہ ضخیم و عظیم ناول

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2 قیمت: -/450 روپے

”میں نے سوچا شاید چوکیدار بھیج طور پر دھیان نہ رکھ سکے اور وہ نین ڈبے والا نکل جائے۔“ میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”میں چوکیدار کے علاوہ ایک نوکر کی ذیولٹی بھی لگا دوں گی۔ اس کے علاوہ میں خود کل سب اپنے ملازموں کے علاوہ پاس پڑوس کے بھی دو چار ملازموں کو بلوا کر ”تفتیش“ کروں گی۔ ہو سکتا ہے“ نین ڈبے والے کی آمد کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔ اس کا کوئی شکنا و غیروہی مطمئن ہو جائے۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔ اس ڈبے کے لئے تمہاری پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی۔ دل چاہو! یہ۔۔۔ اس نے جلد اور صراحت چھوڑ دیا۔

”کیا دل چاہ رہا ہے؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔
”دل چاہ رہا ہے وہ دنیا ابھی کہیں سے مل جائے اور میں اسے تمہارے سر پر دے ا دوں۔“ وہ خمیدگی سے بولی۔
”اگر وہ مل جائے تو میں تمہاری اس حرکت کا بھی برا نہیں مانوں گا۔“

”یقیناً۔ کیونکہ تم برا ماننے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔ تمہاری کوہنچی نوٹ بھی ہوگی۔“ وہ اطمینان سے بولی۔
ہم جب ہوئی پیچھے تو شرکا کا نام شروع ہوئے کوحا گھنا گزر چکا تھا۔ مگر شواہی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ مشاقان دید کے مبرا کا پوری طرح احسان لیا جا رہا تھا۔ شرکے لئے ہوئی کا ہال دوم مخصوص کھدایا تھا اور اس میں ایک خصوصی اسٹیج اور میز لگا دی گئی تھیں۔ ہال کچھ کچھ بڑا ہوا تھا۔ کسی تیسرے درجے کے صلیب کی طرح دیواروں کے ساتھ بھی لوگ کھڑے ہوئے تھے حتیٰ کہ تین چار پائیس والے بھی موجود تھے۔ ٹکٹ بہت مہنگا تھا اس کے باوجود انتظار دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس ہوٹل میں کسی بھی تقریب یا شادی وغیرہ کے سلسلے میں میں نے بھی ایسا جھوم نہیں دیکھا تھا۔ تاہم طاہرہ خانم کے لئے سب سے اگلی دی آئی ٹی قطار میں ایک بیرونی خلی میں کسی کے ساتھ صرف دو نشستیں تھیں۔

قیمت یہ رہا کہ ہمارے بیٹھے ہی شرکی خرید شروع ہو گئی۔ صنی ہال کی پتیاں بھٹکتیں اور اسٹیج کے تاریک پردے پر رنگ برنگی روشنیاں چکراتے لگیں۔ یہاں خیر قسم کی منہلی موسیقی سے فضا مرقش ہو گئی۔ دھیرے دھیرے پردہ ہٹا اور دو فنیاں اسٹیج پر چکراتے لگیں۔ پھر یکدم یہ دو فنیاں بھی غائب ہو گئیں اور موسیقی بھی ایک جھٹکے سے دم توڑ گئی۔ ہال میں سکوت چھا گیا۔ صرف لوگوں کی کمری سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بالکل ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی چڑے سے غار میں بہت سے رچھہ اجتماعی شب خوابی کا پردہ گرام ہٹا کر سورہے ہوں۔

پھر اچانک ہی ایک چمکا سا ساہوا اسٹیج پر بجلیاں سی چکیں اور وہ قیامت یکدم سامنے کودی جس کے انتظار میں سب دل تھام کر بیٹھے تھے۔ ڈانسر کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ پھت کی طرف سے اسٹیج پر کودی ہو۔ اس کا سر ہلکا اور رقص کا انداز دیکھ کر مجھے ہال

میں مردوں کی تعداد پر تو حیرت نہ رہی لیکن وہاں کی صورت موجود تھیں۔ صرف طاہرہ خانم ہی نہیں تھیں۔ ان کی مرد میری حیرت ضرور برقرار رہی۔ شاید وہ یہ ”تحقیق“ کر گئے ہوں کہ مہر کس بات پر لڑتے ہوئے ہیں۔

پھر جب ڈانسر پرفنس تھینے نے موسیقی بند ہوئے ساتھ ساتھ یہ غایت کرنا شروع کیا کہ اس کے رنگہ میں سے بجلیاں ہوتی تھیں تو ہال میں ایسا خاصا شور ہونے لگا حالانکہ وہاں شرکے معززین کی بھی لیکن مجھے اس روز مطمئن ہوا کہ معززین کا بھی بیٹھنا عجا کر اور بڑھکیں مار کر اپنے جذبات کھٹے کو دل چاہتا ہے۔ ان دنوں اس قسم کے ڈانس شو پر خاص پابندی نہیں تھی۔ اونچے ہوٹلوں ”ڈراموں“ حتیٰ کہ ٹیلیوں میں بھی ڈانس کا کوئی نہ کوئی موقع نکال رہا تھا۔ یہ میں تو انٹ کلب تک کھلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود لوگ تھینے کا ڈانس کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار موقع اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ زیروست رقص کرے۔ کو اصل پھل کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ لیکن ابھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ اپنا لائٹ ابھی تک اس پر نہیں پڑی تھی۔ لوگوں کو چہرے سے شاید کچھ زیادہ غرض تھی۔ پھر رقص میں کچھ اور روانی آئی تو ایک اپنا لائٹ تھینے کے چہرے پر پڑی اور میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

طاہرہ خانم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سنبالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”کیا تو اس میں بولی۔“ ”کیسا۔ میں نے کبھی تم تمہارے دل پر بھی ضرور بجلیاں گرائے گی۔“ مگر اب ایسا انسان اپنی سیٹ سے ہی اٹھ جائے۔ پلیز اب بیٹھ جاؤ جذبات کا اظہار بیٹھے بیٹھے ہی کرتے رہو۔ ڈانسر کی جب بٹنے کی کوشش نہ کرو۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے بھی آواز میں کلمہ ”زہ ہو کر نہیں اٹھا ہوں۔ دراصل مجھے تو اس لڑکی کی طاہرہ کی کسی اور نام سے مجھے چہرے دے چکی ہے۔“

”کوئی بات نہیں جان خانم!“ وہ پکارنے کے سے بولی۔ ”ان عورتوں کا کام ہی پھرتے ہوتا ہے۔ ہر گھنٹی نہ جانے کن کن مردوں کو بچنے دیتی ہوئی کیا کر رہی ہیں۔ نہ جانے کتنے گلوں میں کتنی جائیدادیں بٹھائی؟ بیگنوں میں ان کے اکاؤنٹ ہوتے ہیں۔ تم بھی اب اسی بھول باز اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔“

میں بیٹھ گیا کیونکہ میرے پیچھے والی میزوں سے شور مچا تھا۔ شرکا کا گھانا خراب ہوا تھا۔ طاہرہ خانم دھیرے میرا ہاتھ سلا رہی تھیں جیسے کسی بولے ہوئے بچے کو کوشش کر رہی ہو۔

”تم کچھ نہیں رہی ہو۔ بات دراصل یہ ہے۔۔۔“

مزید سنی آموز حقائق سے مجھے ہلکا کرتی تھیں، میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کلمہ "تم بات کو بالکل غلط سمجھ لے رہی ہو۔ معاملہ یہ نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس رات مجھے وہ بلیک باکس..."

ظاہرہ خانم نے دونوں ہاتھوں سے سر قدام لیا "اف میرے خدا۔ پھر دی بلیک باکس! پھر وہ بھت کی طرف دیکھ کر کرا رہے کے سے انداز میں بولی۔ "وہ میرا سو فیوا رہا تھا اس ای ایس بندے نے رحم فرما۔"

اس اتفاق کے بعد اس نے ترمیم تہیز نگہوں سے میری طرف دیکھا اور گویا بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "ایک عسین عورت اتنا زبردست دانش پوش کر رہی ہے اور ایک عسین عورت تمہارے پہلو میں بیٹھی ہے۔ لوگ اکیلے بھی بیٹھے ہیں تو دنیا کو بھولے بیٹھے ہیں۔ اور ایک تم ہو کہ جسے اس شخص بلیک باکس کے سوا کچھ سوچ رہی نہیں رہا ہے۔ اگر خدا انخواست کوئی طیارہ کر لیں ہو جائے اور جائے حادثہ سے اس کا بلیک باکس عتاب ہو جائے تو ان لاشوں والے شاید اسے... بھی اس جوش و خروش اور رواں تگی سے غلامش نہ کریں جو تم نے اپنے سر پر سوار رکھی ہے۔"

پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "دیکھو وہ بلیک باکس کتابا بھی قیمتی سہی اس میں کتنی ہی قیمتی دستاویزات اور میرے سوتی سہی۔ لیکن وہ سب چیزیں زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں۔ تم اس پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے کہ تم اس وقت صحت اور تندرستی کے ساتھ زندہ ہو اور ان مکت نعشیں، تمنا نیش، دولت اور عیش و نشاط کا سامان تمہارے قبضے میں ہے۔ وہ سب چیزیں تمہارے پاس موجود ہیں جن کا اس ملک میں بیٹے والے نہ جانتے نہ کئے نہ لوگوں نے کبھی خواب تک نہیں دیکھا۔ تم صرف انہی سے انبوائے کیوں نہیں کرتے؟ فی الحال اس ذلیل شخص بلیک باکس کو بھول کیوں نہیں جاتے؟"

میں نے سختی سے ہونٹ بچھنے لگے۔ عام حالات میں میرے بھی بالکل ایسی خیالات ہوتے تھے جن کا وہ اعجاز کر رہی تھی۔ یعنی وہ میرا ہی فلسفہ میرے منہ پر مار رہی تھی۔ میری اپنی عاقبتوں کی وجہ سے یہ قوت آئی تھی۔ میں اپنے اوصاف اور اپنی زبان پر اس طرح کنٹرول نہیں رکھ پا رہا تھا جس طرح پیشہ رکھار کرتا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میں ایک محافت اور کھنڈے لگا تھا۔ یعنی ظاہرہ خانم کو بلیک باکس والا اصل واقعہ سناتے لگا تھا جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ درحقیقت میری ملکیت نہیں تھا۔ میں تو محض اس کی پراسرار شام اور ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ جبکہ آج شام ہی میں ظاہرہ خانم سے کہہ چکا تھا کہ وہ میری ملکیت تھا اور اس میں میری کچھ قیمتی چیزیں تھیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ظاہرہ خانم نے مجھ سے اس بات کا تذکرہ نہ کیا تو میری محفل بیانی سامنے آجاتی۔ ایسی محافت مجھ سے شاذ و نادر ہی سرزد ہوتی تھی۔

کہ چند دن پہلے وہ لڑکی عجیب پراسرار حالات میں مجھے ملی تھی۔ اپنا نام حسہ بتایا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر بھی لے گئی تھی۔ اسی رات اس گھر سے عتاب بھی ہوئی تھی۔ میں اس کے بکھر میں اسی کی وجہ سے پڑا تھا۔ اسی رات رتنا نڈوڑی اور شجاع فرار ہوئے ہوئے حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ اچھے ہوئے معاملات تھے اور ان کے سرے نہ جانے کہاں رکھا ل رہے تھے۔ معاملات کا سب سے زیادہ تعلق ریڈ جے معلوم ہوا تھا۔

پس حسہ کے دانش شو کا اشتہار میں نے کل ہی اخبار میں لکھا تھا۔ اس میں لکھ کر اسے دانی اس کی تصویر بھی شامل تھی۔ کچھ اس قسم کی تصویر تھی جس میں چہرے کو ایک پھوپھو کرنے پر لی توجہ دی جاتی ہے۔ میں نے بھی چہرے کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ کچھ بیٹر اسٹاک اور میک اپ وغیرہ کا بھی عمل دخل تھا۔ میں اسے حسہ کی حیثیت سے نہیں پہچان سکا تھا۔ پہچانا تو میرا اس پر شبہ بھی نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی پرئس حسہ کا رے طور پر کئی ملکوں میں جانا پہچانا تھا۔ میں اس رات سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنا نام حسہ سناتے والی لڑکی پرئس حسہ ہے۔ اس نے بھی یقیناً دل ہی دل میں شکر ادا کیا ہو گا کہ میں مالی سے بے وقوف بن گیا۔

پ میں اس رات کے واقعات کو یاد کر رہا تھا تو مجھے ایک اور نا عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق حسہ اصلاً ترکی کی باشندہ تھی۔ لیکن اس رات جب وہ حسہ اسے ملی تھی تو مجھے اس پر غیر ملکی ہونے کا شبہ تک نہیں ہوا۔ لی صورت کی حد تک تو ایک پاکستانی اور ترک لڑکی میں کوئی فرق قائل مقرر کرنا بڑا مشکل تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنے بعد بھی خالص پاکستانی تھا۔ اس میں کسی غیر ملکی لہجے کی شک نہیں تھی۔ جبکہ اخبار میں دانش شو کا جو اشتہار چھپا تھا رتنا لکھا گیا تھا کہ پرئس حسہ کا پاکستان کا پہلا وہ تھا۔

یہ سب الجھنیں تو اپنی جگہ تھیں لیکن فی الحال ظاہرہ خانم سے بڑی الجھن بننے پر قلی ہوئی تھی۔ وہ میری بات کانٹے کہہ رہی تھی۔ "میں سب سمجھ رہی ہوں۔ اس تلاش کی مابینوں میں تقریبات میں جہاں بھی شر کے چھوہ چھوہ ملا کو دیکھ لیتی ہیں فوراً دھڑکتی کا تھ لیتی ہیں۔ لیکن یہ جو تم ہے ہو کہ کسی اور نام سے پھرتے ہو جی ہے یہ بات البتہ میری نہیں آتی۔ شو بزنس کی عورتوں کا نام ہی تو ان کا اصل ہوتا ہے۔ اور بھلا ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے؟ ان کے نام ش اور حسرت کی چھک جو ہے تو متاثر ہو کر لوگ ان کی کچھ بٹے آتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہنے کا موقع میرا آجائے تو سارا شوق اتر جاتا ہے۔"

لیکن ظاہرہ خانم کی شو بزنس کی عورتوں کی زندگی کے بارے میں

عظیم فساد کے فن کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہا۔
 "ہمت بد معاش ہو گئی" وہ سہلانے ہوئے بولے۔ اس پر
 دھیرے دھیرے اس نے کراچی کا پرہیز گریا اور ہال کی تکیاں دھونے ہو کر
 میں اٹھ کر اس کے بائیں دنگ کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم
 اور حسے آرائشی پردوں کے عقب سے ایک راستہ اس کے
 جاتا تھا۔ اس ہال میں چونکہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد کرا
 کوئی غیر معمولی شہ ہوتا رہتا تھا اس لئے اس کے عقب میں کرا
 کی ایک قطار کو مستقل طور پر ڈورنگ ددم "ٹیک آپ ددم"
 میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ شرفتم ہونے کے بعد آؤشٹ دینے
 جاتے تھے۔

میں ایک قدم بھی بڑھا نہیں پایا تھا کہ ظاہر خان نے ایک
 پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس بار اس کی گرفت میں گداز اور در
 کم "حقّی زیادہ تھی۔

"تم کہاں چل دیے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
 "مجھے حنت۔ میرا مطلب ہے پرنس حسین سے بہت
 بات کہنی ہے۔ پانچ منٹ میں واپس آنا ہوں۔" میں نے حیرت
 کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ اس کے عقبی
 کی طرف جا رہے تھے۔

وہ غلطی سے بولے۔ "میں حسین اس لئے یہاں نہیں آیا
 کہ تم مجھے جھوڑ کر پرنس حسین سے "ضروری باتیں" کر لے
 یہ قول جیسے اور موزوں خواہتا ہے۔ ایک بات تھی۔
 "مجھے معلوم ہے۔ لیکن تم مجھ پر اعتبار کرو۔ میں اس پر
 ہونے کے ارادے سے ہرگز نہیں جا رہا۔ یہ محض ایک اتفاق
 کہ اس کا تعلق ایک پراسرار معاملے سے نکل آیا ہے۔
 شکوک عورت ہے۔ میرا اس سے بات کرنا ضروری ہے۔"
 ملاحت سے کہا۔

"اس قسم کی عورتوں کا اکثری پراسرار معاملات سے
 کوئی تعلق بن جاتا ہے۔ لیکن حسین ایسے کسی معاملے سے
 سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ تم پوئیس والے
 آئی ڈی والے؟" ظاہر مجھے دوبارہ نفست پر بٹانے کی
 کوشش کرتے ہوئے بولے۔ کوئی اور عورت ہوئی تو شاید
 ایک ہاتھ رسید کرتا۔ لیکن وہ کینت ایک تو حسین سے
 اوپر سے قسم یہ کہ دل کی بہت اچھی تھی۔ کسی قسم کی گلی یا
 بغیر اور حسین باندھے بغیر اس سے پہلے ملاقات میں ہی
 اور جتنا بھی مرا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی چاہتی تھی اور وہاں
 دیوار نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مزید یہ کہ وہ رقابت میں
 ہو سکتی تھی۔ دوستی کے پہلے ہی دن!

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولے۔ "ویسے بھی تم اس سے
 کے لئے تھلا وقت کا انتخاب کر رہے ہو۔ اس وقت اچھی
 پر کارمنس کی وجہ سے وہ تھکی ہوئی ہے۔ اوپر سے شرم

ایک لمحے کے وقفے کے بعد میں نے ملاحت سے کہا۔ "آئی
 ایم سوری۔ واقعی میں نے بیک باکس کو اپنے سر پر کچھ زیادہ ہی سوار
 کر لیا ہے۔ لیکن خیر۔ اب میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ بس کچھ لو
 میں نے نفست بیچ دی اس پر۔"

میں پرنس حسین کی طرف توجہ ہو گیا جو اب وائس کا پٹرن
 بالکل بدل کر جتناٹک کے سے کچھ کتب دکھا رہی تھی۔ اس کے
 ساتھ ہی موسیقی کا انداز بھی بدل گیا تھا۔

"دراؤ دیکھو۔" ظاہر ہونے سے میرا ہاتھ دبا کر بولی۔ "میں
 معلوم ہوا ہے کہ اس عورت کے جسم میں بڑی تو کبھی ہے ہی
 نہیں۔"

"ہاں۔ واقعی۔" میں نے غلوں دل سے اس کی تائید کی اور
 محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں ٹاڈانستہ طور پر اب تک اس کی
 طرف سے جتنی بے توجہی برت چکا تھا اب اس کی غلطی کرنے کی
 کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرشاری اور آنکھوں میں نظیلا
 پن سا تھا۔

پرنس حسین کے جتناٹک کے کتبہ کچھ کر لوگ دم بخود بیٹھے
 تھے۔ لیکن یہ عرصہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ موسیقی نے ایک بار پھر
 کوٹ لی اور اس نے دوبارہ رقص شروع کر دیا۔ رقص میں اس
 نے یکے بعد دیگرے سات پٹرن بدلے، یعنی اس کے رقص میں کم
 از کم سات ٹکوں کے دو اچھے رقص اور ثقافت کی جھلک تھی۔ اس
 نے مسلسل تقریباً ایک گھنٹے رقص کیا۔ آخری دیر کا آ رہا "میان
 تو" قسم کا رقص کرنا اور سچ میں جتناٹک کے کتبہ بھی دکھانا کوئی
 آسان کام نہیں تھا۔ رنگ برنگی دوشینوں میں اس کے جسم پر پھیند
 چک رہا تھا۔ لیکن اس کی پٹری و مہارت اور جسم کے لوج میں کوئی
 فرق نہیں آیا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی وہ غلطی بھی برقرار تھی
 جو وہ اولین لمحے میں اپنے ساتھ لے کر اس کے پڑی تھی۔

بالآخر موسیقی نے دم توڑ دیا اور وہ حاضرین کے سامنے تفکر
 کے اعکاس کے لئے جھک گئی۔ اس بات لائٹس صرف اس کے وجود پر
 مرکوز تھیں۔ باقی اسٹیج تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ تائیاں بجا بجا
 کر اپنے ہاتھ توڑے ڈال رہے تھے۔ میں نے بھی سوجھا کہ تائیاں
 بجانے میں تجوی سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ میں بھی خامے جوش و
 خروش سے تائیاں بجانے لگا۔ میرا خیال تھا اس سے ظاہر بھی
 خوش ہوگی کہ میرا ذہن تقریباً کی طرف مائل ہو چکا تھا۔

لیکن دنیا کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتی۔ میں نے زیادہ
 تائیاں بجا میں تب بھی ظاہر خان نے میرا ہاتھ دھک دیا اور
 مصنوعی غلطی سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "کچھ تائیاں آئندہ کے
 لئے بھی بچا رکھو۔ یہ اس ہوٹل کی تاریخ کی آخری ڈانس نہیں ہے۔
 امید ہے یہاں آئندہ بھی ڈانسز آئی رہیں گی۔"

"تھماری مرضی۔" میں نے مصوبیت سے کہا۔ "میں تو
 تھماری خوشی کے لئے بجا رہا تھا۔ حسین بڑا شکوہ تھا کہ میں اس

وین مزان جا میں پھیلانے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں والے بھی جا کر اسی وقت اسے گھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اجمل فیر، پبلک ریلیشنز فیر، پرنس سینہ کا پانچا فیر، ہو کر رہے دو ہار لوگ، میکس پورٹی والے اس وقت سب وہیں دے رہے ہیں۔ شر کے اچھے بھلے معززین سے اور بڑے بڑے دن سے بھی اس وقت وہاں کوئی خاص اچھا سلوک نہیں دیا۔

۴ چھ سلوک کرنا تو خیر میں جانتا ہوں میں نے کہا۔ ۳ اس کے انکان سے لے کر وہ نیک مجھے جانتے بھی ہیں اور سامنے میرا اسی وقت اس لڑکی کو کچڑا ضروری ہے ورنہ یہ بھر ہو جائے گی۔ کیونکہ ایک بار پہلے بھی مجھے اپنا گھر دکھا کر اس فائب ہو چکی ہے کہ مجھے بعد میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ مگر اس کا یہاں کوئی گھر نہیں۔ یہ اسی ہو گی کے دی آئی پلی۔ نمبر تین سو ستو میں ٹھہری ہوئی ہے۔ طاہرہ خانم اطمینان لیں۔ اور یہ کہیں غائب نہیں ہو سکتی۔ اس ہو گی کے ساتھ باورے ایک ماہ کی پر قارض کا معاہدہ ہے اور ابھی تو اسے بچیں کرتے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا۔ لیکن یہ مجھے گاؤں گاؤں کی ایک کوٹھی میں ملی تھی۔ اس مافقا کہ وہ اس کا گھر ہے۔ اس کے پاس وہاں کی تمام چایاں ہیں۔ میں نے کہا۔

طاہرہ خانم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ۳۱۱ اپنی اپنا تم واقعی ہی بولے ہو؟ مجھے اس قبیل کی عورتوں کے لئے شر کے بہت روکھا اپنے دل کے دواؤں سے بھی کھلے رکھتے ہیں اور اپنی مثال میں کے بھی۔ کسی مردان نے دے دی ہو گی اپنی کوٹھی۔ پھر اس نے مناسب سمجھا ہوا گاؤں سے غائب ہوئی ہو گی۔ لیکن اکامل ٹھکانا سیم دی آئی پلی سوٹ نمبر تین سو ستو میں ہے۔ سب چاہا ہوا نمبر اس سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ میں جنس جان داتی ہوں یہ فی الحال کہیں نہیں بھاگے گی۔ لیکن کم از کم یہ تک میں تمہارے ساتھ ہوں تم بھاگ بھاگ کر اس کی طرف نے کی کو شش مت کرو۔

”جنس اس کے بارے میں اتنی معلومات کیوں کریں؟ میں نہ پتا چلا۔

”میں جب کسی چیز میں تھوڑی بہت دلچسپی لیتی ہوں تو اس کے سے میں معلومات رکھنے کی کو شش ضرور کرتی ہوں۔ یہ میری بالی ہے۔ ۳۳ میں نے جواب دیا۔ میں نے پہلے ہی دن اس عورت کی قارض دیکھی تھی اور اس نے مجھے عورت ہوتے ہوئے بھی اڑا کیا تھا۔ اس میں کوئی بات ہے ضرور۔ یہ شخص جسمانی نمائش انھما نہیں کر رہی اس کے پاس فن بھی ہے اور اس کی نصیحت میں کوئی پراسرار سی کشش بھی ہے۔ یہ زبردست ڈانسر ہے اس کے باوجود نہ جانتے کیوں مجھے بھی شہ سا ہوتا ہے کہ حقیقت یہ ڈانسر نہیں ہے۔“

میں نے اپنے جوش و خروش کو دبانے ہوئے بیٹھ جانا مناسب سمجھا۔ یہ طاہرہ خانم بھی بڑے کمال کی چیز تھی۔ میں نے بنور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تمہارے ملک میں تفتیشی رپورٹنگ INVESTIGATIVE REPORTING کا رواج نہیں ہے لیکن جنس کسی اچھے سے اخبار میں اسی قسم کی رپورٹرز ہوتا چاہئے تھا۔

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”تفتیشی رپورٹنگ کی طرف میرا رجحان ہے یا نہیں اس سلسلے میں تو میں جنس سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن کسی زمانے میں مجھے عورتوں کے لئے ایک بڑا ماذن قسم کا رسالہ نکالنے کا بہت شوق تھا۔ جس کام کی تک چھہ ہوا وہ میں کر گزرتی ہوں۔ زبردست انتظامات اور کافی بڑی انوسٹمنٹ کے ساتھ نکال ڈالا انگریزی میں سلا ایک رسالہ۔“

”کیا نام تھا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”سپارک۔“ طاہرہ نے جواب دیا۔ ”بہی سنا نہیں یہ نام اور نہ ہی کبھی رسالہ نظر سے گزرا۔“

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تو تیرکڑی رہی۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”ہم خود ہی میگزین چھاپتے تھے اور خود ہی پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ جن بے شمار کہینوں میں ہم مفت ہاتھتے تھے وہ بھی نہیں پڑھتے تھے۔ رسالے سے زیادہ رسالہ نکالنے والیوں میں لوگ زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔“

”پھر تو جنس خوش ہوتا چاہئے تھا۔“ میں نے سسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تو خیر خوش ہی تھی کیونکہ میں ہر حال میں خوش رہتی ہوں۔ لیکن میرا مطلب ہے لوگوں کی قاصر مہمانوں کے باوجود رسالے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ہم اسے جاری نہیں رکھ سکے۔ میں نے اس میں بہت سی خوبصورت اور چلبلی قسم کی لڑکیاں رکھی تھیں۔ میرا خیال تھا جس رسالے کے پیچھے اتنے بہت سے خوبصورت چہرے ہوں اسے تو چلی ہی جانا چاہئے۔“

”پھر بھی نہیں چلا؟“ میں نے حقیقتاً حیرانی سے پوچھا۔ ”میں تو قہری لگا تھا کہ خوب چل رہا ہے۔ آراستہ ویرا استہ مالیشان قسم کے دفتر میں ہر وقت گھما کھی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے اشاف سے زیادہ مصروف لوگ دنیا میں پائے ہی نہیں جاتے۔ لڑکیاں واقعی بہت مصروف تھیں۔ کوئی بوائے فرینڈ کی تعداد بڑھانے میں مصروف تھی۔ کوئی گھر بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ کوئی مال بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ کوئی اپنے بکے ہوئے کام سنوارنے میں مصروف تھی۔ کوئی رسالے کے خرقہ پرنت نے مجربات کرنے میں مصروف تھی۔ رسالے کو اشتارات بھی خوب ملتے تھے۔ اس کے باوجود خداداد لاکھوں میں جا رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ جب میں بھی کہے نہیں آتا تھا۔ سال ڈیڑھ سال میں لاکھوں کا نقصان اٹھانے کے بعد میرا شوق پورا ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ انگریزی جو غلام کی

- اردو کے شاہکار سفرنامے ضیاء ساجد 30/-
 منتخب مشہور سفرنامے ضیاء ساجد 50/-
 منتخب مشہور افسانے ضیاء ساجد 10/-
 منتخب اعلیٰ افسانے ضیاء ساجد 15/-

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

دلجوئی کے لئے مجھے اس کے ساتھ دوبارہ اس کے گھر بھی جانا
 وہاں سے مجھے واپسی ہو سکی۔ نیند کی کمی سے میری آنکھیں رو
 تھیں لیکن میرا سونے کے بجائے تار ہو کر آفس جانے کا ارا
 تھا۔ آج کی ضروری ملاقاتیں ملے تھیں۔ آہم اس سے پہلے
 اور کام بھی ضروری تھا۔

میں نے اپنے ایک خاص کارکن منیر کو فون کیا اور کہا۔
 کان کے سوئٹ فیرمیں سو ستر سو پندرہ سو تیس سو تیس کے نام سے
 ڈائریکٹر منیر سے جو اسی ہوٹل میں روزانہ فانس شپ پیش کر رہی ہے
 "میں سر مجھے معلوم ہے۔" منیر نے کہا۔

"مسعود کو بھی ساتھ لے لو۔ اس لڑکی کی چو ہیں گئے مگر
 ہونی چاہئے۔ مسعود کے علاوہ بھی کسی کی ضرورت ہو تو اسے
 طلب کرو۔ جس طرح بھی تم جاؤ مگر انی کے انتظامات کرو۔
 سروس کے ویٹول اور کمرول میں چھوٹے سونے کام کرنے
 میںہ ذکو بھی ساتھ ملا ضروری ہو تو کسی بھی حربے سے ملا لیا جا۔
 یہ لڑکی کیس غائب نہ ہونے پائے سمجھ گئے؟"

"میں سر ایسا ہی ہو گا۔ غائب نہیں ہو سکے گی۔" منیر
 وفاق سے کہا۔ اس کا وعدہ یا دعویٰ قطعیہ لکھ رہا تھا۔ اسے
 مسعود کو اس قسم کے کاموں میں خصوصی صارت تھی۔ کسی
 جگہ مقیم یا کہیں بھی سرگرم عمل آدمی "خواہ اس کے معمولات
 بھی ہوتے" اس کی چو ہیں گئے مگر انی میں منیر اور مسعود کا
 نہیں تھا۔ یہ کام پتا ہرست آسان نظر آتا تھا لیکن درحقیقت
 ہی ذہانت طلب اور احصاب حکم کام تھا۔ خصوصاً جبکہ
 بہت ہی شاطر قسم کے لوگوں سے ہو۔ منیر اور مسعود اس کا
 ایچہٹلٹ تھا۔ اس ضمن میں جو بھی انتظامات کرنے
 ہوتے تھے وہ خود ہی کر لیتے تھے۔

تیار ہونے اور ناشتا کرنے کے بعد میں آفس جانے کے
 ٹکٹے لگا تھا کہ لاہور کا نام کا فون آگیا۔ نیند کی کمی کے اثرات
 کی تواز سے بھی ظاہر ہونے لگا۔ مجھے گھر آیا میں تھا۔
 کے لئے میں قورات سے بھی زیادہ تھکتی اور تھک تھی۔

چھیلنے کے سے انداز میں بولی۔ "کی مال اسے سو نہیں
 "میں تو ٹھیک ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔" میں نے ایک بار

یہ نام غلام حسرت کی ماہرین مجھے بچ کر کہا جائیں گی۔ چنانچہ میں نے
 رسالہ بند کر دیا۔ مجھے خود بھی حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی اندر ستر میں
 چلا سکتی ہوں "اتنا سا رسالہ نہیں چلا سکتی۔"

"جس کا کام اسی کو سناجھے۔" میں نے کہا "اندسٹری تصاری
 لائن میں گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ اب تم ہر لائن میں ٹانگ اڑا
 سکو۔ میرا خیال ہے رسالے نکالنے والے اگر کاروبار یا اندسٹری کی
 طرف آنے کی کوشش کریں تو شاید وہ بھی اسی طرح ناکام رہیں۔"

"مکن ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے تو اگر اب میں کوئی نیا کام
 شروع کرنے کا سوچتی ہوں اور مجھے اس کا تجربہ نہیں ہوتا تو میں خود
 اس کی کرنا دھرتا نہیں بنتی۔"

اس دوران ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ چند میزوں پر لوگ وہ
 گئے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں وہاں بھی سڑکی جاری تھیں لیکن
 لاہور بولی۔ "پلوہ ستوران میں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

رستوران میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ بیشتر لوگوں نے
 کھانے سے فارغ ہو کر ڈانس شروع کیا تھا۔ کھانے پینے کا اپنا
 ایک شمار ہو آ ہے اور اس شمار کو دہلا کرنے کے لئے لوگ اس
 قسم کے "پوسٹ ڈنر انکم" سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک پڑسکون
 گوشے میں میز سنبھالنے کے بعد ہم نے اپنی اپنی پیند کی چیزوں کا
 آرڈر دیا۔

کھانے کے دوران لاہور ٹولنے والی نغموں سے میری طرف
 دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تو پندرہ سو تیس سو تیس سو تیس کا اب بھی
 سوار ہے؟"

"اتر گئی۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "اب تو ذہن پر
 صرف تم سوار ہو۔"

"رات ڈھل رہی ہے نا۔" وہ غائبانہ سے لہجے میں بولی۔
 "ہمارے سورج کے آدھ چھاؤں کے ساتھ انسان کے اندر کا موسم بھی
 بدلا رہتا ہے۔ کبھی فرصت میں تم سے پوچھوں گی کہ اس عورت
 نے تمہیں کیونکر مجھ دیا؟ اس سلسلے میں دھوکا دیا؟ فی الحال تو میں
 صرف اپنی اور تمہاری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یہاں
 صرف اس لئے لائی تھی کہ تم اسے محض تفریح کا ایک ذریعہ سمجھ کر
 دیکھو گے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ اس سے تمہارا کوئی پکر نکل
 آئے گا۔"

"پکر کوئی نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے
 اب اس معاملے کو ذہن سے جھٹک دیا ہے۔ تم بھی جھٹک دو۔ یہ
 محض اتفاق تھا کہ تم آئیں تو تمہارے ساتھ کچھ اچھے ہوئے
 معاملات کے سراغ بھی ملے آئے۔ لیکن میں نے اب کسی بھی
 معاملے میں سرکھپانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی
 ہو۔ میں بھی اب صرف اپنے اور تمہارے بارے میں سوچنے کی
 کوشش کروں گا۔"

میں اس کی دلجوئی کے لئے یہ باتیں کر رہا تھا اور نہ پندرہ سو تیس
 کوئی الحال میں اپنے ذہن سے جھٹکتا نہیں چاہتا تھا۔ لاہور کی مزہ

کہ تھک شہر میں کسی بستر میں بیٹھ کر یہ غصہ نہ کرنا
لما بعد من سے ملنا پسند کرتی ہیں اور نہ ہی انکو دیکھنا چاہیے کہ حضور
کچھ نہ بھی کر اور انہیں کرتیں۔ اسی تک ان کی واحد تصویر دی
ہے جو اشتہار میں چھپی ہے اور وہ کوئی ایسی قابل تریف تصویر
نہیں۔ شاہ غانون کا خیال ہو کہ وہ جو کچھ اسٹیج پر پیش کرتی ہیں وہی
ان کی قدرت دور دور تک پھیلانے کے لئے کافی ہے۔ ہر حال
ہمارے فوٹو گرافر گزشتہ رات اچانک ہی اس وقت نہایت عرصہ

پہنیں شب رفتہ کا شمار موقوف کرتے ہوئے کمال
سارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔ وہ یہ ہے۔
پانچ رات پہلا وقت رہے گی جس میں نے پوچھا۔
وہ تو ہے کی سی۔ لیکن وہ سری خبر شاید جس میں اس سے زیادہ
نہ محسوس ہو۔ وہ یہ ہے۔ وہ نہیں دیکھنے والا ہوا گیا ہے۔
نیدرلینڈز کے اسے پکڑ کر اپنے کمرے میں بٹھایا ہوا ہے۔
وہ پہلے تو یہی طرح ڈر گیا تھا لیکن میری ہدایت پر اس کے
مت اچھا سلوک کیا گیا۔ بلکہ میں سمجھو کہ اسے دی گئی گولی
لگا ہوا ہوا ہے۔ اب تاؤ مزید "تفتیش" کا بعد دست بھی میں
پہناتم خود ہی اس معاملے کو جیسا کہ ہے؟

تم کہہ بھی مت کہو۔ تم نے جتنا کہنا ادا ہی کافی ہے۔ چہرہ
نہ تک میرا ایک گولی کی پیچھے گا۔ اس سے آگے جو کچھ بھی
ہو رہی ہو گا وہی کہے گا۔ جس تم نہیں دیکھنے والے کو اس
اے کہو۔ اس کے بعد ہمارا کام ختم ہے۔ میں نے کہا۔
میری چند باتیں اور ہوئیں پھر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
اس کے بعد میں نے سردار شیخ سے رابطہ قائم کیا اور اسے
اس والا سلسلہ سمجھانے کے بعد کہا۔ "اب وہ نہیں دیکھنے والا
خاتم کی کوٹھی پر موجود ہے۔ جس میں اس سے مطوعات کرنے
پر ہوا ہے اور ہر حال میں اس بلیک باکس کو تلاش کر کے یہ
تلاش نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ اطمینان کر لینا کہ اس دوران کوئی
بے پیچھے نہ لگا ہو۔ باکس حاصل کرنے کے بعد جس میں
تلاش کرنے کی ضرورت ہوگی۔ وہ باکس کوئی تم سے پیچھے نہ

"اس کے سر" سردار شیخ نے جواب دیا۔ "آئی ایم آن مانی
"میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس دوران ملازم نے خاص
باخبردارت لاکر میرے سامنے رکھ دیئے۔ آج میں ابھی تک
رات بھی نہیں دیکھ پانچواں تھا۔ ذہن وہ سری باتوں میں الجھا ہوا
میں نے سوچا "جائے سے پہلے سری نظر ڈال لی جائے
انگریزی اخبار میں بھی کوئی کام کی خبریں انکو اڑی نظر آجائی
نہیں دیکھنے میں میرا بیکر کیلئے اسلاف بھی بھی کھار سکتی کر جاتا

میں اس وقت نیم تو تھی سے ایک انگریزی اخبار کے صفحات
میں اخبارتہ تقریبات کے صفحے پر میری نظر ایک نمایاں تصویر پر
ہو صرف چہرے کا کھڑا ہوا تھا۔ تصویر باکس میں چھپی ہوئی
اب یہ چہرہ میرے لئے خوب جانا پہچانا تھا کہ گزشتہ رات
نار میں نے اسے اسی طرح کمرے میں آپ میں ہر زاویے سے
دیکھا تھا۔ وہ پرنس حنین کا چہرہ تھا۔ تصویر کے نیچے چھ سطری
رہ گئی۔ اخبار نے لکھا تھا:

تقریبات کے ضمن میں پرنس حنین ہر میں ایک اچھا اضافہ
لیکن پرنس کے لئے اس کی آمد کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے

انکا، اقبالہ، سونا گھاٹ کا پجاری

غلام روہیں، امبر بیل، درخشاں، غبیث

کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور

پراسرار ناول

برہم چاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب

کتابت و طباعت

قیمت: -/ 150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2



سے ان کا گھڑا اب اپنے کمرے میں محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گئے جب وہ ڈرنک روم سے نکل ہی تھے۔ موصوف کی لڑاکو برہی کے باوجود ہم یہ تصور اپنے کارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہوئی گئے۔

مہارت کا انداز تو ڈراما سا تھا ہوا بھی تھا۔ اس کے باوجود تصویر پر اس طرح شائع کی گئی تھی جیسے یہ ایک کارنامہ تھا۔ اور اگر یہ کارنامہ انجام نہ دیا جاتا تو صحافت کی تاریخ میں بہت بڑا غلامہ ہوتا۔

کئی لمبے تک میں ایک تک اس چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ حیران حیران آنکھیں کھلی کر دیکھ رہی تھی۔ اور میں ایک بار پھر الجھن میں تھا۔ جب یہ لڑکی حنہ کے نام سے مجھے ملی تھی تب بھی انہی آنکھوں نے مجھے الجھن میں ڈالنے رکھا تھا۔ میری کچھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آنکھیں میرے لئے ششاکیں تھیں؟ اب چونکہ یہ آنکھیں تصویر کی صورت میں میرے سامنے ساکت تھیں اس لئے میں زیادہ متروک طور پر ان کے بارے میں غور کر سکتا تھا۔ ایک انہی چہرے پر یہ ششاک آنکھیں کہاں سے آئی تھیں؟

پھر ایک نکتہ میرے ذہن میں چمکا کسا ہوا۔ بعض باتیں پونی اہم تک بالکل غیر متوقع طور پر یاد آتی ہیں جیسے کمری آری کی میں کبلی کا کوئی لپکا ہوا اور کوئی منظر کیم ڈوشن ہو گیا ہو۔ مجھے یاد آیا تھا کہ یہ آنکھیں کس کی تھیں۔ اور مجھے چین تھا کہ یہ شخص مشابہت کا معاملہ بھی نہیں تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ جب یہ لڑکی حنہ کے نام سے میرے سامنے تھی تو وہ کون سی شخص تھی جو میرے اصحاب میں سرسراہٹ ہی دوڑائے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ حنہ کی آنکھیں مجھے ششاک لگ رہی تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی پوری شخصیت ہی میرے لئے ششاک تھی۔

درحقیقت وہ نہ تو حنہ تھی اور نہ ہی پرنس سینہ۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہ اصل میں اپنی تھی۔ لیکن اس کی صورت کو کیا ہوا تھا؟ یہ میری کچھ میں نہیں آتا تھا!

کئی لمبے تک میں اس تصور کو دیکھتا رہا۔ اس لڑکی کے سنے روپ تھے؟ یہ فیصلہ کتنا مشکل تھا۔ ایک مختصر عرصے میں اس کی شخصیت کی زاویوں سے میرے سامنے آتی تھی۔ ہر بار مجھے اس میں ایک عجیب سی پراسراریت کا احساس ہوا تھا لیکن اب تو معاملہ بہت ہی حیران کن ہو گیا تھا۔ اب تو اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ اسے غائب ہوئے قریباً تین ماہ ہو چکے تھے اور اس دوران مجھ سے ٹیلیفون پر رابطہ رکھنے والے ایف ایم عرف ایڈی کی باتوں سے کئی غائب ہوا تھا کہ وہ ریڈ ذات کے قبضے میں تھی لیکن اب آزاد

عاطون

- ۱۔ اہرام مصر سے قرار 150/-
- ۲۔ اندلس کی آخری شمع 125/-
- ۳۔ ہڑپہ کی ناگن 125/-
- ۴۔ عاطون موت کے دروازے پر 200/-

مشہور سینا کے دہشت گرد

- ۱۔ ٹاپ سیکرٹ مشن 150/-
- ۲۔ کشمیر کے غازی 150/-
- ۳۔ کمانڈر ایکشن 200/-
- ۴۔ گولکنڈہ کے مجاہد 200/-

- گنگا کے پجاری ناگ (اول) 150/-
- گنگا کے پجاری ناگ (دوئم) 200/-

مکتبہ القریش

اُردو بازار، لاہور

فون : 7224665

نظر نہ آئی۔ اس کا کہنا تھا کہ معلوم نہیں کب کون سا کتہ اہم اور کارآمد ثابت ہو جائے۔

سوار شیخ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”شام سے فقیدار کے ہاں گھما سٹی شروع ہو جاتی ہے۔ غیلوں پر اور بوریوں وغیرہ میں کچرا اور کاغذ کا باز جمع کرنے والے وہاں پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہزار ہا چیزوں کی چھاننی ہوتی ہے اور ان لوگوں کو پیسے دے کر فارغ کر دیا جاتا ہے۔ ٹھیلے والے نے اس باس کو دھات کی چیزوں میں ہی ڈالا تھا لیکن وہ چونکہ کچھ صاف ستھری سی چیز معلوم ہو رہی تھی اس لئے اس نے بعد میں اسے الگ رکھ لیا تھا کہ اسے پختل آئینہ کے طور پر فقیدار سے اس کی خصوصی قیمت وصول کرنے کی کوشش کرے گا۔

پہلے ٹھیلے والے نے اس باس کو خود بھی ٹھوک بجا کر دیکھا تھا۔ اس میں پینڈل تو موجود تھا لیکن وہ تقریباً ٹھوس دھات کا ایک ٹکڑا ٹھوس ہو رہا تھا۔ اس میں کیس کی جڑ نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کیس سے کھلا ہے یا نہیں۔ ٹھک بار کر اس نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ وہ کوئی ایسی کارآمد چیز نہیں ہے جسے اپنے پاس رکھا جائے۔ چنانچہ شام کو اس نے دیگر کاغذ کا باز کے ساتھ فقیدار کے قوی کے سپرد ہی کر دیا تھا۔ اس کی بدی منت ثابت کے بعد فقیدار کے قوی نے الگ سے اس کی قیمت لگادی تھی۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں وہ قیمت کیا تھی؟

”نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”وہ دھوپ۔“ سوار شیخ نے بتایا۔ ”وہ دھوپ میں وہ باس کاغذ کا باز میں چلا گیا۔“

”وہ دھوپ؟“ میرے پیلو میں نہیں سی اٹھی۔ جس جگہ کے لئے کتہ و خن ہونے کے آثار پیدا ہو رہے تھے جان کی اڑناں تھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دھوپ میں کاغذ کی ہاتھ بک گئی تھی۔ کیا تم غریبی تھی؟

سوار شیخ نے کمانی ٹانے کے انداز میں بات جاری رکھی۔ میں اس کمانی کا کھانکھانکھانے کے لئے بے چین تھا لیکن اپنی بے تابی پر قابو رکھتے ہوئے مرحلہ وار ہر بات سن رہا تھا۔ سوار شیخ کے ہاتھ فقیدار میں ہی کاغذ کے ہاں شام کے وقت دو تین آدمی ”مال“ کی دھولی کرتے ہیں۔ وہ خور ایک لمبی چوڑی چارپائی پر بیٹھا حد کوڑا آ رہتا ہے۔ اسے تو باس کے ٹھیلے میں کچھ نہیں معلوم۔ ٹھیلے والے نے اس دن اپنا ”مال“ جس شخص کے سپرد کیا تھا اسے یاد ہے کہ اس قسم کی کوئی باس تھا جس میں اس دن کوئی تو تھی لیکن اسے صحیح طور پر یاد نہیں کہ اس کا کیا نام تھا۔ کاغذ خانے میں ہاتھ سے کام کرنے والی دو تین برسین مشین قسم کی چیزیں ہیں۔ ان سے کاغذ کا باز کو پچا کر اس کا حجم کم کیا جاتا ہے اور مختلف نوعیت کی چیزیں ٹرکوں میں لاد کر مختلف کارخانوں کو روانہ کر دی جاتی ہیں۔ اس روز اتفاق سے لوہے کے سامان کا زرک جا رہا

تھے۔ باوجود اور مجھ سے سامنا ہونے کے باوجود وہ مجھ سے کیوں نہ رہی تھی؟ صرف اجنبی ہی نہیں، بھاری سی جگہ اس لئے پکڑ دینے کی بھی پوری پوری کوشش کی تھی۔ کیا اسے یہ حساس نہیں تھا کہ اس کے انوائے مجھے کتنا پریشان کیا تھا اور اس کے لئے کتنا فکر مند رہا تھا؟

نی الحال چونکہ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا اس میں نے انہیں ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں دھکیلنے کی ش کی اور آفس روانہ ہو گیا۔

آفس کی اپنی ایک الگ سی دنیا تھی وہاں پہنچ کر میں بہت مصروف ہو جاتا تھا۔ ”فون“ ”فون“ ”مذرتیں“ ”شرکت“ ”کافہات“ ”کانبار“ ”دھول“ ”مالی انتظامات“ اور ایسی باتیں سنی چیزیں ہوتی تھیں جو سر کھانے کی بھی مصلحت نہیں تھیں۔ پھر بعض اوقات غیر کاروباری ”محادثات“ کی رپورٹیں دہیں آتی رہتی تھیں۔ انہیں بھی سننا ہوتا تھا اور ان کے لئے میں فیصلہ بھی کرتا ہوتا تھا۔ اس روز بھی شام تک میں بے مصروف رہا۔ پھر وہ غیر کاروباری فون کال آئی جس کا مجھے دوسری سے انداز میں انتظار تھا۔ وہ سوار شیخ کا فون تھا جس میں نین ڈبے والے کے ساتھ بلیک باس کی تلاش کی سہ پر بھیجا

”یہ ایک عجیب و غریب قسم کی سہ ہے۔ وہ بلیک سی ہنسی کے ساتھ۔ اس ہنسی میں بلیک سی شخص اور خود استہزائی کی جھلک تھی۔ بن ڈبے والے کا کہنا تھا کہ اس نے حسب معمول شام تک گھر کا باز جمع کیا اور لے جا کر کاغذ کے ہاں ڈھیر کھڑا جملہ ہر کی چھاننی ہوتی ہے۔ شیشہ ”کافہات“ ٹھوک پلا شک وغیرہ سب کی الگ۔ ڈھیر میں لگائی جاتی ہیں اور پھر ہر جگہ کے ریت کے حساب سے پیلے والوں کو پیسے ملتے ہیں۔“

”اور یہ کیا نیا کہاں ہوتا ہے؟“ میں نے بات کاٹنے ہوئے

”اس کا نمکنا ملا ہوا خانم کی کوٹھی سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں میرے ملائے میں اس نے ایک بہت بڑے اور قیمتی مال پلاٹ پر جا بڑ بڑ کر کے ”بوسے بوسے“ چھپو ڈال کر اپنا گوام لٹایا ہوا ہے۔ پلاٹ کے چار دھوسے دار ہیں۔ چاروں متحدہ سے انہیں برسوں سے مصروف ہیں اور اس دوران کیا نیا اطمینان سے وہاں اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ ٹھیلے والے اسے لگبھگ اسی کہتے ہیں اور وہ خاصا آسودہ حال آدمی ہے اس کے پتے ترک پڑے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ میں سوار شیخ کو یاد دے بغیر نہ رہ سکا۔ اس شخص میں یہ بڑی خرابی تھی۔ اسے جب خصوصی ہدایات کے ساتھ کی مساعلیں میں لگایا جاتا تھا تو وہ بڑی گراؤ میں جا کر ہر پہلو سے ملکی تفصیلی معلومات جمع کر کے لاتا تھا۔ خواہ پٹا ہر ان کی کوئی اہمیت

تھا۔ تو سے قید امکان بھی تھا کہ وہ باکس اسی ٹرک میں لوہے کے کارخانے کو چلا گیا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان پُر سکون رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے سر میں صرف یہ سن کر تو نہیں آسکتا تھا کہ وہ باکس آگے کیس چلا گیا۔" سردار حوصلہ سانس لے کر بولا۔ "میں اس کارخانے میں گیا جہاں لوہے کا ٹرک گیا تھا۔ بیچ میں ایک آڑھتی کا کردار بھی آتا ہے جو پہلے مختلف کباڑیوں کے ہاں سے آنے والے مال کو یکجا کرتا ہے پھر کارخانے والوں سے انکھالین دین اور حساب کتاب کرتا ہے۔"

"کارخانہ کہاں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شیوپورہ روڈ پر واقع ایک انشیل ری روٹنگ مل ہے۔" سردار نے جواب دیا "اس کا احاطہ بہت بڑا ہے جہاں لوہے کا کاٹھ کباڑا جمع کیا جاتا ہے پھر اسے صاف کرنے کے لئے مختلف مراحل میں بھیجیوں میں بھیجا جاتا ہے۔ وہاں نہ جانے کس کس علاقے سے اور کب کب کا آیا ہوا کاٹھ کباڑا جمع تھا۔ یوں سمجھئے کہ کاٹھ کباڑے پر باز کھڑے تھے ظاہر ہے وہاں کس کی یاد نہ سکتا تھا کہ کسی انبار میں لوہے کی کس نمائندگی چیز بھی آتی تھی نہ نہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "میں کے باوجود میں نے کسی نہ کسی طرح انتظامات کیے کہ کاٹھ کباڑے ان تمام گھبراہٹوں کو کھٹکا جائے۔" سردار نے بتایا۔ "۱۹۷۰ء میں کسی سانس لے کر وہ گیا۔ سردار شیخ فطی اور ضیف وغیرہ اس طرح تقریباً نامکمل کاموں کو مکمل بنانے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔"

سردار بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن سر! کیس دھمکی کیس لالچ اور کیس پکڑ دینے کے باوجود اس ساری جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس باکس تھا چیز کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کم از کم وہ ان انباروں میں کیس نہیں تھا جو کارخانے کے احاطے میں موجود تھے۔ پچھلے تین چار دنوں میں کئی انبار بھٹلائے بھی جا چکے تھے اور صاف کرنے کے بعد سلاخوں وغیرہ میں ڈھالے جا چکے تھے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ ان میں شامل ہو کر ایسے ہی کسی انجام کو پہنچ چکا ہے۔"

"نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "مگر ایسا ہوا ہو تو بہت دیر ہو چکی ہوگی اور اگر کارخانے میں اس قسم کا کوئی حادثہ پیش آیا ہو تو تمہارے علم میں ضرور آجائے۔"

مجھے یاد تھا ایڈم عرف ایڈی نے باکس کے بارے میں فون پر مجھ سے بحث کرتے وقت خیال کیا تھا کہ اگر باکس کو ذرا بھی غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو وہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اگر باکس میں کسی قسم کے میگزین سے فسلک ڈاکٹریٹ موجود تھا تو بہت ہی جاکر اسے زیادہ تباہ کن انداز میں پھٹ جانا چاہئے

تھا۔

"کارخانے والوں نے اس قسم کے کسی حادثے کا ذکر کیا۔" سردار بولا "وہاں تو سکون و اطمینان سے معمول کے کام ہو رہا تھا۔"

"وہ باکس ظاہر لوہے کا ایک کھڑائی نظر آتا تھا جس میں صرف اسے اٹھانے کی غرض سے چھوٹا سا ہینڈل لگا ہوا تھا۔ آ ذرا توجہ سے دیکھتے تو خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے کارخانے کے احاطے میں سے کوئی مزدور وغیرہ اسے اٹھا کر لے گیا ہو۔" لیکن اس کے ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ شاید ایڈم محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے کبھی پھوڑی ہوا کہ میں باکس کھولنے کی کوششوں سے باز رہوں۔ میں ممکن تھا کہ اس میں ڈاکٹریٹ وغیرہ نہ رہا ہو اور وہ واقعی جہتی میں جا کر کسی اور خطرہ داخل چکا ہو۔

سردار بولا "میں سرا۔ یہ ممکن ہے۔ کارخانے میں اجرت پر کام کرنے والوں اور مستقل ملازمین کو ملا کر تقریباً بیس توہی کام کرتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم باہر جاتی سب کو چیک کر لیتے ہیں۔ ان کے گھروں پر پہنچ کر پوچھ گچھ کر ہیں اور ذرا چھان بین بھی کر لیتے ہیں تاکہ کوئی جھوٹ بول کر انہیں کی کوشش نہ کرے۔"

مجھے معلوم تھا سردار کسی کام کو بے نتیجہ چھوڑنا پسند کرتا تھا خواہ اس میں کتنی ہی محنت کی ضرورت ہوتی۔ لیکن میرے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "چلو چھوڑو سردار! اتنے لمبے پھرتی صحت پر دو۔ فی الحال اتنی جدوجہد ہی کافی ہے۔ میری اس میں ایک کیس ہی ہو گئی ہے۔ فلت سمجھو اس پر۔"

"جیسے آپ کا حکم سر۔" ویسے آپ کیس تو ایک کوشش کر کے دیکھی جا سکتی ہے۔ تمام ملازمین کو چیک کر کے کام چاروں میں عمل ہو جائے گا۔ ہم نہیں چار آدمی لگ جائیں۔ ذرا اطمینان ہو جائے گا۔"

"جس رہنے ہی دو" مجھے ویسے ہی اطمینان سا ہو گیا ہے۔ "نے کہا اور سلسلہ منتقل کر دیا۔ میں نے ظاہر قائم کے مشورہ عمل کر ہی لیا تھا اور ایک باکس پر فلت سمجھ دی تھی۔"

کچھ روز بعد میں نے ڈائریکٹر برمنیئر سے رابطہ قائم کیا جسے نے پرنسپل کی عمرانی کی ڈسے وادی سوئی تھی۔ ڈائریکٹر اس کی طرف سے جواب ملنے میں چند منٹ لگ گئے۔ شاید وقتہ کسی مناسب جگہ پر نہیں تھا جب اسے ڈائریکٹر برمنیئر سے "کیا خبر ہے؟" میں نے سرسری سے پوچھا۔

"عمرانی جاری ہے سر!۔" منتر نے جواب دیا "آج سارا اپنے سٹنٹ میں ہی موجود رہی ہے۔ چھ منٹ کے لئے بھی ٹلی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ہمارے علاقہ بھی کوئی اس کی کر رہا ہے۔ ظاہر ہے ایک بے ضرر ماسفیڈ قائم ہے۔ مگر یہ

”مگر ہے“ اس نے سکون کی سانس لی ”ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اب تمہاری باقی زندگی اسی کا غلبہ پڑے گا مگر جائے گی۔ اچھا یہ بتاؤ تین مہری طرف آ رہے ہو یا نہیں؟“
”میں نہیں سے نہیں کہہ سکتا“ میں نے تذبذب کے عالم میں کہا ”مجھے ایک کام ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو میں تمہاری طرف آسکتا ہوں۔“

”مجھ سے دو ٹوک بات کرو ڈیرانی! اس طرح انتظار کی سولی پر لٹکا کر میری شام برباد مت کرو۔ اور مجھے اسپر و میل بھی مت عطا کر فلاں و میل لٹکنا نہ چلاؤ اس کی جگہ تمہیں لگانوں کا وزن اسی سے کام چل جائے گا۔ میں اس انداز کی دوستی کا قائل نہیں۔“
”دراصل میرا دل تو تمہاری ہی طرف اٹکا ہوا ہے لیکن ذہن کہیں اور پھنسا ہوا ہے۔“ میں نے کج بیانی سے کہا۔ میں آج رات پرئس خینہ والے سلیٹے میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن دوسرے پھنسا ہوا تھا۔

”میں تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہم اس طرز زندگی کے قائل نہیں ہیں۔ دل کہیں اٹکا ہوا ہے ذہن کہیں... اٹکا ہوا ہے اور جسم کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔ جب اٹکاؤ تو سب کچھ ایک ہی جگہ اٹکاؤ اور جب رخصت کی طلب ہو تو اپنا سارا ہی بستر پورا صیبت کر دہاں سے کوچ کرلو۔ قدموں کے نشان تک مت چھوڑو۔“
”یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ تم تو بہت سی تبدیلی کی باتیں کر رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

”تم عمر میں مجھ سے چند سال چھوٹے ہو۔ شاید پندرہ سال میں تمہارا سوپنے کا انداز بھی میرے جیسا ہو جائے۔ شرطیکہ تمہیں بھی وہی تجربات حاصل ہو سکیں جو مجھے ہوئے ہیں۔“ وہ بولی۔ میں نے وہ پہلی عورت دیکھی تھی جو کم عمری کے کوشش نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ وہ چاہتی تو اپنی عمر چھپا سکتی تھی۔ اس کا سراپا ایسا ہی تھا۔ میں نے ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں جن کے بارے میں سبھا طور پر کہا جاسکتا تھا کہ جیت میں آنت نہ منہ میں دانت۔ مگر میں نے بات بات پر انہیں یہ بھی کہتے سنا تھا ”میری عمری کیا ہے۔“
”بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں عمر کی میڑھی پر دوسروں سے ذرا اوپر کھڑے ہونا پڑا نہیں لگتا بلکہ وہ دوسروں کے چھوٹے پن، خصوصیت اور نا تجربہ کاری سے محفوظ ہوتے ہیں۔“
”مجھے ایسے تجربات نہیں چاہئیں جو انسان کو کھوڑا بنا دیں۔“

میں نے کہا۔

”تبدیلی اور حقیقت پسندی کے درمیان بہت باریک سی لکیر ہے۔ اور میں حقیقت بند ہوں، تشدد نہیں“ وہ بولی ”جو تجھے میرے جتنے ہیں وہ“ میرے ہاتھ میں ہو“ میں اس کی حکایت کے احساس سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ جو اچھے سے چل جائے اس کے لئے قہوڑی دیر افسوس ضرور کرتی ہوں ”زیادہ باریک چیز ہو تو اس

کا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر اپنے آپ میں محکم رہتا ہے لیکن نیچے کہ وہ پرئس خینہ کی عمرانی پر مامور ہے۔“
”میں نے تصدیق کی“ اس کے علاوہ تو کوئی نہیں آیا؟“

”جی نہیں۔ عمرانی کہنے والا تو کوئی نہیں لگا۔ لیکن ہوٹل کے میں بھی مجھے نچلے درجے کے دوایک ملازمین پر شہبہ ہے کہ ان کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پرئس کا میگزین بھی کچھ ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔ وہ صرف میگزین نہیں مہوتا۔“

میرا مشاہدہ قابلِ داد تھا۔ ابھی اسے عمرانی پر مامور نہ تھے تھے مگر وہ جیسے لیکن اس نے بہت سی باتیں سمجھ ساری پاور بہت سی باتیں سمجھ سکتی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ عمرانی جاری رکھو لیکن غیر معمولی طور پر محتاط۔ اور اگر ڈیوٹی بدلنے کی ضرورت پیش آئے تو اپنی جگہ احمد اور ب کو مامور کرنا۔“ میں نے ہدایت کی۔

”مگر ازم و آزمائش کتنے کتنے تھیں اور مسعود عمرانی جاری رکھ دیں سر!“ میرے جواب دہ ”اس میں کسی خاص ہنگام دوڑ آتا نظر نہیں آ رہا ہے اس لئے شاید ہم اس سے زیادہ وقت کے بھی مسلسل عمرانی جاری رکھ سکیں۔ سر حال اگر ضرورت پڑی تو انتظام کروں گا اور آپ کو اطلاع دے دوں گا۔“

میں نے خدا حافظہ کر کے ریسیور رکھا ہی تھا کہ کیتھرن نے لارووی ظاہرہ خاتم مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے لائن کے لئے کہا۔ ظاہرہ خاتم میری آواز سننے ہی بولی۔ ”کیا آج تین ہی رات گزارنے کا ارادہ ہے؟ خدا خیر کرے“ ٹیکسٹری بھی لی موجود ہے۔“

”بدمعاشی والی تنگدوست نہیں چلے گی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
”کیوں؟ تمہیں ڈر ہے وہ سن لے گی اور برا مان جائے گی؟“
”میرے دفتر میں ایسی سیکرٹریاں نہیں پائی جاتی جو میری اجازت کے بغیر کسی سے میری تنگدوست کے بارے میں اس حد تک گفتگو میں لگا ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے مگروفون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم مگر پہنچ چکے ہو گے۔“

”ہاں۔۔۔ کبھی کبھار دیر ہو جاتی ہے۔“
”اس باکس کا کیا راز؟ اچھا کیا؟ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ انگریزی کا ایک نماد ہے نہ جس کا مطلب کچھ والا ہے۔ گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ وہی گھاس جسے بغال میں پرانی کہتے ہیں۔ تو اس باکس کی مثال بھی اب کچھ ایسی ہی ہوئی ہے۔ اسے تلاش کرنا سوچیں گھاس کے انبار میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے تمہاری صحبت کا عمل کرتے ہوئے اس پر غصہ بھیج دی ہے۔“

ہمت ہی عجیب قسم کی مصوفیت۔ میرا تو خود تمہاری طرف متوجہ رہا تھا۔

تو فوراً بولے۔ "مگر میں ہی ذمیت میں کر چھیں فون نہ سہا دھت ہمارے میں کر چھیں اپنے ہاں ہلائی۔" قلمی پیرائے کی مصوفیت کی مثالیں دیتے ہیں لیکن ہیں کہ تمہاری آمد کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی تمہارا نے کے لئے وقت نکال لینے ہیں۔ ہمارے بعد چھیں ایسے نے نہیں ملے گے۔

ہمارے بعد چاہئے والوں کو تلاش ہی کون کبھت کرے ہنٹے غلوں سے کہا۔

سب مت دیکھ کی باتیں ہیں۔ "اس کے لیے میں واقعی ضروری کرتی تھی۔"

اس وقت تو خیر میں تمہارا مت دیکھے بغیر بات کر رہا ہوں۔ علوم ہی سے ٹیلیفون پر مت تو نظر نہیں آتے تھے۔ میں مت اچھے ہیں۔ میں نے اسے کھٹکتی کی طرف لانے کی کہ۔

میں نے عاودہ استعمال کیا تھا۔ "وہ بولی۔"

اتنی دیر نہیں کہیں ہو رہی ہو کہ عاودے ہونے پر اتنی بے ادب بھی بگڑے بھگتے انداز میں پوچھا۔

جب کئی دن تک تم سے ملاقات نہیں ہوتی تو میں ایسی ہی ہوں۔ بلوچر تاحر مصوفیت کہ۔ "وہ مجھے لیے میں بولی۔"

میں بس آج کل میں تمہاری طرف آنے والا ہوں۔ "میں نے چین دلائی۔" "مور تو سب ٹھیک خاک ہے نا؟"

ہاں۔ ٹھیک ہی ہے۔ "وہ کچھ ہم دیکھی سے بولی۔ پھر چھ عیاد کیا ہیں ایک خرچا بیہ کیا ہے۔"

ایک خرچا بیہ کیا ہے؟ کوئی بکری یا بکری یا بکری ہے کیا؟

بکری یا بکری نہیں البتہ بکرے یا بکری یا بکری ہے۔ میرا خیال ہے ایسی ہی کتا زیادہ مناسب ہو گا۔ وہ تو خوار قسم کے بکری میرا ہے میں نے اپنی حفاظت کے لئے وہ مسلح گارڈ رکھ لئے۔

وہ بولی۔

آج پھر انہیں بکرے ہی کہہ "قربانی کے بکرے۔" میں نے لیکن چھیں ان کی کیا ضرورت آن چڑی؟

مصطوف نہیں کیوں مجھے کچھ دہم سارہتا ہے کہ جیسے ہر وقت گھرانی ہو رہی ہے۔ مصطوف نہیں میری کون ہی حس بگڑے لڑائی دیتی ہے کہ کوئی ٹاپوید یا مصطوف تاکہ مجھے دیکھ رہی کی بار کبھی آتے ہاتھ یہ احساس بھی ہوا کہ میرا تعاقب ہے۔ میں میں سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن ان باتوں کا دہم سا

دہنہ لگا ہے۔ میں نے سوچا احتیاطی سہڑ ہے۔ "وہ نہایت کی سے بات بتا رہی تھی۔"

مگر کہ تو تم نے مجھ سے ذکر کیا ہوتا۔ میں چھیں آدمی رہا۔

کرائے کے قومی۔ میرا مطلب ہے اگلی بندھی تنخواہ پر کام کرنے والے یہ روایتی سے حفاظت کوئی خاص کار آمد نہیں ہوتے۔"

"اوسے چھوڑو" وہ شکوہ تمیز سے مجھے میں بولی "تم نے تو قسلیاں دینے دیتے ہی وقت گزارتے رہا تھا۔ اس دوران خواہ یہ بندھی ہی گزر جاتی۔"

"میری نیت جیونی قسلیاں دینے کی نہیں ہوتی" میں نے بھی تنبیہ کی سے کہا۔ "کیا تم میری بات کو سمجھ نہیں سکتی؟ میں شروع میں ان باتوں کو زیادہ تنبیہ کی سے نہیں لیتا۔ بلکہ اپنے معاملے میں تو آخر تک بھی میں ان معاملات کو اہمیت نہیں دیتا۔ اب جبکہ میرے

گھر کا ماحول دشمن کا جال تک ہو رہا ہے میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی گھرانی سے بالکل منع کر دیا ہے۔ لیکن تمہارے لئے دوسرے حال ہو تم نہیں دو کیا جاسکتا تھا۔ اب میں تمہاری طرف سے اتنا بھی بے

پردا نہیں ہوں۔ خیر۔ اب بھی میں اپنے ایک آدمی کی بیوی لگاتار ہوں۔ وہ دور سے تمہاری گھرانی کرتا رہے گا اور اگر کوئی تمہارا تعاقب کرنا ہے یا نہ میں نہیں رہتا ہے تو وہ اس کی بھی چھان بین کر لے گا۔"

"اوسے نہیں" وہ یکدم بدلے ہوئے ٹکفٹے لیے میں بولی "اب

اتنا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ویسے ہی نہیں چھیز رہی تھی۔ کرید رہی تھی کہ چھیں میری کچھ پروا بھی ہے یا نہیں۔ تمہارے لیے کی تشریح ہی میرے لئے کافی ہے۔ ان

مسائل سے دوسری میں بھی نہیں گاڑو تو میں نے پونہی بس احتیاطاً رکھ لئے ہیں۔ بھی کوئی میری گھرانی کرنا ہے تو کرتا رہے۔ تعاقب کرنا ہے تو کرتا رہے۔ ہمارا میں جانتے جب کوئی کچھ کرے گا تو

دیکھا جائے گا۔ جو مفرد میں ہو گا بگڑت میں گم۔ دیسے تو میں نے روایتی سے نہیں دیکھ اچھے تو ہی ہیں۔ اسنے کے استعمال

میں باہر ہیں اور جڑو کرنا تو خود بھی جانتے ہیں۔ مجھ سے کے بھی ہیں۔ کبھی کبھی میں انہیں غلوں میں اسٹنٹ میں کے طور پر قہوڑا

ہمت کام دلوا دیتی ہوں۔ ایسے اسٹنٹ میں ہیں۔ انہیں غلوں میں اس طرح کام کرنے کا شوق بھی ہے اور انداز شری میں آجکل اس قسم کے قومیوں کی ذرا کمی بھی ہے۔ تنخواہ کے علاوہ انہیں آمدنی بھی

ہو جاتی ہے۔ بے چارے خوش ہو جاتے ہیں۔ سرکاری کمانڈو رہ چکے ہیں۔"

"چلو تم کہہ رہی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔ لیکن میرا ایک آدمی۔۔۔

بہر حال جو میری حفاظت کے لئے تمہارے پیچھے رہا کرے گا۔" میں نے فیصلہ کن نیت میں کہا۔

"اوسے نہیں۔ بس اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا

تا کہ حقیقت میں تو میں بھی تمہاری ہی طرح مسلکوں اور دوشوں کے سے انداز میں سوچتی ہوں۔ کم از کم زندگی اور موت کے بارے

میں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"تو پھر کارڈ کس لئے رکھ لئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

تاریخی ناول

خالد بن ولید الماس ایم۔ اے
سلطان ٹیپ شہید الماس ایم۔ اے
نواب حیدر علی خاں الماس ایم۔ اے
سلطان صلاح الدین ایوبی الماس ایم۔ اے

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

کہا۔

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "ہاں۔ واقعی۔ تمہارے عالم تو دکھائیں جا رہا۔ صبح تمہارے فون کی گھنٹی سے ہی ہے اور رات کو بھی تم سے ہی باتیں کرنے کرتے سوئی ہو۔ میں نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ آج پر مڑ کر اٹھنے کو لے رہے تھے کہ دماغ کی چونکیں اٹھیں۔ آج کی شام ہی بد نصیب تھی۔

"راجلہ! اگر میں چند دن حسیں فون نہیں کر سکا تو مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں بھول گیا یا میرے دل میں تم کہ ہو گئی؟" میں نے دھڑاک لگے میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر تم مزہ نہ چاہو فون نہیں کرو۔ زیادہ متاثر ہو جاؤ گی۔ میں کبھوں کی میری جدائی میں حال ہو گیا ہے کہ آنکھیں دھندلا گئی ہیں۔ ٹیلی فون دکھائی نہ آتا ہے۔ ہمارے فیروزا کی نہیں ہوتا۔ شہت تم سے خائف دے گیا ہے۔ میرا خیال یہ کہ یاد نہیں رہا۔ خبر نہ لے سکیں؟ میں کیا تھا وہ نہ ہی تمہیں کہیں سے لے سکتا تھا کیونکہ ارض پر تو رہتی تھیں۔ دوسرے سیارے پر رہتی ہوں۔ ہاں۔ بھلا کس طرح ہو سکتا تھا؟"

میں بالکل خاموش رہا۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد "کیا تو سنو؟ کوئی بھی جواب نہ دے سکتی؟"

"جس بے چارے کے ساتھ اتنی بری ہو رہی ہو وہ تو قاتل رہے گا؟" میں نے مزہ سے لہجے میں کہا۔

"پھر بھی کچھ تو بولو۔ کوئی جھوٹ سی بولو۔"

"میں اچھا بچہ ہوں۔ جھوٹ نہیں بولو۔" میں نے نیچا

کہا۔

وہ طرہ۔ انداز میں ہنسی "میت خوب! اس سے بڑا جھوٹ کیا ہو سکتا ہے۔"

"میں بھی شوق میں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "تو ہی ذرا دی اتنی لی جا سکتے گنا ہے۔ اور اگر پہلے ہی سے دیکھ اتنی لی ہو تو ذیل دی اتنی لی ہو جاتا ہے۔ علم استاد کو دینے بھی ضرورت رہتی ہے۔ دکھائیں۔ کبھی بھی مداح اور پرستار کسی بد تیزی پر اتر آتے ہیں۔ کبھی کسی جگہ اپنا کس طرح جہم ہو جاتا ہے۔ اعصاب عقیدت کے طریقے بھی تو ہمارے ہاں کچھ عجیب ہیں۔ لوگوں کا بس نہیں چنا کہ اپنے پسندیدہ فنکاروں کی ہونیاں فوج ڈالیں، اس کی گازی توڑ ڈالیں اور اس سے ایسا سلوک کریں کہ وہ کبھی پلنگ مقامات پر آنے کی جرأت نہ کرے۔"

"شاید آتے آتے کبھی سلیقہ بھی جائے۔ پیستہ وہ شجر سے امید بدار دکھائیں نے غنڈی سانس لے کر مشورہ دیا۔

"ہاں۔ بدار اتنی ضرور چاہئے۔ بھول کھٹے ضرور چاہئیں۔ خواہ ہماری قبریں کھلیں۔" وہ غنڈی سانس لے کر بولی۔ "مٹی الخال تمہارا کیا بد کر ام ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک بینک میں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم سے جب بھی پوچھو تم کسی بینک میں جا رہے ہوتے ہو یا بینک سے آ رہے ہوتے ہو۔ تم تو بڑے من کے بجائے کوئی سرکاری افسر معلوم ہونے لگے ہو۔ خیر۔ میں تمہارے فون کی منتظر رہوں گی۔" اس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منتقل کر دیا۔

میں ریجور رک کر اٹھنے کے لئے اپنا ریفر کیس و فیو وی سنبال دیا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور شری سی ہنسی کے ساتھ کیتھریں نے بتایا "اب کراچی سے راجلہ کی کال ہے۔"

"سوہ مائی گاؤ!" میں دھم سے دوبارہ کرسی پر گر پڑا۔ آج تو عجیب سی اتفاق ہو گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا تینوں عورتوں کے فون آج ہی۔ اور اوپر تلے ہی آئے تھے؟ تینوں میں سے کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جس کے لئے میں کیتھریں سے یہ کہنے کا تصور کر سکتا کہ اسے ٹر خاوا جائے۔ راجلہ کے فون کی اطلاع سن کر تو میرا دل عجیب سی انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے روز فون کیا کروں گا لیکن پچھلے دس روز میں ایک مرتبہ بھی یہ وعدہ نہ تھا۔

کسی یا خیر پھر کی طرف شرمندہ سے لہجے میں "میں نے کیتھریں سے کہا "لاؤ۔"

گلاب کی جلی سی آواز کے ساتھ راجلہ کی آواز ابھی جو دم دے میں نشہ سادہ ڈال رہی تھی۔ وہ بلا تشدد بولی "کچھ ہے جب کوئی چیز حاصل ہو جائے تو اس کی وہ قدر نہیں رہتی۔ بعض لوگ اچھا نہیں کرتے کہ اپنے عشق کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ میں انہی بد نصیبوں میں سے ایک ہوں۔"

"حاصل حصول کی خبریں تو بہت دور ہیں راجلہ زہرا! ابھی تو تم نے جی بھر کے باتیں کرنے کا بھی شوق پورا نہیں ہوا اور تم نے بے قدری کے شکوے شروع کر دیے۔" میں نے حقیقتاً کہا کہ

”ہندی آئندہ احتیاط کرے گی عالم پناہ! وہ اپنی کواڑ میں لڑش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”میرے کچھ بچے جو کہ زیادہ طویل فون کال کرنے کی عقل نہیں ہو سکتی اس لئے اب فون بند کر رہی ہے۔“

”کیا فون کرنے کا مقصد صرف بعض طعن کرنا ہی تھا؟ اتنی دیر میں تم نے مدح کو سطر کرنے والا ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ اصل کو خوشی دینے والی ایک بھی بات نہیں کی۔“

”فون تو تمہیں صرف یہ یاد دلانے کے لئے کیا تھا کہ کراچی میں صرف تمہارے بڑے پارنر اور بڑے کو چلانے والے کارندے ہی نہیں رہتے، کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں، جو بے شک تمہارے لئے کچھ کاتے نہیں مگر جن کے دل تمہارے لئے دھڑکتے ہیں اور جو بڑے تمہیں یاد کرتے ہیں۔“

”مے ہندی خاص اور کثیر عام! جا کر ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہم جلد ہی ان سے ملنے آ رہے ہیں۔“ میں نے ٹاپانہ لہجے میں کہا۔ ”اور اگر ان کے دل واقعی تمہارے لئے دھڑکتے ہیں اور وہ واقعی ہر لمحے ہمیں یاد کرتے ہیں تو پھر انہیں ہم سے رسی کسم کے گلے لٹکے ہرگز نہیں کرنے چاہئیں۔ سب بے ٹیلی فون کالز کے محتاج نہیں ہوتے۔ ہندیوں کو تو اپنا نواب خود بخود مل جاتا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر قمام لیا۔ آج کیے بعد دیگرے تین عورتوں کے فون آئے تھے تو مجھے احساس ہوا تھا کہ کہیں میں کچھ زیادہ سی تو نہیں اچھا کیا تھا۔ اصل میرا یہی کتا تھا کہ عشق مجھے صرف رابطہ سے قلعہ لیکن اگر میں ستاد سے قطع تعلق کرنے کے بارے میں سوچتا تھا تب بھی میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ اور اگر کسی میں پیچھا تھا کہ اس سے میرے تعلق کا انجام کیا تھا؟ تب بھی کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ ایک اچھی یا بری بات یہ تھی کہ خود ستاد نے آج تک نہیں پوچھا تھا کہ اس کے اور میرے تعلق کا انجام کیا تھا۔ ایک کشش تھی جو بس خوابشات اور محسوسات کے دھارے پر بہتی چلی جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی؟ یہ تو اسے معلوم تھا اور نہ ہی مجھے۔

یہ بے حیل سفر تو اپنی جگہ قہار لیکن اب اس طاہرہ خانم نے اگر ایک ہی رات کی ملاقات میں مجھے کسی انہماک بندھن میں جکڑ لیا تھا۔ وہ بھی یکدم ہی مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بے پناہ حسین تھی۔ لیکن بر حال نوازانی میں وہ دو مرتبہ یہ وہ چکی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کی عمر نہ جانے کس کس دشت کی سیاحتی میں گزری تھی۔ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑی بھی تھی۔ ستاد کو کو میری ہم عمری تھی لیکن گھات گھات کا پانی وہ بھی پئے ہوئے تھی۔

رابطہ! جس سے میری دانست میں مجھے مشتق تھا کہو کہ بہت سی نہیں بہت سی اونچی چیز تھی۔ وہ میرا آئینہ دل تھی! ایسا آئینہ دل

”یہ مجھ تو نے ہی بحر کے مجھے شرمندہ کر لیا۔“ میں نے غماص لہجے میں کہا ”مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ تم جو سزا دو مجھے قبول ہے میں اگر محض تمہارا شکوہ در کرنے کے لئے دواچی اور رسی انداز میں نہیں فون کرنا چاہتا تو جیتے گزشتہ دنوں میں کئی بار کر سکتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک تو تمہیں فون کرنا ایک خصوصی کام تھا۔ میں تو نہایت فرصت میں نہایت اطمینان کے ساتھ تم سے نہایت لمبا لمبی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں یہی میری غلطی تھی۔ مگر اتنی فرصت میرے آہل! ایسا خصوصی موقع نہ مل سکا اور فون نہ کیا جاسکا۔ اب بتاؤ اس کی مثال کسی طرح کروں؟ پر سوں تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟ گلے لٹکے کچھ کہہ دوں؟“

”اب اتنے بڑے جھوٹ بھی مت بولو کہ دم ہی نکل جائے۔“ وہ منظر ہی نہیں کے ساتھ بولی۔ ”یہ تو پر سوں ہی پتا چلے گا جب یہ بھلا ناچے ہو تو فون کی طرح نہ اٹھا کر تمہارے در در ملت پر دیکھ دے رہا ہو گا۔“

”در غرت کو۔“ اس نے بھیجی کہ ”اب میں تمہیں اتنی زیادہ بھی تکلیف نہیں دیتا چاہتا۔ اب تم صحیح معنی میں بڑے سن ہو۔ جتنا وقت میرے پاس آئے اور جاتے میں ضائع کرو گے اتنی دیر میں تو دو چار لاکھ روپے کما لو گے۔“

”صاف فوہ! میں نے ایک سال کے لئے دانت بھیجنے کے بعد کہا کہ اب تو بے اختیار سر پہنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میرا بڑے سن ہو تو میرے لئے طعنہ بن گیا ہے۔ لیکن کم از کم تم مجھے روپے پیسے کے لالچ کا طعنہ مت دینا۔ ورنہ ابھی سب کچھ چھوڑ چھاؤ کراچی سوٹ میں کراچی پہنچ جاؤں گا۔“ لکھ نہیں۔ یہ سوٹ بھی مرگا ہے۔

امارت کی نشانی ہے اسے بھی نہیں چھوڑ دوں گا اور لڑا بازار پہنچ کر کسی سرے ہوئے انگریز کی ٹیکر بلش شرت خرید کر پہن لوں گا۔ کسی زمین کے تھوڑا کلاس ڈپٹے میں بیٹھ کر آجاؤں گا۔ پھر گزرا کر لو کی میرے ساتھ؟ زندگی بھر؟“

وہ بے اختیار ہنس دی۔ اس کی حرم اور کلکتی نہیں دل کے بچے حصار پر ادا رہی کوئی تھی۔ غصہ تو اسے پہلے بھی کم تھا۔ اصل میں تو غصے کی ادا کاری ہی زیادہ کر رہی تھی لیکن اب اس کی ہنسنے بتا دیا کہ جو تھوڑا بہت غصہ تھا وہ بھی میرے غلوں کے روپے میں بر گیا تھا۔

”تم بہت بد معاش ہو۔ میرا کافی دیر تک تم سے خفا رہنے کا ارادہ تھا لیکن تم نے بہت جلد مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔“ وہ ہنسی منہ کرتے ہوئے بولی۔

”یہ امر از صرف تمہیں حاصل ہے کہ تمہارے غصے پر مجھے غصہ نہیں آتا۔ پھر آتا ہے ورنہ غصے کے جواب میں مجھے خود زیادہ غصہ آنے لگتا ہے۔ کوئی صرف خواتین تو میرا اس پر داؤنے کوئی چاہتا ہے۔ کوئی آپس میں دکھائے تو میرا گھونٹا دکھائے کوئی چاہتا ہے۔“

لے لئے بھرتے تھے۔ پھر بھی کم از کم مجھے ان پر مرٹھے سے پڑنے کے لئے سوچنا چاہئے تھا۔ وہیں سے نہیں سوچا تھا۔
جبکہ اس سے پہلے زندگی کے سفر میں نہ جانے کتنی چڑچڑاہٹوں کو نہ جانے کیسے کیسے اچھڑے دیکھوں کو نہ جانے۔
پاکیزہ ہوں کو نظر انداز کرنا ہوا چلا آیا تھا۔ ان میں۔
بھی زندگی کا ساقی ہو سکتا تھا کوئی بھی میرے پیسے ہوئے
بعد شوق قائم سکا تھا کوئی بھی لازوال سمجھوں کا دعوے دار
تھا کوئی بھی ایسا مہربا جس کے ماضی سے کوئی لعش واپس
تھی۔ کوئی بھی ایسا نازک خیال جس کے وجود کی چاندی کہ
میں کی حرارت سے پگھلی نہیں تھی۔ مگر میں نے بھی ان کی
خاصی توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔

میں ایسا تو نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو جتنی مضبوط خواہ
کا مالک سمجھتا تھا، اندر سے درحقیقت اتنا ہی کمزور تھا۔
جذبے تو آتے تھے، میری سوچیں بے کام تھیں، میری خواہ
سمندر تھیں اور ضبط کے بند کچے؟ شاید ایسا نہیں تھا بلکہ
صرف اتنی تھی کہ میری ذہنی سطح میرے آگے بڑھتی تھی۔
سوچوں کا سفر شاید بہت تیز تھا۔ مگر تھیں، مگر میں نے کچھ دیکھ
نظر میں بیچے ہی نہیں تھے شاید سوچ کی اسی تیز رفتاری نے
دنیا کی کامیابیاں بھی جلد از جلد حاصل کرنے میں بڑی مدد دی
خیالوں کے یہ پھینکی ہوئی نگوں کی ڈار کی طرح ذہن کے آ
ازے پہلے گئے۔ اچانک میں نے چنک کر بھر پھری سی۔
حقیقتاً خوفزدہ سی نظروں سے فون کی طرف دیکھا اور دل ہی دل
اپنے آپ کو سمجھایا۔ پر خردوار الی! اس سے پہلے کہ فون کی
ایک بار پھر بجے، تم اپنا یہ بد حال تجزیہ یا تحلیل نفسی وغیرہ
کو اور نہ کرنے کا کام ہے۔ وہ کہو زندگی کو کوئی تنگ کی طرح
وہ خواہ منہاں منہاں کر رکھو، اسے تو جس طرح گزرتا ہے
طرح گزرتے گی۔ زیادہ براطامت ہو اور نہ ہی اپنے آپ کو
اوتھنے سگھاس پر غما کر اپنا جائزہ لو۔ جیسی گزرتی ہے گزرتی
وہ دیکھا جائے گا۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا۔ تم میں
کون سا شرفاب کا پر لگا ہوا ہے جو اپنے بارے میں ایسے تشو
زہ ہو کر سوچنے لگے ہو؟ اس سے پہلے تو تم پر اس طرح کا وہ
پڑا تھا۔

میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنے دائرہ
لائن والے فون کی طرف ہاتھ بوسایا اور اپنے چند ماحول
ضروری ہدایات دیں۔ انہیں ایک حتمی پتہ دین کے بارے
سمجھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اپنے آئین کے ہیونٹی جیسے میں آیا تو کیتھرین احرام
کھڑی ہوئی۔ اس کی میز کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ر
کر کہا، "کیسی! صاف کرنا" آج میری وجہ سے تمہیں بھی بہت
تک پہنچنا پڑا۔"

میں نے لڑکھن کے زمانے میں، میں صرف ایک حسین بت کی طرح
ذہن میں تراش سکا تھا، بھی پائے کا تصور نہیں کر سکا تھا۔ میرے
بیکراں عشق کو اپنی باتوں میں میٹھنے سے پہلے اس نے میرے دل پر
گھرا گھاڑ بھی لگایا تھا۔ کسی اور کی بین کر اس کا گھربانے کی کوشش
بھی کر دیکھی تھی۔ اس کے باوجود ہم گھٹنا لگات کے مرھائے
پہل لے اچانک سی زندگی کے ایک سوز پر مائے آجی تھی تو کچھ پر
اکشاف ہوا تھا کہ میرے دل میں تو اس کے لئے وہی شعلہ فرداں
تھا جس سے آقاؤ عشق میں دل منور تھا۔

ستم عمر لڑی تھی کہ میں تو تپتی کے لئے بھی بے چین تھا۔ اسے
میں نے گویا پائے سے پہلے ہی کھو دیا تھا۔ جب وہ میری ذرا سی نظر
الغفات کے لئے بے چین تھی، دیدہ و دل میری دوا میں بیچائے
رکتی تھی تو حیرا ذہن نہ جانے کہاں اچھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی
طرف پیش قدمی کی سہلت نہیں ملی تھی لیکن جب وہ پراسرار
حالات میں یکدم غائب ہوئی تھی تو مجھے بھی اچانک احساس ہوا تھا
کہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی بات ضرور تھی۔ میں اسے
تلاش کرنے کے لئے بے چین ہو گیا تھا بار بار میں نے دیر تک اس
کے بارے میں سوچا تھا اس کے بارے میں غور نہ ہوا تھا کہ نہ
جانے اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ مجھے اس کی خاموش عقیدت میں اس
کی نگاہوں کی پیاس اس کا ایسا بے تلاش بار آتا رہا تھا۔

اب میں وہ سب بھٹیاد کرنا تھا تو احساس ہوا تھا کہ وہ جذبات
کی تمام شدتوں سے میری طرف بڑھنا چاہتی تھی لیکن اس کی بہت
نہیں پڑتی تھی۔ شاید وہ کیا سمجھتی تھی کہ میں اس کی بے غرض
چاہت کی پڑائی نہیں کروں گا۔ اسے وہ مقام نہیں دے سکوں گا
جس کی وہ خواہش مند تھی۔ اور یوں اس کا شیشہ دل ٹوٹ جائے
گا۔ اس نے اپنے پندار کو مجموعہ کرنے کے بجائے اپنی ذات کے
ذہن میں سکھنے سے رہائی بہتر سمجھا تھا۔

اب جب سے میں نے اسے پر نفس حینہ کے دھب میں پھنسا
تھا تب سے اس پر گزرتے ہوئے حالات کو جاننے کا جنس تو ہے
تاکہ ہوا ہی تھا لیکن اسے یہ بتانے کی خواہش بھی بڑی شدت سے
ابھرتی تھی کہ اسے کھونے کے بعد میں نے اس کے بارے میں کیا
محسوس کیا۔ کس طرح اس کی طلب میرے دل میں جاگی۔

آج پہلی مرتبہ ایک وقت ان سب عورتوں کے بارے میں
سوچنے بیٹھا تھا تو یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر میری ذات
میں یہ کیا نشا بپا تھا؟ یہ کون سی پیاس تھی جو مجھے ساحل ساحل
بھٹا رہی تھی؟ اس میں شک نہیں تھا کہ اپنے اپنے ناقابل رشک
ماضی کے باوجود یہ عورتیں معمولی عورتیں نہیں تھیں۔ اپنی اپنی
جگہ پر ہر ایک بہت مختلف اور بہت غیر معمولی تھی۔ اس کے باوجود
اگر میں خود زنا سا خوبست ہو کر سوچتا تو ان کا اور میرا ساتھ کچھ
چلتا نہیں تھا۔ گو کہ ان میں سے ہر ایک ایسی تھی جس کی ایک ذرا
ی نظر لگات کے لئے نہ جانے کیسے کیسے لوگ متاع نباتات جیلتی

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سنگتراش

اوہا پرستی کے نئے رنگ میں رنگے ہوئے جبرین قبیلہ کی طلسماتی داستان
آتش کھسے کا متحسک پردہت بائینی پر اسرار اور ماورائی طاقتیں اس کی غلام تھیں۔
جس سے جبرین کا سردار جو با بھی خائف رہتا تھا۔
ایک سنگتراش کی محبت کا دلداز فسانہ جس کی محبت کی روح پردہت کے قبضے میں تھی۔

اقلیم علیم کے پر اسرار قلم سے

خواص صورت سرورق، دیدہ زیت کتابت و سرورقے

دو جلدوں میں مکمل

جلد اول : - ۱۵۰/-

جلد دوم : - ۱۵۰/-

کتاب اپنے قارئین کو سب سے پہلے
قاریوں یا کہانے کے تمام مکمل قیامت کا
مافی آئندہ کی سال قریب آئے
کتاب آپ کو
بذریعہ سہ ماہی کتابت و سرورق

نخط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور، فون ۲۲۳۶۶۵

قلم زیادہ نہیں تھا۔ نام میں نے اسے نہایت سست رفتار سے لے کیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو جو ہدایات دی تھیں میں نے ان پر عمل درآمد کے لئے سلسلہ چاہتا تھا۔

اتر کان کی پارنگ لائن میں پہنچ کر میں گاڑی میں بیٹھ رہا۔ بظاہر میں نے سرسری سے اعزاز میں امداد کا ہاتھ لیا۔ گاڑیاں تو بہت سی موجود تھیں لیکن کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گاڑیوں کی نگرانی کرنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے پورے خفیہ خانے سے ریڈیو کا ایک کھلا اور صندوق سے دھماکا قائم کیا۔ صندوق میرے اس ساتھی کا نام تھا جسے میں نے کچھ دور پہلے طلب کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور کوئی سیلین قلم لٹاؤی تھا۔ تاکہ مجھے ان دونوں کی ضرورت پڑی جاتی۔ میں نے صرف اسی شخص کو مختلف مقامات پر تعینات کرنے کے لئے بلایا تھا۔ اگر چھوٹا سا کام کرنا ضروری ہو جاتا تو میرے ذہن میں اتفاقاً صندوق سیلین بہت کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔

"میں سر" صندوق نے منتقلی کے لئے اور کوڑاؤ سننے کے بعد کہا "میں اور سیلین اپنی پوزیشن پر پہنچ چکے ہیں۔ آپ کا منتقلی کے ہم حرکت میں آجائیں گے۔"

سیلین جو اس وقت دوسرے پوائنٹ پر موجود تھا "وہ ہماری منتقلیوں کا تھا۔ میں نے اسے طلب کیا تو وہ بلا میں نے اتر کان کا بیچلا چھوٹا گیت میری نظر میں ہے۔ اور حرکت چلی۔ اور اتر جہاں بھی ہے۔ پارسل اگر دوسرے لے جانا پڑا تو زیادہ اہم رہے گا۔"

"دیکھیں گے جیسی بھی پوزیشن ہوگی۔" میں نے ہنس لے کر کہا "یہ کچھ ایسا معاملہ ہے کہ اس میں عملی اوزار وقت کوئی خاص ہدایت نہیں دی جاسکتی۔ میں ممکن ہے کہ یہ کام کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ کوئی دوسرا راستہ نکل آئے خدا حافظ۔" میں نے ریڈیو کو ہٹ کر خفیہ خانہ بند کیا اور گاڑی سے اتر گیا۔ مونڈک اور ڈھنگوار تھا۔ اتر کی گھری ہوئی تھی لیکن اتر کان امارت اپنی روایت کے مطابق جھنگواری تھی۔

پارنگ لائن اور اصل امارت کے خویل و مریض ڈرائیو کے درمیان ایک اونٹنی راہ را حاکم تھی جس کے تقریباً وسطیہ دروازہ موجود تھا۔ اس سے گزر کر میں ڈرائیو دے میں آیا تو دروازے کے سامنے گاڑیوں کی آلودہ رفت اور خوب چل چل تھا۔ انہی صورت حال کو یا میری خواہش کے عین مطابق تھی۔ یہی چاہتا تھا کہ جب میں ہول پھیلے تو وہاں خوب گھبراہٹ ہوگی۔ ہول میں مختلف شہنشاہوں میں کام کرنے والے اہلکار ہیں۔ بیشتر لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ آئے جانے والوں میں بھی اکثر شہنشاہ صورت آشنا نکل آتے تھے۔ لیکن زیادہ گھبراہٹ کی صورت بہت مشکل تھا کہ میری طرف کسی کی توجہ جاتی اور کوئی میری آمد یاد رکھتا۔ آج کل ڈاکٹر شری وجہ سے دیئے جی بہت سے ایسے

کیتھن کے چہرے پر ہلکی سی سرفی آئی۔ وہ کھنکھنی سی آواز میں بولی "سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ پاس بھی کیس سندھت کیا کرتے ہیں؟ دفتر میں جو بھی دیر تک کام کرتا ہے اسے اتنا اور نام ملتا ہے جتنا کسی اور دفتر کسی اور کارخانے میں نہیں ملتا سر!"

"وہ صرف ہمارے وقت کا معاملہ ہوتا ہے۔ لیکن جس غلوں سے میرے ساتھی میرے لئے کام کرتے ہیں اس غلوں کا میں کوئی معاوضہ نہیں دے سکتا۔" میں اس کے کندھے پر ہلکی سی ہتھکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میری یہ ہتھکڑیاں اور یہ ہتھکی گاڑیوں کی فلوپس نہیں تھیں۔ میں واقعی دل سے اپنے کارکنوں کے غلوں کا معترف تھا۔ میری ترقی میں ان کی اٹھک محنت کا بڑا دخل تھا۔ اسی لئے میں نے اپنے کاروباری نظام میں ایسی بہت سی شخصیات رکھی تھیں کہ میرے ساتھ دھیرے دھیرے یہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ ترقی کرتے چلے جائیں۔ ان کے بھی حالات کچھ نہ کچھ بدلتے چلے جائیں۔ شاید یہی وجہ تھی۔ یا پھر یہ بھی محض میری خوش قسمتی کی ایک اور مثال تھی کہ جو کارکن میرے لئے صرف دفتری اور کاروباری خدمات انجام دیتے تھے وہ بھی میرے جاں نثار تھے۔

فنی "سردار شیخ" ضیف "شیرج" شیخ شاہ اور ان چہرے دوسرے پچاسوں جہان تو مشن کے سے اعزاز میں میرے ساتھ تھے۔ کاروبار بھی سنبھالتے تھے اور دوسرا کوئی حکم بجالانے کے لئے بھی مستعد رہتے تھے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنہیں گمان تک نہیں تھا کہ میری کچھ غیر کاروباری مصروفیات بھی ہو سکتی ہیں۔ عام سطحوں کے برعکس میں بہت سے خطرناک معاملات میں بھی ہاتھ ڈال سکتا ہوں یا اپنے آپ کو بہت خطرناک سمجھنے والے طاقتور لوگوں سے الجھ بھی سکتا ہوں۔ وہ لوگ مکمل طور پر مجھے صرف اور صرف کاروباری شخصیت سمجھتے تھے لیکن وہ بھی وقت چلنے پر مجھ پر جان نچاؤ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ بعض موقعوں پر میں نے ان کے غلوں اور جاں نثاری کے ایسے مظاہرے دیکھے تھے کہ میری آنکھوں میں نمی آئی تھی۔

انسان کی شخصیت کا یہ تضاد کبھی کبھی مجھے بہت حیران کرتا تھا۔ محنت خانوں میں جو لوگ دوسروں کو سسکا سسکا کرارتے ہیں یا ان کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتے ہیں وہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ اور یہی انسان جب کسی حقیقت و محبت کا اظہار کرنے پر آتا ہے تو اس کے پاس چاہنے میں بھی فخر محسوس کرتا ہے اس کے اشارے پر جان دینے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کی بڑی سے بڑی نجات "معنا بہت اور بڑے سے بڑے جیب کو بھی نہ صرف نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ اس کی بدترین حرکتوں میں بھی ایسے معافی تلاش کر لیتا ہے جیسا شبہ حضرت انسان بے شمار تضادات کا مجموعہ ہے۔ یا پھر شاید انک معاہدے سمجھنے کا نہ سمجھنا لے۔

اپنے افکار پر عمل سے الجھتا ہوا میں گاڑی میں بیٹھ کر اتر کان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے ہاتھ آفس کی عمارت سے اتر کان کا

اس ایجنسی میں کتنی کے چند گاؤں موجود تھے اور انہیں بھی معصیت ذرا کم ہی ہوتی تھی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ ایجنسی کی خدمات کا مبادیہ امت اجناس کا لیکن پھر بھی ایسے ہیملے دولت مند لوگ بھی مستحق تھے اس سے استفادہ کرنے کے بارے میں سوچتے تھے کہ نہیں تھے تو نہ اس کے اغراضات بہت زیادہ تھے اور بیشتر مہربانوں کو ابھی جان اور مال کے کھانے نہیں پڑے تھے۔ بہت تھوڑے لوگ "زیادہ ہی بھڑائی کے عالم میں بھی کھانسی ماری ضروری طور پر اس ایجنسی کے گاؤں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ میرے خیال میں کرل صاحب کو ایجنسی سے کوئی خاص آمدنی نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ غلامانی دولت مند تو تھے۔ ایجنسی کو اسی مبادیہ سے چلانے کا بار پڑے تھا۔ شاید اردو فتر تھا۔ گاڑیاں تھیں "اسلو تھا اور باصلاحیت لوگ مستقل گاڑی سے شاید ایجنسی اس امید پر چل رہی تھی کہ کبھی نہ کبھی تو حالات زیادہ خراب ہوں گے اور پیسے والے لوگ پرائیویٹ انجینیئروں کی طرف بھاگیں گے۔

آمدرفت بھی شوق ہو چکی تھی جو اکثر وہ بستر اس ہوئی والوں میں شامل نہیں تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے وہ جن میں نشست و برخاست کے در حقیقت تحمل نہیں تھے لیکن اس قسم کی کسی کشش کی وجہ سے آنے لگے۔ ان ایسے تھے جن کے پاس مدیہ کافی تھا لیکن وہ ابھی اپنے پیسے کا قرض نہیں رکھتے تھے۔ مگر پانس تینہ کا نہیں بھی یہاں پہنچا تھا۔

لوں کی بھیڑ بھاڑ میں شامل ہو کر میں لٹ تک پہنچا اور تھوڑا سا دیر سا رہی بھیڑ بھاڑ اور روٹی گراؤ کا شور مچا رہی تھی۔ وہ در کی حریفوں پر وہی سا ناخوشاں دیکھ رہا تھا۔ ہوش میں آگیا کہ اس کے خالی رہتے تھے لیکن راجہ اربوں میں مومنا ایسا ہی بنا تھا جیسے تمام کمرے خالی ہیں اور وہ توں سے بند ہیں۔ کسی بید کے علاوہ شہرہ و شور ہی کوئی آنا جانا یا کمرے سے پرکھ ہوتا رہتا تھا۔

لیکن اس راجہ اربوں میں اتنی زیادہ دیرانی نہیں تھی جس کی آتی پانی سوئٹ نمبر تین سو ستروا دہ تھا۔ میں نے بھی اس چیز سے "مرا" ایک تقریباً اپنے ہی جتنے دروازہ توئی سے نکلے کر آئے تھے۔

رکھتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ توئی دراصل ایک نہیں دو دونوں کی شکلیں مگر کہ لٹی نہیں تھی لیکن پھر بھی ان پر جڑواں ہونے کا لگن گرا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کا تہ "جسامت اور رحمت تقریباً ایک جیسی تھی اور وہ ایک جیسی بلجور دی میں تھے۔

وہ دونوں جوان بھاری ایجنسی "شیر" کے گاؤں معلوم ہوتے تھے۔ کھانا پھر نہیں لے اس لئے استعمال کیا کہ ان کے پاس ایجنسی کے لوازمات یعنی بیٹریں اور سوئچر گرام وغیرہ موجود تھے لیکن انہیں ذرا توجہ سے دیکھنے پر جیسی چھٹی یا شاید کسی اور معلوم جس نے نہ جانے کیوں مجھے بالکل خفیہ اور لاشم سے ایزاز میں خبردار کیا تھا کہ ان کا قرض "شیر" سے نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے شیر کے گاؤں کی شکلیں خود آفرودیکسی نہیں تھیں اور نہ ہی میں ایجنسی کے مالک راجہ کرل صاحب کو جانتا تھا۔ ایجنسی کا دفتر بھی میں نے صرف باہر سے ہی دیکھا ہوا تھا۔ پھر ایجنسی کی وہ ایک گاڑیاں بھی سوک پر لاہر آدھر آتی جاتی دیکھی تھیں۔ اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں نے انہیں دیکھتے ہی توجہ اٹھ کر لیا تھا کہ وہ شیر کے توئی نہیں تھے۔

وہ دونوں سفید قام تو نہیں تھے لیکن سرخ و سپید اور لمبے ٹوٹے تھے۔ صرف چودہ کچھ کریہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کس ملک کے باشندے ہیں۔ وہ "دونوں سوئٹ نمبر تین سو ستروا دہ کے سامنے قیادت تھے اس راجہ اربوں میں مرنے سے پہلے یہ آگے بڑھ کر میرے راستے میں مائل ہو گئے تھے گویا انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سری راجہ اربوں سے کوئی شخص ان کی طرف آ رہا تھا۔ حالانکہ راجہ اربوں میں دینے والی پچا ہوا تھا اور میرے تہہ میں کی ذرا سی بھی آہٹ نہیں ابھی تھی اس کا مطلب تھا کہ بلور گاؤں کے رہنے نہیں تھے۔

ان میں سے ایک نے بالکل درست لفظ کے ساتھ صاف اور شہتہ اور میں مجھے غالب کیا "آپ کس سے ملنے کے لئے شریف لائے ہیں؟" اس کے لیے میں کوئی عیب نہیں تھا اس کے باوجود

زیادہ پراسرار انداز میں اس نے نہایت خاموشی سے مجھے اپنے
سے دزنگ کارڈ ایک لایا اور کسی کے چہرے پر ایک غمناک
ایک لفظ بولے بغیر وہاں سوئٹ میں چلا گیا۔ دونوں کارڈز نے
دوسرے کی طرف دیکھ کر امریکیوں کے سے انداز میں کھڑے
اچانکے اور پیچھے ہٹ کر دوازے کے دونوں طرف دوڑے گا
کر کھڑے ہو گئے۔ میرے آنے سے پہلے وہ غالباً اسی جگہ کھڑے
تھے۔

چند لمبے بود سوئٹ کا دروازہ دوبارہ کھلا۔ اس بار قہری
سوئٹ میں ایک میانہ قد مگر بھاری بحرکم اور مضبوط جسم کا قہری
ہاتھیں پھیلاتا ہوا برآمد ہوا جیسے اسے اپنے کسی برسرِ حال
چھڑے ہوئے دوست کی آمد کی اطلاع ملی ہو۔ حالانکہ اس کا
صورت میرے لئے اتنی ہی اجنبی تھی جتنی افریقہ سے درتوڑ
کسی بن مانس کی۔ تاہم اس کی شکل بن مانس سے مشابہت رکھتی
تھی۔ اچھا خاصا خوش شکل اور ادیزہ مروتی تھا۔

وہ مگر خوشی سے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا لیکن نہ چلا
کیوں یہ گھنٹھی اس کے چہرے سے کچھ میل نہیں کھاتا
تھی۔ شاید اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کے نقوش بہت
چمکے اور چمکے سے تھے۔ کچھ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس کا
چہرہ کسی مل کو تراش کر بنایا گیا ہو اور مجسمہ ساز نے نقوش
زیادہ ہی باریکی سے تراشے ہوں۔

ایک لمحے سے اس نے صاف کے لئے میرا ہاتھ لیا
لیاس کا ہاتھ بھی چھری سے تراشیدہ معلوم ہوا تھا۔ نہ جانے

نہ جانے کیوں میرا یہ شہ دور نہ ہو سکا کہ شاید وہ پاکستانی نہیں
تھے ایک مجھ سے بات کرنے کے لئے ذرا آگے آیا تھا۔ دوسرا
ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ چہرے دونوں
اس کے ہاتھ تھے۔ دونوں کے ہاتھ دیشین ظہور کے بیرونی طرح
ہو لٹھول پر تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو مجھ سے مخاطب
تھا۔ اس کی ہجرتی آنکھیں دو آدموں کی طرح تھیں جن کے بار اس
کی شخصیت میں جھانکنا بڑا مشکل تھا۔ میں اس طرح ایک نیک کسی
کی طرف دیکھتا تھا تو عام طور پر وہ نظریہ الٹا تھا لیکن اس نے ایسا
بھی نہیں کیا۔ میں مسکرایا۔ جب بھی اس کا چہرہ ہاتھ ہی رہا۔ وہ
انسان تھا مگر چہرہ ہاتھ رکھنے کے معاملے میں کسی بات سے زیادہ
مستقل مزاج تھا۔

میں اس کی اصلیت کے بارے میں کسی شے کا اعتقاد کرنا چاہتا
تھا لیکن پھر میں نے اس سے مطلب کی بات کے علاوہ کوئی بات
کرنے کا ارادہ نہ ہی کر سکا۔ کے پنے تھے۔ لیجے میں صرف اتنا کہ "مجھے
پرنس حینہ سے ملنا ہے۔"

"میزم اس وقت آرام کر رہی ہیں سر۔" اس نے اپنے
چہرے سے بھی زیادہ ہاتھ لیجے میں کہا "آئیے مجھے وہ شہر کی
تیار کر دیں گی۔ یہ ان کسی سے بھی ملے کا وقت نہیں
ہے۔ صرف شو کے بعد وہ تھوڑی بہت دیر کے لئے لوگوں سے ملتی
ہیں۔"

دل تو چاہا اس سے کہوں "ایسی جیسی تمہاری میزیم کی اور
ساتھ تمہاری بھی۔" دل تو یہ بھی چاہا کہ انہی کہتے ہی بیک وقت
دونوں کی کھوپڑی پر کرائے کا وہ ہاتھ رسید کروں کہ کھوپڑیاں جھج
جائیں اور اسپتال جا کر ہی ہوش آئے لیکن میں نے صرف سڑی
مسکراہٹ پر اکتفا کیا اور اپنا دزنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا "یہ اپنی میزیم کو دے دو۔ وہ یقیناً مجھ سے ملنا پسند
کریں گی۔"

وہ جو بھی جواب دینے جا رہا تھا یقیناً نفی میں ہی تھا لیکن اسی
دوران پیچھے سوئٹ کا دروازہ کھلا اور ایک گھریلے ملازم ٹاپ
شخصیت ہوں باہر آئی جیسے کسی نے اسے باہر دھکا دیا ہو۔ وہ تقریباً
چالیس کی عمر کا ایک مٹھی اور شاطر صورت سا آدمی تھا۔ دوسرے
اس لئے وہ ذرا سنبھل کر ہوں آگے بڑھا جیسے بد دروازے کے پیچھے
سے وہ سارا تشاؤ دیکھ رہا تھا حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ میں دیکھ چکا
تھا کہ میرے آنے سے پہلے دروازہ پوری طرح بند تھا اور جب وہ
غصے باہر آیا اس وقت دروازے کی ٹاپ گھولی تھی۔ دروازے
میں گئی ہوئی بجک آئی سے بھی صرف سامنے کھڑا ہوا ایک سیڑھی
نظر آتا تھا۔ جبکہ اس وقت ہم تین اس دروازے کے سامنے بھی
نہیں کھڑے تھے۔ دروازے سے خاصا ہٹ کر کھڑے تھے۔

عجب پراسرار سے انداز میں وہ باہر آیا تھا۔ اس سے بھی

غیر ملکی زبانیں سیکھئے

مصنف: پروفیسر ایم اشرف

جرمن اور دو ریڈر 90/-

جرمن اور دو ششری 90/-

جرمن فریز بک 90/-

اطالوی اور دو ریڈر 80/-

اطالوی اور دو ششری 90/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

درد اذہ میرے عقب میں منتقل کر دیا اور اپنی دانست میں میری نظر بھا کر چالی جیب میں ڈال لی۔ میں نے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ اس قسم کی حرکتوں پر مجھے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس قسم کی ملاقاتوں پر جاتے وقت ایسی حرکتیں میرے لئے متوقع ہوتی تھیں۔ کچھ کا انتظام کر کے آتا تھا اور کچھ کا توڑ کرنے کے لئے میں خود بھی تیار رہتا تھا۔

آرامتہ و پیراستہ ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم سیدھے بندہ دم میں جا پہنچے۔ پرنس حرمینہ سامنے ہی ایک آرام کر سی پر بیٹھی تھی۔ کمال نے سن لے کر کہا تھا کہ وہ بے آبی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی لیکن پرنس جس انداز میں بیٹھی تھی اسے اور خواہ مخواہ بھی کہہ لیا جانا ہم از کم بے آبی سے آزاد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ بالکل بتی بیٹھی تھی۔ ایک ایسا بت جس کی آنکھیں کسی انجانے خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے دونوں بازو آرام کر سی کے بچھون پر یوں تھے ہوئے تھے گویا وہ بالکل اپنے آپ کو اٹھ بھاگنے سے باز رکھ رہی ہو۔ اس کے منہ میں جسم پر ایک نہایت نفیس مگر نہایت کٹائی لباہ تھا۔ لباہ کو اس لباہ سے کاٹا صری تھا۔ وہ پورے میک اپ میں تھی۔ گلے میں جوئیں بھی سونے ہوئے منظر والی ایک مالا تھی جو اس کے گلے میں پھیل چکی تھی کہ شاید بیروں کا پار بھی اس کے سامنے چھ مٹھو ہو۔ اگر اس کے چہرے پر اتنا خوف نہ ہو تا تو وہ جسم کو کچھ ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھی ہوتی تو شاید ڈانسر کے بجائے پرنس ہی معلوم ہوتی۔

وہ گھڑلو ملازم نما شخص جو میرا وزنگ کارڈ لے کر اندر آیا تھا۔ ایک کونے میں قدم نہانے کے غلاموں کی طرح اٹھتا ہوا تھے۔ نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ وہ گویا مراتب میں تھا۔ کچھ دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا۔

میں نے سوئٹ میں داخل ہوتے وقت اور بندہ دم تک پہنچنے کے دوران غیر محسوس طور پر اوپر اوپر نظر دوڑا کر اطمینان کر لیا تھا کہ وہاں کمال نے سن پرنس اور اس ملازم نما شخص کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ البتہ وارڈ روپ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس میں کسی کے ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ ملازمین ہر طبقہ کی املاساں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ ان میں کوئی آسانی سے چھپ سکتا۔ اور پھر وارڈ روپ کا دروازہ میری طرح بند تھا۔ ایسی آزمائش الماری میں چند منٹ چھپنے کے لئے بھی براحوصلہ درکار تھا۔

مجھ پر نظر پڑے ہی پرنس حرمینہ نے اپنے تاثرات پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ ایک کامیاب اور اگاہ کی طرح اس کے تاثرات بیکری تبدیل ہو گئے۔ وہ حتی الامکان سچوں اور پراچھو نظر آنے لگی۔

”ہیلو مشر حرمینہ! خوش آمدید۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کا

ایک ہاتھ کے لئے میرا دل چاہا کہ اس ہاتھ کو اپنے اچھ کی تھیں کر رکھ دوں لیکن بلاوجہ ایسا کرنا ظاہر ہے کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر تو وہ سنی اور خوش خلقی نظر آ رہی تھی۔

اس نے ہینڈ پمپ کی طرح میرا ہاتھ ہلاتے ہوئے گریبوشی سے عاجز میری سمجھ میں نہیں کیا۔ تاہم مجھے اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ ان کی تھیں۔ میں نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے وہی یہ عالم مصرع ڈھرا دیا۔

یار سن ترکی وہ سن ترکی نئی داغ
وہ کم از کم اس مصرعے کی حد تک تو قاری سمجھتا ہی نہایت خوش دل سے ہوا اور اگر پری میں ہوا ”صاف کیجئے گا چوہری! میں اپنی اس کمزوری پر آج تک قابو نہیں پاسکتا کہ گریبوشی میں اپنی بادی زبان بولنے لگا ہوں۔“

میں اس سے کچھ زیادہ مشتاق نہیں تھا۔ وہ ترک ہو بھی سکتا تھا، میں ممکن تھا کہ وہ مجھے محض اپنے ترک ہونے کا تعین دلائے و شش کر رہا ہو۔ سو وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”مجھے کمال نے کہتے ہیں۔ میں پرنس حرمینہ کا بیٹا ہوں۔ آئیے شریف لائیجئے۔“ بے سوئٹ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا ”میں آپ کو خوش رکھتا ہوں۔“

”میں پرنس حرمینہ سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے قدم بڑھائے۔ کہا۔ میں گویا یہ کہتے کہتے رہ گیا تھا ”مجھے تم سے ملنے کا کوئی شوق ہے۔“ لیکن میں نے اپنے لیے میں نے کمالی نہیں آئے دی تھی مگر تاثر میں رہنا چاہتا تھا۔ وہ اس نے لے لیا مگر ذرا بھی برا نہ مانے بولا ”میں آپ کو پرنس سے ہی ملانے لے جا رہا ہوں۔ میں اس ل میں بھی جھلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ جیسے بڑے شخص سے ملنے آئیں گے۔“

میں نے گاؤڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”مگر یہ تو کہ ہے کہ پرنس آرام کر رہی ہیں اور اس وقت کسی سے نہیں کہیں۔“

”اور مشر حرمینہ! آپ اتنے بڑے پرنس میں ہیں۔ آپ کو غافرو ہونا چاہئے بلکہ آپ کو تو خود بھی یہ طریقے استعمال کرنا تھے ہوں گے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ یہ امکانات کن لوگوں کے لئے ہوتے ہیں اور کن لوگوں کے لئے نہیں۔ کس وقت ان پر راد تو ضروری ہوتا ہے اور کس وقت ان میں لے لیا جاتا ہے۔ آئیے شریف لائیجئے۔“ پرنس بے آبی سے آپ کا انتظار رکھ رہی تھی۔

اس راہداری میں صرف دو ہی تکی لی سوئٹ تھے اور ان میں سے دروازے بھی ایک دو صوفے کے میں متعلق نہیں تھے۔ سوئٹ کو نواہ سے نواہ پرائیویٹ فرام کرنے کا پورا پورا خیال لگایا تھا۔ میں کمال نے سن کی رہنمائی میں اندر پہنچا تو اس نے

"کیسی حقیقت مسخرہ دہری؟ کسی کی حقیقت؟" اس نے نہایت مصومیت سے انگریزی میں ہی پوچھا۔

ہو نہیہ! میں اسے خیرے بازیاں چھڑدی رہی۔ "میں نے ملائت سے کہا۔ مجھے معلوم تھا اپنی خیریت بچانی بھی اچھی طرح آتی تھی۔"

لیکن اس وقت وہ اپنی ادکاری جاری رکھنے پر مگنی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں مصومیت سے پٹ پٹا رہے ہوئے ہوتی تھیں۔ زبان یہاں تک تو بے لکھن میں ابھی اسے سمجھنے نہیں گئی۔ دیے میں زبانیں سمجھنے کے معاملے میں بڑی تیز ہوں۔ جس ملک میں ملتا ہے میں بھی جاتی ہوں، چند ہی روز میں گروا سے لاکھ اس کی زبان سیکھ لیتی ہوں۔ یہ غالباً میں کی ملاقاتی زبان میں سمجھ کر کہا۔ زیادہ سے زیادہ وہ بچنے بھد میں آپ کو ایسے چھوٹے موٹے جملوں کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤں گی۔"

"جان!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میں نے تمہارے سر پر دستہ شفقت رکھ دیا تو تم چند ہی سیکنڈ میں نہ جانے کن کن زبانوں میں کیسی کیسی باتوں کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤ گی۔"

کمال نے سن ہم دونوں کے درمیان برقی کی طرح کھڑا تھا۔ گویا انتظار کر رہا تھا کہ دونوں طرفوں میں اصل سرگرمی شروع ہو تو وہ پراخت ہو گئے شروع کرے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا "میرا خیال ہے ہمیں کم از کم چھ تو جانا چاہئے۔" انھیں سے ہمیں ہنگامہ بھی پڑے کہ ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے میں اب پہلے بیسی خوش فطرتی یا انکسائی نہیں تھی۔

ہم تینوں پیشے کی ایک سینئر نجل کے گرد کھڑے تھے۔ چلنے میں ہل پر سنس تیز نے ہی کی۔ پھر میں اور کمال نے سن بھی چنے گئے۔ اعداد کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اہم کاغذ سنس شروع ہونے والی ہو اور شرکانے اپنی نشیمن سنبھال لی ہوں۔

میں نے قدم سے بے زاری سے پر سنس تیز کو مخاطب کیا "میں زیادہ لمبی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا ہوں! انھیں شاید اعانہ نہیں ہے کہ تمہاری گمشدگی سے میں کتنا پریشان تھا، کوئی ذرا سا سرائی بھی میرے سامنے ہو تا تو میں نہ جانے کیا کیا کر گزرتا۔ لیکن سرائی کے بجائے اب تم خود ہی مجھ سامنے آئی ہو تو مجھے بچانے سے بھی سکر ہو۔ کیا اس طرح ملے دیتے ہیں کسی کی ہمدردی کا؟"

وہ یوں غالی غالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میری ہنگامہ کا ایک نقطہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ کمال نے سن کی پراسرار خاموشی بھی برقرار رہی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا شاید وہ دونوں سکر تھے کہ مجھے بتا رہا ہے کہ میں بول نہیں آؤں۔ انہیں اعزاز وہ ہو جائے کہ میں کیا جانتا ہوں، کتنا جانتا ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لئے پیشانی میل کرنا، جس زور سے میری ہڈی دھکیلا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ ساری ہنگامہ کر رہے ہیں؟ قسم سے

اٹھنا گویا ایک خوب صورت سانچے میں ڈھلی ہوئی سندھ دی سوچ کا اٹھنا تھا۔ اس کے اعضا میں لمبوں کا سالاج تھا۔ میں جبران تھا کہ جب میں نے اسے بتی کی حیثیت سے دیکھا تھا تب مجھے اس میں اتنی خوب صورتیاں کیوں نظر نہیں آتی تھیں؟

شاید اب وہ بچہ پاش "ہو کر سامنے آئی تھی۔ شاید پہلے مجھے اس کی طرف اتنی گہری نظروں سے دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اور شاید اس وقت اس کا حدود اربعہ اتنی تفصیل سے سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی مرحوم میں نے ذکر کیا تھا کہ اس کے ایک ڈانس نے فلم میں بڑی دھوم مچائی تھی مگر میں وہ فلم بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ چیتا اس میں وہ کچھ اسی انداز میں سامنے آئی ہوگی، جس انداز میں آج کل اس کا ڈانس شوپل رہا تھا۔

اس نے بڑی تھکت سے معاملے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لمحے پہلے اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف کے ابوداد اس کا ہاتھ سر نہ نہیں تھا۔ کمال نے سن کے ہاتھ کے چہرے لس کے بعد اس ہاتھ کی حرارت اور گداز ایک خوش گوار تجربہ تھا۔

وہ ہنگامہ ہی آواز میں انگریزی میں بولی میں شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ سے ملنے کے لئے حریف لائے مسخرہ دہری! مجھے آپ سے مل کر حیرت انگیز خوشی ہوئی ہے۔" الفاظ میں بڑی روانی تھی۔ میرے لیے حتی الامکان طومر سونے کی کوشش کی گئی تھی لیکن پھر بھی اس میں ایک پیشہ ورانہ سادہ رنگ اٹھا تھا۔ نہ جانے اس پہلے کی۔ اور اس جیسے دوسرے کتنے جملوں کی تسلی ملتی کی گئی تھی۔

"مجھے بھی آخر کار تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ صرف حسن۔ صرف پر سنس تیز!" میں نے اس کی آنکھوں میں جمنا کھتے ہوئے سکر کر کہا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ٹانے کے لئے دی پلا سا خوف عود کر آیا۔ رنگت ذرا خستہ ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے وہ دھک دھک سکر اہٹ کے ساتھ بولی "اس اپناہت کے لئے بھی میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے پہلی ملاقات میں مجھے بتی کہ کہ مخاطب کیا۔ میرے لئے یہ بات ناگوار کی کے بجائے خوشی کا باعث بنی ہے۔"

"اور حسن کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جمنا کھتے ہوئے پوچھا۔

"حسن۔" اس کی عمرانی پیشانی پر ٹھیکیں نمودار ہوئیں۔ میں بھی نہیں۔ آپ اگر مجھے اس نام سے مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ دیوے سے میرے نام کا حصہ نہیں۔ لیکن آپ جس نام سے بھی پکاریں، میرے لئے وہی اچھا ہے۔"

"مقامی نام پر قسم ہے بتی! انہارے منہ سے یہ اپناہت بھرے الفاظ سن کر بڑے بڑے لوگ ہلکے ہلکے اٹھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اس وقت یہاں دل فریب جملوں سے خوش رہنے نہیں۔ حقیقت جاننے آیا ہوں۔"

اس کا چرایا ہوا سا چوہہ ستور سات رہا اور اسی سات بیٹے میں وہ بولا "نہیں مسٹر جہد ری! یہ اتفاق نہیں، غلطی ہوگی، ایک سنگین غلطی۔"

"تپ بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میری زندگی میں اس قسم کی سنگین غلطیوں کا انبار لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہ بولا، ایک نلک جیسی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک ڈانسر کے نمبر کی آنکھیں نہیں تھیں۔

میں نے ان آنکھوں کی سفاکی کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "مسٹر کمال نے من! اعتبار رکھا ہے کہ میں صرف آنکھیں شٹا سا ہونے کی وجہ سے پرئس تھینہ پر اپنی ہونے کا شبہ کر رہا ہوں؟ بات صرف آنکھوں کی نہیں ہے، وجہ ان کی بھی ہے۔ میرا وجہ ان کہ رہا ہے کہ یہ آنکھیں اپنی کے سوا کسی کی بھی نہیں ہو سکتیں۔ اور اب۔۔۔ جبکہ میں اس عورت کے دہرہ بیٹھا ہوں تو میں نہیں سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ اپنی کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس گھرے ایک آپ اور کون کی خوشبو ہونے سے اپنی کے وجہ کی خوشبو آ رہی ہے۔ انسان ان گنت خوشبو میں استعمال کرتا ہے مگر اس کے اپنے وجہ کی بھی ایک الگ بدبو یا خوشبو ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس معاملہ میں میری قوتِ شامہ کسی بلڈ ہاؤنڈ سے بھی تیز ہے۔"

"لیکن مسٹر جہد ری! کمال نے من بدستور پوچھنا ہے۔ میں بولا "پرئس تھینہ ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت ہیں۔ ان کے پاس ٹرنش پاسپورٹ موجود ہے۔ آٹھ سال سے اسٹیج کی دنیا میں اس نام کی بدھوم چلی ہوئی ہے۔ دنیا کے تقریباً چالیس ممالک میں میڈم اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ وہاں کے اخباروں و رسالوں میں ان کے فن کے مظاہروں کی ایک تاریخ محفوظ ہے۔ یہ شخصیت کوئی راقص رات فراخ کر سائے نہیں آگئی جو آپ ایسا بے سرواہہ قسم کا دعویٰ کر رہے ہیں۔"

"اے! کام تو یقیناً پکا کیا کیا ہوگا۔" میں نے حلیم کیا "میں" متھی سلیمانے کے لئے تو میں آیا ہوں۔ عین ممکن ہے اصل پرئس تھینہ کو غائب کر دیا گیا ہو اور اس کی جگہ اس عورت کو سامنے لایا گیا ہو۔ کاغذ یا پاسپورٹ اور دیگر سب چیزیں پرئس تھینہ کی۔۔۔ میرا مطلب ہے اصل پرئس تھینہ ہی کی جگہ رہی ہوں۔ میرے خیال میں تم جن لوگوں کی نمائندگی کر رہے ہو "ان" کے لئے تو یہ۔۔۔ اور اس قسم کے ہزاروں دوسرے کام بائیں اچھ کا کھیل ہیں۔"

"اور آپ کے خیال میں ہمیں کن لوگوں کی نمائندگی کرنا ہوں مسٹر جہد ری؟" وہ ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ اس کی آنکھیں سانپ کی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ گولی نہیں چھی۔ مگر وہ انہیں جھپکاتا ہی نہیں تھا۔ شاید اس

ساری باتوں کے سر پر کاچ نہیں چل رہا۔" اپنی "میں نے لافٹ سے کہا "کیا تم ابھی تک اپنے آپ تین دہانے پر کھلی ہوئی ہو کہ میں نے تمہیں نہیں پہچان لیا؟ یہ ہے کہ اس رات جب تم نے مجھے حنہ کے نام سے قلم دیا تو تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔ لیکن نہیں اتنا تو یاد ہوگا کہ تم فرخزاد بول رہی تھیں۔ پھر میں نے تم کے اخبار بار ایک کلوز اپ دیکھا اور صرف آنکھوں کی وجہ سے پہچان لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری صورت بکھر لیا ہے۔ لیکن تمہاری آنکھیں وہی ہیں۔ میں ان آنکھوں کو نہیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ اب تو یہ آنکھیں اپنے پیشہ خاصوں یا کچھ اور معلومات کی وجہ سے پہلے پہل دیکھ رہی ہیں اس وقت ان بڑی بڑی آنکھوں میں صرف ایک بے عنوانی سی ہیرا کے رہتی تھی۔ اور اسی لئے یہ آنکھیں مجھے بہت ہند میرے دل پر محض تھیں۔ اسی لئے میں نے انہیں پہچان بھی اسی لئے میں ان کے بارے میں اندازہ نہیں بھی ہوں۔"

پرئس تھینہ کے ہونٹ ایک لمحے کے لئے ٹھہر گئے مگر اس نے سختی سے ہنسنے لیا۔ کمال نے من نکاد کر گھا صاف کرتے بولا "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں" آپ کو پرئس تھینہ اپنی دست کا لکھن مگر رہا ہے مسٹر جہد ری! جبکہ آپ یہ بھی حلیم ہے جس کو میڈم کی شکل آپ کی اس دست سے بہت مختلف۔ آخر آپ میڈم سے اپنی بات منوانے پر کیوں متھے ہوئے آپ کو میڈم کے چہرے پر صرف آنکھیں شٹا سا رہی ہیں تو ان کو اپنی دست قرار دینے پر ہند ہیں۔ اس دنیا میں تو بعض ت دو توی کھل طور پر ایک دوسرے کے ہم شکل بھی نکل رہے ہیں لیکن ہر حال دو مختلف انسان ہوتے ہیں۔"

میں نے کمال نے من کو گھورتے ہوئے کہا "چلو۔۔۔ یہ اپنی نہ کم از کم حنہ ہونے کا تو اقرار کر لے۔ منگل کی رات دو بجے یہ اسی شکل صورت اسی سراپا کے ساتھ ایک ٹیم تاریک گلی میں آئی تھی۔" میں نے مختصر آواز دھاندھ کر بڑا اور ڈہریلے لہجے میں صاب تم کو گے کہ وہی کوئی اور عورت تھی۔"

"یہ ایک عجیب اتفاق ہو سکتا ہے۔" وہ وہٹائی سے بولا "آپ۔۔۔ عجیب کمائی کے لئے کھارے پاس آئے ہیں مسٹر جہد ری! لیکن مال۔۔۔ زندگی اتفاقات کا ہی مجموعہ ہے۔ آپ ان ساری باتوں بھول کیوں نہیں جاتے؟ بھول جاتے ہیں آپ کا کیا نقصان ہے؟ واقعی آپ کا کچھ لے کر بھاگی ہے اور نہ ہی حنہ نے آپ کو کوئی مان پہنچایا ہے۔"

"مسٹر کمال نے من۔۔۔ یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہے۔" میں اسے گھورتے ہوئے سرو لیجے میں کہا "اگر میں تمہارے من پر دھندلا کر تمہارے کچھ دانت پیٹ میں پہنچا دوں تو یہ بھی محض یہ اتفاق ہوگا۔"

لیکن اُس وقت عملی زندگی میں مجھے کوئی پراسرار کوئی معنی خیز کوئی انوکھا واقعہ پیش نہیں آتا تھا۔ میری زندگی اتنی ہی سادہ تھی جتنی دہریہ میں چڑے ہوئے کسی مینڈک کی۔ ذرا چلا کھنگالنی تو ایک قدم آگے ہو گئے پھر ذرا پھرد کے تو وہ قدم پیچھے ہو گئے اور سہا کر بس یہی کل کا کاٹا ہے۔ عجیب و غریب اور اچھے ہوئے واقعات مجھے اس وقت سے پیش آنے شروع ہوئے ہیں جب سے میں دولت مند ہوا ہوں۔ بے مٹا شے میں مجھے کوئی شام حاصل ہوا ہے۔

اس سے پہلے کہ کمال نے سن مزید کچھ کتا میں نے پرس تھین کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا پھلی پھلی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تھین کو مخاطب کیا "تھین! تمہیں اس سے۔۔۔ کیا کسی سے بھی ڈرنے کا شعور کوئی ضرورت نہیں۔ تم پر جو بھی گزری ہے بھلا کچھ اور ظالم کاست مجھے بتا دو۔ یہاں نہیں بتا سکتیں تو کھرچل کر بتا دے گا" تھین نے یہی جواب دیا۔

میرا خیال تھا کہ تھین عرف پرس تھین کمال کی طرف الجھنے نظروں سے دیکھے گی۔ وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی دھمکا دے گا اور وہ دل کی بات کہتے کہتے رہ جائے گی۔ لیکن وہ اس کے جوابی دھمکی سے آواز میں بولی "میں کمال کی بات کی تائید کروں گی آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو بیک وقت مجھ پر دو غلط فہمیتوں کا گمان گزر رہا ہے جبکہ میں اصل میں تھین کی شخصیت ہوں۔ یعنی پرس تھین۔ اس کے سوا میرا کوئی اور نام یا کوئی اور شخصیت نہیں ہے۔ اور نہ کبھی رہی ہے۔ میں آپ کے قصورات کو دیکھتا ہوں۔ اس کے سلسلے میں معذرت خواہ ہوں لیکن میں مجبور ہوں میں بھلا آپ کی انسانی ہی باتوں کو کیونکر تسلیم کروں۔ بات ہی اتنی ہے کہ میں شخص آپ کا دل رکھنے کو بھی اسے تسلیم نہیں کر سکتی۔" گویا جس پر تھین قہارہ پڑے بھی ہوا دے رہا تھا۔ میں نے کچھ

وقت جھپٹکا تھا جب میری نظر اس کی طرف نہیں ہوتی تھی۔ "کاش مجھے ان کے بارے میں صحیح طور پر کچھ معلوم ہوتا۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا "صرف ایک نام اب تک سامنے آیا ہے۔ شاید وہ بھی فرضی ہو۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ وہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور معمولی بچکدوں میں نہیں ہیں۔ کوئی بہت ہی بڑا سیٹ آپ ہے اور بہت ہی بڑے مقاصد ہیں۔ لیکن تم انہیں میری طرف سے بھی پتہ نام۔ دینا۔ اگر تمہاری بہت اونچی سطح تک رسائی ہے تو ان سے کہہ دینا کہ وہ مجھے اندازہ یعنی سیٹ نہ کریں۔ مجھ سے بچا نہ لیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے اذیت پہنچانے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار نہ کریں اور مجھے بلک میل کرنے کے لئے میرے دوستوں اور بھروسہ داروں کو مشغول نہ کر لیں۔"

"یہ بچا کیا ہوتا ہے مسٹر چوہدری؟" کمال نے سن نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔ میں نے اپنی محنت میں اس لفظ کا انگریزی میں ترجمہ نہیں کیا تھا۔ جو بات اصل میں تھی وہ ترش میں ہی نہیں کہتی تھی۔

"بچا۔۔۔ بس بچا ہی ہوتا ہے۔ جب انسان لے پکنا ہے تب ہی اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے دراصل بچا کیا ہے۔ عام طور پر اس کے بارے میں پہلے سے خبردار کرنے سے انسان خبردار نہیں ہوتا۔" میں نے وضاحت کی۔

"آپ ٹھکن مانڈ ڈوئی معلوم ہوتے ہیں چوہدری؟" وہ فصرے فصرے لہجے میں بولا "جتنے بڑے آدمی بچے کے بعد آپ کو بہت پریشانی ہوتا چاہئے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن افسانہ طرازوں میں الجھا رہا ہے۔ زندگی کسی جاسوسی ناول "جرم و سزا کی کہانی یا اسپاکی فلم سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ آپ بہت سیدھی سادہ چیزوں میں پیچھے کیاں ڈھونڈنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔"

"مسٹر کمال نے سن! مجھے زندگی کے بارے میں سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں زندگی کیا ہوتی ہے اور کیا نہیں۔ میں نے زندگی کا ہر رنگ "ہر دھنک اور ہر دوپ دیکھا ہے" اس لئے مجھے یقین ہو چکا ہے کہ زندگی وہ حقیقت جاسوسی ناولوں "جرم و سزا کی کہانیوں اور اسپاکی فلموں سے زیادہ پراسرار، پیچیدہ اور منحنی خیز ہے لیکن ہر ایک کی زندگی نہیں۔ زندگی اپنی پراسراریت اپنی پیچیدگیوں اور اپنی منحنی خیزوں کے اظہار کے لئے کسی کسی کو مقرب کرتی ہے۔"

وہ بدستور ایک تک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی "میں جب فخر تھا غریب تھا تب ٹھکن مانڈ ڈوئی تھا۔ خیالوں خوابوں کی دنیا میں کھڑا رہتا تھا۔ مستعار لے کر قلمی رسالے "جاسوسی ناول" اسپاکی کہانیاں "فریڈیک جوئل جاتا تھا پڑھتا تھا اور میرا ذہن نہ جانے کن کن بھل بھولوں میں جھٹکتا رہتا تھا

تاریخی ناول

ابلیس مصر	الاس ایم۔ اے۔ 00/-
حسن بن صباح	الاس ایم۔ اے۔ 25/-
راجا جکھاری	الاس ایم۔ اے۔ 50/-
نور الدین زنگی	الاس ایم۔ اے۔ 50/-
سلطان عادل	الاس ایم۔ اے۔ 50/-

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

میں نے قدرے بے زاری سے کہا "جی۔ زیادہ قصیدہ خوانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت کھڑے نہیں ہونے ہوں گے۔ تمہارا کتنا شاہد درست ہو کہ وہ آنکھیں بند کر کے انکسائٹ کی قبیل کرتے ہیں لیکن اس وقت ان کی آنکھیں جاوڑا نہیں دیکھتا ہوں گی۔"

"کیا مطلب؟" اس کی پیشانی کی صفوں میں ایک اور چین کا اضافہ ہو گیا۔

"اس سوٹ کے سامنے والا بھی دی آئی لی سوٹ ہے؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ اس نے الجھن آمیز انداز میں انہات میں سر ہلایا۔

"اور تم اپنے گاؤڑ کی جتنی تقریریں کر رہے تھے اس سے مجھے وہ بھی دی آئی لی محسوس ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انہیں دی آئی لی سوٹ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اس وقت گھڑی بند پر اندھے لینے آرام کر رہے ہوں گے۔ ان کے ساتھ تھوڑی سی ناشائستگی صرف یہ ہوتی ہو گی کہ ان کے ہاتھ پت پر باندھ دئے گئے ہوں گے۔ اور میں ممکن ہے پاؤں بھی بندھے ہوئے ہوں۔ اس کے لئے میں جلدی ضرورت خواہ ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ برہمی سے بولا اور اس کے چہرے ہوئے نفوس میں یک لخت برنجال سا ہوا۔

"یہ بکواس نہیں، چند چھوٹی موٹی تہذیبیاں ہیں جو باہر دنیا ہو چکی ہوں گی لیکن تم یہاں ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ نہیں پا رہے۔" میں نے طاقت سے کہا۔

"اور تم کیا انہیں دیکھ رہے ہو؟" اس نے طعنے سے مجھے میں پوچھا۔

"تقریباً ہی سمجھ لو۔" میں نے جواب دیا "میں جب وقت کا تعین کر کے اپنے قریبوں کو کوئی کام بتا کر آتا ہوں تو آنکھیں بند رکھتے ہوئے بھی مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ کام اسی طرح ہو رہا ہوگا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"مگر سامنے والے سوٹ میں تو کوئی غیر ملکی زیلیٹ لٹھرا ہوا ہے۔" مکمل اپنی برہمی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"وہ آج شام جا چکا ہے۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا۔ وہ کچا کام نہیں کرتے۔"

"میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

میں نے اسے پیٹنے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایک معزز قوی کی بات پر یقین کرنا چاہئے۔ ویسے بھی شاید کسی کو اس وقت تمہارا اس کمرے سے باہر جانا پڑے نہ ہو۔" میں نے رد وازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے گردن موڑ کر رد وازے کی طرف دیکھا۔ رد وازہ ذرا سا مکمل چکا تھا اور اس سے ایک ریم والور کی چھٹی "خوف ناک" سی جھلک رہی تھی۔

انہی اعتبار کرتے ہوئے کہا "نہجک ہے، جیسے تم دونوں کی میں نے تو سوچا تھا کہ ہنر اگر کسی کو فکشن سے اپنے کمرے پہنچ جائے اور سکون و عافیت سے آئندہ زندگی گزار سکے تو بے عرض میں بلیک باکس ان لوگوں کے حراسے کیوں گا اس کی تلاش ہے میرے لئے اپنی زیادہ اہم تھی وہ بلیک باکس۔ میری نظر میں یہ سودا برا نہیں تھا۔ لیکن تم دونوں تو نیت کو حقیقت تسلیم کرنے کے لئے ہی تیار نہیں ہو۔ میں نے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"غصہ مسٹر جی، یہ کمال نے سن تیزی سے بولا۔ پہلے تو اس کی آنکھیں ہی عجیب لگ رہی تھیں کہ یہ بات کی طرح وہ جھپک نہیں تھا اب مجھے اس کی آواز بھی سانپ کی پھکار شاہ محسوس ہوتی تھی۔

میں نے چراتے بچے انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولا "اب بلیک باکس کا ذکر نہ کیا ہے تو تم اتنی آسانی سے نہیں جانتے۔"

"لوگوں کو دے گا مجھے؟" میں نے اس کی طرف تھوڑا سا جھپکتے ہوئے پوچھا "تم۔۔۔ یا تمہارے وہ بدلی گاؤڑ جو شیشی روم کی پٹنے لگے ہیں؟"

"جیہدہ فکشن شروع ہونے کے بعد وہ خوش خلقی سے ہاؤس میں لے کی اداکاری بالکل بند کر چکا تھا۔ اب پہلی بار اس کے ذہن پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری لیکن یہ مسکراہٹ بس ایسی تھی جیسے کسی جیسے نے کسی جگہ پھلے بادوں کے ذریعہ اثر اپنے ذہن کو ہمہ سہی حرکت دینے کی کوشش کی ہو۔

"میں تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں مسٹر جی، یہ کچھ یقین سامنے لگا ہے کہ وہ درست ہی ہوگا۔ تمہاری بات بہت تیز ہیں۔ بالکل درندوں کی طرح جو بہت سی ایسی باتیں محسوس کر لیتے ہیں جن کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہوتا۔ تم نے یقیناً بیکر کے سارے گاؤڑ کی خطیں تو نہیں دیکھ رکھی ہوں گی لیکن تم نے محسوس کر لیا۔"

ایک خانے کی خاموشی کے بعد وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولا "لیکن اس صورت میں تمہیں ان سے زیادہ غصہ محسوس کرنا چاہئے کہ وہ بیکر کے گاؤڑ نہیں ہیں۔ انہیں سیکر ملی انجینیئروں کے گاؤڑ بھی بھلا کوئی گاؤڑ ہوتے ہیں۔ ان میں اور تمہارے ملک کی پولیس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہ سب وہ پھٹتے ہیں جو پرندوں کو ڈرانے کے لئے کھینچوں میں کھڑے کر دئے جاتے ہیں۔ ان سے صرف پرندے ہی ڈرتے ہیں۔" وہ دندے نہیں۔ لیکن وہ جو باہر کھڑے ہیں ان سے درندوں کو بھی ڈرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ عجیب سی چیز ہیں۔ محسوسات عام کی کوئی چیز ان میں نہیں ہے۔ بس آنکھیں بند کر کے انکسائٹ کی قبیل کرتے ہیں درندوں سے بھی بدتر ہیں۔"

ہی نہیں ہوں۔ اس لئے میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ اگر
 بنی سمجھ کر آپ کو کوئی خوشی مل رہی ہے تو بے شک سمجھ رہی
 لیکن مجھے ساتھ لے جانے کی خدمت کیجئے میں جہاں ہوں نہ
 خوش ہوں۔ آخر آپ کیوں خون خرابہ کرنے پر مت ہوتے ہیں؟
 یہ میرے لئے شرمسار کر دینے والی صورت حال تھی۔ میرا
 کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مجھے افسوس ہوا
 کہ اتنا خرد میں نے کس لئے کیا تھا؟ لیکن یہ ایسا تھا ہوا کہ
 جس کا دہلیز ہوتا پڑا مشکل تھا۔ واپسی میں بھی سر حال غلام
 پہن تھے۔

”اگر کسی نے کوئی عاقبت نہ کی تو کوئی خون خرابہ نہیں
 ہوگا۔“ میں نے اپنی کوئین دہلیز ۳۳ گر میرے ساتھ بیٹھے میں تھرا
 کوئی مجھ پر آڑے آ رہی ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اس کا بھی مل نظر
 لوں گا۔“

”میری سب سے بڑی مجبوری تو یہی ہے کہ میں اپنی نہیں
 ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی ”دوسری مجبوری یہ ہے
 کہ اس ہوئی میں میرا ایک ماہ کا کنٹرول چل رہا ہے جس کو پور
 ہونے میں ابھی تین دن باقی ہیں۔ اگر کنٹرول میری طرف سے
 نکلے تو مجھے لاکھوں روپے پر جانہ اور کاٹ دے گا۔“

”جس مسئلے کا تعلق روپے پیسے سے ہو اس کی تو بالکل ہی
 مت کرو۔ پر جانہ جتنا بھی ہوا سمجھ دیا جائے گا۔ اور کچھ؟“ میں نے
 ان شانسا آنکھوں میں جھانکا جو اپنی نظر آنے کی پوری پوری
 کوشش کر رہی تھیں۔

میری اس جھٹک سے وہ گویا زنج ہو گئی۔ اس نے مزید کچھ کہنے
 کے بجائے سر جھکا لیا، ساتھ ہی اس کے کھدے بھی بے جان سے
 انداز میں جھک گئے۔

کمال نے سن ہوئے سے کھانسنے کے بعد مجھ سے غائب ہو
 ”تم نے ابھی بلیک باکس کی بات کی تھی۔“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”اور اس میں دلچسپ
 ظاہر کر کے تم نے ثابت کر دیا تھا کہ تریڈ ڈاٹ کے آوی ہو۔“

”اس بات کو جاننے دو کہ میں کس کا آوی ہوں اور کس
 نہیں۔ ضروری نہیں کہ بلیک باکس سے دلچسپی صرف تریڈ ڈاٹ ہی
 ہو۔ ویسے بانی راونے نے یہ تریڈ ڈاٹ ہے کیا؟ کسی آوی کا فریضہ؟“
 ہے؟“

”اب اتنے مصموم نہ بنو۔“ میں نے بے زاری سے کہا ”مجھے
 اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنی کو تریڈ ڈاٹ نے افوا کر دیا تھا اور
 انہی کے قبضے میں تھی۔ اور یہ بات خود انہی م عرف ایڈی فون پر
 سے کہہ چکا ہے۔ وہ مجھے یہی نصیحتیں کیا کرتا تھا کہ میں اس کا
 تلاش کے سلسلے میں پریشان ہو چھوڑ دوں۔“

”اور یہ انہی م عرف ایڈی فون کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔ میرا
 ڈونے کے باوجود وہ مصموم بننے پر تیار ہوا تھا۔

دیواروں جس کے ہاتھ میں قہارہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے
 معلوم تھا کہ وہ احمد ہوگا۔ احمد بلاشبہ کمال کا آوی تھا۔ شعل
 دودازے کو بے آواز طریقے سے کھولنے میں اس کا جواب نہیں
 تھا۔ کمال نے من جیسے شاطروں پر تیار آوی کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ
 کب سوئٹ کا پھونکا دودازہ اور پھرینہ دم کا دودازہ کھلا تھا۔ باہر
 اس کے دونوں مسلح گارڈز کو کب قابو میں کیا گیا اور کب سامنے
 والے سوئٹ میں منتقل کیا گیا اس کا تو اسے ذرا بھی اندازہ نہیں
 ہو سکتا تھا۔ اس کام میں احمد کے ساتھ آفتاب شریک تھا۔

اس وقت مجموعی طور پر اکثر کال میں میرے چھ آوی ڈیوٹی پر
 تھے۔ احمد کے دیوار کی بل توینہ دوم میں جھانک رہی تھی۔
 آفتاب باہر دودازے پر تعینات تھا۔ منیر اور مسعود پسلی سی نیچے
 کپڑاؤں میں سوخو رہتے ہوئے سوئٹ کی نگرانی کر رہے تھے۔ صفور
 اور سلیمان ہونٹ سے باہر جانے کے راستوں پر تعینات تھے۔ میں
 اپنی کوسا ساتھ لے جانے کا پورا بندوبست کر کے آیا تھا۔ مجھے معلوم
 تھا کہ یہ آسان کام نہیں ہوگا۔

کمال نے من اندھ چکا تھا لیکن ایک لمبے تک دودازے کی
 طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے
 چہرے پر دوبارہ پسلا سا صمراؤ آیا۔ اس نے گویا دل ہی دل میں
 اعتراف کر لیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کو روکنے کے لئے اب کچھ
 نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس احساس کے ساتھ گویا اسے قرار سا
 آیا تھا۔

”یہ سب کیا ہے مسٹر جی؟“ اس نے دودازے کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے ہوا لہجے میں پوچھا۔

”یہ سب میرے ریگول کنٹرول نظام کا ایک حصہ ہے۔“ میں
 نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اور اس وقت اس نظام کی کار کوئی مجھے دکھانے کا قصد؟“
 اس نے ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے کہا تھا کہ میں اپنی کوسا ساتھ لے جانے کے لئے آیا
 ہوں۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا ”مجھے یہ بات بالکل پسند
 نہیں ہے کہ کوئی میرے دوستوں کو افوا کرے اور انہیں کھلونوں کی
 طرح استعمال کرنا چہرے۔“

وہ بڑی تھکن خیز سی ہوا ”یہ عورت نے آپ اپنی سمجھنے پر
 بڑی طرح ہند ہیں“ پسلی اس سے تو چھو بیٹھ گیا ہے آپ کے ساتھ
 جانے کے لئے تیار ہے؟“ اس کے کچھ میں بڑا ہر تھا لیکن ٹھیک میں
 اپنی ہوئی کوئی کی طرح۔

میں نے اپنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میرے ساتھ چلو۔ اس
 سے اچھا موقع نہیں پھر نہیں لے گا۔ میں تمہاری خاطر ہر دھمک
 لے رہا ہوں۔“

”وہ گویا سر پینٹہ پینٹہ رہ گئی اور بے زاری سے بولی ”مسٹر
 جی؟“ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں آپ کو کیسے چین دلاؤں کہ میں

نہ صرف ایسی تہارا مدد مانی پاپ ہے جسے تم نے فراموش
 بھی ممکن ہے وہ تہارا حقیقی باپ ہی ہو۔ میں نہیں
 سکتا۔ میں نے اسے آؤ دلانے کے لئے کہا۔ آؤ
 مجھے خود آ رہا تھا۔

نہ وہ ذرا بھی نصیب میں آئے بغیر متاخذانہ سے انداز میں سر
 ے ہولا "جب آدمی اس طرح ہنسیلا کر جو اب دے تو اس
 کی ہونا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔"
 لاہر ہے "اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو بات کچھ آگے نہ بڑھ
 بہ میں اتنے عرصے تک بتی کے معاملے میں بے دست و پا
 نہ بیٹھا رہتا۔" میں نے اپنی لا علمی کا اعتراف کر لیا "لیکن
 ریڈ ڈاٹ کے بارے میں اتنا بے خبر بنے کا شوق کیوں چرایا

ہو سکتا ہے مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم ہو اور
 ہے کہ کچھ معلوم نہ ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم
 ٹک کو چھوڑو اور کام کی بات کرو۔ اگر تم بلیک باکس میرے
 رکھو تو اس صورت کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو جسے تم بتی
 ہے ہو۔ اب بتی نکلے یا کچھ اور یہ تہارا مقدر ہے۔"
 "کیونکہ کیا تم نے؟" میں نے بتی کو مخاطب کیا "یہ ہے ان لوگوں
 بلیک تہاری اور کا۔ یہ تہاری مرضی معلوم کیے بغیر بلیک
 کے عوض جیسے میرے پروردگار نے کئے تیار ہیں۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور خاموشی سے سر
 ا۔ شاید اس نے اب خاموشی رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔
 کمال نے سن بولا "تم پر فس کو چھوڑو مجھ سے بات کرو۔
 اگر باہر کیسے ہے تو اپنے آدمیوں سے منگو۔ الہی۔ اسی
 ے میں ہم دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بلیک باکس میرے رکھ
 پر فس کا ہاتھ قائم کر اسے ساتھ لے جاؤ۔"

"جے جی ہاں پر فس! میں نے ترم آئیر لیجے میں کہا "جس کا
 س کی تقدیر کا فیصلہ کر رہا ہے! میں نے تو سچا بھی نہیں تھا کہ
 میں ایسی بھی کوئی پر فس موجود ہے۔" میں بتی کی طرف دیکھ رہا
 کہ شاید اس کے دل میں خوف کی دھند میں لپٹے ہوئے کسی
 بے کو سرکش پر آمادہ کر سکوں مگر وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی

کمال نے سن اب اپنے لیے کی بے نالی نہ چھپا سکا۔ تجزی
 ہولا "سچہ پروری! کام کی بات کرو۔ وقت ضائع مت کرو۔ میں
 وجہ کی نہیں سکتا تھا کہ تہارے پاس اتنا طاقتور ہونا ہے۔"
 "طاقتور وقت تو میرے پاس واقعی نہیں ہوتا۔ دراصل وقت کو
 متناہل کرنے کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ میرے انداز
 ماری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ کام کی بات کے پورے میں
 ڈاؤنش ہے میرے بھائی۔ کہ میں بلیک باکس تہارے حوالے
 رہی نہیں سکتا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ میرے پاس ہے ہی

نہیں۔"

"جو تم جھوٹ بول رہے تھے؟ اس کے پھرائے ہوئے چہرے
 پر ایک بار ہزاروں کے سے تہار نمودار ہوئے۔

"میں سمجھ لو۔ میں بلیف کر رہا تھا" جوائن جیٹ لوگوں کے ساتھ
 بلیف کرنا میرا مشغلہ ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا "دوسری بات
 یہ کہ تم تو اس وقت شرابی کا کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہو۔
 بتی صرف پر فس جینے کو تو میں ہر حال میں ساتھ لے ہی جاؤں گا۔
 شاید اپنے یا میرے گھر پہنچنے کے بعد اسے یاد آجائے کہ یہ واقعی بتی
 ہے۔"

"حقیقی اطمینان اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی ابھی نہیں
 ہوتی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ پھر اس نے ایک نظر کوئی پر
 ڈالنے کے بعد کہا "میں بھی نہیں اپنے ریموٹ کنٹرول نظام کا ایک
 معمولی سا نمونہ دکھاتا ہوں۔" وہ اس میز کی طرف بڑھا جس پر بتی
 دی وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

"کوئی اطمینان حرکت نہ کرنا سونے سن!" میں نے خواہ کیا۔
 "میں کی جو ٹال دوڑاؤ سے بے جا تک رہی ہے یہ محض دکھاوے کے
 لئے نہیں ہے۔ یہ آتش و آہن بھی اگلی ہے تہاری ڈاڑھی ٹلا
 حرکت تہارے لئے موت کا پیغام ثابت ہو سکتی ہے۔ دوڑاؤ سے کی
 طرف پشت نہ کرنا۔ اور نہ ہی میری طرف۔"

اس نے زہریلی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اسے احساس
 نہیں ہو سکا تھا کہ کب میرے ہاتھ میں شمشیر پھسل آچکا تھا۔ اس
 کی نظریں میرے اس پھسل کے لئے بھی اور دوڑاؤ سے بے جا تک
 ہوئی ٹال کے لئے بھی بے جا عداوت اور ہمت آئی۔

"دو بڑے آدمیوں کو بات چیت کرتے وقت اس قسم کے
 کھلونوں سے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرنی
 چاہئے۔" وہ مرتیان لہجے میں بولا "یہ جوئے لوگوں کے کام آئے
 والی چیزیں ہیں۔ کیا تم ان پر ہمت زیادہ بھروسہ کرتے ہو سسر
 چوہری؟"

"بھروسہ تو میں صرف اوپر والے پر کرتا ہوں۔" میں نے
 دوہر بیانہ انداز میں انگلی اٹھا کر بھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 کہا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا "ہو سکتا ہے ان
 کھلونوں کی موجودگی میں بھی تم اس ہوٹل سے باہر نہ جاسکو۔"

"اگر میں ہوٹل سے باہر نہ جاسکا تو ہوٹل لپے کاؤچر میں جائے
 گاؤنڈ کمال نے سن! میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 "دیکھا جائے گا۔" وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر
 بولا۔ "لیکن تہارے لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ زیادہ جلدی
 باتیں مت کیا کرو۔"

مخاطب انداز میں وہ اس طرح بتی کی طرف بڑھا کہ اس کے
 اوتھوں کی حرکات و سکنات دیکھی جاسکیں۔ اس نے بتی کی ٹالی

واضح ہوتا ہمارے پس ظلوں میں رات کا منظر دکھایا جاتا ہے۔
حیرت خیز اپنی یعنی سی گاڑی سے ٹیک لگاتے کھڑا سکرٹ کے کمر
لے رہا تھا۔ وہ سکرٹ پٹا نہیں تھا لیکن شاید بے کیف عمرانی اور
طویل انتظار کی کوفت سے اکتا کر اس وقت شغل کے طور پر ہمار
تھا۔

کمال نے سن نے ایک اور جن دایا۔ منظر بدل گیا۔ اس
سکرٹوں دو سرے کمرے سے ہو گیا تھا۔ یہ کیا ڈری کا ایک اور
کوش تھا۔ یہاں چمکی تنچ بھی پڑی تھی اور تھوڑی سی روشنی بھی
تھی جس کی وجہ سے منظر روز روشن کی طرح صاف نظر آتا تھا
مسود چمکی تنچ پر پڑنے سے ٹیک لگاتے 'ٹاک پر ٹاک' دیکھنے سے
فکرے نوجوانوں کی طرح عیاں مانی بہا رہا تھا۔ اس کے ہوتوں کا
حرکت سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

کمال نے سن تھری انداز میں بولا۔ "یہ دونوں نوجوان چمکی
کیا نڈ میں رہتے ہیں اس سوئٹ کی کڑکوں کی طرف نظر اٹھا کر
بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی نظر سے کچھ
بھی اونچل نہیں۔ یہ جگہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ انہیں معلوم
ہو آئے کہ کس وقت بیڑیوں کا پکڑ لگنا چاہیے۔ کتنی دیر میں
لفظوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ کتنی کتنی دیر بعد باری باری رہا
داروں میں نظر ڈال لینی چاہیے۔ احتیاطاً انہوں نے سبکدوش طور پر
ایک کمرہ بھی لے لیا ہے تاکہ ہوئی میں ان کی موجودگی اور اذیت

کھول۔ اس میں دی ی آور دکھا ہوا تھا۔ کمروں میں رکھے ہوئے ٹی
دی ہوئی کے ایک مرکز دی سی آرتے فٹلک تھے لیکن دی آئی
ہلی سوئٹ میں ایک انگ دی سی آرتی موجود کی حیرت کی بات
نہیں تھی۔ وہ سوئٹ میں قیام کرنے والے کا اپنا بھی ہو سکتا تھا اور
یہ بھی ممکن تھا کہ ہوئی والوں نے فراہم کیا ہو۔

گھر زاتجہ سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دی سی آرتے
کچھ مختلف تھا۔ وہ ساڑھیں دی سی آور بتائی تھا لیکن اس کا سوچ
پتلا بہت مختلف تھا اور اس پر بانیر کے طور پر کام دینے والی ایک
چھوٹی اسکرین بھی موجود تھی۔ سوپڑوں اور سرخ سبز لٹل کی تعداد
بھی زیادہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کلوز سکرٹ ٹی دی
کے نظام کو چلانے والی ایک مختصر ٹیٹر القاصد مشین تھی اور اس
دور کے لحاظ سے جدید ترین تھی۔

اس نے مشین کا ایک جن دایا اور ٹی دی تن کیا۔ اس کی
اسکرین روشن ہو گئی لیکن اس پر کوئی مختصر نہیں ابھرا۔ اس کی چھوٹی
اسکرین بھی ساتھ ہی تھی۔ کمال نے سن ایک نظر میری طرف دیکھ
کر بولا۔ "ہم نے اس سوئٹ کا انتخاب صرف اس لئے نہیں کیا تھا
کہ یہ اہم غنیمت کے لئے مخصوص ہے۔ بلکہ ہمیں اس کا عمل
وقوع بھی پسند تھا۔ دو طرف سے یہ اونچل ہے۔ تمہارے تو میں کو
بھی یہ آسانی محسوس ہوئی کہ وہ کچھ کیا نڈ میں دو مختلف مقامات پر
کھڑے ہو کر اس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ لیکن اسی طرح ہمارے لئے
بھی ان پر نظر رکھنا آسان تھا۔ انہی دونوں محسوس میں اس سوئٹ کی
کڑکوں میں دو کمرے نصب ہیں جن کا تمہارے تو میں کو علم
نہیں۔"

مجھے حیرت کا تصور اس کا تکلیف دہ برکا لگا۔ پرنس حینہ کے
سوئٹ کی عمرانی چتر اور مسود کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان
کے بارے میں کسی کو شبہ تک نہیں ہو گا کہ وہ کسی کی عمرانی کر رہے
ہیں۔

کمال نے سن گویا میرے خیالات چڑھتے ہوئے بولا۔ "تو یہی
تمہارے تو میں کی کارکردگی ہے بہت عمدہ۔ ان پر کوئی کسی قسم کا
شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن انہیں۔ بلکہ ہمیں بھی ابھی تک اندازہ
نہیں ہے کہ تمہارا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔"

اس نے ایک بار پھر کڑی دیکھی اور مشین پر ایک جن اور
دایا۔ اسکرین تاریک ہو گئی۔ کمال ایک اور جن کا بار بار دہاتے
ہوئے بولا۔ "تمہارے دونوں آدمی اس وقت اندر سے ہیں۔
لیکن تمہارے کمرے اغراض ہیں۔ انہیں ہمیں سے اس مشین کے
ذریعے حرکت بھی دی جا سکتی ہے۔ گھبرا اچھی تمہارے آدمیوں کو
تلاش کرنے گا۔"

اسکرین پر تاریکی بھی ہو چکی تھی اور مختصر نظر آدمی تھی۔
اچانک ایک بھلا نمودار ہوا اور گھبراؤں گھبراؤں ایک لمبے بعد وہ
بولا اور اس کے آس پاس کا منظر کافی واضح ہو گیا۔ تقریباً اتنی سی

ہٹلر کی حیاتِ معاشقہ

☆ ---- پروفیسر ایم اشرف

ہٹلر کے معاشقوں کی مکمل تفصیل

اس کی ذاتی زندگی کے متعلق

ایک دلچسپ کتاب ----

جو اس سے پہلے شائع نہیں ہوئی۔

قیمت :- 75/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

دکھائی دے رہی تھی۔

کمال نے سن کر غصہ سے بھرے انداز میں کمری سانس لے کر بولا۔ "یہ تو پہلے ہی روانہ ہو چکا ہے۔"
میرا اندازہ تھا کہ منیر پر وار کرنے کے لئے آوی اس کی کار کے پیچے سے برآمد ہوا ہوگا۔ میں نے ایک گنگ کمال کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھے لیکن میں پوچھا۔ "ان دونوں کو کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"کسی انتہائی سفر پر۔ خطی مجھے معلوم نہیں۔" وہ بے نیازی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔

میں نے یہ تو از بخیر صرف ایک کوڈوٹ بولا۔ یہ احمد اور آفتاب کے لئے تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ فوری طور پر اپنے ان ساتھیوں کی خبریں جن کا مشر ہمیں پی وی پر دکھایا گیا تھا میاں کی صورت حال کو میں خود ہی سننا چاہتا ہوں گا۔

چشم زدن میں روح اللہ کی تال دو آواز سے سے غائب ہو گئی اور دو آواز کھٹ سے بند ہو گیا۔ وہ لوگ بھی مشینی انداز میں حرکت میں آئے والے تھے اس کی تو مجھے توقع تھی لیکن میری ساری توجہ کمال نے سن پر رہی اور یہی میری غلطی تھی۔ میں نے کونے میں کھڑے ہوئے اس بھول اور ڈھانچا ہوا شخص کو نظر انداز کر دیا تھا جو پہلے سے کھیلے ملازم اور ہسانی طور پر نہایت محیفہ و زار نظر آ رہا تھا۔ کمال نے سن لے تو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی لیکن وہ ڈھانچا یکدم ہی اس طرح ہوا میں اچلا جیسے اس کے پیروں تلے نہایت طاقتور اسپرنگ فٹ تھے جنہوں نے اسے مشینی گڈے کی طرح ہوا میں اچھال دیا تھا۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ گویا اڑنے پر بھی قادر تھا۔ عقاب کی طرح اڑتا ہوا وہ یکدم مجھ پر اتر کر تالین میں آخری لمحے میں مجھے اس حیرت کے جھٹکے سے پہنچنے کا موقع مل گیا تھا جو اس کے حرکت میں آنے سے مجھے لگا تھا۔ میں نے نہایت تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹے ہوئے مشین پائل کا دستہ اس کی کھوپڑی پر رسید کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی کھوپڑی کے بجائے کندھے پر لگا۔

اس ضرب سے بھی میرے اندازے کے مطابق اس کے کندھے کی ہڈی کم از کم چھ تو جانی چاہئے تھی لیکن اس بد بخت پر تو جیسے اس کا بال برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ چھل کی طرح دھب سے اوجھ سے منہ دھیر تالین پر گر اکر اسی حالت میں اس طرح اچھل کر سیدھا اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسپرنگوں والے کسی بم سے مارنے کے بعد پڑا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں اس نے جس انداز میں غائب کھائی اور ساتھ ہی مجھے چاب رسید کرنے کی کوشش کی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تو جیو جیٹر کا ماہر تھا۔ جس انداز میں اس کا استخوانی بازو ہوا میں کھوٹا تھا وہ کسی عام آدمی کی گردن توڑ دینے کے لئے کافی

باد آمد رفت مشکوک نظر آئے انہیں ہمارے غلو پر داخل سکنا تھا لیکن انہوں نے جان بوجہ کر نہیں لیا کہ ہم اسنا ہونے کا امکان کم رہے۔ وہ بالکل اس طرح اچھلے سے بھج جان کر رہا تھا جیسے منیر اور مسعود کی حرکات و سکنات سے اس کی سوچوں سے بھی واقف ہو۔ مجھے افسوس ہوا رہا تھا کہ میں نے بلاوجہ منیر اور مسعود کا وقت اور توانائی ضائع کی تھی۔

کمال نے سن بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس میں شک کہ میری اور پرس خیمہ کی جگہ کوئی اور ہوگا۔ اور وہ اس سے لگنا چاہتا تو ان دونوں کی نظریں آتے بہتر نہیں شکل سکنا لیکن ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں تو اس ہوٹل سے فی الحال لگنا ہی تھا۔ اور اگر ہم لگنا چاہتے تو تسماری یہاں کمری کی ہوئی یا ایک تالین بھی ہمیں نہیں روک سکتی تھی۔ ہمیں خواہ میاں کرانہ طور تک پہنچوں میں سوراخ کر کے اور پھر زمین میں بھا کر بھی جانا پڑتا تو ہم چلے جاتے۔ لیکن ہمیں اس کی رت نہیں تھی۔ اور ہمیں تو چنگ تسماری آدمی کی توقع بھی تھی لئے ہم اس کے لئے بھی تیار تھے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ تسماری آدمی کا انداز کیا ہوگا۔ صرف اسی لئے باہر کھڑے تھے ہمارے دو توہمیں کو زار تکلیف اٹھانی پڑی۔ لیکن اس سے باز قی نہیں پڑتا۔"

کندھے اچکا کر اس نے ایک بار پھر کمری دیکھی اور خفیف سی راہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے اپنے ریموٹ کنٹرول ختم کا ذکر اٹھا۔ اتفاق سے کچھ اسی قسم کا نظام ہمارا بھی ہے۔ اب ذرا پتہ تو ہمیں کا مشر بھی کر لیا۔ وقت تو ہو گیا ہے۔"

اسکریں پر اب بھی مسعود چھپر بٹھا کھینچا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک چھپر کے پیچھے سے کمرے کے کھٹ کے کسی چست قسم کے اس میں ایک شخص سائب کی طرح جل کھا کر نکلا۔ اس نے مسعود کے عقب میں سر اٹھا دیا تھا۔ اپنے سامنے سے بھی خبردار رہنے والا مسود اس کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔

اس شخص کا چہرہ اسکریں پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ کمرے کا زوایہ نہ کچھ ایسا تھا لیکن میں نے اسے پتہ یا ڈھنڈے جیسی کوئی چیز جو زیادہ لمبی نہیں تھی مسود کے سر پر رسید کرتے ہوئے دیکھا کہ مسود کے سر پر رکھے جانے والے اس داری پر چٹ مجھے اپنے دل پر فوس ہوئی لیکن اب کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مسود کی گردن دھیلے دھالے انداز میں ایک طرف کو جھک گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ چھپر کو ڈھیر ہو جاتا اس شخص نے عقب سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر بے رحمی سے اسے چھینچ لیا اور "دوسرے ہی لمحے وہ دونوں کمرے کی آنکھ سے اوچھل ہو گئے۔

کمال نے سن لے پہلے والا جن دلیا۔ گیمرا منیر کی کار پر تیز لیکن اب منیر وہاں نہیں تھا۔ اچانک سے فرش پر ایک سگریٹ چڑی اب بھی سگ رہی تھی اور پی وی کی اسکریں پر چنگاری کی طرح

ہو گیا۔ وہ چلا اٹھی۔ مکمل ایلینہ۔ مڈک۔ یہ سب کچھ مڈک۔ میں
چوہری صاحب کو سالوں کی۔ ان کی مت کرلوں گی۔ یہ یہاں سے
چلے جائیں گے۔ تم دونوں میں سے کسی کا بھی مرنا ٹھیک نہیں
ہے۔

وہ ایک لمبے کے لئے بھی میری طرف سے نظر ہٹانے کا تحمل
نہیں ہو سکتا تھا۔ پرنس کی طرف دیکھے بغیر بیٹھے بیٹھے دھڑلے کے
درمیان سے بولا۔ "تم خاموش رہو۔ تمہارے دل میں کیا سسر
چوہری کی ہر روی جاگ اٹھی ہے؟ کیا تم اسے مرے دیکھنا نہیں
چاہتیں؟"

"نہیں۔ میں دراصل تمہیں مرے نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ
تیزی سے بولی۔ اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی سانس
تیز چل رہی تھی۔

کمال کے دانت بدستور بیٹھے رہے اور اسی عالم میں وہ عجیب
سے انداز میں ہنسا۔ اس کی ہنسی دلچسپی کی طرف مائل کسی درد سے
کی آواز محسوس ہوئی اور وہ بدستور چوہری کی رفتار سے ٹھیکے ہوئے
بولا۔ "میں اتنی آسانی سے مرے والا نہیں ہوں۔ لیکن میری
خواہش تھی کہ چوہری بھی نہ مرے۔ لیکن اس نے ابھر کسی خاص
مقصد کے مناسبت امتحان انداز میں اپنے آپ کو نلکا پھڑ میں
پھنسا لیا ہے۔"

کھدائی کے انتہائی حد تک تھے ہوئے مار کو توڑنے میں بھانچا
نہا محض نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ وہ کہے ہوئے تھے کی طرف ٹھہر
اس سے کہیں زیادہ تیزی سے بچے گرا۔ اپنی دانت میں اس نے
بڑی شو باری دکھائی تھی۔ اس نے اپنی لمبی انگلیں بڑھا کر مجھے
ازگلی لگا کر اوپر سے سر گرانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنی
جگہ سے ہٹے ہوئے اس کے ہاتھ پر ٹھکر کر سید کی جو ٹخڑ توڑ ڈالے
کے لئے کافی تھی۔

اسی لمبے کمال نے سن فاز کر دیا تھا کہ میرے اس جگہ سے
ہٹ جانے کے باعث صرف دھار کا تھوڑا سا نیڑا اکڑ کر رہ گیا۔
اس کے ساتھ ہی میں آگے بڑھ کر دھانچے کی پوئیں میں بھی ٹھکر
رہید کر چکا تھا۔ اگر مجھے دوسری ٹھکر کر سید کہنے میں ایک ہاتھ
کی بھی تاجز ہوئی ہو تو اچھل کر دوبارہ کھڑ ہو چکا ہوتا۔

دھن تو اس کا کم ہی تھا۔ میری پوری قوت سے رید کی تھی
ٹھکر کرنے اسے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی
شاہ میں کمال پر بھی فاز کر چکا ہوا تھا۔ اس نے ایک اور ایسی
حرکت ہوئی جو میرے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ پرنس حینہ پر سے
میری نظر ایک ٹانے کے لئے ہٹ چکی تھی اور اس کی طرف سے
مجھے اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس خطرناک ٹکٹش میں ٹانگ اڑانے
کی کوشش کرے گی۔

لیکن شاید وہ کبھت ہی نہیں تھی۔ پرنس حینہ ہی تھی۔
سب کام ایک ساتھ ہی ہو رہے تھے۔ اسی لمحہ وہ بھی نہ جانے کہاں

تھا۔ میرا بھی اس سے بچنا ہوا خوش قسمتی تھی۔ میری پڑوں کی
تاجر منبوی کے باوجود شاید کوئی بڑی توجہ ہی جاتی اور نہ جانے
کتنی دیر کے لئے میں دنیا داری سے بے خبر ہو جاتا۔

یہ کھل میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے بدوقت اس کے بارے
میں خبردار ہونے اور اس کی خطرناکی کا اندازہ لگانے کی سلت مل
گئی ورنہ اس کا ظاہری سراپا بیٹھا لوگوں کو دھوکا دیتا ہو گا اور وہ کسی
کے کچھ دیکھنے سے پہلے ہی اسے ڈھیر کر دیتا ہو گا۔

اب جبکہ وہ بھی کچھ چکا تھا کہ میں کوئی آسان شکار نہیں ہوں
تو یکدم غما ہو گیا تھا۔ اور کمال نے سن سے نہ جانے کہاں سے
ایک خوفناک صورت سارے اور کمال لایا تھا جس پر نہایت عمو قسم
کا ایک مائیلرٹ تھا کہ اس سے روٹ اور کی خوفناکی میں کچھ اور
اضافہ ہو گیا تھا۔

صورت حال اب عجیب ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھ میں شین
مائل اور کمال کے ہاتھ میں مائیلرٹ والا روٹ اور تھا۔ ہم دونوں کے
درمیان وہ ڈھانچا تھا جس کا موار سا چوہر ہاڑ سے
کاری تھا کہ اس کی آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔

چند لمبے کے لئے تو ہم تینوں ساکت رہے۔ کچھ کہہ نہیں جاسکتا
تھا کہ کسی کی ذرا سی حرکت کسی کا ذرا سا غلط اٹھا ہوا قدم کسی کے
لئے موت کا پیغام لا سکتا تھا۔ اچھی کے تھے ہوئے آندوں کی طرح
گویا ہم ایک دوسرے کی زندگی کے مار تھا۔ ہوئے کچھ
نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ذرا سے غلط دباؤ سے کسی کی زندگی کا روٹ
جاسکے تھی کہ وہ دونوں تو سچی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے
کے لئے فرشتہ اجل ثابت ہو سکتے تھے کسی ایک کی غلطی ان میں
سے کسی کو بھی موائی تھی۔ کہہ ہدف ان دونوں کا میں ہی تھا۔

پرنس حینہ ایک دھار سے جا گئی تھی۔ اس کی خوبصورت
آنکھیں دھشت سے چیلی ہوئی تھیں۔ کراہے لگ کر کشادہ تھیں
بہر حال ہونے کا کرا تھا۔ کوئی طویل و مریض میدان جنگ تو تھا
نہیں۔ محض جگہ کی غلطی کے باعث بھی موت کسی کا لٹو چاتی ہوئی
گزر سکتی تھی۔ اس کا اندازہ چاند ہی کو تھا۔

پھر ہم تینوں نے ہمزاد اپنے پر آنے کے لئے ایک وقت چوٹی
کی رفتار سے اپنی جگہ سے کھٹکنا شروع کیا۔ کوئی ایک دوسرے
سے ذرا سی بھی زیادہ جلت کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کا
مرکز نگاہ میں تھا اور مجھے ایک وقت ان دونوں پر نظر رکھنا پڑ رہی
تھی۔ میں نہایت آہستگی سے دوسری دھار سے جا لگا۔ موجودہ
صورت حال میں یہی حکمت عملی بہتر تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ
ادھا ز شروع ہو تو ڈھانچا تھا محض درمیان سے ٹکلی جائے یا کسی
طرح میری پشت پر پہنچ جائے۔ کمال کی اور میری انگلی کا دباؤ اپنی
پلی گن کے ٹریگر پر خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا۔ کسی کی گن سے
کسی بھی لئے کوئی برآمد ہو سکتی تھی۔

صورت حال کا غما شاید پرنس حینہ کی بدداشت سے باہر
نہیں نکلتا تھا۔

ڈھانچے نے درخالی جان دیکھ کر فوراً ہی لات ہو دیں بلند کر کے ہتھوڑے کی طرح میری پیشانی پر رسید کرنا چاہی لیکن میں ایک طرف ہٹ گیا۔ لات کمال نے سن کی پیشانی پر پڑی۔ بالکل اسی طرح جیسے فرش پر پڑے ہوئے خربوزے کو کسی نے ہانکی مار کر پھینکے کی کوشش کی ہو کمال کا جسم ڈھیلے پڑ گیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ڈھانچے نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

ایک دار خالی جانا دیکھ کر ایک لڑخاٹھ کے بغیر دو سراوار کرنا مارشل آئرس کا بنیادی اصول ہے۔ ڈیٹا لچا اس اصول پر کچھ زیادہ ہی عمل پیرا تھا۔ ابھی میں ایک دار سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ وہ دو سراوار کرتا تھا لیکن مجھ میں اب جو درنگی پیدا ہوئی تھی اس کی وجہ سے اب یہ مقابلہ ٹینک کی کانسیں حالات کا ہو کر نہ گیا تھا۔ وہ ایک بار پر عتاب کی طرح مجھ پر آیا۔ وہ میری پیشانی پر چاب مارا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا وار روکتے ہوئے اسے بازوؤں کے گھٹنے میں بکڑ لیا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ میری گرفت میں آ گیا تھا۔ اب اس کی حیثیت میرے لئے ایک کچھوے سے زیادہ نہیں تھی۔

میں نے اسے بھیجنا شروع کیا تو وہ بلبلہ اٹھا۔ مارشل کورس
میں دشمن کی گرفت سے نکلنے کے لئے جیتے، داؤ بیچ سکھائے جاتے
ہیں وہ سب اس نے مجھ پر آزمائے گی کوشش کی لیکن اب اس کی
ایک نہ چل۔ چار چہ دان میں آپکا تھا۔ اب اس کی کوئی تدبیر
اس کے کام نہیں آسکتی تھی۔

میں نے کام میں اس کی
 ہر طرف سے بھرتے والے کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا موقع
 ضرور آتا ہے جب وہ محسوس کرنا ہے کہ فحش حاصل کرنے کے لئے
 صرف مارشل آرٹس یا کسی بھی قسم کی صرف ٹیکنیک کافی نہیں
 ہوتی۔ جب اس کے ساتھ طاقت۔ بلکہ بے پناہ طاقت کا امتزاج
 ہوتا ہے تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

میرے اندر ایک عجیب سا ایال اندہ رہا جو کہ یہ لمحہ شدید ہو رہا تھا۔ میری رگ و پے میں کوئی خرفان سا اندہ رہا جو کہ مجھے کی طرح بید ہوتا ہوا گرا کھڑی میں آکر سر کھڑا ہو رہا تھا۔ میں دھانچے کو بھینٹا چلا گیا۔ وہ بلاشبہ فلاور کی طرح سخت تھا مگر کچھ شلے ایسے ہوتے ہیں جن میں فلاور کو بھی کچھ نہ کچھ سنبھانا پڑتا ہے۔

اس کی حالت خیر ہو گئی۔ دھمکی ہوئی آنکھیں اُبل آئیں۔
 دیکھ ہوئے گال پھول گئے۔ چپقلی کے چہیت کی طرح زور چوہا اور غواٹی
 ہو گیا۔ اس نے بہت ڈاٹھ پاؤں مارے لیکن کوئی ناکاہ نہیں ہوا۔
 جو جستو بھی اس کے کسی کام نہ آئی۔

آخراً کچھ دیر بعد وہ فواد کی دھانچا نرم پڑ گیا، جیسے کسی روٹ کے ٹوٹ چلے ہوئے ہوں۔ اس کی گردن ایک طرف کڑھلک گئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ عریض جسم نے اسے بازوؤں کے شعلے سے آزاد کر دیا۔ وہ مردہ سانپ کی طرح قابضین پر جا

پناسا ہسپتال نکال چکی تھی جو میں نے بعد میں دیکھا۔ مجھے
چاہتا تھا کہ محض پناہ حاصل کر لیں۔ ایک بڑا سا دھماکا ہوا اور
اسل میرے ساتھ سے نکل گیا۔

[illegible]

انے اس کے بازو پر کرائے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ مجھے یہی
 اس کے لوہے سے کسی چھوٹے سونے پل پر ہاتھ رسید کر دیا
 گولی اور چل سنی لیکن دیوار اور سہر مال اس کے ہاتھ سے
 جس اس پر مزید گولی وار نہ کر پڑا کیونکہ اسی لمحے عقب سے
 گچے نے مجھے تن دیا تھا جس کی چند پٹیلیاں اور ٹھنڈ
 دھانے کے ساتھ ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

ان دونوں کے درمیان سیدوچ بن کر رہ گیا۔ ہم تینوں لڑ چکا کر رہے۔ اس دوران شاید اس بد بخت ڈھانچے نے ہر کوئی داؤ بھی توڑا تھا کہ کد مجھے اپنی ریاضہ کی بڑی میں بندھ لے محسوس ہوئی تھی۔ وہ دوپائی پڑی مضبوط تھی۔ ایک تینوں کے گرنے سے بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

ماٹیاں اس وقت بچے تھا لیکن وہ بچے کی طرح کھل کر نہیں
 مہی لئے کمال بچے آتیا اور میں اوپر - ڈھانچا "واہو" کی
 بچ کے ساتھ ہوا میں اچھلا - میں نے اس کا استخوانی ہاتھ
 ہاٹھ بچے آتے دیکھا - اس کا یہ خوب ہنستہ کا وار میرے لئے
 تھوار کے وار سے کم نہ ہوا کہ میں کمال سمیت بچے لڑا حک
 اس وار سے بال بالی ہی بچا - دو تالی کی دو غم تھیں کے بیک
 رنے سے نہیں غولی تھی "اس استخوانی ہاتھ کی ضرب سے
 مات فوٹ گئی - اگر اس کی تھک میری گردن ہوتی تو -

مورستو حال کی یقین اور نزاکت حد سے چھٹی تو میرے جسم
 تخت ایک انسانی سی حیوانی قوت جاگ اٹھی۔ سارا منظر
 آنکھوں کے سامنے دھندلا گیا۔ صرف کمال اور ڈھانچے کے
 وہ گئے۔ مجھے ان چہروں کو منظر سے ہٹانا تھا۔ اس کے سوا کوئی
 ہی کوئی خیال، کوئی اندیشہ، کوئی احتیاط باقی نہ رہی۔ مجھ پر
 ہی سوار ہو گئی۔

”زندگی چاہے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تلاش
الوں کو ہمارا دل لاش بھی نہیں لے گی۔“
مجھ گیا کہ حضور اس زمانے کا نام تھا جسے میں نے چند لمے
اپنے غصے سے آواز کیا تھا لیکن پرنس خیمہ یہ ظاہر کر دی
وہ کارروائی اب ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کی
کی تھی لیکن میں نے سوچا کہ تھوڑا بہت بھل کر میری طرف
نہ اس ذرا سے میں حقیقت کا رنگ بھر دے جاؤں میں کوئی
میں تھا۔

میں نے فراتے کے سے اواز میں کہا۔ ”سنی الحال تو میں
ہوں۔ لیکن تم جو کوئی بھی ہو اپنے سر رستوں کو تباہ نہ کر
یہ ساتھیوں کو کوئی نقصان پہنچا تو میں قبر تک ان کا پیچھا کروں

یہ کہہ کر میں تیزی سے گھبرا اور بڑے دم و ڈر اٹھ دوام کے
زسے خاصی زوردار آوازوں کے ساتھ بڑھ کر ہوا یا ہر گیا۔
اور پڑی راہوں میں کھل جاتا تھا۔ اندر ایک ہنگام پچا ہو چکا
لیکن باہر دی سکوت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر اور آفتاب اس
نہ میر اور مسعود کے افوا کا کام ہلانے کے لئے ان کے عقاب
ہوں گے۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ گھبراہٹ جاتے وقت میں ابھی
ستے ہی میں تھا کہ کار کے ریڈیو پر مکمل سروسول ہوا۔ دوسری
ب آفتاب تھا۔ اس نے بتایا۔ ”سرا ہم نے سنیر اور مسعود کو
رالیا ہے۔ انہیں لے جانے والے تین توئی تھے ایک ذرا تیر
اور دو شاید وہی تھے جنہوں نے سنیر اور مسعود کو بہ ہوش کیا
وہ تین مارے گئے ہیں۔“

”اور!“ میں نے آسف سے کہا۔ یہ آسف ان کے ارادے
نے پرنس تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ کوئی کار تہ سراغ ہاتھ آنے
ایک اور موقع ضائع ہو گیا تھا۔ میں کے بغیر نہ سکا۔ ”تم نے
نہ کا تعاقب کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہوئی کہ وہ سنیر اور مسعود
لوگ کہاں لے جاتا چاہ رہے تھے یا پھر سنیر اور مسعود کو اس طرح
جڑانے کی کوشش کی ہوئی کہ انہیں افکار لے جانے والوں میں
سے کوئی دھماکا ہاتھ آجائے۔ شاید اس سے کوئی کام کی بات معلوم
اسکتی۔“

”یہ دونوں ہی باتیں ممکن نہیں تھیں سرا“ آفتاب ہوا۔ ”ان
تینوں کو ہلاک کیے بغیر سنیر اور مسعود کو جلد از جلد ان کی گرفت سے
چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ انہیں جڑانے میں ہم جتنی تاخیر کرتے اتنا
ی ان کی زندگی کے لئے خطرہ بڑھتا جاتا۔ ایک ایک لمے کی تاخیر
سنیر اور مسعود کو موت کی طرف لے جاتی تھی۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے دریافت کیا۔
”سرا وہ سنیر اور مسعود کو کسی عام گاڑی میں نہیں لے جا رہے
تھے۔ آفتاب نے بتایا۔ ”ہوٹل کے عقب کی طرف جہاں چلائی

کی گاڑیاں وغیرہ آتی ہیں۔“ آئیں کریم سیلائی کر رہے ولا ایک بڑی
مشہور تیلنگی کا ٹرک کھڑا تھا۔ وہ اس ٹرک کو لے بنائے تھے
ذرا تیر کی جگہ انہوں نے اپنا توئی بٹھایا تھا اور منہ اور مسعود کو
بے ہوشی کی حالت میں فرار میں ڈال دیا تھا۔ وہ اندازہ نہ کیا ہے کہ
کیٹ کی طرف بھاگنے کے جا رہے تھے۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ
ان کی کوئی خاص خطرہ نہیں تھی۔ وہ بس یہی چاہ رہے تھے کہ سنیر
اور مسعود فرار ہو کر سر بائیں تو ان کی لاشوں کو کسی دیر ان مقام پر
پھینک دیا جائے۔“

میرے اعصاب میں ایک لمبے کے لئے تباہ ہو گیا۔ آفتاب
بات جاری رکھتے ہوئے ہوا۔ ”اس صورت حال میں ہم معاملے کو
طول دینے کا فائدہ سول نہیں لے سکتے تھے سرا اب بھی سنیر اور
مسعود ہمیں برف کی طرح اور اڑا رہے ہوئے تھے ہیں۔ بد بختوں
نے انہیں بالکل ختم خانے سے آئے والے گوشت کی طرح آفس
کریم کی شیفوں کے درمیان ٹھونسا ہوا تھا۔“

”انہیں فوری طور پر دھو کر لے جاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔
”ہم وہیں لے جا رہے ہیں سرا“ آفتاب نے جواب دیا۔ مائل
ٹاؤن والی طویل درمیان کوٹھی میں مسعود کی جگہ میں مسعود دیکھنے
پر کچھ کل وہ تمام لمبی سوئیں چھوٹیں جو کسی چھوٹے سونے کر
جدید اور اعلیٰ اچھال میں پھیر آسکتی تھیں۔ کچھ عرصہ عمل میں
نے ضرورت محسوس کرتے ہوئے یہ اطلاعات کے تھے۔ ہر وقت
وہاں ایک یا دو اور ایک نرس بھی موجود رہتی تھی۔ وہ بھی اپنے ہی
لوگ تھے۔ اس سے بڑی سولت ہو گئی تھی۔

آفتاب ہوا۔ ”مسعود اور سلطان کو ہم نے ہوٹل کے انہی
دو دروازوں پر موجود رہنے کی ہدایت کی تھی جہاں وہ قیامت تھے۔“
”میں نے انہیں وہاں سے رخصت کر دیا ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”ہوٹل کے۔ یا اس سوٹ کی گھرائی کرنا اب کوئی خاص
ضروری نہیں رہا۔“

”اچھ کی تواضع دینے پر ابھری۔“ سرا اگر آپ حکم دیں تو مکمل
نے من کو اٹھا لیتے ہیں۔ وہ تھوڑا بہت اہم آدمی معلوم ہوتا ہے۔“
”اگر ایسا کرنا ضروری ہو جائے بھی چند دن بعد کریں گے۔“
میں نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے وہ فی الحال تائب نہیں ہو گا۔ وہ
جہاں ہے اسے وہیں رہنے دو۔ میں قریب کے واقعے کے سلسلے میں
اس کا راز عمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تم یہ معلوم کرنے کی
کوشش کرنا کہ اسے ہدایت کہاں سے ملتی ہیں۔ ویسے مجھے وہ اہم
آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ میرا اپنا اندازہ تو یہی ہے کہ ابھی تک کوئی
اہم آدمی ہمارے سامنے قیامی نہیں۔ ہم تو ابھی یونہی اس پاس
کے جواز جھکاڑے الجھ رہے ہیں۔ اصل درشت اس کی شاخوں
میں۔ لیکن پتہ تک ابھی نہیں پہنچے۔ جڑ تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ
ریڈیو ڈاٹ کا کوئی بہت ہی بڑا بہت ہی لمبا چڑا پھر معلوم ہوتا
ہے۔“

ہیں۔

"ٹھیک ہے۔ تم انہیں وہاں پہنچاؤ۔ میں صبح ان کی حالت کے بارے میں جولی سے رپورٹ لوں گا۔" میں نے خدا حافظہ کر کر ریڈیو کا سوچا تک کر دیا اور خفیہ خانہ بند کر دیا۔

امروز پنج کر میں نے شاور لیا اور کھانا کھا کر سب کچھ زہن سے جھٹک کر سو گیا۔ گوکہ آج کی رات کا اتنا زامہ نہیں ہوا تھا جتنی خواب بہت اونچے آئے تھے۔ میں اس وقت یقیناً بہت کمزور تھی۔ قہار جب فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ کئی سیکنڈ تک تو میری کھمبہ میں ہی نہیں آیا کہ میرے پیڈ کے قریب جو چیز وقفے وقفے سے بج رہی تھی فون کی گھنٹی تھی۔

گھر پر آنے والی ٹیلی فون کا گھنٹہ باز میں ہی ریمبو کی جانی تھی۔ طارق خان یا بلا برلی میں سے جو بھی ڈیوٹی پر ہوا تھا وہ فون ریمبو کو تھا اور اگر ضروری سمجھتا تھا تو مجھ سے ملاوٹ تھا لیکن اس وقت گھنٹی میرے پرانیٹ فون کی بج رہی تھی جو ڈائزٹ تھا۔ اس کا نمبر خاص خاص فون گروں کی کے پاس تھا۔

اس وقت رات کے تین بجتے والے تھے۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ سو سکا کہ رات کے اس پس کس کو مجھے فون کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی؟ شاید ستاہ یا پھر کراچی سے رابطہ تھی۔

اگر اس قسم کا کوئی آواز دوست سنائی دینے والا معاملہ ہوتا تو شاید اتنی کمزور نہ ہوتا مجھے ناگوار نہ گزرتا۔ گوکہ اتنی کمزور نہ تھی۔ لیکن جب میں نے ریمبو راٹھا کر کان سے کچھ زیادہ تانہ دم کو کھینچی تھی۔ لیکن جب میں نے ریمبو راٹھا کر کان سے کچھ زیادہ تانہ فون سے کا حد سے دو چند ہو گیا۔ طبیعت جھک ہو گئی۔ بڑی شدت سے دل چاہا کہ ٹیلی فون کے نظام میں یہ سولت بھی شامل ہونی چاہئے تھی کہ اگر انسان فون کرنے والے کے سر پر ریمبو بھیج کر مانا جاوے تو مار سکے۔

دوسری طرف دی ہوئی دسم احمد خانجے میں تقریباً بھول چکا تھا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر سے محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ سخت گھبراہٹ زدہ انداز میں پوچھ رہا تھا "سر۔ سر۔ سر۔ آپ افضل چوہدری کی بول رہے ہیں؟"

"نہیں۔ میں ان کی مدد بول رہی ہوں جو قفسی غصی اور جینر ٹاکس و فیوہ سے پرہیز کر رہی ہے۔" میں نے جمل کر جواب دیا۔ "سر! میں اس وقت آپ کو پریشان کرنے کی سلائی چاہتا ہوں۔ لیکن سر! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" وہ بدستور سرگوشہ لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں نے کب کہا کہ یہ مذاق کا وقت ہے۔ یہ قبروں میں لینے ہوئے مردوں کو نہایت شجیعہ سے جگانے کا وقت ہے۔ معلوم نہیں مجھ سے یہ حماقت کس طرح ہو گئی کہ میں نے جنہیں اپنا دوزخ نگ کارڈ سے دیا جس پر میرا پرانیٹ فون نمبر کا موجود تھا۔"

"میں بھی کچھ کہتا ہوں سر! احمد بولا "ابھی تک ہم اس کے بارے میں صرف محسوسات کی بنیاد پر ہی بات کر سکتے ہیں۔ فونی نے اس معاملے میں ہمیں جس حد تک بریف کیا ہے اس سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر یہ واقعی کوئی "تیم" ہے تو ابھی تک اس کے سرپر کا پتہ نہیں چل رہا۔"

میں نے غصہ کی سانس لے کر مشتاقانہ لہجے میں کہا "بچو! ابھی تو تمہارا پاس ایڈریس ہے میں ہے تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا۔ سر حال۔۔۔ پھر سالوں کے جواب صرف وقت کے پاس ہوتے ہیں۔ میں بھی انتظار کر رہا ہوں اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ آئے والے چند دنوں میں کوئی نہ کوئی بات۔۔۔ کوئی خاص بات ضرور سامنے آئے گی۔"

احمد بولا "سر! وہ جن دو بجلی گارڈز کو ہم نے بے ہوش کر کے پرنس تینہ کے سامنے والے سوٹ میں ڈالا ہے ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انہیں اٹھوایا جائے؟ وہ غیر میں غفل کرالیا جائے؟ شاید ان سے کچھ معلوم ہو سکے۔"

"احمد! ڈیڑھ اپنی جگہ خطرناک ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ وہ بھی مجھے معمولی حیثیت ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب مجازاً ہنگامی ہے۔ اس سے الجھنے میں تو دنیا میں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "وہ جو تین تو می تم لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں ان کے بارے میں تم نے کیا رائے کاظم کی تھی؟"

"پیشہ وروہشت گرد معلوم ہوتے تھے سر! احمد نے جواب دیا "گوکہ انہیں ہمارے سامنے دہشت گردی دکھانے کا موقع نہیں ملا لیکن ان کے انداز و اطوار بتا رہے تھے کہ وہ بڑی چابی پھلانے کے اہل تھے۔ ان کے جسموں پر گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سفاری سوٹ تھے اور ہیٹ "ٹانگوں اور ہیلیوں کے ساتھ کئی خطرناک قسم کی گھیس اور خنجر و فیوہ بندھے ہوئے تھے لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے ان کی شناخت میں مدد ملتی۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے کہا "وہ بجلی گارڈز بھی اسی قبیل کی چیز معلوم ہوتے تھے۔ احمد وہ بھی دیکھائی نہیں دیتے۔ یہ جسم اور ہتھیار استعمال کرنے والے لوگ ہیں۔ جو ہدایات ملتی ہوں گی انہیں بند کر کے ان پر عمل کر گزرتے ہوں گے۔ قتل و غارت خانے اور چابی پھلانے میں یقیناً ماہر ہوں گے لیکن زیادہ اہم داغ استعمال کرنے والے لوگ ہوتے ہیں جن کا حکم جتا ہے جن کی ہدایات پر عمل ہوتا ہے۔ ایسا کوئی آدمی سامنے آئے گا تو کچھ بات بنے گی۔"

میں گھر پہنچ چکا تھا۔ گاڑی ڈرائیو سے میں روکتے ہوئے میں نے ریڈیو پر پوچھا "میرا اور مسود کی کیفیت اس وقت کیسی ہے؟" جواب آفتاب نے دیا "تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ سر! ان کے جسموں کی حرارت بحال ہو رہی ہے۔ ہم دو نمبر پہنچنے ہی والے

مجھے پوری بات بتاؤ اور شہد سے بتاؤ۔
 میں کارخانے سے ہی بول رہا ہوں۔ اپنے آپ سے۔ وہ
 کوئی کچھ سمجھتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری رات کی
 ڈیوٹی ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ چھوٹے چچائے چوری
 وغیرہ کے پکڑ میں چھانسنے کی تیار کر رہے ہیں اور آپ نے مجھے
 مشورہ دیا تھا کہ میں ان کی جال کو اسی پر الٹ دوں۔
 مجھے یاد تھا۔ اس بنے مجھے بتایا تھا کہ چھوٹے چچائے ہند بھر
 کیش بینک میں جمع کرانے کے بجائے میز کی درازوں میں بھرے
 رکھتے تھے۔ اسی کمرے میں رات کو آکر وہیم احمد بیٹا تھا اور اپنے
 بی باپ کے کارخانے میں نائٹ سپروائزر کے طور پر ایک ملازم کے
 فرائض انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ جس رات میز
 کی درازوں میں بیٹے بھر کا کیش جمع ہو۔ اس رات وہ کسی طرح
 درازوں میں کھول کر ساری گڈیاں اس طرح میز پر سجائے جیسے کوئی
 چور انہیں لے جانے کی تیار کر رہا تھا لیکن اور سے وہیم احمد کے
 آجانے کی وجہ سے وہ جھانک گیا۔ اپنے باپ کو فون کر کے اس
 واقعے کی اطلاع دے دے۔

اس طرح ایک تو اسے قصور سارکریٹ مل جانے لگا کہ
 بدوقت اس کی آمد کی وجہ سے اور اس کے لٹکارنے کی وجہ سے بہت
 جلدی رات چوری ہونے سے بچ گئی۔ وہ میرے جب رقم لٹی جانے کی تو
 چھوٹے چچائے کے کھیلے بھی سامنے آجائیں گے۔ اول تو اس کی
 روزین منٹھوک ہانے کے لئے یہی گھپلا کالی ہو گا کہ وہ بیٹے بھر کا
 کیش درازوں میں رکھتا تھا۔

وہیم احمد کہہ رہا تھا "اتج رات میں نے آپ کی ہدایت پر
 عمل کرتے ہوئے درازوں سے سارا کیش نکال کر میز پر سجایا
 تھا۔ میز کی درازوں میں ایک بھرا ہوا روپے اور بھی موجود تھا۔ معلوم
 نہیں آیا کہ اس کا بھی پتا ہو گا یا نہیں۔ سہ حال میں نے روپے اور بھی
 نکال کر میز پر رکھ لیا تھا۔ میری کارروائی ابھی جاری تھی کہ اچانک
 دھاڑ سے دروازہ کھلا اور چھوٹے چچا اندر آ گئے۔"

"یہ رات کے تین بجے چھوٹے چچا کارخانے میں کہاں سے
 پہنچ گئے؟" میں نے حیرت سے کہا "تم نے تو بتایا تھا کہ ان کی ڈیوٹی
 دن میں ہوتی ہے۔"

"سرا یہ تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔ اس وقت اگر چچا بچ
 کوئی چور یا ڈاکو آتا تو شاید مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی لیکن ان کی آمد
 کا تو مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔"

"چونکہ ار اس وقت کہاں سے؟" میں نے دریافت کیا۔

"چونکہ ار تو میں سے کافی فاصلے پر گیت پر ڈیوٹی دے رہا ہوا
 ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اسے ایک قریبی دستوران میں بھیجا
 ہوا تھا۔ یہاں چونکہ آس پاس کئی کارخانے ہیں اور تین تین
 شخصوں میں کام چلتا ہے اس لئے وہ دستوران دن رات کھلا رہتا
 ہے۔ کھانے پینے کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ اسی لئے ہم نے کارخانے

راہیں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ میری کچھ مدد
 کرنا چاہتا ہوں۔"

اپنے کوئی ایسا وقت بھی گزرا ہے جب تم مصیبت میں نہیں
 تھے نہ پوچھا۔

راہیں وقت مجھے بہت سی بڑی مصیبت کا سامنا ہے۔ یہ
 سب بات نہیں ہے۔ سونہ میں آپ کو تکلیف نہ
 دے دل نے کہا کہ آپ کے سوا کوئی میری مدد نہیں
 کر سکتا۔ اے فون بدست کیجئے گا۔ میری زندگی برباد
 کی۔"

تھوڑی سی زندگی پہلے کون سی آباد ہے۔ میں نے غصہ
 لے کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ جب میں
 مسکین سی صورت دیکھتا تھا اس کا چہرہ میرے تصور میں
 مارتا تھا اس پر ترس آتے لگتا تھا اور سے اس کا لہجہ مجھے
 لرزہ دیتا تھا۔ اتنی مازسی اور مسکین ہوتی تھی اس کے لیے
 اسے ڈانٹ ٹھٹ کرتے ہوئے شرمندگی سی ہونے لگتی

و یکدم ہی جیسے پھنس جاتا۔ بھوں بھوں کر کے رونے لگا فون پر
 پچھلیاں سنائی دینے لگیں۔ مجھے ایک بار پھر اس پر ترس
 مجھے پھر وہی خیال آیا کہ اگر کچھ لوگ ایسے ہوتے تو کم متل
 دیا اور اس ہوتے ہیں تو اس میں ان کا اپنا تو کوئی قصور نہیں
 لہذا انہیں خود تو شاید احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ہوتے تو کم
 اچھوٹا اور اس ہیں۔ سمجھتا تو ہر شخص یہی ہے کہ اس میں دنیا
 خوبیاں نکلتی ہیں۔ انہی خوش فیروں کے سارے تو زندگی ذرا
 سے بھر ہو جاتی ہے ورنہ درحقیقت زندگی بڑی ٹھنکن ہے۔

لیکن وہیم احمد کم از کم اس حد تک تو خجست تھا کہ اسے اپنی
 بیوی کا کچھ نہ کچھ احساس تھا۔ ہر سالے میں وہ خود ہی بفراموش
 بننا تھا۔ وہ جب بھی اپنے آپ کو مصیبت میں محسوس کرتا تھا تو
 کے لئے کسی نہ کسی کی طرف بھاگتا تھا لیکن اب یہ اس کی
 فی تھی کہ بیشتر لوگ اسے دھکا دیتے تھے حتیٰ کہ وہ اس کے
 باپ کے دل میں اس کے لئے بھردری نہیں تھی "اس کی
 توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔

میں نے کہا ہے؟ میں نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ زیادہ نرم نہیں
 لے دیا۔

"سرا اس وقت میرے سامنے ایک لاش پڑی ہے۔ وہ
 اب دو گتے ہوئے ہوا۔"

"کاش؟" میں نے قدرے چونک کر کہا "یہ تم کہاں سے
 ان کے پکڑ میں پڑ گئے کسی کی لاش ہے؟"

"چھوٹے چچا کی۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ چھوٹے چچا اچانک لاش میں کیو کر تبدیل ہو گئے؟ انہوں
 تو تھوڑی سی زندگی انجمن کر رہی تھی۔ تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

میں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں رکھا۔ مجھے اس وقت کچھ بھوک سی لگ رہی تھی۔ میں نے چڑکیدار کو بھیج دیا کہ میرے لئے ہفتا لے آئے۔ پیسے بھی میں نے سوچا کہ میری کارروائی کے دوران وہ ڈیوٹی پر نہ ہی رہے تو اچھا ہے۔ کبھی کبھار گانا بواگیت سے یہاں تک آجاتا ہے۔ چھوٹے بچے بھی بیٹھا اس کی فیرو موجودگی میں ہی اندر آتے ہوں گے۔ اس نے بتایا۔

”اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ ان کے آنے کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہر نامی تھا سر۔۔۔ اس کی آواز ایک بار پھر بھڑکنے لگی۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ پھر میری ہی ہوئی تو ان کی گڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی نہ جانے کیا سوچ کر آئے تھے لیکن یہ منہ دیکھ کر تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کوئی میں ایک سو سا ڈھائی دو اور سے لگا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس نے اور کیوں یہاں رکھا تھا۔ چھوٹے بچا وہ اٹھا کر اتنی لمبائی تک حالت میں میری طرف بڑھے کہ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے میرے دیوہ اور اٹھا کر ان پر قاز کر دیا۔ اس کی آواز ایک بار پھر کانپ گئی۔

مجھے خون پر بھی اس کے تھوک ٹپکنے کی ’نچ‘ صاف سنائی دی۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولا ”سرا آپ تو میری بات کا یقین کرتے ہیں؟“ قسم سے۔۔۔ اس میں میرا بالکل کوئی تصور نہیں۔ اگر میں کوئی نہ چلا تو چھوٹے بچے بیٹھا میری کھوپڑی کھول دیتے اور ان کی جگہ اس وقت میری لاش پڑی ہوتی۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لئے کوئی چلا پڑی۔ لیکن میری بات بھلا کون سمجھے گا؟“

”چنانچہ تم نے اپنی ’ڈس ایڈنٹائٹ اینڈ وائزر سرس‘ کو فون کر لیا۔“ میں نے منمنی ناگوار دی سے کہا ”اب تم یہ پوچھنا چاہتے ہو گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کس طرح تمہاری جان بچا سکتی ہے؟ کیا بات ہے؟“

”سرا آپ کو معلوم ہے اس دنیا میں میرا کوئی بھروسہ نہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ کس سے مشورہ کروں؟ میری شہنشاہی کون ہے؟“ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر رونے لگے گا۔ آئندہ بھانے اور انہیں حکم دے دیتے ہیں اس کا جواب نہیں تھا۔

”تمیں یقین ہے کہ چھوٹے بچے اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں؟“ میں نے جلدی سے پوچھا ”تم نے ایک ہی قاز کیا تھا؟“

”ہمیں سرا“ اس نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا جو اس وقت مسکراتے ہوئے محسوس ہوا۔ اچھولی تو میں نے ایک سی چلائی۔۔۔ لیکن قدرت کا کمال دیکھئے آگرمیں چاہے ہفتا لے باز کی پریکس کرنا رہتا تب بھی شاید اتنا اچھا نہ لگا میرے لئے مشکل ہو نہ غیر نشانہ لئے اور بغیر سوچے چھبے چلائی ہوئی۔ کوئی یقین ان کے دل کے پار ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ فرش پر گرنے سے پہلے ہی مر چکے تھے۔

”ہٹاؤ اٹھ!“ میں نے کہا۔ تبارک ہو۔ تمہاری زندگی کا

سب سے بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ تب اور کیا چاہتے ہو؟“

”سرا یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ وہ گڑبڑایا ”جو کہ اور کسی بھی لمبے والیں آئے والا ہوگا۔ میں اس وقت کمزری کے واسطے کینٹ کی طرف ہی دیکھ رہا ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ یہ بتاؤ کیا رویہ اور تم نے ابھی تک ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ میرے ہاتھ دھکا دیا ہے۔ تب کو فون کرنے سے پہلے کہ دیا تھا۔“

”تب سے پہلے اسے کسی کونٹ میں پھینک دو۔“ میں نے کہہ دیا۔

”لیکن پھینکنے سے پہلے اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیتا۔“

”انگلیوں کے نشانات تو اس پر ہیں ہی نہیں سرا۔“ وہ جلدی سے بولا ”میں نے میری درازوں سے نوٹ دھبوٹا لے کر وہاں احتیاطاً دھتائے ہیں کہ شروع کی تھی۔ دھتائے ابھی تک میرے ہاتھوں پر ہیں۔“ ایک لمبے کے لئے وہ جیسے خطرات کو بھول گیا اور اپنے مخصوص امتحان شریٹلے پن کے ساتھ بولا ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں کالی جاسوسی گمانیاں دیکھ رہا ہوں۔ تھوڑا بہت احتیاط کا تو خیال تھا مجھے۔“

”میں تو پھر۔۔۔ حق کہیں کے اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔“

مید حاصل اور محل ہمارے سامنے تو موجود ہے۔“ میں نے ہلکی سی حنائی لے کر کہا ”پیتھول۔۔۔ یا روالور۔۔۔ جو کچھ بھی وہ ہے۔ اُسے چھوٹے بچے کے سامنے کسی کونٹ میں پھینک دو اور خود جلدی۔۔۔ شیشوں والے حصے کا پکڑ لگاتے پٹے جاؤ۔ جو کہ اگر تمہارا نشانہ کراہی کرے میں آئے گا؟“

”میں سرا“ وہ مستعدی سے بولا۔

”میں۔۔۔ لاش اسے ہی دریافت کرنے دو۔“ میں نے کہا۔

غرض کرو۔۔۔ بلکہ اپنے آپ کو یقین دلاؤ کہ کچھ ہوا ہی ہے۔ کم از کم تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ جو کہ اور لاش دیکھے گا تو پچھانے گا۔ تمہیں دھوکہ آتا ہو گا۔ دوڑا دوڑا آئے گا۔ تب تم دو اور سرے تو میں کو ساتھ لے کر کرے میں پہنچنا اور حیرت و ہشت زدہ دیکھو وہ جانے کی جتنی بھی اچھی لوکار دی کرے گا۔

امریکہ رے امریکہ	طارق الخلیل مارکر - 30/-
سونیت اور عالم اسلام	طارق الخلیل مارکر - 25/-
کورٹ مارشل	طارق الخلیل مارکر - 00/-
آخری کتاب کی صلت	طارق الخلیل مارکر - 10/-

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

دماغ ہوتی ہے۔ اگر کسی نے مجھے زیادہ ڈرا دھکا کر پوچھ گچھ کی تو
بوکھلا کر کہیں میرے منہ سے جھنجھٹا نکل جائے۔
"اب یہ تمہارے نصیب ہیں بچہ" میں نے ٹھنڈی سانس
لے کر کہا "اگر تم مجھ کے لئے اپنے دل و دماغ اور زبان کو قابو
میں نہیں رکھ سکتے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"
"دینی رکھاں! اختیار نہ کریں سر امیر انو! ہوا دل کچھ اور ٹوٹ
جائے گا۔ مجھے تمہارا سی حاصل دے دیں۔ شاید میں آزاداش سے
گزری جاؤں۔" وہ سنایا۔

"بھائی! اب میں تمہیں اور کس طرح حوصلہ دوں؟ کیا وہاں
اگر تمہارا سر سلاخیں تمہاری کمر چھپایاں دوں، تمہیں بچنے سے
لگاؤں؟" میں نے طاقت سے پوچھا "یہ تمہاری جاکا مسئلہ ہے"
تمہیں توڑی بہت تو بہت کہنی پڑے گی۔"

"وہ۔۔۔ پر۔۔۔! دراصل مجھے ان کے پھمڑوں، ڈنڈوں اور
بھاری ہونٹوں کے ٹھنڈوں سے بہت خوف آتا ہے۔ اور پھر دوسری
بہت سی شرمناک حرکتیں بھی کرتے ہیں۔ بہت ایذا دیتے ہیں گی
آوی کو۔ ایسا لگتا ہے جی جیسے ظلم کو برے بڑے طریقوں سے زیادہ
سے زیادہ اذیتیں دے کر انہیں دماغی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ بہت
لطف آتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ذہنی مریض لگتے ہیں سر! مجھے
ایک مرتبہ ایک نوجوان کے ساتھ گفتگو ہوئے دیکھنے کا اتفاق
ہو گیا تھا۔ غلطی سے باہر قسمی سے مجھے سب کچھ دیکھنا پڑا تھا۔ اس
پر چوری کا الزام تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے
چوری نہیں کی تھی مگر۔۔۔" اس نے ایک لمبے کے لئے خاموش
ہو کر گویا بھر پھر لی۔

پھر تباہیادہ قہقہہ نکل کر بولا "تب سے ذہن میں دہشت سی
بیٹھ گئی ہے سر! کسی بار جب سی ہل کے پولیس والے کو دیکھ کر
سیدھی بات بھی منہ سے اٹنی نکلے لگتی ہے۔ وہ جیسے یاد آجاتی ہیں
جن سے وہ اس بے چارے بے قصور کی مثالی پلید کر رہے
تھے۔ خاص طور پر وہ چمتر! شکرگوں نے اس پر یہ بھی لکھا ہوا
تھا۔ "چنانچہ کتنی گزاری اٹی رات تو" حالانکہ ظلم بے
چارے نے وہ رات گویا نوالہ میں گزارا تھی جس رات چوری
ہوئی تھی۔ میں اس کا گواہ تھا۔ مگر انہوں نے کسی کی نہیں سنی۔ بلکہ
میرے بولنے پر وہ تو مجھے بھی شامل قہقیش کرنے لگے تھے قسمت
ابھی تھی نہیں بل بال بلی تھا۔"

"ہر رنگ۔۔۔ ہر بازی ایسا نہیں ہوتا میرے بھائی! میں نے
آخر کار حوصلہ بند جانے والے لیے میں کہا "تمہیں پولیس والے
پروں اور حاضریہ اپنا چارے کا سامان لے کر کسی پر نہیں چڑھ
دے ڈالے۔ جسیں اتنا دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم
نے اس واقعے کو ذہن پر مسلط رکھا تو تم اپنا کام خراب کرلو
گے ضروری نہیں ہے کہ وہ بہت بار کی سی تھیش کریں۔ اور
یہ بھی ضروری نہیں کہ ساری قہقیش کا مرکز تم ہی بنو۔ بعض

تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم اداکاری میں اچھا خاصا عمل دخل
دے ہو؟"
"جی جی۔۔۔ یونہی تمہارا بہت گزارا کرتا ہوں۔" اس نے
ادکاری سے کہا جیسے کسی بہت بڑے پیشہ ور اداکار کو اسٹیج پر
کی دعوت دی جا رہی ہو اور اس کی بے پناہ تعریف و توصیف کی
جائی ہو۔ جس کے جواب میں وہ ادکاری کا مظاہرہ کر رہا ہو۔

"تم یہی ظاہر کرنا کہ تم توجہ دیا کرنا شے کے لئے بھیج کر
ہوں پر کام ہونا دیکھنے پلے گئے تھے۔ جسیں تو کچھ معلوم ہی نہیں
تمہارے پیچھے اتنی سی دیر میں چھوٹے چچا کہاں سے ٹپک
سے میرے فونوں کی گڈیاں کہاں سے آئیں اور چھوٹے چچا کے
ذہن میں سوراخ کون کر لیا۔ تم کہہ دینا کہ پائے جیسی ایک توازن
سنی تو حتمی لیکن اس لئے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کہ حتمی
قوت میں اس قسم کی توازن سٹائی دینی ہی رہتی ہیں۔"

وہ اتنی خاموشی سے میری بات سن رہا تھا کہ مجھے ایک لمبے کے
لئے شہ ہوا "شاید وہ دوسری طرف کوئی موجود ہی نہیں۔ مجھے امتیاز
چھٹا پڑا "تم میری بات سن رہے ہو یا تمہاری مدد بھی تقویٰ
میری سے ہوا کر گئی ہے؟"

"نہیں سر! وہ گڑبگڑ کر جلدی سے بولا "میں تو آپ کی باتیں
سن نہیں کر رہا ہوں مگر مجھ سے کوئی لفظ نہ ہو۔"

"لوگوں کو تم خودی نتائج اخذ کرنے دینا۔" میں نے سلسلہ
کلام جوڑتے ہوئے کہا "البتہ سچ سچ میں تمہارے بہت اشارے
دیتے رہتا کہ شاید تمہارے جانے سی کوئی چور کر کے میری جان بھسا
ہو گا۔ اس لئے درازوں سے ساری رقم نکالی ہو گی لیکن کسی بچھ
و غریب اور باطمینان اتفاق کے تحت اوپر سے چھوٹے چچا بھیج گئے
ہوں گے انہوں نے چور کو لٹکا رہا گا "اس پر حلقہ کہنے کی کوشش
کی ہو گی اور اس کے ہاتھوں مارے گئے ہوں گے یعنی بس تم اپنا
رہار کسی باطمینان چور کو سونپ دو۔ چچا رات کے اس پر کوئی مگر
نہیں۔۔۔ اور درازوں میں اتنا کیش کیوں موجود تھا؟ اس قسم کے
لے پولیس کے لئے اور اپنے آبائی کے لئے چھوڑ دینا خودی
دب حاش کرتے رہیں گے اور ابھی پر ذرا چھوٹے چچا کی
قیقت بھی ظاہر ہو جائے گی۔ یہی وہ کام ہے جو تم کرنا چاہ رہے تھے
اور جس کی کوشش میں تم نے اتنا کمزور کیا۔"

"نیک ہے سر! میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن۔۔۔" ایک بار پھر
گواہ کی مدد کا ہونے لگا۔

"سب کیا ہوا؟" میں نے پوچھا "کیا چور ادا نہیں آیا؟"
"نہیں سر! میری قسمت ابھی ہے۔ وہ تو ابھی تک نہیں
آکر۔ دستوران پر تقریباً ہر وقت سی خاموش ہوتا ہے۔ میں تو
دراصل پولیس گئے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ تو بڑی بارکی سے
تھیش کریں گے۔ سب سے زیادہ پوچھ گچھ تو مجھ سے ہی کریں گے
یہی تو دوسری کسی خوف ناک سی شکل والے پولیس میں کو دیکھ کر

تھاور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آپ نے ان پر اتنا بھروسہ کیا تھا میں سوچ سوچ کر اپنی پانی ہوئے جا رہے تھے۔ جیڑی لے لیا۔

"امتیق ہیں وہ۔" میں نے اس خبر سے محکوم ہوتے ہوئے کہا۔ "ایک تو انہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس بار ہمارا واسطہ عام قسم کے جرائم پیشہ لوگوں سے نہیں ہے۔ دوسرے ان کے ساتھ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔ شاید اس لئے وہ شرمندگی محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی فرخوان ہیں زیادہ پختہ نہیں ہوئے۔ ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ جو بیٹہ دوسروں کو ناگوں بننے چاہتے ہیں انہیں بھی کبھی خود بھی ناک رگڑنی پڑ جاتی ہے۔ یہ کوئی ایسی انسانی بات تو نہیں ہے۔" سلیطہ تو زندگی کے ساتھ ہیں اور چلتے ہی رہیں گے۔ کبھی اونٹنی بھی بچے۔

"وہ زارور ہے تھے کہ کہیں آپ ان سے خائف ہوں۔" جمل بولی۔

"میں اسی وقت فون کر کے ان کا زور دور کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور سلیطہ متعلق کر کے منبر اور مسجد کو فون کیا۔ منبر آباد کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں دو دونوں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ فون منبر نے ریمو کر لیا۔ انہیں قطعاً توقع نہیں تھی کہ میں رات کے اس پر ان کی خیر دعائیت و صاف کرنے کے لئے فون کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ میرے لئے ان کا خیر دعائیت لوٹ آنا میرے لئے زیادہ اہم تھا۔

فون بند کرتے وقت مجھے ابھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بے حد خوش اور پرجوش تھے۔ ساتھیوں کا سوراں بلند رکھنے کے لئے اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں پڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ میں چار افراد سے اتنی دیر باتیں کر کے خند تو آجاتا ہوں کہ لیکن دل پہلے سے کچھ زیادہ مطمئن سا ہو گیا۔ میں نے غصے میں نہ پھنسا یا تو چند منٹ بعد وہ دوبارہ یاد آنا فرمایا ہے خبر ہو گیا۔

دوسرے روز میں انہیں میں نے بے حد مصروف تھا کہ مارکیٹنگ فون کر کے بتایا "سر! وہ ایک فوجوان ہے نا۔" حسن علی۔ جسے آپ کی خصوصی ہدایت پر یہاں پہنچ کر ہر انداز کے طور پر لازم رکھا گیا تھا۔ وہ کئی دن سے آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہے۔ کوئی دفعہ مسئلہ ہو تا تو میں مل کر دیتا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ کئی پر عمل کام ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ جب میں شادی عرف بے بی کے قتل کے لیے میں سرائی کی تلاش میں داخل پارک کی ایک بلڈ کم میں گیا تھا تو پلا سائلا سایہ فوجوان مجھے سیز جوں میں مل گیا تھا۔ ایک رخ اور حساسیت زور فوجوان معلوم ہوا تھا۔ اس کی باتوں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ غرت اور بے ہودہ کاری کی تفسیر کا مارا تھا۔ میں نے اسے اپنے ہاں رکھ دیا تھا اور بھول گیا تھا۔ آ مارکیٹنگ فون پر ذکر کیا تھا تو مجھے وہ سارا واقعہ اور اس فوجوان باتیں یاد آ گئی تھیں۔

واقعہ تو وہ اس قسم کے واقعات کو بالکل عام سا معاملہ سمجھ کر دسی کارروائی کر کے ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ زیادہ زحمت ہی نہیں کرتے۔ اور پھر آخر تم کا رخانے کے مالک کے بیٹے ہوں اور اس معاملے میں کیش مائب نہیں ہوا۔ ملک بچ گیا ہے۔"

"رخانے دار کا بیٹا ہونے سے ہی تو مجھے زیادہ خوف آتا ہے۔ آتا کون سا میری حمایت کریں گے۔ بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ چھوٹے بچا کی موت سے ان کا دماغ زیادہ ہی نہ اٹک جائے۔ میرے بارے میں ان کا فیتہ و فضب اور نہ بڑھ جائے۔" اس کے لیے میں حقیقتاً بڑا خوف تھا۔ ایک بیٹے کے لیے میں باپ کی طرف سے اتنا خوف محسوس کر کے میرے دل میں رود کی لہری اٹھی۔

میں نے ملائمت سے کہا "تم ہر خوف و ذہن سے نکال دو۔ جس طرح میں نے کہا ہے اس طرح کرو۔ اگر پولیس واقعی تم سے کچھ زیادہ پوچھ کچھ کرے اور تم ان کے تیز زور اٹھانے دیکھو تو کسی طرح مجھے ایک فون کرنا۔ میں سائٹ کے ایس ایچ او سے کہ دوں گا۔ کوئی تمہیں انگلی بھی نہیں لگائے گا۔ اب تو ٹھیک ہے؟" اور پوچھا کیا ہے؟

اس کے لیے میں یک ایک اس بچے کی خوشی سن آئی تھی کسی خوف ناک بلا کے بچوں سے نجات مل گئی ہو۔ میں نے آپ نے یہ کہہ دیا۔ میرا سارا خوف دور ہو گیا۔ اب میں شیریں گیا ہوں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ مجھے معلوم تھا۔ میرا مسئلہ آپ کے سوا کوئی حل نہیں کر سکتا۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے سر! اور اس سے بھی بڑا تو می بنائے۔"

"میں۔۔۔ اب مجھے سونے دو اور خود بھاگ کر چھینوں کی طرف چلے جاؤ۔ اب کیا اس وقت ہی یہاں سے لو کہ جب چوکیدار سر پر آجائے گا؟" میں نے کہا اور ریمو در کر دیا۔

میں نے سوچا "اب خیر تو خراب ہو ہی چکی ہے۔" لگے ہاتھوں منبر اور مسجد کی خیریت بھی دریافت کر لیں۔ میں نے وہ بھر فون کیا۔ حسب معمول چلی طرف منبر سے ریمو کر لیا۔ معلوم نہیں یہ عورت دن رات کے کسی حصے میں سولی بھی چھو پا سکتی ہے۔ اگر سولی چھو تب بھی فون ہر حال دی ریمو کرتی تھی۔

میں نے خیر اور مسجد کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "وہ تو یہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ہی بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے تھے۔ سزا میں نے انہیں اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک تو دیر کاٹی ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا۔ آپ سو گئے ہوں گے۔ دوسرے وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس لئے میں نے ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ اس کو رپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی ان سے بات کر لیں گی۔"

"شرمندہ شرمندہ کیوں تھے؟" میں نے دریافت کیا۔ "اسی بات پر کہ انہیں بے خبری میں چھو ہوں کی طرح مار لیا گیا

تسارے اندر جو شعلہ خدیہ ہے وہ ہمیں کیا کچھ کر کر رہے ہیں
کر سکتا ہے۔

”میں ضرور اس کام میں قسمت آزمائی کر کے دیکھوں گا سزا“
وہ پرجوش سے کہنے لگا ہوا ”تو یہ دست لڑائی میں تو میں کسی
سے نہیں ڈرتا اپنے سے کئی گنا طاقتور انسانوں سے بھی نہیں
ڈرتا۔ کیونکہ بے دوز گاری اور مسلسل ہتھیاروں کی وجہ سے میرے
اندہ جھلپا ہٹ اور خشم کا ناک چپکے چپکے بڑھ گیا ہے۔ ہاں وہ گپ کو
شاید انداز دی ہو کہ غرت کا زہر انسان کو اندر ہی اندر بہت طاقتور
باندھتا ہے۔ خواہ اس کا جسم کتنا ہی کمزور ہو۔“

محسن ملی خود اپنا تجربہ بھی محمدی سے کر سکتا تھا۔ صرف اپنا
ی نہیں بلکہ عمومی انسانی نفسیات کا اصول بیان کرنا تھا۔ وہ اپنی
مزد زبانت کا ثبوت دیتے ہوئے ہوا ”آپ یہ تو استعمال کرنے
والے پر منحصر ہے کہ وہ ہم جیوں کے چنے میں خدیہ اس آتش
فطرت کی توانائی کو فوہار بھگالنے اور نت نئے سانچوں میں ڈھالنے
کے لئے استعمال کر سہے یا دوسروں کا کھر جالنے کے لئے۔“

پھر ایک لمحے توقف سے وہ ہوا ”اگر کوئی میری ذرا سی مدد
کرتے تو میں دو چار دن میں ہی ہرجے کا استعمال اچھی طرح سیکھ لوں
گا۔ میں کچھ بھی سیکھنے کے معاملے میں غبی نہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اس کا بندوبست
ہو جائے گا۔“ میں نے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ تم میری دفتر میں ہی رہو اپنے
کسی کارخانے و قیوم میں زیادہ مشکل اور زیادہ تنہا رہنے والے کام
پر لگنا جس میں ہمیں سر کھانے کی بھی فرصت نہ ملے۔ لیکن مجھے
معلوم ہے تم دو چار دن میں اس سے بھی اگلا جاتے۔ تساری مدد
بھ اصل ایڈیٹر نامک رہی ہے۔“

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ صرف آپ میری بات سمجھ سکیں
گے سزا“ وہ پہلے سے زیادہ پرجوش کہنے لگا ”میں ہوا“ سی لئے میں نے
آپ کے پاس آکر اپنا مسئلہ بیان کرنے کی جرأت کر لی۔ آپ کی جگہ
کوئی اور پاس ہوتا تو میری باتوں کو حقیقتاً صرف ناٹھری کی پیداوار
کہہ کر مجھے کان سے پکڑ کر نکال باہر کر دیتا۔ چھوٹا آکر وہ
محسن نظر آ جاتے تو مجھے کیا کہنا ہے؟“

”جیسے وہ محسن اپنے نہیں دے جائیں گے کسی بھی طرح اس
محسن کو قابو میں کر کے ان میں سے کسی ایسے نہیں پر پکڑا جا سہے
خیال رہے کہ کوئی حملے نہ پائے۔ مجھے وہ زندہ حالت میں
چاہئے اب تم اسے کسی طرح قابو میں کرو گے۔ موقع ملے گی
مناہت سے کیا طریقہ کار اختیار کرو گے یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔“

”بالکل ٹھیک ہے سزا“ وہ مستحضر سے بولا بہت خوش نظر
آ رہا تھا۔ شاید اسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ اس کے تمام تر انمازی
جن کے باوجود کوئی اہم کام اس کے سپرد نہ کی جائے گی۔ میرے لئے
تو کہ یہ ہم کوئی ایسا اہم کام بھی نہیں تھی لیکن اسے دینے کے لئے۔
فحائل میں ایک ”نیشہ کیم“ میرے ذہن میں آیا تھا۔

1/-	محرا کا چاند	اے حمید
10/-	پلی جت کے آنسو	اے حمید
50/-	اور اس جنگل کی خوشبو	اے حمید
0/-	چاند چہرے	اے حمید

مکتبہ القریش اردو ہزارہ لاہور 2

وہ بالکل انمازی اور مصوم تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ ہے؟
ہاتھوں میں ایک سینڈ میں مارا بھی جا سکتا تھا لیکن اس
میں شعلہ خدیہ ہونے کی بات کی تھی اور چنے میں شعلہ خدیہ
والوں کا احتیاج میں اسی طرح لینے کا تھا۔ اگر وہ دوا کو
نہ کے مقابلے میں محسن اپنے جذبے کی بدولت کچھ کر کر
ایک تجربہ ہی اسے یکدم کلکتا بھی جا سکتا تھا۔ اگر اسے
”کرزا“ لگ جاتا تب بھی وہ ہر حال میں کچھ سیکھ سکتا تھا
بے آب اور پرجوش امیدوار جو بہت جلد حیرا کی ٹیکٹا
اس کے لئے میری نظریں تو حساب طرہ ہی تھا کہ اسے
کھلے سمندر میں دھکا دے دیا جائے۔ میرے تجربے کے مطابق
بات کا بہت کم امکان ہوتا تھا کہ وہ ڈوب جائے۔

میں نے دروازے سے اسے فن کی ایک کوادرز ساز کی
تصویر لٹل کر اس کی طرف دیکھا تو مجھے کتا یہ ہے وہ
حاش کرنا ہے۔“

تصویر کو دیکھنے ہی چیتے اس کا سارا جوش و خروش جو
طرح پینہ گیا۔ شاید اسے یہ گمان بھی کر رہا ہو کہ میں اس
کر رہا ہوں۔ اسے فن کو تو دیکھ دیکھنے سے بھی کچھ اچھا
مغرب نہیں ہوتے تھے جبکہ یہ تصویر تو دیکھنے ہی محسن
اسٹوڈیو میں کھینچی گئی ہوئی تھی تو شاید تو گرا فرما کر اسے فن
کی تمام تر مشقہ نیزی کے باوجود اس میں بھی اسکرین کا
کرنے کی اپنی ہی خوش کرنا۔ لیکن یہ تو محسن سیکھنے والے
میں استعمال ہونے والے کمرے سے اس کی لائٹس میں اور
کھینچی گئی تھی۔ اس میں تو اسے فن تقریباً اندر ہی معلوم ہوا
میں محسن ملی کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔
نہ وہ سکا۔ اسے آپ اتنا ہی خطرناک تو ہی کہہ رہے ہیں
قابو میں کرنے کے لئے آپ نے بہت سے تو میں کی ڈھول
ہے؟“ اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لئے
پہنچی تھی۔

بہت ضروری ہو رہا تھا لیکن میں اس کا بھی کوئی شیڈول نہیں بنایا تھا۔ اور صرف ذات میری جان کو اتنی ہوتی تھی۔ اور صرف ایک ظاہرہ خانم اور ستارہ کے ساتھ میرے دوسرے دوا ہونے کی نوبت نہیں آ رہی تھی۔

حالانکہ میں نے کام کو اتنے محنت سے خود بخود شعبوں میں بانٹ رکھا تھا، اتنے قوی آواز اور طور پر ایک ایک میرے کا دوبارہ کو چلا رہے تھے اس کے باوجود مصروفیات میرے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھیں جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے اعصاب کو ہر وجہ سے تیز اور کھٹا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس جوانی سے ہی ٹھکرات اور مصروفیات اس طرح مجھ پر سوار ہو جائیں کہ اوپر میری تک میرے ہاتھوں میں لڑو آجائے۔

آنکھوں سے دھشت لپکنے لگے اور خواب توڑ گویوں کی مدد سے بھی نیند اتنی بند ہو جائے۔ دولت اور کا دوبارہ کا پیکر کچھ ایسا ہی طمسانی قسم کا تھا۔ انسان کو با بھی نہیں چلا تھا اور یہ اسے بیکر کر کہیں سے کہیں لے جاتا تھا۔ انسان سب کچھ جانے بوکنے ہوئے بھی اس لپکنے سے نہیں نکل پاتا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے

اعصاب جواب دے رہے ہیں جو اس کی برداشت سے باہر ہو رہے ہیں۔ اس کا دل بچنے کو بچہ سمجھ رہا تھا جو کم کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرنا۔ جنہیں وہ بوجھ کم کرنے کے لئے اپنے قریب لانے کی کوشش کرتا ہے وہ خود اٹھا اس پر مزید بوجھ بن جاتے ہیں۔

میں آہٹ سے نکلا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آج رات بڑی صاحب کے ہاں پائلٹی تھی اور میں کئی روز پہلے اس میں گئے کی ہائی برج چکا تھا۔ بڑی صاحب بھی بہت بڑے امپورٹر انجینئرز تھے کسٹمر کلسن کا بزنس بھی تھا۔ انگریزی فلمیں بھی امپورٹ کرتے تھے اور ٹلسٹائی میں سرمایہ کاری بھی کرتے تھے۔

جو کچھ فلمی شے سے تھیں نہ کسی حد تک ان کا تعلق تھا اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ ان کی پائلٹی میں ستارہ بھی موجود نہ ہو۔ کئی دن سے جن کا بھی کچھ نہ کچھ قائل ذکر تعلق ہوتا تھا فلمی ستاروں کے بغیر تو ان کی پارٹیاں مکمل ہی نہیں ہوتیں تھیں۔ اب عالم یہ تھا کہ وہ چار دن کے لئے میں ستارہ کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ پائلٹی میں کراچی تو وہی ٹھکرے لگے ہوں گے اور وہی طرح کے حیر اور اگر کہیں بد قسمتی سے وہاں ٹھہرے خانم بھی موجود ہوئی تو صورت حال میرے حق میں کچھ عجیب سی ہو جائے گی۔

ظاہرہ خانم تو ہمیشہ طوائف کی طرح مجھ پر چھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ دیکھنے بھی بہت مکمل فلی عورت تھی۔ شکایت رکھنے کی تو فاکس نہیں تھی۔ اگر وہ بھی بڑی صاحب کی پائلٹی میں کرا جاتی تو نہ جانے اس کا رویہ کیا ہوتا اور ستارہ اسے دیکھ کر کیا تاثر لیتی۔ میں اس نگاہ کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن مجھے رات کم از کم باہر بچے تک وقت بھی گزارنا تھا اور

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے لئے تمہارا بچہ مکمل غیر میں ہے۔ ہر عام آدمی کا یہ مکمل میں ہوگا۔ لیکن اگر تم خاص بنا چاہتے ہو تو لوگوں کے ظاہری سراپا کے اندر چھپے ہوئے انسان کو پہچاننے کا ہنر سیکھنے کی کوشش کرو۔ صرف ظاہری صورت یا ظاہری رویہ دیکھ کر کسی کے بارے میں حتمی رائے دینے کی کوشش مت کرو۔"

"میں سراپا وہ دیکھ رہا ہوں ہے سے بے میں بولا "میں بت چاہتا ہوں۔ میں ایک لمحے کے لئے بھول گیا تھا کہ اس کے بارے میں مجھے آپ بتا رہے ہیں۔ اور جب آپ بتا رہے ہیں ٹھیک سی بتا رہے ہوں گے۔"

"میں اس لئے بھی تمہیں اس کے بارے میں زیادہ اچھی ج خبردار کر کے میدان عمل میں بھیج رہا ہوں کہ مجھے تمہاری کی عزت ہے۔ یہ کہہ کر میں نے ایک بھرتی ہی دیت پر ایک نمبر لکھا اور بچے کو صرف ایک جملہ لکھا "بچہ کو تیرا ٹکھا۔"

ریت میں نے محسن علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس نمبر دن کرنا۔ جو قوی فون ریسرو کرے گا اس سے کہیں ملاقات کا ت ملے کرنا اور یہ چٹ اسے دے دینا۔ وہ تمہیں گاڑی اور باروے گا۔ نیز چند دن میں بتانا کچھ سکھانا ضروری ہوگا کہ سکھا

ے گا۔ بہت مختصری تربیت ہوگی۔ اپنی اصل تربیت تو تم خود ہی کرو گے۔ یا پھر حالات تمہیں بہت کچھ سکھادیں گے۔ لیکن تربیت کے ران بھی اگر تمہیں یہ یاد رہنا چاہیے کہیں نظر آجائے تو تمہیں

ن پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش ضرور کرنی ہے۔ یا ہمیں اطلاع کرنی ہے۔ ہمیں اطلاع دینے کے طریقے بھی تمہیں ہی شخص سمجھا دے گا۔" میں نے چٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں سراپا۔ وہ یوں خوش نظر آیا تھا جیسے میں کی مراد پوری ہو گئی ہو۔ مجھے اس نوجوان میں ٹینٹ نظر آتا تھا۔ لگ رہا تھا کہ جو بڑا یہ کچھ اکیلے پائوں میں جا کر اپنی جوتوں بدل لے گا۔

"سب تم جانتے ہو۔" میں نے کہا اور وہ شکر یہ ادا کر کے اٹھ کر چلا ہوا۔

اچانک اسے گریا کچھ یاد آیا اور دیکھتے ہوئے بولا "مرا میرے موجودہ فرائض کون انجام دے گا؟"

"میں کسی تم گزند کو۔ لوگ آتے رہتے ہیں جاتے رہتے ہیں ایک دوسرے کی جگہ لینے رہتے ہیں۔ اتنے بڑے سینہ اپ میں ایک پیچک سپروائزر کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ صرف اپنے ذہن اور فکس کے انحصار کو مطلع کرتے جاؤ کہ تم میری ہدایت پر کسی اور کام پر جا رہے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد شام تک میں بے حد مصروف رہا۔ کا دوبارہ ملاقات بہت جلدیلتے بارے تھے۔ اور چند دن کے لئے میچلنڈن "امریکا کے چند شہروں اور فوراً اپنے کے دورے پر جانا

پہلے کے سالانہ سمیت تمام قاضی ججز کا اسٹاک رکھا جاتا تھا۔ ایک کونے میں بڑا سالانہ میز مدام تھا جس داغ دکھ اور ڈرائی ٹیبلنگ کی چٹینیں لگی ہوئی تھیں۔

اس وقت وہاں دو نشیہ رائے نام قاضی سب دوواڑے منتقل تھے۔ میں نے وہ خانے کا پتہ لگایا۔ کہیں کوئی مسجد نہیں تھا۔ یہاں کا فرش خامساگدا اور پتلا تھا۔ باہر کتے تک میرے ہونٹوں کے تلے چپ چاپ بیٹھے ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں باہر پٹنے دوٹی پر ڈاکڑ صاف کیا اور کچے اندھیرے میں ایک طرف ٹرائیوں کے قریب دباؤ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

رات کے اس پیراس طرف شاہزادہ کی کوئی آقا تھا۔ شرم غم ہوئے چند منٹ گزر چکے تھے تو ہوش کی بین بلڈنگ کی طرف بھی ساتھ چھانے لگا۔ سامنے کافی قاضی پر عمارت کے کونے پر ایک پل لگا ہوا آرائشی گھوب دھندل دھندل دووی دوٹی ٹیبلنگ تھا۔ میں کچھ زیادہ پڑھیں نہیں تھا کہ پرنس تینہ گئے۔ رات کو اس وقت اسے ہوش کے ایک ٹم تھک گیا اور وہ ان کونے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے راستے میں کتنے لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی۔ بالائی میں تو اس وقت بھی عمارت لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ جو راتوں کو ان کی طرف دیر تک جاگتے تھے اور صبح تک سوئے تھے۔ اس کے علاوہ میرا خیال تھا کہ کل نے سن سامنے کی طرح پرنس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اس سے وہ کچھ جان چڑا سکتی تھی؟ یا نہیں پہلے بھی میرے دماغ میں تھیں اس کے باوجود میں نہ جانے کس طرح چلا آیا تھا۔

مجھے وہاں کھڑے خاصی دیر گزر گئی۔ پرنس تو نہ آئی البتہ مجھے باہر کی آہستہ سنا دینے لگی۔ لیکن مجھے یاد تھا کہ اس نے خود بھی اپنے پیغام میں اس بات کا اسکان کاہر کر دیا تھا کہ شاید وہ آئے گا۔ اس صورت میں اس نے دوسرے دوواڑے کی وقت اسی جگہ مجھے دوبارہ انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن مجھے کبھی کبھار اس طرح گزار کر احساس سا ہو گیا تھا کہ کسی مصیبت ہی جگہ پر کھڑے ہو کر چھ دنوں کی طرح انتظار کرنا۔ اور وہ بھی بے جتنی کے عالم میں انتظار کرنا واقعی بڑا تکلیف دہ مسئلہ تھا۔

میں اس وقت جبکہ میں وہاں سے بیٹھے اور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا عمارت کے کونے سے گھوب کی دھندل دوٹی میں ایک عورت مجھے میں منٹ کے وسطوں راستے پر آئی دکھائی دی۔ وہ ہوش کی ایک کوئی پاؤں میں تھی۔ میں نے اس کے پیچھے چلنا شروع کیا۔ وہ بھی شامل تھیں اس نے چہرے پر کچھ زیادہ ہی آنکھ جھپکایا ہوا تھا۔

سوڑ سڑتی چوکر دوٹی اس کے عقب میں دو گئی تھی اس لئے میں اسے سامنے سے صاف طور پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن خود خیال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک اکاوت میڈ تھی۔ ورنہ پتہ پاؤں میں ڈھکوں میں کام کرنے والی ماسیوں سے ذرا ہی بہتر دکھائی

یہ وقت بھی ایسا تھا کہ کاروباری مصروفیات میں استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ پرنس تینہ نے مجھے ہوش کے خانے میں لاؤری دوم کے قریب لٹنے کے سلسلے میں یہی لکھا تھا کہ میں اس کے شر کے بعد وہاں اس کا انتظار کروں اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے رات ایک بیٹے کے قریب ہی وہاں جانا چاہئے تھا۔

چنانچہ گھر کا کچھ کاروبار تیار ہونے کے بعد میں وقت گزاری کے لئے ڈرتے ڈرتے بڑی صاحب کے اہل پارٹی میں چلا ہی گیا۔ قیمت تھا کہ وہاں ساتھ اور طاہرہ خانم دونوں ہی مدعو ہونے کے باوجود میں آئی تھیں۔ البتہ اور بہت سے چاند چہرے ساتھ آگئیں موجود تھیں۔ مہلوں چہرے بھی تھے اور وہ سے زیادہ مہلوں آگئیں تھیں۔ لیکن میرا ذہن اور دماغ پر مہنا ہوا تھا۔ بہر حال وقت بہت اچھا گزارا۔

رات باہر بیچے میں بڑی صاحب کی طویل و عریض حویلی لیا جھگڑا کی کوئی سے نکل آیا۔ پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی تاہم وہاں موکا صمان رخصت ہونے شروع ہو گئے تھے۔

دوانے ہونے سے پہلے میں نے لگی میں کھڑی ہوئی اپنی کار میں بیٹھ کر ٹوٹی سے رابطہ قائم کیا اور اسے پوچھن سمجھانے ہوئے بتایا کہ میں کہاں کہیں سے ملاقات کے لئے جا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پرنس تینہ سے ملاقات کے دوران یونانی احتیاط اور کہیں ٹوٹی کو موجود رہنا چاہئے تھا۔ پرنس کا پیغام میرے لئے کوئی چال بھی ہو سکتا تھا کہ میری ماسٹرم میں مجھے اس سلسلے میں کسی دھمکے سے خبردار نہیں کر دی تھی لیکن پھر بھی احتیاط بہتر تھی۔

ٹوٹی کی بات سمجھنے کے بعد بولا "ٹھیک ہے سراسر آپ کو پرنس کو نظر نہیں آؤں گا لیکن میں اس پاس کہیں نہ کہیں موجود ہوں گا۔"

سلسلہ منتقل کرنے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ غصا میں خنکی تھی اور اس سے بیکل ہوئی ہوا خرگوار محسوس ہو رہی تھی۔ آخر کار میں نے کوئی کا شیشہ چھالنا گاڑی اسٹارٹ کی اور ہوش کی طرف دوانے ہو گیا۔

میں جب ہوش پہنچا تو اس شرم غم ہوا ہی تھا۔ پتھر لوگ رخصت ہو چکے تھے ساتھ ساتھ چھانے لگا تھا۔ رات کے تک ہوش کی مدد شرم کے دم سے ہی تھی۔ شرم غم ہوتے ہی سکوت سا چھانے لگا تھا۔ توڑی بہت مدد کافی شاپ باہر بیٹھ کر ہل میں پائی رہ جاتی تھی۔

گاڑی پارکنگ سٹاٹ میں چھوڑ کر میں ٹھلنے کے سے انداز میں مدد دوواڑے کے سامنے سے گزر کر عمارت کے دوسری طرف پہنچا جہاں وسطوں کشادہ رات کے خانے کی طرف جا رہا تھا۔ خانے کے داخلے کا راستہ بہت بڑے کیرج سے مشابہ تھا۔ اس میں کوئی دوواڑہ نہیں تھا۔ اندر کئی شیشے تھے۔ ان کے الگ الگ دوواڑے تھے۔ سب دن بے بے اسٹور دوم تھے جن میں کھانے

میں کر سکتی تھی۔ یہ نکتہ کچھ آنکھیں میری جانب مٹھراں ہوئی
 تھیں۔ ایک بڑا بک قلات سے میری نوازا۔ میری ہر سرگوشی بھی کچھ
 کانوں تک پہنچ رہی ہوئی تھی۔
 ”اب کیسے آئی ہو؟“ میں نے اس کی ہنستی زلفوں کے قریب
 سرگوشی کی۔

مرکب کی۔
 ”وہ پانی۔ بادشاہوں کے زمانے والی ترکیبیں قیج کے دور
 میں بھی کام آجاتی ہیں۔“ وہ عرض کرے جس میں ہولی معلوم نہیں ہے۔
 آئینہ کے مستتر سے ہیں یا غیر مستتر؟ اس معاملہ کبھی جگہ چھٹا کر
 شہزادی کو محبوب سے ملنے جانا تھا۔ کڑے پرے تھے۔ آخر کار وہ
 اپنی جگہ کینز کو ملنا کہ اس کے کپڑے پن کر نکلتی تھیں۔ یہی جگہ اس
 وقت میرے شب خوابی کے لباس میں میڈ لکھی ہوئی ہے۔“ وہ
 ہلے سے ہنسی ”آخر میں بھی تو شہزادی ہوں۔“ ہنس تھینے۔ جمل
 ۔۔۔ بلکہ جمل دور جمل پر ہنس ہی کسی کی جگہ اصل پر ہنس تو وہ بھی
 نہیں تھی جس کی میں نے جگہ لے رکھی ہے۔ اس نے ابھی صرف
 نام کو فطرت بھاری بھر کم پڑکھش اور مستزادہ ہانے کے
 رننس ساتھ لگا ہوا تھا۔“

میں نے کہا۔

”جب تم نے مجھے پہچانا تو میں بتا نہیں سکتی کہ حقیقی مشکل
میں نے اپنے اندر رکھنے والے محسوسات کے طوفان کو دیا۔ مجھے
حالت ہو گئی تھی میری۔ مجھے ہنس لگا کہ اس بھری مری سٹاک
میں صرف تم ہی میرے دوست“ میرے جو دو دادو آتے ہو۔ میرا
دادو ہاتھ میں لے کر تھمارے پیروں میں بچہ باؤں۔ سمجھ میں
آتا تھا کہ کیا کروں۔“

خیر اب اتنی بھی انکساری ٹھیک نہیں تھی۔ "میں نے بگو
 ہنسی کے ساتھ کہا۔

جی کے ساتھ لگا۔
 "یہ اکھاڑی میں تنگ خواہجت کا تفکر۔ جس میں
 کہ میں تمہارے بارے میں کس طرح سوچتی تھی۔ کیا محسوس
 تھی۔ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ میں تمہارے لئے راستے میں
 ہوئے نکلے سے بھی زیادہ حیران ہوں۔ لیکن جب تم نے مجھے
 میرے لئے تنہائیں کا اعداد کیا تو مجھے احساس ہوا کہ تمہاری
 محبت میری کوئی اہمیت تھی۔ تم نے میرے بارے میں کچھ سوچا
 میرے بارے میں فکر مند ہوئے تھے۔ تب میں اندر ہی اندر
 جی بہت اوروں کی بہت معزز بہت اہم مند ہو گئی۔"

ہمت اور ہمت آہستہ رہتا ہے جب تک کہ آپ کو
اور عمل کے ذریعے اپنے آپ کو کوئی اور چیز نہ کہے۔

”اوروں کی بات میں نہیں جانتی۔“ وہ بولی ”میں تو اپنا

خبر ان میں شائع ہوئی کہ اس امر اور خوش حال ہوئی
 کہ شاید کسی مجبور کی وجہ سے اس معمولی نوکری میں تن
 دہی ہو۔

راستہ و حلوان پہلے کے پانچ سو چلے گئے تھے قدم اٹھاتی
ایسی طرف آ رہی تھی۔ اس کی چال میں شائع کل کا سا لہر
چل رہی تھی۔ میں شاید ابھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ حلائی سی
دل سے لہر اُڑ رہی تھی آ رہی تھی۔

[illegible]

دو جب دوستی کی رسائی سے کافی آگے تقریباً اسی طرح کے
نئی دوا سے جو بے پڑا تھا اور انہیں ذرا پیچھے کر لیا اور انہیں
باز چاڑھ کر اور کھڑے رکھا۔ مجھے حیرت کا لالچا سا ہوا تھا کہ
دراصل پرس جس نے یہ قسمیں کھائی تھیں اس وقت اس کا چومک اپ
انگل بے نیاز تھا جس پر بھی کم از کم مجھے اس سے ہنر لگ رہی
ہیسی وہ ہمارے اسیچ میک اپ کے ساتھ تھوڑا اور رنگا رنگ
دوستوں میں غرق تھی۔

میں دیوار سے بٹکا کر اتحادہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ
تھی۔ میں دراصل اس اطمینان کر رہا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں
آجائے۔ لیکن اس کے پیچھے آنا تو کتنا آسان تھا ابھی تک کسی نے غارت
کرنے سے جھکا بھی نہیں تھا۔

آخر کار اس نے تھوڑا اور آگے ہنر سرکشی کے انداز
پکارا "بیٹی!"

ایک لمحے کے لئے میری دھڑکنیں بے ترتیبی ہو گئیں۔
 میری تو میرے لئے شکار تھا۔ تو اس کو کہہ کر گشتی سے زیادہ اپنے
 گشتی پر بھی مجھے بے فہمی نہیں کی تو اس نے بہت عطف محسوس
 کیا۔ اس نے باندھ رکھا ہے کہ کہیں اس کو جھگڑے ہو گئے اور
 زار، آجیہ اور ایش ایک زالی پر بیٹھ گیا۔

آخر کار میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا: ہوں۔

وہ دیک کر ادھر تلی اور برسوں کے مجھڑے ہوئے دوسرے طرح کی سیرے اصحاب جھنجھٹا اٹھے۔ کئی لمبے کی مبر خاموشی کے بعد وہ میرے اچھے دیوانوں کی طرح انہی آنکھوں سے ہوئے بولی۔ "کتنی بے چین تھی میں تم سے ملنے کے لئے مگر غاسا سنہ، کچھ کر، غصہ دل کتنی تھک۔ حتیٰ کہ غاسا کا آنکھ

کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ کس نے قتل کیا تھا انہیں؟

”انہیں قتل نہیں کیا گیا تھا۔“ اس کے لیے میں افسوس کی آہی۔ ”یہ ایک افسوسناک اتفاق ہے کہ انہیں ریڈ ڈاٹ والوں کی تحویل میں رہنے کے دوران ہی ہارت آئنگ ہو گیا۔ گوکہ ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں تھی لیکن رابطہ بالکل اس طرح تھا کہ میں بھی کبھی انہیں چلتے پھرتے اپنے چھوٹے موٹے کام کاج کرتے لی دی اسکرین پر بھی دیکھ سکتی تھی۔ ان سے بات بھی کر سکتی تھی۔ ان پر کوئی تشدد و فریب نہیں کیا جا رہا تھا انہیں وہ صرف مجھے بلکہ میل کرنے کا ایک ذریعہ بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ اگر میں ان کے ساتھ تعاون نہ کرتی تب وہ ضرور ان پر تشدد کرتے اور آخر کار انہیں مار ڈالتے۔“

”لیکن یہ قصہ کیا ہے؟ مجھے سب کچھ شروع سے بتاؤ۔ بات کچھ میں نہیں آ رہی۔ تمہاری عقل بدل جائے کا کیا قصہ ہے؟ یہ ریڈ ڈاٹ کیا ہے۔ کون لوگ ہیں؟ انہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ ریڈ ڈاٹ کیا ہے۔ میں نے بھی اس ان لوگوں میں رہنے کے دوران یہ نام ہی سنا ہے۔ سرحال اپنے اندر اذو اطوار سے یہ کوئی حکیم ہی لگتی ہے لیکن اس کا کوئی سرور میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ کر کھڑی ہوئے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

”کیا ایسا قسم کی کوئی چیز ہے؟ میں نے پوچھا۔“

”ایسا کے بارے میں مجھے بہت زیادہ اور حقیقی معلومات تو نہیں۔“ وہ بالوں میں اٹھایاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن کم از کم کہیں میں جتنا کچھ جڑا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریڈ ڈاٹ شاید اسی سے کہیں آگے کی کوئی چیز ہے۔ ایسا کا تو سب کچھ ایسا ایسا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں ہائیڈروجن بم کے ہونے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی سرگرمیاں ناجائز تجارت، منشیات کے کاروبار اور اسلحے کی تجارت کی گروہی گھوٹکی ہیں اور اس سلسلے میں جتنی رشت گردی کی ضرورت پیش آتی ہے وہ بے دریغ اس کا سہارا دیتے ہیں۔“

”یہ تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ریڈ ڈاٹ ہر معاملے میں اس سے بہت آگے معلوم ہوتی ہے۔“ یہی جھرجھری سی لے کر بولی۔ ”میرا خیال ہے میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان پاتی، کچھ بھی نہیں دیکھ پاتی۔ اس کے باوجود میری عقل دنگ ہے۔ ان کا کیا سائنٹیفک طریقہ کار ہے۔ کیا کیا ایجادات ہیں ان کے پاس۔ معلوم نہیں اس میں کس کس قوم کے لوگ شامل ہیں۔ یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس کی جڑ کہاں ہے؟ اس کے مستند کیا ہیں؟ میں کچھ بھی نہیں جان سکتی۔ اس کے باوجود ان کے اشاروں پر پھرتے پھرتے مجبور ہوں۔“

کر رہی تھی۔ میں تو ایک رات وہ درگاہ قسم کی عورت ہوں۔ چپکے چپکے دل میں تم سے پیار کرتی تھی لیکن تم سے ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتی تھی۔ زمانہ اگر میرے دوزخ کا حساب کرنے بیٹھے تو مجھے طوائف، فاحشہ، بد چلی، آلودہ فاحشہ اور نہ جانے ایسے کون کون سے القابات سے نوازے۔ اور مجھی بات یہ ہے کہ میں ان کی سخی بھی ہوں۔ لیکن تمہارے سامنے اتنی سخی تو میں اندر ہی اندر اپنے آپ کو سولہ سال کی معصوم اور اچھوتی لڑکی محسوس کرتی تھی۔ تم سے کچھ بھی تو کہنے کا حوصلہ نہیں پڑا تھا۔ تم میرے لئے آسمان کی رفعتوں پر بھٹلاتے ہوئے کسی بہت سی روشن ستارے کی طرح تھے اور میں خود اپنی نظریں زمین پر پھیلا ہوا نیچر تھی۔“

میں مجب سے انداز میں ہنسے بغیر وہ کہتا ہے۔ یہی اپنے آپ پر قسم نہ جانے کیا بات تھی۔ اتفاق تھا۔ یا میری اپنی لامشوروی طلب کا نتیجہ تھا کہ میری قسمت میں رات وہ درگاہ قسم کی عورت ہی لکھی تھی۔ اس قبل کی عورتیں بہت سی تو گزریں وقت میں کچھ پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اور جاتی جاتی یہ تھی کہ مجھے بھی کشش انہی میں محسوس ہوتی تھی۔ یہی عمر کی کچھ ذہن کی پھولی ہوئی سی نظر آنے والی لڑکیاں مجھے کبھی اکیلے نہیں کرتی تھیں۔ بدل ان کی طرف کھینچتی تھیں تھا۔ شاید وہ کہیں سے ہی دل و دماغ میں کوئی خرابی چھپ گئی تھی۔ شاید مجھ میں آپ انتظار نہیں تھی۔ ہندو رہیں پر عموماً دھنک دیتے رہتے۔ تب کوئی ہٹ کھاتا ہے اور پھر بھی کہ نہیں سکتے اندر کتنی ٹھنک ہو سکتی ہے کیسی ہیں۔ بے دوا ہمارے میدانوں میں سفر کے لئے تھیں۔ میں بانہ ہوتا ہوں۔ ان کو تو دیکھیں نہیں دیتا پڑتا۔ ان میں چار در چار راستے نہیں ہوتے۔ جو بات ہوتی ہے۔ یہ عید می اور صاف ہوتی ہے۔

لو کہیں میں صرف راحیل ایک ایسی لڑکی تھی جو جنون میں کر ذہن پر سوار ہوئی تھی اور وہ رات وہ درگاہ قسم کی چیز میں تھی۔ طرار بہت تھی بہت اونگھی چیز تھی۔ لیکن پیپ سے لٹکے ہوئے سوئی کی طرح شفاف اور آلودہ اس سے مصلحتی خاطر کے دوران کبھی خواہشوں کے کھوڑے بے لگام نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی ایک طلاق کی بارگاہ آئی تھی۔ لیکن کبھی اب پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی نیڑہ تھی ضرور۔ جب کسی کو دل سے اتر جانا چاہئے تھا اس وقت وہ دل میں گھس جاتی تھی۔

یہی کہہ رہی تھی اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی جب تم نے مجھے پچھا تھا۔ میری ہاں بھی شاید اس بدل ہوئی شکل اور اس روپ میں مجھے نہ پہچان پاتی جو دن رات کی محنت سے مجھے دیا جا رہا تھا۔

”میں کے ذکر پر یاد آیا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے ان

”لیکن یہ سوال تو میں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگر آخر وہ سب تردد کس لئے کر رہے تھے۔ اور اس کے لئے ان کی نظر انتخاب تم پر ہی کیوں پڑی تھی؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ اس سوال کا کچھ جواب تو میں نے مختلف لوگوں کی اچھٹی ہوئی باتوں سے اخذ کیا ہے جو مختلف مواقع پر میرے کانوں میں پڑتی رہیں۔ دوسرے میں نے اپنے طور پر بھی کچھ اندازے لگائے ہیں۔ پر نس حنینہ تو واقعی اس دنیا میں موجود تھی۔ تو جس میں بھی معلوم ہو گا۔ وہ ایک دولت کا اس ڈانسر اور ان کی آواز کا۔ جسے ان کے لئے بہت بڑے بڑے کام انجام دیا کرتی تھی۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں ایک اور کس طرح وہیہ ذات سے ہائی ہو گئی۔ اس دوران وہ اپنی انفرادی حیثیت میں بھی خاصی طاقتور اور مالی دانست میں اس پھر سے پرواز کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ لیکن پرواز کے آغاز میں ہی اسے ہلک کر دیا گیا۔ اس کی خوب صورت لاش کو نہ جانے کب۔ کراکال کی پھلیاں کھا چکی ہیں۔ نہایت خاموشی سے میں اس کی جگہ لے چکی ہوں۔ اسی کا پاسپورٹ اسی کے کاغذات اور اسی کی تمام شناختی چیزیں میرے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔ لیکن ایک ایک مل میس کرانی ہو رہی ہے۔ یہی ہر بات سنی جاتی ہے۔ اپنی پرواز اور اسی حرکت کے لئے مجھے ہدایات ملتی ہیں اور میں انہی کے مطابق ہر قدم اٹھاتی ہوں۔“

”لیکن اس رات تم مجھے صحت کے نام سے کرائی تھی۔“

میں نے یاد دلایا۔

میرے کان اس کی سرگرمی نما آواز پر لگے ہوئے تھے اور مجھے ذہن کی گردش دیکھ کر تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے یوں سانس لی کہ ذرا بھی توانا پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر سلسلہ کام نے ہوئے ہوئی سانس لے لیا۔ دیکھ لو کہ کامیاب سرجری کے ذریعے ناکھل بدلی گئی ہے۔ ایک ہفتے تک میرے چہرے پر کامیاب سرجری کا عمل جاری رہا۔ صرف آنکھوں کو نہیں چھیڑا گیا کیونکہ سامنے ہی تھیں جیسی انہیں مطلوب تھیں۔ اور انہی آنکھوں کے دے تم نے مجھے پہچان لیا۔ ”وہ اندھیرے میں میری طرف ہر کردار اللہ سے انداز میں مسکرائی۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”وہ ایک نہایت شاندار اور جدید ترین آپریشن جیفر تھا جہاں میری کامیاب سرجری کی ناکھل ایسے ایسے جدید آلات اور مشینری موجود تھی جن کے لئے نام تک معلوم نہیں۔ اور شاید تم بھی ان کا تصور نہ کر سکو۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کامیاب ٹھیک اور آپریشن جیفر تھا کہ نہیں۔ میرے چہرے کی تبدیلی کا عمل مکمل ہونے اور کانوں کے نیچے سرجری کے بعض نشانات درست ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ اس کے بعد ایک ماہ تک میری برین ڈانک کی جاتی رہی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے ماضی کے کسی دوست ”ٹنسا“ یا کسی بھی قسم کا قتل کر دیکھنے والے کو پہچانوں۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنی آلات ”تفصیلی“ کرے اور تمام جدید ترین ٹیکنیکس استعمال کرنے کے علاوہ مجھے ہٹا کر بھی کیا گیا۔ پتا چلا کہ میں چاندن کے لئے واقعی اپنی اپنی اور اشد تقریباً کچھ بھی تھی لیکن اس بات کا شاید میں نے بھی اندازہ نہ ہو کر میں انتہائی مضبوط قہر اور ادائیگی کی مالک رہی۔ مسلسل مزاحمت کرتی رہی۔ یوں مکمل برین ڈانک سے انکی لیکن میں نے نہایت اسی میں محسوس کی کہ یہ بات ان پر ظاہر ہونے لگی۔ ان کے سامنے میں واقعی انکی ہی گئی جیسے میرا برین اسی طرح پر دوش ہو چکا ہے اور میں ان کے اشاروں پر چلنے والی ہو چکی ہوں۔“

”اپنے اس کارنامے پر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ مجھے اندھیرے میں بھی اس کی مسکراہٹ بڑی روشن محسوس ہوئی۔“

”کام کتنا مشکل تھا؟ اس کا اندازہ تو جیتھینا اسی کو ہو سکتا تھا جو اس تجربے سے گزر کر آ رہی تھی۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”پھر ایک مہینے تک مجھے پرس حنینہ کے انداز میں نشست و برخاست اور انہی شرفیں گھسنے کی تربیت دی گئی۔ ہر میرے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ کیونکہ میں بنیادی طور پر ڈانسر ہی تھی۔ سب کام کہاں کہاں ہوتے رہے اور کون کون سا اور میری میرے پاس آتی رہیں۔“

اس طرح کی کوئی بات مجھے نہیں معلوم اس لئے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔“

”وہ یہی ہو کلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ اس وقت توڑی دیر کے لئے کرنا ایک قسم کی ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ قسمت کا مجیب تھا شاید کہ مجھے ہر حال میں تم سے دور رہنے کی تحقیر کی تھی تھی لیکن تم ہی اس تاریک گلی میں مجھ سے آئے۔ مگر اسے میں چند لمحے کے لئے ہدایات نہیں لے سکی تھی۔ میں نے اپنے ہی طور پر محسوس کیا کہ شاید ان حکموں سے حالات میں میرا نام سے پرس حنینہ کی حیثیت سے ملنا مناسب نہ ہو۔ تم نے اس حیثیت سے مجھے پہچانا بھی نہیں تھا۔ اس لئے فوری طور پر میں صحت پر مبنی ایک قطعی فیصلہ کر لیا۔ میں مجھے بتایا گیا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں پرس حنینہ کی حیثیت سے بھی اپنا تعارف کرا دیتی تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن اس وہ خواہ خواہ ہو کلاہٹ میں ایک حالت سرزد ہو گئی۔ مگر میری اس قطعی کو صاف کر دیا گیا تھا کہ ایک تو اس سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ دوسرے میں صاف سے سامنے اس سے صاف ہی کر گئی تھی۔ ان کے خیال میں میں اتنی کافی تھا۔ انہوں نے اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اصل اہمیت تو یہی اس ایک باس کی تھی جو ان کے ہاتھ میں آتے آتے پھر نکل گیا۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ زیادہ قصور اسے تن کا تھا جو صحیح وقت پر مقررہ جگہ پر نہیں پہنچا۔“

کا تھا جہاں مجھے باکس اس کے حوالے کر رہا تھا۔

”اس باکس کا کیا قصہ ہے؟ اس نے ریڈ ڈاٹ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پریشان کر رکھا ہے آخر اس میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم صرف انا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ہمارے ملک کے نہ جانے کن کن اہم آدمیوں کے ہاتھوں میں سے ہوا ہو آخر کار اس رازناؤ کی آگئی نہی اور شجاع کے پاس پہنچ گیا تھا۔ معلوم تو شاید اسے بھی نہیں تھا کہ اس میں کیا ہے لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بہت اہم چیز ہے اور اس کے لئے سرحدی بازیاں لگی ہوئی ہیں۔ اس نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ اور شجاع ایک کہت تو ہی تھا۔ پہلے اسے کسی درجے سے ملنے کا لالچ دیا گیا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہیں ملا۔ ملا کہ وہ یہ اس کی کمزوری تھا۔ ہو سکتا ہے وہ دیکھتا پایا ہو کہ دیکھنے زیادہ سے زیادہ کتنی اہمیت پا سکتی ہے۔

سر حال اس دوران ریڈ ڈاٹ والوں نے اس پر دھرا حیر آواز لے کر کوشش کی۔ اس کی دوسری بڑی کمزوری عورت تھی۔ وہ ہوئی میں پہلے دن میرا پہلا شور دیکھتے ہی مجھ پر توجہ نہ ہو گیا تھا۔ بے باک انا تھا کہ اسی روز میرے ایک آدم میں تھکنی میں پہلی ملاقات میں ہی اس نے مجھے دیکھنے کوئی کہ جب تک میں پاکستان میں ہوں تب تک اگر میں اس کی داشتہ بن کر رہوں تو وہ مجھے کسی بھی بڑے مسئلے سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اسی نے مجھے گاؤں گاؤں میں وہ کوئی بھی خفیہ میں دینے کی دیکھنے کی جہاں میں خودی دیر کے لئے نہیں لے گئی تھی۔

مجھے جو حقائق ملی ہوئی تھیں ان کے مطابق میں نے اس سے کہہ دیا کہ مجھے اس کی دیکھنے قبول ہے مگر اس کے عوض مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے۔ صرف وہ ایک باکس میرے حوالے کو دے دے وہ بڑا بد صاحب اور بڑا چکراز تھا۔ سر حال کسی نہ کسی طرح ان کیلئے اس کی شرط تھی کہ کوئی تیسرا فرد اس معاملے میں تانگہ نہیں اڑائے گا۔

ریڈ ڈاٹ کے لئے وہ ایک کبھی سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ اسے کسی وقت بھی ہلاک کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اندیشہ تھا کہ یہ راز نہ چھپے ہی میں نہ لے جائے کہ اس نے بیگ باکس کہیں چھپایا ہوا ہے۔ سر حال۔ پروگرام ملے ہو گیا کہ جو بھی باکس وہ میرے حوالے کر دے گا میں اس کی دہی ہوئی کو بھی میں جا کر نہتا شہر کھول گی اور روزانہ شہر ختم کرنے کے بعد وہیں جا کر رات گزارا کروں گی۔ اس نے کوئی بھی چاہیاں بھی مجھے دے دی تھیں۔

اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ حادثے میں مارا گیا باکس وصول کرنے کے بعد اسے ویسے بھی ہلاک کر دیا جانا تھا کہ اس نے ریڈ ڈاٹ والوں کا خاصا ناکہ میں دم کیا تھا۔ سر حال اس رات سب پروگرام میں شہر ختم کرنے کے بعد اس کے ساتھ روانہ

ہوئی۔ اس نے باکس اپنے خیمہ ٹھکانے سے نکل بھی لیا لیکن وقت پر نہ جانے کیوں اس کا راز بدل گیا اور اس نے باکس دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے داشتہ بننے سے بھی کم از کم ظاہری طور پر اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس کا ذہن بھی کسی شیطانی شخص طرح کام کرنا تھا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا منصوبہ کیا تھا۔ سر حال اور ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ اسے نیا ہاتھ غیر معمولی طور پر ہمارا مقابلہ کرے گا تاکہ اسے شجاع کہیں ہو کہ نہ جانے اس کی عمرانی ہو رہی ہے۔ جو بھی وہ باکس میرے حوالے کر دے گا اسے نہ کسی بھی جگہ آگے آکر مجھ سے چھین لے گا اور اسے شجاع کا بھی قصہ ختم کر دے گا۔ مگر اس سارے پروگرام میں جو طرح سے گز رہو گی۔ اور اسے شجاع کا راز بدل گیا اور اسے نہ وقت پر نہیں پہنچ سکا اور مجھے عین وقت پر کام ہونے لگا کہ اس کے لئے اسے شجاع سے باقاعدہ دیکھا جانی چاہی۔ اور اسے ختم نہیں کیا۔ جس کا کوئی سچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یوں سب کچھ کن ہو گیا اور ایک بار پھر وہ باکس نہ جانے کہاں گئی ہو گی۔

”وہ“ میں کبھی سانس لے کر وہ کیلے کہ نہ کچھ نہیں ہو سکتی تھیں لیکن مسئلہ اور مسئلہ کا مسئلہ ابھی حل ہوا تھا۔

”وہ بات تو درمیان میں ہی ہو گئی۔“ میں نے کہا مگر اس پر نے جنس ہی پر نس خیمہ بنانے کا تصور کیا؟

”جیک تو اس لئے کہ پر نس خیمہ بھی ایشیائی تھی اور میں بھی۔ اس کی اور میری رگت“ آئیں اور سراپا بالکل ایک جیسا تھا۔ میری اور اس کی تمام باتیں تک ایک ہیں۔ اور میرے سب سے بڑی بات یہ کہ میں بھی بنیاد طور پر ڈانسر تھی۔ میں میری شکل

ایم اے راحت کے قلم سے

کائنات

دو حصوں میں مکمل

جلد اول = 50/-

جلد دوم = 50/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

لازوال
کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

۷

شاہکار ناول

نجیشت (۵ حصے) ۲۰۰/-

برہمچاری ۱۵۰/-

درخشاں (۲ حصے) ۹۰/-

رقص ابلیس ۱۵۰/-

آسیب زندہ ۱۱۰/-

دستک ۱۰۰/-



مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

فون ۷۲۲۶۶۶۵

میں در حقیقت صرف معمولی ہی تبدیلیاں کرتی رہی ہیں۔ زمین
آسمان کا فرق پر کیا۔ میری عمل پیرائی ہو گئی۔

۳۳ اور اب تم کیا کہہ کر رہی ہو؟ مجھے نے دریافت کیا۔

”مجھے ابھی کچھ زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سر حال ہوتے
ہوئے اہم سرکاری، غیر سرکاری لوگ اور ہوتے ہوئے سینہ میرے
درد و دل پر قطار در قطار ماضی دے رہے ہیں۔ مجھے ہدایات ملتی
رہتی ہیں کہ فلاں سے تعلقات جوڑنے ہیں، فلاں سے رگمائی
استیاء کرنی ہے۔ مزید ہدایات ملتی رہیں گی کہ کس کو کس طرح
استیاء کرنا ہے، کس سے کیا کام لینا ہے، کس کو کس حد تک آگے
لے کر بہت دینی ہے۔“

میں ابھی کچھ اور پوچھنے والا تھا کہ خانے میں ہوتے ہندو
کی کڑکڑاہٹ ہوئی۔ کمرے کی سکوت میں وہ تواز کی دھماکے سے کم
نہیں تھی۔ مٹی نے غصہ ہو کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں
جکڑ لیا۔ وہ شاید بے اختیار بچاؤ تھی لیکن میں نے ہدایت اس کے
بغیر ہاتھ رکھ دیا۔

”جی کا خوف بھی لگاتی تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسرے
ی لمبے اس نے اپنے خوف پر قابو پایا تھا۔ میں نے اس کے منہ
سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ اب اتنی خوف زدہ
نہیں تھی۔ کمری مگر بے توازی سانس لے کر اس نے جسم ڈھیلے
چھوڑ دیا۔

توازی سے مجھے اس کی نوعیت کا کچھ اندازہ تو ہو گیا تھا۔ وہ نہیں
کا کوئی ایسا ڈاکر کرنے کی توازی تھی جس میں کچھ بھرا ہوا تھا۔ وہ ڈاکر
کر تھینا۔ وہ تین فٹ تک لاٹھک چلا گیا تھا۔

ایک لمبے کے لئے میں اور اپنی دواوار سے چپکے رہے۔ ایک بار
پھر چاروں طرف وہی سکوت چھا چکا تھا۔ میں نے اپنی گردنیں ساکت
رہنے کا اشارہ کیا اور خود دواوار سے الگ ہوئے بغیر گھوم کے تین
منٹ میں داخل ہو گیا۔ ہم میں منٹ کے دواوارے کے قریب ہی
کھڑے تھے اور اس دواوارے میں کوئی پٹ یا شرونگو نہیں تھا۔

میرا پسندیدہ ترین مشین ہنسل میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔
میرے لئے یہ ہلکی مشین گھن کا کام کرتا تھا۔ مجھے کسی حد تک اندازہ
تھا کہ توازی کس سے ابھری تھی۔ وہ یقیناً آشور اور ذرائع لیننگ
پلانٹ کے درمیان کوئی جگہ تھی۔ دواوارے سے اس کا فاصلہ خاصا
تھا اور اندر گھپ اندھیرا تھا۔

اندھیرگی میں دواوارے لگ کر ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے
میں انسان دواوارے کے ساتھ لگ کر کسی طرف بڑھے تو اس کا پیلا
حرکت کرنا دکھائی نہیں دیتا۔ میری آنکھیں تو اندھیرے میں دیکھنے
کی کافی حد تک عادی تھیں۔ ویسے بھی اب تو مجھے اندھیرے میں
کھڑے ہوتے ہوئے چلنی تھی۔ آشور دھوم کا آہنی دواوارہ اور اس پر
لگا ہوا پڑا سانا لگے سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

ہے جلدی سے بولا "جنتی دیر سے یہاں چننا کھڑا تھا یہی سوچ رہا تھا آج زندگی میں پہلی بار اپنی ہی نظر میں اتنی زلت محسوس کر رہا تھا اور دل میں دل میں حمد کر رہا تھا کہ آئندہ چہری نہیں کھوں گا۔" اب سے میں نے یہ اسطور سے چیزیں چرائے گھر لے جانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ بچے زیادہ بڑا رہنے لگے ہیں۔ گھر میں زیادہ گی ترشی رہنے لگی ہے۔"

"چلو۔" شکر ہے یہ سیدھی سی اور پرانی سی بات تمہاری سمجھ رہی تھی "میں نے کہا۔

"بس یہی... آپ اس مرتبہ مجھے صاف کریں اور کسی کو بری رپورٹ نہ کریں۔ ورنہ میں بڑا ہوجاؤں گا۔ مجھے تو کہیں لڑکی ملنا بھی مشکل ہو جائے گی۔ میرے بچے بھوکے سر ہائیں گے" اس نے میرے پیروں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے بدوقت اس کا ہاتھ گرفت میں لے کر اسے اس کوشش سے باز رکھا۔

"تم نے ہماری باتیں بھی سنی ہوں گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا

"نہیں سی باتیں تھیں۔۔۔؟" اس نے حیرت اور مصیبت سے میری طرف دیکھا۔ یہ حیرت اور مصیبت مجھے معنوی نہیں لگی۔ دیکھ بھی نہیں منٹ کے دروازے سے یہاں تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ سر کرشیں میں کی جانے والی باتیں سنی نہیں جاسکتی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے اسے اچھی طرح غماں لے لیا ہاتھ بٹھرا۔

وہ غوری وضاحت کرتے ہوئے بولا "صاحب بی اُمی تو اس وقت ڈالے کر میاں سے نکلے گی لگا تھا جب سامنے سے مجھے آپ آتے دکھائی دیے۔ میں یہاں دیک گیا کہ شاید کسی کو میری چوری کی رہی ہو گئی ہے۔ کوئی مجھے پکڑنے آ رہا ہے۔ لیکن آپ میں منٹ نہ دروازے پر کھڑے ہو گئے میں سمجھا کوئی صاحب رات بھر مل رات آئے ہیں ابھی چلے جائیں گے مگر پھر آپ باہر ہی نہ جانے کس رخ کو ہو کر کھڑے ہو گئے مجھے آپ نظر نہیں آ رہے تھے لیکن سلوم تھا کہ ابھی آپ گئے نہیں ہیں۔ پھر میں نے سرور اساتھ لے کر جھانک کر دیکھا تو ایک اور بیوہ... کو آتے دیکھا۔ وہ عورت سلوم ہوتی تھی۔ میں نے سوچا شاید اساتھ میں سے کوئی عورت ہوا ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ کبھی کبھار کسی اندر میرے کونے کدو سے میں ایسا پکڑ ہوجاتا ہے۔ پھر میں نے سوچا اساتھ کے لوگوں کو دیکھ بھی کہیں نہ کہیں لٹے کے مواقع میسر رہتے ہیں۔ انہیں اندر میرے میں اتنی دوزخ لگے کہانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں لڑتک میں ہی بہت سے کونے کدو سے ہیں۔ بس اور میرا بھینس تھی اور اور خوف تھا۔ آپ دونوں تھے کہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ لیکن مجھ سے جو قسم چاہے لے لیں میں نے آپ کی سے کسی کی کوئی آواز نہیں سنی۔"

"تم شہر سے... میں چھپے کھڑے ہو؟ آگے نہیں آئے؟" میں

نے پوچھا۔

"نہیں سراسر اس سے آگے تو چھپنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ آپ ذرا اندر جھانکتے تو مجھے دیکھ لیتے میں تو جب سے یہیں رہا ہوں چپکا کھڑا ہوں۔ آپ میرا خوف اور بے وفائی دیکھیں... محض بالکل خبیث ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ دیکھیں کہ اس وقت سے میں زیادہ تھ میں ہی لٹکائے کھڑا ہوں۔ اتنی بھی محض نہیں آئی کہ اسے تہمت سے فرش پر ہی رکھ دوں۔ آخر کار ہاتھ شل ہو گیا اور یہ پھوٹ کر گر گیا۔ ورنہ شاید میری چوری نہ پکڑی جاتی۔ آپ آخر کار اپنی باتیں ختم کر کے چلے ہی جاتے۔ وہ اب کالی حد تک سنبھل چکا تھا لیکن آواز میں لرزش پائی تھی۔

"ہر چوری ایک نہ ایک دن پکڑی جاتی ہے" میں نے کہا۔ "اب تم یہ ڈرا اٹھاؤ اور میاں سے پھوٹ لو۔ لیکن شہر یہ ہوگی کہ آنکھیں بند کر کے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر نکلے۔ میں تمہیں پچھلے میٹ تک چھوڑ آؤں گا" میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اندر میرے میں بھی اپنی طرف پر نفس جیتنے کا بیڑا دیکھے۔

"سراسر آپ واقعی کسی سے میری شکایت نہیں کریں گے؟" اسے گرد لایقین نہیں آ رہا تھا۔

"اب میں تمہیں یہ بات بدلتی کاغذ پر لکھ کر دے رہا۔ جلدی سے ڈرا اٹھاؤ" میں نے باغی کارخ ڈبے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "خفیہ ڈاک خود دشمنی میں آئینے کی طرف پھینک رہا تھا۔" "خدا کے لئے یہ باغی بھاد بچتے" وہ نکلیا۔ اسے اب اس ڈبے سے خوف آ رہا تھا جس کی خاطر اس نے اتنا غصہ مول لیا تھا۔

میں نے باغی بھادی تو وہ سرگوشی میں بولا "کیا واقعی ڈاک میں لے جاؤں؟"

"ہاں۔ اب یہ آخری چوری تو تمہارے حساب میں لکھی ہی گئی ہوگی۔ اسے تو اب لے ہی باؤ۔ کوئی باہر ڈاک کیے کا تو چوری کا راز کھل جائے گا اور پھان میں شروع ہو جائے گی" میں نے کہا۔ اس نے ڈرا اٹھا لیا۔ میں نے احتیاطاً اس کی آنکھوں پر دھال باندھ ڈالا جو اس نے نہایت سعادت مندی سے بندھا لیا مگر کا پٹی آواز میں بولا "سراسر! کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ جب دھال میری آنکھوں سے ہٹے تو میں اپنے آپ کو سمیٹر صاحب کے سامنے کھڑا پاؤں؟"

مجھے ہنسی آتے آتے نہ گئی۔ وہ عرض میں مجھ سے کہیں بڑا تھا لیکن میں نے ششادہ لہجے میں کہا "نہیں پر خوردار! اطمینان رکھو، ایسا نہیں ہوگا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

میں اس کا ہاتھ قائم کر لے چلا تو وہ بولا "اب اتنی زحمت نہ کریں۔ میں آنکھوں پر دھال بندھا ہونے کے باوجود پچھلے دروازے تک چلا جاؤں گا۔ میاں کا چپ چپ میرا جانا بچانا ہے۔ آنکھیں بند کر کے بھی جاسکتا ہوں۔"

ایک عذاب اور نا اگنی رحمت ہوتی ہے۔

”اب میں انا بھی انا ہی اور انا ہی میں ہوں“ میں نے قہقہے آواز میں اس کا کھنکھاتے ہوئے کہا ”میں نے کچھ سوجھ سمجھ کر ہی اسے آئے دیا ہے۔“

”تمہاری یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کسی روز تمہیں لے نہ ڈالے گی میں اس تصور سے ڈرتی ہوں۔“

”جب تو دنیا ہو گا تو اب جائیں گے ابھی سے اس غم میں ڈیٹے ہوئے کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے کہا ”تم سلسلہ کلام دہراؤ سے جو دہراؤ میں سے نوا تھا کیا کہہ رہی تھی تم؟“

”اب تو مجھے خود بھی یاد نہیں رہا“ وہ سادگی سے بولی وہ ایک عجیب عورت تھی۔ زندگی میں جانے کیا کچھ دیکھ بھلی تھی لیکن کچھ بھی اس کے انداز گفتگو میں اتنا بھونچا اور سادگی ہوتی تھی کہ حیرت ہونے لگتی تھی۔ آزارات سے وہ اسکول کی ایک نوخیز اور معسوم لڑکی نظر آتے لگتی تھی۔

”اب۔۔۔ تم بتا رہی تھیں کہ مختلف کاموں کے سلسلے میں تمہیں ہدایات ملتی رہتی ہیں۔ کون دیتا ہے ہدایات؟“ میں۔۔۔ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے پوچھا۔

”کبھی کوئی، کبھی کوئی۔ دینے زیادہ تر ہدایات کمال نے سن ی کی زبان سے ملتی ہیں۔“ اس نے جواب دیا ”لیکن کبھی کبھی وقت کسی بھی ذریعے سے میرے لئے کوئی حکم آ سکتا ہے۔“

”تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ اس عظیم کارسراہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سراہ۔۔۔؟“ اسے گویا اب میری سادگی پر ہنسی آتے آتے رہ گئی ”میں نے بتایا تو ہے کہ مجھے ابھی تک عظیم کے سربراہ کی کچھ ہی نہیں آئی۔ سربراہ تو دور کی بات ہے، مجھے ابھی تک ہی اندازہ نہیں ہو سکا کہ جتنے لوگوں سے مجھے واسطہ پڑ چکا ہے ان میں زیادہ اہم کون تھا۔ ایک ہی شخص ایک روز کسی سے انکادات لے لے لگا ہے اور دوسرے روز وہی شخص اسے انکادات دیتے لگا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں تو ان کے مقاصد کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہو گا؟“ میں نے تندرستہ لہجے سے کہا۔

”ہرگز نہیں“ وہ قہقہے میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”اپنے چھوٹے بارے میں اپنے طور پر کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ فلاں کام کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ ہو گا اور فلاں کے پیچھے وہ۔ مثلاً جب مجھے ہدایت ملتی ہے کہ فلاں سرکاری آفس کے دل میں کس کس کوں اور کسی ایسے شخص میں ”جب وہ رشتہ منقطع ہو رہا ہو“ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ فلاں قبر کی فاکس کس کی تحویل میں ہے اور اس کی حفاظت کے کیا انتظامات ہیں؟ تو میں کچھ جانتی ہوں کہ اب اس فاکس کی خبر نہیں۔ وہ تو چورس ہو جائے گی یا اس کی حکم پالی جائے گی۔ لیکن میرا کام ہر حال صرف معلومات حاصل کرنے تک ہی

”ہرگز اور!“ میں نے پہلے سے زیادہ شفقت سے کہا ”میں تمہیں اس لئے کچھ دور تک چھوڑنے جا رہا ہوں کہ راستے میں ایک شخص کھڑا ہو گا۔ وہ کچھ اور کچھ کہیں تمہیں گولی نہ مارے۔“

مجھے معلوم تھا، خانے کی دیوار کے ساتھ بچنے کے کی طرف لڑتی کھڑا تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ بین لڈنگ کی طرف سے آنے والوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ ایسے کسی شخص کو خانے سے رخصت ہوتے دیکھتا تھے اس لئے آتے نہیں دیکھا تھا تو تشویش میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

میں چراغ دین کو اندر لے میں جی کے سامنے سے لے کر گزرا تو وہ دیوار سے چپکی کھڑی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس نے ہمیں دیکھ کر سانس بھی روک لی تھی۔ اس نے میڈ کی پوچھا ”کام کا وہاں غائب کی طرح چہرے پر پلٹ لیا تھا۔ وہ کچھ بولی تھیں۔ پہلی پہلی آنکھوں سے بغور دیکھتی رہی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اسے دیکھ دیکھ کر اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

خانے کے کونے سے گھوم کر ہم زیادہ لمبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھے۔ کچھ دور چلے اندر لے میں لڑتی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ میں نے اسے ”سب ٹھیک ہے“ کا اشارہ دیا اور چراغ دین کو کچھ آگے تک چھوڑ کر کہا ”اب تم دیکھ کر چل جاؤ چاہے ہو پہلے جاؤ۔ مگر مڑ کر مت دیکھنا۔ کہیں کھڑکی میں سوراخ نہ ہو جائے۔“

وہ خوف سے کانپتی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں واپس ہٹ کر پاس آیا تو وہ بہت خوف زدہ تھی اور سارا معاملہ جاننے کے لئے تجسس سے بھی مری جا رہی تھی۔

”کھوڑا ہمارا نکلا چڑا۔ اور وہ بھی چرواں کسے والا چڑا؟“ میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا ”وہی غرت کی دیکھ بھری ہی کمانی!“

”کیا قصہ تھا؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے قصہ اسے سنایا تو وہ بولی ”اس نے یقیناً ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔ وہ ریڈ ڈاٹ والوں کا جاسوس ہو گا“ اس کے لہجے میں بے پناہ خوف تھا۔ شاید برین واشنگ کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی تھے۔ یہ اس کی شاندار قوت ارادی ہی کا کام تھا کہ اتنے سائنٹفک انداز میں کئی مرحلوں میں کی جانے والی برین واشنگ میں وہ اپنا ذہن بجا کر لے آئی تھی لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ کچھ نہ کچھ گوشوں پر ”کچھ غیبات پر کسی حیرت، کسی الیکٹرک شاگ یا کسی دوا کے ٹھوڑے بہت اثرات باقی نہ رکھے ہوں۔“

اس کے بعد سے میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ذہن پر ریڈ ڈاٹ کا بہت زیادہ خوف بیٹھا ہوا تھا۔ شاید وہ جو کچھ دیکھ کر آئی تھی وہ اسے خوف زدہ کھینچنے کے لئے کافی تھا۔ میں ابھی ان کے بارے میں کچھ زیادہ آگاہ نہیں تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اکثر ابھی

جس نے میرے دربار میں حاضر کیا دی ہوں۔ نہ جانے کن کن حالتوں میں کس کس انداز میں دقت گزریاں گی وہاں اس کے بارے میں میں تم پہلے ہی تصور نہیں کر سکتا کہ وہ کتنا کھٹ ہوگا؟ جہاں جہاں وہ اپنی شرمناک گزریوں اور بد عزتوں کے ثبوت چھوڑ کر گیا ہو وہاں وہ چنانچہ میں نے کسی منہ سے آسکا ہے؟

پھر اسے کچھ یاد آیا اور وہ بولی "تمہارے جو توئی اپنی دانست میں بڑی رازداری سے میری عمرانی کر رہے تھے۔ اور وہ نتیجہ اپنی لاش کے اہر بھی ہوں گے۔ ان پر بھی کبیرے مرکز تھے کمال نے سن میرے بڑے دھم میں بیٹھا دی پر انہیں دیکھتا تھا۔ تو سچ کہ بیش و نشاط میں غرق لوگوں کے بارے میں کیا کچھ سواد جمع نہیں ہوا ہوگا؟ سب بھی محض میرے اندازے ہیں۔ مجھے بتایا کچھ نہیں جاتا۔ لیکن میں خاموشی سے سر جھکا کر ہدایات پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ کن انہیں سے حالات کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ مشاہدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور جو کچھ میری ناقص عقل میں آ رہا ہے وہ تمہیں بتا رہی ہوں۔"

"تمہاری عقل ناقص نہیں، بڑی کار آمد ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور شاید آگے چل کر مزید کار آمد ثابت ہو۔" "تشویش میں مبتلا ہونا اور غم کے بارے میں غور کرنا ویسے بھی میری ذمہ داری نہیں ہے۔" اپنی اپنی دھن میں بولی "یہ کمال نے سن کا شبہ ہے۔ مجھے ہدایت ملی ہوئی ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کا غلطو یا اندیشہ محسوس ہو نہیں صرف کمال نے سن کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ میری تو ویسے ہی جو میں کھٹے عمرانی ہوتی ہے۔ مجھ سے پہلے تو ہر خطرے کو وہ خودی محسوس کہتے ہیں اور خودی منٹ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی نظر ٹھک بھی جائے تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس طرف سے مجھے اطمینان ہے۔ صرف تم جیسا سرکاری محکمہ ہے اس جزے میں سرگرمی کے بعد محفوظ رہ سکتا ہے۔" "میری طرف یہ لوگ اتنے حوجہ کیوں نظر آتے ہیں؟ میری ذات میں ان لوگوں کی دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" وہ غمی میں سر ملاتے ہوئے بولی "اس سلسلے میں کوئی اندازہ ابھی نہیں لگا سکی۔ میرے سامنے اب تک جو لوگ آئے ہیں وہ شاید اتنے اہم نہیں تھے کہ ان کے درمیان تمہارے بارے میں کوئی تفصیلی تبادلہ خیال ہوتا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ مسکرائی۔ اس کے ہواور سفید دانت اندر میرے میں موتیوں کی طرح جھلکنا اچھے شرے سے بچے میں وہ بولی "ہو سکتا ہے میری طرح ریڈ ڈاٹ بھی تم پر بے وجہ عاشق ہو۔" اندازہ مجھے بہر حال ہو چکا ہے کہ یہ تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ ان کے لئے زرا بھی مشکل کام نہیں ہے۔"

میں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "جب تک ادھر والے کو منظور نہیں ہوگا تب تک ان کے لئے کیا امن سے بھی

ہوتا ہے اس سے آگے دو سرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے اہر انک ہوتے ہوں گے مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہو آ کہ اس اول کی نوعیت کیا ہے اس میں ریڈ ڈاٹ کی دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟ کب اور کس طرح اسے چرایا یا پالی کی جائے گا اور اس کا کیا صرف ہوگا۔ یہ کوئی بڑا ذرہ مست نیٹ ورک ہے۔ کوئی بہت بڑی رلی ہے۔ مجھ سے پہلے کسی پرزے کا کام چل رہا ہوتا ہے۔ پھر تک پہنچتا ہے۔ میں بھی ایک چھوٹا سا پرزہ ہوں۔ میں اپنا کام م دے دیتی ہوں۔ اس کے بعد کسی اور پرزے کا کام شروع آتا ہے۔ وہ حرکت میں آ جاتا ہے۔ مشینری کیا ہے اس کی ت کیا ہے اس کا نقش کیا ہے ظاہر ہے یہ پرزوں کو نہیں آسکتا۔"

"لیکن اس طرح تو تمہاری پوزیشن مشکوک ہو سکتی ہے۔ تم خطرے سے دوچار ہو سکتی ہو کہ اور تم نے کسی اپنی سرکاری رے کسی اہم اور خفیہ فائل کے بارے میں معلومات حاصل ما اور اور وہ فائل غائب ہو گئی۔ اس آفسر کا خیال تو سیدھا ری طرف جائے گا۔ وہ پلٹ کر تمہاری طرف آسکتا ہے۔ رے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ تمہاری ہر کار نہیں بچے قلعے کے لئے سہی لیکن بہر حال تم غلامی سلاخ پر کام کر رہا میں نے کہا۔"

"یہ تو میں نے محض خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ فائل چوری تی ہے۔ میں ممکن ہے ایمان نہ ہوتا ہو" وہ بولی "ہو سکتا ہے اس صرف کاپی کی جاتی ہو اور کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا ہو" پھر وہ غمی سی لے کر بولی "میں بھی مجھے سرگرم عمل ہونے زیادہ مرہ ہوا۔ ابھی تک تو مجھے کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہتا ہے کہ میرے گرد ہر طرح کا فتن نظام موجود رہتا ہے اور میں تمہیں یہی بات بتاؤں۔ میرا یہ اند ہے کہ کوئی اہم سے اہم فائل خفیہ ترین خانہ ذات بھی ملی ہو جائیں تب بھی کوئی آفسر لٹ کر میری طرف آئے یا کوئی دوائی کرنے کے بارے میں شاید سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے انہماک سے دریافت کیا۔

"اس سے پہلے اسے اور بہت کچھ سوچنا پڑے گا" وہ غمی لے کر بولی "میں تو پہلے ہی حیران ہوا کرتی تھی اب اور حیران ہوتی ہوں کہ ہم کیسی کرنت موسیقی میں رہ رہے ہیں۔ غزلیں اور عاشقیوں کس کس سلاخ پر اور کس کس انداز میں ناہوئی ہیں۔ کیسی مشینری فاصلے معاشرے کو چلا رہی ہے۔ کاپیٹل دماغ کا اداسی بہت بڑا بھو ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے والو کچھ جیسی گناہ کار عورت کا بھی قدرت پر چین پلٹ ہو جاتا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "کوئی آفسر لٹ کر کسی گناہ پر اب طبعی کے سلسلے میں بھلا میری طرف کیسے آسکتا ہے؟

میری طرف رکھتے ہوئے سرگرمی میں ہی بولی "یہ بھی تو امکنہ کی ایک قسم ہے کسی ایک کے ہوا جادو دہندہ مارے جاؤ گے۔"

اپنے گوشوں کو کرنا ہوں توجہ کل کسی ایک کا ہر چیخے کہ دل تو دہیں انکار دیتا ہے لیکن یہ تن تو وہ نہ جانے کس شاخ سے نوا ہوا ہے۔ ہواؤں کے دوش پر اوہ رادھر مٹکا پھر ہے۔ لیکن یہ اس وقت تم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ یہ دقت ہے انہی باتیں کہ کا؟ کمال نے سن کے بارے میں کیا بتا دی تھیں تم؟

"میں کیا بتا دی تھی کہ تمہارا کارڈ دیکھ کر کمال نے سن کی باجیس کل گئی تھیں کہ چلو اس راستے سے ہی تم ان کے پاس کو چنوس کے تھماری بھری کزوریوں کے کچھ ثبوت تاحہ تباہیں کے توشاہ تم کچھ مجبور ہو جاؤ گے شاید کچھ باتیں مانے لگو گے۔"

میں ہولے سے اس دبا "کیا سناؤا چاہے ہیں وہ مدھ سے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" وہ بے بسی سے بولی۔

"اس قسم کے ٹھوڑے جھنجھڑوں سے میں بلیک میل ہولے والا نہیں ہوں۔ کسی کی غلطی سے چرائے ہوئے جذباتی ٹھوں کی تصویروں کو استعمال کرنا بت ہی چھوٹے بد معاشرہ کی بدست ہی پرانی ٹیکنیک ہے۔ میں ریڈ واٹ سے اس کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔" خیر لے تجارت سے کمال۔

"ضرورت ضرورت کی بات ہے" وہ بولی "میں جرحہ کارم نظر رہا ہو وہاں یہ دی استعمال کر لیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ متعدد پورا ہونا چاہئے" خواہ وہ کسی بھی ذریعے سے ہو۔ اسی۔ بعض اوقات یہ لوگ مجھے اپنا "اسی آئی اے اور کے جی بی" سے آگے نظر آتے ہیں اور بعض اوقات بتول تھماریے بالکل فر دہشت بد معاشرہ اور گنہ باز گئے ہیں۔"

"لیکن مجھ پر تو ٹھوڑے جھنجھڑوں میں انہیں بالکل ہٹائی ہوئی کیوں کہ میں نہ تو کوئی اعلیٰ سرکاری آفسر ہوں۔ نہ سیاسی لیڈ ہوں۔ نہ وزیر ہوں۔ نہ سفیر ہوں۔ نہ کوئی نام نوا ملٹی ر ہوں۔ نہ ہی کسی پارسی شخصیت کے طور پر مشہور ہوں۔ حتیٰ میں تو شاید شدہ بھی نہیں ہوں۔ مجھے اس قسم کے رازنا ہونا ہے کیا زور ہو سکتا ہے!"

"ایک مدت بڑے بڑے میں تو ہوں۔ آخر ایک بڑے متعدد ایک بڑے بڑے میں کا بھی معاشرے میں اپنا ایک مقام ہے" وہ بولی۔

"بڑے۔ اور معاشرے میں اپنے اس مقام و حیثیت کو کچھ زیادہ پروا نہیں ہے۔ میں سن موٹی تھی ہوں۔ اگر مجھے چیزوں کی زیادہ سے زیادہ پروا محسوس ہوگی تو پھر ان کی حفاظت کروں گا۔ اول تو ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن اگر اس سے کبھی مجھے رسوا کرنے کی کوئی کوٹش کی جائے اور اس کو پھوڑی کو کم جائے تو پھر ریڈ واٹ والے ہوں یا کوئی اور انہیں بھی دن میں مارے نظر آجائیں گے۔"

بڑی شیطانی قوتوں کے لئے یہ ایک مشکل کام ہی رہے گا۔ جس دن اور پولا چاہے گا اس دن ایک ٹھکرے سے بھی موت آسکتی ہے۔"

مہمت دوسری آگنی ہے طبیعت میں "وہ بولی۔"

مہمت سے ہی دوسری ہے میری طبیعت میں۔ تم نے محسوس نہیں کی ہوگی پہلے۔ میں نے کہا "اس دوسری کی وجہ سے ہی قوتیں اندر سے بہت مطمئن رہتا ہوں۔"

"اور بد معاشرہ بھی ساتھ ساتھ جاری ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"بندہ بھر ہوں۔ گناہ گار ہوں۔ اس امید پر ہی رہا ہوں کہ کسی دوزان کزوریوں پر بھی جا پڑاں گا اور کوئی دھمک کا افسانہ نہیں باؤں گا" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔

اسے جیسے کچھ یاد آیا "کل جب تم میرے پاس آئے اور تم نے اپنا کارڈ اندر بھیجا تو کمال نے سن کی باجیس کل اٹھی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ تو کیا سمجھا تھا کہ آخر کار تھیں بھی میری کشش سمجھ لائی ہے۔ گو کہ انہیں معلوم ہے "عورتوں سے تھماری دوستی کا معیار کچھ عجیب ہی ہے۔ تم عام دولت مندوں کی طرح میں پرست نہیں ہو۔ چپ اور پرویشعل عورتوں کی طرف بھی حوجہ نہیں ہوتے۔ اور مجھے طبیعت کی عورتوں کی بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ گون کی تھیں کب اپیل کر جائے اور کسی کے حسن و جمال کی پکاچہ نہ کے باوجود تم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔"

میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا "میری ذات کا یہ پہلو تو خود میرے لئے بھی گورکھ دھندا ہے۔ اس معاملے میں میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا۔ لیکن میں نے جہاں تو خواہ امت تجزیہ کیا ہے اس سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنی ذات میں سے جھوکش ہر طرح کا پیکر نکال دیا ہے لیکن کیس نہ کیس۔ لاشعور کی گزرائی میں محبت سے عورتی کا کوئی بہت برا ظلم موجود ہے۔ باپ کے سوا مجھے بچپن سے کسی کی بے غرض محبت نہیں ملے۔ اب میں نہ چاہے ہوئے بھی کسی کی ایسی عورت کی طرف جھٹک جاتا ہوں جس میں ایک خاص قسم کی کشش تو ہوتی ہی ہے لیکن میرے لئے زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی غرض کے مجھے چاہتی ہے۔ میری طلب رکھتی ہے۔ مجھ سے کوئی ملے نہیں چاہتی۔ کوئی زیادہ لمبی امیدیں وابستہ نہیں رکھتی۔ مجھ پر بے غرض نہیں جاتی۔"

مجھ سے باز پرس نہیں کرتی۔ مجھے گپ چٹنگ کی طرح چھوڑے رکھتی ہے لیکن جب بھی میں اس کی طرف لوٹ کر آتا ہوں "وہ اسی پرانے غلوں "اسی گرم جوٹی" اسی شدت سے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے اپنی شدتوں میں کوئی کمی نہیں کرتی۔ بے غرض پرست عورتوں سے بہت گہرا ہوں۔"

اس کے بھر۔ جو بھرے نیم و ہونٹوں کے عقب سے سفید دانت اب بھی جھانک رہے تھے۔ اندر میرے میں گمات لگا کر بھی ہوا کہ شہر۔ کسی خوب صورت شیرینی کی طرح۔ وہ ایک تک

”ہاں“ اس نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا ”شاید اس لئے کہ وہ یہاں زیادہ آسانی سے مکمل مل جاتے ہیں۔ ویسے جس سرخس نے میری کامیابی سر جری کی وہ اور اس کا اسٹنٹ سفید ظام تھے۔ بعض لوگ میں نے ایسے بھی دیکھے ہیں جن کی قومیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ کئی زبانیں اسی طرح روانی اور درست تلفظ کے ساتھ بولتے تھے جس طرح انسان اپنی مادری زبان بولتا ہے۔“

”صحیح ہے!“ غیر ارادی طور پر میرا انداز خود گلابی کا سا ہو گیا۔ ”یہ کوئی عجیب سی چکر ہے۔ واقعی اس کا لکڑی سر جری کچھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں ہماری اینجینیاں اور اوارسے کیا کر رہے ہیں۔“

”ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ وہ سچے سے بولی ”اینجینیاں اور اوارسوں کی عین ناک کے چھونچے جاتے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ صرف اس وقت چرکتے ہیں جب بڑے بڑے سامنے ہوتے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ رمی اور کانڈی کاغذ انیاں یا محض خات پڑی اور عذر خدای کرتے ہیں۔ وہ بھی بالکل غمراہ!“ اسے عورت ہوتے ہوئے بھی اتنا اندازہ تھا۔

”اے نن کے بارے میں ہمیں کیا معلوم ہے؟“ آج مورت میرا گیا تھا تو میں اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے لئے کوشاں تھا لیکن یہ کوشش کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ معلومات کے سلسلے میں وہ خود بھی دامن تھی ”میری آمد کوئی۔“

”اے نن مجھے کوئی انسانی ظنون نہیں لگتا۔“ وہ کراہت سے جھرجھری سی لے کر بولی ”وہ کوئی عجیب سی چیز ہے اور شاید عجیب غریب کام ہی اس کے سپرد کیے جاتے ہیں۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں کہ وہ کوئی اہم توی ہے یا نہیں۔ ہر عورت کو دیکھ کر رال پٹکا لگتا ہے۔ زبان ایک بالشت باہر لٹک آتی ہے۔ مجھے تو اس کو دیکھ کر گھن آتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ میں نے ایک سفید عورت کو اس پر فریفتہ دیکھا۔ نہایت عوامی قسم کی عورت تھی۔ فٹ سے لگتا ہوا تو اس کا قد ہوگا۔ لیکن سچی بے پناہ خوب صورت۔ سوکس معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس طرح اسے نن کے۔ میں یا نہیں ڈالے پھرتی تھی جس طرح کوئی اپنے ہاتھ بندھ کر پھرتا ہے۔ اس کی ہر بات پر اتنا خوش ہوتی تھی کہ میرے سامنے۔“ اس نے کمری سامنے لے کر جملہ اوصاف چھوڑ دیا ”میں ہمیں کیا بتاؤں!“

میرے خیال میں اس نے جتنا بتایا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ ”لے پوچھا“ تم انہیں مکمل دیکھا کرتی تھیں؟“

”یہاں مجھے کامیابی سر جری اور برین واشک کے علاوہ چند ماہر رکھا گیا تھا۔ وہ دونوں بھی کھیا وہاں آتے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ کس لئے آتے تھے۔ وہ کوئی بہت بڑا اور عالی شان

”شہر دہی نہیں ہے کہ کمال نے سن کے ذہن میں وہی خیال آیا ہو جو میں سمجھ رہی ہوں۔“ مٹی بولی ”مکس ہے اس کی باہمیں کھی اور وجہ سے مکلی ہوں۔ ہر حال وہ تساری آمد کی اطلاع پاتے ہی بہت خوش ہوا تھا اور اس نے جلدی سے مجھے دعوت کی تھی۔“ ”جس سب کچھ بھول بھال کر چھوڑی کہ تو اب میں کتا ہے۔ اسے اپنا بے دام غلام بنانا ہے۔ اسے اتنا خوش کرنا ہے کہ اپنے ہوش و خواس سے بے گانہ ہو جائے۔ چہ دہری ایک آزاد پرندہ ہے۔ اس کے پر کھڑے ہیں۔“ وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں ان الفاظ کی وضاحتوں میں جاتی۔ تسارے آنے کے بعد تو بادل ہی الٹ گئی۔ ”اس بے چارے کو معلوم نہیں تھا کہ چہ دہری تو پہلے ہی تسارے دام غلام ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھئی باتیں مت کرو۔ سامنے خواب مت دکھاؤ۔ مجھے اپنی اوقات معلوم ہے۔“ اس کے لیے میں یک ایک اداسی از آنکی۔

”دہی عورتیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں جنہیں اپنی اوقات معلوم ہوتی ہے۔ خبر۔۔۔ کل کی افغانی کے بعد کمال نے سن اور اس ڈھانچے کا وہ عمل کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ میں انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ تم انہیں ادھ مہا چھوڑ کر گئے تھے لیکن شو کے وقت تک وہ دونوں ہوش میں آ گئے تھے۔ اس ساری مگر بڑے باوجود میں نے وقت پر شو پیش کیا تھا۔ انہوں نے شاید اوپر کسی کو اس واقعے کی رپورٹ کر دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم انہیں اوپر سے مزید کیا بات کی ہوں۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ مجھے صرف یہی تبدیلی نظر آئی کہ وہ پہلے کی نسبت کچھ چپ سے ہیں۔ پہلے کی طرح زیادہ چمک نہیں رہے۔“

”وہ ڈھانچا جسے تم صفحہ کے نام سے غلاب کر رہی تھیں کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”معلوم نہیں“ اس نے جواب دیا اور میں اس جواب پر کچھ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جلدی سے بولی ”میرا مطلب ہے مجھے اس کی اصلیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مجھے وہ انڈین لگتا ہے۔ وہ تقریباً گولوں کی طرح رہتا ہے۔ شاید ہماری کچھ بولتا ہے۔ وہ میرے لئے ٹیبل درسیے کے باڈی گارڈ کے فروکش انجام رہتا ہے۔ ہر وقت سامنے کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے۔ اس پر کمال نے سن کا حکم چلا ہے۔ کمال نے سن گویا میرا ڈرا اوٹے درجے کا باڈی گارڈ ہے۔ مٹھو بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کے گھیر لانا مٹھو جیسے مٹھو کی وجہ سے مٹ سے لوگ اس کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کمال نے سن اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ کل وہ دونوں کس طرح تم سے مار لگا گئے۔“

”میں بھی جنہیں اس طرح کی شاید اور بہت سی چیزوں کا سامنا کرنا پڑے۔“ میں نے کہا ”لیکن جنہیں اپنے اندر گرو زیادہ تڑپا بیانی لوگ ہی نظر آتے ہیں؟“

سکون تو کسی نہ کسی ذریعے سے بھگادوں۔ اس میں میری زندگی کو غلطو فہم ہو گا لیکن میں یہ کام کرنے کی کوشش کروں گی۔ مگر تم اور خود مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی تمنا کو بخش نہ کرنا۔ کل کے واقعے کو گویا تم بائبل پر عمل جاؤ گے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے خطبات لہجے میں ہدایات کا سلسلہ جاری رکھا "بلکہ میرا تو تمہیں یہی خطبات اور دوستانہ مشورہ ہے کہ ان سے اپنے کا سلسلہ ہی بند کر دو۔ ان سے تمنا میرے تمہارے جس کی بات میں ملتی ہے۔"

"جیسا کہاں الجھتا ہوں؟" میں نے کہا "مجھے تو وہ خود ہیں۔ جس اب میرا جنس لگا ہوا جا رہا ہے کہ شاید میں تمہارے مشورے پر عمل نہ کر سکوں۔"

"مردوں میں..... خصوصاً تم جیسے مردوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے" وہ لفظی سانس لے کر بولی "مگر انہیں جس کام سے منع کر داتے وہ ضرور کرتے ہیں۔"

"کیا یہ سلسلہ پر ناجی رہی؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔" پھر وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "اور تم یہ؟" زندگی بھر کے الفاظ اس طرح استعمال کر رہے ہو جیسے یہ کوئی بہت لمبی مدت ہو۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے زندگی بہت مختصر بھی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً مجھ جیسی عورت کی۔ جو مل سے ان کی رفتار بھی نہیں ہے اور جس کی اہمیت بھی ان کی نظر میں صرف جسم و جوانی کی کشش کے حوالے سے ہے۔ اگر یہ مجھ سے خوش رہیں تب بھی جسم کے چراغ کی لو مگمگ پڑے ہی میری اہمیت ختم ہو سکتی ہے اور مجھے تمام چھوٹے سوتے رازوں سمیت دوا بید کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شاید اصلی پر نفس حینہ کو شخص خدا ہی کی وجہ سے فرق نہ کیا گیا ہو بلکہ اصل وجہ یہی ہو کہ اس کی عمر مڑنے لگی ہے۔" پھر زبوں کے لئے اس نے خوبصورت شکار میں کشش نہ رہی ہو۔

"تم بھی بیٹی اس قسم کے مل جسک اندازے مت لگائی جا کر۔" جو نامعلوم ہے اسے نامعلوم ہی رہنے دو۔ بعض اوقات نا اگہی بڑی رحمت ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں اصل بات تو بتائی ہی تھی کہ فی الحال میرے ان لوگوں کے ساتھ رہنے کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے؟" وہ گہری سانس لے کر گویا کہانی کے اصل موڑ کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"وہ وجہ بھی بیان کر ڈالو اس لئے پہلے کہ صبح کی پیدید نمودار ہو جائے" میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے؟ تم اصل میں میرے دوست کس طرح بنے تھے اور میرے غلوں کا لیکن تمہیں کب آیا تھا؟" اس نے گویا میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے پوچھا۔

"اب۔۔۔ ایسا باتیں میں بھولا نہیں کرتا۔" میں نے ان بھولے

پر اسرار قسم کا بنگلا معلوم ہوا تھا۔ میں وہاں صرف دو گھنٹوں تک محدود تھی۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہوسکا کہ بنگلا کہاں واقع تھا اس میں آمد و رفت کے راستے کون سے تھے؟ آسمان میں نے وہاں بڑی حیرت انگیز سائنسی ایجادات "الیکٹرونک آلات اور مشینریاں وغیرہ دیکھیں۔"

"کیا وہ ریڈ واٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" وہ جلدی سے بولی "تاکہ مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ تو ان کے چھوٹے سوتے کاموں کے سلسلے میں زیر استعمال رہنے والی کوئی معمولی اور غیر اہم سی جگہ تھی۔ ہیڈ کوارٹر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں ہو اور کیا ہو۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نے تو اسے سن کو کوئی اہم آدمی سمجھ کر اپنے سب آدمیوں کو اس کی تلاش پر لگا دیا ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بالکل بے کار اور بے مقصد اقدام ہے۔ اپنے آدمیوں کا وقت اور انہی ضائع مت کرو" وہ غریبانہ لہجے میں بولی "اول تو وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ بڑی فیث بدع ہے۔ اور اگر ہاتھ آجی کیا تو میں نہیں سمجھتی اس سے جیسں کوئی فائدہ ہوگا۔ جتنی معلومات تمہیں میں نے دی ہیں اس سے شاید اتنی بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ جب کہ میں یہی سمجھتی ہوں کہ ابھی مجھے کوئی کام کی بات نہیں معلوم۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گہری دیکھ کر بھر پوری سی لہجے ہوئے بولی "اب میں چلتی ہوں۔ میرے پاس نیڈ کے کئی چند گھنٹے ہوتے ہیں جن کے دوران مجھے شمالی سمروں کی ہے آج کی بند میں نے قرآن کر دی ہے۔ صبح سے دن بھر نہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملاقاتیں کرنا پڑیں گی اور کل رات پھر شو پیش کرنا ہے۔ بڑے اعصاب شکن روز و شب ہیں میرے۔ اوپر سے جس میڈ کو اپنی جگہ اپنے لباس میں لٹا کر آئی ہوں اسے گو کہ میں نے بہت بھاری معاوضہ دیا ہے لیکن پھر بھی ظاہر ہے ایک راز اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ میں کچھ دیر کے لئے رازدارانہ انداز میں تمہیں غائب ہوئی تھی۔ اگر کسی کو ڈرا سا بھی شک ہو گیا تو ہوا بھڑاچھوٹ جائے گا۔ یاد دہانی اگر اس میڈ نے غموس کر لیا کہ یہ کوئی بہت اہم چکر ہے اور وہ بک گئی، کسی خوف یا کسی لالچ کے تحت اس نے یہ بات اگلی دن تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوگا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اتنا بھی مت ڈرو۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"اب تم مجھ سے ملنے یا سامنے آنے کی کوئی دانت کو شش مت کرنا" وہ بولی "تمہارا مدد مل ایا ہونا چاہئے جیسے تمہیں یقین آ گیا ہے کہ میں جتنی میں پر نفس حینہ ہی ہوں۔ اگر بھی اتفاقاً سامنا ہو بھی جائے تو ادھیسی ہی بنے رہا۔ میں کو شش کروں گی کہ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے اگر کوئی کارآمد اطلاع تمہیں بھجوا

کر زندگی کا سطرے نہیں کرتے گا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک بہت اچھے خاندان میں بچ گیا۔ ایک آسودہ حال مگر بے اولاد جوڑے نے اسے اپنا بیٹا بنایا تھا اور بہت شہادہ اور طریقے سے تعلیم دلائی تھی۔ ہمارے ہاں تو ابھی تک الیکٹروکس کی تعلیم عام نہیں ہے مگر وہ ان دنوں امریکا سے الیکٹروکس کا کوئی کورس کر کے آیا تھا۔

وہ بچے سے میرے ہاتھ سے اپنے آنسوؤں کی نمی صاف کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کی غاسرشی کے بعد بولی "خون کی کشش جوش مارتی تھی تو وہ بھی کبھی چپ کر بازار حسن آیا کرتا تھا۔ اس کے ہاں باپ مر چکے تھے لیکن ایک بڑی بہن اس وقت تک بازار میں تھی اور بڑی اونچے درجے کی رقصہ تھی۔ وہ چاہتی تھی تو بازار حسن نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ بہت بڑے بے معاشوں کے قبضے میں تھی اور وہ بھی اس پر بازار حسن کی چھاپ اپنی مگر ہو چکی تھی کہ باہر کی دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔"

"اچھا... تو اسی پس منظر کی وجہ سے وہ نہیں جانتا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بچپن سے ایک دوسرے کے نقش میں گرفتار تھے۔ اس کے نقش قدم پر چلنے ہوئے تو میں بھی بعد میں اپنی طرف سے کر بازار حسن سے نکل آئی تھی۔ میری ماں بہت اچھی بیٹی تھی۔ اس نے کبھی میری کوئی بات نہیں سنا۔ اس جیسے ماں میں شریف زادوں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ وہ جتنا مرید بنے رہی، صرف میرے لئے زخمہ رہی۔"

جب کوئی اس والدین اور اہل خانہ میں اپنی ماں کا ذکر کرتا تھا تو میرے سینے میں دل گریا ایک آدمیک فلاں جانا تھا جس میں "تیر چپٹا بیلیاں سی بجائے کلنی تھیں پیسے رات کے پچھلے پیران اپنے بہت زادوں میں کوئی طوفان سر اٹھا رہا ہو۔"

"میں نے اچھا تھا وہ... تمہارا محبوب وہاں کیا کر رہا تھا؟" میں نے جلدی سے اپنا سوال دہرایا۔

"وہ شاید وہاں بعض الیکٹرونک آلات اور کچھ عجیب قسم کے کمپیوٹر کی تعمیرات پر اس وقت تھا۔ میرا خیال ہے اس کی حیثیت اس ایک دستری کی سی تھی اور وہ ایک دولت کی طرح اوپر اوپر آتا جاتا تھا۔ اس کا چوبیسہ تاثرات سے ماری رہتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح تھیں نہ پہچانتے اور اپنے ماسی سے بے خبر ہونے کی ادانگاری کر رہا ہو جس طرح تم کل تک میرے سامنے کر رہی تھیں؟" میں نے خیال ظاہر کیا "اس نے اسی میں عافیت اور صحت بھی ہو؟"

میں نے جواب دیا "میں نے بھی اس کی کافی بھی سنائی تھی۔ کہ رزمی میں کوئی مجھے پہلی پہلی محبت کے خوب صورت خواب دکھا کر لایا لباس پہنا کر بچہ کر رہا تھا کہ میں تو بڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ شادی اور حور سے خواب کی طرح نہ گئی تھی۔ اسی دن کی یاد دہانے کے لئے میں عین اسی وقت اسی کمرے میں وہی عروسی لباس پہن کر ہر سال جا کر پیشانی تھی کہ شاید کبھی کسی منجھڑے کے تحت وہ لوٹ ہی آئے۔ مگر وہ منجھڑا دھوا نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" میں نے مجھے بتایا تھا "میں نے کہا۔" وہ بھی مجھے ان لوگوں کے درمیان نظر آیا ہے۔ وہ ان کے لئے کام کر رہا ہے۔" وہ سر ہٹا کر افسردہ لمبے میں بولی۔ میں نے یہی جتنی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہ سرگوشی سے بھی دیکھ لے جس میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "جس بچے میں مجھے رکھا گیا تھا" وہ بھی وہاں موجود تھا۔ میرا دل اسے دیکھ کر دھڑکنے لگا۔ اس وقت تو میری برین واشنگ کا مکمل بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوش سے پاگل ہو جائے گا۔ وفاق ڈی ہوئی ایک طوائف زادی نے رسول اس کا انتظار کیا تھا۔ اس کی سرگوشی بھی ٹوٹ گئی۔

"لیکن کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مضبوطی سے ہاں میرا ہاتھ تھام لیا جیسے ڈوبنے سے بچنے کے لئے سارا تلاش کر رہی ہو۔ وہ آنسوؤں آتش خیال کی طرح میرے ہاتھ پر گرے مگر وہ مسکراتے ہوئے بولی "اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ میری ساری گرم جوشی میری ساری باتوں کے جواب میں وہ یوں بہت بنا رہا جیسے میں اس دوسرے سیارے کی گلفون ہوں اور میری زبان اس کی سمجھ سے باہر ہے۔"

"وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟" میں نے جلدی سے اسے سوال میں الجھائے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا دل غصہ غمور ہو رہا تھا مگر وہ ایک بہادر عورت تھی، مسکراتے جا رہی تھی اور اپنی آنکھیں خشک رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"میں نہیں اس کے بارے میں بتا نہیں سکتی تھی" وہ اپنی سرگوشیوں میں کہنے لگی کہ وہاں کب کب دھڑکتے ہوئے بولی "وہ بھی طوائفوں کے ایک بہت اونچے اور صرف گھرانے کا لڑکا تھا لیکن لاہور سے ہی بہت حساس اور ذہین تھا۔ کم عمری میں ہی سوچ کر بازار حسن پہنچ گیا تھا کہ وہ اس خاندانی پس منظر کا جو بوجھ اٹھا

مشق ہو جاتا ہے مگر وہ اس کی رسائی میں نہیں ہوتی، اسے معلوم ہو آئے کہ وہ ان چیزوں کو پائیں سکا لیکن محض اسی بنا پر وہ ان سے منہ نہیں موڑ سکا۔

"میں بدعا نہیں دے رہا۔ ویسے ہی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک امکان سامنا کر رہا ہوں۔ پاتوشایف تم مدبران کو کی نہ سکو" میں نے کہا۔

"میں ایک سوہوم ی امید تو ہے۔ اس کے کچھ بھولے میرے وعدے تو میرے پاس امانت ہیں۔ تمہارا تو میرے پاس کوئی وعدہ امانت نہیں۔ چاند ستارے، برف پوش چٹانیں اور چٹانوں سے وعدے نہیں کرتے کہ وہ ان کے ہو جائیں گے۔ تم نہ جانے کن چیزوں کے راقی ہو اور میرا انجام نہ جانے کیا ہوتا ہے۔ لیکن تم یہ سب باتیں کیوں کر رہے ہو؟ جنہیں کون سا زندگی کے سفر میں میرے ساتھ چلنے کی آرزو ہے؟" وہ ایک بار پھر میری آنکھوں کے راستے دل میں جھانکتے ہوئے بولے۔

میں کچھ نہ بولا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اس سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کر سکتا تھا جسے پورا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اپنی حیل تو مجھے خود معلوم نہیں تھی۔ میں نے کسی بھی عورت سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں اچھا انسان تھا یا برا۔ لیکن میں نے کسی بھولے جذبے کا ٹکڑا نہ کسی اچھی یا بری عورت کے ہاتھ چلائے کی کوشش نہیں کی تھی۔ واقعتاً جیسی جیسی تھیں، انہیں معلوم تھا۔ میں نے ان میں بھی جھوٹے وعدوں کے رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"جب ہو گئے؟" وہ میری ناک چھوتے ہوئے شر سے بچے میں بولی "ذرا مت۔ میرا تمہارے گلے چرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو دیسے یو پوچھ رہی تھی کہ آخر تم نے اتنا کیوں کر دے رہے ہو؟ جب کہ تمہارا اس ٹکڑا تو کل بٹانے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"میں بھی بس دیسے ی کر رہا تھا" میں نے اسی کے سے بچے میں جواب دیا "کسی سنے کی گتیاں سلجھنے دیکھ کر ایک اسطوری خوشی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے کچھ دریافت کیا ہے۔"

"میں اب چلتی ہوں" اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی "گھبراہٹ سے اس میز کا پارٹ ٹبل نہ ہو جائے۔ وہ گھٹنے کا معاونہ میں نے اسے دس ہزار دیا ہے۔ اس کی دس ہادی خواہ۔"

"یہ معاونہ اس کا پارٹ ٹبل ہونے سے بچانے میں کافی معاونہ رہے گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "معاونہ کے ذکر پر یاد آئے۔" تمہیں کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے؟

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اسی بے آواز انداز میں ہنسنے لگی۔

"کیا میں نے کوئی بہت اچھا بات پوچھ لی ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"مجھے تمہارے پوچھنے کے انداز پر ہی آری ہے۔ جنہیں جو

میں اجمرا۔ اور پھر تم کیا کہتے ہو۔ ایک عورت کے جس کے تصور میں ایک مرکز زدہ ہو گیا وہ اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتی کہ ذہنوں کا رابطہ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے دل میں بھی نہیں۔ میری کوئی تصویر، میری یاد کا کوئی نقش اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں بھی محفوظ نہیں تھا۔ وہ گویا مکمل طور پر ایک نیا انسان تھا۔ یا جنم لے کر آیا تھا۔ صرف شکل گویا کسی کی غلطی سے پرانی لگی نہ تھی۔"

"ہو سکتا ہے وہ تمہارے محبوب کا ہم شکل ہو۔ اس کا کوئی جزواں بھائی تو نہیں تھا؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں جنہیں کسی فلم کی کہانی نہیں سناری" وہ دیر سے ہنس کر بولی۔ اس خاموش فہمی میں بھی ذہن تھا۔

"نام کیا تھا اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"مدبران" اس نے تو بھرنے کے سے انداز میں نام لیا۔

"جہاں تم نے اسے دیکھا تھا وہاں اسے اسی نام سے پکارا جا رہا تھا؟"

"وہاں میرے سامنے اسے صرف ایک بار پکارا گیا تھا۔ سفید کام سرخیں کے سفید فام اسٹینٹ نے اسے "مسٹر بے" کہہ کر پکارا تھا۔ انداز حکمانہ تھا۔" اس نے بتایا۔

"ہو سکتا ہے وہ مسٹر بے ہی ہو" میں نے اسے بلا لے کی کوشش کی۔

"کوئی اسے بے کے یا کہ مجھے معلوم ہے وہ میرا مدبران تھا" وہ فیصلہ کن بچے میں بولی۔

"تم اس کا ذکر بھی چیزوں کی ان شدتوں کے ساتھ کرتی ہو۔ اور مجھ سے بھی مشق بناتی ہو۔ یہ کیا چکر ہے؟" میں نے یوخی ذرا اسے ٹوٹنے کی خاطر پوچھا۔

"میرا اصل مشق وہی ہے۔ وہی جہن کی محبت جو کبھی انسان کے دل سے جدا نہیں ہوتی، چاہے وہ کتنا بھی آوارہ ہو جائے، کتنی ہی دنیا گھوم لے، کتنا ہی برا بن جائے۔ وہ جو ایک جیسی ہی عقل دل میں نہیں رہتی ہے وہ تو جس زندگی بھر کے لئے ہوتی ہے۔ مدبران نظر آیا تو سب بھولے میرے خواب جاگ اٹھے ساری تسلی، ساری محرومیاں، تمام اور حسی تمنائیں۔ سب کچھ از سر نو زندہ ہو گیا۔ مدبران تو میری کتاب زندگی کا پلا وہن ہے۔ اسے تو میں پھاڑ کر نہیں پھینک سکتی۔ کتاب بے شناخت ہی ہو جاتی ہے۔"

"اور میں کیا ہوں۔" اسٹیو میل؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

وہ دیر سے اسے اسی بے آواز انداز میں ہنسی "تم بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ لیکن تم سے میرا مشق میں کچھ ایسا ہی ہے جیسے انسان کو دیکھنا چاہتا اچھا لگتا ہے۔ لگ بھگ برس چٹیلوں پر جمی ہوئی برف اچھی لگتی ہے۔ شام ڈھلے چٹیلوں پر آگ کی طرح دھبے سے پھول اٹھتے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی کسی چیز سے بھی انسان کو

کار بند رہوں۔ وہ کون تے کیا تے؟ ان کے مقاصد کیا تے؟ کبھی بہت بڑی سازش کے نامے بنائے تو میں نے جانے دیے؟ یہ جاننا میرا نہیں، ایجنسیوں کا کام تھا۔

میں اپنے آپ کو بار بار یاد دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ مجھے بس ایک بڑے برٹس بینک کی طرح سوچنا چاہئے تھا اور اپنے طور پر طریتے بھی کافی حد تک ویسے ہی رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے تھی۔ زیادہ سے زیادہ بس میں مناسب تھا کہ میں اپنے آپ کو عام دولت مند یا برٹس بینک کی طرح آسان شکار بننے دوں اور اگر کوئی میرے ساتھ کسی بھی سطح پر زیادتی کی کوشش کرے تو اسے منہ توڑ جواب دوں یا ساتھ ساتھ خود زارت سبقتی سکھا دوں۔ اس سے آگے نہ بڑھوں۔ اسی حکمت عملی کو اپنی مستقل پالیسی بنا لوں۔

لیکن میرے اندر جو ایک اور افضل چہ دردی چھپا بیٹھا تھا وہ مجھے اعانہ پناہ دینا اور اختیار نہیں کرنے دیتا تھا۔ وہ مجھے کبھی بھی جذباتی بھی بنا دیتا تھا۔ کبھی میرے جنس کو بھی بدعاتی تھا اور کبھی میرے دل میں یہ تشویشیں پیدا کر دیتا تھا کہ میں میرے ملک کے خلاف تو کچھ نہیں ہو رہا؟ لوگوں کے پاس دولت زیادہ آتی ہے تو ان کے دل میں وطن کی محبت کم ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سے ملک کے بارے میں بہت بے فکر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی فکریں دور ہو چکی ہوتی ہیں۔ وہ کچھ اس انداز میں سوچنے لگتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ملک کو کچھ ہو بھی گیا تب بھی ہمارے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھانج کر فلاں ملک ملے جائیں گے۔ فلاں ملک میں ہمارا چہرہ ہے، فلاں ملک میں بنگلہ ہے، فلاں ملک میں کاغذ ہے، فلاں ملک میں سکینی میں شیراز ہیں، فلاں ملک میں ولا ہے، فلاں ملک میں بچے پڑھ رہے ہیں۔

میرا معاملہ الٹ تھا۔ میرے پلیس دولت آتی تھی تو مجھے اس ملک میں اپنی چیزیں زیادہ مری محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں سوچتا تھا، میں جو کچھ بھی ہوں اوپر والے کی مہربانیوں اور اس ملک کی حمایت کے سبب ہوں۔ جس شاعر پر بیڑہ کریم نے کسی طرح بھی اپنا آئینہ نہ بٹایا ہے، مجھے میں اپنی ایماں بھکتا ہوں اب اس شاعر کا بھی کچھ نہ کچھ خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ بس اسی انداز فکر کی وجہ سے مجھے ریڈ واٹ کے بارے میں بھی تشویش ہونے لگی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اتنے بڑے پائے پر اتنے منظم اور فخریہ انداز میں نامعلوم قسم کی سرگرمیاں کسی بڑے اور خفیہ مقصد کے لئے ہی کی جاتی ہیں۔ جی نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میرے شبہات کچھ او

قوی ہوئے تھے۔ انہی سوچوں میں الجھا ہوا میں دیوار کے قریب سے ہٹ کر ہٹا گئی کے سامنے آیا کہ کوئی مجھے دیکھ لے اور مجھ جائے گئے۔ اب رخصت ہو رہا تھا۔ اب وہ بھی جا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے۔ وہاں کمرے ہونے کے بعد میں عمارت کے سامنے والے حصے طرف چل دیا۔

کچھ پوچھتا ہوتا ہے، بہت سادہ اور دو ٹوک انداز میں پوچھ لیتے ہیں۔

”دوستوں کے سامنے انسان کو اسی طرح رہنا چاہئے خواہ غم کے چاند غم ڈالنے سے کیا تاکہ“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ بالی مسئلہ کوئی نہیں ہے“ وہ سنجیدگی سے بولی ”بہت مدد ہے۔ بلکہ خرچ کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ وہ پچھلے کے معاملے میں انہوں نے مجھے بہت با اختیار بنا رکھا ہے۔ اور پھر میرا اپنا سب کچھ بھی انہوں نے پہلے ہی نہ جانے کب میرے لئے نام پر زائر سفر کر دیا ہے۔ اپنی کی حیثیت سے میں اپنی کو بھی پرکھ رہی تھی کہ کچھ بھی ہوں۔ کوئی مجھ سے کسی چیز کا حساب طلب نہیں کرتا۔ کم از کم اس اعتبار سے وہ مجھے خوش اور مطمئن رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”دوبارہ اس پتے میں جانا نہیں ہوا جہاں ہمیں چند ماہ رکھا گیا تھا؟“

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔

”پھر تو شاید عدالت سے بھی دوبارہ سامنا نہیں ہوا ہوگا؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”پھر بولی“ لیکن میں اس کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ کم از کم یہی معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ ان وہ سال میں اس پر کیا کڑی رہی اور کیا اب بھی وہ کسی طرح مجھے اور اپنے آپ کو شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ کتنی عجیب بات ہے۔ وہ انسانوں سے ان کی شخصیت اور ان کا

اضنی نہیں لیا کرتا ہے۔

اس نے جانے کے لئے قدم بڑھایا۔ وہ میڈی می کی معمولی سی جوتاں پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اتنی دیر تک دیوار سے لگ کر کھڑی رہنے سے تمہارا تو

حشر خراب ہو گیا ہوگا؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”میں بڑی سخت جان ہوں۔“

”ہاں“ کافی حد تک اندازہ ہوتا جا رہا ہے ”میں نے حلیم کیا اور اس کے ساتھ چلنے کے لئے تم بڑھایا۔“

وہ مجھے روکے ہوئے بولی ”تم یہیں کھڑے رہو۔ میرے جانے کے بعد جانا۔ اور میری یاد دلاتی یاد ہیں نا؟“

میں نے انہماک میں سر ہلایا اور وہ رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں دیوار سے ٹک لگائے کھڑا رہا۔ وہ میری سوچوں کو کچھ نئی راہیں ضرور دے گئی تھی۔ ریڈ واٹ کے بارے میں میں کبھی نہ کسی حد تک روشنی میں ضرور تھا تھا۔ میں غیر جذباتی اور حقیقت پسند ہو کر سوچنے کی کوشش کرنا تھا تو میں کچھ میں آتا تھا کہ مجھے ان کے بارے میں زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے حق میں بہتری تھا کہ صرف چونکا رہوں اور جب بھی وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں تو اپنے آپ کو اس سے بچاؤں۔ کسی حد تک دفاعی حکمت عملی پر ہی

گھر آکر میں بھی ان کو سونایا۔

نایت سے بھی سو م نہیں ہوتے۔

”اسل میں وہ لوگ کانی تجربہ کار ہو گئے ہیں۔ انہیں شکل دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کام کی بات کرنے آیا ہے اور کون صرف وقت ضائع کرنے“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”سرا کیا میں شکل سے اندازہ ہی احمق لگتا ہوں کہ کوئی مجھ سے کسی کام کی بات کی توقع ہی نہیں رکھتا؟“ اس نے دہانک سے لمبے میں پوچھا اور خود ہی اپنی ٹھوڑی قیام کرچو گویا میرے معائنہ کے لئے ذرا آگے کو کر دیا۔ اس کے اس انداز پر مجھے ہنسی آئی۔ آتے نہ گئی۔ اس کی شخصیت میں یہی بڑی عجیب بات تھی۔ ایک بل میں اس پر غصہ آئے لگتا تھا اور ایک بل میں ترس۔ یا پھر خواہ خواہ ہی ہنسی آجاتی تھی۔ خصوصاً اس کی حد سے زیادہ سنجیدگی اور ”دردناکی“ مستحکم فخر تھی۔ درد نہ جوں تک اس کی شکل مسرت کا تعلق تھا ”چما بھلا پنڈت سم لڑا تھا۔ خرابی بس یہی تھی کہ اس کی شکل پر حد سے زیادہ وفات برستی تھی، خصوصاً مولے مولے شیشوں کے عقب میں اس کی آنکھیں ان کی آنکھوں کی طرح کول کول نظر آتی تھیں۔ ان کی وجہ سے چہرے پر زیادہ مستحکم فخری جھلک آتی تھی۔

”نہیں۔ نہیں“ میں نے فوراً زری سے کہا ”شکل مسرت تو اللہ کی بنائی ہوتی ہے۔ مصل شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہئے۔ میں تو دیوے ہی راق کر رہا تھا۔“

وہ دیک دم جیسے اپنا سارا ”منج و دم“ بھول گیا اور شکایت کے بجائے بڑے مان سے ہوا ”آپ کو معلوم ہے۔ میں ایک کھنے سے آپ سے ملاقات کے انتظار میں کھڑا ہوں؟ آپ کے گارڈ نے جب مجھے بھگاوا تو میں یہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں باڑھ کے پیچھے اس لئے چھپا ہوا تھا کہ کہیں آپ بھی مجھے دور سے دیکھ کر گاڑی دیواروں کے گرد بھاگنے لے جائیں۔ دیوے بالی داوے چوہری صاحب۔! یہ دنیا مجھے دیکھ کر بھانجی کیوں ہے؟“

”دنیا کو ابھی تھمادی قدر نہیں معلوم“ میں نے قہقہے دینے کے انداز میں کہا مگر حال تم مل چھوٹا نہ کہو۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا اس قدر ناشائسی پر بچھڑائے گی۔ تم یہ تباہ کن دن چڑھتے ہی میری طرف کیسے دوڑ پڑے؟“

”ہمارے بار دینے اور شہرے ادا کرنے آیا تھا سرا“ وہ نہایت مسرور لمبے میں ہوا ”آپ کے لئے مصلانی بھی لایا تھا“ اس نے ڈبا گاڑی میں ہی میرے کھنڈوں پر رکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے باز رکھا۔ جب ہی میں نے رکھا کہ وہ واقعی مصلانی کا ایک پڑا سا ڈبا تھا۔ اس پر گھٹ پینک کا مسخ رس بھی لپٹا ہوا تھا۔

”مصلانی..... اس بات کی مصلانی لائے ہو بھائی؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ میں ابھی تک گاڑی سے نہیں اترا تھا۔

”وہ..... چھوٹے پچا نکل ہو گئے تھے۔“

دوسری صبح میں دیر تک سو آ رہا اس لئے خوب دل چڑھے تیار ہو کر آؤں جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ میں اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک فوجیوں ایک گھوڑے کے بڑے کی باڑھ کی اوٹ سے نکل کر یہاں سامنے آ گیا جیسے کسی نے اس کی کمرہ لات رسید کر کے اسے میری گاڑی کے سامنے دھکیل دیا ہو۔ میں نے فوراً پرک لگائی۔ دھکیل گاڑی خفیہ سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ گاڑی کا بندر اس کے کھنڈوں کو تقریباً چھو رہا تھا۔ اس کے باندھ وہ اس طرح بات چیت رہا تھا جیسے ابھی میں کانی دور ہوں اور وہ سڑک کے پھول بچ کھڑے ہو کر مجھے رکے کا اشارہ کر رہا ہے۔ اس کا جوش و خروش دیکھ لیا تھا۔ پھر مجھے گلی کے کونے سے اس کی زندگی فوسکی بھی سمجھائی نظر آئی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا تھا۔ آج تو کسی کالی بی نے میرا راستہ بھی نہیں لگا تھا۔ اس کے باندھ نہ جانے کیوں گھر سے نکلے ہی یہ فوجیوں آکر لایا تھا۔

جی ہاں۔۔۔ وہ سو اچھا تھا! گلاس کے چہرے بٹنے مولے مولے ہر دوسروں والی اس کی میک پھل کر میں ہانک کی نوک پر آئی ہوئی تھی ”تیس چٹون سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ کوئی ڈبا سا اٹھائے ہوئے تھا۔

میں نے گاڑی ایک طرف دیوار کے ساتھ لگائی اور دوا نہ کھل کر گردن نکالے ہوئے کہا ”سوچا اگر تم نے گاڑی کے پیچھے آکر ہی مولے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کم از کم مجھے بتا دو تا ہوتا۔ میں تمہیں گاڑی کے پیچھے آنے کا صحیح طریقہ بتاؤں گا جس میں تکلیف کم ہوتی اور نتیجہ سو فیصد جیتی نکلا۔“

”سرا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں“ وہ قریب آتے ہوئے شریلے سے لمبے میں ہوا۔

”آپ کی وجہ سے تو مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ میں بھلا خود گلی کا کیسے سوچ سکتا ہوں۔“

”مگر نئی زندگی لی ہی گئی ہے تو اس پرانی زندگی کو کیوں ضائع کرنے پر تل گئے ہو۔ اسے بھی مشاہد کر دو کہ وہ بھی کام آجائے گی“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”مجھے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ تم خود گلی کرنا چاہتے ہو جس کے لئے تم نے کانی مصلیٰ کا ثبوت دیتے ہوئے میری گاڑی کا انتخاب کیا ہے کیوں کہ یہ تقریباً ٹرک جتنی بھاری ہے اس کے پیچھے آکر تھمادی جتنی ہڈیوں کے سلامت رہنے کے امکانات ذرا کم ہی ہوتے۔“

”سرا! میں کول۔۔۔ مجھے اسی طرح آپ کو راستے میں روکنا پڑا ہے۔ آپ کا اٹھان میرے اور آپ کے درمیان علاج کی دیوار بنا رہا ہے۔“ یہ کہہ ہی اس کی ٹوڈا گلو گیری ہو گئی۔ ”دفتر جانا ہوں تو آپ کے رہنمائی والے آگے نہیں جاسکتے۔“ گھر آتا ہوں تو آپ کے سیکرٹری گاڑی ڈیفو کیٹ سے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیتے بلکہ آپ کو میری آمد کی اطلاع بھی نہیں بھجواتے۔ منت

ہوئے کہا۔

”میں نے اس خوشی میں تم مٹائی بانٹ رہے ہو؟“ میں نے آپ

خاصی جہت سے پوچھا۔

”جیسے تو سمجھو۔ دنیا داری اور شرم کی شرم نہ ہو تو اس دنیا میں ان گنت لوگ ایسے ہیں جن کی سوت پر مٹائی پاشا پڑا اچھا کام محسوس ہو“ اس کے چہرے پر بدستور محافت پرستی رہی مگر بات وہ سہی کر گیا۔ پھر جلدی سے بولا ”لیکن ہر حال میں مٹائی اس لئے نہیں بانٹ رہا۔ آپ کو تو کچھ جانا چاہئے تھا۔ میں تو اس خوشی میں آپ کے لئے مٹائی لا رہا ہوں کہ میں چھوٹے بچے کے قتل کے الزام میں لوٹ ہونے سے بچ گیا ہوں۔ میں نے آپ کے مشورے کے مطابق کمانی گھڑ کر اباجی کو اور پولیس کو مٹائی۔ پولیس نے تو دیے ہی کچھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔“

”مبارک ہو“ میں نے کہا ”جس کے کمرے میں قتل ہوا ہو اور پولیس اس آدمی میں دلچسپی نہ لے وہ مبارک باد کا مستحق ہوتا ہے۔“

”خیر مبارک۔ خیر مبارک“ وہ ایک بار پھر تھوڑا سا شہرا کر بولا ”لیکن اصل مبارک باد کے مستحق تو آپ ہیں۔ اسی لئے میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے کی وجہ سے ہی میں اس بچہ سے بچا ہوں۔ اباجی کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ انہیں یقین آ گیا کہ چھوٹے بچے کا کھیل کر رہے تھے۔ اب تو ان کے سامان کی تلاشیاں لی جا رہی ہیں۔ ان کے کاغذات دیکھے جا رہے ہیں۔ اور ہر قدم پر نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ وہ تو کارخانے کو میرے اندازوں سے زیادہ چمکا رہے تھے۔ سبھی تو کارخانہ اتنا زیادہ مانع نہیں دے رہا تھا جتنا اسے اباجی کے اندازوں کے مطابق دینا چاہئے تھا۔“

”چلو۔ دیر سے ہی کسی لیکن ہر حال اباجی کی آنکھیں تو کھل گئیں۔“ میں نے کہا۔

”آنکھیں کیا کھلی ہیں بلکہ چہرہ طبع روشن ہو گئے ہیں“ خوشی کے بارے و حکم احمد کے قدرے ہلکے ہوئے گالوں پر سرخی آگئی تھی۔ ”میرے لئے تو کئی طرف سے خوشیوں کا سامان ہو گیا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اتنی بہت سی خوشیوں کو کس طرح سنبھالوں۔ اور پولیس نے میری کمانی پر یقین کر لیا کہ چھوٹے بچے کسی ناکہ کے انھوں قتل ہوئے ہیں اور انھوں نے جیتے اس میں لوٹ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور چھوٹے بچے کا کاغذ درمیان سے نکل گیا۔ جنہوں نے میری غمزدہ زندگی کو مزید غمزدہ بنا رکھا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ اباجی کی نظریں میری کچھ تھوڑی سی ہے۔ فی الحال تو ان کا دماغ کالی بدل گیا ہے۔ شاید انہیں احساس ہو گیا ہے کہ وہ سروں کے مقابلے میں ہر حال انسان کی اولاد پھر بھی اس کی زیادہ ہر روز ہوتی ہے۔ چاہے وہ کبھی ہو“ حق ہو“ کھنڈ ہو۔ جیسی بھی ہو۔ لیکن اولاد ہر حال اولاد ہوتی ہے۔“

”چلو۔ تمہاری پانچوں کچی میں ہو گئیں“ میں نے مسکراتے

”میری زندگی میں تو جیسے راتوں رات انقلاب چل رہا ہے۔ چہرہ صاحب!“ وہ فکرمگن میرے لیے میں بولا ”لیکن یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ آپ پارس ہیں سر! جسے بھی آپ چھو لیتے ہیں وہ سوتا ہوا جاتا ہے۔ جس دن سے میں آپ کی صورت دیکھ کر آپ کے پیچھے لگا رہا ہوں“ میری زندگی میں انقلابات ہی انقلابات آئے چلے جا رہے ہیں۔ میرے تو حالات ہی بدل گئے ہیں۔ آپ بہت کئی انسان ہیں سر! جو آپ کے ساتھ لگتا ہے اس کی بھی قسمت بدل جاتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس چھوڑوں۔ بلکہ چمکوں۔“

وہ چمک میرے چہرہ پر چمکے گا۔ میں نے جلدی سے پاؤں سیٹ کے نیچے کھسائے اور اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کمرے ہوئے کہا ”انسانوں کے ساتھ اتنی زیادہ محبت کا اظہار اچھا نہیں ہوتا۔ اچھے برے اتفاقات تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔“ ”یہ بات نہیں ہے سر! انسان کے حق میں بہت لوگ ایسے ثابت ہوتے ہیں اور بعض برے۔ کسی کا ساتھ میرا ہے تو کب تک کام سونے لگتے ہیں اور کوئی ساتھ لگتا ہے تو جیتے بھلے کام بھی اونگھ ہو جاتے ہیں۔ آپ کا ساتھ میرے لئے بہت مبارک ثابت ہوا ہے سر!“ اس کا بدوش عقیدت کم نہیں ہو رہا تھا۔ ”لیکن میں نے تو تمہارا کسی معاملے میں کبھی مصلحت میں ساتھ دیا ہی نہیں بھائی! میں نے تو بلی فون پر تمہیں صرف اتنی بتا دیا کہ اگر حادثاتی طور پر چھوٹے بچے تمہارے انھوں بارے میں ہیں تو تم اب اپنا بیان اس طرح دینا“ میں نے لامنت سے کہا ”اور اگر تم میں تھوڑی سی عقل ہوتی تو جو دیکھ میں نے کہا ہے“ بات خود بخود تمہارے ذہن میں بھی آ جاتی۔“

”میرے پاس عقل ہوتی تو پھر وہ ناشی کی بات کا تمہارا“ غصہ ہی سانس لے کر بولا۔ ”آپ نے فون پر جو کچھ کہا تھا“ میرے لئے بس وہی کافی تھا۔ اسی نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ یہ کچھ میں نہیں آتا“ کس طرح آپ کا شکر ادا کروں۔ سر! خوشی میں آپ کچھ غریب کی طرف سے تھوڑی سی مٹائی تو کمانی میں اس نے پکڑ لی ہے ڈاکہ کھلا اور میرے سامنے کر دیا۔

”جس بھائی! بہت شکریہ۔ میں مٹائی نہیں کھاتا“ میں فری سے ڈاکہ سامنے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس پر جانے کس کس ٹھونے کی مٹائی بھری رہی تھی۔ مٹائی کھا دینا ایک لمحے سے میں نے مٹائی دیکھ ہی نہیں تھی۔ ”سر! آپ تھوڑی سی کمانیں۔ ڈاکہ دیکھو کی فکر نہ کرو۔ آپ کون سا مٹا ہے کاٹنا کر ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ ایسے کسٹ کے مالک ہیں۔ آپ کو تھوڑی بہت مٹائی کھا لینے سے کیا چھوٹے گا“ اس نے اصرار کیا۔

”یہ بات نہیں ہے یار! میں کبھی ڈاکہ دیکھو کے پکا

آنکھیں ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گئیں۔ مجھے ایک بار پھر شب ہو کر ان آنکھوں کی گہرائیوں میں اتنی حالت میں تھی جتنی سلی طور پر نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ میری بات اس کے دل پر جا کر لگی تھی۔ جب کہ حساس بائیں ایسے احمقوں کی سمجھ میں نہیں آتیں جیسا وہ سمجھتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ گویا کسی خیال سے چڑھنے لگے۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا "آپ کا حکم سرتانکھوں پر۔ آپ فکری نہ کریں سر! میں ابھی بین مارکیٹ جا کر دکان کے سامنے کھڑا ہوا ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں سارا دن وہیں کھڑا رہوں گا اور جو بھی ایسا بچہ نظر آتا جو عطیاتی کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو گا میں اسے ایک ڈالے دوں گا۔ پیسوں کی آپ فکر نہ کریں سر! آج کل میرے مالی حالات بگڑ چکے ہیں چل رہے ہیں۔ آئندہ مزید ٹھیک ہونے کی امید ہے کیوں کہ ایک تو بائیں کا دوسرا ٹھیک ہوتا نظر آ رہا ہے۔ دوسرے اب چھوٹے چچا والی جگہ مجھے سی سنبھالنا ہوگی۔ میرا وعدہ اہمیت اور تحفظ۔ سب کچھ چھ جائے گا۔ اب تو فکری کوئی بات ہی نہیں۔"

"پتلا ٹھیک ہے۔ اب جاؤ۔۔۔۔۔ عیش کو۔۔۔۔۔ اور مجھے اجازت دو" میں نے گاڑی اشارت کرنے کے لئے ہاتھ پڑھائے ہوئے کہا۔

"یہ نہیں سر۔" وہ جلدی سے بولا "یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ نے جو کام بتایا ہے وہ تو میں کر ہی دوں گا۔ لیکن یہ کوئی کام تو نہ ہو اسرار!"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ سر۔۔۔۔۔ وہ نظریں جڑاتے ہوئے سر کھپا کر بولا۔ "مجھے کوئی ٹھیک ٹھاک حکم کا کام بتائیے کوئی مشکل حکم کا کام مجھے اپنی خدمت کا سونپ دیجئے۔ میں آپ کے لئے کوئی اہم کام انجام دیتا جا رہا ہوں جس پر آپ خوش ہو کر میری بیٹہ ٹھوکیں۔ مجھے شاباش دیں۔ میرے دل میں آپ کے لئے عقیدت کا سمندر تھا جس میں رہا ہے۔ محبت کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ میں آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آپ میری کچھ رہنمائی کر دیجئے نا۔"

"تم میرے لئے اہم کام انجام دو گے؟" میں نے اسے گھورا۔ "سر! آپ ابھی میرے ابا کی طرح یوں بے اعتباری سے میری طرف نہ دیکھیں۔ آپ تو انسانوں کو کھینچنے والے آدمی ہیں۔ میری شکل پر نہ جائیے سر! میری مدد میں جھانک کر دیکھئے۔ کسی نے آج تک میری صلاحیتوں کو سمجھا ہی نہیں۔ کسی نے آج تک مجھ سے کوئی صحیح کام لینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کم از کم آپ تو میرے ساتھ ایسا مت بیچئے مجھے اتنی حق سمجھ کر میری ہر بات مت ڈالئے۔ مجھے دیکھتے دیجئے" اس کی آواز فوراً ہی گھور گئی۔

یکدم اسے بہت سے الیہ دانیہ کر کے بڑھ چلا میرے ہوش

میں چلا۔ میں تو برا کڑا اہم بہتر معنی قسم کا انسان ہوں۔ بس دینے ہی اس وقت دل نہیں چاہ رہا۔ میں ابھی ابھی ٹکڑا ٹکڑا کر کے نکلا ہوں۔ میں نے عطیاتی سے جان چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔ ساتھ ہی محسوسات پر ایک عجیب سی لہر اتر کر گر گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے بچپن یاد آیا تھا۔ کتنا شوق ہو کر آقا جیسے عطیاتی۔ اور خصوصاً بنی کھائے گا۔ گاؤں میں چبے حلوائی کے چھوٹے اور گندے سے شیکس میں توڑی سی رنگ برنگی عطیاتی تھی رات ہی جی جو اصل طاقت اور زور سے زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ کتنا دل چاہتا تھا ساری عطیاتی بڑپ کر جائے کہ۔ اس وقت تو سستی بھی بہت تھی۔ مگر اس وقت سنے دواؤں خریدنے کے لئے بھی غیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے۔

کیا چیزیں بھی خوب صورت لگتی ہیں جب رسائی میں نہیں ہوتیں؟ اب ضرورت پڑنے پر شرمبھری دکانوں کی عطیاتی خرید کر بھی کسی قریب میں تلخے کے طور پر بھجوائی جا سکتی تھی۔ لیکن اب عطیاتی کھانے کو ایک برس سے دل نہیں چاہتا تھا۔ کبھی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ اب تو جیسی بھی شدت سے دل چاہتا تھا کہ کوئی چیز ایسی بھی ہو جسے دیکھ کر منہ میں پانی آئے اور اس کا حصول مشکل نظر آئے۔ کرب بار رسائی کی لذت سے بھی آگاہ رہنا چاہئے۔ اسے بھولنا نہیں چاہئے۔

"سر! آپ توڑی سی کھا لیں۔ مجھ غریب کا دل رہ جائے گا" دیکھ کر ایک بار پھر کھلبلیا "قسم سے۔۔۔۔۔ مجھے کوئی اتنے پیار محبت اور حقیقت سے زہر بھی کھلائے تو میں کھاؤں۔"

میں نے برنی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دھیرے دھیرے چبائے ہوئے اس میں بچپن کی قسم گنتہ دل میں تلاش کرنے لگا کہ وہ اس میں نہیں تھیں۔ دیکھ کے اس قدر مجبور کہنے پر میں نے اس کی فرمائش تو پوری کر دی تھی لیکن اب وہ ڈبا ہوا تھا پر کھائے اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا "اس کا کیا کھاں سر؟ یہ تو میں آپ کے لئے لایا تھا۔"

"قسم ایسا کدو سمجھا؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے دیکھے لمحے میں کہا "تھوڑی سی دھت کرنا۔ اسی دکان پر چلے جانا جہاں سے تم نے عطیاتی خریدی ہے۔ زرا درہ کے لئے وہاں کھڑے ہو جانا اور گزرتے ہوئے لوگوں کو ڈرا فور سے دیکھنا۔ ان میں جس میں کوئی نہ کوئی ایسا کم عمر لڑکا ضرور نظر آئے گا جو شیکسوں میں تھی ہوئی رنگا رنگ عطیاتیوں کو حسرت کی نظر سے دیکھتا ہو گا کڑے گا۔ اس کی نظروں کی باج ہی بتا رہی ہوگی کہ وہ کچھ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہ ڈبا میری بالائی طرف سے اسے دے رہا۔ بلکہ اگر تم وہاں زیادہ دیر کھڑے ہو سکو اور جس ایسے کتے ہی بیٹے اور بچیاں نظر آئیں ان سب کو میری طرف سے ایک ایک اتنا ہی بڑا ڈبا خرید کر دے دینا۔ تمہارے پاس اگر پیسے نہ ہوں تو مجھ سے لے جاؤ۔"

سوئے سوئے دھڑوں کے عقب میں اس کی گول گول سی

گو کہ جب سے بنی نے مجھے بتایا تھا کہ ریڈ ڈاٹ میں اسے فن کی کوئی خاص اہمیت معلوم نہیں ہوئی تھی جب سے میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ دینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ لیکن فی الحال کچھ دن کے لئے کچھ لوگوں کو اس کی تلاش میں لگائے رکھنے میں کئی حرج نہیں تھا۔ جو اس قسم کے معاملات میں تربیت یافتہ نہیں ذرا مشعل ہو جاتی۔ ذرا تربیت ہو جاتی۔ اور جو تربیت یافتہ تھے انہیں ذرا مشعل ہو جاتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے فن کی تصویر دیکھ کر وہ سمجھ گیا تو یہ بھی کچھ بالاس ملاحظہ آئے گا۔ اس کا جوش و خروش کچھ لمحہ بڑا اٹھ گیا۔ وہ ذرا نیچے نیچے سے لہجے میں بولا "یہ کون ہے سر؟ کیا بندہ فریو ہوتا ہے؟"

"بندہ تو یہ خود نظر آتا ہے برادر! یہ انسانوں کو بھاتا ہے" میں نے لمبی سانس لے کر کہا "تم بھی دیکھ سب لوگوں کی طرح اس کی شکل دیکھ کر دھوکا کھا گئے ہو۔ حالانکہ مجھے اس معاملے میں تم سے ذہانت کی توقع تھی۔ خود سمجھو کہ جب میں بذات خود یہ تصویر تمہارے حوالے کر رہا ہوں اور تمہیں اس شخص کی تلاش پر مامور کر رہا ہوں تو یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہوگا۔"

"ہاں... یہ بات تو ہے سر" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور اس کی گول گول سی آنکھوں میں غور و خیز ہی چمک اٹھی "آئی ایم سوری! ابھی چند لمبے لمبے آپ نے ہی مجھے زندگی کا اہم اصول بتایا ہے کہ محض شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔"

دینے کے لئے کافی تھی۔ میں نے جلدی سے شفتانہ لہجے میں کہا "نقصی اسحق ہرگز نہیں سمجھ رہا۔ اور دھوکے بھلا میں تمہیں دے رہا ہوں؟ میں تو کافی میں بیٹھا ہوں۔"

"میری مراد ہڈی دھکے دینے سے تھی سر!" وہ مدال نکال کر پر رکھتے ہوئے بگلی بگلی سی شل شل کے ساتھ بولا "دھکے بٹ باتوں سے ہی نہیں دیے جاتے سر! دھکے لٹھوں سے بھی پڑ جاتے ہیں۔ اور وہ باتوں کے دھکوں سے زیادہ دل شکن

میں ایک بار پھر ایک لمبے کے لئے خاموشی سے اس کی طرف تارہ گیا۔ آخر کا شہنشاہ نے مزید ملاحظہ سے کہا "تم لڑا کچھ رہے دیکھ! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ایک بہت با صلاحیت زان ہو۔ کوئی بھی کام کر سکتے ہو۔ لیکن اس وقت تمہیں بتانے کے لئے کوئی خاص کام میری سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ میرے پاس ہر طرح کے کام کرنے کے لئے بیگنوں آدمی ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا کام نہیں ہے جو التوا میں پڑا ہو۔ جیسے ہی مجھے تمہارے لائق کوئی کام نظر آیا" میں اب وہ اپنے کسی آدمی کے سپرد کرنے کے بجائے مارے ہی سپرد کر دیا۔

"سر! مجھے معلوم ہے آپ بڑے آدمی ہیں۔ بیگنوں افراد آپ کا حکم بھالنے کے لئے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ پھر بھی یہاں نہیں ہو سکتا کہ میرے لئے آپ کوئی ذمہ داری ہی تلاش نہ کر سکیں۔ سر! آپ ذرا چیک انداز میں مجھے رخا نے کی کوشش نہ کریں۔ خدا کے لئے کوئی خدمت میرے سپرد کر دیں تاکہ اسے انجام دے کر میرے دل کو کچھ سکون ملے۔"

"تم کسی قسم کا کام کرنا چاہتے ہو میرے لئے؟" آخر کار میں نے غصہ آکر پوچھا۔ وہ واقعی جان کو آجائے والی چیز تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر ڈر کے آثار تھے۔ مجھے اذیت کا وہ جیس سڑک پر کھڑے کھڑے بھول بھول کر کے مدد نہ شوق کر دے۔

وہ پرامید سا ہو کر بولا "سر! کوئی بھی ایسا کام جس میں ذرا مشکلات ہوں... مشقت ہو... خود زانو یا زانو ہو... کچھ مختصر آئے سرایہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو میں گزار رہا ہوں۔"

"کام میں خواہ جان کا ضیاع ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک ہو سر!" وہ بلا تامل بولا "آپ کے کام کے لئے جان بھی حاضر ہے۔ آپ حکم دے کر رہیں۔"

اس سے جان بچانے کی میرے ذہن میں اچانک ہی ایک تدبیر آئی تھی۔ میں نے اپنے ریلنگ کیس سے اسے فن کی ایک تصویر نکالی اور اس کی طرف پوچھا "یہ کون سا ہے؟" اس شخص کو شرمیں تلاش کرو اور زندگی یا ہم زندہ حالت میں میرے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرو۔"

الماس ایم اے کے ایمان افروز قلم سے

نور الدین زندگی

600 سے زائد صفحات

قیمت: 250/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

مجھے اس کو ذہن نشین کر لیتا چاہئے۔ خود مجھے ہی لے لیجئے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں شکل سے امتحان نظر آتا ہوں۔ شکل دیکھ کر ہی لوگ میرے بارے میں حتیٰ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ میں امتحان ہوں۔ میرے والدین تک کی رائے یہی رہی ہے۔ اسی لئے تو آج تک کسی نے بھی مجھے کوئی اہم کام میرے سپرد نہیں کیا۔

وہ کم از کم اس حد تک تو نسبت تھا کہ اسے اپنے بارے میں معلوم تھا۔ وہ شکل سے امتحان نظر آتا ہے۔ ورنہ آج تک تو میں نے کسی کو یہ اعتراف کرتے بھی نہیں سنا تھا، خواہ شکل پر محنت کے ڈوگرے برس رہے ہوں۔ اس اعتراف کے بعد تو وہ مجھے غصہ مند معلوم ہونے لگا تھا۔

”بے فکر رہو“ میں نے اس کا بازو تھپتھپایا ”میری تمہارے بارے میں یہ رائے ہرگز نہیں ہے کہ تم امتحان ہو۔ اسی لئے تو میں ایک اختیاتی اہم کام تمہارے سپرد کر رہا ہوں جس میں میرے تمام آدمی ایسی تک ناکام ہیں۔ بلکہ جچ پوجھو تو ایک طرح سے میں بھی ناکام ہو چکا ہوں۔ وہ ایک مرتبہ تو یہ چملا دا میری گرفت سے بھی نکل چکا ہے۔“

”آپ مطمئن رہیں سر! میں اس مردود کو لا کر آپ کے قدموں میں ڈالنے کے لئے جان بھی لڑاؤں گا“ وہ کسی حد تک قلمی انداز میں بولا۔

”اس حد تک جان لڑانے کی ضرورت نہیں کہ جان ہاتھ سے ہی چلی جائے“ میں نے جلدی سے کہا ”۳۱ پی جان بچاتے ہوئے اسے قابو میں کرنا ہے۔ اگر یہ ممکن نظر نہ آئے تو بے شک اس کام کو کسی بھی مرحلے پر بند کر دیتا۔ یہ اب اتنا بھی ضروری نہیں کہ اس کے لئے تم اپنی جان گنواؤ۔“ مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ میں تو اس امتحان سے جان چمڑانے اور اسے توڑنا بہت سبق سکھانے کی نیت سے یہ کام تیار تھا۔ لیکن میں وہ اپنی کسی محنت کی وجہ سے اسے نہ کے اچھوں نتائج ہی نہ ہو جائے۔ امتحان ہونا اب کوئی جرم بھی نہیں تھا کہ اس بے چارے کو اتنی بڑی سزا دے دی جاتی۔

”ٹھیک ہے سر“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر سیٹھ کرتے ہوئے بولا ”بس آپ سمجھ لیں کہ میں اس لئے سے ہی اپنے مشن پر ہوں۔“

”خدا حافظ“ میں نے جلدی سے کہا اور گاڑی آگے بڑھائی۔ مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی بھی آدمی تھا۔ یہ میں نے ایسا سلسلہ شروع کروا تھا کہ جو کوئی بھی مجھ سے کوئی ”اہم“ کام مانگتا تھا، میں اس کے ہاتھ میں اسے نہ کی تسویر تھا۔ ماریٹا طور پر ان مضطرب و بے چین نوجوانوں سے بچنا چمڑانے کا یہ ایسا طریقہ میرے ذہن میں آگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ ان دنوں ہم احمدیہ نوجوانوں کو تو شاید اسے نہ اپنے قریب پہنچنے بھی نہ دیتا۔ لیکن بر حال ان نوجوانوں کو دھندے لگانے رکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس کے بعد میرے تین دن خالص کامیابی مصروفیات میں گزرے۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ جذباتی ”کناؤں“ پر بھی سکوت چھایا رہا۔ کراچی سے راجستھان کا کوئی فون نہ آیا جس سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ ناراض تھی۔ میری بد قسمتی تھی کہ بارہا ارادہ کرنے کے باوجود میں اسے فون نہیں کیا تھا۔ اب میں نے محسوس کر لیا تھا کہ صرف فون کرنے سے بات بننے کی بھی نہیں۔ اب میرا خود جا کر اسے سناٹا ضروری ہو گیا تھا لیکن اپنا شیڈول دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس بد ذکر آدمی جا سکوں گا۔ ساتھ لے بھی فون نہیں کیا تھا۔ پہلے تو وہ فیسر سے باہر بھی شوٹنگ کے لئے جاتی تھی تو فون کر لیتی تھی۔ شاید اس کی انامی مجروح ہو گئی تھی۔ کوئی مناسب موقع دیکھ کر مجھے جا کر اس کی مجروح اتار بھی محبت کا مزہم رکھنا تھا۔ ظاہر خانم البتہ مست ملکہ عورت تھی۔ وہ ایک مرتبہ خود میرے گھر آئی تھی۔ اس کی طرف اگر میں کچھ دلوں میں زیادہ توجہ نہیں دے پا رہا تھا تو اس نے بکے بکے انداز میں تمویز امت شکوہ ضرور کیا تھا لیکن منہ پھلا کر نہیں کہتی تھی۔ اسے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بتایا تھا۔ اسے زندگی کے پتے دیا میں سے مرثوں کا جتنا حصہ لے جاتا تھا وہ اسی میں خوش رہتی تھی۔ دل کھول کر اسی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ اور جو ہاتھ نہیں آتا تھا اس کا ٹم نہیں کرتی تھی۔ اس جیسی بے فکر اور ہر حال میں خوش رہنے والی عورت میں میں نے کم ہی دیکھی تھی۔ لیکن پارٹنوں وغیرہ میں وہ کسی برفیسی طرح سنجیدہ، بلکہ کسی حد تک رنجیدہ سی عورت نظر آتی تھی۔ محفل میں اور غلط میں وہ بالکل دو مختلف عورتوں کی طرح تھی۔ اپنے کارخانوں میں وہ ایک سخت گیر اور خشک مزاج ملکہ اور اپنے شہریشہ کارخانہ رکھتی تھی۔

میرے جوں کا تواری مصروفیات میں گزرتے تھے، انہیں میں ”ہموار“ دن میں ہی شمار کرتا تھا۔ مگر کہ ان دنوں میں بھی سر کھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور قدم قدم پر ہی ایجنسیں بھی درپیش ہوتی تھیں۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو ہانکا پھانکا محسوس کرتا تھا۔ کامیابی مصروفیات اور ایجنسیں مجھے پریشان نہیں کرتی تھیں کیوں کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بنیادی اصول طے کر لیا تھا کہ مجھے دوپہر کا نا ضرور ہے لیکن دوپہر کے لئے اپنے آپ کو ہانکا نہیں کرتا ہے۔ پیسے پر جان نہیں دیتی ہے۔ اس لئے میں تمام تر مصروفیات اور ایجنسیں کے باوجود پرسکون رہتا تھا۔

لیکن زیادہ دن ”ہموار“ انداز میں گزرتا شاید میرے مقدر میں شین لکھا تھا۔ چوتھے دن میں غلطی سے رات کا کھانا کھانے کے اثر کان میں چلا گیا۔ اس رات تھائی میں اتنی سے ملاقات ہو جانے کے بعد میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ کم از کم اس وقت تک انٹرکان کا سفر نہیں کروں گا جب تک وہ وہاں عیم ہے اور اس کا ڈانس شو چل رہا ہے۔ میں اب اس سے قطعی لاف تفنن نظر آنے کا اثر دیتا جا رہا تھا۔ لیکن انٹرکان میں ایک عرصے سے آمدورفت چلی آ رہی تھی۔ کچھ

ادا کرتے ہیں لیکن ہر شخص اتفاقات کو اتفاقات میں سمجھتا۔ کوئی اسے اپنی کار کوئی سمجھتا ہے اور کوئی تندر کا کھلا۔
 کھانا کھانے کے دوران دھڑکنے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی خاموش رہا۔ کھانے کے بعد وہ ملے کر آیا بیٹھے اور میں ان کے آداب کے مطابق چیک کھا جاتا ہوں۔ چیک حسب معمول ایک نوڈل میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے چیک دیکھنے کے لئے نوڈل کھولا تو اس میں چیک کے ساتھ ایک چھوٹا سا لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر دیکھ کر طرف دیکھا مگر اس کا چھوٹا سا لفافہ ظاہر ہے وہ کیا چاہتا تھا کہ میں اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال نہ کروں۔ چیک اٹھا کر دیکھتے وقت نہایت محتاطی سے لفافہ میں نے اپنی جیب میں منتقل کر لیا اور دھڑکنے کے لئے نوڈل میں باج سو وہ چھپ رکھ دی جو اصل مل کی رقم سے زیادہ تھی۔ وہ ٹرے اٹھا کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔

وہ چھپتا کوئی اہم اور شاید خطرناک خط تھا۔ بھیجی دھڑکا ہے مجھ تک پہنچانے میں اتنی احتیاط برت رہا تھا۔ اسے غالباً اس سلسلے میں خاص ہدایات دی گئی تھیں۔ ورنہ دیکھ تو ہو مل میں اکثر نشست و برخاست رکھنے والوں کو کسی نہ کسی کا کوئی پیغام بوقت ضرورت پہنچانے ہی رہتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی اور اس میں اتنی رازداری کی ضرورت نہیں تھی جتنی میں نے دیکھا ہر شخص کی قیادت میں اندری اندر یہ سوال پوچھتے ہیں کہ جتنے کے بارے میں خط کس کا ہو سکتا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد میں رستوران سے اٹھ کر باہر آیا۔ پارکنگ لائن میں گھر کو ابھی دیرانی ہی تھی لیکن وہاں بھی میں نے لفافہ نکال کر نہیں دیکھا۔ میں سیدھا گھر گیا۔ بیٹہ دم میں پہنچ کر لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے اس لفافے کو چاک کیا۔ اس میں نہایت باریک کاتھ پر خود بخود ہی لکھائی میں خاصا طویل خط موجود تھا۔ اس قسم کی تحریر میں نے کالج کے زمانے میں انتخابات کے موقع پر ہوا ایک بلاغی قسم کے اراکوں کے پاس دیکھی تھی جو شکل مارنے کی فکر میں رہتے تھے۔ ان تحریروں کو "ہونی" "ہجرت" یا اس قسم کے دوسرے کئی نام دیے جاتے تھے۔ خط کے آغاز میں میرا نام کوئی القاب یا آخر میں خط لکھنے والے کا نام وغیرہ نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بیٹہ پریم دروازے پر آتا ہے۔

شروع کیا۔ جیسی جگہ میں تھیں اُن کا خط کہہ کر میں نے یہ خط مکمل کر لیا تو آخر تک پہنچا بھی نہیں گیا۔ کیوں کہ میرا نام سے وابستہ تمام سکرٹس کی کوٹیشن کرنا میرے حق میں بھی سخت خطرناک ہے اور تمنا ہے حق میں بھی۔ سہ ماہی میں بہت گھما پھرا کر کسی نہ کسی طرح یہ خط تم تک پہنچانے کی کوٹیشن کروں گا۔ کاش یہ بدلتی تم تک پہنچ جائے تاکہ جو خطا میں تھیں فراموش کر رہا ہوں اس سے تم بکھر اشتادہ کر سکو اور اپنے آپ کو ایک بہت بڑے نقصان سے

بابت ہی میں ممتی تھی۔ جب میں رستوران میں جا بیٹھا تب اچانک احساس ہوا کہ میں نے تو فی الحال اور کارڈ نہ کرنے کی نکتہ عملی اپنا لی ہوگی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ اٹھ کر مل میں چلا جاؤں پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے سوچا "تھوڑی بہت" "بڑی بہتری" کوئی حرج نہیں ہے۔ میرے یہاں نظر آنے سے اب مل کی تپ کوئی ایسا اثر بھی نہیں پڑ سکتا تھا کہ میری یا اس کی راتوں کی ہی حرام ہو جاتی۔ چنانچہ میں نے اطمینان سے انہیں پیلا کر نہوتے کھانے کا آغاز دیا۔

آؤر لیجے والا دھڑکنے پہنچا تھا اور اس سے پہلے عام طور پر ہمارا زمانہ مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا کرتا تھا لیکن آج تو اس نے اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے بھی نہیں نوازا۔ کچھ ایسی گھبراہٹ کی سے آؤر نوٹ کرنے لگا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کھانے کے میں مل ادا کے بغیر فرار ہو جاؤں گا۔

جب کہ آؤر نوٹ کرتے ہوئے وہ بڑھانے کے سے انداز میں ہلاہلا بہت اچھا ہوا آپ آج آگئے سہراؤر نہ اب رات کے چلے پھر مجھے آپ کی تلاش میں لگنا پڑتا۔ نہ جانے آپ سے بات ہوئی یا نہیں۔

میں نے چیک کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میری فکرت سیات بھی یکدم بیدار ہو گئی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اگر وہ رازدارانہ انداز میں کوئی بات کہہ رہا تھا تو میرا چوک کر اس کی طرف دیکھنا مناسب نہیں تھا۔ آؤر مختصری تھا۔ اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور مستردی سے واپس چلا گیا۔

میں بظاہر اسی طرح ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں بیٹھا رہا۔ پھر میں نے بے مقصد سے انداز میں سرسری نظر سے ہال کا جائزہ لیا۔ صرف چند بیویوں پر اکاؤنٹ لوگ موجود تھے اور ان میں سے کوئی بھی مشکوک معلوم نہیں ہوا تھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا اور کوئی بھی ریڈ واٹ کا توئی معلوم نہیں ہوا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ آؤر نوٹ کی طرف سے آنے والی موسیقی کی نہایت دھمکی آواز بتا رہی تھی کہ ابھی ڈانس شروع ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ریڈ واٹ کے کمال نے یہ یا سٹمر کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص ہو جس میں ہو گا تو وہ اس وقت آؤر نوٹ میں ہی ہو گا۔

سہ ماہی اعتبار بہتر تھی۔ دیکھ کھانے کر آیا تو اس کی دیو داس جیسی سنجیدگی پر رقرار تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج اس کا ہونے والا ہوا کیوں تھا؟ وہ اپنی نظر آنے کی پوری پوری کوٹیشن کیوں کر رہا تھا؟ اس نے خاص طور سے میرے آج آنے کو اچھا کیوں قرار دیا تھا؟ میں تو آج محض اتفاقی تھا۔ سہ ماہی یہ تم مجھے بار بار تجربہ ہو چکا تھا کہ اتفاقات میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتے تھے۔ شاید ہر شخص کی زندگی میں ہی اتفاقات اہم کردار

تفتیش بہت اونچے پائے پر ہوگی اور ایسے حالات بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ جس میں تفتیش میں سمجھ لیا جائے اور یہ بات تمہارے سارے ہی کا دیاری معاملات کے لئے چاہ کر ثابت ہوگی۔

وزیر خارجہ کو قتل کرانے کا دوسرا بڑا مقصد ایک خاص ملک سے ہمارے تعلقات خراب کرنا ہے اور اس سے بھی بڑا مقصد انہیں اس مشن پر جانے سے روکا ہے جس کے لئے وہ مشرق وسطیٰ جا رہے ہیں۔ میں وقت پر اس مشن کا منتظر ہوں جو جلد ہی اس اثرات مرتب کرے گا۔ عالمی سطح پر کئی بڑی تبدیلیاں اور مسائل رونما ہوں گے۔ اگر تم اخبارات ذرا توجہ سے پڑھتے ہو تو ہمیں کچھ اندازہ ہوگا اور جہاں تک مجھے اندازہ ہو چکا ہے اس کے مطابق میں بھی اس خط میں آگے چل کر اپنا خیال ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اسے تم محض اشارہ ہی سمجھنا۔ اصل میں کیا کچھ ہو گا یہ میں بھی صحیح طور پر نہیں جان سکا۔ میرا سیاسی علم بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

جس اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وزیر خارجہ کے قتل کی سازش کون لوگ کر رہے ہیں۔ مجھے ریڈ واٹ کا ہاتھ نام لینے کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی محض وضاحت کے لئے لکھ رہا ہوں۔ لیکن ان کے علاوہ اس میں ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی "کو آئز نیوز انٹرنیشنل" کا نام بھی ملے گا ہے۔ یہ کمپنی بھی اس سازش میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ان دو فریقوں کا آپس میں کیا تعلق ہے "اس کا بھی مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ ریڈ واٹ کے کسی معاملے میں "کو آئز نیوز انٹرنیشنل" کا نام میں نے بھی پہلی بار سنا ہے۔ لیکن خبر... میں کیا اور میری حیثیت ہی کیا۔ مجھے تو ریڈ واٹ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ اتفاق شاید تمہاری ہی خوش قسمتی کا مہر ہونے والا ہے کہ میں نے ٹرانسپیر پر یہ اہم گفتگو کافی حد تک سن لی اور یہ ایک ایسی زبان میں تھی جسے تم نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کو بظاہر بہت آسان تھی۔

میں یہ نہیں جان سکا کہ وزیر خارجہ صاحب کو قتل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ وہ کوئی ایسا دوائی طریقہ نہیں ہوگا جس کے لئے سیکرٹری والے پہلے ہی سے تیار ہوتے ہیں یا تمام خلائی تدابیر اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔

خط میں اس سے آگے بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ جن جوں میں پڑھا گیا میرے لوگوں کی حوا رہت کچھ کم سی ہوتی تھی۔ خط ختم کرنے تک میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ ورنہ تک میری نظریں ان باریک باریک لفظوں میں ہی الجھی رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اپنے اعصاب کی تمام تر مضبوطی کے باوجود جلدی الجھل پریشان سا ہو گیا تھا۔

بنیادی طور پر تو میں وہی ایک دہائی اور سپر حاسنا سا آدمی

بنانے کی کوئی تدبیر کر سکا۔ یہ خط لکھنے کا مقصد ہمیں ایک سازش سے خبردار کرنا ہے جسے عمل طور پر تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا ہوں لیکن جتنا کچھ مجھے معلوم ہو سکا ہے وہ میں جس میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مزید معلومات کے "سازش کی لڑیاں جو زنا اور اپنا بھائی کرنا تمہارا کام ہے۔

ایک بہت مختصر سا ٹرانسپیر جو ایک لاکھ کی شکل میں خود میری تمام بات چیت کیس شکر کرنے کے لئے ہر وقت میرے جسم کے ساتھ رہتا ہے اس پر اتفاقاً میں نے شاید فریکوئنسی کی کسی گڑبگڑ وجہ سے دو افراد کے درمیان بہت اہم گفتگو سن لی ہے۔ کراچی میں تمہارے قریبی اشارہ ہو کر میں انھیں جولا کی کی شب کو وزیر خارجہ حفیظ احمد صاحب کے اعزاز میں ایک بہت بڑی ذرا پارٹی کی بلنگ ہوئی ہے۔ ہمارے مالی پتہ ملکوں کے سفارت کاروں کی طرف سے یہ ذرا دیا جا رہا ہے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ وزیر خارجہ سترہ جولا کی کو اسلام آباد سے لاہور آئیں گے۔ یہاں بھی ان کی کچھ مصروفیات ہیں۔ انھیں جولا کی کی صبح وہ کراچی پہنچیں گے۔ کچھ سوانح کے پیش نظر وہ ڈر سے پتہ چھٹے ملک کی اسٹیٹ گیٹ آؤس سے تمہارے ہو کر داخل ہوں گے اور پتہ چھٹے وہیں قیام کریں گے۔ وہیں سے رات کو وہ ڈیوٹکٹ ہال میں ڈر میں شرکت کریں گے۔ ان کا پروگرام سفارت کاروں کی درخواست پر انہیں کی تجاویز کے مطابق رکھا گیا ہے۔ انہیں جولا کی کی صبح وزیر خارجہ مشرق وسطیٰ کے چار ملکوں کے دورے پر کراچی سے ہی روانہ ہو جائیں گے۔ ان کا یہ دورہ ایک خاص مشن کے سلسلے میں ہے۔

ان معاملات سے تو خیر تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو عالمی سیاست کی باتیں ہیں لیکن اس حد تک تمہارا بہر حال تعلق ہے کہ تمہارے ہو کر میں میں اس تقریب کے دوران حفیظ صاحب کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ ایک بہت بڑا سازش ہے۔ اس سے بیک وقت کئی مقاصد حاصل ہوں گے۔ ایک تو جس کا دیاری طور پر بہت بڑا کام چلایا مقصود ہے۔ تمہارا ہو کر مل گیا ہے۔ پہلی بار اسے ایک بہت بڑے اور اہم ڈیپلومک ڈر کی بلنگ لی ہے اور اسی کا انجام اتنا خراب ہو جائے گا۔

تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کسی ملک کے وزیر خارجہ کا قتل کوئی معمولی سا واقعہ نہیں ہوتا۔ تمہارا ہو کر اس سرکاری طور پر تو بیک لٹ ہو ہی جائے گا لیکن ساتھ ہی اسے اتنی منفی شہرت ملے گی کہ دیگر ممتاز لوگ بھی یہاں ملتی تقریبات کے لئے تو کیا دیکھتے بھی نشست و برخاست کے لئے دوسرا کام کرنے سے گریز کریں گے۔ شاید اس منفی شہرت کو ہوا دینے کے انتظامات بھی کئے جائیں گے۔ ہو کر کے الگ یا انتخاب کا تو ظاہر ہے اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہوگا لیکن ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہو کر کی شہرت کو زیادہ سے زیادہ دھندلہ کرنے کے لئے شاید کچھ لوگوں کو درجن میں بھی دی جائیں گی۔ صرف یہی نہیں "چوں کہ ایسے معاملے کی تحذیبات اور

طاقتیں کو ناکام نہ پہنچا جاتی یہ بہت بڑک معاملات تھے۔
مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ کوئی طاقت میرے ملک کے وزیر
خارجہ کو قتل کرانے میں کامیاب ہو جاتی۔ میری ان سے کوئی
شناسائی نہیں تھی، مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ اور اس سے کوئی
فرض بھی نہیں تھی کہ ان کے سیاسی نظریات کیا تھے مجھے تو بس یہ
معلوم تھا کہ وہ ہمارے ملک کے وزیر خارجہ تھے۔
ہمارا ملک خواہ چھوٹا تھا، ترقی پذیر تھا لیکن مجھے یہ سہنا بھی
اچھا معلوم نہیں ہوا تھا کہ کوئی بھی بڑی بڑی طاقتیں ہمارے اہم
لوگوں کو خلیج کے مہلوں کی طرح استعمال کریں۔ کہ جب تم چاہا
ہو اسے ہٹا دو۔ میں ان معاملات میں اپنے آپ کو ایک معمولی
اور بے وقعت آدمی سمجھتا تھا لیکن جب اس قسم کا کوئی سوال پیدا
ہوا تھا تو اپنے اندر انا اور خودداری کا ایک طوفان اُٹھ اُٹھ اُٹھ
ہوا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ایسی کسی بھی کوشش کا منہ توڑ جواب دیا
جائے۔

ماضی میں مجھ سے صرف اس حد تک نا اہلیاں ضرور سرزد
ہوئی تھیں کہ میرے پاس مد پے پیسے کی تہ کے ذرائع کچھ درست
نہیں رہے تھے لیکن وہ بات اب پرانی ہو چکی تھی۔ ایک مرتبے
سے میں ان ذرائع کو ترک کر چکا تھا اور اس سے کہیں زیادہ دولت
میرے پاس درست اور جائز ذرائع سے آئی تھی اور آئے ہی چلی
جاری تھی۔ تب سے ہی میں اپنی کچھ بوجھ کے مطابق اپنی اس دور
کی حرکتوں کا کٹاوتہ بھی ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنے آپ
کو ایک معزز، معقول، متوازن اور محب وطن شہری کے سانچے میں

دقت کے سوا کے ساتھ ساتھ انا مروج مل گیا تھا، یہ اور
ان کی شان تھی کہ کس طرح سب کچھ ہو گیا تھا، یہ میری خود بھی
کہیں نہیں آتا تھا۔ اب مجھے دھانکا کہنے کا کچھ لیتہ تو چاہی تھا
انچھ ملوں میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے عالمی سیاست کا بھی کچھ پتا
ہم سے معاملات کی شد بد تھی لیکن اس خوش قسمتی میں بھی
نہیں ہوا تھا کہ میں کوئی بد ریا اور سیاست بین گیا تھا۔
میں اپنی زندگی کو حتی الامکان سیدھی سادی ہی رکھنا چاہتا
اور اختارات و فیوض میں سب کچھ چھٹا تھا۔ غیر ملکی رسائل اور
اخبارات بھی دیکھتا تھا۔ وہاں کے حالات سے بھی آگاہ رہنے کی
کوشش کرتا تھا لیکن میرا مقصد زیادہ تر گامداری ہوتا تھا۔ پتا
کہ میں کی ہوتا تھا کہ کہیں کوئی سوداگر کے پیسے تو نہیں جاں
کھیں سے مال منگوا کر لائیں مال بیچ کر دیکھتے ڈوب تو
کھینچا جائے۔ میں الا قومی سیاست تو کیا، کبھی ملکی سیاست میں بھی
اثر نہ تھا۔ ان وزارتوں تک اثر نہ تھا کہ ان کی معاملے میں ملوث ہونے
میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

لیکن کبھی کبھی حالات انسان کو کسی معاملے میں بالکل اسی
طرح کی طرح دھکیل دیتے ہیں جو کسی ڈوبے ہوئے شخص کو بچانے
لے سمندر میں کود رہا تھا۔ وہ اس شخص کو بچاؤ کا تھا لیکن یہ
شے بغیر نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے دھکا کھانے لگا تھا؟ مجھے بھی کچھ
دیہ ہاتھ اس معاملے میں دھکا دے رہے تھے جس کا میں اپنے
پاکوئل نہیں سمجھتا تھا۔

میں اس معاملے سے لائق ہو کر اسے نظرائے اذ کرنے بھی
نہیں جیت سکتا تھا کیوں کہ میرا ہوئی میرے خوب صورت بڑا بول
ان سے ایک تھا۔ وہ میرے لئے ایک خوب صورت پھول وار
کے کی طرح تھا جسے میں نے بڑی محنت سے سچا تھا۔ ابھی تو اس
پھول آئے شہر ہی ہوئے تھے۔ ابھی سے میں اسے بد نہیں
کر رہا تھا۔ ایک بڑی کی دھوپ میں مر جاتے نہیں دیکھا سکتا تھا۔
ان کے ساتھ ساتھ اگر میری ذات بھی کسی ایسے معاملے میں
لٹ ہو سکتی تھی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا تو یہ اور
نا ادا ہونا تھا بلکہ بد اشت بات تھی۔ جب میرا کوئی تصور ہی نہیں
اتھیں اس قسم کی سزا نہیں بد اشت کرنے کے لئے بھی بتا نہیں
خواہ سازش کرنے والوں کو اپنی طاقت پر کتنا ہی گھمنہ تھا۔

دو چربے دھیرے میری دھوپ میں بھیل جانے والی تھی
کوئی چلی گئی اور اس کی جگہ مجھے کی پیش نے لے لی جو اندری
درختہ و فشب کا پھل ہوا آتش فشاں بھی بن سکتی تھی میکین
لاز میں اپنے دماغ کو غلط اسی رنگے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس
را غلط سے انداز میں نہایت سناکی کے ساتھ مجھے گھیرنے کی
ش کی جاری تھی، میں بھی اسی طرح غلطے دماغ کے ساتھ
سازش سے شستا زیادہ بہتر تھا۔ جوش اور جذباتیت میں شاید
کوئی ایسی حرکت کر جاتا جو روڈاٹ یا اس کے پس پشت کار فرما

ناز کفیل گیلانی کا نیا رومانی، معاشرتی، سماجی

ناول

تین پیا سے درشن کے

قیمت = /150

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

ڈھالنے کے لئے بھی کوشش تھا۔ اور اگر اسے کوئی خود پرستی نہ سمجھتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ میں ایسے بے شمار لوگوں سے بہتر تھا جو سیاست، سماجی، بہبود یا زندگی کے ایسے دوسرے کئی محاذوں پر سانجے کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے تھے۔ معاشرے میں جن کا بڑا مقام تھا لیکن جن کے اصل چہروں سے صرف گنتی کے چند لوگ ہی واقف ہوتے تھے۔

میرے خیالات اور احداث پر ہلکے رہتے تھے اور خط میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ خط پہلے نے لکھا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر مرد کا سینہ استعمال کیا تھا تاکہ اگر تمام تر احتیاطوں کے باوجود خط غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے تو کم از کم فوری طور پر اس پر شبہ نہ جاسکے۔ یہ خط لکھ کر اس نے بلاشبہ حق دوستی ادا کر دیا تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ افغانہ جولائی کی شب کراچی میں میرے ہوٹل میں اس سازش کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ جب کہ اس وقت سولہ جولائی کی شب بھی تقریباً گزر چکی تھی۔ بہت دیر پہلے رات کے بارہ بج چکے تھے یعنی تقریباً سترہ جولائی کی صبح آجکی بھی اور میں ابھی لاہوری میں بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی منشی سوجن کو قافہ میں کہنے کی کوشش کی۔ مجھے اس خط کی مدت میں کوئی شب نہیں تھا۔ پھر بھی منظم انداز میں کچھ کہنے کے لئے سب سے پہلے تو ہرات کی تصدیق ضروری تھی اور جو کام پہلے کرنا ضروری تھا اس کی طرف پہلے ہی توجہ دی جانی چاہئے تھی۔ ابھی میں اس خط کو منسلک نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے اسے ساکڑ نیل کی دروازہ میں رکھ کر منتقل کروا اور فون پر اپنے کراچی کے یہود چیف شفیع شاہ کا نمبر ڈال کر لیا۔

تیسری گھنٹی پر اور دیر پور اٹھایا گیا۔ شفیع شاہ کی آواز پر مجھل تھی۔ میں نے ملافت سے کہا "معاف کرنا شفیع۔۔۔ تمہیں سوتے سے جگایا۔"

وہ میری آواز سننے ہی بولا "سر! ایسی باتیں کہنے کے شرمندہ نہ کیا کریں۔ آپ کی آواز سن کر تو ہم بہتر رہی اٹھ بیٹھیں گے۔ ویسے میں اس وقت سو نہیں رہا تھا۔ باہر سے ابھی ابھی آیا ہوں۔ کپڑے بدل رہا تھا" اس کی آواز سے پوچھ لیا کہ "ابھی بن غائب ہو چکا تھا۔"

"کیا میٹھی ہو رہی تھی؟" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"آج کل تو سب میٹھیل ہوئے ہوئے ہیں سر! میں ہوئی ہوئی میں گئے ہوئے ہیں" اس کے لیے میں لکھنئی لکھی "میں نے اس کے لئے کئی اہم کنٹریکٹ حاصل کئے ہیں۔ آپ سنیں گے تو جیتنا خوش ہوں گے سر! بہت۔۔۔ کم ریسے میں ہمارا انوکھی ریسٹ سب سے زیادہ ہے۔ ابھی سے یہ عالم ہے کہ کسی کسی دن تو ہمارے ہاں ایک سنگل بیڈ روم بھی نکالی نہیں ہوئے۔ ہمیں اسٹاف بھی بہت اچھا ملا ہے سر! اب لوگ بہت محنت کر رہے ہیں" شفیع شاہ میں نے بھی ایک بڑی ڈبلی تھی۔ کبھی صرف اکیلا کسی کام کا کرینے۔ لینے کی

کوشش نہیں کرتا تھا۔ دوسرے لوگوں کی محنت کا بھی شہود کر کر رہا تھا۔

"کیا ہمارے ہاں افغانہ جولائی کو قاتل منشی کے اعزاز میں ازرب تو قتل کے لئے جگہ ہوئی ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا جس میں اس نے جواب دیا "ابھی اصل بات کر کے اسے چوٹا نہیں چاہتا تھا۔"

"ہاں سر! وہ ضرور لہجے میں بولا "آپ کو معلوم ہی ہے کہ کچھ گریمر اس قسم کی تمام تقریبات وغیرہ اسلام آباد میں ہی ہوتی ہیں۔ منشی اور میں کے سب لوگ اور تمام ڈپلو میٹس وغیرہ وہیں ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ منشی صاحب کی مصروفیات کا ٹیڈل بک لے کر ایسا کیا کہ انہیں کراچی سے ملل ایسٹ روانہ ہونے سے ذرا پہلے ہی انہیں اس دنز کارپورگم روگنا بڑا۔ بہتر سنارت کار بھی اسلام آباد سے لے کر ہی یہاں آئیں گے۔ انہی کی خواہش تھی کہ پروگرام ہو کہ میں رکنا ہے۔ انہیں جاتے تاکہ انہیں لاہجگ اور یوڈنگ میں آسانی ہو۔ اور جہاں گے۔ کراچی میں اونچے لوگوں کی کوئی تقریب ہو تو میں گرنے کی بات اب کو آتی ہے تو اب ہمارے ہی ہوٹل کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ خانہ انہوں نے تھوڑی سی دلچسپی ظاہر کی۔ اپنی کام ہمارے پر سوال پوچھا اور دلدادہ راہدہ لے آگے بڑھ کر لیا۔ وہ اچھا اور لیڈنگ لڑکا ہے۔ سر! افغانہ میں شفیع شاہ ضرور لہجے میں سب کچھ بتاتے جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تو ہی تھا کہ جس اعزاز کے بارے میں وہ اتنا خوش ہے اس نے مجھے مکمل خفیہ فکر مند کر دیا ہے۔ وہ دو ذریعہ خارجہ اور دوسرے محلوں کے اتنے اہم ذرائع سنارت کا دلوں کے "اپنے ہوٹل میں اجتماع کو ایک بہت خوش آئند ایک واقعہ سمجھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ اعزاز کس ہمارے ہے۔ وقت ہی نہ بڑھتا ہے۔"

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ کو کسی نے اس دن کے بارے میں بتایا تھا یا آپ نے اخباروں میں پڑھا ہے؟" میں نے جواب دیا "میں نے تو اس کے بارے میں کسی نے بتایا ہے اور نہ ہی میں اس کا ذکر میاں کے اخباروں میں بھیجی ہے" میں نے جواب دیا۔

"میں تو بھیجی ہے سر! بلکہ بعض اہم ذرائع اخباروں نے تو اس کے بارے میں ہوٹل کا نام بھی دیا ہے۔ ذرے کے موقع پر بھی پورا پورا ذکر موجود ہو گا۔ لیکن وہی کو رنگ بھی ہوگی۔ ذرے سے پہلے بہت اہم قسم کا انہوں نے تقریریں ہوں گی نا" اس لئے اسے بہت اہمیت دی جا رہی ہے۔ پھر "آپ جیتے اسے اپنا اصل سوال یاد آ رہا اور وہ چرکتے ہوئے بولا "میں سنا تھا کہ آپ کو نہ تو کسی نے بتایا اور نہ ہی ابھی یہ خبر ہاں کے اخبارات میں نکلی۔ جیسا۔۔۔ تو ہر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے الحال اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مکمل فیصلہ "آپ تو ہر ذرے سے بتاؤ ہمارے سیکرٹری کے انتخابات کیسے ہیں؟" میں نے کہا کہ اپنے بھی سیکرٹری کے انتخابات تھے۔ یہ بات ابھی ایک الگ شعبہ تھا۔ ہمہ دوس تو ہی اس میں ملازم تھے لیکن لاہور میں ہے ایک۔ "آپ کو ہمارے کے سیکرٹری کے انتخابات تو پہلے سے میرے موٹے معاملات کے لئے ہی ہوتے ہیں۔"

طرف سے بالکل مطمئن اور بے فکر دیکھا جانتا ہوں سر! آپ پر لاہور میں ہی کام کا جتنا بوجھ ہے وہی کافی ہے۔ یہاں کے معاملات میں تو میں آپ کی بہت سی غامض سوچ پر رہنمائی دیتے رہا کریں وہی بہت ہے۔ اگر یہاں کے مسائل میں بھی آپ کو سرکھپانا پڑا تو پھر ہم جیسے آپ کے جاں نثاروں کی زندگی کا کیا ناکامہ؟

میں جو کچھ جان چکا تھا وہ چون کہ ابھی اس سے آگاہ نہیں تھا اس لئے اس معاملے کو رو نہیں میں لے رہا تھا۔ میرا مقصد فی الحال صرف یہی تھا کہ قہر کا ہر دور گرام واقعی طے تھا۔ اس کے علاوہ صورت میں اسے صرف قہر داما ہو شمار کرنا چاہتا تھا وہ میں نے کر دیا تھا۔ اب مجھے اپنی کی طرف سے سوسل ہونے والے خط کے حذر بات کے بارے میں بالکل ہی شبہ نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اگلا قدم اٹھانا تھا۔ شفیق شاہ کو قہر حافظہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ رات کو اس وقت قارئین سفر صاحب کو اپر وچ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟

میں نے ذہن پر بہت زور دیا کہ میرے ہائے والوں میں کون ایسا آدمی ہو سکتا ہے جس کا سفر صاحب سے کوئی تعلق واسطہ نکل سکتا ہو۔ اور تعلق واسطہ بھی ایسا۔ کہ جس کی وجہ سے سفر صاحب لاہور آتے ہی فوری طور پر مجھے ملاقات کا وقت دے دیں۔ انہیں اس سازش سے بخوار کہنے کے لئے اور کوئی غیر مددائی قسم کی حکمت عملی طے کرنے کے لئے میرا ذاتی طور پر ان سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔ اس کے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ جس سازش کا مجھے ایشادہ ملا تھا اسے کسی غیر مددائی حکمت عملی کے ذریعے ہی ناکام بنایا جاسکتا تھا جس کی سازشیں کو بالکل موقع نہ ہو۔ ورنہ اہم شخصیات کی حفاظت کے دوائی انتظامات تو سودوری ہوتے ہیں۔ قارئین سفر کا تعلق چونکہ بین الاقوامی معاملات سے ہوتا تھا اس لئے ان کے حفاظتی انتظامات غیر معمولی ہوتے تھے لیکن بہر حال وہ سب بھی مددائی ہی ہوتے تھے جن کا سازشوں کو بھی ابھی طرح علم تھا۔ اگر سفر صاحب کو قتل کرنے کے لئے کوئی دوائی طریقہ استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی تب تو ان انتظامات کے ذریعے اسے ناکام بنایا جاسکتا تھا۔ مثلاً مسافروں میں سے کوئی دشمن کا آواز کار ہو گیا کوئی شخص کسی بیروپ میں قریب ہی گھس گھس گھس کا مایاب ہو جاتا اور غریبا ہسپتال وغیرہ سے سفر صاحب پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا تب تو سیکورٹی والے عہدگی سے اس سے نمٹ سکتے تھے اور شاید اس کوشش کو ناکام بھی بنا سکتے تھے۔ لیکن خط میں مجھے بخوار کیا گیا تھا کہ ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔

کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ طریقہ کیا ہو گا۔ بات چوں کہ بہت مجسم تھی اور بے پناہ سوچ بچار اور ایشادہ کا قہر خاکی تھی اس لئے میں سیکورٹی والوں پر زیادہ مجبور مانا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگ عموماً کبیر کے قہر ہوتے ہیں۔

انتظامات ٹھیک ہی ہیں سر! ذہنی رات میں ہوئی ہیں میں غامض شکوں پر اپنے چار چھ خاص آدمی بھی لگا دوں گا۔ لیکن قریب تو ہم اپنے طور پر محض احتیاط کریں گے۔ سفر صاحب! میں اور دوسرے ذیلہ پیش کی تو اپنی سرکاری سیکورٹی ہوگی۔ تاکہ قہر سے ایسا الگ انتظامات ہوں گے۔ ہمارے اپنے آدمی بھی ساتھ کریں گے۔ جہاں قہر ہوں گے ان کی اجازت سے ہوں گے اور میں اپنے تمام انتظامات ان کی روایت کے مطابق کرنے کے لئے اس سلسلے میں ایشادہ تاریکی کی سرکاری سیکورٹی کے لئے ہر ان تمام شکوں اور راستوں وغیرہ کا تفصیلی معائنہ کریں گے۔ جہاں جہاں قریب کے دوران معزز مسافروں کی آمد و رفت ہے۔ مسافروں کی آمد سے ایک گھنٹہ پہلے سیکورٹی چیف خود آکر کرکے انتظامات دیکھیں گے اور سرکاری طور پر ہانڈل کاپیرنس ہوں گے۔ اس کے بعد وہ واپس ایشیٹ گیٹ ہاؤس جاکر سفر صاحب کو لے آئیں گے۔ سیکورٹی چیف صاحب کا نام انکرام پیک ہے۔ وہ خاص طور پر قارئین سفر صاحب کے ساتھ ہی آتے ہیں۔ باہر سے لاہور والوں پر بھی وہی ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں آتے ہیں۔ میری خود ان سے فون پر کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے۔ وہ طوطی قوی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بدستور بڑے مسرور انداز میں مکالمات کرتے جاتے جاتے ہیں۔ میں ہنکارا بھر کر دیا گیا۔ میں نے تمام انہیں ذہن نشین کیے جا رہا تھا۔

آپ ایک لمحے کے توقف کے بعد شفیق شاہ بولا "آپ نے رات کو کتنے وقت فون کیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں ضرور کوئی تشویش ہے اسلئے کیا ہے؟"

ذہن وہ ہوئی کے سلسلے میں اتنے دوش و خروش سے کام کر رہا تھا میں ابھی کچھ بتا کر اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی کادش و خروش حشر ہو گیا۔ میں نے سرسری سے لیے میں کہا کہ۔ ایسی کوئی خاص تشویش نہیں ہے۔ بس ذرا ہو شمار رہنا۔ تو کئی قہر بات بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ ہمارا ہوئی نیا نہیں اور ہمیں معلوم ہے اگرچہ اپنی اور لاہور میں ہمارے بہت سے کام ہوں گے ساتھ ساتھ قہر ذمے بہت خواہی سودوری ہیں۔

پھر "آپ فکر نہ کریں سر! شفیق شاہ بغیر کسی تشویش کے بولا "ہم سارا اللہ اس ذمے داری سے۔ بلکہ اس سے بھی بڑی ذمے داری سے بلا رکاوٹ سمجھتے رہیں گے۔ کراچی کے جتنے بھی عہدے ہیں ان کے بارے میں میں نے آپ کو پہلے بھی کوئی مکالمہ نہیں ہونے دی۔ انشاء اللہ آئندہ بھی نہیں ہونے والی

آپ اس کا ترجمہ چین ہے "میں نے تو میں سب کچھ تم پر چھوڑ کر لاہور بیٹھا ہوا ہوں۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

بہر حال۔۔۔ اب آپ نے ایشادہ دے رہا ہے تو میں اس کی غامض طور پر ہو شمار رہوں گا۔ لیکن میں تب کو اس

چند لمبے سوچنے کے بعد مجھے ملحق ذہن صاحب کا خیال آیا۔ وہ ان دنوں چھبڑ تک کمرس کے صدر تھے اور بڑی جان بچان والے توی تھے۔ وہ ان سے بھی جان بچان رکھتے تھے جن سے انہیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی آئندہ بھی کوئی کام پڑے گا اسکان نظر نہ تھا۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ملحق ذہن صاحب رت بجے کہنے والے توی تھے۔ رات کے ایک دو بجے تک تو پیسے ہی ان کی کوئی نہ کوئی مصروفیت چلتی رہتی تھی۔ اس کے بعد وہ خواب آور گولیاں کھاتے تھے اور بستر ان کے "گولیاں بھی، کبھی اثر دکھاتی ہیں تو وہ چار گئے سو لیتا ہوں ورنہ اپنا گزارا تو زیادہ تر تینے کے بغیر ہی چل رہا ہے۔ تم دیکھ لیتا۔ میرے جسم کی بظاہر ابھی خاصی نظر آئے والی یہ مارت کسی روز اچانک ہی دھڑام سے زمین پر ہو جائے گی۔ تم سے باتیں کرتے کرتے تمہارا یہ خادم کسی روز نہیں بچ جائے گا۔"

اس پر میں نے ان سے افسار برداری کرنے کے بجائے کہا تھا "آمین! اللہ ایسی آسمان موت سب کو نصیب کرے۔"

ملحق صاحب خفا نہیں ہوئے تھے۔ سر جھکاتے ہوئے بولے "یار چرچہ در! تم برہات میں کوئی اتنا ہی تکتہ نکال لیتے ہو۔"

"ملحق صاحب! اتنا نہیں یہ تو سب سے سیدھا تکتہ ہے۔ مثبت پہلو تلاش کرنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ کوئی ضروری ہے کہ کوئی میڈن یا بروس مسٹر ایذا یاں رگڑ رگڑ کر ہو بیڑوں کی کڑکڑ سن کر مرے؟"

یہ گفتگو زیادہ کرتے ہوئے میں نے ان کا نمبر ڈائل کیا۔ انہیں رات کے اس پہر فون کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ان کے ملازم نے پہلے یہ حقیقت کی کہ صاحب نے ابھی سلیپنگ پلازہ میں کھائیں؟ جب یہ تصدیق ہو گئی کہ ابھی ان کے بیڈ روم سے سلیپنگ پلازہ کھانے کی خبر نہیں ہوئی ہے تو نوکر نے فون بیڈ روم میں ملاوا۔

ملحق صاحب چھوٹے ہی بولے "یار چرچہ در! تمہاری عمر یہی ہے۔ میں ابھی تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں کل ہی جاپان سے واپس آیا ہوں۔ میں تو کچھ کرئیر ان وہ گیا کہ جاپان جیسے ملک میں سوتی ساریوں کی زبردست مارکیٹ اچانک ہی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمیں تو ایک سپورٹ پروڈکشن ہو جو دواؤں تک نے نہیں بتایا۔۔۔ خیر۔۔۔ ان بے چاروں کو تو خود بھی معلوم نہیں ہو گا۔ اور ادھر اغراض و احراز۔"

"ملحق صاحب! میں نے ان کی بات کانٹے ہوئے کہا "خدا کے لئے۔۔۔ کم از کم بیڈ روم میں پہنچ کر کواڈر کوبھل جایا کریں۔ اگر کواڈر کا ہی ہے تو سوتی ساریوں کے بجائے ساری دالیوں کو یاد کیا کریں۔ بلکہ آپ جیسے شادی شدہ انسان کا اخلاق فریضہ تو یہ ہے کہ بیڈ روم میں پہنچنے کے بعد بیوی کے علاوہ کسی اور موضوع پر نہ سوچے۔"

"یار درم! تو کہہ بھر کر لے" اب تو یہ موضوع بھی دوم بیڈ روم میں چلا گیا ہے۔ دو سال سے الگ بیڈ روم میں سو رہا ہے۔ اس لئے اب تو اس موضوع پر بھی سوچنے کی ضرورت پڑ رہی۔ پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ محضدی سانس بھر کر بولے "وہ تو بار صاف کہہ چکی ہے کہ اگر خاندان کی عزت و ناموس اور بچوں کی شرم نہ ہوئی تو کم از کم کچھ سال پہلے مجھ سے ملحق۔ بچکی ہوئی۔ ابھی مجھ سے ناراض ہیں۔ بیٹا اسکا میں جا کر بیٹا ہے۔ واپس آئے کام نہیں لیتا۔ بیٹی سولگر لینڈ میں پڑھ رہی مگر مجھے نہیں معلوم کیا پڑھ رہی ہے۔ چینیوں میں بھی کمر آئی۔"

"تو پھر آپ کس کے لئے اتنا کما رہے ہیں؟" میں نے پوچھا "معلوم نہیں" وہ ساگی سے بولے۔ مگر وہ اتنے سال نہیں تھے۔ زیادہ ساہہ ہوتے تو شاید اتنے بڑے سیٹھ نہ ہو۔ ایک لمبے کے وقفے سے بولے "تمہاری تو ابھی شادی بھی ہوئی۔ تم کس کے لئے اتنا کما رہے ہو؟"

"معلوم نہیں" میں نے بھی انہی کی سی ساگی سے جواب دیا "شاید اپنے لئے۔ لیکن کم از کم اتنا تو ہے کہ کچھ سونے کے سلیپنگ پلازہ میں کھائی جائیں۔"

"میری عمر کو پتہ کون ہے تو کھانے لگو گے۔ تمہاری عمر میں ابھی نہیں کھانا خوار خودوار! ان کا کمال ہی تھا کہ بھی مجھے بھائی بنا لیتے تھے، کبھی بر خودوار اور کبھی بزرگوار کے مرتبے کا زکر دیتے تھے۔ میں اصل موضوع کی طرف آنے کی سوجنا تھا کہ انہوں نے خودی میری مشکل حل کر دی۔ بڑے ششقا: میں بولے "تو پیسے رات کے تقریباً دو بجے تم نے میرے اذ منانات کر کے کے لئے تو فون نہیں کیا ہو گا؟ یہ وقت تو چاہا ہے۔ لیکن تم سے مجھے یہ امید نہیں ہے۔"

"ملحق صاحب! میری یہ کمال کمال۔ وہ۔۔۔ اصل ٹر جھوٹا مسئلہ آن پڑا تھا۔ میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں گے لئے چلے دالیں میں کوئی ایسا توی ہے جو سچا دزمہ صاحب سے میری ملاقات کا انتظام کرانے؟"

"وزیر خارجہ صاحب سے؟" وہ تعجب سے بولے "سپر اڈو کہ تمہارے کا دوبار پر کوئی اعتراض ہو گیا ہے جو وزیر خارجہ صاحب سے سفارش کرانا چاہتے ہو؟" "کسی بھی قسم کی سفارش و فیحو کا سلسلہ نہیں ہے۔" ان کے استہزائیہ لہجے کے جواب میں سنجیدگی سے کہا "پرائیویٹ ہی بات ہے۔"

"ویسے تو خیر سفارش بھی غاسا پرائیویٹ معاملہ ہوگا۔ تمہارا سالہ کیا اس سے بھی زیادہ پرائیویٹ ہے؟ کسی شہزادی و فیحو پر تو عاشق نہیں ہو گئے؟" پھر وہ جواب کا اٹا بنیو لے "ویسے تو خیر انسان جس عورت پر عاشق ہو جائے تو"

تجارت تک نہیں بلکہ ہر زمانے ' ہر حکومت میں ہر جگہ کے وزیروں تک رہتی تھی۔ انسان نے بتایا کہ کام تو کوئی مشکل نہیں تھا لیکن اس کے لئے ہر حال وقت درکار تھا۔ انہیں قانون شہر کا شیڈول معلوم کرنا پڑے گا پھر اس میں صحافت دیکھ کر کہیں مجھے فٹ کرنا پڑے گا۔ اس مسئلے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان سے میری ملاقات کب ممکن ہو سکے گی۔ ایسی غیر یقینی کاوش کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اس ذریعے پر بھی انحصار نہیں کیا۔

نئی فون بند کر کے ایک بار پھر نیم دراز ہو کر سوئے گا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنی کمائی لے کر سرکاری حکام کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس طرح میں لمبے پکڑوں میں پھنس جاتا۔ جس کام میں مشغول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ تجربہ بھی تھا اور کچھ میزائل بھی کتا تھا کہ ایسے بڑا کم اور پیچیدہ مسائل کو ہماری سرکاری مشینری مزید الجھا تو کتنی تھی مزید خراب بھی کر سکتی تھی لیکن ان کا کوئی حل نہیں نکال سکتی تھی۔ کیوں کہ مشینری بہ ذات خود ان مسائل سے بھی زیادہ الجھی ہوئی تھی۔

پھر مجھے ستارہ کا خیال آیا۔ قلمی ستاروں اور خصوصاً خاتون قلمی ستاروں کے شناساؤں کے حلقے میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا اگر ستارہ ذہن پر زور دے تو شاید اس کے جانے والوں میں کوئی ایسی شخصیت نکل آئے جو شہر صاحب سے میری نجی ملاقات کا ذریعہ بن سکے۔

ایک مرتبہ پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے مجھے کچھ شرم سی بھی آئی اور میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "واہ میاں افضل چودھری! اشرک بڑے معزز آدمی بہت بڑی کاغذ باری شخصیت اگر آپ آف سپر کے مالک بہت بڑا حلقہ احباب رکھتے والے اور اپنے تئیں بڑے بچے خان بچے پھرتے ہو لیکن عالم یہ ہے کہ اگر ہنگامی طور پر ایک مرکزی وزیر سے..... اسی کی بھلائی کی خاطر ملاقات کی ضرورت آئے پڑے تو اس کے لئے ویسے تلاش کرتے پھرتے ہو۔ خواتین دوستوں تک کو ذمت دہنے کی سوچتے ہو۔ کیا فائدہ شہر صاحب اس شان و شوکت کا؟"

لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اتنا تو قلمی ہونے کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی وقت اور حالات انسان کو کسی بھی ایسی عجیب و غریب الجھن میں ڈال سکتے ہیں جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوا۔ اور ایسے موقع پر کوئی ایسا انسان اس کے کام آسکتا ہے جس کے بارے میں کبھی اس نے سوچا بھی نہیں ہوا۔

میں ستارہ کو فون کرنے جا رہا تھا کہ اس سے پہلے مجھے طاہرہ خانم کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا اب خواتین دوستوں سے مدد کرنے کی نوبت آئی گئی ہے تو پہلے طاہرہ خانم کو بھی پوچھ لیا جائے وہ بھی خاص بلاترہا کہ ہماری عورت معلوم ہوئی تھی۔ کچھ کہا نہیں

شہزادی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی میں نے سوچا پوچھ لوں تو بہتر ہے۔

"طارق صاحب! زندگی میں پہلی بار آپ سے کام پڑا ہے۔ پورے زندگی میں پہلی بار میں ذرا زیادہ پیچیدہ ہوا ہوں تو آپ مذاق کرنے لگے ہیں۔ خدا کے لئے ذرا مزیدگی سے میری بات کا جواب دیجئے۔ میں نے درخواست کی۔

"یار! بڑی سارا دن دفتر میں مدنی صورت بنائے بیٹھا رہتا ہو مگر آتا ہو تو گھر کی دیوار میں بھی اس سے سیدھے مذاقات نہ کرتی ہوں! ایسے آدمی کو کم از کم رات کے دو بجے تو قہوراً بہت مذاق کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ خصوصاً جب کہ تمہارا سوال اتنا مزید ہے۔" طارق صاحب کے لیے میں ہر حال ملاکی جمیدگی تھی۔

"دنیا کا دستور یہی ہے طارق صاحب! میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کوئی سخت مشکل میں ہوتا ہے لیکن دنیا کو اس کا مسئلہ پورا مزید نظر آتا ہے۔ دنیا اس پر ہنستی ہے۔ میرا خیال ہے آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اچھا... خدا حافظ۔"

"فہم۔۔۔ فہم۔۔۔ ابھی فون بند مت کرنا" وہ جلدی سے بولے "آخر تمہاری بات کا جواب دینا بھی تو میرا اخلاق فرض ہے۔ کتنے ہیں انسان گڑبڑ دے کر بھی بات تو کہے۔ میں تمہیں گڑبڑ نہیں دے سکتا لیکن تمہارا کام تو نہیں کر سکتا لیکن گڑبڑ بھی بات ضرور کر رہا ہوں یعنی نہایت ناجزی! افسار۔۔۔ اور محاسن سے تمہیں بتا رہا ہوں کہ ایسا کوئی آدمی میرا اتنا اچھا واقف نہیں ہے جو اسے ہنگامی انداز میں قانون شہر صاحب سے شہرادی بینک اریج کرانے کے البتہ اگر منفعہ و تجارت کے شہر صاحب سے ملتا ہے تو بتاؤ۔ ان سے اپنی سلام دعا اچھی ہے۔ ان سے ملاقات چند گھنٹے کے فوس پر ہو سکتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اپنے متعلقہ وزیر تو وہی ہیں۔ قانون شہر صاحب سے ہمیں کیا لینا ہے۔"

"ایک تو ہم کاغذ باری لوگوں کی یہ بڑی مصیبت ہے کہ صرف انہی سے سلام دعا رکھتے ہیں جن سے کوئی مطلب ہو آجے نہیں لے سنا۔ یہاں تک کہ میں کہتا ہوں "وزیر منفعہ و تجارت سے ملاقات کرنا ہوتی تو کسی نہ کسی حوالے سے تھوڑی بہت سلام دعا تو آپ کے اہل خدام کی بھی نکل ہی آتی۔ آپ کو تکلیف دینے کا مقصد یہی تھا کہ معاملہ ذرا غیر متعلقہ سے شہر صاحب کا آن پڑا ہے۔ خیر..... ضرورت چاہتا ہوں کہ آپ کا اور اپنا وقت ضائع نہ کیا۔"

وہ دھیرے سے کہنے لگا "اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے ہیں" نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ وقت کی نامزدیت کی پروا کئے بغیر میں نے لڑکی مزید دو چار بڑی بڑی کاغذ باری شخصیتوں کو فون کیے اور اپنی درخواست دہرائی۔ سب ہی نے معذرت کی۔ البتہ سب ہی میری ملاقات وزیر منفعہ و تجارت سے کرانے پر تھے۔

میں نے دو چار ایسے دولت مندوں کو بھی فون کیے جو سیاست میں بھی منہ مارنے لگے۔ ان کی شناسائی صرف وزیر منفعہ و

شرف آدمی کے گھر جانے کا وقت نہیں ہے۔

"نہیں۔ میں کم از کم صبح کا اجالا نمودار ہونے کا انتظار کروں گا" میں نے اسے تسلی دی "اب میں تھمارا کسی شکر یہ تو ادا کروں گا نہیں۔ شکر یہ ادا کرنے کے لئے مجھے تھمارے گھر بھی آنا پڑے گا۔"

"یقیناً۔ تھمارے وہی شکر یہ کی تو ہے۔" ت بھی نہیں ہے۔ ویسے بالکل داؤ ہے۔ اس وقت میں نے نہ جواب کرنے کے بعد اب تم خود کیا کرو گے؟"

"میں دو تین گھنٹے نیند لے لوں گا" میں نے اطمینان سے جواب دیا "خیر خان سے ملاقات کے لئے جاتے وقت میرا وہی ذرا تازہ ہو تو رہا ہے۔"

"بڑے ہی کیسے اور خود غرض انسان ہو تم" وہ معنوی نگلی سے بولی۔

"تغریب کا شکر یہ" میں نے کہا "اور شب بخیر۔۔۔ بلکہ اب تو شب بھی ہے چاری تقریباً گزری چکی ہے۔ اس لئے مجھے خیر۔"

سلسلہ منقطع کر کے میں اپنے آپ کو قدرے مطمئن محسوس کرتے ہوئے کوٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ طاہرہ خانم سے شامانی میرے لئے قائمہ مندی ثابت ہوئی تھی۔ وہ عورت جیسی بھی تھی مگر اندر سے ابھی تھی۔ کم از کم کہی تو تھی۔

○●○

علی الصباح اٹھ کر میں نے خیر خان کے گھر فون کیا۔ کسی عورت نے رسپونڈ کیا اور بتایا کہ خان صاحب نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس نے میرا نمبر لے لیا کہ چند منٹ بعد خاں صاحب خود مجھے فون کر لیں گے۔ خیر خان نماز پڑھ رہا تھا۔ میں نے سوچا تو ہی ٹھیک سی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مکمل کربات کر لینے میں شاید کچھ حرج نہ ہو۔ چند منٹ بعد اس کا فون آ گیا۔ میں نے اپنا رخارف کرایا تو وہ غائبانہ طور پر مجھ سے واقف ہی نکل آیا۔ وہ جس کہنی کی ایک بڑا بڑا کا جزل بیئر تھا "اس سے ہماری کسی کہنی کا کچھ لین دین تھا۔ میں نے طاہرہ خانم کا حوالہ دیا تو وہ بولا "اب اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں چودری صاحب! بہر حال میرے بارے میں اگر اس نے آپ کو بتایا ہے تو پھر آپ مجھے اپنا برا خاوم سمجھیں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے مزاج میں اتنا انکسار تھا کہ فوراً بولا "یہ تو میرے لئے اعزاز ہو گا چودری صاحب! میں ابھی حاضر ہوا ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس مجھے بتائیں۔"

"نہیں۔ میں خود ہی آ رہا ہوں" میں نے کہا۔ مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا کہ اس کے انکسار سے فائدہ اٹھاؤں۔ کام اس سے مجھے تھا۔ بہترین تھا کہ میں اس کے گھر چلا جاتا۔ اس نے بت کیا کہ مجھے اس کے "غریب خانے" پر آنے کی دعوت کی کیا ضرورت

شاید امور خارجہ کی وزارت میں انڈر سیکریٹری تھے۔ مجھے کچھ صحیح طرح معلوم نہیں۔ بہر حال اس زمانے میں کچھ لوگ ان کے قبضے میں موجود ایک ٹاکس حاصل کرنے کے لئے انہیں اغوا کرنا چاہتے تھے لیکن خفیہ صاحب میں وقت پر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ان کا لٹکا معلوم کرنے کے لئے ان لوگوں نے خیر خان کو بلا دیا۔۔۔ میرا مطلب ہے خیر خان کو اغوا کر لیا تھا۔ اس پر بہت تشدد کیا تھا۔ جس میں اس کا ایک ہاتھ بھی ضائع ہو گیا تھا لیکن اس نے خفیہ صاحب کا پتا نہیں بتایا تھا۔ تب سے آج تک خفیہ صاحب اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اس کی کوئی بات نہیں مانگتے۔

"پلو۔۔۔ شکر ہے" ہمارے کسی مشنر میں اتنی وضع داری تو ہے "میں نے کہا "تو اب یہ خیر خان کیا کرتا ہے؟ کہاں پایا جاتا ہے؟"

"سیکرٹری کے کام کے تو وہ مکمل نہیں رہا تھا۔ بلکہ دایاں ہاتھ آدمی کلائی تک ضائع ہو جانے کی وجہ سے اس کے لئے ہر کام ہی دشوار ہو گیا تھا۔ لیکن خفیہ صاحب نے ہی بہر حال اسے حکومت سے کافی رقم بھی دلوائی تھی اور بعد میں کسی پرائیویٹ کمپنی کے آفس میں جنرل بیئر بھی رکھ دیا۔ اگر کچھ اسی قسم کی باتیں تھیں۔ مجھے کچھ زیادہ صحیح طرح سمجھت یاد نہیں۔ بہر حال۔۔۔ تم لوگ تو خود ہی پوچھ لیا۔ اب اس کے حالات خاصے بہتر ہیں۔ وہ سن آباد میں ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتا ہے۔ میں ابھی اس کا ایڈریس تلاش کر کے قبضہ دیتی ہوں۔ میں نے سنا ہے خفیہ صاحب وزیر خارجہ بننے کے بعد بھی خیر خان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ جس وقت چاہے انہیں فون کر سکتا ہے۔ خفیہ صاحب اس کی کوئی بات نہیں مانگتے۔ اور وہ میری کوئی بات نہیں مانگتا۔ تم میرے حوالے سے جا کر اس سے مل لو۔ میں اسے فون بھی کروں گی۔ اچھا" شریف آدمی ہے۔ اس کی قسمت ابھی تھی جو مجھ جیسی عورت کے لئے نہیں پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مشنر صاحب سے تھمارے کسی بھی وقت کی ملاقات طے کرادے گا۔"

"ہیں۔ پھر مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" میں نے سکون کی سانس لے کر کہا "اتنی سی تو بات تھی۔ مجھے ایسے ہی کسی آدمی کی تلاش تھی۔"

"دیکھا۔۔۔ کس طرح جنگی بجائے میں تھمارا مسئلہ حل کروا؟ مجھ جیسا کچھ سکے بھی کبھی کبھی کام آتا ہے۔ مجھے زندگی کے راستے پر بے پروائی سے کہیں اور حوا دھرنہ پیریک دینا۔"

"ہرگز نہیں۔ میں تو قبضہ طوائفی اشنی سمجھ کر سب سے اوپر والی جیب میں سنبھال کر رکھوں گا" میں نے محبت سے کہا "تم ذرا خیر خان کا ایڈریس اور فون نمبر دینو مجھے بتاؤ۔"

اس نے کچھ دیر مجھے ہولٹہ کرایا اور نہ جانے کہاں سے وہ ایڈریس وغیرہ تلاش کر کے مجھے لکھانے کے بعد بولی "میں اسی وقت اس کے گھر نہ چل دیتا۔ میری بات اور ہے۔ لیکن یہ کسی

کے قہے سنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن آپ نہ جانے کیوں پہلی ہی ملاقات میں کچھ اپنے اپنے سے لگ رہے ہیں اس لئے تیار ہوں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد میرا وہ سری شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیوں کہ بچے تقریباً جوان ہی ہو چکے تھے۔ خاص طور پر عمر میں اپنے سے اتنی چھوٹی لڑکی سے شادی کرنے کا تصور میرے لئے کچھ ایسا خوش کن نہیں تھا لیکن یہ ذرا ٹھیکہ کا امرا تھا۔ اس نے صرف مجھے ہی نہیں اپنے والدین کو بھی مجبور کر دیا۔

”پھر تو آپ کی تشریف تھی جس کوئی شک نہیں“ اب میں نے ذرا دلچسپی محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ہنسا سا بھی ہوا کہ کہیں وہ جاننا نہ دے کہ تو میں گریہ کرتا تھا؟

وہ اپنے ہاتھوں سے میرے لئے ایک پلیٹ سے ٹینک سے نمی صاف کرنے ہوئے بولا ”ہم کسی حد تک قلمی سے حالات تھے جن میں ٹھیکہ سے بیوی شادی ہوئی۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ میں تو ایک صبح ٹیکسی میں سڑک چورنگی سے گزر رہا تھا کہ صدمہ سینا کے قریب مجھے ایک عجیب سا ناظر تھا۔ کالج کے پرنسپال میں ایک نمائندہ خوب صورت لڑکی، جو جن ڈنکرے قسم کے ٹنڈے اٹھا کر ایک جیب میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کہنے میں جتنی نرم و نازک تھی اتنی ہی تھوڑی سی شدت سے مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کا پرنسپال بیٹ چکا تھا، کتا ہیں بس اسٹاپ کے سامنے بکھر چکی تھیں۔ بس اسٹاپ پر چند دوسری لڑکیاں بھی تھیں جو کسی ہوئی ہریوں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی تھیں۔ کوئی ان بد معاشوں کو روکنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا کیوں کہ ان میں سے دو کے پاس راکٹیں تھیں۔ ٹرنک چلا جا رہا تھا۔ لوگ نظر بجا کر گزرے پلے مارے تھے۔ پولیس تو وہاں موجود نہیں تھی۔ میں خود پولیس میں نوکری کر چکا ہوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات پولیس موقع پر پہنچ سکے کی اہل ہونے کے باوجود نہیں پہنچتی۔ مامولت کے بعد ہی پہنچتی ہے۔ بہر حال کچھ دور ایک ٹرنک کا ٹینیل موجود تھا۔ وہ بھی بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا حالانکہ وہ ٹرنک کا آدھی ہی سہا لیکن اس کے سیم پر قانون کی دہائی ہوئی تو موجود تھی۔“

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے متاثرانہ سے انداز میں گہری سانس لی۔ میں نہایت اشناک سے اس شخص کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ سلسلہ کلام دوڑنے ہوئے بولا ”مجھے اپنی آنکھوں پر تھپڑ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ لاہور جیسے شہر کی ایک بھری پڑی سڑک پر ہو رہا ہے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کے لئے کہا تو بولا ”چھوڑ دینا“ آپ کیوں پکڑ میں پڑے ہیں۔ کیا پتا لڑکی کا کچھ سے کوئی پکڑ ہو“ میں عام طور پر رشیدہ فیسے کے عالم میں بھی گاڑ نہیں دیتا لیکن اس بار میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو گالی دی۔ وہ مجھے ختم چمچ فٹ کا ڈوان تھا۔ میری مدد کرنے کے بجائے مجھے مٹوا دے رہا تھا۔ اور چاندی صاحب! میں اس وقت بھی اسی طرح خدا تھا۔“

یہ میں جہاں حکم کھوں وہ حاضر ہو جائے گا لیکن میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی۔

میں جب اس کا ہڈیوں میں تلاش کرتا ہوا سمن تیار کی ایک گلی میں اس کی چھوٹی سی گھنٹی تک پہنچا تو وہ گھٹ گھٹے باہری سرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ ایک قد آور اور سرخ و سپید آدمی تھا۔ آرمے سے زیادہ بال سفید تھے۔ پچاس پچپن کے بیٹے میں تھا۔ معمولی سی سفید شلوار ٹیڈ میں وہ ایک عام سیدھا سادا دوکان دار صاحب سا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے جوتے پر طمانیت کی چمک تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو زندگی سے زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں دن بدن گنتی جا رہی ہے۔ اسے دیکھ کر کسی کو گالیاں تک نہیں گزر سکتا تھا کہ ملک کے دزیر خارجہ سے اس کی ایسی قریبی شناسائی ہوگی کہ وہ اس کی کوئی بات نہ لے نہیں ہوں گے۔ اس کا ایک ہاتھ یقیناً معنوی تھا۔ اس پر دستانہ چڑھا رہا تھا۔

میں گاڑی سے اترتا تو اس نے ”السلام علیکم“ اور ”جی آریاں“ فرماتے ہوئے بہت گرم جوش سے میرا استقبال کیا۔ جو انکسار میں نے فون پر اس کے لیے میں محسوس کیا تھا وہ اس کے دیکھتے میں بھی موجود تھا۔ وہ مجھے سیدھا ڈرائنگ روم سے ملنے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں گھریلو لباس میں ایک نہایت خوب صورت لڑکی ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لئے برتن کھڑی تھی۔ ایک نوکر اس کی مدد کر رہا تھا۔

پہلی نظر میں تو اس لڑکی پر غیر ملکی ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ اس کے بال شمرے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ رنگت سفید فاموں کی طرح سرخ و سپید تھی۔ لگتا تھا جیسے کے لئے کوئی خصوصی اجازت ہو رہا تھا۔ ذریعہ خان سے ملے یہ ایک عمارت میں ناٹا اس کے ساتھ کھول کا کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی اس لڑکی نے مجھے سلام کیا۔ اس کی عمر نہیں کے قریب ہوئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں مل گئی۔ لڑکی کی گھریلو ہی صورت ہی معلوم ہوئی تھی۔ سلام کرتے ہی وہ دوپٹا سر ٹھیک کرتے ہوئے فوراً کچن میں چلی گئی۔

اس کی عدم موجودگی میں ذریعہ خان اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا ”یہ ٹھیکہ تھی۔ عام طور پر لوگ اسے میری بیٹی سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ اس نے میں پہلے ہی وضاحت کر دی تو بہتر ہو گا کہ یہ میری بیوی ہے۔“

اجماعتی ہوا اس نے وضاحت کر دی۔ غلامی مجھے بھی ہونے لگی تھی۔ بہر حال یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ بندے پر تھوڑی سی خوش حالی آجائے اور وہ جتنی میں بھی رہے تو بڑی عمر میں بھی دوسری شادی کے لئے کم مراد حسین لڑکیاں میرا آجاتی ہیں۔ ذریعہ خان کو میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ ہم بیٹھ چکے تو بولا ”پہلی ہی ملاقات پر اس قسم کی وضاحتیں کرنا اور اپنے نجی معاملات

نذیر خان ہوں "میں نے لھنڈی سانس لے کر کہا۔

نذیر خان سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "ٹکلیہ کے ذہن پر اس واقعے کا عجیب سی اثر ہوا۔ اس نے گھروالوں سے دو ٹوک کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گی تو صرف بچہ سے۔ وہ چڑھی نکھی اور سوچنے والی لڑکی تھی۔ اس نے عجیب سی فلسفہ اپنایا۔ کہنے لگی کہ وہ اس سوسائٹی میں کسی سے شادی کر کے کیا کرے گی جو اس کی عزت لئے دیکھ کر اس کی بددعا کے لئے نہیں اٹھ سکتا۔"

"لیکن آپ بھی تو اسی سوسائٹی کے فرد تھے" میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ مجھے اس گم گشتہ تہذیب کی بھی کبھی نشانوں میں سے ایک قرار دیتی تھی جو اب نہ جانے دنیا کے کس گوشے میں منہ چھپائے پڑی ہے۔ وہی تہذیب جس کی روایتوں میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کہ کسی پر ظلم ہوتے دیکھ کر خاموش نہ رہا جائے۔"

ٹکلیہ اگر کالج کے زمانے میں اتنا سوچ سکتی تھی اور اتنی زبردست قوت فیصلہ رکھتی تھی تو وہ بلاشبہ ایک ذہین اور منفرد لڑکی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے نذیر خان بولا "ٹکلیہ کو ایک مضبوط مرد کا سارا میسر آیا تو وہ ایسی شیرینی بنی کہ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہر امت میں بیانات دیے۔ پریس کاغذ میں کہیں۔ ہر جگہ فلم ٹھوک کر کھڑی ہوئی۔ ادھر اسی جگہ کچھ نام کے آدمیوں سے شہسائی تھی۔ اللہ کا بڑا کریم ہے کہ سرکاری جٹوں میں بھی دو چار آدمی آپ کے اس خادم کی عزت کرتے ہیں۔ ہم حقیر فقیر لوگ تھے۔ لیکن سوبائی وزیر صاحب کو ہم نے اچھا رکھا لگا دیا۔ انہیں ہم جیل تو نہ بھجوا سکے لیکن وزارت سے ہر حال انہیں اسٹیشن دنا پڑا۔ ان کے وہ خاص بد معاش البتہ آج تک جیل میں مزے ہیں جنہوں نے ٹکلیہ کو اغوا کر ان کی خدمت میں پیش کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔"

"بڑی خوشی ہو رہی ہے مجھے یہ سن کر" میں نے کہا۔

"بہر حال اس وقت مجھے ان لوگوں سے بچنا لینا اتنا مشکل محسوس نہیں ہوا تھا جتنی مشکل میں ٹکلیہ نے مجھے ڈال دیا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے پر قائل بھی تھی جب کہ مجھے اپنی اور اس کی عمر کا فرق دیکھ کر۔ اپنے تقریباً دو اربان بچوں کو دیکھ کر شرم آ رہی تھی۔ لیکن بہر حال۔۔۔ یہ کام ہونا تھا سو ہو گیا۔ پہلی بوری سے میرا ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اتفاق ہے کہ لڑکی کی شادی بھی ملک سے باہر ہوئی اور لڑکا بھی تو کسی کے سلسلے میں ملک سے باہر ہے۔ ٹکلیہ سے بھی میرے دو بچے ہیں۔ وہ ابھی چھوٹے ہی ہیں۔ اسکول جاتے ہیں۔ ذرا ٹھیک ٹھاک سی گزر رہی ہے۔" وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔

"اور ظاہرہ خانم کبھی یاد نہیں آتی؟" میں نے اس سے بھی دھیمی آواز میں پوچھا۔

اس نے اپنا منہ مٹی ہاتھ گھوما یاد دہانی کے لئے بلند کیا۔ اس ہاتھ پر چھابوا لہا رستانہ اس کی آستین میں گیا ہوا تھا۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ننان صاحب! ہمارے نظام کی خرابیوں نے اور تو جو گل کھلائے ہیں سو کھلائے ہیں لیکن ساتھ ہی ایک بہت بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ بد معاشوں کو یہ نظام دن بدن زیادہ بے خوف اور شریف آدمی کو دن بدن زیادہ بزدل بنا رہا ہے۔"

"اصل میں بد معاش دن بدن زیادہ خند" زیادہ منظم ہو رہے ہیں جب کہ شریف آدمی دن بدن بکھر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ دور ہو رہے ہیں۔ پڑوسی بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔" نذیر خان نے کہا "بہر حال۔۔۔ چوہدری صاحب! وہ لٹکار دیکھ کر میری تو کھوپڑی گھوم گئی۔ راجہ اور میرے پاس تھا۔ ٹیکسی سے اترتے ہی میں نے دو چار ہوائی فائر کئے اور اس ننگی ہاتھ سے ہی ان کی کھوپڑیاں پٹکی کر رکھ دیں۔ یہ ان پر ٹیک اسیل "ٹھوس پلاسٹک کا ہے اور مضبوط پتوں کے ذریعے کھنٹی تک بندھا ہوا ہے۔ یہ بھی میرا ایک معقول ہتھیار ہے۔ ٹکڑی کے متعلق ڈے کا کام دیتا ہے۔ آپ اسے خود پرستی باگپ مت سمجھئے گا۔ اچھا اکیلا! اچھی بجلی عمر کے "ٹنڈے" آدمی نے ان کی درگت بنا دی۔ انہیں ایک گولی بھی چلائے کی صلت نہیں دی۔ یہ صرف جذبے کا کمال تھا۔ میں دل میں صرف ایک بے غرض جذبے لے کر کیا تھا کہ مجھے اس بے بسی اور کمزور لڑکی کو بد معاشوں کے ہاتھوں سے بچانا ہے۔ میں نے صرف یہ تیر کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ باقی سب کچھ کیسے ہونا چلا گیا۔ مجھے صرف اس وقت ہوش آیا جب میں نے انہیں جیب میں بیٹھ کر رکھا مجھے دیکھا۔ ٹکلیہ کو وہ چوڑے گھٹے تھے۔ ایک کی رائفل بھی وہیں کر گئی تھی۔"

"جب اصل اور سچے مرد میدان میں آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ٹکلیہ کو اس کے گھر چھوڑ کر آیا۔ اس کی کمائی کا پتا چلا۔ ایک صوبائی وزیر کا چکر تھا۔ موصوف کالج کی کسی تقریب میں ٹکلیہ کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ عمر چالیس تھے اور تھی۔ تین چار بیویاں پہلے سے موجود تھیں۔ کوئی گاؤں میں کوئی خیریں۔ دو چار دانشتار بھی تھیں۔ وہ بچے کے حساب تھا۔ زمین داری اور سیاست نے بے شمار بنا دیا تھا۔ کم غرض کو یہ چیزیں ہضم نہیں ہوتیں۔ پہلے اس نے ٹکلیہ کے گھر رہنے کا بیٹھام بھیجا۔ ٹکلیہ کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے والدین تو خوف اور الجھن میں کوئی ذرا ب بھی نہ دے پائے مگر خود ٹکلیہ نے صاف انکار کر دیا۔ وزیر صاحب نے اتنا مسئلہ بنایا۔ وہی پرانے چٹکنڈے" وہی فٹنڈہ گروی۔ اور آخر کار موصوف آخری حربے پر اتر آئے۔ فٹنڈے بھیج کر ٹکلیہ کو انھوں نے کی کوشش کی۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سچ میں ٹک بڑے نذیر خان۔"

"کاش! ایسے ہر موقع پر ٹک بڑے نہ لے دیا میں بہت سے

وہ صرف گورنر ہاؤس میں رہیں گے بہت سے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ بہر حال آپ کو اس سلسلے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی ملاقاتیں خواہ کسی سے بھی ہوں، ہم سے ملاقات بہر حال ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے ہمیں کم از کم دو مہینے تو انتظار کرنا پڑے گا تاکہ وہ گورنر ہاؤس پہنچ سکیں اور ذرا سکون کی سانس لے سکیں۔ اس وقت تک آپ آرام سے باقی رہیں۔ پھر اگر بیٹھیں۔ ڈٹ کر، خالص لاہوری قسم کا اشتہا کر سکیں۔ یہ غریب خانہ اس قابل نہیں لیکن پھر بھی آپ اسے اپنا ہی تصور کریں۔ میری بھی آج دفتر سے چھٹی ہے۔ آج بھی کام کر لیتے ہیں۔ کچھ کپ شب کر لیتے ہیں۔“

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ چونکہ کرولا، لیکن آپ تو بہت مصروف ہوتے ہوں گے۔ سو دیکھتے خالص کرنے کے متعلق ہو سکیں گے؟“

”آپ کے پاس بیٹھنا وقت ضائع کرنا تو نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ویسے بھی میرے دوسرے معاملات تو چلتے ہی رہیں گے لیکن اس معاملے کو میزرائی طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ اب تو جتنا بھی وقت صرف کرنا ضروری ہوگا کر لیں گے۔“

اس دوران میزبر اشتہا لگایا جا چکا تھا۔ اشتہا لازمی لے لی گئی تھی۔ لیکن دوبارہ کرنے میں نہیں آئی تھی۔ اشتہا واقعی خالص لاہوری قسم کا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ ذہن خان نے لاہور کے ہر گوشے میں ہاتھ میں استعمال ہونے والے لوازمات جمع کر لئے تھے۔ پوری پرانے ہائے تھامری، چھوٹے، لمبی اور نہ جانے کیا کچھ موجود تھا۔

میں نے حیرت سے کہا میں تو اکیلا ہی آپ سے لئے آ رہا تھا۔ آپ نے تو ہاتھ کا انتظام پوری بتائیں گے لئے کیا ہوا ہے۔“

”میں نے سوچا۔ آپ کو ان میں سے نہ جانے کون سی چیزیں ہوں۔ میں نے بھی کا انتظام کر لیا۔“ وہ سادگی سے بولا ”مگر بری کے ہاتھ تو آپ کرتے ہی رہتے ہوں گے۔ میں ذرا دیکھ سکتا ہوں۔ دیکھ آؤں گی بتائیں تو آپ مجھے ہی سمجھ لیں۔ کوئی چیزیں صاف تو ہیں کدوں گا۔ جہاں تک آپ کا میں چلے آپ اپنی کوشش کیجئے۔ میں اب دیر مت کیجئے اور ان چیزوں پر توجہ دے رہے۔“

اس کا اظہار ہاتھ حرکت میں آیا۔ وہ واقعی ایک خوب ذراک آؤں تھا۔ پہلوؤں کی طرح کھاتا تھا۔ میں کوشش پاؤں جو اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ غرت کے زمانے میں دنیا کی ہر کھانے کو ہی چاہتا تھا۔ اب طبیعت میری تھی۔ ویسے بھی نے محسوس کر لیا تھا کہ طاقت ور رہنے کے لئے زیادہ کھانا ضروری نہیں تھا۔

کھانے کے بعد لمبی کا درہ چل رہا تھا جب میں نے میزبر

وہ ہونے سے ہنسا ”بڑی غیبت عورت ہے۔ اس نے یقیناً آپ کو بتایا ہوگا کہ کبھی میں دل و جان سے اس پر مذاق تھا۔ انسان پر زندگی میں عجیب و غریب دور آتے ہیں۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں قدرت نہ کرتی ہے بہتری کرتی ہے۔ اچھا ہی ہوا مجھے دوسری شادی کے لئے طاہرہ خانم جیسی عورت میر نہیں آئی۔ وہ عورت نہیں طوفان ہے۔ اسے اپنے گھر تک اپنی زندگی تک محدود رکھنا میرے پس کی بات نہیں تھی۔ مجھے تو تکلیف جیسی عورت ہی کی ضرورت تھی۔ میں قسمت کے اس فیصلے پر بہت خوش ہوں۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اچانک ہی پوچھا ”آج کل وہ آپ پر مہمان ہے کیا؟“

نہ جانے کیوں اس موقع پر میں بچ روٹنے سے کڑوا گیا ”کا درہ کی حد تک مہمان ہے۔ ہم جلد ہی ایک بواخت وینچر شروع کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے ہیں اور پس۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس نے سر ہلایا ”ہے وہ بڑی غیبت۔ لیکن عزت اس کی میں بھی کرتا ہوں۔ ابھی تک کرتا ہوں۔ بہر حال میں نے تو آپ کو اپنی رام کمانی شادی۔ جو میں تقریباً برسے آئے والے کرنا تھا۔ میں نے آپ کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب آپ اپنی سانیے طاہرہ نے آپ کو کس سلسلے میں میرے پاس بھیجا ہے؟“

اب میں نے اسے اپنی رام کمانی سانیے میں لے کر وراثت کا اور جی کا نام نہیں لیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ سازش میرے لئے ملک کے لئے اور خود ذہن خارجہ کے لئے خطرناک تھی۔ میں اس سلسلے میں ذاتی طور پر کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے مشور صاحب سے میری ملاقات ہونا اور ان کا مجھ سے شفق ہونا ضروری تھا۔ سازش کا سن کردہ بھی فکر مند ہو گیا۔ تاہم اس نے غیر ضروری بلکہ ضروری سوالات بھی نہیں کیے۔

”مشور صاحب سے ملاقات تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبا رہنے کے بعد وہ بولا ”لیکن ان کو قائل کرنا آپ کا کام ہے۔ وہ بڑے میٹھے آدمی ہیں۔“

مگر مشق کر کے دیکھنا ہمارا فرض ہے۔ ورنہ ویسے تو یہ معاملہ میں نے اور والے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا۔

اس نے قریب ہی تالی پر رکھا ہوا فون اٹھا کر اپنے سامنے ڈائمنڈ نیل پر رکھا اور مجھے بد دیکھے کئی قبر گھمانے اور کئی افراد سے بات کرنے کے بعد فون واپس رکھتے ہوئے بولا ”مجھے تو مشور صاحب کی فلاح ہی لاہور پہنچنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ ایئر پورٹ پر پریس اور ٹی وی کے نمائندوں وغیرہ سے باتیں کرتے کراچے انہیں آؤ گھنٹا اور گزر جائے گا۔ وہ کافی عرصے بعد لاہور آ رہے ہیں اور وہ بھی صرف دو حالتیں گھنٹے کے لئے۔ اس دوران

ہے یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے ان کی بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔
 اس نے تک سے تھوڑی سی لمبی گلاس میں اندر لے چائے کی
 طرح اس کی چمکیاں لیتے ہوئے بولا "رست ہاؤس سے واپس پہنچ
 آدمیوں نے مجھے دھوکے سے بے قابو کر کے اغوا کر لیا۔ آنکھوں پر
 پٹی باندھ کر وہ مجھے نہ جانے کہاں لے گئے۔ جہاں میری آنکھوں
 سے پٹی کھلی گئی وہ ایک بہت بڑا جگن تھا، جیسے عام طور پر ہوٹلوں
 وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ میرے پاؤں انہوں نے باندھ دیے تھے۔ ہاتھ
 البتہ کھلے ہوئے تھے۔ حفظ صاحب اس روز دفتر سے اپنے برف
 کیمس میں کوئی فائل لے کر پلے تھے لیکن مجھے ظاہر ہے اس کے
 بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ ہائی گاؤز کو بھلا ایسی چیزوں کا کہاں
 پتا ہوتا ہے۔ لیکن انہیں شاید کیمس سے کوئی غلط اطلاع ملی تھی یا کیا
 بات تھی۔ بہر حال انہوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا کہ حفظ
 صاحب وہ فائل لے کر کہاں گئے ہیں۔ میں نے ان کے کسی بھی
 سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے میرا دایاں ہاتھ
 ٹھوس ٹھوس لٹکڑی کے ایک گاؤز پر رکھا اور گشت کاٹنے والا ایک
 بھاری چاڑا اٹھا کر چوڑے رخ سے اس پر مارا۔ میں نے اپنے ہاتھ
 کی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز سنی۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر گر گیا میرے چہرے پر کوئی
 رد عمل تلاش کرنے لگا۔ میں خاموش بیٹھا ایک گھنٹہ اس کی طرف
 دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا "میں نے بہت چھین ماریں لیکن ایسا معلوم ہوتا
 تھا کہ وہاں دور دور تک میری آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ چاڑا کا
 ایک وار کر کے میری ہڈیوں کو مزید چور بنا دیا پھر پوچھے "حفظ
 صاحب اس وقت کہاں ہیں؟" میں اپنے ہاتھ کا منسوب بننے دیکھ رہا
 تھا اور چھین مار رہا تھا۔ فوج ہوتے ہوئے بکے کی طرح ڈر رہا تھا
 لیکن وہ گریا میری آواز میں سن ہی نہیں رہے تھے۔ انہیں صرف
 اپنے سوالیہ کے جواب سے غرض تھی۔ بار بار وہ اپنا سوال دہرائے
 جا رہے تھے۔ ہاتھ کا بالکل منسوب بن گیا تو وہ اس سے ذرا اور کمال
 کی طرف آگئے۔ سچی بات ہے۔ میں آپ سے حقیقت نہیں
 چھپاؤں گا۔۔۔ اذیت کی شدت کے باوجود میں بے ہوش بھی نہیں
 ہوا تھا۔۔۔ اور اذیت میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ آخر کار
 میں نے انہیں بتا دیا کہ میں نے کالی در پہلے حفظ صاحب کو رست
 ہاؤس میں چھوڑا تھا۔ آج سوچا ہوں تو شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے
 اشد بخیر ہو کر یہ بات بتا دی تھی کہ یہ جواب ان کے کسی کام کا
 نہیں تھا۔ رست ہاؤس میں وہ دیکھ چکے تھے۔ حفظ صاحب وہاں
 نہیں تھے۔ وہاں سے وہ کہیں اور روانہ ہو چکے تھے۔ کسی کو نہیں
 معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے تھے۔ مجھے اغوا کرنے والوں کو یقین تھا کہ
 مجھے ان کے پروگرام کا علم ہے۔ مجھے یاد تھا انہوں نے مجھے بتایا تو
 تھا کہ رست ہاؤس سے وہ دوسرے ہائی گاؤز اور دوسرے ذرا دور
 کے ساتھ کیمس بائیں گے لیکن میں نے ان کی بات زیادہ توجہ سے
 نہیں سنی تھی۔ میرا ذہن کیمس اور پھنسا ہوا تھا۔ جگہ کا نام مجھے یاد

رست ہاؤس کے معنوی ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ظاہرہ خانم
 نے مجھے بتایا تھا کہ جس واقعے میں آپ کا یہ ہاتھ ضائع ہوا تھا"
 راصل وہی واقعہ آپ کو منتر صاحب کے قریب لانے کی وجہ بتا تھا؟
 "جی ہاں۔ اور اسی واقعے کی وجہ سے میں نے آپ کی سٹائی
 کی کمائی پر اتنی جلدی یقین کر لیا ہے۔ آپ نے کسی لمبی مختل
 سٹی کی بات کی ہے۔ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس میں
 ہی کوئی لمبی مختل سٹی نہیں ملوث تھی۔ وزارت خارجہ کا معاملہ تھا۔
 اہر ہے بڑی لمبی چوڑی تحقیقات ہوئی تھیں۔ مجھے زیادہ تفصیل تو
 علم نہیں ہو سکتی۔ میں تو اس وقت محض ایک ہائی گاؤز تھا۔
 اس لیے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ ایک بڑے ملک کے اشارے
 اس کمپنی کے بارے میں تحقیقات ہو کر دی گئی تھی۔"
 "ہو آیا تھا؟" میں نے پوچھا اور کوشش کی کہ میرے لیے سے
 بارہ جنس کا اظہار نہ ہو۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن اب بھی وہ وقت یاد آتا
 ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے اس معنوی ہاتھ میں اذیت کی ٹھوس
 ڈر رہی ہیں۔ شاید وہ ہاتھ اب بھی کسی غیر ملکی راجلے کے ذریعے
 لیٹا ہوا ہے جو اب اس بازو کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ بغور اپنے
 ستان پر ہوش معنوی ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "وہ شاید میرے لئے بیک
 تھ خوش قسمتی اور بد قسمتی کا لمحہ تھا۔ بد قسمتی اس لئے کہ مجھے
 بے دامن ہاتھ سے نہایت اذیت تک انداز میں محروم ہو چاڑا۔
 دش قسمتی اس لئے کہ یہ جو تھوڑی بہت عزت اور خوش حالی میری
 زندگی میں آئی ہے۔ یہ اس واقعے کے بعد ہی رفتہ رفتہ آئی ہے۔
 حفظ صاحب مہربان ہوئے تو ان کے وسیلے سے اللہ نے زندگی کی
 ماری آسانیش دے دیں۔ بچے بھی سیٹ ہو گئے۔ حتیٰ کہ شکلیہ
 میں بڑی بھی لی گئی۔"

کسی کا عظیم الشان گلاس میز پر رکھ کر وہ شہر سے ہونٹ
 صاف کرنے کے بعد بولا "ان دنوں حفظ صاحب منتر نہیں تھے
 ہی منتر میں اندر سیکرٹری تھے۔ منتر بیٹ ڈائریکٹ آتا ہے۔ وہ
 پہلے منتر ہیں اور اسی وزارت سے پہلے عہدے سے لے گئے۔ گویا
 صحیح معنوں میں "مینکریٹ" ہیں۔ جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں
 اس روز میں انہیں ایک رست ہاؤس میں پہنچا کر آیا تھا۔ اس
 وقت گاؤز کی ڈیوٹی بدل چکی تھی۔ اس لئے میں گھر واپس جا رہا تھا۔
 سرکاری گاؤز میں تھا۔ حفظ صاحب کے قبضے میں چوں کہ ہر وقت
 کوئی نہ کوئی ایسا فائل رہتی تھی یا انہیں کم از کم یہ علم ضرور ہوتا
 تھا کہ فلاں فائل کہاں ہے۔ اس لئے انہیں ہر وقت گاؤز کی
 خدمات حاصل رہتی تھیں۔ انہوں نے شاید مجھ سے باتوں باتوں میں
 ذکر کیا تھا کہ رست ہاؤس سے وہ کہاں جائیں گے لیکن میں نے اس
 وقت توجہ سے سنا نہیں تھا کیوں کہ انہیں رست ہاؤس پہنچانے کے
 بعد میری ڈیوٹی ختم ہو رہی تھی۔ میرے حق میں اور ان کے حق میں

رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ میں لمبے چوڑے دعوے کرتا
تھیں کرتا۔ اگر مجھے یاد ہو تو کوئی بے حد نہیں کہ اس اذیت کی
بند نہ لاکر میں بتا ہی دیتا۔ انسان ہر حال انسان ہی ہوتا ہے
نہیں جس قدرت کو اس پرانے مجھے عزت دلا تا تصور تھا۔ میں نے
وہیں حنیف صاحب کو بھی یاد دلاتا تھا کہ وہ میری قوت برداشت کا
مال نہیں تھا جو میں نے زبان بند رکھی۔ بلکہ مجھے یاد ہی نہیں رہا
تھا۔

اس کے باوجود حنیف صاحب نے اسے میری قربانی ہی سمجھا۔
ان کی انسان نوازی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان کے پاس
سننے کی ترسیل سے حقیقی ایک بہت اہم فائل بھی جو اگر کسی کے
ہاتھ لگ جاتی تو ہمارے ملک کو ناقابلِ غلطی نقصان پہنچتا۔ اس
وقت موقع بھی بہت نازک تھا۔ ہر حال میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ
میری ذرا سی قربانی سے ملک ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔ اس
کے بعد حنیف صاحب کے لئے حقیقی انتظامات بہت بڑھادیے گئے
تھے اور فائلوں کی نقل و حمل میں بھی خصوصی احتیاطی تدابیر اختیار
کی جانے لگی تھیں۔

مذہب خان ایک بار پھر شہر پہرے ہوئے اور وہیں صاف
کہنے لگا تو میں نے پوچھا "انگوارا کے والوں نے آپ کی جان کیسے
چھوڑی تھی؟"

"انہوں نے رتنہ رتنہ صرف میرا ہاتھ ہی نہیں بلکہ کھائی کا کچھ
حصہ بھی بھل ڈالا تھا" مذہب خان مزید بتانے لگا "پھر انہوں نے چاؤ
سیدھا کر کے دھار کی طرف سے اس کچلے ہوئے ہاتھ اور کھائی پر
باقاعدہ ترتیب سے کٹ لگائے شروع کیے۔ بالکل اسی طرح جیسے
قصاب پھندے بنانے کے لئے پہلے گوشت کو چپا کر کرتا ہے پھر اس پر
آؤٹے ترتیب سے کٹ لگاتا ہے۔ میرے ہاتھ اور کھائی کا گوشت تو خیر
چپا نہیں ہوا تھا، بالکل لمبو بن چکا تھا۔ ہڈیوں تک کا چروا رہا تھا
تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود مجھے کٹ لگائے
جانے کی تکلیف بھی اسی شدت سے محسوس ہو رہی تھی جس طرح
ضلع سلامت ہاتھ پر ہو سکتی تھی۔ اس بازو سے خون بھی بھل بھل
کر کے بہ رہا تھا۔

آخر کار قدرت کو کچھ پر رحم آیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔
میری حالت اس وقت ویسے بھی قریب المرگ تھیں جیسی ہی تھی۔
اس کے علاوہ جس رفتار سے میرے بازو سے خون بہہ رہا تھا اس
کے پیش نظر شاید انہوں نے سوچا ہو کہ زیادہ خون بہہ جانے کے
باعث آخر کار مجھے مری جانا ہے چنانچہ وہ مجھے ایک سڑک کی گرین
سیٹ پر ہنگے کی گولت میں پیچیکر لگے۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ سڑک
بالکل سنسان تھی۔ یہ صرف میری خوش قسمتی تھی کہ گھوڑوں پر
لوٹ کر گئے ہوئے دو سپاہیوں کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس سے بھی
زیادہ خوش قسمتی یہ تھی کہ ان میں سے ایک سپاہی مجھے پہچانا
تھا اس لئے اس نے مجھے افکار اسپتال پہنچانے میں کچھ زیادہ

مستعدی دکھادی اور نہ میں ممکن تھا کہ وہ دونوں صلاح مشورے میں
مقصوف رہے اور میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ کیوں کہ
اسپتال والوں نے بتایا تھا "اگر مجھے وہاں پہنچنے میں مزید پندرہ منٹ کی
تاخیر ہو جاتی تو میرا پورا مشکل تھا۔

میں اس واقعے کے بعد سے ہی حنیف صاحب سے بہت سی
قریبی تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ یہ ان کا ظرف اور وضع داری ہے
کہ وزیر خارجہ بننے کے بعد بھی انہوں نے ان تعلقات میں فرق
نہیں آنے دیا۔ انہوں نے ہی مجھے اپنے ساتھ امریکا لے جا کر یہ
مصنوی ہاتھ لگوا دیا۔ انہوں نے ہی مجھے ایسی نوکری دلائی جس کا میں
بھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر میرے لئے وہ
عزت و اہمیت ہے جو وہ مجھ جیسے حقیر کوئی کر دیتے ہیں۔ کوئی چیز اس
عزت و اہمیت کی متبادل نہیں ہو سکتی۔ مجھے اپنے ہاتھ سے ضرور
"ہاتھ دھونا" پڑا لیکن انہوں نے مجھے یہ صدر اور عہدوی
بھلا دی۔"

"آپ نے ان لوگوں کی شکلیں دیکھی تھیں جنہوں نے آپ کو
انگوارا کیا تھا" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ان میں سے تو کسی فیٹ نے قصاب تک پہنچنے کی
رحمت نہیں کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کسی کا خوف
نہیں تھا۔ ان میں سے ایک سفید قام تھا۔ بالی چار دیواری تھے۔
مذہب خان نے بتایا۔

"سفید قام کس ملک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا؟" میں نے
دروازت کیا۔

"میں زیادہ دھا لکھا آدمی نہیں ہوں چوہدری صاحب! میں
ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں سارے سفید قام ہی انگریز معلوم
ہوتے ہیں۔ آپہیں میں وہ سارے ہی انگریزی میں بات کر رہے تھے
مجھ سے اردو میں بات کرتے تھے۔ سفید قام نے تو مجھ سے کوئی بات
ہی نہیں کی۔ وہ جو بھی بات کرنا چاہتا تھا، مقامی لوگوں سے انگریزی
میں کرنا تھا۔ وہ آگے مجھ سے اردو میں کرتے تھے۔ حالانکہ مجھے
سفید قام کی زبان "انگریزی ہی میں بات سمجھ میں آ جاتی تھی مگر وہ گویا
میرے لئے ترجمہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔"

پھر وہ گویا اس وقت کو یاد کرتے ہوئے بھر جھری ہی لے کر بولا
"چوہدری صاحب! ایک عجیب سی بات میں نے یہ محسوس کی تھی کہ
سفید قام مجھ سے نظر نہیں لارہا تھا۔ حالانکہ میرے لئے بالی
لوگوں کی طرح وہ بھی اجنبی تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی اسے
دیکھا تھا۔" اس کے بعد وہ زندگی میں کبھی مجھے نظر آیا۔ مگر ایسا
معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ مجھ سے شرمندہ تھا کہ مجھ پر سختی کی باری
تھی۔ ساری کارروائی ہمارے دیکھی بھائیوں نے انجام دی۔ میرے
ہاتھ کا قیدہ انہوں نے ہی بنایا۔ اور بلا ٹیپا ہٹ بنایا۔ سفید قام نے
مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بلکہ ہاتھ کا ٹبر بننے کے دوران تو وہ
مر رہا تھا۔ کڑا رہا جیسے اسے افسوس ہو رہا ہو کہ بات یہاں تک پہنچ

کسی سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں ہے اگر ہوئے بھی ہیں تو وہ پرانی ہی پٹی آری ہے۔ گورنر صاحب گھنٹی کے انہی چند لوگوں میں سے ایک ہیں۔

"آپ کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ہم ان سے ملاقات کے لئے جاسکتے ہیں" میں نے محض تعذیبی کی خاطر کہا۔

"جی ہاں۔ کیا ہم بچہ ہماری ان سے ملاقات طے ہو چکی ہے" وزیر خان نے گھڑی دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "یہ ملاقات کئی دیر کی ہونی چاہئے" یہ ہماری عرضی پر منحصر ہو گا۔ میری سب سے آخر میں جوابات ہوئی ہے وہ ان کے پی اے کے نیم تہہ کی سے ہوئی ہے۔

میں سن چکا تھا۔۔۔ وہ اس سے بڑی بے تکلفی سے بات چیت کر رہا تھا۔ میں نے یوں ہی ذرا معلومات کے لئے پوچھا "کیا فخر صاحب کا پی اے بھی سرخس میں ان کے ساتھ چلتا ہے؟"

"صرف پی اے ہی نہیں بلکہ ان کے اٹالک کے کئی بنیادی اور خاص خاص لوگ تقریباً ہر سرخس میں ان کے ساتھ جاتے ہیں" وزیر خان نے بتایا۔

"اکرام بیگ بھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ ان کا سیکرٹری چیف ہے۔ وہ بھی ضرور جاتا ہے" وزیر خان نے جواب دیا "یہ تو فخر صاحب امردون نے بتایا۔ ہوں ملک جہاں بھی جاسے گے" ان کی سیکرٹری کی دسے والی برڈ کوئل کے مطابق وہیں کی کسی نہ کسی انجینئری کی ہوگی۔ لیکن اس انجینئری کے آدمی کافی حد تک اکرام بیگ ہی کی ماتحتی میں کام کریں گے حتیٰ کہ غیر ممالک میں بھی سیکرٹری کے انتظامات ان کے اپنے ہوں گے لیکن اکرام بیگ چاہے تو کسی چیز پر اعتراض کر سکتا ہے۔ مناسب جواز پیش کر کے وہ کسی بھی انتظام کو یا کسی بھی فرد کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اگر کسی جگہ کے بارے میں وہ سیکرٹری کے انتظامات کے بارے میں رائے دے کہ وہ ان سے مطمئن نہیں ہے تو فخر صاحب وہاں نہیں جائیں گے۔ بہت پرانا آدمی ہے۔ فخر صاحب قاعدے قوانین سے قطع نظر بھی اس پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"اے نہیں" میں نے گھڑی سانفٹ لے کر کہا "اگر جانتا ہوتا تو آپ کو کیوں زحمت دیتا۔ میں نے راہی میں اپنی سبکدوشی کے ریڈیٹنٹ ڈائریکٹر شفیع شاہ کی زبانی اس کا نام سنا تھا۔"

"آپ کے ہول میں قریب سے پہلے کانسٹیبل دی دے گا۔ اچھا آدمی ہے۔ سنزل گورنمنٹ کا افسر ہے۔ سی آئی اے سے آیا ہے" پھر اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی "امریکا والی سی آئی اے نہیں۔ ای سی آئی اے۔"

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا "چلیں؟"

"ہاں" وہ اٹھتے ہوئے بولا "وقت تو ابھی کافی ہے لیکن ہم ذرا آرام سے آرام سے چلیں گے۔ حقہ صاحب جیسے لوگوں سے ملنے کے

میں۔" لیکن کارروائی کا انچارج دی معلوم ہوا تھا؟

"جی ہاں۔ گورنری ست گواہ دست والا معاملہ معلوم ہوا تھا۔ جسکی مستحدی سے ہمارے دیکر بھائی کارروائی انجام دے رہے تھے اتنی شاید اسے بھی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال ہے مجھے بے ہوشی کی حالت میں پکڑا گیا شاید سفید فام نے ہی ہو۔ ورنہ اپنے دیکر بھائی تو شاید میرا ایری سے چوٹی تک ہی قید بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں میں سے بھی کوئی زندگی میں دوبارہ مجھے نظر نہیں آیا آج تک۔"

"کیا وہ جگہ۔۔۔ وہ کچن تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟"

میں نے پوچھا۔ "کی تھی۔ لیکن میں اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہاں لے جایا گیا تھا۔ آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو میں اس بند کچن میں کھڑا تھا۔ وہاں سے پھر مجھے بے ہوشی کی حالت میں ہی نکالا گیا اور جہاں لے جا کر پھینکا گیا وہ جگہ وہاں سے نہ جانے کتنی دور تھی۔ بہر حال مجھے چوں کہ اس پر کسی ہول کے کچن کا گمان گزرا تھا۔ اس لئے مجھے بہت سے ہوٹلوں کے کچن لے جایا گیا مگر ان میں سے کوئی بھی وہ کچن نہیں تھا۔ پھر یہ کوشش ترک کر دی گئی کیوں کہ وہ کسی مکان کا کچن بھی ہو سکتا تھا۔ ماشاء اللہ ہمارے شہر میں ایسی ایسی کوکھیاں اور پچکلے سوہدو ہیں جن کے کچن لائبرائٹس ہوٹلوں کے کچن سے زیادہ بڑے اور نالیخان ہیں۔ محض کچن تلاش کرتے ہوئے کہیں تک پہنچا ہوا مشکل تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد تو معلوم نہیں کیوں "انوشی گیشن" ہی بند کر دی گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس کیس کی فائل کا کیا بنا۔ میں نے کبھی فخر صاحب سے پوچھا ہی نہیں۔"

اسی طرح کی باتوں اور پھر ادھر ادھر کی گپ شپ میں دو گھنٹے گزر رہی تھیں۔ اس دوران اس کی بڑی شکایت بھی کچھ دیر کرے میں آکر پہنچی اور اس سے ری سی گھنٹو دی۔ وہ سوچوں میں ڈوبی رہنے والی بڑی گھڑی سی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بچے بھی اسکول جاتے وقت مجھ سے مل کر گئے۔ اس کے گھر میں مجھے ایک عجیب سے سکون اور اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ اسی لئے اتنا وقت بغیر کسی اضطراب اور احساس زبانی کے گزر گیا۔ آئیڈیل دنیا میں حقیقت کے دھپ میں کم ہی نظر آتے ہیں لیکن بہر حال وہ کافی حد تک ایک آئیڈیل گھر تھا۔

آخر کار وزیر خان نے خود ہی گھڑی دیکھ کر دوبارہ ٹیلی فون کھمکھانے شروع کیے۔ کئی لمحوں پر بات کرنے کے بعد وہ فون رکھتے ہوئے بولا "گھڑی۔۔۔ فخر صاحب گورنر ہاؤس پہنچ گئے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لئے وہ گورنر صاحب کے صمان ہیں۔ اپنی ملاقاتیں بھی انہوں نے وہیں رکھ لی ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو مگر زرا صاحب اور فخر صاحب میں پرانی شناسائی ہے۔ فخر صاحب شاہزادہ عری

اسی جگہ سے کمرے سے ہمیں راہداری کے ذریعے ایک گاڑی کی رہنمائی میں ایک طویل و عریض صاف صحرے اور تہ راستہ دہراستہ کمرے میں پہنچ دیا گیا۔ اس کی آرائش ایک شاندار ذرا رنگ دھم کے طرز کی تھی۔ سیاہ شیردانی اور سفید شلوار میں لمبوس ایک ادبیز عرصہ میں اس کمرے میں ہمارا استقبال کیا۔ وہ بھی نذر خان سے بہت گرم جوشی سے ملا۔ نذر خان نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ منتر صاحب کاپی اے جسم قریشی تھا۔ اس نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا کہ ہم کس سلسلے میں آئے ہیں۔ بس ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوش خلقی سے

لے جاتے وقت دیسے بھی پانچ دس منٹ کی گنجائش رکھ کر کھانا چاہئے۔ وقت کے بڑے پابند ہیں۔ زندگی کا بڑا حصہ دوسرے ملکوں میں ہی گزارا ہے۔

میں اپنی گاڑی میں نذر خان کو ساتھ لے کر گورنر ہاؤس کی طرف روانہ ہوا۔ تمام ترست و رفتاری کے باوجود ہم چند منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ پہلے ترمیمت سے داخل ہوئے ہی ہماری زبردست تلاشی ہوئی۔ گاڑی کو بھی انجن کی نوک سے لے کر کچھلے بندر تک اچھی طرح ٹھوک بھا کر دیکھا گیا۔ میں ممکن تھا کہ تلاشی لینے والے ہماری گاڑی کے نیچے بھی ٹھس جاتے کہ سامنے سے ایک باوردی پولیس آفیسر مسکراتا ہوا آیا۔ وہ نذر خان کو جانتا تھا۔ دونوں ملے ملے گرم جوشی سے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی اور مجھ سے بھی تعارف ہوا۔ اس دوران تلاشی لینے والوں نے گاڑی کے نیچے کھینے کا ارادہ شاید ملتوی کر دیا اور ہمیں گاڑی اس جگہ میں پارک کرنے کی ہدایت کی جو سڑک کی گاڑیوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس دوران داخلی ٹیلی فون وغیرہ پر یہ تصدیق کر لی گئی تھی کہ ہم ”بلائے گئے“ مسلمان ہیں۔ بن بلائے ہیں۔

پولیس آفیسر اور نذر خان ایک دوسرے کو مختصراً اپنے آدھ ترین حالات سے آگاہ کر کے تو ہم آگے بڑھے اور کسی پانچ گھنٹہ سے زیادہ طویل و عریض خوبصورت اور بڑبہار سبزہ زار کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک استقبال ہال میں پہنچے۔ یہاں خاصا جہوم سا تھا۔ بہت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

ایک میز پر موجود شخص کو نذر خان نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے اندر کسی سے فون پر بات کی۔ اسی لمحے طرے اور کلاہ والا ایک قد آوار جوان بدلیشا کے پوچھنا م میں تھا، ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں ایک بار پھر نئے سرے سے ہماری تلاشی ہوئی۔ حتیٰ کہ دھات کا سرخ و سبز والے ٹیل ڈیکٹر تک سے ہمیں سر آ پیک کیا گیا۔ جس نے میری جیب میں گاڑی کی چابیوں تک کی موجودگی پر ”ہپ ہپ“ کر کے شور مچا دیا اور مجھے وہ بھی نکال کر یکسر دلی والوں کو دکھانا دیا۔ مجھے اس حد تک تو نہیں مہلت کسی نہ کسی حد تک اس تلاشی وغیرہ کے پھر کا پہلے ہی اندیشہ تھا۔ اس لئے میں ہر وقت اپنے ساتھ موجود رہنے والا مشین ہینل ہانگ سے بندھا رہنے والا پتلا سا زہرا بھرا اور دو ایک دوسری چھوٹی موٹی چیزیں اٹھا کر بھی چھوڑا تھا۔

میرا اور میرے آدمیوں کا بیشتر انھیں اسلحہ انٹنس ہاؤس تھا لیکن پھر بھی میرے پاس سے جو کچھ 100 سے دیکھ کر تلاشی لینے والوں کو یقیناً عجیب ہو تاکہ... شکر کے ایک بونے اور معزز پرنس ہیں کہ آخر خود اس قسم کی چیزیں اٹھانے بھرنے کی کیا ضرورت رہتی تھی؟ زیادہ ہی ضروری تھا تو اس اپنے لئے گاڑی وغیرہ رکھ سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے ان لوگوں کے سامنے میں اپنے معاملات کی وضاحت تو نہیں کر سکتا تھا۔

سیو کن ماڈرن جاپانی

★ ---- شاہد حمید

یہ کتاب سالہا سال کے ذاتی تجربات کا نتیجہ اور نچوڑ ہے۔

زبان کے سلسلے میں بنیادی حقائق کی طرف خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔

مشکل نکات کو نہایت

آسان الفاظ میں واضح کرنے

کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

جس کے مختلف کالموں میں

انگریزی الفاظ، جاپانی تلفظ

اور جاپانی ترجمہ شامل ہے۔

خوبصورت سرورق۔ بہترین کمپوزنگ و طباعت

قیمت: -/120 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی۔ مجھے ان کے چہرے سے قہر سے سردی کا احساس ہوا۔ شاید وہ انہیوں سے اسی طرح لٹے تھے۔ انہوں نے نہیں بیٹھے کے لئے کہا اور پوچھا کہ ہم کیا نہیں گے لیکن ایک قومیں اور ذہن خان گھر سے ہی ٹانگے کے نام پر بہت کچھ ٹھوس کر گھر سے نکلے تھے دوسرے ہمیں معلوم تھا کہ خضر صاحب کی دعوت صرف رسمی تھی۔ ان کا وقت اتنا قیمتی تھا کہ اس قسم کی رسمیات یا تعلقات میں ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے ساتھ تو اگر کسی کو واقعی چاہئے یا ہونی یا کمانا ہوتا تو اسے پہلے سے باقاعدہ شیڈول میں رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہم نے نہایت سوہانہ انداز میں انکار کر دیا۔

ذہن خان کے کہنے پر میں نے اپنی رام کمانی شروع کی۔ ریڈ واٹ اور ہنی کی جگہ مجھے اس کمانی میں ”کچھ باطلوم خضر پاک لوگ“ اور ”مستبر ذرائع“ وغیرہ جیسے الفاظ شامل کرنا پڑے۔۔۔ لہذا بالکل کسی سرکاری شخصیت کے سامنے ان دونوں کا ذکر کرنا میری نظر میں خلاف مصلحت تھا۔

اس دوران خضر صاحب ایک ٹک میری طرف دیکھتے رہے۔ وہ آگے بہت کم بڑھتے تھے۔ اس انداز اور اپنی آنکھوں کی مختلطی چمک کی بدولت وہ شاید کمزور اعصاب کے لوگوں کو نروس کر دیتے ہوں۔ ان کی لائن ڈیولپنگ تھی۔ انہیں دن رات جموت سے واسطہ پڑتا تھا۔ اخبارات میں بیانات جاری کرنے کے لئے انہیں خواہ دوسرے کے دل کی بات کہنی پڑتی ہو خواہ سچ کہنے ہی جموت کا طبع چھایا پڑتا ہو لیکن پس پردہ شاید وہ اپنی ان نظموں کے ذریعے سچ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

انہوں نے خاموشی سے میری پوری بات سنی۔ اس دوران ایک بھی سوال نہیں کیا۔ وقفے وقفے سے سارے کٹ لیتے رہے۔ میں تھا کہ خوشی خضر صاحب پچھتاہٹ تھا۔ وہ ہونا کا سگار پی رہے تھے۔ وہ اپنے تاثرات پوری طرح چھپائے رکھنے پر قادر تھے۔ اپنے غم کی مائش کا سن کر انہوں نے بلک بلک نہیں جھپکی تھی۔ ان کی آنکھوں سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ وہ میری بات پر تھیں کر رہے تھے یا اپنے جھوٹا سمجھ رہے تھے۔

میرے خاموش ہونے پر وہ بولے ”مستبر بدوی آپ کی بات پر کوئی تبصہ کرنے سے پہلے میں یہ جانا چاہوں گا کہ آپ نے جن ”باطلوم خضر پاک لوگوں“ کا ذکر کیا ہے وہ کون ہیں؟ دوسرے آپ کو خطا لگ کر اظہار دینے والا کون ہے؟ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ خبر کا ذریعہ خود کتنا قابل اعتبار ہے۔“

”سرا میں نے باطلوم خضر پاک لوگوں کا میڈا اسی لئے استعمال کیا ہے کہ میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ خبر کے ذریعے کے بارے میں بھی میں صرف آپ کو اپنی ذاتی ضمانت ہی دے سکتا ہوں کہ وہ ایک قابل اخبار شخصیت ہے اور جس بیڑے کو اس نے یہ المیہ بھجوائی ہے وہاں سے آنے والی خبر غلط نہیں ہو

ولا“ آپ کو صرف تین چار منٹ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔ خضر صاحب خریف لارے ہیں“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ مجھے خضر صاحب سے وقت کی پابندی کی اتنی امید نہیں تھی لیکن ذہن خان اور خضر صاحب کی ٹھیک سی کمانا تھا۔ ٹھیک تین منٹ بعد گھرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور وہی سی آواز میں ”السلام علیکم“ کہنے ہوئے خضر صاحب اندر آ گئے۔ ہم انھ کو کمرے ہوئے۔ خضر صاحب نے پہلے ذہن خان کا معنوی اور دستانہ پرش ہاتھ تمام کر خاصی کڑبڑی سے معاف کیا۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ سیاہ نائیلون کے دستانے میں چپے ہوئے پلاسٹک کے اس ہاتھ میں بھی غلوں کی حرارت محسوس کر رہے ہوں۔

غلوں کی حرارت اگر ذہن خان کے بے جان معنوی ہاتھ میں نہیں تھی تو اس کی آنکھوں میں ضرور تھی۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں تو غلوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خضر صاحب کے سامنے شکرگزاری کے اظہار کے لئے کیا کرے۔

آخر کار اس نے خضر صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ میری کاروباری حیثیت اور پوزیشن وغیرہ بتانے کے بعد وہ بولا ”سرا یہ میرے بڑے پرانے دوست اور صریح ہیں۔ ان سے کا دوبارہ تعلق بھی ہے۔“ حالانکہ ذہن خان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر اس نے مجھے پرانا دوست اور صریح قرار دے دیا تھا۔ یہ اس کی صریح تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”یہ صرف بڑے کا دوبارہ آری ہی نہیں اپنے وطن کے زبردست خیر خواہ اور آپ جیسی شخصیتوں کے بڑے ہی قدردان ہیں جنہوں نے ملک کے لئے بہت سی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی لئے یہ آپ کے بارے میں ایک بری خبر سننے ہی میرے قہر سے فوراً آپ کے پاس پہلے آئے ہیں۔ اگر آپ ان کی بات توجہ سے سن سکیں اور ان کی نیکیاں تیری نوازش دیا کر ہم ہوگا۔“

ذہن خان کو ساتھ لانا اجماعی رہا تھا۔ میں شاید ایسے لحاظ بھرے اور ڈیولپنگ انداز میں گفتگو نہ کرنا۔ خضر صاحب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی تصویریں بار بار دیکھی تھیں۔ وہ ایک بارہلی دی پر بھی دیکھا تھا لیکن وہ اپنی تصویروں کی نسبت بہتر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سادہ مگر نفیس سی شلوار قمیص اور واکسٹ میں تھے۔ ہونٹوں میں سگار دبا رہا تھا۔

وہ یقیناً ساتھ کی عمر کو پہنچ رہے ہوں گے مگر صحت نہایت شاندار تھی۔ سرخ سپید رنگت، چھوٹھوں سے بے نیاز، کمر سیدھی گھٹ سے چڑھے اور آنکھیں بے پناہ چمکیلی تھیں۔ چہرے پر بکلی سی نخوت بھی تھی۔ ان کے قد و قال سے جاگیردارانہ سا جلال جھلکا تھا۔ حالانکہ میری معلومات کے مطابق ان کا خاندانی پس منظر جاگیردارانہ نہیں تھا۔ ان کے ہونٹوں پر نہایت ہی مدھم اور نرمی تھی۔ مسکراہٹ تھی۔ بلکہ میری طرف دیکھتے ہوئے تو یہ

سکتی۔ میں اس سلسلے میں زیادہ تفصیل آپ کو اس لئے بھی نہیں چاہتا کہ اس صورت میں مجھے خود اپنی جان کا خطرہ ہے۔ میں نے بلائے۔

”وہ کیوں؟“ انہوں نے جیسے لمحے میں پوچھا۔

”سرا! میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کے قسط سے ان لوگوں کے بارے میں کسی سرکاری ایجنسی کا حرکت میں آجاتا میرے لئے ان لوگوں کے غریبہ و غصب کا باعث بن سکتا ہے۔ ابھی تک میرے بارے میں ان کا مدیہ خوف ناک نہیں رہا ہے۔ شاید وہ اس لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی مرحلے پر بھی مجھے استعمال کریں گے لیکن اب اگر ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ میں ان کے بارے میں کوئی کمائی لے کر آپ کے پاس آیا تھا تو اس کے بعد سرکاری ایجنسیاں حرکت میں آجی نہیں تو اس کا نتیجہ خوف ناک رد عمل کی صورت میں نکل سکتا ہے۔“

”مسٹر چوہدری! آپ کی آمد کا قصد کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسے آپ میری حفاظت کے سلسلے میں... اور مجھے اس سازش سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ کرنا چاہئے ہیں۔ لیکن اگر آپ خود ہی اتنا ڈرتے ہیں تو آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں؟“

”میں ڈرتا نہیں ہوں سرا“ میں نے بدستور امانت سے کہا۔ ”بلکہ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ مجھے سیکورٹی کے سرکاری نظام اور ایجنسیوں کے طریقہ کار پر زیادہ محسوس نہیں ہے۔ یہ نظام آپ جیسی سرکاری شخصیتوں اور کچھ مخصوص خطوط پر کام کرنے والوں کو ترسوت کر سکتا ہے لیکن ایک عام شہری کو کچھ جیسے شخص کو سوٹ نہیں کر سکتا۔ بعض معاملات بہت ہی باریک بینی بہت ہی غناست و نزاکت اور بہت ہی نرمی سے پنڈل کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی مددائی طریقہ، پکڑ و کھڑا جلد بازی بہت سے بے گناہ انسانوں کی ہلاکت اور تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لئے فی الحال میں ان معاملات میں سرکاری مداخلت نہیں چاہتا۔ البتہ جہاں میں سمجھوں گا کہ معاملہ میرے دسائل اور اختیارات سے باہر ہو گیا ہے، یا جب میں محسوس کروں گا کہ اب اسے سرکاری دسائل سے ہی پنڈل کرنا زیادہ بہتر ہے گا تو میں ضرور آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔“

”بہت خوب!“ مسٹر صاحب نے کہا۔ مگر اس لمحے میں حسین والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ساگر کا کمرائش لیتے ہوئے پڑ خیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ابھی تک ان سے نظر نہیں چرائی تھی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس کی مثال کسی بھری چڑی عمارت میں صوب کئے گئے ایسے ہم کی سی ہے جس کی ساخت کے بارے میں ہم ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں کچھ نہیں جانتا۔ اس لئے کوئی ذرا سی بھی غلط حرکت عمارت کو اور لوگوں کو بچانے کے بجائے ان کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ ہم کو ناکام بنانے سے پہلے ہم کی

ساخت کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے۔“

”اور آپ کے خیال میں سرکاری ایجنسیاں یہ کام نہیں کر سکتیں؟“ انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں ان کے بارے میں محسن محن میں مبتلا رہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے فیڈ بیک انداز میں جواب دیا۔“

”شاید اس لئے کہ ایک عام آدمی کو سرکاری ایجنسیوں کی طاقت، پہلاؤ اور رسائی کا اندازہ نہیں ہوگا۔ خواہ وہ شخص بہت بڑا بڑی شخصیت یا بہت ہی باخبر آدمی کیوں نہ ہو۔“ ان کے لمحے میں جگہ سی سرد مری اور تنی ”مسٹر چوہدری! آپ کو تو شاید معلوم بھی نہ ہو کہ ہمارے ملک میں کتنے قسم کی خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔“

”سرا! ہو سکتا ہے اس معاملے میں میری معلومات ناقص ہوں۔ میں ایک عام آدمی ہوں اور عام آدمی کے کسی چیز کو اپنے کے کارسارے بھی عام سے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک عام آدمی شہر تیار کرنے کے لئے پانی میں میٹھا ڈالنے سے تو اسے کچھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ شکر درست مقدار میں ڈالی جا چکی ہے یا نہیں۔ عام آدمی کو اس سے غرض نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں کتنی ایجنسیاں کام کر رہی ہیں، ان میں کتنی تعداد میں لوگ ملازم ہیں، ان کے کتنے دفاتر اور کتنی شان و شوکت ہے۔ وہ تو آخر میں صرف نتیجہ دیکھتا ہے کہ ان ایجنسیوں کی بدولت اس کے ملک میں کتنی سازشیں ناکام ہوئیں، کتنے خطرناک مجرموں کا سراغ لگا، کتنی تعداد میں ملکہ اور متوقع حادثات کو روکا گیا، تحریک کاری کے کتنے مشنوں کو ناکام بنایا گیا۔ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اس قسم میں عام آدمی کا تجربہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔“ میں صاف گوئی سے کام لینے پر قائل کیا تھا۔

میں خیر خان کی طرف دیکھ کر کہتا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ مضطرب ہو چکا تھا۔ اسے مسٹر صاحب سے اپنے قریبی تعلقات کا مان تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے سامنے صاف گوئی یا تلخ زبانی کا تحمل وہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میری مشنوں سے زیادہ میل ملاقات میں تھی، زیادہ ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ اور میں میل ملاقات بلا ضرورت رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے ان کے پاس جانے والے لوگوں کی تنگدستی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ صرف اپنا کام نکالنے ان کے پاس جاتے تھے، ان کی خوشامد کرتے تھے، انہیں مس گاؤں کرتے تھے، ان کے کارناموں پر داد و تحسین کے ڈونگے برساتے تھے جو انہوں نے انجام نہیں دیے ہوتے تھے۔ مسٹر خواہ کسی بھی شے کا ہوا، خواہ لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ ملے، کام پڑنا یا نہ پڑنا لیکن وہ صرف دوا دہانے کا عادی ہوتا تھا۔ انہیں ایسا بنانے میں ہمارے نظام کا بھی قصور تھا، بگاڑ سیاست کا بھی قصور تھا۔ اور نہ جانے کس کس کا قصور تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ اس میں لوگوں کا بھی قصور تھا۔ لوگوں نے اپنے چمڑے چمڑے مفادات کے لئے قوی مفادات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ہر کسی نے

ابھی تین ہیں۔

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی کپٹیوں کے پاس بجلی سی جیٹش کا احساس ہوا۔ شاید فشر صاحب مجھے بے وقوف سمجھ رہے تھے جو میں اس قسم کی ایک "کمانی" لے کر ان کے پاس چلا آیا تھا۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دوں۔ ان کے نقل کی وجہ سے میرے برفس یا ہوئی پر چڑاؤ پڑا وہیں بھگت لیتا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اپنی کمپوزٹی ٹھنڈی رکھنی چاہیے۔ ہمارے ملک کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ جب کوئی ذرا بھی اونچے سنگھاسن پر بیٹھا تھا تو وہ گویا ایک خول میں بند ہو جاتا تھا۔ اور گرد کا مٹھرا اس کی نظر سے اور جھل ہو جاتا تھا۔ وہ خفا کی دنیا سے گٹ جاتا تھا۔ اس کے خیال میں خفا کی صرف وہ ہوتے تھے جو اسے اس کے مخصوص ذرائع سے ہٹائے جاتے تھے یا جو کچھ وہ خود محسوس کرتا تھا۔ دوسرے ذرا کچھ محسوس کرتے تھے یا اسے ہٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اس کی نظر میں خفا کی نہیں رہتے تھے۔

فشر صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "حقیقی زندگی میں" اس قسم کی بڑی سازشیں کرنے والوں کے لئے کسی کو سوا دیا گیا ہوا مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ سمجھا بھرا کر کوئی پڑجیج اور لہا راست اختیار کریں۔ وہ بس سیدھے سادے طریقے سے گرائے کے ٹاکوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور آوی کو سوا دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مناسب موقع کسی نہ کسی قافل کو لی جاتا ہے۔ بس وہ سامنے آتا ہے اور فساد سے گولی مار دیتا ہے۔ زیادہ صحیح سوچنے نہ ملایا زیادہ بڑے تشدد اور ہنگامہ پرورد انداز میں کسی کارنامہ ہوا تو کسی مقام پر کسی گاڑی میں یا کسی قمارت میں بم رکھوایا۔ نقیشتی اینجینیاں ہلدیش ٹرینیں مارنی رہتی ہیں۔ کبھی وہ سازش کرنے والے اصل لوگوں تک پہنچ نہیں پاتیں۔ اور کبھی سب کچھ کچھ جانے کے باوجود ذرا دباؤ پر ہاتھ نہیں ڈال پاتیں۔ بڑے بڑے ملکوں کے صدور اور وزراء نے انھیں کو اس انداز میں قتل کیا گیا ہے۔ میں کیا جیچا ہوں۔" میں نے حق الامکان ملافت سے کہا "سراپیں جس سازش کی بات کر رہا ہوں۔ ہم اس کی تمام تفصیلات سے واقف نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے اس میں صرف آپ کو قتل کر دیا ہی اصل مقصد نہ ہو۔ شاید یہ کوئی ایک سے زیادہ مقاصد رکھنے والی سازش ہو۔"

"اس نقطہ نظر سے تو یہ بات اور بھی زیادہ عجیب لگتی ہے۔ زیادہ آتی ہے" وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے میرے قتل سے زیادہ مقاصد تو کیا کوئی ایک مقصد بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی ملک میری پالیسیوں کی وجہ سے مجھے قتل کرا چاہتا ہے تو اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ میرے مرنے سے ہمارے ملک کی پالیسیاں بدل نہیں جائیں گی۔ پالیسیاں کسی ملک کی حکومت اختیاری طور پر بناتی ہے۔ وزیر خارجہ کا کام صرف انہیں آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ میں نہیں تو میری جگہ کوئی اور دوسرا آدمی ان پالیسیوں پر عمل درآمد

فرشاد کرنے اور اپنا آئندہ حاکمیت میں دوسرے کو مات دینے کی غامی ہوئی تھی۔

فشر صاحب کے جیسے پر صرف سرد مری تھی۔ ناگواری یا کسی قسم کی پہل نہیں تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہمارے ملک میں نہ جانے کیسی کیسی قوتیں سرگرم عمل رہتی ہیں" زیر زمین نہ جانے کیسے کیسے منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ سیاست سماجی، بہود مسلمان مشن، غیر ملکی علاقائی ادارے۔۔۔ ان سب چیزوں کی آڑ میں نہ جانے کون کون سی قوتیں کیا کچھ کرتی رہتی ہیں۔ ہمیں صرف اس وقت پتا چلتا ہے جب کوئی بہت بڑا سامعہ دلنا ہو جاتا ہے یا کوئی برائی سیلاب بن چکی ہوتی ہے ہمارے قاصد سے باہر نکل چکی ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس دوران ہماری اینجینیاں کیا کرتی رہتی ہیں" میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ سخت الفاظ استعمال نہ کروں۔ میری یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ ویسے بھی ان کا حکم ایسا تھا کہ ان پر زیادہ دل کا غبار نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ آج میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں تو اس وقت کے حالات پر ہی ریجیدہ غافل رہتا تھا، جذباتی ہو جاتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری گناہ گار آنکھوں کو یہاں کیا کیا سامنے کیا گیا، لیجیے کیا کیا سازشیں اور کیا کیا شیطانی قماشے دیکھنا پڑیں گے۔

فشر صاحب نے ہماری مائنس لی اور قتل سے بولے "یہ بڑی لمبی بحث ہے سبز چوہری! اینجینیوں کے اپنے طور طریقے ہیں اور عام آدمی کا سوچنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ہمیں ایک دوسرے کے نقطہ نظر اور حالات سے آگاہ ہونے کے لئے بہت زیادہ وقت چاہئے۔ اس لئے میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ منتفی اور سازشی قوتیں ہر دور میں ہر ملک میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ کسی بھی ملک کے خواہ کتنے بھی وسائل ہوں وہ اپنے آپ کو ہر سازش پر برائی سے بالکل پاک صاف نہیں کر سکتا۔ اینجینیاں اپنی ہی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ عام لوگوں کو ان کا ظلم نہیں ہونے پاتا۔ ہمارے ملک کی کسی بھی چیز کا ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی معاملہ اینجینیوں کا بھی ہے۔ ہماری اینجینیوں کی کارکردگی دوسرے ملکوں کی اینجینیوں جیسی تو نہیں ہو سکتی۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے ہاں کام چوری اور کرپشن بھی زیادہ ہے۔ لیکن اینجینیاں ہر حال ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھی رہیں۔ اگر وہ بالکل ہی کچھ نہ کرتی ہوں تو یہاں خدو رنج جائے"

میں خاموش رہا۔ یہ واقعی بہت لمبی بحث تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولے "میرا حال یہ ویسے بھی ذرا الگ موضوع ہے۔ ہمارا اصل موضوع وہ کمانی ہے جو آپ میرے پاس لے کر آئے ہیں۔ یہ ایک جاسوسی کمانی ہے۔ ایسا ہی اسٹوری معلوم ہوتی ہے۔ جیسے حیرت ہے کہ اب ہمارا اونچا طبقہ بھی اس قسم کی کمانیوں پر یقین رکھنے لگا ہے۔ یہ باتیں ڈانٹوں کمانیوں اور غلوں وغیرہ میں

”سرا آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ آپ ان معاملات کا مجھ سے بہتر علم رکھتے ہیں لیکن مجھے جو خط موصول ہوا ہے اس میں ایک شخص کی تو غاصے واضح طور پر نشان دہی کی گئی ہے۔“ میں نے انہیں یاد دلایا ”گر اگر آپ سے آپ سیدھے مشرق وسطیٰ روانہ ہو رہے ہیں۔ مجھے موصول ہونے والے خط کے مطابق مشرق وسطیٰ کے ایک ملک کو دو سرابوت نام بنانے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی ”کوآڈی نیرز انٹرنیشنل“ کا بھی اس سلسلے میں نام آیا ہے۔“

حفیظہ صاحب کا سگار تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے خوب صورت سگار بکس سے ہوا کا ایک اور سگار نکال کر ٹکائی لاٹری سے سلگایا۔ میں نے جین اسموکرز توہمت سے دیکھے تھے لیکن نام طور پر وہ سگریٹ پینے والے ہوتے تھے۔ سگار کا جین اسموکر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”سرا بے شک میں ایک بزنس میں ہوں لیکن ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت اور وسعت کے بارے میں آپ یقیناً مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ مثلاً جنرل سوئز جنٹی بڑی کمپنی ہے اس کے مقابلے میں اگر پاکستان سوئزر لینڈ اور ساؤتھ افریقہ کے تمام مالی دساکں کبجا کر لو گے جاسم تب بھی وہ اس کے برابر نہیں آسکتے۔ جب کہ ان میں سے سوئزر لینڈ وہ ملک ہے جہاں دنیا بھر کے بڑے بڑے لوگوں ”سرا بھائی ملک“ ٹیکس چروں اور بڑے بڑے اسمگلروں کے جائز و ناجائز ہر طرح کی کمائی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ کسی ملک کی کر بھی مالی اعتبار سے جنرل سوئز کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ”ڈیج ٹیل“ ایسی کمپنی ہے جو ایران و نیوزیڈ اور ترکی کے مجموعی دساکں سے زیادہ اثاثے رکھتی ہے۔ ”گڈ ایئر ہاؤز“ نامی کمپنی سعودی عرب سے زیادہ دولت مند ہے۔ اسی طرح کوآڈی نیرز انٹرنیشنل اس قسم کی جتنی کمپنیوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔“

فخر صاحب کے چہرے پر اب سرد مری کی جگہ خفیف سی مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر سے ان کا موڈ کافی خوش گوشت تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے اثاثات چھپائے رکھنے اور اپنی شخصیت کے سامنے ایک غیر مرمی سا پردہ اٹانے رکھنے کے عادی تھے۔ اس پر اسے میں سے اگر ذرا سی مسکراہٹ چھن کر باہر آ رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اندر مطلق کافی صاف تھا۔

”آپ ایسے بزنس میں ہیں مسٹر جودہی!“ وہ بولے ”آپ کی معلومات معقول ہیں۔“

”شکریہ سرا!“ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”میرا یہ جہاں اپنے ساتھ خوش حالی لاتا ہے بے شمار مسائل حل کرتا ہے۔ دہائیوں سے زیادہ میرا یہ اپنے ساتھ بے شمار مسائل بھی لاتا ہے۔ اور اس کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ طلب کے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ بس جتنی قسم کی کمپنیاں دنیا کی

کرنے کے لئے آگے آجائے گا۔ بات وہیں کی وہیں رہے گی۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے ”گوئی اور متحد کیا ہو سکتا ہے؟“ فی الحال آپ کی کمائی سے صرف ایک ہی شخص فخر آتا ہے۔ آپ کے ہوٹل، آپ کے کلابز اور ساکھ کی تفصیلات پچھانا اور آپ کے لئے برطانیایں اور آئینیں پیدا کرنا۔ جن کا معلوم اور خطرناک لوگوں کی آپ بات کر رہے ہیں اگر وہ واقعی اتنے ہی ماسلوم اور اتنے ہی خطرناک ہوں تو ان کے پاس بڈسٹرے چڑھاؤں طریقے ہو سکتے ہیں جو زیادہ آسان ہوں گے۔ وہ ہوٹل کو کم سے بھی اڑا سکتے ہیں۔ آپ کو دوسرے کسی چکر میں بھی پھنسا سکتے ہیں۔ مجھے خاص طور پر آپ کے ہوٹل میں قتل کرنا کسی کے لئے بھی کوئی زیادہ فائدہ مند کام نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف ایک سٹسی خیر خیر توہین سکتی ہے اور اس سے توہیدی دیر کے لئے سرکاری اور قومی سطح پر خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔“

میں نے ماحول کے پوچھل میں کو قدرے کم کرنے کی فرض سے مسکراتے ہوئے کہا ”سرا اگر آپ کا جودہا جو سرد جودہا یہی ہے تو پھر آپ کی سیکرٹری کا اتنا زیادہ استہزاء کیوں کیا جاتا ہے؟ میں نے سنا ہے۔۔۔ اور وزیر خان نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ صدر اور وزیر اعظم کے بعد سب سے زیادہ سیکرٹری آپ ہی کی ہوتی ہے۔“

”یہ صرف وقار کی خاطر ہوتی ہے“ وہ بلا تامل بولے ”وزیر خارجہ کسی ملک کی ناک ہوتا ہے۔ کہ کوشش یہی کی جاتی ہے کہ یہ ناک کھٹنے نہ پائے۔ وہ پورے ملک کا دفتر صفا مانی و مطالب اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔ اس کی خصوصی دیکھ بھال تو ہوتی چاہئے۔“

اب ان کے چہرے پر پہلے جیسی سرد مری نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ دل میں دل میں میری بات کو کچھ اہمیت تو دے رہے تھے لیکن بحث و تھیمس کے ذریعے اس مسئلے کو بعض اچھی طرح چھان چھانک لینے کی فرض سے میرے خیال کی ترویج کر رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ قدرے لامنت سے بولے ”بڑے ملک۔۔۔ بڑی طاقتیں۔۔۔ یا ان کے اشدادوں پر کام کرنے والے بہت بڑے بڑے طاقت ور گروہ اور مافیا آپ کی طاقتیں اگر کسی ملک کو سختی دینا چاہتی ہیں یا اسے اپنی مرضی کے مطابق چاہا چاہتی ہیں تو اس کے لئے وزیر خارجہ کو قتل نہیں کرایا جاتا۔ سربراہ ملک کو قتل کرنا جاتا ہے یا کسی اور طریقے سے راستے سے تاراج کیا جاتا ہے یا پھر لمبی منصوبہ بندی کے ذریعے اس ملک کو سیاسی و معاشی غلام بنایا جاتا ہے۔ اور ایسی کمپنیاں اور اس قسم کے دوسرے گروہوں کے ذریعے اسے اپنا محتاج اپنا دست گھر بنا کر بیٹھ کے لئے کسی دیکھو میں جکڑ لیا جاتا ہے کہ وہ کبھی نکلنے نہ پائے۔“

بالوں میں بانٹ لیا ہے تاکہ دنیا بھر میں آپس میں دست بہ گرمی رہے۔ صرف وہ چند ممالک آپس میں سمجھتی نہ تھیں، ایک دوسرے کو کچھ نہ کہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے ذرا ایک دوسرے پر آنکھیں نکالتے رہیں، ایک دوسرے کو گیدڑ جھمکیاں دیتے رہیں لیکن درحقیقت یہ صرف دوسروں کی سرزمین کو میدان کارزار بنانے رکھیں اور دوسری قوموں کے افراد ان کی پیچھے ہوتی جنگوں کا اندھ من بنے رہیں۔ اس صورت حال کو اب پرانے اسکولوں کے بچے بھی سمجھتے ہیں لیکن تمام جموں ملکوں کے بڑے بڑے مرد بھی قی کر تپائی و بد حالی کے اس گڑھے سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے۔

"مجھویوں کی فوجیں بہت مضبوط ہیں مشرعوں کی! حفظ صاحب فھرے فھرے لیے ہیں والے" چوبے اور اودھر مانگنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر چوبے دان بڑی خوب صورتی سے تیار کیے گئے ہیں۔ پھر چوبے کی اپنی نا اقلیات ہیں بھی۔ لیڈر شپ کے جھگڑے بھی ہیں۔ کرپشن بھی ہے۔ دولت کے لئے بک جانے والے اور ہر کام کر کرنے والے بے مشرعوں بھی ہیں جو اپنی ہی قوم اپنے ہی ملک کی چیزیں کھو کھلی کرتے رہتے ہیں۔ اچھائی کی قومیں خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں وہ برائی کی ان تمام قوتوں کو یکدم صاف کر کے اس دنیا کو صاف ستھری، پرسکون اور تیز چل بھی نہیں سکتیں۔ بڑی قومیں اپنا کام کئی رہتی ہیں، اچھی قومیں اپنا کام کئی رہتی ہیں۔ دنیا کا کلام اس طرح چلا رہا ہے۔"

"مجھے آپ کی بات سے اختلاف نہیں ہے" میں نے کہا "میں بھی اچھائی کے ہاتھ مضبوط کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ میرے لئے میرا کا دھار یا ساتھ بھی اتنی اہم نہیں ہے جتنا میری نظریں آپ کا مشن اہم ہے۔ میں اس مشن کی جزئیات اور تفصیلات سے واقف نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے اور ہمارے برادر ملکوں کے مفاد میں ہیں لیکن میں ممکن ہے کہ بظاہر ہمارے ہر دور نظر آنے والے کسی ملک نے یہ کو آڑی نیزہ اتر پھینکا ہو" کو چھل دی ہو" مگر میں گنل رہا ہو کہ حفظ صاحب کو اس مشن سے مدد دیا جائے کیوں کہ آپ کا مشن کا سیلاب ہونے کی صورت میں اسلئے کی تجارت کے بہت سے پول کھلے گا بھی اندیشہ ہے۔ ایک ہی ملک بعض اوقات دو مختلف متضاد گروہوں کو اسلئے چلاتی کر رہا ہوا ہے لیکن دونوں جگہ اس نے مختلف نتائج بہن رکھی ہوتی ہیں۔"

ملٹی پلش کمپنیاں ہی ان کی تھیں ہیں۔

"کسی حد تک آپ کے تجزیہ درست ہیں مشرعوں کی!" فخر صاحب پہلو بدل کر بولے "میں میں ملک نہیں کہ ملٹی پلش کمپنیوں کی خوفناک سرگرمیاں اپنے اصل کاروباروں سے سمجھ زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اسلئے کی تجارت میں بعض کمپنیوں کے کردار بھی مجھے علم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کمپنیاں بہت سے ملکوں

سیاست پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مختلف مقامات پر اسلئے کی ضرورت پیدا کرتی ہیں پھر اس کی چٹائی کا بندوبست بھی کرتی ہیں۔ ان کے ایجنٹ دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، خود کو بڑی اور ارب پتی ہیں۔ میں اپنے کھلی رازداری میں نقل نہیں رکھتا اور نہ ہی اس موضوع پر آپ کو کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے جس حد تک اشارہ ملا ہے اس حد تک بات ضرور کروں گا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک انتہائی اہم مشن پر مشرق وسطیٰ جا رہے ہیں۔ آپ ایک ایسا منصوبہ لے کر جا رہے ہیں جو مشرق وسطیٰ کے ایک ملک کو دو سرادیت نام بننے سے بچا سکا ہے۔ اس طرح تو اسلئے کی کچھ کا ایک بڑا میدان تیار ہونے سے روکا جائے گا سر اور آپ کو معلوم ہی ہے اسلئے کی تجارت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منافع بخش صنعت ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کا یہ مشن کسی طاقت کو اور اس کی وجہ سے کو آڑی نیزہ اتر پھینکا کو بالکل پسند نہ ہو۔"

یہ بات میں انہیں شروع میں ہی بتا چکا تھا لیکن اس وقت وہ اکثرے اکثرے سے تھے اور اب بات ذرا تفصیل سے دہرائی تھی۔ اب وہ ذرا خیال نظروں سے میری طرف نہ کھینچ رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سر! یہ درست ہے کہ ایک وزیر خارجہ راہ سے بہت جائے تو ملک کی پالیسیاں تبدیل نہیں ہو جاتیں، پالیسیاں حکومتوں کے ساتھ تبدیل ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو حکومتوں کے ساتھ بھی تبدیل نہیں ہوتیں۔ لیکن پھر بھی آپ جیسی شخصیت کے منظر عام سے بننے سے ایک خلا پیدا ہو جائے گا جو فوری طور پر پُر نہیں کیا جاسکے گا۔ ممکن ہے یہ منصوبہ بڑے بڑے لے کر جا رہے ہیں" صرف آپ کے اپنے ہی ذہن کی تحقیق ہو۔ اسے زیادہ تر آپ نے صرف اپنی ہی کلاشوں سے مکمل کیا ہو۔ اس لئے اس کی باریکدوں کو بھی صرف آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ خدا نخواستہ اگر آپ کسی سازش کا نشانہ بن جاتے ہیں تو کم از کم وقتی طور پر تو منصوبہ ختمی ہو جائے گا۔ بلکہ شاید پھر بھی اس پر عمل درآمد نہ ہو سکتے۔ دونوں صورتوں میں ان نامعلوم طاقتوں کو مشرق وسطیٰ میں اپنا کھیل شروع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جنگ کا مظہر ایک بار برقی سے باہر آجائے تو پھر اسے قابو میں کرنا کسی کے بس کی بات نہیں رہتی۔"

وہ بدستور خاموش تھے۔ بس سار کے ہلکے ہلکے سس لے جا رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سب کو معلوم ہے کہ بڑی طاقتوں نے تمام جموں اور ترقی پذیر ملکوں کو جاگیر کی طرح آپس میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اب کوئی انھیں چھپی بات نہیں کہ بعض ملک تو علی الاعلان ان کی کالونیاں بنے ہوئے ہیں اور بعض بظاہر بڑے شیر بنے رہتے ہیں لیکن درپردہ وہ بھی ان کے سامنے کھینچتے رہتے ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر ہر خطے پر قوم کو د

دور سرکیں ہو گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں نے کہا تاکہ وزیر خارجہ پر ملک کی ناک ہوئے اور اس کے قتل کیا گیا تو اس کی بڑے پائے پر نمائندہ قسم کی تحقیق ضروری ہوگی خواہ اس کی تفصیلات اخبارات میں آئیں۔ ہماری ایجنسیاں خواہ کتنی ہی ست، ہائی اور گہرے جاتی ہوں لیکن وہ اتنی ہی گہری بھی نہیں ہیں کہ وہ کچھ کر سکیں۔

میں نے تحقیق کا کوئی نہ کوئی سرا اس ملٹی نیشنل کمپنی تک ضرور پہنچے گا اور کسی نہ کسی ایجنسی کی رپورٹ میں اس کا نام ضرور آجے گا۔ اس بات کو نہ تو کچھ بے پرواہی ہے اور نہ ہی اس کی پڑ پڑی کے والے ممالک۔ ان کے وٹنڈے خواہ کچھ بھی ہوں

وہ بہت نیک نام رہتی ہیں۔ اپنی نیک نامی پر وہ گورنوں والے کرما خرچ کرتی ہیں۔ پریس کو خوش رکھنے کے لئے گورنوں، اشتہارات دیتی ہیں۔ خود اپنے انہوں نے سیکڑوں اخبارات رساں نکالے ہوئے ہوتے ہیں۔ بی وی جمل خریدے ہوئے ہیں۔ سیکڑوں دفاتر ٹرسٹ اور ادارے ان کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ وہ کبھی بداشت نہیں کر سکتیں کہ کسی ملک وزیر خارجہ کے قتل کی تحقیق رپورٹ میں اس کا نام آئے اور بھی ایک ایسا وزیر خارجہ جو بہت اہم اس شخص پر چارہ تھا۔"

"سرا میں نے عرض کیا کہ ضروری نہیں آپ کا قتل و قتل نظر آئے آپ کا نظریہ ہے کہ کسی کو قتل کرائے کے۔ صرف ڈائریکٹیشن ہوتا ہے یعنی بس غماہ کر کے گولی مادی ہے" میں نے کہا "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر مہتر پر ایسا ضروری نہیں ہوتا۔ خدا نخواستہ آپ کو ہارٹ ایٹک بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں براہ باقاعدگی سے اپنا میڈیکل چیک اپ کرانا ہر میرا آئندہ ترین میڈیکل چیک اپ بچھلے ہفتے ہی ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ میرا دل اتنا ہی صحت مند ہے جتنا کسی میں سا۔ فوجیان کا ہر سکا ہے" حلیہ صاحب نئی کلی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"ڈاکٹر کو آپ کو تو نہیں بتایا ہو گا کہ آپ پر زہر اثر نہیں ہو سکتا؟" میں نے سادگی سے کہا۔ "جی ہاں یہ بھی کہ صاحب کے مدخل نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا انسان جتنے اونچے عہدے پر فائز ہوتا ہے اتنی زیادہ اسے جان کا محاذ کا گہرا رہتا ہے۔ اسے اگر کوئی جھوٹے سے بھی جا کر آجے کہ اس کے قتل کی سازش ہو رہی ہے تو وہ خوف سے اچھا پڑتا ہے" اس کے یوں کہنے سے زمین ٹھل جاتی ہے اور وہ اپنی حفاظت کے ذمے دار افراد میں ایک ایسا برا کھتا ہے "آسمان پر اٹھاتا ہے۔"

لیکن میں تو مسلم ہی تھا۔ حلیہ صاحب جین کر کے لے جاتی نہیں تھے کہ کوئی انہیں قتل کرنے کی سازش کرے گا۔

میں کہہ رہی تھی اور خیر فروش سیاست دان تیار کرتی ہیں، انہیں پالتی ہیں، مقبول ہونے کے لئے انہیں حکمت عملیاں تیار کر کے دیتی ہیں، انہیں ایکشن لڈا دیتی ہیں، ان کے لئے ہر طرح کی سہا یہ کاری کرتی ہیں اور بعد میں یہ سب کچھ ان کی قوموں اور ان ملکوں سے منسوب و موصول کرتی ہیں۔"

فسر صاحب اب کچھ بھلے پر آمادہ نظر آ رہے تھے تاہم اب بھی وہ بہت فسر فسر کر ایک ایک لفظ کو توڑتے ہوئے بڑے محتاط اور مخصوص ڈیپلویٹک انداز میں بول رہے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سلسلہ کلام بدلا دیا "جس قسم کے مشن میں جا رہا ہوں، مجھے اس سے روکنے کے لئے "کو آڈی نیرز انٹر نیشنل" یا اس کی پشت پناہی کرنے والے ملکوں کے سامنے بہت سے طریقے ہو سکتے تھے۔ ہم پر سیاہی ڈالنا چاہتا تھا۔ کسی بھی طریقے سے ہمارے اور ہمارے برادر ملکوں کے درمیان ٹانگہ نہیں پیدا کی جا سکتی تھی۔ مجھے بہت ہماری دشمنی کی پیشکش کی جا سکتی تھی جس کا حساب سن کر میری عمر بھر کی اصل پسندی اور دیانت داری ڈنگا جاتی۔ اور کئی طریقے ہو سکتے تھے۔ لیکن مجھے قتل کرنا ان کے لئے محض دور سر ہو گا۔"

"وہ کیوں؟ میرے خیال میں تو یہ شہادت کت ہے۔ کیوں کہ ان کے پاس وقت کم ہے، پریس تو آپ روانہ ہو رہے ہیں" میں نے کہا۔

ان کے ہونٹوں پر مہماندہ سی مسکراہٹ کی رشت نمودار ہوئی۔ "مسٹر جوری! مجھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ اس قسم کی خاموشی کر ہمارے مشن کا عین وقت پر پتا چلا ہو گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دنیا کے جاسوسی کے سب سے بڑے اور بہترین ادارے ان کے لئے خدمات انجام دیتے ہیں۔ ہم جیسے ملک میں تو کسی منصوبے پر ایسی کاغذی کام شروع ہوتا ہے تو انہیں پتا چل جاتا ہے خواہ ہم کتنی ہی راز داری برت لیں۔ انہیں جو کچھ کرنا ہو آپ اس کے لئے وہ بہت پہلے سے کام شروع کر رہے ہیں۔ بہت لمبی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور وہ بڑے سب سے نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ اب جیسے یہ شرق وسطیٰ میں نت نئے ناسور پیدا کرنے یا یہاں ایک نیا دہشت گردانہ کام کا مسئلہ ہے اس پر بھی بہت پہلے سے کام ہو رہا ہے۔ اگر فی الحال مجھ جیسے کچھ لوگوں کی کوششوں سے یا کچھ سربراہان حکمت کی سمجھ داری سے یہ مسئلہ حل بھی کیا جاتا ہے تو اس منصوبے کو منسوخ نہیں کریں گے۔ خواہ کتنی ہی ست رفتاری سعی، لیکن اس پر کام جاری رہے گا۔ خواہ اس دوران حالات کے مطابق اس کی شکل بدل جائے اس میں بہت سی تبدیلیاں آجائیں لیکن پانچ سال، دس سال، حتیٰ کہ چند ہی سال بعد بھی کسی نہ کسی طرح اس پر عمل ضرور ہو گا۔"

"لیکن وہ بات پھر بھی مددگی۔ آپ کا قتل بھلا ان کے لئے

ہے۔ ان کا سارا زور بیان اور دلیلیں میرے اندیشوں اور میری اطلاعات کو غلط ثابت کرنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ تاہم وہ بات کافی حد تک محض اور شفقت سے کر رہے تھے ورنہ شاید میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چلا آتا۔ شاید وہ میرا حوصلہ آزار رہے تھے کہ میں اپنے موقف کو اپنے اندازوں پر قائم رہنے کے سلسلے میں کتنا مستقل مزاج ہوں۔ بعض لوگ اس طرح بھی کسی کی بات کے وزن کا اندازہ کرتے ہیں۔

ایک بار پھر وہ میرا نہ سے انداز میں بولے "مسلحہ بدوی! آپ ایک بڑے بدشمن ہیں۔ آپ کو فاسق وقت میر تو نہیں آتا ہو گا۔ لیکن اگر کبھی قصور سے فرصت میر آجائی ہے تو اس میں آپ انسانی انجینئرز کی کمائیاں تو نہیں پڑھتے؟ ان میں بڑی دور کی کوڑی لاکھ جاتی ہے۔ مثلاً سی آئی اے ایجنٹ نے کسی ڈیکٹر کے جوتوں پر پڑھنا پانچ سو چھترک دیا جس کے اثر سے اس کی سوجھیں اکڑ کر گر پڑیں اور اس نے پٹ سے گر کر دم توڑ دیا۔ یا پھر کسی جلی ایجنٹ نے کسی بادشاہ کے پسندیدہ جیوگم کے ڈبے میں ایک زہریلا جیوگم شامل کر دیا جس سے اس کے دانت نکل کر گر پڑے اور آتشیں ایک دوسرے سے گڑھ ہو گئیں۔ یہ سب خیالی پلاؤں ہیں۔ چودری! یہ لوگوں کو دقت گزاری اور تفرقہ میا کرنے کے ذرائع ہیں۔ رانگ بیٹے اس قسم کی کمائیاں سوچتے رہتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر لوگوں کو دقت کچھ اچھا گزر جاتا ہے۔ وہ اپنے مسائل سے دور کے لئے زہار حاصل کر کے منشی بخری کی ایک انوکھی دکان میں پلے جاتے ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے لوگوں کو حقائق کی دنیا میں رہنا پڑتا ہے۔ خصوصاً میں تو بچپن میں بھی اس قسم کے گھٹن اور غلوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔"

"سرا! میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے آخر کار ٹھہرے ٹھہرے لیے میں کیا۔ غیر ارادی طور پر میرے لیے میں بکلی سی سو مری بھی در آئی۔" بعض اوقات ساری دلیلیں "سارے جواز انسان کو دھوکا دے جاتے ہیں اور وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کی کوئی دلیل کوئی جواز نہیں ہوتا۔ ساری منطق دھری رہ جاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں دلیلاں اور منطق سے زیادہ اپنی حیات پر بھروسہ کیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میری حیات نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ آپ ایک اچھے آدمی ہیں۔ میں آپ کے وعدے کی وجہ سے نہیں، آپ کی اچھی شہرت کی وجہ سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔ میرا عقائد مشوہ ہے کہ آپ منطق، دلائل اور اپنی معلومات پر زیادہ انحصار نہ کریں۔ آپ میری بات مان لیں۔ میری

حیات پر بھروسہ کر لیں۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان تو نہیں ہے۔ میری حیات مجھے بتا رہی ہیں کہ مجھے موصول ہونے والی اطلاعات غلط نہیں ہیں۔ میں فدا میں سازش کی تو محسوس کر رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ کو کس طرح قتل کرنے کی

کوشش کی جائے گی۔ خواہ اسے آپ میرا وہ ان کہہ لیجئے۔ "کس طرح؟" انہوں نے ایک لمبے کے گھرے سکوت کے بعد پوچھا۔ اب ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے الفاظ ان کے منطقی پسند چہرے دل میں اتر چکے تھے۔ "آپ کو پارٹ ایک کے ذریعے "قتل" کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کوئی اسے قتل کرے ہی نہیں سکے گا۔ اس نے تحقیقات قضیہ اور دوسرے لمبے چکر کی نوبت ہی نہیں آئے گی" میں نے پرتین لمبے میں کہا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟" وہ ایک لمبے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آواز اب سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "میں آخری وقت پر تقریب کی جگہ بدل لیجئے۔ ذریعہ ہوٹل کے بجائے کسی اور جگہ۔ انتہائی رازداری کے ساتھ کراچی میں۔ انتظامات میں بھی کرا سکتا ہوں۔ بالکل آخری لمحے میں مسافروں کو اس تہذیب سے مطلع کیا جائے" میں نے تجویز پیش کی۔

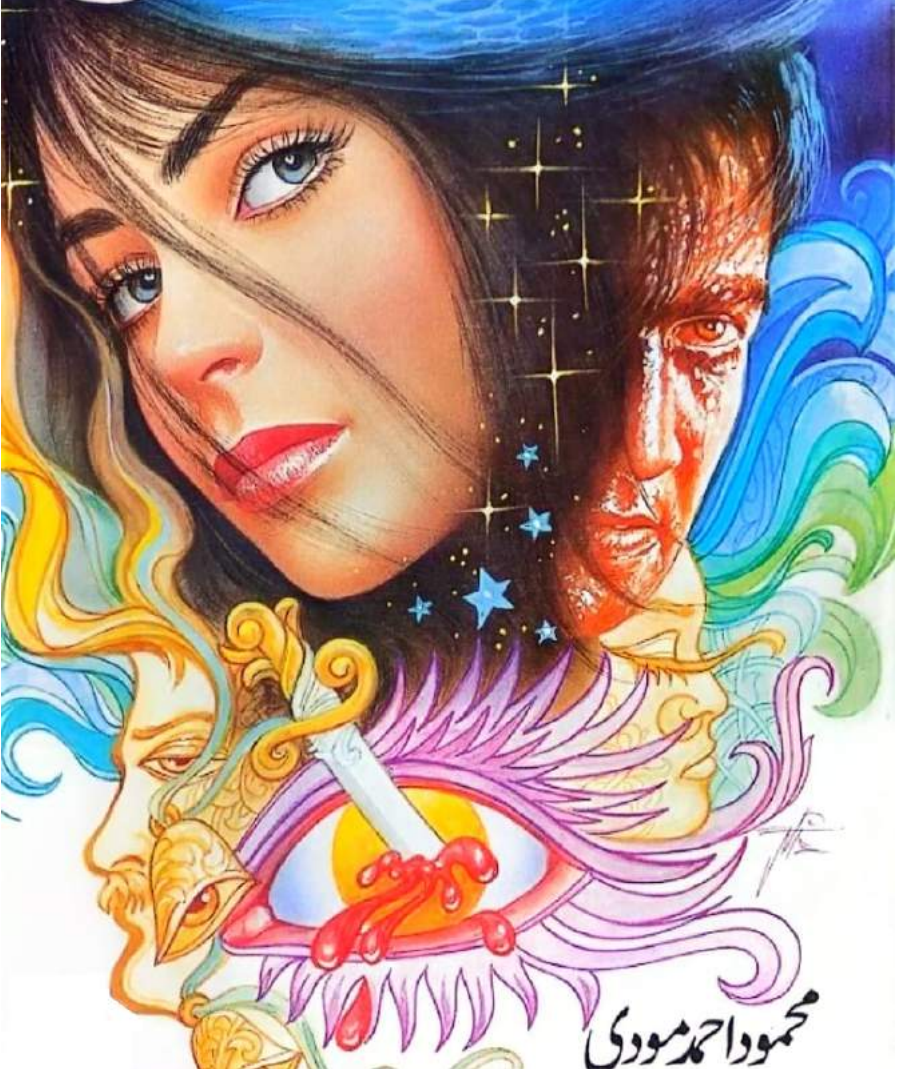
"اے مکن" وہ فیصلہ کن لمبے میں بولے "جس طرح کے لوگ اس تقریب میں آ رہے ہیں ان کے ساتھ اس طرح نہیں کیا جاتا۔ یہ ذاتی طور پر میرے اور میرے ملک کے وقار کے بھی خلاف ہے۔ ذریعہ میں بڑے ٹکوں کے سفارت کار اور بعض ٹکوں کے ڈرائیو خارج بھی موجود ہوں گے۔ سب کو اندازہ ہو جائے گا کہ سیکورٹی کے مسئلے کی وجہ سے جگہ تبدیل کی گئی ہے۔ وہ دل میں نہیں گئے کہ ہم ایک تقریب کے لئے سیکورٹی کے مسائل سے نہیں نمٹ سکتے اور ایک امن مشن نے کروڑوں کے ایک اہم نفلے میں امن قائم کرانے بارے ہیں۔ ہمارے مقام و منزلت کے اعتبار سے یہیں ہونا نکل جائے گی۔ اس معمولی سی بات کے "میرے مشن پر بہت بڑے اثرات مرتب ہوں گے۔"

"تو پھر میری دوسری تجویز مان لیجئے۔ وہ کہ کم از کم آپ اس تقریب میں نہ کوئی چیز کمائیں نہ بچیں۔ چکیں تک نہیں۔ حتیٰ کہ پانی بھی مت پئیں۔ خرابی صحت کا باعث کر لیں۔ کچھ بھی کر لیں" میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دہے ہوئے سارے دعوے کی کٹی سی ٹھیکر ایریز کنڈیشن کر کے شک فضا میں بند ہو رہی تھی۔

نشدت کی جگہ آئے تھے۔ راستہ تو یہ کہ ایک سیکورٹی مسافر کی سیکورٹی کو اپنا جوار رکھنے کا ہوا۔ فاضل مسافر جتنے جتنے ملک کے باشندے ہیں۔

سکس



محمود احمد مودی

گئی لہوں کی خاموشی کے بعد آخر کار مسٹر صاحب مری
سائس لے کر ہوئے۔ ”مسٹر چوہدری! تقریب ہونے والی نہیں ہے۔
ایک بڑی سی میز میرے ساتھ بہت سے خاص سفارت کار کھائے
پیتے ہیں مشغول ہوں گے باقی اس پاس دوسری میزوں پر ہوں
گئے اگر میں کھائے پیتے سے ایسا زبردست پرفیئر کروں گا تو اس
بات کو بھی نوٹ کیا جائے گا۔ غیر ملکی پریس کے نمائندے بھی وہاں
موجود ہوں گے ویسے تو خوشے چھوڑنے میں اپنا پریس بھی کچھ کم
نہیں لیکن غیر ملکی پریس تو خصوصاً اس میں مسٹر کا پہلو نکال لے
گا۔ وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مسئلہ سیکورٹی کا ہے۔ چھوٹے ملکوں
کی تو ہر چیز انہیں ویسے ہی مشکوک نظر آتی ہے۔ یہ تو گویا انہیں

لطیفہ ہی ہاتھ آجائے گا کہ وزیر خارجہ صاحب اسے ڈرے ہوئے
تھے کہ کسی چیز کو چھو تک نہیں رہے تھے۔ یہ تدبیر بھی ہمارے لئے
اتنے ہی مسٹر کا باعث بنے گی جتنا کہ تقریب کی جگہ بدلتا۔“
پھر وہ اپنی اپنی کئی نہایت خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ
ہوئے۔ ”آپ کیوں ہم فریبوں کا مسئلہ اٹھانا چاہتے ہیں؟ آپ
کے اس فریب سے ملک کا یہ فریب سا وزیر خارجہ پہلی بار اتنا بڑا
مشن لے کر باہر جاتا ہے؟ آپ اس کے سفر کا آغاز ہی طرہ مسٹر
سے کروانا چاہتے ہیں۔“
”کچھ دیر کے مسٹر کے عوض اگر ایک جیتی جان بیج جائے تو
سودا مگنا نہیں ہے سراسر“ میں نے کہا۔ ”میرے حال۔۔۔ یہ تجریز بھی اگر

آپ کے دل کو نہیں لگتی تو پھر آپ ہی بتائیے کہ آپ کی جان کی حفاظت کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے؟
”میرا خیال ہے ہمیں اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے۔“ مسٹر صاحب بولے۔

”اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی یہی ہے کہ پہلے ہم اعتقاد کریں۔ اس کے بعد توکل کریں۔“ میں نے ملائحت سے کہا۔ ”اللہ پر توکل کر کے اگر ہم ایک مہینے کو دیر یا پچیس برس کے سامنے آجائیں تو یہ کوئی ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی زندگی اور موت دینے والا ہے، ہر چیز پر قادر ہے لیکن ہم جیسے گناہ گاروں کو اپنے لئے عجوبوں کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔“

وہ ایک بار پھر چند لمحوں کے لئے سگار کا کش لیتا بھول گئے۔ ایک منگ میری طرف دیکھتے رہے۔ ان کی ہنس سی مسکراہٹ گویا ان کے ہونٹوں پر جم چکی ہو کر وہ لگتی تھی۔ شاید وہ یکدم میرے لمبے میں موقوف نہ رہ سکے بلکہ آئے پر حیران تھے لیکن وہ انہی لوگوں میں سے تھے جن کی آنکھوں سے ان کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

آخر کار وہ طویل سانس لے کر بولے۔ ”مسٹر جی ہدیری! تجاویز پیش کرنے کے معاملے میں آپ کا ذہن بہت زور خیز ہے۔ آپ کو کوئی ایسی تجویز پیش کیجئے جس سے ضیافت کے انتظامات میں وقفہ برابر بھی تبدیل نظر نہ آئے اور خطروں بھی نکل جائے۔ اگر واقعی کوئی خطرہ موجود ہے۔“

انہوں نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ ایسے آدمی بھی نہیں تھے کہ جس پر زور ڈال کر یا سخت دبیہ اختیار کر کے میں کوئی بات منوا سکا اور اس پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ میں سوچتا میری طرف سے وہ جنم میں جائیں، زندہ رہیں یا مر جائیں، مجھے اس سے کیا۔ میں فی الحال انہیں اتنا قائلو قرار دیتا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد بظاہر ہلکتے خورہ سے

انداز میں طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بہت بہتر حفظ صاحب!

فی الحال تو کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہیں آ رہی۔ لیکن ابھی کچھ وقت

باقی ہے۔ میں اس سلسلے میں غور کروں گا۔ میں کو شش کروں گا کہ

کراچی میں تقریب سے کچھ دیر پہلے جب آپ میرے ہوٹل میں

مختصر قیام کے لئے تشریف لائیں، اس وقت آپ سے ملاقات

کر سوں۔ اس وقت تک میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ اگر آخری لمحوں میں میں

آپ سے کوئی بات کہوں تو ضرور مان لیجے گا کیونکہ اس وقت بحث و

جددیں اور دلیل کا وقت نہیں ہو گا۔ ہو سکتا ہے ذرا تقریروں کے

دوران ہی مجھے آپ کو کوئی اشارہ دینا پڑے، آپ سے سرگوشی میں

کچھ کہنا پڑے۔ براہ کرم میرے اشارے کو نظر انداز مت کیجئے گا۔

میری سرگوشی کو کسی ان معنی مت کیجئے گا۔“

”تو کیا آپ تقریب میں موجود ہوں گے؟“ مسٹر صاحب نے

مسنوی حیرت سے پوچھا۔ میں نے پہلی بار ان کے لمبے میں ایک خفیف سی شرارت چھپی محسوس کی اور حیرت سے سوچے بغیر نہ سکا کہ کیا واقعی ان میں تو کوئی بہت حس مزاجی ہوتی تھی؟

”جی ہاں۔“ میرا وہاں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔“ میں نے

جواب دیا۔ پھر میں جانتے بغیر نہ سکا۔ ”آپ کی اس تقریب کے

لئے مجھے بے زاری خود آخری لمحے تک سر کھپانا پڑے گا اور اپنا چہرہ

وقت صرف کرنا پڑے گا جبکہ آپ کی نظر میں اس سارے سلسلے کی

کوئی اہمیت ہی نہیں۔“

”آپ نے کیسے محسوس کر لیا کہ میری نظر میں اس سارے

سلسلے کی کوئی اہمیت نہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔ میں نے محسوس کر

کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ڈرا کر مئی مورچہ بھی لیکن میں نے

اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ میرا وہ تھا۔

”آپ کی باتوں سے تو میں ظاہر ہو رہا ہے سراسر۔“ میں نے ملائحت

اور مڑبانہ لہجے میں کہا۔ ”میں تو اس سازش کی خبر دیتے ہی جس

طرح بے چین و مضطرب ہوا تھا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ آپ سے

فوری ملاقات کے لئے مجھ میں نے جو جتن کئے وہ مجھے ہی معلوم

ہیں۔ یہ محسوس میری خوش قسمتی یا شاید غلطی تھی تھا کہ میں نے

ذخیر خان صاحب کو صوبہ کلکتہ میں سے میری پہلے شناسائی تک

نہیں بھی۔ سراسر میری نظر میں آپ کی ذات قوم کا ایک قیمتی اثاثہ

ہے اور آپ کا ذہن ملک کی امانت ہے۔ میں۔۔۔ کی جذبات دل میں

لئے میں دوڑا چلا آیا تھا لیکن میری بچہ نگہ کوئی سرکاری یا سیاسی

حیثیت نہیں ہے، شاید اس لئے میری باتوں کی آپ کی نظر میں کوئی

اہمیت نہیں ہے۔ آپ کی سطح کے لوگ شاید صرف خیر ایجنسیوں

ہی کی اطلاعات پر یقین کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔“ میرے الفاظ

کی نوعیت کچھ جذباتی ہی تھی لیکن میں نے اپنے لہجے میں جذباتیت

نہیں آنے دی تھی اور نہ ہی کھردرا پن پیدا ہونے دیا تھا۔ میں چاہتا

تھا کہ میرے دل میں جو کچھ ہے وہ بھی کہہ جاؤں اور وہ زیادہ بڑا بھی

نہ مانتا۔ میری ان سے پہلے ملاقات تھی۔ مجھے کچھ زیادہ تجربہ

نہیں تھا کہ اس سطح کے لوگوں سے نمٹتے و شنید کے جواب کیا

ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن عموماً کس نہج پر سوچتے ہیں۔ میں اس پہلی

ہی ملاقات میں کوئی کنیڈ کی یاد مزیں پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے

بے جا سے ذخیر خان کا بھی خیال تھا جو قاتل سرائیو کے باوجود

میری ہمدردی میں میرے ساتھ چلا آیا تھا اور اب بیٹھا ہے چینی

سے پولیوڈل دیا تھا۔ شاید اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ میں عزیز صاحب

سے اس کے بھی تعلقات کنیڈ نہ کرادوں۔ میں اسے نیکی کے

غرض کیجھتا رہا۔ میرے ملے ملا نہیں چاہتا تھا۔

خلافہ توقع میری تقریر خاصی دل پذیر ثابت ہوئی۔ پہلی بار

میں نے حفظ صاحب کی مسکراہٹ کو محفلات کے قلم سے آواز

ہوتے دیکھا۔ وہ کھل کر مسکرائے اور ان کی آنکھوں نے بھی اس

مسکراہٹ کا ساتھ دیا۔ صرف یہی نہیں، انہوں نے پروٹوکول کا

وہیں ملوں گا۔ آج شام ہی ہم کراچی روانہ ہو جائیں گے۔
 "تیار کیا کرتی ہے کئی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں
 تیاری تو ذہنی ہوتی ہے۔ اور ذہنی طور پر ہم اس وقت ہی تیار
 ہو گئے تھے جب حفیظ صاحب کے سامنے ہائی کمری تھی۔ آپ جب
 بھی حکم کریں گے میں اتر پورٹ پہنچ جاؤں گا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "ویسے آپ نے
 ٹھیک ہی کہا تھا۔ فخر صاحب ہیں واقعی بڑے ٹیڑھے آدمی۔ انہیں
 قائل کرنے میں مجھے تو دنوں پہلے آگئے۔"

ذخیر خان پہلو بدل کر بولا۔ "بات ہی کچھ ایسی تھی۔ لیکن فخر
 کیجئے آپ کے سامنے تو وہ بھر بھی بہت آسان ثابت ہوئے۔ آخر
 میں تو ان کا مدد دیکھ کر میں حیران ہی رہ گیا۔ وہ آپ کو 'برخوردار'
 اور تم کو کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ برخوردار تو انہوں نے شاید کبھی
 اپنے گھر سے بیٹے کو بھی نہیں کہا ہوگا۔ آپ کے ساتھ وہ جس طرح
 پیش آئے، یہ ایک انجینی کے لئے ان کا سب سے زیادہ مہربانی اور
 گرجوئی کا سلوک تھا۔ یہ انداز تو وہ کئی سال کی شناسائی کے بعد
 اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ سچ سچ میں آپ کے لیے میں سرکشی بھی
 جھٹکتی رہی جسے آپ دبانے کی کوشش کرتے رہے۔ صاف ظاہر
 ہوا تھا کہ آپ زبردستی اپنا لوجہ مٹوانہ دیکھنے کی کوشش کر رہے
 ہیں۔ فخر صاحب ان باتوں کا سراغ پانے کے معاملے میں بڑے
 حساس ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ آپ کے سامنے انہوں نے کوئی مزہ
 عمل ظاہر نہیں کیا۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بھی غلوں میں کمال ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم
 دل میں غلوں کے لے کر انہی کی ہمدردی میں وہاں گئے تھے۔ جب
 بات میں غلوں شامل ہو تو وہ ضرور دل پر اثر کرتی ہے۔ ہر حال
 انہوں نے میری بات کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی میں توقع کر رہا
 تھا۔"

"اس سطح کے لوگوں کی نفیات کو شاید آپ زیادہ نہ سمجھتے
 ہوں۔" نرنی خان بولا۔ "یہ بیک وقت متضاد کیفیتوں کا شکار رہتے
 ہیں۔ اس قسم کی خبریں کریہ انداز سے بے پناہ خوفزدہ بھی ہو جاتے
 ہیں۔ موت کا تصور انہیں عام آدمی کی نسبت کہیں زیادہ دہشت
 زدہ کرتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب یہ اپنے ارد گرد بچیلے ہوئے
 حفاظتی انتظامات کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی ہلاک نہیں
 کر سکتا۔ بلکہ بعض ایسی شخصیتیں جو حفیظ صاحب سے بھی زیادہ
 اونچے مقام پر ہوں، وہ تو بعض اوقات لاشعوری طور پر شاید اپنے
 آپ کو غیر فانی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ جیسی تو یہ عالم ہے کہ آپ
 دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔۔۔ آپ کو بے شمار ایسے لوگ نہیں گئے
 جو زندگی بھر ایسی حرکتیں کرتے رہے، ایسے اقدامات کرتے رہے
 جیسے انہیں دہم و مہم و مہم تک نہ ہو کہ ایک روز انہیں بھی ہر حال
 موت آئے۔ اور انہیں ایک بہت سی ادنیٰ عدالت میں پیش ہونا
 ہے۔ یہ مقام و مرتبہ بھی عجیب چیز ہوتے ہیں چودھری صاحب!

پانڈر چنگائی کی طرح ہوتا ہے۔ انسان بڑے جوش و خروش سے
 قوت صرف کر کے چمکتا ہے اور بھی محسوس کرتا ہے کہ فاصلہ بہت
 آہستہ آہستہ ملے ہو رہا ہے۔ جوانی کا زمانہ گویا کچھ عرصہ پہاڑ کی
 چوٹی پر کھڑے رہنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ وہ ساری
 عمر کوئی بلندی پر کھڑا رہے گا۔ دنیا اسے خلیب میں دکھائی دیتی ہے۔
 مسائل سچ نظر آتے ہیں۔ اور عمر کی آگ آگاز ہوتا ہے تو گویا ڈھلان
 کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی جگہ رکے رہنے کی بہت
 کوشش کرتا ہے۔ بہت چاہتا ہے کہ اس کے پاؤں چوٹی پر ہی رہے
 رہیں۔ اس کے لئے ہر جتن کرتا ہے۔ محروقت کا مغرب اسے
 ڈھلان کی طرف دھکا دے چکا ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں نیچے نہیں
 پاتے۔ اور جڑ عمری سے بڑھاپے تک کا دور تو وہ ہے جب انسان
 ڈھلان پر اپنے ارادے و اعتبار کے بغیر جس لڑھکے چلا جا رہا ہوتا
 ہے۔ اور گرد کا سفر بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔ بس یہی احساس
 رہتا ہے کہ فاصلہ بہت تیزی سے ملے ہو رہا ہے۔ چند برسوں میں
 بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ میں عمر کے اسی دور سے گزر رہا ہوں۔ دنیا تو
 وہی کی وہی ہے مگر میرے لئے بہت بدل گئی ہے۔ چند برس میں بہت
 فرق پڑ گیا ہے۔"

ایک لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ "آپ نے بات بہت
 دل نشیں انداز میں کی ہے اور میری سمجھ میں آگئی ہے۔ ویسے مجھے
 امید نہیں ہے کہ کراچی میں فخر صاحب کی تقریب میں ہمیں
 بارہوا، 'فائرنگ'، افغان یا کسی اور خطرناک صورت حال سے
 واسطے بڑے کا لیکن اگر آپ ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار محسوس
 نہیں کر رہے تو میں آپ کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کروں گا۔"
 "نہیں۔ نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میرا اتنی لمبی تقریر
 کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اس ڈسے داری سے پہلو بچاتا
 چاہتا ہوں۔ حفیظ صاحب کے لئے کہیں جانا۔ اور وہ بھی آپ
 جیسی شخصیت کے ساتھ جانا میرے لئے اعزاز سے کم نہیں۔ بلکہ
 میرے لئے یہ دُعا اعزاز ہے۔ میرے تانے کا مقصد تو صرف یہ تھا
 کہ آپ مجھ پر بہت زیادہ محرومیت سمجھیں گے۔ مجھ سے بہت زیادہ
 توقعات مت رکھئے گا۔ میں صرف بڑی عمر کا ایک ٹھنڈا آدمی ہی
 نہیں۔ کالی حد تک سیدھا اور پیٹھ دھکی ہوں۔"

"آپ سیدھے سادے اور پیٹھ دھکی ہیں" اسی لئے تو آپ کو ساتھ
 لے جا رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تیزو طرار اور
 شاطر لوگوں کا تو فخر صاحب کے گرد بھی جھٹکا ہوگا۔ اس دنیا میں
 زیادہ سمجھتیں تیزو طرار اور شاطر لوگوں ہی کی لائی ہوئی ہیں۔"
 وہ ہنس دیا۔ اس کے چہرے پر جلی کی پاشاٹ ٹوٹ آئی۔ گنگا
 رام اسپتال کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں آپ
 کو گھر جمع کر دیتا ہوں۔ آپ اپنا ایک چھوٹا سا سڑی بیک لے کر تیار
 رہیے گا۔ میں اپنے فریول ایجنٹ سے بات کرنے کے بعد آپ کو
 فون کروں گا کہ آپ کو کس وقت اتر پورٹ پہنچنا ہوگا۔ میں آپ کو

”میرے ذہن میں کوئی واضح پروگرام نہیں ہے۔“ میں نے گاڑی اچھو موڑ کی بجائے سڑک پر سوڑتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ میں اور آپ دینروں کے روپ میں اس تقریب میں شرکت کریں گے شاید میں عین وقت پر نقل کی سازش کو سمجھ سکوں اور کانگوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے ناکام بنا سکوں۔“

اس نے بے اختیار ایک بلند آہنگ تعجب لگایا۔ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ دینر نہیں گے؟“ اس کے لیے میں بے چینی تھی۔

”ہاں۔۔۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ میں نے سادگی کے ساتھ کہا۔

”ایک بڑا آدمی۔۔۔ فائبر اسٹار ہوٹل کا مالک۔۔۔ اپنے ہی ہوٹل میں دینر نکڑا ہو گا۔ کیا عجیب لگے گا۔ مجھے اس قصور سے ہنس آگئی تھی۔“ نذیر خان بولا۔

”بالکل عجیب نہیں لگے گا۔“ میں نے وثوق سے کہا۔ ”جب ہم دینر کی رودی بن لیں گے تو دینر ہی لگیں گے۔ دینر بھی ہم ہی جیسے انسان ہوتے ہیں۔ میں نے کئی بار ایسے دینر چھوئے ہوئے کام کرنے والے مزدور پیش فرم کر اور نوکر دیکھے ہیں جن کے بارے میں مجھے خیال آیا کہ اگر وہ ذرا فحاشی سے نادم ہو کر مہم لہاس پن کر مٹگی سی گاڑی میں بیٹھ جائیں تو شاید ان کی بیٹھ معلوم ہوں جبکہ بعض بیٹھوں کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ اگر وہ صرف اپنے دفتر سے نکل آئیں اور پیدل کسی چارے ہوں تو شاید چڑیا بیٹھ ہوں۔“

”وہ تو درست ہے چودری صاحب!“ نذیر خان ہنستے ہوئے بولا۔ ”پھر بھی سماجی حیثیت کی اپنی ایک خوب ہوئی ہے۔ جو خود مثال میں رنج بس جاتی ہے۔ آدمی اگر کافی عرصے سے دینر چلا رہا ہو تو اس کی شخصیت میں دینر رنج بس جاتی ہے۔ اور اگر آدمی کافی عرصے سے دولت مند چلا رہا ہو تو اس کے سہرا کے گرد دولت ایک ہالہ سا نکلتی ہے۔ آپ دینر کی رودی ضرور بن لیں گے لیکن راتوں رات دینر دکھائی نہیں دیتے لگیں گے اس کے لئے آپ کو کم از کم چند دن پہلے ریاضت شروع کرنی چاہئے تھی۔“

”مردار عزیز! آپ چند دن پہلے کی بات کر رہے ہیں یہاں تو کل تک میں معلوم تھا کہ ہمارے سر پر کیا افتاد پڑنے والی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”بہر حال۔۔۔ میں یہاں تک کہ جس بیٹانے کی سازش کی آپ بات کر رہے ہیں اس کی مدد میں میرا اندازہ ہے کہ وہاں باریک بین آنکھیں تو موجود ہوں گی۔ میری تو کوئی بات نہیں میں تو دینر کے روپ میں بیچ جاؤں گا لیکن باریک بین آنکھوں نے اگر ذرا توجہ سے آپ کو دیکھ لیا تو سمجھ جائیں گے کہ بندو بھر مرکز میں ہے۔“

انسان کی سائیکالوجی بدل دیتے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ عجیب وہ انسان ہوتے ہیں جو مقام اور مرتبے والوں کو گھیر لیتے ہیں۔ ان کے گرد عجیب دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں۔“

مرنگ چوٹی کے چوراہے سے میں نے فیروز پور روڈ کی طرف مڑتے ہوئے ایک نظر نذر خان کی طرف دیکھا۔ وہ کمری نظروں سے ٹھٹھک کر دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ”بڑے لوگوں کو تو چھوڑیے چودری صاحب! عام لوگوں کی سائیکالوجی بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ جب تک حادثہ خود کو پیش نہ آئے تب تک انسان اس کی جھنجھکی کو محسوس ہی نہیں کرتا۔ کسی خوبصورت اور پُر فریب سے راستے پر گزرنے کی موجودگی کا کسی کو اس وقت تک نہیں محسوس آتا جب تک وہ چاکر اس میں گر نہ جائے۔ آگ کسی کو اس وقت تک آگ محسوس نہیں ہوتی جب تک اس کی پیش اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر نہ محسوس ہونے لگے۔“

میں ہنس دیا۔ یہ بات میں پہلے بھی کسی کی منہ سے سن چکا تھا اور مجھے درست لگی تھی۔ وہ گویا کسی سوچ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”چودری صاحب! میں زیادہ چڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔ شاعری مجھے کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آتی۔۔۔ اور غالب کو سمجھنا تو بہت سے شاعروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ لیکن میں واقعی انہیں عقیم شاعر مانتا ہوں۔ کسی کیسی بے کس باتیں وہ اتنے برسوں پہلے کہے گئے جو ضرب اللہ بن گئیں۔ اب اسی مصرع کو لے لیتے۔“

گرمی ہے جس پر کل بجلی وہ میرا آشیانہ کیوں ہو
ختم ہوئے روپ کی۔ انسانی نفسیات کا ایک عجیب ہی پہلو
سودھا ہے اس ایک مصرع میں۔ آگ جب بیٹوں کو جلاتا شرف
کرتی ہے تو ہر آدمی کی سمجھتا ہے کہ میرا گھر اس سے محفوظ رہے گا۔
افراد کی بات تو چھوڑنے پوری پوری قومیں بھی کسی کے کہنے میں آکر کبھی کسی خون میں آکر اپنے آپ کو لے جا کر کسی گڑھے میں گرا لیتی ہیں۔ حالانکہ راستے میں بہت سے درد مند اسے سمجھا رہے ہوتے ہیں کہ اس راستے پر مت چلو آگے تباہی منہ کھولے کھڑی ہے مگر کوئی ان کی نہیں سنتا۔ بلکہ بعض اوقات تو لوگ سمجھانے والوں کو مارتے ہیں۔“

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”اصل میں انسان کا یا قوموں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ آج کے دور میں کینیڈا ڈن اٹا پچھا ہوا ہے کہ کچھ پائیس چٹا کون واقعی سمجھا رہا ہے اور کون صرف پکڑ دے رہا ہے ایک گڑھے سے ہٹا کر دوسرے گڑھے کی طرف دھکیل رہا ہے۔“

”میں نہیں۔ یہ دنیا کے تماشے عجیب ہیں۔ یہ لمبی باتیں ہیں۔“ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”آپ یہ بتائیے کہ آپ نے خطبہ صاحب والے مسئلے میں سوچا کیا ہے؟ کراچی جا کر کرنا کیا ہے؟“

”وہ بڑی طرف کوئی زیادہ توجہ سے نہیں دیکھتا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”ویسے... چوہدری صاحب!“ وہ میری طرف رخ کر کے بیٹھتے ہوئے کمری سنجیدگی سے بولا۔ کیا آپ کا خود کو... یہ نفس نفس“ خطرے میں ڈالنا ضروری ہے؟ زیادہ سے زیادہ میں ریڑھ کے بہرہ میں تقریب میں شرکت کر لیتا ہوں۔ آپ مجھے اپنا ہی نمائندہ سمجھ لیں۔ ہم کوئی ایسا طریقہ طے کر لیں گے کہ اگر آپ مجھے کوئی دامت دینا چاہیں تو فوری طور پر دے سکیں۔ آپ جو کہیں گے وہ میں کر کر دوں گا۔ آپ کبھی ہند کر گئے۔“

”آپ کے اس غلو میں اور ایسا ہیست کا بہت ذریعہ بھالی!“ میں نے حقیقی معنویت سے کہا۔ ”لیکن مجھے لگتا ہے جب تک میں خود چوہدری تقریب کے دوران حفظ صاحب کے قریب نہیں رہوں گا بات نہیں بنے گی۔ اور نہ ہی میرے دل کو اطمینان ہوگا۔ جو لوگ اس میں ملوث ہیں، میں انہیں کوئی فائدہ حاصل کرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اگر وہ خطرے ہوئی میں حفظ صاحب کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کی بڑی فتح ہوگی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیوں یہ مجھے اپنی ناک کا مسئلہ محسوس ہونے لگا ہے۔“

”سمجھنا میرا فرض تھا۔“ ذریعہ خان بولا۔ ”حالانکہ حفظ صاحب سے میرا جو دل رشتہ ہے اس کا تو آپ کو ابھی طرح اندازہ ہو چکا ہوگا۔ ان کی جان مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن آپ بھی پہلی طاقت میں ہی بہت زیادہ اچھے اور اپنے اپنے سے لگے ہیں۔ دل گوارا نہیں کرے گا کہ آپ کو بھی کوئی نقصان پہنچے دیکھوں۔ مجھے تو یہ ضروری محسوس نہیں ہو تا کہ آپ اس معاملے میں ملوث ہوں۔ بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی حفظ صاحب کی جان کو کوئی سنگین خطرہ لاحق محسوس نہیں ہو رہا۔ اگر وہ بھی تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ان جیسی شخصیات کی حفاظت کے لئے پولیس، سی آئی ڈی، اسٹیشن سیکورٹی، حتیٰ کہ بعض مقامات پر آئی ایس آئی تک کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ حفظ صاحب کا جان بھار ہونے کے باوجود میں اسے اداروں کی موجودگی میں عزیز صاحب کے لئے پریشانی اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“

”تقریباً یہی بات خود حفظ صاحب نے بھی کہی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”مصلحتاً ان کی سمجھ میں بھی ذرا آخر سے آیا تھا۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ان اداروں کے لوگ عام اجتماعات میں اہم شخصیات کی حفاظت کرنے میں ماہر ہوتے ہیں، تربیت یافتہ ہوتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی تربیت لگے ہندے خطوط پر ہوتی ہے۔ وہ صرف اس قسم کی صورت حال کے لئے تیار رہتے ہیں کہ کہیں کوئی سنگی یا فسطی اس شخصیت پر حملہ نہ کر دے۔ کہیں کوئی تحریک کار کسی بہرہ میں یا کسی شخصیت کی آڑ میں تقریب میں نہ آیا ہو۔ کہیں کوئی شخص کوئی ہتھیار چھپا کر اندر لانے میں کامیاب

نہ ہو گیا ہو اور یکدم فائز نہ کر دے یا پتھر کا دار نہ کر دے۔ وہی آئی بی شخصیت کی کار میں کسی نے ہم نہ فٹ کر دیا ہو۔ ریٹرو پٹی دی کے یا ٹیکو فون یا کمرے میں کوئی ہم نہ ہو۔ لیکن میں نے بتایا تا کہ عزیز صاحب کے معاملے میں اس قسم کا کوئی چکر نہیں ہوگا۔ وہ اس قتل کو قتل تو ظاہر کر رہی تھی چاہے۔“

”ہاں۔ وہ تو میں سمجھ گیا تھا۔“ ذریعہ نے صحت سے سہلایا۔ ”خدا کرے کہ آپ بروقت ان کے طریقہ واردات کو سمجھنے اور اس کا توڑ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن میں اس بات سے ڈر رہا ہوں کہ اپنی سازش کو ناکام ہوتے دیکھ کر کہیں ان کا نرلہ آپ پر نہ کر پڑے۔“

”ہم جب اس معاملے میں ٹانگ اڑا رہے ہیں تو پھر ٹانگ کو بچانے کا بعدا دست تو رکھیں گے ہی۔“ میں نے کہا۔ ”اپنی ہی سب قدیریں کر لیں گے۔ نتیجہ اور دالے پر چھوڑ دیں گے۔“ ”ٹھیک ہے چوہدری صاحب!“ وہ کمری سامنے لے کر بولا۔ ”جب حفظ صاحب نے آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دئے ہیں تو میں کیا چیز ہوں۔ جو دل چاہے سمجھتے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بلکہ آپ کے پیچھے پیچھے ہیں۔ بے شک کراچی لے جا کر سمندر میں ڈبو دیجئے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”آپ ایسا چیز نہیں ہیں کہ آپ کو سمندر میں ڈبو دیا جائے۔“ خان صاحب!“ میں نے اس کی گلی میں گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے تو ابھی بہت سے کام لیتے ہیں۔“

”بڑی خوشی ہوگی کہ آپ مجھے جیسے ناکارہ کو کسی کام کے قابل سمجھیں گے۔“ وہ افسار سے بولا۔ اس کا گھر آچکا تھا۔ گیت ہند تھا۔ میں نے گاڑی دیوار کے سامنے میں روک لی۔

وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”آئیے نا۔۔۔ اب دوسرا کاکھانا کھا کر ہی جائیے گا۔ حفظ صاحب جیسے خشک آدمی سے مل کر آپ رہے ہیں۔ اب ہمیں اس خشکی کے اثرات بھی تو دور کرنا ہوں گے۔“

”دوسرا کاکھانا...؟“ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”خدا کا خوف کیجئے خان صاحب! جو ناشائستہ نے صبح کیا ہے اس کے بعد تو دو دن تک کھانے کی ضرورت، محسوس نہیں ہوتی چاہئے انسان کو معدے پر صرف اتنی ہی بو جھ لانا چاہئے کے معدے سے اس کے تعلقات خراب ہوں۔“

”آپ نے ہی اپنے معدے کو اتنا آرام طلب بنا رکھا ہوگا۔“ وہ گاڑی سے اتر کر انگوڑی لیتے ہوئے بولا۔ ”اپنا معدہ تو مزدور معدہ ہے۔ دن رات مشقت میں لگا رہتا ہے۔“

دیسے یہ واقعی حیرت کی بات تھی کہ بتناہ کھاتا تھا اتنا بے ڈول اور صاحب تو نہ نہیں تھا۔ میں نے نمی میں سہلایا۔ ”کہا۔“ میرا لی الحال اپنے معدے کو مشقت کرائے گا کوئی موڈ نہیں ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔ آپ تیار رہیں گے گا۔ خدا حافظ۔“ میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

بھی مجھ سے کیا تھا اور میں نے جس حد تک مناسب سمجھا تھا انہیں جواب دے دیا تھا۔

”مفتخر صاحب کی بات چھوڑو۔ وہ تو مرغاں مرغ اور مرغ دار قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ سیکرہائی کے مسائل کس طرح حل کئے جاتے ہیں۔ وہ تو سب کچھ ہم پر چھوڑ کر مطمئن بیٹھے رہتے ہیں۔“

”میرے خیال میں تو وہ آپ سے زیادہ معاملہ فہم آدمی ہیں۔“ میں نے جھٹتے ہوئے لیے میں کہا۔ ”اور مزید بحث نہ کرو۔“

میں ہلکے چھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے نظریہ رانی شروع کر دی تھی تاہم اس کے لیے میں وہ ہلکی سی رعوت برقرار رکھی۔ ”آپ ان کا اور میرا موازنہ چھوڑیں چودہری صاحب! ان کی اور میری پوزیشن میں بڑا فرق ہے۔ وہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔“

”تو آپ کرتے رہتے اپنا کام؟“ میں نے سرد لیے میں کہا۔ ”میں نے تو آپ کو کام سے نہیں روکا۔“ میں نے اٹھ کر گرم جوشی سے اس کا استقبال تو کر لیا تھا لیکن اب وہ شخص یک یک مجھے برا لگنے لگا تھا۔ میں نے اس کی خاطر دیرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کر دیا کہ اسے لے کر نہیں پوچھا۔

”فہم سی کے سلسلے میں تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“ اس کے لیے کا کھروار میں کچھ کہہ کر گیا۔ ”جب آپ مجھے خبر کے ذریعے کے بارے میں بتائیں گے تبھی تو میرا کام آگے بڑھے گا۔ اگر وہ کوئی خط ہے۔ یا کسی خبیہ انجمن کی رپورٹ کی کوئی نقل۔ کوئی فوٹو اسٹینڈ وغیرہ آپ کے ہاتھ لگ گئی ہے تو آپ وہ مجھے دے دیں۔“

اس نے یوں میز پر ہاتھ پھیلا دیا جیسے اسے یقین ہو کہ اس قسم کی کوئی چیز میری جیب میں ہی تھی اور وہ میں اس کے سپرد کرنے کے لئے بے تاب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے قدرے استہزائیہ سی نظریہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ ایک سچے دھت اٹھا کر اس ہاتھ پر رکھ دوں۔ وہ ایک دھاتی سرکاری آدمی تھا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ اس قسم کے لوگ خواہ کسی بھی عہدے پر ہوں۔ وہ کسی معاملے کو نزاکت، فحاشیت اور خوبصورتی سے پسند کرنا تو جانتے ہی نہیں۔ اسی لیے میں نے مفتخر صاحب کے اصرار کے باوجود ان کے سامنے بھی ریڈ زائٹ نہیں کیا یا اس کے خط کے معاملے میں زبان نہیں کھولی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سرکاری مشینری یا اس کا کوئی نہ کوئی کل پڑو مجھے بھی مرادے گا اور یہی تو بھی۔ اگر کام یک کا طرز عمل بتا رہا تھا کہ میرے اندیشے درست ہی تھے۔

تاہم میں نے حتی الامکان قہر سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کی کوئی چیز آپ کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتا۔ وہ اطلاع ٹیلیفون پر آئی تھی اور میرے ٹیلیفون کے ساتھ ریکارڈنگ

وہاں سے آفس آکر میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ میزجر کو ٹیبل ایجنٹ سے رابطہ قائم کر کے شام کی کسی ٹائمٹ میں دو خبیثیں بک کرانے کی ہدایت کی اور جلدی جلدی اس روز کا کچھ کام نٹانے لگا۔ کیسٹرن کو میں نے اگلے دو تین روز کے لئے تمام ملاقاتیں منسوخ کرنے کی ہدایت کر دی تھی۔

ابھی میں نے زیادہ کام نہیں نٹایا تھا کہ کیسٹرن نے اطلاع دی۔ ”کوئی اکرام بیک صاحب ملے آئے ہیں۔ فارن مفتخر صاحب کے سیکرہائی چیف ہیں۔“

”اوہ۔ ہاں۔“ میں اندر بھیج دو۔ ”میں نے ذرا غور فکریاں کیا کہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ جس وقت میں اور مذکر خان مفتخر صاحب سے ملنے کے لئے گئے تھے اس وقت اکرام بیک سیکرہائی کے انتظامات کے سلسلے میں کہیں گیا ہوا تھا۔ شاید مفتخر صاحب نے اس کے واپس آنے ہی اسے میرے پاس بھیجا تھا۔ یہ امر میرے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مفتخر صاحب کا رویہ ظاہری طور پر خواہ کچھ بھی تھا لیکن دل ہی دل میں وہ میری بات کو اہمیت دے رہے تھے۔

اکرام بیک اندر آیا تو میری یہ خوشی یا شاید خوش فہمی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ وہ ایک لمبا ترنگا مضبوط آدمی تھا۔ قد چھ فٹ سے خاصا لگتا ہوا تھا۔ بال سو جڑ کرٹ تھے۔ چہرے پر کڑنگی اور آنکھوں میں کچھ شاطرائے اور کچھ سفاکانہ سی چمک تھی۔ وہ گرمیوں کے بہت نفیس اور پیش قیمت لباس میں تھا۔ اس نے اپنے دھڑو کو ضرورت سے زیادہ ہی فراہمی کھون سے مغطر کیا ہوا تھا۔ عمر کے اعتبار سے تو اسے کچھ ایسا کرگڑا ہوا باراں دیدہ نظر نہیں آتا جیسے تھا کیونکہ ابھی اس نے چالیس کی حد کو بھی غالباً عبور نہیں کیا تھا لیکن وہ نہایت جہانمہ آدمی معلوم ہوا تھا۔

طویل و عریض کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پہلے یوں چاروں طرف کا جائزہ لیا جیسے آفس کی آرائش وغیرہ دیکھ کر میری حیثیت کا یقین کر رہا ہو۔ لیکن شاید یہ اس کی عادت رہی ہو۔ وہ سیکرہائی کے شعبے کا آدمی تھا۔ شاید کسی بھی جگہ پہنچتے ہی وہ اسی طرح اسے نظروں میں نظر یوں میں کھانٹا ہو۔

میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ ایک خاص فطرت کے آدمیوں کی طرح اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے وقت مجھے اپنی مضبوطی اور طاقت کا احساس دلانے کی کوشش کی لیکن میں نے بھی جواباً اسے احساس دلایا کہ اس کی یہ کوشش فاصلہ ہے۔

شاید وہ بہت جلدی میں تھا۔ پچھتے ہی بلا تمہید بولا۔ ”مفتخر صاحب کے قتل کی سازش کی جو کہانی ملے کہ آپ ان کے پاس گئے تھے میں جانتا چاہتا ہوں کہ اس میں آپ کی خبر کا ذریعہ کیا تھا؟“ اس کے لیے میں ملاحت یا خوش اخلاقی نہیں بھیجی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر اس کے ساتھ کہا۔ ”کیا آپ کو مفتخر صاحب نے نہیں بتایا؟ یہ سوال انہوں نے

کو ضروری سمجھتی ہو اسے چھپانا یا روکنا سچا جرم ہے۔

مجھے معلوم ہے سراسر میں نے لفظ "سسر" پر زور دیتے ہو۔ اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے "اس جرم میں مجھے ہتھکڑیاں لگا کر لے چلے۔"

ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹ بھیجے گئے پھر وہ بہت سی دھڑکیاں لے کر بھاگنے لگا۔ "گنگا ہے آپ کو بھی پھنسل لیول کے کسی سیکرور کے آگے آئی ہے پالا نہیں پڑا۔ آپ کو شاید ان کے اختیارات کا بوجھ بالکل اندازہ نہیں۔"

"اندازہ کیوں نہیں ہے بیک صاحب! مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے اس ملک میں صرف شریف شہروں کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہاں سب کے پاس اختیارات ہی اختیارات ہیں۔۔۔ اور سرکاری اہلکاروں کے اختیارات کا تو کتنا ہی کیا! میں نے اپنے لیے سے وہ زہر چھلکے نہیں دیا جس کی تلخی ایک بار پھر میرے دل میں پھیل رہی تھی۔

"تو گویا میں سمجھ لوں کہ آپ مجھ سے تعاون کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں؟" اس نے گہری سانس لے کر کرسی کے پٹے سے ٹیک لگایا۔

"میں نے تو اپنے آپ کو سرتاپا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ تعاون کیا ہو سکتا ہے؟ آپ ہی بتائیے۔" میرے انکسار سے کہا۔

"آپ بہت بچی ہوئی چیز سمجھتے ہیں چودری صاحب! مجھے حیرت ہے کہ اب تک کہاں بچے ہوئے تھے آپ کو تو اب تک کسی نہ کسی ایجنسی کی نظر میں ہونا چاہئے تھا۔" وہ بڑے خیال انداز میں سہلاتے ہوئے بولا۔ "گنگا ہے مجھے کسی نہ کسی ایجنسی کو آپ کے بارے میں تحقیقات کی ہدایت کرنی پڑے گی۔"

"ہاں جی۔۔۔ یہ میری تلافی ہے کہ آج تک کسی ایجنسی کی ڈھونڈ میں کوئی مقام کوئی اہمیت حاصل نہیں کر سکا۔ اب آپ آگے ہر تو آثار بتاتے ہیں کہ اس فدوی کے آگے پیچھے ایجنسیاں کی ایجنسیاں ہوں گی۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے مصیبت سے کہا۔ "مجھے بتا نہیں چلا۔ لیکن یقین سا ہو رہا ہے کہ اس وقت ضرور مجھے کسی پائل کے لئے کاٹا تھا جب میں اپنی بہن ہودی کی کمائی لے کر فخر صاحب کے پاس چلا گیا تھا۔ شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے وہ ماہوار ایجاد ہوا ہے۔۔۔ قتل مجھے مار۔"

"آپ یہی سمجھ لیں۔ لیکن ابھی تو بیل نے آپ کو مارا نہیں۔" وہ بولا۔ "ابھی تو بیل نے آپ کی طرف صرف رخ کیا ہے۔"

"ارے نہیں صاحب! بیل نے ہماری طرف نہیں ہم نے خود ہی بیل کی طرف رخ کر لیا تھا۔ زندگی میں یہ اس قسم کی پہلی غلطی تھی۔ آئندہ نہیں کریں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا اور فون کا طرف ہاتھ بڑھایا۔

سستم شک نہیں ہے۔

"میں نے اطلاع دی تھی؟" اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے سادگی سے کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ وہ گویا اپنے جذبات کی جارحیت کو دباتے ہوئے کھینچے کھینچے سے لمحے میں بولا۔ "چودری صاحب! کیا آپ مجھے پتہ سمجھ کر مجھ سے مذاق کر رہے ہیں؟" "ہرگز نہیں۔" میں نے نہایت غلو سے کہا۔ میرا تجربہ تھا کہ بعض اوقات کسی پر مڑ کر کہنے "اس کی توہین کرنے یا اس کا مستحکم اڑانے کی نسبت سادگی سے اس کے سوالوں کا جواب دینا اور اس کے سامنے بالکل انجان اور معصوم بننے کی کوشش کرنا اس کے قیام میں زیادہ اہم لگتا تھا۔

وہ گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اسے مذاق میں لیا جائے اور نہ ہی میں کوئی پولیس کا فٹیل ہوں جسے مذاق کے انداز میں اٹالے سیدھے جواب دے کر ٹالنے کو کوشش کی جائے۔"

"اگر میں نے اس معاملے کو مذاق سمجھا ہوتا تو کیا میں دوڑا دوڑا فخر صاحب کے پاس جاتا؟" میں نے اپنے لیے کی سادگی پر قرار رکھی۔

"لیکن اگر آپ کو تمام اطلاع ملی ہوئی تو تب تو آپ ہرگز نہ جاتے۔ وہ یقیناً کوئی ایسا ذریعہ ہے جس پر آپ بہت بھروسہ کرتے ہیں۔" وہ قدرے ٹھہرے ٹھہرے لیے میں بولا۔ "میں جانا چاہتا ہوں وہ ذریعہ کیا ہے۔"

"کاش میں آپ کو بتا سکتا۔" میں نے بے چاری سے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اب بھی ہلکے نہیں جھپکائی اور اپنے چہرے کو حتی الامکان سیاہ رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے جارحانہ پن میں کچھ کی آگئی تھی۔ وہ اب کچھ متحمل ہو کر بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ میں کوئی عام سنا کاروباری آدمی یا پھر روایتی قسم کا چھوٹا موٹا سیٹھ نہیں تھا جو پولیس والوں، انکم ٹیکس والوں، ایف آئی اے والوں، یونین والوں، ڈاکوؤں، طالب علموں اور نہ جانے کن کن لوگوں سے ڈرتا ہے۔ بے چارہ دولت کا بھی لیتا ہے، بچا بھی لیتا ہے لیکن بیشتر زندگی ڈرتے ڈرتے ہی گزار جاتی ہے۔

جس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اکرام بیگ میرے پاس آیا تھا اب اس کے رویے میں وہ بات تو نہیں رہی تھی لیکن اب کوئی ناکہ نہیں تھا۔ اس کا اپریشن میری نظریں خراب ہو چکا تھا۔ اب وہ اسے بہتر نہیں دیکھتا تھا۔ آتے ہی اس نے جو رویت اختیار کیا تھا، اسی سے اس کی اصل فطرت کا پتہ چلتا تھا۔ اب وہ اس پر محض مصلحت کی غمازیوں کے لئے کی کوشش کر رہا تھا۔ "آپ کو شاید معلوم نہیں۔۔۔" وہ اب خامسے ٹھہرے ٹھہرے لیے میں بولا۔ "مگر سرکار کسی معاملے کی تفتیش میں اگر کسی شہادت

ہیں۔

اس کی بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی لیکن فی الحال میں نے اسے قبول کر لیا تاہم میں نے اپنے روئے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آنے دی۔ میرے خیال میں ابھی خوش خلقی کا مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں بدستور سیات سے انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کمری پر وہ بیٹھا تھا وہ عینیں مہم کی اور نہایت آرام دہ تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کچھ زیادہ آرام سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس کی وجہ سمجھنا بھی میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ اس کی ذمہ داریاں فیس تے دونوں پہلوؤں میں چوڑی سیٹ کے ساتھ دو ہولسٹرنگے ہوئے تھے جن میں غالباً کوڑیہ ریو اور منجود تھے۔

وہ خاصی درد نک دوستانہ سے لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس پر حیرت ضرور ہے کہ فخر صاحب نے آپ کی کمپنی پر یقین کر لیا حالانکہ آپ سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی اور آپ نے اپنی بات کا کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کیا تھا۔“

”مشریک!“ میں نے پوچھل سے لہجے میں کہا۔ ”میری تو الیہ ہے کہ ہمارے ہاں جرم و قریح پڑ رہی ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ مجرم قرار بھی ہو جاتا ہے اور ہم بیٹھے ثبوت کو ہی دوتے رہتے ہیں۔ ثبوت کی تلاش میں اور دواہر دوڑتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو مجرم بھی سامنے موجود ہوتا ہے اور ثبوت بھی اس کے باوجود کچھ نہیں ہوتا۔ جبکہ میں ایک ایسے معاشرے کے خواب دیکھتا ہوں جس میں جرم کو قریح پڑ ہونے سے پہلے ہی روکا جاسکے۔ لاشوں پر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرنے کا کوئی لاکھ نہیں ہے ایک صاحب! اور یہ بات میں صرف دوزیروں، سفیروں اور بڑی شخصیتوں ہی کے لئے نہیں کہ رہا تھک دنا ایک کلی کوچوں میں کیڑوں کوڑوں کی طرح تارے جاتے والے مظلوم الحال اور بے روح لوگوں کے بارے میں بھی کہ رہا ہوں۔“

وہ میز پر ذرا آگے کو جھک آیا تھا۔ ہونٹ نیم وا تھے۔ میں نے دیکھے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کاش کوئی ایسا طریقہ ہو جائے کہ ہم لوگ جرم کی تفتیش کے علاوہ جرم کو روکنے اور اس کی پیش بندی کے بارے میں بھی کوئی نظام وضع کر سکیں۔ ہم صرف انتظار ہی نہ کیا کریں کہ کچھ ہو جائے تو پھر حرکت میں آئیں۔ کوئی واقعہ کوئی سانحہ کوئی الیہ جنم لے چکے تو پھر سب حسب مراتب اپنا اپنا اسکریٹ باڈر کے اسٹیج پر اپنا اپنا کردار ادا کرتے جائیں۔ بیانات داتے والے بیانات وائیں اور غزوگان کے ساتھ تصویریں کھینچوائیں۔ ٹکٹوں والے خانہ بچی کریں! اپنی اپنی ٹانگوں کا پیٹ بھرس اور جان چھڑائیں۔ بے اختیار لوگ چپ کر کے سب کچھ دیکھتے رہیں، ٹکٹ دہم دم نہ کھینچ کر تصویر بنے رہیں، دل ہی دل میں گڑبگڑتے رہیں اور ٹکٹس کا دیوار چن رہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ایک صاحب“

”کے فون کرنے لگے ہیں آپ؟“ اس نے چٹائی پر تل والے ہوئے پوچھا۔

”فیضان صاحب کو۔“ میں نے جواب دیا۔
”وہ اس وقت آپ کو نہیں ملیں گے گورنر صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”کیا کھانا تھا آپ کو ان سے؟“

”کیا۔۔۔ کہ صاحب! ہم آپ کی محبت میں دوڑے دوڑے آپ کے پاس آگئے تھے ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم اپنی محبت واپس لے لیتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اگر آپ کو میری پوچھ گچھ گراں گزر رہی ہے تو اس مسئلے میں ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سیکرٹری چیف کی حیثیت سے مجھے پورے اختیارات حاصل ہیں کہ میں جو کچھ ضروری سمجھوں وہ کروں۔“ وہ اب بھی بظاہر ہنگامی سے بات کر رہا تھا لیکن درحقیقت اس کے لہجے میں تبدیلی آچکی تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ فخر صاحب نے درحقیقت اسے صرف صورت حال سے آگاہ کیا تھا جو ان کے لئے واقعی ضروری تھا لیکن اکرام یک کا میرے پاس آنا اور اس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا ناقابل اس کا اپنا نسل تھا جس میں شاید اس کی اپنی کوئی مصلحت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں فخر صاحب کو اس معاملے سے آگاہ کروں۔ میں نے بھی فی الحال اس پر زور نہیں دیا اور انہیں فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

کراچی سے شفیع شاہ کی فون پر اکرام یک سے خاصی دیر بات نیت رہی تھی اور شفیع نے اس کے بارے میں کئی رائے دی تھی کہ وہ اچھا آدمی ہے۔ شفیع شاہ عمر میں مجھ سے بڑا نہیں تھا لیکن ننانوں کو پرکھنے کا تجربہ اسے مجھ سے زیادہ تھا۔ میں کسی بھی شخص کے بارے میں اس کی رائے کو بڑا وزن دیتا تھا، خواہ شفیع شاہ کی اس سے محض ایک آدھ ملاقات ہوئی ہو یا اس نے نہ کوہ شخص سے صرف فون پر ہی بات کی ہو۔ لیکن اکرام یک کے بارے میں نہ بانیے کیوں میری رائے اس کی رائے سے مل نہیں پائی تھی۔ اس لادوچہ یقیناً خود اکرام یک ہی تھا۔ شفیع شاہ سے بات چیت کرتے کہ شاید حالات کچھ اور تھے۔ اس لئے اکرام یک کا اندازہ گفتگو کی کچھ اور بڑا ہوگا۔ فخر صاحب سے میری ملاقات کے بعد بات کچھ اور ہو گئی تھی۔ شاید اس لئے اکرام یک میرے بھی کوئی تبدیلی کی تھی۔

تاہم میرے بارے میں شاید اس کے اندازے غلط ثابت سکے۔ وہ اب پٹلا سا کھاتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ ”آپ کو میری باتوں سے ناراض نہیں ہونا چاہیے چونکہ میری صاحب! آپ کو رازہ نہیں ہے کہ ہماری ڈسے داریاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔ ہمیں یہی طریق مختلف موقعوں پر مختلف طریقے اختیار کر کے لوگوں کو بھگانا پڑتا ہے۔ ہم ان کی اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے

وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "جس نظام کے آپ خواب دیکھتے ہیں وہ تو امریکا میں بھی نہیں۔"

"معلوم نہیں ہم اکثر معاملات میں امریکا، انگلینڈ اور فرانس وغیرہ کو مثال کیوں بناتے ہیں۔ امریکا کوئی بہت اچھا ملک تو نہیں ہے۔ ہماری آئینہ الٹی تو اس سے بھی بہتر ہوتی چاہئے تھی۔ وہاں بس انڈیٹینان ضرور ہے کہ آپ امریکیوں یا غریب آپ کے حقوق صرف زبانی لکائی نہیں بلکہ عملی طور پر مساوی ہیں اور آپ کی شتمانی ہو جاتی ہے۔ لیکن انسانیت تو وہاں بھی کچھ زیادہ سکھ میں نہیں ہے۔"

وہ ایک بار پھر ہنس دیا جیسے کسی خواب پرست شاعر کی خیال آرائی سے محظوظ ہو رہا ہو۔ میں نے سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا اور آپ کا قیمتی وقت ضائع کرتے ہوئے آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں۔ شاید آپ کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو۔ پچھلے دنوں میں نیوا راک میں تھا۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شام ڈھلے ڈرا فرصت میری آئی تو شب بچھ پر چل قدمی کرنے نکل کھڑا ہوا۔ ہوٹل سے خاصی دور نکل گیا جہاں زیادہ دقت نہیں تھی۔ ذرا سنی کی طرح لمبے اور سوکھے سے ایک امریکی نے مجھے دیکھا اور شاید سوچا کہ سوٹ وغیرہ تو قیمتی پہنا ہوا ہے، آدھی خوشحال ہو گا۔ شاید اس نے یہ بھی سوچا ہو کہ الیشیائی نظر آتا ہے، یقیناً گدھا ہوا گا۔ لپک کر میرے قریب آیا اور چھوٹا سا گندا سا ایک جسم میرے ہاتھ دس ڈالر میں فروخت کرنے پر متل گیا جو بقول اس کے 'ہا بھی دانت کا تھا۔ حالانکہ ایک اندھا بھی اسے دیکھ کر سنا سکتا تھا کہ وہ سفید پلاسٹک کا تھا۔"

وہ مسکرتھا کہ میں اس سے مجسمہ ضرور خریدوں۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے اپنی پہلی ہوئی چیز کی جیب سے نکلے دار چاقو کی جھلک بھی دکھائے جا رہا تھا۔ اگر وہ ہمارے ہاں کے ویت نامی مگر مسکین فقیروں کی طرح کوئی دارستان غم، فخر، جمہوری ہی سہی انسان کا بڑی سے دس ڈالر مالکانہ تو شاید میں اسے دے دیتا۔ یہ کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ چلو ہم نے "ایڈ" لیتے لیتے آج کسی امریکی کو "ایڈ" دے والی ہے۔ لیکن وہ بد بخت مجھ سے دکانیں وصول کرنے کی فکر میں تھا۔ ایسی باتوں پر ہم جیسے پیڑوں کی بھی بھی کھوپڑی محوم جاتی ہے۔ پھر بھی میں نے زیادہ غصے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ زیادہ ہی سر پر جھٹکنے لگا تو میں نے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ اسے شاید اپنے لمبے چوڑے ڈھانچے پر بہت ناز تھا۔ اسی لئے وہ میرا قد کاٹھ دیکھنے کے باوجود مجھ پر چڑھا رہا تھا۔ جگے سے ایک دھکے میں وہ تلا بازی کھا کر کوئی آٹھ دس فٹ دور جا کر۔"

ایک پولیس والا جو کہیں دور کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا شاید دیکھ رہا تھا ایک کہ قریب آیا۔ وہ امریکی غنڈہ تو پولیس والے کو دیکھ کر کھٹک گیا۔ پولیس والا مجھے سمجھانے لگا کہ مجھے ہوشیار رہنا چاہئے اس قسم کے توارہ گردوں سے نہیں الٹھا چاہئے۔ میری کسی

قلبی سے مجھے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اسے بھی تھوڑی سی جھانپائی کہ تمہارا قانون اچھا ہے جو یہ معاش کو تو لگام نہیں دیتا اسے تو نہیں سمجھتا کہ وہ ایک شریف آدمی کے ساتھ غنڈہ گردی نہ کرے۔ لیکن ایک شریف آدمی کو سمجھانا ہے کہ اسے کیا کیا احتیاط کرنی چاہئے۔

وہاں کے ہوٹلوں میں بھی آپ نے دیکھا ہو گا۔ لمبے چوڑے پردات نامے تو پڑاں رہتے ہیں۔ فلاں دقت باہر نکلے فلاں دقت مت نکلے، نقد رقم ساتھ مت رکھے، یہ کیجئے، وہ مت کیجئے، خبر جی۔ میری تقریر کے جواب میں وہ پولیس والے صاحب فرماتے تھے کہ وہ بغیر ثبوت کے، کسی کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کر سکتے حتیٰ کہ اس کیس کو سپریم غنڈہ بھی نہیں کر سکتے۔

میں نے کہا، وہ زبردستی لوگوں کو کوئی کھلیا یا چیز منگے دواہوں خریدنے پر مجبور کرتا ہے، نکال بھی اس کا پیشہ ہے۔ پولیس والا بولا، چیزیں بیچنا کوئی جرم نہیں ہے، آپ بے شک مت خریدیں۔ میں نے کہا، وہ جیب میں منگے والا چاقو لے کر پھرتا ہے۔ پولیس والا بولا، ہمارے ہاں چاقو جیب میں لے کر پھرتا کوئی جرم نہیں۔ جرم تب ہو گا جب وہ اسے کسی ممنوع کام میں استعمال کرے گا۔ میں نے کہا، تو یہ بہت اچھا ہے کہ جب کسی کی آنتیں باہر آجائیں تب تمہاری تعقیب شروع ہو۔ وہ امریکیوں والے مخصوص انداز میں کندھے اچکا کر بولا، کیا کریں۔ مجھ کو یہ ہے، ہر شہری کے کچھ حقوق ہیں۔ عدالتیں ہزات کا ثبوت مانگتی ہیں۔ میں نے ان کے عقیم قوانین پر اسے خراج خمیں پیش کیا اور ہوٹل واپس آنے کے لئے مڑ گیا۔

تب اس نے کوئی صفائی پیش کرنے کے سے انذار میں بتایا کہ وہ کئی بار اس نوجوان کو "رٹے" ہاتھوں پکڑنے کے لئے اچکا ہے مگر جو خی وہ اس کی طرف لپکتا ہے، نوجوان اپنا چاقو کسی کمر وغیرہ میں چھپک رہتا ہے۔ جب تک اس کے پاس سے کچھ برآمد ہی نہ ہو اور نہ اس بات کا کوئی گواہ ہو کہ وہ راہ کیروں کو ڈرانا دھمکتا ہے تب تک اس کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ ان تمام "سوسلوں" کے باوجود وہ صوف و تھمن مرتبہ سزا کاٹ چکے تھے۔ آپ سوچیں کہ وہ کیسی سنگین حد تک آگے بڑھا ہو گا جب امریکی قانون کے کانکھوں نے اسے جیل جانے کی "زمت" دی ہوگی۔

بہر حال میں ہوٹل واپس آیا۔ دوسرے دن میں اندھیرا پھیلنے پر جان بوجھ کر اس سڑک پر چل قدمی کے لئے نکلا۔ وہ بد بخت ہانس کا چچا اپنے گھٹ پر سو جو تھا البتہ پولیس کی گاڑی اس مدد نظر نہیں آ رہی تھی۔ آپ اس شخص کی دھناتی دیکھنے کے میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے قدرے پردہ داری سے چاقو نوک میری ہیلوں پر نکادی اور غرا کر مجھے بتانے لگا کہ کل میں نے اس کے ساتھ بڑی بد تمیزی کی تھی اس لئے آج مجھے بیس ڈالر میں اس سے مجسمہ لینا پڑے گا۔ گویا دس ڈالر مجھ سے اور دس ڈالر بد تمیزی، ہر پانہ۔

کہا۔ "ہمارے ہاں تو سیاست کا مفہوم ہی بدل دیا گیا ہے۔ جب کوئی ہمارے ساتھ دھوکا اور فریب کر جاتا ہے، ہمیں پکڑ دے جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ فلاں ہمارے ساتھ بڑی سیاست کھیل گیا۔ حالانکہ سیاست کا یہ مطلب، یہ معنی تو ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو ہم نے اسے دے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "میری اس گفتگو کا مقصد اپنے آپ کو سیاست کا اہل ثابت کرنا نہیں تھا۔ میں تو آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اس طرح کے ملک میرا آئیڈیل نہیں ہیں۔ ملک اور معاشرے صرف اونچی اونچی عمارتوں، عالی شان سڑکوں، لمبی چمکتی دھنکی گاڑیوں اور رنگارنگ روشنیوں سے ہی نہیں بنتے۔ یہ چیزیں ہوں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن ان سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہاں انسانیت کتنے دکھ سکھ میں ہے۔ اور جب ہم انسانیت کے سکھ میں ہونے کی بات کرتے ہیں تو اس میں نہ جانے کیا کچھ آتا ہے۔"

"بے شک ہے۔ تو آپ نے اپنی بات کے پاؤں میں سب کا پاؤں دلی بات کر دی۔" اکرام بیگ مسکرایا۔

"ایسا ملک میرا آئیڈیل نہیں ہو سکتا جہاں تو رسمی عسکرانی باغیا کی ہے۔ جہاں ایک طرف اتنی بڑی بڑی کینیاں ہیں جن کے بجٹ بیسیوں ملکوں کے بجٹ سے بڑے ہیں اور دوسری طرف اتنی ہی سال کی بوڑھی عورتیں اور مرد فئیب کی سڑی میں فٹ پاٹھوں کی تہنیں تلے اپنے جسم پر اخبار لپیٹ کر سوتے ہیں۔ ایسے ہی اور نہ جانے کتنے تضادات ہیں جو دنیا کے بیشتر ملکوں کو میرا آئیڈیل نہیں بننے دیتے۔"

"یہ ان ملکوں کی بد قسمتی ہے۔" اکرام بیگ نے اپنی دانست میں طنز کیا۔

"نہیں۔ بد قسمتی تو یہ میری ہے۔ یا پھر شاید یہ انسانیت کی بد قسمتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بات بہت دور چلی گئی۔" اس نے گویا مجھے اصل موضوع یاد دلانے کی کوشش کی جس کی طرف میں اتنا نہیں چاہتا تھا۔

"اے صاحب! آپ تو بات کی بات کر رہے ہیں۔ آپ مجھے لوگوں سے بات کرتے وقت تو بعض اوقات میں خود بہت دور چلا جاتا ہوں۔ جسم میں ہوا ہے۔ لیکن ذہن نہ جانے کہاں پہنچ جاتا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

وہ میرے الفاظ پر توجہ دے بغیر بولا۔ "مجھے بتا چلا ہے کہ آپ اور نذیر خان بھی فخر صاحب کی ڈنر پارٹی میں شرکت کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ارادہ تو ہے۔ فخر صاحب نے ازراہ کرم ہمیں بھی مدعو کر لیا ہے ورنہ یہ تو خالصتاً فیملی جگہ ڈنر تھا۔ صرف فیملی تک اور چند دوسرے خاص خاص لوگ ہی وہاں مدعو تھے۔ غالباً سینا کے انداز میں کچھ تقریریں بھی ہوتی ہیں۔ آپ کے پاس سمنائوں کی جو

سمنائیں تھیں اسے بتایا کہ میں میں کے بجائے پچاس ڈالر اس کی خدمت میں پیش کروں گا بشرطیکہ وہ مجھے تعویذی ہی کو کہیں خود سے دے یا کسی اور سے دلادے۔ اس کی باجھیں کھل گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اصل میں کسی اور لائن کا آدمی ہوں۔ میں اسے باتوں میں لگا کر ایک گندے کٹی گلی میں لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا چاقو وغیرہ سب دھوا کر گیا۔ میں نے اس کی کٹی گلی پیش قسم کی پٹائی کی۔ ٹاک مٹ توڑ دیا اور بار بار کرے ہوش کر دیا۔ اسے گلی میں پڑا چھوڑ کر ہو گئی میں مدد اپنی گئی۔

تو سچی رات کو اسے اسپتال میں کہیں ہوش آیا ہوگا۔ اس کے ایک آدھ گھنٹے بعد پولیس ہو گئی۔ میرے پاس آٹن پہنچی۔ وہ مجھے پوچھ کر مجھ کے لئے پولیس اسٹیشن لے گئے۔ میں نے پہلے ہی ایک دھانسی قسم کے دیکل کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ ادھر اسے فون کیا، آدھ روہ حاضر۔ وہ باؤ بھر کر مجھے ملتان پر اسی وقت رہا کر کے لے گیا۔ شام کو ہم بچ صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ دہی کے اپنے دعوے کے سوا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ میں نے اسے اس بڑی طرح مارا تھا۔ میرے جسم پر خراش تک نہیں تھی۔ وہ پولیس والا بھی عدالت میں موجود تھا جس نے گزشتہ روز مجھے صحت کی قسم۔ صرف اسے ہی نہیں، بچ کو بھی یقین تھا کہ میں نے اسے بد معاشی کی ٹھکانا کی ہے لیکن اسے ثابت نہیں کیا۔ چند منٹ کی بحث کے بعد مابودلت باعزت بڑی ہو گئے۔

اسی روز کی نے جب باعزت بڑی کے جانے کا حکم نامہ ٹائپ کر کے مجھے تھمایا تو میں نے بچ صاحب سے کہا۔ "مرا مجھے آپ کا نظام انصاف بہت پسند آیا۔ یہ جس کی کٹلائی اس کی بیٹھن کی بچی اور کچھ تصویر پیش کرتا ہے۔"

اس بچ صاحب پر امانت کے حالانکہ اس سے پہلے وہ ذریعہ مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے "عدالت کا احترام تو خاطر رکھنے" کے جرم میں مجھ پر دو ڈالر جرمانہ عائد کر دیا۔ جرمانہ خوشی ادا کرتے وقت بھی میں خاموش نہ رہا۔ میں نے کہا۔ "مرا مجھے آپ کا نرخ نامہ بھی بہت پسند آیا۔ دو ڈالر میں انسان کو دل کی بھڑاس ٹکانے کا موقع مل جائے تو سوراخ نہیں ہے۔" میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بھول وہاں کے نظام میں بھی موجود ہے۔ وہاں بہت سی اچھائیاں بھی موجود ہیں مگر وہ ہماری تہذیب و تاریخ میں ان سے پہلے موجود تھیں۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم ان سے محروم ہو گئے اور دوسری قوموں نے انہیں اپنا لیا۔"

میں خاموش ہوا تو اکرام بیگ علامتی طور پر خاموش آبی بھار مجھے داد دیتے ہوئے بولا۔ "چند دہری صاحب! آپ کے پاس اپنی سوج اور آئیڈیالوژی بھی ہے۔ جیسے بھی ہے۔ آپ یقیناً تقریر بھی اچھی کر سکتے ہیں۔ آپ کو تو سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ آپ بہت جلد آگے آجائیں گے۔"

"خدا نہ کہے کہ میں سیاست میں حصہ لوں۔" میں نے

فہرست ہوئی اس میں مجھ جیسے یا ندیر خان جیسے کسی آدمی کا نام ہرگز نہیں ہوگا۔

”اب تو آپ بھی خاص آدمی ہی ہو گئے تائی“ ایک بار پھر اس کا لہجہ نیم طنزیہ سا ہو گیا۔ ”فخر صاحب نے مجھے آپ دونوں کے نام دے دیے ہیں۔ میں جو اصل بات معلوم کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا تھا وہ یہ تھی کہ آپ کا ہال کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ میرا مطلب ہے۔ اگر واقعی کوئی سازش ہو رہی ہے تو آپ اسے کیسے روکیں گے؟“

”یہ بات اگر آپ شروع میں ہی اسی طرح سیدھے سادے انداز میں پوچھ لیتے تو آپ کی جان بچے۔ اسی وقت چھوٹ جاتی۔ آپ کو میری تقریر نہ سنتی پڑتی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بات صرف اتنی ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم“ میں کیسے اس سازش کو روکوں گا۔“

وہ ایک تک میری طرف دیکھا رہ گیا۔ دل ہی دل میں یقیناً سوچا کہ تب کہا ہوا تھا لیکن اب وہ کچھ گیا تھا کہ وہ عمل ظاہر کرنے کا کوئی قاعدہ نہیں۔ اس لئے بظاہر سکون بیٹھا تھا۔

”تو پھر ایک بات ضرور ذہن میں رکھئے گا۔“ آخر کار وہ گرمی سانس لے کر بولا۔ ”کوئی ایسی حرکت مت کیجئے کہ جو ہم سیکورٹی والوں کے لئے“ فخر صاحب کے لئے۔ یا خود آپ کے لئے شرمندگی کا باعث بن جائے۔“

”اچھا“ راست میں تو ہم تینوں فریقوں کو شرمندگی سے بچانے ہی کی اپنی ہی کوشش کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ کو جس ذریعے سے اس معاملے کی خبر ملی ہے کیا وہ اس سے پہلے بھی اس قومیت کی اطلاعات فراہم کر رہا ہے؟“ اب وہ دوستانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”نہیں۔ وہ کوئی پرانا یا پیشہ ور معجز نہیں ہے۔ یہ اس کی پہلی اطلاع ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”صبر ہے اب آپ اس کی پہلی اطلاع پر ہی اس طرح آنکھیں بند کر کے یقین کر رہے ہیں۔“ وہ سر کو خفیف سا جھکا کر بولا۔

”بعض باتوں کو انسان ثابت نہیں کر سکتا“ صرف محسوس کر سکتا ہے۔ بیشتر پولیس والوں کے پاس محسوسات کی کمی ہوتی ہے۔ وہ صرف دو اور دو چار کے فارمولے پر سوچتے ہیں اور اسی فارمولے پر تحقیق کرتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے ہاں تحقیق کا حال زیادہ خراب ہے۔ آپ کی بنیادی تربیت بھی چرک پر پولیس والی ہے اس لئے آپ کو میری بات پر یقین کرنا دشوار ہی محسوس ہوگا۔“

”چند دہری صاحب! ہو سکتا ہے میرے بارے میں آپ کے تمام اندازے غلط ثابت ہو جائیں۔“ وہ چر خیال سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن فی الحال میں اس بحث میں نہیں جڑنا چاہتا۔ اب چر تک آپ اس معاملے میں گود ہی پڑے ہیں اس لئے بستر ہے کہ ہم اس کے بارے میں تھوڑا سا تبادلہ خیال کر لیں تاکہ

ہم کچھ اندازے قائم کر سکیں کہ غلطو کس مرتبے پر ہو سکتا ہے اور کہاں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھا ہوا۔ وہ لگے بندھے انداز میں اپنے حقائق اقتادات کی منصوبہ بندی کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہوٹل میں اپنے سوٹ میں بیٹھنے کے بعد فخر صاحب تقریب کے وقت تک کہیں نہیں جائیں گے۔ اپنے سوٹ میں ہی رہیں گے۔ اس آخری وقت میں وہ اپنے پرس میں ایڈوانسز اور ان چار آدمیوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہوں گے جو انہیں تقریریں لکھ کر دیتے ہیں۔ اس آخری مرحلے میں یہ میٹنگ رکھنے اور پہلے سے تیار شدہ تقریر میں کچھ تبدیلیاں کرانے میں فخر صاحب کی کوئی مصلحت ہے جس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ کوئی رازداری کا مسئلہ ہوگا۔ وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ وقت سے پہلے پرس میں یا سفر میں مطلقاً کوئی ایسی بات آجائے جسے وہ کسی خاص وقت پر بیان کرنا چاہتے ہوں۔“

”آپ کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”فخر صاحب کے پورے پروگرام میں وقت کے تقصیر کی بہت اہمیت نظر آ رہی ہے۔ ہر کام وہ ایک خاص اور لگے بندھے انداز میں کسی مخصوص جگہ پر کرنا چاہتے ہیں۔ اس تقریب کے فوراً ہی بعد انہیں مشرق وسطیٰ بھی روانہ ہونا ہے۔ یہ سب باتیں ڈیجیٹر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”فخر صاحب جس طور پر فہرست کے زیادہ تر ذخیرہ کلکی سفارت کار و غیرہ بھی اسی طور پر منتظم ہوں گے لیکن تقریب میں شرکت کے لئے فخر صاحب اس طور سے“ ان لوگوں میں سے کسی کے ساتھ ہال کی طرف روانہ نہیں ہوں گے۔ وہ مجھ سمیت سیکورٹی کے چار آدمیوں کے ساتھ لفٹ کے ذریعے ہال کی طرف روانہ ہوں گے۔ آخری منٹ پر بھی لفٹ کو چپک کیا جائے گا۔ ہوٹل سیکورٹی والے“ راستوں“ راہدار یوں اور نگلوں وغیرہ کو چپک کر کہنے کے ذمے دار ہوں گے۔“

”جی ہاں۔ یہ مجھے معلوم ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

وہ کوئی دتا ہوا سبق کہہ کرانے کے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”مہمانوں کو ان کی آمد کا اس وقت تک چاہئیں چلے گا جب تک وہ ہیڈ ٹیبل پر نہیں پہنچ جاتیں گے۔ ہال کے دروازے سے بیڑھیوں اور لفٹ تک ہمارے آدمیوں کے علاوہ ہوٹل سیکورٹی کے بھی چند لوگ تعینات ہوں گے۔ آپ کے آدمی شیشہ شامہ لگے ٹون پر بتایا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے قاتلہ اشارہ ہوٹلوں کی طرح آپ کے ہوٹل میں بھی سیکورٹی کا پابندہ عملہ رکھا گیا ہے جس کے انچارج کا نام راؤ چوہدری ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ کوئی خاص ضرورت پڑنے پر اس محلے میں اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ انہی انتظامات کی وجہ سے ہم نے آپ کے ہوٹل کو زیادہ پسند کیا تھا۔ فارن فخر صاحب دس خاص خاص مہمانوں کے ساتھ بیٹھا

بھی کسی معاملہ ہوگا۔ کچھ نہیں کہا جا سکا کہ خضر صاحب کس بوقت میں سے پانی یا شراب لیں گے یا کس برتن میں سے ان کے لئے چائے وغیرہ پئے گی۔

”ان باتوں سے گویا آپ کو حنا مل جاتی ہے کہ تقریب میں کچھ نہیں ہوگا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے پوچھا۔

”آپ خود ہی ہمارے بارے میں کہہ چکے ہیں کہ ہم محسوسات پر مجبور سا کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ اس لئے ہم تو دور دور چار والی بات ہی کریں گے۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی بے پروائی تھی جس پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جس پوزیشن پر تھا وہاں وہ ہلکی سی بے پروائی کا بھی مشعل نہیں ہو سکتا تھا۔

”لیکن میرے محسوسات کہہ رہے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے جسے دیکھنے کی اگر ہم نے تدبیر نہ کی تو وہ ضرور ہو کر رہے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اب یہ منطقی اور احساس کا معاملہ ہے۔ دیکھیں اس روز میں کون جیتتا ہے۔“

اکرام بیگ اب ذرا مضطرب انداز میں پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ خضر صاحب کی کسی پلیٹ میں ذہر والا جائے گا؟ لیکن کچھ میں سیکورٹی کے ایک آدمی کی ذہنی خامی طور پر اس کام کے لئے لگائی گئی ہے کہ وہ نہ صرف دھیان رکھے کہ کسی پلیٹ میں کوئی مشکوک چیز تو نہیں ڈالی جا رہی بلکہ وہ اگر کسی کو یہ کہتے سمجھے کہ فلاں پلیٹ خضر صاحب کے لئے ہے تب بھی وہ فوری طور پر مجھے یاد دلاؤ چوہدری کو رپورٹ کرے۔ یعنی اگر کسی پلیٹ کے بارے میں خاص طور پر کوشش کی گئی کہ وہ خضر صاحب کے سامنے ہی جائے تو اس کے بارے میں ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ پلیٹ میز تک پہنچنے سے پہلے۔“

”میرا خیال ہے کچھ میں ایسی حرکت نہیں کی جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”لیکن سے ہال تک کے راستے میں بھی عمرانی کا یہی عالم ہوگا۔“

”میرا خیال ہے راستے میں بھی کوئی ایسی حماقت نہیں کرے گا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ گویا زنج ہو کر بولا۔ ”تو پھر کیا کوئی ہال میں ہی اگر خضر صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کرے گا: جناب! ذرا مت کھول لیجئے۔ مجھے آپ کی زبان پر ذہر پڑا ہے۔“ آپ کے خیال میں کیا یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا؟“

”نہیں۔“ میرے خیال میں یہ بھی عمریوں کی نظر میں کوئی مناسب طریقہ نہیں ہوگا۔ ”میں نے کبھی سمجیدگی سے جواب دیا۔“ دیکھیں چوہدری صاحب! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے اور نہ ہی میں اور آپ مذاق کی پوزیشن میں ہیں۔“ وہ گویا اپنا غصہ منبج کرتے ہوئے بولا۔

خیال نہ رہا کہ یہ سب مہمان ایک قطار میں بیٹھے ہوں گے۔ میر کے دو سر کی طرف کوئی نہیں ہوگا بلکہ سامنے دو سر کی گول میزوں پر مہمان ہوں گے۔ خضر صاحب بیٹھیں گے۔ یہی اپنی نشست سے اٹھ کر تقریر کریں گے۔ ان کے پیچھے دیگر اور سیکورٹی کے لوگ ہوں گے۔ ہال میں موجود تمام لوگوں پر ان کی نظر ہوگی۔

”دیکھیں یہ بھی؟“ میں نے پوچھا۔

”گوشتوں کی ڈسے وادی ہوئی سیکورٹی والوں کی ہے۔ راؤڈ چہرہ رکھنے والے ہیں۔ کب سب بھروسے کے آدمی ہیں۔ سب سے اہمیت ملازم رکھا گیا ہے تب سے ہر ایک کی عمل فائن ہوئی کے آفس میں مکتوف ہے۔ اس کے علاوہ سب وہ سر کرنے کے لئے اس ہال اور دیگر کچھ داخل ہوں گے تو ان کی تلاشی لی جائے گی اور اس کے بعد وہ تقریب کے اختتام تک اس طرح نظر میں رہیں گے کہ انہیں باہر کا کوئی بھی شخص کوئی چیز نہ دے سکے۔“

میں سیکورٹی کے اس قدر انتظامات پر دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ معلوم نہیں خضر صاحب کے لئے یہی تدبیر اتنے انتظامات ہوتے تھے یا آج کل کوئی خصوصی معاملہ تھا۔ میں اس سلسلے میں اکرام بیگ سے پوچھنے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بولا۔ ”صرف ٹارن خضر صاحب کے لئے اتنی سیکورٹی ہوتی ہے۔ دوسرے مرکزی ذہروں کے لئے نہیں۔“ دیکھئے آپ کا یہ شہ بھی درست ہے کہ آج کل کچھ خصوصی حالات چل رہے ہیں۔ ہمیں اوپر سے آرڈر ملے ہیں کہ ملک کی کچھ ایسی شخصیات کے لئے سیکورٹی مزید ٹائٹ کر دیں جن کا تعلق بین الاقوامی معاملات سے ہے۔“

”اس کا مطلب ہے براہم خضر اور پریذیڈنٹ کے لئے تو سیکورٹی اس سے زیادہ ہوتی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”کیس زیادہ۔“ اکرام بیگ نے جواب دیا۔ ”اس کا تو آپ تصور نہیں کر سکتے۔“

”لیکن مسئلہ یہ ہے۔“ میں نے کرسی کے پٹے سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا۔ ”کہ یہ سب انتظامات دوایتی ہیں جو ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں۔ یہ انتظامات صرف قاتلانہ حملے سے بچاؤ کے لئے کئے جاتے ہیں۔“

”ہاں۔“ جبکہ آپ کو قاتلانہ حملے کا اندیشہ نہیں ہے۔“ اکرام بیگ نے سر ہلایا۔ ”مجھے خضر صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کے خیال میں انہیں ذہر دینے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ ذہر کو کہہ دینے نہیں ہے۔ ہر شخص کو اس کی میز پر ہی سر کیا جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے۔ بیشتر چیزیں کچھ سے بڑی بڑی اجازت میں ہی آئیں گی۔ دیکھئے ابھی ایک ایک ڈش سے کھانے کی چیز کئی کئی افراد لیتے ہیں۔ جو چیزیں پلیٹوں میں آئیں گی وہ بھی دیگر کچھ سے اس طرح لے کر چلیں گے کہ ہر ایک ٹرے میں کئی کئی انہیں ہوں گی۔ اب یہ تو ہر گز نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی پلیٹ خضر صاحب کے سامنے جائے گی۔ پانی کی بوتلیوں اور دیگر مشروبات کا

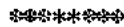
"مجھ ہے جو سوال جتنی سنجیدگی سے کیا جا رہا ہے اتنی ہی سنجیدگی سے میں جواب دے رہا ہوں۔" میں نے لاشعرت سے کہا۔
 "اچھا۔ تو آپ کے خیال میں اس وقت فخر صاحب کے کھانے میں زہر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی جب پلیٹیں ان کے سامنے رکھی جائیں گی؟ اس وقت میں اور دادو چوہدری خود ہال میں موجود ہوں گے۔ فخر صاحب کی پلیٹیں اور وہ میزوں وغیرہ کی حرکات و سکنات پر ہماری نظر ہوگی۔"
 "مثلاً اس وقت بھی ایسی کوئی حرکت نہ کی جائے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا۔

"تو پھر آخر آپ کے ذہن میں کیا تصویر ہے جس پر سازشی لوگ عمل کریں گے؟" اب اس نے اپنا لہجہ ہموار رکھا۔
 چرچا بہت ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے وہ میرے خیال میں اندری اندر سلگ رہا تھا۔
 "کاش میں آپ کے سوال کا جواب دے سکتا۔" میں نے لہجہ مضطرب سانس لے کر کہا۔ "محسوسات پر بھروسہ کرنے میں یہی تو مشکل ہے۔ محسوسات، انسان کو کسی معاملے میں اشارہ تو دے دیتے ہیں لیکن وہ پوری نقشہ کشی نہیں کرتے۔ عمل ہدایت نامہ تیار کرنے میں دیتے۔"

"تو پھر میرے خیال میں آپ کو خواہ خواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اٹھٹھٹھ ہونے لگا۔ "آپ بالکل مطمئن اور بے فکر ہو جائیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اس معاملے میں نہ ہی پزیریں تو اچھا ہے۔ آپ خواہ خواہ کراچی جانے کی زحمت نہ کریں۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "یہ مت سمجھئے گا کہ میں آپ کے محرمات کی "گادروگی" کو تسلیم نہیں کر رہا۔ ہو سکتا ہے وہ سب سے بہت سے معاملات میں آپ کے محسوسات آپ کی درست رہنمائی کرتے ہوں۔ میں بہر حال آپ کے محسوسات کو سلام کرتا ہوں۔" اس نے ہوا میں دیکھتے ہوئے اڑیاں ملا کر کسی ناویدہ چیز کو باقاعدہ سیٹھ کیا اور تیزی سے گھوم کر رخصت ہو گیا۔ اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔

میں کچھ دیر اس کے بارے میں سوچا مگر فائیکل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ناہم دیکھتے ہوئے تو فوڈی ہی دیر ہوئی تھی کہ کیتھرن نے بتایا، شام چوبیس بجے کی فلائٹ پر فرسٹ کلاس میں میرے اور نذیر خان کے لئے دو سیٹوں کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں نے کیتھرن ہی کے ذریعے نذیر خان کو مطلع کر دیا کہ وہ پانچ بجے ائر پورٹ پر پہنچ جائے۔



فلائٹ لاہور سے بالکل صحیح وقت پر روانہ ہوئی۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے ہم کراچی ائر پورٹ پر اتر چکے تھے۔ شفیق شاہ

نے ہمیں لینے کے لئے گاڑی بھیجی ہوئی تھی۔ میں نے نذیر خان کو اپنے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ میں نے اس کے قیام کا انتظام دیکھ کر راکھا ہوا تھا۔

وہ آنکھوں پر ہاتھ کا چھپا سا بنا کر اس بلند وبالا عورت اور چمک و دکھت خوبصورت عمارت کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "ہوٹل بہت خوبصورت بنایا ہے سچی!"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں نذیر بھائی!" میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔ "میں نے تو بس ایک خواب دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح اس کی تعبیر کے اسباب پیدا ہوتے چلے گئے۔ پھر ایک روز میں کراچی آیا تو میرے خواب کی یہ تعبیر یہاں سراٹھانے لگی تھی۔ بس یہ قسمت کا کچھ کمال ہے۔ اوپر والے کی مہربانی ہے۔ ورنہ آپ کو معلوم ہے خواب تو سبھی دیکھتے ہیں۔"

"تمی ہاں۔" بعض اوقات تو آدمی خواب دیکھ کر چھپتا ہے۔ وہ بالکل سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "تعبیر بالکل الٹی نکل آئی ہے۔" "اچھا۔" میں اب چلا ہوں۔ "میں نے کہا۔" "میرا کچھ نہیں۔" آج رات واپس آؤں یا نہیں۔ شاید آپ سے کل ملاقات ہو۔ ویسے ہوٹل کی انتظامیہ نے ازراہ مہربانی مجھے آپ کے برابر والا کمرہ دے دیا ہے۔ فخر صاحب ہم سے اوپر والے فلور ٹھہریں گے۔"

"ہوٹل کی انتظامیہ...؟" نذیر خان نے مسکراتے ہوئے دہرایا۔ "آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے وہ آپ کے ملازم نہ ہوں جیسے آپ ہوٹل کے مالک ہی نہ ہوں۔"

"بھئی ہوٹل کا مالک تو میں ہوں۔ لیکن وہ لوگ مرضی کے مالک ہیں۔ بڑی آزاد طبیعت پائی ہے انہوں نے۔" میں نے لہجہ سانس لے کر کہا۔ "ہوٹل کے ڈسٹن میں وہ لوگ مجھے بھی دخل نہیں دینے دیتے۔ کہتے ہیں، اگر ہوٹل چلانا ہے تو ہمیں اپنی مرضی سے چلانا ہے۔ نتیجتاً آپ نے ہوٹل بنوایا ہے، آپ کا کام ہو گیا۔ اب اسے چلانا ہمارا کام ہے۔ میں بھی سوچتا ہوں، اچھا ہے۔ ہوٹل دو سرے قسم کا بزنس ہے لیکن میرے لئے یہ کام پرنٹنگ رہا ہے جس میں مجھے خود کوئی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔"

"کمال ہے!" نذیر خان نے قدرے تعجب سے سر ہلایا۔ "آپ کی خوش قسمتی میں واقعی کوئی شک نہیں۔ ورنہ لوگوں کو کہتے تھے کہ روپیہ ہر مسئلے کا حل نہیں ہے۔ جس کام پر بھی توجہ نہ دو اس کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے، خواہ کتنے ہی بھروسے کے ہوں۔"

"آپ تو اب یہاں قیام کر رہے ہیں۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔ میرا تو اس کو چلانا میں اتنا بھی عمل دخل نہیں ہے جتنا مہمان کا ہو سکتا ہے۔ مجھ سے زیادہ تو یہاں قیام کرنے والے مرضی اور مشورے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اتنی دیر میں ایک پورنر نے آکر نذیر خان کا سامان اٹھالیا۔

پہلے ہی اپنی پینٹنگز وغیرہ بڑی مشکل سی سنبھال ہوئی تھیں۔ میں نے اس کا سارا کام دیکھ کر محسوس کیا تھا کہ اگر اس نے حالات صحیح رہے ہوتے اور وہ ملازمت میں نہ جھسکتی ہوئی تو یقیناً بڑا کام پیدا کرتی۔ حتیٰ کہ وہ کارٹون کی فیلڈ میں بھی بڑا نام بنا سکتی تھی۔ حالانکہ اس فیلڈ میں تو مرد بھی ہر دور میں گنتی کے چند ہی رہے تھے۔ عورت تو کبھی کوئی سامنے آئی ہی نہیں تھی۔

میں دروازے پر کھڑا راجیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور دستک دینے کے بارے میں متذنب تھا۔ اچانک ایک ٹپکتے سے دروازہ کھل گیا۔ راجیلہ سرخیں رنگ کی ایک جھلملائی ہوئی سی سکیں میں سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اٹھئی اور وہ گویا غیر ارادی طور پر بول اٹھی۔ "مجھے تمہارے وجود کی خوشبو آئی تھی۔ میں یہیں میں تھی۔ اچانک ہی مجھے محسوس ہوا جیسے تم دروازے پر کھڑے ہو۔ میں نے یہی سوچا کہ یہ میرا وہم ہے۔ لیکن پھر میں نے سوچا" ایک نظر کو دیکھ لیتے ہیں کیا ہرج ہے؟"

مجھے دستک دینے یا بھل جانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور دروازہ کھل گیا تھا۔ میں ساکت کھڑا ایک تنگ اس کی طرف دیکھ کر جا رہا تھا۔ میں جب بھی اس کی طرف دیکھتا تھا دل پہلے سے زیادہ اس کی طرف کھینچا تھا۔ وہ صبح چہرہ میرے لئے سڑیوں کی اداس راہوں میں دُور آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرح تھا جو میری رسائی میں ہوتے ہوئے بھی رسائی میں نہیں تھا۔

اچانک گویا اسے یاد آگیا کہ وہ تو مجھ سے ناراض ہے۔ اس نے چہرے پر حد سے زیادہ شہید کی لہر رنجیدگی اور انجینیت طاری کر لی۔ سیاہ لہجے میں بولی۔ "صاف کہتے گا میں آپ کو کوئی اور سمجھی تھی۔ فرمائیے کس سے ملنا ہے؟"

"راجیلہ سے۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"اس کا تو کب کا انتقال ہو چکا۔ آپ کو نہیں معلوم؟" اس نے نہایت مصعوبیت سے کہا۔ "آج تو اس کا چلم ہے۔"

"میں چلم ہی میں شرکت کے لئے تو آیا ہوں۔ اس کے بعد مجھے ان کا مزار بنانا ہے اور اس پر مجاور بن کر بیٹھنا ہے۔" میں نے بھی اسی مصعوبیت سے جواب دیا۔

"ارے صاحب!۔" وہ ٹھٹھکی سانس لے کر بولی۔ "آپ ہزار ہزاروں والی شخصیت کہاں۔ آپ تو پلازے اور کوٹھیاں بنانے والی ہستی معلوم ہوتے ہیں۔ پانیجے۔ اپنے انہی حدود میں گمن رہئے۔ یہاں غریب مروجین کے پاس کیا لینے آئے ہیں؟" "یہاں غریب مروجین میں ان فلاحیات کا بالکل مدافع نہیں ہوں؟"

میں نے حیرانی سے چلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ "ہزار میل دور سے آئے ہوئے مسلمان کو اندر آنے کے لئے مجھے نہیں پوچھئے؟"

"آف۔۔۔۔۔ کیسی ظالم رہا ہے۔۔۔۔۔ کیسے ذہیت لوگ ہیں۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "مروجین کو ان کی آخری آرام گاہوں میں

نے ڈرا آئینہ رکھ دیا وہیں انار دیا اور خود گاڑی لے کلشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد میں ایک بار پھر اس فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا جس کے بند دروازے کے پیچھے میری محبت کی کھلی کتاب رہتی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں نے اس کتاب محبت کے اب تک بستے دروازے پلٹے تھے ان سے میں اس کا صحیح معلوم سمجھ پاتا تھا یا نہیں؟ لیکن بس میں اس کتاب کا اسیر تھا۔ محسوس پھر کراسی کے پاس واپس آنے کو دل چاہتا تھا۔

دروازے پر چھاپاں رنگین کارٹون اب بدل چکا تھا۔ اب ایک نئی اور سخت کی ڈرائیوئی شاخ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے بال ہوا میں لہراہے دکھائے گئے تھے۔ وہ پہلی پہلی گول آنکھوں سے زنان کی طرف دیکھ رہی تھی گویا جھلائی لگا کر زمین پر اتنا چاہتی ہو مگر اس کی ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ نیچے دیباہی ایک معصوم سا بچہ دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا گویا بچی کی سمت بھرا ہوا ہو کہ کور باڈ میں جھپس سنبھال لوں گا۔ لیکن بچی کے اثرات بنا رہے تھے کہ اس کی جھلائی لگانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میں ہیٹ کارٹونسنوں کے اس ہنسرے برا محظوظ ہوتا تھا کہ وہ محض چند ٹیکوں سے شکل اور تاثرات سب کچھ واضح کر دیتے تھے۔

راجیلہ سے پچھلی طویل ملاقات میں جہاں دیا جہاں کی باتیں ہوئی تھیں وہیں میں نے اس کا بہت سا کام بھی دیکھا تھا۔ مجھے تو وہ اچھی لگتی تھی میرے لئے وہ سرنا پا خوبصورتی تھی اس کا ہر کام خوبصورت تھا۔ میں شاید اسے اپنے چہرے پر ہی ہوتی آنکھوں سے نہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ مگر میں نے کئی بار جذبات کا سوچ آف کر کے صحن سخن کی ٹینک انار کر بھی اسے دیکھا۔ وہ حقیقتاً سرنا پا خوبصورتی تھی۔ اس کے کام بھی خوبصورت تھے۔ ٹینکس کالج آف آرٹس کے پڑھے ہوئے لوگ عموماً اپنی کوئی ایک لائن بنالیتے تھے اور اسی تنگ محدود ہو جاتے تھے۔ کوئی تجزیہ پیش نہ کرتا تھا تو اسی میں مقام بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی REALISTIC آرٹ میں اپنا رجحان دیکھتا تھا تو اسی میں قدم جانے کی کوشش کرتا تھا۔

کبھی کبھار کوئی کارٹونٹ کے طور پر بھی ابھرتا تھا لیکن زیادہ تر میکینیکل قسم کے کام کرتے تھے صرف لے آؤٹ اور ڈیزائننگ وغیرہ میں مہارت حاصل کرتے تھے اور رنگا رنگ رسالوں انشادوں یا پھر ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں کھپ جاتے تھے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اپنا کوئی مقام بنا پاتے تھے۔ ان میں سے کوئی کوئی ہی بڑے نام والا بنتا تھا۔

راجیلہ کا کام یہ تھا کہ وہ آرٹ کے ان چاندوں شعبوں پر حادی معلوم ہوتی تھی۔ صرف مجسمہ سازی یا SCULPTURE کو اس نے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس شوق کی تکمیل کے لئے جگہ نہیں تھی۔ اس نے

میں آرام سے صبح رہنے دیتے۔
پھر اس نے ایک طرف ہٹ کر میرے لئے راستہ چھوڑ دیا اور
اپنے لمبے کو جلا کر سنا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے
بولی۔ ”آئیے... شریف لایے۔“
”راشہ کہاں ہے؟“ ”نمر پتھ کر میں نے پوچھا۔“
”بھول ہی میں ہو گا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”اس
لئے تو آج کل بھول کو گھر اور گھر کو بھول بنایا ہے۔ یہاں تو وہ
صرف چند گھنٹے سونے کے لئے آتا ہے۔ بلکہ کسی بھی دن تو سونے
کے لئے بھی نہیں آتا۔ شاید وہ کچھ ایسا محسوس کر رہا ہے جیسے
بھول کا پورا بوجھ اسی بے چارے کے نازک کندھوں پر ہے اور اگر
اس نے اپنے کندھے بنائے تو خدا انخواستہ بھول کی عمارت و حرام
سے بچنے آکرے گی۔“

”میرے لئے کام کرنے والا ہر شخص کچھ اسی طرح محسوس
کر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔
”بہت چالاک سیٹھ ہو۔ ملازموں کو غلوں کے پھندے میں
پھنسا رکھا ہے۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔
”میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ میں تو اپنے بہت سے
ملازمین کو جانتا بھی نہیں۔ بہت سے ملازمین کو میں نے دیکھا تک
نہیں۔ وہ جو بھی کرتے ہیں، خود ہی کرتے ہیں۔ شاید یہ بھی میری
خوش قسمتی کی ذخیرہ ہی کی ایک کڑی ہے کہ مجھے نیچے سے اوپر تک
وفا دار ملازمین ملے ہوئے ہیں۔ وہ خود ہی غلوں کے پھندے میں
پھنسے ہوئے ہیں۔ میں تو کسی کو بھی، کسی بھی پھندے میں نہیں
پھنساؤں۔“

”اور... اتنی مثالی پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ
مصنوعی ہنسی سے بولی۔ ”میں کون سا تم پر کوئی فرد جرم عائد کر
رہی ہوں۔“
”دو بے باقی دادے... غلوں ہو گا جیسی تو اس کا پھندا بھی
ہو گا۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”حقیقت یہی ہے
راہیل! میں اپنے کارکنوں کے لئے اپنے دل میں بہت غلوں
محسوس کرتا ہوں۔ میرے سامنے آج تک میرے کسی بھی پروجیکٹ
کے ملازمین کے مطالبات کی جو بھی فائل آئی ہے، مجھے اگر وہ
مطالبات ذرا بھی معقول لگے ہیں تو میں نے ان پر دستخط کرنے میں
ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ خواہ اس سے ہمارے بجٹ میں
لاکھوں کا فرق پڑ رہا ہو۔ میں سوچتا ہوں، شاید یہ میرے بے شمار
کارکنوں کی کاوشیں اور دعائیں ہیں جو مجھے اتنا آگے لے جا رہی
ہیں ورنہ میں تو اس قابل نہیں تھا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ
جتنا میں مشتاق ہوں، جتنا اپنی دولت میں دوسروں کو شریک کرتا ہوں،
اتنا ہی وہ مجھنے کے بجائے بڑھ رہے ہیں۔ جس سال میں سوچتا ہوں کہ
میرے فلاں فلاں شعبوں میں مندی رہی ہے اور شاید کوئی خاص
منافع نہ ہوا ہو، اس سال حلیات آؤت ہو کر آتے ہیں تو پتہ چلتا

پراسرار ہولناک اور ناقابل فراموش کہانیوں کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

بدن کا قیدی

30

اردو بازار لاہور

کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مگر میرے سامنے یہ محبت و دیوبہ کی باتیں مت کیا کرو۔ یہ سب فضولیات ہیں۔ بہت بیکار لگتا ہے مجھے یہ لفظ۔"

"جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ درحقیقت زیادہ بری طرح محبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اب ان لنگڑے لنگڑوں کی دکان بند کرو اور یہ بناؤ کیا بیو گے۔ کیا کھاؤ گے؟"

"ہاں۔۔۔ اب کی ہے تم نے کام کی بات۔" میں نے ذرا پچھل کر بیٹھے ہوئے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے کچھ اور باتیں بھی ضروری ہیں۔ یہاں آؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھو۔ مجھے بتاؤ کیسے گزر رہے ہیں تمہارے روز و شب؟ چاندنی راتوں میں کبھی ایک دم اور چار اسرار سی اداسی تمہارے دل کو کہہ داتی ہے یا نہیں؟ ایک ایسی اداسی جو گراں گزرنے کے بجائے دل کو بھلی لگتی ہے؟ جس کے دامن میں پناہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ تمہارے کبھی تمہارے کانوں میں سرگوشیاں نہیں کرتے کہ زندگی کتنی بے کیف ہے؟ کبھی تمہارے دل کے آئین میں کوئی غلا پھٹا کرین نہیں ملتا؟ کبھی تمہیں میری یاد نہیں آتی۔"

وہ میرے قریب آگئی ہوئی تھی لیکن یہ سب کچھ سن کر بیٹھے بیٹھے رک گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی لگنا سی چھا گئی۔ اس سنجیدگی میں کسی ہلکے سے خوف کی آمیزش بھی تھی۔ وہ جیسے اپنے اندر کسی ڈرلے کو چھپائے کھڑی تھی اور بالکل خاموش تھی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بھی مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ میں گویا اس کے لئے ایک شفاف دیوار تھا اور وہ اس کے پار کسی اور سی چیز کو دیکھ رہی تھی۔

"بولنا۔۔۔ کچھ تو بولو۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے اسے ہلا جا کر گویا کسی انجانی دنیا سے واپس لانے کی کوشش کی۔ اس نے ایک عجیب دہشت زدگی کے ساتھ عالم میں مجھ سے ہاتھ چھڑا لے لیا وہ ہاتھ بھلی کے نیچے امداد سے جھوٹے ہوں۔ جس حالت سے اس نے مجھ سے ہاتھ چھڑائے تھے اس نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ ایک دہلی چلی دراز زد لڑکی تھی۔ اس کی جسمانی ساخت امریکی لڑکیوں سے مشابہ تھی۔ امریکی لڑکیاں بھی خواہ وہ چلی چلی ہوں لیکن ان کی حرکات و سکنات کے بھی بے پناہ توانائی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں ایک خاص قسم کی تیزی و تندگی ہوتی ہے جو بیشتر ایشیائی عورتوں میں تو کم ہوتی ہے۔ ان میں بھی نہیں ہوتی۔ لیکن راحیل کی حرکات و سکنات میں جو جوش و تندی ہوتی تھی وہ کبھی بھی مجھ سے بھی حیران کر دیتی تھی۔ اس کی تیزی و تندگی امریکی لڑکیوں کو مات کرنی نظر آتی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپایا اور تب میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ سر سے پاؤں تک خروں رسیدہ تھی کی طرح کانپ رہی تھی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے قلم شاعرانہ انداز

میں نے جلدی سے کہا۔ "میرا حال۔۔۔ میرے ہاں مصرعے ڈالنا محبت نہیں کرتے۔ اس لئے ان کا وزن اور بچے ہوتا رہتا ہے۔"

"دیئے تم نے جو الفاظ بولے تھے ان کا مطلب میری کچھ میں آیا ہے۔ بہت سی ملکی اور غیر ملکی زبانیں ایسی ہیں جو مجھے زیادہ نہیں آتیں لیکن ان کی کچھ بوجھ ضرور ہے۔"

مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔ "اچھا بتاؤ میں نے کیا کہا تھا؟"

"تم نے کہا تھا۔ ہم روٹھے ہوئے دوست کو مٹانے آئے ہیں لیکن ایسی کیا تھا تم نے؟"

"ہاں۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مطلب مجھنے کے بعد بھی تمہارے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یوں گھورے بارش ہو جیسے میں نے تمہاری کوئی جیب وغیرہ کاٹ لی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ مگر معاف کرنا۔۔۔ خواتین کی تو عام طور پر عجیب سی نہیں ہوتی۔"

"اچھا اب یہ ادھر ادھر کی باتیں بند کرو اور سنجیدگی سے بتاؤ کہ اچانک کیسے ٹپک پڑے؟" وہ بدستور گھورتے ہوئے بولی۔

"بتانا تو ہے۔ ایک تو تم عورتوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے کہ کسی بات کا یقین ہی نہیں کرتیں۔ میں چند دن فون میں کپاپا تھا تو تم بہت ناراض تھیں نا۔ میں نے کہا تھا اب فون کرنے کے بجائے میں خود آکر تمہاری تاراسکی دور کروں گا۔ سو بندہ حاضر ہے۔"

"ہاں۔ بندہ حاضر تو واقعی ہے۔" وہ سہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن جھوٹ بولنے میں بندے کا خواب نہیں۔ کسی بزنس ٹپ پر آئے ہوئے ہو گئے تم نے سوچا ہو گا کہ یہاں ایک بے وقوف سی لڑکی رہتی ہے، پھلو اس پر بھی احسان دھرتے چلو۔ یہی بات ہے نا؟" "لڑکی کے بے وقوف ہونے کی حد تک تو مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے لیکن باقی بیان درست نہیں ہے۔" میں نے گہرا زور لے لیا۔ "پتا تو بزنس ہی محبت ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے کبھی بزنس کی اتنی پردا نہیں کی کہ ادھر ادھر بھائے گھر۔"

"مجھے سب کی ہیں لیکن ہزار روپے کا نقصان ہو جائے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"تمہارا جو دل چاہے کبھی روہے وقوف لڑکی! میں نے شامانہ لیے ہیں کیا۔" ہم تم سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ ہم بحث کرنے کے لئے نہیں آئے۔ بحث تو جب اور جہاں جا ہو شروع کی جاسکتی ہے لیکن محبت کرنے کے لئے انسان کو برا مہر کرنا پڑا ہے برا سزا کرنا پڑا ہے۔ اردو میں بھی سزا کرنا پڑا ہے۔ انگریزی میں بھی "SUFFER" کرنا پڑتا ہے اسی کا نام محبت ہے۔"

"باتیں بہت آگئی ہیں شمس۔ زبان خوب چلنے لگی ہے۔ بہت تیز ہو گئے ہو۔" وہ اپنے خوبصورت بالوں میں انگلیاں پیچھرتے ہوئے بولی۔ چہرے سے صاف ظاہر ہوا تھا کہ وہ سکرابٹ منیٹ

بازو چھوڑ دے۔

”تمہاری سمجھ میں بات کیوں نہیں آتی؟ میں پہلے بھی وضاحت کر چکی ہوں۔“ وہ مدد دینے والی آواز میں بولی۔ آفتاب اس کی آنکھوں میں نہیں، آواز میں بول رہے تھے۔ ”میں نے کہا تھا کہ میں اب اپنے آپ کو تمہارے قابل محسوس نہیں کرتی۔ مجھے اپنی جگہ رہنے دو اور تم اپنے راستوں پر اپنا سفر جاری رکھو۔ جب تک بھی زندگی رہی، بس ہم اچھے دوست رہیں گے۔“

”فکروے لفظوں کا سارا اب تم لے رہی ہو۔ یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو کہ کون کس کے قابل ہے اور کون کس کے قابل نہیں ہے۔ تم میری بات مان لو۔ اور اگر زندگی میں کبھی تمہیں احساس ہو کہ میری بات مان کر تم نے غلطی کی تھی تو بے شک اسی لئے اپنا راستہ جدا کر لیتا۔“ میں نے پُر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی چھاسویں لڑکیوں اور عورتوں سے آج تک تعارف ہوا تھا۔ بعض سے مراسم رہے تھے بعض سے بہت گہرا تعلق رہا تھا۔ بعض سے تعلق ابھی تک چلا آ رہا تھا۔ یہ خود ساختہ نہیں، حقیقت تھی کہ ان میں سے کسی کو بھی اگر میں نے یہ سب کچھ کہا ہو تو میں راجہ سے کہہ رہا تھا تو نہ جانے کس خوش و خروش اور خوشی کے ساتھ یہ پیشکش قبول کر لی جاتی۔ غوث کے دور سے نکل آئے کے بعد جتنی بھی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی، میں ان میں سے کسی کے ساتھ بھی شادی کر سکتا تھا۔ لیکن یہ کبیرت دل جاں جا کر انکا تھا ہاں انکار کے سوا کچھ نہیں تھا۔

یہ فطرت انسانی کا ایک عجیب پہلو تھا۔ شاید یہ بھی مقدروں ہی کی ایک قسم غریبی تھی کہ جو کچھ میرا ہوتا ہے وہ انسان کی نظر میں زیادہ نہیں چمکتا۔ جو چیز رسائی سے جتنی دور ہوتی ہے، دل ان ہی اس کی طرف کھینچا ہے۔ راجہ کی طرف سے میرے دل کو اچھا بھلا قرار آ چکا تھا۔ میں اسے بھولا تو نہیں تھا لیکن وہ صرف ایک لکھ کی طرح میرے دل میں جا کر نہیں تھی۔ مگر دوبارہ ملاقات نے، اس کی عزت نے، اعتراف محبت نے گویا دل میں طلب کا طوفان پہلے سے زیادہ شدتوں کے ساتھ جگایا تھا۔ مگر نصیبوں کی آنکھ پچی عجیب تھی۔ جدھر دل ملتا تھا، دھڑے ”ہاں“ میں جواب نہیں ملتا تھا۔ حالانکہ راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، کوئی مجبوری نہیں تھی، سراج کی کوئی دیوار نہیں تھی۔

”انی! ایمنس۔ تم اس موضوع پر مجھ سے بات کرنا چھوڑ دو۔“ اس کے لیے میں ہزار احتجاجیں تھیں۔ ”دنیا میں اور بھی اتنے بہت سے موضوع ہیں بات کرنے کے لیے۔ باتیں اتنی ہیں کہ کبھی ختم ہونے میں نہ آئیں لیکن تم ہو کہ گھوم پھر کر اسی موضوع پر آ جاتے ہو۔“

”تمہارے انکار کا جواب۔ تمہاری منطق میرے دل کو نہیں لگتی۔“ میں نے کہا۔

میں بولے ہوئے الفاظ اس شگدل سی لڑکی پر اتنا اثر کریں گے۔ ”مت کیا کر اس طرح کی باتیں۔“ وہ لڑتی آواز میں بولی۔ ”تم وہی جتنے کھیلے بے پروا اور کلنڈر سے اپنی رہنمائی میں برسوں سے جاتی ہو۔ خواہ خواہ لفظوں کے نشتر لے کر میرے خوابیدہ ذہنوں کو کیریدنے کی کوشش مت کرو۔ تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔“

”کیوں؟“ کیا تمہارے خیال میں زندگی کے پہلو پر میرا دل کامیاب نہ ہو گا؟ میں کوئی شہیدہ بات نہیں کر سکتا؟ کیا تمہارے خیال میں میں سوچ، فکر اور محسوسات سے محروم ہوں؟ میں نے حقیقتاً مجروح سے لیے میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”مجھے معلوم ہے ان کے دل زیادہ بوجھل ہوتے ہیں جو بظاہر ہلکے ہلکے جتنے کھیلے اور بے فکر نظر آتے ہیں۔ مگر نہں۔۔۔ زندگی اسی طرح بھی تو گزر سکتی ہے۔ مدون جذبول کے سزاروں کو کیریدنے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ چرسے سے پٹائے۔ پل بھر میں اس کی آنکھیں جھپک جھپک تھیں۔ سرخ ہو چکی تھیں۔

”نہیں مگر زندگی اس طرح زندگی۔“ میں نے قدرے تیزی سے کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔۔۔ خود فریبی ہے۔ تمام عمارتیں اپنے آپ کو کھوکھلے لفظوں، کھوکھلے جذبول اور کھوکھلی ہنسی سے نہیں بھرا سکتا۔“ میں نے اس کی بیٹھکی آنکھیں پوچھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کیوں اپنی ذات پر خدا کا آغا تخت ڈال چڑھا لیا ہے؟ اپنے آپ کو بھی انسانی سولی پر معلوب کر رکھا ہے اور مجھے بھی اذیتوں کے خارزار میں بیٹھنے کے لئے چھوڑا ہوا ہے۔ کبھی کسی کی قربت میں پناہ تلاش کرتا ہوں اور کبھی کسی کی نوازشوں سے دل کی وحشت کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ہر مرحلے سے گزرتے کے بعد آج بھی اسی طرح تشنہ کام ہوں جس طرح ملا کہن میں تھا۔“

اس نے کسی انجانے پوچھ سے جھکی ہوئی لمبی چٹکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ جھپکی بیٹھکی آنکھوں میں بے چینی کی پچھائیاں تھیں۔ نہ جانے کیوں میری آواز بیٹھی جا رہی تھی۔ یہ مشکل میں نے کہا۔ ”میری کوٹھیاں پھٹنے، کارخانے سب کچھ کبھی کبھی مجھے بہت بے مصرف لگتے لگتا ہے۔ گھر میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں مگر درد و بار سے ویرانی جھاکنے ہے۔ میرے ساتھ چلو اور اس دیرانی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو۔ ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ ہم شادی کر لیں۔“

”میں بہت پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“ وہ غیر ضروری طور پر اونچی آواز میں بولی۔ گویا مجھ سے زیادہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی ہو۔

”لیکن کیوں؟“ میں نے بھولا کر کہا اور غیر ارادی طور پر اس کے بازو اتنے زور سے پکڑ لئے کہ وہ کراوا اٹھی۔ میں نے جلدی سے

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ افسردگی سے بولی۔ ”یہ سمجھ لو“ ہرجال باتیں کرتے ہیں۔“
 میں خود اذیت میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ اپنے آپ کو سزا دے رہی ہوں۔ اور اس نے طمانیت محسوس کر رہی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ کیا تمہاری زندگی کی ساسھی بننے کی طلب مجھے نہیں تڑپاتی؟ بہت تڑپاتی ہے۔ تمہارے لئے میرے وجود اور میری مدد میں طلب کا ایک لامتناہی سحرا پھیلا ہوا ہے لیکن میں نے ناشی میں تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ اتنا سفاکانہ اور گھٹیا غل تھا کہ اب اس کی ہز میں اپنے آپ کو ترس رہی ہوں“ سسکاری ہوں“ تڑپ رہی ہوں۔ میں اسی کی سستی ہوں۔“
 چکر تم سے زیادہ تو تارسانی کے عذاب سے میں تڑپ رہا ہوں۔ تمہیں سزا کاٹنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے تو تمہیں معاف کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”جھگڑیں نے اپنے آپ کو معاف نہیں کیا۔“ وہ بولی۔
 ”پلو خیمہ۔“ میں نے لٹھری سانس لے کر کہا۔ ”ہر سزا کا ایک اختتام ضرور ہوتا ہے۔ میں انتظار کر لیتا ہوں۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کب تک جاری رہے گی یہ سزا؟“

”میں چاہتی ہوں اس سزا کا اختتام موت پر ہو۔ میں یہ سزائے محرومی کاٹنے کاٹے مر جانا چاہتی ہوں۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔
 ”حل غلٹی کے جرم کی سزا اتنی سنگین بھی نہیں ہونی چاہئے۔“ میں نے کہا۔
 ”اس جرم کی سزا تو اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہونی چاہئے۔“ وہ بولی۔

”خیمہ۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ مجھے امید ہے میں ایک نہ ایک دن تمہارے خیالات بدلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔۔۔“
 نالائمال کوئی اور بات کرتے ہیں۔ تم نے مجھے میں تین دن سے فون نہیں کیا۔ میں بھی نہیں کر سکا۔ میں بھی سوچ رہا کہ بہت سی زیادہ فرصت کا وقت میسر ہو جب آرام سے ٹائپیں پیار کر فون سینے پر رکھ کر کم از کم دو چار گھنٹے تم سے باتیں ہو سکیں۔ لیکن ایسا وقت میسر نہیں آ سکا۔ اس لئے میں فون نہیں کر سکا۔ لیکن تم بتاؤ۔ اس دوران وقت کیا کر رہا؟ کبھی میری یاد آئی یا نہیں؟ کیا سوچتی رہیں؟ جو محل تھا مجھے کس طرح گزارتی رہیں؟ کچھ تو بتاؤ۔ کوئی انجی سی بات کرو۔ دو محبت کرنے والے کچھ عرصے کی جدائی کے بعد ملتے ہیں تو کس طرح کی باتیں کرتے ہیں؟“

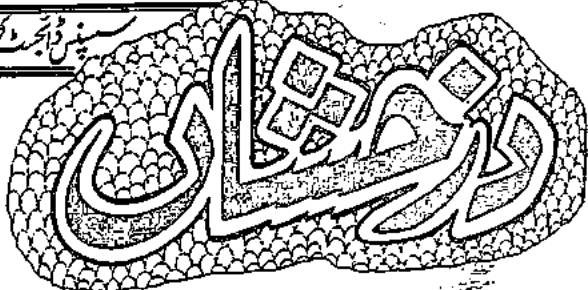
”مجھے تو معلوم نہیں۔“ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ اس کی تمارہے پاکی گویا ہوا ہو گئی تھی۔ رخساروں پر گلاب گل رہے تھے۔ اس لئے اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شادی اور طلاقی کے تجربے سے گزر چکی تھی۔ وہ ایک چھوٹی موٹی سی اسکول گرل دکھائی دے رہی تھی جس پر ساٹھ سو گواہ برس طبع ہو رہا تھا۔ وہ ہلاکی جیسی نہیں، عمر خرد بھی تھی۔
 میں نے لٹھری سانس لے کر کہا۔ ”مجھے بھی معلوم نہیں۔“

”رات کو خاصی دیر تو اسے عام طور پر روزانہ ہی بوجاتی ہے۔“ راحیلہ نے بتایا۔ ”جب کوئی خاص موقع ہوتا ہے تب تو اس کے لئے رات اور دن میں کوئی امتیاز ہی نہیں رہتا۔ کل تمہارے ہوٹل میں کوئی بہت بڑا ڈر ہے نا۔۔۔ سا بے گلی اور بھلی گلی دو سو نہایت اہم شخصیات شریک ہو رہی ہیں۔ راشد کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ڈنر کو خوش اسطولی سے نمٹنا ہوٹل کے لئے بہت نازک ذمہ داری ہے۔ بس بے چارہ سی گھر میں بلکان ہو رہا ہے۔“
 تب مجھے یاد آیا کہ درحقیقت میں کیوں اچانک کراچی آیا تھا۔ اس اصل مقصد کو تو میں کچھ دیر سے بالکل بھولی گیا تھا۔ تاہم میں نے راحیلہ سے اس مسئلے میں کوئی بات نہیں کی۔
 ”میں فون کر کے راشد کو بتا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”میری توقع کے مطابق راشد کو میری آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ فون پر یہ جان کر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش سا ہو گیا کہ میں اسی کے گھر سے بول رہا تھا۔ آخر وہ راحیلہ کا بھائی تھا۔ گوکہ اسے معلوم تھا ہمارے درمیان کیا سلسلہ تھا۔ لڑکھن سی سے وہ ہر بات سے آگاہ تھا اور تھا۔ میرے دل میں مل چڑ رہیں تھا۔
 ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ہموار لہجے میں بولا۔ ”آپ ہوٹل نہیں آئے۔“

”بس۔۔۔ میں نے سوچا جب مگر موجود ہے تو ہوٹل میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
 ”ہوٹل کے مالک کے منہ سے یہ ہوٹل میں دھکے کھانے والی بات خوب کہی آپ نے۔“ وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔
 ”زیر کے انتظامات کیسے جا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ سب تیار ہواں مکمل ہیں۔ سسٹم تو کوئی نہیں ہے۔ یوں تو ہم لوگ دو گھنٹے کے فون پر دو ہزار توہمیں کے ذمہ کا انتظام بھی کر سکتے ہیں لیکن ایک تو یہ ذمہ دار خاص نوعیت کا ہے۔ دوسرے ہم لوگ برص میں بنے ہیں اس لئے کچھ زیادہ سی

سینئر ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

انوار
صدیقی



ایک عشق گزیدہ نواب زادے کی ہنگامہ خیز سرگزشت

حصہ اول :- ۲۵/-
حصہ دوم :- ۲۵/-

دو حصوں
میں مکمل

ایک خوبصورت ناول جس کی یاد
آپ کے دلوں میں پرسوں
کروٹیں لیتی رہے گی

کائنات

ایک خوبصورت اور یادگار
ناول کا دلکش اضافہ

مفت مضمون
ایک اچھی راحت
نے
ناول میں

کتاب اپنے قاریوں کے مسائل سے طلب و فہمائیں
یا ادارے کے نام کو حقیقت کا معنی آج
آنکھیں کھولیں۔
کتاب آپ کو بڑا قیمتی اور نادر کتاب بنائے گی

دو حصوں میں مکمل
حصہ اول :- ۲۵/-
حصہ دوم :- ۲۵/-

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرگرم روڈ، اردو بازار، لاہور، فون ۶۲۲۶۶۵

کماں جیسی ہے؟ کا دہ بار "مستحقین" تجارت سے یہ سب رت کے گھونڈے ہیں۔ میں ان میں پناہ تلاش کرنا نہیں چاہتی۔"

"میں تو یہ ساری دنیا ہی رت کا گھونڈا ہے۔ ایک روز سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ صبح اور زوال کی بھی بے شمار کامیائیاں اس دنیا میں ٹھہری پڑی ہیں۔ اگر سب تمہارے تختہ نظر سے سوچیں تو لوگ دنیا میں کسی بھی کام کے لئے جدوجہد کرنا ہی چھوڑ دیں۔ لوگوں کے پاس تو سب کچھ ہوتا ہے" اس کے باوجود وہ مزید آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کا کلا کاٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہمیں میں شرفاء، اغواؤں میں آگے بڑھانے کے لئے تمہارا ہاتھ تمام رہا ہوں مگر تم ہو کہ اپنی جگہ سے جنبش کرنے کے لئے تیار نہیں۔ عجیب فضول قسم کے انسان ہو تم دونوں۔"

"جدوجہد تو ہم اب بھی کرتے ہیں۔ بس اب اپنی اپنی نوکری کو زیادہ سے زیادہ عمدگی سے انجام دینے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم جیسے بھی ہیں، بس ہمیں تمہارے حال پر رہنے دو۔" راحیلہ بولی۔ راشد بالکل خاموش تھا۔ مجھے معلوم تھا، فیصلہ راحیلہ ہی کے ہاتھ تھے۔ راشد اور راحیلہ کی عمریں زیادہ فرق نہیں تھا مگر راشد کی طبیعت میں بڑی سعادت مندی تھی۔ وہ اپنی مرضی بالکل نہیں چلاتا تھا۔ راحیلہ کے پیچھے پیچھے بٹتا تھا۔

"راحیلہ! میں نے تم کو کون لے کر لیا تھا۔" دل تو میرا یہی چاہ رہا ہے کہ تمہارے منہ پر ایسا گھوسا رسید کروں کہ تم اڑتی ہوئی بالگلی کے راستے چوتھی منزل سے نیچے سڑک کے پتھروں پر جا گرو اور اس بارہ جہازی قسم کے ٹرک تمہارے اوپر سے گزر جائیں۔ جب میں اور راشد ازراہ موت تمہاری لاش اٹھانے چلے گئے تھے تو سڑک پر صرف ایک رنگین سا نقش باقی ہوا۔

"اتنی لمبی بد دعا! راحیلہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طرے سے بھاگی۔

"بعض لوگ اتنے سخت جان اور خدئی ہوتے ہیں کہ اتنی لمبی لمبی بدعاؤں سے بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔" میں نے حسرت سے کہا۔ "جبر حال میں چاہتا ہوں کہ یہ فوت آنے سے پہلے تم میری بات مان لو۔ بلاشبہ تم بہت خدئی ہو لیکن میں نے بھی جیت کر رکھا ہے کہ ہمیں تمہارے حال پر نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہیں اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں ہمیں درحقیقت اس وقت ہونا چاہئے تھا۔"

وہ دونوں خاموش رہے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "میں نے تم دونوں کے بارے میں اب ایک نیا فیصلہ کیا ہے۔"

"پرانے فیصلے پر تو عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ تم نے نیا فیصلہ بھی کر لیا۔" راحیلہ ٹھکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ میرے خیال میں میرا نیا فیصلہ بہتر ہے اس لئے اب اسی پر عملدرآمد کیا جائے گا۔ نیا فیصلہ یہ ہے کہ تم دونوں لاہور

شفٹ ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ ایک لمحے کے لئے وہ دونوں بھی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔

"اس میں اتنا حیران ہونے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ کر کیا بات ہے؟" میں نے حقیقتاً قدرے تعجب سے کہا۔ "تم تو اسی طرح حیران و پریشان نظر آ رہے ہو جیسے میں نے تمہیں کوہ کاف رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دے دیا ہو۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس بار راشد سکوت توڑا۔ وہ الٹا الٹا کر بولا۔ "وہ..... دراصل..... ہم لوگ کیسے جا سکتے ہیں۔"

"جہاز میں بیٹھ کر۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے۔ ہماری نوکریاں..... ہم لوگ یہاں یہ ہیں۔" راشد بھلا گیا۔

"نوکریاں تو تمہاری جگہ کوئی بھی دوسرے دو افراد کر سکتے ہیں جو تم دونوں جیسی کو انٹیکیشن رکھتے ہوں۔ اور اگر تمہارے خیا میں تم پہلے سیٹ ہو تو میں تمہیں اب سیٹ کرنے کے لئے لاؤں۔ نہیں لے جاؤں گا۔ میں تمہیں اس سے زیادہ سیٹ کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں دم بخود سے بیٹھے تھے۔ فیصلہ فی الحال تو میرا راحیلہ ہی پر بھروسہ مگنی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے لاہور میں تم دونوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ ملازم تو لاہور میں بھی میرے پاس بہت سے ہیں اور کراچی میں بھی۔ مزید میں بھی جتنے چاہوں تو جا سکتا ہوں۔ مگر میں اس اعتبار سے خوش نصیب ہوں کہ لاہور میں میرے جال بٹا رہے ہیں۔ وہ صرف نوکری نہیں کرتے، پیڑھے پیچھے میری ہی طرح میرے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس باوجود میرے کچھ آدمیوں کا ایک اور الگ حلقہ بھی ہے، جو خالص میرے اپنے آدمی ہیں۔ میرے ساتھی، میرے دوست، میرے شریک کار۔ جو کبھی مجھ سے الگ ہو کر گیس جانے کا تصور نہ کر سکتے اور میں بھی ان کے بغیر زندگی کے میدان میں آگے بڑھ نہیں سوج سکتا۔ تم دونوں بھی میرے انہی آدمیوں کی فہرست میں آتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں نوکریاں کر کے ضائع ہو۔ رو۔ میں تم سے بہتر قسم کے کام لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم بھی ان آدمیوں کو خوش یا غیر مطمئن محسوس کرو تو فوراً واپس آ جانا۔ تمہارا یہ فلیٹ..... تمہاری نوکریاں اسی طرح تمہاری شہر ہوں گی۔ یہ وعدہ ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ کھٹکھٹا کر گھٹا صاف کر دیا۔ "میں نے تمہارے لئے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ دیکھو یہی لوگ اپنے چھوٹے کاروبار کو بھلا جاتا ہے۔ وہ کراچی کا کار کرتے ہیں۔ کمپنیاں نام طوطا پر بیٹھ آئیں اور غیور بیٹھ جاتی ہیں۔" "میرا معاملہ الٹا ہے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ "میرے کاروبار

کا ہوا حصہ لاہور میں ہے البتہ میں جب پہلی بار تمہارے گھر آیا تھا اس وقت اگر کسی کوئی بات ہوتی تو میں اپنا کاروبار شروع سے کرنا چاہتا تھا لیکن اب میرے لئے بے شمار دشواریاں ہیں۔ میں نے تو وہاں بھی کراچی میں صرف اس لئے بنایا ہے کہ ماہرین کے سروے کے مطابق لاہور میں فی الحال ایک اور فائبر مشین ہو سکی کہ چھانکھٹ نہیں تھی۔ اگر میں اپنا پروگرام دو چار سال لٹ کر لیتا تو شاید میرا وہاں بھی لاہور نہیں ہی بنتا۔ لیکن میری کچھ میں تمہیں آتا کہ تمہارا بیٹا کراچی میں کیا رکھا ہے جسے چھوڑ کر جاتے ہوئے تمہیں اتنی پریشانی ہو رہی ہے؟

”بچپن اور لاہور کی یادیں ہیں۔۔۔ اسی کی قبریں ہیں۔“

راحیلہ دھتکے لمبے میں بولی۔

”میں نہیں سمجھتی کسی ایسی جگہ تو میں نے جا رہا جہاں سے خدا خواست تم بھی یہاں نہیں آسکو گے۔“ میں نے کہا۔ ”تم جا دو تو ہر ایک ایڈر کی تلاش پر تمہاری راء نظر پ کی ریزرویشن کرادو کروں گا۔ خوب ابھی طرح یادوں سے گھٹے ل لیا کرتا۔ قبروں پر بھی حاضری دے دیا کرتا۔ اور کوئی مسئلہ؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”میں۔۔۔ مسئلہ تو کوئی نہیں ہے۔۔۔“ راحیلہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

”دوپہ۔۔۔ پانی واوے۔۔۔ تم دونوں کو اپنے والدین کی قبروں پر آخری بار گئے ہوئے تھے دن ہوئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہی کوئی۔۔۔ تقریباً چھ ماہ۔“ راحیلہ نے جواب دیا۔

”مثلاً اللہ!“ میں نے سر ہلاتے ہوئے استہزاء سے کہہ دیا۔

”اتنی جلدی جلدی پکڑ لگائے والوں کو تو واقعی فکر ہوئی چاہئے کہ اگر وہ لاہور چلے گئے تو کیا ہوگا۔“

راحیلہ قدرے عزامت آمیز سے انداز میں مسکرا دی اور خاموش رہی۔ راشد سر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی اپنے محسوسات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بات مشکل سی ہے۔۔۔ اور مجھے اس قسم کی باتیں کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔۔۔ پھر بھی شاید آپ میری بات سمجھ جائیں۔ اتفاق سے اس وقت آپ دونوں ہی سامنے موجود ہیں۔“ اس نے ایک نظر راحیلہ کی طرف اور ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرفی تھی۔

پھر اس نے بطور خاص مجھے مخاطب کیا۔ ”اپنی بھالی! ہماری زندگی کا کوئی پہلو آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ آپ کی حیثیت اب ہمارے نزدیک کسی قریبی رشتہ دار سے بھی زیادہ کرے۔ راحیلہ کے اور آپ کے درمیان جو تعلق خاطر چلا آ رہا ہے اس کا بھی میں ایک مدت سے راز داراں چلا آ رہا ہوں۔ میں اس پر کبھی دوا جی ہائیں کی طرح نہیں۔ ہمیں اس لئے نہیں ہو سکا کہ میرے نزدیک

اس میں کوئی مہیوب بات نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ راحیلہ مجھ سے بڑی ہے اور یہ ہمیشہ سے اپنی زندگی میں خود مختار رہی ہے۔ میں نے کبھی اس کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ اس نے جب آپ کو چھوڑ کر جیل سے شادی کے لئے ہائی بھری تب بھی میں نے اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی تک کرنے کے لئے نہیں کہا۔ حالانکہ میری خواہش یہی تھی کہ یہ آپ کو چھوڑ کر جیل سے جیل کو اس وقت بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن بات یہی تھی کہ میں اس وقت بھی راحیلہ کے فیصلوں میں دخل دینے کی جرأت یا خواہش نہیں رکھتا تھا اور آج بھی نہیں رکھتا۔ بلکہ میری زندگی کے بارے میں بھی بیشتر فیصلے ہی کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ منطق کے اعتبار سے وہ کچھ ایسے غلط بھی نہیں ہوتے البتہ تقدیر انہیں غلط ثابت کر دے تو بات دوسری ہے۔“

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے انھیں سے کہا۔ ”یہ اتنی لمبی تمہید کس لئے ہے؟ میں ابھی تک تمہاری بات کا سراخا نہیں کر سکا۔“

”میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بن بھالی آج بھی اسٹے ضرور رو رہے ہیں لیکن ہم اپنی اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہیں۔ مجھے معلوم ہے راحیلہ اپنا برا بھلا اچھی طرح سمجھتی ہے اور یہ دانستہ طور پر کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی۔ یہ چاہے تو اس کی بھی آپ کے ساتھ لاہور جا سکتی ہے اور کوئی بھی پرنس سیٹ کر سکتی ہے۔ چاہے تو مجھے بھی ساتھ لے جا سکتی ہے۔ چاہے تو آپ کی تجویز رو بھی کر سکتی ہے۔ میں ہر صورت میں اس کے ساتھ ہوں۔ لیکن میں اس ایک چر سے ڈرتا ہوں۔“

”خدا کے لئے وہ بھی جلدی سے بیان کر ڈالو۔ میں تجھ سے سرا جا رہا ہوں۔“ میں نے اسے ایک بار پھر خاموش ہوتے دیکھ کر بے تابی سے کہا۔

”راحیلہ اور آپ جو بھی پروگرام بنائیں۔ جس پرنس میں بھی پارٹنر شپ کریں یہ آپ کی آپس کی بات ہے لیکن میری خواہش ہے کہ مجھے زیادہ آگے بڑھانے کے لئے کوئی سارا وغیرہ نہ دیں۔ مجھے بس ایسے ہی کسی نوکری وغیرہ میں رہنے دیں جس میں میرا معیار زندگی زیادہ بلند نہ ہو۔ میں زیادہ آسودہ حال اور نمایاں کاروباری آدمی نظر نہ آؤں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے۔ اس نوجوان کو چہ درسی صاحب اس کی بہن کی وجہ سے نواز رہے ہیں۔ میں خواہ کتنی بھی محنت کروں اپنے آپ کو کسی بھی پرنس کا اہل ثابت کروں لیکن لوگوں کی زبان پر یہ بات ضرور آئے گی کہ مجھی اس شخص پر توجہ دہری صاحب کی نوازشات کی وجہ اس کی بہن ہے۔“

کمرے سے باہر تو رات کا گہرا سکوت پھیل چکا ہوا ہی تھا اب کمرے میں بھی ایک لمحے کے لئے گہرا سکوت پھیل گیا۔ راحیلہ نے تقابلی انداز میں دھیرے سے سر ہلایا۔

"بات تم نے منقول کی ہے۔" آخر کار میں نے ملاحت سے کہا۔ "اس میں دوڑن ہے۔ ایسی باتیں معائنہ میں آتی ہیں۔ لیکن جس میں ان اندیشوں میں جلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے ہم اس ماحول اس طبقے میں نہیں رہتے جہاں ایزیاں ایجا اٹھا کر دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میرے ملازمین اور خاص آدمیوں میں تو اس قسم کی باتوں کا "رداع" ہی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم آسانی سے ایڈجسٹ کر لو گے۔ کسی کو بھی احساس ہی نہیں ہو گا کہ ہمارے درمیان رشتوں کی جو ایک قسم کی بے عنوان سی شائستگی موجود ہے وہ کب اور کس طرح وجود میں آئی ہے۔ ہماری حیثیت ایک فیملی کی ہی ہو گی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم کسی اپنے حلقوں میں اس طرح کی کوئی بات نہیں سنو گے جس کا تم اندیشہ محسوس کر رہے ہو۔ سمجھے؟ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ اب اس قسم کی فضول باتوں میں الجھ کر مزید آخر کرتے رہو۔ میں بس تمہیں ایک ماہ کا وقت دے رہا ہوں۔ ایک ماہ ہی تم لاہور شفٹ ہونے کی تیاری مکمل کر لو۔ یہاں جو بھی سمجھنے والے ملتے ہوں انہیں سمیٹ لو۔ میں مزید کچھ نہیں سنوں گا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے بسی سے مسکرا دیے۔ راجیلہ متذہب سے لہجے میں بولی۔ "ویسے مجھے لاہور پسند بہت ہے۔۔۔"

"بہن! پھر مزید کسی اگر تمہاری گھبراہٹ کی نہیں دیتی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد تم دونوں لاہور میں اپنے نئے گھر میں آؤ گے۔"

وہ خاموش رہے۔ میرے خیال میں اب راجیلہ کی ضد بھی دم توڑ چکی تھی۔ وہ بہت مشکل سے قائل ہوئے تھے لیکن ہو گئے تھے۔ میرے لئے یہی بڑی خوشی کی بات تھی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی خاموشی میں رضامندی شامل تھی اور اس احساس سے مجھے بڑی طمانیت حاصل ہوئی تھی۔ میں گویا کوئی اہم مسئلہ حل ہو جانے کی وجہ سے یکسو ہو گیا تھا۔ مجھے لاہور میں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ دونوں میرے خاص ساتھیوں میں بہت اچھا اضافہ ثابت ہو سکتے تھے۔ راجیلہ تو مارداؤ "ڈرائی" جھگڑے والے خطرناک کاموں میں بھی بڑی کارآمد قسم کی ہستی ثابت ہو سکتی تھی۔ راشد بے چارے میں اس قسم کی صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ ان بن بھائیوں کا معاملہ گویا انہی تھا۔ لڑکی بظاہر دھانپان اور گھڑائی کی طرح ناؤ کا اندام نظر آتی تھی مگر حواس قسم کے مردوں کے بھی جیسے جھڑا سکتی تھی۔ اس کی امداد کا ملنا ہوا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جبکہ راشد مرد ہونے اور اچھا بھلا صحت مند ہونے کے باوجود لڑائی جھگڑے سے گھبراتا تھا۔ بہر حال وہ ایک ایماندار آدمی تھا۔ میرے لئے اس کی یہ خوبی ہی بہت اہم تھی۔ مجھے قدم قدم پر ایسے آدمیوں کی ضرورت رہتی تھی جن پر میں مدد سے پیسے اور دوسرے چیزیں معاملات میں آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکوں۔

"میرا خیال ہے اب کچھ دیر سو بھی لیا جائے۔" راشد جہاں دوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے گھڑی دیکھ کر بولا۔ "کل کی شام کچھ اصرامی ٹاؤ میں ہی گزرے گی، جب تک منشر صاحب کا ڈیڑھ خیر عاقبت سے اختتام کو نہیں پہنچ جائے گا۔"

ابھی تو اس بے چارے کو اصل بات ہی نہیں معلوم تھی او وہ اصرامی ٹاؤ کا ذکر کر رہا تھا۔ اگر وہ اصل سازش کے بارے میں جان لیتا تو یقیناً بہت پریشان ہو جاتا۔ اسی لئے میں نے اسے اس پکار سے بے خبر رکھا ہی بہتر سمجھا تھا حالانکہ صورت حال بے تحاشے لئے مجھے کسی معلومات میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ مجھے اسی سے اپنے اور نذیر خان کے لئے دیگر کی ویدیاں حاصل کر تھیں۔ ریڈیوں کے طور طریقوں کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ ریڈیوں کو ڈیوٹی سے ہٹا کر اس طرح خاموشی سے ریڈیوں میں شامل ہونا تھا کہ دوسرے ریڈیوں پر چلنے والے میں بالکل نہ جانا پائیں۔ شفیع شاہ کو میں نے فون پر پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ وہ گھر میں تو کیا، کراچی میں ہی میری آمد کی خبر کو بالکل خفیہ رکھا جائے۔ کسی بھی ایسے شخص سے میری آمد کا ذکر نہ کیا جائے جو میری صورت یا پھر میری حیثیت سے واقف ہو۔ یہ بھی غیبت تھا کہ ہوئی کا بیشتر اشاف مجھے پہچاننا نہیں تھا۔ میرا ارادہ ہی تھا کہ راشد کو آئندہ بھی اصل معاملے سے بے خبر رکھتے ہوئے ہی اس کی مدد حاصل کروں گا۔ اسے ابھی اہم معاملات میں شامل کرنے کے لئے خاصی تربیت کی ضرورت تھی۔

میں نے بھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اب تم دونوں کو جان فی الحال بخش رہا ہوں۔ میں سو بھی جا رہا ہوں۔"

"آپ نہیں میرے بیڑے سو جاتیے نا۔" راشد جلدی سے بولا۔ "میں ذرا تنگ دھم میں سو جاؤں گا۔ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ جب گھر موجود ہو تو ہوٹوں میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔" "بہن! جب تک گھر میں رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ نہ لئے۔ اب گھر سے دل بھر گیا ہے۔ اب ذرا تبدیلی کے لئے ہوئی جا کر دیکھنا چاہیے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

راجیلہ کھوٹے کھوٹے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "بات بنا تو تم پر غصہ ہے کچھ یا خداں سے ہوئے چارے ہو۔ جب چاہتے ہو نکلتے نظر بدل لیتے ہو۔"

"بہن! کبھی میں دوسروں کی بہتری اور آسانی کے لئے ایسا کر ہوں۔" میں نے کہا اور دوڑاؤ کے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں مجھے بیڑیوں تک چھوڑنے آئے۔

مجھے آگ گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے دیکھا، چوتھی منزل پر صرف ایک فلیٹ کی ایک کمرہ میں روشنی نظر آ رہی تھی اور اس روشنی میں ایک بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کندھوں پر جھنگے ہوئے ٹاپوں کی عجیب سے انداز میں گھڑی ہوئی تھیں بتا رہی تھیں کہ وہ راجیلہ تھی۔ میں نے گاڑی سے ہاتھ نکال کر بلایا تو پہلے نے

میں اسی لئے غالباً انہوں نے کسی خاص موضوع پر گفتگو ختم کی تھی۔ کمرے میں سرگت اور سنگار کا جلا دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ ہماری بھر کم سفید قام کوئی سفارت کاری معلوم ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ناخن بٹل میں دباہے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور حقیقتاً صاحب سے مصافحہ کر کے رخصت ہونے لگا۔ حقیقتاً صاحب اسے چھوڑنے دو اڑے تک گئے۔ میں اور نذیر خان وہ دونوں ہی کے سے مودبانہ انداز میں ہاتھ بانٹے ایک طرف دوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

سفید قام رخصت ہو چکا تو حقیقتاً صاحب واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھے اور سنگار کا کش لیتے ہوئے کمری نظر سے ہمارا جائزہ لیتے گئے۔ ان کے اونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں اور نذیر خان بڑے مسکین انداز میں گردن ذرا نیچے ہی کے کمرے تھے۔ آخر کار حقیقتاً صاحب نے کسی سانس لیتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "اس کا مطلب ہے تم ابھی تک اپنے اس نظریے پر قائم ہو کہ میری جان کو خطرہ لاحق ہے؟"

"میں ابھی کہ میرا یہ نظریہ کل سے زیادہ پختہ ہو گیا ہے حقیقتاً صاحب!" میں نے جواب دیا۔

"اور تم نے خالصتاً فکری انداز میں اس خطرے سے غصے کا فیصلہ کیا ہے؟" حقیقتاً صاحب نے ہماری دونوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا میرا!" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "غور و فکر کے لئے زیادہ وقت نہیں تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ خطرے کا امکان کس طرف سے۔ یا کسی کی طرف سے ہے۔ اگر ہم اپنی اصل حیثیت میں ڈر میں شریک ہوتے تو صرف ہم دو ہی توئی بالکل غیر حلق نظر آتے۔ اس طرح شاید کسی کو چونکنے یا خوار ہونے کا موقع مل جاتا۔ فوری طور پر ہمیں یہی آسان اور محفوظ راستہ نظر آیا۔"

"کیا تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ سیکورٹی کا نظام کتنا عمدہ ہے؟" حقیقتاً صاحب نے دریافت کیا۔

"بے شک عمدہ ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "میں اسے مزید عمدہ بنانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میرے اور نذیر خان کے آجانے سے اس نظام میں کچھ بہتری ہی پیدا ہوگی کوئی حرج نہیں ہوگا۔"

ہاتھ پلایا۔ ایک طویل اور تھکی تھکی سی سانس لیتے ہوئے میں آڑی آگے بڑھا دی۔

~~~~~

دوسرے روز شام کے چوبیس بجے میں نے اپنے ہوٹل میں نذیر کو ساتھ لیا اور ہم لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل کی طرف ہوئے۔ اس پر سے فلور پر غیر ملکی سفیر وغیرہ گھرے ہوئے حقیقتاً صاحب بھی اسی فلور پر ایک دی آئی پی سوئٹ میں تھے۔ اس فلور پر لفٹ سے نکلے ہی سیکورٹی والوں نے ہمیں تقریباً لیا۔ لفٹ کے دو اڑے اور بیڑیوں کے قریب سیکورٹی قیادت تھے۔ ان میں وردی اور سادہ لباس والے دونوں ہی کے لوگ تھے۔

میں اور نذیر خان وہ دونوں کی وردی میں تھے اور خالی ہاتھ تھے۔ اور یہ سیکورٹی کے سلسلے میں پہنچنے بھی توئی قیادت تھے ان سے کوئی بھی ہمیں نہیں پچھانا تھا اس لئے ہمارے ساتھ ان کا بیسی قاضیاد بیڑوں کے ساتھ ہوا تھا۔ کو کہ ہمارے پاس یا سیکورٹی پاس موجود تھے لیکن سیکورٹی پاس دوسرے کئی اسکے پاس بھی موجود تھے جو دم سروس کی ذمہ داری اس فلور کر رہے تھے۔ تاہم جب بھی ان بیڑوں میں سے کوئی کسی لاقیل میں اس فلور پر آتا تھا تو ہر جگہ میں اس کی تلاشی لی نا اور تیسے یا چالی میں وہ جو چیزیں ساتھ لے ہوا تھا انہیں لہر دیکھا جاتا تھا۔ ہم دونوں خالی ہاتھ تھے تو ہمیں زیادہ شک سے دیکھا جا رہا تھا۔ انہوں نے ہمارا پورا جسم تھپتھا کر دیکھ کر الٹ کر دیکھ لیں۔ بیڑوں تک میں اگھیاں ڈال کر دیکھا۔ بعد بھی گویا بادل غواستہ ہمیں آگے جانے کی اجازت دی

نیل صاحب کے سوئٹ پر پہنچ کر میں نے دو اڑے پر دستک دواہ ان کے باڈی گارڈ بیٹالی نے کھولا۔ اس سے بھی میرا ہونکا تھا۔ نذیر خان کو وہ پہلے ہی سے پچھانا تھا۔ وہ فوری اس وقت ہمیں پچھان نہ سکا۔ بیڑوں کی پوزیٹارم میں ہم ت مختلف لگ رہے تھے۔ تاہم دوسرے ہی لمحے اس نے ان لیا اور اس کے چہرے پر پچھلا ہوا تھوڑا دور ہو گیا۔ حقیقتاً لی طرح وہ بھی بہت کم مسکراتا تھا۔ ایک طرف بہت کرا اس کے لئے راست چھوڑ دیا۔

نیل صاحب ڈرائنگ روم میں ہی موجود تھے۔ سیکورٹی چیف - فلورنگاس والی کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ ہمیں وہ بیڑوں میں دیکھ کر اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کچھ اور گئی۔ وہ اس وقت ڈر سوئٹ میں تھا اور بڑا بارعب و کھائی نا۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔

نیل صاحب سینئر نیل کے قریب ایک صوفے پر موجود تھے۔

نیل ایک سفید قام بیٹھا تھا۔ سبز ایک فائل رکھی تھی۔

باعث نہیں کی؟

”نہیں۔۔۔ اپنی تو کوئی بات نہیں۔“ اکرام بیگ نے  
نخواستہ جواب دیا۔ ”لیکن مجھے ان حرکتوں کا کوئی فائدہ  
نہیں دے رہا۔ ہر حال آپ بند ہیں تو میں یہ سب کچھ  
لیتے ہیں۔“ منتر صاحب کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اگر  
معاملات میں باہر کے لوگوں کی مداخلت بے کار ہوتی ہے  
پھر وہ گویا زبردستی مسکرائے کی کوشش کرتے  
ہوئے۔ ”میرے اعزاز میں ذر دینے کا وعدہ بھولنے کا مر  
حکوت میں اس قسم کی پیشکش مسخر کرنے والا آدمی نہیں  
”میں نے بھی پیشکش کھن رعب ڈالنے کے لئے  
”میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس ہوئی کو آ کر  
کھینچے۔ جب بھی آپ کراچی آئیں اپنے اعزاز میں جتنے  
لے لیں اور ان میں جتنے مسلمانوں کو چاہیں مدعو کر لیں۔  
اکاؤٹس زپارٹمنٹ سے آپ کے نام کوئی بل جاری  
جائے گا۔“

”آپ جذباتی ہو کر پیشکش تو کر رہے ہیں۔ بعد میں  
نہیں۔“ اکرام بیگ جسمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔  
”میں اس قسم کے معاملات میں جذباتی نہیں ہوتا  
ضروری ہیچناؤوں کو دل میں جگہ دیتا ہوں۔“ میں نے جوا  
منتر صاحب نے گہری نظر سے اکرام بیگ کی طرف  
وہ مزید کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر  
پلی سی جینڈ کی جھانکی جس سے اس کا چہرہ پتلا ہوا سا  
لگا تھا۔ پھر منتر صاحب میری طرف گردن گھماتے ہوئے  
بولے۔ ”اس وقت زیادہ عاقم طائی بننے کی ضرورت  
برخود رہا۔ چودری اذرا اپنے سرپا پر ایک نظر ڈال لو اور  
حیثیت کو یاد رکھو۔ کہیں سپینار اور ذر کے دوران بھی  
کوئی بات نہ کر بیٹھنا۔“

میں نے ایک فطرائی و بڑی دودھی پر ڈالی اور  
بولے۔ ”آئی ایم سو سی سر! میں واقعی  
بھول گیا تھا۔ آئی ایم مٹ اے ویر۔“

حقیقہ صاحب نے سگار کا کارٹریج لیا اور نذر غلام  
دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ہیزر اٹم تو مت بولنے والے آدمی  
نہیں کی طرح خاموش کیوں کرتے ہو؟“

”بس جی۔“ نذر خان اپنی دو ہنوں والی بیٹھارم  
موجود چھن درست کرتے ہوئے بولا۔ ”جی جگہ  
ساما حول ہے۔“ کچھ کی کوشش کر رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں  
نہ ہو جائے۔“

”بس آجکے بد کر کے چودری کے پیچھے چلتے  
ہو گئی تو ہم سب ل کر چودری کی گردن پائیں گے۔“  
خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ پھر انہوں نے

ہوتے ہیں۔ کسی اجلاس میں شرکت کرتے ہیں۔ یا سفر کر رہے  
ہوتے ہیں تو میرا ان کے ساتھ رہنا لازمی ہو آجے۔“  
”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں آپ کو  
ذر اور سپینار سے غیر حاضر رہنے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ میں نے  
سنا ہے اس تقریب میں آپ بھی ایک مہمان ہی کی طرح منتر  
صاحب کے دائیں طرف بیٹھے ہوں گے۔ کیا یہ درست ہے؟“  
”ہاں۔ میں نے سیکورٹی کو زیادہ سے زیادہ نوٹر بنانے کے  
لئے منتر صاحب کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔  
منتر صاحب کے عین پیچھے جیلانی کھڑا رہے گا۔“ اکرام بیگ نے  
بالائی کار کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ کسی جیسے کی طرح سیاہ  
تھا۔

”بس تو پھر آپ صرف اپنی زحمت کیجئے گا کہ آپ کے سامنے  
کھائے پئے کی جو بھی چیز سڑکی جائے اسے آپ منتر صاحب کی چیز  
سے تبدیل کر لیں۔ خواہ وہ سوپ ہو کھانے کی کوئی چیز ہو مشروب  
ہو یا پانی۔ غرضیکہ کسی بھی برتن میں کوئی چیز ہو وہ آپ منتر صاحب  
کے سامنے رکھ دیں گے اور منتر صاحب کے لئے آئی ہوئی چیز اپنے  
سامنے رکھ لیں گے لیکن اسے کھائیں یا پئیں گے نہیں۔ اگر کسی کی  
توجہ اس طرف پٹی بھی جائے کہ آپ کچھ کھائی نہیں رہے اور وہ  
اس بارے میں کوئی بات کرے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا پیٹ  
کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”اور اگر کسی نے پوچھا کہ میں ہر چیز منتر صاحب سے کیوں  
تبدیل کر رہا ہوں؟“ اس نے کچھ ہنسنے لگے میں نے بھلا۔  
”آپ ہر چیز کی نہ کسی بنائے سے تبدیل کیجئے گا۔ کبھی کچھ  
کہتے ہوئے کبھی کچھ کہتے ہوئے مثلاً۔۔۔ ”سرا! آپ یہ پلیٹ لے  
لیجئے۔ اس میں چاول زیادہ عمدہ دکھائی دے رہے ہیں۔“ ”سرا! آپ یہ  
کرشت لیجئے۔ یہ زیادہ عمدہ دیکھنا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔۔۔ وغیرہ  
وغیرہ۔ اس طرح کی کوئی بات کرتے ہوئے آپ چیز تبدیل کر سکتے  
ہیں۔ اور اگر کوئی آپ کی طرف متوجہ نہ ہو تو پھر بات بھی کہنے کی  
ضرورت نہیں۔“

حقیقہ صاحب بولے۔ ”برخود رہا چودری! یہ کچھ بچکانہ سی  
حرکتیں نہیں ہیں؟ اکرام بیگ نے مجھے بتایا ہے کہ کھانے پینے کی  
چیزوں کے بارے میں تمام احتیاطی اقدامات کر لئے گئے ہیں اور ان  
میں کوئی شراکت نہیں کی جاسکتی۔“

”پھر بھی احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے حقیقہ صاحب! یہی  
سرکاری مہمندیوں نے تو احتیاط پسندی کے پیکارڈ ٹوڑے ہوئے  
ہیں۔ آپ احتیاطی اقدامات میں اضافہ کرتے ہوئے اسے کیوں  
شراہہ ہے ہیں؟“

حقیقہ صاحب نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے اکرام بیگ کی  
طرف دیکھتے ہوئے بھلا۔ ”آپ کے خیال میں کیا اس قسم کی  
احتیاطی تدبیریں ہادی ہمارے ملک کی یا حقیقہ صاحب کی جیسی کا

اُردو کے منفرد اور صاحب طرز ادیب قمر اجٹالوی  
کا ایک انتہائی بڑا سراد سنسنی خیز اور تحریر خیز ناول

## مقدس مورتی

وہ جیون بھید کیا تھا۔ جس کی خاطر ساؤ خاندان تین صدیوں تک نسل در نسل بودھ کی ایک  
مورتی کو تلاش کرتا رہا؟

تختاگت بدھ کے فلسفہ نروان اور بودھ تاریخ و آثار کے پس منظر میں بودھ گیانی تھا رو کشیپ  
کی لرزہ خیز آبِ جی جیسے پڑھ کر آپ رائیڈر بیگرڈ کی کہانیوں کو بھول جائیں گے۔ دو شہزہ ایوارڈ  
یافتہ شاہکار قیمت: حصہ اول -/200 حصہ دوم -/200

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

## بغداد کی رات

----- قمر اجٹالوی

غفائی کی ایک ہزار ایک راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات، دجلہ اور نیل کے دامنوں  
س لپٹی ہوئی رات، آسمان کی پستانیوں میں بکھرے ہوئے ستاروں سے آراستہ رات۔ جسے  
صاحب طرز ادیب قمر اجٹالوی مستند تاریخوں اور بے شمار کتابوں کے حوالوں سے آراستہ کر کے  
پ کے لئے پیش کرتے ہیں۔

1200 سے زائد صفحات قیمت حصہ اول -/300 حصہ دوم -/300

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

”اب اتنا بھی مستعد بننے کی ضرورت نہیں۔“ میں۔  
 گھبرا۔ ”ہو سکتا ہے اس کی حیثیت ایسی نہ ہو کہ سب کے  
 اس پر ہاتھ ڈالا جائے۔ دوسرے اسے صرف پکڑ لے لے لے  
 ہو گا۔ اسے سرکاری ہاتھوں میں سوچنے سے پہلے میں اپنے  
 بھی کچھ معلوم کرنا چاہوں گا۔ اس کے لئے مجھے نہ جانے کتنے  
 اقتدار کرنا پڑے۔ شاید تم ایسا کوئی طریقہ اختیار کرنے کے  
 ہو سکو۔“

”او کے سراپے آپ کا حکم۔“ واڈو نے سعادت منہ  
 سرگوشی میں ہی جواب دیا لیکن بظاہر اس کا انداز ایسا تھا  
 مجھے کچھ بات دے رہا ہو۔ پھر وہ مجھ سے کچھ معاملے پر ایک  
 میں جا کر گزرا ہو گیا۔

ہال میں گول میزوں پر مہمان بیٹے اپنی نشستوں  
 سے بیٹھ چکے تھے۔ اب ہوٹل کا پبلک ریلیشنز مینجر اور  
 مل کر خاص اہم مہمانوں کو سب سے پہلے پہنچانے پر  
 تھے۔ آخر میں پروٹوکول کی ذرا سی خلاف ورزی کرتے ہو  
 بیک خود خسر صاحب کے دائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ تقریب  
 شروع ہو گئی۔

ایک عجیب تقریب تھی۔ اسے سینار بھی کہا  
 پریس کانفرنس بھی اور سفارتی اجتماع بھی۔ لیکن دعویٰ کا  
 اسے صرف قانون خسر صاحب کے ساتھ ایک ڈزاکا  
 تہم مہمانوں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو یقیناً  
 نوعیت کا اندازہ تھا۔ سب پوری طرح ”تیار“ ہو کر آئے  
 اندازہ مجھے بعد میں ہوا جب میں نے بعض غیر ملکی سفیر  
 بعد دیکرے تقریریں کرتے دیکھا جو وہ کلمہ کلائے  
 ابلاغ کے نمائندے سوالات کے ہتھیاروں سے پوری  
 تھے۔

ہر میز پر ایک موجود تھا۔ سوال یا تقریر کرنے  
 مہمان کو اپنی سیر سے انھیں کی ضرورت نہیں تھی پہلے  
 سفیروں نے مخصوص نظم و ضبط کا انداز میں مختصر اور گول  
 تقریریں کیں۔ ان کی تقریروں کا لپ لپک بھی تھا کہ  
 خارجہ پالیسی خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان کے ممالک اپنا  
 رکھیں گے۔

پہلے باوقار انداز میں تقریریں جاری تھیں۔ آخر  
 صاحب نے تقریر شروع کی اور ہال میں ایسی خاموشی چھ  
 مہمانوں کی سانسوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگی  
 حنیف صاحب کی تقریر بے پناہ اہمیت کی حامل تھی۔ اب  
 کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اسے کہیں آخری وقت تک  
 گیا تھا۔ وہ خارجہ پالیسی کو ایک اہم موڑ پر لے آئے۔  
 نے اس میں ایک اہم تبدیلی کردی تھی جو شاید کئی ملکوں  
 حوالہ تھی۔ شاید اس تبدیلی کا حلقہ اس امن منسوب ہے

اور ان کے اثرات یکسر بدل گئے۔  
 ”ویٹرز!“ انہوں نے پارے لیے میں کہا۔ ”اب تم جا سکتے  
 ہو۔ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ہم نہیں بلوائیں گے۔“  
 ”پلیس سیر!“ میں نے سسے ہوئے سے انداز میں سلام کرتے  
 ہوئے کہا۔ ”آج جو دفتر آپ کو اور غیر ملکی مہمانوں کو سرور کرب  
 ہیں انہیں اکرام بیک صاحب کے سیکرٹری انتظامات کے تحت نمبر  
 آلات کے گئے ہیں۔ میرا اور نمبر خان کا نمبر تھوڑا دور چوہ ہے۔ اگر  
 ہمیں طلب فرمانا ہو تو ان نمبروں سے طلب فرمائیے گا۔ نام سے  
 نہیں۔“

”مجھے کیا پتا ہے۔“ حنیف صاحب نیم چڑاری سے ہاتھ  
 ہلاتے ہوئے بولے۔ ”بس نے نمبر آلات کے ہیں وہی بلائے گا۔  
 میں کون سا کی کو بلائے کے لئے خود فون کرتا ہوں۔“  
 میں نے بھی انداز میں سر ہلایا اور نمبر خان کو ساتھ لے کر  
 سوئٹ سے نکل آیا۔ اکرام بیک کے انتظامات اپنی جگہ تھے لیکن  
 کچھ انتظامات مجھے بھی کرتا تھے اور مہمانوں کی آمد شروع ہونے  
 میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ اس قسم کی تقریبات میں ہر کام پابندی  
 وقت کے ساتھ ہوتا تھا۔



اس رات ٹھیک آٹھ بجے حنیف صاحب عقی دروازے سے  
 ہوٹل کے چیکوٹ ہال میں داخل ہوئے تو مہمانوں نے ہلکی سی  
 تائیلوں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ ان کے دائیں ہاتھ پر اکرام  
 بیک تھا اور دائیں ہاتھ پر بیٹا لیا۔

ہال میں دوسرے ڈاکٹر مہمان موجود تھے۔ ان میں کئی قوموں  
 کے لوگ تھے۔ بہت سی خواتین بھی تھیں۔ ان میں سے بیشتر تو سفید  
 فام سفارت کاروں کی بیویاں تھیں اور باقی چند ایک کے کندھوں پر  
 لٹکے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹیپ ریکارڈز اور ہاتھوں میں موجود  
 ڈائریاں وغیرہ تھیں کہ وہ غیر ملکی اخبارات کی نمائندہ تھیں۔  
 مردوں میں سے بیشتر ڈزاکا تہم تھے۔

میں اور نمبر خان وغیرہ کی پینتار میں مسکین سی شکلیں  
 بنائے ہوئے ٹیبل کے قریب دیوار سے ٹک گئے کھڑے تھے۔ حنیف  
 صاحب کی آمد پر تائیاں بھیجیں تو ہم جلدی سے سیدھے ہو کر کھڑے  
 ہو گئے اور مستعد نظر آنے کی کوششیں کئے گئے۔ اس سے پہلے ہم  
 اکثر دیروں کی طرح ڈھیلے ڈھالے اور بے پروا سے نظر آنے کی  
 کوشش کر رہے تھے۔ واڈو چوہدری بھی ہال میں موجود تھا۔ وہ  
 ہوٹل کے سیکرٹری اسٹاف کا انچارج تھا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا  
 تھا۔

میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ ”بھئی بھی مر دیا عورت اگر  
 چلیں ذرا سی بھی مشکوک حرکت کر آیا کرتی دکھائی دے تو تم فوراً  
 مجھے مسئلہ بنا۔“  
 ”میں اسے پکڑوں گا۔“ واڈو چوہدری مستعدی سے بولا۔

ایک دولت مند صنعتکار و برنس میں اور اس ہوٹل کا مالک و دیگر کی دردی پہنے مستعدی سے ان کے سامنے برتن جما رہا تھا۔

ظاہر ہے جتنی چیزیں سرو کی جارہی تھیں، مہمان اتنا کچھ تو نہیں کھا سکتے تھے۔ حنیف صاحب تو ویسے بھی خوش خوراک مہلوم نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہر جگہ کو بس چکھتی رہے تھے۔ آخر کار کھانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ڈور بڑھ گیا۔ حنیف صاحب نے کالے کئی اقسام کا بیٹھا سرو کیا گیا۔ اس کے برتن سینے بائیں دو ہر کالی چائے وغیرہ کی باری آئی۔ حنیف صاحب نے اپنے لئے کالی پینڈ کی تھی۔

اکرام بیک نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے حنیف صاحب سے اپنے برتن تبدیل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ ہم تینوں اس مہم میں خواہ مخواہ ہی اندیشے محسوس کر رہے تھے کہ کوئی یہ حرکت دیکھ کے گا تو کیا ہوئے گا۔ کسی نے بھی اس سلسلے میں کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اگر کسی نے اکرام بیک کو تاثر سے یہ سب کچھ کرتے ہوئے دیکھ لیا بھی تھا تو اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس طبقے کے مہمانوں کو غالباً اندازہ تھا کہ حقیقی اقدامات کے طور پر اس قسم کی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ کسی نے بھی اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

چائے کالی کا دور ابھی چل رہا تھا۔ میں ایک بار پھر حنیف صاحب کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک دیگر ایکڑے میں چند خوبصورت اور مقش چولی مندو چنے اٹھائے ہال میں آیا۔ یہ سکرینوں اور سگاردوں کے مندو چنے تھے۔ سکرینوں کے چند مندو چنے تو اس نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ بھیل پر سجائے لیکن سگار پاکس سے ایک ایک سگار نکال کر ہر مہمان کے مین سامنے فطرتی میں رکھنے لگا۔ وہ ہوائے کے بہترین سگار تھے۔ ہر سگار نہایت خوبصورتی اور عمدگی سے سیلینڈر میں پیک شدہ تھا۔ اعلیٰ درجے کے سگار پینے کے تقریباً تمام شوقین کی براہ ریزی تھی۔ حنیف صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔

جو لوگ سگار نہیں پیتے تھے، دیگر نے ان کے سامنے بھی ہر حال ایک ایک سگار سجا دیا۔ اکرام بیک ایک نئے منگوائے ہوئے برتن سے کالی انڈیز کر پشکیاں پینے میں مشغول رہا۔ اس نے سگاردوں اور سکرینوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے اسے حنیف صاحب سے کھانے پینے کی ہر چیز تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس میں سکرٹ یا سگار کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ شاید اس لئے اس نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ وہ خود اسکو کر نہیں تھا۔

میں نے خود بھی سگاردوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ میں اس دیگر کو ہائی میزوں پر بھی سکرٹ اور سگار سہاتے دیکھتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں چمکا کا سا ہوا۔ سکرٹ اور سگار یہ کیا اس ذکر کا آخری اذکار تھا۔ اب تک ہم بہت مستعد بہت ہوشیار رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک مہلوم رہا تھا۔ لیکن آؤ غم

و انہوں نے مشرق وسطیٰ کے لئے تیار کیا تھا۔ بہت اچھے ہوئے حالات تھے۔ بہت یاد رکھیں۔ میں نے ان میں زیادہ سرکھانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور سوڈان انداز میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہر مہمان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

حنیف صاحب کی تقریر ختم ہوتے ہی غیر ملکی اخباری نمائندوں نے ان پر سوالات کی بھرمار کر دی۔ حنیف صاحب بڑے عمل سے دل نہیں انداز میں جوابات دیتے رہے۔ ایک ڈپلومیٹ کی پوری شش ہوتی ہے کہ وہ اپنا کام بھی کرتا رہے اور کوئی اس سے افس بھی نہ ہو۔ حنیف صاحب اسی ہنر کا نہایت کامیابی سے اظہار کر رہے تھے۔

سوالات کا سلسلہ کافی طویل سمجھ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹا ہی اس کا صرف ہو گیا۔ اس دوران وہ میزوں نے کئی بار پانی اور کولڈ ٹرس کے گلاس مہمانوں کے سامنے لا کر رکھے جن میں سے کچھ خال ہوئے، کچھ نوٹی ہوئے رکھے رہے تاہم انہیں بھی تبدیل کیا جاتا رہا۔ ہر بار بار سے آنے والے وغیرہ سے ان گلاسوں کی ٹرے پر کمر میں نے خود گلاس مہمانوں کے سامنے رکھے نہایت بے رنظر آنے والے ان صاف و شفاف اور خوبصورت گلاسوں میں کسی کی تیس تیس موت بھی جا کر بس ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بیان ہوا کہ اکرام بیک نے ہر بار نہایت صفائی سے سفر صاحب گلاس سے اپنا گلاس بدل لیا۔ گو کہ ابھی تک حنیف صاحب نے صرف ایک گلاس سے چند گھونٹ پانی پیا تھا لیکن میں نے نہایت بعد ان کے سامنے گلاس تبدیل کر دیا تھا اور پھر اکرام نے اسے اسے گلاس سے تبدیل کر لیا تھا۔ سوال وجواب کے شباہوں میں کسی مہمان کی توجہ اس طرف نہیں گئی تھی۔

آخر کار ڈز شروع ہوا۔ کھانے میں کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ دل اور سوال وجواب کے سلسلے سے کچھ لوگ تھک گئے تھے، کچھ چوہوں سے عدم دلچسپی جھلک رہی تھی، کچھ کو چپ سی لگ گئی۔ ہر حال اشتہار انگیز خوشبوؤں کے ساتھ کھانوں کی آمد ہوئی تو ہال کا ماحول بدل گیا۔ چوہوں پر بلاشت آگئی۔ لوگ آؤ اڈوں میں بیٹھنے چلے گئے۔ حشرم سوائی ہنسی بھی سنائی گئی۔

ہر جگہ مہمانوں کو ان کی میزوں پر ہی سرو کی جارہی تھی۔ کچھ ساکے دو دانے تک ٹرے لے کر آ رہے تھے۔ اندر کھڑے دیگران سے چپس لے کر آئے کے برساتے تھے۔ ان سے چپس بیٹھ بھیل پر میں اور نذیر خان سرو کر رہے تھے۔ خصوصاً حشرم کے سامنے تو ہر چیز میں ہی رکھ رہا تھا۔

سفر صاحب پوری کوشش کر رہے تھے کہ وہ میری طرف کوئی توجہ نہ دیں اور مجھے ایک وغیرہ کی طرح نہت کریں۔ وہ بیفتہ بہت کو فراموش کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے کہ

اگر ہم نے اپنے آپ کو کچھ ڈھیلا سا چھوڑ دیا تھا۔

دندہ عام طور پر اپنے شکار کو اس وقت دوڑتا ہے جب وہ گرد و پیش سے ذرا بے پردا ہو جاتا ہے۔ حادثہ عام طور پر وہاں پیش آتا ہے جہاں ڈرائیور سمجھتا ہے کہ اب راستہ صاف ہے اور وہ اپنے آپ کو کچھ ڈھیلا سا چھوڑ دیتا ہے۔ میری "ساتویں حس" میرے اعصاب میں کچھ ٹھنکا سا پیدا کر رہی تھی جیسے کوئی بند پڑا ہوا ٹیبل کلاک اچانک ہی ٹک ٹک کرنا شروع کر دے۔ میں نے اپنے آپ کو مضطرب محسوس کیا۔

آخر کار میں رو نہ سکا۔ حقیقت صاحب کے سامنے سے میرا صاف کرنے کے بہانے میں نے آگے بڑھ کر چیزیں ہٹانی شروع کیں۔ اس وقت تک حقیقت صاحب کافی ختم کر چکے تھے اور غالباً سگار کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے۔ ان کی نظر بتا رہی تھی کہ وہ سگار چیز سے اٹھانے ہی والے ہیں۔ لیکن میز سے برتن سمیٹنے اور میز پر پیش صاف کرنے ہوئے اسی لمحے میرا ہاتھ سگار سے ٹکرایا اور وہ پیچھے جا کر۔

"اوہ... میں معافی چاہتا ہوں سر!" میں نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا۔ میں ان کے عقب سے "وائس" طرف سے "ان" کے اور اکرام بیگ کے درمیان کھڑے ہو کر میز صاف کر رہا تھا۔ بظاہر میں سگار اٹھانے کے لئے جھکا لیکن اسی دوران میں نے حقیقت صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔ "کوئی سگار مت پیئیں گا۔ اپنا بھی نہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ایک ٹائٹل کے لئے حقیقت صاحب کے جسم میں تڑپ اٹھی۔ انہیں سگار پینے سے باز رکھنا ویسے ہی ان کے لئے آزار بخش ہے کہ نہیں تھا اور اس وقت تو ظاہر ہے اس ہدایت کا ایک خاص ہی مقصد تھا جو انہیں چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ تاہم انہوں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ انہیں کوئی جھٹکا ہے۔ وہ ذرا بائیں طرف جھک کر ایک سفید قام صمان سے باتیں کرنے لگے۔

میں نے سگار میز کے پیچھے سے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ سیدھا کھڑا ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ میزوں پر سرگوشیاں اور سگار سمانے والا دھڑال سے باہر جا چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا تاہم میں نے صافاٹوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں غلط میں ہوں۔ مجھے یاد تھا کہ اس دہتر کے سینے پر آریاں بیچ کے مطابق اس کا نمبر آٹھ تھا اور وہ ایک لمبا ترنگا سرخ دھپید فوجوان تھا۔

باہر رابدار رہی میں وہ مجھے کیسی نظر نہ آیا۔ میں نے ہوش سیکر ملنے کے ایک آدمی سے پوچھا۔ "اتیس نمبر کہاں ہے؟ ابھی باہر آیا تھا۔"

اس نے رابدار کی کے اختتام کی طرف اشارہ کیا۔ میں لپک کر وہاں پہنچا۔ دائیں ہاتھ پر ایک قطار میں چند سوٹ تھے۔ بائیں

تینیات تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اتیس نمبر وئیر کس طرف ہے؟"

اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ "نمبر کا تو مجھے نہیں... ایک وئیر ادھر گیا ہے۔" اس نے اوپر جانے والی میز صاف کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لیے کی رکھائی اور گرد و پیش پر مجھے کوئی شکوہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آخر وہ ایک "وئیر" مخاطب تھا۔ تاہم میں تھوڑا سا حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ سیکورٹی انتظامات کے مطابق، سرو کرنے والے وئیروں کا روم مقرر تھا۔ اس صاف سے اسے اوپر نہیں جانا چاہئے تھا۔

"آپ نے اسے اوپر جانے سے روکا نہیں؟" میں نے پوچھا۔ "وئیروں کو اس طور سے اوپر جانے کی اجازت نہیں تھی۔"

پولیس آفیسر نے سخت لگا ہوں سے مجھے گھورا۔ اسے ایک وئیر کا اس کے طرز عمل پر اعتراض کرنا تینیا بہت کراں گزرا تھا۔ اور موصوع ہونا تو شاید وہ مجھے کسی ناکردہ جرم کے قصے میں اندر کے بارے میں غور کرتا لیکن اس وقت خاصے ممبر صلیب کا کمانہ کرتے ہوئے گھروڑے لہجے میں بولا۔ "یہ ہوئی سیکورٹی والی کام ہے۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔"

میں مزید کچھ کے بغیر میز صاف کی طرف بڑھا دوڑا بولا۔ خودی بتایا ہے کہ وئیروں کو اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب معلوم ہو چکا ہے تو کیوں نہ میں روک لوں؟

تاہم اس نے آگے بڑھ کر مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا مقصد صرف ٹھوسا کرنا تھا۔ میں ایک نظر اس کی طرف کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ چند میز صاف چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو کچھ اطمینان ہوا کہ وہاں ہوئی سیکورٹی کا ایک آدمی تو تھا۔

"اتیس نمبر کہاں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "اور کہاں آیا ہے؟"

سیکورٹی کاڈر اپنے ہاتھ میں موجود ایک کانڈ پر نظر دوڑا ہوا بولا۔ "ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد وئیر اوپر آسکتے ہیں کیونکہ لاکر روم اس طور پر ہے جہاں انہیں یہ تیار مقررہ بندیل ہے۔ اتیس نمبر کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ وہ چودہ گھنٹے سے تھا۔ اور راتم کر رہا تھا۔"

"اگر روم کدھر ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ یہ میری تلافی تھی کہ ہوئی کا مالک ہوتے ہوئے نہیں معلوم تھا "وئیروں کا لاکر روم کہاں ہے۔ لیکن اس۔"

تلافی یہ تھی کہ میں وئیر کی وردی میں ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وئیروں کا لاکر روم کہاں ہے؟ الفاظ منہ سے نکلتے تھے مجھے اپنی کا احساس ہوا تھا لیکن جلدی میں بات منہ سے نکل چکی تھی۔

ہے تدبیر واقعی عمدہ تھی۔ اس طرف تو کسی کا دھیان جاری نہیں رہا تھا۔ غلطی کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ کامیابی بھی یقینی تھی۔

حفظ صاحب سگار کے زبردست دسیا ہیں۔ اپنا خصوصی برانڈ دیکھ کر وہ سگار پئے بغیر نہ ہی نہیں سکتے تھے اور یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے بارے میں میں خوش صاحب کو کیا اگر کام بیک کو کوئی بدایت بھی نہیں دے سکا تھا۔ میرا خود بھی اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔

دبڑ الماری کی طرف پشت کئے ساکت کھڑا تھا۔ سادہ کپڑے اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف نمودار ہو چکا تھا لیکن بظاہر وہ اسی طرح معصوم اور بے خبر رہا۔ تدرے فیسے سے بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ اور تم ہو کون؟ مجھے تو تم دبڑ مظلوم نہیں ہوتے۔"

"دبڑ تو شاید تم بھی نہیں ہو۔ تم نے بھی غالباً کسی بد نصیب کی جگہ لے رکھی ہے۔ کہاں مار کر پچھتا کا ہے اصلی دبڑ کو؟ کیا وہ تمہارا ہم شکل تھا؟" میں نے پوچھا۔

"تم تو واقعی پیلیاں بھجوا رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہو۔ میں نے بہت لمبی ڈیوٹی دی ہے۔ اب میں بری طرح تھکا ہوا ہوں۔ میرے پاس تمہاری فضول اور ابھی انجھی باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔" وہ اپنے سادہ کپڑوں کو سینے کے لئے درست کرنے لگا۔ لیکن اس کی نظر مجھ پر سے نہیں اٹتی تھی۔

"اچھا۔۔۔ یہی بتا دو کہ حفظ صاحب اس سگار کو پی لیتے تو کیا ہو؟ ان کے دل کی دھڑکن رکیتی یا بلڈ پریشر بے پناہ بڑھ جانے کے باعث برین ہمو راج ہو تا؟" میں نے خاموشی سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ سفاکی نمودار ہو رہی تھی۔ میری نظر اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ میں اس کے چہرے پر آیا آنکھوں میں نمودار ہونے والی ان خفیف تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھا۔

وہ خاموش رہا تو میں نے پوچھا۔ "اس سگار میں جو زہر شامل کیا گیا ہے، انسانی جسم میں غالباً اس کا سراغ لگانا ممکن ہو گا؟"

اس نے میرے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ "اچھا۔۔۔ کم از کم اتنی ہی بتا دو کہ کس نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں؟ کب اور کس طرح تم دھڑوں میں شامل ہوئے تھے؟"

وہ خاموش رہا تو مجھے احساس ہوا کہ میں خواہ مخواہ ہی وقت ضائع کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کی حرکتوں میں ملوث ہونے والے اگر اتنی آسانی سے سوالوں کے جواب دیتے گلیں تو بڑی بری مصلحتیں چھپتے ہیں مگر نہیں گلیں۔

میری نظر اس کے چہرے پر جمی لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک ہاتھ میں کپڑے کیڑوں کی آڑ میں دو سرا ہاتھ نمائت آہستگی سے اپنی رانست میں میری بے خبری میں اپنی چوڑی جلیٹ کی طرف

کھینچ رہی تھی۔ اس سے کچھ مضموم کا احساس اس وقت ہوا۔

سیرکولی گاڑنے میں میری توقع سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے ایک قدم پیچھے ہٹے ہوئے ہولسٹر سے رپو اور نکال لیا اور خوفناک نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے غرایا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے اس وقت اس سے اپنا اصل تعارف کرانا مناسب نہ سمجھا اور کھنی کھنی آواز میں تجزی سے کہا۔ "اے گدھے! رپو اور ہولسٹر میں ہی رکھ لو۔ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔"

"اوہ۔۔۔" اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اور رپو اور واپس رکھ لیا۔ پھر اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ لا کر دو م کس طرف تھا۔ وہ ایک گوشے میں، ایک دیوار کی آڑ میں واقع تھا۔ سامنے سے نظر نہیں آتا تھا۔ میں تجزی سے وہاں پہنچا۔ دروازہ غیر مشعل تھا۔

اندھ پہنچ کر میں نے دیکھا، لوہے کی چلی پٹی اور لمبی لمبی سی الماریاں قطار در قطار کھڑی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک الماری کے سامنے وہ دبڑ کھڑا ہوا تھا جس نے چیکوٹ ہال میں سکرٹیں اور سگار سرو کئے تھے۔ الماری کا دروازہ کھول کر وہ اپنے عام کپڑے نکال چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر وہ خوفزدہ سے انداز میں گھوما لیکن جب اس نے ایک اور "ڈبڑ" کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اطمینان کی سانس لی اور شناسائی کے اعتبار کے لئے خواہ مخواہ مسکرا دیا حالانکہ ظاہری بات تھی وہ مجھے پہچان نہیں تھا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر چپ سے وہ سگار نکالا جو میں نے حفظ صاحب کے سامنے سے خرش پر گرا تھا اور چھپا کر لیا تھا۔ سگار اسی طرح بیوقوفین میں بیک تھا اور اس پر خوبصورت لیبل بھی چسپاں تھا۔

"سگار بیوگے؟" میں نے سگار دبڑ کی طرف پوچھا تو وہ غصہ کر کے مجھ سے پوچھا۔

اس نے تدرے چوک کر میری طرف دیکھا اور سپاٹ لیجے میں بولا۔ "نہیں۔۔۔ شکر۔۔۔ میں سگار یا سکرٹ وغیرہ نہیں پیتا۔" لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ضرور پو۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "یہ بہت خاص قسم کا سگار ہے۔ یہ تم نے قاتل خفیہ صاحب کے عین سامنے رکھا تھا۔ اس کے لیبل پر میں نے بروقت ایک بار کسان نشان دیکھ لیا تھا جو بظاہر لیبل کے ڈیزائن کا ہی ایک حصہ نظر آ رہا ہے۔ اس سے یقیناً تمہیں بہت آسانی رہی ہوگی۔"

"کس بات کی آسانی؟" اس نے انجمن بنے ہوئے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں کہ کون سا سگار خاص طور پر حفظ صاحب کے سامنے رکھا



دول کا۔

مجھے صرف ذرا سا ایک طرف کو کھٹکنا پڑا لیکن اصل اہمیت بوقت کھٹکے کی تھی۔ اگر اس میں مجھے ایک سیکنڈ کا دسواں حصہ بھی تاخیر ہو جاتی تو صرف اس کا نتیجہ ہی نہیں شاید ہیخڑ کے پیچھے پیچھے اس کی کلائی بھی میرے پیٹ میں ٹکس جاتی۔ دارا اس نے کچھ اتنی ہی طاقت سے کیا تھا۔

دارا خالی جانے پر وہ اپنی جمبوک میں ذرا لڑکھڑایا۔ ہیخڑ اسے زور سے ایک ستون سے ٹکرایا کہ اس کے ہاتھ سے جمبوک گیا۔ اس کی ایک دھڑ شاید یہ بھی تھی کہ اس کا دستہ ملیٹ کے ہٹل کی شکل کا تھا اور زیادہ برا نہیں تھا۔ اگر اس نے ہیخڑ چھوڑ دیا ہوتا تو شاید اس کا اپنا ہاتھ ہی کٹ جاتا۔ لیکن دارا کی اس ٹاکالی یا اپنی جمبوک میں کچھ آگے چلے جانے سے اس کے لئے گویا کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اسی لمحے اس نے عقب میں لات گھما کر مجھے دیکھ لگ کر رید کر کے لے کر واپس کی۔

لگ میرے منہ پر پڑی ہوئی لیکن یہ محض ایک اتفاق اور میری خوش قسمتی تھی کہ میں اسی لمحے ہیخڑ کو ٹھوکر مار کر ذرا دور پہنچانے کے لئے اپنی جگہ سے مزید تھوڑا سا ہٹ چکا تھا اور میرا چوہ بھی ایک ٹانے کے لئے جھک گیا تھا۔ یوں میں نہ صرف اس لات سے بچ گیا بلکہ میں نے اس پر چاب بھی رید کر دی۔ اس کی پٹلی کا گوشہ یقیناً پھٹ گیا تھا کیونکہ وہ ایک اذیت بھری کراہ کے ساتھ

بڑھا رہا تھا جو اس کی کمر کے گرد ہٹل کوٹ کے اوپر ہی بندھی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہوگا کیونکہ سیکورٹی پر مامور سرکاری آفیسروں کے علاوہ آخری لمحے میں ہوئی سیکورٹی والوں نے بھی غیر متوقع طور پر دونوں کی تلاشی لی تھی۔ میں نے اپنی موجودگی کو خفیہ رکھنے کے لئے پوری کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ آوی میری اصل حیثیت سے لاعلم رہیں۔ چنانچہ میری بھی تلاشی ہوئی تھی۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ تیزی سے ہٹل اتار کر اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی فکر میں ہے۔ میں نے سگار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سخت لمحے میں کہا۔ ”تمہیں ہر حال میں اسے چٹا پڑے گا۔ کم از کم دو چار کھل لے کر رکھا دو۔ میں تمہیں دس ہزار روپے انعام دوں گا۔ اگر تمہارے خیال میں یہ سربہ سرگرا رات ہی بے ضرر ہے تو تمہیں ایک معقول انعام کے عوض دو چار کھل لگانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ خواہ تم تمباکو نوش نہیں ہو۔“

”میں نہیں چٹا۔ کوئی زبردستی ہے کیا؟“ وہ یکدم ہی جیسے پھٹ پڑا۔ ”دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل کا ایک جھوٹا غمخوڑا کھنجر دکھائی دیا۔ اس نے انتہائی پھرتی سے ہٹل کے ہٹل کو کھینچا تھا اور ہیخڑ اس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ وہ حقیقت ہٹل کا ہٹل ہی خنجر کا دستہ تھا اور پھل کے لئے ہٹل ہی پیام کا کام دے رہی تھی۔

وہ ایک خوبصورت نوجوان قاتل تھوڑا سا بیک ہی بے حد خوفناک دکھائی دینے لگا تھا۔ سفاکی نے اس کے چہرے کو غائب کی طرح چھپایا تھا۔ اس کے دل میں کیسی نفرت کا زہر اتنا زیادہ تھا کہ اس کے چہرے کے عضلات ہی طرح کھینچ کر رہ گئے تھے۔

”کون ہو تم؟“ اور میرے پیچھے کیوں گئے ہوئے ہو؟“ اس کی آواز پھنکار سے مشابہ تھی۔ میری نظر اس کے چہرے پر ہی جمی رہی۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ۔ مشکل تین فٹ تھا اور اس فاصلے پر اس کے ہاتھ میں خنجر کی موجودگی خاصی خطرناک تھی۔ لیکن میں نے بظاہر خنجر کو بالکل نظر انداز کر رکھا۔

”اب بھی وقت ہے۔ مجھے سب کچھ جیج جیج یاد۔“ وہ نہ تمہیں ہر بات بہت بہت بڑے حالات میں بتاتی پڑے گی۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے دھمکے لمحے میں کہا۔

ظاہر اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے لیکن یہ میری توجہ بنائے رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ وہ حقیقت اس کا خنجر والا ہاتھ اسی تیزی سے حرکت میں آیا جس تیزی سے کوئی طاقتور اسپرنگ ٹوٹ کر اچھلتا ہے۔ میرے لئے اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہیں تھی۔ ظاہر ہے اس نے خنجر نکالا تھا تو اسے استعمال بھی کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ محض اس کی باتیں سن کر تو میں اسے جانے نہیں

## غیر ملکی زبانیں سیکھیے

پروفیسر ایم اشرف

فریج اردو ریڈر 90/-

فریج اردو ڈکشنری 90/-

جاپانی اردو ریڈر 90/-

جاپانی اردو ڈکشنری 60/-

ناشر: مکتبہ القریش

اردو بازار - لاہور

کیوں کر رکھی تھی کہ آج تک میں نے کسی کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمزور محسوس نہیں کیا تھا۔ تاہم مجھے جب بھی شبہ ہوتا تھا کہ میرا کوئی حریف تقریباً میرے ہی جتنا طاقتور ہے تو میں رواجی انداز میں طاقت کے جواب میں طاقت ہی کا استعمال کرتے ہوئے اس کا مقابلہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اپنے آپ کو خواہ خواہ زیادہ تھکاتے اور زیادہ جسامت توڑ چھوڑ کرانے والی بات تھی۔

ایسے موقعوں کے لئے مجھے ایک جاپانی پهلوان سے سیکھی ہوئی چند ٹیکنیکس بہت پسند تھیں۔ ایک طویل عرصے تک وہ پیشہ ور پهلوان رہا تھا۔ مشرقی اسٹائل کی تکنیکوں میں اسے خصوصی مہارت حاصل تھی لیکن اور بھی نہ جانے کس کس انداز کی لڑائی میں عمل دخل رکھتا تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ الیکٹروکس کی ایک بہت بڑی اور مشہور کمپنی میں چیف انجینئر کے طور پر ملازم تھا۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اس کے دورِ پاکستان کے موقع پر میری اس سے ملاقات ہو گئی اور تھوڑی بہت دوستی بھی ہو گئی۔

اس نے مجھے بہت سی کام کی باتیں بتائیں۔ عملی طور پر کسی گُر سکھائے وہ خصوصاً اس میدان میں بہت ماہر تھا کہ طاقت ور دشمن کی طاقت کو خود اسی کے خلاف کس طرح استعمال کیا جائے۔ اس نے مجھے سکھایا تھا کہ کس طرح اس اصول کے تحت صرف طاقتور انسانوں ہی کو نہیں حیوانوں کو بھی شکست دی جاسکتی تھی اور خالی ہاتھ انہیں ہلاک کیا جاسکتا تھا۔

اسی نے مجھے بتایا تھا کہ جاپان، چین اور تھائی لینڈ وغیرہ میں بہت سے ایسے پهلوان موجود تھے جو کسی سرکش گھوڑے یا سینے کی گردن بھل میں دبا کر توڑ سکتے تھے۔ اس میں طاقت کو بھی دخل ہوتا تھا لیکن اصل اہمیت ٹیکنیک کی تھی۔ وہ دراصل گھوڑے یا سینے ہی کی طاقت اور جھنجھلاہٹ کو اس کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ اس کی گردن کو لاک لگاتے ہوئے ایک ایسے زاویے اور ایسے لمبے میں جھکا دیتے تھے کہ درحقیقت حیوان اپنے ہی زور میں اپنی گردن ٹوڑا بیٹھتا تھا۔ لیکن اس ٹیکنیک کو استعمال کرنا بہر حال ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ عام سے طاقتور انسانوں کے لئے بھی اس کو سیکھنا آسان نہیں تھا۔

میں ایک بار اس کا کامیاب عملی مظاہرہ کرچکا تھا۔ ستارہ کی ایک شوٹنگ کے دوران جب اس کے گھوڑے کو ایک سازش کے تحت زہر کا انجکشن لگایا گیا تھا تو وہ ستارہ کو پشٹ پر لئے باہل ہو کر دوڑ پڑا تھا۔ اسے روکنے کی کوئی ذمہ داری نہیں کی جاسکتی تھی۔ بالآخر میں نے راستے میں اس پر چٹا لک لگا کر اس کی گردن بھل میں دبا دے ہوئے اس پر وہی ٹیکنیک آزمائی تھی اور غیر متوقع طور پر مجھے کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ گھوڑے کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن اس موقع پر موجود لوگوں کے علاوہ اگر میں کسی کو یہ بات بتاتا تو شاید وہ یقین نہ کرتا۔ خصوصاً جب میں تھری نہیں سوٹ پٹے اپنے آفس میں بیٹھا فکرمو کہہ رہا ہوتا تھا کاغذات بردھٹھا کر رہا ہوتا تھا جب

تا اور اس نے میرے منہ پر گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں ایک بار پھر بروقت تھوڑا سا پیچھے کھٹک چکا تھا۔ گوکہ اس طرح عقب میں میرا سر ایک ستون سے ٹکرا گیا لیکن منہ پر گھونسا کھانے کی نسبت یہ گھر بھر تھی کیونکہ زیادہ زوردار نہیں تھی۔ اس سے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں پہنچی لیکن اگر اس کا گھونسا میرے منہ پر پڑ گیا ہوتا تو نہ جانے کب تک کے لئے میں یہ زخموں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا کیونکہ اس کا گھونسا الماری پر پڑا تھا۔ میرے خیال میں اس کے گھونے اور لوہے کے وزنی تصور دے میں کوئی خاص فرق نہیں تھا کیونکہ میں نے لوہے کی جی خاص جی بھاری بھر کم اور موٹی چادر کی الماری میں ہلکا سا ڈینٹ پڑنے دیکھا۔

دیکھتے میں وہ محض ایک صحت مند فوجی تھا لیکن اس لئے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ عام صحت مند فوجی نہیں تھا۔ جس کا گھونسا لوہے کی ایک مضبوط الماری میں ڈینٹ ڈال سکتا تھا وہ محض عام صحت مند فوجی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے گھونے سے پچاسی ہزار تھا۔ میں اس کے پیٹ میں لایت رسید کرچکا تھا مگر اس کا پیٹ بھی گویا لوہے کا ڈرم تھا۔ اس نے صرف ہلکی سی آواز کی آواز نکالی۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی اثر دکھائی نہ دیا۔

اپنے دونوں وار خالی جاتے دیکھ کر اس پر گویا درندگی سوار ہو گئی۔ شاید وہ اپنی معمولی سی کامیابیوں سے بھی مانوس نہیں تھا۔ وہ یقیناً غیر معمولی طور پر مشاق لڑاکا یا قابلِ تہین حد تک طاقتور اور خطرناک تھا۔ چند لمبے پیلے تک اس کی شخصیت سے اس قسم کی خصوصیات کا ذرا بھی اظہار نہیں ہو رہا تھا مگر اب یکدم ہی اس کے سراپے گویا کئی غیر مرئی خول اتر گیا تھا اور اندر سے کوئی بہت سی بے جا یک ہی چر کل آئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر میری گردن ٹپکنے میں لینے کے لئے چھپتا۔ اس وقت تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس کے ہاتھ میں اگر کسی ساڑ کی گردن بھی آجاتی تو ساڑ کے بارے میں کسی ایسے انجام کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

خود رستی سے قطع نظر مجھے ابھی تک کسی ایسے آدمی سے واسطہ نہیں پڑا تھا جسے میں نے اپنے سے زیادہ طاقتور محسوس کیا ہو۔ اور یہ طاقت خدا داری تھی۔ میں نے اس کے لئے پیشہ ور پهلوانوں، تین ساروں یا مارشل آرٹ کے ماہروں کی طرح دن رات محنت اور ریاضت نہیں کی تھی۔ اِن اتنا ضرور کیا تھا کہ زندگی کے سفر میں جہاں بھی کسی سے کوئی ذرا سی بھی کام کی بات سیکھنے کا موقع ملتا تھا تو میں نے وہ موقع ضائع نہیں کیا تھا۔ تھوڑی بہت دور شیں بھی میں یاد رکھتی سے کرتا تھا۔ سب سے اہم بات بس یہ تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی بڑی بے اعتدالی نہیں آنے دی تھی۔ پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ دیگر بے شمار صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اور اس لئے نے ایک بے صلاحیت، بے تجربہ

تو کسی کو گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ میں بھی لڑائی بھڑائی کے معاملات میں ہاتھ بھی پلانا ہوں گا۔

سب خیالات بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکے۔ لیکن یہ موقع ان یاروں میں اچھے کا نہیں تھا۔ وہ ہاتھ موت کے پناہ میں کر تقریباً میری گردن تک پہنچ چکے تھے۔ وہ آہنی ہاتھ تھے یہ میں اچھا طرح جان چکا تھا۔ لا کر دم میں کھلی جگہ بھی بہت کم تھی۔ کمرے کا بیشتر حصہ لوہے اور لکڑی کی الماریوں سے بھرا ہوا تھا یا پھر درمیان میں کہیں کہیں ستون تھے۔ یہاں زیادہ اچھے میں زیادہ تو پھوڑ کا اندیشہ تھا۔ چنڑوں کی تو پھوڑ کا نہیں اپنی توڑ پھوڑ کا۔

میں نے ایک بار پھر پانی کی حکمت عملی اختیار کی۔ ایک بار پھر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اس حکمت عملی کی بدولت کئی بار میں اس طرح بھی کسی کی دھڑکت پانے میں کامیاب ہوا تھا کہ میرے لباس پر چند ٹکٹیں بھی نہیں آتی تھیں۔

دیگر جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اصلی دہڑ نہیں تھا بلکہ کسی دہڑ کی جگہ لئے ہوئے تھا۔ ایک بار پھر اپنی جموٹک میں ذرا آگے کو گیا اور میں نے اس کے جڑے پر ایک زوردار حسم کا کھوسا رسید کیا۔ اس کی گردن ذرا سی گھوٹی لیکن قدم اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ آہم ایک ٹانے کے لئے اس کے حواس ضرور قفل ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سر جمک کر سنبھل پاتا میں نے اس کی گردن پر کرانے کی ایک چاب رسید کی۔ اس کی گردن واقعی سانڈ کی طرح منبھو تھی لیکن اسی لئے اس کا سر بھی لوہے کی الماری سے ٹکرا گیا۔ پہلی بار دہڑی طرح لاٹھرایا۔ اس کی گردن کھینچنے سے انداز میں ٹیڑھی ہو گئی۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے جڑے پر ایک اور کھوسا رسید کیا۔ میرا بھی یہ کھوسا شاید لوہے کی الماری میں ڈھنٹ ڈالنے کے لئے کافی ہو گا۔ اس بار اس کے پاؤں زمین سے اٹھڑے۔ وہ ذرا سا اچھلا اور چاروں خانے چپٹ گرا۔ لیکن بے ہوش وہ اب بھی نہیں ہوا تھا۔

اس پر کچھ عجیب سی اثر ہوا تھا۔ کرنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ جیت پڑا ایک تک چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے یہی گمان گزرا کہ وہ مردکا ہے لیکن پھر اس کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہوا کہ وہ سانس تو لے رہا تھا لیکن کتنے کی سی حالت میں چلا گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر سگار جیب سے نکال کر اس کے قریب پیچھے ہوئے کہا "میرے چاند! اب تو اس کے دو چار کھل لگاؤ۔ اتنی خیر ابھی نہیں ہوئی۔"

لیکن اب وہ گویا میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی حالت میں ذرا بھی تبدیلی نہ تھی۔ وہ اسی طرح ساکت رہا۔ ہاتھ شاید کچھ زیادہ ہی زور سے پکڑا تھا۔ اسے کوئی دماغی چوٹ آئی تھی۔

میں سگار کو آنکھوں میں چھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں تیز گھوما لیکن اگر ام بیگ کو دیکھ کر کسی سانس لے کر نہ کر دوں گا۔ اس کے قریب کھڑا تھا۔ خون کا سی شل کا ایک بڑا من لیو کر اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اور کامن کو کہ میرا طرف تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو یہی تسلی دینے کی کوشش وہ درحقیقت دہڑ کو گڑ گڑے ہوئے تھا۔

اگر ام بیگ کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک قدم آگرا پنا خالی ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "اگے سگار مجھے دے دو۔ وہ سگار نہ ہٹاؤ شاید میں خود ہی اس کے حوالے کر دیتا اس کے لیے میں کوئی بات نہیں جس نے مجھے چھوٹا کر دیا۔ میں نے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! یہ سگار ایک شہادت ہے۔۔۔ اسی بات کا ثبوت ہے کہ فشر صاحب کو قتل کر کی سازش کی گئی تھی۔۔۔ اور اس سازش کا آنا یا بیٹھا بہت تک پہنچا ہوا ہو گا۔ میں یہ ثبوت اپنے ہاتھ سے خفیہ صاحب خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اگلی اور آہم شہادت دار ہاتھوں میں جانی چاہئے۔"

"تو کیا تمہارے خیال میں میں نہتے وار آدمی نہیں ہوں اگر ام بیگ کا لوجہ یکدم درشت ہو گیا۔ مجھے کی شہادت سے اس کا اور غوالی ہو گیا۔ وہ معززانہ لباس میں داخل حالت میں بھی آگے ہٹاؤ اور خطرناک سا آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن اس وقت خفیہ فشر کے عالم میں تو پورا درندہ دکھائی دیتے لگا۔"

میرے اندر میری نامعلوم ساتویں حس سرگوشیاں تو مت سے کر رہی تھی لیکن اب پیچھے کوئی تیز تیز کھینچا تھی۔ فشر سے اندیشوں کے باوجود اس واضح اور یقینی انکشاف نے مجھے جڑ کے شدید ہٹنے سے دو چار کیا تھا کہ بیٹھا تو بھل میں ہی موجود تھا۔ وہ ایک ایسے محاذ کی کھال میں چھپا ہوا تھا کہ کسی کو اس پر شبہ نہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ قادر فشر صاحب سیکورٹی چیف ہی؟

لیکن پھر میرے ذہن میں ایسے کئی سربراہان حکمت کی تصویر ابھرنے لگی جو اسے محاذوں کی باتوں انجام کو پہنچے تھے۔ وہ ام وشتاق اور مسیح لوگ جنہیں بیسیوں چھٹیوں سے چھاننے کے بعد قابل اہم اور وقار سمجھ کر اس منصب پر فائز کیا گیا تھا، جن کے بارے میں سمجھا گیا تھا کہ حفاظت کا فریضہ ان سے بڑھ کر کوئی انجام نہیں دے سکتا، جن کے بارے میں یقین کر لیا گیا کہ ان کی وفاداریاں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ لیکن ایک دن انہوں نے غی پلوٹس کھڑے ہو کر اپنے آقاؤں کو خون میں نہلا دیا تھا۔ ایسی بہت سی تصویریں تاریخ کے کسی نہ کسی موڑ پر ابھرنے لگی تھیں۔ یہ کوئی انمولی بات نہیں تھی۔

ایک سینکڑے کے شاید ہزاروں میں مجھے میں خیالات کی یہ رو میرے

ہیں سے گزری اور میری رگ دپے میں جا پھنسی سی پھیلا گئی لیکن  
میرے اچھن محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اب بھی اکرام بیگ نے  
پتے آپ کو بے نقاب کرنے میں جگت کیوں دکھائی تھی؟ وہ چاہتا تو  
ہی ذرا نقاب ہی نہ سکا تھا۔ میری مامعول ساتویں حس اس کے  
سے میں سرگوشیاں تو کر رہی تھی لیکن میں نے ان سرگوشیوں کو  
بہر سمجھ کر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

اکرام بیگ کے یوں ہیکہ م سامنے آجانے کی وجہ یہی ہو سکتی  
ہے کہ وہ سازش کو کامیاب ہونے دیکھ کر بہت بری طرح جھنجھلا گیا تھا  
شاید اس نے مجھے ٹھکانے لگا کر سازش کا لہجہ مجھ پر ڈالنے کا  
لہ کر لیا تھا۔

میں نے سوچے میں کہا "میں مسٹر بیگ! میرے خیال میں تم  
بڑے ذرا قوی ہو۔ سازش کے ذمے دار! میں سگار تمہارے  
لے نہیں کر سکتا۔"

اس کا چہرہ کچھ اور ادغوانی ہو گیا۔ دانت پیٹتے ہوئے اس نے  
لی بیٹھائی کا نشانہ لیا۔ اس کے ہاتھ بہت مضبوط تھے جس ہاتھ  
ریو اور تھا اس کے تینے تھے غصلاں مٹھلائے انداز میں چل  
پہ تھے اس کے اور میرے درمیان فاصلہ خطرناک تھا۔ وہ  
نکھتا ہوا... بلکہ چٹا ہوا آدمی تھا۔ اس کے سامنے کوئی غیر  
اقدام اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ ہتھیار اس کے  
مکھوتا تھے۔ اس کے پیچھے تربیت اور گونا گوں تجربات کا ایک  
بار تھا اور اس کی حیثیت بھی ایسی تھی کہ مجھ جیسے کسی  
میں کو کسی بے وقت خرگوش کی طرح گولی مار کر کوئی بھی کمائی  
پتا اور منافع پہنچا دینا اس کے پاس ہاتھ کا کام تھا۔

مجھے صرف ایک سی سو سو سی امید نظر آ رہی تھی۔ وہ یہ کہ  
اکرام بیگ ناکرے تو میں گولی سے بچنے کی کوشش کروں۔  
کاجیے خاصا تجربہ قابلین میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ  
م بیگ جیسے گھاک آدمی کے سامنے میرا یہ تجربہ کام آئے گا یا  
بہر حال آپ تو صرف قسمت آزمائی ہی کی جا سکتی تھی۔

اکرام بیگ گویا میرے خیالات پر ہنستے ہوئے قدرے ملالت  
ولا "میں تمہیں یہاں قتل کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر تم نے  
میرے حوالے نہ کیا تو میں یہ کام بھی کر کر دوں گا۔"

"اور اگر میں نے سگار تمہیں دے دیا تو تم مجھے کیسے اور لے  
تل کرو گے؟ یہی مطلب ہے تمہارا؟" میں نے پلک جھپکائے

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کی توجہ دیگر کی  
مہذب ہونگی تھی۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر وہ بولا "گلیا  
استہاروا ہے؟"

میں نے دیگر کی طرف نہ دیکھا۔ ایک لمحے پہلے مجھے کچھ شبہ سا ہوا  
تھے اس نے خفیہ سی حرکت کی ہے لیکن میں نے اس کی  
دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر وہ

ہوش میں آگیا اور اس نے اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش  
کی تو میں آخری لمحے پر ہی میں اپنے بھائی کی کوئی کوشش کروں گا۔  
لیکن اب میں نے اس کی طرف نہ دیکھا تو وہ پہلے ہی کی طرح ساکت  
نظر آیا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "جب یہ گرا تھا اس وقت تو زندہ  
تھا۔ بعد میں مر گیا ہو تو معلوم نہیں۔"

وہ دہن پر دوایا نظر ڈالنے کی زحمت کے بغیر بولا "چھ! اب  
تم دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ منہ الماری کی طرف کر لو اور ہاتھ  
الماری پر رکھو۔" دونوں ناخنیں چوڑی کر لیں۔

"تمت خوب! تم کو کسی فزیکل انسٹرکٹور کی طرح ہدایات دے  
رہے ہو۔" میں نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔

"یہ طرز مزاح کا وقت نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں نے تمہیں  
کسی بات پر کوئی تبصرو کرنے کے لئے کہا ہے۔" وہ گھٹے گھٹے مگر  
نصیحتانہ لہجے میں بولا۔ "تیکر پر اس کی انگلی کا بازو خطرناک حد تک  
بڑھ گیا تھا۔ میرے اعصاب جتنے ہوئے تھے اور میں کسی فیصلہ کن  
حرکت کے لئے تیار تھا۔ وہ گولی یا دہائی کے طور پر بولا "تم نے شاید  
دیکھا نہیں ہے اس ریو اور پر سائیکس فٹ ہے۔ اور یہ ایسا  
سائیکس ہے جو بہت سے ناکوں کے بعد بھی جام نہیں ہو گا۔"

"چھ! یہ سائیکس ہے؟" میں نے آنکھیں پھیلائے ہوئے  
معصومیت سے کہا "میں تو سمجھتا تھا شاید تم نے یو پی ذرا ریو اور کی  
سجارت کے لئے اوپر کچھ لگا رکھا ہے۔ ذرا دکھانا۔ کیا ہو تا ہے  
سائیکس۔"

میں نے ہاتھ بھی اس کی طرف برسا دیا۔ اس کی آنکھیں شعلے  
آگئے لیکن اور اس نے ہاتھ تال کاڑ کر دیا۔ گولی میرے بالوں کو  
چھوئی ہوئی گزری۔ شاید چند بالوں کی قربانی بھی لے گئی۔ اس میں  
کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا شخص دھکیوں سے کام چلانے کا کوئی  
ارادہ نہیں تھا۔ ضرورت پڑنے پر شاید وہ کچھ بھی کر کرے۔ مجھے  
یقین تھا کہ وہ تیزی سے حرکت کر لی ہوئی چیز پر بھی نشانہ لگانے میں  
ماہر ہو گا۔

میں سفاک اور عیار ترین مجرم سے بھی کسی نہ کسی غلطی کی  
توقع رکھتا تھا اور عام طور پر میری توقع پوری ہو جاتی تھی۔ وہ جس  
طرح مجھے الماری کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دے رہا تھا  
اس سے ظاہر تھا کہ وہ سگار میری جیب سے نکالنے کے لئے خود  
میرے پاس آئے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ وہ کتاب بھی  
ماہر و مشاق سہی لیکن میرے قریب آجائے تو اس کے ہاتھ میں  
خفاک ریو اور کی سوجھ بوجھ کے باوجود میرے لئے امید کی کرن  
نمودار ہو گئی تھی۔

"یہ گولی صرف خوار کرنے کے لئے تھی۔" وہ غرایا "میں  
تمہارے بارے میں معلومات کر چکا ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم  
خاصی خطرناک اور بے خوف جسم کی چیز ہو۔ لیکن میرے سامنے ذرا

آئے پولیس والے اگر کچھ دیکھیں گے تو بات پھیل جائے گی۔“  
حفظ صاحب نے پولیس والوں کو باہری رکھنے کا حکم دیا اور  
میں نے آگے بڑھ کر دو اندازہ بند کر دیا۔ حفظ صاحب الجھن زدہ لمبے  
میں بولے ”بات کیا ہے؟“ اسی لمحے ان کی نظر اکرام بیگ پر پڑی جو  
آواز پر تھپ تھپ پر ڈھیر تھا۔ انہیں گویا حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ وہ  
اپنی ساری تخت، ستانت اور وضع داری بھول کر ایک گھبرائے  
ہوئے بچے کی طرح ٹپک کر اکرام بیگ کے قریب پہنچے اور کسی حد  
تک احتیاط سے انداز میں اسے ہلا کر دیکھنے لگے۔

”اسے کیا ہوا؟“ وہ رو دینے والی آواز میں بولے ”کیا اس  
نے میری حفاظت کرتے کرتے جان دے دی؟“ لہجے آپ کو مجھ پر  
قرآن کر دیا؟“

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ اس جہانگیرہ شخص کی خوش فہمی یا  
سادہ لوحی؟ بلا علمی فہمی یا خود فریبی؟ میں نے ذرا سمجھتے ہوئے سے  
لمبے میں کہا ”حضور! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی جان  
لینے کی سازش میں خود مرے مرے بچا ہے۔“

حفظ صاحب کو حیرت کا پہلے سے زیادہ شدید جھٹکا لگا۔ وہ اٹھ  
کھڑے ہوئے اور پچھلی پچھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔  
ایک لمحے کے سکوت کے بعد وہ سرسراہٹ سی آواز میں بولے  
”تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے افضل! اکرام بیگ برسوں سے میرا  
جان نثار محافظ ہے۔ ایک بار حکومت کے خلاف مظاہروں کے  
دوران ایک ہجوم نے اچانک ہی کسی کے ہنگاموں میں آکر غلط و  
غضب کے عالم میں میری گاڑی کو گھیر لیا تھا۔ انہوں نے میرے  
معاذلوں کو بھی قابو میں کر لیا تھا۔ اس وقت خدائے اکرام بیگ ان کے  
سامنے سینہ سپر ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف جرأت سے ہجوم کا راستہ  
روکا تھا بلکہ نہایت ہوشیار سی سمجھے ان کے زرنے سے بھی نکال  
لے گیا تھا۔ اس روز شاید اس کی ٹکابوٹی ہو جاتی لیکن اس نے ذرا  
بھی پروا نہیں کی تھی۔“

”تاریخ بہت سے جان نثاروں کے پک جانے کے قصوں سے  
بھری پڑی ہے حفظ صاحب!“ میں نے قدرے بیزار سی کہا ”یہ  
انسانوں کی دنیا ہے“ فرشتوں کی نہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں، پچھلے  
چند منٹوں میں کیا ہوا ہے اور کس طرح ہوا ہے۔۔۔“

پھر میں نے انہیں ساری بات بتائی۔ وہ دم بخود رہ گئے۔ بڑی  
مشکل سے ان کا ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوا اور وہ  
مستافانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے ”میری سمجھ میں  
نہیں آ رہا کہ اکرام بیگ کس کا آقا کاربن ملکا ہے!“

”یہ معلوم کرنا خفیہ سرکاری ایجنسیوں کا کام ہے۔ کیونکہ یہ  
ایک سرکاری آدمی ہے۔ اگر سرکار کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں خود ہی  
سب کچھ معلوم کر لیتا۔“ میں نے کہا ”فی الحال میں یہ مسئلہ اچھا  
ہے اور بیجا ہے، کی بنیاد پر آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ اس ذخیرہ کی  
بالی گزیاں تلاش کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے

کہ آپ یہ معاملہ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کیجئے گا۔ اس  
پنڈل کرنا پولیس کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ اکرام بیگ کو ایسا  
طرح بے ہوشی کے عالم میں ہی اتنی ذی دلوں کے سپرد کر دیتے  
آفسر وہ ہونے چاہئیں جو ذاتی طور پر اکرام بیگ کے شناسا یا دوسرے  
نہ ہوں اور کچھ نہ کچھ دباؤ انداز رکھتے جاتے ہوں۔“

حفظ صاحب مجھے سمجھنے سے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولے ”مجھے  
ہدایات مت دو۔ مجھے معلوم ہے اس قسم کے معاملات کو کس طرح  
پنڈل کیا جاتا ہے۔“

میں شخص حقو اب کے باعث خاموش رہا ورنہ کہنا چاہتا تھا۔  
”یہ شخص آپ کی خوش فہمی ہے کہ آپ ان معاملات کو پنڈل کرنا  
جانتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ ان معاملات میں تو کیا، ہر طرح کے  
معاملات میں ہی ایک رنگ آنکھ مشینری چمکاتے ہیں جو خوش  
فہمی سے کبھی بکھار صحیح کام کر جاتی ہے اور کبھی شخص آپ کو گمراہی  
کرتی ہے۔“

اچانک کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ باہر ہلکا سا شور بلند  
ہوتا محسوس ہوا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ لائٹ  
باہر سے بولنے کی گئی تھی۔ واؤڈ چوہدری نے اندھیرے میں اپنے  
مخصوص پارعب انداز میں لٹکارا۔ ”کوئی اپنی جگہ سے نہ بٹے۔“ پھر  
اسے گویا خیال آیا کہ یہ رعب ڈالنے کا موقع نہیں۔ وہ ذرا نرم  
لہجے میں بولا ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“

”یہ کیا ہوا ہے؟“ حفظ صاحب کی لڑکتی ہوئی آواز ابھری۔  
ان کے لمبے سے وہ رعب، غلط اور تخت غائب ہو چکی تھی جو ان  
کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ سازش کے انکشاف اور میں اپنے پہلو  
سے ہی ممکنہ قاتل کی برآمدگی نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کا دل  
رکھاؤ دھرا گیا تھا۔ وہ یکدم ہی سا ہوا پتہ بن گئے تھے۔ میرا اپنا  
اندازہ تھا کہ کسی بھی بڑے آدمی کے عین قریب سے جب اس طرح  
سازش کا لالچا پھوٹا ہو گا تو وہ اسی طرح خوفزدہ ہو جاتے ہوں گے۔  
میں نے بہت سے سربراہان مملکت کا احوال پڑھا تھا جن کے  
حفاظتی انتظامات کی تفصیلات پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی لیکن  
اس کے باوجود وہ اتنے خوفزدہ رہتے تھے کہ اگر کبھی غیر متوقع طور پر  
ان کے قریب سے چڑا بھی پھٹک کر گزر جاتا تھا تو وہ بہشت سے  
چچ مار کر بے ہوش ہونے والے ہو جاتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہوتے  
تھے جن کے ایک اشارے پر ہزاروں ہتھی سکرانی زندگیوں کا ناکہ  
گھاٹا اتر جاتی تھیں ”اویٹ ٹاک موت ان کا مقدر ہو جاتی تھی۔  
میں نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر حفظ صاحب کا کندھا  
تھمکنے کی کوشش کی تو وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئے اور ایک ستون سے  
ٹکرا گئے۔

”کون۔۔۔ کون۔۔۔ کون ہے؟“ وہ پھلکا۔

”یہ تو میں تھا حفظ صاحب!“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔  
”گھبراہٹ نہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہر جگہ ہمارے آدمی

ہے۔ "میں نے کہا۔ بھر پوچھا۔ "کیا سب صبران رخصت ہو چکے؟"  
میرے سوال کا جواب شفیق کے بجائے حنیف صاحب نے دیا۔  
"اگر تمہاری مراد آج کی تقریب کے مہمانوں سے ہے۔ تو میں ان  
سب کو رخصت کر کے ہی دھر آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان میں  
سے کسی کو گمان تک نہیں گزرا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔" پھر انہیں  
گواہ کچھ خیال آیا اور بخور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "تم بھی  
مجھے خاصے خراج سرازیر کیجئے ہو۔ سیدھے سارے پولیس میں تو معلوم  
نہیں ہوتے۔ نہایت مہربان سکون اور مشاقی سے ان معاملات کو  
ہنڈل کرتے ہو۔ لگتا ہے کچھ تربیت یافتہ لوگ بھی تمہارے ساتھ  
ہیں۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟"

"سلسلہ کوئی خاص نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہہ  
"یہ دنیا بڑی سخت امتحان گاہ ہے۔ یہاں آدمی اگر خود زار سائیاں  
ہو جائے تو اسے زندگی گزارنے کے لئے کچھ انتظامات رکھنے پڑتے  
ہیں ورنہ دنیا جینے نہیں دیتی۔ بس میں نے ذرا انتظامات رکھے ہوئے  
ہیں۔ آدمی میرے وہی ہیں جو میرے مختلف شعبوں میں ملازم ہیں۔  
میرے کاروبار سنبھالتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عام ملازمین  
کے مقابلے میں ذرا چال کھاتے ہیں۔" ہوشیار ہیں۔"

حنیف صاحب پر خیال انداز میں سر ہلا کر رہ گئے۔ پھر انہوں نے  
ایک پولیس والے کو بھیج کر ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کو بلا دیا اور  
اسے تمام معاملہ سمجھانے کے بعد ہدایات دینے لگے۔ اکرام بیگ  
ابھی تک بے ہوش ہی تھا۔ اچانک وہ ہوش سیکورٹی کا ایک آدمی  
قد سے ہونکھٹائے ہوئے سے انداز میں آن پہنچا۔ اس نے دائرہ  
چوہدری کو اطلاع دی "مرا وہ سوچ دوم میں گڑ بڑ کرنے والے خود  
آدی پکڑے گئے تھے وہ تو خود بخود ہی مر گئے۔ ان کی تو عجیب سی  
حالت ہو گئی ہے۔" شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس  
طرح ان کی حالت سمجھائے۔ اچانک اس کی نظر ایک طرف پڑے  
ہوئے وہ بڑبڑا۔

اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ لیکن پھر وہ جلدی سے اس  
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ان دونوں کی بھی بالکل ایسی ہی  
حالت ہو گئی ہے۔ مراد یا اٹکا ہے کہ انہوں نے آنکھ پٹا کچھ کھایا  
تھا۔ لیکن۔۔۔" اس نے الجھن آمیز سے انداز میں جملہ ادھورا  
چھوڑ دیا۔

میں غصہ کی سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں نے سی آئی ڈی انسپکٹر  
سے کہا "ہزاروں اکرام بیگ کا ذرا ابھی طرح خیال رکھئے گا۔  
کس سے بھی خبردار ہوش میں آتے ہی باڑی لٹی دیکھ کر کسی خوفناک  
چیز نہ کھالے۔ بے ہوشی کی حالت میں ہی اس کی ذرا اچھی طرح  
نکاحی لے لیجئے۔"

وہ لوگ اپنی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔ اکرام بیگ کو  
بے ہوشی کی حالت میں ہی وہاں سے اٹھا کر لے جایا گیا۔ میں نے  
شفیق شاہ کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ ان میں سرفروست تو قیسی تھی

خود ہیں۔ صورت حال پوری طرح ہمارے قابو میں ہے۔ اور یہ  
میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ یہ کوئی سرکاری اعلان نہیں ہے۔  
نہ ابھی آجائے گی۔" الفاظ ابھی میرے منہ میں ہی تھے کہ کرا  
رہو گیا۔ باہر سے بھی دوسری خفیف سا شہر شانی راجا جیسا معما ہر  
جگہ شانی روتا ہے جہاں بجلی کے بریک ڈاؤن کے بعد دوبارہ  
ن آئی ہے۔

میں نے دیکھا حنیف صاحب کے چہرے پر وحشت تھی لیکن  
ن آئی تو انہوں نے اپنے تاثرات معمول پر لانے کی فوری  
شش کی اور پچھلی سی منکر اہست کے ساتھ بولے "شکر ہے  
ہیڈ بائی جرنیلز نے جلدی کام شروع کر دیا۔"

"جی نہیں۔ یہ اسٹینڈ بائی جرنیلز تن نہیں ہوئے ہیں۔ لائن  
ہے۔" میں نے ان کی غلط فہمی دور کی۔ "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا  
اس سازش پر مملکت آدھیں تاخیر ہوگی تو شاید کوئی دوسرا راستہ  
پار کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس سلسلے میں سب سے پہلے  
ن آف کی جائے گی۔ اس لئے میں نے ہونٹ کی سوچ دوم اور  
سب اسٹیشن پر معمول کے حفاظتی انتظامات کے ساتھ ساتھ  
ن طور پر خفیہ انداز میں اپنے خاص آدمی قیادت کئے تھے۔  
ہاں ن لائن آف کی تھی۔ میرے آدمیوں نے اسے اس  
ت کا موقع دیا ہو گا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے انہیں قابو  
کر لیا ہو گا اور لائن بحال کر دی ہوگی۔ اب کسی بھی لمحے اس  
لمحے اطلاع آنے والی ہوگی۔"

"بہت دوش سے بات کر رہے ہو۔" حنیف صاحب قدرے  
ت سے بولے۔

"بس۔۔۔ یہ اپنے اپنے نظام پر اعتبار کی بات ہے۔" میں نے  
راتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے مردانہ ایک ہار پھر کھلا اور شفیق شاہ کرے میں داخل  
پولیس والوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے  
خصوصی پاس تھا اور اس کے کوٹ کے کار پر خاص بیج بھی  
ہاں تھا اس لئے وہ انہیں دھکیلتا ہوا اندر گیا تھا۔

اس نے بالکل اسی طرح بات شروع کی جیسے وہ در سے ہمارے  
ہی کمرہ آتھو کر رہا تھا اور محض ایک لمحے کے لئے باہر چلا گیا  
"مرا وہ دو آدمی تھے۔ ایک نے سوچ دوم کا آلا کھولا تھا اور  
رے نے میں سوچ آف کیا تھا۔ پاور سب اسٹیشن پر کوئی گڑبڑ  
ن والا نظر نہیں آیا۔"

"ان دونوں کا کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ن نہیں قابو میں کر لیا گیا تھا۔ میں اپنے آدمیوں سے کہہ دیا  
نہیں بانہہ کر ایک طرف الال دیں۔" شفیق شاہ نے بتایا۔  
ہائے سوچا۔ آپ سے پوچھ لوں ان کا کیا کرنا ہے؟"

ظاہر ہے سب سے پہلے تو ان سے یہی معلوم کرنا پڑے گا کہ  
ماکس نے اس کام پر کیا کیا تھا۔ بعد میں دیکھیں گے ان کا کیا کرنا

کہ دیشوں کو ایک بار پھر نئے سرے سے باریک بینی سے چیک کیا جائے کہ ان میں کوئی غلط آدمی تو داخل نہیں ہو گیا ہے کسی کا ماضی مشکوک تو نہیں ہے بلکہ ہو سکے تو ہوئل کے تمام ملازمین کے بارے میں نئے سرے سے تحقیقات کر لی جائے۔

دیگر کے روپ میں جو شخص مرید تھا اس کے بارے میں فوری طور پر معلوم ہونا مشکل تھا کہ وہ دیشی تھا یا اس کے کسی دیشی جگہ لی تھی۔ کیونکہ اس کی حالت ہی قابل شناخت نہیں رہی تھی۔ مجھے اندیشہ بھی تھا کہ کس اس کی جگہ بے چارہ اصل دیشی کی صحبت میں گرفتار نہیں شہر یا مرقہ حالت میں نہ پڑا ہو۔ شفیق شاہ نے مجھے تسلی دی کہ وہ اس ضمن میں تمام معلومات حاصل کر لے گا اور اگر اس کام میں تاخیر بھی ہوئی تو وہ مجھے فون پر لاہور رپورٹ دے دے گا۔

ان سب معاملات سے نشتے نشتے صبح ہو گئی۔ ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ سے مشر صاحب کو ٹیڈل ایٹ روانہ ہوا تھا اور وہ بے چارے ایک ہل کے لئے بھی نہیں سو سکے تھے۔ چار گھنٹے کی ان کی فلائٹ تھی اور وہاں جاتے ہی انہیں بے شمار مصروفیات درپیش تھیں۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر ترس سا آ رہا تھا۔ وہ مجھے اس خطبہ سے بہت مختلف نظر آ رہے تھے جس سے میری پہلی ملاقات گورنر ہاؤس میں ہوئی تھی۔ بہر حال وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا شیڈول تبدیل نہیں کیا اور مقررہ وقت پر اپنے اسٹاف کے ساتھ انٹرپورٹ روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد ہوئل میں گویا سکوت چھا گیا۔ سی آئی ڈی اور پولیس والوں نے بھی ہماری جان چھوڑ دی تھی۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ نذر خان کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی بھی گویا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ آہم میں نے اسے اس کے کمرے میں بھیج دی دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ آرام کر لی لے تو بہتر ہے۔ اس کے ساتھ پروگرام یہ لے پایا تھا کہ وہ ہر ایک بچے والی فلائٹ سے ہم لاہور واپس چلیں گے۔ شفیق شاہ کو میں نے سینیٹر کنفرم کرائے کی ہدایت کر دی تھی۔

چند گھنٹے میسر تھے میں نے سوچا آرام یا بے آرامی میں گزارنے کے بجائے راجیلہ کے پاس گزارنے جائیں تو بہتر ہیں۔ چنانچہ میں ایک بار پھر اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس روز چھٹی تھی۔ میں نے سوچا اس کے دفتر کا رخ بھی نہیں ہو گا۔ میں ذرا یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ میں نے ابھی مشکل انہیں لاہور شفٹ ہونے پر آمادہ کیا تھا تو اب بھی وہ اپنے اس فیصلے پر قائم تھے یا ان کا ارادہ کچھ ڈگرا رہا تھا۔

راجیلہ کے ہاں یہ چند گھنٹے لمحوں کی طرح گزر گئے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ اور راشد لاہور شفٹ ہونے کے فیصلے پر قائم تھے۔ بلکہ پہلے تو خود ہی بہت الجھا ہوا تھا کہ وہ بھی دونوں بہن بھائیوں میں صلاح مشورے کے بعد دور ہو چکی تھیں۔ دوسری سب

جائیں بھی پہلے ہی کی طرح ہوتی رہیں لفظوں کے شکر۔ رہے۔ راجیلہ کی قوت تو جاں فزا تھی ہی اس سے بات کر لطف آتا تھا وہ اپنی جگہ تھا۔ اس کی وضاحت لفظوں میں ہو سکتی۔ راجیلہ سے تعلق میں ایک بے عنوان تھی بھی ایک عجیب راحت بھی۔ اس کے ساتھ جو بھی وقت گزرتا مدح کو سرشار کر جاتا تھا۔

فلائٹ کا وقت قریب آیا تو میں ہائل خواست اس کے بار رخصت ہوا۔ وہ انٹرپورٹ تک ساتھ آنا چاہتی تھی لیکن میں اسے منع کر دیا۔ میں نے راستے میں ہوئل سے نذر خان ساتھ لیا اور وہاں سے ایک ڈرائیور ہمیں انٹرپورٹ چھوڑنے ہوا۔ شفیق شاہ بھی ساتھ ہوا تھا کہ جو جائیں نہیں ہو سکی تھے ہم راستے میں کر لیں۔

جواز جب کراچی سے روانہ ہوا اور اس کی پرواز ہموار تو میں نے حقائق بلیک کھولنے کے بعد مجھے کھلے سے اندازہ سیٹ کے پٹے سے ٹیک لگا کر، ٹین دیا کر اسے ترہما کر لیا اور دروازہ کھولا۔ آنکھیں بند کیں تو گزشتہ شب کے واقعات نظر آ گئے۔ نگاہ اللہ نے عزت رکھ لی تھی۔ میرے ہوئل میں ایسا واقعہ دو ماہ میں ہوا تھا جس کا اسکیڈل بن سکتا۔ اس طاعون کی وجہ سے ہی مجھے قطعاً متحکم محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں اس طمانیت سے زیادہ محفوظ نہ ہو پایا۔ اس روز فر

## بغداد کی راتیں

### قمر اجنالی

الف لیلٰی کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات، دجلہ اور نخل کے دامنوں میں لپٹی ہوئی رات، جسے بے شمار کتابوں کے حوالوں سے آراستہ کیا گیا ہے



پیشکش کی گئی ہے  
اردو زبان میں

کوٹھی کا جو بھگڑا چل رہا تھا اس کا کیا ہوا۔ ملک صاحب اس  
بتانے لگے کہ فلاں گاڑی تو انہوں نے فلاں کو کھینچ میں دے دو اور  
فلاں کو ٹھیک تو وہ عقدے میں دیت گئے تھے مگر انہیں بالکل پسند  
تھی اس لئے انہوں نے بچ دلی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ملک صاحب جی بھر کے شوق کر رہے  
اور ان کے سامنے اس کام میں حسب قریض ان کا ہاتھ نہ ہے  
تھے۔ اگر ہو سکتا تو ضرورت تھی۔ بلکہ بلاشبہ بہت  
خوبصورت تھی۔ آتے جاتے یہ سب باتیں اس کے کانوں میں پڑ  
ری تھیں۔ ملک صاحب کی نظر انکس کا بھی اسے احساں نہ  
کبھی کبھی اس کی سکرابٹ میں دلداری کی روش بھی آجاتی تھی  
لیکن یہ باتیں دو تہندی کے تھے۔ دو تہندی کی نگاہ ان کے  
سب کچھ اس کے لئے خود را بہت اہم شاید رہا ہو لیکن بیاہر مال

کلاس میں سرکہ مسافر بہت کم تھے لیکن میرے آس پاس کی چھ  
سات نشستوں پر بالکل مسافروں کا ایک ہی گروپ تھا۔ وہ ایک  
دوسرے سے خوب اور کچی اور کچی تو اوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔  
چھوٹے چھوٹے گھمے پٹے نیم مزاحیہ جملوں پر خوب زور زور سے  
بہن رہے تھے۔

میں نے بالآخر انکھیں کھولیں اور اخبار کی اوٹ سے کن  
انکھیں سے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں سے دو شخص عین میرے  
ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا وہی ان کا سربراہ معلوم ہوتا تھا۔ باقی  
لوگ بھی گہرا پتلوے اور رک رک رکھاؤ میں اسی جیسے دکھائی دے رہے  
تھے لیکن ان کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس کے ہم مرتبہ نہیں تھے۔ ان  
کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے  
لئے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی بے تکلفی بھی ذرا مونہانہ قسم کی  
تھی۔ وہ اس شخص کو ملک صاحب کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

ملک صاحب اوجھڑے چڑھے چکے اور کورے پٹے تھے۔  
قد کاٹھ اچھا تھا۔ مونہا بے کاشکار نہیں تھے۔ ہاتھ پاؤں کے مضبوط  
معلوم ہوتے تھے۔ دولت نے قیافہ ان کی شخصیت میں ایک سوہوم  
سی ملائمت اور چمک دکھائی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی  
میں ان کا وسوسہ والہ اور دراپن۔ سر حال برقرار تھا۔ چہرہ بتاتا تھا  
کہ اس شخص میں جوانی میں خاصی مردانہ وجاہت رہی ہوگی جس  
کے بچے کچے آثار اب بھی موجود تھے جن کا انہیں شاید اب بھی  
کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ تب ہی بار بار غیر ضروری طور پر  
ازہو سنس کو بلائے جا رہے تھے اور اسے اپنی دالمانہ نٹروں سے  
نوازے جا رہے تھے۔ وہ بے چاری اپنی پتی تلی پیشہ ورانہ  
سکرابٹ کے ساتھ اسی طرح انہیں برداشت کر رہی تھی جس  
طرح عام طور پر ازہو سنس فرسٹ کلاس مسافروں کو کیا کرتی ہیں۔

ملک صاحب شاید ازہو سنس کو سنانے کے لئے ہی بھی اس کی  
موجودگی میں اپنے کسی سامنے کی مخاطب کر کے پوچھتے۔ "اکمل  
صاحب! یاد آئے۔۔۔ پچھلے سال جدوں اسی پیرس گئے ہی تے جہاز  
ایچ اوس ایم نے کی آگیا سی؟" (یاد ہے پچھلے سال جب ہم پیرس  
گئے تھے تو جہاز میں اس ایم نے کیا کیا تھا؟)

کبھی وہ کسی دوسرے سامنے کو یاد دلاتے۔ "میرزا صاحب!  
اچھے تے انسان دہاں ایچ اے سی دے بغیر گزارا نہیں۔۔۔ پھر لندن  
ایچ تے انسان دہاں ایچ ساڈے کولوں سو ٹنگ دی نہیں سی  
ہندی۔ پانی تے ایچ بند اسی جیوس برف۔" (یہاں تو ان دنوں میں  
ایئر کنڈیشننگ کے بغیر گزارا نہیں۔ لیکن لندن میں تو ان دنوں ہم سے  
سو ٹنگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ پانی تو ایسے ہوتا تھا جیسے برف۔)

سامنے بار بار ان کی ہاں میں ہاں ملائے۔ پھر لندن پیرس اور  
روم کی باتیں شروع ہو جائیں۔ کبھی ملک صاحب کے سامنے ان  
سے پوچھتے لگتے کہ فلاں جیتی گاڑی کا انہوں نے کیا کیا اور فلاں

## اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                    |
|-------|--------------------|
| 200/- | اندھیروں کے سادبان |
| 200/- | تاریک رزم گاہ      |
| 150/- | صقیلہ کا مجاہد     |
| 150/- | عقاب               |
| 150/- | صحرا کی آگ         |
| 150/- | قتیبہ بن مسلم      |
| 150/- | موت کے مسافر       |
| 150/- | یثرب کا ابلیس      |
| 150/- | سنہری غول          |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2



نہیں تھا۔ فرسٹ کلاس میں یہ اس کے لئے آئے دن کا تجربہ تھا۔  
خصوصاً جبکہ وہ خوبصورت بھی تھی۔

معلوم نہیں وہ اندر ہی اندر بور بور ہی تھی یا نہیں۔ بہر حال  
میں خاصاً بور ہو رہا تھا لیکن اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا  
تھا کہ سفر طویل نہیں تھا۔ منزل جلد ہی آنے والی تھی۔ یہ ان چابی  
رہاقت زیادہ دیر کے لئے گلے کا ہار نہیں تھی۔ تاہم میں اپنی  
ناگواری کا اظہار کے بغیر نہیں رہ سکا۔ گو کہ یہ خاموش اظہار ہی تھا  
مگر کوئی محسوس کرنے والا ہوتا تو کر سکتا تھا۔

میں نے اخبار چرسے کے سامنے سے ہٹا کر فونڈمک نیبل کے  
ساتھ اڑس دیا اور ملک صاحب کو ناگواری سے گھور کر دیکھا۔ اسی  
لئے انہوں نے پہلی بار میرا چہرہ دیکھا۔ میری ناگواری کی طرف تو  
شاید ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ انہوں نے باجیس پہلائے ہوئے  
اپنے کسی ساتھی کو مخاطب کیا۔ ”ارے بھئی.... ہم نے تو دیکھا ہی  
نہیں.... ہمارے ساتھ تو چودری افضل صاحب بیٹھے ہوئے  
ہیں.... سبحان اللہ! کیا حسین اتفاق ہے۔“

انہوں نے گرجوش سے معافی کے لئے میری طرف ہاتھ  
بڑھایا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے خشک لبے  
میں کہا ”معاف کیجئے.... میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“  
وہ ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر بولے ”بھئی تو حالات کی ستم  
ظرفی ہے ہی.... آپ کی تصویر کبھی اخبار میں نہیں چھپی لیکن ہم  
نے آپ کو پہچان لیا.... اور ہماری تصویریں آئے دن اخباروں میں  
چھپتی رہتی ہیں لیکن آپ نے ہمیں نہیں پہچانا.... بڑے افسوس کی  
بات ہے....“

میں نے غلامت سے کہا ”اخباروں کا کیا ہے جناب!  
اخباروں میں تو عجیب عجیب تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔ کبھی تصویر  
چھپ جاتی ہے، فلاں جگہ دو ناگوں اور چار آنکھوں والا ایک بچہ  
پیدا ہو گیا۔ کبھی لائن میں کھڑے ہوئے چار چھ بیڑے بیڑے سے  
کوئیلوں کی تصویر چھپی ہوتی ہے جن کے بارے میں کھٹا ہوتا ہے کہ  
پولیس مقابلے میں یہ کپڑے کئے اور ان کے اتنے ساتھی مارے  
گئے۔ کبھی کبھی تو تلاش کشیدہ میں کسی قلم صاحب کے کتے کی تصویر  
بھی چھپ جاتی ہے کہ کئی آنکھوں اور بھروسے بالوں والا لٹنی تین  
دن سے غائب ہے اور اس کی چدائی میں بیگم صاحبہ کا دمودہ کرڑا  
حال ہے۔ اتنی تصویریں چھپتی ہیں اخباروں میں.... انسان کس  
کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔“

ملک صاحب تو ایک لمحے کے لئے گڑبڑا کئے۔ ان کی رحمت  
کچھ متغیری ہو گئی۔ لیکن ان کے کچھ بولنے سے پہلے ان کے معزز  
ختم کے پچوں میں سے ایک بول اٹھا ”کمال ہے چودری صاحب!“

اے حمید

کے ایڈوینچرس قلم سے

عاطون

انسانی تاریخ کا ایک انوکھا سفرنامہ

چار جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

150/- اہرام مصر سے فرار

125/- اندلس کی آخری شمع

125/- ہڑپہ کی ناگن

200/- عاطون موت کے دروازے پر

مکتبہ القریش

اردو بازار - لاہور 2



پاؤں سے اندازہ ہوا کہ اس کا اصل شوق لڑائی ہی تھا۔ شاعری کی یہ جہلی غمک اس نے قاتلوں ہی پالی ہوئی تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کے لئے سیاست ہر اعتبار سے منافع بخش ہوتی ہے۔ شوق کا شوق، شہرت کی شہرت، مشغلے کا مشغلہ اور کا دیار کا کا دیار۔ جہاں لاکھ لاکھ دہاں سے بعد میں دس لاکھ کماتا۔ ان لوگوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے ہوتا ہے۔ دلی طور پر انہیں کسی نظریے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ جہر کا پلڑا جھگٹے دیکھتے ہیں اسی طرف ہو جاتے ہیں۔

تاہم ملک ریاض راہی فی الحال ایک جھوٹی سی پابائی میں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہاں اسے بڑا ساعدہ ملا ہوا تھا۔ دولت اس کے پاس ٹھیک ٹھاک ہی چلتی تھی۔ بنیادی طور پر زمیندار تھا لیکن پرائیویٹ کے دھندے میں بھی سرگرم معلوم ہوتا تھا۔ لاہور میں بڑی بڑی کوفٹیاں خرید کر بیچتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والے چھ سات آدمی بھی خوفناک ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی اس کی پابائی کا عہدہ اور تھا اور کوئی بغیر عہدے کے ہی اس کے لئے کوئی نہ کوئی خدمت انجام دے رہا تھا۔ وہ کچھ شاطر اور موقع پرست سے آدمیوں کا ایک جھوٹا سا ٹینگ معلوم ہوتا تھا۔

کافی باتیں ہو چکیں تو وہ سوال میری زبان پر آیا جو شروع سے ذہن میں گھبرا رہا تھا۔ ”ملک صاحب! آپ نے مجھے پہچانا کیسے؟ جبکہ بقول آپ ہی کے میری تصویر اخباروں میں بھی نہیں چھپی؟“ وہ ایک غیر ملکی سگرنٹ سلکا کر طویل کش لینے کے بعد بولا۔ ”آپ جیسے لوگ عوامی سطح پر مشہور نہیں ہوتے لیکن شرکے خاص خاص لوگوں میں اور اونچے طبقوں میں بہت اچھی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں۔“ پھر وہ معنی خیز سے انداز میں ہنسا۔ ”اور آپ جیسے لوگ ہم جیسے سیاسی لوگوں کی قوت پر ہوتے ہیں۔ آپ کو پہچانا تو ہماری ضرورت ہوتا ہے۔ خواہ قاجانہ طور پر ہی سہی۔“

”لٹ پر ہوتے ہیں!“ میں نے حیرت سے گوبرایا۔ ”لوگوں سی لٹ پر ملک صاحب؟ کیا ہٹ لٹ پر؟“ اس نے ایک کو گمزار قہقہہ لگایا۔ ”سگرنٹ کا ایک اور نسخہ لے کر راہک جہاز کے قاتلین پر جمادی اور خوشدلی سے بولا ”خدا نہ کرے آپ کسی کی ہٹ لٹ پر ہوں۔ ابھی تو آپ نوجوان ہیں۔ ابھی تو آپ کو بے شمار کام کرنے ہیں۔ ملک و قوم کے لئے۔۔۔۔۔ ہمارے لئے۔“

ایک تو یہ قوم کے خیف و زار اور مرل کھوڑے کی پیٹھ پر سوار کی گئے والے موٹے موٹے گھرچے ہر بات میں ملک و قوم کو درمیان میں ضرور لے آتے تھے جن کی حالت انہی کے اعمال کے بوجھ سے اتر چکی۔

میں نے دھیمے لیے میں کہا ”حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے۔ گرجہ کیزا ہوں میں ذرا سا۔“

آپ بات کو کہاں لے گئے۔ اپنے ملک ریاض راہی صاحب تو بڑے مشہور لڈر ہیں۔ دوزان کے بیانات چیتے رہتے ہیں اخباروں میں، تصویر بھی اکثر چھتی رہتی ہے۔ بڑے پاپولر آدمی ہیں اپنے زمانے میں۔۔۔۔۔ انکا بیٹا ہے ان کے نام کا۔“

”یہ میری بد قسمتی ہے کہ اس ڈنگ کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔“ میں نے بدستور شانگشی سے کہا مگر حال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ ”میں نے معاملے کے لئے ملک ریاض راہی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی باچھیں ذرا کھل گئیں۔ اس نے گرم جوشی اور مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ آدمی مضبوط معلوم ہوتا تھا۔

اسی لمحے مجھے کچھ یاد آیا کہ ضلعی جڑوں والے سٹے پر نظر دوڑاتے وقت شاید یہ نام میری نظر سے گزرا تھا لیکن ظاہر ہے وہ منہ میں بڑھ نہیں پاتا تھا۔ یو سی سرسری سے انداز میں نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اخبارات کے ان صفحوں پر شاید کبھی کبھار اس کی چند سٹری کوئی خبر مشغل کالم میں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شاید تصویر بھی چھتی تھی لیکن میرے ذہن میں نہیں رہی تھی۔ میں نے کبھی توجہ سے دیکھی ہی نہیں تھی۔

”یہ ریا کیا آپ کا تخلص ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بی بالہ۔“ اس نے فخر سے جواب دیا۔ ”لیکن ابھی میں نے شاعری شروع نہیں کی۔ ابھی میں کوئی اچھا سا استاد ڈھونڈ رہا ہوں جو میرے کلام پر اصلاح دے سکے۔“

”کلام پر اصلاح دینے کی بات بھی خوب تھی۔ میں نے کہا۔ ”جب آپ نے کچھ کتا شروع ہی نہیں کیا تو پہلے سے ہی اصلاح کرنے والے کی تلاش کیوں شروع کر دی؟“

”دیکھیں ناچہر دی صاحب! انسان کوئی بھی نیا کام شروع کرتا ہے تو اس میں غلطیاں ہوتی ہیں نا۔۔۔ میں زیادہ خوش فہمی میں جھا رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔“ وہ حتی الامکان محتانت سے بولا۔ میں اس کے اس بیان سے محظوظ ہونے بغیر نہ رہ سکا۔ حالانکہ اس کے ساتھ چھ سات آدمی ایسے سز کر رہے تھے جن کا کام ہی عابکار سے دن رات خوش فہمیوں میں جھلا رہنا تھا۔ سمجھو کہہ رہا تھا کہ وہ خوش فہمیوں میں جھلا رہنے والا آدمی نہیں۔ عجیب بات تھی۔ بیشتر لوگوں کے ساتھ میں نے یہی معاملہ دیکھا تھا کہ جو وہ ہوتے تھے اپنے آپ کو اس کے بالکل الٹ سمجھتے تھے۔ یا کم از کم الٹ ظاہر ضرور کرتے تھے مثلاً ہر وقت خرمشاہیوں میں گھرے رہنے والے اور ذرا ذرا سی تحریف پر پھول جانے والوں کو میں نے کتنے سنا تھا کہ وہ خرمشاہ کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ملک ریاض راہی کو دراصل استاد کی نہیں، کسی ایسے مفلوک الحال شاعری کی ضرورت تھی جو اپنا کلام اس کے ہاتھ فروغیت کر سکے جسے وہ اپنے نام سے چھڑا کر اور مشاعروں میں بڑھ کر شاعر ہونے کی سند پاسکے اس کی

اس نے ایک بار پھر کو نیلا سا قندہ لگایا۔ اس کے پھنے کے ساتھ ہی اس کے ہم سفروں کی باجیس بھی پھیل جاتی تھیں۔ وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا ”آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں چوہدری صاحب۔ آپ کی فزونی کے باوجود آپ کی کاو داری حیثیت کو دیکھتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ آپ بھی دوسرے کاو داری پرے لوگوں کی طرح خشک نہ ہوں۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ ”بہر حال۔۔۔ آپ کی مصروفیات زیادہ تر خشک قسم کی ہی ہوں گی۔ کاو داری بڑا خشک کام ہے لیکن اگر کبھی آپ شرکی زندگی سے بور ہو جائیں اور آپ کی طبیعت سرور و شکار، تفریح اور لڑائی و جھگڑ کی طرف مائل ہو تو ہمیں یاد فرمائیے گا۔ ہم آپ کو اپنے علاقے میں لے چلیں گے۔ کچھ دن تفریح میں گزاریں گے تو یاد کر سکیں گے۔“

پھر وہ آٹھ دبا کر سر کوٹھی میں بولا ”یہ مت سمجھئے گا کہ گاؤں جا کر آپ خاک پھانک کر آجائیں گے وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ بلکہ بلا ضرورت بھی آپ جو کہیں گے حاضر کر دیا جائے گا۔ جنگل میں مشکل ہے ایک بار تجربہ کر کے ضرور دیکھیں گے۔“

”مجھے اندازہ ہے ملک صاحب! آدمی کے پاس دولت ہو تو جنگل بھی شریں اور دولت نہ ہو تو شہر بھی بیاہاں ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ پھر اکٹھے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا ”لاکھ روپے کی بات کی ہے آپ نے۔۔۔ پیسے والے ہیں نا آپ۔۔۔ اس لئے آپ کو پیسے کی حالت کا اندازہ ہے۔ سارا کھیل ہی پیسے کا ہے۔ یہ پوری دنیا اپنے محور کے گرد نہیں پیسے کے گرد گھوم رہی ہے۔ ہمارے ہاں ہر سرگرمی پیسے کی وجہ سے ہے یا پیسے کے لئے۔ سیاست تو کبھی ”حق“ کہ ساتھی خدمت“ سب کی دھم پیسے کا ہی پتھر ہے۔ ہم بھی زمانے کے ساتھ چل رہے ہیں۔“

”کیا زمانہ بہت بُرا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کو اس میں کوئی شک ہے کیا؟ آپ دنیا کی حالت نہیں دیکھ رہے؟ چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔“ وہ گویا میری بے خبری پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن میں نے حال ہی میں ایک حدیث پڑھی ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ زمانے کو بُرا مت کہو۔ زمانہ میں ہوں انسان زمانے کو بُرا کہہ کر مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”اور واقعی۔۔۔ زمانہ تو غیب کی علامت ہے۔ بُرے تو ہم انسان ہوتے ہیں۔ ہم اپنی حرکتوں سے جس دور کو جا ہیں اچھا بنا سکتے ہیں اور جس دور کو جا ہیں بُرا تو پھر ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انسان بہت بُرا ہو گیا ہے۔ یہ کیوں کہتے ہیں کہ زمانہ خراب آگیا ہے۔“

ملک راضی راہی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا ”چوہدری صاحب! آپ میں آپ کو غلط تو نہیں

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”مولوی ہونا تو کافی مشکل ہے۔ میں تو پہلے اندر سے انسان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“ وہ طمانیت کی مٹھائی میں لے کر بولا۔

”آج کل کچھ بات سن کر لوگ ڈر کیوں جاتے ہیں؟“ میں نے مصوویت سے کہا۔

”چوہدری صاحب۔۔۔! وہ ایک بار پھر آٹھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولا ”اب آپ اتنے بھولے بادشاہ نہ بنیں۔ آپ کو پھر اچھی طرح پتا ہے دنیا کہ ہر جاہلی ہے لوگ کیا کر رہے ہیں کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو دنیا داری کے سارے پھکڑوں کا پتا ہے اگر آپ اتنے سیدھے ہوتے تو اتنے بڑے بڑے فرس میں نہ بنے۔“

”میں نے کب کہا کہ مجھے دنیا داری کے پھکڑوں کا پتا نہیں۔ میں نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ ”جب سے پتا چلا ہے دنیا کو زمانہ قریب سے دیکھا ہے تب سے ہی تو دل زیادہ دنگے ہے۔ آگئی بلاشبہ ایک عذاب ہے۔“

”چھوڑیں گی۔۔۔“ وہ میرا ہاتھ تھمک کر بولا ”آپ کسی کے عذاب ٹوٹ کے پھکڑوں میں نہ پڑا کریں۔ آپ کی انہی عمر کیا ہے۔ دنیا دیکھیں، ہر چیز کو انجوائے کریں۔ ورنہ بعد پچھتا سکیں گے۔“

”انجوائے تو میں کر رہا ہوں۔ میں تو آپ جیسے لوگوں کی باتوں بھی انجوائے کرتا ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے پھر بھی بعد میں پچھتے پڑے۔ پچھتاوے کا کیا ہے۔ زندگی کے آخری موڑ پر پہنچ کر تو نے اکثر لوگوں کو۔۔۔ خصوصاً دنیا داروں کو پچھتاوے ہی دیکھا ہے۔ دنیا میں سب کچھ دیکھ لینے حاصل کر لینے اور رہنے کے بعد بھی میں ہاتھ جھڑا کر کی سوچتے ہیں۔“ اچھا۔۔۔ اس کی تھی دنیا؟ کے لئے اتنے پاؤں پیلے؟ اتنے پاپ کماؤ؟ پورے منہ۔۔۔ اچھا وہ منہ سے ایسا نہ کہیں لیکن قریب سے مشاہدہ کرنے پر ان محسوسات کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

”چھوڑیں چوہدری صاحب! آپ تو خیالوں فراوان کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ فونڈلنگ میز کی اینٹ رے میں سرگرم ہوئے بولا ”ہم نے تو زندگی کی آخری سانس تک دنیا والوں کو داری ہی کے پھکڑوں میں پریشان دیکھا ہے۔ ہنر مرگ پر پڑا ہوں گے، آخری سانس سینے میں اٹکی ہوئی ہوگی لیکن لگ رہی ہے کہ فلاں جا کر ادا کیا یا؟ فلاں کا رخا نہ فلاں لڑکے نے سنبھال نہیں، فلاں فلاں فلاں فلاں فلاں فلاں فلاں سے نکل آئیں یا نہیں اچھی نگہوں میں ترپتے ہوئے اور خواب آور دواؤں کے انجوائے لگواتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور میں کہتا یہ ٹھیک ہی ہے۔ زندگی اسی جدوجہد کا نام ہے۔ آدمی کو اسی ہاتھ پاؤں مارے مارے مرنا چاہئے، مظلوم ہو کر نہیں۔ بے بسی

پھر اس نے انگوٹھے کے ذریعے بوتل منہ سے لگانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ شغل چلے ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلادیا۔  
"میں تو خرابی ہے آپ میں۔" وہ گویا مرض کی جڑ پکڑتے ہوئے بولا "جب بھی عیبی آواز میں آپ کو ستایا کریں بوتل کھول لیا کریں۔ ساری آوازیں ختم ہو جائیں گی۔ صرف خواہشوں کی آواز رہ جائے گی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں آپ کو ہم جیسے انسانوں کی صحبت کی اشد ضرورت ہے۔ آپ پہلی فرصت میں چاہئے لاہور میں ہمارے ساتھ نشست رکھیں یا پھر زمیوں پر چلے گا کوئی پروگرام بنائیں۔"

مجھے اس کی دعوت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن معلومات کی خاطر میں نے پوچھا "کہاں ہیں آپ کی زمینیں؟"  
"اوپر والے کا برا کرم ہے۔" ایک کمرہ پہلے وہ جس طرح کی باتیں کر رہا تھا ان کی بدھنی میں یہ اوپر والے کے کمرے کی بات اس کے منہ سے بڑی عجیب لگی لیکن حاشوہ ایسے ہی تعدادات سے بھرا پڑا ہے میں کس کس پر حیران ہوتا۔ وہ بڑے لشکر بھرے لمبے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دو مختلف علاقوں میں زمین ہے انٹی۔" اس نے علاقوں کا نام بتایا اور میں چرے کے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ ان میں سے ایک علاقے کا نام شکر گڑھ تھا۔  
میں نے سرسری سے لمبے میں کہا "شکر گڑھ کے قریب تو کافی زمین ملک اسلم حیات کی بھی تھی۔ کئی چک آباد تھے ان زمینوں پر۔"

میں نے تو اپنا چکر لٹا اس پر ظاہر نہیں ہوئے رہا تھا لیکن وہ واضح طور پر چوک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا آپ جانتے تھے ملک اسلم حیات کو؟"

میں نے بے نیازی سے کہا "نہیں۔ البتہ ملک اسلم حیات کا کوئی بیٹا تھا۔ شاید قیصر ملک نام تھا اس کا۔ وہ قلم برنس میں بھی تھا۔ میرا بھی کچھ بیسہ قلم برنس میں لگا ہوا ہے۔ وہیں اسٹوڈیو میں اتفاقاً ایک آدمہ بار اس سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ کچھ ایسے خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال اس کے بیک گراؤنڈ کا بچا تھا۔"

وہ گویا اطمینان کی سانس لے کر بولا "قیصر سے تو کم ہی لوگوں کی ملاقات خوشگوار حالات میں ہوئی تھی۔ تھا تو وہ بڑا ذہن دل اور ہمارے جیسے ہی شوق رکھنے والا لڑکا۔ لیکن قلم لائن نے اسے کچھ زیادہ خراب کر دیا تھا۔"

میں نے دل میں سوچا۔ میرے خیال میں تو وہ قلم لائن کو زیادہ خراب کر رہا تھا۔ لیکن میں خاموش رہا۔ ملک ریاض بات جاری رکھتے ہوئے بولا "خرابی اس میں صرف یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اسے اپنے فائدے نقصان کی تمیز نہیں رہی تھی۔ کیا آپ کو معلوم ہے وہ دونوں باپ بیٹے کے بعد دیگرے کچھ ہی عرصے میں مارے گئے تھے؟"

ہنر سنا ہو۔ حتیٰ کہ سوچ بھی ٹھیک طرح سے اس کے قابو میں نہ آتی۔  
"اب یہ تو کوئی انسان یقیناً سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے کیسی بات نصیب ہوگی۔ دنیا کی ساری دولت بھی انسان کو اس کی پسند کی بات نہیں دلا سکتی۔" میں نے کہا۔ "اسی لئے تو میں سوچتا ہوں کہ طرح کی موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ بلکہ صرف موت کے لئے انسان تیار رہے تب بھی قیمت ہے۔ یہ یاد رکھ لے کہ موت کے بعد کسی کے سامنے پیش ہوتی ہے۔"

"اب آپ بالآخر آخرت وغیرہ کی بات کریں گے۔ خدا داراں میں پوری صاحب کوئی ہم جیسے گناہ گار انسانوں میں اٹھنے بچنے والی باتیں کریں۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔  
"گناہ گار تو میں بھی بہت ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔  
"لیکن گناہ گار گناہ سمجھتے ہیں۔" اچھے اور بُرے کے درمیان امتیاز کئے میں کیا فرق ہے؟ انسان کم از کم گناہوں پر فخر تو نہ کرے۔ نہیں زندگی کا حاصل تو نہ سمجھے۔ یہ بھی قیمت ہے۔ اس سے نشان کا ضمیر زندہ ہونے کا سراغ ملتا ہے۔"

"پھر نہیں جی پوری صاحب! خالی غلطی اختیار رکھنے اور شرمندہ ہونے کا کیا فائدہ؟ جب انسان گناہوں کو چھوڑ نہ سکتا ہو۔" برائیاں سے پرہیز نہ کر سکتا ہو۔ چھائی کے راستے پر قائم ہی نہ رہ سکتا ہو۔ ان ساری باتوں کی اس میں طاقت ہی نہ ہو تو پھر خالی وہ عمل کرتے رہنے کا کیا فائدہ؟ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ خالص دنیا دار ہی بن جائیں۔ ہر وقت ایک غلٹ میں ایک کک میں تو جھلا نہ رہیں۔ سچ میں تو نہ لگے رہیں۔ یا تو آپ سارے احکام کی عملی پابندی کریں یا پھر پورے دنیا دار ہو جائیں کسی ایک طرف کے ہو جائیں۔ انسان کسی بھی معاملے میں دو کشتیوں کا سوار نہیں رہ سکتا۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آدمی باطلی معلوم ہوتا تھا لیکن جاہلی بھی کبھی بچے کی بات کر جاتے ہیں۔ وہ جو بھی تھا لیکن جاناں نہ بہر حال معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پہلے کی نسبت ذرا کمزور لمبے میں کہا "میں تو نہ اپنے آپ کو اچھے، نیک اور پار سالوگوں میں شمار کر رہا ہوں اور نہ ہی سچ والوں میں۔ بہر خیال ہے میں تو خود بھی آپ جیسے دنیا داروں میں ہی شامل ہوں ملک صاحب! لیکن یہی سب کچھ کوئی عیبی آواز سی ہے جتنی کہ دیتی ہے۔ میرا کبھی کبھی بہت نیک بہت پار سارین جانے کو جی چاہتا ہے لیکن معلوم نہیں کس چیز نے روکا ہوا ہے۔"

"دنیا کی کشش نے۔" ملک مسکرایا۔ "اس دنیا میں بڑی کشش ہے۔ اس کی ہر چیز میں بڑی لذت ہے۔ سچی ہے یا جھوٹی پائیدار ہے یا ناپائیدار لیکن بہر حال لذت ہے۔ آپ بھی آواز سے زیادہ پریشان نہ ہو کریں۔ ہم جیسوں سے دوستی رکھیں آپ کو ہر طرح کی عیبی آوازیں ستا بند کر دیں گی۔"

تھا۔ وہ مجھے بلکے سے کہی مار کر اور آنکھ دبا کر بولا "کیسی ہے؟"  
 "اچھی ہے۔" میں نے سادگی اور سنجیدگی سے کہا "لیکن اسے اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ بے چاری یہاں گزرتی ہے تو کچھ سہی سہی نظر آتی ہے۔"

"چھوڑا ہوا تو ہے اس کے حال پر۔ ہم کون سا اسے الے جا رہے ہیں۔" ملک ریاض نے قدرے عجیب سی نظروں میں طرف دیکھا "ویسے آپ اس کے سہی سہی نظر آتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ذرا دکھاوے کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ جہاں کا بیٹے ہے۔ ذرا پر فارموش دیتی ہیں اور ایکٹنگ کرتی ہیں کہ سیدھی سادی، پاکیزہ اور معصوم ہیں۔ لیکن بڑی خرافت ہوتی ہے یہ تو دل سے جانتی ہیں کہ ہم جیسے مشہور اور دولت مند لوگ ان طرف متوجہ ہوں، انہیں لفت دیں۔ جال ہم تو وٹائی پیچہ بکھڑے ہوتے ہیں جال تو ان کے پاس ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کچھ واقعی سیدھی سادی، پاکیزہ اور معصوم ہوں۔ خرافت نہ ہوتی ہوں۔ جال لے نے پھرئی ہوں۔" میں نے دھیسے لہجے میں کہا "آخر ہم لوگوں کے بارے میں حسن ظن کی باتیں کر رکھے؟ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ شاید ہماری نظرسوسہ رسی ہوں۔ شاید ہمارا تجربہ جھوٹ بول رہا ہو؟ کبھی بھی خزاہ حقہ سامنے ہو تب بھی کیا کچھ اور فرض کر لیں؟ زیادہ بھلا نہیں لگتا؟"

"چوہدری صاحب! ہم جیسے لوگوں کے منہ سے یہ افسانہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ ہاتھ ہلا کر بولا "ہم حقیقت کی دنیا لوگ ہیں۔ کم از کم میرا اپنے بارے میں تو یہی خیال ہے کہ میں سوچیں بہت جیسے چھوڑ آیا ہوں۔ دستانوں میں پرورش پائے داد خیالی اور خواب پرست نوجوانوں کے لئے۔ جھوٹی موبی ٹوکھا کرنے والے شریف اور شرمیلے باپوں کے لئے۔ ناکام شاعر اور اربوں کے لئے۔ ہم بہت آگے کے لوگ ہیں چوہدری صاحب! ہمیں دنیا کو اسی طرح دیکھنا چاہئے جیسی وہ ہے۔"

وہ اڑبوسٹوں کو خرافت کہہ رہا تھا لیکن خود زبردست خرافہ منگوم ہوا تھا۔ اندر سے وہ یقیناً بہت گھڑا اسٹاک اور خود غرا تھا۔ میں نے اس سے بحث کرنا فضول سمجھا۔ ویسے بھی اب نیا باتوں کا وقت نہیں رہا تھا۔ اسٹیکر پر کمیشن کی آواز ابھر رہی تھی۔ تیار ہا تھا کہ چند منٹ بعد ہم لاہور ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔ ریاض ملک بولا "آپ سے تو کچھ امید نظر نہیں آ رہی کہ تو کبھی ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں گے۔ اس لئے جلد ہی خود آپ کے در دولت پر حاضری دیں گے۔"

میں اڑبوسٹوں کا رڈ نکال کر اسے دینے لگا تو وہ بے پردہ سے بولا "اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے عرض کیا، تاکہ ہم آپ جیسے لوگوں کو قاتلانہ طور پر بہت اچھی طرح جانتے ہر ویسے بھی آپ جیسے لوگوں کا بیڑہیں فون نمبر وغیرہ منگوم کرنا تو سادہ شغل کام ہے۔ ڈائریکٹری میں بھی آپ کی تو یہ سب چیزیں جانا

"ہاں۔ میں نے کچھ سنا تو تھا لیکن مجھے صحیح طور پر حالات کا علم نہیں۔ میں نے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ شاید ملک ریاض کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹے میرے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے۔

وہ ترمیم آہستہ سے لہجے میں بولا "وہ جیسے بھی تھے بہر حال نہایت غیر متوقع طور پر ان کے خاندان کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ باپ بڑا مراء حالات میں غائب ہوا۔ غائب کیا ہوا۔ سب ہی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مرنے کا ہے۔ اس کے بعد زمین جائیداد وغیرہ اکلوتے بیٹے کے نام منتقل ہوئی۔ پھر وہ بھی مر گیا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ یعنی اپنی بڑی زوجہ امری وغیرہ کا کوئی وارث ہی نہیں۔ بس قریب ترین رشتے دار میں ہی تھا۔ میرے پاس بیٹے ہی اللہ کا دیا بہت کچھ تھا لیکن ان کا سب کچھ بھی مجھے ہی مل گیا۔ کچھ عدالتی کارروائیاں ضرور کرنی پڑیں۔ لیکن خانے پھر میں ہم لوگوں کے لئے گھر کی طرح ہوتی ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں بیٹھے ٹھکانے سے دکان بڑا زمیندار بن گیا۔ حالانکہ ان لوگوں کی زندگی میں میرا کبھی ان لوگوں سے میل جول نہیں رہا۔ بلکہ یوں سمجھ لیں کہ دونوں طرف ایک طرح کی ہلکی پھلکی ہی پائپنڈی لگائی جاتی تھی۔"

پھر وہ بھی سی سی کے ساتھ بولا "لیکن یہی جی بات ہے ان کے مرنے کے بعد میں ان کا کافی شکر گزار ہوں۔ کافی فائدہ پہنچا ہے ان کی موت سے۔ میری صاف کوئی شاید آپ کو پسند نہ آئے لیکن میں کھرا آدمی ہوں۔ جی بات کرتا ہوں۔ خواہ کجاء منہ لٹا کر بیٹھنے اور ایسے لوگوں کی موت پر اظہارِ افسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتا جن کی موت کا مجھے حقیقت میں کوئی افسوس ہوا ہی نہیں ہو۔ کیوں ہی کیا میں غلط کہہ رہا ہوں چوہدری صاحب؟"

"نہیں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے بے دھیانی سے کہا۔ میں اصل میں اب ایک نئے زاویہ نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یہ اتفاق بڑا عجیب سا لگا رہا تھا کہ میری زندگی کے ساتھ دونوں پر دشمنی اور نفرت کے خانے میں جس شخص کا نام سب سے پہلے... اور بہت گہرے خوف میں گھسا گیا تھا، آج اس کی زمینوں اور جائیداد کا وارث میرے برابر بیٹھا مجھ سے گپ شپ کر رہا تھا۔ وارث بھی وہ جو درحقیقت وارث تھا ہی نہیں۔ وقت نے ویسے ہی اٹھا کر سب کچھ اس کی بھولی میں ڈال دیا تھا۔ اس دولت و جائیداد کے لئے ملک اسلم حیات اور پھر اس کے بیٹے قیصر ملک نے نہ جانے کیا کیا باپ کمائے تھے، کیا کیا علم ڈھائے تھے۔ اس دولت و جائیداد کو حقیقی وارث بھی میر نہیں آسکا تھا۔ اور اس کے بل پر وہ اپنے لئے عزت کی موت بھی نہیں خرید سکے تھے۔ اگر گری نظر سے دیکھا جائے تو بڑی بے وقعت لگتی ہیں یہ چیزیں۔

اب ایک وی اڑبوسٹ ایک بار پھر ہمارے قریب سے گزری جس کی نظر اتفاقات کے لئے ملک ریاض خاصی دیر سے پڑا رہا

نمایاں طور پر آپ کے گروپ آف کمپنیز کے موٹر گرام کے ساتھ چھپی ہوئی ہیں۔“

اس کا سہرے بارے میں اس طرح سطحی سی معلومات رکھنا بھی مجھے ٹھک رہا تھا۔ بغیر کسی مطلب کے کوئی کسی کے بارے میں اتنی معلومات بھی کہاں رکھتا ہے۔ بہر حال میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ لاہور انٹرپرائٹ پر ایک چھوٹا سا جلوس اسے لینے آیا ہوا تھا۔ ملک ریاض اراخیل لاؤنچ میں پہنچا تو جلوس کے شرکا نے اس کی گردن بادوں سے لا دی۔ دو تین فوٹو گرافر بھی اس وقت موجود تھے جنہیں یقیناً پائل و درکری بھیج کھانچ کر ساتھ لائے تھے۔

ملک ریاض فاتحانہ انداز میں ہاتھ ہلاتا اور ہر دو تین قدم بعد بڑی محنت سے رک رک کر فوٹو گرافروں کو اپنی تصویر کھینچنے کا موقع دیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ اچانک اس نے ہاتھوں کے انبار میں بڑی مشکل سے گردن ڈرا کھما کر تلاشی نظروں سے پیچھے دیکھا۔ یقیناً اسے میری تلاش تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی غالباً سب سے پہلے تو اسے یہ اطمینان حاصل ہوا کہ میں اس کے استقبال کا یہ عقیم اور ستار شکن شکاہ دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس نے مجھے بھی اس اعزاز میں شریک کرنے کے لئے جلدی سے قریب آنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے اشارے سے ہی معذرت کی اور فوراً اس طرف کو ٹھک لیا جہاں ٹونی کرا تھا۔ حالانکہ میں نے فون کر کے صرف ڈرائیور کو بلوایا ہوا تھا لیکن ٹونی میری آمد کی اطلاع سن کر خود بھی چلا آیا تھا۔

میں نے پرفیکٹ کیس اسے تھمایا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ لپک کر میرے ساتھ ہوتے ہوئے بولا ”خیریت ہے سر؟ آپ بہت نکلت میں دکھائی دیتے ہیں۔“

”تم نے دیکھا نہیں، قوم کا ایک عقیم خادم مجھے اپنی رفاقت کا اعزاز بخشنے پر تیار ہوا ہے۔“

ٹونی اپنے مخصوص دھیمے سے انداز میں ہنس دیا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے جہوم کے سامنے آنے اور پبلک مقامات پر خواہ مخواہ خود کو نمایاں کرنے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔ وہ لوگ ابھی لاؤنچ میں ہی نمبر بازی کر رہے تھے، ہر باہر ہنر پارکنگ لٹ کی طرف بڑھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹونی شرکے تقریباً ہر قابل ذکر آدمی کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا ”تم اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”ملک ریاض راہی کے بارے میں؟“ اس نے تصدیق چاہی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا ”کچھ ہی عرصے پہلے ایک آنکھ پائل میں شامل ہوا تھا۔“

”آنکھ پائل میں؟“ میں نے حیرت سے ڈہرایا۔

”اوہ معاف کیجئے گا۔ یہ ایک عوامی اصطلاح ہے اور آپ کا اب عوامی اصطلاحوں سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔“ ٹونی

سکراتے ہوئے بولا ”دراصل ہمارے ملک میں بہت سی ایسی پارٹیاں بھی ہیں جن کے حامی دار اور ارکان وغیرہ سب مل کر ایک ٹانگے میں سانسکتے ہیں۔ انہیں آنکھ پائل کہا جاتا ہے۔ ملک ریاض جب اس پائل میں شامل ہوا تو وہ بھی آنکھ پائل ہی تھی۔ لیکن اس کے آنے ہی کو پائل میں بھی جان پڑی اور خود ملک ریاض بھی راکٹ کی رفتار سے سیاست کے آبی پر سفر کر رہا ہے۔ ابھی اس سطح پر تو نہیں پہنچا کہ کئی کچوں میں جانا پہنچانا جانے لگے لیکن آثار بتاتے ہیں کہ سال دو سال میں بڑے بڑے جفاوری لیڈروں کے کان کتر جائے گا۔“

”ابھی کیا خولی ہے اس میں؟“ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا ”جہاز میں سفر کے دوران میری اس سے تقریباً ایک گھنٹا گفتگو رہی۔ مجھے تو انتہائی غبار بد معاش، منافق اور جھوٹا آدمی دکھائی دیا۔“

”یہی تو ہمارا المیہ ہے سر!“ ٹونی لٹھڑی سانس لے کر بولا ”اکثر بد بشر سیاست میں آنے والوں کی یہی برائیاں ان کی خوبیوں بن جاتی ہیں۔ انہی کے سہارے وہ تیزی سے آگے آتے چلے جاتے ہیں۔ سیدھے سادے اور کم علم لوگوں کو جو جتنا زیادہ ٹوہنا سکتا ہے وہ اتنا ہی بڑا اور کامیاب لیڈر بن جاتا ہے۔“

”کیا اس میں لوگوں کا کوئی قصور نہیں؟ میرا مطلب ہے عوام کا؟“ میں نے کہا۔

”عوام کا تو شاید نہیں۔“ ٹونی ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا ”لیکن ان کی کم علمی، کم فہمی اور بے خبری کا ضرور ہے۔ لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں جان بوجھ کر کم علم اور ذہنی طور پر پسماندہ رکھا گیا ہے۔“

”ملک ریاض کے بارے میں اور کچھ جانتے ہو؟“ میں نے اس طوالت طلب موضوع سے کتراتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی کامیابی کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے سر!“ ٹونی بولا۔ ”جیسے وہ پائل کی طرح ہمارا ہے۔ پائل کے دفتروں میں فکری کھلے رہتے ہیں۔ پریس والوں کے لئے، جیسے جلوسوں کے لئے گویا تھیلیوں کے منہ کھلے رہتے ہیں۔ ویسے تو بہت سے لوگ سیاست میں غاندانی دولت اس امید پر خرچ کرتے رہتے ہیں کہ آج دس میں لاکھ لگائیں گے تو کل دس میں کروڑ ڈالیں گے۔ لیکن ملک ریاض جس دروادی سے خرچ کر رہا ہے اس سے تو لگتا ہے کہ وہ غاندانی دولت بھی نہیں ہے۔ جوں جوں سیاست میں اس کے خرچے بڑھ رہے ہیں، اس کی غاندانی دولت اس سے بھی زیادہ بڑھتی دکھائی دے رہی ہے۔ ویسے ہی بس میرا مشاہدہ ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ میں نے اسے کبھی اپنی اہمیت نہیں دی۔“

”وہ زمیندار ہے اور بڑی پراپٹی کا ساکھ پرنس بھی کرتا ہے۔ دونوں کام بہت زیادہ منافع دے رہے ہوں گے۔ جتنا میں نے خرچ ہو رہا ہو گا اتنا تو شاید وہ ایک گھنٹے میں کمایا ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”ویسے بھی ہمارے ہاں جب لوگ سیاست میں آجاتے ہیں تو ان سے حساب کتاب لینے والا کوئی نہیں رہتا۔ ایک عام آدمی ذرا صاف ستھری سی کپڑے کی دکان بھی کھول لے تو اس کے پاس انکم ٹیکس والے پہنچ جاتے ہیں اور حساب مانگتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ دکان کھولنے کے لیے نیسہ کہاں سے آیا لیکن یہ دل چاہتا ہے پچھلے والے جب سیاست میں آکر سرسبز دکانوں میں گھومنے لگتے ہیں بلکہ ٹیکس کمزور کر لیتے ہیں تب بھی ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ دکان کہاں سے پتلے آئے ہیں۔“

ٹوٹی استہزائیہ سے انفرادیت میں کر رہ گیا۔ نذیر خان کراچی سے لے کر اب تک صرف سامنے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ اتنی دیر سے وہ بالکل نہیں بولا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”نذیر بھائی! آپ تو بالکل ہی چپ ہیں۔ جب سے کراچی سے چلے ہیں تب سے ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ ایسی بھی کیا غوثی۔ آپ کے سامنے اتنے اتنے عظیم موضوعات پر تبادلہ خیال ہو رہا ہے۔ آپ بھی تو کچھ اظہار خیال کیجئے نا۔“

نذیر خان پہلو بدلتے ہوئے ایک مڑیا نہ بے نیازی سے بولا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک بولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ ساری بات یہ کہ مجھے موقع ملا۔ میں تب بھی نہ بولا۔ ایک بے چارے نذیر خان کے بولنے سے کیا ہو گا؟ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر لوگ ہر پہلو سے بول چکے، لگے بچکے، ہرزادے ہیں۔ ان پر اظہار خیال کر چکے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑے گا؟ کچھ بھی نہیں۔ پرناہ وہیں رہ رہا ہے اور وہیں رہے گا۔ الجھاوے وقت کے ساتھ ساتھ مزید بڑھیں گے۔ کم نہیں ہوں گے۔ ہمارے نظام اور ہمارے مسائل کی مثال اچھے ہوئے دھاروں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کی سی ہے۔ ہر دھار کا الجھا ہوا ہے۔ ہر ایک کس کس نہ کہیں جا کر پھنسا ہوا ہے۔ جس کسی کو بھی یہ ڈھیر سلجانے کے لئے بھجایا جاتا ہے وہ اپنی آنکھوں پر اپنے کچھ مخصوص مفادات کی پٹی باندھ کر اسے سلجھانے بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے آپ آنکھوں پر پٹی باندھ کر تو اس ڈھیر کو نہیں سلجھا سکتے۔ آپ تو مزید الجھائیں گے۔ بس یہی ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔“ اس نے گویا بات ختم کر دی۔

گاڑی میں ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ صرف اڑکنڈیشر اور انجن کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آخر کار ٹوٹی بولا ”آپ کیوں ملک دماغ کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس دینے ہی مجھے لگا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ جبکہ میری بے خبری کا یہ عالم ہے کہ میں اسے جانتا تک نہیں تھا۔ مجھے اس کی دلچسپی کچھ عجیب لگی۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے وہ آپ کو اپنی پادری میں شامل ہونے کی دعوت دینا چاہتا ہو۔“ ٹوٹی مسکراتے ہوئے بولا ”آپ مجھے لوگوں کی تو ہر پادری کو ضرورت رہتی ہے نا۔ الٹیشن بھی قریب ہیں۔“

”خدا نہ کرے کہ وہ ایسی کوئی دعوت لے کر میرے پاس آسکے۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ٹوٹی سے پوچھا ”میری غیر موجودگی میں یہاں کوئی خاص مسئلہ تو سامنے نہیں آیا؟“

”نہیں سرائیکی کوئی بات نہیں ہے جو آپ کے علم میں نہ آسکے۔“ ٹوٹی نے جواب دیا۔

”اس کے بارے میں کوئی خبر ہے جسے تلاش کرنے کی ذمہ داری میں نے تمہارے سپرد کی تھی؟“ میرا اشارہ اسے سن کر طرف تھا جس کی تلاش پر میں نے صرف ٹوٹی کو ہی نہیں بلکہ اپنے دفتر کے ملازم، محسن علی اور اس افسر نوجوان و سیم احمد کو بھی لگا دیا تھا۔ سنجیدگی سے یہ حکم میں نے درحقیقت صرف ٹوٹی کو ہی دیا تھا۔

ٹوٹی اگلی بیٹ پر بیٹھا تھا اور سڑک کے دوران بھی اس کی نظریں آتی سیاتی گاڑی سے الگ رہی تھی۔ ستاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لے کر وہ بولا ”سرا! اس کی تلاش میں پھر پھر کرتے ہیں۔ گاڑی کے بازو کھسکائے ہیں، مگر وہ نظر نہیں آیا۔ اگر اس کا ڈراما بھی کوئی سراغ نہ ہوتا۔“ اس نے جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا۔

”یہی تو مسئلہ ہے۔ سراغ ہوتا تو شاید مشکل کچھ نہ بچو آسمان ہو جاتی۔ اب تک تو وہ چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر چھلاوے کی طرح غائب ہوتا رہا ہے۔ اب اس جگہ پر جسے شرمیں اسے تلاش کرنے کی سی حروف ہے۔ میرا خیال ہے تم خاص طور پر اس کی تلاش میں خاک چھاننے نہ پھر۔ اپنے دو مہرے کام لگا کر کھینچ رہو۔ بس ساتھ ساتھ گرد و پیش پر نظر رکھو۔ اگر بھی نظر آگیا تو ٹھیک ہے ورنہ نکتہ بھیجیو۔“

”ٹھیک ہے سرا جیسے آپ کا حکم۔“ ٹوٹی بولا۔

ستہزیر خان نے کھار کر گا صاف کرنے ہوئے کہا ”اگر یہ کوئی زیادہ سیئر انویسٹ معاملہ نہیں ہے تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کسی ذکر خیر ہو رہا ہے؟ شاید کسی کی تلاش میں میں بھی کسی کام آسکوں۔“

”نذیر بھائی! آپ نے تو جو کام کر دکھایا ہے وہی بہت ہے۔“

ایک وقاردار اور غیر متزلزل انداز میں اپنے فرائض انجام دینے لگا تھا۔  
 "ہر کام کا کوئی نہ کوئی پلادان تو ہوتا ہے اس کا بھی یہ بکاؤ بنے کا تھا ہو گا۔"

"شکر ہے وہ تہاڑ میں ہی پکڑا گیا۔" میں نے کہا "اگر یہ آتش کا سیلاب ہو جاتی اور حفیظ صاحب کی موت کا سبب دل کا درد ہی سمجھا جاتا تو اکرام بیگ کی طرف یا سازش کے امکان کی طرف تو کسی کا بھی دھیان نہ جاتا اور وہ مزید آگے بڑھ کر نہ جاتے کہ ان کا کیا مزہ کام دکھاتا۔"

"اب اکرام بیگ کا بے گناہی؟" نذیر خان نے جانا چاہا۔  
 "میں نے حفیظ صاحب کو جو بندوبست کرتے دکھا تھا اس کے مطابق تو خیر یا بیخیاں اسے تفتیش کے لئے لاہور لائیں گی۔ شاید آج ہی کسی فلائٹ سے اسے لاہور پہنچا دیا جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی تفتیش میں گھسنا پڑے گا؟" نذیر خان نے قدرے تجزائی سے پوچھا۔

"میں نہیں میں نے اس کا بندوبست کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا ہم دونوں ہی اس کے متحمل نہیں ہو سکتے میں نے حفیظ صاحب سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہم نے ہتھ کر دیا اتنی کافی ہے۔ ہمیں احتیاط قسم کے سوالوں جوابوں میں نہ گھسیٹا جائے۔ آپ کو یاد نہیں۔ رات میں نے آپ سے ایک کاغذ پر سائن کروائے تھے جسے آپ نے پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کیونکہ آپ کا خیال ہے برا حال تھا؟"

"ہاں۔" نذیر خان نے سر ہلایا "آپ نے بھی اس پر دستخط کیے تھے۔"

"جی ہاں۔ وہ ہمارا ایک سیدھا سادا سا تحریری بیان تھا۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا یا جس حد تک بتا نہیں سکتا تھا وہ میں نے لکھ کر ان کے حوالے کر دیا تھا اور حفیظ صاحب سے کہہ دیا تھا کہ قانچوں میں جہاں جہاں بھی ضروری سمجھا جائے، بس اس کو آگے بڑھایا جائے۔" مجھے یا نذیر خان کو کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ حفیظ صاحب اب اپنی بات تو نہیں ٹال سکتے تھے۔ انہوں نے اسی وقت اس تحریر کی تائید پر اپنا توجہ لکھ دیا تھا۔

"شکر ہے خدا یا! نذیر خان نے اطمینان کی سانس لی۔ یہ آپ نے بڑا اچھا کام کیا۔"

میں نے فوراً رد کو دہانت کی کہ مجھے گھبرا کر وہ نذیر خان کو بھولنے نہ چلا جائے۔ فونی کی گاڑی میں میرے ہاں کھڑی تھی۔ وہ بھی وہیں اتر گیا۔ نذیر خان رخصت ہو چکا تو فونی میرے ساتھ ڈرائیو میں آئے ہوئے ہوا "میرا میں اس شخص کی موجودگی میں آپ کو ہاتھ نہ دے رہا تھا۔ آپ کی غیر موجودگی میں ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ کرشمہ رات مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی

تھی۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ میں تقریباً اغوا ہو گیا تھا۔"  
 "کیا کہہ رہے ہو بھئی؟" میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ میں اندر جاتے جاتے لان کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اسے ایک لان چیمبر پھینے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے مخصوص کھنڈر انداز میں "ڈیجیٹل ڈیوائس امریکی جیکٹ پہنے" دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ٹھونسنے بے پروائی سے چلا آ رہا تھا۔ بھورے بال حسب معمول پیشانی پر پکڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ کم از کم چہرے پر تو کوئی خواش و غمیر بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کیسا ہوا تھا؟" مجھے ٹھیک سے یاد نہ۔ "وہ چند چکا تو میں نے تشویش سے پوچھا۔  
 "پیشانی کی کوئی بات نہیں ہے سرا۔" وہ بے پروائی سے بولا "تھوڑی سی پیشانی اس بات کی ضرور ہے کہ میں ان میں سے کسی کو قابو میں نہیں کر سکا کہ کچھ معلومات ہو جائیں۔ اس پکڑ میں میرا پتہ صاف ہو جاتا، اس لئے میں نے معاملے کو زیادہ طول نہیں کھینچے دیا۔"

"یعنی تم نے ان کا پتہ صاف کر دیا؟" میں نے اب پُر سکون لمحے میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے لہری سے اغوا کر کے ٹھکر علی دھڑلے جا چکے تھے۔ نہروالی رگ پوسٹ۔" فونی بالکل دھجے اور سرسری سے لمحے میں بتائے جا رہا تھا۔ "پھر وہ درختوں کے عقب میں اندر ہرے میں گاڑی روک کر انتظار کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ اور لوگ پہنچنے ہی والے تھے۔ میں نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ لہری سے تو میں خودی سعادت مندی سے اغوا ہو کر ان کے ساتھ چل رہا تھا؟ لیکن جب میں نے انہیں اور لوگوں کا انتظار کرتے دیکھا تو انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں دونوں میرے ہاتھوں مارے گئے۔"

"تلاشیں؟" میں نے دریافت کیا۔  
 "نہیں میں پیچیدگی دی تھیں۔ کیس بہت دور جا کر دریافت ہوئی ہوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولا "مگر وہ تیزو نہر میں پیچھے کاڈ کر رہا ہو۔"

"اغوا کیسے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔  
 "بالکل سیدھے سادے اور پُر امن انداز میں" لہری میں کہا یوں کی ایک دکان سے۔ "اس نے ہڈے سے ایک پتہ بتا دیا تو مجھے ہوئے جواب دیا۔ پھر ذرا مٹھیلے سے مجھے میں بولا "آج کل مجھے تھوڑا سا سلاسلے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ رات کو لیت کر جب تک کوئی نہ کوئی چیز تھوڑی بہت چڑھ نالوں جب تک نیند نہیں آتی۔ میں لہری میں کہا یوں کی دکان پر انگریزی رسالے دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں ایسا ہی قلموں والے انداز میں اگر میرے دائرے میں آجائیں کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے ہاتھ بیکیوں کی جیبوں میں تھے اور وہ ریلوے لائنوں کی ٹائیس میری پیلیوں میں پھنسے گئے تھے۔ سرگرمی میں



بعد ششیں خاموش ہو گئیں۔ چونکہ دوسری طرف سے سلسلہ نہیں کیا گیا تھا اس لئے ششیں آن تھی اور فخر تھی کہ کوئی ریکارڈ نہ کیا جائے۔

فون کرنے والی نے پہلو بھی سرگوشی کے انداز میں کہا تھا اب تو وہ بالکل ہی خاموش تھی گویا تہذیب میں ہو کہ پیغام نہ کرائے یا نہیں۔ اس نے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ بس انداز اندازہ ہوا تھا کہ آواز نسوانی تھی لیکن میں اسے پہچان نہیں تھا۔ پھر اس سرگوشی نے آواز نے صرف اتنا کہا ”اٹنی۔۔۔“ میں نے اس کے بعد یوں لگا جیسے اس عورت کے ہاتھ سے ریسیور پھیر گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے سلسلہ منقطع ہو گیا اس لئے ششیں آف ہو گئی تھیں۔ میں نے نیپ کو برت آگے تک چلایا مگر اس پر کوئی آواز نہیں تھی۔

میں الجھن میں پڑ گیا۔ ستارہ اور طاہرہ خانم تو اپنا نام بتا کر کرچکی تھیں۔ تو پھر یہ چیٹی چیٹی سی نسوانی آواز کسی کی تھی اور کیوں ایک جملہ بھی مکمل نہیں کر سکتی تھی۔ آواز سے اندازہ مشکل نہیں تھا کہ وہ خوفزدہ تھی۔ کیا واقعی اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا گیا تھا یا یہ محض میرا وہم تھا؟

میں ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھا کہ میرے ذہن میں چھٹا کا سا ہوا۔ معلوم نہیں کیوں میرا ذہن فوراً ہی سامنے کی بات پر نہیں گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی انٹرکان نمبر ڈائل کیا اور آہر بڑے کا ”سوئٹ نمبر جن سوئٹرو۔۔۔ پر نس حینہ سے بات کر اؤ۔“

”سر۔۔۔! وہ تو جا چکی ہیں۔“ آہر بڑے نے مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں تیزی سے کہا اور غالباً کوئی دوسری کال انہیں کرنے لگا کہ میں نے تیزی سے کہا ”ہاں جن مت چھوڑا کر۔! صبح طر بات کا جواب دو۔ کب جا چکی ہیں؟ کہاں جا چکی ہیں؟“

آہر بڑے فوراً منسوب ہو گیا اور ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا ”سرا! تجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔ بس رات ان کی پر غار نمک کے بعد سے ان کا کوئی پتا نہیں۔ ان کے اسٹاف میں سے بھی کوئی موجود نہیں ہے۔ ان کا سوئٹ خالی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو جنرل نمبر صاحب سے بات کر لیں۔ شاید وہ آپ کو کچھ بتا سکیں۔“

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا۔ ”نہیں، رہنے دو۔“  
”سرا! آپ کا نام؟“ آہر بڑے نے گویا ڈسٹے ڈسٹے پوچھا لیکن میں نے جواب دے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا خورجانی ضروری تھا۔ میں باہر آکر گاڑی میں بیٹھا اور آدھی طوفان کی طرح ہوش کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوش کھینچ کر میں نے پہلے اوپر اُدھر معلومات کرنے کے بجائے سیدھا چاہی طرف پرس حینہ کے سوئٹ کا ہی رخ کیا۔ اب تو مجھے اس میں قطعاً کوئی شک رہا ہی نہیں تھا کہ میں نے اپنی ششیں

نہایت سرسری انداز میں انہوں نے مجھے باہر چل کر گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے سوچا چلو دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے میرا دیوہ اور دستوں وغیرہ بھی نکال لیا۔ وہ بھی مجھ سے سعادت مندی سے نکل گیا۔ لیکن غصے پر لے جا کر جب وہ اور لوگوں کا انتظار کرنے لگے تو پھر مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ تب ہی میرا ارادہ انہیں باہر آنے کا نہیں تھا لیکن صورت حال کچھ ایسی چلی کہ۔۔۔“ اس نے معذرت خواہانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں۔۔۔ جو اسو ٹھیک ہوا۔“ میں نے نیپ پر والی سے کہا۔ یہ بتاؤ کہ ان کے بارے میں کچھ اندازہ بھی ہوا؟“

”نہیں۔۔۔ وہ ہمارے کسی بد خواہ یا دشمن کے آدمی بھی ہو سکتے تھے اور کرائے کے قاتل یا بدہمت گرو بھی کسی ٹیگت سے بھی تعلق ہو سکتا تھا ان کا۔“ ششوں سے ویسے بولا تھا قسم کے بدہمت گرد ہی لگ رہے تھے۔ کسی جراثیم پیشہ کردہ کے رکھن۔ خاص ترانہ غراش کی کٹھنی داڑھیاں تھیں۔ مٹی دار مونچھیں۔۔۔ ذرا چڑھی چڑھی سی سرخ سرخ آنکھیں۔۔۔ بھاری جسم۔۔۔ چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمزوروں پر ظلم کرنے اور ان کے سامنے بد معاشی جمانے کے بہت زیادہ عادی ہیں۔ لیکن اندازہ بہر حال قوی یا فخر و ست پر شاہوں سے ذرا اونچا تھا۔“

فونی نے خاصی کاسہانی سے ان کی شخصیت کا نقشہ کھینچ دیا لیکن میں انہیں کسی ٹائپ میں فٹ نہیں کر سکا۔ اس لئے سرودست میں نے اس الجھن کو ذہن سے جھٹک دیا۔

کچھ دیر بعد فونی رخصت ہو گیا اور میں اندر آیا۔ شاور لینے کے بعد میں کچھ دیر کے لئے سو گیا۔ شام کو اٹھا تو میں نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ اب میں ٹلی فون کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے دو نمبر ایسے تھے جن پر فون ملا زمین ریسیو کرتے تھے اور میری عدم موجودگی میں ایک مخصوص پیشہ پیغامات نوٹ کر کے رکھ دیتے تھے۔ لیکن میرا ایک ڈائریکٹ نمبر جو خاص خاص جاننے والوں ہی کے پاس تھا۔ اس کے ساتھ ریکارڈنگ سسٹم منسلک تھا جو میری غیر موجودگی میں کام آتا تھا۔ یہ انسرنگ مشین Answering Machine کا کام بھی دیتا تھا اور اگر فون کرنے والا کوئی پیغام چھوڑتا چاہتا تو وہ بھی ریکارڈ کر لیتا تھا۔

میں نے اس مشین کے سوچے آن کے تو پتا چلا کہ میری غیر موجودگی میں ستارہ اور طاہرہ خانم نے ایک ایک مرتبہ فون کیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں دو دن کے لئے شہر سے باہر گیا ہوں کوئی پیغام چھوڑے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

تیسرا فون کسی اور کا تھا۔ اسے جب یہ ریکارڈ شدہ آواز سنائی دی۔ ”مسٹر افضل چوہدری دو دن کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ براہ کرم اپنا نام بتا دیجئے اور اگر کوئی پیغام دنا چاہیں تو ریکارڈ کر دیجئے۔“ یہی منہموم انگریزی میں ڈیڑھ لیا گیا اور اس کے

دیکھا شدہ جو سرگوشی نما آواز سنیں تھی وہ اپنی عرف پر نس تیرید  
لے سوا کسی کی نہیں تھی۔

تیسری منزل کی اس مخصوص راہداری میں آج دریائی اور  
لوت نے میرا استقبال کیا۔ آج وہاں کوئی مسلح گارڈ نہیں تھا، کوئی  
شنگ گارڈ لینے والا نہیں تھا۔ میں نے سوئٹ کے دروازے کی  
جھانک کر دیکھا۔ دروازہ بھی منقش نہیں تھا۔ دروازے کے اوٹوں میں جو  
رے وغیرہ خالی ہو جاتے ہیں ان کے دروازے منقش ہوتے

میں نے اندر جھانکا۔ ہر چیز صاف ستھری، اسی طرح قرینے  
پینے سے رکھی ہوئی تھی جس طرح اونچے ہوٹلوں کے ان خالی  
روم میں ہوتی ہے جو مسافروں کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں۔ میں  
انگ روم سے گزر کر بیڈ روم میں جا پہنچا۔ وہاں بھی صاف  
نئی، دریائی گویا میرا منہ آواز دہی تھی۔ صرف ہٹی کے میک  
پ کے سامان اور خوشبوئیات کی پٹی کچی میک کمرے میں رہتی  
تھی اور اسے بھی صرف میں ہی پہچان سکتا تھا۔ اس کے سوا  
بہی ایسی خفائی نہیں تھی جس سے ظاہر ہو سکتا کہ وہ بھی اس  
رے میں آئی بھی تھی۔

گو مجھے امید نہیں تھی کہ وہاں میرے لئے کوئی سراغ، کوئی  
نام، کوئی اشارہ موجود ہو گا۔ اس کے باوجود میں نے جاسوسوں کی  
راخ خود بخود انداز میں دونوں کمروں کو گھٹانا شروع کیا۔ میں نے  
کی چادر، کبل، میزٹیں اور کتنے اٹار کر، جھاڑ کر دیکھے۔  
میں کے علاوہ میں ہاتھ ڈال ڈال کر دیکھا۔ کرنے کمرے میں  
انکا ڈورا رنگ روم کے صوفوں کے گوشے کھٹکے۔ ہاتھ روم کی ہر  
رکام صاف کیا۔ ٹشو پیپر کا دیل تک کھول کر دیکھا کہ کہیں اس پر  
رے لئے کچھ لکھا ہوا تو نہیں۔ حتیٰ کہ میں نے دیو اموں کا بھی  
میں طرح جائزہ لیا کہ شاید کہیں لپ اسٹک، آئی ہوڈیشنل یا عام  
ٹیشل سے ایک آدھ لفظ ہی لکھا ہو۔ لائنوں کے شیڈز تک میں  
انکا۔ مگر کہیں پیغام تو کیا، ایک ٹیکر تک موجود نہیں تھی۔ اگر اس  
نت ہوئی کا کوئی ملازم مجھے اس مصروفیت میں متنبہ دیکھ لیتا تو  
ن کا نہ جانے کیا رد عمل ہوتا! میں نے چند لمحوں پہلے نظر آنے والی  
تیب و صفائی اور قرینے کا جس طرح بیزار غریق کیا تھا اس پر یقیناً  
مروں کے دروچار بھی مدد دے ہوں گے۔

فکروں اور جاسوسی کمائیوں میں عام طور پر اتنی تلاش کے بعد  
سوس کے ہاتھ کوئی نہ کوئی سراغ آتی جاتا ہے لیکن میرے ہاتھ  
دلی سراغ نہ آیا۔ ابوس ہو کر میں باہر نکلیا۔ برابر کا کمرہ پر نس  
بند کے اسٹاف کے لئے تھا۔ اس کا دروازہ بھی غیر منقش تھا۔ اس  
بھی دہی عالم تھا۔ اس کی بھی میں نے تلاشی لی لیکن اب جوش و  
روش کچھ کم ہو چکا تھا۔

وہاں سے بھی جب ایوی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو میں نے  
اچانک منزل غیر سے مل لی لیتا چاہئے۔ شاید اس سے کوئی کام کی

# اے حمید کے ایڈوینچر س قلم سے

عاطون

انسانی تاریخ کا ایک انوکھا سفر نامہ

چار جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

150/-

125/-

125/-

200/-

اہرام مصر سے فرا

اندلس کی آخری فتح

ہرپہ کی ناگن

عاطون موت کے دروازے پر

مکتبہ القریش

اردو بازار - لاہور 2



بات معلوم ہو سکے اس کا نام مانگیل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جرم اور خوش اطوار مقامی کرپشن تھا۔ مجھے اچھی طرح جانا تھا۔ خصوصاً اس وقت سے تو بہت سی احکام کرنے لگا تھا جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ کراچی میں میرا اپنا ہوٹل مکمل ہو چکا تھا۔ ایک بار تو ہنسنے ہوئے کہہ چکا تھا۔ ”آپ سے تو غرض کے تحت بھی ششماہی رکھنی چاہئے مسٹر جی جی تاکہ اگر کبھی یہاں سے نوکری چھوٹی پڑے تو درخواست لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں۔“

اس پر میں نے سنجیدگی سے کہا تھا ”آپ کو درخواست لے کر کیس جانے کی ضرورت نہیں ہے مشرمانگیل! آپ ہوٹل میجمنٹ میں جس مقام پر ہیں وہاں اس کی ضرورت نہیں رہ جائی۔ اگر خداخواستہ کبھی آپ کو یہ آفس چھوڑ کر کلکتہ میں یا تو میرے آدی آپ کو لینے کے لئے دو روزے پر کھڑے ہوں گے۔“

یہ سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا لیکن آج میں اس کے آفس میں داخل ہوا تو وہ مجھے خیمہ الخواص سا نظر آیا۔ تمام مجھے دیکھ کر وہ حتی الامکان خوش غلی سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسٹاف کے کچھ آدی کرے میں موجود تھے۔

”سرا میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ کرسی پیش کرنے کے بعد اس نے مضطرب انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا ”آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے کیس بلایا ہوا۔“

”میں ایسی زحمت کرنے کا عادی ہوں۔“ میں نے بیٹھے ہوئے کہا ”تم ان لوگوں سے بات چیت ختم کرلو۔ میں تنہائی میں بات کروں گا۔“

اس نے جلدی ان لوگوں کو خارج کر دیا۔ موضوع گفتگو سی پرنس خیمہ کی پراسرار کشیدگی تھی۔ اخبارات میں اشتہار دینے اور ہوٹل کی لالی میں نوٹس چسپاں کرنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ پرنس خیمہ کے شوکی ایڈوائس بنگک منسوخ کی جا رہی ہے۔ جو لوگ ٹکٹ کی رقم واپس لینا چاہیں وہ ہوٹل سے لے لیں۔ جو لوگ ٹکٹ استعمال کرنا چاہیں وہ متبادل شو میں استعمال کر سکتے ہیں جو آج ہی سے پرنس کے شو کی جگہ شروع ہو رہا تھا۔ انہوں نے بگای طور پر ایک مقامی ڈانس ٹرف کے شو کا انتظام کیا تھا اور بتاتے یہ کیا تھا کہ پرنس خیمہ سازشی طبع کی بنا پر اپنے ملک واپس جا رہی ہیں۔

وہ لوگ چاہتے تو مانگیل خلاف حالت مضطرب انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوا۔ ”سرا! آپ کیا نہیں گے؟“

”رسی چکوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں مانگیل! میں بھی پرنس خیمہ ہی کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔ کہاں غائب ہو گئی ہے وہ؟“ میں نے سرری سے لہجے میں پوچھا۔

”مائی گاڈ!“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے رہ گیا۔ ”سرا! آپ کیسی؟“

خیمہ عالم جیٹس کے دربار میں جب دوسرے سازشیا ساتھ ساتھ اس کے سہیلے بیٹے ہونٹس نے بھی تلوار نکال کر کے چلو میں گھونپ دی تھی اور اس نے جب یہ تاریکی پر تھا۔ ”ہونٹس! اپنی...؟“ تو اس کے لہجے میں بھی شاید وہ نہیں نہ رہا ہو جو اس وقت مانگیل کے لہجے میں تھا۔

”گھبراؤ نہیں مانگیل! میں اس کا عاشق یا پروانہ نہیں ہوں کسی اور وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے جلدی سے اسے دلی۔

”نہیں سرا یہ بات نہیں ہے۔“ وہ گڑبڑا کر بولا ”میرا معلوم ہے“ آپ جیسا نہیں آوی ایسی چلتی پھرتی عورتوں کا پروانہ نہیں ہو سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ کیس آپ نے اپنے کے لئے اس سے کوئی کنٹریکٹ وغیرہ۔ یا کوئی بات چیت کر لی تھی؟“

”نہیں“ ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ”میں نے جواب دیا۔ ”میرے ہوٹل میں ابھی ایسی خرافات شروع نہیں ہوئیں۔“

”اوم...“ اسے اپنے ہوٹل کی اس فخریہ پیشکش کے خرافات کا لفظ سن کر تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی لیکن وہ ہی لہجے اس نے غالباً اس احساس کے تحت سکون کی سانس پر نرس خیمہ سے میرا کوئی جذباتی یا کا دیاری پکڑ نہیں تھا تو اس کے بارے میں پوچھنا ہوا آیا کیوں تھا؟

وہ ایک سرگت سلگنے کے بعد بولا ”اس خبیث عورت پکڑیں تو میں صبح سے پریشان ہوں۔“

”ہی کے لئے خبیث؟“ سن کر اب مجھے ذرا تکلیف پہنچی لیکن میں اس کا اظہار نہیں کیا۔

”اصل معاملہ تو مانگیل کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ ایک کش لے کر بولا ”میں تو اس وقت کو کس رہا جب اس کی آمد کی خبریں کس اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ یہ کے بیک گراؤڈ سے واقف تھا۔ ہوٹل آج کل خطرہ اجاڑا سامنے ہی وہ سرائیو اشار ہوٹل بن گیا ہے تاکہ میں نے پرنس کے شو سے ہوٹل کو سنبھالا مل جائے گا۔ اچھی گا دوسرے ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس ہوٹل والوں نے اس کے ساتھ شو کا کوئی پروگرام نہیں بنایا اور میں گلا حادوڑا دے گیا۔“

”اس کا مطلب ہے تم نے ان سے رابطہ قائم نہیں کیا؟“ نے ان لوگوں کو باہر سے نہیں بلوایا تھا؟“ میں نے تھوڑی چال ”نہیں سرا مجھے تو چاہا تھا کہ وہ یورپ اور امریکا کے سے واپس ترکی جاتے وقت پاکستان اور بھارت سے ہوئی جائے گی لیکن ان دونوں ملکوں میں ڈانس کا کوئی پروگرام کرے گی کیونکہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے“ صرف سیر تفریح کے ان دونوں ملکوں سے گزر رہی ہے۔ لیکن میں نے سوچا ”چلو کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ غالباً تو وہ بہت ہی آسنا

”کیا کسی بہت بڑے آدمی کا فون تھا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بڑا ہی سمجھ لیجئے سہرا!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”مہاری سوسائٹی میں جو بھی لوگوں کو مہوانے، بجلیے، ان کا مشنٹر کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ کہیں دور بیٹھا میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔

اس نے کوئی نا تو بات نہیں کی۔ بس میرا نام جانتے ہی بولا ”پرنس خیمینہ کی گمشدگی کو اسکیٹلینڈ بنانے کی کوشش مت کرنا۔ بھول جاؤ کہ وہ بھی خیمین ملی تھی یا تمہارے بھول میں اس نے کوئی پروگرام پیش کیا تھا۔ اس نے تم سے کوئی ایڈوانس نہیں لیا تھا۔ تمہارا کوئی مالی نقصان نہیں ہوا۔ اس لئے شور مچانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے اور اسے معمولی واقعے ہی کی طرح لینا۔ کوئی بھی مذہب باندھنا نہ کر کے کوئی متقابل انتقام کرنا۔ زیادہ چوچھ کھولنے کی ضرورت نہیں۔ جی ہاں چوہدری صاحب! بالکل یہی الفاظ تھے اس کے۔“

”تم نے کیا کہا؟“

”یہ باتیں میں نے کسی کو بھی نہیں بتائی ہیں۔ یہ صرف میرے اور آپ کے درمیان رہتی چاہئیں سہرا“ وہ لچاہٹ سے بولا ”یہ کوئی پراسرار اور خطرناک معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ میری کسی دانست یا نادانست غلطی سے میری جان خطرے میں پڑ سکتی ہے“ وہ بے جا وہ ڈیلا پٹلا مذہب اور شائستہ آدمی تھا۔ کافی خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

”انتہا ڈرنے کی ضرورت نہیں مانگیل! بھولنے کے پرنس میں ہر طرح کے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے۔ فون پر دھمکیاں بھی ملتی رہتی ہیں۔ اتنی لمبی سروس کے بعد خیمین تو اس طرح کی باتوں کا عادی ہو جاتا چاہئے“ میں نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”جو کہ کھوکھلی دھمکیاں ہوتی ہیں“ ان کا مجھے اندازہ ہو جاتا ہے سہرا! اس شخص کا تو لہجہ ہی رکوں میں خون ٹھنڈا کر دینے والا تھا“ وہ جھرمجھری سی لے کر بولا ”مجھے میں نے آپ کو پوری بات تو بتائی ہی نہیں۔ میں نے اپنے تمام تر خوف کے باوجود بہت کر کے کہا کہ میں اس طرح گمنام لوگوں کی ہدایات کی پابندی نہیں کیا کرتا۔ اس پر وہ کسی بددعائی کی طرح جھانپناٹ کی پستکار سے مشابہ تھی اس کی ہنسی۔ وہ جیسے صرف فون پر مجھ سے بات ہی نہیں کر رہا تھا“ مجھے دیکھ بھی رہا تھا۔ کہنے لگا ”تم نے ابھی باپنی پی کر میز پر جو گلاس رکھا ہے“ ذرا اس کی طرف دیکھو میں نے گلاس کی طرف دیکھا اور دور سے ہی لکھے وہ کمرہ کی کچی ہو کر کھڑ گیا۔ میرے ہاتھ سے ریسیور پھوٹ گیا تھا۔“

”سائیلنسنگ ریڈائل یا ریڈیو کی گولی ہوگی؟“ میں نے سر سرے سے لہجے میں کہا۔

”ریڈیو اور استعمال کیا گیا تھا سہرا! اس گولی سے گولی چلائی جی

مان جی اور اس نے کچھ زیادہ لہجے چڑے مٹالے بھی نہیں کئے۔“

”وہ غائب کب سے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سرادات تو اس نے پروگرام پیش کیا ہے۔“ وہ کراہ کر بولا

”اب آج صبح معمولی دن چڑھے میڈان کے سوئٹ میں گئی تو وہ اس طرح خالی پڑے تھے جیسے وہاں کئی دن سے کوئی داخل نہیں ہوا۔ کسی نے بھی پرنس یا اس کے اسٹاف کے کسی آدمی کو باہر جانے نہیں دیکھا۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس وقت اور کس طرح غائب ہوئے ہیں۔ اس طرح کسی کی نظر میں آئے بغیر تو وہ دیواریں بھانڈ کر ہی باہر جاسکتے تھے۔“ مانگیل پر ابھی تک بے یقینی طاری تھی۔

”گولی بعید نہیں کر انہوں نے ایسا ہی کیا ہو۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”نہیں سہرا!“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”وہ کوئی کھلے قسم کے مسافرو نہیں تھے جو شرار آٹا پھر مل کی حسرت نکالنے کے لئے کسی اونچے ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں اور موقع مناسب دیکھ کر ابھر آکر اس سے کور بھانڈ کر بھاگ جاتے ہیں۔“

”سکرٹ کا ایک شخص لے کر وہ بولا“ بات میری کھوپڑی میں بیچہ نہیں رہی ہے سہرا! اس قبیل کے لوگ اس طرح کی حرکتیں نہیں کیا کرتے۔ بچکے سے غائب ہونا تو دور کی بات“ وہ تو عام طور پر کنٹرول کی خلاف ورزی بھی نہیں کرتے۔ انتہائی ناگزیر حالات میں کوئی اونچے بچھ ہوتی ہے۔ پرنس خیمینہ کا ایک نام ہے۔ ایک ریپویشن ہے۔“

”دیئے تم نے اتنی جلدی کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ غائب ہو گئی ہے اور واپس نہیں آئے گی؟“ میں نے کہا ”میں ممکن ہے“ جس طرح اچانک وہ غائب ہوئی ہے اسی طرح اچانک میں شکر کے وقت یا اس سے ذرا پہلے کہیں سے نمودار ہو جائے“ واپس آجائے۔“ میں دراصل مانگیل کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے لئے امید کی یہ کرن تخلیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ایسا نہیں ہو گا سہرا!“ وہ ابھی سے سر ہلا کر بولا۔

”آخر کیوں؟“ میں نے اسے کڑوا۔

”اس لئے کہ جب میں نہایت غصے کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ مجھے پرنس کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہئے“ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے“ مجھے دھوکا دیا ہے“ مجھے پوئیس میں لپٹ بھی دینا کرانی چاہئے“ میں اسی وقت ایک ٹیلیفون آیا اور میرا سادہ افسر بھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔“

لے کر کہا۔

”میں سرا مجھے اپنی اس ملائقی کا اعتراف ہے“ وہ بیٹے پر ہاتھ رکھ کر لڑا ”لیکن اب تو آپ بتا دیجئے کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ غائب ہو چکی ہے؟“

”میں نے فون کیا تھا۔ آپ بیٹے بتایا کہ اب تو اس سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ جا چکی ہے۔ میں دیکھنے آیا تھا کہ کیا چکر ہے۔ رہی یہ بات۔۔۔ کہ میرا مسئلہ کیا ہے؟ تو صحیح طرح مجھے بھی نہیں معلوم“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے ابھمن میں چھوڑ کر میں اس کے آفس سے نکل آیا۔

یکدم ہی مجھ پر احساسِ زناں نے غلبہ پایا تھا۔ میں ایک بار پھر وہیں کھڑا تھا جہاں عرصہ پہلے تھا۔ اپنی عرف پر نس تینہ کے سارے مجھے ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں کچھ آگے بڑھنے کی امید ہوئی تھی لیکن میں نے اپنی حماقت سے اسے کھو دیا تھا۔ میں اس کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بے پروا ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ فرض کر لیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جائے گی کی ریڈ ڈاٹ والے اس مرے کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹائیں گے۔ لیکن یہ سمجھا میری غلطی تھی۔ مجھے کم از کم اس کی نگرانی کے لئے کسی کو ضرور تعینات رکھنا چاہئے تھا۔ اس کی نگرانی کرنے والے میرے دو آدمی اغوا ہوئے تھے تاہم انہیں چھڑا لیا گیا تھا لیکن اس کے بعد میں نے اس سلسلے کو بے فائدہ سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ لیکن اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ مجھے اس سے ستر کوئی بندوبست کرنا چاہئے تھا۔

اب اپنی اس کوتاہی پر بچھٹانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حالات اور شواہد سے میں جو اندازہ لگا سکتا تھا وہ کچھ بھی تھے کہ کراچی میں فخر صاحب کے قتل کی سازش ناکام ہوئے ہی غالباً ریڈ ڈاٹ والوں کا شبہ اپنی ہی پر گیا تھا کہ اس سلسلے میں معلومات اسی کے ذریعے لیک ہوئی ہیں اور انہوں نے لاہور میں فوراً اسے اس کی جگہ سے ہٹایا تھا۔ میرے لئے اب یہ کوئی حیرت کی بات نہیں رہی تھی کہ ان لوگوں کا جال کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کے رابطے کتنے حیران و متحیر تھے اور وہ لوگ چشمِ زدن میں کیسے کیسے انتظامات کر سکتے تھے۔ اب مجھے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ اگر انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ اپنی کی برین داؤد کھلے طور پر کامیاب نہیں رہی تھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بچان لیا تھا۔ نیز یہ کہ فخر صاحب کے بارے میں ان کی سازش کی جھلک کسی طرح اپنی کو بڑھتی تھی اور اس نے مجھے خبردار کیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

وہ اپنی ہر ہولناک تشدد بھی کر سکتے تھے۔ اس معاملے میں وہ پولیس سے بھی آگے تھے۔ انسان پر عقوبتِ خاتون میں تشدد کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ قدیم بادشاہوں اور سرکاری اہل کاروں کے زمانے سے لے کر آج کے تقشفی سیلون وغیرہ کے نام پر قائم کئے گئے تارچہ کیسوں اور مافیا کے متعلق خاتون والے زمانے تک بعض

تھی۔۔۔ اس نے دائیں طرف اشارہ کیا ”اور کوئی میز کی سطح کو چھوئے بغیر اور دوار پر ٹکڑی کے پیش میں بیوست ہو گئی تھی۔۔۔“ اس نے بائیں طرف اشارہ کیا ”وہاں میں نے اسٹیکر چسپاں کر دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسٹیکر ہٹا کر ٹکڑی میں دھنسی ہوئی کوئی کامیاب کر سکتے ہیں۔“

”اس کی اب نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا ”اسے نشانی کے طور پر دیں دھنسی رہے۔۔۔ اس قسم کی شعبہ بازاں کچھ مشکل نہیں ہوتیں۔ ایک شخص کوڑھی پر موجود ہو گا۔ دو سرائے سے فون پر بات کر رہا ہو گا اور ان دونوں کا آپس میں بھی رابطہ ہو گا کیوں کہ اس کوڑھی کے سامنے کوئی کمرہ نہیں ہے جہاں سے کوئی بیک وقت تم سے فون پر بات بھی کر سکے اور تم پر نظر رکھتے ہوئے ناز بھی کر سکے۔“

”جی ہاں سرائے تو میں بھی سمجھ گیا تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تھے اور میں نے اٹھ کر کوڑھی وغیرہ کا جائزہ لیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ریڈیو دوبارہ کان سے لگایا تو وہ شخص بولا ”کوئی نکاس کے بجائے تمہاری کھوپڑی میں بھی از سکتی تھی۔ ذرا سا رخ بدلنے ہی کی بات تھی۔ لیکن ہم کیزے کوڑوں کا شکار کرنے کے قائل نہیں۔ جب تک وہ ہمارے بیروں سے کابلے نہ لگیں“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اور اس کے بعد سے میں نے اس کی ہدایات پر دل و جان سے عمل کیا ہے کیوں کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا۔“

اس نے سگریٹ ایٹش ٹرے میں مسل دی اور ٹائی کی ٹائٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولا ”میری تو اس تصور سے روحِ نقا ہو رہی ہے کہ آج رات جب شو پر نس تینہ کے بجائے نفہ سلطانہ خوش کرے گی اور کل اخباروں میں اشتہارات آئیں گے کہ پر نس کا اب کوئی شو ہو گا یا نہیں۔ تو کیسا طوفان مچے گا۔ بڑی بڑی ایڈوائس بلنگ تھی پر نس کے شو کی۔ لوگ اگر صرف اپنے پیسے واپس لے کر مطمئن ہو گئے تو ان کی بڑی مرہانی ہوگی۔ انہیں جو کوفت ہوگی، کہیں اس کا غصہ نہ وہ ہم پر نکالتے لگیں۔“

”نہیں۔ تمہارا واسطہ کریاں توڑنے والے طبقے سے نہیں ہے“ میں نے اسے قتل دی۔

وہ دوسری سگریٹ نکالتے ہوئے بولا ”میں نے نفہ سلطانہ کی منتِ حاجت کی ہے کہ وہ خوب محنت کرے اور پر نس تینہ کی متبادل ثابت ہونے کی پوری پوری کوشش کرے لیکن نفہ سلطانہ کے ہاں صرف جسم کی نمائش ہے۔ اس کے پاس وہ خوب صورتی وہ آہٹ اور وہ ”پنج آف کلاس“ نہیں ہے۔ بہر حال بے چاری محنت بہت کر رہی ہے۔ دوسرے اپنے ڈانس کے استاد کے پاس ریسرسل میں لگی ہوئی ہے۔“

”نقد مختصر ہے تم نے پر نس تینہ کو کھو دیا اور تم سے اس کا سراغ ملنے کی کوئی امید نہیں رہی جاسکتی“ میں نے لٹھڑی سانس

نے تو شاید "لمسرح" ہی اس موضوع پر کی ہے کہ انسان کو  
 وہ زیادہ اذیت پہنچانے کے کون کون سے نئے اور ناقابل  
 طریقے ایجاد کئے جاسکتے ہیں۔ دوسری طرف اسی دنیا میں وہ  
 ان بھی موجود ہیں جو راستے میں کوئی زخمی یا بیمار ملی پڑی دیکھ کر  
 پہنچتے ہیں اسے اٹھا کر گھر لے آتے ہیں "اپنے انھوں سے  
 کا جسم صاف کرتے ہیں" اسے دوا لگاتے ہیں "اس کی بیمار داری  
 دے ہیں۔ یہ دنیا اور انسانی زندگی شاید انہی تضادات سے  
 رت رہی ہے اور پیشہ رہے گی۔

قدر کے حوالے سے میں ریڈ فاٹ والوں کی بھیجی ہوئی ایک  
 ناکٹ دیکھ چکا تھا جس نے مجھ جیسے اتنی اعصاب کے مالک کو  
 بلا کر دکھ دیا تھا۔ مجھے وہ کہہ کر یہی خیال ستائے جا رہا تھا کہ اگر  
 کو میری دوستی کی اتنی بھاری قیمت پکا کر دیتی تو یہ بات زندگی بھر  
 کے لیے میرے ضمیر پر ایک بوجھ بن جاتے گی۔ میری عدم موجودگی  
 اس نے مجھے فون کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا مطلب تو یہی  
 کہ اسے خطرے کا احساس ہو چکا تھا ورنہ شاید وہ اس کی جرأت  
 لیں۔ اس کا ٹیلی فون ٹیپ ہوتا تھا۔ اس کی ہر لمحے کی گفتگو اس  
 لاگت میں پڑے ہوئے ٹرانسلیٹر کے ذریعے کہیں سنی جاتی تھی۔  
 اب اسی پر بس نہیں تھی "دن رات کے پچھترے میں کمال نے  
 اور مٹھو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے۔

میں قدرے افسردہ اور دل گرفتہ سا گھر واپس آیا۔ میرا کہیں  
 نے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب میں بیستر پر غم راز تھا  
 رہے ڈائریکٹ نمبر والے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بے دلی سے  
 بچر اٹھایا لیکن دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سن کر  
 بازرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ ایڈم عرف ایڈی تھا۔  
 "ہمت پریشان ہو رہی کے لئے؟" وہ اپنے مخصوص چلنے سے  
 بچ رہا ہوا۔

میں سمجھ گیا کہ اسے میرے اکثر کان جانے اور اپنی کے سوٹ  
 نا ملاشی لینے کی اطلاع مل چکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ  
 "کون سی بھی آٹھ جی جو میری عمرانی کرتی تھی اور میری ہل ہل کی  
 ٹک و حرکت کی خبر ان لوگوں کو پہنچاتی تھی۔ عموماً میں اس بات کا  
 ست خیال رکھتا تھا کہ میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ اکثر مجھے اس کا  
 دباپ لگتی میں ہی ملتا تھا۔ اس کے باوجود ایڈم عرف ایڈی جب بھی  
 مجھے فون کرتا تھا وہ میری تازہ ترین سرگرمی سے باخبر ہوا تھا۔

"ہاں۔ پہلے تو صرف ہمت کے لئے ہی پریشان تھا اب پرس  
 نمینہ کے لئے بھی پریشان ہوں" میں نے کہا "اسے بھی تم لوگوں  
 نے غائب کر دیا۔ کیا جس میں اس بھری پڑی دنیا میں اور لڑکیاں نظر  
 نہیں آتیں؟ جس لڑکی سے مجھ غریب کی دوستی ہوتی ہے اسے ہی  
 غائب کرتے ہو" میں اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں  
 اس حقیقت سے لاعلم ہوں کہ اپنی اور پرس نمینہ ایک ہی  
 شخصیت کے دو نام ہیں۔ لیکن میری یہ کوشش قطعی ناکام رہی۔

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولا "ایک ہی لڑکی کے لئے  
 دو دو مرتبہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان کو اتنا فضول  
 خرچ بھی نہیں ہونا چاہئے۔ تھوڑی بہت پریشانی دوسرے موقعوں  
 کے لئے بھی بچا کر رکھنی چاہئے۔ تم جیسے سرکش انسان کو تو ابھی نہ  
 جانے کس کس موقع پر پریشان ہونے کی ضرورت پیش آسکتی ہے"  
 میں نے گویا اس کی باتی بکواس پر توجہ دے بغیر کہا "یہ تم ایک  
 ہی لڑکی والی بات کر رہے ہو؟ میں سمجھ نہیں سکا۔"

"افضل چوہدری! اب تم ذہنی جسمانی اور باطنی طور پر کافی  
 بڑے ہو چکے ہو" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "یہ نئے نئے تپوں والی  
 اور کاری اور صدا کاری کرتے ہوئے تم اچھے نہیں نکلتے اس  
 حقیقت سے انجان بننے کا اب کوئی فائدہ نہیں کہ اپنی اور پرس  
 نمینہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس  
 حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہو۔"

"یہ تو میں اب شمار ہی نہ پاتی ہی سن رہا ہوں اور بلاشبہ سخت  
 حیرت زدہ ہوں۔" میں نے حیرت کی اور کاری یا صدا کاری جاری  
 رکھی۔

وہ اب میرے الفاظ پر توجہ دے بغیر بولا "آپ پر ہماری منت  
 خالص تھی۔ اس کی برین واشنگ میں خالی رہ گئی۔ اس نے اپنی  
 اصلیت کو یاد رکھا۔ نہ صرف یاد رکھا بلکہ جس میں بھی یہ بات عادی  
 اور تم سے مل بھی گئی۔ درحقیقت وہ ذہنی اور اعصابی طور پر بہت سی  
 مضبوط لڑکی ہے۔ وہ ہماری جدید ترین ٹیکنک اور جادو اور شو دلوں کو  
 بھی شکست دے گئی اس نے اپنے ذہن کا کوئی کوتاہانہ کے اثرات  
 سے بچایا اور بعد میں اس کے سارے اس کی یادداشت لوٹ  
 آئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کنوئیں میں ڈوبتا ہوا انسان صرف ایک  
 دھبے کے سارے باہر آجاتا ہے۔ انسانی ذہن بھی ایک عجیب ظلم  
 خانہ ہے۔۔۔۔۔"

"تم مجھے انسانی ذہن کی پڑ اسرار و حیدگیوں کے بارے میں  
 جاننے کے بجائے یہ بتاؤ کیا ذہنی یا فنی اور پرس نمینہ والی بات  
 درست ہے؟ یقین کرو مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی اور نہ ہی اس  
 نے مجھے بتائی تھی۔ بلکہ اس نے تو پرس نمینہ کے طور پر ہی مجھے  
 بالکل اسی طرح گھبرنے کی کوشش بھی کی تھی جس طرح اس قبیل  
 کی عورتیں سوئی اسامیں کو گھبراتی ہیں۔"

"فضول بائیس مت کرو افضل چوہدری؟" ایڈم بہ مزگی سے بولا۔  
 "اب جب کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو تم کیوں خدی پتھوں  
 کی طرح ایک بات کی تکرار کے جارہے ہو۔"

"کس نے بتایا کہ میں سب کچھ؟" میں نے پوچھا۔  
 "خود ہی نے" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ایک لمحے  
 کے لئے میری شئی کم ہو گئی۔

"جب کیوں ہو گئے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں ہلکا سا  
 قدم ہٹایا شاید جس میں ہمت سے یہ امید نہیں تھی۔

”کیا تمہیں اپنی ستارہ کی اور ہنسی کی جانیں عزیز نہیں ہیں؟“ اس نے نہایت شفقانہ لہجے میں سوال کیا۔

”تم نے میرے بارے میں اتنے بہت سے اندازے قائم کئے ہیں۔ کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ میں بیک میل ہونے والا آدمی نہیں ہوں؟“ میں نے ٹرسکون لہجے میں کہا۔

”درست ہے۔ لیکن عقل سے کام لینے والے آدمی تو ہو“ وہ ہرلا اپنی اور اپنی حسین دوستی کی جانیں شخص ضائع ہی کر دے گا۔ تمہاری اس فریالی سے بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں ہمارے بارے میں معلوم ہی کیا ہے جو کسی کو بتاؤ گے۔ جنہیں معلوم تھا، ہمیں تو وہ بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔

”حکومت اب بھی تمہاری راہ پر تو کھکتی ہے“ میں نے کہا۔ ”اکرام بیک کو خفیہ ایجنٹوں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ جس طرح تمہیں دعویٰ ہے کہ کسی سے بات انگوٹے میں تم لوگ بہت باہر ہو اسی طرح ان لوگوں کی کارکردگی بھی بے مثال ہے۔ وہ تو ایسے جراثیم کا اعتراف بھی کرا لیتے ہیں جو لوگوں نے کئے نہیں ہوئے۔ اکرام بیک سے تحقیق پوری ہوگی۔ وہ سب کچھ بتا دے گا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”بے چارہ اکرام بیک! وہ کیا بتائے گا۔ اسے تو خود کچھ معلوم نہیں۔ تم شاید اسے خفیہ ایجنٹوں کے مہرہ کے بڑی خوشی اور اطمینان محسوس کر رہے ہو گے کہ تم نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اگر اسے کچھ معلوم ہوتا تو کیا ہم اسے اتنی آسانی سے ہاتھ سے جانے دیتے؟ اس سے زیادہ تو اسے معلوم تھا جنہوں نے موقع پر ہی خود کشی کر لی۔“

مجھے اپنے ہونٹوں میں دھڑکی جگہ لینے والا وہ نوجوان اور سوچ رو م میں گھنے والے دو آدمی یاد آئے جن کے جسم چند لمحوں میں خشک مٹی کی طرح جھج گئے تھے اور دراڑوں سے گوشت کراہیت انگیز انداز میں جھانک رہا تھا۔ گوشت کی رگت بھی بدل گئی تھی۔ ”تم نے حقیقہ صاحب کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کیوں کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ادھر سے حکم ملا تھا“ اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”تمہارا مطلب ہے تمہارے“ ادھر والے دماغ“ نے حکم دیا تھا؟“ میں نے گڑبھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں“ وہ جلدی سے بولا ”میں اور مجھ سے ادھر والا دماغ۔۔۔ دونوں بہت ہی معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ ہم تو چھوٹے موٹے معاملات نہناتے ہیں۔ حقیقہ صاحب کا پتہ صاف کرنے کا حکم تو بہت ادھر سے آیا تھا۔“

”ان کا پتہ صاف کرنے سے تم لوگوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اب اتنے بڑے بڑے سوالات مت کرو جن کے جواب خود مجھے نہیں معلوم“ وہ نیم بیزار سی بولا ”تمہیں بتانا پڑا جاتا ہے

وہ کیا کم ہے؟ تم کوئی کام کی بات کرتے نہیں ہو۔ بس سوال پر سر کرتے رہتے ہو۔“

”مجھے دراصل اپنی جہل مانج بڑھانے کا بڑا شوق ہے۔ وہ تمہارے نزدیک کام کی بات کیا ہے؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔ ”اس سادگی پر کون نہ مر جائے اسے خدا“ وہ ٹھنڈی سادگی لے کر بولا۔ ”یعنی پھر بھی ایک سوال درج دیا۔ بھی کام کی بات ہے کہ ہمارے بارے میں کچھ نیک خیالات کا اظہار کرو۔ ہمارے طرف ذرا مختلف زاویہ نظر سے کچھ توجہ دو۔“

”تم جیسے خبیثوں کے بارے میں کوئی نیک خیال دل میں کہہ سکتا ہے؟“ میں نے اپنے لہجے سے بے بسی کا اظہار کیا۔

”عمر کے اعتبار سے اب تم لوٹنے لپاڑے نہیں رہے افغان چوہدری! اب تمہیں بالکل سنجیدہ لوگوں کے انداز میں سوچنا چاہئے اور ہندوستانی بائیں ترک کر دینی چاہئیں“ وہ افسانہ لہجے میں بولا۔

”سنجیدہ لوگ کس طرح سوچتے ہیں؟“ میں نے جانتا جانا۔

”جب کوئی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو وہ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ خواہ خواہ کی دشمنیاں نہیں پالتے۔ جس کا میں فائدہ نظر آتا ہے اس کے بارے میں ضرور سوچ بچار کرتا ہوں۔ جو لوگ آج کی نہیں سو سال آگے کی باتیں سوچتے ہیں وہ خفیہ نہیں“ ان کی آنے والی ٹیلیں بھی فائدے میں رہتی ہیں۔ ہر وہ میں ان کی طرف رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اتنی بلند یوں بٹے جاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی حیثیت ان کے سامنے زمین پر لیٹنے والے کیڑے مکوڑوں کی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ انسانی نظر نہیں لہجے میں بولا۔

”ویسے تو قدرت جس کو ایسا بنانا چاہتی ہے بنا دیتی ہے لیکن تم شاید سنجیدہ لوگوں کی نہیں“ بے خیر لوگوں کی بات کر رہے ہو جو صرف فائدہ دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ فائدہ کس ذریعے سے ہو رہا ہے اور کس چیز کے عوض ہو رہا ہے۔ میں تو اس وقت بھی کسی حساب سے نقصان میں نہیں ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت مجھے میسر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اُن گنت انسانوں سے بہتر بنایا ہے، بہتر حال میں رکھا ہے اور ابھی جدوجہد کے لئے میرے سامنے کھلا میدان پڑا ہے۔ زندگی نے جتنی سہولت دی شاید اتنی ہی مزید آگے چلا جائے۔ میں اپنی جگہ بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ تم مجھے کون سے فائدے نقصان کا فلسفہ سمجھانا چاہتے ہو؟“

”چہ۔۔۔ چہ۔۔۔“ ”وہ نرم آہستہ سے انداز میں بولا ”بس وہی چھوٹی چھوٹی باتیں۔۔۔ وہی جذباتی باتیں۔۔۔ وہی بیچارہ باتیں۔۔۔!“ ”مجھ وہ ٹھنڈی سادگی لے کر بولا ”خیر۔۔۔ ہمیں امید ہے کہ جلد ہی میزک کنکریں سے نکل آئے گا۔ ہمارے ساتھ میٹنگ کے بعد تمہارے خیالات میں انقلاب آجائے گا۔ لیکن میں چاہا رہا تھا کہ میٹنگ سے پہلے ہی تمہارا ذہن کچھ ہموار ہو جائے۔“

بولنے کا انتظار کئے بغیر اس نے سلسلہ متعلق کر دیا۔ ریسور رکتے کے بعد میں ایک بار پھر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ میری نظر سفید چھت پر جمی ہوئی تھی جو میرے لئے گویا اسکرین بن کر رہ گئی تھی اور اس پر میری یادوں کی پرچائیاں بہت ہی طرح ایک دوسرے میں گڑبڑ اور سی ٹھیس بہاوت گویا الجھتی جاری تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کا سفر مجھے کہاں لئے جا رہا ہے۔

میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اطمینان کی باتوں کو اب مجھے کچھ زیادہ سنجیدگی سے لینا ہو گا اور کچھ اضافی اقدامات بھی کرنے ہوں گے میرے آوی بہت منظم بہت مستعد اور بہت جاں نثار تھے لیکن میں سوچ رہا تھا کیا میں انہیں مزید منظم کروں؟ کیا میں انہیں آگاہ کروں کہ ہمیں شاید کسی وقت اچانک کسی ہولناک خطرے کا سامنا کرنا پڑ جائے گا؟ میرے سامنے یہ بیان کا شکار ہونے والے تو نہیں تھے لیکن اس طرح وہ خواہ مخواہ اضطراب میں مبتلا ہو سکتے تھے جب کہ خطرے کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب تک کپے دھاگے سے بندھی تلواری طرح ہمارے سروں پر ہی لٹکتا رہے؟

ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میری قوت دو جگہ غنی ہوئی تھی۔ میرے بہت سے بہترین ساتھی کراچی میں تھے اور باقی لاہور میں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان سب کو لاہور میں ہی جمع کر لوں۔ اس سے کراچی کے بزنس پر بہت بڑا اثر پڑ سکتا تھا۔ لیکن انتہائی ناگزیر حالات میں میں ایسا بھی کر سکتا تھا۔ مدد یہ بہر حال میری پہلی ترجیح نہیں تھا۔

ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں میں اضافہ کرنا چاہیے۔ لیکن محض افراد میں اضافہ کرنا میری نظر میں کبھی مفید نہیں رہا تھا۔ انتہائی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل اور انتہائی جاں نثار لوگ ہی میرے ساتھی بن سکتے تھے۔ یہ سب خوبیاں بیک وقت ایک ہی فرد میں شامل ہونا ضروری ہوتی تھیں۔ میرے بیشتر ساتھی نوخیز کے دور سے میرے ساتھ چلے آ رہے تھے اور کچھ حالات کے بہاؤ کے ساتھ ہم میں شامل ہو گئے تھے۔ وقت نے دھیرے دھیرے سب کو کچھ اور "پالش" کر دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ بہرا تھا۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر ایک اپنی جگہ گروہوں پر بھاری تھا۔ ایسے لوگ آسانی سے نہیں ملتے تھے اور ہر جگہ نہیں ملتے تھے۔

البتہ اب راجہ لاہور آ رہی تھی اور دھرندری خان سے اتفاقاً میری شہساز بہت اچھی و دگر پہ آ گئی تھی۔ ان دونوں کو میں اپنی ٹیم میں شامل کر سکتا تھا اور یہ ہر اعتبار سے اچھے ساتھی ثابت ہو سکتے تھے۔ ظاہر خان بھی کام کی غور تھی لیکن وہ زیادہ بھروسے کے قابل نہیں تھی۔ ستارہ جاں نثار تھی لیکن وہ صرف جذبوں اور خلوتوں کی غیر معمولی ساتھی تھی۔ اس میں اور کوئی ایسی غیر معمولی صلاحیتیں نہیں تھیں کہ میں اس پر زیادہ انحصار کر سکتا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے میرے ذہن میں کہاں سے تاہماری تلاش کر لی ہے" میں نے کچھ سوچ کر نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ممبر مال میں بینک کا شکر رہوں گا۔"

وہ بدجنت گویا میرا ذہن پڑھتے ہوئے بولا۔ "وہ جو بیوی پرانی کہانیاں میں ہوتا ہے تاہم کہ کوئی نیک، شریف یا قانون کے رکھوالے صاحب متعلقہ ڈاکوؤں یا خبروں کے جھروادور ہم خیال بن کر ان کے گردہ میں شامل ہو گئے تاکہ سارے رازوں سے آگاہ ہو سکیں اور مناسب موقع ملنے ہی ان کا دھڑن تختہ کر سکیں۔ جب ہمارے ساتھ بینک ہوئی تو اس قسم کی کوئی کہانی ذہن میں مت رکھنا۔ ہمارے ہاں اس قسم کی کہانی بالکل نہیں چلے گی، غلاب دجائے گی۔ کیوں کہ یہ کسی گروہ یا چھوٹی موٹی تنظیم کا معاملہ نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں ایسا نظام ہے کہ کوئی سارے رازوں سے آگاہ ہو سکے یا دھڑن تختہ کر سکے۔ ہمارا تو بیٹ آپ ہی بہت مختلف در کچھ میں نہ آنے والا ہے۔ اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حالاں کہ میرا خیال ہے شاید میں پیدای ریڈ واٹ میں ہوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ جب ہم ہمارے پاس آؤ گے تو ہمیں ہمارے ہی رہاؤ گے اس کے سوا ہمارے سامنے کوئی راستہ ہی نہیں ہو گا۔" میں خاموش رہا۔ اسے گویا کچھ یاد آیا اور وہ دوسرے چارے دے دئے بولا۔ "ایک ضروری بات تو میں تمہیں بتانی بھول ہی گیا۔" عمدہ حقیقت صاحب والے معاملے میں۔۔۔ یا کسی بھی ایسے معاملے میں جس کا تعلق ریڈ واٹ سے ہو، تاکہ اڑانے کی ہرگز کوشش مت کرنا۔ ریڈ واٹ بار بار نا کامیاں برداشت کرنے کی عادی نہیں ہے۔ حقیقتاً صاحب والے معاملے کو بھی تم اپنی صف اور ہماری نا کامی بھر کر زیادہ خوش مت ہونا۔ یہ صورت حال کی صرف عارضی رپٹی ہے۔ حقیقتاً صاحب کو بہر حال جانا ہے۔ اپنا عمدہ یا یہ دنیا توں میں سے ایک چیز ان کو بہر حال چھوڑنی ہوگی۔ ہم کوشش کریں گے کہ انہیں انتخاب کا حق دے سکیں کہ وہ کون سی چیز ڈھانچا چاہتے ہیں۔"

میں اس کی باتوں کا تکیہ نہ کر رہا تھا اور تھوڑا سا مذاق بھی اڑاتا رہتا تھا، بظاہر اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ان حقیقت یہ تھی کہ اس کا لہجہ میرے لاشعور کے بند دو آؤں پر بھی دستک دیتا تھا۔ ذہن کے ان نامعلوم تاریک گوشوں میں سرو ہوائیں سرسرا لگتی تھیں اور اعصاب میں خوف کی ہلکی سی رگڑ لگنے لگتی تھی۔ میں اس طرف سے توجہ ہٹانے دھکتا تھا۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں اس کی باتوں سے شرمگاہ نہیں ہوں۔ انسان اپنی راست میں کتنا ہی مضبوط، ای طاقت ور بن جائے لیکن کیسے نہ کہیں اسے خود فریبی کی ش میں راحت تلاش کرنی پڑتی ہے۔

میں ایک لمحے کے لئے اپنے خیالات میں الجھ گیا تھا۔ اسی لمحے میں نے اپنے عرف الہ کو یاد دلانے کی کوشش کی۔



کسی باصلاحیت لڑکی تھی اور کیسی بے خوف و خطر ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ بچہ سی گئی تھی، اس کی ملا جلیوں پر گرد جم گئی تھی، ذہن کو کچھ رنگ سا لگ گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ لاہور میں وہ میرے قریب، میری رسائی میں رہے گی تو اس کی ملا جلیوں سے یہ رنگ اور گرد و جلد صاف ہو جائے گی۔ اس کے کراچی رہنے کے دوران خواہ میں وہ زمانہ نہ جوازے اس کے پاس جانا رہتا اور فون پر مستقل رابطہ رکھتا لیکن وہ بات پھر بھی نہ ہوتی جو ایک ہی شرمیں رہنے میں تھی۔ قائلے بہ حال قائلے تھے! انسان کی سائنسی ترقی رابطے آسان بنا سکتی ہے، قائلے سائنسیں سکتی۔

میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ اگر کام کا ریزہ بہا۔ گیت ہاؤس سے طارق بول رہا تھا "سر! وہ ہونی سا لڑکا وسم احمد آیا ہے۔ بہت گھبراہوا ہوا ہے۔ کہتا ہے اے نن کے بارے میں کوئی خبر ہے۔ میں اسے گیت سے باہر ہی کھڑا کر کے آیا ہوں۔ سر! میں جو کئی چھوٹا گیت ڈرا سا کھول ہوں وہ فوراً اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے اس کا یہی انداز ہوتا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ کسی روز کوئی الٹی سیدھی حرکت کرتے وقت ناواقفگی میں میرے ہاتھوں مارنا نہ جائے۔"

میں تو اٹھ کر چہنچکا تھا۔ میں نے تیزی سے کہا "نہیں" نہیں۔ اس بے چارے کا خیال رکھا کرو۔ اور اس وقت تو اسے فوراً اندر بھیج دو۔ کسی سے کہو اسے ڈرا تنگ دوم میں لے آئے۔"

میں ڈرا تنگ دوم میں پہنچا تو وہ بیٹھا نہیں تھا۔ کمرے کے وسط میں کھڑا سر اٹھائے فانوس کی طرف دیکھ کر یوں تیزی سے آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا جیسے فانوس نے اس کے کان میں کچھ کہہ دیا ہو۔ اس کی عینک پھسل کر ناک کی نوک پر آئی ہوئی تھی۔ بال پریشان تھے اور پیشانی پر پسینہ پنک رہا تھا۔ لگتا تھا سانس بھی ابھی تک کچھ تیز ہی چل رہی تھی۔

مجھ پر ٹکڑ پڑتے ہی وہ تقریباً اچھل کر قریب آتے ہوئے اور مضطربانہ انداز میں ہاتھ لاتے ہوئے بولا "سر! آپ کے گھر پہنچ کر بھی آپ سے ملاقات کی فہمیت آتے ہیں بہت سائنسی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ سر! میری آپ سے پر زور اپیل ہے کہ یہ بادشاہوں والے طور طریقے ترک کر دیجئے۔ اپنے کمرے کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رکھئے۔ یہ سیکورٹی۔۔۔ یہ گارڈز۔۔۔ یہ اونٹنے اونٹنے گیس۔۔۔ یہ بجلی والی آئینے۔۔۔ یہ سب ہٹا دیجئے سر! وہ بالکل کسی فکری فراڈ کی طرح لگتا تھا اس جذباتی اپیل کے ساتھ میرے بیروں میں گر جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر منہ منہ کیا۔ شاید اسے بروقت اپنی آمد اصل مقصد یاد آ گیا تھا۔

"چاہتا ہوں میں بھی یہی ہوں برادر! میں نے لفظی سانس لے کر کہا "لیکن اس کے لئے مجھے دو بارہ فاتحہ مست ہٹانے پڑے گا۔"

اس وقت تو آپ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً میرے ساتھ جتنے لمحے ضائع ہو چکے ہیں وہی بہت ہیں "اس نے قریب آگ ہاتھ قہام لیا اور دروازے کی طرف لے جانے کی کوشش کر لگا۔

"بات کیا ہے؟" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر اسے گھورا "سر! آپ نے جو کام میرے سپرد کیا تھا وہ میں نے کر لیا وہ سر کھاتے ہوئے بولا "میں نے اس شخص کو پکڑ لیا ہے۔ جو تصویر آپ نے مجھے دی تھی۔ جس کا نام آپ نے اے نے تھا۔"

میں ایک ننگ اسے گھورا رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کم مذاق کرنے کا اہل ہی نہیں ہے لیکن اس وقت مجھے شبہ ہوا شاید وہ میرے ساتھ مذاق کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فوراً عتاب صفت فون جو ان اے نن کی تلاش میں تھا۔ میرے دفتر پر فون جو ان حسن علی جو بیٹے میں ایک برقی پتاں چھپائے پھر تھا تھا۔ کاکوئی بھی کام کر کرنے کے لئے تیار تھا، سر! پتلی لے لئے پھر وہ بھی اسی صبر پر ٹھکا ہوا تھا۔ لیکن ان دونوں کو ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ جب سے میں نے یہ کام ان کے سپرد انہیں اے نن کی جھٹک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ چلیں یہ کیا جا سکتا تھا کہ اس معاملے میں ہونق و سیم کی قسمت نے کی ہو یا محض اتفاقاً اے نن کیس نظر آ گیا ہوگا۔ لیکن نے اسے "پکڑ" لیا تھا، یہ میرے لئے ناقابل نہیں کی بات میں نے محض جان چھڑانے کے لئے اسے یہ کام بتایا تھا۔ مجھے کی کامیابی کی امید تو درکنار "انا فکر لگی ہوئی تھی کہ کس چارہ اے نن کے ہاتھوں مارنا نہ جائے لیکن وہ تو کچھ اور ہی کر گیا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" میں نے بے چینی سے پوچھا "کس طرح قابو میں کیا تم نے اے نن؟"

"تفصیل میں آپ کو راستے میں بتا دوں گا۔ آپ وقت مت کیجئے فوراً میرے ساتھ چلئے" وہ بے گلی سے بولا "ہوں کہ آپ کی امانت آپ کے سپرد کروں۔ مجھے اندیشہ میں اسے زیادہ دیر قابو میں نہیں رکھ سکوں گا۔"

اُس نے جس سنجیدگی سے لفظ "امانت" استعمال کیا مجھے انہی آتے آتے نہ گئی۔ کچھ ایسا ہی تصور میرے ذہن میں بیٹھے اے نن کوئی پوٹلی وغیرہ تھی جو میں نے خود اس پر رکھوائی تھی۔

میں نے اس کے ساتھ ڈرا تنگ دوم سے نکلے ہوئے ایسا ہی غلط والا معاملہ تھا تو ہم خود آئے کے بجائے مجھے دیتے۔ کچھ وقت چھتا۔

"فون کیا تمہیں نے" وہ تیزی سے برآمدے کی طرف اترتے ہوئے بولا "لیکن آپ کمرے میں رہتے۔ کمرے میں کچھ

ڈرائیور کچھ نہیں کر سکا، وہ مٹیانا لہجے میں بولا۔ ہم میں بلیوارڈ پر پہنچ گئے تھے۔ اس نے مجھے مائل ٹاؤن کی طرف چلنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ مائل ٹاؤن سے آگے بھاڑ کے علاقے میں اس کے بابا کے چھوٹے مکان کے کارخانے تھے اور ہمیں اس وقت وہیں جانا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کارخانوں کی طرف جانے کی کیا تک تھی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ جب وہ اپنے کارخانے کی تفصیل سنانے کا توجہ سمجھ میں آجائے گی۔

میں بلیوارڈ پر اس وقت ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا "اب بتائیے چکو، وہ بد بخت کس طرح تمہارے ہتھے چڑھا گیا؟"

"سر، میں نے اسے گھبرنے کی بات تادمہ پلاننگ کی ہوئی تھی۔ جب آپ نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا، اسی وقت کرلی تھی پلاننگ" وہ غصے سے بھرا ہوا تھا "صرف اس کے نظر آنے کی وجہ سے... اور معلوم نہیں اب یہ آپ کی خوش قسمتی تھی یا میری کہ آج وہ مجھے نظر آگیا۔"

"کہاں؟" میں نے جی الا مکان پر سکون لہجے میں پوچھا۔ "چڑیا گھر میں" اس نے اطمینان سے جواب دیا مجھے ایک بار پھر شبہ ہوا کہ وہ کس اپنی طاقت کا کوئی نمونہ مجھے دکھانے تو نہیں لے جا رہا تھا۔ میں نے اسے سن کر حلاش کا کام جن کے زبے لگایا تھا وہ اسے دھوڑتے ہوئے کم از کم چڑیا گھر تو نہیں جاسکتے تھے۔ "تم کیا اس کی تلاش میں چڑیا گھر گئے تھے؟" میں نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

"نہیں سر۔ جی بات ہے میں تو اس کی تلاش میں تھا ہی نہیں" اس نے صاف کوئی کا مظاہرہ کیا "میں نے تو ایسے ہی سوچا ہوا تھا کہ اگر کس نظر گیا تو اپنی تدبیر پر عمل کرنے کی کوشش کر ڈالوں گا۔ چڑیا گھر تو میں ویسے ہی سمجھی گھبرا جاتا ہوں۔ بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ میں تو خود فکر کرنے کے لئے وہاں جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رنگا رنگ مخلوقات دیکھ کر ان کی حرکات دیکھ کر سوچ بچار کی ٹی ٹی راہیں کھلتی ہیں۔ میری تو تنہائی ہے کہ ایک ایک کر کے میں ساری دنیا کے مشہور ترین چڑیا گھر دیکھوں۔"

"بہت خوب! اللہ تمہاری آرزو پوری فرمائے" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر قدرے الجھن کے عالم میں کہا۔ مجھے بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ اگر دسیم بھی مذاق کرنا تو شاید میں اس کا اندازہ لگانے سے بھی قاصر رہتا۔ اس کا چہرہ اس کے حلقہ اثرات کچھ ایسے ہی تھے۔ چاہی میں چلا تھا کہ بنید کی غیر سنجیدگی اور بچیدگی کے درمیان حد فاصل کہاں کہاں تھی۔

"آمین" اس نے غایت خلوص اور عقیدت سے کہا اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "اے نن پر اچانک میری نظر پڑی۔ وہ چیمپیزوں کے بیگرنے کے پاس کھڑا تھا اور مجھ سے بھی زیادہ محبت سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید وہ بھی

تھا۔ میں نے سوچا، چل کر آپ کے دروازے پر دھڑکا مار کر ہی جاتا ہوں، مگر آپ کے آتے ہی آپ کو پکڑ سکوں۔"

"کچھ دیر پہلے میں واقعی گھر پر نہیں تھا" میں نے اسے احساس دہانی کی کوشش کی کہ اسے رُخایا نہیں گیا تھا "اور تھوڑی دیر بعد میں دوبارہ نکل جانا۔ اتفاق ہی ہے کہ ہماری ملاقات ہو گئی۔ تو اس وقت گھر آئے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔"

"میری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں دل ہی میں کتنی دعاؤں مانگتا تھا کہ آپ مجھے گھر پر ہی مل جائیں۔ درتوئی کی دعا میں بڑی طاقت ور ہوتی ہیں۔"

ڈرائیور سے میں سوچ کر میں نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ "میری گاڑی باہر ہی کھڑی ہے۔ اب گیٹ کھلے اور گاڑی لے میں مزید وقت ضائع ہو جائے گا۔ اسی میں آجائے۔"

میں نے اسے اپنی گاڑی میں دھکیل دیا۔ وہ کھلے ہوئے کہا "اب اتنے بھی کے قدر دان مت بنو۔ صرف چند سیکنڈ کا فرق ہے گا۔ چند کے فرق کے لئے میں تمہاری گاڑی میں جانے کا خطوط مول لے سکتا۔ اگر وہ کھنڈا راستے میں بند ہو گئی تو کس گھنٹوں کا اندر پڑ جائے" یہ کہنے کہنے میں گاڑی اشارت بھی کر چکا تھا اور نہ خان نے گیٹ باز میں بیٹھے بیٹھے ٹھن دبا دیا تھا جس سے میں پشیمہ موڑنے کے ذریعے گیٹ بھی کھل چکا تھا۔

اپنی گاڑی کے بارے میں رازدار کس سن کو دسیم کے چرنے پر لے کے لئے تکلیف کے آثار ابھرے۔ میں کچھ مذاق میں اور دواں میں اس کی گاڑی کو کھنڈا کہہ گیا تھا لیکن میرے دل میں بت با شفر کے جذبات ہرگز نہیں تھے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے لگا ہوا کہ مذاق میں بھی ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ دسیم جیسے ہل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کب بڑی سے بڑی کو نظر انداز کریں اور کب چھوٹی سے چھوٹی بات کو دل پر لے

وہ گلی میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف ایک نظر دیکھ کر بولا۔ "مجھے جنکی گاڑی کی حالت... دیکھ کر اس کے بارے میں حتمی نہیں کرنا چاہئے۔" وہ میرے ہی چند پند پرندہ ترین اصولوں سے ایک اصول مجھے سمجھا رہا تھا لیکن چل کر میری زبان ذرا ناچکی تھی "اس لئے اب میں نے خاموشی سے اس کی نصیحت میں ہی غایت سمجھی۔"

وہ منگ درست کرتے ہوئے بولا "مگر آج آپ میری گاڑی کو لے دیکھ لیتے تو اسے گراں پری دیس میں بھیجے کی سفارش تے اس کے کمالات دیکھ کر تو اسے نن بھی پکڑا گیا ہوگا۔"

"کمالات تو اصل میں چلانے والے کے ہوتے ہیں گاڑی چاہی خود تو کوئی کمال نہیں دکھا سکتی۔" میں نے دسیم کو کہیں کا ماتھ لگانے کی کوشش کی۔

"وہ تو درست ہے سر! لیکن جب تک گاڑی ساتھ نہ دے"

میرے خیال میں اب انجان بنے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا "دل چھوٹا مت کرو۔ ویسے ہی تمہاری بہت وفادار ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک ہمیں اور ہمارے طور طریقوں کو بھی جان گئی ہے۔ اگر وہ زبان بند رکھتی تو یقیناً ہمیں زبان کھولنے کی کچھ ترکیبیں اس پر آزمائا پڑتیں۔ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ ذہنی اور اعصابی طور پر بے پناہ مضبوط تھی لیکن جسمانی تشدد سے اس میں بالکل حوصلہ نہیں ہے۔ زندگی میں ایک بار وہ ایک خفیہ سرکاری ایجنسی کی "مفتیش" میں چکی ہے۔ اس کے جسم کی خوب صورتیاں بڑی مشکل سے دیکھی گئی ہیں۔ دوح کے گماڑا اب تک نہیں بھرے۔ اس لئے اس نے جب دیکھا کہ اس کا بھانجا پھوٹ چکا ہے تو اس نے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہیں کی۔"

وہ گویا اب میری خاموشی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس نے فوراً اعتراف کر لیا کہ وہ اپنی اصل شخصیت کو بھولی نہیں۔ اور یہ کہ تم بھی حیرت انگیز قوت مشاہدہ کا ثبوت دیتے ہوئے اسے پہچان چکے ہو۔ اس کی رپورٹ ہمیں کمال نے سن سے بھی مل چکی تھی لیکن اس کے سامنے تو وہ تمہاری اس بات کی تردید ہی کرتی رہی تھی۔ بعد میں وہ تم سے کسی طرح رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے سب کچھ ہمیں بتا دیا ہے۔ ہمیں اس کی یہ بات اچھی لگی۔ اس نے خود کو اور ہمیں زیادہ دیر سر میں جلا نہیں کیا۔ جوں ہی اس نے محسوس کیا کہ بازی الٹ چکی ہے تو اس نے مزید مصیبت کو دعوت نہیں دی اور جو کچھ ہم نے پوچھا وہ بتا دیا۔ اگر وہ نہ بتاتا تب بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہمیں بہت سے طریقے آتے ہیں معلوم کرنے کے۔"

میں تصور کر سکا تھا کہ ان لوگوں کی گرفت میں ہنسی کے خوف اور وحشت کا کیا عالم ہو گا۔ مجھے اس پر غصہ نہیں تھا ورنہ ہی اس سے کوئی شکوہ تھا کہ اس نے زبان کھول دی تھی۔ اس نے اچھائی کیا تھا کہ ستم کروں کی ستم کوئی کے لئے اپنے آپ کو مزید سختہ وشنہ نہیں بنایا تھا۔ وہ زندگی میں جو کچھ سہ چکی تھی وہی بہت تھا۔ وہ زندگی کا قرض ادا ہو چکی تھی۔ یہی بہت تھا کہ وہ اپنے وجود کی تمام تر دلکشی اور خوب صورتی کے ساتھ اب بھی زندہ تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں چین سے بیٹھا اس کے مقدر میں نہیں لکھا تھا۔

"تمہیں اس پر شک کیسے ہوا؟" آخر کار میں نے ویسے ہیجے میں پوچھا اور انجان بننے کی کوشش ترک کر دی۔

"حافظ صاحب والا معاملہ جب عین وقت پر ناکام ہونے کی ہمیں رپورٹ ملی تو مجھ سے اوپر والا داغ بھی پکرا گیا....." وہ بولا۔ "تم سے اوپر والا داغ؟؟؟" میں نے ڈھرایا۔ یہ اصطلاح میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"میرا مطلب ہے 'میرا پاس' اس نے وضاحت کی۔ 'ہمارے ہاں بعض لوگوں کی اہمیت صرف ان کے داغ کے حوالے

سے ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ان کا تذکرہ صرف داغ ہی سے کر جاتے ہیں۔ خیر..... تو میں بتا رہا تھا کہ پاس پکرا گیا نظام ایک پروف ہے۔ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں گئی ہے۔ پھر یکدم ہمارا ذہن اپنی پر گیا۔ ہمارے نظام میں ایک کڑور پوائنٹ فی الحال اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس منصوبے میں شریک ہی نہیں تھی۔ وہ بخیر کیسے کر سکتی؟ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "بہر حال ہم نے اس کی جگہ سے ہٹایا اور جب پوچھ کچھ ہوئی تو سب بتا چلا۔ بھی معلوم ہو گیا کہ ذہنی طور پر وہ مکمل پرفنس تھیں، تھی اور یہ بھی بتا چلا گیا کہ ہمارے دو ٹرانسپیرٹوں پر وہ مفلکوں کا کچھ حصہ فریکوئنسی کی غلطی کی وجہ سے اٹھا آئے۔ لیا تھا اور نہایت مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً تھیں دیا۔ تم حسبِ عادت وہ نہیں سکتے۔ فوراً کوہ پڑے اس میں۔"

"تمہارے خیال میں مجھے ہاتھ پر اتھو دھرے بیٹھے رہنا تھا؟" میں نے ملاحت سے پوچھا۔

"اس طرف تو خیر ہمارا ذہن ہی نہیں گیا تھا کہ ہمیں معاملے کی ہیک بھی پڑ سکتی ہے لیکن قسمت انکڑ تمہارا ساٹھ ہے۔ بلکہ اس معاملے میں تو شاید تمہاری ہی خوش قسمتی کا حقیقہ صاحب پر بھی پڑ گیا جو وہ فی گئے۔ بہر حال.... اگر ہم یہ بھی کرتے کہ تم اس پکڑ سے آگاہ ہو جاؤ گے تب بھی ہم تم سے مستعدی اور حاضر و دائمی کی توقع نہ رکھتے۔ ہمارا خیال تھا کہ تم تر معاملات میں بارود جاڑا کرتے ہوئے گورنے کے عادی ہو اور ہونے کے باوجود زیادہ جوڑ توڑ نہیں کرتے۔ ایسا کوئی قدم شاذ ہی اٹھاتے ہو جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ تم ذہنی ورزش بھی کر ہو۔ لیکن حافظ صاحب والے معاملے میں تو تم نے کمال کر راتوں رات نہ صرف ان سے دوستی کا ٹھٹھائی بلکہ پرانے جانے والے انداز میں ہمیں بدل کر وینٹر کے روپ میں متوجہ پر بھی رہے۔"

"تو تمہیں سب رپورٹ مل چکی ہے؟" میں نے غلطی جا ل۔

"مہم ناکام ہوتے ہی ہمیں سیال لاہور میں عمل درآمد کرنی تھی۔ تمام تر جزئیات کے ساتھ" وہ حاشیت سے بولا۔ "ہمیں تقریباً ہر لمحے کی خبر مل رہی تھی۔ لیکن ہمارا خیال تھا کہ ہمارے طریقہ واردات کو کچھ نہیں سکو گے کیوں کہ حافظ صاحب سنگار کے ذریعے ہلاک کرنے کا فیصلہ ہم نے آخری لمحوں میں تھا۔ اور جیٹل پلان کچھ اور تھا جو تمہارے ٹانگہ اڑانے کی وجہ ہم نے بدل دیا تھا۔ ہمیں اپنی مہم ناکام ہونے پر غم و غصہ تو بہت لیکن ہم قدر شناس لوگ ہیں۔ تمہاری ذہانت اور مستعدی کی دے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔"

میں نہیں بدل سکتی تھی۔ میرے اوپر والے دماغ نے حکم دیا کہ۔  
 فی الحال سب کچھ ڈراپ کر دیا جائے۔"

"ہنی بے کماں؟" میں نے سرسری سے لمبے میں پوچھا۔ مجھے  
 امید نہیں تھی کہ اس سوال کا جواب ملے گا۔

"سب سے پہلے ہم نے اسے غائب کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں  
 ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کا کیا کریں؟" وہ  
 بالکل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ہنی انسان نہیں، کوئی ایسا چیز  
 تھی جو بازار سے سوے سلف کے ساتھ فاضل آگنی خلی اور اب  
 سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ وہ بات جاری رکھتے  
 ہوئے بولا "اس پر ہماری ایک قسم کی خاصیت ہوتی ہے۔ ہم  
 اسے ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کام تو سنبھالے ہے لیکن شاید اس  
 ملک میں نہیں۔ عین ممکن ہے ہم اسے کسی اور ایشیائی ملک میں  
 بھیج دیں۔"

"مجھے صرف ہنی کی خیریت عزیز ہے اور فی الحال میرے لئے  
 تمہاری بات پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"چندرا!..." وہ بڑے پیار سے بولا۔ وہ یقیناً غیر ملکی تمام  
 ہمارے روایتی الفاظ بھی ایسے خیریں اور سچے ہوئے لمبے میں بولتا  
 تھا کہ اہل زبان بھی شراکت تھے "میں جب کوئی بات بتاتی نہیں  
 ہوتی تو ہم سب سے پہلے ہی نہیں لیکن جو بتاتے ہیں بالکل ٹھیک  
 بتاتے ہیں۔ اپنے دو ماموت پند دل کو کھلی دے رکھو۔ ہنی بالکل  
 خیریت سے ہے۔ ہو سکتا تو میں آج رات فون پر اس سے تمہاری  
 بات کرادوں گا۔"

"بڑی ہی نوازش ہوگی تمہاری" میں نے کہا "دوے تم نے اتنی  
 محنت میں اسے پیش منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا؟"

"فی الحال میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری حکومت ہماری طرف  
 متوجہ ہو جائے۔ حالانکہ اس سے ہمارے لئے کوئی فرق بھی نہیں  
 پڑتا۔ پھر بھی غیر ضروری الجھنوں سے بچتے رہنا ہماری پالیسی ہے۔"  
 "حکومت تو پھر بھی تمہاری طرف متوجہ ہو سکتی تھی اگر میں  
 لفظ صاحب کو تمہارے بارے میں بتا دیتا" میں نے کہا۔

"میں تم سے عقل مندی کی توقع تھی اور تم نے عقل مندی  
 ہی دکھائی۔ تم نے اپنے حق میں بھڑکی کیا کہ ہمارے بارے میں  
 زبان بند رکھی۔ اس سے تمہارا ہی نہیں تمہارے بہت سے ہم  
 وطنوں کا بھلا ہوا۔"

"کیا مطلب؟ میں تمہاری بات سمجھا نہیں" میں نے کہا۔  
 "فی الحال تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ وقت آنے پر  
 دھیرے دھیرے تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا جائے گا۔۔۔۔۔ اور آثار  
 بتاتے ہیں کہ وقت اب قریب آتا جا رہا ہے" وہ ہنس لہجے میں بولا۔

"حکومت کو تو میں اب بھی بتا سکتا ہوں۔ کچھ دنے دار لوگوں  
 کی توجہ تم لوگوں کی طرف مبذول کر سکتا ہوں" میں نے کہا۔  
 اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا مگر اس نے اسے کوئی لطفہ نہ دیا۔

"ذرا فزائی ہے تمہاری۔ ویسے بندہ اس سے بھی زیادہ قابل  
 ہے۔ امید ہے تم سے داد و تحسین وصول کرنے کے مواقع مجھے  
 آئندہ بھی میسر آتے رہیں گے۔ غالباً مجھے تمہارا شکریہ بھی ادا کرنا  
 چاہئے کہ تم نے اس بار بھی میری گستاخی پر مجھے بخش دیا" میں نے  
 معنوی منونیت سے کہا۔  
 "بھلا پڑا ہے" وہ لٹھڑی سانس لے کر بولا "آخر دوست ہو  
 ہمارے۔"

"یہ ابھی ایک طرف دوستی ہے جس کا مجھے علم ہی نہیں۔ آخر  
 میرے دل میں جو اب دوستی کے جذبات کیوں پیدا نہیں ہو رہے؟"  
 میں نے بڑی حسرت سے کہا۔

"ہو جائیں گے۔ ہو جائیں گے" وہ نہایت متینانہ لہجے  
 میں بولا "اب وقت آ رہا ہے۔ اب ہماری تمہاری ملاقات ضروری  
 ہو گئی ہے۔ امید ہے اس کے بعد تمہارے خیالات تبدیل ہو جائیں  
 گے۔"

"کیا تمہارے ہاں اس قسم کا بھی کوئی آپریشن ہوتا ہے جس  
 کے ذریعے دوسری طرح کے خیالات انسان کے دل میں لاکھڑی  
 میں اندلڑ دے جاتے ہیں؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"ارے۔۔۔۔۔ ہمارے ہاں کیا کچھ ہوتا ہے اس کا نہیں کہاں  
 اندازہ ہے" وہ لٹھڑی سانس لے کر بولا "جب اندازہ ہو گا تو  
 ہمارے ساتھ شامل ہونے کی تمنا کرو گے۔ ہم جلد ہی تمہارے  
 ساتھ میٹنگ کو بھی اپنے کسی ایجنڈے میں رکھیں گے۔"  
 "میں بے تاملی سے انتظار کروں گا" میں نے بڑے غلوں سے  
 کہا "ہنی کے ساتھ تم نے کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ بے پروائی سے بولا "میں نے بتایا تاکہ  
 اس نے نہایت عقل مندی کا مظاہر کیا کہ آسانی سے زبان کھول  
 دی۔ اپنے لئے مصائب کو دعوت نہیں دی۔ اب ہمیں اس پر سختی  
 کرنے کا شوق توڑ دیا تھا۔ ہمارا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا۔  
 ہمارے ہاں کوئی اپنے بیمار ذہن کو تسکین دینے کے لئے یا محض اپنی  
 نفرت کی آگ بجھانے کے لئے کسی پر تشدد نہیں کرتا۔ جب بھی ایسا  
 کیا جاتا ہے، کسی ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔"

"شرقاء کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔ میں تو تم لوگوں کی  
 شرافت کا قائل ہوتا جا رہا ہوں" میں نے غلوں سے کہا۔

"جلد ہی تم یہ استہزاء سب لہجہ ترک کر دو گے مائی ڈیئر افضل  
 چوہدری!..." وہ ایک بار پھر لٹھڑی سانس لے کر بولا "اور اس طرح  
 کی باتیں سمجھدی سے کرنے لگو گے۔"

"کیا تم نے واقعی ہنی کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا؟ اس  
 کی "تمہاری" پر اسے کوئی سزا نہیں دی؟" میں نے سمجھدی سے  
 پوچھا۔

"وہ سزا کی مستحق تو تھی لیکن اب اس کا کوئی خاص فائدہ  
 نہیں تھا۔ ڈاکا ہی تو ہمارے سامنے آئی چلی تھی۔ فی الحال وہ کامیابی

پاس بھی کسی زمانے میں ایسی ہی ایک کھٹارا گاڑی تھی اور میں زندگی موت کی جنگ لڑا کرتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے دوا۔

”میرا آپ نے گاڑی کے جذبات“ والی بات شاید کی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے جان اشیاء کے بھی جذبات ہیں ”وہ پرجوش لہجے میں بولا ”بلکہ سچ پوچھیں تو اس دنیا میں بے جان ہے ہی نہیں۔ اس کائنات کی سب چیزیں جاندار وہ بھی انسان کی محبت کے جواب میں محبت اور نفرت میں نفرت کرتی ہیں۔ اکثر اوقات ان کی محبت اور نفرت اور مجبور ہوتی ہے۔ انسان اسے محسوس نہیں کر سکتا۔ معمولی حساس لوگ اسے محسوس کر سکتے ہیں اور وقت پر محبت یا نفرت اپنا اثر دکھاتی ہے۔“

مجھے اس احمق نوجوان سے اتنی گہری بات کی توقع لیکن یہ موقع ایسی باتوں پر تبادلہ خیال کرنے کا نہیں تھا۔ نری سے اسے یاد دلایا ”وہ اسے سن کی بات دہری تھی۔“ ”جی ہاں۔ میں وہی جانتے لگا تھا“ وہ اصل موضوع ہوئے بولا ”کیونکہ گراؤ ڈھلے آگے نکل کر جب وہ دریاں پہنچا اور اس کی گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ گھیرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں نے سڑک تنگ ہونے کی گاڑی کو ٹھنڈا دے لیا اور واپس روانہ ہو گیا۔ آپ نے سمجھے؟“ اس نے چپکے آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ”نہیں“ میں نے لٹی میں سر ہلایا۔ میں اسی کی زبانی سنا چاہتا تھا۔

”یہ میری نفسیاتی چال تھی سرا“ وہ فائنل لہجے میں نے اس کے جیش کو خوب ابھارا۔ اتنا ابھارا کہ اب وہا کا جواب حاصل کئے بغیر گھر نہیں جاسکتا تھا کہ آخر میں کیا تعاقب کر رہا تھا؟ یہ ”کیوں؟“ آدمی کو برا بے حین کرتی اب وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ اب میرا کام صرف اتنا تھا کہ پیچھے نہ چڑھنے پاؤں۔ اور یہ بڑا مشکل کام تھا۔ کیوں کہ میں آپ کو ہی ذرا دست دراز کر رہا تھا ہوں لیکن وہ میرا بھی بازی کر معلوم ہوتا تھا بالکل۔ ہر حال۔۔۔ میری قسمت اور کچھ حواس نے ساتھ دیا۔ ٹریفک کے سلسلے میں بھی خ سے کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور میں اسے اپنے پیچھے لگا دیاں لے آیا جہاں لانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ ”وہ اب گویا سہ ابھارنے کے لئے خاموش ہو گیا۔

”کہاں لے جانا چاہتے تھے تم اسے؟“ مجھے پوچھنا ہی ”ہمارے کارخانوں کے پیچھے ایک گودام ہے۔ میرا لے جانے کا پروگرام تھا۔ اور میں اس میں کامیاب ہوئے جواب دیا ”میں یہی ظاہر کر رہا تھا کہ سخت خوفزدہ ہونے گودام تک میں اس سے ذرا پہلے پہنچ گیا اور خوف زدہ

سوچ بچار حاصل کرنے ہی چڑھا کر جاتا ہوں۔ میرا تو اس سے یہ کہنے کو بھی جی چاہا ”بھائی! تم تجربے کے باہر کیا کر رہے ہو“ تمیں تو تجربے کے اندر ہونا چاہتے“ لیکن پھر مجھے فوراً اپنی زندگی کا سہرا اصول یاد آگیا۔ کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے۔ ویسے بھی میں ایک سنجیدہ نوجوان ہوں۔ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ مجھے غیر سنجیدہ گفتگو نہ کرنی پڑے۔۔۔۔۔

”خیر۔ تو جبر ہوا کیا؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ذرا بے آلی سے پوچھا۔

”ہو گیا تھا سرا“ اس پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہ وہی پُر اسرار اور خطرناک آدمی ہے جس کو قابو میں کرنے کا فریضہ چہرہ صاب نے مجھے سونپا ہے۔ میں اب اس کام میں کوتاہی تو نہیں کر سکتا تھا۔ میں فوراً اس کے پیچھے لگ گیا۔۔۔۔۔ اس نے دائرہ طلب نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں فی الحال اسے داد دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

”سب سے زیادہ وقت اس نے بندروں کے بچروں کے پاس ہی صرف کیا لیکن باقی جانوروں کا معاملہ بھی اس نے خاصے اطمینان کے ساتھ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں تھا لیکن ہر حال میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اسے احساس بھی دلایا کہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے قدرے ہزارے سے پوچھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی تہ میں بھی کوئی فلسفہ کار فرما ہو گا۔

”یہ میری حکمت عملی کا ایک حصہ تھا“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”ویسے بھی اگر میں اسے یہ احساس نہ ہونے دتا تو شاید وہ گفتگوں چڑھا کر میری شکل دیتا۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ اپنی دانست میں تصدیق کے لئے اس نے ادھر ادھر چکر لگائے۔ میں سامنے کی طرح اس کے پیچھے رہا۔ آخر کار اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں تو اس نے اچانک گھڑی دیکھی، پیچھے اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔ پھر وہ چڑھا کر سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ اہر پال سے کینٹ کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ ادھر ادھر پھرنے کے بعد آخر کار وہ والٹن کی طرف مڑ گیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس دوران اس نے کس طرح کی ذرا تیوٹنگ کی اور کس طرح میں نے اپنے کھٹارے میں اس کا تعاقب جاری رکھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی میں نے اسے اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔“

”بھئی! اگر میرے الفاظ سے تمہارے ہاتھ ہاری گاڑی کے جذبات کو نہیں پہنچی ہے تو میں انہیں واپس لیتا ہوں“ میں نے سسکراتے ہوئے کہا ”میں نے اسے فحارت سے نہیں بلکہ یوں ہی روانی میں اور کچھ بے دھبائی میں کھٹارا کیا تھا۔ مجھے تو خود ایسی پرانی چیزوں سے بہت پیار ہے۔ بہت وفادار ہوتی ہیں۔ میرے اپنے

وہ چلو بدلتے ہوئے بولا "ہمارے کارخانوں کو ایک نوجوان  
دکاندار کیپٹن سلائی کرتا ہے اس سے میں نے خصوصی فرمائش  
کر کے اور اس کی مت ساجت کر کے ایک گیس کا چھوٹا سلسلہ  
تیار کروا کے اپنے آفس میں رکھا ہوا تھا۔"  
"کیسی گیس کا سلسلہ؟" میں نے ذرا چوکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ سرکھٹا کر بولا "میں نے مجھے اس  
کیپٹن کا نام بھی بتایا تھا لیکن میں بھول گیا ہوں۔ بہر حال وہ بے  
ہوش کرنے والی گیس تھی۔ میں جب اپنے آفس سے سلسلہ اٹھا کر  
دوبارہ گودام کے دروازے پر پہنچا تو وہ بن ماس کا پتہ اندر سے  
دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ  
دور سے دوڑ لگا ہوا بار بار آکر دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ اور جس  
قوت سے ٹکرا رہا تھا اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ بالکل  
ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے توپ کا گولا دروازے سے ٹکرا رہا تھا پھر  
کوئی بہت ہی پلا ہوا لڑکا سا بے دست و پا سے دوڑتا ہوا آکر  
دروازے پر ٹکر رسید کر رہا تھا۔ میں نے اسے زیادہ ٹکریں رسید  
کرنے کی مصلحت نہیں دی۔ دروازے کے نیچے سے میں نے سلسلہ  
میں لگی ہوئی ریز کی نکل اندر داخل کی اور الدیا کر گیس کھول دی۔  
شوں شوں کر کے گیس اندر جانے لگی۔ وہ چیخا چلا "کھانسا" لیکن  
آخر کار میں نے اس کے دھب سے کرنے کی گواہی سنی اور اس کے  
بعد اندر خاموشی چھا گئی۔ وہ کیا بے ہوش ہوا گویا ایک طوفان  
بد قیامت ختم کیا۔"

"اور تم دوڑے دوڑے میرے پاس چلے آئے؟" میں نے  
کہا۔

"جی نہیں۔ میں کام مزید بکا کر کے آیا ہوں۔ دروازے پر اپنا  
ایک چکر مار بھی بٹھا کر آیا ہوں۔ وہ بندوق لئے بیٹھا ہے۔۔۔  
دروازے کے سامنے ہی۔۔۔ چارپائی پر۔ اب بتائیے۔۔۔ کام بکا ہے  
یا نہیں؟" اس نے داوطلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
"ہاں۔۔۔۔۔ محسوس تو یہی ہو رہا ہے" میں نے قدرے تذبذب  
کے عالم میں اثبات میں سر ہلایا "تم سے مجھے اتنی امید نہیں تھی۔"  
"یہی تو میری زندگی کا المیہ ہے سزا" یکدم اس کے لہجے میں  
دنیا بھری اداسی سم آئی "بھی کسی نے مجھ سے میری ملا جلیوں  
کے مطابق کام ہی نہیں لیا۔ ورنہ معلوم نہیں آپ کا یہ خادم اب  
تک کیا کچھ کر کے دکھا چکا ہوتا۔"

میں اب سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ کیوں نہ اس نوجوان کو  
اپنے ساتھیوں میں شامل کر لوں؟ وہ یقیناً کوئی اور ہی چیز تھا۔  
آنکھیں اس کے بارے میں دھوکا دیتی تھیں۔ اس کے باوجود اسے  
اپنے مطلب کی نرسنگ دلانا مجھے کچھ مشکل سا کام لگتا تھا۔  
بھانپتا بیچ کر اس نے اس سمت میری رہنمائی کی جہاں ایک  
چھوٹا موٹا صنعتی علاقہ چھپتا جا رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی سڑک اس  
طرف جا رہی تھی۔ ہم جب اس علاقے میں پہنچ کر جہاں جھکاڑ کے

کاڑی سے چھلاٹک لگا کر گودام کا آٹا کھول کر اندر گھس گیا۔ میں  
نے آوازوں وغیرہ سے تاثر کی دیا کہ کسی پچھلے دروازے سے مزید  
ندرجا گیا ہوں لیکن درحقیقت میں دروازے کے پیچھے ہی چھپا ہوا  
تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست ہی رہا کہ وہ اندھا دھند  
میرے پیچھے آئے گا۔۔۔۔۔"

یقیناً اسے خود بھی معلوم تھا کہ وہ شکل سے جتنا ہوتی نظر آتا  
ہے اتنی ہی اسے بے ضرر سمجھا جائے گا اور کوئی اس کے پیچھے آئے  
میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ حتیٰ کہ اس کا تعاقب کرنے  
والا تو کسی احتیاط کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی  
خصوصی احتیاطی مسکراہٹ کے ساتھ بات چاری رکھتے ہوئے بولا۔  
"وہ اندھا دھند گودام میں گھسا اور میں نہایت پھرتی سے دروازے  
کے پیچھے سے باہر نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کندی میں آٹا  
لگا دیا۔"

میں قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا  
واقعی اس جیسا ہوتی نوجوان اسے نہ پیچھے تھنے کو اتنے سیدھے  
سادے طریقے سے پکڑنے میں کامیاب ہو سکتا تھا؟ پھر میں نے  
لفظی سانس لے کر دل میں اپنے آپ کو سمجھایا کہ بعض  
ایسے مشکل کام جو بڑے بڑے شاطر لوگ تمام تر چالاکی کے ساتھ  
بھی انجام نہیں دے پاتے وہ نہایت سیدھے سادے انداز میں  
ہو جاتے ہیں۔

"گودام کا دروازہ کیسا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔  
"کھڑکی کا ہے۔ جیسے عام طور پر پرانے مکانوں میں ہوتے  
ہیں۔ درخت والا۔ کافی مضبوط ہے" اس نے جواب دیا۔  
"کوئی اور دروازہ لگ کر بھی ہے گودام میں؟"

"بالکل نہیں سزا" وہ غصے سے لہجے میں بولا "اس لئے تو میں نے  
گودام کو منتخب کر رکھا تھا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں کچا کام کر کے  
نہیں آیا ہوں۔ ابھی تو میں نے آپ کو ان مزید احتیاطی اقدامات  
کے بارے میں نہیں بتایا جو میں کر کے آیا ہوں۔"

"اچھا۔ تو تم نے مزید احتیاطی اقدامات بھی کئے ہیں" میں  
نے قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ مجھے بار بار شبہ ہونے  
لگا تھا کہ دیکھ اتنا احمق نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ احمق نظر آتا شاید  
اس کی لاشعوری کوشش تھی۔ شاید اسے احساس تھا کہ احمق نظر  
آنے میں زیادہ فائدہ نہیں ہیں۔ قدرت نے اس کا چہرہ ایسا نہیں  
بنا تھا۔ شاید وہ بڑی کوشش سے اپنے چہرے پر مہارت طاری کئے  
رکھا تھا اور اب اس کام میں بہت ماہر ہو چکا تھا۔ قدرت نے اسے  
اچھا بنا دیا۔ سم چھوٹا کیا تھا لیکن اس نے شاید جان بوجھ کر اس  
پر کچھ اور ہی طرح کا رنگ چڑھایا تھا۔ یہ حوصلہ بھی ہر کسی میں  
نہیں ہوتا۔ لوگ تو احمق ہونے کے باوجود بہت بڑے دانشور اور  
عزت نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہر حال دیکھ کے بارے میں  
ابھی تک میں کوئی یقینی اور حتمی رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔

”ہمدردی امارا ہاتھ سے چوٹ گیا تھا صاحب! ام کو سنبھالو موقع بھی نہیں ملا۔ وہ اور نظر آئی اور اور بجلی کا مافوق کا ڈیڑھ منٹ کر غائب ہو گئی۔ اور پھر آپ ام کو بولا بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے کہ نہیں مارا ہے۔ ابی اگر ام کو خبر ہوئی کہ چور ڈاکو اسے ام ایک منٹ میں اس کو کوئی مار کر لٹا دیتی۔ ابی ام کو خبر نہ تھی کہ وہ حرا خور کا بچی اسے کون؟ ام سوچا کہ ام اس کو کوئی مارے اور آپ ام سے پوچھا کہ ام کو تو وہ زندہ چاہئے۔ تو ام کیا کر گیا اس نے کوئی بہت اہم سوال اٹھاتے ہوئے جواب طلب نظر سے دیکھا۔

”چھوڑو یا تم بالکل بے کار آدمی ہو۔“ دوسم بد مزگی بہ بولا۔

اب خان صاحب جوش میں اٹھ بیٹھے اور فرط جذبات سے دوسم کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوئے بولے۔ ”امارے بے عزتی خوار مت کرو صاحب! ابی ام کو بتاؤ۔ جب سے ام اس کا رخائے پر پڑا ہے اسے ابھی تمہارا کارخانہ یا گودام میں چوری ہو؟“ انا کا پڑا؟“

”نہیں۔ چوری وغیرہ تو نہیں ہوئی لیکن۔۔۔“

”لیکن دیکھ کو چور۔۔۔ چوکیدار کا کام اے جان مال حفاظت سواہ ام کرتی اے اور کرتی رہے گی۔ اس مالے میں ام کچھ خرابی نہیں تھا۔ تم اگر ام کو صحیح طرح بتانا تو ام کچھ کوشش کرنا۔ ابی مہر کرو۔“

مہر تو واقعی صرف دوسم نے ہی نہیں میں نے بھی کر لیا تھا میں نے دروازے وغیرہ کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ چوکیدار کچھ نا مضبوطی سے دیوار میں نصب نہیں تھی۔ عام آدمی تو شاید دو بجے بھی مل کر اسے دھکیل کر نہ اکھاڑتے لیکن معاملہ ان سے نا قدر اس کے بارے میں یقین سے نہیں لگا جاسکتا تھا کہ وہ کیا کچھ کر تھا۔ دیکھو اس چوکیدار کو اکھاڑنا سہرا حال نامکانات میں سے تھا۔ شاید میرے لئے بھی یہ کچھ ایسا مشکل کام نہ ہوتا۔ گودام کے رکھے ہوئے چیلوں اور ریز کے خنوں کے بڑے بڑے کارشن بھی بالا ہو چکے تھے گھر ادھر اٹلے پڑے تھے۔

دوسم سر کھباتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔ ”تو کیا واقعی میرے جانے کے بعد ہوش میں آگیا تھا؟ اور کیا واقعی یہ دروازا اسی کی کھلوں سے اکھڑا ہے؟“

”نہیں۔ شاید اس گودام میں رہنے والے کسی آسیب نے! کی مدد کی ہو یا پھر وہ اپنی روحانی قوتوں سے کام لے کر نکل گیا ہو۔ میں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔“ اب اس قسم کی باتیں کر کے اگور میرا مزید دل نہ جلاؤ۔ مجھے اب اجازت دو۔“ میں گودام نکل آیا۔

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے منظرانہ لمبے میں بولا۔ ”سہرا! معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا لیکن پلیز نہ ناراض نہ ہوں۔ میں نے اپنی سی کوشش کی تھی۔“

قریب سے گزرتے ہوئے ایک کچے راستے پر سڑک بڑی سی چار دیواری کے عقب میں پیچھے تو میرا ہاتھ ٹھکا۔ صورت حال اس سے کچھ مختلف نظر آ رہی تھی دوسم چھوڑ کر گیا تھا۔

اس نے بھی گزریا کو محسوس کر لیا تھا اور اس کا منہ ایک بار پھر ہونٹوں والے انداز میں کھل گیا تھا۔ اس نے گاڑی روک لی اور ہم دوڑتے ہوئے گودام تک پہنچے۔ مجھے دوسم کے جانے سے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ گودام کا دروازہ کون سا تھا کہیں کہ دروازہ چوکیدار سمیت زمین پر پڑا ہوا تھا اور چوکیدار چارپائی پر ادھر جا پڑا ہے ہائے کر رہا تھا لیکن غیبت یہ تھا کہ وہ زندہ سلامت تھا۔ دو مزدور ٹائپ آدمی اس کی کمر باندھے تھے۔ دو تین اس شکاف کے قریب کھڑے تھے جس میں اب دروازہ نہیں رہا تھا۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے گودام میں جھانکنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن دوسم دوڑا دوڑا میں پٹ کے دروازے تک پہنچا اور اچھی طرح اندر کا جائزہ لے کر آیا گویا اسے توقع رہی ہو کہ کسی مجھے کے تحت اسے نہ اسے کہیں پڑا بغیر آجائے گا۔ وہ جب چوکیدار کی طرف پلٹا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ چوکیدار اسے اپنی طرف آنا دیکھ کر ذرا زیادہ زور سے ہائے ہائے کرنے لگا۔ اس کی پرانی سی تھری ناٹ تھری چارپائی کے سارے کھری تھی۔ دوسم کے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ خود ہی صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا۔ ”وہ خانہ خراب کا بچی باگ مٹی صاحب!“

دوسم کی آنکھیں ٹینگ کے موٹے موٹے پیشوں کے عقب میں پہلے ہی کی طرح گول گول سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ ادھیڑ عمر بھاری بھر کم اور صاحب تو نہ چوکیدار کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”کون بھاگ گئی؟“ وہ گویا قحط سے کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دلی وال خور کا بچی صاحب! جس کو آپ اندر بند کر کے گیا۔“ وہ کراچے ہوئے بولا اور اندر گرجھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پھر اس نے گھر ہاتھ رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ سی نظروں سے دوسم کی طرف دیکھا اور لینے لینے ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ طوفان میل تھی صاحب! ام اپنی پوری زندگی میں اتنا چھوٹے آدمی میں ایسا بلاق مافوق طاقت نہیں دیکھا۔“

”وہ کب ہوش میں آگیا تھا؟“ دوسم نے بدستور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے تو آپ کے جانے کے دو تین منٹ بعد ہی دوبارہ دروازے پر ٹکا ٹک شروع کر دیا تھا صاحب! ام اس کو بورت بولا کہ حرا خور کا بچہ! آرام سے بیٹھو۔ مگر صاحب! ڈرا دیں بعد دروازہ ہمارے اوپر آگئی۔ آپ امارا بات کا یقین کرو صاحب! ہمارا تو کمر تخت تخت ہو گیا۔“ اس نے ایک بار پھر کمر ہاتھ رکھ کر کرائے ہائے شروع کر دی۔

”تم نے اس پر مٹی نہیں پلائی؟“ دوسم نے پوچھا۔





معاملے بالکل لا حلق کر دیا گیا تھا۔

سرکاری ایجنسیوں کے وسائل بے شمار تھے۔ ان کے ہاتھ ہتھیار، تحاریر، اخبارات تھے۔ اگر میں ان کی تحقیقات سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو میری معلومات یقیناً کچھ نہ کچھ اضافہ ہو سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید انہوں نے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم کر لیا ہو۔ شاید وہ اس مسئلے میں صحیح راستے پر چل نکلے ہوں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس ضمن میں سب سے پہلے اکرام علی سے ملاقات کر کے دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے؟ میں نے اس کے لئے اوہرا دھرون کے قریب چلا کر اسے ایک قلعے میں رکھا گیا ہے اور تحقیقات جاری ہے۔ ڈی آئی کی صاحبہم مجھے اس سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کے لئے مجھے وزارت داخلہ سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا پڑے گا۔

یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ حفیظ صاحب ان دوران غیر ملکی دورے سے واپس آچکے تھے اور اسلام آباد میں تھے۔ مجھے اسلام آباد فون کے ان سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ پہلے میں نے ان سے پوچھا کہ انہیں سازش کی کوئی تفصیل معلوم ہوئی تھی یا نہیں؟

وہ عدم دلچسپی سے بولے۔ ”میرا خوراک میں آج ہی تو غیر ملکی دورے سے آیا ہوں۔ مجھے فرصت ہی نہیں ملی اس طرف توجہ دینے کی۔ ویسے بھی ابھی اس معاملے کو چند روز ہی تو ہوئے ہیں۔ سرکاری مشینری تو بعض اوقات ایسے معاملات میں میڈیاں اٹھتی رہتی ہے۔“

میں نے انہیں بتایا کہ میں اکرام علیک سے ملنا چاہتا تھا اور اس کے لئے وزارت داخلہ کا خصوصی اجازت نامہ درکار تھا۔ وہ فحش سانس لے کر بولے۔ ”وہ میرا ڈیپارٹمنٹ تو نہیں ہے لیکن بہر حال میں اس فحش میں فون کر دیتا ہوں۔ وہ بے چارے ہماری کوئی بات ٹالتے نہیں۔ ہمیں کل کو ریسر سروس سے اجازت نامہ موصول ہو جائے گا۔ لیکن تم اس غیبت سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”سرا آپ تو اس معاملے میں کوئی دلچسپی لے نہیں رہے۔ میں نے سوچا، میں ہی جا کر دیکھ لوں کہ تحقیقات کہاں تک پہنچی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم تو خود مجھے کوئی خفیہ ایجنسی معلوم ہونے لگے ہو۔“ وہ بولے۔

”کیا کریں سر! ہم بے چارے عوام کو سرکار کے حصے کا بھی کچھ کام کرنا پڑتا ہے نا۔“ میں نے جواب دیا۔

”جلو۔ تم اپنا شوق پورا کر لو۔“ وہ خوشی سے بولے۔ ”مجھے اپنے کچھ ضروری کو آف ٹاؤن۔ ہمیں جو اجازت نامہ جاری کیا جائے گا اس میں وہ کو آف ورنج کئے جائیں گے۔“ انہوں نے چند

یہ چکر مارا تا کہ وہ نہیں ہے جتنا آج ثابت ہوا ہے شاید اسے اپنے اس عظیم الشان جھگڑے کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آ رہا کہ وہ اتنا مختصر الوجود اور کم ہنر کا فرسٹ کزن نظر آئے والا شخص اس کے سامنے سے نکل گیا اور یہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لئے یہ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اب میں اتنا احتیاط بھی نہیں کرتا جتنی بات نہ سمجھ سکوں۔“

”فیصلہ میرے خیال میں تو تم ہرے سے احتیاط ہی نہیں۔“ میں نے گاڑی کی طرف بدھتے ہوئے کہا۔ ”لوگ گیٹ آپ کر کے شکل بدلتے ہیں۔ تم نے اس طرح بدلی ہوئی ہے۔“

وہ خاص شاعرانہ انداز میں آداب بجا لاتے ہوئے بولا۔ ”وقت فرازی اور بندہ شای ہے آپ کی۔ اگر آپ نے اسی طرح میری امت افزائی اور قدر شناسی جاری رکھی تو میں ضرور کچھ نہ کچھ بن جاؤں گا۔“

میں گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے گھر آیا۔ اس کے بعد چند دن ذرا سکون سے گزر گئے۔ کاروباری مصروفیات کے علاوہ کوئی خاص مصروفیت نہ رہی۔ ایڈم عرف ایڈی نے بھی دوبارہ رابطہ قائم نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سیم نے اسے سن کر پکڑنے کی جو کوشش کی تھی اس کے بارے میں ضرور وہ فون کر کے تصدیق کرنا چاہے گا کہ کیا یہ میری ذہانت پر ہوا تھا۔ لیکن اس کا فون نہیں آیا۔ خود اسے سننے سے بھی رابطہ قائم کرنے یا شکل دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ ساری پچھل ذہن اب چلی گئی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی پھڑکی پک رہی تھی۔

ایڈم نے ہنسی سے فون پر بات کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس وعدے پر عمل نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کے وعدے پر یقین بھی ذرا کم ہی تھا۔ مجھے ہنسی کے بارے میں ذرا تشویش ضرور تھی لیکن ساتھ ہی نہ چاہنے کیوں امید ہی تھی کہ وہ لوگ اس پر تشدد نہیں کریں گے۔ کم از کم اس حد تک ایڈم نے سچی سچی کہا تھا کہ غداری کے باوجود وہ ان کے لئے ایک قیمتی اثاثہ تھی۔ اس پر ان کی خاصی محنت ہو چکی تھی اور جن چیزوں پر وہ محنت کر چکے ہوتے تھے انہیں ضائع کرنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

مجھے یہ سکوت اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ کاروباری مصروفیات اپنی جگہ تھیں لیکن ان کے دوران بھی ذہن بار بار دوسرے معاملات کی طرف چلا جاتا تھا۔ خصوصاً یہ احساس ایک بار بار سامنے لگا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی میرا کسی صورت ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ ہر ایک روز مجھے اکرام علیک یاد آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ خفیہ ایجنسیاں اس سے جو تحقیقات کر رہی تھیں اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ مجھے سے تو کسی نے کچھ پوچھنے کے لئے بھی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ قارئین حفیظ صاحب کے ذریعے اپنے آپ کو ہر معاملے سے بری الذمہ قرار دلوانے اور تحقیقات سے فحش رہنے کا قاعدہ تو ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ نقصان بھی تھا کہ مجھے اس

قلے کی سیر کرانے کی ہدایت نہیں کی گئی۔ قلے کے دو حصے دوسرے ہیں جو سیر کرنے کے قابل ہیں اور عوام کے لئے کھلے ہیں۔ یہ ایک الگ دنیا ہے چوہدری صاحب! یہاں پہلو بہ پہلو دو الگ جہان آباد ہیں۔ یہ دوسری دنیا آپ کی نظر سے اوچھل ہی رہے تو ہنستے ہیں۔ وہ اپنے ماعت کے ساتھ باہر چلا گیا اور دیر تک واپس نہ آیا۔ اس دوران کمرے میں مختلف یاد دہانی اور بے دردی لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ چوتھوں لوگوں کی صورتوں پر مجھے ایک عجیب سی کرنٹنگ اور خشونت نمایاں محسوس ہوئی۔

ڈی ایس بی کمرے میں واپس نہیں آیا۔ کافی دیر بعد ڈھیل ڈھال لیلیٹیا کی شلوار قمیض والا ایک جلاوطن صورت سا آدمی اندر آیا اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری محمد افضل آپ ہی ہیں نا؟“

میں نے انہماک میں سر ہلایا تو وہ گویا میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے بولا۔ ”آئیے۔۔۔ اکرام بیگ سے آپ کی ملاقات کرا دیتے ہیں۔“

میں اس کی رہنمائی میں کمرے سے نکلا تو وہ مجھے ایک راہداری میں گھما کر اسی کمرے کے عقب میں ایک راتے میں لے گیا۔ وہاں دو ادول پر میل اور کالی سی جی ہوئی تھیں۔ نئی اس قدر تھی کہ کہیں کہیں بانی اوس کی طرح چمک رہا تھا۔ موسم ٹھنڈا نہیں تھا مگر

میں پوچھیں جو میں نے انہیں بتا دیں۔  
”دوسرے دو گورنر سروس سے مجھے خط مل گیا اور میں اسی اہم قلے جا پہنچا۔ قلے کا جو حصہ تقیتی شیل کے طور پر استعمال آتا تھا وہاں ایک دیر قامت اور سانولے سے ڈی ایس بی نے میرا استقبال کیا۔ اس کے آفس میں تنگیا سا اندر جہا تھا۔ ملاخوں والی فزیکل سے بہت کم بدشعنی اندر آدمی تھی۔ اس کی میز کے گرد کڑی کی بھاری بھر کم کرسیوں پر اسی جیسے سانولے اور گرفت صورت سے تین چار آدمی سر جھکائے کچھ پڑا سراسر سے انداز میں خاموش بیٹھے تھے۔“

میرا اجازت نامہ دیکھ کر ڈی ایس بی سر اٹھاتے ہوئے ہلکی سی گواہی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ اجازت نامہ آج سے ہی کارآمد ہے۔ پھر بھی اگر آپ ایک آدھ دن مبر کر لیتے اور ہمیں پیشگی اطلاع کر دیتے کہ آپ کتنی قیدی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو چاہا ہوتا۔ اس طرح اچانک ملاقات کے لئے چلے آتا تو اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے یہ خصوصی تقیتی شتر ہے۔ ملک بھر میں مشہور ہے۔ لیٹان کے ساتھ اکثر کشیش جاری رہتی ہے۔ بعض اوقات طرم اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ اسے ملاقاتی کے سامنے پیش کیا جاسکے۔“

”مگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ملاقات کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو میں واپس چٹا جاتا ہوں۔“ میں نے ملاقت سے کہا۔

”نہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ وہ ٹوٹی اٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ”آپ کو قصور سا انتظار کرنا پڑے گا۔“ اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ ”آپ کوئی خاص سی آدمی معلوم ہوتے ہیں جو آپ کو یہ اجازت نامہ جاری ہوا ہے۔“ میں نے زری سے کہا۔

وہ ایک شخص کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ ”میں آپ کے ساتھ ہی چلا ہوں۔ مجھے کسی مختصری ملاقات ہی کرنی ہے۔ جہاں وہ ہے وہیں مل لوں گا۔“

ڈی ایس بی عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ اس کی شخصیت کو بہت ناک حد تک سادہ رکھا جاسکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ غیظ و غضب کی حالت میں کسی معمولی اور عام سے آدمی کی طرف دیکھ لیتا ہو گا تو اس کا چہرہ شائبہ نکلا ہو جاتا ہو گا۔

اس کے مونے مونے ہونے ایک لمحے کے لئے پہنچ گئے پھر وہ سیر زرا جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”جہاں وہ ہے وہاں آپ نہ ہی جائیں تو اچھا ہے چوہدری صاحب۔ آپ سوٹ پونٹ پہننے والے معزز آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ وقت تک اپنے لئے چلے والوں کو افسانے سناتے ہیں گے ویسے بھی اس اجازت نامے میں ہمیں اکرام بیگ سے صرف آپ کی ملاقات کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔“ آپ کو

# اے حمید کے ایڈوینچر قلم سے شیوہ سینا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ = 700 روپے



اردو بازار لاہور

وہاں ایک عجیب سی نحوست، ایک عجیب سی عجیب سی بجلی ہوئی تھی جس کے اثر سے رگ و پے میں ایک سردی لہر دوڑ گئی۔ ملاقات کے لئے اکرام بیگ کسی خصوصی کمرے یا الگ جگہ پر نہیں دہیں برآمدے میں ایک دروازے تک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس بھی کوئی ایسا چیز موجود نہیں تھی جس پر بیٹھ کر میں اس سے بات کر سکتا۔ لیلیٹا کی شلوار قمیض والا جلد صورت سا آوی بیٹھ ہوئے لیجے میں بولا۔ "لیلیٹی۔۔۔ کرلیں ملاقات۔۔۔ زیادہ لمبی ملاقات مت کیجئے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اکرام بیگ کے سامنے دم بخور کھڑا رہ گیا۔ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غم و افسوس میں تھیں۔ چندی دنوں میں اس کی تو حالت بدل گئی تھی۔ پہلی نظر میں تو شاید اس کا کوئی پرانا شہنشاہ بھی نہ جان بآتا کہ یہ وہی اکرام بیگ تھا جس کے وجود میں بلبلیاں سی تہیہ محسوس ہوتی تھیں، جس سے عام آدمی کا آٹھ لاکھ لاکھ بات کرنا مشکل تھا۔ جس کے لباس سے قیمتی فراہمی ٹکڑوں کی ہلک سی آہنی تھی۔

شاید اسے یہاں لانے سے پہلے تو ذرا امت اجہتام کیا گیا تھا۔ اس کی کچھ صفائی ستھرائی کی گئی تھی لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کے بال کیلے تھے۔ چوہو سجا ہوا اور جگہ جگہ سے نیلا تھا۔ ہونٹ متورم اور کٹے پھٹے تھے۔ وہ اس طرح ناگہم پھیلائے دروازے تک لگائے بیٹھا تھا جیسے اس کے جسم میں جان نہ ہو۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہلنے کی کوشش کی لیکن بڑی طرح کراہ کر رہ گیا۔

"میری ذلت کا تماشا دیکھنے آئے ہو چہ پوری؟" وہ بھٹی بھٹی سی آواز میں بولا۔

"بعض ذلتیں مقدر میں ہوتی ہیں لیکن میرا خیال ہے بعض خود بھی خریدی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور میرے نظریے کے مطابق موجودہ ذلت تم نے خود خریدی ہے۔ تم ایک نفیس انسان کے ساتھ بہترین عرصے پر کام کر رہے تھے۔ بہترین مراعات، سوتیلیں اور دنیا بھر کی نعمتیں تمہیں حاصل تھیں۔ تم نے خود ان سب پر لات مار دی۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے یہ حلیم ہے۔" اس کا لہجہ کچھ بدل گیا اور وہ موزن ہونے لگا۔ "میرے دینے والے اعزاز میں بولا۔" "میری حالت بہت خراب ہے۔۔۔ مجھے یہاں سے چھڑا دیجئے چہ پوری صاحب۔ آپ شاید تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہاں میرے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ میں زندہ کیسے ہوں! شاید بہت سخت جان تھا جو اب تک بچا ہوا ہوں۔ مجھے انٹالاک کرنا جانے کن کن چیزوں سے مارا گیا ہے۔ پلاس سے میرے ناخن کھینچے گئے ہیں۔ جسم سے بال کھینچ کر اکھاڑے گئے ہیں۔۔۔ سکرٹوں سے واقف کیا ہے۔۔۔ چہ چہ بچہ پانی پلا کر سوئے سوئے آدمی جو توں سمیت میرے پیٹ پر کوئی نہ رہے ہیں اور وہ بھی اس انتظام کے ساتھ کہ پوشاب نہ

لٹھے پائے۔ مسنوں مجھے برف کی سطحوں پر لٹایا گیا۔ میرے ہر غلطی کے توبے ہاتھ سے لگے۔۔۔ بجلی کے جھٹکے دے گئے۔۔۔ بہت سی شرمناک باتیں ہیں جو میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ایک ایک بات بھی ٹوٹ چکی ہے اور مجھے خلوص ہے کہ اگر مزید ایک دن مجھے صحیح طبی امداد نہ ملی تو میں عمر بھر کے لئے معذور ہو جاؤ گا۔ شاید مری جاؤں۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ہی چکا ہوں۔ نہ جانے آپ سے کس طرح باتیں کر رہا ہوں۔۔۔ صرف قوت ارادی کے سارے اب تو تکلیف کا احساس کر رہا ہے۔ خدا کے لئے چہ پوری صاحب۔! وہ جملہ عمل نہ سکا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

شاید بعد کوشش اس نے بو جمل پونے ذرا اٹھائے اور بار بار بہت سی اذیت بھرے انداز میں کراہ اٹھا۔ میں سمجھتا تھا ملازمین کے لئے میرا دل بھرے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا۔ بھر کے کون کون سے گوشوں میں سوہم بھی دیا ہوا تھا۔ میرے دل اس کے لئے ہر مدی کی لہر ابھری لیکن میں نے سر دت اسے دیا تاہم بات نرم لیجے میں ہی کی۔ "تمہیں جو کچھ معلوم ہے تم انہیں کیوں نہیں دیتے؟"

"تھا چکا ہوں۔۔۔ سب کچھ بتا چکا ہوں۔" اس کی آواز غم کنوں کی گڑبگڑ سے آ رہی تھی۔ "لیکن شاید یہاں انسان کی بات اس وقت بھی نہیں کیا جاتا جب وہ سسک سسک کر۔۔۔ تڑپ تڑپ کر دم توڑتا ہے۔ وہ فرائض کسے پھرتے ہیں اور؟" اور تازہ۔۔۔

"تم پولیس اور سی آئی اے وغیرہ میں فوری کر دیجئے۔ اور بھی تمہاری لائن کچھ ایسی ہی تھی۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے میں کہا۔ "کئی بار حقیقتاً تمہاری وجہ سے۔۔۔ تمہاری نظامی کی بنا کچھ نہ کچھ لوگ اسی طرح پکڑے گئے ہوں گے۔ ان کے ساتھ کیا کیا کچھ ہوا ہو گا۔ ان میں سے کچھ بے گناہ بھی ہوں گے۔ حسیہ کچھ اندازہ ہوا ان پر اور ان کے لواحقین پر کیا گزری ہوگی؟ جبکہ توبہ قصور بھی نہیں ہو۔"

"آپ مجھے جو احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ مجھے پہلے دن ہی ہو گیا تھا۔" وہ کراہا۔ "اس کی گردن ایک طرف آ دھکی جا رہی تھی۔ آواز اتنی بڑھم ہو چکی تھی کہ اس کی بات سننے کے لئے مجھے آنکڑوں اس کے پاس بیٹھنا پڑا۔ وہ کہنا کہ سی سرگود میں بولا۔ "مجھے ایسے ہی کسی بے گناہ کی یاد آئی ہے۔ میں نے کچھ سوچا بھی نہیں تھا کہ میں بھی اس مشینری کے جزیروں میں آسکا ہوں جو انسانوں کو سوکھ کے پتھر کی طرح ہیں ذاتی ہے۔ یہاں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو کبھی میرے ماتحت کے طور پر کام کر چکا ہے۔ اس نے بھی میرا کوئی لحاظ نہیں کیا۔"

"تم نے انہیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

”ریڈ ڈاٹ۔۔۔ کیا ہے؟“ اس نے چونک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اس میں شاید اذیت کے سوا کوئی اثر دینے کی سکت نہیں تھی۔  
 ”یہاں جنسین واقعی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟“  
 اس نے بے یقینی سے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ میں تو پہلی بار یہ نام سن رہا ہوں۔“ اس نے کراچے دے کر اپنا ہاتھ پلانے کی کوشش کی۔ اس کی تین انگلیوں کے ناخن اب بڑھے اور سوجا ہوا ہاتھ مردوں کی طرح بھول رہا تھا۔  
 ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں نے تیزی سے کہا۔  
 ”مجھ میں اب جھوٹ بولنے کی سکت نہیں رہی۔“ اس کی سرگوشی ابجری۔

”تو پھر تم نے کس کی ہدایت پر غارن فخر صاحب کو قتل کرنے کی سازش کی؟“  
 ”سازش وغیرہ تو میں نے کوئی نہیں کی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ سازش کہاں تیار ہوئی۔ مجھے تو بس نوٹوں سے بھرے ایک بریف کیس نے مراد دیا۔ ایک شخص نوٹوں سے بھرا بریف کیس لے کر میرے پاس آیا تھا۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ وہ مگر حقیقت صاحب تک پہنچے دوں اور اگر وہ اسے پہنچے نہ پائیں تو میں کسی نہ کسی طرح ایسی صورت حال پیدا کروں کہ وہ بی بی ایس۔ اس کے علاوہ میری ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ جو دیگر گار مرد کرے اسے خیر و عافیت سے وہاں سے نکل جانے دوں۔ بس صرف اس خدمت کے عوض نوٹوں سے بھرا وہ بریف کیس میرا تھا اور کام مکمل ہو جانے کے بعد اتنی ہی مزید رقم میرے لئے سوئٹزرلینڈ میں کھولے گئے ایک اکاؤنٹ میں منتقل ہو جاتی تھی۔“

”لیکن۔۔۔ اکرام بیگ۔۔۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“ تمہاری سروس کار کا کارڈ خاصا طویل ہونے کے باوجود بے دار ہے۔ ایک عرصے سے تم حقیقت صاحب کے سیکورٹی چیف ہو۔ اور میری معلومات کے مطابق کچھ نہ کچھ عرصے کے لئے دوسری بڑی شخصیتوں کے سیکورٹی کے عملے میں بھی شامل رہ چکے ہو۔ پہلے بھی جنسین کبھی نہ کبھی ضرور اس قسم کی پیشکشوں کے ساتھ آدھ اوریج کیا گیا ہو گا لیکن تم نہیں کیجے۔“

”ہر آدمی کا کہنے کا ایک نہ ایک دن ایک نہ ایک قیمت ہوتی ہے جب وہ دن آتا ہے وہ قیمت ملتی ہے“ آدمی ہمیں ہلکا سے۔۔۔  
 ”اور تاک ہی تو بھر کر دلا۔“ بعض لوگوں کی زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آتا۔ وہ قیمت کبھی نہیں ملتی جس پر وہ بک سکتے ہیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے اور اس خوش قسمتی کی بدولت وہ نہ بکے واسطے لوگ“ کہلاتے ہیں۔ قیمت اتنی بڑی تھی جتنا میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سوئٹزرلینڈ میں بڑے لوگوں کے اکاؤنٹس کے صرف حصے سے تھے۔ نوٹوں سے بھرے بریف کیسوں کے تارے ہوتے دیکھے تھے۔ لیکن اتنا بڑا کوئی بریف کیس بھر کر کبھی میرے سامنے نہیں رکھا گیا تھا۔ سوئٹزرلینڈ میں کبھی میرے

”اکاؤنٹ“ کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔۔۔ اور پھر کام اپنا آسان تھا۔ میں بھول گیا۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو کوچ دیا۔۔۔ حقیقت صاحب کو بچا کر جان کے مجھ پر کئی احسانات ہیں۔“  
 ”اور پھر کس قسم کماں پہنچے؟“

”تن زبردہ زبردہ لئے یہاں پڑا ہوں۔ رگ رگ میں اذیتوں کے سمندر میں گم گئے ہیں۔۔۔ کواں مردوں ایک عجیب احساسِ اذیت میں بھڑکا ہوا ہے۔ کاش میں مری جاتا۔“  
 ”اور نوٹوں سے بھرا وہ بریف کیس کہاں ہے؟“  
 ”معلوم نہیں کس ایجنسی کے قبضے میں پہنچ چکا ہو۔ اور معلوم نہیں کون کون اسے ہاتھ کرکھا جائے گا۔ کافزات میں نہ جانے اس کا ذکر آئے بھی پائے یا نہیں۔ شاید یہ کمانی کچھ اور ہی بن جائے۔ اگر ذکر ابھی کیا تو نہ جانے اس کی نایب سکر کر سکی نہ جانے سروس کے دوران میں نے ایسے بہت سے کامائے دیکھے ہیں۔“

”تو پھر کیا رہا تمہارا ایک جانا؟“ میں نے غلطی سے دریافت کیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر پٹے پر جھکا جا رہا تھا۔ اس سے زمین پر بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا اور ہلو بولنے کی بھی اس میں کچھ زیادہ سکت نہیں تھی۔  
 ایک لمبے بعد اس نے بڑی ہی تکلیف کے سے عالم میں سر اٹھایا اور درم زور بولنے لگا۔ ”میں نے تقریباً چھپتی ہوئی آنکھوں کو یہ مشکل ذرا سا کھولتے ہوئے بولا۔“ آپ کو میری کمانی پر یقین آگیا یا نہیں؟“ اس کی آواز اب سرگوشی سے بھی نہ سمجھ سکتی تھی۔  
 ”میں اس سلسلے میں ابھی اپنا فیصلہ محفوظ رکھوں گا۔“ میں نے کوئی واضح جواب نہ دیا۔

”خدا کے لئے میری باتوں پر یقین کر لیجئے۔“ وہ گواہ سب کر بولا۔ ”مجھ میں اب مزید کوئی قسم کمانے کی سکت نہیں ہے۔ میں نے تارے کے دوران اتنی قسمیں کمانی ہیں جو شاید زندگی بھر کے لئے کافی ہیں۔ بشرطیکہ میں زندہ رہ سکوں۔“  
 ”میں ایک بار پھر پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم واقعی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟“ میں نے ایک مبہوم سی امید کے سارے دریافت کیا۔

اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔ اس کے ہونٹ بھی ذہنی تھے اور مسکراہٹ بھی۔ ”ذوق سی آواز میں وہ بولا۔“ شاید آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ آپ بھی اس قلعے کے جلاوطن کی طرح ہیں۔“

”جب آدمی اپنا اقرار کھودتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال میں تمہاری باتوں پر یقین کر لیتا ہوں۔“  
 ”تو پھر آپ میری رہائی کی کوشش کریں گے؟“ اس کی بھینتی ہوئی آنکھوں میں امید کی ایک مبہوم سی کرن نمودار ہوئی۔  
 ”میرے یہی بچوں اور رشتے داروں کو تو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں

ہوں کہاں۔ جب تک کسی کو چٹا چل سکا۔ اور جب تک میرے لئے قانونی یا طبی امداد کا کوئی بندوبست ہو سکا جب تک نہ جانے میرا کیا بن جائے۔"

"یہ ایک مشکل کام ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں بہر حال اپنی کوشش کروں گا۔" اسی لئے اسے خون کی اپنی اپنی۔ اس میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ وہ کسی طرف کو جھک کر اپنی کر دیتا۔ اس کے کپڑے کچھ اور تھکے غلیظ خون کریان میں چلا گیا۔ وہی نیم نیم اور سیاہ قام شخص جو مجھے وہاں چھوڑ کر گیا تھا اچانک ہی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہوا اور اس کی نظروں میں اچھوٹے سے ایک بچے کی طرح اسے جھٹکے سے پیچھڑی کے ساتھ اٹھاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب آپ جا نہیں سکتے۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔"

دوسری طرف سے اسی قبیل کا ایک اور شخص آیا۔ وہ دونوں اکرام بیک کو تقریباً گھینے ہوئے اندر کی طرف لے گئے۔ آفس میں آکر میں نے ایک رجسٹر میں دیکھا کہ اپنے انگوٹھے کا نشان لگایا اور باہر گیا۔ پورا محل دل کے ساتھ جب میں گاڑی میں بیٹھ کر قلعے کے عقب میں پہنچا تو ٹھیک معمول کے مطابق جاری تھا۔ وہی گاڑیوں اور انسانوں کا ڈراما تھا۔ وہی زندگی کی جابھی اور بگاڑ خیزی تھی۔ بلند بالا قلعے کی بن پٹ کی چھوٹی چھوٹی نیم تاریک کھڑکیوں اور کالی زرد دیواروں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ روز نظر آنے والی مانوس چیزوں میں شامل تھا۔ شاید کبھی کسی کو خیال بھی نہ آتا ہو کہ سٹین اور کالی زرد ان دیواروں کے پیچھے نیم تاریک کوٹھریوں اور بے ہوش خانوں میں کسی دنیا آباد ہے۔

مجھے ڈیوس ملڈ پر ایک آفس میں کچھ کام تھا۔ میرا ارادہ اسٹیشن کی طرف سے محکمہ کر جانے کا تھا۔ دو سو روپے پل کے قریب جب میں مسئلہ پر روکنے کے لئے گاڑی کی رفتار کم کر رہا تھا تو مجھے ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ سڑک کے کنارے کا ڈرائیو کی جیکٹ کی جیپوں میں ہاتھ ڈالنے سے نہ کسی قلمی بیرو کے سے امداد میں کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اس کی شخصیت کے ساتھ قلمی بیرو والا انداز اپنے اندر ایک مضحکہ خیز تضاد رکھتا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ میں ادھر سے گزروں گا اور وہ میری گاڑی کے انتظار میں تھا۔ اس نے دوسری سے مجھے دیکھ لیا اور ہاتھ ہلا کر کہنے کا اشارہ کرنے لگا۔ میں ایک طویل سانس لے کر نہ گیا۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ میں نے اس کی ناش میں ہر کارے دوڑا رکھے تھے اسے کسی نہ کسی طرح پکڑنے اور قابو میں کرنے کے احکامات جاری کر رکھے تھے اور وہ خود ایک پُر جھوم سڑک پر گاڑی ہوئی دھول میں کھڑا مجھے ہاتھ دے کر روک رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس کے قریب لے جا کر دی اور وہ کچھ اسی

طرح دودازہ کھیل کر میرے برابر آن بیٹھا جیسے ویران سڑک کھڑی کوئی مشکوک سی حینہ کسی امیر زادے کی گاڑی میں بیٹھا ہو۔

دودازہ بند کر کے اس نے اتر کھڑکھڑ گاڑی کی خشکی میں کمر سانس لی اور پُر سکون لمبے میں بولا۔ "شکر ہے پارچہ دوسری قسم ملتا ہی آگئے ورنہ میں سوچ رہا تھا یہاں کی دھول مٹی چاک چاک میرا تو ناک نہ بند ہو جائے گا اور مجھے کانوں سے سانس لینا پڑے گا۔"

امداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میرا بے تکلف دوست تھا اور میں اسے وہاں لے کر تاکا رہا ہوا تھا۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا لیکن میری نظروں سے بے نیاز اپنی جیب سے ایک ٹیس سی گھسی نکال کر اپنی لمبی لمبی زنجیریں درست کرنے لگا۔

میں نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھانی تو وہ تھکی جیب میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے۔ بہت چپ چپ ہو۔ کیا اکرام بیک سے ملاقات خوشگوار نہیں رہی؟"

ایک لمبے کے لئے تو میری کوپڑی محوم گئی۔ آخر یہ لوگ کیا چیز تھے؟ نہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں اکرام بیک سے ملاقات کے لئے گیا ہوں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں ادھر سے گزروں گا۔

"اکرام بیک سے بہت کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں ریڈ واٹ کے بارے میں۔" میں نے پوچھی کوئی خاص غور کے بغیر ہوا میں تہ چھوڑا۔

وہ مجھے بچوں کی طرح پچھارتے ہوئے بولا۔ "سب تم جوان ہو چکے ہو۔ اب تمہیں اس طرح بچوں والے بلف نہیں کرنے چاہئیں۔ اکرام بیک بے چارہ ریڈ واٹ کے بارے میں کسی کو کیا بتائے گا؟ جب اسے خودی کچھ معلوم نہیں۔ وہ تو قرانی کا بکرا تھا۔ سلاٹر ہاؤس پہنچ گیا۔"

میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اکرام بیک نے مجھے جو کچھ بتایا ٹھیک ہی بتایا تھا۔ اسے نہ بالکل براہ راست پھر کر دینی بے نیازی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "صبح کو اکرام بیک کو۔ میں نے اس کے بارے میں جاننے کے لئے تم سے ملاقات کی زحمت نہیں کی۔"

"تو پھر کس لئے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے؟" میں نے ذہریلے لمبے میں پوچھا۔

"اس پچھنے والے بڑے کو تم نے میرے پیچھے لگایا تھا؟" اس نے کبھی سی خشکی سے پوچھا۔ میں کچھ کیا کہ اس کا اشارہ سیم اندر کی طرف تھا لیکن میں نے ایک بار پھر انہیں بننے کی بجلی پکلی سی کوشش کر ڈالی حالانکہ مجھے معلوم تھا اس مافوق الفطرت سے قوی کے سامنے اس قسم کی کوششیں بے کاری تھیں اور میں ان کو حشوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر کبھی سی کھیا بٹ بھی محسوس کرتا تھا۔ پھر بھی غیر ارادی طور پر میں یکدم اعتراض نہیں کر پاتا تھا۔

”کون جیسے والا ہے؟“ میں نے محسوسیت سے پوچھا۔  
 ”ایک تو ہمیں غیر ضروری موقعوں پر انجان بننے کی بڑی عادت ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“ وہ ہنسنی سانس لے کر بولا۔ اس نے تقریباً وہی بات کہہ دی تھی جو میں خود ہی محسوس کر رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس پھندے ایک لمحے کے لئے مجھے چکر دے دیا تھا۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی شکل پھندوں جیسی تھی لیکن گودام میں بند ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں جڑ کاٹا گیا ہوں۔ اس گدھے کو دیکھو۔۔۔ بعد میں گودام میں جیسے چھوڑ کر مجھے بے ہوش کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ یہ تم نے کس قسم کی چیزیں پال رکھی ہیں؟“  
 ”پالنے والی اللہ کی ذات ہے۔۔۔ میں کون ہوتا ہوں پالنے والا۔“ میں نے دہرایا۔

”وہ تمہارے دوستوں میں سے نہیں ہے؟“ اے فن ورتن سے بولا۔ ”تمہارے جو دو چار آدمی میں نے دیکھے ہیں وہ تو بڑی ٹھیک ٹھاک چیز لگتے ہیں۔ کام کے لوگ ہیں۔ لیکن اس بے چارے کو معلوم نہیں تم نے کس چکر میں میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ شکر کہ میرے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچ گیا۔ آئندہ ایسی کسی مخلوق کو میرے پیچھے مت لگانا۔“  
 ”جیسے کیونکر خیال گزرا کہ اسے میں نے تمہارے پیچھے لگا دیا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”تمہارے سوا اس شہر میں اور کسے ہماری ذات سے اتنی دلچسپی ہے؟“ وہ ہنسنی سانس لے کر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ پھندے گودام میں بند کرنے کے بعد دوڑا دوڑا تمہارے پاس ہی گیا تھا کیونکہ مجھے رپورٹ ملی ہے کہ بعد میں تم اسی جگہ اسی ہوتی کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔ میرا وہاں واپس جا کر اس پھندے کو اٹھالینے کا ارادہ تھا لیکن جب مجھے پتا چلا کہ تم اس کے ساتھ دیکھے گئے ہو تو میں نے ایک سو دو بھر کی مہر کر لی تھی، بہتر سمجھا۔ میں ویسے بھی بلا ضرورت کسی کو ہلاک کرنا پسند نہیں کرتا اور وہ تو مخلوق ہی ایسی تھی کہ اسے ہلاک کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ جس آتا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تمہارے حکم کا ظام دکھائی دیتا ہے تو اسے بالکل ہی بخشا دیتا۔ آخر تم دوست ہو تمہارے تمہاری عافیتیں ہم معاف نہیں کریں گے تو کون معاف کرے گا۔“

”تپ کا یہ احسان بندہ مرتے دم تک نہیں بھولے گا۔“ میں نے شرفِ طاقت بخشا تھا؟“

”نہیں۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ تم کیوں مجھ سے ملنے کے خواہشمند تھے اور اس کے لئے ہمیں ایسے اگلے سیدھے طریقے اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ جس میں اگر اس خادم کی ضرورت ہو تو تم براہِ راست مجھے طلب کر سکتے ہو۔ میں سر کے غل

تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ وہ بڑی محبت سے بولا۔  
 ”پہلے کی طرح سب مشین گن سے گولیاں برساتے ہوئے آؤ گے یا راکٹل کا بٹ مار کر کھوپڑی توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے؟“ میں نے بدستور سنجی سے کہا۔

”ارے نہیں یارا۔“ وہ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ ”اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اب ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ وہ کچھ اور مراحل تھے ان کا کچھ اور پس منظر تھا۔ تاہم اس وقت بھی ہمیں ہلاک کرنا مقصود نہیں تھا۔ اب حالات کچھ اور ہیں۔ اب تو تم ہی کچھ مارا کرو گے تو کرو گے، ہمارا تو اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم پھندے دل سے ہمیں مجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ ہم تو بڑے اس پسند لوگ ہیں۔“

”زیادہ اونچے درجے کے بد معاش اور بین الاقوامی دہشت گرد ایکٹریہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ وہ بڑے اس پسند ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہماری اس پسندی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ آج تک ہمیں یا تمہارے کسی ساتھی کو ہمارے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچا۔“

”بھی تم کہہ رہے تھے کہ اگر میں تمہاری ضرورت محسوس کروں تو ہمیں بلا سکتا ہوں۔ مگر کس طرح؟ میرے پاس تو تم سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایہ تم تو اکثر کہیں فون کرنا دیتا ہے“ اس سے کہہ دیا کہ وہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔ مجھے فوراً پیغام مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر تم مجھ سے ملنے چلے میں زیادہ سنجیدہ دکھائی دے تو ہمیں ایسا ٹرانزیشن بھی دیا جاسکتا ہے۔“ اس نے اپنی جیکٹ کے ایک ٹخن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ٹخن ساڑ میں ایک روپے کے ٹکے جھٹکا تھا۔ اے فن سے جب پہلی بار گراؤ ہوا تھا تو ایک ٹرانزیشن میرے ہاتھ لگ چکا تھا جسے میں نے کھول کھال کر دیکھنے میں خراب کر دیا تھا۔

اے فن کے انتہائی مکار ہونے میں تو مجھے کوئی شک ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے کوئی ایسی چیز نہیں دے سکتا تھا جس سے مجھے ان لوگوں کا سراغ پانے میں کوئی مدد ملتی۔ ایک بار ایٹم بھ سے فون پر بات کر رہا تھا تو میں نے معلوم کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کس نمبر سے بول رہا ہے۔ اور اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے چکر دیا تھا کہ وہ کسی ایسے نمبر سے بول رہا تھا جس کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔

میں نے چلے کئے سے انداز میں کہا۔ ”میں رہنے دو۔ اب تم اپنے حسین بھی نہیں ہو کہ میں تم سے ملنے کی آرزو میں غصے نہ لگوں۔“

”وہ وقت آنے ہی والا ہے جب تم ہم سے ملنے کی آرزو میں ترپنے لگو گے۔“ وہ کسی بندر کی طرح مسکراتے ہوئے بولا۔

”خدا مجھے وہ وقت نہ دکھائے۔ میں نے یہ آواز بلند اور صدق دل سے دعا کی۔ اسی دوران ٹیوس روڈ پر اس فزکی عمارت آگئی جس میں مجھے کام تھا۔ میں نے گاڑی اس کی طرف موڑنے سے پہلے رٹارڈر پائلٹ کم کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس عمارت میں کام ہے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

اس کا استخوانی ہاتھ کسی آنٹی بچے کی طرح اسٹیرنگ و میل پر آٹن جما اور وہ سوار بیچے میں بولا۔ ”میدھے چلتے رہو۔ اپنا کام کسی اور وقت اختیار کرو۔“

”تمہیں کیونکر یقین ہے کہ میں تمہاری بات مان لوں گا؟“ میں نے گاڑی روکے ہوئے پوچھا۔

”میری بات ماننے کے سوا تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ تمہاری گاڑی کے نیچے ایک ریموٹ کنٹرول پلاسٹک بم چپکا ہوا ہے۔ ریموٹ کنٹرول جس جگہ موجود ہے وہاں تم بھی نہیں بچ سکتے۔ وہاں ہماری اس تمام فٹنگ کا ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے اور اگر اس فٹنگ کا اختتام میرے بولے ہوئے ایک کوڈ روڈ پر نہ ہوا تو بم پھٹ جائے گا۔ اگر اس بم کو دہاں سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی تب بھی وہ پھٹ جائے گا۔ اسے وہاں سے بہ حفاظت الگ کرنے کا طریقہ صرف مجھے معلوم ہے۔ میرے کوڈ روڈ کے بغیر اگر تم نے گاڑی سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تب بھی بم پھٹ جائے گا۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ تم بھی تو مرو گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میری تو کوئی بات نہیں۔ میں تو اپنی طبی عمر پوری کر چکا ہوں۔ پوسٹ میں بی رہا ہوں لیکن تمہاری اس نئی جی اور کارکنڈ جوائی کے ضائع جانے کا تو ایک زمانے کو افسوس ہوگا۔“ وہ تریبانہ لیجے میں بولا۔ ”اور اس بات کو اپنے بلف کی طرح مت سمجھنا۔“

میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ رسک نہیں لینا چاہئے۔ ذرا آگے جا کر میں نے کہا۔ ”تم لوگ الیکٹروکس میں بہت آگے ہو۔“

”ہم برجز میں بہت آگے ہیں۔ سبیل جول بڑے گا تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم تمہیں بھی بہت آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ صرف تمہارا ذہن تھوڑا سادہ لے جانے کا انتظار ہے۔“

”میں پہلے بھی کئی مرتبہ پوچھ چکا ہوں آخر مجھے کہاں لے جانا چاہئے ہو؟ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیجئے؟“ میں نے جھجھکا کر پوچھا۔

”بہت جلد ہمارے بڑے تم سے آئے سائے بیٹھ کر بات کریں گے اور اس اب وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔ میں یہ باتیں کہنے کا حجاز نہیں ہوں اور مجھے کچھ زیادہ معلومات بھی نہیں ہیں۔“

”تو پھر میری گاڑی میں سوار کیوں ہوئے تھے؟ محض کچھ دیر

جو اس کرنے کے لئے؟“ میں نے چاہتا تھا۔

”یہ جو اس نہیں یہ سب ضروری باتیں ہوتی ہیں۔“ تنبیہ کی گئی تھی۔

”مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ اتنی فضول باتوں کے لئے تم اپنا احترام کرتے ہو۔ کہیں گاڑی کے نیچے ریموٹ کنٹرول بم لگا ہوا کہیں کوڈ روڈ طے کرنا۔“ میں نے قہر میں لہجے میں کہا۔

”تمہارے لئے یہ تقریباً معمول کے کام ہیں۔“ وہ بے پرواہ سے بولا۔ ”تم سے ملتے وقت تھوڑی بہت امتیاز تو رکھنی پڑتی ہے۔ تمہارے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ تم کب کیا کر سکو۔“

”میری نقل و حرکت کے بارے میں باخبر رہنے کے لئے میرا خیال میں تم لوگ الیکٹروکس سے ہی سب سے زیادہ مدد لیتے ہو؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ مگر اس کے علاوہ بھی بہت سے ذرائع ہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا ”زور موڑ لو۔“ اس نے ہلکا آہی آہی اسے آفس سے اہرل کی طرف ہڑنے کا اشارہ کیا۔

”ارادے کیا ہیں؟ مجھے انہیں اگروا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ ہنس کر بولا۔ اس کی ہنسی میں بھی بے حد رک خفاہٹ کی جھلک تھی۔ ”تمہیں ہم برقی ہوش و حواس اور جاگتی آنکھوں کے ساتھ انہیں اگروا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ہمارے بھی نہ جانے کس کس قوی کو لے لیجئے۔ اور خود کو بھی ہلاکت میں ڈالو گے۔“

پھر وہ تھیں آہستہ لہجے میں بولا ”تمہارے اعضاء کی مضبوطی کا تو میں شروع سے قائل ہوں۔ اس وقت کچھ اور قائل ہو رہا ہوں۔ تم ایک ایسی گاڑی میں سفر کر رہے ہو جس کے نیچے بہت طاقتور پلاسٹک بم فٹ ہے۔ تمہیں کوئی خوف یا بے چینی محسوس نہیں ہو رہی؟“

”خوف یا بے چینی کا کیا فائدہ؟“ میں نے بے نیازی سے آ ”اور والے نے اگر موت لکھی ہوئی تو اسے میں روک نہیں سکتا اور پھر میرے ساتھ تم بھی تو ہو۔ اگر مرا تو تمہیں ساتھ لے کر دے مروں گا۔“

”میں ہمیں روک دوں۔“ اچانک اس نے ایک جگہ سڑک کے کنارے موجود درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے گاڑی وہیں ٹکیے اندر سے میں روک دی۔ ایک لمبے کے لئے ہم دونوں بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ صرف انجن کی نمایاں بجلی کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔

”تم پر کیا یاقین کر گیا ہے؟“ بالآخر میں نے پوچھا۔

وہ میرے الفاظ پر دھیان دیئے بغیر بولا ”بیویوں طرکی ایک کردہ ہمارے قناب میں تھی۔ لیکن وہ آگے نکلتی چلی گئی ہے اور قناب ہو چکی ہے۔ واپس بھی نہیں آئی اور آگے جا کر بھی گھیر

میں رک گیا اس میں تمہارا آدمی تھا؟  
 حضرات جن جن پر یہ رہے ہیں میں نے خالص انتظامات  
 دینی کی کر دیئے ہیں۔ میں نے جواب دیا میں نے اب اپنے  
 نہیں کر اپنے عقاب میں رہنے سے منع کر دیا ہے۔  
 بہت غریب بالکل ٹھیک کیا تم نے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں

تھا۔  
 اگر وہ بیرون کر دیا غائب ہو چکی ہے تو ہمیں کچھ لینا چاہئے  
 کہ وہ ہمارے عقاب میں نہیں تھی۔ میں نے اسے قتل دینے کی  
 کوشش کی۔

میں بھی اب اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ وہ دروازہ کھولنے  
 ہوئے بولا میں اب تمہاری گاڑی کے نیچے کس کر اڑاؤ مہربانی وہ  
 پانچک ہم آدروں کا لیکن اس دوران تم دور جا کر گمن و غیور سے  
 نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود نقصان میں رو گے اس  
 طرح کا ارادہ بھی مت کرنا۔ اگر تم گاڑی سے اترے تو میں ہم  
 انارے کا کام درمیان میں ہی چھوڑوں گا اور تمہارا خدا ہی حافظ  
 ہوگا۔

وہ جواب بھی ہے۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔  
 اس نے دروازہ کھولنے ہوئے کسی ناقابل قسمی زبان میں چند  
 الفاظ بولے۔ وہ غالباً اس کے کوڑو رڈ تھے۔ پھر وہ اتر اڑاؤ سانپ  
 کی طرح گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ کافی دیر تک وہ گاڑی کے نیچے  
 سے نہ نکلا۔ یوں خالی پٹھے پٹھے مجھے تھوڑا سا محسوس ہونے لگا۔  
 صورت حال مجھے کچھ مشکوک نظر بھی لگ رہی تھی۔ میں کتنی سعادت  
 مندی سے اسے غن کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر  
 ہنسی آئی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس کی ہر بات پر یقین کرنا چاہئے  
 تھا یا نہیں؟ لیکن فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب  
 میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ کس ایسا تو میں کہ وہ ہم انارے  
 کے بجائے درحقیقت اب ہم نصب کر رہا ہو؟

پھر میں نے اپنے آپ کو پہلے کی طرح تنہا پر قدر چھوڑ دیا اور  
 کھڑکی سے سر نکال کر رازرا بلند آواز میں گفتگو سے پوچھا۔  
 تم ان آدمی کو بھی بولنا فوت ہو چکے ہو؟

”بے مہربانی مت کرو یا راز“ اس کی غصی گھنٹی سی آواز سنائی  
 دی۔ ”یہ بڑا نازک معاملہ ہے اور یہاں روشنی بھی نہیں ہے۔ میں  
 نے سب سے جلد پکڑی ہوئی ہے۔“

چند لمبے بعد بالآخر وہ گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ اس کے  
 ہاتھ میں چپا سا ایک مستطیل زبا تھا جس کے ساتھ کچھ تاریں اور  
 ٹیڈز لہا لہا ایک بار کی سی چرس جھول رہی تھیں۔

”عجب یہ بے ضرر ہو چکا ہے۔“ وہ زبا ہاتھ میں بلند کرتے  
 ہوئے بولا۔ اس کا دوسرا ہاتھ پشت پر تھا۔ پھر اس نے وہ زبا کچھ دور  
 غیب میں پھینکی ہوئی نہیں دیکھ دیا۔

”جین ہم کے غریب سے نجات پاتے ہی کوئی اتنی سیدھی  
 حرکت کرنے پر مت تل جانا۔“ وہ فوراً ہی پیچھے کیا ہوا ہاتھ سامنے  
 لاتے ہوئے بولا۔ اس ہاتھ میں عجیب سی ساخت کا ایک رولہ اور  
 تھا۔ جس کی بال بہت موٹی تھی۔

”یہی خوفناک گمن ہے یہ۔ اس کی گولی جسم میں بافت بحر  
 چڑا سوراخ کر دیتی ہے۔ گولی جھو کر بھی گزر جائے تو سوت چینی  
 ہو جاتی ہے۔“ وہ سر سر سے لیے میں بولا۔

میں ساکت کھڑا رہا۔ جو بھی اس نے زبا نہیں پھینکا تھا مجھے  
 بلاشبہ ایک ٹائٹ کے لئے خیال آیا تھا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے لیکن  
 اس فتنے سے کسی کچھ پن کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

اسی اثنا میں مجھے درختوں کے عقب سے ایک شخص جھول ہوا  
 سامنے طرف آنا دکھائی دیا۔ بولے سے وہ دھڑکا جلائی معلوم ہوتا  
 تھا۔ درختوں کے عقب میں ڈھولان کی زمین تھی جو سرسبز گھاس  
 سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اسی مختصر سی ڈھولان پر چڑھ کر وہ سڑک کے  
 کنارے اٹھیا اور کچھ مٹی پر چلا ہوا بے پروائی سے سنی بجاتا ہوا  
 ہماری طرف آنے لگا۔

اب میں اسے زرا صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دونوں  
 ہاتھ چلون کی بیروں میں تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھا اور آنکھوں پر  
 کچھ ایسا ابھرا ہوا سا تاریک چشمہ تھا جسے کو لو کے تیل کی آنکھوں  
 پر کھوپے چڑھے ہوں تیلی اور لگی ہوئی فوٹو فکٹ سوچیں تھیں۔  
 انہی سے تیل کھاتی تیلی اور نوکیلی سی داڑھی تھی جو صرف ٹھوڑی  
 تک محدود تھی۔ وہ سیاہ جیکٹ اور چلون میں تھا۔ بغل میں چھڑی  
 دبی ہوئی تھی جیسی عمارت کے زائے میں شرفا چل قدمی کے لئے  
 جاتے وقت بغل میں دبا لیتے تھے۔ حالانکہ پہلے وقت اس سے سارا  
 لینا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ مجبوری طور پر وہ پرانی فلیٹوں کا جو کرنا  
 کامیابی سے معلوم ہو رہا تھا۔

اے نن نے اسے آتے دیکھ کر گمن جیب میں ڈال لی لیکن  
 اس کا ہاتھ بھی اس کے ساتھ ہی جیب میں رہا۔ جو کہ غما اس شخص  
 کے ہونٹوں کے گوشے میں سگریٹ جھول رہی تھی جو سلی ہوئی  
 نہیں تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ سنی کی طرح سہا ہوا تھا۔ ہونٹوں  
 کے گوشے میں سگریٹ دبا کر سنی سے ابھی غاصی دھن الا پنا ذرا  
 صارت کا کام تھا۔ اے نن تک ذہی سی نظروں سے اس کی طرف  
 دیکھ رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میری طرف سے بھی غافل نہیں  
 تھا۔ میں یقیناً اس کی جیب میں موجود گمن کی زد پر تھا۔

قریب آکر جو کہ غما شخص رک گیا اور خواہ خواہ باج میں  
 پھیلائے ہوئے بولا ”اچس ہوگی آپ کے پاس؟“ اس کی آواز  
 عجیب سی تھی۔ کچھ بھٹی بھٹی سی۔ کچھ پھٹی پھٹی سی۔

میری جیب میں لاکڑ موجود تھا حالانکہ میں سگریٹ نہیں چتا  
 تھا لیکن میں نے لاکڑ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ نہیں ڈالا۔  
 مبادا اے نن یہ نہ سمجھ لے کہ میں گمن نکالنے لگا ہوں۔



”معاف کیجئے گا“ میں سرگرم نہیں بیٹا۔ میں نے شائستگی سے کہا۔

”اور میں بھی۔۔۔“ اسے نن نے فوراً کہا ”لیکن دوسروں کی سرگرمی سنانے کا بغور دست رکھتا ہوں۔“ اس نے وہی بات کی تھی جو کبھی کبھار میں بھی کرتا تھا۔

اس نے پائیں ہاتھ سے جیب سے ایک خوبصورت لائٹنگ ٹکڑا اور انجینی کی سرگرمی کو شعلہ دکھایا۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا اصل مقصد سرگرمی سنانا نہیں، انجینی کے چرے کا روشنی میں جائزہ لینا تھا۔ نہایت آہستگی سے وہ مجھ سے مزید ایک قدم دور کھسک گیا تھا تاکہ ایک ہی گھنٹہ سے ہم دونوں کو کور کر کے باہم گھس کر اس کی جیب میں ہی چھپ جائے۔

انجینی کی سرگرمی سنانے کے بعد اس نے لائٹنگ بجھاتے ہوئے بڑے حلقہ سے جیب میں کہا ”بہت ہی گھنٹیاں تم کا میک آپ ہے تمہارا۔“

میں بھی رکھ چکا تھا کہ انجینی کی واڑھی سوچیں اور گال پر موٹا سا مسادہ وغیرہ لٹکی تھا لیکن میں نے فی الحال خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ صرف یہی نہیں بیٹ اور عجیب سا تاریک چشمہ بھی تھا۔ کچھ صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان چیزوں کے بغیر اس کی صورت کیسی ہوگی۔

وہ اگر اسے نن کی بات کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس کا مشکوک قرار پانا یقینی ہو جاتا لیکن اس نے پہلے ہی کی طرح پانچیں پھیلا دیں اور ذرا بھی چونکے یا ندوس ہوئے بغیر اسی بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں بولا ”خیر ہو آپ کہ۔۔۔“ اس کی آواز کچھ ایسی تھی جیسی عام طور پر ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں زیادہ صحیح صحیح کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے تاثرات بدل گئے۔

وہ سرگرمی کا ایک کس کس لگا کر بے حد غصہ سے جیسے میں بولا۔

”آپ تو خیر خامے جھانڈو اور محزز سے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ میرے میک آپ کو تو اگر دن میں دس سال کا پتہ بھی دیکھ لے تو وہ بھی پہچان لیتا ہے کہ یہ چیزیں لٹکی ہیں۔۔۔“

اسے نن لائٹنگ جیب میں رکھ چکا تھا۔ پائیں ہاتھ سے یکدم وہ انجینی کا بازو پکڑتے ہوئے پھسکا رہا۔ ”کون ہو تم؟“

مجھے اندازہ تھا کہ اس کی گرفت میں انجینی کے بازو کا کیا حال ہو گا۔ انجینی یکدم سہم گیا۔ وہ گھٹکیاں لٹکی ہوئی ہی آواز میں بولا ”مائی باپ! آپ ایک دم کیوں غصے میں آ گئے؟ آپ کو کوئی لڑائی تھی تو نہیں ہو گئی؟ میں تو خود آپ کو کیلی بتانے لگا تھا کہ میں کون ہوں۔ حضور! آپ کے سپنے نہیں۔ میں تو فیملر کا ایک معمولی سا۔۔۔ میں روپے دہائی والا ایکٹر ہوں۔۔۔“

اب مجھے احساس ہوا کہ واقعی اس کی آواز اور لب و لہجہ فیملر کے روایتی سے ایکٹروں والا ہی تھا۔ وہ تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ”سری! میں تو آپ کی تھوڑی سی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے رکا

تھا۔۔۔ آپ تو لانا مجھ پر گرم ہونے لگے۔۔۔“

”فیملر کے ایکٹر فعلی واڑھی سوچیں لگائے سرگرمی پر پھرتے۔“ اسے نن غرا لیا لیکن اب اس کے لیے میں پہلے فیملر نہیں تھی۔

”میں تو میں آپ کو بتانے لگا تھا جناب عالی! میں تو آپ کو مظلومیت کی کمائی سنانا چاہتا تھا۔“ وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔ ”ہمارے پاس کمائی سننے کا نام نہیں ہے۔“ مختصر بات کر کے نن نے حکم دیا اور ساتھ ہی اس کی بیٹیں وغیرہ چھپنا دیکھیں۔ ”کیا واقعی تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے؟“ ”ہتھیار۔۔۔؟“ انجینی کرا کرا کر بولا ”کیا اس کی سمجھ میں نہ ہو کہ اس بات پر پٹے یا روئے۔“ پانڈی! میری جیب میں ہا کھانے کو پیسے نہیں ہیں، آپ ہتھیار کی بات کر رہے ہیں۔“ ”جن کی جیب میں روٹی کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے؟“ کبھار وہ بھی ہتھیار اٹھالیا کرتے ہیں۔“ اسے نن بولا۔ اب اس کے لیے میں سختی نہیں رہی تھی۔

”میں تو میں آپ کو بتانے لگا تھا۔۔۔ ہم جیسے بے کار لوگوں کا اس کا بھی حوصلہ نہیں ہوتا۔“ وہ اب گویا کچھ شعلے ہونے لگا ”پانچ سال ہو گئے ہیں جی فیملر کی۔ فن کی خدمت کرتے ہوئے ابھی تک چار چھ لاکھوں والے رول ملتے ہیں اور ان کے لئے بعض اوقات میک آپ میں کو ہمارا ٹوٹیکٹ آپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ جس ڈرامے کی کاسٹ ڈرامہ بی ہو، اس میں میک آپ بڑے آرام سے کہہ دیتا ہے۔ یا راتلو بادشاہی تم تو کمرے ہی کوئی بھی واڑھی سوچ لگا کر آتا۔ تمہاری طرف کون سا کسی نے اسے دیکھا ہے؟ چنانچہ جناب۔۔۔ اکثر ایسا ہی کرتا رہا ہے۔“

پھر وہ اپنی فوٹا پوکٹ میں سوچہ درست کرتے ہوئے بولا ”آج کل جو آرٹس کوئٹل میں ڈراما چل رہا ہے، پانچ ہزار روپے کی کاسٹ پوری بارہات جتنی بھی ہے۔ میں اس میں تمہارا رول کر رہا ہوں۔ چار لاکھ کھانے والے رول ہے۔۔۔ اب ڈراما حلقہ فرمایم یہ واڑھی سوچیں میں تمہارا رول کے رول کے لئے لگا کر جا رہا ہوں تمہارا رول کی ایسی سوچیں یا ایسی ڈرامے آپ نے بھی دیکھ ہے؟ لیکن میں کیا کوں۔۔۔ گھر میں کوئی بار۔۔۔ حکم کی واڑھی سوچیں موجود ہی نہیں تھیں۔ میں نے سوچا چلو گی کیا لگاؤں۔ کیا کاسٹ کی ای پیدا ہو جائے گی۔ شکر ہے روٹی تو پروڈکشن والوں نے مل جاتی ہے۔“

پھر اچانک اسے جیسے خیال آیا اور وہ ذرا چونک کر امید مگر۔۔۔ لیے میں بولا ”آپ لوگوں نے دیکھا ہے یہ ڈراما؟ پانچ ہزار روپے رول ہے تو چار لاکھ کاسٹ۔ لیکن بڑی جان ہے اس میں۔“ ”نہیں! چچا! ہمارے پاس ڈرامے اور سٹیجوں کی اچھل کی وغیرہ دیکھنے کے لئے وقت نہیں ہے۔“ اسے نن نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ اسے سسلانے لگا۔

آپ زیادہ عمدہ ہوتا اور تم زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتے تو تمہاری ایک نہ چلتی۔ تم نے اپنی اصل شکل کی طرف توجہ جانے ہی نہیں دی۔ بعض اوقات سادہ ترین طریقہ کاری عمدہ ترین طریقہ کار ہوتا ہے۔

”مستظوم نہیں مرا“ وہ شریعلے سے لہجے میں بولا ”میں تو زیادہ باریکیوں سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے تو اس لئے ان چیزوں کی مدد لی تھی کہ میرے پاس ان کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ احتیاطاً اپنے ساتھ صرف بھی لئے بھر رہا تھا۔ گاڑی بھی ایک دوست کی ملی ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ بندر کا چتہ میری گاڑی پہچانے لگا تھا۔ اگر میں اس میں اس کا حلقہ بربادی تو یہ فوراً ٹھک جاتا۔“

”ٹھک تو اب بھی کیا تھا۔ لیکن تم نے اچھا کیا کہ بہت آگے نکل گئے۔ اس کی نظروں سے اوچھل ہو گئے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے تو اتنی احتیاط کی کہ واپس بھی اس گاڑی میں نہیں آیا۔ لفٹ لے کر آیا ہوں۔ اور خاصی دوسرے آپ کو دیکھ کر باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔“

”تم کب کہاں سے پڑے؟“ میں نے پوچھا۔

”جب یہ میرے ہاتھ آکر نکل گیا تھا“ میرا ذہن اسی میں پھنسا ہوا تھا۔ میں تو پاگل سا ہو گیا تھا۔ شرمیں مارا مارا بھر رہا تھا۔ پتا نہیں میں نے کتنا پٹرول پمپ کوکھ ڈالا ”ناگز گسا ڈالے۔“ بہر حال اتنی ہی طلب اور حق کے ساتھ انسان کسی کو دھوڑ رہا ہو تو وہ مل ضرور جاتا ہے۔“ وہ اپنے منہ کے چشے پر سے وہ تاریک شیشے اتارنے لگا جو اس نے کپ کے ذریعے لگائے ہوئے تھے۔ پھر اس نے داڑھی مونچھیں اور بیٹ اتارا۔ یکدم ہی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی جگہ کوئی اور نوجوان آن کھڑا ہوا ہو۔ اب وہ دہی پسٹلا والا وہیم احمد تھا۔

میں نے اس کی بغل میں دلی ہوئی چھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ چادری چھڑی مستظوم ہوئی ہے۔ میرے خیال میں تو اسے نئے کے سر چھڑی مار کر اسے نہیں لایا جاسکتا تھا۔“

”یہ چھڑی کہاں ہے مرا“ وہ سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو ٹھوس اسٹیل کی راڈ ہے۔ مجھے تو اسے نئے سے زیادہ واسطے نہیں پڑا لیکن جب یہ گورام کا دروازہ توڑ کر بھاگا تھا تو مجھے بھی کچھ کچھ ایمان نہ ہو گیا تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔“

”اسٹیل کی راڈ؟“ میں نے ڈہرایا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ہوتی نظر آنے والے چھوٹے جسم کے اس نوجوان کا وار بھی معمول نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اسے نئے پر ہلکتے ہوئے کہا۔ ”میں تو تم سے باتوں میں لگ گیا۔ اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ کہیں دنیا سے گزری نہ گیا ہو۔“

اس کی چشمالی سے کچھ خون بہہ کر ہنسیوں اور آنکھوں کے پاس جم گیا تھا۔ چند لمحوں میں ہی خون کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر ترچھا پڑا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کا دل دھڑک

”اگر آپ پسند فرمائیں اور میرے ساتھ چلیں تو میں دو پاس آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ مجھے ذرا آپ کی گاڑی میں منتقل ہونے کی۔ ورنہ ابھی حال تک پیدل جا کر کسی سے لفٹ چما پڑے گی۔“

”اب چل۔ اپنا کام کر۔“ اسے نئے اسے دھکا دیا۔ ”وہ میرے مولا۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر فریاد سے بڑاؤ میں بولا ”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی زمانے میں ننگا دل کی یہ بے قدری ہوگی۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر چھڑی مرا آگے چل رہا لیکن دوسرے ہی لمحے پھرت پڑا۔

”صاف کیجئے گا۔ باتوں باتوں میں سرکرت ہی بچھ گئی۔ ذرا بھر دمت کیجئے گا۔“ اس نے بھی ہوئی سرکرت دکھائی۔

اسے نئے نے غالباً اسے ڈانٹ کر روکنا کہ اسے زیادہ کیا لیکن پھر ہونٹ بچھ کر ریب میں ہاتھ ڈالا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب وہ اسٹینج ٹرٹ کی طرف سے بالکل بے پروا ہو چکا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ صرف مجھ پر تھی لیکن یہ میں بھی نہیں دیکھ سکا کہ اب اسٹینج ٹرٹ کا ہاتھ کبلی کی طرح حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے اسے نئے پٹ سے زمین پر پڑا تھا۔

اسٹینج ٹرٹ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی اتنی چھڑی سے اس کے سر پر رسید کی تھی کہ میری آنکھیں بھی میچ طور پر اس حرکت کو نہیں دیکھ سکی تھیں۔ اس حرکت کا رد عمل بھی میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ میرے خیال میں اگر اسے نئے کی کھوپڑی پر چھڑی زیادہ دیر سے رسید کی جاتی تو چھڑی ٹوٹ جاتی چاہئے تھی اور اسے نئے کو زیادہ سے زیادہ کچھ لٹکھڑا جانا چاہئے تھا۔ اس کا یوں نہ سے کہ جانا میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ میں تو خود یہ سوچ کر اب اس پر کپا ہاتھ نہیں ڈالنا تھا کہ اس سخت جان مخلوق پر اگر کوئی وار کیا جائے تو وہ پوری طرح کارگر ہونا چاہئے۔

”کمال کر دیا تم نے وہیم احمد!“ میں نے حسین آمیز لہجے میں کہا ”میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا ناپاؤ دار کر سکتے ہو۔ اور وہ بھی اسے نئے پر۔“

”تم آپ نے مجھے پہچان لیا؟“ وہ اپنے سر پر ہنس مٹراتے ہوئے بولا۔

”ہاں“ میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے پُر سکون لہجے میں کہا ”پہلے تو میں پہچاننا تھا لیکن جب تم آگے روانہ ہوئے تو اپنی اصل حال چلنے لگے۔ میں نے تمہاری چال سے تمہیں پہچان لیا۔ لیکن ان چند معمولی سی چیزوں نے واقعی تمہاری صورت بیکر تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔ آواز بھی تم نے بڑی عمدگی سے بدل لی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ میں تمہارے نفسیاتی حربے سے متاثر ہوا ہوں۔ تم نے کمال یہ کیا کہ ایسی معمولی چیزوں سے مدد کر صاف طور پر عقلی نظر آتا ہے۔ اور فوراً ہی اس بات کو تسلیم بھی کر لیا۔ کمالی بھی اچھی گزری۔ اور مجھے میں بھی کمال کا اعتراف تھا۔ اگر تمہارا میک

میں تردید شروع کر دیتے ہو کہ تم تو بالکل سیدھے اور محصوم ہو  
ہر وقت دوسرے کو اپنے بارے میں کینہی ڈرکتے ہو تاکہ  
تمہارے بارے میں غلط نہ کہائے کہ تم درحقیقت کیا چیز ہو۔  
”میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آئیں سراسر محال  
مرضی کے مالک ہیں۔“ وہ بدستور شریطے انداز میں مسکراتے ہو  
غازی سے بولا ”میرے بارے میں آپ جو بھی سمجھتے ہیں جو  
کہتے ہیں، ٹھیک ہی ہو گا۔ ہم تو آنکھیں بند کر کے آپ کی ہر بات  
بجور سنا کرتے ہیں۔“

چند منٹ میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک کے کنار  
دستک کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دوداؤہ کھولنے ہوئے بولا ”سرا  
آپ کوئی اور ایسا ہی ذرا مشکل سا سب دواڑے دار سا کام ہے  
سر دیکھئے گا تاکہ آپ میرے بارے میں کچھ اور اندازے لگا سکیں  
مجھے تو اپنے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ آپ ہی میرا نفسیاتی  
کر کے میری معلومات میں اضافہ کرتے رہے گا۔“

”میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔“ میں نے اسے قہری  
کا لہجہ آگے بڑھادی۔

دوسری سڑک پر پہنچ کر میں نے گاڑی واپس موڑی اور  
فاصلے طے کر کے جم خانہ آگیا۔ میں اب گاڑی کا ریڈیو بھی اس  
کے نام نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جم خانہ سے فون پر فونی سے رابطہ  
کیا اور اسے فوراً جم خانہ پہنچنے کی ہدایت کی۔

فون کر کے میں واپس پارکنگ لٹ میں گاڑی میں آ بیٹھا۔  
ذرا نیچے سیٹ پر ہی تھا لیکن میری نظر پچھلی سیٹ پر بھی جہاں  
نے اسے تن کو لٹایا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک بے حس و حرکت تھا۔  
اس شیطان سی مخلوق کا کچھ نہیں تھا کہ کب اٹھ بیٹھے پار  
لٹ میں کہیں کہیں الیکٹرونک فریڈرنگ ہوئے تھے گمان  
سے ایک آدھ ہی روشن تھا۔ وہاں ٹھیک انداز پر چلا ہوا تھا۔

فونی نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ اپنی گاڑی کچھ  
پارک کر کے میری گاڑی پہچان کر اس طرف آگیا۔ میں نے گا  
سے اترتے ہوئے کہا ”اپنی گاڑی بیسیں لے آؤ۔“ پھر میں نے ا  
ن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس شخص کو تمہاری گا  
میں منتقل کرنا ہے اور میں ہی اسے وہ تجربے کر جاؤں گا۔ تم  
گاڑی لے جاؤ اور اپنے کسی خاص الیکٹرونک انجینئر سے اس  
باریک بینی سے چیک کراؤ کہ اس میں کوئی مشکوک یا غیر ع  
آلہ۔ کسی بھی قسم کا کوئی فالتو الیکٹرونک ڈیوائس کہیں فٹ نہ  
ہے۔ اس کی ایک ایک مار ایک ایک پرچہ ہر ایک ایک نٹ ہر  
غرضیکہ ہر چیز بہت ہی تفصیل سے چیک ہونی چاہئے۔ خواہ اس  
کتنی ہی وقت لگ جائے۔“

”میں سمجھ گیا سرا“ فونی نے جواب دیا۔ اس نے اپنی گا  
میری گاڑی کے قریب لاکھڑی کی اور چند ہی لمحوں میں ہم نے  
ن کی اس کی گاڑی میں منتقل کر دیا۔ میں اسے لے کر روانہ

رہا تھا۔ نہیں بھی ٹھیک ہی چل رہی تھی۔  
دسم اس کی نہیں وغیرہ دیکھے بغیر ہی یقین سے بولا ”اس کی  
جگہ کوئی اور ہو گا تو شاید مرچکا ہو۔ لیکن مجھے معلوم ہے اس کی  
تصویق کی ہڈی صرف معمولی سی چٹنی ہوگی۔“

”کیس یہ چٹ اس کے لئے ملک ثابت نہ ہو۔ میں اسے  
لے چلا ہوں۔“ میں نے اسے بازو دس پر اٹھایا۔ وہ مختصر الزجور تھا  
لیکن مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں نے لوہے کے کسی ٹکڑے جسے کو  
اٹھایا ہو۔ اسے اٹھانے کا تجربہ ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا لیکن  
اس وقت وہ ہوش میں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کا وزن پہلے سے  
بھی کچھ بڑھ گیا تھا۔

میں نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی کو نیچے سے چیک کیا۔  
یونٹ کھول کر دیکھا۔ کم از کم مجھے کہیں کوئی بم دکھائی نہ دیا۔ میں  
نے دسم کو ساتھ بٹھایا اور اللہ کا نام لے کر گاڑی اشارت کی۔  
خیریت ہی رہی ہوئی کہ وہ فیو نہیں پھٹا۔ میں نے گیسز نکالا۔

پہلے پر پہنچ کر میں نے دسم سے پوچھا ”تمہاری گاڑی کہاں  
کھڑی ہے؟“

”مجھانے سے ذرا آگے“ اس نے بتایا۔

”میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔ تم اپنی گاڑی میں ہی  
واپس جانا۔“ میں نے کہا۔ میرا ارادہ اس وقت باطل ٹاؤن والی  
کو بھی میں جانے کا تھا اور وہ چونکہ میرا خفیہ بیڑ کو ارڈر تھا اس لئے  
میں دسم کوئی الحال وہاں تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ جب وہ  
میرے خاص رفیقوں میں شامل ہو جاؤ تو بات دوسری تھی۔ میں اب  
اس مسئلے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

دسم اپنی دائرہ میں موٹیس اور عینک کے رنگین شیشے بڑی  
احتیاط سے جیبوں میں رکھتے ہوئے بولا ”پھر کبھی کام آئیں گے۔“  
پھر وہ ایک نظر اسے تن کی طرف دیکھ کر بولا ”شکر ہے میں آپ کی  
امانت آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔“

میں اس کے انداز پر مسکرایا۔ وہ اسے تن کے لئے امانت کا  
نقطہ ایسے استعمال کر رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز تھی جسے وہ مجھ تک  
پہنچانے کے لئے اٹھائے پھر رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد  
میں نے کہا ”دسم تمہارے بارے میں میرا شبہ درست معلوم ہوتا  
ہے۔ تم وہ واقعی کوئی پہچانی ہوئی چیز۔“

وہ سر جھکا کر اپنے مخصوص شریطے سے انداز میں بولا ”سرا!  
میں تو بس یونٹیں سا آؤں ہوں۔ سوچتا ہوں آپ کی صحبت اور  
رجحانی میری ہر توجہ کی قائل ہو جاؤں گا۔“

”پالیسی بھی تمہاری اچھی ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا  
”جب کوئی شخص اس حق قرار دے کہ کوئی شخص کرنا ہے تو تم سادہ لوح  
انسانوں والے انداز میں یہ بتانے کی کوشش کرتے ہو کہ ایسی کوئی  
بات نہیں ہے۔ تم تو بڑے عقلمند ہو۔ اور جب کوئی اس شے میں جھلا  
ہوتا ہے کہ تم بہت ہوشیار بہت باصلاحیت ہو تو تم شریطے انداز

ہے۔ اس میں ابھی تک تو کوئی مشکوک چیز یا الیکٹریک ڈیوائس نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شام تک معائنہ مکمل ہو جائے گا۔ میں نے گاڑی میں آٹریشن کرا کے جو چند چیزیں اپنی ضرورت اور آڑے دھنوں کے استعمال کے لئے فٹ کر رکھی تھیں ان کا بھی معائنہ ہوا تھا۔

آفس میں ہی دوسرے قریب مس ٹرپ کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اے ٹن کو ہوش آیا تھا لیکن اس کی حالت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ کچھ بول نہیں رہا تھا بس خالی خالی نغموں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ دماغی چوٹ آنے کے بعد اس قسم کی کیفیت غیر متوقع نہیں تھی۔ یہ عارضی بھی ہو سکتی تھی اور مستقل بھی۔ دماغی چوٹ کے بعد بعض لوگ بیشہ کے لئے یا دوا داشت کھو بیٹھتے تھے جسے بنیاد بنا کر ہمارے ہاں نہ جانے کتنی فلموں کی کمائیاں کھسکی تھیں۔ ڈاکٹر نے اسے مزید دوائیں وغیرہ دے کر سلا دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دیکھا کہ اس کی یادداشت مستقل طور پر غائب نہ ہو، کہیں میری ساری تک و دو اور بے چارے و سیم کی محنت ضائع ہی چلی جائے۔

اس روز بھی ایڈم کا فون نہیں آیا۔ شام کو میں گھر چلا گیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ڈانگ مدم میں بیٹھا کالنی بی رہا تھا کہ ملازم نے ایک بڑا سا ڈبل وزنگٹ کارڈ لا کر دیا۔ کارڈ ملک ریاض راہی کا تھا جس کی چاروں ساؤنڈ چھپی ہوئی تھیں۔ اس کے نام کے ساتھ اس کی پائلٹی میں اس کا عہدہ اور نہ جانے کس کس انجمن میں اس کے کتنے عہدے درج تھے۔

کارڈ طارق خان نے میرے پاس بھجوا دیا تھا۔ ابھی میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ انٹر کام کا برز بجا۔ گیٹ ہاؤس سے طارق خان ہی بول رہا تھا۔ ”سر! یہ آؤی جس کا میں نے کارڈ بھجوا دیا ہے“ ایک چھوٹے موٹے جلوس کی سی شکل میں آیا ہے... ایک لینڈ کروزر اور ایک مریسرز آؤمیں سے بھری ہوئی ہے۔ کل دس آؤی ہیں جن میں سے چار تو ٹھلوں سے ہی ڈاکو لگ رہے ہیں۔ ان کے پاس سیون ایم کی رائفلیں بھی ہیں۔ ملک ریاض راہی کا کہنا ہے کہ ڈیوٹی آپ کا دوست ہے اور آپ کو کسی قریب کی دعوت دینے آیا ہے۔“

”میں ڈرائنگ روم میں بیچ دو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ایک ملاقات میں ہی اسے دوستی کا دعویٰ ہو گیا ہے۔ جہاں تک زیادہ آؤمیں اور اسلئے کا تعلق ہے تو بعض ملاقاتوں کے لئے جانے کا ان لوگوں کا بھی اسلئے ہو آئے۔“

”ان کا اسلئے گیٹ پر ہی رکھو اسے؟“ طارق خان نے پوچھا۔ ”نہیں، براہ سنا جائیں گے۔ آئے دو۔ بس دیے ہی ذرا الٹ رہنا۔“ میں نے کہا۔

میں نے ہال میں آکر کرسی کے پیشے سے باہر دیکھا۔ طارق

اور فونی میری گاڑی لے گیا۔ ”سبرنگ کر میں نے اے ٹن کو مس ٹرپ کے حوالے کرتے ہوئے کہا“ اسے گیٹ روم میں بچاؤ اور ہمارے ڈاکٹر سے کہنا کہ اس کی ذرا توجہ سے دیکھ بھال اور علاج کریں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ چکی ہوگی۔“

مس ٹرپ نے اس کے مختصر وجود کو دیکھتے ہوئے بے پروائی سے اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اس کی کوشش میں اونگھے منہ کرتے کرتے پئی۔ پھر اس نے سنبھل کر اسے بازوؤں پر اٹھایا۔ عام عورت تو شاید بے ہوش پڑے اے ٹن کو ہلا بھی نہ سکتی۔

”یہ اتنا بھاری کیوں ہے؟“ مس ٹرپ نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہے۔“ میں نے

لفظی سانس لے کر کہا۔ ”یہ بڑی عجیبہ روزگار قسم کی مخلوق ہے۔ میڈیکل سائنس کے ماہرین اس کی جسمانی ساخت کا تجزیہ کریں تو شاید کچھ پتا چل سکے۔ اسے گیٹ ہاؤس میں رکھ کر اسی طرح اس کی حفاظت کرنا چاہیے یہ کوئی جن ہے اور فرار ہونے کی فکر میں ہے۔“

گیٹ ہاؤس اس طویل و عریض کوشی کے درخانے میں واقع چند کمروں پر مشتمل تھا جہاں ان لوگوں کو ٹھہرایا جاتا تھا جنہیں خصوصی تحویل میں رکھنا مقصود ہوتا تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہونا کسی کے لئے تقریباً ناممکن ہی تھا۔ ہر طرح کے حفاظتی انتظامات موجود تھے۔ اگر کوئی ان حفاظتی انتظامات کے باوجود گیٹ ہاؤس سے فرار ہونے میں اس حد تک کامیاب ہو جاتا کہ کمروں اور راہروں سے نکل آتا تب بھی وہ درخانے سے باہر آنے کا راستہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسٹیل اور ٹکریٹ کی بت بڑی قہر تھی جس میں ہر قسم کی آسائشیں موجود تھیں اور وقت بے وقت فریقوں میں بھی تبدیل ہو سکتی تھیں۔ یہاں قدم قدم پر تشنگ میکینزم موجود تھے۔ کچھ فرائض انجام دینے کے لئے وہاں دو تین افراد بھی موجود رہتے تھے۔ وہ کامیاب نہ تھے۔

مس ٹرپ کے درخانے کی طرف جاتے ہی میں وہاں سے لوٹ آیا۔ مگر آکر میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ سلاشوری طور پر مجھے ایڈم کے فون کا انتظار تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کو اے ٹن کی کشتی کے آگاہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ پہلے تو ہونا ریڈ فائٹ سے حائل کسی بھی واقعے کے کچھ دیر بعد ہی ایڈم کا فون آیا تھا لیکن اس رات بت دیر تک انتظار کرنے کے باوجود فون نہیں آیا۔ حلالہ کہ میرا خیال تھا ”اے ٹن کا میرے بچے چڑھ جانا ریڈ فائٹ کے لئے کافی اہم واقعہ ہو گا۔ انتظار کرتے کرتے بلاآخر میں سو گیا۔“

”دوسرے روز میں معمول کے مطابق تیار ہو کر آفس گیا۔“ میں نے فونی کا فون لیا۔ اس نے بتایا کہ گاڑی کا معائنہ جاری

قرآن والے بھیڑنے سے متاثر تھی۔

”وعلیکم السلام“ میں نے بخور اس کی طرف دیکھتے ہو کہا۔

”چوہدری صاحب! آپ نے اس شیر جوان کو پہچانا نہیں ملک ریاض نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا انداز کچھ ایسا ہی عجیب جس میں ملک کی کسی انتہائی مشہور مسٹر ہستی کو پہچاننے سے قاصر رہا ہوں۔

میں نے نفی میں کہہ دیا تو وہ بڑے پرجوش لہجے میں بولا ”بھیم اپنا نور ماچھی ہے۔ آج کے دور کا سب سے بڑا ذریت۔ اس سر کے لئے دس لاکھ روپے کا انعام مقرر ہے حکومت کی طرف سے۔ یوں سمجھیں ہم دس لاکھ کا چیک جب میں زائے بھرن ہیں۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ خود نور ماچھی بھی لگا۔ اس کی ہنسی بھی بھیڑنے کی غراہٹ سے ہی مشابہ تھی۔

ملک ریاض راہی گویا اس کے قابل فخر اور عظیم کارناموں تفصیل جاری رکھتے ہوئے بولا ”ہمیا لیس توکل ہیں اس کے کما میں۔ جن کی ایف آئی آر درج نہیں ہو سکی ان میں وہ شامل ہیں۔“

اب اس کے تین ساتھیوں نے قہقہہ لگایا اور ڈرائنگ روم میں ان کی آوازیں گونج کر رہ گئیں۔ اب مجھے یاد تھا کہ میں نے کچھ عرصہ پہلے واقعی کسی اخبار میں اشتہار پڑھا تھا جس میں نور ماچھی کی زندہ یا مردہ حالت میں گرفتاری پر دس لاکھ کے انعام اعلان کیا گیا تھا۔ شاید میں نے بھی اسی قسم کا کوئی پوسٹر بھی کب چسپاں دیکھا تھا لیکن جہاں تک مجھے یاد تھا ”ان میں نور ماچھی تصویر کالی خلف معلوم ہو رہی تھی۔ وہ غالباً نور کی نوجوانی تصویر تھی۔ پولیس کو شاید وہی میرا سکی تھی۔ سر حال یہ کوئی چیز کی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے اشتہارات میں عموماً ایسا ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میرے سامنے سینہ بآں کر کہ ہوا وہ شخص نور ماچھی ہی تھا۔ اس کے ناک نقشے میں اس تصویر جھلک موجود تھی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ اخبارات کے مطابق پورے صوبہ پولیس جس کی تلاش میں تھی اور جس کے سر کے لئے دس لاکھ روپے کی خطیر رقم کا انعام مقرر تھا، وہ اپنے ساتھیوں اور اسٹے سمیت ایک ”معتزہ“ زمیندار اور اس کے ساتھیوں کے ہاں شریک نہ جانے کین کن بھری پڑی شاہراہوں سے گزرتا ہوا ایک ممتاز شہری اور بزنس مین کے گھر آیا تھا اور اب ڈرائنگ روم پر کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ کوئی عہد نہیں تھا کہ جہاں بھی وہ پایا جاتا اس جگہ کے سوا باقی ہر جگہ پولیس اسے تلاش کرتی پھرتی ہو چنگلوں، بیابانوں اور پھاڑوں میں اس کی گرفتاری کے لئے محاصرے کرتی ہو۔

”ہمت خوب، ہمت خوب۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا

خان نے گیت ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے ٹپن دبا دیا تھا اور گیت کھل رہا تھا۔ گیت پورا کھل چکا تو ایک بڑی لیڈر کوزر اور نیلی سرسبز آگے پیچھے ڈرائیوے میں داخل ہوئیں۔ میرا ایک ملازم برآمدے میں ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

کافی ختم کر کے میں بھی ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ طویل و عریض ڈرائنگ روم میں بڑی روشنی اور گماگماہی سی دکھائی دینے لگی تھی۔ صوفوں پر وہ لوگ خوب چڑے ہو ہو کر بیٹھے تھے۔ بلکہ بعض تو تقریباً لیٹے ہوئے تھے۔ سگریٹوں اور سگار کے دھوئیں سے کرا بھر گیا تھا۔ ذرا سی درمیں ہی کرشل کی بڑی بڑی فرانسیسی ایئر ٹریڈ میں راکھ بکھری نظر آنے لگی تھی۔

ملک ریاض راہی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر آگے آیا اور یوں مگر جوش سے گلے ملا چھے میرا بازو اٹا اور دست کا چھڑا ہوا دوست ہو۔ اس نے میری پیٹھ پر خوب تھپکیاں دیں ”مصافحہ کیا پھر اپنے ساتھ آنے والوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔ ”بھئی۔۔۔ یہ ہیں اپنے چوہدری صاحب، جن کی میں تمہارے سامنے تقریباً کر رہا تھا۔ ملک کے بہت بڑے آدمی ہیں۔۔۔ اور بڑے ہیڑا آدمی ہیں۔۔۔

بڑے ہندو نواز ہیں۔۔۔ اپنے بکریاں بار ہیں اور آگے چل کر یہ باری اور بھی مضبوط ہوگی۔ ٹوہے کی طرح۔“ ایک لمبے کے لئے وہ یوں میرے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے تصویر کھینچا رہا ہو۔ اس کے ساتھ آنے والے سب لوگ باری باری اٹھ کر بڑی عقیدت اور احترام سے مجھ سے مصافحہ کرنے لگے گویا ملک ریاض راہی کی زبانی تعارف ہوتے ہی میں ان کی نظر میں بہت معتبر اور بزرگ ہستی بن گیا تھا۔

طارق خان نے درست کہا تھا۔ ان میں سے چار آدمی مشکوں سے ہی ڈاکو لگ رہے تھے۔ وہ چاروں ہی دروازہ توڑے چلے اور سانولے تھے۔ ان کے چروں پر خشونت مگر خشکی اور کھردرا پن تھا۔ جسے وہ اس وقت مزید باندھ سکا انہوں میں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں درندگی اور سرخی تھی۔ ان کے ہاتھ بھی کھردرے اور فولادی تھے۔

انہوں نے اپنی رائفلیں صوفوں کے ساتھ ٹکادی تھیں۔ وہ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیصوں میں تھے۔ یہ اندازہ لگا تا مشکل نہیں تھا کہ گولیوں کی بیلیاں ان کی قمیصوں کے نیچے ان کے جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ چاروں ہی ابھی ابھی سی گھنی داڑھیوں والے تھے۔ کچھ عمر کا ایک شخص ان کا سردار معلوم ہوا تھا۔ ان کی ٹولی میں وہ سب سے نمایاں شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر کھردرا پن اور سنائی دوسروں سے زیادہ تھی۔ ان میں سے دو مختصر چڑیاں بھی باندھے ہوئے تھے۔ باقی دو بچے سر تھے۔ ان کے بال لمبے تھے۔

سردار نے مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر بھی مجھے سلام کیا۔ ”سلام میڈا سائیں!“ اس کی آواز کسی کمرہ میں

ہے۔ "شاید وہ چاہ رہا تھا کہ نور ما بھی کی اعلیٰ کوالیفیکیشن کے بارے میں کوئی بات بتانے سے نہ نہ جائے۔

"بہت خوب!" میں نے کہا پھر منوبان لیے میں پوچھا۔ "نور ما بھی صاحب! پولیس آپ کو گرفتار نہیں کرتی؟ میں تو سمجھتا تھا آپ کیس جینگوں، پٹاروں، بیانیوں میں کسی نامعلوم مقام پر تاریا کھوہ میں چھپے بیٹھے ہوں گے لمحہ بے لمحہ پولیس کا کھیرا آپ کے گرد تنگ ہو رہا ہوگا۔ آپ کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں ہوگا۔ درختوں سے کچے پکے پھل توڑ کر کھاتے ہوں گے جو ہروں سے پانی پیتے ہوں گے دنیا سے آپ کا رابطہ کٹا ہوا ہوگا۔ لیکن آپ تو بڑی شان سے 'صاف سحر' گہڑے پہنے 'بہترین قسم' کی گاڑیوں میں بھرے بڑے شہر میں 'سمزز' کے ساتھ گھوم رہے ہیں؟"

نور ما بھی نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے جیسے کوئی بڑا دانشور کسی سادہ لوح دہائی کی بات سن کر محفوظ ہو رہا ہو۔ میں نے اپنے چہرے پر حشی الامکان سادہ لوحی طاری رکھنے کی کوشش کی تھی۔

نور ما بھی جھٹکے دار انداز میں بولا "پولیس اپنا کام کرتی رہتی ہے، ہم اپنا کام کرتے رہتے ہیں مینڈا سائیں۔ کبھی کبھار گروہ کا کوئی ایک آدھ آدمی مارا جاتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب کوئی واردات بہت ہی سنگین ہو جائے پولیس اپنی کارروائی وال ڈیوٹی ہے۔ قصوریں سمجھاتی ہے پولیس کا فرض دیکھ کر لگتی ہے کچھ مال قیمت آپس میں بانٹ لیتے ہیں کچھ سامنے لے آتے ہیں۔ کچھ ساریقیقت شارٹلیٹ آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ان کا بھی دل پشوری ہو جاتا ہے۔ ہمارے کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس میں بھی اپنے آدمی موجود ہیں۔ اگر کوئی زیادہ خردماغ افسر آجائے اور لمبی چوڑی کارروائی کرنے کی کوشش بھی کرے تو ہم کو سب خبر ملتی رہتی ہے۔ ساڑی باغ باری نول کوئی فرق نہیں چنے اینڈ سائیں!"

ملک ریاض نس کر بولا "جوہری صاحب! یہ تو جب اور جہاں چاہے چلا جاتا ہے ملک سے باہر بھی چلا جاتا ہے۔ اپنے خاص خاص لوگوں کے ہاں شادی بیاہ میں بھی شرکت کرتا ہے۔"

"واو ملک صاحب!" میں نے دھیمے لیے میں کہا "زمانہ واقعی بڑی ترقی کر گیا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے جوہری صاحب!" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر سمجھدہ ہوتے ہوئے بولا "اب اصل کام بھی کر لیا جائے جس کے لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔"

"سمزز صاحبان! آپ سب تشریف رکھئے۔" لفظ "سمزز" پر میں نے زور دیا تھا۔

"پلے ہی کی طرح بھیل کر بیٹھ چکے تو میں نے پوچھا "آپ لوگ کیا کھا چاہتے ہیں؟"

ملک ریاض نے سب کی ترغیبی کافرینہ انجام دیا۔ "میں جس چیز کو دل چاہے، منگوا لیجئے جوہری صاحب! میں تو کسی چیز سے انکار ہی نہیں ہے۔ کیوں نور؟"

"بالکل ٹھیک ہے فرما دیجئے اور مینڈا سائیں! نور ما بھی نے غراہٹ نما آواز میں جواب دیا اور ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر نس دئے۔

میں نے ملازموں سے کہہ کر ان کی خاطر مدارت کا بندوبست کرایا۔ اس دوران خوش گلیوں، بلند آہنگ قہقہوں اور غمی مذاق کا سلسلہ چلتا رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں پر انہوں نے جنات کی طرح ہاتھ صاف کیا۔

اسی دوران ملک ریاض مگب شپ جاری رکھتے ہوئے بولا "میں آپ کی طرف آ رہا تھا تو میں نے سوچا نور کو بھی ساتھ لے چلوں۔ آپ سے ملاقات ہی ہو جائے گی۔ بڑا کام کا آدمی ہے۔ آپ کو ایسے لوگوں سے میل ملاقات رکھنی چاہئے۔"

میں بدستور مسکراتا رہا۔ میں ان کے انداز چٹکوں سے بہت محفوظ ہو رہا تھا۔ ملک ریاض "نور کی بیٹھ پر چھک کر دیتے ہوئے بولا "چچہ ہے اپنا۔ چچہ بھی ہے، یار بھی ہے" بعد ازاں بھی ہے۔ آپ یوں سمجھیں، بہت بڑے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ جو زمین جو ان اس کے ساتھ ہیں۔۔۔۔۔ یوں سمجھ لیں یہ اس کی کاہنہ ہے۔"

"لیکن آپ کا اور نور کا ساتھ کیسے ہو گیا؟" میں نے ملافت سے پوچھا۔

"جس، کبھی کام کے لوگ ہمیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کبھی ہم کام کے لوگوں کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔" ملک ریاض شائراۃ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "ہمارا فلسفہ ہے کہ سب کے ساتھ بنا کر رکھو۔ اور وہ سب لوگ جن سے ہماری ملاقات ہوتی ہے انہیں ہماری نصیحت لینی ہوتی ہے کہ ہم تم سے بنا کر رکھ رہے ہیں، تم بھی ہم سے بنا کر رکھو۔ نور ما بھی کو ہماری ضرورت پڑتی ہے تو ہم اس کے کام آتے ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت پڑتی ہے تو یہ ہمارے کام آتا ہے۔ لیکن لی جمل کر چننا چاہئے۔ اس طرح زندگی میں آسمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چار دن کی زندگی ہے۔۔۔۔۔ اور کام انسان کو بہت سادے کرنے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ بڑے بڑے کام۔۔۔۔۔ اہم کام۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے گہری نظروں سے نور ما بھی کا جائزہ لیتے ہوئے پُر خیال لیے میں کہا۔ وہ بھی زیر لب۔۔۔۔۔ بلکہ زیر لہجہ مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ملک ریاض مزید بولا "چالیس آدمی ہیں نور کے گروہ میں۔ اور سب ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ ان میں لہجہ کوئی نہیں

”یہ کیا ہے ملک صاحب؟“ میں نے لفاظہ کھولے بغیر پوچھا۔  
 ”دعوت نامہ ہے چوہدری صاحب!“ اس نے واپس اپنی جگہ  
 بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

”کس تقریب کا؟“ میں نے اب بھی لفاظہ نہ کھولا۔

”بات یہ ہے چوہدری صاحب۔۔۔۔۔“ وہ کھاکار کر کھلا صاف  
 کرتے ہوئے بولا ”میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ بڑی متوں خیرادوں سے  
 ہوا تھا۔ وہ بھی دوسری بیوی سے۔ پہلی بیوی سے تو کوئی اولاد نہیں  
 ہوئی تھی۔ دوسری شادی کی تو اس کے بھی کئی سال بعد اللہ تعالیٰ  
 نے مجھے فرزند سے نوازا۔ ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس سال اسے  
 لندن میں بورڈنگ اسکول میں داخلہ لی گیا ہے۔۔۔۔۔ بہت بڑا۔۔۔۔۔ بہت  
 اونچے درجے کا اسکول ہے جی۔۔۔۔۔ دزیر دلی سفیروں اور شہزادوں کے  
 بچے ہی پڑھتے ہیں وہاں جہاں میرے فرزند کو داخلہ ملا ہے۔ بس  
 اس خوشی میں ہم نے اپنی شکر گزہ والی حویلی میں ایک بہت بڑے  
 جشن کا اہتمام کیا ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ میں کمری سانس لے کر وہ گید بیٹے کو لندن کے  
 اسکول میں داخلہ ملنے پر جشن منایا جا رہا تھا۔ خیر۔۔۔۔۔ یہ تو ملک جیسے  
 لوگوں کے لئے واقعی اعزاز کی بات تھی۔ دولت کی فراوانی ہو  
 تو کام سے صحت یاب ہونے پر بھی جشن منایا جاسکتا ہے۔

اب میں نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ وہ تقریباً ایک فٹ لمبا کارڈ  
 تھا۔ لفاظے کی طرح اس کا بھی رنگ طلائی تھا۔ اس پر نہ جانے کیا  
 کیا لفاظی کی گئی تھی۔ خلاصہ بس یہی تھا کہ ایک تقریبِ مرت کا  
 اہتمام کیا گیا تھا۔ تاریخ دوسرے روز کی تھی۔ مقام تقریب شکر  
 گزہ والی دی حویلی تھی جو بھی ملک اسلم کی ملکیت ہو کر تھی۔  
 اس کی ساری زمینوں اور حویلی وضعہ کا مالک بھی اب ملک ریاض  
 ہی تھا۔

شکر گزہ اور اس حویلی کی یاد آتے ہی ذہن میں یادوں کی ایک  
 فلم سی جل پڑی۔ ایک لمحے کے لئے میں کھوسایا پھر جھرجھری لے  
 کر خٹکا۔ میں نے دیکھے لمحے میں کہا۔ ”ملک صاحب! میں معذرت  
 چاہوں گا۔ تاریخ بہت قریب کی ہے۔ یعنی کل ہی کی ہے۔ میری  
 بہت سی مصروفیات پہلے سے ملے ہیں۔“

”چوہدری صاحب! مجھے احساس ہے کہ مجھے کارڈ پہنچانے میں  
 تاخیر ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا صرف اس لئے ہوا کہ میں خود ذاتی طور پر  
 کارڈ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ اور میں  
 بڑے مان سے آیا ہوں۔ یہی سوچ کر آیا ہوں کہ خود جا رہا ہوں تو  
 چوہدری صاحب سے ”ہاں“ کروا کے ہی آؤں گا۔ آپ میرا دل  
 نہیں توڑ سکتے۔“

”لیکن ملک صاحب۔۔۔۔۔!“

”جھڑپیں جی۔۔۔۔۔ کا وہ باری مصروفیات تو چلتی ہی رہتی ہیں۔  
 ملتوی کرنا چاہے تو انسان ہر مصروفیت کو ملتوی کر سکتا ہے۔ اتنی  
 زیادہ کا وہ باری بن جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہی مصیبت ہو جاتی

ہے کہ وہ ہر مصروفیت کو سر پر سوار کر لیتا ہے۔ ہمارا مشورہ  
 تفریح کو بھی ضرور قہوڑی بہت اہمیت دیا کریں۔ اور پھر ہر  
 جشن کو بھی معمولی جشن نہیں ہوتے۔ لطف آجائے گا آپ  
 صیغوں نشہ نہیں اترے گا۔ پوری رات جشن چلے گا۔ کھلے  
 میں مرغیاں اور کمرے دوست ہوں گے۔ شراب پانی کی طرح  
 گی۔ قلمی دنیا کی تمام ٹاپ کی ڈانسرز ہوں گی۔ بہت کھانا ملا  
 ہو گا۔ لمبی عیشیاں ہوں گی۔ ہر طرح کی آزاریاں ہوں گی۔ ہر  
 آبی گھٹن زہ فضاؤں سے دور ہوں گے۔ بہت بڑے بڑے  
 وہاں جمع ہوں گے۔ نورہ ماچھی کے بھی خاص خاص آدمی ہوں  
 گے۔ آپ کی جان پہچان کی بھی بہت سی بڑی بڑی ہستیاں ہوں گی  
 طبیعت خوش ہو جائے گی آپ کی۔“

”لیکن ان میں تو میری دلچسپی کی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔“  
 نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو پھر آپ کی دلچسپی کن چیزوں میں ہے؟“ اس کی آنکھیں  
 حیرت سے پھیل گئیں۔

”یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ میرا کچھ پتا نہیں ہو تا کہ  
 کب کس چیز میں دلچسپی لینے لگوں۔“ میں نے کہا۔

”بس۔۔۔۔۔ تو پھر آپ چلے گی ہاں بھرے۔ وہاں بیٹھے ہی آپ  
 دلچسپی شروع ہو جائے گی اور آپ اپنے اس فیصلے پر خوش ہوں

عظیم جرنیل بونا پارٹ کی زندگی  
 اور کارناموں پر مشتمل

ایک دلچسپ کتاب۔۔۔۔۔

نیولین بونا پارٹ

قیمت: -/75 روپے

☆۔۔۔۔۔ پروفیسر ایم اشرف

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

میں، بچتا نہیں ہے نہیں۔ یہ نہیں سوچیں گے کہ ہمارا تھی دور  
زمینوں پر جا کر وقت ضائع کیا۔ میں۔۔۔ اب میں انکار نہیں سنوں  
کا۔ یوں سمجھیں کہ یہ قریب تو ہے ہی آپ کے اعزاز میں۔ آپ  
یہ نہ ہوئے تو قریب کا کیا لطف رہے گا؟ میں کل دن پڑھے آپ کو  
پلنے کے لئے گاڑی بھیج دوں گا۔

میں ایک لمحے کے لئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا رہا۔  
میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محض ایک مختصر سفر کے دوران اتفاقاً  
مل جانے والا یہ شخص مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا؟ تقریباً کہیں  
یہ ہوا جا رہا تھا۔

”دوسری طرف شکر گڑھ کے گلی کوچوں کی یادیں بھی مجھے اپنی  
طرف کھینچ رہی تھیں۔ بالآخر میں نے کہا ”اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے ملک  
صاحب۔ لیکن میں اپنی ہی گاڑی میں چلوں گا۔ آپ صرف ویسے  
یہ ساتھ چلنے کے لئے اپنی گاڑی بھی بھجوا دیجئے گا۔ بہت مدد نہیں  
ہو گئی ہیں مجھے ان راستوں پر گئے ہوئے۔ دراصل ہماری رہے گی تو  
اچھا رہے گا۔“

”مفروضہ بددی صاحب! اللہ نے کل ای کوئی نہیں۔ دل  
خوش کر دیا آپ نے۔“ دواٹھ کر پڑخوش انداز میں مجھ سے مصافحہ  
کرنے لگا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بھی جانے کے لئے اٹھ  
کھڑے ہوئے۔

”ملک ریاض راہی نے دوسرے روز صبح کے مطابق  
مجھے پلنے کے لئے گاڑی بھیج دی لیکن میں اپنی ہی گاڑی میں روانہ  
ہوا۔ ملک کی بھیجی ہوئی گاڑی پائٹ کے طور پر میرے آگے آگے  
چلتی رہی۔ سفر روانہ ہونے سے پہلے میں نے فونی کو فون کر کے کچھ  
ضروری ہدایات دے دی تھیں۔

ملک ریاض کی بھیجی ہوئی گاڑی میں تین آدمی تھے۔ ان میں  
سے دو دراصل برادر تھے۔ ہم شام کے قریب شکر گڑھ پہنچے۔ قصبوں  
اور دیہات میں دیسے بھی کچھ پہلے ہی شام ہو جاتی ہے۔ مجھے وہاں  
قد سے دیرانی کا احساس ہوا۔ قصبہ تقریباً دیسے کا ویسا ہی تھا جیسا  
میں چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید کچھ تبدیلیاں آئی بھی ہوں لیکن مجھے ان کا  
احساس نہیں ہوسکا کیونکہ میں قصبے کو صحیح طور پر دیکھ ہی نہیں سکا۔

ملک ریاض کی حویلی جو بھی ملک اسلم کی ہوا کتنی عجیب و غریب  
پہنچنے کے لئے قصبے کے گلی کوچوں سے گزرنے کی ضرورت نہیں  
تھی۔ وہ قصبے سے بہت دور کھلے میدان میں ”پائل الگ ٹھکانہ“  
آج بھی اسی طرح غوث سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے آس  
پاس اب بھی کسی قسم کی تعمیرات کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ کچھ دور  
مصرف ان لوگوں کے چند نیم پختہ مکانات موجود تھے جو بطور خاص  
مصرف حویلی میں ہی مختلف خدمات انجام دیتے تھے۔

حویلی اپنے طویل و عرض اور شان و شکوہ کے لحاظ سے کسی قلعے  
سے کم نہیں تھی۔ ملک اسلم اپنے زمانے میں اتنا بڑا زمیندار نہیں

لازوال  
کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

۷

شاہکار تاول

نجیشت (۵ حصے) ۲۰۰/-

برہمچاری ۱۵۰/-

درخشاں (۲ حصے) ۹۰/-

رقص ابلیس ۱۵۰/-

آسیب زندہ ۱۱۰/-

دستک ۱۰۰/-



مکتبہ القادسیہ

اردو بازار لاہور

فون ۶۶۵۶۴۴



ہوئی تھیں۔ کئی جگہوں پر الاؤ دیا کہ باہر کیوں کے انتظامات جاری رہے تھے۔ بیسیوں آدمی تندی سے مختلف کاموں میں لگے رہے تھے۔ آثار تیار رہے تھے کہ ملک ریاض کا دعویٰ درست تھا۔ یہاں میں منگل کا سامان یہاں آکر نہ کی جا رہا تھا۔

ملک بڑی ہی عاجزی، بڑی ہی منونیت سے بولا۔ "میرا صاحب! میں بتا نہیں سکتا کہ آپ کی آمد کی مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ آپ نے یہاں شریف لاکر میری عزت بڑھائی ہے۔ میرا بڑھایا ہے مجھے ڈر تھا کہ آپ نے مروت میں آکر وعدہ تو کر لیا تھا لیکن شاید بعد میں آپ کا ارادہ بدل نہ جائے۔"

"میری نکت میں وعدہ خلافی کا لفظ نہیں ہے ملک صاحب! میں نے اس کا کدھا چھینکے ہوئے کہا۔" میں یا تو وعدہ کرنا نہیں کر لیتا ہوں تو اسے بھانے کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"جہاں مردوں کی یہی شان ہوتی ہے چوہدری صاحب! میں نے میرا ہاتھ تمام کر اندر لے جاتے ہوئے کہا۔ اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ حویلی کی ساخت میں خام تہذیبیں ابھری تھیں۔ کئی انسانے کئے گئے تھے۔ جدید تقاضوں۔ مطابق ترین و آرائش کی گئی تھی۔ وہ کھلا صحن جو پہلے میدانِ طرح پھیلا ہوا تھا اب اتنا کھلا نہیں رہا تھا۔ اس کا کچھ حصہ بھی قبر میں چلا گیا تھا۔ اوپر کی منزل پر بھی کچھ نئی تعمیرات نظر آ رہی تھیں۔ صحن کا جو حصہ اب بھی کھلا تھا اس میں شامیانے لٹا ہوئے تھے۔

کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ سامنے ہال کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم لوگ وہاں نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا سیلاب تھا۔ ادھر سے ادھر کچھ خاتون کے رنگے پہاڑ بھی لٹکائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ملک ریاض نے پہلے مجھے شامیانے میں لے جا کر کریمین اکھرے ہوئے لوگوں سے ملوانا شروع کیا۔ وہ واقعی مجھے اس اجازت و احترام سے لوگوں کے سامنے لے جا رہا تھا جیسے میں یہاں کی سب سے بڑی شخصیت ہوں، جیسے واقعی میرے ہی اعزاز میں سب آ رہے ہوں۔

دہاں میرے جانے پہچانے کی بڑے صنعت کار، تاجر اور برلن میں موجود تھے۔ ان میں ایک تو بارلش حامی صاحب بھی موجود تھے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ اس قسم کے جٹر ہائے عیش کو کبھی یا دوسری نقیبات کے قریب بھی نہیں جھٹکتے ہوں گے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ مجھے جیسے جیسے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ انہیں ہنس کر باتیں کر رہے تھے، چمک رہے تھے۔

کئی ایسے بڑے ہو دو کریم بھی موجود تھے جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا تھا اور سرکاری مشینری میں ان کی اہمیت سے بھی واقف تھا۔ ان میں سے بعض تو اسی طرح کچھ ریور نظر آنے کی کوشش

تھا جتنی بڑی اور پرکشش اس کی حویلی نظر آتی تھی۔ شاید یہ اس کا شوق تھا یا اس نے جان بوجھ کر اتنی لمبی چڑی حویلی بنوائی تھی۔ اس میں مصلحت بھی کارفرما ہو سکتی تھی۔ اس قسم کی حویلی سے زمیندار کی شخصیت اور اس کی زمینداری اور بھی زیادہ بھاری بھر کم معلوم ہوتے لگتی تھی۔ اس کا رعب داب اور اس کے خاندانی پس منظر کا تاثر کچھ اور گہرا ہو جاتا تھا۔

اب دولت کی ریل ویل کے اعتبار سے ملک ریاض کا زمانہ تو اور بھی بہتر تھا۔ اس نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ اس دور افتادہ مقام پر واقع یہ حویلی ایک عمدہ جائیداد تھی اس کے فائدے اپنی جگہ تھے۔ اس نے اس پر اپنی چیز کو کھینچا اور خستہ حالی کا شکار نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے اسے اور بھی بہتر بنایا تھا اس پر اور بھی روپیہ خرچ کیا تھا۔ اتنے برس بعد وہ پرانی اور شکستہ حال نظر آنے کے بجائے پہلے سے زیادہ خوبصورت، چمکی دکتی اور شاندار نظر آ رہی تھی۔

اب تو ویسے بھی یہاں ہر آسائش میسر تھی۔ کم از کم ملک ریاض کو تو میسر تھی۔ بالائی کمروں کی دیواروں سے ایئر کنڈیشنر جھانکتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت تو رنگین تیلوں کی جھالروں سے دودھوار پر "جہاں اٹاں" بھی کیا گیا تھا۔ وہی چراغاں جس میں کوئی چراغ استعمال نہیں ہوتا۔

قیسے کے قریب سے گزرتے وقت مجھے قدرے ویرانی کا احساس ہوا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے ایک اواس شام اپنے تاریک بازو پھیلائے دھیرے دھیرے قیسے میں اتر رہی ہے۔ کہیں کہیں آواز دے گئے بھی تھکے تھکے انداز میں گردن جھکائے ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن یہاں حویلی اور اس کے گرد و نواح میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ یہ غروت کے سمندر میں دولت کا جزیرہ تھا۔ شہر ہوں یا دیہات، بستیاں ہوں یا ویرانے، یہ جزیرے ہر جگہ نظر آ جاتے ہیں۔ جی ہاں، ویرانوں میں بھی نظر آ جاتے ہیں۔

غریب آدمی شکار کھیلنے کا شوق رکھتا ہے مگر زندگی کی کشمکش اسے فرصت نہیں دیتی۔ کبھی کبھار ناں کر کوئی زیادہ ہی شوقین مزاج قسم کا غریب اگر وقت نکال ہی لیتا ہے تو زیادہ سے زیادہ ایک سستی سی ہنسی لے کر کسی نمرا جھیل میں ڈور اال کر، قسمت پر نگیہ کر کے چھلی چھنے کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے اور اوتھنا رہتا ہے۔ کبھی دو لہندوں کو شکار پر جانے دیکھتے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا ویرانوں میں دولت کے جزیرے کس طرح نمودار ہوتے ہیں۔

حویلی کے قریب بڑی بڑی گادوں کی قطاریں موجود تھیں۔ کافی لوگ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ ہماری گاڑیاں بھی جا کر ایک قطار میں لگ گئیں۔ ملک ریاض نے اپنے چند خاص خاص آدمیوں کے ساتھ باہر آکر میرا استقبال کیا۔ وہ انہیں غرض اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے ملا جیسے برسوں سے چمک رہا ہوا میرا مزہ ترین دوست تھا۔ میدان میں جا بجا انٹینوں کے غارضی پسوں لچل چل رہے تھے۔

تکلف مقامات پر تعینات تھے کہ کسی کی نظر میں نہ آسکیں۔

"ان بے چاروں کو بھی یہاں کے رونق میلے سے لطف اندوز ہونے دیتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اُدھر کیوں نکلا رکھا ہے؟ کیا کسی کی طرف سے ملے کا خلا ہے؟"

"نالا چوہدری صاحب! ملک ریاض بے پروائی کے ساتھ ہاتھ ملا کر بولا۔ "اس علاقے میں کسی کی مجال ہے کہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ حملہ کرنے والوں نے اپنی نسلوں کا نام نشان ملوثا ہے؟"

میں نے دوری سے سرکاری ملازموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ویسے بھی سرکار تو خود یہاں موجود ہے۔ ڈاکوؤں پر اور بھلا کون حملہ کر سکتا ہے۔

"ٹھیک کہا آپ نے چوہدری صاحب! ملک ریاض مسکراتے ہوئے بولا "ہم اپنا کام پکا رکھتے ہیں۔ ہمارے دیار میں بھی حاضری دیتے ہیں۔ سرکار بھی، ڈاکو بھی۔ اور یہاں کوئی ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہاں سب اپنے اپنے معاملات نمٹانے کے لئے اور ساتھ ساتھ شغل میلے کے لئے آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے الجھنیں کھڑی کرنے کی غرض سے نہیں۔ بہر حال ہم چاروں طرف اپنے آگاہی اس لئے لگا دیتے ہیں کہ ہماری مرضی کے بغیر علاقے میں پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔ ہماری طاقت، رعب اور دہد بہ اپنی جگہ ہے لیکن رقبہ تو دشمن اور حد کے سلسلے تو چلتے رہتے ہیں۔ کیا چابک کوئی پاگل کا ہتھ اپنے داغ میں کوئی خناس لے کر ادھر کا رخ کر لے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے دھمکے لیے میں کہا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے میرا ذہن ایک بار پھر اگلے سوچوں کے صحرائیں بھٹکنے لگا تھا۔ کتنا احمق تھا اس کے لیے میں! ابھی وہ ملک کا کوئی بہت ہی بڑا بہت ہی معروف اور قابل ذکر زمیندار نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کا انداز گفتگو کچھ ایسا تھا جیسے یہ اس کی ایک علیحدہ سلطنت تھی جہاں اس کا فرمان چلتا تھا اس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں مل سکتا تھا اس کا حکم ہی یہاں کا قانون تھا۔

ملک میں اسی کے قبیل کی اس سے بھی کہیں بڑی نہ جانے کسی کسی توپ چڑس بھری پڑی تھیں۔ ان سب کی اپنی اپنی الگ الگ بادشاہتیں تھیں جہاں ان کے نام کا مکہ چلتا تھا جہاں ان کے من سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ کبھی کبھی میں حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ آخر طاقت و انصاف کا اصل مرکز کہاں تھا؟

"ڈانرہ بھی آچکی ہیں۔" ملک ریاض نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچے ہوئے کہا۔ "ادھر کمرہوں میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ قوام کر رہی ہیں تاکہ اپنی رات بھر کی خدمات کے لئے تازہ دم ہو سکیں۔ کچھ قلمی کامیڈین بھی ہیں۔ بتا رہے تھے کہ وہ بڑے اچھے اداکار تھے۔

روئے تھے جس طرح دفنوں میں دکھائی دیتے تھے لیکن بعض اس طرح نکل کر بیٹھ رہے تھے جیسے مدت بعد اپنے آپ کو نصن سے آزاد محسوس کر رہے ہوں۔

نورودا بھی وہاں موجود تھا اور اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر رہ سکا۔ وہ قہری بیٹس سوٹ میں تھا۔ پولیس متابوں اور ڈاکوؤں کے بعد جنگل میں جا کر چھپنے والا دوسرا ہوتا تھا۔ دہشت بھیلانے والا بیٹوں کو ماراج کرنے والا گھروں کو نذر آتش کرنے والا اور بڑے بڑے مکانوں کو بلی بھر میں ویران کر دینے والا نورودا بھی قہری بیٹس سوٹ میں، چھائی چوڑی کے میرے سامنے کھڑا اپنے مخصوص نیم شور اور سبک سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

اس کا سوٹ گو کہ اس کے جسم پر بہت ڈھیلا تھا۔ ممکن ہے آپ اسے نہ سوا یا گیا ہو یا پھر شاید اپنی ضروریات کے تحت اس نے جان بوجھ کر سوٹ اتار ڈھیلا رکھوا یا ہو۔ کیونکہ اس کے کوٹ کے نیچے پتلون کی چٹ کے ساتھ کیڑوں کی پٹی اور دونوں طرف دو بڑے لالہروں کی موجودگی کا احساس تو مجھے بھی ہو گیا تھا۔ ان کے علاوہ میں اس کا سوٹ ڈھیلا ڈھیلا ہونے کی وجہ سے اور نہ جانے کس کس چیز کے لئے پردہ داری میں اشتہال ہو رہا ہو۔ بہر حال ایک نامی لڑائی ڈاکو کو قہری بیٹس سوٹ میں سرکاری و غیر سرکاری معززین شہر کے درمیان دیکھنا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔

آٹھ دن ڈاکو اس کے ساتھ تھے۔ وہ بھی معززانہ لباسوں میں تھے لیکن مشکوں سے بہر حال ڈاکو ہی دکھائی دے رہے تھے۔ انسانی کردار کے بارے میں ذرا سا بھی شعور رکھنے والا آدمی قہری بیٹس نہیں دیکھ کر ان کی اصلیت کا اندازہ لگا سکتا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہاں موجود سب لوگوں نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں یا پھر شاید وہ انہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کے حلقے میں شمار کر رہے تھے۔ اور اعمال کے لحاظ سے شاید یہ بات کافی حد تک درست بھی تھی۔

ان میں سے دو کے پاس تو بگلی سی مشین تھیں تھیں۔ وہ شاید ان میں جوبلی کے دروازے کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ دو ڈاکو سامنے کی طرح نورودا بھی کے ساتھ ساتھ تھے۔ آؤنٹیک رائفلیں ان کے کندھوں سے لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت اپنے سروار کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عقاب کی آنکھوں کی سی چمک تھی اور وہ خطرناک انداز میں مسلسل ہمت سے ہر گونے کا جائزہ لے رہے تھے۔

نورودا بھی خود کچھ ایسا چکرنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ چٹون کی بیٹوں میں ڈالنے بے فکر سے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ سامنے بھی سب توفیق اسطو اٹھائے ہوئے یا اپنے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ ملک ریاض نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ نورودا بھی کے کردہ کے ہاتھ آدمی کچھ فاصلہ چھوڑ کر جوبلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے ہوئے ہیں۔ وہ اس طرح

کر کے لائے ہیں۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”آپ بھی چاہیں تو آرام کر لیں۔ اور آپ کے لئے بھی ایک کمرہ خالی ہے۔ آپ بھی سڑ کر کے آئے ہیں۔“

میں ہنس دیا ”اب ایسا بھی کوئی دشوار گزار سفر نہیں تھا کہ آرام کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔“

”آپ اپنے ہم پیشہ اور ہم مرتبہ آدمیوں کی طرح آرام طلب نہیں ہیں چوہدری صاحب!“ وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”تخت جان بھی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کچھ خلیفہ آدمی ہیں۔“

”شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں۔ میں خود اپنے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔ ابھی تو آپ سے ملاقاتیں شروع ہوئی ہیں۔ اگر یہ ملاقاتیں جاری رہیں تو آپ میرا تجزیہ کرتے رہیں گا اور مجھے میرے بارے میں آگاہ کرتے رہیں گے۔“

”ملاقاتیں تو اب یقیناً جاری رہیں گی اور تعلق بھی بہت مضبوط ہو گا۔“ وہ وثوق سے بولا۔

”آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں عرض آپ سے کافی بڑا ہوں چوہدری صاحب! میں نے دنیا دیکھی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ انسانوں کے ساتھ کون سی چیزیں تعلقات کو مضبوط بناتی ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ ممکن ہے آپ کے تمام اندازے غلط ہوں ملک صاحب! لیکن میں خاموش رہا۔ ابھی میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص درحقیقت کتنے راستوں کا مسافر تھا اور مجھے کہاں لے جانے کی فکر میں تھا۔

چند لمحے بعد وہ مجھ سے معذرت کر کے دوسرے مہمانوں سے بات چیت کرنے چلا گیا۔ میں ٹھلنے کے سے انداز میں شامیانوں سے باہر آیا۔ مہمانوں میں ابھی پھٹکی ڈرکس چل رہی تھیں۔ باوردی میرے مستعدی سے تمام لوازمات اٹھائے پھر رہے تھے۔ مہمان ابھی ”موز“ بنا رہے تھے ایک ریڑھ پر لیگی ہوئی مختلف چیزیں لئے میرے پاس بھی رکھ میں نے صرف .... کوئلہ ڈرک کا ایک ٹکاس لینے پھر آکٹافیا اور ذرا آٹائی کی تلاش میں ایک گوشے کی طرف چل دیا۔

جوبلی کے اس صحن کا فرش کسی زمانے میں عام سینٹ کا ہوا کرتا تھا۔ اب ماربل کے خوبصورت ٹائلز کا تھا۔ ایک طرف ریوار کے ساتھ ایک پختہ چوڑا ہوا کمرہ تھا۔ ملک اسلم کے ہاں جب بھی کسی سلسلے میں مزارع کالی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے تو ان سے باتیں کرنے کے لئے وہ اس چوڑے پر آہٹا تھا۔ تالین اور چکاڑ

اب اس چوڑے کی جگہ منظر طرز کی ایک چھوٹی سی پارکوری نما چڑھتیر کی گئی تھی جو بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ تالین اس میں بھی بچھا ہوا تھا۔ گاؤں کے گئے ہوئے تھے۔ میں اس کے ایک ستون کے سارے کمرہ ہو گیا اور ماضی کی دھندلی دھندلی پرتھائیاں میری آنکھوں میں اترنے لگیں۔

یہی جگہ تھی۔۔۔ ہاں۔۔۔ بالکل یہی جگہ تھی جہاں ایک گندی اور چارپائی پر میرے باپ کی خون میں تھنڑی ہوئی لاش لاکر رکھی گئی تھی۔ ملک اسلم نے جو کچھ کہا تھا ”جویم گا جو یو عمل تھا“ تھا سیدار نے مجھ سے جو سلوک کیا تھا وہ سب مناظر وہ سب باتیں میرے ذہن پر نقش تھیں۔ اس دن کی سوگاری مجھے نہیں بھولی تھی۔ کیا سائبان میرے سر سے ہٹ گیا تھا اور میں نے خود کو کیسا بے لالہ محسوس کیا تھا تو جوانی اور نوخیزی کے دور کا وہ ذہن مندرل تو ہو چکا تھا لیکن دل سے اس کی کک نہیں مٹی تھی۔ اب بھی ماضی کا کوئی دوالہ سامنے آجاتا تھا تو وہ کک جاگ اٹھتی تھی۔

اس سامنے کے بعد ملک اسلم کے بیٹے قیصر کے دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب مجھے قیدی کی حیثیت سے جوبلی میں لایا گیا تھا۔ یہ بات تو زیادہ پرانی بھی نہیں تھی۔ بہت ہنگامہ رہا تھا۔ اس جوبلی کا تھوڑا سا حصہ مندم بھی ہوا تھا لیکن اب وہ نہ صرف مرمت ہو چکا تھا بلکہ پہلے سے بہتر حالت میں تھا۔ میرے ذہن پر اس واقعے کی خراشیں بہر حال آج بھی موجود تھیں لیکن اب ملک قیصر اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔

## غیر ملکی زبانیں سیکھئے

مصنف: پروفیسر ایم اشرف

جرمن اردو ریڈر = 90/

جرمن اردو کشتری = 90/

جرمن فریزبک = 90/

اطالوی اردو ریڈر = 80/

اطالوی اردو کشتری = 90/

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

اب وقت نے یہ عجیب کھیل لی تھی۔ آج اسی حوالی میں مجھے مداحرام و امرا اس محفل طرب و نشاط میں مدعو کیا گیا تھا۔ زہریلی یادوں کے زخم تک دینے لگے تو دل نے کہا کہ مجھے اس جگہ ایسا محفل میں رکنا نہیں چاہئے۔ جس جگہ سے اتنی بد صورت نہیں وابستہ تھیں وہاں میں کسی خوبصورت کسی کو نشاط سے کیونکر لطف اندوز ہو سکتا تھا؟ لیکن اب واپس جانا بھی بہت عجیب لگا۔ ملک ریاض راہ میں حاکم تھا۔ عزت کی ذخیرہ ہزاروں میں تھی۔ میں نے کہا اپنی سوچوں اپنے محسوسات سے الگ تیار۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو باقاعدہ پینے پلانے کا دور چلنے لگا۔ بالائی دھکی دھکیو کے کمرے کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ ادھر کھلے پیرانے سے ہوا کے ساتھ کھانوں وغیرہ کی اشتبا انگیز خوشبو نہیں بھی آنے لگی تھیں۔ شامیانوں میں ایک سرے پر بہت عمدہ استیج بھی بچھا گیا تھا۔ ٹائیک وغیرہ بھی موجود تھے۔ فی الحال ایک غیر معروف ماکسیٹین دن میں شو پیش کر رہا تھا۔ کچھ لوگ اس کے چٹکوں سے محظوظ ہو رہے تھے اور کچھ آپس میں کپ شپ میں لگے ہوئے تھے۔

شراب واقعی وہاں پانی کی طرح اندھائی جاری تھی۔ پینے پلانے کا دور کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گیا۔ میرا خیال ہے وہاں صرف تین چار ہی آدمی ایسے تھے جو نہیں پیا رہے تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ کئی سہانہ امی سے لٹھے میں بدست دکھائی دینے لگے تھے۔ ڈاکوؤں میں سے بھی ایک آدھ مدہوش دکھائی دینے لگا تھا۔ نووہا بھی کچھ پی رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ہاتھ روک کر پی رہا تھا البتہ اپنے ساتھیوں میں سے وہ کسی کو نہیں روک رہا تھا۔ کچھ کی رات شاید سب آزاد تھے۔ ڈاکوؤں نے بھی شاید اپنا ڈسپلن اور بانڈیاں بلائے طاق رکھ دی تھیں۔ شرور اور جنگلوں دونوں بھگول کے ڈاکو ایک دوسرے میں مکمل مل گئے تھے۔

استیج پر اس دوران صرف ماکسیٹین کا سلسلہ چلتا رہا۔... میں نے وہاں کئی دنیا کے دو تین ابھرتے ہوئے اور ایک آدھ نامور ماکسیٹین کو بھی دیکھا۔ حاضرین اب ان کے انگلیز سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ باہر آگ پر تیز ہرن اور سرخالیوں وغیرہ کا گشت بھرتا جا رہا تھا، ہوا کے دوش پر اشتبا انگیز خوشبوؤں کا ستر تیز تر ہو گیا تھا۔

پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مہن میں رکھی ہوئی میزوں اور اسٹینڈز وغیرہ پر بھی ڈشیں لالا کر رکھی جاری تھیں اور وینز بھی مسالوں کے درمیان چکر مار رہے تھے۔ سوکھنے کا انتظام کچھ ایسا تھا کہ ہر صحن کو ذرا سا ادھر ادھر پھر کر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اپنی پنک پھیر کر چڑھ کر آجائے۔ ہر چیز داغ و خراش میں تھی اور آگ سے آگہر کر آدھ تازہ لائی جاری تھی۔ ہر رتن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کھانے کا انتظام عمدہ تھا اور کھانے کے سبھی شوقین معلوم ہوتے تھے۔ زندگی میں نہ جانے کیا کچھ کھائے تھے۔

اسی دوران کھانے میں شریک ہونے کے لئے اوپر کی منزل سے خواتین بھی قطار در قطار اتر آئیں۔ ان میں سے چار تو واقعی فلم انڈسٹری کی باپ کی ڈانسرز تھیں بلکہ اب تو وہ بیرونی پینے کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ دو ڈانسر لڑکیاں ایسی تھیں جو لاکو کا فلوں میں کاسٹ ہوئی تھیں۔ یہ وہ چہرے تھے جنہیں میں پہچان سکا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی مجھے پہچانتی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ ملک ریاض مجھے ان سے متعارف کرانے کے لئے دھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں جلدی سے مسالوں کے جھرم میں ایک طرف کو ہو گیا اور پھر یوں ادھر ادھر ہونے لگا کہ ملک مجھے تلاش نہ کر سکے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فلمی لڑکیاں مجھے اس محفل میں دیکھیں۔ ملک ریاض غالباً میری طرف سے مایوس ہو کر دوسرے خاص خاص لوگوں کو ان سے ملوانے لگا۔

وہ اپنے ہونٹوں پر نیچی تلی پیشہ ران مسکراہٹ سہانے سب سے اکساری سے مل رہی تھیں۔ آداب، بجالا رہی تھیں۔ ان کے اچھے برے جلوں پر ہنس رہی تھیں۔ لڑکیاں بری نہیں تھیں۔ تقریباً سبھی قبول صورت تھیں بلکہ ان میں تیزی سے ابھرتی ہوئی ایک نئی لڑکی افروز کو تو خوبصورت لڑکیوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خوشگوار قسم کی نازکی تھی۔

محل و صورت سے قطع نظر ان کی شخصیتوں میں ذرا دوسری ہی قسم کی کشش تھی۔ اور پھر ان کا تعلق شو بزنس سے تھا۔ یہ گوم چلا ساتھ لگ جانے کے بعد لڑکیوں میں عام لوگوں کو ایک اور ہی طرح کا گھبر، ایک اور ہی طرح کی کشش محسوس ہونے لگتی ہے جو درحقیقت صرف تصوراتی ہوتی ہے۔ ان کے قریب آنے وقت سب کی باجیس پھیل جاتی تھیں۔

لڑکیاں صرف وہ چہ نہیں بیسیوں تھیں۔ بانی معلوم نہیں کون تھیں، کہاں سے آئی تھیں لیکن ان کے ساتھ کچھ لوگ تھے جنہیں دیکھ کر ان کا پس منظر جانتا کچھ ایسا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ سب نے اس محفل میں آنے کے لئے بہت ہی اہتمام کیا تھا۔ لباس اور میک اپ کے معاملے میں گویا سب ایک دوسرے کو کھست دینے پر تلی ہوئی تھیں۔

ان کی آمد سے ہی درحقیقت وہاں رنگ، خوبصورتیاں اور خوشبو نہیں بکھری تھیں۔ وہ سب میں مکمل مل گئی تھیں۔ اس کام میں وہ یقیناً باہر تھیں۔ جو بھی ان کے قریب ہوتا تھا وہ اس کے سامنے بچہ، بچہ جاتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا وہاں کوئی بھی آدمی معمولی نہیں تھا۔ مترنم اور گونجیلے، غمور تھے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ لاکھڑائی زبانوں کے فقرے ایک دوسرے میں الجھ رہے تھے۔

کھانے کے بعد شامیانوں سے گریساں وغیرہ نکال دی گئیں اور فرشی لٹت کا اہتمام کر دیا گیا۔ قالینوں پر چاندناں بچھ گئیں۔ گاؤں لگے لگے سازندوں نے اپنی جگہیں سنبھال لیں اور پھر

مجدوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مجدوں میں بھی کچھ دیر انکی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پہلے ایک لڑکی نے روایتی انداز میں مغلیہ لباس میں 'فرزل' گائے ہوئے کلاسیکی رقص کیا۔ اس کے فوراً بعد موسیقی نے پلٹا کھایا اور مغلیہ دھن پر ایک لڑکی خالصتاً مغربی لباس میں میدان میں آگودی۔ اس کے رقص نے گویا حاضرین کے پہلے ہی سے گمراہے ہوئے میں آگ لگا دی۔

اس کے بعد ایک عجیب سی تجربہ کیا گیا۔ مشرق اور مغرب کا آبیرو تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ قدماست اور جدت کو ایک دوسرے میں بدغم کر دیا گیا۔ موسیقی مشرقی ہی تھی اور اس پر گاکی بھی جاری تھی فرزل.... لیکن لڑکیاں دو رقص کر رہی تھیں۔ ایک مشرقی اور دوسری کلاسیکل.... دوسری خالصتاً مغربی رقص اسی دھن پر پیش کر رہی تھی۔

حاضرین دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ داد و تحسین کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ نوٹ اٹائے جا رہے تھے۔ نہ جانے کس کس انداز سے رقاصاؤں پر نچھاور کئے جا رہے تھے اور اس بارے میں عجیب عجیب حرکتیں کی جا رہی تھیں۔ لڑکیاں ہنسنے ہونٹوں پر مجسم مسکراہٹوں اور سر ہلکانوں کے ساتھ سب کچھ سہہ رہی تھیں۔ وہ تو کچھ پتلیاں تھیں، مٹینیں تھیں، مٹنا طیس تھیں۔ جیسوں سے نوٹ لکل لکل کر ان کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ ہر لڑکی کی نائیکہ نوٹ سمیٹنے کی مشین تھی۔

پینے پلانے کا دور اب بھی چل رہا تھا۔ جن کو طلب تھی یا جن کا حرف ابھی ساتھ دے رہا تھا وہ اب بھی پل رہے تھے۔ بعض کا حرف ساتھ نہیں دے رہا تھا مگر وہ بھی پل رہے تھے اور آپے سے باہر تھے۔ کبھی اٹھ کر لاکڑائے قدموں سے کسی رقاصہ کے ساتھ ہر قص بننے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی ایک ہی جمونے لگتے تھے۔ چند لمبے بعد گرتے پڑتے اپنی جگہ پر واپس آ جاتے تھے۔ دوسرے ان کی حرکتوں سے محفوظ ہو رہے تھے۔ آج کی رات ہر چیز سے محفوظ ہونے کی رات تھی۔ بعض صرف ذرا ب مسکراتے پر اکتفا کرتے تھے۔

میں ایک کونے میں چھپا بیٹھا تھا لیکن ملک ریاض آخر کار مجھے ڈھونڈا ہوا وہاں آن پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس نے گویا اطمینان کی سانس لی.... "شکر ہے آپ موجود ہیں.... میں تو سمجھ رہا تھا گلے گئے۔" پھر وہ خود ہی اپنے خیال کی تردید کرتے ہوئے بولا۔ "نکل کیسے سکتے ہیں۔ میں نے آپ کی اور آپ کی گاڑی کی گمرانی کے لئے ہندے باہر کمرے کئے ہوئے ہیں کہ چوہدری صاحب گلے کر جانے نہ پائیں۔" اس نے مخمور سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے یہ بات مذاق میں کہی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب آپ کی خوشی کی خاطر آگئے ہیں تو بائیں گے بھی آپ سے پوچھ کر ہی۔ ابھی تک تو کوئی

ایسی وجہ پیدا نہیں ہوئی جو منہ چھپا کر جانے کی ضرورت پڑے۔"

وہ پھنس پھنسا کر میرے پاس بیٹھتے ہوئے بچی آواز میں بولا۔ "آپ کچھ مشکل میں نہیں کر رہے.... جیسے جیسے بیٹھے ہیں۔ آپ کوئی کیش وغیرہ ساتھ نہیں لائے تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ حکم کریں کتنا کیش منگواؤں؟ بعد میں حساب ہوتا رہے گا۔ یا ہمیں حکم دیں۔ ہم آپ کی طرف سے لاکھ دو لاکھ لٹا دیں۔ یا چھوٹے چھوٹے سرکاری ملازموں کو اور تنخواہ داروں کو دیکھیں۔ کس طرح نوٹ اچھا ل رہے ہیں۔ آپ تو اتنے بڑے آدمی ہیں۔ اس کا اشارہ رقص کرتی ہوئی عورتوں پر نوٹ نچھاور جانے کی طرف تھا۔ میں نے معصومیت سے پوچھا۔ "کیا عورتوں پر نوٹ نچھاور کرنے سے ہی انسان کا مقام و مرتبہ ظاہر ہوتا ہے؟" "نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے چوہدری صاحب! وہ آپکے پکٹ سے اپنے لئے پان نکالتے ہوئے بولا۔ پان سے عجیب عجیب سی چیز خوشبو میں پھوٹ رہی تھیں۔ "لیکن ہر حال یہ زندگی، مشکل کیلے ہوتے ہیں۔ ان موقعوں پر اسی طرح کرنا اچھا لگتا۔ جس طرح روایتیں چلی آ رہی ہوں۔ دولت عیش و عشرت کے۔ ہی ہوتی ہے۔ اس طرح کسی خیمین چرے پر لٹانے میں بھی کبھی بڑا مزہ آتا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ محفل کو کچھ بڑا انجوائے نہیں کر رہے۔ آپ نے پینے پلانے میں بھی حصہ نہ لیا۔ آپ کا کچھ موڈ نہیں بہا رہا، نہ مجھے اتنی وضاحتیں کرنے ضرورت پیش نہ آتی۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "لفظ اندوز ہو رہا ہوں۔ لفظ اندوز ہونے کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ کچھ حرکتیں کر کے محفوظ ہوتے ہیں۔ آ لوگ انہیں دیکھ کر محفوظ ہوتے ہیں۔"

"میں ایک بار پھر کہوں گا اگر کیش کا کوئی مسئلہ ہے۔"

"نہیں یہ مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کا۔ ہوئے کہا۔ "بریف کیس میری گاڑی میں پڑا ہے، اتفاق سے اس میں کافی کیش ہے۔ اسی میں چیک بک بھی موجود ہے۔ میں ابھی نوکر سے بریف کیس منگوا لیتا ہوں۔ اخلاقیات کا بھی مجھے کچھ دعویٰ نہیں ہے۔ اگر میں کوئی بہت بڑا پارسا آدمی ہوتا تو اس محل میں آتا ہی نہیں۔ کبھی کا مرض بھی مجھے لاحق نہیں ہے۔" وہ انتہائی سے تیار رہا ہوں اس تصور سے میرا دل نہیں ڈوب رہا۔ میں لاکھ دو لاکھ روپیہ ان عورتوں پر لٹا دوں۔

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟" ملک ریاض نے ابھرنے سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے یہ کام بڑا عجیب بہت مشکل چیز، نہایت تفصیحی آہیز لگتا ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ملک ریاض سے مولیٰ کو بڑی دالے آدمی کے سامنے کس طرح اپنے عموں سے

کوئی پرزہ غلط لگ گیا ہے" میں نے کچھ ہی پر اٹھی مارتے ہوئے کہا۔  
اس دوران ملک کا نوکر میری گاڑی سے میرا ہرف کس لے آیا تھا۔

اس نے ایک اور قصبہ لگایا پھر نیچی آواز میں بولا "جب آپ شہر میں ہوتے ہیں تو کیا کبھی شاہی بازار یا پرائیوٹ پارٹیوں میں بجز شہر دیکھتے نہیں جاتے؟"

"نہیں" بازاروں میں تو میں کبھی نہیں گیا۔" میں نے ذہن پر زور دے ہوئے کہا "اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کسی ایسی پرائیوٹ پارٹی میں بھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا جہاں مجھے وغیرہ کا انتظام رہا ہو۔ ذرا ماڈرن قسم کی پارٹیز میں جانے کا البتہ اکثر اتفاق ہوا ہے جہاں کھانے پینے کے بعد ڈانس وغیرہ کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ شاید کھانا ہضم کرنے کے لئے۔"

"وہ بھی انگریزی بجز ایسا ہوتا" ملک نے ہلکا سا قصبہ لگایا۔

"نہیں۔ میرے خیال میں وہ کافی مختلف چیز ہوتی ہے۔ اس میں کوئی ایک شخصیت تماشاشا اور باقی سب تماشائی نہیں ہوتے اور یہ دونوں وغیرہ کا سلسلہ بھی نہیں ہوتا۔ سب خودی تماشاشا ہوتے ہیں اور خودی تماشائی۔"

"یادوں کہ میں کہ ہر کوئی اپنا تماشائی بھل میں لے پھرتا ہے۔" ملک ریاض ہنسنا پھر میری طرف جھٹکتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "وہی یقین نہیں آتا چوہدری صاحب کہ آپ اتنے ہی سادہ اور عیاشیوں سے اتنے ہی بچے ہوئے آوی ہیں۔ آپ کی جوانی تو اسنڈا طوفان معلوم ہوتی ہے۔ کیا کریں گے اس کو بچا بچاکے رکھ کر؟"

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" میں نے پلو بدلتے ہوئے طویل سانس لے کر کہا۔ "میں نے کہا تھا کہ زندگی کو برتنے کا ہر کسی کا اپنا طریقہ اپنا ملتا ہوتا ہے۔"

میں نے ہرف کیس کھولا۔ اس کے ایک حصے میں نوٹوں کی گڈیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ میں نے دس ہزار کی ایک گڈی نکال کر ملک ریاض کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لکھتے۔ یہ آپ میری طرف سے اس رقعہ پر لانا دیجئے" جب دوسری آئے گی تو مزید رقم آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

"نہیں چوہدری صاحب! یہ کام اس طرح نہیں ہوتے۔" وہ نفی میں اٹھی ہلاتے ہوئے بولا "آپ کی رقم ہے۔ آپ ہی آگے آکر پیش کریں۔"

"ملک صاحب! میں ابھی تک ان لڑکیوں سے اپنی شکل چھپانے میں کامیاب رہا ہوں۔ اب آپ کیوں مجھے ایک چوڑ گھسنے پر مجھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق فلمی دنیا سے بھی ہے اور وہ مجھے بچاتی ہیں۔ فلمی دنیا میں میرا ایجنسی بالکل مختلف قسم کا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ میں پیش برست قسم کا روایتی سینہ نہیں ہوں۔ ذوق و شوق سے اس قسم کی محفلیں نہیں جاتا اور نہ ان

وفات کروں۔" ایک بڑی عجیب سی روایت بڑا عجیب سا رواج ہے۔ معلوم نہیں اس نے کب اور کس طرح جنم لیا ہوگا۔ آپ کو عجیب نہیں لگتا کہ ایک عورت ناچ رہی ہے لوگ اس پر نوٹ اچال رہے ہیں۔ یا اسے نوٹ دینے کے بجائے اس کے ساتھ عجیب عجیب حرکتیں کر رہے ہیں۔ اور وہ مسکرا رہی ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اس وقت اندر سے بھی مسکرا رہی ہوگی؟

ملک ایک تک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی فیسورت آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں خمار کے گلابی ذورے تیر رہے تھے۔ پان چبانے کے لئے وہ بے خیالی کے سے عالم میں دھیرے دھیرے نہ چلا رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں رچھ یا بندر والا آیا کرتا تھا۔" میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ شکر گڑھ ہی میرا گاؤں تھا جہاں میں اس وقت بیٹھا تھا "رچھ یا بندر مختلف تماشے دکھاتا تھا" ناچتا تھا۔ پھر سب بچے اس پر پیچے بیٹھتے تھے یا مادی اس کے ہاتھ میں الو شوم کا ایک کٹورا دے دیتا تھا جسے لے کر وہ سارے محلے کے سامنے پھرتا تھا اور سب اس میں حسب توقع پیسے ڈال دیتے تھے۔"

ملک ریاض نے غیر ملکی سگریٹ کا پکٹ نکال کر لمبی سی ایک سگریٹ سلوائی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "رچھ یا بندر کا تماشہ اور بجز مجھے کچھ ایک ہی طرح کی چیز محسوس ہوتی ہے۔ عورت۔ خواہ طوائف ہو۔ اس میں اور رچھ بندر میں کوئی فرق ہونا چاہئے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ ڈانس آرام سے کیولی سے بیٹھ کر دیکھا کریں اور اس کا کوئی طے شدہ معاوضہ یا حسب حیثیت اور حسب حالات کوئی رقم رقص سے پہلے یا رقص کے بعد طوائف یا اس کی ٹانگیں کو ادا کر دیا کریں۔ یہ ایک ایک نوٹ اچالنا یا اس کے لئے طوائف کو قریب بلانا" اس سے چھٹیں کرنا نوجوان محسوس ہی کرنا کچھ عجیب سا نہیں لگتا؟"

میں بہت نیچی آواز میں بات کر رہا تھا "ویسے بھی وہاں ایک بچکا رہتا تھا" سب بتول ملک ریاض کے۔ "مشتعل ملے" میں گئے ہوئے تھے ورنہ شاید اس بات میں بیٹھے ہوئے معززین برا مانتا جاتے۔ ملک ریاض نے ایک گونچا قصبہ لگایا۔ تب بھی کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔

"اپنا ہماری بجز کم ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بولا۔ "چوہدری صاحب! کسی وی برسے ہی کمال بندے اور۔ ہر گز ایجنسی گھنٹوں اسچ پے جانے اور۔" (چوہدری صاحب! آپ بھی کمال کے آوی ہیں۔ ہر بات میں انجمنوں میں پڑ جاتے ہیں) "کیا کون" مالک نے ایسا ہی بتایا ہے۔ "میں نے ٹھنڈی ماس لے کر کہا۔ کوئی میو فیکرک ٹالٹ ہے مجھ میں۔ شاید یہاں

سے محفوظ ہوتا ہوں۔ بشری کرداریاں میرے ساتھ ضرور ہیں۔ مجھے زہد و پارسائی کا دعویٰ نہیں ہے۔ عورت سے مجھے دلچسپی ہے، بلکہ خاص دلچسپی ہے لیکن وہ میری خلوت کی زندگی ہے۔ میں سر بازار تماشا نہیں لگاتا۔ آپ میری طرف سے یہ گدزی اس کے بیرون میں رکھ دیں۔

"قرش پر رکھی ہوئی گدزیاں خواہ نفس نہیں اٹھائیں۔ یہ مجھے کے آداب کے خلاف ہے۔" ملک ریاض مسکراتے ہوئے بولا۔  
"آپ یہ کہہ کر رکھ دیجئے کہ یہ فن کے ایک گنہگار ستار کی طرف سے ہے اس کی ٹائیکہ اٹھالے گی" میں نے کہا "جس طرح وہ چھجور کے جانے والے نوٹ سمیٹتی ہے۔"

"اچھا... جلیں... جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ چند لمبے بعد وہ آگے بچھا۔ نوٹوں کی گدزی اس نے رقاصہ کے بیرون کی طرف اچھال دی اور یہ آواز بلند بولا "یہ فن کے ایک شرمیلے قدردان کی طرف سے ہے جو سامنے نہیں آتا چاہتا، چہرہ نہیں دکھانا چاہتا۔" اس کی آواز پات دار تھی۔ موسیقی اور داؤد عجمین کے شور میں بھی صاف سنائی دی۔

ایک لمحے کے لئے بدست تماشاویں کی چیخ پکار تو ختم مئی لیکن موسیقی کی دردناک سی پکار مسلسل جاری رہی۔ رقاصہ کے قدم ایک لمحے کے لئے رکے۔ اس نے حلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جو نوٹ نہیں لٹا رہے تھے اور پھر مجھ تک تو روشنی بھی صحیح طور پر نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ نہیں جان سکتی تھی کہ فن کا وہ گنہگار قدردان کون ہو سکتا تھا جسے ملک ریاض نے شرمیلا قرار دیا تھا۔

رقاصہ تیز روشنی میں تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں نمی جھلکائی تھی یا پھر شاید یہ میرا وہم تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ماہرانہ انداز میں رقص کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑا۔ ٹائیکہ نے اپنے کارندے کے ذریعے گدزی اٹھوائی جو اسی کام پر مامور تھا۔

اسی طرح میں نے ملک ریاض ہی کے ہاتھوں ہر رقاصہ کے قدموں میں دس ہزار کی گدزی پکوائی۔ صرف اس لئے کہ ملک یہ نہ سمجھے میں تجویس ہوں اور حسب حیثیت خرچ کرنا نہیں جانتا۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ میں پیپ نظر آنے سے بچنا چاہتا تھا۔

رات کے بارہ بجے تک شامیانوں سے موجود سہانوں میں سے بیشتر نشے میں موصت ہو چکے تھے۔ محفل اپنے کٹھن عروج پر تھی۔ اور یہ ایسا کٹھن عروج تھا جس کے بعد یکدم لوگ تھک کر گر پڑتے ہیں۔ نورود ماچھی نشے میں بدست ہو کر اور بھی خوفناک دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے چوڑے چہلے کھروے چہرے پر ہلاکی و وحشت تھی اور سرخ انگارہ آنکھوں میں ایک ایسی دردنگی تھی جو نشے کی تہ میں نہ ہم پڑنے کے بجائے زیادہ طاقتور ہو گئی تھی۔

اس وقت افروز ڈانس کر رہی تھی۔ وہ سہانوں کے لیے اصرار پر تیری مرتبہ ڈانس کرنے آئی تھی۔ وہ شکل صورت اعتبار سے بھی سب لڑکیوں سے بہتر تھی اور اسے رقص پر بھی ہر تھا۔ ایک آپ کی خوں کے باوجود یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا اس کی رنگت واقعی سرخ و سپید تھی۔ اس کی آنکھیں بادامی بال سنہری تھیں۔ اس کے جسم میں شاخ گل کی سی لچک تھی۔ ہاں ہی میں قسم دالے اسے بازار سے ایک کمرے کے لئے تھے لیکن انھی مصروف نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سنا تھا اسے لڑاکاری بالکل نہیں آتی تھی اور اس کا لہجہ بہت خراب تھا اور شاید وہ بیرون بھی بن سکتی تھی۔ اس کی یہ خامیاں سخت کوشش اور محنت کے باوجود دور نہیں ہو رہی تھیں۔ ڈانسر کے طور پر اس کے کامیاب ہونے کی امید تھی۔ اس کی ولایت کا خانہ اگر کبھی پڑ گیا کیا ہوگا اس میں یقیناً کسی خوبصورت لڑکی کا نام آیا ہوگا۔

افروز اس وقت شاید اپنا آخری رقص پیش کر رہی تھی۔ نشے میں نہیں تھی لیکن موسیقی کے دھم، محفل کے جوش و خروش یا پھر کسی انجانے اندرونی جذبے نے اس پر بھی والہانہ کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ رقص کیا تھا، بے خودی کا ایک عجیب سی مظاہرہ تھا۔

پھر اس بے خودی نے نورود ماچھی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اس طرح کو کر آگے بچھا جیسے کسی درد سے نئے رخت سے کیا میدان میں چلا تھک لگائی ہو۔ اس نے افروز کے دونوں ہاتھ قفا لئے اور بالکل ریڑن ٹکسوں کے کسی وحشی کردار کی طرح اس کے رقص میں شریک ہو گیا۔ تماشاویں نے آسمان سر پر اٹھایا۔ میٹیاں اور تالیاں بجنے لگیں۔ نعرے لگنے لگے۔ ان دونوں پر نوا چھجور کے جانے لگے۔ چار چہرے اور ڈاکو بھی اٹھ کر ان دونوں کے گرد دائرہ بنا کر ناچنے لگے۔ بالی لوگ تالیاں بجا کر ان کا ساتھ دینے لگے۔

اس دھن کو بہت طویل دیا گیا۔ ناچتے ناچتے دونوں پیسے بھر شراہور ہو گئے۔ آخر کار موسیقی ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی نورود ماچھی نے افروز کو ایک بازو سے قرش سے اٹھایا اور کسی ہلکا پھلکی چیز کی طرح کندھے پر لاد لیا اور دو بڑے اطمینان سے ہال کی طرف چل دیا۔ پھر ہال کے کھلے دروازے سے میں نے اسے بیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ وہ اوپر کی منزل کی طرف جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے محفل پر خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر یکدم سکوت ٹوٹا اور سب قہقہے لگنے لگے۔ تالیاں بجانے لگے لیکن یہ قہقہے اور تالیاں چند لمحے بعد ایک بار پھر ختم ہو گئے کیونکہ اوپر کی منزل کے کسی کمرے سے افروز کی کرناک چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ وہ زنج ہوتے ہوئے کمرے کی طرح زنج رہی تھی۔ افروز کی ٹائیکہ جو شاید اس کی ماں بھی تھی سناٹ بیٹھی ہال کی طرف دیکھ رہی تھی جس سے بیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ اس کی

میں پہلی پہلی سی قمیں اور رنگت زرد پر چکی تھی۔ چند لمبے تنکے وہ بڑے لمبے اور نازدارا سے پان چار دہری تھی لیکن اب کے بڑے ساکت ہو چکے تھے۔

افروز کی کرب ناک چیخوں کا سلسلہ جاری تھا لیکن سب نے اس طرف سے کان بند کر لئے تھے۔ حاضرین کے نزدیک گویا یہ خاص بات نہیں تھی۔ ایک اور قصہ سے قربان کی جا رہی کہ وہ آئے آئے اور رقص شروع کئے مگر وہ سازندوں کے پان اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ پھر اس نے مجبور سی نظروں کا دل طرف دیکھا مگر کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہا اس کے اپنے ساتھ آئے والے بھی اس وقت اس کی طرف نے کے بہانے بار بار ہال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ رقص کے آگے نہیں بڑھی۔

میں سب سے پیچھے گاؤں کے سارے اپنی جگہ ساکت بیٹھا درانی روکن میں لمبی تیز ہوتی ہوئی گردش کو معمول پر رکھنے لوشل کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا کہ اس موقع پر میرا خواہ بہرہ دینا ضروری نہیں تھا۔ اس سے میرا کوئی ایسا تعلق تھا یا نہیں؟ میں بہرہ کا بہرہ دین سے ہوتا ہے اور وہی میں وہ زندگی میں اس سے ایسا کوئی جذباتی تعلق استوار کرنے کا ذمہ تھا۔

جگہ وہ فوجان تھی لیکن ہر حال ایک منہمی ہوئی تھی۔ اس قسم کی محفلیں بدست شرابی تھی کہ درندہ ت واکو بھی شاید اس کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھی جب وہ ت سنے کی اس قسم کی مصوں پر نکلی ہوں گی تو یقیناً ان میں یہ دخلات اور امکانات پر بھی ان کی نظر رہتی ہوگی۔

”میں اپنی میاں! یہ تمہارا سلسلہ نہیں ہے۔“ میں نے اپنے کو کھینچ کر کہنے کی کوشش جاری رکھی ”ابھی میری سکون سے نہ حالات کس رخ پر جاتے ہیں۔“

افروز نے کرب ناک چیخوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جو اس وقت کے لئے تیار ہوئی تھی مگر افروز کی چیخیں سن کر رک جاتی تھیں۔ ”ملک ریاض اس کی طرف دیکھ کر ہوا۔“ ”تو کیوں بہت بن ہا تو اپنا کام چلا کر۔“

آخر کار ایک آواز بلند ہوئی تھی۔ یہ میرا مشاہدہ تھا کہ ہر جگہ اسے خلاف کوئی نہ کوئی آواز بلند ضرور ہوتی تھی۔ خواہ وہ کتنی ہی دور ہوئی تھی خواہ وہ زیادہ کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی دبا دی جاتی تھی۔ خواہ آواز بلند کرنے والے کا نام دشنام صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا لیکن آواز ابھرتی ضرور تھی۔ انسانیت کی تائید یہی تھی۔

وہ ایک رولا تھا غیر معروف سا کامیڈین تھا۔ سائلی رنگت سے ہونے سے بال زور آکھیں۔ ’’خوشامدوں کی بڑیاں ابھری کی جس سے آواز سے بڑے۔ اعصاب زدہ بھی معلوم ہوا تھا۔ افروز چیخیں سن کر چند لمبے ضبط کر کے بیٹھنے کی وجہ سے شاید اس کے

جسم پر خفیف سا رزہ طاری تھا۔ ’’دولت‘‘ رسائی اور اعتبارات کے نشے میں چڑ بڑے بڑے آوازوں کو اس کی بھری محفل میں اس وقت شاید ظاہری اعتبار سے سب سے حقیر اور کمزوری نظر آ رہا تھا مگر میرے خیال میں وہ سب سے بہتر تھا۔ اس نے زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنے میں پہل کی تھی۔

وہ اٹھ کر سامنے آیا اور یکدم گویا پست برا ”ملک صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم یہاں اس لئے تو نہیں آئے تھے۔“

وہ ایک منہمی سا آواز تھا لیکن اس کی آواز میں گرج تھی۔ گو کہ اس وقت یگانہ زندگی اور فطری جذبات سے آواز پست ہی تھی مگر پھر بھی سارے شور پر جاری تھی۔ محفل میں ایک لمبے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر یکدم ملک ریاض دبا ہوا۔ ”تو اور کیا تم یہاں ٹو اب کمانے کے لئے آئے تھے؟“

”ٹو اب عذاب کی باتیں رہنے دیں ملک صاحب!“ ہضم سے کامیڈین کا سائلی چہرہ اور غواٹی سا ہو گیا۔ شدت جذبات سے آواز کچھ اور کانپ گئی ”ٹھیک ہے“ افروز حوالہ دے کر اس کے لئے کوئی نئی مخلوق نہیں ہیں۔ نورو کو اسے ساتھ لے جانا تھا تو پارحمت سے لے جاتا۔ افروز کو اس طرح درونک انداز میں چیخیں مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آخر وہ غیبت کر کیا رہا ہے؟ میں وہ اسے جان سے نہ مارنے آپ اسے کچھ تو سمجھا نہیں تھا۔

نورو ما بھی کے لئے ”غیبت“ کا لفظ سن کر اس کے ساتھی ڈاکووں میں سے دو یکدم جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن نورو براہ اندام کامیڈین اس وقت گویا اپنے گرد پیش سے بے خبر تھا۔ اس کی نظر صرف ملک ریاض پر تھی اور وہ یگانہ غالباً افروز کی کرب ناک چیخوں کی طرف تھا۔

”نورو ما بھی کو بھلا کون سمجھا سکتا ہے؟“ ملک ریاض خاصی خفا سے مسکرایا ”یہ اس کا اسٹائل ہے۔ کھوٹے کا پتھر۔ گھاس کم چڑتا ہے دو تیاں زیادہ چلاتا ہے۔ بے فکر رہو۔ افروز مرے گی نہیں۔“ ہمیں تو زیادہ پتا ہو گا اپنی برادری کا۔ اتنی آسانی سے مرے والی مخلوق نہیں ہیں۔ یہ تو بڑی بہت ذکی شخص ہو جائے گی تو مریم ہنی دو ادوار کو دیں گے سب انتظام سے ہمارے پاس۔ گھائے میں نہیں رہے گی وہ۔ ایک آواز بڑی ترالے گی، چار چھ ذم کھائے گی تو نورو ما بھی اس کی جموی سونے جانی سے بھروسے گا۔ بہت مال ہے اس کے پاس۔ ویسے بھی افروز نے یہاں سے کیا کم مال سمیٹا ہے؟“

کامیڈین کی منیایں بھنچ گئیں۔ شدت جذبات سے اس کی آواز گونج گئی۔ اس کا غصہ ایک مجبور آدمی کا غصہ تھا لیکن وہ اسے بس کھولنے سانس کی طرح پتے میں دبا کر نہیں بیٹھا تھا۔ کھٹی کھٹی سی آواز میں بولا ”ملک صاحب! میں کتا ہوں اس حرام زادے کو روکو۔“

”اوئے۔۔۔ اوئے چنے! تو تو بہت ہی بڑھتا جا رہا ہے۔“ ملک



لیکن مسانوں کے حواس پر شمار کا قبضہ تھا۔ ان کی دھڑکنے کے لئے ضرورت تھی لیکن جلد ہی وہ دوبارہ رقص میں رقصہ کے جسم کی ہلکے اعضاء کا دھڑکنے کی آواز کی گھر گھروں کی باسی ملک ہی سب کچھ تھی۔ ملک ریاض اورا کے گروہ کے ڈاکو تو سب سے زیادہ انجوائے کر رہے تھے۔

مجموع رہے تھے اور ان کی باچیس پھیلی جاری تھیں۔ وہ رقص قسم ہونے سے پہلے ہی ہال کی میزوں میں اتارتی بلکہ تقریباً لامتناہی دکانی دی۔ وہ چٹکے کا سارا لے لے چلی آ رہی تھی۔ اس کا لباس جو کچھ دیر پہلے اس کے کی شان پر بھرا ہوا تھا اب چھتروں کی صورت میں اس کے بھول رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہلہا تھا۔ جسم کا جو حصہ بھی اس پر خراشیں اور نعل ہی تھے۔

اس کی ٹانگیں اور دو ایک ساڑھے اچھے کر اس دوڑے۔ انہوں نے میزوں پر اسے سنبھالا۔ وہ ان کے میں بھول گئی۔ ملک نے اپنی جگہ سے پیٹھے پیٹھے بہ آواز دیا۔ "اوسے جاؤ اوسے" اس شدی کی مرہم پٹی دوا بندوبست کرو۔"

نوکوں نے جا کر ہال میں افراد کو خود سنبھال لیا۔ تا سازندوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ وہ اسے اندر ہی اندر حویلی میں گئے۔ ٹانگیں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ ساڑھے نوٹ رقص اسی طرح جاری رہا۔ گو کہ اس دوران رقصہ اور بھی کن انھیں سے بار بار ہال کی طرف دیکھتے رہے۔

چند منٹ بعد نور دیا بھی اسی طرح سے واپس آیا۔ وہ طرح خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا جیسے کسی درندے کو اس پسند شکار کیا ہو اور وہ باچوں پر زبان پھیرتا۔ اس کا لہو صاف واپس چلا آ رہا ہو۔ اس کی جگہ خالی پڑی تھی۔ اس کی فریاد بھی گویا کسی بادشاہ کے خالی تخت کی طرح تھی۔ کسی نے بھی اس کی جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس جگہ کی طرف بڑھتے وقت وہ ملک ریاض کے بار گزرا تو ملک ریاض نے چار بھرے انداز میں اسے ڈانٹے کہا "اوسے جانگوس کے پیٹے اچھے یہ کہ گندی عادت ہے تم تصویر کو بگاڑ رہا ہے۔ اسے یہ تو فائدہ سونے سونے عورتوں کے ایسا سلوک نہیں کرتے۔ جو ان ہی ہم پر بھی اتنی تھی۔ اور ان کیس کی نہیں ہے لیکن یہ گتے بیٹوں کی طرح چرچاؤ ہم نہیں کی۔ جو ان کی کوئی بھی توانائی نہیں ہے نا۔"

وہ شاہانہ انداز میں اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ملک کا اسے ڈانڈا بھرا ایسا ہی تھا جیسے کوئی باپ اپنے نا بوجھ بچے کو تنبیہ ہو کہ اسے صاف کانڈوں پر بیٹھنے سے آڑی نہ چھی لکیرا کھینچنی چاہیے۔

نور کا ڈانڈے سے ٹپک کا کر گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

بولا اور اسی لمحے دونوں ڈاکوؤں نے بیک وقت اپنی اپنی راکٹل کا بٹ کامیڈین کو رسید کیا۔ ایک بٹ اس کے کندھے پر لگا اور دوسرا چہرے پر وہ بہت دور جا کر اور وہیں ساکت ہو گیا۔ دونوں ڈاکو ایک بار پھر اس پر بیٹھنے لگے تھے مگر ملک نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "بس کرو یا اس بے چارے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔۔۔ اس میں رکھا کیا ہے۔۔۔ بیڑیوں کی بلاتا تو ہے۔"

ڈاکو سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رک گئے اور اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ افراد کی ٹانگیں نے آگے بڑھ کر کامیڈین کو سیدھا کیا اور اسے دوپٹے سے اس کا چہرہ چھپنے لگی۔ خون سے اس کا پھل ٹھنڈا گیا لیکن نیست تھا کہ کامیڈین کے چہرے سے خون کا بہاؤ جاری نہیں رہا۔

میں بدستور ساکت بیٹھا رہا۔ میری رگوں میں لو سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے الٹی یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر ہر کوئی یوں سوچ کر بیٹھا رہے کہ جب تک ظلم کی ٹپک میرے بدن تک نہیں پہنچے گی تب تک وہ میرا مسئلہ نہیں ہے تو ظلم کئی گنی پھیل جاتا ہے اس سوسائٹی میں سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔

اس کے باوجود ویس ساکت بیٹھا رہا۔ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ صورت حال عجیب سی تھی۔ اسی دوران افراد کی چٹخیں بھی معدوم ہو گئیں۔ شاید وہ بے ہوش ہو گئی تھی یا اس میں مزید چٹخنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ کوئی بے اختیار نہیں تھا کہ جکی آواز میں وہ اب بھی چیخ رہی ہو یا کراہ رہی ہو لیکن فاصلے کی وجہ سے اب اس کی آواز ہم تک نہ پہنچ رہی ہو۔

افراد کی ٹانگیں نے کامیڈین کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور ایک نوکر سے لفظ پانی لے کر اپنا آٹھل بھگو کر اس کا چہرہ صاف کر رہی تھی۔ ٹانگیں کا چہرہ صاف تھا۔ صورت حال گو کہ واضح تھی پھر بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی تھی۔

ملک ریاض ایک بار پھر اس دوسری رقصہ پر بریں پڑا جس کا نام مجھے معلوم نہیں تھا اور جو ابھی تک بتی کھڑی تھی "اوری تھو پر کیا فاج کر گیا ہے؟ کیوں مسانوں کا بنا بنایا سوڈ خراب کرتی ہے۔ چل۔۔۔ تو کسی شجر سے گانے پر منتھرا سازان سن شروع کر۔"

اس بار وہ بہت برہم نظر آیا تھا بلکہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔ وہ گیا تھا۔ ساز ایک بار پھر کراہ اٹھے اور رقصہ کے پاؤں بھی باؤل تا خواست حرکت میں آ گئے۔ چند لمبے بعد ہی رقص و موسیقی کا سلسلہ دوبارہ عروج پر پہنچ گیا مگر اب گویا ہر چیز روح سے خالی تھی۔ رقصاؤں کی آواز اور پاؤں کی حرکت میں ویسے بھی ان کے جذبات ذرا کم ہی شامل ہوتے ہیں۔ وہ ایک طویل مٹن کے تحت مشقی سے انداز میں سب کچھ کرتی ہیں لیکن اس وقت تو رقصہ بالکل ہی کھجلی میں تھی۔ چوہر حركات کا ساتھ نہ دے تو انسان کچھ عجیب محکمہ خیر سا لگتا ہے خواہ وہ رقصہ ہی کیوں نہ ہو اور رقص ہی کیوں نہ کر رہی ہو۔



نے مجھے بتا تھا کہ میں کیا سمجھوں گا اور کیا نہیں۔ لیکن اس نے کندھے اچکائے ”یہ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ اس زور نہیں دیا جاسکتا۔ آپ کے بارے میں ہمارے اندازہ سے محسوس ہو رہے ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا کہ آپ بڑی مزاح آوی ہیں۔ فلمی کاکیوں شاکیلوں سے بھی آپ کا تعلقات ہیں۔“

”فلمی دنیا کا تو میں نے کبھی صحیح طرح مرغی نہیں کیا فروش، جھوٹی جھوٹی سی لڑکیوں نے کبھی مجھے کوئی خاص کیا۔ زیادہ تر تو ویسے ہی کئی گزری ہیں۔ ان کا معاملہ تو بڑے پردے تک ہی ٹھیک ہے۔ صرف ایک ہی ”کاکا شاکا“ ہے۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ لڑکھن کا کوئی قتل واقعہ حوالہ نکل آیا تھا۔ دوسرے اس کے ساتھ اپنا جو بھی تجارتی خیالوں پر نہیں ہے، صرف محسوسات کی بنیادوں پر اس کو اچھے لگتے ہیں وہ ہم کو اچھی لگتی ہے۔ اور جب سے ہماری میل ملاقات ہوئی ہے تب سے اس نے کمر طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ فلمی دنیا میں رہتے ہوئے ہم ناقابل تعین سی بات؟“ میں نے گلے اندھیرے میں ملک کے میں جھانکا جہاں پہلے ہی بڑا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے انداز میں سر ہلایا۔

میں نے سسکراتے ہوئے کہا ”آپ نے میرے بارے زیادہ صحیح معلومات جمع نہیں کیں۔ کون ہے آپ کا تجربہ؟“ ”ہماروں کے ہماروں کے“ وہ مٹھیانہ انداز میں میرا ہونے بولا ”اب آپ سے قتل واسطہ ہوا ہے تو جلد ہی کچھ جان جائیں گے۔ ویسے آپ کو اسے خبر کا نام چاہئے۔ معزز آوی ہے۔ آپ کا پرانا جانتے والا ہے۔ بھرے کا آوی ہے۔“

وہ میرے تجسس کو بھڑکا رہا تھا لیکن میں نے بھی اس طور پر نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے۔ میرا کوئی پرانا جانتے والا بھروسے کا آوی کیونکر ہو سکتا تھا؟ میرے ذہن میں سوال نے سر اٹھایا لیکن سرست میں نے ان کی طرف سے توجہ ملک بدستور سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں سر ہلایا۔ بولا ”میرا دل آپ کی طرف سے پہلے ہی کچھ کھٹک رہا تھا۔ لائن کے آوی نہیں لگتے۔۔۔۔۔ آپ نے تو گویا یہاں آکر ضائع کیا۔ دوسری طرف میرا دل کہتا ہے کہ آپ ہمارے کھل نہیں رہے۔ آخر ایسی کیا مصلحت ہے؟ آپ ہمارے کھل جائیں تو شاید زیادہ فائدہ ہے ہیں رہیں۔“

”ملک صاحب!“ میں نے فحشی سانس لے کر کہا ”کو بتانے کی کوشش کر چکا ہوں، مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ آوی ہوں یا بندہ۔ یا میں کس لائن کا آوی ہوں۔“

ہونے لگی۔ حتیٰ کہ دوڑا کو بھی اوپر چلے گئے۔ باقی البتہ تو روکا جھی کو گھرے میں لئے رہے۔

ملک ریاض اس دوران کھٹک کر بیچھے میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا ”آپ کی تواضع کے لئے میں نے افروز کو منتخب کیا ہوا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ذکر کا پتہ اسے کئی ہفتوں کے لئے بستر روتا دے گا۔ غیبت کہیں کا۔ کھلونے سے زیادہ کھیلتا نہیں ہے۔ بس اسے توڑنے پھونڈنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ خیر، لغت سمجھیں اس پر پڑے ہیں کہ جو سامنے بیٹھی ہیں ان میں سے کوئی پسند ہے؟ ورنہ ایک گھنٹے کے نوٹس پر کوئی دوسرا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔“

میں ایک طویل لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں بہا طور پر حیران تھا۔ کیا اتنے بڑے بڑے زمینداروں سیاست میں حصہ لینے والوں اور دنیا کی ہر آسائش کے مالکوں نے بھی اب یہ کام سنبھال لیا تھا؟ میں نے گلے اندھیرے میں نظروں سے اس کے چہرے کو ٹٹولا۔ مگر اس چہرے پر خفت و دغامت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اس نے گویا بالکل عام سی کوئی روٹین کی بات کی تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا ”چوہدری صاحب! شرائیں نہیں۔ ہماری یہ دنیا ایک بالکل الگ تھلک دنیا ہے۔ سارے ڈر خوف اور اندیشے دل سے نکال دیں۔ زمانے کو کبھی بھول جائیں اور خود کو بھی۔ یہاں آکر بڑے بڑے لوگ اپنے آپ سے اور دنیا سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں، بڑے بڑے سرکاری افسر تک کیسی ترنگ مین ہیں۔ یہاں سب بے محرک اپنے اپنے دل کے ارمان نکالنے آتے ہیں کیونکہ یہاں سے کوئی خبر یا ہر نہیں جاتی۔“

”دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں وہ تو میں نے دیکھ ہی لیا ہے ملک صاحب!“ میں نے مانت سے کہا ”اور خبر کے باہر جانے یا نہ جانے سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ آوارہ جذبوں کی تسکین کا میرا یہ انداز نہیں۔ میری خواہشوں کے جنگل میں ان پیشہ ور لڑکیوں، ان گوشت پوست کی مشینوں کا کبھی گزر نہیں رہا۔ میں نے کبھی ان کی تمنا نہیں کی۔“

”چوہدری صاحب! یہ کوئی ایسی دلی لڑکیاں نہیں ہیں۔ سب ٹاپ کی موسائیں گزر رہیں۔ ستھری چیزیں ہیں۔ گندی شندی گلیوں سے چڑکے نہیں لائی گئی ہیں۔ یہاں کوئی ایسے گرے پڑے لوگوں کا معاملہ نہیں ہے۔ ہمارا بھی کوئی معیار ہے اور ہم دوسروں کے معیار کو بھی سمجھتے ہیں۔“ ملک سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا ”آپ کی ممانداری میں واقعی کوئی کمی نہیں ملک صاحب! لیکن مجھے معاف ہی کر دیجئے۔ یہ بڑے نازک محسوسات کے معاملے ہیں۔ آپ انہیں نہیں سمجھ سکیں گے۔“

ملک نے قدم سے بھر کر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”بہت خوب! اب مجھ پر یہ رقت بھی آتا تھا کہ آپ جیسے نوجوانوں

اُدھر درختوں میں ان کے اپنے ساتھی ہی چھپے بیٹھے تھے نہ جانے کیوں؟ ملک راضی نے تو اس کی وجہ صرف یہ بتائی تھی کہ کبھی کبھی جشن یا خوشی کی خبر یا کوئی دشمن یا بدخواہ رنگ میں بھگ ڈالنے کی کوشش کر بیٹھتا تھا۔

جوتلی کی تعمیر میں قدیم دکنی اور کنورین اسٹائل کی ملی جلی سی جھلک تھی۔ چھت پر ٹاور سے مشابہ برجیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چھت کے وسط میں بہت سی خوبصورت لائن چیمبرز اور بیٹھے کی میز وغیرہ پڑی تھیں۔ ابھی تک صبح کی سپیدی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ چاند رخصت ہو چکا تھا مگر فضا میں ابھی تک چاندنی کا سراغ باقی تھا۔ منڈیر کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا دوڑ کھینچے اندھیرے میں باغات اور کھیت ایک دوسرے میں مدغم نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ٹک ہوا اور گھبرا آسمان بہت بھلا لگ رہا تھا۔

ایک کمری سانس لے کر میں ملک راضی کا اشارہ پا کر لان چیمبر پر بیٹھ گیا۔ نوردا بھی کے ساتھیوں میں سے چار چھت کے چادروں کوٹوں پر جا کھڑے ہوئے اور بے مقصد سے انداز میں فضا کی تاریکی میں نظریں دوڑانے لگے۔ نوردا بھی عین میرے ساتھ بیٹھ کر بیٹھ گیا۔ ملک راضی میرے مقابل بیٹھا تھا۔ باقی ڈاکو ہمارے گرد گھیرا سا زالی کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں فضا میں ایک بیک کوئی تبدیلی محسوس کر رہا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور پہلے ہی کی طرح پُرسکون رہا۔

ملک راضی سرگرم لگا کر اور ناگس پھیلا کر بیٹھے ہوئے بولا، "چوہدری صاحب! آپ کو معلوم ہے اعلیٰ حکومت میں آپ کا یہ خادم وزیر تجارت ہو گا؟" اس نے انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے قدر سے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، "لیکن ملک صاحب! ابھی تو الیکشن بھی نہیں ہوئے اور آپ نے خود ہی اپنے آپ کو وزیر تجارت کے عہدے پر بھی فائز کر لیا؟" میں نے پوری کوشش کی کہ میرا لہجہ استعزائیہ نہ ہونے پائے۔

"سیاست میں بہت آگے کی خبر رکھتی پڑتی ہے چوہدری صاحب!" وہ آنکھ مار کر بولا، "آپ اس میدان میں بچے ہیں۔ کاروبار میں آپ بہت تجربہ ہوں گے لیکن سیاست کے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے۔ اس حینہ کی زلفوں کے نیچہ دم کو کھینچنے کے لئے ایک مرد کار ہوتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ملک صاحب! لیکن پھر بھی کچھ تو طور طریقے اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ توئی کسی نہ کسی سسٹم سے تو گزر کر آگے آتا ہے۔ پارٹیاں الیکشن میں حصہ لیتی ہیں۔ ان کے امیدوار کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثریتی پائلٹی حکومت بناتی ہے اور اپنے آدمیوں میں وزارتیں تقسیم کرتی ہے۔"

وہ مسکراتا رہا جیسے اطلاعات کے موضوع پر کسی نئے تپ کی

ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتا دوں۔ اگر آپ نے محسوس کر لی لیا ہے کہ میں نے یہاں آ کر وقت ضائع کیا ہے تو اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"ارے نہیں صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ گویا یکدم کسی خیال سے چٹختے ہوئے بولا، "ہمارے سب سے خاص سمان تو یہی ہیں۔ آپ تو سب سے آخر میں جائیں گے۔ صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے پہلے ہی سب لوگ یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آرام سے آپ کے ساتھ باتیں ہوں گی۔"

میرا جنس بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں بدستور اسے چھپائے بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں اسے مجھ سے کیا باتیں کرنا تھیں؟ اُدھر لڑکیوں کے ساتھ جوتلی میں لوگوں کی آمد رفت جاری تھی۔ کچھ لوگ واپس بھی آنے لگے تھے۔ مزید کچھ لوگ اندر جا رہے تھے۔ کچھ عجیب بازار سا لگا ہوا تھا۔ میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے پھلے پڑے پڑے لوگوں کے لئے اس بازار میں سے انداز میں کیا لذت تھی؟ کیا لطف تھا؟ لوگوں کے محسوسات کا کچھ پتا نہیں ہو گا۔ شاید ان کے لئے یہ سب کچھ ایک دلچسپ ایڈرنگ ہو۔

جلدی لوگوں کے واپس روانہ ہونے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ان میں سے بیشتر کے ذرا بڑے جوتلی سے کچھ دور گاڑیوں میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ خود اس وقت صبح ذرا تیرنگ کمرے کے قابل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو بھجوانے کا خدمت ملک راضی کر رہا تھا۔ وہ خود کسی حینہ دنوٹاؤ کے ساتھ نذر کا پھیرا لگانے نہیں گیا تھا۔

میدان میرے انداز سے کچھ پہلے ہی صاف ہو گیا۔ صبح آداب کے آثار نمودار ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب لوگ رخصت ہو گئے۔ افراد کو بھی مرہم بنی کے بعد بے ہوشی کی حالت میں ہی نہ جانے کہاں بھیج دیا گیا تھا۔ صرف نوردا بھی اس کا ٹوٹا اور ملک راضی کے آدمی رہ گئے تھے۔ کسی رات کے رخصت ہوجانے کا سامنظر تھا۔ یا پھر کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سی دلالوں کا قافلہ وہاں اترا تھا اور ایک طویل ہنگامہ برپا کرنے کے اندر رخصت ہو گیا تھا۔

ملک راضی واپس میرے پاس آ کر بولا، "آئیے چوہدری صاحب! اور چھت پر بیٹھیں۔ کھلی ہوا میں۔۔۔ رات کے پچھلے پہر دماغ آگے۔"

مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں خود کچھ حرکت میں آتا جا رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ٹھیک کیا تھا۔ دایلی کی میز جیروں کے راستے ہم اوپر چھت پر آ گئے۔ چھت کیا تھی؟ ایک بہت بڑا میدان تھا۔ ہوا بھی اُداس کا ٹوٹا ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ ان لوگوں کا فضا سب کچھ کو لپکا تھا۔ ہمیں سنبھالے وہ اس طرح الٹ نظر آئے کہ کوشش کر رہے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ اگر وہ کس دشمن لعنت لگائے بیٹھا تھا حالانکہ مجھے پتا چلا تھا جوتلی سے کچھ دور اوپر

”ہاں۔ بلکہ میں اپنا عہدہ کچھ گھٹا گیا۔ انحصار میں ہمارے  
صرف وزیر تجارت نہیں بلکہ وزیر صنعت و تجارت۔ ا  
معلوم ہے یہ دونوں شعبے ایک دوسرے سے جڑے پڑے  
ہیں۔“

”چلیں خیر ہم نے مان لیا۔“ میں نے گویا اس کا دل ریز  
لئے کہا ”میں آپ کو اس پیشگی اعلان پر پیشگی مبارکبادیں  
ہوں۔“

”خالی مبارکباد سے کام نہیں لے گا چودری صاحب! ہمارے  
اختیاری انتظامی قسم میں ہمارا ساتھ دینا چاہئے گا۔“ وہ سرگرم  
خیال انداز میں انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔

”لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے ہمارے دونوں کو کم  
باریں اور دوڑوں کو بھی۔ تو پھر یہ انتظامی قسم کہاں سے  
آئی؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”نیم تو اپنی جگہ پورا ہو گا نا خانہ چری بھی کوئی چیز ہے  
مکن ہے کوئی انتظامی اختصار میں جائے ابھی حتمی طور پر کچھ  
جاسکتا۔ کوئی بھی بات سامنے آسکتی ہے۔ کوئی بھی پیشتر بولا  
ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”حتمی طور پر صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ آئندہ  
صنعت و تجارت ہوں گے؟“ میں نے سمجھتے ہوئے کھینچے میں کہا  
لیکن یہ لہجہ اس کے لئے سمجھتا ہوا نہیں تھا۔ بڑے ا  
سے اس نے جواب دیا ”بالکل۔“

میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ”لیکن مجھے یہ سب کچھ کیوں بتانا  
ہے؟ اس کے بجائے میں نے پوچھا۔“ تو پھر میرے لئے ا  
ہے؟“

وہ سرگرم الٹش رٹے میں مبتلا ہوئے بولا ”آپ نے ر  
او کا آج کی محفل میں ہمارے کیسے کیسے مہمان موجود تھے ا  
سے ہر ایک ہمارے لئے دلفراوانی اپنی حیثیت کے مطابق کا  
حیثیت سے بڑھ کر کچھ نہ کچھ کرنا دیتا ہے۔ کسی کے ذمے  
ہے کسی کے ذمے کوئی کام پھر جب اور جہاں ہمارا ہاتھ پڑ  
تا ہے ہم بھی ان کے کام آتے ہیں۔ اسی طرح ادارہ اسی سے رہتا۔  
چلتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟“

”جی ہاں۔ میرا خیال ہے کچھ کچھ سمجھ ہی رہا ہوں۔“  
مناہ لے کر میں نے کہا۔

”جی کہ آج کی محفل بھی اسپانسرز تھی۔“ وہ مسکراتے  
بولا۔

”کمال ہے! اب محاشیاں بھی اسپانسرز ہونے لگیں۔“  
”آپ ان کے لئے ذرا زیادہ گرفت لفظ استعمال کر  
ہیں۔ ہم انہیں تقریمات کہتے ہیں۔ اور تقریمات اکثر ا  
ہوتی ہیں۔ صرف طور طریقے بدل جاتے ہیں۔“ وہ شاطرا  
میں بولا ”ہمت خرچ آتا ہے ایسے کاموں پر۔ روپیہ پالی کی ط

تقریر سن رہا ہوں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”گھٹا  
معاف۔ آپ کی پابندی کا تو شاید بعض لوگوں نے نام بھی نہ سنا ہو۔  
میں بدگھنٹی نہیں کر رہا ویسے ہی حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ  
سے انداز میں آپ کے دعوے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا  
ہوں۔ معلوم نہیں آپ کی پابندی کو کوئی سیٹ بھی ملے یا نہ ملے اور  
آپ نے وزارت اپنے لئے محفوظ کرالی!“

وہ سرگرم کا ایک طویل کش لے کر بے پروائی سے دھواں  
فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ ”یہی تو آپ کو پتا نہیں چودری  
صاحب! ہمارے ہاں بڑے بڑے ٹیم ہوتے ہیں۔۔۔ اور پاور کا ٹیم تو  
سب سے الگ سب سے پُر جوش سب سے مشکل ہے۔“

”اگر مجھ جیسے ذرا اوپر کے آدمی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہے تو پھر  
عام آدمی کو کیا معلوم ہو گا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے اور میں بھی۔ کہ عام  
آدمی تو بس سیاست کی بجلی کا ایندھن ہے۔ کچھ ایندھن کسی کے  
پاس ہے کچھ کسی کے پاس۔ کبھی ادھر کا ایندھن ادھر ہو جاتا ہے  
اور کبھی ادھر کا ادھر۔ لیکن ایندھن بہر حال ایندھن ہی رہتا  
ہے۔ اس کا کام جلنا اور بجلی کی آگ کو تیز یا دھم گنا ہونا ہے۔  
جس کی آگ دھم پڑنے لگتی ہے اس کا کھیل ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔  
بجلی میں جھونکے کے لئے لکڑیاں میسر آتی رہیں تو ٹھیک ہے ورنہ  
بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس حقیقت کی۔۔۔ سے بھی آپ کا وزیر  
تجارت بننا کہاں سے نکل آیا؟“ میں نے اس کی آنکھوں  
میں جھانکا۔ ”جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے۔ ہمارے  
ملک کے سیدھے سادے فہم علم اور بے خبر لوگوں کی یہی نوعیت  
ہے۔ ہر ایک نے انہیں غپے میں دے دیے ہیں۔ کبھی کسی فلسفے سے کبھی  
کسی فلسفے سے۔ انہیں بجلی کا ایندھن ہی بتایا گیا ہے۔ کسی نے  
انہیں سرکا تاج نہیں بتایا۔ لیکن آپ تو ابھی اس پوزیشن میں بھی  
نہیں ہیں۔ آپ کی بجلی میں تو برائے نام ہی ایندھن ہے۔“

”میں جو بات کر رہا ہوں وہ پابلی کی بنیاد پر نہیں کر رہا ہوں۔  
میں آپ کو اپنے رازوں سے زیادہ آگاہ نہیں کر سکتا کیونکہ آپ  
ہمارے زیادہ پرانے دوست نہیں ہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں پیشتر  
سال سے پاور کے سلسلے میں ایک سے ایک بڑھ کر کمال ٹیم ہو رہا  
ہے لیکن اب جو ٹیم ہونے والا ہے وہ ہر ٹیم کو مات کر دے گا۔ اور  
ہم اس ٹیم کا ایک حصہ ہیں۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں ایک  
ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ”ہماری پابلی کو آپ کوئی مادیوں۔  
ہمارے دونوں اور ہمارے دونوں کو بھی مادیوں۔ بس آپ کے  
سامنے اس ملک کا آئندہ وزیر تجارت بیٹھا ہے۔ اسے پھر لکیر  
سمجھیں۔“

”ملک کا وزیر تجارت؟ یعنی آپ دلفراوانی ہوں گے؟“ میں  
نے مسکراتے ہوئے کہا۔

امریکا کا الیکشن لڑ رہے ہیں ملک صاحب؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ذاتی نہیں چوہدری صاحب! اس وقت بہت سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ زندگی اور موت کے مسئلے ہیں۔" وہ کمری سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں! اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یہ زندگی اور موت کے مسئلے ہیں۔" میں نے بظاہر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "یہی سی بڑی بڑی دور افتادہ عمل سراسر میں کبھی دن کی روشنی میں اور کبھی رات کے اندھیروں میں سر جوڑ کر کچھ فیصلے ہوتے ہیں اور ہزاروں زندگیوں موت کی آغوش میں جاسوتی ہیں۔ سیکڑوں گھبراہٹ جاتے ہیں۔ لوگ دردندوں کی طرح ایک دوسرے کو بے رحمی سے دھکے دیتے ہیں۔"

"ہذا بات اور انسانی باتیں نہیں چوہدری صاحب! وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "کام کی بات کریں۔ صرف کام کی بات۔ اس قسم کی باتیں صرف بند کمرلوں میں بیٹھ کر گڑھنے والوں کے لئے چھوڑیں۔ ہم بڑے لوگ ہیں۔ بلندی پر بیٹھے ہیں۔ ہمیں مزید بلندی پر جانے کی باتیں کرنی ہیں۔ ہم پاور کے کیم کے کلاڑی ہیں۔ ہمیں اپنے کھیل کے بارے میں سوچنا ہے۔" اس کے گھروڑے پیچھے میں ہلاکی مسکائی تھی۔

"پھر بھی، مجھے معلومات دہانے کا تو موقع دیں ملک صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں فطرتی کتب ہوں۔ زمین میں کچھ سوالات تو پیدا ہوتے ہیں۔ فطرتی ہی بات ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے الیکشن کے اخراجات کی کوئی حد بھی مقرر ہے اور وہ خاصی کم ہے۔"

وہ اب گویا قہقہہ ضبط نہ کر سکا۔ فضا مرقش ہو کر رہ گئی۔ میرے برابر بیٹھا ہوا نور دیا بھی جھٹکے دار سے انداز میں ہنس رہا تھا اور اپنی ایک مونچھ کو ہل دے جا رہا تھا۔

"آپ بھولے بادشاہ بننے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت اچھے لگتے ہیں چوہدری صاحب!" ملک راضی بولا "جو لوگ یہ حدیں مقرر کرتے ہیں انہیں خود بھی پتا ہے کہ اتنے پیسے تو لوگ جعداروں کی یونین میں عہدہ حاصل کرنے کے لئے خرچ کر دیتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہاں کیا ہو رہا ہے۔ سب کی ناک تلتے ہو رہا ہے لیکن ہمارے آپ کے ساتھ مذاق کرنے کے لئے وہ لوگ بیٹھے قاعدے قانون بناتے رہتے ہیں۔"

"میرے خیال میں یہ ہمارے آپ کے ساتھ نہیں قوم کے ساتھ مذاق ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اپنی دانست میں تو وہ بے چارے قوم کے سامنے سرخرو رہنے کے لئے یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ قوم کو بتاتے ہیں کہ دیکھو ہم تمہارے نمائندوں کو اخلاقیات، ساجیات اور معاشیات کی حدود کا پابند رکھنے کی کیسی سرٹو کو ششیں کر رہے ہیں۔ غارتگری بھی

میں کیا چاہتا تھا۔ تو پھر مت کیا کریں ایسے کام کیا کسی حکیم دور رہا ہے ایسے کام کرنے کا؟ لیکن اس کے بجائے میں نے اسے کہا "دوپے پیسے کی آپ کے پاس کیا کمی ہے ملک

"وہ تو ٹھیک ہے۔" وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولا "لیکن زور سے برف نہ پگھلے تو دریا کب تک بہتے ہو سکتے ہیں؟ اگر دولت جاتے ہی کے راستے کھلے رہیں اور دولت آنے کے میں کوئی تدبیر نہ کی جائے تو ایک روز قادیان کے خزانے بھی جاتے ہیں۔

"آپ کے ہاں تو دولت آنے کے راستے بھی خاصے کشادہ دیتے ہیں ملک صاحب! پریشان ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔"

نے کہا۔ "آپ کا مشاہدہ درست ہے۔ لیکن آپ سے کس نے کہا کہ پتان ہیں؟ ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ دولت آنے کے نہ ٹھک نہ ہونے پائیں ملک کچھ نہ کچھ کشادہ ہوتے رہیں۔ کام روز بروز بڑھ رہے ہیں اور ان کے دام بھی بڑھ رہے جو کام پہلے ہزاروں میں ہوا تھا وہ اب لاکھوں میں ہوتا ہے لاکھوں میں ہوتا تھا وہ کہہ ڈالیں میں ہوتا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ گفتگو کس طرف جارہی انھیں ایک لمحے کے لئے گمراہی سے چھوٹ جائے۔ ملک راضی اور انھیں کی نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

ملک راضی سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "ہمارے بہت سے ہمارے لئے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو کبھی ہم نے مہمانوں کی خدمت میں شامل کر لیا ہے اور آتما میں ہی ہم آپ اسے برا کام لگا رہے ہیں۔ لیکن آپ گھبرائیے گا نہیں۔ ہم کو قاعدے بھی بہت بڑے بڑے بیچا میں گے۔ ہم وزیر صنعت رت ہوں گے اور آپ ملک کے ایک بڑے صنعت کار اور ان میں ہیں۔ اندر خانے اگر ہم نے آپ کا چھوٹا تھا ہوا ہو گا تو لی آپ اس ملک کے چند دولت مند ترین افراد میں سے ایک گے۔"

"ملک صاحب! بے حساب! بے اندازہ اور سب سے زیادہ ن کے خواب دیکھنا کبھی میری کمزوری نہیں رہی۔" میں نے ان کیسے میں کہا "لیکن آپ کی بات چوہدری سننے کی غرض سے میں رہا ہوں کہ آپ نے میرے ذمے کیا کام لگانے کا سوچا ہے؟"

"آپ کو ہمارے الیکشن فنڈ میں پچاس لاکھ روپے دینے ہوں۔ ہمارا معاملہ ذرا دوسرا ہے۔ ہمیں بہت زیادہ روپے کی بہت ہے اور اس کا بیشتر حصہ ہم آپ کے ذمے ڈال رہے

"پچاس لاکھ روپے تو اکیلا میں ہی دوں۔ کیا آپ صوبہ



باتیں کرتا ہے۔" اس نے موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے گھورا جن میں ہر وقت خون سا تار اترتا تھا۔

میں نے پلک نہیں جھپکائی نہ سر دھری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو میں دو ٹوک بات کر لے لاتی ہوں۔ ادھر ادھر کی باتیں تو میں صرف اس لئے کرتا ہوں کہ لوگوں کو ہنسنے پر مجبور سکوں اور ہوسکے تو لوگ بھی مجھے ہنسنے پر مجبور لیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ موٹی عقل کے لوگوں کی سمجھ میں بات ڈرا دہرے آتی ہے۔ ویسے نو روایہ جو تم نے اتنا بڑا جھڑپاندھا ہوا ہے اس کے اندر اتنا بڑا شمار لکھوڑا ہے۔ یہ بتاؤ اس کھوپڑے میں کھوڑا کتہا کتہا بھی ہے یا اس کے بغیر کام چلا رہا ہے؟"

نور دماغی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس نے مجھے کوئی جواب دینے کے بجائے ملک ریاض کو ہی مخاطب کیا۔ "ملک سامعین! میں بے عزتی کرانے کے لئے ادھر نہیں بیٹھا ہوں۔" اس کی رائفل کرسی کے سارے کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ اس کی بال پر جم چکا تھا۔ ملک ریاض نے ہاتھ کے اشارے سے گویا اسے کوئی قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ وہ اب بھی انتہائی خصل مزاج نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"مقتصد یہ ہے کہ آپ رقم نہیں دے سکتے؟" ملک ریاض نے ملائمت سے تصدیق چاہی۔

میں نے ایک نظر اس حویلی کی منڈیروں اور بڑیوں کی طرف دیکھا۔ اس حویلی میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ ہر چند برس بعد یہ مجھے سمجھ کر اپنے پاس ملا لیتی تھی۔ اور اس کے آئینوں میں کوئی نہ کوئی بد خبری لکھی نہ کوئی مصیبت میری منتظر ہوتی تھی۔ یہ حویلی اور اس کے پس منظر میں بچیلی ہوئی زمینیں ملک خاندان کے ہاتھوں سے لٹکے کے کوئی آثار بھی نہیں تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "میں تمہیں پچاس لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔ تم یہ حویلی اور زمینیں مجھے دے دو۔"

ملک ریاض نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا جیسے اس نے اپنے ذوق کے حساب سے کوئی بہت ہی عمدہ لطیفہ سن لیا ہو۔ لوردا مچھلی نے بھی اپنی تاحیر غیبناکی کے باوجود اس قہقہے میں اس کا ساتھ دیا۔ نور دماغی کے قہقہے سے نضا کچھ اس طرح سرخسٹ ہوئی تھی جیسے بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے ہوتی ہے۔

"یہ حویلی اور زمینیں پچاس لاکھ سے بہت زیادہ کی ہیں جن جی! ملک بولا۔"

"چلو زیادہ لے لو۔ مارکیٹ ویلی مقرر کرنا تو اس حساب سے لے لو۔ میں نے تو یہی ان کی تفصیل جانے بغیر بات کی تھی۔ تم ہاں کرو۔ قیمت جو بھی ہوگی وہ لے لیتا۔" میں نے دھمکی سے کہا۔

"بس... بس۔۔۔ اب اتنا اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں۔" ملک ریاض نے مجھے پکارا "جنہیں سچ کر تو رقم سب کو ہی مل جاتی

تھی بھی رہتے رہیں گے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں ۳۰ لاکھ سا بیڑا نہیں چاہتا۔ ایک طرح کا تانواں ہے۔ جس کی کسی پر آپ کی نظر کرم نہیں تاکہ یہ تانواں ادا کرنا پڑتا ہے۔"

پوچھنے سے تانواں کی شکل نہیں دینا چاہتے۔ اسی لئے اتنا دھمکانا ماحول تخلیق کرتے ہیں۔ رقم کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ سناٹے آئندہ ہم اس بات کی کوئی نہ کوئی قدم بٹھالائے اس کے بدلے میں جس سے رقم لیتے ہیں۔ ہم اس کے احسان کو یاد رکھتے ہیں اور اس کا صلہ چکانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی نہ لے لے اور خود ہی اسے اپنے لئے تانواں بنالے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ رقم تانواں نہ بنے پاسکے لیکن کیا کریں۔ مال بہت بری چیز ہے۔ لوگ اسے آسانی سے خود سے چوراکا پھند نہیں کرتے۔"

"مال واقعی کمال چیز ہے" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"ہاں ہاں دیکھ لیں کہ آپ جیسے دولت مند لوگ ہر طرف سے مزید مال کھینچنے کے لئے کیا کیا کھنکھن کرتے ہیں کیا کیا ازارے بجاتے ہیں اور کیا کیا لٹے لٹھرتے ہیں۔ میں تو یہ سوچ کر پیشان ہو رہا ہوں کہ آپ جیسے لوگ جب اسمبلیوں میں بیٹھیں گے تو اس قوم کا کیا بنے گا؟"

"آپ قوم کو چھوڑیں" اپنی فکر کر رہی چوہدری صاحب! ملک ریاض ہڈاؤں سے بولا۔ "معلوم نہیں آپ ہر بات میں ملک اور قوم کو کیوں بچھیننے لگے آتے ہیں۔"

"واقعی مجھے ایسی بے ہودہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ تو آپ لوگوں کے کھلنے ہیں۔ جب دل چاہا کھینچے جب دل چاہا توڑ دیا۔ یا پھر شاید یہ الفاظ صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ آپ جیسے لوگ تقریروں اور بیانات میں ان کی بجائیں کہتے رہیں۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے یہ الفاظ زبان پر لانے کا۔"

میں ہنس کر رہا تھا کہ ملک ریاض نے اب تک بظاہر جو صبر و تحمل اور صبر و احتیاط کر رکھا تھا وہ جواب دینا جارا تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں مگرینٹ انگلیوں میں گھمرا رہا تھا۔ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "ویسے میں نے واقعی انگریزوں کے تانواں کی ایسی کسی دادات کے بارے میں آج تک نہیں سنا تھا جس میں شکار کو پہلے ڈاکو دھرت نامہ دے کر بلایا گیا ہو" اس کی خوب خاطر مدارات کی گئی ہو! میں دھرت کے لوازمات پیش کئے گئے ہوں اور پھر اس سے لے کر تانواں کا مطالبہ کیا گیا ہو۔"

نور دماغی اس ساری گفتگو کے دوران پہلی بار بولا۔ وہ ملک ریاض سے مخاطب تھا۔ "ملک صاحب! میں نے آپ کو بولا تھا کہ محبت کی زبان لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر آپ کے تو کسی بھی کام کو کرنے کے اپنے ہی طور طریقے ہیں۔ آپ نے تو بولا تھا یہ زیادہ ٹوک بات کہنے والا بد ہے مگر یہ تو ادھر ادھر کی بہت



بچے سے کچھ کا شیر نکل آتا ہے۔ اب بھی شاید مجھے اتنی حیرت نہ  
چلتی تھیں دیکھ کر ہوئی ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے تمہاری  
موجودگی نہایت مناسب بھی ہے۔ اب یہاں تینوں طبقوں  
لنا بندگی ہو گئی ہے۔ کورم پر رہا ہو گیا ہے۔ جاگیردار ڈاکو لوٹاؤ  
تیوں ہی موجود ہیں۔ اب تم لوگوں کو اپنے شکار کے بارے میں  
پرچہ میں آسانی رہے گی۔

”بات تو تم اس طرح کر رہے ہو جیسے خود بڑے ہیڑر ہو  
پارسا ہو۔“ حاجی عالم شیر لڑا کا عورتوں کی طرح ہاتھ بچا کر ہوا  
چوہے کھانے کی جگہ کو چلی۔

”پلو خیر“ میں توبہ ہی ہوں جو نوسوچے کھانے کے بعد آ  
ہو گئی اور جگہ جانے کا ارادہ باندھنے لگی۔ لیکن تم تو دوہلی ہو  
سے واپس آنے کے بعد بھی چوہے ہی کھاتے چلی جا رہی ہے۔  
یہ کہتے ہوئے گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے دائیں با  
کھڑے ہوئے ڈاکو اراٹ تھے مجھے اٹھتے دیکھ کر باقی سب  
بھی اراٹ ہو گئے۔ ڈاکوؤں کے کندھوں پر راہنیں اور ہاتھوں  
روالور تھے۔

ان کے اعصاب پر اتنا غارتھا کہ اسے میں بھی محسوس  
تھا۔ صرف ملک ریاض میری طرح پُرسکون نظر آنے کی کوشش  
رہا تھا لیکن میرے اندازے کے مطابق حاجی عالم شیر کے غم  
ہونے کے بعد وہ بھی اندر ہی اندر غارتھا کا شکار تھا۔

میں پشت پر ہاتھ رکھ کر شکار ہوا پھرتی کی دیوار کے قریب  
گیا جو دو ڈھانچے ٹٹ بلند تھی۔ گنگا اندر چرا کچھ ہلکا ہوا جا رہا تھا۔  
لفظ میں کچھ دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ یہی نظر میں اس مندر میں  
رہی تھیں۔

اچانک میرے عقب سے ملک ریاض یہ آواز بلند  
”چوہری صاحب! ہمیں معلوم ہے آپ کے کوٹ کی اندر دہلی  
میں کوئی گن موجود ہے۔ ایک آدھ افسار شاید اور بھی موجود  
لیکن کوئی ہتھیار نکالنے کے لئے ہاتھ کو حرکت بھی مت دیجئے  
ایسے موقعوں پر ہمدردی کے جوہر دکھانا فضول ہوتا ہے۔ ہمیں  
آپ کی جان عزیز ہے۔ ہم اگر اسے ضائع کریں گے تو اتنا  
مجبوری کے عالم میں ضائع کریں گے۔“

”بڑی سہرا ہی ہے تمہاری۔ تم جیسے سہراں زندگی میں کبھی  
نہ ملتے ہیں۔“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر انتہائی مہربانی سے  
”مجھے معلوم ہے یہ ہمدردی کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ہے  
میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں صرف سوچ بچار کر رہا ہوں۔  
”سوچیں ضرور سوچیں۔“ ملک ریاض صرٹ آمیز لہجے  
ہوا ”سوچ کچھ کر انسان زیادہ ستر فیصد کرتا ہے۔“

دو ڈاکو میرے دائیں بائیں تھے ان کی انگلیاں روالور  
زیر زبر تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ دو ڈاکو میرے پیچھے بھی کچھ  
جوز کر کھڑے تھے اور باقی لوگوں کی نظر بھی مجھ پر ہی تھی۔

ہم تو لوگوں کی چڑیں بکوا کر تم لینے والے لوگ ہیں۔ بات کو  
گھمانا پھرنا چھوڑو۔ اصل موضوع کی طرف آؤ۔“ اس کا لہجہ اب  
بدل رہا تھا۔

میں خاموش رہا۔ فضا میں سخت تازہ تھا۔ اچانک ایک چوڑی  
سیڑی کے عقب سے ایک بھولا برآمد ہوا اور اندر چرے سے نکل  
کر ہماری طرف دو تھنی کی رسائی میں آیا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت  
کا خاصا زور وار چھٹکا لیکن میں بدستور کرسی پر ساکت بیٹھا رہا۔ وہ  
عالم شیر تھا۔ حاجی نمازی اور بارش اسٹیکر عالم شیر۔ اس کے لیے  
چوڑے تن و توش پر کمرے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شلوار تھیں۔ ہم  
ہو امیں دیر سے دیر سے پھر پھڑا رہی تھی۔

وہ ملک ریاض کی طرف دیکھ کر آتا ہٹ آمیز لہجے میں بولا  
”میں نے تم سے کہا تھا کہ کبھی یہی سیدی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ  
خود دو سہراں سے رقم لوٹنے والا آدمی تمہیں پچاس لاکھ اتنی آسانی  
سے کس طرح دے دے گا؟“

”آخر صبر نہیں ہو سکا نا تم سے۔“ ملک ریاض لٹھری سانس  
لے کر ہوا ”باہر آئی گئے۔ حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب  
تک میں اٹھانہ دوں باہر مت آنا۔“

”تمہارے اشارے کے انتظار میں تو میرے کھٹے جام ہو جانے  
تھے۔ ملک یار! تم تو بات کو بہت ہی طول دیتے ہو۔ حالانکہ کوئی  
سے دو باغیں کر کے ہی اس کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور  
چوہری کے بارے میں تو میں نے تمہیں پہلے ہی بتا کچھ بتا دیا تھا۔ یہ  
آدمی تمہیں اتنی آسانی سے مال نکالے والا نظر آتا ہے؟“ اس نے  
میری طرف اشارہ کیا۔ میں بالکل خاموش بیٹھا ان دوہوں کی طرف  
دیکھ رہا تھا۔

”ملک ریاض ہاتھ اٹھاتے ہوئے مہربان لہجے میں بولا۔  
”مہربان میرے چاہا۔ صبر۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے بھری کی وجہ سے تم  
اپنے بچے ہوئے کام بھی بگاڑ لیتے ہو گے۔ چوہری دیے بھی مرے  
کا آدمی ہے اس سے دوستی جتانے میں بات کرنے میں مزہ آتا  
ہے۔ مجھے یقین ہے اس سے دشمنی رکھنے میں بھی مزہ آئے گا۔“

”میرے وغیرہ کی باتیں تم کسی اور وقت پر اٹھا کر کوئی الحال تو  
تم اسے اٹھا کر بیچ کر نہیں بند کرو اور اس کے چیتوں سے رقم  
نکوانے کا بندوبست کرو۔“ عالم شیر نے ہنسی سے ہاتھ ہلاتے  
ہوئے فیصلہ سنایا۔ وہ مجھے اٹھا کر بند کرنے کی بات کچھ اس طرح  
فحاشی سے کر رہا تھا جیسے منگولی کا کوئی شہتیر وغیرہ تھا جسے اٹھا  
کر کہیں پھکوا دینا مقصود تھا۔ میری کپٹیوں میں ایک ٹانے کے  
لے ہلکی سی چٹائی لیکن میں بدستور خاموش بیٹھا رہا۔ لٹھڑے  
دراغ کے ساتھ اس قسم کی صورت حال سے بلکہ ہر قسم کی صورت  
حال سے زیادہ بہتر طور پر سنا جاسکتا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے حاجی عالم شیر کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں  
یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی عالم شیر! اگر تمہاری جگہ اس بڑی کے

# صہونیت اور عالم اسلام

طارق اسلمیل ساگر -----

☆ خلیج کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی عبرت انگیز تحریر

☆ صہونیت کے مکروہ عزائم کا کچا پٹھہ

☆ عظیم تر اسرائیل کے نپاک ارادوں کا احوال

☆ یہودیوں کے مستقبل کے گھناؤنے منصوبوں کا تفصیلی تذکرہ

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

قیمت / - 125

## امیر تیمور گورگال

☆ ..... الماس ایم۔ اے

امیر تیمور اور امیر حسین کی خانہ جنگی اور وحشیانہ قتل و غارت کے پس منظر میں

حسینہ تاتار و لشاد آغا کی قید و بند کی زندگی اور سرائے خانم کے درجے تک پہنچنے

کی دلچسپ داستان -----

دو حصوں میں مکمل قیمت: / - 300 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

سب سے خطرناک میری نظریں نور دیا تھی تھا۔

میں ایک قدم اٹکے بڑھ کر پھٹ کی دیوار سے نیچے بھاگنے لگا۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ میرے دائیں بائیں موجود ڈاکو میرا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔ اسی لمحے ویرانے میں آلو کی تیز اور کثرت آواز مگرچ آج بھی۔ آلو ایک مخصوص انداز میں تین مرتبہ چینا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ فی الحال وہ آلو میں ہی تھا لیکن میں نے پوری کوشش کی تھی کہ کسی کو احساس نہ ہونے پائے آواز میرے ہی حلق سے برآمد ہوئی ہے۔ آواز گویا کہیں دور سے ہی آئی تھی۔ یہ نوعمری کے اس خطرناک دور کی سبکی ہوئی ٹھیک تھی جب ہم جان بھیلی پر لے کر خطرہ جھگول اور دشاگر گزار راستوں پر رہتے تھے۔ سرحدی فوجیوں اور انہی اسٹاکنگ دستوں کو بچے دیتے پھرتے تھے۔ اس دور کے مقابلے میں آج کی بڑی سے بڑی خطرناک صورت حال بھی آسان لگتی تھی۔

میں بظاہر نیچے ہی دیکھ رہا تھا جب آلو کی پکار ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ملک ریاض شہم استہزائیہ سے مجھے میں بولا "نیچے چلا نک لگنے کی تمنا کس نہیں ہے چوہدری صاحب! اسخندہ ہونے کا خطرہ ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، مانی عالم شیر نے غصیلے لہجے میں ملک ریاض کو مخاطب کیا "اے بے گدھے! تم نے سنا نہیں؟ اس نے اپنے ساتھیوں کو کشتل دیا ہے۔ تم نے آلو کی آواز نہیں سنی تھی؟"

میں نے صرف استہزائیہ انداز میں ہنسنے پر اکتفا کیا۔ اپنی کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ ملک ریاض خود ہی بولا "آواز دور سے آئی تھی۔ اس علاقے میں اکثر آلو بولتے رہتے ہیں لیکن ہمیں آلو بتانا آتا آسان نہیں ہے۔"

اس موقع پر میرا وہ مشہور زمانہ شعر پڑھنے کو بڑی شدت سے نکل آیا۔

برباد چمن کرنے کے لئے بس ایک ہی آلو کافی تھا  
ہر شاخ پہ آلو بیٹھا ہے، انجام گلستان کیا ہوگا  
لیکن میں نے دل ہی دل میں اس شعر کا گلا گھونٹ دیا۔ ملک ریاض کی رائے میرے حق میں جاری تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ بھی یہ طریقہ بڑا پرانا ہو گیا ہے۔ اس قسم کے طریقوں پر عملدرآمد آج کے دور میں بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ چوہدری صاحب جیسے ماہرن آدمی اس قسم کی حرکتیں کرتے ہوں گے کیوں چوہدری صاحب؟"

میں ان لوگوں کی طرف گھوم گیا۔ سب کی نظریں مجھ پر تھیں۔ عالم شیر ایک کرسی پر اتنی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر بدعمری کے آثار تھے۔ ملک ریاض میری مزید صفائی پیش کرتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب ہمارے آدمیوں کے ساتھ آئے تھے اور اکیلے آئے تھے۔ ہم نے اطمینان کر لیا تھا کوئی ان کے پیچھے

نہیں تھا۔"

اس کا مطلب تھا کہ سب کچھ ایک طے شدہ پروڈ تحت ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنی احتیاط پسندی پر فخر و بغیر نہ رہ سکا۔ کبھی کبھی احتیاط پسندی بہت کام آجاتی ہے ان کے لئے یہی سمجھنا بہتر تھا کہ شکار نہایت مصعوبیت یہ جال میں آگیا تھا۔

عالم شیر گویا ملک ریاض کو سمجھانے کی ایک اور کوشش ہوئے بولا "ملک ریاض! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ بڑا خطرناک ہے۔ بہت تیز ہیں اس کے آدمی۔ چھری چھری۔ اگر معاملہ کسی چھوٹے موٹے ٹولے کا ہو تو تو یہ نشت لیتا۔"

"ہم اطمینان رکھو میرے بارش چاند!" ملک ریاض کے کندھے پر چھکی دی "یہ ملک ریاض کا علاقہ ہے۔ یہاں کی خطرناکیاں دھری رہ جاتی ہیں۔ کوئی انہی چوہدری میں بھی نہیں چھپ سکتا اور ہماری اجازت کے بغیر سرعام سکتا۔ آلو تو چوہدری صاحب کو ہمارے ساتھ روانہ ہو۔ کسی قسم کی گزرباز یا بالکل شک تک نہیں تھا۔ میں ٹھیک کہتا چوہدری صاحب؟" اس نے براہ راست مجھے مخاطب کیا۔ "بالکل" میں نے اعتراف کیا۔

"اگر بالفرض چوہدری صاحب بہت احتیاط پسند بھی ملک ریاض نے عالم شیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دور! بعد میں اپنے آدمیوں کو یہاں پہنچ کر دھراؤ اور کہیں چھپ ہدایت کر رہی ہو تب بھی انہیں مہر کر لینا چاہئے۔ کیونکہ ان آدمیوں کی لاشیں بھی غائب ہو چکی ہوں گی۔ یہ علاقہ وفادار ہے۔ ہمارے دشمنوں کو تو یہاں کی زمین اس طرح ہے جیسے کبھی کو چھپ چکی۔"

"واہ... واہ... کے مثال دتی اے میڈا سامن! اہم ملک کر ملک ریاض کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ملک نگاہوں سے اسے کھورا۔ شاید اس وقت وہ اپنی تعریف محفوظ ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ بظاہر ہر ممکن فو کے اعصاب و افکار کے تاروں کی طرح تے ہوئے تھے۔ "آپ نے کیا فیصلہ کیا چوہدری صاحب؟" ملک ریاض بڑی شغاس اور بڑے اجرام سے پوچھا۔

"بات یہ ہے ملک صاحب۔" میں نے اپنے دوا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ ایک خطرناک ڈاکو... ایک کرپٹ اور سیاست میں حصہ لینے والے باگ اور درمیانے درجے کے ایک اسمگلر کے درمیان کیا فرق مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ تینوں معززین کمن علاقہ تحت اکٹھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے پہلے بھی اکٹھے ہوئے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے رہے ہوں۔ لیکن میرا

زور رہا ہوں۔

میں نے غیر محسوس طور پر ایک نظر پھر گھڑی کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن پھر بھی انسان کی زندگی میں سب سے بڑی کمزوری اس کی اپنی جان ہے جسے یہ غلام بنا کر اسے بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ جو اس وقت تم کر رہے ہو۔ لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے اس پولوسے بھی بلیک میل نہ ہونے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ میں نے اپنا یہ یقین پختہ کر لیا ہے کہ جان اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک اس کی مرضی نہ ہو کوئی اسے نہیں جین سکتا۔ جب سے یقین کی یہ پہچان حاصل ہوئی ہے تب سے زندگی بڑی آسان ہو گئی ہے۔ خوف بہت کم ہو گیا ہے۔ شر میں بغیر مداخلتوں کے بھرتا ہوں۔ حالانکہ شرمسیر سید عالم میرے چہرے پر کلاں دشمن بھی موجود ہیں اور میری بل بل کی حرکات و سکنات کی خبر رکھنے والے بارہ لوگ بھی۔ جو کسی اور ہی تیار سے آئی ہوئی مخلوق کہتے ہیں۔"

ملک ریاض مجھے گھورتے ہوئے بولا "اب میرے ممبر کا پانہ بھی لبریز ہو گیا ہے۔ اتنی لمبی تقریریں سن کر بھی آدمی کو کچھ حاصل نہ ہو تو کیا فائدہ؟ آپ ان تقریروں کا خلاصہ بتاویں چوبدری صاحب!"

"کمال ہے! خلاصہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا ملک صاحب؟ خلاصہ صرف یہ ہے کہ میں آپ کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں آپ کو پچاس لاکھ تو کیا پچاس روپے بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ بات اصول کی ہے۔ میں پچاس لاکھ روپے کسی اسپتال 'کسی خیرم خاں کو ملنے کے طور پر دے سکتا ہوں' تمہیں نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ہم پچاس لاکھ لیں گے بھی نہیں۔" ملک ریاض اطمینان سے بولا "اب ہم ایک کروڑ لیں گے۔ اور اس طرح لیں گے جس طرح میرے جاں شاد دوست نور دیا بھی اور عالم شیر تجوڑ کر بس گئے مجھے اعتراف ہے کہ میرا طریقہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں اب معاملہ اپنے دوستوں کے ہاتھوں میں دے رہا ہوں۔ یہ لوگ رقوم وصول کرنے کا فن بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

اس نے گویا بات ختم کر دی اور سگٹٹ سلگائے لگا۔ نور دیا بھی ایک سوچے کو بل دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی رائفل کمر کی ہی کے کنارے کھڑی چھوڑ دی تھی اور اپنا کوئی ریو اور فیوہ بھی نہیں نکالا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چار آدمیوں نے مجھے گور کیا ادا تھا۔ چار پانچ آدمی اور بھی ہتھیار بدست تھے۔ صرف ملک ریاض غیر مسلح اور بے پروا نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے کوئی زحمت اٹھانا ضروری نہیں تھا۔ ہر کام اس کے اشارے پر ہو سکتا تھا۔

نور دیا بھی نہایت ڈرامائی انداز میں قدم اٹھاتا میری طرف

کہ میں نے زندگی میں بہت پہلے ایک اصول بنالیا تھا اور آج اس پر سختی سے کاربند چلا آ رہا ہوں۔"

"ہاشام اللہ۔ ہاشام اللہ! ملک ریاض کے لیے میں مٹھاس لینا ہوا زہر تھا۔ بڑے لوگوں کی بھی تو شان ہوتی ہے۔ وہ سترے رمل کے تحت زندگی گزارتے ہیں اور بیش سختی سے ان پر کاربند رہتے ہیں۔ ارشاد فرمائیے وہ اصول کیا ہے؟"

"میں تمہارے لیے کے گھنٹا گھر کو نظر انداز کرتے ہوئے بتا رہا ہوں۔" ملک ریاض نے کہا "بہت پہلے میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں زندگی میں کبھی بلیک میل نہیں ہوں گا 'خراہ جان چلے' یہ کیونکہ جو لوگ ایک بار بلیک میل ہوتے ہیں وہ زندگی بھر بلیک میل ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔"

"واہ۔ واہ۔ کیا برسوں کے تجربات کا پھر زار شاد فرمایا۔" ملک ریاض نے جھوٹے اداسی کے ساتھ کہا۔

میں نے اس کے انداز پر توجہ دے بغیر بات جاری رکھی 'اچھے برسوں پہلے میں نے اپنی زندگی سے رفتہ رفتہ ان کمزوریوں کو ہٹا دیا جن کی بنا پر مجھے بلیک میل کیا جاسکتا تھا۔ بلیک میل بہت چلتا ہے اور اس میدان میں واقعی ہزاروں آدمیوں سے طبع کی جاتی ہے۔ آپ جیسے لوگ تو ان باتوں کو بہت اچھی طرح نہ ہوں گے۔ میری پیشہ سے کو شش رہی ہے کہ مجھے کسی بھی سب سے بلیک میل نہ کیا جاسکے۔"

میں اٹھ بیٹھا ہاتھ پھسائے دیوار سے ٹک لگائے کھڑا تھا۔ کرتے کرتے میں نے کن انکھیں سے گھڑی دیکھی۔ مجھے دو اور گزرا تھے۔ ان کی آواز کا سچل دے مجھے پانچ منٹ سے نہیں ہوئے تھے۔ ملک ریاض کی نظریں بھی اس قسم کی باہر آئی اور آؤٹ فٹنڈ تھیں لیکن میں نے پرانی چیزوں کو نئی ل کے جھیلیں میں بھی پیشہ کار آ رہا تھا۔ ویسے بھی میں ریاض زندہ رہنے والا آدمی تھا۔ قدامت اور جدت کا استخراج مجھے لگتا تھا۔ نئی اور پرانی چیزوں کو گنڈ کر کے میں نے اکثر بڑے فوائد حاصل کئے تھے۔

ملک ریاض اس بار ذرا سنجیدگی سے بولا "اس دنیا میں کسی بھی آدمی کی زندگی ایسی نہیں ہوتی کہ اسے کسی بھی ذرا سب سے بلیک میل کیا جاسکے۔"

"کلی حد تک تمہاری بات درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "تو اس دورے ابھی تک شادی کرتے ہوئے بھی ٹھیک رہا ہوں۔ اپنے انسان کے چہروں کی زنجیر ہوتے ہیں۔ اس کی کمزوری بھی بات ہے۔ کوئی انہیں اغوا کر کے بھی آپ کو بلیک میل کر سکتا ہے کہ میرے شادی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی میری آخری بل لڑی نہیں ملے۔ اور اگر ملے تو کسی اور طرف جائے۔ واپس آئی تو مجھ سے شادی پر رضامند نہ ہوگی۔ لیکن یہ وجہ بھی ہے کہ میں اپنی زندگی میں یہ کمزوری پالتے ہوئے

برہما۔ اب ترجمے بھی جیسے ذرا تشویش ہونے لگی تھی۔ ہمارے  
طے شدہ طریق کار کے حساب سے تقریباً آٹھ ماہ اور ہو چکا تھا۔  
آٹھ ماہ نہ جانے کتنے انسانوں کی زندگی کا فیصلہ کر دینے کے لئے  
کافی ہوتا ہے۔

میں نے غیر محسوس طور پر اپنے اور ریوالور برادران کے  
درمیان فاصلہ بنانے کی کوشش کی۔ ریوالور برادر ڈاکو کچھ دور  
تھے لیکن دو بالکل قریب تھے۔ درمیان کی خالی پٹی پر نوروما بھی چلا  
آ رہا تھا اور ان پانچوں کی نظر مجھ پر تھی۔ کسی کارروائی کا خطرہ مول  
تو لیا جاسکتا تھا لیکن اس کے لئے محض ایک ثانیہ کو ان کی توجہ  
بٹانے کا کوئی سبب بن جانا تو بہتر تھا۔ میرے لئے وہ ایک ثانیہ کی  
مسلت کافی ہوئی ورنہ خطرات بہت زیادہ تھے۔ میری کمپوزیٹ یا سینے  
میں سوراخ ہونے کا بڑا قوی امکان موجود تھا۔

ضائع کرنے کے لئے بھی میرے پاس ایک لمحہ نہیں تھا۔ اگر  
نوروما بھی مین میرے سامنے آن پہنچتا تو میرے لئے کوئی قدم اٹھانا  
اور مشکل ہو جاتا لیکن مین ای لمے اسی برقی کے عقب میں چھت  
کی دیوار سے ایک ہیونے سے سر اٹھا رہا جس کے پیچھے کچھ دیر پہلے  
نک عالم شیر چھپا ہوا تھا۔ چھت کا وہی ایک کونا ایسا تھا جہاں مگرانی  
کے لئے کوئی آوی تینا نہیں تھا۔

ہیولا دونوں ہاتھ دیوار پر پھنسا کر اوپر اٹھا اور بے آواز طریقے  
سے بلی کی طرح چھت پر کود آیا۔ اس کے ساتھ ہی بیک وقت دو  
کام ہوئے۔ ایک تو کہیں دور بہت دور وار فائرنگ شروع ہو گئی۔  
دوسرے میرے پاس کھڑے ہوئے وہ دونوں ڈاکو تقریباً ایک ساتھ  
اچھل کر دور جا کر گئے جنہوں نے ریوالور میری کمپوزیٹ کی طرف بلند  
کئے ہوئے تھے۔

خاموش وارنٹل کی گولیاں افیس چلتی تھیں۔ ان میں  
سے ایک کاربولور چل گیا تھا لیکن غصیت تھا کہ میں دیوار سے  
نمک لگائے کھڑے کھڑے تھوڑا سا نیچے کو ٹھک چکا تھا۔ اس کے  
باوجود گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ اگر میں ذرا سا بھی  
سیدھا کھڑا ہوتا تو میری کپٹن میں سوراخ ہوتا لازمی تھا۔

وہ مسلت میرے لئے کافی نہ تھی۔ زیادہ تھی۔ دور فائرنگ کی  
آواز نے سب کو چڑکا دیا تھا لیکن شاید ان کی سیر کچھ میں نہیں آیا  
تھا کہ اتنی دور ہوئے والی فائرنگ سے میرے دائیں بائیں کھڑے  
ہوئے ڈاکو اچھل کر دور کس طرح جا کر گئے تھے۔ مجھ سے ذرا دور  
کھڑے ہوئے دو ڈاکوؤں کے ریوالور گرے لیکن اس وقت تک  
میں ایک کھٹکے کے بل بیٹھ چکا تھا۔ دوسرے انہوں نے اپنے سردار  
نوروما بھی کو بچانے کے لئے داؤد بہل کر فائر کئے تھے۔ گولیاں نہ  
جانے کہاں سے گزریں۔

گزربڑکا احساس ہوتا ہی نوروما بھی زخمی و زندے کی طرح مجھ  
پر چھپتا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے اپنی  
گولی گن وغیرہ بھی نکالنے کی کوشش کی۔ یہی اس کی غلطی تھی۔

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میری لات نے اسے کم  
دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا سرخ اس کے ساتھیوں کی  
تھا اور عقب سے اس کی گردن میری گرفت میں آگئی  
نکلنے کے لئے جو ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا تھا وہ میر  
ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

اس دوران دوسرے دو ڈاکو جن کے ریوالور  
طرف تھا غالباً کسی ایسی پوزیشن پر پہنچنے کے لئے کھڑے  
نوروما گزرتا پہنچائے بغیر مجھے نشانہ بنائیں لیکن ان کی  
کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ گولی چلانے سے پہلے ہی ڈھیر  
تک کسی کی سمجھ میں صحیح طور پر نہیں آسکا تھا کہ چھت  
سے وہ ہیولا اسی برقی کی آڑ میں ہو چکا تھا جس کے پیچھے  
عالم شیر چھپا ہوا تھا۔

یہ احساس سب سے پہلے غالباً عالم شیر کو ہوا کہ وہ  
لئے کوئی چھت پر پہنچ چکا ہے۔ اس نے کرسی سے چلا کر  
میز کو اٹھا ہوا رکوع کی حالت میں ایک دوسری برقی  
کے لئے دوڑا۔ اس دوران وہ سینے سے ایک لمبا مار  
نکال چکا تھا۔ لیکن اسے بھی ریوالور کے استعمال کا موقع  
ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا کر اور  
کے ساتھ اس کا بازو بے جان انداز میں جھول گیا۔  
گولیوں کی زد سے بچانے کے لئے وہ فرش پر گر کر ایک  
لڑھکھا چلا گیا۔

ایک ڈاکو کے پاس بلی مشین گن بھی تھی۔ وہ  
کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسے غالباً  
لگی۔ وہ پٹ سے اس طرح گرا کہ سب مشین گن اس  
ہی گری۔

یہ سب کچھ تقریباً بیک وقت ہی ہوا تھا۔ برقی کے  
پلنے والے ہیونے کو میں نے بچان لیا تھا۔ وہ قبیضہ آلا  
میرے خاص ساتھیوں میں سے ایک۔ وہ بہت اچھے ذہ  
تھا۔ صورت حال کو اس نے کم سے کم وقت میں بہت  
سمجھا تھا اور اس کی کارکردگی بہت شاندار رہی تھی۔  
اس نے اکیلا ہوتے ہوئے بھی ایک ایسی جگہ پر

صرف انہی لوگوں کو ہر وقت نشانہ بنایا تھا جنہیں نشانہ  
بہت ضروری تھا۔ اس کی چلائی ہوئی کسی بھی گولی کو ایک  
تاخیر ہو جاتی تو صورت حال میں نہ جانے کتنا فرق پڑتا۔  
فائرنگ کے درمیان وقفہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر ڈاکو  
کسی ماہر کو اس وقت صورت حال پر توجہ دینے کی فرصت  
شاید بھی سمجھتا کہ بیک وقت کئی توہی چھت پر کودنا  
آفتاب نے اگر چند سینکڑوں یا ہزار پلٹ دیا تھا۔ مجھے زیادہ  
پلنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس نے صحیح معنوں میں  
والی کارروائی کی تھی۔

مگر اس کے حواس گریبا حلق ہو چکے تھے۔ اس کی گویا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا تھا وہ کس طرح ہوا تھا۔ عالم شیر کی ڈھیلی ڈھالی تیس کی ایک آستین خون میں تر تھی لیکن اس کے حواس ٹھکانے پر تھے۔

میں نے ان دونوں کے سر آپس میں ٹکراوے لیکن زیادہ زور سے نہیں۔ دونوں ہماری تن و توش کے آدی تھی۔ پکراے ہوئے سے انداز میں ادھر ادھر جھولنے لگے پھر ملک ریاض نے سر جھٹک کر وحشت زدہ سے انداز میں میری طرف دیکھا گویا پچانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"دیکھا تم نے اہل سیاست؟" میں نے ملک ریاض کے گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "صرف اتنی سی دیر گنتی ہے بازی بیٹے میں۔ نرم شکار کساتے کساتے بہت عادی بن چکے ہیں تمہاری۔ میرے ساتھ چکا لینے کے لئے جہیں اپنے سنا کرگوں اور ڈاکوؤں وغیرہ سے ذرا زیادہ اونچے درجے کے لوگوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔"

میں نے ایک بار پھر ذرا آہستگی سے اس کا سر عالم شیر کے سر سے ٹکرایا۔ مجھے حیرت تھی کہ ان دونوں میں مزاحمت تک نہیں رہی تھی حالانکہ آدی جاندار تھے۔

"تم سیاست کے ماتھے پر ہلکے کانٹے ہو۔۔۔ اور مجھے انوس ہے کہ اس ماتھے پر ہلکے کے ٹیکوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ماتھا اب کہیں نظری نہیں آتا۔" میں نے ملک ریاض کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "میں کوشش کروں گا کہ تمہارا وزیر صنعت و تجارت بنے گا تو کیا؟" ایم این اے بننے کا خواب بھی پورا نہ ہو سکے۔ مجھے فرصت ملی تو میں ضرور ایسا بندوبست کروں گا کہ تم نہ تو اپنی ہانسی کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لے سکو اور نہ ہی کوئی اور جو ذوق زیادہ سووے بازی کر سکو۔ میں تو اس تصور سے پریشان ہوں کہ سیاست میں اگر تم جیسے لوگوں کی تعداد اسی طرح بڑھتی رہی تو اس ملک کا کیا ہے؟"

میں نے اسے فرش پر بیٹھ دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ دہیں پڑا آٹھکس پٹ پٹا رہا، خاموشی ایسے میری طرف دیکھا رہا۔ میں نے عالم شیر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "اور تم۔۔۔ ضیث آوی! تم کچھ رہے تھے کہ ملک ریاض کے ساتھ کچھ جوڑ کر کے تمہاری طاقت ڈھکی ہو جائے گی؟ تم مجھے آسانی سے کچل ڈالو گے۔۔۔ رقم بھی ٹھکالو گے؟ ایسے خواب دیکھنا چھوڑو۔"

میں نے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کی۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکل۔ اسے کراہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے وہ شاید گر جا یا لیکن میں نے اسے گرنے سے روک دیا۔ "یہ تمہارے لئے آخری موقع تھا۔ آئندہ تم نے مجھ سے الجھنا اور سازش کرنا تو درکنار اگر میرے راستے میں آنے کی بھی کوشش کی تو وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

میں نے جھٹکے سے اسے سیدھا کھڑا کیا "نہیں دن پہلے یقیناً ٹوٹی

کو بھی تمہارے آدھوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وحشت زدہ ہی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم میرے لوگ میرے ایک آدی کو بھی قابو میں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو مجھے پکڑنے، ٹھکانے لگانے یا مجھ سے اپنے اہتمام مطالعات منوانے کے خواب کیوں دیکھتے گئے ہیں؟"

پھر میں نے قدرے زری سے اسے سمجھانے کی کوشش کی "عالم شیر! تمہارے ذہن میں میرے بارے میں ایک جھگے ہوئے نا تجربہ کار اور نا سمجھ نوجوان کا جو تصور ہے اسے ذہن سے جھٹک دو۔ تم کیوں ابھی تک اسی میں پھنسے ہوئے ہو؟ میں بہت آگے بڑھ چکا ہوں۔ میں کم از کم تم جیسے اچکوں ڈاکوؤں اور چھوٹے سروس جانکروں کے ہاتھ آنے والی چیز نہیں ہوں۔ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے میری بات؟"

وہ اب بھی کچھ نہ بولا۔ میں نے اسے بھی ملک ریاض کے قریب بیٹھ دیا۔ دور فاصلے کی آوازیں معدوم ہوتی جاتی تھیں۔ دھن دھن سے لاکڑ کا ٹانگہ کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ آقاہر چھت کے وسط میں مستند کھڑا تھا اور عقابی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا رپورٹ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "تین چار گن مین نیچے بھی موجود تھے۔ احمد نے انہیں فی سنا کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔" آقاہر نے بتایا "چاروں طرف نظروں ڈالتے ہوئے بولا "کچھ توں اور جنگلوں میں گیس ڈاکو موجود تھے۔ سیر، مسود، مندر اور سلیمان نے ٹوٹی رہنمائی میں ان میں سے کئی کو ہلاک کر دیا تھا۔ باقی بھی اب تک مر چکے ہوں گے یا فرار ہو چکے ہوں گے۔" اس کے لہجے میں بلا اعتماد تھا "یہ ان لوگوں کی تربیت کا ایک حصہ ہے۔ بازی بیٹے دیکھ میں تو فرار ہوئے ہیں دیر نہیں لگاتے۔"

"بہت خوب! تم لوگوں نے صورت حال کو بہت اچھی طرح سمجھا اور بہت اچھی طرح پیشل کیا۔ میں بہت خوش ہوں۔ اتنی عقلی سے سب کام ہونے کی امید نہیں تھی۔ ہمارے آوی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟" میں نے دریافت کیا۔

"جب میں یہاں پہنچا ہوں تب تک تو ہمارے کسی ساتھی خراش تک نہیں آئی تھی۔ ہم نے نہایت خاموشی سے ایک گم چلائے بغیر تین سیاہ پوشوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ہمیں اندازہ ہو چکا کہ وہ ڈاکو ہیں اور انہوں نے اس حوالی اور میدان کو اسی۔ عاصمے میں لیا ہوا ہے کہ آپ کی مدد کے لئے کوئی نہ پہنچ سکے آپ نے ہمیں کچھ اشارے تو دے دیے تھے۔ باقی صورت حال کا ہمیں یہاں آکر اندازہ ہو گیا۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ اگر خطرات پیش آئے تو ان

انداز کیا ہوگا۔ میں نے تو احتیاطی سب کچھ کیا تھا لیکن کام آگیا۔ ملک ریاض اور نور ماہی سے ملنے ہی مجھے میری کوئی حس ان کے بارے میں خبردار کر رہی تھی۔ "میں نے کہا۔  
نور ماہی کے گرد وہ اب تقریباً ختمی سمجھے۔ "آفتاب بولا۔ پھر اس نے ملک ریاض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تو کاشا بھد میں کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اسے اٹھا کر لے چلے ہیں۔"

"جیس معلوم ہے ہمارے پاس کوڑا کی طرح کے رکھنے کے لئے جگہ نہیں ہوئی۔" میں نے ملک ریاض کو بکلی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا "جب کوئی مسئلہ کھڑا کرے گا تب ایک بار پھر اسے دیکھ لیں گے۔ اس طرح کی بیماریوں کے بہت سے علاج ہیں ہمارے پاس۔ اس وقت تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ آؤ پیچھے چلے ہیں۔"

میں نے پیچ جانے والے ڈاکو کی طرف دیکھا۔ لوگوں کو بدبخت زور کرنے والی وہ مخلوق اس وقت خود کافی بدبخت زور نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے بدستور بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف، ٹہر ہو چکا تھا۔ آفتاب نے اس کے ساتھ ساتھ احتیاطاً ملک ریاض اور عالم شیر کی بھی تلاش کی۔ پھر سب ہمیں اٹھا کر چھت سے نیچے دوڑ پھینک دیں۔

ہم بیڑیوں سے اترنے لگے تو آفتاب نے بیڑیوں کا اتنی رد و انداز کر کے اپنی طرف سے بولٹ چڑھا دیا "انہیں ابھی چھت پر ہی رہنا چاہئے۔ دن چڑھے کوئی نہ کوئی آکر دوڑا زور کھول دے گا۔"

ہم نے حویلی کے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ ہال کے راستے ہم سیدھے باہر چلے آئے۔ ہم جب اس طرف پہنچے جہاں نور ماہی کرا تھا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت کا لپکا سا جھٹکا کہ وہ ہوش میں آچکا تھا اور گھسٹ کر حویلی کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم پر نظر پڑے ہی اس کا ہاتھ جیب کی طرف گیا لیکن میں نے ایک ڈنڈہ لگا کر اس کے قریب پہنچ کر اس کے بازو پر ٹھوکر رسید کی۔ اس کا بازو بے جان انداز میں زمین پر پھیل گیا۔ اس نے سر جھکی ڈھیلے ڈھالے انداز میں زمین پر ٹکا دیا۔

اس کی شاید ایک یا دو ٹولیاں ناقص ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کے چہرے پر زبردست اذیت کے آثار تھے۔ اس کا چہرہ سینے میں تر تھا۔ وہ بار بار سختی سے آنکھیں بند کرنا پھر کھول لیتا۔ بلاشبہ وہ زبردست قوت برداشت کا مالک تھا۔ آدمی وہ غیر معمولی تھا۔ غلط راستوں پر نہ ٹکرا ہوا تو بڑے کام کی چیز ہوتا۔

آفتاب نے آگے بڑھ کر اس کی جیب سے خوف ناک ساخت کا ایک دیو اور نکال لیا۔ نور ماہی نے قطعاً مزاحمت نہیں کی۔ اس میں مزاحمت کی سکت نہیں تھی۔ میں اس عالم میں اسے گولی

مارنا نہیں چاہتا تھا۔

"اس نے خوش آنکھوں سے مجھے گھورا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹھوکر رسید کی۔ رخسار پر اس کی کھال پھٹ گئی۔ چہرے پر خون کا دھبہ بھیننے لگا۔

"اگرے ہوئے دشمن کو مارنا میری عادت نہیں ہے۔" میں نے ٹھٹھکی ٹھٹھکی سی آواز میں کہا "لیکن اس کمزور اور ناتواں عورت افروز کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا۔ یہ اس کے جواب میں ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر دوسری ٹھوکر رسید کی۔ اس کے دوسرے رخسار کی ہڈی پر سے بھی کھال پھٹ گئی۔

میں نے پیہ در پیہ اس کے چہرے پر مزید کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ اس نے چہرہ اوپر اوپر گھما کر ہنسنے کی کوشش کی لیکن نہ فتح سکا۔ اپنی جگہ سے ہٹنے کی بجائے اس میں سکت نہیں تھی۔ ہر ٹھوکر پر اسے ایک جھٹکا سا لگتا اور وہ اذیت کے عالم میں سختی سے آنکھیں بند کر لیتا لیکن اگلی ٹھوکر پر غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔

اس کا چہرہ چند ہی لمحوں میں ایک بڑے سے لو تھرے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے اپنے چہرے کو ہٹانے کی کوشش ترک کر دی اور اوندھے منہ زمین پر ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ ہوش میں تھا۔

میں نے اسے ٹھوکر سے سیدھا کرتے ہوئے کہا "اگر اپنے آپ کو مود کا پتہ سمجھتے ہو۔۔۔ اور زندہ بچنے کے لئے اسلحہ کسی عورت کے ساتھ ایسا نہ کرنا جیسا تم نے افروز کے ساتھ کیا۔ چاہے وہ طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ عورت کو اس کی مرضی کے خلاف اٹھا کر لے جانا اور اپنی حیوانیت کی تسکین کرنا ہی ایک سنگین جرم ہے۔ مگر اس خوب صورت کتاب کے پروردگار اپنی حیوانیت کے انتہائی نفوش ثبت کرنا تو میری نظر میں بالکل ہی ناقابل معافی ہے۔ خوب صورت کتابیں پڑھنے کے لئے ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ خدائی کی سامتی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ چرچا زور کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔"

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں میں خون بھر گیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے امید تھی کہ اس کے ذہن بھر گئے تب بھی اس کی شکل پہلے جیسی نہیں رہے گی۔ اس کے ٹھٹھکا لالا ہونے کا بھی امکان تھا۔ اچھ بھی حویلی کا گیت باہر سے بند کر کے ہمارے پاس آگیا تھا۔ آفتاب دیو اور سے نور ماہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اسے گولی ہی مار دیتے ہیں، لوہے کا کالی درد سڑ سڑ ہو جائے گا۔ وہ اسے ہلاک کرنے اور اس کے گردہ کا قلع قمع کرنے کا کیریڈ بھی لے لے گی۔"

"ڈوبتے ہوئے جہاز پر آخری ٹھکانا لانے کی ذمہ داری تو ان کے لئے چھوڑ دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم نے ان کا کام تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اگر وہ واقعی اس گردہ کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں

ملک ریاض فرش پر گر کر ساکت ہو چکا تھا۔ وہ سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ یہ اس نے قتل مندی کی تھی۔ اس کے پاس غالباً کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ہر وقت دوسروں پر انحصار کرنے والوں کے لئے ایسی صورت حال بڑی مشکل ہوتی ہے۔

نوروما بھی میری گرفت میں تھا۔ میں نے اسے جیب کی طرف ہاتھ لے جانے سے روک دیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں خود بھی اپنا شہین ہٹل یا خنجر وغیرہ نہیں نکال سکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں اور جسم کی پوری قوت نوروما بھی کو قابو میں رکھنے میں صرف ہو رہی تھی۔ وہ کسی ارٹے مینے سے کم نہیں تھا۔ ذرا سی دھمیل پاتے ہی وہ نہ صرف میری گرفت سے نکل سکتا تھا بلکہ مجھے بڑی مشکل میں بھی ڈال سکتا تھا۔

ہر وقت ہتھیاروں اور اپنے اور گرد و موبودہ ساتھیوں پر انحصار کرنے والے لوگ اگر جسمانی طور پر بہت طاقتور ہوں تب بھی رفتہ رفتہ انہیں ذہن لگتا جاتا ہے۔ ہاتھ پیروں سے وہ کوئی کارنامہ دکھانے کے زیادہ اہل نہیں رہتے۔ لیکن نوروما بھی کامعاملہ مختلف معلوم ہوا تھا۔

آج رات اس نے خوب پی تھی۔ نشے میں ڈھمت رہا تھا۔ پھر افزوں کے ساتھ درندگی کے مظاہرے میں بھی وہ آپے سے باہر رہا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے جسم میں ذرا سا بھی ارتعاش نہیں تھا۔ میں اسے صحیح کر ایک طرف کو لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاؤں ہاتھی کی طرح مضبوطی سے جتے ہوئے تھے۔

وہ اس گھر میں تھا کہ مجھے کرپرا اچھال کر اپنے سامنے پیٹیک دے لیکن میرے پاؤں بھی اپنی جگہ سے اٹھنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ عالم شیر پانچ جانے والا ایک ڈاکو اپنی گن تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ ان کے لئے ایک لمبے کی مہلت بھی کافی تھی۔ اس ڈاکو نے جان بچانے کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے تھے اور آفتاب نے کمال خوش ظنی اور اصول پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا تھا حالانکہ اس کی راسخل اس کے پیروں میں ہی پڑی تھی۔

نوروما بھی ٹیکے میں پھنسے ہوئے درندے کی طرح خراخرا رہا تھا اور زور آزمائی میں مصروف تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے اُلی پڑی تھیں۔ میں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی ”زیادہ دور مت لگا نوروما گردن لوٹ جائے گی۔“

لیکن اس پر میرے مشورے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے نور آزمائی جاری رکھی۔ میں اس کی گردن توڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس ٹیکے میں اس کی اپنی طاقت ہی اس کی گردن ٹوٹنے کا سبب بن سکتی تھی۔

میں نے اس کی گردن ٹوٹنے سے بچانے کے لئے اس کی پیٹھ پر مکتنا سید کیا لیکن اس حرکت سے میرا وہ توازن خراب ہو گیا جس کے تحت میں نے اسے قابو میں کیا ہوا تھا۔ وہ تڑپ کر میری گرفت

سے نکلا اور کھوٹے ہوئے اس نے اندھا دھند مجھے لات رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس کی لات سے بچنے کی کوشش میں میں گر گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر تھا۔ ریوالتور نکالنے کی کوشش نہ اس نے کی تھی اور نہ ہی میں نے۔ ہمارے پاس اپنی مہلت ہی نہیں تھی۔ یہ پلک جھپٹنے میں سرخ بدلی لینے والی محسوس تھی۔ اس نے چپتے کی طرح مجھ پر چلا تھک لگائی تھی اور اس کے آہنی ہاتھ سیدھے میری گردن کی طرف بڑھے تھے۔

صرف چند سیکنڈ اس سے الچ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غیر معمولی قوت کا مالک تھا۔ اس کا جسم لوہے کی طرح سخت تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی غالی بھی تھی۔ اس کے جسم میں پلک نہیں تھی۔

وہ مجھ پر گر اٹھا مجھے یہی لگا جیسے لوہے کی ایک سل مجھ پر گر پڑی ہو۔ قطعی اضطرابی طور پر میں نے اپنی گردن اس کے ہاتھوں کے گھٹنے میں جانے سے بچانے کے لئے پوری قوت سے اسے اپنے گھٹنوں پر اچھال دیا۔

مجھے اندازہ ہی نہیں رہا تھا کہ اس وقت ہم چھت کی دیوار کے بالکل قریب تھے تو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے نوروما بھی کی چیخ سنی۔ میں نے اسے صرف ایک لمحے کے لئے اڑتے ہوئے رچھنے کی طرح ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہو گیا اور پھر نشیب سے بھر کی زوردار آواز سنائی دی۔

تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نیچے جا کر اٹھا۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر چھت کی دیوار سے جھکا۔ حویلی دو منزلہ تھی اور پرانی تعمیر میں منزلیں ذرا اونچی ہوتی ہیں۔ حویلی کے ارد گرد زمین پکی ہی تھی لیکن نرم نہیں تھی۔ نوروما بھی جہاں جا کر گرا تھا وہاں ایک بڑی سی گتھڑی کی صورت میں ساکت ہو گیا تھا۔ وہ بلاشبہ فلواید جسم کا مالک تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے جسم میں بڑی قوت چھوڑ ہوئی ہوگی۔

تھیل ختم ہو چکا تھا اور اس میں پورا ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ میں پلٹ آیا۔ آفتاب بھی برج کے عقب سے نکل آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جرمین لیو کر تھے۔ اس نے ٹھوکروں سے دو گتھیں دور ایک کونے میں پہنچا دیں جن تک ملک ریاض ’عالم شیر‘ زندہ بچ جانے والے ڈاکو کی رسائی ہو سکتی تھی۔

میں نے عالم شیر کو گریبان سے پکڑ کر آگے کھینچا اور ملک ریاض کے قریب پہنچ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑا۔ ایک جھٹکے سے میں نے دونوں کو بیک وقت کھرا کیا۔ ملک ریاض کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ اس طرح میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ اسے گوکہ ذرا سی جوت بھی نہیں ملتی تھی اور نہ ہی کوئی گولی اسے چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔



تو تشنگ ٹنگا لیس گئے۔ ورنہ جو کچھ بھی ہو گا اس سے ہمیں  
حقائق کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔“

صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ اگر یہ علاقہ قصبے سے اتنا  
دور نہ ہوتا تو شاید اب تک یہاں آمدورفت شروع ہو جاتی۔ اسی  
اٹا میں ایک طرف سے ایک چپ اور دوسری طرف سے ایک  
سفید کار ہماری طرف بڑھتی دکھائی دی۔ چند لمبے بعد ان گاڑیوں  
میں منیر، مسعود، مسعود اور سلیمان بھی ہمارے قریب آچکے۔ چپ  
کے اسٹیرنگ و ہیل پر فوٹی تھا۔ وہ سب تھوڑے بہت مٹی میں  
تسڑے ہوئے تھے۔ ان کے بالوں اور کپڑوں میں کیسی کیسی گھاس  
پھوس، ٹنگے اور پتے پیچھے ہوئے تھے لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان  
ہوا کہ ان میں سے کوئی معمولی ڈنڈی بھی نہیں تھا۔

”اگرچہ مشکل تو ثابت نہیں ہوا؟“ میں نے فوٹی کا کندھا  
تھپکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں سر! یہ تو بالکل آسان ڈکار تھے۔“ فوٹی بولا ”یہ لوگ  
اصل میں اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ یہ جنگل کے بادشاہ ہیں  
اور کوئی دوسرا جنگل کا بھیدی ہو ہی نہیں سکتا۔“  
”ان کی خوش فہمی ایک لحاظ سے بجا ہوتی ہے۔“ میں نے کہا  
”اگر پولیس کبھی انتہائی مجبور ہو کر کسی وجہ سے ان کے خلاف  
آپریشن پر کمر باندھ بھی لے تو وہ بے چاری ایسے ہی جنگلوں میں  
ٹانک ٹوئیاں مارتی رہ جاتی ہے۔“

مسعود مسکراتے ہوئے بولا ”سر! ویسے بھی ان کا حساب تو کچھ  
یوں ہوتا ہے کہ پانچ ڈاکوؤں کے لئے پانچ سو پولیس والے روانہ  
ہوتے ہیں اور میٹوں پہلے سے منصوبہ بنایا ہوتا ہے۔ اخباروں  
میں بڑی بڑی خبریں چھپنا شروع ہو جاتی ہیں کہ ڈاکوؤں کے خلاف  
آپریشن شروع ہونے والا ہے۔ یہ گویا ڈاکوؤں کو خبردار کرنے کا  
بندوبست ہوتا ہے کہ برادران! کہیں ادھر ادھر نکل جائیں... اپنی  
خفاقت کا بندوبست کر لیتے، ہم آتے دالے ہیں۔“

”اگر اخباروں میں خبریں نہ چھپیں تو پولیس میں موبودان کے  
بحری انہیں خبردار کر دیتے ہیں اور اسے ڈاکو نہیں مارتے جتنے بے  
چارے پولیس والوں کی لاشیں واپس آتی ہیں۔“ منیر نے اپنی  
رائے سنل سیٹ کے نیچے کھکاتے ہوئے کہا۔

”سر! ایک آدھ ڈاکو تو ہم سے بھی بچ کر نکل گیا ہے۔“  
سلیمان نے بڑے افسوس سے اطلاع دی ”ایک ساڈ گور کرنے  
سے رو گئی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک آدمی اور دو ٹاؤتے۔“

”منیر۔ کوئی بات نہیں۔ اس کا افسوس مت کرو۔“ میں نے  
اسے قہر دی ”ڈاکوؤں کے سر سرتوں کو صحیح طور پر اطلاع دینے  
والا بھی تو کوئی ہونا چاہئے کہ ان پر کیا گزری۔ انہیں صرف لاشیں  
ی نہ جمع کرنی ہیں۔ ایک آدھ آدمی زندہ بھی واپس آجائے تو کوئی  
حرج نہیں۔ ویسے بھی ہمارا تو یہ پروگرام ہی نہیں تھا۔ میں نے تو  
احتیاطاً تم لوگوں کو یہاں آنے کی ہدایت کر دی تھی اور تیار تھا کہ

کئی حالات میں کیا گیا ہے۔ یہ ڈاکوؤں کا شکار تو ہمیں ہونا  
ہو گیا۔“

پھر میں نے فوٹی کی طرف دیکھا۔ ابھی تک فوٹی میں  
شروع نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ لوگ ابھی تک سنبھل نہیں  
تھے۔ جہاں جہاں بندھے تھے وہاں سے ابھی نکل نہیں سکے تھے۔  
نے فوٹی سے کہا ”صبح کا جالا پھیلنے والا ہے۔ تم لوگ نکل جاؤ۔  
.... قصبے سے ہوتا ہوا آؤں گا۔ میں ذرا اپنے بچپن کے ایک  
دوست سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک بار پہلے بھی یہاں آیا تھا تو اس  
طرف جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔“

فوٹی نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور گے بھیر  
سکا ”سر! یہ کوئی موقع ہے بچپن کے دوست سے ملنے جانے کا؟“  
خفرو ملا نہیں۔ ملک ریاض کے پاس اور بھی بہت سے آدمی  
گئے۔ اب آپ کا کیلے زیادہ دیر اس علاقے میں موجود رہنا  
نہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی نکل چلئے۔“

”ملک ریاض اور اس کے آدمیوں کو تو ابھی لاشیں جمع کر  
اور اس جنگل سے سنبھلنے کے لئے کافی وقت درکار ہو گا۔ تب تک  
میں بھی تم لوگوں کے پیچھے آ جاؤں گا۔ ویسے بھی ان لوگوں کو  
وقت جو سبق مل چکا ہے اس کے بعد وہ مجھ اکیلے پر بھی ہاتھ ڈال  
ہوئے ایک لمحے کے لئے ضرور سوچیں گے۔“ میں نے مسکرا  
ہوئے کہا ”ویسے بھی یہ علاقہ صرف ملک ریاض کا ہی نہیں  
بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہاں میری کوئی حویلی نہیں ہے۔“

## غیر ملکی زبانیں سیکھئے مصنف: پروفیسر ایم اشرف

کورین اردو ریڈر 80/-

ر شین اردو ریڈر 80/-

ر شین فرہنگ 75/-

چائنز اردو ریڈر 80/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

پاسکا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجھ جیسا آدمی جو شر کے جھیلوں میں اور اتنے بہت سے کاموں کے ساتھ کسی نہ کسی بد خواہ کی کھینچا تانی میں بھی پھنسا رہا تھا، اس قسم کے کاموں کے لئے صرف سوچنا ہی رہتا تھا۔ ان کے لئے کبھی وقت نہیں نکال سکتا تھا۔ اس قسم کے کام اگر ہو سکتے تھے تو اس اچانک ہی ہو سکتے تھے۔

اس وقت کو کہ اعصاب ذرا منتشر تھے۔ ذہن کچھ الجھا ہوا تھا۔ میں جلدی سی خوربری اور موت و زندگی کی چند لمبے کی نکلتش سے گزر کر آ رہا تھا لیکن ریاض احمد عرف راجو کا خیال اچانک ہی ذہن میں آ گیا تھا اور دل اس سے ملنے کو بے چین ہو گیا تھا۔ وہ میرے بچپن کا وہ دوست تھا جس کے ساتھ کچھ بچے کچھ سینا ہاڑ میں زندگی کی آدھیں ٹھیس دیکھی تھیں، آنکھوں میں معصوم خواب سجائے تھے اور نہر کے کنارے شو شگر کی تھیں۔

گلی کو بڑے ذرا بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ بہت سی چیزیں بہت سی نشانیوں خود میرے ذہن سے غائب ہو گئی تھیں۔ ایک بار پہلے بھی مجھے ذرا سی دیر کے لئے یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن وہ بات بھی خاصی پرانی ہو چکی تھی۔ اس وقت میں ریاض احمد عرف راجو سے ملنے نہیں جاسکا تھا جس کا مجھے برا افسوس تھا۔

بڑی مشکل سے میں نے وہ گلی تلاش کی جس میں راجو کا گھر تھا۔ میں کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے خود سے شرم آ رہی تھی۔ انسان جہاں پیدا ہوا ہو، پلا بڑھا ہو، جہاں کے ڈرے ڈرے میں ایک مٹلس کی یادوں کا خزانہ بکھرا پڑا ہو کم از کم وہاں تو اسے کسی سے رات پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی چاہئے تھی۔

آخر کار میں اس گلی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی کیا جس میں راجو کا گھر تھا۔ وہ بھی دوسری بہت سی گلیوں کی طرح ایک تنگ اور ناموار گلی تھی۔ بچپن میں یہی گلیاں بہت کشادہ اور کھلی کھلی گلی تھیں۔ گاڑی بمشکل اس گلی میں داخل ہوئی۔ دو تین تنگ و حڑنگ سے بچے بھی پیچھے لگ گئے جو نہ جانے علی الصبح کید کر گھروں سے نکل آئے تھے۔

راجو کا مکان پچان کر میں نے اس کے سامنے گاڑی روکی۔ گلی میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ راجو کا مکان بھی جوں کا توں تھا۔ وہی اینٹوں کی دیوار، وہی ٹاٹ کا پردہ، وہی صحن سے جھانکا ہوا شہوت کا درخت، وہی دروازے پر بیٹھا ہوا کالے رنگ کا کٹنہ۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ پہلے یہاں بیٹھا ہوا کٹنہ کھنٹی رنگ کا ہوا کرتا تھا۔ چلو کم از کم اتنی تبدیلی تو آئی تھی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا کوئی خواب چند لمبے کے لئے ٹوٹ گیا تھا۔ چند لمبے بعد خواب کا سلسلہ جڑ گیا تھا۔ میں پھر اسی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ گزرے ہوئے ماہ و سال گویا میرے ذہن سے غائب ہو گئے تھے۔ ایک ٹائے کے لئے تو مجھے یہ گمان بھی گزرا کہ میں جس گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا وہ شاید میری اپنی نہیں تھی۔ میرے جسم پر موجود سوٹ بھی میرا اپنا نہیں تھا۔ میں تو درحقیقت ایک انٹلی کی

مانڈا نہیں ہے لیکن میرا بچپن تو یہاں گزرا ہے۔ یہاں کے کوچہ و بازار پر میرا بھی حق ہے، ان سے میری بھی کچھ آشنائی ہے۔ "سرا! اب میں کیا کروں؟" ٹوٹی بھی مٹکرا دیا "آپ مرضی کے ایک ہیں۔ میں تو آپ کو یہ نصیحت بھی نہیں کر سکتا کہ ہوشیار رہنے کا۔ کیونکہ ہوشیار رہنا تو خود ہم نے آپ سے سیکھا ہے۔ بہر حال آپ اب بازت دیں تو میں آپ کے پیچھے پیچھے رہوں؟"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کا کدھا تھپکے ہوئے کہا "جہاں تم لوگوں کی ضرورت تھی وہاں تم نے اپنا کام میری سے انجام دے دیا۔ اب تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔"

بچ اور سفید کارڈ وصول اڑائی، آگے پیچھے جڑی سے روانہ ہو گئی۔ اپنی گاڑی کی طرف جانے سے پہلے میں نے اوپر چھت کی طرف دیکھا۔ ملک ریاض اور عالم شیر دیوار کے عقب سے سر ٹالے پیچھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی مٹن وغیرہ ہوتی تو وہ ضرور ہم پر ناز کر چکے ہوتے۔ وہ نیچے بھی نہیں آ سکتے تھے کیونکہ بلڑیوں کا دواؤہ بند تھا اور ان کے بچے کچھ آدی پیچھے کسین بند تھے۔ نوردا جھگی خون میں لت پت ایک طرف بے ہوش پڑا تھا۔ ملک ریاض اور عالم شیر نے مجھے اوپر کی طرف متوجہ پا کر بلدی سے سردیوار کے پیچھے کر لئے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں ان پر گولی چلاؤں گا۔ میں نے قدرے بلند آواز سے کہا "متو! اگر تمہارا بھی قصہ پاک کرنا ہو تو اسی وقت نہ کر دیتا جب میں اوپر تھا۔ یہ میں نہیں ایک موقع دے کر جا رہا ہوں۔ اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ آئندہ پگا لوگ تو جان بخشی نہیں ہوگی۔"

انہوں نے میری آواز تو پیشانی ہی ہو گئی لیکن دیوار کے عقب سے سر نہیں نکالا۔ میں حویلی کی بھٹی دیوار کی طرف آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور قہیے کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات اس میدان میں زندگی کے بنگارے جو اب تھے اور صبح اجل کا نانا جھیل چکا تھا۔ انسان کی زندگی کو بوجھ قماشیا بنے رکھتا ہے۔

قہیے کے قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں توڑی بہت تھوڑی تھی لیکن ایسی کوئی نمایاں تبدیلی بہر حال نہیں آئی تھی۔ وہاں کو گھسی ہوئی مٹی کی گلیاں تھیں۔ وہی آواہ گئے اور وہی شہر بنے نکلتے۔

گھٹیل میں اڑاؤ کا افراد کی آمد رفت شروع ہو چکی تھی اور وہ گزرتے ہی گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جن گلیوں کے آرام میں میری گاڑی کی وجہ سے خلل پڑا تھا انہوں نے بھونکنا شروع کیا تھا۔ ایک آنکھ تو مجھ کو دیکھ کر گاڑی کے پیچھے دوڑا بھی آیا۔

ٹوٹی نے درست ہی کہا تھا میں نے اپنے بچپن کے دوست سے ملنے کے لئے عجیب سی وقت کا انتخاب کیا تھا۔ میری گاڑی ہی نہیں، بلکہ سوٹ بھی مٹن کی لتھڑا ہوا تھا لیکن توڑی سی جھاڑ پونجھ کے بعد یہ طرہ بھی کم از کم ایک قہیے کے لئے تو خاصا سبز زانہ ہی قرار

شمار قیس پتے انہی گلیوں میں بھٹکتے والوں اور مسالہ کا تھا۔  
راجو کے دروازے پر بیٹھا ہوا کالا کتا جذب سے انداز میں بھٹکتے لگا۔ میں نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے لوہے کی گندی سے دروازہ کھٹکایا اور اپنے لباس سے گرد بھانڈ کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

اُڑے اُڑے سے چہرے والی ایک پست قد عورت چنی کر بیمار سی عورت نے مات کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور ہاتھوں کی نیس غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی تھیں۔ نعل میں چڑے ہوئے بال سختی سے سر پر تھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی ایک چچی یاد آئیں۔ جوانی۔ یا یوں کہنے کہ ذہنی جوانی میں وہ کچھ ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ میرے چچا کا کنبہ بھی یہاں سے ذکر سکونت کر کے نہ جانے کہاں جا چکا تھا۔ مجھے آج تک ان کا سراغ نہیں ملا تھا۔

عورت نے مجھ سے پہلے دروازے پر کھڑی ہوئی جہازی ساڑھی کی گاڑی کو دیکھا پھر میرا سراپا جائزہ لیتے ہوئے دو بار دست کر کے حتی الامکان مہذبانہ لہجے میں بولی "تی۔۔۔ آپ کون ہیں؟" اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف تھا۔ نہ جانے کیوں!

"میں راجو کا بچپن کا دوست ہوں افضل۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں اس سے ملنے آیا ہوں لاہور سے۔"

عورت کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے ہلچل سے چلی۔ اداسی کا سمندر حلاطم سا ہوا۔ ہونٹ تھر تھرائے اور وہ کرپا حلق میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نکلتے ہوئے بولی "ایک منٹ ٹھہریے۔"

وہ اگلے قدموں غالباً دوڑ کر اندر گئی۔ بظاہر مکان سکوت میں ہی ڈوبا رہا مگر مجھے یوں لگا جیسے اندر ایک خاموش بمونچال سا آہٹیا تھا۔ چند لمحے بعد ایک باریش بزدل گرتے پڑتے باہر آتے دکھائی دئے۔ وہ اتنے متر نہیں تھے لیکن ان کی کرچک چلی تھی۔ وہ بیک وقت واسٹ کے جن بھی بند کر رہے تھے اور گھڑی بھی درست کر رہے تھے۔ غلط میں انہوں نے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بھی بڑھا دیا اور اس کو شش میں دو چوکت سے الجھ کر کرتے کرتے بیٹھے۔

وہ بہت کمزور تھے۔ آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ نظر خاصی کمزور معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے سیدھے ہو کر بلکہ بچوں کے بل کھڑے ہو کر انتہائی قریب سے میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پھر آنکھیں میکڑے ہوئے بولے "کون ہو میاں تم! میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔"

میں نے خود بھی امیں نہیں پہچانا تھا لیکن آواز سن کر پہچان گیا۔ آواز اب بھی خاصی کراہی تھی۔ وہ راجو کے والد تھے۔ جب تک میں نے انہیں دیکھا تھا انہوں نے داڑھی نہیں رکھی تھی نہ ہی اس وقت وہ سر پہ گھڑی رکھتے تھے۔ اتنے کمزور بھی نہیں

"چاچا! میں افضل ہوں۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں بتا دیا۔  
"کون افضل؟" انہوں نے آنکھیں میکڑیں۔ ان کی عین پریشانی پر شکایتیں کچھ اور بڑھ گئیں۔

"افضل۔۔۔ جی وہ راجو کا دوست۔ چوہدری اجمل کا بیٹا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنی شناخت کراؤں۔ انہوں نے ایک لمحے ذہن پر زور دیا پھر ان کی دھندلائی آنکھوں میں یکدم چمک سی آگئی اور وہ مجھے سینے سے لگائے۔ کوشش کرتے ہوئے بولے "اوتے۔۔۔ اوتے۔۔۔ اب پہچان۔۔۔ تم وہ ایتھے کے پتر تھے ہو۔"

مجھے اب یہ اتنے اور نچے والی عزت کچھ زیادہ اچھی نہیں لیکن جس انداز سے انہوں نے مجھے سینے سے لگنے کی کوشش تھی اور جو چمک ان کی آنکھوں میں ابھری تھی وہ بہت جلدی ان کے سینے سے لگنے کے لئے مجھے بہت زیادہ جھکا پڑا۔

"بھئی میں کیسے پہچانتا" وہ معذرت خواہانہ سے انداز بولے "میں بدل گئے ہو تم کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھیں۔۔۔ آؤ پتر! اندر آ جاؤ۔ تمہیں بھلا اس گھر کا دروازہ کھٹکائے ضرورت تھی؟ سیدھے اندر آ جاتے۔"

"چاچا! آپ نے تو پہچاننا ہی نہیں تھا۔ سب سے پہلے تم ہی جوتی اٹھا کر سمجھ مانی تھی کہ یہ کون کدوا نہ اٹھائے گا۔"

## ہٹلر کی حیاتِ عاشقہ

☆ ---- پروفیسر ایم اشرف

ہٹلر کے عاشقوں کی مکمل تفصیل

اس کی ذاتی زندگی کے متعلق

ایک دلچسپ کتاب ----

جو اس سے پہلے شائع نہیں ہوئی۔

قیمت: 75/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

”میں نے کہا۔

”ہاں پتہ! یہ بھی ٹھیک کام تھے۔“ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جانے سے پہلے ایک سانولے سے بچے کو ڈانٹ پلائی جو بچے پائس تھا اور گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا ”اوائے۔۔۔ اوائے کھوٹے کے پتہ زندگی میں توڑی بہت تیز بھی سیکھ لے۔ آخر یہ تا بے پڑے باپ کی بے ہوئی اولاد۔“ وہ اسے ہاتھ رسید کرنے کی ادا کا دی کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

لا کاؤرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر نیچے اتر گیا لیکن مجھے معلوم تھا اس کا یہ اقدام عارضی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اندر جاتے ہی نہ صرف وہ بلکہ اس کے دو ساتھی بھی گاڑی پر چڑھ جائیں گے جو لال لال ایک طرف کو کھڑے تھے اور بظاہر مصوم بنے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں راجو کے والد چوہدری فیاض کے ساتھ اندر پہنچا تو کئی بچوں کو خوفزدہ سے انداز میں ایک کمرے کے کھلے دروازے سے بھاگتے پایا۔ اس کمرے کے قریب ایک چھوٹی سی کونٹری میں وہی عورت بیٹھی تھیں جہاں جلا رہی تھی جو دروازے پر آئی تھی۔ جس کونٹری میں وہ بیٹھی تھی وہ ان کا بچن تھا۔ اس میں دروازہ نہیں تھا۔ بچن میں جب میں اس گھر میں آیا کرتا تھا تب بھی سب کچھ اسی طرح تھا۔ یہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

راجو کے والد جنہیں ہم تیا فیاض اور منہ پر صرف بتایا کہا کرتے تھے میرے لئے سخن میں بڑی ہوئی ایک چارباکی پر چاور بچائے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ارتعاش تھا۔ بچن میں ان کی سوزوگی میں ہمیں گھر میں گھسنے کی جرأت ذرا کم ہی ہوتی تھی۔ اب ان کے لئے تیا کا لقب بھی میضی زبان کو نامانوس سا لگ رہا تھا۔ میں نے انہیں چاہا ہی کہہ کر مخاطب کرنا جاری رکھا۔

”چاہا! راجو کہاں ہے؟“ میں نے پوچھتے ہوئے پوچھا ”میں غائب طور پر اس سے لٹنے لاہور سے آیا ہوں۔“ میں نے تھوڑا سا تبصرت ہوا۔

”تھا تو ہوں پتہ! جانا ہوں۔“ پہلے کوئی چائے پانی تو پی لے۔“ ان کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی آئی ”فردوس! ذرا میرا حق تو پکڑا۔“

بچن میں بیٹھی ہوئی وہی عورت دوپٹا چہرے کے گرد لپیٹے آئی۔ چوہدری نظروں سے میری طرف دیکھا اور حق رکھ کر ملی گئی۔ بچن میں جاگدہ مٹھنی سے انداز میں کام میں بھٹ گئی۔

”یہ عورت کون ہے چاہا؟“ میں نے ازراہ تجسس پوچھا۔ ”تم نے پہچانا نہیں؟ یہ راجو کی بد نصیب بیوی ہے فردوس۔“ چاہا فیاض نے تو بھر کر کہا۔ مجھے یاد تھا کہ ہم جب بیڑک میں تھے مگر راجو کی شادی ہو چکی تھی۔ اور اس نے باپ کی کریانے کی دکان پر بیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے ہی اس کا دوستوں کے ساتھ دوستی بھانا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ جب وہ خود میری نہیں تھا تو

اسے زیادہ آزادی حاصل تھی۔ ہم اکثر دو چتر فلم دیکھنے چلے جایا کرتے تھے۔ آوارہ گردی بھی کرتے رہتے تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تھی تو وہ توڑی بہت دیر کے لئے باپ کی دکان پر بیٹھ کر دو چار روپے چرا بھی لایا کرتا تھا جس سے فلم دیکھی جاتی تھی اور دوسری عیاشیاں کی جاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی شادی ہو گئی اور باپ نے دکان اس کے سپرد کر دی تب یہ سلسلے ختم ہو گئے تھے۔

شادی کے وقت یا اس کے بعد میں نے کبھی اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ آج دلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ بیوی کم اور بیوہ زیادہ لگ رہی تھی۔ اوپر سے چاہا فیاض نے بے نصیب کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ میرا ہاتھ ٹھکا۔

”خیریت تو ہے چاہا۔ کیا ہوا راجو کو؟ آپ مجھے جلدی سے بتائیں۔ میں اس سے لٹنے کا بڑا ارمان لے کر آیا ہوں۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”ہو نہ کیا تھا پتہ! از میںوں اور بے شرموں کو کچھ نہیں ہوا کرتا۔“ ان کی وجہ سے تو فردوس کو بی بی لگ جاتی ہے۔“ چاہا فیاض تھے کاش لے کر کھانٹے ہوئے بولے ”دو سال ہو چکے ہیں وہ بد بخت اسے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔“ ”بھاگ گیا ہے؟ کہاں بھاگ گیا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ تو ہمیں نہیں معلوم سننے میں یہی آیا ہے کہ لاہور چلا گیا تھا۔ کسی نے لاہور میں کبیس دور سے ایک مرتبہ اس کی جھلک بھی دیکھی تھی لیکن جا کر اس سے لٹنے کا موقع نہیں مل سکا۔ دو سال سے ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں کہ کہاں ہے کس حال میں ہے۔ بے بدینا کتہا سخت دل کیسا لٹوٹا چشم نکلا۔ ایسا کہ مگر کراپنے بیوی بچوں کو بھی دیکھنے نہیں آیا۔“ چاہا فیاض گڑا رو رہے کو تھے۔

حقے کا ایک اور کش لے کر بڑے ”تم اس کے دوست ہو تمہارے دل میں بھی اس کی ہوک اٹھی تو لٹنے چلے آئے لیکن اسے دیکھو۔ ذلیل کو کبھی اپنے کسی بچے کی بھی یاد نہیں آئی۔“ ان کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ فردوس جو بچن میں ہماری طرف ہی منہ کئے بیٹھی تھی جلدی سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

”آخر اس طرح کیوں بھاگ گیا وہ؟“ میں نے الجھن سے۔

پوچھا۔ ”دیکھا تھا پتہ! کچھ نہیں کہا جا سکا کہ کب کسی انسان کے سر میں کیا سودا سا جائے۔ شروع کے دو چار سال تو شادی کے بعد ذرا آرام سے گزر گئے تھے۔ ہنی (دکان) پر بھی جا کر بیٹھا تھا۔ پھر جو اس نے کڑا کر شروع کی تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ بد بختی چلی گئی۔ ہر وقت ہر ایک کے ساتھ لڑتا تھا۔ کتا تھا اتنی کم عمری میں شادی کر کے تم لوگوں نے میری قسمت بھڑی۔ پیسے کی طرف سے ہاتھ بڑا تنگ رہتا تھا۔ گھر والوں پر غصہ لگتا تھا۔ ویسے بیوی سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا مگر بچے و حوا و حو ہوتے جا رہے تھے۔“

میں نے بے دھانی سے بچوں کو پار کیا۔ وہ ایک ایک کر کے کرے میں وہاں چلے گئے۔ کچھ خاموش خاموش سے بچے تھے کم از کم اس وقت تو عام مظلوم الحال دیہاتی بچوں کی طرح بد تمیز اور اکھڑ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

اس دوران فردوس نے لکڑی کی ایک پرانی سی تپائی لا کر سامنے رکھی اور اس پر ناشتا کھاوا۔ گرم گرم پراٹھے تھے جن سے ویسی کھجی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ دیہی اور اجار تھا۔ سالن عانا رات کا بچا ہوا تھا جو وہ گرم کر کے لائی تھی۔ کسی بھی تھی۔

وہ تقریباً سرگوشی نما لہجے میں بولی "اگر آپ جائے چنا پیند کریں تو وہ بھی ملے آؤں" میں نے بتائی ہے۔ "مٹی کے تیل کے چرلے پر اس نے انہی چیزیں تیار کرنے میں بڑی بھرتی دکھائی تھی۔

"لے آئیں" جو کچھ بھی ہے لے آئیں۔ میں سب کچھ چٹ کر جاؤں گا۔" میں نے ذرا بھی تکلف سے کام لئے بغیر کہا۔ فردوس کے خشک اور چٹے چٹے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رشت نمودار ہونے لگی تھی مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ مسکراہٹ کو شاید اس نے اپنے لئے شجر منوہ بنالیا تھا۔ نام اس کا فردوس تھا مگر زندگی شاید اسے جنم محسوس ہوتی ہو۔

چاچا فیاض کھانسی آمیز غصے کے ساتھ بولے "تجے۔۔۔ میرا مطلب ہے افضل! تیرا انداز ذی چھین والا ہے۔ باہر سے تو آتا بدل گیا ہے لیکن لگتا ہے اندر سے بالکل نہیں بدلا۔"

چاچا فیاض شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں زندگی اور

میں نے محسوس کیا کہ فردوس بہن میں کچھ اور دوک مچی تھی۔

"پورے دس بچے ہیں ماشاء اللہ اس کے۔" چاچا فیاض نے بات جاری رکھتے ہوئے بتایا "سب سے چھوٹا والا تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا جب راجو بد بخت گھر سے بھاگا تھا۔ اس بے چارے نے تو پاپ کی شکل بھی نہیں دیکھی۔" چاچا فیاض کی آواز کچھ اور بھرا گئی۔ انہوں نے جلدی سے تجے میں پناہ تلاش کی۔

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ چند لمبے حقہ کڑکڑانے کے بعد انہوں نے سنبھل کر سلسلہ کلام جوڑا "ہم نے اس کے ساتھ کیا برائی کی تھی؟ اس کا بھلائی سوچا تھا۔ اس کی شادی ہی کی تھی" اسے عرقید کی سزا تو نہیں دی تھی۔ بچا بے معصوم بچوں کا کیا قصور تھا جو کینہ نہ کر ان کی شکل بھی نہیں دیکھا؟" یہ سوال کرتے ہوئے ان کا لہجہ کچھ ایسا جارحانہ ہو گیا جیسے وہ اس لہجے میں مجھے بھی برابر کا شریک سمجھتے ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے لہجے میں ملاحت لوٹ آئی۔

انہوں نے کرے کی طرف منہ کر کے پلو، پلو، دنگو، دنگو اور اسی قسم کے دوسرے نہ جانے کیا کیا نام لے کر آوازیں دیا شروع کیں۔ اس کرے سے مجھے کچھ بچپانے بچے لکھنا شروع ہوئے اور نکتے ہی چلے گئے۔ بڑے بچے چھوٹے بچوں کا ہاتھ پکڑے انہیں تقریباً کچھتے ہوئے لا رہے تھے۔ واقعی پورے دس بچے تھے کسی کے پاؤں میں پھل نہیں تھی، کسی کے تن پر قمیص نہیں تھی۔ کسی کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں، کسی کی ناک بہہ رہی تھی۔

"چاچا کو سلام کر میرا چاند!" چاچا فیاض باری باری سب کو ایسا بلا کر فرمائش کر رہا تھا کہ وہ مجھے سلام کرے۔ کسی نے سلام کیا، کسی نے نہیں کیا۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ میں اس گھر کو دیکھ رہا تھا، راجو کی پیڑہ نما بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ ان بچوں کو دیکھ رہا تھا اور میرا ذہن لڑکھن کے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔

راجو بھی تقریباً میرے ہی جیسے خواب دیکھنے والا لڑکا ہوا کرتا تھا بلکہ اس کے خواب تو مجھ سے بھی اونچے تھے۔ میں تو بعض معاملات میں قاعدت پسندی سے سوچ بھی لیتا تھا۔ وہ قاعدت پسندی کے نزدیک بھی پھٹکا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس وقت ہم اپنے زمانے کی حسین ترین، ہیروئینوں کے ساتھ شادی کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اس وقت ان بے روپ ہمارے ذہنوں میں ہوا کرتے تھے جو اسکرین پر نظر آتے تھے۔ ان کی اصل شکل صورت اور اصل روپ یا حقیقی زندگی کے بارے میں تو ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا۔

خواب اور چاہے جیسے بھی تھے لیکن اس گھر جیسے نہیں تھے۔ ایک طویل عرصے تک تو وہ خوابوں کی عکاسی کو سمجھ گیا تھا لیکن شاید روح کے ٹکڑوں میں تشقہ پھیل آرزوؤں اور سنگین حسرتوں کا ڈھواں کچھ زیادہ ہی بھر گیا تھا۔ شاید اس کا دم بھٹنے کا تھا۔ شاید اسے فرار کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

## شاہ فیصل شہید

☆ ---- پروفیسر ایم اشرف

شاہ فیصل شہید کے کارناموں اور ان کی ذاتی زندگی کے متعلق ایک دلچسپ کتاب ----

قیمت: -/50 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ہوت کی مس مقلع سے گزر کر آ رہا تھا۔ کچھ تو ویسے بھی کھائے  
تھے بہت دیر گزر چکی تھی اور کچھ اس قسم کی ہنگامہ خیزی سے  
گزرنے کے بعد میری جھوک بہت بڑھ جاتی تھی۔

فردوس چائے پینے چلی گئی۔ چاچا فیاض رازدارانہ سے انداز  
میں طرف جھٹکتے ہوئے بولے "پڑھتے...! لگتا ہے تم نے تو بہت  
تعلیمی کیا ہے۔ کیا کہیں ڈپٹی کمشنر وغیرہ لگ گیا ہے؟" وسات والوں  
کی سوچ ڈپٹی کمشنر سے آگے نہیں جاتی تھی۔ ان کے خیال میں ڈپٹی  
کمشنر بڑا شاہی کوئی آدمی ہوتا ہی نہیں تھا۔

مجھے بھی آگئی۔ میں نے ہاتھ دھوئے کے لئے صحن میں گئے  
ہوئے پتھر پپ کی طرف جاتے ہوئے کہا "نہیں چاچا! ڈپٹی تو  
میں نہیں لگ سکتا۔ سر حال کا دیوار ہے اپنا۔ کچھ کارخانے وغیرہ  
ہیں۔"

"کارخانے...؟" چاچا نے بے یقینی سے دہرایا۔ میں ہاتھ دھو  
کر واپس گیا تب بھی ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔  
میں ناشتے پر ٹوٹ پڑا تو وہ سنبھل کر میرے ساتھ شریک ہوتے  
ہوئے بولے "پڑھ لاہور جا کر کیا اللہ دین کا چراغ ہمارے ہاتھ لگ  
جایا تھا؟"

"نہیں چاچا! اللہ دین کا چراغ تو نہیں ملا تھا۔ بس قسمت نے  
پلا کھالیا تھا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "ویسے چاچا...!  
میرے خیال میں خوش قسمتی ہی کا دوسرا نام اللہ دین کا چراغ  
ہے۔"

"اے پڑھ! یہ بھی تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔" چاچا فیاض معذرتی  
سانس لے کر بولے "جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو آدمی جس چیز  
کو بھی ہاتھ لگاتا ہے وہی اللہ دین کا چراغ بن جاتا ہے اور جب  
قسمت مہربان نہ ہو تو اللہ دین کا چراغ بھی کوڑے کہاڑے میں چلا  
جاتا ہے۔"

بات چاچا فیاض کی سمجھ میں آگئی تھی۔ چند لمبے ہم دونوں  
غلامی سے ناشتے میں اچھے رہے۔ چاچا فیاض کے جذبہ جستجس نے  
ایک بار پھر سر اٹھارادہ میری طرف کو تدریے جھٹکتے ہوئے بولے  
"بچے بچے کتنے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں چاچا!" میں نے جواب دیا۔

"کیوں بھی... یہ کیا بات ہوئی؟" چاچا فیاض یکدم چڑچک کر  
اُسے انہیں گویا اس اطلاع سے ناقابل بیان صدمہ پہنچا تھا "شر  
میں تو بڑے بڑے قابل ڈاکٹر اور لیڈر ڈاکٹرس ہوتی ہیں۔ تم نے  
اپنی بیوی کو ان کے پاس لے کر جانا تھا... مشورہ کرنا تھا۔"

"یہی ہوئی تو نے کر جانا نا چاچا!" میں نے منہ چلاتے ہوئے  
غراب دیا "اگر وہ ہونے کا فی الحال ہی تو ایک سیدھا سادا سبب  
ہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔"

"شادی نہیں ہوئی؟" حیرت کے جھٹکے سے چاچا فیاض گویا  
کھانپائی سے گرتے گرتے بچے۔ ان کی دھندلائی ہوئی آنکھیں ایک

بار پھر بہت زیادہ پھیل گئیں۔ ان کے ذہن میں گویا ایسا کوئی تصور  
ہی نہیں تھا کہ کوئی جوان آدمی غیر شادی شدہ بھی ہو سکتا ہے۔

حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد انہوں نے جارحانہ سے  
لمبے میں پوچھا "کیوں نہیں کی اب تک شادی؟" میں نے محسوس کیا  
کہ ان کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں کچھ شک بھی جھلک آیا تھا۔  
"بس چاچا... فرصت ہی نہیں ملی اس طرف توجہ دینے کی۔"  
میری سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے اس جرم کا کیا معقول جواز پیش  
کر دوں۔

"فرصت...؟" چاچا نے ایک بار پھر آنکھیں نکالیں "فرصت  
کی اس میں کیا ضرورت ہوتی ہے؟ شادی بس شادی ہوتی ہے۔ وہ تو  
کئی ہوتی ہے۔ فرصت ہونہ ہو۔ ٹھیک ہے تم بہت مصروف ہو گے۔  
بہت بڑا کام دار ہو گا تمہارا۔ مگر دیکھو نا... شادیاں تو بڑے بڑے  
ملکوں کے مغلذ... بڑے بڑے جرنیل کرنل بھی کرتے آئے  
ہیں۔" وہ گویا مجھے قائل کرنے پر تل گئے تھے۔

"کئی تو ہے ہی شادی" مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔ "میں  
نے کہا "بس ذرا سوچنے سمجھنے کے لئے وقت مل جائے اور کوئی  
مطلب کی لڑائی مل جائے۔"

"پڑھ! شادی میں زیادہ سوچنا سمجھنا نہیں چاہئے۔ زیادہ  
باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اس میں بے قراری بننے کا کوئی فائدہ  
نہیں ہوتا۔" چاچا نے سمجھایا۔

"لیکن بالکل ہی سوچے سمجھے بغیر شادی کرنے کا بھی تو کوئی  
اجما اہتمام نہیں ہوتا۔" میں نے ایک نظر بکس میں بیٹھی فردوس اور  
کمرے سے جھانکتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

چاچا فیاض میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولے "یہ مت سمجھو کہ  
زیادہ سوچنا کر کے جو شادی کی جاتی ہے وہی کامیاب ہوتی ہے۔ یہ  
تو قسموں کے سووے ہوئے ہیں پڑھ! بس شادی نے کامیاب ہونا ہوتا  
ہے وہ ہر حال میں ہوتی ہے۔ چاہے وہ راہ چلے ہوئی ہو۔ جس کو  
کامیاب نہیں ہوتا وہ نہیں ہوتی۔ چاہے اس میں بچاس  
اشٹام پیپر لکھے گئے ہوں۔"

"میں آپ کی بات سے بالکل متفق ہوں چاچا۔" میں نے  
جلدی سے کہا "بس اب میں شادی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں  
گا۔"

"یہاں والوں کو اپنی شادی میں ضرور ملانا پڑا جو محبتیں پرانے  
لوگوں میں ہوتی ہیں وہ کہیں نہیں ملتیں۔" چاچا نے مشورہ دیا "تم  
بہت بڑے آدمی بن گئے ہو۔ شرمیں بڑے بڑے لوگ تمہارے بار  
دوست ہوں گے لیکن جو مزہ پڑانے دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے میں  
ہے وہ نئے دوستوں میں نہیں ہوتا۔"

"چاچا! اس بات کا مجھے پتا ہے تبھی تو راجہ سے ملنے آیا  
تھا۔" میں نے کہا۔ اس دوران فردوس نے چینی کے پیالوں میں  
چائے بھی سامنے لا رکھی۔ چائے بھی ٹنگ ساڑیالوں میں تھی۔

کر دیا ہے۔ ہاتھ بیکر کا بچے ہیں۔ سودا توں ہوں تو کھانا بچے کر بانا ہے۔ آنکھوں سے ٹھیک نظر نہیں آتا۔ شرارتی بچے کو کان سے چڑیں اٹھا اٹھا کے بھاگ جاتے ہیں۔ کھونٹے پیسے دے جاتے ہیں۔ لیکن خیر۔ دنیا اسی کا غم ہے۔ ایک طرف ایسے لوگ ہیں تو دوسری طرف بھلے لوگ بھی ہیں۔ ان کے ویلے سے اسی پرانی مٹی کے برائے سے رزق مدد کی چل رہی ہے پتھر اچھی یا منڈی۔ بہر حال گزر بسر ہو رہی ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ بچے بھی بھوکے نہیں سوئے۔ میں ناگاہ نکلا بڑھاسی، لیکن ان مصو میں پیٹ پالنے کے لئے اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ "چاچا فیاض کے لیے میں ویں تفکر دیتی تو کل قاجو آب پرانے لوگوں میں بھی کیا ہوتا جا رہا تھا۔

پھر اچانک کر دیا چاچا فیاض کو کچھ یاد آیا۔ وہ چمکتے ہوئے "جے۔۔۔ میرا مطلب ہے اصل اچھن میں تو تم مجھے آیا کر پکارا کرتے تھے۔ یہ اب میں چاچا کیوں ہو گیا؟" "چاچا! میں نے سوچا آپ کی تنہا دہلی چاہئے۔ آپ اب سے زیادہ جوان ہو گئے ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کو لایا۔ بجائے چاچا بنایا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں اب تان نہیں سکا کہ اب نہ جانے کیوں لفظ لایا زبان پر نہیں آتا تھا۔ چچا چاچا بڑی دہائی سے کہا جاتا تھا۔

"ہوگ میرے دروازے کے سامنے گاڑی کھڑی دیکھیں گے تو حیران ہوں گے کہ چوہدری فیاض سے ملنے کون آیا ہے۔ کسی کے وہم گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ چوہدری اجمل کا پوتا فضل آیا ہے۔ درنہ ابھی یہاں ملنے والوں کی بھیڑ لگ جائے" چاچا فیاض بولے۔

"نہیں چاچا! کسی کو پتا نہ ہو۔" میں نے گہرا کر کہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ چاچا فیاض درست کہہ رہا تھا۔ میں اس وقت لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے ملنے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے خلوس میں میرے لئے اب بھی کشش تھی۔ یہاں میرے ساتھ کسی نے کوئی ایسا اچھا سلوک نہیں کیا تھا جو میرے ذہن پر نقش رہتا۔ پھر بھی میں ان لوگوں کے بارے میں سوچتا تھا تو میرے دل کے آئین میں خوشبوی بچیل جاتی تھی۔

غیروں کا تو ذکر ہی کیا، مجھ سے تو میرے بچے چچا چچی نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن ان کی یاد آتی تو دل میں سکھ سی اٹھی۔ میں نے چاچا فیاض سے کہا "میں ایک مرتبہ اپنے چچا وغیرہ کو دیکھنے یہاں آیا تھا۔ ان کا کچھ پتا نہیں چلا تھا" آپ کو کچھ معلوم ہے وہ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

"وہ مکان چھ کر سیا کلوٹ گئے تھے۔ لیکن پھر سنا تھا کہ وہاں سے بھی کہیں چلے گئے تھے۔ نہ وہ کبھی لوٹ کر آئے اور نہ ہی ان کی کوئی خبر آئی۔" چاچا فیاض نے بتایا۔ اس سے پہلے بھی مجھے بس اتنی ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ میں پکارا پکار کر رہ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ قسمت میں ہوا تو شاید زندگی میں بھی ان لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔

چاچا فیاض دونوں ہاتھوں میں اپنے ہاتھوں کو لٹکاتے ہوئے بولے "میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرنا اور راز کو ضرور تلاش کرنا۔ وہ تو شاید تمہارے ہی شہر میں کہیں بنے خدا کے لئے اسے ضرور تلاش کرنا۔ اسے سمجھانا کہ جو اس مرد اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ نہیں کرتے۔"

"میں اسے ضرور تلاش کروں گا چاچا! اس کا دل بھی میٹھ کروں گا۔" میں نے چاچا فیاض کو تسلی دہی "ابھی تک اس کا دل بھی میٹھا نہیں ہے۔"

"اللہ تجھے اس نیک ہر دم سے جوڑے گا چچا۔" میں نے دین کے جواب کے ہوئے "ہرے تپوں میں ہی زندگی بھر رہی ہے۔" "چاچا فیاض نے مسرت سے منسوب سے منسوب مجھے میں کہا۔

"گزر اوقات کا ذکر نہ کیا ہے چاچا؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"وہی اپنی پرانی مٹی ہے پتھر اپنا رزق تو اسی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔" چاچا فیاض نے لفظی سانس لے کر کہا "راض بھاگ گیا تو دربارہ میں ہی وہاں بیٹھنے لگا لیکن اب دکانداری اور سودے سلہ لانا میرے بس کی بات نہیں رہی پتھر یا ریوں نے مجھے کھوکھلا

ہمارا راجہ رنجیت سنگھ

اور ان کی عیاشیاں

☆ --- پروفیسر ایم اشرف

ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کے متعلق تحریر

میں ایک مکمل حوالہ جاتی کتاب جو تار

کے لئے دلچسپی کا باعث بنے گی۔

قیمت : - 75/- روپے

مکتبہ القرآن اردو بازار لاہور 2

بولے "نہیں پڑا، تم دل چھو نہ کرو۔ میں سمجھا تھا تم ہم پر ترس کھا کر دے رہے ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں میں چاہتا ہوں ان بچوں کو ایسی کوئی چیز استعمال نہ کرنے دوں جو ان پر ترس کھاکر انہیں دی گئی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے چاچا! اور اگر دوست کو یا دوست کے بچوں کو مشکل میں دیکھ کر کوئی کچھ کرنا بھی ہے تو اسے اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے جس نظر سے آپ دیکھ رہے ہیں۔" میں نے شکوہ آمیز سے لبے میں کہا۔

"بس... بس پڑا میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ تم میری طرف سے اپنے دل میں میل نہ لاؤ۔" انہوں نے مجھے یار کیا۔ بچپن میں وہ مجھے بہت ڈانٹا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ راجو کو قتلوں کی لت میں لے نکالی ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

انہوں نے پہلے میں نے پوچھا "چاچا! آج کل علاقہ کس کے پاس ہے؟ سب سے بڑی زمینداری کس کی ہے؟"

"اور حری زیادہ زمینیں تو ملک ریاض کو مل گئی ہیں۔ اسی کا حکم چلا ہے علاقہ میں۔"

"کیسا آدی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"پڑا میرا تو زمینداری کا شکار ہے۔ کبھی کوئی واسطی نہیں رہا۔ ہمیں تو مظلوم ہے میں تو شروع سے ہی ڈکاندار چلا آ رہا ہوں۔" چاچا فیاض نے جواب دیا "کبھی ان کے کسی کارندے کا سامنا ہو جاتا ہے تو ہاتھ باندھ کر سلام کر دیتے ہیں۔ کبھی ان کے سامنے سر نہیں اٹھاتے۔ علاقے کے بادشاہ جو ہوتے لوگ بتاتے ہیں کہ اب تو ان کے ڈیروں پر ڈاکو نظر آتے ہیں۔ ملک کے اپنے آدی بھی بڑے سخت ہوئے اقرے ہیں۔ مرضی کے خلاف کوئی کام ہو چلے تو گھر کے گرجا باندھ دیتے ہیں۔ ہم تو ملک اسلام کو ہی برا سمجھتے تھے لیکن یہ تو اس سے بھی دس قدم ان کے مظلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں زمانہ تنہا کرتا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ظلم بھی تنہا کرتا رہا ہے۔"

"وہ اگلے انکیشن میں کھڑا ہوگا۔ کیا خیال ہے لوگ اسے ووٹ دیں گے؟" میں نے سرسری سے لبے میں پوچھا۔

چاچا فیاض مجھ سے انداز میں ہنس دئے لیکن فوراً ہی ان کی ہنسی کھانسی میں مدغم ہو گئی۔ کھانسی تھی تو وہ اپنے ہونے بولے "لوگوں بے چاروں کا کیا ہے پڑا یہ لوگ جب تیرے کہتے ہیں کہ ان کو جیتنا ہے... تو کبھی یہ جیت جاتے ہیں۔" انہوں نے گویا بات ختم کر دی۔

میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی جلدی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "کیا تم ایک رات بھی یہاں نہیں ٹھہرو گے؟"

"نہیں چاچا! حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں یہاں ٹھہر سکوں۔ اگر میں کچھ زیادہ دیر بھی ٹھہرا تو مجھے جس میں خیر پھیل جائے گی۔ ملنے

چاہا فیاض کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی لیکن وہ کہہ نہ سکا۔ ایسی جوانی اور کہاں کی جوانی پڑا جوانی سے ہی مجھے تو بتا رہا تھا کہ کیا چاروں ملک کتنی تھیں۔ اور ریاض کی ماں مری تو کوئی نہ تھی کہ نہ والا بھی نہیں رہا۔ اسی لئے ریاض کا ہر کام جلدی جلدی کیا تھا کہ زندگی کا کوئی محسوس نہیں۔ میری ذمے داریاں جلدی جلدی ہوتی تھیں۔ لیکن اب مجھے پتا چلا کہ ذمے داریاں تو میرے ہی سر پر ختم نہیں ہوتیں۔ اور زندگی کا بھی کچھ پتا نہیں ہوا کہ کتنی لمبی ہو جائے۔ کیسے کیسے صحت مند میرے سامنے چلے گئے۔ وہ بیمار بیمار آدمی ابھی تک بیٹھا ہوں۔"

"ایسی آپ بہت جلدی کے چاچا! اپنے ہونے پوتیوں کے گھر گزارتے دیکھیں گے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔" میں نے ان کی احتوائی انداز سے پرچھکی دی۔

میرے سامنے باہر اگر گاڑی سے اپنا برف کس نکلا۔ گلی میں اندر رفت شروع ہو چکی تھی۔ گزرتے ہوئے ہر شخص نے مجھے جس بلکہ شک زدہ سی نظروں سے دیکھا۔ وہاں اندر اگر میں نے چاچا فیاض کے پاس بیٹھے ہوئے برف کس کھولا اور ایک گڈی نکال کر ان کی طرف پڑھاتے ہوئے کہا "ان بچوں کے لئے میری طرف سے چھپس ہزار کی یہ تحیر سی رقم رکھ لیں۔ فی الحال میرے پاس زیادہ کیش نہیں بچا ورنہ کچھ زیادہ پیش کرتا۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ کچھ اور بھی جھجھکوں۔ یہ میرے دوست کے ہیں۔ میرے لگنویا یار کی اولاد ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ بچے بے مال میں نظر آئیں۔"

چاچا فیاض نے نوٹوں کی گڈی کی طرف اٹھ نہیں پڑھایا۔ ان نے عدالتی ہوئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے "بیٹا! میں نے تمہیں کچھ کر اپنے حالات سے آگاہ کیا ہے۔ میرا مقصد تم سے مدد مانگنا تھا۔ ہمارے لئے تو بس اتنی ہی خوش کافی ہے کہ اللہ نے تم پر بڑا آدمی بنادیا ہے۔"

"یہ میں مدد کے طور پر نہیں دے رہا چاچا! میں نے جلدی نہ کیا۔ اتنے برسوں بعد پہلی بار دوست کے گھر گیا ہوں اور خالی نہ آیا ہوں۔ بچوں کے لئے ملھائی تک نہیں لاسکا۔ کیا ان بچوں پر اتنا بھی حق نہیں کہ میں ان کے لئے اچھے کپڑے، کھلونے یا مٹرن کے دیگر تحائف لاسکوں؟ اگر میں وہ چیزیں لے کر آتا تو آپ راضی کر دیتے؟"

"بس۔" انہوں نے فی فی میں سر ہلایا۔

"میں تو ہر کچھ لے کر آتا ہوں لیکن مجھے ان کے لئے تجھے تحائف لانے کا پتہ نہیں مل سکا۔ دوسرے میں سیدھا گھر سے نہیں آ رہا ہوں۔ یہ لوگ کیا تھیں کہ کہاں کہاں سے دھکے کھاتا ہوا آ رہا ہوں۔ اس نے تجھوں کی جگہ نقد رقم دے رہا ہوں۔ آپ نے انکار کر کے میرا برا کیا ہے۔"

جب چاچا فیاض نے جلدی سے رقم لے لی اور گلو گھر آوازیں



والوں کا اتنا بندھ جائے گا اور میں اس کا تحمل نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن راجہ کو ضرور تلاش کرنا۔ اور اگر ذرا سی بھی کوئی خبر پڑے تو مجھے خبر کرنا۔ چاہے کوئی بندہ میرے پاس پہنچ نہ سکے۔ اگر وہ کوئی کاپڑ تمہارے سمجھانے سے بھی نہ کیجے تو بے شک اس کو تھوڑی بہت پھینٹی لگانا۔" انہوں نے گویا مجھے اجازت نامہ جاری کر دیا۔

"تپ بے فکر رہیں چاہا! میں نے انہیں تسلی دی۔ میں نے اسے دھوڑنے کا ارادہ کیا ہے تو کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔"

میں باہر آگیا۔ چاہا فیاض دماغ میں دئے جا رہے تھے۔ دن کا آبیلا کھیل چکا تھا۔ گلی میں اب خاصی آمدورفت نظر آ رہی تھی۔ اور اگر دھڑا کا دکان لوگ کڑے پٹا ہراتوں میں مصروف تھے۔ لیکن درحقیقت وہ تجسس سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ چند ایک گھروں سے ٹاٹ کے پردوں یا پتھوں کے پیچھے سے نسوانی ہتکھیں بھی بھاٹک رہی تھیں۔

غیبت تھا کہ ابھی کسی نے چاہا فیاض کے ہاں آکر ہاتھ جلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے ہاں کون آیا ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے جاتے ہی چاہا سوالات کرنے والوں کے زرنے میں ہوں گے اور جب چاہا انہیں بتائیں گے کہ ان کے ہاں آنے والا کون تھا تو ان سب کو شکایت ہوگی کہ میں ان سے مل کر کیوں نہیں گیا۔ یہ شکایت ان لوگوں کو بھی ہوگی جو مجھے جانتے تک نہیں تھے۔ جنہیں میرا نام تک یاد نہیں رہا ہوگا۔

گلیوں سے نکلنے کے بعد میں خاصی تیز رفتاری سے واپس روانہ ہوا۔ میں بالکل چوکنا تھا۔ کسی بھی موڑ پر کوئی بھی واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ لیکن خیریت ہی رہی۔ واپسی میں چونکہ مجھے ملک ریاض کی حویلی یا زمینوں کے قریب جانے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کسی سے سامنا نہ ہوا۔ شاید وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ میں ابھی تک قصبے میں موجود ہوں گا۔ لاہور تک کا سفر بغیر کسی خاص واسطے کے گزر گیا۔

دو برسے روز و رات سب سے پہلے میں دو نمبر یعنی اوائل ناؤن والی کوٹھی پر پہنچا۔ میں اسے نہ کوئی خبر فیرنا چاہتا تھا۔ سٹل گاؤڑ نے میرے لئے گیت کھولا اور کس ٹیپ نے ڈرائیو سے میں آکر میرا استقبال کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند اور تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ ابھی تو فراس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے گمان سا گزرتا تھا کہ اس عورت پر شاید کبھی بڑھاپا نہ آئے۔ وہ کچھ عجیب سی چیز تھی۔

"کیا حال ہے مریم؟ محبت کا؟" میں نے اسے سن کے بازے میں پوچھا۔

"خود ہی چل کر دیکھ لیجے۔" مس ٹیپ گہری خمیدگی سے بولی۔

"اس کی پیشانی پر ضرب کیا آپ نے لگائی تھی؟"

"نہیں۔ میرے ایک نئے عقیدت مند نے۔" میں نے ہوا دیا۔

"اوہ۔۔۔" اس نے قمیسی انداز میں سر ہلایا "میں بھی رہی تھی کہ اتنا ڈانڈی ہیں کس سے سرزد ہوا ہے؟"

"اس کی جگہ اگر میں ہوتا تب بھی شاید یہ اتنا ڈانڈی ہیں ہو جاتا۔" میں نے کہا "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنی فیرا ہے اس کا قابو میں آنا بڑا مشکل تھا۔"

میں اس کے ساتھ نیچے دھانے میں پہنچا۔ اسے سن چھوٹے سے کمرے میں صاف ستھرے بستر پر گاؤٹیکے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ناک کی جڑ تک اس کی پیشانی پر دو ہڈیاں بندھی تھیں۔ وہ ایک اخبار دیکھ رہا تھا۔ اخبار اس نے الٹا پکڑا ہوا تھا۔ بچوں کی طرح قلمکاروں مار رہا تھا۔

ہیں دیکھ کر اس کی قلمکاریاں ختم تھیں۔ وہ خالی خالی سے ایک ٹنگ ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اخبار اس کے ہاتھ چھوٹ کر گر گیا لیکن اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"ہیلو اے سن!" میں نے اس کے قریب جا کر مصافحہ لئے ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس کا چوکھٹم کے آڑ سے عاری تھا۔

"اے سن! کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟" میں نے پوچھا۔ چوہا اب بھی ہر تاثر سے عاری رہا۔ بس وہ طلق سے غاؤس کا سی بے معنی آواز نکال کر رہ گیا۔

"یہ اداکاری چھوڑو" میں نے طاعت سے کہا "میں ان کوئی خطرو نہیں۔ ہمیں معزز اور شریف آدمیوں کی طرح آرا بیچ کر صرف چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ گویا میری سن ہی نہیں رہا تھا اور اگر سن رہا تھا تو شاید الفاظ اس ناقابل فہم تھے۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا اور قہر ناکواری سے کہا "اے سن! تمہیں اس ایکٹنگ سے کوئی فائدہ ہوگا۔ زندگی یہیں پڑے پڑے گزر جائے گی۔"

تب اس کے چہرے پر پہلی بار کوئی تاثر ابھرا لیکن وہ ہی تھا جیسے دودھ پیتا بچہ کسی چیز سے ڈر گیا ہو۔ وہ سم کرکٹ طرف کو سمت گیا اور اس کے طلق سے غاؤس کاؤس کی زیادہ تیزی سے نکلے گئیں۔

مس ٹیپ نے غیر محسوس طور پر میرا ہاتھ دبا دیا۔ مل اشارہ پا کر اس کے ساتھ جا ہر اہل میں آگیا۔ کمرے کا خود گارے عقب میں بند ہو گیا۔ مس ٹیپ ٹھنڈی سانس لے رہی تھی اس کے ساتھ بہت مغزاری کیچکی ہوں اور لا کر چکا ہے ڈاکڑ نے کچھ میٹیشیں میاں لا کر اس کے ٹیٹ تھے۔ ہوش میں بھی اور بے ہوشی کی حالت میں بھی اسے اس کے کہ وہ اداکاری نہیں کر رہا۔ ڈاکڑ نے مجھے اضافی

پوچھا۔ میں نے مختصر اسے اسے غن کے بارے میں بتایا۔

ساری بات سن کر وہ تنبیہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی  
”اب اس کا کرنا کیا ہے؟“

”مجھے دو چار دن تو اسے بیس رکھو۔ علاج جاری رکھو۔ اس دوران میں کچھ سوچ کر بتاتا ہوں۔ لی الحال تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں نے تو بڑی امیدوں سے اسے پکڑ دیا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم ہونے کا لیکن یہ تو اتنا معیشت نکل رہی۔“  
میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور مس ٹرپ کو خدا حافظ کہہ کر دو فبرے رخصت ہو گیا۔

میرا وہ دن آفس میں بڑی مصروفیت میں گزرا۔ ذہن دوسرے معاملات میں بھی الجھا رہا۔ ملک راج اور عالم شیر کا تصور بار بار ذہن میں رنگ آتا تھا۔ میں اندازہ لگاتا چاہتا تھا کہ ان کی طرف سے کیا بدعمل سامنے آئے گا۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں یک وقت ممکن بھی نظر آ رہی تھیں اور ناممکن بھی۔ دوسری طرف اسے سن کا بھی خیال آئے جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں بھی میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ کچھ عجیب سی اتفاق تھا کہ جوں جوں میری کاروباری مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں توں توں غیر کاروباری الجھناؤں بھی بڑھتے جا رہے تھے۔

شام کو آفس سے اٹھنے میں مجھے خاصی دیر ہو گئی۔ وہاں سے سید حامد ملٹی پلا گیا۔ کچھ لوگوں کو میں نے بڑی ڈنر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ کھانے سے پہلے بہت سی باتیں ہوئی تھیں اس لئے میں ذرا جلدی پلا گیا تھا۔ وہ ایک خریدار پائل بھی تھے میں نے مدعو کیا ہوا تھا۔ اس سے بات چیت کا سیاق رسی اور ڈنر بھی بڑے خوشگوار ماحول میں شروع ہوا۔

اس وقت کھانے سے تقریباً سبھی نادم ہو چکے تھے جب ہیڈ وینٹر نے قریب آکر دھیمی آواز میں مجھے بتایا ”سرا! آپ کا فون ہے۔“

مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ ہوٹل میں مجھے فون کرنے کی ضرورت کے پیش آنکی تھی۔ کیا کوئی ایمر جنسی آن پڑی تھی؟ میں نے صافوں سے مصدقہ کی اور اٹھ کر ڈائمنگ ہال کے کاؤنٹر پر پہنچا۔ کاؤنٹر کلرک ریسیور تھا میرے انتظار میں کھڑا تھا۔

دوسری طرف اتفاق تھا۔ اس کی آواز سننے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی غیر معمولی بات تھی۔ تاہم وہ اپنے لہجہ کو حتی الامکان پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”سرا! اس وقت آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کو نہیں کیا ہے۔ بتا چکا کہ آپ کسی ڈنر کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ خبردار تاہم تھی میں نے سوچا جنسی جلدی آپ تک پہنچ جائے اچھا ہے۔“

”کیسی خبر؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔  
”سرا! سنا کہ اغوا کر لیا گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

چپے میں پر ایک طویل لپکھڑا۔ غلام جس کا یہ تھا کہ سر ہلکے والی چٹ لے اس کے ذہن کو شیر خوار کی کے دور میں پہنچا دیا ہے۔“

”وہ۔۔۔ یہ تو ساری محنت ہی ضائع ہو گئی۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”اس کے ٹھیک ہونے کی کوئی امید رکھی جاسکتی ہے؟“

”اس موضوع پر بھی ڈاکٹر نے مجھے ایک طویل لپکھڑا تھا۔“  
”مس ٹرپ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”اس کا کہنا تھا کہ انسانی ذہن قدرت کا ایک ایسا شاہکار ہے کہ سائنس اپنی تمام تر ترقی کے باوجود اس کے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں بنا سکتی۔ اس موضوع پر اس کے لپکھڑا کا خلاصہ یہ تھا کہ سال دو سال میں اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی آنے کی موبوم سی امید رکھی جاسکتی ہے ورنہ زیادہ امکان کیا ہے کہ یہ اب دوبارہ ذہنی طور پر اسی طرح اسی رفتار سے پروان چڑھے گا جس طرح کوئی دودھ پیتا بچہ پروان چڑھتا ہے۔“

”تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”وہ طویل لپکھڑے کے بعد میں بھی کافی حد تک ڈاکٹر سے متفق ہو گئی ہوں۔ وہ اپنے زخماں پر انگلی رکھتے ہوئے بولی ”ڈاکٹروں سے تو دیئے بھی متفق ہونا ہی پڑتا ہے۔ پھر خود مجھے بھی ایسی علامتیں دکھنا پڑیں۔ مثلاً یہ کچھ کھاسی نہیں رہا تھا۔ میں نے پونہ جی مل بھی کر لیا۔ ڈنر میں دودھ ڈال کر دیا تو مزے سے پی لیا۔ چیزوں کو پکڑنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ اگر بڑھاتا بھی ہے تو اندازاً واقعی بچوں والا ہوتا ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں۔ کھانے پینے کا انداز بچوں والا ہے لیکن خوراک کی طلب بچوں سے بھی زیادہ ہے اس لئے ہر ایک کھانے کے بعد اسے دو باشت لہا فیڈرں پڑتا ہے ورنہ غصے غصے کر کے روئے لگتا ہے۔ ہلکتا بھوکا کھلانے پڑے ہیں۔ اٹلے آلو کچل کر چھچھے سے کھلانے پڑے ہیں۔ لاکرے کام ہارٹ میڈنٹ کو سنبھالنے پڑے ہیں۔“

”وہ ایک اور کہ بھر کر بولی ”مجھے اپنے بچے پالنے کا تجربہ نہیں تھا۔ انہیں میرا شوہر پال رہا ہے لیکن لگتا ہے اگر یہ ضیثت خلقی بریل ری تو اسے پالنا کس میرے ہی ذمے پڑے۔“

”تمہارے اب تمہارا وقت اتنا بھی قانون نہیں کہ اسے ایسے لاہل میں ضائع کر لیا جائے۔“ میں نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا خدا صاف بتایا۔

”تو کیسے تو چننا بھی نہیں۔“ مس ٹرپ کراہ کر بولی ”جسٹری لیا ہوا ہے۔ کچھ چلا رہا ہے۔ کھلونے لاکر دے تو بدوا خوش ہوا۔“  
”اس ضیثت کی عمر پہلے ہی ڈیڑھ سو سال ہے۔ اب لگتا ہے کہ اس نے دوسرا جنم لے لیا ہے۔ اب کہیں نئے سرے سے نہ پیدا نہیں کر دے۔“ میں نے کہا۔

”تو ہے کون؟ کیا میں منظر ہے اس کا؟“ مس ٹرپ نے

پولیس افسر ڈھونڈ نکالے۔ میں نے خیال ظاہر کیا۔  
 ”اس پکڑ میں نہ جانے کس کس بے قصور کی بھی پھنسا  
 جائے گی۔“ اتفاق ہوا۔

”تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سراسر تو کوئی دھوکا  
 بھی نہیں لی تھی۔ نہ ہی آج کل اس کے ارد گرد کوئی بدستور  
 مشکوک لوگ منظرار ہے تھے۔ بلکہ سے ٹھوکی وجہ سے وہ بکرا  
 ضرور تھی۔ آرام کرنا چاہ رہی تھی لیکن پریشان یا خوفزدہ ہو کر  
 تھی۔“

”وہ تو مجھے بھی اندازہ ہے۔“ میں نے کہا ”پریشان یا خوف  
 ہوئی تو مجھے ضرور بتا دیتی ہوتی۔“

”آپ تو میں اور دوسرے کئی قلم ساز پریشان ہیں سراسر  
 متوحش لیجے میں ہوا۔“ اس کی توجہ وہ فہمیں تو اس وقت پڑا  
 ہیں اور چند سولہ مزید اس نے سائن کر رکھی ہیں جن کی کہ  
 خاص طور پر اسے سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ جن فہمیں تو  
 بھی تحلیل کے قریب ہیں جن میں وہ بہرہ ور ہے۔“

”آپ تو تم بھی خاصے کاروباری بن گئے ہو اتفاقاً؟“ میں  
 سنجیدگی سے کہا ”ستارہ کی زندگی اور عافیت کے بارے میں  
 سوچ رہے۔ اس کی مکمل فہمیں کے بارے میں سوچ رہے۔“  
 ”سرا جب سے میں نے یہ خبر سنی تب سے میں اس کا  
 اور عافیت کے بارے میں ہی فکر مند تھا۔“ وہ قدرے عوامت  
 ہوا ”لیکن چند لمبے پہلے ہی مجھے خیال آیا کہ پیش دراند کھٹے  
 آپ کی بدولت مجھے جوئی زندگی ملی ہے وہ ایک بار پھر آؤپر  
 ہے۔ اگر خدا انعامت ستارہ کو کچھ ہو گیا تو میں نے اپنے لئے  
 لئے جو کچھ کیا ہے وہ سب ملتی ملتی مل جائے گا۔ دوسرے پہلا  
 اور ڈائریکٹوز کی پریشانی کا بھی میں نے کچھ ہی دیر پہلے اندازہ  
 ہے۔ اس لئے اس نے بے اختیار ذکر کر بیٹھا۔“

”خیر۔ یہ بتاؤ جائے واردات سے پولیس کو کوئی سراغ  
 یا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں سرا“ اتفاقاً ایسی سے ہوا ”یعنی شاہدوں  
 گاڑیوں کے رنگ بھی صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکے۔ ان  
 تضار پایا جاتا ہے۔ میں خاصی دیر اس ایس ایچ او کے ساتھ ملا  
 جس کے علاقے کا یہ کیس ہے۔ اس وقت تک تو کوئی خاص  
 سامنے نہیں آئی تھی۔ بہر حال میں ان سے رابطہ رکھوں گا۔  
 ہی کوئی نئی بات سامنے آئی، آپ کو اطلاع دوں گا۔“

”ہاں اگر کوئی ذرا سا بھی سراغ سامنے آجائے تو میں  
 طور پر بھی کچھ تفتیش کرا سکتا ہوں۔ کچھ لوگوں کو اس کا  
 ہوں جو پولیس سے زیادہ جلدی دست سے کام لے سکتے ہیں۔  
 کرنے کے لئے کچھ تو سامنے ہونا چاہئے۔“ میں نے کہا۔  
 ”سراغ سامنے ہو یا نہ ہو، آپ اس سلسلے میں ضرور

”کب۔ کیسے۔ کہاں سے؟“ میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں  
 تاہم میں اپنا جبر سکون رکھنے میں کامیاب رہا۔

”سرا آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور اتفاق تھا کہ  
 اس کی دھڑکنیں بھی یکسر ہو گئیں۔ وہ جلدی گھر جا رہی تھی۔ شام  
 کو چار بجے کے قریب اسٹوڈیو سے رخصت ہو گئی تھی۔ بددعا  
 والے اسٹوڈیو میں شوٹنگ تھی اس کی۔ آپ کو معلوم ہے وہ سڑک  
 خاصی سنسان رہتی ہے۔ وہ اسٹوڈیو سے زیادہ دور نہیں جانے پائی  
 تھی جب اسے اغوا کر لیا گیا۔“

”کچھ نہیں چلا کون لوگ تھے؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”سرا پولیس کو بڑی مشکل سے نہ ایک موقع کے گواہ ملے  
 ہیں۔ ان سے پتا چلا ہے کہ وہ اسٹوڈیو میں سے دو گاڑیوں نے آکر  
 ستارہ کی گاڑی کو روکا تھا۔ اس کے بعد صحیح طور پر کچھ پتا نہیں چل  
 سکا کہ کیا ہوا۔ بس ستارہ قایم ہو گئی۔ اسے اغوا ہونے سے بچانے  
 کی کوشش میں اس کا ایک گاڑی مارا گیا اور دو سرا شدید زخمی ہوا  
 ہے۔ اسپتال میں ہے۔ بے ہوش ہے۔ پولیس کو اس کے ہوش میں  
 آنے کا انتظار ہے۔“ اتفاقاً نے بتایا۔

”انتظار کے علاوہ بھی پولیس کچھ کر رہی ہے؟“ میں نے  
 پوچھا۔

”جی ہاں سرا خاصی مستعدی دکھا رہی ہے کیونکہ ایک قلم  
 اشار کا معاملہ ہے۔ اسٹوڈیو میں بھی خاصی کھلی گئی ہوئی ہے اور  
 آئندہ کا کچھ عمل ملے ہو رہا ہے۔ پولیس نے کچھ پیش در مجرموں کی  
 تلاش میں چھاپے بھی مارنے شروع کر دیے ہیں۔“

”کوئی رائے قائم کی ہے انہوں نے؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 مجھے اپنی کپٹیوں میں ہلکی سی چشم محسوس ہو رہی تھی اور ذہن میں  
 گویا کچھ بلب تیزی سے جل بجھ رہے تھے۔

”سرا اس موضوع پر میری ان سے براہ راست بات تو نہیں  
 ہو سکی اور نہ ہی انہوں نے کسی دوسرے شخص کے سامنے کوئی  
 خیال ظاہر کیا ہے لیکن میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ اسے اغوا برائے  
 تاوان کی واردات فرض کر کے تفتیش کر رہے ہیں۔ ویسے ابھی وہ  
 خود خاصے کنفیوژ ہیں۔ گھبرائے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی وارداتوں  
 سے پولیس افسروں کو بھی ذرا نمایاں ہونے کا موقع ضرور ملتا ہے۔  
 مشہور شخصیتوں کی شہرت میں سے تو ذرا سا حصہ انہیں بھی ملتا ہے  
 لیکن شخصیت کی بازاریابی میں جوں جوں دیر ہوتی جائے ان پولیس  
 آفیسرز کو حاصل ہونے والی شہرت مثلی رخ اختیار کرتی چلی جاتی  
 ہے۔ اس وقت تو اخباری رپورٹروں سے دوڑے دوڑے ان کے پاس پہنچ  
 رہے ہیں اور وہ کلف لگی دودھوں کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھ کر  
 بیان دہرہ جاری کر رہے ہیں۔ تسلیاں بھی دے رہے ہیں لیکن مجھے  
 اندازہ ہے اندر ہی اندر دیر بھی رہے ہیں کہ اگر ستارہ کی بازاریابی میں  
 دیر ہو گئی تو میں ان کے نیچے آؤ میرے گا۔“

”اگر یہ واقعی عام پیش در مجرموں کی واردات ہوئی تب تو شاید

کچھ پیچھے پلیرا "اتفاقِ الحاحیہ" لیے جسے میں بولا "اور کچھ نہیں تو پولیس پر زور پڑی ڈالو کیجئے۔ ان پر ذرا اوپر سے دباؤ ہو تو یہ زیادہ تندی سے کام کرتے ہیں۔"

"وہ تو میں کروں گا ہی۔" میں نے کہا "میں بہت کم باتوں پر برطان ہو تا ہوں لیکن اس خبر نے مجھے برطان کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ وہ عورت ہماری کاؤداری ضرورت ہے۔ کاؤدار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا اور تمہارا بھی کام چل رہا ہے گا۔ ویسے ہی مجھے اس عورت کی بڑی فکر ہے۔ اب تو اس کی شخصیت کی جمیل شفاف ہونا شروع ہوئی تھی۔ مٹی گرد پیچھے پیچھے لگی تھی۔ اس کی مدح کا گلا بہن دور ہوا تھا۔ اب وہ اندر سے ایک خوب صورت عورت بننے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ اب اس کے ساتھ کوئی ایسا دیا حادثہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے ذہن کے پیشے پر غراشیں پڑ جائیں گی۔"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں سرا" وہ مجھے لیے جسے میں بولا "میں سوچ رہا ہوں، اگر یہ صرف اغوار اے آدمی کی واردات ہو تب بھی غیبت ہے، اسے کوئی ذہنی یا جسمانی گزند نہ پہنچے۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں اغوار کہنے والے کو دھو لیتے غبار انوں کے ادباز اور سرچرے لڑکے نہ ہوں جو کبھی کبھی صرف کسی شخصیت کے گہر کی وجہ سے اسے اغوار کہتے ہیں، اسے اپنی آوارگی کا نشانہ بناتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ بعد میں یاوں دوستوں میں بیٹھ کر چٹکارے لے کر کہہ سکیں کہ انہوں نے فلاں مشہور علمی بیرونی کو اغوار کیا تھا اور اس کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا۔ ان کی نظر میں یہ شخص ایک پرفلک ایڈیٹر ہوتا ہے۔ ایک بیان خیر ہم ہوتی ہے۔"

"مگر ایسا ہوا تب تو شاید پولیس جلد ان کا سراغ لگا لے۔"

میں نے کہا "اس صورت میں انہیں سزا عدالت نہیں دے گی، میں دلوں گا۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو سرا" وہ شاید جھرجھری سی لے کر بولا "لوہے پیسے کے بدلے ہی ستارہ کی جان چھوٹ جائے تو اچھا ہے۔ بالی نقصان تو پورے ہو جاتے ہیں۔"

"خیر۔" وہ سمجھتے ہیں کیا ہوتا ہے "میں نے طویل سانس لے کر کہا "ہم پولیس سے رابطہ رکھو۔ کوئی ذرا سا بھی سراغ سامنے آئے تو فوراً مجھے مطلع کرو۔ خواہ وہ کتنا ہی غیر اہم محسوس ہو۔ میں ڈی آئی ٹی صاحب سے بھی کہلوانا ہوں اور اپنے دو ایک آدمیوں کو بھی لگاتا ہوں۔"

فون بند کر کے میں نے واپس آکر اپنے مہمانوں کے ساتھ مزید غور و مراقبت گزارنے کے بعد ان سے اجازت چاہی۔ وہ اسی ہوئی میں گھر سے ہوئے تھے۔ میں انہیں وہیں بیٹھے چھوڑ کر گھر گیا۔ مجھے وہ ضروری ٹیلیفون کرتے تھے۔ پلا فون تو ڈی آئی ٹی صاحب کو کرنا تھا۔ ان سے درخواست کرتی تھی کہ وہ اس سلسلے میں متعلقہ لوگوں کو زیادہ سرگرمی سے تفتیش کرنے کی خصوصی ہدایت

کریں۔ دوسرے فون کو فون کرنا تھا کہ وہ اپنے طور پر جیسے بھی ممکن ہو، چا چلائے کی کوشش کرے کہ اس واردات کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔

لیکن یہ دونوں فون کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔ ان کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں ابھی جا کر اسٹڈی میں بیٹھا ہی تھا کہ میرے ڈائریکٹ نمبر پر فون آگیا۔ دو سری طرف ایڈم تھا۔

"ستارہ کے اغوار کی اطلاع تمہیں کانی تاخیر سے ملی؟" وہ چکا۔

"تو یہ تمہارا گھنٹا پن تھا؟" میں ایک طویل سانس لے کر وہ کیا۔

"ظاہر ہے گھنٹا پن کے جواب میں گھنٹا پن کا ہی مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا "ہم نے اسے فن کو غائب کر کے اچھا نہیں کیا۔"

"تو کیا یہ اس کا جواب ہے؟" میں نے اپنا لہجہ پُر سکون رکھنے کی کوشش کی۔

"ظاہر ہے۔ بعض اوقات کسی ایک چیز کے بدلے کوئی دوسری چیز ضمانت رکھتی پڑتی ہے" اس نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں یہ الٹا مگر ہو کہ اسے فن کو میں نے غائب کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہارے سوا اس شخص میں اس کا قاتلہ روانہ اور کون ہے؟"

وہ بدستور شگفتہ لیے جسے میں بولا "ویسے بھی وہ جب اپنے ٹھکانے سے نکلا تھا تو تم سے ملنا اس کے شیڈول میں شامل تھا اور ہماری اطلاع کے مطابق اس کی تم سے ملاقات بھی ہو گئی تھی لیکن وہ چمکے ہر طرح کی صورت حال سے ٹپکنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے کسی کی حفاظت یا تحرائی کے لئے کوئی غیر معمولی انتظامات کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہمیں تو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ تمہاری گاڑی میں بیٹھا تھا، اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ تردید اور انکار کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم سرکس سے آئی ہو۔ بات ذرا مشکل سے ہی مانتے ہو۔ ہم تمہارے بارے میں پتے اچھے اچھے پروگرام بناتے ہیں، تم درمیان میں اتنی ہی گندی سی کوئی نہ کوئی حرکت کر گزرتے ہو۔ اس لئے ہمیں اندیشہ ہے کہ تم نے کہیں اسے فن کو ہلاک ہی نہ کر دیا ہو۔ ویسے وہ آسانی سے ہلاک ہونے والی چیز تو نہیں ہے لیکن چیز تم بھی غیر معمولی ہو۔ تم سے کچھ بعد نہیں ہے۔ سر حال۔ اگر تم نے اسے ہلاک نہیں کیا ہو گا تو یہ تمہارے حق میں بہت بڑا ہوگا۔ ورنہ سمجھ لو کہ تمہارے لئے بہت بڑی پریشانی ہے۔ بلکہ پریشانی کھڑی ہو جائیں گی۔ ستارہ کا غائب ہونا اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔"

میں نے اس سے صاف گوئی اور سیدھے طریقے سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ستارہ کی جان کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ جلد از جلد اس کی بازیابی کی کوشش کر لے گا ہی میرے حق میں بہت

لیا۔

”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے“ وہ مجھ سے لیے میں ہوں  
”بہر حال... تم ہی بتاؤ پھر کیا صورت ہو سکتی ہے؟ ہم تو تمہارے  
ساتھ بالکل فریجٹا چاہتے ہیں۔“

میں نے الفاظ کا سہارا لے بغیر تسلیم کر لیا تھا کہ اسے نہ  
میرے قبضے میں ہے۔ اب میں نے بات طے کر لیتا ہی میٹر سمجھاؤ  
مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا فیئر بے کا دعویٰ کس حد تک درست  
تھا بہر حال اب میں نے بالکل فریج ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

”بات آگے بڑھانے سے پہلے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں“  
میں نے اب دوستانہ لیے میں کہا ”اب تم نے فریج ہونے کی بات کی  
ہے تو میں بھی حتی الامکان ایمان داری سے کام لینے کی کوشش کرنا  
گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسے فن یا دواشت کھو بیٹھا ہے۔“

”تم نے تاجر کیا ہو گا اسے“ اس نے فوراً کہا لیکن پھر خود  
بولتا ”مگر وہ تو تاجر ہے جسے یادداشت کھو دینے والا آدمی نہیں ہے  
تم نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟“

”مجھے تو اس کے ساتھ کچھ کرنے کی حسرت ہی رہی تھی“ میں نے  
ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”میں تو اس پر طبع آزمائی کر رہی نہیں تھی۔  
نہ جانے کس نے کس پکڑ میں اس کی پیشانی پر لوہے کی سلاخ لگا  
زیادہ ہی طاقت سے دے ماری۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسی نے  
میرے ہاتھ میں بھی لٹکایا ورنہ یہ چھلوا تو میرے ہاتھ ہی نہیں لگ  
رہا تھا۔ ہوش میں آیا تو اس کی یادداشت جا چکی تھی۔“ میں نے

اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کا طرز عمل دودھ پیتے بچے جیسا تھا۔  
ایڈم ایک لمبے خاموش رہا پھر بولا ”تمہارے سوا کسی کو اور  
کی پیشانی پر سلاخ مارنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی تھی؟“

”کوئی ہم دونوں کو ایک دیران سرگ پر ٹوٹنے کی فکر میں تھا  
خاص طور پر مجھ سے گاڑی چھیننا چاہتا تھا۔ وہ مجھ رہا تھا ہم دونوں

تھا۔ ویسے بھی اسے فن یا توازن کھو چکا تھا۔ اس حالت میں وہ  
میرے کسی کام کا نہیں تھا۔

”تم نے ستارہ کو کوئی گزند تو نہیں پہنچائی؟“ میں نے نرمی سے  
پوچھا۔

ایڈم نے غالباً محسوس کر لیا کہ میں مذاکرات کی طرف مائل  
ہوں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار لہجے میں بولا ”ہم کسی کو بھی  
اس وقت تک گزند نہیں پہنچاتے جب تک گزند پہنچانا ناگزیر نہ  
ہو جائے ابھی سے اسے گزند پہنچانے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی تو  
تم سے بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ تم سے بات چیت کا کام ہونے کی  
صورت میں ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد ایک طرفہ تو یہ  
ہو سکتا ہے کہ ستارہ شعلوں میں نہیں جھنجھکی جائے۔ کبھی ایک ہاتھ“  
کبھی ایک بازو“ کبھی انگلیاں“ کبھی پاؤں اور سب سے آخر میں  
سر۔“

مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کے لوگوں کا خوشگوار لہجے میں اس  
قسم کی باتیں کرنا عام قسم کے جرائم پیشہ لوگوں یا بد معاشرلوں کی  
دھمکیوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ رینیور پر  
میری گرفت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے فوراً اپنے اعصاب کو  
ڈھکیلا چھوڑا۔ میں اس سے اعصابی کشیدگی کے عالم میں بات نہ کرنا نہیں  
چاہتا تھا۔ جس طرح وہ اپنے آپ کو بالکل پرسکون اور بے پروا ظاہر  
کر رہا تھا اسی طرح مجھے رہنا چاہیے تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ  
جہیں ستارہ کے ٹکڑے اکٹھے ہی بارسل کر دئے جائیں۔ ستارے  
کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ لیکن تم نے کسی ستارے کے  
اتنے ٹکڑے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے جتنے ہم تمہیں بھیجیں گے۔  
تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ انتہائی نرمی کا  
سلوک کرتے ہوئے ستارہ کو صحیح سلامت تمہارے پاس بھیج دیں۔  
صرف اس کی کھوپڑی میں ایک آدھ سوراخ ہو۔ اب یہ تمہاری  
مرضی پر منحصر ہے کہ تم کون سا طریقہ پسند کرو۔ یا یوں کہو کہ یہ  
تمہارے طرز عمل پر منحصر ہے کہ تم کون سا طریقہ اختیار کریں۔“

”مقتضیات چھوڑو۔ مختصرات کرو“ کیا چاہتے ہو؟“ میں نے  
رکھائی سے پوچھا۔

”کیا اب بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟“ وہ طاقت سے بولا  
”ظاہر ہے ہم جاہلہ چاہتے ہیں۔ تم اسے فن کو چھوڑو۔ ہم ستارہ کو  
چھوڑ دیں گے۔“

”یعنی میں چھوڑنے میں ہل کر اور پھر انتظار کرنے بیٹھ  
جائیں کہ کب تم ستارہ کو چھوڑتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ ہم کوئی اٹھائی گیارے یا بیسہ دروازا کھولنے والے  
تو نہیں ہیں۔ تمہیں ہماری بات پر اعتبار کرنا چاہئے“ اس نے  
جواب دیا۔

”نہیں۔ مجھے اعتبار نہیں ہے“ میں نے صاف کوئی سے کام

### رومانی ناول

|                  |                    |       |
|------------------|--------------------|-------|
| لڑکی اس گلی کی   | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 100/- |
| اس جلتے جہاں میں | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 100/- |
| خدا کہاں ہے      | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |
| جلتے بجتے لوگ    | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |
| میرا             | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |
| ردتے کنول        | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |

اعتبار کی آجاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد کسی باوقف، بلکہ  
مہجم سی جگہ پر ہو تاکہ تمہارے آدمی کوئی گزیر نہ کر سکیں اور گزیر  
نہیں تو آسانی سے فرار نہ ہو سکیں۔

”ہمارا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی ہم اس میں زیادہ  
آویں کو لوٹ کرنا چاہتے تھے لیکن تم اپنی تسلی کے لئے جس طرح  
کے بھی انتظامات چاہتے ہو، کرو۔ جو بھی طریقہ اختیار کرنا چاہتے  
ہو کرو اور جو بھی مقام منتخب کرنا چاہتے ہو، کرو۔ اتنے فراخ دل  
لوگ تمہیں کہاں ملیں گے۔“

”واقعی۔ اگر آج حاتم طائی زندہ ہو تو تمہاری دریاہلی دیکھ کر  
شرمندگی سے دوبارہ مروانا۔“ میں نے کہا ”ایک تو تم اپنے منہ میاں  
مٹونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔“

وہ کھینکا ہونے بغیر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا ”خیر۔۔۔ تم جگہ  
بتاؤ۔“

”میرے خیال میں بھائی کا علاقہ ٹھیک رہے گا۔“ میں نے ایک  
لمبے سوچ کر کہا ”مڑکیں اور گھیاں تک تک ہیں۔ تمہارے آدمی  
کوئی گزیر کر کے آسانی سے بھاگ نہیں سکیں گے۔“

”مظلوم نہیں تمہارے دماغ میں گزیر کا خیال کیوں سلایا ہوا  
ہے۔ اب میں تمہیں کیسے یقین دلاناؤں کہ ہمارا گزیر کا کوئی ارادہ  
نہیں۔“ ایڈم بولا ”اور اگر ہم ارادہ کریں تو پھر بھائی ہوا  
لوہاری۔“ ہمارے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم کہیں بھی، کچھ بھی  
کے کھل سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی ہوگا کہ میں تمہیں آدمی  
مرواؤں گے۔ ضرورت پڑنے پر ہم یہ بھی کر سکتے ہیں لیکن بلا  
ضرورت ہم کچھ نہیں کرتے۔ یہ تمنا راہ گیروں یا کاندھلوں وغیرہ  
کو مروایا جائے تو اس کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہئے۔“

”تمہارے اعلیٰ و عظیم فلسفوں کا تو میں پہلے ہی قائل ہوں۔“  
میں نے کہا ”اب اپنا پروگرام بتاؤ۔ جلد کس وقت ممکن ہو سکے  
گا۔“

”اب تو دور ہو گئی ہے۔ بات صبح پر ہی جا رہی ہے۔ ورنہ جلد  
تو آج بھی ہو سکتا تھا۔ ہمیں ایک مکی ہیروئن کو رات بھر صمان  
رکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ تم جگہ بتاؤ۔“

”بھائی میں پائلٹ ہونے کے قریب تک چوراہے پر یہ کام  
ہونا چاہئے۔“ میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ”تم گاڑی میں  
ستارہ کو لے آنا۔ میں اپنی گاڑی میں اسے نکلنے کو لے آؤں گا۔  
گاڑیاں ایک ہی سڑک پر آگے پیچھے رکنی چاہئیں۔ تم اپنی گاڑی  
دروازہ کھول دیتا۔ میں اپنی گاڑی کا دروازہ کھول دوں گا۔ تم آکر  
اسے نکلنے کو لے جانا۔ میں ستارہ کو تمہاری گاڑی سے اتار لوں گا۔“  
”تم نے کیسے فرض کر لیا کہ اس کام کے لئے میں ہی آؤں گا  
وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”تم سے میری مراد ہی شخص ہے جو تمہاری نمائندگی کر  
ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت ہیں۔ یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ تم ضروری سمجھو گے تو میں  
دلوں کا لیکن اصل اہم بات صرف یہ ہے کہ اسے نیا یادداشت  
لو بجھا ہے اس کے دماغ میں چوٹ آگئی ہے۔“

”خیر۔ ٹھیک ہے۔“ ایڈم کی سانس لے کر بولا ”میں تمہاری  
کہانی کا یقین کر لیتا ہوں۔ وہ جس حالت میں بھی ہے ہم اسے واپس  
لے کے لے جا رہے ہیں۔ وہ کسی حد تک مثبتي خصوصیات رکھنے والا  
نسان ہے۔ ہم کو تشویش کریں گے کہ اس کے کل گزیروں میں جہاں  
زنی چھپا ہے اسے ٹھیک کر لیں کیونکہ اس پیچیدہ مخلوق کو صرف ہم  
یہتر سکتے ہیں۔ ہر حال ہم ستارہ کو بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں  
تمہارے حوالے کریں گے۔ اس سے زیادہ فیئر معاملہ کیا ہو سکتا  
ہے۔“

”اس میں شک نہیں۔ تمہاری ایمانداری کے واقعات تو  
میں نے شہرے الفاظ میں لکھے جا چکے ہیں۔“ میں نے کہا ”میری الحال  
اپنے منہ میاں مٹو ہونا چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ جلد کس طرح عمل  
میں آئے گا۔“

”بالکل سیدھے سادے انداز میں۔“ اس نے جواب دیا ”تم  
وے نکلنے کو لے کر کہیں بھی آ جاؤ۔ ہم ستارہ کو لے کر وہاں بھیجیں  
گے۔ شہر کی طرح تم ہماری چیز ہمارے حوالے کر دیتا۔ ہم تمہاری  
چیز تمہارے ہیرو کیوں گے۔“

”میں تو خیر ستارہ کو اپنی چیز نہیں سمجھتا۔“ میں نے ہنسی  
تم لے اسے چاہی کو کچھ سے تعلق کی بنا پر ہی انکار کیا ہے اس  
لئے اسے تمہارے چنگل سے چھڑانا میری اخلاقی ذمہ داری بن گیا  
ہے۔“

”یہ شک۔“ وہ ہم انتظار سے میرے لئے بولا ”میں پہلے ہی  
امید تھی کہ تم اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی پاسداری کرو گے۔ اسی لئے تو  
میں نے یہ ذمہ داری تم پر۔“

میں نے اس کے لئے کو نھر انداز کرتے ہوئے پوچھا ”تم نے  
مجھے ہی انکار کیوں نہیں کر لیا؟“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”محالہ سوال ہے۔ شاید ہی کوئی اپنے  
بارے میں خودیے سوال کرتا ہو کہ مجھے کیوں نہیں انکار کر لیا گیا۔“ پھر  
”مجھ سے ہونے بولا۔“ یہی بات یہ ہے کہ ہمیں انکار کا خاصا  
مشکل کام ہے۔ اس کے لئے ہمیں ذرا لمبی چوڑی منصوبہ بندی کرنی  
پڑتی اور لی الحال ہم جگہ میں تھے۔ کوئی بہت ضروری بات ہوگی تو  
نہیں بھی ذمہ داری لیں گے۔“

”ستارہ کے انکار کا میرے انکار سے زیادہ شور مچا ہوگا۔“ میں  
نے کہا۔

”شور کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔“ وہ بے نیاز سے بولا۔ ایک  
لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ ”تو پھر کیا ملے پایا؟“  
”ابھی تو کچھ بھی ملے نہیں پایا۔“ میں نے جواب دیا ”تمہارا کہنا  
ہے کہ میں اسے نکلنے کو لے کر کہیں بھی آ جاؤں۔ بات پھر وہی ہے۔“

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا "ویسے اس کام کے لئے میں خود ہی آؤں گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے" میں نے کہا "اس بے شمار ادب و احترام سے آج تک آواز ہی سنتا آ رہا ہوں۔ بڑا اشتیاق ہے جس میں رہنے کا۔"

"دیکھ کر کیا ہی ہوگی" وہ خوش دلی سے بولا "ہم کون سا شہر نہیں کے لوگ ہیں۔"

"ماہوسی تو بعض اوقات شہر نہیں کے لوگوں سے مل کر بھی ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ جیسی ہمیں ستارہ کو بہت قریب سے دیکھ کر ہوئی ہے۔" وہ فوراً بولا "وہ اتنی حسین تو نہیں جتنی اسکرین پر نظر آتی ہے۔"

"اے حسین تو کم ہی لوگ ہوتے ہیں جتنے وہ اسکرین پر نظر آتے ہیں۔ ویسے کوئی کوئی اس سے زیادہ بھی ہوتا ہے۔"

"معلومات میں اضافے کا شکریہ۔ ویسے یہ بات مجھے بھی معلوم تھی۔" وہ بولا "میں تو اصل میں یہ جانتا چاہتا تھا کہ تم اس پر عاشق کیوں ہو؟ مجھے یقین ہے اس سے بہتر لڑکیاں تمہاری نظر انتہا کی خطرہ بنی ہوں گی۔"

"میرا اس سے تعلق حسن کی بنیاد پر نہیں ہے۔ ویسے بھی حسن صرف اسی کام نہیں ہے جو آنکھوں کو نظر آتا ہے۔" میں نے جواب دیا "اور میرے اس سے تعلق کو عشق بھی نہیں کہا جاسکتا۔"

"وہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا اس سے تعلق کس بنیاد پر ہے۔" وہ فحش کر بولا "اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے اس سے تعلق کو عشق بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن جو کچھ بھی ہے" اتنا ضرور ہے کہ اس کے لئے تم سے کوئی چاہتا نہ سہی "چاہت بات ضرور منوائی جاسکتی ہے۔ اچھا تو پھر کل صبح جو بچے کا وقت بتادلے کے لئے ٹھیک رہے گا؟"

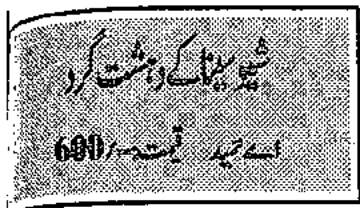
"ٹھیک ہے۔" میں نے ذرا سوچ کر کہا۔

"اور گرد یقیناً تمہارے آدمی موجود ہوں گے؟" اس نے سرسری سے لمحے میں پوچھا۔

"ہاں" میں نے دیانت داری سے جواب دیا "میں نہیں چاہتا کہ اس ذیل میں میرے ساتھ کوئی گزر ہو۔ میرے آدمیوں کو شاید تم دیکھ نہ سکو، بچکان نہ سکوں۔ کوئی بدعاشی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ خواہ مخواہ کی خوریزی ہوگی۔"

"تمہارے آدمی بھی اسی طرح اور گرد موجود ہوں گے۔ تم نہیں جان سکو گے وہ کہاں ہیں، کس عہدہ میں ہیں۔ تم بھی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ ایک بالکل فیئر پلے ہوگی۔ آدمی کے بدلے آدمی۔ نہایت پرسکون اور پُر امن انداز میں سب کچھ ہونا چاہئے" ایڈم نے بولا۔

"امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ اگر تم نے کوئی گزروانہ کی تو شاید



قریب سے گزرتے راہ گیروں کو بھی پتا نہ چلے کہ سڑک کے کنارے کھڑی گاڑیوں میں کس نوعیت کا تبادلہ عمل میں آیا ہے۔ ہمیں

اس قسم کے معاملات عام طور پر شہر سے دور دراز مقامات پر ملے پاتے ہیں۔ لیکن تم بہت چالاک ہو۔ تم نے دو متحان ترین علاقہ منتخب کیا ہے۔

"زہد نوازی ہے تمہاری۔ تم سے واسطہ نہ رہے گا تو بہت سیکھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کل کا پروگرام طے رہا؟" اس نے تھوڑی سی ہنسی سے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے" میں نے کہا۔

مائنس لے کر کہا۔ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریسیور رکے بعد میں بھی کئی منٹ تک ساکت بیٹھا رہا۔ اب ڈی آئی بی ملا سے بات کرنے کا اور پولیس کی کارروائی کی خبر رکھنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ یہ معاملہ پولیس کے بس کا نہیں تھا۔ اب ستارہ کی بنا پر تک انہیں صرف ہلک ٹوئیں ہی ماری تھیں۔

کئی منٹ تک سوچنے کے بعد بالآخر میں نے فونی کا نمبر ڈاکر اور اس کام کے بارے میں اس سے تبادلہ خیال کرنے کا جواز صبح درپیش تھا۔ خاصی طویل گفتگو کے بعد بالآخر خیر کا پروگرام پایا۔ فونی کی تجویز تھی کہ ہم ایڈم عرف ایڈی پر ہاتھ ڈالنے کو شش کر سں۔ یہ ریڈ ڈاٹ کا سرا ہاتھ آنے کا ایک ذریعہ ہو سکتا تھا لیکن میں فونی سے متفق نہ ہو سکا۔ میں جانی جیسی پڑا جگہ پر ان لوگوں سے تصادم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور ستارہ کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ میں اس کی باڈی والی وقت میں کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ دونوں طرف سے آتش فشاں پھٹ پڑا۔ فونی نے محفوظ طریقوں سے صورت حال منتقل کرنے کے لئے کئی تجاویز پیش کیں لیکن ان میں سے میرے دل کو نہ لگی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں ریڈ ڈاٹ کو قدرے بہتر طور پر جاننے لگا تھا۔ فونی ابھی انہیں اتنا بہتر نہیں جانتا تھا۔

اس رات مزید کچھ دیر سوچ بچار کے بعد بالآخر میں مہینے سوئے میں کامیاب ہوئی گیا۔ دوسری صبح الارم نے مجھے جا جلدی جلدی تیار ہو کر اور ہٹا کر کے میں دو نمبر پہنچا۔ میں

ٹھیک نو بجے ایک سفید فورڈ کیری میری گاڑی کے عین پیچھے آن رکی۔ میں نے اس کے اندر جھانکنے سے پہلے اوپر اُدھر دیکھا۔ میں اندازہ لگاتا چاہتا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے لوگ کہاں کہاں کھڑے ہیں لیکن اس غلٹ میں "ٹائز" نے نظر میں کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے کوسوں کے بارے میں کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ روز کی طرح لاہور کے مرکزی علاقے کی پُربنگاہ زندگی رواں دواں تھی۔

تب میں نے سفید فورڈ کیری کی طرف دیکھا۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ پر ایک مرد تھا۔ پچھلی سیٹ پر برقعے میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ پوری طرح نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

مرد ڈرائیونگ سیٹ سے اتر آیا۔ وہ ایک دھلا چلا "نمائت" نہیں قسم کا دوجیز عمر آدمی تھا۔ سفید فام تھا اور قمری چش سوٹ میں تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی زیادہ سے زیادہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ کسی اچھی کمپنی میں اعلیٰ عہدہ پر آیا آسودہ حال قسم کا "شریف" اور وضع دار برنس میں ہوگا۔ کوئی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کا کسی عجیب و غریب اور پُر اسرار عقیم سے کوئی تعلق ہوگا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ معزز آدمیوں کی طرح چائپ بھی پی رہا تھا۔

قریب آکر اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے ملامت سے کہا "مجھے ایلیم کہتے ہیں" انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے دو شناسا برنس میں اتفاقاً سر راہ مل گئے ہوں۔ میں ایک "ٹک" اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔

"سمت باوی ہوئی تم سے مل کر" بلا خرمیں نے کہا "میرے ذہن میں تمہارا بہت مختلف قسم کا نقشہ تھا۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے مل کر باوی ہوگی" وہ مسکراتے ہوئے شستہ آنسو میں بولا۔ اس کی آواز نے تصدیق کر دی کہ وہ واقعی ایلیم تھا۔ میں فون پر یہی آواز سنتا تھا۔

میں نے اس کی گاڑی میں جھانکا۔ عورت نقاب ہٹا کر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ کینٹ واقفی ستادہ تھی۔ اس نے نقاب دوبارہ چہرے پر ڈال لیا اور فورڈ سے اتر کر میری گاڑی کی طرف بڑھ آئی۔ حریف نے اس کے لئے اگلا دروازہ کھول دیا۔

ایلیم نے میری گاڑی کے قریب جا کر دوبارہ کھول کر پیچھے جھانکا اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے فون پر اطمینان سے گاڑی سے اتر آیا۔ وہ بالکل صحیح طرح اپنے پیروں پر چل رہا تھا۔ صرف یہی نہیں "میرے قریب رنگ کردہ مصافحے کے لئے ہاتھ بچھاتے ہوئے نہایت خوش دلی سے مسکرا کر بولا "کیا حال ہے چچہ بدی چند؟"

میرا دل جا ہکا کہ کج کی پروا کے بغیر جیب سے شیٹیں پھسل نکالیں اور اس کا سینہ چھپتی کر دوں۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھا۔ اس وقت اگر ہتھیار نکالنے کے لئے میرا ہاتھ حرکت میں آتا تو اسی لئے

کے ساتھ - خانے میں پہنچ کر میں نے اسے فون کی آنکھوں پر پٹی باندھوائی اور احتیاطاً اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھوا دیے۔ اس نے شیر خوار بچوں کے سے انداز میں عاقل عاقل کر کے تھوڑا سا احتجاج کیا لیکن بالآخر قابو میں آگیا۔

اسے اپنا کر میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ وہ اسی طرح لیٹ کر ٹانگیں چلانے لگا اور عاقل عاقل کرنے لگا جیسے کوئی بچہ ہتھوڑے میں لپٹا ہو۔ میرا ایک آدمی حریف خان گمن لے کر اس کے پاس پہنچا اور ہم بھائی گٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے چھ دوسرے آدمی دو مختلف گاڑیوں میں آگے پیچھے روانہ ہوئے تھے لیکن بھائی گڑھ ہم سے بالکل غیر مشتعل تھے۔

بھائی گٹ میں پہنچ کر میں نے پائلٹ ہوکر سے مجھ دور ایک فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی روک دی۔ جس کی ہم نشانی مقرر کر چکے تھے اس وقت نیوٹن میں دو منٹ باقی تھے۔ میں نے اتر کر دو پیش کا جائزہ لیا۔ میرے آدھوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ کوئی گتے کے ریں دالے کے پاس کھڑا تھا۔ کوئی سری پائے کے ٹھکانے پر جا بیٹھا تھا۔ کوئی قصبے والے کے پاس کھڑا تھا۔ کوئی کسی پھل والے سے ہماؤ ناکر رہا تھا۔ وہ سب بے شرک کام سے شہریوں میں گھل مل گئے تھے۔ ان کے ہتھیار ان کے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ ایک خاص حکمت عملی کے ساتھ ایسے پوزیشن پر کھڑے تھے کہ اچھے بھلے لوگوں کا ان کے زرنے سے نکل کر جانا مشکل تھا۔

دن چڑھ چکا تھا لیکن صبح کے اخبارات ابھی تک جوش و خروش سے یک رہے تھے کیونکہ ان میں ستادہ کے اغوا کی کہانی "فکشن" تصویروں اور پتھارے دار تجویزوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ ہر اخبار کے رپورٹروں اور قلمی وقایع نگاروں نے معجزہ درخ کے خزانے سے نہ جانے کس کس زاویے سے تجزیے چھاپے تھے۔ انہوں نے تمام امکانات کا جائزہ لینے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ ایک اخبار نے تو خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ ستادہ کے کسی ناکام عاشق کی حرکت تھی جس کا بہت سا رویہ اور جائزہ ستادہ پرپ کر چکی تھی۔ میں تمام اخبارات میں یہ خبریں اور رپورٹیں سرسری نظر سے دیکھ کر کہے روانہ ہوا تھا۔ اخبارات ہی سے مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ عالم قسم کے بد معاشرہ کے اڈوں پر پولیس کے چھاپوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ بد معاشرے تھے جن کا کسی نہ کسی حوالے سے فکری دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے علاوہ گزشتہ رات سے ہی پولیس شہر سے باہر جانے والے راستوں کی بھی نگرانی کر رہی تھی۔

۔۔۔ اور میں وہاں شہر کے وسط میں ستادہ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر حریف نے اسے فون کی آنکھوں سے پٹی اور ہاتھوں کی بندھیں کھلی دی تھیں۔ وہ اب انگوٹھا چوس رہا تھا اور ہوا میں ٹانگیں چلا رہا تھا۔



ایک تاریخی دستاویز

# ہٹلر کے آخری دس دن

پروفیسر اشرف

قیمت:- 75/

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

خوف ناک خوریزی شروع ہو سکتی تھی۔ میں ایک بھی بے گناہ راہگیر  
... کو مروا نہیں چاہتا تھا۔

”تم نے اپنی ادا کا وہ ملا جلتوں کو ضائع کیا“ میں نے اسے سن  
کو کھورتے ہوئے کہا ”جو رفتار میں تم نے میرے ہاں دی اس پر  
تمہیں اکیڑی اپراؤ مل سکتا تھا۔“

”ارے ... ہمیں تو نہ جانے کس کس چیز پر اپراؤ مل سکتا  
ہے۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔“ وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے  
ساتھ بولا۔ اس کی وہ مسکراہٹ اچھے بھلے ٹھنڈے مزاج کے آدمی  
کو بھی ناؤ دلانے کے لئے کافی تھی۔

میں نے مصالحوں کے لئے بڑھا ہوا اس کا ہاتھ تھا نہیں تھا  
لیکن وہ زبردستی اپنا آہنی سا ہاتھ میرے ہاتھ میں پھنساتے ہوئے  
بولا ”سبحان ... تمہاری میرانی کا بہت شکر ہے۔ تمہارے ہاں قیام  
میں بڑا مزہ آیا۔ اس بارے میں کچھ آرام کر لیا۔ وہ نہ مجھ غریب کو تو اکثر  
رات کو بھی لینے کی فرصت نہیں ملتی۔“

”درختوں کی شاخوں پر چملا نہیں لگاتے رہے ہو گے“ میں نے  
سادگی سے کہا۔

”ہائے ...“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر باتیں آنکھ دباتے ہوئے بولا  
”تم نے تو وہ شائیں دیکھی ہی نہیں جن پر ہم چملا نہیں لگاتے ہیں۔“  
پھر یکدم جیسے اسے یاد آگیا اور وہ ٹھنڈی سانس لینے ہوئے بولا  
”ویسے تمہارے اس خفیہ ٹھکانے پر وہ عورت بڑے غضب کی تھی  
مجھے دو سرے لوگ مس ٹرپ کے نام سے مخاطب کرتے تھے مجھے  
اگر تمہارے اس خفیہ ٹھکانے کا پتا چل گیا تو وہاں سے صرف اس  
عورت کو پار کرنے کی کوشش کروں گا۔“ عجیب سافٹی سلونی قسم کی  
قیامت ہے وہ۔ پھر میری طرف جھکتے ہوئے وہ نہایت سنجیدہ اور  
رازدارانہ سے لہجے میں بولا ”تم پر تو مہربانی ہوگی؟ میں نے اس کی  
آنکھوں کی گہرائیوں میں تمہارے لئے ایک عجیب سا پیغام دیکھا  
تھا۔“

”مجھ تک تو میں پہنچا وہ پیغام“ میں نے خشک لہجے میں کہا  
”اگر یہ سوال تمہیں اتنی ہی تکلیف دے رہا تھا تو میں اسے ہی بوجھ  
لیا ہوتا۔“

”یہ تو مجبوری تھی“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”وہاں تو میں  
بقول تمہارے اکیڑی اپراؤ والی رفتار میں دے رہا تھا۔ اس کے  
دوران اس قسم کی باتیں نہیں ہو سکتی تھیں جس کا مجھے بیشہ افسوس  
رہے گا۔ وہ اس قسم کی عورت نہیں تھی جس کے سامنے انسان الو  
کے بچوں جیسی حرکتوں میں وقت ضائع کر کے واپس آ جاتا۔“

”اتنی حسرت رہ گئی ہے تو آؤ ... تمہیں واپس لے چکا ہوں  
اس کے پاس“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”نہیں۔ اب ایسی بھی بات نہیں“ اس نے جلدی سے ہاتھ  
واپس کھینچ لیا ”ہر کام کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ مابعد  
اس سے ملاقات کا بھی کوئی مناسب وقت تلاش کر لیں گے“ اس

نے اپنا لہجہ شاہانہ بنانے کی کوشش کی جو اس کی ہندو نما فضا  
کے ساتھ ٹھکے خیزی محسوس ہوا۔

”شاید تمہاری موت اسی کے ہاتھوں لکھی ہو۔ تم نے ابھی  
صرف اس کے سامنے سلوئے دیکھیں چھٹی کوشش کو ہی محسوس  
کیا ہے؟ اس کے ہاتھ نہیں کھائے اکثر احمق اس کے بارے میں  
اعزاز نہیں کر پاتے کہ وہ کیا چیز ہے“ میں نے کہا۔

”ارے ... مابعد تو ایسی ... بلکہ ہر قسم کی خواتین کے  
عظیم ترین قدردان ہیں۔ ان کے ہاتھوں تو موت قبول کرنے کے  
لئے بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں“ وہ گردن خم کرتے ہوئے بولا۔  
”تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ وہ شادی شدہ ہے  
وہ بچوں کی ماں ہے“ میں نے کہا۔

”اوه نو۔“ اس کی پھولی چھٹی آنکھیں بے چینی سے کچھ  
پھیل گئیں ”مابعد ان معاملات میں خود کو دنیا کا تجربہ کار تو  
آوی کھینچتے ہیں لیکن ہمیں تو اس کے بارے میں ایسا کوئی شبہ  
نہیں گزرا“ اسے گویا اندازے کی بنا پر غلطی کا بے پناہ افسوس تھا  
”یہی تو اس کی شخصیت کا کمال ہے“ میں نے کھمبے اچکا  
”کتنی برس سے میں بھی اسے ایسی ہی دیکھ رہا ہوں۔ اس  
بچے بڑے ہو رہے ہیں مگر اس کی عمر جیسے وہیں رہی ہوئی ہے۔“  
”خیر ...“ وہ بے پروائی سے بولا ”وہ شادی شدہ ہوا غیر شادی  
شدہ، بچوں والی ہوا بغیر بچوں والی، ہمارے لئے اس سے کوئی فرق  
نہیں پڑتا۔ ہم تو جس کے قدردان ہو گئے سو ہو گئے۔“

ایم اس دوران خاموش کڑا مسکرا رہا تھا۔ بظاہر وہ اسے  
کی باتوں سے محفوظ رہ رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا وہ غیر محسوس طور  
پر روپوش کا جائزہ لے کر اعزاز دہانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہر

آوی کہاں کہاں موجود ہیں۔ میرا خیال تھا کہ میرے آدمیوں میں سے شاید کوئی کو وہ پہچانتا تھا لیکن کوئی اس وقت سڑک پر نہیں تھا۔ وہ ایک پرانی عمارت کی عکس و آئینہ میں کھڑا تھا۔ ایڈم نے نہایت شائستگی و لادغت سے گفتگو میں مداخلت کی، میرے خیال میں یہ اس قسم کی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ پھر اس نے ششما کے انداز میں اسے سن کا کدھا تھپکتے ہوئے گویا میری مدح و ثناء میں اضافہ کیا۔ "اے سن ہماری ٹیم کا سب سے زندہ دل آدمی ہے۔"

"آوی....؟ آپ اسے آوی کہتے ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اے سن نے ایڈم کی طرف دیکھ کر گویا میرے انداز گفتگو پر مہذرت کی "چوہدری صاحب کبھی کبھی دل دکھانے والا مذاق بھی کرتے ہیں لیکن میں ان کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔"

ہمارا انداز اب بھی سرسراہل جانے والے ششما کی طرح مپ شپ کرنے کا ہی تھا لیکن تینوں ہی شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح چوکتے تھے۔ ستارہ بڑے مہرہ محل سے میری گاڑی میں غائب کرائے بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ پر حنیف خان بظاہر ہشت سے انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم راہ تھیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ گرد پیش پر اس کی بھی پوری طرح نظر تھی اور اس کی ڈھلی ڈھالی قیاس کے دامن تلے اس کی گردنیں سب مشین گن کی بوٹی تھی جو ذرا سی گڑبڑ شروع ہوتی ہی آگ لگتی ہوئی باہر آسکتی تھی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے" ایڈم بولا "چوہدری زیبا تم نے دیکھا ہم لوگ معاملات طے کرنے میں کتنے فیصلہ ہیں؟ ہمیں خوشی ہے کہ تم نے ہم سے تعاون کیا۔ ہم سب کے حق میں جتنی بھی ہے کہ آئندہ ایک دوسرے کے آدمیوں کو اٹھانے یا ہلاک کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کی جائے۔"

"مجھے تو اس قسم کا کوئی شوق ہے ہی نہیں" میں نے بے ڈاری سے کہا "اور نہ ہی میں نے اس طرح کی حرکتوں کا آغاز کیا تھا۔ یہ سطلے تمہاری طرف سے ہی شروع ہوئے تھے۔ میں تو آرام و اطمینان سے زندگی گزار رہا تھا۔ اپنے معمولات میں مگن تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سا منحوس دن تھا جب میں تمہاری نظر میں آگیا۔"

"ایک وقت آئے گا کہ تم اس دن کو منحوس کے بجائے احتمالی مہارک کو گے اور ہم پر برہنہ ہونے کے بجائے ہمارے احتمالی شکر گزار ہو گے" ایڈم بدستور محل اور متانت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"جن سے ششما کی کا آغاز لایا ہے ان کے ساتھ آگے چل کر تعلقات کی نوعیت نہ جانے کیا ہوگی؟ میں نے بدستور بیزاری سے کہا۔

"خیر۔ یہ بات تو ہوتی رہے گی چوہدری زیبا اس شہر میں.... اس ملک میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو زندگی کے میدان میں تم

سے کہیں زیادہ کامیاب ہیں لیکن وہ تیار رکھتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ ان پر مہمان ہو جائیں۔ ان کی سرپرستی کریں لیکن بہر حال۔۔۔ اس موضوع پر بات کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ اب تم جا سکتے ہو" اس نے دوستانہ انداز میں میرا کندھا تھپکا۔

"تم بھی اب جا سکتے ہو" میں نے اسے احساس دلایا کہ میری طرف سے اشارہ لے بغیر وہ بھی وہاں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی گاڑی میں جا بیٹھے۔ اے سن نے کوڑی سے سر نکال کر دیڑھی عرصے سے ہاتھ ہلا کر مجھے خد اعانہ کہا۔

"اگو کا چھاپا!" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ستارہ میرے برابر پینچر سیٹ پر بدستور چہرے پر نقاب ڈالے بیٹھی تھی۔ نقاب دہرا تھا۔ قریب بیچہ کر بھی مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ستارہ کو میرا لالے میں انہوں نے یہ بڑی عقل مندانہ احتیاط کی تھی ورنہ راستے میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی اسے ضرور دیکھ لیتا اور پہچان لیتا۔ گاڑی انہوں نے رنگین شیشوں والی استعمال نہیں کی تھی۔

"تم خیریت سے تو ہونا؟" میں نے ستارہ کا سر تاپا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ میں خیریت سے ہوں اور خداوند کرم سے تمہاری خیریت نیک چاہتی ہوں" وہ خوش دلی سے بولی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی تھی۔

میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور موڑ پر پہنچ کر سرکلر روڈ کی طرف مڑ گیا جب کہ میرے پیچھے آنے والی ایڈم کی گاڑی سٹیما کے گرد گھومتی ہوئی غالباً لوہاری کی طرف چل دی۔ ہمارے پیچھے کئی اور گاڑیاں بھی حرکت میں آئی تھیں لیکن وہ ٹریفک میں جکلی ملی ہوئی تھیں۔ کچھ تو شاید ابھی آنکھوں ہی کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ راتا دیوار والے موڑ سے گزر کر میں نے گاڑی کھسالی کی طرف بڑھائی تو ستارہ بولی "ادھر کہاں جا رہے ہو؟ گھر نہیں چلو گے؟"

"اطمینان سے بیٹھی رہو۔ میں ذرا دیکھتا جا رہا ہوں کہ کوئی میرے پیچھے آتا ہے یا نہیں۔ ڈیل بیس ختم ہو گئی ہے یا ابھی اس کا کچھ حصہ باقی ہے" میں نے کہا۔ کئی بات تو یہ تھی کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ستارہ واقعی اتنی آسانی سے، کسی قسم کی ہمارک دہڑ، کسی قسم کی سراغ رسانی اور کسی قسم کی ماردھاڑ کے بغیر بازا ب ہو گئی تھی۔

شاہی بازار والے سکتل پر مجھے گاڑی روکنا پڑی۔ ستارہ سر جھکا کر شاہی بازار کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "گڈ بڈ اوھر سے گزری ہوئی ہوں تو ان گت یادیں ذہن میں اٹھی چلی آ رہی ہیں۔"

"عام طور پر جو عورتیں میراں سے نکل کر اپنی ایک بہتر دنیا آباد کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں وہ تو سڑک اس طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں" میں نے یوں ہی بے دھیانی سے کہا۔ میری زیادہ توجہ

لکھ سکتی ہو۔ کوئی اچھا رائٹر نہیں رہی رائٹ کر دے گا۔ تمہارے نام سے۔ یعنی ایک قلم اشار کے نام سے چھپنے کی تو بہت مشہور ہوگی۔ مشرق اور مغرب میں بہت سے ممالک میں بہت سی کتابیں اسی طرح چھپ رہی ہیں اور بڑی دھوم مچا رہی ہیں۔

”یہ بھی میرے بس کی بات کہاں ہے۔ میں تو بس سوچتی رہتی ہوں کہ کچھ بھی نہیں پاتی۔ زندگی خود ہی جس طرف چاہتی ہے مجھے بہانے لئے جاتی ہے“ وہ لٹھڑی سانس لے کر بولی۔

چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اس وقت ایک برقع پوش خاتون کو ساتھ بٹھا کر لے جاتا تھیں کیسا لگ رہا ہے؟“

”کوئی ایسی انوکھی بات تو نہیں“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”بس ایسا معلوم ہو رہا ہے کوئی شریف شہری اپنی پارہہ الیہ کے ساتھ کہیں جا رہا ہے۔“

”کاش یہ حقیقت ہوتی“ وہ ایک اور لٹھڑی سانس لے کر بولی۔

”پچاس فیصد تو حقیقت ہے۔ شریف شہری تو ہیں ہوں۔ بس تم الیہ نہیں ہو“ میں نے گاڑی بادی باغ کی طرف موڑ لی۔

”قوی تو میں کہہ رہی ہوں۔ کاش ہم بھی الیہ کھلانے کے اہل ہوتے“ اس نے سیٹ کے پستے سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا۔ یکدم ہی اس کے لیے میں سٹپ ہو کر رہ گئی۔ میں خاموش رہا۔ اس قسم کا موضوع چھڑنا تھا اور کوئی منجیدہ رخ اختیار کرنے کا تھا تو میرے ہوش گم ہو جاتے تھے۔ میں اس سے بچنے ہی کی کوشش کر رہا تھا۔ پارک کے قریب بسوں کی وجہ سے ٹریفک بھڑا ہوا تھا۔ مجھے گاڑی روکنا پڑی۔ فٹ پاتھ پر پارک لاک شام کے دو ایک اخبارات کا پتہ جو دن چڑھے ہی اٹکے تھے۔ ویسے بھی دوسرے اخبارات آکر جاتے تھے لیکن آج شاید ستارہ والی خبر کی وجہ سے انہوں نے معمول سے بھی کچھ زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔ ان میں سنسنی خیزی اور چنگاہ ڈرا زیادہ ہوتا تھا اس لئے اچھے خاصے کب بھی رہے تھے۔ ستارہ نے بھی کھڑکی سے اچھ نکال کر وہ اخبارات خرید لئے۔

پہلے صفحات پر اسی کے انواع کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ پُرکشش تصویریں زیادہ سے زیادہ بڑی کر کے چھاپی گئی تھیں۔ مذاہم تھا تصویریں زیادہ ہمارے چاروں طرف گاڑیاں ٹرک ریز بھرتے آگے، پیچھے سائیکلس سب ہی کچھ تھا۔ انسانوں کا ایک سیلاب تھا اور ان سے کے درمیان ستارہ میرے برابر بیٹھی خود اپنے انواع کی خبریں پڑھنے سے پڑھ رہی تھی۔

دو تین منٹ میں ہی اس نے سرسری نظر سے سب کچھ دیکھ لیا۔ ایک اخبار کو لہراتے ہوئے بولی ”یہ تو بہت ہی دور کی کوئی بات ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ قلم اشار ستارہ نے خود ہی اپنے انواع ڈراما رہا ہے۔ کوئی بہت نہیں کہ اس وقت وہ مری یا اسیٹ کیا میں اپنے کسی قدر ان یا سامی بہرہ کے ساتھ دوا میں دے گا۔ بڑے حساب سے اس نے یہ سارا آثار دینے کی کوشش کی۔

”بچے والے گاڑیوں کی طرف تھی۔“

”کسی حد تک تمہارا خیال صحیح ہے“ وہ بولی ”لیکن یادیں خواہ کسی بھی ہوں ان کی اپنی ایک کک ہوتی ہے“ ایک کشش ہوتی تھی۔ ویسے شاید یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے یہاں کچھ ایسی بھری زندگی نہیں گزار دی کہ جس کی یادیں ذہن پر ایک شرمناک جلوہ بن جائیں۔ یہاں بھی باقی ماحول کے کی طرح طبقہ بندی ہوتی ہے اور میں یہاں پہنچنے کے بعد خوش قسمتی سے جلد ہی اونچے طبقے میں چلی گئی تھی۔“

”اوہ“ میں نے مسکراتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

”میں تمہاری نظر میں معزز بننے کی کوشش نہیں کر رہی۔ مجھ پر طوائف اور ایکٹریس ہونے کا جو لہجہ لگ چکا ہے اس کے بعد میں معزز تو شاید دوسرا جنم لے کر ہی ہو سکتی ہوں۔ میں بس ویسے ہی۔۔۔“

”ریکاڈ درست“ رکھنے کے لئے تھیں بتا رہی ہوں کہ میں یہاں صرف ڈانس اور سکرٹس، جسم فروشی میں نے کبھی نہیں کی“ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ یکدم ہی سمجیدہ ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ مجھے تو ان وضاحتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ زندگی بھی اس کی اپنی تھی اور وجود بھی اس کا اپنا۔ زندگی نے اسے یا اس نے زندگی کو کس طرح برتا تھا؟ اب ان باتوں میں الجھنے کا کیا فائدہ تھا؟ بہر حال میں نے موضوع بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید یہاں کی ہوا میں کوئی بات تھی جو اسے یکدم ہی کسی اور دنیا میں لے گئی تھی۔

”کاش ہم کچھ دیر کے لئے یہاں رک سکتے“ اس کے لیے میں جیسی حسرت پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میرا خیال تھا کہ اس دلدل سے نکل جانے والی عورتیں تو یہاں کے دودھ پوار کے سائے سے بھی بھاگتی ہوں گی۔

وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اس جھگڑ پر گول مچے بیچنے والا ایک بوڑھا سا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ بابا فضل نام تھا اس کا۔ برا مزہ آتا تھا اس کے گول مچے کھا کر۔ بہت مشہور تھا وہ اس علاقے میں۔ اس زمانے میں ظاہر ہے ہم بالکل بھی مشہور نہیں تھے لیکن پھر بھی کبھی باہر نکلتے تھے تو اسی طرح برقع پہن کر نکلتے تھے“ وہ دیر سے سے نہیں گویا ان دنوں کے تصور سے محفوظ ہو رہی ہو۔

مستل کھل چکا تھا۔ میں گاڑی آگے بڑھا چکا تھا مگر وہ ابھی انہی یادوں میں گھومتی ہوئی تھی۔ غلطی سے اسے میرے بولی ”اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی بے شمار دنیا میں آباد ہیں اور شاہی بازار ان میں سے ایک بہت ہی انوکھی دنیا ہے۔ کاش مجھے کسی کہنے مشق رائٹر کی طرح لکھنا آتا تو میں اس پر زبردست کتاب لکھتی۔“

”بہت پرانا موضوع ہے۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی صورت میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بہت ساموا دیا ہے جو چنچ نہیں سکتا“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”بہر حال اس کے لئے کہنے مشق رائٹر ہونا بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ تم جاہلو تو جس طرح بھی تم سے ہو سکے تو نے پھوٹے انداز میں اپنی یادداشتیں

اور یہ اشارہ بھی دے دیا ہے کہ عین جس وقت ستارہ افوا ہوئی ہے اس وقت سے مشہور قلم اشارہ زاہد بھی اپنی ایک جگہ ہوئی شرمگاہ پھر ذکر غالب ہے۔ ستارہ چوں کہ اپنی شرمگاہ درمیان میں چھوڑنا اور فریضے دار ہونے کا التزام اپنے سر لیتا نہیں چاہتی تھی اس لئے اس نے ذرا راجے کی ذمت کر لی۔

ایک طویل سانس لے کر اخبار ڈھکیں بوند پر رکھتے ہوئے وہ بولی "اے کتنے ہیں زعموں پر شک چھڑکا۔ بخش اخبار نویس تو منہی پا چکا رہا یہاں کہنے کی کوشش میں بہت سی سفاک ہو جاتے ہیں۔"

"ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اس قسم کی خبروں اور رپورٹوں سے توجہ نہ جانا۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تم اس احساس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرو کہ اس وقت اخباری رپورٹوں کے مطابق شرمگاہ کی پولیس تمہاری تلاش میں سرگرداں ہے اور نہ جانے کس کس ایجنسی کو چوکس کر دیا گیا ہے لیکن حقیقت تم دیکھ ہی رہی ہو۔ ہم اتنی بھری پڑی سڑکوں سے گزر رہے ہیں، راستے میں کسی جگہ پولیس والے بھی نظر آئے لیکن کسی نے آگوا کبھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔"

"اب ان ہے چاندوں کو کیا معلوم کہ وہ سامنے گاڑی میں ایک نہایت معزز نظر آنے والے شخص کے ساتھ بیٹھنے میں آرام سے بیٹھی منویہ ہی جا رہی ہے۔" وہ اس کرہولی "وہ تو شاید منتظر ہوں گے کہ میں پورے میک اپ کے ساتھ "چوہ کھولے انہیں کہیں نظر آئی گی اور کوئی میرا ہاتھ پکڑے ان کے قریب جا کر کہے گا "باب! میں مشہور قلم اشارہ ستارہ کو افوا کر کے لے جا رہا ہوں۔" اب اگر اسے بازیاں کہنے کی کوشش کرتا چاہتے ہیں تو براہ مہربانی ہٹ کر لیجئے۔" یا پھر شاید ان کے ذہن میں یہ ہو کہ کوئی گاڑی سڑک سے گزرے گی جس میں سے "بچاؤ بچاؤ" کی جھین باندھ ہو رہی ہوں گے۔ وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ گولیوں کا تار مار ہو گا۔ بد معاش اسے جائیں گے، قرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے اگر فوری ہتھیاروں سے انہیں روک لیا جائے۔ اور میں جھپٹی سیٹوں کے نیچے رستوں سے بندھی ہوں انہیں لی جاؤں گی۔"

مگر وہ سنجیدگی سے بولی "وہی بھی تم خود ہی سوچو اب وہ نرنگ کے اس سیلاب میں ہر گاڑی کو مدد کر اندر جھانک جھانک کر اصل حاشیائی تو نہیں لے سکتے ابھی اگر وہ دو چار گاڑیوں کو ہی روک لیں تو وہ میل بھی لائن لگ جائے گی اور پھر شرمگاہ کی شوز لائے لگیں گے کہ پولیس نے ان کا ٹاک میں دم کر دیا ہے۔ انہیں ان کے خلاف خبریں اور اور اسے آجائیں گے۔ اسی لئے وہ لوگ جال لے کر کھڑے رہتے ہیں اور وقتے وقتے سے نرنگ کے اس سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ کبھی کبھار واقعی نرنگ سے کوئی چھل اٹھ آجاتی ہے تو اسے وہ افسران اور عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔"

"اور تو غیر ضروری کچھ سے میٹنگ دینہو پھنپتے رہتے ہیں

انہیں وہ تھوڑی بہت کھینچا تالی اور خدائے وغیرہ کی کارروائی کے بعد دوبارہ اس سمندر میں چھوڑ دیتے ہیں "میں نے کہا "وہی مجھے اطلاع ملی ہے کہ شرمگاہ پر جانے والے راستوں پر واقعی سختی سے چیکنگ ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کیوں انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ انہیں شرمگاہ سے باہر لے جانے کی کوشش کی جائے گی۔"

"شاید ان کا خیال ہو کہ اتنے بڑے شرمگاہ مجھے چھپانے کی کوئی معقول جگہ موجود نہیں ہوگی۔" وہ استہزائیہ سے کلمے میں بولی۔

"میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے انواع و اقسام کے تمامان ہی کی واردات سمجھا ہے اور ایسی وارداتوں میں مجھ کا ذکر دو دروازہ شرمگاہ یا علاقہ غیر میں لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے پولیس کی کارروائی بھی اپنی جگہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ اس وقت ہم راوی چوک کے قریب پہنچنے والے تھے لیکن اس سے پہلے ہی میں نے گاڑی واپس شرمگاہ طرف موڑ لی۔

"میں تو برا خوش ہو رہی تھی کہ شاید تم نے کسی دوسرے شرمگاہ جانے کا پروگرام بنالیا ہے۔ اب تو واقعی چند دن کے لئے لاہور سے کہیں دور جانے کو دل چاہ رہا ہے۔" ستارہ بولی۔

"یہ بڑا اچھا وقت ہے لاہور سے باہر جانے کا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا میں نے تو گاڑی اس لئے واپس موڑی ہے کہ راوی چوک پر میری اطلاع کے مطابق پولیس ابھی تک گاڑیوں کی چیکنگ کر رہی ہے۔ خواہ توجہ جا کر پتہ چلنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں تو مجھے ہی تمہارے افوا کے التزام میں نہ دھریں۔"

"اتنے مسکین مت بنا کرو۔" ہمیں کون کسی التزام میں دھر سکتا ہے؟ وہ نقاب کی اوٹ سے شرمگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "وہی بھی بھلا کس پولیس آفسر کی جرات ہو سکتی ہے کہ وہ ایک پردہ نشین خاتون کو نقاب اٹھنے کے لئے کہے۔ میں تو ہنگامہ کھڑا کر دوں گی۔"

اس وقت تک مجھے اطمینان ہو چکا تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والی گاڑیوں میں کوئی بھی مشکوک نہیں ہے۔ تب میں نے جسم کو ذرا ڈھیلا چھوڑتے ہوئے سیٹ کے پیچھے سے ٹیک لگا کر کہا "تم بالکل... پڑھو اور آواز دوں نظر آ رہی ہو۔ لگتا ہے انہوں نے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی؟"

"نہیں۔" دھنوں کا دیرینہ دوستوں سے زیادہ اچھا تھا۔ انسان کو زیادہ تکلیفیں تو دوستوں سے پہنچتی ہیں۔" وہ بولی۔

"زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کیا واقعی انہوں نے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی؟ کسی قسم کی سختی کا مظاہرہ نہیں کیا؟"

"ہرگز نہیں۔ ان کا رویہ میرے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں ان کی بہت معزز ہوں۔ بلکہ میں ہی ان کو پریشان کر رہی۔ چھٹی چلائی رہی۔ ان سے پوچھتی رہی کہ آخر وہ کون ہیں اور

”ان میں سے ایک بچ گیا ہے“ میں نے اسے بتایا۔

”مجھے اتنا افسوس ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں ڈھیر ہوتے دیکھا۔ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہی ہوں۔ شکر ہے ان میں سے ایک تو بچ گیا۔ میری کچھ میں نہیں آیا دوسرے کی موت کی سلامتی میں کس طرح کیوں گی۔“

”یہ تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہے۔ بعض کاموں کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے۔ ان میں زندگی کا کچھ مجروح نہیں ہوتا۔ یہ بات ان لوگوں کو خود بھی معلوم ہوتی ہے“ میں نے کہا ”لیکن ہم جیسے لوگ نہ درحقیقت اندر سے بہت حساس ہوتے ہیں اس قسم کے واقعات اپنی اخلاقی سی ڈے داری محسوس کرتے ہیں۔“

”ہاں۔ اسی اخلاقی سی ڈے داری ہی کا تو مسئلہ ہے“ وہ بولی ”اس کا ایک ہی طریقہ نظر آتا ہے۔ دو یا چار انسانی زندگی کا کام الہل تو نہیں ہو سکتا۔ کم از کم اس کے نواحقین کے لئے تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی میں اس کی جیلی کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کروں گی۔ ویسے وہ دونوں میرے شہدہ تو تھے ہی۔“

”میں بھی یہی مشورہ دیتے والا تھا“ میں نے کہا ”لیکن فوراً طور پر تو ان کی جیلی کو کچھ دینے والے کی کوشش مت کرنا۔ ان کا زخم تازہ ہوگا۔ اس قسم کی باتیں بھی بری لگیں گی۔ کچھ ٹھہر کر ان کے لئے کچھ کرنا۔ ان کی کچھ ایک شہرکی ہو جائے گی۔“

”ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا“ اصل بات درمیان میں ہی ہو چکی گارڈز کے ڈھیر ہونے کے بعد کیا ہوا؟“

”میں بدحواس ہو گئی تھی۔ چیخ و پکار کرنے لگی تھی لیکن ان میں سے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور نہایت آسانی سے انہوں نے مجھے اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔ پھر ایک آدمی۔ عین میری ناک کی نیچے انہوں نے کوئی شفاف سی چیز اٹھائی۔ اسے کرتھے سے اڑے کی طرح توڑ دی۔ کسی ٹیکسیکل جیسی چیز کا میری ناک میں ٹھس اور چند ہی سیکنڈ بعد میں دیکھا مایسا ہے۔ بے دم ہو چکی تھی۔ آنکھ مٹی تو میں ایک بیلے روم میں تھی۔ دہل سا دوسرا ماں بہت سی کم تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ بہت ہی عالی شان مکان کا کمرہ معلوم ہو رہا تھا۔ کچھ عجیب خواب ناک سا ماحول تھا وہاں کا۔“

”کوئی اور تھا وہاں؟“ میں نے اپنی بے تابی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ بہت دیر تک تو کوئی بھی میرے پاس نہیں آیا۔“

”کمرے سے نکلنے کی کوشش کی تو دروازہ قفل تھا۔ عجیب بات تھی کہ اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود میں وہاں اپنے آپ کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ اس کی فضا کی تاثیر تھی۔ وہاں کوئی عجیب سی بات تھی ضرور۔ جیسے میں کسی سکون والے کمرے کی طرح تھی۔ یہ ہو اور وہ برسائیں کے موسم میں جا کر دگ دپے میں سکون اور فرحت کی لہریں دوڑا رہی ہوں۔“

مجھے کیوں اضمحلائے ہیں لیکن وہ بالکل گتے میرے بنے رہے۔ رات انہوں نے غالباً مجھے چائے وغیرہ میں کوئی خواب آور دوا دے دی تھی کیوں کہ رات میں جتنی کمری خند سوئی ہوں اتنی کمری خند مجھے برسوں سے نہیں آئی اور میں چوں کہ خواب آور دواؤں کی عادی نہیں ہوں اس لئے ہلکا سا ڈوب بھی مجھے پرست اثر کرتا ہے۔“

”مجھے مختصراً ذرا اپنی دواؤں کا تو سہی“ کیا ہوا تھا۔ کس طرح ہوا تھا اور ان لوگوں کی تحویل میں تم پر کیا گزری؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میرے اغوا کی تفصیل تو اخبارات میں درست چھپی ہے۔ گاڑی اسٹونڈ سے چند فرلانگ ہی دور پہنچی تھی۔ جب اس گاڑی نے ہمارا راستہ روکا۔ تین آدمی گھیس لئے نیچے اترے تھے جب کہ ذرا نیور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرے ذرا نیور نے گارڈز سے بھی پہلے جراث کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے پاس بھی ریپورلور تھا۔ اس نے تیزی سے اترتے ہوئے پوزیشن لینے اور فائر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ اس قسم کے کاموں میں نہایت ماہر اور مشاق معلوم ہوتے تھے۔ ذرا بھی زور نہیں ہوئے تھے۔ بڑے سکون اور اطمینان سے وہ گویا کوئی معمولی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ذرا نیور کو کوئی نہیں ماری۔ نہایت پھرتی سے اس کا ریپورلور چھین لیا اور اس کی کپٹی پر گن مار کر اسے صرف بے ہوش کیا۔“

”تم نے اس دوران کوئی چیخ و پکار وغیرہ نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اپنے آپ کو بڑی پر اعتماد اور یادگار ظاہر کرنے کی کوشش میں خاموش رہی۔ بعد میں جب میں جینچی چلائی تب کون سا کوئی ناکہ ہوا۔ وہاں کون سا کوئی سننے والا تھا۔ اگر ہوتا بھی تو کوئی کیا کر لیتا۔ اسلحہ برداروں کے سامنے نئے لوگ بے چارے کیا کر سکتے تھے۔ اب وہ خواہ مخواہ آگے آکر تو اپنے آپ کو چھٹی کر دانے سے رہے۔ اسی لئے تو اسلحے کے بل پر لوگ بھرتے چڑے بازاروں میں واردات کر کے فرار ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس تو اتنی خطرناک گھنٹیں تھیں۔ ایک کے پاس تو غالباً ہکی شیشیں گن بھی تھی۔“

”تمہارے گارڈز غالباً خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ہوں گے؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”جی ہاں پھرتی تو انہوں نے دکھائی۔ بے چارے جان پر تو کھیل گئے“ ستارہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”بلکہ اگر وہ فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش نہ کرتے تو شاید ان کی جانیں بچ جاتیں۔ اغوا کرنے والے قبیح نہایت مجرا من انداز میں بغیر کسی خونریزی کے اپنا کام کرنا چاہتے تھے لیکن گارڈز نے یہی سوچا ہو گا کہ اگر ان کے ہوتے ہوئے بھی میں ذرا سی بھی مزاحمت کے بغیر اغوا ہو گئی تو ان کو لازم رکھنے کا بھلا کیا جوڑے گا۔ اس لئے ان بے چاروں نے کوئی چلانے میں پہل کی اور اسی لمحے مارے گئے۔“

سے لگائے جائیں لیکن کم از کم ہم قلم لائن کے کوکوں کو تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کہاں کیا چیز کس طرح لٹائی گئی ہے اور اس سے فلاں آؤ کس طرح لیا جا رہا ہے لیکن میرے سامنے جو کچھ تھا وہ سیٹ نہیں تھا۔ اس میں عارضی پن نہیں تھا۔ دیوار کے رنگ اسے خوب صورت اور تصوراتی سے تھے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس طرح کئے گئے ہیں اور کون سے پینٹ ہیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک بڑا "بلند وبال" چھت سے ملا ہوا ایکوریم موجود تھا جسے دیکھ کر چند لمحوں کے لئے تو میں ہموٹ ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے سمندر کو شفاف بنا کر فرسٹ کر کے شیشے کے ایک گھر میں مقید کر دیا گیا ہے۔ سمندر میں پانی جانے والی ہر مخلوق کا کم از کم ایک نمونہ وہاں ضرور موجود تھا۔ چٹائیں، رنگ برنگی جھلیاں، بھانڈیاں، پودے۔ حتیٰ کہ ایک گھر جہ بھی تہ میں بیٹھا قیلولہ کر رہا تھا۔ باقی ہال میں چاروں طرف بلندی سے بچے کی طرف آتے ہوئے اور بل کھاتے ہوئے راستے سے بنے ہوئے تھے جیسے غالباً بچوں کے کسی غیر ملکی وینڈلینڈ قسم کے تقریبی مقام پر ہو سکتے ہیں۔ پانڈیاں، پودے، مصنوعی آبشار اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ چھت کی جگہ مصنوعی تاریک آسمان اور اس میں جھللاتے ہوئے مصنوعی ستارے بھی تھے۔ ایکوریم کے عین قریب ایک نہایت خوب صورت شاندار قسم کی کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کرسی پر صرف ایک دلن کی کرسی تھی۔ دلن اور گھبرا ہوا تو اس جگہ جتنا خوب صورت سین پیکر اڑا کیا جاسکتا تھا وہ شاید آج تک کسی انگریزی فلم میں بھی پیش نہ کیا گیا ہو۔

"میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟" میں نے یوں ہی اسے کچھ چڑانے، کچھ کریدنے کے لئے کہا۔

"مجھے معلوم تھا تم ہی کو گئے" وہ چڑ کر بولی "اسی لئے میں تو بتانا بھی نہیں چاہ رہی تھی اور میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں۔ اب بھی میں صحیح طرح سے اس کی منظر کشی نہیں کر سکتی ہوں۔ وہ ایک بہت ہی خوب صورت جگہ تھی۔ میں سمجھ نہیں سکتی کہ وہ کس طرح تاریک کنی ہو گئی۔"

"تمہیں اس میں مغز کیا نے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں نہ جانے کیا کچھ بنا ہوا ہے اور کیا کچھ بن سکتا ہے۔ مجھے تو بہت سے دوسرے سوالات پریشان کر رہے ہیں" میں نے کہا "بہر حال..... وہاں کوئی موجود نہیں تھا؟"

"نہیں۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چند لمحوں پہلے ہی اس کرسی سے اٹھ کر گیا تھا اور شاید جلد ہی واپس آنے والا تھا۔ میں کئی منٹ وہاں محزوہ سی کھڑی رہی لیکن کوئی نہیں آیا۔ پھر میں بہت کر کے چند قدم آگے بڑھی اور اسی لمحوں میں وہ سفید قلم عورت وہاں آئی پٹنی دو کئی بار میرے کمرے میں آ چکی تھی۔ وہ بہت گہرائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے وہاں نہیں اتنا چاہئے تھا۔ وہ مجھے آؤ دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی غلطی سے دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور اس کی غلطی کی وجہ سے میں اس کی لاعلمی میں وہاں نکل آئی۔ لیکن میرے خیال میں وہ اداکاری کر رہی تھی۔

"اس وقت تمہارے موڈ پر رومانویت اور تخیل پرستی کا غلبہ ہو گا" میں نے اسے چھیڑا۔

"ہاں۔ حالات بہت خوش کن تھے نا" وہ جمل کر بولی "رومانویت کے قریب اب میں بہت جا رہی تھی میں۔"

"اچھا خیر۔ جلومت۔ اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "کچھ بھی نہیں۔" وہ طویل سانس لے کر بولی "میں ایک معذور صبا کی طرح وہاں پڑی رہی۔ کالی دیر بعد ایک سفید قلم عورت اور پھر ایک سفید قلم مرد کمرے میں آئے۔ بعد میں بھی بس انہی سے ملاقات رہی۔ انہوں نے ہی میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ وہ صاف آؤد ہوئے تھے۔ مجھے انگریزی کچھ زیادہ نہیں آتی..... لیکن گراؤس لائق بول لیتی ہوں۔ میں نے جب ان سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی تب بھی انہوں نے آؤد میں ہی جواب دیا۔"

"کیا کر رہے تھے وہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں کی انہوں نے۔ بس وہ گویا میری ضروریات کا خیال رکھنے کے لئے وہاں موجود تھے۔ توڑے توڑے وقتے بعد بس کچھ اسی قسم کی مزیدانہ گزارشات کرتے رہتے تھے۔ "میں نے یہ کھا لیجئے..... وہ دلی تھپتھے..... اب آپ آرام لیجئے..... کیا آپ کوئی کتاب پڑھنا پسند کریں گی؟ وغیرہ وغیرہ۔ جب میں ان سے کوئی سوالی کرتی تو وہ گویا کوئے سے کہتے بن جاتے۔"

"ان کے سوا تمہارا کسی سے سامنا نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں" اس نے جواب دیا "یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ اس جگہ دو ایک افراد اور بھی موجود ہیں لیکن میں انہیں دیکھ نہیں سکتی۔"

"تمہیں اس کمرے سے نکلنے کا موقع نہیں ملا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں تھا۔ توڑی دیر کے لئے میں اس کمرے سے نکلی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ سفید قلم عورت جان بوجھ کر دروازہ غیر مقفل چھوڑ گئی تھی۔ کمرے سے نکلنے ہی میں ایک طویل راہداری میں پہنچی جہاں دو سیڑیاں روشنی پھیلی ہوئی تھیں۔ دونوں طرف سیٹ ڈیڑھری تھیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ان کے پیچھے کمرے ہیں۔ راہداری کے صرف ایک سرے پر کھڑا راستہ تھا۔ اس سے گزر کر میں ایک طویل وعریض ہال میں پہنچ گئی۔ "ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہو گئی۔"

"کیا ہوا؟" چپ کیوں ہو گئیں؟" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

"میرا سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارے سامنے اس ہال کی منظر کشی کیسے کیوں؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی "وہ بس دیکھنے کی چیز تھی۔ غراب مگر سا لگ رہا تھا۔ انگریزی کی اسپانی فلموں یا پھر ماٹس فلموں میں اس سے کچھ کچھ ملتے جلتے سیٹ نکلے نظر آتے ہیں لیکن یہ تو بہر حال سیٹ ہی ہوتے ہیں۔ کتنی بھی عمدگی

نہیں بنا۔

"تمہاری اس سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔  
 "نہیں" ستارہ نے جواب دیا "اسے تو جیسے معلوم ہی نہیں  
 کہ اس کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہے۔"  
 "اس مکان کے بارے میں تمہیں قطعاً کوئی اندازہ نہیں  
 کہ وہ کہاں واقع تھا؟" میں نے ایک مبہوم سی امید کے ساتھ  
 پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو اسے پوری طرح دیکھ ہی نہیں سکی۔ ایک  
 ردم اور دوسرے وہ ماڈرن الف لیڈو سال۔ ان دو جگہوں  
 علاوہ تو میں کہیں جانی نہیں سکتی۔ میں تو صحیح طور پر یہ بھی نہیں  
 سکتی کہ وہ مکان ہی تھا یا کوئی عجیب جگہ تھا، اڑن فکشن ہی  
 اور ستارے پر پائے جانے والے کسی مکان کی نقل تھی۔ کچھ  
 اور چاروں طرف سے بند بند ہی جگہ تھی۔ میں ابھی تک اس  
 بارے میں الجھن میں ہوں۔"

"تمہیں یہ الجھن نہیں ہے کہ تمہیں افواہیں کیا گیا تھا  
 میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے بہت الجھن تھی۔ ان کا کوئی مطالبہ نہیں تھا  
 بدلتی نہیں کی انہوں نے میرے ساتھ۔ تو پھر آخر متعدد  
 اس حرکت کی بے مقصدت میرے لئے زیادہ الجھن کا باعث  
 ہوئی تھی لیکن اب بات سمجھ میں آچکی ہے" وہ بولی "میں نے تو  
 سے قیدی کا تبادلہ ہوتے دیکھ لیا ہے۔ تم نے ان کے کسی وقار  
 اٹھایا ہوگا۔ وہ تمہاری داناوار کو اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"تم نے شکوہ نہیں کیا کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی  
 اٹھانا پڑی؟" میں نے کہا۔

"شکوک کرنا اپنی عادت ہی نہیں ہے۔ خصوصاً تم سے  
 کرنا تو اپنے آپ سے ہی شکوہ کرنے کے مترادف ہے۔"  
 غالباً زیر غلبہ مسکراتی تھی "اس سے پہلے کبھی کیا ہے شکوہ؟"  
 وہ ایک لٹھڑی سانس لے کر مایوسی سے بولی "دیسے بھی تم سے  
 کرنے کا کوئی فائدہ تو ہو نہیں سکتا اس لئے اس فضول حرکت  
 ضرورت ہے۔"

"شکر ہے تمہیں اتنی عقل تو آگئی" میں نے ایک نظروں  
 طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس جگہ میں ہو؟  
 ساتھ اچھے پھر رہے ہو؟ مجھے تو یہ کوئی بڑا جگر لگتا ہے اور  
 محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ تم مجھے  
 بتاتے کیوں نہیں؟"

"مجھے خود کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔ میں خود اس بے سروا  
 میں الجھا ہوا ہوں۔"

"پھر بھی... کچھ تو معلوم ہوگا" اس نے اصرار کیا۔  
 "ہاں۔ کبھی آرام سکون سے بیٹھنے کا موقع میرے آئے گا  
 یہ سن کر وہ مسکرائی۔

اسے ابھی طرح معلوم تھا کہ میں کب کمرے سے نکلی تھی۔ وہ لوگ  
 خود چاہتے تھے کہ میں کمرے سے کچھ دیر کے لئے نکلوں۔ اور کدو  
 ذرا کچھ چیزیں دیکھوں۔ بے شک وہ عورت اداکاری ابھی کر رہی  
 تھی لیکن میں خود اداکارہ ہوں۔ پہچان سکتی ہوں کب کون اداکاری  
 کر رہا ہے۔ انیس اطمینان تھا کہ میں کہیں نہیں جاسکتی۔ وہاں سے  
 نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ کم از کم مجھے تو نظر نہیں آیا تھا۔  
 بہر حال وہ مجھے فوراً کمرے میں واپس لے آئی۔ مجھے کھانا دیا گیا۔  
 اس کے بعد میں نے چائے کی فراکش کی تھی پیتے ہی میں جانتی و  
 چہرہ ہونے کے بجائے اس طرح سوچتی چیتے میں نے چائے پینے  
 بلکہ سیال افون بلی ہو۔"

ہم اس وقت تک واپس منو پارک کے قریب پہنچ چکے تھے  
 اور میں نے گاڑی کی رفتار پہلے سے بھی کم کر دی تھی۔ میں بہت  
 توجہ سے ستارہ کی بات سن رہا تھا لیکن کوئی بھی نکتہ کسی طرف  
 رہنمائی نہیں کر رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پلو بدلتے ہوئے بولی "صبح میں  
 اٹھی تو عورت نے سب سے پہلے مجھے یہی خوش خبری سنائی کہ میری  
 واپسی کے امکانات آگے ہیں۔ انہوں نے مجھے عمدہ قسم کا ناشتا  
 کرایا۔ مجھے تیار ہونے کا موقع دیا۔ پھر یہ ربح لا کر مجھے دیا۔ میں  
 ربح پہن چکی تو نہایت معذرت کے ساتھ انہوں نے میرے ہاتھ  
 پشت پر باندھ دئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے اس گھر سے نکال  
 کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ کوئی میرے ساتھ بھی بیٹھا تھا۔ جب  
 آنکھوں پر پٹی تھی تب بھی غائب اسی طرح میرے چہرے پر گری  
 ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے گاڑی میں ہم تقریباً ایک گھنٹا سفر میں رہے  
 ہوں گے۔ پھر میرے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے چابی گاڑی میں ہی  
 میرے ہاتھ کھول دئے اور آنکھوں سے پٹی بھی اتار دی۔ میں یہ  
 دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہم شہر کے بارونٹی بازاروں سے گزر رہے  
 تھے۔ ایک جگہ گاڑی ایک لمحے کے لئے رکی تو میرے برابر بیٹھا ہوا  
 شخص تیزی سے اتر گیا۔ صرف ڈرامیٹک سیٹ پر وہ شخص رہ گیا  
 جس سے تم ملے تھے۔"

"تمہیں پھر بھی شہر شرابا کرنے کا خیال نہیں آیا؟" میں نے  
 پوچھا۔

"میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ انہوں  
 نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مجھے تمہارے پاس لے جا رہے ہیں اور مجھے  
 ان کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے آپ کو شہر کے  
 بارونٹی علاقوں سے گزرتے دیکھ کر مجھے حوصلہ ہو گیا تھا۔ میں نے  
 سوچا شہر شرابا کرنے سے کہیں اتنا کام خراب ہی نہ ہو جائے۔"  
 "جو شخص گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا اس کا نام ایڈم عرف  
 ایڈی تھا" میں نے ستارہ کو بتایا "اصل نام کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔  
 بہر حال مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ کیا اسے تم نے اس مکان میں نہیں  
 دیکھا تھا جہاں تمہیں رکھا گیا تھا؟"

”بہت ستر جناب!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”جو کچھ آپ فرماتے ہیں، کہہ دوں گی۔ ہمارا تو اب اللہ ہی حافظ ہے۔“

”تمہارا پہلے بھی اللہ ہی حافظ تھا اور آئندہ بھی اللہ ہی حافظ رہے گا“ میں نے کہا ”اللہ تو ہم سب کا حافظ ہے۔“

”اب تم قلقی ہو رہے ہو“ وہ گویا خردوار کرتے ہوئے بولی۔

”ابراؤ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو“ تو کچھ۔۔۔ اب تم ذہنی توازن کھونے لگے ہو۔“

اس وقت ہم دوبارہ دوا دربار کے سوڑ پر پہنچ چکے تھے جہاں ایک طرف سڑک تم کھائی ہوئی بھائی گیت کی طرف جاری تھی اور دوسری طرف دن دے کے مطابق حلق پچھری کی جانب سے ٹریفک آ رہا تھا۔ کالی در پہلے ہم ادھر سے ہی گزرتے تھے اب دوبارہ وہیں پہنچ گئے تھے۔ اس جگہ سے زرا ادھر ہی تھے جہاں ستارہ اور اے نن کا تبادلہ عمل میں آیا تھا۔

”دوبارہ یہاں کیوں آگئے؟“ ستارہ نے چونک کر پوچھا۔

”تمہیں دوبارہ ان کے حوالے کرنے کیا ہوں۔ اگر خوش قسمتی سے وہ لوگ نظر آگئے تو ان سے کہوں گا، بھائی اپنی دی ہوئی چیز لے جاؤ۔ بہت کان کھاتی ہے“ میں نے معنوی تنبیہ کی سے کہا۔

”اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے یہیں آنا۔۔۔ میں خود ہی دھونڈ لوں گی۔“ وہ بھی اپنا لہجہ جلا کھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”ویسے بھی اخلاق کے اعتبار سے وہ تم سے بہت بہتر معلوم ہوتے تھے۔“

”ہاں۔ ابھی تو تم نے ان کی کتاب، اخلاقیات کے صرف چند ابتدائی صفحات ہی پڑھے ہیں۔ تمہیں کچھ عرصہ اور ان کے ساتھ رہنا چاہئے تاکہ ان کے بارے میں بہتر طور پر جان سکو اور تمہاری طبیعت اب بھی طبع صاف ہو سکے۔“

ستارہ نے شاید اس کے جواب میں کچھ کہا تھا لیکن وہ میں نہیں سن سکی کہیں کہ میری نظر سامنے جاتے ہوئے ایک آنکھ پر جم کر رہ گئی تھی۔ آنکھ کی تو خیر کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آنکھ تو وہاں بہت سے ”دونوں طرف کی سڑکوں پر آ جا رہے تھے۔“ رنج لگ کرتے ادھر سے ادھر سب مقدور رفتار سے بھاگ رہے تھے۔

اس وقت اسی قسم کی سواریوں کی وجہ سے ہماری گاڑی ٹریفک میں تقریباً پھنسی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ آنکھ اپنا راستہ ہاتے ہوئے زیادہ تیزی سے آگے جا رہے تھے۔ گاڑیوں کی رفتار کم تھی۔ یہ انہی ملا قوں میں سے ایک علاقہ تھا جہاں پہنچ کر انسان کو احساس ہوتا تھا کہ وہ کار کے بجائے آنکھ میں سفر کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا رہے۔

جس آنکھ نے مجھے چونکایا تھا وہ اوپر سے کھلا تھا اس پر کیوس کی ”پھٹ“ تھی ہوئی تھی اور اس میں کوچان کے علاوہ

بہت زیادہ نہیں ہو کہ میری دوستی کی وجہ سے تم پر آئندہ بھی ایسا ہی نہ ہو سکتا ہے؟“

”تمہیں کم از کم میری اتنی فکر تو ہے تاکہ ان کا آدمی واپس لے کر مجھے جھڑانے آگئے۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ جب تک سارے نزدیک میری اتنی اہمیت پر قرار ہے تب تک میں تمہارے لئے خطرات سہل لیتی رہوں گی۔ تم ہی نے درد دیا ہے تم ہی وارڈنا۔“ وہ دھیرے سے ہنسی ”ویسے بھی انہوں نے اس بار مغویہ کے ساتھ جس شرافت، خوش خلقی اور محبت کا مظاہرہ کیا، اگر آئندہ بھی معاملہ ایسا ہی رہے تو میں مستقل بنیادوں پر میسے میں ایک نوہ ابراؤ خواہو رہے کے لئے تیار ہوں۔“

”ابھی تو تم نے ان لوگوں کے رویوں کا ایک ہی رخ دیکھا ہے۔ دوسرا رخ دیکھ لو کہ ان کے ہتھے چڑھنے کے بجائے مرمانے یا پھر لگ چھڑ کر بھاگ جانے کو ترجیح دو گی“ میں نے کہا۔

”کیا مجھے اپنے حقائق، انتظامات، پڑھانے پڑھانے کے پوچھنے کی عادات حاصل کروں یا مزید کارڈ ملازم رکھوں۔۔۔ کیا کروں؟“ اس نے تنبیہ کی سے پوچھا۔

”رہا آپ کچھ عرصہ تو پولیس والے خود ہی تمہارے گھر پر پہنچیں گے کم از کم دو گاڑیوں تو اب تمہیں اپنے پرانے گاڑیوں کے قبائل کے طور پر رکھنے ہی پڑیں گے۔ میں اپنے دو آدمیوں کی ذمہ داری لے گا انہیں جو تم سے دور رہتے ہوئے تمہاری حفاظت کریں گے لیکن میں نہیں سے نہیں کہہ سکتا کہ ان انتظامات کا کوئی ناکہ بھی ہو گا یا نہیں۔“

”اب تو میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے تو وہ لوگ کوئی جن بھوت تم کی طرف سے لگتے ہیں۔ میں تو سوچتی ہوں اپنے آپ کو تن پہ نقدیر ہو کر ڈول۔ جو ہو گا سو دیکھا جائے گا“ وہ بولی۔

”خیر۔ اب اتنا بھی مایوس یا بے نیاز ہونے کی ضرورت نہیں“ میں نے کہا ”اپنی سی اصطلاحی تدابیر جاری رکھو۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

پولیس کو اب میں کیا کہانی سناؤں گی؟

”انوارہ کی بالکل کوئی عام سی کہانی گھر کر سناؤ اور ہر بات سے اطمینان ظاہر کرنا“ جو ایک طرح سے جی بچ ہو گا“ میں نے کہا۔

”وہ بھی تو جانا چاہیں گے کہ اتنی جلدی میری رہائی کیسے ممکن ہو سکتی؟“

”تمہارے کہ اس وقت انتظام سے تمہاری تمام قیمتی چیز لری اور پھر کیش بھی تمہارے پاس تھا۔ وہ سب انہوں نے لے لیا“ اس نے پھر بولا۔ ”انوارہ کی رقم کا بندوبست کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کا بھی کام آسان ہو گیا اور تمہاری بھی جان جلدی چھوٹ گئی۔ کہانی ابھی سے زرا ابھی طرح ذہن میں رکھو۔ کوئی بھی بات



میں بیک جھپٹنے میں فیصلہ کرنے والا آدمی تھا اور اگر اس  
ساتھ میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید اب بھی میں بیک جھپٹنے  
کوئی فیصلہ کر لیتا لیکن اس کی سوجھ بوجھ نے مجھے الجھا کر رکھا۔  
تو میرا یہی چاہ تھا کہ گاڑی وہیں چھوڑ کر دوڑ کر پٹولان کی رہا  
آنے میں چڑھ جاؤں اور ان کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ اس کے  
ان سے برف کس نما بیک باکس لینے کے لئے جو طریقہ  
محسوس ہو وہ اختیار کروں۔

لیکن میں یوں یکدم سناہ کو چھوڑ کر بھاگنے کا متحمل  
ہو سکتا تھا۔ اس کی زندگی کو اب بھی کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا  
میرے یوں ایک دم بھاگنے سے بدحواس ہو سکتی تھی۔ کل  
سیدھی حرکت کر سکتی تھی۔ اور پٹولان جی پیٹھ اسلام  
کر کے جارہے تھے میرے یکدم ان کے آنے پر چڑھ رہا  
تھے وہ بھی ہو سکتا تھا۔ خواہ مخواہ گاڑی تھانک سکتا تھا۔  
کسی خاص آدمی کی نظر اتفاق سے اس بیک باکس کی طرف  
گئی تھی تو اب جا سکتی تھی۔

کیا پٹولان جی بیک باکس کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے؟  
یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ پٹولان جی باکس کی طرف سے  
دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس قبیل کے دستروکوں کی طرف  
خواہمید کی سے عالم میں اپنی رنگ میں جارہے تھے لیکن  
باکس کو لئے کیوں جارہے تھے؟

ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیا واقعی  
باکس تھا؟ کہیں اسی ساخت کا کوئی دوسرا باکس تو نہیں تھا؟  
جائے کیوں میرا دل کھتا تھا کہ اس ساخت کا کوئی دوسرا باکس  
میں ہوا مشکل ہی تھا۔ وہ نہ جانے کب کا اور کہاں کا ہوا  
شاید خاص طور پر کسی مقصد کے لئے ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن  
بالکل بے مصرف نظر آتا تھا۔ تمام تر سادگی کے باوجود اس  
ساخت میں ایک عجیب نفاس، مقبولی اور خوب صورتی تھا  
تھی لیکن وہ چوں کہ کسی طرف سے کھتا نہیں تھا اس لئے  
نہیں آتا تھا کہ کوئی اس کا کرے گا کیا؟

اتنے بہت سے خیالات نے بیک وقت میرے ذہن پر طاری  
لیکن ایک فیصلے پر ہر حال میں پہنچ جاتا تھا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا  
نہایت خاموشی اور سکون سے۔۔۔ ماحول میں قطعاً کوئی غیر متوا  
حرکت کوئی ہلچل پیدا کرنے کے بغیر کرنا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں  
ساتھ کو بازاپ کر رہا تھا۔ اگر قسمت میرا غیر معمولی طور پر سنا  
دے ہی رہی تھی تو ذرا سی بے احتیاطی سے یہ موقع۔۔۔ میرے ہاتھ  
سے کھتا نہیں جائے تھا۔

میں نے فوراً گاڑی ایک طرف فٹ پاتھ کے ساتھ لگا لی اور  
کھڑکی سے سر نکال کر مرکز دیکھا لیکن ٹوٹی کی گاڑی مجھے کہیں  
نہیں آئی۔ میں نے کھڑکی کا شیش چھس کر جلدی سے ریڈیو کا  
اس طرح کھلا کر کہ۔۔۔

شہر کی شخصیت تھی۔ اسے دیکھ کر ذہن میں پہلا خیال کی رطائز  
پٹولان جی کا آقا تھا۔ بڑی سی کڑی اس کا کلف لگا ہوا۔ دھبلا  
ڈھلا کر۔۔۔ کئی لنگی بیروں میں زری والے گھتے اور کندھے  
پر رنگ برنگار لٹکی ہوئی۔

پٹولان جی پچھلی سیٹ پر خوب بچھل کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر  
ان کی یقیناً کافی تھی لیکن اس عمر میں بھی صحت قابل رشک تھی۔  
چوڑا، چوڑا سرخ و سپید تھا۔ موٹی موٹی سفید موچیں اوپر کو اٹھی  
ہوئی تھیں اور غائبانہ جلی میں چڑی ہوئی تھیں کیوں کہ دھوپ میں  
دور سے چمکتی نظر آ رہی تھیں۔۔۔ ہتھوڑوں تک میں سفیدی غالب تھی  
مگر وہ اس طرح تن کر بیٹھے ہوئے تھے گویا اس وقت بھی کشتی کے  
لئے تیار ہوں۔

حسب عادت ان تمام جزئیات کا تو میں نے ایک ہی نظر میں  
جائزہ لے لیا تھا لیکن ظاہر ہے ان میں تو مجھے چونکا نے والی کوئی  
بات نہیں تھی۔ درحقیقت جس چیز کو دیکھ کر میں اچھلے اچھلے رہ گیا  
تھا وہ پٹولان جی کی گود میں رکھا ہوا برف کس تھا، جو دراصل  
برف کس نہیں تھا!

پہلی نظر میں میں اسے برف کس ہی سمجھا تھا لیکن کچھ  
عادت سی بن گئی تھی کہ میری نظر گرد و پیش کی غیر متعلقہ چیزوں کا  
بھی باریکی سے جائزہ لیتی رہتی تھی جس کا بعض اوقات تو مجھے  
احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ دیگر چیزوں پر سے ہوتی ہوئی جب میری  
نظر دوبارہ اس برف کس پر پڑی تھی تب احساس ہوا تھا کہ وہ  
برف کس نہیں، وہی بیک باکس تھا جس نے کچھ دن تک مجھے اور  
نہ جانے کتنے دوسرے لوگوں کو دیوانہ بنے رکھا تھا۔ برف کس سے  
وہ خاصی مختلف چیز تھی لیکن سرسری نظر میں اس پر برف کس کا  
گمان گزر سکتا تھا۔

تاکہ مجھ سے خاصا آگے تھا۔ بیچ میں کئی لمبے ہاتھ گاڑیاں  
اور نہ جانے کیا کچھ رینگ رہا تھا۔ بیک وقت کئی متضاد خیالات نے  
میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ سوچوں کے افق پر جھلایا ہی کو نہ دے  
تھیں۔ کیا یہ شخص اتفاق تھا کہ میں اس مقام پر ہی مجھے وہ بیک  
باکس نظر آتا تھا جہاں تقریباً کھتا ہر پہلے میری ریڈیو ڈاٹ والوں سے  
ملاقات ہوئی تھی۔ اگر یہ اتفاق تھا تو یقیناً بہت ہی عجیب اتفاق تھا۔  
کوئی بعید نہیں کہ ریڈیو ڈاٹ کا کوئی آدمی اب بھی اس پاس  
کہیں موجود ہو کہ میں نے سوچا اور اس خیال سے میرے خون کی  
گردش تیز ہو گئی۔ مگر پھر مجھے خود ہی بات بعد ازاں آگیا۔ ریڈیو  
ڈاٹ کا کوئی آدمی اس بیک باکس کو دیکھ کر حرکت میں آئے بغیر  
نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یہ ظاہر بہت ہی عجیب لگ رہا تھا۔ جس بیک  
باکس کے لئے کچھ عرصہ قبل سوچوں کی بازی لگی ہوئی تھی اسے  
پٹولان جی میرے بازار میں گھنٹوں پر رکھے ہوئے بے پروائی سے  
ایک ہاتھ اس پر ٹکا ہے تاکہ کسی حرکت کے ساتھ بھولے ہوئے  
سے بچے جارہے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک ستم گر فنی تھی۔

”ہاں“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”اب بھی وقت ہے تم مجھ سے اعلان کا تعلق کرو۔ اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار دے دو کہ میرا مسمیٰ محمد افضل چودھری سے کسی قسم کا اخلاقی یا غیر اخلاقی ذہنی یا روحانی، قلبی یا جسمانی تعلق پرگز نہیں ہے۔ ایسا سمجھنے والا اپنے نفع و نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میرے نفع و نقصان کا بھی ذمے دار ہوگا۔ اشتہاروں کے بدل مجھے بجھوا دیتا۔“

”بہت خبیث ہوتے جا رہے ہو تم۔ کیا قبیح کی طرح زبان چلتی ہے۔ عورتوں کو مات کر دیتے ہو“ وہ جمل کرولی ”میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تمہاری وجہ سے اگر مجھے کوئی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے تو اس پر مجھے کوئی بچھڑا ہوا ہے لیکن پھر بھی.... اگر تمہاری دوستی میں جان جاتی ہی ہے تو کم از کم مجھے مرتے وقت معلوم تو ہونا چاہئے کہ میں کیوں مر رہی ہوں۔ پچاسی پانے والے کو بھی پتا ہوتا ہے کہ وہ کس جرم میں مر رہا ہے۔“

”جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کیوں مر رہا ہے۔ اس سے کوئی منزل بدل تو نہیں جائے گی۔ پہنچو گی تو وہیں جہاں تمہیں پہنچنا ہوگا“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر میں نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھینسایا ”ویسے بے فکر ہو۔ میرا دل کتاب ہے ابھی تم نہیں مری۔ ذہنی بھرپور شب کے اٹھاپات میں قلابازیاں کھانے والے ہم تم جیسے لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ آسانی سے نہیں مرتے۔“

اس دوران ٹولی کی گاڑی میں میری گاڑی کے پیچھے تن رکی تھی۔ سردار شیخ اس کے ساتھ تھا۔ میں گاڑی سے اتر گیا اور ٹولی میری جگہ اسٹیرنگ و سیل پر آ بیٹھا۔

”کوئی غامض انسٹرکشن سر....؟“ اس نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔ بس ستارہ کو حفاظت سے گھر پہنچانا ہے اور اس کی حفاظت کا کوئی مستقل بندوبست بھی کرنا ہے۔ باقی باتیں پھر ہوں گی“ میں نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم تھا ٹولی مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کا وقت نہیں تھا۔ اس نے آنے میں پہلے ہی کچھ دیر کر دی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تاکہ خاصا آگے نکل گیا ہوگا۔ شاید لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے بجائے مجھے دوڑنا ہی پڑے لیکن گاڑی پھر بھی میں اندر لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ٹولی کی گاڑی بھی بڑی تھی اور میری اس سے بھی بڑی۔ اس قسم کی گاڑیوں کا اندرون بھائی کے بے ہنگم ٹرنک میں چھٹنا لازمی تھا۔ ایسی جگہوں پر.... تاکہ بڑے آرام سے بیٹھ کر چرتا اپنا راستہ بتاتا زیادہ تیزی سے نکل جاتا تھا۔ تاکہ چیز ہی کچھ ایسی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر ہنس کر خود ہی راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

برسوں پہلے میں بھی بھائی کے علاقے سے گزرا تھا۔ اس کے بعد عجیب اتفاق رہا کہ اس شہر میں رہتے ہوئے برسوں گزر گئے تھے

رابطہ قائم ہونے پر میں نے پوچھا ”ٹولی اتم کہاں ہو؟“ میں آپ سے کافی پیچھے رہ گیا ہوں سر! چوک پر ٹرنک ٹیبل کے اشارے کی وجہ سے ٹرنک رک گیا ہے“ اس نے بتایا لیکن سڑک بحال آپ کی گاڑی میری نظریں رہی ہے۔ آپ بدلتا ہوا سڑک سے چند قدم ہی آگے ہوں گے۔“

”ہاں۔ لیکن تم فوراً یہاں پہنچو اور میری گاڑی کو سنبھالو۔ ابہر کو حفاظت سے گھر پہنچانا اب تمہاری ذمے داری ہے۔ میں کچھ کے لئے یہاں سے غائب ہو رہا ہوں۔ میرے بارے میں فکر مند نہ رہا۔ صرف ستارہ کی حفاظت کی فکر کرنا۔ اپنی گاڑی سردار یا بٹ خان کے حوالے کر دینا۔ سب کچھ بالکل اسی طرح رہے گا۔ رہ میں جا رہا ہوں“ میں نے تیزی سے کہا۔

”اوکے سر! میں آ رہا ہوں“ اس نے جواب دیا اور میں نے ایک دایہ ویش بورڈ کے خفیہ خانے میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اندرون تاکہ اندرون بھائی گیت کی طرف مڑ چکا تھا لیکن اب بٹ خان کے اندر ایک سی لیا سا بازار تھا جو گھومنا کھانا نہ جانے کہاں سے کہاں جاتا تھا لیکن وہ اتنا تنگ تھا اور ہر وقت وہاں اس رجحان رہتا تھا کہ مجھے امید تھی تاکہ زیادہ دور نہیں جاسکے گا۔ وہی گاڑیوں والے تو اس بازار میں گاڑی لے کر کھنے کا تصور بھی کیا کرتے تھے۔

مجھے احساس ہوا کہ ستارہ عجیب سی نظروں سے میری طرف لہری تھی۔ جا رہا ہے۔ لیجے میں رہو لی“ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”میں حفاظت سے گھر پہنچانے کی تدبیر“ میں نے بظاہر ایسا طریقہ بیان سے جواب دیا۔

”مجھے تمہاری حفاظت کی فکر ہے تم کہاں غائب ہو رہے ہو؟ جانے کیا دیکھ کر چرکے تھے؟ سامنے تو کسی تاکے میں کوئی ایسی بڑا لٹوا بھی نہیں جا رہی تھی“ وہ شک زدہ لہجے میں ہوا۔ ایک لمکے لکے مجھے خیال آیا کہ شاید ایسے موقع پر کسی بڑی کالج بھی ہلائی ہو نہ۔

”مینڈر لٹوا کو دیکھ کر تو تمہارا یہ غلام پرگز نہ چوٹکا۔ اپنی مت میں تو اب عجیب عجیب چیزوں کو دیکھ کر چوٹکا ہی رہ گیا ہے“ اس نے آہر کر کہا۔

”پھر بھی.... کچھ بتا دو“ اس نے اصرار کیا۔

”یہ زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے“ میں نے بے تابی سے مزکر کر دیا۔

”تم نے گاڑی میں یہ دائرہ لیس وغیرہ بھی لگائے ہوئے ہیں۔ تم اپنی جگہ پر بیٹھ رہے ہو۔ کن چیکروں میں رہتے ہو تم؟“ وہ میری آواز سے لہجے میں بولی ”میرا خیال ہے تمہارے انہی چیکروں پر رہتے ہو میری بھی شامت آتی ہے۔“

لیکن اور حسرت بھی گزر نہیں ہوا تھا۔ میں بھائی کے تاریخی اور بلند و بالا دروازے کے نیچے سے گزر کر میں بازار میں داخل ہوا تو حیرانہ اب بھی وہی نظر آیا لیکن بھیڑ بھاڑ پہلے سے زیادہ محسوس ہوئی۔ تاہم نظر ایک دوں دوں ہواں جھوم تھا لیکن اس میں وہ آنکھ نہیں تھا جس میں پہلوان جی شریف فرما تھے۔ آگے دو تین آنکھ اور اوپر کو ہٹتے فرماتے جا رہے تھے لیکن ان میں پہلوان جی کے بھائی کے پردے دار خواتین موجود تھیں۔ سواروں کے بوجھ اور بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے آگے میری توقع کے مطابق رکھ ہی رہے تھے۔ اس کے باوجود پہلوان جی والا آنکھ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے ایک سائیکل کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ جس پر میں مسلسل تھمتی بھاتا، تیزی سے لہرا ہوا اور شکر کس کے سے کرب دکھاتا ناگوں اور ریزہ ریزہ آنکھوں وغیرہ کے درمیان سے گزرتا آگے چلا جاتا اور بہت دور تک مطلوبہ آنکھ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا لیکن فی الحال چوں کہ سائیکل میر نہیں تھی اس لئے میں نے اپنے ناگوں سے ہی سائیکل کا کام لینے کی کوشش کی اور بہت تیزی سے اگلے آنکھ تک جا پہنچا۔ اس سے آگے دو در دو تک کوئی آنکھ نہیں تھا اور نہ ہی کہیں پہلوان جی کی موجودگی کے کوئی آثار تھے۔

میں نے چند لمحوں میں ہی دنیا کی بھیڑ میں پہلوان جی کو کھو دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا۔ ستارہ کی زیادہ سے زیادہ جھاکھ کی فکر میں پڑ کر میں نے کچھ قیمتی وقت ضائع کر دیا تھا۔ مجھے بے حد حیرت ہی تھی۔ آگے کو اندرون بھائی گٹ کی طرف مڑتے دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ اچھی بھیڑ بھاڑ میں تو وہ کہیں غائب ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ قسمت جب ٹھانڈی ہے تو اسی طرح چھوٹی چھوٹی اور تقریباً انمولی سی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مجھے کچھ عجیب سا قہقہہ لیکن میرے خیال میں ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دو چار ڈکانداروں سے پوچھ لینا چاہئے۔ بازار میں دونوں طرف کھولیوں سے مشابہ ڈکانوں کی قطاریں تھیں۔ کوئی بڑی تھی، کوئی چھوٹی۔ کوئی یہ خانے کی طرح تھوڑی سی زمین میں اترتی ہوئی تھی اور کوئی گویا چوڑے پر قائم تھی۔ کوئی سڑک کے کنارے سے اندر کو تھمتی ہوئی تھی اور کوئی باہر آ رہی سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت کا دہادہ میں ”تیزی کا رہنما“ تھا۔ بیشتر ڈکاندار مصروف تھے۔ ایک ڈکان دار ذرا فارغ نظر آیا تو میں نے اس کے قریب رک کر پوچھا ”بھائی صاحب! آپ نے چند منٹ پہلے یہاں سے آگے میں ایک پہلوان جی کو گھوڑے سے اترتے نہیں دیکھا۔“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا ”باڈی! اور حسرت تو دن میں کوئی ساتھ ستر پہلوان گزرتے ہیں۔ آپ کس پہلوان جی کی بات کر رہے ہیں؟“

وہ نوجوان تھا۔ ذرا تیز و طرار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل تو

چاہا کہ ایک ہاتھ رسید کر کے وہیں لٹا دوں لیکن اس وقت پر تھا۔ نہایت محل سے میں نے پہلوان جی کا چلبہ بیان کیا اور کہ ابھی چند منٹ پہلے ہی یہاں سے گزرے ہوں گے میں نے شاید آپ کی نظر پڑی ہو۔“

”فرض کریں نظر پڑی بھی ہو“ وہ ذرا شک کی نظر سے سر ہاتھ جاترہ لیتے ہوئے بولا ”آپ جانا کیا چاہتے ہیں؟“

”ان کا نام پتا۔ کوئی ٹھکانہ وغیرہ؟“ میں نے طر ف سے کہا۔

”جب آپ ان کو جانتے ہی نہیں تو پھر اس طرح افسوس پر دیکھ کر ان کے پیچھے کیوں بھاگے چلے آئے ہیں؟“ اس نے چاہتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی سرسہ بھری آنکھوں سے مجھے اس کی پان سکرٹ اور بوتلوں وغیرہ کی دکان تھی۔ عام طور میں نے دیکھا تھا کہ پان سکرٹ پیچھے والے نوجوان کی پیشانی پر تھے اور نہ ہی سکرٹ پہتے تھے لیکن اس نوجوان کے سر کی ہاتھ تار ہی تھی کہ شاید اتنے پان رہ چکا نہیں تھا جتنے کہا جاتا تھا۔ میں نے سر ہٹا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا ”مر والی سرکار! تمہیں تو کہیں سی آئی ڈی وغیرہ میں ہونا چاہئے تھا۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ یہاں بیٹھے پان سکرٹ بیچ رہے ہو۔“

اس نے کچھ کہنے کے لئے نہ کھولا لیکن میں نے ایک لمحہ اسے گھورا اور اس کا منہ دوبارہ بند ہو گیا۔ کوئی نظر اتر نہیں میری خاموش نظر نے اسے ہٹا دیا تھا کہ اس کے حق میں کیا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔

ذرا آگے مجھے ایک اور ڈکاندار فارغ نظر آیا۔ وہ ذرا چل کا تھا اور قدر سے معقول آدمی معلوم ہوا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ قسمت آزمائی کر ڈالی۔ وہ میری توقع سے زیادہ معقول آدمی ہوا۔ میری پوری بات سننے کے بعد بولا ”میں سمجھ گیا ہوں آئی ڈی“

”پوری دیکھ۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ میری نظر پہلوان جی کا لہجہ چوڑا سراپا محسوس کیا۔ خصوصاً وہ نمایاں اور کچھ توند جواں کے لیے چوڑے رنگ کی کرتے میں آنکھ کی حرکت ساتھ قفل قفل کرنی نظر آتی تھی اور اس کے ساتھ پری کا لقب۔!

”ہاں جی۔۔۔ ان کا نام یہی ہے“ ڈکاندار غالباً اس نام اور ڈکاندار کا نام تھا کہ اسے اس میں کوئی تشابہ قائم کرنے کی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”آپ سمجھ رہے ہیں کہ وہ یہاں سے گزرے ہوں گے وہ بازار شروع میں ہی اتر گئے ہوں گے۔ کیوں کہ وہیں ان کا کھانا اصل موقع تو وہاں شام کو ہی لگتی ہے لیکن صبح بھی ان کے وہاں پہنچے آتے ہیں۔“

مجھے اس کی بات زیادہ ترین قیاس معلوم ہوئی۔ جیسی جی

آنکھ بازار میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ غالباً بازار کے شروع میں علی پہلوان جی کو آثار گروہی سے محوم کر لہاری کی طرف چلا گیا غادر موڑ کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آیا تھا لیکن مجھے تو بازار کے شروع میں کوئی اکھاڑہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ تو پھر پہلوان جی کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ان گلی کوچوں میں کسی اکھاڑے کی موجودگی کا تصور بھی میرے لئے خاصا حیران کن تھا۔ یہاں .... جہاں سڑکیں دو گلیاں سڑکیوں سے مشابہ تھیں اور مکان اور پیچھے بہتے ہوئے قنادی کی طرح دکھائی دیتے تھے .... کیا واقعی یہاں کوئی اکھاڑہ بھی ہو سکتا تھا؟

مکاندار نے مجھے اکھاڑے کا محل وقوع سمجھایا اور میں اس کا شکر ادا کر کے واپس روانہ ہوا۔ بازار کے پہلے سرے پر گیت کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا بازار کی ایک شاخ کی طرح ایک چھوٹی گلی بھی تھی جسے مرغ اندر کی طرف جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ مکان دار نے مجھے اسی گلی میں جانے کے لئے کہا تھا۔ تاکہ اس گلی میں نہیں جاسکتا تھا، اس لئے وہ یقیناً اس کے سرے پر اتر گئے ہوں گے۔ میں اپنی جھونک میں سیدھا بازار میں تقریباً دوڑا چلا گیا تھا۔ اس امکان کی طرف میرا ذہن نہیں گیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مکان دار نے میری ٹھیک ہی رہنمائی کی تھی۔ وہ مجھے خلیفہ نواز پری بیکر کہہ رہا تھا یقیناً وہی میرا مطلوب آدمی تھا۔

گلی شیطان کی آنت کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ میں مکان دار کی ہدایت کے مطابق دائیں بائیں بڑھتا ہوا آخر کار اس بچی اور شکستہ کی چادر پوشی تک جا پہنچا جو مکان دار کی بنائی ہوئی ٹٹلتوں کے مطابق اکھاڑہ تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ درحقیقت وہ چند چھوٹے چھوٹے مکانوں پر مشتمل کوئی کسروی تھی۔ مکان سب کے سب ختم ہو چکے تھے۔ بیشتر تلبہ نکالا جا چکا تھا۔ صرف مٹی وہ گلی تھی جس کا اونچا سا چوڑا تین کیا تھا اور گردنم شکستہ چادر پوشی تھی۔ اسی مٹی کا ایک حصہ نرم کر کے اکھاڑہ بنایا گیا تھا۔ پیچھے دو تین بچہ نما کرے تھے۔ ایک حصے میں باڈی بلڈنگ کا سامان بھی بکھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ہینڈ پم لگا ہوا تھا۔ گھڑوئی پر تین چار گھڑے رکے تھے۔ ایک چھپر میں اکھاڑے کے دو سرے لوازمات بکھرے ہوئے تھے۔

نرم مٹی پر چند نوجوان اپنی اپنی جان بٹانے کی جدوجہد میں مصروف تھے دو تین آپس میں زور آزمائی کر رہے تھے کوئی ڈنڈہ نچلا ہوا تھا۔ فی الحال ان کے جسموں میں شیعہ کم اور پہلیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ صرف امید کی جاسکتی تھی کہ اگر وہ اسی گلیں اور شوق سے پہلوانی میں بچے رہے تو شاید آگے چل کر کوئی قابل دید چیز نکل آئیں۔ صرف ایک نوجوان چاندرا دکھاؤ آدے رہا تھا۔ اس کا قدم بھی چوڑے سے اوپر تھا۔ مٹی میں لٹھڑے ہوئے اس۔ دب صورت اور سرخ دھندل جسم سے طاقت جھلکنی محسوس ہوتی تھی۔ چادر پوشی کی ایک جگہ سے بالکل ہی ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہی گلیاں

اکھاڑے کا دروازہ تھا۔ اسی جگہ دیوار پر مجھے ایک بورڈ بھی آویزاں نظر آیا جو سالہا سال سے موسم کی سختیاں اور نہ جانے کن کن لوگوں کی چہرہ دستانیاں سہہ سہہ کر سیاہ پڑ چکا تھا لیکن اس پر دھندلے دھندلے سے کچھ نقوش کا سراغ مل رہا تھا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے الفاظ ملے۔ لکھا تھا "اکھاڑہ خلیفہ نواز پری بیکر"۔ بچے لکھا تھا "ملک کے نوجوانوں آؤ اور تھوڑے ہی عرصے میں بیٹھ کر کسی فیض اور چندے کے ملک کے قابل فخر نوجوان بن جاؤ۔"

اس جملے کے پیچھے ایک ٹکھٹا سی پکار پنہاں محسوس ہوتی تھی اس میں پورے ملک کے نوجوانوں کو دعوت عام دے دی گئی تھی لیکن میرا خیال ہے بھائی کے اس بازار سے باہر کسی کو اس اکھاڑے کی موجودگی کا علم تک نہیں تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بیشتر مقامات پر جذبات اور خدمات کی بے قدری کا یہی عالم تھا۔

اسی بورڈ پر ایک طرف کو موٹی موٹی مچھوں والے ایک پہلوان کی دھندلی سی تصویر تھی جس کے جسم پر صرف ایک ٹکھٹ اور کندھے پر ایک گڑ موجود تھا۔ جہاں ممکن تھا کہ بیشتر نے یہ خلیفہ نواز پری بیکر کی جوالی کے زمانے میں ان کی تصویر بنانے کی کوشش کی ہو لیکن درحقیقت یہ تصویر کم اور کارٹون زیادہ تھا۔

میں نے اندر پہنچ کر ذرا ملاحظہ نظر آنے والے نوجوان سے پوچھا "خلیفہ جی کہاں ہیں؟" میں نے اپنے سرسری لہجے سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں خلیفہ جی کو جانتا تھا۔ اس نے میرا سر تاپا جائزہ لیا اور بے نیازی سے پیچھے موجود ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دروازے پر چٹن پڑی ہوئی تھی۔

چل اٹھا کر میں اندر پہنچا تو کوٹھری کا منظر مجھے خاصا حیران کن سا دکھائی دیا۔ دیواروں پر مقدس مقامات کی تصویریں اور طعنے و فہرہ آویزاں تھے۔ کچے فرش پر ایک طرف ایشیوں پر صاف ستھری صراحی اور مٹی کا کٹورا رکھا تھا۔ اگر جی کی پوجا جمل خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور ایک کونے میں چٹائی پر پہلوان جی بیٹھے غالباً جو کی روٹی بڑے اشماک سے توڑ توڑ کر کھا رہے تھے اور ساتھ چھاچھ کے ٹکھٹ بکھڑے تھے۔

ان کے گول منوں، پھولے پھولے ہتے چہرے پر ہلا کی معصومیت تھی۔ وہ کسی کمرے خیال میں تھے۔ کئی لمحے تک تو انہیں یہی آمد کی خبر ہی نہ ہوئی۔ پھر یک لخت انہوں نے چوک کر سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ خلیفہ نواز پری بیکر وہی پہلوان جی تھے جنہیں میں نے آٹکے میں دیکھا تھا۔ صرف یہی نہیں، چٹائی پر ایک طرف کو وہ بلیک باکس بھی رکھا تھا جو کسی محتاط شخص کی طرح مجھے سمجھنے کی سیماں تک لایا تھا۔ چٹائی پر دو سری طرف جاء نماز پکھی ہوئی تھی۔ اس کے آگے رعل میں قرآن پاک رکھا تھا اور باس ہی موٹی سی بیچ رکھی ہوئی تھی۔

وہ کسی خلیفہ پہلوان کا ٹکھٹا نہیں کسی درویش کا چہرہ معلوم

ہوا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے پہلوان کی کو چھاپے کے ساتھ جو کی روٹی کھاتے دیکھ کر ہوئی۔ میری مصلوات کے مطابق تو پہلوان بہت کھاتے تھے اور میرے دم تک کھاتے ہی رہتے تھے۔ تو نہ تو ان خلیفہ جی کا بھی بہت نمایاں تھی۔ جو کی روٹی کھاتے اور چھاپے پینے والے کی تو نہ اتنی نہیں ہوتی چاہئے تھی۔

پہلوان جی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے خوش آمدید کہا اور تمام تر اذیت کے باوجود گرم جوشی سے بولے "آؤ باؤ جی... آؤ... کم اللہ..." پھر انہوں نے اپنے قریب چٹائی کو پھینکا یا اور خالص بھائی والے انداز میں بولے "ایہ مراد جاؤ... ایہ تھے بھو!"

انہیں یہ دیکھ کر غالباً خوش ہوئی کہ میں اپنے سوت کو خاطر میں لائے بغیر ان کے قریب آتی پاتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ چھاپے کے بڑے سے پالے اور ڈالیا میں رکھی ہوئی جو کی روٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "آپ کے اس غریب خادم خلیفہ نواز کے پاس تو اس وقت یہ چھاپہ اور جو کی روٹی ہے جسے کھانا بیفنا آپ کے بس کی بات نہیں ہوگی لیکن آپ حکم کریں... کیا کھانا پسند فرمائیں گے؟ ابھی حاضر ہو جائے گا" اب وہ حتی الامکان صاف لمبے میں اُردو بولنے کی کوشش کر رہے تھے جو ان کے اصل لہجے کے آثار چڑھاؤ کے ساتھ بڑی دلچسپ محسوس ہو رہی تھی۔

"بس... خلیفہ جی... بڑی نوازش بڑی مہربانی... میں یہاں کچھ کھانے پینے نہیں آیا..." میں نے ان کا کول مثل کدھا چپکتے ہوئے کہا۔

وہ میری بات کانٹے ہوئے بولے "بھئی کھانے پینے تو کوئی بھی کسی کے گھر نہیں جاتا یہ تو میزان کا فرض ہے تاکہ وہ جو بھی خاطر بد اثرات کر سکا ہو وہ کرے۔"

"خلیفہ جی..." میں نے ان کی توجہ آداب میزبانی سے ہٹانے اور اپنے پنجس کی تسکین کے لئے کہا "آج میں نے زندگی میں پہلا پہلوان دیکھا ہے جو چھاپے کے ساتھ جو کی روٹی کھا رہا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا! یہاں کوئی باداموں کی پوری... کوئی دسک لگی کا کسٹر... سردائی کے سامان کے خیلے... کوئی پیڑ... کوئی چرٹے... کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ آپ کس قسم کے خلیفہ ہیں... یہ کس قسم کا کھانا ہے... یہ کس قسم کا ذریعہ ہے؟"

"تمہاری جرنانی اپنی جگہ ٹھیک ہے بھئی" وہ زیر موٹھے مسکراتے ہوئے بولے۔ وہ پوری کوشش کر رہے تھے کہ "ر" کی جگہ "ڑ" نہ بولیں لیکن عادتاً کہیں کہیں بول جاتے تھے "جو چیزیں تم چاہو وہ وہ ہم نے جوالی میں کھائیں اور میرے حساب کھا نہیں۔ یہ خود دیکھ رہے ہو؟" انہوں نے پیار سے ہنست ہاتھ پھیرا "یہ اسی زمانے کی کھال ہوئی چیزوں کی نشانی ہے۔ ابھی تک کم ہونے میں میں تیری۔ حالانکہ اس وقت جتنا کھاتے تھے ساتھ اتنی ہی جان مٹی کھاتے تھے۔ خون بہنے ایک کرتے تھے۔ وہ کشتیاں... وہ

کمرشیں... دن رات جسم کو مٹی کے ساتھ مٹی اور لوہے کے ملاؤ لوہا کے رکھتے تھے۔ کھاتے تھے تو اس کو حلال بھی کرتے تھے۔ اب دو تین سال سے اس لئے سب کچھ کھانا چھوڑ دیا ہے کہ اب ضرورت ہی نہیں رہی۔ اب ہمیں کون سا کشتیاں لٹنی ہوئی ہیں جن کے لئے تیار ہوں کریں۔ کسرت بھی بس رگ پھول اور جوتوں کو برداں رکھنے کے لئے تھوڑی بہت ہی کرتے ہیں۔ کبھی کھار پھول کو زور شور کرانے کی ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے کسی بھی کچھ کافی ہے جو میں کھا رہا ہوں۔"

میں نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔ وہ ایک نوا لا چلائے اور چھاپہ کا بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد ذرا بادلے ہوئے سے لہجے میں بولے "دیکھو بھی جب سے اللہ سامنے سے لو لگائی ہے تو پتا چلا ہے کہ طاقت کھانے پینے کی چیزوں میں نہیں... یہاں ہوئی ہے۔ یہاں... انہوں نے سینے پر دل کی جگہ ہاتھ مارا۔ ان کے لمبے میں ایک عجیب سا درجہ میں اور صوفیانہ رنگ۔ ٹھنک آیا تھا۔ چہرے کے بھونچ اور کشش میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

مکدم خلیفہ جی گویا کسی خواب سے جگے اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولے "تمہارے خیال میں میری عمر کیا ہوگی پر خوردار؟"

"میری کوئی ساٹھ سال..." میں نے جواب دیا۔ وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگا "دیکھا... دس سال کی غلطی کھا میرے ستر سال کے قریب پہنچ رہا ہوں میں لیکن سوچتے سامنے کا بڑا کرم ہے۔ آج بھی کسی شبہ زور کی کلائی پکڑ لوں تو چھڑا نہیں سکتا۔ آزمائش کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں خلیفہ جی۔ مجھے آپ کی زبان پر یقین ہے" میں نے کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے اس کے طاقت ور ہونے کا یقین تھا۔ اب ایسی بات تو نہیں تھی کہ وہ میری کلائی پکڑ لیتا تو میں چھڑا پاتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اتنا طاقت ور ضرور تھا جتنے ستر سال کی عمر میں اس دنیا میں بہت کم ہی لوگ ہو سکتے تھے۔ اس کے چہرے پر بھیلی ہوئی اعتماد اور مہارت کی روشنی مجھے ایسا متاثر تھی۔ فی الحال مجھے آزمائش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دواجی پہلوانوں سے بیگانہ کلائی مختلف قسم کی حلقوں تھی۔

خلیفہ جی جو کچھ کھا رہے تھے وہ نہ جانے ان کا ناشتا تھا یا دوپہر کا کھانا۔ بہر حال اسے ختم کرنے کے بعد وہ اللہ کا شکر ادا کر کے بولے "پر خوردار اسحاق کرنا میں نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ تم تھے کس لئے ہو؟"

"خلیفہ جی! میں بہت دور سے آپ کو آنے میں جاتے دیکھ کر دوڑا دوڑا آپ کے پیچھے آیا ہوں" میں نے کہا اور بیک باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ آپ کو کہاں سے ملا ہے؟" "کیوں... نہ بہت...؟ چوری کا تو نہیں ہے؟" ان کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

نہیں تھی۔ میں نے خود تو اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی تھی، مجھے اس کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ اس وحشت پر تو زچھوڑ کی کوششوں کا اثر ہونے کی امید کم ہی تھی۔ ایلم عرف ایلمی نے مجھے خبردار کیا تھا کہ غلام ساد طریقوں سے کھولنے کی کوشش میں باکس دھاکے سے پھٹ بھی سکتا تھا لیکن قیمت تھا کہ وہ اب تک سلامت تھا اور کسی کی ہلاکت کا باعث نہیں بنا تھا۔

"خلیفہ جی! اکھاڑے چلانے والے پہلوان تو عام طور پر خانے امیر ہوتے ہیں۔ یہ آپ اتنے....." میں نے جان بوجھ کر بربلہ اور دھواں چھوڑ دیا۔

"اکھاڑوں سے دولت کمانے کے دو طریقے ہوتے ہیں باؤ جی! پہلوان جی کمری سنجیدگی سے بولے "ایک تو یہ کہ اکھاڑوں پر منشیات فروشی اور قمار بازی کے دھندے ہوتے ہوں اور پہلوان کرائے کے بد معاشوں کے طور پر چلتے ہوں یا پھر وہاں آنے والے پہلوان جی اور باؤ جی بلڈنگ کے شوقین فوجیوں سے ابھی خاصی نفیس اور چندے وغیرہ لے جاتے ہیں۔ یہاں یہ دونوں ہی سلسلے نہیں ہیں۔ میری آٹلی کا زریعہ تو بس میری دودھ دہی کی ایک چھوٹی سی دکان ہے اس سے بھی جو تھوڑا بہت کماتا ہوں وہ اسی ڈوبتے ہوئے اکھاڑے پر لگتا ہوں۔ وہ غریب نوجوان جنہیں جان شان بنانے یا پہلوانی کی تلاش میں آنے کا شوق ہے مگر جو ابھی خوراک وغیرہ کا خرچ نہیں اٹھا سکتا ان کو میری چھوٹی سی دکان سے ہر چیز ملتی ہے۔ جو کچھ بھی ضروری ہوتا ہے مفت دیتا ہوں۔"

"اکھاڑہ ذوق کیوں رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو لوگوں میں دیسے ہی صحت مند سرگرمیوں کا رواج نہیں رہا۔ کچھ لوگوں کو زندگی کی کاڑی کھینچنے سے فرصت نہیں اور کچھ لوگ بس زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر میں دن رات گدھوں کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ ہانپتے کانپتے کرتے رہتے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں ہیں میں ان کو بغیر کسی نفیس اور چندے کے بلاتا ہوں بلکہ انہی کو مجھ سے ہوسکتا ہے ان کی خدمت کرتا ہوں۔ اس کے باوجود اتنے لوگ نہیں آتے جتنے میرے اندازے کے مطابق آتے چاہئیں۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ ہے کہ میرے پاس اکھاڑے کے لئے جگہ ہی نہیں ہے۔ پہلے ہم راوی روڈ پر ایک پلاٹ پر بیٹھے تھے۔ وہاں سے کارپوریشن والوں نے اٹھا دیا۔ اس جگہ کو اوقاف کی سمجھ کر ہم نے یہاں ڈیرے لگائے تھے اب اس کے بھی دودھ دے دار نکل آئے ہیں۔ انہوں نے وکیل کے ذریعے نوٹس دے رکھا ہے کہ جگہ خالی کر دو ورنہ مقدمہ کر سینگے۔ مجھے زبردستی کسی کی ملکیت پر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا ورنہ پانچ دس سال تو مقدمے میں بھی گزارے جاسکتے ہیں۔ پہلوان کو انجی آسانی سے کوئی جگہ خالی کرتے آپ نے بھی نہیں دیکھا ہوگا "پہلوان جی نے لٹھری سامنے لی۔

"واقعی پہلوان جی! " میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کو

"نہیں..... چوری کا تو نہیں کہہ سکتے..... البتہ گندہ ضرور ہے" میں نے کہا "میری گاڑی سے غلطی سے کسی نے گرا دیا تھا تب سے یہاں پر شان تھا۔ کافی دن گزر گئے ہیں اس بات کو۔"

"اے....." ان کے چہرے پر قدوے طمانیت جھلک آئی "میں تو یہ نیچے..... میرا مطلب ہے رشتہ کباڑے سے کل ہی خریدا ہے۔ تو اس کو ڈھلائی کے لئے اسکرپ میں بیچنے لگا تھا۔ میری نظر پڑی مجھے پسند آیا۔ میں یوں ہی نیچے کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی زمانے میں اسے بھی ذرا زور کرنے کا شوق تھا۔ چھا تھا اپنا بہت بڑا کھاڑا خانہ ہے مہربانی روڈ پر اس کا۔ اب تو لگھ پتی ہے شاید اسی لئے پہلوانی چھوڑ گیا۔"

"اس کے پاس کہاں سے آیا تھا یہ؟" میں نے ان کی بات ماننے ہوئے پوچھا۔

"کوئی کچا گیا تھا تو کل کر۔ لوہے کے بھاؤ "انہوں نے بتایا "اس زمانے کو کھلنے کی بڑی کوشش کی لیکن کھلا ہی نہیں۔ وہ تو اس کی زچھوڑ کرنے لگا تھا۔ میں نے کہا..... یا راجب صورت چیز ہے۔ لی کو تو دوست۔ مجھے دے دو۔ جو پیسے چلنے ہیں لے لو۔ وہ تو ایک باہمی نہیں لے رہا تھا، تجھے کے طور پر پیش کر رہا تھا لیکن میں نے اپنی ایک یہ بھی اصول بتا رکھا ہے کہ اپنی ذات کے لئے کسی سے عقد نہیں لیتا۔ میں نے زبردستی اسے پچاس روپے دے لئے۔"

"لیکن پہلوان جی..... آپ نے خریدا کیوں؟ جب کہ آپ دیکھ چکے تھے نہ یہ کھتا ہے نہ اس میں کچھ رکھا جاسکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پیسے ہی..... ذرا شوق ہو رہا تھا کہ ہاتھ میں لے کر چلیں گے اپنا گھر دیکھنے میں تو کوئی منگ قسم کا ریفٹ کیس ہی لگتا ہے۔" لوان جی ذرا شرما کر بولے "توئی ذرا معزز سا لگتا ہے۔ ایک ریفٹ کیس جو مجھے اچھا لگا تھا..... میں نے پوچھا تھا..... وہ ہزار روپے کا تھا۔ جی بات ہے باؤ جی! میں غریب سا توئی ہوں ہزار روپے کا ریفٹ کیس ہاتھ میں لٹکا کر نہیں بھر سکتا۔ اس کی کی پوری سلیکی ڈھیر ہو چکی تھی۔"

میں پہلوان جی کی معصومیت سے محفوظ ہونے بغیر نہ سکا۔ اس کے معصوم سے شوق کی بدولت میری رسائی دوبارہ بلیک باکس ہو گئی تھی میں سیاہ اسمبل فکس وحشت کے اس باکس کی نسبت "تو حیران تھا۔ یہ کباڑی کے ہاتھ سے ہوتا ہوا نہ جانے کون کون سے گھوم پھر کر دوبارہ کباڑی ہی کے ہاتھ میں پونجی لگا تھا۔" ان کی بات سے پچاس روپے میں خریدے لائے تھے جب کہ میں اپنے نو کی تحسین کے لئے اسے حاصل کرنے کی غرض سے پچاس روپے سے بھی زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے تیار تھا۔

بلیک باکس کے اس سفر کے دوران یقیناً بہت سے لوگوں نے لکھنے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس پر اب بھی کوئی خراش

باتیں کسی اور دنیا کی باتیں لگ رہی ہیں۔“

”ہاں پر خود را اس زمانے میں یہ کسی اور دنیا کی باتیں لگتی ہیں“ وہ افسردگی سے مسکرائے ”لیکن بات یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں ہر قدم ہر ایک نئی دنیا آباد ہے“ وہ بھی مجھے پر خود را کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے اور بھی باؤنی کہہ کر۔ ”آپ“ کا سینہ استعمال کرتے تھے اور بھی ”تم“ کا لیکن ان کے لہجے میں رنگ اپنائیت اور بے تکلفی کا ہی محسوس ہوتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے بلیک باکس کے بارے میں ملکیت کا دعویٰ تو کر دیا تھا لیکن اگر پہلوان جی نے کٹلی کے لئے پوچھ لیا کہ اس کے اندر کیا ہے اور کیا اس کی کوئی چابی وغیرہ میرے پاس ہے تو میں کیا جواب دوں گا؟ میں تو شانی کے طور پر اس کے اندر کے بارے میں کوئی بات نہیں بتا سکتا تھا لیکن اس وقت میں نے اطمینان کی کمری سانس لی جب پہلوان جی نے باکس اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ لو باؤنی اپنی امانت۔“

شاید میرے معززانہ طعنے کی وجہ سے انہوں نے زیادہ کمرائی میں جانے بغیر ہی میری بات کا اعتبار کر لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح تشکر کا اظہار کروں۔ میرے پاس اس وقت زیادہ کیش نہیں تھا۔ بریف کیس گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔ آٹم میں نے ادھر ادھر کی جیبوں کو کھٹکال کر تقریباً دو ہزار روپے نکال کئے اور مٹو بانڈ انداز میں ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا ”خلیفہ جی! آپ سے مل کر عجمیت خوش ہو گئی ہے۔ آپ جیسے لوگ دنیا میں بہت کم باب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس وقت میری جیبوں میں زیادہ رقم نہیں ہے ورنہ اس اکھاڑے کی خدمت کے لئے ضرور کچھ پیش کرتا لیکن خیر۔ میں اسی شرمیں ہوں۔ زندگی رہی تو اب آپ سے ضرور رابطہ رہے گا اور آپ کے نیک مقصد کے سلسلے میں مجھ سے جو بھی خدمت ہو سکی ضرور کروں گا لیکن فی الحال یہ حقیر سی رقم صرف ایک اچھا سا بریف کیس خریدنے کے لئے رکھ لیجئے۔“

انہوں نے روپے لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ خاموشی سے ایک تک میری طرف دیکھتے رہے۔ نہ جانے پہلوان جی کا ذہن اس وقت کس ٹریک پر بارا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا ”آپ کے شوق کے بارے میں کچھ بڑی خوشی ہوئی پہلوان جی! واقعی بریف کیس صرف دفتری بابوں کے ہاتھ میں ہی ہونا ضروری نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بریف کیس کے ساتھ ایک اپنے خالص دکنی پہلوان کی پرسیٹی کیسی لگتی ہے۔ آئندہ جب آپ سے ملاقات ہو تو میں آپ کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا بریف کیس دیکھنا چاہتا ہوں۔“

پہلوان جی نے لولی جواب نہ دیا۔ میرے ہاتھ میں موجود نوٹوں میں سے صرف پچاس کا ایک نوٹ سمجھ لیا۔ نہایت ٹھہرے ٹھہرے سے بے میں وہ بولے ”میں نے بلیک باؤنڈ کو بس اتنے

سی روپے دئے تھے۔ وہ میں لے لیتا ہوں۔ آپ اپنی یہ بات رقم پر میں ہی رکھ لیں۔ میں نے عرض کیا تاکہ میں تجھے تحائف نہیں ہوں۔ بس یہ میری زندگی کا اصول ہے۔ چاہے آپ اسے اپنی سمجھیں یا برا۔“

”لیکن۔۔۔ خلیفہ جی!“ میں نے قدرے سختی سے کہا ”خیر تحائف تو بڑے بڑے بزرگ اور اولیاء تک قبول فرماتے رہے ہیں۔“

”بزرگوں اور اولیاء کی مثالیں ہم جیسے گناہ گاروں کے دوسروں نہ دیا کریں باؤنی!“ وہ تیزی سے بولے ”وہ زمانے اور تھے۔ یہ باتیں اور تھیں۔ انہیں تو بتا ہوتا تھا تحفہ کہاں سے آ رہا ہے۔ کمالی سے آ رہا ہے۔ کس نیت سے آ رہا ہے۔ پھر بھی وہ تحفہ اپنے لئے نہیں حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے لئے لیتے تھے۔ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے رشوتوں کو بھی تحفے کا نام دے دیا ہے۔ عام طور پر ہم تحفہ محبت بڑھانے کے لئے نہیں کسی کا احترام ادا کرنے کے لئے کسی کو خوش کرنے کے لئے یا کسی سے کام کھانے کے لئے دیتے ہیں۔“

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سیدھا سادہ رسائی سا پہلوان اتنی کمری باتیں کرنے کی اہلیت رکھتا ہو گا۔ میں نے اپنا ہاتھ بچہ لاتے ہوئے کہا ”پہلوان جی! دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم نے تو آپ کی باتوں سے خوش ہو کر ذرا یہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی اور طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر۔ فی الحال میں آپ کی بات کا قائل ہو جاتا ہوں۔ میں اس وقت کا انتظار کروں گا، جب آپ مجھے جاننے لگیں گے۔ میرے غلوں پر اعتبار کرنے لگیں گے اور میرے کسی تحفے کے پیچھے آپ کوئی غرض نظر نہیں آئے گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو“ انہوں نے پچاس کا نوٹ نمائندہ حفاظت سے داسکت کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ انداز سے کام تھا کہ ان کی نظر میں وہ پچاس کا نوٹ بہت اہمیت اور قیمتی لگے گا۔ رقم بالکل حقیر تھی۔

بلیک باکس میں نے گود میں رکھ لیا تھا۔ اب وہ مجھے مل گیا تھا کچھ زیادہ اہم نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”خلیفہ جی! میں اب آپ سے جو بات کرنے لگا ہوں اپنی تعلق نہ آپ کی ذات سے ہے اور نہ میری ذات سے۔ اس مجھے امید ہے کہ کم از کم اس کے سلسلے میں آپ انکار نہیں کریں گے۔ اس کا تعلق صرف ایک عظیم اور تحریری مقصد سے ہے۔ ہم کے لئے آپ زندگی وقف کئے ہوئے ہیں۔“

”میں نے تو اب اپنی زندگی صرف یاد اللہ کے لئے وقف کر دیا ہے باؤنی!“ وہ انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ”لیکن قوم کے نوجوانوں کی ذہنی اور جسمانی تعمیر و ترقی کے لئے جدوجہد کرنا بھی تو آپ کی زندگی کا مقصد ہے“ میں نے انہیں

میں نے انہیں مختصراً اپنے کاروبار کے بارے میں بتایا۔ پتا  
میرا کاروبار پھیلا ہوا تھا اسی مناسبت سے ان کی آنکھیں پھیل  
گئیں مگر جتنی تیزی سے پھیلی تھیں اتنی ہی تیزی سے سکڑ بھی  
گئیں۔ وہ ایک زبردست معاملہ فہم کے سے انداز میں مجھے گھورتے  
ہوئے بولے ”باؤنی! جب آپ لاکھوں روپے خرچ کر کے ہماری  
مدد کریں گے تو کل کو یقیناً آپ کو بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑ جائے  
گی۔ کبھی آپ کے کسی کارخانے میں ہڑتال ہو جائے گی اور یونین  
والوں کو سیدھا کرنے کے لئے آپ کو بندوں کی ضرورت ہوگی۔  
کبھی آپ کو روپے پیسے کے لین دین پر کوئی جھگڑا اٹھانا ہوگا۔ کسی کو  
سیدھا کرنا ہوگا۔ کسی رعب شرب ڈالنا ہوگا۔ ان سارے کاموں  
کے لئے آپ کو بندوں کی ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے آپ مجھے بلادرا  
بھیہا کریں گے کہ اتنے پهلوان لے کر آجائے۔ بہت سے اکھاڑوں  
پر بھی دھندے ہوتے ہیں لیکن میں آپ کو ہٹا چکا ہوں کہ خلیفہ نواز  
پری دیکھنے کبھی اس طرح کے کام نہیں کئے۔“

مجھے ان کی بات پر غصہ آنے کے بجائے ہنسی آئی۔ میں نے  
ملاحت سے کہا ”خلیفہ جی! آپ واقعی خامسے پرانے وقتوں میں  
زندگی گزار رہے ہیں۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب اس قسم کے  
کام دست بازو کے زور سے نہیں چلتے اور صاحب اختیار لوگوں کی  
پشت پانسی سے ہوتے ہیں۔ ایک انچ کی گولی چھ فٹ کے پهلوان  
سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور ملائے کے ایسے انچ اوکے منہ  
سے نکلا ہوا ایک جملہ کسی خلیفہ کی برسوں کی ریاضت پر ہماری ہوتا  
ہے۔“

پهلوان جی ذرا ہوشیاروں والے انداز میں مسکرائے ”میں  
اتنا بھی پرانے خیالات کا آدمی نہیں ہوں باؤنی! مجھے بہت اچھی  
طرح پتا ہے آج کل کے زمانے میں کہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہ تو مجھے  
معلوم ہے کہ گولی پهلوان سے زیادہ طاقتور ہے اور گولی چلانے  
کے لئے پهلوان ہونا ضروری نہیں لیکن پھر بھی... اگر بندے کی  
جان ذرا اچھی ہو تو اس کے ہاتھ میں بندوق کی بھی ایک انگلی  
شان ہوتی ہے۔ آتشیں اسلحہ بھی ذرا دور آتشہا ہو جاتا ہے۔ جان  
دار آدمی کا تو ذرا لٹکائی انگلی ہوتا ہے باؤنی! اچھا! چڑی ہو اور  
ہاتھ میں بندوق بھی ہو تو بندوق بھی زیادہ طاقتور درکھائی دیتی ہے  
اور چھاتی بھی۔ اسی لئے تو جرائم پیشہ لوگ پهلوانوں کو اپنی لائن پر  
لگانے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ پهلوان میں جان ہوتی ہے تو وہ  
خالی ہاتھ بھی براقت گزار جاتا ہے۔ پولیس کی سختیاں بھی سہلینا  
ہے۔“

”اور یہ سارے خرچ آپ برداشت کریں گے؟“ پهلوان جی  
نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورا۔  
”جی ہاں“ میں نے بلاتامل جواب دیا۔  
”آپ کو معلوم ہے شہری علاقوں میں پراپرٹی کی کیا قیمت  
ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ بے شک میں نے یہاں کبھی جانکاد خریدنے کی  
ضرورت محسوس نہیں کی لیکن میں یونین میں ہوں۔ مجھے چیزوں کی  
قیمتوں کا اندازہ ہے“ میں نے جواب دیا۔  
”کیا کاروبار ہے آپ کا؟“ وہ اب کچھ تجسس دکھائی دے رہا  
تھا۔

”میں نے ایک کاروبار چلایا ہے۔ اس کے بعد اور کچھ۔“



پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے "آپ یقیناً باقاعدہ طور پر کسی اکھاڑے میں جاتے ہیں۔ کون سے اکھاڑے میں جاتے ہیں؟"

مجھے ہنسی آگئی "خلیفہ جی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ ان کاموں کے لئے وقت کہاں ہے لوگوں کے پاس۔ میرے پاس بھی نہیں ہے۔ بس گھر پر ہی صبح کو کچھ دیر کی سخت ورزش کو معمول بناد رکھا ہے۔"

"لیکن تم روزی وری کی ورزشوں سے یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ بے یقینی سے بولے اور اپنی بے تکلفی کی معافی چاہتے ہوئے ایک بار پھر انہوں نے مجھے یوں ٹٹولا جیسے تعاب بکرا خریدنے سے پہلے اسے ٹٹولتے ہیں۔

"بس... جو کچھ بھی ہے زیادہ تر قدرتی طور پر اسی طرح ہے" میں نے کہا

خلیفہ جی میری پیشانی پر نظر جماتے ہوئے بڑبڑانے کے سے انداز میں بولے "قسمت آپ پر بہت مہربان ہے باؤمی! میں نے بہت کم لوگوں پر قسمت کو اس طرح مہربان دیکھا ہے۔"

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ قسمت مجھ پر جتنی مہربان ہے اس کے لئے میں خدا کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ میں ہر اعتبار سے خوش قسمت ہوں" میں نے صدقہ دل سے کہا اور خلیفہ جی سے اجازت طلب کی۔ وہ مجھے چھوڑنے لگی کے موڑ تک آئے۔

میکٹ سے نکلنے ہی میں روڈ پر مجھے ٹیکسی ٹلی گئی اور میں سیدھا گھر آگیا۔ تمام راستے میں اس طرح چوکنا رہا جیسے میری نفل میں کوئی خزانہ دبا ہوا ہے اور بہت سی طاقتیں اسے مجھ سے چھیننے کے لئے کوشاں ہیں۔

گھر پہنچ کر میں نے فون پر فونی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ابھی گھر نہیں پہنچا تھا اور نہ ہی اپنے دفتر میں تھا۔ جب میں نے ٹرانسپیر پر اس سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اس وقت گاڑی میں تھا اور اپنے دفتر جانے کے ارادے سے محو سفر تھا کیوں کہ وہ کئی دن سے دفتر نہیں جاسکا تھا "کام وغیرہ کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔" میرے گروپ آف کپٹیز، ہی کے ایک یونٹ کا چلا تھا۔

اس نے بتایا کہ وہ ستارہ کو اس کے گھر سنبھال چکا تھا۔ دور رہ کر اس کی حفاظت کے لئے اس نے دو آدمیوں کی ڈیوٹی بھی لگادی تھی۔ اتفاق علی کو فون بھی کر دیا تھا کہ وہ پریس اور پولیس کے سامنے ستارہ کی واپسی کے معاملے کو پیڈل کرے۔

"بائیکل ٹھیک" میں نے طمانیت سے کہا "لیکن اب تم آفس جانے کے بجائے میرے ہاں آجاؤ۔ ایک ضروری کام تمہارے پرو کرنا ہے۔"

وہ میرے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، جلد ہی آیا۔ میں نے بلیک باکس گئے کے ایک ڈبے میں بلیک کوا کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ یہ ریڈیو ڈاٹ والوں کے لئے

"میں آپ کی بات مانتا ہوں خلیفہ جی!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "لیکن مختصر اہل میں اتنا ہی وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر میں بھی اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں آپ کے پاس جدو کے لئے آیا تو آپ کو اختیار ہو گا کہ مجھے گولی مار دیں، اکھاڑے کے سارے پہلوانوں کو میری سختابوئی کرنے کے لئے چھوڑ دیں یا کوئی بھی اور سزا جو آپ چاہیں دے لیں۔ یہ بات میں اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا وزٹنگ کارڈ میں نے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس پر میرا انڈریس وغیرہ موجود ہے۔ اگر میری بات آپ کے دل کو گتے تو جگہ وغیرہ تلاش کر لیں۔ میں کوئی آدمی آپ کے ساتھ کر دوں گا جو آپ کی سرپرستی میں سارے کام کرے گا۔ مجھے امید ہے کہ ہم مل کر ایک بہت اچھا اکھاڑہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور ایک دن شرمش اس کی مدھم ہوگی۔"

خلیفہ جی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک سی نمودار ہوئی مگر فوراً ہی مدھم ہو گئی۔ تاہم انہوں نے میرا کارڈ لے کر اسی طرح احتیاط سے واسٹ کی جیب میں رکھ لیا جس طرح کچھ دیر پہلے پچاس کانٹ رکھا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے

"باؤمی! مجھے آپ کے چہرے پر سچائی کی روشنی تو نظر آ رہی ہے اور میرا دل بھی کہہ رہا ہے کہ آپ کے ساتھ مل کر میں کوئی بڑا کام اچھے طریقے سے انجام دے سکتا ہوں لیکن فی الحال میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔ میں دو ایک دن سوچوں گا۔ اگر میرا دل مانا تو آکر آپ سے ملاقات کروں گا۔ اگر مجھے اتنا ہوا تو میں دو چار دن کے اندر اندر آبادیوں کا روند سمجھ لیجئے گا کہ خلیفہ فائز پری میکٹر بڑا کام کرنے کی ہمت نہیں کر سکا اور زندگی کے باقی دن بھی وہ اسی طرح کسی کوئے کھدے میں اپنی کھال میں مست رہ کر گزارے گا۔"

"بہر حال میں سمجھ نہ کچھ عرصہ ضرور آپ کا انتظار کروں گا" میں نے کہا اور جیک باکس کو ایک پرانے اخبار میں لپیٹ کر نفل میں دبا کر روانہ ہونے لگا تو خلیفہ جی نے اٹھ کر مجھے گرم خوشی سے گلے لگایا۔ ان کے بازوؤں میں واقعی جان تھی اور سینہ لوہے کے ڈوم کی طرح مضبوط تھا۔

گلے ملنے کے بعد وہ کوپا غیر ارادی طور پر میرے بازو ٹٹولتے ہوئے بولے "میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کی حیثیت چاہے جو کچھ بھی ہے لیکن آپ کو کسرت اور باؤمی بلڈنگ وغیرہ کا شوق ضرور ہے اور خامسا زبردست شوق ہے۔ جیسی تو آپ اتنی دلچسپی سے میری باتیں سن رہے تھے اور اکھاڑہ قائم کرنے کے لئے اپنی فراخ دلی سے کام لے رہے ہیں ورنہ توجہ کل کون ہم جیسے لوگوں کی باتیں سنتا ہے ورنہ کون اس قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتا ہے۔"

ہیں تو نہیں لیکن یہ ایسے زیادہ مشکل بھی نہیں ہیں۔ اگر تمہیں شوق ہے کہ تمہارے لئے یہ سب کیا جائے تو کروں گے۔ بس ذرا توپوں کا انتظام مشکل ہو گا۔ ایک آدھ توپ سے کام نہیں چلے گا؟ میرا مطلب ہے وہ جو لوزر ہال کے قریب ایک چوراہے پر توپ کھڑی ہے ہائے بھٹیوں کی توپ کتنے ہیں! وہ ادھار لے لیں گے اور کچھ.....؟ کوئی اور حسرت ہے تو وہ بھی بتا دو۔"

"ہیں..... اب تو ایک ہی حسرت ہے" وہ لہجہ کی سانس لے کر بولی "اور وہ یہ کہ تم اسی بھٹیوں کی توپ کے آگے مجھے باندھ کر اڑا دو۔ میں اسی قابل ہوں۔"

"کیوں.... تم سے کیا جرم سرزد ہو گیا؟" میں نے مصنوعی تشویش سے پوچھا۔

"یہ کرم کیا کم ہے کہ ہم نے تمہارے حکم پر عمل درآمد میں کچھ زیادہ سی مستعدی دکھادی" وہ بولی "تم نے ہمیں لاہور شہت ہونے کے لئے ایک ماہ کی ملت دی تھی لیکن اس سے کچھ پہلے ہی یکم تاریخ آگئی اور ہم نے یہ سوچ کر استعفیٰ دے دیا کہ بات پھر مزید ایک ماہ آگے چلی جائے گی۔ بس تب سے ہم دونوں بہن بھائی گھر پر بیٹھے پور ہو رہے ہیں اور تمہارے فون کا انتظار کر رہے ہیں۔ آخر بے شرم بہن کہ خود ہی فون کرنا پڑا۔"

"واقعی..... تمہاری اس بے شری تاریخ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں..... میں واقعی بڑی سنجیدہ ہوں کہ خواہ مخواہ فون کر کے تمہارے کان کھاتی ہوں" وہ بولی۔

"سنجیدہ سے زیادہ تم مجھے رنجیدہ معلوم ہو رہی ہو۔ میرے کان کو پیچھے کے سری ہائے نہیں ہیں جنہیں تم کھانے کی کوشش کرو..... اور ہاں..... میں بھی تمہیں استعافی سنجیدہ ہو کر آخری بار بتانے لگا ہوں کہ فون چاہے میں کروں یا تم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے اتنا کام مسئلہ مت بنایا کرو۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کن بھٹیوں میں بیٹھا ہوا تھا تو تم اس بات پر خدا کا شکر ادا کرو گی کہ اس وقت تم میری آواز سن رہی ہو ورنہ شاید تمہیں عالم بالا میں مجھ سے رابطہ قائم کرنا پڑتا اور شاید تمہیں معلوم ہو کہ وہاں فون کے ذریعے رابطہ نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے سارے شکوے شکایتیں بھول کر یکدم تشویش سے بولی "کیوں..... کیا ہوا تھا؟ خیریت تو ہے؟"

"ہیں..... جب تک تم میری آواز سنتی رہو تب تک تو یہی سمجھو کہ خیریت ہی ہے یہ باتیں فون پر نہیں ہو سکتیں۔ یہاں آؤ گی تو سب معلوم ہو جائے گا۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ سر سے کفن باندھ کر آنا۔ چونکہ اس کے لئے تیار ہو؟"

"ہیں اب ڈائیلاگ مت پڑو..... اور نہ ہی مجھے بولنے پر مجبور کرو۔" جھجھکاؤ تو تباہ کر کیا مسئلہ ہے؟ "اس کے لہجے میں تشویش

کریں! ہم ہے لیکن اتنا مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ اس کے لئے وہ کسی کو..... بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اس لئے اس کے بارے میں بھی الٹ رہنا اور اپنے بارے میں بھی۔ میرے خیال میں فی الحال تو انہیں علم نہیں ہے کہ یہ ہمارے پاس پہنچ چکا ہے لیکن بعض باتیں نہایت چراسر اور عجیب و غریب انداز میں انہیں معلوم ہو جاتی ہیں اس لئے بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

فونی نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں نے بغور اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ وحشت سیارہ رنگ کی این فور سڈ اسٹیل معلوم ہوتی ہے۔ ہاکنس کے ہارڈل طرف جو پالی جیسی پارک ایک لکیری نظر آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے یہی اس کا جوڑیا پھر اس کے کھلنے کی جگہ ہے لیکن اس کے بارے میں ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش پر یہ دھماکے سے پھٹ بھی سکتا ہے۔ اس لئے تمام تر احتیاط ضروری ہے لیکن اسے کھولنا بھی بہر حال ضروری ہے۔ ہمارا انجینئر رشک ایکٹروٹکس اور دھماکا خیز اشیاء کا ماہر ہے۔ اسے کھولنے کا کام اس کے سپرد کرو اور اس میں سے جو کچھ بھی برآمد ہو دے کہ فوراً میرے پاس پہنچو۔ اپنے آدھیں میں سے مزید جس کی بھی مدد کی ضرورت ہو حاصل کر لو تاہم اسے کھولنے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ چلی چیز احتیاط ہے۔ کسی کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہئے۔"

"اؤکے سر" وہ کارٹن لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد میں آنس جانے لگی۔ سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی ممکنہ بجائی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے مترنمی "ہیلو" سن کر تمام الجھے الجھے سے خیالات گویا یک لخت ہی میرے ذہن سے نکل گئے۔ وہ راجہ لہجہ۔

میری آواز پہچانے کے بعد وہ بولی "حضور والا! کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ کراچی میں دو فریوں کو ہجرت کا حکم دے کر آئے تھے؟ میرا خیال ہے لاہور پہنچتے ہی یہ بات آپ کے ذہن سے نکل بھی ہو گی۔" "اسکی کوئی بات نہیں ہے" میں نے سہلے ہوئے کہا "میں تو یہاں تمہاری اور ارشد کی آمد کے انتظار میں مگن مگن کروں گزار رہا ہوں۔"

"ارے ہاں..... میں تو بھولی ہی مگنی تھی۔ میرے قریبی فون کی عمر ان رات بجتی رہتی ہے۔ تم ہر وقت یہی پوچھ رہے ہو کہ میں کب آؤں گا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم نے لاہور کے ریلوے اسٹیشن اور ایئر پورٹ پر استقبال دینے بھی کہنے کئے ہوئے ہیں کہ مجھے ہی راجہ بیگم شریف ان کے لئے سرخ قالین بچھایا جائے۔ بھول چکا ہوں کہ انہیں بیٹھ بویا جائے اور پانچ سات توپوں کی سلامتی دی جائے۔ ہے نا؟"

”زیادہ تیز چلنے والے اوپر سے منہ گرد پڑتے ہیں۔ میری طرح۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ گرتا۔۔۔ گھٹاتا۔۔۔ چھٹاتا۔۔۔ چھٹاتا۔۔۔ یہی زندگی ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا دھیان برابر اپنی زندگی کے دکھ دینے والے پہلوؤں کی طرف جاتا رہے۔ اس کی افسردگی میرے دل میں بھی افسردگی کی ایک لمبی جگہ بنی تھی۔ مجھے گزشتہ زمانے یاد آنے لگتے تھے، جنہیں میں یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سر حال ایک خوش آئند بات یہ تھی کہ اب جب کہ راجہ نے لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو یقیناً وہ اس پر جلد از جلد عمل درآمد کے لئے بے چین تھی لیکن زبان سے اقرار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سداغ کی اپنی ایک انا ہوتی ہے اور نسا ایت کی اپنی ایک انا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”ٹھیک ہے۔۔۔ پھر میں تین روز کے اندر اندر ہی چپختے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں نہیں فون کروں گی۔۔۔ اور میرا خیال ہے اب میں فون بند کرتی ہوں۔ اس مہینے کے کوئے میں اتنی ہی فضول خرچی کافی ہے۔“

”جب سے تم بقتل تھمارے ”غریب“ ہوئی ہو تب سے بہت زیادہ کجکوس نہیں ہو گئیں؟“

”شکر کہ میں تو غریب ہونے کے بعد ہی کجکوس ہوئی ہوں۔ غریب ہونے کے بعد تو کجکوس ہونا انسان کی ضرورت بن جا رہا ہے۔ لیکن بعض لوگ تو دولت کے انبار رکھتے ہوئے بھی مجھ سے سوچ گنگا زیادہ کجکوس ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ان کے بارے میں کوئی خیال ظاہر کر کے میں اپنے خیالات ضائع کرنا نہیں چاہتا“ میں نے کہا ”میں اب بے چینی سے تھماؤ اس فون کال کا شکر رہوں گا جس میں تم مجھے اپنی آمد کی اطلاع دو گی۔“

”اسی بے چینی سے جس سے تم روزانہ مجھے فون کرتے ہو؟“

اس نے معصومیت سے کہا۔

”دیکھو۔۔۔ تم طرز و مزاج کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے ہو۔ یہ کوئی انجمنی عادت نہیں ہے“ میں نے کہا ”خیر۔۔۔ فی الحال خدا حافظ۔ یہاں آؤ گی تو پھر تم سے دو دو ہاتھ ہوں گے“ میں نے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں آفس چلا گیا۔ آفس میں حسب معمول خاصی مصروفیت رہی۔ بیشتر اسٹاف کے چلے جانے کے بعد بھی میں آفس میں ہی بیٹھا تھا جب فونی آن پہنچا۔ کارٹر اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

”کیا بلک باکس کو کچھ لمحے میں کامیابی نہیں ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔ فونی کے چہرے پر کسمیر جھید کی دیکھ کر مجھے قدرے الم آئی تھی۔

لیکن وہ سکر اتے ہوئے بولا ”اسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”یہ مسئلے مسائل تو میری زندگی میں شامل ہو گئے ہیں۔۔۔ تم فی الحال ان کا ذکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کیا تم نے آنے کی سب تیاری مکمل کر لی ہے؟“

”ہاں۔ لیکن سامان کا سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کریں۔ کس طرح ساتھ لائیں؟“ اس کے لہجے میں ہلا کی معصومیت تھی۔ اس معصومیت بھری تشویش پر مجھے ہنسی آئی۔

”اے دفع کہ سازو سامان کو“ میں نے کہا ”تمہارا خیال ہے کہ لاہور میں فرنیچر اور ضرورت کی دوسری چیزیں نہیں ملتیں؟ یہ اتنا بڑا شران چیزوں کے بغیر ہی آباد ہے؟ پورے پورے امپورینڈ بیڈ روم سیٹ تک ملتے ہیں یہاں اور جنہیں ان چیزوں کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نہیں ایک چھوٹی سی فرنیچر کو بھی ملے گی یہاں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی چیز نہیں ہے بھی مشکوٰۃ چاہو گی؟“

”خواہشات کا بوجھ اتنا مت بڑھاؤ کہ ابتدا میں ہی میری تنگی ہی جان پھر کر رہ جائے۔“

”اتنی آسانی سے نہیں پس سکتی یہ تنگی ہی جان۔ مجھے معلوم ہے اس تنگی ہی جان میں بڑے بڑے جنات مقید ہیں“ میں نے بے پروائی سے کہا ”میں تم اتنا کہہ کر اپنے چند پسندیدہ ترین لمبوسات ضروری کاغذات اور دو پھولی موٹی چیزیں جو جنہیں بہت عزیز ہوں ایک دو سوٹ کیسوں میں ڈالو اور اپنے آپ کو آنے کے لئے تیار سمجھو۔ راشد سے کہنا کہ شفیع شاہ کو فون کر دے، وہ تمہارے لئے جہاز پر ریزرویشن وغیرہ کر دے گا۔ وہاں تمہارا جو بھی کوئی کام باقی ہو وہ بھی اسے بتا دینا۔ وہ کر دے گا۔ تمہارا سازو سامان کسی سسٹم کو اٹھار دے گا۔ مجھے صرف اپنی فلائٹ کے ٹائم سے مطلع کر دینا۔ ماہدولت بہ نفس نفیس جنہیں ریسو کرنے کے لئے حاضر ہوں گے۔ اور کوئی مسئلہ؟“

”مسائل تو غریبوں کے لئے ہوتے ہیں جناب والا!“ وہ لٹھری سانس لے کر بولی ”تمہارے سامنے مسائل کی بھلا کیا اہمیت؟ تمہارے پاس دولت کا چراغ الٰہی بن چکا ہے۔“

”جب تمہیں ”جناب والا“ کے مسائل کا پتا چلے گا تو تم غریبوں کے مسائل بھول جاؤ گی“ میں نے اس سے بھی زیادہ لٹھری سانس لے کر کہا ”فی الحال تم یہ امیر غریب کا موازنہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اندازاً تم تک روانہ ہو جاؤ گی؟“

”جس طرح تم نے چنگی بجاتے ہیں سارا مسئلہ حل کر دیا ہے اس طرح تو میں بھی پہنچ سکتی ہوں۔ بشرطیکہ شفیع شاہ ہمیں اگلی فلائٹ کی ٹکٹیں دلا دے“ وہ بولی۔

”شفیع شاہ یہ بھی کر دے گا۔ تم آنے کی ہاں تو مجھو۔ یو لو آج آنے کے لئے تیار ہو؟ شفیع شاہ جنہیں آج ہی بھیج دے گا خواہ اسے اس کے لئے جہاز چارٹر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

”یہ باکس جس شخص کا ہو گا اس کے لئے تو اس کا استعمال ایک بریف کیسی کی طرح آسان ہو گا۔ اور درحقیقت یہ ایک زیادہ مضبوط زیادہ محفوظ قسم کا بریف کیسی ہی ہے جسے غالباً اس کتہ نظر سے ڈیزائن کیا گیا ہے کہ اس پر کوئی حادثہ گزر جائے تب بھی اس میں موجود چیزیں محفوظ رہ سکیں۔“

نوٹی نے تم مسکراتا تھا لیکن اس وقت میرے چہرے کی طرف انور دیکھ کر ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بولا ”سرا! اب میں سب سے اہم پہلو کی طرف آتا ہوں“ اس نے بلیک باکس کو کتاب کی طرح کھولا اور وہ آسانی سے کھل گیا۔ اس میں ایک فائل رکھی تھی۔ میں نے اپنی بے آبی پر قابو رکھا اور فائل اٹھانے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

نوٹی نے بی فائل ہاتھ میں لے کر بلند کی اور کہا۔ ”اس فائل کے علاوہ اس میں کچھ نہیں تھا۔“ پھر اس نے فائل کھول کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا ”در اس فائل میں اس ایک ورق کے سوا کچھ نہیں ہے“ اس نے ورق کا کونا دو انگلیوں میں دباتے ہوئے اسے آہستہ سے پھرنے لایا۔

”صرف ایک ورق۔۔۔!“ میں نے بے یقینی سے دہرایا اور گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹپک لگایا۔

”میں سرا! صرف ایک ورق“ نوٹی نے دھتے لیجے میں کہا اور فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اس میں نگے ہوئے اکلوتے ورق کا جائزہ لیا۔ وہ صرف ایک طرف سے ٹاپ شدہ تھا۔ صرف اس ایک صفحے کے لئے اس قدر پرکاشہ برپا ہوا تھا کہ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا ”کھودا پہاڑ نکلا چڑھا“ کا صحیح مضمون آج بھیج میں آیا تھا۔

لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اگر ریڈ ڈاٹ والے اس کے لئے اتنا فکر مند تھے تو یقیناً یہ کوئی کام کی چیز تھی۔ میں نے جبکہ کر توجہ سے اس صفحے کو پڑھنا شروع کیا۔۔۔ وہ دراصل کچھ افراد کے ناموں کی فہرست تھی۔ ہر نام کے آگے اس کا عہدہ اور عہدہ بھی لکھا ہوا تھا ان میں سے کوئی عہدہ بھی چھوٹا یا غیر اہم نہیں تھا اور ہر نام کے بھی تقریباً سبھی اہم تھے۔ ان میں آخری نام ریٹائرڈ ڈی آئی بی احمد شجاع کا تھا جس کے ہاتھ میں ”میں نے پولی بار یہ بلیک باکس دیکھا تھا اور جس کے قبضے سے یہ نکل گیا تھا۔ میرے خیال میں تو درحقیقت اسی کے چکر میں اس کی جان چلی گئی تھی۔ وہ کار کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

اس ٹاپ شدہ فہرست کے سوا فائل میں کچھ نہیں تھا اور اس فہرست کا کوئی سرچر نہیں تھا۔ اس پر کوئی تنقید نہیں تھی کوئی نوٹ نہیں تھا۔ کسی بھی قسم کا کوئی مضمون نہیں تھا جس سے پتا چلتا کہ یہ فہرست کس سلسلے میں تھی، کس نے تیار کی تھی، کیوں تیار کی تھی؟ کلچر میں افراد تھے اور ان کا تعلق سات مختلف حکومتوں سے تھا۔

میں نے اس کے بارے میں غلط معلومات دی تھیں۔“  
”ہمارا مطلب ہے باکس مکمل کیا ہے؟“ میں نے اطمینان کی ناکھ لیتے ہوئے پوچھا۔

”کسی بے گتے طریقے سے کھولنا یقیناً بہت مشکل۔۔۔ بلکہ شاید ممکن ہو تا لیکن روز اعلیٰ درجے کے انجینئرز کے لئے کل اسے کھولنا کوئی ایسا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ اعلیٰ اقدارات میں زیادہ تیز بہاؤ ہوا“ نوٹی نے بتایا ”میں خود اس کام کی نگرانی کر رہا تھا۔“

”کوئی دھماکا وغیرہ نہیں ہوا؟“ میں نے پوچھا  
”وہاں؟“ سرا! وہاں تو کوئی زیادہ زوردار کھٹکا بھی نہیں ہوا“ نوٹی نے کارشن مزید رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس میں کوئی جاکھیر چیز نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کسی نے اس کے بارے میں دوسروں کو خوفزدہ رکھنے کے لئے یہ کہانی گھڑی ہوئی تھی۔ انجینئر رش نے الیکٹرونک آلات سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس میں کوئی جاکھیر چیز نہیں تھی۔ ہر حال پھر بھی اس نے تمام تر احتیاطیوں کی قسمیں۔“

نوٹی نے باکس کارشن سے نکالا اور میز پر میزری طرف جھکتے ہوئے مجھے دکھایا۔ باکس جوں کا توں تھا۔ صرف ہینڈل کے قریب اس میں ایک چھوٹا سا میٹس قسم کا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ نوٹی نے ہینڈل کا پچھلا حصہ مجھے دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”یہاں انسان کی نظروں سے ہی بہت کم جاتی ہے کیوں کہ یہ کھٹکے ہینڈل ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہاں آپ کو ایک چھوٹے سے نقطے کے برابر دان سا نظر آئے گا۔ یہ اس قسم کا ٹین ہے جسے عام غور پر الیکٹرونک گزروں میں عام وغیرہ درست کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت الیکٹرونک لاک کا ٹین ہی ہے لیکن اس باکس کے بارے میں کچھ نہ جاننے والے کے لئے اسے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔“

میں نے کمرے کی فاضل لائٹس آن کرنے کے بعد دیکھا تب لائٹن نظر آیا جو ہینڈل کی ہموار سطح پر اسی کے ہم رنگ نقطے کی طرح تھا۔ اس کا کسی کی نظر میں آنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ نوٹی بات بدل کر کہنے ہوئے بولا ”ایسا ہی ایک ٹین اس کے عین سامنے باکس پر لپٹا ہوا ہے۔ ان دونوں کو کسی نوٹسلی چیز سے چند ایک مرتبہ ایک خاص ترتیب سے دبا دجڑا ہو گا اسے الیکٹرونک لاک کا کوڈ سسٹم کچھ سمجھے اس سے باکس نہایت آسانی سے خود بخود کھل جاتا ہو گا لیکن ہمیں چوں کہ وہ ترتیب۔۔۔ وہ کوڈ نہیں معلوم تھا اس لئے شک نے نہ جانے کلات سے کتنی دیر تک اسے ٹھوک بجا کر دیکھنے کے بعد بھی اس جگہ سے ڈرل کیا جہاں لاک کا لیور نصب تھا اور باکس فوراً کھل گیا۔ میں اس کی ہمارت کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

میں نوٹی کی زبانی رپورٹ سن کر ہی انجینئر رفیق کو داد دے بغیر نہیں رہ سکتا تھا وہ ہمارے اہم آدمیوں میں سے ایک تھا۔ نوٹی بولا

اس نے لکھا تھا کہ ”خوش قسمتی“ سے اسے ایک نادر مل گیا تھا۔ میری طرح زندہ دل گرم جوش اور مشرقی تو نہیں خالص انگریز تھا لیکن وہ ”تقاعوت“ کا شہوت دیتے ہوئے اس ساتھ مل کر میری جدائی کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کا یہ برائے فریڈ کسی لارڈ کا بڑا پوتا یا شاید بڑا نواسا تھا۔ یہ اس نے بڑے ”فرزد“ اور ”موجھل“ دل کے ساتھ لکھا تھا۔ ساتھ اس نے اپنی اور اس نے برائے فریڈ کی تصویر بھی بھیجی۔ جس میں وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بائیں والے کمرے تھے۔

پہلے میں نے سوچا کہ اسے چند سطروں کا جواب لکھ دوں گا پھر ارادہ بدلتی کر دیا اور تصویر سمیت تمام خطوط پھاڑ کر پودے کرنے والی مشین میں ڈال دئے۔ اس کے بعد میں دوبارہ پرنٹر متعلق قائلین دیکھنے بیٹھ گیا۔ احساس ہی نہ ہو سکا کہ کب باہر کا اندازہ ہوا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔

میں اس وقت آخری فائل دیکھ رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دفتر سے اٹھنے کے بعد مجھے کہاں جانا ہے۔ کیونکہ یہ تو مجھے بتا دیا کہ میری کوئی کاروباری مصروفیت تو ہے نہیں ہے اچانک شیشے کا زور وار چمکا کا سن کر میں بری طرح چمک اٹھا۔ میرے خیالات درہم برہم ہو گئے۔

شیشہ میرے اپنے کمرے کی بڑی کڑی کاٹو تھا۔ بڑے ساڑ نہ صرف پورا شیشہ بلکہ اس کے پیچھے لگے ہوئے بلائرز بھی ٹوڑ کر قائلین پر آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ناقابل بیان پھلنے ایک شخص اندر آؤگا۔ اس کی بغل میں سب مشین گھنٹی ہوا تھی جس کا اسٹریپ اس کے گلے میں حائل تھا۔ اس کا طبع گوارا بالکل دیکھی تھا لیکن اس کی آمد کا انداز انگریزی نظروں کے ہیروہ تھا۔

وہ غامبی سے رنگ کی شلوار لہجے میں تھا۔ پیروں میں شکاریوں والے نل بوت تھے۔ شلوار کے پائینے اس نے جوتوں ہی میں اڑے ہوئے تھے۔ کڑی کے راستے پہلے اس کی ٹانگیں ہی اڑی آئی تھیں۔ پھر اوپے کی طرح مل کھا کر اتنی پھرتی سے پانی ختم اندر آیا کہ میں اس سے محظوظ ہوا رہ گیا اور خطرے کا احساس مجھے ایک لمحے تاخیر سے ہوا جب وہ مجھ پر گھمن آن چکا تھا۔ وہ چار رنگ کی ایک نمائندگی خصوصیت، ”نئی“ چم کرتی گھنٹی تھی۔ غالباً جرمین تھی اور اس نے یقیناً اسی سے شیشہ توڑا تھا۔ چرے پر اس نے اس طرح ڈھانسا ہوا تھا کہ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور آن آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی، درندگی تھی۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ تو جوان تھا۔۔۔ اور بے حد خوشحال و خوش حال تھا۔ میں سہکتا رہا۔ وہ سخت بیجان ڈھ تھا۔ میری ذرا سی حرکت سے وہ ارادے یا اضطرابی طور پر ٹھیک رہا سکتا تھا اور اس کے ہاتھوں میں کوئی معمولی گھنٹی نہیں۔۔۔ بلکہ مشین گھنٹی تھی۔ بیجان اور

میں کئی منٹ تک اس فرست پر جھکا رہا۔ اس دوران ٹوٹی۔۔۔ نہایت خاموشی اور سکون سے بیٹھا ایک رنگ میری طرف دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا لیکن میں کسی حسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ آخر کار میں نے فائل بند کر کے ٹوٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”اس فرست کی دس فوٹو اسٹیٹ کا پیاں بیس دفتر میں تیار کر لو اور مختلف مقامات پر محفوظ کر دو۔ ایک بیس دفتر میں رکھ دیتے ہیں۔ دو تین تم اپنے ساتھ لے جاؤ اور مختلف جگہوں پر رکھ دو۔ ایک میں گھر لے جاؤ گا۔ اس طرح۔ اطمینان ہو جائے گا کہ اگر اور پینل فرست ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تب بھی کئی کاپیاں ہوں گی۔ کوئی نہ کوئی تو محفوظ رہے گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح اس فرست کا شعلہ مائل ہو سکے۔“

ٹوٹی نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا ”اس وقت تک تم کم از کم اتنا تو کہو کہ ان انگلیوں میں ذہن کر کے ان لوگوں کے بارے میں جس حد تک بھی معلومات حاصل ہو سکیں وہ حاصل کر کے مجھے بتاؤ۔ ہو سکتا ہے اس طرح ہی کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔“

”تمہیک ہے سر اب تو فائر ہند ہو چکے ہوں گے۔ میں کل شام تک آپ کو رپورٹ دوں گا“ ٹوٹی نے کہا۔

ٹوٹی دیر میں ٹوٹی اس نام سے فارغ ہو کر رخصت ہو گیا۔ چھ کاپیاں اور اصل فرست وہ میرے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔ میرا تمام اسٹاف بھی رخصت ہو چکا تھا۔ بچے کچھ دھوکوں کو بھیجی میں نے خود ہی جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں چون کہ آج کل دفتر کو صحیح طور پر دقت نہیں دے رہا تھا اس لئے کئی قائلین ایسی جمع ہو گئی تھیں جنہیں میرا خود دیکھنا ضروری تھا۔ میں نے سوچا تھا توجہ انیس دیکھ کر اور دستخط کر کے ہی جاؤں گا کیونکہ میرا کچھ پانچ نہیں ہوتا تھا تب مجھے کتنی دیر کے لئے دفتر سے غائب ہونا پڑ جائے گا۔ میری عدم موجودگی سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑتا تھا۔ کام تو چلا ہی رہتا تھا لیکن اپنے کاروباری حالات سے زیادہ سے زیادہ باخبر رہنے کے لئے اور اپنے اطمینان کے لئے مجھے جب بھی وقت ملتا تھا میں تمام چیزوں کو ایک نظر دیکھتا ضرور تھا۔

ذاتی خطوط کی فائل میں کئی خطوط کتب میں لگے ہوئے تھے جنہیں کمرال ہی نہیں گیا تھا۔ کیوں کہ ان پر جلی ٹاپ میں ”پرسنل“ لکھا ہوا تھا۔ وہ لندن کی بزنس وین جو ذی فوسٹ کے خطوط تھے انہیں کمرال کر دیکھنے اور پڑھنے میں میرا کافی وقت گزر گیا۔ خطوط ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے ٹاپ شہ نہیں تھے اتنی بڑی بزنس وین میں نے خود جینے کر ذاتی خطوط لکھنے میں نہ جانے کتنا وقت صرف کیا تھا۔ بہت لمبے لمبے خط تھے۔ سب میں یہی شکوہ تھا کہ اب صرف ہماری کمپنیوں کے درمیان کاروباری تعلق رہ گیا تھا۔ ذاتی تعلق کو میں نے بالکل فراموش کر دیا تھا۔ وہ باتیں ”وہ ملاقاتیں“ وہ قریبیں ”وہ انمول“ لمحے سب کچھ میں نے بھلا دیا تھا۔

محسوس ہو رہا تھا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ آوازیں  
نے پہلے بھی سنی تھیں یا نہیں۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرے سوال کا جواب نہیں دے گا لیکن  
غلاف توجہ دے کر فوراً یہ کہنی کہنی ہوئی آواز میں بولا "میں خود ماچھی  
کا بھائی ہوں۔ دیکھو ماچھی۔۔۔"

"اوہ۔۔۔" میں نے بے اختیار گہری سانس لے کر کرسی کے  
پیشے سے سر نکالیا۔

وہ یکدم کچھ بڑک کر بولا "میں آرام سے چوڑے ہو کر مت  
بنو سیٹھ! میرے پاس تمہارے ساتھ ذخائر کثرت کرنے کے لئے قائم  
نہیں ہے۔ انھوں نے میرے آگے آگے چلو۔۔۔ باہر تمہارا جہاز گاڑ  
موجود ہے اس کو گن جھینگے کا آؤ دو۔"

"کیوں؟" میں نے لامنت سے پوچھا "تم مجھے کیوں لینے آئے  
ہو؟" اب میری سمجھ میں آگیا تھا کہ مجھے اس کا لہجہ شناسا کیوں  
محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لیے میں خود ماچھی کے لیے کی بڑی  
مشابہت تھی۔ وہی غراہٹ، وہی اتار چڑھاؤ، وہی الفاظ کی جھنگے دار  
آواز تھی۔ اس کی آوازیں نوجوانی کا ٹیکساں زیادہ تھا۔ وہ یقیناً خود  
ماچھی کا چھوٹا بھائی تھا۔

"کمال ہے!" وہ زہریلے لہجے میں بولا "ہمارے سولہ آدمی  
مروانے اور نوہو کو موت کی منہ میں پہنچانے کے بعد تم اس کے  
چھوٹے بھائی سے پوچھ رہے ہو کہ وہ تمہیں لینے کیوں آیا ہے؟  
تمہیں سزائے موت دینے کے لئے تو اتنی ہی کافی ہو تاکہ تم اپنے  
آپ کو خود ماچھی سے نکل لینے کے قابل سمجھتے لیکن تم نے تو اس  
کے ساتھ باقاعدہ میدان جنگ کھولا ہے میڈا سائیں! اگر وہ مر گیا تو  
تمہارے ساتھ تعلق رکھنے والا کوئی بھی آدمی اس شہر میں زندہ نہیں  
رہے گا۔"

"مجھے تو اس کے ساتھ ٹکر لینا اس کے ساتھ میدان جنگ  
کھولنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں نے تو اس کی منحوس شکل بھی  
کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کا نام سنا تھا ایک دو مرتبہ  
اشتراک میں رہا تھا جن میں اسے زندہ یا مردہ پکڑنے پر دس  
لاکھ کا انعام رکھا گیا تھا لیکن مجھے وہ بات یاد نہیں تھی۔ کیا تمہیں  
معلوم نہیں ہے کہ اس کے سر پرست ملک ریاض نے مجھے سمان  
کے طور پر جتنا سادے کر بلایا اور وہاں مجھ سے پچاس لاکھ آواں  
لینے پر قائل کیے۔"

"اگر آواں دے دیتے تو جھڑا اتنا تڑپتا نہ ہوتا" وہ فرمایا "روپیا  
جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہوتا۔"

"روپیا تو واقعی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا لیکن بات دوپے  
کی نہیں تھی" میں نے اب بھی لامنت سے کہا "تم لوگ اپنے  
آپ کو ایسا فروغ کیوں سمجھتے ہو اور خواہ مخواہ کسی کے گلے  
پر جاتے ہو؟ آخر یہ کیا زبردستی ہے کہ کسی کا گلا پکڑا جائے  
اس سے کہا جائے کہ اتنی رقم نکال دی جائے میرے لیے"

مظاہر کے باعث اس کے ہاتھوں میں ہلکا سا رگڑاش تھا اور یہ  
رگڑاش اس کے ہاتھوں میں سب مشین گن کی موجودگی کو اور بھی  
غریب بنا رہا تھا۔

میرا آنسو چوتھی منزل پر تھا۔ اس سے اوپر ایک منزل اور  
تھی۔ جس طرف کی کھڑکی سے وہ گیا تھا دوسری منزل تھی لیکن اس  
زرف سے عمارت کی ساخت ایسی نہیں تھی کہ کوئی باپ و دھیہ کے  
سارے چہرہ کرچہ بھی منزل کی کھڑکی تک پہنچ سکا۔ یہ عمارت  
بڑی اپنی تھی اور اس میں میرے دفاتر کے مختلف شعبے چھلے ہوئے  
تھے۔ صرف ٹاپ فلور ایک دوسری کہنی کے پاس کرائے پر تھا لیکن  
کچھ عرصہ قبل انہوں نے خالی کر دیا تھا۔ میرے کچھ لوگوں کو اوپر  
لٹٹ ہوا تھا لیکن فی الحال وہ فلور خالی ہی تھا۔ شاید وہ شخص شام کو  
اسی وقت وہاں جا چھپا ہو اور اب کسی طرح اوپر سے کھڑکی کے نیچے  
پرکھو اور۔۔۔

میرے فلور پر بھی دفتری کمروں سے باہر ایک کشادہ لابی تھی۔  
اس میں مری پیمنٹس کے علاوہ دوسرا کارڈز بھی بیٹھے تھے شاید  
بہ بات سب تو نواد کو بھی معلوم تھی۔ اس لئے اس نے ادھر سے  
آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یہ عمارت مجھے میں نے اپنا ہیڈ آفس بنایا تھا، کسی زمانے میں  
ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جو پرانا، بوسیدہ اور غلاب ہو چکا تھا۔ میں  
نے عمارت خرید کر اپنے حساب سے از سر نو تعمیر کرائی تھی اور گر  
کہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھا کہ میرے دفتری ٹھکانے کو  
ایک فطرت لاحق ہو سکتے ہیں، اس کے باوجود میں نے عمارت کی  
صاف میں سیکورٹی و دھیہ کا خیال رکھا تھا اور حتی الامکان حفاظتی  
اقدامات کئے تھے۔ دفتری اوقات میں کسی غیر متعلقہ آدمی کا  
مارت میں گستاخا مشکل ہی تھا لیکن اس وقت رات ہو چکی  
تھی۔ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ باہر لابی میں کوئی کارڈ بھی  
موجود تھا یا نہیں؟ ممکن تھا کہ کارڈ موجود ہو۔۔۔ وہ بھی مسلح شخص  
مانے روزاڑے سے آنے کے بجائے کھڑکی کے راستے کمرے میں  
کھڑا تھا۔

"چلو انھو سیٹھ سائیں!" اس نے گن کو ہلکی سی حرکت دی  
"تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کمال ہے؟" میں نے ہر سکون لہجے میں دریافت کیا۔

"جب موت سامنے ہو تو اس قسم کے سوالات نہیں کیا  
کرتے" وہ جھنگے دار لہجے میں بولا۔ پھر اس نے غصہ و غضب کا  
مظاہرہ کرنے کے لئے ایک کرسی کو زوردار ٹھوکر رسید کی۔ کرسی  
ٹھوکر کر دوڑ پڑی گئی۔

"چلو۔۔۔ انھو۔۔۔" وہ گر جا کر منہ پر ڈھانپا ہوا ہونے کی وجہ  
سے اس کی آواز زیادہ بارعب محسوس نہیں ہوئی۔

مجھے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ایک تک اس کی  
طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "گوں ہو تم؟" مجھے اس کا لہجہ کچھ شناسا

ظلم پر خرم ہو۔

”تمہارے خاندان میں کیا سہمی ڈاکو ہیں؟ کوئی شریف تو نہیں ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جنہیں تم شریف آدمی کہتے ہو ہماری نظر میں وہ زیادہ بڑے ڈاکو ہیں“ وہ نفرت سے بولا۔

”تم مجھے زندہ لے جانے کا خفیہ کیوں مول لے رہے ہو؟ نہیں کیوں نہیں مار دیتے؟“ میں نے پوچھا ”ہاں لے جا کر بھی تو آخر کار تم لوگوں نے مجھے مارنا ہی ہے۔ دل میں لھنڈ تو تمہارے بھی پڑے گی۔ تو پھر خراہ خراہ مچا لے لو کیا کیوں کر رہے ہو؟“

”بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن ہم تم کے غلام ہیں۔ دوسرے یہ ضروری نہیں کہ تمہیں مار دیں یا جائے۔ ہو سکتا ہے دو تین کروڑ روپیہ مل جائے اور نو دہائی بیانیے تو تمہیں چھوڑ دیں یا جائے۔ ملک ریاض اور نور دو دنوں شاید اس بات پر مان جائیں۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں، چپ چاپ میرے ساتھ چلے میں تمہارا قاتل ہے۔ زندگی کی تھوڑی بہت امید ہے۔“

اچانک دروازے پر ایک نہایت ہی خفیف سا کھٹکا ہوا۔ آواز اتنی دھم دھم تھی کہ میں بھی مشکل سے سن پایا تھا۔ دیکھا تو اچانک ڈھانے نے اس کے کان بھی ڈھانپے ہوئے تھے مگر وہ دھم سا کھٹکا اس نے سن لیا۔ سانپ کے پھانکارنے کے سے انداز میں سر کوئی میں بولا ”بلڈنگ میں اس وقت تمہارے گن مین کے سوا کوئی نہیں ہے۔ وہی آیا ہوگا۔ اسے دروازے پر ہی روک دینا اور گن پھینک دینے کے لئے کہہ دینا ورنہ۔۔۔۔۔۔“ اس نے گن کو فیصلہ کن انداز میں حرکت دی اور کونے میں لگے ہوئے آرائشی پرے کے بچھے پلا گیا۔ دو دروں کے درمیان سے اس کی گن کی نال جھانک رہی تھی اور ایک خوں رنگ آنکھ مجھے تنک رہی تھی۔ وہ کینت بظاہر چسکوں ہو جانے کے بعد اندرونی طور پر ابھی تک اندہ بجان زندہ تھا کہ ٹپک بھی نہیں چھپک رہا تھا۔

میں چاہتا تو کرسی سے گرتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے مشین پشیل نکالنے کا رسک لے سکتا تھا مگر اس کی شکل کی وہ بہر میرے لئے بہت اچھی ڈھال تھی۔ بظاہر وہ عمدہ لکڑی سے بنی ہوئی تھی لیکن لکڑی کے تختوں کے نیچے ہر جگہ اسٹیل کی موٹی ڈھکی۔ محراب میں نے یہ رسک لینا ضروری نہ سمجھا۔ میرے نیچے میرے گھٹنے کے قریب چھوٹا سا ایک مٹن موجود تھا جسے گھٹنے سے یا میں دبا چکا تھا۔ اس مٹن کو دبائے سے گاڑ کے قریب بولڈر پر ایک بلب بجلی سی آواز کے ساتھ روشن ہوتا تھا جو اسے خبردار کرنا تھا کہ کہاں اور کس طرح تاس کی مدد کی ضرورت ہے۔

باہر کی طرف میرے کمرے کے ساتھ ہی کھترن کا حجرہ تھا۔ بھی خاصا کشادہ تھا۔ میرے ملا تینوں کو اگر کچھ دیر انتظار کرنا ہوتا تھا تو انہیں اسی کمرے میں بٹھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد چاروں سہیل میں کارکن کے کمرے وغیرہ تھے اور ان کے درمیان کراس

نا قابل برداشت نہیں یہ زبردستی ناقابل برداشت ہے۔۔۔۔۔ اور میں چون کہ اس زبردستی کے سامنے سر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہوں اس لئے میں نے سر نہیں ہچکایا۔ بس اتنی ہی بات ہے۔“

”اپنے ملک میں ہر کام زبردستی ہوتا ہے میڈا سائیں! ہم تمہارے پاس جمولی پھپھلا کر نہیں آسکتا کہ ہم کو ٹیک کاموں کے لئے پچاس لاکھ چندہ چاہئے۔ تم دو۔ اچھا۔۔۔ اب فالٹو بائیں نہیں۔ انھو اور میرے ساتھ چلو۔ فالٹو باتوں سے ویسے بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ بلڈنگ کو ہمارے آدمیوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ ٹیلی فون کی تاریں ہم نے کاٹ دی ہیں۔ اگر میں تم کو لے کر زندہ یہاں سے نہیں نکل سکتا تو تم بھی اس عمارت سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ تمہارے گن مین کو ہم نے اسی لئے نہیں مارا کہ تم دقت سے پہلے خبردار نہ ہو جاؤ۔ ہم کو اچھی طرح پتا لگ چکا ہے کہ آدمی تم خطرناک ہو لیکن تم کو ابھی اچھی طرح پتا نہیں ہے کہ ہم کتنے خطرناک ہیں۔ بے شک تم ہمارے ہی اوڑے پر نہیں ایک ہاتھ دکھا آئے تھے لیکن اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ تم نے میدان جیت لیا ہے۔ ابھی ہمارے سب لوگ نہیں مرے ہیں۔“

”اگر تمہاری حرکتیں یہی رہیں تو وہ بھی مر جائیں گے“ میں نے بے ساختہ کہا ”آخر تم لوگوں کی کھوپڑی میں منفرکیوں نہیں ہے؟ تم لوگ دماغ سے کام نہیں لیتے اسی لئے کتنے کی موت مرتے رہتے ہو۔“

”کیوں اس مت کرواؤ؟“ وہ دبا دبا ”ہمارے پاس تم سے زیادہ عقل ہے۔ صرف ہمارے عقل کے حساب کتاب الگ الگ ہیں۔ ہم اپنی عقل کو اپنے حساب کتاب سے استعمال کرتے ہیں اور تم اپنی عقل کو اپنے حساب کتاب سے۔ اب انھ جاؤ۔ مجھے تم سے اتنی لمبی بات صرف اس لئے کرنی پڑی ہے کہ تم صرف ہمارے نہیں ملک ریاض کے بھی مجرم ہو اور اس نے تمہیں زندہ لانے کی قیمت دس لاکھ رکھی ہے۔ مگر وہ لانے کی صرف پانچ لاکھ۔ میں چاہتا ہوں تمہیں زندہ ہی لے چلوں لیکن اگر تم زیادہ پاؤں دگڑو گے تو میں پانچ لاکھ پر ہی ممبر کروں گا۔“

”میں تمہیں میں لاکھ دیتا ہوں۔ تم مجھے ملک ریاض کا برلاڈ“ میں نے کہا۔

وہ ہنسنے کے غرائے کے سے انداز میں ہنسا۔ یہ آواز سن کر مجھے نور دیا بھیجی کی ہنسی یاد آئی۔ دونوں کے ہنسنے کے انداز میں بھی بڑی مشابہت تھی۔ اب اس کے اعصاب کا ارتعاش دور ہو چکا تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں لرز نہیں رہی تھی، ساکت ہو چکی تھی۔ ”ہم ڈاکوؤں کے تم شریف زادوں سے زیادہ بکے اصول توالتی ہیں سیٹھ سوہتا! ہم احسان فراوش نہیں ہوتے۔ ملک تو ہمیں دس کروڑ میں بھی لا کر نہیں دے سکتے“

”کچھ ایسا ہو گیا جیسے اسے اپنی وفاداری اور غیر متزلزل

ان صورت میں چار راہدار اہل حق ہیں۔ ان میں سے صرف ایک راہی میزبوں اور لٹ تک جاتی تھی۔ اسی راہداری کے نام پر ایک بڑا سا مضبوط اور بھاری بھر کم چلی دودھ تھا۔ اس دھ سے آگے وہ لابی تھی جس میں کوئی نہ کوئی گاڑ ڈیوٹی پر تھا۔

اصل خاصا تھا اور راستے میں قالین بچے ہوئے تھے۔ قدموں کو آواز تو سنائی نہیں دے سکتی تھی لیکن میرے اندازے کے مطابق گاڑ کو میرے کمرے کے دروازے پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر اندہ ستور بند تھا۔ وہ بڑے کشیدہ لئے تھے۔ پردے کے عقب میں کسی آنکھ اور اس سے اوپر دیکھنا بھی کی آنکھ مجھے تک رہی۔ دونوں آنکھوں میں موت کا پیغام تھا۔ میں کو شش کر رہا تھا کہ مجھے جسم کا کوئی چھٹا تک حرکت نہ کرے۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ہوا تھا۔ کمرے میں غضب کا سکوت چھایا تھا۔ یہ سکوت بے شروع گل سے زیادہ اعصاب شکن تھا۔

چند منٹ کا وہ انتظار صدیوں پر محیط محسوس ہوا۔ بالآخر دروازے کے اعصاب شاید جواب دے گئے۔ وہ پردے کی اوٹ سے آیا۔ وہ غالباً اسی نیچے پر پہنچا تھا کہ دم سا جو کھٹکا اس نے سنا۔ "ایراہم تھا۔ بیسیوں چیزیں اس کھٹکے کی وجہ سے ہو سکتی تھیں۔ پہلے سینہ۔۔۔ باہر چلو۔۔۔" وہ اب میز کے بالکل قریب آگیا۔ غرض خیال ہے تمہارا گمن مین وہیں بیٹھا آگے رہا ہو گا۔ میں اسے پیچھے ہوں۔ تم ہی وہاں چل کر اسے گھنٹے کا حکم دو۔ دم لٹ سے پیچھے جائیں گے۔ گاڑی پیچھے ایک جگہ کھڑی ہے۔" موت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا خیال یہی تھا کہ میرا ٹانگی فائدہ پڑی کے لئے رکھا گیا کوئی عام سا گمن مین ہو گا جبکہ وہ دوسرے گاڑوں کی طرح سابق کاغذ پر تھا۔ وہ کافی عرصے سے اہل حق میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس دوران اسے ایک مرتبہ لاکھ نہیں چٹا چڑی تھی لیکن اس نے ابھی تک اسی وجہ سے باہر ہو کر کم از کم ڈیوٹی کے اوقات میں اونگھنا شروع نہیں کیا تھا۔ اس بات کا میں نے کئی بار اطمینان کر لیا تھا۔

میں نے کسی سانس کے لئے روٹوٹو گھڑی کے پٹے سے ٹپک لٹے ہوئے کہا "بات یہ ہے دیکھو!۔۔۔ کہ میں ذمہ سلامت لے کر آئے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں اپنے آپ کو دھوکے کے دم و کرم پر چھوڑ دینے کی نسبت مرنا بتر سمجھتا ہوں۔ مجھے نہیں ہار دو۔ برست مار کر میرا جسم چھلکی کر دو۔ بلکہ اگر میں موت تو آجائے گی۔ تمہارے ساتھ جا کر تو نہ جانے کس کی طرف سے سکنا پڑے۔ ایسی زندگی سے موت ہی بتر ہے۔" پھر اسے ذرا حیرت ہوئی "جسیں زندگی سے پیار نہیں! کیا سانس تک زندگی کی آس رہتی ہے۔ تم اتنی جلدی آس لکھنا توڑے ہو؟" "اس تو مجھے ہے" میں نے جواب دیا "اگر زندگی ہوئی تو جسم

گولیوں سے چھلکی ہوئے کے بعد بھی بچ جائیں گا لیکن زندگی کی آس لے کر قربانی کا کربان کر میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔" اب حیرت کی جگہ غیظ و غضب نے لے لی۔ اس کی لالہ آنکھیں پچھ اور انگارے ہی ہو گئیں۔ سب مشین گن کے ٹریگر پر تھامنا انداز کے بغیر اٹھ کر گاڑ کو خطرناک ہوا سے اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی اٹھتی ٹریگر کو خطرناک حد تک دبا چکی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان شاید صرف بال برابر فاصلہ تھا لیکن اس عالم میں بھی میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ زندگی اور موت کے درمیان تو بیشی ہی بال برابر فاصلہ ہوتا ہے خواہ کسی نے آپ پر گمن تان رکھی ہو یا آپ کے سر پر دست شفقت رکھا ہو!۔۔۔

"سینہ۔۔۔" وہ پتکارا "یہ مت سمجھا کہ میری دھکیاں بس دھکیاں ہیں۔ میں نفع نقصان پر بھی لست بھیج دوں گا اور ملک راج پر بھی۔ میری آنکھوں میں بھائی نور کی تصویر ہے۔ آج صبح میں سیالکوٹ کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں اس کی حالت دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہ زندگی اور موت کے بیچ میں لٹکا ہوا ہے۔ ہم اس کو کسی بڑے اسپتال میں بھی نہیں لے جاسکتے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ میں نے ٹریگر پر اپنی اٹھتی کو کتنی مشکل سے روکا ہوا ہے۔"

میں اسے غضب ناک ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ غیظ و غضب کی حالت میں انسان گرد و پیش کے بارے میں اتنا جو کتنا نہیں رہتا جتنا اسے ہونا چاہئے۔ ویسے اس وقت تو وہ پہلے ہی جتنا جو کتنا رہتا ابھی شاید اسے کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر کچھ دور کمرے کا دروازہ تقریباً اسی رفتار سے کھل رہا تھا جس رفتار سے گھڑی کی منٹ کی سوئی گھمکتی ہے۔

میں اپنے گاڑ فضل الہی کے حمل کی داد دے بغیر نہ رہ سکا۔ کچھ دیر پہلے نہایت خفیف سا جو کھٹکا سنائی دیا تھا وہ آٹے کی "زبان" اس کے کھانچے سے باہر آنے کا تھا۔ فضل الہی نے دروازے کی تاب تقریباً بے آواز طریقے سے اور نہ جانے کتنی آہستگی سے کھانچی تھی لیکن قفل جب اپنی باہر کھلی ہوئی زبان کو واپس اپنے منہ میں کھینچتا ہے تو آواز ضرور پیدا ہوتی ہے عام فضل الہی نے وہ آواز بھی پیدا نہیں ہونے دلی تھی۔ بس ایک خفیف سا کھٹکا ہوا تھا جیسے ماچس کی کوئی تیلی ٹوٹ گئی ہو۔

اس کے بعد اس نے بڑا غریب انتظار کیا تھا۔ دروازے میں باہر سے اندر اور اندر سے باہر دیکھنے کے لئے دو خفیہ سوراخ موجود تھے جو میرے حفاظتی نظام کا حصہ تھے۔ فضل الہی تقریباً سوئی کے ٹاکے جتنے اس سوراخ سے دیکھ رہا تھا کہ باس کی جان کو کوئی فوری خطر لاحق نہیں تھا۔ تھوڑے بہت انتظار کی کھجانش موجود تھی۔ اس لئے وہ بڑے حمل سے اپنا کام کر رہا تھا۔ دیکھو جب پردے کے پیچھے گیا تھا تو دروازہ ساکت تھا۔

اب دروازے میں اتنی جھری پیدا ہو چکی تھی کہ فضل الہی کی



دو کمرے میں آچکا تھا۔ میں میز کے نیچے سے نکل آیا۔  
کنارے پر جہاں سے لکڑی کی دے کے پرچے اڑ چکے تھے وہاں  
کی موٹی پلیٹ پر بھی کمرے نشان پڑ چکے تھے۔ گولیوں نے ان  
پلیٹ پر سے چھلے ہوئے اس کمرے کے پٹے کے پرچے اڑا دیے  
جس پر چند لمبے پتلے تنک میں بیٹھا تھا۔ دو تین گولیاں نیچے اڑا دیں  
بیوست ہوئی تھیں۔

ان چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دیو کی تلاش میں  
دو ڈرائی۔ وہ وہاں نہیں تھا، جہاں چند لمبے پتلے کھڑا تھا۔  
دور جا کر تھا۔ سیون ایم ایم کی گولیوں نے اس کے زوہار  
چیمبروں میں تبدیل کر دیا تھا اور اس کا آدھا چوہا غائب ہو گیا تھا  
اس کے چرے پر صرف ایک آنکھ دکھائی تھی جو اب بھی کھلی  
تھی مگر اب اس میں عادی خون نہیں اترتا ہوا تھا بلکہ حیرت  
اڑا تھا۔

اس کی سب مشین مکن عجیب انداز میں اس کے پیچھے  
آن کر رہی تھی اور اس کے بازو اس کے گرد و مائل ہو گئے تھے۔  
معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے مرنے سے پہلے بطور خاص  
سے مکن کو گلے سے لگایا ہو۔ بعض اتفاقات میں عجیب  
پناہ ہوتی ہیں۔ مکن سے اس نے یقیناً زندگی میں بہت بار  
اس پر بہت اٹھار کیا تھا لیکن مکن نے اس سے وقار نہیں  
مکن بہت کم لوگوں سے دفا کرتی ہے یہ رہنے توڑتی ہے  
نہیں اس لئے میری جی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ میں اس  
زیادہ اٹھار نہ کر سکوں۔ اس کے بل پر اپنے آپ کو زناہ  
محسوس نہ کر سکوں۔

فصل الٹی سپاٹ چہو لئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ دھما  
پرسکون لہجے میں اس نے پوچھا "مرا کیا آپ سے جانتے تھے  
"ہاں۔۔۔ ایک بہت بڑے ڈاکو کا بھائی تھا۔ اور شاید  
بھی ڈاکو تھا" میں نے جواب دیا۔

اسی دوران بیک وقت دو طرف سے گولیاں ملنے کی آواز  
سنائی دینے لگیں۔ ایک تو بجلی کل سے غالباً ہوائی فائرنگ کے  
میں گولیاں چلائی گئی تھیں یا پھر شاید اس کو کڑی کو نشانہ بنایا گیا  
جس کے راستے دو تار بھی اندر کوڑا تھا۔ غالباً بجلی کل میں  
کوئی ساتھی موجود تھا جسے اتنی دیر بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ  
ہو چکا ہے، ہم ناکام ہو چکی ہے۔ وہ بھی جھٹ میں یا پھر  
میں دشمن کو بدعواس کرنے کے لئے بجلی کل سے اس  
فائرنگ کر رہا تھا جس میں اسے دو شئی نظر آ رہی تھی اور  
غالباً اس نے اپنے پاس دو تار بھی کو اندر جاتے دیکھا تھا۔  
بھی تھا محض گولیاں ضائع کر رہا تھا۔ یہ ایک اعتقاد حرکت  
لیکن ایک قدرے تشویش ناک بات ہے تھی کہ بالکل  
سے بھی فائرنگ کی گرج اور شیشے ٹوٹنے کے جھنکے سنائی  
کوئی یقیناً میزیموں یا لٹ کے ذریعے اوپر آچکا تھا یا پھر

سیون ایم ایم کی مکن کی ٹال اس میں داخل ہو سکتی تھی۔ فصل الٹی  
کو بس اتنی سی جگہ درکار تھی۔ مکن کی ٹال دو دروازے کی جھری میں  
داخل ہو چکی تھی لیکن اب مجھے یہ مدد میسر آنے پر خوش محسوس  
ہونے کے بجائے خوف آ رہا تھا۔ ٹریگر پر دبا دھکی کی انگلی کا دباؤ  
خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اس عالم میں اگر کسی کو اچانک بے  
خبری میں آکر گولی لگے تو مصیبت کی اضطراری حرکت کا نتیجہ  
طرح کا ہو سکتا ہے۔ ٹریگر پر انگلی کو جھکا لگ جانے سے مکن گولیاں  
بھی اگل سکتی ہے اور ٹریگر سے یکدم انگلی ہٹ بھی سکتی ہے۔ لیکن  
کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے مقدر میں کیا رد عمل ہوگا؟

اتنی لکڑی اور رگڑ کے لئے میری زندگی میں کبھی آئے تھے  
میں نے دیو کے ذہن کو ایک خاص نکتے سے ہٹانے کی ایک اور  
کوشش کی "دیو! میں کسی بھی اچھے اسپتال میں تمہارے بھائی کے  
علاج کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں  
تھی۔ اس نے تو خواہ مخواہ ملک راضی کی خدمت کرنے کے لیے۔"  
"میں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ اب اٹھ جاؤ" وہ میری بات  
کانتے ہوئے بولا۔

"دیو! تم کچھ بڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ ایک تعلیم یافتہ  
انسان کی طرح مجھ سے دلیل کی زبان میں بات کرو۔ بددوق کی زبان  
میں نہیں۔۔۔" حقیقت یہی تھی کہ وہ مجھے میں اپنے بھائی سے تمام تر  
مشابہت کے باوجود اس کے مقابلے میں کچھ بڑھا لکھا معلوم ہو رہا  
تھا۔

لیکن اس نے میری بات کانتے ہوئے مجھے بھی ایک موٹی سی  
گالی دی اور تعلیم کو بھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ایک ساتھ تین باتیں  
ہوئیں۔ ایک تو میں کرسی سے پھسل کر نیچے جا کر اٹھ اور مکمل طور پر میز  
کی آڑ میں ہو گیا۔ دوسرے فصل الٹی کی مکن کی ٹال نے شعلہ آگلا۔  
تیسرے دیو کی انگلی نے ٹریگر کو اس حد تک دبا دیا جس سے میں  
ڈر رہا تھا۔ موت کا پیا میر بننے کے لئے اس ٹریگر کو صرف بال برابر  
فاصلہ ہی مزید ملے کرنا تھا۔ وہ اس نے ملے کر لیا۔

اس کی صحیح وجہ کا تعین کرنا بہت مشکل تھا۔ میں ممکن تھا کہ  
دیو مجھ سے مجھے کرسی سے پھسلنے دیکھ کر ارادہ ٹانگر دیا ہو اور یہ  
بھی ممکن تھا کہ کپڑی پر گولی لگنے کی وجہ سے ٹریگر خود بخود دب گیا  
ہو جس کا مجھے حدش تھا۔ بہر حال۔۔۔ وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا  
تھا۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ مکن سے ترمیمے رخ سے برست آیا تھا  
اور میز کے کونے پر سے لکڑی کی دے کے پرچے اڑ گئے تھے۔

نیچے پون انچ موٹی اسٹیل کی دے تھی اور اس دے کے نیچے میرا سر  
تھا جو گولیوں کی اس پوچھاڑ سے بال بال بچ گیا تھا۔ بلکہ سے اس  
برست کے بعد ایک بار پھر کمرے میں بلا کا سکوت چھا گیا۔ مکن سینڈ  
کے بعد آخر کار میرے گاؤں فصل الٹی کی محتاط اور پرتلی سی آواز  
سنائی دی "مرا آپ ٹھیک تو ہیں؟"

پہلے سے موجود تھا۔

فضل الہی نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر میں سوچ آف لیا۔ اس غور کا میں سوچ دو جگہ موجود تھا۔ ایک میرے کمرے کی اور ایک باہر لابی میں جہاں فضل الہی بیٹھا تھا۔ پورا غور گپ دہریے میں ڈوب گیا۔

”آپ ہمیں رہنے کا سرا“ فضل الہی نے اندھیرے میں سرگرمی میں مجھے ہدایت کی اور دو واڑہ تھوڑا سا کھول کر باہر کی تھریں کے کمرے میں رہیگ گیا۔ دور کیس وقتے وقتے سے کوئی اب بھی برست مار رہا تھا۔ دو واڑے کھڑکیاں اور پارٹیشن وغیرہ تباہ کر رہا تھا۔ اسے غالباً میرے کمرے تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم نہیں تھا۔ وہ مختلف کمروں میں جا رہی پھیلاتا آگے آ رہا تھا۔ پھر فائزنگ کی نواؤں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک نہیں دو افراد تھے۔

ابھیروا ہوئے ہی انہوں نے بوکھلاہٹ کے انداز میں بے تماشائی برست مارے لیکن پھر شاید انہیں احساس ہوا کہ یہ کوئی بڑا قاتل اور اندھیرا دانستہ طور پر کیا گیا تھا۔ یہ انہیں گھبرنے کی کوئی قدر تھی بلکہ ہی گرا سکوت چھا گیا۔

فضل الہی نے مجھے وہیں رکھنے کی تلقین کی تھی لیکن میرا اس ہدایت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے مشین پائل فلک لیکن پھر اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ یہ جاہل سے لوگ تھے۔ ڈاکو اور پولیس والے دونوں ہماری بھڑک کر اور زیادہ کھن گرج والے اسلئے سے زیادہ مرعوب ہوتے ہیں۔ پہلے میں نے سوچا دیکھو ابھی کی سب مشین کھن اٹھاؤں لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ وہ بدل اور جس حالت میں پڑی تھی وہیں بہتر تھی۔ اس پر دیکھو ہی کے انہوں نے کشائات برقرار رہے یہ مزید بہتر تھا۔

میں نے اندھیرے میں اپنا ناٹنگ کینٹ کو ٹٹلتے ہوئے سب سے نچلے خانے کے ایک طرف ہاتھ پھیرا اور ایک نھا سائین دیا غور بظاہر ایک اسکرپٹ محسوس ہوا تھا۔ نچلے خانے کا ایک چپٹا حصہ باہر آگیا۔ اس میں ایک امریکن سب مشین کھن رکھی تھی۔ یہ دیکھا بھی کی کھن سے بہتر تھی۔

اس دوران پھیلنے والی سے کھڑکی پر ایک اور برست مارا گیا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ دیواروں پر گولیاں چلا کر وہ کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے تو میرے خیال میں انہیں اس کا کوئی سہیے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ تاہم اس برست کے بعد پھیلنے لگیں بھی سکوت چھا گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اندھیرا موجود دیکھ کے سامنے نے مزید گولیاں شائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

میں اس دوران کی تھریں کے کمرے میں پہنچ چکا تھا لیکن فضل الہی اس سے آگے نکل چکا تھا اور راہداری میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اندھیرا غاصا گرا تھا لیکن میں کسی نہ کسی حد تک یا چیزوں کو۔۔۔ لہذا کم ان کی آؤٹ لائن کی حد تک ضرور دیکھ سکتا تھا۔ ویسے بھی میں انہیں کے چپے چپے سے اس طرح واقف تھا کہ انہیں بند کر کے

بھی اندھیرا دھڑک رہا تھا لیکن مجھے یوں ہی اندیشہ سا تھا کہ شاید ڈاکو بھی تاریکی میں عام انسانوں کی نسبت ذرا بہتر طور پر دیکھتے ہو قادر ہوتے ہوں اس لئے میں بہت محتاط تھا۔ دیواروں کے ساتھ لگ کر دھیرے دھیرے آگے کھٹک رہا تھا۔

غارت میں ایک بار پھر سکوت چھا گیا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس سکوت اور اندھیرے میں کس کوٹھے میں موت گھٹات لگائے کھڑی ہو اور گولیوں کی ترخا بہت کے ساتھ اپنا بیٹام کسی کی لوح بدن پر نقش کرے۔

میں اس راہداری میں خاصا آگے بڑھ چکا تھا جو باہر لابی تک جاتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ فائزنگ کرنے والے دونوں آدمیوں کو ہمیں کیس ہونا چاہئے تھا۔ انہیں اندھیرا زیادہ جھٹکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ فضل الہی مجھ سے آگے نہ جانے کہاں تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں اندھیرے میں اس غور پر ان کی تلاش جاری رکھوں اور ہر کمرے میں جھانکوں یا خاموشی سے کہیں گھٹات لگا کر ماسکٹ ہو کر انتظار کروں کہ کب کوئی کہیں اپنی موجودگی کا سراغ دے گا۔ اس قسم کے معرکے کبھی کبھی صرف مزید سکوت اور انتظار سے بھی جیتے جاسکتے تھے۔

ابھانک پورا غور ایک بار پھر منور ہو گیا اور میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ فضل الہی تین لابی میں پہنچ چکا تھا اور اس نے اندھیرا میں سوچ آن کر دیا تھا۔ دیواروں اور دروازوں پر جگہ جگہ گولیوں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ لابی سے راہداری میں کھٹنے والا میں دو واڑہ کافی لمبا چڑھا اور مضبوط تھا۔ فضل الہی وہ دو واڑہ کھول کر اندر آیا اور سیدھا حائرے کمرے کی طرف آئے گا۔ کھن بے پروائی سے اس نے ہاتھ میں لٹکانی ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح ہر سکون تھا۔

میں راستے میں ہی اس کے سامنے آگیا۔ وہ ٹھٹھکا نہیں۔ شاید اسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی نکل آیا ہوں گا اور راستے میں کہیں اسے ٹل جاؤں گا۔

”وہ دونوں بھاگ گئے سر“ اس نے اطلاع دی ”میں نے ان کا چھپا کر کے کے بجائے یہاں رہنا بہتر سمجھا۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ لابی میں پہنچا۔ میں نے اندھیرا دھڑکنا۔ چاروں طرف گولیوں کے نشانات موجود تھے جو چیزیں ٹوٹنے والی تھیں وہ ٹوٹ گئی تھیں۔ استغناء کے نواز وغیرہ میں سوراخ ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے محض دہشت پھیلانے کے لئے چاروں طرف فائزنگ کی تھی اور اس وقت شاید ان کی اپنی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ شاید انہیں ایک دفتری غارت میں محض دو افراد کی موجودگی میں کسی خاص مزاحمت کی توقع نہیں تھی یا مجھ کو کافی زور تھے بھی انہوں نے بھانسنے میں اتنی جلد کھائی تھی۔

ابھانک فونی دکاریوں کی طرح محتاط انداز میں جھٹکے کے ساتھ

آفس میں آکر گولیوں کی پوجا کر دی تھی لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بس دیواروں کا پلستر ڈھنسا تھا اور کھڑکیاں دروازے یا فرنیچر ٹوٹا تھا۔ جبکہ ان دونوں کے لئے صرف ایک ایک کلاں کافی رہی تھی۔

”جو چیز جہاں ہے اور جیسی ہے“ اسے وہیں اور وہیں ٹھہرا دو“ میں نے کہا۔ ”آؤ۔۔۔ ذرا رسمی کارروائی بھی پوری کر لیں پوری کو اس واقعے کی اطلاع بھی دے دیں۔“

ہم واپس اوپر میرے کمرے میں آئے دھوا بھی کے کورہرے سے خون ایک لٹروں کے سی صورت میں بہہ رہا کہ کچھ چلے میں جذب ہو گیا تھا اور کچھ جم گیا تھا۔

”یہ آپ کے کمرے تک کیسے پہنچ گیا؟“ ٹونی نے حیرت پوچھا۔

”کھڑکی کے راستے“ میں نے کہا اور حلقہ انداز میں گولی ڈرا سر نکال کر گلی میں بھانکا۔ عقبن گلی سٹان پڑی تھی۔ گولی نہیں چلی۔ فائرنگ کی آواز سن کر بھی کوئی اس گلی میں نہیں تھا۔ جن غاروں کی عقبن کھڑکیاں اس گلی میں کھلتی تھیں ان۔ بھی کوئی بھانکا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک تو یہ خارج کارروائی اور دفتری قسم کی تھیں۔ رات کے وقت شاید ان لوگ تھے ہی نہیں۔ اگر تھے بھی تو کم از کم گردن نکال کر بھاگ رہے تھے۔

میں نے اوپر دیکھا۔ چھت کی مندر میں ایک رتی بڑی جگہ تھی جو میری کھڑکی تک آئی ہوئی تھی۔ میرا اندازہ درست نکلا تو دھوا بھی پہلے چھت پر گیا تھا۔ وہاں سے رتی کے سارے کرا تک اترا تھا“ میں نے بڑبڑائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”الہا کہ مجھے ایک بھی گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔“

پھر میں نے دیو کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹونی کو ”نوروا بھی کا بھائی دھوا بھی مجھے لینے آیا تھا۔ ملک ریاض اور نوروا بھی کے حضور پیش کرنے کے لئے۔“

”یہ لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں؟“ ٹونی نے انجھن پوچھا۔

”موت کے خلف برائے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی موت اس طرح ہی لکھی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تین غیب طاقتور ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں۔ ملک ریاض، نوروا، دھوا اور عالم شیر۔ ملک ریاض اور عالم شیر نے مل کر ابھی نوروا دھوا بھی اور اس کے گروہ قربانی کا بکا بنایا ہوا ہے۔ اس گروہ کے کافی لوگ ہمارے ہاتھوں شکرگاہ کے علاقے میں مارے گئے تھے۔ میں اب مرچے ہوں نوروا دھوا بھی خود موت اور زندگی کی کشاکش میں جلا تھا۔ میرا خیال ہے اب اس گروہ کے بچے کچھ لوگ تو ہمارے سامنے آئے گا کوشش نہیں کریں گے لیکن یقین سے کچھ کا بھی نہیں جاسکتا۔ لوگ عقل سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر حال اس گروہ کے عمل

لگ کر بیڑیاں چڑھا دکھائی دیا۔ وہ چوک چوک کر قدم رکھ رہا تھا۔ سائنسٹر والا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ گویا کسی بھی لئے کسی مسلہ شخص کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھا۔ گمن کو استعمال کرنے کے معاملے میں اس شخص کی پچھتی کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ وہ ایک ایسا نوجوان تھا جو صرف ریوالور سے سب مشین گن والوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس کی کوئی گولی شاذ و نادر ہی ضائع جاتی تھی۔ بیڑیوں اور لابی کے درمیان بیٹھے کا پارٹیشن ٹوٹ چکا تھا اس لئے ٹونی نے ہمیں دوری سے دیکھ لیا اور بائی بیڑیاں وہ تیزی سے چڑھ آیا۔

”سرا آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ وہ تھوٹیل زور انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ تم تو جا چکے تھے“ میں نے دریافت کیا۔

”سرا میں اپنا آفس بند کرنے کے بعد واپسی میں دوبارہ دوسرے گزر رہا تھا جب میں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں آفس میں کوئی گزر رہا ہے۔ میں بھاگ کر آیا۔ میں نے گاڑی بھی سڑک کے کنارے چھوڑ دی ہے۔ اور آہا تھا تو قہر زور پر مجھے اوپر سے دو آدمی تیزی سے بیڑیاں اتر کر بھاگتے نظر آئے کمرے تک کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ چوڑ پر ڈھالے تھے۔ ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ میرا ذہن فوراً نوروا دھوا بھی واسلے واقعے کی طرف گیا اور میں نے قہر زور پر بیڑیوں کے موڑ پر ہی انہیں گولی مار دی۔ اگر مجھے ایک ٹائٹل کی بھی تاریخ ہو جاتی تو وہ مجھے چلتی کر دیتے ان کا انداز تھا رہا تھا کہ وہ سامنے آئے دھالے ہر شخص کو چیلنج کر دیں گے“ ٹونی نے حسب عادت دھتے لیچے میں بتایا جیسے کسی عام سے واقعے کے بارے میں بتا رہا ہو۔

”بہت اچھا کیا تم نے“ میں نے کہا ”جو کام ہم سے رہ گیا تھا وہ تم نے مکمل کر دیا۔ ان کی لاشیں کہاں ہیں؟“

”بیڑیوں میں پڑی ہیں“ ٹونی نے بتایا۔

”پچھلی گلی سے جو فائرنگ کر رہا تھا وہ بچ کر نکل گیا ہوگا“ میں نے کہا۔

”میں دیکھ کر آؤں سرا“ ٹونی نے مستردی سے پوچھا۔

”نہیں۔ اسے جانے دو“ میں نے بے پردائی سے کہا ”ملک ریاض اور نوروا دھوا کو کوئی تانے والا بھی تو ہونا چاہئے کہ مجھے انھارنے کی سم کا کیا بنا؟“

ٹونی کے ساتھ میں نے اور فضل الہی نے نیچے تیسری منزل پر جا کر ان دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں دیکھیں۔ دونوں آڑے ترختے پڑے تھے گھیس ان کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ انہیں صرف ایک ایک گولی لگی تھی۔ ایک کے قلموں میں اتر گئی تھی اور دوسرے کی پیشانی میں بیوست ہوئی تھی۔ انتہائی ہنگامی حالات میں بھی صاف سحرانندانہ لگنے میں ٹونی کا جواب نہیں تھا۔ انہوں نے

منائے کے بعد شاید ملک ریاض اور عالم شیر اپنی اپنی طاقت کے ساتھ سامنے آئیں گے۔ ابھی وہ غیر اہم مشغلوں کو مروا رہے ہیں۔  
 ”ہر اس سے پہلے ہی میں کچھ کر لینا چاہئے“ ٹوٹی بولا ”ورنہ یہ خدائے خواہ ناخواہ سر ہمیں تنگ کر تارے گا۔ جبکہ اس سے کہیں بڑا خطرہ رہے گا۔“  
 ”اصل خطرہ وہی ہے“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”یہ ملک ریاض اور عالم شیر جیسے لوگوں کی میری نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔“

میں نے عام فون کا ریپورر اٹھایا۔ وہ بے جان تھا۔ عمارت کے ٹیلیفون بورڈ کا کنکشن واقعی ان لوگوں نے کاٹا ہوا تھا لیکن میرا ڈائریکٹ ٹیلیفون ٹھیک تھا۔ اس کا کنکشن کاٹا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی حفاظت کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے متعلقہ پولیس اسٹیشن کو واقعے سے مطلع کیا۔

پولیس کی کارروائیوں وغیرہ میں دو گھنٹے لگ گئے۔ پھر بھی ہمارا کم ہی وقت ضائع ہوا تھا۔ کیونکہ یہ شہر کے ایک بڑے اور ہارسوخ آدمی کا معاملہ تھا۔ میں نے اب واقعے کو ابتدائی سے رپورٹ کر دیا تھا۔ میں نے اپنے بیان میں لکھو ادا تھا کہ بڑے ذمیدار اور مشہور یا کسی شخصیت ملک ریاض کے اشارے پر فوراً مجھے نے مجھے یہ لٹال بتایا تھا ہمارے آدھان وصول کرنے کی کوشش کی تھی ”میرا اور میرے ساتھیوں کا ان سے مقابلہ رہا تھا اور آج نورد کے بھائی نے مجھے اغواء کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سب کچھ بے کم رکست تیار کر اب اس معاملے کو بالکل سیدھے طریقے سے پنڈل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہر چیز ریکارڈ پر آجانی چاہئے اس کے بعد جو ہو گا وہ کیا جائے گا۔

لاشیں اٹھائی جا چکیں اور دفتر خالی ہو چکا تو میں نے ٹوٹی کو ہدایت کی کہ صبح سے وہ سیکورٹی کے انتظامات دیکھنے کو لے پھر میں نے جنرل شیخ کو اس کے گھر فون کر کے ہدایت کی کہ صبح سے وہ ہنگامی بنیادوں پر دفتر میں حرمت وغیرہ کا کام مکمل کرانے تاکہ ملازمین، خصوصاً خواتین کا کارکن پریشان یا خوف زدہ نہ ہوں۔ گو کہ میرے ہاں کام کرنے والوں میں خوف زدہ اور پریشان ہونے والوں کی تعداد اہمیت کم تھی پھر بھی میری کوشش یہی رہتی تھی کہ انہیں حالات میں کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس نہ ہو۔

ان پھلوں سے فارغ ہو کر میں گھر آیا اور کھانے وغیرہ کے بعد سو گیا لیکن اس رات سکون کی خیر نصیب نہیں ہوئی۔ صبح کازب کے وقت جبکہ میں کمری نیند میں تھا ایک خاص الارم نے مجھے جگایا۔ میرا کمر سا آٹھ پروف تھا۔ اس کے باوجود فائرنگ کی ڈر کم کسی آواز میں اندر پہنچ رہی تھیں لیکن مجھے ان آوازوں نے نہیں ”الارم نے جگایا تھا۔ میری کوشش کی دیواروں پر غاروار آدموں کی حائل قلع باڑھ تھی اور رات کے وقت ان آدموں میں کرنٹ ڈرنا تھا۔ میرے کمرے اور گیٹ ہاؤس میں الارم اس وقت جتا

تھا جب کوئی ان آدموں کو کسی بھی چیز سے چھوئے یا کانٹے کی کوشش کرتا تھا۔  
 ایک بار پھر میں گمن سنبھال کر کمرے سے نکلا تو اندازہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے دو طرف سے کوشش میں داخل ہوئے کی کوشش کی تھی۔ ایک تو عقبی دیوار کے اوپر سے اور دوسرے گیٹ چلا گیا کہ رات کو میرے ہاں عموماً دو گاڑو ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ دونوں طرف زبردست فائرنگ جاری تھی لیکن یہ مقرر کہ جلد ہی اختتام کو پہنچ گیا۔

اس میں حملہ آور دو لاشیں چھوڑ کر بھاگے تھے۔ ایک اس شخص کی تھی جس نے پھل دیوار پر چڑھ کر تاروں کانٹے کی کوشش کی تھی۔ دوسرا وہ تھا جس نے گیٹ چلا گئے کی کوشش کی تھی۔ میرے گاڑو طارق خان نے بتایا کہ حملہ آور چھ سات تھے۔ لاشوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی ڈاکو ٹائپ ہی چیز تھے۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ہی رات میں وہ لوگ کیسے بعد دیکرے میرے دفتر اور گھر پر حملہ کریں گے۔

ان حملوں کے لئے انہوں نے کوئی خاص منصوبہ بندی بھی نہیں کی تھی۔ بس پونی چڑھ دوڑے تھے۔ حالانکہ اب تک انہیں اندازہ ہو جانا چاہئے تھا کہ میں اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والا شکار نہیں تھا لیکن شاید ان پر روایتی ڈاکوئوں والی جذباتیت غالب آگئی تھی۔ وہ شاید صرف کوئی روٹول ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ مجھے یہ بتانا چاہئے تھے کہ اتنی مار کھانے اور اسے آدمی مروانے کے بعد بھی وہ نہ خود چین سے بیٹھیں گے اور نہ مجھے چین سے بیٹھنے دیں گے لیکن یہ کوشش انہیں ممکن ہی نہ تھی۔ اتنے آدمی انہوں نے مزید مروا دئے تھے اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔

میں نے اس واقعے کی بھی رپورٹ درج کرا دی اور اپنے بیان میں ملک ریاض اور فوراً مجھے پر شبہ ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ عالم شیر کا نام بھی لکھو ادا۔

دوسری صبح جب چڑھتے ہی میں نے ڈی آئی جی صاحب کو فون کیا۔ وہ ابھی آفس نہیں پہنچے تھے۔ گھر فون کیا تو گھر پر مل گئے۔ ان کا نام ملک شحات علی تھا۔ یعنی ملک ریاض راہی کی طرح وہ بھی ملک ہی تھے۔

میرا نام سننے ہی بولے ”چھوہری صاحب! ضرور کوئی کام ہو گا جیسی آپ نے صبح ہی صبح کیا دیا ہے۔ آپ ہمیں صرف اسی وقت یاد کرتے ہیں جب کوئی کام ہوتا ہے۔“  
 ”پولیس والوں کے بارے میں وہ بڑی مشہور کمادت ہے نا۔۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”ملک صاحب میری بات کانٹے ہوئے بولے“ نہ ان کی درستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔“

”جی ہاں۔ آپ سے بہتر اس معاملے کی حقیقت سے کون واقف ہو گا“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”میں اسی پر عمل کرنے کی

کو شش کرتا ہوں۔ نہ آپ سے زیادہ دوستی کا بخشنے کی کوشش کرتا ہوں اور نہ ہی ہم نے کبھی آپ سے دشمنی مول لینے کا سوچا ہے۔ آخر ہمیں اسی شرمیں رہنا ہے۔“

ملک صاحب نے خوش دلی سے غصہ لگایا اور کہا ”چوہدری صاحب! اصل میں اس شرمیں آپ ہی جیسے لوگوں کو رہنا ہے۔ ہمارا کیا ہے؟ ہم تو ملازم آدمی ہیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ ہمارا تو کبھی کبھی ٹھکرے تک بدل جاتا ہے۔“

”آپ کہیں بھی رہیں ملک صاحب! بادشاہی تو آپ ہی جیسے لوگوں کی رہتی ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ ہم جیسے لوگوں کو ہی اس شرمیں رہنا ہے جبکہ کچھ لوگ ہمیں اس شرم سے نکالنے پر تھے ہوئے ہیں۔ آپ کی بادشاہی میں ہمارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔“

”کیا ہوا چوہدری صاحب؟ آپ کی طرف کس نے آنکھ اٹھانے کی جرأت کی؟ آپ نے تو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو اتنا مضبوط کر رکھا ہے کہ آپ سے الجھ کر کوئی بچھڑانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔“

”وہ تو درست ہے۔ لیکن بعض اوقات قانون کے دائرے میں رہنا بھی منگنا پڑنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہتر مرگ تک پہنچنے سے پہلے نہیں بچھڑاتے۔ بلکہ بعض لوگ تو زندگی میں بھی بچھڑاتے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی ایسے لوگوں کا کوئی بندوبست ہو جائے۔“

”ہوا کیا چوہدری صاحب؟“ ملک شفاعت علی نے تشویش سے پوچھا۔

”میں نے قدرے ترمیم کے ساتھ انہیں تمام واقعات سنائے اور کہا ”حقانے پچھروں سے مننے کے لئے مجھے قانونی مشیران کے طور پر رہنا تو جوں کے ایک پورے شکل کی خدمات حاصل ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے یہ لے چکر ہیں اور ان پچھروں کی طوالت سے فائدہ اٹھا کر ملک ریاض یا نور دماغی جیسے لوگ اپنے مقاصد پورے کرتے رہتے ہیں۔ میں ان پچھروں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے احتیاطاً ایف آئی آر درج کرا دی ہے تاکہ کل کو آپ جیسے میرے مہربان ہی یہ طعنہ نہ پڑے لگیں کہ میں نے قانون کو ہاتھ میں لے لیا اور صحیح راستہ اختیار نہیں کیا۔ ویسے بھی کبھی کبھار دھول مٹی اور درجنوں کے انبار میں دبی ہوئی ایف آئی آر بڑے کام آجاتی ہے۔“

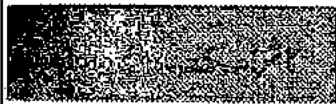
میں نے محسوس کیا کہ ساری باتیں سننے کے بعد ملک شفاعت علی کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ دھیمے سے لمبے میں بولے ”چوہدری صاحب! آپ کو کچھ اندازہ ہے آپ نے کتنی بڑی بات کی ہے؟ ایک ڈاکو جس کے سر کی قیمت دس لاکھ مقرر ہے اس کا تعلق ایک بڑے زمیندار اور خاصی مشہور سیاسی شخصیت سے ہے؟ یہ ایک

پراسرار ہولناک اور ناقابل فراموش کہانیوں

کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

زندگی کا جسم



اردو بازار لاہور

بہت بڑا الزام ہے اگر یہ بات پریس میں آگئی تو خونخوار ہوجائے گا۔“

”آپ میری پوری رام کہانی سننے کے بعد بھی اسے الزامی کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ ”صاف سمجھئے گا چوہدری صاحب! کسی بھی تادمے کا عدال سے فیصلہ ہونے سے پہلے اس قسم کی ہر بات ہمارے لئے الزامی ہوتی ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر سرے پر قانونی اور ٹیکنیکل زبان ہی استعمال کریں۔“

”میرے آپ کے قانونی اور ٹیکنیکل زبان استعمال کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن کم از کم آپ کے ذہن میں تو ہر معاملے کی کجی تصویر ہونی چاہئے۔“

”ہمارے ذہن میں کیا ہے اور کیا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑا چوہدری صاحب! ملک شفاعت علی نے میرے گھر کے لئے میں کہا ”ہم سرکار کے ملازم ہیں۔ قوانین مضابطوں اور قاعدوں کے تقاضوں میں پکڑے ہوئے مجبور لوگ۔ ہمیں ہر کام ایک خاص دائرے میں رہتے ہوئے کرنا ہوتا ہے۔“

”یہ کام کرنے کی نہیں۔ کام نہ کرنے کی باتیں ہیں ملک صاحب“ میں نے قدرے سوجھے میں کہا ”جب آپ لوگ کسی کام کا نتیجہ کر لیتے ہیں تو ایک معمولی کالیکٹبل بھی پڑا دو ہزار کی چوری کے محض شے میں پکڑے ہوئے کسی غریب آدمی کو اذیت داک طریقے سے سسکا سکا کر ہلاک کر دیتا ہے۔ اس وقت اسے

کوئی قانون کا قاعدہ کوئی ضابطہ یا دیکھ نہیں رہا۔ اگر یاد رہتا بھی  
 کا تو اسے اس کی پروا نہیں ہوتی ہوگی۔ اسے اس نے سمجھنے کے  
 لیے مطلب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب آپ کو کوئی کام کرنا نہیں  
 پڑتا تو ایک ڈی آئی جی کو بھی تمام قوانین، ضابطے اور قاعدے یاد  
 آجاتے ہیں۔ وہ انہوں میں جھنسا ہوا ایک مجبور شخص بن کر رہ جاتا

ہے۔ دیکھیں چوہدری صاحب۔ آپ ایک لمبی بحث چھیڑ رہے  
 ہیں۔ ملک صاحب، بیگم سی بی بی سے بولے "اس موضوع پر ہر  
 راجہ بڑی باتیں" بڑے بڑے کرے ہوئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے یہ  
 نظام کی خرابیاں ہیں اور کوئی فرد واحد انہیں درست نہیں کر سکتا۔  
 آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کوئی جاہل سا پولیس والا نہیں  
 ہوں۔ بارہا ۱۴ ہوں۔ سی ایس بی ہوں۔ چار سال باہر رہ کر آیا  
 ہوں۔ آپ کی طرح میری بھی شدید خواہش ہے کہ اس ملک میں  
 قانون کی صفائی ہو۔ ہر کام قاعدے، قانون اور قریبے سلیقے سے ہو  
 ۔ اور میں کم از کم اپنے ذہن پارٹنر کو سہارا دے کر اپنی سی  
 کوشش بھی کر رہا ہوں لیکن اس ملک میں کسی بھی چیز کی اصلاح  
 سب سے مشکل کام ہے۔ آپ اپنے انڈسٹریسٹس میں جھانک کر  
 دیکھیں۔ ایک آدمی کا اگرچہ انفرادی اکاؤنٹ ہے تو وہ اسے صحیح طرح  
 نہیں چلا سکتا۔ ان چھ آدمیوں میں سے کسی کا گھر کسی طرف ہوگا،  
 کسی کا کسی طرف۔ کسی کی کوئی رائے ہوگی کسی کو کوئی اور رائے  
 زندگی کے بارے میں ہر ایک کا نظریہ اور ہر ایک کا طرز عمل مختلف  
 ہوگا۔ ایک شخص جب چار چھ آدمیوں کے گھر کو اپنی مرضی کے  
 مطابق صحیح طرح نہیں چلا سکتا تو آپ کیسے توقع کرتے ہیں کہ کوئی  
 اتنے بڑے محکموں۔ اور پھر اتنے بڑے ملک کو صحیح طرح چلا سکے  
 گا؟ اور پھر ان کاموں میں بہت سا وقت بھی چاہیے ہوتا ہے۔  
 اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ابھی کسی جگہ کے ایک کونے سے  
 تھوڑا سا بچرا صاف کر کے فارغ ہوتا ہے۔ "ورا سکون کا سانس لیتا  
 ہے اور عین اسی وقت اس کا مین اور تباہ ہوجاتا ہے۔ بے شمار  
 مسائل ہیں چوہدری صاحب! جو جس کر پی پر بیٹھا ہے وہی وہاں کا  
 حال بہتر جاتا ہے۔"

"ان سب باتوں سے میں اچھی طرح آگاہ ہوں ملک  
 صاحب! میں نے نرم لیے میں کہا "لیکن ملک یا محکموں کو کوئی  
 ایک شخص نہیں ملے گا ایک پوری مشینری چلائی ہے۔"  
 "وہی تو میں عرض کر رہا ہوں" ڈی آئی جی صاحب میری بات  
 کاٹتے ہوئے بولے "مگر مشینری درست نہیں ہے۔ اس کی حالت  
 بہت خراب ہے۔"

"میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں ڈی آئی جی صاحب" میں نے  
 ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "کہ آپ کو میری بات کا تعین  
 ہے یا نہیں؟ تو یہ بھی اچھی اور اس کا کردہ ملک ریاض کا ہر اول دستہ  
 ہے۔ یا یوں کہنے کے ہر اول دستہ "خا" میں نے اس کی کمر توڑ دی

ہے۔ لیکن یہ سب کچھ خود حفاظتی کے مسئلے میں ہوا ہے۔ آپ کہ  
 رہے ہیں کہ ملک ریاض اور نو رو ماچھی کے گھر جوڑی بات اگر  
 پریس میں آگئی تو براہنگام کھڑا ہو جائے گا۔ مجھے حیرت اس پر ہے کہ  
 یہ بات ابھی تک پریس میں آئی کیوں نہیں؟ اگر اب بھی آئی تو بڑی  
 تاخیر سے آئے گی۔"

"چوہدری صاحب! کسی بات پر تعین رکھنا اور بات ہے" اسے  
 عدالت میں ثابت کرنا اور بات "ملک شفاعت علی نے نہایت تحمل  
 سے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر یہ بات عدالت میں  
 ثابت ہوئے بغیر پریس میں آگئی تو ہم سے لوگوں کو لینے کے دینے پڑ  
 جائیں گے۔"

"کیوں؟" میں نے جیسے لیے میں پوچھا۔  
 "میں صوبائی حکومت کا ملازم ہوں چوہدری صاحب! بعض  
 معاملات میں مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ملک ریاض کی پارٹی  
 بہت چھوٹی ہے لیکن اس قسم کے لوگوں کے پاس نہ جانے کیا  
 جادو ہوتا ہے۔ ملک ریاض کی مرکز میں بھی بڑی دور دور تک پہنچ  
 ہے۔ مجھے تو یہ بھی رپورٹ ملی ہے کہ اس الیکشن میں اپنے طبقے سے  
 اس کے کامیاب ہونے اور فیڈرل فکشن ہونے کے بڑے قوی  
 امکانات ہیں۔ ان معاملات میں آج کل سیاسی طاقتوں کے  
 درمیان پہلے ہی سے معاہدے طے پا جاتے ہیں۔"

"ڈی آئی جی صاحب! میں نے خاص طور پر انہیں نام کے  
 بجائے عموماً سے خطاب کیا "کم از کم مجھے آپ کے منہ سے اس  
 طرح کی بات سننے کی توقع نہیں تھی۔ ایک طرف آپ بات کرتے  
 ہیں کہ آپ بھی میری طرح اس ملک میں قانون کی عملداری اور  
 کوئی طریقہ قریب دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف آپ اپنے  
 بڑے عمدے دار ہوتے ہوئے شخص اس بنا پر ایک شخص سے  
 غافل ہیں کہ وہ بہت بڑا زمیندار اور سیاسی اثر رسوخ کا مالک  
 ہے کیا ان دونوں خصوصیات کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو چاہے کرے  
 پھرے؟ ڈاکوؤں کے گروہ کے گروہ پالے۔ دولت مندوں کو اغوا  
 کرے۔ ان سے بھاری ٹاؤن وصول کرے۔ کل وغارت  
 چائے۔ لوگوں کے گھروں اور دفتروں پر حملے کرے۔ ان سب  
 چیزوں کا انشس مل جاتا ہے اسے؟"

ڈی آئی جی صاحب خاموش رہے۔ شاید وہ اس وقت میرے  
 لیے پر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے بات  
 جاری رکھتے ہوئے کہا "ملک صاحب! میں اس وقت برا حیران ہوا  
 تھا جب وہ منظور ڈاکو بڑے معززانہ لباس میں "ملک ریاض کے ہاتھ  
 میں ہاتھ ڈال کر اس بھرے چڑے شہر کی شاہراہوں سے گزر کر  
 میرے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھا تھا اور مجھے ان کا شرف پہنچائی  
 حاصل کرنا پڑا تھا لیکن اس سے زیادہ حیران میں اس وقت آپ کی  
 باتیں سن کر ہوا ہوں۔ ہماری آپ سے دوستی تو ایک طرف رہی۔  
 بڑے بوڑھوں کی نصیحت کے مطابق ہم نے پولیس والوں کی دوستی پر

رنگ نہ دیں۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا لیکن میں احتیاطاً  
کو بھی چوڑی امیدیں دلانا نہیں چاہتا۔ میری پوزیشن ویسے بھی  
کل کچھ اچھی نہیں ہے۔ میں آئی جی صاحب کی گڈ کس میں  
ہوں۔

”انسان کو صرف کام اچھا کرتے رہنا چاہئے اور گڈ کس  
ہونے یا نہ ہونے کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ  
اب اس مقام پر ہیں کہ آپ کے لئے ان باتوں سے فرق نہیں  
چاہئے۔“

”مہذرت کر کے کہوں گا چوہدری صاحب! آپ کا ظاہر  
غلط ہے۔ سرکاری ملازم بھی اس مقام پر نہیں پہنچتا کہ اسے کوئی  
گڈ کس میں رہنے یا نہ رہنے کی پروا نہ رہے۔ سرکاری ملازم  
بیشہ رتی پر چلنے کے حرافہ ہی رہتی ہے۔ ذرا توازن خراب  
اور آپ نیچے۔ جبکہ مجھے کوئی خائن خیال بھی نہیں ہوتا۔“

”چلے ملک صاحب! اولیٰ بات نہیں“ میں نے گہری سانس  
لے کر کہا ”آپ ہمیں ایسی باتوں سے ہی مبتلا رہتے ہیں۔ ہم  
دیکھیں گے کہ ملک راض کے ساتھ پولیس کی جاگیر داری کی  
سیاست کی اور ڈاکوؤں کی کشی طاقت ہے۔“

”دیکھئے چوہدری صاحب! وہ جلدی سے بولے ”تقہ نہ  
دوستی اپنی جگہ ہے لیکن میں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ آپ

کبھی زیادہ بھروسہ نہیں کیا لیکن میرا خیال تھا کہ ایک فرض شناس  
آفیسر کی حیثیت سے ہی آپ میری باتیں سن کر اچھل پڑیں گے اور  
فوری ہی بہت سخت ایکشن لیں گے۔ آپ نے تو مجھے بہت دباؤس کیا  
ہے ملک صاحب!“

”چوہدری صاحب! آپ تو جوان ہیں لیکن میرا خیال ہے بہت  
مجید اریں۔ دنیا دیکھی ہے آپ نے آپ میری پوزیشن کو سمجھ  
نہیں رہے ہیں۔“

”میں آپ کی پوزیشن بھی سمجھ گیا ہوں اور آپ کی بات بھی“  
میں نے لفاظی کو چبانے کے سے انداز میں کہا ”مخصوص اس گفتگو کا یہ  
ہو کہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔“

”نہیں۔ یہ بات نہیں ہے“ وہ قہقہے سے بولے ”آپ نے  
ایک اتنی آدھری کرادی ہے تو وہ نہیں کی کارروائی تو چلے گی لیکن  
میرا مقصد حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے آپ کو یہ بتانا تھا کہ  
آپ اس سلسلے میں زیادہ اونچی امیدیں نہ رکھیں۔ یہ معاملہ یونسی  
کچھ عرصہ لٹکا کر ختم ہو جائے گا۔۔۔۔ اور اگر ملک راض نے  
اسے اتنا کام مسئلہ بنالیا تو پھر آپ کے لئے وکالت کرنے والے ریٹائرڈ  
بجروں کے پیکل سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو خود بھی عدالتوں میں  
گھسنا پڑے گا۔“

”ملک صاحب! ایک ملک کو دو سب سے ایک بھی  
مردوب نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے طعنے بنی کے ساتھ کہا ”جاگیر  
داری، میاں اور دروغ اور خطرناک ڈاکوؤں سے گٹھ جوڑی سب  
کچھ نہیں ہوتا۔ طاقت کے اور بھی بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔ ہر  
صنعت کا رانا بے دست دیا اور نازک بھی نہیں ہوتا جتنا عام طور پر  
سمجھا جاتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے چوہدری صاحب! آپ بے دست دیا اور  
نازک نہیں ہیں۔ آپ کے بارے میں زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ خبر تو  
رکتا ہوں“ ملک صاحب بولے۔

”ہاں۔ شرفا کے بارے میں خبر رکھنے کے سلسلے میں تو آپ یقیناً  
بہت مشغول ہوں گے“ میں نے کہا۔

”سراپہ ٹھوڑا مزاح اچھا نہیں ہے۔ پیلٹ سے نیچے وار نہ  
کریں۔ یہ کھیل کے اصولوں کے خلاف ہے“ ملک صاحب نے  
انگریزی میں کہا۔

”سرا! آپ پیلٹ کی بات کر رہے ہیں“ یہاں تو معاملہ بگڑی اور  
شلے تک پہنچ گیا ہے۔ ملک صاحب شیش اُردو اور انگریزی میں  
متفکر کرتے تھے اس لئے میں نے جلدی سے کہا ”شلے کو غالباً اُردو  
میں گھڑا کئے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے ہم اب بڑے صنعت کار بڑے  
پولیس میں ہو گئے ہیں۔ اب ہم بھی بڑا اُردو اچھا کر کے پھر سکتے ہیں  
لیکن پچھلا کہ ٹرا اب بھی جاگیر دار۔۔۔۔۔ کا ہی اونچا رہے گا۔۔۔۔۔ اور  
میں انسانی بد معاشرہ قسم کے جاگیر دار کا۔“

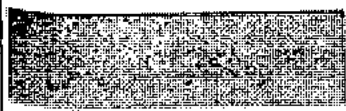
”صاحب! اجنبی باتیں نہ کریں اور معاملے کو طبعاً

پراسرار ہولناک اور ناقابل فراموش کہانیوں

کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

خون آرزو



اردو بازار لاہور

درست ہے کہ وہ سب ملک اہم ملکوں میں اعلیٰ عہدے دار تھے۔  
 ”تھے۔۔۔؟“ میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے تصدیق  
 چاہی۔

”جی ہاں۔ یہی بات تو مشترک ہے کہ وہ سب رعائز ہو چکے  
 ہیں۔“

مجھے امید تھی کہ ٹونی نے اپنی کارروائی تشبیہ نہیں چھوڑی  
 ہوگی۔ میں نے پوچھا ”تم نے رعائز منٹ سے آگے ان کا سراغ  
 لگانے کی کوشش کی؟“

”نہیں سر!“ اس نے جواب دیا ”اور تب مجھے ایک اور بات  
 ان سب میں مشترک نظر آئی۔ اگر یہ اتفاق ہے تو بہت سی عجیب  
 اور دلچسپ اتفاق ہے کہ وہ سب کے سب رعائز منٹ کے کچھ عرصے  
 بعد یا تو مر چکے ہیں یا ملک سے باہر جا چکے ہیں۔“  
 ”بہت خوب“ میں نے کہا ”ان کے مرنے کے انداز میں تو  
 کوئی بات مشترک نہیں پائی جاتی؟“

”شاید یہ نہیں کہا جاسکا سر“ ٹونی بولا ”ان میں سے کوئی کسی  
 حادثے کا شکار ہوا۔ کسی کو بیماری سے۔ یا ویسے ہی طبعی موت  
 آئی۔ کوئی اچانک دل کے دورے وغیرہ سے مرا اور کوئی کچھ عرصہ  
 ہسپتال رہنے کے بعد۔“

”چلو۔ فی الحال اتنی ہی معلومات کافی ہیں“ میں نے کہا  
 ”اب تم میرے پاس آ جاؤ۔ کچھ ضروری باتیں زبانی کہنی ہیں۔“  
 ”میں حاضر ہونا ہوں سر“ ٹونی نے کہا اور سلسلہ منتقل کر دیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ میرے اپن پہنچ گیا۔ ہم اسٹڈی میں جا بیٹھے  
 دروازہ میں نے منتقل کر دیا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے  
 کہا ”ٹونی! امیر اخیال ہے ملک ریاض ہمارے لئے خواہ مخواہ کا درجہ  
 سرینے والا ہے۔ میری ساتویں حس مجھے خبردار کر رہی ہے کہ وہ خواہ  
 مخواہ قدم قدم پر ہمارے لئے دشواریاں پیدا کر رہا ہے گا۔“

”جی تو میں کہہ رہا تھا سر!“ ٹونی بولا ”ملک ریاض۔۔۔ عالم  
 شیر۔۔۔ نورما اچھی۔ یہ ہمارے لئے ان کتوں کی طرح ہو گئے ہیں جو  
 قدم قدم پر ہمارے گائے کے لئے لپکتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں  
 آسانی سے سفر جاری نہیں رکھا جاسکا۔ ان کا کچھ نہ کچھ بندوبست  
 کرنا پڑے گا۔“

”نورما اچھی تو شاید جان بوجھ کر ہو سکے“ میں نے کہا ”ملک ریاض  
 کی تمام سرپرست پناہی کے باوجود شاید اسے ایسے علاج کی سہولتیں  
 میسر نہ آسکیں۔ اسے شہروں میں دھناتے پھرنے کے خواہ کتنے ہی  
 مواقع میسر آتے رہے ہوں لیکن ایک بدنام زمانہ مفرد ڈاکو بہر حال  
 ڈاکو ہی ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی حد تک تو اسے اپنے آپ کو بچا کر ہی  
 چلنا پڑا ہے۔ ویسے بھی اس کی کرنٹ بجلی ہے۔ عموماً وہ بھی اور  
 جیتنا بھی۔ اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں ہے اور عالم شیر بھی زیادہ بڑا  
 مسئلہ نہیں ہے۔ بھلا ہر تو وہ بھی ایک معزز بزنس مین بنا ہوا ہے لیکن

ایڈمز اور کی کوئی چوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔“  
 ”ہاں ایڈمز اور کی چوٹیں مجھ جیسے نہیں ملک ریاض جیسے لوگ  
 پیدا کرتے ہیں ڈی آئی جی صاحب!“ میں نے کوشش کی کہ میرے  
 دل کی جھنجھیرے لہجے میں خفقان نہ ہوئے پائے ”اور ستم غریبی یہ  
 ہے کہ وہ لوگ پھر بھی نیک نام رہتے ہیں۔“

”نہیں چہرہ دی صاحب! ایک نام تو آپ جیسے لوگ رہے  
 ہیں۔ ملک جیسے لوگوں کو جب وقت کارگزار لگتا ہے تو کوئی ان کا  
 پرسان حال نہیں ہوتا۔ ان کی کوئی سی بھی طاقت ان کے کسی کام  
 نہیں آتی“ ملک شفاعت صاحب کے لہجے میں قدرے غلوس تھا۔  
 ”اور آپ لوگ آرام سے بیٹھے اس وقت کا انتظار کرتے  
 رہتے ہیں“ میں نے اگلی سی ٹی کے ساتھ کہا اور فون پر دیا۔

کافی دیر تک میں سوچ میں گم بیٹھا رہا۔ دفتر جانے کو بھی دل  
 نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے مظلوم تھا وہاں مرمت وغیرہ کا کام شروع  
 ہو چکا تھا۔ ایک دو دن تک خاصی دسٹریس رہنے کا امکان تھا۔ اس  
 کے بعد پاس پڑوس سے دو چار لوگ اعلیٰ درجہ رومی کے لئے آگئے۔  
 علاقے میں اس خبر نے مٹی پھیلا دی تھی کہ رات میرے گھر پر  
 ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اور ایڈمز کے کوشش کی تھی۔ ان دونوں  
 ڈاکوؤں کی کارروائیاں اتنی عام نہیں ہوئی تھیں کہ اسے روزمرہ کی  
 ایک خبر سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے اس کے علاوہ بڑے لوگوں کے  
 محل نما مکانوں والے علاقوں میں بھی ایک دوسرے سے اتنی زیادہ  
 لاطعلی کا درجہ نہیں ہوا تھا۔

کافی وقت لوگوں کے ساتھ باتوں اور ان کی خاطر مدارت میں  
 گزار دیا۔ یہ سلسلہ ختم ہوا ہی تھا کہ ٹونی کا فون آگیا۔ وہ شکوہ آمیز  
 سے لہجے میں بولا ”سر! آپ نے مجھے اطلاع ہی نہیں دی۔۔۔ بچا چلا  
 ہے رات گھر پر بھی حملہ ہوا ہے؟“

”یہ اطلاع اس قابل نہیں تھی کہ تمہیں پہنچائی جاتی“ میں  
 نے جواب دیا ”کہہ رہی تھیں کہ ایک ناکام اور بے وقوف تانہ کوشش  
 تھی۔ نہیں آدمی دفتر کی بلڈنگ میں مرے تھے۔ دو آدمی یہاں  
 مر گئے مظلوم نہیں ابھی کتنے باقی ہیں۔ ملک ریاض شاید پاگل  
 ہو گیا ہے یا پھر ان بے ہمارے ڈاکوؤں کی اس کی نظر میں اتنی ہی  
 اہمیت ہے کہ انہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح موائے چارہ ہے۔“

”سر! اس سلسلے میں کچھ ہونا چاہیے۔ کوئی فیصلہ کن اقدام  
 ۔۔۔ ٹونی غصا لہجے میں بولا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس خطا لہجے کی تہ  
 میں خواہ بڑے آتش فشاں کا خاموش غیظ و غضب کہہ نہیں لے رہا  
 تھا۔

”ہو جائے گا۔۔۔ ہو جائے گا“ میں نے اسے تسلی دی ”تمہیں  
 معلوم ہے جذباتیت اور جلد بازی ہمارے منشور کے خلاف ہے۔“  
 ”نہیں سر!“ اس نے سعادت مندی سے کہا پھر اصل موضوع  
 کی طرف آتے ہوئے بولا ”سراوہ بلیک باکس سے لئے والی فہرست  
 کو میں نے چیک کیا تھا۔ ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ یہ تو



سرکاری فائلوں میں برہمال اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔  
اسے تو کسی بھی وقت راستے سے ہٹایا جاسکتا ہے۔  
”یعنی آپ کی نظر میں اصل مسئلہ صرف ملک ریاض ہے؟“  
”نہی نے تو رہتی چاہی۔“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا ”اس کا سیاسی اثر و رسوخ ایک  
مسئلہ ہے۔ درود سرا مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ ہماری اور اس کی دشمنی  
ریکارڈ پر آگئی ہے۔ میں دو جگہ اس کے بارے میں ایف آئی آر  
درج کر چکا ہوں اور اس کے بارے میں ڈی آئی جی صاحب سے  
بھی میری بات ہو چکی ہے۔“ میں نے ٹوٹی کو ڈی آئی جی صاحب  
سے اپنی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔

پورا بات سننے کے بعد ٹوٹی بولا ”اس کا مطلب ہے ڈی آئی  
جی صاحب نے آپ سے دوستی کے باوجود اس معاملے میں آپ کی  
کوئی خاص ہمت افزائی نہیں کی؟“

”ہاں۔ اسی لئے تو مجھے ذرا تنگدل کر سوجنا پڑ رہا ہے۔ اب  
احتیاط زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ میں جلد بازی یا جذباتیت میں کوئی  
قدم اٹھا کر اپنے لئے کسی قسم کی الجھن کھڑی کرنا نہیں چاہتا۔ میں  
اپنی اس پالیسی پر قائم رہنا چاہتا ہوں کہ اگر کچھ کٹا ناز پر بھی  
ہو جائے تب بھی ہاتھ صاف رکھ کر کیا جائے۔“

”یہ پالیسی ہمارے لئے بہت مفید رہی ہے۔ سر میں نے خود بھی  
اس سے بہت کچھ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔“ ٹوٹی بولا۔

”میں چاہتا ہوں اب بھی تم اسی پالیسی پر قائم رہتے ہوئے  
ملک ریاض کے علاج کا بندوبست کرو۔ یہ فیصلہ برہمال میں لے کر لیا  
ہے کہ اس کا پتا صاف ہو جانا چاہئے لیکن یہ کام اب چند دن ٹھہر کر  
کرتا ہے اور بہت دیکھ بھال کر کرتا ہے۔ تین چار ساتھیوں کو اس  
کام کے لئے خاص طور پر ساتھ ملاؤ۔ ملک ریاض کے گاؤں اور شہر  
والے سب نمٹانے تمہارے علم میں ہیں۔ پہلے کچھ دن اس کی  
نگہ رانی کرو۔ اس کے معمولات کا جائزہ لو۔ اسے یا اس کے کسی  
آوی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس پر نظر رکھی جا رہی ہے۔  
خود اس کے لئے تمہیں اور ہمارے دوسرے تو میوں کو میک اپ  
کا سارا لینا پڑے یا کوئی سرپ۔ بھرتا پڑے۔“

”میں سمجھ گیا ہوں۔ سر اب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔  
آپ قطعاً فکر نہ کریں۔“ ٹوٹی کی عادت تھی وہ کسی بھی کام کو قطعاً  
مشکل نہیں سمجھتا تھا۔ ہر کام کو وہ انجام بھی کچھ اس طرح دے کر  
آپنا تھا سمجھ دے اس کے لئے یا نہیں ہاتھ کا کھیل رہا ہو۔ وہ کسی بھی  
کام کو نہ تو کرنے سے پہلے ہوتا یا نہ تھا اور نہ ہی اسے کر کے آنے  
کے بعد جتنا تھا کہ اس میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”لیکن ملک ریاض کے  
قل میں ہم کوئی چاقو“ خنجر۔ حتیٰ کہ لاشی تک بھی استعمال نہیں  
ہونا چاہئے۔ کوئی بھی ہتھیار قطعاً استعمال نہیں ہونا چاہئے۔“  
ٹوٹی کے پلے پلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ٹھیک ہے۔ سر! ایسا ہی ہوگا۔ میں ممکن ہے اس کی گاڑی کو خارج  
پیش آجائے۔ بریک وغیرہ ٹھیک ہو جائیں۔ یا کوئی ٹرک اس کی  
گاڑی کو چپکا چور کر کے فرار ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے وہ کہیں  
بیز چروں سے پھسل کر گرے اور گردن تڑوا چیتھے۔“

”ہاں۔۔۔ دیکھ لیتا۔۔۔ موقع ملے گی مناسبت سے جو بھی ٹھیک  
لگے۔ میں نے کہا ”میں یہ خیال رکھتا کہ کام کچا نہیں ہونا چاہئے  
ایسا نہ ہو کہ اس میں کچھ سانسیں باقی ہوں۔ اپنا کل چکی کر  
جائے جو لوگ زمین کے نیچے پر بوجھ ہوتے ہیں عام طور پر وہ بڑے  
 سخت جان ہوتے ہیں۔“

ٹوٹی نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا۔ دل ہی دل میں اس نے  
یقیناً منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ میں نے ازراہ احتیاط مزید  
تاکید کی ”کوئی سراغ باقی نہیں رہنا چاہئے جو ہماری طرف تھامی  
کر کتا ہو۔۔۔ در نہ ساری محنت قارت ہو جائے گی۔“

ٹوٹی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ برقرار تھی۔ دھمکے لیے  
میں وہ بولا ”سر! آیا آپ کو ٹوٹی کے کاموں پر مجبور سانس رہا؟“

”نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تم پر اور تمہارے کاموں پر تو  
قبضہ اور قات میں اپنی ذات سے زیادہ مجبور سامعوس کرتا ہوں۔ مجھ  
پر تو پھر بھی کبھی کبھی جذباتیت حملہ آور ہو جاتی ہے لیکن تم تو  
جذباتیت کو قریب بھی نہیں سمجھتے دیتے۔ اس کے باوجود میں احتیاطاً  
بار بار یاد دلوا رہا ہوں کہ اس معاملے میں ذرا سا بھی سراغ باقی نہیں  
رہنا چاہئے۔ ملک ریاض کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ میں نے قدرے  
آخر سے کیا۔ اگر آج صبح بھی میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہوتا تو میں ڈی  
آئی جی صاحب سے اس موضوع پر بات ہی نہ کرتا۔ اب ان کے  
ذہن میں یہ بات رہے گی۔ ملک ریاض خواہ کسی بھی انداز میں  
مرے لیکن ان کا ذہن میری طرف ضرور جائے گا۔ اس لئے میں  
چاہتا ہوں کہ ذرا سا بھی سراغ ہماری طرف راہنمائی نہ کرے تاکہ  
اگر ڈی آئی جی صاحب اس معاملے میں کوئی بات کریں تو میں بھی  
ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں۔ جتنا ابھی چڑے  
بارے میں اندازے لگانا اور بات ہے اور اسے ثابت کرنا وہ سرا  
بات۔ یہ انہی کا فرمان ہے جو میں بوقت ضرورت ان کی طرف  
لوٹنا چاہتا ہوں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر ملک ریاض کا احتیاطاً  
عمدگی سے کیا گیا تو ڈی آئی جی صاحب اس سلسلے میں مجھ سے کوئی  
بات نہیں کریں گے البتہ اگر ملک ریاض کے لئے ان کے دل میں  
کوئی نرم گوشہ ہوا تو شاید وہ خاموشی سے اس کی حادثاتی موت کی  
تحقیقات کرانیں۔“

”اگر آپ ابھی تشویش محسوس کر رہے ہیں تو اس معاملے کو  
مؤخر کر دیتے ہیں۔ ملک ریاض کو کچھ دن اور ٹھکے کھیلنے کی صلت  
دے دیتے ہیں۔“ ٹوٹی کو یاد ابل خاطر سے بولا۔  
”نہیں۔“ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا ”میں نے  
اس پہلو پر بھی سوچا تھا لیکن میرے خیال میں اس معاملے کو مؤخر

لہا اور بھی خراب ہو گا کیونکہ ملک ریاض اپنی حرکتوں سے باز تو  
 نہ کا نہیں۔ چنانچہ جتنا زیادہ وقت گزرے گا اتنی ہی اس کی اور  
 بڑی دشمنی کی داستانیں عام ہوتی جائیں گی۔ اس لئے میں نے یہی  
 دعا ہے کہ یہ کاٹنا جسم میں زیادہ گہرا اترنے سے پہلے ہی نکل جائے  
 اور اچھا ہے۔ ہماری طرف کم لوگوں کا دھیان جانے گا۔

”درست ہے برا۔“ لونی نے سہلایا۔ ”میشن بھی قوی ہے۔  
 اگر اس دوران اسے ٹکٹ بھی مل جائے تو اور اچھا ہے۔ اگر اس  
 کی حادثاتی موت کی۔ میں سازش تلاش کرنے کی طرف کسی کا  
 دھیان چلا بھی گیا تو سب سے پہلے اس کے سیاسی مخالفین کی طرف  
 نظر مارتے گی۔“

”لیکن میں یہ بھی پسند نہیں کروں گا کہ اصرام کا پسند کسی ہے  
 کا کہ اسے نگلے میں فٹ کر دیا جائے۔“ میں نے کہا۔

”آپ اس معاملے کو کچھ پر چھوڑ دیں اور بھول جائیں مبرا  
 میں اسے ہینڈل کر لوں گا۔ ہم کوئی ایسا اچانک اور جان لیوا حادثہ  
 تخلیق کریں گے کہ اسے کوئی حادثے کے سوا کچھ کہہ ہی نہیں سکے  
 گا۔“ لونی بے پروائی سے بولا۔

”بس۔۔۔ ٹھیک ہے۔ تم آج سے اسی صبح پر لگ جاؤ۔ باقی  
 سب کام چھوڑ دو۔ اس کے لئے خاصا وقت درکار ہو گا۔ ملک  
 ریاض اب بہت محتاط ہو چکا ہو گا۔ اس نے اپنے حفاظتی انتظامات  
 بہت بڑھائے ہوں گے مناسب موقع تلاش کرنے اور پھر حادثے  
 کے انتظامات کرنے کے لئے جسیں کافی دن اس کی گھرائی کرنا پڑے  
 گی۔“

”ٹھیک ہے سر۔۔۔“ پھر قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ بولا  
 ”میں تو اس طرف لگ جاؤں گا لیکن آپ کو کچھ فکر اپنی سیکورٹی  
 کے بارے میں بھی کرنی چاہئے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ خطرات  
 جن جن بڑھ رہے ہیں آپ کی ذاتی حفاظت کے انتظامات ختم  
 ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔“

”میں نے توجہ لے لی دی ہے کہ خود بہت زیادہ چونکنا رہنے لگا ہوں  
 اور تم لوگوں سے ہر وقت رابطے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور رکھتا  
 ہوں۔ مجھے ملک ریاض، عالم شیر یا نور یا مچھی ناپ کے لوگوں کی  
 فکر زیادہ فکر نہیں ہے انہیں میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ مجھے  
 تشویش صرف ریڈ وائٹ کی طرف سے ہے۔ وہ لوگ ابھی تک میری  
 کچھ میں نہیں آئے اور جو لوگ سمجھ میں نہ آئیں وہ مجھے زیادہ  
 خطرناک محسوس ہوتے ہیں۔“

”میں ملک ریاض والا قافیہ نمٹاؤں، اس کے بعد ریڈ وائٹ  
 کے بارے میں بھی کچھ سوچتے ہیں۔ کوئی منصوبہ بناتے ہیں“ لونی  
 بولا۔

”ہم ان کے بارے میں کوئی منصوبہ بنانے کی پوزیشن میں  
 نہیں ہیں۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”فی الحال تو اگر ہمیں یہ  
 معلوم ہو جائے کہ ہمارے بارے میں ان کے منصوبے کیا ہیں تو

نہایت ہو گا۔ تب بھی شاید ہم کچھ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔“  
 کچھ دیر بعد لونی رخصت ہو گیا اور میں شاور لینے چلا گیا۔ شاور  
 سے فارغ ہو کر میں لباس تبدیل کر کے گھر سے نکلنے کی تیاری ہی  
 کر رہا تھا کہ کراچی سے راجہ لاٹون آیا۔

”راجہ۔۔۔ میری۔۔۔! میں اسے جان کتنے کتنے دک کیا۔  
 میرا اس کا قتل بھی عجیب تھا۔ ہم ایک دوسرے کے سب کچھ تھے  
 لیکن دو سال نہ جانے کون سی غیر ملکی دیواریں مائل تھیں جو بے  
 تکلف اور عام سے لفظوں کا بھی رابستہ روک لیتی تھیں۔ جذبات تو  
 دلوں میں مقید تھے ہی۔“

”راجہ۔۔۔ میری دوست! میں نے جلدی سے کہا ”تمہاری  
 عمر یقیناً بہت لمبی ہے۔۔۔ اور ہونا بھی چاہئے۔ آخر تم شیطان کی  
 خالہ ہو۔“

اس نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ میرے ہونٹوں پر بے ساختہ  
 لفظوں نے کیا پلٹا کھایا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ بالکل خاموش  
 رہی پھر جیسے اپنی خوش دلی کو آواز دیتے ہوئے بولی ”مجھ میں دادی  
 آپ سے سنا تھا کہ جھوٹ بولنے والے کے سینگ نکل آتے ہیں۔  
 اگر یہ بات سچ ہوتی تو تمہارے سر پر بالوں سے زیادہ سینگ  
 ہوتے۔“

”وہ تو ہیں“ میں نے کہا ”لیکن وہ دوسرے جھوٹے کو نظر نہیں  
 آتے۔ فی الحال ان باتوں کو چھوڑ دو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی میں  
 سوچ ہی رہا تھا کہ آفس جاکر جیسے فون کر کے معلوم کروں گا کہ  
 تمہارے آنے کے پروگرام کا کیا پتا؟“

”کچھ ہی دن گیا ہے“ وہ لٹھری سانس لے کر بولی ”اطلاعات  
 عرض ہے کہ ہم آج رات ساڑھے نو بجے والی فلائٹ سے پہنچ رہے  
 ہیں۔“

”کیا واقعی۔۔۔؟ یقین نہیں آ رہا“ میں نے حیرتاً حیرت سے  
 کہا۔

”میں سوچ کر تم گھبرمت بیٹھے رہا۔ کہیں میں اور راشد  
 ان پورٹ پر ڈبل دوڑا رہے ہیں اور تم بعد میں اطمینان سے کہہ  
 دو کہ جیسے تو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ آج فرسٹ ایئرل بھی نہیں  
 ہے، جو تم یہ بیان کر سکو کہ تمہیں شبہ ہوا تھا بے وقوف بنائے  
 جانے گا۔“

”بے بنائے کو کوئی کیا بنائے گا“ میں نے لٹھری سانس لے کر  
 کہا ”بہر حال آپ کا یہ خادم ان پورٹ پر موجود ہو گا۔“

”وہ تو جیسے ساتھ لے کر آتا جس سے تم نے مجھے سلائی دینے کا  
 ارادہ ظاہر کیا تھا۔“

”تمہیں معلوم ہے کبھی کبھی توپوں کا نشانہ غلط بھی ہو جاتا ہے  
 گولا انہیں ہی جا لگتا ہے جنہیں سلائی دی جا رہی ہوتی ہے“

میں نے کہا۔

”ہاں۔ بشرطیکہ توپیں تم بیٹھا ہو۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ

عظیم مدبر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) - 150/-

(قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (زاہد حسین انجم) - 150/-

(پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے حالات زندگی)

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

نہیں چاہتا تھا کہ ان کی رہائش کسی کی نظر میں آئے اور میرے دوست ہونے کے جرم میں وہ بھی ستارہ کی طرح کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔

کافی عرصہ پہلے جب میں نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی اس کو علی میں میری اپنی رہائش ہوا کرتی تھی۔ پھر اس میں میرے نیکاشک کے پرنس کا آفس بھی رہا تھا۔ کچھ عرصے سے یہ کوٹھی خالی اور بے مصرف پڑی تھی۔ میرے اسٹیٹ منیجر نے اس میں راحیلہ اور راشد کی رہائش کے تمام انتظامات کر کے تھے وہاں ایک نوکر اور چوکیدار کا بندوبست بھی کرنا تھا میں صرف ایک نظر ان انتظامات کا جائزہ لیتا چاہتا تھا۔ ذاتی طور پر اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ راحیلہ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ میرے ایک اور خراب کی تعبیر تھی کہ وہ جان غزل میرے شرمیں رہنے آ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی راہ میں آنکھیں بچاؤس یا دل کو خوش راہ کر دوں۔

تین بیڑ دوم کی وہ خوب صورت سی کوٹھی مجھے آج بھی خوب صورت لگی۔ شاید اس لئے کہ اس میں بھی میری جوانی کی خفا راقوں کی ایک ٹیٹھی لگاؤ سی رہتی ہوئی تھی۔ نوکر وہاں موجود تھا، چوکیدار بھی ڈیوٹی دے رہا تھا، صرف کہیں نہیں تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری طرح اس گھر کے دو دروازہ کو بھی کینوں کا انتظار تھا۔

وہاں کے انتظامات سے مطمئن ہو کر میں دفتر چلا گیا۔ دفتر میں ذرا دوشور سے چڑھی خڑول پر مرمت وغیرہ کا کام جاری تھا۔ جو چیزیں نئی آئی تھیں وہ آ رہی تھیں۔ بہر حال کام بھی تقریباً معمول کے مطابق ہی جاری تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ایک دو دن میں دفتر اپنی پرانی حالت پر لوٹ آئے گا۔

میں کچھ دیر کے لئے کتھرن کے کمرے میں جا بیٹھا کیونکہ سب سے کم دسٹرنس وہیں تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "مرزا کو آپ کے پاس کیا لینے آئے تھے؟"

"مجھے بھی لینے آئے تھے" میں نے جواب دیا "اس سے کم وہ کسی چیز پر راضی نہیں تھے۔"

توچس خود چلائے بیٹہ جاگ۔ تم صرف گاڑی چلاؤ۔ یہاں شفع شاہ کہ رہا تھا کہ لاہور میں انتظامات کرنا ہوں، کوئی اگر آپ کو رہیو کرے گا لیکن میں نے کہا، نہیں مجھی۔۔۔ لاہور میں اپنا ڈرائیور موجود ہے۔ وہ شاہانہ لیجے میں بولی۔

"ڈرائیور؟۔۔۔؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "مگر عالیہ! آپ نے میرا درجہ اتنا بلند کیوں کر دیا؟ میں آپ کا ڈرائیور بننے کے لائق کہاں۔ میں تو آپ کی گاڑی کا گارڈ ہوں۔۔۔"

"وہ بھی گھسا ہوا۔۔۔ وہ جلدی تے بولی۔"

"شاہد اسی لئے آپ نے اسٹیشن کے طور پر رکھا ہوا ہے"

میں نے دردناک ہنسنے میں لگا۔

"آجما۔۔۔ اب فضول باتیں مت کرو" وہ تیزی سے بولی "میں رپورٹ پر تیار انتظار کروں گی۔"

"انتظار آپ کو نہیں، مجھے کنا پڑے گا خاتون! میں آپ کو رہیو کرنے آ رہا ہوں" میں نے ہجج کی۔

"انتظار کا کیا ہے، کوئی جب چاہے، جہاں چاہے کر سکتا ہے۔"

اچھا خدا حافظ! اس نے ظافہ قویع جلد ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں بیڑ دوم سے نکل آیا اور ملازم سے الگ سا نشانہ لانے کے لئے کہا۔ آج میں صحیح طور پر ہانپتا نہیں کر سکتا تھا۔ ہانپنے کے دوران میں نے اختیارات پر نظر ڈال۔ ستارہ کی پولیس کانفرنس کو

لہاں جگہ ملی ہوئی تھی۔ ایکسپرس کے بیانات معافی دیں، آج سے شائع ہوتے ہیں۔ متنوع تصویروں سے ان کی شان بڑھ جاتی ہے۔

ستارہ نے سائل کو عذر کی سے نبھالیا تھا۔ اس نے اپنی باڈیائی

کارٹیٹ پولیس کو دے دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اسے ماسطوم

افراد نے تادان کی غرض سے ہی اغوا کیا تھا لیکن پولیس نے اتنی

عمر کی سے ان کے گرد گھیرا نگ کیا تھا کہ خوف کے باعث انہوں

نے تادان وصول کئے بغیر ہی اسے چھوڑ دیا تھا۔ یہ پولیس کا وہ

"گھبرا" تھا جس کے بارے میں پولیس کو خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا

لیکن اندازہ بہر حال یہی ہوا تھا کہ اس بیان سے وہ خوش ہو گئے

تھے اور انہوں نے ستارہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے بجائے فحریہ بیانات دے کر ترقیاں حاصل کرنے کے لئے کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔

میں نے سوچا ستارہ کو خون کر کے مفت میں اتنی چلبلی ملنے پر مبارک بادوں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ہٹوی کر دیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں اب راستے میں اپنے آگے پیچھے آئے جانے والی گاڑیوں پر خاص طور سے نظر رکھنے لگا تھا۔ اس وقت تو میں خصوصی آج سے گاڑیوں کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان میں سے کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہی؟

مطمئن ہو جانے کے بعد بھی میں نے ادھر ادھر بے مقصد کئی جگہ لگائے۔ آخر کار میں اس چھوٹی سی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا جہاں میں نے راحیلہ اور راشد کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ میں

کھٹاں! خنسیں کیا پتا، ایف آئی آر.... یہ تھلے پھرہاں کیا ہوتی  
 نہیں۔ تم دو اور دو چار کرنے والے شری سیٹھ! تمہارا خیال ہو گا کہ  
 ایف آئی آر درج ہونے کے بعد مجھے پھانسی لگ جائے گی؟

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "ہمارے  
بہت بندے مرے ہیں۔ ایف آئی تو مجھے دین کرائی چاہئے تھی  
لیکن میں ان حکامات میں نہیں چلا۔ پولیس نے اپنے طور پر جو  
ایف آئی اور چاہی دین کر لی۔ میں تو سارے واقعات سے لاعلم رہا۔  
میں نے تھمارا نام بھی نہیں لیا۔ ہم تو ایف آئی اور کبھی کبھار ہی  
دین کراتے ہیں اور پھر دوسرے کو سمجھ آجاتی ہے کہ ایف آئی اور  
کس کو کہتے ہیں لیکن جب ہم ایف آئی اور دین نہیں کراتے اس  
وقت دوسری پارٹی کو زیادہ ڈرنا چاہئے۔ مگر تم ابھی بچے ہو۔ تمہیں  
دینا کچھ پتا نہیں۔"

میں مسکرا دیا۔ آپ میں اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”تمہارا اعاعی اخیر سوخ کافی تھا کہ تم ایف آئی آرمی میں نام درج کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے آگے میری کرتا۔ زیادہ لمبی چوڑی امیدیں مت رکھنا۔“

”بہت بھر سکا را اور کوئی حکم؟“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”حکم تو ایسی بہت سے جاری ہوں گے جن میرے اصل کھیل  
 ہی اب شروع ہوگا۔“ اس نے ایک بار پھر استہزائے سے انداز میں  
 قہقہہ لگایا۔  
 ”جس..... کسی جاننے کے لئے فون کیا تھا؟“ میں نے ملاٹت  
 سے پوچھا۔

”تمہیں۔ ہم کسی کو کچھ بتانے کے لئے فون نہیں کیا کرتے۔ میں نے تو یہ سوچنے کے لئے فون کیا ہے کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے یا نہیں؟“ اس کے صبح میں فروغیت تھی۔

”یہ ایک نہایت ہی اہم سوال ہے“ میں نے ٹوکھاں سے کہا ”ویسے بھی یہ میرا اور مجھے زندگی عطا کرنے والے کا معاملہ ہے۔ میں اس موضوع پر تم جیسے جاہلوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا“ میں نے فون بند کر دیا اور کیتھرین سے کہا ”اگر یہ شخص دوبارہ فون کرنے کی کوشش کرے تو مجھے امید ہے کہ تم اس کی آواز پہچان لو گی۔ آواز سننے کی ڈانٹ بلا فون بند کر دیتا۔“

”بہت بہتر سرا“ کیتھریں نے مستندی سے کہا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کمرے میں کام جاری تھا۔ تالین تبدیل کیا جا رہا تھا اور میز وغیرہ کا خاص طور پر تیار شدہ اسٹیل کا اندرونی ڈیزائن دو بار ایک کارخانے میں بھیجا جا رہا تھا تاکہ اس پر لکڑی کی تہ چھائی جاسکے۔ یہ میز فریجیر کے ایک بڑے زبردست ماہر فن نے میرے لئے ڈیزائن کی تھی۔ جنگی حالات میں کام آنے والی بہت سی خوبیاں اس میں موجود تھیں۔

کیسٹرن نے بتایا کہ آج دفتر سے باہر میری کئی ملاقاتیں طے

۱۴ اسی لئے مارے گئے کہیں کے! " وہ اسی شریر سی  
ہٹ کے ساتھ بولی " نہیں اپنی اوقات کے مطابق کوئی چیز  
کڑا جائے تو۔ "

”میں نے سفیدگی سے بچنا چاہا۔“ مسیح یاں آئے ہی تم نے  
 سے بچنا چاہا اور خون میں غسل کر لی جس سے دیکھی ہوں

”ہرا آپ کے آفس میں بیٹھ کر کسی بھی چیز سے خوف محسوس  
ہوتا۔ وہ مطمئن اور خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔  
ہاؤس کے دوران وہ ٹیلیفون وغیرہ بھی سنتی جا رہی تھی۔ چند  
دور کیل آئی تو وہ مارتھ پریس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ”سرا  
کے لئے کال ہے لیکن وہ شخص اپنا نام نہیں بتا رہا۔ آپ نہیں

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "نہاؤ۔۔۔"

میں نے پہلو کھاتو پہلے ادھر سے ایک استراحتیہ ساقیہ سنا لی  
 تو آواز آئی "چچو بدی! میرے چاند! مبارک ہو کہ تم ابھی زندہ

میں ایک طویل سانس لے کر وہ گیا۔ وہ ملک واپس تھا۔ اس وقت ضرور دیکھا تھا اس کے لیے میں غور کا زہر تھا۔ میں دیکھے لیے میں کہا "مبارکباد کا شکر ہے۔ مجھے بہر حال تمہارے ملک زندہ ہونے پر شرمندگی ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میرے کانوں کی لوہیں تپ اٹھیں کہ جبکہ اس لمحے مولیٰ کی گالی دی تھی۔ میں نے اپنے جذبات کو قابو میں کیا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ جو لفظ صرف میں نے سنا ہے اس کی کثرت کا تیکہ بن کر بھی ادا نہ ہو۔ دوسرے مجھے اس شخص سے کہا تھا۔ وہ اپنی راست میں زمین پر ایک جھوٹا سا فرعون تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ موت کا بھیجی اس کے تعاقب میں ہو چکا تھا۔ وہ اپنی مالیت، اپنے گھمنڈ، اپنے اثر و رسوخ سے خفاشی انتقامات کے خول میں مقید رہے ہوئے تھے۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ ناقابلِ تحسّر مخلوق ہے۔

نکاتِ حقیر آمیز لہجے میں وہ بولا "منا ہے تم نے لاہور میں دو سال تک ایف آئی آرمز کن کرائی ہے جن میں مجھے اپنے گھر اور محلے کا فاسے دار اڈاکوئس کا سرپرست" اغوا برائے تالان کا کسے والا اور نہ جانے کس کا قراور ہے؟

میں حیران رہے بغیر نہ رہ سکا۔ اچھی تو شاید ان ایف آئی آوروں  
یا ایف جی شنگ نہیں ہوئی تھی کہ اسے ان کی خبر تک مل گئی  
اسرائیلی ملک رماض کے قبل کے لوگوں کی اس کھام میں جڑیں  
کھانی تھیں۔

لاستہزائیہ سے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے پولہ "جن

تھیں۔ میں ان کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ مصروفیت آج بھی بہت تھی۔ اور سب ملک ریاض نے فون کر کے ذہین مزید الجھایا تھا لیکن ان سب تصورات اور مصروفیات پر راجیلہ کا تصور غالب تھا۔ دل کو پیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جان آرزو آج واقعی منتقل رہنے کے ارادے سے میرے شہر آ رہی تھی۔ بار بار اس کی تصویر سوچ کے ہر دے پر ابھر آتی تھی۔ ہوٹل میں بیٹھ کے دوران بائیں دوسروں سے گزرا رہا لیکن آنکھوں کے سامنے بار بار ان کی صورت و حند لاتی رہی اور راجیلہ کا چہرہ ان کی جگہ لیتا رہا۔ ہر صورت میں اسی ایک صورت کا جلوہ تھا، ہر چہرے میں وہی ایک چہرہ تھا۔ وقت تھا کہ کائے نہیں کٹ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے دن ڈھلا اور رات کا اندھیرا گہرا ہوا۔ میں رات کا کھانا کھائے بغیر آٹھ بجے ہی ان پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے کسی ملازم، کسی ڈرائیور وغیرہ کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ یہ گویا خالصتاً میرا نجی معاملہ تھا۔ میں اسے اپنے تنہا ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔

میں وقت سے کافی پہلے ہی ان پورٹ پہنچ گیا تھا چنانچہ وقت گزاری کے لئے رستوران میں بیٹھ کر گندے سے برتنوں میں آنے والی کافی سے دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا آخر کار فلائٹ کی آمد کا اعلان ہوا اور میں ارا نیل لائنز میں سب سے آگے نکلے کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ دن دے پر تیز روشنی تھی اور دوپہر اشتیاق سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔

جب جہاز کچھ دور میرے سامنے آکر دکھائی دیا اور بیڑی لگائی گئی تب تو میرا دل گویا کپٹیوں میں آکر دھڑکنے لگا۔ میں پلک جھپکنا بھول گیا اور جہاز کے شگ سے پر آ رہا ہونے والے مسافروں کو ایک تک دیکھنے لگا۔ میرا اشتیاق واقعی ایک نو عمر لڑکے کا سا تھا۔ بے آبی اور جذبات کے اس ظالم میں بڑی لذت تھی۔ میرے لئے یہ لذت بھی ایک نعمت تھی۔ بعض لوگ ہنستے اصرار ہونے کے بعد نو عمری اور لڑکپن کے محسوسات سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں لیکن کسی نہ کسی خاص موقع پر میرے یہ محسوسات اب بھی بیدار ہو جاتے تھے۔

میں نے فون پر راجیلہ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ وہ فرسٹ کلاس میں ہوگی یا اکانومی کلاس میں۔ بہر حال اب میں آنکھیں میچاؤ بچھاؤ کر دوںوں ہی دوںوں سے براہ ہونے والے ہر مسافر کو دیکھے جا رہا تھا۔ دونوں دوںوں پر دو انہو مشین چمکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کڑی مسافروں کو رخصت کر رہی تھیں۔

آخر کار دونوں دوںوں سے کڑی در کڑی باہر آنے والی مسافروں کی ذخیرہ کھل ہو گئی۔ مسافروں کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا مگر راجیلہ اور راشہ باہر نہ آئے۔ میرا دل ڈوب گیا۔ تیز دھڑکیاں آنکھوں کے سامنے آکر یکپوں میں دھلتے گئیں۔ کیا پوکر گرام میں کوئی

عظیم مدبر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) 60/-

(قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (زاہد حسین انجم) 60/-

(پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے حالات زندگی)

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

کڑو ہو گئی تھی؟ ایسی کون سی ناگزیر وجہ ہو سکتی تھی جس۔ راجیلہ کو آنے سے روک دیا تھا؟ اگر ایسی کوئی بات تھی تو وہ کر کے مجھے اطلاع دے سکتی تھی۔

دونوں انہو مشینوں نے ایک نظر لائنز کی طرف دیکھا اور چل گئیں۔ میرا دل ایک عجیب سی شکل کی دباؤ سے بھرا ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ آؤ! کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ اگر اس فلائٹ سے نہیں آتی تو اگلی فلائٹ سے آسکتی تھی۔ آج نہیں تو کل آسکتی تھی۔ جب دل پر اشتیاق لا کہیں جیسا طاری ہوتا ہے تو ابھیلاں لڑکپن بھی ہوتی ہیں۔ انہو کی بھی کبھی مڑوا ل ہوئی ہے۔

میں نے سوچا کہ جاکر مسافروں کے ناموں کی فہرست چاکر کول میں اس خیال سے مڑنے ہی والا تھا کہ فرسٹ کلاس دوںوں سے آسکتی سے خوب صورت بھروسے والوں والا۔ سربراہ کیا اور میں بے اختیار ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

وہ بھی پتہ بے آبی نو عمری کے دور میں وہ ایسی جاری تھی۔ موقع پر بھی شجارت کر کے اس نے غیر ارادی طور پر یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی دماغ پر سے اداسی کی برف پگھل رہی تھی۔ وہ جہنم لے رہی تھی۔ اس کے لڑکپن کا شرعاً ایسا زواہی تھا کہ ایک خوش آنکھ علامت تھی۔ میرے اندر کی فضا بھی کھل رہی تھی۔ اس لئے میرا دل ایک عجیب سی فوٹی سرشار ہو گیا۔

وہ چھ دنوں کی طرح قدم اٹھاتی باہر آئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر جی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہم لوگوں کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے کے پیچھے اپنے اپنے پیادوں کو رسیوں کرنے کے لئے کڑے تھے لیکن اپنے دل کی صدا پر اسے کس غضب کا یقین تھا۔

یا اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اسے رہیو کرنے کے لئے وہاں  
راہوں گا۔

اس کے پیچھے پیچھے راشد بھی برف کیس اٹھائے باہر آگیا۔  
پہنسی بھی دوبارہ باہر آگئی۔ وہ بھی لاؤنج کی طرف دیکھ کر  
کراہی تھی۔ یقیناً وہ بھی راجیلہ کی شرارت میں شریک تھی۔  
راجیلہ نے یقیناً اسے بتایا تھا کہ وہ سب سے آخر میں نکلے والے  
سائزر کے بھی ایک ڈیڑھ منٹ بعد باہر آئے گی۔ اب وہ کسی  
ٹھنڈی اور بے فکری لڑکی کی طرح تیزی سے میڑھیاں اتر رہی  
تھی۔ اس کے خوب صورت بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور تیز  
دستی میں چپے ہوئے آسٹے کے باریک روٹھی آمروں کی طرح  
گلا رہے تھے۔

آج مجھے راجیلہ میں اسی لڑکی کا پرتو دکھائی دیا جسے میں نے  
پہلے کراچی کے انٹرویوٹ پر دیکھا تھا جب وہ اپنے والد اور  
بائی کے ساتھ مجھے رہیو کرنے آئی تھی۔ میں اس وقت بھی اس  
کے صنفیلاخیز کو دیکھ کر کم سم سا ہو گیا تھا۔ اور میں آج بھی اسے  
جو کر کم سم سا تھا۔

کھٹ کھٹ کرتی وہ لاؤنج کے قریب آئی۔ لاؤنج کی میڑھیاں  
بٹنے سے پہلے ہی اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مسکراہٹ اس کے  
پٹوں سے ہی نہیں پورے چہرے سے پھولی پڑی تھی۔ راشد  
نے آگے آکر کم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں نے راجیلہ کے ہاتھ سے اس کا ہینڈ بیگ لینے کے لئے  
اٹھ بڑھایا تو وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی "کیا کوئی لازم وغیرہ  
ماتو نہیں ہے؟"

"آپ نے صرف ڈرائیور کو طلب فرمایا تھا" اور ڈرائیور حاضر  
ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھکتے ہوئے سنجیدگی سے  
غائب خانہ انداز میں کہا۔

اس نے بیگ مجھے نہیں دیا اور میرے ساتھ.... چلتے ہوئے  
بلیا کی مشاطہ طبعی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تم بھی سمجھتے تھے تاکہ  
میں ان فلائٹ سے نہیں آئی ہوں؟"

"نہیں" میں سمجھا تھا جہاز والوں نے جن میں فالو مسافر سمجھ کر  
راستے میں کس دیر اور غیرہ میں پھینک دیا ہو گا" میں نے سنجیدگی سے  
فائل دیا۔

"کی جرات کون کر سکتا ہے" وہ اکثر بولی "میں خود انہیں  
تاکڑ کر کے ہڈیوں میں پیچھک دیتی۔"

"آپ کی کیا بات ہے خاتون آپ کی دہشت سے تو جہاز بغیر  
لوگوں کے اڑنے لگتے ہیں" میں نے مصنوعی مرحومیت سے کہا۔

میں کوئی بیٹک کے قریب آکھڑے ہوئے۔ ان کے سوٹ کیس  
پائسوے زالی پر رکھا کہ ہم باہر آئے اور بارنگ لائٹ میں کوئی  
فائلنگ کچھ پیچھے راجیلہ ایک نظر گاڑی کو دیکھ کر بولی "بہی وہاں...."

بڑے ٹھاٹھ ہیں تمہارے۔ تم تو واقعی بڑے آدمی ہو گئے ہو انی!"  
"بڑا آدمی تو میں پہلے بھی تھا لیکن پہلے میرے پاس دولت  
نہیں تھی" میں نے کہا پھر میں نے راشد کو مخاطب کیا "تم کیوں  
غاموش ہو؟"

"جب آپ دونوں بول رہے ہوتے ہیں تو مجھ غریب مسکین کی  
جرات کہاں ہوتی ہے سچ میں بولنے کی" وہ عاجزی سے بولا۔ اس  
کے انداز پر میں اور راجیلہ ہنس دئے۔

شہر کے قریب پہنچ کر میں نے گاڑی کلبرگ کی طرف موڑتے  
ہوئے کہا "راستے میں پہلے میرا غریب خانہ رہتا ہے۔ پہلے وہاں  
ہو لیتے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو آج کی رات وہیں گزار لیتا۔ صبح اپنے  
دولت خانے میں منتقل ہو جاؤ۔ اگر اس تجربے سے اتفاق نہ ہو تو  
میں تم دونوں کو آج رات ہی تمہارے دولت خانے پر پہنچا دوں  
گا۔"

میں نے جب گاڑی انی کو بھیج کے سامنے لے جا کر روکی اور  
طارق خان نے میرے کی آنکھ سے اندر گیت ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے  
میری گاڑی دیکھنے کے بعد اتونک گیت کھولا تو راجیلہ کے ہونٹ  
دائرے کی صورت میں سکڑ گئے۔

"اوہ.... یہ تو بیچ بچ کی سی ہے" میں نے کہا "وہ گاڑی سے اتر کر  
طویل و درمیش ڈرائیور سے میں کھڑی ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے  
بولی "انی! یہاں تم اکیلے رہتے ہو؟"

"بھوری ہے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "چند  
نوکروں چند گھنٹوں اور چند پردوں کے سوا کوئی میرے ساتھ رہنے پر  
آمادہ ہی نہیں ہے۔"

میں نے ان کے لئے کھانا لگوا دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی  
راجیلہ نے اصرار کیا کہ انہیں وہیں پہنچا دیا جائے جہاں انہیں  
مستقل رہنا ہے تاکہ وہ آج سے ہی اس جگہ سے مانوس ہونے کی  
کوشش شروع کر دیں۔

میں نے انہیں اس کو بھیج پر پہنچا دیا جو میں نے ان کے لئے  
تیار کرائی تھی۔ راجیلہ اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد بولی  
"ہماری اوقات سے تو یہ بھی بڑی ہے۔"

"تم اسے کرائے پر اٹھاؤ اور خود ریلوے اسٹیشن پر ستر  
لگا لیا" میں نے کہا "شاید اس طرح تمہارے اس اوقات والے  
ظرفے سے انصاف ہو سکے۔"

کچھ دیر اسی طرح بیٹھی بیٹھی نوک جھونک کے بعد میں انہیں  
خدا حافظہ اور شب بخیر کہہ کر داپس روانہ ہوا۔ رات آدھی سے  
زیادہ بیت چکی تھی۔ کلبرگ کی سڑکوں پر دیرانی چھا چکی تھی۔

میں اس وقت گاڑی غالب مارکیٹ سے میں لیمبو پر موڑ رہا  
تھا جب اچانک ہی ایک شخص میری گاڑی کے سامنے آگیا۔

اگر میں بروقت بریک نہ لگاتا تو گاڑی اس پر چڑھ گئی ہوتی۔ یہ بھی قسمت تھا کہ میں اس وقت موٹر کاٹ رہا تھا گاڑی کی رفتار کم تھی۔ وہ گاڑی سے ٹکرانے سے قوتی گیا لیکن لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم دور چلا گیا۔ ایک بلکے سے دھچکے کے ساتھ گاڑی کے پٹے کو زمین میں دھس چکے تھے۔ لیکن میں فوری طور پر گاڑی سے نہیں اترا۔ میں اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔

ایک گاڑی چند قدم کے فاصلے پر آڑی ترمیمی کھڑی تھی۔ وہ یقیناً اسی شخص کی گاڑی تھی۔ اس کا ایک انکوارڈر اذہ بھی لکھا تھا۔ وہ ایک مختصر اندر و شخص تھا۔ ٹھنکن اتار دے سوٹ میں تھا۔ چلی ڈھیلی ہو کر گئے ہیں بھول رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی شکل صحیح طور پر دیکھ پاتا وہ لڑکھڑاتا ہوا دور چلا گیا تھا لیکن پھر گھوم کر میری طرف آنے لگا۔

راتوں کو نشے میں دھت ہو کر گلی کوچوں میں یا سڑکوں پر بے مدار پھرنے والے لوگ مجھے کبھی اچھے نہیں لگے خواہ ان میں سے کسی کے پیچھے کوئی المناک کہانی ہی رہی ہو اور خواہ وہ موافق قلبی یا افسانوی امیر ازمیں "غم بھلانے" کے لئے پھر رہے ہوں۔ اپنے دکھ دور اور الم بڑی نمی سے چیریں ہوتی ہیں۔ انہیں سڑکوں پر لے کر نہیں بھرتا چاہئے۔

دیے بھی اپنے آپ سے بچانے ہو کر پھرنے والے یہ لوگ کوئی ایسے اگر واقعہ دل میں لے کر لٹکے ہوں تو دوسرا ایسے سڑک پر چمڑا جاتے ہیں۔ یعنی عام طور پر کسی نہ کسی حادثے کا سبب بنتے ہیں۔ اگر خود گاڑی میں ہوں تو گاڑی بے چارے کی راہ گیر چڑھا دیتے ہیں۔ فٹ پاتھ، ٹھیکے یا کسی دوسرے کی گاڑی سے ٹکر دیتے ہیں۔ کسی موٹر سائیکل والے کو مار کر سڑک پر پڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ خود پیدل ہوں تو کسی گاڑی والے کے سامنے آکر اس کے لئے مسئلہ بن جاتے ہیں۔

وہ کم ظرف بھی یقیناً نشے میں دھت تھا۔ اوھر اوھر پکراتا پھر رہا تھا۔ میں گاڑی سے اترا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے ایک ایسا ٹھیک خاک قسم کا چھتر رسید کروں گا کہ اس کا نشہ جرن ہو جائے گا یا پھر وہ کھل طور پر ہی دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو کر ایک طرف کوئیں جا کرے گا اور آرام سے وہیں پڑا رہے گا۔ فطرت خدا کے لئے ہزاروں اور پریشانی کا باعث نہیں بنے گا۔

لیکن جب وہ قریب آیا تو میرا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ مجھے اس کی صورت شناسا محسوس ہوئی تھی لیکن یہ شناسائی میرے لئے ناقابل یقین تھی۔ کیس پر ہی آنکھیں دھو کر تو نہیں کھاری تھیں؟ تبدیلیاں کو کہ بہت سی آچکی تھیں۔ وہی تبدیلیاں جو مر رہنے اور حالات کے خنثی و فراز کی وجہ سے آیا کرتی ہیں لیکن پھر بھی صورت جانی پہچانی سی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں وہ درست ہو سکتا ہے۔

میں ابھی الجھن میں ہی تھا کہ وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے

انتہائی محور محو رہا جتنا کہ مجھے میں بولا۔ "بھائی صاحب! وہ۔۔۔ تاکہ کڑھے میں پھنس گیا ہے۔۔۔ جی۔۔۔ بڑی اڑیل کھڑا ہے۔۔۔ بلکہ اڑیل ٹوٹے۔۔۔ جی۔۔۔ ذرا دیر نہیں لگتا۔۔۔ گودھا کھینکے۔۔۔ خدا کے لئے آپ ذرا چل کر اس کو سمجھائیں۔" وہ اپنی اپنی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

مگر مجھے تو کوئی گدھا ہی صحیح طور پر سمجھا سکتا ہے۔ میں نے غیر ارادی طور پر کہا۔ وہ جب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی گھڑائی طرف لے جانے میں ناکام رہا تو خودی لڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب گیا اور گاڑی کے اگلے حصے کو لٹا دیکر اس کی گردن سر سے نیچے پاؤں پکڑ کر پٹنے لگا۔ تھوڑا سا محسوس کروہ کر پڑا۔

میں نے اس کے قریب جا کر گر بیان سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ہلکا ہلکا سا آدھی تھا۔ اس کے منہ سے وہ مسکائی ہوئے کچھ بولے۔ "آپ نے نہ کھانا۔۔۔؟"۔۔۔ کتنا غیبت کھوڑا ہے۔ میں نے اسے ایک لٹی ماری تو اس نے مجھے دو لٹی ماریں۔۔۔ گارے کا ش میرے پاس پستول ہوتا تو میں اسے بھی گولی مار دیتا۔ اوپر اس کی بد معاشی دیکھیں۔۔۔ مجھے تانگے پر چڑھنے بھی نہیں دیا۔۔۔ جی۔۔۔ میں چڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو اچھلنے کودنے لگتا ہوا ہے۔۔۔ ایسے تانگے سے تھوڑا سا گاڑی اچھی۔"

اس دوران میں نے اس کا گر بیان چھوڑ دیا تھا۔ وہ لٹی مارا۔۔۔ سے گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی کوشش میں وہ گر کر پڑا۔ ایک بار پھر میں نے اسے افکار کھڑا کیا اور ایک بار اس نے مجھ سے شکایت کی۔ "سرا دیکھا آپ نے؟ یہ گودھا مجھے اپنے تانگے پر چڑھنے نہیں دیتا۔۔۔ جی۔۔۔ اسے ضرور مجھ سے کئی دھنسی ہے۔"

"تم نے آج اس کے حصے کی گھاس کھائی ہوگی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں اور وہ کڑے کھڑے بھی اوھر اوھر رہا تھا۔

"اور۔۔۔ فورس۔۔۔" وہ جھومتے ہوئے بولا۔ "میں نے کھان نہیں کھائی۔ بالکل نہیں کھائی تھی۔۔۔ میں نے تو شراب۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ سر۔۔۔ میں نے تو شراب پیا تھا۔۔۔ گودھا بڑا شرارتی ہے سرا۔۔۔ مجھے لے کر گھر نہیں جانا چاہئے۔۔۔ دو لٹیاں مارنا ہے۔۔۔ آڑی کرتا ہے۔ ایک بار یہ مجھے گھر لے جائے۔ میں اسے ضرور شوٹ کر دوں گا۔۔۔ میرا پستول گمراہ ہے۔۔۔ ہمارا گودھا ہم سے میاں دے۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو میں خار سے میں اس ترمیم سے بھرا ہوتا لیکن اس وقت میرا ذہن اس کی شناسا صورت کے بارے میں

اس کا مطلب تھا راجہ کی کاپا صرف سوٹ اور گاڑی تک ہی نہیں بلکہ حتیٰ 'مصرف' کی رہائش بھی 'کوٹھی' میں تھی اور اس عالم بے خودی میں بھی اس نے یہ بات جتانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ مزید انتخاب یہ کہ وہ میٹرک سے لی اے بھی ہو گیا تھا۔ میرے سامنے تو اس نے میٹرک پر ہی مشکلوں نے ٹھکسٹ ٹھکسٹ کر کیا تھا۔ آرمے سے زیادہ بھر عمل کرنے میں اس نے اس کی مدد کی تھی۔ لیکن خیر یہ زیادہ حیرت کی بات نہیں تھی۔ کوئی بچہ نہیں تھا کہ بعد میں اس نے لی اے کر لیا ہو۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا پورا نام محمد ریاض چیمسلی تھا۔ میرے لئے زیادہ باعث حیرت تو وہ نشانیاں تھیں جو کہ غائبے بڑے معاشی انتخاب کا پتا دے رہی تھیں۔

وہ بدستور ادھر ادھر کو بھول رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے اوڈو ڈرائیون والے گھر سے! سیدھا کھڑا ہو جاؤ نہ ایسا ہاتھ دھو کر نہ گھبراؤ گا کہ آئندہ یہ منہ شراب پینے کے قابل نہیں رہے گا۔" بچہ نے اٹھتے نہیں بچاؤ؟ اپنے بچپن کے دوست کو؟ ابے ہم تو کادور ہائیں بچ بچ کے لنگوٹیاں رہیں۔ ایک جیسی لنگوٹیاں باندھ کر میری چھٹا نہیں لگایا کرتے تھے۔ نہر کے کنارے "شوٹنگ" کیا کرتے تھے۔ بھگنوں سے کھار بازی کیا کرتے تھے اور نہر میں غروڑے ایک دو سرے پر کھینچ کھینچ کر لاتے تھے۔ تم اپنے ابا کی دکان سے بچے چھڑا کر لایا کرتے تھے اور ہم انہیں قلمیں دیکھنے جایا کرتے۔ ابے راجہ کے بچے آیا تو وہ سب کچھ بھول گیا؟ میں نے اسے ہنسنے ڈالا۔

اس کے چہرے پر ڈر کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کے خواص پر خواہ نے کیا کھاسی غلبہ تھا لیکن بچپن اور لڑکھن کی یادوں کے نعوش کچھ اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ فراموشی کی ان معمولی تہوں کے نیچے نہیں دبتے۔ اس کا چہرہ تار تار تھا کہ باؤں اس کے منطوق سے ذہن میں لچل چاری تھیں، اس کے خائفے میں بھٹائی ہوئی تھی۔ وہ سب باتیں یقیناً اسے یاد تھیں۔ صرف تھار کی لہروں میں منظر ہندلا گئے تھے۔ کچھ میری گرفت کی وجہ سے اس کی گردن پر دباؤ تھا، کچھ وہ ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں اس کی آنکھیں آنسو کی طرح گولی گولی سی ہو گئی تھیں۔

راجا تک اس کے چہرے کے عضلات کچھ زیادہ ہی پتھر پڑے اور وہ کھٹی کھٹی سی آواز میں بولا۔ "تم افضل ہو نا۔؟ محمد افضل چوہدری۔؟"

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ اس کی یادداشت ٹھیک ہو گئی تھی۔ نہ پتھیا کا نہ تک بلکا ہو گیا تھا۔ باؤں تھار پر غالب آگئی تھیں۔ اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے خلق سے ایک عجیب باریک سی آواز نکلی جو کسی بچے کی آنسوؤں میں جھگی ہوئی جھ سے مشابہ

تھی اور بے یقینی کے درمیان الجھا ہوا تھا۔ اگر اس کی ذہنی حالت کوٹھی کے دو اپنی نئی ماڈل کی کار کو آنگے سمجھ رہا تھا تو اس سے کسی سوال کے صحیح جواب کی توقع رکھنا بھی بے کار تھا۔

انہم میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک موہوم سی امید کے سارے بغور اس کی طرف دیکھا اور مجھے اس میں کوئی شک نہ رہا کہ وہ میرا بچپن کا دوست ریاض عرف راجہ ہی تھا۔

بہسی کبھی مجھے خود بھی اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں کچھ دن پہلے ہی گاؤں میں ریاض عرف راجہ کے باپ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ لاہور میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا لیکن ابھی اسے تلاش کرنے کی فورت نہیں آسکی تھی۔ میں دوسرے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ تلاش کرنا تو دور کنار، بچی بات یہ تھی کہ میرے ذہن میں دوبارہ اس کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ رات کو اس وقت یوں آجائیک مجھ سے آگے نکلا تھا۔

بے یقینی مجھے اس لئے اپنی طرف کھینچ رہی تھی کہ ایک تو میرے ذہن میں راجہ کا لڑکھن کا چہرہ تھا۔ اب اس میں خاصی تبدیلیاں آچکی تھیں لیکن ..... یہ ایک فطری سی بات تھی۔ اس سے کبیں زیادہ حیران کن میرے لئے راجہ کا طبع تھا۔ میرے ذہن میں راجہ کا تصور ایک مظلوم الحال انسان کا تھا۔ میں چند دن پہلے گاؤں میں اس کا جو گھر دیکھ کر آ رہا تھا اس میں ابھی تک غرت والٹاس کا راج تھا۔ اس کے دس عدد بچے دادا کے زیر سایہ مظلوم الحالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ تین چار سال سے اس نے ان کی خبر تک نہیں لی تھی۔

وہ گہرے غائب تھا۔ اس کا بوجھ باپ، سیدھی سادی بیوی اور دس معصوم بچے آنکھوں میں اس کا انتظار بڑھتا نہ جانے کس طرح زندگی کی گاڑی کھینچ رہے تھے اور وہ یہاں عمدہ سوٹ اور نئے مال کی خاصی تنگی کا گاڑی میں گھوم رہا تھا۔ اپنے عرف سے بڑھ کر اوزک بھی کئے ہوئے تھا۔ تھار کی تنہا ہٹ کے علاوہ اس کے چہرے پر خوشحالی کی چمک بھی تھی۔

"تم راجہ ہو نا۔ ریاض راجہ؟" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ آنکھیں بنائیں وہ بے مشکل کھول پا رہا تھا، یکدم خاصی پھیل گئیں۔ اس نے بغور میری طرف دیکھا لیکن شاید نظر ہندلائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلک سی ابھری۔

ظاہر ہے چونکہ بچپن کا تھا لیکن اب وہ بولا تو اس کے لہجے میں پہلے سے زیادہ گتت اور لڑکھٹا ہٹ تھی۔ "تم؟ تم کون ہو مجھے راجہ کہنے والے؟ میں کسی راجہ راجہ کو نہیں جانتا۔ میں تو محمد ریاض چوہدری ہوں۔ محمد ریاض چیمسلی۔ اے۔۔۔۔۔ میری کوٹھی پر بھی یہی نم لپٹ گئی ہوئی ہے۔ کبھی آکر دیکھ لیتا۔"



تھی۔

وہ یکدم ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔ وہ بچوں کی طرح ہچکچاہٹ لیتے ہوئے لڑا۔ افضل! میرے یار... تم کہاں کو گئے تھے؟ میں نے تمہیں اتنا دھونڈا... اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی بھائی یا نہیں تھا... کوئی سچا دوست نہیں تھا۔ میں راتوں کو دو دو کردہ عین مانگ کرتا تھا... یا اللہ! میرا پیارا دوست کسی دن اپنا ایک ہی راہ چلتے کسی سوڈر پھٹے مل جائے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اللہ میاں مجھ جیسے گناہ گار اور بڑے آدمیوں کی دعا میں بھی سنتے ہیں۔

گناہ گار بھی اگر کسی کا بُرا نہ چاہے... غلو صِ نیت سے دعا مانگے... اچھی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ سن ہی لیتے ہیں۔ میں نے اس کی بیٹھ تھکے ہوئے کہا "میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ تم رات کے اس پیر اس طرح مجھے مل جاؤ گے۔ اور وہ بھی خصوصاً ان دنوں جب میں نے تمہیں تلاش کرنے کا ارادہ ہی باندھا تھا۔" وہ ہنسنے لگے ہوئے اور قدرے سنبھلے ہوئے بولا "مجھے کچھ لوگوں نے بتایا تو تھا کہ ایک خواہ افضل چوہدری تو شہر کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے سیٹھ۔ کئی کارخانے اور بڑے بڑے کاروبار ہیں ان کے۔ ان کا گروپ آف کمپنیز ملک کے بڑے بڑے گروپس میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے یہ سنتے ہی اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنا پیارا افضل نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک ہے... کبھی کبھی انسان کا فلوک ٹک جاتا ہے۔ اس کے پاس چار پیسے آجاتے ہیں۔ جیسے میرے پاس آگئے ہیں لیکن اب اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آدمی بارہ تیرہ سال میں آسمان پر ہی جا پہنچے۔"

"یہ تو آسمان والے کی مرضی ہے۔ جسے جہاں چاہے پہنچا دے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ذرا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دوبارہ مجھے غور سے سرتاپا دیکھا۔ پھر آنکھیں سنبھل کر میری گاڑی کا جائزہ لیا اور بے چینی کے عالم میں بولا "تمہارا مطلب ہے... تم ہی وہ افضل چوہدری ہو جس کا لوگ مجھ سے تذکرہ کرتے تھے اور میں اسے کوئی اور سمجھا کرتا تھا؟"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" میں نے غیر واضح لہجے میں کہا۔ "گروپ آف کمپنیز تو بہر حال میرا ہے۔ کاروبار بھی ہیں۔ کارخانے بھی ہیں۔ جھوٹی سونی پر جرج ہے۔"

"بس۔ بس۔ اب زیادہ انکساری برتنے کی ضرورت نہیں۔" وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس پر فٹے کا اثر اب بھی کم نہ کیا تھا۔ اس کے حواس کو نہ باتیت اور حیرت کا جو جھکاؤ تھا اس نے سارا نشانہ ہرن کر دیا تھا۔

پیچھے ہٹتے ہوئے وہ مسرت سے معذور لہجے میں بولا "یار... اس کا مطلب ہے تم نے قربت ترقی کی ہے۔ پریشانی بھی بڑی نکال لی ہے۔" وہ... کیا بات ہے... وہ ہاتھ ہلا کر گویا کسی اچھے

شعور را دوسے رہا تھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر وہ رازدارانہ سے اشارے میں بولا۔ "یار! اگر آپ ہم دونوں کو گاڑی والے دیکھیں تو انہیں یقین آئے گا کہ یہ وہی آدمی ہے اور کھینچے قسم کے چھوڑے اور جو اب ناپا ہیں؟ قسم ہے... کوئی یقین نہیں کرے گا۔ اور جب یقین کرے گا تو بے عزتی کرنا شروع کر دیں گے۔ اے وہ دن بھول گیا جب تیری ماں ہمارے گھر بسن پانا مانگنے آیا کرتی تھی! کوئی بڈا دلدار گاہ۔ اے تیرے باپ نے میرے باپ سے ہی تو بچاس روپے ادھار لے کر اپنی دکان کی رجسٹری کرائی تھی! غوث کے زمانے والے ملتے ہیں تو اسی قسم کی کمپنی اور چھپوڑی باتیں شہر کا کہتے ہیں۔ اس لئے میں تو گاڑی والوں سے ملتا ہی نہیں۔ اس زمانے کی کوئی جانی پہچانی شکل نظر بھی آجاتی ہے تو میں راستہ بدل لیتا ہوں۔ کتھرا کر نکھل جاتا ہوں۔"

"یہ تو تم اچھا نہیں کہتے یارے! میں نے مسکراتے ہوئے کہا "صرف غوث کی وجہ سے آدمی کو اپنے ماضی سے شرمندہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ سوچ کر خلف اندوز ہونا چاہئے کہ ہم کیا کئے ہیں۔ کئے۔ دولت آنے کے بعد تو انسان کے کمپلیکس COMPLEXES کم ہوتے ہیں۔ بڑھتے نہیں جاتے۔"

"بقراملی نہیں چاہئے مجھے بالکل۔" وہ ہاتھ ہلا کر گویا کسی چیز کا قطعی رد کرتے ہوئے بولا۔ "گھر پر ہی بقراملی جھاڑی رہتی ہے۔ کان کھائی رہتی ہے۔ ادھر مرنے ملتے ہی بقراملی جھاڑی شہر کا کڑی۔ میرے یار! میرے بھڑے میرے پیچھے چلے! بالکل سیدھی سادی باتیں کرو۔ سیدھے سادے انسانوں والی۔ گناہ گاروں والی۔"

"باتیں تو ابھی بہت ہوں گی یارے! ہر طرح کی ہوں گی۔ باتوں کا تو ایک سمندر امٹنا چلا آ رہا ہے۔ لیکن کیا ہم رات بھر سڑک پر ہی کھڑے باتیں کرتے رہیں گے؟" میں نے پوچھا۔ چلنے کے بارے میں کیا پروگرام ہے؟ تمہارا آنا کہ تو چل نہیں رہا۔ گھوڑاؤں کر کھڑا ہو گیا ہے۔"

"آنا کہ... کیا میں آتا کہ میں یہاں آیا تھا؟ آنا کہ والا کمال کیا؟" اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔

"تم پر تو واقعی جادو سا ہو گیا۔ یکدم ہی تم تو ہوش و حواس میں آ گئے۔" میں نے حیرت سے کہا "ذرا دیر پہلے تک تم اسے آنا کہ رہے تھے۔" میں نے اس کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بغور اس طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو میری اپنی گاڑی معلوم ہوتی ہے... پھر اس نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ "تو اسے آنا کہ کہہ رہا تھا؟ کیا میں نے اس میں تھا؟"

"نہیں۔ نہیں۔ وہ تو تو میری ذرا تھوڑی زبان بھسل گئی تھی۔" میں نے اس کی بیٹھ پستویائی۔ "چھوڑو اس بات کو۔ آؤ دیکھیں گاڑی کیوں بند ہوئی ہے؟" گاڑی تقریباً ہی سی تھی۔ انجن میں کوئی خرابی ہونے کا نشانہ

ذرا مہر سی تھا۔ میں نے قریب جا کر جائزہ لیا تو گاڑی کا میٹر بیڑول ختم ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ راجہ سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔۔۔ مجھے یاد پڑتا ہے میٹر تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ اور بیڑول ڈولانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن پھر شاید میں بھول گیا۔ چلو۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ گاڑی بیٹیں چھوڑ دیتے ہیں۔ صبح کسی کو بھیج کر نکالیں گے۔“

”اٹال تم مجھے اپنی گاڑی میں لے چلو۔“

”صبح تک تمہیں یہاں سے گاڑی نہیں، صرف گاڑوں کے نشان ہی ملیں گے پیارے۔“ میں نے کہا۔

”چوہری ہو جائے گی؟“ اس نے کچھ ایسی بے یقینی سے پوچھا گیا یہ اس کے خیال میں کوئی انمولی سی بات رہی ہو۔ پھر خود ہی سہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں یار۔۔۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ گاڑی اگر چہ رہی ہو مگر تو میری بیوی مجھے گھر سے نکال دے گی۔“

”بہت ڈرتے ہو بیوی سے؟“ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

”ڈرتا پڑتا ہے پیارے!“ وہ لٹھنڈی سانس لے کر بولا ”گاڑی“

کو غمی اور سارے ٹھٹھاٹ بات دراصل اسی کے دم سے ہیں۔ سب کچھ اسی کا ہے۔ میں تو آج بھی وہی ناگاہ، کھٹو اور کنگال راجہ ہوں۔ بیوی کے پیسے سے کوئی کاہد پار کرتا ہوں تو اس میں گھٹا ہوا جاتا ہے۔ بیوی سے مزید بھائیوں سننا پڑتی ہیں۔“

”اور۔۔۔!“ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ”تو یہ قلعہ ہے۔ زر خرید شوہر ہو کر۔“

”اچانک اسے جیسے کوئی خیال آیا۔ چپکے چپکے ہوئے بولا۔ ”پیارا! کہیں تمہارا بھی یہی قلعہ تو نہیں ہے؟ کہیں ہم دونوں دوستوں کی ایک سی کہانی تو نہیں ہے؟ ہر ایک سی جتنی کے سوار تو نہیں ہیں؟“

”لکھنؤ اللہ! ایسا کوئی پتھر نہیں ہے۔“ میں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو ہر قسم کی بیوی سے بچا ہوا ہوں۔ میں نے تو ابھی تک شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔“

”کیا واقعی؟“ اس نے یوں حیرت سے میری طرف دیکھا گویا دنیا کا ساتواں عجوبہ اس کے سامنے آ گیا ہو۔ پھر لٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”پیارا! ہمیشہ سے ہی خوش قسمت رہے ہو۔“

”ہمیشہ سے ہی کہاں یار!“ میں نے اس کی گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”جب تک گاؤں میں تھے تب تک تو میرے حالات تم سے بھی زیادہ خراب تھے۔ گاؤں سے نکلنے ہی قسمت نے کچھ چٹا کھایا۔“

”بعض لوگوں کے لئے مفرداتی وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔“ راجہ نے کہا۔ ”لیسے میں بولا۔ گاؤں سے نکلا تو میں بھی یہی سوچ کر تھا۔ مالی حالات تو بول گئے لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اپنی آنکھوں کو بھٹانے کے لئے شراب پیتا ہوں۔ بے حساب پیتا ہوں۔۔۔ اور اس کے بعد بیوی کے ہاتھوں مزید ذلیل ہوتا ہوں۔“

میں نے اس وقت اسے گاؤں میں چڑے ہوئے اس کے دس بچوں اور بیوی کے بارے میں بتانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے ذہن پر یقیناً پہلے ہی بہت بوجھ تھا۔ اب تو اس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اب اس سے ”چوتھ کچھ“ کہنے اور اسے شرم دلانے کے بہت سے مواقع میسر آتے تھے۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے اپنی گاڑی کی ڈکی کھولتے ہوئے کہا ”میں احتیاطاً بیڑول کے دوڑن رکھتا ہوں۔ ایک تم اپنی گاڑی میں ڈال لو۔ میرا خیال ہے اب تمہاری حالت اس قابل ہو گئی ہے کہ کٹلی حد تک صبح ذرا آٹو تک کر سکو۔ اس لئے بیڑول ڈال کر تم اپنی ہی گاڑی میں بیٹھو اور میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میرے گھر چلتے ہیں۔“

پانی کپ شپ وہیں اطمینان سے بیٹھ کر کریں گے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں یار!“ وہ یکدم خوفزدہ سا ہو گیا۔ ”میں تو مجھے اتنی رات گئے تک باہر رہنے اور پینے پلانے کے سلسلے میں بیوی کے ہاتھوں ذلیل ہوا ہے۔ اگر تمہارے ساتھ چلا گیا تو پھر تو رات ہی باہر گزر جائے گی۔ اس کے بعد تو بیوی گھر میں ہی نہیں گھسنے دے گی۔ تمہارا گھر دیکھتے کا اشتیاق تو مجھے بھی ہو رہا ہے لیکن فی الحال اس پر گورام کو رہنے دو۔ ابھی تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ تم باہر ع آؤ گی ہو۔ مجھے میری بیوی کے غیظ و غضب سے بچانا۔ ممکن ہے تمہاری موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے وہ خود ہی اپنا عظیم الشان درباری پروگرام بٹولی کر دے۔ پلیر۔۔۔ تم میرے ساتھ چلو۔“

اس نے میرا ہاتھ قلم لیا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی چھلی ہوئی تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجہ سے میری ملاقات ان حالات میں ہوگی۔

بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ آئے پر میرا اس کی خبر لینے کا ارادہ تھا لیکن فی الحال مجھے نہ صرف اپنا ارادہ بٹولی کرنا پڑا تھا بلکہ اس کی مسکین سی شکل دیکھ کر مجھے ترس بھی آ رہا تھا۔

”چلو خیر۔۔۔ فی الحال میں ہی تمہارے ساتھ چلا ہوں۔“ میں نے بیڑول کا ڈالنا اس کو قصداً سے بولے کہا ”ذرا دیکھتے ہیں اس شہر کی پتی کچھ جو تمہاری بیوی کھلاتی ہے۔ مل کہاں سے گئی تمہیں ایک دولت مند عورت؟“

”جس۔۔۔ اتفاقات ہیں زمانے کے۔“ وہ لٹھنڈی سانس لے کر ڈالنا تھا تے ہوئے بولا۔ ”وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک لمحے کی جھپکی ہٹ کے بعد وہ بولا۔ ”وہ حقیقت وہ بیوہ تھی۔ وہ خود تو کچھ بھی نہیں تھی۔ خاندانی پھل منہر کے لحاظ سے وہ بھی میری طرح ”گھری“ تھی لیکن اس کا بڑا حاشہ رہا اس کے لئے کافی دولت۔“

”پانی کپ شپ وہیں اطمینان سے بیٹھ کر کریں گے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں یار!“ وہ یکدم خوفزدہ سا ہو گیا۔ ”میں تو مجھے اتنی رات گئے تک باہر رہنے اور پینے پلانے کے سلسلے میں بیوی کے ہاتھوں ذلیل ہوا ہے۔ اگر تمہارے ساتھ چلا گیا تو پھر تو رات ہی باہر گزر جائے گی۔ اس کے بعد تو بیوی گھر میں ہی نہیں گھسنے دے گی۔ تمہارا گھر دیکھتے کا اشتیاق تو مجھے بھی ہو رہا ہے لیکن فی الحال اس پر گورام کو رہنے دو۔ ابھی تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“

اس نے میرا ہاتھ قلم لیا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی چھلی ہوئی تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجہ سے میری ملاقات ان حالات میں ہوگی۔

بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ آئے پر میرا اس کی خبر لینے کا ارادہ تھا لیکن فی الحال مجھے نہ صرف اپنا ارادہ بٹولی کرنا پڑا تھا بلکہ اس کی مسکین سی شکل دیکھ کر مجھے ترس بھی آ رہا تھا۔

”چلو خیر۔۔۔ فی الحال میں ہی تمہارے ساتھ چلا ہوں۔“ میں نے بیڑول کا ڈالنا اس کو قصداً سے بولے کہا ”ذرا دیکھتے ہیں اس شہر کی پتی کچھ جو تمہاری بیوی کھلاتی ہے۔ مل کہاں سے گئی تمہیں ایک دولت مند عورت؟“

”جس۔۔۔ اتفاقات ہیں زمانے کے۔“ وہ لٹھنڈی سانس لے کر ڈالنا تھا تے ہوئے بولا۔ ”وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک لمحے کی جھپکی ہٹ کے بعد وہ بولا۔ ”وہ حقیقت وہ بیوہ تھی۔ وہ خود تو کچھ بھی نہیں تھی۔ خاندانی پھل منہر کے لحاظ سے وہ بھی میری طرح ”گھری“ تھی لیکن اس کا بڑا حاشہ رہا اس کے لئے کافی دولت۔“

”پانی کپ شپ وہیں اطمینان سے بیٹھ کر کریں گے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں یار!“ وہ یکدم خوفزدہ سا ہو گیا۔ ”میں تو مجھے اتنی رات گئے تک باہر رہنے اور پینے پلانے کے سلسلے میں بیوی کے ہاتھوں ذلیل ہوا ہے۔ اگر تمہارے ساتھ چلا گیا تو پھر تو رات ہی باہر گزر جائے گی۔ اس کے بعد تو بیوی گھر میں ہی نہیں گھسنے دے گی۔ تمہارا گھر دیکھتے کا اشتیاق تو مجھے بھی ہو رہا ہے لیکن فی الحال اس پر گورام کو رہنے دو۔ ابھی تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“

ہینرول سے تنگی کا تالا کھولتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس کی موت کے بعد اصل مسئلہ اٹھنا ہو گیا کیونکہ یہ ذرا الگ ہی لائن ہے۔ حالانکہ وہ اصل لائن آملی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ کسی چھوٹے موٹے کارخانے سے کم نہیں تھا لیکن ظاہر ہے اسے اس لائن کا آدمی ہی چلا سکتا تھا جسے تجربہ، شوق اور لگن ہوئی۔ میری گمرانی میں آنے کے بعد اس کا کچھ اور عیذا غرق ہو گیا۔ ہمیں بھی بھلا کیا پتا ہے کہ ریس کے گھوڑوں کی برید کس طرح کی جاتی ہے۔ ان کے ہاؤس طرح اٹھائے جاتے ہیں۔ ہم نے تو گھوڑے زیادہ تر انگوں میں ہی رکھتے ہوئے دیکھے تھے جن کی پٹلیاں نکلی ہوتی تھیں، چابک کھاتے تھے اور پانچ کر کے چلتے تھے۔ دو چار سو روپے میں یک جاتے تھے۔ ریس کے گھوڑے کی تو دو چار سو روپے میں تصویر بھی نہیں ملتی۔"

میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا "اے انوکھی دہ! تمہارے سر پر تانگہ کچھ زیادہ ہی سوار ہے۔ میں نے پوچھا تھا اس پر دو سے تمہاری ملاقات کیونکر ہوئی اور وہ بیوہ سے تمہاری بیوی کیونکر بن گئی؟ ریس کے گھوڑوں اور گدھوں کی کہانی بعد میں سناتے رہنا۔"

وہ ڈبے سے تنگی میں ہینرول ڈالنے لگا تو اس کے ہاتھوں کے ارتعاش کے باعث وہ اچھا ہینرول بننے لگا۔ میں نے ڈاس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت یہ ہینرول بہت قیمتی ہے۔ منافع مت کرو۔ اگر یہ بھی راستے میں ختم ہو گیا تو تمہیں گھر جانے کے لئے کوئی تانگہ بھی میرے سر سے آئے گا۔ لاؤ میں ڈال دوں۔"

وہ میرے سوال کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ اصل میں تم نے کیا پوچھا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے میری شادی کی نوبت آجائے گی۔ قسمت کے کھیل واقعی خرابے ہوتے ہیں۔ میری اصل میں اس کے ڈرائیور سے دوستی ہو گئی تھی۔ ڈرائیور کو کسی کو کبھی میں سروٹ کو اڈر ملا تھا اور میں ڈرائیور کے ساتھ اس سروٹ کو اڈر میں چھپا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے میں چونکہ انکمن کی اجازت کے بغیر رہ رہا تھا اس لئے چاروں کی طرح رہتا تھا۔ ڈرائیور نے اس کو کھانچے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا کیونکہ شرمیں میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔"

میں ہینرول ڈال چکا وہ دھمکن لگاتے ہوئے بولا۔ "راتوں کو وہ سوچ نکال کر مجھے ڈرائیور تک سکھایا کرتا۔ پھر اسی نے پیسے خرچ کر کے مجھے لائسنس لے کر دیا۔ ارادہ یہی تھا کہ ڈرائیور تک کا "بہتر" ہاتھ میں ہو گا تو کسی پچھلے کو بھی پڑا ڈرائیور کے طور پر نوکری مل جائے گی۔"

اس نے تنگی کو تالا کر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا "لیکن پھر ہوا یہ کہ ایک روز "بینک صاحب" نے مجھے دیکھ لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ہسٹر لایا تھا کہ سروٹ کو اڈر سے جانے کا حکم دے گی اور ڈرائیور کو

میں نے تفصیل نہیں پوچھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس پہلی ملاقات اور شادی کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی ہوں گی، بڑے پکر چلے ہوں گے۔ راضی و غرض پہلے شغل مختصر الزوج تھا لیکن اس کی شخصیت میں بہر حال منتخب نازک کے لئے خاصی کشش موجود تھی۔ وہ سرخ دپیہ اور دجبرہ تھا۔ اوپر سے عمرزور بھی تھا۔ شادی اس کی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ اب بھی اسے دیکھ کر کسی کو گمان تک نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ دس بچوں کا باپ تھا۔ اگر کسی بوڑھے کی بیوہ دو تندر ہونے کے باوجود اس پر بھراں ہو گئی تھی تو مجھے اس پر زیادہ حیرت نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ شغل صورت کی طرف سے خود بخود ذرا کمزور ہی ہو۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ عمر میں بھی اس سے کافی بڑی ہو۔ لیکن فی الحال میں نے یہ باتیں پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے سوچا ملاقات ہوگی تو خود بخوبی سب کچھ سامنے آجائے گا۔

دیسے بھی راجہ کا نشانہ ہرن ہوا تھا تو اس پر حکمن نے غلبہ پایا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے اور کہاں کہاں خوار ہوتا ہوا آ رہا تھا۔ اب شغل سے نہیں فتنے میں سے گرا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کم از کم اپنے گھر تک تو خیریت سے ڈرائیور تک کر لے۔ وہ خود بھی اب گھر جانا چاہتا تھا۔ تھکے تھکے سے انداز میں ڈرائیور تک سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا "تم اپنی گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔"

ہم آگے پیچھے وہاں سے روانہ ہوئے۔ ڈرائیور تک اس کی اب بھی کافی اطمینان نہیں تھی لیکن قیمت یہ تھا کہ سڑکوں پر لاکاؤ کی گاڑی کا ڈی آتی جاتی رکھائی رہتی تھی۔ وہ بھی خائے وقفے کے بعد۔ میں اس کی خیریت کی دعا میں مانگتا اس کے پیچھے پیچھے گاڑی چلا رہا۔ ایف سی کالج کے سامنے سے گزر کر اس نے بل عبور کیا اور سرے کے دو سری طرف شاہ جمال کی طرف مڑ گیا۔ سرے کے کنارے سڑک کی چڑھائی پر چڑھتے وقت اس کی گاڑی بری طرح لڑائی تھی اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ یہی پرچہ سننے کے بجائے وہ سر میں نہ اتر جائے لیکن قیمت رہا کہ وہ گاڑی کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ درنہ میں نے تو چھلانگ لگا کر اسے سرے نکالنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔

شاہ جمال ایک مختصر لیکن مشہور لوگوں کی آبادی تھی اور راجہ نے جس کو کبھی کے سامنے گاڑی لے چکر روکی وہ خاصی شاندار تھی۔ اس نے ہارن سے بلکی سی "بپ" کی آواز نکالی اور چکر دیا۔ اس نے جلدی سے گیت کھول دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ڈرائیور سے

لاڑی لے گیا۔

راجہ نے گاڑی سے اتر کر راجہ دارانہ انداز میں چوکیدار سے بات چیت کرنا شروع کی۔

”میرے کو کیا ملامت صاحب! چوکیدار نے غم بھاری سے کہا۔ میں نے ان کو روت دیر سے نہیں دیکھا۔“

راجہ کو گویا کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ اور چالی سے اندرونی دروازے کا تالا کھولا۔ اس کی دیکھا می میں نے بھی چوہوں کی طرح ہال میں قدم رکھا۔ ہال میں پیرا تھا۔ اس نے لائٹ آن کی اور دھڑکے پیچھے اس کی کھمبے کی بجلی۔ غیر ارادی سے انداز میں وہ گویا میرے پیچھے پیچھے کی شکل کرتے لگا۔

میں نے دیکھا سب سے اوپر والی بیڑھی پر خوبصورت نائٹ ڈن میں ایک خوبصورت عورت دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے بالکی تھی۔ اس کے سیاہ رنگش ریشمی بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اور اس ریشمی رات کے لباس میں اس کا چاند چرو گویا ماحول منور کر کے ہوئے تھا۔ اس نے ذرا سا بھی میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اور یہ اچھا ہی کیا تھا۔ چاند چہرے پر مصنوعی رنگوں کی چائیاں شاید اچھی نہ لگتیں۔

میں اس کا چوہا صحیح طور پر تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن بے پناہ بےصورتی کا ایک تاثر تھا جو فوری طور پر مجھ تک پہنچا تھا اور یہ اثر میرے لئے حیرت کا ایک جھٹکا تھا۔ میرے ذہن میں تاثر کچھ ایسا تھا کہ کسی امیر بوڑھے کی خاصی بڑی عمر کی کوئی بھاری بھر کم لڑیا ہوگی جسے اپنی شخصیت کی کمزوریوں کا احساس ہوگا اور راجہ سے ایک غیبت قسم کا شور بدکھائی دیا ہوگا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ لاجسٹائی طور پر بھی ضرور راجہ پر حاوی ہوگی اور کوئی بغیر نہیں کہ اپنے ضرورت اس کی ”نکاحی“ بھی لگائی ہو۔

لیکن وہاں بلندی پر جو عورت کھڑی تھی اس کے ساتھ تو اگر لڑکی کی بیساکھیاں نہ ہوتیں تب بھی شاید اس کے لئے رشتوں کی گناہ نہ ہوتی۔ عمر اس کی شاید مجھ سے اور راجہ سے تھوڑی سی زیادہ ہو، لیکن یہ اس کی شخصیت کا کردار پہلو نہیں بلکہ اس کی خوبی ہی کی تھی۔ وہ عین سچ آسمان پر آیا ہوا آفتاب بن گئی تھی۔ ہمارے جسم کی تھی لیکن ڈھیلا ڈھالا نائٹ گاڈن بھی اس کے لڑائی کی قیادتوں کو چھپانے میں ناکام تھا۔

وہ ہمارے جسم کی شخصیت کی بالک ہرگز نہیں تھی۔ کرتلی شاید اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ قمار سنوانی نزاکتیں اور لافیں اس کے چکر سے جھانک رہی تھیں۔ اس کے باوجود راجہ اس سے خوفزدہ تھا۔ اس کا خوف بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ اس وقت میں رعب، مکتوت، حتیٰ کہ بالکی ہی خوفناک بھی سمجھ رہی تھی لیکن اس کا اندر ذہن کماں تھا، یہ جاننا مشکل تھا۔ شاید وہ اس کی کامیابی تھی جو راجہ جیسے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھی یا

شاید کوئی اور وجہ تھی جسے راجہ ہی سمجھ سکتا تھا۔ بہر حال وہ اس کا شور بر تھا۔ میں تو ایک اجنبی تھا جو آج پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ بعض عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے یا پھر یہ ان کی ایک ادا ہوتی ہے کہ وہ جہاں آپ کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہیں لیکن درحقیقت وہ کسی تازیدہ آنکھ سے آپ کو بہت غور سے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اس نے بھی کچھ اسی ادا کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف راجہ پر اپنی نظر مرکوز رکھی۔ اس کے نزدیک گویا میں وہی موجود ہی نہیں تھا۔

”تم آج پھر اتنی دیر سے آئے ہو۔ اور اتنی دیر سے مجھے تمہارے وجود سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ خدا کی پناہ! تم شراب پیتے ہو یا اس سے فائدے ہو؟“ اس کی آنکھوں اور چہرے سے کئی گنا زیادہ سرمہ لگا گیا اس کے لیے میں سمٹ آئی تھی۔ مجھے ان شہزادوں کی بد نصیبی پر افسوس ہوتا تھا جن کی بیویوں کے لیے میں ان کے لئے اتنی سرمہ لگاتی تھی۔ صرف سرمہ لگنے غرت سے زیادہ بڑی محسوس ہوتی تھی۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو پھر میں نے اتنی زیادہ تو نہیں پی تھی۔ میں بالکل نشے میں نہیں ہوں۔ میں خود گاڑی چلا کر آیا ہوں۔ دیکھو میں بالکل سیدھا کھڑا ہوں۔“ راجہ نے سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کی اور اس کی کوشش میں گرتے گرتے پھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ایک ہاتھ سے اسے سارا دبا۔ میں دراصل ایک تک اس کی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے ذہن میں جھماکے سے دور ہے تھے۔ آج کی رات شاید میرے لئے حیرتوں کی رات تھی۔ پہلے راجہ کا راستے میں لگنا جانا ایک حیرت تھی۔ پھر اس کی بیوی کو دیکھنا اس سے بڑی حیرت تھی۔ کیا اسی عورت کو اس کی بیوی ہونا تھا؟

اس عورت کی تصویر میرے ذہن کے نیاں خانوں میں بہت دور کہیں تاریک گوشے میں پڑی تھی۔ اس پر فراموشی کی گرد نہ در نہ جم چکی تھی لیکن آج قدر کے ان دیکھے ہاتھ نے اسے جھانپا مجھے کر میرے سامنے لا رکھا تھا۔

تصویر بہت بدلی چکی تھی مگر بہر حال وہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ میری یادوں کے خزانوں میں اس کی جس زمانے کی تصویر محفوظ تھی اس وقت وہ ایک دھان بان سی سرخ و سپید لڑکی ہوا کرتی تھی۔ برف بہتی تھی۔ شتاب میں اکثر آؤسے سے زیادہ چوہ بچاتی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اور یہ آنکھیں بدھرو تھیں۔ انکھوں کو اصل چہرہ کو دیتی تھیں۔ ہر چہ میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتی تھیں۔

کبھی کبھی وہ پورے چہرے پر بھی شتاب ڈال لیتی تھی مگر اس چاند چہرے کی کرشمیں باریک سیاہ کپڑے کی تلوں سے بھی چھن چھن کر باہر آتی رہتی تھیں۔ باریک کپڑے کی وہ وہیں اس حسن بلا خیر کو چھپانے کے لئے قطعی ناکامی محسوس ہوتی تھیں۔

خوبصورتی اس کا ایسا اچھا تھا جسے ابھی وقت بھی بچنے میں  
کا سبب نہیں ہوا تھا۔ عمر کے ساتھ اس کے نین نقش میں "اس  
کے سرپا میں پختی آگئی تھی۔ نشیب و فراز میں بھی بڑی تبدیلیاں  
آگئی تھیں لیکن ان سب تبدیلیوں نے اس کی دلکشی میں اضافہ ہی  
کیا تھا۔ کسی اور طرح کا اضافہ۔

میں ساکت کھڑا تھا اور اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی  
سرسراہٹ سن رہا تھا۔ میرا ذہن میرے حواس میرے گاہوں کی  
ایک گلی میں بھٹک رہے تھے جہاں میں اس کے انتظار میں سستا سا  
دوالا، سستی سی عطر کی شیشی، انمول جذبات سے آراستہ خط کے  
ساتھ لے کر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ وہ خط جن کا بھی جواب نہیں آیا  
تھا۔

پھر جب میں نے اس کی طرف سے پاپس ہو کر ذہن دوالے کے  
دروازے اس کی طرف سے بند کر لئے تھے تو ایک طویل عرصے بعد  
اس کا خط چلا آیا تھا۔ اس نے تنہائی میں لٹنے کے لئے بلایا تھا۔ میں  
اپنی زندگی کی وہ شام بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اسی کے نیم پختہ مکان  
کا چھٹا نیم تاریک کمرہ۔ اس کی قربت کی خوشبو۔ اس کی  
سرگوشیوں کا نقش۔ اس کی حوصلہ افزائی۔ بظاہر یہی لگا تھا جیسے وہ  
میرا ہاتھ تھام کر خرابیوں کے سمندر میں اتر گئی لیکن پھر زائد  
ظاہر رونے بھی دہی لگی تھی۔

میں نے سبب پوچھا تو وہ نے دوتے اس نے ایک عجیب بات  
مجھے بتائی تھی جسے میں آنے بھی نہیں بھولا تھا۔ شاید کبھی نہیں بھول  
سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا "تم گواہ ہو" میں نے کس طرح اپنی حفاظت  
کی۔ یہاں کے کس کس خوردہ نے مجھے حاصل کرنے کے لئے کیا کیا  
حبیب نہیں آزمایا مگر میں نے اپنے آپ کو سب کا موتی بنا کر رکھا۔  
اس کا صلہ میرے باپ نے مجھے یہ دیا ہے کہ میری شادی ایک ایسے  
مخلص سے طے کر دی ہے جس کی بیٹیاں عمریں مجھ سے بھی بڑی  
ہیں۔ میں نے سوچا ہے اب گناہ تو کر لوں۔ تاکہ آئندہ جو زندگی  
مجھے کراوائی ہے اس کے بارے میں یہی سوچ کر دل کو تسلی دے  
سکوں کہ وہ میرے گناہ کی سزا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ گویا پیش کے لئے ہم ہو گئی تھی۔ ایک  
عرصے سے شاید میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی کسی  
سورہ پر اس سے دوبارہ ملا کاٹ ہوگی۔ خصوصاً اسے راجو کی بیوی  
کے روپ میں دیکھنے کا تو میں نے ظاہر ہے تصور بھی نہیں کیا تھا۔  
میں نے محاورے نہیں "حقیقتاً آنکھیں مل کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ  
شیم ہی تھی۔ راجو نے اسے مجھ کو کہہ کر پکارا تھا۔ اس سے بھی  
ظاہر ہوا تھا کہ اس کا نام شیم ہی تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا  
وہی تھیں۔ وہ شیم کی کوئی ہم شکل نہیں بلکہ شیم ہی تھی۔

راجو گویا اس کے غیظ و غضب کا رخ سونے کے لئے  
بولتا "بورا ادھر تو کیجیو۔ یہ میرے ساتھ کون آیا ہے۔ یہ افضل  
چوہدری ہے۔۔۔ اچھل چوہدری کا بیٹا۔ یہ بھی اپنے گاہوں کا ہی

ہے۔ شاید تم نے بھی وہاں دیکھا ہو۔ شاید تم پہچان سکو۔"

اب اس نے نہایت آہستگی سے گردن میری طرف کھمالا اور  
وہ لسان ساز آنکھیں میری آنکھوں سے آنے لگیں۔ نہ جانے کیوں  
میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے کئی لمحے پہلے پہچان چکی تھی لیکن اس  
نے کچھ یوں ظاہر کیا جیسے اس کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے  
ششمالی کا سورج طلوع ہو رہا ہو۔

اس نے واقعی راجو کو بخش دیا۔ اس کی برہمی، بارہا آہستگی اور  
فلکی رخصت ہو گئی۔ دھیرے دھیرے ایک مدھم سی مسکراہٹ کی  
کرن اس کے ہونٹوں پر پھولی اور وہ بہت دھیرے دھیرے مجھے میں بولا۔ "ابن  
میں نے انہیں پہچان لیا ہے۔ تماری گلی سے ایک گلی چھوڑ کر ہی  
تو رہتے تھے۔۔۔ پندرہ سو تو یہ اس وقت بھی تھے۔ مگر اب تو پندرہ  
ہست ہی گھر آئی ہے۔"

راجو اپنی بیوی کے منہ سے دوسرے کی وجہات کا ذکر کرنے کر  
ذرا بھی خجلیس ہوئے بغیر بولا۔ "یہ سب پیسے کا کمال ہے میری جان! یہ  
دولت آجائے تو کبھی کبھی شخصیت بھی لٹکا رہے لگتی ہے۔  
غرت تو تیکڑو مٹی کی طرح ہے پتھر مٹی میں تسخیر کر تویرے کی چبک دک  
بھی مانہ پڑ جاتی ہے۔ موصوف بہت بڑے سراپے دار ہیں گئے ہیں۔  
دولت چھریا زکراں پر رہی ہے۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" شیم آنکھ نہیں بھپک رہی  
تھی۔

راجو کے لئے گویا یہی خوشی کافی تھی کہ وہ بیوی کے غیظ و  
غضب کا نشانہ بننے سے بچ گیا تھا۔ اس کی ہانسی کھلی جا رہی  
تھیں۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا تم بھی مجھ سے۔۔۔ میرا  
مطلب ہے شیم کو پہچانتے ہو؟"

"ہاں۔ پہچانتا ہوں۔"

"اوم۔۔۔" اس کے لئے یہ جواب گویا کچھ خوش کن نہیں  
تھا۔

"کیوں۔۔۔ منہ کیوں لٹک گیا تمہارا؟" میں نے پوچھا۔  
"شیم جلا تک اس زمانے میں برقع پہنتی تھی۔ لیکن مجھے پولا  
لگتا ہے جیسے اس وقت بھی اس کو سب جانتے تھے۔ اور ابھی تک  
نہیں بھولے۔" راجو گویا بہت کر کے بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا "شیم خود ہی اپنے چہرے  
پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قدرے جارحانہ سے انداز میں بولی "یہ  
صورت ایسی نہیں کہ لوگ اسے آسانی سے بھول جائیں۔"

"شاید برقع ہی کی وجہ سے لوگوں نے زیادہ یاد رکھا ہو۔" میں  
نے کہا "میرا خیال ہے پورے گاہوں میں شیم برقع والی واحد لڑکی  
تھی۔"

شیم بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ہم لمبے میں بول رہی  
تھی۔ "ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو۔" بے پردگی  
کے اظہار کے لئے اس نے آہستگی سے کندھے اچکائے اور۔



طبقے میں اٹھنا بیٹھا سکھایا۔ دنیا کھائی۔ وہ بڑھا مٹھا کر اس کا دل جوان تھا۔ اس نے مجھ سے اپنی محبت کی۔ اتنی محبت کی۔ کہ میرے دل میں اس کے خلاف جتنی نفرت جتنی ہوتی تھی میں اسے نکال بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر راجو کی طرف دیکھا۔ وہ سر کھارہا تھا۔ وہ دانت چپن کر معنوی غصے سے اس کے کندھے پر ایک گھونسا رسید کرتے ہوئے ہوئی "یہ شخص تو جیلس بھی نہیں ہوتا۔ میں جتنی اپنے مدمردم شوہر کی تعریفیں کرتی رہتی ہوں اور یہ دیدے پھاڑے آرام سے بیٹھا سنا رہتا ہے۔"

"مردمیں پر غصہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ان کے بارے میں جیلس ہو نا چاہئے۔" راجو نے نہایت مدبرانہ طرز میں کہا "اور بالفرض میں جیلس ہوتا بھی ہوں تو ضروری نہیں تھیں اس کا علم ہو سکے۔ دلوں کے بھید تو اللہ ہی جانتا ہے۔" اس نے دھڑلانا انداز میں ہجست کی طرف انگلی اٹھائی اور ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ میں مسکرائے بغیر نہ سکا۔

خیم لھنڈی سانس لے کر گویا اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے اصل موضوع پر آگئی۔ "قسمت انسان کو کب نکال اور کس سے نکرادیتی ہے؟ انسان اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے شوہر کے انتقال کو ایک سال گزر چکا تھا اور مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ راجو میرے ہی گھر میں سونٹ کا در میں پھپک کر میرے ذرا نیوہ کے ساتھ رہ رہا ہے۔"

"یہ قسم میں افضل کو سنا چکا ہوں۔" راجو اس کی بات کاٹنے ہوئے ہوا "البتہ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم ہمارے گاؤں کی نکل آئی تھیں۔ تم نے مجھے بھانپنا تھا اور یہ معمولی سی شلماسائی بھی ہزاری شادی کی ایک وجہ بنی تھی۔"

"اور سری دندوات بھی تھیں۔" خیم لھنڈے کھوٹے سے لہجے میں بولی "میں یکدم بہت خاشا خاشی ہو گئی تھی۔ سوچیں او! او! کے ساتھ میری مقدمے بازی چل رہی تھی۔ میں ایک سارے کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ لیکن اب میں سوچتی ہوں راجو سے شادی کرنے سے تو بہتر تھا میں ایک بکرا پال لیجی۔"

"عام بکرا تمہارے ساتھ عدالتوں میں چیشیں پر نہیں جاسکتا تھا۔" راجو اس کے قریب بیٹھے بیٹھے ذرا سکتزے ہوئے ہوا "اور وہ جو ایک بار میں نے تمہارے سوتیلے بیٹے کی تھوڑی سی ٹھکانی کرانے کے لئے کرائے کے گھنڈوں کا بندوبست کیا تھا۔ وہ کام کوئی عام بکرا کر سکتا تھا؟ وہ کام صرف خرائی کا بکرا ہی کر سکتا تھا۔ مجھ جیسا خرائی کا بکرا۔"

خیم نے ایک بار پھر اسے تھوڑا دیکھ کر غور کیا لیکن میں اب اس کے رویے کے بارے میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے راجو کے لئے اس کا غصہ اس کی برہمی اس کی بیزاری کچھ معنوی معنوی ہی تھی۔ درحقیقت یہ محبت ہی کے

روپ تھے۔ اس نے اپنے بڑے مرحوم شوہر سے بھی محبت کی تھی اور اب راجو سے بھی محبت کرتی تھی۔ اس کے دامن میں محبت صرف میرے لئے ہی نہیں تھی جس نے لڑکپن کا پورا دور اس کے خواب دیکھتے گزارا تھا۔ آخر میں وہ انسانی حدوں تک مہربان بھی ہوئی تھی تو صرف تقدیر سے انتقام لینے کے لئے۔ وہ نوافذ اس کی محبت کا ثبوت تو نہیں تھی۔ میرے دل میں ایک عجیب بے عنوان سے درد کی تلخی پھیل گئی اگر آپ نے کسی سے ٹوٹ کر محبت کی ہو بے غرض محبت کی ہو اور آپ کو احساس ہو جائے کہ اس کے دل میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی تو دل کا عجیب سی عالم ہو جاتا ہے دنیا میں چاہے آپ سب کچھ پاگے ہوں مگر احساس محرومی آپ کی رگ رگ میں پھیل جاتا ہے۔

خیم نے گویا راجو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "میرے شوہر کی چاہے کوئی لڑیاں بھی توڑ ڈالے لیکن اس کی زبان بند نہیں کر سکتا۔"

"اس پر مجھے حیرت ہے۔" میں نے کہا "یہ خوبی تو بھاری کی علامت ہے۔ جبکہ راجو تو تمہارے سامنے بڑوں کی سی زندگی گزار رہا ہے۔"

"اس غلامی میں مت رہنا۔" خیم تیزی سے بولی۔ "تمہارا خیال ہے یہ مجھ سے ذرا ہے؟ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ مصطفیٰ دیک کر رہتا ہے۔ اس عیش و آرام سے محبت کر رہا ہے جو اسے میری وجہ سے میسر ہے۔ اسے معلوم ہے اگر کبھی ہمارے درمیان اختلافات اس حد تک بڑھے کہ علیحدگی کی نوبت آگئی تو اسے اس گھر سے نکالنا ہوتا ہے۔ اس کا جس کا اس میں حوصلہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے۔" وہ خاموش ہو کر راجو کو گھورنے لگی مگر اب اس کی نظروں میں خوشخواری نہیں تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "یہ دراصل ہم کرا دیک کر ڈر چکے ہیں کراپنی پوزیشن سے محفوظ ہونا ہے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی چکا ہو گا کہ انسانی اندازات بھل بھلیوں کا ایک لائق سلسلہ ہے۔ انسان نہ جانے کن کن باتوں سے لذتیں کیشہ کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ مجھے چاہئے کہ غصہ ڈال کر اور خود بھیگتی ہوں کہ بڑی لذت محسوس کرتا ہے۔ میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ جو کچھ یہ ظاہر کرتا ہے وہ صرف اس کی ایک تنگ ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس روز اس کی مصلحتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا یا اس کا دل مجھ سے بکریا تو میرے گھونٹنے کے جواب میں بیٹھے گات رید کرے گا۔"

"اے۔۔۔ میری یہ جرات کہاں مجھ پر میری جان! راجو لھنڈی سانس لے کر بولا۔ اس نے خیم کی زبانی اپنا نفسانی تجزیہ بڑی توجہ سے سنا تھا لیکن اس کے چہرے پر پھیل ہوئی مسکینگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے بھی شبہ ہوا کہ اس کے متعجب و دو دہش کوئی شاطر چتر مسکینگی کے لہارے میں چھپا

دیکھنا۔" میں نے کہا۔

"تم چاہے اس بات کو جس طرح بھی کہو لیکن یہ برمال  
بڑوں کی کا کام ہے۔ مجھ جیسے کم ہمت لوگوں کی سے اس کی توقع  
رکھی جاسکتی ہے۔ میرے اس طرز عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ  
میرا دل غصے اور جھجھلاہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ میں چونکہ محسوس کرتا  
تھا کہ والد صاحب نے میری زندگی خراب کی ہے۔ میری شادی بھی  
انہوں نے میری مرضی کے خلاف کی تھی۔ میں نے سوچا انہیں ذرا  
مزہ آئے، بے شک وہ کرپانے کی دکان کرتے ہیں لیکن ذرا سچ طرح  
انہیں آئے وال کا بھانڈا معلوم ہو۔ اس لئے میں یہی بچوں کو ان  
کے سر پر چھوڑ کے بھاگ آیا۔"

"والدین کے بارے میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتے چند! "  
میں نے طاقت سے کہا "ان کے بارے میں یہ کہنا بدعت ہی پڑا ہوتا  
ہے کہ انہوں نے زندگی برباد کر دی۔ میرا خیال ہے کوئی بھی ماں  
باپ اپنی اولاد کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہے۔"  
"ہاں تو نہیں ہیں لیکن بعض اوقات ان سے ہو جاتی  
ہے۔" راجو مت بڑا کر بولا۔ "اپنی دانست میں وہ بزرگام اولاد کی  
زندگی سنوارنے کے لئے کرتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کام تو  
اولاد کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔"

"چلو شادی تو تمہارے باپ نے تمہاری مرضی کے خلاف  
کر دی تھی۔ دس بچے بھی کیا تمہاری مرضی کے خلاف ہو گئے؟"  
میں نے پوچھا۔

"بچے۔" اس نے کھیانے سے انداز میں سر کھپایا۔ "بچے تو  
بس پھر ہو ہی جاتے ہیں نا۔ کم عمری اور نا سبھی کی شادی میں۔  
چاہے شادی زبردستی ہی کی ہو۔"

"برمال۔۔۔ تم نے خیمہ کو اپنی اس شادی کے بارے میں نہیں  
بتایا ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں بھئی۔ اور تم بھی مت بتانے بیٹھ جانا۔" اس نے  
مضطربانہ انداز میں سرگوشی کی۔ اسی دوران خیمہ کی آواز سے  
اندازہ ہوا کہ وہ کچن سے واپس آ رہی تھی۔ راجو سر جھکا کر بیٹھ گیا۔  
ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ بطور شوہر اس کی  
پوزیشن دیکھ ہی کچھ قابلِ رشک نہیں تھی لیکن اس شادی کی بنیاد  
بھی صحت پر تھی۔

باتوں ہی باتوں میں صبح کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ خیمہ کچن  
سے واپس آنے لگی۔ "راجو سے آج پہلی ملاقات میں ہی تمہاری  
رات خرابی میں گزر گئی ہے۔ ابھی آگے آگے دیکھنا کیا ہوگا۔"  
"دوستوں کی وجہ سے ہوئے والی خوراک میں بھی ایک لطف  
ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ پھر توجہ بھر کے لطف اندوز ہوتے رہنا۔" خیمہ  
ٹھنڈی سانس لے کر بولی "نی الحال تو میں صرف یہ مشورہ دوں گی کہ  
تم ناشتا کر کے ہی جانا۔ صبح ہونے والی ہے۔"

آخری نوکین سے نوجوانی تک اس کا اور میرا ساتھ تھا۔ یہ تو  
معلوم تھا کہ وہ اس وقت بھی بڑا تیز و طرار تھا لیکن عمر کے جس  
رہ میں ایک دوسرے کی کچھ خبر نہیں رہی تھی وہ بہت زیادہ  
بلاں لانے والا دور تھا۔ جب تک مجھے اس سے زیادہ واسطہ نہ  
آج تک میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ گزرنے ہوئے ماہ  
بل میں اس کی شخصیت میں اندر ہی اندر کیا تبدیلیاں آچکی  
تھیں۔

برمال اسی طرح کی باتوں کے دوران انہوں نے کھانا کھایا۔  
میں نے صرف کافی کی فراہمی کی تھی۔ اس ساری نشست کے  
دوران خیمہ اتنی خواہ کچھ بھی کرتی رہی لیکن اس کی نظریں زیادہ تر  
میرے ہی مرکوز رہیں۔ کبھی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے وہ گویا  
گڑے ہوئے برسوں کی تمام ان کی کمائیاں پڑھنے کی کوشش کر  
رہی تھی۔ جو چیزیں وہ پڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ان کے  
بارے میں اس نے ان گنت سوال کئے۔ وہ میرے بارے میں سب  
کو جان لینے کے لئے بے یقین تھی۔ میں قدرے محتاط انداز میں  
اپنے بارے میں بتاتا رہا۔

اس دوران وہ ایک بار لازماً سے کچھ کہنے کے لئے اٹھ کر  
کچن بھی گئی تو میں نے سرگوشی میں راجو سے پوچھا "تم نے اسے بتا  
کہا ہے کہ گاؤں میں بھی تمہاری ایک عدد دیوی اور دس۔ پچھتر موجود  
ہیں؟"

اس کے چہرے سے سُرخئی اور تھماہٹ یکدم غائب ہو گئی۔  
اس نے خوفزدہ سے انداز میں ایک نظر دواڑے کی طرف دیکھا  
اور پھٹی پھٹی آواز میں بولا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شادی تو تمہاری میرے سامنے ہی ہو چکی تھی۔ اور بچے میں  
چوڑا ہلے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ بہت بڑے حال میں ہیں۔ تم ان کی  
نگاہیں نہیں لیتے؟"

"وہ منزل پر اٹھی رکھ کر مجھے غاموش رہنے کا اشارہ کرتے  
ہے۔" اس سلسلے میں بعد میں بات کریں گے۔

اب جب اس نے دیکھا کہ خیمہ کے فوری طور پر کچن سے واپس  
لے کے آثار نہیں تھے تو وہ سرگوشی میں بولا۔ "میں جب گاؤں  
آتا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میری آدمی زندگی ماں  
اپنے تباہ کر دی تھی اور باقی آدمی زندگی بچے تباہ کر دیں گے۔  
وہاں سے خواب ٹوٹ گئے تھے۔ اور بے شک دوستی اتنی زیادہ  
ناگہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ میں بہت شگ آکر  
بہک رہا تھا۔" وہ کہتا تھا۔

ایک بار جب اس نے احتیاطاً دواڑے کی طرف دیکھا اور بات  
انہوں نے کہنے سے بولا "اب میں پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھ میں  
بھروسہ نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ اپنے دس  
بھائی اور بیوی کو پیچھے چھوڑ آنا۔ پھر پلٹ کر ان کی طرف نہ



”مشہور معقول ہے۔ قبول کیا جاتا ہے۔“ میں نے شاہانہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد بادشاہ میرزا لگ گیا۔ راجہ نے تو چونکہ رات کا کھانا ہی کچھ دیر پہلے کھایا تھا اس لئے اس نے ناشتے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اب باقاعدہ ادغہ رہا تھا۔ اس کی حالت پتا رہی تھی کہ اس کا بس چلے تو کھانے کی میز پر سر رکھ کر سو جائے۔

ناشتے کے بعد میں نے اجازت چاہی۔ خیمہ مجھے چھوڑنے کیٹ تک آئی۔ راجہ نے بھی گرتے پڑتے اس کے پیچھے پیچھے آنے کی کوشش کی لیکن چند قدم چل کر ہی اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”یار! میرا سر گھوم رہا ہے۔ میں بندہ دم میں جا رہا ہوں۔ اگر میں نے مزید چلنے کی کوشش کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ گر پڑوں گا اور اپنی بیگم کی مزید ذانت پھینکار سنوں گا۔ اس لئے یہیں سے خدا حافظ۔“

ذرا تیروے میں لنگھا اندھیرا تھا۔ خیمہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”ہائیں بہت ہوئی ہیں۔ پھر بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے بہت سی باتیں ان کی رہ گئی ہیں۔ آئندہ ملاقات جلد ہوئی چاہئے۔“

میں نے لچکاپاٹ آمیز انداز میں اس کا ہاتھ تھاما اور یکدم گویا ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کڑیاں بچھڑ گئیں۔ اس کے ہاتھ کے شناسا لمس میں وہی رسول پہلے کی سی حرارت تھی وہی گداز تھا۔ میں نے ان جھلملاتی اور شکر سی آنکھوں میں جھانکا جن میں کہیں میرے لاکھن کی یادوں کا کشمیر خزانہ دفن تھا۔ ان تمام باتوں کی طرف دیکھا جن کی سرگوشیاں میری سماعتوں کی جھیل میں ابھی تک ڈوبی ہوئی تھیں۔

میرے محسوسات بھی کہیں آسمان اور زمین کے درمیان ہلکورے لینے لگے۔ میں نے گہرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کی سرگوشی ہوا کی آہٹ سے بھی مدھم تھی۔ ”کیا اب میں تمہیں اچھی نہیں لگی؟ کیا وہ عشق لڑکھن کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا؟ وہ مٹی جون کی چلائی دیوہروں میں تمہارے راستے میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا۔“

باتی خوالے اس نے نہیں گوارائے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس موضوع پر تو خاموشی بھی بول سکتی تھی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں جب باتیں کرنے پر آمنا تھا تو اپنے آپ کو بہت باتوں ثابت کر سکتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا جب میں لفظوں کے جنگل میں جھٹکا پھرتا تھا اور مناسب الفاظ میرے ہاتھ نہیں آتے تھے۔ اس وقت بھی میں کم قسم تھا اور نہ جانے کیوں میری کپشیاں سنار ہی تھیں۔

وہ انگلی سے میرے کوٹ کے کالر پر لکیری کھینچتے ہوئے بولی ”میں تم سے خدائی میں ملنا چاہتی ہوں۔ کل میں تمہیں فون کروں گی۔ جب راجہ گھر نہیں ہو گا۔“

”تم اب میرے دوست کی بیوی ہو۔“ آخر کار میرے حلق

سے چھٹی چھٹی سی آواز نکلی۔ میں اپنی گاڑی کے سامنے اڑھا۔ چونکہ راکٹ سے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے ایک طویل نظر لے کر تھوڑا سا حوصلہ اور بہت سی ہوا پیچھے مڑوں میں بچھڑ گئی ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ تم خدائی میں مجھ سے طرہ پرسل پڑا خدائی میں ملی تھیں تو ایک ایسا دھم دے گئیں تھیں جو مذمت پر مشتمل ہوا تھا۔ آج پھر تک لکھ رہی تھی۔“

”میں تو سمجھی تھی میں تمہیں ایک خوبصورت یادوں پر جاری ہوں۔ کھردری اور ناہموار زندگی میں ایک خوبصورت میل۔ محرومی کے مارے ہوئے روز و شب میں ایک چھلکی خوشی۔“ اس کے ہونٹ حرکت کرتے دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اس کی آواز اسی طرح میری سماعت تک پہنچ رہی تھی جیسے ٹھہری ہوئی جھیل میں دم ہوا سے ارتعاش سایدا ہوتا ہے اور لہریں کناروں تک پہنچتی ہیں۔

”وہ خوشی تھی؟“ میں نے پلکے سے کرب سے کہا ”جس پر تم پھوٹ پھوٹ کر رہی تھیں کیا وہ بھول گئی ہو؟ تمہارے آواز انگارے بن کر ایک مدت تک میرے محسوسات کو جلاتے رہے۔ تھکے سوچ کی سطح پر ایک کھاد سا پڑ گیا تھا۔ اپنی فزائش کا جو انداز نے بتایا تھا اس نے گویا میرا سکون لوٹ لیا تھا۔ وہ ملاقات میری ہی تھی جیسے کسی کو بہت سی خوبصورت پلیٹ میں بہت سی مٹھو رکھ کر دیا جائے مگر اس میں ذرا ہوا ہو۔“

”خیر۔ اب ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔ انسان کی عمر مختلف دور ہوتے ہیں۔ مختلف باتیں ہوتی ہیں۔ ان میں اچھے ناکہ زندگی نہیں گزر سکتی۔ ہم دونوں ہی اس وقت کم عمر تھے۔ تم سے بھی چھوٹے تھے۔ ہم دیرانی لوگوں کی سوچیں اکثر بڑی انداز ہی ہوتی ہیں۔ لیکن اب تو ہم دونوں نے دنیا دیکھ لی ہے۔ مجھے آزاد حال میں زندہ رہنا چاہیہا۔ تمہیں بھی آجانا چاہئے تھا۔“

”شاید تمہارا ہو۔ مجھے خود چاہئیں۔“ میں نے ہم سے لپٹے کہا۔ ”لیکن میں نے جو تمہیں بتایا ہے کہ اب تم راجہ کی بیوی وہ زمانہ حال ہی کی بات ہے۔ راجہ جو ابچھین کا یار ہے۔ چنا

تعلق ہے اس سے میرا۔“

”میں اس سے بے وفائی کی بات تو نہیں کر رہی۔ میں اس ویسے بھی مطلق لپٹا چاہتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”یہ بے وفائی سے بھی زیادہ بری بات ہوگی۔ ویسے بھی میں تم سے بڑا دی کرنے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتا۔ آج ہی خدائی نے ملاقات ہوئی ہے۔ ایک رات کی ملاقات میں اتنے بڑے نہیں کئے جاسکتے۔“ مجھ میں یکدم ہی صاف گرتی کی جرات آگے

ورنہ دل کے معاملات میں صاف گرتی سے کام لیتا بہت مشکل ہے۔ کبھی اپنے دل کے بجھوج ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوسرے کے محسوسات کو لہو ہو جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے مگر خیمہ کے معاملے میں ”میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ جتنا

مادی تھی، اسے اس سے کسی حد تک باز رکھنا ضروری تھا۔  
 بہت سی حد سے زیادہ تیز پیش قدمی میں مرد کو زرا دیتی ہے۔  
 "میں اتنی خوش فہمی میں رہنے والی عورت نہیں ہوں۔" وہ  
 بولی "میں راجو سے طلاق لینے کی بات اس امید پر نہیں  
 کر رہی کہ اس کے بعد تم مجھ سے شادی کر لو گے مجھے معلوم ہے تم  
 پہ کتنی دوساں لڑکے نہیں ہو جو میری ایک جھلک دیکھنے کے  
 لیے خود کو فدا کرنے پر تے رہتے تھے میں تو خود ہی کہہ چکی ہوں کہ  
 تم کے ساتھ خیالات، محسوسات... حتیٰ کہ آئینہ طرز بھی بدل  
 جاتے ہیں۔ میں تو ویسے ہی راجو سے طلاق لینے کی بات کر رہی  
 تھی میں اس کے ساتھ زیادہ خوش نہیں ہوں۔ اس سے زیادہ  
 زنی تو میں اپنے بڑے شوہر کے ساتھ تھی جس سے شادی ملے  
 بہت دور وقت میری نظروں میں دنیا اندھیر ہوئی جاری تھی۔"  
 میں نے ایک نظر کمریوں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھا اور سوچا  
 کہ میں سے کسی کھڑکی کے شیشے سے راجو ذرا نیروے کے قلعے  
 اور میرے میں کھڑی دو پرچھائیوں کو دیکھ کر کچھ سوچ تو نہیں رہا  
 ہو گا۔

غیم بولی۔ "اگر تم سوچ رہے ہو کہ راجو اپنے بیڑی روم کی  
 کھڑکی سے نہیں دیکھ رہا ہو گا تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ اب تک  
 تو میری ہر کر کر خزانے لینے لگا ہو گا۔"  
 "میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہوں۔ اب اسے تم سے بہتر  
 کون جانتا ہو گا۔" میں نے کہا "میں یہ کہنے لگا تھا کہ میں ایک  
 دیابت پرست اور وضع دار آدمی ہوں۔ دوستوں کو ان کی خوبیوں  
 اور خامیوں سمیت دوست رکھتا ہوں۔ اس لئے مجھے تو اس سے  
 زنی نہیں کہ اس میں کیا خامیاں ہیں۔ میں صرف تمہاری حد تک  
 پہنچ رہا ہوں کہ جس میں اس سے کیا شکایت ہے؟"

گولگی ایک شکایت ہو تو بتاؤں۔ ویسے تو دنیا کے ہر کسی میں  
 ہیں کہ ایک دوسرے سے شکایتیں ہوتی ہیں۔ میں اس قسم کی  
 باتیں شکایتیں کر کے جس پر نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اس کی  
 ایک لمبی فہمیت کا ذکر ضرور کروں گی جو سب برائیوں پر بھاری  
 ہے وہ یہ کہ راجو جلا کا خود غرض ہے۔ اسے دنیا میں اپنی ذات کے  
 نام کی سے پیار نہیں۔ اپنا پیش و آرام اپنی خوشی اپنی خواہشیں  
 کی کے لئے ساری چیزوں پر مقدم ہیں۔ تمہارے خیال میں کیا یہ  
 خود غرضی اور بے حسی کی انتہا نہیں ہے کہ اس شخص کو کبھی پتا  
 نہ ہو کہ اس نے اپنی بات سے غرض ہوتی ہے کہ اس کی بیوی  
 کو رقت کہاں ہے کیا کر رہی ہے کیا سوچ رہی ہے؟"

میں نے ایک لمحے کے لئے راجو کی پہلی بیوی کو دیکھا اور  
 لڑے باپ کے بارے میں سوچا جنہیں وہ چھوڑ کر بھاگ آیا تھا  
 اور اس کی اس نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی۔ لیکن میں دوست  
 بہت آدمی تھا۔ چند ہیچھے دوست کی برائیاں کرنا اور اس کی  
 گوریلوں سے کاٹہ اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں اس کے

دھنک پر ہی تھا رہا۔

"وہ جیسا بھی ہے۔ اب اسی کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش  
 کرو۔" میں نے مٹی کا لہجے میں کہا۔ "اے مجت دو۔ محبت بہت  
 ہی طاقت ہے۔ محبت کے ذریعے تم اس کی بہت سی خامیاں دور  
 کر سکتی ہو۔ مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ اس کی ذات میں محبت سے  
 محرومی کا ایک بہت بڑا غلا موجود ہے۔"

"محبت سے محرومی کا ایک بہت بڑا غلام سب کی زندگیوں  
 میں موجود ہوتا ہے کسی کو اس کا احساس جلدی ہو جاتا ہے اور  
 کسی کو دیر میں۔ لیکن اس کی وجہ سے ہر انسان اتنا خود غرض نہیں  
 بن جاتا جتنا راجو ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"سہر حال... وہ تمہارا اپنا انتخاب ہے۔ چند برس تو اس  
 انتخاب کی लाग رکھو۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔  
 "میں تو ہر لمحہ کئی کئی برس کے برابر محسوس ہو رہا ہے۔" وہ  
 لٹھڑی سانس لے کر بولی۔

"اب ایسی انتہا پسندی سے بھی کام مت لو۔ انسان کو اپنی  
 غلطیوں سے بھائی چاہئے۔ اتنی جلدی اس پر بچھتاوے کا  
 اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ وہ جیسا بھی ہے اسی کو منہ حار کر سنو اگر  
 اپنے مطلب کا انسان بنائے کی کوشش کرو۔" میرے پاس بیٹھنے والے  
 اس کے لئے اس کے سوا کوئی مشورہ نہیں تھا۔ وہ گاڑی کے  
 دروازے پر جھکی ہوئی تھی اور میں اپنے چہرے پر اس کے سانسوں  
 کی حرارت محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی سانسوں میں ایک عجیب  
 طرح کی خوشبو تھی۔ شاید یہ طلب کی خوشبو تھی۔

میں نے اپنی ذات پر ضبط کا جو بدن منہ باندھا تھا اس کی  
 بنیادوں میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ میں نے اس سے نظریں نہ اٹھائے  
 ہوئے کہا "میں اب چلا ہوں۔"

وہ ایک طویل سانس لے کر بولی "تو تمہارے پاس میرے لئے  
 اب نصیحتیں اور مشوروں کے سوا کچھ نہیں رہا؟"  
 "اسی میں تمہاری بہتری ہے۔" میں نے آغوش میں جالی  
 چھماتے ہوئے کہا۔

"وقت وقت کی بات ہے۔ مجھے تمہارے منہ سے یہ بھی سنتا  
 تھا۔" وہ دروازے سے ہٹے ہوئے بولی "سہر حال... اس سے کوئی  
 فرق نہیں پڑتا۔ راجو سے تو میرا رشتہ الگ ہوتا ہی ہے۔ یہ تو میرا  
 تم سے آج کی ملاقات سے بہت پہلے کا فیصلہ ہے؟"

"یعنی اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں آئے گی۔ میرے لئے  
 یہی طرہیت کافی ہے۔" میں نے کہا۔ گاڑی کا انجن کھل گیا  
 سرسراہٹ کے ساتھ پیدا ہو چکا تھا۔ میں نے تدریسے ہچکچاہٹ  
 سے ساتھ ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شب  
 رفتہ ہمارا تھا۔

"شب خیر تو اب میں کہہ نہیں سکتا۔ شب تو گزر چکی ہے۔  
 خدا ماننا ہی کون گا۔" میں نے خواہ مخواہ کا بوجھل پن دور کرنے کے

لئے کہا۔

”خدا حافظ۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور وہیں کھڑی ایک ٹمک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے دونوں ہاتھ سیلنگ گاؤن کی جیبوں میں تھے۔ سبک خرام ہوا اس کے شانوں پر اس کے تراشیدہ، خوبصورت ریشمی بالوں سے کھیل رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس سے نظر ہرا لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے حواس اس کے وجود سے اخٹی ہوئی ٹمک میں الجھ جائیں۔ میں نے گاڑی ریورس کی اور ہلکی سی ”پپ“ دی۔ چوکیدار اندر آگیا اور اس نے میرے لئے گیٹ کھول دیا۔

میں اس کے گھر سے باہر آگیا اور اس لئے میرا دل چاہا، کاش کوئی ایسا بھی بدواڑہ ہوتا جس کے راستے میں اس کے دل سے اس کے ذہن سے اس کے خیالات سے بھی نکل آتا۔ واقعی وقت بھی کیسے انقلابات لاتا ہے۔ کیا زمانہ تھا کہ دل اس کی ایک نظر التفات کے لئے بھکاری بنا رہتا تھا۔ اس کی ایک نوازش، ایک ادائے کرم کے لئے پورا وجود دست سوال بنا رہتا تھا اور ایک یہ بھی دور آیا تھا کہ وہ شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں اُگرے کو بے تاب تھی لیکن میں نے واسن کرنا سیٹ لیا تھا۔

میں کوئی پارسا آدمی نہیں تھا لیکن روایت پرست ضرور تھا۔ راجو خواہ میرا کیسا بھی دوست تھا لیکن بچپن کا ایک تعلق تو چلا آ رہا تھا۔ میں اس کے لئے آٹھ کی شرم برقرار رکھنا چاہتا تھا اسے شاید اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ اس کی بیوی اس کی بیٹہ بچھے کیا کرتی پھرتی ہے لیکن میں نے خودی اپنے لئے حدیں مقرر کر لی تھیں۔

گھر آکر میں لمبی ٹان کر سو گیا۔ دوپہر کے بعد میں سوکر اٹھا اور کھانا کھانے کے بعد تیار ہو کر آفس پہنچا یہ تھا کہ راجیلہ کا فون آگیا۔

”انی! تم نے فلیٹ کر ہماری خبری نہیں لی۔“ وہ بلا تہید بولی۔  
”کیا مجھے تمہارے ہاں سے آئے دو چار سال مگر گئے ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہمیں تو یہی محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ معصومانہ لہجے میں بولی۔ ”ہم کام کرنے والے لوگ ہیں۔ صبح سے ہم دونوں فارغ بیٹھے ہیں۔ کچھ بھی نہیں آ رہا کہ کیا کریں۔ وقت گزارے نہیں مگر رہا۔ ہمیں کوئی کام بتاؤ۔“

”اب ایسی بھی کیا جلد بازی!“ میں نے کہا۔ ”ایک آدھ دن تو آرام کرو۔ کل رات ہی تو تم اپنا شر چھوڑ کر آئے ہو۔ اگر بور اور ہے تھے تو آج کھوم پھری جیتے۔“

”ارے۔۔۔ شرلوں کا کیا ہے۔ سبھی شر اپنے ہیں۔ دیے بھی لاہور ہمارے لئے نیا نہیں۔ ہمارے کئی عزیز رشتے دار یہاں ہیں۔ بہت سی تعلیمات ہم نے یہاں گزار دی ہیں۔ سب کچھ دیکھا بھالا گھونٹے پھرنے کا کچھ زیادہ اشتیاق نہیں۔“ اس نے بے

پروائی سے جواب دیا۔

”گھر میں سیٹ کر لیتیں۔“ میں نے ایک اور مصروفیت کی۔

”گھر میں سیٹ کرنے والی کوئی چیز باقی ہی نہیں۔ ہر چیز سیٹ ہے۔ اس سلسلے میں بھی میرے لئے کوئی کام چھوڑا ہی نہیں گیا۔ جتنے انداز میں گھر میں ہے اتنا شاید میں خود بھی کر سکتی۔“

”یہ تو برا مسئلہ ہو گیا۔“ میں نے سر سمجھاتے ہوئے کراؤ مڑا چرائے کے جن کی طرح میرے پیچھے پڑ گئی ہو کہ قمیضیں ہم جاتے۔ کچھ بات ہے کام تو میں نے ابھی تمہارے لئے کوئی سہارا نہیں۔ ابھی تو سوچنے کی بھی سہلت نہیں مل رہی۔“

”میں اس طرح بیکار رہاں نہیں بیٹھوں گی۔ فوراً کراچی آجی جاؤں گی۔“

”نی! انحال تو تم ایسا کہو کہ حمایت شاندار اور پُر کلف حم کھانے کی تیارواں شروع کر دو۔ آج میری تمہارے ہاں نیاں ہے۔ ایسا مہمان قمیض نہیں لے گا جو خودی کسی کی طرف اپنے آپ کو کھانے کی دعوت دے رہا ہو۔“

”یہ کوئی کام ہے؟“ وہ حقاقت آمیز سے انداز میں بولی۔ ”کھانے وغیرہ تو وہ ملازمہ بھی تیار کر لے گی جو تم نے یہاں چھوڑ رکھی ہے۔“

”خاص مہمانوں کے لئے کھانے اپنے ہاتھ سے تیار جاتے ہیں بے وقت!“ میں نے کراچے کے سے انداز میں کلمہ ”خاص اور عام کا سوال تو جب پیدا ہو گا جب میں مہمان سمجھوں گی۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”تم مجھے ہاتھ ملانے کی اور بیکار کاسوں میں الجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں اب سمجھ رہی تھی کہ تم نے میرے یہاں آنے سے پہلے ہی میرے لئے بہت سے کام سوچ کر رکھے ہوئے ہوں گے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ چراغ کے جن اب خواتین کی فلاح میں بھی پائے جانے لگے ہیں ورنہ میں ضرور ہمدردیت کرنے رکھتا۔“ میں نے کہا۔ ”مسئلہ یہ ہے کہ قمیض کام بھی تو کچھ ٹیڑھے اور مشکل سے تانے پڑیں گے جو تمہارے شانان شان ہیں۔ سیدھے سادے کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔ ان کے لئے تو قمیض کراچی سے یہاں لانے کی ضرورت نہیں تھی۔“

”ٹیڑھے اور مشکل کام۔“ اس نے دہرایا۔ ”مثلاً۔۔۔؟“

## کائنات

ایم اے راحت قیمت: =/ 100

"مثلاً۔۔۔ یہی کوئی بندے شہدے اٹھوائے۔ کسی کو قتل کروانا۔ کسی کو غائب کرانا۔ اسی قسم کے کام مناسب رہیں گے تمہارے لئے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ میں اس قسم کے کام بھی بڑی عمدگی سے انجام دے سکتی ہوں۔ بشرطیکہ تم صرف میری پشت پناہی کے لئے موجود رہو۔ دوسرے جن لوگوں کو میں غائب کروانا قتل کرواؤ نہایت ذلیل، بد معاش اور "دھرتی پر بوجھ" قسم کی چیز ہونے چاہئیں۔ کسی شریف آدمی کو مت مرواؤ نہ میرے ہاتھوں۔" اس کے لیے سے سنجیدگی بیان تھی۔

"شریف آدمی کو مروانے کی ضرورت کہاں پڑتی ہے۔ وہ تو خود ہی مر جاتا ہے۔ حالات کے ہاتھوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "باقی جہاں تک پشت پناہی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں صرف اتنی ہی کوشش کرو۔"

تو مطلقاً ناکار خوں دو عالم میری گردن پر جو تمہارا دل چاہے کر کے آجائے۔ میری گردن حاضر ہے۔" "اچھا۔۔۔" اس نے کھنسی سانس لی۔ "خیر۔۔۔ ملے یہ پایا کر ڈالال تمہارے پاس میرے لئے کوئی کام نہیں۔"

"تم ذرا مجھے سکون کی سانس تو لینے دو۔ اس کے بعد ہمیں سر کھانے کی فرصت نہیں ملے گی۔ یہ جو اس وقت فرصت میسر ہے اسے قیمت جانو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں ان دنوں کو یاد کر کے آئیں بھرا کر۔" میں نے کہا۔

"میں دنوں کو نہیں، دنوں کو یاد کر کے آئیں بھرنے کی قائل ہوں۔ اچھا۔۔۔ یہ بتاؤ کیا رات کا کھانا کھانے واقعی میری طرف تڑپے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "بیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔" اس نے کہا اور سلسلہ مطلق کر دیا۔

آفس میں اب کام وغیرہ معطل پر اچکا تھا۔ ایک روز پہلے ڈاکٹور نے جو حملہ کیا تھا اور مجھے لے جانے کی کوشش کی تھی اس سے گویا ایک پُر سکون جمیل خنن تھوڑی سی اپہل پیدا ہو گئی تھی مگر اب لڑکی معدوم ہو چکی تھی اور جمیل دیکھا نہ پُر سکون تھی۔

اس وقت میں اسٹینو کو چند ضروری خطوط کے بارے میں نوٹس لکھوا رہا تھا جب کیتھرن نے انٹر کام پر اطلاع دی۔ "سر! خلیفہ فراز پری بیکر آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ تین آدمی اور بچا۔۔۔ وہ سب پهلوان لگ رہے ہیں۔" وہ اس وقت یقیناً اپنے فیکس کی پیشہ کی دیوار سے انہیں دیکھ رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی کہ اس نائب کے لوگ کس سلسلے میں مجھ سے ملنے چلے آئے۔

"وہ پهلوان لگ نہیں رہے۔ بلکہ جیج پهلوان ہی ہیں۔" ملنے سے پہلے ہی کسی کے ساتھ کہا "میں پانچ منٹ بعد اندر بھیج رہا۔ میرا خطوں کا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔"

پانچ منٹ بعد خلیفہ فراز اپنے مخصوص "پهلوانانہ" انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے دائیں بائیں اور چھ ان کے نیچے تھے وہ نوجوان تھے اور پهلوانوں والے سٹیل میں نہیں تھے لیکن واقعی پهلوان نظر آرہے تھے۔ میں نے انھیں کران کا استقبال کیا۔ خلیفہ جی بڑے ظہور سے مجھ سے بھگتے بھگتے کرکٹ کے اظہار کے لئے انہوں نے میری پسلیاں کرکٹ کرانے کی کوشش کی جس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ ان کے تینوں نیچے خاصے طاقتور اور مضبوط دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا رویہ میرے ساتھ بے حد مودبانہ تھا۔ خلیفہ جی نے میرے کندھے پر ہتھکی دیتے ہوئے اپنے شاکر دہنوں کو بتایا۔ "پڑا ہے ہیں محمد افضل چودہوی صاحب! بہت بڑے آدمی ہیں۔ ایک ہی دن میں۔۔۔ بلکہ یوں سمجھو کہ ایک ہی منٹ میں یہ ہمارے قدردان بن گئے اور ہم ان کے زبردست قدردان ہو گئے۔"

میرے طویل و برہنہ کمرے کے ایک حصے کی آرائش ڈراکنگ روم کی طرز پر تھی۔ وہ وہاں بیٹھ چکے تو میں نے خوش ظنی سے پوچھا۔ "آپ کیا پسند فرمائیں گے؟"

"پینے پلانے کو چھوڑو! ڈاکٹر افضل چودہوی! خلیفہ جی نے بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "آپ چائے یا کافی کو پوچھیں گے۔ تو عرض یہ ہے کہ چائے ہم نے زندگی میں کبھی پی نہیں۔ اور کافی ہمیں صرف ایک ہی پسند ہے۔۔۔ اور وہ ہے بابا بلی شام کی کافی۔"

"خلیفہ جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم آپ کو صرف چائے اور کافی کے لئے ہی پوچھ سکتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم شرمیں بیٹھے ہیں۔ بیڈن روڈ میاں سے دور نہیں ہے۔ چند منٹ میں جیکے پهلوان کی دکان سے لٹنی بھی آسکتی ہے۔ کارنگر آدمی ہے وہ بھی۔ لٹنی تو اس کو بتانی آتی ہے۔ سرور آجائے اس کی لٹنی لی کر۔ اور اگر اس کو پیغام مل گیا کہ لٹنی خلیفہ فراز پری بیکر کے لئے جاری ہے تو چپکری دھوئی سنبھال کے خود دوڑا آئے گا۔" میں اسٹیبل لٹنی ٹرے میں سجا کے۔

خلیفہ فراز کی آنکھیں تھوڑی سی پھیل گئیں۔ ان کے چہرے پھولے، محول منول اور معصوم سے گال سوتی سوتی سفید سو پھولوں کے عقب میں تھر تھرائے اور وہ بے یقینی سے بولے "ڈاکٹر! تمہیں بھی پتا ہے لیتون کا۔۔۔ جیکے پهلوان کا۔ اور ہماری اس کی جان بچان کا؟ کمال ہے!"

"ہمیں سب پتا ہے خلیفہ جی! ہم ہر طرف کی خبر رکھتے ہیں۔" میں نے انٹر کام پر کیتھرن کی ہدایت کی کہ وہ جیکے پهلوان کی دکان سے لٹنی بخش مقداد میں لٹنی کا انتظام کرائے۔ کیتھرن کو حیران ہونے کا موقع دئے بغیر میں نے انٹر کام کا رسیور رکھ دیا اور خلیفہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

خلیفہ جی بڑے خیال انداز میں سوچھ کو مل دیتے ہوئے

”آپ کو کچھ عکسہ ہوا کہ میں یہ کام فائدے کے لئے کرنا چاہتا ہوں؟“ میں نے حیرت سے کہا ”میں ان لوگوں میں سے تو نہیں ہوں جو ہر کام فائدے کے لئے کرتے ہیں۔ ویسے بھی یہ تو ہمارے فلاحی کاموں والے کھاتے میں جانے گا۔“

”فلاحی کاموں کا ہمارا بجٹ ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔ سرائیوں اور فلاحی انجمنوں کو عطیات ہیں۔ انفرادی عطیات ہیں۔ ماہانہ تحفے ہیں۔ سرکاری افسروں کی قربانگوں پر عطیات ہیں۔ اور بہت کچھ ہے۔“

خلیفہ غواڑ پری بیکر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولے ”باؤ افضل! اگر کوئی مسئلہ ہے تو رہنے دیں۔ ہم تو ویسے ہی آپ کی محبت میں آگئے تھے ہمیں خود پرانے پیسے سے کوئی بھی کام کرنے کا بالکل شوق نہیں ہے۔“

”آپ اتنی جلدی ارادے سے بدلیں خلیفہ جی!“ میں نے مسکراتے ہوئے انہیں دلاسا دیا۔ ”آپ سیدھے آوی ہیں۔ آپ کو دفتروں وغیرہ سے واسطہ نہیں پڑا۔ صرف سرکاری دفتروں میں ہی نہیں پرائیویٹ دفتروں میں بھی یہ جو اکاؤنٹس اور فنانس۔ میرا مطلب ہے حساب کتاب اور مال پانی والے شعبے کے لوگ ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کسی کو دوسرے بھی دیتے ہیں تو کچھ اسی تکلیف کے عالم میں دیتے ہیں جیسے اپنی جیب سے قرض دے رہے ہیں۔ دوسرے ان کے منہ سے فوری طور پر تو کسی کام کے لئے ”ہاں“ تو نکلتی ہی نہیں۔ آپ ان کی باتوں کا بالکل بُرا نہ سمجھیں۔ ان سے تو میں خود بھی ڈرتے ڈرتے رقم مانگتا ہوں۔“

خلیفہ جی نے غالباً اچھے کار اور کرایا تھا لیکن میری بات سن کر ہلکی کر دیا۔ میں نے اب مسکراہٹ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے مجید صاحب کو غائب کیا۔ ”یہ فلاحی کام ذرا مختلف نوعیت کا ہے اس کا ایک بڑا مقصد اپنی پرانی روایات و اقدار اور اپنی ثقافت کے ایک جتنے ہوئے حصے کو بچانا ہے۔“

بولے ”باؤ افضل! میں نے اپنے سارے بچوں سے دوستوں سے ساتھیوں سے مشورہ کیا ہے۔ انہیں آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ سب نے یہی مشورہ دیا ہے کہ میں آپ کی پیشکش قبول کروں اور آپ کے تعاون سے شرمیں کسی نئی اور بڑی جگہ کا انتظام کر کے خوب زور و شور سے۔ ٹھیک ٹھاک طریقے سے۔ بڑا بچن تاج قسم کا اکاؤنڈ شروع کیا جائے۔ ہماری طرف سے تو ہاں ہے۔ ہم تیار ہیں۔ اب آپ حکم کریں کیا کرنا ہے کب کرنا ہے کیسے کرنا ہے؟“ پھر انہوں نے تائید طلب نظروں سے اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔ ”کیوں بھی پتہ! ٹھیک ہے؟ میں نے دو حلی بات کردی ہے۔“

بچوں نے خاموشی سے تائید میں سر ہلادیا۔ خلیفہ جی بولے ”میرے یہ تینوں شکڑے۔ میرا مطلب ہے شاگرد۔“ پہلوان جی ایسا بھائی والا لہجہ درست کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ صرف کبھی کبھی زبان ہلک جاتی تھی۔ ”یہ تینوں تھوڑے بہت پر مے لکھے ہیں۔ سارے معاملے میں ملے کریں گے۔ اگر کوئی گفت پر امت ہوگی تو میں صرف انکو ٹھانگاؤں گا۔“

”میں خلیفہ جی! آپ نے ہاں کہہ دی تو مجھ میں سارا مسئلہ طے ہو گیا۔ اس میں کوئی لمبی چوڑی کاروائیاں نہیں ہوں گی۔“ میں نے ان کا کندھا حاکمیتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کا کام ہے۔ آپ ہی کو چلانا ہے۔“

میں نے اپنے فنانس کے شعبے کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر مجید کو بلایا اور خلیفہ جی کا تعارف اس سے کراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ان کے ساتھ دو چار دن لگانے ہیں۔ شرمیں جو زمین یہ پسند کریں وہ خرید کر انہیں ایک شاندار اکاؤنڈ تیار کرنے میں مدد دینی ہے۔ حکم انہی کا چلے گا۔ ہمارا کام صرف اس کو فنانس کرنا ہے۔“

مجید جی ان نظر آنے لگا۔ وہ مالی معاملات میں کافی ذہیل تھا۔ مگر آوی تھا۔ بلا ٹھکے مجھ سے بات کرتا تھا۔ کوئی تجویز اسے پسند نہیں آتی تھی تو صاف میرے منہ پر ہی کہہ دیتا تھا۔ پُر خیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سرا یہ آپ کو یکدم اکھاڑے کی کیا سوجھی؟“

”مجھے جو بھی سوجھتی ہے یکدم ہی سوچتی ہے کیا آپ کو اب تک اندازہ نہیں ہوا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اکھاڑے کے لئے خاصی زمین درکار ہوگی۔ اور اندرون شرمیں بڑی مہنگی ہے۔“ مجید نے مجھے کچھ احساس دلائے کی کوشش کی۔ ”بہت سے دوسرے اخراجات بھی ہوں گے۔“

”کیا ہمارے پاس پیسے کی کمی ہوگئی ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”نہیں سرا! خدا کا شکر ہے ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ یہ کوئی فائدے کا سودا نہیں۔“ اس نے قدرے محتاط لہجے میں کہا۔

### رومانی ناول

|       |                   |                  |
|-------|-------------------|------------------|
| 100/- | اسلم راہی ایم۔ اے | لڑی اس گلی کی    |
| 100/- | اسلم راہی ایم۔ اے | اس چلتے جہاں میں |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | خدا کہاں ہے      |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | چلتے بھگتے لوگ   |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | سیرا             |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | روتے کنول        |

تو قہات سے بڑے کام کریں گے۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

ان کے جانے کے بعد میں کچھ دیر سی کام کر پیا تھا کہ فنی آگیا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اپنے عقب میں قفل کر دیا اور بیٹھے ہی بلا تمہید بولا۔ "سراڈی آئی جی صاحب نے آپ سے جو گفتگو کی تھی اس سے تو لگ رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں کریں گے لیکن پولیس کانی تیزی سے حرکت میں آئی ہے۔ انہوں نے ملک ریاض راہی کو تو نہیں چھیڑا لیکن اس کی شہر گڑھ والی حویلی پر چڑھائی کر ڈالی تھی۔ وہاں ایسی بہت سی نشانیاں ملی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں سے اس کے رابطے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے اپنے آپ کو پھر بھی ان چیزوں سے لافعلی قرار دینے کے اس کے پاس تہیوںں طرہ تھے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔  
"اس حویلی میں چونکہ اس کی اپنی یا اس کی جیلی کے کسی فرد کی رہائش نہیں ہے، اس لئے اس نے بڑے آرام سے کمرہ رانیکر حویلی چونکہ دیرانے میں واقع ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ کب وہاں ڈاکو کس آئے ہوں اور نہ جانے کب تک رہ کر گئے ہوں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" میں نے اہانت میں سر ہلایا۔ "ان بے چارے معصوموں کو کہاں کوئی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"جو ایسی بی اس پولیس پارٹی کی قیادت کر رہا تھا اس نے صرف چند افراد کی موجودگی میں بعد میں لاہور میں ملک ریاض سے ملاقات کی تھی۔ ان میں دو خضر بھی شامل تھے۔ ہر کمرے میں ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی یہ تو معلوم نہیں ہو سکتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ آپ کے بارے میں بھی خضروں اور ایسی لے کے کان بھرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ یہ صرف چند گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "ملک ریاض جو کچھ کہتا ہے اسے کرتے ہو۔ تم اس کے کرد و مت کا کھنچو کئے کی تیاریاں جاری رکھو۔"

"میں اسی لئے آپ سے مشورہ کرتے حاضر ہوا تھا کہ ادھر جب ملک ریاض ایک پولیس آفیسر اور دو خضروں کے سامنے آپ کے بارے میں کیا کیا ذہر افشانی کر چکا ہو گا کیا اس کے بعد جلد ہی اس کا مارا جانا آپ کے لئے الجھنیں تو کمزری نہیں کرے گا؟"

میں نے ایک لمبے سوچا پھر کہا۔ "میں اس کے علاج کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں اب ملک ریاض جیسے زمینداروں کو کرہٹ پولیس آفیسر یا نوردا بھی جیسے ڈاکوؤں سے بلیک میل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ہمیں بہت عرصہ ہو گیا ہے عوامداری اور درگزر کی پالیسی اپنائے ہوئے میرے خیال میں اب اس قبیل کے لوگوں کو ہماری طاقت کا اندازہ ہو جانا چاہئے اب جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔"

مجید میرے بدلتے ہوئے لہجے کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ سعادت علی سے سر ملاتے ہوئے بولا۔ "میں سرا"

"سب کام خلیفہ جی کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے اور انہیں ہم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ یوں سمجھو کہ اس بریکٹ میں، میں ذاتی طور پر کسی دلچسپی لے رہا ہوں۔" پھر میں نے خلیفہ جی کو مخاطب کیا۔ "آج کے بعد آپ کا زیادہ واسطہ مجید صاحب سے ہی رہے گا لیکن اگر کسی بھی سرے پر آپ کوئی پریشانی آئی ہے اطمینانی محسوس کریں تو سید سے میرے پاس آئیں گے۔"

اب خلیفہ جی نے سچے سے اگڑنے کا ارادہ نہایت کر دیا تھا۔ کچھ دیر اسی سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران بڑے احترام سے لٹی بھی آگئی۔ اپنے نئے دوستوں کا ساتھ دینے کے لئے میں نے کسی ایسی کامیابی ساز کاگلاس منہمال لیا۔ نیلے پتلوانے نے غلظت نواز پری بیکر کے لئے "دمت بست" سلام بھی بھیجا تھا۔

جب وہ باقی تعیلات طے کرنے اور پروگرام بنانے کے لئے مجید صاحب کے ساتھ رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا "خلیفہ جی! رت بھنے گا کہ ابھی میں نے دوپہر لگایا اور ابھی سے آپ کے کام میں دھل دینے لگا۔ میں صرف ایک گزارش کرنا چاہتا تھا۔ ایک تجویز پیش کرنا چاہتا تھا۔ آپ کا دل چاہے تو مان لیجئے گا چند دنے تو بے شک ایک کان سے من کر دو سرے سے نکال دیجئے گا۔"

"تم حکم کرو افضل پھر اتھارا حکم اکھتے پر۔ میرا مطلب ہے ہر اکھوں پر ہوگا۔" خلیفہ جی بڑی اپناہیت سے بولے۔

"میں یہ چاہ رہا تھا کہ اکما نہ باندی طور پر تو تم اپنے اس قدیم نو کو زندہ رکھنے کے لئے سی قائم کریں لیکن اگر ہم اپنی نئی نسل کو دنیا کی جدید ٹیکنیکس سے بھی روشناس کرانے کی حتی المقدور کوشش کریں تو کوئی حرج نہیں۔"

خلیفہ جی ٹھنڈی سانس لے کر لٹی کے بجک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "پڑاویے تو تم نے اس لٹی سے بھی زیادہ انہی آئندہ بولی ہے لیکن میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ تمہارا اٹھان حواری کرانے۔۔۔ باڈی بلڈنگ ڈیفنڈ کی طرف ہے؟"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے خلیفہ جی! میں نے جلدی سے کہا۔

"مجھے اس میں اعتراض بھلا کیسے ہو گا لاؤ افضل! مجھے تو خوشی ہوگی۔ میرا بس طے تو میں اپنے نوجوانوں کو دنیا کی ہر ٹیکنیک سکھادوں۔ آج کل ویسے بھی ان طور طریقوں کا بڑا ادواج ہے۔ اگر تم اپنے اکما ٹوے میں ان چیزوں کا بندوبست رکھیں گے تو نوجوان زیادہ جلدی حوجہ ہوں گے اور زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ بات یہ ہے کہ جتنا کڑوا لیس کے اعادی جیسا ہوگا۔"

"مگر کی آپ کھن کریں۔ یہ اپنے مجید صاحب شروع شروع لہزار کجوسی کی باتیں کرتے ہیں۔ بعد میں گزری بوریں کے منہ مل دیتے ہیں۔ اب یہ آپ کے ساتھ نکلیں گے تو آپ کی



وہ اپنے مخصوص اور نہایت خفیف سے انداز میں مسکرایا۔  
”سراپ کو معلوم ہی ہے ان خطرناک اور دشوار گزار راستوں پر  
آئے دن حادثات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ تیرے  
حالات کی روشنی میں ایک بار پھر آپ سے گرین سٹنٹل لے لیا  
جائے۔“

”ہاں۔۔۔ بعض حادثے گرین سٹنٹل مکمل جانے کے بعد بھی پیش  
آتے ہیں۔“ میں نے اس کی تجویز پر صرف ایک لمحے غور کیا پھر  
کہا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اس سفر میں ملک ریاض راہی  
کو حادثہ پیش آ جانا چاہئے۔ اس کے ساتھ کون کون ہوگا؟“  
”ابھی تو صحیح معلوم نہیں ہو سکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس  
کے ساتھ صرف مسلح محافظ ہوں گے۔“ ٹونی نے جواب دیا۔  
”وہیں بھی ملک ریاض کے ساتھ حادثے کا شکار ہونا پڑے  
گا؟“ میں نے قدرے تذبذب سے کہا۔

”ظاہر ہے سراسر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ ٹونی بولا۔ ”اس  
سلسلے میں کسی بچھتاؤنے کو بل میں جگہ نہ دیں سراسر ایسے لوگوں کے  
کارڈ بھی کوئی شریف آدمی تو نہیں ہوتے۔ پہلے ہی سے پیشہ ور قاتل  
یا ڈاکو وغیرہ ہوتے ہیں یا پھر ان کی بناء میں آنے کے بعد ایسے  
ہو جاتے ہیں۔ اپنا ہر چیز کو جائز اور قانون بنا لیتے ہیں لیکن ان کے  
انداز تو پیشہ ور مجرم ہی جیسا ہوتا ہے۔“  
”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”کارڈز کو بھی  
صاف کر دو۔ میرا خیال ہے کوئی ٹرک ان کی جیب کو نگر مارے  
گا؟“

”نہیں سرا!“ ٹونی نے سر ہلایا۔ ”میرے خیال میں کسی مناسب  
رہے گا۔ ٹرک جانے حادثہ سے فرار ہو جائے گا جیسا کہ بیشتر  
حادثات میں ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ابھی دو دن ہیں۔ اس دوران  
ہم موٹ کا جائزہ لے لیں گے۔ اس جگہ کا۔۔۔ اور دو ایک دوسرے  
قابل مقامات کا جائزہ لے لیں گے جہاں حادثہ پیش آنا چاہئے۔  
اگر ایک جگہ کوئی گڑبڑ ہوگی اور حادثہ تیزی کرنا پڑا تو دوسری جگہ  
سہی۔ دوسری جگہ پر بھی موقع مناسب نہ ہو تو تیسری جگہ سہی۔ یہ  
سفر اس کے لئے ہر حال موت کا سفر ثابت ہو گا۔“

”جیب کو بہت گہری کھائی میں گرنا چاہئے جہاں وہ پاش پاش  
ہو جائے اور کسی کے ذمہ نہ پہنچے کا امکان نہ رہے۔“ میں نے کہا۔  
”ایسا ہی ہوگا۔“ ٹونی نے دھوق سے جواب دیا۔

”میں اس دوران عالم شیر کو دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا ”ملک  
ریاض کے بعد اس کا بھی زیادہ دن زندہ رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ  
بھی ہمارے لئے در در سخت چارہ ہے۔ ملک ریاض کی موت کے بعد  
ہیں زیادہ پریشان کہنے کی کوشش کرے گا۔“

”یہ بھی ممکن ہے کہ ملک ریاض کا انجام دیکھنے کے بعد خوفزدہ  
ہو کر خاموش ہو جائے۔“ ٹونی نے خیال ظاہر کیا۔ ”قدوم ملک ریاض  
کو بھی احساس ہو گیا ہے کہ اس نے آپ سے بچنے کے لئے غلطی کی

بڑے بڑے سنگین معاملات پر بڑے سرسری اور لاپرواہی سے انداز  
میں بات کرنے والا یہ نوجوان کبھی کبھی بڑی گہری بات کر جاتا تھا۔  
”بہت عمدہ بات کی ہے تم نے۔“ میں نے بغیر نہ وہ سکا۔

”جائیں کرنا۔ اور مکمل کرنا۔ دونوں کام آپ ہی کی صحبت میں  
کئے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ  
بولا۔ ”ملک ریاض راہی والے کام کو میں نے ”آپریشن ایم ڈبل  
آر“ کا نام دیا ہے۔ ایم ڈبل آر سے مراد ملک ریاض راہی ہی ہے۔  
اس آپریشن میں میرے علاوہ چار آدمی کام کر رہے ہیں۔ پھر جس  
مرحلے پر جس کی خدمات کی بھی ضرورت پڑتی جاری ہے وہ ہم  
حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اصل اور سب سے اہم خبریں آپ کو  
اب سنائے گا ہوں جو شاید آپ کو زیادہ اہم نہ لگے۔“  
”تم بنیاد تو سہی۔ فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اس خبر کا تعلق بھی  
”آپریشن ایم ڈبل آر“ سے ہے؟“

”ہاں سراسر! ابھی تو میں موضوع میرے سر پر سوار ہے۔“ ٹونی  
بولا۔ ”ایک ٹیلیفون آپریشن کے ذریعے ایک اہم اطلاع حاصل ہوئی  
ہے۔ ملک ریاض پرسوں شام علاقہ غیر کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔  
صرف ایک جیب میں چار آدمی جا رہے ہیں۔“

”شاید ملک لینے جا رہا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”کوئی ہمد نہیں ہے سرا!“ ٹونی سنجیدگی سے بولا۔ ”موقع بہت  
اچھا ہے۔۔۔ آپ کو معلوم ہی ہے علاقہ غیر تک پہنچنے کے لئے بڑے  
دشوار گزار راستوں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ بل کھائی ہوئی تنگ پہاڑی  
سڑکیں ہیں جو سیکڑوں فٹ کی بلندی تک جاتی ہیں۔ ان کے ایک  
طرف تراشیدہ پہاڑ ہیں اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہری  
کھائیاں۔ یہ تو پھر بھی شہری علاقوں کے راستے شمار ہوتے ہیں۔  
پہاڑی اور جنگلاتی راستے تو اور بھی خطرناک ہیں۔ کسی جگہ تو  
پہاڑی ندی ٹالوں پر چوٹی تختوں سے بنے ہوئے ایسے پل بھی ہیں جو  
موٹے موٹے ریلوں سے بندھے جھول رہے ہیں۔ ان پر سے چند  
افراد اگر ذرا جھلک کے عالم میں گزریں تو وہ بلی ہنڈولے کی طرح  
جھولنے لگتے ہیں مگر انہی پر سے لوگ جھپوں اور سریفٹروں میں  
گزرتے ہیں۔“

”مجھے یاد ہیں وہ سب راستے۔“ میں نے کہا ”میں نے ایک ساتھ  
ان پر بہت سفر کیا ہے۔ کیسا عجیب قانوجوانی کا وہ دور بھی۔ تھماری  
تو اس وقت مسک بھی نہیں جھٹکی تھیں۔ عدم آگہی میں کسی راحت  
تھی۔ ہر وقت ہم موت کے گلے میں بائیں ڈالے پھرتے تھے۔“  
”موت تو اب بھی نہ جانے کس کس روپ میں ہماری ہم قدم  
رہتی ہے سرا!“ وہ بے پروائی سے بولا ”موت سے دوستی رکھے بغیر  
زندگی کا لطف نہیں اٹھایا جاسکتا۔“

”خیر۔ تم نے جو میری جغرافیائی معلومات تازہ کرنے کی  
کوشش کی ہے اس کا مطلب میری سمجھ میں آگیا ہے؟“ میں نے  
اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔



ہے کہ وہ لوگ مختلف ٹھکانوں میں بڑے عمدہ دل پر فائز رہے تھے لیکن اب ان میں سے کوئی بھی سروس میں نہیں تھا۔ رنڈاڑ ہلے کے بعد کوئی طبعی موت مرچکا ہے کوئی کسی حادثے میں اور کوئی ملک سے باہر جا چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو ہمارے مختلف ٹھکانوں میں رہتے ہوئے ریڈ ڈاٹ کے لئے کام کر رہے تھے۔

”میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔“ میں نے دھجھے لیے میں کہا۔

”دور بہ بڑی خوفناک حقیقت ہے سرا“ ٹونی کے لیے میں پلکا مارا کرب تھا۔ ”کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ لوگ کب اور کس طرح ریڈ ڈاٹ کے آثار کار بنے ہوں گے اور انہوں نے اس کے لئے کیا کیا خدمات انجام دی ہوں گی۔“

”کاش ہمارے اندازے غلط ہوں۔“ میں نے کہا۔ یہ محض ایک خواہش تھی، ایک دعا تھی۔

”ان میں سے نہ جانے کون کن حالات میں رنڈاڑ ہوا ہوگا۔ کس کی موت صرف ظاہری حد تک طبعی ہوگی۔ کون نہ جانے کیوں ملک سے باہر جانے پر مجبور ہوا ہوگا۔“ ٹونی بولا۔

”ان میں آخری نام رنڈاڑ ڈی آئی جی احمد شجاع کا تھا۔“ میں نے اپنی یادداشت کو ٹوٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے وہ آدلی اکثر اور دینگ دکھائی دیا تھا۔ فرسٹ میں اس کا نام شامل ہونے کا مطلب بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ بھی ریڈ ڈاٹ کا آثار کار رہا ہوگا لیکن شاید رنڈاڑ منٹ کے بعد کچھ پھیل گیا ہو۔ کچھ کرنا چاہتا ہو۔ ریڈ ڈاٹ کے ان ایجنٹوں کی وہ فرسٹ شاید اسی نے تیار کرانی ہو۔ ریڈ ڈاٹ اس سے وہ فرسٹ حاصل کرنے تک اس کے ساتھ کوئی سختی نہ کرنا چاہتی ہو۔ اس مقصد کے لئے ہی انہوں نے مٹی کو بھی

پر بیس تھینک کی حیثیت سے استعمال کیا ہو۔ شاید وہ فرسٹ ریڈ ڈاٹ کے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا ہو لیکن عین آخری لمحوں میں پھر پھیل گیا ہو۔ وہ کچھ اسی قسم کا آدلی دکھائی دتا تھا۔ میرا خیال ہے اس پھڑے کے عین آخری لمحوں کے دوران ہی میں اس طرف جا چکا تھا۔ پھر حادثاتی طور پر احمد شجاع بھی مارا گیا تھا اور اپنے پیچھے ان گنت سوالات چھوڑ گیا تھا۔ ہر حال۔ یہ سب اندازے ہیں۔ محض اندازے۔“

”مجھے یہ اندازے حقیقت سے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔“ ٹونی بولا۔

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“ میں نے کہا ”وہ آدلی جو شاید اب ریڈ ڈاٹ کے لئے کسی کام کے نہیں رہے تھے ان کی مختصری فرسٹ کے لئے ریڈ ڈاٹ نے سروھڑکی بازی کیوں لگائی ہوئی تھی؟ اس سلسلے میں تم نے کوئی اندازہ قائم کیا ہے؟“

”میں سرا!“ ٹونی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے انہیں ریڈ ڈاٹ کے معاملات کسی ایسے سرے پر ہوں گے کہ وہ اپنے اس

ہے۔ آپ اتنے چھوٹے آدلی نہیں ہیں اور نہ ہی محض ایک بے ضرر سیٹھ ہیں۔ یہ احساس ہونے کے بعد ہی اس نے نوردا بھی سے لا قتل ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور اسے پالیس کے ہتے چڑھ جانے دا ہے۔ اس نے غالباً سوچا ہے کہ جب تک آپ سے ٹکلیش جاری ہے تب تک اپنی شخصیت کے ساتھ کم سے کم قابل گرفت چیزیں وابستہ رکھی جائیں۔“

”لیکن ہے۔“ میں نے کہا ”ہر حال عالم شیر موٹے داغ کا آدلی ہے۔ وہ آدلی باریکدوں میں نہیں جاتا۔ وہ شطرنج کی طرح چالیں نہیں چلے۔“

”شاید اسی لئے وہ سیاست میں حصہ نہیں لیتا۔“ ٹونی بولا ”دور نہ سائل تو اس کے پاس بھی بہت ہیں۔“

”ہاں۔ بہت سولی مری ہے۔“ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے مشور طلب سے انداز میں کہا ”ملک ریاض کی حوالی میں اس رات جشن عیش و نشاط میں میں نے بہت سے جانے پہچانے چہرے دیکھے تھے۔ ان میں کئی بڑے سرکاری آفیسر بھی تھے۔ میرا خیال ہے مجھے ان سب کی ایک تفصیلی فرسٹ تیار کر لینی چاہئے۔ کبھی کبھی حوالے کے لئے کام آسکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ ملک ریاض کا ارشاد ہے کہ وہ حوالی تو ایک عرصے سے دیر ان بڑی ہے اور اسے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔“ ٹونی پر خیال لیے میں بولا ”فرسٹ تیار کر کے رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ نام۔ ان کی حیثیتیں۔ عہدے وغیرہ۔ تحریری شکل میں محفوظ ہو جائیں تو اچھا ہی ہے۔ یادداشت سے بہت سی چیزیں ٹھیک بھی ہو جاتی ہیں۔ ویسے آپ کی اپنی تیار کردہ فرسٹ کی حیثیت تو ویسی ہوگی جو آپ کے ذہنی بیان کی ہوگی۔“

”ہاں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں۔ ویسے ہی ذرا ٹائپ شدہ اور فائل میں لگی ہوئی بانٹا بل قسم کی فرسٹ کچھ مستند قسم کی چیز لگتی ہے۔ اور ہاں۔ فرسٹ پر مجھے یاد آیا۔ بلکہ بائس میں سے جو فرسٹ پر آمد ہوئی تھی، ان افراد کے بارے میں مزید کچھ معلومات تو حاصل نہیں ہوئیں؟“

”نہیں سرا! میں اس طرف توجہ ہی نہیں دے سکا۔“ ٹونی بولا۔ ”میں یہ ملک ریاض والے چکر میں لگ گیا ہوں۔ آدلی ذرا اہم ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کام میں کوئی غائی نہ رہ جائے۔“

”میں تو میں بھی چاہتا ہوں۔ میں نے شروع میں ہی تمہیں بتا دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”ویسے میں نے اس فرسٹ کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہے۔“ ٹونی ہنسیا پاتے ہوئے بولا۔

”خود بتاؤ۔“ تمہیں معلوم ہے میں تمہاری رائے کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”خود فواری ہے آپ کی۔“ ٹونی بولا۔ ”یہ تو معلوم ہو ہی چکا

# موت کے سوداگر کے خالق

اقلیم علیم کے قلم سے لکھی گئی

پہلی سلسلے وار طلبہ مالی کمائی جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کئے۔

ناگ بھون

ایک پراسرار اور ایڈونچر کہانی جو  
روپ بدل کر انسانوں کو محسوس کرنے  
والی جھگیلی ناگوں، جل منڈل، ناگ بھون اور ناگ پوجا جیسے  
ہونناک اسراروں سے پردہ اٹھاتی ہے۔

انعام یتلی ہوتی زہریلی ناگوں جل کماری، ناگ رانی کے  
طسمانی تصادم میں گھرنے کے بعد ایک نئی زندگی حاصل کرنے والے  
محمد سلطان خان کی زرخیز کہانی جو اقلیم علیم نے اسی کے الفاظ میں قلمبند کی ہے۔

جس کتاب اپنے قریبی ایک مشال سے طلب  
قریبی یا آہستہ سے نام مل جیست کا  
میں آہستہ سے سال قلمبند کی ہے  
جس کتاب آپ کو  
بند رہے جس سے آہستہ سے سال قلمبند کی ہے

قیمت  
حصہ اول: 150/- روپے  
حصہ دوم: 150/- روپے

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکل روڈ، اردو بازار، لاہور، فون: ۵۲۲۴۶۵

قسم کے رازوں کو راز ہی رکھنا چاہتی ہوگی۔ وہ نہیں چاہتی ہوگی کسی کے علم میں آئے کہ وہ ہمارے حکموں میں بھی سرایت کر چکی ہے یا وہاں بھی اس کے مفادات کی حفاظت کرنے والے موجود ہیں۔

”موجود ہیں۔؟“ میں نے لفظ ”ہیں“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ فرست تو رٹا رٹا اور مرحوم لوگوں کی تھی۔“

”اگر پہلے کچھ جگہوں پر ان کے لوگ موجود تھے تو اب بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ امکان تو نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی وجہ سے پرانے رازوں کی حفاظت بھی ان کے لئے اہم ہو سکتی ہے۔“ دلیل جو اذور قیاس کے میدان میں بھی ٹوٹی کا ذہن نہایت مستعدی سے کام کرتا تھا۔

”لیکن اب وہ یکدم ہی بلیک باکس کی تلاش کے سلسلے میں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو صرف ہمارا خیال ہے۔“ ٹوٹی بولا۔ ”ممکن ہے وہ ابھی سرکاری سے اسے تلاش کر رہے ہوں۔ البتہ ہماری طرف سے وہ مطمئن ہو گئے ہوں۔ انٹیلی جنس ہو گیا ہو کہ بلیک باکس ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور پہلے وہ واقعی ہمارے پاس نہیں تھا۔ یہ تو ہمیں ایک اتفاق ہے تاکہ میں اس وقت بلیک باکس ہمارے پاس نہ ہو سکے۔ جب وہ اس سلسلے میں ہماری طرف سے مطمئن اور بے فکر ہو گئے تھے۔“

”تمہاری یہ بات بھی دل کو گھتی ہے۔“ میں نے کہا۔  
”یہ بھی ممکن ہے ٹیڈ ڈاٹ کے حالات نے کوئی ایسا پلانا کھایا ہو کہ اب وہ فرست یا یہ راز ان کے لئے اہم نہ رہا ہو۔“ ٹوٹی نے معاملے کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ یہ بھی ممکن ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ یہ سب اندازے میں نے بھی قائم کئے تھے۔ میں نے بھی ان معاملات پر اپنی ذراویوں سے غور کیا تھا لیکن ٹوٹی جیسے ذہین نوجوان سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد جیسے دل کو کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا اور میری رائے اپنی ہی نظر میں مستحضر ہو گئی تھی۔

کچھ دیر مزہ اس سے مٹھکر رہی۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا ”جب تم آپریشن ایم ڈبل آر پر روانہ ہونے لگو گے تب مجھے اطلاع دے دینا اور مشن مکمل ہونے پر تو مجھے اطلاع دو گے۔“ میں اصراراً اس دوران میں اپنی مصروفیات ایسی رکھوں گا جن کی کوئی وقت پڑنے پر بہت سے لوگ دے سکیں۔“

”ٹھیک ہے سر! آپسے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ ٹوٹی نے کہا اور رخصت ہو گیا۔ شام تک میں نے آپس میں کام کیا پھر گھر آیا۔ مجھے کھانے پر راجہ کے ہاں جانا تھا۔ ارادہ تھا کہ گھر سے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد تیار ہو کر نکلوں گا۔ لیکن کمر بچ کر میں ابھی لباس بھی تبدیل نہیں کر پایا تھا کہ گیسٹ ہاؤس سے طارق خان نے اصرار کام پر اطلاع دی کہ کوئی خاتون مجھ سے ملنے آئی ہیں ”شیم“ نام بتاتی ہیں۔

میں کمری سانس لے کر رہ گیا۔ میرا خیال تھا میرے مگرش رات کے دوپہے سے اس کی خاصی دل چسپی ہوئی ہوگی اور اب وہ میری صورت بھی کچھ دن کے بعد ہی دیکھنا پسند کرنے کی جگہ وہ غالباً میرے وزٹنگ کارڈ سے ہی میرا ایڈریس دیکھ کر آئی تھی۔ اور وہ بھی فون کے بغیر۔

میں نے اپنے بیڈ روم کی فریج دعوے کے تارکے پیٹھے سے دیکھا طارق خان نے اسے گاڑی ڈرائیو دے میں لانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ گاڑی ہی میں بیٹھی تھی۔ مجھے فکر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ایک ملازم کو بھیجا کہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

چند منٹ بعد میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہ دونوں ہاتھ پشت پر رکھے شاہانہ سے انداز میں ٹپل رہی تھی۔ دروازوں پر آؤریاں مشہور آرٹسٹوں کی پیٹنگز کا ماحولہ کر رہی تھی۔ کمرے کی آرائش کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ نکلیں ”سرخ“ بکریلے سے لباس میں تھی جس نے اس کی عمری کمری کی شخصیت کو شعلہ جوالا سا بنا دیا تھا۔ کمر خوشبو سے مکا ہوا تھا بلکہ اس کے دودھ سے کچھ دوشن روشن کرنا بھی ہو گیا تھا۔ وہ لباس کسی اور پر شاید اتنا نہ چلتا۔ سرے پاؤں تک اس کا وجود گواہی دے رہا تھا کہ وہ بہت ہی خاص اہتمام سے میرے ہاں آئی تھی۔

اک ادائے خاص سے وہ میری طرف گھولی اور دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی ”تمہارا مکان تو بہت شاندار ہے افضل ذرا میں بہت کم چیزوں سے امیر ہوں ہوتی ہوں لیکن اس مکان کو خود زانا دیکھ کر ہی بے پناہ مرعوب ہو گئی ہوں۔ تم نے اس میں اس خوبصورتی اور جاہ و جلال کو کبجا کر دیا ہے۔“

”یہ میرا نہیں“ چپے کا کمال ہے شیم بیگم! میں نے اسے بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”پیرہ اس شرمیں اور بھی بہت سے لوگوں کے پاس بے شمار ہے لیکن ان سب کے پاس ذوق نہیں ہے۔ جہیں نہیں آتا کہ دیہات کی غروت اور پستیوں سے نکل کر کوئی حیثیت اور ذوق دونوں کے اعتبار سے اتنا اونچا سا ملے گا۔“ وہ بولی۔

میں خاموش رہا۔ ایک لنگ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے لباس کو سنبھالتے ہوئے بڑی نزاکت سے ایک صوفے کی نرم مگرانیوں میں اتر گئی۔ اس کی شخصیت میں ظاہر خانم کی ہلکی سی جھلک تھی لیکن وہ ظاہر سے زیادہ تر نازہ، شگفتہ اور قدرے کم عمر نظر آتی تھی۔

میرے خواص پر دھند سی چھا رہی تھی کیونکہ میرے اندر ایک نکمکش برپا تھی۔ میرا دل اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا لیکن میں اپنے دل کو قابو میں رکھنے کی ذہنیت کو شش کر رہا تھا۔ اس نے اس وقت اس اہتمام سے میرے ہاں آکر مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں۔۔۔ خدا کی پناہ! وہ بولتی آنکھیں تو گویا آج

موتیہ تیار کر دینے پر ہنسی ہوئی تھی۔

میں نے گزور سی آواز میں پوچھا "راجو نہیں آیا تمہارے ساتھ؟"

”تمہارا تراسہ ہی چاہئے تھا۔“ وہ ہنسنی ساٹھس لے کر بولی۔  
 وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ برسوں بعد کل رات اس سے  
 تمہاری شخصیت ملاقات ہوئی ہے۔ تمہارا خیال شاید یہ رہا ہو کہ وہ  
 تمہارے لئے اور اطمینان سے بیٹھ کر تجھ کی کپ شپ کرنے  
 کے لئے تیار رہا ہو گا۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایسی  
 کئی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سن کر دل چھوٹا مت کرنا  
 اور اچھی مت ہو۔ وہ حسب معمول شام تک خزانے لیتا رہا۔  
 پھر اچھ کر تار ہو کر اپنے تھوڑی دیرت قسم کے نقشے اور شرابی دوستوں  
 کے ساتھ غفلت بنانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے تمہارا  
 ذکر تک نہیں کیا۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دلکش لہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی "دوسری طرف ہم ہیں جو تمہارے دوست نہیں ہیں۔" اس نے لفظ "نہیں" پر بہت زور دیا۔ اس بات پر جاننے کے بعد وہ میں بھی غصہ نہیں آئی۔ ذہن کو تھوڑے وقت میں تودہ ٹواری کی یادوں میں بھٹکا۔ پھر اس نے میرے لئے نیند بھی آئی تو خواب تمہارے ہی آئے۔ وہاں آج کل بھی تمہارے ہی بارے میں سوچتی رہی، چنانچہ اب تو یہی کہ جب بڑے بڑے لوگ تمہاری راستوں میں سے بھی گئے ہیں لیکن اب تمہاری گلیوں کے راستوں میں سے بھی گئے ہیں۔ لیکن پھر جب یہ خیال آیا کہ ہم کون سا تمہارے بچپن کے دوست ہیں، ہمارے لئے کی تحسین کون سی خوشی ہے؟ تو دل پر ایک لب طرح کی افسردگی چھا گئی۔ اس کے باوجود ہم تم سے ملنے آگے صرف دل کے انہوں مجبور ہو کر۔"

”بہت شکر ہے۔“ میں نے دیکھتے دیکھتے کہا۔ ”یہ میری عزت افزائی ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔ راجر کے نہ آنے کا مجھے القوی نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے نظریات اور محسوسات میں تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن میری نظر میں اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ نہیں آیا... کوئی بات نہیں! میرا جب دل تپا ہے گا میں خود اس سے ملنے چلا جاؤں گا۔ یہ کوئی حساب کتاب یا مل جل کا مسئلہ نہیں ہے جسے برابر اور درست رکھنا ضروری ہو۔ دوستی، محبت اور عشق کے قزاقوں میں کبھی ایک چلا جاتا ہے، کبھی دوسرا۔ ان معاملات میں زیادہ باریکیوں میں نہیں جانا پڑتا۔“

”بالکل۔“ وہ زرا کھل اٹھی۔ ”میں سوچ کر تو میں ہل آئی  
 ہوں۔ تمہیں مجھ سے ملنے کی ترغیب تھی مجھے تو ہے۔“  
 ”میں تمہیں بتا چکا ہوں اب سوال تمہارا نہیں رہتا۔ باتوں کا  
 جھگڑا تم کی شرم کا ہے۔ ہم اب اس پر مزید بحث نہیں کریں

مگر رات تفصیل سے بات کر چکے ہیں۔ یہ بتاؤ کیا ہوگی 'کیا کھاؤ گی۔'

”جو تم ملاؤ گے فی لیس گے۔ جو تم کلاؤ گے اٹھا لیں گے۔“ وہ دل آویز انداز میں مسکرائی۔ ”بس تمہاری آنکھیں، تمہارا لہجہ، مہیاں دے میرے لئے فی الحال اتنی کافی ہے۔“

وہ شکر صرف حرکات و سکنات اور آنکھوں سے ہی نہیں، لفظوں سے بھی مجھے آزمائش میں ڈالنے پر تکی ہوئی تھی۔ میں نے ملاؤم سے اس کی خواہش کے لئے کچھ خیریں منگوائیں جن کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بس ایک کولڈریک کا گلاس ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ چسکیاں لیج رہی اور بائیں کرتی رہی۔ باتوں میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی ہوگی نہ کوئی اشارہ ایسا آتا تھا کہ میرا دل اٹھل چھل ہونے لگا لیکن میں نے بعد کو بخش اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔

ایسا لگتا جیسے وہ واپس جانے کے موڑ میں نہیں تھی۔ شب رفت کی طرح وہ آج کی رات بھی باتوں میں گزارنے آئی تھی۔ میرا دل اور راجہ میں اٹکا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی اور اس دوران وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یعنی فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ راجہ رانگھانے سے پہلے ہی میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ وہ راجہ کا فون ہوگا۔ کھنٹی اس فون کی بجی تھی جسے ملازمین میں سے کوئی نہیں اٹھاتا تھا۔

میں نے ریسرور اٹھایا۔ میرے دل نے صبح سنبھل دیا تھا۔  
دوسری طرف... راجیلہ ہی تھی۔ میرے "بیلو" کتے ہی اس نے  
میری آواز پہچان لی اور بلا تمہید یوں۔ "شرعاً عمو! رات کا کھانا  
جلدی کھا لیتے ہیں... اور میں تمہارے انتظار میں جو کی بیٹھی ہوئی  
ہوں۔"

"میں اب تک پہنچ چکا ہوں لیکن غیر متوقع طور پر میرے کچھ مسان آگئے۔" میں نے نیچی آواز میں کہا۔

اس موقع پر خیمے نے کھکار کر گا حنا ف کیا۔ ظاہر ہے اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ دوسری طرف کون تھا لیکن اس کے باوجود مجھے کچھ ایسا لگا جیسے وہ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ کراخول و عریض تھا اور فون ایک گوشے میں تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر فون سننے آیا تھا۔ میرے اور خیمے کے درمیان خاصا فاصلہ تھا لیکن راجیلہ کی سماعت کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ خیمے کے کھکارنے کی آواز اس تک پہنچ گئی۔

وہ بخشنے والی نہیں تھی۔ فوراً اپنی مکھنکار نے کانداز ہار مارا ہے کہ مکھنکار نے والی نے برا حشر کم کھا پایا ہے۔ کون ہیں یہ خاتون؟

”وہ ہمارے ایک دوست ہیں۔۔۔ ان سے بڑی سچی چٹائی ہے۔۔۔ ان کی پیٹیم ہے۔“ میں نے بہت کوشش کی کہ میرے لیے میں ان کا برقرار رہے لیکن نہ جانے کیوں کچھ فکرا پن آئی گیا۔ اور صراحتاً چٹائی کا اندازہ عین ایسا ہی ہوتا تھا جیسے دو دوسری طرف نوٹ پر میری

ہو جاتا۔

تصویر بھی دیکھ رہی ہو۔

”یہ تساری کئی کئی گم ہو رہی ہے“ وہ تیزی سے بولی۔

”میں تو کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے اپنے لیے میں جتنی پیداکرنے کی کوشش کی۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جن کی کسی بھی موقع پر سنی ذرا مشکل سے ہی گم ہوتی ہے لیکن راحیلہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے سامنے میرے اندر کارستانی اور شرمیلہ تیرہ چودہ سال پہلے کا نوجوان عیاں ہونے لگا تھا۔ اس جنٹیل میڈی نازک اور نمکتی عورت کے سامنے میری بہانے بازی یا جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میری پیشہ خواہش ہوتی تھی کہ میں اس سے بات کروں، اس کے سامنے ”پیش“ ہوں تو مجھ میں کوئی عیب کوئی خالی نظر نہ آئے۔

”کیا واقعی کرے میں اس خاتون کے شوہر بھی موجود ہیں؟“ اس نے پچھتے ہوئے لیے میں پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں۔ کوئی تساری ان سے بات کراؤ؟“ میں نے بڑی جرات سے کہا۔ میں شیم کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ میں اپنے آپ کو یہیل دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ شیم اس گفتگو میں رعب و خاش نہیں کر پاسے گی کیونکہ وہ صرف میری آواز سن رہی تھی جسے میں حتی الامکان سنی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اگر میں زیادہ نیچی آواز میں بات کرتا تو راحیلہ اور شیم دونوں ہی کی نظریں مشکوک

راحیلہ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا تو میں ذرا شرم برہیلہ میں نے کہا۔ ”ان صاحب کو ویسے بھی تم جیسی شخصیات سے بات کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں تساری ان سے بات کر اسکا ہوں لیکن ذرا سوچو تساری یہ حرکت کیسی لگے گی؟“

”بھائو میں گئے وہ صاحب۔“ راحیلہ تیزی سے بول رہی تھی۔ اس وقت تمہارے پاس موجود ہوں یا نہ ہوں مجھے اسی سے کیا مطلب؟ رات کو اس وقت اگر تم کسی اکیلی خاتون سے بھی گفتگو کر رہے ہو تو میرے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں کوئی جیلز تو نہیں ہو جاؤ گی۔ میں تو ویسے ہی ذرا تمہیں چھو رہی تھی۔ میرا اور تمہارا کوئی جیلز ہونے والا رشتہ تو نہیں ہے تم تو میرے پاس ہو۔ بلکہ بیک پاس۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے۔“ میں نے مہنوی سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا مجھے فرصت مل جائے۔ پھر میں تم پر رعب و خاش ڈالا کروں گا۔ اگر کل ذرا بڑی ہوں۔ ابھی تم پر رعب ڈالنے کے لئے وقت نہیں مل رہا۔“

”ابھی کھانے پر آؤ گے تو ہی بھر کے رعب ڈال لیتا۔ میں ذرا اپنے اوپر مسکینی طاری کروں۔ جب تم آؤ گے مجھے کانپتی ہوئی بازو گئے اس نے بیٹے غلوں سے وعدہ کیا۔“ تم مجھے کس طرح لائے دیکھنا پسند کرو گے۔ یہ بچوں کی طرح یا خزاں رسیدہ بچے کی

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خود نوشت

دہشت گرد

سلیم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلا سکتا تھا۔

○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہو لہان ہو گئے تھے۔

○ ”جی کہانیاں“ کا ایک مقبول ترین ایڈ و سخر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

تسارا ابھی کوئی ایسا تعلق کہاں کہ میں اس قسم کی باتوں سے بیٹھیں  
ہوئے نکلے۔

دعویٰ دونوں ہی عورتوں کو تھا کہ وہ بیٹھیں نہیں، بیٹھیں  
ہوئے رالہ ان کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ لیکن رقاہت دونوں کے  
لبے میں بول رہی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی زبردست حیرت محسوس  
ہوئی تھی کہ جس مرد پر عورت مہمان ہوئی تھی اس کے آس پاس کی  
دوسری عورت کی پرچائیں کو بند آنکھوں سے بھی پہچان لیتی تھی۔  
دور سے صرف آہٹ سن کر سمجھ جاتی تھی کہ پیش قدمی کرنے والی  
کوئی عورت ہے۔

”میں نے ابھی مرد یا عورت کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔“ میں  
نے پتہ بڑا دیا۔ ”میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ایک بے تکلف  
دوست کا فون تھا۔ ابھی میں نے یہ وضاحت تو نہیں کی تھی کہ وہ مرد  
تھیا عورت۔“

”وضاحتیں کو بھڑو۔“ وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر گویا اس  
موضوع کو ختم کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ بتاؤ تم نے شادی کیوں نہیں  
کی؟“

”یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔“ میں نے سادگی سے کہا۔  
وہ خنجر دہی کہ شاید میں اپنی بات کی وضاحت کروں گا لیکن میں  
خاموش رہا تو بولی۔ ”شاید اب تم مکمل کر مجھ سے بات کرنا بھی پسند  
نہیں کرتے۔“

”یہ بات نہیں ہے خیمہ!“ میں نے لائنٹ سے کہا ”وہ۔۔۔  
در اصل مجھے ایک جگہ ٹھکانے پر جانا تھا۔“ میں نے گھڑی دیکھتے  
ہوئے کہا۔ ”میں اس کے لئے لیٹ ہو رہا ہوں۔۔۔ مجھے تم سے بھی  
شرمندگی ہو رہی ہے۔ کوئی اور موقع تو آتا تو ہم دیر تک بیٹھ کر باتیں  
کرتے۔۔۔ بہت مزہ آتا۔۔۔ تم اور راجو کسی نزدیکی سے ہاں کھانے پر  
کیوں نہیں آجاتے؟ کھانے کے بعد رات بگا کریں گے۔“

”راجو کو درمیان میں ٹھینکا کیا ضروری ہے؟“ وہ متناہی کر بولی  
”وہ ہماری وجہ سے اور ہم اس کی وجہ سے بھر ہوئے رہیں گے۔“

وہ راجو کو روکھ کی کھسی کی طرح درمیان سے نکالتے پر تلی  
رہتی تھی اور میں راجو کو گچ میں موجود رکھنے کا خواہشمند تھا۔ میں  
نہیں چاہتا تھا کہ خیمہ کے ساتھ خراقات میں میری ہیشتیں  
ہوں۔ میں کوئی زاہد و پاراس نہیں تھا۔ خیمہ کی تصویر تو ویسے ہی  
خواہشوں کے شہستان میں لڑکھن سے آوہاں تھی۔ اس کے سطلے  
میں تو تیس ہاں بلکی کی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ حدود اور فاصلے  
برقرار رکھنے کے عند پر قائم رہ سکوں گا نہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ

شعلہ بدھیاں تھی اور مجھے بھی راکھ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔  
ایک لمبی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ”البتہ اگر تم نے اسے  
پتہ پلانے کے معاملے میں جھوٹ دے دئی تو وہ دھت پھر ایک  
طرف کو لڑکھ جائے گا۔ پھر اسے کروڑوں کی اپنی بیٹی کی کھسی  
بھی چیز کی کوئی پروا نہیں رہے گی۔ تمہارے ذہن میں زلیخہ کا سہیل

”میں نے کوئی رقم کی طرح۔“ میں نے جواب دیا۔  
”ہرات میں اپنا ذکر مت لے آیا کرو۔“ اس نے کہا اور پھر  
لدی سے بولی ”اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ اب بات لمبی مت کرو۔ جو خاتون  
کرے میں تمہارے ساتھ بیٹھی ہے وہ پور ہو رہی ہوگی اور اس  
نہ یقیناً نہیں گھور رہی ہوگی۔“

میں نے خیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھور تو نہیں رہی تھی  
اب ایک تک میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ رابطہ بات جاری  
رکھتے ہوئے بولی۔ ”جب اس خاتون کے ساتھ تسارا ”بزنس“ ختم  
ہو جائے تو کھر سے نکل لینا۔ اب تو تم بھی غائبے انگریزی دان  
ہو گئے ہو۔ جیسے معلوم ہی ہو گا کہ انگریزی میں لفظ ”بزنس“ کا  
نوم بہت وسیع ہے۔“

”تم نے ابھی صرف لفظوں کی دستیں دیکھی ہیں میرے  
کونے کی رسائی نہیں دیکھی۔ اگر زندگی میں کبھی میں نے تمہیں  
گونا گوند کرنے کا ارادہ کر لیا تو کوئی ذمہ بکتر بھی تمہیں نہیں بچا  
سکتی گی۔“

”خیر۔ یہ تو وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے  
ای۔۔۔ ٹی اٹھال تم جلدی سے اس خاتون سے جان چمڑانے کی  
کوشش کرو اور آج آج میں بھوک سے مری جا رہی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے میرا جان چمڑانے کو دل نہ چاہ رہا ہو۔“ میں نے  
کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر میں آکر چمڑا دوں گی جان۔ بیشک کے  
لئے۔“ وہ مسکاتی آہیز لبے میں بولی۔

”جیسے تو بیٹھیں نہ ہوئے کا دعویٰ تھا لیکن تمہارے تو ہر لفظ  
سے جلی کی بو آ رہی ہے۔“

”یہ بیٹھنے کی بو نہیں انسان دوستی کی خوشبو ہے۔ میں جیسے  
اٹنے انسانوں کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اب میں  
لاکھ نہیں سنوں گی۔ آج مجھے کتنے تک آج آج۔۔۔ ورنہ۔۔۔“

”ورنہ کیا؟“

”یہ غلاما بتایا جائے گا۔ خدا حافظ۔“ اس نے سلسلہ متقطع  
کر دیا۔

میں نے واپس آکر خیمہ کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا ”ایک بے  
تکلف دوست کا فون تھا۔“ مجھے ابھی طرح یاد تھا میں نے کوئی  
ایسا جملہ نہیں بولا تھا جس سے اندازہ ہو سکتا کہ دوسری طرف کوئی  
لڑکی تھی۔ میں احتیاط کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

خیمہ کچھ عجیب۔۔۔ سیانے سے انداز میں مسکرائی اور بولی۔  
”اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں جھکا۔ میں نے تم سے کب پوچھا  
تھا کہ کس کا فون تھا؟ ویسے بھی انسان کو جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہ ہو  
آسے بولنا ہی نہیں چاہئے۔ اگر دوسری طرف کوئی لڑکی تھی تب  
میں جیسے میرے سامنے صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا

بہن کے دوست کی حیثیت سے جو تصور ہوگا، مجھے یقین ہے راجو اب وہ نہیں رہا۔ تم خود ہی اپنے اور جو بندہ میں چاہے عائد کرتے رہو، چاہو تو تمام حدود پھیلاتے رہو، اس کی صحت پر ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ ان سوچوں، ان پکڑوں سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنی عجیب و غریب چیزیں چکا ہے۔ اس کی نفسیات بہت اچھ بھگی ہے۔

"چلو، کوئی بات نہیں۔ ہماری نفسیات تو سلیبی ہوئی ہے۔ ہم ہی جہاں تک خیال کر سکتے ہیں کر لیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ غالباً اپنی بد مزگی چھپانے کی جی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ وہاں سے لیے میں بولی۔ "تھک ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ تم کھانے پر جاؤ۔ جب جب نقد پر یا فراہم ہیں ایک دوسرے کے سامنے لائی رہے گی، ہم ملتے رہیں گے۔ شاید کبھی ہمارے راستے بھی مل جائیں۔"

اس نے مصافحے کے لئے اٹھ بڑھایا۔ میں ایک ٹائٹ کے لئے ہٹ گیا۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کبھی ہم اپنی زندگی خراب کئے رکھتے تھے، اب اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے بھی خوف آنے لگا تھا۔ خوف و حقیقت اس سے نہیں اپنے آپ سے تھا۔ انسانوں کے خیالات، خواہشیں اور محسوسات اس کے چہرے، آنکھوں اور لہس سے دوسرے تک پہنچتے ہیں۔ اس کے اندر آنکھیں طلب کا جو سمندر موجزن تھا، میرا ہاتھ تمام کر وہ گویا مجھے بھی اس میں کھینچ لیتی تھی۔ آدمی ایک بار نہ زور موجوں کی زد میں آجائے تو اسے ڈوبے کی یاد پڑتی ہے۔

لیکن اس حد تک بد خلقی کا مظاہرہ بھی میرے بس کی بات نہیں تھی کہ میں اس کا بڑھا ہوا ہاتھ نہ تھامتے۔ وہ تو محض ایک خول تھا جو میں نے افلا ق اپنے اوپر چھایا ہوا تھا ورنہ پسندیدگی کی شہوت اب بھی اندر دوڑتی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تو اب بھی اس پر نظر ڈالنے سے تیز ہوتی تھیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے اور شاہانہ سے لہجے میں بولی۔ "فضل، کبھی تم کاؤں کی کیوں میں میرا انتظار کیا کرتے تھے۔ اب میں زندگی کی راہوں پر تمہارا انتظار کیا کروں گی۔ تمہاری بھینوں کا مجھ پر جو غرض ہے، شاید اس طرح ادا ہو جائے۔ خدا حافظ۔"

پھر وہ چلی گئی۔ میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ پھر میں نے دم سے صوفے پر گر کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ میری زندگی میں پہلے ہی خاصی اچھل تھی۔ اب یہ عورت مزید حاطم برپا کرنے چلی آئی تھی۔

چند لمبے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور راجیلہ کی طرف جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد میں راجیلہ کی طرف روانہ ہوا تب بھی میرا ذہن خیم میں ہی پھنسا ہوا تھا۔

میں جب راجیلہ کے ہاں پہنچا تو وہ گیٹ کے سامنے ہی پڑے روش پر کھڑی تھی اور خستہ نظموں سے اوپر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ گیٹ کھلا ہی تھا۔ میں گاڑی اندر لے گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے میں آئی اور گیٹ بند کرنے کے بعد قریب آکر بولی۔ "یہ مت کہنا میں باہر کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں تو ذرا پاس ہی جا کر رہے رہی تھی۔"

"مغالی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے گاڑی سے اترے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تم جو تھوڑی سی ملکہ ہو اور میں اس سلسلے میں تمہارا ایک انتہائی ملائی شاکر ہوں۔ راشد کہاں ہے؟"

وہ چلا ہوا ہونٹ وائٹل میں دبا کر ایک لمبے مجھے گھورتی رہی اور بولی۔ "ہمت فکر ہے تمہیں اس کی؟ تمہاری دوستی اس سے ہے یا مجھ سے؟"

"دوستی وہ غیر تو سب کچھ تم سے ہی ہے۔ لیکن اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے۔ کبھی منا ہے تم نے یہ لفظ؟"

"پہلے تو بہت سنا تھا لیکن جب سے تم سے واقفیت ہوئی ہے، ذہن سے ہی اتر گیا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "میرا حال تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ راشد ایک صاحب کے ہاں گیا ہوا ہے جو ہمارے رشتے دار ہی ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارے نئی رشتے داروں کے گھر ہیں۔ سب غامض تو محال ہیں لیکن جب ہم پر زوال آیا تو انہوں نے کتنا شروع کر دیا تھا۔ شاید ڈرتے تھے کہ ہم کوئی بد طلب نہ کر لیں۔ کوئی کراچی آتا تھا تو فون بھی نہیں کرتا تھا۔ مجھے تو ان میں سے کسی سے بھی ملنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں رہا۔ لیکن راشد بے جا نہ نہیں سکا۔ صبح سے گھر میں پڑا کھسا رہا تھا۔ آخر کل ہی کھڑا ہوا۔ کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا تھا کہ شاید وہ کھانے پر نہ پہنچ سکے۔"

"خیر۔ اس میں گرا ماننے کی کیا بات ہے۔ سب تمہاری طرح سخت دل تو نہیں ہو سکتے تھے۔ بعض لوگ دوسروں کے بویے بھول بھی جاتے ہیں۔ معاف بھی کر دیتے ہیں۔ تم تو اپنی حرکتوں پر خود کو بھی معاف کرنے کی قائل نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے جیسے نظروں سے مجھے گھورا لیکن کچھ بولی نہیں۔ اس دوران ہم ڈانٹک دوام میں پہنچ چکے تھے۔ میز پر برف تپ رہے تھے اور ہمیں روشنی تھیں۔ کمرے میں روشنی بدھم بھم۔ "واحد، واہ۔ کیا کہنے۔" میں نے استہزائیے لیکن پھر جوش لے میں کہا۔ "پورا انگریزوں والا احترام ہے کھانے کا۔ تمام دو خیاں، میز پر ہضمیں۔ کہیں کھانے بھی انگریزی تو نہیں ہوں گے؟ آج انگریزی کھانے کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔"

"نہیں۔ کھانے بالکل رکسا ہیں۔" اس کا لہجہ ثورے شرملا سا ہو گیا۔

ہم میز پر بیٹھ چکے تو وہ بولی۔ "کھانے بنانے میں لے ہیں لیکن میز پر ملا نہ لگائے گی۔ میں اب تھک چکی ہوں۔ کچھ دیر پہلے شاد

یہ میرا دل چاہ رہا تھا، سو جاؤں۔“  
اس قسم کی سختیوں کی عادت نہیں ہے۔ ابھی نیا غا شرق

نیا شرق نہیں ہے جناب والا! اب تو خاصا عرصہ ہو گیا ہے  
بہت۔“

اس کا مطلب ہے رسک لیا جاسکتا ہے کھانے کا۔“ میں نے  
جسے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا! پہنچنے کا خطو کم ہو گیا

اگر میری پکانی ہوئی کسی چیز پر کوئی بے ہودہ تبصرہ کیا تو کوئی  
بڑا کمریہاڑدوں گی۔“ اس نے خبردار کیا۔

”پتہ سامنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی پکانی ہوئی کوئی چپاتی  
زیادہ ملک ثابت ہوگی۔“ میں نے کہا۔

اس نے خیر خواہ نظروں سے مجھے گھورا لیکن میں نے اس کے  
نے کی کوئی پروا نہ کی اور کھانے کے دوران بھی اس کی تیار کی  
بڑوں پر ہمت لیکن تبصرے جاری رکھے تاہم دل ہی دل میں  
بڑا فکرتا ہوا کہ اسے نہ صرف اچھے کھانے پکانے آئیے  
اس کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ اسے پوری گھرواری کا  
ڈھانچا تھا۔

کھانا بہت پر لطف رہا۔ میرے لئے تو ظاہر ہے کھانے سے زیادہ  
لہذا ساتھ اہم تھا۔ نوک جھونک بھی چلتی رہی لیکن کبھی کبھی  
میں غصہ بھی ہو جاتا۔ اس دوران یہ طے پا گیا کہ راجیلہ  
میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولے گی۔ ہمارے اپنے  
ہاٹل کپٹیز کا پبلشنگ کا ایک بہت بڑا بجٹ تھا جس کا اکاؤنٹ  
میں نے بھی کے پاس تھا۔

ایجنسی شروع کرنے کے لئے ہمارا اپنا ہی پبلشنگ کا کام کافی  
گراہمیں امید تھی کہ اگر میں نے اور راجیلہ نے ذرا سی بھی  
پلازیم کی دوسرے بڑے اکاؤنٹ لانے میں بھی کامیاب  
کئے اور ہماری ایڈورٹائزنگ ایجنسی ایک ”ہوم ایجنسی“  
لگنے کے بجائے اپنے طور پر بھی ایک بڑی اور نمایاں ایجنسی بن  
سکتی۔

بڑے بڑے مسائل ہم نے سرسری طور پر طے کر لئے تھے  
ذاتی شوق کا مسئلہ رہ گیا تھا۔ یعنی ایجنسی کے نام کا مسئلہ۔  
ایجنسی کا نام کیا ہونا چاہئے؟“ آخر میں نے اس طرف آئے

تم ”مالک ہو۔ اپنے ہی نام پر رکھ لو۔ چوہدری  
”نکسہ“ راجیلہ تجھ کی ہے۔

اپنے ہوا اور بے وقوفانہ بات کی ہے۔“ میں نے تیزی سے  
انکسائی وڈ ہوئی۔ اگر نام ہی اتنا پینڈوانہ ہو گا تو قابل چکی  
”اس سے زیادہ کون جانتا ہو گا کہ ایڈورٹائزنگ بڑا نہیں، نیم  
اور بڑے کھسے لوگوں والا کام ہے۔ اس میں چوہدری کو

کمال سے ٹھسکا دیتے؟ بالکل ایسا مظلوم ہو گا کہ کسی میٹرک پاس  
ریسائی نے شروں کی دیکھا دیکھی گاؤں کی کسی بھنگ میں ایجنسی  
کھول لی ہے اور ٹیڈے تو ریاں بیچنے والے چھوٹے آڑھتیوں کے  
استاد تیار کئے کا پروگرام بنایا ہے۔“

”آخر تمہارے گروپ آف کمپینیشن بھی تو ”چوہدری“ لگا ہوا  
ہے۔ اس گروپ کی تو ساری کمپینیاں راکٹ کی رفتار سے اوپر  
جاری ہیں۔“ راجیلہ منہ بنا کر بولی۔

”کاروبار میں اس قسم کے نام چل جاتے ہیں، بلکہ کچھ  
جاگیرداری والا رعب بھی پڑ جاتا ہے۔ ایڈورٹائزنگ بھی ہے تو  
کاروباری لیکن ذرا مختلف قسم کا۔ اس میں امپریٹیشن کچھ مختلف ہوتا  
چاہئے۔ ویسے تو خیر جب کوئی چیز چل جاتی ہے تو پھر اس کا نام خواہ  
کچھ بھی ہو، کانوں کو بھلا گئے لگتا ہے۔ لیکن فی الحال چوہدری کا  
ووٹ ”چوہدری“ کے خلاف ہے۔“

پھر ایک لمحے کے وقف سے میں نے کہا ”اور ابھی تک  
تمہارے ”نکسہ“ آلودہ دماغ میں یہ بات بھی نہیں آئی کہ تم ایجنسی میں  
پارٹنر ہو۔ میں اکیلا اس کا مالک نہیں۔ ایکریٹینٹ میں ایک شخص یہ  
فہمی ہو گی کہ اگر کچھ عرصے بعد یہ بطور پارٹنر اس قابل ہو جاتی ہو کہ  
دوسرے پارٹنر کا ابتدائی سرمایہ واپس کر سکو تو سول پروپر انٹرنیشنل بلا  
شرکت غیرے مالک بھی بن سکتی ہو۔ الگ ہو سکتی ہو۔“

وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ ”حاش میں  
اس وقت جب اٹھا کر تمہاری اس بڑی سی کھوپڑی پر مار سکتی۔  
تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے الگ ہونے کے لئے کراچی چھوڑ کر  
آئی ہوں؟“

”یہ میں تمہیں صرف آزادی کا احساس دلانے کے لئے بتا رہا  
ہوں۔ تاکہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر تم اپنے آپ کو پابند محسوس نہ  
کرو۔“ میں نے کہا۔

”بہت گراں چکی ہوں میں آزادی کی زندگی۔“ وہ بیزار سی  
ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”کچھ نہیں دیا مجھے آزادی نے۔ اب میں تھوڑی  
سی پابندیاں اپنے اوپر باندھ رکھا جاتی ہوں۔ فائدہ مند پابندیاں۔  
زندگی کچھ زیادہ ہی بے ثمر ہو گئی ہے۔ میں اب کچھ حرکت میں آنا  
چاہتی ہوں۔ اپنی نظر میں اپنے آپ کو کچھ اہم، کچھ مفید ثابت کرنا  
چاہتی ہوں۔“

”شکر ہے یہ بات یہاں آکر تمہاری سمجھ میں آگئی۔ کراچی میں  
تو تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہاں بھی میں تمہیں یہی تو  
سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”سمجھ میں تو آ رہی تھی بس میں اپنے گے بندھے معمولات  
کے کنوئیں سے نکلنے کا حوصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اب کنوئیں سے  
نکل کر سمندر میں چھلانگ لگا ہی دی ہے تو پھر واقعی کچھ کر گزرتا  
چاہئے۔“ اس کے لیے میں بلند حوصلوں کی کھٹک تھی۔  
”ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لئے کوئی دوسرا نام ہے تمہارے



”ہاں میں؟“ میں نے پوچھا۔

”الٹی میٹ ULTIMATE کیس نام ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
میں نے ایک لمحے سوچا پھر ڈانٹنگ ٹینک پر لگا سا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اس نام کو اوکے کرتا ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد تم اس پر دیکھتے ہو کام شروع کرو۔“  
”ایک ہفتے کے بعد...؟ وہ کراہ کر بولی۔ ”ایک ہفتہ کیسے گزرے گا؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ اس دوران ملازمہ کافی لمے آئی۔ ہم کافی کے کپ لے کر ڈانٹنگ روم میں قالین پر پڑے ہوئے دبیز کشور پر آ بیٹھے۔ چند لمحے خاموشی سے چسکیاں لیٹے کے بعد وہ بولی۔ ”تم مجھے کام بتا رہے تھے۔“

”اب سوچ رہا ہوں کہ نہ بتاؤں۔“ میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کام کچھ خطرناک بھی ہے۔ غیر شرطانہ سا بھی ہے۔ تم پسند نہیں کرو گی۔“

”خطرناک کی حد تک ٹھیک ہے۔“ اس کی آنکھوں میں وہی پرانی الجھن پھر پند لڑائی جاتی دکھائی دی جس نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اپنا امیر بنا لیا تھا۔ ”لیکن یہ غیر شرطانہ ہے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”غیر شرطانہ صرف اس مفہوم میں ہے کہ تمہیں تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔ کسی اور کا روپ دھارنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

”کس لئے؟“ اس نے جانا چاہا۔

”وہ دراصل تم نے کہا تھا کہ اگر میں تمہاری پشت پناہی کے لئے موجود رہوں اور معاملہ کسی ذیلی بد معاش اور ”وہرٹی“ پر ہو جو ”حکم کی شخصیت کا ہو تو تم اسے قتل بھی کر سکتی ہو۔ بس... تمہاری یہ بات سن کر ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔“ میں نے جذذب کے سے عالم میں کہا۔ ”لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ شاید تم نے مذاق میں یہ بات کی ہو۔ یا پھر یہ شخص بات برائے بات رہی ہو۔“

”یہ فیصلے تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم صرف بات کرو۔ جو کہنا چاہتے ہو وہ کرو۔“ وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”شاید تمہیں اندازہ نہ ہو کہ میں تمہارے لئے کیا کر کر سکتی ہوں۔“

”ایک شخص ہے۔“ میں نے وہمی آواز میں کہا۔ ”منشیات کا اسمگلر ہے۔ خطرناک آدمی ہے۔ کئی انسان اس کے حکم سے قتل کئے جا چکے ہیں اور کئی کو اس نے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ بظاہر ایک مذہبی اور شریف آدمی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر کوئی اس کے کڑوت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”اے تم بہت سے لوگ ہیں ہمارے پاس۔“ راجیلہ بولی۔ ”ہم تو ان سے نہیں سن سکتے۔ ڈرگز کا دھندا تو بہت خطرناک صورت

... اختیار کر رہا ہے۔ ڈرگ مافیا تو کئی ملکوں میں حکومت کر رہی ہے اور حکومتیں اپنے قاتل و ماسک ”ایلی قوت“ کا جادو جلال کے ساتھ بھی ان سے نہیں سن سکتی پامیر۔ چارے اس ضمن میں کیا کر سکتے ہیں؟“

”پہلے میری بات تو سن لو۔“ میں نے صوفے پر لیٹا ہوا دے کہا۔ ”میں جیسے ڈرگ مافیا کے خلاف جہاد شروع کرنے لے نہیں کر رہا تھا۔ یہ تو موضوع ہی الگ ہے۔ کئی ملکوں کی حکومت ہی ڈرگ مافیا کی ہے۔ میں اس لیے چکر میں نہیں اس پر تو محض بات کرنے کے لئے بھی بڑا وقت چاہئے۔ صرف اس مسئلے کی بات کر رہا ہوں جس کا تعلق میری ذات ہے۔ اور مستقبل میں تمہاری ذات سے بھی ہو سکتا ہے۔“

”دوست!“ اس نے گویا سکون کی سانس لی۔ ”پھر تمہارے بات کرو۔“  
”اس قبیل کے لوگ جب کسی سے ناراض ہوتے معمولی بات کو ان کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔“ میں نے سلسلہ کلام ہوئے کہا۔ ”یہ شخص بھی ایک چھوٹی سی بات پر مجھ سے اہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے یا اس کے کچھ حواریوں کو لائن سے نکل آنا پسند نہ آیا ہو۔ برسوں پہلے جب میرا ام سے تھوڑا بہت تعلق تھا تب بھی میں نے ڈرگز کے دھندہ قریب چھٹکے کی بھی کوشش نہیں کی حالانکہ کئی لوگوں نے

ایک خوبصورت اور دلچسپ ٹائلا

انمول

ایم اے راحت

دو جلدوں میں

جلد اول = 180/-

جلد دوم = 200/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

”یہ تو صرف زبرد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ان معاملات کو تو میں اتنا زیادہ خطرناک نہیں سمجھتا۔ اصل خطرناک معاملات تو دوسرے ہیں۔ ان کے بارے میں میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔“

”اُف خدا یا! کیا ان سے زیادہ خطرناک حالات سے بھی واسطہ پڑ رہا ہے؟“ اس نے آنکھیں مزید پھیلانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ ابھی میں نے اسے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں مرحلہ وار اسے تمام حالات سے آگاہ کر کے اپنے خاص الحاح ساتھیوں میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں شامل ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی تھی جس میں ٹولی ”شیخ شاہ“ ضیف ”سردار و غیرہ شامل تھے۔ صرف اسے ہمارے معاملات سے مانوس ہونے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔

میں نے اس کا مرحری ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”اسی لئے تو میں نے تمہیں خبردار کیا تھا کہ لاہور آؤ گی تو سر پہ کفن باندھ کے آنا۔ میں اپنے جاں نثار ساتھیوں میں اضافہ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جو بہت مصلحت بھی ہوں اور جن پر میں اسی طرح آنکھ بند کر کے اعتماد کر سکوں جس طرح اپنے آپ پر کرتا ہوں۔“

”میں تو سمجھتی تھی کہ تم اب صرف بزنس کر رہے ہو گے۔“ جمی تو میں خفا ہوئی تھی کہ کیا بزنس اتنا اہم ہو گیا جو تمہیں فون پر مجھ سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ان چکروں میں پڑے ہو گے۔“

”ان چکروں میں میں خود نہیں پڑا۔ مجھے الجھا دیا گیا ہے۔“ میں نے کہا ”میں تو خود بھی ایک سیدھی سادی امین پسندانہ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ کاروبار کی اپنی الجھنیں اپنے ہی مسائل کیا کم ہوتے ہیں جو میں ان چکروں میں الجھتا پھروں۔ لیکن کیا کروں۔ چکر خود ہی مجھے ڈھونڈتے ہوئے آجاتے ہیں۔“

اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تشویش دیکھ کر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا ”لیکن تمہارے سامنے دونوں راستے موجود ہیں۔ چاہو تو اپنے آپ کو صرف بزنس تک محدود رکھو۔ زندگی اور موت کے مسائل میں میرا ساتھ مت دو۔“

”میں تو مسئلہ ہے۔۔۔!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”جزوی رفاقت اپنے مسلک میں نہیں ہے۔ اب تمہارے ساتھ چل پڑے ہیں تو ہر معاملے میں ہی ساتھ رہیں گے۔ باقی زبرد کی اور موت کا مسئلہ تو وہ نہ تمہارے اختیار میں ہے نہ میرے اختیار میں۔ یہ جس کا معاملہ ہے وہی جانے۔ ہمیں اس فکر میں ڈبے ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”یہ تم نے میرے دل کی بات کر دی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میری ہر بات تمہارے ہی دل کی بات ہوگی۔“ وہ میرے سے ہنس کر بولی۔

”سوائے ایک بات کے۔“ میں نے فوراً کہا۔

پنے کی بھی کوشش کی اور میری مزاحمت پر ناراض بھی اس میں پیرہ بھی زیادہ تھا۔ اس کے باوجود میرا کچھ دل لٹا نہیں گیا۔ یہی طور پر اس لائن کا آدمی نہیں تھا۔

مجھے جواب بھی نہیں آتا کہ ماضی میں تمہارا کبھی اس حلقہ رہا ہے۔ تم اس لائن کے آدمی تو لگتے ہی نہیں۔“

بے چینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

اس پکر میں مت پڑنا کہ اس لائن کے لوگ صورت سے باتے ہوں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے سر پر نہیں ہوتے۔ وہ دوسرے معززین سے زیادہ معزز دکھائی دے۔ صرف فلوں میں ایسا ہوتا ہے کہ اسٹیکر اور ڈرگ مانیا بدل سے بچانے جاتے ہیں۔“

”تو مجھے معلوم ہے۔“ راجیل بولی۔ ”میں تو اس ماسٹروم بات کر رہی تھی جو ہمیں انسانوں کے بارے میں خبردار کرتی ہے۔ دل بدل گیا ہے تم ہمارے پاس آئے تھے اس وقت تو میری جس تمہارے بارے میں مسئلہ دے تھے۔ لیکن اب تو تم مجھے ان خلاف پناہ کی جتنی کی طرح لگتے ہو جس میں جھانک کر نہ بولی آسانی سے دیکھ سکتی ہوں۔“

”میری حیات بھی میری حیات کی طرح قابل بھروسہ نہیں۔“

”کہا۔“ پائلٹ ٹھیک ٹھیک رہنمائی کرتی ہیں تمہاری۔“

”کہا۔ تو تم اس شخص کی بات کر رہے تھے۔ نام کیا ہے اس ہنگر راجیل نے پوچھا۔

”لے لے ایک لمحے سوچا پھر اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دینے کا کہہ دے گا۔“ اس کا نام عالم شیر ہے۔ میری گرامی کے پاس میری ذات سے بہت فاکرے تھے۔ اور اب ہاسی کے نام پر ایک دوسرے کے بڑے بڑے مسئلے حل کئے۔

”لاہور و تھ لائن چھوڑ دی تو اس طرح کے لوگوں سے میں لا ہوں۔ ایک تو اس طرح کے لوگوں کے لئے ہی بڑی تکلیف دہ ہے کہ ان کے فیصلے کا کوئی شخص اتنی آسانی سے ان کا گھبرا لے گیا۔ پھر قدرت کی کچھ ایسی مہربانی رہی کہ میں جائز غلطی بھی ان سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ لا شعوری طور پر انہیں انسانی اذیت میں مبتلا کیا۔ اوپر سے کوئی چھٹی موٹی بات نہ کہ عالم شیر صاحب میرے خون کے پیاسے ہو گئے۔“

”انہوں نے راجیل کو وہ سب کچھ تفصیل سے بتا دیا جو عالم شیر میرے ساتھ کر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل چلی گئیں۔

”میں نے مزید پوچھنے کی گنجائش نہ رہی۔

”انہوں نے ہوا تو وہ بے چینی سے بولی۔ ”یعنی۔ اب بھی تم ہر خطرناک واقعات سے دوچار ہوتے ہو؟ اس طرح ہرگز آرام گرم رہتا ہے۔ اور اس کے باوجود تمہارے دل کی اتنی طاقت باقی ہے کہ اس طرح سکون سے بیٹھ کر کسی خطرناک کسک کو؟“

کرنا بھی میرے لئے کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے جسکی شہرت شرابے کے ساتھ نہیں کرنا چاہتا۔ کسی بڑے آدمی کو کسی شرابے سے قتل کرنا میری پالیسی نہیں ہے۔ ایک تو میں کسی قتل کی طرف لوگوں کی غیر ضروری توجہ مبذول نہیں کروانا چاہتا۔ زیادہ شور مچانا ہے تو خواہ مخواہ کسی سراغ سامنے آجائے۔ پولیس وغیرہ زیادہ پریشانیں اگر بہت زیادہ بھاگ دوڑ شروع ہو جائے تو خواہ مخواہ پچاسوں بے گناہوں کی شامت آتی ہے۔ گھر کے سامنے محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ان کی بددعا میں بھی میرے کمانے نہ چلی جائیں۔

”بہت زور ہے وہ بددعاؤں سے؟“ وہ دھیرے سے بولے۔  
”صرف بے گناہوں کی بددعاؤں سے زور آتا ہے۔“  
جواب دیا ”چنانچہ میری کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی کا پتا نہ ملے گا تو میری بھی ہو جائے تو اس کے قتل کو کوئی دوسرا دنگ نہ بنے اور اگر یہ ممکن نہ ہو جب بھی اسے جی الامکان خاموشی سکھائی جائے۔“  
”من پسندی“ سے قتل کیا جائے تاکہ معاملہ صرف اپنے ایک محدود درجے کوئی بے گناہ لیٹ میں نہ آئے زیادہ شور ہو زیادہ لوگوں کی توجہ مبذول نہ ہو۔“

”بہت معقول اور فکرمند پالیسی ہے۔“ راجیو نے دیکھ کر کہا۔  
”سہرا لایا۔“ تو پھر عالم شیر کا پتا تک صحاف کر رہے ہو؟  
”یہی تو مسئلہ آج پڑا ہے کہ اس کا پتا صحاف کرائے میں

”یہ اس مت کرو۔“ اس نے فوراً ڈانٹ پلا دی۔ ”وہ تم عالم شیر کے بارے میں پتا رہے تھے۔“ شادی کے موضوع پر تو وہ مجھے آنے ہی نہیں دیتی تھی۔ ایسی ضدی لڑکی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

”عالم شیر اب مجھے قتل کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گا۔ میں اب بہت جلد اس کی طرف سے کسی خوفناک کارروائی کی توقع کر رہا ہوں جس میں وہ اپنے تمام وسائل جو تک وے لگائے۔“

”اور تم آرام سے بیٹھے اس وقت کا انتظار کر رہے ہو؟“ اس نے ڈانٹنے کے سے انداز میں پوچھا۔ ”کوئی حفاظتی انتظامات وغیرہ نہیں کیے تم نے؟“

”ابھی ایک لمحے پہلے ہی تو تم نے کہا ہے کہ زندگی اور موت جس کا معاملہ ہے وہی جائے ہمیں اس فکر میں ڈبے ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان پرستی ہوئی گولیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جائے۔ احتیاط بہر حال فرض ہے۔“ وہ بولے۔

”احتیاط تو میں کر رہا ہوں۔“ میں نے عقیدہ ہوتے ہوئے کہا۔  
”احتیاط اور حفاظتی انتظامات کے میرے اپنے انداز ہیں۔ وہ تمہاری سمجھ میں ذرا دیر سے آئیں گے۔ عالم شیر جیسے آدمی کو قتل

## صاحب طرز ادیب قمر اجنالوی کی تاریخی کتب

|       |                         |       |                |
|-------|-------------------------|-------|----------------|
| ۲۰۰/- | نئی دنیا                | ۱۲۵/- | پر تھال        |
| ۹۰/-  | لاڈو                    | ۱۰۰/- | پنڈارے         |
| ۶۰۰/- | بغداد کی رات (اول دوئم) | ۱۵۰/- | ولی عہد        |
| ۶۰۰/- | دھرتی کا سفر (اول دوئم) | ۱۵۰/- | شمشیر          |
| ۴۰۰/- | مقدس مورتنی (اول دوئم)  | ۲۰۰/- | چاہ بابل       |
| ۱۴۵/- | جہان لوح و قلم          | ۲۰۰/- | سلطان          |
| ۱۵۰/- | غزالہ                   | ۱۵۰/- | جنگ مقدس       |
|       |                         | ۱۲۵/- | اور خان الغازی |

مکتبہ القریش، اردو بازار لاہور، فون: ۲۲۳۶۶۵

وہ اپنے ہاتھ میرے ہاتھ سے جھڑا کر پھلتے ہوئے اور انہیں  
ان کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ”ان ہاتھوں کی نزاکت محض ایک  
دھوکا ہے۔ ان کی سفاکی اور سختی تم پر کیجئے گئے ہو۔“  
”وہ بہت پرانی بات ہے۔ قصہ پارینہ ہے۔“ میں نے است  
چرانے کے لئے سنجیدگی سے کہا۔

”اب یہ ہاتھ زیادہ تکلیفیں جمیل کیجے ہیں۔ اب ان کی  
خونخاک بڑھ چکی ہے۔“ وہ ہاتھوں کو آہستہ بچوں کی طرح اٹکراتے  
ہوئے بولی۔ ”ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ بظاہر نرم و نازک نظر آتے  
والے میرے اس وجود میں ہزاروں خونخوار سٹ آئے تھے۔ میری  
رنگ رگ میں نفرت کا زہر بھر گیا تھا۔ دل چاہتا تھا دنیا کی ہر چیز  
توڑ پھوڑ دوں۔ ہر طرف آگ لگا دوں۔ سب کچھ تباہ کر دوں اور  
جانے کس کس کو قتل کر دوں۔ شکر ہے میں نے اپنی اس کیفیت  
قابو پالیا ورنہ معلوم نہیں کیا میں جاتی۔“

”ہاں۔۔۔ کبھی کبھی انسان اس کیفیت سے آگاہ کرتا ہے تو آگے  
چل کر بھڑکھٹکنا ہے۔ دنیا کو ایسے لوگوں کی وجہ سے بڑی تباہی  
مٹھ دیکھنا پڑتا ہے۔ شکر ہے دنیا ایک خاتون بھڑکے انتقام کی چوڑ  
کاریوں سے بچ گئی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”بقیاتی مت از او میرا۔“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔  
”میں بہت خونخاک عورت ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسی لئے تمہیں  
نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں تمہارے اندر عقیدہ طاقتوں کو کسی  
مثبت اور تعمیری مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں  
چاہتا کہ تم صرف دفتری سیزننگ محدودہ کرنا شروع کرنا چاہو۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں کسی شخص پر معاش کی سکن سے نکلی ہوئی  
مگولیاں کھا کر اس دنیا سے کوچ کروں؟“ اس نے مجھے گھورا۔  
”انسان جڑالی سے لڑتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا  
تو کئی حرج نہیں۔ یہ ایک اچھی موت ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ لعنتی سانس لے کر بولی۔ ”نیک ہے۔ تمہارا ہاتھ تمام  
لیا ہے۔ اب جہاں جی چاہے لے جا کر مروا دینا۔ بس مزار ورا اچھا  
سا بنوا دینا۔“

”آہستی آسانی سے نہیں مرنے دیں گے تمہیں۔“ میں نے کہا۔  
”خاتم شیر کے بارے میں کوئی پلان ہے تمہارے ذہن میں؟“  
اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ دو چار دن بعد اس پر عمل کریں گے۔ اس وقت تک  
میں ذرا اس کی ”باریک“ جزئیات پر بھی غور کروں گا۔ مجھے ایک خبر  
کا بھی انتقار ہے۔ وہ سن لوں تو گویا اس مشن کا حصہ اول مکمل  
ہو جائے گا۔ پھر اسے بھی نفاذ پائیں گے۔ عالم شیر اب میری  
برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔“

”نیک ہے۔“ راجیلہ نے بردباری سے بولی۔ ”میرے ذمے تم جو

باف کرانے بیٹا شور مچا رہا ہو گا۔“ میں نے غریب سانس لے کر  
کہا۔ ”اس نے مجھ سے پکا تو لے لیا ہے اور مجھے مروانے پر بھی  
جار کھائے بیٹھا ہے لیکن میری اطلاع کے مطابق وہ اندر سے  
دروازہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ ہر وقت مسل  
انکھوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔ تمام محصولات بدل لے ہیں۔  
کچھ پتا نہیں ہوتا کس وقت کہاں لایا جائے گا۔ اس کے دو تین  
بھناؤ فیرو بھی ہیں اور کاروبار کے لئے ایک نام نوا سادہ فیر بھی بنا  
لگا ہے۔ شہر میں کئی کرشیل بننے لگیں ہیں اس کی۔ لیکن ان میں  
کسی جگہ بھی نہیں جاتا۔ زیادہ تر اپنے کاروازی کی فوج غفر سوج کے  
اتھ گھر میں ہی مقید رہتا ہے۔ اونچی اونچی دیواروں والی خاص بڑی  
قلعہ نما کوٹھی ہے اس کی۔“

”بڑے ٹھات ہیں اسمگلروں کے۔“ راجیلہ نے گردن کو  
نیچ سا جھٹکا۔

”ہاں۔ ٹھات باٹ کی اس دوڑنے ہی تو اس ملک میں  
زائق رہی ہر ایک کی ہے۔ جائز اور ناجائز کی تفریق ختم کر دی ہے۔  
رات کے پانچ بج گرنے کے لئے ہر کسی کو شارٹ کٹ کی تلاش  
ہے۔“ میں نے لعنتی سانس لے کر کہا۔ ”اور یہ عالم شیر تو ابھی کوئی  
نئی مچھلی بھی نہیں ہے۔ اگر تم بڑی مچھلیوں اور مگر مچھلیوں کے  
باہری اور خفیہ ٹھات باٹ کے بارے میں جان لو تو تمہاری  
انکھیں اس سے بھی زیادہ پھیل جائیں اور نہ جانے کتنے دن تک  
ٹپکی رہیں گی۔ ہمارے ہاں تو ابھی یہ تقریباً آغاز ہی ہے۔ آگے یہ  
حال نہ جانے کہاں تک جانے گا۔“

”خدا ہمیں اس وقت سے بچائے۔“ راجیلہ جھرجھی سی  
لے کر بولی۔

”عالم شیر فون پر بھی کسی سے بات نہیں کرتا۔ صرف ایک  
اس فون نمبر ہے جس پر فون کیا جائے تو کچھ لوگ فون کرنے  
اس کے بارے میں خوب پوچھ کچھ کرتے ہیں اور اس کا فون نمبر  
لے لیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر عالم شیر ضروری سمجھتا ہے تو اس  
بڑے سٹ بعد خود فون کرتا ہے۔ ان حالات میں اسے مروانا  
کام سے بھگتے کا باعث بنے گا۔ ایک طرح سے چڑھاؤ ہی کرنی  
پڑے گی۔ ہمارے آدمیوں کی جان کو بھی خطرہ ہو گا۔ اس کے بھی نہ  
بائے کتنے کاروازی بارے جائیں۔ نہایت غیر ضروری خونریزی ہوگی۔  
لی اس سے بچنے کی تدبیر کرنا چاہو رہا تھا۔ اگر تم ساتھ دو تو نہایت  
آہستگی سے اس کا پتا صاف ہو سکتا ہے۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں کسی کی بجائے اس کے گھر میں چلی جاؤں اور  
اسے شوٹ کر کے آجاؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے بھی ہانگی۔“ اب یہ آج آسمان کام بھی نہیں۔ میں نہیں  
انتہا کر تم لاش کی صورت میں اس مکان سے باہر آؤ۔ میں ان  
لوگ ہاتھوں کو شوٹک وغیرہ چپے ہے ہر وہ کاموں کی ذمہ دینی  
مالکی حق میں نہیں۔“

کہا۔ "عالم شیر کے معاملے میں اصل مسئلہ یہ ہو گا کہ ذرا سے کیونکر بہت عمدہ ہونی چاہئے یعنی ذرا سے پر ذرا سے کا شیر نہیں ہونا چاہئے اسے گمان تک نہیں گزرتا چاہیے کہ اس کے لئے جال پھیلایا جا رہا ہے یا اسے چاروا ڈالا جا رہا ہے۔"

"انڈازہ تو میرا کیا ہے کہ ذرا سے کے ذرا کثرت ہو کے تو ذرا ٹھیک ہی ہو گا۔" راجیلہ بولی۔ "تمہیں امید ہے کہ میں ڈول کے کردار میں نشت رہوں گی؟"

"تمہارا کردار زیادہ دیر تو صوتی ہی رہے گا۔ آخر میں بہت مختصری ملاقات ہوگی تمہاری عالم شیر سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ڈولی کس قوم کی لڑکی تھی؟ کس ملک کی رہنے والی تھی؟"

راجیلہ نے پوچھا۔

"یہ تو خود عالم شیر کو بھی معلوم نہیں۔ بس وہ امریکی لے بیٹا انگریزی بولتی تھی جو تمہارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

"معاف کرنا، بائیں ہاتھ سے انگریزی نہیں بولی جاسکتی۔"

میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"یہ میں نے محاورہ بولا ہے۔" میں نے اسے گھورا۔

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔" اس نے شکل پر مسکھٹی ملائی کہ۔ "نہایت معمولی سے میک اپ کی مدد کے لئے تو امریکی لڑکی کے طور پر بھی پاس ہو سکتی ہو۔ لیکن اس کی ضرورت نہیں کہ تمہارا اوجہ ہرگز پاکستانی نہیں ہونا چاہئے۔"

"عالم شیر کس قسم کا آدمی ہے؟ میرا مطلب ہے کلاہی شخصیت کیسی ہے؟" چاک راجیلہ نے تجسس سے پوچھا۔

"بہت چمڑم ہے۔ بالکل رابرٹ ریڈ فورڈ معلوم ہوتا ہے دیکھتے ہی عاشق ہو جاؤ گی اور اس کے مارے جانے کا نہیں شیفا زندگی بھر غم رہے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو راسا پوچھ لینے سے اتنے ٹیکس کیوں ہو رہے ہو؟ ٹیک ٹھیک بتا دو۔" اس نے دانت بچھ کر مجھے گھورا۔

"ٹھیک ٹھیک کیا بتاؤں۔" میں نے ابھین زدہ لے بیٹے کی کہا۔ "ایک آدھ دن میں میں تمہیں اس کی تصویر بھی مٹا کر دوں گا۔ تین چار سال پرانی ہوگی لیکن کچھ زیادہ تبدیلیاں نہیں آئیں گی۔"

اس میں۔ لمبا چڑا بھاری تن و قوت کا آدمی ہے۔ خاص طور پر ہے۔ رنگت سرخ و سپید ہے۔ بڑی سی گھٹنی داڑھی ہے۔ اس کے ہاتھ بڑے ہیں۔ آئینے میں سوئی اور خوبصورت ہیں۔

شرابیوں کی طرح بھاری ہیں حالانکہ شراب نہیں پیتا البتہ زمانے میں کوڑوں میں گلیں شراب اسٹل کر چکا ہے۔ چھلک چھلک برائیاں اور چھوٹے موٹے گناہوں کا قائل نہیں۔ جو کچھ کر کر کے بے پرواہی سے کرتا ہے۔ شراب نہیں پیتا لیکن خون نہ پیتا۔

کتنے انسانوں کا پی چکا ہے۔

"یہ بھر محاورہ بولا ہے تا تم نے؟" راجیلہ نے سادگی سے پوچھا۔ "تمہاری مراد یہ ہے کہ بہت سے انسانوں کا خون پیا ہے۔"

کام لگاؤ کے وہ میں کردوں گی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایڈوکیٹ رہے گا۔ میں ایک ڈل زندگی گزارنے کے گزارنے پور ہو چکی ہوں۔"

مجھے خوشی تھی کہ اس نے ذہنی طور پر میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب باقی سب کچھ سمجھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اصل مشکل مرحلہ مجھ پر بھروسہ کرنے اور ذہنی طور پر میری سامگی بننے کا ہی تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا "تمہارے ذہن میں غامکہ کیا ہے؟"

"عالم شیر کی کئی خفیہ کمائیاں میرے علم میں ہیں۔ میرا ان میں سے ایک سے فائدہ اٹھانے کا پروگرام ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی دعوئیاں ہیں اور وقتاً فوقتاً دستاویزی بھی زندگی میں آتی جاتی رہی ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک لڑکی پر دل و جان سے عاشق ہے۔"

میں نے اسے یہ ہے کہ اس نے آج تک اس لڑکی کی صورت نہیں دیکھی۔ صرف فون پر اس کی آواز سنتا رہا ہے۔ اس کا نام ڈولی تھا۔ اس کا تعلق مشیات کے اسمگلرز کے ایک بین الاقوامی گروہ سے تھا۔"

راجیلہ توجہ سے سن رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "کچھ عرصے سے وہ لڑکی اسمگلنگ کے ریکٹ سے بالکل غائب ہو گئی۔ حافی عالم شیر کو معلوم نہیں کہ وہ اس وقت ترکی کی ایک جیل میں ہے۔ انٹر نیشنل ٹیک نے یہ خبر عالم شیر تک پہنچے ہی نہیں دی کیونکہ اس میں ان کا کچھ نقصان تھا۔ وہ لڑکی ترکی کی جیل میں ہے یا مددگار پڑی ہوئی ہے اور غالباً وہیں مر جائے گی۔ بہت لمبی سزا ہوئی ہے اسے۔ کبھی اس کی حیثیت ایک ملک کی ہی تھی۔ اب وہ ایک پکا ہوا امرہ ہے۔"

"تم مجھے ڈولی کی حیثیت سے سامنے لانا چاہتے ہو؟" راجیلہ میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ سامنے تو تمہیں بالکل آخری لمحوں میں آنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ہی پھیل قسم ہو جائے گا۔" میں نے کہا "تمہارے نام کے ساتھ عالم شیر کے لئے کوئی بڑا لالچ بھی دبا ہے کرنا پڑے گا تاکہ اگر صرف تمہارے نام کی کشش کا کافی ثابت ہو تو وہ "بڑا سالانچ" اسے بھیج لائے۔ اصل مسئلہ اسے اس کے قلعے سے نکالنا ہے۔ اسے عائنوں کے حصار سے باہر لانا ہے۔ دو تین گاڑیوں کے ساتھ ہوں تو کوئی بات نہیں۔ بڑے شکار کے ساتھ بعض اوقات ایک آدھ چھوٹا موٹا نور بھی مارا جاتا ہے۔"

وہ کسی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "بہت سفاک ہو گئے ہو۔"

"سفاکوں کے ساتھ میں سفاک ہوں۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اگر میں ایسا نہ ہوتا تو یہ شارک پھلیاں مجھے کھا چکی ہوتیں۔ اس دنیا کے سمندر میں میری لگاؤ کا بڑیاں تمہیں کیوں ادھر ادھر تھرتی ہوئی تھیں۔" پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے

”ہاں میرا مطلب یہی ہے۔ صبح کا شکر ہے۔“ میں نے  
 کہا ”مگر عالم شیر ڈھلی ڈھالی شلوار قمیص کے بجائے خاکی چٹن  
 ٹوٹ اور فوجی جیکٹ پہننا شروع کرے تو دوسرا فیڈرل کاسٹرو  
 ظلم ہو گا۔“

”ٹھیک ہے میرے ذہن میں اس کی تصویر بن گئی ہے۔“  
 راجیلہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔  
 ”کیس یہ تصویر پیش کے لئے نقش نہ ہو جائے۔“ میں نے آہ  
 بھر کہا۔

”اتنا کمینا ذوق نہیں ہے میرا۔“ وہ منہ ہٹا کر بولی۔ ”تمہیں  
 جی بیوری میں پسند کر لیا تھا۔ مارکیٹ میں تم سے بہتر پروڈکٹ  
 دستیاب نہیں ہو گی۔“  
 کچھ دیر ہم ایک دوسرے پر جھلے کتے رہے۔ اس دوران راشد  
 جی ٹیوا۔ باتوں کا مرکز ذرا بدل گیا۔ اسے بھی کیا بے تابی تھی کہ  
 اسے جلد از جلد کسی کام پر لگایا جائے۔

”کام میرے ہاں اتنے زیادہ ہیں کہ انتخاب مشکل ہو گیا ہے کہ  
 نہیں کس کام پر لگایا جائے۔“ میں نے کہا ”بہت سے کاموں کے  
 لئے صرف تم موزوں نظر آتے ہو۔ فی الحال تم صرف اتنا کرو کہ  
 کپال ہینک کے قریب ہماری ایک باؤسنگ انکیم چل رہی ہے  
 اس کا چارج سنبھال لو۔ سب کچھ تمہیں اپنی گھرائی میں کرانا ہو گا۔  
 زیادہ جیکٹ مکمل ہونے کے بعد میں تمہارے لئے کسی اور کام کے  
 بارے میں سوچوں گا جو میرے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری ہو گا۔“  
 ”بلکہ ہے؟“

”جیسے آپ کی مرضی اتنی بھائی!“ اس نے کندھے اچکائے  
 ”میں تو صرف کام سے مطلب ہے۔ کام با عزت ہونا چاہئے اور  
 اسے ٹھیک ٹھاک ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ ہمیں بھلا کیا  
 ہے۔“

راجیلہ نے اسے ڈانٹا۔ ”زیادہ فری ہونے کی کو شش نہ کر۔ یہ  
 اعلیٰ ذوق وغیرہ جیسے انتخاب بھول جاؤ۔“ ”سر“ کہا کرو۔“

”وہ تو میں کتنا ہی ہوں۔“ راشد سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ  
 تو اس مسئلے میں آپ کو فیصلہ نہیں کیا کرتا ہوں لیکن اس وقت ذرا  
 پیش پیش ہوئے ہیں۔۔۔ بڑا اچانیت بھرا ماحول ہے۔۔۔ بیٹ بھر کر  
 بالکل اگلے گھر درپے کسی ان باتوں کی وجہ سے زبان ذرا پھسل  
 لگ گئی۔“ پھر وہ سری طرف دیکھ کر مستثنیٰ سے بولا۔ ”سوری سرا“

”یہ سوسائٹی جو تمہیں نصیحت فرما رہی ہیں، خود چند لمحے پہلے  
 تو فری ہو رہی تھیں کہ میری کھوپڑی توڑنے کی بات کر رہی  
 تھیں۔“ میں نے ارشد کو بتایا۔ ”وہ تو شکر ہے اپنی کچھ دہشت بیٹھی  
 اسے دندنے سے قانون مابودت کو بھی ضرور جوڑو کرانے کے ہاتھ  
 لڑائی کی کو شش کرتیں۔“

”اس قسم کی کو شش تو باقی کو اسی دن کرنی چاہئے جس دن ان  
 کا خود کشی کا ارادہ ہو۔“ راشد نے کئی انجیوں سے راجیلہ کی  
 طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”باس کو کھن لگانے کے لئے تم بھی اسی طرف ہو گئے نہ دار  
 کسی کے!“ راجیلہ نے اسے گھونسا دکھایا۔ ”یعنی جس پر گاؤں کی  
 قادی ہی سوکھا پتا ہوا دینے لگا۔“

”آف۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر قمام لیا۔ ”مصرعے  
 کا اتنا بڑا حشر۔! حالانکہ تمہارا تو شاعری کا اچھا بھلا ذوق ہے۔ وزن  
 بحر وغیرہ کا بھی علم ہے تمہیں۔“

”تم سے کس نے کہا کہ میں نے مصرع پڑھا ہے؟“ اس نے  
 معنوی شکل سے مجھے گھورا۔ ”میں نے تو تشریں بات کی ہے۔“  
 مزید کچھ دیر اسی طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا اور کھل کر  
 چند قہقہے لگانے کے بعد میں نے انہیں شب بخیر کہا اور اٹھ کھڑا  
 ہوا۔ ان کے ہاں کچھ وقت گزارنے اور ہنس بول لینے سے ذہن ہلکا  
 ہو گیا تھا۔ اس رات ذرا بہتر نیند آئی۔

دوسرے روز میں آئیں جس میں تھا کہ خیم کا فون آیا۔ اس کے  
 لیے میں کچھ معنوی سی مٹھاس تھی۔ اس کی وجہ چند لمحے بعد میری  
 سمجھ آئی۔ وہ اپنے فک کی تصدیق کے لئے اور طر کا ایک بہت ہی  
 زہریلا حیر چلانے کے لئے تمہید باندھ رہی تھی۔

اوجھڑاؤ صحر کی چند باتوں کے بعد اس نے اچانک ہی پوچھا۔ ”اور  
 سنا۔۔۔ داشتہ کے ہاں رات کیسی گزری؟“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے تو یہ علت نہیں پائی تھی۔ داشتہ  
 کے تصور نے مجھے کبھی اپنی اپنی جگہ ان میں نے کبھی اس کی  
 ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ظاہرہ خانم اور ستارہ خواہ کسی  
 بھی عورتیں نہیں لیکن اپنی اپنی جگہ ان میں ”کا آف کلاس“  
 ضرور تھا۔ ستارہ کا ایک گراؤ خواہ اچھا نہیں تھا لیکن اب اس کی  
 شخصیت میں اس کے بیک گراؤ کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ وہ بھی  
 ایک نہیں عورت معلوم ہونے لگی تھی اور سوسائٹی میں بہر حال  
 اس کا برا نام تھا۔

ظاہرہ خانم تو خیر ذہنی نکمی، نہیں اور غاندانی عورت تھی۔ یہ  
 دونوں میرے لئے جس طرح دیدہ و دل فرس راہ کے رکھتی تھیں  
 اس میں ایک جگہ بھی روانیت کی آمیزش تھی۔ اس کا کوئی  
 کاروباری پہلو نہیں تھا۔ خلوت کی زندگی میں کاروبار کی آمیزش  
 مجھے بڑی شرمناک سی لگتی تھی۔ اگر کوئی عورت مجھے اچھی لگتی تھی  
 تو میں اس سے دوستی کے بارے میں ضرور سوچتا تھا لیکن میں نے  
 کبھی اسے داشتہ بنانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ خواہ وہ ایک  
 طوائف ہی کیوں نہ رہی ہو۔

تو پھر یہ خیم کیا کہہ رہی تھی؟ میری داشتہ کہاں سے آن چکی  
 تھی؟

میں ایک لمحے خاموش رہا تو خیم نیم ظہیر سے لیے میں بولی۔

”اب مایا تم نہایت معصومیت سے پوچھو گے۔ کون سی داشتہ؟ میری تو کوئی داشتہ نہیں۔“ ہے نا؟ کسی کہنے والے ہوتا تم؟“

”خوش قسمتی سے تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے۔“ میں نے سر ہلچے میں کہا۔ ”میں واقعی جاننا چاہوں گا کہ تم کسی بد نصیب کو میری داشتہ قرار دینے پر تکی ہوئی ہو؟ میری زندگی میں اس قبیل کی کسی چیز کا گزر نہیں ہے۔“

تھی۔۔۔ بالکل تھے۔۔۔ کہ تو کو کبھی نہیں اور کبھی کا نام بھی بتاؤں؟“

تب میری سمجھ میں آیا وہ راحیلہ کی بات کر رہی تھی۔ میری کنپٹیاں ٹھگ اٹھیں۔ میں نے یہ مشکل اپنے لیے کی سرد مری پر قرار رکھتے ہوئے کہا "عظیم بیگم! وہ کوئی اور ہی چیز ہو تا ہے جو کسی عورت کو گیت پر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنے پر مجبور کیا کرتا ہے۔ داستانیں گیت پر کھڑے ہو کر انتظار نہیں کیا کرتیں۔"

"اسی بات سنی ہو تو اس قسم کے جذباتی ڈرامے بھی کئے جاسکتے ہیں۔" وہ بولی۔

ایک تانتے کے لئے میرے دانت بھیج گئے۔ پھر ایک گرمی سانس لے کر میں نے اپنے فٹے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم سے تعلق ہی کچھ اور چلا آ رہا ہے۔ کسی اور نے اگر اس لڑکی کے لئے راشی کا لفظ استعمال کیا ہوتا تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لیتا۔"

”اوم!“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہلکی سی سٹی بجائی۔ ”بہت محنت کرتے ہو اس سے؟“

”محبت تو میرے دل میں تمہارے لئے بھی باقی ہے شمیم! لیکن تم اسے برباد کر دینے پر کبھی مائل ہو۔ تم ایسی تو نہیں تھیں۔“ اسی بول کیوں گئی ہو؟ میرے ذہن میں تو تمہارا بہت مختلف قسم کا ایجنڈا تھا۔ میں تو میری توں تم سے دو بارہ بٹنے کی آرزو میں تڑپا ہوں۔ لیکن اب میں سرچا ہوں کاش تم سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔“

”ہو سکتا ہے تبدیلی مجھ میں نہیں، تم میں آئی ہو۔ اور اس...  
 تمہیں کس کس سے محبت کا دعویٰ ہے؟ میری محبت کی بات بھی کر  
 رہے ہو، اس لڑکی کی محبت بھی تمہارے لیے بھی بول رہی ہے جس  
 کے گھر میں نے گزشتہ رات تمہیں جاتے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے  
 ایسی کئی اور بھی ہوں گی۔ عشق تمہارے لئے کئی طرح ہو گا۔  
 سہلا ہوا تو دل لیا۔“

”عظیم! تم اپنی ذہن لڑکیوں کو گھسی ہو؟ تمہارے ہر لفظ سے ذہن ٹک رہا ہے۔“ میں نے آنسو سے کہا۔  
”ہو سکتا ہے مجھے محبت نے ایسا بنا دیا ہو۔“ اس کا لہجہ کچھ دھمپا ہو گیا۔

”محبت میں تو بڑی مناس ‘بڑا دقار ہوتا ہے۔“  
”ہو سکتا ہے تمہاری بے توجہی نے مناس کو زہر اور دقار کر دیا۔“

گھنیا پن بتا دیا ہو۔“ اس کے لیے میں چٹکا سا کرب جھٹک آیا۔  
 ”آخر تم میری طرف لوٹ کیوں نہیں آتے؟ بے شک مجھ سے  
 شادی مت کرنا لیکن مجھے یہ احساس تو ملا کہ وہ جس واقعتی غم  
 سے محبت ہے۔ مجھ سے ملنے تو آیا کرو۔ تم نے اگر راجہ کو مسئلہ حل  
 ہے، پھر نہ کی دوستی تمہاری راہ میں حائل ہوتی ہے تو میں اس سے  
 طلاق نہ لیتی ہوں۔ اس کے بعد کیا مسئلہ رہ جاتا ہے؟“

”جس میں قسمیں بتا چکا ہوں کہ میں تمہارے اس اقدام کو ہرگز پسند نہیں کروں گا اور میں اس موضوع پر مزید گفتگو بھی نہیں کیا چاہتا۔“ میں نے فون بند کر دیا اور کیتھرین کو پداہت کی کہ وہ بلا اس عورت کا فون آئے تو مجھ سے نہ ملائے۔

میری کپڑوں میں سنسانٹ سی ہو رہی تھی۔ اس عورت کے جذبات کی شدت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ کسی کی طلب میں کوئی عورت اتنی صاف گوشتی جاسے اور ایسی دونوں کو بھی ہو سکتی ہے۔ عورت خواہ کتنی بھی خیر، کتنی بھی ایڈوانس، کتنی بھی آزاد خیال اور خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھے، وہ اپنی دل کی بات دل میں ہی رکھتی تھی۔ وہ کسی نہ کسی حد تک اپنے دل کی بات دل میں ہی رکھتی تھی۔ وہ اپنے دل کے درد اور خواہ چوہٹ کو دل ہی رکھتی تھی لیکن توقع یہی رکھتی تھی کہ مرد سبک دے۔

کلیں شہم میرے پاس سے رخصت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد شاہ  
راجپوت کی طرف روانہ ہوا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ شہم گھر واپس  
جانے کے بجائے گاڑی میں آس پاس ہی کہیں موجود رہی تھی اور  
اس نے شاہجہاں کے گھر تک میرا تعاقب کیا تھا۔ دوسرے دن یہ عالم تھا  
کہ ایک تو شہم نے غیر متوقع طور پر آکر میرے دروازے کو کھینچنا  
تھا۔ دوسرے آج کل میرا شاید کچھ خوش قسمتی کا دور چل رہا تھا کہ  
کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا اس لئے بھی بھلا اس طرف سے  
میری توجہ ذرا ہٹ جاتی تھی۔ رات بھی میں نے کوئی خاص دھیان  
نہیں رکھا تھا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے یا نہیں؟ ورنہ شہم اس  
معاملے میں اتنی ماہر تو نہیں ہو سکتی تھی کہ میری نظر میں نہ آتی۔  
بہر حال اس کی یہ حرکت میرے لئے حیران کن تھی۔ میں نے اپنے  
آپ کو سرزنش بھی کی۔ تعاقب کے معاملے میں مجھے مستقل طور  
پر کتنا رہنے کی ضرورت تھی۔ ایک طرح سے صرف بھی میل  
اصطلاحی مذہب تھی۔ مگر یہ باہر اپنی خفایت کے دیگر اظہار تو  
میرے غم کو لے تھے۔

اسی روز مجھے ایک تجربہ اور ہوا۔ انسان بعض اوقات جس سے جتنا چاہتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کے سامنے آتا ہے۔ رات کو میں ایک نایاب اشارہ ہوئی میں ایک خاص قریب میں تھا۔ اس میں شہر کے مختلف سماجی طبقوں سے بہت سی تھوڑے اور خاص خاص لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

میں سے کپ شپ کے انداز میں نیم کا دوبارہ سی منگھو کر رہا تھا کہ

اپنی جگہ پر دو تار تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کی طرف ہموار  
طرح دیکھ رہی تھیں جیسے دونوں ایک دوسرے کی نظریں زمین  
ریتیں ہو کوئی حقیر سا کیرا ہوں۔

میں نے پہلے ان دونوں کو اور پھر اپنے آپ کو کوسا۔ مجھے اور  
پارٹی میں آنے کا کوئی خاص اشتیاق نہیں تھا۔ خواہ مخواہ میزبان کا  
محروم میں چلا آیا تھا۔ ستارہ کو میاں دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی  
تھی۔ وہ ابھی اس درجے کے دولت مندوں میں تو شمار نہیں ہوتا تھا  
جس درجے کے دولت مند اس پارٹی میں جمع تھے لیکن شوہر کی  
وجہ سے ہر حال اس کا نام بڑا تھا۔ قلموں پر ناک بھول چلا  
والے اچھے بھلے بڑے بڑے لوگ بھی اس طرح کی ٹھنسیوں کا  
بلانے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

لیکن میں نے اس پہلو پر بالکل نہیں سوچا تھا کہ وہاں میری  
قریبی۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی قریبی شناسا خواتین بجا ہوجا سکیں اور  
مجھ میں میری موجودگی سے ایک اچھا بھلا سینڈویچ تیار ہو جائے گا  
میرے خیال میں وہ دونوں جہادیدہ اور پختہ کار عورتیں تھیں۔ اور  
میں ایسی بے وقوفانہ جذباتیت اور در رقابت کے جذبات نہیں ہوں۔  
چاہئیں تھے لیکن اب مجھے اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑ رہا تھا۔ عورت  
خواہ کہیں بھی ہو، کیسی بھی ہو، جو اپنے خاندان کو "مٹھ" مٹھل ہو پختہ کا  
ہو، تو خیر ہو، غریب کہ کچھ بھی ہو لیکن جذباتیت اور در رقابت سے بالکل  
عاری نہیں ہو سکتی۔

اچانک ستارہ بڑے مان اور اپنائیت سے میرا بازو پکڑ  
ہوئے بولی۔ "اٹنی! اڈرا ایک منٹ اور آؤ۔۔۔ مجھے تم سے ایک  
ضروری بات کرنی ہے۔"

میں نے طاہرہ خانم کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر مجھ پر جمی ہو  
تھی۔ بظاہر اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا لیکن مجھے معلوم تھا  
اس وقت کیا سوچ رہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی نظر  
میرے بیروں کی زنجیر ثابت ہوتی ہیں یا نہیں؟ میں ایک خاموش  
آزمائش کے در راہ ہے۔ کڑا تھا۔ اس لمحے میں نے اپنے آپ  
سخت بے وقوف محسوس کیا۔

"طاہرہ زہرا! میں نے اپنائیت سے اس کا کندھا جھپٹا لیا  
وہ اپنی نیکی محسوس نہ کرے۔" میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔  
اس سے پہلے کہ ستارہ کوئی کلامانہ سا جملہ بولتی میں خود  
اسے تقریباً دھکیلا ہوا آگے لے گیا جہاں اس نے ایک لمبے  
اشاہہ کیا تھا۔ ہم ستون کی اوٹ میں پہنچ کر رک گئے۔ چو کو ستارہ  
چاروں طرف آنکھوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ستارہ قہر آدم آئیے کیا  
اور میرا بازو لینے لگی جیسے دیکھ رہی ہو کہ ہم دونوں کی جوڑی  
لگ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ نہایت اطمینان سے بولی۔ "تم خواہ  
بے چاری سے ایک منٹ میں واپس آنے کا وعدہ کر آؤ گے؟  
تمہیں ایک منٹ میں چھوڑنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔"  
"تمہیں مجھ سے کیا بات کرنی تھی ستارہ؟" میں نے نہایت

ظاہرہ خانم مجھ سے آن کرائی۔ بڑنس میں سے میری بات ختم  
ہوئے ہی وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

بات کوئی خاص نہیں تھی، بس وہ ذرا میری "خبر لینا" چاہتی  
تھی کہ میں نے اتنے دن سے اس سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا۔ پھر  
وہ مجھے کچھ اپنا احوال سنا چاہتی تھی کہ اس کے یہ دن کس طرح  
گزرے اور اس دوران کیا کیا خاص باتیں ہوئیں۔

ظاہرہ خانم بہت اونچے سطحوں میں میل جول والی عورت  
تھی۔ اس لئے مجھے وہاں اس کی موجودگی پر حیرت نہیں تھی۔ میں  
اپنی صفائی وغیرہ پیش کر کے ذرا محبت سے اس کی دلجوئی میں مصروف  
تھا کہ جھلسل کرے لیبارے میں کوئی عورت ہمارے قریب آن کھڑی  
ہوئی۔ میں نے گردن ذرا گھما کر دیکھا اور میری زبان کچھ لاکھڑی  
گئی۔ وہ ستارہ تھی!

ذرا تک ہاتھ میں لئے وہ شیم استہرائیہ سی نظروں سے میری  
طرف دیکھ رہی تھی۔ طاہرہ خانم کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا  
جیسے وہ ایک خوبصورت اور خوش لبازہ عورت نہیں بلکہ سبزی کی  
مکان پر رکھی ہوئی پانی لوی توڑی یا بھنڈی ہو۔

"میں کیا سوچ رہی تھی کہ تم ابھی تک مجھے نظر کیوں نہیں  
آئے۔" ستارہ کی آواز ویسے بھی دلکش اور کلک دار تھی۔ اس  
وقت اس میں خمداری نہایت بھی سی آمیزش تھی جس نے اسے اور  
بھی دلکش بنا دیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے معلوم تھا تم اس پارٹی  
میں ضرور موجود ہو گے۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسی طرح کسی  
کوئے کھدرے میں چھپے کھڑے ہو گے۔"

ظاہرہ خانم ایک تلک اسے دیکھے جاری تھی۔ مجھے وہ پچویشن  
کچھ عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے طاہرہ خانم  
سے ستارہ کو حشارف کرانے کی کوشش کی۔ "ستارہ! ان سے ملو۔  
یہ طاہرہ خانم ہیں۔ شہر کی ممتاز صنعت کار ہیں۔"

"اوہ۔۔۔" ستارہ نے یوں طاہرہ خانم کو دیکھا جیسے اب اس کی  
موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ "صنعت کار ہیں یہ۔۔۔ میں تو کبھی بھی  
خود ایک صنعت ہیں۔"

ظاہرہ خانم نے اس موقع پر بڑے قہر اور زبرداری کا مظاہرہ  
کیا۔ ایک شائستہ اور باعزت عورت کی طرح وہ سنجیدگی سے ستارہ  
کی طرف دیکھتی رہی اور اس ریمارک کو بولی گئی۔ میں نے جلدی سے  
کہا۔ "طاہرہ! انہیں تو تم نے پہچان ہی لیا ہو گا۔ ملک کی مشہور  
قلم استاد ہیں۔ قلمی ستارہ ہیں۔ نام بھی ستارہ ہے۔"

"ہاں۔" طاہرہ خانم شہرے شہرے لیے بولی۔ "شکل تو کچھ  
جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ انداز گفتگو سے تصدیق ہو گئی کہ ان کا  
تعلق قلم اڈسٹری سے ہے۔"

ستارہ نے جو بھل پلکیں اٹھاتے ہوئے زیادہ غور سے طاہرہ  
خانم کی طرف دیکھا۔ دونوں سرودھ تھیں۔ دونوں کی شخصیت اپنی



لے پڑھا۔  
 "ہات تو کوئی خاص نہیں تھی۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔  
 "نہ دن سے نہ تم سے ملاقات ہوئی نہ فون پر بات ہوئی۔ میں  
 بیان تھی کہ آخر ایسی بھی کیا مصروفیت۔ تم تو مصروفیت کو ذہن پر  
 دار کرنے والے آدمی نہیں ہو۔"  
 اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر ایک مصنوعی اداسے بے  
 ازبی سے بولی۔ "عالمیہ طاہرہ خانم ہی تمہاری تازہ مصروفیت  
 ہے؟"

"جس طرح سے اب ہمارا تعلق ہے۔۔۔ جن لوگوں میں  
 بارہ اختلافتا بیٹنا ہے۔۔۔ وہاں اس قسم کی رقیبانہ گفتگو کا رواج بھی  
 ہے۔ اور اس سے پہلے میں نے تمہیں اس لیے میں بات کرتے سا  
 ہی نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" میں نے گھبرے گھبرے لمحے میں  
 کہا۔

"اس سے پہلے میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے تمہیں اتنی  
 غریب عورت کے شانہ بہ شانہ کھڑے نہیں دیکھا تھا۔" وہ  
 مسکرائی۔ "اس عورت کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ اس کے تعلق میں  
 جانے والا وہاں نہیں آسکتا۔"

"تمہیں ان باتوں کی پروا کب سے ہونے لگی؟ ہمارے  
 درمیان کوئی حد درمیان تو نہیں ہے؟" میں نے ملاحت سے کہا۔  
 "مادرہ کے طرز عمل میں یہی بار تبدیلی آئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا  
 کہ سخت رویت اختیار کر کے اس کی دل شکنی کروں۔ وہ ایک ایسا  
 پش دوست تھی۔ اس نے میری وجہ سے بہت سی تلخیوں بھی  
 اٹھائی تھیں۔"

"ہاں۔۔۔ میں تو صرف فاضل اور پوجل لمحوں کا سہارا ہوں۔  
 میں اس حقیقت کو بھول گئی تھی" اس نے گہری سانس لی۔ اسی لمحے  
 اس کے اثرات ایک نکتہ بدل گئے۔ اس کی بلاشت ٹوٹ آئی۔  
 غصہ کی ادا کارہ تھی اور چہرے کے اثرات زندگی پر بحال پڑنے  
 ہیں۔ حقیقی زندگی میں بھی جب وہ کوئی بات واضح کرنا چاہتی تھی تو  
 اپنے اثرات کی مدد سے دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر طور پر واضح  
 کر جاتی تھی۔

جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ میرے  
 کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسی پرانے دوستانہ اور بے غرض لہجے  
 میں بولی۔ "اے میرے دوست! مجھے معاف کرنا۔۔۔ مجھ پر یہ ایک  
 گہری آئی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ میں تمہارے  
 معاملے میں ایسی بیٹا نہیں جانتی۔ حقیقی زندگی میں ایسی نظر آتا نہیں  
 جانتی۔ کم از کم تمہارے معاملے میں" میں نے اپنے آپ کو حدود  
 رقابت جیسے عاملانہ جذلوں سے بالاتر ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اور  
 اب تک اس میں کامیاب بھی چلی آ رہی تھی لیکن آج یہ اچانک  
 ہی مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔"  
 اس نے اپنے ہاتھ میں موجود گلاس اٹھایا۔ "شاید یہ اس

کینت کا اثر تھا۔ میرا خیال ہے میں نے طاہرہ خانم پر کوئی اچھا  
 امپریشن نہیں چھوڑا۔ میں اتنی بڑی اداکارہ ہوں۔ مجھے لوگوں میں  
 ۔۔۔ اور خصوصاً معززین کے حلقے میں اپنا ایک بہتر ایجنٹ چھوڑنا  
 چاہئے۔ بالخصوص تم اس کے پاس واپس چلے جاؤ۔ میں خود تو اس سے  
 معذرت نہیں کر سکتی۔ لیکن تم کسی طرح اس کے سامنے میرے  
 رویے کی مثالیں کوٹنا۔ شب بخیر۔" اس نے ہولے سے میرا کندھا  
 تھپتھپایا اور نہایت پردہ دار انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی مسمانوں کی  
 ٹولوں کے درمیان ایک طرف کوچل دی۔

اگر وہ جذباتی ہو کر بھی یہ بات کر رہی تھی تب بھی کوئی صریح نہیں  
 تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں ایک لمحے وہیں  
 ساکت کھڑا رہا۔ پھر میں نے طاہرہ خانم کے پاس واپس چلے جانا ہی  
 بہتر سمجھا۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا جہاں طاہرہ خانم کو کھڑی چھوڑ  
 گیا تھا تو وہ وہاں نہیں تھی۔

میں نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ کہیں نظر  
 نہ آئی۔ ہر رنگ کے پیرہن، ہر طرح کے چہرے، ہر طرح کی  
 خوشبوئیں کچھ اس طرح چادروں طرف بکھری ہوئی تھیں کہ کسی  
 ایک مخصوص چہرے کو جلد تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔

میں کہیں معذرت نہ کر سکتی، کہیں خوش غلطی سے دانت نکال، کہیں  
 کسی نرم و گداز اور کہیں کسی گرفت پائے بھٹم ڈھیلے ڈھالے ہاتھ  
 کو مصالحتی کے لئے تھمتا ہوا مسمانوں کے درمیان پکڑا چند  
 منٹ ادھر ادھر پھرا رہا لیکن طاہرہ خانم کہیں نظر نہ آئی۔ میرے  
 دل میں ہلکی سی غصے، جگے سے بچتا رہنے کی لڑائی تھی۔

پھر یکدم میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے وہاں سے کھسک ہی لینا  
 چاہئے۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا۔ جیکوٹ ہال کا دو روزہ وہاں  
 سے خاصی دور تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلا، مسمانوں کی  
 ٹولوں سے گھبراؤ ادھر چل دیا۔ ابھی میں نے آدھا فاصلہ بھی طے  
 نہیں کیا تھا کہ ایک سرسبز باغوں نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ طاہرہ  
 خانم کا باغ نہیں تھا۔ کم از کم اتنا مجھے فوری طور پر اندازہ ہو گیا۔  
 دوسرے ہی لمحے ایک ستون کے عقب سے وہ بری چہرہ نکل  
 آئی۔ وہ شیم تھی اور کل سے بھی زیادہ خوبصورت، زیادہ خوش  
 لباس نظر آ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" میں اندر ہی اندر کراہ اٹھا۔ "کیا تمہیں  
 بھی اسی وقت یہاں موجود ہونا تھا؟" مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں  
 آ رہا تھا۔ صبح کی گفتگو کی تناظر ناگوار کی کے باوجود وہ بڑے سن  
 موہنے انداز میں مسکرا رہی تھی لیکن میں اس کی مسکراہٹ کا  
 جواب مسکراہٹ سے نہ دے سکا۔ ایک تک اس کی طرف دیکھنا  
 گیا۔ اس کے ہاتھ میں غالباً کوئلہ ڈرک کا گلاس تھا۔

"طاہرہ خانم اور ستانہ۔۔۔ دونوں سے گھبرا کر بھاگ رہے  
 ہو؟" وہ بچی آواز میں بولی۔ "انہما دو کشتیوں کے سوار کا بھی اچھا  
 نہیں ہوتا۔ تم تو ایک وقت نہ جانے کتنی کشتیوں کے سوار معلوم

ہوتے ہو۔ پلے پوائے پئے ہوئے ہو۔

”میری بات چھوڑو۔“ میں نے جمل کر کہا۔ ”میں تو تمہیں چکھتا ہوا ہوں۔“

وہ میری بات کاٹنے ہوئے ہوئی۔ ”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ پلے پوائے کو سلیس اردو میں کبھی کبھی چکر بھی کھنا پڑتا ہے۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔

”شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگوں کی پارٹی میں ہمیں کس نے بلا لیا؟“ وہ بدستور مسکرائے جاری تھی اور اس میں خلک نہیں تھا کہ کینٹ کی مسکراہٹ خوبصورت تھی۔

ایک کمری سانس لے کر وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم زیادہ دولت مند اور زیادہ اہم لوگ نہیں ہیں لیکن میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہمارا ریس کے گھوڑوں کا ایک چھوٹا سا اصطبل ہے۔ اور ریس بڑے بڑے لوگوں کا شوق ہے۔ اس طرح کچھ بڑے لوگوں سے ہماری بھی سلام دیا ہے۔ ہمیں بھی محبت سے بلا لیتے ہیں اپنی تقریبات میں وہ لوگ۔“

”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ تم تو چھوٹے اور بڑے کی بحث میں پڑ گئیں۔“ میں نے جھجکا کر کہا۔

”تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟“ وہ ملاشت سے بولی۔

”چھوڑو اسے۔“ میں نے ہزاری سے کہا ”یہ بتاؤ راجو بھی کیا ہے تمہارے ساتھ؟“

”جتنی تمہیں راجو کی پروا ہے۔۔۔ جتنا تم اسے پوچھتے ہو۔۔۔ جتنی محبت سے اسے یاد کرتے ہو اتنی اگر میری پروا کرتے“ مجھے پوچھتے اور اتنی محبت سے مجھے یاد کرتے تو میں تمہارے قدموں کی دھول بن جاتی۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے بولی۔

”تم ظاہرہ خانم اور ستارہ کو جانتی ہو؟“ میں نے قدرے ملاشت سے پوچھا۔

”ستارہ کو تو خیر بے شمار لوگ جانتے ہیں۔ توہڑی بہت قابل ذکر بات یہ ہے کہ میں ظاہرہ خانم کو بھی جانتی ہوں۔ بڑی خوش نصیب عورت ہے۔“

میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کی نظر میں ظاہرہ خانم کی خوش نصیبی کی وجہ کیا تھی لیکن وہ خودی وضاحت کرتے ہوئے ہوئی۔ ”ہر معاملے میں خوش نصیب عورت ہے۔ اس کی پہلی خوش نصیبی تو میری نظر میں یہی ہے کہ وہ تمہاری دوست ہے۔ دوسری یہ کہ دولت گوا اس کی خرابیوں کو چھپاتی ہوئی اس کی طرف لگتی ہے یہ عورت جوئے تک میں بھی کبھی نہیں ہارتی۔ ہمارا ایک گھوڑا ہے۔ ریس کورس میں دوڑتا ہے۔ کلر KILLER اس کا نام ہے۔ اس نے بہت سے غریبوں کو توڑا سا خوشحال اور امیروں کو امیر تر بنایا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ ظاہرہ خانم کا بھی ٹھوٹ ہے۔ بہت رقیں جیتی ہیں اس نے کلر کے ذریعہ۔ میں اس حوالے سے بھی ظاہرہ خانم کو جانتی ہوں۔“

”تم نے راجو کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ اس پارٹی میں کیا ہے یا نہیں؟“ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا وہ شرقاً اور مغرباً کی فٹنسی ٹھار پارٹیوں میں پور ہوتا ہے۔ کبھی کبھار میں ہی اسے پہنچ کھانچ کر لایا ہوں۔ وہ اس وقت بازار میں بیٹھا کسی ٹھوڑے طوائف کا ہنجراد رہا ہوگا اور بڑی محنت سے حاصل ہونے والا روپیہ بے دردی سے لٹا رہا ہوگا۔ وہاں محفل میں خوب مگر مگر کا احساس ہو گا۔ گھبراہٹ اور فقرے بازی ہو رہی ہوگی۔ شراب کا دور چل رہا ہوگا۔“

”تم اتنی سخت گیر بیوی ہو۔ اس پر کنٹرول کیوں نہیں رکھتیں؟“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”میں سخت گیر نہیں ہوں۔ اس نے مجھے سخت گیر مشورہ کر رکھا ہے۔ خود مظلوم شوہر بنا ہوا ہے۔ میں ڈانٹ ڈھٹ ضرور کرتی ہوں۔ اس سے ڈوبتی نہیں لیکن باتی میں ہر لحاظ سے گھائے میں ہوں۔ شادی کے وقت میں نے باقاعدہ تحریری طور پر اسے اپنے آدھے سے زیادہ مالی معاملات اور جائیداد وغیرہ کا ٹکڑا بنا دیا تھا۔ پاور آف انامٹی ہے اس کے پاس۔“ اس نے سر جھکایا اور کہہ اس طرح اپنے گھاس میں جھانکنے لگی جیسے کوئی اہم چیز اس میں ڈوب گئی ہو۔

”کنٹرول کیوں نہیں کر دیتیں پاور آف انامٹی؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میرے سامنے کوئی قتال راستہ نہیں ہے۔ اور مجھے ان معاملات سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں۔ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ”انسان کی زندگی میں مالی معاملات نہیں۔ جذباتی معاملات زیادہ اہم ہوتے ہیں لیکن زندگی کا بیشتر حصہ وہ مالی معاملات میں ہی الجھ کر گزارنا ہے۔“

”میرے جذباتی معاملات تو تمہیں بہت گراں گزرتے ہیں۔ بڑے ذہن پلے ٹھوڑے غیروہ کرتی ہو۔“ میں نے کہا۔

”اس کی بھی ایک جذباتی دنیا ہے۔“ وہ مجھے لہجے میں ہلکا۔

ہم ٹپٹے ہوئے باہر آگئے تھے اور سو ٹھنک پول سے ذرا دور ایک آرائشی عراب کے قریب کھڑے تھے۔ میں نے جب برسوں بعد تمہیں دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے تم میری کوئی کھلی ہوئی چیز تھے اور اتفاقاً مجھے مل گئے تھے۔ کچھ راتے تعلق خاطر کی وجہ سے تم براہمان سا تھا ”ابائیت سی تھی لیکن میں نے دیکھا تم تو جیسے ٹوٹ کا بال بنے ہوئے تھے۔ مجھے تو تم نے راجو سے دوستی اور آنکھ کی شرم وغیرہ والا تشدد سنا کر ایک طرف بٹھا دیا لیکن میرے سوا گویا ہر کوئی تم پر حق جمائے ہوئے تھا۔ میرے سوا جیسے تم شہر بھر میں صاف تھے مجھے ایک شاک سالک۔ میں جیسے کسی اونچی جگہ سے گر چکی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھ سے بڑی متاع عزت چھین کر لے گیا ہے۔ میں اس صدمے کو فوری طور پر برداشت نہیں

اور میرے خیالات کو یہ دہلا کر دیا تھا۔

ایک مہرے سانس لے کر وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن وہ جو ایک بھر پور ”اولین اور بعد کو سیراب کر دینے والی محبت ہوتی ہے۔۔۔ وہ کبھی نہیں مرے گی۔ کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ تم سمجھتے ہو کہ صرف تم ہی لڑکھن میں مجھ سے عشق کیا تھا؟ راتیں جاگ کر گزار دی تھیں؟ راہوں میں کھڑے ہو کر انتظار کیا تھا؟ خون دل کے قطرے کاغذ پر پھونکے تھے؟ میں تمہیں بہت آخر سے بتا رہی ہوں۔ لیکن بچہ تارکی ہوں کہ میں نے بھی اسی شدت سے تم سے عشق کیا تھا۔ میں بھی اسی طرح جھری گھنٹی آگ میں جلی گئی۔ میں نے بھی اسی طرح رت بچکے کاٹے تھے۔ لیکن میں کبھی تمہیں بتا نہیں سکی کہ میں پائیکری کی سولی پر مصلوب تھی۔ میں اس سوتیلے باپ کی عزت کی حفاظت کر رہی تھی جس نے مجھے بوڑھے دولت مند کے ہاتھ بیچ دیا اور اس پیسے کے بل بوتے پر اس نے خود ایک اور شادی کر لی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اسے وہ پیسہ برتا نصیب نہیں ہوا۔ اپنی نوبت اتنا بدیہیت وہ نرنگ کے ایک خاوندے میں ہلاک ہو گیا۔“

”اور تم نے شادی کے بعد اپنے شوہر سے محبت شروع کر دی؟“ میرے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔

”میں نے ابھی تمہیں ادھوری اور تینہ محبتوں کے بارے میں بتایا ہے۔“ وہ بوجھل سے انداز میں چلیں اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”وہ میری ادھوری محبت تھی۔ شاید محبت بھی نہیں، مومنیت تھی۔ میں اس پر شرمندہ نہیں ہوں۔ وہ بہر حال ایک اچھا آدمی تھا۔ میں اس کی ذر خیرہ تھی۔ وہ جانتا تو مجھ سے بہت برا سلوک بھی کر سکتا تھا۔ بعض عمر رسیدہ خاوند اپنی نوخیز اور نوجوان بیویوں پر بہت شک کرتے ہیں۔ اپنی خامیوں کا انتقام ان سے لیتے ہیں۔ بہت برا سلوک کرتے ہیں لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس میں کوئی کمی یکس نہیں تھا۔ اس نے بچوں کی طرح مجھے رکھا۔ یہ جو آج میں اتنی بیش قیمت چیز لری ہوں، اسے نہیں لایا میں اس عاقلانہ ہوش میں کھڑی اتنے اعتماد سے تم سے باتیں کر رہی ہوں؟ یہ اسی کی بدولت ہے۔ ورنہ ہم کیا تھے اور ہماری اوقات کیا تھیں؟“

چند لمحے سکوت چھا گیا۔ ہمارے چاروں طرف ہوش کی بلند و بالا غارت تھی اور ہمارے قریب تمام روشنیوں میں سونگ ہول کا بانی جھلکا رہا تھا۔ ہم گویا ایک چکرور کنویں کی تہ میں کھڑے تھے۔

آخر وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”میں اب کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گی۔ دنیا کے ہاتھوں سے تمہیں واپس چھیننے کے لئے بے تاب نہیں دکھاؤں گی۔ اب تو تم مجھ سے ناراض نہیں ہو؟“

”بہاراض تو میں تم سے پہلے ہی نہیں تھا۔“ میں نے ملاعت سے کہا۔ ”تم نے مجھے الجھن اور آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ تم مجھے

کر سکتے تھے کہ تم کوئی بیوی ہو گی۔ میرا دل بھی چپ عورتوں جیسا ہو جاتا ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگا۔ لیکن اب میں شخص کی ہوں۔ اب میں کوئی چپ حرکت نہیں کروں گی۔ تم پر حق نہیں جاسکتا۔

اس کے چہرے کی اندر کی دیکھ کر میرا دل کٹ سا گیا۔ میں نے اپنی کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن دوسرے ہی لمحے ہٹا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ تلے اس کا جود و سونم کے جیسے کی طرح پھیل پائے گا۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”مجھے تو یاد نہیں ہے کہ تم نے کبھی مجھے متاعِ مری کی طرح سمجھا تھا۔ میرا عشق تو یک طرفہ ہی تھا۔ میں خط لکھتا تھا تو وہ گویا کسی اندھے کنویں میں جا کرتے تھے۔ کبھی کسی کا جواب نہیں آیا۔“

”غلا خنی ہے تمہاری۔“ وہ جیسے بڑب کر بولی۔ ”وہ خط جس اندھے کنویں میں جا کر گرے تھے وہ میرا دل تھا۔ دفن ہو جاتے تھے وہ میرے دل میں لیکن ان کا ایک ایک لفظ مجھے آج تک یاد ہے۔ چہرہ کی خطوط تو تھے بہت مختصر۔ کو تو ب کے سب تمہیں زبانی سنا دوں؟“

میں نے آنکھوں سے لہجی میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان آنکھوں میں نمی جھللا رہی تھی اور ان کی گہرائیوں میں پانی کی شمعیں روشن تھیں۔ اس کا دعویٰ کھل لٹا نہیں تھا۔ وہ گلاس کو اٹکیوں میں گھماتے ہوئے سر کوئی کے سے انداز میں بولی۔ ”وہ ہم ساتویں کالز کیں۔ اس لڑکھن کا عشق۔ اور اس عشق کی خوشبو۔ اسی سے تو ابھی تک خاوند دل آباد ہے۔ ورنہ تو اس دل میں محبت کا بہت بڑا خلا ہوتا۔“

”کیونکر ہوگا؟ تم تو کہہ رہی تھیں کہ اپنے مرنوم شوہر سے بھی محبت تھی؟“ میرا لہجہ اب بھی اکڑا اکڑا تھا۔

”یقیناً تھی۔“ وہ بلا تامل بولی۔ ”یہ غلط ہے کہ ہم زندگی میں صرف ایک محبت کرتے ہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری خاص اٹکس محبت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ مکمل اور بھر پور ہوتی ہے۔ اس کے نقوش ان مٹ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی ہماری کچھ محبتیں ہوتی ہیں۔ وہ ادھوری اور تینہ ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو صرف اس لئے بھی ہمیں کسی سے تھوڑی سی محبت ہو جاتی ہے کہ وہ کسی آڑے وقت میں ہمارے کام آیا ہو یا ہے۔ کوئی ہمیں دیکھنے میں اچھا لگتا ہے تو اس سے بھی تھوڑی سی محبت ہو جاتی ہے۔ کسی کی باتیں ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ کسی کے خط ہمیں اچھے لگتے ہیں۔ یہ سب محبتیں ہوتی ہیں لیکن ادھوری اور تینہ سی محبتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرجاتی ہیں۔ مٹ جاتی ہیں۔“

میں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صبح تک میری نظریں اس کا تاثر ایک سطحی عورت کا تھا لیکن اس نے یکدم ہلکا ہلکا

لا کہیں کی ایک حسین یاد کے بجائے کوئی اور سی عجیب سی چیز بن کر  
 ملی تھی۔ میں حیران تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں کیا  
 ہو گیا ہے۔

”میرے اندر پیاس کا ایک لاشعاری صحرا پھلا ہوا ہے۔ اگر  
 میں کچھ دیر کے لئے دیوانی نظر آتی تھی تو کیا ہوا؟ میں قابلِ معافی  
 ہوں۔ میں اب بھی تمہیں نہیں جانتا کیونکہ توجہ دانی کے آثار سے  
 لے کر اب تک روزِ دشب، ماہِ دسال مجھ پر کیسے گزرتے ہیں۔ کیا  
 کیا عرصہ میاں دے کر گئے ہیں۔ یہ سارے دہانے دوا فضول ہے۔  
 کچھ تم سمجھ نہیں سکو گے، کچھ میں سمجھا نہیں سکتا کیونکہ تمہیں  
 میری کیفیت کا اندازہ نہیں ہو گا۔ بظاہر میں ایک خوش حال اور  
 خوش نصیب عورت ہوں جسے دنیا میں ہر خوشی میسر ہے لیکن میں  
 جتنی شواہد اور اندازے جتنی خالی ہوں یہ مجھے ہی معلوم ہے۔“

”اندازے تو اس دنیا میں ہر کوئی تنہا ہے شیم! میں نے کہا۔  
 ”مکن ہے۔“ وہ دھجھے لیجے میں بولی۔ ”تم سے مجھے ہر حال  
 اور کچھ نہیں چاہئے۔ صرف مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرو۔ اور  
 بس۔ مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے بُرا مت سمجھو۔“

”تم میرے عزیز ترین دوستوں میں ہو۔“ میں نے ظلم سے  
 کہا۔ اس کے چہرے پر طریت پھیل گئی۔ ایک حلاطم جھیل گیا  
 یکدم ہر سکون ہو گئی۔

”تھینک یو۔“ اس نے ایک لمبے کے لئے میرے ہاتھ پر ہاتھ  
 رکھ دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گولڈ ڈرنک تھی اور دوسرے ہاتھ  
 میں ایک ٹاڈیہ سی آگ۔

”میں آپ چلتا ہوں۔“ میں نے گہری دیکھتے ہوئے کہا ”میرا  
 یہاں آنا اچھا بھی ہوا اور برا بھی۔“

”دوبارہ گھر کب آؤ گے؟“ اس نے بڑی نرم سی مسکراہٹ  
 کے ساتھ پوچھا۔

”اس غیثت۔۔۔ راجہ سے کتنا کبھی تمہیں ساتھ لے کر میری  
 طرف آئے۔ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ تم لوگ۔ بھرت بگا  
 کریں گے۔ جی بھر کے باتیں کریں گے۔ اے میری طرف سے شرم  
 دلاؤ۔ پیغام دے گا کہ اس گھر سے ایسی بے وفائی کی امید نہیں  
 تھی۔ اس نے دوبارہ فون تک نہیں کیا۔“

”تمہارا پیغام دے دوں گی لیکن میں اس کے بارے میں کچھ  
 کہہ نہیں سکتی۔“

میں ہوش سے نکل آیا۔ سڑکوں پر دیرانی پھیلنے لگی۔ اور  
 دیرانی میرے دل میں کی تھی۔ شیم نے مجھے اداس کر دیا تھا۔ دل  
 کی یہ دیرانی بھی عجیب تھی۔ جس کے بہت سے دوست تھے بہت  
 سے چاہنے والے تھے وہ بھی تھا تھا۔ جس کے دل میں محبت کا خلا  
 تھا وہ بھی تھا تھا۔ مفلس بھی تھا تھا، دولت مند بھی تھا تھا۔ بلکہ وہ  
 مفلس سے بھی زیادہ تھا تھا۔ نہ جانے یہ خدائی کہاں سے آتی تھی  
 اور کیوں دل میں گھر کر لیتی تھی۔

دوسرے روز میں نے آفس سے سنا کہ فون کیا توچا چلا کہ وہ۔

کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے مری روانہ ہو چکی تھی۔ ظاہرِ ظاہر  
 فون کیا توچا چلا کہ وہ کسی کام سے کسی سوبائی دزیر کے دفتر کی ہو  
 تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں اس  
 کا ردِ عمل کیا تھا اور اب وہ میرے ساتھ کس طرح پیش آنے لگی  
 لیکن فی الحال میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

اس رات گھر آ کر میں سوئے کی تیار کر رہا تھا کہ فون کا فون  
 آیا۔ اپنے مخصوص سرسری سے انداز میں وہ بولا۔ ”سرا! آپ نے  
 ملک ریاض راضی کا نام تو سنا ہی ہو گا۔ خاصی مشہور شخصیت  
 تھے۔“

”تھے۔ کیا مطلب۔۔۔؟ میں نے اپنے لمبے سے اپنے آپ کو  
 حتی الامکان بے خبر اور لاشعاری غافل کر کے کی کوشش کی۔

”سرا! آج شام ایک افسوسناک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا  
 .... فون نے اپنے لمبے کو متاثرانہ بنانے کی کوشش کی۔ ”وہ تھکا  
 آزاد قبائلی علاقے کی طرف جا رہے تھے لیکن پہاڑی راستے پر کسی  
 ٹرک نے ان کی جیب کو ٹکر مار دی اور جیب گہری گھاٹی میں  
 جا گری۔ وہ اپنے چاند کا ڈنڈ سمیت سوتے پر ہی ہلاک ہو گئے۔  
 جیب میں آگ لگ گئی۔ دو گاڑوں کی مسخ شدہ لاشیں تو بری طرح  
 جھلس جی گئیں۔ کچھ لوگ اندر ہی پامنی بنا کر بنے بچے گئے تھے لیکن  
 کوئی ٹانگہ نہیں ہوا۔ ملک ریاض راضی کی لاش کی شناخت بھی  
 مشکل سے کی جا سکی۔“

## بغداد کی رات

قمر اجنالوی

الف لیلیٰ کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و  
 رنگین رات، دجلہ اور نیل کے دامنوں میں لپٹی  
 ہوئی رات جسے بے شمار کہوں کے حوالوں سے  
 آراستہ کیا گیا ہے



بغداد کی رات

ہی ہی مشکل سے آخر کار میں نے آنکھیں قموڑی سی کھولیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے جھنجھوڑ نہیں رہا تھا بلکہ میرا بندہ یوں لرز رہا تھا جیسے برقی طاقت سے کسی مشین میں دایریشن یا ارتعاش پیدا کیا جا رہا ہو۔ آنکھ ذرا اور کھلی، نظروں کے سامنے پھیلا ہوا کمراسفید رخسار چھٹا اور احساس ہوا کہ وہ میرا بندہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ میرا کمراسی نہیں تھا جہاں میں لینا ہوا تھا۔ درحقیقت وہ کوئی عام کمرایا بندہ دم بھی نہیں تھا۔

وہ تو ایک نہایت طویل و عریض ہال تھا۔ اس میں گویا کسی انگریزی، اسپانی یا پھر سائنس ٹیکنیشن فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا لیکن اس میں فلمی سیٹ والا عارضی پن، نہیں تھا۔ وہ دیوار کے رنگ واقعی تصوراتی تھے۔ روشنیوں سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس وقت دن تھا یا رات؟

ایک طرف دیوار کے ساتھ بلند وبالا چھت سے لٹا ہوا آٹا بڑا اکوڑم موجود تھا جتنا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر کو شفاف اور مختصر کر کے پیشے کے گھر میں قید کر دیا گیا ہے۔ سمندر میں پانی جانے والی برجڑ اس میں موجود تھی۔ پانی ہال میں چاروں طرف ٹل کھاتے ہوئے اونچے اونچے راستے بنے ہوئے تھے جیسے غیر ممالک میں وندرا لینڈ ٹاپ ٹفری مقامات پر ہوتے ہیں۔ پرائزیاں پودے، مصنوعی آبشار اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔

چھت کی جگہ غالباً مصنوعی تاریک آسمان اور اس میں جھللاتے ہوئے ستارے بھی تھے۔ اکوڑم کے عین قریب ایک نہایت خوبصورت شانہ قسم کی کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں جس اسٹریچر نما بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اس میں دایریشن قسم ہو گئی تھی اور چتریں میری نظریں صحیح طور پر فوس ہونے لگی تھیں۔

مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا لیکن ذہن پر زور دیتے سے بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا تھا۔ پھر اچانک ذہن میں چھٹکا سا ہوا۔ میں نے دراصل یہ جگہ نہیں دیکھی تھی بلکہ ستارہ نے میرے سامنے بالکل اسی طرح اس کی اپنے الفاظ میں منظر کشی کی تھی جس سے میرے ذہن میں کچھ ایسا ہی تصور آیا تھا۔

شاید میں اب یہ سب کچھ خواب میں دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے ذرا کاٹلی کی تو سب چیزیں دیکھ لی تھیں لیکن اپنے قریب نظر نہیں والی تھی۔ میرے عین قریب ایک خوبصورت رنگ برنگی کرسی پر اسے تن بیٹھا مگر آ رہا تھا۔

”خوش آمدید مسٹر جیوڈری!“ اس نے گویا کسی قریب میں میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ جیسے میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا۔ ”وہم میں نے پڑیں مسٹر جیوڈری! یہ کوئی خواب نہیں ہے۔“

”اوہ! یہ تو واقعی بہت بُرا ہوا۔“ میں نے بھی مستحضرانہ لیے بی کہا۔ ”تک تو جانے حادثہ سے فرار ہو گیا ہوگا؟“

”جی ہاں۔ اس کا تمام نشان بھی نہیں ملا۔“ ٹوٹی نے جواب دیا۔ ”جدا انفس ہو اس کی۔“ میں نے کہا۔

”بہتر تھیلیات کل یا رسول کے استیلاجات میں آجائیں گے۔“ ٹوٹی بولا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ”اور ہاں! مسٹر! آپ کو معلوم ہی ہے میں ایک ضروری کام سے پشاور آیا ہوا ہوں۔ آج رات ہی باہر جانے والی فلائٹ سے لاہور واپس پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اب اہم خبر مجھے یہاں بیٹھ ل گئی ہے جو شاید آپ کو لاہور میں پہنچنے سے بھی نہ ملی ہو۔“

”خبریں وغیرہ انھی کسے کا ذمہ تو تاج کل تمہارا ہے۔ میں تو نیک کل ذرا دوسرے ہی معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”خبر ہے؟“

”سنا ہے مشہور ڈاکہ۔“ بلکہ ڈاکو نہیں۔ ڈاکو کے ساتھ شاید ”مشہور“ نہیں بلکہ ”برنام“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اہ تو۔ نام ڈاکو نہ دیا بھی پولیس کی تحویل میں انتقال کر گیا ہے۔“

”دع!“ میں اس خبر پر کوئی تبصرہ نہ کر سکا۔ ”سرا میں اثر پورٹ سے ہی بول رہا ہوں۔ میری فلائٹ کا بت ہوا ہے۔ پانی باتیں کل آپ سے زبانی ہوں گی۔“ ٹوٹی بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے ریسپورڈر کو دیا اور چند لمحوں پر نظر لانے بیٹھا رہا۔ دیوار پر میرے سامنے ایک فلم سی پل رہی تھی جس پر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کے لئے بیٹ گیا۔

چھت کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے غیر ارادی طور پر کہا۔ ”نام خیر! اب تمہاری زندگی کے دن بھی تو زور نہ گئے ہیں۔“ پھر میں سکون سے سو گیا۔ بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی سکون سے ابلہ سوتے ہوئے آدی کو یہ اندازہ تو نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سویا ہو لیکن میری غنودگی جب ٹوٹنے لگی تو مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میں دیوال سوتا ہوں اور اب پوری طرح بیدار ہونا میرے بس کی بات نہیں۔

میں گویا بیٹھوں تک کنارے سمندر میں غرق رہا تھا۔ میرے اس پر برف کی جھیں جم گئی تھیں اور جسم کے جوڑوں میں گویا کمر لکڑی لکڑی تھا۔ کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا لیکن میری کچھ باتیں آ رہا تھا کہ میں کیوں بیدار نہیں ہو رہا تھا۔ میں آنکھیں لڑا جاتا تھا لیکن پچھنے گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔ اگلی تک کوئی نہیں دی جا رہی تھی۔

محنت دور سے کسی کی آواز سرگوشی کی حد تک مجھے سنائی دے رہی تھی۔ ”مسٹر جیوڈری! اب اٹھ جائیے۔ بیدار ہو جائیے۔“ ٹوٹی بولی۔

کے لئے مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت محسوس ہوئی۔

بے بس انسان کا قصہ سناپ کے ذہری طرح اس کے ہم  
میں اندری اور گردش کرتا ہے شاید اسی کا وہ عمل تھا کہ  
اس اسٹریج نمائین پر اٹھ بیٹھا۔ بیڑا اپنی جگہ سے تھوڑا آگے  
کھٹک گیا۔ اسٹریجری کی طرح اس کے نیچے چار چھوٹے چھوٹے  
کول پیٹے لگے ہوئے تھے۔ ٹھیل ٹیس کی گیندوں سے مشابہ۔

اے نن مری آنکھوں میں جمائے ہوئے حسین تصویر لیے  
میں بیلا۔ ”چوہدری! تم بلاشبہ ایک طاقتور توی ہو جو اتنی جلدی  
اٹھ بیٹھے ہو۔“

میرے دل میں نفروں کے جھڑپوں سے تھکے میں چاہتا تھا کہ  
اٹھ کر اے نن پر ٹوٹ پڑوں اور خالی آنکھوں سے ہی کسی طرح اس  
کے کھڑے کھڑے کروں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔  
میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اس سے آگے  
میرا جسم میرا کچھ زیادہ ساتھ نہیں دے سکتا۔ اٹھ بیلا سے کہا  
جان سی نکلی ہوئی تھی۔ مجھے اے نن کے مسکندہ سر پر اسی چمکی  
ہوئی طاقتوں کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ میں اس پر تلے کی کوئی  
ادھوری کوشش نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ مجھے اپنے خیالات چھپائے رکھنے میں ہی  
نمارت حاصل تھی لیکن میری آنکھوں میں نہ جانے کہاں کہاں  
کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس سے وہ میری سرچوں کی منتی میں جھانک  
بارہا تھا۔

نمائت نمبر نمبر لیے جس وہ بیلا۔ ”جس تھماری آنکھوں  
میں نفروں کے آتش فشاں دیکھ رہا ہوں چوہدری! میرا دوستانہ اور  
جھانکنا مشورہ ہے کہ اپنے ڈکے سے ہوتے ذہن پر اس قدر رجحان  
ڈالو۔ تھماری دماغی تسوں کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے  
تاکہ تھماری ذہنی رجحان حالت جلد از جلد معطل پر آسکے۔ ہمیں  
اسی ہے کہ ایک عام آدمی کی نسبت تم بہت جلد اس قابل ہو جاؤ  
گے کہ بہ قافی ہوش و حواس ہمارے ساتھ میرے بیٹے کو ذرا کرات  
کر سکو۔“

”کیسے ذرا کرات؟“ میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔ میں لمحہ بھر  
اپنی حالت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ نفرت کے ذہرنے تھماری کام کام کیا  
تھا۔ رگ و پے میں بجلی سی دوڑ رہی تھی۔ لوہی گردش جو بہت  
ہو گئی تھی اب اس میں دوبارہ دھڑائی آ رہی تھی۔

”تو بھی مظلوم ہو جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بیلا۔ ”جس  
ہم چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے تم صرف اپنی توانائیاں بحال ہونے  
دو بند باییت کی لہروں کو اپنی سوچ پر غالب مت آئے۔“ وہ ہمیں  
نمائت میرا سکون اور ذہنی تسوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں  
تم ایک تجربہ کار آدمی ہو تم نے دنیا دیکھی ہے۔ جس میں انداز  
ہو جانا چاہئے کہ یہ کوئی تھی جو تھیں نہیں ہے جس میں میرا ایک  
مستانہ لگا کر اٹھنے کا اور کھنکھن کے پٹے لگا دے گا۔“

میں نے کمزوری آواز میں پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں؟“

اے نن نے مضمون سے انداز میں سر ہلایا اور لمبھی سانس  
لے کر بیلا۔ ہر شخص ہوش میں آتے ہی سب سے پہلا سوال یہی  
کرتا ہے نہ جانے کیوں؟

میں خاموش رہا۔ وہ قدرے توقف کے بعد بیلا۔ ”مجھے اہم  
سوالوں کے جواب اتنی جلدی تو نہیں دے جاسکتے تھے۔ یہ تاؤ تھماری  
طبیعت کیسی ہے؟“ لہجہ دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔ جیسے وہ میرا نمائت  
خاص غیر خواہ ہو۔

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خودی ایک ڈاکٹری  
طرح کو کھامبھیری بیماری کی تشخیص کرتے ہوئے بیلا۔ ”دیکھو تو تم  
ٹھیک ٹھاک نہ ہو۔“ اسی کمزوری ذرا زیادہ محسوس ہو رہی ہوگی۔ وہ  
بھی چند محسوس میں دور ہو جائے گی۔ یہ اس کیس کے اثرات ہیں  
جس کے ذریعے تھیں بے ہوش کیا گیا تھا۔“

”میرے اپنے گھر میں۔ میرے بیڑا میں۔ نیو کے دوران  
مجھے کیس سے بے ہوش کیا گیا تھا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ظاہر ہے۔“ وہ بے پروائی سے بیلا۔

میں اصل میں یہ چاہتا تھا کہ میرے سیکورٹی کے  
انتظامات کیا ہوئے؟ وہ دو ایروڈوں کے اوپر خاردار حفاظتی تاروں میں  
دو ڈیڑھ گز اونچائی پر دو مسلح گارڈز۔ وہ خفیہ کمرے لکھیا ان  
سب کی موجودگی میں میرے کمرے میں کیس پھیلا کر مجھے سوئے میں  
بے ہوش کر دیا گیا تھا؟ کیا یہ تمام حفاظتی انتظامات میرے کسی کام  
نہیں آئے تھے؟

اے نن کو کھامیرے خیالات پڑتے ہوئے بیلا۔ ”تم جیسے  
بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ حفاظتی انتظامات اس ملک میں بہت سی  
ضعفیتیں کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض ضعفیتیں  
بالکل عام سے پھروں کے ہاتھوں نقل ہو جاتی ہیں۔ ہمارے لئے تو  
یہ بالکل بھگانا سی چیزیں ہیں۔ جب تک ہم کسی کو اٹھانے یا ہلاک  
کرنے کا فیصلہ نہیں کرتے جب تک یہ انتظامات اہم دکھائی دیتے  
ہیں لیکن جب ہم کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر ان انتظامات کا کیا کسی  
بھی قسم کے انتظامات کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ گزشتہ رات  
تھماری گارڈز تھماری بلڈ ہاؤسڈ اور ملازمین سب بے ہوش  
ہو گئے تھے۔ خاردار تاروں میں برقی رد منتقل ہو گئی تھی اور چند  
آدی گھر کے افراد ہی کی طرح تھماری ہاں محسوس پھر رہے تھے۔“

اس کی بات سن کر میرا دل خراب ہوئے لگا۔ پہلے ہی ایک ایسی  
سی محسوس ہو رہی تھی کہ ثابت بھی ہلاکی تھی۔ میں جب کم عمری میں  
ہی بالکل تن تنہا نہایت خطرناک کاموں میں ملوث ہو گیا تھا اور ہر  
وقت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پھرا کرتا تھا حالانکہ  
میرے کوئی دوسرا نہیں تھے کوئی طاقت نہیں تھی اس وقت بھی  
میں نے بھی اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ اور بے  
بسی سے مجھے نفرت تھی۔ شاید یہ بے بسی کی انتہا تھی کہ ایک لمحے

رہا تھا۔ سرگرم زیادہ مگرمی ثابت نہیں ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ کسی عمارت کی دو حریفوں، یعنی کمرانی تھی۔

اندھیرے ہی میں بیڑ نہایت آہستگی سے رک گیا اور میرے پانچنی کی طرف ایک دوڑانے کی سی صورت میں روشنی نمودار ہوئی۔ ایک لمبے بودبختے احساس ہوا کہ دور حقیقت وہ ایک تنگ سا دوڑانہ ہی تھا جو کھل گیا تھا۔ اسٹریچر نائید گویا ایک معمولی سی ڈھلان پر تھوڑا سا پہل کر اس دوڑانے سے گزرا اور رک گیا۔

میں نے اپنے آپ کو ایک بہت سی چھوٹے سے بیڑ دوم میں پایا۔ بیڑ دوم کیا تھا... کسی بخری جہاز کے کپتان کو نہایت جدیدہ خوبصورت اور صاف ستھرا ہوا دیا گیا تھا۔ اس کا صرف رقبہ کم تھا ورنہ وہ ہر اعتبار سے ایک نہایت شاندار اور پر قیمتی بیڑ دوم تھا۔ یہاں کی دیواریں چھت اور فرش وغیرہ چمکنے صاف اور نفوس پلاؤنگ کی شیشوں سے بنے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ یہاں ایک خوشگوار خشکی اور فرحت بخش خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ تنگ ہونے کے باوجود محض کاؤر ابھی احساس نہیں تھا۔

خوشبو شاید اس خوبصورت عورت کے وجود کی تھی جو ایک کمرے میں بدبوٹ کی طرح سیدھی کمری تھی۔ وہ ایک نہایت اسٹارٹ اور بھلہ سفید فام عورت تھی لیکن یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ وہ کس ملک کی تھی۔ بعض عورتیں اپنی رنگت کے پیکے پن کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں کہ وہ روسی ہیں۔ بعض کے سرخ بال ان کے جرم ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ بعض کے سرخ بال اور جھپٹے نقوش ان کے فرانسیسی ہونے کی دلیل لگتے ہیں اور بعض کی حد سے زیادہ نیلی شفاف آنکھیں ان کے انگریز ہونے کا امکان ظاہر کرتی ہیں۔

لیکن یہ سب حقیقتیں نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی سی بھی نشانی کسی بھی قومیت کی لڑکی میں پائی جاسکتی ہے اور یہ سب نشانیاں کسی ایک لڑکی میں بھی جمع ہو سکتی ہیں۔ مجھ جیسا پاکستانی جس نے بیرونی ممالک میں بہت زیادہ عرصہ بھی نہیں گزارا تھا یقین سے پہلا کوئی بات کہہ کر کہہ سکتا تھا۔

لڑکی کے ہلکے سرخے ریشمی اور سیدھے بال اس کے کندھوں پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکڑوں یا لیبارٹری میں کام کرنے والوں کی طرح لمبا سا سفید اور دل کل پہنے ہوئے تھی۔ نیچے ہلکے باری سے رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ پیروں میں کیونز کے خوبصورت "تیس اور نازک سے جوتے تھے" اس کی اپنی شخصیت کی طرح کمرے میں دن کا سما جالا پھیلا ہوا تھا اور وہ خود بھی اچالے سے کم نہیں تھی۔ میرا اسٹریچر نائید میں اس کے سامنے جا کر رکھا تھا اور میں اس پر کچھ اس طرح ایک کرسی کے بل نیم دراز تھا جس طرح چھوٹے موٹے دیہات میں چوہدری اپنی چوہال میں بیٹھے ہیں۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک تنگ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اپنے آپ کو اسٹریچر پر محسوس کیا۔

ایک ٹانھنے کے لئے میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا لیکن اب وہ جذباتیت کی لمر گر چکی تھی۔ میں فٹنڈے دل سے حالات کا اندازہ لینے لگا۔ اس بے پناہ طویل و عریض ہال میں اسے نہ اکیلا ہی لگا رہا تھا۔ ہال کے دور آئندہ گوشے لیجے اندھیرے میں ڈوبے گئے تھے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ دیواریں کہاں ہیں اور ان کا کس کوئی دوڑانہ بھی ہے یا نہیں؟

اسے نئی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کسی قسم کی باتھ بائی" دھارایا افواج کا خیال بھی دل میں مت لانا یہ تھوڑی سی لوگوں باتیں ہیں۔ کسی قسم کا فکری سین بھی یہاں نہیں چلے گا۔ نہایت سکون اور براہ امن ماحول میں کچھ باتیں کچھ فیلے ہوں گے۔ تمہیں کی تکلیف نہیں ہوگی۔ تم یہاں اپنے آپ کو قیدی نہیں سمجھنا۔ مجھے تمہیں بے ہوش کر کے لانا جا رہی مجبوری تھی۔ اپنی خوشی سے تم کسی نہ آتے خواہ ہم تمہیں کتنا بھی سمجھاتے۔"

اس کے یہ بات درست تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر بھی غور کیا۔ باغرض میری جسمانی توانائی لوٹ بھی آئے اور میں کسی طرح بے نقاب رہا۔ ابھی پائلت تب بھی کیا اس کا کوئی فائدہ ہو گا؟ مجھے مہلک کا تو کیا؟ اس ہال کا بھی حدود اور بڑے معطوم نہیں تھا۔ میں ان تھا کہ اس پر قابو پانے یا اسے ہلاک کرنے کے بعد بھی میں بال سے نقل نہ پانا اور اس سے بھی زیادہ بڑی صورت حال کا ہمیں سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بعض مسائل طاقت سے حل نہیں ہوتے۔

تو ہر اب سامان کے لئے کیا حکم ہے؟ میں نے ہمارے لیے پوچھا۔ "کچھ بھی نہیں۔ ایسی جلدی کیا ہے۔" وہ اطمینان سے لڑتے ہوئے بولا۔ "میں بھی تمہارا ذہن سست ہے۔ ہم چاہتے ہیں ہم تمہارا کرات کی میز پر بیٹھو تو تمہارا ذہن پوری طرح مستعد ہو۔ تم صبح طور پر سوچ بچار کر سکو اور ہر بات کا معقولیت سے ابدے سکے۔"

"کیا یہاں کوئی گول میز کا نفرین مستعد ہو رہی ہے؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں۔ میز تو منتقل ہی ہوگی۔" اس نے منجیدگی سے کہا۔ "لیکن یہ کا نفرین بہت سی گول میز کا نفرینوں سے زیادہ ہوگی۔ اب تم آرام کرو۔"

اس کے ہاتھ میں ریگوت کنٹرول ٹاکوئی چیز تھی حالانکہ ان سامان سے ہال ریگوت کنٹرول چیزوں کا استعمال شروع نہیں ہوا۔ سامان نے ریگوت کنٹرول کارڈ میرے اسٹریچر نائید کی طرف سے ہونے کوئی ٹپن دیا اور بیڈ تہستہ تہستہ فرش میں دھنسنے لگا۔ اذانیاسی تھا جیسے لفٹ نیچے جا رہی ہو۔

اور میرے ہی لئے بیڈ بچھ سمیت فرش کی سٹل سے نیچے جا چکا تھا۔ اب یہ منتقل جگہ خالی نہیں رہی تھی بلکہ فرش برابر ہو گیا تھا اور ابھی وہ بیٹھے ہی بیٹھے گویا ایک تاریک عبوری سرگرمی میں پہنچے اور

کیا رکھا ہے مجھے تو صرف لٹی سے نشہ چڑھا ہے۔ ہلٹے میں بھی لٹی پتا ہوں اور رات کو سوتے وقت "ہائٹ کپ" کے طور پر لٹی کو ہی دل چاہتا ہے۔ لیکن خبہ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں اس کے بغیر بھی گزارا کر لوں گا۔"

"خفگیہ مسٹر چوہدری۔" اس نے گویا اطمینان کی سانس لیے ہوئے تھیں۔ "سب میں گدا۔" سب میں جاؤں؟

"کس کبشت کا دل چاہتا ہے کہ تم جیسے مہمانوں کو جانے کے لئے کہے۔" میں نے لٹری سانس لے کر عاشقانہ لہجے میں کہا۔

"سرا میں مہمان نہیں، میزبان ہوں۔" اس نے اسکول کی لڑکیوں والی بھونٹ آمیز بھید کی سے بچنے کی۔

"میری گرامر کثور ہے۔ زبان دیکھان کی غلطیوں پر تم زیادہ توجہ مت دینا۔" میں نے مٹھو دیا۔

"تیس سر۔" اس نے سعادت مندی سے کہا اور اس دیوار کی طرف بڑھ گئی جس میں چھوٹے پیلے شکاف نمودار ہوا تھا گراہ "پیلے ہی کی طرح نمودار اور بے جوڑ نظر آ رہی تھی۔ دیوار کے قریب پہنچے ہوئے وہ بولی۔ "آپ اب آرام کیجئے سر۔ اگر مجھے بلانے کی ضرورت محسوس کریں تو بیڈ کے قریب دیوار پر اٹھی رکھ کر بلا کر دباؤ ڈالیں گے۔"

"یہیے خفگانہ رازوں سے مجھے آگاہ مت کرو۔" میں نے گراہ کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ میں اس دیوار سے ہی ٹپک لگا کر سو جاؤں۔"

وہ عطا انداز میں دھیرے سے تھی اور بولی۔ "آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں سر۔" یہ ایک نہایت ہی رسمی سا سلام تھا۔ اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔

اس نے اپنے سامنے کی دیوار پر اٹھی رکھی اور وہی ایسی جگہ سا مستطیل دروازہ پیدا ہو گیا جیسا کہ میرے اسٹریچر ٹائیڈ کے اس کمرے میں آتے وقت پیدا ہوا تھا۔ وہ باہر جا چکی تو دیوار کا وہ شکاف پھر برابہ ہو گیا۔ اب میں نے ذرا غبر سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بالکل ہی ایک لکیر دیوار میں مستطیل کلزے کی موجودگی کی نشاندہی کرتی تھی۔ یہ کلوا ذرا سا بچہ بہت کردیاری میں ایک طرف کو کھٹک جاتا تھا تو دروازے جیسا خٹاف پیدا ہو جاتا تھا۔ مجھے اس وقت واقعی ذہنی و جسمانی دونوں طرح سے آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن لڑکی کے جانے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے ایک منٹ انتظار کیا پھر بیڈ سے اتر کر دیوار پر مین اسی جگہ پر اٹھی رکھی جہاں لڑکی نے رکھی تھی اور دیوار میں شکاف نمودار ہو گیا تھا۔

لیکن میرے اٹھ کر نکلنے سے شکاف نمودار ہونا تو درکنار میرے ذرا سا سوراخ بھی نمودار نہیں ہوا۔ الٹا میری اٹھی میں گویا کوئی ہی سوئی اتر گئی۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور میرے حلق سے اذیت بھری آواز نکلنے لگتی تھی۔ میں نے اسے ہونٹوں میں ہی دبا لیا۔

لڑکی کی مسکراہٹ روشن تر ہو گئی۔ وہ دلی ارادہ سے بڑے ہوئے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئی تھیں۔ میرے اور جسمی فہمی اور گہری میں بولی۔ "مسٹر چوہدری! آپ اس بیڈ پر تشریف لے آئیے اور آرام کیجئے۔"

شاید اسے اندیشہ تھا کہ زیادہ مدافعی سے انگریزی بولنے پر میں آسانی سے سمجھ نہیں سکوں گا۔ بیڈ زیادہ لمبا چڑا میں تھا مگر کھولا کھولا گھسٹا اور آرام نہ نظر آ رہا تھا۔ میں اسٹریچر ٹائیڈ سے نیچے اترے بغیر ہی بیڈ پر منتقل ہو گیا۔ میرے جسم پر اس وقت وہی شب خوابی کا لباس تھا جو میں اپنے گھر میں پہن کر سوتا تھا۔

بیڈ بہت آرام دہ تھا اور میرے جسم پر ابھی تک شکاف کا غلبہ تھا۔ میں آرام سے لیٹ گیا۔ لڑکی نے اسٹریچر ٹائیڈ کی ایک پائے کو چھوا۔ شاید اس میں کوئی لیچ ٹخن موجود تھا۔ بیڈ جس طرح اس کمرے میں پہنچا تھا بالکل اسی طرح واپس روانہ ہو گیا۔ کمرے سے اس کے نکلنے ہی تک سا مستطیل دروازہ بند ہو گیا اور کمرہ چادوں طرف سے کسی خوبصورت اور آراستہ بڑے سے صندوق سے مشابہ دکھائی دینے لگا۔

میں اب بھی گہری غفروں سے لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی اسکول کی نوخیز لڑکی جیسی مصیبت تھی۔ سفید گاؤں کی دونوں بیٹوں میں ہاتھ ڈالے وہ میرے بیڈ کے قریب آگئی اور اسی گھبرے گھبرے لہجے میں بولی۔ "سرا! آپ کچھ چنا پسند کریں گے۔"

"ہاں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مٹی لی جائے گی؟"

"کیا! لٹی۔؟" اس کی مصیبت نئی آنکھیں قدرے حیرت سے پھیل گئیں۔ شاید اسے معلوم تو تھا کہ لٹی کیا ہوتی ہے لیکن فوری طور پر اسے یاد نہیں آ سکا تھا۔ جوں ہی یاد آیا اس کی آنکھیں معمول پر آئیں اور وہ قدرے باؤسی سے بولی۔ "سرا! برا خیال ہے کہ فوری طور پر آپ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی جاسکے گی۔" "مٹی سانس ہی تھی نظر آ رہی ہے براں۔" میں نے ہاتھ پھیلا کر چادوں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا فائدہ ایسی سانس ہی تھی کا جو انسان کو ایک گلاس لٹی بھی فراہم نہ کر سکے۔" میں نے باؤسی سے سر ہایا اور سخت مصیبت نظر آنے کی اداکاری کی۔ میں اس کے مصیبت سے چہرے پر برائی اور ذمات کے آثار دیکھ کر دل میں دل میں محفوظ ہوا تھا لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ حقیقتاً اتنی ہی مصیبت محسوس تھی جتنی نظر آ رہی تھی؟ وہ یقیناً مرجھ رہی تھی۔ اس کی عمر یقیناً اس سے زیادہ تھی جتنی عمر کی وہ نظر آ رہی تھی۔

"سرا! اسی اور ذریعہ کا حکم دیتے۔ دھسکی، جن ڈو گا۔ جو بھی آپ پسند کریں۔" وہ نیم اچھاڑے سے لہجے میں بولی۔ "نہیں۔" میں نے منہ دیا کر کہا۔ "ان بے ہودہ مشروبات میں



کی تاجانہ لیا۔ اعلیٰ صبح سلامت تھی۔ صرف اس میں بھی ی  
 بہت باقی تھی۔  
 اسی لمحے کمرے میں لڑکی کی آواز ابھری۔ وہ تسلطانہ لہجے میں  
 کہہ رہی تھی۔ ”سرا آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے ایسی اٹنی  
 بددی دیکھوں گی کیا ضرورت ہے؟ آرام سے سو جائیں۔“  
 وہ بالکل اس طرح بات کر رہی تھی جیسے دیوار پر لٹنے کی ہو اور وہ  
 اس کی دوسری طرف کمری میری تمام حرکات و سکنات دیکھ رہی ہو  
 لیکن اس کی آواز میرے عقب سے سنائی دیتی تھی۔ میں نے گھوم کر  
 دیکھا۔  
 پہلی نظر میں مجھے یہی محسوس ہوا کہ بڑے کی پانچویں کی طرف جو  
 دیوار تھی اس میں ذرا بلندی پر واقع ایک چور کو شکاف سے وہ  
 کمرے میں جھانک رہی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے احساس ہوا کہ  
 دیوار میں درحقیقت ذرا بلندی پر پٹی دی کی طرح ایک چھوٹا  
 سلاکسکین موجود تھا جو پہلے روشن نہیں تھا تو دیوار ہی کا ہم رنگ  
 نظر آتا تھا لیکن اب روشن ہو گیا تھا تو اس کی موجودگی کا احساس  
 ہوا تھا۔ اس پر اس لڑکی کا کھڑا ہوا نظر آتا تھا لیکن وہ جیسے ٹی دی  
 اسکین پر نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ حقیقت میں سامنے کسی  
 دانشوران سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ یعنی صرف میں  
 واسے نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔  
 اس کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جیسے کوئی بزرگ  
 کسی بچے کی حرکت پر اس سے خفا ہونے کی اداکاری کر رہا ہو۔ اس  
 کے مصحوم سے چہرے پر اس طرح کا عریانہ تاثر دیکھ کر میرا چہرہ  
 ٹپکا۔  
 ”سرا“ وہ ایک بار پھر منہ نہایت لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔  
 ”آپ کو جب بھی اور جو بھی کام ہو مجھ سے کہئے گا۔ آپ اپنے  
 بار پر کچھ کہنے کی کوشش مت کریں۔ آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا  
 ہے۔“  
 ”نفع نقصان کی تو خبر زندگی میں کبھی تمہارے اس خادم نے  
 ہوا نہیں کی۔“ میں نے لفظی سانس لے کر بیٹھ پر واپس آتے  
 ہوئے کہا۔ ”لیکن تم اتنے پیار سے کہہ رہی ہو تو تمہاری بات مان  
 لیتا ہوں۔ یہ بہت بڑی عادت ہے مجھ میں کہ حسین لوگ پیار سے  
 کوئی بات کہیں تو میں دل نہیں سکھاتا۔“  
 اسکین سے ہی اس نے میرے بیٹے کے ساتھ دلی دیوار کی  
 طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس دیوار کے علاوہ آپ دیوار یا  
 کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگائیں۔ آپ کو کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو  
 آپ بس اس دیوار کو اٹھلی سے چھوئیں۔“  
 ”عجب امرت دھارا قسم کی دیوار ہے۔“ میں نے اردو میں  
 کہا۔ پھر جلدی سے انگریزی میں سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔  
 ”مسئلہ تو بس یہی درپیش ہے کہ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔“  
 ”یہ میرے اختیار میں نہیں ہے سزاؤں میں ذرا آپ کے

حکم کی تعمیل کرنی۔“ وہ بڑی عاجزی اور ملاطفت سے بولی۔  
 پھر وہ اسکین پر دھیرے دھیرے پیچھے کو جانے لگی۔ اس کے  
 سفید گاؤں کا کار نظر آیا تو میں نے کہا۔ ”میں تم سے پوچھتا ہوں  
 کیا تھا۔ تم ذرا کٹھن ہو؟“  
 ”نہیں سرا“ اس نے ہنسی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب  
 دیا۔  
 ”یہاں کسی لیبارٹری وغیرہ میں کام کرتی ہو؟“  
 ”نہیں سرا یہاں کوئی لیبارٹری وغیرہ نہیں ہے۔“  
 ”تو پھر تم کون ہو؟“  
 ”میں آپ کی خادمہ ہوں سرا۔“  
 ”اف! میں دھم سے بستر پر گر گیا۔“ مجھے معلوم ہی نہیں تھا  
 کہ میں اتنے خوش قسمت ہو گیا ہوں۔ اتنی حسین شخص اور شاندار  
 خانہ میں میرا آنے لگی ہیں مجھے۔ میں کہہ مالاخواہ خواہ مکرمانے کی  
 آرزو کر رہا تھا۔  
 ”آپ اسے اپنا کھری سمجھیں سرا۔“ وہ محبت سے مسکرائی۔  
 ”ٹھیک ہے اب تو تم لوگ مجھے دیکھو دے کر بھی یہاں سے  
 نکالو گے تو میں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر غلوص  
 دل سے کہا۔  
 ”سرا یہاں کسی کی جرات ہے جو آپ کو دھکے دے سکے۔ آپ  
 ہمارے خاص مہمان ہیں اور ہمارا خاص مہمان ہونا کوئی معمولی  
 بات نہیں ہوتی۔“  
 ”میں خود بھی ہر ایک کو شرف میزبانی نہیں بخشا۔ یہ اعزاز  
 کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔“ میں نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔  
 وہ دھیرے سے غمی اور پھر دیوار میں نصب وہ اسکین سادہ  
 ہو گیا۔ اب اس کا رنگ تقریباً دیوار جیسا تھا اسی لئے وہ سرسری  
 نظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے لفظی سانس لے کر آواز  
 بلند کر کے ”اس کمرے میں تو انسان کو ذرا سی پرائیویسی بھی میسر  
 نہیں۔“  
 میں نے ایک بار پھر اسکین کی طرف دیکھا لیکن وہ بدستور  
 سادہ رہا۔ اب اس پر کوئی نہ عمل نظر نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی آواز  
 سنائی دی۔ میں نے کوٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔  
 حقیقت یہ تھی کہ میرے ذہن میں آنے والی سی چل رہی  
 تھی۔ نہ جانے وہ کون سی تھی جو مجھ پر استہلال کی گئی تھی۔  
 ابھی تک ایک تو اس کے اثرات ذہن اور جسم پر پائی تھے دوسرے  
 جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ بھی کم تشویش ناک نہیں تھا۔ اعادہ  
 انداز رہائش اتنے سائنٹیفک طور طریقے آخر کس لئے اختیار  
 کئے گئے تھے؟ یہ سب انتظامات کب اور کس نے کئے تھے؟ کس  
 لئے کئے تھے؟ ریڈ فاٹ والے کیا اپنے پاؤں یہاں اتنے مضبوط  
 کر چکے تھے؟ کس لئے وہ اتنا تردد کر رہے تھے؟ یہاں ان کا یہ ایک  
 ہی ٹھکانا تھا یا ایسے اور بھی ٹھکانے موجود تھے؟ ابھی تو مجھے اس

تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں گئے ہوئے تھے۔ مجھے وہاں کوئی حلیف ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ گری، گھٹن یا جس کچھ نہیں تھا جس اپنی مرضی کے خلاف کہیں موجود ہونے کی اپنی ایک غفلت ہوئی ہے۔ کہیں قید ہونے کے احساس کے ساتھ ایک عجیب ماحول بھی احساس ہوتا ہے۔

میں نے دیوار پر آہستگی سے انگلی رکھی۔ اگلی میں نے دائیں طرف کی دیوار پر بھی انگلی اور لیوی اسکرین میرے ہاتھ کی جانب دیوار میں ذرا پلٹ کر موجود تھا لیکن اس کس کے ساتھ ہی اسکرین روشن ہو گیا۔ ایک لمبے بعد اس پر اسی لڑکی کا چہرہ نمودار ہوا۔

وہ اپنے مخصوص دھن ادا میں مسکرائی۔ "مکھر ہے آپ جاگ گئے سر میں تو بھیجی تھی آپ سونے کا گلی ریگازڈ کام کیا چاہتے ہیں۔"

"کیا میں بہت دیر سوا ہوں؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"خیر چھوڑیے اس بات کو۔" اس نے گویا اس سوال کے جواب سے گریزی مناسب سمجھا۔ "مید ہے اب آپ خود کو آگاہ دم محسوس کر رہے ہوں گے۔"

"کچھ ایسا خاص نہیں۔" میں نے منہ کچھ اور ہلاتے ہوئے کہا۔

اس کی خوبصورت پیشانی پر تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ "کیا میں ڈاکٹر کو آپ کے پاس بھیجوں؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "ڈاکٹر کی تو میں صورت ہی دیکھ کر تیار ہو جاتا ہوں۔ میری صحت کا راز تو مجھ کے میں ڈاکٹر کو لے کر رہتا ہوں۔"

"آگاہ۔" وہ دھیمے اور حرم ادا میں ہنسی لیکن خود ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سرا مجھے خوشی ہے کہ ایک طویل عرصے بعد آپ جیسے خوش مزاج انسان کی خدمت کا موقع مل رہا ہے لیکن آپ کو ابھی تک محسوس نہیں رہتا چاہئے تھا۔ یہ ذرا تشویش کی بات ہے۔ کہیں اس گیس کا ذرہ زیادہ نہ ہو گیا ہو جس سے تپ کو بے ہوش کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے میں ڈاکٹر کو بھیجی ہی ہوں۔"

"خدا کے لئے میرے سامنے بار بار ڈاکٹر کا نام مت کہہ میں نے کرا کر کہا۔ "میری محسوس نظر آنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے بڑے زور کی ہموک لگی ہوئی ہے۔ یہاں اگر تم لوگوں کی خوش غلطی دہری نہ لگی ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے کھانے کے لئے نہیں پوچھا۔"

"میں پوچھنے ہی والی تھی سر۔" اس کے چہرے پر غصہ و غضار انسانوں والی شرمیلی جھلک نکلی۔ "آپ کیا کھانا پینہ کریں گے؟"

"اگر قلعے مل جائیں تو ذرا الحف رہے گا۔" میں نے ذرا

ٹھکانے کی وسعت کا ہی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ستارہ بھی ایک رات یہاں قیام کر کے جا چکی تھی۔ اس نے مجھے جو کچھ بھی بتایا تھا اس کے مطابق یہاں اور بھی بہت سے کمرے تھے۔ ابھی نہ جانے کتنے گوشے ایسے رہے ہوں گے جو ستارہ بھی نہیں دیکھ سکی ہوگی۔

سوچتے سوچتے میرے ذہن کا پورا جمل پن بڑھ گیا لیکن محض سوچنے سے میرے سوا لٹوں کے جوابات نہیں مل سکتے تھے۔ اس لئے نے بہتر سمجھا کہ کچھ دیر واقعی آرام کر لیا جائے۔ اگر وہ لوگ موقع دے دیں تو اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جو ہو گا سو کھا جائے گا۔ اپنے اس پرانے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے میں جلد ہی سو گیا۔

جب نیری آنکھ کھلی تو مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوسکا کہ میں کتنی دیر سوا تھا کیونکہ میری کلائی پر گھڑی نہیں تھی اور کمرے میں بجلی ہوئی سفید روشنی سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس وقت دن ہے یا رات۔ وہ دن کے اجالے اور نیوب لائٹس کی روشنی دونوں ہی سے مختلف تھی۔ اس پر قدرتی روشنی کا بھی گمان ہوتا تھا اور معنوی روشنی کا شبہ بھی۔ وہ پوری چھت سے پھوٹی محسوس ہوتی تھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ چھت میں کہیں روشنیوں نصب تھیں۔ پوری چھت ہی یکساں روشن تھی۔

چند انگڑائیاں اور ہچکچاہٹیں لینے کے بعد میں سیدھا ہوا کر بیٹھ گیا۔ اب میں اپنے آپ کو بالکل آگاہ دم اور توانا محسوس کر رہا تھا جس طرح عام حالات میں محسوس کیا کرتا تھا لیکن میں نے پوری کوشش کی کہ اپنے چہرے پر اضطراب ہی ظاہر نہ رکھوں۔ مستعد اور پوری طرح بیدار نظر نہ آؤں۔

پھر میں نے کن انھیلوں سے دیوار گیر اسکرین کی طرف منہ کیا۔ وہ بدستور سادہ تھا لیکن نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ کوئی آنکھ تھی جو میری غلطی میں جھانک رہی تھی۔

جب لڑکی اس اسکرین پر مجھ سے مخاطب تھی تو اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے میری بھی تمام حرکات و سکنات دکھائی دے رہی تھیں لیکن اس طرح کا اسکرین مکھڑ سرکٹ ٹی وی کیسرے کا بھی کام نہ تھا یہ میری معلومات کے مطابق ممکن نہیں تھا۔

اس بار میں نے اٹھ کر دیواری ٹی وی اسکرین سے چھینر جھاڑی کوشش نہیں کی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیسرے کی آنکھ یعنی کیسرے کا لائٹس کہاں پوشیدہ ہو سکتا ہے لیکن مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا میں نے زیادہ سرگھٹانے کی کوشش بھی نہیں کی اور فیصلہ کیا کہ لڑکی کی ہدایت پر عمل کر کے دیکھنا چاہئے۔

میں نے اپنے بیڈ کے دائیں طرف جڑی ہوئی دیوار کی طرف منہ کیا۔ وہ جھانپنا سلک کی پگھٹی سی دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو ایک خوبصورت کہیں میں حقیقہ محسوس کر رہا

شرکت کرتی ہے۔ آپ کھانا کھا کر چائے پانی وغیرہ پی کر فریض ہو جائیں۔ جب آپ پسند کریں گے تب آپ کو بیٹنگ میں لے جایا جائے گا۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"طیوہا!" میں نے اپنا بیٹ بھرے لیے میں کہا۔ "جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ مجھے تم سے معلوم ہونے کی توقع تو نہیں لیکن پریشی۔ ایک سوہوم سی امید کے سارے پوچھ رہا ہوں۔ میں اور تم اس کمرے میں بند ہیں۔ فرض کو میں اچانک تمہاری اس ڈانک سی خواہمورت گردن پر کرانے کا ایک ہاتھ مار کر اسے توڑ دوں۔ گو کہ میں حسین مخلوقات کے ساتھ اس قسم کی غیر شاندار حرکت کرنے کا قائل نہیں ہوں لیکن انسان ہر حال خطا کا پتلا ہے، کبھی جھوٹا ہٹ میں اچانک اس سے کوئی ایسا ہے اور وہ حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں کیا ہو گا؟"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے کچھ ایسی جھڑکی نظروں سے میری طرف دیکھا تو اس کی محبوب اور نہایت قابل اعتماد ہستی نے دھوکے سے اس کی کمرش خنجر کھونچنے کی بات کر دی۔

ہو۔

بیٹی بیٹی سی آواز میں وہ بولی۔ "سر! ایسا سوچنے کا بھی نہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو یہ کرا آپ کے لئے ایک بھی سہائی قبر میں تبدیل ہو جائے گا۔ بدوشی اور ازکندہ بیٹن بند ہو جائیں گے پند منٹ میں آپ کا دم گھٹ جائے گا اور آپ دیواروں سے سر ٹکراتے ٹکراتے خدائو خدائو مر جائیں گے۔ یہاں کی ہر چیز ان بریک ایل اور فل پروف ہے۔ آپ کوئی دیوانہ تو نہیں سکیں گے کسی جگہ اتنا شگاف بھی نہیں بنا سکیں گے کہ ایک ہاتھ ی باہر نکال سکیں۔ کوئی آپ کو یہاں سے نکالنے نہیں آئے گا بلکہ نہ جانے کتنے دنوں تک کوئی یہ بھی دیکھنے نہ آئے کہ آپ کی لاش کس حال میں ہے۔"

"اور اگر میں تمہیں پر غمال ہاؤں؟" میں نے بدستور شیخی سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں مجھے امید تھی کہ اس کے پاس ایسی کیمیائی یا فضاوی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں ہو گا جیسا کہ معائنہ سائنس نکش پر جتنی ظلوں میں لڑکوں وغیرہ کے پاس ہوتا ہے جس کا رنگہ دہاتے ہی وہ کشوں کے پٹے لگا رہی ہیں "انسانوں کو باپ یا کر اڑا دیتی یا چٹانوں کو روڑہ کھداتی ہیں۔"

اس نے بھی میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "آپ جہاں چاہیں گے میرے پاس کوئی ہتھیار تو کیا، بل کمر تک نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اتنا پالی وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی۔ میں ایک امن پسند، مذہب اور شاکستہ لڑکی ہوں۔ مجھے پر غمال بنانے میں آپ کو ذرا بھی دقت پیش نہیں آئے گی لیکن اس کا نتیجہ بھی وہی ہو گا جو میں بیان کر چکی ہوں۔"

"تم میرے ساتھ ہو کی تب بھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہیں سر۔ اس صندوق میں ایک کے بجائے دو لاشیں پڑی

سکین سی شکل بنا کر کما۔  
"ہٹ۔ لے۔" اس نے اٹکتے ہوئے حیرت سے اپنے منہ میں دہرایا۔ "وہ کیا ہوتے ہیں سر؟"

"اس انسان کی بھی کوئی زندگی ہے جسے یہی معلوم نہ ہو کہ قلعے کیا ہوتے ہیں۔" میں نے ایک لمبی سی آہ بھر کر کہا۔ "جب تم پانی پی نہیں ہو کہ قلعے کیا ہوتے ہیں تو تم ان کا انتظام کیا کر دو گی۔"

"سرا! اگر آپ اسی قسم کی چیزوں کی فراہم کر رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ مجھ کے پاس ہی رہ جائیں گے۔" اس نے منہ باندا کر دیا۔

"مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو خیر! ہم دونوں چیزوں کو تمہو مناسب سمجھو کھا دو۔ بس کوئی حرام چیز مت کھاؤ۔ تمہیں معلوم ہے ہم لوگوں کے ہاں کیا کیا چیزیں حرام ہوتی ہیں اور کیا کیا حلال؟"

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے سر۔" وہ دھکس مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "میں تو ڈیوڈر میں کھانے کو حاضر ہوتی ہوں۔" "میں نے تمہارا نام ابھی تک نہیں پوچھا۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہ بتا سکتے ہیں سر۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"تم امریکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب دینا میرے دائرہ اختیار میں نہیں آتا سر۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور اسکرین سے غائب ہو گئی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ آخر کار دائرہ اختیار یہاں بھی سچ میں آئی گیا تھا، دائرہ اختیار، قدم قدم پر بڑے مسئلے کھڑے کرتا تھا۔

چند منٹ کے بعد وہ ایک خوبصورت ڈرائی کو صرف انگوٹھے اور ایک انگلی کے سوا سارے دھکیلتی ہوئی آن پگنی۔ ڈرائی پر ایک خوبصورت ٹرے میں غصات سے کچھ برتن سجے ہوئے تھے کھانا ذرا انگریزی قسم کا تھا لیکن ہر حال عمدہ تھا۔ میرے کھانا کھانے کے دوران وہ منہ باندا کر دیا۔

چند منٹ خاموشی سے کھانا کھانے کے بعد میں نے سرا خاکہ گئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "طیوہا! جاج تاؤ کیا میری حیثیت یہاں قیدی کی ہے؟"

"ہرگز نہیں سر۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ نے ایسا کیوں سوچا سر کیا مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہے؟"

میں ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس سے کچھ بھی پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جیتنا لگے بندھے، دے دے اور رکی جواب دینے پر آمور تھی۔ پھر بھی میں نے ایک سوہوم سی امید کے سارے پوچھا۔ "مجھے کس لئے یہاں لایا گیا ہے؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو یہاں کسی بیٹنگ میں

ہوں گی۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں بھی کوئی بچا ہے نہیں آئے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں سر۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

ہے۔ ویسے تو میں شریف آدمی ہوں۔ کسی بھی معاملے میں جرح مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ لیکن بہر حال انسان ہوں، خطا کا چکا ہوں۔ ہم تم ایک کمرے میں بند ہیں اور چالان نہ جانے کہاں ہے۔ بلکہ چالان سرے سے ہے ہی نہیں۔ فرض کرو میری نیت خراب ہو جائے۔؟"

"اس میں جبر کی اور اتنی لمبی قید کی کیا بات ہے سر۔" اس کی مسکراہٹ میں خوشی جھلک اُٹی۔ "آپ کو خوش رکھنا میری میزبانی کے فرائض میں شامل ہے اور اگر آپ کی خوشی اس قسم کے معاملات میں ہے تو مجھے اس سے انکار کی اجازت نہیں ہے۔ میں آپ کی خادمہ ہوں۔ غائبہ وسیع معنوں میں۔" وہ میرے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں میں غار سا اثر لگے تھا۔

"غیبہ اب اتنی جلد بازی کی بھی ضرورت نہیں۔" میں نے کمری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "جہاں کمری ہو وہیں کمری رہو۔ ابھی تو میں صرف اپنی مطہرات میں اضافہ کر رہا ہوں۔ کیا چاہی کب تک یہاں رہنا پڑے۔ انسان کو معلوم تو ہونا چاہیے کہ کیا کیا سورتیں اسے میسر ہیں اور کیا کیا نہیں۔"

"سر! آپ بالکل بیک سمجھیں مجھے اپنے گھر پر ہیں۔" وہ دلدارانہ انداز میں مسکرائی۔

"گھر یا دست دلاؤ۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا۔ "مگر میں تو تمنا کیاں ہیں" بے دلتی ہے۔ محبت کی تلاش میں تو مجھے بیشہ دو سروں کے گھر مانا پڑتا ہے۔"

"دوست۔" میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

میں نے اس وقت تک کہا تھا تقریباً قسم کر لیا تھا۔ وہ میرے لئے تحریک جگ سے پانی گلاس میں اڑھٹے لگی۔ اس کے سفید کاغذ کے تمام ٹپن کئے ہوئے تھے۔ مجھے اس کے نہیں لباس میں سے اس کی تمام خوبصورتیاں نمایاں تھیں۔ میرا دل ایک لمحے کے لئے بری طرح دھڑکا لیکن میں نے اس پر قابو رکھا۔ اس کے گلے میں باریک سی زنجیر میں ایک طلائی لاکٹ موجود تھا۔ اس کی ساخت کوٹ کے اسی ٹپن سے مشابہ تھی جو ایک بار اسے فن سے گراؤ کے دوران میرے ہاتھ لگا تھا اور بعد میں وہ نہایت سی چھیدہ ساخت کا ایک نچھا سا ٹرانسپیرنٹ ثابت ہوا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھامے ہوئے کہا۔ "میں وہ احسن ہوں جس کا غیر شادی شدہ ہونا بھی اس کے کسی کام نہیں آسکا۔ میری زندگی کسی شادی شدہ آدمی کی زندگی سے بھی زیادہ بے کیف ہے۔"

"پھر بھی آپ کی گھر فریڈ تو ہوں گی سر۔" وہ بالکل مشتاق لڑکیوں کی طرح شریطے سے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں، بس یونی گراؤ لائق دوچار ہیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔ "لیکن ان میں سے تم جیسی خوبصورت صرف

"بھئی قدر ہے تمہارے ہاں کارکنوں کی؟" میں نے اپنے لیے میں ٹھہر سونے کی کوشش کی۔ "ریڈ ڈاٹ کی صلہ دیتی ہے اپنے جاں نثاری کی خدمات؟"

"میں ریڈ ڈاٹ کی ایک ادنیٰ خادمہ ہوں سر! اگر میری جان کسی کام آجائے تو میں اسے اپنے لئے فخر سمجھوں گی۔ یہ اعزاز ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔" اس کے لیے میں ڈانے بھر کا غلوں اور عقیدت سمٹ آئی تھی۔

مجھے ایسی نظیروں کے بارے میں پڑھ کر کیا کسی بھی ذریعے سے ان کے بارے میں جان کر سخت حیرت ہوتی تھی جو خواہ کیسے ہی مذموم مقاصد کے لئے کام کر رہی ہوتی تھیں لیکن ان کے کارکنوں کا ایمان ہوتا تھا کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ اسٹیج اور عظیم ترین مقاصد کے لئے کام کر رہے ہیں اور وہ بڑی خوشی سے اس راہ میں جان دے کر اس طمانیت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتے تھے گویا انہوں نے غلطیوں کی نہ جانے کون سی بلندیوں کو چھو لیا اور اپنی نوع انسان کے لئے وہ زمین پر نہ جانے کون سی جنت تخلیق کر کے جا رہے ہیں۔

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں قربانی کے ان بکروں کی ٹھیل ہوتی تھی وہ انہیں کون سا مقصد کھول کر پلاتے تھے؟ کون سی گیدڑ دیکھی سکتا ہے جسے کہ ان میں اپنی کوئی قوت فیصلہ اور اپنے طور پر صحیح و غلط میں امتیاز کرنے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ انہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا اور کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ بس وہ نہایت جاں نثاری سے ان دیکھی جینیوں کا ایدھ بننے کے لئے تیار رہتے تھے۔

میرے اپنے سامنے بھی میرے جاں نثار تھے۔ وہ بھی میرے احکامات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے تھے لیکن ان کی اپنی عقل اپنا شعور اور اپنی قوت فیصلہ آزاد تھی۔

مجھے معلوم تھا میں ان سے کوئی غلط کام نہیں لے سکتا تھا کسی کمزور اور بے گناہ پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف ظلم اور زیادتی کا جواب دیتا جانتے تھے یا اپنے دفاع کے لئے جو مناسب سمجھتے وہ کر سکتے تھے۔ میں نے انہیں اس نظریے کے ساتھ زندہ رہنے کی تحریک دی تھی کہ کسی کے ساتھ زیادتی مت کرو اور اپنے ساتھ زیادتی مت ہونے دو۔

پندرہ لکھے اپنی سوجن میں اچھے رہنے کے بعد میں نے کہا۔ "ایک اور فضول سا سوال بھی پوچھتا چاہوں گا۔ تم بھی سوچو گی کہ کیسے عجیب آدمی سے بالا پڑا ہے۔ برسات تم سے ہی ہاتھ جارہا

”یہ ہے۔“ دو چار گراں فریڈز کافی نہیں ہیں سر۔“ اس کی آنکھیں  
 دت سے پھیل گئیں۔ گو کہ اس کے بیشتر تاثرات اوکار پر ہی مبنی  
 تھے لیکن اس کے چہرے پر ہر حال مصیبت تھی اور جب وہ اس  
 لمحہ آنکھیں پھیلاتی تھی تو زیادہ مصوم نظر آتے لگتی تھی۔  
 ”کافی تو نہیں ہیں۔“ میں نے بانی کا کاس خالی کر کے کہا۔  
 لیکن ہم شقی لوگ قناعت پسند ہوتے ہیں۔ حرف شکایت زبان پر  
 نہیں لاتے۔“

وہ حشرم سے انداز میں ہنسی پھرائے گویا میرے الفاظ یاد  
 آئے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہلے۔ ”سرا کیا میں  
 تو بھرت ہوں؟“

”اتنی انجان مت ہو۔ یہ بات مجھ سے پہلے نہ جانے کتنے  
 دن نے کہیں بتائی ہوگی۔“

”نہیں سر۔“ کچھ اتنے زیادہ لوگوں نے تو نہیں بتائی۔“ وہ سلامتی  
 سے ہلے۔ ”ویسے بھی بعض باتیں بار بار سننا کانوں کو بھلا لگتا  
 ہے۔“

میں نے ٹھوکر سے ہاتھ منہ پونچھتے کے بعد کہا۔ ”یہ بات اتنی  
 لمبی لڑکی ہو کہ میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں لے کر کہیں بھاگ  
 دوں۔ چلو تم میرے ساتھ بھاگ چلو۔ مجھے امید ہے ہماری زندگی  
 نہ ابھی گزرے گی۔“

”حیرتی زندگی تو اب بھی ابھی گزر رہی ہے سر۔“ وہ سر جھکا کر  
 لہ۔

”تم اسے زندگی کہتی ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”مجھے  
 لگی تو دور کی بات ہے۔“ اسے تو زندگی کہنا بھی زندگی کی قہر بن لگتا  
 ہے ان مصدقہ لہجہ پر اسرار کمروں میں بندہ جانے انجانے صافوں  
 باہر تھمت میں مڑنا نہ طور پر حاضران کے ایک اشارہ ابھو پر خود  
 لڑکی تپش کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟ تمہیں  
 کسی کے دل کی نگہ میں کر رہنا چاہئے۔ کلی فضاؤں میں لگی و  
 لڑاؤ تم کی جھلک پر اپنے جیون سا بھی کے ہمراہ دوڑتے بھاگتے  
 لہا رہا ہے۔ جس طرح ظہوں میں جھوٹیں سلوموشن میں بھاگتی  
 لگی ہیں۔ تمہارے یہ ظالم ریشمی بال سلوموشن میں لہراتے ہوئے  
 تھے تو صورت لکھیں گے۔“

وہ ایک تنگ میری طرف دیکھنے لگی اور چند لمبے کی خاموشی کے  
 بعد لڑکی سانس لے کر ہلے۔ ”سر ایک تو آپ کے بارے میں یہ  
 اٹھ چلا کہ تب کب سنجیدہ ہیں اور کب مذاق کر رہے ہیں۔“  
 ”وہ تو مجھے بھی پتا نہیں چلا۔“ میں نے صخر پر مسکینی طاری  
 لڑکی کو خشکی۔

”میر حال۔“ اس نے کندھے اچکائے ”میں کسی کے ساتھ  
 کب بھاگ چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ جو کچھ تب دیکھ  
 ہے ہیں ضروری تو نہیں کہ یہی کل زندگی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ

زندگی کا صرف ایک رخ ہو۔ ہو سکتا ہے یہ صرف جاب ہو، ایوٹی  
 ہو، ملازمت ہو۔ اتنی جلدی آپ کیسے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں؟ ممکن  
 ہے میری بھی زندگی کچھ اور ہو۔ ممکن ہے ابھی آپ کی فکر کا سفر  
 محدود ہو۔“

”جو کچھ فکر آ رہا ہے وہ ہر حال بالکل اچھا نہیں ہے۔ مجھے  
 پسند نہیں آیا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تم اس سے بہتر  
 مقام کی جستجو ہو۔“

”کوئی اور بات سمجھئے۔“ وہ بدستور دلکش انداز میں مسکرائے  
 جاری تھی۔ مسکراتے ہوئے وہ چٹکتی ہی نہیں تھی۔

”اچھا۔۔۔ یہ بتاؤ یہاں اپنی نائی کوئی لڑکی بھی موجود ہے؟ وہ  
 پرنس جینین کے نام سے پچھلے دنوں اخبار کان میں ڈانس شو پیش  
 کر رہی تھی۔“ میں نے اس سے کوئی کام کی بات معلوم کرنے کی  
 ایک کوشش اور کر ڈالی۔

میری یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کے تاثرات میں کوئی  
 تبدیلی نہ آئی۔ نجات ملازمت سے وہ بلا تامل ہلے۔ ”مجھے اس  
 بارے میں کچھ علم نہیں۔ میں یہاں صرف ایک ہی بیوی آدمی کی  
 موجودگی سے باخبر ہوں اور وہ آپ ہیں۔“

”وہ؟“ میں نے ابھی سے کہا۔ ”مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ  
 دنیا میں اتنی محدود معلومات رکھنے والی لڑکیاں بھی موجود ہیں۔“

اچانک بیوی اسکرین روشن ہو گیا اور کسی الیکٹرونک آلے  
 کے شکل جیسی مختصر آواز ابھری۔ ”یہ تانے مڑا کر اسکرین کی طرف  
 دیکھا۔ اس زمانے میں ہمارے ہاں کمپیوٹر کا استعمال عام نہیں ہوا  
 تھا۔ اسکرین پر کمپیوٹر کے سے انداز میں تیزی سے چند سطروں پر  
 مشتمل عبارت نمودار ہوئی جو میرے لئے ناقابل فہم تھی۔ اس میں  
 اتنا کچھ لکھا کہ اس میں کہیں کہیں انگریزی کے حرف لکھی سے ملتا  
 جلتا کوئی کوئی لفظ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

لڑکی نے عبارت کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ عبارت اسکرین پر  
 سے غائب ہو گئی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہلے۔ ”سرا اگر  
 آپ تیار ہوں تو بینک میں تشریف لے چلیں۔ آپ کا انتظار ہو رہا  
 ہے۔“

”چلو۔ دیکھ لیتے ہیں تمہارا بینک کا ڈراما بھی۔“ میں نے  
 اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکا سا کھپاؤ آیا جیسے اسے لفظ ”ڈراما“ سن کر  
 تکلیف پہنچی ہو لیکن فوراً ہی اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے  
 ہوا رہے میں ہلے۔ ”آپ تیار ہونا چاہیں تو ہو جائیں“ میں چند  
 منٹ بعد آ جاؤں گی۔“

”مجھے کیا تیار کرنا ہے؟“ میں نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔  
 ”یہاں کون سا میری وائز دلوں موجود ہے کہ میں لباس منتخب  
 کروں، غسل کروں، کون لگاؤں، بریف کیس اٹھاؤں اور پھر چہرے  
 پر ایگزیکٹو اسروں والی سنجیدگی اور محنت طاری کر کے اس بینک

میں شرکت کے لئے روانہ ہوئی جس کے سرپرست کا مجھے علم نہیں۔  
"سر" اگر آپ پسند کریں تو یہ تمام لوازمات آپ کو مہیا کئے جاسکتے ہیں۔"

"لوازمات نہیں" تنکفات کہو۔ "میں نے بھیجی۔" "تو جان کی ضرورت نہیں۔ آج دو بیٹا انداز میں سلیپنگ گاؤں میں ہی بیٹنگ اینڈ کے دیکھتے ہیں۔ کوئی بیٹہ نہیں کہ بیٹنگ کے دوران مجھے نیند ہی آجائے۔"

"نہیں سر" ہمارے ہاں بیٹنگ بہت سنجیدہ اور اہم معاملہ ہوتی ہے۔ آپ بھی اس کے دوران پوری جگہ کی اور ہدایت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کیجئے گا۔" اس نے دھمکے لیے میں کہا۔ وہ گویا دوستانہ انداز میں میرے مفاد میں مجھے نصیحت کر رہی تھی۔

"تم کہتی ہو تو سنجیدہ ہو جانا ہوں ورنہ عام طور پر مجھے اس وقت سنجیدہ ہونا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے جب دو سرول کو حد سے زیادہ سنجیدہ دکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اسی دیوار پر اٹھ کر رکھی جس میں دو اندازہ نمودار ہوتا تھا۔

مجبب بات تھی کہ اس کے اٹھلے رکھنے سے دو اندازہ اس بار بھی نمودار ہو گیا جبکہ میں نے بالکل اسی طرح "اسی جگہ اٹھلے رکھی تھی تو اس میں سوئی سی اسٹرنگ تھی۔ شاید اس مہکینڈم کا انگلیوں کے نشانات سے کوئی تعلق ہو" میں نے سوچا اور سرست ان مسائل کو غیر اہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

میں لڑکی کی رہنمائی میں آگے بڑھا۔ وہ ایک نیم تاریک اور تنگ سی راہداری تھی۔ اس میں تین چار قدم آگے مجھے ایک شافت اوپر جانی اور تاریک بھت میں کہیں غائب ہوئی دکھائی دی۔ شاید اسی شافت کے سارے میرا اسٹرینچ لہا بیٹے بچے تیا تھا۔ اسی کے قریب راہداری میں موڑ تھا۔

موڑ مڑنے کے بعد اچانک ہی ایک دیوار سامنے آگئی۔ یہ سیاہ رنگ کی دیوار تھی اور کسی دھات کی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر صرف ایک سرخ بنٹ نصب تھا جیسا موائٹ لفٹ طلب کرنے کے لئے لگا ہوتا ہے۔ لڑکی نے اس بنٹ کو ٹپ کیا تو اچانک بھت کی طرف سے دائرے کی صورت میں تیز رفتاری روشنی ہم پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو گئی۔

لڑکی خطرے سے انداز میں کھڑی رہی۔ میں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہاں بھی نیم تاریک تھی۔ یہ گویا تھی سے سکوت کا ایک سمندر تھا جس کی میں ہم کھڑے تھے اگر یہ کوئی غارت تھی تو بلاشبہ نہایت عجیب غمراہ تھی۔ اس کا اسٹرکچر اس کا ڈیزائن اور اس کے سائنسی انتظامات تو ایسی جگہ عجیب تھی لیکن ہر قدم پر اس کا نفسیاتی اثر بھی بے حد عجیب تھا۔

ایک انجینی کو اس کے اندر پہنچ کر سب سے پہلا احساس یہی ہوا تھا کہ وہ یہاں قید ہے اور یہاں سے لکھنا تو دور نہ کہ کسی کی مدد

کے بغیر وہ یہاں چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکتا۔ یہ غارت بھول بھلیاں قسم کا ایک کھد معلوم ہوئی تھی جس میں قدم قدم ایک نیا مہکینڈم موجود تھا۔

چند سیکنڈ بعد دیوار بے آواز طریقے سے ہمارے سامنے سے ایک طرف کو کھٹک گئی۔ اب ہم جس راہداری میں داخل ہوئے وہ خاصی چوڑی تھی۔ اس میں دونوں طرف تقریباً عام سائز کی دروازے نظر آ رہے تھے لیکن وہ ذرا مختلف تھے۔ دکھائی دے رہے تھے وہ گار کے دروازوں سے مثلاً معلوم ہوتے تھے فرق صرف یہ تھا کہ وہ بڑے سیدھے اور مستطیل تھے۔

یہاں بھی دیواروں اور دروازوں کا رنگ سیاہی مائل سی معلوم ہوتا تھا۔ روشنی ذرا زیادہ تھی۔ لڑکی نہایت چھٹی سے قدم اٹھاتی چلی بارہی تھی۔ مجھے کھد چشم کا فائن جاننے کے لیے موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ فرش قدرتی پتھر کا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم کھد کسی پھاڑی گھڑی پر چل رہے تھے فرق صرف یہ تھا کہ یہ گھڑی ایک خوبصورت سرنگ میں تھی اور اس پر شہر قسم کا ٹرسٹری کالین بچھا ہوا تھا۔

اس راہداری میں چار منٹ پہلے اور دو موڑ مڑنے کے بعد ہم خاصی بندھ پڑ آگئے۔ اب ہم ایک خاصے بڑے سیاہ دروازے کے سامنے کھڑے تھے جس کے درمیان موجود ایک پارک سی گہر تھاری تھی کہ اس کے دیوار تھے۔ دو دروازے کی بیڑائی پر ایک ٹوک گھڑیوں کے ڈاک کی طرح چند چوکور خانوں کی ایک قطار تھی۔ دائیں ہاتھ پر دیوار میں لٹ کے بنوں کی طرح چھٹیں لگے ہوئے تھے۔

لڑکی نے سرخ بنٹ دیا۔ ایک بار پھر ہم بھت میں کہیں ہم پر تیز رفتاری روشنی پڑی اور غائب ہو گئی۔ پھر دو دروازے کی بیڑائی پر موجود گھڑی کے ڈاک کی جیسے چوکور خانوں میں سے ایک خانہ روشن ہوا اور اس پر اسٹاپ والی طرح نمبر تیزی سے نمودار اور غائب ہونے لگے۔ لڑکی گویا کھد چشم سے بے نیاز ایک تک اس خانے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جب خانہ تاریک ہو گیا تو لڑکی سر جھکا کر دوسری دائیں ہاتھ پر لگے ہوئے رنگین بنوں کی طرف حوجہ ہوئی۔ اس نے تیزی سے چند بنٹ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے ایک خاص ترتیب سے بنٹ دیا۔ تھے کوڑ بیٹیا ہر بار تبدیل ہوتا تھا اور اسے کوئی انجینی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کوئی بھی انجینی اپنے آپ کو ان دروازوں کے درمیان قیدی تو محسوس کرتا ہی ہو گا لیکن یہ بھی محسوس کرتا ہو گا کہ اپنے گائیڈ کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اس لئے گائیڈ کو بلا کر با بے بس کر کے اسے بچ کر گزرنے کا خواب نہیں دیکھنا چاہئے۔ شاید یہی اہم اور اطمینان تھا جس کی بدولت وہ لڑکی ایک ٹیل گزرتک ساتھ لئے بغیر میرے ہمراہ چل رہی تھی۔ اس کے سوا اب تک میں نے وہاں کسی کو نہ دیکھا تھا۔

کے والدین اور اکاری کا مظاہرہ کئے تب بھی لوگ ہتھے ہیں۔

لیکن اس وقت اسے فن بھی چربے پر نہ لے بھری سنجیدگی طاری کئے بیٹھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ آج سنجیدگی اس کے چربے پر ذرا بھل لگ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ادھر ادھر بلند ہوتی ہوئی، آؤی ترمیمی گڈ بنیاسی موجود تھیں۔ ان پر روشنی بہت کم تھی۔ ان میں سے ایک گڈ بنیاسی پر وہ عجیب و غریب روشنی کا چمکنا بھی بیٹھا تھا جس نے کئی بار مجھے بہت پریشان کیا تھا۔

وہ غیر معمولی ملاہتوں اور طاقات کا مالک تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ صرف پولے کی صلاحیت سے محروم تھا ورنہ وہ پوری طرح انسان تھا۔ اور نہایت شاطر و چالاک انسان تھا۔ وہ ایک گڈ بنیاسی کے کنارے پر 'بلندی' پر کھینچے اندر چربے میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ملکر دارا افشار نظر آنے کی پوری پوری شعوری کوشش کر رہا تھا۔ کھینچے اندر چربے میں اور تاریکی کے پس منظر میں 'دور سے وہ بلندی پر کھینچے ہوئی کسی تصویر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

اسے نن سے میں کافی حد تک واقف تھا۔ ایڈم سے میری صرف ایک بار سناہٹ کی بازگاہی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی۔ محترم جوڑا میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ وہ دونوں گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی کے بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رشتی تک نہیں تھی۔

میں نے بے تکلفی سے اسے نن کے کمرے پر ہاتھ مارنے ہوئے کہا۔ "کیا حال ہیں چندا؟"

اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے میرے انداز خطاب سے اسے سخت تکلیف پہنچی ہو۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ باتیں کچھ اس طرح ایک تک میری طرف دیکھتے رہے جیسے اوپر چلنے کے بجائے کچھ لوگوں کے ذرا تنگ دھم میں کوئی اجڑا قسم کا خالص رسائی کس آیا ہو اور "وہ تک تک ویدم دم نہ کشیدم" کی تصویر بنے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہے ہوں۔

چیمپیری کا نام میری مملوکت کے مطابق بلیک ہڈ تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے نن سے پوچھا۔ "کیا آج کے اجلاس کی صدارت اسے کرنی ہے؟"

اسے نن نے گویا خون کے گھونٹ بھرتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور صاف سے بولا۔ "ہیٹہ جاؤ اور عجیبہ رہنے کی کوشش کرو۔"

"ہیٹہ تو میں جاتا ہوں۔" میں نے کرسی پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس جگہ روشنی جتنی کم اور سنجیدگی جتنی زیادہ دیکھنے میں آ رہی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے میں بیمار نہ ہو جاؤں۔ میں لے جاؤں گی بھی بتا رہا تھا کہ جب کوئی مجھے زیادہ سنجیدگی کی نصیحت کرتا ہے تو میرے دل میں گونگیاں ہی ہونے لگتی ہیں۔"

"نی الحال اپنی گونگیاں کو روکو۔" اسے نن آہستہ سے بولا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد لڑکی نے سراخا کر دوہاں پر کور ان کی پٹائی کی طرف دیکھا۔ یوں لگا جیسے کسی ٹیبلے آنکھ نے اس کی کاٹنا شروع کر لیا ہو۔ دوہاڑے کے دونوں ہٹ بے آواز طریقے بائیں بائیں کھٹکتے لگے۔

میں نے لڑکی کے پیچھے پیچھے اندر قدم رکھا۔ آگے موڑے بیٹھے یک اور دوہاڑہ تھا۔ وہ خود بخود کھل گیا اور تب اچانک ہی مجھے اس ہوا کہ میں تو اسی طویل و عریض ہال میں کھڑا تھا جہاں میری کھلی تھی۔

اب وہاں وہ اسٹریٹ لائٹ نظر نہیں آ رہا تھا جس پر میری آنکھ لی تھی۔ اب میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بیڈ کہاں پر تھا اور کہاں سے نیچے کیا تھا۔ اس ہال کی مسافت اور اس کا پانی تاثر اپنی جگہ عجیب تھا۔ اسٹریٹ لائٹ اور اس کرسی کا باپ میں نے اسے نن کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اب کہیں نامہ وہ نشان تک نہ تھا۔

میں لڑکی کی رہنمائی میں چھوٹی سی ایک معمولی پہاڑی کے پہ سے گھوم کر دوسری طرف پہنچا تو اچانک ہی میں نے اپنے پاؤں پر سی ایک سفید میز کے قریب پایا۔ میز کے ایک طرف ۷ نن اور ایڈی بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک مسٹر جوڑا بیٹھا۔ وہ ایک خوبصورت اور باوقار جوڑا تھا۔ دونوں سفید کام تھے۔ وہ تھوڑے فرائی مائل اور سنجیدہ صورت تھے۔ جوانی میں یقیناً یہ ان گنت لڑکیوں کی توجہ نصیب ہوئی ہوگی۔ مگر ابھی وہ جیسے تھا۔ میز کا وہ سرا جس طرف آداب مہفل کے تحت عموماً میزبان تہا، خالی تھا۔ اس طرف جو کرسی رکھی تھی وہ بھی دوسری دیوار سے ذرا مختلف اور خاص معلوم ہو رہی تھی۔ دوسرے رے پر ابھی کرسی خالی تھی۔ لڑکی نے مجھے اس پر بیٹھے کا اشارہ کیا اور اب اس کے لئے مڑ گئی۔

سفید میز پر چھت کی طرف سے کچھ اس طرح وحشیانہ روشنی پڑ لی تھی جس طرح آپریشن میجر میں آپریشننگ ٹیبل پر پڑتی ہے لیکن اس طرح کی بڑی بڑی لائٹس نظر نہیں آ رہی تھیں جیسی ہٹن میجر میں ہوتی ہیں۔ روشنی گویا کسی سوراخ سے آ رہی تھی دیکھتے آتے آتے پھیلتی جا رہی تھی۔ کرسیوں پر روشنی بہت کم نہ۔

میز پر خاصی دو دھیا روشنی ہونے کے باوجود اس گوشے کا نل نہایت خوباناک سا تھا۔ وہاں موجود چار دیواری افراد کے چہروں کو ایسی گہیر سنجیدگی طاری تھی جیسے وہ وہاں کسی قریبی سامع کی لہت کے لئے جمع ہوئے ہوں۔ اسے نن مجھے جب بھی نظر آیا تھا 'عجیبہ اور چمکتا ہوا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شخصیت بھی کچھ لڑکی کہ سنجیدگی اس کے چہرے سے سلی ہی سنیر کھاتی تھی۔ وہ سنجیدہ بھی ہوتا تو اسے دیکھ کر مسکراتے کوئی جانتا تھا۔ جس لڑکیوں میں اگر کوئی مشہور کامیڈن سنجیدہ سین کرنے کی کوشش

۳۳ اور سنجیدگی سے بیٹھو۔ اس وقت کی سنجیدگی زندگی بھر تمہارے کام آئے گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی نامعلوم ڈسپلن کے بہت سختی سے پابند تھے اور مقام و مرتبے کے لحاظ سے غالباً مسٹر جوڑا "ایڈم" اور اے۔نن سے برتر تھا۔ ایڈم اور اے۔نن میں مجھے ایڈم سینئر معلوم ہوا تھا۔ عمر سیدہ مرد اور عورت بدستور گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے لیکن ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے۔

"کیا تمہارے ہاں تعارف کا رواج نہیں ہے؟" میں نے اے۔نن سے پوچھا۔ میں عمر سیدہ مرد اور عورت کے نام جاننا چاہتا تھا۔ زیادہ امکان تو یہی تھا کہ وہ نام فرضی ہوتے لیکن کم از کم کچھ بات تو آگے بڑھتی۔ ان کا خاموشی سے کئے جانا مجھے کراں گزرتے لگتا تھا۔ "تعارف وغیرہ جیسی رسمیات کی ضرورت نہیں۔" اے۔نن بولا۔ "یہی کافی ہے کہ ہم تمہیں جانتے ہیں۔"

چہرے کے لئے باقی سا سکوت چھا گیا۔ میں پھر بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا ہم یہاں کسی تنوعی اجلاس میں شرکت کے لئے جمع ہوئے ہیں؟"

ایڈم نے مجھے گھورا۔ اے۔نن نے بے چینی سے پہلو ہلایا۔ مسر جوڑے کے چہرے بدستور ہر تاثر سے عاری رہے۔ ایڈم نے پہلی بار زبان کھولی اور صاف سختی اور دھمکی بولا۔ "ہیں "باس" دن" کا انتظار ہے۔ ان کی آمد پر میٹنگ شروع ہوگی۔"

"یہ "باس" دن کون ہے؟" میں نے غیر ارادی سے انداز میں پوچھا۔

ایڈم کی گویا سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ یہ کسی آئینہ سے انداز میں ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا۔ "باس" دن۔ "باس" دن ہے۔ تمہارے ملک میں ہماری حکیم کے مرحلہ وار اندازِ جزی میں پہلا امتحان دینا ہے۔ تمام ضروری مسائل کو وہی پتھل کرتا ہے۔ اگر کوئی معاملہ اس کی حدود سے نکل جائے تو پھر اس نوکے سامنے آتا ہے۔"

"اور تمہارے ہاں کل کتنے "باس" ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ایڈم نے عمر سیدہ عورت کی طرف دیکھا گویا اجازت طلب کر رہا ہو کہ اس سوال کا جواب دے دیا جائے یا نہیں؟ عورت کو کہ منہ سے اب بھی کچھ نہیں بولی اور نہ ہی اس نے کوئی اشارہ کیا لیکن شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اثبات میں جواب مل گیا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ہاں پہلی یعنی "پریجیکٹ" ہے۔" میں تین "باس" ہیں۔ "باس" دن۔ "باس" ٹو۔ "باس" تھری۔"

اچانک میز پر سرخ دھنی پھیل گئی۔ میں نے سراغا کر دیکھا۔ جہت سے میز پر پڑنے والی تیز دودھیا دھنی ہی سرخ دھنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہلکا سا ایک ہر بجا۔ دھنی

دوبارہ سفید ہو گئی۔ میں نے دیکھا "ایڈم" اے۔نن اور مسر جوڑا مودبانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اے۔نن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ جب تک مجھے معلوم نہ ہوا کہ آئے والا کون ہے اور وہ احرام کا سٹیفٹ بھی ہے یا نہیں؟ میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے گھورا لیکن میں نے سوچا جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ چاروں دونوں کی طرح اٹھتے ہوئے اور ساکت کھڑے تھے۔

مجھے زیادہ تجسس میں مبتلا نہیں رہتا۔ پاپا کچھ کاٹلے پر چھٹی اور قدری بیٹری سی ایک پھاڑی تھی جو بالکل قدرتی پھاڑی کی طرح کھڑکی اور تارہوار نظر آ رہی تھی۔ اس میں کہیں کہیں گڑھے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس پر گھاس بھی اگی ہوئی تھی اور کہیں کہیں کالی بھی اگی ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ پھاڑی اور اس پر نظر آنے والی گھاس وغیرہ سب کچھ معنوی تھا۔ میرے خیال میں یہ تو مشکل ہی تھا کہ وہ پھاڑی انہوں نے بالکل صحیح سالم نہیں سے لاکر کہاں سے لائی ہو۔

اس پھاڑی کے عقب میں اندھیرا تھا۔ اسی اندھیرے گڑھے سے ایک دراز قد شخص نمودار ہوا اور بچے قد تھکڑے سے "مسٹر" انداز میں میز کی طرف آگیا۔ وہ بالکل اسی طرح نمودار ہوا تھا جیسے اندھیرے نے اسے اپنی کوکھ سے اگلا ہو۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کہاں سے اور کس راستے سے آیا تھا۔

اس کرسی کے قریب پہنچ کر وہ ڈرامائی انداز میں رک گیا اور غالباً اسی کے لئے مخصوص تھی۔ وہ دوسری کرسیوں سے ذرا الگ اور قدرے شاہانہ سی ساخت کی تھی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کڑی تو وہ ٹھیک ہی تھا۔ بس ذرا دراز قد تھا اور اس کے کندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس نے اپنے نہیں اور پیش قیمت سوٹ کے نیچے بھی کوئی موٹا اور دھڑلہ "باس" پہن رکھا تھا لیکن سب سے بڑی وجہ جس نے مجھے ایک تک اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا کچھ اور تھی۔

حیرت کی بات تھی کہ اس کا کوئی چہرہ نہیں تھا۔ اس کے نہایت چوڑے کندھوں کے درمیان سر کی جگہ ایک بہت چھانپا انداز رکھا ہوا تھا۔ میں نے شرمخ کا اندازہ بھی دیکھا نہیں تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ بھی ایسا چھانپا ہوا ہو گا۔ سر اور گردن کی جگہ بس وہ انداز نکلا ہوا تھا۔ اندازاً جہاں اس کی ناک ہونی چاہئے تھی وہاں جلی انداز اور سیاہ رنگ میں "ایک" کا ہندسہ نظر آ رہا تھا۔

اسے دیکھ کر ذہن میں بعضی ذہنی تصور آتا تھا۔ میں اگر اس وقت ان گت سوچوں میں نہ الجھا ہوا ہوتا تو شاید اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس بڑے سے اندازے میں آنکھوں کی جگہ بھی کوئی سوراخ وغیرہ نہیں تھا۔ اس



کے بارود وہ اسی طرح مستعدی سے چلا ہوا آیا تھا جیسے اسے ہر چیز  
اکل صاف نظر آ رہی ہو۔

ایک اچھے بھلے معتقل اور سونڈہ بونڈ و مڑ پر سر کی جگہ ایک  
بے سے انڈے کی موجودگی اپنی جگہ متحکک خیر سہی لیکن اس کا  
ایک عجیب 'خوفزدہ سا کہنے والا اثر بھی تھا۔ مجھے پہلی بار تجربہ  
ہوا کہ اپنے سامنے ایک بھلے بھرتے بے چوہا انسان کو دیکھ کر جسم  
میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی محسوس ہو سکتی ہے۔

چند لمحوں کے لئے گھرا سکتا طاری رہا۔ ہر چیز جیسے اپنی جگہ  
ماکت ہو گئی تھی۔ اس صورتِ بیضا کی آنکھیں نہیں تھیں، کم از  
کم ظاہری طور پر تو نہیں تھیں لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے  
ہم دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے ہارے میں  
اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بے چوہہ ہونے کے باوجود اس کی شخصیت کا اس کی موجودگی  
کا ایک تاثر تھا جسے میں محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میرا یہ کہنا  
ثابہ مراد محسوس ہوا کہ فضا میں متناہسی لہریں ہی دوڑتی محسوس  
ہوئے لگی تھیں۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ باقی چاروں افراد مت بے  
کڑے تھے اور اپنی اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہے تھے۔

مجھے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ "باس دن" اس قسم کی شخصیت  
ہوگی۔ آخر کار وہ خود ہی میری کرسی کے قریب آیا اور مصالحوں کے  
لئے ہاتھ بڑھائے ہوئے ہوا "خوش آمدید مسز افضل چوہدری!"  
میں نے مصالحوں میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ ایک لمحے کے لئے

ہمارے ہاتھ مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسے رہے۔ اس کا  
ہاتھ فزادہ تھا۔ اس کے ہونٹ تو تھے نہیں جو بولتے وقت چلنے  
لیکن اس کی تواضع تک پہنچ گئی تھی تاہم آواز کچھ ایسی ہی تھی جیسے  
کسی کم طاقت کے مایک اور اسپیکر کے ذریعے آئی ہو۔ اس نے  
مجھے انگریزی میں خوش آمدید کہا تھا۔

میں پوری طرح براہِ اخلاقی کا مظاہرہ کرنے پر تیار ہوا تھا۔ میں  
نے اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اس کے احرام میں اٹھنے کی  
زحمت بھی میں نے ابھی تک نہیں کی تھی لیکن ایسا معلوم ہوا تھا  
کہ اس نے میری ان گستاخیوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے اسے  
نہ وغیرہ کہنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی مسز چوہدری!" اس  
کی آواز ایک بار پھر میری سماعت تک پہنچی۔ اگر وہ کسی اسپیکر کے  
ذریعے پہنچ رہی تھی تو وہ یقیناً بہت ہی چھوٹا لیکن نہایت نفیس  
سانٹ کا اسپیکر تھا۔ اس کے ذریعے یقیناً ایک سرگوشی کا زیر و بم  
بھی صحیح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہو گا۔

"میری یہاں موجودگی، بجائے خود میرے لئے بہت بڑی تکلیف  
ہے مسٹر۔"

"باس دن۔" اس نے جملہ مکمل کیا۔ "مجھے پاس دن کہتے  
ہیں۔" اس کی آواز سنائی دی اور دو پلٹ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

"ہاں۔ وہ تو میں سمجھ گیا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔  
"تمہارا چوہدری حساری غم پلٹ ہے لیکن میں سمجھا تھا کہ شاید  
تمہارا عام انسانوں کی طرح بھی کوئی نام ہو گا۔"  
"میں عام انسان نہیں ہوں مسز چوہدری!" اس کی کراہی سی  
آواز ابھری۔ "مجھے عام انسان سمجھنے کی غلطی بھی نہ کرنا۔"  
"عام اور خاص کو تو چھوڑو، میں تو اب تمہیں انسان ہی سمجھنے  
کو تیار نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

ایک ٹھنکنا تاہو اس وقت فضا میں گونجا۔ میرے دونوں طرف  
وہ چاروں افراد سر جھکائے، ہات چروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پاس  
دن کی آواز ابھری۔ "ہی! اگال تمہارا یہ اکثر انداز کھٹو تمہاری  
خوبیوں میں شامل ہے۔ سروسٹ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ  
تم ہر جگہ ہر قسم کے حالات میں بے خوفی سے ٹھٹھو کر سکتے ہو۔  
جہیں اس کی پروا نہیں ہوئی کہ تمہارے مقابل کون شخصیت ہے۔  
ہم تمہارے اندر یہی غلطی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ اس جگہ کے  
آداب کے مطابق تمہارا یہ انداز کھٹو ناقابلِ معافی ہوتا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھے معاف نہ کرو۔ میں اب  
اس روز روز کی کھینچا تانی! افزا قریبی اور خواہ خواہ کے جنس سے  
بیزار ہو چکا ہوں۔ جہیں جو کچھ بھی کرنا ہے کر لو۔ اس وقت تو  
میں مکمل طور پر تمہارے اختیار میں ہوں۔ مکمل مار کے ایک طرف  
پھینکو اور قہقہہ ختم کرو۔ ان پر اسرار سائنسی ٹکشن قسم کے پکڑوں  
لے تو مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ مجھ میں ایک بہت بڑی غای ہے  
کہ میں زیادہ لمبے عرصے پیش برداشت نہیں کر سکتا۔"

ایک بار پھر اس کا ٹھنکنا تاہو اس وقت ابھرا اور وہ بولا۔ "مسز  
چوہدری! اگر ہمیں یہی کام کرنا ہو تو یہ بہت پہلے کسی بھی سروک پر  
ہو چکا ہوتا۔ ہم نے تمہیں دریافت کرنے اور ہر زاویے سے  
تمہاری شخصیت کی اسٹڈی مکمل کرنے میں بہت زحمت اٹھائی ہے۔  
یہ سب کچھ ہم نے اس لئے نہیں کیا کہ تمہیں گولی مار کر کسی آواز  
نہیے کی طرح ایک طرف پیٹھ پٹکا جا جائے۔ تم ہمارا ایک متوقع قیمتی  
اٹاٹ ہو مسز چوہدری!"

"چلو ان لیا۔" میں نے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے اپنی بنیادی  
کو روکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "اب اس اٹاٹ کے لئے  
کیا حکم ہے؟"

"آج یہ سینگ منعقد ہونے کی نوبت آئی ہے تو بات تفصیل  
سے ہوگی مسز چوہدری۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ بولا۔ میں نے  
اسے قریب سے بھی غور سے دیکھا تھا اور اب بھی دیکھ رہا تھا لیکن  
جہی بات یہی تھی کہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ اگر اس کے  
چہرے پر ہنس پڑے تو چہا ہوا تھا تو وہ کس قسم کا مایک تھا؟

اس کی گردن کا ذرا سا بھی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے اس کا  
زیادہ موٹائی والا حصہ نیچے کی طرف تھا اور وہ گویا اس کے بند کالر پر  
ٹکا ہوا تھا۔ بند کالر میں بھی لگی ہوئی تھی۔ اندر سے کاجو حصہ

”مرد انہوں نے ایک آف نیشنز کی جگہ پونا کیلے نیشنل آرگنائزیشن یعنی یو۔ این۔ او۔ پی۔ ایل۔ میں بے کما۔“  
 ”ہاں۔ لیکن یہ تو محض دھمکی کا کام ہیں جو دنیا کی ترقی کے لیے کئے جاتے ہیں اور ان میں دنیا کو بھی شریک کر لیا جاتا ہے۔ گو کہ یہ ادوار بھی صرف سپر پاورز کے مفادات کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اگر انصاف اور قوموں کی برابری کا تصور اس کے پیش نظر ہو تو اس کے مفاد میں دنیا بھر کی شہ نہ رکھی جائے۔“  
 ”میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں۔“ میں نے بڑبڑا کر جواب دیا۔

”لیکن اس خوش فہمی میں مت روتا کہ میں تمہارے ملک کی کیا اس جیسے دوسرے چھوٹے ملکوں کی ہمدردی میں یہ بات کر رہا ہوں۔“ اس نے گویا فوراً ہی میری خوش فہمی دور کی۔ ”بات ذرا آگے چل کر واضح ہو گی۔ یہ میں صرف پس منظر بیان کر رہا ہوں اور کچھ تم سچ میں غیر متعلق چیزوں کا ذکر کرائے جا رہے ہو۔“

پھر وہ خود ہی بولا۔ ”لیکن یہ بھی ایک لحاظ سے اچھا ہے بات اور بہتر طور پر تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ ہم ہمیں سب کچھ صاف صاف بتا دیتے ہیں، کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔“

”جین تم جن چھ ملکوں کا ذکر کر رہے تھے ان کے تم ۲۴ نام نہیں بتائے“ میں نے کہا۔

”وہ میں ابھی بتاؤں گا بھی نہیں۔“ اس نے بے بلا آمل جواب دیا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصل بات جو تمہارے لئے سمجھنا ضروری ہے وہ کچھ اور ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ مری جنگ حکیم سے چھ کلکوں نے سب سے زیادہ سچی بھی سمجھ لیا۔ پھر ان اور بھی بہن گئی۔ اس سے بھی بڑے اور طاقتور کلکوں کے مذاقات کی حفاظت ہو رہی ہے لیکن ان خاہری اختلالات کے علاوہ بھی انہوں نے خفیہ طور پر یہ طے کیا اور ایک طرح کا ”اطلاقی“ سامراجہ کیا کہ وہ آپس میں بھی نہیں لڑیں گے۔ ویسے تو وہ اپنے خاص چیخول کو بھی آپس میں نہیں لڑنے دیں گے لیکن اگر یہ ان کے بس میں نہ ہوتا تب بھی کم از کم وہ چھ بھی ایک دوسرے کو معمولی مگر بڑی بھی نہیں پہنچائیں گے۔“

دوسری عالمی جنگ نے انھیں جو سبق دیا تھا اس کے بعد ان کے لئے اس اخلاقی معاہدے پر قائم رہنا نہایت آسان تھا۔ وہ آج تک اس پر ثابت قدم چلے آ رہے ہیں۔ جنگ کے دوران جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، آج وہ بھی دردِ دردِ ایک دوسرے کے جھڑپوں، غم، خزاؤں اور مفادات کے غمراں ہیں۔ تاہم یہ طے پایا تھا کہ دنیا کو دکھانے کے لئے وہ کبھی کبھی ایک دوسرے پر ذرا آنکھیں کھل لیا کریں گے، غزا لیا کریں گے لیکن چھ مہینے مہینے کے حتیٰ کہ جنگ کے دوران جو ایک دوسرے کے اتحادی تھے ان میں سے دو ملکوں نے تو نہایت کامیابی سے اس ذرا سے اس نورِ انسانی کو اٹا

نبیؐ پلا ہوتا ہے وہ گویا اس کی پنڈرا تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ سائنس کس طرح لے رہا تھا اور اگر سب کچھ دیکھ رہا تھا تو کس طرح دیکھ رہا تھا؟ کیا وہ ماسک پلاسٹک نما کسی ایسے میٹرل سے بنا ہوا تھا جس سے لٹیلٹکس اس کی طرح باہر سے اندر کی طرف نہیں دیکھا جاسکتا تھا؟ البتہ اندر سے باہر کی طرف دیکھا جاسکتا تھا؟ کیا سائنس لینے اور آواز باہر منتقل کرنے کے لئے بھی کوئی نظام اس ماسک کے اندر ہی بنتا تھا؟ لیکن محض اس کی طرف دیکھتے رہنے سے میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد باس دن بولا۔ ”مستر جوہری! تمہارے ذہن میں بہت سے سوالات گھبرا رہے ہوں گے اس لئے میں شروع سے بات کروں گا۔ تم جنہیں معلوم ہی ہے کہ ہر ملک کی کچھ نہ کچھ خفیہ تنظیمیں ہوتی ہیں، اور اسے ہوتے ہیں۔ کچھ صرف ملک کے اندر ہی کام کرتے ہیں اور کچھ حسبِ قیاس ملک سے باہر بھی ادھر ادھر امرتہاں کے گوشے گوشے میں۔ ہر ملک کی ہر چیز اس کی حیثیت اور اوقات کے مطابق ہوتی ہے۔ دولت مند ترقی یافتہ اور بڑے ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں بھی دولت مند ترقی یافتہ اور بڑی ہیں۔“

”خیشے کے سچی بلی اور سی آئی اے وغیرہ“ میں نے لقمہ  
 دیا۔

”ہاں۔ عام لوگ زیادہ تر انہی کے ناموں سے واقف ہیں۔ یہ زیادہ بدنام ہو گئی ہیں۔“ ہاس وک نے کہا۔ ”ویسے چند برسوں سے عالمی افسر پر کچھ اور خفیہ ایجنسیاں بھی ابھر رہی ہیں جو خامے پڑے پڑے اور خطرناک کام انجام دے رہی ہیں۔“

”کیا ریڈ ڈاٹ بھی انہی میں سے ایک ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”جی ہاں، وہ بھی ایک ہے۔“  
 ”اس دن نے کھٹکنا ہوا سا وقتہ لگایا۔ ایک بڑے سے  
 سیٹ اٹھنے سے کھٹکنا تے قہقہے کی آواز منہ بھی ایک عجیب سی  
 نچر تھا۔ وہ گویا میری بات سے محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم نے  
 میری تمہید سے غلط نتیجہ اخذ کیا۔ میں اس طرف نہیں آ رہا تھا۔ یہ  
 کچھ اور خفیہ ایجنسیوں کی بات تو یونہی معنی طور پر درمیان میں آگئی  
 تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خفیہ ایجنسیاں تو اپنا اپنا کام کرتی ہی رہتی  
 ہیں۔“

۱۴ اور دنیا ان کے نتائج بھگتی رہتی ہے۔ ہمیں نے پھر لقمہ دیا۔

”ہاں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ایک لمبے کے توقف کے بعد بولا۔ ”دنیا میں یوں تو بہت سی سفید فام قومیں ہیں لیکن صحیح معنوں میں طاقتور اور قابل ذکر قومیں صرف چھ ہیں۔ باقی فزادہ طاقتور اور مضبوط قوم کے طور پر ابھر نہیں سکیں یا وہ ایک دوسرے میں غلط نظر ہیں۔ جن چھ قوموں اور چھ ملکوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان میں سے کچھ دوسری جنگ عظیم کے دوران انہیں ہر سرسبز بیکار رہے لیکن اس جنگ نے انہیں بہت بڑا سبق سکھایا۔“

مے بھایا کہ آج دنیا کے بڑے بڑے دانشور اور ماہرین سیاست  
کی ایک سمیٹے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ  
پاکستان سے برا ذرا ماہ ہے اور اتنا کامیاب ہے کہ اس نے پوری  
دنیا کو بڑا کولم میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصے سے تو ان دونوں  
ملکوں کی معیشت کا زیادہ واسطہ دار اس نورانی پٹی چلا آ رہا ہے۔  
اس کی آڑ میں انہوں نے جو قائمہ اٹھائے ہیں "اس کا دنیا تصور  
بھی نہیں کر سکتی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج پوری دنیا میدان کارزار بنی  
ہوئی ہے" ان کی اسٹے کی چٹائیاں دن رات چل رہی ہیں "دھڑا دھڑ  
اس طرح رہا ہے جو ان کی معیشت کی ریلوے کی ڈبی ہے۔ لیکن  
انہوں نے خود براہ راست بھی ایک دوسرے کو خراش تک نہیں  
گال۔"

اب میں تصور اس طرح نکال دو واقعی بنیادی سے یہ بات کر رہا  
تھا؟ لیکن میں اس کی بنیادی کا اندازہ کر سکتا تھا؟ بنیادی کا اندازہ  
چرے کے تاثرات سے لگایا جاتا ہے اور وہاں تاثرات تو کیا "چوہی  
نہیں تھا۔ میں نے سفید قلم جوڑے اور انیم کی طرف دیکھا۔ ان  
کے چرے بھی تاثرات سے عاری تھے۔ اب تک کی گفتگو میں  
انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ ابھی تک تو میں سمجھ نہیں  
پاتا تھا کہ میز پر ان لوگوں کی موجودگی کا مقصد کیا تھا۔ پھر میں نے  
سوچا، لیکن ہے یہ ان کے پردوں کو کھل کا حصہ ہو۔

باس دن سلسلہ قلم جوڑتے ہوئے بولا۔ "حسین یہ بھی  
معلوم ہے کہ تقریباً تمام بڑے ممالک نے کچھ چھوٹے ممالک کو تو  
براہ راست اپنی کالونی بنا رکھا ہے۔ وہاں جو بھی نظام آتا ہے، انہی  
کے حکم سے آتا ہے، سربراہ تک انہی کے حکم سے تبدیل ہوتے  
ہیں۔ بعض ملکوں پر اگر گرفت اتنی مضبوط نہیں ہے تب بھی ان کی  
معیشت کو بڑے ملکوں نے اس طرح قرضوں وغیرہ کے جال میں جکڑا  
ہوا ہے کہ وہ ان کے احکامات کی خلاف ورزی کی جرات نہیں  
کر سکتے۔"

"درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"میں کے باوجود چند سال قبل سفید قلم قوموں کے چہ پڑے  
ملکوں نے محسوس کیا کہ دنیا پر جس حد تک ان کی حکمرانی ہے وہ بھی  
اکائی ہو چکی ہے۔ بڑے ملکوں کی معیشت اور سماجی نظام کو بہت سے  
خطرات لاحق ہیں۔ ویسے بھی دنیا بہت بڑی ہے۔ ابھی تک کچھ  
چھوٹے ممالک بڑے ملکوں کے مکمل تسلط سے بچے ہوئے ہیں۔  
بعض ملکوں کی معیشت بہتر ہو جاتی ہے یا وہاں کے سربراہوں کو  
عوامی حمایت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ بڑے ملکوں کو انھیں دکھانے  
کہتے ہیں، چوں چاہاں کہتے ہیں۔ انہیں زیادہ عظیم لیڈر بننے کا  
شوق چرے لگتا ہے۔"

انہیں فوری طور پر ان کی جگہ سے ہٹانا یا کوئی سبق سکھانا اور  
مشکل ہونا ہے۔ اس کے لئے مغربی منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔  
چنانچہ چند سال قبل چہ سفید قلم قوموں کے نمائندوں کا ایک مقام

پر خفیہ اجلاس ہوا جو چند ہفتوں تک جاری رہا۔ ان چہ ملکوں نے  
پانی تمام دنیا پر حکمرانی کو سنبھالنے پر منظم کرنے کے لئے ایک نیا  
طریقہ کار طے کیا۔ برائی پالیسی میں تو یہ تھا کہ جو بڑی طاقت کسی بھی  
حصے، جھگڑے یا حکمت ملکی کے تحت کسی ملک میں اپنے بچے  
کاڑنے میں کامیاب ہو جاتی تھی وہ اس سے جو بھی فائدہ  
اٹھا سکتی تھی اٹھاتا شروع کر دیتی تھی۔ بعض اوقات کوئی دوسری  
بڑی طاقت بھی اسی ملک میں ٹانگ اڑانے لگتی تھی۔

یوں بعض اوقات تو ایک ایک ملک کوئی بھی طاقتوں کا اتحاد  
بن جاتا تھا۔ اس بندر باندھ میں کسی بھی بڑے ملک کو زیادہ فائدہ  
نہیں ہوتا تھا۔ چھینا چھینی میں بہت سے مسائل ضائع ہو جاتے  
تھے۔ چنانچہ پلاننگ تو یہ طے کیا گیا کہ آئندہ جو کچھ کسی ملک میں  
ایک مشترکہ نظام کے تحت ایک دوسرے کو آگاہ رکھ کر کیا جائے

گا۔

اس خفیہ اجلاس میں چہ سفید قلم ملکوں نے پانی ساری دنیا کو  
اپنی مشترکہ کالونی قرار دے دیا۔ طے یہ پایا کہ خفیہ ایجنسیوں کی جو  
کارروائیاں چلی رہی تھیں یا جن جن ملکوں میں طویل المیعاد  
منصوبوں پر کام ہو رہا تھا وہ تو آہستہ آہستہ ان کے نتیجے میں جو  
بھی فائدہ حاصل کئے جائیں گے، جو بھی مال خیمت ہاتھ آئے گا  
اسے ایک مشترکہ فنڈ کے طور پر جمع کیا جائے گا اور سال کے سال  
چہ ملکوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔

اس کی ایک آسمان اور عام فہم مثال کچھ یوں ہو سکتی ہے کہ  
جنگل میں چہ درندے شکار کے لئے نکلے ہوئے ہیں۔ پہلے ان کا  
طریق کار یہ تھا کہ جس کو بھی جو شکار نظر آیا وہ اس پر جھپٹ پڑا۔  
شکار زیادہ سرکش یا جائدار ہوا تو بعض اوقات درندہ اسے زیر  
کرتے ہوئے زخمی بھی ہو گیا۔ بعض اوقات دوسرے دو تین  
درندے بھی اسی شکار پر جھپٹ پڑے۔ جس کے جو ہاتھ آیا لے  
بھاگا۔ کچھ حصہ ضائع بھی ہوا۔ توجہ کھسوٹ میں خود درندے بھی  
زخمی ہوئے تو نانی بھی زیادہ صرف ہوئی۔

اب گویا درندوں نے طے کر لیا کہ شکار خواہ کوئی اکیلا کرے یا  
مل کر نہایت مہربان سکون سے کیا جائے گا کہ نانی ضائع نہ ہو اور  
ایک دوسرے کو گزند نہ پہنچے۔ اس کے بعد نہایت منصفانہ انداز  
میں شکار کے حصے بخرے کئے جائیں گے اور کسی کے ساتھ ناانسانی  
نہیں ہونے دی جائے گی۔ پورے جنگل میں شکار کے سلسلے میں  
جموئی طور پر یہی طریق کار ہو گا۔

تمام ملک اس پر راضی ہو گئے اس کے لئے ایک خفیہ کمیشن  
تاکم کر دیا گیا جو اس نظام کی حکمرانی کرے گا اور خیال رکھے گا کہ  
کسی کے ساتھ ناانسانی نہ ہونے پائے کسی کو اگر نکلاں چیز زیادہ ملی  
ہے تو دوسرے کو نکلاں چیز زیادہ مل جائے کسی جگہ ایک ملک کے  
و مسائل زیادہ ختم ہونے ہیں تو اسے دوسری جگہ اس طرح غلطی کا  
احساس ہو جائے۔"

ریڈ ڈاٹ چاہے، اپنے لئے طلب کر سکتی ہے۔ دنیا کے بہترین  
سائنس دانوں، قابل ترین انجینیئروں اور بڑے بڑے ماہرین  
محاشیات کی خدمات ریڈ ڈاٹ کو حاصل ہیں۔  
یوڑھا ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا،  
خستہ انداز اختیار کرنا چاہتا تھا لیکن میری رگ دوپے میں مسک  
ہی دوڑنے لگی تھی۔ اب گویا مریدہ عورت کے بوسے کی اداس  
ہی۔ وہ نہایت ملائم اور مشتاقانہ لمبے میں ہول۔ ”اگر ہم ضرورت  
محسوس کریں تو ہمیں دنیا کے بہترین دہشت گردوں کی خدمات بھی  
مہیا کی جاتی ہیں۔“

”ریڈ ڈاٹ کے قیام کا مقصد ابھی تک واضح نہیں ہوا۔ میں  
نے کہا۔

”ہم اسی طرف آ رہے ہیں۔“ مریدہ عورت نے گویا بات  
کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پوری دنیا میں اس وقت جو اور  
تیم چل رہا ہے، ریڈ ڈاٹ اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہر ملک میں  
اس کی شاخ موجود ہے۔ یہ ایک ایسا نیٹ ورک ہے، ایسی مشینری  
ہے جس کا کوئی مطلبہ بن دباتے ہی کسی بھی ملک میں اقتدار کا  
توازن تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام نئے انتظامات پر ہماری  
اخراجات آتے ہیں لیکن فائدہ پہلے سے ہی گنا بڑھ گئے ہیں۔ پوری  
دنیا رفتہ رفتہ چمکوں کے کنٹرول میں آ رہی ہے۔ جہاں جہاں کنٹرول  
حاصل کرنے میں کچھ کسر ہے وہاں اس سلسلے میں کام جاری ہے۔“  
میں اس کی باتوں کو محض گپ یا مبالغہ آرائی سمجھ کر ہل کو  
تسلیم بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں جس ماحول میں موجود تھا وہ میرے  
لئے ظلم ہو رہا ہے کہ میں قہراً بشریت میں وہاں ایسی شخصیتوں کا  
استعمال کرتی یا نہ ممالک میں بھی عام نہیں ہوا تھا۔ وہ آج کا دور  
بھی نہیں تھا جب الیکٹرونکس کا سیلاب دنیا میں عجیب عجیب تماشے  
دکھاتا رہا۔ یہ کئی برس پہلے کی باتیں ہیں۔

”جن ملکوں میں تمہاری شاخیں موجود ہیں، کیا وہ ان کی  
موجودگی سے باخبر ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر وہ باخبر ہو جائیں تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے  
گا۔“ مریدہ عورت نے جواب دیا۔ ”دنیا ہماری کالونی ہے اور  
کالونیوں میں رہنے والے، اپنے آقاؤں کے غلاموں کی طرف  
انگلی بھی نہیں اٹھایا کرتے۔ لیکن فی الحال ہم نے ہر جگہ اپنی  
موجودگی کو غیبی ہی رکھا ہوا ہے۔ ہم غریب مزدوری یا خزانہ خزانہ  
دوسروں کی نظریں آتے کو بہتر نہیں سمجھتے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے کہا۔

”تاکیدات کو ممکن بنانا ہی ہمارا کام ہے۔“ بڑھاپا مشتاقانہ  
انداز میں مسکرائی۔ ”ویسے بھی سب ممالک کی نظریں ایک  
دوسرے کی خفیہ ایجنسیوں پر رہتی ہیں۔ ہم اپنی طرف کسی کی توجہ  
مبذول ہونے کی نوبت ہی نہیں آتے دیتے۔ ہماری آمد کے انداز  
ہمارے طور طریقے۔۔۔ سب کچھ بہت مختلف ہے۔“

باس دن اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس  
نے میز کو دو انگلیوں سے ٹکھٹایا۔ یہ گویا مریدہ سفید قام مرد کے  
لئے اشارہ تھا۔ جس طرح اسٹیج پر ایک اداکار سے دوسرے اداکار  
کو کہتا ہے اور اس کے خاموش ہوتے ہی دوسرا یوں شروع کر دیتا  
ہے بالکل اسی طرح مریدہ سفید قام نے کٹکار کر رکھا صاف کیا اور  
مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مسٹر چوہدری! آپ یقیناً  
حیران ہوں گے کہ آپ کو انٹرنیشنل اکاؤنٹینٹس کا یہ سارا پس منظر  
کیوں سمجھایا جا رہا ہے؟“

اتنی دیر بعد ایک انسانی چہرہ مجھ سے مخاطب ہوا اور اس پر کوئی  
تأثر بھی نظر آیا تو مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ پہلی  
بار مجھے اندازہ ہوا کہ ہم لوگ انسانی چہروں اور ان کے اثرات کو  
دیکھنے کے کتنے عادی ہوتے ہیں۔ اگر ایک بہت بڑا سیٹ انداز  
انسانی شانوں پر دھرا، آپ سے دیکھ کر ہم کلام رہے تو شاید آپ  
بھی دیکھ ہی انجمن محسوس کرنے لگیں جیسی اس وقت میں کر رہا  
تھا۔

”نہیں۔ میں کچھ ایسا زیادہ حیران نہیں ہوں۔“ میں نے  
جواب دیا۔ ”میں تو آجکل کو شش کر رہا ہوں کہ حیران ہونے کی  
عادت ہی ترک کروں۔“

یوڑھا مشتاقانہ انداز میں مسکرایا اور بات جاری رکھتے ہوئے  
بولتا۔ ”اس پس منظر کے بعد ہم اس پہلو کی طرف آتے ہیں جس  
سے ہمارا براہ راست تعلق ہے۔ چھ ملکوں نے جو نیا ورلڈ آرڈر تیار  
کیا تھا، اس پر مملکت آد کے لئے کئی بڑے بڑے اداروں کی  
ضرورت تھی جو خفیہ ایجنسیوں کی طرز پر قائم کرائے گئے ہیں۔  
بظاہر وہ سرکاری تنظیموں کے بے ضرر شعبے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان  
کا اصل کام کچھ اور ہے جو وہ کئے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ  
ضروری سمجھا گیا کہ ایک بہت بڑی خفیہ تنظیم بھی قائم کی جائے۔  
بڑے غور و خوض کے بعد اس کا بھی خاکہ تیار کیا گیا۔ اس کا نام ریڈ  
ڈاٹ رکھا گیا۔“

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں تقریباً غیر ارادی  
سے انداز میں بول اٹھا۔ ”کیا یہ نیا کی طرز کی کوئی عظیم ہے؟“  
”اُدھ۔ نو۔۔۔“ یوڑھا دھیرے سے ہنس دیا۔ ”نیا تو بہت  
چھوٹی، بہت پرانی اور بہت مختلف قسم کی چیز ہے۔ یہ اپنی کی طرح  
محرموں اور ناممکنوں کے بڑے بڑے منظم ٹولوں کا نام نہیں ہے جو  
کبھی ایک دوسرے سے چھٹی نہ کر اور کبھی آزادانہ طور پر کام کر  
رہے ہیں۔ یہ ٹولے بعض ملکوں میں حکومتوں کی متوازی اپنا نظام  
چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خود دو جہازوں کی طرح ہیں جبکہ  
ریڈ ڈاٹ کو تو چھ بڑی طاقتوں نے خود دینے کی تشکیل دیا ہے۔ دنیا کے  
بہترین دانشمندیوں نے اس کی منصوبہ بندی کی۔ یہ دنیا کے چھ بڑے  
ملکوں کی سرکاری، انتظامی، سیاسی اور سائنسی طاقت اس کے پیچھے  
ہے۔ چھ بڑی طاقتوں کے جتنے بھی دماغ ہیں ان میں سے جو بھی

اعلا تا نیچے بھی تو ذرا بہت مذاق کرنا چاہئے۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں اور جس قسم کی سیاست کا نقشہ میں نے گزشتہ برسوں میں ملک میں ابھرتے دیکھا ہے، اس کے بعد میں ویسے ہی اپنے آپ کو اس "عظیم سیاست" میں حصہ لینے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس سے پہلے کہ کوئی حکومت مجھے مائل قرار دیتی، میں نے خود ہی اپنے آپ کو مائل قرار دے لیا ہے۔ میں نے تو بھی جیمز آف کمرس کا الیکشن لڑنے کے بارے میں بھی نہیں سوچا، جہاں میری اچھی خاصی اہمیت ہے اور بار بار دوستوں نے مجھ پر زور بھی ڈالا کہ الیکشن میں حصہ لیں لیکن میں نے سختی سے منع کر دیا۔ تم مجھے سربراہ مملکت بنانے پر تلے ہوئے ہو۔"

سب خاموش رہے، گویا مجھے اچھی طرح بول لینے کا موقع دینا چاہتے ہوں۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد میں نے اپنے موقف کی مزید وضاحت کے لئے کہا۔ "سیاست بالکل نظام میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے انسان کا کوئی مخصوص بیک گراؤ نہ ہوتا چاہیے۔ کوئی جاگیردار یا دُورہ سیاست میں حصہ لیتا ہے، آگے آتا ہے، ہمارے ہاں سیاست میں غلبہ لیڈر لائڈز کا رہا ہے۔ کبھی کبھی کسی تیز رفتار اور ہنگامی دور میں تو بڑے بہت بڑے مفلس بھی آگے آجاتے ہیں لیکن آتے بہر حال جیسی ہیں جب وہ سیاست میں حصہ لیتے رہے ہوں۔ یا پھر ایک تیسری قوت اچانک اقتدار میں آجاتی ہے۔ اس کے بارے میں تم یقیناً جانتے ہو گے لیکن میرا ان تینوں طبقوں سے کوئی تعلق نہیں، میری کوئی سیاسی پارٹی نہیں، حتیٰ کہ میں تو سیاسی ورکر تک نہیں۔ میں نے تو کبھی کسی کو الیکشن لڑنے کے لئے قابل ذکر چندہ تک نہیں دیا۔ تو آخر میں کس جھجک سے آؤں گا؟ کس طرح سربراہ مملکت بن جاؤں گا؟ جبکہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ میں اپنے آپ کو اس حربے کے قابل نہیں سمجھتا۔ میری اس طرح کی کوئی تربیت نہیں ہوئی۔"

باس دن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ باقی چاروں کے چہروں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ نکلی۔ انہوں نے گویا بڑے قہقہے سے میری تقریر دل پذیر بنی تھی اور اس سے محظوظ ہوئے تھے۔ میں نے اپنی دانست میں انتہائی سنجیدگی اور بالغ نگاہ سے جو باتیں کہیں وہ ان کی نظر میں گویا محض ایک بچے کے ذہنی الجھانے کے لئے پڑھائیاں تھیں۔

باس دن اب نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "ہم نے سربراہ مملکت کا نقطہ استعمال کیا اس اصطلاح سے جس میں لفظ "غیر سیاسی" ہم نے اسے غیر رسمی مفہوم میں ایک علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ہماری نظر میں سربراہ مملکت وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے اختیار ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس نے سے بڑے بڑے انتہا بات آتے ہیں۔"

"سیاسی نظام میں اس قسم کے اختیارات اس قسم کی طاقت تو

"پھر بھی۔ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے؟" میں نے قدرے بے یقینی سے کہا۔ "۳۲ برس سے انتخابات اتنے بہت سے غیر ملکیوں کی موجودگی۔ کیا یہ سب ہماری کسی ایجنسی کی نظر میں نہیں آتا؟" "نہیں۔" اس بار جواب ایڈم نے دیا۔ "ہم نہ جانے کس کس آؤ میں آتے جاتے رہتے ہیں اور کس کس منصوبوں کی آؤ میں اپنے کام کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ سب کچھ بہت آسان ہے۔ اتنی بد انتظامی اور افراطی نظری ہے یہاں ہر وقت ایک فتنہ ساز رہا کرتا ہے۔ غیر ملکیوں سے سرعیت بہت زیادہ ہے۔ یہاں تو ہمیں کبھی کوئی خاص دشواری محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ہم تو ان ملکوں میں بھی سرایت کر چکے ہیں جہاں سیکورٹی کے انتظامات اور خفیہ ایجنسیوں کی کارکردگی بہت بہتر ہے۔ دنیا تو سی آئی اے اور کے۔ بی۔ لی ٹائپ ایجنسیوں کی بد ساشیوں پر ہی حکومت بُرے انداز میں چلتی ہے۔ ہم تو ان سے بہت آگے کی چیز ہیں۔ ہم اس پیکر میں مت پر دہ کر رہے ہیں جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ کیسے کرتے ہیں۔ بس ہم کر لیتے ہیں۔ حاکمیت ہمارے سامنے ہیں۔ ہمارا یہ ایک چھوٹا سا پراچہ آئرس ہمارے سامنے ہے۔"

"یہاں ہمارے کتنے لوگ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"خاموش ہیں۔" ایڈم نے جواب دیا۔ "اور بہت ضرورت آتے جاتے بھی رہتے ہیں۔" اس کا جواب گول مول تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صحیح تعداد بتانا نہیں چاہتا۔

"میں اس سارے پیکر میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

ایڈم نے باس دن کی طرف دیکھا۔ اب غالباً پھر اسی کے بولنے کی باری تھی۔ وہ ایک عجیب سے ہنسنے کی طرح مسکرت ہنسا تھا۔ اس کی آواز ابھری۔ "کم از کم اس ملک کی حد تک" اس پیکر میں ہماری حیثیت بہت اہم ہے۔ ہم نے ہمیں سربراہ مملکت بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

میں واقعی اپنی کرسی سے توڑا سا اچھل پڑا۔ پھر مجھے کسی آہنی لیکن ان چاروں کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ باس دن کے "چہرے" پر تو کوئی تغیر آئی نہیں مسکا تھا۔ باقی چاروں نے میرے ہنسنے پر اس طرح میری طرف دیکھا تھا جیسے اچھا خاصا برا مناتے ہوئے پوچھ رہے ہوں اس میں ہنسنے کی بجائے کیا بات ہے؟ میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔ "یار! مجھے اس سہ جھوٹا کوئی مدد دے دو" میں اسی پر خوش ہو جاؤں گا۔"

اس بار باس دن کی آواز ابھری تو اس میں ہلکی سی ناگواری شامل تھی۔ "اب تک یہاں جو کھنگو ہوتی رہی ہے" اس کے بعد غالب اس مخصوص موضوع کے بارے میں مذاق کی گنجائش نہیں دیتا۔

"جب تک کھنگو سنجیدہ تھی تب تک میں بھی سنجیدہ تھا لیکن اب تم نے مجھ دو دلیں سے مذاق شروع کر دیا ہے تو جواب میں

سربراہ مملکت کے پاس صرف صدارتی طرز حکومت میں ہوتی ہے۔ پارلیمانی طرز حکومت میں تو زیادہ طاقت پارلیمنٹ کے پاس ہی ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔

”درست ہے۔“ پاس دن مہینہ بے میں بولا۔ ”اس لئے ہم اس قسم کے سربراہ مملکت کی بات ہی نہیں کر رہے۔ نظام تو جہاں جو چل رہا ہے، پتہ رہے گا۔ یہاں حالات کے مطابق۔ اور دنیا کو دکھانے کے لئے جہاں جس قسم کا نظام ضروری ہو اور لایا جائے گا لیکن ہم نے جو نیا عالمی نظام ترتیب دیا ہے اس میں ہم نے ان لیے چکروں کے ساتھ ساتھ ہر ملک میں ایک ایک شارت کٹ بھی رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پاکستان میں شارت کٹ تم ہو گے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

”ہر ملک میں ہمارا جتنا قتلہ ہے وہ تو اپنی جگہ ہے ہی لیکن وہاں ریڈ ڈاٹ کی موجودگی کا مقصد یہ ہے کہ وہاں کے اقتدار پر زیادہ سخت اور زیادہ قریبی کنٹرول رکھا جائے۔ ہر ملک کو وہی کرنا ہو گا جو ریڈ ڈاٹ چاہے گی۔ کسی بھی ملک کا برسر اقتدار طبقہ ریڈ ڈاٹ کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھائے گا اور ریڈ ڈاٹ اس مقصد کے لئے ہر جگہ ایک مقامی شخص کو آگے رکھنا چاہتی ہے۔ عملی طور پر دراصل وہی اس ملک کا حاکم ہو گا۔ باقی سب چیزوں کو دکھاؤ سمجھ لو۔ اسی کا رد و انیاں سمجھ لیا غائب پری سمجھ لو جس میں بہت سے لوگ اپنا شوق پورا کرتے رہیں گے اور اپنا اپنا حصہ وصول کر کے جاتے رہیں گے۔“

”ہم جس مقامی شخص کو اپائنٹ کریں گے اسے اتنا طاقتور بنادیں گے کہ اس کی مرضی کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہو گا۔ ملک میں پتہ ہمارے نظام کے مطابق حکمران طبقہ حکمرانی کر رہا ہو گا لیکن ان کے اوپر وہ ایک شخص حکمران ہو گا مشیر چوہدری! جس کی کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہوگی“ جس کا سیاست میں کوئی کردار نہیں ہو گا لیکن یہی پردہ حکم اسی کا چلے گا۔“

”اور اس کے اوپر ریڈ ڈاٹ کا حکم چلے گا؟“ میں نے بنور پاس دن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بات کو اس طرح کہنے سے کچھ اور تاثر ملتا ہے۔ جیسے وہ شخص ریڈ ڈاٹ کی کٹھ پتلی ہو گا۔“ پاس دن نے پر خیال لیے میں کہا۔ ”لیکن تمہارا یہ خیال درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ریڈ ڈاٹ کے ضابطہ اخلاق کا پابند ہو گا جو خود نے عالمی نظام کی پابند ہے۔ لیکن وہ اپنی جگہ بہر حال ایک بہت بڑا آدمی ہو گا۔ وہ کافی حد تک ایک آزاد شخصیت ہو گا۔ اپنی مرضی سے بھی فیصلے کر سکے گا۔ اپنی بہت سی خواہشوں کے تکمیل بھی کر سکے گا۔ اس کی کوئی حرکت ریڈ ڈاٹ۔ یا دوسرے لشکروں میں یوں کہو کہ چھ حکمران ملکوں کے مفادات کے خلاف نہ جاری ہو۔ بس صرف اس بات کا خیال رکھتے ہوئے وہ ہر طرح سے آزاد ہو گا۔ تم شاید تصور نہ کر سکو کہ وہ کتنا طاقتور شخص ہو گا۔“

”یہ تو میں تصور کر سکتا ہوں لیکن یہ نہیں سمجھ پا رہا کہ اسے اتنا طاقتور کس طرح بنایا جائے گا؟“ میں نے کہا۔

”یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ تم صرف اس طرح کہتے رہو جس طرح تمہیں ہدایات ملتی رہیں۔“ پاس دن نے جواب دیا۔

”اور وہ ہدایات کس قسم کی ہوں گی؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”یہ ابھی تو نہیں بتایا جا سکتا۔ جب تم اس پوزیشن پر قائل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ گے، وہ قیاداری کا حلقہ اٹھائے گے، چند ضروری کاغذات سامنے کر دو گے، تقریباً چھ ماہ کی ایک خصوصی تربیت لے لو گے تب جا کر ہدایات ملنے کا مرحلہ شروع ہو گا۔“ پاس دن خاموش ہو گیا۔

اس خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے نے پہلی مرتبہ مکتھو میں حصہ لیتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”اپنی! تم تصور نہیں کر سکتے کہ تم کسی قدرت اور طاقت کے مالک ہو جاؤ گے۔ عملی طور پر کسی ملک کا حکمران ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔“

”خواہ وہ چھ ملکوں کا لے پاکستان ہی کیوں نہ ہو۔“ میں نے کہا۔ وہ گویا میرے الفاظ پر توجہ دے نہیں بولا۔ ”اسی یہ چھٹی سی بڑی لگتی ہوگی لیکن اس ملک میں ہمارے خاص اہم آدمی بن جانے کے بعد یہ سب چیزیں تمہیں اونٹ کے منہ میں ڈیرے کی طرح محسوس ہوں گی۔ تمہیں خود بھی اندازہ نہیں رہے گا کہ تمہاری دولت و جائیداد کتنی ہے۔ دولت اور جائیداد سے قطع نظر طاقت کا جو نشہ ہوتا ہے، کوئی بھی نشہ اس کا قیابل نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اس کے اشارے پر رنج و سخت لرز جاتے ہیں، اس کے سرور کا تم اندازہ نہیں کر سکتے کہو کہ ایسا بننے کا تم نے بھی خواب تک نہیں دیکھا۔ تم ایسے کسی شخص کے قریب سے بھی نہیں گزرے۔ وہ بادشاہ نہیں ہوتا، بادشاہ گر ہوتا ہے۔“

”اس عقیم مرتبے پر قائل کرنے کے لئے تم لوگوں کی فائدہ انتخاب مجھ غریب پر ہی کیوں پڑی ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہم تمہیں خوش فہمیوں میں جلا نہیں کرنا چاہتے لیکن جائز تعریف کے بہر حال تم متفق ہو۔“ اسے نے یہ دستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تمہیں شاید خود بھی اپنی ملا جلیوں کا اندازہ نہ ہو کہو کہ ابھی تم نے اپنے آپ کو چلی چل رہی رکھا ہوا ہے۔ تم ذہین، بے خوف اور جسمانی و اعصابی طور پر غیر معمولی حد تک مشروط انسان ہو۔ خوف گویا تمہاری سرشت سے ہی کھل چکا ہے۔ تم میں چیزوں کو، ارادوں کو اور افراد کو منظم کرنے کی، آڑ کھانز کرنے کی بھی بے پناہ صلاحیت ہے۔ ہم نے تمہیں ایک عرصے تک پرکھا ہے۔ تم براہ اعتبار سے ہمارے آئینیل آدمی ہو! محض چند مہرے!“

میں ایک ٹیک اسے تن کی طرف دیکھا رہا۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ شخص اس حد تک مجبورہ بھی نظر آسکا ہو گا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "کوئی زمانہ تھا کہ نازک اور بین الاقوامی فیس واریوں کے لئے بوڑھے اور گرگ بارداں دنیا قسم کے لوگوں کو موزوں سمجھا جاتا تھا لیکن جو نیا عالمی نظام ترتیب دیا گیا ہے اس میں غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نوجوانوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اور دی جا رہی ہے۔"

اس کے لیے میں جتنی ترغیب بھی وہ واقعی کسی کو دے گا اس سے زیادہ دے خود کر دینے کے لئے کافی تھی لیکن میرے ذہن میں اس وقت ایک کھینچن اثر تھا جس کے اسکرین پر ہند سے جمل بچہ رہے تھے، الفاظ اور جملوں کا تجربہ ہو رہا تھا۔ ان کی ہر بات میری اداشت میں محفوظ ہو رہی تھی۔

پھر اس دن گویا معجزہ ہوئے کی موجودگی کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بڑا ذات میں جہاں جہاں بھی عمر کے لوگ موجود ہیں وہ صرف مشکل معاملات میں مشاورت کے لئے ہیں۔ انہیں فنی ذمے داریاں نہیں سونپی جائیں۔ ان میں سے ہر ایک عموماً کئی کئی شعبوں کا ماہر ہوتا ہے۔" اس نے معجزہ ہوئے کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں عالمی مشیر قسم کی ہی چیز تھے۔

اس دن بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ان کی اہمیت ہر حال عملی کام کرنے والوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو صرف ان کے مشوروں کے تحت کوئی بہت بڑا پروجیکٹ کوئی بہت بڑا منصوبہ ترک کر دیا جاتا ہے جس کی منظر پر ادب والے دے پچھتے ہوتے ہیں۔"

میں نے بظاہر سرسری لیے میں پوچھا۔ "یہاں کوئی آجینسی تمہاری موجودگی سے واقف نہیں ہے؟"

"تم اس پیکر میں مت ڈرو۔" اس دن کے لیے میں بھی سی بی آر کی جگہ آئی۔ "یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں اگر تم کسی قسم کے خوف کے تحت یہ سوال کر رہے ہو تو ہمیں حیرت ہوگی کیونکہ ہمارے تجربے کے مطابق خوف تمہاری سرشت میں شامل ہی نہیں ہے۔ ہر حال۔ اگر تم اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی بھی اہم فیصلہ محسوس کرتے ہو تو اسے ذہن سے نکال دو۔ ہمارے ساتھ تو تمہارا مستقبل اتنا ہی محفوظ ہے جتنا کسی بھی سپر ہائر کے سربراہ کا۔ جب کوئی ہمارا ہم سفر بنتا ہے تو اندیشے اس کی زندگی سے رخصت ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم نے جب نیا عالمی نظام ترتیب دیا تو کئی برس تک ہر پیکر پر غور و خوض جاری رہا تھا۔ ہم نے ہر چھوٹے سے چھوٹے اندیشے کا حل سوچ لیا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ نہ تھیں۔ ہرے چھ ممالک کسی ایک ورلڈ انڈیا پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ کیا ہر بڑا ملک یہ نہیں چاہے گا کہ وہ ایک ایسی پوری دنیا پر تسلط حاصل کرے؟ آج تک تو کسی کو خشیت ہوئی کئی ہیں۔"

"انہی کو خشیتوں اور کھینچاؤ کی فوجوں کی حالت زیادہ بری تھی اور فائدہ کم تھا۔" اس دن نے جواب دیا۔ "ہر بڑے ملک نے یہ دیکھ لیا ہے اور محسوس بھی کر لیا ہے کہ کسی کے لئے بھی تمام پوری دنیا پر تسلط برتنا مشکل ہے۔ برطانیہ کی مثال سب کے سامنے ہے۔ اس کا تو براہ راست پوری دنیا پر قبضہ تھا۔ ہر جگہ اس کے اپنے حاکم موجود تھے۔ یعنی یہ ان ڈائریکٹ یا عوامی ڈیپٹیوں کے ذریعے کسی ملک کو اپنی کالونی بنانے والا سلسلہ نہیں تھا بلکہ انہی کا کہنا تھا 'انہی کا قبضہ الہامی تھا۔ اور ان زمانوں میں جہالت و پسماندگی بھی زیادہ تھی۔ جہاں جہالت اور پسماندگی زیادہ ہو وہاں حکومت کرنا اتنی ہی آسان ہوتا ہے۔ لوگوں کو لڑوائے رہو اور حکومت کرتے رہو لیکن اس کے باوجود کیا ہوا؟"

وہ ایک لمبے کے لئے خاموش ہو گیا۔ یقیناً وہ میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن نہ جانے کس طرح؟ پھر اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "وہ برطانیہ جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا" اس کا عالم یہ رہا کہ ایک ملک کو قابو میں کرنا تھا تو دوسرا ہاتھ سے نکلنے لگا تھا۔ دوسرے کو سنبھالنا تھا تو تیسرا آٹھنیں دکھانے لگا تھا۔ آخر ایک ایک کر کے سبھی ہاتھ سے نکل گئے اور انگریزوں کا جو جانی نقصان ہوا وہ الگ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ "اب تو ویسے ہی نہاندہ زخمیں بکھری ہوئے ہیں۔ یہ مداخلت اور مداخلت کا دور ہے۔ پسماندہ ترین ملکوں میں بھی تھوڑی بہت تعلیم، تھوڑا بہت سیاسی شعور اور تھوڑی بہت بیداری موجود ہے۔ اس لئے یہ بات تو بڑے ملکوں نے بہت پہلے محسوس کر لی تھی کہ چھوٹے ملکوں میں اپنی فوجیں بھیجنا مجتہد الہامی اور زیادہ الجھنیں مول لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ شوق پورا کئے بغیر بھی جو فائدے اٹھائے ہوں وہ اٹھائے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتے رہیں گے اپنا مجتہد الہامی رہیں گے اور اپنی جگہ خوش رہیں گے انہیں خوش رہنے دو" اس میں کیا حرج ہے؟"

میں اپنے سینے میں کھنکی کو چھپائے خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "لیکن سیاست کا شعور رکھنے والے صاحب علم لوگ جانتے ہیں کہ چھوٹے ملکوں کی حیثیت کہیں کی سی اور ان کے سربراہوں کی حیثیت ریفرنٹ ڈائریکٹروں جیسی ہو چکی ہے۔ ان کے لئے کسی ملک ہے کہ تو کسی کریں 'اپنا وقت پورا کریں' جیسے بھڑکے اور جاں میں کوئی بھی ڈائریکٹراں قوم میں حتمی بیداری حتمی آزادی کی خواہش یا حتمی خوشحالی کی انگ بیدار کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

اس نے ایک لمبے توقف کیا پھر بولا۔ "جب یہ طے ہو گیا اور کافی سالوں تک اس نظام پر خاصی حد تک کامیابی سے عملدرآمد ہوتا رہا تو پھر اس میں مزید اصلاح کی گنجائش تھی۔ بڑے ملکوں نے نئی پالیسی وضع کی اور ان کے بہترین دماغوں نے یہ نتیجہ اخذ کر کے

وہ ہاتھ دیاں میز پر نکالتے ہوئے بولا۔ "مہتر ہے کہ ہم اسی موضوع پر اپنی گفتگو ختم کر لیں۔ اس موضوع سے حلقہ ختم کی بجائے پہلو پر کوئی بھی سوال کر سکتے ہو۔"

"ہم نے کمال فراخ اندلی سے مجھے ایک بہت بڑے اور غلط فہمی والی راز سے آگاہ کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بات تو خیر اب کوئی راز نہیں کہ سپر پارڈز جاکے بجائے چھ ہو گئی ہیں اور انہوں نے کوئی نیا عالمی نظام ترتیب دیا ہے لیکن وہ عالمی نظام کیا ہے؟ اس بارے میں صرف انہوں میں مشہور ہیں۔ قیامت لگائے جا رہے ہیں۔ دنیا بھر کے دانشور اور صحافی اس پر اپنے اپنے اندازوں اور کچھ بوجھ کے مطابق تجزیے اور مضامین لکھ رہے ہیں۔" مہتر مڑبولا۔

"مقصود کیا ہوا؟" ہماری گفتگو کا بیشتر حصہ خفیہ ہے؟ میں نے کہا۔

اس بار جواب اس دن سنے دیا۔ "ہاں۔ اسماعیلی خفیہ۔ اس گفتگو کا ایک نقطہ بھی باہر نہیں جانا چاہئے۔"

"لیکن میں باہر جاؤں گا تو باتیں بھی باہر جا سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ان باتوں کا راز دینا تمہاری زندگی کی ضمانت ہے مگر چھوڑی؟" اس دن کے لیے میں ایسی سو مری در آئی جو مجھ جیسے انسان کی رگ و پے میں بھی ہلکی سی سستی دھڑانے کے لئے کافی تھی۔ کچھ دہان کے دھندلاہٹ زندہ ماحول میں بھی بڑی مشکل تھی۔

ایڈم نے بھی کھڑا لگایا۔ "اسی زندگی کی قیمت پر تم کوئی راز افشاء کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ گو کہ ہمارا نظام ایسا ہے جس میں تمہارے باہر جا کر باتیں کرنے سے تمہارے لئے کوئی خاص فائدہ نہیں پڑے گا لیکن ہم محض اپنے دلچسپی کی خاطر تمہارے وجود کو صفحہ اسی سے مٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اس دن بولا۔ "لیکن ہم تم سے ایسی توقع نہیں کر سکتے کہ تم نے تمہیں اپنے لوگوں میں شمار کر لیا ہے اور جب کسی کو اپنا کہہ دیا جائے تو اسے اس قسم کی حرکت نہیں کرنی چاہئے۔"

"لیکن تم نے کس بنیاد پر مجھے اپنے لوگوں میں شمار کر لیا؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔ "کیا میں نے بھی تم لوگوں میں دلچسپی ظاہر کی؟ جب سے ریڈ ڈاٹ کا کام میرے علم میں آیا ہے کیا میں نے بھی اس کے بارے میں دوستانہ جذبات یا محض جنس کا بھی اظہار کیا؟"

"نہیں۔" ایڈم نے تسلیم کیا۔ مجھ سے فون پر پیشہ اسی کا رابطہ رہا تھا۔

"تو پھر یہ ایک طرف نظر رکھ کر کیا ہے؟" میں نے جانتا چاہا۔ "اب سے پہلے بات کچھ اور تھی۔" اس دن بولا۔ "اب سے پہلے ہم نے یہ ملک پلیٹ میں رکھ کر تمہیں خوش نہیں کیا تھا۔" میں نے جانتا بھی نہیں کہ کوئی اس ملک کو پلیٹ میں رکھ کر

دیا کہ بل کر کھانے میں زیادہ فائدہ ہے۔ اس طرح تعلق زیادہ مضبوط ہو گا؟ زیادہ دیر تک پہلے کا دور مسائل کم شائع ہوں گے۔ بس اس کے نتیجے میں ہم تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خیال میں سامنے کی یہ ہینڈا کب تک پہنچے گی؟ سپر پارڈز کی یہ "ہینڈلنگ" کتنی "ٹوٹ" بھی تو سکتی ہے۔ ہر ملک کی انفرادی دوزخ دہا بھی تو شروع ہو سکتی ہے۔ کوئی ایک ملک اس سارے ورلڈ آئڈز کو تنہا اپنی ملٹی میں دلوچے کی اس میں بھی تو جھلا ہو سکتا ہے؟"

"ان سب پہلوؤں کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔" اس دن بولا۔ "میرا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر ہوا بھی تو اس میں صدیاں لگ جائیں گی۔ اتنا براڈ سیٹ اب ہے۔ اس کو نوٹے بکھرنے کے لئے بھی بیگزین سال درکار ہوں گے۔ ہمیں اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہم انہی بہت پرست انسانوں کی بھی تو مشکل ہے۔" میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا۔ "ہم ہر چیز کے بارے میں اندازے اپنے معاملوں" اپنی کاغذی رپورٹوں" اپنے شاندار انتظامات" اپنے کسیبوں کے حسابات اور اپنے وسائل و فیو کی مدد میں لگاتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک نظام اوپر آسمانوں میں بھی کام کر رہا ہے جس کے تحت یہ کائنات چل رہی ہے۔ ہم تو بیٹھے اپنے فیصلے کرتے رہتے ہیں، ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ اوپر آسمانوں میں کیا فیصلے ہوتے ہیں۔ ہم زمینی حقوق" حقیر انسان زمین پر بیٹھے حساب لگاتے رہتے ہیں کہ فلاں کام کے لئے صدیاں درکار ہوں گی لیکن اوپر سے اشارہ ہوتا ہے تو وہ کام برسوں" مہینوں" ہفتوں یا ہلکے جھپٹے میں ہو سکتا ہے اور جس کام کو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ چکی بجاتے ہیں ہو جائے گا وہ بھی ہوس نہیں پاتا۔ اس لئے ذرا اس دن! اتنے دقتوں سے کوئی بات مت کہو۔"

وہ پہلی بار ذرا کھل کر ہنسا۔ کم از کم اس کی آواز سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ مکمل کر رہی رہا تھا۔ مہر جو ذرا بھی مسکرا رہا تھا اور زیادہ توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی قسمی تو اس دن بولا۔ "ہمیں خوشی ہے کہ تمہاری شخصیت میں یہ لچ بھی موجود ہے۔ ہمیں معلوم ہے، تمہاری قوم کو بھی کبھی روحانیت کی کوئی بھی دینا پڑتی ہے۔"

"پلینہ۔" ایسے بے درد لہجے میں بات نہ کرو۔" میں نے سنجیدگی سے التجا کی۔ "روحانیت بہت بڑی حقیقت ہے۔ مجھ جیسے گناہ گار یا تم جیسے انہی بہت پرست اس کی باریکیوں کو کیا جانیں۔"

"خیر۔" فی الحال یہ موضوع غیر حلقہ ہے۔" اس دن نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے پہلی بار ہاتھ کو حرکت دی تھی ورنہ اتنی طویل گفتگو کے دوران وہ بالکل ساکت رہا تھا۔ اگر سر کو چھوڑ کر اس کا باقی جسم انسانی نظر نہ آتا ہوتا تو اس پر کسی رپورٹ کا ہی امکان نہ رہتا۔



ہوں؟ میں نے پوچھا۔

”جیس ہوتا چاہئے“ پاس دن زور دینے ہوئے ہوا۔ ”ظاہر ہے تم جنگل میں بیٹھے ہوئے دنیا سے بے نیاز کوئی ملک یا دوش نہیں ہو۔ تم دنیا وار ہو، پرنس کرتے ہو اور اسے بدمانے کے لئے دن رات محنت کرتے ہو۔ اس کا مطلب ہے تمہارے دل میں دنیا کی محبت موجود ہے۔ دنیا سے محبت ہی کہتی ہے تو زرا اچھی طرح“ شان سے کہہ دینا داری کا کچھ لطف تو آئے۔

”دنیا سے محبت کرنے والوں کے دل کے کسی کو نہ دے میں بھی خود ہی دوسری موجود ہو سکتی ہے۔ میں اگر کاروبار کرتا ہوں اسے ترقی دینے کے لئے کوشاں رہتا ہوں تو ممکن ہے میری خواہشات کی تسکین کے لئے یہی کافی ہو، میرا صرف اسی میں مگن رہنے کوئی چاہتا ہو۔ ضروری نہیں ہے کہ میرے دل میں بے پناہ اوپر جانے کی ہوس ہو اور اس کے لئے میں اپنے ہی ملک کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کا ایک حصہ بننے کے لئے تیار ہو جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا یہ دعویٰ غیر قطعی ہو گا۔ ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ دنیا داری، دولت کی ہوس اور طاقت و حکمرانی کا شوق یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی کوئی حدود نہیں ہوتیں۔ اگر ان چیزوں کی کوئی حد ہو جاتی تو یہ دنیا کیسے نہ کہیں پہنچ کر ضرور ساکت ہو جاتی۔ کوئی نہ کوئی حیل پالنے کے بعد لوگوں کو ضرور قرار آ جاتا۔ لیکن بھاک دو“ افراتفری اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش جاری ہے۔ یہ فطرت کا اصول ہے۔“

”فطرت کا اصول ضرور ہے لیکن نہایت مخ شدد حالت میں ہمارے سامنے رہ گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں اس خطا قات کا درس دے کر مت شرفاؤ۔“ پاس دن

نہرے نہرے لہجے میں ہوا۔

میرے ساتھ یہ بھی ایک بڑی مصیبت تھی۔ ایک بڑا پرنس میں اور صنعت کار ہونے ہوئے جب میں دوسری کی بات کرتا تھا تو کوئی اس پر یقین نہیں کرتا تھا۔ لوگوں کا لوگوں پر اس اعتبار اس حد تک اٹھ گیا تھا کہ کوئی کسی کے دل کی بات تسلیم ہی نہیں کرتا تھا۔ ترقی کی خواہش اور ناجائز کی ہوس دونوں کے درمیان لوگوں کی نظر میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا تھا۔

میں خاموش رہا تو پاس دن ہوا۔ ”تم ایک بڑے پرنس میں ہو“ انٹر نیٹیل پاور کیم کو بھی سمجھتے ہو لیکن شاید تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا کہ ہم تمہیں کیا پیشکش کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس کے بڑا دیں مے کی بھی پیشکش لے کر کسی ایسے شخص کے پاس جا سکیں جس کا تم سے بڑا کرنا بدنام ہو، اچھا خاما سا سی مقام ہو تو وہ ہم پر کے لئے ہمارے سامنے دست بستہ کھڑا ہونے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ بلکہ یہ بڑا دیاں حصہ بھی میرے خیال میں کچھ زیادہ بڑی پیشکش ہے۔ اگر ہم تمہیں سے بھرا ہوا صرف ایک بریف کیس لے جا کر

ہم سامنے پیش کرنے کی جرأت کرے۔“ اب میں نے قلعی دیکھ میں کہا۔ ”میں اس ملک کا ایک معمولی سا شہری ہوں۔ میں اس دھڑکی کا ایک حیران زدہ تعین کر ہی رہا چاہتا ہوں۔“

”جہ پوری پلیز“ ایہ باتیں چموزو۔“ پاس دن کے لیے لیٹکی سی تیز آواز جھلک آئی۔ ”ہم نے جذبہ حب الوطنی وغیرہ پر غور کرنے کے لئے تمہیں اپنی دقت نہیں دی۔ تمہارے ملک میں برادری، مصلحت، دولت اور اقتدار کی ہوس میں مرا جا رہا ہے لیکن وہ لوگوں کو مٹانے کے لئے اپنے لوگوں سے اپنی اصل شخصیت کو لٹی لٹکھنے کے لئے اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔“

میں نے کرسی کے پچھلے سے ٹپک لگایا۔ اسی کی ایک عجیب سی لریرے وجود میں پھیل گئی۔ ایک لمبے کے لئے میں افسردہ سی نظروں سے پاس دن کے پیشہ نما چہرے یا اس کے طرف دیکھتا رہا۔ ”خاموش کیوں ہو گئے؟“ پاس دن کی آواز ابھری۔ اس کے لیے میں ہلکا سا اضطراب تھا۔

”مجھے اعتراض ہے کہ دولت اور کسی بھی قسم کے اقتدار کی ہوس نے ہمیں رسوا کر دیا ہے پاس دن!“ میں نے ٹھکے ٹھکے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہاں قوم کی حالت پر کڑے والا اور اس کی اصلاح کرنے والا کوئی رہا ہی نہیں۔ یہاں درمندانہ دل رکھنے والے ان گنت لوگ ہیں جو ہر کمروں میں بحث و تمحیص کرتے اور گڑبگڑ رہتے ہیں ان کے بس میں کچھ نہیں ہوتا لیکن کچھ ہیں جو اپنی بساط کے مطابق اصلاح احوال کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“ پاس دن قدرے تیز آواز سے ہوا۔ ”سب اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں ہم اپنی بات کہتے ہیں۔“

”میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے طمانت سے کہا۔ مصیبت یہ ہے کہ ایک تو کوہ دار کے لحاظ سے ہم لوگ پہلے ہی پتہ ہو چکے ہیں اور سے ہم جیسی پسماندہ قوموں کی جان کو اپنی قسم کے موٹے موٹے طرح چنے ہوئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کس کس سے نجات پائیں اور کس طرح نجات پا سکیں۔ ان کا کچھ خون بہے ملک چس جاتے ہیں، کچھ برسرِ اقتدار سیاستدان چس جاتے ہیں، کچھ اقتدار کی ہوس میں مارے ہوئے سیاستدان چس جاتے ہیں، کچھ مرگاری ٹھکے اور پورہ دکر کس چس جاتی ہے۔ اس کے باوجود ہم جیسی قومیں بچا کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور یہ ایک میجرے سے کم نہیں۔ نہ جانے کب ان قوموں کی تقدیر بدلے گی۔“

”جہ پوری پلیز“ یہ تقریریں چموزو اور کام کی بات کرو۔“ پاس دن ہوا۔ ”ایم اور اے من نے بے چینی سے پھوہ لایا۔

”تم نے کچھ فرض کر لیا کہ میں بے اندازہ دولت اور ملکی نظام سے بالا بالا اصل اقتدار کی طاقت حاصل کرنے کا خواہش مند

کام کے نہیں ہوتے، وہ بھی کسی کا قیمتی اثاثہ نہیں بن سکتے۔ وہ گاڑی کے اس پہیے کی طرح ہوتے ہیں جس کے ٹیٹ بولٹ ڈیڑھ ہوتے ہیں۔ کچھ ہاتھ نہیں ہوتا کہ کب تک وہ گاڑی کے ساتھ چلتے رہیں اور کب کسی موٹر پر الگ ہو کر لڑھکتے ہوئے کسی طرف کوچاں دیں۔

اب گویا اس نے اپنا پیڑا اڑا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سے فوری جواب نہیں چاہتا۔ اس طرح کے بڑے فیصلے فوری طور پر نہیں کئے جاسکتے۔ ہم تمہیں خاطر خواہ وقت دیں گے، تمہیں قائل کر دیں گے۔ تمہیں چند گھنٹوں کے دورے پر بھیجا جائے گا جہاں تم ان لوگوں سے ملو گے جن کا ہم نے تقرر کیا ہے۔ ہر ملک میں ہمارا ایک نمائندہ موجود ہے جسے ہمارے پاس ’ریزیڈنٹ رولر‘ یا ڈپٹی آف’ کہا جاتا ہے۔ تم ذرا ان کے خطبات اور ان کی علالت و اختیارات دیکھنا۔ ہر ملک کی حکومت ہمارے ریزیڈنٹ رولر کے سامنے لڑ رہا اندام رہتی ہے اور کو شش کرتی ہے کہ اس کی پیشانی پر چھن نہ آئے پائے۔ جب تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہارے دل میں خود بخود ہمارا ریزیڈنٹ رولر بننے کی خواہش پیدا ہو جائے گی۔“

خدا مجھے اس وقت سے محفوظ رکھے۔ میں نے غلوں میں سے بہ آواز بلند دعا کی۔

لیکن باس دن ہے گویا میرے الفاظ پر قطعاً توجہ نہیں دی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے پاس پورے دو ماہ کی صلت ہوگی۔ اس دوران تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ بس ایک تو ہمارے بارے میں زبان بند رکھنی ہے، دوسرے ہماری آج کی شہرت میں جو بھی باتیں ہوئی ہیں ان کے بارے میں خود بخود خوش فہمی رکھنا ہے۔ اس دوران ایف۔م بھی کبھی تم سے رابطہ قائم نہ کرے گا۔ تمہارے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی بھی سوال ہو تو تم ایف۔م سے اس کا جواب حاصل کر سکتے ہو۔“

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے گویا میرے ذہن میں کا جائزہ لیا۔ میں پوری کو شش کر رہا تھا کہ میرے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہوتے پائے۔

باس دن بولا۔ ”اس دوران تمہارے چند ملکوں کے دورے، قیام اور ملاقاتوں کا شیڈول تیار ہو چکا ہوگا۔ دو ماہ بعد ہمیں تم سے حتیٰ جواب درکار نہیں ہوگا۔ تم اطمینان سے ہمارے نمائندے کے ساتھ دوسرے پر جانا۔ یہ شخص ایک خلیگ اور سرمایہ دار نہیں ہوگا۔ اس میں ہر طرح کی تعجبناک شائلی ہوں گی۔ تمہیں کوئی چیک بک کوئی ٹرولر چیک مٹی کہ جب میں سو دے گا ایک نوٹ بھی لے کر جائے گی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان ملکوں کے اعلیٰ ترین ہونٹوں کے دی گئی پی سوشل میں تمہارا قیام ہوگا۔ سچی ترین وکانوں میں جا کر تم جس چیز پر چاہے اعلیٰ رکھ دو تمہاری

کسی کے سامنے رکھ دیں تو وہ باجیس پھیلا کر ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑا ہوگا اور خود ہی پوچھے گا۔ ”کیا حکم ہے میرے آقا؟“ ہم تمہیں ایک پورے ملک کا غیر رسمی الگ وگلا کرنا چاہ رہے ہیں لیکن تم شاید اس کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں رہے۔ ہم اس ملک کو ترقی بھی دیں گے۔ یہاں بڑی دولتیں مدفون ہیں، ان گنت وساکل چھپے ہوئے ہیں۔ ہم سب باہر نکالیں گے۔ یہاں کے بوسیدہ نظام کو درست کریں گے۔ یہاں دولت کی بریل چلے ہوگی۔ ہم اپنا حصہ لیں گے، تمہیں تمہارا حصہ دیں گے اور پانی سب کو ان کا حصہ دیں گے۔ سب خوش ہوں گے، سب کے مزے ہوں گے۔“

”یہ تو صرف تمہارے خواب ہیں۔“ میں نے قحلی سے کہا۔ ”دنیا کے ذہر کہ تریں انسان چنے کر جو کچھ سوچتے ہیں، جس طرح کے منصوبے، جس طرح کے نقشے بناتے ہیں سب کچھ اس طرح نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو غلوں نیت شامل ہونے کے باوجود اس طرح نہیں ہوتا۔ تمہارے ساتھ تو تین دو فیو کا بھی کوئی معاملہ نہیں ہے۔ تم نے تو محض اپنے مفادات کے لئے ایک عالمی ڈراما ترتیب دیا ہے جو اٹھ اور ٹھار اور ظاہری حقائق کے اعتبار سے تمہیں درست نظر آ رہا ہے۔ کامیاب دکھائی دے رہا ہے لیکن یہ قحلی قلاب بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی رہا ہمارے پاس بکاؤ لوگوں کا دستیاب ہو جانا، اس سے مجھے اٹکار نہیں۔ بک جانا اور ہر طرح پر کتنے رہنا ہماری قومی شرافت بننا چاہا ہے۔ یہ ہماری بے نصیبی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے پاس نہ کچھ والے لوگ بالکل ہی فہم ہو گئے ہیں۔ کچھ نہ کچھ لوگ تو ضرور ہوں گے جن سے یہ عمارت نہیں یوں ہونے سے پہلے ہوئی ہے۔“

”اور تمہیں انہی لوگوں میں شامل ہونے کا حق ملتا ہے۔“

باس دن نے لفظی سانس لی۔ ”مجھے شعوری طور پر کسی بھی قسم کے لوگوں میں شامل نہیں ہونا۔ میں تو بس جو ہوں سو ہوں۔ ہر شخص اپنی فطرت کے مجبور ہوتا ہے۔“

”ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جو ’برائے فردیت‘ قسم کے لوگ دستیاب ہیں ان میں سے ہمیں کوئی پسند نہیں۔ چھوٹے موٹے کاموں کے لئے تو ہم ان کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں، ڈائریکٹ نہیں بلکہ ان ڈائریکٹ طریقوں سے۔ لیکن اتنے بڑے منصب کے لئے ہمیں ذرا مختلف قسم کا آدمی چاہئے۔“

”تم تلاش جاری رکھو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ ہو سکتا ہے مجھ سے بہتر مل جائے۔“

”نہیں۔ ہماری تلاش مکمل ہو چکی ہے۔“ باس دن فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”اب میں تمہیں سچی بات بتاؤں۔ ہمیں تمہارے جواب سے مایوسی نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ انسان کا کوئی کردار ضرور ہونا چاہئے، ہمیں بھی بالکل ہی بے کردار یا ’قحالی کا ڈیٹھن‘ قسم کا آدمی نہیں چاہئے۔ ایسے لوگ کسی

ریحانہ، سلمیٰ، عذرا کے خالق اختر شیرانی  
کی عشقیہ شاعری اور شخصیت کا تفصیلی جائزہ

## جہاں ریحانہ رہتی تھی

----- اختر شیرانی

غوبصورت سرورق ----- عمدہ طباعت

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

قیمت: -/100 روپے

## نور جہاں

☆ ----- الماس ایم۔ اے

مرزا غیاث بیگ اہلانی کی بیٹی

آصف جاہ کی بہن اور

شہنشاہ ہند نور الدین جہانگیر کی محبوب ترین بیگم -----

----- جس کے چشم و آبرو کے اشارہ سے امیروں اور فقیروں کی تقدیریں بدل جاتی

تھیں۔ جس کی پیشانی کی شکنیں نظام سلطنت کو درہم برہم کر دیتی تھیں۔ عقل و فراست، عزم و

استقلال، جلال و جمال اور حسن و سیرت اور حسن صورت کا دل فریب شاہکار -----

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

قیمت: -/75 روپے

ہو جائے گی۔ شاید ترین کیسینوز میں جا کر لاکھوں کی رقمیں ہار کر آجپا کوئی تم سے حقیر سا ایک مسکے بھی طلب نہیں کرے گا۔ ہوٹلوں اور کیسینوز میں نظر آنے والی حسین ترین لڑکیاں تمہارے ایک اشارے کی منتظر ہوں گی۔ تم اس دورے کے اصل مقصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ پوری طرح انجوائے کرنے کی بھی کوشش کرنا۔ یہ ہماری طرف سے دوستی کے آغاز کا ایک معمولی سا تحفہ ہوگا۔ واپس آ کر تم ایک ہفتہ آرام کرنا۔ اس دوران بھی تمہارے ذہن میں کوئی سوال ہو تو ہم سے پوچھنا۔ ہم ہر طرح سے تسلی بخش جواب دیں گے۔ اس کے بعد ہم تم سے حتمی جواب چاہیں گے۔ اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ اثبات میں ہوگا۔“

جی بات یہ تھی کہ اب میری کچھڑی میں دھماکے سے دھڑکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید یہ سب کچھ ایک مذاق ہو۔ شاید یہ ایک خواب ہو اور جلد ہی میری آنکھ کھلے والی ہو لیکن میری ایسی کوئی خوش گمانی سچ ثابت نہیں ہو سکی۔ مجھے یک لخت چھٹکن سی محسوس ہونے لگی۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ہر ملک میں تم اپنے ریزیڈنٹ دولر کے طور پر کسی بزنس میں کوئی منتخب کرتے ہو؟“  
 ”یہ ضروری نہیں ہے۔“ پاس دن نے جواب دیا۔ ”اس کا تعلق کسی بھی شعبہ زندگی سے ہو سکتا ہے لیکن ہر حال وہ اپنے میدان میں ایک نمایاں اور غیر معمولی آدمی ہوتا ہے۔ وہ کوئی بہت بڑا سرکاری آفیسر بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم وہ لانا غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔“

”اگر میں تمہاری پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دوں تو میرا انجام کیا ہوگا؟“ میں نے دریافت کیا۔

پاس دن میرے سوال کا براہ راست جواب دینے کے بجائے بولا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔ جب تک حتمی جواب کا مرحلہ آئے گا تب تک تمہارے خیالات بدل چکے ہوں گے۔“

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی دوسرے کا موقف سننے یا قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ صرف منصوبہ بنانا، حکم جاری کرنا اور انہیں حلیم کرانا جانتے تھے۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں کافی حد تک تمہارے سیٹ اپ کو سمجھ گیا ہوں لیکن محض تصدیق کی خاطر پوچھ رہا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ چھ ملکوں کی ایسوسی ایشن نے بائی دیا پر اپنی عکرماتی مضبوطی رکھنے کے لئے ایک بہت بڑا نظام تشکیل دیا ہے۔ اس نظام کو زیادہ موثر اور حیرت انگیز رکھنے کے لئے اور مقامی برسر اقتدار طبقے کے سر سوار رہنے کے لئے تمہارا ریزیڈنٹ دولر موجود رہتا ہے اور ریزیڈنٹ دولر کو قابو میں رکھنے کے لئے ریڈ ذات موجود رہتی ہے۔“

”درست ہے۔“ پاس دن نے جواب دیا۔ ”ریزیڈنٹ دولر کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ عکراں طبقے بعض اوقات آزادانہ طور پر پالیسیاں بناتے گئے ہیں“ فیصلے کرنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اوقات چھ ملکوں کی ایسوسی ایشن کے لئے ان سے فوری طور پر کوئی بات منوانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے پاس جواب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں فلاں سسٹم کام کر رہا ہے“ اس سے ہٹ کر اتنی جلدی فلاں فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے موقع پر ہم غیر ملکی لوگ براہ راست آگے آکر معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتے۔ اس سے ہمارے ملکوں کی بدنامی ہوتی ہے۔ اب جدید نظام میں ہم اپنے لئے بدنامیاں مول نہیں لیتے۔ ایسے موقعوں پر ریزیڈنٹ دولر حرکت میں آتا ہے۔ وہ کچھ ایسی ذریعہ ہلاتا ہے کہ حکومت گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔“

”اسی لئے ریزیڈنٹ دولر کا مقامی ہونا ضروری ہوتا ہے؟“

میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔“ تاکہ سب کچھ ان کی آہٹ کی، داخلی منظر کشی محسوس ہو۔ ریزیڈنٹ دولر کو ہم انعامات دیتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہلانے سے کسی بھی ملک کا نظام لرزے لگتا ہے۔“ پھر پاس دن ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ”ریزیڈنٹ دولر کا مقامی ہونا اور بھی کئی وجوہات کے تحت ضروری ہے جن پر فی الحال چھوڑ دینا خیال کرنا ضروری نہیں۔ ہمارے بڑے دانشوروں کے ایک فیصلے نے تجویز کیا تھا کہ جس ملک میں بھی ریزیڈنٹ دولر تعینات کیا جائے اس کا تعلق اسی ملک سے ہونا چاہئے“ اس کے پیچھے لمبا چڑا قلند ہے۔“

”ضرور ہوگا۔“ میں نے حلیم کیا۔ ”لیکن یہ زندگی کا سودا کچھ احقانتہ نہیں؟ ایک شخص ریزیڈنٹ دولر بننا نہیں چاہتا لیکن تم اسے بنانے پر تکتے ہوئے ہو۔ وہ تمہارے لئے کس طرح نقص ہوگا؟ کس طرح تمہارے لئے خدمات انجام دے گا؟“

”ہم کب کہہ رہے ہیں کہ ہم کسی کو زندگی بھی ریزیڈنٹ دولر بناتے ہیں؟“ پاس دن کے لہجے میں ہلکا سا تعجب جھلک آیا۔ ”جب کوئی ہمارا ہاتھ غصاتا ہے تو صدق دل سے غصاتا ہے۔ ہماری نظروں میں فی الحال تمہارا انکار قطعی تشویش کا باعث نہیں بلکہ ہمیں اس سے خوشی ہوتی ہے کہ تم فوراً ہی آنکھیں بند کر کے بک جانے والے آدمی نہیں ہو۔ اصل بات وہ تین ماہ بعد ہوگی۔ فی الحال تم کچھ اور پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو۔“

”جو کچھ پوچھ لیا ہے اور جو کچھ میں لیا ہے فی الحال تو اسی سے سرچکا رہا ہے۔ ان ”خدمات“ سے مستقبل میں تو کچھ اور پوچھوں گا۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

”میں تو پھر سنگ ختم کی جاتی ہے۔“ پاس دن یکدم ہی جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا غامضی بڑی تھی۔ وہ دوسرے کنارے سے مجھ تک مصالحے کے لئے ہاتھ نہیں پچھا سکتا تھا اس لئے ایک بار پھر محسوس کہ میرے قریب آیا۔ بائی جانوں! اگر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن میں اس بار بھی جان بوجھ کر بیٹھا رہا۔ تاہم اس نے کیا کسی

”ہاں۔ تمہارا اندازہ صحیح ہے۔“ ایڈم بولا۔ ”دنیا کے بہترین نیرودہ سرجن میں سے ایک نے اس کے دماغ کا آپریشن کیا تھا۔ یہ ٹھن ایک معمولی سا تجربہ تھا جس پر لاکھوں ڈالر خرچ کئے گئے ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ تو سرجن کی فیس ہی تھی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اب یہ جینیٹری ذہانت کے اعتبار سے ایک جینٹلس انسان کے برابر ہے۔“

”بہت اچھا کیا تم نے۔“ میں نے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”انسان تو اب بغیر کسی دماغی آپریشن کی ہی جانور بنے جا رہے ہیں۔ تم جانوروں کے آپریشن کے انہیں انسان بنانے کی کوشش کرو تاکہ انسانیت کا خلا کسی حد تک پُر ہو سکے۔“

”کبھی کبھی تم مردانہ حد تک تنبیہ ہو جاتے ہو چند اسی نے اپنے ہاتھ بلند کر کے میرا کندھا تھپکے کی کوشش کی۔ اس کا تھپکے سے بہت چھوٹا تھا۔ میں نے غصے کی ایک دھڑکن اور مہربانوں کے جانے کے بعد ایڈم اور اے ن کی غصہ بھریں پرچا ہوا بیچیدگی کا دخل دیر سے دیر سے اتر رہا تھا۔

”تنبیہ تو میں پیش ہی ہوا ہوں میری جان۔“ میں نے غصہ سے انداز میں کہی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تو تو مجھے کبھی بھاری دل سے ٹھکراتا کہ جو کم کرنے کے لئے غیر تنبیہ نظر آئے کی کوشش کرتا ہوں۔“

ایڈم گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہلکی جھینس تمہارے کمرے تک چھوڑ آئے گا۔ مجھے اور اے ن کو ابھی کچھ دیر یہاں بیٹھ کر باتیں کرنی ہیں۔“

پھر گویا اسے کچھ خیال آیا اور حد سے زیادہ تنبیہ کی سے اس نے مجھے دعا دی کی۔ ”راستے میں ہلکی کے ساتھ قطعاً کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی یہ خیال دل میں لانا کہ اس کے حوالہ ہونے کا کوئی قاعدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی غیر ذمہ دارانہ حرکت کرے تم بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے یا پھر کوئی ناقابل حل مسئلہ نصیبان اٹھائیں گے۔“

”ظاہر ہے۔ بندوں کے ساتھ چھینچھاڑ کر کے انسان کو قاعدے کی توقع تو رکھنی ہی نہیں چاہئے۔“ میں نے کہا۔ ”وہی بھی اب تم نے مجھے اس کی ذہنی سطح کے بارے میں بتا دیا ہے تو میرے دل میں اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ پناہ لینے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔ یہ جب ستارہ کے گھر میں گھسا تھا تو ستارہ کے سامنے بہت بے ہوش رہیں گے کہ رہا تھا۔ کیا جینٹلس ہو جانے کے بعد بھی اس کا یہی عالم ہے؟“

”جنرالی جلیت کی ایک آدھ جھک تو برقرار رہنی چاہئے تھی نا۔“ اے ن منسکراتے ہوئے بولا۔ ”وہی بھی تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جینٹلس مرد عورتوں کو دیکھ کر زیادہ ریٹھ کھلی ہوئے ہیں۔“

اور نے میری اس بے ادبی پر کوئی تبصرو نہیں کیا اور باس دن مجھ سے اسی خردادی انداز میں مصافحہ کر کے مارتے کرتے کے سے انداز میں مستعدی سے قدم اٹھاتا ہوا اسی پہاڑی کے عقب میں اندھیرے میں غائب ہو گیا جہاں سے نمودار ہوا تھا۔

مرد رسیدہ مرد اور عورت نے بھی میری طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ میں نے ہار ہار ہار ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ دونوں سے تعارف نہیں ہوا۔“

”ہو جائے گا جب ضرورت ہوگی۔“ عورت نے منسکراتے ہوئے کچھ شفقت اور کچھ بے پروائی سے کہا۔ ”وہی ہے ہم کچھ زیادہ اہم لوگ نہیں ہیں۔ کچھ عرصے بعد شاید ہم آپ ہی کے غلاموں میں شمار ہوں۔“

وہ دونوں بھی اسی سمت میں چلے گئے جس طرف باس دن گیا تھا۔ اس دوران بلیک بڑا ٹائی سیاہ چھینٹوڑی میز کے قریب آگہرا ہوا تھا۔ اب میں نے دیکھا وہ سیاہ سوٹ میں تھا اور اس نے فانی بھی لگا لی ہوئی تھی تاہم پردوں میں اس نے کیڑوں شوز پہنے ہوئے تھے۔ سوٹ کے ساتھ کیڑوں شوز جتنے تھے لیکن اس کے منالے میں شاید موزونیت سے زیادہ اس کی سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ پٹ پر رکھے ایسے گمراہ انداز میں کھڑا تھا کہ مجھے شبہ نہ آئی میں نے ایڈم سے پوچھا۔ ”کیا یہ بھی ریڈ ڈاٹ میں کسی اہم مدد سے پناہ ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“ ایڈم نے ہنس انداز میں جواب دیا۔ ”یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ جہاں انسان اپنے آپ کو عاجز اور مجبور پڑے ہیں وہاں یہ کام آتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اسے تم حیران مت سمجھو۔ یہ انگریزی اور اردو زبان میں ہر بات سمجھتا ہے۔ یہ ہر اعتبار سے ایک جینٹلس انسان ہے۔ صرف پول نہیں لگا لیکن ہمارے نزدیک یہ اس کی ایک اضافی خوبی ہے۔ اس کی طرف سے ہمیں انٹرایڈ راز کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔“

پھر ایڈم نے خود ہی اپنے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے بولا۔ ”خیر۔ یہ ہمارا ایسا سامعہ ہے کہ اگر بولنے پر قادر ہو تا تب بھی دوسرے سامعوں کی طرح ہمارا کوئی راز فاش نہ کرتا۔“

پھر اس نے بڑے پیار سے جینیٹری کو مخاطب کیا۔ ”ہلکی! ذرا سر جھکاؤ۔“

ہلکی نے نہایت سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔ ایڈم نے اس کی گھڑی اور کشینوں سے ہال ہٹا کر مجھے دکھایا اس کے سر کے گرد وادھ سامنا ہوا تھا جس پر سے بال غائب تھے لیکن ڈھم کا سایہ نشان لیے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ٹھن گولا کی میں کبھی ہوئی ایک گھیر کر تھی۔

”یہ تو کسی آپریشن کا نشان معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

لے تو اتفاقاً اور ناراضگی میں صحرائیں کوئی پروا کھالیا تھا جس سے تھمارے خون کے اجڑائے تو بھی بدل گئے اور تھماری جوانی پر ابھی تک زوال نہیں آیا۔ بقول تھمارے اپنے "تم لوگو سوسال کے ہو چکے ہو۔ مجھے بھی ایک ہزار ایک شایسی باپ نے ایک طبعی گرزدا تھا اور بدایت کی صحت کہ صبح شام اسے تھماری کراہت طاقتور ہو جاؤ گے۔ بس یہی گرزدا کمال ہے۔"

اے نن ایک لمحے مجھے کھوراما پھر لٹھری سانس لے کر کہا۔ ایڈم مسکرا رہا تھا۔ انمول نے مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا۔ ہلکی بدستور اپنی جگہ کھڑا فضیل نظروں سے مجھے کھورما تھا۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

ایڈم نے میرے نیچے ہاتھ لے جا کر کسی چیز کو باہر کی طرف کھینچا۔ وہ بلاشبہ لہجہ کی چیز کا تھوڑا سا پھر چھوٹی سی درواز کی طرح باہر نکلا۔ اس پر کھلکھولنے کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹپٹپٹ ہوئے تھے۔ ایڈم نے نہایت پھرتی سے کچھ بنوں کو ایک خاص ترتیب سے چھوڑا۔ اسی روز پر تھما ایک صحن دانہ چھلایا۔ وہ قائب ہوا تو اسی کے برابر ایک سبز دانہ چھلایا۔ ایک ٹائٹل کے بعد وہ بھی قائب ہو گیا اور ایڈم نے اس چھوٹے سے روز کو واپس میرے نیچے کھسکا دیا۔

پھر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "طبیعی حسیں لینے آرہی ہے۔ ہلکی کو تو تم نے ناراض کر دیا۔ ویسے میری بھی نہایت سنجیدگی ہے تم سے درخواست ہے کہ آئندہ مذاق میں بھی ہاتھ پائی دیکھو کہ کوشش نہ کرنا۔ یہاں ڈچلن کا مت خیال رکھا جائے اور غیر پیچیدہ حرکات کو پسند نہیں کیا جاتا۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہے۔ مقبرے جیسا ماحول نظر آ رہا ہے یہاں لیکن تم میرے بارے میں اتنی مصلحت رکھتے ہو جتنی شاید میں خود بھی نہیں رکھتا۔ جس اندازہ ہونا چاہئے کہ مایدولت ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے اور وہی کہتے ہیں بول کے۔" پھر میں نے ہلکی کی طرف دیکھ کر اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "اس کے ساتھ چیخو خالی اس لئے بھی کی ہے کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ تم خود ہی سوچو۔ میں اتنی ضرورت چیز کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اب اس صورت حرام کے ساتھ واپس جاؤں؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

ہلکی کے چہرے پر ڈر لے کے سے آثار نظر آئے۔ انسانی محسوس اور حیوانی جبلت کے ساتھ وہ کوئی عجیب چیز بن گیا تھا۔ حالت اس میں یقیناً کسی عام چھینٹنی سے زیادہ تھی۔ اس وقت اس کا بس نہیں بل رہا تھا وہ نہایت ہیچ پھر چلا گیا۔ حیوانی قالب میں ہوتے ہوئے بھی وہ ڈچلن کا پابند تھا۔ ایڈم نے اسے محسوس اشارہ کیا تھا اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے ہٹا بھی نہیں تھا۔

اسی اثنا میں لیٹا کن چمکی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو۔ اب یہ کوئی صورت تو ہے نا جس کے

چھینٹنی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اب سن چکا تھا کہ اسے میری رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے تو اس سے مبرا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ حالانکہ صاف ستھرا تھا لیکن مجھے اس کے بالوں بھرے ہاتھ سے کراہت محسوس ہوئی۔

میں نے اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دور صوفی میری جان! مانا کہ تم چھینٹنیوں کے دانشور ہو لیکن میں تھمارے علم کا غلام تو نہیں۔ اب اتنے بے تکلف بھی مت ہوؤ کہ ہاتھ پکڑ کر بیٹھنے لگو۔"

اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی فکر میں تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت پتھر کی تھی کہ وہ حقیقتاً طاقتور تھا۔ میں نے سخت نظر سے اسے کھورا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ واقعی چھینٹنی تھا تو میری فکر کا مطلب سمجھ جائے گا۔ مجھے اس کی بدچیزئی اچھی نہیں لگی تھی۔

اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تو اچانک میں نے خود اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ایک خاص انداز سے جھٹک دیا۔ وہ میرے قریب سے ہوتا ہوا اودھ سے منہ دور جا کر۔ باہم اتنی دور جا کر نہیں گرا جتنی دور میرے اندازے کے مطابق اسے کرنا چاہئے تھا۔ اے نن کی طرح اس کی بھی حسامت زیادہ نہیں تھی لیکن وزن کے اعتبار سے وہ کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس کا جسم گوشت پوست کے بجائے ٹھوس لوہے سے بنا ہو۔ اس میں جھک نہیں تھا کہ جنگلی ورندوں کا وزن ان کی حسامت کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتا ہے لیکن اے نن اور یہ چھینٹنی اس صنف میں بھی بہت ہی غیر معمولی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ اے نن کے وزن اور سخت جانی کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ ہلکی کے بارے میں اب اندازہ ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ دونوں کیا کما تے تھے۔ کیوں اتنے ٹھوس تھے!

جس داؤے میں میں نے ہلکی کو پیچھا تھا اس کی جگہ کوئی جہیم قسم کا پیلوان بھی ہوتا تو اس سے زیادہ دور جا کر گرتا۔ جتنی تیزی سے وہ گرا تھا اس سے کہیں زیادہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گو کہ وہاں مٹی کا ایک ذرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اتنے ہی اس نے غیر ارادی طور پر پکڑے بھاؤ سے اور خوشخوار نظروں سے پہلے میری طرف دیکھا پھر ایڈم اور اے نن کی طرف یوں دیکھا جیسے کہ رہا ہو۔ "بازت ہو تو اس گدھے کا دماغ ٹھکانے لگا دوں۔" لیکن اے نن نے اسے محسوس اشارے سے منع کر دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اے نن اور ایڈم دونوں ہی سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اے نن بولا۔ "چھوڑ دے یا راجا بیچ بتاؤ تھماری طاقت کا راز کیا ہے؟ ہلکی کو کوئی اسے نکالے۔ پیشہ ور مصلو بھی محسوس ہاتھ پکڑ کر اتنی دور نہیں بیٹھ سکتا۔"

"میرے اندازے سے تو وہ اب بھی کم دور جا کر گرا ہے۔ بہر حال۔ قدر دان کا شکر ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم

”یعنی تم میں اور ضرورت کی دو سری چیزوں میں کوئی فرق ہی نہیں؟“ میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ اس کی فراخ دلانہ دلچسپی ایک بار پھر مجھے یہی خیال آیا کہ کوئی بید نہیں کہ میں کی مخلوقوں کو بھی کیسے قتلایا جاتا ہو۔ یہاں کا کوئی گوشہ بھی انجانا، انکسوں کی دسترس سے باہر محسوس نہیں ہوا تھا۔

کافی غم کے میں آنکھیں بند کر کے جت لیٹ گیا۔ میں چاہتا تھا میری آنکھیں بند ہوں لیکن ذہن پوری طرح بیدار ہو۔ میں سوچ بچار کرنا چاہتا تھا اور بالکل کافی نے حواس میں معنوی جستجو کی اور ذرا دی تھی ورنہ میں اس خطرلے اور ہوشیار جنگ کے بعد اپنا سر گھومتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ گھومنے نے ان لوگوں کے سامنے ہر مسئلہ کی تشویش کا کشمیر نہیں ہونے کا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے ذہن کی گمراہیوں میں کیسے خطرے کی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ میرے اعصاب میں سرسراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

میں بیٹھے بیٹھے عجیب سی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ مجھ میں کچھ صلاحیتیں موجود ہونا ہی میرا جرم ہیں کیا تھا۔ جبکہ مجھے خود بھی اپنی ان صلاحیتوں کا کچھ زیادہ ابھی طرح اندازہ نہیں تھا۔ میرے لئے ان لوگوں کی محنتوں میں چھپے ہوئے کچھ بیم سے اشاروں کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بائیں ہتھ پتے پھلے سارے اور بے ضرر انداز میں کی گئی تھیں اتنی ہی خوفناک تھیں۔

انہوں نے میرے سامنے دو ہی راستے چھوڑے تھے۔ میں مل و جان سے ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاؤں یا پھر ہستی مسکراتی، دلکش زندگی اور اسرار و تجسس کے پردوں میں چھپے ہوئے مستحیل کے الوداع کہہ دوں۔ بے مقصد موت کی اندھی گمراہیوں میں اتر جاؤں۔ موت کا ایک دن مہینے ہوتا ہے اور مجھے موت کا کوئی خوف نہیں تھا لیکن یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں تھا کہ بظاہر محسوس ہو جیسے کسی نے میری موت کا حکم سنایا ہے۔ اپنے ہر کاموں کے ذریعے مجھ پر موت کا فیصلہ صادر کیا ہے۔ میں کسی نئی مخلوق کو یہ اختیار دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

میری اپنی جان دال اور آرام و آسائش یا مصائب سے کسیں زیادہ اہم سوال وطن کا تھا۔ مجھے کوئی عظیم وطن یا عظیم مادی رہنما وغیرہ ہونے کا دعویٰ نہیں تھا لیکن ملک پر آنے والے دیکھنا اس کی جڑیں کاٹنے کا تصور بھی میرے لئے ناقابل قبول تھا۔ پاس دن نے تو میرے وطن کی ان وارثت ٹھکری اور کم مانگی کی جو تصویر کھینچی تھی اسی نے میرا وطن لہو لہو کر دیا تھا۔

عالمی فوج و غم کی یہ دھندلی دھندلی تصویریں تو پہلے ہی تحت الشعور کے دھندلوں میں موجود تھیں۔ ہر وہ شخص جو عالمی معاملات کا تصور ذہنیت شعور رکھتا ہے، اور امر امر کی چیزیں پر دستا ہے، سمجھدار لوگوں میں ایسا بیٹھتا ہے۔ اسے کافی حد تک اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی بساط پر اس کا ملک کس حربے کی جگہ کھڑا ہے۔

تو جانے کوئی چاہے ٹھیک ہے انسان کے حالات کبھی کبھی باب ہو جاتے ہیں لیکن اب ایسی بھی کیا بد حالی کہ انسان پیسز یوں کی رہنمائی میں چلے گئے۔

لیونا سٹاپ چو لئے منوبانہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس نے اس کے قریب پہنچے ہوئے کہا۔ ”پلے۔ تمہارے ساتھ میں قی کے بار بھی جانے کے لئے تیار ہوں۔“

وہ سب انتہائی سنجیدہ صورت میں مانے کھڑے تھے۔ میں نے اپنے جانے مڑ کر کہا۔ ”یک تو یہ جگہ ویسے ہی کسی مقبرے سے کم نہیں ہے۔ کم از کم شکلوں پر تو ذرا سی مسکراہٹ سہا کر کھو۔“

لیکن انہوں نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں یا شاید ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی۔ چند لمبے پہلے ان کے چروں پر زرا گفتگو آئی تھی لیکن اب وہ دوبارہ اسی طرح حد سے زیادہ سنجیدہ صورت میں مانے کھڑے تھے جیسی بیٹنگ کے دوران تھیں۔

میں جس طریقے اور جس راستے سے لینا کے ساتھ آیا تھا اسی طریقے سے اسی راستے سے واپس روانہ ہوا۔ راستے میں میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا یہ جگہ پاکستان میں تمہارا ہیڈ کوارٹر ہے؟“

”یہی سمجھ لیجئے۔“ اس نے ہنس سے انداز میں جواب دیا۔

”اس کا پتہنا حصہ میں دیکھ پایا ہوں“ اس سے توثیق کیس زیادہ بڑی ہو گئی؟ میں نے بظاہر غمی سرسری اور دستانہ سے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔ بس ہماری ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔“

وہ بے پروائی سے بولی۔ کوئی غیر ضروری بات جس سے دوسرے کی معلومات میں اضافہ ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی زندگی میں شامل نہیں تھا۔

”اس کے علاوہ بھی لپکانے ہوں گے؟“ میں نے اسے

کہنے کی اپنی سی کوششیں جاری رکھیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر مٹھانہ انداز میں مسکرائی اور ملائمت سے بولی۔ ”اس طرح آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا

سفر چہرہ پر ہی۔“

”پھر بھی۔۔۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“ میں نے سادگی سے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی اور اس دھندلاہٹ زدہ ماحول میں

جیسے فزکی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ ہم واپس اسی کمرے میں پہنچ گئے جو

اب مجھے کسی خوبصورت نیل کی کوٹھڑی محسوس ہونے لگا تھا۔

”سر! آپ کچھ کھانا یا پینا چاہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ مجھے بیک کافی لا دو۔“ میں نے کہا۔ وہ چلی گئی اور چند

منٹ بعد بیک کافی لے آئی۔

کافی کی ٹرے پتائی پر رکھ کر وہ خوبصورت اور ذہنی

مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”جب بھی آپ میری یا کسی اور چیز کی

ضرورت محسوس کریں تو مجھے بلائیے گا۔“

طے کی۔ سائنسی لوازمات سے آراستہ اس طویل و مضبوط قبر میں تو میں اپنے آپ کو بالکل ہی بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا بھی نہیں تھا کہ مجھے کب یہاں سے رخصت کیا جائے گا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور دائیں ہاتھ والی دیوار کو انگلی سے چھوا۔ میرے پیروں کی طرف دو اور میں موجود اسکرین روشن ہو گیا۔ چند لمحوں پر گلیمری سی ہانپتی رہیں پھر یوں ٹکا چڑھ کر نمودار ہوا۔  
”ہیں سر؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
”مجھے کب یہاں سے جانے دیا جائے گا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”سرا مجھے تو اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں مسٹر ایلم سے آپ کی بات کرائی ہوں۔“ لیونا نے مودبانہ لہجے میں کہا اور اسکرین سے غائب ہو گئی۔ چند لمحوں تک اسکرین پر رنگ برنگے چوکور خانے ابھرتے اور معدوم ہوتے رہے پھر ایلم کا چہرہ نمودار ہوا۔ شاید کسی میجر سر جیکب کے بیٹھا تھا۔

وہ سر اٹھا کر گویا میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ اس کے سامنے اگر کوئی میجر موجود بھی تو وہ اسکرین پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بلا تہدید سنجیدگی سے پوچھا۔ ”مجھے کب یہاں سے جانے کی اجازت ہوگی؟“

”اجازت؟“ اس نے مصحوبیت سی دہرایا۔ ”جیسں اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ تم مرضی کے مالک ہو، جب چاہو جا سکتے ہو۔ نہیں تم سے جوابات کرنا بھی اگر چاہے۔ تاہم جیسں دس بارہ گھنٹے مزید یہاں رکھنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اب جیسں ذمت نہیں دی جائے گی۔ صرف آرام کرتے رہو۔“

”مجھے آرام کا اتنا زیادہ شوق نہیں ہے۔“ میں نے ہنسی سے کہا۔ ”ویسے بھی اس قسم کے مقبول میں آرام تم لوگ ہی کر سکتے ہو۔ مجھے تو یہاں سخت دشت ہو رہی ہے۔ اگر تم مجھے جانے کی اجازت دے دو تو تمہاری بڑی لواؤں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اس کے انتظامات کرتا ہوں۔ تم کچھ دیر تو آرام کرو۔“ ایلم نے ممانعت سے بولا۔

”کیا یہاں سے جانے کے بعد میری عمرانی کی جائے گی؟“ میں نے پوچھا۔ گو کہ مجھے صحیح جواب ملنے کی توقع نہیں تھی لیکن سوالات کرتے رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بعض باتوں کے وہ بالکل صحیح جواب بھی دے دیتے تھے اپنے عوام کے بارے میں صحیح طور پر بتا دیتے تھے۔

ایلم تمکھانہ انداز میں مسکرایا، جیسے میں نے کوئی بچہ گمانہ سوال کیا ہو۔ ”جیسں تمہاری عمرانی کرائے کی ضرورت نہیں۔ تم خواہ کیسں بھی ملے جاؤ، کیسں بھی چھپ جاؤ، جب ہم تم سے رابطہ قائم کرنا چاہیں گے تو جیسں ڈھونڈنا کیسں گے۔ یہ ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ تم غائب ہونا یا چھپنا کیوں چاہو

لیکن بڑی طاقتوں کے ایجنٹوں کے سامنے جتنے کہ سرسری اور مختصر آمیزے انداز میں اپنی قوی سبہ وقعتی کا ذکر مشاغل پر خراشیں ہی ڈال جاتا ہے۔

مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ میرے دل میں تو کیسں وطن کی شدید محبت چھپی ہوئی تھی۔ میں تو اسے دنیا میں سر فرزا دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا قتل تو اس قوم سے تھا جس تو اس خدا کو سامنے والوں میں تھا جنہوں نے دنیا پر عمرانی کی تھی۔ ہماری غلطیاں، لغزشیں اور کردار کی خامیاں بے شک ہمیں بہتوں میں لے گئی تھیں لیکن دل کے کسی تاریک گوشے میں عظمت رفتہ کی چنگاری آج بھی روشن تھی۔ میں ایک گناہ کار انسان تھا لیکن مجھ جیسے گناہ کاروں کا آج بھی جی چاہتا تھا کہ دنیا کے پشروہ بنیں۔ ہمارا وطن اس کہار میں بڑی طاقتوں کے لئے قتل کا گندہ ہو۔ ہم انہیں بتائیں کہ ہمارے اسلاف اس دنیا میں کیا مثالیں چھوڑ گئے ہیں اور اگر آج بھی ہم اپنے اپنے خیل سے نکل آئیں، چھوٹی چھوٹی خود غرضیوں میں الجھ کر اپنے کردار کا ہیذا غرق نہ کریں تو آج بھی دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

لیکن شاید ہمارے اندر عظمت رفتہ کی اس چنگاری کو ہی سرد کرنے کے لئے ہمیں بے شمار مسائل میں الجھنا پڑا گیا تھا۔ یہ طاقتیں چاہتی ہی نہیں تھیں کہ ہم کسی سر اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ اسی لئے انہوں نے ہمیں ایک دوسرے کے سر قلم کرنے پر لگایا ہوا تھا، ایک دوسرے کے گریبان تار تار کرنے میں الجھایا ہوا تھا۔ کبھی حقوق کے نام پر، کبھی سیاست کے نام پر، کبھی مسائل کے نام پر تو کبھی دوسرائی کے نام پر۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ان سب باتوں کے بارے میں اتنے دھوکے کے ساتھ سوچ سکتا ہوں۔ میں نے تو اپنے آپ کو ہمیشہ ہی یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں ایک لائیلی سا آدمی ہوں لیکن یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میرے اندر تو موت کا ستانا پھیل گیا تھا۔

پاس وں نے مجھے نوید شادی تھی کہ مجھے اس قدر طاقتور بنادیا جائے گا کہ اپنے ملک کی ہر حکومت میرے خوف سے کانپتی رہے گی، دنیا کی ہر فرقت میرے قدموں میں ڈیر ہوگی اور یہ سب کچھ بغیر کسی سیاسی عمل کے ہوگا، میری کوئی پاداشی نہیں ہوگی۔ یہ سب کچھ بھلا کیسے ممکن تھا؟ ظاہر ہے اس کے لئے کوئی ایسے طریقے تو اختیار نہیں کئے جاتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں نہ جانے کون کون سے شیطانی منصوبے تھے جن کے سلسلے میں آگے رکھنے کے لئے انہوں نے مجھے منتخب کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب چیزیں میرے ملک کے مفاد میں نہیں ہو سکتی تھیں۔

میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ جی تو یہ تھا کہ انہوں نے فیصلہ کرنے کا اختیار میرے پاس چھوڑ دیا ہی نہیں تھا۔ سارے فیصلے تو انہوں نے خود ہی سناوئے تھے۔ فی الحال تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت کب



ہم؟ تم ہمارے پاس آؤ گے ہمارے ساتھی ہمارے دوست ہو گئے اپنے وسیع کاؤدار اور بانڈو وغیرہ کو چھوڑ کر تم کہاں مقاب ہو سکتے ہو اور کب تک مقاب رہ سکتے ہو؟ بلکہ اس کی کوئی ضرورت بھی نہ ہو۔ تم کہتے ہو کہ میڈیک ہو، ہم تمہیں دوا میں لارہے ہیں۔ تمہیں دھڑکی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی خوفزدہ ہونا چاہئے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہو تو خوشی سے اچھل رہا ہوتا۔

”میں نے خوشی سے اچھلنے کی عادت بچپن میں ہی ترک کر دی تھی۔“ میں نے ہنسی سے کہا۔ ”تم اس طویل تقریر کو چھوڑو یہ تازہ میری دوا لگی کا انتقام کب تک ہو سکتا ہے؟“

”میں کو شش کرنا ہوں کہ جلد از جلد ہو جائے۔ تم اطمینان سے لیٹ جاؤ۔“ اس نے امانت سے کہا۔ ”میں افسوس ہے کہ تم نے ہمیں کسی خاص خدمت کا موقع نہیں دیا۔“

”یاد زندہ محبت باقی۔“ میں نے کہا۔ ”میں بھی تو مطمئن نہیں کتنی مرتبہ تم سے واسطہ پڑے۔“

”جیسے۔ اب ہم سے ہی واسطہ رہے گا۔“ اور کسی سے واسطہ رکھ کر کیا کرے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے چٹ لیٹ گیا۔ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد الیم کی آواز سنی۔ ”اب ایسی بھی کیا چیز اسی؟“ وہ شے ہوئے عجیب کی طرح آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔“

”میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا مجھ پر حقیقتہً ہنسی کا حملہ ہوا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا۔ اسکرین ساتھ ہونیکا تھا۔ میں نے گڑبڑ لی اور واقعی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی جلدی اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ذرا دیر پہلے ہی میں نے بلیک کافی پی تھی میرے ذہن پر خود کی کاشانیہ تک نہیں تھا لیکن چند منٹ بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوئے لگا جیسے میں نے بہت تیزی سے آنکھ دس لی۔ کچھ چڑھائے ہوں۔ اس ننگ سے کمرے میں ہوا بہت بوجھل محسوس ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے میں تختوں کے راستے ہوا نہیں بلکہ انتہائی باریک ذرات کی حد میں پھینچ رہا ہوں۔

میں نے ہنر بڑا کر آنکھیں کھولیں۔ کمرے کی فصاحتیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سب کچھ اسی طرح تھا لیکن میرے لئے آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ میں نے کوئے کھدکوں کا جائزہ لیا کہ شاید کسی سوراخ سے کمرے میں کوئی گیس چھوڑی جا رہی ہو لیکن کہیں ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دئے کمرے میں کسی شے کی بو بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں تیزی سے اٹھ بیٹھا اور سانس روک کر اپنے آپ کو خود کی گئی اس جگہ سے بچانے کی کوشش کرنے لگا لیکن سانس روکنے کی طویل مشق بھی میرے کسی کام نہ آسکی۔ آخر کار مجھے

سانس تو لینا ہی تھا۔ ایک طویل وقفے کے بعد جب میں نے سانس لینا شروع کیا تو غیر ارادی طور پر میں آہستگی سے لیٹ گیا اور پھر نہ جانے کسے ہانچا میری آنکھیں اس نئے بچے کی طرح بند ہوتی چلی گئیں۔ شے اس کی بالوں لوری دے کر سلا رہی ہو۔

جب میری آنکھ کھلی اور میرے ذہن سے بوجھل دھندلاہٹ دور ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اپنے بیڈ روم میں پایا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ واقعی میرے اپنے مکان میں میرا اپنا بیڈ روم تھا۔ میں ایک بار پھر کافی محسن محسوس کر رہا تھا لیکن اتنی نہیں جتنی پہلی بار ہوش میں آئے کے بعد محسوس کی تھی۔

میں نے کوئی کارہ نہ کر دیکھا۔ صبح کا جالا نمودار ہو رہا تھا۔ میرے سامنے کھڑکی سے باہر میرے ہاتھ کے وہی جانے بچانے درخت لہرا رہے تھے وہی شناسا ماحول تھا اور وہی آشنا سکوت جو کسی بھی صبح اس وقت بیدار ہونے پر چاروں طرف چھایا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ محض ایک خواب پریشان تھا۔ میری لاشعور میں جاگزیں رہنے والے دوسروں اور اندیشوں کی افسانویت آئینہ تصویریں تھیں۔

لیکن رات کو گہرا کاک کچھ اور کمانی سا رہا تھا۔ اس میں تاریخ بدلی ہوئی تھی۔ اس تاریخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں کل رات اپنے کمرے میں سو رہا تھا اور آج دوسری رات کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جب میری آنکھ اپنے کمرے میں کھلی تھی۔ میں تقریباً چھتیس گھنٹے تو اپنے کمرے میں سو رہا نہیں ہو سکا تھا۔

میں نے سر دھست اپنے ذہن کو اس گورکھ دھندے سے نکالنے کی کوشش کی اور دیر تک آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔ دھیرے دھیرے میری توانائی واپس آئی تھی۔ میں نے اٹھ کر غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور انٹر کام پر بٹر کو دعوت کی کہ وہ لانگ روم میں میرے لئے ناشتا لگوائے۔

میں جب ناشتے کی میز پر پہنچا تو روم تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لازم اپنے اپنے معمول کے مطابق کمرے کے کاسوں میں مصروف تھے کسی کو بھی گویا ظلم نہیں تھا کہ میں کمرے سے غائب ہوا تھا۔ آخر مجھے کس طرح کمرے سے لے جایا گیا تھا اور کس طرح واپس پہنچایا گیا تھا؟ یہ کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ کیا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی؟ کم از کم میرے سیکورٹی گارڈ کو تو تشویش ہوتی چاہئے تھی۔ کیا انہیں بھی علم نہیں ہو سکا تھا؟ مجھے میرے بیڈ روم سے کوئی کھڑکی کے راستے نکال کر چھت سے پہلی کاپڑ کے ذریعے تو میں لے جاسکتا تھا۔

میں نے نہایت خاموشی اور سکون سے ناشتا کیا۔ میں اپنی ذہنی اور اعصابی طاقت کو مکمل طور پر بحال کرنا چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جس سرج ۱۱۔ شیکس سے مجھے قہوڑے ہی وقت میں وہ مرتبہ بے ہوش کیا گیا تھا اس نے ذہن اور اعصاب کو کافی متاثر کیا

تھا لیکن قیمت تھا کہ میں جلد ہی اس کے اثر سے نکل آیا تھا۔  
مجھے معلوم تھا کہ گھریلو ملازموں سے اس سلسلے میں کچھ چھتا  
زیادہ فائدہ مند نہیں تھا کیونکہ میرے اندازے کے مطابق وہ سب  
اس وقت اپنے اپنے گوارڈ میں سوئے ہوئے ہوں گے جب مجھے  
خیر ہی کے دوران بے ہوش کر کے کہیں اور منتقل کیا گیا ہو گا۔

ناٹھے کے بعد میں نے انٹرکام پر گٹ اڈس سے طارق خان کو  
طلب کیا۔ وہ سیکورٹی انچارج بھی تھا اور رات کو ظاہر خان کے  
ساتھ چادر پارکی کے اندر گشت بھی کرتا تھا۔ دن میں دوسرے دو  
گارڈ ڈیوٹی دیتے تھے۔ یعنی مجموعی طور پر چار مسلح گارڈز جو سابق  
کمانڈو تھے، دن رات مکان کی چوکیداری کرتے تھے ان کے پاس  
اپنے وقت کے گناہ سے جدید ترین اسلحہ موجود تھا۔ میں نے گھر کے  
دروازے پر پرانی سی بندوق کے ساتھ ایک روایتی اور گناہی  
چوکیدار بٹالے پر انکشاف نہیں کیا تھا۔

”طارق خان! جس معلوم ہے کہ کل رات غالباً تو مئی رات  
کے قریب میں اس گھر سے غائب ہو گیا تھا اور آج رات شاید آرمی  
رات کے قریب ہی مجھے یہاں واپس لایا گیا ہے۔“ میں نے قدرے  
سرد لیے میں کہا۔

”میں سرا“ اس نے اطمینان سے جواب دیا اور اس کے  
جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ ”مجھے صحیح وقت تو معلوم نہیں لیکن یہ  
معلوم ہے کہ کل رات آپ کی دقت گھر سے نکلے تھے۔ دن بھر  
آپ باہر ہی رہے اور رات میں کسی وقت واپس آئے ہیں۔“  
”جیسے اس پر تشویش نہیں ہوئی؟“ میں نے کمری نظروں  
سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تشویش۔“ وہ قدرے متذہب لہجے میں بولا۔ ”میں کوئی  
خاص وجہ تو یہاں نہیں ہوئی تھی کہ مجھے تشویش ہوئی۔ کل علی الصبح  
کسی نے مجھے فون کیا تھا اور آپ کی طرف سے پیغام دیا تھا کہ آپ  
گورات میں اچانک کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ ایک آدھ دن میں آپ  
واپس آجائیں گے، مجھے آپ کے بارے میں پریشان ہونے کی  
ضرورت نہیں۔ گیت کی اور دوسری تمام ضروری چابیاں تو آپ  
کے پاس ہوتی ہی ہیں اس لئے میں نے کوئی تشویش محسوس نہیں  
کی۔“

”تم نے اس پر تشویش محسوس نہیں کی کہ جس نے تو میرے  
جانے کا پتلا چلا اور نہ واپس آنے کا؟“ میں نے اسے گھورا۔

”سرا! آپ سے تو کچھ بید نہیں ہے نا۔“ اس نے مسکراتے کی  
وشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”مجھے  
بات یہ ہے کہ مجھے تشویش تھی اور میں آپ کے پاس آنے ہی  
والا تھا۔ مجھے کچھ گریز کا احساس ہوا تھا۔“ مجھکی سے پہچل رات  
ظاہر خان اور میں کافی پیٹے کے لئے زور دیر کو گیت ہاؤس میں بیٹھ  
گئے تھے۔ ہم نے محسوس کیا کہ کافی پیٹے کے دوران ہماری سستی  
دور ہونے کے بجائے ہم پر اور بھی غور کی سی طاری ہونے لگی تھی

اور سانس لینا کچھ مشکل مشکل سا محسوس ہونے لگا تھا۔ حیرت انگیز  
طور پر ہم دونوں ہی کچھ دیر کے لئے سو گئے۔ جب اٹھے تو طبیعت میں  
بہنی فکستی تھی۔ میں نے کافی کوچک کر لیا ہے جو قہقہے میں کافی  
ساری ہنسی ہوئی تھی لیکن اس میں کچھ ملا ہوا نہیں تھا۔ اس لئے میں  
کچھ مطمئن ہو گیا۔ آج رات پھر مجھے اور ظاہر خان کو ایسا ہی تجربہ  
ہوا۔“

”اس کے باوجود تم اس حد تک تشویش زدہ نہیں ہوئے جتنا  
میں ہونا چاہئے تھا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مگر اتنی گریز  
بھی جیسے میں چوکا کتنی تو پھر کتنی گریز پر تم جو کچھ؟ تم ظاہر  
خان اور دن کی شفٹ کے دونوں آدمی سب کمانڈو ہیں لیکن مجھے  
افسوس ہے کہ تم میری توقعات پر پورا نہیں اترے۔“

”کمانڈو دراصل ایکشن کا آدمی ہوتا ہے سراسر سازشیت کا  
نہیں۔“ طارق خان سر جھٹا کر بولا۔ ”لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھ  
سے عقلی ہوئی ہے۔ ویسے بات کیا ہے سرا؟“

”جس دوران تم دونوں راتوں میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے  
سوئے تھے اسی دوران مجھے بھی اسی طرح بے ہوش کر کے اس گھر  
سے لے جایا اور پھر واپس پھوڑا گیا۔ تمہارے بے خبر ہونے کی وجہ  
سے ان نامعلوم لوگوں کو سیکورٹی کے دیگر انتظامات کو بھی کچھ دیر  
کے لئے بے کار کر دینے کا موقع مل گیا۔ مجھے یہ سب انتظامات بے  
مقصد اور بے مصرف دکھائی دینے لگے ہیں جن پر میں خاصی بدلی  
رقم خرچ کرنا ہوں۔“

”آپ خیریت سے تو ہیں سرا؟“ اس نے سر اٹھا کر تشویش زدہ  
نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔ لی الحال تو خیریت سے ہی ہوں مجھے تمہارے سامنے  
بیٹھا بات کرنا ہوں لیکن ان حالات میں تو تمہارے سامنے میری  
لاش بھی آسکتی تھی۔“

”خدا نہ کرے سرا“ وہ تجزی سے بولا۔ ”اصل میں مجھے کسی  
خاص گریز کے آثار دکھائی نہیں دے رہے اور پھر آپ کی طرف سے  
بھی ہمیں اطمینان رہتا ہے کہ آپ کوئی عام آدمی نہیں ہیں جسے  
کوئی آسانی سے اپنے ساتھ لے جاسکے اس لئے میں یہ دقت آپ  
کے بارے میں مطہات کرنے کے لئے حرکت میں نہیں آسکا۔  
ملازموں کو بھی میں نے ہی اطمینان دلایا کہ صاحب کہیں گئے ہیں  
لیکن میں خطرہ ضرور تھا اور آپ کو دیکھنے کے لئے آئے ہی  
والا تھا۔“

”میں کوئی سیکورٹی فون نہ ہوئی طارق خان!“ میں نے تاحسے  
کہا۔ ”مگھنی اگر مجھے میرے ہی گھر سے اٹھا کر لے جائے اور کسی کو  
کانٹوں کان خبر نہ ہو۔ تو اس سارے کھڑاک کا کیا فائدہ؟ گھر سے  
باہر میں نے اس لئے سیکورٹی کی گرہ جوڑ دی ہے کہ میں اس وقت  
بیدار ہوتا ہوں اگر کوئی مسئلہ آن پڑے تو خود ہی جو کچھ کر سکا ہوں  
کروں گا۔ اگر کوئی نقصان بھی اٹھا بیٹھا تو مجھے افسوس نہیں ہو گا۔“

میری ذہن میں رکھنا ہو گا کہ آئندہ تم لوگوں کو کوئی ایسی چیز کے دوران میں سے بے ہوش نہ کیا جاسکے۔

”ٹھیک ہے سر! میں سب چیزوں کا جائزہ لیتا ہوں اور نئے انتظامات کے بارے میں بھی غور کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچوں میں غم رہا۔ مجھے ایک اہم فیصلے پر پہنچنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میں اگر ریڈ وائٹ کے انکشافات کو سامنے میں دے دیتا تو بیٹا رتاب بھی میری جان نہیں بچھوٹ سکتی تھی۔ مجھے ان کا آواز کاربہنے کے سلسلے میں اقرار یا انکار میں جواب دینا تھا۔ ان انکشافات کو اپنے تک محدود رکھنے پر میرا ضمیر آمادہ بھی نہیں تھا۔ ان باتوں سے کسی اور کو آگاہ کرنے کے نتیجے سے بھی ان لوگوں نے مجھے خیردار کر دیا تھا۔

سوال یہ بھی تھا کہ میں ان انکشافات کو لے کر کس کے پاس جاؤں؟ زبان کھولنے کی صورت میں انہوں نے مجھے موت کی دھمکی دے دی تھی۔ یہ زندگی اور موت کی بازی تھی۔ وطن کے لئے اگر مجھ کو گناہ گاری کی جان کسی کام آجاتی تو مجھے اس میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ ہوتی لیکن یہ سوال ضرور میرے ذہن میں تھا کہ اگر میں وطن کے لئے جان دوں گا تو وطن کو اس سے کوئی فائدہ بھی پہنچے گا یا نہیں؟ کیا ریڈ وائٹ کا کم از کم ہمارے ہاں سے خارج ہو سکے گا؟ کیا آئندہ ان لوگوں کو یہاں منظم ہونے سے روکا جاسکے گا جن کے سامنے مانیا فاضل کتب تھی؟ اور مانیا کے ذکر پر استہزائیہ انداز میں ہنسنے تھے۔

ان سوالوں کا میرے سامنے کوئی جواب نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہو گا وہ جوئے کی طرح ہو گا۔ ایک ایسا جو اس میں میرے جینے کے امکانات بہت کم نظر آ رہے تھے لیکن بات یہ تھی کہ مجھ جیسے لوگ سبھی بازاں جینے کے لئے ہی نہیں نکلتے۔

بہت دیر تک سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد آخر کار میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ میں وزیر خارجہ حفیظ احمد صاحب سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اور ان کی سطح کے کئی لوگوں کے نام میرے ذہن میں آئے تھے جن سے میری صاحب سلامت تھی لیکن جس قسم کا معاملہ درپیش تھا اس میں حفیظ صاحب ہی کام کے آدمی دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے مجھے اپنے جو بہت سے فون نمبر دے رکھے تھے میں ان میں سے اسلام آباد کا ایک نمبر ڈائل کرنے ہی لگا تھا کہ مجھے یاد آیا ”تین روز قبل میں نے اخبار میں پڑھا تھا“ حفیظ صاحب سات آٹھ گھنٹوں کے دورے پر روانہ ہو چکے تھے۔ ان کا خاصا طویل پروگرام تھا اور اس دوران ان کا وطن واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ انہیں اپنا یہ کثیر القاصد قسم کا دورہ مکمل کر کے ہی واپس آنا تھا۔ محض میرے پیغام پر تو وہ دورہ مختصر نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے ایک گھنٹی سانس لے کر فون سے ہاتھ ہٹالیا۔ مزید

سوچنا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا یا مگر انھوں کے ساتھ ہوا اور اس کے مقابلے کے لئے میری طاقت ناکافی رہی لیکن بے خبری میں بارے جانا مجھے کارا نہیں۔ اپنے کمرے میں ایک محفوظ قلعہ سمجھ کر سوتا ہوں، میرا ستر پر سکون انداز میں تیس بیٹھتے تھے کے لئے غائب ہو جانا میرے لئے کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ میں ابھی تک حیرت اور صدمے سے سنبھل نہیں سکا ہوں۔

طارق خان نے اپنی اسٹین گن نکالتی اس میں لگا ہوا ایک مشرا بیگن اور اپنی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی اور مجھے لمبے میں بولا۔

”میں اپنی ذمے داریاں صحیح طور پر انجام نہیں دے سکا سر! میں اپنے آپ کو آپ کی خدمت کے قابل نہیں سمجھتا“ اس نے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کو اپنے دشمنوں کے بارے میں ذرا سی بھی معلومات ہیں تو مجھے بتا دیجئے میں اور ظاہر خان اپنی ذاتی حیثیت میں ان کے پرانے اڈاؤں کے۔“

میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا۔ ”مجھے تمہارے ظلم یا زیادہ داری پر شک نہیں ہے اور نہ ہی میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اس بات کو بھی پسند نہیں کروں گا کہ تم خود ہی خبر دینا محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان ذمے داریوں سے بہکدوش کر لو۔“

”پھر میں کیا کروں سر؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔ ”میری جان آپ کے لئے حاضر ہے۔ مجھے بتائیے میں اسے کہاں اور کیسے آپ کے لئے قربان کروں؟“

”تمہاری جان بھی میرے لئے اپنی ہی جان کی طرح قیمتی ہے طارق خان! میں نے اس کا کدو حاصل کیا۔“ میں اسے بے مقصد اور بے فہم انداز میں ضائع ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ سیکرٹری کے انتظامات کو کچھ اور بہتر بناؤ کچھ نئے طریقے سوچ، مکان میں کوئی ٹیماپیکٹوزم فٹ کرانا ہو تو کراؤ۔ کچھ نئے آدمی رکھنا ضروری ہو تو اپنے مطلب کے آدمی تلاش کرو اور رکھو۔ تم سیکرٹری کی لائن کے آدمی ہو جو بھی مناسب سمجھو کر دو۔ میں نے سب کچھ تم پر چھوڑ دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے سر! میں اپنی کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔“ اس نے گن و فیر واپس اٹھالیا۔

”ٹھیک اور بات بتا دوں۔“ میں نے کہا۔ ”میرا اپنا اندازہ ہے کہ پہلے جنہیں اور ظاہر خان کو گیت ہاؤس میں گیس کے ذریعے بے ہوش کیا گیا۔ اس کے بعد مجھے بھی بیلہ دم میں سینے کے دوران ہی گیس سے بے ہوش کیا گیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ گیت ہاؤس میں گیس کس طرح پھیلائی گئی؟ گیت ہاؤس گیت کے اندر کی طرف ہے۔ گیت میں گیس ذرا سا بھی سوراخ نہیں ہے۔ دیواریں اونچی ہیں اور ان پر گیس ہیں جن میں کرنٹ دوڑتا ہے۔ کہیں کسی قسم کی توڑ پھوڑ کے آثار نہیں ہیں۔ اصل میں سارا کام جنہیں ... بلکہ پڑھنے کے بعد آسان ہوا۔ نئے انتظامات میں جنہیں یہ تکنیک

کچھ دیر سوچوں میں الجھا رہنے کے بعد میں نے فون دوبارہ اپنی طرف کھسکایا اور راجیلہ کا نمبر ملا۔ دوسری طرف فون پلکی ہی کھنکی رہا تھا کیا جیسے بے تابی سے کسی کے فون کا انتظار کیا جا رہا ہو۔ پلو کھینے والی راجیلہ یہ تھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ میں نے اپنا نام بتائے بغیر پوچھا۔  
 ”اوہ۔ تو تیار ہو گئے حضور والا۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”کیا ہنگامہ کا منتظر کر سوتے ہوئے تھے؟“  
 ”ابھی میں نے کسی ہنگامہ کو جو اس کی نہیں کیا“ اس نے یہ نوبت نہیں آئی۔ تم نے فون کیا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”تمہیں پیغام نہیں ملا کیا؟“ اس نے انا مجھ سے یہ سوال کر دیا۔

”نہیں۔ مجھے تو کسی نے پیغام نہیں دیا۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”پیغام کون دتا۔ فون میں نے تمہارے پرائیوٹ نمبر پر کیا تھا جس کے ساتھ تم نے وہ جواب دینے والی مشین وغیرہ کے ڈیٹا کو ملے فٹ کئے ہوئے ہیں۔“ راجیلہ بولی۔ ”میں نے فون کیا تو خرابی سی آواز میں جواب ملا۔“ چھوڑی صاحب سو رہے ہیں۔ پیغام چھوڑ دیجئے یا پھر بعد میں کسی وقت فون کیجئے۔“ میں نے سوچا ”پھر کسی وقت“ جیسے نہ جانے کیا مراد ہو اس لئے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوبارہ فون کرنے کے جرات نہیں ہو رہی تھی۔ ”وہ خوب نکل انا ر اتار کر کر رہی تھی۔“

”مشین کو تو میں چیک ہی نہیں کر سکا۔“ میں نے کہا۔ ”میں دراصل نیند میں ہی کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی واپس ہوئی ہے۔“

”نیند میں چلنے کی بیماری ہوگی۔ نیند میں چلتے چلتے کسی خوبصورت سی لڑکی کے گھر پہنچ جاتے ہو گے۔ پھر وہاں سے واپس آنے کو دلی نہیں چاہتا ہو گا۔ نیند میں بعض لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اس کے لیے میں مناس میں پلٹنا ہوا نظر تھا۔

”یہ اپنے مقدور کہاں۔“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔ ”ہم تو خوبصورت لڑکیوں کو صرف فون ہی کر کے رہ جاتے ہیں۔ جیسے اس وقت کر رہے ہیں۔ مگر جانے کی نوبت کہاں آتی ہے۔“

”کس نے منع کیا ہے؟ کیا راستے میں دشمن کی فوجیں کھڑی ہیں؟“ اس کا لہجہ کچھ اور گھڑی ہو گیا۔

”یہی سمجھ لو۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی بتاؤ فون کیوں کیا تھا۔ کوئی ضرورت بات تو نہیں تھی؟“

”ہاں۔ بہت ضروری کام تھا تم سے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ کہیں بہت جگہ ہو گئے ہیں اور عالمی سیاست پر اس کا بہت برا اثر پڑا ہے۔“

میں ایک لمبے کے لئے خاموش رہا۔ میں چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ اس وقت وہ اپنی مسکراہٹ کو دوبارے کی کوشش کر رہی

ہوگی۔ میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ”جین نیم چمے کیلے اب بھی سستے ہیں۔ اگر تم ان کی طرف محبت کی نظر سے دیکھو تو عالمی سیاست دم کے بل کھڑی ہو جائے گی۔“

”تم اسی قسم کی کجواس کرنے کے لئے فون کیا کرتے ہو؟“ وہ جلی کر بولی۔

”ہرگز نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو نہایت سنجیدگی سے تقریباً سنجیدگی کے عالم میں فون کیا تھا۔ کجواس تو تم نے شروع کی ہے۔ اب سنجیدگی سے ایک بات سنو۔ انا سنا رہی ہوں؟“

”بہت پہلے۔“ وہ بولی۔ ”اب تو بیٹھی بیچ و تاب کھا رہی ہوں کہ کہاں اگر شخص مٹی ہوں۔ کوئی کام ہی نہیں ہے۔“

”کام شروع ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے میرے پاس اب وقت کم ہے اور مجھے بہت سے ضروری کام نکلنا ہے۔“

”یہ انکشاف اچانک ہی ہوا ہے کیا؟“ اس نے چہنچہ ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہی کچھ۔ بعض اوقات صرف ایک لمحہ زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔ اتنے دیر واس کیوں ہو رہے ہو؟“ اس نے استہزاء سے انداز میں پوچھا۔

”ویسے ہی۔ ذرا ذرا نقد بدلنے کے لئے۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ فضول باتیں پھر ڈو اور ٹھیک آؤ گے مجھے بعد بلٹن کے کٹنی پار میں پہنچ جاؤ۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ تمہارا تعاقب نہ ہو رہا ہو۔“

”آہ۔ اب وہ زمانہ کہاں جب ہمارے پیچھے تعاقب کرنے والوں کی قطاریں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو لوگ شکل پر برستی ہوئی پینکار و کچ کر رہی سمجھ جاتے ہیں کہ بے چاری کوئی نیچر کی مادی ہوئی مخلوق ہے۔“ وہ لفظی سانس لے کر بولی۔

”تمہیں زیادہ کس قسم کی ضرورت نہیں۔ ذرا شرم میں نکل کر تو دیکھو تعاقب کرنے والوں کی قطاریں تو اب کئی لگ جاتی ہیں۔ تمہارے کل اور آج میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے کہ قدر دان اپنے راستے بدل لیں۔ لاہور تو ویسے بھی ذمہ دلوں کا شہر ہے۔“

”ابھی کجواس مت کرو۔ کام کی بات کرو۔“

”رہنما“ ہنسی بدل لی نا فوراً ”میں نے کہا“ خیر۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذرا تعاقب کا خیال رکھنا۔“

”مجھے تو اس شرم میں آئے بعد جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ کون میرا تعاقب کرے گا؟“ وہ سنجیدگی سے بولی ”کیا کوئی جاسوسی کمائی شروع ہو گئی ہے؟“

”نہیں۔ بس میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ اب تمہارا تعلق واسطہ مجھ سے ہے۔ تمہیں ہر قدم احتیاط سے ہی اٹھانا پڑا ہے گا۔ نیز تو نہیں ہو جاؤ گی؟“

احمد کے ساتھ ہی رہا رت دی تھی کہ گاڑی میں کہیں کوئی ایسا الیکٹرونک آلہ کسی بھی قسم کی مشکوک چیز موجود نہیں جو کہیں بھی گاڑی کی سمت یا قافلے وغیرہ کے بارے میں نشانہ دہی کر سکتی ہو یا جس کی مدد سے کسی اور طرح کوئی میری گاڑی کا یا میرا سراغ پاسکتا ہو۔

اس کے باوجود ریڈ ڈاٹ والے میرے بارے میں اتنے مطمئن اور پر احماد کیوں تھے؟ میرے لئے ایک مقام تھا۔ انہوں نے سب کچھ بتانے کے بعد مجھے آزاد چھوڑ دیا تھا اور کوئی میری نگرانی نہیں کر رہا تھا۔ میں وہ تمام معلومات کسی کو منتقل کر کے رہ پوش بھی ہو سکتا تھا۔ کیا انہیں میری فطرت کا اندازہ تھا اور یقین تھا کہ میں آسانی سے رہ پوش ہونے والا آدمی نہیں ہوں؟ یا اس سے ان کے لئے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا؟ شاید انہیں یقین تھا کہ میں رہ پوش بھی ہو گیا تو وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ یہ بات انہوں نے مجھ سے بھی بھیجی تھی۔ شاید یہ مصلحت ایک دعویٰ نہ ہو، وہ واقعی ایسا کر سکتے ہوں۔ ممکن ہے انہیں یہ احساس ہو کہ آخر میں کب تک رہ پوش رہ سکتا ہوں۔ مجھ جیسا آدمی جس کے کاؤ باری سلسلے وغیرہ اتنے پچھلے ہوئے تھے، زیادہ عرصے رہ پوش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی سراغ حاصل کیا ہی پاسکتا تھا۔

ان سوچوں میں الجھا آخر میں پلٹن جا پہنچا۔ میں نے گھڑی دیکھی، راجیلہ کو میں نے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد یہاں پہنچ جانے کے لئے کہا تھا لیکن مجھے گھر سے نکل پون گھنٹے سے بھی زائد ہو چکا تھا۔ میں اندر پہنچا تو حسب توقع راجیلہ کافی بار میں موجود تھی۔ وہ کسی میز کے بجائے کاؤنٹر کے قریب ہی ایک اسٹیل پر بیٹھی تھی۔ سیاہ کڑھائی والی انتہائی سفید شلوار قمیض کے ساتھ اس نے کیڑوس کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ بھرے تراشیدہ بالوں کے ساتھ اس حلقے میں وہ کسی کالج کی اچھلیٹ لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف کوئی ریگٹ وغیرہ ہوتا تو اس کے کھلاڑی ہونے میں کسی کو کوئی شبہ نہ ہوتا۔

وہ کافی کا ایک خالی کمرے کے سامنے سی کاؤنٹر گرل کو ایک ٹک دیکھے جارہی تھی مگر کاؤنٹر گرل اس کی نظروں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی۔

میں راجیلہ کے قریب ایک اسٹیل پر جا بیٹھا، اس نے تب بھی گردن کھٹا کر میری طرف نہیں دیکھا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کافی بار میں میرے قدم رکھتے ہی میری آمد سے آگاہ ہو چکی تھی لیکن وہ بدستور کاؤنٹر گرل کو دیکھتی رہی۔

”کیا تصور ہو گیا ہے اس بے چاری سے؟“ میں نے بچی آواز میں پوچھا، اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس نے گرا میری آواز سنی ہی نہیں۔

”کیا اس بے چاری کو نظروں ہی نظروں میں کہا جانے کا ارادہ ہے؟“ میں نے بدستور بچی ہی آواز میں پوچھا۔ اس نے تب بھی

”جی طرح گھر بی رہی تو بزار ہو جاؤں گی۔ میں ایکشن میں رہنے والی عورت ہوں۔ تم نے مجھے مریضوں کی طرح گھر میں بٹھایا ہے۔“

”غیر۔“ تم آؤ تو سہی۔ تمہاری بیزاری کا علاج بھی ہو جائے گا“ میں نے کہا ”ٹھیک آدھے گھنٹے بعد۔ پلٹن کا کافی بار“ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

انٹھے سے پہلے میں نے دو نمبر پر جلی عرف مس ٹریپ کو فون کیا، ”جولی! اتمام اسٹاف کو ہدایت کر دو کہ الارٹ رہیں۔ غیر ضروری طور پر کوئی مجھ سے فون پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے“ میں نے دھیمے لیپے میں کہا ”اسٹاف“ سے ہماری مراد اپنے خاص خاص لوگ ہوتے تھے جو محض دفتری کارکن نہیں تھے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”جیس ساری توجہ اس بات پر رکھنی ہے کہ دو نمبر کسی کی نظر میں نہ آئے پائے اور مجھ سے اس کا کوئی تعلق بھی ظاہر نہ ہوئے پائے۔ بہت زیادہ محتاط رہنا ہے۔“

”اوکے سر۔“ جولی نے مستعدی سے کہا ”کوئی ایمر نہیں؟“

”کوئی خفیہ۔۔۔“

”فی الحال نہیں۔ لیکن ہر قسم کی صورت حال کے لئے تیار رہنا ہے۔۔۔ اور یہ سمجھ کر تیار رہنا ہے کہ ہم خود بھی ہیں لیکن ہمارا مقابلہ ہاتھی سے ہے“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے سرا“ جولی نے جواب دیا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کرنا ہے۔ میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل نہیں تھا لیکن میں نے احتیاطا ساتھیوں کو الارٹ کر دیا۔

چند لمحوں بعد میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ طارق خان اس وقت گھر میں چاند طرف گھوم پھر کر دو دروازے کے معائنے میں مصروف تھا۔ میری گاڑی گلی میں آگئی اور خود کار گیٹ بند ہو چکا تو میں نے غیر محسوس طور پر دائیں بائیں گلی کا جائزہ لیا۔ گلی میں کوئی کار نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ایسا شخص موجود تھا جس کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا۔ وہ میری کوشش کی نگرانی کرنے پر مامور ہو سکتا ہے۔

میں نے نہایت سست رفتار سے ڈرائیونگ شروع کی اور پلٹن جانے کے بجائے لہری اور پھر وہاں سے داخل ڈکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں بے مقصد سے انداز میں گاڑی اور ہمارے لئے پھر رہا۔ کبھی میں نے رفتار بہت کم کی، کبھی دوڑ مانی رکھی اور کبھی نیز رفتار کے رکنا دو قائم کرنے کی کوشش کی۔

میں بہت اچھی طرح اطمینان کرتا چاہتا تھا کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ اس دوران میں نے ہر گاڑی پر نظر رکھی۔ آخر کار ٹاسا وقت ضائع کرنے کے بعد مجھے قائل ہونا پڑا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ کافی دن پہلے میں اپنی گاڑی کا بھی ایک، ہر ترین الیکٹرونک ایلیمنٹ سے خود بینی معائنہ کرا چکا تھا جس نے مکمل

# کالی دنیا

ایم اے راحت قیمت = 100/-

## طنز و مزاح

|            |       |                    |
|------------|-------|--------------------|
| مظفر بخاری | 125/- | تجہ در تیج         |
| مظفر بخاری | 75/-  | قصہ مختصر          |
| مظفر بخاری | 90/-  | ایک سوا ایک (کالم) |
| مظفر بخاری | 100/- | گستاخی معاف        |
| مظفر بخاری | 100/- | ایک سو نو (کالم)   |
| مظفر بخاری | 200/- | چمن کو چلے         |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور نمبر 2

”موجود لوگوں کی یہی قومیت ہے“ میں نے ہنسی سانس لے کر کہا ”کئی کئی بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں تب بھی ان کے مٹے آتے رہتے ہیں اور سے تم نے علیہ بھی باطل کی بڑی قسم کی لڑکیوں والا ہی بنا رکھا ہے“

”میں نے تو کسی بھی قسم کا علیہ نہیں بنایا۔ میں تو جیسے بیٹی جی دیے ہی اندھ کر بیٹی آئی۔ تم نے باطل کسی ہی آئی اے ایجنٹ کی طرح ٹیک وقت پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ میں ڈر رہی کہ معلوم نہیں کون سی آفت آن پڑی ہے۔ میں یہ سوچ کر بیٹی مستحی سے دوڑی دوڑی آئی کہ شاید ہم غریبوں کی جیسے ہی غداں بھی بڑے لوگوں کے کچھ کام آجائیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے، جنہیں صرف خود ابراہام رائے کا شوق چلایا ہے“ وہ میرے گہنایاں دکھ کر دونوں ہاتھوں کے ملتے میں چومکا کر ہنسنے لگی۔

”میرا تو ہو رہا ہے“ میں نے گہری سانس لے کر کہا ”جب تمہاری بیٹری ختم ہو جائے تب میں کچھ بولوں گا۔“

کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ میرا انداز تھا کہ وہ صحیح وقت پر پہنچ گئی ہوگی اور اسے خاص دیر انتظار کرنا پڑا ہوگا۔ ایک لمحے کی غاسوشی کے بعد میں نے کہا ”آئی ایم سوری۔ میں اپنی مرضی سے لیٹ نہیں ہوا۔ مجھے تم کو انتظار کرانے کا اتنا شوق نہیں تھا۔ اس میں میری اناکا ہرگز تسکین نہیں ملتی۔“

جب وہ گہری سانس لے کر خود ابراہامی طرف کو گھوم گئی۔ وہ بولی تو اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی ”جنہیں معلوم ہے“ انتظار کتنا تکلیف دہ کام ہے؟“

”مجھے معلوم ہے“ میں نے اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں نے زندگی میں بار بار طویل انتظار کیا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں جی ہوئی برف یک لخت ہی پگھل گئی اور اس کے عقب سے مسکراہٹ کی کرن چلی۔ اب وہ بولی تو اس کے لیے میں خفگی کا شائبہ تک نہیں تھا ”میں دیر لگی تھیں؟ خیریت تو تھی؟ کوئی گزرتا نہیں ہوئی؟“

میں نے لٹی میں سر ہلایا۔ گاؤں پر چند اور گاہک بھی موجود تھے جن میں سے دو گورے بچے سے لڑکے کروں سوڑے نیم استراہٹ یہی نظروں سے میری طرف دیکھ چکے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ میری آمد سے پہلے وہ راجیلہ کو گھور رہے ہوں گے

پچھے پیڑوں پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ذرا دور ایک کونے میں رکھی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”آؤ وہاں چل کر بیٹھے ہیں۔“

وہ اندھ کھڑی ہوئی۔ دونوں کورے سے لڑکے جو کسی کھاتے پچھے کھانے کے گڑے ہوئے نمونے معلوم ہوتے تھے پوچھ رہے تھے ہمارے طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے کو کہنی مارتے ہوئے کہا ”جو بھی اہم تو سوچتے ہی نہ گئے۔ چلی تھی کہنے والے کا بھی گزرے“ آواز تقریباً سرگوشی جتنی ہی گہری گراتی ضرور تھی کہ میں سن سکا۔

میں ان کے قریب سے گزرتے گزرتے رک گیا۔ میں نے صرف ایک ٹائٹ کے لئے اس لڑکے کو گھورا اور وہ فوراً اپنے اسٹیل پر مسکرا گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ ان کے لیے بے بال پڑ کر دونوں کی کھوپڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر چٹکا دوں لیکن راجیلہ نے میرا ہاتھ تمام کر کھینچ لیا اور میز کی طرف پڑتے ہوئے بولی ”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا میں ان دونوں کے لئے کافی نہیں تھی؟ لیکن ہماری توانائیاں اتنی فاصلہ نہیں ہیں کہ گلیوں میں آواز پھرنے والے سگھوں پر بھی خائف کہنے لگیں۔“

لڑکوں کو کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ہم کو لے والی میز پر جا بیٹھے تو راجیلہ بولی ”انہی نمونوں کی وجہ سے تو مجھے انتظار اتنا کراں گزرتا تھا۔ یہ شاید مجھے اپنے ہی طبقے کی۔۔۔ کالج گرل سمجھ رہے تھے۔“

”میں اصل میں اس لئے زیادہ تک بک کر رہی ہوں کہ کئی دنوں سے خاموش بیٹھی تھی۔ دوسرے اس لئے دل کی بھڑاس نکال رہی ہوں کہ یہاں آنے ہی ان دنوں نے موڑ آگ کر دیا تھا۔ مجھے اکیلی دیکھ کر انہوں نے فوراً اپنی نظروں کے تیر چلائے اور دل بھپچڑے وغیرہ میری طرف بچھنے شروع کر دئے۔ کچھ فترے بازی بھی فرماتے رہے۔ میں بیٹھی سوچتی رہی کہ اگر میرا وہ کالج والا زائد ہوتا تو فوراً اصرار شروع کر دیتی لیکن اب میں سنجیدہ خاتون ہو گئی ہوں۔ پبلک مقامات پر دھچک مٹتی اور خود کو تماشانا پاند نہیں کرتی۔ جب تک کوئی بہت ہی بڑی بھجوری نہ آئے۔“

پھر وہ ناک سیکڑ کر ادھر ادھر کیجئے ہوئی ہوئی ”تھک تو ٹھیک سی دکائی دیتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی اتنی نے کیسی گھٹیا جگہ پر ملنے کا نام دے دیا ہے۔ حیرت ہے۔“ اب ”تھک کا کلاس“ ایسی جگہوں پر بھی آئے گی ہے۔“

”اب کیر کڑا کلاس کو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ جس کے پاس دیکھ رہے ہیں وہ کسی بھی جگہ کسی بھی شعبہ زندگی میں جاسکتا ہے۔ میں نے لٹریچر سائنس لے کر کیا۔“

”تھک! اگر لکھ دے رہی ہو ایسی دیکھی دکھائی دے رہی ہو“ اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا ہو کہ وہ کوئی دل پیچ تک ہم کی چیز ہے۔ پھر اگر لوگ اس قسم کی حرکتیں کریں تو میں انہیں زیادہ ضرور دیکھیں سمجھتی لیکن یہ جو حالہ کہ ہر ایک کے ہی پیچھے لگ جاتے ہیں انہیں تو میرا دل چاہتا ہے دھچک کر دکھ دلوں۔“

”میرا تو اسی قسم کا ہڈ کرام بن گیا تھا“ میں نے کہا ”لیکن تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو میرا بھی کچھ ارادہ بدل گیا۔ سنجیدہ خاتون والے جراثیم مجھ پر بھی حملہ آور ہو گئے۔“

”تمہارا مقام و مرتبہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس قسم کا بکرا اپنے انہوں سے اٹھائے پھو۔ تمہارے ایک اٹھارے اس قسم کی غلوں کی توہنی پہلی برابر کے سڑک پر پیچک دیا جانا ہے۔“ راجہ مل نہ بنا کر رہی۔

”اس قسم کے کاموں کے لئے میں ”مغلہ مطالعی“ سا جگہ لئے میں پھر آؤں اور جتنی دیر میں فون وغیرہ کروں اور مجھے کا کوئی آدمی آئے اتنی دیر میں بکرا غائب بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی زیادہ تر میں بنا کام اپنے ہاتھ سے ہی کرتا ہوں کہ آہوں ”پھر میں نے مسکراتے آئے کہا ۳۰ وز جو کچھ تمہارے راستے میں آئے گا اسے ہانا تو لانا ہے اپنی ذاتی ذمہ داری محسوس ہو گا۔“

”اچھا۔ اب یہ ادھر ادھر کی باتیں چھوڑو اور کام کی بات لکھو۔ ایسی کیا بات تھی جس کے لئے تم میری نہیں آتے تھے؟“

”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا گھر ابھی کسی کی نظر میں آئے“ میں نے جواب دیا۔

”یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ کوئی عمرانی کرتا نظر تو نہیں آتا لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میری تمام شکل و حرکت سے واقف ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔ نہیں! آنکھ کا پکر معلوم ہوتا ہے“ وہ مسکرائی ”مگر ان کا تبیین کے علاوہ بھی کوئی غیبی تعلق تمہارے اعمال پر نظر رکھتی ہے“ پھر وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے ہوئی ”پکر کیا ہے؟ سچ بتاؤ۔“

پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے ریڈ ڈاٹ والے پکر کے بارے میں سب کچھ بتا دوں لیکن پھر فوراً ہی یہ ارادہ ہلتی کر دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال اسے اس پکرتے دور رکھنا ہی بہتر تھا۔ ”یہ باتیں زیادہ ضروری نہیں ہیں۔ میں نے اصل میں تمہیں عالم شیر والے مسئلے پر بات کرنے کے لئے بلایا ہے۔ فی الحال وہ مسئلہ حل کرنا زیادہ ضروری ہے کیوں کہ پانی مسائل کے بارے میں سروسٹ ہم کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں عالم شیر والا کانا بھی راستے سے ہٹ جائے تو بہتر ہے تاکہ اگر کل کو ہمارا بیگزروں کے کسی بہت بڑے فون سے سامنا ہو جائے تو ایسا نہ ہو کہ راستے میں ہانک پکڑنے کے لئے ایک گنا بھی موجود ہو۔ وہ سوچ بے موقع اپنے بل سے نکل کر سامنے آتا رہتا ہے اور میری ذہنی کے لئے کوئی ناخوشگوار کرتا ہے۔“

”تھک ہے“ وہ بے پروائی سے ہوئی ”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ آج کل وہ قلعہ بند ہے۔ تمہارا کام اسے صرف قلعے سے نکالنا ہے اس کے بعد میں اس سے خود ہی نمٹ لوں گا۔ اس قسم کے کاموں کے لئے لڑکی کوچ میں لانا مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا لیکن اس غیبت کی کوئی اور شدید ضرورت میرے علم میں نہیں ہے جس سے قاعدہ اٹھائے ہوئے میں اسے اس کی کچھارے باہر لا سکوں۔“

”اب اپنی فنی قسم کی موانع خود داری کوچ میں لانے کی کوشش مت کرو“ راجہ فنی آئینہ لیے میں ہوئی ”تم اگر مجھے اپنی ساتھی بنا چاہتے ہو تو پھر مجھے لڑکی مت بتاؤ کرو۔ میں سواہیت کے خل میں صرف اس حد تک رہنا چاہتی ہوں کہ کوئی بھی کام کرنے میں مجھے رکاوٹ محسوس نہ ہو اور نہ ہی کوئی مجھے گھس لڑکی سمجھ کر ایک کونے میں بٹھائے کی کوشش کرے۔“

”تھک ہے۔ میں تمہیں بن مانس شمار کیا کروں گا۔ اللہ کے دیا کے تمام چیزیں گھر ایسے حسین بن مانسوں سے کچا کچھ بھر جائیں۔ گھٹ لینے والوں کا وہ جہم ہو گا کہ ہر روز لاٹھی چارج ہو کر آئے گا۔ چڑا گھر کے اندر کسی چیز کے لئے بھی پر پھیلائی کی گنجائش نہیں رہے گی۔“

”میرا پھر بھی شمار مت کرنا“ اس نے مجھے گھورا ”تم مرو سکتے خاندان ہوتے ہو۔ کسی لڑکی کو مرد کا درجہ نہیں دے سکتے۔“

”خدا نہ کرے جو ہم لڑکیوں کو مردوں کا درجہ دیں۔“ جنہیں مردوں سے ایسے بے ہودہ اور غیر شاعرانہ کام کی توقع نہیں رکھتی

# سپنس ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ درخشاں

انوار صدیقی

ایک عشق گزیدہ نواب زادے کی ہنگامہ خیز  
سرگزشت

حصہ اول: 45/ حصہ دوم: 45/



اردو بازار لاہور

”افسان کی کہانی نہیں اُٹھتی چاہئے باقی ہے ہر جگہ اُٹ

جائے“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”کمال ہے!“ میں نے غلطی سانس لے کر کہا ”یہ بات اب  
وہ لوگ بھی کہنے لگے ہیں جن کی اپنی کہانی برسوں پہلے اُٹ چکی  
ہے۔“

اس نے مجھے گھورا لیکن میں بے نیازی سے چلا رہا۔ وہ میرے  
ساتھ ساتھ لیے لیے ڈگ بھڑکی باہر نکلی۔ پارک لائٹ میں بیٹھ کر  
وہ بولی ”کیا ہم اپنی اپنی گاڑی میں چلیں گے؟“

”نہیں۔“ تم میری گاڑی میں ہی چلو“ میں نے کہا ”اپنی گاڑی  
میں کبھی جھوڑو۔ پھر لے لیتا۔“

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور ہم دو ٹول سے نکل آئے تب اس  
نے پوچھا ”ہم جا کمال رہے ہیں؟“

”شکر کے نواح میں ہمارے پاس کرائے کا ایک بنگلا ہے۔ بہت  
دفوں سے بے مصرف چڑا ہوا ہے۔ آج میرے ذہن میں اس کا یہ  
بہترین مصرف آیا ہے کہ اسے عالم شیر کے لئے ہسٹل کے طور پر  
استعمال کیا جائے“ میں نے جواب دیا ”تم اسے کئی کمالی گاڑی کہ  
تم منشیات کی اسٹور کے سلسلے میں ایک مرحلے سے ترقی کی پتلی  
میں چھبے۔ کسی نے تمہاری خبر نہیں لی۔ اب تم سڑاکاٹ کر اوپر  
اُدھر کو حرکت کی گھاسنی پاکستان آئی ہو اور تقریباً مدیوٹی کے عالم میں  
روز و شب گزار رہی ہو۔ یہاں جمال بیگ نے تمہارے قیام  
بندوبست کیا ہے۔ جمال بیگ کا نام سن کر عالم شیر کو یقین آجائے  
کہ تم واقعی ڈولی ہو کیوں کہ جمال بیگ ڈرگ مافیا کا آدمی ہے۔“

چاہئے۔ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ تم چاہتی ہو ہم  
اس رنگ پر تیار کول پھیر دیں۔ یہ ظلم ہم سے نہیں ہوگا۔“  
”پھر اتر گئے پڑی سے“ راحیلہ نے آنکھیں نکالیں ”بات  
ہو رہی تھی عالم شیر کی۔ ذرا مجھے سمجھاؤ کہ اس ہنرِ دم کے شیر کو  
کس طرح بچھا رہے نکالنا ہے۔“

”شیر تو وہ صرف نام کا ہے“ میں نے کہا ”نوابہ خصوصیات تو  
اس میں کو مزی اور بھڑے وغیرہ کی پائی جاتی ہیں۔ میں نے نہیں  
بتایا تھا کہ اس کی ایک ٹیلی فونی محبوبہ تھی۔ بس تمہیں اس کے نام  
سے عالم شیر کو فون کر کے ایک ایڈریس پر بلانا ہے۔ میں تمہیں وہ  
ساری گفتگو سمجھا دوں گا جو تمہیں اس سے کہنا ہوگی۔ مجھے معلوم  
نہے وہ اتنی آسانی سے پکر میں نہیں آئے گا۔ تمہارے انداز میں  
ذرا بھی جھول نہیں ہونا چاہئے۔ بہت سے متوقع سوالات ہیں جو وہ  
تم سے کر سکتا ہے۔ تمہارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہونا  
چاہئے۔ تمہیں ذرا بھی گھڑانا نہیں چاہئے۔ جو کہ بھی میں بتاؤں  
اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتا۔ اگر تمہاری اس سے گفتگو  
کا مایاب رہی اور وہ بے وقوف بن گیا تب بھی مجھے یہ توقع نہیں ہے  
کہ وہ منہ اٹھا کر دوڑا چلا آئے گا۔ وہ کئی طریقوں سے اطمینان  
کرے گا۔“

”تم صرف مجھے میرا کردار اور مکالمے سمجھاؤ۔ ذرا سے کی  
کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ پھر پرچہ دود“ راحیلہ بولی۔

میں نے اسے سمجھانا شروع کیا کہ اسے کیا کیا مکالمے بولنے  
ہوں گے، عالم شیر کی طرف سے کیا کیا سوالات متوقع ہو سکتے ہیں  
اسے کس سوال کا کیا جواب دینا ہوگا۔ وہ اٹھا کر سے نشی رہیں  
اور سر ہلاتی رہی۔

کافی دیر تک نجی آوازوں میں مصروف گفتگو رہنے کے بعد میں  
نے پوچھا ”جتنی باتیں تمہیں ذہن نشین ہو جائیں گی؟“  
”تم نے مجھے اپنی طرح کو وہ غمزہ رکھ رکھا ہے کیا؟“ وہ میرے  
کانی کے کنب میں جھانکنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے شرارت  
آیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہیک تو تمہیں اپنے بارے میں خوش فہمیاں بہت ہیں۔۔۔  
اور خوش قسم لوگ سچ راستے میں مارے جاتے ہیں“ میں نے کہا۔  
”سچ راستے میں تو کبھی کبھی بڑا بھی مارے جاتے ہیں“ وہ  
بولی۔

میں نے بل ادا کر کے اٹھتے ہوئے کہا ”اچھا اب انوار اور  
میرے ساتھ چلو۔“  
”میں پاس!“ اس نے مستعدی سے کہا اور ایک جھپٹے سے  
اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”آہستہ۔ اب اتنی مستعدی دکھانے کی بھی ضرورت  
نہیں۔ ابھی میراث باقی۔“



ہے۔ کارگو کو محفوظ رکھنا، خطرہ پر مال وصول کرنا اور فروخت کرنا۔  
سب دوسروں کا دورہ کروا گا۔

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“ راجیل نے مجھے گھورا۔  
”تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ میری رال ٹھیک لگی ہوگی؟“ دوسرے  
کے دھندے نے تو مجھے میری گمراہی کے زمانے میں بھی اہل  
نہیں کیا۔ اب میں کیسے لالچ میں آسکتا تھا؟“

ہاتھیں کرتے ہم والٹن سے آگے نکل چکے تھے جب میں نے  
سامنے سے ایک نہایت شاندار چپ کو تیز رفتاری سے آنے  
دیکھا۔ سنان سڑک پر وہ اپنی سائیز پر چلی آ رہی تھی۔ اس کے  
پیشے کمرے رنگ کے تھے اس سڑک پر ٹریفک چل کر برائے نام  
ہوتا تھا اس لئے اس کی تیز رفتاری پر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔  
حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب اچانک اس کے تارک یک پیشے  
پر دھچک کر لٹکا رہا اور وہ یکدم ہی اپنی سائیز چھوڑ کر سڑک کے  
میں چل گئی۔ ٹارور کی فوجی اور غیر مصروف سڑکیں زیادہ  
چوڑی نہیں ہیں۔ سڑک کے کنارے زنن لٹکی تھی اور ایک کالا  
بھی موجود تھا۔ میری گاڑی کی رفتار بھی کم نہیں تھی۔ اگر میں یکدم  
کے پسے اتار دیتا تو گاڑی اٹنے کا خطرہ تھا۔

تادم میں نے حواس قابو میں رکھے اور پوری قوت سے بریک  
لگائے۔ دونوں گاڑیوں کے بریک یک وقت ہی چرچرائے اور دونوں  
کے دھچک ایک زبردست دھچکے کے ساتھ گویا سڑک میں گڑھے  
راجیل اگر یہ وقت نہ سنبھل گئی ہوتی تو اس کا سرو عڑا سکر رہے ہوتا  
تھا۔ دونوں گاڑیاں ایک دوسرے سے چند انچ کے فاصلے پر رکی  
تھیں۔

اسی لمحے جب سے دونوں سمتوں سے بیک وقت چار آدمی  
کوڑے اور میں گمراہی سانس لے کر رہ گیا۔ ان میں سے ایک عالم  
شر تھا اور تین اس کے گمنام تھے۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں اسٹین  
گنیں تھیں۔ عالم شر بظاہر خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اتفاقاً  
اس سڑک پر آ رہا تھا کہ اس نے دور سے میری گاڑی دیکھ کر پہچان  
لی تھی۔

وہی عالم شر جسے میرے گھبرانے کے منصوبے میں اور راجیل بناتے  
ہوئے جارہے تھے اس نے انا ہمیں اچانک ہی اس دیرانے میں  
گھیر لیا تھا۔

میں ان پر خطر لحاظ میں بھی قدرتی اس ستم طریق پر حیران  
ہوئے بغیر نہ رہ سکا!

وہ چاروں تجزی سے گاڑی کو گھرے میں لینے کے لئے پک  
رہے تھے۔

ان چاروں کی اچانک آمد نے مجھے اتنا حیران نہیں کیا تھا جتنا  
اس وقت راجیل نے کر دیا۔ بجلی کی سی تجزی سے اس نے اپنی قمیص  
کے نیچے ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے مجھے اس کے ہاتھ میں چپنا سا

عالم شر کتاؤ کی کہ مجال بیک نے ہمارے چپنے کے لئے ایک چٹکے  
کا بندوبست کیا ہے اور چند دن کے لئے ہمیں ایک ڈرائیور بھی دیا  
ہوا ہے۔ وہ بنگالی ہو گا جس میں ہمیں اپ دکھانے جا رہا ہوں اور  
ڈرائیور میں ہوں گا۔ میں نہایت محرم کے میک اپ میں ہوں  
گا۔“

”دور میں اسے یہ بھی بتاؤں گی کہ اس وقت بھی میرے پاس  
دفعہ کو کو کین ہے لیکن نہ تو میں اسے بچنے کی پوزیشن میں ہوں اور  
نہ ملک سے باہر لے جانے کی پوزیشن میں ہوں“ راجیل بولی تھیں  
اس سے کہوں گی کہ مجھے اس کی مدد کی بھی ضرورت ہے اور اس  
ہے لے کی تنہا بھی۔“

”ہاں“ میں نے تائید کی ”میرا اعزاز ہے کہ پہلے اس کے  
آدمی اس بنگلے پر پہنچیں گے اس کی تلاش میں گئے“ ہمیں دیکھیں  
گئے“ مجھے دیکھیں گے“ پھر مطمئن ہونے کے بعد فون پر عالم شر کو  
اطلاع دیں گے اور خود بنگلے کے آس پاس پوزیشن سنبھال لیں  
گے اس کے بعد عالم شر صاحب کی ساری دہاں پہنچے گی۔“

”پھر ہمیں ان پر قابو پا کر دیں انہیں لٹھا کرنا ہو گا“ راجیل  
بولی۔

”ہاں۔ تم چوں کہ اس طاقت کو رازدارانہ قرار دو گی اس  
لئے مجھے افسوس ہے کہ وہ سے زیادہ آدمی نہیں بھیجے گا۔ یعنی عالم  
شر سمیت کل تین آدمی ہوں گے جن سے ہمیں نمٹنا ہو گا“ میں  
نے کہا۔

”ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے“ راجیل بولی ”عالم شر  
کو بھی ڈرگ مانی کا آدمی ہے اور مجال بیک بھی۔ تو کیا میرے پاس  
ان سے پہلے عالم شر مجال بیک سے تصدیق نہیں کر سکتا کہ اس  
نے ڈرگ مانی ایک کیریئر لڑکی کے لئے بنگلے کا بندوبست کیا ہے یا  
نہیں؟“

”نہیں۔ وہ تصدیق نہیں کر سکے گا۔ کیوں کہ تم بتاؤ گی کہ تم سبھی  
ان سے پاکستان آئی ہو گی ہو۔ اس وقت مجال بیک ہمیں موجود تھا  
لیکن کل ہی وہ لندن کے لئے روانہ ہوا ہے۔ وہاں سے نہ جانے  
کھل جائے گا۔ عالم شر اس سے رابطہ قائم نہیں کر سکے گا۔“

”ہمیں ڈرگ مانی کے بارے میں خاصی معلومات ہیں“  
راجیل نے زور میری طرف دیکھا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے جو میں نے ہمیں بتایا ہے“ میں نے  
نئی سانس لے کر کہا ”مجھے تو اس سے کئی گنا زیادہ معلومات ہیں  
لیکن کوئی ہماری معلومات سے استفادہ ہی نہیں کرنا۔ ڈرگ مانی  
ناجی جھگڑے کے شاید بھی میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔  
بظاہر میں بھی ملک کی ایک خاصی معروف شخصیت میرے پاس  
آئے لے کر آئی تھی کہ اگر میں ڈرگ ٹریفک کے بارے میں اپنی  
گلی کی آؤ فراہم کروں اور ہمارے کارگو میں منشیات بھی شامل  
ارہائے لگیں تو مجھے دو کروڑ روپے امان کی فاضل آمدنی ہو سکتی

### طلوز و مزاج

|       |           |                                        |
|-------|-----------|----------------------------------------|
| 100/- | ضیاء ساجد | مختب مزاج پارے                         |
| 120/- | ضیاء ساجد | ممتاز ادیبوں کے مختب خاکے              |
| 200/- | ضیاء ساجد | مختب شگفتہ شہ پارے                     |
| 100/- | ضیاء ساجد | سر جیکل وارڈ                           |
| 150/- | ضیاء ساجد | مزاج مزے کا                            |
| 90/-  | ضیاء ساجد | مختب شاہکار محض خاکے                   |
| 120/- | ضیاء ساجد | مختب مزاجیہ مضامین                     |
|       |           | مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور نمبر 2 |

ایک ہسپتال نظر آیا۔ میرے لئے بس اتنی ہی اطمینان کافی تھا۔ وہ اپنی طرف کا درد اذہ کوٹھتے ہوئے باہر لڑھک گئی۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر مجھے اس کی طرف سے زیادہ تشویش نہیں رہی تھی۔ میں بھی اسی لئے اپنا مشین ہٹل نکالتے ہوئے اپنی طرف کا درد اذہ کوٹھ کر باہر لڑھک گیا۔

اس قسم کی صورت حال میں زیادہ فائدے میں وہی رہتا ہے جو دوسرے کو زیادہ سے زیادہ حیران کرے۔ میرے اور راحیلہ کے درمیان زبردست ذہنی ہم آہنگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ محسوس کر لیا تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس بات کرنے کی توہمت ہی نہیں تھی۔

عالم شیر اور اس کے مسلح محافظوں سے اچانک سامنا ہونے پر ہم تو ایک ٹانے کے لئے حیران ہو چکے تھے۔ اب ان کے حیران ہونے کی باری تھی۔ ہوتا مگر یہ ہے کہ جب مسلح افراد یوں اچانک کسی گاڑی کو گھیرتے ہیں تو اس گاڑی کے مسافر چند سیکنڈ کی اس مہلت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے جو انہیں حاصل ہوتی ہے۔ وہ تذبذب میں رہ جاتے ہیں۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے اور آخری لمحے تک اس آس میں رہتے ہیں کہ دشمن سے کوئی بات ہو جائے گی۔ بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

ہم نے اس طرح کی کسی توقع یا تذبذب میں وقت ضائع نہیں کیا۔ میں تو خیر ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ راحیلہ نے بھی ایسا نہیں کیا ورنہ وہ میرے لئے درد گارے کے بجائے رحمت بن گئی تھی۔ میں خود اپنی حفاظت کے لئے تو کچھ کر ہی لیتا لیکن اس کی حفاظت میرے لئے مسئلہ بن جاتی۔

میں نے اور راحیلہ نے انہیں محسوس ہی نہ کرنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ میرا مشین ہٹل اور راحیلہ کا عام ہٹل ایک ساتھ کر کے اور میری طرف کے دونوں گاڑیوں میں تیزی سے میری طرف لپکے تھے، اتنی ہی تیزی سے اچھل کر زمین پر آڑے ترچھے ڈھیر ہو گئے۔ اسی دوران دوسری طرف راحیلہ نے اس گاڑی کو بھی ڈھیر کر دیا تھا جو عالم شیر کے آگے آگے دوڑا آیا تھا۔

انہیں ان کی صرف ایک ٹانجے کی ناخبرگی مر دیا تھا۔ عالم شیر کو شاید انہیں میرے بارے میں بتانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ شاید یہاں تک سمجھتے تھے کہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے جوڑے کی طرف ان کا مشین گینے کے ٹکڑے کی گائی ہوگا، ٹیکر دبانے کی تو ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ وہ دونوں تو بہت بے بیٹھے ہو جائیں گے۔

ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ ہم ایک ٹانجے کے لئے بھی نہیں ہچکچائیں گے اور اتنی تیزی سے ہتھیار نکال بھی لیں گے اور ان کے سینوں میں گولیاں اتار بھی دیں گے۔ یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہو گیا۔

عالم شیر نے اپنے ہماری بھر کم بختی کے باوجود حیرت اچھیز

پہلے کا مظاہرہ کیا اور دیوار سے ٹکرانے والی دیوار کی گیند کی طرح تیزی سے واپس دوڑا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس نے کوئی گن وغیرہ نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا ہی نہیں۔ اس جیکل کے لوگوں کا ہر کام حکم دینے سے اور اشارہ کرنے سے ہو جاتا ہے، اس لئے عین وہ خود کوئی ہتھیار رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت اسلحہ برداروں کے حفاظتی حصار میں رہتے ہیں۔

ہو امیں اس وقت بھی قانڈوں کی بازگشت باقی تھی جب میں تیزی سے چپا۔ ۳۰ سے مت مارا۔ میری یہ متنبہ راحیلہ کے لئے تھی۔ غیبت تھا کہ ابھی اس کے ہسپتال سے نکل ہوئی کسی گاڑی نے عالم شیر کا ٹو نہیں چاٹا تھا۔ اس سے اب مجھے اس ایک لمحے کی ناخبرگی تو قیغ نہیں تھی جس نے عالم شیر کو پلٹ کر بھاگنے کی مہلت دے دی تھی لیکن شاید راحیلہ نے اس کے غیر مسلح ہونے کی اطلاع سے اسے چھوڑ دیا تھا۔ راحیلہ گاڑی کی آڑ میں تھی، میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میرا حال اس کی طرف سے مزید کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں بھی گاڑی کے وکیل کے قریب بیٹھنے کے بل لپکے تاکہ عالم شیر کو ہماگ کر جیب میں بیٹھے دیکھتا رہا۔ جیب اشارت ہی تھی ہاتھوں کی چرچہ بہت کے ساتھ وہ تیزی سے دیواروں کی چوٹی پر لڑا۔ آندھی طوفان کی طرح میری گاڑی کے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ عالم شیر اپنی زندگی کی حفاظت کرنے والوں کی لاشیں لاوارثوں

ہاتھوں کو چھوڑو۔ میں تمہیں تھوڑا سا خزانہ حسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک سیلینڈر پر تھوڑا سا داؤد بڑھایا اور گاڑی چلیے درندے کی طرح غرا کر آگے بڑھی۔ ناگہانی طرح چڑھائے جس طرح چند لمحوں پہلے عالم شیر کی بیماری بھرم اور بڑی سی جیب کے چہرے پر آئے تھے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہلکی سی جھلکی دے کر کہا۔ "تم نے بہت بھرتی دکھائی۔ اگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی تہذیب میں ایک سینکڑہی ضائع کر دیتا تو شاید اس دیرانے میں ان گاڑی کی جگہ ہماری لاشیں پڑی ہوتیں۔ یہ بتاؤ تمہیں ہسپتال ساتھ لے کر نکلنے کا خیال کیسے آیا تھا؟"

"جس انداز میں تم نے بلایا تھا اور جس طرح احتیاط کی" نقیین کی تھی "اس سے میں نے محسوس کیا تھا کہ خالی ہاتھ گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔" وہ بولی۔

"وہ تو میں نے محسوس کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اندیشہ ہوا یا نہ ہو لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہارے ساتھ نہ کر مجھے کسی بھی قسم کے پکر کے لئے تیار رہنا چاہئے۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ میرے دوستوں کو جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "عالم شیر سیدھا پولیس کے پاس دروازہ کیا ہو گا؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس قبیل کے لوگ پولیس کے پاس جانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میں تمہیں یہ ہے گاڑا دیے گی کسی نہ کسی پکر میں پولیس کو مطلوب رہے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے قبضے میں کوئی ایسا چیز نہیں ہوگی جس سے ان کا عالم شیر سے کوئی تعلق ظاہر ہو سکے۔ تبھی وہ اتنی بھرتی سے انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔"

"بھاگ کر وہ نہیں سکا تھا۔" راجہ کمری سانس لے کر بولی۔

"ایک توتے ہوتا اس کے حق میں مسلح ہونے سے زیادہ اچھا ثابت ہوا۔ دوسرے میں بس ایک لمحے کے لئے چٹکی لگی۔ نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا کہ تم ابھی اسے مروہ دیکھنا نہیں چاہتے ورنہ میری انگلی تو زہر کو توڑنا دبا ہی چکی تھی۔ باقی تین گولیاں اس کے حصے میں آجائیں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ قائم ہے۔" میں نے سکرانے ہوئے کہا۔ "میرے چہنچے سے پہلے ہی میرے ذہن کا پیغام تم تک پہنچ چکا تھا۔ اگر ہم اسی طرح دو قالب ایک ذہن کی طرح سوچ سکیں تو ہم دو افراد دس میں آدمیوں کی ہم سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن تمہیں خطرناک ثابت ہونے کا اتنا شوق کیوں چڑھا ہوا

میں دیرانے میں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ میں کہنے کے بعد کمر سیدھا کھڑا ہوا تو گاڑی کے دوسری طرف سے راجہ بھی اٹھتے ہوئے بولی "یہ صلہ دینے میں لوگ نیکی کا۔ میں نے اس کہنے کو مٹا ہونے کی وجہ سے نہیں مارا لیکن وہ محسوس ابھی جاتے جاتے مجھے جیب تلے پھل جاتا۔ اگر میں بدوقت لڑکھ کر گاڑی کی پیچھے نہ ہو جاتا۔"

"دل چھوٹا مت کرو۔ صلہ خواہ کچھ بھی ملے انسان کو احسان کرتے رہنا چاہئے۔" میں نے سکرانے ہوئے کہا اور مشین پائل کی ٹال میں پھونک مارنے کے بعد اسے واپس اندر کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا ہسپتال بھی شاید جہاں سے یہ آمد ہوا تھا وہیں واپس پہنچ چکا تھا۔

میں نے تیزی سے تینوں گاڑی کا جائزہ لیا۔ تینوں ہی مرچکے تھے۔ خون زمین میں جذب ہو چکا تھا۔ کسی میں بھی زندگی کی رمق تک نہیں تھی۔ "تمہیں ان کے پاس پڑی ہو گی تمہیں۔ تینوں ہی کو پیٹے میں گولیاں لگی تھیں۔"

راجہ میرے قریب آئی اور جس طرف جیب مٹی تھی "اوپر اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "عالم شیر کا شائبہ نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔ مجھے علمی قسم کی کارچیز تک کا شوق نہیں ہے۔ اگر مجھے اس وقت اس کی ضرورت ہوتی تو میں اسے جانے ہی نہ دیتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ عالم شیر تھا؟"

اس نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے ایک رخسار پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ کپڑوں پر بھی مٹی کے دانے پڑ گئے تھے۔ چہرے پر پھر وہی پہلی سی مصویت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فرسٹ ایئر یا سینڈ ایئر کی کوئی طالب کچھ دیر کس شرارتوں میں مشغول رہنے کے بعد گھر واپس آئی ہو۔ اس کا سفید لباس اس آواز کو مزید گہرا کر رہا تھا کیونکہ بیشتر گڑگڑاؤں کا یونیفارم سفید تھا۔ "اتنی تفصیل سے تم مجھے عالم شیر کے بارے میں بتا چکے تھے۔" وہ بولی۔ "اس کے بعد بھی میں اسے نہ پہچانتی؟ تم مجھے الو گتے ہو کیا؟"

"الو تو خیر تم نہیں ہو سکتیں، الو کی مادہ ہو سکتی ہو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے گاڑی کی طرف کھینچے ہوئے کہا۔ "اگے اس سے پہلے کہ کوئی اس طرف آئے، ہم بھاگ چلیں۔"

"دور رہے ہو؟"

"ہاں۔ لاشیں میرے رومانی خوابوں کو خراب کر دیتی ہیں۔"

میں نے گاڑی میں بیٹھنے ہوئے کہا۔

"اوہ۔۔۔ اس کا مطلب ہے رومانی خواب دیکھے جارہے ہیں۔ آج کل۔" وہ استہزائیہ نئے لہجے میں بولی۔ "کون آئی ہے تمہارے رومانی خوابوں میں؟"

"بہت سی آتیں ہیں۔" میں نے بے پردائی سے کہا "کچھ

نوار بکرا لے۔ کچھ لادارٹ کا نہیں۔ کچھ چوہہ چلیں۔ ان فضول

مونی تو ایک بار پھر غار چڑھائے۔ راحیل بولی۔ ”اب ہم جا کمال رہے ہیں؟“  
 ”وہیں جہاں کے لئے روانہ ہوئے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں وہ مکان دکھانے کے لئے نکلا تھا جہاں ہمیں عالم شیر کے لئے پھندا لگانا ہے۔“

”لیکن اب اس کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟“ وہ قدرے حیرت سے بولی ”مجھے تو امید نہیں کہ اب وہ قمارے پکر میں آئے گا۔ وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اب وہ منصوبہ قابل عمل رہ گیا ہے۔“

”منصوبہ اب بھی قابل عمل ہے۔“ میں نے کہا ”اس میں صرف چھوٹی موٹی چند تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”ایک تو اب اس پر ہشت دس دن ٹھہر کر عمل کیا جائے گا۔ دوسرے تمہیں تھوڑا سا میک اپ کا سارا لینا پڑے گا۔ وہ تمہیں بہت زیادہ اچھی طرح تو ان حالات میں نہیں دیکھ سکا۔ چھوٹی موٹی تبدیلیوں سے ہی کام چل جائے گا۔ اور میرا تو پہلے بھی طبع بدل کر اس کے سامنے آنے کا ارادہ تھا۔“

”تمہاری بھی کھوپڑی میں کیسی ٹیڑھا پن ہے ضرور۔“ وہ بولی ”آخر تم نے اس وقت ہی اسے گولی کیوں نہیں مار دی جب وہ اُٹے

ہے؟“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”میں بہت خطرناک حالات میں گھرا ہوا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
 ”میں وہاں کچھ چکی ہوں۔ کچھ خطرناک حالات، تو ابھی چپ میں بیٹھ کر گزار دیتے ہیں۔“ وہ نہ بٹا کر بولی۔  
 ”ایک لڑکے کو شٹ کر کے اتنی بڑی تیس مار غاں بننے کی کوشش مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”خطرناک حالات سے میرا اشارہ عالم شیر کی طرف نہیں تھا۔ حالانکہ وہ بھی کچھ کم خطرناک آدمی نہیں ہے۔ ڈرگ مانیا کا آدمی ہے اور ڈرگ مانیا کی خوفناک کا تمہیں اندازہ نہیں۔ ہر حال اس کے باوجود میں اسے اپنے خطرناک دشمنوں میں شمار نہیں کرتا۔ وہ تو میری نظر میں ایک بڑا بڑا ہوا گدا ہے۔ جو خواہ مخواہ اور حراہ لوگوں کو دو لٹیاں مارتا پھرتا ہے۔“

”تو پھر کیا اس کے آقا تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں؟“ راحیل نے پوچھا۔  
 ”اس کے آقا ڈرگ مانیا کے بڑے لوگ ہیں اور ڈرگ مانیا کے بڑے لوگ تو جس حکومت کے پیچھے لگ جائیں اس کا بھی تحفظ الٹ دیتے ہیں۔ میں بے چارہ کس شمار قطار میں ہوں۔“ میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا ”لیکن عجیب اور ناقابل یقین سی بات ہے کہ میرے پیچھے جو لوگ لگ گئے ہیں وہ ڈرگ مانیا سے بھی اونچی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ بہت اونچی۔“

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ترجیحی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دل میں وہ میری بات پر یقین رکھتی تھی لیکن ظاہر مضحکہ اڑانے کی کوشش کرتی تھی۔ اب بھی وہ استعزائیہ لہجے میں بولی۔ ”اب ایسی بھی کوئی انوکھی چیز نہیں ہو کہ کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے تم میں؟“  
 ”میری تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔“ میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا ”میں تو خود کو بالکل حقیر فقیر سی چیز سمجھ کر ایک کونے میں بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔“

”چلو خیر۔“ وہ شاباش سے لہجے میں بولی۔ ”اب تم تھانے کے لئے بے قاراری ہو تو تھانہ کیا پکڑے؟“  
 ”نہیں۔ میں ہرگز بے قرار نہیں ہوں۔“ میں نے زکمائی سے کہا۔ ”میں نے اشارتاً بھی صرف اس لئے تاکہ کر دیا ہے کہ جتنی ہوشیار اور مستعد اس وقت نظر آتی ہو، آئندہ اس سے بھی زیادہ رہتا۔“

”چلو اب اتنا رامت متاؤ۔ پوری بات بتاؤ۔“ اس نے مجھے پکارتا۔  
 ”نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ فی الحال زیادہ جانا تمہارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ میں نے اپنے لہجے میں بھی حتی الامکان سنجیدگی سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
 وہ ایک لمبے خاموش رہی۔ میں نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر

معروف مصنف

ایم اے راحت

کالیک خوبصورت اور شاہکار ناول

کائنات

جلد اول: 45 جلد دوم: 45

پاکستان کی سب سے بڑی کتاب فروش

اردو بازار لاہور

قدموں بھاگ کر چپ میں سوار ہو رہا تھا؟ میں تو ہنگامی مٹی تھی لیکن اس وقت وہ تمہارے بھی نشانے پر تھا۔ جہاں تین لائیں گری تھی اور وہاں چوتھی بھی گرجا تھی اور قصہ ختم ہوتا۔ اتنے لمبے چوڑے پکڑیں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میری کھوپڑی میں بیڑھا پن موجود ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”میری کوشش ہوئی ہے کہ میرا کوئی خاص دشمن جس نے بلاوجہ مجھے بہت زچ کیا ہو یا بے بنیاد باتوں پر میری جان کے ورپے رہا ہو اور بیش مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا ہو۔“ اسے میں ہنگامی یا حادثاتی انداز میں ہلاک نہ کروں بلکہ نہایت مہذب و سلیکون سے اسے اس کی فوج جرم شاکر موت کے ستر روانہ کروں۔“

”اس کا مطلب ہے تمہارے ذہن میں کیسے اذیت پرستی کے جراثیم موجود ہیں؟“ وہ بولی۔

”فلا خیال ہے تمہارا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کبھی کسی کو حتیٰ کہ اپنے دشمن کو بھی ایذا پہنچا کر خوشی اور طمانیت محسوس نہیں ہوئی۔ میں انہیں ان کی بدوش سے باز آنے کا ہر موقع مٹاتا کرتا ہوں لیکن وہ مجھے مجبور کر دیتے ہیں کہ جو زبان ان کی سمجھ میں آتی ہے صرف اسی میں ان سے بات کروں۔ وہ میرے لئے بجا کا مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ بات چینی ہو جاتی ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہ سکا ہے نہ رہا میں۔“

وہ جو خیال سے انداز میں ہٹا کر بھر کر دیتی تھی۔ میں نے گاڑی ایک چھوٹے سے بنگلے کے سپاہ گریٹ کے سامنے لے جا دی۔ چابیوں کا بچھا نکال کر میں نے کئی چابیاں تالے میں آزمائیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کون سی چابی اس تالے کی تھی۔ آخر ایک چابی لگ ہی گئی۔

”تمہاری سرگرمیاں کچھ مشکوک سی ہیں۔“ وہ میرے ساتھ اندر آتے ہوئے معنوی سنجیدگی سے بولی۔ ”شعرے اپنی دور اس دران سی چک رہے ہیں۔ بنگلا کیوں لے کر چھوڑا ہوا ہے؟“

”مجھ جیسے لوگوں کو ہر طرح کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس لیے ہر طرح کی جہیزیں تیار رکھنا پڑتی ہیں۔“ میں نے کہا ”ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہاں سے زرا آگے ایک انٹر سٹرل ایریا ہے۔ وہاں کسی زمانے میں ہم نے ایک چھوٹا سا کارخانہ خرید لیا تھا۔ یہ بنگلا ہمیں اس کے ساتھ ہی ملا تھا۔ اس کے اضافے کے تین چار آدمی یہیں رہتے تھے۔ بنگلا کرائے کا تھا۔ وہ کارخانہ محض دودھری تھا۔ اسے ہم کب کا چھوٹے تھے ہیں۔ اضافے کے وہ لوگ بھی جا چکے ہیں جو یہاں رہتے تھے لیکن یہ ابھی تک ادارے کھاتے میں پڑا ہوا ہے۔ مالک اس کا ملک سے باہر ہے۔ لیکن وہ نہیں میں اسے کرایہ جا رہا ہے۔ اسے بھی کوئی پروا نہیں ہے۔ ہمیں بھی کوئی پروا نہیں ہے۔“

”ہاں بھئی! بد سے لوگوں کی ہڈی ہاں۔“ وہ لٹھری سانس لے

کر بولی۔

”بھئی کھار اس کی ضرورت پڑی جاتی ہے۔ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ کرایہ وصول ہو گیا۔“ میں نے کہا۔

”کسی بھولی بھنگی لڑکی کو لے کر یہاں آ جاتے ہو گے۔“ وہ بظاہر سادگی سے بولی۔

”حق کیس کی؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”لڑکی کو لے کر اتنی دور اس دیرانے میں دنگے کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا گھر کیا اس قسم کی سرگرمیوں کے لئے بڑا ہے؟ اس سے زیادہ محفوظ جگہ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ میں کون سا شادی شدہ ہوں جو مجھے بیوی کا زور ہو گا۔“

درا وقت سے میں نے ایک گری سانس لے کر کہا ”لیکن اسے کئی لڑکی ایسا چھین ابھی تک یقین نہیں آیا ہے کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں؟“

”وہ تو مجھے معلوم ہے کہ آدمی تو تم بہت شریف ہو، لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجبوراً کسی لڑکی کی طرف دیکھنا بھی پڑ جائے تو آنکھ کے بجائے کان سے دیکھتے ہو لیکن شریف آدمیوں کو بھی تو کبھی کبھی ضرورت مند اور بے سارا لڑکیوں کو سارا دینے اور ان کے کام آنے کے لئے غلطی میں لے جانا پڑتا ہے۔“ وہ اپنی شریر مسکراہٹ کو دہانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”چھوٹا اس بند کو اور اس مکان کو اچھی طرح دیکھ لو“ ساخت کو سمجھ لو۔“ میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔

”میں باتوں کے دوران بھی سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔“ وہ بولی۔

بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اچھی طرح اس کا معائنہ کرنے کے بعد بولی۔ ”جگہ تو معتدل ہے۔ کتنا سکون ہے یہاں۔“ اس نے گری سانس لی۔ ”میں تو سوچ رہی ہوں تم مجھے گھبرک دالی کو کئی کے بجائے کیا دے دیتے؟“

”ہاں بہت فائدہ دیتا۔ مجھ سے تمہاری جان کا پی راتی۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں جو چند بنگلے نظر آ رہے ہیں ان میں ایک سی بڑی خرابی ہے کہ کبھی کبھی یہاں ڈاکوؤں کے پورے پورے گروہ آکر رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ تم جیسے حسین میزبان کو دیکھ کر تو وہ یہاں سے جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیتے۔ بلکہ شاید ان میں انہیں میں لڑائی شروع ہو جاتی کہ تمہاری میزبانی پر کس کا حق زیادہ بنتا ہے۔“

اس کے رساموں پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ ایک دوا دے پر گھوٹنا رسید کرتے ہوئے بولی۔ ”ہوئی کہ تمہیں کچھ اس قسم کی بڑی عادت ہے۔ فی الحال تو میں نے یہ گھوٹنا دوا دے پر رسید کر کے اپنا قصہ نکال لیا ہے لیکن تم نے مزید اس قسم کی کئی بات کی تو یہ گھوٹنا تمہارے جڑے پر بھی پڑ سکتا ہے۔“

”اس کے بعد بہت دیر تک اس گھوٹنے کی ماضی کرنا پڑے

کہا "میرن آف شیخ پلے۔"

میں نے مکان کو آلا لگایا اور ہم واپس روانہ ہو گئے۔ واپسی کے لئے میں نے دروازہ راستہ اختیار کیا۔ شرمیج کر میں نے راجہ کو ہوئی آٹا مارا کہ وہ اپنی گاڑی میں چلی جائے اس کے رخصت ہونے تک میں نے گاڑی باہر سڑک پر روک رکھی اور جب وہ باہر آئی تو میں کچھ دور تک اس کے پیچھے لگی گیا۔ حتیٰ کہ مجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا جب میں دفتر لوٹ آیا۔ آج کسی وارننگ کے بغیر راجہ کو ایکشن میں دیکھ کر میں چلے پر پہنچ گیا تھا۔ ذہنی طور پر تو وہ میرے جتنا قریب تھی اور اس سے میرا جو رشتہ یا تعلق تھا وہ اپنی جگہ لیکن عملی طور پر بھی وہ میرے نہایت قریبی اور خاص ساتھیوں میں شامل ہونے کی اہل تھی۔

اپنے ان قریبی اور خاص ساتھیوں کے ملنے کو اب میں نے "دی سرکل" کا نام دے دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ راجہ کو بھی "دی سرکل" کا تمام سیٹ اپ سمجھا دوں گا اور اس میں شامل خاص خاص ساتھیوں سے متعارف کروا دوں گا۔ اس کے علاوہ اب اسے چند خاص ہتھیار وغیرہ بھی فراہم کئے جاسکتے تھے مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ہمارے ملنے میں بہت شاندار اضافہ ثابت ہو سکتی تھی۔

دفتر پہنچتے ہی یہ سب خیالات میرے ذہن سے نکل گئے کیونکہ واشنگ ڈیم میں راجہ میرا شہر تھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اس کی سوتلی سوتلی خواہشورت آنکھوں میں گھٹی ڈورے حیرت سے تھے اور میں میں خوشی و ارباب تھا۔ ٹائی کی گرد ڈھیلی تھی اور کار کا جین کھلا ہوا تھا۔ سوٹ شکن آنکھ تھا۔ اس پر اس وقت بھی ہلکا سا بخار طاری تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ اس کا مستقل ہی اسٹائل تھا۔ گھر سے باہر وہ شاید ہر وقت اسی طے اور اسی موڈ میں نظر آتا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے ایک دیکھ گلیں سالا ابلی بن جا رہا ہوا تھا۔

"یہ تم چاہتے کہاں سے ٹپک پڑے؟" میں نے اس سے گلے لیتے ہوئے کہا۔

"میں۔۔۔ جان بگم! اہم تو جب بھی چلتے ہیں اسی طرح اچانک چلتے ہیں۔" وہ ہاتھ اونچا کر کے ہیرا کا تھمکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "چھاپا بھلا اطمینان جانے کے ارادے سے نکلا تھا لیکن اچانک تمہاری یاد آگئی۔ دل پر رقت طاری ہو گئی۔"

"در تم نے سوچا پھلو اطمینان نہ سنی" افضل چوہدری کا دھڑکی دیکھ لیتے ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔" میں نے اس کی بات آنے ہوئے کہا۔

کی۔ میں ممکن ہے ہڈیوں کے کسی ماہر کو بھی دکھانا پڑے۔" میں نے کہا۔

"خوش قسمی ہے تمہاری۔" وہ گھونسا ہوا میں کسی غیر مٹی چیز کو رسید کرتے ہوئے بولی "اس گھونسنے کی حقیقت اس سے پوچھنا جس نے کبھی کمایا ہوگا۔"

"جیسے ایک رخسار پر پڑا ہوگا اس نے دروازہ کھل بھی آگے کر دیا ہوگا۔" میں نے کہا "ویسے میں تمہیں سنجیدگی سے بتا رہا ہوں۔ ایک بار آکھوں گا ایک پورا نولہ برساں آکر رہنے لگا تھا" سب آٹے وغیرہ تو ذریعے تھے۔ جس طرح وہ حیرت سے یہاں رہنے لگے تھے اس طرح تو فرما لگ بھی اپنے مکان میں نہیں رہتے۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" راجہ نے زچگی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ اپنے صرف دو آدمیوں کو بھیجا تھا۔ ڈاکو اس طرح سر پاؤں رکھ کر کھائے کہ لوٹے ہوئے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے اور کچھ زیورات بھی ہمیں چھوڑ گئے تھے جو ہمیں پولیس کی خدمت میں پیش کرنے پڑے۔ نہ جانے کن بد نصیبوں کے ہوں گے۔" میں نے بتایا۔

"تجربہ متقل ہے۔" راجہ بولی۔ ہم معائنہ مکمل کر چکے تھے۔ "مجھے تو اب بے چارے عالم شیر پر تکیا رہا ہے۔" "اگر وہ لوگ مجھے گولیوں سے چھلٹی کر کے تمہیں اٹھا کر لے گئے ہوتے تو پھر شاید تمہیں ان پر اور بھی زیادہ ترس آتا۔" میں نے کہا۔

"اچھا آسان نہیں ہے مجھے اٹھا کر لے جانا۔" وہ منہ ہٹا کر بولی۔ "چلو اب واپس چلیں۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے معنوی سنجیدگی سے کہا "میں تم کی کہہ رہی تھیں بڑی پرسکون جگہ ہے۔ اب ہفتہ دس دن گزار کر رہی چلیں گے۔"

"میرا تو کچھ نہیں ہے۔" وہ کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولی۔ "کیسے تم اپنے کا دوبارہ جدائی کے غم میں ہوش و حواس نہ کھو بیٹھو۔"

"گادواد سے جدا رہنے کو کون کہہ رہا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "دو زمانہ صبح میں اپنا برف کیس لے کر دفتر روانہ ہوا کروں گا۔ تم گیت پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا کرنا۔ پھر شام کو گیت پر کھڑے ہو کر میرا انتظار کیا کرنا۔ میں تم کا ہارا آنس سے آیا کروں گا۔ تم میرے لئے اچھے اچھے کھانے پکا کر رکھا کرنا۔"

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ شیخ پلے واپس آجاؤ۔" وہ میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولی۔ "آئو ایک پروین کا اصلاحی معاشرتی اور روحانی اضافہ ختم ہو چکا ہے۔ آج کل تو تیسرے بانڈ کی مارو دھاز سے بحر و بر زیر چل رہی ہے۔"

"چلے جانا اب واپس آگیا۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر

کرنے سے قاصر ہوں کہ زندگی اس وقت زیادہ بے کیف تھی یا اب ہے؟

"یادوں کی تھڑکی میں بھر کسی وقت ہاتھ ادریں گے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے کہا۔ "نی اگال تم میرا جیس دور کرو۔ یہ بتاؤ کیسے آئے ہو؟"

"کمال ہے یا را۔" وہ حیرت سے بولا "میں نے بتایا تو ہے کہ تمہاری یاد آئی اور میں چلا آیا۔ باروں سے یا تو اسی طرح لٹے آتے ہیں۔"

"بہت دور سے پہنچی نہیں یاد تم تک۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری یاد اتنی تھکڑی تھکڑی سی ہوگئی ہے۔ بخاری اس رات کی ملاقات کو خاسے دن گزر چکے ہیں جب تم اپنی گاڑی کو آگے سمجھ کر گدھے کی طرح لاٹیں مار رہے تھے۔" میں نے ذرا روکے لیے میں کہا۔ میں ابھی تک اس کے سامنے کھڑی تھا۔

"اور۔۔۔ اب میں سمجھا۔" وہ یکدم چمکتے ہوئے بولا "تم ناراض ہو مجھ سے۔" خیم بھی بتا رہی تھی۔ تمہاری ناراضگی بجا ہے۔ میں واقعی بڑی تاخیر سے تم سے ملے آیا ہوں۔ لگوئیے یا را پیسے نہیں ہوتے لیکن یا را میں بس پتا نہیں، کچھ عجیب سا ہو گیا ہوں۔ ذہنی زبرد جرح کو پہنچی ہے بس اور حرح رہتا چلا جاتا ہوں۔ میں تو ہی نہیں گنداپلا ہو گیا ہوں۔ کسی چیز کا خیال نہیں آتا تو میمون نہیں آتا۔ کسی چیز کی سبک چڑھتی ہے تو وہ میری جان کو آجاتی ہے اور میں اس کی جان کو آجاتا ہوں۔"

میں خاموش کھڑا ایک لمبک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ذرا غور سے میری طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تمہاری ناراضگی دور نہیں ہوئی ہے لیکن یا را میں تم سے ہر طرح سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔ میں تو اپنی غلطی پر تم جیسے دوست کے پاؤں بھی پکڑ سکتا ہوں۔"

اس نے اٹھ کر کچھ میرے پاؤں پکڑ لے اور یکدم ہی آنسو بہانے شروع کر دیے۔ میں حیران رہ گیا۔ دونا خواہ کسی کا بھی ہو یا ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ پریشان کر دیتا تھا اور مرد کا دونا تو مجھے بہت ہی عجیب لگتا تھا۔ راہو نے یکدم ہی مجھے الجھن میں پھنسا دیا تھا۔ میں پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ بھوں بھوں کر کے میری ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ میں نہ تو اس سے ناراض تھا اور نہ ہی خروش۔ میں تو اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خیم نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے تو یہ تاثر ملا تھا کہ وہ ایک خود غرض ہے پروا اور لاابالی انسان تھا جسے اپنے عیش و آرام اور اپنی خواہشوں کی تکمیل کے سوا دنیا کی کسی بات سے کسی کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن راہو کا لہجہ اور اس کے انداز و اطوار مجھے کچھ اور ہی کہانی سناتے تھے مجھے

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "آنکھیں مسکیر کر اور حرح دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بلڈنگ اپنی ہے یا کرائے کی ہے؟"

"پہلے کرائے پر ہی تھی۔ بعد میں خرید لی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"واہ واہ کیا ٹھاٹ ہیں تمہارے۔" وہ قہوڑا سا جھوم کر بولا۔ "بھئی میں گھر سے دو رنگ پانی کر چلا تھا۔ ایک رنگ کا شمار تو اس وقت دور ہو گیا جب میں اس بلڈنگ میں داخل ہوا۔" پھر اس نے سامنے بیٹھے کی دیوار کے عقب میں بیٹھی ہوئی کیتھرین کی طرف اشارہ کیا۔ "دوسرے رنگ کا شمار اس وقت دور ہو گیا جب اس نے مجھے روک دیا۔ میں تو تمہارے نام کی سختی دور سے ہی دیکھ کر منہ اٹھائے تمہارے کمرے میں گھسا جا رہا تھا کہ اس بی بی نے مجھے دم سے پکڑ کر کھینچ لیا اور تھا ہونے لگی کہ میں بظاہر تو خود اہمیت پڑھا لکھا نظر آتا ہوں لیکن دفتری آداب سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے اسے بتایا بی بی یا چوہدری میرا بچپن کا یا رہے میرا لنگوٹا ہے۔ اس کے دفتر میں آنے کے لیے مجھے دفتری آداب سیکھنے کی ضرورت نہیں لیکن خاتون نے میری ایک نہ سنی اور مجھے بیٹھے کے اس بچرے میں انتظار کے لیے بٹھا دیا۔ بلکہ وہ تو مجھے زخا نے ہی کی فکر میں تھی۔ انتظار کرنے کے لئے تو میں خود ہی بیٹھا ہوں۔"

"خیم ہوگئی تمہاری داستان غریب حرح؟" میں نے اسے گھورا۔

"بالکل ختم ہوگئی۔" اس نے منہ باندھ انداز میں ہاتھ باندھ لئے۔

"تو پھر اندر چلو۔" میں نے اس کی کمرہ ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دھکا دیا۔

"ابھی سے کیوں دھکے دے رہے ہو جان بھگرا؟" اس نے شکوہ کیا۔ "جب رخصت کرنا ہو گا اس وقت دھکے نہ دے۔"

"یا را یہ "جان بھگرا" کون سی اصطلاح ہے؟" میں نے اسے مزید ایک ہلکا سا دھکا دے کر کمرے میں پہنچاتے ہوئے پوچھا۔ "صرف جان۔۔۔ جان من۔۔۔ یا جگر یا روغرو تو میں نے سنا ہے یہ جان جگر کیا ہے؟ پلو جان دیکھو ہو آت بھی ٹھیک لگتا۔"

"دیکھو یا را محبت میں گرامر کو کچھ میں مت لایا کرو۔" وہ بڑاری سے بولا۔ "ہاں جو لفظ دل کو اچھا لگ گیا" زبان پر چڑھ گیا اور جس سے جذبے کا اظہار ہو گیا وہ ٹھیک ہے۔ دیے باقی داوے تم اتنے غلام کب سے ہو گئے؟ اسکول کے زمانے میں تو تمہاری گرامر بھی خاصی غریب تھی۔ میرا مطلب ہے پور تھی۔"

"اسکول کے زمانے میں میری گرامر تو کیا؟ میں خود بھی پور تھا۔" میں نے غیبتی سانس لے کر کہا "وہ تو تم جیسے دوستوں کی مرانی سے کچھ شغل میلہ ہو جاتا تھا ورنہ زندگی بہت ہی بے کیف ہوتی۔"

وہ سوسنے پر ڈیر ہوئے ہوئے بولا۔ "ویسے یا را۔۔۔ اس فیصلہ

ہیں۔ تم دی تھے۔ میں دی راہ۔

”میرے خیال میں تو اندر بھی کچھ تبدیلیاں آگئی ہیں۔“ میں نے کہا ”ہم صرف تھوڑے بہت دی تھے وہی راہوں گئے ہیں۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ کیا پیو گے؟“ اس نے چند منٹ میں ہی میرے دل سے بد گمانیوں کو دھووا تھا۔ میں اس کے لئے اپنے دل میں دی ہوئی سی عبت ’دی پلا سا غلوس محسوس کر رہا تھا جو بچپن کی یاد تھی کی بنیاد ہوتا ہے۔

”میں جو کچھ پینے کا شرفین ہوں وہ تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”اس کا انتظام معلوم نہیں تمہارے دفتر میں ہو گا یا نہیں۔“ بانی کسی چیز سے ابدولت کو اتنی دلچسپی نہیں۔ یہ لفظ نے ’گرم‘ چائے اور کافیاں وغیرہ تو تم جیسے شریف شرفا کو بیلانے کی چیز ہیں۔“

”واہ اور بے بد معاش!“ میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”خود کو شراب کی لت لگا کر کچھ رہے ہو کہ تم بہت بڑے بد معاش ہو گئے ہو؟“

”نہیں بد معاش نہیں۔“ وہ آنکھ دبا کر بولا ”سمجھا کرو۔ میرا مطلب ہے تم تو زندگی سے لطف اندوز ہونے والے لوگ ہیں۔ شریف شرفا سے ہماری مراد ہوتی ہے‘ بے کیف اور پور زندگی گزارنے والے لوگ۔ بحث چھوڑو یہ بتاؤ کچھ پینے پلانے کا انتظام ہے یا نہیں؟“

”انتظام تو ہے۔“ میں نے کہا ”ہاں ایک دیوار میں باقاعدہ پار موجود ہے۔ میرے ہاں غیر ملکی مسلمان بھی خاصی تعداد میں آتے رہتے ہیں لیکن میں تمہاری خدمت میں اس قسم کی کوئی چیز پیش نہیں کروں گا۔“

”آخر کار نیکے ناوی غلامانہ ذہنیت کے مارے ہوئے۔“ وہ ہاتھ کو جھٹک دے کر بولا ”گوروں کی خدمت میں ہی گئے رہتا۔ اپنے ہم وطنوں کو کبھی نہ لانا۔“

”میں اپنے ہم وطنوں کو ایسی چیزوں سے نوازنے والوں میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”مگر تمہیں کہیں کے اچھے سے مانگتا ہے تو کوئی ذہنیت کی چیز مانگو۔ خود ہی بتا رہے ہو کہ میں گھر سے دو پیسہ بانی کر رہا ہوں۔ ابھی وہی جگہ رکے ہو تو منہ چاڑھ کر بیٹھ گئے ہو۔ رات تک سختی کی جاو گے؟“

”کبھی نہ شائب نہیں رکھا۔“ وہ بے پردائی سے بولا۔ ”جب بھی غمار ٹوٹنے لگتا ہے تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔“

”زندگی میں کبھی بانی یا جوس وغیرہ بھی پیا ہے یا اس قسم کی چیزوں کا استعمال بالکل چھوڑ دیا؟“

”جب کچھ اور میسر نہ ہو تو مجبوراً بانی یا کوئلہ رک بانی لیتا ہوں۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”ا۔۔۔ راہوں گئے اپنے حال پر رحم کرو۔ اپنے مختصر وجود کو دیکھو اور اپنی پینے پلانے کی رفتار

اس کی بات سچ معلوم ہوتی تھی کہ وہ لاپرواہی اور قدرے سنگی تھا مگر خود غرض نہیں تھا۔ بس جدوجہد اپنی زندگی تک جاتی ہوگی اور مرگا رہتا ہوگا۔

”یہ کیا ہے ہو گئی شروع کر دی ہے تم نے؟“ میں نے اسے ڈانٹا اور کوٹ کا کالر پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ ”بند کر دیہ نہیں۔ جھٹکے۔ اور پاؤں بھی چھوڑ دو میرے۔ یہ میرا آفس ہے۔ کوئی اسٹیج نہیں ہے جہاں تم دھواں دھار قسم کی اینٹنگ کر کے داد سمیٹ سکو۔ آرام سے ادھر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اسے صوفے کی طرف دھکیلا لیکن اس نے میری ٹانگوں سے لپٹنے کی کوشش جاری رکھی اور بدستور دوتے ہوئے بولا ”میرے آفسوں اور میرے غلوس کو اینٹنگ کا نام مت دو۔ بس تم ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے معافی حاصل کرنے بغیر نہیں چلوں گا۔ میں تمہاری دوستی سے محروم ہونا اور ڈر نہیں کر سکتا۔ اس بھرے شہر میں میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ تمہیں مجھ کو معاف کرنا ہوگا۔“

”اچھا بابا میں نے تمہیں معاف کیا۔ معاف کیا۔“ میں نے اسے صوفے پر دھکیل کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”آپ تم بھی مجھے معاف کر دو۔ تم تو انسان کے بجائے جو تک ہیں گئے ہو۔ جھاڑ جھکاڑ ہیں گئے ہو۔ چٹ جاتے ہو تو چھوڑتے ہی نہیں۔ میں نے تو تمہیں ذرا غور سے دیکھ کر معیت ہی مل لے لی۔“

”شکر ہے تم نے مجھے معاف کر دیا۔“ وہ آفس پر بٹھتے ہوئے بولا ”دروغ میں نہ جانے کیا کر گزرتا۔ جو تک اور جھاڑ جھکاڑ تو ہم صرف یاروں کے لئے بن سکتے ہیں ورنہ ہم تو وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا ڈھونڈ لیتی ہے۔ بہت سے لوگ ہمارے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں مگر ہم ان کے ہاتھ نہیں آتے۔ ان میں میری بیوی بھی شامل ہے۔“ اس کا لہجہ شامانہ ہو گیا اور وہ ذرا جھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ آفس خشک ہو چکے تھے۔

میں اس کے متقابل بیٹھا ایک ٹنگ اس کی طرف دیکھ کر بار بار تھا۔ وہ سب سے ہونے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یارا تم اس طرح ایک ٹنگ کیوں گھورتے ہو؟ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔ تمہاری نظریں ہی ظالم ہے۔“

میں نے گہری سانس لے کر اس کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا ”میں دیکھ رہا ہوں کہ بچپن سے اس عرب تک انسان میں کتنی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ بچپانہ مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی انسان ہے۔“

”ہر ایک میں نہیں آتیں۔“ وہ فوراً بولا۔ ”جن کے حالات ہماری ہی تبدیلی ہوتے ہیں وہ انسان خود بھی ہماری ہی تبدیلی ہو جاتے ہیں۔ انسان کو اس کے حالات ہی تو تبدیل کرتے ہیں اور ہلکا کیا چیز انسان میں تبدیلی لا سکتی ہے؟“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ بالکل ایک نئے انسان ہو۔ یہ تمہارا نیا جسم ہے لیکن یار! میرا خیال ہے اندر سے ہم وہی





و غیر کا آواز دیا۔

کولڈر نکلتی آئیں تو وہ باطل نخواستہ ایک گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ”اب تم نے منگائی ہے تو بتائی پڑے گی۔ ویسے یہ اپنے پینے کی چیز نہیں ہے۔“ پھر ایک لمبے کے توقف کے بعد وہ رازدارانہ سے لہجے میں بولا ”پھر بھی۔۔۔ کچھ تباہ تو کسی کیسا ذہنی بوجھ ہے؟ کوئی کاروباری مسئلہ ہے۔۔۔ دھرمی مسئلہ ہے۔۔۔ عاشقانہ مسئلہ ہے۔۔۔ تاجرانہ مسئلہ ہے۔۔۔ یا عاجزانہ مسئلہ ہے؟ یا عاجزانہ مسئلہ میری زبان میں اسے کہتے ہیں کہ انسان کسی کی حرکتوں سے عاجز آجائے۔ اب بتائی دو کس قسم کا مسئلہ ہے؟“

”اے یار! تم نے تو بات ہی پکڑ لی۔“ میں نے جلدی سے کہا ”وہ تو ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ اس قسم کے مسئلے تو روزانہ ہی زندگی میں سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ کچھ حل ہو جاتے ہیں، کچھ سخت اشعور کے اسٹورم میں پڑے رہتے ہیں۔ مسئلہ تو کوئی ایسا خاص نہیں ہے۔ میں تو صرف پینے کی طرف سے ذرا تمہارا دھیان ہٹانا چاہتا تھا اور شکر ہے میں اس میں کامیاب ہو گیا جس کے نتیجے میں تم اس وقت اپنے پسندیدہ مشروب کے بجائے کولڈر تک لپی رہے ہو۔ تم میری فکر چھوڑو۔ یہ تباہ کن زندگی کسی کر رہی ہے؟ پینے پلانے کے علاوہ تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟“

”بس یار! معززین اور ملازمین صبح صبح اپنے دفتروں کو اور دکانوں کو جاتے ہیں۔ میری بیوی صبح ہی صبح مجھے اصطبل بھیج دیتی ہے۔“ وہ ابھر کر بولا۔

”شکر کرو وہ تمہیں صرف صبح بھیجتی ہے۔ عین ممکن ہے کوئی اور بیوی ہوتی تو تمہاری حرکتیں دیکھ کر تمہیں اصطبل میں ہی باندھ دیتی۔“ میں نے کہا ”تنا ہے تم نے دو تین اور کاروبار بھی تو کئے تھے۔ ان کا کس طرح بڑا فرق کروا؟“

”بس یار! ایک تو میں خودی شاہکار چرچ ہوں۔۔۔ اور سے مجھے ہر کام بیوی کی ہدایات کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے کاروبار ان کی بیویاں چلاتی ہیں، ان کا بھی اللہ ہی حافظ ہو تا ہے اور ان کے کاروباروں کا بھی۔ اس نے اس وقت مجھے سیکنڈ ہینڈ کاروں کا بزنس کرا دیا جب مجھے کاروں کے بارے میں اس کے سوا کچھ پتا نہیں تھا کہ انہیں چلایا کیسے جاتا ہے۔ میں نے خود بھی بوٹ اٹھا کر انہیں کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ بعض گاڑیوں کے بارے میں تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کا انجن آگے ہو تا ہے یا پیچھے؟ نتیجہ یہ کہ میرے کاروں کے شوروم میں سے رفت رفت شرمبی ختم ہو گئی اور روم بھی نہ رہا۔ بس کھارا گاڑیوں کی قطاریں وہ لگتی جنہیں آخر میں کباڑ خانے والے لوہے کے بھاد اٹھا کر لے گئے۔“

”تم پیسے ملا تھو کہ اپنی ہر ناکامی کسی نہ کسی کے سر ڈالنے کے لئے بہانہ چاہے ہو تا ہے۔“ میں نے کہا۔

”جو لوگ نالوں کو ڈسے داریاں سونپتے ہیں ان کو بھی سزا ملنی چاہئے۔“ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ صرف نالوں ہی کی کمپانی

ہوتی رہے۔“ وہ ہر زور لہجے میں بولا۔ ”اس کے بعد پچیسو نے۔۔۔ میرا مطلب ہے خیم بیگم نے مجھے پراپٹی کا نام کرا دیا۔ اس کا کتنا تھا کہ یہ اس قسم کے کام تھے جن میں لوگ کم سے کم سرمایہ لگا کر راتوں رات لکھ بٹی لکھ کر ڈپٹی بننے جارہے تھے۔ لیکن میں کتا ہوں، کام خواہ کچھ بھی ہو، بندے کو اس کی تھوڑی بہت الف بے کا تو پتا ہونا چاہئے۔“

”پراپٹی کے کام میں تمہارا کاروں کے کام سے زیادہ براہِ راست ہوا ہو گا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”بے شک۔“ اس نے منانت سے سر ہلایا ”جن جائیدادوں کے میں نے سووے کرائے ان کے مالکان اور خریداروں نے راتوں رات پلائی بالا آپس میں معاملات طے کر لئے۔ مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ بعض جائیدادوں کے ہم نے سووے کرائے تو ان کے جھگڑے نکل آئے جن میں ہمیں بھی فریق بنایا گیا۔ ملنا ملنا ٹوٹیا تھا“ ابھی تک عدالتوں کے سمن آتے رہتے ہیں۔“

”تمہاری داستان غریب مزہ تو واقعی بہت جبرت ناک ہے۔ تمہاری بیوی جنہیں امیر مزہ ملنا چاہتی تھی لیکن تم بیوی محنت اور بیوی کوشش سے غریب مزہ ہی رہے۔“ میں نے کولڈر تک کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے نظریے کے مطابق تو تمہاری بیوی کو چاہئے تھا کہ جنہیں کرایے کی دکان کھلواتی جو تمہارا خاندانی کام تھا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے، تم اس کا بار کو بھی عمر کی سے ٹھکانے لگا دیتے۔ کنستروں اور یوریوں میں دال چاول کی جگہ چوہے چھلا نکلیں گے رہے ہوتے۔“

”پھر تصانیات لاکھوں میں تو نہ ہوتے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”لیکن میری بیوی اس قسم کی بات تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اب اونچی عورت ہو گئی ہے۔“

”مگر مے کیسے؟“ شکر کرو، تمہاری بھی اوقات بدلتا چاہتی ہے لیکن تم اس کے لئے بڑے مٹکے شور ہر ثابت ہوئے ہو۔“ میں نے کہا۔

”بھئی، میں نے تو جنہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ بابر دلت کو تو اب زندگی میں عیش کرنے کا موقع ملا ہے تو ضرور کریں گے اور کئی بحر کے کریں گے۔“ وہ اٹھ کھڑی لے کر بے پروائی سے بولا۔

”مگر بیوی نے لات مار کر اپنی زندگی سے نکال پھینکا تو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی مجھے ہر وقت توقع رہتی ہے اور اس کے لئے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولا ”کچھ دیکھا میں نے بیوی سے آگے بچا کر ایک طرف ڈالا ہوا ہے۔ اس نے لات مار دی تو پہلی بیوی کو اپنے پاس بلا لیں گے۔ بچوں کے سر پر دست شفقت رکھ دوں گا اور کسی ٹی ٹی کلاس آبادی میں اوجھا جازل اسٹور بھول کر بیٹھ جاؤں گا۔“ مجھے یقین ہے، میری پہلی دفا شمار بیوی میری شکل دیکھنے ہی مجھے صاف کر دے گی۔ بچوں کی نیم خوشی سے چھلا نکلیں

فل سکتا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ میں نے اس کے غالی گلاس میں مزید کوئلہ ڈرک اڑنے کی کوشش کی تو وہ جلدی سے مجھے روکنے ہوئے بولا "اچھا خاصا ٹھنڈا موسم ہے" اس کے باوجود تم دفتر میں اسے ہی چلائے بیٹھے ہو۔ اوپر سے مجھے بے حساب ٹھنڈا پلانے کی گھر میں ہو۔ تم کیا مجھے یہاں سے نمونے میں بھلا کر کے بھیجتا چاہتے ہو؟ میں اس قسم کی ٹھنڈی ٹھار چیزوں کا عادی نہیں ہوں۔ تم میں ہی ہوگی اتنی قوت برداشت مجھے تو بخش دو۔"

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں اب چلا ہوں۔ میں تو اصل میں تمہیں ساتھ لینے آیا تھا۔ تمہیں دکھانے کے لئے ہمارے پاس اور تو کچھ ہے نہیں میں نے سوچا تھا کہ آج تمہیں اپنا اصل ہی دکھانے لے چلوں لیکن اب تم سے کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ تم بھلا میرے ساتھ چل کر اصل بھیجے بے ہودہ چیز کو دیکھنے میں کہاں وقت ضائع کرو گے۔ اتنی دیر میں تم یہاں بیٹھ کر لاکھوں کا بزنس کرو گے۔"

"اصل دیکھنے سے تو مجھے واقعی دلچسپی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارا دل دیکھنے کے لئے ساتھ چل سکتا ہوں۔ کیسے تم یہ نہ سوچو کہ کاروبار دوستی کو کھایا ہے۔"

"تم میرے اصل کاروبار کر ہی لو تو بہتر ہے۔ یہ بھی نہ جانے کتنے دن کا مسمان ہے۔" وہ غمزہ لہے میں بولا۔ "اگر ہماری آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا تو ہمیں واقعی برا دھچکا لگے گا۔ دو چار لکھوں میں ہم نے روپیا لگایا ہوا ہے لیکن ان کی آمدنی سے ہم اتنے ٹھٹھات باٹ سے نہیں رہ سکتے۔"

"لیکن تم اس کی طرف سے اتنے پاپس کیوں ہو؟ تمہیں کیوں اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اصل ختم ہو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"خفا رہے جب ریس کے کاروبار کا مالک ہی اس کے پیچھے لگ گیا ہے تو تباہی و بربادی ہی اس کا مقدر ہوگی۔" وہ اب کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا "ریس کے کاروبار کے مالک کو تو اصلوں کا سرپرست ہونا چاہئے۔"

"یہ ذرا تفصیل طلب باتیں ہیں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "اگر تمہارا واقعی میرے ساتھ چلنے کا سوڈ ہے تو انھوں میں تمہیں راستے میں صورت حال بتا دوں گا بلکہ تمہیں تیزی سے تھوڑی سی دولت کمانے کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں خود ایک ناکام بزنس مین ہوں لیکن دو سڑوں کو دولت کمانے کا راستہ مجھا سکتا ہوں۔ میں اس وقت اس لئے بھی اصل چاہتا ہوں کہ آج شمس کے بھی وہاں پہنچنے کا امکان ہے۔ کبھی بھی وہ اچانک چپک کر آجاتی ہے کہ میں اصل بیچا ہوں یا نہیں؟ اپنی دانت میں تو وہ اچانک ہی چھپا جاتی ہے لیکن مجھے بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کے یہ "اچانک"

لگے گی کہ انہیں لاہور شہر میں رہنے کا موقع ملے گا۔ ابھی اگر اس وقت تک زندہ ہوئے تو تھوڑی مدت خدمت ان کی بھی کر دیں گے انہوں نے جو مزید جو تیاں وغیرہ رسید کرنی ہوں گی وہ چپ کر کے مہر و شکر سے کھائیں گے یوں زندگی کی کتاب کے آخری باب بھی اپنی خوش ختم ہو جائیں گے۔"

"ہمت یہ بد معاش ہو نہ۔" میں نے اسے ٹھوڑے ہوئے کہا "میں میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بڑے ہو کر تم ایسی خبیث چیز نکلو گے۔ اچھا یہ تازا اب اصل حال ہے؟"

"یہ تازہ ترین ستم چل رہا ہے مجھ پر۔" وہ بولا۔ "مجھے بھلا کیا پتا تھا" ریس کے گھوڑوں کے کیا کیا پتھر ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ریس کے گھوڑے اور تانگے میں کتے ہوئے گھوڑے میں صرف صحت کا فرق ہوتا ہے لیکن اب پتا چلا ہے کہ یہ تو برا پیچیدہ کاروبار ہے۔ کوئی کروڑ پتی اپنی بیٹی کا رشتہ کسی کو دیتا ہے تو اس کے حسب نسب کی اتنی چھان بین نہیں ہوتی جتنی کسی گھوڑے کو ریس کورس کی شکل دکھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ان کی ذم کا مال بھی ہماری عزت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔"

"تمہاری عزت سے زیادہ اہم ہو گا مجھے مت اپنے ساتھ شمار کرو۔" میں نے سکرانے ہوئے صبح کی۔

"ہاں بھئی۔" تم خود اب زندگی کے ریس کورس میں اعلیٰ حسب نسب کے گھوڑے کی طرح ہو گئے ہو۔ ہر ریس جیتنے جا رہے ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میرا حال اصل کو تو میں نے سنبھال لیا تھا لیکن اس پر دیے ہی بد بختی سایہ ٹھن ہے۔ دیے تو اصل میں چھ گھوڑے ہیں لیکن درحقیقت اصل ایک ہی گھوڑے پر چل رہا ہے جو ہمیں خوب کما کر دے رہا ہے لیکن اب وہ بھی سازشوں کی زد میں ہے۔"

"کیا زائد لگایا ہے۔ بے چارے گھوڑوں کے خلاف بھی سازشیں ہوتی ہیں۔"

"کوئی ایسی دس سازشیں؟" وہ بولا "جس طرح ہر کاروبار ہر صنعت اپنی جگہ ایک الگ دنیا ہے" اسی طرح یہ بھی ایک الگ اور بڑی وسیع دنیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک حرب پر اس کا ریس کا گھوڑا کیلیفورنیا کے کسی مقام سے اغوا ہو گیا تھا۔ چھ ملین ڈالر تاوان دے کر اسے واپس لایا گیا ہے۔"

اس نے کوئلہ ڈرک کا ایک گونٹ بھرا اور ٹھنڈی سانسوں کو اس کی مدد سے مزید ٹھنڈا بناتے ہوئے بولا "کاش میں ریس کا ایک گھوڑا ہی ہوتا۔"

"بڑے بڑے لکھ پیوں کو نکال کر دیتے تم۔" میں نے کہا۔ "پھر بھی معاشرے میں بڑی عزت ہوتی۔ یہی کی جی جی تو نہ سنا پڑی کہ میری دولت دونوں ہاتھوں سے برباد کر رہے ہو۔ جن کی دولت برباد ہو رہی ہوگی وہ کم از کم میرے سامنے آکر ٹوٹ بھی نہ کرتے گھوڑے سے تو انہیں جواب میں دلتی کے سوا کچھ نہیں

دوسرے کب متوقع ہوتے ہیں۔ اب دوسرے موقعوں پر تو میں چاہے غائب رہوں لیکن ان موقعوں پر موجود رہتا ہوں۔ وہ چاہے جتنی جھلاک ہو لیکن آخر میں اس کا شوہر ہوں۔" وہ قاتلانہ انداز میں مسکرایا۔

میں نے اٹھنے سے پہلے کینٹرین اور جنرل نیجر کو چند ملاقاتوں اور ضروری کاموں کے بارے میں کچھ ہدایات دیں پھر راجہ کے ساتھ چل دیا۔ نیچے آکر میں نے کہا۔ "میں تمہاری ہی گاڑی میں چلوں گا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے جان چکر کہ تم نے میری گاڑی کو اس قابل سمجھا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھٹکے ہوئے بولا۔ "آج کھانا

شاننا بھی اچھے ہی کھائیں گے پھر میں جس چموز جاؤں گا۔"

گاڑی میں دوڑ پلانے کے بعد وہ بولا "اللہ میری پوری کے مرحوم شوہر کو جنت میں جگہ دے۔ میں اسے بڑی دعا میں دیتا ہوں۔ بے جاہ میرے لئے شمیم جیسی خوبصورت پوری اور بیش کرنے کے لئے خاصی دولت چھوڑ گیا جس کا کافی حصہ میں نے یہ حسن و خوبی ٹھکانے بھی لگا دیا ورنہ میں تو شاید اس وقت کسی کم ظرف نوادے کے پاس ڈرائیوری کر رہا ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے میرے جیسے کسی آدمی کے پاس؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس نے لمبی میں سر ہلایا "تم نوادے جیسے ضرور ہو لیکن کم ظرف نہیں ہو۔ تمہاری عادات و اطوار معلوم نہیں کیوں خانہ دانی دولت مندوں والی لگتی ہیں۔ بلکہ اب تو خیر خانہ دانی دولت مند بھی

نوادہ تینوں سے زیادہ چپ ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے مجھے تمہارا اسٹیٹرز بہت ادب بجا لگتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم مجھے آدمی کے پاس تو مجھے ڈرائیوری بھی نہیں ملنی تھی۔ میں نے تو کسی چھوٹے موٹے آسودہ حال آدمی کے پاس ہی کب جانا تھا۔"

"چھاپا یہ مسکا پاش چھوڑو۔ تم اصطبل کے بارے میں کچھ بتانے لگے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اصطبل کے ذکر کے ساتھ ہی تو مجھے شمیم کا مرحوم شوہر یاد آتا ہے۔ اصطبل اس کے چھوڑے ہوئے اثاثوں میں سے ایک ہے۔" راجہ بولا۔ "یہ اس کی زندگی میں بھی ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ تین چار اوسط درجے کے گھوڑے موجود تھے۔ کبھی ان میں سے کوئی گھوڑا کوئی دیکھ بھال سے جیت جاتا تھا۔ کوئی مار جاتا تھا۔ پونسی سلسلہ چل رہا تھا۔ کوئی خاص شور شرابا نہیں تھا۔ ہمارے ملک کی بعض بہت بڑی اور ثانی گرامی شخصیات کے دیکھ کے گھوڑے دیکر

ممالک میں نہایت شاندار فارمولوں پر چلتے ہیں۔ بعض کے اپنے بڑے بگ فارم بھی ہیں۔ یہ گھوڑوں کا گلاب ہے لیکن بے ذرا پیچیدہ قسم کا۔ اس میں بڑا مقابلہ ہے۔ بڑے چکر ہیں۔ ان ثانی گرامی

افعیوں کے گھوڑے دوسرے ملکوں کے دیکھ کر ٹیکس میں بھی دوڑتے ہیں اور ملکی ٹیکس پر راج کرنے والے گھوڑے بھی مہما

"ہمارے ہاں دیکھ کے کا دیار میں تین بڑے فرق ہیں۔" راجہ بولا۔ وہ ایک ہاتھ سے اسٹیٹنگ رھیل سنبھالے "ایک بازو کھڑکی میں ٹکائے خاصی مشافی سے ڈرائیو تک کر رہا تھا۔ "ایک تو

دیکھ کر اس کا مالک، یعنی جو صرف زمین اور اس پر موجود خیرات وغیرہ کا مالک ہے۔ اس کا تعلق ہمارے ہاں کے مشہور ترین منکر

انہی کے ہوتے ہیں۔" "یہ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے اپنے اصلیل کے بارے میں بتاؤ۔"

"وہی بتاتے لگا ہوں۔" وہ اپنی ٹانگیں کھڑکی میں ٹکاتے ہوئے بولا "جس طرح کبھی کسی غریب، غلامانہ اور نہایت معصی صفت صورت کے آدمی کے ہاں بہت خوبصورت، ہونہار اور غیر معمولی بچہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح سال ڈیڑھ سال پہلے ہمارے ایک گھوڑے "ڈاکٹر" نے دیکھ کر ایک پر قدم رکھا اور چاہیاں چا دیں۔

وہ واقعی کٹر ثابت ہوا۔"

"بہت زیادہ جیتنے لگا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت زیادہ دھن۔" اسے یہی وہ کبھی بار بار ہی نہیں۔ وہ تو شاید دنیا کے سارے دیکھا توڑنے پر مہلک ہوا ہے۔" راجہ بولا۔ "حالانکہ اس کا "حسب نسب" زیادہ اونچا نہیں ہے لیکن دیکھ کر اس میں دوڑنے کے لئے وہ بہر حال کو ایضاً کرتا ہے۔ جب وہ جوان ہوا تو ہم نے اس کی تربیت مکمل ہونے کے بعد دوڑتے ڈرتے اسے دیکھ کر اس میں پہلی اسٹیری دلائی تھی لیکن اس نے تو پہلی دیکھیں جس ہی کمال کر دیا۔ ایسا لگتا ہے اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔"

"تو اسے گھوڑوں کے کسی ماہر نفسیات کو دکھاؤ جو اس کی تحلیل نفسی کر کے بتائے کہ اس کے لاشعور کے اندجیروں میں کس کیمیکس کی تاثیریں ملتی رہتی ہیں۔" میں نے شجیدگی سے کہا "گھوڑوں کے بھی ماہر نفسیات تو ہوتے ہوں گے؟"

"ان کے نضر اور ڈاکٹری ان کے ماہر نفسیات بھی ہوتے ہیں۔" راجہ بولا۔ "ویسے میں مذاق نہیں کر رہا۔ شجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اس گھوڑے کی نفسیات میں کوئی گڑبڑ سے ضرور لیکن وہ مثبت قسم کی ہے۔ یعنی وہ کسی کو اپنے سے آگے نکلنے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ بہت طوقانی قسم کا اشارات نہیں دیتا۔ انکیا دوڑنے میں بھی کوئی ایسی قیامت کی چیز نہیں ہے لیکن جو جتنی وہ کسی دوسرے گھوڑے کو اپنے سے آگے نکلنے دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے اور اس سے آگے نکلنے کے لئے جان لڑا دیتا ہے۔ اس کے منہ سے جھاک بننے لگتا ہے۔ عجیب سی حالت ہو جاتی ہے اس کی۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ کیا تمہیں دیکھ بھالنے والے گھوڑے اچھے نہیں لگتے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تو اچھے لگتے ہیں۔" اسے اچھے نہیں لگتے جس کی جیب سے دولت جاتی ہے۔" راجہ نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

خانہ انوں میں ایک سے ہے۔ دو سرائق فرق وہ ہے جو ریس کے کھام کو چلا رہا ہے اور جس کے ہاتھ میں تمام مالی معاملات ہیں۔ کاروبار زیادہ منافع میں جا رہا ہو تو اس کی تجویزوں راتوں رات بھر جاتی ہیں۔ تیسرا فرق یا تیسرا عنصر وہ ہے جس کے گھوڑے ریس کو درس میں دوڑتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی فرد واحد نہیں ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف لوگوں کے گھوڑے دوڑتے رہتے ہیں۔ نئے مالکان بھی آتے رہتے ہیں۔ نئے گھوڑے بھی آتے رہتے ہیں۔ بہر حال کاروبار میں تین بڑے فرق ہیں۔ ان کی دوسری سمت سی پھولی پھولی شاخیں ہیں جن کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کسی کو ہمارا شکر کوئی طرح کہا۔  
 ”وہ جو درمیانی فرق ہے، جس کا مالی معاملات پر کنٹرول ہے اور جس کا دنیا گردش میں رہتا ہے، وہی تقریباً مالک و مختار نظر آتا ہے۔ اس کا نام بھی مختار ہے۔ مختار رشتہ۔ گھوڑ پتی آدمی ہے۔ شہر میں دو چار شہنشاہ دو تین چیلے دو رہے کے ہو گئے۔ ایک آدھ بس سروس، اسی قسم کے کاروبار ہیں اس کے۔ یہ تقریباً سبھی کاروبار ایسے ہیں جنہیں چلانے کی مرتبیاں مرغ اور بہت زیادہ شریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس کا تھوڑا بہت بد معاش ہو گا ہی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مختار رشتہ تھوڑا بہت نہیں بلکہ بہت ہی بڑا بد معاش ہے۔“  
 ”یہ نام تو کچھ سنا ہوا سا لگ رہا ہے۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ضرور سنا ہو گا۔ کاروباری حلقوں میں بھی کھار اس کا ذکر نکل آتا ہے لیکن عام طور پر اس کا ذکر کاروبار کی وجہ سے کم اور اس کی بد معاشیوں کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ کم از کم چندہ میں کیس تو اس پر ہر وقت چلتے رہتے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق اس نے شاید ہی کبھی عدالت کی شکل دیکھی ہو۔ ہماری سوسائٹی میں اس میدان کے بڑے بڑے اساتذہ گرام پائے جاتے ہیں جنہیں بہت زیادہ تجربہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی قانون کی گرفت اور سزا سے پیشہ کس طرح بچ کر رہا جاسکتا ہے۔ مختار رشتہ انہی اساتذہ میں سے ایک ہے۔ بڑی کٹی شے ہے۔“ راہو نے صے کے ارے کو فری سے باہر قہقہہ دیا۔

ایک موٹر سائیکل سوار اس کے قہقہے کی زد میں آتے آتے بچا۔ راہو جلدی سے گزرنے سے روکنا لے ہوئے چلا گیا۔ ”معاف کرنا بھائی صاحب! میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔“

میں نے مڑ کر دیکھا، موٹر سائیکل سوار کے چہرے پر جو برہمی نمودار ہوئی تھی وہ دور ہو گئی۔ کچھ آگے نکل آنے کے بعد راہو بولا۔ ”ہاں، تو میں یہ بتانے کا تھا کہ گھوڑے ریس میں جتنا زیادہ جیتے رہیں گھوڑوں کے مالکان کا اعزازی فائدہ ہے کیونکہ ہر گھوڑے پر لگنے والی شرطوں میں سے مالکان کی ہر شیج نکالی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جن گھوڑوں کا جیتنے کا اوسط اچھا ہوتا ہے، جن کا ریکارڈ اچھا

ہوتا ہے یا جن کے جیتنے کے امکانات زیادہ نظر آ رہے ہوتے ہیں، انہی پر زیادہ شرطیں لگتی ہیں۔ اسی لئے گھوڑوں کے مالکان زیادہ سے زیادہ اچھی نسلوں کے اور بہتر گھوڑے میدان میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گھوڑوں کی بڑی ٹیم میں مقابلے بازی کی بنیاد پکی ہوتی ہے۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ایک اچھا گھوڑا اپنے مالک کے لئے کتنا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔“  
 ”بے شک۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”یعنی اس وقت ”ڈاکٹر“ تمہارے لئے ایک قیمتی اثاثہ ہے؟“

”سب سے قیمتی اثاثہ اور سب سے بڑا ذریعہ آمدنی۔“ راہو بولا۔ ”جن اسکیوں میں ہمارا دنیا لگا ہوا ہے ان سب کی مجموعی آمدنی اتنی نہیں ہے جتنی اس وقت ہمیں ”ڈاکٹر“ سے ہے۔“  
 ”یہ بات مختار رشتہ کو پسند نہیں ہوگی؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔  
 ”اں۔ اب مسئلے کی نوعیت کی طرف تھمارا ذہن چلا گیا ہے۔“ راہو بولا۔ ”اسی خوشی میں میں ذرا دو گھونٹ مٹن سے آنا لوں، ہونٹ میلے کر لوں۔“

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نہایت مہارت و مشق سے ایک ہی ہاتھ سے ڈش بورڈ کے خانے سے پھولی سی چٹنی بوتل نکالی، اسی ہاتھ سے دھکا کھولا اور چھوٹے چھوٹے دو گھونٹ لے کر اسٹیرنگ کو میل پر صرف پھولی کا ذرا سا حصہ نکالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دھکا بڑھایا اور بوتل واپس خانے میں رکھ دی۔  
 میں نے دائیں بائیں دیکھا کہ گزرتی ہوئی کسی گاڑی والے نے راہو کی یہ حرکت دیکھی تو نہیں؟ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ راہو میری گردن گھومتے دیکھ کر بولا۔ ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس خاکسار کی تویہ آئے دن کی مصروفیت ہے۔ برا تجربہ ہے مجھے چٹنی گاڑی میں پینے کا۔ ویسے بھی آئے شاید توجہ نہیں دی۔ میں نے وہ مسکرا دیا کی بوتل میں ڈالی ہوئی ہے۔ بے جا حد مرضی اس وقت اپنی خوراک لے رہا تھا۔“

”اللہ تمہیں اس مرض سے شفا دے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔  
 وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ”گھوڑوں کا ریس میں بھی جیتنے رہتا، کبھی ہارے رہتا تو مختار رشتہ جیسے لوگوں کو گراں نہیں گزرتا کیونکہ اس کو قانون میں بھی ان کی تجویزوں میں دنیا آتا رہتا ہے لیکن ”ڈاکٹر“ جیسا ایک بھی گھوڑا میدان میں آجائے اور اچھے خاصے طویل عرصے تک وہ اسی پوزیشن پر جمادے تو اس جیسی فطرت کے آدمی کو مرگی کے دورے بھی پڑ سکتے ہیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے منافع میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ بلکہ ”ڈاکٹر“ تو وہ گھوڑا ہے جس نے ریس کو ریس کی معیشت کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ عرصے تک تو گھوڑے کے مسلسل جیتنے کو بھی برداشت کر لیا جاتا ہے کیونکہ اس سے ریس کو درس کی اور اس دھندے کی سادگی بدلتی ہے۔ زیادہ لوگ اس طرف آنے شروع ہو جاتے ہیں۔“

”لیکن زیادہ عرصے تک گھوڑے کے اس پوزیشن پر رہنے سے تو کاروبار کے مالک کی اپنی جیب سے بھی رقم جانی شروع ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہی تو ہونے لگا ہے۔ مالک کے تو منافع میں بھی مسلسل کمی ہوتی رہے تو وہ اسے بچنے سے ہی رقم جانے کے مترادف سمجھتا ہے جبکہ عمار رشق کے تو کافی دنوں سے بچنے سے جانے کی نوبت واقعی آئی ہوئی ہے۔“ راجہ بولا۔ ”اس کے اکاؤنٹس کے شعبے کے لوگ ہر ماہ بلیٹس پیش کرتے ہیں۔ کئی ماہ سے یہ ہوا ہے کہ بلیٹس پیش کی فائل اس کے سامنے جاتی ہے تو وہ بال نوچنے لگا ہے۔“

”تم اس کے سامنے جاؤ تو وہ یقیناً اپنے بچائے تمہارے بال نوچنے کی کوشش کرے گا۔“ میں نے کہا۔

”میرے بال نہیں، میری تو وہ کمال نوچنے کی فکر میں ہے۔“ راجہ بولا۔ ”مصور جمال بہت عجیب ہو گئی ہے۔ ایک گھوڑے نے انسانوں کو مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ کالی عرصے سے یہ عالم ہو گیا ہے کہ نوے فیصد شرح میں صرف ”واکر“ برلگ رہی ہیں۔ چیتے والوں کو ادا ملنے کا تناسب چاہے کتنا ہی کم کر دیا جائے، بہر حال لاکھوں روپیہ جیب سے جا رہا ہے۔ اسی لئے تو میں تمہیں بھی مشورہ دیتا چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ ہمارے چار ٹانگوں والے بے ضرر رکھ کر دو ٹانگوں والا کوئی شیطان مفت کھر کوئی نقصان پہنچا دے، تم بھی جلدی جلدی اپنے آدمیوں سے اس پر چند لاکھ روپے لگا کر کئی گنا زیادہ رقم کماؤ۔ پیسے بھانے بغیر کسی محنت کے لاکھوں روپیہ ہاتھ آجائے تو کیا برا ہے۔ گھوڑے کا مالک خود تمہیں ٹپ دے رہا ہے۔“

”مجھے دولت حاصل کرنے کے لئے اب کسی شارٹ کٹ کی تلاش نہیں رہی۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”وہ تو تم یہ مشورہ دینے سے پہلے ہی مجھے رہیں کورس میں دیکھ چکے ہوتے دینا کے تمام آثار خانے اس طرح کے خواہش مندوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن سب کے خواب پورے نہیں ہوتے۔“

”میں ان سب بلیٹوں کی بات نہیں کر رہا، میں تو سو فیصد یقینی چیز کے بارے میں بات کر رہا ہوں، بہتر لگنے کے بارے میں بات کر رہا ہوں جس میں سب ہاتھ دھو رہے ہیں۔“ راجہ بولا۔ ”ویسے اب یہ ذکر اتنی کیا ہے تو میں تمہیں ایک بات اور بتا چلوں۔ رہیں کورس یا کسی آثار خانے میں اور دنیا کے بڑے بڑے کیسینوز میں سب لوگ صرف چیتے ہی کے لئے نہیں جاتے۔ سب کو غلط ہو رہا ہے کہ ان کے بارے میں زیادہ امکانات ہیں۔ وہ صرف تفریح کے لئے وہاں جاتے ہیں، ہار جیت کی بیکان خیزی سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ اپنے دولت مند ہوتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی دولت کہاں خراب کریں۔ کسی ضرورت مندی دود کے لئے تو شاید انہیں سو روپے یا دوسرے دوا لک والوں کو سو ڈالر وغیرہ نکال کر دینا کو ارا نہ ہو لیکن

قمار خانوں میں وہ ایک رات میں ہزاروں روپے یا ہزاروں ڈالر بیٹھ کر چلے آتے ہیں کہ انکے اس کام میں بڑی لذت ہے۔“

”میں اس کام میں اس لئے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی ضرورت مند کی مدد کرنے کی لذت سے واقف ہی نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”نہی۔ اب تم مجھے اخلاقیات پر پھر مت رہنا۔“ وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو تمہیں گناہ گاروں کی دنیا کی باتیں بتا رہا تھا۔ عمار رشق بھی ان گنم ٹیکس والوں سے، ایکسٹرا والوں سے، حتیٰ کہ اپنے دھندے میں نہیں کر کے بھاگ جانے والے کسی کارندے سے بھی کبھی اتنا خفا نہیں ہوا جتنا وہ آج کل مجھ سے اور ہمارے گھوڑے سے ہے۔“

”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ وہ اپنے رہیں کورس میں راکر کی انٹری بین کیوں نہیں کر دیتا؟ اس کے داخلے پر پابندی کیوں نہیں لگاتا؟“

”وہ ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ ہم تمام ملکی اور بین الاقوامی رہیں ٹیک کے قوانین اور شرائط پوری کرتے ہیں۔ راکر اس وقت تک اپنا جو مقام بنا چکا ہے، اس مرحلے پر اس قسم کی کوئی پابندی رہیں کورس کی شہرت اور ساتھ کا یہ فرق کر دے گی۔ عمار رشق ہمیں کر رہ گیا ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ کبھی اس قسم کا کوئی گھوڑا بھی سامنے آ سکتا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ گھوڑوں اور ان کے مالکوں کے درمیان گزرا ہے۔ اس کے خیال میں کسی گھوڑے کا مسلسل اتنے عرصے تک صرف چیتے رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے ناممکن کو ممکن ہوتے دیکھ رہا ہے۔“

”خواب تمہاری کیوں مدح خواہی رہی ہے؟ کیا اس نے تمہیں کوئی دھمکی دی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کس شمار نظام میں ہوں۔ مجھ جیسے پچارے مسکین آدمی کی تو بغیر کسی وجہ کے بھی اس جیسے آدمی سے مدح خواہی چاہئے جبکہ یہاں تو اتنی بڑی وجہ موجود ہے۔“ وہ سر کھٹاتے ہوئے بولا۔ ”ابھی کچھ دن پہلے تو میرے آفس میں تم بڑے بچے غل بن رہے تھے، مجھے مدد کی دیکھیں کر رہے تھے، غصا سا ہسپتال بھی نکال کر دکھا رہے تھے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا، اگرچہ کیرا ہوں میں ذرا سا۔“ انسان جس قائل بھی ہو اسے جبری یا رکی مدد کے لئے کمزور تو رہنا چاہئے، خواہ جبری یا رکی کو اس کی مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اپنے جذبے کا اظہار کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ تمہارے لئے اس کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو، بہر حال اپنی جان حاضر ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”اور اس جان کی عمار رشق کے سامنے بھی کوئی اہمیت نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”اس کی نظریں میری

بیت تو شاید اس کچھوے جتنی بھی نہ ہو جو کسی بھی وقت کسی  
لوٹوے کے ٹمٹے آکر کھلا جاسکتا ہے۔ وہ خود بہت زیادہ معاش  
ہے اور کئی خطرناک قسم کے بد معاش اس کے ساتھ مخالفت میں  
پورش پاتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے کوئی دھمکی نہیں دی اسے  
نہ کو دھمکی دینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے مراد کر اسے  
کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گھوڑا تو پھر بھی دس میں دوڑنا رہے گا۔  
”جتنی اصلی مخلوق ہے چارے بکڑ کر ہے۔“

”ہاں۔ اس کی مخالفت کے لئے ہمیں نہ جانے کیا کیا  
انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی مخالفت  
کرنے کے لئے میں بھی مارا جاؤں۔ بہر حال اصل برف وہی ہے۔“  
راجو بولا۔ ”اس کے لئے ہم نے تین چار گاڑوں رکھے ہوئے ہیں۔  
بائیسے سا نہیں اور ٹیڑھ وغیرہ سے لے کر اسٹیل میں مثالی کرنے  
والے جعدا رنگ کا انتخاب دیکھ بھال کر کرنا پڑتا ہے کہ وہ مجھ سے  
کا آوی ہو اس کا رنگ لڑا اچھا ہو۔ ہمارے پاس تو خیر سب پرانے اور  
بجڑ سے کے آوی ہیں۔ غصے کے پلے، مرحوم شہر کے زمانے سے  
ہی پلے آئے ہیں لیکن پھر بھی ان پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ آوی کو  
کھنے اور اس کی نیت بدلنے کی دیر لگتی ہے۔ دھڑکاٹا رہتا ہے کہ  
نہیں کوئی نظر پکڑا کر گھوڑے کو کچھ کھلانے دے اسے کوئی انجکشن  
وغیرہ نہ لگا دے۔ دوسرے گھوڑوں کے سامنے میں یہ ہوتا ہے کہ  
دس کورس والوں کو دھڑکاٹا رہتا ہے کہ مالکان انہیں جتانے کے  
لئے کہیں کوئی انجکشن وغیرہ لگا کر نہ لے آئیں۔ اسی لئے گھوڑوں  
کو دس سے کئی کھنٹے پہلے دس کورس کے اپنے اسٹبل میں پہنچا  
پڑتا ہے۔ جہاں وہ دس کورس اور مالکان دونوں کے نمائندوں کی نظر  
میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی حفاظت کے لئے فیر جاندار  
مسلح محافظ بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گھوڑوں کا مساجد بھی کرتے ہیں کہ  
انہیں کوئی انجکشن وغیرہ تو نہیں دیا گیا اور دس میں چونکہ کئی کھنٹے  
باقی ہوتے ہیں اس لئے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اگر کوئی انجکشن وغیرہ  
دیا بھی گیا ہو گا تو اتنی دیر میں دوا کا اثر ختم ہو جائے گا اور اس کا انا  
اثر شروع ہو جائے گا جتنی گھوڑا مزید ست ہو جائے گا۔“

اس وقت تک ہم بند روڈ پر پہنچ چکے تھے اور راجو نے گاڑی  
ایک پگڈنڈی نام نم پتہ سڑک پر موٹی کی۔ وہ بات جاری رکھتے  
ہوئے بولا۔ ”لیکن ہمارا انا مسئلہ ہے۔ ہمیں اور ہمارے آدمیوں کو  
اب نظر رکھنا پڑتی ہے کہ دس کورس کے اسٹبل میں کوئی ہمارے  
گھوڑے کو ست کرنے والی یا کسی اور طرح کا ضرر پہنچانے والی دوا  
کا انجکشن نہ لگا دے۔ ایک بار تو میں نے ایک جاکو کو ایک سرنج  
کے ساتھ رکھے ہاتھوں پکڑا بھی تھا لیکن اس کے خلاف تحقیقات  
آگے نہیں بڑھ سکی۔ صرف اسے ایک لٹ کر دیا گیا۔“  
گڈی کے ایک گیت کے سامنے پہنچ کر گاڑی رک محسوس اس  
کے عقب میں ایک ٹومبز مسخ دھپیدہ نوجوان شوار قبیل  
واسکٹ اور گلاہ میں مستہ کھڑا تھا۔ کندھے پر رائل ٹی۔ گاڑی

دیکھ کر اس نے گیت کا آلا کھول دیا تھا۔ گاڑی طویل و عرض  
احاطے میں داخل ہوئی۔ سامنے بہت دور چند صاف ستھرے ٹیک  
جیسے کرے نظر آ رہے تھے جن میں دو گاڑوں کی جگہ کھلے  
ہوئے تھے ان میں سے تین میں گھوڑے دکھائی دے رہے تھے۔  
احاطے میں بھی دو مسلح آدمی موجود تھے۔ دو تین دوسرے  
آوی بھی اور دوسرے مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ دو گھوڑے  
احاطے میں ست رکھاری سے دوڑ رہے تھے ایک گھوڑے پر  
چست ٹیک سوٹ اور لی کیپ میں بوڑھا سا ایک ڈیلا پتلا شخص  
سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں چابک تھا۔ دو سرا گھوڑا بغیر زین وغیرہ  
کے ہی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

ہمیں گاڑی سے اترتے دیکھ کر گھڑ سوار ہمارے قریب آگیا۔  
اس عمر میں وہ جس مقامی و مستعدی سے گھوڑے سے اترا وہ قابل  
دوا تھی۔ وہ ادب سے سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ باقی لوگوں نے بھی  
دوسرے سلام کیا اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے۔  
”کیا حال ہے نور محمد؟“ راجو نے عمر شخص کا کندھا ٹپک کر

پوچھا۔  
”ٹھیک ہوں جی۔ کرم ہے اوپر والے کا۔“ وہ آہستہ آہستہ  
چابک اٹلی ٹانگ پر مارتے ہوئے دھمکے لہجے میں بولا۔  
”کسی گڑبڑ کے آثار تو نظر نہیں آتے؟“ راجو نے دریافت  
کیا۔

”نہیں جی۔ اللہ کا شکر ہے ابھی تو امن امان ہی ہے۔“ اس  
نے جواب دیا۔

راجو نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا ”یہ  
ہمارے ٹیڑھ ہیں نور محمد صاحب۔ بڑے پرانے اور مجھے ہوئے آوی  
ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بڑی بڑی شائد راجا دس میں چھوڑ کر  
ابھی تک ہمارے پاس گئے ہوئے ہیں اور اس اسٹبل کو اپنا گھر  
سمجھ کر پاس کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی بچہ کوئی نہیں ہے۔ ان  
گھوڑوں ہی کو اپنے بچے بکھتے ہیں اور سچے اولاد کی طرح پیار  
کرتے ہیں۔“

مگر سیدہ شخص بچوں کی طرح تھوڑا سا شرابا تھا۔ اس کے  
رخسار پر بالکی سی سرخی آگئی۔ اس سے ہاتھ ملانے کے بعد میری  
نظر اس سے اپنی تو اس گھوڑے پر جم کر گئی جس سے وہ اترا تھا۔  
میں نے زندگی میں بہت سے شائد ار گھوڑے دیکھے تھے خصوصاً غیر  
ملکی دوڑوں میں مجھے بڑے بڑے تھیں گھوڑوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا  
تھا لیکن جو گھوڑا اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا وہ واقعی دست  
قدرت کی مٹائی کا ایک شاہکار تھا۔

سب سے پہلے تو اس کا رنگ ہی انوکھا اور حیران کن تھا۔ وہ  
بیلگنی سارنگ تھا جس میں شب و دہر کی سیاہی کی بھی آمیزش تھی  
اور اس کی جلد میں خلل کی سی چمک تھی۔ وہ میرے سین مقابل  
سراٹھائے ساکت کھڑا تھا۔ صرف اس کے ننھے دھیرے دھیرے

پھول پک رہے تھے اس کا کڑے ہونے کا انداز بھی مجھے نصیحت عجیب اور غیر معمولی لگا۔ کہنے کو وہ ایک چمپا "ایک بے زبان جانور تھا مگر عجیب شان اور نخوت تھی اس کے انداز میں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک ذی شعور کی سی گھمبیرانہ چمک تھی۔ اسے گویا خود بھی اپنی بڑی آنکھیں غیر معمولی بن کا احساس تھا۔ میرا جو بھی تھوڑا بہت مشاہدہ تھا اس کے مطابق تو عموماً میں نے کوڑے پٹکے بدن کے ہوتے تھے ان کے رگ پٹے پڑیاں اور جو عام گھوڑوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مضبوط ہوتے تھے مگر وزن کم ہوتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ رفتار سے دوڑ سکیں اور ان کا اپنا وزن ان کے لئے رکاوٹ نہ بنے۔ مسلسل دوڑ میں رہنے کی وجہ سے ان کا فاضل گوشت اور چربی گھٹتی رہتی تھی لیکن میرے سامنے جو گھوڑا کھڑا تھا وہ کافی جسم تھا۔ خاصا بھاری بھرکم مگر سانچے میں ڈھلا ہوا جسم تھا۔ دنیا کا بڑے سے بڑا سنگتراش ایسا خوبصورت مجسمہ نہیں تراش سکتا تھا۔

راجو میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے اب "واٹر" کو تم سے حصارف کرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم نے اسے پہچان لیا ہے۔"

"جو کچھ تم اس کے بارے میں بتا چکے ہو اس کے بعد اسے پہچانا مشکل نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "دیسے مجھے امکان محسوس ہو رہا ہے کہ اگر تم مجھ سے اس کا تعارف کراؤ تو یہ مصالحتی کے لئے اپنا کمر بھی آگے بڑھا دے گا۔ اس کی آنکھوں میں انسانی ذہانت کی چمک ہے۔"

"تہہ نہ بولو یا راجو میرا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "اسے خود اختیاد یہ احساس مت دلاؤ کہ اس میں کوئی انسانی خصوصیت موجود ہے۔ خواہ خواہ زخم میں جلا ہو جائے گا۔ لہذا سلا راستوں پر چل نکلے گا اور کبھی کام کا نہیں رہے گا۔ اسے گھوڑا ہی رہنے دو "انسان بنانے کی کوشش مت کرو۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کوٹھڑوں کے قریب لے گیا جن میں کوڑے بند تھے۔ ایک گھوڑا سست سے انداز میں چکی نہیں پر بیٹھا تھا۔ اس کی پٹلیاں نکل ہوئی تھیں۔ ایک لڑکا کوٹھڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ وہ ٹیکر اور بیانی میں تھا۔ ذرا پاؤں ہلڈر تائب تھا مگر جسم پر ابھی گوشت کی خاصی تھی۔

"گھوڑوں کو ابھر سائز کرائی تھی آج؟" راجو نے اس سے پوچھا۔

"جی۔۔۔ سر جی، انہوں نے مستعدی سے بولا۔ "مگر تو مج سے استاد جی کے ساتھ ہی ہے۔ جانی گھوڑوں کو میں نے ابھر سائز کرا دی تھی۔ بلو نمون آج بھی سست ہے۔" اس نے کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے کوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کسمتی رنگ کا ایک عام سا گھوڑا نظر آ رہا تھا۔ پٹلیاں نکل ہوئے کی وجہ سے اس کی حالت کچھ اور بھی قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھی۔

راجو اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم سوچ رہے ہو گے کہ اس اسٹبل میں اس گھوڑے کا کیا کام ہے؟ اسے کسی ٹانگے میں جتا ہونا چاہیے تھا۔"

"ہاں، لیکن اس کا ماضی یقیناً شاندار ہو گا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"بڑا جیسا شاندار تو نہیں لیکن بہر حال کبھی اس کا شمار بھی ٹریک کے بہت اچھے گھوڑوں میں تھا۔" راجو بولا۔ "اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ یہ بڑا سا گھائی ہے۔ شجروں کے مقابلے میں دونوں کی رگوں میں ایک ہی گھوڑے اور ایک ہی گھوڑی کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہ بڑے سے صرف تین سال بڑا ہے لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق لگتا ہے۔"

"یہ بتا رہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" راجو نے جواب دیا۔ "جب بڑے ٹریک کے لئے تیار کیا جا رہا تھا اس زمانے میں بلو نمون ٹریک پر دوڑ رہا تھا اور اس کی کارکردگی خاصی بہتر تھی لیکن پھر ایک مہینے میں یہ گہرا "اس کی کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپریشن ہوا۔ ہڈی تو جڑ گئی لیکن ظاہر ہے ٹریک کے لئے یہ اُن فٹ ہو گیا۔ تب سے اسے گویا نم لگ گیا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن کسی دیکھارے اور ناکام دوڑ اور عاشق کی طرح عام طور پر گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ بڑی مشکل سے ابھر سائز کرنا ہے۔ بہت کم کھانا چیتا ہے۔ گھوڑا کم شمار زیادہ لگتا ہے۔"

"اس کے بھی اپنے کچھ جذبات، کچھ احساسات ہوں گے۔ مظلوم نہیں یہ کیا سوچتا ہو گا۔" میں نے لھڑی سانس لے کر کہا۔

"جیہاتوں کی بھی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہے۔ انسان اس دنیا میں جمائے تو یقیناً بہت سے انوکھے تجربات حاصل ہو سکتے ہیں۔"

"اس دنیا میں ہر طرف ہی اُن گت دنیا میں آباد ہیں اور زندگی بہت مختصر ہے۔ انسان کو خود اپنی ذات کو صحیح طرح دیکھنے اور کھنگالنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ دو سرور دنیا اس کو کیا کھنگالے گا اور کیا سمجھے گا۔" راجو نے سادہ اور سرسری سے لمبے میں بڑی جی بات کہی۔ "کبھی کبھی میرا پیٹے پلانے اور خزانہ قسم کی عورتوں سے بھی دل بڑا ہو جاتا ہے۔ ان دنوں اس اسٹبل میں میرا بڑا دل لگتا ہے۔ ان گھوڑوں سے بڑی محبت محسوس ہوتی ہے۔"

"گھائی لگتے ہوں گے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"نہیں۔ ہم جیسے انسان ان کے بھائی بننے کے لائق کہاں ہیں۔" وہ لھڑی سانس لے کر بولا۔ "یہ معصوم ہم سے بہت اچھے ہیں۔"

"تو اب یہ روناؤ زندگی گزار رہا ہے؟" میں نے بلو نمون کی طرف اشارہ کیا۔ "مگر تو کچھ زیادہ نہیں لگتی اس کی۔"

"بعض لوگ افزائش نسل کے مسئلے میں اس کی خدمات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔" راجو بولا۔ "بعض بڑے



کر رہا ہوں۔ اسے بھی کچھ ہو گیا تو اسطبل ختم ہو جائے گا۔ مجھے معلوم ہے، بخار رشتی اسے مروانے کے بارے میں مسلسل غور و خوض کر رہا ہے۔

میں نے کچھ دو روز قدیں بھرتے ہوئے بکر کو دکھا۔ اس کے عضلات کی پھڑکن اور چمک قابلِ دید تھی۔ بے اختیار میرے من سے نکلا۔ ”تیسرا شائد ارگھوڑے کو مرنا نہیں چاہئے۔“

”اگر بخار نے اسے مروانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر اسے بچانا میرے بس کی بات نہیں۔“ راجو بولا۔

”کیا اس نے تمہارے من پر بھی اس سلسلے میں جھیمیں کوئی دھمکی دی ہے؟“

”میرا تو حوصلے سے اس سے سامنا ہی نہیں ہوا۔“ راجو بولا۔

”اور نہ ہی مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہے۔ میری تو اس سے مدد کا ہوتی ہے۔ البتہ خیریں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔ وہ اب بکر کو ٹریک سے ہی ایسے دھنسا رہی رخصت کرنے پر تیار ہوا ہے۔

اس کام کے لئے اسے شاید لاہور کے بڑے بڑے خطرناک بد معاشوں میں سے کوئی مناسب معلوم نہیں ہوا جو اس نے چھپے دنوں فیصل آباد سے ایک بندے کو بلایا ہوا تھا۔ شاید دوسرے شر سے بندہ ملانے میں کوئی اور مصلحت رہی ہو۔“

”کیا کیا اس بندے نے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بخار رشتی تو اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ اس نے اس بندے کو حکم دے دیا تھا کہ بکر کو ٹریک پر ہی راکٹل سے گولی مار دی جائے لیکن وہ اس واردات سے کھڑا کیا۔ بجلی کی رفتار سے دوڑتے گھوڑے کو گولی مارنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ دوسرے

گھوڑے اور دوسرے جاکی بھی مر سکتے تھے۔ دوڑ ختم ہونے کے بعد

یا شروع ہونے سے پہلے گولی ماری جاتی تب بھی اس بندے کے رگتے ہاتھوں پکڑے جاتے کا کافی امکان تھا۔ حالانکہ بخار رشتی نے

اسے خاصی تسلیاں دیں کہ اسے ٹریک کورس کے ایک محفوظ گوشے سے فرار کرانے کا بندوبست ہو گا، باہر کار بھی ٹھہر ہوگی لیکن وہ بندہ

نہیں آیا۔“

”کیا نام تھا اس کا؟“ میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

”اصل نام تو معلوم نہیں لیکن بد معاشوں کی دنیا میں اسے ”بگھو“

”بگھو کوشا“ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔“ راجو نے جواب دیا۔

”بگھو کوشا؟“ مجھے ہنسی آگئی۔ بگھو کوشا بخالی میں ناشپاتی کی

ایک قسم کو کہتے ہیں۔ بعض بد معاشوں کے نام خالصے منگھو خیر

ہوتے ہیں۔

”نام بے شک منگھو خیر ہے لیکن میں نے سنا ہے آوی بڑا

خطرناک ہے۔“ راجو بولا۔

”لیکن حلقہ بھی ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھ بھال کر

واردات کرنا ہو گا۔ اس واردات میں اسے خلہ نظر آیا ہو گا۔“

”ہو سکتا ہے لیکن میرا تو خیال ہے کہ میری قسمت ہی اچھی

باکرار اور نواب یا دوسری بڑی شخصیتیں جو گھوڑوں کی بڑی ٹیم میں دلچسپی رکھتی ہیں، ان کے گھوڑے گھوڑاؤں دوسرے ممالک میں سخت افزا مقامات پر پرورش پاری ہیں، خوبصورت فارمز بنے ہوئے ہیں ان کے لئے۔ ایسے لوگ بلجیٹن اور بکر کے عجیب نسب سے واقف ہیں۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا کہ بلجیٹن کو روڑنے کے قابل نہیں رہا تو اس سے افزائش نسل کا کام لیا جائے انہیں معلوم ہے کہ بکر کے قریب تو میں کسی کو پھٹکے نہیں آتا گا۔ بلجیٹن بھی بہر حال بھائی تو اسی کا ہے۔ وہ لوگ اسے باہر لگائے اور مجھے ہماری معاونہ دینے کے لئے بھی تیار ہیں۔“

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“

”کبھی کبھی مجھے لالچ آتا ہے لیکن پھر کاروباری رقابت غالب

آجاتی ہے۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ کسی بکر جیسا کوئی دوسرا گھوڑا

ٹریک پر آئے۔ پھر راجو آکر بکر بولا۔ ”اس کے علاوہ مجھے

ایک اندیشہ ہے بھی ہے کہ معلوم نہیں یہ بلجیٹن کا بچہ اس سلسلے

میں بھی دلچسپی کا مظاہرہ کرے گا یا نہیں؟ یہ تو بالکل ہی نازک الدعا

ہو گیا ہے۔ حکیم کے مرحوم شوہر کو اس اسطبل سے ”ان گھوڑوں

سے“ مجھ سے کہیں زیادہ محبت اور لگاؤ تھا۔ کاروباری مفادات تو اپنی

جگہ تھے ہی لیکن دیے بھی وہ انہیں بچوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کی

محبت ہے کہ اس کے کسی بھی گھوڑے کو اشد مجبوری کی حالت

میں بھی گولی مار کر ہلاک نہ کیا جائے۔ اگر کسی اشد مجبوری میں تن

پڑے کوئی گھوڑا کسی وجہ سے کسی ناقابلِ علاج اذیت میں مبتلا ہو

تب بھی اسے کوئی ایسا انجینئر دے کر ہلاک کیا جائے کہ اسے کم

سے کم تکلیف ہو سکے۔ موت آئے۔“

”بہت خوب!“ میں نے حسین آئینہ جیسے میں کہا۔

”اس کی وصیت میں سب سے بڑا حصہ گھوڑوں کے متعلق

تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے سب سے زیادہ دنیا

گھوڑوں سے ہی کیا تھا۔ دوسرے کام تو بد میں گئے تھے۔ اس نے

زبرداریات بھی اپنے وصیت نامے میں لکھی تھیں۔ مثلاً اس کے

کسی گھوڑے کو فروخت نہ کیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی ناگوار

ہو جائے۔ نسل کشی بھی اپنے ہاں کی جائے، معاونے پر دوسروں کو

فدائیت نہ پیش کی جائے۔ جس حد تک میں ممکن ہو ہر گھوڑے کی

طبی موت کا انتظار کیا جائے، اسے کسی اور طریقے سے ہلاک نہ کیا

جائے۔“

پھر ایک لمحے کے توقف سے راجو بولا۔ ”ان واردات پر بھی

مل کر پڑنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گھوڑے بھی اس مرحوم کو

باپ ہی کی طرح سمجھتے تھے۔ اس کے اس دنیا سے رخصت ہوتے

ہی اسطبل پر بھی زوال سا آگیا۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ

گھوڑے بے چارے کو داخل شکستہ ہیں۔ دو تین مرگئے، دو تین

ایک سے اکڑت ہو گئے۔ موصوف کے انتقال کے بعد لے دے کر

ایک بے ”بکر“ ابھرا ہے۔ اسے بچا کر رکھنے کی میں اپنی ہی کوشش

حمی۔ "راجہ بولا۔

"تمہیں کیا یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔  
 "ویسے تو مجھ سے بہرہ دہی رکھنے والے چھوٹے موٹے لوگ  
 مجھے کچھ باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ کچھ بھولی کچھ جی کچھ عمدتہ کچھ  
 غیر عمدتہ لیکن جو گوشتے سے تو عمارتیں کی تھوڑی سی ٹھنکوں میں  
 نے خود سی حمی۔ راکھی سیماسی ایک پارے طور پر عمارتیں کے  
 وقار ہیں۔ اس کے دفتر میں ایک عرصے سے مجھے گھسنے کی ہمت نہیں  
 ہوئی۔ دواؤں پر پیرتے اس کا ایک جلاذ مہورت مسلح کر کا کھڑا رہتا  
 ہے۔ عمارت کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ کمروں کی قطاروں کے  
 عقب میں بھی ایک تنگ سی گلی سے مشابہ راستہ موجود ہے۔ ادھر  
 کچھ ہاتھ موڑ بھی ہیں۔ میں اتفاق سے اس راستے سے گزر رہا تھا تو  
 اپنے قمار خف کے باوجود جنس سے مجبور ہو کر پونی ذرا امن گن  
 لینے کے لئے عمارتیں کے کمرے کے پیچھے رک گیا۔ اتر کڑھٹنگ  
 کی وجہ سے حالانکہ کمرے پر طرف سے بند رہتے ہیں لیکن اس روز  
 شاید لائٹ گئی ہوئی تھی۔ پچھل دیوار میں ایک روشندان کھلا ہوا تھا  
 اور عمارتیں شاید غصے میں جو کوشے سے بات کر رہا تھا اس لئے  
 مجھے بھی ان کی ٹھنکوں سنائی دے گئی تھی۔"

"کیا واقعی وہ قدرت کے اس بے زبان شاہکار کو مروانے کی  
 بات کر رہا تھا؟" میں نے ایک بار پھر فکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو  
 اچالے میں جکر کاٹ رہا تھا۔ "اس نے بھی گھوڑوں سے بہت  
 دولت کمانی ہوگی۔ کیا اسے ان بے زبانوں سے ذرا بھی بہرہ دہی  
 نہیں؟"

"اگر معاملہ دوپے پیسے کا آن چڑے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی  
 ماں کے بھی ہاتھ پاؤں توڑنے پر تیار ہو جائے گا۔ بعض لوگوں کی تو  
 دوپے پیسے کی ہوس دیکھ کر یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ اس معاملے  
 میں ذہنی کریمیں ہیں۔" راجہ بولا۔ "میں تو سوچ رہا ہوں" ایک توجہ  
 مینے میں گھوڑے کو کراچی کے دس کورس میں لے جاؤں لیکن اس  
 کے لئے بہت سے انتظامات کئے ہوں گے یہ بھی کوئی آسان کام  
 نہیں ہے۔ کہیں میرے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وہ غیبت کچھ  
 کرنے لگے۔"

"نہیں۔ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ تم اطمینان سے اپنے  
 معمولات جاری رکھو۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "یہ تمہاری قتل  
 دے رہے ہو یا کوئی نفوس بات کر رہے ہو؟"

"میں تمہاری باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے جواب  
 دیا۔

"عمارتیں دلیل یا شرافت کی زبان نہیں سمجھتا۔" راجہ بولا۔  
 "مکوئی بات نہیں۔ ہمیں ہر طرح کی زبان بولنی آتی ہے  
 چاہے اس میں نے اس کے کندھے پر ہلکی سی چھبکی دی۔" سترجین

کا بھی انتظام ہے۔ ہر زبان میں معلوم کا ترجمہ کر کے سمجھا دیتے  
 ہیں۔ اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ آدمی کبھی بھول ہی  
 نہیں۔"

"تو تم اس سلسلے میں کچھ کو گے؟" اس نے پرامید لہجے میں  
 پوچھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے لہجے میں خوف جھلک آیا۔  
 "یار ارموا مت دنا مجھے۔"

"بھول دو سہیل کی تو وہ بھی نہیں کہنی چاہئے۔" میں نے  
 ناکارہی سے کہا۔ "اس طرح لڑنا ہی قاتل پر گھسنے یہ سب باتیں  
 بتانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ۔ دراصل۔۔۔ یار۔ میری عمارتیں سے روح نکل ہوئی  
 ہے۔" وہ چپکلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ایک عمارتیں سے کاہنا شروع کو گے تو پھر تمہیں زندگی  
 میں بہرہ دم پر کوئی نہ کوئی عمارتیں ٹکراتا رہے گا۔" میں نے کہا۔

"تم بڑے آدمی ہو تم اس طرح کی باتیں کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔  
 "اس شہر میں بہت سے بڑے آدمی بھی کسی نہ کسی عمارتیں  
 سے کانپتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ گاڑی میں سے اپنی چپکلی بول نکال کر کت کی جیب میں  
 ڈال لایا تھا۔ اسے جیب سے نکال کر اس نے دو گھنٹہ بھر کے  
 بول جیب میں ڈالی اور غیر ملکی گھنٹ کا پکٹ نکال لیا۔ گھنٹ  
 سٹاک کر اس نے ایک طویل کش لیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک بیچ  
 جا بیٹھا۔ اس کی نگاہوں کی گردش بتا رہی تھی کہ وہ ذرا زوریں تھا۔  
 مجھے خود ہی خیال آیا کہ اس کا خوف سما تھا۔ اس کی نظر میں تو میں  
 محض ایک بڑا بزنس مین تھا۔ عمارتیں اس کی نظر میں بہت بڑا  
 بد معاش تھا۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ ایک بزنس مین بھلا ایک بد معاش  
 سے کیونکر منٹ سکتا تھا؟

راجہ کسی سوچ میں تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے  
 کہا۔ "میں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ مجھے محترم عمارتیں صاحب سے  
 شرف ملاقات حاصل نہیں ہے۔ موصوف کس قسم کی شخصیت کے  
 مالک ہیں؟ کیا صورت سے ہی اعلیٰ درجے کے بد معاش نظر آتے  
 ہیں؟"

"ہاں، لیکن طبع برا معززانہ ہوتا ہے اس لیے بد معاشی والا  
 آثار ذرا دب جاتا ہے۔ لہذا وہ سیاہ قام آدمی ہے۔ بیل ٹیڈو کی  
 طرح ٹھکراتا ہے۔ مضبوط آدمی ہے۔ مکی نظر میں امریکا کا کوئی  
 سیاہ قام باکسر دکھائی دیتا ہے لیکن قریب سے دیکھتے پر احساس ہو جاتا  
 ہے کہ پاکستانی ہے۔ میرا خیال ہے مجھ میں اسکول کی شکل زیادہ  
 عرصے نہیں رہی لیکن خود کو پرمعا کھانا ہر کرنے کا پورا ذہن و است  
 کیلکس ہے۔ سترجین میں سارے انگریزی اخبار منکھوتا ہے حالانکہ  
 کسی کی ہیڈ لائن بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ جن دنوں میرا اس کے دفتر  
 میں آتا جاتا تھا ان دنوں ایک مرتبہ تو میں نے دیکھ کر حیران رہا کہ  
 وہ ٹیکسٹر کے ڈراموں کا مجھ سے بھل میں دوائے چلا رہا تھا۔ میں

نے یوں مذاق میں چڑھ لیا کہ کیا اسے شیکسٹر کے نام کی اپیلنگ آتی ہے؟ مت براستان کیا کہ جس وقت کچھ اور لوگ بھی دفتر میں بیٹھے تھے مجھے انھوں کا برابر پھکوانے لگا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بچ بھاڑ کر دیا۔

”واہ ایہ تو دلچسپ بات بتائی تم نے۔“  
”ایک طرف تو اپنے آپ کو پڑھا لکھا ظاہر کرنے کا ایسا سیکس ہے۔ دوسری طرف اگر تم اسے اپنے بد معاشی ساقیوں یا اپنے کسی کے ملازموں سے بات کرتے دیکھ لو تو شرم سے تمہیں بیٹھے آجائیں گے۔ ایسی گندی زبان میں بات کرتا ہے کہ باقاعدہ فحاشی تقاضا محسوس ہونے لگتا ہے۔“

”خود بھی ہاتھ پاؤں چلا لیتا ہے یا بد معاشوں پر عسکرانی ہی کرتا ہے؟“ میں نے اس کو ٹھٹھکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس میں ایک گھوڑے کی بات کی جارہی تھی۔  
”خود بھی پٹا شور کا بچہ ہے۔ کوک کی بول دانت سے کھول لیتا ہے، گھوٹا مار کر کسی کا ہتھا توڑ دیتا ہے۔ دونوں بظلوں میں ہولشوں میں پھنسل رکھتا ہے۔ اس کے ٹرے اس کے سامنے کانچے ہیں۔“ راجو نے بتایا۔

”تم تو میرے اشتیاق کو ہوا دے رہے ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
دلفتار راجو کیت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ارے سدا را شیم بھی آگئی۔“

میں نے بھی کیت کی طرف دیکھا۔ مسلح محافظ کیت کھول رہا تھا اور شیم کی سرنگ گاڑی اندر آ رہی تھی۔ شیم نے غائب ہونے پر ہتھ پر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی توڑی سی دھول اڑائی اور حری آگئی اور ہم سے محض چند فٹ کے فاصلے پر ہی رکی۔

شیم گاڑی سے اتری تو ایک لمبے کے لمبے میں اس کی طرف دیکھا وہ گیا۔ وہ سرخ ہونٹوں کے چست ٹاڈوں اور دھول کی ٹوٹی بلو جیکٹ میں تھی۔ کھلے ریشمی بال کدھوں پر لہرا رہے تھے۔ پھول میں جا کر ڈھبے برسوں پر انا حسن اب بھی اس کا سا تھی تھا۔ وہ دو دانے پر ہاتھ رکھ کر بیڑی ادا سے کھڑی ہوئی تو توڑی سی دھوپ اس کے چہرے پر پڑی جس نے اس کے حسن کو کچھ اور اجال دیا۔

”چشم بد دور۔“ وہ مسکرائی۔ ”زندگی رہے تو کبھی نہ کبھی جگر کی دوستوں کو برسوں کی جدائی کے بعد بھی کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھنے کا موقع میسر ہی جاتا ہے۔“

میں بھی مسکرا دیا۔ میرے قصور میں گاڑی کی وہ شیم ابھر آئی جو برقع پہن کر دست کاری اسکول جاتی تھی۔ اس تصویر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنا ایک عجیب ”دلچسپ اور حیران کن تجربہ تھا۔“

وہ ایک ٹھک بیری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم خود تو میاں

نہیں پہنچ سکتے، تمہیں راجو لایا ہوگا۔“ ہم اس کی غرض ناسبت ابھی سے راجو کی طرف گھومی اور وہ غصے سے لمبے میں بولی۔ ”آج تمہیں کیسے یاد آگئی، فضل کی؟ میں نے تمہیں اتنی مرہبہ کہا کہ جا کر مل لو مگر تمہارے کان پر جوں نہیں دھنکتی۔“

”اب اسی کے سامنے تو مت ڈالو۔“ راجو مسکرایا۔  
”دوستوں میں کوئی دیر سویر نہیں ہوتی۔ جب مل بیٹھے بھی محفل ہم مٹی کھلے شکوے دور ہو گئے۔“

جیم نہایت گھبراہٹ سے چھوٹے قدم اٹھاتی راجو کے قریب ہتھ پر آ بیٹھی۔ اس کے اور میرے درمیان راجو حائل تھا لیکن اس کے وجود کی خوشبو اور حرارت مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ حیات کے ذریعے اور کچھ سوچ کے ذریعے وہ ذرا جبک کر میری طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں پہلے کی طرح ہی پاس اور طلب تھی۔ راجو کی موجودگی میں بھی اس نے اسے غفلت رکھنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ راجو کا واقعی ان باتوں کی طرف دھیان نہیں تھا یا پھر شاید شیم جی کبھی تھی، اسے ان باتوں کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی ایک انگ دینا تباد کرتے ہوئے تھادور اسی میں مگن تھا۔

”شیم! دلفتار راجو بچوں کے سے جوش و خروش سے بولا۔  
”میں نے افضل کو عیار دینے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ افضل کہہ رہا ہے کہ یہ اس کا بندہ دست کر دے گا۔ اس کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”اگر تم کسی قابل ہوتے تو وہ ہمارے لئے بھی مسئلہ نہ بنتا۔“ وہ سر دھبے میں بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ عیار دینے کے نام پر ایک لمبے کے لئے اس کی آنکھوں میں تغیر سامنا تھا۔  
”کچھو کچھ دبی پرانی لڑائی نے سرے سے مت شروع کر دینا۔“ راجو ہاتھ بانہتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے کہ بندہ کسی قابل نہیں ہے لیکن آخر کار تمام مسائل اسی غلام، اسی خاکسار کے ذریعے حل ہوتے ہیں۔“

شیم نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ راجو تیزی سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے احتجاج سے لمبے میں بولا ”کچھو کچھ پلیرا دوستوں کے سامنے شو بہروں کی بے عزتی نہیں کیا کرتے۔ ان بے ہادوں کی انا بھڑوٹ ہو جاتی ہے۔ یہ میرا نہیں، ایک مشورہ ابر نفسیات کا کتاب ہے۔“

مجھے یقین ہو چلا تھا کہ راجو، شیم سے مرعوب نہیں تھا۔ وہ صرف مرعوب ہونے کی اداکاری کرنا تھا اور شیم بھی اس بات سے واقف تھی۔ یہ انداز کہ کبھی مشکل نہیں تھا کہ دونوں ہی کا دل ایک دوسرے سے بھرا ہوا تھا لیکن دونوں کسی مجبوری کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کی مجبوری کسی مدد ظاہر بھی تھی۔ راجو کی مجبوری شیم کا وہ بیٹا تھا جس کے غل پر وہ ہمیشہ کر رہا تھا اور شیم کی مجبوری شاید یہ تھی کہ ایک ایسے شہر کی

میرے بارے میں اس کا رویہ ٹارٹل ہوا تھا، وہ مجھے خاصی اچھی لگنے لگی تھی۔

”تم نے ناخن مجھے لٹٹ دینے کی زحمت کی۔“ میں نے سکوت توڑنے کی غرض سے کہا۔ ”میں یہاں سے کوئی عیسیٰ وغیرہ لے کر چلا جاؤں۔“

ایک نظر میری طرف دیکھ کر وہ مترقّم سے انداز میں ہنسی۔ ”عیسیٰ؟“ اس نے استہزاء سے انداز میں دہرایا ”یہاں تو ہمیں کدھ کاڑی بھی میسر نہیں ہکتی تھی۔ ویسے ہمیں بہت اخیر سے یہ بات جتانے کا خیال آیا۔“

”اصل میں مجھے بار بار ہے چارے راجو کا خیال آئے جارہا ہے، جسے تم سزا کے طور پر وہاں بٹھا آئی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بے چارہ وہاں کرے گا کیا؟“ اسطبل کے کام کو ظاہر ہے ملائین ہی کو کہتے ہوئے ہیں۔“

”ملائین سے کام لیتا بجائے خود ایک اہم کام ہے اور راجو کو اس کام کی اہمیت کا قطعاً اندازہ نہیں۔ کبھی کبھاری تو وہ پھنستا ہے یہاں۔ اگر وہ دوبرا اور کھوے پھرے“ اسطبل کا جائزہ لے تو سو کام نکل آئیں۔ اسطبل کی بھڑی کے لئے وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ میرا مرحوم شوہر اپنے کا دہار میں سب سے زیادہ وقت اسطبل کو دیتا تھا۔ ہمیں سب سے زیادہ آملی بھی اسی سے تھی۔ ساری بات دلچسپی کی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر شراب اور چپ عورتوں کے سوا راجو کو کسی بھی چیز سے دلچسپی کیوں نہیں ہے؟ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مزاج میں ذرا سی بھی نفاس، عمدہ ذوق یا اچھا رہن سمن رکھنے والی عورتیں بھی راجو کو بالکل اپنی نہیں کرتیں۔ چاہے وہ اس پر صبران ہی کیوں نہ ہوں۔“ ”پھر تم اس کے دل کو کیسے بھانگیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اس وقت وہ بوکھلا رہا ہوا تھا۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا ”اس نے تو شاید تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس غرمت کے عالم میں اسے خوبصورت بیوی اور عیش کوٹی کا تمام سامان میسر آجائے گا تاہم حیرت انگیز طور پر اس کا دل مجھ سے جلد ہی بھر گیا حالانکہ میرا خیال تھا وہ زندگی بھر میرا سیر رہے گا۔“

پھر وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر رائے طلب انداز میں بولی۔ ”دیسے کیا خیال ہے۔۔۔ میں کوئی ایسی گلی گزری عورت تو نہیں ہوں کہ بندے کا سال دو سال میں مجھ سے دل بھر جائے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے قدرے شریٹے لہجے میں کہا ”میں شریف آدمی ہوں راجو خرافت ہے۔ وہ کم سے کم وقت میں زندگی کو زیادہ سے زیادہ بہت لیتا چاہتا ہے۔“

”گھدھا ہے۔ نقصان میں رہے گا۔ ایسے لوگ بہت جلد زندگی کے دیران راستوں پر غالی ہاتھ کھڑے رہ جاتے ہیں۔“ وہ ہنسا کر بولی۔ ”جتنے۔۔۔ چھوڑو راجو کے تذکرے کو۔ میں اس کے بارے میں

آز میروں ہے جو حالانکہ مزاج نہ رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ بھی شاید معاملات کی بات میں کچھ اور مصلحتیں کارفرما رہی ہوں لیکن ابھی مجھے ان کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

اس دوران اسطبل کے عملے کے لوگ ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ شمیم ان سے مختلف معاملات کے بارے میں پوچھ کچھ کرنے لگی۔ پھر اس نے سب لوگوں کو مختلف ہدایات دیں۔ خصوصاً اسلحہ خانہ والوں کو وہ بہت محتاط رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ ان سب سے بات چیت کر کے اس نے انہیں واپس بھیج دیا پھر میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”یہ سب ہدایات دینا ہی سب انتظامات کرتا راجو کا کام ہے لیکن مجھے کہنا پڑتا ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ دیکھنے کے لئے بھی آنا پڑتا ہے کہ یہ یہاں موجود ہے یا نہیں۔ یہ قسمی سے یہاں فون نہیں ہے۔“

”اب تمہاری بے اعتباری کا تو کوئی علاج نہیں۔“ راجو بولا۔ ”ورنہ دیکھ لو میں یہاں موجود ہوں اور ملازمین کو وہ تمام ہدایات تم سے کیوں زیادہ مختصر الفاظ میں دے چکا ہوں؟ جو تم نے اب آکر دی ہیں۔“

”تم پر اعتبار کر کے تو میں جیسے گھائے میں رہی ہوں۔“ وہ لہجہ می سانس لے کر بولی۔ ”پھر وہ اچھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہاری گاڑی یہاں نظر نہیں آ رہی۔“

”میں راجو ہی کی گاڑی میں آیا ہوں۔“ اس نے اس سے اٹھا کھلایا ہے مجھے۔ ”میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور اب مجھے واپس بھی جانا ہے۔“ پھر میں نے راجو کی طرف دیکھا۔ ”چلو راجو! مجھے واپس پکچادو۔“

”راجو کو تم ہمیں رہنے دو۔“ شمیم ہلاتی بولی ”ہمیں میں چھوڑ دوں گی۔ یہ آج خوش قسمتی سے یہاں آئی کیا ہے تو اسے کچھ وقت ہمیں گزار لینے دو۔ شاید کوئی دھبک کا کام کر ہی لے ورنہ مجھے تو اب اس اسطبل کا انجام قرب ہی نظر آ رہا ہے۔“

”یہ عورت کبھی وہ جگہ دو ستوں کو گپ شپ کرتے نہیں دیکھ سکتی۔“ راجو میری طرف دیکھ کر لہجہ می سانس لیتے ہوئے بولا۔ میں ذرا تذبذب میں تھا کہ شمیم کے ساتھ جاؤں یا نہیں۔ راجو کے چہرے پر تشویش یا شکوک و شبہات کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔

”شمیم ذرا زور دے کر بولی۔ ”چلو ثابت بن کر کیوں کھڑے ہو گئے؟ مجھے تم سے عیاریت کے بارے میں بھی بات کرنی ہے۔“ میں نے اجازت طلب نظروں سے راجو کی طرف دیکھا تو وہ لہجہ می سانس لے کر بولا۔ ”جیہا بھائی! اسی میں میری اور تمہاری بھلائی ہے۔ میری بیوی انکار سننے کی عادی نہیں ہے۔“

اب وہ خود ہی اجازت دے رہا تھا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میں اسے خود احتاط کہہ کر شمیم کے ساتھ چل دیا۔

گاڑی اسطبل سے نکل کر پتہ سڑک تک آئی۔ شمیم اس دوران بالکل خاموش رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ جب سے

بات کرنے کے لئے جس میں ساتھ نہیں لائی۔ مجھے تو تم سے بھار  
رشتے کے بارے میں بات کرنا تھی۔ راجو نے جس میں اس کے بارے  
میں سب کچھ بتا دیا ہے؟

”ہاں۔ میرا خیال ہے ابھی کچھ بتا دیا ہے۔“ میں نے تذبذب  
لے میں کہا۔ ”لیکن اب مجھے کیا معلوم کہ ابھی کچھ سے تمہاری  
کیا مراد ہے؟“

”اس نے کیا بتایا ہے؟“ فہیم نے جانا چاہا۔ میں نے وہ سب  
کچھ دہرا دیا جو مجھے راجو نے بتایا تھا۔ اس وقت تک گاڑی بھان  
روڈ پر پہنچ چکی تھی اور ہم بے چہم ٹریفک میں گھر چکے تھے۔ آگے  
رہنے والے گاڑیوں، بھیس، وگنیں، سائیکس، موٹر سائیکس اور  
پیدل چلنے والے راہ گزر بھی ٹک سی سڑک پر ایک دوسرے میں  
گڈڑتے اور ٹریفک سٹ رفاہی سے چل رہا تھا۔

”سن آباؤ موڑ کے قریب پہنچ کر شیم کو زور رفتار بڑھانے کا  
موقع ملا اور اسی دوران اس نے پوچھا۔“ تم نے بھار رشتے کے  
بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”مجھے تو کچھ نہیں سوجا۔ ابھی تو راجو نے اس کے بارے میں  
بتایا ہی ہے۔ دیکھ لیں گے اسے ابھی بھی کی جلدی ہے؟“ میں نے  
بے پروائی سے کہا ”بہر حال تمہیں اس کے بارے میں پریشان  
ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں سے بچا لینے کا شوق اکثر نہ  
چاہتے ہوئے بھی میرے دل میں ابھر آتا ہے۔“

”میں تمہیں اس کے بارے میں ایک بات بتانا چاہتی تھی جو  
راجو کو بھی معلوم نہیں۔“ وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔ میں  
نے محسوس کیا کہ وہ کافی دیر کی ذہنی کشش کے بعد اس فیصلے پر پہنچی  
تھی کہ یہ بات مجھے بتادی جائے۔

”بتاؤ۔ جو کچھ بتانا ہے تم بھی بتاؤ۔ تاکہ اس مفہم ہستی سے  
شرف ملاقات حاصل کرنے سے پہلے اس کے بارے میں میری  
معلومات مکمل ہو جائیں۔“ میں نے لکھڑی سانس لے کر کہا۔

”وہ عجیب مجھے اپنی راشتہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ بات اس نے  
صاف طور پر مجھ سے کہی تھی۔“

”فہیم نے کیا حلق میں اٹھی ہوئی کوئی چیز اکھ دی۔ میں ایک  
لمبے کے لئے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ بھی بظاہر انصاف سے  
ڈرائیو تک کرتی رہی۔

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“ میں نے کھار کر گھا صاف کرتے  
ہوئے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے کیا جواب دیا ہو گا؟“ اس  
نے اٹنا مجھ سے ہی سوال کر دیا۔

”بھئی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے اسے چرانے کے لئے  
غیر واضح لے میں کہا۔ ”میری تو بہن عورتوں سے بھی تو بڑی بہت  
جان پہچان رہی ہے۔ وہ سب کی سب مجھے سن سوتی ہی نظر آتی  
ہیں۔ سن میں آجائے تو راشتہ بننے پر بھی تیار رہتی ہیں۔ سن نہ

چاہے تو گلہ بنے پر بھی رضامند نہیں ہوتیں۔“

”مجھے بھی ان عورتوں میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض  
نہیں۔“ خلاف توقع وہ بولی۔ ”میں بھی بڑی سن سوتی ہوں۔ اس  
کے باوجود راشتہ ہونا مجھے کسی عورت کے لئے بہت ہی تو بہن کی بات  
لگتی ہے۔ عورت نہ ہوئی تو یہ ہو گیا۔ نہ مانے دعوے بدن پوچھا اور  
اگلی پر لٹکا کر بھول گئے۔ عورت کو اپنے من پسند آدمی کی بھی راشتہ  
نہیں ہونا چاہئے مگر تو اس کی بیوی ہونا چاہئے اور اگر حالات  
اس کی اجازت نہ دیتے ہوں تب بھی کم از کم مجبور ہو۔ رشتے کی  
کوئی جذباتی بنیاد تو ہونی چاہئے۔ عورت اور تو لے میں کچھ تو فرق  
ہونا چاہئے۔“

”تمہارا یہ فلسفیانہ جواب بھار رشتے کی سمجھ میں آیا تھا؟“  
میں نے پوچھا۔

”میں نے اسے یہ جواب تو نہیں دیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”اس سے  
تو میں نے یہ کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو راجو کی راشتہ بنادے۔ وہ جتنا  
بھی خرقہ وغیرہ مٹائے گی، میں رو کر دل لگ۔ تم سوچ سکتے ہو کہ اس  
جواب پر بھار رشتے جیسے آدمی کا کیا حال ہو گا۔“

”میں اس کی دشمنی کی بڑی وجہ میں جواب تو نہیں؟“ میں نے  
کہا۔

”نہیں۔ بڑی وجہ تو یہی گھوڑے والا معاملہ ہے۔ مالی نقصان  
اس کی نظر میں سب سے بڑا نقصان ہے۔ بہر حال میرے انکار نے  
اس کے غم کو دو آتشہ کر دیا ہے۔“

”لیکن حیرت ہے اس نے ابھی تک کسی رد عمل کا اظہار نہیں  
کیا۔“ میں نے کہا۔

”وہ گھبراہٹ میں اپنا وار نہیں کرتا۔ خاص خاص معاملات  
میں وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے اور ہر مسئلے کا بڑا پکا علاج  
کرتا ہے۔“ فہیم بولی۔ ”یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ہم دو مرتبہ  
اس کے وار سے بچ چکے ہیں۔“

”راجو نے تو صرف ایک کوشش کے بارے میں بتایا تھا۔ کسی  
چاکی کو اس نے رشتہ انہوں پکڑا تھا جو بکر کو کوئی انجکشن دینے کی  
فکرس تھا۔“ میں نے کہا۔

”بہت سی باتیں راجو کو معلوم نہیں اور بہت سی باتیں شاید تم  
کو بتانے کی ابھی اسے سلت نہ ملی ہو۔“ فہیم بولی۔ ”اس لئے میں  
تیار رہی ہوں۔“

ایک لمبے کے لئے وہ کسی سوچ میں الجھ گئی۔ پھر اٹھ کھڑی ہو کر  
کوئی نئی بات شروع کرتے ہوئے بولی ”میری پہلی شادی کے ابتدائی  
دنوں میں ایک لڑکی میری دوست بنی تھی۔ مازی اس کا نام تھا۔  
بہت اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد میں مسود  
کے ساتھ ملک سے باہر ہجرت گئی۔ جس میں معلوم ہے نا مسود میرے  
مروجہ شوہر کا نام تھا؟“

میں نے اہمیت میں سر ہلایا تو وہ سلسلے کلام جوڑتے ہوئے

میں نے محسوس کیا کہ وہ خود موقع نکال کر مجھ سے ملنے کی فکر میں رہتی تھی۔ دو ایک بار وہ ایسے موقعوں پر آئی کہ میں اصطبل کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بڑے اصرار سے میرے ساتھ وہاں بھی گئی۔ ملنے کے لوگ اسے پہچانے لگے۔ پھر ایک روز استاد نور محمد نے مجھے فوری طور پر اصطبل بلایا۔ اس نے میرے پاس آ کر بیٹھا تھا۔ میں اصطبل پہنچی تو دیکھا کہ ان لوگوں نے نازی کو پکڑ کر بٹھایا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ درد تھا۔

استاد نور محمد نے بتایا کہ نازی میری عدم موجودگی میں وہاں پہنچی تھی اور یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے مجھے ڈھونڈنا ہوئی پہنچی ہے۔ ہمارے سے وہ بڑے پاس بھی جا پہنچی جو اس وقت کوٹھی میں بند تھا۔ ملنے نے اسے میری دوست سمجھ کر کھانے کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن استاد نور محمد کے دل میں کھٹکا تھا۔ انہوں نے اس پر آنکھ رکھی اور یہ احتیاط کام اٹھایا۔ انہوں نے نازی کو عین اس وقت پکڑا جب وہ جنگل میں ہاتھ ڈال کر بکڑ کو چھوئے صابن کے سائز کی ایک چاکلیٹ سی کھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے بہت ڈرایا دھمکا یا گیا کہ بتا دے وہ کس کی ہدایت پر یہ کام کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس نے زبان بند رکھی۔ اصطبل والے بھند تھے کہ میں انہیں اجازت دے دوں وہ اسے پیچھے کوٹھی میں لے جائیں، پھر وہ خود ہی اس سے سب کچھ معلوم کر لیں گے لیکن میرا دل نہ مٹا کہ اس کی اجازت دوں۔ وہ بہت دہشت زدہ تھی، اس نے زار و قطار دوئے جاری تھی اور میرے پیروں میں گرنے کی کوشش کئے جا رہی تھی لیکن زبان نہیں کھول رہی تھی۔ آخر کار تھک ہار کر میں نے اسے چھوڑ دیا جس پر ملازمین مجھ سے کچھ فحاشیاں ہوئیں۔

اس دن کے بعد نازی کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ میں نے اسے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ کافی دنوں بعد میں نے ایک روز اسے شاندار مارکیٹ میں گاڑی میں بٹکار بیٹھ کے ساتھ دیکھا۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں بھی ان سے بات نہیں کر سکی۔ وہ آگے نکل گئے۔ شہر تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن اس روز گویا تقدیر ہو گئی کہ نازی بھی بٹکار بیٹھ کر آگے نکلا۔ وہ بھی اور شاید اس کی زندگی میں آئے والے خاموش اور شرمناک انتخاب کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ معلوم نہیں وہ شخص کن کن دھندلوں میں لوث ہے۔ ہر حال میری تو اس سے نازی والے معاملے پر بھی بات کرنے کی بہت شہر باز تھی۔ دیسے بھی میری اور راجو کی اس سے ملاقات شاندار رہی ہوئی ہے۔ مالی معاملات بھی زیادہ تر بیٹوں اور ہمارے دیکھوں ہی کے ذریعے طے ہوتے رہے ہیں۔

ایک طویل سانس لے کر وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "تم دونوں میاں بیوی کی باتوں سے مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تم نے اسے اپنے لئے آوا بنا دیا ہوا ہے۔"

بولی۔ "میرے بیویوں ملک قیام کے دوران نازی سے میرا کوئی رابطہ نہیں رہا۔ میں دانتیں آئی تب بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کافی عرصے بعد ایک روز اچانک اس سے ملاقات ہوئی تو میں اسے پہچان ہی نہیں سکی۔ وہ ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت تھی۔ ظاہری طور پر تو اس میں جو فرق پڑا تھا سو پڑا تھا لیکن باطنی طور پر بھی وہ بالکل بدل گئی تھی۔ جس معزز گھرانے کی وہ لڑکی تھی اس کی کوئی بھی نشانی اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سرگت بننے لگی تھی اور وہ بھی سادہ ٹیمپل۔ اس میں نہ جانے کیا کچھ بھر کر گرے ہوئے برس اس کے چہرے پر گویا کچھ زیادہ سی گھرے تھے قدم چھوڑ گئے تھے۔ اس کی حرکات و سکنات بھی عجیب ہو گئی تھیں۔"

وہ خاموش ہو گئی گویا اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ کس طرح اپنی بات کی وضاحت کرے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "میں یوں سمجھ کر کہ وہ ایک کال گرل سی بن گئی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو پہلے ہی کی طرح ایک معزز گھرانے کی شریف لڑکی ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں وہ بات نہیں رہی تھی۔ ظاہر ہے اس قسم کی تبدیلیوں کا احساس تو ہوا ہی جاتا ہے۔ میں بھی کوئی ایسی بچی تو رہی نہیں تھی، دنیا دیکھ چکی تھی۔" چہرے سے اس نے گاڑی سیالی صاحب کی طرف سوڑی تو میں نے پوچھا "کمال جانے کا ارادہ ہے؟"

"میں جیسے اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" وہ بولی۔ اس کا گھر گلبرگ میں ہی تھا۔ "تو پھر آج پکڑ کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ سنن آباد سے ہی نکال لیتیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے مزگ چرچ پر صرف چند سیکنڈ کا ایک کام ہے۔ ایک لیبارٹری سے اپنی ایک ٹیسٹ رپورٹ اٹھانی ہے۔" اس نے بتایا۔ میں نے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے اپنا کون سا ٹیسٹ کرایا تھا۔ میری کوشش ہوئی تھی کہ قریبی دوستوں سے بھی کوئی حد سے زیادہ ہی گئی سوال نہ پوچھوں کہ وہ خود ہی بتا دے تو بات دوسری تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "میں جیسے نازی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے اپنا گھر بھی چھوڑ دیا تھا اور بظاہر کسی معمولی سی فرم میں نوکری کر رہی تھی لیکن اس کا رہیں سنن معمولی نوکری کرنے والی لڑکیوں جیسا نہیں تھا۔ اس نے خود کوئی اعتراف نہیں کیا، میں نے بھی اسے نہیں کریا۔ میں اسے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ہر حال اتنا مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ پہلے والی نازی نہیں رہی تھی کمال گرل بن چکی تھی لیکن یہ میرے لیے ہر حال معافی رہا کہ اسے کس نے اس راستے پر لگایا تھا اور اتنے کم عرصے میں ایسی خرافات کی طرح بنا دیا تھا۔

اس سے میری دوبارہ میل ملاقاتیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں اس سے ملنے کی کچھ ایسی زیادہ خواہش مند نہیں رہتی تھی لیکن

”میت خوب!“ میں نے کہا۔ ”راجہ اگر شاہکار ہے تو تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔ حالات کو بگاڑنے میں کچھ نہ کچھ ہاتھ تمہارا بھی ہے۔“

”ہاں۔ لیکن بہت معمولی حد تک۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”لیکن میں بہر حال ایک عورت ہوں اور میرا تعلق کسی کاروباری خاندان سے نہیں ہے۔ یہ کام تو مردوں کے ہوتے ہیں۔ میں مسودہ خرچ کرنے تو کچھ بھی ان کاموں میں الجھانے کی ضرورت ہی مخصوص نہیں کی تھی۔“

”تو وہ بار لاکھ کی رقم نہیں دی جاسکتی؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں۔ ہر وقت تو راجہ کسی نہ کسی نئے کاروبار میں الجھا ہوتا تھا۔ کبھی بھانسنی ہی نہیں تھی اور اس وقت تو بالکل بھانسنی نہیں ہے۔ اگر کسی طرح سمجھ جائے کہ ہم بارہ لاکھ اسے دے بھی دیں تو ہمیں گزر اوقات میں بھی دیتے ہوئے لگے گی۔ جس رعب سن کے ہم حادی ہیں اس سے بچنے آئے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”تم لوگوں نے اپنی زندگی کو کچھ زیادہ ہی پیچیدہ بنایا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہر معاملے میں بد انتظامی کی انتہا ہے۔ تم دونوں تو اپنے معمولات اور اپنے کاروبار کو بالکل اسی طرح چلا رہے ہو جس طرح ہمارے ملک کو چلایا جا رہا ہے۔“

”تم ہمیں جتنا بھی ڈانٹو، کم ہے لیکن اب جب ہمیں۔۔۔ یا یوں کہو کہ صرف مجھے کچھ عقل آتی ہے تو ہم حالات کے گھٹنے میں اس طرح جکڑے جا چکے ہیں کہ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سوچ رہے۔ جو خطرات گواہی کی طرح ہمارے سروں پر لٹک رہے ہیں ان کے ڈور ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ مختار رشق کا خوف ہماری زندگیوں کو جو تک کی طرح چٹ گیا ہے ایک تو ہم بکھر کو رہیں گورس سے نہیں ہٹا رہے، دوسرے میں نے اس کے لئے سالانہ عشرت بننے سے انکار کر دیا۔ اب وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیرنے والا ہے۔ قرض کی ادائیگی کے لئے بھی اس کا پیغام آچکا ہے اور اس کا پیغام فرشتہ اجل کے پیغام کی طرح ہوتا ہے۔ پھر اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔“

اس نے مزید چوکی کے بجائے گنگا رام اسپتال کے قریب ایک لیبارٹری کے سامنے گاڑی لے جا کر روکی اور مضرت کر کے اندر چلی گئی۔

چند لمحے بعد وہ واپس آئی تو میں بیئر سیٹ سے کھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک لفافہ تھا جس میں غالباً بیٹ روپٹ تھی۔ اسے پرس میں رکھ کر وہ بیئر سیٹ پر بیٹھے ہوئے بولی۔ ”غیرت۔۔۔؟ یہ تم نے ڈرائیونگ سیٹ کیوں سنبھال لی؟“

”میں نے سوچا، تم خاص طویل ڈرائیونگ کر چکی ہو، تھک چکی ہوگی۔ اب کچھ دیر میں تمہیں سنبھالنے کا موقع دوں۔“ میں نے کہا۔

”کئی بات نہیں ہے۔ ہم خواہ مخواہ اس سے نہیں ڈرتے۔ ہمیں ڈرنا ہی چاہئے کم کم زور ہیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور جب وہ ہمارا کچھ بگاڑنے کا فیصلہ کر لے گا تو ہم اسے روکنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔“

”تم نے یہ سب کچھ کو اپیلے ہی سے طے کیا ہوا ہے۔“ میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ ”اگر یہ فارمولہ درست ہوتا تو دنیا میں طاقتور اور بلا دست لوگ تو ایک بھی کمزور اور مجبور کو زندہ نہ رہنے دیتے۔ ہر وقت ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات بڑا مضبوط ہاتھ بھی کسی کمزور سے پردے کو اکھاڑنے سے قاصر رہتا ہے۔ کیا تمہیں خدا پر بالکل بھروسہ نہیں ہے؟“

”خدا پر بھروسے کے بغیر تو ہم پیسے گناہ کا دل اور سیاہ کا دل کا بھی گمراہ نہیں ہے۔ اسی بھروسے کے سارے تو پیٹھے ہوئے ہیں ورنہ ڈر کے مارے کب کے شر پھونڈ کر بھاگ گئے ہوتے لیکن وہ ایک الگ بات ہے۔ حقیقت تو اپنے بھیاک جڑے کھول کر ڈراتی رہتی ہے۔“ وہ بولی۔

میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ”اب میں تمہیں ایک اور اہم بات بتانے لگی ہوں، ایک اور چیز جس نے ہمیں مختار رشق کے سامنے آنکھ اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ راجہ ابھی تمہیں وہ بات بتانے کی جرأت نہیں کر پایا ہو گا۔ ”کنکاشی انٹرا انڈسٹریز“ کے نام سے ہم میاں بیوی نے فرم بناد رکھی ہے جس کے ہم دونوں ڈائریکٹر ہیں۔ اپنے سارے کام وعدے ہم اسی فرم کے نام سے کرتے ہیں۔ راجہ کی عاقبتوں کی وجہ سے ہماری یہ فرم۔۔۔ یا یوں سمجھو کہ ہم دونوں میاں بیوی، مختار رشق کے بارہ لاکھ کے مقروض بھی ہیں۔“

”کمال ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو اچھا دشمن ہے جو قرضہ بھی دیتا ہے۔“

”یہ قرض اس وقت چڑھا تھا جب اس سے دشمنی شروع نہیں ہوئی تھی۔“ غمیم بولی۔ ”میرے شوہر ٹانڈا نے اس کے ساتھ پچھلیوں اور مویشیوں کی فارمنگ کا ”عظیم الشان منصوبہ“ بنایا تھا۔ اندازہ کچھ ایسا ہی تھا کہ جس ان کے منصوبے کے کامیاب ہونے کی دیر ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا کو پچھلیوں اور مویشیوں کی سلائی صرف وہی دونوں کر رہے ہوں گے۔ پچھلیوں کی جگہ ان کے فارموں پر وحشت الارض پیدا ہوتے رہے اور مویشیوں کی جگہ الو بولنے رہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مختار رشق نے زمین بھی اپنے ہی کسی رشتے دار کی لے لی تھی۔ کوڑیوں کے بھڑ بکتے والی زمین بھی جو اس نے ملی بھگت سے سونے کے دام خریدی۔ قصہ مختصر یہ کہ اس میں آخر کار بارہ لاکھ کا نقصان ہمارے حصے میں آ گیا جو معاہدے کے تحت ہمیں ہر حال میں پورا کرنا ہے اور ہم اس سلسلے میں قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اسٹامپ پیپر لکھ کر دے رکھا ہے۔“

”ہاں۔ میرے خیال میں تو بہت ضروری ہے۔ تمہارے سامنے وہ کسی بات سے منکر نہیں کئے گا۔ اس کی ہر بات تم اپنے کانوں سے سن سکو گی، ہر وہ عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گی، مجھے تمہارے پاس رپورٹ لے کر آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ویسے بھی میں اکیلا اس کے سامنے ”دری ست گواہ جست“ کی تصویر بن کر جانا نہیں چاہتا۔“

”میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ تم راجہ کو ساتھ لے جاتے۔“ وہ چپکے سے ہوتے ہوئے بولی۔

”وہ بے کار آدمی ہے۔ تم سے بھی زیادہ بڑیل ہے۔ اس سے تو بہتر ہے میں کسی بکرے کو کان سے پکڑ کر ساتھ لے جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”میرا مطلب ہے یہ کچھ عجیب اور معیوب سائنس لگاکر غور ات ایک حاتی کو ساتھ لے کر ایک بڑے معاش سے بات چیت کرنے، حساب کتاب کرنے جاری ہے۔ وہ اسے بنیاد بنا کر مجھے ذلیل اور رسوا نہیں کرے گا؟“ شمیم یکدم سخت الجھن میں پڑ گئی تھی۔

”جیسں اچھا نہیں لگتا میرے ساتھ رسوا ہوتا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بات کی کوئی بنیاد ہو، تعویذی بہت حقیقت شامل حال ہو تب تو رسوا ہونے میں کچھ فرق بھی ہے۔ خالی خالی رسوائی کا کیا فائدہ؟“ وہ ہنسبکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”پہلے انسان رسوا ہو کر تو دیکھے، پھر شاید بات میں سے بات نکل آئے۔“ میں نے کہا ”اور اگر تم خوفزدہ ہو تو میرے دوستوں کے حلقے میں شامل ہونے کے بعد خوف کو ذہن سے نکال دو۔“ جیسں ایک وقت میں صرف ایک سی چیز سے دوستی رکھنا ہوگی۔ خوف سے یا بچھ سے۔“

”میرا خوفزدہ ہونا غلط تو نہیں ہے۔ دو بیٹے لڑتے ہیں تو مجھایاں بے چاری خواہ مخواہ ہی لگی جاتی ہیں۔“ وہ بولی۔

”بیٹے کون ہیں اور مجھای کون؟“ میں نے اسے گھورا۔

”اب اتنے بھی انجام مت بنو۔ ظاہر ہے بیٹے تم اور عکار رشت ہو مجھای میں ہوں۔“

”اگر مجھایاں اتنی حسین ہوا کرتیں تو میں اپنے گھر کا لالہ جھایوں ہی سے بھرنا سب پھول پورے ہلاتا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اس مجھای سے تو تم بہت بڑی کرگرتے ہو۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا اس میں کائنات زیادہ ہے؟“

”اب مجھای نے زبردستی دامن سے ہلتا چھوڑ دیا ہے تا شاید اس نے ابھی تکے لگی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرا حال۔۔۔ تم کچھ جانے کی فکر مت کرو۔ ہوٹل کا نام بتاؤ، جس میں عکار رشت کا دفتر ہے۔“

”ہیلں ہوٹل۔“ وہ بولی۔ ”لیکن کیا تمہارا یوں تن تھا ایک

جہت شکر ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”لگتا ہے اب واقعی تمہارے دل میں ہم جیسوں کے لئے بھی کچھ جگہ بڑا ہوئی جا رہی ہے جو تمہاری چھوٹی چھوٹی تکلیفوں پر بھی تمہاری نظر جانے لگی ہے لیکن یہ معمولی اور پرانی سی کار تمہارے شایان شان نہیں ہے۔ شاید تم الجھن محسوس کرو کہ یہ کیا کھانا چلانا پڑا ہے۔“

”خیر، اب ایسی کسر تھی سے بھی کام مت لو۔ ابھی بھلی گاڑی ہے یہ کوئی کھانا تو نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جیسں کیا معلوم ہم نے زندگی میں کیسے کیسے کھانے چلائے ہیں۔“

میں نے گاڑی واپس موڑی اور وارث روڈ کے راستے نیل روڈ پر لے آیا۔ اس دوران ادھر ادھر کی باتیں جاری تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”عکار رشت کا دفتر کہاں ہے؟“

”اس کا اصل دفتر تو راکی سینما ہی کے ایک فلور پر ہے۔ زیادہ تر وہ وہیں پایا جاتا ہے۔ ایک دفتر تیس کورس میں بھی ہے لیکن وہاں وہ صرف ریس والے دن ہوتا ہے۔ راکی سینما جس میں اس کا ہیڈ آفس ہے، اس کا اپنا ہی ہے۔ دو ایک دوسرے سینما بھی ہیں۔ گبرگ میں اس کا ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے، اس میں بھی اس کا دفتر ہے۔ ہوٹل چھوٹا ہے لیکن بڑے بڑے کاموں کے لئے مشہور ہے۔ نہایت رُفیش ہوٹل ہے۔ اس میں فلور شو وغیرہ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ فلور میں ڈانس کے ذریعے ابھرنے والی کئی اور کارائیں ماضی میں وہاں ڈانس شو پیش کرتی رہی ہیں۔“ شمیم نے خاصی تفصیل بتادی۔

”اس وقت وہ کہاں ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے اپنی سرسری نکلائی پر بندھی سیاہ گفٹی پر نظر ڈالی۔ ”زیادہ امکان یہ ہے کہ اس وقت وہ اپنے ہوٹل والے آفس میں ہوگا۔“

”چلو اچھا ہے، اس وقت ہمارا رخ اسی طرف ہے۔ لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھ ہی لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی رحمت قدرے زبرد پڑ گئی تھی۔ ”کیا تم ابھی اسی وقت اس سے ملو گے؟“

”ہاں۔ کیا سرج ہے۔ مجھے اس طرح کے کاموں کے لئے روز روز کہاں وقت ملتا ہے۔ جو کام منٹ جائے اچھا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ عکار رشت سے میری ایک سی ملاقات کافی رہے گی۔ تمہارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”مجھے اس کی اُمید نہیں ہے۔“ وہ اضطراب سے انداز میں بولی۔

میں نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر صرف مسکراتے پراکتھا کیا۔

وہ بولی۔ ”کیا میرا ساتھ جانا ضروری ہے؟“



دم نہ اٹھا کر وہاں چلا مناسب ہو گا میرا مطلب ہے حکم از کم ایک  
 آدھ آدمی۔ کوئی گاڑ وغیرہ ساتھ لے لیتے۔  
 مجھے اس کے شکرانہ انداز پر بھی مٹی گرنے سے ہی لمحے  
 میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے ان گفتگوں میں پڑنا ہوا  
 تو میں اس شخص کو انھواری لیتا، خود کسی قسم کی رحمت ہی نہ کرتا  
 لیکن یہ تم سے خصوصی تعلق اور لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ میں خود  
 تمہارے ساتھ چلا جا رہا ہوں۔ میں نے سوچ بچار میں دقت ضائع  
 نہیں کیا۔ اس کو کہتے ہیں ذاتی دلچسپی لینا۔“  
 ”تمہاری اس جلد بازی نے ہی تو مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔“

”پلو! آج بھی مجھ کے خوفزدہ ہوں۔ امید ہے اس کے بعد خوف  
 بیشہ کے لئے تمہارے ذہن سے نکل جائے گا۔ جس ہوئے سے  
 انسان ڈرتا چلا آ رہا ہو، ایک بار اس کا سامنا کر ہی لیتا جا بیٹے تاکہ  
 معاملہ کسی کنارے لگ جائے۔ ادھر یا اُدھر“ تخت یا تختہ میں  
 نے اطمینان سے کہا اور گاڑی میں لیوڈ پڑے ہوئے۔ وہ خاموش  
 رہی۔ میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کی  
 زردی کم نہیں ہوئی تھی۔ چوں چوں تپیں ہوئی قریب آ رہا تھا، وہ  
 گویا اپنی جگہ سڑکی ہی جا رہی تھی۔

آخر کار میں نے گاڑی تپیں ہوئی کے سامنے لے جا دی۔  
 وہ چھوٹا سا ایک خوبصورت ہوٹل تھا۔ میں باغی میں دو چار مہرے  
 اس میں کھانا کھانے آچکا تھا لیکن میں نے بھی جاننے کی ضرورت  
 محسوس نہیں کی تھی کہ یہ کس کا ہوٹل تھا یا کس قسم کا ہوٹل تھا۔  
 بہر حال اس میں شک نہیں تھا کہ چھوٹا ہونے کے باوجود وہ ایک  
 رنگا ہوٹل تھا۔ اس کی تزئین و آرائش پر بیٹا بھی دل کھول کر  
 خرچ کیا کیا تھا اور کم سے کم جب میں زیادہ سے زیادہ شان و شوکت  
 پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بارے میں جو آڑی آڑی  
 سی باتیں سننے میں آتی رہتی تھیں ان سے البتہ کسی حد تک اندازہ  
 ہوا تھا کہ اس کی شہرت ابھی نہیں تھی۔

گاڑی سے اتر کر میں نے عظیم کو آگے بٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ  
 اس طرح آگے بڑھی جیسے اسکول میں کوئی سنگین شرارت کرنے  
 والے بچے کو پریل لے اپنے دفتر میں طلب کیا ہو۔ میں اس کے  
 پیچھے پیچھے چل رہا۔

باہر سے ہوئی کی ساخت کئی منزل کو مٹی سے مشابہ تھی۔ میں  
 میٹ سے لابی کے دروازے تک خوبصورت اور رنگارنگ سانپان  
 نصب تھا جس میں چھوٹے چھوٹے رنگارنگ فانوس تو ہریاں تھے  
 ایک طرف چھوٹا سا خوبصورت لان اور دوسری طرف پارکنگ  
 لاٹ تھی۔ دونوں طرف جانے کے لئے علیحدہ علیحدہ پتھر روش  
 موجود تھی۔

لابی کا دروازہ تاریک اور موٹے شیشے کا تھا۔ اسے دیکھ کر  
 خواہ مخواہ ہی کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے عقب میں کوئی  
 پراسرار دنیا آباد تھی۔ دروازہ پارکی ساخت میں امپورٹڈ شیشے اور

امپورٹڈ میٹائلوں کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا تھا۔ لابی کے تالین  
 میں پاؤں دھسنے جا رہے تھے۔  
 ریسپشن کے نیم دائرہ نما کاؤنٹر پر جو کلرک موجود تھا وہ  
 استقبالیہ کلرک کے بجائے رنگین چیمپن معلوم ہو رہا تھا۔  
 قیمت تھا کہ وہ ریسلر ڈالے ملے میں میں تھا۔ یہ فیشن کا کوٹ  
 پہنے ہوئے تھا، وہ بھی لگائی ہوئی تھی۔ بال بھی پلٹے سے تھے ہوئے  
 تھے اور خوب چمک رہے تھے۔

عظیم کو دیکھ کر وہ مسکرایا لیکن نظروں میں سوال بھی تھا۔ مجھے  
 دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کی مسکراہٹ قایم ہو گئی اور آنکھوں  
 میں یکدم سردی آگئی لیکن چونکہ عظیم اسے نظر انداز کرتے  
 ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی تھی اس لئے میں نے بھی اس کی طرف  
 زیادہ توجہ نہیں دی۔ میں نے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن محسوس کیا کہ  
 ہمارے آگے بڑھتے ہی اس کا ہاتھ ٹائیٹن کی طرف چلا گیا تھا۔

سیڑھیوں کے قریب سرخ فوٹی والا ایک باوردی شخص کھڑا  
 تھا۔ اس کے کندھے سے سرخ لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر عظیم  
 کو دیکھ کر شناسائی کی کوئی روش نہیں ابھری۔ اس نے سرخی نظروں  
 سے ہمیں دیکھا تاہم روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا چہرہ بدستور  
 پتھرا ہوا سا رہا۔

ہوٹل چار منزل تھا۔ اس میں لفٹ نہیں تھی۔ پہلی منزل پر  
 بھی ہمیں ایک باوردی مسلح محافظ کھڑا نظر آیا۔ میں نے اسے دور سے  
 کے کسی ہوٹل میں اس طرح سیڑھیوں اور لفٹ کے قریب مسلح  
 محافظ کھڑے نہیں دیکھے تھے۔

دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھتے وقت عظیم میری طرف  
 مڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ”محافظ رفیق کا دفتر پر پہنچ  
 سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہمیں ہینڈ آجائے گا۔“

میں مسکرائے بغیر نہ دیکھ کر کہ ہینڈ اس وقت خود اس کی  
 پیشانی پر چمک رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی وجہ سیڑھیاں  
 چڑھنے کی شقت نہیں بلکہ عمار کے سامنے جانے کی گھبراہٹ  
 تھی۔

عظیم مدبر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) 150/-

(قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (زاہد حسین انجم) 150/-

(پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے حالات زندگی)

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

”ہم ذرا عمار کے پاس جا رہے ہیں۔ کچھ کا دیواری بات چیت کرنے“ شمیم نے بڑھو قار انداز میں جواب دیا۔ شوکے کی نظروں ایک لمبے کے لیے شمیم کے سر پر کو چھبڑی رہیں۔ میں نے اس دوران بہ حد کو شش اپنی پٹیاں لٹھڑی رکھیں۔

”پاس کو آپ کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے میڈم“ وہ وہ جانے کیوں لٹھڑی سانس لے کر بولا۔ اس کا ”میڈم“ کہنے کا انداز، منو بانہ کے بجائے استہزائیہ تھا۔ ”اور وہ آپ کے مختصر ہیں لیکن۔“

اس کی سوالیہ نظر مجھ پر آن لگی۔ میں ایک ٹھیک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ بے چین سا ہو گیا۔ اس کا ارادہ غالباً مجھے دہیں رکھنے کے لیے کہنے کا تھا لیکن پھر گواہ حاتم عالی کی قبر پر بات بارتے ہوئے بولا ”آپ بھی جاسکتے ہیں لیکن آپ کی جیب میں جو پتول ہے وہ سہولتی کر کے مجھے دے جائے“ وہ اپنی پرل جانے لگا۔ پاس ایسے مسافروں کو پسند نہیں کرتے جو خنجر پتول وغیرہ لے کر کاروباری گفتگو کرتے آتے ہوں۔“

بظاہر وہ شرفانہ ہی انداز میں بات کر رہا تھا لیکن لہجہ کچھ ایسا جھجکے دار تھا کہ خواہ خواہی میں استہزائیہ سا محسوس ہوتا تھا۔

میں جلی ہو لٹھڑی نہیں لگا آ تھا۔ اپنا شیش ہٹل کوٹ کی اندرونی جیب میں ہی رکھتا تھا۔ اس نے اگر یہ اندازہ لگایا تھا کہ میرے کوٹ کی جیب میں ہٹل موجود تھا تو اس کی نظر قابلِ داد تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور میرے لیے بھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ہاتھ کسی گن کے دے رہا تھا۔

میں ایک لمبے ساکت رہا تو وہ دھیمے ٹھوڑے ہی جھجکے وارے لیے میں بولا۔ ”اس بات کو یقینی بنانا میری ذمہ داری ہے کہ جب کوئی پاس سے بات کرنے آئے تو صرف بات ہی کرے۔“

شمیم منظر پر اس کی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے جیب سے شیش ہٹل نکالا اور نہایت منو بانہ انداز میں شوکے کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شوکے نے اسے بائیں ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا اور خمیں آمیز لہجے میں بولا۔ ”اچھی چیز ہے۔ کیا اکثر استعمال میں رہتا ہے؟“

”نہیں۔ ایسے ہی شوریہ رکھا ہوا ہے۔ اگر یہ جیب میں موجود ہو تو کوٹ کی ڈنگ ذرا اچھی معلوم ہوتی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس نے موٹی بھوس اچکا میں اور کچھ کہنے کے لیے ہونٹ ہلاتے آئیں پتھری میں کہ وہ کدھا چاہتا تھا۔ ”وہاں شیش چنے کی کو شش نہ کرنا چاہی۔“ شاید تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔“

لیکن اس نے غالباً کچھ بھی کہنے کا ارادہ پتھری کر دیا اور ہمیں بیڑیوں کی طرف جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ دیوار میں نصب ایئر کام سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ہم اوپر پہنچے تو ٹھیک چھت پر نہایت فرحت بخش ہوا کے

”کیا میں تمہیں ایسا نظر آتا ہوں کہ چار حیل کی بیڑیاں چڑھ کر بیٹے ہو جاؤں گا یا اپنے لگوں گا؟“ میں نے پوچھا۔

”نظر تو نہیں آتے لیکن کیا ہے۔“ اس کی مسکراہٹ اب بھی چمکی تھی۔ پھر ایک لمبے کے توقف سے وہ بولی۔ ”جو تھی حیل تک کرانے پر اٹھنے والے کرے وہ فیروہ ہیں۔ اس کے بعد چھت پر کسی خوبصورت انیس کی طرح عمار کا آفس بنا ہوا ہے۔ جو تھی حیل تک تو ہمیں کوئی نہیں پوچھے گا لیکن جب ہم چھت پر جانے کے لیے بیڑیاں چڑھنے لگیں گے تو ہمیں جو سب آوی گھڑا ملے گا، اس سے ذرا احتیاطی رہ کر بات کرنا۔ وہ ہمیں دو کے گائیڈ کرے گا اس سے آگے جانے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم عمار کے پاس جا رہے ہیں۔ شاید وہ تمہاری تلاش بھی لے۔ اس سے مت الجھنا۔ اس کا نام شرکا ہے۔ بیڑیاں اندر معاش ہے۔“

”میں جس طرح لوگوں میں اسی طرح کروں گا۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔ ”لیکن تم نے کسی سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ عمار اس وقت دفتر میں موجود بھی ہے یا نہیں؟“

”پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔“ وہ بولی۔ ”مالی میں قدم رکھتے ہی ریپیشنٹ کا چہرہ دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ عمار دفتر میں دفتر میں موجود ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ریپیشنٹ اور راستے میں ملے والا ہر کافہ کتنا چاق و چوبند اور مستعد نظر آ رہا تھا؟“

”میں ان لوگوں کو بہتر جانتی ہو، تمہارا مشاہدہ اور دلیل قابلِ اعتبار ہے۔“ میں نے طمانیت سے سہلاتے ہوئے کہا۔

چوتھی حیل پر پہنچ کر جب ہم مزید بیڑیاں چڑھنے کے لیے آگے بڑھے تو اچانک ہی ایک ستون کی آؤ سے ٹکل کر ایک شخص ہمارے سامنے آگیا۔ کم از کم مجھے اس سے وہ ”شرکا بد معاش“ برگر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ڈز سوٹ میں تھا اور لو لگائے ہوئے تھا۔ شرٹ بھی صاف ستھری اور سفید تھی۔ حتیٰ کہ اس نے عمدہ قسم کا کھون بھی لگا رکھا تھا۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اب بد معاش بھی خوش لباس ہوتے جا رہے تھے۔ شاید انگریزی عینیں دیکھنے لگے تھے لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر شرکا بد معاش جیسا کوئی نام ذہن میں آتا تھا۔ چوڑا چمکا، کھورا چہرہ، خاص پر دو تین جگہ زخموں کے نشان تھے۔ موٹی موٹی مونچھوں نے بالائی ہونٹ کو چھپا رکھا تھا۔ آنکھوں میں گہرا خون اتر رہا تھا۔ دراز انداز اور مضبوط تھا۔ جسم کسرتی معلوم ہو رہا تھا۔

ہم جب سے ہوٹل میں داخل ہوئے تھے، مٹائی رنگ کے نہایت دھڑقلین پر چل رہے تھے۔ وال فووال کا رنگ تھا۔ ہمارے قدموں کی ذرا سی بھی آہٹ نہیں ابھری تھی اور اسی طرح بے آواز قدموں سے اچانک وہ ہمارے سامنے آگیا تھا۔

”کہاں جا رہی ہیں میڈم؟“ اس نے شمیم کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ اگر شمیم کا غانا ناں بھی اس کے ساتھ دے گا تو اسے بھی قصہ آجاتا۔

”ہم ذرا عمار کے پاس جا رہے ہیں سمجھ کر داری بات چیت کرنے“ شمیم نے بڑا قار انداز میں جواب دیا۔ شرکے کی نظریں ایک لمحے کے لیے شمیم کے سر پر گھسٹتی رہیں۔ میں نے اس دوران بہ صد کوشش اپنی کپٹیاں مضبوطی سے رکھیں۔

”پاس کو آپ کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے میڈم“ وہ دے جانے کیوں مضبوطی سانس لے کر بولا۔ اس کا ”میڈم“ کہنے کا انداز: سودا خانہ کے بجائے استراحتیہ تھا۔ ”اور وہ آپ کے منتظر ہیں لیکن۔۔۔“

اس کی سوالیہ نظر مجھ پر آن گئی۔ میں ایک تنگ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔ اس کا ارادہ غالباً مجھے وہیں رکھنے کے لیے کہنے کا تھا لیکن پھر گویا وہ حاتم طائی کی قبر رلات پارتے ہوئے بولا ”آپ بھی جاسکتے ہیں لیکن آپ کی جیب میں جو ہتول ہے“ وہ سوالی کر کے مجھے دے جانے والا ہی پرل جاسے گا۔ پاس ایسے مسلمانوں کو پھنس نہیں سکتے جو خیر ہتول وغیرہ لے کر کاروباری ہتھکڑی کرتے آتے ہوں۔“

بظاہر وہ شرعاً ہی انداز میں بات کر رہا تھا لیکن لہجہ کچھ ایسا جھنجکے دار تھا کہ خواہ تو وہ ہی ہم استراحتیہ سامعوس ہوتا تھا۔

میں بجلی ہو لپٹ نہیں لگا آتا تھا۔ اپنا شین ہٹل کوٹ کی اندرونی جیب میں ہی رکھتا تھا۔ اس نے اگر یہ اندازہ لگایا تھا کہ میرے کوٹ کی جیب میں ہٹل موجود تھا تو اس کی نظر قابلِ داد تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور میرے لیے بھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ہاتھ کسی کس کے دے رہا تھا۔

میں ایک لمحے سا کٹ رہا تو وہ مجھے ٹھیکوڑی سے ہی جھنجکے دار سے لیے میں بولا۔ ”اس بات کو یقینی بنانا میری ذمہ داری ہے کہ جب کوئی پاس سے بات کرنے آئے تو صرف بات ہی کرے۔“

شمیم حنظلانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے جیب سے شمین ہٹل نکالا اور نہایت سنجیدہ انداز میں شرکے کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شرکے نے اسے بائیں ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا اور خمین آمیز لہجے میں بولا۔ ”اچھی چیز ہے کیا اگر استعمال میں رہتا ہے؟“

”نہیں۔ ایسے ہی شوقیہ رکھا ہوا ہے۔ اگر یہ جیب میں موجود ہو تو کوٹ کی ڈنگ ذرا اچھی معلوم ہوتی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس نے موٹی ہنس اچکا نہیں اور کچھ کہنے کے لیے ہونٹ پلاتے آہٹیں پھاری تھیں کہ وہ کتنا بھانپتا تھا۔ ”خواہ شرم نہ لے کی کوشش نہ کرو باجانی! شاید تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔“

لیکن اس نے غالباً کچھ بھی کہنے کا ارادہ ہٹل کر دیا اور ہمیں بیڑیوں کی طرف جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ دیوار میں نصب ایئر کام سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ہم اوپر پہنچے تو مکمل بچت پر نہایت فرحت محسوس ہوا کہ

”کیا میں جیسے ایسا نظر آتا ہوں کہ چار حنظل کی بیڑیاں چڑھ کر بیٹھے ہیں ہو جاؤں گا یا اپنے گلوں کا؟“ میں نے پوچھا۔

”نظر تو نہیں آتے لیکن کیا بات۔“ اس کی مسکراہٹ اب بھی چمکی تھی۔ ہر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ ”جو حنظل تک گرائے پر اٹھنے والے کرے وہیروں۔ اس کے بعد بچت پر کسی خواہدورت ایسی کی طرح عمار کا آفس بنا ہوا ہے۔ جو حنظل تک تو ہمیں کوئی نہیں پوچھے گا لیکن جب ہم بچت پر جانے کے لیے بیڑیاں چڑھنے لگیں گے تو ہمیں جو سب آوی گھڑا لے گا“ اس سے ذرا احتیاطی وہ کرات کرتا۔ وہ ہمیں روکے گا کہ نہ اس سے آگے جانے کا مطلب یہی ہو گا کہ ہم عمار کے پاس جا رہے ہیں۔ شاید وہ تمہاری تلاش ہی لے۔ اس سے مت الگ نہ ہو۔ اس کا نام شو کا ہے۔ بیڑا اندر معاش ہے۔“

”تم جس طرح کوئی میں اسی طرح کروں گا۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔ ”لیکن تم نے کسی سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ عمار اس وقت دفتر میں موجود بھی ہے یا نہیں؟“

”پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔“ وہ بولی۔ ”گالی میں قدم رکھتی رہی رہیںشت کا چہرہ دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ عمار دفتر میں دفتر میں موجود ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ رہیںشت اور راستے میں لے والا ہر لحاظ سے تاجرانہ دھند اور مستند نظر آ رہا تھا؟“

”تم ان لوگوں کو بہتر جانتی ہو“ تمہارا مشاہدہ اور دلیل قابلِ اعتبار ہے۔“ میں نے طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

جو حنظل پر پہنچ کر جب ہم بیڑی بیڑیاں چڑھنے کے لیے آگے بڑھے تو چابک کی ایک ستون کی آڑ سے نکل کر ایک شخص ہمارے سامنے آگیا۔ کم از کم مجھے اسے وہ ”شو کا بد معاش“ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ڈزسوٹ میں تھا اور بولگے ہوئے تھا۔ شرٹ بھی صاف ستھری اور سفید تھی۔ حتیٰ کہ اس نے معدہ قسم کا کپڑا بھی لگا رکھا تھا۔

مجھے یہی خوشی ہوئی کہ اب بد معاش بھی خوش لباس ہوتے جا رہے تھے۔ شاید انگریزی عینیں دیکھنے کے تھے لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر شو کا بد معاش جیسا ہی کوئی نام ذہن میں آتا تھا۔ ”چوڑا چٹکا“ کہو در چوڑا تھا جس پر دو تین جگہ ڈھنوں کے نشان تھے۔ موٹی موٹی مونچھوں نے بالائی ہونٹ کو چھپا رکھا تھا۔ آنکھوں میں گویا خون اتر رہا تھا۔ دراز قد اور مضبوط تھا۔ جسم کسری معلوم ہو رہا تھا۔

ہم جب سے ہوٹل میں داخل ہوئے تھے، مقامی رنگ کے نہایت دھڑکاپور قلعین پر چل رہے تھے۔ وال فرمال کارٹ تھا۔ ہمارے قدموں کی ذرا سی آہٹ نہیں ابھری تھی اور اسی طرح بے آواز قدموں سے اچانک وہ ہمارے سامنے آگیا تھا۔

”گالیاں جاری ہیں میڈم؟“ اس نے شمیم کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ اگر شمیم کا خاندان بھی اس کے ساتھ ہو تو اسے بھی فخر آجاتا۔

”اور عورت آئے تو باہری کمرے پہنچتے رہے ہو؟“ خیم نے تصدیق چاہی۔

منظر نے اثبات میں سر ہلایا تو خیم میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دیکھا۔ عورت ہونے کے لئے ناکہ ہوتے ہیں۔“

”بعض جگہوں پر ناقابل طاقی نقصان بھی ہو جاتا ہے۔“ میں نے شجیدگی سے کہا۔

خیم نے آگے بڑھ کر دو سرا دروازہ کھولا اور ہم ایک طویل و عریض کمرے میں پہنچے جہاں عمو حم کے اتر فرزند کی خوشبو بجلی ہوئی تھی۔ یہاں دو دریاوی بدشتی میں ماحول کچھ خراب تھا کہ سالک رہا تھا۔ کمرے کا ایک حصہ نشست کا وہ مشکل تھا دو سری طرف بڑی سی آرامت میز کے عقب میں عمار روٹو لوگ چیز کے پھٹنے سے ٹھک لگائے خیم دراز سی حالت میں ٹبل کوزی رہتی سے اپنے ناخن ہموار کر رہا تھا۔

پہلی نظر میں مجھے اس پر کسی ٹیکو دی کا گمان ابھرا لیکن پھر ٹیکو دی کی طرح اس کے نقوش موٹے موٹے نہیں بلکہ چمکے تھے۔ ایک اور آنے بے نیازی کے اظہار کے لیے اس نے ہماری آمد پر بھی سراٹھا کر نہیں دیکھا۔

خیم ایک لمبے کے لیے میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔ ”خیرت ہے اب۔ بھڑپے بھی ناخن تراشنے لگے۔“

ہم کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک گئے۔ منظر ہمارے عقب میں کھڑا تھا۔ خیم بولی۔ ”عمار امیر خاں ہے ہم کل آجائیں گے۔ کل تک تو تم اس ضروری کام سے فارغ ہو ہی جاؤ گے۔ ہے نا؟“

تب عمار نے ٹبل کوزہ کے میز کی دراز میں رکھا اور نہایت آہستگی سے نظر اٹھائی۔ مجھے دیکھتے ہی اسے گویا حیرت کا شدید جھٹکا لگا لیکن اس کا اندازہ مجھے صرف اس کی آنکھوں سے ہوا۔ اس کی کسی اور حرکت سے بدو عمل کا کوئی خاص اظہار نہیں ہوا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ شرم میں شاید اب ایسے لوگ خاصی تعداد میں پائے جانے لگے تھے جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا مگر وہ مجھے پہچانتے تھے۔

”زبے فیبا!“ وہ کافی تیز سے انداز میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری صاحب ہمارے پاس تشریف لائے ہیں۔ کمال ہے! یہ انہوں نے کیسے ہو گئی؟“ میں نے تھائی ہو خیم پر گہرے۔

”نہیں۔ میں انہیں میں لائی یہ مجھے لائے ہیں۔ میں تو تمام راستے انہیں روکنے کی کوشش کرتی آئی ہوں۔“ خیم بولی۔

”اگر تم انہیں واقعی یہاں آنے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں تو بہت برا کر رہی تھیں۔ چوہدری صاحب خود چل کر کسی کے پاس جائیں! یہ اعزاز ہر کسی کو کہاں حاصل ہوتا ہے!“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے ذرا تامل کیا۔ میرا اس سے ہاتھ ملانے کوئی نہیں چاہا رہا تھا لیکن پھر ملا لی۔ خیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہ جانے کیوں

جو کون نے ہمارا استقبال کیا۔ سامنے ایک خوبصورت ایلیسی ی نظر آ رہی تھی جس میں منظر کی طرز کی عماریں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی شان و شوکت اور منجلی آرائش کا عنصر نمایاں تھا۔ عمار اپنی ابھی خاصی لپٹا رہنے لگی بیٹھا تھا۔

یہاں بھی میں دواڑے پر ایک باوردی مسلح محافظ نظر آیا تھا۔ آنکھوں سے وہ خیم فریبیدہ سا نظر آیا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ حقیقت میں وہ چپیتے کی طرح چوکنا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بھی اس کے خیم فریبیدہ انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے قریب بھی دواڑ میں اکثر کام نصب تھا۔ یقیناً اسے بھی ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔

ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ بہت دھیمی آواز میں خیم سے مخاطب ہوا۔ ”باس آج زیادہ آدمیوں سے ملاقات کے متوہش نہیں ہے۔ کیا ان صاحب کو ساتھ لے جانا ضروری ہے؟“ اس نے آنکھوں سے میری طرف اشارہ کیا۔

”اسی صاحب کا جانا تو اصل میں ضروری ہے۔“ خیم بولی۔ ”میں تو بھی ذرا سجادت کے لیے ساتھ آئی ہوں۔“

اس جملے میں لفظ ”سجادت“ کے استعمال سے میں محفوظ ہونے بغیر نہ رہ سکا۔ خیم کی جرأت اب شاید واپس آ رہی تھی۔ اب تو وہ خزل پر ہی پہنچ گئی تھی۔ غالباً اس نے سوچ لیا تھا کہ جو ہوتا ہے اب اس کے ملنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ چنانچہ اب پریشان ہونے کا کوئی ناکہ نہیں۔

لیکن وہ مسلح گارڈ یقیناً کوئی کھوپڑی کا آوی تھا جیسا کہ عمو اس قبیل کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس نے خیم کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دی اور آنکھیں سیکڑتے ہوئے بولا۔ ”باس کو تو ان کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں۔“

”میں ہی ان کی آمد کی اطلاع ہوں۔ یعنی اطلاع اور یہ صاحب ساتھ ساتھ ہی آئے ہیں۔“ خیم بولی۔

گارڈ نے دُورے انہوں کے سے عالم میں اندر کا دروازہ کھول دیا اور خود بھی ہمارے پیچھے پیچھے اندر آگیا۔ وہ دروازہ کمرے کا نہیں بلکہ دھڑکی نما ایک حصے کا تھا جہاں بدشتی بہت کم تھی۔ خیم وہاں ایک دم رک کر مسلح گارڈ کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔ ”میں نے آج تک کبھی تمہارا نام ہی نہیں سنا تھا۔“

گارڈ کے چہرے پر اچھی سی مسکراہٹ آئی۔ ”میرا نام منظر ہے۔“

”چہرے سے نام منظر نکلتے ہو۔“ خیم نے زیر لب کہا، پھر جلدی سے ذرا بلند آواز میں بولی۔ ”منظر! تم باہری اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے؟“

منظر نے اپنا ہوا سا سر نیچے میں ہلایا۔ ”جب کوئی مرد باس سے ملنے آتا ہے تو میں اندر باس کے پاس رہتا ہوں۔ باس کا یہی حکم ہے۔“

اس کی شخصیت پر باکسر کا گمان گزرتا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ایک باکسر  
 ہی کا ہوتا تھا۔ تاہم اس نے مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی  
 کوشش نہیں کی۔ میں نے بھی ہاتھ ڈھیلا ہی رکھا۔

اس نے بڑے احترام سے جھکے ہوئے مجھے پیچھے کا اشارہ کیا  
 لیکن میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میرے پاس وقت کم ہے سسر  
 میاں رشتہ ایسا صرف ایک چھوٹا سا معاملہ طے کرنے آیا ہوں۔"  
 "اگر شاہ" وہ دونوں ہاتھ میز پر ٹکاتے ہوئے ذرا آگے کو  
 مہجک آیا۔

"تمہارے پاس عظیم اور راضی کے دستخطوں کے ساتھ کوئی  
 اسٹامپ بھی موجود ہے؟ ہم وہ دلائل لینے آئے ہیں۔" میں نے  
 ہوا زبے میں کہا۔

اس نے او اس نفیوں سے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے  
 متاثرانہ سے انداز میں سر ہلایا۔ "بہت بری بات ہے عظیم بیگم!  
 اپنے کاروباری راز اس طرح فاش کرتے پھرنا بہت بری بات ہے۔  
 اور اگر تم چوہدری صاحب کو صہمان کے بجائے سماجی کی حیثیت  
 سے ساتھ لائی ہو تب بھی بہت بری بات ہے۔"

عظیم کے بجائے میں نے ہی جواب دیا۔ "ہم یہاں تم سے کسی  
 بات کے اچھی یا بری ہونے کے بارے میں ٹوٹی لینے نہیں آئے"  
 صرف وہ اسٹامپ بھی لینے آئے ہیں۔"

جس آپریشن سے وہ اٹھا تھا اسی آپریشن سے دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس  
 کی آنکھوں میں ہلکی سرد مری آگئی۔ ہم سوالیوں کی طرح اس کے  
 سامنے کھڑے تھے۔

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا  
 تھا۔ "چوہدری صاحب! آپ اتنی محبت۔ اتنی امانیت اور اتنے  
 جوش و خروش سے عظیم بیگم کے لیے وہ اسٹامپ بھی لینے آئے ہیں  
 تو آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے وہ دوبارہ لاکھ کے قرض کی ادائیگی کا اقرار  
 نامہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"باہ لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے چوہدری صاحب! اچھے بیٹے  
 کاروباری قوی کے لیے تو بہت بڑی رقم ہے۔ اور مجھے یقین ہے  
 کہ آپ جیسے بڑے آدمی کے لیے بھی یہ کچھ ایسی چھوٹی رقم نہیں  
 ہوگی۔" اس کے لیے میں برف زاموں کی سی سرد مری پر قرار دے۔  
 "انسان معاہدے اس لیے کرتا ہے کہ ان کی پاس داری کرے۔  
 قانونی کاغذات اسی لیے تیار کرانے جاتے ہیں، گفت پر دھت اسی  
 لیے کی جاتی ہے کہ کوئی کسی کے حقوق کی خلاف ورزی نہ کرے۔

جہاں خلاف ورزی ہوتی ہے وہاں نقصان ہوتا ہے چوہدری  
 صاحب۔ بھی جانی نقصان، بھی مالی نقصان۔ خلاف ورزی کوئی  
 اچھی بات نہیں ہے۔" وہ گویا ایک سرد مہرہ رنگ کی طرح مجھے  
 سمجھا رہا تھا۔

"بے شک خلاف ورزی بہت بری بات ہے لیکن بے ایمانی

اس سے بھی بری بات ہے۔" میں نے علامت سے کہا "مختصہ میں  
 اس وقت یقین کرنے یا یقین نہیں بننے کے لیے نہیں آیا۔ میں اس  
 بحث میں بھی نہیں پڑوں گا کہ تم نے عظیم اور راجو سے یہ باہ لاکھ  
 ہتھیائے۔ یا اس قرض کی بنیاد پر عظیم کو بلیک میل کرنے کی  
 منصوبہ بندی کس طرح کی تھی۔ میں تو سیدھے طریقے سے اس  
 مسئلے کو نشانے کیا ہوں۔"

میں نے جیب سے چیک بک نکالی، باہ لاکھ کا چیک نکھا اور  
 اٹھ کر میز پر اس کی طرف کھسکا دیا۔ اس نے چیک اٹھا کر دیکھا۔  
 اس کی دونوں ہونٹیں نیم دائروں کی سی صورت میں مسکرائیں۔ پھر  
 نہایت آہستگی سے اس کے مونے مونے ہونٹوں پر مسکراہٹ  
 ابھری۔

پھر خیال انداز میں ایک اٹھنی سے ٹھوڑی کھاتے ہوئے اس  
 نے باری باری مجھے اور عظیم کو دیکھا، جیسے ہر زاویے سے عمارت  
 سرایک کی پتانکس کر رہا ہو۔ پھر مہلاتے ہوئے بولا "چوہدری  
 صاحب! عظیم جی تو ایسی ہے کہ اس کی دلدادہ کے لیے باہ لاکھ  
 خرچ کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہوئی ہے۔ آپ کی  
 راہ و رسم تو بہت اونچے درجے کی عورتوں سے ہے۔ اور ہی اوپر  
 عظیم سے اتنی محبتیں کب پروان چڑھ گئیں کہ ہمیں ہی نہیں  
 چلا؟"

"بات صرف اتنی ہی ہوگی جتنی ضروری ہے۔" میں نے سرد  
 لہجے میں کہا۔ "میں یہاں تمہارے کندے ذہن میں پیدا ہونے  
 والے سوالوں کے جواب دینے نہیں آیا لیکن شاید ان الجھاؤوں  
 میں جسیں رات بھر خیزندہ آئے اس لیے بتانا چلوں کہ اتفاق سے  
 عظیم اور اس کا شوہر دونوں ہی میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم  
 ایک ہی گاؤں کی گلیوں میں کھیلے اور بچے بڑھے ہیں۔ راضی مجھے ظم  
 دکھانے کے لیے اپنے باپ کی دکان سے پیسے چرا کر لایا کرتا تھا آج  
 اگر مجھے باہ لاکھ دے کر اس کی با اس کی بیوی کی کسی حیثیت کے  
 چٹکوں سے جان چڑھائی پڑی ہے تو میرے لیے یہ مرگ سودا نہیں  
 ہے لیکن تم جیسے جانور بھلا ناؤگ جذبات اور احساسات کی ان  
 باریکوں کو کہاں سمجھتے ہوں گے؟ اس لیے ان باتوں کو رہنے دو۔"

اس کے چہرے پر ایک لمبے کے لیے دلچسپی کی لہر ابھری لیکن  
 اپنے لیے حیثیت اور پائوور وغیرہ کے القاب سن کر اس کے چہرے پر  
 سختی سی آگئی۔ اس کا چہرہ یکدم چہرے زشا ہوا دکھائی دینے لگا۔  
 اس نے میرے عتب میں کھڑے ہوئے منظور کی طرف دیکھا۔  
 دوسرے ہی لمحے ریوالتور کی نال بہت سختی سے میری ریڑھ کی ہڈی میں  
 چبھنے لگی۔

"چوہدری صاحب!" میرے عتب سے منظور کی آواز سنائی  
 دی۔ "تجاس سے کوئی اس زبان میں بات کرے تو ہمیں بہت سخت  
 برا لگتا ہے۔ خاص طور پر مجھ سے تو بدواشتی نہیں ہوتا۔ دل  
 چاہتا ہے دونوں گروں میں ایک ایک گولی اتار دوں۔"

”مخار“ تم نے زندگی میں کبھی کسی پر اعتبار کرنا نہیں سیکھا؟“  
میں نے مختار سے پوچھا۔  
”اعتبار کا وہ سرا نام خطروں میں لینا ہے جو بدری صاحب! پیسے کے علاوہ میں ہر چیز میں خطروں میں لینے کے لیے تیار رہتا ہوں۔“ وہ بولا۔ میری طرح اب وہ بھی کوئی نہ بڑے ہوئے منکر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ اس کا حافظہ تھا۔ اب گویا بدری کا ضمیر تھا جو ایک کونے میں پڑا تھا۔

”دو پیسہ جیسا دنیا میں سب سے گھٹیا چیز ہے اور تم اسی کے معاملے میں اتنے بے اعتبار ہو؟“ میں نے اپنے لیے کی مختار پر قرار رکھی۔

”اس قسم کی باتیں ظلوں اور کمائیوں میں اچھی لگتی ہیں جو بدری صاحب! آپ اس معاشرے میں جینے کر روپے پیسے کو سب سے گھٹیا چیز قرار دے رہے ہیں جہاں روپے پیسے کے لیے آپ کو بہنوں کا سودا کرنے والے بھی مل جائیں گے اور وطن کا سودا کرنے والے بھی۔“ وہ زہر لے انداز میں ہنسا۔ ”اس قسم کی بحث میں

میں اتنی تیزی سے گھوما کہ شاید اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا کوئی اتنی تیزی سے بھی گھوم سکتا ہے۔ قیمت تھا کہ میرے اور شیم کے درمیان توڑنا سا فاصلہ تھا۔ پھر بھی میں احتیاطاً اس طرف گھوما تھا جو شیم نہیں تھی ورنہ وہ پلیٹ میں آنکٹی تھی۔ دوسرے ہی لمحے منکر کے حلق سے ہلکی سی گراہ نکلی کیونکہ میں نے اس کی کھائی پر کرانے کا ہاتھ رسید کیا تھا۔

اسے یقیناً کسی سوئیڈ بونیف ”جو بدری صاحب“ سے اتنی چرتی اور اس قسم کی چاپ کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میں نے ہنسنے لگا کہ اس اچانک ضرب سے اس کی انگلی سے زہر نہیں دب گیا تھا۔ ویسے زیادہ امکان یہی تھا کہ زہر دب جائے تو کوئی مختار کو لٹتی یا اس کی میز میں پست ہوئی کیونکہ میں سامنے سے ہٹ چکا تھا لیکن فی الحال میں مختار کو بھی گولی لگتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

منکر اپنی مضروب کھائی کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر دہرا ہوا چکا تھا، رو اور لیچے گیا تھا۔ میں نے ایک لمبے ضائع کئے بغیر وہ اٹھایا۔ میری نظر اب مختار اور منکر دونوں ہی پر تھی۔ مختار نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی اور میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ اس کا ہاتھ کسی دراز کی طرف بھی نہیں بڑھ رہا تھا۔

میں نے منکر کو مخاطب کیا۔ ”میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔ ہتھیار اس وقت تک مت نکالو جب تک اسے استعمال کرنے کا قطعی فیصلہ نہ کر لو۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گھوڑی پر اس کے ہی روالہ کا دست رسید کیا۔ وہ ابھی کھائی کو ہی پکڑے گراہ رہا تھا۔ کھائی کی ہڈی غالباً لوٹ چکی تھی اب گھوڑی بھی جھجک رہی تھی۔ وہ کئے ہوئے شتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ میں نے منکر سے اسے کمرے کے ایک کونے میں بٹھایا، پھر اپنے اور شیم کے لیے کرسیاں منبج کر بیٹھے ہوئے مختار کو مخاطب کیا۔ ”اب ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ بدلی سٹ گواہ جست قسم کے لوگ خواہ خواہ چچ میں دخل دیتے رہتے ہیں۔“

مختار کے چہرے پر ہلکی ہوئی طمانیت اور خود اعتمادی میں توڑی سی کمی ابھی تھی لیکن وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کا اظہار نہ ہونے پائے۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں جھسانے بیٹھا تھا۔ چیک اس کے سامنے رکھا تھا۔

”میں چیک کاٹ چکا ہوں مختار رفیق!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب اسٹامپ پیپر دینے میں تمہاری طرف سے تاخیر کیوں ہے؟“

وہ جیسے کسی خیال سے چٹکا اور سنہلنے ہوئے بولا۔ ”جو بدری صاحب! ہمارے ملک میں چونکہ چیک ڈس آنز ہوتے پر کوئی سزا دینا نہیں ہے اس لیے بعض لوگ بات بات پر چیک کاٹتے رہتے ہیں۔ باہر لاکھ کا معاملہ ہے، میں کانٹہ کے اس بڑے پر کیسے اعتبار کر لوں جسے اس وقت بینک میں بھی پیش کیا جا سکتا۔“

روزنامہ ”امروز“ میں چھپنے والے  
نکاسیہ اور شگفتہ کالموں کا انتخاب

گستاخی معاف

☆ --- مظفر بخاری

قیمت: -/100 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ماگے بھون

اقلیم علیم قیمت: -/300

کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی اور میں اس امتحان میں کامیاب رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اٹل آئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مجھے گھنٹا بھر ٹھوکر رسید کرتا تھا۔ اس نے اسے کوٹے میں بے ہوش ڈال دیا۔ اس کے گارڈ پر بھی کھڑا۔ ایک لمحے کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئے۔ عمار کے قلعے سے خرخرات کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کے مزے کس بل ٹھانے کے لیے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی پھر گریبان سے پکڑ کر اسے کمرہ کیا۔

میرا اندازہ غلط نکلا۔ اس کے کس بل نکلے نہیں تھے۔ اس نے سیدھا ہوتے ہی مجھے ٹھوکر رسید کرنے کی کوشش کی۔ ٹھوکر سے تو میں بچ گیا لیکن اس کے لیے مجھے اس کا گریبان پھوڑنا پڑا۔ گریبان چھوٹنے ہی اس نے بن بناس کی طرح مجھ پر چلا جھٹکا لگائی۔ عام حالات میں وہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن میں نے اسے جو جھٹکا دیا تھا اور اس کی پسلیوں میں جو ٹھوکر رسید کی تھی اس کی وجہ سے اس میں زیادہ دم نہیں رہا تھا۔ وہ فیس میں اندھا ہو کر مجھ پر چھٹا تھا۔ فیس میں اندھے ہونے والے عموماً مجھ سے زیادہ مار کھاتے تھے۔

جس انداز میں وہ مجھ پر چھٹا تھا، میں چاہتا تھا اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر رخ رتا لیکن وہ دو جہات کی بنا پر میں باز رہا۔ ایک تو استثنائی دفعہ قاتلین کی وجہ سے اسے چوٹ کم لگتی، دوسرے بلی جنرل پر ابھی خاصی دھمک سنائی دیتی جو کسی کو تشویش میں مبتلا کر سکتی تھی۔

شیم ایک اور بلی سی چیخ مار کر بالکل ہی کوٹے میں جا گھسی۔ میں نے عمار کو جھٹکا دی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ذرا آگے کو کیا تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کے منہ میں میری نظریہ جانے کس وقت ایک لمحے کے لیے چپک گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلا اٹھرا ٹھہرا تھا جو اس نے نہ جانے کب اور کہاں سے نکالا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ رہو اور اس کی جیب میں نہیں تھا۔ ورنہ وہ رہو اور بھی نکال سکتا تھا۔

بہر حال میری نظریہ چپک مجھے اب بھی ہنگامی پر سکتی تھی۔ اٹھرا کوئی کم خطرناک چیز نہیں تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اسی وقت ہو گیا جب وہ لڑکھڑاتا ہوا کچھ آگے نکل گیا لیکن میرے کوٹ کی آستین ایک جگہ سے کٹ گئی۔ وہ اپنا وار کر گیا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی نود میں صرف آستین ہی کا کچھ حصہ آیا تھا، بازو بچ گیا تھا۔

میں نے آج تک سنا تو تھا کہ کچھ بد معاش اٹھرا سے بھی لڑتے ہیں لیکن کسی کو لڑتے دکھا نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک بد معاش کا تذکرہ سنا تھا جس کے نام کے ساتھ ہی "اٹھرا" کا ہوا تھا۔ وہ "جیدہ اٹھرا" کے نام سے مشہور تھا۔ اصل نام عبد الجید تھا۔ سنا تھا کہ وہ اٹھرا سے لڑائی کے فن میں بادشاہ تھا۔ کئی

ایک دن کا وقت آپ کے پاس شاید ہو میرے پاس بالکل نہیں ہے۔ "بحث تو بہت ہی فضول چیز ہے کیونکہ ہمارے ہاں کوئی آدمی کسی دوسرے کے موقف کا کبھی قائل نہیں ہوتا۔ میرے پاس بحث میں ایکٹو کے لیے تو کیا، اس کام کے لیے بھی وقت نہیں تھا جس کے لیے میں آیا ہوں۔ تم سے پھر کسی وقت ملاقات کا پروگرام تھا لیکن بس اچانک ہی گھوڑی گھوم گئی۔ یہ جو تم نے چپک ڈس آ کر ہونے کی بات کی ہے، تو ہر ایک کو اپنے جیسا ٹھہرا پڑس میں مت سمجھا کرو۔ یہ تو چپک ہے، میں اگر چٹ بھی لگھ کر بھیج دوں تو شاید بیک خیر چھبیں باہر لاکھ دے دے۔ وہ صرف فون پر مجھ سے تصدیق کرے گا کہ چٹ واقعی میں نے ہی بھیجی ہے، تم جیسا کوئی اچکا جیل تو لگھ کر نہیں لے آیا۔"

اس کا ساٹھلا چوہ کچھ اور تاریک ہونا چاہتا تھا۔ یقیناً اس کے جسم میں خون کی گردش بہت تیز ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شیم کی موجودگی کی وجہ سے وہ زیادہ قوی محسوس کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان میاں بیوی پر اس کی زبردست دہشت طاری تھی لیکن اب یہ تاثر دوسرے برہم ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ایسا برگز نہیں چاہتا تھا لیکن میں ایسا ہی چاہتا تھا۔

وہ اس تاثر کو اتنی آسانی سے برباد ہوتے دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ڈر کے سے آثار نمودار ہوئے۔ آنکھوں میں خون سا اترتا ہوا تو پہلے ہی محسوس ہو رہا تھا، اب آنکھیں کچھ اور اتنا ہی ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے میز کے کنارے کو اس طرح پکڑ لیا جیسے وہ ہاتھ نہیں کھینچے ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ میز اگر کسی ذرا بھی نرم چیز سے بنی ہوتی تو چپک جاتی۔ اس کی چوڑی پیشانی پر ایک سوئی سی مس بھرتی ہوئی صاف دکھائی دینے لگی۔

جب وہ بولا تو اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ اس نے گویا اپنے اصل روپ میں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ گویا مجھے آنکھوں اور نیچے سے کل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس عمارت سے زندہ واپس نہیں جانا چاہتے چوہری؟ ایک آدمی کو ڈھیر کر کے تم بچھ رہے ہو کہ تم نے دنیا فتح کر لی؟"

اس کا ہاتھ جس تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا، اس تیزی سے شاید سانپ بھی کسی چیز پر چھن نہ مارتا ہو لیکن دروازہ کھلنے سے پہلے ہی میں کرسی سے اٹھ کر اس کی گردن میں دھج چکا تھا۔ میز پر ہی تھی اور سچ میں خالص تھی مگر میں اسے گردن سے پکڑ کر باہر کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کی کرسی الٹ گئی اور میری اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ شیم بالکل ہی چیخ مار کر کچھ دور جا کھڑی ہوئی۔ میں نے گردن ہی سے پکڑے پکڑے عمار کو اونچا کر دیا تھا۔ اس کی ٹانگیں ہوا میں جھول رہی تھیں۔ وہ ایک دروازہ مضبوط اور نفوس سا شخص تھا۔ اسے اس طرح اٹھا یا میری طاقت کا امتحان تھا۔ شکر ہے مجھ سے اندازے کی

چھڑا لیتا۔ میں نے اس کے عقب میں دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ سامنے مجھے دیوار میں سیف نظر آ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کیش اور ضروری کاغذات اس میں ہی رکھتے ہو گے۔“

”کیش اور کاغذات اس میں ضرور ہیں۔“ وہ ہانہوار سانسوں کے درمیان بولا۔ ”لیکن وہ اسٹامپ پیپر ہیڈ آفس میں ہے۔“

”یہ مت سمجھنا کہ یہ بات سن کر میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں اسی حالت میں تمہارے اس ہوٹل سے تمہارے جیالوں کے سامنے کھینچا ہوا ہیڈ آفس تک بھی لے جاؤں گا۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ بہتر یہی ہے کہ پیچھے اگر یہاں موجود ہے تو میرے حوالے کر دو۔ اگر میں تمہیں ہیڈ آفس لے گیا اور پیچھے وہ نہ ملا تو تمہارے منہ میں ایک بھی دانت باقی نہیں رہے گا۔“

اس نے ایک لمبے سوچا۔ اب ظاہر اسے یقین آچکا تھا کہ میں جو کہوں وہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا سیف کی طرف چل دیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ اسٹامپ پیپر ہیڈ آفس میں موجود تھا۔

”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرو ورنہ تمہیں یہ بھی جان نہیں چل سکے گا کہ تمہارے ساتھ ہوا کیا؟ جس تم اپنے آپ کو عالم بالا پر پاؤ گے۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سیف میں کوئی ہتھیار یا اس کا تھیل بھی موجود ہو سکتا تھا اور وہ اسے استعمال کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ تاہم میں نے اس کے سر پہ جاکر کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اور میرے درمیان خاموشی کا فاصلہ تھا۔ میں میری کے قریب کھڑا رہا تاکہ ضرورت پڑنے پر فوری طور پر اس کی آڑ میں ہو سکوں۔ کراہت بڑا تھا اسی لیے اتنی

آدھیں کی گردن اڑا چکا تھا لیکن ایک لڑائی میں کسی کا صرف ایک ٹکڑا کھا کر مر گیا تھا۔ اخبار میں خبر بھی تھی۔

مگر یہ ذرا نیچے درجے کے۔۔۔ کچھ اور طرح کے بد معاشوں کی باتیں تھیں۔ سینہاڑوں کے جہم میں کٹلوں کی بلیک پر۔۔۔ ٹک و آریک گلیوں میں پگنی شراب کی بوتلیوں اور جوئے کے اڈوں پر اس طرح کی لڑائی کا تصور کیا جاسکتا تھا لیکن اس مہم ہوٹل میں اس شاندار آفس میں میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ایک کوڑھی اور سوئڈ ہونڈ شخص مجھ پر استرا نکال کر جھپٹ پڑے گا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ بد معاش قاتلین اس قسم کی بد معاشی!

اس معاملے میں خلیو مول میں لیا جاسکتا تھا۔ میں نے سوچا۔ کوئی بھید نہیں۔ وہ آستریے سے لڑنے کے معاملے میں جبرے آستریے ہی کی طرح باہر نکلے ہو اور اسی لیے اس نے اس آڑے وقت میں یہ ہتھیار نکالا ہو۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا کچھ آگے نکل گیا تھا۔ میں نے مٹینی انداز میں اس کی کمر لٹا دیکر کمر لٹاتے ٹھیک ٹھاک ہی پر گئی۔ وہ دروغ کی سی حالت میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کا سر پیٹھ غیر معمولی طور پر مضبوط تھا۔ دیوار سے اس کا سر ٹکرانے کی کچھ ایسی ہی آواز آئی تھی جیسے لوہے کا بڑا سا گولہ ٹکرایا ہو۔

وہ آدھے منہ گرا۔ میں نے ٹپک کر اس کی کٹائی جوئے کے نیچے دیالی۔ میں نے پاؤں پر وزن اتار دیا تاکہ استرا اس کی گرفت سے نکل گیا۔ میں نے پہلے اسے اٹھا کر بند کر کے جیب میں ڈالا۔

میری دوسری جیب میں منگور کارڈیالوز موجود تھا۔ پھر میں نے عقب سے اس کی گردن پکڑ کے اسے اٹھایا۔ اس کے حواس قفل تھے۔ اب اس کے سر میں نکل چکے تھے۔ میں نے اسے کمر بان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس

اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرے لیے یہ خاصی حیرت کی بات تھی۔ میں نے اسے تھمیت کر کرسی کے بجائے اس کی میز پر بٹھا دیا اور اسے تھوڑا سا جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”اسٹامپ پیپر ہڈ لاکھ کی آرائش کا ہے اور تمہیں ہڈ لاکھ کا چیک مل گیا ہے۔ ٹھیک ہے؟“

اس نے اذیت میں سر ہلایا۔ میں نے اسے مزید ایک لپکا سا ہٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں بے ایمانی والی تو کوئی بات نہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اس کا کمر بان چھوڑ دیا۔ اس کی قمیص کا اکھا حصہ اور ٹانگی ٹانگی تھی کوٹ بظلوں پر سے پھٹ چکا تھا۔ میں نے طاقت سے کہا۔ ”چلو۔ اب اسٹامپ پیپر نکالو۔“

”وہ یہاں نہیں ہے۔“ وہ ہانچتے ہوئے بولا۔  
”کیا تمہیں ابھی کچھ اور ذکر کرتے ہو؟“ میں نے دوبارہ اس کا کمر بان پکڑ لیا۔ اس میں اتنی بھی سخت نہیں تھی کہ کمر بان

### رومانی ناول

|                  |                    |       |
|------------------|--------------------|-------|
| لڑکی اس گلی کی   | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 100/- |
| اس جلتے جہاں میں | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 100/- |
| خدا کہاں ہے      | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |
| جلتے بھجتے لوگ   | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |
| سیرا             | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |
| روتے کنول        | اسلم راہی ایم۔ اے۔ | 75/-  |



ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئی خیم کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن سچی بات ہے کہ اس سے تمہارے بارے میں اتنا کچھ سننے کے بعد مجھے تم سے مل کر مایوسی ہوئی ہے۔ اچھی خاص مایوسی۔"

"تمہاری مایوسی جلد دور ہو جائے گی چہرہ در! اس کی آواز سانپ کی پیچکار سے مشابہ تھی۔ "ہمت منکا پڑے گا تمہیں اس عورت کے پکڑ میں الجھنا۔"

"کاش تمہارے ذہن سے یہ پکڑ نکل سکے کہ میں اس عورت کے پکڑ میں الجھا ہوا ہوں۔" میں نے لعظری سانس لے کر کہا۔ "خیر، اب تم سے تعارف ہو گیا ہے، یہ بات تو تو ہی ہی رہیں گی۔ فی الحال میں تمہیں ایک تکلیف اور دوں گا۔ ذرا ہاتھ دوں میں چلے جاؤ۔ شاید اس وقت تمہیں ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہو۔"

اس نے خوشخوار نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے ریو اور کو حرکت دی تو وہ باہل خواست ہاتھ دوں کی طرف چل دیا لیکن دوواڑے پر پہنچ کر رک گیا۔ میں نے اس کی طرف دو قدم بڑھائے تو وہ دوواڑہ کھول کر اندر چلا گیا۔ میں نے یہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ دوواڑے پر باہر کی طرف بھی لوٹ موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ اندر پہنچنے ہی کوئی شرارت اس کے ذہن میں آئی، میں نے لپک کر لوٹ چڑھا دیا۔

پھر میں نے بے ہوش پڑے ہوئے منظور کو بلا کر دیکھا۔ اس کے جلدی ہوش میں آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنا طیلہ ذرا درست کیا اور خیم کو ساتھ چلے گا اشارہ کر کے کمرے سے نکل آیا۔ دوواڑہ میں نے نہایت احتیاط اور تسکلی سے بند کیا۔

چلی منزل پر پہنچنے تک میں نے ہونٹوں پر نہایت مہذبانہ مسکراہٹ بھی سما لی، مگر اب ہم عمارتوں سے نہایت خوشگوار ملاقات کر کے واپس آ رہے تھے لیکن خیم کا خوف ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ راستے میں وہ سرگوشی میں بولی۔ "تم نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی کر دی۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔"

"اپنے حساب سے تو میں نے کم کی ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھے تو میں کو تو میرا قبرستان بچانے کو جی چاہتا ہے جو مختلف کونوں کھدوؤں میں زمین کے سینے پر خدا اپنے بیٹے رہتے ہیں۔"

"لیکن وہ ابھی زندہ ہے۔ اور تم ہر لمحے تو ہماری حفاظت کے لیے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔" وہ بولی۔

"ہر لمحے اپنے بندوں کی حفاظت کرنا اور والے کا کام ہے۔" میں نے ہمت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا یہ ویسا شانہ منکار مجھے اطمینان نہیں دے سکتا۔"

"بد نصیبی ہے تمہاری۔" میں نے کہا۔ "میں اس طرح خوف سے کانپنے والوں کو اپنے دوستوں میں شمار نہیں کر سکتا۔ اگر تم نے

دھینگا شتی کے باوجود سامان کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔ خیم میرے قریب آگئی ہوئی اور سرگوشی میں بولی۔ "آئی! مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنے غرور اور خطرناک آدمی ہو۔"

"میرے بارے میں تمہاری معلومات میں شاید گاہے بہ گاہے اضافہ ہوتا رہے۔" میں نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ پھر اضافہ ہوا کہ ایک بار اور چڑھا کر کیا۔ "میرے ہاتھ میں ریو اور ہے۔ اگر تجوری سے مجھے کانٹے کے علاوہ کچھ اور باہر آنا دکھائی دے تو اس کے ساتھ ہی تمہارا بیچا بھی کھو پڑی سے باہر آجائے گا۔ پھر ذرا ایک طرف کہت کر نکالنا تاکہ میں تمہارے ہاتھ پر نظر نہ کر سکوں۔"

اس نے سیف میں چالی لگائی پھر ذرا نکل کھڑا کر فیر لگائے۔ تجوری کھلی تو سامنے ہی مجھے ایک خانے میں، بہت سی گڈیاں بھی دکھائی دیں جو قیدی تھیں۔ اس نے دوسری چالی لگا کر نیچے کا ایک چھوٹا خانہ کھولا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اسٹامپ پیپر کسی ناکل میں لگا رکھا ہو گا لیکن وہ دہلی کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔ عمار میری ہدایت کے عین مطابق عمارت انداز میں اسے نکال کر میز کی طرف لوٹ آیا۔ پیپر پر ربرک چڑھا ہوا تھا۔

اس نے کانٹہ کا دھول یوں میری طرف بڑھایا جیسے مجھے کسی گمن سے شوٹ کر رہا ہو۔ ظاہر ہے اس وقت اس کی دلی خواہش تو یہی تھی۔ لاشعوری سے انداز میں وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

میرے ہاتھ میں منظور والا ریو اور تھا۔ دوسرا ہاتھ جیب میں تھا۔ میں نے خیم کو اشارہ کیا۔ اس نے لرزے ہاتھ سے دھول قیام لیا۔

"اسے کھول کر دیکھ لو، یہی تمہارا مطلوبہ اسٹامپ پیپر ہے نا؟" میں نے کہا۔ خیم نے پیپر کھول کر دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹ خشک نظر آ رہے تھے۔ شاید اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"پرس میں رکھ لو اسے۔" میں نے اسے ہدایت کی۔ اس نے قدرے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا پرس کچھ دور قالین پر پڑا تھا۔ اس نے لپک کر اسے اٹھایا اور پیپر اس میں رکھ لیا۔ وہ ابھی تک بدحواس ہی تھی جبکہ عمار کچھ سنبھل چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹھہراؤ اور خود اعتمادی واپس آ چکی تھی۔

وہ ایک خشک میری طرف دیکھتے ہوئے سر ہلے میں بولا۔ "یہ تم نے خیم کے ساتھ دوستی نہیں بھائی چہرہ در! دوستی کی ہے اس کے ساتھ۔ سچی ہی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے تم نے بازوؤں کی حفاظت اور لانے میں مہارت ہر وقت ہر جگہ کام نہیں آتی۔ خیمیں شاید خیم نے میرے بارے میں صحیح طرح بتایا نہیں۔"

"اس نے تو مت ہی بڑھا چکا کہ بتایا تھا۔ دیکھ نہیں رہے یہ تم سے کتنی مرعوب ہے۔ ابھی تک اس کے حواس ٹھکانے نہیں

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ خفیر سا ہو گیا۔ اس کا ذہن ایک لمحے کی تاخیر سے اس نکتے کو سمجھ سکا تھا کہ منظور کا رپو الور میرے پاس موجود ہونے کا مطلب کیا تھا۔

اس نے تیزی سے رپو الور سیدھا کیا اور ڈرنگر دبا دیا۔ اگر اس میں کوئی ہوتی تو یقیناً میرے سینے میں سوراخ ہو گیا ہوتا لیکن میں اسے اس حق میں تھا کہ لوڈز رپو الور اس کے ہاتھ میں رہے نہ تھے۔

اس نے رپو الور ایک طرف پھینک دیا اور جب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے بائیں جیب میں موجود طین ہٹل کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں چند! اس قسم کی کوئی حرکت نہیں چلے گی۔ ہم تو پرسکون ماحول میں بات چیت کرنے والے مذہب لوگ ہیں۔“

میری جیب سے ہٹل کی نوک اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس کا جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک چکا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت جو تاثرات تھے ان کی وضاحت بہت مشکل تھی۔ ان میں جیت بھی تھی بے چینی بھی مجھے کی شدت سے نہ جانے کیا کہہ کر گرنے کی خواہش بھی تھی اور مجبوری دے بھی تھی۔

میں نے دائیں جیب سے بخار رقیق کا سٹرا بھی نکال کر اس کی طرف پھیر دیا۔ بلیہ بخار کو دے دیا۔ یہ بھی غلطی سے میرے پاس آ گیا تھا۔ اس سے کہنا ”اکیلا آگیا“ اچھا نہیں لگتا۔ باقی اوزار بھی خریدنے والے اور ایک صندوق بھی تھیں رکھ کر بیچ ہی سچ لوگوں کے

مزید اس طرح کی بزدلانہ باتیں کہیں تو میں نہیں دہاؤں اور اسی کے کمرے میں چھوڑ آؤں گا۔ تم اسٹامپ بھی اسے دہاؤں گے نہ۔ میں اپنا چیک بھی دہاؤں نہیں لوں گا۔ تم اس کے پیروں میں گر جانا اور ردود کر فرما دیتا۔ ”میرے آقا! مجھے معاف کر دیجئے وہ بد بخت اور بد معاش چوہدری خواہ خواہ میری حمایت پر کمر بستہ ہو گیا تھا۔ میں نے تو یہی تھی اسے وقت گزاری کے لیے اپنی داستان غم سنا لی تھی۔“ پھر شاید وہ باہر لاکھ کے عوض اپنی اور منظور کی پٹائی کو بھول جائے اور تمہیں معاف کر دے۔ یوں تم بھی خوشی زندگی بسر کرنے لگو۔ اس المیہ گمانی کا انجام طریہ ہو جائے، مارواڑ کا سین بیس ختم ہو جائے۔“

”بہت کشور ہو تم۔“ اس نے غلطی سے میری طرف دیکھا۔ ”مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنے بد معاش ہو گئے ہو۔“

”مجھے بار بار بد معاش کہہ کر میری توہین مت کرو۔ میں ایک انتہائی شریف آدمی ہوں لیکن نہایت مضبوط قسم کا شریف آدمی۔ زیادہ تر شریف آدمیوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ بے چارے کمزور ہوتے ہیں اس لیے کسی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے مجبوراً شریف ہیں۔ حالانکہ انہی میں سے کوئی بھی ”تنگ آمد چنگ آمد“ کے صداقت پر مبنی بد معاشی پر اتر آتا ہے تو بڑے بڑے بد معاشوں کے چنگے چمڑا دیتا ہے۔“

اس دوران ہم چلی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ شوا کا ایک بار پھر کسی بد معاش کی طرح ہمارے سامنے آ گیا۔ اس نے میرا سین ہٹل مجھے دہاؤں کہتے ہوئے کہا۔ ”نوخت کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“

اس قسم کے بد معاشی مندرجہ الفاظ میں بھی کہہ سکتے ہیں تو جیہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی خودداری پر غراؤ میں ڈالنا چلا جاتا ہے۔ تاہم میں نے نہایت خوش خلقی سے رانت نکالنے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔“

میں نے شین ہٹل کوٹ کی باہر والی بائیں جیب میں ڈال لیا۔ جیب کے اندر اب ہٹل کا رخ اسی کی طرف تھا اور میں بائیں ہاتھ سے بھی ہر قسم کے حالات میں ایسی عمدہ نشانہ لگا سکتا تھا جتنا دائیں ہاتھ سے۔

ہم بیڑیوں کی طرف چل دیے۔ جب بیڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی تو میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ ”تم بیڑیاں اتنی دھن دہاؤں مت آگے۔“

اس کے بعد میں نے دیکھ اس طرح چوٹنے کی اداکاری کی جیسے مجھے اچانک کوئی بات یاد آئی ہو اور میں دہاؤں شوکے کی طرف پلٹ پڑا۔ اس کے سامنے پہنچ کر میں نے دائیں جیب سے منظور کا پستول نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یار! یہ ذرا منظور کو پہنچا دینا، غلطی سے میرے پاس رہ گیا تھا۔“

اس نے اسٹرا کی سے انداز میں ہاتھ بڑھا کر پستول لے لیا

محروا سرا رک کی ایک روز گھنٹے گھڑی کر دینے والی داستان

حبیب

انوار صدیقی کے قلم سے

5 حصوں میں مکمل = 200 روپے



اردو بازار لاہور

اعتیاداً جیسے نظر رکھوں گا۔

وہ نروس تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شراب ڈرامہ مکہ نہ کرے اور گاڑی کہیں مارنی نہ دے لیکن گھبراہٹ نے اس پر عجیب سی اثرات مرتب کیے۔ اس نے طوقانی انداز میں گاڑی چلائی اور چند منٹ بعد ہی گاڑی اس کے چنگے کے پورچ میں کھڑی تھی۔

”یہ کیا؟“ میں نے کہا۔ ”تم نے تو مجھے میرے آفس پہنچانے کے لیے لفٹ دی تھی۔“

”چلے جانا آفس۔ مرے کیوں جا رہے ہو۔“ وہ گویا جل کر بولی۔ ”اب وہاں کون رہ گیا ہوگا۔ لڑکیاں بھی اپنے گھروں کو جا چکی ہوں گی۔“

”لو کیوں کی کس کہنت کو فکر ہے۔“ میں نے لفٹری سانس لے کر کہا۔ ”مجھے تو اپنی گاڑی لینی تھی۔ وہ میری جدائی میں اداس ہو گئی ہوگی۔“

”لے لیا گاڑی بھی۔ تمہاری اپنی بلڈنگ کی پارکنگ لائٹ ہے۔ تمہارے اپنے چوکیدار ہیں، کوئی اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ تمہاری گاڑی کو۔“ وہ بولی۔

گاڑی سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا، پورچ میں آگے راہو کی گاڑی کھڑی تھی۔ عظیم گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلے گئے سے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”دیکھ لو۔ میں اپنے اسٹبل میں چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ وہاں بھی آگیا۔ اب اسے اپنی شام کی سرگرمیوں کے لیے لے لکنا ہوگا۔ تیار ہونے لیا ہوگا۔“

میں وہیں کھڑا رہا تو وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے اندر لے جانے کے لیے کہنے لگی۔ ”خدا کے لیے اب ابھی جاؤ اندر۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں گی، جہاں تم کو گے دم شگ کیوں ہوا ہے تمہارا۔ اچھا ہی ہے، اس وقت راہو وہیں آگیا ہے۔ تمہارے سامنے ذرا سے بھی حالات سے آگاہی ہو جائے گی۔“

”چھاپا میڈم اچھے۔ اندر چلے ہیں۔“ میں نے لفٹری سانس لے کر گھر کا اہتمام کرنے کے لیے گئے۔ ”انسان دوستوں کے معاملات میں ناگ اڑاتا ہے تو پھر ناگ بہت دور تک چلی جاتی ہے۔“ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

”تم نے تو اس کی ناگ اڑائی ہے کہ مجھے اپنی اور راہو کی ناگوں کی فکر پڑ گئی ہے۔“ وہ بولی۔ ”آہم اس کی آنکھیں تھاری تھیں کہ اب وہ اتنی خوفزدہ نہیں تھی جتنی کچھ دیر پہلے نظر آ رہی تھی۔“

وہ مجھے سیدھی اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ راہو واقعی ہاتھ روپ پٹنے ہاتھ روم سے نکل رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن مجھے اس کے انداز میں کچھ شکی کی کچھ کی محسوس ہوئی۔ عظیم نے مجھے کاؤچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ راہو ڈورنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر ڈرامے سے ہال شگ کرتے ہوئے عظیم سے مخاطب ہوا۔ ”تم تو افضل کو اس کے آفس چھوڑنے لگی تھیں۔ ابھی تک پہنچ نہیں سکیں وہیں؟“

دردانے لگا کر پوچھ لیا کہ کسی کو شیو تو نہیں بنانی یا بال تو نہیں کٹوانے؟ ہارت نامہ یہ کام اچھا ہے گا۔“

اس نے استہزا لینے کے لیے تیزی سے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بڑھ لیا کہ وہ استہزا لے کر اسے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے میں نے استہزا اسی طرف پھینک دیا جو حد اس نے غلطی اور پھینکا تھا۔ میں نے سوچا، کوئی بید نہیں کہ وہ بھی اپنے سر پرست عمار کی طرح آستری کے استعمال میں استاد ہو۔ اور کئی بات یہ تھی کہ میں اسے کم از کم اس وقت گولی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ شین ہٹل کی مال میں نے صرف دھمکانے کے لیے اس کی طرف کی ہوئی تھی۔

استہزا لینے کے لیے وہ میرے قریب آچکا تھا اور اتنے قریب آکر وہ واؤ کیلئے سے باز نہ رہ سکا۔ اس نے میری گردن اپنے ہاتھ میں چڑے ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کا ارادہ غالباً میری گردن اپنے ہاتھ کے آہنی چنگے میں جکڑ کر ایک طرف کو گھومتے ہوئے مجھے ہی اپنی ذمہ داری بنانے کا تھا۔

وہ اپنی جگہ بڑا پختہ خال اور بد معاش سی لیکن شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ ان معاملات میں وہ میرے سامنے بچے تھا۔ میں نے گردن پچھانے ہوئے اور ایک طرف کو پھرتے ہوئے عظیم ہٹل جیب سے نکال کر اس کا رستہ صرف ایک ہی بار اس کی کپٹی پر ریسر کیا اور وہ دھپ سے اوڑھے منہ وہیں گر پڑا۔

میں نے شین ہٹل جیب میں رکھ لیا اور ہاتھ جھاڑ کر اطمینان سے بیڑیوں کی طرف چل رہا۔ عظیم یوں تو اتنی ڈرپوک نظر آ رہی تھی لیکن اس وقت اس نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ وہ بیڑیوں سے اترتی نہیں تھی بلکہ بیڑیوں کی دیوار کی اوٹ سے سر نکال کر سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم مجھے پہنچنے تک راستے میں لٹنے والے ہر شخص کو پھٹی پھٹی لٹاتے چلے جاؤ گے؟“

”میرے پاس اب اتنی بھی فالو اڑتی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تو صرف اسی کو لٹاتا ہوں جو مجھے لٹانے کی فکر میں ہوتا ہے۔“

باتی تھیں منزلوں پر بھی ہیں اسی طرح صلح کا ڈالٹ کھڑے۔ لے۔ ان بے جا دلوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کا بگ پاس اوپر ہاتھ روم میں بند تھا۔ ہم دوسری بیٹھنے کے سامنے سے گزرے تو ریلنگ پہنچیں قسم کے استقبالیہ کلرک نے ایک بار پھر بغور ہمارا جائزہ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب ہم لائی کا دروازہ کھول کر باہر جا رہے تھے تو اس کا ہاتھ انٹر کام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ عمار کو جلد ہی مدد میرا آجائے گی اور اسے ہاتھ روم سے نکال لیا جائے گا۔

باہر آکر میں نے عظیم سے کہا۔ ”اب گاڑی تم ہی چلاؤ۔ میں

کیا ہوا؟ خیریت تو رہی؟ کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟

”جھگڑا؟“ خیم استہزائیہ انداز میں ہنسی اور پھر فحشی سی چلی گئی۔ مجھے اس کو پہننے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس کے اعصاب پر سے عکار ریش نامی ”بہوت“ کا خوف دور ہو رہا تھا۔ پھر وہ بیان زدہ سے مجھے میں نہایت تیزی سے راز کو سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

راجہ ڈرنک ٹیکل کے اسٹول پر بیٹھ گیا جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو۔ بات ختم کر کے خیم اسٹامپ پیپر کا مدلل اس کے سامنے بلند کرتے ہوئے بولی۔ ”اور یہ راہ وہ اسٹامپ پیپر۔“  
راجہ حوک نکل کر بولا۔ ”یار افضل، تم نے ہمیں مروانے کا پورا پورا بندوبست کر دیا ہے۔“

میں نے اسے وہی لہجہ دیا جو میں اس سے پہلے خیم کو دے چکا تھا، پھر اسے کافی نقل و نقل دی جس سے اس کی حالت کچھ سنبھلی۔ خیم نے اس سے مشورہ طلب انداز میں پوچھا۔ ”اب اس اسٹامپ پیپر کو کہاں رکھنا ہے؟“

اس کا جواب راجہ کے بجائے میں نے دیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پیچہ لیتے ہوئے کہا۔ ”احتوا! اب اسے سنبھال کر رکھنے کی ضرورت نہیں۔“

پتائی پر فریج کر ٹل کی بڑی سی ایٹل رُسے رکھی تھی۔ لائٹز اور سکرینز کا ڈیا بھی قریب ہی رکھا تھا۔ میں نے لائٹز اٹھایا اور پیچہ کو شعلہ دکھا دیا۔ وہ ابھی طرح آگ پکڑ چکا تو میں نے اسے ایٹل رُسے میں ڈال دیا۔

”تم نے کیا کیا؟“ خیم نے حیرت سے پوچھا۔ راجہ بھی پوچھی پوچھی آنکھوں سے ایٹل رُسے میں دم توڑتے ہوئے شعلہ کو دیکھ رہا تھا۔

”ہمیشہ تھا کہ تم جیسے ہونٹوں کو عکار دو چار گیارہ بجائیاں دے کر یہ کاغذ جھین کر نہ لے جاؤ اور جو پسند آئیں انہیں تمہاری گردنوں سے نکالا ہے۔ دو دو بارہ گردنوں میں نہ بڑ جائے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”اس لیے میں نے قصہ ہی ختم کر دیا ہے نہ کاغذ ہو گا نہ وہ تم سے چھین سکے گا۔“

”جو کرنا اب ہم عکار کے بجائے تمہارے مقروض ہو گئے؟“ راجہ طویل سانس لے کر بولا۔

”لیکن میں تم سے کبھی تقاضا نہیں کروں گا۔ جنہیں خودی اگر بوجھ محسوس ہو اور تمہاری پٹی کچی خودداری جنہیں تنگ کرے تو آسمان قطعوں میں داہیں کرتے رہتا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔“

”یاب! آج رات تو ہمیں برا ڈور لگے گا۔“ راجہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”آج رات تم آواز آمد گردی پر نہیں جاؤ گے۔“ خیم نے کہا۔ اسے حکم سنایا۔ ”میں اکیلی گھر نہیں رہوں گی۔ تم جاؤ گے تو میں

اس نے سرسری لمبے میں یہ بات کی تھی لیکن خیم نے فوراً چٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے نظروں لمبے میں بولی۔ ”اوہ۔۔۔ خدا کا شکر ہے تمہارے لمبے میں بھی تنگ اور رقابت کی رشت تو محسوس ہوئی۔ میں تو سچی تھی، تم اس صلاحیت سے ہی محروم ہو۔“

وہ ہم دونوں سے نظر اٹھا رہا تھا۔ آئینے میں ہمیں دیکھ رہا تھا۔ کھوکھلے سے انداز میں ہنس کر بولا۔ ”تنگ اور رقابت؟“ نہیں! نہیں! تمہارا خیال درست ہی ہے۔ میں نے یہ سوچ پالایا ہی نہیں۔ میں نے تو ایک سیدھا سا سوال کیا تھا، تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔“

خیم ایک ادائے بے نیازی سے اپنے بال پھیلا کر بیڈ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔ ”دراصل آفس جانے کے بجائے اتنی نے مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دے دی جو میں نے قبول کر لی۔ وہاں پہنچ کر اتنی لگنے لگے، پل میں تھیں اپنا بیڈ روم دکھاتا ہوں۔ میں نے سوچا، پل ایک بڑے قوی کا بیڈ روم دیکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے یہ موقع ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

اس نے تھکے تھکے انداز میں ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور ایک لمبے کے صبر آزمادہ کے بعد بولی۔ ”بیڈ روم صحیح معنوں میں بیڈ روم تھا۔ وہاں کا ماحول نہایت خوبانہ تھا۔ اوپر سے اتنی نے خوبانہ کی باتیں شروع کر دیں۔ مجھے اپنی سندھ کچھ ہی نہیں رہی۔ بس۔۔۔ کیا تاؤں۔۔۔ توج کی شام ایک یادگار شام تھی۔“

راجہ کی نظر پچا کر اس نے مجھے آنکھ ماری۔ جس لمحے میں اور جس اداسے اس نے یہ سب کچھ کہا، میرے اعصاب میں جوشیلاں سی رہ گئیں۔ میں نے قدرے کھینچے انداز میں راجہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور ڈراڈنگ پر ہلکا کر ہوئے سے آلیاں بجاتے ہوئے بولا۔ ”بہت خوب! بہت اچھا! سحر نامہ تھا۔ ایسی باتیں کہنے میں تمہارا جواب نہیں۔“

اس نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے قہقے اور اس کے لمبے کا کھوکھلا بننا میرا تھا کہ اندر کہیں نکل ضرور تھی۔ وہ چاہے کتنا ہی خود غرض، کتنا ہی لائق اور کتنا ہی اپنی دنیا میں مگن نظر آئے کی کوشش کرتا تھا لیکن بہر حال اس عورت کا شہر تھا۔ مجھے اس پر ترس سا آیا۔

میں نے بے آواز بلند کہا۔ ”راجہ! تمہاری بیوی تو نہ جانے کب تک بکواس کرتی رہے۔ پھر ہے میں جنہیں اصل بات بتا دوں۔ ہم جب اصل میں سے روانہ ہوئے تو تمہارے اسی ویریدہ مہمان عکار ریش کا تھک جاتی تھا اور کچھ زیادہ ہی دیر جاری رہا۔ خیم نے اس کے بارے میں چند باتیں اور بتائیں۔ میں اپنے اشتیاق پر قابو نہ رکھ سکا اور اسی خیم کو ساتھ لے کر اس سے ملنے جا پھلا۔“

راجہ بڑبڑا کر بلند بالوں کا ریش اس کے ہاتھ سے کر گیا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ”تم عکار کے ہاں چلے گئے تھے؟ پھر

بھی تمہارے ساتھ جاؤ گی۔“  
 ”اے ڈاؤن کی ضرورت نہیں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔  
 ”تمہارا چرکدار کیا آؤ گی؟“

”ہمیں۔“ ٹھیک سی ہے۔ جیسے وہ آتی ہے چرکدار ہوتے ہیں۔  
 ہر حال۔۔۔ غلطو نظر آنے پر جان ڈارے کا، اے مجھے یقین ہے۔“  
 راجوڑا۔

”میں ٹھیک ہے۔ وہ آؤ گی میں اپنے بھیج دیتا ہوں۔ وہ چند دن  
 یہاں حفاظت کے لیے موجود رہیں گے، جب تک تمہارا خوف دور  
 نہیں ہو جاتا۔ ان کی موجودگی میں تمہیں قطعا خوفزدہ ہونے کی  
 ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا اور انہی کے اس سے فون کر کے اپنے  
 وہ آؤ میں کو طلب کر لیا۔ آہم ان کے آنے سے پہلے ہی میں ان  
 کے ہاں سے رخصت ہو لیا۔ شیم سی مجھے آفس تک چھوڑنے آئی۔  
 آفس بند ہو چکا تھا۔ میں نے پارکنگ سٹاٹس اپنی گاڑی نکالی۔  
 شیم اپنی گاڑی میں مردس روڈ پر ہی موجود تھی۔ میں نے  
 گاڑی اس کے برابر روکی تو وہ کمزری سے سر نکال کر بولی۔ ”تمہاری فح  
 خبر لیتے رہا۔ وہ آؤ گی تمہاری حفاظت کے لیے تعینات کر کے بے فکر  
 نہ ہو جانا۔“

”فکر مت کرو، ضرورت پڑی تو تمہارے لیے دس میں ہزار  
 گوبلیوں کی فوج بھرتی کر لوں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”میرے آفس اور گھر دونوں جگہ کا ڈاکٹر تک غیر تمہارے پاس  
 موجود ہے۔ جب بھی ضرورت محسوس کرو مجھے فون کرنا۔ میں  
 آؤ گی اور طوقان بین کر بائیں اسی طرح تمہاری مدد کے لیے آن  
 پہنچوں گا جس طرح میں ہمیرو ہیروئن کی پکار سن کر پہنچتا ہے۔“  
 ”ہمیرو ہیرو جیسے تمہارے نصیب کمال!“ اس نے ہنسنی  
 سانس لے کر کہا اور میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا  
 دی۔

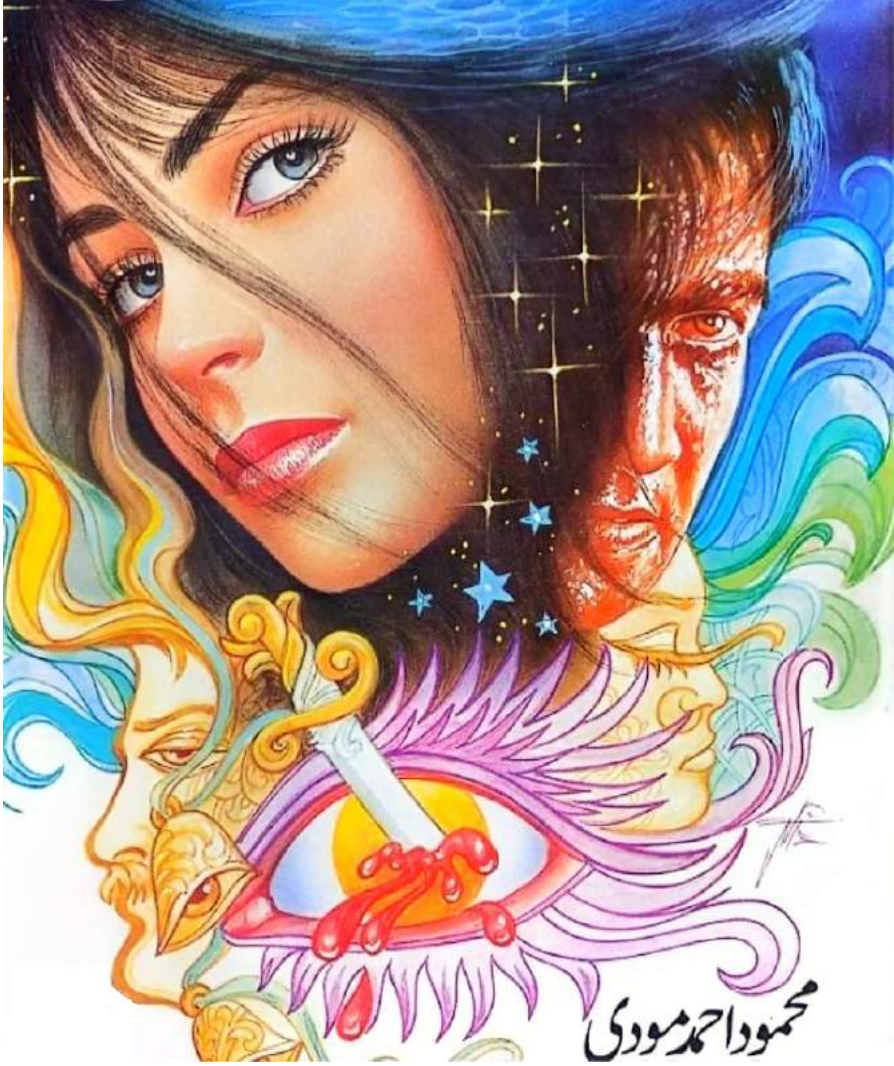
گھر آکر نامزدہم ہونے کے بعد میں ایک بار پھر حفیظ احمد  
 صاحب کے بارے میں نامزدہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لیے  
 فون پر مصروف ہو گیا۔ پتا چلا کہ اب وہ وانا پہنچ چکے تھے اور اعلیٰ  
 حکومتی عہدید اعلیٰ کے علاوہ کوئی اتنا سے رابطہ قائم نہیں کر سکا  
 تھا۔ مجھے بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار تھا۔ ریڈ واٹ کے  
 سلسلے میں بات کرنے کے لیے میں ان کے ساتھ ایک میٹنگ رکھنا  
 چاہتا تھا۔ اونیچے حکومتی مطلق میں میرے ٹاسکوں میں سب سے  
 زیادہ کام کے آؤ گی وہی تھے۔ کسی اور سے بات کرنے کو میرا دل  
 نہیں مانتا تھا۔ خصوصاً جب سے میں نے بلیک باکس سے برآمد  
 ہونے والی خبرت دیکھی تھی تب سے تو میرا اعتبار ہی اٹھ گیا تھا۔  
 کچھ ہی عرصے میں تھا کہ کس گھگھے میں کس عہدے پر ان کا تجربہ بڑھا ہوا۔  
 اور میں ریڈ واٹ کے بارے میں حکومت سے بات کر کے گوا ریڈ  
 واٹ والوں کی ہدایت کی خلاف ورزی کرنے جا رہا تھا۔ صرف میں

”یہ رونا دھنا بند کرو اور فوراً میرے ہاں پہنچو۔“ میں نے  
 سخت لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں میٹ پر ہی ملوں گا۔ باقی باتیں  
 راستے میں ہوں گی۔“ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

زندگی کے آؤ مجھے نیچے راستے ٹوکنا۔ ایک سے سرگرم  
 مسافر کا سرگرم ان ابھی جاری ہے، باقی واقعات  
 پانچویں حصے کے پچھلے صفحہ پر۔

5

# سکرش



محمود احمد مودی

وہ پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”قادر وہاں سے آیا ہے۔ اصطبل میں فون بھی نہیں تھا کہ یہ فون ہی کروٹا۔ اور رات کے اس پہر اسے راستے میں بھی کہیں فون میسر نہیں آیا۔ کسی ٹریڈی ہے۔ رات گئے کسی ایمر جنسی کی صورت میں بعض علاقوں میں میلوں تک فون بھی دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ بعض سوئسائیکل پر چلا تھا۔ انسان جتنی زیادہ جلدی میں ہوتا ہے، بعض اوقات اتنی ہی زیادہ رکاوٹیں راستے میں حائل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وحدت کالونی کے قریب اس کی سوئسائیکل بھی خراب ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے ایک ٹیکسی ملی۔ ہم جس حال میں تھے، اسی طرح اٹھ کر بھاگے اس کے باوجود تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کتنا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ کیا بچا ہو گا وہاں!“ اس کی آواز میں ایک سسکی سی شامل تھی۔

”وہاں مسلح محافظ موجود رہتے تھے۔ وہ کیا ہوئے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ محافظ موجود تھے۔ لیکن قادر نے جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے منظم انداز میں۔ خاص حکمت عملی کے ساتھ اصطبل پر شب خون مارا گیا تھا۔“ خیم بولی ”پہلے ٹانبا بے خبری میں گاڑ ڈر پر حملہ کر کے انہیں بے ہوش کیا گیا۔ اسٹافورم کو بھی بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ قادر ہند کوٹھری میں سونے کا عادی ہے یہ بے ہوش ہونے سے بچ گیا۔ آگ کی چش محسوس کر کے اس کی آنکھ کھلی تب اس نے دیکھا اس کی کوٹھری بھی شطوں میں کمری ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ نکلا۔“

راجو بالکل خاموش تھا اور غاک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ خیم نے اپنا منٹ گاؤں درست کیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سلسلہ کام جوڑا ”قادر کے علاوہ رات کو اصطبل میں عملاً تین چار آدمی ہی موجود ہوتے ہیں۔ سب بے ہوش پڑے ہوئے

میں حسب وعدہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر نیچے پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے گیٹ سے باہر نکالی اور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ باہر آنے سے پہلے میں نے ایک فون بھی کیا۔ اس قسم کے معاملات میں کہیں روانہ ہونے سے پہلے میں کچھ احتیاطی تدابیر ضرور کر لیتا تھا جو اکثر کام آتی تھیں۔

چند لمبے بعد ایک گاڑی آندھی طوفان کی طرح گلی میں داخل ہوئی۔ وہ میرے قریب آکر رکی تو رات کے خانے میں اس کے بریکوں کی چرچاہٹ کچھ زیادہ ہی تیز محسوس ہوئی۔ وہ خیم ہی کی گاڑی تھی اور وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ راجو اس کے برابر بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک اور شخص موجود تھا۔ وہ غالباً اصطبل پر کام کرنے والا کوئی ملازم تھا۔

”تم گاڑی اندر کھڑی کرو اور میری گاڑی میں آیاؤ۔“ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا ”وہ گاڑیوں میں جانا مناسب نہیں رہے گا۔“

میں نے گیٹ کھلایا اور خیم گاڑی ڈرائیو سے اتر گیا۔ وہ گاڑی وہیں چھوڑ آئی اور تینوں میری گاڑی میں آ بیٹھے۔ سڑکیں دیران تھیں اور موقع اہم تھا۔ میں نے اپنی گاڑی سے ہوائی جہاز کا کام لینے کی کوشش کی۔ جب خیم کو اطمینان ہو گیا کہ میں حتی الامکان تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا تب میں نے پوچھا ”قصہ کیا ہے؟“

”قصہ تو فتم ہو گیا۔“ وہ افسردگی سے بولی۔ اس نے جب فون کیا تھا تو اس کا انداز ہسپتالی تھا لیکن اب وہ اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پا چکے تھے۔ اب بظاہر صرف افسردگی رہی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کا بل اب بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔

”پھر بھی کچھ تفصیل تو بتاؤ۔“ میں نے ایک سو ڈکائے ہوئے کہا۔

احسان کو بھول نہیں سکتی۔ مجھے نقصان وغیرہ کا کوئی افسوس نہیں  
مجھے تو صرف ہلکے جیسے گھوڑے کے انجام کا افسوس ہے۔ غیر معمولی  
انسان ہی نہیں، غیر معمولی حیوان بھی کسی بکھاری پیڑا ہوتے  
ہلکے ایک غیر معمولی گھوڑا تھا۔ مجھے اس سے غیر معمولی حد تک  
انیت تھی۔ وہ مجھے بعض انسانوں سے زیادہ عزیز تھا۔

”میں نے تو اسے آج پہلی بار دیکھا تھا۔“ میں نے اپنے  
کے تاسف کو چھپاتے ہوئے کہا ”مجھے خود اس سے انیت ہو  
تھی۔ میں ویسے بھی غیر معمولی چیزوں اور غیر معمولی مخلوقات کا بہ  
برادار دران ہوں۔ اور اس وقت تو مجھے صرف ہلکے کا نہیں،  
سب گھوڑوں کا بھی بہت افسوس ہو رہا ہے۔ بڑا ظلم ہے کہ کوئی گھوڑا  
پر پینڈول چمڑک کر آگ لگا دی جائے اور مجبور ہے زبان جانور ز  
جل جائیں۔“

”تم جانوروں کی بات کر رہے ہو۔ ہماری سوسائٹی میں  
انسانوں کے ساتھ بھی یہ سلوک ہو رہا ہے اور باتیں کرتے ہیں  
لوگ اخلاقیات، انسانیت اور مذہب کی۔“ غمیم تنہا بیٹھے میں بولی  
”میں نے تو حقارت و نفرت کے لیے اتنی سی سبق کافی سمجھا تھا،  
میں اسے دے آیا تھا۔“ میں نے سر جھکے میں کہا ”لیکن گناہ  
اسے اپنے انجام تک پہنچنے کی بہت جلدی ہے۔“

”نہیں... بلکہ... اب اسے کچھ مت کہنا۔“ غمیم گویا سہم  
بولی ”ایسا نہ ہو کہ اس کے انجام تک پہنچنے سے پہلے ہم اپنے انجام  
کو پہنچ جائیں۔“

”اب ڈرنے کا کیا فائدہ؟“ میں نے کہا؟ ہمیں ہلکے کی  
سے زیادہ فکر تھی وہ تو اتھ سے جا چکا ہے۔“

”ابھی ہماری جائیں تو پہنچی ہوئی ہیں۔ تم چاہتے ہو ہم ان  
بھی اتھ دھو بیٹھیں؟“ وہ تیزی سے بولی لیکن ”دوسرے ہی لمحے ا  
کے لیے میں حد درجہ زری آگئی ”دیکھو۔“ میں تمہاری مریاں  
منکر نہیں ہو رہی۔ لیکن اب بھلا خدا جیسے لوگوں کا کیا علاج ہے  
بہتر کی ہے کہ انسان اس جیسے لوگوں کے راستے سے ہٹ جائے  
”کی تو تمہارا اہلہ ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر  
کہ ”ہم بڑے لوگوں کے لیے راستے خالی کرتے چلے جاتے ہیں جو  
کی وجہ سے وہ ہر قدم پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے جا۔  
ہیں۔ اگر خیانت کے راستے پر سفر شروع کرتے وقت انہیں شر  
ہی سے مستقل طور پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے تو ان کے حو  
استے بلند نہ ہوں۔“

”جن کے پاس کسی نہ کسی قسم کی طاقت موجود ہو“ ان کے  
سے یہ باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ”کنکور“ بے بس اور شریف لوگ تو  
چارے ٹکے میں گریبان کھول کر چلنے والے دو ٹکے کے لٹکنے  
بھی ڈرتے ہیں۔“ غمیم بولی۔

”اگر تم جیسے لوگ بھی اپنا شمار غریب، مجبور اور قطعاً بے  
لوگوں میں کرنے لگیں تو پھر مزاحمت کرنے والے کہاں سے آئیں

تھے۔ ان کے سروں پر کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی گئی تھی اور  
پورے اسٹبل پر پینڈول چمڑک کر آگ لگائی گئی تھی جو ہر چیز کو اپنی  
لیٹ میں لے چکی تھی۔ اس نے گھوڑوں کو بری طرح ہنساتے سنا۔  
یہ بولکھا گیا۔ اکیلا تھا ”اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اس  
نے صرف اتنا کیا کہ گاؤں اور استاد نور محمد کو اٹھا کر محفوظ جگہ پر  
جا کر لٹایا اور ہمیں اطلاع دینے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس کی موٹر  
سائیکل بھی آگ کی لیٹ میں آئے ہی والی تھی۔ معلوم نہیں اب  
تک وہاں کیا ہو چکا ہو گا!“

”ان سرکوں پر گاڑی اس سے تیز نہیں چلائی جاسکتی ورنہ میں  
کچھ اور جلدی پہنچنے کی کوشش کرتا۔“ میں نے کہا۔  
”میرے خیال میں تو تم اس سے بھی کچھ کم رفتار سے ہی  
چلاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ایک سڑیچلی کے سلسلے میں جاتے جاتے خود  
دوسری سڑیچلی بن جائیں۔“ وہ بولی۔

”ہاں... مجھے بھی اس رفتار سے ڈر لگ رہا ہے۔“ راجو نے  
بھی اتنی میر میں پہلی بار زبان کھولی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔  
”میرے تو ویسے ہی ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ میں ابھی باہر سے آکر  
سویا ہی تھا۔“

”تمہارے حواس ویسے بھی کب ٹھکانے ہوتے ہیں۔“ غمیم  
جلے بیٹھے سے انداز میں بولی۔

راجو نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں اور ایک سکرینٹ  
لٹکاتے ہوئے بولا ”حقارت و نفرت نے تو عمل ظاہر کرنے میں ذرا بھی  
تاخیر نہیں کی“ اسی لیے میں اس سے چٹکاتے ہوئے ڈرتا تھا۔

”چلو... حقارت و نفرت سے تو چٹکاتے ہوئے تم ڈرتے تھے اور  
کس سے چٹکاتے کی بہت ہے تم میں؟“ غمیم چار مانہ لیٹے میں  
بولے۔ میں نے غمیم کو کیا کہ اس وقت اسے اپنا غصہ اور مغلطائت  
ٹھکانے کے لیے ایک ہدف کی ضرورت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ  
وہ ہدف راجو ہو۔ صورت حال جو کچھ بھی تھی ”راجو کا اس میں کچھ  
زیادہ قصور نہیں تھا۔ بد معاش اپنی اپنی بد معاشیاں دکھا جاتے ہیں  
کنکور لوگ آپس میں لڑتے رہ جاتے ہیں۔“

”اپنا گھوڑا زامت شروع کر دے۔ وقت نہیں ہے اس طرح  
چر نہیں لڑانے کا۔“ میں نے ان دونوں کو ڈانٹا مگر مجھے سمجھ میں تھا۔  
”غمیم! ہمیں افسوس تو ہوا ہو گا کہ میری دخل اندازی سے  
فائدے کے بجائے نقصان ہو گیا۔ میں تم سے شرمندہ ہوں  
تمہارے مفادات کی حفاظت صحیح طور پر نہیں کر سکا۔ میں اس نتیجے  
پر پہنچا ہوں کہ سانپ اگر نظر آجائے تو چراس کا سر جیسی جلدی کھل  
دیا جائے اتنی ہی اچھا ہوتا ہے۔“

”اب تم مجھے شرمندہ مت کرو۔“ وہ تیزی سے بولی ”اصل چیز  
نیت ہوئی ہے۔ تم نے جو کچھ کیا“ ظاہر ہے میری بہتری کی نیت سے  
کیا تھا۔ اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالا تھا۔ حقارت جیسے آدمی پر  
ایک بے خوفی سے ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ تمہارا احسان تھا۔ میں اس



کے؟ میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

”میرے رفیق کے مقابلے میں میں غریب، مجبور اور بے بس ہی ہوں۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”غیر۔ میں دوبارہ اس بحث میں الجھا نہیں چاہتا۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ اگر میں نے تمہیں اس بچتاوے کے ساتھ چھوڑ دیا کہ تم نے مجھ سے عدلے کر غلطی کی تھی تو میں زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا گا۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے پہلو پڑتے ہوئے منہ کھولا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”میں بند ہو چکا ہوں۔ سڑک تنگ اور اورنجی تھی۔ دونوں طرف شیب میں پانی تھا اور وہاں کوئی الیکٹرک پل وغیرہ بھی نہیں تھا۔ چاروں طرف گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اب بھی بہت تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا اس لیے جتنا دیرنا چاہتا تھا۔ اس سڑک پر اس رفتار سے ڈرائیو کرنے کے لیے توجہ اور یکسوئی ضروری تھی۔“

آخر کار ہم اس پگڈنڈی پر مزے لگے جو اصطبل کی طرف جاتی تھی۔ میں نے گہری دیکھی۔ اپنے گھر سے روانہ ہونے کے ٹھیک میں منٹ بعد میں نے ان لوگوں کو یہاں پہنچا دیا تھا۔ لہذا ہوتے ہوئے شیلے ہمیں دور ہی سے نظر آئے تھے۔ اصطبل میں غیرات اپنی زیادہ نہیں تھیں اس کے باوجود آگ خامے بڑے رہنے پر پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں شیلے دم توڑ رہے تھے اور کہیں شاباب پر تھے۔ گڑی کا بڑا سائیک بھی جل کر گر چکا تھا اور دیکھتے ہوئے بڑے بڑے انگاروں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گویا اس راستے سے بھی داخل ہونا مشکل ہو گیا تھا۔

احاطے کا بیشتر حصہ اور کچی دیواریں آگ سے محفوظ تھیں لیکن اس کا اب ظاہر کبھی فائدہ نہیں تھا۔ آگ تار رہے تھے کہ جس چیز کی ذرا بھی کوئی اہمیت ہو سکتی تھی اسے آگ نکل چکی تھی۔ میں نے گیت سے خاصی دور ہی گاڑی روک لی کیونکہ تیز ہوا کے ساتھ صرف دھواں اور تپش ہی نہیں بلکہ شرارے اور چنگاریاں بھی اڑ کر آ رہی تھیں جن سے کسی اور چیز کے بھی آگ پکڑ لینے کا اندیشہ تھا۔

گاڑی بہت کٹھاہ تھی۔ خیم اور راجو کسی عقی یا دھواری کے بغیر آگے ہی اگلے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے گاڑی سے اترا لیکن وہ ایک لمبے کے لیے دم بخود بیٹھے ہی رہے۔ دونوں پٹنی پٹنی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے جہاں اب غالباً کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ کہان ”وہ اضطراب جو تمام راستے ان پر طاری رہا تھا“ اب گویا یکدم ہی ختم ہو گیا تھا۔ مایوسی اور مدلل غلطی نے اس کی جگہ لے لی تھی آخر کار وہ ڈھیلے ڈھالے اور گھٹ خورہ سے انداز میں گاڑی سے اترے۔

اس وقت تک وہاں خامے لوگ جمع ہو چکے تھے جو غائب تھے اب آتی تھے۔ ان میں سے چند ایک کے پاس باتیاں بھی

تھیں اور وہ ایک جوڑے سے پانی لا کر آگ پر ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جوڑے کا قاطعاً خاسا تھا اور آگ بہت پھیلی ہوئی تھی۔ جنسی درمیان ایک شخص بالائی بھر کراتا تھا ”آئی درمیان اس کا آگ پر پانی پھینکنا محض لذت ہی محسوس ہوتا تھا۔ لیکن لوگ بے چارے بہر حال اپنی ہی کوشش کر رہے تھے اور یہ کوشش قابل تحریف تھی۔ فضا میں گوشت جلنے کی آواز اور چراغ بجلی ہوئی تھی۔ گھوڑوں کی آوازیں نہ جانے کب کی معدوم ہو چکی تھیں لیکن میں فضا میں اب بھی ان کی لرزہ خیز آواز گشت محسوس کر رہا تھا۔

ہجوم سے تین افراد ہماری طرف بڑھے۔ شیلوں کی لرزتی تاریکی روشنی میں نہیں نے دیکھا ان میں سے ایک استاد نور محمد تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دو افراد گاڑوں پر راہنیں اب بھی ان کے اطرافوں میں تھیں اور ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ قیدیوں کی طرح شرمندہ تھے کہ ان کی موجودگی میں سب کچھ مذکر آتش کدیا گیا تھا لیکن درحقیقت ان کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ اس قسم کے گاڑوں عام سے چودوں ڈاکوؤں یا دونوں ڈاکوؤں کے ساتھ آتے ہوئے والوں کے مقابلے میں تو دیوار میں کرکھڑے ہو سکتے ہیں لیکن مکاری اور منصوبہ بندی سے کارروائی کرنے والوں کے سامنے کچھ زیادہ کار آمد ثابت نہیں ہوتے۔

ان میں سے ایک کے کان اور رخسار پر خون چھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے کو غالباً جب عتب سے کوئی زہنی چیز مار کر بے ہوش کیا گیا تو وہ اور مجھے منہ زمین پر گرا تھا اور اس کی تنہی پھوٹ مچھی تھی۔ اس کا چہرہ مٹی اور خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسے بھی اصطبل جتنے بڑے رہتے پر پھیلا ہوا تھا اور جیسا اس کا مکمل وقوع تھا اس کی مناسبت سے میرے خیال میں اس کی حفاظت کے لیے رات کی تاریکی میں دو گاڑوں کا کافی تھا۔ لیکن وہ بہر حال زوال کو پہنچا ہوا ایک اصطبل تھا جس کا اصل اثاثہ صرف ایک ہی گھوڑا تھا۔ اس حساب سے اس پر جتنے اخراجات اٹھ رہے تھے میرے

|       |           |                        |
|-------|-----------|------------------------|
| 200/- | خیاء ساجد | اردو کے شاہکار سفرنامے |
| 250/- | خیاء ساجد | منتخب مشہور سفرنامے    |
| 150/- | خیاء ساجد | منتخب مشہور افسانے     |
| 125/- | خیاء ساجد | منتخب اعلیٰ افسانے     |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

اندازے کے مطابق راجہ اور ٹیم کے لیے وہی بہت زیادہ تھے۔  
 راجہ استاد نور محمد سے پتہ کر رہا تھا بلکہ دوسرے لگا۔ وہ اس  
 کا چہرہ چھلکے ہوئے اسے تسلیاں دیتے تھے۔ ان کی اپنی آواز بھی  
 بھائی کی ہوتی تھی اور آنکھوں میں نمی تھی۔ راجہ تو وزاری کے  
 درمیان بولا "کل تو کھر کوئیں میں حوصلہ تھا۔ اور آثار تیار ہے  
 تھے کہ کل کی ریس میں بہت ہماری جھوم ہو گا۔ لاکھوں روپے تو  
 دیکھ کر دس سے باہر شرطوں میں لگ چکے ہوں گے۔ ہماری آمدنی  
 کا آخری ذریعہ یہ ٹیم ہو گیا۔ ہم تمام ہو گئے استاد۔"  
 مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ وہ کھر کا ذکر صرف ایک ذریعہ آمدنی  
 کے طور پر کر رہا تھا۔ ایک جائدار کے طور پر نہیں۔ استاد اسے  
 تسلیاں دیتے تھے۔ ٹیم بدستور دم بخود کھڑی تھی اور کھر کوئی وہ فیو  
 کی ان قضاہوں کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں اب صرف دم توڑتے  
 ہوئے شعلے دیکھنے انگڑوں کے انبار اور راکھ کے ڈھیر پائی رہ گئے  
 تھے۔ ہوا میں ابھی تک گوشت اور چڑا چلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی  
 جس سے دل خراب ہو رہا تھا۔

جھوم بھی دھیرے دھیرے ہمارے گرد جمع ہونے لگا تھا۔ لوگوں  
 کو علم ہو گیا تھا کہ مالکان آگے نہیں ہیں۔ وہ بھی مختلف سوالات کر کے  
 اپنے قبضے کی تسلیوں کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں بھی اندازہ  
 ہو گیا تھا کہ آگ لگی نہیں تھی لگائی گئی تھی۔ وہ جانا چاہتے تھے کہ  
 یہ کس کی حرکت تھی ٹیم اور راجہ کو جھوم سے دھشت ہو رہی  
 تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سوال کا کیا جواب دیں۔  
 وہ قریب ہی ایک بجلی کی آبادی میں رہنے والے نیم دستی سے  
 لوگوں کا جھوم تھا۔ وہ ایک بے عنوان سے افسانے اور ہوردی کے  
 تحت سوالات کر رہے تھے۔ انہی میں سے کچھ لوگ بالیوں سے  
 آگ بجھانے کے لیے مقدور پھر کوششیں کر رہے تھے۔ میں نے  
 محبت اور ملائمت سے ان سے درخواست کی کہ اس وقت وہ راجہ  
 اور ٹیم سے کوئی سوال نہ کریں۔ وہ بہت پریشان ہیں اور اس وقت  
 کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں ہیں۔

اسی وقت میں فائبر گیڈ کا سائزن سنائی دیا۔ شاید راجہ یا ٹیم  
 نے روانہ ہونے سے پہلے فائبر گیڈ کو فون کیا تھا۔ گو کہ اب اس  
 کی آدھ کا کوئی قاعدہ نہیں تھا لیکن اپنے حساب سے وہ بہت حال جلدی  
 ہی آگئے تھے۔ اس دور دراز مقام پر ان کا کسی اطلاع پر آجنا ہی  
 غیبت تھا۔ فائبر گیڈ کی دو گائیاں جسے جھوم انہیں راستہ دینے  
 کے لیے ادھر ادھر بکھر گیا۔

فائبر گیڈ والے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اب تو وہ  
 بجھتی ہوئی آگ کو ہی بجھا سکتے تھے۔ کچھ بچا نہیں سکتے تھے۔ کارواز  
 ابھی تک ٹیم کے سامنے معذور تھی پیش کر رہے تھے کہ وہ بے خبری  
 میں مارے گئے روزنہ شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا لیکن ٹیم گویا ان کی  
 آواز نہیں سن رہی تھی۔ میں ٹیم اور راجہ دونوں کو بازو سے پکڑ کر  
 ایک طرف لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔

"اب تو آگ ٹھنڈی ہونے کے بعد ہی دیکھا جاسکتا ہے کہ کھر  
 بچا ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے اصل میں ٹیم کی خاموشی سے الجھن  
 ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ بولے۔  
 وہ ہنسی کی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میں لاکھوں کے سوا  
 تو کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ اور ان کی اب کوئی آواز سنائی نہیں  
 دے رہی۔"

استاد نور محمد اپنے چمچہ روئے اور سفید بالوں میں اٹھکایاں  
 پھیلتے ہوئے بولا "ٹیم بنی اتنی دلی مہمنا مت کرو۔"  
 وقتاً مصلیٰ کی طرف آنے والی پگڈنڈی پر کسی گاڑی کی ہیڈ  
 لائٹس نمودار ہوئیں۔ استاد نور محمد نے جملہ ادھر ادھر پھوڑا۔ ان  
 کی نظر ادھر ہی جم کر رہ گئی تھی۔ کوئی گاڑی میں دوڑے پگڈنڈی پر  
 مڑی تھی میں بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

چند لمبے بعد گاڑی ہمارے قریب آ کر رکی۔ وہ ایک قیمتی سیاہ  
 لمبی سی سرسبز تھی۔ تمام بیٹھے کمرے رنگ کے تھے گاڑی کے  
 چاندروں دوڑے بیک وقت چلے اور اس نے چار آدمیوں کو یکدم  
 ہی اگل دیا۔ تین کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ایک کے ہاتھ  
 میں ہلکی مشین گن۔ نہایت مہربانہ سے انداز میں انہوں نے ہمیں  
 گھیرے میں لے لیا۔

مصلیٰ کے گاڑا اس وقت کچھ فاصلے پر تھے۔ وہ جلدی سے  
 پوزیشن لینے کے لیے دوڑے لیکن اسی لمحے پانچواں شخص نہایت  
 شانہ انداز میں گاڑی سے اترا اور بازو بڑھا کر انہیں رکے کا اشارہ  
 کرتے ہوئے بولا "نہیں۔۔۔ نہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔  
 یہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہو رہا۔ ہم تو صرف افسوس کا اظہار  
 کرنے آئے ہیں۔"

لیکن گاڑا اس کے باوجود دو درختوں کی آڑ میں چلے گئے اور  
 ایک گاڑے لگاڑا "اوتے خانہ خراب کا بچہ" اگر کسی نے کوئی  
 بد معاشی کیا تو اس کا لاشا ایدھر سے جائے گا۔

گاڑی سے اترنے والا پانچواں آدمی مختار رفیع تھا۔ وہ تھری  
 چوس سوٹ میں تھا۔ رات کے اس پہر بھی وہ گویا کسی ڈنر میں  
 شرکت کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ وہ بہ آواز بلند گویا گاڑا کو خبردار  
 کرتے ہوئے بولا "مت بھولنا کہ تمہارے مالک اور ان کے  
 پیارے دوست ہمارے گھر سے ہیں۔ لیکن میں ایک بار پھر بتانا  
 ہوں۔ کوئی بے وقوفی نہ کرنا۔ ہم تمہارے مالکان کے دوست ہیں  
 ان سے ملنے آئے ہیں۔"

گاڑا زمین جانتے تھے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ وہ تو صرف ان کی  
 قمیص دیکھ کر احتیاطاً پوزیشن لے کر بیٹھ گئے تھے۔ مختار رفیع کی  
 بات سن کر وہ گویا الجھن میں پڑ گئے ایک لمحے کے لیے سکوت چھا  
 گیا۔ مائل پر عجیب سا تناؤ تھا۔ دوسرے گاڑے درخت کے  
 عقب سے چلا کر پوچھا "نیک صاحب ایسا حکم ہے؟"  
 ٹیم حقو کھل کر بولی "کوئی مت چلاؤ۔ خطرے والی کوئی

بات نہیں۔“  
میں بالکل خاموش کھڑا، پگلیں جھپکائے بغیر سب کچھ دیکھ رہا تھا جیسے میرا اس ساری صورت حال سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔  
کارڈز کے لیے ٹیم کی ہدایت سن کر مختار رفیق کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ اپنے مخصوص ہونٹاک سے انداز میں ٹیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ٹیم بیگم! میری بیٹھ سے تمہارے بارے میں رائے یہی رہی ہے کہ تم ایک ذہین اور معاملہ فہم عورت ہو۔ بس گزشتہ شام میری تمہارے بارے میں رائے ذرا بدل گئی تھی۔ لیکن خیمہ کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔“

اس کے لہجے میں بولا کی شانگلی اور ملاحت تھی جو اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اسے دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ اس کا بچپن گلیوں میں لڑائی مار کھائی میں اور جوانی بد فحاش لوگوں میں گزری ہوگی لیکن اس کے ساتھ اس کا نہیں سوٹ کچھ کر اور اس کا شائستہ دھیریں لبہ سن کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بول پر محفل کا ظلال چڑھا رہا گیا ہو۔

مختار سا جھوم ہم سے کچھ دور تھا لیکن لوگوں نے دور سے ہی محسوس کر لیا تھا کہ باہر میں تباہ تھا اور بندھنوں کی نالیں ایک دوسرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دھیرے دھیرے کھسکا شروع کر دیا تھا۔ اصطبل کی آتشیں اور پھر بندھن بڑا ہون کی آمد دیکھ کر انہوں نے قابل نتیجہ انڈر کر لیا تھا کہ یہ دشمنی کا کوئی چکر تھا اور وہ اس دشمنی میں الجھتا یا کسی بھی دافنے کا گواہ بننا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم وہ دو چار آدمی جو کچھ دیر پہلے تک بائیسوں سے پانی لا کر آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ اب فلائز بریگیڈ والوں کی مدد میں گئے رہے۔ فلائز بریگیڈ والے بھی اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان خاصا فاصلہ تھا وہ گویا ہماری طرف سے بے خبر تھے۔

راجو اور ٹیم دونوں ہی دم بخود کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں تیار رہی تھیں کہ ان پر ایک بار پھر مختار رفیق کی دہشت غالب آچکی تھی۔ بلکہ شاید وہ اس دہشت کے حصار سے ایک لمبے کے لیے بھی نہیں نکلے تھے بخار کو شاید ان کی پہلی پہلی آنکھیں اور خشک ہونٹ دیکھ کر خاصا اطمینان ہوا۔

جس طرح میں صورت حال سے لا تعلق، ایک میٹ بٹ کھڑا تھا اسی طرح اس نے اب تک مجھے قلعی نظر انداز کیا ہوا تھا۔ اب اس نے ذرا مالی تاثر پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے نہایت آہستہ سے گردن موڑتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ہنسویں اُچکاتے ہوئے اسی شائستہ دھیریں لبہ میں بولا ”ادوہو۔۔۔ چوہدری صاحب! کچھ ایساں موجود ہیں۔ آپ نے بت اچھا کیا جو ان دونوں کے اچھے خنے آئے چوہدری صاحب! معیشت اور پریشانی کے وقت دوستوں، بہادران اور خیر خواہوں کو موجود رہنا چاہیے۔“

ہے۔

اس کے چہرے سے دھیمی سی مسکراہٹ غائب ہو گئی، آنکھیں سبز تھیں اور ہوا میں اُگرتی ہوئی پنکھیاں گویا ان آنکھوں میں اتر آئیں۔ اس نے اپنے اوپر تہذیب و دانش کی کاجو خول چڑھایا ہوا قہارہ شاید جھٹکے تھا۔

دقتاً خشم میرا بازو تھامتے ہوئے اچھاپے سرکوشی میں بولی "اضطر! اخدا کے لیے بات مت بڑھاؤ۔ یہی تو وہ چاہتا ہے۔ ہم جو نقصان اٹھا چکے ہیں اس کی تلافی تو نہیں ہو سکتی پھر اب خون خرابے کا کیا فائدہ؟"

مخار کی معدوم شدہ کمینہ سی مسکراہٹ واپس آئی دکھائی دی۔ سفاک سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا "خشم بیگم کو آپ کی زندگی بہت عزیز معلوم ہوتی ہے چودہری صاحب! اپنے مسکین سے شوہر کی زندگی سے بھی زیادہ۔"

سانکٹ کھڑا ہوا راجو اتنی دیر میں پہلی بار کسمپاسا میں حقارت سے تھوکتا تو بخار کے نہ پر چھاپتا تھا لیکن اس اقدام کو مؤخر کرتے ہوئے میں نے زمین پر ہی تھوکتے پر اکتفا کیا اور کہا۔ "تمہارے غلیظ ذہن سے مزے ہوئے خیالات تمہارے گمراہ نامہ سے باہر تو آتے ہی رہیں گے۔ انہیں تو صرف موت ہی روک سکے گی جو تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ فی الحال مجھے صرف اتنا بتا دو کہ دھنسی ٹھانکے کا کیا تھیں کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا؟"

"کیا مطلب؟" اس نے ایک بار پھر بصیرت اُچکا نہیں۔ "دودھ پیتے بچے بننے کی کوشش مت کرو۔" میں نے غصہ ناک لہجے میں کہا "اس شاندار اصطلاح کو آگ لگوا کر اور بے زبان کھوڑوں کو آگ میں زندہ جلوا کر تمہیں کیا مل گیا؟ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا ہوتا جس سے تھوڑی بہت مراد گئی ظاہر ہوتی۔"

"شریف آدمی کسی پر بلا تحقیق الزام نہیں لگایا کرتے چودہری صاحب! میری طرف سے تو وارنٹ کیے جانے والے ہنگ عزت کے دعوے بھی کر ڈھوں میں ہوا کرتے ہیں۔" وہ ششمان لہجے میں بولا۔ مجھے واقعی ہنسی آئی "تم۔۔۔ اور ہنگ عزت کی دعوے؟" میں نے بے یقینی سے کہا "کیا واقعی عدالتیں تمہارے دعوے سامنے کے لیے منظور کر لیتی ہیں؟ کیا واقعی وہ اس غلط فہمی میں جلا ہو جاتی ہیں کہ تمہاری کوئی عزت بھی ہے؟"

"یہ تو ابھی آپ کو بتا چلے گا چودہری صاحب!" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ کو جلد اندازہ ہو جائے گا کہ ہماری کتنی عزت ہے اور کتنی اہمیت۔ ابھی قہرات شروع ہوئی ہے۔"

ایک بار پھر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خشم کی طرف دیکھا اور طویل سانس لے کر بولا "ہم تو یہ بڑی خبریں کر رہے ہیں بیگم سے اظہارِ افسوس کرنے آئے تھے لیکن آپ نے دل جلانے والی باتیں شروع کر دیں۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ خشم یہاں بھی آپ کو ضرور ساتھ لائی ہوگی اور آپ ضرور حالات کو

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھبے میں نے نہایت دھیمے اور ہموار لہجے میں کہا "مخار! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فائزر ریگنڈ کے اس اسٹیشن سے تمہارا بھی مستقل رابطہ رہتا ہے جس سے یہ گازیان یہاں آئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ایک لمحے کے لیے اس کی بصیرت کمان ہو گئیں۔

"مطلب یہ کہ فائزر ریگنڈ کی اور تمہاری گازیان تقریباً آگے پیچھے یہی یہاں پہنچی ہیں کیا فائزر ریگنڈ والے جنہیں اطلاع دے کر روانہ ہوتے ہیں کہ فلاں جگہ آگ لگی ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ سوال سے نہیں میرے گھورنے سے ذرا مضطرب ہوا لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لیے بچی آواز میں بڑا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے سوال سے۔۔۔ اور اس کے عقب میں چھپی ہوئی بے بسی سے وہ محفوظ رہ رہا ہے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ ایسا محفوظ بھی نہیں ہو رہا تھا اس کے اعصاب اس دقت پہنچتے ہوئے تھے۔

"چچا سوال ہے چودہری صاحب! اچھا سوال ہے۔" اس نے مرتبہ انداز میں سر ہلایا "لیکن اس قسم کے سوالوں سے حالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے اپنے کچھ ذرائع ہیں ہمیں خبریں ملتی رہتی ہیں۔"

"تمہارے ذرائع کی ایسی جیسی مراعات دے!" اچانک میں نے گرج کر کہا۔

اسے گویا حیرت کا جھکا سا لگا۔ بددوق برادروں نے یکدم بددوق سی دھمکی کر لی۔ وہ گویا خستہ تھے کہ اشارہ ملتے ہی مجھے چھٹی کر ڈالیں۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ فی الحال میں صرف مخار کو اشتعال دلانے کا خلصہ مول لے رہا تھا۔ لیکن اس نے ایک بار پھر اپنے آؤ میں کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور حیرت آمیز شائستگی سے بولا "کمال ہے چودہری صاحب! آپ یہ زبان بھی بولتے ہیں؟ میں تو آپ کو نہایت مذہب و شائستگی آدمی سمجھا تھا۔ خاص طاقت رکھنے والا مذہب و شائستگی آدمی۔ آپ کو قلمی زبان بولنے میں کتنے جھگڑے ہوتے ہیں؟"

اس نے تحقیر آمیز سے انداز میں ایک بار از سر نو میرا سر تپا جائزہ لیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا "کالی دنیا کسی نہ کسی کمزوری کی نشانی ہوتا ہے۔ ظالم لوگ تو اپنے دشمن کو بس مسل ڈالتے ہیں کالی نہیں دیتے۔"

"بس کر سائے! کسی معصم اخلاق کی ناجائز اولاد!" میں نے پہلے سے زیادہ گھروڑے لہجے میں کہا "مسل تو میں نے تجھے آج دھڑیر ہی دیا ہو گا۔ میں نے اپنی دانست میں تجھے مدھرے کا سو بیج دیا تھا۔ لیکن ثابت یہ ہوا کہ کتنے کی قوم اکثر انسانی شکل میں بھی پائی جاتی

بچاؤنے کی کوشش کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے یہ آپ کی عادت ہے۔  
 ”ہاں“ میں نے جواب دیا ”مجھ میں ایک جبری عادت اور ہے  
 شاید آج شام ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہوا۔“

میں اتنی دیر سے اس کے ساتھ مکالمے بازی کے دوران کچھ  
 اندازے لگا رہا تھا۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ دیکھ رہا تھا۔  
 اس کے مسلح آدمیوں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کہاں کہاں کھڑے تھے۔  
 میرا جائزہ عمل ہو چکا تھا۔ مجھے اگر راجہ اور شمیم کی نظر نہ ہوتی تو  
 مختار کی زبان بند کرنے کے لیے میں کب سے عملی قدم اٹھا چکا  
 ہوتا۔ اندیشہ یہی تھا کہ اگر فائرنگ شروع ہوئی تو کہیں وہ دونوں اس  
 کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ اتنی بہت سی گولیاں موجود ہیں کہ اگر میں  
 صرف اپنا ہی بچاؤ کر لیتا تو وہ کافی تھیں۔ ان دونوں کا بچاؤ میرے لیے  
 بہت مشکل تھا اور ان سے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ خود اپنا بچاؤ  
 کر لیں گے۔

لیکن مجھے باتوں باتوں میں خاصی ملت لی تھی۔ میں نے  
 کچھ ستریں وغیرہ کا اندازہ کر لیا تھا۔ اسی دوران قدرت نے میری  
 ایک اور مدد کی۔ مختار نے دونوں ہاتھ گولت کی جیبوں سے نکال  
 لئے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کے گولت کی دونوں  
 تیروں میں دو پیسے پھنسل تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ ان سے  
 ہٹ جائیں۔ جن کے ہاتھوں میں زیادہ خطرناک گولیاں تھیں ان کی  
 مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔

وہ سگار سلگاتے ہوئے بولا ”جو بدی صاحب! اب مجھے یقین  
 ہو چکا ہے کہ آپ میں ایک دو نہیں بہت سی جبری عادتیں موجود  
 ہیں۔ جن میں سے سب سے جبری عادت ہے دوسروں کے معاملات  
 میں ناگاہ اڑانا۔“

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس  
 وقت وہ اپنے آپ کو پوری طرح ایک غمی ہاس محسوس کر رہا تھا۔  
 صورت حال پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھی۔ ہم گویا اس کے  
 قیدی اس کے سامنے مجبور محض تھے۔ میں اس وقت جبکہ اس کی  
 خود اعتمادی نقطہ عروج پر تھی اور اس کے تھے ہوئے اعصاب ذرا  
 ڈھیلے پڑ گئے تھے میں نے اچانک پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر  
 گھونسا رسید کیا۔

جب کوئی شخص خوش فہمی میں جلا ہو چکا ہو اس وقت اسے  
 جھٹکا دینا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ میں نے اسے اپنا بہت سی خاص  
 قسم کا گھونسا رسید کیا تھا۔ اس طرح اپری چوٹی کا دور لگا کر میں  
 شاندار سی کسی کو گھونسا رسید کرتا تھا۔ لیکن اسے برداشت کرنا بھی  
 ہر ایک کی بس کی بات نہیں تھی۔ یہ اپڈیل گھونسا ایک سانپ کو بھی  
 پکارا دینے کے لیے کافی تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور اس شخص پر جا کر اس کے ہاتھوں  
 میں ہلکی شین گھن تھی۔ دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ اس کا ہنگامہ

میں اچھل کر پڑ گیا۔ اڑانا، بڑا بہت سی دور جاننا۔ مجھے معلوم تھا کہ  
 میرے اس قسم کے کسی اندازہ کے نتیجے میں مختار کے آدمی اس کے  
 حکم کا انتظار کیے بغیر کوئی چلا دیں گے۔ اس لیے فوراً ہی میں بھی  
 بیٹنے کے کل کر گیا تھا۔

ساتھ ہی میں نے شمیم اور راجہ کو بھی اوندھے منہ گر جانے کا  
 اشارہ کیا تھا۔ راجہ کو تو اس اشارے کا کوئی فائدہ نہ ہوا لیکن شمیم  
 نے اس وقت کمال مستعدی اور حاضردہانی کا ثبوت دیا۔ اس نے  
 راجہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی ایک جھٹکے سے اپنے ساتھ گرا لیا تھا  
 ورنہ شاید وہ ہونٹوں کی طرح کھڑا رہ جاتا۔

میں نے ستریں وغیرہ کا جو حساب لگایا تھا اس کے مطابق ان  
 دونوں کو زیادہ خطرہ تو نہیں تھا لیکن اچھا بہر حال ہوتی ہے۔  
 اس وقت مختار اور اس کے آدمیوں کی توجہ کامیاب نہیں ہی تھی۔ ان  
 کے غیظ و غضب کا نشانہ اگر بنا تھا تو مجھے ہی بنا تھا۔ لیکن وہ  
 بوکھلاہٹ میں کوئی نقصان اٹھا سکتے تھے تاہم شمیم نے میری تشویش  
 کالی تم کو دی تھی۔

گولیاں چلیں لیکن وہ تقریباً بے آواز تھیں اور مختار کے  
 آدمیوں نے نہیں چلائی تھیں۔ وہ چلانے تو لگے تھے لیکن ان کی  
 حسرت ان کے دل میں ہی رہ گئی تھی۔ ڈٹ کی سی تیز آوازوں کے  
 ساتھ گولیاں ان کے ہاتھوں سے گر گئیں۔ ان میں سے دو تو اپنا ہاتھ  
 قحط کر کر رہے ہوئے تقریباً ڈھیر ہو گئے۔ جبکہ تیسرا اچھی مار کر نیم  
 دائرے میں گھوم گیا۔ اس کا بازو کئی ہولی کی حالت میں اس کے  
 پهلوسں جھولنے لگا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ دو آدمیوں کے تو ہاتھوں پر گولیاں گئی  
 تھیں جبکہ تیسرے آدمی کی کئی آؤ گئی تھی۔ اسے یقیناً سب سے  
 گولی گئی تھی۔ ٹوٹی، سوراخ اور صلیف وغیرہ سے مجھے ایسے ہی  
 بے خطا نشانے کی توقع تھی۔ مختار رشتی اور اس کے آدمی بڑے زہم  
 میں تھے کہ انہوں نے ہمیں گھبراہوا تھا لیکن انہیں معلوم نہیں تھا  
 کہ انہیں بھی کچھ لوگوں نے گھبراہوا تھا جو ان سے کالی دور مختلف  
 چیزوں کی آڑ میں چپے ہوئے تھے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہم سب سے  
 معمولی، غیر اہم اور بے ضرر سمجھ کر نظر انداز کیے رکھتے ہیں وہ سب  
 سے زیادہ حاضردہانی اور دلیری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پوزھا استاد نور  
 محمد نے ہم نے بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور مختار رشتی یا اس  
 کے آدمیوں نے بھی غالباً کسی شمار قطار میں نہیں رکھا تھا۔ اس نے  
 اس وقت سب سے اہم کام انجام دیا۔

میرے اٹھنے سے بھی پہلے اس نے تینوں شخص اٹھا کر تیزی  
 سے دور پھینک دیں۔ سب شین گھن والا اپنی گھن سمیت مختار  
 رشتی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ گھن آدمی تو بھی تھی اور وہ ابھی اسے  
 چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن اس نے گھن چھوڑی بھی نہیں  
 تھی۔ استاد نور محمد نے گھن سمجھ کر اس کے ماتھے سے اور مختار کے

جسم کے پیچھے سے نکالنے کی کوشش کی۔

تھا وہ اب بڑی طعن تو نہیں ڈکرا رہا تھا لیکن حلق سے کراہیں بر حال خارج ہو رہی تھیں۔

”تمہاری کچھ سمجھ میں آیا مختار رفیق؟“ میں نے اسے ہلکا سا جھکا دیتے ہوئے کہا ”میرے لیے تم صرف ایک گھونے کی بار ہو۔ اکثر اوقات فتح اور شکست کے درمیان صرف ایک گھونے کا فرق ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ گھونسا بالکل صحیح طور پر... صحیح جگہ پر مارا جائے۔ تم نے دیکھا یا نہ؟“

وہ آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آنکھیں بند ہوئی جادہ تھیں اس کا سر دائیں بائیں بھول رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ایک نہایت سخت جان آدمی تھا لیکن ایک ہی گھونے میں اس کے تمام کسٹل نکل گئے تھے۔ میں خواہ خواہ اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اب احساس ہوا کہ شاید اس کی سمجھ میں میری کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔

مجھے کچھ افسوس بھی ہوا کہ یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ اس میں کچھ جان تو رہنی چاہیے تھی۔ ابھی تو میری رنگوں میں لو صحیح طور پر گرم بھی نہیں ہوا تھا۔ دشمن اپنی ٹانگہ زانی کے ساتھ سامنے آئے تو اس کے ساتھ کچھ دیر تو کھیل چلنا چاہیے تھا۔ میری پہلی کوشش تو یہی ہوتی تھی کہ زندگی نہایت پسندی کے ساتھ گزرتی رہے لیکن جب کوئی کسی قسم کی دشمنی میرے سر پر مسلط ہی کر دیتا تھا تو پھر اسے مزہ چکھانے میں ذرا لطف آتا تھا لیکن یہ مختار رفیق اور اس کے ساتھی تو بہت ہی جلدی ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔

میں نے اسے ذرا دور سے جھکا دیا۔ اس کی آنکھیں ذرا کھلیں۔ میں نے تقریباً اس کے کان میں چیخے ہوئے کہا ”ٹھیک! تمہیں مطلوب ہے تم کس سزا کے مستحق ہو؟ میں تمہیں بتاتا ہوں تم نے اپنے لیے دنیا ہی میں جہنم تیار کر لیا ہے جو تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

میں نے یکدم ہی اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے اونچا کر لیا اور لمبے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں غازی بر گینڈ والوں کی کوششوں سے کسی دو تک تو آگ لٹھڑی ہو گئی تھی مگر بہت بڑے حصے میں ابھی تک شعلے بھڑک رہے تھے یا بڑے بڑے شہتیر اور ٹیلیاں انکا دوں کے دیکتے انبار میں تبدیل ہو چکے تھے۔

غازی بر گینڈ والوں نے سب سے پہلے چولی کٹ کے انکا دوں کو لٹھڑا کیا تھا اور انہی پر سے گزرتے گزرتے تھے۔ غازی بر گینڈ کی دونوں کاڑیاں بھی اندر داخلے میں پہنچ چکی تھیں۔ میں مختار رفیق کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے سر سے بلند کیے آگ کے قریب جا پہنچا حتیٰ کہ اس کی جیش مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔

تب غازی بر گینڈ والوں کی کچھ میں آیا کہ میرا ارادہ کیا تھا۔ وہ اپنے پائپ وغیرہ پھوڑ کر دوڑے آئے اور میری راہ میں دوڑیں گئے۔ ہیلٹ والے ایک فوجیوں نے متوجہ نہ ہو کر میرے لیے کہا ”سراہیہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

استاد تقریباً ساٹھ کی عمر کا ایک مختصر الوجود شخص تھا۔ گن ہماری تھی اور ایک مضبوط آدمی کے ایک ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ اوپر دوسرا ہماری بھر کم آدمی ڈھیر تھا۔ استاد کو اسے فوری طور پر کھینچنے میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے حیرت انگیز جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گن والے کی کینٹی پر ایسی ٹھوکر رسید کی کہ اس نے ہلچلا کر گن چھوڑ دی۔

استاد نے سب مشین گن دور نہیں چھوڑی۔ اس جیسے شخص کے لیے اس گن کو دور پھینکا آسان بھی نہیں تھا۔ وہ اسے سنبھال کر کچھ پیچھے ہٹ کر ان لوگوں کو کور کر کے کھڑا ہو گیا۔ گوکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں اٹھ چکا تھا اور میرا مشین ہائل جیب سے باہر آچکا تھا پھر بھی مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ استاد فوراً سب مشین گن صحیح طور پر سنبھالے کھڑا تھا اور اس نے ظاہر کر دیا تھا کہ اس میں اس قسم کی صورت حال میں دخل اندازی کی صلاحیتیں موجود تھیں۔

مختار ابھی تک اٹھنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ گھونسا اس کے لیے کافی قسری بخش ثابت ہوا تھا لیکن وہ بے ہوش نہیں تھا۔ کسی تکلیف سے بڑی طرح ڈکرا رہا تھا جیسے اس کا کوئی جوڑو علیحدہ ہوا جا رہا ہو۔ اس کے پیچھے رہا ہوا شخص بر حال نکل آیا تھا تاہم اس نے اٹھ کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کے لیے تو یہ اچھا ہی ثابت ہوا تھا کہ مختار اچھل کر اس پر جا کر اٹھا اور وہ اس کے پیچھے دب گیا تھا۔ اس طرح وہ دشمنی ہونے سے بچ گیا تھا ورنہ اس کے بھی ہاتھ یا بازو پر گولی ضرور گرتی۔

میرے آدمی اب بھی سامنے نہیں آئے تھے۔ انہیں صرف پانسہ پلٹنے میں میری مدد کرنی تھی۔ وہ انہوں نے کر دی تھی۔ میں مختار رفیق کے قریب پہنچا۔ وہ اونڈھا ہوا تھا اور اس کمرے کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جیسے کسی انڈی قضا نے اندر دھواڑ کر کے ڈال دیا ہو۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کے کھڑا کیا تو اس کے ڈکرانے کی وجہ سے میری سمجھ میں آگئی۔

اس کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ نقودہ مرلیٹن کی طرح اس کا پتھر تو چما اور منہ سا ہونچا تھا۔ ٹھوڑی کی کمال پھٹنے کی وجہ سے تو ہوا چہرہ خون میں تھوڑ گیا تھا۔ ایک لمبے کی ناخن سے یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ اس کا جیڑا اس لوٹک ہو گیا تھا ابھی جب سے ہٹ گیا تھا۔ اسی کی تکلیف سے وہ ڈکرا رہا تھا اور اس کی شکل بالکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔

میں نے مشین ہائل جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ دائیں ہاتھ سے اس کا گریبان مضبوطی سے پکڑتے ہوئے میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے جیڑے پر ایک ضرب لگائی۔ جیڑا اب اس کی جگہ پر تو چھلکا لیکن شاید کوئی فکڑ پھر بھی ہو گیا تھا۔ جیڑا زور دینے کو ٹٹک گیا تھا۔ اور دیر سے دیر سے ٹھہر رہا

”یہ آگ اس مزدور کی بھڑکائی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے لاکھوں کا نقصان ہوا۔ بہت سے بے زبان جانور زندہ جل کر مر گئے۔ پچاسوں لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑی جن میں تم بھی شامل ہو۔ شخص اپنی آگ کی تسکین اور اپنی طاقت کے اظہار کے لیے اس نے یہ آگ لگوائی ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ اسی دنیا میں اس کا مزہ چکھ لے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ اسے آپ کو بہت زیادہ معاش سمجھتا اور بد معاشی کی طاقت پر تمہیں کتنا غشی پڑی طاقت ہے۔“ تم لوگ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“

”نہیں سر! ہم آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے یہ نہیں کرنے دیں گے۔“ ہیلٹ کے نیچے تھمتاتے ہوئے چہرے والا نوجوان بولا۔ ان لوگوں کا اعزاز فیصلہ کن تھا۔ وہ مضبوطی سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں الجھ چسکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بہت ہی باخیر مظلوم ہوتے تھے۔

ایک اویز عمر اور سنجیدہ صورت نازنن بولا ”موجودہ اگر آپ اسے سزا دینی چاہتے ہیں تو قانونی طریقے سے دیں۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیں۔ رہت درج کرائیں۔“

میں نے تشہہ لگایا۔ غیر ارادی طور پر اس قسم میں زہریلا پن اور وحشت جھلک آئی۔ میں نے کہا ”آپ کے کہنے پر میں اسے ایسے ہی چھوڑ دیتا ہوں آپ اسے خواہ مخواہ جھڑپ کر کے لوگوں کا وقت اور دوسرے ضائع کرنا کہیں چھوڑنا چاہتے ہیں؟ اس قسم کے لوگوں کے معاملے میں اگر ہمارا قانون ہمارا نظام موثر ہوتا تو ان لوگوں کی تعداد اور ان کی طاقت دن بے دن بڑھتی نہ چلی جاتی۔ ہمارے قوانین اور ہمارے نظام نے شریف کو کمزور اور بزدل اور بد معاش کو منظم اور طاقتور بنایا ہے۔ مجھے ایسے بے وقوفانہ مشورے مت دیں۔ میرا اصول ہے ”اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔“

اس سے پہلے کے نازنن کوئی جواب دینا کسی نے مجھے پیچھے سے پکڑ کر زور سے کھینچنے کی کوشش کی۔ میرا توازن ذرا خراب ہوا۔ شاید غکار رفتی میری گرفت سے نکل کر گر جائے۔ لیکن میں سنبھل گیا۔ میں کافی دیر سے اس دہائی لاش جیسے بوجھ کو سر سے ہچکچاتے کرتا تھا۔

میں نے گردن ذرا موڑ کر دیکھا۔ وہ عظیم شخص اس کے چہرے وحشت تھی۔ آنکھیں بھٹی بھٹی سی تھیں۔ وہ ایک بار پیچھے نیچے کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”تمہارا دل غرور خراب نہیں کیا۔ یہ کیا کرنے لگے ہو۔۔۔!“

پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی ”میں۔۔۔ اسنے لوگوں کے سامنے تم پر حرکت کر کے کیا پکا ثبوت تیار کرنا چاہتے ہو؟ اس سے تو بڑے دیوانے ہی پوچھنا چاہیے کہ شرمیں چسپاں کرادو کہ غکار نہیں کو تمہیں قتل کیا ہے۔“

”اگر تم لوگوں کا اصرار یہی ہے تو میں اس کی جاں بخشی کر دیتا ہوں۔“ میں نے غکار کو زمین پر گھڑا کرتے ہوئے کہا ”ورنہ میری عدالت نے تو جائے واردات پر ہی اس کے جرم کی سزا سنائی تھی۔“

حقیقت یہ تھی کہ میرا ان سب کے سامنے غکار کو آگ میں پھینکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو اسے صرف ایک نفسیاتی جھٹکا دینا چاہتا تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ غکار کے حواس قفل تھے لیکن اس کی آنکھوں کی وحشت بتا رہی تھی کہ جو جھٹکا میں اسے دینا چاہتا تھا وہ اسے پہنچ چکا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اگر نازر ریگیز والوں اور عظیم نے مجھے نہ روکا ہوتا تو میں ضرور اسے آگ میں پھینک دیتا ہوتا جس کی پشیمانی دور سے بھی نہیں جھلسائے دے رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس جھٹکے کے بعد اس کی طاقت تو سلب ہو چکی تھی لیکن میری بات وہ ابھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

”دیکھا تم نے؟۔۔۔“ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا ”جس عظیم کو تم ناکہ دینے پر تلے ہوئے ہو“ اسی کی وجہ سے آج تمہاری جان بچی ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ اس کا جیڑا اب بھی ہوئے ہوئے قہر تھا رہا تھا۔ وہ محض آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گیا۔ میں اسے گریبان سے پکڑ کر تقریباً کھینچتا ہوا واپس لے آیا۔ استاد نور محمد نے اس کے چاندوں کو زمین پر اس پاس زمین پر اکڑوں بٹھایا ہوا تھا اور خوراجی تک سب مشین ممکن سنبھالے کھڑا تھا۔ اصطبل کے دونوں مسلح محافظ بھی درختوں کے عقب سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے بھی ان لوگوں پر راتھیلیں تالی ہوئی تھیں۔

”صاحب! کیا آگ ان لوگوں نے لگایا تھا؟“ ایک محافظ نے راتھل سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو شاید نہیں۔۔۔ لیکن انہی کے دوسرے بھائی بند ہوں گے۔“ میں نے کہا ”مگر اصل میں حکم دینے والا اور نفاذ کی جڑ یہ شخص ہے۔“ میں نے غکار کو آگے کر دیا۔

”صاحب! آپ ایک طرف ہو جائیں۔“ محافظ راتھل سیدھی کرتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اُم اس کو گولی مار دے گی۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

”لیکن تمہاری ماکن نے اسے معاف کر دیا ہے۔“ میں نے اس کی راتھل کی نال پر ہاتھ رکھ کر اسے بچا کرتے ہوئے کہا۔ محافظ نے سواہی نظروں سے عظیم کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے جھٹکے جھٹکے لہجے میں بولی ”جسرا قسم کو نایاب گلہ ان لوگوں

وہ طویل سانس لے کر بولی "تمہارے لیے تو ہر بات ہی اتنی کر بات ہوتی ہے۔"

"اب تمہارے لیے بھی ہونی چاہیے۔" میں نے کہا "کیا اس پر بھی تمہارے دل سے عمار رتی کا خوف نہیں نکلا؟ اس کی اکثر حرکت بے دخل دیکھ کر بھی تم نے اس سے ڈرنا نہیں چھوڑا؟"

"انج دیہہ اس کی تھوڑی سی حرکت ہی تمہیں تو اس کا نتیجہ نکلا ہے۔" عظیم نے آخر وہ اصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب اس کی زیادہ حرکت دیکھنی ہے تو نہ جانے کیا نتیجہ نکلے۔"

اس نے کمری سانس لے کر مسکرائے کی کو خوشی کی "لیکن خیر میں شکایت نہیں کہہ رہی۔ ظاہر ہے تم ہماری ہی وجہ سے اس معاملہ میں الجھے ہو اور اتنی زحمت اٹھا رہے ہو۔"

"بلکہ میری کو خوشی تو اب یہ ہے کہ اس کی توجہ تمہاری طرف سے ہٹ جائے اور اس کی دشمنی کا رخ میری طرف ہو جائے۔"

میں نے کہا "پھر میں زیادہ آسانی سے اس سے نمٹ لوں گا۔" رفتاً میں راجو کی طرف دیکھتے ہوئے چونک پڑا۔ اس

آنکھوں سے دو آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے اور ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا جو فائزر بیگم والوں کی کوشش

سے اب ہم دم پڑنے لگی تھی۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اگ کا پندرہن بجنے کے لیے کچھ بچائی نہیں تھا۔

"مت دو راجو! اب رونے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں اس کا بازو جھٹکتے ہوئے کہا۔ اسے خاصی تاخیر سے صدمے

احساس ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ عظیم کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ ایک بے حس آدمی تھا۔

وہ گھوٹ کر آواز میں بولا "میں نے ان بے زبانوں کی کبھی نہیں کی۔" کچھ بات ہے مجھے اس اصل کی کبھی کوئی خاص

نہیں رہی تھی۔ لیکن اب میں ان کے بارے میں سوچ رہا ہوں میرے دل کو جیسے کچھ ہوا ہے۔ یہ بے زبان جانور انسانوں کو

فائدے سے پہنچاتے ہیں زندگی بھر انسانوں نے ہمیں لاکھوں مصیبتوں دیا اور اب ہماری وجہ سے ہی یہ دردناک موت مر گئے۔ غلام

پر مجھے کڑے یاد آ رہا ہے۔ اس کا خوب صورت سراپا غلام گھوم رہا ہے۔ کیسا شاندار گھوڑا۔۔۔ کیسی بے بسی سے اس

میں تڑپ تڑپ کر مڑا ہو گا۔"

استاد نور محمد نے کھنکار کر گھاسا کیا اور تاباں گل کو وغیرہ سمیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "آپ لوگ ذرا سا

ساتھ آتا پھرنے کریں گے؟" انہوں نے ہم سب کو ہی مخاطب کیا "کہاں؟" عظیم نے پوچھا۔

"آپ آئیں تو کسی۔۔۔" ان کے لمحے میں اصرار تھا گاڑی میں ہی چلتے ہیں۔ اس وقت پیدل چلنا شاید آپ کو

گزرے۔"

میں استاد عظیم اور راجو میری ہی گاڑی میں بیٹھ کر ا

کو جانے دو۔ مجھے ان کی سورتیں دیکھ کر دشت ہو رہی ہے۔ میرا

بہت دل گھبرا رہا ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کی خلائی تو اب نہیں

ہو سکتی۔ اب جھگڑے کو پھیلانے سے کیا حاصل؟ اس طرح تو یہ

سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ ہم ان کے آدمی ہمارے گھر پر ہمارے

آدمی ہمارے گھر۔۔۔ پھر ہم ان کے آدمی ہمارے گھر۔ یہ سلسلہ کب

تک سہلے گا؟ کسی ایک کو تو اپنا ہاتھ روکنا ہی پڑے گا۔ ان کے

ساتھ چینی ہو گئی ہے وہی کافی ہے۔"

استاد نور محمد بولا "عظیم صاحب ٹھیک کہہ رہی ہے تاباں

گل!"

"ٹھیک اے۔۔۔ آپ مرضی کا مالک ہے صاحب!" تاباں گل

کے گھر پر برہنہ کے آثار تھے۔ اس نے پشت میں اپنے ساتھی

خائف سے بات شروع کر دی۔ تھوڑی بہت پشتو میری سمجھ میں آئی

تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ سانپ جب لاشی

کے نیچے آیا ہوا ہو تو اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اس کا سر پھل

والا نہ چاہیے۔ وہ اگر ڈھیلا پڑ گیا ہو تو یہ نہیں جھٹکنا چاہیے کہ اب

وہ اپنی فطرت سے باز آجائے گا۔ وہ جو کسی شے سے ڈرتا ہے

ڈنک مارے گا۔"

میں اس آن پڑھ سے آدمی کی اس دانشورانہ بات سے متعلق

تھا لیکن مصلحتوں کے تحت میں نے اپنی ذاتی عدالت انصاف کا

فیصلہ مؤخر کر دیا تھا۔ عمار رتی بالکل خاموش کھڑا تھا۔ میں نے

اس کے ہاتھ پر ہلکی سی ٹھوک کر رسید کرتے ہوئے کہا "جاؤ۔۔۔ اب

اپنے ان کاٹھ کے گلوں کو لے کر میاں سے بھاگ جاؤ۔ یہ جو

تمہارا ایک گلوں زخمی ہونے سے بچ گیا ہے، یہ گاڑی چلا لے گا۔

تمہارا اسلحہ ضبط کیا جا رہا ہے۔"

میں نے اس کی جیبوں سے بھی دونوں ہتھول نکال لئے "یہ

تمام اسلحہ تاباں گل اور اس کے ساتھی میں تقسیم کیا جائے گا۔ تم

لوگ خالی ہاتھ جاؤ گے۔ فی الحال تو صرف تمہارے ہاتھ خالی ہوں

گئے۔ لیکن اگر دوبارہ دھرم کا رخ کیا تو جاتے وقت تمہارے جسم بھی

روح سے خالی ہوں گے۔" میری بات سن کر تاباں گل اور اس

کے ساتھی کے چروں پر مسکراہٹ آگئی۔ اتنی اچھی قمیص ملنے کی خبر

ان کے لیے غالباً ایسی ہی تھی جیسے کسی بچے کے لیے کوئی بیش قیمت

کھلونہ ملنے کی خبر۔

عمار اور اس کے ساتھیوں میں ذرا بھی مزاحمت نہیں رہی

تھی۔ وہ بڑے ذمہ میں آئے تھے لیکن جو اتنی انہیں احساس ہوا تھا

کہ ان کا واسطہ کمزور لوگوں سے نہیں تھا بلکہ سن جھاگ کی طرح

بیٹھ گئے تھے عمار نے انہیں اشارہ کیا اور وہ کرتے پڑے سیاہ

مریٹھڑ کی طرف بڑھ گئے۔ چند لمحوں بعد مریٹھڑ نے پوئلک لیا اور

واپس روانہ ہو گئی۔

میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے عظیم کی طرف دیکھا اور کہا "بس

اتنی ہی بات تھی!"



کی انٹرنیٹ پر ایک کی خبر ہو گئی ہو۔ بلکہ انٹرنیٹ کے عوض تو انٹرنس کی رقم بھی مل جاتی ہے۔ ہمارا کمر تو یہ شدہ بھی نہیں تھا کوئی انٹرنس سینی اس کا انٹرنس کرنے کے لیے تیار نہیں تھی شاید اس کے پیچھے بھی بخاری کا ہاتھ رہا ہو۔

حکیم حفیظی سانس لے کر بولی ”ہمارے ساتھ ساتھ دیکھیں کورس سے باہر غیر قانونی شرمیں لگانے والے مارے جائیں گے۔ سنے اذان کی شرمیں بک کر چکے ہوں گے اور وہ اب منسوخ بھی نہیں ہو سکتیں۔ دیکھیں کورس میں دیکھیں کھینچنے والوں کے لیے تو اتنا فرق نہیں پڑے گا لیکن باہر نہ جانے کتنے لوگوں کا کلا کھول دے گا۔“

اس دوران ہم استاد نور محمد کی رہنمائی میں کئی بستی میں پہنچ چکے تھے۔ پہلی دو تین گلیاں ذرا کشادہ تھیں۔ ان سے ہم گزر گئے پھر سامنے ایک تنگ سی گلی تھی اس سے گاڑی نہیں گزر سکتی تھی۔

”جس... یہاں دیوار کے ساتھ گاڑی کھڑی کر دیجئے۔“ استاد نے ہدایت کی پھر گاڑی سے اتر کر ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ گلیوں میں اندھا جھانک رہے تھے ہم چاندنی کی وجہ سے راستہ قدرے آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ کئی گلی میں دونوں طرف ٹالیاں تھیں بیشتر کانوں پر ٹاٹ کے پردے لگے ہوئے تھے۔

رہنمائی میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ آخر وہ اصل کی گرد و پاشا پکڑا کر ہم ایک میدان سے گزرے جس میں کھیں کھیں پانی ٹکڑا تھا۔ پھر ہم ایک متروک کیف سے گزرے جس میں بھار بھکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ استاد ہمیں اصل کی مقب میں کچھ فاصلے پر رافٹ کی بستی میں لے جا رہے تھے۔

راجہ کا ذہن بدستور فکر کے مودے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بڑھانے کے سے انداز میں بولا ”اس خبیث... مردود... بخارنے یہ درد کی دکھانے کے لیے دن بھی ڈکایا جن کر منتخب کیا۔ کل شام اسے سالانہ دیکھ میں حصہ لیتا تھا۔ سالانہ دیکھ پر بہت بھاری جمع ہوتا ہے۔ دیکھ کو اس کی اور باہر کی سب شرطوں کو ملا کر دیکھا جائے تو چند گھنٹوں میں کدو ٹول دودھ اور سرے اوجھر ہو جاتا ہے۔ آج تو بے چارے فکر کی اخباروں میں تصویر بھی چھپی تھی۔ کئی اسے دیکھ میں موجود نہ پا کر تماشائیوں اور اس کے شیدائیوں پر نہ جانے کیا کرے گی۔“

اس نے دھمال نکال کر آکھیں پوچھیں۔ میں نے مرکز دیکھا حکیم انور کی سے سر جھکائے بٹھی تھی شاید اس نے بھی بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے ہوئے تھے۔ وہ ہر حال راجہ سے زیادہ حوصلے والی عورت تھی۔ گاڑی کا ہمارا کپے راستے پر پھنکے لے کھاری تھیں۔ استاد میری طرف دیکھتے ہوئے عذرت خواہانہ سے لمبے میں بولے ”اس طرف مرکز تو کیا کوئی ڈھنگ کی کھڑکی بھی نہیں ہے۔ گاڑی کو اوجھر لانا تو نہیں چاہیے تھا لیکن میں نے سوچا جو حالات بہت کچھ ہیں ان کے بعد اب شاید آپ لوگوں کو پیدل چلتے ہوئے کوٹ ہو۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے کہا ”یہ گاڑی ہر طرح کے راستوں پر چل سکتی ہے۔ یہاں رفتار البتہ کچھ سی جتنی رکھنی پڑے گی۔“

پھر میں نے ایک نظر راجہ اور حکیم کی طرف دیکھا ”کل فکر کے نہ ہونے سے سالانہ دیکھ تو میرا خیال ہے نہ دبلا ہو جائے گی۔“

”مالی لحاظ سے تو صرف یہ فرق پڑے گا کہ دولت کا بڑا ہمارے بجائے مجموعی طور پر بخار کی طرف ہو جائے گا۔“ راجہ دھمال سے ٹاک رکھتے ہوئے بولا ”اس کے بھی دو گھوڑے بہت اچھے ہیں۔ سلور ٹیلٹ... اور لمبے بڑے۔ دگر کے فوراً بعد انہی کی پوزیشن ہے۔ دگر کی وجہ سے وہ ابھر نہیں پاتے تھے۔ اب ان کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ دیکھ کورس میں لگنے والی نانوے فیصد شرطوں کا رخ ان کی طرف ہو جائے گا۔ دگر کے بیٹے پر صرف محصول پر شیخ بخار کے اکاؤنٹ میں باقی تھی۔ سلور ٹیلٹ اور لمبے بڑے ہتھ کمانیں کے وہ سارا کاسار اس کا حصہ ہو گا۔ دوسرے گھوڑوں کی پرستش اس کی علاوہ ہوگی۔ راتوں رات اسے لاکھوں کا فائدہ ہو جائے گا اور ہماری پوزیشن اس صنعت کار کی سی ہو جائے گی جس

ڈاکٹر محمد علامہ اقبال

بال جبریل

قیمت: 30/-

ڈاکٹر محمد علامہ اقبال

ضربِ کلیم

قیمت: 40/-

ڈاکٹر محمد علامہ اقبال

بانگِ درا

قیمت: 60/-

ڈاکٹر محمد علامہ اقبال

شاعرِ امروز و فردا

قیمت: 150/-

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

استاد بھی بہت برتا تھا۔ اس لیے انہیں بھی میرے اس معمول کا  
خبر نہیں ہو سکی۔ آج میری یہ احتیاد کام آئی گئی۔

”بیوہ استاد... جیہ... استاد نور محمد زندہ باد“ راجو نے سنی  
تھنی کی تو راز میں غور کیا اور نہایت پرورش انداز میں آگے بڑھ  
کر استاد کو گود میں اٹھایا۔ اس نے استاد کو دو تین چمکے دے  
ڈالے۔ استاد بکے پھٹکے آوی گئے اس لیے راجو جیسے مختصر الوجہ  
نے بھی انہیں اس طرح اٹھا کر پکڑے ڈالے۔ جوش سے اس کو  
چہرہ تھمرا رہا تھا استاد کو زمین پر گھڑا کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ کر کھچ  
کو زور سے تھپتھپاتے ہوئے بولا ”آج ہمارا شیر میدان میں دوڑے  
گا۔ بھڑکے پھٹنے پر سوگند دے گا۔“

”شکر ہے میری محنت رانیاں نہیں گئی۔“ استاد بولے۔  
”لیکن استاد! آپ نے ہمیں بھی نہیں بتایا کہ آپ یہ  
احتیاد کر رہے تھے۔“ راجو ان کی طرف منہ کر کے بولا ”کراہ  
دیوہ بھی آپ اپنے لیے سے دے رہے تھے؟ کدو کی آپ نے؟“  
اس کے لیے میں پیار بھرا شکوہ تھا۔

”میں نے سوچا تھا اگر کسی کسی کی نظر میں آگیا تو تباہی کا۔  
ری کرانے (دیوہ) بات تو سوسوہ صینہ کون سا ایسا بڑا مسئلہ تھا۔  
آپ نے آج تک نہ جانے کتنی مرتبہ ہزاروں دیوہ بھیج کر حساب  
کتاب کے مجھ پر خرچ کیا ہے۔ اور وہ وقت تو میں کبھی بھول  
نہیں سکتا جب میری بیوی اسپتال میں مر رہی تھی اور بیکم صاحب  
چوبیس گھنٹے اس کے سرہانے بیٹھی رہی تھی۔ نوٹوں سے بھرا ہو  
پر اس انہوں نے غلٹی کر دیا تھا۔ ایک ایک ڈاکٹر کو پکڑ کر اس کی منہ  
کی کھجی کر کسی طرح میری بیوی کی جان بچائی جائے۔ میں ان باتوں  
بھول تو نہیں سکتا راجو صاحب!“

”چھوڑے ان باتوں کو۔“ غم میں ان کا کندھا تھپک کر بولی  
تو میں اتنا کہوں گی کہ استاد آخر استاد ہوتا ہے۔“

میں بھی دل ہی دل میں قائل ہو گیا تھا کہ استاد نے واقعی بڑا  
استاد دکھائی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت مختار رفیق اپنا  
میں ہو گا جب اسے خبر ملے گی کہ کل سالانہ ریس میں دوڑا ہے  
میں چشم تصور سے دیکھنے کو کوشش کر رہا تھا کہ اس وقت اس کی  
کیسٹ ہوگی یہ قصور خاما مخلوط کن تھا۔

راجو نے استاد کو مخاطب کیا ”اصطبل کی صفائی ستھرائی وغ  
میں تو شاید خاما وقت لگ جائے۔ اس کے بعد میرا خیال ہے مختار  
پتائے بڑے دو تین گھنٹوں کی رہائش کے لیے کسٹ رکھ کر آگے  
گئے۔ مستحق میں اگر کبھی ہمارے پاس زیادہ گھوڑے ہوتے تو  
جائے گا۔ جب تک وہاں صفائی دیوہ نہیں ہو جاتی تب تک آ  
بکری رہا کٹس کے لیے ہمیں اس کے شایان شان بندوبست کر لیم  
گا۔ زور بھی ہمیں نصیحت کر دین لیکن اس سے کہیں کسی کی نظر  
نہ نہ آئیں تو ہمزہ ہو گا۔ یہ بات پہلے نہ پائے کہ یہاں کسی  
گھوڑے کو رکھا گیا ہے۔ انکرا ساز کے لیے اسے آپ فر

”استاد آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟“ غم میں منٹائی۔  
”میں لے جا رہا ہوں تو کسی اچھی جگہ ہی لے جا رہا ہوں  
گا۔“ استاد نے جواب دیا۔

کلی مختصر تھی۔ چند قدم چل کر ہم اس کے اختتام تک پہنچ  
گئے وہاں دوسرے مکانوں سے ذرا ہٹ کر ایک مکان نظر آ رہا تھا۔  
اس کی چار دیواری نیم پختہ اور خاصی اونچی تھی۔ اس کے  
دروازے پر پائت کا پردہ نہیں تھا۔ دروازہ بھی خاما اوچھا مضبوط  
اور نیا تھا۔ اس کی کتھڑی میں ایک بڑا موٹا سا آلہ لٹکا ہوا تھا۔

استاد نے جیب سے چابی نکال کر آلا کھولا اور ہم ان کی  
رہنمائی میں اندر پہنچے۔ مکان کی چار دیواری نے خاصی بڑی جگہ  
گھیری ہوئی تھی لیکن اس میں کرا ایک سی تھا۔ وہ پختہ اینٹوں کا بنا  
ہوا کھڑا تھا جس کی دیواروں میں پرانی طرز کی سیدھی سادی کھڑکیاں  
نظر آ رہی تھیں۔ ان میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی  
تھیں۔ کھڑکیاں کھلی ہی تھیں لیکن کمرے میں آکر یہی تھی اس لیے  
کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر بھی لٹکا تھا۔

استاد نے وہ دروازہ بھی کھولا اور دیا سلائی ڈال لیکن میں دیا  
سلائی چلنے سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ وہاں کیا تھا۔ دیا سلائی چلنے کی  
پکلی سی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں گھوڑے کی جنتا بہت گونج  
اٹھی تھی۔ تاریکی موٹھی پھیلی تو بکر بچھلی دیوار کے ساتھ اپنے  
مخصوص ٹرنٹ انداز میں سر اٹھائے کھڑا نظر آیا۔ اس کی بڑی  
بڑی سیاہ آنکھوں میں شک کے سامنے تھے جیسے وہ ابھن میں ہو کہ  
رات سے پچھلے پر ہم اس کے کمرے میں کیوں تھے پہلے آ رہے  
تھے۔ کمرے میں گھوڑے کے راتب کے لیے بڑی سی ٹانڈ اور پانی کی  
پانی بھی موجود تھی۔

بکر پر نظر پڑے ہی راجو کو سکتے سا ہو گیا اور غم کے حلق سے  
بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑکی گردن میں  
تقریباً بھولی گئی تھی۔ مگر بھی سرت آہر سے انداز میں ہنسنے اور  
اس کے کندھے پر تھو جھتی رگڑنے لگے۔ استاد نے کمرے میں موجود  
لاٹین روشن کر دی۔ تب راجو کے ہونٹوں سے سرسراہٹ ہوئی سی  
آواز نکلی ”کیا بکر واقعی زندہ ہے؟ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ  
رہا؟“

”نہیں راجو صاحب! یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔“ استاد  
نور محمد مسکرائے ”مجھے مختار رفیق کی طرف سے کافی عرصے سے خطرو  
تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ بکری زندگی خطرے میں ہے۔ کچھ عرصے  
پہلے ہی میں نے یہ مکان صرف سو دوپے صینہ پر اس ہستی میں  
گرائے پر لیا تھا۔ رات گئے میں پکے سے بکر کو اصطبل کے پچھلے  
دروازے سے نکال کر یہاں لاکر باندھ دیتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول  
تھا اور میں نے کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوائی تھی۔  
میں اپنے سامنے سے بھی ہوشیار رہتا چلتا تھا۔ چونکہ ابھی کچھ نہ  
نظر رکھتے نہیں تھے۔ اچانک میں ہی غشت کرتے رہتے تھے۔ سن

تھا۔ "راجہ بولا ۳۳" یہ دیکھ کر اور بھی اطمینان ہو گیا ہے کہ تم جیسا یا میری مدد کے لیے موجود ہے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا تم ہر لحاظ سے اتنے طاقتور ہو گئے ہو۔ مجھے اب کسی سے ڈسنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"خیم بولی" لگتا ہے تمہیں اس قسم کے معاملات کا بہت تجربہ ہے۔ تم آدمیوں کا بندوبست کر کے چلے تھے۔ ہمیں تو ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ تمہارے آدمی آس پاس کیسے چھپے ہوئے ہیں۔"

"اگر تمہیں احساس ہو جاتا تو پھر وہ سروں کو بھی ہو سکتا تھا۔ اس طرح تو لینے کے دینے نہ سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اندازہ تھا کہ تمہارے اپنے گروں کے ساتھ یہاں پہنچے گا؟" راجہ نے پوچھا۔

"مجھے تو قلعہ تو نہیں تھی۔" میں نے اعتراف کیا "میرا خیال تھا کہ اس نے جو کچھ تھا کر لیا۔ یعنی آگ لگوا دی۔ اب وہ آرام سے گھر بیٹھ کر صبح کا انتظار کرے گا۔ لیکن محض اسی لمحے میں نے اپنے آدمیوں کو پیچھے پیچھے آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ میری احتیاط اکثر کام آتی جاتی ہے۔"

"اگر وہ لوگ بروقت نہ آتے تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔" خیم بولی۔

"پھر بھی شاید ہم پر اوپر والے کا کرم ہی رہتا۔" میں نے کہا "ان سے بچنا تو ہم نے خود ہی لیا تھا ورنہ تمہارے چاہہ تو اپنی لگوائی ہوئی آگ اور ہماری بے بسی کے نظارے سے لطف اندوز ہونے ہی آیا تھا۔ میں نے سوچا اب وہ اتنے شہرت سے رات کے پچھلے پیر سوٹ بوٹ پہن کر آئی گیا ہے تو اسے تو خود اسامیتوں سے ہی دیا جائے۔ ویسے وہ اور اس کے گرگے میرے اندازوں سے زیادہ بڑے نکلے۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو، ہم نہیں۔" راجہ بولا "ہماری درگت بنانے کے لیے تو ہی کافی تھے۔"

"ہم واپس وہیں پہنچ چکے تھے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ آگ تقریباً..... بجھائی جا چکی تھی۔ اب وہاں مجھے ہونے کو کھولیں اور سیاہ لہجے کے ڈھیر میں کیس کیس کوئی دیوار یا لوہے کا کوئی ڈھانچا کھڑا رکھائی دے رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کی ایک گاڑی کسی ہائیڈرینٹ سے مزید پانی لینے لگی ہوئی تھی۔"

"ہمیں وہاں مختلف چکروں سے فارغ ہو کر واپس آتے آتے دن کا ایک بج چکا نہیں ہے خیم اور راجہ کو ان کے گھر آنا۔ خیم ہند تھی کہ میں ان کے ہاں چلوں لیکن میں نے مضرت کی اور گھر آکر کھانے کے بعد سو گیا۔"

میری شامیں بھی عام طور پر مصروف ہی ہوتی تھیں، کبھی کوئی کاروباری یا غیر کاروباری دفتر، کبھی کوئی تقریب، کبھی کوئی رسمی یا غیر رسمی مینگن۔ جس روز کوئی مصروفیت نہیں ہوتی تھی اس روز میں

میدان میں لے جایا کریں۔

"میراں باتوں کی آپ فکر نہ کریں۔" استاد بے پروائی سے بولے "ان سب انتظامات کے بارے میں میں نے سوچا ہوا ہے۔ بس شکر کا مقام یہ ہے کہ آج ہم بڑے نقصان سے بچ گئے۔"

"مجھے تو ان بے چارے گھوڑوں کا بھی الحوس ہے جو جل کر مر گئے۔" میں نے کہا "ان کو محض اس لیے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا اب رہیں میں کوئی مقام نہیں رہا تھا۔"

"تم درست کہہ رہے ہو افضل! خیم کمری عیسیٰ کی سے بولی "ان کا الحوس بھی میرے دل سے نکلے گا تو نہیں۔ ویسے بھی وہ سب کے سب بے گناہ نہیں تھے۔ ان میں سے چند ایک تو اب بھی کبھی کبھار رہیں میں صبر دیتے رہتے تھے۔ وہ سب کے سب ہمارے دوست تھے، رشتہ تھے، محسن تھے۔ ان بے زبانوں میں بھی ہماری طرح جان تھی۔ لیکن تم نے تمہارے اس کے ساتھیوں کی جو درگت بنائی اور جس طرح ان کی آنکھوں کو کالی اس سے میرے دل میں گھوڑوں کی دردناک موت کا غم کچھ کم ہو گیا ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ دوسرا اور تیسرا مختلف تاریک اور نیم تاریک کوشن میں مختلف چیزوں کی آڑ میں چند اور سائے بھی حرکت میں تھے جن کی موجودگی سے استاد خیم اور راجہ بے خبر تھے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ میرے ساتھی اصل میں اسے آس پاس جہاں جہاں چھپے ہوئے تھے اب بھی وہیں چھپے ہوئے تھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے وہ ہمارے ساتھ ہی متحرک تھے۔

راستے میں خیم بولی "ہو سکتا ہے اب تمہارا ڈر وائل پیلے سے زیادہ شدید ہو۔ شاید اب وہ زندگی یا موت کی بازی کھیلے۔"

"اس کے جسم میں موت ہی آئے گی۔" میں نے کہا "تم دونوں یہاں بیوی اب اسے ذہن سے جھٹک دو۔ وہ اب میرا دروسر ہے۔ تم اب یہ بھی اطمینان رکھو کہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمہاری حفاظت کے لیے میرے جو دو آدمی تعینات ہیں وہ لایا اس کے گروں جیسے بیروں آدمیوں کے لیے کافی ہیں۔"

"ہم ان کم میں اب خوف زدہ نہیں ہوں۔" خیم بولی "آج جو کچھ ہوا اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ تمہارا خوف یکایک ہی میرے دل سے نکل گیا ہے۔"

"میرے لیے بس اتنی کافی ہے۔ اس سے میرا کام آسان دجائے گا۔ ورنہ میرے لیے یہی الجھن رہا کرتی کہ تمہارا کوئی بندوبست کروں یا تمہاری کچھ دور کروں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے گردن جھکا کر ایک نظر راجہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

"تمہارا کیا حال ہے؟ تمہارا بھی خوف وغیرہ دور ہوا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو پہلے ہی اپنے آپ کو تنہا ہی چھوڑا ہوا



ہو جائے "میں نے کہا۔

"تم مجھے کس کام پر لگا رہے ہو۔" وہ کراہ کر بولی "میں تو یہاں بڑس کرنے آئی تھی۔"

"یہ بھی بڑس ہی ہے دنیا کو خبیثوں سے پاک کرنا۔" میں نے کہا۔

"کہاں تک پاک کرو گے دنیا کو خبیثوں سے۔" وہ آہ بھر کر بولی "خبیثوں کو ختم کرنے کے لیے پاکم از کم انہیں خباثت سے روکنے کے لیے دنیا میں صدیوں سے اسی طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ منظم ادارے بنائے جاتے رہے ہیں۔ قوانین بنائے جاتے رہے ہیں۔ اسی بات سے لوگ انفرادی اور اجتماعی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ مذہبی سطح پر بھی کوششیں ہوتی رہی ہیں مگر خبیثوں کی تعداد بے حد بڑھتی جا رہی ہے اب تو ہر جگہ ہر رنگ میں ہر روپ میں ایک سے ایک بڑھ کر خبیث موجود ہے بعض اوقات تو فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون بڑا خبیث ہے ان حالات میں تم اکیلے کیا کرو گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جلا تامل جواب دیا "میں کب سارے خبیثوں کی بات کرنا ہوں۔ یہ میرے بس کی بات کمال۔ میں تو صرف ان خبیثوں کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھاتا ہوں جو ہمارا جینا دو بھر کر دیتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں بھی انتہائی قدم اس وقت اٹھاتا ہوں جب زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی "اچھا خیر۔" صبح میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

سلسلہ منقطع کر کے میں نے انوار سے رابطہ قائم کیا۔ انوار فلفلی دنیا کا بہترین میک آپ میں تھا مجھے اتفاق نے اس سے ملوایا تھا۔ میں نے اس کے کام اور کردار کو اچھی طرح پرکھنے کے بعد اسے اپنے آدمیوں میں شامل کر دیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بوقت ضرورت ہمیں کسی قسم کی تکنیکی مدد فراہم کرتے تھے اور جن پر ہر قسم کے حالات میں بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ ملکی زندگی میں وہ مختلف شعبوں میں سرگرم عمل تھے اپنے اپنے ہنر کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی ذریعہ معاشی اعتبار کیے ہوئے تھے لیکن ان کی وفاداریاں مجھ سے وابستہ تھیں کچھ مفادات کا رشتہ بھی تھا لیکن میری کوشش تھی کہ وہ صرف مفادات کی ذبحی میں نہ بندھے رہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی میرے وفادار رہیں ایسا نہ ہو کہ مفادات کی ذبحی ٹوٹے تو وہ میرا ساتھ چھوڑ جائیں۔ انوار ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

میں نے اسے صبح گھڑی موجود رہنے اور کچھ تیاریاں مکمل کر کے رکھنے کی ہدایات دیں پھر ٹیلی سے رابطہ قائم کر کے اسے صورت حال سمجھائی اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ عظیم اور دراز کے اصلیں والی صورت حال کی طرح اس صورتحال کو بھی سوچنے کی مناسبت سے سنبھال لے گا وہ خوش تھا کہ میں نے اہم شیر کے سلسلے

میں کوئی حتمی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عالم شیر سے ٹوٹی کو بھی بڑی غرت تھی لیکن دیگر معاملات کی طرح وہ اس معاملے میں بھی مکمل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ وہ جھیل کی طرح پُر سکون رہنے والا نوجوان تھا۔ اسے سب کچھ سمجھانے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوسرے روز میں ایک عام گاڑی میں جینہ کر گھر سے نکلا۔ مجھے معلوم تھا عالم شیر میری خاص گاڑی کو پہچانتا تھا۔ میں معمولی سی شلوار قمیص میں تھا وہ نہ ہونے سے پہلے میں نے راجیلہ کو فون کر دیا تھا۔ میں اس کے ہاں پہنچا تو وہ تیار بیٹھی تھی وہ ایک بار پھر کانچ کے یونیفارم جیسی سفید شلوار قمیص اور جوکرز پینے بیٹھی تھی۔ گفتا تھا کہ آج کل اسے یہ لباس اور جوکرز کچھ زیادہ ہی پسند آگئے تھے۔ "جوکرز تو ٹھیک ہیں۔" میں نے اس کا سر ہاتھ پا جائزہ لیتے ہوئے کہا "لیکن یہ شلوار قمیص نہیں چلے گی۔ تمہیں تو آج ایک امریکن لڑکی کا روپ اختیار کرنا ہے تمہارے پاس کچھ اس طرح کے لباسات نہیں پڑے جیسے تم یونیورسٹی کے زمانے میں پہنتی تھیں؟ کوئی چیز۔ اسپورٹس شرٹ وغیرہ۔"

"اچھا۔ تو آج تمہارا عالم شیر کے ساتھ وہ ڈولی والا ڈراما کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ میرا مقصد سمجھتے ہوئے بولی "تم نے مجھے صرف تیار رہنے کے لیے کہا تھا۔ وضاحت نہیں کی تھی۔ ورنہ میرے پاس تو ہر قسم کے لباسات موجود ہیں۔"

وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ ڈراما ٹک دم میں واپس آئی تو اس کا لباس فلفلی مختلف تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شخصیت کا تاثر بالکل بدل گیا تھا۔ وہ ساٹھ ستر فیصد امریکن نظر آنے لگی تھی۔ مجھے امید تھی کہ باقی کمر انوار جیسے ماہر فن میک آپ میں کی خدمات حاصل ہونے کے بعد پوری ہو جائے گی۔

میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور انوار کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں میں نے اسے تمام ضروری باتیں سمجھا کر شروع کر دیں۔ وہ سب کچھ ذہن نشین کرتی جا رہی تھی میں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ اگر عالم شیر کوئی غیر متوقع سوال کر ڈالے یا راجیلہ ویسے ہی کسی بات پر اٹکے لگے تو اسے کیا کرنا ہو گا؟

"تم مطمئن رہو۔ یہ ڈراما میرے لیے زیادہ مشکل نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

آخر ہم انوار کے گھر باپنجہ اس کے گھر کے ایک بظاہر معصی سے کمرے میں میک آپ کا اعلیٰ ترین اسپورٹس ڈیل سامان موجود تھا۔ ایک کھینے بعد ہم انوار کے گھر سے نکلے تو ہمارے ٹیلی بالکل ہی تبدیل ہو چکے تھے۔

راجیلہ اب واقعی مکمل طور پر ایک توامہ کرد امریکی لڑکی دکھائی دے رہی تھی اور میں ایک بانٹش آئن پڑھ سا ڈراما جو جس کے سر پر کافی ٹوٹی تھی بیروں میں پٹاری چل اور گلے میں منظر۔ راجیلہ گھر سے ایک بیک بھی لے کر چلی تھی جو اب اس کے

کھدے پر زیادہ بچ رہا تھا۔

راتے میں ہم مزد بائیں کرتے رہے اور بالآخر شہر سے دور ویران سے علاقے میں داخل اس جنگل میں جا پہنچے جو میں راجیلہ کو دکھانا چاہتا تھا۔ چند منٹ سستانے کے بعد میں نے ٹیلیفون راجیلہ کے سامنے لا رکھا۔ دوسرے کمرے میں اس کی ایکسٹینشن بھی موجود تھی وہ میں اپنے لیے اٹھا لیا۔

راجیلہ نے میرا دیا ہوا نمبر ڈائل کرنے کے چند لمحوں بعد جو خفیہ لائن "کما" میں نے بھی ایکسٹینشن کا ریسپور اٹھا لیا۔ ایکسٹینشن اٹھانے پر چونکہ دوسری طرف والے کو معمولی سی کلک کے ساتھ آواز بجی سنا کی دینے لگتی ہے اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ منٹگر شروع ہونے کے بعد ایکسٹینشن اٹھاؤں۔ کوئی مجھو سا نہیں تھا کہ دوسری طرف بات کرنے والا اس معمولی سی چیز کو محسوس کر لیتا۔ میں نے مانتھ چین پر ہاتھ رکھ لیا اب میں دونوں کی منگھوس سن سکتا تھا۔

"ہیلو۔۔۔؟ دوسری طرف سے ایک کھردری اور بھاری آواز سنائی دی۔

میری پڑایت کے مطابق راجیلہ نے خاص امر کی بجائے میں انگریزی میں بات شروع کی۔ "میں عالم شیر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"دوسری طرف سے بات کرنے والا کچھ کڑ بڑایا شاید اسے راجیلہ کے لیے کی وجہ سے بات سمجھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ پھر وہ انگریزی میں جواب دینے پر قادر نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا "ایک منٹ۔۔۔" پھر اس نے ریسپور کسی اور کو پکڑا دیا۔ "آواز اس کی بھی بھاری اور کھردری تھی۔ راجیلہ نے اپنا سوال دہرایا۔ "عالم شیر ہے۔۔۔؟" وہ کون ہے؟ یہاں تو کوئی عالم شیر نہیں رہتا۔" بڑی مصوحت سے جواب ملا۔ وہ خامی ردائی سے انگریزی بول رہا تھا۔

"دیکھو؟ مجھے پریشان مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ یہ نمبر عالم شیر نے خود خاص طور پر مجھے دیا تھا۔" راجیلہ بولی۔

"یہ بہت پہلے کی بات ہوگی محترمہ۔" وہ ملاٹت سے بولا۔ "ہاں۔ بات تو کافی عرصہ پہلے کی ہے لیکن مجھے معلوم ہے یہ عالم شیر کا نمبر۔ دیکھو۔۔۔ اگر تم عالم شیر کے تھوڑے سے بھی خاص آدمی ہو تو شاید تمہارے لیے میرا نام شناسا ہو۔ میں ڈوئی بول رہی ہوں۔ لاس ویگاس والی ڈوئی۔"

اس شخص نے فوری طور پر کسی قدر عمل کا اہتمام نہیں کیا ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر محتاطانہ لہجے میں بولا "آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں۔ میں عالم شیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کچھ بتا سکیں تو چہرہ منٹ بعد آپ کو اطلاع مل جائے گی۔"

راجیلہ نے فوراً نمبر اسے لکھوا دیا اور منت بولی "دیکھو۔ میری خاطر اسے تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرنا میرا اس سے رابطہ بہت ضروری ہے۔ کاش تم سمجھ سکتے۔" "آپ اطمینان رکھیں محترمہ۔" وہ بدستور محتاطانہ لہجے بولا "چند منٹ میں آپ کو کوئی نہ کوئی اطلاع ضرور مل جائے گی خدا حافظ۔"

ہم دونوں کان سے ریسپور لگائے ایک دوسرے کی طرف رہے تھے راجیلہ نے خدا حافظ کہہ کر سگراتے ہوئے ریسپور دیا اور رائے طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ابتدائی ٹیسٹ میں تو تم کامیاب ہو گئی ہو۔" میں۔ "کما" اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم آسانی سے اصل مرحلہ بھی کر جاؤ گی۔"

میں اٹھ کر ڈرنک ٹینل کے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اپنا جائزہ لینے لگا۔ میں واقعی خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان تھا۔ انوار واقعی اپنے فن میں بادشاہ تھا اس کے کیے ہوئے میک اپ کی سب سے بڑی خلیا یہ تھی کہ اس پر میک اپ کا شہ یک ضیہ مگر آقا قادر نے فلوں میں تو میک اپ میں جو میک اپ کرتے۔ اسے تو اسکرین پر دیکھ کر بھی اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی سیر ہو چکا کہ کھڑ کر پڑے گی یا دلن کی سفید بھوس کھانے کی پلیٹ میں جا کر پس گی۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ فٹ پاتھ سے باہر آنے والی داڑھی لے کر کسی اداکار کے چپکادی گئی ہے۔

راجیلہ کو بھی پہچانا بہت مشکل تھا۔ میں نے اسے سکرین ایک پکٹ بھی دے دیا تھا اور پڑایت کی تھی کہ عالم شیر کا سا کرتے وقت اس کے ہاتھ میں سکرین ضرور ہونی چاہیے اور اسے سکرین نوٹی کے معاملے میں انڈی نظر نہیں آتا چاہیے۔ اس مجھے دو چار پکٹ دکھا کر کھائے اس کے انداز میں انڈی بن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف تھوڑی سی "بد معاشی" کی کئی تھی ڈوئی جیسی لڑکی کا جو تصور میرے ذہن میں تھا اس کے مطابق اس کے چہرے پر وہ ملاٹت اور معززانی یہ پکٹ نہیں ہونی چاہیے جو جو کر تھی۔

راجیلہ کا کہنا تھا کہ وقت آنے پر وہ اپنی اداکاری سے اسے آپ کو پوری پوری "بد معاشی" ظاہر کر دے گی۔ میرا حال یہ کوا بہت زیادہ ضروری بھی نہیں تھا۔ مجھے اطمینان یہ تھا کہ عالم شیر اصل ڈوئی کو بھی دیکھا ہوا نہیں تھا۔ اس لیے تھوڑی بہت خامیاں چل سکتی تھیں۔ بلکہ جنہیں میں "خامیاں" سمجھ رہا تھا وہ عالم شیر آنکھوں کو چندھیا کے کاسب بن سکتی تھیں۔

امید تو مجھے یہ تھی کہ عالم شیر آج ہی دوڑا ہوا آئے گا لیکن اگر کسی وجہ سے پروگرام کل پر جا پڑے تو ہم دوبارہ بھی یہاں آئے تھے اس صورت میں ہمیں صرف اپنا ایک اپ دوبارہ کرنا پڑتا۔ از کم اسے درس نہ ضرور کرنا پڑتا۔

اطلاع نہیں بھجوا سکتی تھیں؟

”ان دونوں دہاں منشیات کے خاص کیسوں کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی تھی، میری پہچانی دنیا سے پہلے رابطہ بالکل کاٹ دیا گیا تھا۔ ترکی کی حکومت منشیات کے اکثر پیشکش اسٹورز سے بری طرح ارباب تک تھی۔ مجھے کانڈہ کا ایک پڑھ تک فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کانہیں چلا تو مجھے موت کی سزا دے دیے تو میری خوش قسمتی ہے کہ تین سال میں میری جان بچوت گئی ہے۔“

رابطہ بڑی کامیابی سے فی الحال فون پر ڈولی کا کردار ادا کر رہی تھی۔ دفعہ اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا یہ ٹیلیفون محفوظ ہے؟“

”ہاں۔ محفوظ تو ہے۔“ عالم شہر ہوا اس کے بازو جو یہ ساری باتیں فون پر کرنا مناسب نہیں ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

رابطہ نے اسے پچھلے کا مکمل وقوعہ سنبھالا اور بولی ”راستوں دھبہ کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات خود بھی نہیں ہیں۔“ جس میں معلوم ہے میں یہاں ابھی ہوں وہ تو شکر ہے یہاں جمال بیگ نے میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ اس نے مجھے ایک گاڑی اور ڈرائیور بھی دیا ہے۔“

جمال بیگ پاکستان میں ڈرگ ٹرانزاکشن کا خاص آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عالم شہر کو اس کا نام سن کر ہمارے ڈرائے کے حتمی ہونے کا زیادہ یقین ہو جائے گا۔ لیکن وہ جمال بیگ سے کسی بات کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں میں ایٹن گئے کاہر تھا۔ شاید یہ بھی ڈرگ افایا کی ایک حکمت عملی تھی۔ وہ ”ہوا“ اور حکومت کو ”کی پالیسی پر نہایت مہم کی سے عمل کرتی تھی اور ہماری قوم اس کام میں پہلے ہی سے بہت ماہر چل آ رہی تھی۔ جائز یا ناجائز، ہر کام کے سلسلے میں ہمارے لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مذہب دینا میں بے مقصد خونریزی سے بچنے کی سب سے زیادہ تلقین کرتا ہے لیکن یہاں مذہب کے نام پر بھی سب ایک دوسرے کو شہادت کے مرتبے پر فائز کرنے پر کمر بستہ رہتے تھے۔ ناجائز و حلال کا تو ذکر ہی کیا!

آہم جمال بیگ اور عالم شہر کی رقابت زیادہ تر کاویا کی حدود میں ہی راتی تھی۔ دونوں براہ راست تصادم سے گریزی کرتے تھے۔ شاید اس لیے زیادہ گہرائی میں دونوں کی جڑیں کسی ایک ہی جگہ جا کر ملتی تھیں۔ جمال بیگ، سر حال عالم شہر سے بڑا اسٹور اور زیادہ خطرناک آدمی تھا۔

جمال بیگ کا نام سن کر عالم شہر کو گویا جھٹکا سا لگا۔ وہ مجروح سے لے میں ہوا ”یہ“ جس میں جمال بیگ کی پناہ میں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ میں مر گیا تھا کیا؟“

”میں کل سے تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن تمہارے پاس نہیں چل رہا تھا۔“ رابطہ بولی۔

”میں آج کل سحر عام سے تقریباً غائب ہوں۔“ عالم شہر نے حلیمہ کہا۔

چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں جلدی سے بیڈ کے قریب کمری پر آ بیٹھا۔ میں نے اور رابطہ نے بیک وقت اپنے اپنے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔ میں تمام متفقہ سننے رہتا چاہتا تھا کہ اگر درمیان میں رابطہ کو تھوڑی بہت مدد کی ضرورت پڑے تو اشارے سے اسے بتا سکو کہ کیا کرنا ہے۔

”ہیلو!۔“ رابطہ نے بدل ہوئی آواز میں کہا۔

”اولیٰ! یہ تم بولی رہی ہو؟“ دوسری طرف عالم شہر کی بے تابانہ آواز سنائی دی۔ وہ مجھے دار لے جسے وہ انگریزی بول رہا تھا۔

”ہاں۔“ شکر ہے تمہاری آواز تو سنائی دی۔“ رابطہ نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ ”میں تو کبھی بھی تم سے ملے بغیر۔۔۔“

تمہاری آواز سننے بغیر ہی پاکستان سے بھاگنا پڑے گا۔“

”تم جیسے کہاں ڈولی؟ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔“ میری توقع کے عین مطابق عالم شہر کے لہجے میں اطمینان بے باکی تھی۔

”بھوت مت بولو۔“ رابطہ نے ہنسی سے کہا۔ ”کسی نے مجھے تلاش نہیں کیا۔ تلاش کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ سب کو معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں لیکن کسی نے میری خبر نہیں لی۔“

سینڈ کیٹ کے لیے تو خبر میں مھن ایک کیپر تھی حال لے کر جاتے ہوئے پکڑی گئی۔ سینڈ کیٹ نے مال پر مبر کر لیا اور مجھے وہ لوگ بھول گئے۔ لیکن افسوس تو مجھے تم جیسے لوگوں پر ہے جنہیں میری صورت دیکھتے بغیر مجھ سے عشق کا دعویٰ تھا۔ جو مجھ سے ملنے کی حسرت میں مرے جاتے تھے۔“

”تم۔۔۔“ مجھے تمہارے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔“ عالم شہر نے پُر زور لہجے میں متناہی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”جس میں یقین نہ آئے تو میں ٹیلیفون بل پیش کر سکتا ہوں۔ لاکھوں روپے کی تو میں نے ٹیلیفون کاٹر ڈالیں امریکا۔ آخر سینڈ کیٹ والوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ اگر آئندہ میں نے انہیں تک کیا تو وہ مجھے جیلوں کے کسی گندے ٹالے کی ترم میں پتھاروں کے پھر امریکا کے ایک ٹرپ کے دوران میں نے خود بخود کرنے کی کوشش کی تو ایک تجربے نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ آخری بار جس میں نیپال بھیجا گیا تھا اس کے بعد سے تمہارا کوئی پتا نہیں۔ ساتھ ہی تجربے نے مجھے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ کیپر تیز تو آتی رہتی ہیں جاتی رہتی ہیں میں تمہارا زیادہ پتہ چھاننے کی کوشش نہ کروں۔ اس قسم کی حرکتیں سینڈ کیٹ کی مصلحتوں کے خلاف ہوتی ہیں۔“

”تھک کر تمہارا اس۔“ رابطہ نے لہجے میں بولی ”سینڈ کیٹ کے لیے تو ہم لوگ قربانی کے کمرے ہوتے ہیں۔ سر حال مجھے تم سے امید نہیں تھی کہ میرا دوست۔۔۔ میرا محبوب۔۔۔ میرا عاشق بھی میری خبر نہیں لے گا۔ کیا تمہیں واقعی پتا نہیں چلا کہ میں تین سال ترکی کی ایک نیل میں پڑی سڑتی رہی ہوں!“

”نہیں۔ میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے واقعی علم نہیں تھا۔“ عالم شہر پُر زور لہجے میں ہوا۔ ”کیا تم وہاں سے مجھے

لے رہا ہے؟  
”یہ اس کا کوئی کیم ہے، جی! جس میں جلد ہی پتا چل جائے گا۔  
عالم شیر بولا۔

”کی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا کیم کیا ہے۔  
راہیلہ بدستور سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ ”لیکن اتنا ضرور  
ہے کہ میری چھٹی جس جگہ کسی خطرے کا احساس دلا رہی ہے۔ یہ  
خیال ہے میری جان کو خطروں سے۔“

”تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ عالم شیر عجب  
سے بولا ”میں آ کر تم سے ملتا ہوں۔ پھر کیم بھی سمجھ میں آ جائے  
اور تمہاری حفاظت کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تمہارا مجھ سے  
رابطہ قائم ہو گیا ہے“ اب تمہیں کسی معاملے میں پریشان ہونے  
ضرورت نہیں۔“

راہیلہ نے دیرینہ رکان سے لگائے، مسکراتے ہوئے مجھے آہ  
ماری۔ عالم شیر بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ”میں ایک ڈیڑا  
گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ اس کے بعد تم اپنی ہر پریشانی  
ہر مسئلہ میرے سپرد کرنا۔“

”میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم جلال بیک۔  
دشمنی مول لو۔ جو سرحد جنگ چاہتی رہتی ہے، وہی کالی ہے۔ میں نہیں  
چاہتی کہ میری وجہ سے باقاعدہ جنگ شروع ہو جائے۔ سینڈ کیپ  
اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔“ راہیلہ نے اپنے لہجے میں خود  
سمونے کی کوشش کی۔

”ہمارا میں کئی سینڈ کیپٹ... اور جنم میں کیا جلال بیک۔“ عا  
شیر جو ش سے بولا ”اب تمہارا عالم شیر اتنا کمزور نہیں رہا کہ چھو  
چھوٹی باتوں پر ڈر رہا ہے۔“

راہیلہ نے ایک بار پھر مجھے آنکھ ماری۔ عالم شیر بات  
کرتے ہوئے بولا ”ہمیں... تو چہر میں آ رہا ہوں، تم کیس جانا مت،  
اور ہاں... کیا جلال بیک کو اس بات کی فوری خبر ہو جائے گی کہ  
تم سے ملے آیا تھا۔“

”نہیں... میں نہیں بتاؤں گی تو نہیں ہوگی۔“ راہیلہ نے ا۔  
اطمینان دلا یا۔ ”اس کا جو آوی ڈرائیو کے طور پر میرے ساتھ،  
دو تو بالکل شریف معلوم ہوتا ہے اسے تو شاید جلال بیک کے ا  
دھندے کا علم بھی نہیں ہے۔ واٹھی والا ہے۔ نمازی پر ہی  
ہے۔“

”واٹھی والا تو میں بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں نہیں۔  
دو ج بھی کیے ہوئے ہیں۔“ عالم شیر قہقہہ لگا کر بولا ”لیکن تجھے  
معلوم ہے یہ تو صرف ایک آڑ ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو ہمار  
معاشرے میں بغیر شناسائی اور بغیر تعارف کے بھی عزت ملی  
ہے کوئی نیا پولیس آفیسر کسی قسم کی رپورٹ پڑھ کر پہلی بار میر  
پاس پہنچتا ہے تو ایک لمبے کے لیے پکڑ میں پڑ جاتا ہے کہ کیس ا۔  
کوئی، حو کا تو میں ہوں۔“

”پھر مجھے کیوں الزام دے رہے ہو؟“ راہیلہ اس پر چڑھ  
دوڑی۔ ”میں نے تو محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گز رہا ہے تب ہی تو میں  
لے برا اور راست تمہارا گھرا آفس پہنچنے سے گریز کیا۔ تمہارے جو  
دوسرے فون نمبر میرے پاس تھے ان سے یہی جواب ملا کہ تم ملک  
سے باہر ہو۔ یہ جو خاص فون نمبر تھا یہ بھی مجھے زبانی ہی یاد تھا لیکن  
اس میں مجھ سے ایک ہندسہ کی گلطی ہو رہی تھی۔ شکر ہے آج صبح  
مجھے صحیح یاد آ گیا پہلے تو مجھے اس نمبر سے بھی نزع خانے کی کوشش کی  
گئی تھی۔“

”ہاں۔۔۔ کچھ عجیب عجیب خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔“ عالم شیر  
مہم لہجے میں بولا ”تفصیلی باتیں تو دوبارہ دینے کی ہوں گی۔“

”میں مثال بیک سے رابطہ نہ کر لے تو کیا کر لیتی؟“ راہیلہ بدستور  
بگلی سی فکلی سے بولی ”میں ترکی سے یہاں تک پہنچنے تک تقریباً  
تلاش ہو چکی تھی۔ میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ کسی ہوٹل  
میں ٹھہر جاتی۔ اس لیے مجھ پر آج مجھے مثال بیک سے رابطہ کرنا پڑا۔  
مجھے اس کی مدد لینے کا شوق ہرگز نہیں تھا۔ ورنہ مجھے اب بھی تم  
سے رابطہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے مسائل تو حل ہو چکے  
تھے۔“

”ہاں۔ یہ بات ہے۔“ عالم شیر بولا ”میں چشم تصور سے دیکھ  
سکتا تھا کہ اس احساس سے اس کی باپجیں کھل گئی تھیں کہ ڈول  
بھی جہاں کر دلائی اس کی ذات میں اتنی دلچسپی رکھتی تھی۔

راہیلہ بھی آواز میں بولی۔ ”لیکن اہم شیر تھرا مجھے کچھ گڑبڑ  
لگ رہی ہے مجھے معلوم ہے سینڈ کیپٹ مجھ سے خوش نہیں ہے اسی  
ذریعہ سے میں ابھی لاس ویگاس واپس نہیں جاری۔ لیکن مثال  
بیک مجھ پر بہت مہربان معلوم ہوتا ہے۔ اس نے نہ صرف میرے  
تمام مسائل حل کیے، میری ہر طرح سے مدد کی، بلکہ مجھے فوراً تین  
کلو ”سامان“ بھی بکھرا دیا۔“

”سامان“ سے مراد کوئین تھی۔ ان دنوں بیرون کا دھندا اتنے  
لوڈ پر نہیں چلتا تھا۔ ڈرگ مارکیٹ کی سب سے قیمتی اور سب سے  
اوپر درجے پر حرکت میں رہنے والی چیز ”موک“ ہی تھی۔

عالم شیر مضطرب لہجے میں بولا۔ ”تم اپنی احمق کب سے ہو گئی  
ہو؟ اس پینکے میں تمہیں مثال بیک نے پناہ دی ہے۔ فون اسی کا  
ہے۔ اور تم اسی پر ساری باتیں کیے جا رہی ہو۔“

”میں نے اطمینان کر لیا ہے۔“ راہیلہ سرگوشی کے سے انداز  
میں بولی ”مگر میں متھکو ریکارڈ کرنے والے کسی قسم کے آلات  
پوشیدہ نہیں ہیں۔ ٹیلیفون سیٹ بھی میں نے کھول کر دیکھ لیا ہے  
اس میں بھی کوئی گز نہیں ہے۔ میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ مثال  
بیک چاہ رہا ہے میں یہاں سے سودھی دست برتنی چلی جاؤں۔  
نہیں کلو سامان۔ بہت بڑی کٹاؤں تھیں۔ اسے لے کر دست  
جرمنی جانا۔ مجھ جیسی تازہ تازہ مہم ایانڈ کے لیے کوئی آسان کام  
نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مثال بیک اتنا ڈر اسک کیوں



بٹھا کر فون پر باتیں کرنے لگیں گی۔ خصوصاً جب کہ ذرا بچہ رکھ کر  
ایسا خوبصورت بھی نہیں ہے۔ ”راہیلہ شرارت سے مسکرائی  
”خیر۔ یہ تو میں اگر دو کیوں گا۔ خدا حافظ۔“ ”عالم شیر بولا۔“  
راہیلہ نے بھی خدا حافظ کہہ کر سلسلہ متعلق کر دیا اور دیکھ  
رکھتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی جو بھیجی۔ یہ مرحلہ بھی م  
ہوا۔ فکار خود ہی چال میں آ رہا ہے۔“

پھر یکدم وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”کیا واقعی نہ  
نے اسے لٹکانے لگانے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے؟“  
”کیا اب بھی جیسے کوئی شبہ ہے؟“ میں نے حیرت سے  
دریافت کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اسے کسی گہری سوچ میں  
ڈوبے دیکھ کر میں نے پوچھا ”کیا تمہیں کچھ بتا دو رہا ہے جس سلسلہ  
میں شریک ہونے پر؟“

”نہیں۔۔۔ ایسی بات تو نہیں۔۔۔ وہ متذبذب سے لمحے میں  
بولی ”نہیں۔۔۔ ابھی ذرا میرا اندر اتنا طاقتور نہیں ہوا کہ ایسی باتوں کو  
آسانی سے ہضم کر سکوں۔ وہ۔۔۔ دراصل کوئی آدمی آئے  
سانے۔ اچانک سے لڑائی جھگڑے میں ہمارے ہاتھوں مارا جائے تو  
کچھ اور بات ہے۔ لیکن اس طرح ٹھٹھڑے دل کے ساتھ کسی کو  
ترکب اور تدبیر سے ہلا کر ہلاک کرنے کا تصور مجھے کچھ عجیب سا لگ  
رہا ہے۔“

”جب کوئی عادی پیشہ ور فرتی اور انتہائی خطرناک مجرم  
ثابت ہو جائے تو قانون بھی نہایت ٹھٹھڑے دل سے ’بے رحمی ہوش  
و حواس اسے سزائے موت دیتا ہے۔ میری عدالت نے بھی موت  
سوچ سمجھ کر اسے اس کے دوچار ساتھیوں سمیت موت کا سستی  
قرار دے دیا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنے انسان موت کے  
گھاٹ اترے ہیں۔“ ”تھے سب سب کمرے سے ہیں کتنوں کی زندگی  
ایجنٹ ہوئی ہے۔“ ”کتنوں کے گریباں اجڑے ہیں اور جب تک یہ ذمہ  
رہے گا“ ”ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تم غلطی یہ ہو گی کہ وہ اپنے خلف  
جھگڑوں اور طاقت و دولت کی وجہ سے کبھی ان عدالتوں کی گرفت  
میں نہ آ سکے گا جو بظاہر انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے  
قائم کی گئی ہیں۔ تو پھر اس کا حل کیا ہو؟ کیا ایسے لوگوں کو کوئی نوع  
انسان کی زندگی ایجنٹ کرنے کے لیے آزاد چھوڑے رکھا  
جائے؟“ ”نہیک ہے۔ میں ایسے تمام لوگوں کی سرکوبی نہیں کر سکتا۔  
لیکن جو میری گرفت میں آ رہا ہے اسے تو چل سکتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ بس۔۔۔“ ”وہ ہاتھ اٹھا کر کوئی اتنی جذباتی تقریر کرنے کی  
ضرورت نہیں۔ میں کون سا دواہی جا رہی ہوں؟“ ”اب تو آنکھیں بند  
کر کے تمہارے ساتھ چل پڑی ہوں۔ چاہے مرنا دے۔ چاہے اس  
بے مصرف سی زندگی کو کارآمد بنانا۔“

”یہ کام جو ہمیں درپیش ہے اسے آسان مت سمجھنا۔“ میں  
نے اسے خبردار کیا۔ ”اب ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی چہا ہمارے  
چہہ دان میں پھنسنے کے لیے آ رہا ہے یوں سمجھو کہ ہم ایک ہاتھ پر

”خدا کے لیے لوگوں کو اتنا زیادہ پکڑ مت دیا کرو۔ کم از کم اپنا  
میلہ تو بدل لو۔“ ”راہیلہ کراہ کر بولی۔“

میں نے اشارے سے اسے منع کیا کہ وہ عالم شیر کے ساتھ  
اختلافات کے معاملے میں نہ اچھے میرے خیال میں ایک امریکی  
اور اونچے درجے کی ”کیپیٹر“ کی طرح کی بات اس کے کووار  
سے مل کر نہیں کھائی تھی۔

لیکن اتفاق سے راہیلہ کی یہ بات بھی ذہنی کے کووار رشت  
بیٹہ مکی عالم شیر ایک اور ہلکا سا تھکے لگا کر بولا ”میں نے پہلے بھی  
بب تمہیں اپنے لیے کے بارے میں بتایا تھا تو تم نے کسی گمانہ  
میں نے پہلے بھی تمہیں کسی جواب دیا تھا کہ اس بیٹے کے مجھے بڑے  
فائدے ہیں اب میں اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔“

”چھ۔۔۔ خیر۔ تمہاری مرضی۔“ ”راہیلہ بات ختم کرتے ہوئے  
بولی ”مگر تم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ رہے ہو؟ میں تو اشتیاق کے مارے  
مری جا رہی ہوں۔ اتنی پرانی اور اتنی گہری ہماری شناسائی ہے لیکن  
حالات آج ہو گئے۔ کیسی عجیب بات ہے بالکل فرضی تھے گمانوں  
جیسی۔ ہے؟“

”تھے گماناں بھی کہیں نہ کہیں انسانوں کی زندگیوں سے  
جسم لیتے ہیں۔“ ”عالم شیر خوش دلی سے بولا ”حالات تو ہماری ہمت  
پہلے ہو جاتی لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی گریز ہو جاتی تھی۔“  
”لیکن خیر۔ ہم ثابت کر دیں گے کہ گھنٹے کی ہو تو کسی نہ کسی  
حالات ہو ہی جاتی ہے۔“ ”راہیلہ میری طرف دیکھ کر شرارت سے  
مسکراتے ہوئے بولی۔“

”بے شک۔ بے شک۔“ ”عالم شیر زور سے لمحے میں بولا۔“

”چھ۔۔۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ خیال رکھنا۔ کہیں  
میں تمہارا انتظار ہی کتنی رخصت نہ ہو جاؤں۔ میرا یہاں قیام زیادہ  
طویل نہیں ہو گا۔ میں ممکن ہے میں کل ہی نکل جاؤں۔ بحال ایک  
مجھے جلد از جلد رخصت کر دینا چاہتا ہے۔“

”بحال ایک کی ایسی کی تھی۔“ ”عالم شیر روانی میں اردو بول  
گیا پھر اس مضمون کو انگریزی میں ادا کرتے ہوئے بولا ”میں لیکن  
ہے کہ اس بار تمہارے کہیں بھی جانے کی نوبت نہ آئے۔“

”خیر یہ تو تمہارے آنے کے بعد دیکھا جائے گا۔“ ”راہیلہ بولی۔“

وہ سلسلہ متعلق کرنے لگی تھی کہ عالم شیر نے پوچھا۔ ”وہ“

ذرا نیو اس وقت کہاں ہے جو بحال ایک نے تمہیں دیا ہے؟“

”ٹاپر بیٹا جو کچھ اسی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔“

راہیلہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں۔۔۔ اس کا خیال  
کیوں کیا تمہیں؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے بس یہ اطمینان کرنا تھا کہ کہیں

وہ جیسے فون پر بات کرتے ہوئے سن تو نہیں رہا۔ بعض ذرا نیو

اچھی بجلی انگریزی سمجھتے ہیں۔“

”اب میں اتنی پاگل بھی نہیں ہوں کہ بیڈ دم میں ذرا نیو رکھ

ہندو ازلے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شکاری جب جنگل میں شکار پر نکلتے تو اس کی اپنی زندگی بھی خطرے میں ہوتی ہے۔ تمام تر خالص اوقات کے بار جو۔

وہ بچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے وقت سے میں نے کہا۔ ”ہم کچھ ایسے بلا دست بھی نہیں ہوں۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”میں نے کہا۔ ”ہم کچھ ایسے بلا دست بھی نہیں ہوں۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

”یہ وہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔“ راجیلہ بولی ”اس کے خلاف بھی اس طرح جو کس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔“

وا۔ آخر میں ایک ڈرائیو رہا۔

اس نے مجھ سے اجازت لینے یا مزید کچھ پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور مجھے ایک طرف چنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر گیا اس کے دونوں ساتھی تھیں سنبھالے مستعد انداز میں گیٹ پر آن کھڑے ہوئے۔ وہ شکاریوں کی طرح چاروں طرف کا جائزہ لے رہے تھے۔

دبیلے پتلے اور نوکیلے ناک والے نے اندر آتے ہی میری تلاشی لینا شروع کر دی۔ میں نے اپنے رد عمل کو فطری سامانے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے حیرت کا اظہار کیا اور اپنے لمبے میں پلکا سا احتجاج بھی سونے کی کوشش کی ”آپ کو عالم شہر صاحب نے بھیجا ہو گا۔ کس صاحب نے مجھے بتایا ہے۔ لیکن آپ میری تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟“

”چپ رہو۔“ وہ گہرے لہجے میں بولا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ عالم شہر نے انھار خود نہیں آیا تھا۔ اس نے پہلے اپنے آدمیوں کو تفصیلی جائزہ لینے بھیجا تھا۔ وہ خود غالباً راستے میں کہیں رک گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اس کی نفسیات کو سمجھنے میں کامیاب رہا تھا۔

نوکیلے ناک والے نے میری تلاشی سے فارغ ہو کر بیٹنگ کا تنہیدی انداز میں جائزہ لیا اسی دوران راحیلہ بھی باہر آئی جو اس وقت ڈبلی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہو تم؟“ اس نے پیشانی پر تل ڈال کر خالص امریکی لہجے میں نوکیلے ناک والے سے پوچھا۔

”سیم صاحب! اچھے عالم شہر نے بھیجا ہے اور اس کا حکم ہے کہ میں آپ کی آپ کے ڈرائیو ر کی۔ اور اس جگہ کی تلاشی لوں۔“ نوکیلے ناک والا ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔ ”باس نے کہا ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے۔“

”اوہ۔ تو اب تمہارے پاس کو ہماری بھی تلاشی کی ضرورت پڑی۔“ راحیلہ نے ہاتھ نہاتے ہوئے تھوڑے سے غصے کا اظہار کیا ”وہ خود کہاں ہے؟ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ تھوڑی دیر میں یہاں پہنچے گا۔“ نوکیلے ناک والے نے سچ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر مزید کوئی بات کیے بغیر تیزی سے راحیلہ کی سرسری تلاشی لے ڈالی اس نے صرف جیبوں پر ہاتھ مار کر دیکھا۔

پھر وہ یکے بعد دیگرے کمرے میں گھس کر ہر چیز کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے الماریاں کھول کر دیکھیں کہ بیسوں کے نیچے جھانکا۔ صوفوں کو ٹولا۔ ہاتھ دوڑھو کر کنگلان اس اکیلے آدمی نے نہایت اہرانہ انداز میں بے حد پھرتی سے چند منٹ میں پورے بیٹنگ کو کنگال ڈالا۔ میں قدرے تشویش زدہ لیکن مودبانہ انداز میں ہاتھ بائیں سے اس کے پیچھے تھا۔

میں دل ہی دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہ سکا کہ وہ اپنے کام

میں ماہر تھا۔ وہ فالتو بات کرنے یا اپنی کارروائیوں کے لیے کسی اجازت لینے کا بھی قائل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ راحیلہ نے ام دوران پلکا سا احتجاج جاری رکھا لیکن اب وہ گویا ہماری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ اس کے دونوں ساتھی اب پورچ میں آن کھڑے ہوئے تھے وہ بھی ان کے پاس واپس گیا۔

اس نے ان دونوں سے نیچی آواز میں مختصری کچھ بات کی۔ دھمکیں نکل میں دبا کر تیزی سے باہر چلے گئے چند لمحوں بعد میں نے گاڑی اسٹارٹ ہونے اور اس کے تیزی سے روانہ ہونے کی آواز سنی۔ نوکیلے ناک والے کے لئے اب میں اور ڈوبی گویا قلعی غیر اہم چیزیں ہو گئے تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی عقلی نظرس دورانق پر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ میں نیچے پورچ میں کھڑا تھا اور راحیلہ اوپر برآمدے میں۔ نوکیلے ناک والا گیٹ کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔

آخر راحیلہ نے ہی اس سے پوچھا۔ ”عالم شہر کب آئے گا۔“ ”ہاں۔“ وہ آ رہا ہے۔“ نوکیلے ناک والے نے بے توجہی سے جواب دیا۔

”تمیں اندر جا رہی ہوں۔“ راحیلہ بولی پھر دو اڑے پر رک کر وہ مڑتے ہوئے بولی ”ڈرائیو! میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

میں مڑدیا انداز میں اس کے پیچھے چل دیا۔ نوکیلے ناک والے نے جب بھی مرکز ہماری طرف نہیں دیکھا۔ وہ گویا ہماری طرف سے کچھ زیادہ ہی مطمئن ہو چکا تھا۔ اسے ہمارے غیر مسلح اور بے ضرر ہونے کا یقین آچکا تھا۔

بیلہ روم میں پہنچ کر راحیلہ میری طرف مڑتے ہوئے نیچی آواز میں بولی ”تھیل شروع ہو گیا ہے۔“

میں نے اشارے سے اسے منع کیا کہ وہ شمال میں بھی اردو میں بات نہ کرے۔ میری یہ احتیاط کار آمد ہی رہی کیونکہ دوسرے ہی لمحوں کھڑکی کے شیشے پر عتاب نما ایک چہرہ نمودار ہوا۔ یہ وہی نوکیلے ناک والے کا چہرہ تھا جو کھڑکی کے شیشے کی حدتلاہٹ کی وجہ سے کچھ بگڑا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔

وہ مسکراتا ہوا کھڑکی کے قریب سے گزر رہا تھا اور ہمیں اس کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ وہ گھر میں گھٹ کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کچھ دور جا چکا تو میں نے سرگوشی میں پوچھا ”تم کچھ کتنا چاہتی ہو۔“

”ہاں۔“ خانقاہوں کی تعداد تو اب ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔ صرف تین آدمی ہیں۔ عالم شہر سمیت چار ہوں گے۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”سب سے پہلے ہمیں اس کمرے میں عالم شہر کو ہی قابو کرنے کی کوشش کرنا ہوگی نا؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا ”اگر مجھے کمرے سے نکال بھی دے تب بھی تم کسی بجائے سے مجھے بلا لیتا۔ مجھے امید ہے کہ تم

لگا۔ "تمہیں میرے گرو میں کے انداز سے پریشان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ذرا کم بڑے لگے لوگ ہیں۔" اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ خود آکسفورڈ کا پڑھا ہوا تھا۔ "میں نے اسی لئے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ دراصل میں آج کل بہت زیادہ احتیاط کر رہا ہوں۔ حالات بڑے خراب ہیں۔ لوگ مجھے سیدھا سا دوساٹی سمجھ کر پکڑ دینے کی فکر میں ہیں۔ بہر حال۔۔۔ جان سن! ہمیں دیکھ کر میں سب کچھ بھولی گیا ہوں۔ آج زندگی کی سب سے بڑی حسرت پوری ہو گئی ہے۔ میں تو اب واپس ہو چکا تھا کہ شاید زندگی میں کبھی تم سے ملاقات نہیں ہو گی۔"

اس کی بھاری کونجیلی آواز نے کمرے کی فضا کو مرتعش کر دیا تھا وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ ایک نگ راہیلہ کو کھورتے ہوئے اس کی باتیں پچھلیں۔ "آکھوں میں پڑوس پک ابھری اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "وہیے میرے اندازوں سے زیادہ خوبصورت لگی ہو۔ شاید یہ میرے صبر کا صلہ ہے۔ تم خود ہی دیکھو تا۔۔۔ صرف خون پر تم سے واقفیت تھی اور میں صرف اس واقفیت کی بنیاد پر تم پر دل و جان سے عاشق چلا آ رہا ہوں ایسے عاشق ہمیں صرف پاکستان میں مل سکتے ہیں۔" کس اور نہیں۔ کیا میں غلط کر رہا ہوں۔"

"ہاں۔ تم غلط کر رہے ہو۔" راہیلہ بولی "میں بھی تو صرف خون پر ہی تمہاری باتوں سے متاثر ہو کر تمہارے عشق کا جواب عشق سے دیتی آ رہی ہوں۔ تم نے صرف سرسری طور پر مجھے اپنی شکل صورت کے بارے میں بتایا تھا۔"

"سرسری تو نہیں۔ خاصی تفصیل سے بتایا تھا۔ لفظوں میں پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی۔" عالم شیر اسے گھورتے ہوئے بولا مجھے یقین تھا کہ راہیلہ اس کی لفظوں کی وجہ سے اپنے جسم پر چوڑیاں ہی رنگتی محسوس کر رہی ہو گی۔

وہ بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئی بولی "تمہارے خیال میں وہ تفصیل تھی لیکن مجھے تو بالکل اور صریح محسوس ہوئی تھی اصل آرزو تو تم سے ملاقات کی تھی۔ خدا کا شکر ہے آج یہ خواہش پوری ہو گئی۔" میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کتنے ہوئے راہیلہ کے دل پر کیا کر رہی ہو گی۔ پھر راہیلہ نے کانچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ تا۔۔۔ کھڑے کیوں ہو۔"

لیکن عالم شیر بیٹھنے کے بجائے یکدم گھوم کر میرے قریب آیا میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ کھردرے لمبے میں بولا "تم جلال بیگ کے ملازم ہو؟"

"جی۔۔۔ جناب۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "اتنا زیادہ سوچ ہو کر سر جھکانے کی ضرورت نہیں۔ ارے۔۔۔ دیکھو میری طرف۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کس دہ آنکھوں کی عدت سے

اپنی اس کے لیے کافی ہو گی لیکن میں رسک لینا نہیں چاہتا۔ محافظوں کی نظر نیچے ہی نہیں یہ کام کر گزرتا ہے۔ اس کے بعد محافظوں سے منت لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" راہیلہ سرگوشی میں بولی اس دوران فون کی ٹاک والا بیڈیم کی دوسری کھڑکی کے قریب سے گزرا اور راہیلہ یہ آواز بلند سمجھتا ہوا انداز میں بولی "ڈرائیو رانجھے کھنڈا پانی پلاؤ۔"

"میں میڈم! میں نے یہ آواز بلند جواب دیا۔

فون کی ٹاک والا کچھ آگے جا چکا تو میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "کھپا راجی پانی پلاؤ؟"

"ہاں۔۔۔ ڈرائیو رانجی دو۔" وہ شرے مسکراہٹ کے ساتھ بولی "موتے سے ناکہ اٹھا کر تم سے کچھ خدمت ہی کرا لی جائے۔"

میں نے کچن سے پانی کا گلاس فیشری میں لا کر اسے پیش کیا "لیجی میڈم! میں نے ادب سے تجھے ہونے کہا۔"

وہ شامانہ انداز میں بیڈ پر جا بیٹی اور پانی کے چھوٹے چھوٹے گونٹ بھرنے لگی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنے اعصاب کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بظاہر وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی لیکن درحقیقت اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

میں نے گلاس اور فیشری واپس کچن میں لے جا کر رکھی اور انہیں اچھی طرح صاف کر دیا۔ میں کمرے میں واپس آیا ہی تھا کہ باہر ایک بار پھر گاڑی رکھنے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک کونے میں سوچ ہو کر کھڑا ہو گیا جیسے راہیلہ کی کوئی بات سن رہا تھا۔ وہ اسی شانہ انداز میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔

باہر گٹ کھلنے کی ہلکی سی آواز۔ پھر ان لوگوں کے ہاتھ کرنے کی آواز سنائی دیں۔ چند لمحوں بعد عالم شیر اپنے بھاری بھر کم شے کے ساتھ آدھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔

"ڈی۔۔۔ ڈی۔۔۔ میری جان! وہ دونوں بازو پھیلائے تقریباً چلاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ راہیلہ اختلاوری طور پر بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی تھی۔

عالم شیر بے آبی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ شاید اسے گلے لگانے کی فکر میں تھا۔ اسی لمحے راہیلہ نے اپنی تمام تر معنوی "مریکیت" کو بالائے طاق رکھ دیا اور جھکا کر دے کر اس کے معائنے کی کوشش سے بچتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو اہم شیر! کچھ تو خیال کرو۔ ڈرائیو ر کمرے میں موجود ہے۔"

تب عالم شیر کو یکدم بریک لگی اور اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "یہ ڈرائیو ر تمہارے بیڈ میں سو گیا کر رہا ہے؟"

"میں اس سے بات کر رہی تھی۔" راہیلہ بولی "تمہارے آدھوں کی آمد کے اندازے تو مجھے ذرا ہی رہا تھا۔ میں اس سے بات کر کے زرا اپنا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"اوہ۔۔۔ ہنسے ہو۔" عالم شیر نے ایک بلند و بے ہنم قہقہہ

اور ایک راجیلہ کی طرف۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے عصب سے بیت خان اور شیریں خان کی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔ دروازہ باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔ ہم ایک چوہے دان میں پھنس چکے تھے لیکن قدرے اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ عالم شیریں بھی اس چوہے دان میں ہمارے ساتھ تھا۔

میری نظر اس پر جمی ہوئی تھی۔ آخر وہ بیڑہ اٹھ بیٹھا۔ سر ساکت کھڑا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ میرا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری رہے۔ عالم شیریں کا چہرہ تار تار تھا کہ شاید وہ زندگی میں کم بھی صورت حال سے اتنا محفوظ نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔

”بیر افضل چوہدری!“ وہ جیتے ہوئے لمحے میں بولا ”اور مجھے اتنا کڑا چٹھائیوں سمجھ رہے ہو؟ تمہیں معلوم ہے میرا باپ کدھر ہے پر مٹی ڈھونڈتا تھا۔ میں اس باپ کی اولاد ہوں جس نے چارے کو میرے جوان ہونے تک بھی نیا چوتھا نصیب نہیں ہوا۔ ابھی اس پر ایسا دور بھی آیا کہ وہ بیڑوں پر گھاس پیٹ کر شکار پرانوں پر سڑکارتا رہا۔ اگر میں بے وقوف ہوتا تو کیا ایسے باپ کا اولاد ہو کر آج اس مقام پر ہوتا۔“ اس کے لمحے میں فخر تھا۔

”اوہ... اس کا مطلب ہے تم اولاد تو شریف آدمی کو ہو۔“ میں نے اپنی خوش مزاحی کو آواز دینے کی کوشش کی۔ کوکر اس وقت میرا سر گھوم رہا تھا۔

”بے شک۔ لیکن تم یہ دیکھو کہ میں کہاں سے کہاں پہنچا ہوں۔“ وہ اس میں فخر کا پلو تلاش کر رہا تھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میری اپنی کمائی بھی اس سے کچھ ملتی جلتی تھی لیکن بہت جلد اس کی اور میری راہیں جدا ہو گئی تھیں۔ میرے اور اس کے کردار اور نظریات میں زمین آسمان کا فرق تھا اس کی زندگی میں جائز ناجائز کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ دولت کی ہوس، سفاکی، ظلم و تشدد، کینہ پروری، طاقت کا نشہ اور ایسی دوسری بہت سی خواہیوں کا مل جل دہانہ دن اپنی زندگی میں بڑھا آ جا رہا تھا جب کہ میں نے اسے گرداب سے نکلنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنے دولت مندین جانے پر فخر تھا۔ میری نظریں یہ کوئی فخر بات نہیں تھی اور نہ ہی اس میں انسان کا اپنا کوئی کمال تھا۔

میری کچھ میں اب یہ بات آگئی تھی کہ دوسری بہت سی چیزوں کی طرح دولت بھی انسان کے تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔ جتنی ملتی ہوئی ہے ہر حال میں مل جاتی ہے۔ البتہ یہ اب انسان کا اپنا اختیار ہے کہ وہ اس کے لیے جائز ذرائع اختیار کرتا ہے یا ناجائز۔ دولت تقدیر میں نہ ہوتی ہے آپ سرخ کر مر جائیں، نہیں ملتی خواہ ناجائز ذرائع بھی اختیار کر لیں۔ آپ پہلے دن ہی پکڑے جائیں گے۔ اذ کے ہاں بھی انسان شاید اسی لیے پکڑا جاتا ہے کہ جب اس نے جائز اور ناجائز دونوں راستے انسان کے سامنے رکھے تھے اور عقل

مجھے پہچان نہ لے۔ آخر وہ میرا پرانا سنا سنا ٹھیک آپ میں افرارنے میرے پورے چہرے کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں کی ساخت اور ان کا اثر بھی کچھ تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ آواز بھی میں نے بدلی ہوئی تھی۔

میں نے دلی ہی دل میں اپنے آپ کو اطمینان دلایا کہ عالم شیریں مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں نے سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کینہ کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں لیکن ان خوبصورت آنکھوں کی گہرائیوں میں بد صورتیاں رقص کرتی تھیں۔ تاہم اس وقت وہ ایک بہت ہی عجیبہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

”کب سے ملازم ہوئے ہو اس کے پاس؟“ اس نے چاہت ہے میں پوچھا۔

”تقریباً دو ماہ ہوئے ہیں۔“ میں نے جانا مل جواب دیا۔

”کس کی گاڑی چلاتے ہو؟“ وہ کوئی تفتیش کر رہا تھا۔

”میں تو جی۔۔۔ اصل میں بیک صاحب کے دفتر کی ایک دوس چلاتا ہوں۔ تین چار ملازموں کو گھر سے لانے لے جانے کے لیے۔۔۔ میں نے جواب دیا۔ جمال بیک کا بجلی کے تلات تیار کرنے کا ایک بہت بڑا کاغذ اور اس کا دفتر بھی تھا۔

”بہت خوب۔“ عالم شیریں نے قسمیں اٹھاؤں سر ہلایا اور ایک ہماری کو بجلی آواز میں پکارا ”بیت خان... شیریں خان۔“

اس کے جواب میں نہ تو کسی نے کچھ کہا اور نہ ہی کوکر میرے آیا بلکہ ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا اور اسی لمحے بیک وقت کمرے کے دونوں طرف کی کھڑکیوں کے شیشے جھٹکے سے ٹوٹ گئے۔ شیشوں کے علاوہ کھڑکیوں میں گرل بھی لگی ہوئی تھی۔ دونوں کھڑکیوں کی گرل سے گتوں کی نالیں جھانکنے لگیں ایک طرف تو لکڑی ناک والے کا چہرہ دکھائی دیا اور دوسری طرف کھنسی مومچوں والے کا۔

اس کے ساتھ ہی عالم شیریں نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ بڑھا کر میری داڑھی کھینچی۔ داڑھی بہت عمدہ ڈبیرل سے بہت محنت سے تیار کی گئی تھی لیکن مصنوعی چیز ہر حال مصنوعی ہوتی ہے۔ داڑھی کا بیشتر حصہ اس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ چند لمبے میرے چہرے پر لگی وہ گھٹیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ٹوپی میرے سر سے کھینچی۔

گچی بات یہ تھی کہ اس کا یہ حملہ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ آخری لمحے تک مجھے یہی گمان تھا کہ میری توجہ کامیاب جاری ہے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سب کچھ الٹ کر میرے منہ پر دے مارے گا۔ وہ بیڑہ پر جا کر اتب مجھے احساس ہوا کہ وہ ہنس ہنس کر ٹوٹ پھٹ ہوا جا رہا تھا۔

ایک ٹاپیے کے لیے میں نے سوچا کہ اسی بیڑہ پر اس کا کام تمام کر دیا جائے لیکن کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی گتوں کی نالیوں نے مجھے اس پر عمل درآمد سے باز رکھا۔ ایک نال میری طرف اٹھی ہوئی

ہاں ہوتا تھا میں اس دگلس حینہ سے مٹھی مٹھی باتیں کر رہا ہوتا۔  
 نہیں اس کمرے سے نکال کر۔“

پھر وہ معنوی تنبیہ کی سے بولا ”تم نے اس دلہا سے کچھ دیر  
 میری بات چیت کرانے کا پروگرام بھی رکھا تھا یا نہیں؟ کیا میرے  
 آتے ہی بد معاشی شروع کرینے کا پروگرام تھا؟“  
 میں نے دل ہی دل میں کہا ”کوئی کچھ اٹھی مٹھی باتیں  
 کرنے کی حسرت ہی لیے تم اب تک اس دنیا سے رخصت ہو چکے  
 ہو۔ لیکن میں نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے کہا ”کیا  
 نہیں ذلی کا خون لے لی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ میرا چلایا ہوا چکر  
 ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے بلا آمل جواب دیا۔ ”تم سے میں اس قسم  
 کی حرکت کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ تمہارے پاس بہترین آدمی ہیں۔  
 میرا خیال تھا کہ اگر تم میری جان لینے کا فیصلہ کر دے تو اپنے  
 آدمیوں کو براہ راست مجھ پر چڑھائی کر دینے کا حکم دو گے۔“  
 ”میں نے ایسا سوچا تھا۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن اس میں  
 کامیابی کے امکانات کم تھے۔“

”تمہارا اندازہ درست تھا۔“ اس نے تنبیہ کی سے میری تانیہ  
 کی ”ہو نا صرف یہ کہ کچھ آدمی تمہارے مرتے اور کچھ میرے۔  
 تمہارے شاید کم مرتے“ میرے زیادہ مارے جاتے لیکن مجھے مارنا  
 مشکل تھا۔ میں آجکل قلعہ بند ہوں۔ میرے گرد بہت زیادہ حفاظتی  
 انتظامات ہیں۔“

”ہاں۔ جسے تم قلعہ بند ہونا کہتے ہو اسے میں مل میں گھسنا کہتا  
 ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”جس مل سے نکالنا میرے لیے مسئلہ بن رہا  
 تھا۔ تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس روز سڑک پر مجھ سے  
 تصادم کے بعد تم کہاں غائب ہو گئے ہو۔ اس لیے مجھے بھولی بری  
 ذلی کا سارا ایلان پڑا۔“

”تمہارا مطلب ہے اس جلی ذلی کا۔“ اس نے ایک بار  
 پھر شیطانی انداز میں سکرانے ہوئے راجیلہ کی طرف دیکھا ”جنر  
 اچھی ہے۔ میک اپ کے بغیر بھی غضب کی ہو گی۔ تمہارا بہت  
 شکریہ۔ تمہاری وجہ سے مدت بعد ایک شاندار جنر پر ہاتھ ڈالنے کا  
 موقع ملا ہے۔ اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“  
 ”اور مجھے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”جس مظلوم ہی ہو گا کہ یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر  
 نہر بہتی ہے۔ تمہاری لاش ہانے کے لیے وہ نہایت مناسب رہے  
 گی۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ میں نے ایک نظر راجیلہ کی طرف  
 دیکھا۔ وہ بہت بلی کھڑی تھی تاہم اس کے چہرے سے اندازہ لگانا  
 مشکل تھا کہ وہ خوفزدہ ہے یا نہیں۔

عالم شریات جاری رکھتے ہوئے بولا ”جب تمہاری اس نقلی  
 ذلی کا خون ملا تو ایک لمبے کے لیے میں پکرا گیا۔ میرا دل چاہا میں  
 اسے جی جی ذلی ہی کا خون سمجھ لوں یہ میری خوش قسمتی اور ایک

شعور کے ساتھ اسے انتخاب کا حق دیا تھا تو اس نے ناجائزی  
 رائج کا انتخاب کیوں کیا۔

عالم شریک رہا تھا۔ ”جال تم نے اچھا بچھا تھا۔ میری اچھی  
 کڑوری پہلی تھی۔ لیکن بس ایک نکتے سے مار کھا گئے۔ یا یوں  
 سمجھو کہ قسمت نے تم سے تھوڑی سی بے وفائی کر دی۔“ وہ بھی  
 قسمت کی بات کر رہا تھا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا شاید وہ قسمت پر یقین  
 ہی نہیں رکھتا ہو گا۔ قسمت کا مذاق اڑانا ہو گا۔ جس طرح عموماً  
 بہت زیادہ دولت کمانے والے لوگ قسمت کو گھاس ڈالنا چھوڑ دیتے  
 ہیں۔

مجھے حیرت تھی کہ اس معاملے میں قسمت نے میرا کیونکر  
 ساتھ نہیں دیا تھا! میں نے تو محسوس کیا تھا کہ لڑکھن کا دور گزرنے  
 کے بعد سے قسمت جیسے مجھ پر بہت مہمان دہی تھی۔ ہر ہر قدم پر  
 قسمت نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اب تو میں اس پر شک کیے کہ لگا  
 تھا۔ اب اگر کسی مرحلے پر قسمت نامرئی کا سلوک کر جاتی تھی تو  
 مجھے حیرت کا جھٹکا لگتا تھا۔

”کیا ہوا؟ کہاں گزری ہوئی میرے منصوبے میں؟“ میں نے  
 ایک لک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”شاید یہ محض اتفاق تھا کہ برسوں ہی مجھے اپنے ایک ذریعے  
 سے خبر ملی کہ ذلی ترکی کی ایک جیل میں تھی اور اسی جیل کے  
 دوران اس نے جیل ہی میں خود کشی کر لی۔“ عالم شریک نے بتایا ایک  
 لمبے کے لیے اس کے چہرے پر خفا تھا کچھ کم ہوئی اور وہ حقیقتاً  
 قدرے افسردہ لہجے میں بولا ”یہ ایک اور اس کر دینے والی خبر تھی۔  
 لیکن قسمت کے کھیل نرالے ہیں۔ کسی کی جان سے جانے کی خبر  
 کسی کی جان بچ جانے کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر مجھے یہ خبر نہ ملی  
 ہوتی تو آج میں آنکھیں بند کر کے تمہارے جال میں پھنسنے کے لیے  
 چلا گیا ہوتا۔“

”تم اس میں تمہاری ذہانت کا کیا کمال ہوا؟“ میں نے قدرے  
 حیرت کا اظہار کیا ”تم اپنے ذہین ہونے کا دھڑوڑا کیوں پہنتے گئے  
 تھے؟ یہ تو محض ایک اتفاق ہوا تا کہ ایک آواز ترین خبر تم تک پہنچ  
 گئی۔“ مجھ تک نہیں پہنچی۔

”میری ذہانت یہ ہے کہ میں نے جس میں آخری لمبے تک  
 احساس نہیں ہونے والا کہ میں بے وقوف نہیں بن رہا۔“ وہ  
 شاعرانہ انداز میں مسکرایا۔

”لیکن اس سے فرق کیا پڑا؟“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں  
 میں جھانکتے ہوئے کہی تنبیہ کی سے کہا ”جس طرح تمہاری آمد کی  
 توقع کر رہا تھا تم اسی طرح آئے ہو۔ اسی وجہ سے ہمیں نیسے وہ کر  
 تمہارا استقبال کرنا تھا اور تم نیسے ہی ہیں۔“

”فرق صرف یہ پڑا ہے۔“ اس نے دونوں کھڑکیوں سے  
 جھانکتی ہوئی نالوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ورنہ میرے محافظ صرف  
 مکان کے گرد ہی پہرہ دے رہے ہوتے۔ اس کمرے میں غلوت کا

جس اتفاق بھی ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ڈولی کے بارے میں خبر مجھے بہت مستند ذریعے سے ملی تھی۔ ایک ایسے شخص نے خبر دی تھی جو اس کے ساتھ ایک ہی ٹیل میں رہ چکا تھا۔ اس نے مجھے ترکی کے ایک اخبار کی کپی بھی دی تھی جس میں صرف تین سطروں میں ڈولی کی خود کشی کی خبر چھپی تھی۔

"ختمیہ یہ سب باتیں اپنی جگہ ہیں عالم شہر" میں نے گہری سانس لے کر بدلے بدلے سے بچے میں کہا "لیکن اب بالکل یقین کی بات سن لو۔ ہم اس معاملے کو ہمیں ختم کر دیتے ہیں تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ تم اس وقت چاروں طرف سے زلزلے میں ہو یہ مکان میرے آدمیوں کے گھیرے میں ہے جو تمہیں یا تمہارے آدمیوں کوئی الحاح نظر نہیں آسکے ہوں گے۔ لیکن تم یا تمہارا کوئی آدمی اب یہاں سے زندہ نہیں جاسکتا۔ صرف میں ہی تمہیں یہاں سے زندہ جانے کا پروانہ زار ہادی" دے سکتا ہوں ورنہ یہی مکان تمہاری آخری آرام گاہ بن جائے گا۔"

وہ ایک بار پھر زور و شور سے ہنسا جیسے اس بات سے بہت مطمئن ہوا ہو پھر گویا سلسلہ حکام جوڑے ہوئے بولا "جب تمہاری اس جہلی ڈولی کا فون ملا اور میں حیرت کے جھٹکے سے مستحیل چکا تو میرا ذہن ایک اور طرف گیا تھا لیکن پھر میں نے سوچا "نہیں۔۔۔ ایسا صاف تمہارا ذاتی اپنا یا ر افضل چوہدری ہی کر سکتا ہے۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بھی اپنی تھوڑی سی جاسوسی لڑائی اور یقین ہو گیا کہ یہ کارروائی تمہارے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔"

وہ اچھ کھڑا ہوا اور بے پروائی سے انگڑائی لینے کے بعد بولا "چنانچہ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ جس چوہے دان میں تم مجھے ملا رہے ہو اس کے ارد گرد ضرور تمہارے آدمی چھپے ہوں گے۔ اب تم بھی اپنی یہ خوش فہمی دور کر لو کہ میرے ساتھ تمہیں آدمی ہیں جو پہلے یہاں پہنچے ہیں۔ اچھا ہوا کہ جب میں یہاں پہنچا تو تم باہر نہیں گھڑے تھے۔ تم نہیں دیکھ سکتے کہ میں آریک شیشوں والی دیکھ میں یہاں پہنچا ہوں اور میرے ساتھ میرے دس مسزین آدمی بھی آئے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے میرے چہرے کا گہری نظر سے جائزہ لیا گویا دیکھنا چاہتا ہو میرے اثرات میں تبدیلی آنی یا نہیں۔ میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب تھا۔

عالم شہر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ میرے ان آدمیوں میں سے ہیں جو رنجیزا گوسٹ گارڈ اور اینٹی اسکواڈ وغیرہ سے متعلقہ کرنے اور ان کے گھیرے تو ذکر نکل جانے میں بے پناہ ماہر ہیں وہ اس وقت اس مکان کو گھیرے میں لے کر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے ہیں جب تک ادھر ادھر چھپے ہوئے تمہارے آدمیوں کو ان کی موجودگی کا احساس ہوا ہو گا تب تک وہ پوزیشن

لے چکے ہوں گے مجھے یقین ہے کہ اس وقت تمہارے آدمی غزوہ الجھن میں ہوں گے کیونکہ تمہارے اور ان کے اندازوں سے زیادہ آدمیوں نے اس مکان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ تم اس وقت کو گھر گھر کے منہ میں ہو۔ اگر تمہارے آدمی اچانک حملہ آور ہوں تو تب بھی تمہاری موت تو یقینی ہے مجھے معلوم ہے تمہارے آدمی قعدا میں زیادہ نہیں ہوں گے اور وہ اگر ختمہ کرنے کے لیے بڑھیں گے تو انہیں کھلے میں تباہ کرنے کا اس طرح وہ بالکل ہی مار لے جائیں گے کیونکہ میرے آدمی عمدہ طریقے سے پوزیشن لے ہوئے ہیں اب صورت حال بالکل الٹ ہے چوہے دان میں میں نہیں "تم" ہنسنے ہوئے ہو تم خوش فہمی میں مارے گئے ہو۔"

میں خوش فہمی میں نہیں "غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے عالم شہر کچھ عقلمند کچھ چالاک سا نظر آیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا لیکن فوری طور پر مجھے اس پسندے سے نکلنے کا کوئی طریقہ نہیں سوچ رہا تھا۔ میرے اندازے غلط ہو گئے تھے میں نے حکیمہ کی اس بات پر کیا تھا کہ عالم شہر زیادہ سے زیادہ وہ تین آدمی لے کر آئے گا۔ ان سے اور عالم شہر سے میں اور راحیلہ آسانی سے نمٹ لیں گے۔ اپنے چار آدمی تو میں نے محض احتیاطاً مکان سے کافی دور "چاروں سٹون میں قیادت کیے تھے کہ عالم شہر یا اس کے آدمیوں میں سے کوئی بچ کر نہ نکلے جائے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میری تدبیر غلط ہو جائے گی اور عالم شہر اپنے ساتھ گولیوں کا ایک پورا دست لے کر آجائے گا۔"

اب اگر اندر کسی طرح ہم اپنی جانیں بچا کر کچھ کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تب بھی مسئلہ ان دس آدمیوں کا تھا جو مکان کے گرد گھیرا ڈالے اور مکان ہی کی آڑ لے بیٹھے تھے۔ اب زبان دار و دار اس بات پر تھا کہ فونی سردار شیخ اور ضیف وغیرہ کو ایسے لمبے میں کارروائی شروع کریں جب ہماری جانوں کو زیادہ خطر لاحق نہ ہو۔ اگر ہماری جانوں کے خوف سے وہ زیادہ دیر تک خاموشی اختیار کیے بیٹھے رہے تب بھی ہمارے حق میں اچھا نہ ہوتا۔

عالم شہر راحیلہ کے ذرا قریب چلا گیا دل تو شاید اس کا گیا تھا رہا تھا کہ فوری طور پر راحیلہ پر نوٹ پڑے مگر محض احتیاطاً آپ کو باز رکھے ہوئے تھا۔ اس کی طرف "مارا کرتے ہوئے وہ کہنے لگی مجھے بہر حال میں زندہ چاہیے۔" یہ بدانت سماجیت غار اور رشید کو سنانے کے لیے تھی کہ اس نے ان کو مخاطب نہیں کیا تھا۔

پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا "تمہارے ذمے بہت قرض چھ گیا جو تم اب صرف جان دے کر ہی ادا کر سکتے ہو۔ لہذا تمہاری چھٹی! اس نے ہنسی بھائی۔

میں اس وقت بڑی شدت سے اپنے خیالات کو ایک ہی نقطہ پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش ام

بنت لونی حرکت میں آجائے وہ کچھ تو کسے کچھ تو پہل شروع ہو۔ سکوت کسی طرح ٹوٹے جس میں بیت خان اور شیریں خان کی غمیں بچھ رہے اور راحیلہ پر سے ایک ٹانچے کے لئے بھی نہیں بٹ رہی تھیں۔ صرف ایک سینکڑ کی لئے ان کی توجہ بٹ جاتی تو وہ سینکڑ میرے اور راحیلہ کے لئے بہت قیمتی ثابت ہو سکتا تھا۔

میں کو شش کر رہا تھا کہ میرے خیالات کی شدت میری سوچ کا اثر کارکنوں تک لے آئے کوئی ٹیلی فونی بجلی بجی بات ہو جائے۔ میری سوچ کی لہریں کسی طرح لونی کے ذہن سے جا نکرائیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ لونی اس وقت کیا سوچ رہا تھا؟ کیا حکمتِ عملی ترتیب دے رہا تھا۔ اس نے یقیناً یہ تو دیکھ لیا ہو گا کہ مسلح آدمی ہماری توقعات سے زیادہ آگے تھے اور انہوں نے مکان کو گھیر لیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے کس کس چیز کی آڑ میں پوزیشن سنبھالی تھی اور وہ کس حد تک میرے آدمیوں کے مارگٹ پر تھے۔

بہر حال میری سوچ کی شدت تک لے آئی یا پھر شاید یہ محض اتفاق تھا کہ اسی لمحے ایک ساتھ کئی گھنٹیں گرج اٹھیں۔ لیکن یہ گھنٹیں مکان کے بالکل قریب ہی گرتی تھیں وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا مجھے اس کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ لیکن اس سے فائدہ عیسینا راحیلہ نے اٹھایا۔

ایک طویل سکوت کے بعد اچانک دھماکے ہوں تو ان کا ایک فوری اثر ضرور ہوتا ہے خواہ وہ دھماکے متوقع ہی کیوں نہ ہو رہے ہوں اور خواہ انہیں سننے والے کتنے ہی ماہر لڑاکے کیوں نہ ہوں اس نفسیاتی نکتے سے یقیناً راحیلہ بھی واقف تھی اور اسے بھی ضرور ایسے ہی لمحے کا شدت سے انتظار تھا۔ ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ اس وقت عالم شیر راحیلہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا وہ جوشِ جذبات کو دباتے دباتے بھی اس کے خاصا قریب چلا گیا تھا۔ راحیلہ کی ٹانگہ جس تیزی سے حرکت میں آئی اسے میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے آواز سے اندازہ ہوا تھا کہ لات اس کی کپٹی پر پڑی تھی۔ وہ کتے ہوئے شہتر کی طرح بیڑ پر گرا اور راحیلہ نے ہاتھ دم کی طرف چلا ٹنگ لگا لی۔ قیمت یہ تھا کہ اس وقت دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ ہاتھ دم اس کے قریب تھا۔ اس نے نہایت صحیح حکمتِ عملی اختیار کی تھی۔ دروازے سے ٹکرانی ہوئی وہ اندر جا گری اور اسے گویا سو پر میرا تھا۔

دروازہ اس نے لات مار کر بند کر لیا تھا۔ حالانکہ عالم شیر اپنے آدمیوں کے گوشِ گزار کر چکا تھا کہ راحیلہ کو وہ زندہ لے جانا چاہتا ہے لیکن عالم شیر پر راحیلہ کے وار اور اس کے یوں بیڑ پر جا کر نے کے باعث انہوں نے گویا اس پر دیت کو بلانے طاق رکھ دیا۔ گولیوں نے راحیلہ کا قاتب کیا۔

وہ گولیاں غالباً ہاتھ دم کے دروازے سے گزر گئی تھیں۔ میں صبحِ صبح پر دیکھ نہیں سکا لیکن مجھے امید تھی کہ اس وقت تک

راحیلہ دیوار کی آڑ لے چکی ہو گی۔ ہاتھ دم بہت اچھا مورچہ تھا۔ وہاں اب بھی تھا گولیوں کی بو چھاڑ کر دو کتے کے لیے وہ بھی بہت اچھا ثابت ہو سکتا تھا۔

میں خود اس وقت تک اوندمے نہ کر کر بیڑ کی پائنتی پہنچ چکا تھا۔ بیڑ کی پائنتی کی طرف بھی غمیں نکلی کا خاصا اونچا نقشہ تھا۔ بیڑ پر میزس بھی بہت سوئی تھی۔ چند لمبے کے لیے تو یہ چیزیں مجھے گولیوں کی بو چھاڑ سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔ میری یہ توقع پوری ہوئی لیکن اس دوران میری توقع سے بڑھ کر ایک بات ہو گئی۔

راحیلہ تو نوکلی ٹانگ والے کی گمن کی زور تھی اور اسی نے راحیلہ کے قاتب میں برست مارا تھا۔ دوسری گولی پر باسور غصے نے بھی اتنی ہی مستعدی دکھانے کی کو شش کی تھی۔ اور راحیلہ نے ہاتھ دم کی طرف چلا ٹنگ لگا لی تھی اور میں بیڑ کی پائنتی کی طرف لڑھا تھا۔ اس دوران عالم شیر جو بیڑ پر گرا تھا اٹھ نہیں سکا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ مری چکا ہو۔ راحیلہ نے اس کی کپٹی پر جو لگ ریسید کی تھی وہ عموماً جو دمیں خاصی ملک ثابت ہوتی تھی۔

لیکن اس کام میں اگر کوئی کسر نہ ہو گئی تھی تو وہ خود عالم شیر کے اپنے آدمی کے ہاتھوں پوری ہو گئی۔ اس نے مجھ پر برست مارا تھا لیکن میں تو بیڑ کی پائنتی جا کرنے کی وجہ سے بچ گیا تھا پائنتی کے نکلنے کے کچھ کچھ بعد مجھ پر گرنے آئے نام گولیاں اوپر سے گزر گئیں لیکن کچھ گولیاں عالم شیر کے نچلے دھڑ اور میزس کو بھی چمید گئی تھیں۔ میں فوری طور پر یہ دیکھ تو نہیں سکا تھا لیکن میں نے برست مارنے والے کی خوفزدہ سی جی ضرور دیکھی تھی۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس سے حماقت سرزد ہو چکی ہے۔

راقتل کی ٹانگیں گولیوں سے غائب ہو گئیں میں سمجھ گیا کہ بیت خان اور شیریں خان اب دروازہ کھول کر اندر آئیں گے بلکہ شاید ان کے ساتھ ان کا تیسرا ساتھی بھی آئے گا جو غالباً دروازے پر تعینات تھا میری طرف سے انہیں زیادہ توشیوں میں جلا ہونے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انہیں یقینی طور پر مظلوم قاضی نہتا ہوں۔ میرے لیے ایک سینکڑ کا دسواں حصہ بھی قیمتی تھا۔ ان دونوں کی شکلیں گولیوں سے غائب ہوتے ہی میں اچھل کر بیڑ پر چڑھا۔ میں نے عالم شیر کی حالت دیکھنے میں بھی کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ ہاتھ اونچا کر کے میں نے فانوس میں پھنسا ہوا بھاری بھر کم جرسن لیوکر نکال لیا۔ قریب مياں آنے کے بعد جب راحیلہ چائے پانے کچن میں گئی تھی تو میں نے یہ گمن فانوس کے اوپر چھپا دی تھی۔ مجھے امید تھی کہ تلاشی لینے والوں کا دھیان اس طرف نہیں جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا تھا۔

فطری سی بات ہے کہ انسان ہتھیار ایسی جگہ چھپانے کی کو شش کرتا ہے جہاں آسانی سے اور جلد از جلد رسائی ہو سکے۔ فانوس کے اوپر سے ہتھیار نکالنے تک تو انسان کا اپنا کام تمام ہو سکتا ہے لیکن میری توقع کے مطابق یہی جگہ محفوظ ثابت ہوئی تھی۔



مے؟ جس میں معلوم ہے کچھ لوگ مکان کے اندر تھیں کر شوگر کر رہے ہیں۔" وہ بولی پھر اس نے گویا تھکی کی "طبی شوگر نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے دوبارہ بیڈ پر چڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے فائوس پر دوسری طرف رکھا ہوا کھولوں کا ایک چھوٹا ساٹا اٹار۔

ابھی میں بیڈ سے اتر رہی تھا کہ راحیلہ جلدی سے دروازے کے قریب دیوار کی آڑ میں ہو گئی۔ اس نے مجھے بھی فوراً دیوار کی اوٹ میں ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹے کے بل لیٹ چکی تھی۔ میں بھی بیٹے کے بل لیٹ کر کھٹک ہوا اس کے قریب پہنچا۔ وہ کچھ ایسے زامیے پر تھی کہ اس نے شاید مجھ سے پہلے کچھ دیکھ لیا تھا۔

وہ سرگوشی میں بولی "ایک شخص ہماری ہی طرح بیٹے کے بل لیٹ کر بیڑیاں چڑھ کر آئے ہیں۔ اس نے آٹھ کی کوشش کر رہا ہے۔" مجھے دروازے سے سر نکال کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ نیم وا تھا اور جس طرف وہ قبضوں کے ذریعے چوکتے سے جڑا ہوا ہے اس طرف بھی موجود تھی۔ میں نے اس سے آنکھ لگا کر دیکھا۔

عین اسی لمحے اس شخص نے بھی بیڑی سے سر اٹھا کر برآمدے کا جائزہ لیا۔ وہ ڈاکوؤں کی طرح ڈھانچا بندھے ہوئے تھے۔ میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میرے آدمیوں میں سے نہیں تھا۔ وہ گھر کے طرف آتا چاہ رہا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ گھر میں صورت حال کیا ہے۔ وہ یقیناً الجھن میں تھا اور غلام انداز میں کھٹک ہوا آگے آ رہا تھا۔

وہ جب برآمدے میں آچکا تو میں نے اس کی الجھن کا خاتمہ کر دیا۔ میں نے دروازے کے قبضوں والی جھری سے اس پر نظر رکھتے ہوئے صرف اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر۔ اور وہ بھی فرش پر پڑی رکھتے ہوئے ریوالت کی مال ڈرا اوڑنی کر کے فائر کیا۔ اس لحاظ سے یہ ایک مفرد فائر تھا کہ میری آنکھ کبھی اور تھی ریوالت کبھی اور۔ لیکن ہوا وی جو میں چاہ رہا تھا۔ گولی ڈھانچے والے کی پیشانی میں پڑی ہوئی تھی۔

وہ برآمدے میں کچھ اس طرح چلا آ رہا تھا جیسے کوئی اڑیڈا سر فرش سے ذرا اونچا کیے رنگ رہا ہو مگر اب ایک جھٹکے سے اس کا سر فرش سے جا ٹکرایا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ مگر پر اس کا ہاتھ بے جان انداز میں نگاہ گیا۔

"اسے کتے ہیں نشانہ۔" میں نے راحیلہ کی طرف دیکھ کر دانا طلب کیے میں کہا۔

"کوئی ایسا کمال تو نہیں دکھایا تم نے۔" وہ منہ بنا کر بولی "اس طرح تو میں بھی کر سکتی ہوں۔" اور اگر یہ کرے تب تک آئے میں کامیاب ہو جاتا تو اس سے اسے چشم رسید کوئی۔ "اس نے فائر کرنا شروع کیا۔" میں نے راحیلہ کی طرف دیکھ کر دانا

یہ اکثر تاروں اور اس وقت میرا جتنی اٹا تھا۔ اسے اتارتے ہی میں بیڈ کی آڑ میں بیٹے کے بل لیٹ گیا۔

دروازے کی کنڈی کھلی پھر یکدم دروازہ تیزی سے کھلا وہ تین دروازہ دار کمرے میں تھیں آئے یہ ان کی غلطی تھی۔ مجھے ان سے ایسی غلطی کی توقع نہیں تھی وہ پیش دروازے کے تھے لیکن شاید عالم شیر کو یہ سٹ لگ جانے سے پوچھا کر رہ گئے تھے۔

جس طرح منہ اٹھانے وہ کمرے میں تھے "اسی طرح تقریباً ایک ساتھ منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ لیوکر میرے استعمال میں پیشہ سے بڑے بھروسے کی غمن جات ہوئی تھی۔ صحیح طور پر تیار کی گئی اس کی ایک ہی گولی بڑے بڑے پتے خان کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی میں نے قاتر نامراتی حالات کے باوجود عمدہ نشانے بازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ تینوں کو ایک ایک گولی ماری تھی اور بیٹے پر عین دل کے مقام پر مارنے کی کوشش کی تھی۔

تینوں اوپر نیچے ڈھیر ہو گئے۔ ان کی کتھیں ان کے نیچے دب گئیں۔ میں نے ایک لمحے انتظار کیا جب ان میں سے کسی کے جسم میں حرکت کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو میں نے آٹھ کر عالم شیر کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی مر چکا تھا۔ اس کے نیچے دھڑ میں کئی گولیاں پڑی ہوئی تھیں منہ کھلا تھا اور منہ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ بیڑیوں میں جذب ہو رہا تھا۔ لیبٹ خان، شیریں خان اور ان کا تیسرا ساتھی بھی مر چکا تھا۔

عالم شیر کی موت نے بلاشبہ مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔ میں سوچ رہی نہیں سکتا تھا کہ ایک منٹ پہلے آکر کر میرے سامنے کھڑا اور فرعون کے سے لے میں بات کر رہا ہو وہ کیم خیم طاقتور شخص گوشت کے ایک بیکار اور لہو چھوڑتے ڈھیر کی صورت میں میرے سامنے پڑا ہو گا۔

پانسر بیٹے کا سرا صبح معنوں میں راحیلہ کے سر تھا۔ اس کی ایک لنگ نے گویا بغیر بنیادوں کے کھڑا ہوا کوئی محل گرا دیا تھا۔ یکدم ہی گویا کبھی انٹ پلٹ ہو گیا تھا بھرپور ستور فائرنگ جاری تھی اور ایسا لگتا تھا کہ کچھ لوگ مکان کے اندر تھکے ہوئے تھے اور باہر کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔

دھنک مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ریوالت سمیت میں تیزی سے گھوما۔ گردہ راحیلہ تھی جو میرے پیچھے کھڑی آٹھیں ہٹ چلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں فٹس صاف کرنے کا لہا سا دانہ زنی برش تھا۔

"یہ کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔  
"تم نے تو اپنے لیے ہتھیار کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا میں اسی سے ہتھیار کا کام لے لوں گی۔" وہ اطمینان سے بولی۔  
"تم بغیر ہتھیار کے بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہو۔" میں نے کہا۔  
"میرے گھر کے ہاتھ، پائے، روگے، ماہر کی بھی کچھ فکر کر

ریو اور بھی مجھے دے دو۔ مجھے تو زیادہ فکر تھامی ہی ہے۔ مجھ پر کوئی چائے میں تو شاید کوئی ذرا جھجک بھی جائے لیکن تھامی تو جھجک دیکھتے ہی۔“

”کوئی بات نہیں۔ دیکھا جائے گا تم یہ تو پکڑو۔“ میں نے ریو اور دوبارہ لہو کر کے زبردستی اس کے ہاتھ میں تھام دیا۔

میں پنڈلی سے بندھی یام سے خنجر نکال رہا تھا تو وہ بولی ”یہ تو جیسی کام دے کے گا جب تمہیں کسی کے قریب پہنچنے کا موقع ملے اور اس وقت پکڑیں جیسی محسوس ہو رہی ہے اس میں کسی کے قریب پہنچنے کی نوبت نہیں آئے گی۔“

اس کا مطلب تھا کہ وہ معرکہ آرائی کے طور طریقوں کو سمجھتی تھی۔ اسے نرسنگ کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک نظر خنجر کو دیکھتے ہوئے کہا ”کام تو یہ دور سے بھی دے جائے گا لیکن صرف ایک بار۔ اس کے بعد انسان پکڑنے کا نشا۔“

”جھا۔۔۔ تو خنجر پھینکا آتا ہے تمہیں؟“ وہ دوا زے کے قریب پہنچ کر بولی۔

”تھوڑا بہت ہر کام ہی سیکھنے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے جواب دیا دوا زے سے ٹکل کر دوا زے کے ساتھ لگ کر وہ برآمدے کے ایک کونے کی طرف ٹھکنے لگی اور میں دوسرے کونے کی طرف۔

وہ بغیر کئے میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ مکان کی ساخت ایسی تھی کہ بالکل وسط میں عمارت تھی اور اس کے چاروں طرف خلا حصہ تھا جس میں دو طرف لان تھا اور دو طرف کورٹ یا راز۔ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے لان چھڑ جھکاڑا ہوا تھا۔

میں چاہ رہا تھا کہ راحیلہ ایک طرف روانہ ہو اور میں دوسری طرف۔ ہم عمارت کے گرد چکر لگا کر آئے سانسے آجائیں۔ اس دوران ہمیں کچلے حصے میں جہاں کہیں بھی کوئی مسلح شخص نظر آئے اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ مختصر سا سفر بہت کا سفر بھی ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا اس میں دوبارہ ہماری ملاقات ہی نہ ہوتی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کون مکان کے گرد چکر پورا کیا ہے گا اور کون نہیں۔ اس کا زیادہ انحصار اس بات پر تھا کہ کس مسلح شخص پر ہماری نظر پہلے پڑتی ہے یا ہم پر اس کی۔

میرا راحیلہ کو تھا دوسری طرف پہنچنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کی ملا جیوں کو زیادہ مسر طور پر پرکھنے کے لیے رسک لینا ہاگزیر تھا۔ اس کے علاوہ مسر حکمت عملی بھی یہی تھی۔

گولیوں کی تڑخا بہت جاری تھی۔ مکان کی چار دیواری زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس کا بالائی حصہ سینٹ کی جالیوں سے بنا ہوا تھا۔ یہ جالیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔

مکان کی اصل عمارت خاصی بلند ہی پر تھی اس لیے بعض جگہ کھڑکیوں کے چھوٹے کھڑکیوں تک پر گولیاں لگ چکی تھیں۔ آسمان میں چار دیواری سے باہر یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ میرے سامنے کس کی

پھر وہ دوا زے کی اوٹ سے سر زرا نکالتے ہوئے بولی ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ باہر ہو کیا رہا ہے؟“

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔“ میں نے آہستگی سے اٹھتے ہوئے کہا ”میرے آدمیوں نے پہلے دور مارا انکوں سے بے تحاشا ہانچ کر کے انہیں ان کے ٹھکانوں سے نکالا ہے۔ میں نے باہر کچھ بھی دیکھا بھی نہ سکی۔ لگتا ہے کچھ لوگ مر بھی چکے ہیں۔ کچھ شاید زخمی بھی ہوئے ہوں۔ جو بچے ہیں وہ میرے خیال میں مکان میں محسوس آئے ہیں اور سورج بند ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک برآمدے میں مارا گیا ہے۔ فائرنگ کی آوازوں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ لوگ دوبارہ زیادہ سے زیادہ تین ہیں۔“

راحیلہ کان لگا کر سننے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے تین ہیں دو مکان کے سامنے والے حصے میں ہیں اور ایک پچھلی طرف۔“

”تھمرا اندازہ بھی خاصا برا نہ ہے۔“ میں نے تائید میں سر ہلایا ”آؤ ہم اپنے آدمیوں کی مدد کریں۔ عالم شیر کے آدمی مکان میں آچھپے ہیں اس لیے میرے آدمیوں کا مزید قریب آنا اور ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔“

”تم چاہتے ہو ہم اندر رہتے ہوئے ان کا مقابلہ کریں؟“ راحیلہ میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ان کا حیان باہر کی طرف ہو گا۔ اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم کچھ مشاق ثابت ہوئے تو وہ ہمارے ہاتھوں مارے جائیں گے ورنہ یہ مقابلہ نہ جانے کتنا طویل کھینچ جائے۔ اس دوران ہمارے کسی آدمی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ وہ کچلے میدان میں آگے بڑھنے اور اس مکان تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری وجہ سے وہ بے چارے احتیاط بھی بہت کر رہے ہیں ورنہ اب تک تو وہ گریڈ وغیرہ مار کر اس مکان کو بھی کھنڈر بنا چکے ہوتے۔“ یہ کہتے ہوئے میں ایک کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس طرف سے مکان کی چار دیواری کا بھتا بھی حصہ دکھائی دے رہا تھا اس کی آڑ میں ہمیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ لوگ کہاں کہاں تھے یہ جاننے کے لیے کمرے سے لٹکنا ضروری تھا اور اس کا مطلب خطرے کی حدود میں کچھ اور آگے جانا تھا کیونکہ اچھپتی ہوئی گولیاں برآمدے تک آ رہی تھیں۔ مکان کی چار دیواری پر یقیناً ان گنت گولیاں برس چکی تھیں۔

”لیکن ہمارے پاس گن صرف ایک ہے۔۔۔ اور وہ بھی محض ریو اور۔“ راحیلہ بولی ”جبکہ میں باہر سب مشین گن تک کی آواز سن رہی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں ہمارا صرف چنچہ ہی کافی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں یہ ریو اور بھی نہیں لے لو۔ میں خالی ہاتھ ہی کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک خنجر میری پنڈلی سے بندھا ہوا ہے شاید گولیوں کی اس بارش میں وہ کچھ کام آجائے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔“ راحیلہ جلدی سے بولی ”مگر تم

کیا ایک بار پھر ایک کمن گرنی ڈرا وقتے کے بعد پھر اسی کمن کو آواز سنائی دی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ فائرنگ کرنے والا اب صرف ایک شخص باقی رہ گیا تھا اور وہ مکان کے سامنے ہی کی طرف دوسرے کونے میں تھا۔

میں خالی ہاتھ تھا اور دیوار کی اوٹ سے لٹکنے کے بعد میں اس کی نظر میں بھی آسکتا تھا لیکن میں تب بہ تقدیر ہو کر دیوار کی اوٹ سے نکل کر سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر ٹھکنے لگا۔ دو تین قدم آگے بڑھنے کے بعد میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا اور تب وہ شخص مجھے نظر آیا۔

وہ دیوار سے لگا کچھ جھکا کھڑا تھا۔ اس نے کمن کی نال سنسنے کی جانی سے نکلی ہوئی تھی۔ ان احمقوں میں سے جو مرتے جا رہے تھے، زخمی ہوجانے والوں کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ انہیں غالباً یہ احساس تک نہیں ہوا کہ کتنی گولوں سے فائرنگ ہو رہی تھی اور کتنی خاموشی ہو چکی تھیں۔ ہر کوئی بس اپنی اپنی جگہ فائرنگ میں لگا ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں گولیاں برساتے کو ہی شاید بہت بڑی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ عالم شیران کے بارے میں بہت ڈیجینس ہانک رہا تھا جبکہ مجھے یہ سخت احمق لگے تھے۔ ان کی لڑنے کی کوئی حکمت عملی نہیں تھی۔ آپس میں ربط کا کوئی احساس نہیں تھا۔

میں دیوار کو چھوڑ کر آگے کے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ اب اگر وہ شخص مرکز دیکھ بھی لیتا اور میری موجودگی سے باخبر ہو جاتا تب بھی فوری طور پر مجھے نشانہ نہیں بنانا تھا۔ لیکن اس نے مرکز نہیں دیکھا شاید اسے گرد پیش کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسنے فاصلے سے اسے جنم رسید کرنے کی کیا تدبیر کھول کے دوسری طرف سے راجیلہ کے دوپٹے پر فرشتہ اجل کی نظر اس پر پڑی۔ میں راجیلہ کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ غالباً مکان کی دوسری بجلی دیوار کی اوٹ میں تھی لیکن لیوگر کی آواز نے مجھے بتا دیا کہ یہ دوسرا شخص ابھی اس کی ریچ میں آیا تھا۔

اس مرتبہ لیوگر دیوار گر جا اور وہ شخص بھی دوپٹے سے زمین پر پھیر ہو گیا۔ ایک گولی غالباً اس کے کندھوں کے درمیان اور دوسرا گتھی میں پیوست ہوئی تھی۔ اس کی کمن سینٹ کی جالی میں بچھنی لگی رہ گئی۔ وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔

اس کے بعد مکان کے اندر گر بچنے والی تھیں خاموش ہو گئیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب مکان میں ہمارے دشمنوں میں سے کوئی زخمی نہیں رہا تھا۔ دو سائیڈز میں دیکھ چکا تھا اور راجیلہ ہم غالباً دو سائیڈوں کا جائزہ مکمل کر کے پختہ ہی والی تھی۔

میں چند لمبے ساکت کھڑا رہا۔ اس درنہ میں باہر سے فائرنگ بہ بند ہو گئی اور مکمل سکوت چھا گیا۔ راجیلہ ابھی تک دوسرے کو۔

کون کہاں سے فائرنگ کر رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے زیادہ کوشش کرنا بھی سخت خطرناک تھا۔ اس لیے میں رکروں کی سی حالت میں دیوار کے ساتھ رک کر کھاتا آگے بڑھ گیا۔

فی الحال میں جس طرف تھا اور بجلی دیوار تھی لیکن اس کی آڑ میں کوئی نہیں تھا۔ اس طرف کا مورچہ شاید اس شخص نے سنبھالا ہوا تھا جو کمرے کی طرف آنے لگا تھا اور میرے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔

میں جوئی برآمدے کے کونے پر پہنچا مجھے مکان کے سامنے کا حصہ دکھائی دینے لگا جس طرف گیت اور ریچ وغیرہ تھا چاک سی میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر لیٹا ہوا تھا لیکن اس کا سر گیت کے پیچھے تھا گیت کے نیچے اور اوپر گرل کا ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ نیچے کی گرل سے اس نے اپنی سیون ایم بی کمن کی نال نکالی ہوئی تھی۔ وہ مرد آگے بڑھا کر برست مارا پھر سر پیچھے دیوار کی اوٹ میں کر لیتا۔

وہ کمرے رنگ کی شلوار قمیض میں تھا۔ اس کا چوم گیت کی طرف تھا لیکن مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس نے بھی چرسے پر ڈھانا باندھا ہوا تھا۔ اس کی توجہ مکمل طور پر باہری کی طرف تھی۔ میں نے خنجر نوک کی طرف سے قہار ہوا تھا۔ میں نے اسے ہوا میں ڈرا لرایا اس دوران اس شخص کی توجہ دوسری طرف ہی رہی۔

میرا ہاتھ تیزی سے گھوما اور خنجر تقریباً گولی کی سی رفتار سے جا کر اس کے پهلویں پیوست ہو گیا۔ اس خنجر کا تودہ وزنی تھا جو خنجر کو زیادہ کمرائی تک پیوست کرنے میں مدد دیتا تھا۔ اس کے دزن کی وجہ سے خنجر کمرائی میں اتر جاتا تھا۔ خنجر تقریباً دسٹے تک ہی اس کے پهلویں اتر گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ترچھا اس کے دل میں اترتا ہو گا۔

اس نے تڑپ کر کمن سمیت پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس کی کمن گرل میں ہی پھنس کر رہ گئی اور وہ بھی پلٹ نہ سکا۔ کمن پر اس کی گرفت ایک لمبے کے لیے سختی سی ہو گئی لیکن پھر وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اوندھا ہوا۔

اب میں خالی ہاتھ تھا۔ اگر میں اس شخص کی کمن اٹھانے کے لیے اس کے قریب جاتا تو یقیناً ممکن تھا کہ مکان کے دوسرے کونے پر موجود آدمی کی نظر میں آجاتا۔ مجھے فائرنگ کی آواز سے اندازہ ہوا تھا کہ ایک شخص اوپر کونے پر موجود تھا۔

میں ابھی ابھی اس میں ہی تھا کہ مکان کے عقبی حصے میں کہیں میرا لیوگر گر جا۔ ابھی تک فائرنگ وقتے وقتے سے جاری تھی۔ گیت کے عقب میں موجود شخص کے سر نے کے بعد فائرنگ کی شدت میں مزید کمی آگئی تھی۔ باہر سے اب بھی وقتے وقتے سے گولیوں کی بوچھاڑ آ رہی تھی لیکن اس کا اندازہ شور اور کفن گرنے نہیں تھی۔

اسی آوازوں کے درمیان مجھے لیوگر کی آواز سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی فائرنگ گویا ختم ہو گئی۔ میں نے ایک لمبے انتظار



ہے چکر کے زمانے میں بھی انسان کو اپنی جان بچانے کے لیے درندوں کو ہلاک کرنا پڑا تھا یا پھر وہ ان کا قہقہہ سن جاتا تھا۔ اب ہم ہارنا گئیں والے درندوں سے تو محفوظ ہیں۔ انہیں تو ہم نے جنگلوں تک محدود کر دیا ہے یا چڑیا گھروں کے پنجروں میں بند کر دیا ہے لیکن یہ دو عالموں والے درخت اب بھی زندگی اجیرن کیے رکھتے ہیں اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے دینا دی قوانین کا گالی ہیں۔

”مجھ میں نہیں آ رہا تمہاری اس تقریر دل بے زہر کے جواب میں کیا کہوں۔۔۔“ پھر وہ جھرمجھی سی لے کر بولی ”لیکن میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ یہ تم مجھے کس راستے پر لگا رہے ہو؟ میں تو بڑی امن پسند سی لڑکی تھی۔“

”تم اب بھی امن پسند ہی ہو۔ میں جیسے یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ وہ کر تمہارے ہاتھ سے کوئی شریف کوئی کمزور کوئی بے ضرر کوئی شستا اور کوئی بے قصور آدمی ہلاک نہیں ہو گا۔ بلکہ ایسے لوگوں کی تودہ کے لیے ہم بسا دہم کو شش کریں گے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔“ اس نے آبی بھائی ”ماڈرن سلطانی ڈاکو!“ ”مگر میں نے تو آج تک کسی ڈاکا نہیں ڈالا۔“ ”تم ذرا دولت مند سلطانی ڈاکو ہو۔ تمہیں ڈاکے ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس بے چارے کو تو فریبوں کی مدد کے لیے ڈاکے ڈالنے پڑتے تھے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہر دور میں اس دور کی ضرورت کے مطابق لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں یہ بھی شاید فطرت کا ایک اصول ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں جیسے ایک بات بتا دوں۔“ وہ انگلی ڈیش بورڈ پر مارتے ہوئے بولی ”مجھے کوئی فلسفہ وغیرہ نہیں معلوم۔۔۔ میں اخلاقیات کی کسی بحث میں نہیں پڑتی۔ میں تو یہ سب کچھ بس تمہارے لیے کر رہی ہوں۔“

”دیکھا۔۔۔ محبت میں کتنا اثر ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ محبت کہاں سے آگئی چچا میں؟“ وہ تنگ کر بولی۔ ”محبت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟“ میں نے مکیسرہ لے لے ہوئے منگنا کر کہا۔

”کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ میری حماقت ہو سکتی ہے۔۔۔ میرا جذبہ رحم ہو سکتا ہے۔۔۔ جیسے کوئی مارنے آئے گا۔ کوئی تمہاری ہلاکی لگانے کی کوشش کرے گا تو مجھے ترس تو آئے گا۔ دوستوں کو مار بیٹ سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں تو ہلانے پڑتے ہیں نا۔“ وہ بولی۔ میں نے کن اکھبوں سے دیکھا وہ اپنی شرر مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”تمہاری پناہ میں اگر میں خود کو بہت محفوظ محسوس کر رہا ہوں۔“

”ہر ایک قسم کے بھلا کے سر پر درست شفقت رکھنا چاہیے۔“

”میری عادت ہے۔“ وہ شامانہ انداز میں بولی ”جیسے جب کوئی تنگ کرے“ ہلا کھلف میرے پاس چلے آیا کرو۔“

”مجھے تو جب کوئی تنگ نہیں کرے گا“ میں تب بھی تمہارے پاس آ جایا کروں گا۔ صرف تمہاری اجازت کی ضرورت ہے میں نے فوراً کہا۔

”میں کیا تو تم جیسے بچوں میں خرابی ہوتی ہے۔ ذرا سر رکھا اور کھیل ہو گئے۔ دلوں دلوں کرتے جان کو آجاتے ہیں۔ بول۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے اپنے آپ کو ہم بستر کی سامنے ثابت کر دیا تھا۔ ہتھیاروں سے یا خالی ہاتھ تو دونوں طرح لڑائی جھڑپ میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہر ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس کے اعصاب پر اس ساری لڑائی خوں ریزی کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسی طرح تازہ اور خوش مزاج نظر آ رہی تھی۔ ایک لڑکی ہوتے ہوئے اس خوبیاں اور بھی زیادہ قابل قدر تھیں۔ میرے خیال میں اب اس کو ”دی سرکل“ میں ہی شہر کرنا چاہیے تھا۔ وہ میری توجہ سے کچھ براہ کرم کی نگاہیں لگی تھی۔ لڑکی اور شفیق شاہ کے بعد مجھے اس صحیح معنوں میں اسپارک نظر آیا تھا۔ اس کے اندر بڑی بے دودھ اور عجیب و غریب صلاحیتیں مقید تھیں۔ جو غمی اسے! پناہ اور موقع میرے آتا تھا اس نے اپنی ذات کا پھر پورا اظہار تھا۔

ایک عجیب بات تھی کہ میرے دل میں اس کی طلب آرزو تھا شاہ بڑھ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں یکدم ہی یہ خواہش ایک بار بڑی شدت سے ابھر آئی تھی کہ وہ میری بن جائے میرے کہ رہے ہر وقت میری نظر میں رہے! اس کی میری رفاقت ہو جائے اس کے میرے درمیان جو ایک نادیہ سی باریک سی تھی وہ جو غیرت کی ایک تھوڑی سی تھوڑی تھوڑی تھی وہ تم ہو جائے۔

لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا اپنی خواہش بیان کرنے خواہشیں بھی عجیب ہوتی ہیں اور عجیب تر موقعوں پر بیدار ہیں۔ دیے بھی اس کے دل پر پتھر کا جو خلاف چڑھ گیا تھا! ابھی چیلنے کے لیے نہ جانے کتنا وقت درکار تھا۔ چنانچہ میں نے نہ بات دل میں ہی رہنے دی۔

اسے میں نے اس کے گھر آمارا اور گاڑی دو نمبر پر چھ ہوسے وہاں سے دوسری گاڑی لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ فی الحال گاڑی کو میں اپنے گھر پر رکھ کر نہیں چاہتا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے شاور لیا، لباس تبدیل کیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آفس جا پہنچا۔ آفس میں بیٹھ کر میں یوں کا مصروف ہو گیا جیسے میرا تو خواب میں بھی کسی قسم کے لڑائی جھڑپ سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ گو کہ میرے اعصاب ابھی تک کتبہ لیکن میں پوری دوشل کر رہا تھا کہ ہر سکون نظر آ رہا۔

بہت سی متوقع چیزوں کے بارے میں بھی ہدایات لگھ کر رکھ دوں۔  
عین اس وقت جب میں اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا میرے ڈائریکٹ  
فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر بیٹو کا تو دوسری طرف سے  
قدر رحمت سے پوچھا کیا؟ تم ابھی تک آفس میں بیٹھے ہو؟  
آواز جالی پچائی تھی مگر کتنی ہی کیفیتوں میں ابھی ہوئی تھی۔  
اس میں غبار کا رنگ بھی تھا اور آنسوؤں کی نمی بھی۔ کسی اٹھانے  
کے لیے ابھی تھی اور ضبط کی ناکام کوششوں کی جھلک بھی۔ وہ  
ایک گھر گیری آواز تھی جسے خوشدلانہ بنانے کی کوشش کی جا رہی  
تھی۔ وہ ستارہ کی آواز تھی۔

”ہاں۔۔۔ آج مجھے ذرا دیر تک آفس میں رکنا پڑا۔“ میں نے  
دھمے لیے میں کہا ”تم سناؤ۔۔۔ تمہیں آج اس بڑے حقیر پر تصویر کی یاد  
کیسے آئی؟“

”یاد تو جب بھی آتی ہے مجھے ہی آتی ہے۔ فون جب بھی کرتی  
ہوں میں ہی کرتی ہوں خواہ کتنی ہی تاخیر سے کروں۔“  
”یہ تمہاری محبت ہے اور میں اس کا قدر دان ہوں۔“ میں نے  
طلوس سے کہا۔

”تم واقعی میری محبت کے قدر دان ہو؟“ اس نے گویا بطور  
خاص تصدیق چاہی۔

”کیا تمہیں اس میں شک ہے؟“ میں نے الٹا اس سے سوال  
کر دیا۔

”ہاں شک تو ہے۔“ وہ صاف گولی سے بولی ”بہر حال اگر  
تمہیں دعویٰ ہے کہ تم میری محبت کے قدر دان ہو تو فوراً میرے پاس  
پہنچ جاؤ۔“

میں ایک لمحے خاموش رہا تو وہ بولی ”ابھن میں پڑ گئے تائے؟  
دوسری مصروفیتیں آڑے آ رہی ہوں گی۔ میری بے چاری مسکین  
اور صابری محبت کو تمہاری کسی کا دہ باری مصروفیت یا کسی دوسری  
عورت سے کیے ہوئے وعدے نے شکست دے دی ہوگی۔“

”مصروفیت تو کوئی نہیں ہے۔ ہوئی بھی تو میں اسے ملتوی  
کر دیتا۔ کسی اور سے وعدہ ہوتا اسے بھی توڑ لیتا۔ لیکن بات کیا  
ہے؟ تمہاری آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”کسی فلم کے سیٹ پر نہیں ہوں۔“ وہ غمور مگر تلخ سے انداز  
میں ہنسی ”میری آواز سے تمہیں شبہ ہوا ہو گا کہ شاید میں کوئی سین  
کچھ اتر کر کے فارغ ہوئی ہوں اور ابھی تک مجھ پر اس کا اثر باقی  
ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں گھر ہوں۔ آج تو میں شو تک  
پڑ گئی ہی نہیں۔ میں بالکل اکیل ہوں۔ بلکہ بہت ہی زیادہ اکیلی۔۔۔!  
تم آ رہے ہو یا نہیں؟“

”نہیں آ رہا ہوں۔“ میں نے فیصلے پر ہنسنے ہوئے کہا۔

”میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ بہت شدت سے۔“ اس نے  
کہا اور فون بند کر دیا۔ میں ریسیور کو قفاسے ایک لمحے غور سے دیکھا  
رہا۔ مگر وہ بے چارہ محض ایک آکھ تھا۔ مجھے اتنا کچھ ہی سنا سکتا تھا

تھوڑی دیر بعد ہی شیم کا فون آ گیا۔ مجھے کیترن مٹا چکی تھی کہ  
پلے بھی دو مرتبہ اس کا فون آچکا تھا۔ میں نے کہا ”مجھے پیغام مل چکا  
ہے کہ تم نے فون کیا تھا۔ میں ابھی چھپس فون کرنے ہی والا تھا۔  
میں آج صبح سے ذرا ایک کا دہ باری مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ تم سناؤ  
کل کی ریس کیسی رہی؟“

”میں تانے کے لیے تو بے تاب تھی۔ تم نے آج کا اخبار  
نہیں دیکھا؟“ وہ مسرور لیے میں بولی۔

”آج کا اخبار بھی صحیح طور پر دیکھنے کی سلت نہیں ملی۔ بس  
پلے اور آخری صفحے کی سولی سولی سرخیاں دیکھی تھیں۔“ میں نے  
جواب دیا۔

”تھکیلوں کے صفحے پر کلر کی کیا خوب صورت تصویر چھپی ہے۔  
بڑی کوریج دی ہے تمام اخباروں نے اسے۔“ شیم نے بتایا ”مگر بیڑ  
ریس میں اس نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ریس کورس میں بھی کئیں  
بکے اور شرس لگنے کا ریکارڈ قائم ہوا ہے۔ اصطبل میں آنکھوں کی  
خبر۔۔۔ اخباروں میں آئی ہے۔ ہم نے کسی کا نام نہیں لیا۔“

”بہت اچھا کیا۔“ میں نے کہا ”جس محاذ پر غمار نشینی کچھ  
کے گا اسی محاذ پر ہم بھی جواب دیں گے۔ اس بے چارے کی  
حالت کیا ہے؟“

”معلوم نہیں وہ تو بالکل غائب ہو گیا ہے۔“ شیم نے جواب  
دیا ”شاید کسی اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں پڑا ہوا گھر پر ہی علاج  
کر رہا ہو۔“

”اس کی طرف سے ابھی تک کوئی رد عمل دیکھنے میں نہیں  
آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں“ شیم نے جواب دیا ”کوئی دھمکی سننے میں نہیں  
آئی۔ اس کے کسی آدمی نے خوشخوار غصوں سے ہماری طرف دیکھا  
تک نہیں۔ ریس میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔  
بلکہ مجھے تو اس سکوت سے خوف آنے لگا ہے۔ میں نے تو چاروں  
محافظوں کو پوچھیں کہنے کلر کی گمرانی پر لگا دیا ہے۔ وہ باری باری ڈیوٹی  
دے رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”تم انتہائی تدابیر جاری  
رکھو۔ حفاظتی اقدامات میں کوئی کمی نہ کرو اور نتائج اللہ پر چھوڑ  
دو۔“

”ٹھیک ہے سرکار اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ وہ  
کمری ماس کے کر دی۔

نہ چند منٹ اور اصرار کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر سلسلہ  
منقطع کر کے میں دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔ آفس میں بہت سے  
ایسے کام جمع تھے جو میری ذاتی توجہ کے بکھر تھے۔ انہیں نمنانے  
کے لیے میں رات تک آفس میں بٹھارہا۔ میرا اب کوئی بھروسہ  
نہیں ہوا تھا کہ کب کتنی دیر کے لیے کسی پیکر میں پھنس جاؤں اور  
آفس کی طرف توجہ نہ دے سکوں۔ اس لیے میں کوشش کر رہا تھا کہ



اپنے گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہے۔ میں اب خالص دہسکی زیادہ تیزی سے حلق سے آگے نہیں چاہتا تھا۔ آخر ستارہ نے سکوت توڑا "آج میں اپنے وقت کی ایک مشہور فلم اشار کے جنازے پر گئی تھی۔ جس کی قیامت جوانی اور جگر بلانیر اپنے زمانے میں نواب زادوں کو دوانے بنائے ہوئے تھا۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے لگ جاتے تھے۔ آج اپنے دو چھوٹے چھوٹے گھونٹوں کے ٹھنڈے تاریک فلیٹ میں اس عالم میں مردہ پڑی تھی کہ اس کے سرہانے کی طرف تین افراد تھے جن میں سے کوئی اس قابل بھی نہیں تھا کہ عقلمند مہین کے انتظامات کر سکے اور ان کے اخراجات برداشت کر سکے۔"

اس کی آنکھوں میں غمی بڑھنے لگی۔ ایک سسکی سی لے کر وہ بولی "اس کے فلیٹ میں چند برتنوں، ایک بند اور ایک ٹیک کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چوہہ.... نے فلیٹ کا گریبہ نہیں دیا جاسکا تھا۔ چنانچہ عرصہ دو بار ری اس کا زیادہ تر وقت ایک خیراتی اسپتال میں گزارا۔ مجھے اور چند دوسرے لوگوں کو اس کی موت کی خبر محض اتفاقاً ملی تو ہم نے جا کر تمام انتظامات کیے۔ آخری دنوں میں اسے کچلے گھوٹوں، خود داری اور بے بسی کی چڑچڑاہٹ نے اتنا ضدی بنا دیا تھا کہ اس نے سب کو سختی سے منع کر رکھا تھا اس کی بیماری یا موت کی اطلاع فلم انڈسٹری والوں کو ہرگز نہ دی جائے۔"

"اس واقعے نے تمہاری یہ حالت بنا دی؟" میں نے ملامت سے کہا۔

"ہاں کیا تمہاری نظر میں یہ معمولی واقعہ ہے؟" وہ ہنسی پیشی سی آواز میں بولی۔

"نہیں واقعہ تو معمولی نہیں۔ لیکن اس کی بناء پر خود اسنے ڈپریشن میں مبتلا ہو جانا کوئی معقول بات نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس میں اپنا مستقبل نظر آیا ہے۔ ایکس کا انجام آخر کار یہی ہے۔" وہ گلاس رکھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چمپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

"یہ کیا بکواس ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا اور اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھ دیے "دنا میں ایسا کہاں ہوتا ہے؟ یہ کوئی طے شدہ فارمولا تو نہیں ہے۔ کسی بھی شعبہ زندگی کے تمام لوگوں کا انجام ایک جیسا تو کبھی نہیں ہوتا ہے تو اپنے اپنے حالات، اپنے اپنے مقدر اور کبھی کبھی اپنے اعمال کی بات ہوتی ہے۔"

"لیکن میں بہت ڈر گئی ہوں اپنی؟" وہ بدستور روتے ہوئے بولی "اور اعمال میرے بھی کچھ اچھے نہیں ہیں۔ مجھے بک لخت ہی احساس ہوا ہے کہ انسانوں کے اتنے جھوم میں رہتے ہوئے بھی میں کتنی خفا ہوں۔"

"یہ سبے کار وہاں ہے اور بے کار مکالے چھوڑو۔ ان سونچو

میں مت الجھو۔ متوازن زندگی گزراؤ۔ مستقبل پر غور کرو اور کبھی کبھی اس کی فکر کرتی رہو۔ مجھے امید ہے تمہارا انجام بخیر ہوگا۔ میں نے بہت سی اداکاروں کو دیکھا ہے جنہوں نے جوانی میں شان سے گزاری اور پھر پانچ آسودگی سے گزار دی ہیں۔ کسی کسی کا انجام ہی قابل رحم ہوتا ہے۔ اس کی بھی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ تم اپنے آپ کو انہی میں شامل کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟"

"تمہارے خیال میں یہ سب شخص وہاں ہے؟ اور میں یہ مکالے بول رہی ہوں؟" وہ بخیر لگنے میں بولی۔

"تم میرا مطلب غلط سمجھ رہی ہو۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ بعض اوقات انسان خواہ مخواہ ڈپریشن ہونا چاہتا ہے۔ ڈپریشن کو زبردستی اپنے سر پر سوار کر لیتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہے جو کبھی کبھی بیدار ہوتی ہے۔ یونیورسٹی میں اس ہونے کو بھی چاہتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس موڈ سے باہر آ جاؤ۔"

میں نے اپنی گلاس میں کچھ اور انڈی، ایک سگریٹ نکالی۔ اس دوران وہ میری طرف دیکھتی رہی اور ہلے ہلے سسکیاں لیتی رہی۔ پھر اس کا ایک ہاتھ میرے آگے آ کر ہاتھ جو بخار کے مریض کی طرح چپ رہا تھا۔

"تمہارے پاس کیا میرے لیے مشوروں کے سوا کچھ نہیں؟" اس کے ہونٹ لرز اٹھے۔

"مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں؟" میں نے تمام تر اخلاص سے پوچھا۔

"تم مجھ سے شادی کرو۔" اس نے گریا ہونٹوں کی پیپ میں بند خواہش کا موتی یکدم اٹھل دیا۔

میں اپنی جگہ یکدم سن سا ہو کر رہ گیا۔ اور غافل دہسکی میری کپٹنوں میں ٹھوکریں مار رہی تھی۔ میں نہ بچنے والا آدمی تھا۔ ڈر رہا تھا کہ شراب کے زیر اثر کوئی غلط فیصلہ نہ گرجاؤں۔ وہ مجھے انہیں گلے تھی۔ میری دوست تھی۔ میرے نا اسودہ لمحوں کی ساتھی تھی لیکن میں تو دل کے فیصلوں پر چلنے والا انسان تھا۔ اور میرا دل مجھے ستارہ سے نہیں راجیہ سے شادی کرنے کو کہتا تھا۔

یہ میری نہیں اکثر انسانوں کی کہانی تھی جس درخت سے پھل انسان کی بھولی میں گرنے کو بے تاب ہوتا ہے اس سے وہ کتنی کترا کر گزر جاتا ہے اور جس درخت سے پھل گرنا اس کے نصیب میں نہیں ہوتا اس کے نیچے وہ بھولی بھولائے اک مگر کھڑا رہتا ہے! لیکن کسی محبت کرنے والے کی دل شکنی کرنا بھی میرے لیے برا سخت امتحان تھا۔ یوں تو ضرورت پڑنے پر میں بے پناہ مشکل بھی بن جاتا تھا لیکن اس معاملے میں مجھ سے کوئی شش کے باوجود مسئلہ نہیں بنا جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا ستارہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیسے اسے یہ دل شکن بات بتاؤں کہ میں اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ اور اس کی وضاحت کیونکر ہو۔ یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا۔



میں کیا تمہاری خواہشوں کا کچرا گھر ہوں؟

وہ مجھے سمجھو نے کی کو شش کر رہی تھی۔ جو اس کے مس کی بات نہیں تھی۔ میں نے کچھ دیر اسے کھینچا آئی کا موقع دیا پھر آہستگی سے اپنا کمر بیان اس سے چھڑایا۔ وہ دونوں باتوں میں سر چھپا کر روئے گی۔ میں نے چند لمحے اسے دیکھ کر دیکھ کر خیال تھا کہ میں اسے دل کا غبار نکالنے کا موقع دے رہا ہوں۔ لیکن جب وہ بولی تو مجھے اندازہ ہوا کہ غبار تو اس کے دل میں جمع ہو رہا تھا۔

”تم نکل جاؤ یہاں سے۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔“ وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں پانی سے لگی ہوئی تھیں۔

میں... مجھے شہر کے کئی بڑے بدمعاش اور خطرناک قسم کے لوگ قتل کرنے کی کو شش کر چکے تھے اور اس کو شش میں جان کھڑا کر کے تھے۔ اسے وہ قتل کرنے کی بات کر رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس کی اس معصوم و حمکی کو حقیقت کا تجربہ دے دوں۔ کوئی مسلک ہتھیار اس کے ہاتھ میں دے دوں اور سر جھکا کر کھڑا ہو جائوں کہ وہ بھڑ خوشی مجھے موت کی مہربان آغوش میں پیچھا دے۔ میں نے اس کے دل میں تاریکی کا جو الاؤ دیا تھا شاید وہ میرے لوسے ٹھنڈا ہو جاتا۔ اس کے چہرہ پر سوائیت کو جو نہیں لگی تھی اس کی طعنی شاید میری جان سے ہو جاتی۔

میں بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے اس کے پاس کھڑا رہا اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ آخر کار میں نے غصے کو بھجھ کر کہا ”نہیک! یہ۔ میں چلا جاتا ہوں۔“ وہ نے مجھے معاف کر دیا۔

”آئندہ یہاں کبھی مت آنا۔“ وہ پھٹکاری ”مجھے لیتا تمہارے تاریک لمحوں میں تمہارا دل بھلانے والا کھلونا ٹوٹ گیا۔“

میرے ہاتھ میں لگتی ہوئی سکرٹ تھی۔ میں نے اسے بجھائے بغیر اٹھ کر اس کے پاس رکھ دیا۔ اسکی سے بھر گلاس بھی گویا خنجر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں آہستگی سے مڑا اور دھڑکالین پر بے آواز قدموں سے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے سے نکل کر اسے کھائی چھوڑ کر میں راہداری میں آگیا۔ بیڑیوں تک پہنچ کر مجھے مرکز دیکھنا پڑا۔ وہ ننگے پیروں میرے پیچھے دوڑی آ رہی تھی۔ قریب آ کر وہ میری ٹانگوں سے چٹ گئی۔ اور اسی طرح دوڑتے ہوئے بولی ”میں... تم مت جاؤ۔ اس طرح مت جاؤ۔“ مجھ پر شاید دیوانگی کا وہ پڑا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔

”معافی تو مجھے تم سے مانگنی ہے۔“ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور بازوؤں میں بھر لیا۔ ہم کمرے میں واپس آ گئے۔ جب اس کے آنسوؤں کا طوفان تھا اور دل ذرا نکلا تو وہ بولی ”یہ مت سمجھنا کہ میں اپنی کھیلاہٹ دور کرنے کی کو شش کر رہی ہوں۔ میں ویسے ہی گویا بریل تیکر کہ جس بتا رہی ہوں۔ ایک ہدم دیرینہ سے انسان اس طرح کی باتیں کرنا ہی رہتا

میں نے جلدی جلدی دو تین بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اتارنے میرے سینے میں آگ جڑ ہوئی جاری تھی۔ میں ایک دور رہے پر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اسی دور رہے پر کھڑے میری عمر بیت جائے گی؟ ایک طرف ستارہ کا دست طلب تھا دوسری طرف راجہ کا پیکر انگار۔

میرے حلق میں انگار سا انگار ہوا تھا لیکن بھد کو شش میں نے اسے اگل دیا ”میں تم سے شادی نہیں کر سکتا ستارہ!“

”کیوں؟“ اس نے سوال کے خنجر سے مجھے پکڑا لیا۔ اس کی آنکھوں میں نئی بڑھ گئی۔

”میں... اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“ میں نے بے چارگی سے کہا۔

”میں انکڑ نہیں ہوں۔ میرا ماضی اچھا نہیں ہے۔ میں غیر معمولی خوب صورت نہیں ہوں۔ تو عمر نہیں ہوں۔ کیا اس لیے؟“ اس نے مرتش اٹھیوں میں دلی ہوئی سکرٹ ہونٹوں سے لگائی۔

”نہیں۔ میرے نزدیک پنڈے کی اور تاپنڈے کی کے یہ معیار نہیں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کی آنکھیں کسی آجڑے مزار کے درپچوں سے مشابہ نظر آنے لگیں۔ اس کے دل کے نماں خانوں میں کہیں بات چیت تھا۔

”پھر بھی کوئی نہ کوئی جواز تو ہو گا۔ کوئی نہ کوئی دلیل تو ہو گی۔“ اس کے لمحے میں دو ششیں بول رہی تھیں۔

”بات دلیل کی نہیں دل کی ہے۔“ میں سچ کے ساحل تک پہنچنے لگا۔

”تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں؟“ اس کے لمحے میں دو ششیں اب ایک قلعے پر سٹ رہی تھیں۔

”میں یہ بھی نہیں کہہ رہا۔“

”تو پھر تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ یکدم تقریباً چلا اٹھی ”تمہاری بات کا کوئی مطلب بھی لکھا ہے یا نہیں؟“

”مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے گلاس خالی کر دیا اور اپنے کے مزید خودی اندر لپی۔

وہ ساکت بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آنسو خود بخود اس کے رخساروں پر پھیلنے جا رہے تھے۔ میں اس کے آنسوؤں کو اپنے دل کے چتے صحران میں جذب کر لیتا چاہتا تھا۔ لیکن جوئی میں نے اسے چھوئے کی کو شش کی اس نے اپنا گلاس مجھ پر کھینچ لیا۔ قیمت تھا کہ اس کیفیت میں بھی میرے تو اس نے اس حد تک میرا ساتھ دیا کہ میں ہر وقت نیچے جھک گیا اور گلاس دیوار سے ٹکرا کر قالین پر لڑھک گیا۔ عمدہ گلاس تھا۔ ٹوٹا نہیں۔

اس نے یکدم دونوں ہاتھوں سے میرا کمریاں پکڑ لیا اور مٹھی مٹھی دیوانگی آہیر جی آواز میں بولی ”میں کیا بس تمہاری نا آسودہ راتیں دیکھتا ہوں؟“ میرا کیا صرف یہی مصرف ہے؟

مجھ سے شادی کے خواہش مند تو بہت ہیں۔“  
 ”مجھے معلوم ہے۔ قلم اشارے سے شادی کرنے کے خواہش  
 دل کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے حلیم

”میں عامیہ ستاروں کو تو شادی نہیں کر رہی۔ ان کے بارے  
 میں تو کچھ علم نہیں۔ میں تو کچھ خاص خاص لوگوں کی بات  
 کر رہی ہوں۔ دو ڈاکٹر ہیں۔ دو تیرہ ہیں۔ ایک دل ہے۔  
 مرنے ہوئے خیرودا کا روتی ہیں۔ چند سینہ ہیں جو عمامہ  
 ہی ادا کاراؤں کو اسکرین پر دیکھ کر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ایک  
 وہ قوی ٹیم کا کھلاڑی ہے۔ اور اس طرح کی کئی دوسری  
 شخصیات ہیں۔“

”مجھے تمہاری بات پر قطعاً کوئی شبہ نہیں۔“ میں نے رمانت  
 ادا کی سے کہا۔

”لیکن مجھے معلوم ہے ان میں سے کسی سے بھی میری شادی  
 کامیاب نہیں ہوگی۔ وہی خدائیاں اور ان کے ساتھ بہت سی  
 رسوائیاں میرا مقدر ہوں گی۔ ان میں سے کوئی صرف میرے شکم  
 سے متاثر ہے اور کوئی شہرت سے۔ کبھی کو اس روئے پیسے کا لالچ  
 ہے جو میں اب تک کما چکی ہوں اور آئندہ کمائوں گی۔ کوئی میرا  
 سارا لے کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ کوئی مجھ سے نہ جانے کس کس  
 طرح کے فائدے اٹھانے کے منصوبے بنائے بیٹھا ہوگا۔ ظاہر ہے  
 جس ہندوؤں کی بنیاد یہ ہوگی وہ کتنا عرصہ قائم رہے گا؟“

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”لیکن  
 تمہارا معاملہ مختلف ہوتا۔ تم اگر مجھ سے شادی کرتے تو تمہیں مجھ  
 سے کوئی لالچ نہ ہوتا۔ اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ  
 تم قبل بھانے والے آدمی ہو۔ تمہیں مجھ سے محبت نہ رہتی تب  
 بھی تم مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش نہ کرتے شادی کو ایک  
 مقدس عہد و پیمانہ کی طرح بھاتے۔“

”شاید“ میں نے مبہم لہجے میں کہا۔  
 ”حالانکہ میں نے عہد کیا ہوا تھا۔ زندگی میں کبھی تم سے ایسی  
 کوئی بات کرنا تو درکنار ایسی خواہش بھی نہیں کروں گی۔ اپنے اور  
 تمہارے تعلق کو بالکل بے عنوان رکھوں گی لیکن آج اپنی عہد پر  
 قائم نہ رہ سکی۔ مجھے اس پر شرمندگی ہے۔“

”دوستی اور محبت میں شرمندہ نہیں ہوا کرتے۔“ میں نے اس  
 کا کندھا ہٹاتے ہوئے کہا ”میرے لیے گلاس میں تھوڑی سی اور  
 اٹلے۔ میری کینیاں سننا رہی ہیں۔“

”تو کیا تم چاہتے ہو کہ کینیاں بالکل ہی بند سے اڑ جائیں؟“  
 وہ مسکراتے ہوئے بولی اور میرا گلاس ایک بار پھر بھرنے لگی۔  
 آنسوؤں میں بیٹھ گئی اس کی مسکراہٹ میرے دل پر قیامت ڈھا  
 رہی تھی۔

رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ کھلی کرے میں وہی

ہات بلب روشن تھا لیکن میرے اندر اب بھی اندھیرا تھا۔ رگوں  
 میں کھولتے ہوئے آنکھیں نکال کر دیکھتے تھے لیکن میرے حلق میں  
 اب بھی انکارے بھرے ہوئے تھے اور میرا سینہ جل رہا تھا۔  
 ستارہ بے خبر آڑی تر جمی رہی سو رہی تھی۔ میں نہایت آہستہ  
 سے بند سے اترنا۔ کونے میں رہنے ہوئے بند دوم فریج تک پہنچ کر  
 میں نے پانی کی ایک ٹھنڈی بوتل نکالی اور منہ سے نکالی۔ پانی کو  
 گلاس میں اڑنے لپٹے کا تکلف کرنے کی بھی مجھ میں تاب نہیں تھی۔  
 مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ حلق میں پھنسے ہوئے انگاروں پر اگر میں نے  
 جلد از جلد پانی نہ ڈالا تو میرا دم گھٹ جائے گا میں سانس لینے کے  
 قائل ہی نہیں رہوں گا۔

میں نے بوتل خالی کر کے تباہی پر رکھ دی۔ ستارہ تب بھی بے  
 سہ رہی۔ میں چند لمحے اس کونے میں ساکت کھڑا رہا۔ کراہ  
 مجھے ابھی ابھی سا لگ رہا تھا۔ لگتی روشنی میں مختلف چیزوں کے  
 ہونے کو محضت سے میری طرف تک رہے تھے۔ مجھے اپنا وجود چٹکا  
 چٹکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے اب افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے کیوں  
 خواہ مخواہ اتنی پی پی تھی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لاشعوری  
 طور پر میں کچھ دیر کے لیے خود اذیتی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کو  
 سزا دینا چاہتا تھا لیکن کس بات کی؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھی۔  
 موسم خشک تھا لیکن مجھے یکدم کمرے میں جس محسوس ہونے  
 لگا۔ میرا دل چاہا کہ فوراً وہاں سے نکل بیجاؤں۔ میری روح ان  
 دنوں شاید کسی عجیب سے تغیر و تبدل کا شکار تھی۔ مجھے کہیں بھی

## عشق اور چھکا

☆ ---- ستارہ طاہر

کھڑو مزاج پر لکھا جانے والا

ایک دلچسپ ناول

جس میں کرکٹ اور مزاج ساتھ ساتھ ہیں۔

قیمت: 75/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

بجود کھل گیا اور گیت ہاؤس کے قریب سے گزر کر میں نے گاڑی  
برآمدے کے قریب لے جا کر روکی۔

میں فوری طور پر گاڑی سے نہیں اترتا۔ چند لمحوں پہلے جان  
انداز میں بیٹھا اپنے اس قلعہ نما مکان کو دیکھتا رہا جو قلعے اندر  
میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ کتنی دیرانی تھی اس مکان میں بھی  
میرے بیٹے میں بھی۔ میرے حواس پر ابھی تک دھواں سا چھایا  
تھا۔

دفعۃً اپنے عقب میں ایک بجلی کی کراہ سن کر میں سارے  
افرادی دھنسی کو بھول کر تیزی سے پلٹا۔ میرا ہاتھ اس جیب  
طرف چلا گیا جس میں مشین چھل رہا تھا۔

لیکن اسے نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جو چوہ میرے  
سیٹ کے عقب سے نمودار ہوا وہ اتنا معصوم تھا کہ کسی گمنام  
اس کی طرف کرنا زیادتی معلوم ہوتا تھا۔ بھگے ہوئے سیاہ  
بالوں کے حلقے میں گھرا ہوا وہ ایک بیٹوی سا چوہ تھا۔ گاڑی میں  
زیادہ دھنسی نہیں تھی اس کے باوجود اندازہ ہوا تھا کہ اس  
رنگت انتہائی سپید تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں رحم طلب انداز  
میں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ بہ مشکل ستوا اٹھارہ سال کی لڑکی  
تھی۔ نہایت نازک اندام اور بچوں کی طرح بھولی بھالی۔

میرے اعصاب یک لحظ پوری طرح بیدار ہو گئے۔ میں نے  
تیزی سے گاڑی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا اور تب مجھے اندازہ  
ہوا کہ اس نے پچھلی اور اگلی سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹ کر سنا  
کیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہاں سکر رہی تھی۔

میں نے اسے نیچے آنے کا اشارہ کیا وہ کراہ کر قدرے رفت  
آہستہ سے انداز میں گاڑی سے اتر آئی۔ وہ خوفزدہ تو نہیں تھی لیکن  
اس کی آنکھوں میں بھر بھی رحم کی التجا تھی اس کے چھوٹے چھوٹے  
مرمریں ہاتھ میرے سامنے تھے اور بالکل خالی تھے پھر بھی کھنکھ  
اعتیاد میں نے مسلسل نکال لیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے کسی بوجھ  
بدخواہ کی کوئی چال ہو سکتی تھی۔

تھوکی غلط حرکت مت کرنا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔  
میں نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں اسے خبردار کیا۔

لیکن جب وہ گاڑی سے اتر کر ایک بار پھر کراہ کر سیدھی ہوئی  
تو مجھے حیرت کا خاصا شدید جھکا لگا۔ وہ اتنی کمسن اور فرشتہ صورت  
سی لڑکی امید سے تھی۔ شاید پورے دنوں سے تھی!  
اس کے جسم پر چلا سا ناٹ گاؤں تھا۔ میں ایک تک اسے  
گھور رہا تھا۔ وہ نہ جانے نکلی کے باعث یا پھر خوفزدہ ہو کر دھیرے  
دھیرے لرزنے لگی!

”کون ہو تم؟“ میں نے سخت لمحوں میں پوچھا۔  
وہ اپنے فحشے سے ہوتنوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہوئی ”آپ  
کے خیال میں میں کون ہو سکتی ہوں؟“

کسی حالت میں بھی قرار نہیں تھا۔ میں کچھ کھو کر بھی بے چین رہتا  
تھا اور کچھ پا کر بھی مضطرب، لیکن اپنے اوپر میں نے سکون اور  
نصراؤ کا خلی چڑھا رکھا تھا۔

میں نے ہاتھ دوام میں جا کر لائٹ جلا کر ہاتھ منہ دھوا، بال  
بتائے اور باہر گیا۔ ستارہ تب بھی بیدار نہ ہوئی۔ بلکہ اس نے اپنی  
جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔ میں دسے قدموں اس کے کمرے  
سے نکل آیا۔ دیے بھی میری روائت میں تھے۔ میں کبھی اس کے  
ہاں صبح تک نہیں ٹھہرا تھا۔ دروازہ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے  
عقب میں بند کر دیا۔ ایک گرمی سانس لی اور اپنی سیمائی کو سینے میں  
چھپے نیچے لگایا۔

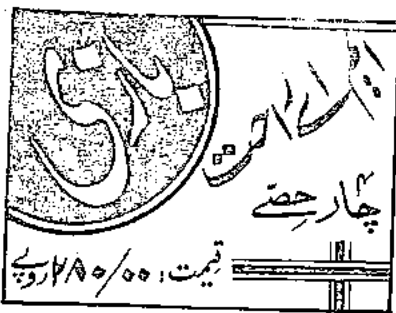
باہر آنے میں نے دیکھا چوکیدار گیت کو اندر کی طرف تالا  
لگائے برآمدے میں سو رہا تھا۔ میں نے اسے ڈرا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر  
آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے چارپالی کے سارے  
کمرے اپنی قہری بات قہری را کھل کی طرف ہاتھ دھرایا لیکن مجھے  
دیکھ کر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

وہ اپنی واسکٹ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر میرے لیے  
گیت کھولنے چل دیا۔ دل ہی دل میں یقیناً مجھے گالیاں دے رہا ہوگا  
کہ اس شخص کو کبھی رات کے پچھلے پیر نہ جانے کیا سوچتی ہے جو  
منہ اٹھا کر صباک نکلتا ہے۔

ستارہ کی کوٹھی کا بوجھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ  
تھی کہ اس میں پوسٹ چھلنی طرف بھی تھا۔ لیکن ستارہ کی نئی اور  
پرانی دونوں ہی گالیاں بے ہودہ طریقے سے سامنے والے بوجھ  
میں ہی کھڑی تھیں۔ میں اپنی گاڑی باہر ہی گیت کے قریب کھڑی  
چھوڑ آیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر کس قسم کے حالات سے  
واسطے پڑے گا اور کتنی دیر لگ جائے گی۔ اندر جانے کے بعد میں  
گاڑی کو بھول ہی گیا تھا۔

گاڑی کی چھت اور وینڈا اسکرین وغیرہ پر اوس جی ہوئی تھی۔  
اندر بیٹھ کر میں نے انجین اشارت کر کے واپس پھرتے لیے کے لیے  
چلائے پھر ان کا سوچ آف کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سڑکوں پر  
دیرانی تھی۔ دو ایک جگہ میں نے سڑک کے کنارے کسی درخت  
دھڑو کے قریب بھکاریوں کو گندڑیوں میں لپٹے پڑے دیکھا۔ فضا میں  
ایک عجیب سا سکوت تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی قریب سے گزرتی تو  
چند لمحوں کے لیے فضا کچھ مرتضیٰ ہو جاتی۔ رات کو سڑکیں  
سنان دیکھ کر عام طور پر لوگ گاڑی بہت تیز رفتاری سے چلاتے  
ہیں لیکن میں نہایت سست رفتاری سے چلا رہا تھا۔

ستارہ کے کمرے کے کونے میں بھی کسی نہیں چاہ رہا تھا اور اپنے کمرے  
جانے کو بھی دل نہیں مان رہا تھا۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں کیا  
چاہتا تھا لیکن میرا رخ سر جال کمر کی طرف ہی رہا۔ آخر کار میں نے  
گاڑی اپنے کمرے کے سامنے لے جا کر روکی۔ بلند دہلا آہنی گیت خود



## بنیادی انگلش اردو ریڈر

☆ ---- عبدالرؤف انجم

انگلش زبان سیکھنے کے لئے

ایک مفید اور لائق کتاب

قیمت: 40/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

”میں نے تم سے جواب مانگا ہے سوال نہیں۔“ میں نے  
جیتنا بکلی ہی جھجکا ہٹ سے کہا۔ میں جس طرح سے رات گزار کر  
آ رہا تھا اس سے میری فکری بکھ اور بڑھ گئی تھی۔ ستارہ کی طرف  
سے وہ میرے لیے شب نوازشات تھی لیکن دل کا صحرا بکھ اور تپ  
رہا تھا۔

میرے لیے نے گویا اس کے دل پر خراشیں سی ڈال دیں۔  
اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی جھلکانے لگی۔ پتلی پتلی  
سی آواز میں وہ بے مشکل بولی نکلی اور واقعی آپ کو میں اتنی خطرناک نظر  
آ رہی ہوں کہ آپ نے مجھ پر ہسپتال تان لینا ضروری سمجھا ہے؟“  
وہ بے ضرر نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس بھی ایسا نہیں تھا کہ  
اس میں کوئی ہتھیار چھپا ہونے کا امکان ہو تا لیکن میرے حالات  
ایسے نہیں تھے کہ میں بھلی بھالی شخص پر بھروسہ کر سکتا۔ میں نے  
مشین ہسٹل کی بل جھانکی لیکن اسے ہاتھ ہی میں رکھا اور اپنا سوال  
دہرایا ”میں نے پوچھا تھا کون ہو؟“

”اگر آپ صرف میرا نام جانتا چاہتے ہیں تو وہ نیلہ ہے۔“ وہ  
پتلی پتلی سی آواز میں بولی۔

”پوچھا تو میں بت کچھ چاہتا ہوں۔“ میں نے بدستور سخت  
لیجے میں گما ”لیکن سب سے پہلے تم مجھے یہ بتا دو کہ تم کہاں سے اور  
کس طرح میری گاڑی میں چھپی تھیں؟“

مجھے گاڑی مجبوراً ستارہ کے گھر سے باہر کھڑی کرنی پڑی تھی  
لیکن ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے میں گاڑی کے پارے میں بہت محتاط رہتا  
تھا کہ وہ اس میں کسی قسم کا کوئی آلفنڈ نہ کر دیں۔ اکثر میں کہیں  
جاتے وقت یہ اطمینان ضرور کرتا تھا کہ میری گاڑی میں بیٹھے وقت  
گاڑی مجھے منتقل حالت میں سی ٹی تھی اور جب میں اتر کر کہیں  
جانے لگتا تھا تو ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ بند کرتے ہی

کا دروازہ بند کر دیتا تھا۔ خود بخود منتقل ہو جاتے تھے۔

تو پھر لڑکی کس طرح گاڑی میں گھسی تھی؟

وہ گھر بھڑکی سی لے کر بولی ”میں میڈم ستارہ کے گھر کے  
سامنے آپ کی گاڑی میں چھپی تھی۔ آپ کی گاڑی آج شام سے  
دیں کھڑی تھی۔“

”گاڑی کا آنا تم نے خود کھولا تھا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔  
سب سے زیادہ تشویش مجھے اسی مسئلے میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ  
میری گاڑی کے کسی بھی دروازے کا آنا کوئی باہر کا چور بھی نہیں  
کھول سکتا۔

”جی نہیں، دروازہ مجھے کھلا ہی ملا تھا۔ میرا مطلب ہے ویسے  
تو بند تھا لیکن آٹا لگا ہوا نہیں تھا۔“ وہ گھر بھڑکی بولی ”میں نے دل  
سی دل میں دوسرے ہوئے۔ کرکڑا کر دیا کی بھی تاکہ اگر میں آپ کی  
گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے دروازہ غیر منتقل  
سلے اور خدا بھی کسی اپنے گناہ کا بدلہ دے گا جس کی گناہ ہے۔  
میں جب گھر پر پہنچی ہوں گا گاڑی تک پہنچی تو دروازہ غیر منتقل تھا۔“

میں جب ستارہ کے ہاں پہنچا تو بہت غلٹ میں تھا۔ شاید  
دروازہ صحیح طور پر بند نہیں کر سکا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا  
دروازہ صحیح طور پر بند نہ ہونے کی وجہ سے جاتی دروازے بھی غیر  
منتقل رہ گئے تھے۔ آتے وقت دیسے ہی میرا داغ ٹھکانے پر نہیں  
تھا۔ میں نے فوری ہی نہیں کیا تھا کہ دروازہ مجھے منتقل ملا تھا یا غیر  
منتقل۔

اس نے خود ہی وضاحت کر دی ”اندر چھپنے کے بعد میں نے  
دروازے منتقل کر لیے تھے مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کب  
آئیں گے اور ہر لمحے مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کے آنے  
سے پہلے ہی مجھے ڈھونڈ لیا جائے گا پکڑ لیا جائے گا۔“

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر گاڑی کا سارے لے لیا اور گویا  
اپنی گراہ کو دہاتے ہوئے بولی ”میں تقریباً دو گھنٹے سے پھیل سینوں کے  
پچھے گھسی ہوئی تھی۔“

”دو گھنٹے۔۔۔ اس حالت میں۔۔۔؟“ میں نے بغیر نہ سکا۔  
 ”جی ہاں۔۔۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو میری لاش ہی سینوں کے  
 نیچے لے گی۔ کئی بار مجھے گمان کزرا کہ میں سرے لگی ہوں لیکن میں  
 بڑی ذہین ہوں جو ابھی تک زندہ ہوں اور آپ کے سامنے کھڑی  
 آپ کے سوالوں کے جواب دے رہی ہوں۔“

میں دیکھ رہا تھا اس کی حالت ابھی نہیں تھی۔ چہ زور تھا  
 ہونٹ جی رہے تھے، آنکھیں بار بار چمکی جا رہی تھیں، اندیشہ تھا  
 کہ کسی بھی لمحے وہ پھرا کر گر جائے گی۔ اس کے چہرے کی  
 مصعومیت اس کے لیے کی شائستگی میرے دل کو چھو رہی تھی۔ میں  
 نے فیصلہ کیا کہ باقی پوچھ چمک اسے اندر لے جانے کے بعد بھی کی  
 جا سکتی تھی۔

میں نے ہٹل جیب میں رکھ لیا اور اسے اندر چلنے کا اشارہ  
 کیا۔ وہ آگے بڑھی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن فی الحال  
 میں نے اسے سارا دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ڈرائنگ  
 روم تک اس کی رہنمائی کی۔ ڈرائنگ روم میں پہنچنے ہی ایک کمری  
 سامنے لیتے ہوئے صوفے پر گر کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

خاصی در تک اس نے نہ تو حرکت کی اور نہ ہی آنکھیں  
 کھولیں۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ اس کی قوت برداشت آخر کار جواب  
 دے گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

”نبیلہ! میں نے دور ہی سے اسے آواز دی تو اس نے آہستگی  
 سے آنکھیں کھول دیں۔  
 اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش میں اسے  
 کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہ سرکوشی  
 کے ساتھ انداز میں بولی ”ایک گلاس پانی مل جائے گا؟“

تب میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا ”پانی تو مل جائے گا“  
 تم کچھ اور کھانا چاہتا پسند کرو گی؟“

اس نے براہ راست اس سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ نظر  
 چراتے ہوئے بولی ”میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

یکدم ہی میں نے محسوس کیا کہ میں اس کی طرف سے غیر  
 ضروری احتیاط کر رہا تھا۔ وہ میرے کسی بدخواہ کی آلہ کار معلوم  
 نہیں ہوئی تھی اور مجھے نقصان پہنچانے یا کسی سازش میں الجھانے  
 کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔ میں نے لازم سے کہہ کر خانہ سالن  
 کو بلوایا اور اس کے لیے کافی سیڑھیاں وغیرہ تیار کرنے کا حکم دیا۔  
 اس دوران وہ صوفے پر نیم دراز اور کھلی آنکھوں سے میری طرف  
 دیکھتی رہی۔

میں نے بھی ایک تک اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ چند  
 لمحے بعد وہ کچھ سنبھل کر سیدھی ہوتے ہوئے بلا تھکید سے انداز  
 میں بولی ”گناہ سے اس مرتبہ میں کامیاب ہو چکی تھی۔ ایک بار میں  
 نے پہلے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لوگ میرے پیچھے  
 آگئے تھے۔ میں گھبراہٹ میں گلبرگ والی نہ تھی۔ چلتی تھی۔“

میں نے سب سے پہلے اس کی بات سن لی۔ اس کے بعد میں نے اسے  
 سارا دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ڈرائنگ روم میں کچھ کھانے پینے  
 انتظام کر دیا۔ میں اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

میں نے اسے سارا دے کر وہاں لے آیا اور سبہ وقت

خواب میں خود بھی شریک ہو گیا۔  
 بیٹ بھرنے کے بعد اس کے جسم میں گویا جان سی آگئی۔  
 اجڑے اجڑے سے چہرے پر زندگی کا کچھ رنگ نظر آنے لگا۔  
 ”اب سناؤ اپنی داستان جو حقیقت کا غم ناک ہوگی۔“ میں نے  
 کافی کے چھوٹے پھرنے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں  
 میں ابھی تک اندازے سے بھرے ہوئے تھے۔

”نہیں، کوئی ایسی خاص غمناک نہیں ہے۔“ وہ دیران سی  
 آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”دنیا میں ایسا ہوتا رہتا  
 ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔“  
 مجھے اندازہ ہوا کہ میرے الفاظ میرا رویہ اس کے دل پر  
 غراؤں ڈال رہا تھا۔ وہ دل جو زندگی کے مصائب سے پھر ہو چکا  
 تھا۔  
 ”تم دنیا کی بات چھوڑو اپنی سناؤ۔“ میں نے قدرے نرمی سے  
 کہا۔

اس نے کافی کاگ میز پر رکھ دیا اور چند لمبے تک اپنے مختصر  
 نازک اور مرسر سے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ اس کے ہاتھوں کی پشت  
 پر نیلے رنگیں ابھری ہوئی تھیں اور انگلیاں مرشش تھیں۔  
 چند لمبے کی خاموشی کے بعد وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی ”آپ  
 نے بھی سیٹھ غیاث کا نام سنا ہے؟“  
 ”اے... شاید سنا تو ہے۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے  
 کہا۔ ”لیکن... غالباً بہت عرصہ پہلے سنا ہے۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ  
 کس سلسلے میں سنا تھا۔“

”جی ہاں، اگر سنا ہو گا تو کافی عرصہ پہلے ہی سنا ہو گا۔ وہ بجلی کا  
 سامان تیار کرنے والے تین کارخانوں کے مالک تھے۔ خاصی بڑی  
 اسامی تھے۔ شاید اسی لیے تین سال قبل ان کی اکلوتی بیٹی کو اغوا  
 کر لیا گیا تھا جو اس وقت صرف چند سال کی تھی۔“  
 ”اور وہ تم تھیں؟“

”جی ہاں، وہ بد نصیب میں تھی۔“ وہ تکلیف دہ حد تک سیات  
 لمبے میں بولی ”میرے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور میں بھی  
 خاصی مختلف مرادوں سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی شادی کے کئی برس  
 بعد۔ جب وہ اولاد کی طرف سے تقریباً پانچ سو بچے تھے اور  
 دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے تب قدرت نے مجھے  
 دنیا میں بھیج دیا۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ دنیا میں الیہ کامیوں کی  
 کوئی کمی نہیں تھی، قدم قدم پر بھری بڑی تھیں لیکن قدرت کو مزید  
 ایک الیہ کامی تخلیق کرنا تھی۔“ وہ خاموش ہو گئی، شاید مزید بولنے  
 کے لیے توانائی بچتے کر رہی تھی۔

”تمہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا؟ کوئی خاندانی تنازعہ وغیرہ تھا؟“  
 میں نے پوچھا۔

”میں، خاندانی تنازعے کا تو کہیں دور دور تک نام و نشان  
 نہیں تھا۔ مجھے تو ہماری توانوں کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔ میرے والد

خواب میں خود بھی شریک ہو گیا۔  
 بیٹ بھرنے کے بعد اس کے جسم میں گویا جان سی آگئی۔  
 اجڑے اجڑے سے چہرے پر زندگی کا کچھ رنگ نظر آنے لگا۔  
 ”اب سناؤ اپنی داستان جو حقیقت کا غم ناک ہوگی۔“ میں نے  
 کافی کے چھوٹے پھرنے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں  
 میں ابھی تک اندازے سے بھرے ہوئے تھے۔

”نہیں، کوئی ایسی خاص غمناک نہیں ہے۔“ وہ دیران سی  
 آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”دنیا میں ایسا ہوتا رہتا  
 ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔“  
 مجھے اندازہ ہوا کہ میرے الفاظ میرا رویہ اس کے دل پر  
 غراؤں ڈال رہا تھا۔ وہ دل جو زندگی کے مصائب سے پھر ہو چکا  
 تھا۔  
 ”تم دنیا کی بات چھوڑو اپنی سناؤ۔“ میں نے قدرے نرمی سے  
 کہا۔

اس نے کافی کاگ میز پر رکھ دیا اور چند لمبے تک اپنے مختصر  
 نازک اور مرسر سے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ اس کے ہاتھوں کی پشت  
 پر نیلے رنگیں ابھری ہوئی تھیں اور انگلیاں مرشش تھیں۔  
 چند لمبے کی خاموشی کے بعد وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی ”آپ  
 نے بھی سیٹھ غیاث کا نام سنا ہے؟“  
 ”اے... شاید سنا تو ہے۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے  
 کہا۔ ”لیکن... غالباً بہت عرصہ پہلے سنا ہے۔ اب یاد نہیں آ رہا کہ  
 کس سلسلے میں سنا تھا۔“

”جی ہاں، اگر سنا ہو گا تو کافی عرصہ پہلے ہی سنا ہو گا۔ وہ بجلی کا  
 سامان تیار کرنے والے تین کارخانوں کے مالک تھے۔ خاصی بڑی  
 اسامی تھے۔ شاید اسی لیے تین سال قبل ان کی اکلوتی بیٹی کو اغوا  
 کر لیا گیا تھا جو اس وقت صرف چند سال کی تھی۔“  
 ”اور وہ تم تھیں؟“

”جی ہاں، وہ بد نصیب میں تھی۔“ وہ تکلیف دہ حد تک سیات  
 لمبے میں بولی ”میرے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور میں بھی  
 خاصی مختلف مرادوں سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی شادی کے کئی برس  
 بعد۔ جب وہ اولاد کی طرف سے تقریباً پانچ سو بچے تھے اور  
 دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے تب قدرت نے مجھے  
 دنیا میں بھیج دیا۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ دنیا میں الیہ کامیوں کی  
 کوئی کمی نہیں تھی، قدم قدم پر بھری بڑی تھیں لیکن قدرت کو مزید  
 ایک الیہ کامی تخلیق کرنا تھی۔“ وہ خاموش ہو گئی، شاید مزید بولنے  
 کے لیے توانائی بچتے کر رہی تھی۔

”تمہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا؟ کوئی خاندانی تنازعہ وغیرہ تھا؟“  
 میں نے پوچھا۔

”میں، خاندانی تنازعے کا تو کہیں دور دور تک نام و نشان  
 نہیں تھا۔ مجھے تو ہماری توانوں کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔ میرے والد

فکائیے ادب میں منفرد اہمیت کے حامل  
 ادیب اعتبار ساجد کی نئی تصنیف

ایمر جنسی وارڈ

قیمت: -/80 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

لے معمولی سا مرحہم تھے۔ ویسی بھی کسی ستم رسیدہ عورت کو اسے سامنے روتے دیکھنا میرے لیے بڑی آزمائش تھی۔ اس کو چہ کرانے کا مجھے ملحق نہیں تھا۔ میں ساری تیزی و طراری بھول چلا تھا۔ الفاظ میری زبان کی گرفت سے نکل جاتے تھے اور اگر کچھ الفاظ سوچتے بھی تھے تو دوسروں کی اذیت کے سامنے وہ بے حد حق محسوس ہوتے تھے۔ لفظوں سے بھلا کس کے زخم بھرتے ہیں؟ نیچے ہی نیچے کسی طرح اس نے آنکھیں خشک کر لیں اور پوچھ لیا۔ اس نے جب سر اٹھایا تو صرف اس کی آنکھوں کی گہری سرخی اور پتوں کے تم کنارے بتا رہے تھے کہ وہ بولی تھی۔ ایک بار پھر پات تھا۔ اسے کچھ خیال آیا اور وہ دوسرا جھجھکے سے مجھے میں بولی "آپ کو معلوم بھی ہے کوئی خانہ کتے ہیں؟"

"ہاں۔ کسی حد تک معلوم ہی ہے۔" میں نے ہم سے لیے کہا۔ یہ اصطلاح عیاشی کے ان اڈوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کوٹیوں میں قائم تھے۔ کال گرلز کے مسکن تھے۔ بعض جگہوں سے کال گرلز سلائی بھی کی جاتی تھیں اور بعض جگہوں پر اندر تمام انتظامات موجود تھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوٹیاں خانوں کے بھی مختلف معیار تھے بعض تو بہت اونچے تھے۔ وزیر، بڑے بڑے میزبان اور کوڑی بیٹھ ان سے مستفید ہو تھے۔ ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والے پولیس افسران۔ تارے اور تنزی ہو جاتی تھی۔ دست تھانوں دراز رکھنے والوں خوشامی و نیک ثانی میں اضافہ ہوا تھا۔

انہم اس سلسلے میں میرا کوئی خاص عملی تجربہ یا مشاہدہ نہ تھا۔ جب خرابات فوجوالی میں بھٹکے کا سلسلہ جاری تھا تو اپنے ابتدائی ساتھی اور تجربہ کار دوست شرف کے ساتھ ایک معمولی کوٹھی خانے پر جانے کا اتفاق ہوا تھا جس کی یاد بھی دھندلا تھی۔ ایک لمبے کے وقف سے نیلے بولی "آپ کو شاید معلوم ہے کہ جس گلی میں میڈم ستارہ کی کوٹھی ہے" اسی لائن کی آخری بہت بڑی۔ کارز کی کوٹھی میں نہایت اونچے درجے کا کوٹھی کھلا ہوا ہے؟"

"نہیں مجھے نہیں معلوم" میں نے اعتراف کیا۔ "آپ کو ایسی جگہوں پر جانے کی ضرورت پیش نہیں ہوگی۔" وہ تھیں انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی "دیکھیں اگر کو اس جگہ کے بارے میں علم ہوتا ہے بھی آپ نہ اٹھا کر وہاں نہیں جاسکتے تھے اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے اسے۔ کسی مخصوص ریفرنس کے کوئی وہاں نہیں سکنا اور جب تک آدمی کو اچھی طرح پر لیا جائے کوئی جان نہیں سکنا کہ وہاں اصل میں کیا ہوتا۔ چھوٹے موٹے آسودہ حال لوگ بھی وہاں نہیں جاسکتے بلکہ وہ اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے ہے۔"

"ای اور اب اس حادثے میں موقع پر ہی میرے!" ایک گہری سانس لے کر اس نے یہ جملہ گویا کسی بھاری پتھر کی طرح اپنی زبان سے اتار پھینکا اور میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اس کی ذات میں پھیلے ہوئے گندہ کی دیرانی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ میرے شکوک و شبہات دور ہوئے جا رہے تھے مجھے اس پر اعتبار آ جا رہا تھا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں نے اپنے اغوا کنندگان کو آپس میں جو باتیں کرتے سنی کبھار سنا۔ اور ایک آدھ مرتبہ جو ادھر ادھر پڑے ہوئے اخبارات میری نظر سے گزرے" ان سے اندازہ ہوا کہ حادثے کے بعد اس رقم کا بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا جو اسی "اے" کے روانہ ہوئے تھے۔ وہ پولیس کو بھی میرے اغوا کی اطلاع دے چکے تھے اور بالا بالا اپنے طور پر بھی معاملات طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حادثے میں میرے والدین کے انتقال کے بعد پولیس بھی حرکت میں آئی اور اغوا کنندگان نے بھی محسوس کر لیا کہ کھیل بڑھ چکا ہے۔ ان کی کندہ لبہ باج آکر ٹوٹ گئی تھی۔ رقم ان کے ہاتھ آتے آتے نکل گئی تھی اور رقم دینے والے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر وہ پرانے پیشہ ور تھے "انہوں نے مجھے جھوڑا نہیں۔" تادان کی رقم تو چاہیں لاکھ طے ہوئی تھی لیکن وہ بازی الٹ جانے کے بعد انہوں نے مجھے بھانپتے چور کی لنگڑی بھلی "کے صدقاً زیادہ لاکھ روپے میں ایک شخص کے ہاتھ بیچ دیا جس نے پہلے ہی ماہ تک مجھے اپنے عشرت کے میں رکھا اور جوانی کی دلچسپی کھڑے ہوئے میرے لڑکپن کو خوب دھندا۔" پھر وہ کچھ سی "مصدقیات" میں الجھ گیا تو اس نے مجھے اٹھا کر اپنے کوٹھی خانے میں ڈال دیا۔ دسترخوان بہت بھرا ہو تو کھانے والے ایک آدھ ڈش حسب خرابات کھانے کے بعد جانوروں کے سامنے بھی ڈال دیئے ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے سے بڑے جانوروں کے سامنے۔ لیکن شاید میں غلط کہہ رہی ہوں۔ میں جس کے قبضے میں تھی اس سے بڑا جوان مجھے بعد میں بھی کوئی نہیں ملا۔ میں نے اس کے پاس جو چند ماہ گزارے "میری اس دور کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی اس وقت میری عمر ہی تھی اسی نازم قسم میں ملی ہوئی ساڑھے پندرہ سال کی لڑکی تھی۔ میزک کا استہان دے رہی تھی جب مجھے اغوا کیا گیا۔"

آخر کار اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ کہاں تک ضبط کرتی؟ اس نے اپنے اوپر بے حس کا جو خول چھایا ہوا تھا "کدم ہی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس نے میز پر سر رکھ کر بازو کے طعنے میں منہ چھپایا اور خاموشی سے بولنے لگی۔ نہ جانے کدھر وہ کوئی آواز نکلتے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے جسم کو خفیف سے جھٹکے لگ رہے تھے صرف انہی سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ دوسری تھی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لیٹا ہی اس کے تن میں بہر تھا۔ اس کے بے حس کے خول تلے نہ جانے کتنی اذیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ آنسو ان زخموں کے

اور اس کی موت کو حادثے کا رنگ دے دیا گیا لیکن وہ میرے دل میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میں نے صرف اسی سے محبت کی ہے۔ اور وہ بھی اس کے مرنے کے بعد۔ میرا خیال ہے میں جب تک زندہ رہوں گی اس سے محبت کرتی رہوں گی۔ وہ ہمیشہ میرے دل میں رہے گا۔

اس نے ایک سسکی سی لی لیکن آنکھ سے کوئی آنسو نہ نکلے دیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ اپنے لہجے کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے بولی "زندگی میں بہت سے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ آپ کے لیے جان دے دیں گے مگر حقیقتاً کسی کے لیے جان نہ بڑا مشکل کام ہے۔"

"کیا وہی تمہارے ہونے والے بچے کا باپ تھا؟" میں نے ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں" اس کا لہجہ ایک بار پھر پٹاٹ ہونے لگا "میری کوکھ کی دلہیز اس روح کے قدم رکھنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔"

"تو پھر اس کا باپ کون ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

میری کنہیوں میں ایک بار پھر سائیں سائیں ہونے لگی۔ وہ سر نہ کاٹے ہوئے بولی "تو جانے تمام تر احتیاطوں کے باوجود یہ بات کہے ہوئی۔ کوئی خانہ چلانے والے اور خاص طور پر میڈم بہت ناراض ہے۔ وہ تو ان کی جو ایک خاص لہڈی ڈاکڑ ہے اسی سے منع کر دیا کہ لڑکی کی جان کا خطرہ ہے؟ ورنہ وہ تو اس روح کو میری شاخ بدن سے نوج بھیجتے۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" اچانک میں نے بے ارادہ سے انداز میں پوچھا۔

"میں ابھی پورے اٹھارہ سال کی نہیں ہوئی۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تو تمہیں اٹھارہ سے بھی کم کی سمجھ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارے انداز گفتگو میں بے پناہ پختگی اور شائستگی ہے۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں اتنے صریح انداز میں گفتگو نہیں کرتیں۔"

"مجھے جس پیشے میں ڈال دیا گیا ہے اس میں لڑکی چاہے تو اپنے آپ کو غلط کاریوں سے بھری "استاد" کے شرمناک گفتگو کی عادی بھی بنا سکتی ہے اور چاہے تو صریح گفتگو بھی سیکھ سکتی ہے۔" وہ بالوں میں اٹھکیاں پھیرتے ہوئے بولی "اور شاید اپنے رشتہ خان کی بھی بات ہوتی ہے۔ میں کہتا ہے کہ لڑکی ہونے اور اعلیٰ میڈیم اسکول میں پڑھنے کے باوجود خالص اردو میڈیم قسم کی لڑکی تھی۔ نویں جماعت سے میں نے ایک سوئی سی ڈائری میں نہایت دردناک اشیاء جمع کرنے شروع کر دیے تھے تمام شاموں اور ایبوں کو بڑھاتا تھا۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہاں تو کوئے پر کسی بیوی پارلر کے نام کا خوب صورت سا بورڈ نصب ہے! میں نے کہا۔"

"درست ہے۔ اس طویل و عریض کوٹھی کے ایک چھوٹی ہال میں چھوٹا سا لیکن نہایت جدید اور بے حد رنگارنگ پارلر بھی موجود ہے۔ بیوی پارلر بھی اس سلسلے میں بہت کام آنے والی چیز ہے۔ ڈائری ڈیوٹی ہے اور وہ سب سے بے شمار فائدے بھی۔ نیا فیلٹ بھی خود بخود شگاف ہوتا رہتا ہے اور اپنے پرانے کیتوں کی آرائش و زیبائش کا کام بھی شاندار طریقے سے کم لاگت میں ہوتا رہتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو جسم فروشی اور مشاغل میں بڑا قریبی تعلق پیدا کر سکتا ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ اس کوٹھی خانے کو جن لڑکیوں کی خدمات حاصل ہیں ان میں نہایت اونچے کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں اور بعض لیڈی ڈاکٹرز تک شامل ہیں۔"

میرے کان ایک لمحے کے لیے ذرا سنسناتا ٹھہرے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اور مجھ جیسی کئی لڑکیاں وہاں قیدی کی سی زندگی بسر کر رہی ہیں جو ابھی تک "قابل اختیار" قرار نہیں پاسکتیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ ان میں کیسی کیسی خوب صورت، سلیبی ہوئی اور اچھے گھرانوں کی لڑکیاں ہیں جو مختلف حالات کا شکار ہو کر نہ جانے کن کن مرطوب سے گزرتی ہوئی وہاں تک پہنچتی ہیں۔"

"تم وہاں کب سے تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"دو سال سے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس دوران تم نے بھاگنے کی کوشش کی؟"

"بالہ۔ تین مرتبہ اس سے پہلے اور آج یہ میری چوتھی کوشش ہے۔ ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میری یہ چوتھی کوشش بھی کامیاب ہے یا نہیں۔ پہلی تین کوششوں میں تو اتنی دور بھی نہیں نکل سکی تھی۔ یہ میں نہیں بتا سکتی کہ ان کوششوں کے بعد مجھ پر کیا گزری تھی۔ الفاظ میرا ساتھ نہیں دیں گے۔ الفاظ کو بھی شرم آجائے گی۔"

اس نے پلو بولا اور ہیٹ پر ہاتھ رکھ کر اڑھتلی سے کراہ کر بولی "ایک کوشش میں تو ایک نوجوان نے میرا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کی جذباتیت ذرا ابھرتی تھی۔ تجربہ کار اور کھائے چلے ہوئے لوگ تو اس پیکر میں نہیں پڑتے۔ وہ تو اپنے متعدد کی تحصیل کے بعد اپنی مصروفیات کی دنیا میں لوٹ جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے ہم جیسی لڑکیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی کمائی تو لگی ہی ہوتی ہے لیکن وہ کمائوں میں نہیں الجھتے۔ وہ صرف جوانی سے مطلب رکھتے ہیں کمائی سے نہیں۔"

"نوجوان نے تمہارا ساتھ دیا تو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"جاننا ہے ہاتھ دھو بیٹھا ہے چاہا! اس کی آواز ایک لمحے کے لیے زبردستی گئی۔ "بھاگنے ہی میں پکڑ لیا گیا۔ اتنا ارادہ کیا



ہیں۔ سب لڑکیاں کو بھی خانے کی دغاوار ہیں۔ سب سے زیادہ ناقابل اعتبار میں ہی تھی اسی لیے سب سے زیادہ سختی بھی ہی تھی ورنہ جو وہاں رہتی ہیں انہیں کچھ نہ کچھ آزادیاں حاصل ہیں۔ اگر دیشتر انہیں کسی کے ساتھ بھی بیچا جاتا ہے۔ بلکہ بچپن میں ہی ایک تو کسی کے ساتھ کچھ دن میں ہی بھی گزار کر کئی عورت انہوں نے اس زندگی کو قبول کر لیا ہے۔ سب سے کم عمر میں تھی۔ ابھی میرے ”سدھرنے“ کا انتظار کیا جا رہا تھا۔“

”کو بھی خانے کی مالک ”میڈم“ ہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ اسے چلانے کے سلسلے میں اہم ترین عورت وہی لیکن مالک ایک اور شخص ہے۔ اس کا نام مختار رفیق ہے۔“  
 نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

میں کرسی سے گرتے گرتے پھا۔ میرے حواس پر جو وحند چھائی ہوئی تھی۔ وہ یکدم دور ہو گئی۔ وہ بدستور غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کے لیے اجنبی نہیں ہے؟“

مجھے ایک بار پھر شبہ ہوا کہ وہ کسی سازش کے تحت تو ا انداز میں میرے ساتھ نہیں آئی تھی؟ لیکن اسی لمحے اس نہایت معصومانہ اور مخلصانہ انداز میں پوچھا ”مختار رفیق سے آپ کس بات پر دشمنی ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم“ میں نے غصا لیے میں کس ”کر کوئی د“ سے تو اسی کی طرف سے ہے۔ وجہ بھی اسی کو معلوم ہوگی۔ میں خود کسی سے دشمنی مول نہیں لیتا۔ کبھی کبھار میں کسی کے اعمال بھول جاتا ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں اس سے جا ملتا ہوں اور وہ اسے جنگ بنالیتا ہے۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”میں نے اتفاق سے کو بھی خانے میں آپ کے بارے ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ سنا تھا۔ وہیں تو آپ کا تذکرہ ہوتا اور پھر کھڑکی سے آپ کو دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ آپ افضل چوہدری ہیں۔ مختار رفیق کا ایک خاص آدمی دو تین روز ہی کو بھی خانے آیا تھا اور میڈم سے باتیں کر رہا تھا۔ آپ بارے میں بات ہو رہی تھی کہ آپ ستارہ کے ہاں آتے ہیں۔ سے آپ کو اٹھایا جائے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ رفیق کو کسی وجہ سے آپ پر بہت غصہ ہے۔ میں وہاں در حقیقت صرف اپنے لیے ہی نہیں آپ کے لیے بھی بھاگی ہوں۔ مختار رفیق بہت خطرناک آدمی ہے۔ میں نے سوچا آپ کو اس بارے میں خبردار کر دینا کی۔ یہ گویا میری طرف سے آپ کی خبر ہوگی۔ شاید اس کی وجہ سے آپ کو کچھ پر کچھ ترس آجائے اور میری بھی مدد کریں۔“

”تم وہاں سے بھاگیں کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”آج اتفاق سے وہاں میڈم نہیں تھی اور وہ خطا نہ نہ۔ مختار چوہدری نے اپنے لیے ادر اور منزلتے رہتے ہیں۔ ان میں

اس نے ایک طویل سانس لی جو ایک خاموشی سے مشابہ تھی۔ یکدم ہی وہ تھک سی گئی۔ ٹوٹتی ہوئی سی آواز میں بولی ”اب ستارہ کو صرف باتیں ہی رہی ہیں۔ وہ بھی نہ جانے کس لمحے ختم ہو جائیں۔ ڈھائی سال میں ایک خوب صورت زندگی ختم ہو گئی۔ سک سک کر۔ گھٹ گھٹ کر۔ غلا غلاؤں میں ڈوب کر۔“

”یہی یہ فیصلہ مت دو۔ ہو سکتا ہے اس موڑ سے کسی نئی زندگی کا آغاز ہونے والا ہو۔“ میں نے اتنی دیر میں پہلی بار کچھ بہت افراہی بات کرنے کی کوشش کی ”کیا تمہارے والدین کے بعد کسی نے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

پہلی بار اس کے آثار اس میں بہت نمایاں تبدیلی آئی۔ اس کا سپید اور ہلکی کے گالے جیسا چہرہ ایک لمحے کے لیے کھنکھ کر رہ گیا۔ پھر وہ زہریلے انداز میں فیس دی ”یہ اُمید و اُمید زنجیر کی ایک اور کڑی ہے۔ میں اپنے والدین کی دولت و جائیداد کی اگلوئی وارث تھی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ اس تمام دولت و جائیداد پر ترقی رشتے و امدادوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ انہوں نے کچھ شواہد کی مدد سے مجھے مراد قرار دلوایا ہے۔ میں تو ان کے لیے تاریکی میں چھپا ہوا سب سے بڑا خطرہ ہوں۔ مجھے دھڑکنے والا قہر کسی نے کیا تھا۔ میرا خیال ہے میں تو اب کسی انتہائی مضبوط سارے کے بغیر اپنے گھر جانے کی کوشش بھی نہ کروں گی تو مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ یہ کنویں سے نکل کر کھائی میں گرنے والی بات ہوگی۔“

”کو بھی خانہ چلانے والے لوگ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”اس کا انتظام چلانے والی تو ”میڈم“ ہے۔ اس کا اصل نام مجھے۔۔۔ بلکہ شاید کسی کو بھی نہیں معلوم۔ سب اسے صرف میڈم کہتے ہیں۔ شاید زہرناک یا زہینہ اس کا اصل نام ہے لیکن میں نہیں سے نہیں کہہ سکتی۔ بڑی خطرناک عورت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خطرناک عورت نہیں دیکھی۔ تین چار اور بھی خطرناک اور بد معاشر سے لوگ کو بھی میں اس کی مدد کے لیے ادر اور کور کو نے کھروں میں موجود رہتے ہیں۔“

”تمہاری رہائش اسی کو بھی میں تھی؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ہاں“ اور کے ایک کمرے میں جس کی کھڑکی میں گرل لگی ہوئی ہے۔ اس کھڑکی سے میں آپ کو میڈم ستارہ کے ہاں آتے جاتے دیکھا کرتی تھی۔ کو بھی خانے والے میڈم ستارہ کو جانتے ہیں۔ گو کہ ایک دوسرے کے ہاں آتا جاتا نہیں ہے اور نہ ہی میڈم ستارہ کو علم ہے کہ ہمارے ہاں کو بھی خانہ ہے۔“

”وہاں اور بھی لڑکیاں ہیں؟“

”کئی ہیں جو وہیں رہتی ہیں۔ اور بہت سی ایسی ہیں جنہیں بوقت ضرورت بلایا جاتا ہے۔ ان میں بہت اچھی اچھی لڑکیاں ہیں جن کے بارے میں شاید کسی کو شبہ بھی نہ ہو کہ وہ کال کر رہیں۔ سب ایک مربوط نظام کے تحت کام کرتی ہیں۔ وہاں کو اور فٹن

بھی صرف دو تھے۔ باقی دو نہ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔ میری طرف آنے کل ان کی فوج بھی ذرا کم تھی کیونکہ اب میں نے کھست خور دی افسار کھلی تھی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ میں اس حالت میں بھاگنے کی ہمت کروں گا۔۔۔۔۔

اس نے گویا ان لحات کو یاد کرتے ہوئے ہنر جھری سی لی "میں بھت پر جا کر برابر دالی کو کھنی کی بھت پر اتری۔ ان کی میڑھیوں کا دروازہ بند تھا اس لیے ایک دیوار پر اتری۔ اس دیوار پر چلتی ہوئی ایک کڑی کے نیچے کی سیڑھ میں پہنچی۔ پہلے مجھے پرکڑی جہاں سے اوردے نہ کرتے کرتے پہنچی۔ مجھے پرے کی شلی گوری اور آپ کی گاڑی میں آچھپی۔ آج شاید قسمت کچھ مہربان تھی۔ آپ کے روانہ ہونے تک کسی کو میرے فرار کا علم نہیں ہو سکا تھا۔"

میں دلی دل میں اس اتفاق پر حیران تھا۔ کیا اس لڑکی کو بھی عمارتوں کے بارے میں ایک کمائی لے کر اور خود اس کمائی کا ایک قابل رحم کردار بن کر انہی دنوں میرے سامنے آنا تھا؟ بیٹھے بٹھائے اس شخص کو میں نے خواہ مخواہ سی اپنی زندگی پر مسئلہ کرایا تھا۔ میں اس زور میں کچھ زیادہ سی الجھتا جا رہا تھا۔ نہ جانے یہ کہاں تک پہنچی ہوئی تھی اور کتنی الجھی ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے عمارتوں میں وہ شخص ہے جس کے ہاتھ انفرانڈ گان نے جیسے فروخت کیا تھا اور خود غائب ہو گئے تھے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور نظرسنجی رکھتے ہوئے بولی۔ "اس کو کھنی خانے میں" میں تقریباً چھ ماہ تک صرف اسی کے لیے مخصوص رہی، کسی اور کو میری جھلک بھی نہیں دکھائی گئی۔ پھر اس کا آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ آج بھی تھا تو میرے لیے نہیں۔"

"گنا ہے اس شخص کی قسمت میں بھی دولت تو بہت ہے لیکن کوئی با عزت کاروبار نہیں ہے۔" میں نے کمری سانس لے کر کہا۔

"بہر حال آپ اس سے بچتے کا بندوبست کر لیں چوہدری صاحب!" اس کی آنکھوں میں خوف دور آیا "آپ کی جان کو سخت خطرہ ہے۔ اس نے حکم دے دیا ہے کہ آئندہ جب بھی آپ ستارہ کے ہاں آئیں تو آپ کو انفرانڈ کرایا جائے۔ آپ کو اندازہ ہی ہو گا کہ وہاں کسی کو انفرانڈ کا زیادہ مشکل نہیں۔ زیادہ تر کو لیاں بڑی بڑی قیل۔ رات کو تو کیا، دن میں بھی گلیاں دور ان رہتی ہیں۔ پڑوسی کو پڑوسی کا پتا نہیں ہوتا۔"

اس کی پہلی ہوئی آنکھیں اور جہرے کی معصومیت دیکھ کر مجھے ہنس آئی۔ وہ ذرا ہنسنے لگی "آپ اس معاملے کو مذاق میں نہ لیں۔"

"نہیں، میں ہرگز مذاق میں نہیں لے رہا۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "لیکن جیسے معلوم ہے اس وقت عمارتوں میں کہاں ہے؟"

"نہیں، لیکن کو کھنی خانے میں اس کے بارے میں مجھے کچھ پہلے سی محسوس ہوئی تھی۔ کچھ ایسا لگا تھا جیسے اس کے بارے میں کوئی بری خبر آئی ہو۔ لیکن بات کیا تھی یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔" اس نے جواب دیا۔

"پہلا اندازہ ہے کہ اس وقت وہ خاصی زخمی حالت میں کسی پرائیویٹ اسپتال میں پڑا ہوگا۔" میں نے کہا۔

اس کی آنکھیں دوبارہ پھیل گئیں "اسے آپ نے اس ن پتہ پایا ہے؟"

"ہاں۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں، موقع اچھا تھا۔ لگے ہاتھوں اسے قبرستان ہی پہنچا دیا ہوتا تو اچھا تھا۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

اسے گویا یقین نہیں آ رہا تھا کہ سب مہمانوں کے ہٹنے کے بغیر معززانہ لباس اور پیش قیمت گاڑی میں تر شاہجہے والا اور صحت شائستہ و منہب طہر آئے والا شخص اس قسم کے دعوؤں کا اہل تھا۔ میں اسے یقین دلانے کی زیادہ کوشش کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری شخصیت کا یہی تاثر بہتر تھا۔

"اس صورت میں تو آپ کو زیادہ محتاط رہنا چاہیے، زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"تم اس سلسلے میں قطعاً کوئی ٹکڑ نہ کرو۔" میں نے ملامت سے کہا "مجھے انفرانڈ کرنے، لاک کرنے اور میری ٹکا بونی کرنے کی صرت دل میں لیے کسی عظیم شخصیتیں دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔ تم بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" وہ سادگی سے بولی "پہلے تو اس رہاں سے نکل آئے کا تصور ذہن میں تھا۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔"

"میں بھی تمہارے مسائل پر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر غور کروں گا۔" میں نے کہا "فی الحال میری ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ اطمینان سے بیٹھ کر غور کر سکوں۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں تمہیں اس گھر میں بھی نہیں رکھ سکوں۔"

"کیوں گویا آپ شادی شدہ ہیں؟" اس نے تدریس سے چونک کر پوچھا۔

"شادی شدہ ہوتا تو اب تک تمہیں بہت اچھی طرح معلوم ہو چکا ہوتا۔" میں نے کہا "مسئلہ یہ نہیں ہے۔ میرے کچھ دوسرے مسائل ہیں، کچھ مشکلات ہیں۔ میرے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تم جیسے مسائل کا شکار کسی لڑکی کو اس گھر میں رکھ سکوں۔"

"آپ کو اپنے اور کوئی الزام آنے کا خطرہ ہو گا؟ بدنام ہونے کا اندیشہ ہو گا؟" وہ ہلکے سے سانس لے کر بولی۔

"ان باتوں کی مجھے کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔ لیکن آج کل میں ذرا محتاط ہوں۔ کچھ لوگ ہیں جو میری کسی بھی کمزوری سے

سے رخسار زندگی کی حرارت سے ختم ہار ہے تھے اور بدن کے شجر کی  
نواں رسیدہ شاخص پھر سے برہی بھری تھیں۔  
”یہ کون ہے؟ تمہاری داشتہ؟“ نیلے نے سرگوشی میں  
انسانی سادگی سے پوچھا۔  
”ہاں۔۔۔ میں نے قدرے عقل سے کہا ”نیا گچ اٹھ کرے  
میں اتنی جلد بازن مت دکھاؤ۔“

ملازمہ نے اسے چکایا تو وہ مجھے سامنے پا کر حواس باختہ سی  
ہو گئی۔ بزرگ عورتوں کی طرح اس نے ششکانہ انداز میں مجھے پکار  
کیا اور دعائیں دیتے ہوئے بولی ”شلا جوائیاں نامیں۔ باز افضل  
یہ آج مدت بعد صبح ہی صبح میری یاد کیسے آگئی؟ آخر تو ہے؟ مجھے تو اپنی  
آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ تم واقعی یہاں آئے ہو یا میں خواب  
دیکھ رہی ہوں؟“

”خواب شواب تو دیکھ لے جتن دیکھتے تھے تم نے۔“ میں نے  
کہا اور نیلے کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں تمہارے پاس چھوڑ کر  
جارہا ہوں۔ شاید اسے دو چار دن یہاں رہنا پڑے۔ اس کا ہر طرف  
سے خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔“  
”باز افضل! تمہارا حکم ہے تو اس کے لیے جان بھی حاضر  
ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو سر قلم کرنا۔“

اس نے کمری فکر سے نیلے کا جائزہ لیا جو ایک طرف کو سکوڑ  
سکی کھڑی تھی۔ اس کے پاس کوئی بڑی سی چادر وغیرہ بھی نہیں تھی  
جس میں وہ اپنے آپ کو لپیٹ سکتی، چھپا سکتی۔ وہ نیلے کو وہیں  
کھڑے چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور  
رازدارانہ انداز میں بولی ”باز افضل! یہ تمہاری غلطی ہے؟“  
”ماحول دلا۔“ میں نے تجزی سے کہا۔

”بات تو یہ لا حول ہی پڑنے کی ہے۔“ وہ اپنی بڑی بڑی سیا  
آنکھوں میں نیند شہک بگائی دھورے لیے شریر سے انداز میں  
سمکراتے ہوئے بولی ”لیکن مجھے تو شرانے کی ضرورت نہیں۔ نہ  
تو تمہاری اپنی نوکر ہوں، غلام ہوں بیروں کی خاک ہوں۔“

”بس! بس!“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”آج زیادہ  
بچے جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے اور تمہارے بارے میں غلط  
فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔ تم میرے اور اس کے بارے میں غلط فہمی  
شکار ہو رہی ہو۔ تم عورتوں کو اس کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ جو  
سمجھ رہی ہو ایسا کوئی پکڑ نہیں ہے۔ وہ بھی اسی طرح معصیت کی  
ماری ہے جس طرح بھی تم معصیت کی ماری تھیں۔ اس کا معاملہ  
ذرا زیادہ غہیں ہے۔“

تب آجائیاں یکدم سنجیدہ ہو گئی اور بد لے ہوئے لہجے میں بولی  
”باز افضل! تم فکر نہ کرو میں اس کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہونے  
دوں گی۔ اچھا ہوا تم اسے یہاں لے آئے۔ میں تو یہاں پڑے پڑے  
ہو رہی ہوں۔ تم نے ابھی تک میرے لیے کوئی کام نہیں سونپا؟“  
”سوچیں گے سوچیں گے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”

فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں اپنی شخصیت کے ساتھ کوئی ذرا سا بھی  
کمزور پہلا راستہ نہیں رکھنا چاہتا لیکن جیسے پریشان ہونے کی  
ضرورت نہیں۔ اور بھی کئی محفوظ ٹھکانے ہیں۔ میں خود جیسے  
کیسے چھوڑ کر آؤں گا جہاں جیسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس  
دوران میں کسی نیلے پر بھی پہنچ جاؤں گا کہ تمہارے بارے میں کیا  
کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر محالیا اور خاموش رہی۔ لیکن  
جب میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ جس پوزیشن میں تھی اس  
کے پیش نظر اسے کیسے بھی چھوڑنا تو بڑے بہت دور سر کے ہی  
حزاف تھا۔ سب سے زیادہ سوتیلیں اور ہر طرح کے انتظامات  
”دوبارہ“ پر موجود تھے لیکن وہاں میں اسے لے جانا نہیں چاہتا تھا۔  
وہ میرا انسانی خیمہ ٹھکانہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی کی بھی  
نظر میں آئے۔ اب اس سے یہ فرمائش کرنا بھی مناسب نہیں تھا کہ  
اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے کیسے لے جایا جائے گا۔ وہ  
میرے بارے میں محکوک ہو جاتی۔ راجیل یا اپنے کسی دوسرے  
ساٹھی کے ہاں بھی اسے چھوڑنا قطعاً مناسب نہیں تھا۔

مزید چند منٹ غور کرنے کے بعد آخر کار مجھے ایک جگہ یاد آگئی  
جہاں اس کا رہنا محفوظ تھا اور اس کا ہر طرح سے خیال بھی رکھا  
جاسکتا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے اس  
طرح اچانک اٹھ کھڑے ہونے پر ذرا حیران ہوئی لیکن سر حال میر کا  
سارا لے کر ہولے سے کرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر نکر میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور روانہ ہو گیا۔ کچھ  
دیر بعد میری گاڑی اس عمارت کے نیچے جا کر کی جس کے ایک قریب  
میں نے اپنے گاؤں کی ایک عورت آجائیاں کو رکھا ہوا تھا۔ صبح  
کے آثار نمودار ہو رہے تھے لیکن چاروں طرف دیرانی اور سکوت  
کا راج تھا۔

وہ میری رہنمائی میں دھیرے دھیرے بیڑمیاں چڑھ کر اوپر  
پہنچی اور میں نے مطلوبہ اپارٹمنٹ کی کال بیل کاٹیں دیا۔ یہ ایک  
مختصر سی عمارت تھی۔ اس میں چند ہی اپارٹمنٹ تھے لیکن کافی  
کشادہ تھے۔

چند لمحے بعد ملازمہ نے آنکھیں ملے ہوئے دروازہ کھولا۔ اس  
وقت مجھے سامنے پارکس کی سستی یک تخت کا فور ہو گئی اور وہ ایک  
طرف بیٹ گئی۔ میں نیلے کو ساتھ لے کر اندر پہنچا۔ ملازمہ نے بتایا کہ  
آجائیاں ابھی سو رہی تھیں۔ میں اس کے بیڈ روم میں جا پہنچا۔ وہ آڑی  
ترتیبی بے خبر پڑی تھی۔

اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی آجائیاں تھیں جو کچھ عرصہ  
قبل بیماری و قحط حالی سے موت کے منہ میں پہنچی ہوئی تھی۔ علاج  
سہا لے اور زندگی کی بہترین آسائشوں میں مود و شب گزارنے کے  
بعد گویا اس کی اپنی ہوائی جہاز دانی واپس آگئی تھی۔ سامنے لے سلونے

دل ایک لمحے کے لیے وحشتناک بھول گیا۔ مجھے وہیں احساس ہو گیا کہ کوئی گریز و بچل بھی۔

رات کا سنا پلوں تو چاروں طرف ہی پھایا ہوا تھا لیکن ظلیٹ میں پھیلا ہوا سکوت کچھ اور ہی طرح کا تھا۔ میں نے ہٹل نکالا اور نہایت محتاط انداز میں ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔ فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری احتیاطی تدبیریں فیروز سب بیکار تھیں۔ اب کسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

در حقیقت یہودی دوا زہ کھولتے ہی مجھے لو کی بو آگئی تھی۔ میری ناک انسانی لو کی بو خوب پہچانتی تھی۔ شاید فیرو جانی سے ہی یہ وصف مجھ میں پیدا ہو گیا تھا۔ جب میں سردی جنگوں میں ڈزنگ کی جنگ میں الجھا ہوا تھا اور موت میرے تعاقب میں ہوتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میں نے ہٹل جیب میں واپس رکھ لیا۔ میرے دل نے کوئی دے دی تھی کہ وہاں کوئی دشمن چھپا ہوا نہیں تھا اور دوست زندگی ہار چکے تھے۔ ملازمہ سامنے ہی قالین پر جت پڑی تھی۔ اس کے پیٹنے میں میں دل کے مقام پر ایک خنجر اس طرح پست تھا کہ صرف دست باہر دیا گیا تھا۔ اس کی پھنی پھنی بے نور آنکھیں پست کو تک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں گریا ایک ہی سوال نقش تھا کہ آخر اسے کس جرم کی سزا ملی تھی؟ وہ تو محض ایک خادمہ تھی۔ اس نے تو کسی کاروائی نہیں چاہا تھا۔ وہ تو کسی کے بھنگوں میں ملوث نہیں تھی۔ اسے تو کسی بھی بات کا پتا نہیں تھا۔

میں آگے بڑھا۔ لاؤنج میں صرف ایک کرسی الٹی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کسی بے ترتیب یا بگاڑے آرائی کے آثار نہیں تھے۔ لاؤنج سے بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی لومیری رنگوں میں کچھ اور سرد ہو گیا۔

بیڈ پر چار بری طرح حسن آلود تھی اور نیلہ اس پر آؤی زخمی پڑی تھی۔ اس کی گردن بیڈ کے کنارے سے نیچے لٹکی ہوئی تھی اور اس کے تن سے تقریباً جدا ہی تھی۔ صرف چند سوئی ہی نہیں تھیں جن کے سارے وہ ابھی بے جان جسم سے منسلک تھی اور لٹکی ہوئی تھیں ورنہ شاید قالین پر پڑی ہوتی۔

اس کا لومیں تھرا ہوا چھوٹے شاخت سا ہو گیا تھا اور اس کی کئی ہوئی گردن کا بیجا تک گماڑ مجھے تک رہا تھا۔ زخروں اور دیگر موٹی موٹی ہی ناٹوں کے سرے گویا ان گنت آنکھیں بن گئے تھے اور ہر اڑام نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ خون اتنا بڑا تھا کہ قالین پوری طرح جذب نہیں کر سکا تھا۔ اس پر چھوٹا سا مالک سرخ جوڑ بن گیا تھا۔ خون غنائی ہونے لگا تھا لیکن پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس فلیٹ میں قیامت گزرے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

تاجاں کیس نظر نہیں آ رہی تھی۔ جنوں نے بھی یہ سب کچھ کیا تھا شاید وہ تاجاں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں اس کی تلاش

الامال تو تم اسی کو سنبھالو۔ یہ بھی ایک اہم کام ہے۔ میں اب چلا ہوں۔

مجھے سبھی تو کسی خدمت کا موقع دیا کرو۔ وہ میرے پیچھے دوسرے کمرے میں آتے ہوئے ہوئی "تھوڑی دیر بیٹھو تو میں تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے ناشتا تیار کر کے لاؤں۔ دیکھی تھی کہ پرائے کھلاؤں گی۔ میں خود مارکیٹ سے دیکھی تھی تلاش کر کے لائی ہوں۔"

"نہیں۔ فی الامال نہیں کھانے ہیں مجھے دیکھی تھی کہ پرائے۔" میں نے کہا۔

بیڈ روم میں نیلہ دیوار سے ٹیک لگائے کاؤچ پر بیٹھی تھی اور خالی خالی نظروں سے دوسری دیوار کو گھور رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے اس کے کندھے پر جھکی دیتے ہوئے کہا "جیس اب گھبرا نے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھ لو تمہاری مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا۔"

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے منہ سے ناوانشی میں ایک اور ہی طرح کا عجیب لکھ رہا ہے۔ میرے احصاب پر فیروز سوار تھی۔ گھر آکر میں بی بی نان کو سو گیا۔ شام سے پہلے سو کر اٹھا تو میرے ایک سپورٹ فینچر نے مجھے فون کر کے دفتر بلا لیا۔ ایک ایسا کاروباری مسئلہ ان پشما تھا جو میرے جانے سے ہی بہتر طور پر حل ہو سکتا تھا۔ میں دفتر گیا تو پھنس ہی گیا۔ وہیں سے ایک باہلی کے ساتھ ڈزہ پر جانا پڑا۔

رات گئے گھر واپس ہوئی۔ صبح اٹھتے ہی آفس جانا پڑا۔ ایک جبک کے صدر سے میری ملاقات ملے تھی۔ آفس ہی سے اس ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس میں تقریباً پورا دن ہی نکل گیا۔ مصروفیت اس قدر زیادہ رہی کہ اس دوران مجھے صرف ایک مرتبہ نیلہ کا خیال آیا۔ تاجاں کے فلیٹ میں فون بھی نہیں تھا ورنہ شاید میں فون کر کے اس کی خبر و عاقبت دریافت کر لیتا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے یہ بھی سوچا کہ اپنے کسی آدمی کو فون کر کے ہدایت کروں کہ ایک چکر وہاں لگائے اور پوچھ لے کہ کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہے۔ لیکن پھر اس خیال پر بھی عمل درآمد ہونے کی نوبت نہ آئی۔ لا شعوری طور پر مجھے یہ اطمینان تھا کہ اب تاجاں بہت ہوشیار ہو چکی۔ تھی روز مرہ زندگی کے مسائل سے تو وہ خود ہی نمٹ سکتی تھی۔ ایک خادمہ بھی اس کے پاس موجود تھی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

دوسرے روز رات گئے ایک ڈزہ سے واپس پر گھر جاتے ہوئے مجھے نیلہ اور تاجاں کی یاد آئی۔ گھر جاتے جاتے یکدم ہی میں نے گاڑی کا ڈان ڈان کی طرف موڑ لی۔

کبھی کبھی تھوڑی سی تاخیر بھی زندگی کا ناقابل طاقی نقصان بن جاتی ہے۔ مجھے بھی تاجاں کے ہاں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی۔ رات کے سانسے میں جب میں وہاں پہنچا تو دروازہ مجھے غیر منتظر ہی ملا۔ بہرا

میں دوسرے بندہ دم میں پہنچا تو ہاتھ دم کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اندر لائٹ آن تھی۔ دروازہ پورا نہ کھل سکا لیکن جتنا کھل گیا وہی اندر کا افسوس ناک منظر دکھانے کے لیے کافی تھا۔ کاش میں نے اندر نہ جھانکا ہوتا لیکن اس کے بغیر جان بھی نہیں تھا۔

تاجاں کا حال بہت خراب تھا۔ جس کسی نے بھی اسے اس خال کو پہنچایا تھا اسے اگر کوئی انسانوں میں شمار کرتا تو میری نظر میں وہ بھی بہت بڑا دشمن انسانیت ہوتا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ اس گڑبگڑ کی طرح مڑی مڑی تھی جسے کسی ہڈیوں کے ہاتھوں نے توڑ چھوڑ ڈالا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے جسم میں بہت کم ہڈیاں سلامت رہ گئی تھیں۔

اس کے بازو ہرے تھرے ہو کر اس کے جسم کے تلے دبے ہوئے تھے اور ہاتھیں غیر فطری سے انداز میں پٹلیوں پر سے بھی یوں مڑی ہوئی تھیں جیسے ان میں ہڈی ہی نہ ہو۔ ظاہر ہے جب ہڈیوں کو پکڑنا چاہا تو ان کا ہونا نہ ہونا برا ہی ہو گیا تھا۔

اور ٹیکس کا ایک بڑا سادہ زنی گھداں پاس ہی پڑا ہوا تھا جس سے ایک بہت بڑے جھوٹے کالام لپٹے ہوئے تاجاں کی یہ حالت بتائی گئی تھی۔ اسے گوشت، خون اور شفت ہڈیوں کے ٹھونے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ گھداں بھی خون میں لتھڑا ہوا تھا اور فرش کا خاصا بڑا حصہ بھی خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ تاجاں کو باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر وہاں کر اگر بھاری گھداں سے اس طرح پکڑا گیا تھا چھوہ کوئی بے جان چیز ہو۔

اس قسم کے کام شدید اور گہری دلی نفرت کے بغیر ممکن نہیں ہوتے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ بعض لوگ ان انسانوں پر ایسا ظلم و تشدد دیکھ کر گزرتے تھے جنہوں نے ذاتی طور پر ان کا کچھ نہیں بگاڑا ہوتا تھا۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہوئی تھی۔ ایسا بے تحاشہ اور بے جواز تشدد کرنے والوں کے خلاف میرے دل میں نفرت ایک طوفان بن کر اٹھتی تھی اور میرے حواس پر چھا جاتی تھی۔

میں پک کر تاجاں کے پاس پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابھی اس میں زندگی کی رحمت باقی تھی۔ اس کے منہوں میں خفیف سی حرکت ہوئی جس سے اندازہ ہوا کہ اس کے جسم میں سانس کی موہومی آمدورفت جاری تھی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ صرف اس کے سر کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی لیکن ایسا یقیناً کسی جذبہ زحم کے تحت نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں بھی ذہرست اذیت پرستانہ مصلحت پوشیدہ تھی۔ سر پکڑنے سے یقیناً تاجاں فوری طور پر مر جاتی۔ جان بوجھ کر اس کا سر کھٹوا چھوڑا گیا تھا تاکہ وہ کچھ دیر زندہ رہے اور اپنے جسم کے پکڑے جانے اور ہڈیوں کو توڑے جانے کی اذیت زیادہ سے زیادہ محسوس کر سکے۔

میں نے اس کے سر کو آہستگی سے ہلایا۔ اس کی اذیت میں کسی

انسان کی گنجائش تو نہیں تھی پھر بھی مجھے اندیشہ تھا کہ سربلٹ سے اس کے تن درجہ درجہ میں دھڑکی کوئی نئی لہر نہ ابھر آئے۔ اس چوہے کی ہڈیاں پکڑنا تھا اور آجکھیں انہی سوتی ہوئی تھیں کہ انہیں کھولنا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا لیکن اس وقت میری حیرت کی آواز نہ رہی جب اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

برسی طرح سوتی ہوئی آنکھوں میں خفیف سی جھری پیدا ہوئی۔ اس نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا۔ اس عالم میں بھی اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔ بڑے جگرے والی عورت تھی۔ مسکرائے کی کوشش میں اس کے منہم اور کٹے ہوئے ہونٹ اذیت زدہ انداز میں کھینچا رہ گئے۔ میرے حلق میں جیسے کوئی گولا سا ٹک گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ اس کی آواز سرگوشی۔ بھی درجہ صغی "بڑا افضل! میری سانس... تمہارے انتظار میں آ ہوئی... تھی... میرا دل کہہ رہا تھا... تم ضرور آؤ گے۔"

"کون تھے وہ؟" میں نے اپنے سینے میں اچھے اچھے آتش فشاں اذیت کو دبا دے ہوئے پوچھا۔ "مجھے... نہیں معلوم۔" اس کی آواز ہوا کی سرسراہٹ۔ بھی دھجی تھی "وہ چار تھے۔ دھڑکے سے اندر آئے تھے۔ بڑے... انہوں نے... میرے سامنے ذبح کیا۔ وہ بھی... بہت لا... میں نے بھی... اپنی سی کوشش... کی... مگر... ہم بے بس ہو گئیں... ان میں سے... ایک نے... تمہارا بھی... پوچھا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا؟" میں نے بے آلی سے دریافت کیا۔ "کہہ رہا تھا... تمہیں یہاں... افضل چوہہ در... نے رکھا۔" "آ؟ یہ بلڈنگ؟" اس کی... ہے... میں نے کہا... نہیں... اس پر... زیادہ... شے ہوئے... میرا زیادہ برا شکر کیا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی یہاں تک پہنچا کیسے؟ جب نیلے کو یہاں چھوڑنے آیا تھا تو میں نے خاص طور پر خیال تھا کہ کوئی میرا حاقب تو نہیں کر رہا؟ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کسی نے میرا حاقب نہیں کیا تھا۔

قلیت میں کوئی جیتی جڑ تھی ہی نہیں۔ دوسری کوئی چیز بھی غا معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ پیش و پیچہ رہا نہیں تھے اور ذہنی کی نیت سے قلیت میں نہیں گھسے تھے۔ وہ جو کر کے گئے تھے یہاں ان کا مقصد تھا۔

ان میں سے ایک نے میرے بارے میں استفسار بھی کیا لیکن مجھے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کون لا تھے؟ وہ ریڈ ڈاٹ کے آدمی بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ریڈ ڈاٹ والوں کے لیے تاجاں اور نیلے قطعی غیر متعلق اور غیر اہم امور تھیں۔ وہ انہیں اس پُر اذیت طریقے سے مروانے کے لیے خواہ کا وہ در سول نہیں لے سکتے تھے۔

تاجاں کی آنکھیں جو ذرا سی کھلی تھیں، بالکل ہی بند



جگہ سے کامیاب ہو گیا۔

سب سے پہلے میں نے اسے خیمہ سے جگہ لے کر پری مغذرت کی۔ میری آواز سننے پر اس کے لیے سے غنودگی غائب ہو گئی تھی۔ وہ خیمہ سے بولا "اگلاں کو چھوڑ دینے سہرا یہ بتائیے کہاں پہنچنا ہے؟"

"تم نے کیسے سمجھ لیا کہ کہیں پہنچنا ہے؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔ میں اس نے دل میں اٹھتی تھیں کو اپنے لیے سے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سہرا! تم بہ رات کو اس وقت فون کے بجائے ٹرانسمیٹر پر مجھے مخاطب کرو۔" میں اس کا مطلب ہے کہ آپ آرام میں گر رہے اور آپ کو یہ بڑی ضرورت ہے۔ "وہ ٹرانسمیٹر لیے میں بولا۔

"ہاں۔" مجھے صرف تمہاری ہی نہیں "سہرا! سچ" ضیف "مغذرت اور سلیلا" کی بھی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"جگہ بہ رات بڑی مہم ہے سہرا؟ بہت زیادہ اسلحہ ساتھ لے کر آنا ہوگا؟" اس کے لیے میں یکدم بے پناہ مستعدی آگئی۔ میں نے اپنے ہاتھ آڑ باج آویں کو بیک وقت بھی طلب نہیں کیا تھا۔

"نہیں، نہیں۔" ایسی کوئی خاص مہم نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "میں جس طرح تم چھوٹے سوئے کاموں کے لیے نکلے ہو اسی طرح ان لوگوں کو ساتھ لے کر آ جاؤ۔" میں وقت کہہ سے تم لگتا چاہیے۔ "پھر میں نے اسے بتایا کہ انہیں کہاں پہنچنا تھا۔

میں منت بعد ہی دو گاڑیاں میری گاڑی کے آگے پیچھے آں رکھیں۔ میں نے انہیں اپنی گاڑی میں ہی بلا لیا۔ گاڑی میں ہی ہم نے پھرتی ہی کانفرنس منعقد کی۔ میں نے انہیں صورت حال سے پوری طرح آگاہ کیا۔ پھر اپنا پروگرام بتایا اور فردا فردا انہیں ڈسے دیا میں سو نہیں۔

مجھے صرف فونی کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا۔ باقی چاروں کو میں وہیں چھوڑے جا رہا تھا۔ میں نے ضیف سے کہا "میں اس کا کام میں تمہاری گھرائی میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تینوں لاشیں میراں سے غائب ہو جانی چاہئیں کہ نہ کہ مجھے اب جو کچھ کرنا ہے وہ ان لاشوں کی وجہ سے میرے لیے الجھن کا باعث بن سکتا ہے۔ میں انتہائی عزت و احترام سے ان تینوں کی تحفیں اور تحفین کرانا لیکن مجبوری آں پڑی ہے۔ اگر میں یہ خواہش پوری کرتا ہوں تو ان کے قاتلوں کو اس انجام تک نہیں پہنچا سکوں گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ جس میں کسی کی نظر میں نہیں آتا چاہیے، کوئی سراغ باقی نہیں رہتا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا سہرا" ضیف نے سہرا کر کہا۔ میں نے انہیں خدا حافظہ کہا اور فونی کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر میڈیم کے کوٹھی خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں میں نے فونی سے کہا۔ "مختار رضی اس وقت غائب ہے۔ اس نے کسی خفیہ مقام سے ان تینوں عورتوں کے قتل کے احکامات دیے ہوں گے۔ اس نے اب

راہ اور خیمہ کے ساتھ ساتھ اپنی کارروائیوں کا سرخ بیری ہا بھی موڑ لیا ہے۔ اس کے آوی کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہی اسے کی نگاہ ان الزام ضروری ہو گیا ہے۔" فونی کی نگاہ کا مطلب سمجھتا تھا۔ "بھئی تہ سہرا تہ، بولا "آپ کو یقین ہے میڈیم ہمیں اس کے بارے میں بتا سکتے کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"

"میرے علم میں اس وقت وہی ایک عورت ہے جس سے کا آتا ہے معلوم ہونے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا "اگر اس سے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا تو پھر کوئی دوسرا ذریعہ کریں گے۔ قرض بہت بھاری ہے، میں چاہتا ہوں کہ آج رات آجرا جائے۔ میڈیم تک ویسے بھی رات میں رسائی حاصل کرنا آسان ہوگا کیونکہ جہاں وہ پائی جاتی ہے وہاں راتیں جاگتی ہیں دن سو تے ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تم کچھ پکے نہیں اس سے کیا کرنا ہے؟"

"جی ہاں" فونی بولا "آپ جگہ کے کوٹنے پری کہیں اندر میں گاڑی روک کر اندر بیٹھے رہیے گا۔ میں اس سے ملاقات پر کون گا کہ ایک مشر صاحب پہلی بار نہایت رازداری سے سے لئے آئے ہیں اس لیے کسی کو ان کی آمد کی کانوں کان خبر ہونی چاہیے۔ وہ جگہ کے کوٹنے پر گاڑی میں ہی بیٹھے ہیں اور کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے وہ میرے ساتھ تک پہنچ آئے گی۔"

"ہاں۔ میں چاہتا ہوں گاڑی میں ہی اس سے منت لیا جا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ وہ عورت سخت سزا کی مستحق اس کی وجہ سے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگیوں برباد ہوئی ہو اور وہ مختار رضی آوی کی دست راست ہے۔ مختار کا سارا اثر اس آڈے کی وجہ سے ہی ہو گا تھے یہ عورت چلا رہی ہے۔ تا بڑی بڑی شخصیات وہاں حاضری دیتی ہیں۔"

"ہاں سہرا! یہی تو البتہ ہے۔" فونی گہری سانس لے کر کہ "ہمارے ہاں ایسے ہی آڈے بڑی بڑی شخصیتوں کی کنووری جاتے ہیں اور وہ وہیں بیٹھ کر ملک و قوم کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا کچھ ہارتے ہیں۔"

"آج رات تو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "سبح تو ہم صرف میڈیم سے منت لینے اور مختار رضی کو تلاش کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد کسی بھی دن اطمینان سے بیٹھ کر ہمیں مختار رضی منصوبہ بندی کے ساتھ آہم کام انجام دینا ہے۔ جس میں اس کو بھی خانے کو اجازت نہ آئندہ میراں یہ وعدہ ہونے نہ پائے۔ ویسے کم ہی خدا فی فوجا معلوم قوم تو نہیں لیکن گئے باتوں یہ کام بھی ہو جائے تو کوئی نہیں۔"

”ہو جائے گا سراسر خیال ہے۔ کوئی ایسا مشکل کام ثابت نہیں ہوگا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ کسی بھی معاملے میں اس جوان کا اطمینان مجھ تک کو قابل رشک محسوس ہوتا تھا۔ حالانکہ میری خود اپنے بارے میں بھی خوش فہمی سے قطع نظر میری رائے بھی کہ مجھے اپنی انصاف پر عمل کا پورا حاصل تھا۔

میں نے اس مسئلے میں ایک لمحے کے لیے مزید سوچنے کے بعد کہا ”کچھ لڑکیاں کو غشی خانے میں رہائش پزیر بھی ہیں۔ بہت سی ایسی بھی ہیں جنہیں مختلف ٹھکانوں سے بلوا کر ادھر ادھر پہلائی گیا جاتا ہے۔ جو وہاں رہائش پزیر ہیں، انہیں بے شک قہر پیشکش کر دیا کر اگر ان کا کوئی اور ٹھکانہ ہو اور وہ شرفناہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں تو انہیں ہر طرح کی مالی یا اخلاقی مدد فراہم کی جاسکتی ہے تاکہ انہیں یہ شکوت نہ رہے کہ حالات نے انہیں کبھی ملت ہی نہیں دی تھی اور انہیں معاشرے نے کبھی شرفناہ زندگی گزارنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جو اپنی مرضی سے اسی پیشے میں رہنا چاہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا لیکن انہیں ٹھکانے پر بہر حال تالا پڑانا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے سراسر چند دن بعد اس پر تالا پڑ جائے گا۔ تالا بھی ایسا نئے سال دو سال تو کوئی نہیں کھول سکے گا۔ کوئی نیا لاک بھی اگر کھولے گا وہ بھی شرفناہ زندگی گزارنے کے لیے۔“ کوئی دنوں سے بولا۔

اس دوران ہم اس گلی میں پہنچ چکے تھے جس میں ستارہ رہتی تھی۔ اس کے کمر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے گلی کے دوسرے سرے پر ایک کوٹھی کی اونچی سی دیوار کے قریب قلیب اندھیرے میں گاڑی ہوئی۔ دوسری طرف ایک کوٹھی کے ٹوٹے پر بولی پار کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے دو گیت تھے۔ ایک گیت تو غالباً منتقل ہی تھا۔ دوسرے پر ایک مسلح چور کا بڑے مستند انداز میں گھڑا ہوا تھا۔ وہ چور فٹ سے لگتے ہوئے قہر کا تھا۔ اس کی موٹی موٹی اور پورے کوٹھی ہوئی موٹھیں کم از کم بالشت بھری تو ضرور دی ہوں گی جو بدھم روشنی میں بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ کچھ کچھ رنگ بھی دی تھیں۔

سو چھپیں عام طور پر مرداچی اور غیرت مندی کی علامت بھی جاتی ہیں لیکن اتنی بڑی موٹھوں کے ساتھ وہ ایک کوٹھی خانے کی چوکیدار کی کر تو آئی تھی نہ جانے کیوں بڑا عجیب دکھائی دیا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس دھندے کی چوکیدار ہے یا مامور تھا؟ کوٹھی کے سامنے کوئی گاڑی کھڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر کچھ لوگ داویدیش دینے کے لیے اس وقت کوٹھی میں موجود تھے تو ان کی گاڑیاں شاید جھیل گلی میں کھڑی تھیں۔ کوٹھی بہت شاندار اور طویل و عریض تھی۔ کسی قلعے سے کم نہیں تھی اور یوں سکوت میں لڑائی ہو گئی تھی اس میں کوئی ذی مدعا موجود ہی نہ ہو۔ کوئی گاڑی سے آکر کوٹھی کے مین گیت کی طرف چلا گیا اور

چوکیدار سے بات کرنے لگا۔ چوکیدار نے وہیں کھڑے کھڑے گیت کے ستون میں نصب انٹر کام ۲۲ جن دیا اور اس کی جالی پر جھک کر بات کرنے لگا۔ میں انٹر کام پر ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ بیرون قافلہ خاصا تھا اور میں نے گاڑی کے پیشے بھی پیچھے نہیں کیے تھے۔

چند لمحے بعد گیت نمودار سا نکلا اور کوئی اندر چلا گیا۔ گیت بند ہو گیا۔ ایک بار پھر دی گرا سکوت چھا گیا۔ چوکیدار ایک بار پھر بتا کھڑا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑی ہوئی میری کار کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ بڑا منع دار معلوم ہوتا تھا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے دیکھنے کی وجہ سے میں کسی قسم کا اضطراب محسوس کروں۔ کوٹھی نے کوئی کوئی کو ٹھک لیا تھا۔ کسی منٹ گزر گئے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس دوران اپنا ریڈی میڈ سائیکل اپ کر لیا جائے۔ گھر و کپار شہنشاہ سے میں نے ایک فیلٹ بیٹ ”قدرے“ تارکیشیوں کا چشمہ اور موٹھیں نکالیں اور اندھیرے میں کھڑی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے ان چیزوں کو ان کی جگہوں پر بنالیا۔

موٹھیں اشتعال میں آسان تھیں، جلد ہی بیٹ ہو جاتی تھیں اور مصنوعی ہونے کے باوجود اصلی معلوم ہوتی تھیں لیکن یہ ذرا پختہ العمر آدمی کی موٹھیں تھیں۔ ان میں چند سفید بال بھی موجود تھے۔ لیکن یہ اتنی ہی سفید بھی تھیں۔ انہیں لگا کر اگر عمر زیادہ معلوم ہوتی تھی تو اتنی زیادہ شخصیت کا تاثر بھی بدل جاتا تھا۔ ان کے ساتھ فیلٹ بیٹ اور ذرا کھاسا بھی شامل ہونے کے بعد تو کوئی مجھے پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ ان چیزوں کے ساتھ مجھے دیکھنے کے بعد اگر کوئی ان کے بغیر دیکھتا تو قسم کھا سکتا تھا کہ پہلے اس نے مجھے دیکھا وہ کوئی اور شخص تھا۔

آخر کار گیت نکلا اور کوئی باہر آیا لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے باہمی ہوئی کہ اس کے ساتھ میڈم نہیں کوئی مرد تھا۔ جب وہ قریب آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ توڑی سی کوشش کر تا تو وہ بھی غریب دعوے کی میڈم تو بن ہی سکتا تھا۔ وہ خوب لرا لرا کر چل رہا تھا اور ہاتھوں کو ہر قدم پر نراکت سے مل دے رہا تھا۔ لیکن شیو تھا، منہ میں گھوری دلی ہوئی تھی۔ سر پر دلی ٹوٹی اور چہروں میں سلیم شاہی جوتی تھی۔ ایک کھائی پر ویسے ہی زری کے کام والا کپڑے کا تھیل لٹا ہوا لٹکا ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت آدمی تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ چلتے وقت وہ اپنی پٹی کمر میں شاخ گلی کی سی چلک پیٹے کر کے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ ٹوٹی اپنے چہرے پر کسی سنجیدگی و محتاط طاری کیے اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ویسے بھی بیشتر وقت نہایت سنجیدہ ہی رہتا تھا۔

وہ نازک اندام نوجوان قریب آئے پر بھی اندھیرے نہ دیکھ سے مجھے نہیں دیکھ سکا۔ آنکھوں پر ہاتھ کا چھایا سا پاکر آنکھیں نیچے



کر شیشے پر بٹک گیا۔ میں نے بن دبا کر کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔ اس نے کھڑکی خراب نہ ہو جانے کا پھر سیدھا ہوتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ایک اداسے خاص سے لہراتے ہوئے، "آئیے وزیر صاحب! اٹھ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ میڈم جی نے آپ کے لیے پیغام بھیجا ہے کہ ہمارے ہاں تو بعض بڑے فقیر کھانا کھانے کے چشم و چراغ بھی آتے ہوئے آتا نہیں شرعاً، اتنی احتیاط نہیں کرتے جتنی آپ کر رہے ہیں۔ میڈم جی نے فرمایا ہے، آپ بلا خوف و خطر اندر تشریف لے آئیے۔ ہمارے سینے میں بڑے بڑے لوگوں کے راز دفن رہتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کے کیا ہمارے سینے میں تو اس ملک کے بڑے بڑے راز دفن ہیں۔"

شاید وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔ زیادہ مبالغہ نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز بھی اسی قسم کی تھی جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اسے نوازنا شمار کیا جائے یا عرواۃ؟ ٹوٹی اس کے عقب میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ غالباً میری آنکھوں میں سوال پڑھ کر آگے آتے ہوئے بولا "میری ابھی میڈم سے ملاقات نہیں ہو سکی" اسی سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہی پیغام لے کر میڈم کے پاس گیا تھا" یہی جواب لے کر آیا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تو پھر اندر جانا ہی پڑے گا!" میں نے گہری سانس لے کر گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ میں چاہ تو تھی رہا تھا کہ اندر جائے بغیر کام چل جائے۔

دو پلٹی ٹوٹی دھلا کر فرش بھلاتے ہوئے بولا "خادم کو خبر کتنے ہیں۔"

غیبت تھا کہ اس نے اپنے آپ کو نذران نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو نذران کہتے ہوئے بھی اچھا نہ لگتا اور نذران نام بھی اس پر بچ نہیں رہا تھا۔ اس کا تو کچھ اور ہی درمیانہ سامان ہوتا چاہیے تھا۔

وہ منوجات انداز میں کوشی کی طرف چلے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "ایک مدت سے میں آپ جیسے بڑے لوگوں کی خدمت پر مامور ہوں۔ کبھی کسی کو کچھ سے شکایت نہیں ہوئی تھی کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ ہر ایک نے خوش ہو کر نوازا ہے اور بہت نوازا ہے۔"

"کیا امید رکھی جائے کہ ان نوازشات کے نتیجے میں تم بڑھاپے تک ایسی ہی کوشی خریدے اور ایسا ہی کوشی خانہ چلانے کے قابل ہو جاؤ گے؟" میں نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا کہ کہیں میں مذاق تو نہیں کر رہا؟ لیکن میں بالکل سنجیدہ تھا۔ وہ قدرے انکساری سے بولا "اتنا بڑا اور اتنا معیاری کوشی خانہ چلانے کا تو میں نہیں سوچ سکتا لیکن ہر حال۔۔۔ کچھ نہ کچھ کری لوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میڈم کے بعد یہ کوشی خانہ مجھے ہی چلانا پڑے۔"

میں نے چلے چلے رک کر کہا "نذران! تمہیں کیا کہیں کہ کراہید ہے کہ تم میڈم کے بعد بھی زندہ رہو گے؟"

"میری ایسی کوئی خواہش تو نہیں ہے سرکار!" وہ ہاتھ جڑوا ہوا "اللہ! انہیں بھی زندگی دے۔ میری عمر بھی انہیں لگ جائے۔ ان جیسی عظیم عمر میں صدیوں میں پیدا ہوئی ہیں لیکن عمر کا فرق ہر حال دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ ساتھ سے اوپر کی ہیں اور میں ابھی چھ سال کا ہوں۔ اس بات کو بھی چھوڑ دینے ان کے خواب بہت اونچے ہیں۔ وہ تو اب فرانس اور اٹلی جیسے ملکوں میں اس قسم کے امور چلانے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ کیا پتا کس وقت رخصت ہو جائیں اور آپ جیسے قدر دانوں کی خدمت کے سارے انتظامات پھر اس خاکسار کو ہی سنبھالنے پڑیں۔"

"فرانس اور اٹلی جیسے ملکوں میں میڈم کی یہ شان و شوکت اور یہ قدر کہاں ہوگی جو یہاں ہے؟" میں نے لفظی سانس لے کر کہا "میں! وہ ملک ہیں" وہاں تو کئی کئی ان جیسی "نوازش" کبھی ہوا ہیں۔"

"ان باتوں کو وہی بہتر سمجھتی ہوں گی سرکار! دنیا گھومی ہوئی۔ انہوں نے" وہ خواہ مخواہ ہی جسم کو لمبا سا دے کر بولا "میں سیدھا سادہ کسی آدمی ہوں۔ تشریف لے جائے۔"

گیت غیر مقصد ہی تھا۔ وہ آگے پڑھ کر اسے وا کرتے ہوئے بولا "آئیے آئیے" بلا تکلف چلے آئیے۔ یہ دروازہ مقدور والوں کے لیے ہی کھلتا ہے۔ ہر قسم کی سازشیں اس دروازے سے باہر ہی جاتی ہیں۔ اندر قدم رکھنے کے بعد آپ دنیا کے تمام مسائل۔۔۔ بے پروا ہو جائیے کہیں کوئی آپ کی تجویز نہیں کر سکے گا۔ کو جا کر نہیں دالوں کو پٹ نہیں دے گا۔ یہ ایک الگ ہی دنیا ہے۔"

"بے شک۔۔۔ بے شک۔" میں نے اس کی تائید میں سر ہلا اور گیت سے اندر قدم رکھتے وقت ذرا مرکز گاڑی کی چابیاں ٹوٹی طرف برساتے ہوئے کہا "میں شاید گاڑی لا کر آج بھول گیا ہوں اور کھڑکی کا شیشہ وغیرہ بھی نہیں چڑھایا۔" ساتھ ہی میں۔۔۔ چونکہ ارکی طرف خفیہ سا اشارہ کیا۔ اس کی پشت اس وقت میرا طرف تھی۔

"آئیے آئیے" آپ اندر تشریف لے چلے آپ کا سیکرٹری گاڑی لا کر آگے آجائے گا۔" نذرانے آگے چلے کا اشارہ کر کے ہوئے کہا۔ ٹوٹی نے اس سے اپنا تعارف غالباً میرے سیکرٹری حیثیت سے کر لیا تھا۔ میں نذران کی رہنمائی میں آگے چل رہا۔

ڈرائیو دے خوب طویل و غریب تھا۔ اس میں بائیں میں قبہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لان زیادہ بڑا نہیں تھا تاہم اس پر شکوہ کو میں کروں کی تعداد بہت زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ کوشی خانے بڑے لان کی نہیں زیادہ کڑوں ہی کی ضرورت تھی۔ دونوں حیلوں پر بیشتر کڑوں کی کڑیوں میں تاریکی نظر آ رہی تھی۔ اندر شاید۔۔۔ روشنی تھی لیکن کڑیوں پر شیشوں کے عقب میں گہرے رنگوں۔۔۔ ہماری ہماری پورے پچھلے ہوئے تھے۔

میں نظریں مسلح مٹھنوں کی تلاش میں بٹک رہی تھیں پل

بارب چوکیدار سے محروم ہو چکا تھا۔

اسی لمحے اندرونی دروازہ کھلا اور خوش شکل، ٹاڑک اندام لڑکی ایک خوب صورت لڑائی دھکیلتی ہوئی اندر آئی۔ یہ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہاں ہماری آمد متوقع رہی ہو۔ لڑکی دھیمی سیلیک سوت میں تھی اور اسے سینے کے سلسلے میں گویا بے پروائی کے ریکارڈ توڑنے پر تھی ہوئی تھی۔ اس کے خوب صورت سیاہ رنگی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور ان سے چھٹی چھٹی منہک پھوٹ رہی تھی۔

لڑکی بے چارے کے تمام لوازمات سجے ہوئے تھے، صرف بوتل نہیں تھی۔ لڑکی ہمارے سامنے روک کر وہ جھکے جھکے سے لیکن دل آویز انداز میں مسکراتی اور دھیمی آواز میں پہلی "آپ

کون سی چٹاپند کریں گے؟"

اس نے یہ پوچھنے کا کھلف نہیں کیا تھا کہ ہم کیا چٹاپند کریں گے۔ بلا تعیدی یا پوچھ لیا تھا کہ "کون سی" چٹاپند کریں گے؟ گلتا تھا، یہاں تمام مراحل شارت کٹ میں طے ہوتے تھے۔

میں نے چہرے پر کچھ بے وقوفانہ اور کچھ عاجزانہ سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہم دوسرائی سے آدمی ہیں۔ ہم فی الحال صرف ٹھنڈا پانی چٹاپند کریں گے۔"

اس نے جھکی سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ خوب صورت تھی، گوری تھی مگر رنگت میں ایک عجیب سا پیکا پن تھا۔ وہ جو زندگی کی حرارت، ملاحت اور دلکاشی ہوتی ہے اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔

جیسی جیسی نظروں سے اس نے ہماری طرف دیکھا تھا ویسے ہی جیسے مجھے میں پہلی "بڑے زمینداروں میں آج کل یہ کہنے کا فیشن عام ہے کہ کئی ہم تو دوسرائی سے آدمی ہیں۔ آپ بھی اذیر ہیں۔ زیادہ

اسکان یہی ہے کہ بڑے زمیندار ہوں گے۔ لیکن آپ... جبکہ آپ یہاں آئی ہیں تو اتنے سیدھے اور صمیم بننے کی کیا ضرورت ہے۔ کھل جائیے خود بھی سکھ میں رہتے اور ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجئے۔"

نذیر اس کے رخسار پر پیار بھری جگہ سی چپت رسید کرتے ہوئے ہم سے مخاطب ہوا "یہ ٹینڈ ہے۔ یہاں نی ہے اور جیسی باتیں کرنا اس کی عادت ہے۔ شاید اس لیے کہ کائنات کی ہر مٹی ہوئی ہے۔ آپ اسٹنڈ نہ کیجئے گا۔ ویسے دل کی بڑی اچھی ہے۔ تنہائی کی بڑی اچھی سامچی ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے مہمانوں میں بڑی

پاپو کر ہے۔"

پھر وہ گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولا "ویسے ٹینڈ کہہ ٹھیک سی رہی ہے۔ جب آپ دل کے اسکان نکالنے کے ارادے سے گھر سے نکل ہی کھڑے ہوئے ہیں تو پھر بیٹے پلانے میں کیا شرمانا؟ اس کے بغیر تو یہ معاملات ایسے ہی ہیں جیسے انسان کھانا تو کھائے مگر پانی

نہ ہے؟"

مجھے کہیں کوئی نظر نہ آیا۔ صرف جھلی راہداری میں غالباً سرورٹ کوارڈز کی طرف جانے والے راستے پر مجھے ایک ہیرو سا نظر آیا جین وہ بھی فوراً ہی ایک عمرانی دروازے کے عقب میں غائب ہو گیا۔ فطائیں ایک خوشگوار منہک چھلی ہوئی تھی جو کئی خوشبوؤں کا آمیزہ معلوم ہوتی تھی۔

ڈرائنگ روم کا ہماری بھر کم منتقل چربی دروازہ ایک خوب صورت آرائشی دیوار کی آڑ میں تھا۔ نذیر نے مستعدی سے آگے

بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے باہر ایک دم چپک چپک بھی آواز دی۔ کبھی کبھی کتا بائی اور فیرواس طرح چپک بارتے ہیں لیکن مجھے معلوم تھا یہ کتنے لمبی دغیرہ کی چپک نہیں تھی۔

باہر یقیناً چوکیدار کا کام تمام ہو چکا تھا۔ فونی کو جب نہایت غامضی سے کسی کو ٹھکانے لگانا ہوا تھا تو وہ سیاہ رنگ کی ایک خوب

صورت اور اختتامی مضبوط ریشمی ڈوری استعمال کرتا تھا جس کے ایک سرے پر جست کی ایک کولی بندھی ہوئی تھی۔ کسی کے عقب سے گزرتے وقت وہ اچانک ہی اس ڈوری کا ایک سرا پکڑ کر ایک

خاص انداز میں گھماتا تھا۔ جست کی کولی کی وجہ سے ڈوری یکدم گھوم کر شکاری کی گردن کے گرد حلقہ بنا لیتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے فونی اس کی گردن میں موت کا چھند اکس دیتا تھا۔

بڑے سے بڑا طاقتور آدمی ہاتھ پاؤں مارا تھ جاتا تھا اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت تک اسے اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا؟ راہ ملے بھی اگر فونی یہ ٹیکنیک استعمال کرتا تو چار

قدم آگے جاتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو بھی قلم نہیں ہو سکتا تھا کہ پیچھے کیا ہوا۔ یہ نہایت پرسکون اور راز دارانہ طریقہ تھا۔

مجھے امید تھی کہ میرے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھنے تک فونی اس لمبی چوڑی لاش کو کہیں اندر جڑے میں کسی ہانڈہ دیوہ کے عقب میں

پچھا چکا ہو گا۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ آتے وقت وہ اوپر اوپر اندر جڑے کوئے کھدروں اور ڈرائنگ روم کے آس پاس کا جائزہ لیتا آئے گا اور اگر مزید کوئی حفاظت ہم کی چیز اس کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

ڈرائنگ روم بہت شاندار اور متاثر کن تھا۔ اس کی آرائش جیتنا کسی اچھے انتیہ پرزور ڈیکورر کی رہیں منت تھی۔ میں ایک نہایت آرام دہ صوفے میں دھنسن گیا۔ نذیر دست بستہ میرے سامنے کھڑا

تھا اور قیام جانے والے انداز میں مسکراتے جا رہا تھا۔

چند لمحے بعد فونی بھی آج پچھا اور میرا اشارہ پا کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اس نے آنکھوں سی آنکھوں میں مجھے بتا دیا کہ وہ اپنا کام کر آیا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے ایک ہاتھ پر تازہ خراشیں تھیں لیکن نذیر کے دیکھنے سے پہلے اس نے وہ ہاتھ اٹا کر کے اپنے چلو میں نکالیا۔ نذیر کو شاید کمان تک نہیں تھا کہ کٹھی کا مین ٹیٹ ان کے لیے ترنگے

ہوئے بولا "ہمیں میڈم تشریف لایا ہی چاہتی ہیں۔"

میڈم ہمیں انتظار کرا کے غالباً اپنی اہمیت واضح کرنا چاہتی تھی۔ اس کی شان بے نیازی کا ہر حال مجھے دل ہی دل میں اعزاز کرنا پڑا۔ نہ جانے کتنے لوگ تھے جو کسی وزیر کا نام سن کر دوڑ پڑے تھے اور نہ جانے کتنے لوگوں کو ان سے شرف ملا تھا۔ حاصل کرنے کے لیے کتنا کتنا عرصہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ لیکن ایک بھی عورت تھی جو وزیر کو انتظار کرا رہی تھی۔ وزیر جلی ہی لیکن اسے تو ابھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔

فونی اپنی بی بی کی دست کرتے ہوئے وہاں نظروں سے گزرنے کی طرف دیکھ کر اپنے پاس صوفے پر ہاتھ مار کر بولا "آپ ذرا یہاں میرے پاس بیٹھیں نا۔ مجھے آپ سے ایک راز کی بات پوچھنی ہے۔"

"کی بی بی یہ جرات کہاں کر آپ جیسے لوگوں کے برابر بیٹھوں۔ میڈم تو میری کمال اتوا کر جس مجھ کو ادب کی۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "دوسرے بھی اس چار دیواری میں آپ سے شکایت آواز بلند بات کریں تو راز ہی رہے گی۔"

"نہیں یا رات یہاں بیٹھو تو کسی۔" فونی اور عواصر دیکھتے ہوئے رازدارانہ سے انداز میں بولا "بات بہت خاص ہے اور میڈم کے آنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد تم چاہے اسی طرح رات بھر ہاتھ پاؤں سے کھڑے رہنا۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے فونی کے قریب بیٹھ گیا۔ فونی نے اس کے کندھے کے گرد بازو بچھلاتے ہوئے اسے اپنے کچھ اور قریب کر لیا۔ وہ شریٹے سے انداز میں ہنستے ہوئے بولا "مرا یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ لگتا ہے آپ ہمارے مطلب کے آوی ہیں۔"

وہ بد نصیب فونی کے بارے میں حد سے زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے لگا تھا۔ وہ نہیں دیکھ سکا کہ فونی کا دایاں ہاتھ جیکٹ کی جیب سے باہر آچکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے سیاہ ڈوری کو لہراتے دیکھ لی لیکن اس کے بارے میں اسے کوئی سوال کرنے کی صلت نہیں ملی۔ اس کا منہ جو کچھ کہنے کے لیے کھلا تھا کچھ اور کھل گیا۔ دوبارہ بند نہیں ہو سکا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے اعلیٰ ہیں، ناخن ہوا میں لڑا نہیں۔ فونی کے ہاتھ اس کی گردن کی پشت پر تھے۔ نذر نے پیچھے ہاتھ لے جا کر اپنے آپ کو اس شیشے سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش میں تو قیضہ گہٹ پر کھڑا رہنے والا لہا تر تھا۔ طاقتور چوکیدار بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ نذر بے چارہ کس شمار تھا؟ میں تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے پیچھے سے پہلے ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہاتھوں میں گر گئے۔

اس کے طعن سے صرف ایسی آواز فنی تھی جیسے کسی نے ہولے سے کھٹک کر گلا صاف کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر نرسوں کا بال بھر

"میں یہاں رہا نہیں ذرا سانس لینے کی صلت تو دو۔ ہم سرطہ دار چلنے کے عادی ہیں۔" میں نے ملاکت سے کہا "اب آتے ہی جتنی ضرورت کریں یہ تو عجیب سا لگتا ہے۔ پہلے پانی پی لیں، میڈم سے ملاکت ہو جائے، پھر آگے چلیں گے۔ ہمیں یہاں روکنا نہیں ہے۔ یہاں سے کچھ لے کر جانا ہے۔"

"وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے آپ چاہیں گے ویسے ہی ہر کام ہو جائے گا۔ ہم تو چاہ رہے تھے کہ میڈم کے آنے تک آپ کا ذرا سوا بن جائے لیکن نذر۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں ویسے کریں۔" نذر نے کہا پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا "ٹھیکہ جانی لائیں فی الحال پانی پی لادو۔ پینے کے لیے ہی مانگ رہے ہیں۔ اپنی امیدوں پر ڈالنے کے لیے تو نہیں۔"

ٹھیکہ کو "جانی" کہتے وقت اس نے جسم کو غیر ارادی طور پر ایک بار پھر لمبا دیا تھا۔ ٹھیکہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے عدم سی سکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ وہ ہلکی سی اور چند لمحے بعد پانی کی ایک بوتل لے کر واپس آئی۔ بوتل پر پھٹی ہوئی دھندلاہٹ بتا رہی تھی کہ وہ خوب ٹھنڈی تھی۔ بوتل ڈالی پر رک کر وہ چلی گئی۔ میں اور فونی ٹھنڈے پانی کو ہی شراب کی طرح چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر پیتے تھے۔ نذر بہ ستور دست بستہ کھڑا تھا۔ نہ جانے کیوں اسی بد بخت نے ہمارے سر پر سوار رہنا اپنا فریضہ سمجھ لیا تھا۔

"میڈم کب آئیں گی؟" میں نے اس سے پوچھا۔  
"ہمیں وہ تشریف لائے ہی والی ہیں۔ میں ایک بار پھر پوچھ کر آتا ہوں۔" وہ فرماتا ہوا ان سیڑھیوں کی طرف چلنا جو ڈرائنگ روم سے سی اور جاری تھیں۔ خلاف توقع وہ نہایت جگے پچھلے سے انداز میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا چلا گیا۔

فونی سرگوشی میں بولا "اس شخص کا بڑا صاف کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔ لگتا ہے کہ میڈم کے ساتھ یہ بھی نہیں موجود رہے گا ورنہ کمرے میں آنا جانا تو رہے گا ہی۔ اس کی وجہ سے کام خراب ہو جائے گا۔"

"ہاں۔ یہ تو درست ہے۔" میں نے ایک بار پھر ایک بی بی سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "سوچ تو میں بھی رہا تھا لیکن میرا اس بے ضرر سے انسان کی پھٹی کراٹے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔"

"آپ اپنے جذبہ زحم کو کچھ دیر کے لیے سلا دیں کیونکہ آج لاشیں گرانے کی رات ہے۔" فونی نے سرگوشی میں کہا۔ اس سرگوشی میں بھی ہلا کی سفاکی تھی۔ میں نیم رضاعتی کے سے عالم میں کھدے اچکا کر رہ گیا۔

اس دوران نذر اسی بھرتی سے سیڑھیاں اتر کر ایک بار پھر ہمارے قریب آ گیا جس بھرتی سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ گیا تھا۔ وہ گھوڑی کی باقیات کو ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے میں پھٹل کرتے

ساجو ڈا ہیا رکھا تھا۔ اس کی سرخ و سپید رنگت پر بالوں کا یہ لٹا کر  
چ رہا تھا۔ اس کا میک اپ بھی نہایت سلیف کا تھا لیکن اس کی  
طرف متوجہ کرنے والی اولین چیز وہ بالشت بھر کا موٹا سا سکار تھا جو  
اس کے ہونٹوں میں دبایا ہوا تھا۔

برسوں سے میری نشست و برخاست بہت اونچی سوئی میں  
تھی لیکن اس سے پہلے میں نے زندگی میں صرف ایک ہی عورت کو  
سکار بیٹے دیکھا تھا اور وہ بھی خالص پاکستانی نہیں تھی۔ دولتی نسل  
کی تھی۔

میزبوں سے اترتے اترتے اس نے دو طویل کش لیے اور  
اس دوران ہی گویا ہمارا جائزہ مکمل کر لیا۔ مجھے اس نے نہایت  
گہری نظر سے دیکھا تھا۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ رات کے اس  
پیر میرا فلیٹ ہیٹ اور تاریک چشمہ دیکھنے والے کی نظر میں کلک  
رہا ہو گا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میرا وزیر والا فرازا دیر نہیں  
چل سکتا تھا۔

اس عورت کو دیکھتے ہی مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگا تھا جیسے ملک  
کے تمام جوان و ذریوں شیروں امیر زادوں اور انہم شخصیتوں کے  
نام اور شکلیں اس کے ذہن کے کپیئر میں محفوظ ہوں گی۔ مجھے  
یقین تھا کہ وہ مجھ سے یہ ضرور پوچھے گی میں کس جگہ کا وزیر ہوں۔  
اس کے ساتھ ہی میرا بھانجا پھونکنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ میں  
ممکن تھا کہ میں جس جگہ کا نام لیتا اس کے وزیر سے میڈم واقف  
ہوئی یا کم از کم اس کی صورت سے آشنا ہوئی۔

### طنز و مزاح

|       |             |                    |
|-------|-------------|--------------------|
| 100/- | اعتبار ساجد | انگور کھٹے ہیں     |
| 80/-  | اعتبار ساجد | غالب کی آبرو       |
| 80/-  | اعتبار ساجد | ایمر جنسی دارڈ     |
| 75/-  | اعتبار ساجد | مٹہ شگافیاں        |
| 75/-  | اعتبار ساجد | جائیل اسے مار      |
| 80/-  | اعتبار ساجد | اس طرح تو ہوتا ہے  |
| 100/- | اعتبار ساجد | غالب ہمیں بھی چھیڑ |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

آٹا اور رگت نکلا رہی تھی۔

جس طرف کے صوفے پر ہم بیٹھے تھے وہ دو پار کے قریب تھا  
اور ہمارے عقب میں ہماری پردے تھے۔ لڑکی کو جب یقین ہو گیا کہ  
نذر مچا ہے تو اس نے ڈوری اس کی گردن سے ہٹائی اور اپنا وہ  
محبوبی مگر نہایت خطرناک اور خاصہ شہتیا رجب میں رکھ لیا۔  
زیر کی لاش اس کے کندھے سے اتن گئی۔ اس نے اسے اٹھا کر  
کسی بیکار چیز کی طرح صوفے کے پیچھے لے جا کر پردے کے عقب  
پن ڈال دیا اور ہاتھ جھاڑ کر واپس آتے ہوئے بولا "اب ہم  
طمینان سے میڈم سے بات کر سکیں گے۔"

میری نظر سامنے والے دروازے پر تھی مگر وہ مکمل طور پر بند  
نہا اور اس میں کہیں کوئی شیشا یا جھری وغیرہ نہیں تھی۔ لڑکی نے  
مجھ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی اپنی کارروائی کی تھی۔  
لڑکی کے پیچھے کے چند لمبے بعد ہی اوپر سے آہٹ سنائی دی۔ پھر  
پیرا صوں پر ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس سے تعارف کی ضرورت  
نہیں تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہی میڈم  
تھی۔ وہ نہایت ڈرامائی سے انداز میں بریز مری پر ڈاراک رک کر  
زیر تھی۔ میزبوں پر قائلین ہونے کی وجہ سے اس کے اونچی  
بڑی کے سینکڑوں کی بہت سی جگہ یی آواز سنائی دے رہی تھی۔  
صرف ہیں دو موہبتی کی کمی تھی ورنہ اس کی شخصیت اور اس کی  
آواز کا انداز بالکل قطعی محسوس ہوتا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عورت نہایت نہیں تھی۔ نذر  
نے لگا تھا کہ وہ سامنے سے اوپر کی تھی لیکن وہ چالیس سے زیادہ کی  
دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تاہم موٹاپے نے اس پر خاصا غلبہ پایا  
تھا۔ وہ ایک ہماری بھرم عورت تھی لیکن عقل مکمل نہیں کر دی  
تھی۔ اس کا دودھ دار بند اس کے قابو سے باہر نہیں ہوا تھا۔

فرائض میرا کئی بار جانا ہوا تھا لیکن کبھی اس قسم کے کسی آڑے  
کا سر نہیں کیا تھا تاہم میرا اندازہ تھا کہ کسی قسم کی کمپلی کو پے میں اگر  
اس معیار کے اور اسے لیے چڑھے "میرا اصل ہاؤس" پائے جاتے  
ہوں گے اور انہیں کوئی "مارا موڈ نیل" ہی چلائی ہوگی تو وہ اسی قسم  
کی شخصیت کی مالک ہوتی ہوگی۔ ویسے جدید فرائض میں یہ روایت  
نہیں ہوتی بارہی تھی۔ سنے زمانے میں ایک تو ہر چیز بہت آگے چلی  
گئی تھی۔ دوسرے ان نکول میں تشکیں کے سامان کچھ اس طرح  
قوم قدم پر بکھرے ہوئے تھے کہ کسی کو اتنا تردد کرنے اور اتنی  
دلچسپی خفیہ کرنے کی ضرورت ہی کہ وہ کئی تھی۔ اور ظاہر ہے جب  
طلب کم ہو جاتی ہے تو دوسرے خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسے  
بیسے بیسے اور معظم آڑے خود بخود کم ہوتے جا رہے تھے۔ جو چل  
سبے تھے وہ بھی زیادہ تر سیاہوں اور ترستے بھرتے غیر ملکیوں کے  
کراہی میں رہے تھے۔

میڈم نگاہیں رنگ کے، جھل جھل کرتے ایک لیے سے  
بیکس نما لباس میں تھی۔ بال ڈالنے کیے ہوئے تھے اور ان کا اونچا

تو میں جہان ہوں" کی عملی تفسیر بننے کی کوشش کرتی تھیں۔ اور لحاظ سے وہ ایک کیاب عورت تھی۔  
وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ برا عمدہ کھن لگائے ہوئے تھی۔ وہ بے شک ایک غلیظ پیشے سے وابستہ تھی مگر بظاہر اس فزکی مائل بیکر غناست اور خوشبوؤں میں لپٹا ہوا تھا۔ بدبو وار پٹ بھی جب بلندی پر چلے جاتے ہیں تو خوشبودار معلوم ہوتے ہیں۔

اس نے ہمارے سامنے موجود نرالی کا جائزہ لیا اور قدور چوکتے ہوئے بولی "رے... اس پر پٹے پٹانے کی چیز تو سوجر نہیں۔ یہ شینہ کو کیا ہوا ہے۔" وہ دروازے کی طرف مت کر کے فر کو آواز دینے ہی لگی تھی کہ میں نے جلدی سے اس کے بازو پر رکھتے ہوئے کہا "پلیز! شینہ کو مت ہلاتے ہم نے ہی اسے لاسے سے متع کیا تھا۔ ذرا گھبر کر تپ کی سمجھا داری سے لا اندوز ہوں گے ایسی جلدی بھی کیا ہے۔"

"درست ہے۔" اس نے حنا سے سر ہلایا "یہی جلد بھی کیا ہے۔" پھر وہ اصرار دہر دیکھتے ہوئے بولی "یہ خبر نہ جانا کہاں مر گیا۔"

اسے نہیں معلوم تھا کہ نذر عمار اور انیس حقیقتاً مر گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے ہی پڑا تھا۔ وہ چاہتی تو ہاتھ بڑھا کر پردے سے پیچھے اسے چھو سکتی تھی۔ تا آگئی واقعی کتنے اطمینان کا باعث ہو ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ نذر کو آواز دیتی۔ میں نے جلدی سے کہا "وہ چند منٹ کے لیے محذرت کر کے گیا ہے۔ شاید ہاتھ د وغیرہ۔"

"اوہ" وہ گہری سانس لے کر دہی۔

"ان سب کو چھوڑ دیجئے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "میں صرف آپ سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ ہم یہاں سے ہیں فی الحال تو یہاں کے طور طریقوں سے اور ضروری باتوں سے آگاہ ہونا چاہیے۔"

"اے صاحب! چھوڑ دے طور طریقوں کو۔" اس نے اوارا بے نیازی سے اپنا گرد راپا ہوا ہاتھ لہرایا اور اس کی انگلیوں سے موجود ہیرے کی انگوٹھیں جھلکا اٹھیں "تجے شکافت میں پڑ کی کیا ضرورت ہے۔ میں تپ کو صحیح صورت حال بتا دیتی ہوں جیسا کہ میں نے عرض کیا آپ اتنی تاخیر سے اور وہ بھی بغیر اطلاع کے تشریف لائے لہذا آپ کی خاطر خواہ خدمت نہیں کی جا سکتی زیادہ تر لڑکیاں تک ہو چکی ہیں۔ کچھ عیس ہیں کچھ باہر مٹی ہیں۔ صرف دو لڑکیاں فارغ ہیں۔ ایک تو دہی شینہ ہے۔ آپ کے پانی وغیرہ دہی لائی ہوگی۔ وہ بھی صرف اس لیے خالی رہا کہ آج اس کا کچھ موڈ آف تھا۔ شاید طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" سے ہی اپنے کمرے میں منہ چھپانے پڑی ہے۔ ہر حال میں کوا

میں یہاں اپنی اصلی شکل میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ نیلہ نے بتایا تھا کہ یہاں میرے بارے میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میڈم مجھے بھی پہچانتی ہوگی۔ اگر میں اپنی اصلی حیثیت میں اس کو کسی میں داخل ہونے کی کوشش کرنا تو سب پہلے ہی ہوشیار ہو جاتے اور ہنگامہ برپا ہو جاتا جبکہ میں صرف ہنگامے سے ہی بچنا چاہتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ ہم جو کچھ بھی کریں بغیر ضروری لوگوں کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہو۔ میرا مسئلہ اب حل ہو چکا تھا۔ میڈم ہمارے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اب اگر وہ چار منٹ بعد مجھے بچان بھی لیتی یا یہ جان جاتی کہ میں دزیر نہیں ہوں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب وہ اس کمرے سے کہیں نہیں جا سکتی تھی اور ہم یہ انتظام بھی کر سکتے تھے کہ اس کی آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔

"خوش آمدید۔" وہ آخری میز پر رکھتے ہوئے کھٹکی آواز میں بولی۔

"شکریہ" ہم نے انہر کر اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ وہ سگار انگلیوں میں دبانے نہایت شاندار انداز میں دوسرے صوفے کی طرف بڑھی۔ صوفہ ہمارے مقابل ہی تھا لیکن وہ دوسری دیوار کے قریب تھا اور کمر نہایت طویل و درمیں تھا۔ اگر وہ اس پر بیٹھ جاتی تو ہمارے اور اس کے درمیان خاموشا قاصلہ رہتا جو ہمارے لیے کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

میں اور لونی جلدی سے ایک دوسرے سے ذرا دور کھٹک گئے ہم نے اپنے درمیان اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑنے ہوئے اسے ادھر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا "آپ یہاں ہمارے پاس تشریف رکھیے نا۔ آپ اتنی دور بیٹھ جائیں گی تو ہم خبروں کی تو آواز بھی آپ تک نہیں پہنچ سکے گی۔"

وہ ہماری طرف لپٹے ہوئے سگار کا شلے کر مسکرائی اور پہلے سے بھی زیادہ کھٹک دار لہجے میں بولی "ہماری اب وہ عمر کہاں کہ آپ جیسے نوجوانوں کے پہلو میں بیٹھ سکیں۔ صبح جبکہ صبح چروں مہلوں کو بٹھانا ہی تو ہمارا کام ہے۔ اطمینان رکھیں اس خالی جگہ کو نہایت خوب صورتی سے پر کرنے والے بہت مل جائیں گے۔ گو کہ آپ ذرا غلط وقت پر آئے ہیں اور بغیر اطلاع کے آئے ہیں۔"

"معذرت خواہ ہوں۔ بس اچانک ہی پر دگرام ہو گیا۔ اس ملاقات کا مقصد تو ویسے بھی صرف آپ سے رسم و رواج یاد کرنا تھا۔ اور آپ کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ہے فی الحال تو صرف آپ ہی ہمارے پاس تشریف رکھئے، باقی مسائل بعد میں حل ہوتے رہیں گے۔"

اس نے زیادہ تر خیرے نہیں دکھائے اور اسی محنت سے قدم اٹھائی ہمارے درمیان آئینہ۔ وہ اپنی عمر سے کہیں کم کی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے عمر رسیدہ ہونے کا اظہار کیا تھا جبکہ میں نے اکثر دیکھا تھا عمر رسیدہ عورتیں بھی "اچھی

تو تیار ہو جائے گی۔ اس کا موڑ دینے ایک منٹ بھی نہیں لگا۔  
دوسری لڑکی بھی ابھی ہے پاکستانی نہیں ہے۔  
اس نے ایک بڑی ہلکے کا نام لیا "وہاں کی بڑے اعلیٰ درجے  
کی ماڈل ہے زیادہ عرصے یہاں نہیں رہے گی۔ اتفاقاً کسی کچھ عرصے  
کے لیے ہمارے پاس آگئی ہے۔" پھر وہ ان لڑکیوں کی کچھ ایسی  
خصوصیات روانی سے بتانے لگی کہ میرے کانوں کی لوبیں جپنے لگیں  
اور میں نے محسوس کیا کہ ٹوٹی کا سرخ و سپید چہرہ بھی کچھ تنہا نے لگا  
تھا۔

پھر یکدم جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولی۔  
"آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ صرف مختصر صاحب کہہ دیا  
تو کال نہ ہوا۔ اور میں یہ بھی جاننا چاہوں گی کہ ہماری طرف آپ کی  
رہنمائی کس نے کی؟"

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے رگڑ کا کمر اسٹش لیا۔ میرے  
لے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے یہ سوال کرنے کا خیال  
اچانک نہیں آیا تھا۔ بڑے حساب سے اس نے منھ کو ایک خاص  
سوزر لاکر اس سوال کا بازو کھینچا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر  
معالف کچھ بڑھ کر ہو گا تو یہ یکدم کچھ اچھے باتیں گے۔

میرے لیے اپنی یہاں موجودگی کا الزام کسی بے چارے وزیر  
پر دھنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ لوگ عموماً جانی بچائی خصوصیات  
ہوتے ہیں۔ میں نے ایک صوبائی وزیر کا نام لے دیا جو میرے خیال  
میں کسی حد تک گماں تھا۔ کم از کم میں نے آج تک اس کی کہیں  
کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔

تاہم میں اب اپنی پول کھلنے کے رد عمل کا سامنا کرنے کے لیے  
تیار تھا۔ ٹوٹی بھی غیر محسوس طور پر اس کے بالکل قریب کھٹک آیا  
تھا۔ اس کا بازو میڈم کے عقب میں صوفے کے پچھے پڑنا ہوا تھا۔  
تاہم مجھے کچھ یوں لگا کہ میڈم کے لیے میرا جواب تسلی بخش تھا۔  
اس کی آنکھوں میں شک کے سائے نہیں ابھرے۔ اس نے  
طمینان سے سر ہلادیا۔

رہنمائی کے طور پر میں نے قائلین کے ایک بہت بڑے صنعت  
کار کا نام لے دیا جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ بڑا معاش  
آوی تھا۔ اس نے ملک کے ہی نہیں غیر ممالک کے بھی اس طرح  
کے سختی سے اڈے کھالے ہوئے تھے۔ اس ضمن میں وہ خاص  
مظاہر میں بہت سے واقعات چٹکارے لے کر سنایا کرتا تھا۔ مجھے  
امید تھی کہ میڈم کے لیے اس کا یا اس کے لیے میڈم کا نام انجینی  
نیں ہوگا۔

میں نے اندہ میرے میں مزید تیر چھوڑتے ہوئے کہا "آپ کو  
معلوم ہی ہے ہم سیاسی لوگ ایکشنل انفرٹ نہیں کر سکتے، ہمیں اپنی  
فنی مصروفیات کے لیے بہت سی خاص لوگوں کے حوالے سے بہت  
سی خاص جگہوں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔"

"میں نے تو آپ کو باہری پیغام بھجوایا تھا کہ آپ یہاں پہنچ

گئے ہیں تو سب کچھ بھول جائیں۔" وہ رگڑ کا دھواں میرے منہ پر  
چھوڑتے ہوئے بولی۔ میں نے دھواں کی سرخی دھندلاہٹ کے پار  
اس کی آنکھوں میں جھانکا تو محسوس کیا کہ وہ باتیں ہم سے کر رہی  
تھی لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

کہیں اپنا تو نہیں تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا؟ یا کم از کم  
اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں صوبائی مختصر ملک بیدار خان نہیں تھا؟  
شاید وہ مطمئن نظر آنے کی صرف اور کاری کر رہی تھی اور  
درحقیقت معاملے کی تہ تک پہنچنے کی فکر میں تھی۔ شاید اس کا ذہن  
کسی کو پیچڑ میں تھا۔ شاید وہ اچانک کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ  
کر رہی تھی۔ میں جو کچھ کرنا تھا اس کے لیے اب مزید انتظار کرنا  
مناسب نہیں تھا۔

میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ میڈم کی آمد سے پہلے ہی میں  
اپنا مختصر جیب میں خفگی کرچکا تھا۔ میں نے ٹوٹی کی طرف دیکھا۔ میرا  
اس کی طرف دیکھنا کافی تھا۔ اس سے میری ذہنی ہم آہنگی بڑے  
کمال کی تھی۔ یہ ہم آہنگی ہمارا بڑا قیمتی اثاثہ تھی۔ اس کی وجہ سے  
ہم دونوں دل کر دو سامنے نہیں "ایک طاقتور کردہ بن جاتے تھے۔

میڈم نے ایک بار پھر تاریک شیشوں کے پار میری آنکھوں میں  
جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ کا پروگرام کیا ہے؟"

"میرا پروگرام کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔" میں نے اچانک سی  
مختصر کی نوک اس کے پلو میں نکالی۔ صرف ایک اشارے کی دیر  
تھی، مختصر اس کے دل میں اتر جاتا۔ مختصر بالکل پتلا اور سیدھا تھا  
لیکن اس کی سادگی میں بھی ایک عجیب سی سخاوت پناس تھی۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور چٹ مارنے کے لیے منہ کھلا  
لیکن اس وقت تک عقب سے ٹوٹی کا بازو اس کی گردن کو اپنے پیچھے  
میں جکڑ چکا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ سختی سے میڈم کے منہ پر جم چکا  
تھا۔ یہ کام اس نے ایک جھپٹے میں کیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے حرکت  
کرنا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

### تاریخی ناول

|                        |                      |
|------------------------|----------------------|
| خالد بن ولید           | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| سلطان فیچہ شہید        | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| نواب حیدر علی خاں      | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| سلطان صلاح الدین ایوبی | الماس ایم۔ اے۔ / 450 |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

”سمجھ تو گئی ہو، ماننا نہ چاہو تو بات دوسری ہے۔ میں مختار فرما کر بات کر رہا ہوں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تم... تم یقیناً افضل چوہدری ہو۔“ وہ بے اختیار ریل انگوٹھی کی پھلکی ہوئی آنکھیں کھٹکھٹا کر دیکھ رہی تھیں۔

”افضل چوہدری کو گولی مارو۔ مجھے نہیں معلوم افضل چوہدری کون ہے۔ میں تم سے مختار فرماؤں کی بات کر رہا ہوں۔ صرف بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔ اور تمہاری جان بخشی ہو جائے گی۔“ میں خشک لہجے میں کہا۔

”مجھے تو اس کا پتا بتانے میں کوئی اعتراض نہیں، میں کون اس کے لیے مری جا رہی ہوں۔“ وہ بولی ”اس کے لیے تمہیں زرا مابا زنی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ اب کسی حد تک خوف پر قابو پا چکی تھی۔

”زرا مابا زنی ہم نے نہیں کی، تم کر رہی ہو۔ مجھے معلوم۔ اتنی آسانی سے یہ بات نہیں بتا سکتی تھیں۔“

وہ پرتو رشتی بوڑھے کے قریب ایک فوٹو تھپتھپا رہی اور نما عالیشان پرائیویٹ اسپتال کا نام لینے ہوئے بولی ”وہ اس وقت اسپتال کے سرجیکل وارڈ ٹو میں ہے۔ اس کے جڑے کا آپریٹر ہے۔“

میں نے اس کے بازو میں بازو چسپاں رکھا تھا۔ اسے ہلکا اس طرح دیتے ہوئے کہ مخبر کی نوک اس کی پسلیوں میں آجائے میں نے سفاک لہجے میں کہا ”یہ مت سمجھنا کہ تم بہتر الٹا سیدھا جاتا کر جان چمڑا لو گی۔ ہم تمہیں یہاں سے جا رہے ہیں اور یہ غلام بنا کر رکھیں گے۔ اگر تمہاری یہ اطلاع ہوئی تو جان سے جاؤ گی اور غلطی کی غلطی پھر بھی نہیں ہو سکے گی۔“

”نہیں، یہ اطلاع غلط نہیں ہے۔“ وہ زور دے کر بولی اس کے لیے جان دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں اس کا یہ رہی ہوں لیکن اس کی دشمنیاں تو نہیں بھٹکتی۔ اس تمہارا جو معاملہ ہے وہ تم جانو، وہ جانے اس میں طاقت ہو سے نہ ملے گا۔“

”انٹرن۔“ ہمیں ہمارے ساتھ چلو ہے۔“ میں نے کہا کے اٹھنے سے پہلے ہی فونی نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ یہ ساتھ لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ اگر غلط بیانی سے کام لے کر مجھے شرف خانے کی خوشحالی کی بجائے وہی دھج بول دے، اسے احساس ہو جائے کہ اس کی جا آسانی سے نہیں چھوڑے گی۔

وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی ”دیکھو، میں نے جھوٹ نہیں کیا۔“ وہ شیخ اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں ہے۔ پاس پرائیویٹ وی آئی بی روم ہے۔ دو آؤں پر اس کے مسلح گارڈ بیٹھے ہیں اور یہ بات مجھ سمیت صرف غلطی کے چکر میں نہیں سمجھی۔“

”تمہارا دوست دھیمی آواز میں کہا ”میزم! میرا دوست آپ کے منہ سے ہاتھ ہٹالے گا لیکن مسئلہ آپ کی زندگی اور موت کا ہے۔ اگر آپ نے جیننے کی کوشش کی تو جی اوموری وہ جائے گی“ اس کے دوران ہی بہت جلد آپ کے دل میں اتر جائے گا۔ اس کے بعد اگر آپ کے مسلح محافظ آپ کی مدد کے لیے پہنچے، تو کیا فائدہ؟ آپ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکی ہوں گی۔ اگر آپ نے کسی کو پکارتے ہوئے کوشش کی تو پکار کسی کے کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی آپ دوسری دنیا میں پہنچ چکی ہوں گی اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ میں پوچھوں، صرف اس کا جواب نہایت آہستگی سے ”جی“ تو آواز میں دےں۔ آپ کے ہونٹوں پر میری نظر جمی ہوگی اور ان ہونٹوں کی ذرا سی بھی غیر ضروری حرکت آپ کی موت کا باعث بن جائے گی۔ بات سمجھ میں آگئی؟“

وہ پچھلی پچھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی لیکن فونی کی گرفت اتنی تھی۔ وہ سر کو حرکت نہ دے سکی۔ اس کا چہرہ لال سمجھو کا ہو گیا تھا۔ میں نے فونی کو گرفت زرا نرم کرنے کا اشارہ کیا۔ ”میزم کو ذرا سانس آئی تو میں نے کہا ”میزم! اگر آپ میں ذرا بھی عقل ہوگی تو آپ ذرا سا بھی دھمکی لینے کی کوشش نہیں کریں گی۔ صرف ایک سوال کے عوض زندگی کا سودا کچھ زیادہ مہنگا نہیں ہے۔“

میں نے مخبر پر دباؤ ڈال رکھا کہ اسے اپنی جلد پر نوک کی چھین محسوس ہوتی رہے۔ پھر میں نے فونی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اس نے نہایت آہستگی سے ”میزم“ کے منہ پر ہاتھ بٹایا اور گردن پر قبضہ زرا دھکا دیا تو ”میزم“ کی حرکت زرا اعتدال پر آئی۔ اس نے جیننے کی کوشش نہیں کی تاہم ٹیرا رادی سے انداز میں کھنٹی کھنٹی آواز میں پوچھا ”کون ہو تم؟“

”تم نے مجھے نہیں پہچانا؟“ میں نے دریافت کیا۔ اس کی نظر ایک لمبے کے لیے میری معنوی مونچھوں پر ٹھہر گئی تھی۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔

”غیر ضروری سوالات کو رہنے دو۔“ میں نے کہا ”میں بہر حال تمہارے دشمنوں میں نہیں ہوں، اس لیے تمہاری جان لینا نہیں چاہتا لیکن اس کا انحصار تمہارے تعاون پر ہے۔ میری دشمنی کسی اور سے ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت آن پڑی ہے جو ظاہر ہے، ہمیں تم سے سیدھے طریقے سے نہیں مل سکتی تھی۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے پچھنی پچھنی سی آواز میں پوچھا۔ فونی نے اس کی گردن پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ زیادہ مکمل کرنے لگی تھی۔

”تمہارا دوست تمہارا اور سرپرست۔ چاہو تو تم اس کی خاطر جان بھی دے سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”میں نہیں سمجھی!“

وہ پچھلی پچھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی لیکن فونی کی گرفت اتنی تھی۔ وہ سر کو حرکت نہ دے سکی۔ اس کا چہرہ لال سمجھو کا ہو گیا تھا۔ میں نے فونی کو گرفت زرا نرم کرنے کا اشارہ کیا۔ ”میزم کو ذرا سانس آئی تو میں نے کہا ”میزم! اگر آپ میں ذرا بھی عقل ہوگی تو آپ ذرا سا بھی دھمکی لینے کی کوشش نہیں کریں گی۔ صرف ایک سوال کے عوض زندگی کا سودا کچھ زیادہ مہنگا نہیں ہے۔“

میں نے مخبر پر دباؤ ڈال رکھا کہ اسے اپنی جلد پر نوک کی چھین محسوس ہوتی رہے۔ پھر میں نے فونی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اس نے نہایت آہستگی سے ”میزم“ کے منہ پر ہاتھ بٹایا اور گردن پر قبضہ زرا دھکا دیا تو ”میزم“ کی حرکت زرا اعتدال پر آئی۔ اس نے جیننے کی کوشش نہیں کی تاہم ٹیرا رادی سے انداز میں کھنٹی کھنٹی آواز میں پوچھا ”کون ہو تم؟“

”تم نے مجھے نہیں پہچانا؟“ میں نے دریافت کیا۔ اس کی نظر ایک لمبے کے لیے میری معنوی مونچھوں پر ٹھہر گئی تھی۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔

”غیر ضروری سوالات کو رہنے دو۔“ میں نے کہا ”میں بہر حال تمہارے دشمنوں میں نہیں ہوں، اس لیے تمہاری جان لینا نہیں چاہتا لیکن اس کا انحصار تمہارے تعاون پر ہے۔ میری دشمنی کسی اور سے ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت آن پڑی ہے جو ظاہر ہے، ہمیں تم سے سیدھے طریقے سے نہیں مل سکتی تھی۔“

”کس کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے پچھنی پچھنی سی آواز میں پوچھا۔ فونی نے اس کی گردن پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ زیادہ مکمل کرنے لگی تھی۔

”تمہارا دوست تمہارا اور سرپرست۔ چاہو تو تم اس کی خاطر جان بھی دے سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”میں نہیں سمجھی!“

ناک طریقے سے مار دیا گیا۔ میں نے بہت غور کیا لیکن مجھے سے  
تاک صربا کہ آخر ان میں عورتوں کے قتل کی کیا ضرورت تھی اور  
اس سے بیکار کو کیا حاصل ہوا؟ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ جس  
طرح بالکل کتا بلا تخصیص راہ چلتے آدمیوں کو کانا پھرتا ہے اور شعور  
سے عاری ہوتا ہے کہ اس سے اسے کیا فائدہ یا نقصان ہے۔ بالکل  
اسی طرح بعض لوگ صرف اپنی منوس نفرت کی وجہ سے اس  
سوسائٹی کو بولہمان اور داغدار کرتے پھرتے ہیں اور ہمیں معلوم  
ہی ہے کہ بالکل کتوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

”لیکن اس میں میرا کیا قصور؟“ اس کے لیے میں احماد  
آلی۔ ”میں اس کے ایک دھندے کی انجام دہ ضرور ہوں لیکن اس  
کے تمام کتا ہوں میں تو شریک نہیں۔ تم نے مجھ سے جو معلوم کرنا  
چاہا وہ میں نے بتا دیا۔ اب تم مجھے چھوڑ دو۔“

”اس دنیا کے معاملات بہت الجھ گئے ہیں۔“ میں نے تلسفیانہ  
لہجے میں کہا ”لوگوں جانے کون کس کے دھندے میں کتنا شریک  
ہے۔“

”میں تم سے بچ کر رہی ہوں۔“ یہ اس کی آخری سرگوشی  
تھی۔ میرے خیال میں وہ جتنا بچ کر چلی گئی اتنی ہی کافی تھا۔ اب  
اس کا خاموش ہو جانا ہی بستر تھا۔ میں نے اس کے پتلو میں خیرات مار  
دیا۔ ٹوٹی نے دباہ اس کے منہ پر پٹی سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ صر  
رہی تھی مگر جان دار عورت تھی۔ بڑی قوت سے کسمالی لیکن یہ  
صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ آخر کار ساکت ہو گئی۔ اس کی پہلی  
پٹی ”بے نور آنکھیں سامنے کی دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔“

خیرات ابھی تک اس کی پٹلیوں کے درمیان نرم جگہ میں ایک  
خصوصی زاویے پر بیٹھ تھا اور خون برائے نام نکلا تھا۔ اس کی  
موت کا یقین ہو جانے کے کچھ دیر بعد میں نے خیرات پر کھینچا اور وہ  
بھی نہایت آہستہ کے ساتھ تاکہ کم سے کم خون نکلے میں خود ذرا  
”ورہٹ گیا۔“

پتلو میں اس کے لباس کا صرف تھوڑا سا حصہ خون میں تر ہوا  
اور بس! خون صوفے تک بھی نہیں پہنچا۔ ٹوٹی نے نہایت آہستہ  
سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ صوفے پر جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔ ایسا  
معلوم ہوا تھا کہ وہ آنکھیں ذرا پھیلائے سامنے کی دیوار پر غور

کو معلوم ہے۔ اس کی اپنی ہڈی کو بھی نہیں معلوم کہ وہ وہاں داخل  
ہے۔ میں نے جیسے بالکل صحیح اطلاع دی ہے۔ تم چاہو تو اس دار  
میں فون کے تصدیق کر سکتے ہو۔ وہ خود ابھی بولنے کے قابل نہیں  
ہے کیونکہ اس کا جڑا پنچوں میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن ڈیڑی پر موجود  
زس اس کی موجودگی کی تصدیق کرے گی۔ اس کے۔ لہجے میں  
صرف یہ کتا پڑے گا کہ میڈم بات کرنا چاہتی ہیں۔ وہ سامنے فون  
رکھا ہے۔ چاہو تو تصدیق کر لو۔ وہ خود بول تو نہیں سکتا لیکن فون سن  
تا ہے۔ اسے اگر کچھ کتا ہوتا ہے تو کتا پڑے لکھ دیتا ہے اور اس کا  
ایک گاڑو بات فون پر کہہ دیتا ہے۔ آج کل وہ اسی طرح اذکات  
باری کر رہا ہے لیکن صرف نہایت ضروری اذکات۔ میں نے  
نہیں ماری بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتادی ہے۔ اب مجھے ساتھ  
ٹھپنے کا کیا فائدہ؟“

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بچ کر رہی تھی۔ میں ایک لمحے کے  
لیے خاموش رہا تو وہ بولی ”جیسے بھی تمہارا مجھے ساتھ لے کر جانا  
لمن نہیں ہوگا۔ چار مسلح محافظ کہیں نہ کہیں سے ہمیں دیکھ رہے  
ہیں گے اگر انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ جانے دیکھ لیا تو  
میں گریز کا احساس ہو جائے گا اور وہ ہمیں گولیوں سے چھلی  
دیوں گے۔“

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے ٹوٹی کو اشارہ کیا اور ہم نے اسے  
باہر صوفے پر اپنے درمیان بٹھالیا۔ اس دوران اس کی گردن  
تور ٹوٹی کے بازو کے مٹھے میں رہی اور میرے خنجر کی نوک بھی  
ناک پٹلیوں پر لگی رہی۔

میں نے مشتاقانہ لہجے میں کہا ”مسلح محافظوں اور گولیوں کی  
ہانڈوں کی باتیں چھوڑو یہ موضوعات ہمارے لیے اہم نہیں  
ہے۔ اگر مسلح محافظوں کی فحاشی نظریں کوئی اہمیت ہو تو ہم رات  
اس وقت اس طرح یہاں کھینے کی جرات ہی نہ کرتے۔ تم یہ بتاؤ  
تھوڑے کرے کا نمبر کیا ہے؟“

”سات۔“ اس نے بلا تامل جواب دیا ”اور یہ بھی بتا دوں کہ  
رست نمبر کو اپنے لیے بہت مبارک سمجھتا ہے۔“

”دیکھتے ہیں یہ نمبر اس کے لیے کتنا مبارک ثابت ہوتا ہے۔“  
نے بے پروائی سے کہا ”تم کہہ رہی تھیں کہ بہت ضروری  
نات وہ ہیں سے جاری کر رہا ہے۔ یقیناً نیلے کے قتل کا حکم بھی  
اسے وہیں سے جاری کیا ہوگا؟“

”نیلے قتل ہو چکی ہے؟“ اسے حیرت کا جھٹکا سا لگا اور اس بار  
فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ بچ کر جان ہوگی یا حیرت کی لدا کاری  
ہی تھی۔ تاہم میں اسے شک کا فائدہ دینے کے لیے چار نہیں  
دو ٹکڑے کتا ہوں اور خباثتوں میں برابر کی شریک تھی۔

”میں معصوم بننے کی ضرورت نہیں!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا  
”یہ تو سب گناہ اور مظلوم تھی ہی لیکن اس کے ساتھ دو اور قطعی  
گناہ اور ان معاملات سے لائسٹ عورتوں کو بھی نہایت اذیت





چھاپا ماریں گے، چڑھائی کریں گے، دو چار چھوٹے بڑے لوگوں  
پائی کریں گے، تھوڑی بہت کاڑھک اور بنگامہ آرائی کریں گے،  
بڑے لوگوں کو پرکس میں ایک پیڑ کرائیں گے جو اس قسم کے  
کی سرپرستی کرتے ہیں، جن کی وجہ سے ایسے اڑے چلائے وا  
بست و لہر اور نڈر رہتے ہیں، ان کے حوصلے بلند رہتے ہیں اور  
کو خاطر میں نہیں لاتے، دو چار مرتبہ اس قسم کی بنگامہ آ  
ہوئی، کچھ لوگوں کی رسوائی ہوئی اور اخباروں میں کہانیاں آنے  
اڑا خودی بند ہو جائے گا۔

"کسی کی کچھ میں نہیں آئے گا کہ کون لوگ ہیں، جو اڑے  
چھپے پڑے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔  
"تمی ہاں۔ اس قسم کے معاملات میں آپ کی وضع کی  
پالیسی آج تک بڑی کامیاب جا رہی ہے کہ جب کوئی کارروائی  
ہو تو صورت حال کو اتنا الجھا دو کہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ  
سب جاک ٹوئیاں مارتے رہیں اور کڑیاں ملائے کی کوشش  
رہیں۔ اس کوشش میں بہت سے منفرد چرے بے غتاب  
رہیں، چھپی ہوئی کہانیاں سامنے آتی رہیں۔ ایسی صورت میں  
اوقات کچھ خفیہ ہاتھ خودی معاملے کو دبائے پر بھی مجبور  
ہیں۔"

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فونی بولا "دیسے ہم  
آج بھی شروع کر سکتے تھے۔ کوئی خانے سے جو لڑکیاں یا  
باجلی تھیں، ان کے بارے میں تو کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا  
چار کمروں کے دو اڑے توڑ کر یا کھلا کر زرا ہم دیکھتے تو س  
کے کون کون سے معززین اور شرفاہاں داویش دے رہے  
۳۳ اس کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا "ہمارا  
لوگوں کے چرے دیکھنا نہیں، اس اڑے کو بند کرانا ہے  
لے تم بعد میں اطمینان سے کارروائی کرتے رہنا۔ آج را  
تو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، دوسرے میرا سونڈا  
نہیں ہے۔ وہاں کافی ضرور موجود ہوں گے، ان سے  
گولیاں چلتیں، اچھا خامسا بنگامہ بپا ہوتا۔ فی الحال ہم  
اور خاموشی سے نکل آئے میں چاہتا ہوں کہ شیخ اپنا  
ہمارا کام اسی طرح پُر سکون انداز میں ہو جائے غیر متعلقہ  
کانوں کان پاتا۔ چلے۔"

"ایسا ہی ہو گا سر" فونی پرا حوا لیے میں بولا "۳۳  
جگہ پر ویسے بھی بنگامہ آرائی مناسب نہیں۔"  
"تم ہو بھی تو اپنی اصل شکل میں، تم نے بھی تھوڑا  
تبدیل کر لی ہوئی تو اچھا رہتا۔ پھر خواہ ہم کتنے ہی لوگوں  
آجائے کوئی فرق نہ پڑا۔" میں نے کہا۔

"میک اپ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" فونی بولا "۳۳  
کے کاموں میں، میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر  
اصل شکل میں ہونے سے بھی کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا

سے کسی چیز کو تک رہی تھی۔ کوئی اس کا چہرہ بخور دیکھا بھی کہ سکا  
تھا کہ وہ عریض تھی۔ اس کے چہرے پر زندگی نہیں تھی۔ باقی ہر  
اعتبار سے وہ جون کی توں تھی۔

میں نے ہاتھ دوم میں جا کر اطمینان سے اپنا تھوڑا دھوا اور فنی  
الحال اسے خشک کر کے کوٹ کی بڑی جیب میں ہی رکھا۔ ابھی اس کی  
ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مشین ہٹل میرے کوٹ کی دو سری جیب میں  
تھا اور میرے دونوں ہاتھ بھی جیبوں ہی میں تھے۔ میں کمرے میں  
واپس آیا تو فنی اندر ملنی دو اڑے پر نظر پڑا، بیٹھا تھا۔ اگر اندر  
سے کوئی آگاہ تو فنی اس سے سننے کے لئے بالکل تیار تھا۔

میرا اشارہ پا کر وہ اٹھ کڑا ہول۔ میڈم کا چہرہ برف کی طرح  
سفید چمکا تھا۔ وہ اسی طرح صوفے پر بیٹھی تھی، کسی طرف لاٹھی  
نہیں تھی۔ اس پر ایک اللہ والی نظر ڈال کر ہم بے آواز طریقے سے  
بیویلی ذرا ذرا سکول کر خاموشی سے باہر آگئے۔ کھاروں طرف اسی  
طرح سکوت طاری تھا۔ کوئی میں موجود دوسرے لوگوں کے وہم و  
گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میٹ پر اور ذرا تنگ دوم میں کیا ہو چکا  
تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اندر موجود شینہ یا کسی دوسری لڑکی کو جب  
احساس ہو گا کہ ذرا تنگ دوم میں سکوت طویل ہو گیا ہے اور کسی  
قسم کی سرگرمی کے آثار نظر میں آ رہے تب شاید وہ دیکھنے آئے کہ  
صورت حال کیا ہے تب تک ہم بہت دور جا چکے ہوں گے۔

میٹ سکول کر رہا ہوا آگئے، کس کوئی مسخ خانہ نظر میں آیا  
کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا، کسی نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا۔ باہر  
اس چوکیدار کا نام و نشان بھی نہیں تھا جسے میں نے آتے وقت  
دیکھا تھا۔

"تم نے اسے کہاں پہنچا ہے؟" میں نے فونی سے پوچھا۔  
اس نے ایک اور کوٹھی کے سامنے موجود خوب صورت اور  
کھنی یاڑھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "۳۳ اس کے پیچھے یہاں تو  
کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔"

یاڑھ کے پیچھے گھرا اندر تھا۔ زیادہ امکان ہی تھا کہ میج کا  
اجالا بھٹنے پر ہی لاش دریافت ہوگی۔ میں نے طمانیت سے سر ہلایا  
اور ہم گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

اس گلی سے میں نے گاڑی بیڑا لائش آن کے بغیر نکالی۔  
"دوسری گلی میں پہنچ کر میں نے بیڑا لائش آن کرتے ہوئے کہا۔  
"یہاں تو مسئلہ خلاف توقع بہت ہی پُر سکون انداز میں حل ہو گیا۔  
زیادہ بار دھاڑ اور غول ریزی نہیں ہوئی۔"

"کوئی خانے کو بند کرنے کا آدھا مرحلہ تو طے ہو ہی گیا  
ہے۔" فونی پانی کیپ سر سے اتار کر گود میں دیکھتے ہوئے بولا "اب  
اسے مکمل طور پر بند کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ سمجھ لیں کہ میڈم  
اس درخت کا تاج تھی۔ تا آج کٹ گیا، جڑ ہم اس وقت اکھاڑنے  
جا رہے ہیں۔ شاخوں کا کیا ہے، خودی سوکھ جائیں گی یا پھر انہیں  
تھوڑا، بڑا، کھاد اور آگے دو چار مرتبہ رات کو یہاں اچانک

”اے کام فاسوشی سے ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اسپتال میں گولیوں کے دھماکے نہ گونجیں تو بہتر ہے نہ جانے پھارے کس کس حالت کے مریض وہاں ہوتے ہیں۔ خواہ خواہ گھبراہٹ سے ان کا برا حال ہوگا۔“ میں نے کہا۔

اس دوران ہم شیخ اسپتال کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے گاڑی مقبلی سروس روڈ کی طرف سوزلی۔ اسپتال حال ہی میں مکمل ہوا تھا۔ ابھی اس کے عقب میں کافی زمین خالی پڑی تھی جو عمارت اس خیال سے چھوڑی گئی تھی کہ مستقبل میں اسپتال کو توسیع دینے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس زمین پر بھانڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

اسپتال کی پچھلی دیوار بہت نیچی تھی۔ گاڑی کچھ دور چھوڑ کر ہم نہایت آسانی سے اسے پھلانگ کر خود دو بھانڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے عمارت کے عقب میں پہنچے۔ مقبلی دیوار میں ٹکاسی اور انرکنٹرکٹنگ کے بڑے بڑے پائپوں کے قریب بقیہ کا ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا جو غالباً صفائی وغیرہ کرنے والوں کی آمدورفت کے لئے بنایا گیا تھا۔

ہم سر جھکائے آگے پیچھے اس دروازے سے گزر کر ایک ٹنگ سی راہداری میں پہنچے جس میں دونوں طرف چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ ان پر اسٹور روم، سوئچ روم وغیرہ کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر ٹنگ سی بیڑھیاں تھیں۔ میں ٹوٹی کی رہنمائی میں بیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ٹوٹی بچی آواز میں بولا ”یہ وہ راستے ہیں جو زیادہ تر چلے درجے کے ملازمین کے استعمال میں رہتے ہیں۔“

”اللہ چلے درجے کے ملازمین کا بھلا کرے۔ ان کی وجہ سے دوسروں کو کوئی نہ کوئی تائدہ پہنچتا ہی رہتا ہے۔“ میں نے غلوں سے کہا۔

بیڑھیوں کے انتظام پر بائیں ہاتھ پر ایک لاؤنج سا تھا جہاں چھت میں بڑی سی سفید لائٹ نصب تھی۔ اس لاؤنج کے دروازے پر اسٹول پر ایک باوردی وارڈروائے ٹاپ کا ٹوچر ان بیٹا بڑے اشاک سے ٹیل کٹرتے بیروں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

ہم اس کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔ ہم کئی کشادہ راہداریوں سے گزرے۔ جہاں کے فرش وحملہ وحملہ سفید روشنی میں جھللا رہے تھے اور ہوا میں جراثیم کش اور دوسری دواؤں کی بگلی سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں طرف کمریوں کی قطاریں تھیں۔ ایک ڈیوٹی روم سے ایک لیڈی ڈاکٹر بھی نکلتی دکھائی دی لیکن اس نے بھی ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

راستے میں لوگوں کی آمدورفت برائے نام ہی دکھائی دی۔ ٹوٹی یوں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا جیسے ہر راستہ اچھی طرح اس کا دیکھا بھالا ہو۔ اس کی جھل جھلٹ عین میرے لئے بڑی کارآمد ثابت

مقام آدمی ہوں۔ گمناہ ہونے کے بھی بڑے قائلہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بعد میں میرا حلیہ سن کر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو بہت پریشان ہوگا کیونکہ شہر میں مجھ سے ملتی جلتی شخصیت کے بڑا ہون نہیں تو نیکوں فوجان تو ضرور موجود ہوں گے۔ اور اگر مددگی میں بھی کوئی مسئلہ کھڑا بھی ہوا تو آپ جو بیٹھے ہیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ، جس شخص اسپتال کا کچھ حدود دار بہ معلوم ہے؟ میں نے تو آج تک اس کی چار دیواری میں قدم نہیں رکھا۔“ میں نے کہا۔

”نہ نہ کریں۔ میرا دیکھا بھالا ہے۔“ ٹوٹی نے مجھے اطمینان دلایا۔ ”سرجیکل وارڈ فرسٹ فلور پر ہے۔ اور یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ ہمارا شمار دی آئی پل بوم میں ہے۔ وہ کرے ایک بالکل ہی اگ ٹھنک راہداری میں واقع ہیں۔ بڑا سکون دیتا ہے اس طرف ہمیں اپنا کام کرنے میں آسانی رہے گی لیکن اسپتال میں داخل ہمیں ہر حال پچھلی طرف سے ہی ہونا پڑے گا کیونکہ اسپتالوں میں تو بین گیت کی طرف راتوں کو بھی خاصی آمدورفت رہتی ہے۔“

”مگر ہم کہیں سے دو سفید اور دو اگل اور دو اسٹینکوپ حاصل کر کے چلتے چلتے تو بڑی آسانی رہتی۔ اور تیل پین کر؟ اسٹینکوپ گلے میں لٹکا کر جہاں چاہتے کھوٹے پھرتے، کوئی ہمیں نہ روکتا۔ لیکن افسوس کہ اب اس کا بھی وقت نہیں۔“ میں نے غلطی ساٹھ لے کر کہا۔

”آپ میری رہنمائی میں چلے گا۔ ہمیں اب بھی کوئی نہیں روکے گا۔“ ٹوٹی اطمینان سے بولا ”اسپتال بے شک اعلیٰ درجے کا ہے لیکن اب سیکورٹی ایسی بھی نہیں ہے کہ پردہ پر بھی نہ مار سکے۔ اور جہاں پردہ پر نہ مار سکے وہاں بھی داخل ہونے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ جس راہداری میں وہ چندویں آئی پل بوم ہیں اسی کے سرے پر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کی دیوار میں بہت بڑا شیشہ لگا ہوا ہے۔ رات کو اس وقت اس کمرے میں صرف ایک ڈیوٹی نرس بیٹھی ہوگی جو آتے جاتے لوگوں کو شیشے کے پار سے دیکھتی رہتی ہے۔“

”وہ رات کو اس وقت ہمیں راہداری میں داخل ہوتے دیکھ کر چٹکے گی۔ اگر ہم سیدھے نکلے چلے گئے تو وہ پریشان ہو سکتی ہے، کوئی گڑبڑ کر سکتی ہے، کسی کو خون وغیرہ کر سکتی ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”چلے اسی کے پاس ہوتے چلیں گے۔“ ٹوٹی بولا ”یوہ بھی میرا اندازہ ہے کہ راہداری میں داخل ہوتے ہی عمارت کے محافظوں کی نظر ہم پر پڑے گی۔ وہ غالباً کمرے کے دروازے پر ہی بیٹھے ہوں گے۔ اس صورت میں پہلے ہمارا سیدھے ڈیوٹی روم میں ہی چلے جانا مناسب ہوگا تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں، ہم ان کی طرف آ رہے ہیں۔ غاموشی کا جذبہ جس دیکھ کر میں ان کے قریب جانا بہتر ہوگا کیونکہ آپ

ہوئی تھی۔

ہو کر بیٹھ گئی اور قدرے پریشان ہو کر بولی "آپ کون۔"

آخر کار وہ چار راہداروں کے عہم پر رک گیا اور دیوار سے لگ کر بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "آپ ہم اس طرف مزے کے تو بیٹھے کا ایک دوازہ آئے گا۔ اس سے گزرے ہی بائیں ہاتھ پر ڈیوٹی روم ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ کرا نمبر سات بھی اسی سیدہ میں کہیں ہوگا۔ کیا خیال ہے، مگر نکال لی جائے؟"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس مقام پر اسپتال، اسپتال کم اور ہو چکا تھا۔ دکانیں دے رہا تھا۔ نو تعمیر شدہ ہونے کی وجہ سے چمک و مک بھی برقرار تھی۔ صرف فرش پر قالین کی کمی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں، مگر اشد ضرورت کے بغیر نہیں نکالی جائے گی۔ ہمیں بالکل بے ضرر سے انداز میں پہلے سیدھے ڈیوٹی روم میں ہی جانا چاہئے۔ ہماری کارروائی میں چند منٹ تو ضرور لگیں گے۔ راستے میں موجود خطرے کا انتظام کرتے ہی چلیں تو بہتر ہے۔"

ہم بظاہر گرد و پیش سے بے نیاز نیچے آواز میں، سرسری انداز میں بائیں کمرے کی اداکاری کرتے ہوئے بائیں طرف مڑے اور بیٹھے کے اس دوازے پر پہنچے جس نے راہداری کو بند کیا ہوا تھا۔ اس پر انگریزی میں جلی حروف میں اوپر "وی آئی پی رومز" لکھا ہوا تھا اور نیچے لکھا تھا "بلا اجازت غیر متعلقہ افراد کا داخلہ ممنوع ہے۔"

لیکن اجازت دینے کے لئے وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ دوازہ غیر منقل ہی تھا۔ اسے کھولنے ہی ہمیں راہداری کے اختتام پر کمرے میں ایک کمرے کے دوازے پر دو گھنٹے میں بیٹھے نظر آ گئے۔ وہ نیچے ہی کرسیوں پر کالہ آئینہ سے انداز میں بیٹھے تھے۔ ان کی آئینہ نگاہیں ان کی گود میں دھکی ہوئی تھیں۔

ہمیں بڑے دوازے سے راہداری میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ فوراً ہی گھٹیں سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں غالباً احساس تھا کہ ہتھار کی وہاں موجودگی کا علم کتنے کے چند لوگوں کو ہی تھا۔ اسی لئے وہ شاید زیادہ غصہ محسوس نہیں کر رہے تھے اور دواختی سے انداز میں پہرہ دے رہے تھے۔ وہ دہیں کھڑے رہے۔

ہم نے بظاہر ان کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی جیسے ہمیں ان سے کوئی غرض نہ ہو۔ ہم فوراً ہی بائیں طرف ڈیوٹی روم میں گھس گئے جیسے ہمیں وہیں کوئی کام ہو۔ وہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ تھا جس میں بہت سے لمبی لوہا زناات موجود تھے۔ ایک طرف سفید پردوں والا پارٹیشن تھا۔

چھوٹی سی ایک میز کے عقب میں سفید پونچھام میں ایک کم عمر سی نرس روٹو لکچر چیمبر پر شیم دوازہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ مطالعے میں کچھ زیادہ ہی کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں اس وقت دیکھا جب ہم اس کے عین قریب جا پہنچے۔ وہ "اوپر" رزرو سیدھی

شاید وہ رات کو اس وقت اس جھے میں کسی کی آمد کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ نفی نے اسے جملہ پورا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وقت کم تھا، اس بات کا قوی امکان تھا کہ ہتھار کے گھنٹے میں بیٹھے ہوئے اس طرف آجاتے۔ میرا خیال تھا، انہیں تجسس تو ضرور ہو رہا ہو گا کہ دواختی اس وقت ڈیوٹی روم میں کیا کرنے آئے ہیں۔ مجھے شاید اس نازک اندام، خوب صورت اور کم عمر نرس کرانے کا وار کرنے میں ایک لمحے کے لئے ہچکچاہٹ ہوئی لیکن انہوں نے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے لڑکی کی کینکلی کرانے کا ایک، بچا حلا ہاتھ رسید کیا۔ وہ کرسی سمیت الٹ کر دوسری طرف کرنے لگی لیکن دوسری طرف میں موجود تھا۔ میں اسے کرسی سمیت سنبھال لیا۔

اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ میں نے اسے ذرا صبح طرح بٹھاوا۔ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ بیٹھے بیٹھے اسے آگلی ہے۔ اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر نیچے گر چکی تھی۔ اسے اٹھا لیا اس کا عنوان تھا "ایک نرس کی آپ بیتی۔" معلوم نہیں اس نرس کو کبھی کسی نے کبھی اس طرح کرا۔ ہاتھ رسید کیا تھا یا نہیں جس کی وہ آپ بیتی تھی۔ جس ذوق و سے وہ نرس اس آپ بیتی کو پڑھ رہی تھی اس سے تو لگتا تھا کہ میں جو وہ کرانے سے زیادہ دلچسپ باتوں کا تذکرہ تھا۔ میں کتاب نرس کے سامنے میز پر اونٹھی رکھ دی۔ پارٹیشن وغیرہ پیچھے جھانک کر میں نے اطمینان کر لیا کہ اس کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔

کمرے سے نکلے وقت میں نے میز سے کسی کا ایک کمرے اوٹنے ایک فائل اٹھائی اور ہم یہ دونوں چیزیں سامنے کے دوسرے کمرے کو دکھانے اس طرح باہر آئے جیسے سائمنٹ تھوٹیں۔ میں کسی مریض کے بارے میں ہمارا خیال کر رہے ہوں۔

ہمارا اندازہ درست تھا۔ دونوں کن بین اسی طرف آ رہے تھے۔ ہمیں انہوں نے اپنے ہاتھوں میں نکالی ہوئی جیسے نگہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے چہرہ جتنی امکان معصومیت اور سادگی طاری کر رکھی تھی بلکہ ہم اسے کافی محروم اور تھوڑے سے خوفزدہ بھی نظر آنے کی کمرے سے جس طرح شریف شری عمو گامی خوف ناک کے ہاتھ میں خوف ناک سی گھنٹوں سے شریف شری کو گھور رہی، وہ دونوں غمی سے بے سناش معلوم ہوتے تھے۔ شکلیں کھردری اور کشت سی تھیں۔ انکھوں میں سرخی اور سناٹا ان میں سے ایک کی توند نفی ہوئی تھی۔ دوسرا زراٹھے ہو درویشی جسم کا لگ تھا۔

وہ ابھی ڈیوٹی روم تک نہیں پہنچے تھے، راستے ہی میں

کھول کر جھانکنے لگے یا کسی مریض کے پاس موجود کوئی تھاردار یہ جاننے کے لئے کھل آئے کہ یہ خلاف معمول آواز ہی کیسی ہیں۔  
میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسے تیزی سے دھکیلا ہوا کرا نبرہ سات کے دروازے پر ہی لے گیا۔ اس دوران فونی بھی اپنا کام نہ کیا چکا تھا۔ اس نے قابض کرانے کی سمت ہی خوف ناک چاپ ماری تھی۔ اس کا شکار بے ہوش ہو چکا تھا اور وہ اسے کھینچے فرش پر ایک بازو سے کھینچا ہوا کمرے کی طرف لا رہا تھا۔ اس کی گمن وہ خود اٹھا چکا تھا۔ قائل اور انکریے دیں پڑا رہ گیا تھا۔

فونی اسے دھکیلا ہوا قریب پہنچا تو میں نے دیکھا اس کے شکار کے سینے میں چاقو پھنس چکا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکا تھا کہ اس نے کب اس کا پانی صاف کر دیا تھا۔ میرا شکار ابھی ہوش میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خاص ٹینک سے جھٹکا دیتے ہوئے اور اپنی غیر معمولی خداداد طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اس کی گردن کا منکا توڑ دوں۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔

فونی نے میرے حکم یا اشارے کا انتظار کئے بغیر اپنے شکار کو چھوڑ کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی گمن کا آہنی دست اتنی قوت سے میرے شکار کی کھوپڑی پر رسید کیا کہ مجھے فوری طور پر اس کے مرجانے کا یقین ہو گیا۔ اس کی کھوپڑی کی بڑی پچھتہ سلامت نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ اپنے مردہ سا مٹی پر ڈھیر ہو گیا۔

غیبت رہا کہ اس دوران راہداری میں دونوں طرف کمروں کے دروازے بند ہی رہے۔ میں نے کرا نبرہ سات کے دروازے کا ہینڈل کھمایا۔ دروازہ غیر منتقلی تھا۔ ذرا سا کھل کر میں نے جھانکنا تو میں اندر جھانکا۔ ٹائٹ بلب کی مدھم دھمکنی میں اسپتال کے مخصوص آہنی بند پر ایک گھٹس سائٹ بچت لیٹا نظر آیا۔

اس کا چوہہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے رخساروں کے گرد اس طرح بچیاں لپٹی ہوئی تھیں کہ جڑے کے نیچے سے ہوتی ہوئی سر کو بھی دھچپے ہوئے تھیں۔ انداز تھا رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا تھا شاید خواب آور دوڑ کے زیر اثر تھا۔ کمرے میں ایک بند اور بھی تھا۔ گمروہ خالی تھا۔

میں نے دروازہ پورا کھول دیا اور فونی نے جلدی سے اندر داخل ہو کر دونوں لاشوں کو بھی اندر ہی کھینچ لیا۔ دروازہ میں نے آہستہ سے بند کر کے منتقل کر دیا۔ اب ہمارا راست بالکل صاف تھا۔ فونی نے جلدی سے چاقو اپنے شکار کے سینے سے نکال کر اسی کے لباس سے اچھی طرح صاف کر کے جیب میں ڈال لیا۔

میں نے کمرے کی لائٹ آن کر دی اور ہم بند کے قریب جا پہنچے۔ لائٹ آن ہونے پر بھی عمارت ساکت ہی رہا۔ وہ لمبی اور گہری سانسیں لے رہا تھا۔ یقیناً خواب آور دوا ہی کے زیر اثر تھا۔ اس کا چوہہ زرا متحرک تھا جس کے گرد بچی کا حلقہ اس طرح کسا ہوا تھا کہ وہ جڑے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی کچھ بول سکتا تھا۔ اس کے بند پر کچے کے پاس ہی ایک رائٹنگ پیڈ اور قلم رکھا ہوا تھا۔

اے بارے میں غالباً تخریب میں تھے۔ وہ زیادہ چرکنا صرف اس لئے نہیں ہوئے تھے کہ ہم قطعی غیر مسلح نظر آ رہے تھے۔ اس سے لے کر وہ ہم سے کچھ پوچھتے میں نے خود ہی انہیں غائب کر لیا۔ بجائی صاف ہے۔ یہ چھ نبرہ کرا اس طرف ہے؟ سینہ ہدایت اللہ ان داخل ہیں۔ نرس تو بیٹھی سو رہی ہے۔ ہم نے اسے جگانا اس نہیں سمجھا۔

وہ ایک لمحے ہمیں گھورتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ہمارے بے خداری بھی تھی۔ شاید وہ فیصلہ کر رہے تھے کہ ہم اس قائل ہیں یا نہیں کہ ہمیں جواب دینے کی ذمت کی جائے۔ ان کے فون میں کھینچیں تھیں۔ ہم اپنے فونوں میں انکریے اور قائل مانے ان کے قریب جا پہنچے۔ میں نے اس قائل پر ہی کرا نبرہ چھوڑ دیا۔ بچت اللہ نام لکھاں لکھاں تھا۔

”جیہ دیکھتے یہ ہے ان کا نام اور کرا نبرہ۔“ میں نے قائل سرتی جسم والے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ فونی دوسرے کو لہرے دیکھانے لگا۔ ہماری یہ حرکتیں صرف انہیں کھینچنے دکر نے لئے تھیں۔ اگر انہیں ذرا بھی سکون اور طمانیت سے سوچنے کا موقع میسر ہو تا تو وہ سوچ سکتے تھے کہ جب انہوں نے ہمیں راہداری سے داخل ہوتے دیکھا تھا تو ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا۔ فونی دم میں نرس ہیڈل ہمارے سو رہی تھی تو پھر ہم وہاں سے یہ قائل انکریے کیوں اٹھا لائے تھے؟ اس قسم کے بیسیوں سوالات ان فونوں میں پیدا ہو سکتے تھے۔

لیکن مجھے معلوم تھا اس قسم کے مونے داغ والے روائتی بد معاش سب سے زیادہ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ آئے والا ہے یا نہ تھا؟ جیسی ہے یا ششما؟ ہارکیوں کی طرف ان کا ذہن ہی نہیں تھا اور اگر جا بھی تھا تو بہت تاخیر کے ساتھ۔

وہ ایک لمحے کے بدلے قائل اور انکریے کی طرف متوجہ نہ ہو ایک لمحہ ہی ہمارے لئے کافی تھا۔ میں نے اور فونی نے وقت انہیں دوڑی لیا۔ میں نے اپنا وہی مخصوص داؤ استعمال کر کے کئی جسم والے کی گردن بازو کے گلے میں جکائی اور گھٹنا کرتے ہوئے اس کا گمن والا بازو اس پر اس طرح مارا کہ اس کا ناکہ زور ٹوٹ گیا۔

اگر اس کی گردن میرے بازو کے گلے میں نہ ہوتی تو یقیناً اس قائل سے ایک کرب ناک جھج برآمد ہوتی۔ گمن اس کے ہاتھ پھٹ کر خاصی زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گری۔ میں نے اسے ٹھوکر مار کر اسی کمرے کے دروازے پر پہنچا دیا جس کے سامنے وہ اٹھ کر آئے تھے۔ کمرے سکوت میں گمن کے گرنے کے پھر فرش پر پھسل کر کچھ دور تک جانے کی آواز بھی خاصی لمبیاں دے رہی ہوئی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ ہند دروازوں کے پیچھے کوئی ایسا مریض جو دوا امت پلے پھرے کے قائل ہو بہتر سے اٹھ کھڑا ہو اور دروازہ

ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹ ہلے اور چہرے کے  
پورے ہلے۔  
میں نے ٹوٹی سے کہا "تھار کچھ کتنا چاہتا ہے۔ اس  
کاٹ دو۔"

بچوں کی وجہ سے تھار کا منہ سختی سے بند تھا لیکن  
کھلوانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے دیر سے لٹی میں  
لیکن ٹوٹی نے اسٹیل کی ٹرے میں سے قیمتی اٹھا کر رخسار  
سے بچوں کا مقلد کاٹ دیا۔

بچے کو اس نے تب بھی حرکت نہ دی اور منہ آ  
رکتے ہوئے بچی آواز میں بولا "چوہدری! مجھے معاف کر  
مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے منہ سے پتلا جلا  
طلب کے سلسلے میں نکلے گا۔ منہ سمجھ کر بولنے کی وجہ۔  
الفاظ ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے تھے تاہم میں نے آ  
میں غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلاکی بے چار  
دیکھ کر مجھے بیش بہا حیرت ہوئی تھی کہ کبھی موت کو سرا  
پر فرعون کے چہرے پر انتہائی لجاجت اور بے چارگی آپ  
قدم قدم پر موت پاٹنے والے موت سے بہت خوف کا  
جب وہ جڑے کھولے ان کی طرف بڑھتی تھی۔

"تم سنا کی سرطے سے گزر آئے ہو تھار رش! "  
سری سانس لے کر کہا "بہت دیر کوئی تم نے لیکن خیر  
جہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو جہیں معاف کر  
ہے لیکن ایک شرط پر۔"

"بولو۔ بولو۔ جلدی کرو۔" وہ بدستور جھپٹے ہوئے بڑ  
ساتھ بولا۔

"ان لوگوں کے نام اور ٹھکانے بتا دو جنہوں نے  
ہدایت پر نیلے اور اس کے ساتھ کلیٹ میں موجود دو عورتوں  
انداز میں قتل کیا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے اس بات کی تردید نہیں کی کہ اس نے ان  
عورتوں کو قتل کرایا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں  
پر کیونکر پوچھا تھا۔ بلکہ اس نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں  
کس طرح ذمہ دار نکالا تھا۔ اسے یقیناً احساس تھا کہ یہ سوال  
ضروری تھے وقت بہت قیمتی تھا اور بات چیت کرنے کے  
سے اہم موضوع کی تھا کہ جاں بخشی کس طرح ہو سکتی ہے؟  
وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے دانتوں کے ساتھ بولا "تو تو  
جو باہر چودے رہے ہیں۔۔۔۔۔"

"چودے رہے تھے۔" میں نے تصدیق کی "مثلاً تھار  
صحیح طور پر کام نہیں کر رہا۔ اگر وہ اس وقت بھی چودے  
ہوئے تو ہم اس کمرے میں کس طرح ہوتے؟ ذرا اور دیر  
نے اس کے سامنے سے بٹتے ہوئے ایک طرف اشارہ  
دروازے کے قریب اس کے دونوں محافظوں کی لائیں پانی

تکھے کے پیچھے سے مجھے ایک گھن کا درد بھی جھانکنا کھائی دیا۔  
میں نے نہایت احتیاط سے اسے نکال کر دیکھا۔ وہ اصفاریہ چارپانچ  
کا ایک شاندار کوٹ رو اور ہوا تھا۔ میں نے اسے بید کے قریب ہی  
رکھی ہوئی کوڑے کی نوکری میں ڈال دیا۔

بید کے قریب ہی ایک اونچی کینٹ پر دو انیس گھوڑوں کی  
ڈرب اسٹیل کی ٹرے میں بچوں کے کئی مدول اور ایک قیمتی ریکی  
تھی۔ میں نے ٹوٹی سے سرگوشی میں بات کی۔ ہم نے بیاں کھول کر  
تین تین چار چار تمیں کر کے ان سے رسی کا کام لیتے ہوئے نہایت  
احتیاط اور آہستگی سے تھار کی کلاہیں اور ٹخنوں کے گرد مقلد بنا تھار  
ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں بید کے پاؤں کے ساتھ باندھ دیئے۔ اس  
دوران وہ بدستور ہمارا انداز میں ہلکی ہلکی سی خراشاہٹ کی ساتھ  
گہری سانسیں لیتا رہا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اور ٹوٹی نے بندشوں کا جائزہ  
لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہایت ہموار سے آہنی بید کے پائپوں سے  
بندھ چکے تھے۔ ہم نے اس کی کلاہیں اور ٹانگوں پر بند نہیں بالکل  
ہلکی ریکی تھیں لیکن ایسی تھیں کہ جو کسی وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا  
بندشیں سخت ہو جاتیں۔

"میرے خیال میں اب اسے جگایا مناسب ہے۔" میں نے  
ٹوٹی سے کہا۔ ٹوٹی نے اس کا کندھا پکڑ کر دھیرے سے ہلایا۔ وہ  
ذرا سا کھسکا لیکن بیدار نہ ہوا۔ تب ٹوٹی نے اسے تقریباً جھنجھوڑ  
ڈالا۔ اس نے تکلیف زدہ سے انداز میں آنکلیں کھول دیں۔

کمرے میں روشنی اور اپنے دائیں بائیں دو اجنبیوں کو کمرے  
دیکھ کر اس کے حواس بیدار ہوئے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس نے  
دایاں ہاتھ اٹھا کر چاہا۔ نہ جانے وہ تکھے کے نیچے سے گھن نکالنا چاہتا  
تھایا اپنے سرانے لگا ہوا وہ گھن دھانچا ہاتھ تھا جس سے نرس وغیرہ کو  
بلا یا جاتا تھا لیکن اس کے بہانے اس کی کلاہی پر بندش سخت ہو گئی۔  
اضطراب سے انداز میں اس نے دوسرا ہاتھ ہلاتا تو اس پر بھی

بندش سخت ہو گئی۔ اس نے غالباً اٹھ کر بیٹھنے کے ارادے سے  
آنکلیں زرا اوپر کرنا چاہیں تو ان پر بھی گہری بندش ہو گئی۔ اب وہ  
چاروں شانے چٹ بالکل بے بس پڑا تھا۔ اپنے آپ کو بے پناہ  
طاقتور سمجھنے والا اس وقت چوبیسے دان میں پھنسے ہوئے چوبیسے کی  
طرح بے بس تھا۔ ستم غریبی یہ تھی کہ اس وقت وہ بول تک نہیں  
سکتا تھا، صحت نہیں سکتا تھا اور کسی کو مدد کے لئے نہیں پکار سکتا تھا۔

صرف اس کی آنکھوں میں ایک خاموش سوال تھا۔ وہ پوچھتا  
چاہتا تھا "تم کون ہو؟" میرے طے کی معمولی سی تبدیلیوں کی وجہ  
سے اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ ٹوٹی تو اس کے لئے تھاری اجنبی۔  
میں نے اپنی آواز پر بے بغیر نہایت گھبرے گھبرے لہجے میں  
کہا "کیسے ہو تھار رش؟ ہم تمہاری عیادت کے لئے آئے ہیں۔"  
اس کی آنکھوں میں یکدم موت کی سی دیرانی پھیل گئی۔ اس  
دیرانی نے مجھے بتا دیا کہ کواڑ کی مدد سے اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

چند الفاظ سے کتنی ہی زندگیاں دردناک انداز میں موت کی آغوش میں سمٹ سکتی ہیں۔

اس کی آنکھوں میں خوف کی گرائیوں میں یہ شکوہ جھلک رہا تھا ”تم نے تو مجھے معافی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میری جاں بخشی کی اس بندھاؤ کی۔ تم نے تو مجھے ایٹھ اے عہد کی امید تھی۔

میں ہنس دیا۔ میری ہنسی میں غبارِ ارادی طور پر ذہر جھلک آیا۔ ”میں وعدے کا پابند انسان ہوں لیکن تم میسوں کے ساتھ نہیں۔“ میں نے فوٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے چشمِ زدن میں اسے نفع کر دیا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تاکہ خرافات کے ساتھ کئی ہوئی کروں سے اٹنے والے خون کے چھینے اس کے ہاتھ یا بازو پر نہ پڑیں۔ اس کا چہرہ بالکل پات تھا۔ محض صرف دو چار سینکڑے کے تڑپا اور سناکت ہو گیا۔ فوٹی نے ہاتھ دوم میں جا کر چاقو دھو کر جھٹک کر اطمینان سے جبب میں رکھا اور ہم سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے۔

فوٹی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا ”صبح کے پانچ بج رہے ہیں سارا“ ”ہاں“ میں نے گہری سانس لے کر کہا ”مجھے امید ہے کہ یہ ایک سانی اور خوب صورت صبح ہوگی۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم رات کا حساب رات میں ہی نشتانے میں کامیاب رہے۔ بس فوٹی سی کمرہ مٹی ہے۔ وہ راکسی سنیما کا فیورٹ نواز۔“

”اسے اب آپ مرہی سمجھیں سارا“ آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔ ”فوٹی نے مجھے اطمینان دلایا اور اگر آپ حکم دیں تو ابھی جا کر اس سے بھی نمٹ آتا ہوں۔“

راہِ ارادی کے کونے پر پہنچ کر ہم نے دیکھا ”فوٹی دوم میں نرس کر سی پر اسی طرح بیٹھی تھی۔ اس کی گردن اب کچھ زیادہ ہی ڈھلک چکی تھی۔ اس کا ایک بازو جو میں نے کرسی کے بچنے پر نکالا تھا اب پیلو میں جھل رہا تھا۔

”شاید آج قین لائیں دریافت ہونے کے بعد یہ نرس بھی اپنی آپ جی لکھے۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے واپس گاڑی تک پہنچے میں ہمیں کوئی دشاری پیش نہیں آئی۔ میں نے فوٹی کو اس کے گھر چھوڑا اور ہدایت کی کہ وہ مجھ سے مستقل رابطہ رکھے اور ہر اہم بات سے مجھے مطلع کرنا رہے۔ گھر پہنچ کر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ میرے اعصاب نے کالی بوجھ برداشت کیا تھا۔ اب میں اپنے آپ کو کچھ ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

خیلہ“ تاہم اور ملازمہ کی دردناک موت کی فطرت کی ابھی میرے دل سے دور نہیں ہوئی تھی۔ ملازمہ بھی تاہم ہی کی طرح

ان کی محسوس بھی ان کے قریب ہی پڑی تھیں۔ اپنے جانکلوں کو مرہو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کے

سانے گہرے ہو گئے۔ پرانے افسوس میں موجود بندوقوں پر تکیہ کرنے والوں اور دوسروں کے ذریعہ بازو کو اپنا سرمایہ سمجھنے والوں کے لئے اس طرح کے نظارے بہت بہت ممکن ہوتے ہیں۔

”دو تہرہ حال یہی تھے“ وہ بولا۔ اب اس کے الفاظ کو سمجھنا اور مشکل ہو گیا تھا ”تیسرا میرے راکسی سنیما کا فیور ہے۔ وہ بھی بہت بڑا بد معاش ہے۔ بظاہر شرافت کی زندگی گزار رہا ہے۔ بس یہی کل تین آدمی تھے جنہوں نے اصل کام انجام دیا تھا۔ چوتھے نے صرف ڈرائیور کے فرائض انجام دیئے تھے۔“

میں نے فوٹی کو مخاطب کیا ”سن لیا تا تم نے؟ راکسی سنیما کا فیور۔ بظاہر شرافت کی زندگی گزار رہا ہے۔ اسے سچے شرافت کی زندگی گزارنے کے قابل بنانا۔“ جنہیں تو معلوم ہی ہے ”اس قسم کے لوگ سب سے زیادہ شرافت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔“ فوٹی نے اثبات میں سر ہلایا اور مختار سے پوچھا ”اس کا نام کیا ہے؟“

”پہر نواز۔“ مختار نے جواب دیا۔

”بس ٹھیک ہے۔“ میں نے غمانیت سے کہا ”تم سے صرف یہی معلومات حاصل کرنا ضروری تھا۔“ پھر میں نے فوٹی کو مخاطب کیا ”مختار صاحب کی بنیاد پہلے کی طرح کس رو۔“

فوٹی نے ٹرے سے تکی لے کر اس کے چہرے کے گرد حلقہ بنادیا۔ میں نے آنکھوں سے آنکھوں میں اشارہ کیا۔ فوٹی نے اس کا سر دھرا دیا اور اٹھاتے ہوئے نہایت چھٹی سے اس کے ہونٹوں پر بھی بنیادیں کیں۔ وہ فوٹو۔۔۔ اور۔۔۔ ہی کرتا رہ گیا۔ ہونٹوں پر بھی تختی سے بنیادیں پست جانے کے بعد اس کی ”اوع اور“ بھی بند ہو گئی تھی لیکن آنکھیں یہی طرح چمک رہی تھیں۔

میرا اشارہ دیکھ کر فوٹی نے اپنا ٹھیکے دار چاقو نکال لیا۔ اس کا پھل سانپ کی زبان کی طرح یکدم باہر آیا مختار اپنی آپریشن کی تکلیف بھل کر گردن داکیں بائیں جتنے لگے۔ اپنے آپ کو بندشوں سے آزاد کرانے کے لئے اس نے ایک بار مجرور لگا دیا لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ ہم نے اسے اس لئے نہیں باندھا تھا کہ وہ آزاد ہونے میں کامیاب ہو جائے۔

میں نے اس پر ہنسنے ہوئے نہایت ملاحت سے کہا ”تمہارے کمرہ گاہ نے جب آخر نہیں بنایا ہو گا کہ انہوں نے تم سے بغاوت کرنے والی خیلہ کو کس طرح ذبح کیا“ اسے بڑا دینے والی عورت کو کس طرح چتر کے ہماری نگہ ان سے کچل کچل کر ہلاک کیا اور ان کی غلامی کے بیٹے میں کس طرح خنجر اُتارنا تو ہمیں یقیناً بہت خوشی ہوئی ہوگی۔ تم نے اپنے آپ پر بہت کچھ محسوس کیا ہو گا کہ بظاہر اس اسپتال کے ایک بہترین لیٹے ہونے کے باوجود تم کتنے طاقتور ہو۔ بظاہر بہت دست و پا ہو پوئی بھی نہیں سکتے لیکن تمہارے لکھے ہوئے

میں ہمارے اس طرح کے تہن ٹھکانے ہیں۔ یہ ان میں سے ایک۔ ایک طرح کا براجم آفس سمجھ لو۔

”خیر وہ جو کچھ بھی تھا مجھے مزعوب کرنے کے لئے توہین تھا۔ میں نے کہا ”تم مطمئن رہو“ میں آج کل سنجیدگی سے مسئلے پر غور کر رہا ہوں کہ تمہاری پیشکش قبول کرنی چاہیے نہیں۔“

”میں کا لفظ تو تم اس معاملے میں نہ ہی استعمال کروا رہے۔“ اس کے لیے میں ایک لٹریٹری سرومی آئی ”تمہیں کے اہم آدمیوں میں سے ایک بننے کی پیشکش کی گئی ہے۔“ مواقع زندگی میں بار بار نہیں آتے اور ہر ایک کی زندگی میں آتے۔“

”مجھے احساس ہے۔ میں نے یہ سب پہلو ذہن میں ہوئے ہیں۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، ہم تمہارے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔“ نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ متعلقہ کر دیا۔ آج اس نے جلدی جھوڑی تھی۔

اس کے ٹیلی فون نے مجھے شکر کر دیا۔ اس مسئلے کا ہم تک کوئی حل تلاش نہیں کیا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہم زندگی میں ان کی پیشکش بھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔

اخبارات سے حلیہ صاحب کی راہی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میری جرئت ان سے اچھی شناسائی ہو چکی تھی اور وزیر کی حیثیت سے وہ حکومتی مشینری کے بہت اہم آدمی تھے۔ رہا تھا کہ ان کے توسط سے حکومت کے کچھ خاص خاص لوگو کوئی خفیہ قسم کی میٹنگ ہو جائے جس میں ”میں تمام تھیلان کے سامنے رکھ دوں۔“

اس طرح میں گویا اپنی ایک قوی ذمہ داری چوری کر اس کے بعد گیند ادیب اختیار کے کورٹ میں چلی جاتی۔ مناسب سمجھتے ”کہتے ہیں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ قوی مفاد و خفاقت کی فکر کریں۔ مجھے ریڈ ڈاٹ کے فوٹو و فیسب سے بچنے کے لئے بھی ان کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تو صرف یہ فکر تھی کہانے جادری تھی کہ ہمارے ملکی نظام کو دہلا کرنے کے ڈاٹ کی بوتلی میں نہ جانے کیا کیا مشروب تھے اور اب تک جانے کیا کچھ کر چکے تھے۔ ملک میں بیڑہ انتشار، درم استحلال، لڑائی جھگڑوں کا جو سلسلہ چل رہا تھا سیاسی نظام جس طرح خوریزی کی زد میں رہتا تھا۔ بات بات پر جس طرح بھائی بھائی خون کے پیاسے رہتے تھے ان سب باتوں کے پیچھے نہ جانے ہم تک ریڈ ڈاٹ کا ہاتھ رہا ہو۔“

پہلے تو ہم یہی دہا دوتے تھے کہ لاس ملک کی خفیہ ایجنسی ہمارے خلاف یہ سازش کر ڈالی، لاس ملک کی خفیہ ایجنسی نے ڈالا لیکن یہ ریڈ ڈاٹ تو خفیہ ایجنسی سے بہت آگے کی چیز تھی

لاوارث اور مصائب کی ستائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بھی ناجاں سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس فلیٹ میں پناہ دی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس فلیٹ میں ہی اس کی موت لکھی تھی۔

اس روز میں آفس نہیں گیا۔ شام ڈھلے تک سوتا رہا۔ شام کو اٹھ کر میں نے ٹیلی فون سے شلک ریکارڈنگ سسٹم پر اپنے ساتھیوں کی رپورٹیں سنیں۔ پھر ان سے رابطہ قائم کر کے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ اخبارات دیکھے اور باہر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ میں گھر سے نکلتے ہی والا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے جو نہی ریڈیو اشکارا چلو کہا ”دوسری طرف سے ایک چلتی آواز سنائی دی“ کیا حال ہے چوہری ڈیڑھ؟“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ایڈم عرف ایڈی تھا۔ میرے گہری سانس لینے کی آواز اس نے بھی سن لی۔ بڑی محبت سے بولا ”کیا بات ہے“ اتنی لمبائی سانس کیوں لے رہے ہو میری آواز سن کر؟“

”کافی دنوں سے تمہاری طرف سے سکوت تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا شاید جنم رسید ہو گئے ہو مگر آج کل کہیں سے کوئی اچھی خبر سننے کو نہیں مل رہی۔“ میں نے کہا۔

”اچھی خبر تو ہم تمہارے لئے لے کر بیٹھے ہوئے ہیں چند! لیکن تم اسے سننے میں دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔“ وہ شفقت سے بولا ”ہماری طرف سے سکوت بھی اسی لئے تھا کہ ہم نے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑا ہوا تھا۔ ہم چاہ رہے ہیں تم جو فیصلہ کرو بہت اچھی طرح دیکھو کی سے سوچ سمجھ کر کرو۔“

”لیکن ابھی تو تمہاری دی ہوئی مسلت کے بہت دن باقی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ وہ تو ہمیں بہت اچھی طرح یاد ہے۔ ہمارے ہاں تو ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی ڈیڈ لائن مقرر ہوتی ہے جبکہ تمہارا معاملہ تو بہت اہم ہے۔ ہم نے تمہارا جواب سننے کے لئے جو آخری دن مقرر کر رکھا ہے، اسے آخری ہی سمجھنا۔ تمہیں جو مسلت ملی ہوئی ہے اس میں توسیع کی امید مت رکھنا۔“

”بہت بہتر خنخور والا! میں نے لمبائی سانس لے کر کہا۔

”لیکن چننی مسلت ملی ہوئی ہے اس میں تو ہمیں سے رہنے دو۔“

”میں نے سوچا یاد دہانی کراتے رہنا چاہئے۔“ ایڈی بولا۔

”کہیں تم اب بھی اس معاملے کو مذاق میں لانے کی کوشش نہ کرو۔“

”میری یہ مجال کہاں۔“ میں نے کہا ”اب تو میں نے تمہارا بیڑہ آفس دیکھ لیا ہے۔ ہاں دن سے ملاقات ہو گئی ہے، دوسرے اہم لوگوں کے ورژن بھی ہو گئے ہیں۔ اب تو مجھے سمجیدہ ہوتا ہی پڑے گا۔“

”وہ ہمارا ہیڈ آفس نہیں تھا ہے وقوف!“ ایڈی ہنسا ”بیڑہ آفس پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ تو کسی اور ملک میں ہے۔ پاکستان

ایجنسیوں کی ایسی ایجنسی تھی جس کے پیچھے تمام اشتعالی  
ملکوں کے دس سال تھے اور تمام جھوٹے ملکوں کو بڑپ  
لے جانے پر ان کا اتفاق رائے تھا۔ نہ جانے پلے کے نیچے سے کتنا  
بڑا بڑا چکا تھا اور ہم محض اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مار رہے

تھے۔  
بہت دیر تک خیالات میں گم رہنے کے بعد میں نے نذیر خان  
نیرزا مل گیا۔ وہ مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ میں نے اس سے کہہ رکھا  
تاکہ جوں ہی غیر ممالک کے دورے سے حنیف صاحب کی واپسی کی  
کوئی خبر ملے وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔

میری آواز سن کر وہ بولا "چودری صاحب! میں آپ کو فون  
کرتے کا سوچ رہا تھا۔ حنیف صاحب آج ہی واپس آئے ہیں۔  
میں اور اس وقت اسلام آباد میں اپنی سرکاری رہائش گاہ پر ہیں۔  
میں ان سے بات نہیں ہو سکی اس لئے مجھے ان کا صبح پر وگرام تو  
میں معلوم لیکن ان کے لپاے سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ  
اب غاصبہ واپس پاکستان میں گزرا ہیں گے۔ آپ چاہیں تو ابھی ان  
سے بات کر لیں۔ ان کے فون نمبر وہ تو آپ کے پاس ہیں۔ اب  
پ کا نام بھی ان کے خاص شاخسوں میں شامل ہے۔ آپ کو ان  
سے رابطہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

"میرا خیال ہے ابھی ان کو ذمت نہ دی جائے۔" میں نے  
ایک لمحے سوچ کر کہا "وہ بہت لمبے دورے سے واپس آئے ہیں۔  
نہج رات انہیں آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں کل ان سے  
رابطہ قائم کروں گا۔"

"کل سے تو شاید وہ کافی مصروف ہو جائیں۔" نذیر خان بولا۔  
حنیف صاحب جب دورے سے واپس آتے ہیں تو دوسرے دن  
سے میرا ان کی مصروفیت شروع ہو جاتی ہے۔ ان سے بات کرنے  
کا بہتر موقع آج ہی ہے۔"

"ابھا ٹھیک ہے، جیسے آپ کا مشورہ۔" میں نے کہا "میں آج  
یہ بات کرتا ہوں۔"

میں نے نذیر خان کا شکریہ ادا کر کے سلسلہ مطلق کر دیا اور  
اسلام آباد میں حنیف صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے  
لگا۔ چند منٹ بعد آخر کار ان کے پرسنل سیکرٹری کے توسط سے ان  
سے رابطہ قائم ہوا۔

"سرا! معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو آرام کا سونچا ہے لیکن  
ذمت دے رہا ہوں۔" میں نے ان کی آواز سن کر اپنا نام بتانے  
کے بعد کہا "منا ہے آپ کچھ ہی دیر پہلے واپس آئے ہیں۔"  
"معذرت و نیرو کو چھوڑو۔ کوئی خاص ہی بات ہوگی جو تم اس  
طرح میری تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔" وہ خوشگوار لہجے میں  
بولے "اس لئے شکلات کو چھوڑا اور بات کو غیریت تو ہے؟"  
"تجارت نہیں ہے سرا میری آپ سے فوری ملاقات ضروری  
ہے۔"

"ایک ہفتے تک تو میرا شیڈول بہت ٹائٹ ہے برقرار رہا؟"  
منا بہت سے بولے "کل میری پرائم فشر سے ملاقات ملے ہے اور  
پرسنل پریذیڈنٹ سے۔ اس کے بعد ہی آج کیوں ایک میٹنگ ہے  
جو شاید دو یا تین دن پہلے پھر کچھ سفیروں سے ملاقاتیں ہیں۔ میں  
جو طویل دورہ کر کے آیا ہوں یہ سب ملاقاتیں اسی سلسلے کی کڑی  
ہیں۔ ان ملاقاتوں کے لئے مجھے کچھ رپورٹیں بھی تیار کرنی ہیں۔  
میری پوری فشری اس وقت بے پناہ مصروف ہے۔ عام لوگوں کو تو  
میں تاثر دیتا ہے کہ وزیر خارجہ کو شاید ملکوں ملکوں کی سرکھانے کے  
علاوہ کوئی کام نہیں ہوتے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ قریبی پڑیر  
ملکوں کے وزرائے خارجہ عموماً بڑے مصروف رہتے ہیں۔ عموماً  
انہیں کوئی نہ کوئی بھگدڑ پڑی رہتی ہے اور اگر خدا نخواستہ کوئی  
بحران آجڑے پھر تو انہیں سرکھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ پارسے  
سال میں ہمیں بہت کم دن فرصت کے نصیب ہوئے ہیں۔" وہ پھر  
ارادہ سے انداز میں اب اردو سے انگریزی پڑا آگئے تھے۔  
"تک تک آپ اسی طرح مصروف رہیں گے؟" میں نے

پوچھا۔

"کم از کم پندرہ دن تو یہی عالم رہے گا۔" وہ بولے۔  
"نہایت تاخیر ہو جائے گی سرا!" میں نے کمری سنجیدگی سے کہا  
"اس لئے کہ آپ کو صرف مجھ سے میٹنگ نہیں کرنی ہے بلکہ شاید  
اس کے بعد بھی کچھ میٹنگوں کا بندوبست کرنا پڑے۔"

"بات کیا ہے افضل زیر؟ تم بہت سنجیدہ معلوم ہوتے ہو۔"  
"میں سرا میں واقعی بہت سنجیدہ ہوں لیکن بات فون پر نہیں  
بتائی جا سکتی۔ بات بہت اہم بھی ہے اور تفصیل طلب بھی۔ اپنے  
اس ٹیلی فون نمبر کو میں کافی محفوظ سمجھتا ہوں پھر بھی احتیاط برتن  
چاہتا ہوں۔"

"تم بہت پراسرار ہو رہے ہو افضل زیر!" وہ شاید سوچ میں  
پڑ گئے تھے۔ "میں اپنی مصروفیات کے درمیان ہی تم سے تفصیلی  
بات چیت کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت تو نکال لوں گا لیکن مسئلہ  
یہ ہے کہ میں اسلام آباد سے مل نہیں سکتا۔"

"آپ صرف ملاقات کے لئے نسلی بخش وقت نکالے؟" اسلام  
آباد تو میں خود آجائوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا "اور یہ کام جتنی  
جلدی ہو سکے اتنی جلدی ہے۔"

"بھئی! کچھ اشارہ تو دو کہ مسئلے کا تعلق ہماری ذات سے ہے  
یا میری ذات سے؟" وہ اب اپنے لہجے کا جتنس چھپانے لگے۔  
"نہ آپ کی ذات سے اور نہ ہی میری ذات سے۔ مسئلے کا  
تعلق پورے ملک کی سلامتی سے ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔" وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے پھر انہوں نے  
اپنے لہجے میں گنگنی لگنے کی کوشش کی "کوئی اسی قسم کا ڈراما ہے  
جیسا میرے ساتھ کراچی میں ہوا تھا؟"  
"سرا کیا وہ ڈراما تھا؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے "انا انہی



سے سوال کر دیا۔

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہے پھر بولے ”نہیں۔ یہ بات تو نہیں۔“

”بس یوں سمجھ لیجئے کہ اب اس سے ہزاروں بلکہ لاکھوں گنا زیادہ اہم بات ہے۔“ میں نے کہا ”مسئلہ یہ ہے کہ حکومتی مطلقوں میں آپ جتنی اہمیت رکھتے والے کسی اور شخص سے میری اس حد تک شناسائی نہیں ہے کہ میں جو کچھ کہوں، وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر سکتے بات آپ ہی کے لیل کی شخصیت کے ذریعے آگے بڑھ سکے گی۔“

”تمہیں یہ خوش فہمی کیونکر ہوئی کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات پر یقین کر لوں گا؟“ انہوں نے تجھے لمبے میں پوچھا۔

”مجھے اس امید پر تو رہنے دیں، آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ ایک لمحے سوچ کر بولے ”تم کل کی کسی فلاٹ سے اسلام آباد پہنچ کر رات کو آٹھ بجے میرے گھر آجائے۔“

”نہیں سوسہ۔ میرا مطلب ہے میں اسلام آباد تو پہنچ جاؤں گا لیکن ملاقات آپ کی سرکاری رہائش پر نہیں ہونی چاہئے۔ میں وہاں نہیں آسکوں گا۔ مجھے اپنی سرگرمیوں میں نمائندگی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ملاقات کے لئے کسی قطعی غیر سرکاری جگہ کا انتخاب کیجئے اور میری درخواست ہے کہ وہاں پہنچنے کے لئے بھی آپ قطعاً کوئی سرکاری قسم کا اہتمام نہیں کیجئے گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک کر بولے۔

”مطلب یہ کہ آپ سرکاری گاڑی میں مت آئیے گا۔ آپ کے ساتھ باوردی گاڑی یا پولیس والے نہیں ہونے چاہئیں۔ گاڑی اگر ہوں بھی تو سادہ لباس میں ہوں اور ظاہری طور پر مسلح نہ ہوں۔“

”بھئی تم نے تو یہ عجیب سی کام شروع کر دیا یعنی مجھے ہدایات دینی شروع کر دیں۔“ وہ کچھ پریشان ہو کر بولے ”میرا مکمل رد و قبول کے بغیر کیسے آنا جانا بہت مشکل ہوتا ہے اور اس قسم کی ہدایات پر عمل کرنا تو میرے لئے بہت ہی مشکل ہو گا۔“

”خیر۔ اب یہ اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے سوا صرف ذرا ہدایات سے بچنے کی بات ہے۔ ملک اور قوم کے لئے کیا آپ اتنی سی زحمت بھی نہیں کر سکتے؟“

”ملک اور قوم کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے۔“ وہ ہر خیال لیجے میں بولے ”لیکن میری پوزیشن کچھ ایسی ہے۔۔۔

فحشاً آج کل حالات ایسے ہیں کہ قدم قدم پر کسی سازش کا حذر کا لگ رہا ہے۔“

”سراپا میں بھی آپ کے خلاف کسی سازش میں آلودہ کار بن سکتا ہوں؟“ میں نے مجروح لیجے میں پوچھا۔ درحقیقت اس وقت

ایک لمحے کے لئے میرا بھی دل چاہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ دھواں بھول بھال جاؤں۔ ریڈ وائٹ کے خیال کو بھی بھاڑ میں جمو گول۔ یہ کچھ وہ کرنا چاہتی تھی یا کر سکتی تھی اسے کہنے والے۔ میرے انداز پر اس کا جو رد و عمل ہو اس کے سلسلے میں بھی اپنے آپ کو تیار۔ نقد پر چھوڑ دوں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اب تو دل میں مجھے وطن سے محبت کا دعویٰ ہو چلا تھا۔ اب تو میں نے اپنے

آپ کو ان دہان پرستوں میں شمار کرنا شروع کر دیا تھا جو اس قوم کی بہتری، ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے اس خواب

کو تعمیر ملنے کی امید بھی پیدا ہو سکتی تھی جب اس ملک میں کسی نظام کو پہنچے کسی قطعی قیادت کو یا اس مضبوط کرنے کا موقع ملے۔

اور ایسا موقع بھی مل سکتا تھا جب ملک کو بین الاقوامی سازشوں کے جنجال سے نکلنے کی صلت ملتی۔ بہت سے ہزاروں تیار

جو لیڈری کے رنگ رنگ لہاؤے ہیں کہ اس قوم کی گردن پر سوار تھے وہ اسے کبھی سکون کا سانس لینے کا موقع دیتے۔ تعلیم عام ہو

لوگوں میں انانہ برا بھلا کہنے کا شعور پیدا ہو۔

اسنے عظیم مقاصد کے لئے قومیت ہی باقی بنی پڑتی ہیں۔ بہت سے جگہ کے سنا پڑتے ہیں۔ اگر حنیف صاحب کے لیجے میں کچھ

ٹھیک تھا تو کیا یا وہ حد سے زیادہ احتیاط پسندی کا مظاہرہ کر رہے تھے تو مجھے اس پر عمل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اگر میں ابھی سے

رجحیدہ خاطر ہو جاؤ تو کوئی بڑی خدمت کہاں انجام دے سکتا تھا۔ لیکن اسی لمحے حنیف صاحب بول اٹھے ”تمہیں میری بات سے

ظلم نہیں میں جتنا نہیں ہونا چاہئے میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ تم میرے خلاف سازش میں آلودہ کار بن سکتے ہو۔ تم تو میری جان بچ

چکے ہو، میرے خلاف ایک بڑی سازش کو ناکام بنا چکے ہو۔ میں تمہارے بارے میں بھلا ایسی بات سوچ سکتا ہوں اسحق کیس

کے؟“ انہوں نے پیار بھرے انداز میں مجھے ڈانٹا اور میرے دل سے افسردگی کی لہر یکدم دور ہو گئی۔ میری سوچ خواہ خواہ ہی ظلمت

میں ٹھنک گئی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے ”مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے سینے میں وطن سے محبت کرنے والا دل دھڑکتا ہے۔

میں تو اصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ بین الاقوامی سازشوں کو سمجھنے کے لئے تمہارے وسائل بہت کم ہیں۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ بین

الاقوامی سازشوں کے لئے ہانے کس طرح بنے جاتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ کیسے نادان تنگی میں تم خود کسی سازش کی لپیٹ میں نہ

آجائے۔ کوئی تمہیں استعمال نہ کر جائے۔“

مجھے ہنسی آتے آتے ہو گئی۔ کیاستم ظریفی تھی اور مجھے بے خبر کچھ رہے تھے جبکہ میرے خیال میں وہ خود لاعلم تھے۔ وہ سازشوں کی

کڑیاں تلاش کرنے نہ جانے کہاں کہاں بھاگے پھرتے تھے۔ کون کون سے ذرائع استعمال کرتے تھے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا

ہی ایک ملک میں، میں حکومت الی فاکر سے بچے کیا ہوا تھا۔  
 آپ مطمئن رہیں۔" میں نے کہا "فی الحال تو میں کسی  
 سے بچنے کے لئے آپ سے خفیہ ملاقات رکھ رہا ہوں۔  
 آپ میری پہلی رام کمانی سن لیجئے اس کے بعد اگر آپ  
 کریں کہ میں کسی سازش میں اشتغال ہوں تو آپ بات  
 فوری کر دیجئے گا۔ کوئی عملی قدم مت اٹھائیے گا۔"

میرا خیر ٹھیک ہے۔ کل رات آٹھ بجے ملاقات تو رکھ لیجئے  
 کر سکیں گے۔ "دو بولے" لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا  
 اوقات کے لئے جی قسم کی جگہ کون سی منتخب کی جائے میری  
 کا تو انداز ہی کچھ ایسا بن گیا ہے کہ یاد ہی نہیں آتا "اسلام  
 میں ہر امر کو فی غیر سرکاری اور قائل احمد قسم کا دوست یا شناسا  
 کی بات نہیں؟"

مگر آپ پسند کریں تو جگہ میں بتا دوں؟ میں نے کہا۔  
 یہ وہاں کا دبا دباؤ دوست بھی ہیں۔ ایک کوٹھی میں میرا بزنس  
 بھی ہے۔ کوئی بھی جگہ رکھی جاسکتی ہے۔  
 "نہیں۔ جگہ میں ہی منتخب کروں گا تاکہ مجھے سولت رہے۔  
 یہ کبھی ہماری جگہ ہونی چاہئے۔ مجھے چند ٹینک سوچنے دو۔"  
 "میں ان سے سوچنے" میں نے کہا اور غامض ہو گیا۔

چند لمبے بعد وہ بولے "میرا طالب علمی کے زمانے کا ایک  
 ت ہے۔ ایک بڑی بڑول اب بھی ہے اس کی۔ بڑے آفس اسلام  
 میں ہے۔ وہ غاصب اور دیش سا آدمی ہے۔ سیاسی معاملات سے  
 سب سے ناگزیر ہے اس کے بچنے پر ملاقات مناسب رہے گی۔"

"ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس ملاقات کے  
 دن کوئی تیسرا فرد موجود نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی تیسرا فرد  
 خود بھی ہوا تو وہ صرف مذہب خان ہوگا اس کے علاوہ کوئی نہیں۔  
 اگلی میں نے اسے بھی لانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ زیادہ امکان ہی  
 کہ میں تنہا ہی آؤں گا۔"

"فی فی الحال تو جس معلوم ی ہے کہ معاملہ کیا ہے۔ اس  
 خود ہی فیصلہ کرتے رہو کہ کیا احتیاط کرنی ہے کیا نہیں؟ کسے  
 تھا لائے؟ کسے نہیں۔ میں تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔" وہ بولے۔  
 "میں ایسا کہہ کر میرے دوست مرزا اکبر تیموری کے بچنے کا خون خیر  
 اور انہیں وغیرہ نوٹ کروں۔ کل ٹھیک آٹھ بجے میں وہاں پہنچ  
 وں گا۔"

انہوں نے ایڈریس مجھے نوٹ کر لیا اور ہم نے ایک دوسرے  
 وقت حافظہ کے سلسلہ منتقل کر دیا۔ اس کے چند منٹ بعد ہی  
 میں نے اپنے بڑول ایڈیٹ کو فون کر کے دوسرے روز کی کسی تلاش  
 میں بیٹ بک کرانے کی ہدایت کی پھر اپنی طے شدہ مصروفیات کے  
 مطابق باہر نکل گیا۔

دوسرے روز شام سے پہلے میں اسلام آباد پہنچ چکا تھا۔ میں  
 نے ایک ہوٹل میں سوئٹ بک کر لیا تھا۔ رات کو مجھے دین قیام

کرنا تھا۔ اسلام آباد میں میرا قیام طویل بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا  
 انحصار حنیف صاحب کے مؤعمل پر تھا۔ رات تک مجھے جو قاضی  
 وقت میرا تھا اس میں میں نے اپنے اسلام آباد آفس کا جائزہ لے  
 لیا اور وہاں سے اپنے اشتغال کے لئے گاڑی بھی لے لی۔

رات کو میں مرزا اکبر تیموری کا گھر تلاش کرنا ہوا آخر کار ان  
 کے گیٹ پر پہنچا تو ایک ملازم گیٹ پر ہی کھڑا تھا۔ میں نے گاڑی  
 گیٹ پر روکی اور حلاشی سے انداز میں پچھلے گاڑی کا نمبر دیکھا تو ملازم خود  
 ہی آگے بڑھ کر بولا "آپ کا نام محمد افضل چوہدری ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ گیٹ کھولتے ہوئے بولا  
 "آپ امیر تشریف رکھتے، حنیف صاحب آتے ہی ہوں گے۔"

میں گاڑی بوسٹ میں روکنے کی جگہ تلاش کرتے ہی ایک اور  
 گاڑی وہاں آن رکی۔ وہ سفید رنگ کی ایک عام سی گاڑی تھی۔  
 حنیف صاحب چہرے پر کجیر خمیدگی لئے گاڑی سے اترے۔ ان کا  
 لباس بھی سفید ہی تھا۔ ان کے ساتھ دو افراد اور گاڑی سے  
 اترے۔ وہ بھی سفید لباس میں ہی تھے۔ سرکاری لوگ محتاج  
 اپنی شناخت چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہر چیز سفید رنگ کی  
 اشتغال کرنے لگتے ہیں جو بجائے خود ایک شناخت بن جاتی ہے۔

حنیف صاحب کا ڈرائیور بھی سفید شلوار قمیض میں تھا۔  
 ڈرائیور کے علاوہ جو دو آدمی حنیف صاحب کے ساتھ نظر آ رہے  
 تھے وہ ان کے مخالف معلوم ہوتے تھے تاہم ظاہری طور پر ان کے  
 پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آتا تھا۔

حنیف صاحب خاص گرجوٹی سے مجھ سے ملے۔ انہوں نے  
 بتایا کہ مرزا اکبر تیموری خود اسلام آباد میں نہیں تھے ملک سے باہر  
 گئے ہوئے تھے لیکن ان کا گھر حنیف صاحب کے لئے اپنے گھر کی  
 طرح ہی تھا۔

میں امیر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ حنیف صاحب کے مخالف  
 باہر لان پر ہی رہے۔ چائے وغیرہ کا دور چل چکا تو حنیف صاحب نیا  
 سگار سلگانے کے بعد جسم کو ویلا چھوڑ کر بیٹھے ہوئے بولے "ہاں  
 اب بتاؤ، تم نے کس سلسلے میں اپنی پراسراریت پھیلانی ہوئی ہے؟"  
 "سر! آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصہ قبل آپ کو گل کرنے کی  
 سازش کی گئی تھی۔ میں نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ  
 بات کہاں سے شروع کر دوں۔"

"کیا امتحان سوال ہے۔ مجھے بھلا کیوں یاد نہیں ہوگا۔" وہ  
 حیرت سے بولے "کسی کو گل کرنے کی گئی ہو تو کیا چند دن  
 بعد وہ اس بات کو بھول جائے گا؟"

"یہ تو میں محض تنہید باعث رہا تھا اور میری گرامر زیادہ اچھی  
 نہیں ہے سر!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بعض اوقات غیر  
 ضروری الفاظ سے گل جاتے ہیں۔"

وہ کچھ چند دن کی شناسائی کے بعد ہی مجھے خاصی اپنا بیت سے  
 "برخوردار" کہنے لگے تھے اور ان کے انداز گفتگو میں ایک بزرگات

شفقت ہوتی تھی اس لئے اب مجھے ان کی ہلکی چٹکی ڈانٹ ہی گئے  
کے بجائے اب بھی گتھی تھی۔  
”میرا وقت بہت قیمتی ہے اس لئے صرف ضروری الفاظ  
استعمال کرو۔“ وہ گرمی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے  
بولے۔

”میں نے اس وقت آپ کو ریڈ ڈاٹ نامی حکیم کے بارے  
میں مختصر بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے دوسراں کے ذریعے ہی  
ان سے نشست لوں گا لیکن اب مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ یہ تو بہت  
ی لبا معاملہ ہے۔ میں اب آپ کو شروع سے اس وقت تک کی  
تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں ملے کر  
ہو گا کہ اس مسئلے میں کیا کیا جائے۔ ایک بہت بڑا خطرہ ہمارے سر  
منڈلا رہا ہے۔ سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہمارے ملک کو  
درپیش ہے۔ بلکہ صرف ہمارے ملک کو ہی نہیں، تمام پسماندہ اور  
ترقی پذیر ملکوں کو۔ لیکن ہمیں تو چاہئے کہ اپنے مسائل سے غمناکی  
مشکل رہتا ہے اس لئے میں صرف اپنی ہی بات کروں گا۔“

پھر میں نے انہیں شروع سے آخر تک تمام واقعات سنانے کے  
کس طرح ریڈ ڈاٹ والے میری طرف اور پھر میں ان کی طرف  
متوجہ ہوا تھا۔ کس طرح ایک عرصے تک انہوں نے مجھے الجھن میں  
جھلا رکھا تھا پھر دیر سے دیر سے سامنے آئے تھے۔ ان کی سائنسی  
ترقی اور دوسراں کا کیا عالم تھا۔ پھر کس طرح انہوں نے اپنا مقصد  
مجھ پر واضح کیا تھا اور کیا دھمکی دی تھی۔ میں نے انہیں بلیک باکس  
میں سے نکلنے والی بڑے بڑے رہنماؤں افراد کی فہرست اور رہنماؤں  
ڈی آئی جی احمد شجاع والے واقعے کے بارے میں بھی بتایا۔

یہ تمام واقعات تفصیل سے ان کے گوش گزار کرنے میں  
خاصا وقت لگ گیا۔ اس دوران حنیف صاحب بالکل خاموش بیٹھے  
رہے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی ان کے  
چہرے پر پہچنے ہوئے اطمینان اور فہم اڑ میں کوئی فرق آیا۔ البتہ اتنا  
ضرور ہوا کہ اس دوران وہ سگار کے کش معمول سے کچھ زیادہ تیزی  
سے لیتے رہے۔

آخر میں ”میں نے کہا“ مجھے انہوں نے جو مصلحت دی تھی ”اس  
میں صرف دو پہنچے پائی گئے تھے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے افکار کی  
صورت میں میری جان کو خطرہ لاحق ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ  
اس قسم کی تنظیموں میں داخل ہونے کا راستہ ہو آجے لیکن وہاں کی  
کوئی راستہ نہیں ہو گا۔ مگر مجھے اس خوف نے ان کی پچکشی قبول  
کرنے سے باز نہیں رکھا۔ ان کی پچکشی میں بلاشبہ کشش بہت  
تھی۔ ہماری دوسراں میں ہی تو چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے لوگ  
دین ایمان، ضمیر اور وطن، سب کا سودا کر لیتے ہیں۔ انہوں نے تو  
مجھے کنگ بیکر قسم کی چیز بنانے کی پچکشی کی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ  
صرف دان نہیں پیچیدہ رہے، وہ واقعی ایسا کر کے دکھانے لگے ہیں۔  
اس کے باوجود میں نہیں چھٹا۔ میں کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں

لیکن میری خواہشوں پر وطن کی محبت غالب آگئی۔ میں ان  
ہدایات کی خلاف ورزی کر کے اپنے لئے زبردست خطرات  
لے رہا ہوں لیکن مجھے ان کی زیادہ فکر نہیں ہے۔ فکر مجھے  
خطرات کی ہے جو نہ جانے کن کن کوئے کھد ہوں سے اس ملک  
طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم جو کچھ ہیں اسی ملک کے دم سے ہیں۔  
مجھے احساس ہوا کہ بات کرتے کرتے میں خاصا جذباتی  
تھا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں  
طرح کے جذبات اس شدت کے ساتھ موجود تھے۔ میں یک  
ای خاموش ہو گیا۔

حنیف صاحب بدستور خاموش تھے۔ مجھے ان کی خاموشی  
وقت بہت طویل محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک تک میری طرف  
رہے تھے لیکن آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان کا ذہن کبھی اور  
آخر کار ان کا سگار ان کی آنکھوں کو جلائے گا تب وہ چمکے  
انہوں نے سگار کو اٹھائیں ٹرے میں ملا اور باکس سے نیا سگار  
سامنے پائی پر رکھ لیا لیکن اسے سٹکایا نہیں۔

لائن کو آنکھوں میں کھمکاتے ہوئے وہ بولے ”تم نے تو عجیب  
کمانی ستاری ہے فیئر اٹھل اٹھلا کہ تم میری نظر میں اب  
قابل اعتبار آدمی ہو“ اس کے باوجود اس پر یقین کرنے کوئی  
چاہہ نہ۔“

”میں جب آپ کو آپ کے قتل کی سازش سے آگاہ کرنے  
تھا اس وقت بھی آپ نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔  
سازش پر عمل ہوتے آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ کو  
بھی گمان نہیں تھا کہ ایک سانپ میں آپ کی اپنی آستین  
موجود تھا۔“

”وہ تو پھر بھی اتنا بڑا اور گہیر معاملہ نہیں تھا۔ میں نے قیامت  
کچھ دیر اپنے فکروں و شبہات اور سوالات سے بچ کر کے  
آخر کار دل میں دل میں تمہاری بات پر یقین کر لیا تھا لیکن یہ سہ  
کچھ تو خیال و خواب کی باتیں لگ رہی ہیں۔“

”مگر میں خود ان تجربات سے نہ گزرا ہوتا تو میں بھی انہیں  
خیال و خواب ہی کی باتیں سمجھتا۔“ میں نے کہا۔

”اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا“ تو عجیب سوال  
نے آپ نے ظاہر ہے ”میں چاہتا ہوں کہ اس حکیم اور اس  
مزاحم کا سدباب کیا جائے۔ کم از کم ہمارے ملک کی حد تک اس  
سے بچاؤ کی تدبیریں ہونی چاہئیں۔ میرا تھکا تو بہت کام ہے۔  
ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں نہ صرف ان کی پچکشی قبول  
کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ ان کی بچ کچی کے لئے حکومت  
نہ اکر ات بھی کرتا پھر رہا ہوں تو نہ جانے ان کا رد عمل کیا ہو۔“  
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حنیف صاحب بولے ”ملک کے  
خلاف اس قسم کی سازشوں سے خیر ایجنسیاں بے خبر نہیں

مینٹنگ کا انتظام کرنے میں مجھ جیسے آدمی کو بھی دو چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔ "حفیظ صاحب بولے۔

"چلیں دو چار دن میں بھی انتظام ہو جائے تو قیمت ہے۔ ہمیں نے کہا جس اس دوران واپس لاہور چلا جاتا ہوں۔ جب انتظام ہو جائے تو آپ مجھے اطلاع دے دیتے گا۔ میں دوبارہ اسلام آباد آ جاؤں گا ویسے اگر مینٹنگ لاہور میں ہی منتقل کی جاسکتی ہو تو زیادہ اچھا ہے۔"

"مرکز کی خیرہ ایجنسیوں کے ہیڈ آفس تو اسلام آباد ہی میں ہیں لیکن مینٹنگ بہر حال لاہور میں بھی منتقل کی جاسکتی ہے۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" وہ کہہ سوچتے ہوئے بولے "اصل مسئلہ میرے لئے اپنی مصروفیات کو الٹے بٹ کرنا ہے۔ خیرہ دیکھتے ہیں کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"انتظامات مکمل ہو جائیں تو آپ مجھے فون پر اطلاع دے دیجئے گا لیکن فون صرف "حفیظ" کے نام سے کیجئے گا۔ اپنی سرکاری حیثیت میں نہیں۔ ہمیں نے درخواست کی کہ اس کے علاوہ مینٹنگ کا انتظام بھی کسی عام سی فنی جگہ پر ہونا چاہئے۔ جیسے یہ بنگلہ ہے۔ اسی طرح کسی عام سے فوری کامکان ہو تو اچھا ہے۔"

"اب میں صورت حال کو سمجھ رہا ہوں۔ اب مجھے یہ باتیں سمجھانے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کہا۔ وہ اب بھی اپنے خیالوں میں الجھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے ان سے اجازت طلب کی اور اسی رات اسلام آباد سے واپس آ گیا۔ دو دن معمول کی مصروفیتوں میں گزار گئے۔ اس دوران شہر کے مختلف حصوں میں لڑائی جھگڑوں اور حادثات دھماکوں میں ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی لاشیں بھی دریافت ہو چکی تھیں جنہیں بارے ہاتھوں مرے تھے۔ فنی نے راکسی سنیما کے غیر باؤ لڈز کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔ پولیس ٹاک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے سمت سے معاملات کی طرح کچھ عرصے بعد یہ معاملات بھی داخل دفتر ہو جائیں گے۔

اخبار میں عیار رنچ کے قتل کی خبر پڑ کر طہم نے خامیے کھائی سے انداز میں مجھے فون کیا تھا۔ وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ یہ میری ہی کام تھا لیکن میں نے بات ہی گول کر دی اور اس موضوع پر بات نہیں کی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں فون پر اس سلسلے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ ملاقات کی ابھی تک نوبت نہیں آئی تھی۔

میرے روز حفیظ صاحب کا فون آیا۔ دوسری سلام دعا کے بعد بلا تمہید بولے "جس لاہور سے ہی بولی رہا ہوں۔ تمام انتظامات ہو گئے ہیں۔ ایڈریس نوٹ کر لو، کل ٹھیک دو بجے ہمیں یہاں پہنچنا ہے۔"

میں نے ایڈریس نوٹ کر لیا اور انہوں نے مزید کوئی بات نیکی بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

ستیں۔ وہ عام طور پر وزارت داخلہ کو مطلع کرتی ہیں۔ وزارت داخلہ اس کی نوعیت کے حساب سے وزارت دفاع، انتظامیہ، فوج یا پولیس وغیرہ کو الرٹ کرتی ہے۔ میرے مجھے یعنی وزارت خارجہ کا اس قسم کے معاملات سے ڈائریکٹ تعلق تو نہیں تھا لیکن ان ڈائریکٹ تعلق ضرور تھا ہے۔ یعنی مجھے اس لئے خبردار رکھا جاتا ہے کہ جو لگ اس قسم کی سازشوں میں ملوث ہوں، ان کے دورے کرتے وقت یا ان سے ملاقات کرتے وقت میں یہ بات ذہن میں رکھوں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مجھے آج تک اس قسم کی کوئی اطلاع ہوئی اشدہ تک نہیں ملا۔"

"کیا آپ کو میری رام کہانی سے اندازہ نہیں ہوا کہ ہماری خیرہ ایجنسیوں کو ابھی اس معاملے کی ہوا تک نہیں لگی ہے؟" میں نے کہا۔

"میری چیز تو مجھے تقریباً ناممکن نظر آ رہی ہے۔" حفیظ صاحب بولے "بہر حال میں اس بحث میں پڑے بغیر اپنی ہی کوششیں کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن تمہی بتاؤ، تمہا کماں سے کیا جائے؟"

"سب سے پہلے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ نہایت رازداری سے ہماری دو تین خاص خاص خیرہ ایجنسیوں کی ایک مینٹنگ بلائی جائے جس میں صرف ان ایجنسیوں کے سربراہ اور ان کے ایک ایک دو دو خاص ماتحت شریک ہوں اور وہ سب کے سب نہایت مجروسے کے لوگ ہوں۔ ان کا ریکارڈ قطعی بے دروغ ہو۔" میں نے کہا۔

حفیظ صاحب مہیا نہ انداز میں مسکرا دیے اور بولے "خیرہ ایجنسیوں میں ذرا سا بھی اوپر وہی لوگ آتے ہیں جن کا ریکارڈ بے دروغ ہوتا ہے۔"

"لیکن سرحداتت کے ساتھ کون کا کہ بلیک باکس سے نکلے والی فرسٹ دیکھتے اور ریکارڈ مرحوم ڈی آئی جی احمد شجاع جیسی شخصیتوں کا معاملہ سامنے آنے کے بعد میں آٹھیں بند کے یقین کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

"خیر۔ فی الحال ہم اس بحث میں بھی نہیں پڑتے۔" وہ بولے۔

"ہائل درست ہے سر لیٹا رہے پاس بحث میں پڑنے کا وقت بھی نہیں ہے۔"

"میں اس قسم کی خیرہ مینٹنگ کا بندوبست تو کر سکتا ہوں۔ خواہ اس کے لئے مجھے کسی سے بھی بات کرنا پڑے،" میں نے کہا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی میری بات نہیں ڈالے گا۔"

"لیکن یہ کام بہت جلد کرنا ہے سر، میں چاہتا ہوں مجھے ریڈ ڈاٹ نے جتنی سلیٹ دی ہوئی ہے اس کے ختم ہونے سے پہلے پہلے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کن کارروائی ہو جائے ورنہ میری بھی خیرہ نہیں اور تو عمل کے طور پر ریڈ ڈاٹ کسی خیرہ کو خرید کر یا کسی اور کو شہر سے خواب دکھا کر اس ملک میں نہ جانے کیا کارگزاری۔"

"میری انتہائی ہنگامی انداز میں کام کر کے بھی اس غیر رسمی

نہ جان کوئی نہیں تھا۔

حفیظ صاحب نے چودھویں کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بچنے کے لئے کہا اور دور دور سے ہی 'صرف اشارے سے تمہیں افراد سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک اچل مر' ہماری بھر کم باقری صاحب تھے۔ دوسرے ویلے پٹے 'مسخ و سپید اور طوطے کی چونچ جیسی نوکیلی ناک والے تھیں صاحب تھے۔ ان کی آنکھیں نیلی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا عام انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہی رہا ہو گا۔ اس کا اندازہ مجھے ان کی طرف دیکھتے ہی ہو گیا۔

تیسرے شہزاد خان تھے۔ وہ شغل و صورت سے کوئی بزنس میں ملوث ہو رہے تھے۔ ناک پر نہایت چھوٹے چھوٹے شیشوں کی عینک لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی حفیظ صاحب کی طرح سگادے کے زبردست رسیا ملوث ہوتے تھے۔

یہ تینوں ہمارے ملک کی سب سے بڑی اور اہم ترین خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ تھے۔ اپنی لوگوں سے میرا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ وہ غالباً ان کے باقت اور خاص قابل اعتماد ساتھی تھے۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ حفیظ صاحب میرے بارے میں ان لوگوں کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکے تھے اس لئے میرے بارے میں انہوں نے کوئی خاص بات نہیں کی۔

تعارف کے بعد چند لمبے اس طویل و عریض ہال میں گہرا سکوت طاری رہا۔ ان سب کی نگاہوں کا مرکز میں تھا۔ وہ گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ مثال رہے تھے۔ گہرے سکوت کے یہ لمبے اعصاب شکن تھے لیکن میں صبر و سکون سے بیٹھا رہا۔ تینوں خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں کا نہ جانے کب تک خاموش رہنے کا ارادہ تھا۔ میں بھی سکوت توڑنے میں پہل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

آخر کار حفیظ صاحب نے سکوت توڑا۔ وہ اپنے مخصوص 'ہماری گھونچ دار اور ہمرے ہمرے لیے میں مجھ سے مخاطب ہوئے "مسٹر چودھری! میں نے ان صاحبان کو مختصراً تو تمہاری سنائی ہوئی کہانی سنا دی ہے۔ لیکن ہمزہ ہو گا کہ تم خود اپنی زبان سے نہایت تفصیل اور قاتل جزئیات کے ساتھ شروع سے آخر تک تمام واقعات ان لوگوں کے گوش گزار کرو۔ اس کے بعد ہی بات چیت کچھ آگے بڑھے گی۔"

میں نے ایک بار پھر اسی طرح اپنی رام کہانی دہرائی جس طرح حفیظ صاحب کو سنائی تھی۔ وہ تمام لوگ اس طرح ہر تن گوش رہے گویا اس وقت ان کے نزدیک دنیا کا اہم ترین کام یہی تھا۔ حفیظ صاحب ہی کی طرح ان میں سے کسی نے بھی میری سرگزشت کے دوران کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے انہیں بھی بلا کم و کاست ہر بات بتادی اور آخر میں اسی طرح اپنے محرمات بھی بیان کر دیے

دوسرے روز میں مقررہ وقت سے خاصی دیر پہلے گھر سے روانہ ہوا۔ میں نے اپنی خاص گاڑی گہری چھوڑ دی تھی اور سرخسی رنگ کی ایک عام سی ٹیوٹا میں گھر سے نکلا تھا۔ ٹیوٹا کو میں نے تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے میں ہر بات سے آگاہ رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنی غیور گاڑی میں بیٹھ بیٹھ تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ جس گھر میں بیٹنگ ہو رہی ہو وہ دور دور سے اس کی عمرانی کرنا ہے۔

گھر سے نکلے وقت میں نے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ میرا تعارف نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے بعد بھی احتیاطاً میں نے کچھ دیر تک ادھر ادھر گاڑی کبھی تیز، کبھی آہستہ بھاگی اور جب مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ ٹیوٹا کے سوا کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا تو میں کینٹ کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ حفیظ صاحب نے مجھے جوابدہ نہیں کیا تھا وہ کینٹ کے کسی پتے کا تھا۔

مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ ایک شاندار اور بول و عریض بنگلا تھا۔ اس کے کینٹ اور سامنے کے دونوں کناروں پر تین آدمی کھڑے تھے۔ بظاہر وہ سادہ لباس میں تھے اور لا قطعی سے انداز میں کھڑے تھے لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ لارڈ پولش کی عمرانی کر رہے تھے۔ میں ممکن تھا پتے کے مقصد میں ہی سادہ لباس والے فیماں رہے ہوں۔ ان کے چہرے بتاتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص شخصوں کے لوگ تھے۔

میرے دل میں مایوسی کی ہلکی سی لہر ابھری۔ آخر وہ لوگ تھوڑا سا احتیاط کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ میں تو بیٹنگ کو اس سے بھی زیادہ خفیہ رکھنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے کچھ چوہوں کے اشتہار باہر کھڑے کر دیے تھے۔

کینٹ پر کھڑے ہوئے دراز قد 'سانولے اور کثرت صورت شخص نے بغیر کچھ بدھتے میرے لئے کینٹ تو کھول دیا لیکن جو مٹی پری گاڑی اندر پہنچی 'دائیں بائیں سے دو آدمی میرے استقبال کے لئے نمودار ہو گئے۔ ان کی نظروں گویا میرے جسم کے پار ہوئی اور یہی تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ میرا شناختی کارڈ طلب کیا اور کینٹ موجود ٹیوٹا فون پر اندر میرے بارے میں اطلاع دی۔ اندر سے ایئر کنڈیشنر نے مجھے آگے جانے کی اجازت دی۔

اندرونی دروازے پر ایک باوردی بھڑنے مجھے رہے کیا اور ایک بہت بڑے ہال میں لے گیا۔ وہ اچھا خاصا ایک ہاٹا بلڈ قسم کا آفٹرن ہال معلوم ہو رہا تھا جہاں بارہ انتہائی عجیبہ صورت افراد کی سی میز کے گرد موجود تھے۔ تیرہویں حفیظ صاحب تھے۔

حفیظ صاحب کے سوا باقی سب گویا نظروں ہی نظروں میں میرا ہمت مار رہے تھے گو کہ میں ابھی زندہ تھا۔ وہ تقریباً سب کے سب کثرت اور بار بار جب چہرے تھے اور جیسی پختہ العمر تھے۔ ان میں

ذہانچے میں بھی بے شمار کمزوریاں ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہمارا ملک کچھ زیادہ ہی سازشوں کا گڑھ بنا رہتا ہے لیکن ان سازشوں کے یہ انداز نہیں ہوتے۔ ان کے جو انداز ہوتے ہیں ان سے ہم باخبر رہتے ہیں۔ باخبر رہنے کے لئے ہمارے پاس بہت بڑا نظام موجود ہے۔

میں بے اختیار مسکرا دیا۔ انسان جب کسی بڑے نظام کا سربراہ ہوتا ہے تو اکثر اسے بہت سی خوش فہمیاں یا غلط فہمیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اسے اپنی ناک کے نیچے دو لٹا ہونے والے واقعات کا علم نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے آپ کو باخبر سمجھتا ہے۔

میر پر نیپ ریکارڈ اور کئی مایک بھی موجود تھے۔ ہم سب کی مٹنگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ میں نے نیپ ریکارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اگر آپ میری آپ جی کو دو بارہ کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر سنیں تو اس میں آپ کو اپنے تمام سوالات اور اعتراضات کا جواب مل جائے گا۔ وہ دو اپنی سازشیں ”مخربصہ“ کا رد اور دہشت گردوں کی کارروائیاں ”ہمارے ہاں کے بگاڑ لوگوں کی سرگرمیاں“ سیاسی غداروں ”سیکٹ ایجنٹوں کی تک ودد“ یہ سب تو اپنی جگہ ہیں ہی ”سب کچھ ہوا ہے لیکن ریڈ وائٹ ایک نیا عالمی مغلوبہ ہے۔ بڑے ملکوں نے دیے بھی ہمیں اپنی کارروائیاں بتا رکھا ہے لیکن ریڈ وائٹ کے ذریعے وہ ہمیں عمل طور پر نکل جائیں گے۔“

اب شہباز خان کنگار کرگلا صاف کرتے ہوئے بولے ”انہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں جو کچھ مطلوب ہے، ان کے جو مقاصد ہیں وہ دیے بھی پورے ہو رہے ہیں۔ انہیں اس سے زیادہ دوسری سول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بہت سے غیر ملکی ہمارے ملک میں داخل ہو کر اس قسم کی ”خواب و خیال کی ”ڈیٹا سنس“ تعمیر کر لیں، جو جی چاہے کرتے پھریں اور ہمیں اس کا ذرا بھی علم نہ ہو۔“

”یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں تو جموٹا قرار پانے کی پوزیشن میں ہوں۔“ ہمیں کے بغیر نہ رہا۔ غیر ارادی طور پر میرے کنبے میں ہلکی سی تھپی بھٹک آئی۔ میں نے حفیظ صاحب کی طرف نہ بولا، وہ دم بخود سے بیٹھے تھے۔ ان کی انگلیوں میں وہ بے ہوئے نگار سے دھڑکیں کی لکیر پڑ رہی تھی۔ انہیں بچہ احساس تھا کہ بیشک جس مفقود کے لئے مشفق کی تھی وہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا بلکہ اس کی جگہ تھی جنم لے رہی تھی۔ لیکن وہ گویا اس ضمن میں کچھ کہنے سے منع رہے تھے۔ مجھ سے نظر تلے ہی انہوں نے سر جھکا لیا۔

فیس صاحب کی نیلی آنکھوں میں سرخسری کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بے مہرے لیے میں بولے ”مشیر چوہدری باجپ کی کمائی میں کوئی بھی

جس طرح حفیظ صاحب کے سامنے کئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میرے غلوں اور حب الوطنی سے وہ بہت متاثر ہوں گے، مجھے خراجِ حنین پیش کریں گے اور اطمینان دانی کے کہ وہ جلد از جلد اس سلسلے میں کوئی زبردست قدم کاروبار و نظم و ترتیب پیش کریں گے ”ریڈ وائٹ“ کا سراغ لگائیں گے اور اس کا قلع بچ کریں گے لیکن ان کا رد عمل میری توقعات کے بالکل ہی برعکس تھا۔

پہلے تو چند لمبے وہ سب ایک ٹک خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر غلطی کی چوٹی جیسی ناک اور نیلی آنکھوں والے فیس صاحب نے کنگار کرگلا صاف کیا اور سر جھپٹے میں بولے ”مشیر چوہدری! ہم نے اسپاکی اسٹورز اور سائنس ٹکنس پڑھنے کے بڑے بڑے شوقین دیکھے ہیں لیکن کسی کے ذہن پر ان چیزوں کا اتنا شدید اثر نہیں دکھا کہ وہ خود ایک کمائی گھر کر ملک کے وزیر خارجہ کے قریب سے ملک کی تین سب سے بڑی خفیہ ایجنسیوں کو اپنی ہی کرے اور انہیں بھی خیالوں خوابوں کی دنیا میں الجھانے کی کوشش کرے۔“

میں دم بخود رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کہوں۔ ایک مدت سے مجھے کسی نے اس طرح مت پر صاف اور واضح انداز میں جموٹا قرار نہیں دیا تھا۔ میری مدح گویا خوب کر رہ گئی اور کلن چپ اٹھے ”آہم مجھے یہ بھی ذہن میں رکھنا تھا کہ وہ ایسے لوگ تھے جن سے ہمارے ہاں حکومتیں بھی خائف رہتی تھیں۔“

میں نے بے پناہ مضبوطی سے کام لیتے ہوئے فیس صاحب کے کنبے میں کہا ”حفیظ صاحب نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میں اس ملک کا ایک ممتاز پرنسپل مین ہوں۔ میرے پاس ٹکنس پڑھنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ جب وقت ہوتا تھا تب بھی میں نے اسپاکی اسٹورز اور سائنس ٹکنس پڑھنے نام ہی پڑھا۔“

اب باقری صاحب میری بات کاٹنے ہوئے بولے ”ہمیں آپ کے بارے میں کافی کچھ بتایا جا چکا ہے مشیر چوہدری! جو نہیں بتایا جا سکا وہ ہم معلوم کر لیں گے۔ آپ اگر جاسوسی اور سائنس قسم کا ٹکنس پڑھنے کے عادی نہیں ہیں تب تو یہ اور بھی زیادہ حیرت کی بات ہے کہ آپ اتنے زیادہ ٹیکنالوجی پرست ہیں۔“

”آپ کو میری کس بات پر تعجب پڑ گیا؟“ میں نے ان کی آنکھوں میں جمائے ہوئے کہا۔ غیر ارادی طور پر میرے کنبے میں سرخسری اور آنکھیں

”تقریباً ہر بات پر۔“ انہوں نے ہلکا سا جواب دیا ”سازشیں ہر ملک کے خلاف کسی نہ کسی انداز میں، کسی نہ کسی طرف سے جاری رہتی ہیں۔ ہمارا ملک پھرنا ”پسماندہ اور دفاعی حکمت عملی کے لحاظ سے اہم پوزیشن کا حامل ہے۔ ہمارے سیاسی، سماجی اور انتظامی

”میں اس ضمن میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ میں نے بے بسی سے کہا ”میرے پاس تو اس ضمن میں خود انجینئری ایجنسیں سوال کر رہی ہیں۔ البتہ اس بات کا جو جواز انہوں نے جس حد تک بیان کیا تھا وہ میں نے آپ کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کس حد تک جھوٹ تھا اور کس حد تک سچ۔ اگرچہ یہ سب مجھے حل کرنے کے قابل ہوتا تو شاید مجھے آپ بھی اہم قضیات کو ذمہ دینی کی ضرورت پیش نہ آتی۔“

وہ کچھ لحاظ سے بڑے جلیں میٹنگ ہر حال کچھ بے نتیجہ رہی۔ کم از کم مجھے تو یہی محسوس ہوا۔ مزید کچھ دیر کی ایسی ہی غم اور غم ناگوار سی بحث و جرح کے بعد انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ حنیف صاحب مجھے چھوڑنے باہر آئے اور مشین سے انداز میں میرا کندھا تھپکتے ہوئے ہوئے ”بدل نہ ہوتا۔ ابتدا میں یہ لوگ منگولک معاملات کی اسی طرح چرچا کرتے ہیں۔ ابھی اجلاس جاری رہے گا۔ اگر کوئی بات تھیں بتانے کے قابل ہوئی تو میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔“

میں وہاں سے دفتر چلا گیا۔ راستے میں ”میں نے نوٹی کو روک کر اس سے کہہ دیا کہ وہ اب میری عمرانی نہ کہے۔ دفتر میں کام بہت خاص نہیں تھا اور میرا دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ میں کمر چلا گیا اور کچھ دیر بعد اپنی اصل گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔ صبح سے میرا حلیہ سنے کا سوچ رہا تھا۔ میں ای کی طرف چلا گیا۔

شاید اس کی طرف جا ہی میری جان نیچے کا بمانہ بن گیا۔ کیونکہ رات گئے میں واپس آیا تو مجھے اپنی گلی سے بہت دور رہی رکنا پڑا۔ میری گلی اور آس پاس کے علاقے میں جھوم تھا۔ گاڑیوں کی گنے سازن سنائی دے رہے تھے اور بہت سے لوگ ادھر ادھر جاگ رہے تھے۔

گاڑی آگے لے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ میں نے گاڑی روک کر اترتے ہوئے ایک دیوانہ زاد سے نوجوان سے پوچھا ”کیا ہوا ابھی خیریت تو ہے؟“

وہ بھینٹا مجھے شعل سے نہیں بچاتا تھا۔ پرجوش سے مجھے بے یوں پولا ”جناب“ اس گلی میں سینہ افضل چوہدری صاحب کی کوٹھی تھی۔ بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ قصبے سے کم نہیں تھی۔ آج رات بے درپے کئی خوف ناک دھماکے ہوئے اور پوری کوٹھی لمبے کا زبرد ہو گئی۔ ہر چیز میں ٹنگ لگ گئی۔ آگ راکھ اور لمبے کے سوا کچھ نہیں بچا۔ سب لوگ مر گئے۔ شاید سینہ صاحب بھی مر گئے۔ سب اندر رہی تھے۔“

وہ گویا اختصار سے ساری کہانی مجھے سن کر آگے بڑھ گیا لیکن میں وہیں کھڑا نہ کیا۔ میرا وجود گویا برف کی سل بن گیا تھا!

مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کہیں دور سے لوگوں کا شور کہیں کی جھجھکاہٹ کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ میرے گرد گویا

سراغ کوئی بھی نکتہ ایسا نہیں جس کے سارے ہم آگے بڑھ سکیں۔ بقول آپ کے ”آپ کو جس پر اسرار اور خیالی سی جگہ پر لے جایا گیا“ اس کے بارے میں آپ کو کوئی اندازہ نہیں کہ وہ کہاں تھی۔ پاس دن“ جس نے آپ سے مذاکرات کئے اس کے کدھوں پر چہرے کے بجائے ایک بڑا سا انڈر کا تھا۔ ایڈم عرف ایڈی کا کوئی سراغ آپ کے پاس نہیں۔ وہ خودی جب چاہے آپ کو فون کرتا ہے۔ اس بگڑا ہوا شخصیت اسے سن کا آپ کو کچھ آتا ہے نہیں۔ پرنس خیمہ عرف ہٹی کے بارے میں اب آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ جب آپ نے اس کے بارے میں ہر سراغ کھودا تب آپ ہمارے پاس آئے ہیں۔“

”مختور اس سے پہلے مجھے معلوم ہی کہاں تھا کہ ریڈ واٹ ہے کیا چیز؟“ میں نے پھٹے ہوئے لمبے میں کہا ”میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی طرف رجوع کیا ہے کہ شاید اس قسم کے معاملات میں سراغ وغیرہ کا آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے۔ آپ اپنی بیوی بیٹی خیرہ ایجنسیاں چلاتے ہیں جن کا جال ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ جہاں تک میں سمجھا تھا“ آپ ہی لوگوں کا کام ملک کو اس قسم کے خطرات سے خبردار رکھنا اور محفوظ بنانے کی ذمہ داری تھا۔ کہیں میں خوش حسی میں تو جھٹکا نہیں تھا؟“

”مختور لہجہ اختیار کرنے کی کوشش نہ کریں مسٹر چوہدری!“ حنیف صاحب نے سرو مجھے میں کہا ”میں یہاں ایک سنجیدہ قوی مسئلے پر تبادلہ خیال کے لئے جمع ہوئے ہیں، ایک دوسرے پر اپنی طرف مزاح کی ملامتوں کا اظہار کرنے کے لئے نہیں۔“

”گستاخی محاف۔ میں تو اسے سنجیدہ قوی مسئلہ ہی سمجھ کر آیا تھا۔ میرے دل میں وطن کی محبت نے جوش مارا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ نیچے یا اوپر۔ ہر جگہ قدم قدم پر ہمارے ہاں وطن سے محبت کو ایک جرم کا سارا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے، وطن کی بھلائی کے لئے سوچنے والوں کو بچھڑاتے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ میں کوشش کے باوجود اپنے لمبے کی گلی پر قابو نہ رکھ سکا۔ انجام سے بے پروا ہو گیا۔“

میرے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ شاید ایسا لہجہ سننے کے عادی نہیں تھے۔ ان کے چہروں کی سرورمی بڑھ گئی لیکن شہر دار خان قدم سے قتل سے بولے ”ہمارے شکوک و شبہات سچا ہیں مسٹر چوہدری! یہ سوال بڑا غور طلب ہے کہ اگر اس قسم کی تنظیم کا واقعی کوئی وجود ہے تو اسے آپ میں ایسا کیا سرخاب کا پرکا نظر آیا ہے کہ وہ آپ کو اپنا آئندہ کارنامے کے لئے سرورحز کی بازی لگانے پر توجہ ہوئی ہے جبکہ آپ ملک میں کسی خاص اہمیت کے حامل بھی نہیں کسی سیاسی پارٹی کے سربراہ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ آپ شر کے جیبر آف کاسرس کے صدر تک نہیں۔ صرف سربایہ دار ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس ملک میں آپ سے بڑے بڑے سربایہ دار ہونے والے ہیں۔“

# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                       |
|-------|-----------------------|
| 500/- | سراج منیر (اول و دوم) |
| 200/- | طارق بن زیاد          |
| 175/- | مقدس دیو داسی         |
| 200/- | سراہوں کے صحرا        |
| 300/- | رقص درویش             |
| 250/- | دشت کے بھیڑیے         |
| 300/- | غریب کا چوپان         |
| 300/- | شیر شاہ سوری          |
| 250/- | سندھ کا سورما         |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

آری کی دلیل پھیل ہوئی تھی اور میں برف کی نل کی طرح اس میں  
اُتر آ جا رہا تھا۔

دھنکا فائر گیٹ کی ایک تیز رفتار گاڑی کے بریک میں میرے  
قرب چہرے اُسے اس کا سائین ٹرنج ہی رہا تھا لیکن ڈرائیور نے  
اِس میں بھی بری طرح بجایا۔ میں اور میری گاڑی اس کے راستے میں  
ماں تھی۔ ٹرک کے دروازے پر لٹکے ہوئے نئی ڈائگری والے  
ایک فائبرین نے چکر کھینچے شرم دلائی ”او بھائی۔۔۔ کچھ تو احساس  
کرنا یا فائر گیٹ کا راستہ روکے کھڑے ہو۔ جسے ذرا احساس  
نہیں کہ کسی کا ٹھکر مل رہا ہو گا۔ تم میں دیر کر رہے ہو۔“

میرا سکرانے کوئی جاپا نہ کھینچے نہیں معلوم تھا کہ میں اپنی اس  
کوشش میں کامیاب ہو سکا تھا نہیں۔ میں اس فائبرین کو یہ بھی  
نہیں بتا سکا کہ وہ بد نصیب میں ہی تھا جس کے گھر کی وہ آگ بجھانے  
جا رہا تھا۔ گو کہ اس کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ راستے میں ملے  
والے فوجیوں نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ  
سب کچھ تو یاد ہو چکا تھا۔ اب وہاں بچانے کے لیے رکھا ہی کیا تھا۔  
انسانی جانیں سب سے قیمتی تھیں۔ وہ بھی نہیں بچی تھیں۔

میں نے خاصا شے سے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی ایک طرف ہٹا کر  
کھڑی کر دی فائر گیٹ کی گاڑی گزر چکی تھیں گاڑی سے اتر کر مجھے  
مجھے قدموں سے اپنی گلی میں داخل ہوا۔ آگ بجھانے والوں کو  
راستہ دینے کے بعد ہجوم ایک بار پھر راہ میں مائل تھا۔ وہاں فائر  
بر گیٹ کی دو گاڑیاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔

وہ لوگ اس آگ کو بھار رہے تھے جس میں اب کوئی کار آمد  
چیز کوئی جاندار جسم نہیں بچا تھا۔ بس دھپتی آگ اور لمبے کا ایک  
بست براؤچر تھا۔ برابر کی دو گھڑیوں کی دیوڑھوں کو بھی نقصان پہنچا  
تھا مالا کہ ان سے میری اصل عمارت کی دیوڑھیں بچ رہی ہوئی نہیں  
تھیں۔ میں نے کوئی بھی کی تعمیر میں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ  
مقبول کا بھی بہت خیال رکھا تھا۔ ہر حصے میں ٹھیکیدار اور  
کھسکٹن کھیتی کو خصوصی میٹیریل استعمال کرنے کی ہدایت کی  
تھی۔ بہت سی چیزیں اسپرینڈ تھیں۔

کھیتی کے تمام تر وسائل اور تیز رفتاری کے باوجود کوئی دو  
سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں میری غریب بازیوں کو بھی بہت  
دفع تھا۔ بہت سی چیزیں نقشے کے مطابق ہونے کے باوجود مجھے پسند  
نہیں آئی تھیں۔ ان میں وہ خوب صورتی نظر نہیں آتی تھی جو ان  
کے لیے میرے ذہن میں ”میرے تصورات میں ہوتی تھی چنانچہ  
انہیں دوبارہ سے بارہ بنایا جاتا تھا۔

ایک کام میں ہمیں نے ذاتی طور پر کافی دقت صرف کیا تھا۔ رقم  
جو کئی برس اس کا حساب تو اُلگ تھا۔ مکان خواہ غریب کا ہو یا امیر کا  
اس کے خوابوں کا منظر ہوتا ہے اپنی حیثیت اور اپنے وسائل کے

مطابق وہ اچھی سے اچھی چیز لا کر اس میں سمونتا ہے۔ کتے لوگوں  
کی کاوشیں اور شخصیتیں نام آتی ہیں تب جا کر ایک مدت میں یہ  
خواب تعبیر ہوتا ہے۔

لیکن اچانک کہیں سے کوئی غصہ زدہ انگڑواہت حرکت میں  
آتا ہے اور یہ خوب صورت خواب چند لمحوں میں بکھر جاتا ہے۔ یہ  
نکاح دلچہ کر ایک بار تو اس خواب کے خالق کی مدد کا ہونا بھی  
نہیں ہوتا ہے۔

یہ تجربہ مجھے اس وقت ہوا تھا۔ آج شام تک جہاں میرا



اچانک ہوائی حملہ کر دیا ہے۔  
پہلے صاحب بولے "واقعی ہوئی؟" لاگو کی جگہ کے بعد سے  
نے خود اتنے خوف ناک دھماکے کبھی نہیں سنے ہیں نے سنا  
چوہدری صاحب کے دائیں بائیں اور سامنے کی کوٹھیلوں کے قریب  
تھیں جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح گھر چھوڑ کر نکل بھاگے  
جب تک قاتر بریگیڈ نہیں آیا تب تک وہ لوگ واپس نہ  
آئے۔

دوسرے صاحب بولے "بہنئی اس میں تعجب کی کوئی بات  
نہیں۔ اگر ہمارے گھر قریب ہوتے تو شاید ہم بھی یہی کرتے۔"  
کچھ اور لوگ بھی طرح طرح کے تبصرے کر رہے تھے۔  
زہین بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مختلف آوازوں اور رنگارنگ تہوار  
کے درمیان میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال گونج رہا تھا:  
یہ کس کی حرکت تھی؟

پچھلے کچھ عرصے میں 'میں نے ملک دھاش' عالم شیر اور لا  
رفی کو ان کے کچھ کرکوں سمیت ٹھکانے لگایا تھا لیکن مجھے مہیا  
تھا کہ ان کی موت کے بعد ان کے جج کیے ہوئے بد معاشوں اور  
خطرناک لوگوں کی کرفٹ گئی تھی۔ وہ ایسے ٹولے تھے جو  
سرکار کے بغیر کسی قابل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انہیں معلوم  
نہیں تھا کہ ان کے سرخیلوں اور سرداروں کو ٹھکانے لگانے  
میں ہی تھا۔ اس لیے میرا ذہن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ  
ان نولوں میں سے کسی کی کارروائی ہو سکتی تھی۔

میری نظریں غیر ارادی طور پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں  
ابھی تک مجھے کوئی شائبہ چھو نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی نے  
طرف کوئی خاص توجہ دی تھی۔ قاتر بریگیڈ والے بدستور چلے  
پہانے میں لگے ہوئے تھے۔ ہر حال ان کی آمد کا اتنا فائدہ ضرور  
تھا کہ آگ آس پاس کی کوٹھیلوں کی طرف نہیں بڑھی تھی۔

اچانک میری جھٹکتی ہوئی نظریں ٹھیکے اندھیرے میں ایک  
جہ کر رہ گئیں۔ وہ مارشل کے ایک آجری بڑی سی کوٹھی تھی۔  
ایک دیوار کے ساتھ ساتھ باہر کی طرف باپلر کے درختوں کی ف  
تھی۔ ان میں سے ایک درخت پر مجھے کوئی چیز حرکت کرتی دکھ  
دی تھی۔ وہ پتہ کوئی ہماری جائیداد تھا جس کے دڑن سے وہ  
کی مضبوط شاخیں ہی نہیں بلکہ پر درخت ذرا سا لرزایا تھا۔

میرا ذہن جو اس وقت مجھے مفلوج محسوس ہو رہا تھا اچانک  
بیدار ہوا اور جسم میں منٹنی سی دوڑ گئی جو زندگی کی علامت  
ورنہ نہیں تو کچھ ہوا تھا کہ اب وہ تک جسم شل ہی رہے گا۔  
میری نظریں درخت پر جمی ہوئی تھیں۔ فاصلہ کافی تھا  
وہ شئی برائے نام کبھی لیکن درخت پر نظر گاڑ کر میں کہہ نہ  
طور پر دیکھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ پھر میں نے ایک سانسے کا  
درخت سے دوسرے درخت پر چلا گیا تاکہ دیکھا۔  
میں مری سانس لے کر کہہ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ

خوب صورت خواب سراٹھائے کھڑا تھا اب وہاں بد صورت لمبے  
شطلوں 'مچھوئیں اور سیاحی کی سوا کچھ نہیں تھا۔ اس خواب کی  
برائی کا مددہ تو اپنی جگہ تھا لیکن ان بامداد اور قاتلوں اور چال  
شاروں کی سرگ باغی کا ذمہ بھی بہت بڑا تھا جو اسی لمبے میں گم  
ہو گئے تھے بے شناخت 'بے نشان ہو گئے تھے۔ کئی گھنٹہ ملازم  
تھے۔ بٹر خاناساں 'یرتن دھوئے والی عورت 'دو مانی 'ڈرائیور'  
صنائی کرنے والے 'سودا سلف لانے والا اور ایک آدھ غیر ضروری  
ملازم بھی تھا۔ ان میں سے ایک آدھ کی فیملی بھی تھی۔ پھر سیکورٹی  
گارڈز طارق خان اور ظاہر علی تھے۔

جس انداز میں کوٹھی تیار ہوئی تھی اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا  
کہ ان میں سے کسی کی لاش تک سلامت نہیں ملے گی۔ نہ جانے  
کس کے پرچے اڑے تھے کون شطلوں کا لقمہ بنا تھا اور کون لمبے  
تھے دب کر لمبے ہی کا حصہ بن گیا تھا۔ کوٹھی کو تباہ کرنے کے لیے  
خانہ بانی طاقتور بمبیک وقت استعمال کیے گئے تھے۔

میں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ خواب ہر حال  
بکھرے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ وہ ٹکڑیٹ کا لبادہ اوڑھ لیں۔  
میں اپنی ان سوچوں کے ساتھ اس جہم میں گویا تھا کھڑا تھا۔ میری  
طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ کچھ لوگ نہایت اشناک سے قاتر  
بریگیڈ والوں کی کارروائیاں دیکھ رہے تھے اور کچھ آپس میں باتیں  
کر رہے تھے۔

ایک صاحب میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ میں انہیں نہیں  
پچانتا تھا اور وہ بھی غالباً مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ وہ اپنے دائیں  
ہاتھ پر کھڑے ہوئے دو صاحبان سے کہہ رہے تھے "اللہ مغفرت  
کرے۔ چوہدری صاحب بہت اچھے آدمی تھے کسی کے برے میں  
نہ بھلے میں۔ نہ جانے کس نے کیوں ان کے ساتھ یہ حکم کیا ہے۔"

دوسرے صاحب بولے "میں آپ سے تو ہوا سا اختلاف  
کروں گا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چوہدری صاحب نہ کسی کے بھلے  
میں تھے نہ برے میں۔ یہ تو سنا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ  
برائی نہیں کی۔ لیکن یہ بھی سنا ہے کہ اگر کوئی معصیت زدہ یا بد کا  
طالب ان تک پہنچ جاتا تھا تو اس کی ہر ممکن ضرور کرتے تھے۔"

بہرے دکھ کے صحرا میں طمانیت کی ایک بوہڑی پہلی۔ میرے  
خیال میں 'میں نے کوئی ایسا اچھا کام نہیں کیا تھا جس کی شہرت  
میرے پاس پڑوس میں پھیل سکتی لیکن نیست تھا کہ یہاں کے کچھ  
لوگ میرے بارے میں ابھی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ شاید  
اس کی وجہ صرف یہ رہی ہو کہ انہوں نے مجھے مرحوم فرض کر لیا  
تھا۔ مرحوم کے بارے میں تو لوگ موت میں بھی ایک آدھ اچھی  
بات کہتے ہیں۔

تیسرے صاحب جھرمجھی سی لے کر بولے "مہمت خوف ناک  
دھماکے تھے۔ ہمارا گھر تو مالا مال تھا۔ یہاں سے خاصا دور ہے لیکن اس  
کے بھی دو دیواروں میں گئے تھے۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید دشمن نے



حیرت ہوئی تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ریڈاؤٹ والے شعیرہ بازوں سے کیوں کام لیتے تھے؟ شاید اس میں ان کی کوئی ایسی مصلحت کارفرما ہوئی تھی جسے سمجھنے سے میں قاصر رہتا تھا۔

جو لوگ اس گلی کی طرف آئے تھے ان میں سے کسی نے مجھے پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی جھجھکاہٹ شروع ہو گئی جو اچھے خاصے شور میں داخل تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو تار رہے تھے "بہی چوہدری صاحب زندہ ہیں۔ چوہدری صاحب زندہ ہیں۔"

اس طرح ایک اچھا خاصا پانگنا سا شروع ہو گیا۔ پاس بڑوس کے لوگوں نے آکر گٹھ لٹ کر مجھے جان بچتے رہا رہا دینا شروع کر دی۔ ساتھ ہی وہ تسلیاں دینے کی بھی کوشش کر رہے تھے کہ کوئی تباہ ہو گئی تو کوئی بات نہیں، مجھے مفہوم نہیں ہوتا چاہیے جان بچ گئی تھی، زیادہ اہم بات یہی تھی "انسان زندہ رہے تو کوئی لیاں اور بھی بڑا مسکا بنے وغیرہ وغیرہ۔"

میں ان سب کی ہمدردیوں اور خیر خواہی کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس دوران ایک دو صاحبان نے مجھے کرپے لے کر بھی کوشش کی کہ آخر میری کسی سے ایسی بھی کیا شدید دشمنی تھی جو اس نے ایسا شدید وار کیا تھا۔ میں بالکل اور معصوم بن کر انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی دوران پولیس بھی آگئی۔ ہم سامنے والی لائن کی ایک کونجی میں جا بیٹھے۔ ان سب چکرلوں سے ٹھٹھٹھنے تقریباً صبح ہی ہو گئی۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پانچ بج رہے تھے۔ جس کو بھی میں ہم بیٹھے تھے وہ دو کڑی صاحب کی تھی۔ وہ بھد تھے کہ میں انہی کے ہاں قیام کروں لیکن میں نے انہیں بتایا کہ رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، کئی ٹھکانے موجود تھے ان کے غلوں کا ذخیرہ ادا کرتے ہوئے میں ان کے پاس سے نکلا تو گلی میں سناٹا چھا چکا تھا۔ فائر گینڈو والے بھی رخصت ہو چکے تھے۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ واقعہ اپنی اپنی جگہ پر موقوف ہو چکا تھا۔ گھوڑوں کی جھل میں ایک غلام بھاگ رہا ہوا تھا اور اب سچ ایک بار پھر ہوا رہا تھی۔

میں دو کڑی صاحب کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے کچھ دور کھڑی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ستارہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ فوری طور پر مجھے وہی ایک موزوں ٹھکانا دکھائی دیا تھا جہاں بیٹھ کر میں سکون سے کچھ غور و خوض کر سکتا تھا۔

ستارہ کا چوکیدار علی الصباح مجھے گیٹ پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس وقت یہ اس سے بہت پہلے میں عموماً یہاں سے رخصت ہوا کرتا تھا۔ اس نے مجھے اندر بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مٹیاں لے کر میں پوچھا "صاحب! کیا بی بی جی کو جگاؤں؟" وہ رات کو بہت دیر سے سوتا ہے۔ بی بی جی رات کو شوٹنگ سے بہت دیر سے واپس آیا تھا۔"

وہ میرا حکم سن کر قہقہہ جاکر ستارہ کو جگانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ میرے لیے کسی وقت بھی جاکر ستارہ کو جگانے پر اسے ڈانٹ نہیں

ہے اب چاہر کے درخت پر نہیں ہوگا۔ اسے صرف چند لمبے کی مسلت درکار تھی جو اس نے حاصل کر لی تھی۔

سڑک کے وسط میں پہنچ کر میں نے جھک کر اس گلی... کو دیکھا۔ بظاہر وہ بے ضرر سی دکھائی دے رہی تھی اس کے باوجود میں اسے اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ ریڈاؤٹ والوں کی شعلہ بازوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

آخر کار میں وہ نہ سکا اور میں نے تمام تر احتیاط کے ساتھ اسے دو انگلیوں میں تمام کر اٹھایا لیا۔ اس میں ابھی بجلی کی حرارت باقی تھی۔ وہ الومینیم فوائل کی طرح ایک چمکیلا سا کانڈی میٹم ہوتا تھا جسے چھوٹی سی گلی کی طرح دول کر دیا گیا تھا۔

میں نے اسے کھولا۔ چمکے اندر میرے میں بھی اس پر انگریزی ٹائپ میں کچھ حرف نظر آ رہے تھے۔ انہیں صاف طور پر سمجھنے کے لیے میں نے اپنے کی رنگ میں موجود سکرٹ کے فلٹر جتنی تھی سی جتنی تاریک نکالی اور اس چمکیلے کانڈ پر روشنی ڈالی۔ باریک حروف میں اس پر نہایت مفاتی اور تحریر ہے دو سطریں درج نظر آ رہی تھیں جو پچھلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں لکھا تھا۔

"کیسی رہی خیرہ! انجینیئروں کے ساتھ تمہاری میٹنگ؟" میں ایک لمبے کے لیے بہت بنا کھڑا گیا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی سے خوف کو نکال چھوڑا تھا لیکن یہ بھی شاید میری خوش قسمتی تھی جو چرس انسان کی جبلت میں شامل ہوتی ہیں وہ ان سے مستقل بچھا نہیں چھڑا سکتا۔

وہ درحقیقت حیرت کی شدت تھی جس کی کوکہ سے اس خوف نے جنم لیا تھا۔ میں تو بہت خوش تھا کہ خیرہ انجینیئروں سے میری میٹنگ کامیاب نہ ہو سکی لیکن خیرہ تو رہی تھی۔ مگر اب اندازہ ہوا تھا کہ ان سے یہ بات بھی خیرہ نہیں رہی تھی۔ انہیں نہ صرف یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے خیرہ انجینیئروں کے ساتھ میٹنگ کی تھی بلکہ انہوں نے بلا آخر مجھے اس کی سزا بھی دے دی تھی۔ سزا بھی کچھ معمولی نہیں تھی۔ انہوں نے میرے خوابوں کے عملوں میں سے ایک عمل سبوتا کر دیا تھا۔

میں نے چمکیلے کانڈ کے اس ٹکڑے کو اسی طرح دول کر کے جیب میں رکھ لیا اور خوف کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میں اپنے پرانے فلسفے پر اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خوف زندہ ہونے سے نقصان کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

گولیاں چلنے اور پھر اس بولٹ نما چیز کے پھٹنے کے دھماکے سے کچھ لوگ اس بھٹی گلی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور دوسرے آئے تھے سڑک پر نظر آنے والے سفید دائرے میں شیشے کی کڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ الومینیم فوائل نما کانڈ کا جو ٹکڑا مجھے ملا تھا وہ یقیناً اسی بولٹ یا جار میں موجود تھا جو دھماکے سے پھٹا تھا اور آنکھیں خیرہ کر دینے والی ہلک پڑا ہوئی تھی۔ بعض اوقات نیچے

تھا۔

”آپ کہ ڈالو کیا اطلاعات تھیں اور کیا بات پر چھتا تھی؟“  
میں نے سوئے پراطمینان سے دراز ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ فون محفوظ ہے سر؟“ اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”ہاں محفوظ ہی سمجھو۔“ میں نے کہا۔

”سرا! کار رشت اور اس کا خاص کر کا پاب نواز جو را کسی سنیما کا بیچر تھا۔ ان کے بارے میں پتا چلا ہے کہ یہ خامے اونچے درجے کے سیاسی بد معاش بھی تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کو سابقہ حکومت نے بھی ایک اترہ اہم سیاسی قتل کرانے میں استعمال کیا تھا اور اس سے پچھلی حکومت نے بھی۔ جبکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ دیئے تو ان کا صاف ہونے سے بہت سے لوگوں نے سکون کی سانس لی ہے لیکن کچھ لوگ شاید خوشی نہ سنانے کے لیے یا پھر کسی اور مصلحت کے تحت پولیس پر دباؤ بھی ڈال رہے ہیں کہ ان کے قتل کی تحقیقات بہت سرگرمی سے کی جائے۔ بہت اہم لوگ دباؤ ڈال رہے ہیں۔“

”مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہوگا۔“ میں نے ہر سکون لیے میں کہا۔  
”پولیس نے کار کو دیکھا نہ دیکھا کے لیے کئی بے گناہ لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے ساتھ خواہ مخواہ کالی زیادتی ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں چھڑانے کے سلسلے میں کچھ ہو سکتا تو اچھا تھا۔ بس میں دیئے ہی سوچ رہا تھا، کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مجھے تو صحیح طور پر معلوم بھی نہیں ہے کہ وہ ہیں کون لوگ۔“  
”ٹولی بلا کا سا کھانا تھا تو اس کے دل کے کسی کونے میں وہ حساس شخص بھی چھپا ہوا تھا جو کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ دیکھیں گے اپنا دامن محفوظ رکھتے ہوئے اگر کچھ ہو سکا تو ضرور کریں گے۔“ میں نے کہا۔

”سرا! اس وقت آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ گھر کی لائیں کیا واقعی خراب تھیں؟“ اسے پراپنی ناہمیں یاد آگئی۔

”لائیں ٹولی فون، ٹولی فون سننے والے سب ختم ہو چکے ہیں ٹولی فون صرف ان کے کٹزے دستیاب ہو سکے ہیں۔ زندگی کی دھوپ میں جو گھر ان کے لیے ساتیان تھا وہی ان کے لیے موت کا آتش گدہ بن گیا۔“ میرے لیے میں افسردگی کی جھلک آگئی۔

”کیا مطلب سر؟“ ٹولی کا کلبہ سرگوشی کی حد تک دھیمہ ہو گیا جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے زیادہ چکنا ہو چکا تھا۔

”وہ گھر لیے کا ڈھیر بن چکا ہے جس کے بوائے میں تمساری بھاگ دوڑ بھی شامل تھی ٹولی۔!“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“ ہلکی بار گیا اسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں جو کچھ دیکھ کر آ رہا تھا وہ میں نے اسے بتایا۔ وہ گویا سنانے

لے گی۔ اس کے باوجود وہ ہنچکا رہا تھا۔ میں نے جوتے اتار کر ایک سوئے پر ہم دراز ہوتے ہوئے کہا ”میں ٹولی جی کو جاننے کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے ٹولی فون یہاں لا دو۔“

اس نے سکون کی سانس لی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے لاؤنج سے ٹولی فون سیٹ لا کر ڈرائنگ روم میں میرے قریب رکھ دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچوں میں گم رہا۔ آخری ڈیٹا ڈاٹ والوں کو کس طرح پتا چلا تھا کہ میں تھیں بی بیوں کی کسی میننگ میں شریک ہوا تھا؟

مجھے یقین تھا کہ کینٹ کے جس پینٹل میں میننگ منعقد ہوئی تھی میرے وہاں تک کے سڑک کے دوران ٹولی کے سوا کسی نے میرا قریب نہیں کیا تھا۔ ٹولی میری عمرانی کر رہا تھا۔ میننگ میں جن لوگوں نے شرکت کی تھی وہ سب اعلیٰ درجے کے افسران تھے اور ان کا فعلی ملک کی حساس ترین ایجنسیوں سے تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں کوئی ریڈ ڈاٹ کا ایجنٹ بھی ہو سکتا تھا۔

ان کے علاوہ تو پھر ٹولی ہی نہ جاتا تھا۔ اور ٹولی گویا میری سی ڈاٹ کا دور سرانجام تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو قدم قدم پر عملاً ہر زندگی بھر کے لیے کو ششیں کرتے رہتے تھے۔ صرف میری حفاظت کی خاطر میرے اشارے پر اس نے سختی سے خطرناک مسائل کو قتل کیا تھا اور شاید کبھی ایک لمبے کے لیے بھی نہیں ہوا تھا کہ اس ضمن میں بد معاشوں کے گرد ہوں یا قانون کی طرف سے اسے کیا خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ ٹولی کے بارے میں کوئی ایسا ایسا بات سنا میرے لیے گویا اپنی ہی ذات پر شک کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے اس امکان کو ذہن کے کسی نایک گوشے میں کی جگہ دینا مناسب نہ سمجھا۔

اس صورت میں ایک بہت بڑا سوال یہ نشان میرے ذہن میں مٹا دیا جاتا تھا۔ میں نے اسے مٹاتی ہی رہنے دیا اور مزید چند لمحوں کے بعد غرض کے بعد ٹولی ہی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھایا اور فون کی ذرا آواز میں بولا ”میں؟“

”یہ میں ہوں۔“ میں نے دھیمے لیے میں کہا۔

”سرا! میری آواز سننے ہی پیش کی طرح اس کے لیے سے فون کی جانب ہو گئی اور وہ غالباً منسلک کر بیٹھے ہوئے بولا ”خیریت تو ہے؟ چند لمحوں کے لیے میں گھر پر آپ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن نہ تو آپ کے ڈائریکٹ نمبر پر رنگ جاری تھی اور نہ ہی گیت آؤں سننے والے فون پر۔ کیا لائیں خراب تھیں؟“

میں نے اسے اصل خبر سننے سے پہلے پوچھا ”تم کیوں رابطہ قائم کرنا چاہ رہے تھے؟ کوئی خاص بات تھی؟“

”میں کوئی خاص بات بھی نہیں تھی۔“ وہ اپنے مخصوص لاٹوالی انداز میں بولا ”بس کچھ اطلاعات آپ تک پہنچا رہی ہیں اور ایک بات پر چھتا تھی۔“ بہت سی خاص باتوں کو بھی وہ خامس نہیں سمجھتا تھا۔ ”آہم ایسی بات نہ تھی“ وہ باتیں میرے گوش گزار ضرور کر دیتا

میں 'اکیا' کچھ بھی نہ بول سکا۔ میں نے اپنے لمبے میں ٹھنکلی لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جو ہوتا تھا ہو چکا" اتنا مددہ دل پر مت لو۔ مجھے اس عظیم الشان کوشش کا نہیں، "ان ملازموں کا افسوس ہے جو ناکارہ گناہ کی سزا میں مارے گئے۔"

"کس کی حرکت ہے سر؟" غولی کے لمبے میں پتکار سی شامل تھی۔

"ریڈ ڈاٹ" میں نے انحصار سے کہا۔

وہ ایک لمبے کے لمبے خاموش ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کے دانت بچھنے گئے ہوں مگر وہ اسی پتکارنے کے سے انداز میں بولا "سر! ایک بار آپ مجھے اس حکیم کا سرا دکھائیں۔ میں اس سرزمین کو ان کے لیے چشمہ بنادوں گا۔"

"اگر برا میرے سامنے ہوتا تو شاید تم لوگوں کے ساتھ مل کر میں اب تک اس کام کا آغاز کر چکا ہوتا۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا "ویسے یہ کام اتنا آسان بھی نہیں۔ فی الحال تو مجھے یہی اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اس سرزمین کو ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کے لیے چشمہ نہ بنادیں۔"

"پھر بھی سر۔ ہمیں کچھ تو کرنا ہو گا۔" اس کے لمبے میں وہی خاموش اور مجبور غصہ پناں تھا جو میرے دل کی گہرائیوں میں کہیں کر نہیں لے رہا تھا اور جسے میں تھک تھک کر ٹھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاں یہی" کچھ "تو میرے لیے اتنا برا سوالیہ نشان بن گیا ہے کہ اس نے باقی سب چیزوں کو چھپایا ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "خیر چھوڑو ان باتوں کو فی الحال میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آج شام تم اپنے گھر پر تمام ماسیوں کی میٹنگ کا انتظام کرو۔ میرا خیال ہے سات بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا ہے۔ تم مجھ سے بات ختم ہوتے ہی فون سنبھال لیتا۔ کراچی والے تمام ماسیوں کو بھی ہر حال میں آج ہی بلانا ہے۔ بارہ تیرہ گھنٹے کی صلت سب کو جمع کرنے کے لیے کافی ہے۔"

"تھک ہے سر!"

"کوئی ساقی رہنے نہ پائے۔ اس میٹنگ میں ہر ایک کو شریک ہونا ہے۔" میں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا "اور یہ بھی خیال رہے کہ میٹنگ کو حتی الامکان خفیہ رکھنے کی کوشش کرنی ہے۔ اگر تمام ترکوشوں کے باوجود خفیہ نہ رہ سکی تو بیکھا جائے گا ہر حال اپنی ہی احتیاد کرنی ہے۔ ہر ساقی یہ خیال رکھے کہ تمہارے گھر تک پہنچنے کے دوران کسی بھی مرحلے پر کسی بھی جگہ اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔ ہمیں تو ریڈ ڈاٹ والے میرے ساقی کی حیثیت سے پہچانتے بھی ہیں۔ سب سے زیادہ احتیاد کی تمہیں ضرورت ہے۔ ہر حال میٹنگ کے اختلاات کے سلسلے میں تو ہمیں گھر سے لٹکانی نہیں ہے۔ فون پر ہی سب سے بات ہو جائے گی اور میرا خیال ہے

تمہارا گھر ریڈ ڈاٹ والوں کی نظر میں نہیں ہے۔"

"ہوا بھی تو نہ بیکھا جائے گا۔" وہ بے پردائی سے بولا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔ "سر! میرا تو خیال ہے احتیاد کا دامن اتار چھوڑ دیں۔ شاید اسی طرح ریڈ ڈاٹ کا کوئی سرا اٹھ آجائے۔"

"وہ بعد میں دیکھیں گے۔ فی الحال اس ایک میٹنگ تک ہر ممکن احتیاد برتنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "مگر کچھ اس بار میں ہی صحیح معنوں میں تمام ساقی اس قصبے سے باخبر ہوں گے۔ بعد ہم آئندہ کالا کونڈا مکمل طے کریں گے۔ سب کو تیار کرنے کی دعوت دیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی اچھی تجویز نہ آئے۔ اس وقت تک میں چاہتا ہوں، ہمارے کم سے کم ساقی ڈاٹ کی نظر میں آئیں۔ جو جتنا بے شناخت رہے گا اتنا ہی ہو گا۔"

"تھک ہے سر! ہم تمام احتیاد میں پیش نظر رکھیں گے۔ مجھے اطمینان دلایا۔"

میں ابھی اسے مزید کچھ ہدایات دے رہا تھا کہ مجھے اہوا کوئی دردناکے میں کھڑا ہے۔ میں نے گردن کھما کر دیکھا تو کوہدوازے میں کھڑے پایا۔ وہ ٹانٹ گاؤں میں تھی۔ صورت 'سیاہ' ریشمی بال منتشر تھے لیکن اس سے تہمتی نہ ایک حسن تھا۔ آنکھوں میں شب رفتہ کا غاریا پھر شاید نوا خند کی کرچیاں تھیں۔ وہ قدرے غصیلی سی نظروں سے میری دیکھ رہی تھی۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہ قصہ حقیقی تھا یا منہ

میں نے بات ختم کر کے فون بند کر دیا اور اٹھ کر بیٹھ کر تب بھی اندر نہ آئی، وہیں کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ آخر میں "کچھ بولو گی بھی۔۔۔۔۔۔ یاد ہیں کھڑی خاموشی تم چلائی رہو گی؟" وہ گویا دانت چپن کے بولی "سیاہ" کہتے ہیں پہلے تو گھر میں نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کر لی تھی۔ یعنی پہلے تو گھر میں دل ہی دل میں اس گھداں کو قتل رہی تھی جو اٹھا کر تھما شرم کھوپڑی پر بارنا چاہتی ہوں۔"

"کیا قصور ہو گیا مجھ سے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"ختم آکر مجھے جگا نہیں سکتے تھے؟ سیدھے میرے پاس آسکتے تھے؟" اس نے قصے سے پوچھا۔

"اے سہے کہتے ہیں نیکی کر دوا میں ڈال۔" میں نے غصہ لے کر کہا "مجھے تو جگہ دار نے بتایا تھا کہ خلاف معمول را نے دیر تک شریک کی ہے اور تمہیں سوتے زیادہ دیر نہیں میں نے سوچا تمہیں ڈسٹرب نہ کروں سوتے دوں۔ یہ جگہ ہے میری ہمدردانہ سوچ کا؟"

"کیا ناکارہ ہوا مجھے تمہاری ہمدردانہ سوچ کا؟" وہ آکر قریب صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی "دوسرے لوگ جگہ کے جگا کے بتا رہے ہیں کہ تمہارے گھر میں افضل آیا ہوا

جاننا اس وقت میرے لیے کتنا اہم ہے۔

"ہاں، تسماری نظر میں بیٹھ دوسروں کی باتیں اہم رہیں گی۔" وہ لہجہ میں سانس لے کر بولی "اس نے اور کوئی خاص بات نہیں کی۔ کہنے لگا میں دوبارہ فون کروں گا۔ اس وقت تک تم ٹیکہ کرلو۔ افضل تسمارے کمر بچھ چکا ہو گا یا بیچنے والا ہو گا۔"

میں اسی وقت فون کی کھنٹی کی دہلی دہلی سی آواز سنائی دی۔ ستارہ کان لگا کر سنتے ہوئے بولی "میرے بیڈ روم میں فون کی کھنٹی بج رہی ہے۔ میں جا کر سنتی ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ "بیٹھی رہو۔ میرا خیال ہے چند لمحوں بعد اس نمبر پر فون آجائے گا۔" میں نے اپنے قریب پائی پر رکھے فون کی طرف اشارہ کیا۔

میرا اندازہ درست رہا۔ بیڈ روم سے نکل مرتبہ کھنٹی کی نہایت تدرہم سی آواز سنائی دی اور جب وہاں کسی نے ریموٹر نہ اٹھایا تو چند لمحوں بعد میرے قریب رکھے ہوئے سیٹ کی کھنٹی بجی۔ میں نے ریموٹر اٹھایا لیکن "ہیلو" نہیں کہا۔

"خاموش ہو۔ لگتا ہے ریموٹر تم نے اٹھایا ہے افضل چہرہ دی۔" دوسری طرف سے ایڈم عرف ایڈی کی استہزائی سی آواز سنائی دی۔

میں تب بھی خاموش رہا۔ بد بختوں کے اندازے غصہ کے ہوتے تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "میں پہلے ہی اندازہ تھا کہ بے گھر ہونے کے بعد سب سے پہلے تم ستارہ کی کمر کا رخ کرو گے۔ یہاں "ہر طرح" کا آرام ملتا ہے نا تمہیں۔" اس نے ہر طرح پرست زور دیا اور پھر استہزائی سا قہقہہ لگایا۔

میں تب بھی خاموش رہا۔ وہ اس کی پروا کیے بغیر بولا "اور پھر ستارہ تم پر جان بھی تو مار کر رہی ہے ایسے دوست آج کے دور میں ہر کسی کو کھانٹ لیتے ہیں۔"

میں نے فہرے فہرے لیے میں کہا "ایڈی! میرے پیش قیمت مکان۔ اور اس سے بھی زیادہ قیمتی چند باتوں کو خاک و خون اور لمبے کے انبار میں تبدیل کر کے تمہیں کیا ملا؟"

ایڈی نے گویا میرے سوال سے محفوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور گویا میری عقل کرتے ہوئے اسی طرح فہرے فہرے لیے میں بولا "پہلے تم تھادو" تمہیں خیرہ ایجنسیوں کے ساتھ میٹنگ کر کے اور ان کے سامنے ہماری رام کمانی بیان کر کے کیا ملا؟"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے خیرہ ایجنسیوں کے ساتھ میٹنگ کی ہے اور ان کے سامنے تسماری رام کمانی بیان کی ہے؟"

میں نے ہر سکون لیے میں پوچھا۔

"میں دیواریں خبر دیتی ہیں، درخت سرکوشیاں کرتے ہیں، راستے کے پتھر بولتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بہت خوش معلوم ہوا تھا۔

"آزاد شاعری چھوڑو، میری بات کا جواب دو۔" میں نے

سے کہو اب کہیں اور چلا جائے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک کر کچھ اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "کس کا فون آیا تھا تمہیں؟"

مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کے ہاں دو فون تھے۔ دوسرے نمبر والے فون کا صرف ایک ہی سیٹ تھا جو اس کے بیڈ روم میں تھا۔ وہ گویا اس کا پرائیویٹ فون تھا۔ جس کال کا وہ ذکر کر رہی تھی وہ یقیناً اسے اسی فون پر آئی ہوگی۔ دوسرے نمبر پر تو میں بات کر رہا تھا۔

"فون کرنے والے نے اپنا نام تو نہیں بتایا۔" وہ باتوں میں اٹھایاں پھرتے ہوئے بولی "لیکن اندازہ کرنا ہر حال مشکل نہیں تھا۔ انہی پراسرار سے لوگوں میں سے کوئی معلوم ہوا تھا جو تسماری وجہ سے کبھی کبھی میری زندگی خراب کرنے پر تلے رہتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" میں نے استہزائی سنجیدگی سے پوچھا۔

"مجھے تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا تھا کہ افضل یہاں نہیں ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہی پوچھا تھا۔" افضل بچتی گئی "میری کھوپڑی کوم گئی۔ ظاہر ہے میں رات کے پچھلے پہر آکر ابھی بمشکل دو گھنٹے سونائی تھی کہ اس کو کے پٹنے نے فون کر کے چکا دیا۔ اوپر سے پوچھ رہا ہے افضل بچتی گئی؟ میں نے کہہ دیا "نہیں، تسماری اہل نے ابھی اسے میرے پاس نہیں بھیجا، وہ برا منالے کے بھائے بننے لگا۔"

پھر یکدم مجھے ستارہ کو یکم خیال آیا۔ اپنے مصنوعی خیرے کو بھول کر وہ میری طرف جھکتے ہوئے معصومانہ سنجیدگی سے بولی "آئی! یہ لوگ خطرناک تو بہت معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے توجہ میں آیا کہ بک دیا۔ وہ سپر نیٹی سے ستارہ ہاں لیکن دل میں تو اس نے برا منایا ہو گا؟"

"یقیناً" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور جب وہ برا مناتے ہیں تو نہایت ہی بڑے انداز میں برا مناتے ہیں اور بہت بڑی سزا دیتے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" اس کی آنکھیں پھل پھل گئیں۔

"اور گھٹیں؟" میں نے استہزائی لیے میں کہا۔

"تم جو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہو مجھے۔" وہ میرے کندھے پر ہلکا سا گھونسا مارے ہوئے دانت نہیں کر بولی "اگر تم چھوڑ کر نہ بھاگا کرو تو میں دنیا میں کسی سے بھی نہ ڈولوں۔"

"چما خیرہ جذباتی مکالے چھوڑو، یہ تھادو اس نے مزید کیا کہا؟"

میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے خوشخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "میرے جذباتی مکالوں کی تسماری نظر میں کوئی اہمیت نہیں؟"

"جذبات کی اہمیت ہے مکالوں کی نہیں۔" میں نے کہا "تم میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ان باتوں کا

لیجے میں کہا "کسی خفیہ ایجنسی میں بھی تمہارے نمائندے موجود ہیں؟"  
 "ہم تمہارے سوالوں کے جواب دینے کے پابند نہیں ہیں یہ بات تم بار بار بھول جاتے ہو۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی سرسری آہنی "تصویر" جس لہجے میں تم پوچھ رہے ہو اس پر تو ہمارا بالکل بڑا تکبر اُٹھتا ہے۔"

"میں تو تمہاری فروغیت کے تاتے سے پوچھ رہا ہوں۔ عام طور پر تم اپنے ذہم میں بہت سی باتیں مٹا پند کرتے ہو۔" میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"میں کسی قسم کے ذہم میں مبتلا ہو کر تو نہیں بہر حال تمہاری قہقہے کے لیے تیار ہوں کہ جن لوگوں کے ساتھ تم ٹینگ میں شریک ہوئے تھے ان میں کوئی ہمارا خیر نہیں تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر تمہیں کیسے سب کچھ معلوم ہوا؟" میں نے ایک سوہوم سی امید کے ساتھ پوچھا۔

"میں نے کب کہا کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے؟" وہ بے پروائی سے بولا "ہم تو صرف پندرہ نو اڑتے دیکھتے ہیں کہ ان کا رخ کس طرف کو ہے۔ باقی آواز سے خود بخود ہو جاتے ہیں کہ وہ کہاں بند کر کس طرح چکے ہوں گے۔"

"صرف اتنی سی بات پر تم نے میرے خوب صورت مکان کو لے کا ڈیر بڑھا؟" میں اپنی آواز کو ہموار رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ ستارہ قریب بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ اتنی سی بات نہیں تھی چند ہی ڈیڑھ گھنٹہ پر زور دینے کو بولا "ہم نے تمہیں بہت سمجھا بھرا سمجھا تھا۔ ہم ابھی تک تمہیں یہ سمجھانے میں ناکام رہے ہیں کہ جب ہم سنجیدگی سے کوئی بات کریں تو تمہیں بھی اس کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ یہ اس سلسلے کا پہلا سبق ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "تمہیں بھولنا نہیں چاہیے تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم تمہاری طرف سے انکار تو سننا ہی نہیں چاہتے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ تمہیں ہمارے بارے میں زبان نہیں کھولنا چاہیے تھی۔ یہ تو ہماری ہدایات کی بالکل ہی ناقابل معافی خلاف ورزی تھی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اس کے باوجود تم زندہ سلامت پھر رہے ہو۔ یہ ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔"

میں نے بدستور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "ایڈی ڈیڑھ گھنٹہ تمہاری نہیں کسی اور کی ضمانت ہے۔ اگر اس کی یہ ضمانت جاری رہی تو تمہاری ضمانتوں کا حساب ضرور چکا دوں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک بار پھر تم سے مزید اہم گزارش ہے کہ یا تو چہرے کی کاپی مکمل ختم کر دو یا پھر مردوں کی طرح سامنے آ جاؤ۔ زندگی اور

موت کی بازی میرے لیے کسی اہم نہیں رہی لیکن مثالہ تو میدان میں ہونا چاہیے۔ میرے وسائل اور میری طاقت تمہارے سامنے ایسا ہی ہے جیسے ہاتھی کے سامنے چوٹی کی طاقت۔ اس کے باوجود اسے میری درخواست سمجھ لو، چنانچہ سمجھ لو ہمارا کیا چاہے سمجھ لو کہ جو کچھ بھی کہنا ہے سامنے آ کر کہو۔"

اس نے ایک لمبھی سانس لی گویا وہ اس قسم کی باتیں سن کر بہت دور ہو چکا ہو۔ مگر وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "چند ہی ڈیڑھ گھنٹہ قہقہے مکالموں اور مزید داستانوں کا زمانہ نہیں ہے۔ ہم تمہیں اس دلیل سے نکالنا چاہ رہے تھے ہم چاہتے تھے تم ان قوموں کی سطح پر آ کر سوچو جو مغرب پرانے ستاروں پر آباد ہوئے والی ہیں۔"

"میں گو کہ اس دنیا کے بعد اب چاند ستاروں کو بھی برباد کر کے والی ہیں۔ ان کا سینہ بھی زخموں سے داغدار کرنا چاہتی ہیں۔" میں نے فطرت سے کہا۔

اس نے ایک لمبھی سانس لی گویا اس نتیجے پر پہنچا ہو کہ مجھے سمجھنا فضول تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "تو رستارہ سے بات کراؤ۔"

"وہ تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔" میں نے بلا تامل کہا۔ "بچوں کی طرح خدمت کیا کرو۔" وہ مہربان لہجے میں بولا "تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر اس وقت تم اس سے میری بات نہیں کراؤ گے تو پھر کبھی نہیں ہو سکے گی؟ ذرا بات کراؤ۔ تمہارے ناکے کی بات ہے۔"

میں نے دبیور ستارہ کی طرف بڑھاتے ہوئے مڑتے ہیں پر ہاتھ رکھنے پر بھی کہا "ایک فیصلہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں دبیور ستارہ کی اس حرکت کچھ ہلکی پڑھکی تھی۔ اس فون کی چونکہ ایکشنیشن بھی موجود تھی اس لیے میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور دوسرے سینٹر پر ان کی گفتگو سننے لگا۔

ستارہ یقیناً ایک لمحے کے تذبذب کے بعد بولی تھی۔ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں اسے بولو کہتے سنا۔  
 ایڈی بولا "ستارہ! تم ایک کم پڑھی لکھی مگر ذہین عورت ہو ہماری سمجھانہ رہ چکی ہو۔ تمہیں کچھ تو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔"

ستارہ یقیناً کچھ سنہیل چکی تھی۔ وہ بولی تو اس کی آواز بیٹھی بیٹھی ہی تھی لیکن اس میں ستارہ کا اپنا رنگ آچکا تھا۔ بظاہر سادگی سے بولی "اں مجھے اندازہ ہو گیا تھا بہت سہولت سے ہو۔"

ایڈی نے برا نہیں منایا۔ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا "تمہارے انداز میں بھی افضل کا رنگ چھلکا ہے۔"

"تمہارے من میں بھی شکر۔" ستارہ بدستور سادگی سے بولی "میرے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوگی کہ میرے انداز میں

افضل کا رنج جھلکے لیکن کاش افضل کو بھی اس کا احساس ہو اور مجھے اس کا کچھ فائدہ ہو۔"

"چاہیہ داری صدقے جانے والی باتیں چھوڑو۔ کام کی بات سنو اور کان کھول کر سنو۔ تم افضل کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہیں دو گی۔ زیادہ سے زیادہ اسے ناشتے تک تمہارے ہاں ٹھہرنے کی اجازت ہے۔ اس کے فوراً بعد اسے چنا کر دو۔"

"تم تو بالکل ہی کھوٹے کے پتھر ہو۔" ستارہ اپنی مصنوعی سادگی برقرار رکھتے ہوئے بولی "اس قسم کی باتیں بھلا مجھے بتانے کا کیا فائدہ؟ یہ گھر افضل ہی کا ہے۔ وہ گھر کا بھی مالک ہے۔ مرضی کا بھی مالک ہے اور اجازت کا بھی مالک ہے۔ اس کی مرضی ہے جب چاہے یہاں رہے، جب چاہے چلا جائے۔ میں بھلا اسے منع کرنے والی کون ہوتی ہوں؟ تمہیں جو کچھ بھی کہتا ہے اس سے ڈانٹ کر ہی کہو۔ تمہارے کہنے سے منع ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ مجھ میں تو اسے کسی بھی بات سے منع کرنے کی جرأت نہیں ہے۔"

ایڈی ایک لمحے کے لیے نہ جانے کیوں خاموش ہو گیا۔ پھر عجیب سے لمحے میں بولا "کچھ زیادہ ہی نڈا ہو افضل پر۔ دل و جان سے چاہتی ہو اسے؟"

"نڈا ہونے اور دل و جان سے چاہنے وغیرہ کا تو مجھے پتا نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی "میں اس کے سوا دنیا میں کوئی اچھا نہیں لگتا۔"

ستارہ کو معلوم تھا کہ میں ایک سٹیشن پر منتقل ہونے پر تیار ہوں۔ یہ ساری باتیں صرف ایڈی کو ہی نہیں، مجھے بھی سننا رہی تھی۔ اس وقت اس کے منہ سے یہ سب کچھ سننا بہت بھلا لگا۔ تھکی ہوئی صبح کو جیسے کچھ شکستگی سی میٹر آگئی۔ مجروح سے حوصلوں کو سارا ملا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔

"میں جو کہ رہا ہوں اسے بہت سنجیدگی اور توجہ سے سنو۔" ایڈی کے لمحے میں ایک نشت ہی بلا کی سفاکی اور سرد مہرپی در آئی۔ ستارہ ادا کاہ خنکی بکوں کے آثار چھڑھڑھ سے بغلی آٹنا تھی۔ اسے یقیناً اندازہ تھا کہ وہ محض دھمکیاں دینے والے کسی تھوڑے سی پر جوش یا کسی غمی وں سے بات نہیں کر رہی تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ حوصلے سے ہر بات کا جواب دے رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے خوف کو بلائے طاق رکھ دیا تھا جو ایک اچھی علامت تھی۔

ایڈی کی آواز کچھ اور نیچی ہو گئی "افضل ہمارے زیرِ مخاب آچکا ہے اور ستارہ بیگم! جو ہمارے زیرِ مخاب آجائے اسے تو زمین بھی پتا نہیں رہتی پتہ کج گھر پتا دے سکتی ہو؟ ابھی تک تو یہ صرف ایک دو ستارہ مشہور تھا، اب تمہیں علم دیا جا رہا ہے کہ افضل کو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد اپنے گھر سے رخصت کر دو ورنہ تمہارا انجام مہرت ناک ہو گا۔"

"انجام کے بارے میں کچھ مت کو چننا! ستارہ دوستانہ

لمحے میں بولی "کسی کو کچھ پتا نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ممکن ہے میں افضل کو رخصت کر دوں لیکن اس کے باوجود بھی میرا انجام مہرت ناک ہو۔"

"میں اس صورت میں، میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔"

"میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس کنیز کو یہ نادر شاہی حکم اور جاں بخشی کی ضمانت کون سے بادشاہ سلامت کی طرف سے دی جا رہی ہے؟" ستارہ نے قدرے استغناء سے لمحے میں پوچھا۔

"یہ حکم تمہیں ان کی طرف سے دیا جا رہا ہے جن کا حکم درحقیقت پوری دنیا پر چلتا ہے۔ جو ہمارا حکم نہیں مانتے وہ پوری دنیا کے سامنے نمونہ مہرت بن جاتے ہیں۔ تم میری بات کو خدا میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو ستارہ بیگم! اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ ایڈی کے لمحے میں جو جمل سنجیدگی تھی۔

"میں تو بہت حقیر فقیر قسم کی عورت ہوں، تم مجھے نظر انداز نہیں کر سکتے؟ تم سمجھ لو کہ میں اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوں، یہاں بہت سی عورتیں ہیں۔" ستارہ کے لمحے میں بھی سنجیدگی آگئی لیکن اس سنجیدگی میں ملاحت بلکہ کسی حد تک التجائی بھی آمیزش تھی۔

"میں کہہ تو رہا ہوں، افضل کو چلا کر دو اور آئندہ بھی اسے کبھی گھر میں گھسنے مت دینا۔ ہم تمہیں بھول جائیں گے۔" ایڈی نے جواب دیا۔

"یہ تم بہت سی مشکل شرط عائد کر رہے ہو۔ اسے ماننا میرے بس کی بات نہیں۔ افضل کی دوستی کے سوا میری زندگی میں کوئی خوشی ہے ہی نہیں۔ میں نے زندگی میں ایک بار اسے دھوکا دیا تھا۔ اپنی شخصیت اور اپنی فطرت کا اس پر بہت سی کھینچا امپریشن چھوڑا تھا۔ تب سے اب تک میں اس کی غلطی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں اب اس کی نظریں بہت اچھی عورت بنا چاتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں وہ مجھے ہمیشہ بہت اچھے الفاظ میں یاد رکھے۔ میں نے کوئی زیادہ اچھی زندگی نہیں گزار لی لیکن اگر میں افضل کی نظریں اچھی ہو گئی تو سمجھوں گی کہ زندگی بہت اچھی گزری۔" وہ بہت سی سنجیدگی سے یہ ساری باتیں کر رہی تھی۔ مجھے اس کے غلوں اور دانگلی کا کافی حد تک اندازہ تھا لیکن پھر بھی اتنے خیر متحمل جذبات کی امید نہیں تھی۔ اس کے الفاظ میری صبح کی گمراہی میں کہیں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اس بیکراں غلوں کی لذتوں سے زیادہ لطف کشید کرتی مگر شہ راتوں کی میری جھکن کچھ کم ہو گئی۔ بے غرض محبت بھی ایک عجیب سی ناک ہے۔

"مٹف۔۔۔ آف۔ اتنی انسانی باتیں! ایڈی نے گویا سپینٹ لیا حستانہ بیگم! تمہیں نہیں آ رہا کہ تم ایک غمی عورت ہو۔ یہ باتیں تو صرف اسکرین کے لیے ہوتی ہیں، سادہ لوح فلم بینوں کو سنائے کے



لے ہوئی ہیں۔ تم تو عجیب سی عورت ہو۔ قلمی بیرونی کی مملی  
 زندگی اس سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ یہ تم کتنی پتھروں میں پھنسی  
 ہوئی ہو؟ چلو عام لوگوں کی حد تک مجھ تمہارے یہ مکالمے ٹھیک  
 ہیں لیکن ہمارے سامنے ایسی قسم کی افسانویت میں الجھ کر اپنا اور  
 امارات ضائع مت کرو۔ جان ہے ہاتھ دھو بیٹھو۔“  
 ”مگر میں نے جان دے کر بھی افضل کے دل میں جگہ بنائی تو  
 میں سمجھوں گی سودا منگائیں ہے۔“ ستارہ بلا تامل بولی ”میں چاہتی  
 ہوں وہ سب بھی مجھے یاد کرے۔ آؤ بھر کر یاد کرے۔ اس کے دل میں  
 نہیں سی اٹھے ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گی۔ زندگی کی اچھی قیمت  
 وصول ہو گئی۔ سودا منگائیں رہا۔“

”اورہ مالی کاڑ۔! بات آٹان سینس! ایڈی بے اختیار بول  
 اٹھا۔ یہ سب کچھ گویا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ میں خود بھی  
 حیران تھا۔ ستارہ نے اس حد تک اور اس پہلو سے آج تک اپنے  
 ظلوں کی شدتوں کا اظہار مجھ پر بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے اندازہ تو تھا  
 کہ وہ اس طرح سوچتی ہے اس طرح محسوس کرتی ہے لیکن پھر بھی  
 اپنی دفاعیت سے اس کے اپنے من سے یہ سب باتیں ستارہ میرے  
 لیے ایک لطیف تجربہ تھا۔“

ایڈی بیڑاری سے بولا ”تم نہیں مانو گی؟ میں تمہاری طرف  
 سے انگار سمجھوں؟“

”میں نہ تو کسی چیز سے انگار کر رہی ہوں اور نہ کسی چیز کا  
 اقرار۔“ ستارہ بولی۔ ”تم مجھ سے ایک عجیب اعتقاد نہ فرمائیں  
 کر رہے ہو جس پر میرا کوئی اختیار ہی نہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں  
 کر سکتی کہ میں بھی افضل سے کہوں وہ یہاں رہے یا چلا جائے۔ یہ  
 اختیار صرف اسے خود کو ہی حاصل رہا ہے اور بیشک اسے ہی حاصل  
 رہے گا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ گھر بھی اس کی ملکیت ہے اور میں بھی  
 اس کی ملکیت ہوں۔“

”کوئی جی! ایڈی نے یہ کہہ کر غائب وادانت چلی کر ریپورٹ  
 دیا۔“

”مگر مے کا پتہ! ستارہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا لیکن یہ  
 جواب ایڈی تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ سلسلہ منقطع کر چکا تھا۔ ستارہ  
 نے بھی ریپورٹ دیا۔“

ریپورٹ دیکھ کر میں دھیرے دھیرے قدیم اٹھانڈا ڈرائنگ روم کی  
 طرف واپس آیا اور جہ کھٹ پر رک گیا۔ وہ دونوں ہاتھ بظنون میں  
 دبائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ادھوری خند کے گلابی ڈورے  
 الٹی تک تھم رہے تھے لیکن ان کے عقب میں اب ایک عجیب سی  
 ادراک تھی۔ وہ بالکل مست سے انداز میں بیٹھی تھی۔ قلمی سی نہیں  
 تھا کہ چند لمبے لمبے کیا عورت ایڈی جیسے اہم اور خطرناک آدمی سے  
 چٹا چٹا ہاتھ کر رہی تھی۔

مکھانے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور وہ یکدم اٹھ کر یوں میری  
 بانہوں میں آن سمی جیسے کوئی سنا ہوا پرندہ پھر پھڑپھڑاتا ہوا۔۔۔ اپنے

آشیاں میں آچمپا ہو۔ وہ باپ رہی تھی جیسے اس نے چند قدم کا  
 نہیں بلکہ خاصا طویل فاصلہ دوڑ کر لے لیا ہو۔  
 ”تمہاری باتوں سے مجھے بہت حوصلہ ملتا ہے۔“ میں نے اس  
 کے ریشمی بالوں سے پھینکے ہوئے سرکوشی میں کہا ”میں اپنے آپ کو  
 ایک پناؤ کی طرح مضبوط محسوس کر رہا ہوں۔“  
 اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور غور سے انداز میں  
 مسکرائی ”شاید پناؤ جیسے مضبوط ہر خود کی بنیاد میں ریشم جیسی نازک  
 کوئی عورت ہوتی ہے۔“  
 ”شاید“ میں نے عیسیم بے کسی کا پھر پھر ”تم واقعی خوفزدہ  
 نہیں ہو؟“

”تم میرے خوف اور بے خوفی کو چھوڑ دو۔“ وہ میرا ہاتھ تمام کر  
 دیا پس صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ”یہ بتاؤ کیا ان لوگوں نے  
 واقعی تمہاری کوئی باتوں کو ہوں سے اڑا دیا ہے؟ میں نے تمہیں فون پر  
 اس طرح کی بات کرتے ہوئے سنا تھا۔“

”ہاں“ میں نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”اسی لیے  
 تو میں اندھیرے آکر تمہارے ہاں پناہ لی تھی۔ کوئی بالکل رست کا  
 ڈھیر بن گئی ہے۔ بڑی مہارت سے اسے اڑایا گیا ہے۔ مکان یا کہیں  
 کچھ بھی نہیں بچا۔ میرا خیال ہے مجھے انہوں نے جان بوجھ کر زندہ  
 چھوڑا ہے ورنہ یہ کام شاید گھر میں میری سوچو گی کے دوران  
 ہوتا۔“

”تم نے آخر فوراً مجھے جگا کر یہ بات کیوں نہیں بتائی؟ تم تو اس  
 طرح آرام سے آکر ڈرائنگ روم میں چپکے سے لیٹ گئے جیسے کوئی  
 بات ہی نہ ہو۔“ وہ ٹھکڑے آہستہ جیسے میں بولی۔

”اب تمہارے آرام میں خلل ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔  
 اگر میں چنچیں مارا ہوا تمہارے ہاں بچتا مگر یہ زاری کرتا نہیں نہ  
 گیا“ میں برباد ہو گیا کہ نعرے بلند کرنا تو تم مجھ سے زیادہ پریشان  
 ہو جاتیں۔ میں ابھی مفلس و قحاش نہیں ہوا۔ زندگی رہی تو ویسی ہی  
 اس سے اچھا مکان اور سائیس گے۔ ہاں ان جانوں کا افسوس ضرور  
 رہے گا جن کا کوئی متبادل نہیں اور جو دوبارہ اس دنیا میں نہیں  
 آئیں گی۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اب واقعی دل کو کچھ قرار  
 سا آچکا تھا۔ میں غلطی اپنی افسردگی اور اضطراب پر قابو پانے میں  
 کامیاب ہو گیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ستارہ بولی ”آخر یہ لوگ کون  
 ہیں؟ کیوں اس حد تک تمہارے دشمن ہو گئے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں  
 یہ؟“

”میرے پاس بیٹھو۔ میں اب جیسے بھی یہ سب کچھ بتا رہی ہوں  
 ہوں تاکہ بات تمہاری سمجھ میں بھی آجائے اب شاید تمہیں بھی  
 بہت زیادہ ہوشیار اور متکا رہنا پڑے۔ میں اس لیے بھی جیسے  
 سب کچھ بتا رہی ہوں کہ اب یہ کوئی ایسا راز بھی نہیں رہا اور  
 شاید حالات سے آگاہ رہتے ہوئے تم ان سے کچھ بہتر طور پر نہ

سکو۔

ہوگی۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ قدرے جلدی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”سب کچھ پریس میں آجائے گا عوام کے سامنے آجائے گا ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ حکومت کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ سرکاری مشینری ہنگامی بنایا ہوا حرکت میں آئے گی تو ریلوے ڈاٹ کا کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔ یہ اندھیرے غلام میں مغل رہنے والی کیفیت تو ختم ہوئی کچھ نہ کچھ ہوگا۔“

”اہں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے ”میں ممکن ہے پریس کانفرنس کے دوران ہم دونوں کا پتا ہی ملد ہو جائے بلکہ کو خطرات سے نجات ملے نہ ملے ہم دونوں کو تو خطرات سے نجات ضرور مل جائے گی۔“

”اب ایسا بھی کیا اندر۔“ ستارہ سیدھی ہو کر بیٹھے ہوئے پلا ”ستارہ اسے پاس کافی تعداد میں بڑے کام کے تو ہی موجود ہیں میرے پاس بھی دو مسلح کارڈز ہیں کچھ اور لوگوں کو بلا لیں گے پولیس کی مدد لے لیں گے۔ پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ پریس کانفرنس کریں گے۔“

مجھے کسی آنکھ اپنی تمام تر ذہانت اور جماعتی کے باوجود کچھ نہ کچھ سادہ سمجھ میں نہ آئے ”میری گفتگو سے شاید تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ انہیں پانچ انتخابی ترقی یافتہ سفید فام قومن کا تمام تر سائنسی ترقی کا ٹیچہ حاصل ہے۔ وہ کچھ اس قسم کے لوگ ہیں جیسے اب تک ہمیں سائنس کشش سائنسی تھے کمانڈر ملے تھے۔ اس قسم کے روایتی اور فرسودہ حفاظتی انتظامات ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ ہم مسلح قومن کا حلقہ اپنے ارد گرد لیے بھرتے رہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم پہلے کی طرح اپنے آپ کو تن بہ تدبیر ہی چھوڑے رکھیں۔ اپنے انتظامات کے بجائے صرف اوپر والے پر ہی بھروسہ رکھیں یہ یقین پختہ رکھیں کہ جب تک زندگی ہے کوئی ہمیں مار نہیں سکتا۔“

پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”اس کے علاوہ اگر ایک بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر میں تمہاری تجویز پر عمل نہیں کر سکتا۔“

”وہ کیا؟“ اس نے قدرے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اس کا ڈر و غور کچھ لحاظ اندر کیا تھا۔

”یہ ایک انتخابی حساس معاملہ ہے مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں ایجنسیاں اس سلسلے میں کیا کریں گی گلیا نہیں، لیکن انہوں نے کم از کم ایک کام ضرور کیا ہے اور وہ یہ کہ مجھے اس سلسلے میں کسی بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا ہے۔ میں تو یہاں بیٹھا ہوں ساری کمانی سنا رہا ہوں۔ انہوں نے تو مجھے سختی سے روایت کی کہ انہیں مطلع کیے بغیر بلکہ ان کی اجازت لے بغیر کسی سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہ کہوں۔“ میں نے اصل وجہ بھی اسے

دہرایا میرے پاس بیٹھ گئی اور میں نے شروع سے آخر تک اسے اس سارے چکر کے بارے میں بتایا۔ ساری بات اس کی کچھ میں آئی تو وہ بھی کچھ پریشان سی ہو گئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کی زیادہ پریشانی صرف میری ذات سے متعلق تھی۔ اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ میرا کیا بنے گا؟ عائلی سازشوں، ملکی حالات یا ترقی پذیر ملکوں کو درپیش خطرات وغیرہ کے ہماری بھر کم معاملات میں وہ سرکھانا نہیں چاہتی تھی۔

”اب تم کیا کہو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے خود نہیں معلوم“ میں نے لٹھری سانس لے کر کہا ”مجھے اندازہ نہیں کہ آئندہ لمحے کیا ہونے والا ہے، اس لیے میں چٹکی تو کچھ بتا ہی نہیں سکتا کہ کیا کریں گا۔ فی الحال تو میں اور مجھ سے متعلق رکھنے والے لوگ صرف احتیاطی تدابیر ہی کر سکتے ہیں وہ ہم کریں گے۔ اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی احتیاطی تدبیر کارآمد ہوگی ثابت ہوگی یا نہیں۔ میں تو اس امید پر یہ معاملہ سرکاری ایجنسیوں کے علم میں لایا تھا کہ شاید سب کچھ ان کی گود میں ڈالی کریں بالکل بے فکر ہو جائوں گا۔“

”انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ ستارہ باور سے بولی۔

”جتنی جلدی وہ کر تو واقعی کچھ نہیں سکتے تھے۔ ان کا پانچا نظام ہے، بہت بڑی مشینری ہے جو دھیرے دھیرے حرکت میں آتی ہے اور کچھ ہندے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے۔ دیگر مشینوں کی طرح اس مشینری کی بھی آنکھیں اور محسوسات نہیں ہوتے۔ وہ وہ اور وہ چارہ کے اصول پر کام کرتی ہے۔ مجھے اس کانفرنس میں ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے اس بات کا ہے کہ انہوں نے شاید اس مسئلے کو زیادہ پیچیدگی سے نہیں لایا یا پھر شاید انہوں نے میری بات کا کچھ زیادہ یقین نہیں کیا۔ مجھے صحیح طور پر کچھ اندازہ ہی نہیں ہے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں کیا چاہتے ہیں اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ بہت مشکل اور ٹیڑھے لوگ ہیں، مغل کری نہیں دیتے۔“

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”اب تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ ان کے پاس جا کر مجھ سے غلطی ہوگی۔ مسئلے کے تدارک کے سلسلے میں بھی کچھ ہوا نظر نہیں آ رہا اور میں ریلوے ڈاٹ کے زیر محاب بھی آیا ہوں اب تک تو ان سے صرف اٹھیلیاں ہی چل رہی تھیں۔ کوئی یقین مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔“

ستارہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ”تم اس معاملے میں حکومت کو ذرا جھنجھوڑنے کی کوئی اور تدبیر سوچو۔ تم اس چکر کو بالکل ہی اوپر کیوں نہیں کر دیتے؟ بہت بڑے پائے پر ایک پریس کانفرنس بلاؤ۔ میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں۔ ایک قلمی بیرونی کے گھیر کر وجہ سے پریس ذرا آسانی سے اکٹھا ہو جائے گا۔ ہم یہ سارا قصہ ان کے سامنے بیان کر دیں گے۔ تمہاری تہ شدہ کو بھی ان کے سامنے

زندگی بڑی بے کیف ہو جاتی ہے۔ دیر نہ دیر وہ اب تم خود ہی اپنی "تعلیمات" کی لٹی کر کے لگے ہو۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "میں تو ویسے بھی اداکار ہوں۔ میری زندگی سے اگر جذبات کو نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جائے گا؟"

"وہ جذبات صرف اسکرین کے لیے ہوتے ہیں۔ اداکارہ کے جذبات صرف اسکرین پر ہی اچھے لگتے ہیں جو اسکرین کے راستے سے اس کے کردار میں آتے ہیں۔ عملی زندگی میں یہ بے وقوفی کی باتیں لگتی ہیں۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن تم تو ایسی "بے وقوفوں" سے محبت کرنے والے آدمی ہو۔ اب ان باتوں سے منکر تو مت ہوؤ۔"

"مجھے اپنے قلمی عزیز ہیں لیکن تمہاری جان ان سے زیادہ عزیز ہے۔ مہلے کار کی باتیں چھوڑو مجھے اب جانے دو۔" میں نے اسے پکڑا۔

"اپنی سی سوچتے ہوئے ہیں جب کسی فرعون کو یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں بھی اس کا حکم ماننے والے نہیں ہوتے۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی۔

"میں خود تو اب تک یہی کرتا آیا ہوں لیکن تم اپنے آپ کو اس حد تک کیوں ٹوٹ کرتی ہو۔" مجھے اس کی ضد سے الجھن ہونے لگی تھی۔

یکدم ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گھو گھری آواز میں بولی "زندگی کے سفر میں تو ساتھ نہیں چلے دیتے کبھی کبھی ان چھوٹے موٹے پڑھراستوں پر تو چند قدم ساتھ چلنے پڑھا کر۔"

میں دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے یکدم اتنا ہی جذباتی سے لہجے میں بولی "اگر تم مجھے تو میں اپنے آپ کو شوٹ کر لوں گی۔"

"آف خدا یا!" میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ چند لمحے اسے الجھونکے کے بعد میں نے کہا "مستاد بیگم! ایک بات تو ہے کہ تمہارا بھی کوئی نہ کوئی پرنسز ہوا ضرور ہے اور وہ ضرور کوئی نابالغ پرنسز ہے۔"

اس نے محسوس کر لیا کہ میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ غمایت سے مسکراتے ہوئے بولی "تھوڑا بہت سبکی تو ہر شخص ہوتا ہے۔"

"تھوڑے بہت کی تو کوئی بات نہیں؟ گزارا ہو جاتا ہے لیکن تمہارا معاملہ تو..." میں نے لٹھری سانس لے کر جملہ ادھر ادھر چھوڑ دیا۔

"اب جو تمہارا دل چاہے کہ لو۔ مجھے بس خوشی یہ ہے کہ تم نے میری بات مان لی۔" وہ کھلی جارتی تھی۔

"اور جان کا تمہیں کوئی خوف نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے ہوا کرتا تھا اب نہیں رہا۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

یاد رہے "میں پھر تو ہو گیا کام؟ وہ گفت خود سے انداز میں جم دیا چھوڑ کر صوفے کے کپڑے سے ٹک لگاتے ہوئے بولی۔

"میں نے گہری دیکھتے ہوئے کہا "میں اب چلا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ یکدم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"انہوں نے جس میں مجھ کو گھر سے نکالنے کے لیے ایک گھنٹی کی مہلت دی تھی۔ میرے خیال میں بھرتی ہے کہ اس مہلت کے قلم ہونے تک میں یہاں سے نکل لوں۔ میں تمہارے لیے خطرات کو بے گناہ نہیں چاہتا۔ میری وجہ سے تم پہلے ہی کافی زحمت اٹھا چکی ہو۔"

"اور؟" وہ مسرور لہجے میں بولی "یہ تم اتنے باکلف کب سے ہو گئے؟"

"معاذ نازک ہے اس میں باکلف رستہ ہی مناسب ہے۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میں اٹھنے لگا تو وہ میرے دونوں بازو پکڑ کر مجھے بٹھانے کے لیے بہادار مزور لگاتے ہوئے تجھانہ لہجے میں بولی "بیٹھ جاؤ تم کیس نہیں جاؤ گے۔ اگر تمہارا پہلے کیس جانے کا پروگرام تھا بھی تو اب تم اس پر عمل نہیں کرو گے۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے کہہ دیا۔" وہ ضدی لہجے میں بولی "وہ کتنے ہی بڑے کتنے ہی خطرناک لوگ سہی، میں نہیں چاہتی وہ یہ سمجھیں کہ تمہارے جان کے خوف سے افضل کو اپنے گھر سے بھاگا۔"

"لیکن تم تو مجھے نہیں بھاگ رہی۔ میں اپنی مرضی سے جا رہا ہوں۔ تم نے تو ان پر بھی جبراً جبراً کیا تھا کہ تم مجھے جانے کے لیے نہیں کوئی لیکن میں اپنی مرضی سے جانا چاہوں گا تو چلا جاؤں گا۔"

میں نے اسے بارود لایا۔

"اب اس وقت روانی میں کہہ تو ہا تھا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اپنی مرضی سے بھی نہیں جاؤ گے۔ کم از کم آج شام تک تو میں نہیں جاؤ گے۔ عجب ہے تم اپنی مرضی سے جاؤ یا کسی اور وجہ سے لیکن وہ لوگ تو میں سمجھیں گے کہ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی ہے ان کی دھمکی سے ڈر گئی ہوں۔ میں ایک کمزور عورت ہوں لیکن انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ دل کے معاملے میں عورت بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہوں کی بات نہیں مانتی۔ میں انہیں ان کی کھلی کھلی پر خیراد کرنا چاہتی ہوں کہ کم از کم تمہارے معاملے میں وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتے۔" اس کا لہجہ فیصلہ کی تھا۔

"ان جذباتی باتوں کا ناکہ؟" میں نے ملاحظہ سے کہا۔

"تم ہی تو کہا کرتے ہو کہ ناکہ ہوا نہ ہو لیکن جذبات کو زندگی سے غافل نہیں کرنا چاہیے۔ ہر چیز کو صرف ناکہ سے اور نقصان سے بچانے سے نہیں بچانا چاہیے۔ اگر جذبات کو نکال دیا جائے تو

بابیٹا لاؤنج والا ٹیلی فون سیٹ بھی اٹھا کر میں وہیں لے گیا۔ جہاں اپنے آرائش اور پر آرائش بیگن میں کھڑی چند لکھے جو حیران حیران سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی جیسے کسی اجنبی جگہ پر آگئی ہو۔ اس کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کام کہاں سے شروع کرے آخر کار وہ کام میں لگ ہی گئی۔

میں اپنی آؤ میگزین میں تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کس ساتھی کو کون سی چیزیں دے دوں۔ دو ساتھی اس وقت بھی ستارہ کی کوشی کی گراؤ کر رہے تھے میرے پاس زیادہ آؤ نہیں تھے اور جو تھے ان میں چاہتا تھا وہ سب کے سب ہی ریڈ ڈاٹ کی نظر میں آجائیں۔ میرا محفوظ سرمایہ تھے۔ میں انہیں بڑے وقت کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

شام کو ان سب کو میٹنگ میں بھی شرکت کرنا تھی۔ وہ جہاں بھی کام کر رہے تھے یا کسی مقصد کے تحت تعینات تھے میٹنگ میں شرکت کے لیے انہیں وہاں سے ہٹا تھا۔ میٹنگ میں نے جہاں بوجھ کر کوئی کے گھر رکھی تھی۔ گو مجھے اندازہ تھا کہ کوئی کا گھر شاید محفوظ نہ ہو۔ کوئی خود بھی ریڈ ڈاٹ کی نظر میں تھا اور میں ممکن کہ اس کا گھر بھی انہیں معلوم ہو لیکن فی الحال اس کے سوا کوئی جگہ مناسب بھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔

ماڈل ٹاؤن والی کوشی جسے ہم دو نمبر کہتے تھے ہمارا سب محفوظ رکھنا تھا۔ پہلے میں نے میٹنگ وہیں رکھنے کا سوچا تھا لیکن ارادہ بدلتی کر دیا۔ میں نے سوچا جب تک ممکن ہو سکے کہ دو سروس کی نظر میں آنے سے بچایا جائے اسی لیے میں نے خود آؤ گھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ خدائی انتظامات کے لحاظ سے بھی وہ ایک عمدہ جگہ تھی۔ کسی معرکے کی صورت میں ایک چھوٹا موٹا قلعہ ثابت ہو سکتی تھی۔ گو کہ مجھے اس طرح کا کوئی معرکہ پیش آنے تو قلعہ کی کمی تھی۔

”تین تم شوٹنگ پر جاؤ گی؟“ میں نے ستارہ سے پوچھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا تھا کہ وہ خوفزدہ نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اُن نے تو کچھ کمال ہی کر دیا تھا بڑی تربیت میں شکار رہی تھی۔

”آئے سو مہر تھیلے سائے“

موت ہمارے نقاب میں تھی اور اسے سو مہر تھیلے سب دیکھا دے رہے تھے۔ اچھا بیٹھتے ہوئے وہ خاص پرکشش قسم گھریلو خاتون معلوم ہو رہی تھی۔ بڑے اہتمام سے اس نے اپنے بھی باندھا تھا۔

میرے سوال پر وہ قدرے چونکتے ہوئے ہولی ”ہاں آج تو کچھ زیادہ ہی ضروری ہے۔ دو ٹھیس ایسی ہیں جن کی شوٹنگ صاحب کی وجہ سے بہت دن سے پار پار کینسل ہو رہی تھی۔ پروڈیو سر کا بہت نقصان ہو چکا ہے۔ اب ہیرو صاحب بڑی سے ہاتھ آئے ہیں۔ شاید وہ کہیں شراب کے خوش کی ت میں بڑے تھے۔ پروڈیو سر نے میری بڑی منت کی تھی کہ اب میری طرف

”خاص طور پر جب تم ساتھ ہوتے ہو تو کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔“

”لگتا ہے میری دوستی کے چکر میں ہی تمہارا پتہ صاف ہو جائے گا۔ بہت سمجھنا کہ بد حال نہ سے نکال رہا ہوں۔ حالات ہی کچھ ایسے نظر آ رہے ہیں۔“

”کی تو میں چاہتی ہوں۔“ وہ مضبوطی سے میرے ہاتھ میں ہاتھ پھنساتے ہوئے بولی ”میں نے ایک بار اپنی داستان میں بہت چالاک بننے ہوئے تھیں دھوکا دیا تھا۔ بد بانی دھوکا بھی اور مالی دھوکا بھی۔ تمہارا وہ قرض چلا آ رہا ہے مجھ پر۔ میں چاہتی ہوں اب ادا تم پر کچھ قرض چھوڑ کر مروں۔“

”پچھانے قرض وغیرہ میں چڑھاتی رہتا۔“ میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا ”میں نے انہیں تو کچھ ناشتا وغیرہ کراؤ۔ اس کے بعد میں ایک صاحب کو ضروری ٹیلی فون کروں گا۔ بلکہ ٹیلی فون تو شاید مجھے کئی جگہ کرنے پڑیں۔ حالانکہ میں خود ہی اپنے اور تمہارے گرد مسلح آدمیوں کا حلقہ بنانے کو فضول حرکت قرار دے چکا ہوں لیکن میرا خیال ہے دل کی تسلی کے لیے کچھ انتظامات کریں گے چاہئیں۔ خیر یہ کام بعد میں کریں گے پہلے ناشتا کراؤ تاکہ دماغ کچھ ٹھکانے آئے۔“

”میں بھی تو خانہ سال وغیرہ بھی بیدار نہیں ہوئے ہوں گے۔“ وہ کھڑی دیکھتے ہوئے بولی ”کیا ستم ظریفی ہے۔ مالک جاگ رہے ہیں تو کر سو رہے ہیں میرا خیال ہے میں انہیں جگانے کے بجائے خود تمہارے لیے ناشتا بناتی ہوں تم بھی کیا یاد کرو گے ایک پر آشمار نے جس میں اپنے ہاتھوں سے ناشتا تیار کر کے کھلایا تھا۔“

”اس کے بعد اسپتال تو نہیں جانا پڑے گا؟“ میں نے مصیبت سے پوچھا۔

وہ مضبوطی سے منہ سے گھورتے ہوئے بولی ”مت بھولو کہ کسی زمانے میں تم ایک عرصے تک میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھاتے رہے ہو۔ اس وقت بھی تم خوب بچے کتے تھے اسپتال جانا تو درکنار تم نے کبھی ہاسپتال کی کوئی گولی بھی نہیں کھائی تھی۔“

”کیا زمانہ یاد دلایا ظالم!“ میں نے لٹھری سانس لے کر کہا ”اس زمانے کی بات مت کرو۔ وہ تو دور ہی کچھ اور تھا۔ اب شاید میرا اشار ہوگی ہو اور میں سیٹھ صاحب اس لیے اب شاید تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا پیسہ نہ ہو۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی ”مرنا تو ایک دن ایک دن ہے۔ بہتر ہے کہ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھاکر مرے۔ گولی کھا کر مرنے سے تو بہتر ہے۔ آؤ لیکن میں ہی آج آؤ بائیں بھی کرتے رہیں گے، میں ناشتا بھی تیار کرتی رہوں گی۔“

”جین میں اپنی آنکھوں سے اپنی موت کا سامان ہوتے دیکھوں گا۔“ میں نے کراؤ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

لیکن میں بھی ایک چھوٹی سی ٹانگ ٹھیک موجود تھی۔ میں اس پر

کو تابی نہ ہو تو اس کی لگی ہوئی فلم کچھ آگے بڑھائی جاسکے گی۔  
 مجرورہ مسکراتے ہوئے بولی "تمہیں تو شاید معلوم نہیں ہوگا  
 آج کل تسماری ایک فلم کی شوٹنگ بھی چل رہی ہے۔ میرا ہی کام  
 شرت ہو رہا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے "خیر"  
 تسماری فلم کا کیا ہے۔ وہ تو پتہ ہی رہے یا چلتی رہے۔ تمہیں کیا فرق  
 پڑتا ہے۔"

"ہاں اس وقت تو واقعی مجھے غلوں کا کوئی ہوش نہیں۔ میری  
 اپنی زندگی ایک عجیب و غریب اور بے سرو سامان قسم کا ڈراما بنی ہوئی  
 ہے۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا "غلوں کے مسائل سے تو  
 اتفاق خود ہی منتظر رہے گا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ میں دو آدمی اور  
 بولالیا ہوں کہ دو پہلے ہی نگرانی پر مامور ہیں۔ یہ چاروں شرنگ پر  
 بھی تسمارے ساتھ چلے جائیں گے اور حفاظت کے لیے موجود  
 رہیں گے۔"

"خدا کی پناہ اتنی کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ ایک بیڑ چموز کر  
 میری طرف گھڑتے ہوئے بولی "میں تو فلم انڈسٹری میں مجھے قاتلانہ دود  
 گے۔ پہلے ہی دو سری ہیرو نہیں اتنی جیلس ہیں مجھ سے۔ پتہ ہیجے  
 مذاق اڑانے کے بہانے دھونڈتی ہیں۔"  
 "کیون مذاق کی اس میں کیا بات ہے؟" میں نے قدرے حیرت  
 سے پوچھا۔

"بھئی میرے دو مسلح گارڈز پر پہلے ہی حملہ ہوا تھا۔ ایک تو مارا  
 ی گیا تھا دو سراسیمہ مرے مرے مشکل سے بچا تھا۔ اس کے بعد  
 بھی تسماری ہدایت پر میں نے دو گارڈز اور رکھے تھے وہ اب چھپتے  
 ہی والے ہوں گے۔ دن مجرورہ میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ باوردی  
 ہوتے ہیں۔ اب چار آدمی تسمارے میرے ساتھ ہو جائیں گے۔  
 میرا تو اچھا خاصا جلوس بن جائے گا۔ دو سری ہیرو نہیں پہلے ہی  
 ایک دو سرے کو بتاتی رہتی ہیں کہ اس عورت نے بھی پتا نہیں کیا  
 کیا چکر لہا لے ہوئے ہیں جیسی تو اسے اپنی جان کا ہر وقت اتنا خطرہ لگا  
 رہتا ہے۔"

مجرورہ دونوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "ان میں سے  
 ایک آدھ تو مجھے اسمگلروں کی کسی بین الاقوامی سینڈیکٹ کی  
 آلہ کار دیو بھی مشہور کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو شکریہ کچھ  
 تسماری وجہ سے اور کچھ میری اپنی وجہ سے میرے پریس والوں سے  
 تعلقات بہت اچھے ہیں ورنہ انہوں نے تو اس قسم کی باتیں پریس  
 والوں کے کان میں بھی پھونکنے کی کوششیں کی تھیں۔ مجھے سب  
 خبریں ملتی رہتی ہیں۔"

"لیکن میرے آدمیوں کی موجودگی کا تو کسی کو احساس نہیں ہوا  
 ہوگا۔ وہ تو کسی قسم کی وردی میں نہیں ہوتے اور درودہ کر نگرانی  
 کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ اب تک تو شاید احساس نہ ہوا ہو۔" وہ بے یقینی سے  
 بولی "لیکن دو سے چار ہو جائیں گے اور آس پاس منزل لاتے رہیں

گے تو ضرور احساس ہو جائے گا۔ تانے والے قیام سے  
 رکھتے ہیں۔ خصوصاً فلم انڈسٹری والے تو کچھ زیادہ ہی قیام  
 رکھتے ہیں۔"

میں تذبذب اور خاموش رہا تو وہ بولی "مجھے تسمارا  
 مشہور زیادہ پسند آیا ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو تنہا بہ نظر  
 چاہیے۔ دو میرے گارڈ ہوتے ہیں دو تسمارے آدمی ہو۔  
 بس اتنی ہی انتظام کافی ہے جو ہوگا دکھا جائے گا۔"

"اپنی ذات کے لیے تو میں اسی نظریے کا قائل ہوں  
 میری وجہ سے دو سرون کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی  
 تکلیف ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اے  
 دو کوں۔"

"اور مجھے تسماری فکر ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے  
 ہے جو جائے۔ اگر یہ قربانی دے کر تسماری جان سے غلو  
 مجھے یہ سودا منظور ہے۔"

"مت کر دو ایسی فضول باتیں۔" میں نے اسے ڈانٹا  
 چینی ٹیلی فون انڈیکس میں ایک فون نمبر تلاش کرنے لگا۔  
 خیر ایجنسیوں سے مینگے۔ کہ دو ران ملے پاپا تو  
 صرف ایک ایجنسی کے سربراہ تیس صاحب سے رابطہ رکھا  
 بات بھی بتائی ہوگی انہیں ہی بتاؤں گا جو کچھ بھی پوچھنا  
 سے پوچھوں گا۔ باقی دونوں ایجنسیوں سے وہ کس حد تک  
 حاصل کریں گے اور اس سلسلے میں ان کا طریقہ کار کیا ہوگا  
 آپس کا معاملہ تھا۔ انہیں اس مینگے کے بعد آپس میں  
 کرنا تھیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی مینگے  
 یا نہیں اور اگر ہوئی تھی تو اس میں کیا ملے پاپا تھا۔

میں تیس صاحب کا راز ہوا نمبر ڈائل کرتے ہوئے  
 تھا۔ وہ بڑے آدمی تھے ملک کی چند انتہائی اہم شخصیتوں  
 ایک تھے میں سوچ رہا تھا معلوم نہیں ابھی وہ سوکر بھی  
 یا نہیں۔ ان کا اصل آفس اور گھر اسلام آباد میں تھا لیکن  
 لاہور میں بھی تھا اور آج کل کسی وجہ سے وہ لاہور میں  
 تھے۔

چند لمحوں کے تذبذب کے بعد آخر کار میں نے نمبر ڈالا  
 جلد ہی ان سے رابطہ قائم ہو گیا۔ آواز سے اندازہ ہوا  
 بالکل چاق و چوبند تھے۔ آپس لمبے میں وہی سرد مہر تھی  
 شخصیت کا خاتمہ محسوس ہوتی تھی۔ میں چشم تصور سے ان کا  
 رہا تھا۔ سرخ و سپید لیکن سوکھا اور مست ہوا سا چہرہ لہلہ  
 جیسی ناک اور شفاف نیلی آنکھیں۔ بے حد دلچسپ پہلے تھے  
 کی شخصیت سے رعب و دواب اور سفاکی عیاں تھی۔  
 "مبارک ہو تیس صاحب!" میں نے کہا اور کر شہ  
 میرے لمبے سے طرہ نہ چھٹکے پائے۔ ان جیسے آدمی کا  
 میرے حق میں اچھا نہیں تھا۔

## تاریخی ناول

|                |                       |
|----------------|-----------------------|
| الیس ممر       | الماس ایم۔ اے - 100/- |
| حسن بن صباح    | الماس ایم۔ اے - 125/- |
| راجکماری       | الماس ایم۔ اے - 150/- |
| نور الدین زنگی | الماس ایم۔ اے - 250/- |
| سلطان عادل     | الماس ایم۔ اے - 150/- |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

اور خود کو بڑے قہقیش مہم محسوس کر رہا ہوں۔ آپ ویسے ہی مجھے کچھ کر سکتے ہیں۔ ایجنسیوں کو مس گائیڈ کرنے کے جرم میں جیل میں کیوں نہیں ڈال دیتے؟

”یہ بات نہیں مسٹر چوہدری! ان کے لیے میں نہایت خفیف سی تبدیلی آئی۔ بہت سی معلوم حد تک رزی کے آثار پیدا ہوئے۔“ آپ کو نہیں معلوم کہ ہمارے سامنے کتنی بڑی بساط اچھی ہوئی ہے اور کہاں کہاں ہم کیا کیا کھیل دیکھ رہے ہیں۔ کس کس معاملے کو ہمیں کنٹرول کرنا ہوتا ہے؟ کہاں کہاں ہمارے لیے جال بچھے ہوئے ہیں، ان سب چیزوں کے درمیان آپ ایک نئی کمائی لے کر آتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ کہاں فٹ ہوتی ہے اور کہاں کہاں اس زنجیر کی کڑیاں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے وسائل بہت کم ہیں اور ہم پر ملکی اور بین الاقوامی سازش کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے مسائل کے مطابق ہر معاملے کو ہر پہلو سے چھاننے کی کوشش کرتے ہیں اگر آپ سچے ہیں تو آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”میرا خیال اس سے ذرا مختلف ہے۔ میں نے کہا میں سوچ رہا ہوں چو کہ میں سچا ہوں اس لیے مجھے زیادہ سے زیادہ پریشان ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

”اگر آپ کو کوئی پریشانی ہوئی بھی تو وہ عارضی ہوگی مسٹر چوہدری! ہمیں صاحب کے لیے میں ایک بار پھر پہلے ہی جتنی سرورسی آگئی، آخری طرح بحال ہی کی ہوئی ہے۔“

”یہ تو برا بھی ایمان ہے۔ میں نے قدرے پیچھے ہٹے ہوئے لیے ہیں کہا۔“ وہ کہہ کر صرف یہ ہے کہ آپ جیسے سربراہوں سے واسطہ پڑنے کے بعد سچے ذہنی کی کہاں تک درست جتنی ہے ابھی تو صرف میرا ڈیڑھ کروڑ اکٹان اور اس میں موجود نو دس انسان خاک و غول کے اہار میں تبدیل ہوئے ہیں۔ آگے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے

ہمیں بات کی؟ انہوں نے سر جھپٹے میں دریافت کیا۔  
”میں نے آپ کو ریڈیو ذات کی جو کمائی ملانی تھی آپ کو اس پر نہیں آتا تھا۔ اس کا کم از کم ایک مہم سا ثبوت تو سامنے باپ میں نے ان کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آپ کو اس کے بارے میں بتایا اس جرم میں انہوں نے میرے ہاتھ لے کر لے کر ڈھیر پھینکا ہے۔“  
”مجھے معلوم ہو چکا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولے ”میں آپ ذہن کا نظاری کر رہا تھا مسٹر چوہدری! آپ نے اس واقعے کے لیے میں ابھی پریس والوں سے کوئی بات تو نہیں کی؟ کوئی بیان تو جاری نہیں کیا؟“

”مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ انہیں میرے مکان کی چابی کا تھپکا اس کا مطلب تھا کہ وہ میری طرف سے قافل نہیں تھے۔ ان اس واقعے پر ان کے لیے میں ماسف یا ہمدردی کی کوئی جھلک نہ تھی۔ انہوں نے اعلیٰ افسوس کے لیے دو لفظ تک کہنے کی سہ نہیں کی تھی۔ انہیں شاید صرف یہ فکر تھی کہ میں نے پریس دن کو اصل بات تو نہیں بتادی۔“

”میں نے اپنے دل میں ابھرنے والی جھنجھکی کو دبا دے ہوئے کہا ”جی نہیں پریس والوں سے ابھی میری ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ ویسے میں کوئی سیاسی لیڈر تو ہوں نہیں کہ میرے مکان کی چابی ان کے لیے بہت بڑا واقعہ ہو۔“

”آپ پریس والوں سے اس سلسلے میں کوئی بات کیجئے گا بھی۔ ان سے لٹھیا کوئی بیان دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم چکا ہے پریس کے سامنے آپ اس سلسلے میں لاطمی ظاہر کر چکے۔ پریس کی ایف آئی آر کی مدد سے پریس والے جو خبر پھینکا ہیں گئے، پھیل گئے۔“

غیر ارادی طور پر میرے لیے میں بھی جی بگنی ہی سرورسی ڈرتی۔ میں نے عرض کیا تاکہ میں کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہوں کہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے فوراً میدان میں کود پڑوں۔ دیکھنا یہ بیان جاری کرنے لگوں۔ میں تو پہلے بھی پریس منظر میں ہوا تھا اور اب بھی پریس منظر میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ سے رعب و ہرجا چاہتا ہوں کہ آپ کو میری کمائی پر اب بھی کچھ یقین آیا نہیں؟“

”اس بات کو ابھی آپ چھوڑ دیجئے مسٹر چوہدری! ہم اس سلسلے میں جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔“ وہ خشک لہجے میں لے کر بتا دیتے کہ اس وقت آپ کہاں ہیں؟“

”ایک دوست کے گھر۔“ میں نے جواب دیا۔

”دوست کا نام دیتا؟“ انہوں نے جانتا دل دریافت کیا۔  
”میں ایک لڑکے کے لیے بالکل خاموش رہا۔ میری کنپٹیوں میں زبردستی ہونے لگی تھی۔ میں نے خشک لہجے میں کہا ”گھمبائی“  
”فائل میں صاحب! اس وقت میں آپ کو کسی خانے کا ایس ایچ

بولے "میں نے آپ کی فائل کھلوادی ہے۔ بہت اہم اور  
کی فائل پارک کی جائے گی۔ پہلے ہم آپ کے بارے میں تھرا  
جانا اور کھانا چاہتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ کس طرح مارا  
ہیں اور کس طرح نمایاں حیثیت اختیار کی ہے۔ ہمارے لئے  
بہت ضروری ہے۔"

"بہت خوب، بہت خوب، نفیس صاحب! آپ تو دائم  
کنیناں بیٹے نکلیں" اسے کہتے ہیں نماز بخشنائے جانا اور  
گلے دینا۔ میں تو کب الوطنی کے شے میں کچھ زیادہ ہی سڑ  
آپ کو ایک ہمایاک خطرے سے خبردار کرنے کے لئے  
تھا۔ اس سلسلے میں تو ابھی آپ نے اور شاید دوسری  
ایجنسیوں نے بھی انگلی تک نہیں ہلائی لیکن میری فائل  
میں قابل رشک بھرتی دکھائی ہے۔ میں آپ کو اس عقیم کار  
مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ واقعی یہ ایک ایسا عقیم کام ہے  
بہت بڑی ایجنسی ہی انجام دے سکتی تھی۔ یہ کسی چھوٹے  
ادارے کی بس کی بات نہیں تھی۔"

"زیادہ خطرہ لمحہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں  
چوہدری! نفیس صاحب سہیلے میں بولے "ہم اپنے کام  
کھتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کون سا کام کا  
شروع کرنا ہے۔ ہمارے ہاں کسی خفیہ ادارے میں کسی  
کھلے کا تصور بڑا عجیب ہے اسے بڑی معیوب بات سمجھا جاتا  
حالا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں۔  
چلے تو میں اس ملک کے ہر شہری کی فائل تیار کر اؤں اور  
بڑے سینئر میں اس سارے ریکارڈ کو کینیڈا تراز کر اؤں۔ آ  
کے بارے میں کچھ بھی جانا چاہیں تو ایک ٹین دیو میں اور  
سائے آجائے اس طرح ملک کا نظام چلانے میں اتنی  
ہو جائے کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔"

"جو کرنے کے کام ہیں پہلے وہ تو سمجھنے نفیس صاحب!  
میں ہی نہیں کسی کے ساتھ کہا "میں تو قوم کو بربادی کے گڑھ  
دھکیل کر پلے جانے والوں کا پورا ریکارڈ نہیں ملتا۔ لاگو کے  
میں کسی اور کو پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا جاتا ہے  
اوقات غائب پری کے لئے اور افسران بالا کی خوشنودی  
"ہول سیل" کے حساب سے پولیس مقابلوں میں ہلاک  
مروا دیا جاتا ہے پہلے جو اندر چڑھا ہوا ہے اس میں  
کر کچھ ریکارڈ کو بعد میں کینیڈا تراز کرتے رہے گا۔  
"یہ سب اسی لئے ہے کہ ہمارے ہاں ریکارڈ درست  
کوئی نظام نہیں ہے۔" وہ زور دے کر بولے۔

"میں نہیں میرے خیال میں تو یہ اس لئے ہے کہ ہمارے  
کردار درست رکھنے کا کوئی نظام نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ  
ہاں آکر تو کینیڈا بھی جھوٹ بولنے لگیں گے۔ کیونکہ  
از خود تو نہیں پلٹتے انہیں بھی انسان ہی جلاتے ہیں۔"

ابھی تو آپ کی گفتگو صرف اس موڑ پر آئی ہے کہ "اگر آپ سچ  
ہیں" جب آپ کے منہ سے میرے لئے یہ الفاظ نکلیں گے "آپ  
واقعی سچے تھے مسٹر چوہدری!" اس وقت تک قبر میں غالباً میری  
ہڈیاں بھی گل چکی ہوں گی۔"

"آپ جوان آدمی ہیٹ جذباتی باتیں کرتے ہیں مسٹر  
چوہدری!" وہ سناٹ لیٹے میں بولے "ہمارے کام میں جذبات کا کوئی  
دلیل نہیں۔ ہم بھی جذبات کے ہاتھوں مس کاغذ ہونے کا خطرہ  
مول نہیں لے سکتے۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"  
"کون سا سوال؟ میں تو آپ کے جواب تک سن کر سوال بھول گیا  
ہوں۔"

"یعنی کہ آپ اس وقت کس دوست کے ہاں گھرے ہوئے  
ہیں؟"

"آپ کے لئے تو شاید اس کا نام زیادہ شناسنا ہو۔ ویسے وہ  
اس ملک کی جانی بچائی شخصیت ہے ستارہ نام ہے پُراسرار زمین  
ستارہ ہوتا ہے اس کا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ کس غالباً قلم سے قلم ہے ان کا۔" وہ گویا ذہن پر زور  
دیتے ہوئے بولے۔

"آپ ٹھیک سمجھتے ہیں" میں نے ہلکے سے استہزائیہ لہجے میں  
کہا۔

انہوں نے میرے لہجے پر کوئی توجہ نہ دی اور پُر خیال انداز میں  
بات جاری رکھتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے مسٹر چوہدری! میں کو شش  
کوں گا کہ آپ جہاں بھی رہیں مجھے اس بارے میں اطلاع ملتی  
رہے۔ لیکن آپ کے حق میں بہتر یہ ہے کہ آپ خود بھی مجھ سے  
رابطہ رکھیں اور اپنی نقل و حرکت کے بارے میں مستقل مجھے آگاہ  
کرتے رہیں۔"

"بہت بہتر سہارہ (ب) کا یہ بدعا ش آپ کو اپنی تمام  
مصروفیات سے آگاہ کرنا رہے گا۔" میں نے سعادت مندی سے  
کہا۔ میرے لیے میں جو زہر تھا اس کا تھوڑا بہت اثر شاید ان تک  
پہنچا۔ وہ تنبیہ کے سے انداز میں بولے "تو جو کس مسٹر چوہدری!"  
میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا "یہ مذاق نہیں سہارا! یہ  
ہے لیکن عجیب بات ہے کہ انسان کو اپنے علاوہ باقی سب کے لیے  
ذاتی نظر آتے ہیں۔"

"آپ بہت اچھے آدمی ہیں مسٹر چوہدری! ابھی بھی  
آپ کی ذات میں تو خود ہی پُر اسراریت جھلکے لگتی ہے اور کبھی  
آپ ظنی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ میں آپ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا  
ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

"سہارا اگر آپ مجھے ہی نہیں سمجھ سکتے تو پھر ریڈ ذات کو کیا سمجھ  
سکیں گے؟" میں نے بغیر نہ رہ سکا۔

"ریڈ ذات تو جب ہمارے سامنے آنے کی تو دیکھا جائے گا۔  
خیال تو ہمارے لئے آپ ہی اہم ہیں۔" وہ گویا کچھ سوچتے ہوئے

”ہمیں اسے طور پر کوئی برا قدم مت اٹھائیں۔ ہمیں اپنی نقل و حرکت سے مطلع رکھیں اور اگر آپ زیادہ غلط محسوس کر رہے ہوں تو ہم آپ کی حفاظت کے لیے کچھ آوی قیامات کر سکتے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”بہت شکریہ سراس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا ”میں ابھی آزادانہ طور پر حرکت میں رہنا چاہتا ہوں۔ آوی میرے گرد گھیرا ڈالے رکھیں گے تو میں اپنے آپ کو بندھنا جیسا محسوس کروں گا۔ میں کسی ایک جگہ قلعہ بند یا ساکت ہو کر بیٹھنا نہیں چاہتا۔ ایسی صورت حال میرے لیے موت سے بدتر ہوگی۔ حفاظت کا معاملہ میں نے اس پر چھوڑ دیا ہے جو سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔“

میں نے ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرے دل میں کتنی کم ضرورت ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ میری عمرانی کے لیے خیر ایجنسیوں کے کچھ لوگ میرے پیچھے ضرور لگیں گے اور یہ چیز میرے لیے مزید الجھن کا باعث ہوگی۔ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ کون خیر ایجنسیوں کا آوی ہے اور کون ریڈ ڈاٹ کا؟ اگر کسی بھی صورت حال میں میرے یا میرے دوستوں کے ہاتھوں کسی غلط فہمی میں خیر ایجنسی کا کوئی آوی مارا جاتا تو میرے لیے بڑا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ ستارہ نے ناشتا میرے سامنے سپارڈا تھا اور خود بھی سامنے بیٹھ

رہی سانس لے کر کہا ”وہیے میرے بارے میں تو آپ نے جاننے کی تکلیف کی۔ میری ناکل تیار کرنے میں کتنی ہی لوگوں کا وقت اور اپنی برباد ہوگی۔ آپ مجھے حکم دیتے ہیں خود اپنے یوم بیدارکش سے لے کر آپ تک کی تمام تھیلیات لے کر خود حاضر خدمت ہو جائے۔“

پہلی بار میں نے ان کی دھمکی سی ہنسی مٹنی لیکن حیرت کی بات تھی کہ جب وہ بولے تو ان کے لہجے کی سرد مہری میں کوئی کی نہیں آئی تھی ”اپنے بارے میں بتاتے تو سبھی بہت کچھ ہیں مسٹر چوہدری! سیاسی لیڈر بھی انھوں کے مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں۔ لیکن جو ہم معلوم کرتے ہیں وہ عموماً بہت قلف ہوتا ہے۔“

”میں کوئی بات دل میں نہیں رکھتا نہیں صاحب! میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا ”اس وقت میں واقعی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اتنے لمبے پھکوں میں پھنسا دیا، اتنے ہم اداوں کو بھی تکلیف دی اور ان کا وقت ضائع کیا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں ریڈ ڈاٹ کی پیشکش قبول کر لیتا۔“

”تمہاری طرف سے آپ کو اب بھی اجازت ہے“ آپ چاہیں تو ان کی پیشکش قبول کر لیں۔ شاید اسی طرح ہمیں ان تک پہنچنے کا موقع مل جائے۔“ وہ بولے۔

ان کی بات میں وزن تھا لیکن میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”اب تو وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تو میں ان کے زیر محاب آچکا ہوں۔ اب تو وہ میرے اقرار پر صرف نہیں گے میں واقعی غلوں دل سے بھی ان کے حکم کا قلام بننا چاہوں تو وہ مجھے اس کا موقع نہیں دیں گے۔ اعتبار بڑا بڑا چکا ہے۔ ہر سواٹے پانے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ ہر سواٹے پانے کا وقت گزر چکا ہے۔ اس وقت مجھے صرف دم کی کمی محسوس ہو رہی ہے ورنہ میں مکمل طور پر اپنے آپ کو دھواں کا گنا محسوس کرتا۔ جو نہ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا۔“

اس بار نہیں صاحب بولے تو ان کا لہجہ خاصا بدلا ہوا تھا۔ نہایت ملامت سے وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولے ”آپ کو اتنا بھی بددل ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر چوہدری! آپ دراصل اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہماری ذمہ داریاں کتنی غاذک ہیں۔ ہمیں ہر چیز کو نہایت غیر جانبدار نہایت غیر جذباتی بلکہ کافی مدد تک سفاک ہو کر دیکھنا پڑتا ہے یہ بہت سببیں کہ ہم نے صرف آپ پر ہی نظر رکھا ہے اور آپ کی سٹائی ہوئی کہانی کی طرف سے بالکل ہی آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ہم نے کچھ مشکوک غیر کلیوں کی عمرانی شروعات کی ہے امید ہے جلد ہی کوئی نہ کوئی سراغ سامنے آئے گا۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے سر؟ ہمیں نے ان کے بدلے ہوئے انداز کو محسوس قدرے اطمینان محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

اعتبار ساجد کی ہنستی مسکراتی  
ہوئی شگفتہ تحریروں کا نیا انتخاب

قلم گاریاں

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2



آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

”جس ڈر گئیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”کچھ دیر پہ  
فون پر تو بڑی بڑی باتیں مار رہی تھیں۔“

”بھئی مجھے اس قسم کی موت سے بڑا خوف آتا ہے کہ اگر  
لمبے کے پیچے رہا سک رہا ہوا آدھا جسم دھماکے میں اڑ گیا ہو اور  
آدھا پڑا تڑپ رہا ہو۔“ وہ جھرجھری لے کر بولی ”اگر کوئی مجھے مار  
ئی چاہتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کرے کہ کھوپڑی میں یا سینہ دل  
مقام پر گولی مار دے۔ گولی بھی اس طرح نہ مارے کہ زیادہ دیر تک  
تڑپنا پڑے۔ میں نے سنا ہے مجھے پیٹ میں ایک آدھ گولی لگا کر  
فوری لمبی اور میٹرن آئے اس کی موت بڑے اذیت ناک طریقے  
سے واقع ہوتی ہے؟“

”مجھے مختلف طریقوں سے مرنے کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں ہے  
اس لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”میں نے  
مشورہ دے سکتا ہوں کہ تم ایک پتھر ساتھ لے کر پھر اگر جس  
موتی سی سرفی ہو ”قاتلوں کے لیے ہدایات“ ”مجھے ترتیب دے  
ہدایات دینے ہوں ”براہ کرم مجھے قتل کرنے کے لیے کوئی خلا  
طریقہ مت اختیار کیجئے۔ قتل ہی کرنا ہے تو پیار سے قتل کیجئے۔ اگر  
مادری ہو تو براہ کرم ذرا ملک قسم کی ماسیے۔ چہ بہ مار گولی مر  
استعمال کیجئے۔ دھیان رکھیے کہ گولی دل میں اترے اور کٹائی کرنا  
تک اترے۔ بلکہ دل کے پار نکل جائے تو زیادہ مناسب ہے گولی  
تیر نیم گولی یا کسی کو شش مت کیجئے۔ اگر دل پسند نہ آئے تو  
حاضر ہے۔ یقین کیجیے اس کھوپڑی میں بھوسا نہیں بھرا ہے نہ  
نہیں قسم کا داغ موجود ہے اس میں گولی اتار دیے اور دیکھا دیکھا  
کی دعا کیجئے۔“

وہ دیر سے دیر سے گوند چلائی رہی اور مجھے گھورتی رہی  
لفظی سانس لے کر بولی ”میں سنجیدہ ہوتی ہوں تو تمہاری رگ  
خراقت پھرنے لگتی ہے اور وہ تک پھرنی ہی چلی جاتی ہے۔ مجھ  
ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی ”تم نے مذاق ہی بنا لیا۔ ویسے تو  
بہت مشکل ہڈی کے امتحانی درد ناک پلوٹوس میں بھی مذاق  
لاتے ہو۔“

”جس بس اب رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سنجیدہ  
ہو جاتا ہوں پوچھ کر پوچھتا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا  
”جس کچھ نہیں پوچھتا مجھے مجاڑ میں جاؤ تم۔“ وہ مصروفی  
سے گوند چلا کر بولی۔

”بھئی تم اب ایسی باتیں پوچھتی ہو جن کا جواب میں فراہم  
میں بھی نہیں دے سکتا۔ ویسے میرے خیال میں تمہارے مکان  
دھماکے سے اڑاے جانے کا امکان کم ہے۔ اتنی جلدی وہاں  
تجربہ کوڈ ہرانے کا مخلوط سول نہیں لیں گے۔ بہر حال اب بھی  
ہے تم کو تو میں کچھ حفاظتی احتیاطات کرنا ہوں۔“ میں نے  
طاقت سے کہا۔

”کراہتھک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اپنے نظرات کو ذہن  
سے جھٹکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ سادگی سے بولی ”میں  
جسیں نظر بھی آ رہی ہوں یا نہیں؟“  
میں نے آنکھیں میکر کر امتحانی کمزور نظروں سے کسی شخص کی  
طرف اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ان کوئی دھندلی دھندلی ہے  
جنگم سی چیز نظر آ رہی ہے۔“

”اس دھندلی اور بے جنگم چیز کے ہاتھوں ضائع مت ہو جانا۔  
اس سے پہلے کہ میں اغدا تمہارے منہ پر اور کوئی اغدا تمہاری  
کھوپڑی پر دے مادل ”تم ہاشا کرو۔“ میں نے اتنی سخت سے تیار کیا  
ہے اور تم نے پتا نہیں کس بے کار آدمی سے باتیں کرتے کرتے  
لفظ آکر دیا۔“ وہ لمبیلیں میری طرف کھٹکتے ہوئے بولی۔  
”کاش جسیں معلوم ہو کہ تم کے بیکار آدمی کمر رہی ہو۔“

اس حمدے پر جو شخص فائز ہوتا ہے وہ ان چند ستونوں میں سے  
ایک ہوتا ہے جن پر حکومت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ ”میں نے  
لفظی سانس لے کر کہا اور ناشتے پر بل پڑا۔  
”تم ان ستونوں کی فکر چھوڑو جن پر حکومتیں کھڑی ہوتی ہیں۔  
تم ان ٹانگوں کی فکر کرو جن پر تم کھڑے ہوئے ہو۔ ہاشا وغیرہ کرتے  
رہو گے تو ان ٹانگوں میں جان رہے گی ورنہ یہ تمہارا وزن نہیں  
سار سکیں گی۔“ وہ خود بھی ہاشا شروع کرتے ہوئے بولی۔

چند لمبے خاموشی سے کھاتے رہنے کے بعد میں نے کہا ”میں  
دونوں طرف سے مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔“ میں سنجیدگی سے  
ستارہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے صورت حال مزید بہتر طور پر  
سمجھانا چاہتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اب سنجیدگی سے بات  
کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے اس مسئلے کو ذہن کے کسی اور  
ی خانے میں دھکیل دیا تھا۔

اطمینان سے گوند چلاتے ہوئے بولی ”ابھی صرف دونوں طرف  
سے مصیبت میں پھنسے ہو؟ اب تک تو جسیں چاروں طرف سے  
بلکہ انھوں طرف سے پھنس جانا چاہیے تھا۔“  
”ستارہ! میں سنجیدہ ہوں۔“ میں نے اسے گھورا۔

وہ لفظی سانس لے کر بولی ”میں تو مصیبت ہے جب ہمارا  
سنجیدہ ہونے کو ہی نہیں چاہتا تو تم سنجیدہ بلکہ ریجیدہ ہونے لگتے  
ہو۔“

”جسیں شاید اندازہ نہیں ہوا کہ نفیس صاحب سے میری کیا  
مٹھکو ہو رہی تھی۔ یہ تو میں جسیں بتا ہی چکا ہوں کہ نفیس صاحب  
کون ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے کافی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔“ وہ قدرے سنجیدہ ہوتے  
ہوئے بولی ”میرے کان اور ہری گئے ہوئے تھے لیکن میں فی الحال  
سنجیدہ ہونا نہیں چاہتی۔ سنجیدہ ہونے لگتی ہوں تو مجھے خوف آنے  
لگتا ہے۔“ پھر یکدم ہی اس نے ہاتھ موکتے ہوئے پوچھا ”آئی!  
کیس وہ اس گھر کو بھی دھماکے سے اڑا تو نہیں دیں گے؟“ اس کی

تھا۔ چاندی کے موٹے موٹے ہماری ہماری زیورات بھی پہنے ہوئے تھے۔ میں بدستور اس کا غور سے جائزہ لے جا رہا تھا۔ وہ کچھ وضاحت کرتے ہوئے بولی "آج دو شغلوں میں میری جیس قسم کی شوٹنگ ہے اس میں میرا کردار ایک راجستانی سردار کی بیٹی کا ہے۔ پروڈکشن والوں نے عجیب سڑے سڑے سے ڈریسز تیار کر رکھے ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ ایک روز میں خود سین کی ڈسٹائز کے مطابق تیار ہو کر آؤں گی، پھر شوٹ کیجئے گا۔ آپ کے گیٹ اپ سے بہتر رولٹ آئے گا۔ میں نے اپنے شوق کے تحت یہ ڈریس اور زیورات بخر کر رکھے تھے۔ میں نے سوچا ٹیبل آج اپنی ذاتی چیزیں شوٹنگ میں بھی استعمال کر لوں۔"

پھر وہ گھوم کر لاؤنج کے دروازے آئینے میں دیکھ کر اپنی لمبی اور موٹی سی پٹیادوست کرتے ہوئے بولی "تمہارا کیا پروگرام ہے؟" "میں اب آفس کا ایک چکر لگاؤں گا۔" میں نے گہری دیکھتے ہوئے جواب دیا "شام کو میں نے ایک جگہ کچھ دوستوں کو جمع کیا ہے۔ جگہ کچھ دماغ لڑائیں گے شاید کوئی کام کی بات سوچ جائے۔ تم وہاں کا بھی فون نمبر رکھ لو۔ اگر کوئی ضرورت پڑ جائے تو تم فوراً مجھے فون کر سکتی ہو۔"

میں نے ایک کانفہ پر اسے فونی کا نمبر لکھ کر دیا۔ اس نے کانفہ بڑی غصت سے دیکھ کر اپنی خوب صورت کڑھائی والی لمبی سی جیب میں رکھ لیا اور بولی "میں آج تقریباً ساوا دان ایونٹ میں سی رہوں گی۔ میری آؤٹ ڈور غم ہو چکی ہیں اگر ہو سکے تو شام کو فارم ہونے کے بعد ایک چکر لگائیں۔ ذرا دل کو حوصلہ سا ہو جائے گا۔" "ٹھیک ہے میں آجاؤں گا۔" میں نے اپنی متوقع مصروفیات کے بارے میں کوئی خاص غور کیے بغیر کہا۔

وہ گہری دیکھتے ہوئے بولی "انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمیں گھر سے نکال دوں ورنہ میرا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اس بات کو اب تین گھنٹے گزر چکے ہیں ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔"

"طعنیں رو خیریت ہی رہے گی۔" میں نے اسے قہقہہ دیا۔ "میرا تو خیال ہے کہ تم آج ہمیں گھر ہی رہو کیس بھی مت جاؤ۔ جن لوگوں کو بھی بلانا ہے۔ ہمیں بلاؤ۔ میں بھی کوشش کروں گی کہ رات کو جلدی واپس آجاؤں۔ میں چاہتی ہوں ان کی ہدایات کی ذرا اچھی طرح ہی خلاف ورزی ہو۔"

"تم صرف یہ ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ ہمیں ان کی ہدایات یا ان کے اعلیٰ ٹیم کی پروا نہیں ہے۔ وہ تم نے ثابت کر دیا۔ اب ہمیں خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا اپنا کام دھندلانا چاہیے۔ مجھے آج دفتر میں بھی بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کرنا ہوں گی۔ شام میں دوستوں کو یہاں جمع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ بد پروگرام لے ہو چکا ہے۔"

وہ لاؤنج کی کمرل سے مچھلی لان کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے

"خفا خفا انتظامات تمہارے گھر پر بھی کافی موجود تھے۔" وہ اپنی مستوی نگاہ کو وہ فوراً ہی بھول گئی تھی۔

"وہ انتظامات کسی اور نقطہ نظر سے تھے۔ ہمارے اہل خفا خفا انتظامات میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی غیر متعلق شخص اندر نہ مچھنے پائے یا کوئی ٹولا چڑھائی نہ کرنے پائے۔ لیکن وہ لوگ سائنسی طور پر جتنے ترقی یافتہ ہیں ان کے لیے اس قسم کا کوئی ہنگامہ نہ کرنا کیے بغیر کسی جگہ کو اڑانا کوئی مسئلہ نہیں۔ ممکن ہے اس کے لیے انہوں نے بلیک ریڈ کو بھی استعمال کیا ہو۔ مکان کی چابی کے بعد میں نے اسے قریب ہی موجود پایا تھا۔ وہ بد بخت صرف پول نہیں سٹکا، وہیں اس کے پاس ایک مچھلی انسان کا موجود ہے۔ اس کی طرف سے تم سخت ہوشیار رہنا۔ کیس اس کی جھلک بھی نظر آجائے تو بھولنا کہ کوئی گھٹین خلوہ آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔ فوری طور پر جو بھی خفا خفا انتظامات کر سکو کر لے گا۔"

وہ کافی اٹھ بیٹھتے ہوئے بولی "ٹاشٹے کے بعد تم ذرا گھر کے ارد گرد کا پھیل گلی کا جائزہ تو لے لیتا۔ ہو سکتا ہے کوئی مشکوک شکل منڈلائی ہوگی نظر آجائے۔"

"وہ لوگ اپنے کپے کام نہیں کرتے۔" میں نے کہا "میرا حال تمہارے اطمینان کے لیے میں جائزہ لے لوں گا۔"

ٹاشٹے کے بعد میں نے پورے گھر کا باریک بینی سے جائزہ لیا کہ کیس کوئی پلاسٹک بم، کیس کوئی مشکوک چیز تو موجود نہیں۔ لیکن کیس کچھ نہ ملا۔ میں نے دونوں طرف لان پر بھی ہیرا ز "ہیرا پورے کا جائزہ لیا۔ پچھلی گلی کا چکر لگایا۔ دینے والوں تک کو چپک کیا میں کام میں کافی ورگ لگ گئی۔ اس دوران ملازم بھی اٹھ چکے تھے اور اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ ساتھ شوٹنگ پر جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔

اس دوران اس کے دونوں گارڈز بھی آپکے تھے، جو صرف لان کی فونی پر سامور تھے۔ کلف گلی نیلی وردی میں وہ دوا دیو مڑ کر سو پینہ مستند سے اٹھاتے تھے جن کی گھٹیا پلیمس والوں کی طرح کندھوں پر لگی ہوئی تھیں۔ ڈیڑی نانی ایک کرچن ٹرک بھی آگئی تھی جسے ستارہ نے آج کل سیکھ بڑی رکھا ہوا تھا۔ وہ تینوں باہر برآمدے میں بیٹھ کر چائے پیتے اور ستارہ کے تیار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

میں اس دوران ٹیبل فون پر مصروف رہا۔ ستارہ تیار ہو کر آئی تو مچھلی کاٹن کے راجستانی سوٹ میں بے وہ پر کشش لگ رہی تھی۔

میں نے اس کا سر تپا جائزہ لیتے ہوئے کہا "بہت جگہ رہی ہو اس لباس میں، جس علاقے کا لباس ہے اسی علاقے کی کوئی شراوی دکھالو اسے رہی ہو۔"

"شکر ہے، شکر ہے۔" وہ گھٹنوں پر انداز میں آداب بجالاتے ہوئے بولی "مفتیس ہے کہ اس طرف بھی تمہاری نظر کام کر رہی ہے۔" اس نے راجستانی ٹیگر کی نمائندگی کا پورا پورا اہتمام کیا ہوا

پیشی سی سکر ایٹ کے ساتھ بولی "وہیے تو اس علاقے میں عموماً  
ٹٹا ہی رہتا ہے لیکن آج ٹٹا معمول سے کچھ زیادہ ہی محسوس  
ہو رہا ہے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی جتنی دیر اسے بت سے  
سیاد پوش برباک قسم کی گھسیٹے ہوئے گود کر اندر آئیں گے اور ہم  
سب کو بھون کر رکھ دیں گے"

"ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے اچھا سے کہا اور انھ کو اس کے  
قریب جا کر حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کے کندھے سے تھپتھپائے  
"حقیقی زندگی اور مادہ حجاز سے بھرپور قسم میں کچھ فرق تو برقرار ہے  
گا۔"

"تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔" اس نے طویل سانس لے کر کہا  
اور گرجوٹی سے میرا ہاتھ دبا کر خدا حافظ کہتے ہوئے باہر کی طرف  
چلی دی۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ ہر آندے میں اگر میں نے  
دیکھا ملازمہ اس کا خوب صورت سافٹن کیمیز پانی کا قاشک اور  
گلاس وغیرہ گاڑی میں رکھ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دیگر  
اداکاروں اور اداکارائوں کے برعکس پروڈکشن کی طرف سے نکھانے  
وغیرہ منگوا کر نہیں کھاتی تھی خواہ وہ کتنے ہی ایسے رستوران یا  
کینٹرنگ سروس سے آتے۔ باہر کا پانی بھی وہ نہیں پیتی تھی اور نہ  
یہی دوسرا دھڑا کوئی برتن استعمال کرتی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کسی  
زمانے میں اس نے غائبہ دوشی کی زندگی گزارا تھی۔

ایک گاڑی اور اس کی سیکرٹری پچھلی سیٹ پر اس کے ساتھ  
بیٹھی۔ ایک گاڑی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا۔ اس نے  
ایک بار پھر اپنے مخصوص دل میں انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ  
ملائے۔ چہ کیڑا اس نے گیت کھولا اور گاڑی باہر دیکھ گئی۔ میں گیت  
نیک آیا۔ میں نے دیکھا کئی کئی کوٹے پر ایک درخت تلے گاڑی میں  
میرے دو کوئی موجود تھے۔ ساتھ کی گاڑی نے موزکات تو وہ گاڑی  
بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔ اس احساس سے میں نے  
قدرے اطمینان محسوس کیا کہ میرے کوئی نہ کوئی دو آدمی ہر وقت  
ساتھ کے آس پاس موجود رہتے تھے۔

گیت بند ہونے کے بعد چند لمحوں میں لان پر کھڑا اور گرد کا جائزہ  
لینا دیکر گرد پوش پر بھی واقفی ایک عجیب فضول سا سکوٹ طاری تھا  
اور دل کے آگن میں بھی ایک افسردہ سا ٹٹا بچھلا ہوا تھا۔ اس  
کمر کو ساتھ نے میرے لیے بالکل ایسا ہی بنا رکھا تھا جیسے یہ میرا اپنا  
ی کمر ہو لیکن اب اس کے جانے کے بعد یہاں بالکل دل نہیں لگ  
رہا تھا۔

میرا کہ کچھ دیر آرام کا ارادہ تھا لیکن میں نے ارادہ ترک  
کر دیا اور گاڑی ٹھیل کر آٹس کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑکوں پر اب  
نریک موٹاں تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں  
تھا یا نہیں۔ فضول ادھر ادھر پکڑانے کی میں نے زحمت نہیں کی  
اور سیدھا آٹس پہنچ گیا۔

آٹس میں میرے مکان کی پٹی کی خبر پھیل چکی تھی اسلاف

کے خاص خاص لوگوں کو سمجھانے اور سلی دینے میں کچھ وقت  
گیا۔ میں انہیں بھی چین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی عام  
بات نہیں تھی۔ آٹس میں کچھ سکون ہوا تو شام ساؤں کے فون کر  
شروع ہو گئے۔ خبر ملا کہ ابھی اخبارات میں نہیں آئی تھی لیکن  
جاننے کس طرح سب کو معلوم ہو گیا تھا۔

بست دیر بعد اکیل سی کچھ بھی تو کام کی طرف دھیان دینے  
کوشش کی۔ اپنی اس عمارت کے کارڈز اور دو تین دوسرے  
آؤس میں کوئیں نے علیحدگی میں بنا کر دیات کر دی تھی کہ وہ سب  
سے کچھ زیادہ مستعدی سے عمارت کی عمرانی کریں اور گرد و  
خصوصاً پارک ایریا وغیرہ پر کڑی نظر رکھیں اور یہ کڑی نظر ان  
کی نہ ہو جیسے کہ عکس میں ہونا ہر قحطوں سے عرصے بعد اعلان کرتی تھی  
کہ بھروسوں اور شریکوں پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔

تاہم وہ دن خیریت سے گزر گیا۔ کہیں سے کوئی بری خبر نہ آئی  
وہ ذات نے گویا چپ سا دھلی تھی۔ شام کو میں ذرا جلدی آکر  
سے اٹھ گیا اور دراصل کے پاں چلا گیا۔ آج میرا اسے باقاعدہ  
سرکل "میں شامل کرنے کا ارادہ تھا۔ اس کے لیے ایک دو  
کار کا بھی بندوبست کیا جا چکا تھا جس کے خفیہ خانے میں مجھ سمیت  
دیگر تمام ساتھیوں سے رابطہ رکھنے کے لیے رہنے پونٹ تھا۔

میں نے اس کے پاں جا کر تیل بھائی تو اس نے خودی آ  
گیت کھولا۔ ساوہ سی سیاہ شلوار قمیض میں وہ شیم سے نمائے ہو  
پھول کی طرح تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں اندر پہنچا تو وہ  
سرگیا جائزہ لینے ہوئے بولی "یہ شکل پر اتنی پختہ کیوں رہی؟  
ہے؟ قرض خزاہوں سے مار کھا کر آ رہے ہو کیا؟"

"ہاں زندگی نے شاید کچھ قرض ایسا بھی چھڑا دیا ہے جس  
اور اچلی میرے بس کی بات نہیں۔" میں نے فطری سانس لے کر  
اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف پھرتے ہوئے کہا۔

"ادھو یہ آج دیو داس کیوں بنے ہوئے ہو؟" پھر وہ خودی آ  
تشبیہ دلیں لیتے ہوئے بولی "دیو داس کی اور سی تو بڑی دھالی  
ظہیانہ قسم کی ہوتی تھی تم تو اس دن تان کی طرح اداس نظر آتے  
ہو جس کی اگرتی ہمیشہ کسی نے چالی ہو۔"

"کاش میں ایسا کوئی دہقان ہی ہوتا! میری خوشیاں بھی بھلا  
پھولی ہو جس اور غم بھی۔ میری کائنات ہی پھولی ہی ہوئی۔ ایک  
محدود سی زندگی گزار کر میں چپکے سے مر جاؤں۔ خواہ خواہ  
کیمیز پالے میں نے خواہ خواہ لہایاں اور ممتاز ہونے کا  
کوشش کی۔" ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے صوفے پر بیٹھ

ہوئے ہوئے کہا۔  
کئی راتوں سے مجھے چند گھنٹے کے لیے بھی سکون سے سونا  
نہیں ہو رہا تھا۔ بے درپے اعصاب شکن واقعات کی پلکار  
میں نے اپنے آپ کو سمجھائے رکھتے اور اپنے آہنی اعصاب  
پر سکون رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ پھر بھی ضد و مثال  
ہوئے ہوئے کہا۔

ہو جاؤ۔ اپنی باتیں ٹوٹی کے گھر پر بیٹھ گئی۔ ہوں گی۔ ہوں گی۔ ہوں گی۔  
آج سے تم باقاعدہ "دی سرکل" میں شامل ہو چکی ہو۔  
"تیار کیا کرتی ہے یوٹی پلٹی ہوں وہ کون سا کوئی شادی کی  
تقریب ہے۔" وہ اپنے سر اپنا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "بلکہ اجازت  
دو تو صرف گمن ساتھ لے لوں؟"  
"اجازت اور وہ بھی صرف گمن کی؟" میں نے حیرت سے کہا  
"بھئی میری طرف سے تو اب خواہ تو پ کھڑے پر رکھ کر چلو مجھے  
کوئی اعتراض نہیں۔"

کچھ دیر بعد ہم ٹوٹی کے بیچلے پر جا پہنچے۔ راجیلہ کو میں اپنی سی  
گاڑی میں لے گیا تھا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے کافی دیر تک اؤٹر اوٹر  
چکرانے کے دوران میں نے اطمینان کیا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں  
کر رہا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے ابھی تک ایک ٹھہرائی ہوئی تھی  
کہ انٹرویو پھر کوئی بھی مجھے اپنا تعاقب کرتا۔ نظر نہیں آیا تھا اور  
اگر بھی میں نے کسی کو اپنا تعاقب کرتے ہوئے پایا بھی تھا تو وہ ہر  
میں ریڈ ڈاٹ کا نہیں بلکہ میرے کسی اور دشمن کا سا بھی ثابت ہوا  
تھا۔ صرف ابتدائی دنوں میں ریڈ ڈاٹ سے قطع رکھنے والے کسی  
فحش نے اپنا پھر اسے سن لے خیر تعاقب کیا تھا۔ اس کے باوجود آج  
تک ریڈ ڈاٹ والے زیادہ تر میری شکل و حرکت سے باخبر رہے  
تھے یہ راز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے  
مجھے آزاد چھوڑا ہوا تھا کہ یہ بھی نہیں نہیں جاسکتا۔ جب چاہیں  
گے ہاتھ جھکا کر دھج لیں گے

اثرات تو جھٹک ہی آئے تھے کہیں نہ کہیں دماغ کی کی چھاپ تو  
لگ ہی گئی تھی جسے اور کسی نے نہ سہی جین راجیلہ کی نگہوں نے  
محسوس کر لیا تھا۔ میرے قریبی لوگوں میں صرف وہ اور طاہرہ خانم  
ابھی تک میرے مکان کی بجائی کے واقعے سے لاعلم تھیں۔ طاہرہ  
خانم کو تو خیر ابھی اطلاع ہو چکی نہیں سکتی تھی۔ وہ کسی کام کے سلسلے  
میں ملک سے باہر گئی ہوئی تھی اور چند دن کے لیے مسلسل سفر میں  
تھی۔

راجیلہ مجھے گھورتے ہوئے بولی "کیا بات ہے آج تو ڈانیا لاک  
پر ڈانیا لاک مار رہے ہو۔ لٹھڑی آئیں بھر بھر کر تم نے اس گھر میں  
برف بادی کا سا حال پیدا کر دیا ہے۔ اندیشہ ہے کہ تمہارے  
خفاک اثرات دیکھ کر دودھ پوار بھی دھاڑیں مار مار کر نہ دے  
گیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ میرے چہرے پر اس قسم کے کوئی خفاک  
اثرات نہیں تھے لیکن اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ میری مدح تک میں  
جھانک لیتی تھی۔ آپ کو اندر سے جاننے والوں کا یہی مسئلہ ہوتا  
ہے۔ آپ چہرے اور آنکھوں کی کھڑکیاں لاکھ بند کریں وہ آپ کے  
دل کے آئین کا ہر سحر دیکھ لیتے ہیں۔

میں نے کہا "پہلے تم میرے لیے نہایت ہوشیار قسم کی بلیک کانی  
جوڑنے لگی کر مجھ پر چڑھ رہی تھیں وہاں میں اور دیر تک وہ سن ہی  
دیں کیونکہ میں بہت دیر تک نہیں پور کرنے کے ارادے سے آیا  
ہوں۔"

"میں خود باکر لاتی ہوں۔"

"نہیں تم میں بیچو۔ ملازمہ سے کہہ دو۔ تم سے مجھے باتیں  
کرنی ہیں۔ وقت کم ہے اور باتیں زیادہ۔"  
"چھا؟ میں تو آج تک یہی سنی آئی تھی کہ وقت کم ہے اور  
عقابہ ختم۔"

"عقابہ تو خیر ختم ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی ہے۔ لیکن اس  
سے پہلے بات بھی تو سمجھ میں آئی چاہیے۔" میں نے کہا۔ وہ ملازمہ  
کو کالی کے لیے کہہ آئی تو میں نے اسے بھی شروع سے اب تک  
تمام حالات سے آگاہ کیا۔ وہ کہہ سکتی تھی آج۔

"کیا تم خوف زدہ ہو؟" میں نے اس کے اثرات کا جائزہ لیتے  
ہوئے کہا۔

"میں اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے خوف زدہ ہوں۔" وہ کہا  
ٹپٹپٹے ہوئے بولی "میری زندگی تو یہی ہے جی ایک رائجیلہ سطر ہے مجھے  
اس کی زیادہ دانی نہیں۔"

"اب تم نے تمہاں ڈاک ڈالنا کر کی مارانی شروع کر دی۔" میں  
نے کہا "تمہاری زندگی چاہے رائجیلہ سطر ہے یا بلا لکٹ سطر، مجھے  
یہ اپنی ہی زندگی جتنی عزیز ہے اور مجھے اس کے بارے میں اتنی  
لامبائی کی باتیں ابھی نہیں گفتیں۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے ایک  
دوسرے کے شانہ بہ شانہ نہ کرنا ہے۔ اب تم چلنے کے لیے تیار

پاکستانی، انڈین اور چائینیز  
کھانوں پر مشتمل اپنے طرز  
کی واحد اور مکمل کتاب

پیشکش چین گائیڈ

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

آنکھیں ہلکی ہلکی جھپکیں، وہ چہرے جسم، پیچھے نعوش اور سرخ  
سیدہ رنگت والا ایک بالکل نوجوان تھا۔ ٹوٹی اور وہ اگر بمالکی نہیں  
تو کم از کم کن ضرور دکھائی دیتے تھے کہ وہ ان دونوں میں دور کا بھی  
رشتہ نہیں تھا۔

شفیع شاہ کے چہرے پر گہبیر سنجیدگی تھی۔ اس کی ہلکی آنکھوں  
کی تہ میں چنگاریاں سی سگ دی تھیں۔ ایک ٹنگ بولی کی طرف  
دیکھتے ہوئے بولا "مس ٹیپ! تم بہت خوش دانی بہت باصلاحیت  
بہت کام کی عورت ہو لیکن کبھی کبھی ہار ایک بات تمہاری سمجھ میں  
نہیں آتی۔ چاہی چاہا اور لاشوں کے انبار لگانا کوئی مشکل کام نہیں  
ہے لیکن پاس یہی تو تھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے سامنے  
کوئی ٹارگٹ نہیں ہے سوال یہ ہے کہ چاہی کہاں چلا جائے؟  
کہاں لاشوں کے انبار لگائے جائیں؟"

مس ٹیپ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی گرائیوں میں تو وہی  
بی الاؤ دیکھتے تھے وہ شفیع شاہ کو خاکستر کر دینے والی نظروں سے  
گھورتے ہوئے بولی "تم ہار ایک سے آوی ہو جا ہار ایک باتیں تمہاری  
سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آتی ہیں ذم تو سیدھی سی بات جانتے ہیں  
بارو یا مرزا۔ اب کھیل شروع ہوا ہے تو ٹارگٹ بھی سامنے آئی  
جائے گا۔"

"بھر بھی ذرا خیال رکھنا کہ اپنے ہی وطن میں چاہی پھیلا  
شروع نہ کرنا۔ اپنے ہی ہم وطنوں کی لاشوں کے انبار لگانا۔"  
شفیع شاہ نے تنبیہ کی۔

"میں ڈرتا نہیں ہوں۔" مس ٹیپ نے واضح کیا "وہی  
ہم وطن اگر وطن فروش ہوں تو ان کی لاشوں کے انبار لگانے میں بھی  
کوئی مضائقہ نہیں۔" چہرہ ہنسنے والی سانس لے کر بولی "لیکن مجھے  
زیادہ ایکشن میں آنے کا موقع ہی کب ملتا ہے پاس تو مجھے بس وہ  
نمبر کا چارج دے کر بٹھاروا ہے۔"

"مہور تمہیں گھوڑی میں ہی اچھی لگتی ہیں۔" شفیع شاہ بولا۔

اس پر صرف مس ٹیپ ہی نہیں 'راجیلہ نے بھی کھانچا  
والی نظروں سے اسے گھورا۔ "مس ٹیپ کی خوب صورت آنکھوں  
میں تو خیر شعلے رقصاں تھیں۔ میں نے ان دونوں کو باری باری  
گھورتے ہوئے کہا "بھئی دشمن کا سامنا ہوا نہیں اور تم لوگوں نے  
ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا شروع کر دی۔ اس سے اندازہ لگا  
مشکل نہیں کہ تم لوگ دشمن سے کس عموگی سے نرسو گے۔"

ٹوٹی جو میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھا تھا، بزرگانہ انداز میں  
مسکراتے ہوئے بولا "سرا یہ پیار بھری ٹوک مجموعہ ہے تمام  
ساتھیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع بہت عرصے بعد ملا ہے ہم  
سب جلی کی طرح ہیں بالکل کا فہار نکال رہے ہیں۔"

"مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ مجھے کیا معلوم نہیں۔ میں ہی تو اس  
جلی کا سربراہ ہوں۔" بھر میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے نیچا  
آواز میں کہا "میں ہی تو نہیں پیار بھری ڈانٹ پلار رہا ہوں۔"

سب ساتھی ٹوٹی کے پاس جمع ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اپنی  
کانیاں ٹوٹی کے گھر کے آس پاس جمع نہیں ہوئے دی تھیں تاکہ یہ  
تأثر پیدا نہ ہو کہ وہاں کسی قسم کا اجتماع ہو رہا تھا۔ وہ دو ساتھی بھی  
آچکے تھے جو ستارہ کی نگرانی پر مامور تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان  
کے آنے تک ستارہ شونگ میں ہی مصروف تھی۔ شونگ گھٹ  
گھٹ کر ہو رہی تھی۔ بہ مشکل پندرہ منٹ شونگ ہوتی تھی تو کسی  
نہ کسی وجہ سے کچھ زیادہ کھٹے کا بریک آجاتا تھا جبکہ دوسرے دو  
سیڑوں پر بھی اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ ان دونوں ساتھیوں کو میٹنگ  
سے فارغ ہو کر وہاں اس کی نگرانی کے لیے پہنچنا تھا۔

شفیع شاہ بھی کراچی سے آچکا تھا اور ہوں اچانک ہنگامی انداز  
میں بلائے جانے پر قدرے شکر بھی تھا لیکن چہرے سے اس کا  
اکھار نہیں ہونے دے رہا تھا۔ ٹوٹی کے گھر میں خاصا بڑا ایک ہال  
تھا۔ وہیں اس نے دو کھانے کی میز جو ڈکرا اور ان کے گرد مزید کئی  
فاضل کرسیاں رکھ کر میٹنگ کا انتظام کیا تھا۔

دو اونے وغیرہ ہندو کے اور باہر چوکیدار کو پیچھے کی چار  
دو ادائی میں گھٹ پر مامور کر کے ہم نے حمایت سنجیدگی سے ایک  
باقاعدہ اور باضابطہ قسم کی میٹنگ کا آغاز کیا حالانکہ مجھ سمیت  
در حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمیں اس میٹنگ میں کرنا کیا  
ہے؟

بہر حال سب سے ضروری کام تو ساتھیوں کو ریڈ ڈاٹ کے  
بارے میں آگاہ کرنا تھا کیونکہ ٹوٹی کے سوا کسی کو ابھی تک اس مسئلے  
میں کھل معلومات ہی نہیں تھیں۔ چنانچہ میں نے پہلے تو اپنی جگہ  
بیٹھے ہی بیٹھے نیچے آواز میں سب سے خطاب کیا۔ ریڈ ڈاٹ کے  
بارے میں جو کچھ بھی مجھے معلوم تھا، جو جزوات اب تک پیش  
آئے تھے ان سے انہیں آگاہ کیا۔ غلطی کو کوئی اذلال تھا میری ہی  
ڈاٹ کے لیے تھا لیکن میرے ساتھی جو تھکے اپنے آپ کو مجھ سے  
اگلا تصور نہیں کرتے تھے اس لیے جو بھی بات ہوتی تھی مجھ ہی کے  
سیٹھ میں ہوتی تھی۔

آخر میں نے کہا "دوستو! جب تک میں نے محسوس کیا کہ  
میں تمہاں پکڑوں سے نہٹ سکتا ہوں، میں نے تم لوگوں کو اس  
خطرے سے خبردار کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ تمہیں سے ہر ایک  
ویسے بھی اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی اہم ذمہ داری سرانجام دے رہا  
ہے۔ میں تمہیں سے کسی کو بھی ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا اور یہی  
بات یہ ہے کہ مجھے خود بھی ادراک نہیں تھا کہ ریڈ ڈاٹ درحقیقت  
کتنا بڑا فیلو ہے۔"

جلی عرف مس ٹیپ بے آبی سے بولی "سرا غلطو خواہ کیا  
بھی ہو، ہم اس سے بھرانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ صرف حکم  
دیے۔ آپ جہاں کہیں 'دہاں ہم چاہی چاہیں گے لاشوں کے انبار  
لگا دیں گے۔"

شفیع شاہ نے سراشا کر مس ٹیپ کو گھورا۔ شفیع شاہ کی

بہر میں نے یہ آواز بلند سنجیدگی سے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "جیسا کہ میں نے تم لوگوں کو بتایا میں نے ملک کی تین اہم ترین خلیہ ایجنسیوں سے میٹنگ کا بھی انتظام کیا اور اس طرح حکومت کو بالواسطہ طور پر اس ہولناک خطرے سے آگاہ کر کے میں نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے لیکن اس کے جواب میں بھی مجھے خاصی باوقاری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان لوگوں سے ہونے والی ساری گفتگو اور ساری کارروائی کی تفصیل میں نے تم لوگوں کو بتا دی ہے۔ ان سے کم از کم فی الحال تو کسی اچھی کارروائی 'سرپرستی' یا تعاون کی امید نظر نہیں آتی بلکہ اللہ تو میری ہی ناکل کھولنے پر تکتے بیٹھے ہیں۔"

سردار فتح پور لاہور ہسٹاشی صاف سرا آپ کے ساتھ تو آہل مجھے آزاد والا معاملہ ہوا ہے آپ کو ان کے پاس جانے سے پہلے ہی یہ میٹنگ ملانی چاہیے تھی۔"

"ہو سکتا ہے تم لوگ بھی مجھے دی کر کے کا مشورہ دیتے جو میں نے کیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ ہم لوگوں کی ذات تک محدود نہیں رہا۔ اس کا ملک سے زیادہ قتل و غلہ تھا جو ہر حال جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اس کے جو بھی نتائج برآمد ہوں گے ان سے میں متاثر ہوں گا۔ اس میٹنگ کا سب سے بڑا مقصد صرف تمہیں ان حالات سے آگاہ کرنا تھا جس سے تم لوگوں کو آگاہ کرنا اب تک میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔"

وہ سب مضطرب تھے کچھ نہ کچھ کر کرنے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن یہ ایک مجبور اضطراب تھا۔ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ کریں تو کیا کریں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ ذرا بات کے جن جن لوگوں سے بھی اب تک میرا سامنا ہوا ہے ان کے طے، شکل و صورت سب کچھ میں نے تفصیلی طور پر بیان کر دی ہے امید ہے تم لوگوں نے انہیں ذہن نشین کر لیا ہو گا۔ میں نے تمہیں اس خطرے کا پچھیزی بلیک بڑے بارے میں بھی آگاہ کر دیا ہے۔ تم میں سے کسی کو بھی ان میں سے کسی کی جھلک نظر آئے تو تمہیں جان کی بازی لگا کر اسے قلاب میں کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ لیکن نہ ہو تو اس کا تقاب کہے یا کسی بھی اور طریقے سے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسے ہلاک کر دینا ہے۔ موردِ سوال کے مطابق فیصلہ تمہیں خود کرنا ہو گا کہ کیا کرنا تمہارے بس میں ہے۔"

وہ سب ہر تن گوش تھے۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "سب کو متنی یافتہ ملکوں کی پولیس کے انداز میں ایک دوسرے سے رابطہ رکھنا ہے" ایک دوسرے کو حالات سے آگاہ رکھنا مجھے بھی جو نئی بات معلوم ہوگی تم لوگوں کو بتانا ہو گا۔ جس کی کو بھی مدد کی ضرورت ہو وہ فوراً اپنی فون 'ٹرانسمیٹر' یا کار کے لیڈ کے ذریعے مدد طلب کرے اور جو بھی سامعی اس کے قریب

تریں موجود ہو وہ اس کی مدد کے لیے پہنچے۔ شفیع شاہ بھی اب کچھ عرصے کے لیے لاہور میں ہی موجود رہے گا۔"

راجیل سے بھی میں نے ان کا تعارف کر دیا تھا اور وہ بھی راجیل کے بارے میں جان گئے تھے کچھ گئے تھے کہ وہ میری زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے اور "ڈی سرکل" میں اس کی کیا حیثیت ہوگی۔

قدرے توقف سے میں نے کہا "میں ممکن ہے ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مجھے کچھ عرصے کے لیے یا خاص طویل مدت کے لیے بد پوش ہونا پڑے۔"

آفتاب نامی ایک چڑچوش ساتھی بول اٹھا "ہم ایسی قیمت نہیں آنے دیں گے سرا"

سب نے بیک وقت اسے گھورا کر آکھوں ہی آکھوں میں تنبیہ کر رہے ہوں کہ اس کو اپنی بات تو مکمل کر لینے دو چوش و خروش تو تارے دلوں میں تم سے زیادہ بھرا ہے۔

میں نے طاقت سے کہا "سرپرست ہمیں کسی قسم کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے سمیت کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے ہمیں ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر مجھے بد پوش ہونا پڑی جائے اور تم لوگوں سے میرا واسطہ مکمل طور پر ٹوٹ جائے تو میری غیر حاضری میں پولیس اور "ڈی سرکل" کے تمام معاملات راجیل ٹولنی اور شفیع شاہ سنبھالیں گے۔ خصوصاً کراچی کے کاروبار میں شفیع شاہ قلعی خود بخار ہو گا اور لاہور میں بھی اگر اس کی مدد کی ضرورت ہوگی تو یہ ہر ممکن مدد کرے گا۔ لاہور کے کاروبار میں چیف ایگزیکٹو کی حیثیت راجیل کو حاصل ہوگی جبکہ ٹولنی ہر طرح سے اس کی معاونت اور رہنمائی کرے گا۔ "ڈی سرکل" کے معاملات میں البتہ ٹولنی کو سپریم حیثیت حاصل ہوگی اور راجیل اس کی معاونت کرے گی۔"

راجیل نے سر اٹھایا شاید وہ اس دتے داری سے انکار کرنا چاہتی تھی لیکن ماحول کا جو بھل پن اور میرا حتی انداز دیکھ کر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ان تینوں کی حیثیت پورے آف ڈائریکٹرز کی سی ہوگی اور ان میں چیف ایگزیکٹو راجیل ہوگی۔ ویسے تو کاروبار میں میرا ایک پورے آف ڈائریکٹرز پہلے ہی موجود ہے لیکن ان کی حیثیت تقریباً نمائندگی ہی ہے۔ ان کا بہت کم سرمایہ کاروبار میں لگا ہوا ہے اور انہیں گھر بیٹھے صرف کچھ منافع لینے رہنے سے غرض ہے۔ جینگ ڈائریکٹر اس وقت میں ہوں لیکن میں اس طرح کی پاور آف اٹارنی تیار کرادوں گا جو میری عدم موجودگی میں کارآمد ہوگی اور اس کے تحت مجھ جیسے اختیارات راجیل کو حاصل ہوں گے۔"

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم سب کو اپنی اپنی جگہ ایک ضروری کام یہ کرنا ہے کہ غیر ملکیوں پر نظر رکھنی ہے۔ سیاخوں کو چھوڑ کر جو غیر ملکی مختلف میٹروں میں مختصراً طویل مدتوں

کا۔

دوسری طرف کئی گھنٹیاں پہلے پہنچے پہنچے کسی نے فون نہ اٹھایا۔  
 باپس ہو کر میں فون رکھنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف ریسیور اٹھایا  
 گیا اور پہلو کی قدرے مڑتے ہی آواز سنائی دی۔ وہ آفس ہی کا  
 کوئی ملازم تھا۔ کسی شیعہ میں اسٹنٹ قسم کی چیز تھا۔ میں نے  
 اتفاق کا پرچھا تو وہ بولا ”جی وہ تو آفس میں نہیں ہیں۔ بلکہ کوئی بھی  
 نہیں ہے۔ میں بھی اتفاق سے ایک فون کرنے کے ارادے سے ہی  
 واپس آیا تھا۔ آپ کون بول رہے ہیں؟“

میں نے اپنا نام بتایا تو وہ حکم دے کر کھائے ہوئے سے مجھے میں  
 بولا ”سرا! آپ کہاں تھے؟ اتفاق صاحب تو آپ کو فون کر کے  
 پاگل ہو چکے تھے۔ اب آپ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آپ  
 اس وقت کہاں ہیں۔“ وہ تقریباً پاپ رہا تھا۔

میں خود نہیں جانتا تھا کسی کو اس بات کا علم ہو کہ میں اس  
 وقت فونی کے ہاں موجود تھا۔ میں نے ملافت سے پوچھا ”اتفاق کو  
 کیا ضرورت تھی کہ وہ جیجے تلاش کرنے کی؟“  
 ”سرا وہ آپ کو اطلاع دینی تھی۔ ساتھ ہی کہ انتقال ہو گیا۔“  
 لڑکے کو گویا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

”کیا کیا اس کر رہے ہو! تمہارا دلغ تو ٹھیک ہے؟“ میرے  
 لہجے کی ملافت حکم دے رہی میں بدل گئی۔ لیکن میرا دل یک لخت  
 ڈوب سا گیا تھا۔

”سرا! میں مذاق نہیں کر رہا۔ میری بے برأت کہاں۔“ لڑکا ہلکا  
 ”اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں ہے ورنہ میں کسی اور سے تصدیق  
 کر دیتا۔ اتفاق صاحب وہیں ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے آپ  
 کو ہی اطلاع دینے کی کوشش کی تھی۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے  
 پوچھا۔

”زیادہ دیر نہیں گزری سرا! لڑکا جنری سے بولا ”لاش ایمری  
 میں میڈم کے ڈرننگ روم میں ہی موجود ہے۔ پولیس کو اطلاع دے  
 دی گئی ہے۔ آپ فوراً آجائیں سرا! اتفاق صاحب بھی آپ کو بلانا  
 ہی چاہتے تھے۔“

”میں آ رہا ہوں۔ میرے آتے سے پہلے لاش کسی کو اٹھانے  
 مستعد۔ پولیس کو بھی فیس لاش کو کسی نے چھڑا تو نہیں؟“

”نہیں سرا! جوں کی توں پڑی ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا اور  
 میں نے فون بند کر دیا۔

فونی، شفیق شاہ اور راحیلہ تینوں ایک ایک میری طرف دیکھ  
 رہے تھے۔ انہوں نے یقیناً میرے چہرے پر فقیر دیکھ لیا تھا اور کھنگو  
 میں لفظ ”لاش“ بھی سن لیا تھا۔

”سرا؟“ فونی نے صرف اتنا کہا اور سوالیہ نظروں سے میرا  
 طرف دیکھا۔

”ستار مرگئی ہے۔“ میں نے اپنے حلق میں آمیزا آتے والے

کے لیے ہمارے ہاں مقیم ہیں ان پر خصوصی نظر رکھتی ہے اور اگر  
 کسی کی کوئی حرکت ذرا بھی مشکوک نظر آئے تو اس کی مستقل  
 نگرانی شروع کر دیتی ہے۔ اس ضمن میں ہر قابل ذکر بات سے  
 وہ سرے ساقیوں کو خبردار رکھتا ہے۔“

پھر میں نے فونی کو مخاطب کیا ”تمہیں بطور خاص سب سے  
 زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ تم میرے ساتھی کی  
 حیثیت سے ریڈ فائٹ والوں کی نظر میں ہو۔“

فونی نے تعجبی انداز میں سر ہلایا اور نہایت ہی خفیف سی  
 مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”ان کا بھی ایلم عرف ایڈی“ اے نن اور  
 بلیک بریڈی کی نظر میں ہیں۔“

”لیکن بہت ہوشیار رہنا“ کوئی کیا قدم نہ اٹھاتا۔“ میں نے  
 بدانت کی ”گو کہ اب ان سے ہماری کھلی جنگ ہے پھر بھی کسی قسم  
 کی غیبت یا بے مہربانی اور غیر ضروری جوش و خروش دکھانے کی قطعاً

ضرورت نہیں۔ ہماری حیثیت ان کے سامنے چوتھی سے زیادہ  
 نہیں۔ لیکن اگر ہم ان کے ناک میں دم کرنے کی تھوڑی بہت بھی  
 امید رکھیں تو اس کے لیے ہمیں اپنے آپ کو نہایت پرسکون اور  
 اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا ہوگا۔ یہ صرف طاقت ہی کی نہیں  
 ذہن کی بھی جنگ ہوگی۔“

کچھ دیر اور اس طرح کے صلاح مشورے ہوتے رہے اور  
 اندر جرا گرا ہونے پر آخر کار میٹنگ ختم ہو گئی۔ فونی کے ملازم نے  
 کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس دوران بھی باتیں ہوتی  
 رہیں اور باقی باقیوں میں ماحول کا جو جھل پھل، منجید کی اور خطرات کا  
 غیر شعوری احساس قسم ہو گیا۔ فنی مذاق اور نوک جھونک بھی  
 ہونے لگی۔ آخر کار میٹنگ برافٹ ہو گئی۔ سب رخصت ہو گئے  
 صرف میں، فونی، شفیق شاہ اور راحیلہ رہ گئے۔ میرا دواں میں دل  
 تھا۔ کسی میں سوچا کہ فونی کے ہاں قیام کر لوں اور کبھی سوچا کہ  
 راحیلہ کے ہاں چلا جاؤں۔

لیکن ان دونوں سے کہیں زیادہ اور کسی اور ہی طرح کی میری  
 بے تکلفی ساتھ سے تھی۔ اس کے ہاں رہنے کی بات ہی کچھ اور  
 تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال قیام ساتھ ہی کے ہاں رکھا  
 جائے۔ اگر واقعی ساتھ کے لیے خطرات کچھ بڑھ گئے تو پھر میں اس  
 ناکہ چھوڑ دوں گا۔

ساتھ کی یاد آئی تو ساتھ ہی خیال آیا کہ اس کی خیر دعائیت  
 و رفاقت کر لی جائے۔ وہ صبح گیارہ بجے کی خواستہ شنگ پر روانہ ہوئی  
 تھی۔ فون پر مجھ سے بات ہو جاتی تو اس کا خصلہ کچھ بڑھ جاتا۔  
 دوسرے میں براہ راست اس سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ  
 کب گھر واپس پہنچے گی۔

میں نے اپنے اسٹوڈیو والے آفس فون کیا۔ مجھے امید تھی کہ  
 اتفاق سے ساتھ کے بارے میں معلوم ہو جائے گا اور اگر وہ آفس  
 پاس ہی کسی ٹکڑ پر ہوئی تو وہ کسی کو بھیج کر اسے فون پر بھی بلوالے

# فرنیچ اردو ریڈر

پروفیسر محمد اشرف قیمت: =/90

ایسا غصہ دکھائی دے جو چہرے پر سے غائب پاکستانی معلوم نہ ہو تو اس پر کسی نظر نہ کرنا۔

انہوں نے سر کو خلیفہ کی جنبش دینے پر اکتفا کیا اور شلنے کے سے انداز میں دو مختلف سمتوں میں بڑھ گئے میں نے راجیلہ کا ہاتھ تھاما اور جھرم کو چہرہ پر آدھے سے گزر کر ڈرننگ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔ پولیس پہنچ چکی تھی اور دروازے پر ایک بدھنق بردار سپاہی تھبتاتا تھا۔

مجھے دروازہ دار بڑھتے دیکھ کر اس نے بازو پھیلا کر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کون ہیں جی آپ؟ کیا بات ہے؟" "ٹھ اپ!" میں نے اس کا بازو جھٹک کر کمرے میں گھستے ہوئے کہا۔ وہ ایک فکر میرے چہرے کی طرف دیکھ کر سمجھ کر ایک طرف کو ہٹ کر گھبرا ہوا گیا۔ راجیلہ میرے ساتھ تھی۔

وہ ایک مختصر سا کمرہ تھا اور چند افراد کی موجودگی سے سی کچھ بچھ بچھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ان میں سے تین پولیس کی دودلیوں میں تھے۔ ایک انسپکٹر تھا، ایک اے ایس آئی اور ایک شاید ہیڈ کانسٹیبل یا کچھ اور تھا۔ میرے وہ دونوں آدمی شاید ابھی وہاں یہاں میں نہیں پہنچے تھے جو ساتھ کی عمرانی کے لیے تھبتات تھے اور اسی کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ میٹنگ میں شرکت کے بعد انہیں کچھ دیر کے لیے مس ٹیپ کے ساتھ دو نمبر جانا تھا اور وہاں سے اسٹورز واپس آنا تھا شاید وہ ابھی دو نمبر پر ہی تھے یا راستے میں کہیں تھے۔

ساتھ کے بارودی گارڈز کو بھی کمرے سے نکال دیا گیا تھا۔ انہیں میں نے باہر کمرے دیکھا تھا۔ اتفاق اور دوسرے چند افراد کمرے میں موجود تھے جنہیں میں پہچانتا نہیں تھا۔ صرف ایک چہرہ میرے لیے قدرے شناسا تھا وہ فلی ولن اگر کم پر روز تھا۔

کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ بڑی سی ڈرننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ سفید فارمیکا کی اس سنگھار میز پر کئی لائٹس نصب تھیں اور اس وقت روشن تھیں۔ میز پر سبک اپ کے سامان کے علاوہ چند پرفیومز بکھری ہوئی تھیں ایک دیوار کے ساتھ کاؤچ لگی ہوئی تھی۔ دو تین چھوٹی موٹی کرسیاں تھیں۔ ڈرننگ ٹیبل پر کھانے کے برتن بھی پھیلے ہوئے تھے۔

کمرے میں موجود کوئی بھی شخص بیٹھا نہیں تھا۔ سب کمرے تھے اور ڈرننگ ٹیبل کے قریب کسی کی سفید شال سے ڈھکی ہوئی تھی۔

آندھن کی کڑواہٹ کو نکلنے ہوئے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر سر ہٹ کر نہیں کہا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ ابھی تو میرا دل اس خبر کو جھٹک رہا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ مجھے یہی قتل دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ جھوٹ ہو گا لیکن ذہن کہہ رہا تھا کہ کوئی مجھ سے اس طرح کا مذاق کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

میں اس ایک لمحے کے لیے کمرہ اسکوٹ چھوڑا۔ صرف ٹی وی اس وقت سے واقف تھا کہ ساتھ سے میرا کوئی خاص تعلق تھا۔ راجیلہ اور شفیع شاہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھے اور وہ ساتھ سے واقف بھی نہیں تھے۔ غائبانہ طور پر میں ایک فلم ایکٹریس کی حیثیت سے اسے جانتے تھے۔

اس وقت میں بہت زیادہ ..... اندیشوں میں نہیں پڑا تھا۔ اس پہلو پر غور نہیں کر سکا کہ مجھے اس موقع پر راجیلہ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ میرے سستانے ذہن میں تو بس ایک ہی جملہ گونج رہا تھا "ساتھ بیٹھ کر کاغذات ہو گیا ہے۔"

راجیلہ اور شفیع شاہ کے لیے بھی یہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس خبر نے میرے محسوسات کی دنیا کو بے ہوش کر دیا تھا۔ میں نے راجیلہ کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔" پھر میں نے شفیع شاہ اور فنی کو ہدایت کی "تم دونوں الگ گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ایمرٹو پٹانا ہے، بہت زیادہ الارٹ رہنا۔"

انہوں نے مستعدی سے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کمرے ہوئے۔ راجیلہ باؤمیک خروم کے سے جھونکے کی طرح خاموشی سے میرے ساتھ تھی۔ میری گاڑی آندھن طوفان کی طرح ایمرٹو کی طرف روانہ ہوئی۔ ٹی وی اپنی گاڑی میں کچھ درمیانی فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے میرے پیچھے تھا۔ شفیع شاہ اس کے ساتھ تھا۔

ایمرٹو میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں واقعی کئی بار حادثہ رونما ہو چکا تھا۔ میں گاڑی پارکنگ لائٹ کے بجائے بیرونی دروازے سے نکلتا تھا جہاں سے دفاتر کی قطار شروع ہوتی تھی۔ چند دفاتر کے دروازے کھلے تھے اور کچھ دروازے کا سامنا تھا۔ آگاہی والوں کی تیزی سے آدھر آدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں ستونوں کے عقب میں کچھ لوگ دو دو تین تین کی گولڈن میں کمرے آئیں کر رہے تھے تاہم اسٹورز میں روز بھی مدتی نہیں گئی۔ جب ہم انہی دفاتر کے عقب میں پہنچے تو ہمیں سامنے کے حصے میں مدتی کم ہونے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ غالباً وہاں کے بیشتر لوگ یہاں پہنچے جسے میں جانتے تھے۔ یہاں مختلف کمروں کی قطار کے درمیان ایک جھونے سے کمرے میں آج کل ساتھ کا ڈرننگ روم تھا۔ اس کمرے کے سامنے اچھا خاصا جھوم تھا۔

میں نے سرگرمی میں فنی اور شفیع شاہ کو ہدایت کی "تم دونوں یہیں رہنا اور جھوم پر نظر کرنا کوئی مشکوک چہرہ نظر آئے، کسی شخص کی کوئی حرکت مشکوک معلوم ہو تو اسے فوراً اطلاع دینا۔ خصوصاً اگر کوئی



چیز ہی تھی وہ یقیناً ستارہ کی لاش تھی لیکن اس سے پہلے میری توجہ کسی اور چیز نے اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔

ڈرننگ ٹیبل کی بڑی دروازے کے قریب فرش پر ایک لپ اسٹک کھلی پڑی تھی اور دروازے کے سفید دھواڑے پر اسی لپ اسٹک سے نیڑے سے بڑے ٹکڑے سے الفاظ میں لکھا تھا "انی اٹھ بجے بھول نہ جانا۔" الفاظ خود بتا رہے تھے کہ کسی دم توڑنے انسان نے بڑی طرح کانپتے ہاتھوں سے انیس پر مشکل لکھا تھا۔ شاید اس وقت جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ موت نے اسے آن دوڑا ہے اور شاید اس وقت اس میں کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

سفید فارمیکا پر سرخ لپ اسٹک سے لکھے گئے ان الفاظ نے یکدم جیسے لمبوس ڈوبے ہاتھوں کا دوپ دھار لیا اور میرے دل کو اپنی خاردار گرفت میں لے کر ملتے گئے۔ کیا مرتے وقت ستارہ کو کوئی اور خیال نہیں آیا تھا؟ کیا وہ کچھ اور نہیں لکھ سکتی تھی؟ اسے میرے دل میں یہ تیری تراژدی کر کے جانا تھا؟

مگر اس اتفاق جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ٹیک ٹاک کی نوک پر آئی ہوئی تھی کچھ پر نظر پڑنے ہی چلا اٹھا "چوہدری صاحب آگئے۔" چوہدری صاحب آگئے۔

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اس نے کسی اہم ترین شخصیت کی آمد کا اعلان کر دیا ہو جس کے آنے ہی اس کے خیال میں تمام مسئلے حل ہو جائے تھے۔ میں نے ایک نظر راجیہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹھیک انہی الفاظ کو تک رہی تھی۔ مجھ سے نظر ملتے ہی اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا چوہا پٹ تھا۔

اسکالر نے غامض مڑبڑاتے انداز میں آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کی صورت میرے لیے ابھی تھی لیکن شاید اتفاق اس سے عجائبات طور پر میرا کچھ زیادہ ہی حاشا کن حاشا کر چکا تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" میں نے دریافت کیا اور محسوس کیا کہ میری آواز کچھ چٹختی پٹختی سی تھی۔ ستارہ کی لاش کو کہ سفید شال میں چھپی ہوئی تھی لیکن میں اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

اسکالر کے سینے پر جوئی توپیاں تھیں اس کے مطابق اس کا نام شام الدین تھا۔ وہ ہماری بھرم کر رہے تھے تو ابھی کچھ سلجھا ہوا معلوم ہوا تھا۔ اپنی چھتری کو دونوں ہاتھوں میں سمھاتے ہوئے بولا "میں ابھی پہنچا ہوں چوہدری صاحب! ابھی میں نے تحقیق شروع ہی کی ہے۔"

دوسرے نعروں میں اس کا مطلب یہ تھا مجھے تو خود کچھ معلوم نہیں جناب! میں تو ابھی معلوم کرنے کی کوشش ہی کر رہا ہوں۔ اتفاق ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تھوڑا بہت اگر کچھ معلوم ہے تو صرف راجہ صاحب کو معلوم ہے۔ آپ

ان سے بات کیجئے چوہدری صاحب!"

میں نے کرون سمجھا کر دیکھا۔ اتفاق نے مجھے راجہ صاحب نام سے مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک ہماری بھرم کر رہے تھے اور مجھ کو راجہ صاحب تھا۔ اسے ابھی غامض خوب صورت لوگوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ ذرا موٹاپے نے غلبہ پایا ہوا تھا۔ جڑے لکھے ہوئے تھے۔ آکھڑ میں تھوڑا سا نیلا پن تھا اور منہ میں خوشبو دار پان۔ وہ بو کی سفید شلوار قمیض میں تھا۔ کندھوں پر خوب صورت کاہر پان تھی۔ پیروں میں زری والے جوتے تھے۔

فوری طور پر میں اس کے بارے میں کوئی واضح رائے نہ دے سکتا تھا۔ بہر حال آدمی ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے معائنہ کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اتفاق نے اس کے بارے میں مزید بتایا "راجہ صاحب پر دو بڑے سرجری ہیں اور ڈاکٹر بھی۔ ستارہ اس وقت انہی کی فلم کی شوٹنگ کر رہی تھی۔"

راجہ اپنی انگلیوں میں دلی ہوئی کسی خوشبودار سرنگے کی راکھ چٹکی بجا کر جھڑکتے ہوئے ہلکے سے جھٹکے دار لہجے میں بولا "ناؤم! مجھ کو بھی کچھ زیادہ نہیں ہے چوہدری صاحب! میڈم جی نے تڑ دوغوں ششوں میں زیادہ ترمیمی فلم کا ہی کام نکھایا۔ اب شام۔ اگر کم پرویز کے ساتھ میڈم کا سچ سین چل رہا تھا۔ اس آکھڑوں سے فلمی دلن کی طرف اشارہ کیا۔

اس موقع پر بھی اس کے لہجے میں بجلی سی چڑچڑاہٹ جھلک آئی "مگر کم پرویز صاحب کے ساتھ رہے سین ہو تو رہی ٹیکس ہوت ہوئی ہیں چوہدری صاحب! بڑی مشکل سے کوئی چھ سات شات ادا کئے ہوئے تھے۔ میڈم ستارہ جھک گئی تھیں۔ کھالے کا بگو ٹیم ہو گیا تھا۔ آپ تو میڈم جی کے خاص آدمی ہیں آپ کو تو پانی ہو گا میڈم پر دو ٹکس کی طرف سے آیا ہوا کھانا نہیں کھاتی تھیں۔" فنن کیمرہ میں بہت سارا کھانا ساتھ لاتی تھیں کہ اگر دونوں ٹیم بھی کھانا کھائے تو کھائیں جگہ دو سروں کو بھی کھلا دیں۔ توجہ دہر کا کھانا بھی انہوں نے اسی ڈرننگ دوم میں کھائی تھا۔ اب رات کو بھی جب وہ جھک گئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کچھ دیر کا بریک کر۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ انہوں نے ایک چھوکرے سے کہا کہ ان کا فنن کیمرہ گاڑی سے نکال کر ڈرننگ دوم میں پہنچا دے۔ چھوکرے نے پہنچا دیا۔ وہ کھانا کھانے یہاں آگئیں۔ جب وہ ڈرننگ دوم میں ہوئی تھیں تو پسند نہیں کرتی تھیں کہ کوئی یہاں آئے۔ ان کے گانا اور دوسرے دو سادہ لباس والے آدمی بھی باہر ہی رہتے تھے۔

وہ میرے آدمیوں کو سادہ لباس والے سمجھ رہا تھا۔ خود اسے انداز میں ایک کش لے کر اس نے ایک بار پھر چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی اور کھار کر بولا "انہوں نے کہا تھا وہ چند منٹ تک وہاں پہنچ جائیں گی لیکن جب آدھا کھانا گزر گیا تو میں نے چھوکرے کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ چھوکرہ کچھیں مارا ہوا ایسٹ پروا میں آیا۔ اس سے بتایا نہیں جا رہا تھا کہ میڈم کو کیا ہوا ہے۔ ہم بھاگے بھاگے

### تاریخی ناول

|       |          |                      |
|-------|----------|----------------------|
| 100/- | قر تسکین | دنیا کے نامور فاتحین |
| 100/- | قر تسکین | شیر مصر              |
| 100/- | قر تسکین | شمشیر اسلام          |
| 100/- | قر تسکین | ترک مرد میدان        |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

دوسرے دوسرے ہاتھ پر راتے ہوئے بولا "یہ اندازہ تو ہو رہا ہے کہ کھانے میں زہر ملا گیا ہو گا لیکن ایسا کوئی زہر میں نے آج تک نہیں دیکھا جو انسان کا یہ حال کرے۔ سترہ سال میری سرورس ہو گئی ہے۔ زہر دیے جانے کے بھی چند کیس میں لے دیکھے ہیں اور انوسٹی گیشن کی ہے اس کے علاوہ میں رہنے والا بھی ایسے علاقے کا ہوں جہاں کے زہر لیے سانپ مشہور ہیں۔ لیکن کسی زہر کا ایسا اثر میں نے نہیں دیکھا۔" اس نے شل میں پچھے ہوئے میری دوستی کے براد کھڑے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت دبی آواز میں کہا "یہ سائنسی اور سیاسی ترقی کے باگ کا زہر ہے جو رفتہ رفتہ شاید پوری دنیا کو افسانے کا شائبہ صاحب!"

میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کیونکہ وہ اس کے سیاق و سباق سے واقف نہیں تھا۔ ہم فلم اسٹوڈیو میں کھڑے تھے وہ شاید اسے کوئی فلمی یا جذباتی مکالمہ ہی سمجھا۔ اس میں زیادہ سر کھپائے بغیر بولا "میرا حال کئی زہر کی دھم پر تو لیبارٹری والے غور کرتے رہیں گے۔ میرا کام تو یہ دیکھنا ہے کہ زہر کس نے ملا کس نے کھانے میں ملایا۔ دو آدمیوں کو یہ موقع حاصل تھا۔ ایک وہ چھو کر جس نے گاڑی سے نقش کیریئر نکال کر یہاں ڈرنک دوم میں چنچایا، دوسرے وہ ملازم یا خاندان میں جو میڈم ستمہ کے گھر میں کام کرتا ہو گا۔ جس نے یہ کھانا تیار کر کے ملا ہو گا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اسپیکر نے راجہ سے پوچھا "کمال ہے وہ لڑکا؟"

راجہ جیسے کسی خیال سے چونک کر بولا "بابا ہری کھڑا ہے ابھی بلا تا ہوں۔" پھر وہ قدرے ہنگامہ سے بولا "لیکن وہ تو بڑا شریف، بڑا تاجدار لڑکا ہے اسپیکر صاحب! ہم عربی ہے اتنی بڑی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ اسے بلا دیں۔ میں نے آپ سے اس کے کیریئر کی کراہی نہیں مانگی۔" اسپیکر نے راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خاصی حد تک اسپیکر انہ لہجے میں

میں آئے تو عجیب سی حال دیکھا۔ میڈم فرش پر بڑی قمیص حالت ہلائی تھی۔ میرا مطلب ہے پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ ہم نے تو ہی کپڑوں سے پہچانا۔ بہت دیر میں ہمیں یقین ہوا کہ وہ میڈم ہی ہیں۔ آپ ایک نظر خود دیکھ لیں۔ گاڑی ہمارے چن کر وہ سارا وقت باہر کھڑے تھے اور جتنی دیر میڈم اندر رہیں کوئی بھی اندر نہیں گیا۔ اس آخر میں چھو کر بلائے آیا تھا۔ وہ فوراً ہی اُٹے بیروں بڑی طرح گھبرا ہوا باہر آ گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا اس کھانا کھانے کے دوران ہی ہوا۔" وہ ابھیں آئیں سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور جبکہ کر ستارہ کی لاش سے شال ہٹا کر دیکھا کہ میں پہلے بھی دیکھ دو لاشیں نہ دیکھ چکا ہوں تو یقیناً ششدر رہ جاتا۔ وہاں اس پر کشش اور قیامت بردوش ستارہ کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ تو جتنی ہوئی خشک مٹی کا ایک بد صورت مجسمہ تھا عام آدمی اس پر اچانک نظر پڑنے پر یقیناً بڑی طرح خوف زدہ ہو سکتا تھا۔

میری رگ و پے میں ایک عجیب لٹنک سی جھلک مٹی جس سے میری سانس کو پانیٹے میں اٹنے لگی۔ اس ڈراؤنے مجسمے کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ لوج اور گداؤ سے بھرا ہوا دیو و پیکر تھا جس کے ایک ایک ٹم 'ایک ایک جنٹل کو کیرا نہ جانے کتنے زاویوں سے ٹھوکر مارتا تھا۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ یہی وہ قیامت ادا تھی جسے محض اسکرین پر دھماکا دیکھنے کے لیے لوگ سینما ہاؤس پر فوٹ پڑتے تھے۔

میں نے جلدی سے اسے شال سے ڈھانپ دیا۔ مجھ میں اس خوب صورت زندگی اور اس بد صورت موت کے تضاد کا زیادہ دیر ٹھانہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ ایک گرمی سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے میں سیدھا ہو گیا۔ کئی دن سے مجھ پر احصاب جھن مسوئیوں اور مبر آقا واقعات کا دباؤ جاری تھا لیکن میں نے جھن کو اپنے اوپر غالب نہیں آتے دیا تھا۔ مگر اب کیا ایک ہی مجھے بچاؤ تھا جھن کا احساس ہوا۔

سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا اور سمجھ میں آتے ہی گویا اس ماحول سے گرد و پیش سے 'وہاں موجود انسانوں سے میری دلچسپی حکیم فتم ہو گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان لوگوں سے منہ پھیر کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔ کسی تاریک اور ویران گوشے میں جا کر چھپ جاؤں اور اس وقت تک چھپا رہوں جب تک میری رگوں میں سرایت کر جانے والا مجبور غیلہ و غضب اُٹھ نہ توڑ جائے یا میں خود موت کی آغوش میں نہ اتر جاؤں۔

میری نظر راجہ پر پڑی۔ وہ گویا بنور میرے آثارات پہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسپیکر صاحب الدین نے ایک زوردار ہٹکارا بھرا اور ڈرنک نیکل پر جبکہ کیریئر کا جائزہ لیا جن میں تھوڑا سا کھانا باقی تھا۔ پھر وہ سیدھے ہوتے ہوئے ایک ہاتھ سے چھتری

کہا۔ راجہ نے کندھے اچکائے اور دو بازو بڑھ کر پکڑ کر رکھا۔  
ہوئے ہانک لگائی "کوئے جیسے! کاکا کتنے اے؟ او جنوں اندر  
بیک۔" (اوتے جیسے! کاکا کہاں ہے؟ اسے اندر بھیج دو۔)

تھوڑی دیر بعد ستوا اٹھا سال کا ایک ساڑھا ساٹھا بڑا  
لیکن نہایت ڈیلا سا لڑکا اندر آیا۔ اس کی آنکھیں پٹی پٹی سی  
تھیں۔ وہ تھر تھراپ رہا تھا۔ انپنکڑ نے مٹنی خیر انداز میں چھری  
ہاتھ پر راتے ہوئے خوشخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا  
"کیوں بے؟ کتنی رقم ملی تھی میڈم کے کھانے میں زہر مارنے کی؟"  
"زہر؟" لڑکے کی پٹی پٹی آنکھیں کچھ اور جھلک گئیں۔ اس  
کے ہونٹوں پر پڑی جمہری تھی۔ اسے ایک لمحے کے لیے ہو گیا کوئی  
لفظ ہی نہ سوجھا پھر یک دم وہ انپنکڑ کے پیروں میں گر گیا اور بری طرح  
گرا گڑاٹے ہوئے ہوا "مجھے سے میری مری ہوئی ماں کی قسم لے لیں  
صاحب جی! میں نے کچھ نہیں کیا میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔  
بڑے دلوں سے اور لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ کبھی کسی کو  
میرے سے کوئی شکایت نہیں ہوئی گی۔"

میرا اندازہ کہ غلط ثابت ہو رہا تھا کہ انپنکڑ قدرے ٹھیکھا ہوا  
غصے غائب کیے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ وہیں سب کے سامنے لڑکے  
کی کھال آویڑنی شروع نہ کرے لیکن میں سب کے سامنے اس  
سے کوئی ایسی بات کہنا بھی نہیں چاہتا تھا جس سے اس کی آنا بھوج  
ہو جاتی۔ اس قسم کے پولیس والوں کی آنا بھوج ڈانک ہوتی ہے۔  
کمرے میں زیادہ جگہ بھی نہیں تھی نہ کچا کچھ بھرا ہوا معلوم ہو رہا  
تھا۔

بہر حال میں نے انپنکڑ کو بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے  
گیا۔ میں نے نیچی آواز میں لیکن سختی سے کہنے میں کہا "انپنکڑ  
صاحب! یہ روایتی اور فرسودہ طریقے اختیار نہ کریں جہاں بھی ذرا  
مستاز قسم کے لوگوں میں کوئی واردات ہوتی ہے سب سے پہلے  
لازموں اور چھوٹے موٹے خدمت گاروں کی شامت آجاتی  
ہے۔"

انپنکڑ نے زخمی نظروں سے مجھے گھورا لیکن میں نے بات  
جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر یہ حرکت اس لڑکے کی ہوتی تو اب تک  
یہ یہاں سے غائب ہونکا ہوتا۔ ستارہ کی ملازمہ کی یہ حرکت اس  
لئے نہیں ہو سکتی کہ ستارہ نے دیکر کبھی ای شین یہاں سے  
کھانا کھایا تھا اور وہ رات تک ٹھیک رہی تھی۔"

بات کسی حد تک اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ اس کا جوش و  
خروش کچھ ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا "تو پھر آپ کو معلوم  
ہو گا یہ کیا پکڑ ہے؟"

"ہاں مجھے اندازہ ہو گیا ہے ستارہ کی گاڑی پارکنگ لائن میں  
ہی کھڑی ہو گئی۔ شین کیریز اسی میں تھا۔ اس کی طرف کسی کی بھی  
زیادہ توجہ نہیں تھی ستارہ کی حفاظت پر جو لوگ مامور تھے وہ اسی  
کے گرد منڈلاتے رہتے تھے اسٹوڈنٹوں میں بڑا دن لوگ آتے جاتے

رہتے ہیں۔ کسی نے دیکر اور وہ شام کے دو بجے اس کی گاڑی کا تھم  
کھول کر کھانے میں زہر ملا دیا۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔  
"لیکن کس نے ملا دیا؟ یہی معلوم کرنا تو میری ذمہ داری  
ہے۔" وہ ٹھوڑی سی کھجائے ہوئے بولا۔

"کچھ عرصے بعد شاید اس کیس کو حل کرنے کے لاکھٹ تیار  
مل جائے۔" میں نے اسے اطمینان دلایا "لیکن فی الحال یہ ذمہ  
داری آپ پر سے ہٹائی جائے گی۔ میں ڈی ٹی کی جی صاحب سے بات  
کروں گا۔ یہ آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا کیس ہے ہی نہیں۔ یہ میر  
لیا پکڑ ہے اسے خفیہ ایجنسیاں ذیل کر رہی ہیں۔"

میں نے تینوں ایجنسیوں کے نام گوائے اور کہا "اگر آپ  
چاہیں تو آپ کو اس سلسلے میں نہیں صاحب سے باخاطبہ احکامات  
بھی مل جائیں گے۔ آپ بس رسی کارروائیاں کریں۔ گول مل  
انداز میں اس معاملے کو نٹھائیں۔ کسی غیر متعلق آدمی سے یہ کہنے  
کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ معاملہ آپ کے دائرہ اختیار سے باہر  
ہے۔ خفیہ ایجنسیوں کا بھی کوئی حوالہ نہیں آتا چاہیے۔ آپ بات  
سمجھ رہے ہیں نا؟"

"بالکل سمجھ گیا مگر جیسے تعذیبی کرنا پڑے گی۔" وہ  
سہلاتے ہوئے بولا۔

"وہ آپ کل کر لیتے گا۔ آج رات میری ان سے بات  
ہو گی۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ  
آسانی سے ہی مان گیا تھا۔ مرغوب بھی نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ  
سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میرا ان معاملات سے کیا تعلق تھا؟ وہ ہمار  
حوالے ہی اس کے لیے کافی رہے تھے۔

اس کے بعد پھر مجھے اور تمام مراحل ملے ہو جانے میں فلا  
دیر نہیں لگی۔ لاکے سے لے کر ٹالپا راجہ تک سبھی لوگ جیل  
ستارہ کی موت کے دھچکے سے پریشان تھے وہیں کم از کم یہ بات ان  
کے لیے قدرے طمانیت کا باعث بنی تھی کہ ان کی جان نہایت  
آسانی سے چھوٹ گئی تھی۔ سب کی نظروں میں میرے لیے فکر  
اور مرغوبیت تھی۔ ان کی نظریں میں واقعی بڑا آدمی تھا جس نے  
اگر انپنکڑ کے کان میں کچھ کہہ کر سارا معاملہ گولیا منوں میں ختم  
کر دیا تھا۔

لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس وقت میں خود اپنے آپ کو  
اپنی نظریں تنہا چھوٹا اور شکست خوردہ شخص محسوس کر رہا تھا۔  
زندگی سے بے پروا اور خواہ حوصلہ عورت جو اسکرین پر پہنچا  
ظلوٹوں میں غفلتوں میں ہر جگہ جاوڑا جاتی تھی، محض حوازن وارڈن  
کر میرا ساتھ دینے میرے شانہ بہ شانہ کھڑی ہونے اور مجھے ہاتھ  
دینے کے جزم میں میں اپنے حوازن کے دور میں مارلی گئی تھی۔ اسی  
نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا اس کی تو کسی سے دشمنی نہیں تھی۔  
مرنے وقت بھی اسے صرف میرے لیے ہی پیغام چھوڑنے کا

کوئی قصور نہیں۔

میں کتنا چاہتا تھا کہ قسمت شاید اس کی نہیں بلکہ میری پلا  
کھاری تھی لیکن میں نے بات اور حوری چھوڑ دی۔ میں نے محسوس  
کیا تھا کہ راجیلہ نے ایک طویل سانس لی تھی۔ وہ پہلی بار ٹھوڑی  
نکالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ریشمی بھورے بالوں کی ایک لٹ نے  
اس کے ایک رخسار کو تقریباً جانب رکھا تھا۔ میں ایک لمحے کے  
لیے گویا اس کی موجودگی کو فراموش ہی کر بیٹھا تھا گو کہ وہ پوری  
کوشش کر رہی تھی کہ اس کے چہرے سے افسردگی کے سوا کچھ ظاہر  
نہ ہو لیکن میری نہ جانے کس حس نے مجھے احساس دلایا کہ راجیلہ  
کی موجودگی میں مجھے ستارہ کے بارے میں اس طرح اپنے  
محسوسات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ تو بس ایک طرح  
کی بے اختیاری تھی جو کچھ میں نے محسوس کیا تھا وہ تو زبان سے  
نکل ہی چکا تھا۔

میں نے یکدم اٹھنے ہوئے گا "آؤ راجیلہ چلتے ہیں۔"

وہ کسی حال کے معمول کی طرح سعادت مندی سے قدرے  
مشقی سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اتفاق سے کہا "میں  
کوشش کروں گا کہ پوسٹ مارٹم وغیرہ کے بعد لاش پولیس سے  
جلد از جلد مل جائے۔ تم لاش لے کر ستارہ کی تدفین کے شایان  
شان انتظامات کرنا۔"

"وہ تو خود بخود ہوں گے سرا" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "میں بھی تو  
اس کی موت کی خبر پوری فہم اندیشی میں نہیں پھیل۔ اندیشی اہل  
کہہ جائے گی۔ کرامت پر پا ہو جائے گا۔"

وہ پھرے ساتھ باہر نکل آیا اور برآمدے کی میز چیموں کے  
پاس ٹوکتے ہوئے بولا "شاید تھے حالات کی روشنی میں نہیں  
محاطات کو از سر نئے کرنے کے لیے ایک تفصیلی مینٹگ کی  
ضرورت پڑے۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں بس تم جس طرح مناسب سمجھو  
کام جاری رکھو۔ کام نہیں رکنا چاہیے کوئی بھی مافی مسئلہ ہو تو تم  
پہلے ہی کی طرف میرے ڈائریکٹر کا کانس سے مل لیا کرو۔"

"سرا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے آپ کی فرائضات کا  
شکر ادا کروں۔" اس کی تواضع بھرا سی گئی۔

مجھے یاد تھا کہ کسی زمانے میں وہ بھی ستارہ کا چاہنے والا ہوا  
کرنا تھا لیکن اس کی طرف سے جاہت کا جو اب میٹرنز آنے پر اور  
پھر ستارہ سے میری شہسائی نکھل آنے پر اس نے گویا اپنی کتاب  
زندگی سے یہ وقت بچا کر بھینک دیا تھا۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کر گاڑی کے قریب پہنچا تو میرے وہ  
"دونوں آدمی بھی فلوئر نمبر آٹھ کی طرف سے آتے دکھائی دیے جو  
ستارہ کی عمرانی پر مامور تھے۔ انہیں بیٹینا سب کچھ معلوم ہو چکا تھا  
ان کے چہروں پر اوداسی تھی۔ ان کے نام خیر اور مسعود تھے۔  
خیر قریب آکر سر جھکائے ہوئے بولا "آئی ایم سوری سرا ہم

لیا تھا اور وہ بھی صرف یہی "مجھے بھول نہ جانا" اور کسی بات  
اسے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ میں اب بھلا اسے بھول بھی  
سکتا تھا؟ وہ اپنے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے یہ یہ الفاظ گویا  
میں نے دل پر کھد کھد کر رکھی تھی۔ فی الحال تو قریب صبح کا گھری میرے  
تہ سے ٹھوٹھ نہیں ہوا تھا۔ کتنے اہتمام سے تیار ہو کر وہ کسی دھن  
راہت ہو ٹول پر چائے کمرے روانہ ہوئی تھی۔ میں نے اسی  
کمرے کے کچن پر کھڑے ہو کر اسے خدا حافظ کہا تھا۔ زندگی کی  
رت گویا اس کے سراپا سے پھوٹی پڑی تھی اور اب۔  
بیانات ہو چکے لاش افشانی جا چکی "لوگوں کی تجزیہ بحث جنگی تو  
ہا اور راجیلہ" اتفاق کے ساتھ میرے اسٹوڈیو والے آنس میں  
مجھے اتفاق کے بال بکھرے ہوئے تھے چہرے پر وحشت تھی۔  
وہ کی موت نے اسے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آنس میں اپنی کرسی پر  
برہو کر اس نے "دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

میں اور راجیلہ اس کے متقابل صوفے پر بیٹھے تھے۔ چہرے  
لے لیے کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ ہم تین اپنی اپنی جگہ الگ طرح کی  
لواری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ راجیلہ نے تو خیر فنی کے ہاں سے  
راہل کے بعد سے اب تک ایک خط بھی نہیں بولا تھا۔

آخر کار اتفاق سر اٹھاتے ہوئے پچھلی پچھلی سی توازن میں بولا  
اس صدمے نے جذباتی طور پر بھی ہمیں مت پرے رخسار سے  
بہار کر دیا ہے اور بالی طور پر بھی۔ تین فلیس تو ہماری سیٹ پر  
میں جو تو کسی سے زیادہ عمل ہو چکی ہیں اور میں میں ستارہ میروں  
کی تیوچہ وہ فلیس دوسرے پروڈیو سرز کی ہیں۔"

آخر کار وہ فلیس آدمی تھا۔ اسے فلیس کی پڑی ہوئی تھی لیکن  
کمرے سے سہاواہانی جگہ ٹھیک سی تھا اس کا سب کچھ تو فلوئر ہی  
سے وارن تھا۔ اس کی زندگی "اس کا وہ صاف پچھوٹا" اس کا ڈورین  
فانی اس کی دلچسپیوں کا محور و مرکز فلیس ہی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "چند ہی صاحب اچھے  
نہیں ہو گیا ہے کہ میں ایک بد نصیب آدمی ہوں۔ جوانی کے دور میں  
فی فنت کہنے کے بعد مجھ پر عروج آیا لیکن بہت کم دنوں کے  
لیکے پھر آپ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے دلدل سے نکالا۔ نگ رہا تھا کہ  
ستارہ کے آئے کی لیکن میں ایک بار پھر ڈوب گیا۔ ساتھ ہی  
لانے آپ کا کافی سرمایہ بھی ڈھونڈا۔ آپ بھی سوچیں گے کہ کیا  
کے لیے میں نے آپ کو گھر لائن میں بھیجا تھا۔"

"ستارہ کی کوئی بات نہیں ہے اتفاق! سرمایہ تو آنا اور جانا  
معاذ انسان اس دنیا سے جا کر واپس نہیں آتا۔ سرمایہ کا  
مطل سرمایہ ہے لیکن انسان کا بدل انسان نہیں ہے ہر انسان اپنی  
جگہ ایک الگ کائنات کی طرح ہوتا ہے وہ سرا انسان اس کا مقابل  
کافر کی ہو سکتا اس پر بس میں اگر کچھ سرمایہ ڈوب گیا ہے تو مجھے اس  
ستارہ کے سوانے اور فلیس اور حوری وہ جانے میں ظاہر ہے تھمارا

میں نہیں آیا کہ کیسے تمہارا دکھ ٹلاؤں۔

”ہیں تم میرے ساتھ ہو، ہر کام ہر مسئلے میں میرے ساتھ چل رہی ہو۔ میرا دکھ ٹانے کے لیے تمہاری یہ رفاقت ہے۔“ میں نے اس کے ٹیم حشر والوں کو کچھ اور حشر کرتے کہا۔

اس نے اپنے گداز ہاتھ سے آہستہ سے میرا ہاتھ دلا اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی ”مجھے بھی ستارہ کی سوت پناہ انوس ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ اس ملک کی غریب اور سڑکی میں بہت اچھا اضافہ تھی اور ابھی اسے بہت کچھ اور اس لیے بھی کہ وہ تم سے اس قدر محبت کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا۔“

”مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا۔“ میں نے جلدی سے کہا اسے ایک اچھی دوست سمجھتا تھا اور بس۔ میں کیا کہہ سکا کہ کوئی اپنے ذہن میں کیسے خواب بن رہا ہے۔ میں نے قہر جھوت بولا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا ستارہ میرے بارے میں سوچتی تھی اور میں اس کے بارے میں کیا سوچتا تھا۔ لیکن راحیلہ کو نہیں سمجھا سکا تھا کہ انسان کی چاہش کتنے غافلوں ہوتی ہیں، کیوں غنی ہوتی ہیں اور کہاں آکر تقدیر کے دھماکے جاتے ہیں کہاں آکر غلامی کی راہیں گنڈھ ہو جاتی ہیں اور چار ظلم بن جاتی ہیں۔ کس سمت میں دست طلب ہوتا ہے تو نہ جاتا ہے اور کس سمت میں بڑھنے نہیں پاتا۔ یہ سب انسانی کی بھول بھلیاں تھیں اس وقت میں ان میں الجھنے اور اپنے راحیلہ کو بھی بھٹکانے کا شغل نہیں ہو سکا تھا۔ بات بچنے بچانے اور ابھی الجھ سکتی تھی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ تو نہیں رہی۔ کوئی وضاحت مانگ رہی۔“ وہ جلدی سے بولی ”میں تو تمہارا دکھ شیر کر رہی ہوں۔“

دکھ شیر کرنے کے بھی اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ اس کی طرح میرے دکھ شیر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بارے میں چاہتا تھا اس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ ستارہ سے شادی نہیں چاہتا تھا۔

وہ گویا موضوع بدلنے ہوئے بولی ”خیر میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی تم میں نہیں ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔ یہ حاور تا بھی تمہارا اپنا اور حقیقت بھی۔“

”تھو تو ابھی یہ بین ہی نہیں سکا، ابھی تو یہ صرف سنا۔“ یہ میں نے تمہاری تذکرہ کر دیا ہے۔ میں نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے وہ سر جھکائے جیتی رہی پھر بھی آواز میں بولی ”ہمارے دو میان محبت کے سوا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اپنے دیکھتے سے“ اپنے عمل سے پیش پیش تھی احسان کہ میں اپنی اور تمہاری چیزوں کو الگ الگ نہ سمجھوں۔

صرف میٹنگ میں شرکت کے لیے گئے۔ واپسی میں دو نمبر پر ٹرپ کے تائے ہوئے کچھ کام کرنے میں دیر ہو گئی اور اس دوران یہاں یہ سب کچھ ہو گیا۔

”تم یہاں ہوتے تب بھی شاید یہ ہو جاتا۔“ میں نے دیکھ لیے میں کہا ”کیونکہ تم ستارہ کی حفاظت کر رہے تھے اس کی خالی گاڑی کی نہیں۔“

”اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟“ مسود نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، میں تم واپس جا کر اپنی کاروباری مصروفیات میں لگ جاؤ لیکن میٹنگ میں جو فیصلے ہوئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں ان پر بھی عمل جاری رکھنا۔ اگر کہیں اور تمہاری ضرورت ہوگی تو میں اطلاع کروں گا۔“

میں اور راحیلہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ٹوٹی کی گاڑی بدستور ہمارے پیچھے تھی۔ راحیلہ کے ہاں پہنچ کر میں نے دیکھا ایک پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اس پر نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ”دوسری سرکل“ کے استعمال میں رہنے والی گاڑیوں میں سے ایک تھی اور میری ہدایت پر بس ٹرپ نے بجوالی تھی۔

”آج سے تم صرف یہ گاڑی اپنے استعمال میں رکھو گی۔ اس کے خفیہ خانے میں ریڈیو موجود ہے جو کچھ سمیت تمام ماحیوں سے رابطے کے لیے مخصوص فریکوئنسی پر سیٹ ہے۔ ایک وقت میں کسی ایک ساتھی سے یا ایک وقت کئی ساتھیوں سے بات چیت کا طریقہ۔ کچھ سکٹرز اور کچھ کوڈ ورڈز میں ٹرپ میج آکر تمہیں سمجھا دے گی۔ یہ گاڑی کچھ اور خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ میں ٹرپ تمہیں ان کے بارے میں بھی بتا دے گی۔“ میں نے کہا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ راحیلہ نے گاڑی سے اترے بغیر پوچھا۔

”بچپن کے ایک دوست، ایک لنگوے پارک کی طرف۔“ میں نے کہا۔

”تھو تو تیار ہو چکا اب تم میں ٹھہر جاتے۔“ وہ نہایت دھیمے لہجے میں بولی۔

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا ”میرے خیال میں ابھی یہ مناسب نہیں۔ ابھی بہت ٹھکانے ہیں۔ میں تمہارے سر پر مسلط ہونا نہیں چاہتا۔ میری موجودگی سے تمہارے لیے خطرہ ہے۔ میں براہ جانیں گے تم پہلے ہی میری وجہ سے جتنے خطرات مول لے رہی ہو وہی بہت بہتری احوال مناسب کی ہے کہ میں تم سے دور دورے رابطہ رکھوں۔“

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

”تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی ایسی خاص بات نہیں۔“ وہ اپنی ساری تیزی و طراری گویا بھول چکی تھی۔ ایک عجیب سی افسردگی سے وہ گویا بھگ کر رہ گئی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”در اصل میری سمجھ

”میں بھی تمہیں میرے پاس آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ اور رہو گی تو مجھے مجھے لگو گی۔ میں پہلی ضرور ہوں لیکن زیادہ مشکل پہلی نہیں۔“ میں نے اس کا کندھا چھو لیا۔ وہ گاڑی سے اتر گئی لیکن پارک میں گاڑی اس وقت تک دھکیلتی رہی جب تک میری گاڑی ریورس ہو کر آگے نہیں بڑھ گئی۔

وہاں سے میں راجہ کے ہاں پہنچا۔ میرے دو آدمی اس گھر کی حفاظت کے لیے بھی تعینات تھے۔ میٹنگ میں شرکت کے بعد وہ واپس اپنی ذیولٹی پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے دور سے انہیں دیکھا تاہم ہم ایک دوسرے سے انجان ہی بنے رہے۔ یہاں خلو صرف کار سٹکی کی طرف سے تھا لیکن اس کی موت کے بعد بھی میں نے ابھی اپنے کاموں کو نہیں بنایا تھا۔ اب یہاں آتے وقت البتہ میں نے ٹوٹی اور شفیع شاہ سے رابطہ برقرار رکھا۔ انہیں واپس بھیج دیا تھا البتہ یہ بتا دیا تھا کہ فی الحال میں راجہ اور شہیم کی طرف قیام کرنے جا رہا تھا۔

شہیم کا چکر لگا رہا بھی مجھے پچھتاہ تھا۔ اس نے میٹ کھول دیا اور میں نے گاڑی ڈرائیوے میں لے جا رکھی۔ میں نے دیکھا کہ برآمدے میں عین بہت کی لائٹ کے نیچے باہر تیرہ سال کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ ایک بے پناہ خوب صورت لڑکا تھا۔ اس کی من موہنی صورت میں اس قدر کشش تھی کہ بے اختیار میرا دل ہالہا جلدی سے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

میں نے یہ مشکل اپنے آپ کو روکا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک اجنبی کی یہ اچانک حرکت چپکے کو خوف زدہ کر دے گی۔ خصوصاً اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں کچھ زیادہ ہی کشش تھی۔ وہ بے پناہ سمجیرہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس عمر کے بچے بھی سمجیرہ بھی کہنے ہوں تب بھی ان کے فطری ذہن سے تو روزانہ بہت کچھ سیکھنا پڑتا ضرور جھلکتا ہے۔ مگر اس بچے میں وہ بیکر مفقود تھا۔ اس کے چہرے پر کسی کا بھوکھن ضرور تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ وہیں کھڑا ایک ٹک مجھے گاڑی سے اترتے دیکھتا رہا۔ میں اس کے قریب پہنچتا تب بھی اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ وہ دونوں ہاتھ چلوں کی جیبوں میں ڈالے کسی بہت بڑے اور اہم شخص کے سے وقار ممانعت بلکہ قدرے نخوت سے کھڑا تھا۔ قد میں ظاہر ہے وہ مجھ سے کہیں چھوٹا تھا اس کے باوجود کچھ اس طرح میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

”السلام علیکم یہذا!“ آخر میں نے ہی بوتلے میں پھل کی ”تپ“ کون چس؟“

”پہلے آپ بتائیے آپ کون ہیں؟“ وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا ”چہ کیدار نے اندر اطلاع دیے بغیر آپ کے لیے گیٹ کیوں کھول دیا؟ کیا وہ آپ کو پہچانتا ہے؟“ وہ نہایت روانی سے

رہنمائی بتا دیا کہ میں کسی کی بھی فرازشات کے باوجود سے گھبرا نے والی عورت ہوں۔ میں نے سمجھنے سے لے کر اب تک بہت بڑی پزیرائی بہت خود بخود زندگی گزارا ہے۔ مجھے فرازشات بہت بڑھتے ہیں۔ یہاں میں ٹوٹ پھوٹ جاؤں گی۔“

”جب میری اور تمہاری چیزیں الگ الگ نہیں تو یہ فرازشات ہمیں کہاں سے آئیں گی؟“ میں نے ان کو فرازشات سمجھنے اور ان کے بوجھ گبرائے کی ضرورت نہیں۔ ہاں کچھ لو کہ اب تم ہمیشہ سے زیادہ آزاد زیادہ خود بخود زیادہ انڈی پینڈت عورت ہو۔ جس میں اپنی فرازشات کے باوجود تھکے تھکے کی کو شش نہیں کر رہا بلکہ آپ تم اپنی پزیرائی میں ہو کہ چاہو تو دوسروں کو اپنی فرازشات کے بوجھ دیا سکتی ہو۔“

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا ”اور آئندہ اس کم کے موضوعات پر بات کرنے اور کڑے محوے اکھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی جو بھی پیچھے دے اسے قبول کرنا چاہو اور کسی بہنوئے کے ساتھ نہیں خوشی ملی اور گرم جوشی کے ساتھ زندگی اسی طرح کرنا۔ میرا ساتھ اگر دے سکتی ہو تو چورے دل سے دو، دن ابھی کچھ نہیں گزرا وہاں کا راستہ کھلا ہے۔ نیچے بہر حال ماری اشد ضرورت ہے اور تمہارے بغیر میں ٹوٹ پھوٹ جاؤں گی۔“

اس نے گویا تڑپ کر سر اٹھایا اور نرم آواز میں کہا ”تمہارے ساتھ لے کر تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں؟“ ”مگر تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تو میں پھر آگئی آگئی؟“ ”نہایتی اور متنازعہ باتیں مت کیا کرو۔ میرا دل دھکتا ہے۔ اور اس وقت میں جن حالات سے دوچار ہوں ان میں کم از کم تم سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم میرا دل دھکا دیا جا ہو گی۔“

”میں تمہارا دل دھکا دے کر نہیں جاتی۔“ وہ ٹھٹھکی آواز سے بولی۔

”تو پھر تم کیا جاتی ہو؟“ میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے

دیکھے اس کی آنکھوں میں بھانکا۔ ”مجھے نہیں معلوم میں کیا جاتی ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ میں نے ٹھٹھکی سانس لے کر اس کے سر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ”تمہارے فیصلہ غیر معمولی انسانوں کا بھی المیہ ہوتا ہے۔ میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ حقیقت وہ کیا جاتے ہیں۔ بہر حال وہ لڑکی کوہاڑا اور اطمینان سے سوچا اور انہماکوں سے بیچھا چھڑانے کی بات کو بالکل سیدھے سادے انداز میں دیکھا کہ وہ انسان کو کبھی کبھی بھول بیٹھتا ہے۔ بھولتا ہے کہ شش کیا کرو کہ وہ بھولتا ہے کہ تم نہ نہ کہو۔“

”میں بھولتا ہوں کہ بہت سادے سادے انداز میں دیکھنے کی سہولت میں ہوں تو تم بہت اچھے اچھے دکھائی دیتے لگتے ہو۔“ وہ

سنکر بھی کھڑکی سے نکلتی ہوئی۔

نکتہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں نے اس کے تیز و زوالوں سے منہ پھینکے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہاں بیٹا! ظاہر ہے وہ مجھے پہچانتا ہے تبھی اس نے میرے لیے گیت گویا ہے۔ آپ اپنا نام تو بتائیے؟" میرا آگے بڑھ کر اسے پیار کرنے کوئی چاہ رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت ریزہ اور لیے دیے رہنے والا بچہ تھا اس لیے میں پیش قدمی سے باز رہا۔

"تمار" اس نے اختصار سے جواب دیا "اور آپ کون ہیں؟" میں افضل چودھری ہوں راجہ۔ میرا مطلب ہے ریاض چیمبر صاحب کا بچپن کا دوست۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ "اور؟" اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آگئی تو آپ میرے سوتیلے باپ کے دوست ہیں۔" انیسویں صدی کے لیے میں بھی راجہ کے لیے پسندیدگی کی خشک نہیں تھی۔

مجھے خفیف سا جھکاٹا۔ اس کے الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ وہ شیم کے سابق اور مرحوم شوہر میاں مسود کا بیٹا تھا اور شیم ہی اس کی ماں تھی۔ لیکن شیم نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا تھا کہ اس کا کوئی بیٹا بھی تھا۔

اچانک اندر سے شیم کی تواز ستائی دی "کون ہے بیٹا؟ کس سے باتیں کر رہے ہو؟" پھر وہ فٹپٹے کے سے انداز میں خود باہر آگئی۔ وہ بالوں کو برش کر رہی تھی۔ مجھے غار کے پاس کھڑے دیکھ کر ٹھکی۔ وہ ایک خوب صورت سے ٹائٹ گاؤن میں تھی۔ اس کے وجود سے کسی اچھے کون کی ہلک پھوٹ رہی تھی۔

"اے۔۔۔ غار بیٹا چودھری افضل سے باتیں کر رہا ہے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" اس نے قریب آکر والدانہ انداز میں عقب سے بچے کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں اور میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی آسودہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "جھا ہوا تم آگے آئی! کہاں رہے ہو آج کل، بگرفون کو تو فون ہی نہیں ملتا۔ آفس فون کو تو تم نہیں ملنے کیا چکر ہے؟" اسے بڑے قوی ہو گئے جو اب ہم قریب غار سے ملنا ہی پسند نہیں کرتے؟ یا ہماری وجہ سے جو تکلیفیں اٹھانا پڑیں ان سے پریشان ہو گئے؟

میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور ایک منگ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شیم! تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تمہارا ایک بیٹا بھی ہے۔"

اس نے جبکہ کہ غار کا رخارجہ اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھی ہوتے ہوئے بولی "میں تو اتنی مدت ہی باتیں کرتی رہی ہوں۔ کو۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے؟" سے نئی مصیبت تو کبیرے رہتی ہیں ہمیں۔

پھر وہ بچے کا کندھا چھتکتے ہوئی بولی۔ "ہر حال۔۔۔ غار سے عاتبا تمہارا تعارف تو ہو ہی گیا ہے۔ یہ ہماری انگریزی اولاد ہے۔ میری میں ایک پورنٹ اسکول میں پڑھتا ہے۔ آجکل چھٹیوں میں گھر آیا ہوا

ہے۔ اب تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی سب سے بڑا اور سب سے بڑی کشش یہی ہے۔" اس کے چہرے پر نہایت خوشیاں رقصاں تھیں۔ اس کا بس نہیں جلی رہا تھا کہ خوشی کی طرح بچے کے وجود میں سا جائے یا اسے اپنے ہوسوں نہ جانے کیوں اب تک مجھے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے شیم کبھی محبت کرنے والی ماں نظر نہیں آ سکتی تھی۔ غار کے عقب میں کھڑے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میں اس محبت کرنے والی مائیں کی ہی پیدا ہوئی ہوں۔

وہ غار کو میرے بارے میں بتاتے لگی۔ "یہ اصل میں بیٹا جانی! تمہارے بابا کے لنگوٹیا دوست۔۔۔ ہمارے ہم ہیں۔ دراصل ہم تینوں ایک ہی گاؤں میں رہا کرتے تھے اور یہی بہت قریب تھے۔"

غار کی محنت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی وہاں پتلون کی جھونپڑ میں ڈالے کھڑا تھا۔ آنکھوں سے میری کار طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میں کی گاڑی تیار ہی ہے کہ بہت دولت مند آدمی ہیں۔"

شیم مسکرائی اور غیر ارادی سے انداز میں اور خوبصورت بالوں میں برش بھرتے ہوئے بولی۔ "ہاں بیٹا! سامنے تو ہم اب بھی قریب غار ہی ہیں۔"

"نی! اہل تو مجھے بھی غریب ہی ہی شمار کرو۔" میں نے غار کی کوشش کی۔ "بے گھر ہوں۔ تمہارے ہاں پناہ لینے آیا ہوں۔" "خیر ماؤں میں ملے گا۔" وہ ایک طرف بچے ہوئے "یہ گھر بھی تمہارا ہے اور گھر والے بھی تمہارے ہیں۔" نہ کرنے تم بے گھر ہوؤ۔ تم نے تو خود نہ جانے کتنے بے گھر دلا دیا تو ہو گا۔ آؤ۔ اندر آؤ۔ اس وقت تمہارے بہت ہی خوش ہوئی۔ میں تمہارے ہی بارے میں سنا تھا۔"

پھر اس نے بچے کو حلقہ کیا۔ "آؤ بیٹا غار! تم گھر آ جاؤ۔ گھر ہو رہی ہے۔"

"نہیں۔ میں ابھی کچھ دیر اور یہیں گزاروں گا۔" چل قدمی کر رہا۔ "وہ فیصلہ کن لیے میں بولا۔" بولے کہ میں ہی رہتا ہوں جہاں اس سے کہیں زیادہ جاتی ہے۔"

شیم نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیے اور مجھے دیکھ کر کچھ بے بسی آمیز سے انداز میں بولی۔ "مری کا کہ اس کی بات چکر لکیر ہوئی ہے۔ اس سے اس کی مرضی کے کوئی کام نہیں کرایا جاسکتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے اسے اپنے بھلے کی تیز بہ کسی غلط بات پر نہیں آؤ۔"

بچے نے غار سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ میں اندر آ گئے۔ وہ انجانک روم میں پہنچ کر غریب بولی۔ "کھانا کھاؤ"

# جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین پراسرار سلسلہ



”موت کے سوداگر کے خالق  
اقلامِ علیم کے پراسرار قلم  
کے لکھی گئی ایک سلسلہٴ اطلاعاتی کہانی  
جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم  
کیے۔ کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہے

قیمت

پلاڈائل ۱۵۰/-، پلاڈوم ۱۵۰/-

مکتبہ القریٰ

اردو بازار لاہور، فون ۶۲۲۸۶۶۶۵

ہیں شرفِ میرانی بخشے؟“  
”شرفِ میرانی کا تو معلوم نہیں۔ بہر حال کھانا میں کھاؤں  
گا۔“ میں نے جواب دیا۔  
”بیک ہے۔ پھر میں بندہ جانتے ہیں۔ ویسے میں کھانا کھا چکی  
ہوں۔“  
”راجہ کہاں ہے؟“ میں نے ڈائجسٹ ٹیبل پر بیٹھے ہوئے

پوچھا۔  
”تو؟“ مگر وہی پر نکلا ہوا ہے۔ ویسے جب سے غار آیا ہے  
اس کی شراب نوشی کچھ کم ہو گئی ہے۔ نئے میں موت ہو کر مگر نہیں  
آتا۔“ اس نے ملازمہ کو کھانا دینا مگر کرنے کے لیے کہا پھر  
میرے مخالفین بندہ کر باؤں کا وسیلہ سا جو ڈالتے ہوئے ہوئی۔ غار  
نہیں کیا کا؟“

”ماشاء اللہ بہت خوبصورت بہت پیارا۔“ میں نے جواب  
دیا۔ ”اور بے پناہ ذہین بھی معلوم ہوتا ہے۔“  
”تمہارے خیال میں کیا وہ غیر معمولی شخص نہیں ہے؟“

”ہر ماں کو اپنا بچہ غیر معمولی ہی لگتا ہے۔“ میں نے جواب  
دیا۔ ”وہ ماں جو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ایک ہاتھ سے اپنے ننگے جوتے  
تھپکی ننگ صاف کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ بیک کے لیے پھیلا رہی  
ہوئی ہے وہ بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس کا بچہ غیر معمولی ہے اس میں  
کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔“

”نہیں۔ میں ایک ماں کے نقطہٴ نظر سے نہیں پوچھ رہی۔ وہ  
نئی میں سرلاتے ہوئے تیزی سے بولے۔ ”میں تو تم سے پوچھ رہی  
ہوں۔ تمہیں وہ غیر معمولی لگا نہیں؟ تمہیں اس میں کوئی خاص  
بات محسوس ہوئی؟“ اس کے لیے میں ایک عجیب سا اصرار تھا۔  
میں ایک لمحے خاموش رہا۔ میں نے اپنے دل کو ٹیٹا اور آخر  
کار اعتراف کیا۔ ”ہاں۔۔۔ وہ ایک غیر معمولی شخص ہے۔ اس کی  
قصیدت میں بے پناہ کشش ہے۔“  
”خیم کے چرسے پر مشق کا پرتو تھا یا قوس قزح کی ریل ری تھی۔  
کچھ عجیب سے انداز میں دوک بنا تھا اس کا چہرہ۔ وہ اس وقت پیش  
سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔“

میں چند لمحے غور اس کی طرف دیکھا مگر میں نے کسی سانس  
لے کر پوچھا۔ ”تو یہ مری میں رہتا ہے؟“

”ہاں۔ اور سینئر کیپٹن کرتے ہی میں اسے سونڈر لینڈ بھیج  
دلاں گا۔ پڑھ لکھ کر یہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔ تمہاری طرح۔“ وہ  
خواب کا انداز میں مسکرائی۔  
”مجھے بھی آگئی۔“ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا۔“ یہ بھی گویا ہر  
ماں کا خواب تھا۔ ان چہ نظروں میں دنیا کی ان گنت ماؤں کی زندگی  
کی کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔  
”میں تو سونڈر لینڈ کا رہا ہوا نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔  
”مہلو۔۔۔ پڑھ لے گا تو اور بھی اچھے اوقات ہوں گے۔ اس کی



ہولی۔ ”یہ میں ذرا غماز کو دے آؤں۔“

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور مسکراتے ہوئے ہولی چھڑائی۔

ہولی۔ ”غماز نے بھی تمہیں پسند کیا ہے۔ کہہ رہا تھا اس شخص کوئی خاص بات ہے ضرور۔ میں نے اس سے کہا۔ ”بیٹا! اس ایک نہیں بہت سی خاص باتیں ہیں۔“ دیکھے تمہارے لیے اعزاز ہونا چاہیے کہ غماز نے تمہارے بارے میں اچھی رائے ہے۔ یہ تو ایسی عجیب شیزمی جسم کی جڑ ہے کہ اسے تو دنیا میں کوئی ہی نہیں آتا۔“

”اچھا! میں نے کہا تھا کہ اس کی طرف ذرا غماز کو دیکھ کر شاید وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ میری باتیں اچھے لگے پہلے اس پر جو فکر مندی طاری ہوئی تھی اسے بھی ہلکا لگتی تھی۔ اس کے چہرے کی دھند واپس آئی تھی۔“

غماز کی بات جاری رکھتے ہوئے ہولی۔ ”بہت اونچا بھی ہے۔ اس عمر میں ہی پورا بڑا ہوا لگتا ہے۔ بہت سی عجیب طویل کرکٹ ہے اس میں۔ راجو کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔“

ہولی۔ ”وہ بلور انسان تو مجھے زیادہ پسند نہیں۔ لیکن ان رشتہ بہت سخت تپتے ہیں۔ سو تیلے باپ کا بھی بھلا کوئی رشتہ کسی کو کسی کا سوتیلے باپ نہیں ہوتا چاہیے۔“ اس عمر میں عجیب و غریب باتیں کرتا ہے کہ عقل چکرا جاتی ہے۔ اپنے

میں یہ جینٹلمن مشورہ ہے۔“

ہولی۔ ”جینٹلمن وہ پیچھے ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کاغذ اڑا رہے تھے اس کو دیکھتے ہی ہو گیا تھا۔“

”اچھا! کیا واقعی تمہیں اندازہ ہو گیا تھا؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ بیٹے کے بارے میں کسی ماں کا اس قدر اچھا جذبات کا اس قدر امانت انداز کوئی تعجب کی بات نہیں۔

جس ماں کا بیٹا اس سے دور رہتا ہو اور کبھی کبھار گھر آنا کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے اس کی یہ شدت اس کا یوں

اصرار سے پوچھتا کہ عجیب لگ رہا تھا۔

ہولی۔ ”ہاں۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ وہ جیسے نالہ سی ہو گئی لیکن ایک لمحے کی خاموشی کے

ی اس قدر کی سے ہولی۔ ”اس کا ذہن اس کی عمر سے کہیں بڑا ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ بات ٹھیک ہی ہو جاتی ہے۔ جب راجو سے شادی کی تو یہ اتنا بھلا تھا کہ میں اسے

ی نہیں کہتی تھی۔ اگر یہ چھوڑ دیا جائے تو میں اس میں شہادتی کہ دی اس کا باپ ہے۔ لفظ ”سوتیلے“ اس میں چھائی کی طرح چھتا ہے۔“

”اس لحاظ سے تو یہ اچھی بات ہے کہ وہ اس گھر سے ہے۔“ میں نے کہا۔

شخصیت میں تم سے کچھ زیادہ غماز آجائے گی۔ شاید یہ تم سے بھی زیادہ بڑا آری ہے۔“ روشن خوابوں نے اس کے چہرے کے گرد ایک ہار سا بنایا ہوا تھا۔

”ہاں۔ یہ دعا کرو کہ یہ مجھ سے بھی زیادہ بڑا آری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو آج تک خود کو کبھی بڑا آری سمجھا ہی نہیں۔“

خصوصاً آجکل تو میں خود کو بہت سی چھوٹا آری محسوس کر رہا ہوں۔ کوئی دھکا دیتا ہے اور میرا کرتا ہوں۔ کوئی آنکھیں دکھاتا ہے تو دھکا

باد لگتا ہوں۔ کوئی میری بات پر شک کر رہا ہے۔ کوئی مجھے جھوٹا قرار دیتے پر کھڑا ہوا ہے۔ کیسے میرے بارے میں حقیقتیں ہو رہی ہیں۔

کیسے مجھ پر زین تنگ کر دینے کی تیار ماں ہو رہی ہیں۔“

”میں ان فراق کرتے ہو۔ کس میں جرات ہے کہ تمہیں دھکا دے یا تمہیں آنکھیں دکھائے۔ میں تمہاری طاقت کے مظاہرے

دیکھ چکا ہوں۔“ وہ ہولی۔

”طاقت کی بھی نہیں ہوتی ہیں۔ بعض جسم کی طاقتیں بعض جسم کی طاقتوں کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔“ میں نے کہا۔

اچانک اسے گویا یاد آیا۔ ”یہ تم ہے مگر ہونے اور پناہ لینے کی کیا بات کر رہے تھے؟ یہ کس جسم کا فراق تھا؟“

”مراق نہیں، حقیقت تھی۔“ میں نے کہا اور اس کے سامنے بھی ایک ایسا ہی رام کمانی دھرائی لیکن ریڈوان کا ذکر کوئی مولیٰ ہی

کیا۔ میں نے اسے ستارہ کی موت کے بارے میں بھی بتا دیا۔

اس کے چہرے کی دھند باندھ گئی۔ وہ متحوش سے لیجے میں ہولی۔ ”کیا واقعی یہ سب کچھ ہو چکا ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

تمہیں یقین ہے کہ یہ ان ہی اسرار لوگوں کی کارروائیاں ہیں جن کا تم ذکر کر رہے ہو؟ یہ تمہیں غماز رفیق کے آدمیوں کے کام تو نہیں

چاہیے؟“

اس کا ذہن غماز رفیق میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اس کے لیے وہی بہت خطرناک آری تھا۔ میں نے فٹی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”غماز رفیق خود زندہ ہوتا تو اس کی بھی اس جسم کی کاروائیوں کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس کی بیویاں چیل کوں کو کھلا دیتا۔

اس کے آری بے چارے اتنی جرات کہاں کر سکتے ہیں۔ بد معاشوں کے یہ ٹولے اپنے سر پرست کے بغیر جیم جیم سے ہو جاتے ہیں۔ جن

کامیں ذکر کر رہا ہوں یہ تو کچھ اور ہی طرح کے لوگ ہیں۔ ایک عالمی مخلوق ہیں۔“

”تمہارا کسی طرح ان سے کچھ نہیں چھوٹ سکتا؟“ اس نے ہمدردانہ لیجے میں پوچھا۔

”چھتا ہوتا تو میں بھی کی ہوں۔ لیکن مکمل مجھے نہیں چھوڑتا۔ جبکہ میں خود تو مکمل کے قریب بھی نہیں گیا تھا۔“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔

اس دوران ملازمہ نے کھانا لگا دیا اور دو لیٹین کا ایک گلاس بھی بنا کر لے آئی۔ عظیم خرد اس سے گلاس لے کر اٹھتے ہوئے

جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور ایک رخسار گویا کسی دیوار سے رگڑا کھایا ہوا تھا۔

تامرہ خامے پر سکون لے رہی تھی۔ "میرا ہمنے بلیک بڑ کو پکڑ لیا ہے۔ وہ قریب طاقتور ہے سربراہی شکل سے قابو میں آیا ہے۔"

"کہاں ہے؟" میں نے بے تالی سے پوچھا۔

"پچھلی گلی میں۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہم نے اسے ٹیلیفون کے کھمبے کے ساتھ باندھ دیا ہے لیکن وہ زیادہ دیر بندھا نہیں رہے گا۔ ہمارے پاس کوئی مقفل رستی نہیں تھی۔ ٹائیلوں کی تھوڑی سی زبردستی اسی سے باندھا ہے۔ ہر مال آفتاب اس پر گرنے لگا ہے۔ آپ چل کر دیکھ لیں اور بتا دیں اس کا کیا کرنا ہے۔"

"میں اس کا جملہ کھل ہونے سے پہلے ہی چل پڑا تھا۔ خیم میرے ساتھ تھی۔ وہ برآمدے کی بیڑیاں اترتے ہوئے بولی۔ میں پیچھے کا چھوٹا گیت کھل رہی ہوں۔ دیوار نہیں چھانسی پڑے گی۔"

"جس وہ کہاں نظر آیا تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ اس کو مٹی کے پچھلی طرف سے پائپ کے ذریعے اور چڑھ رہا تھا۔ وہاں بالکل اندر جڑا تھا۔ اتفاق سے ہی ہماری اس پر نظر پڑا۔" میں نے اس سے پوچھا۔ "وہ کونسا تھا؟"

"میرے دل میں امید کی کرن سی ابھری۔ شاید بلیک بڑی کے ذریعے دیکھ ڈالٹ کا کوئی سراغ مل جائے۔ شاید اسی لمحے کو کھینچے میں کچھ عدل پائے۔ جب کوئی میرا تعاقب کرنا کھائی نہیں دیتا تھا تو انہیں میرے ٹھکانے کا علم کیسے ہو جاتا تھا؟ کبھی بلیک بڑی تو اس کا ذریعہ نہیں تھا؟ کبھی اس میں شکاری کتوں جیسی۔! شاید ان سے بھی بڑھ کر کوئی حس تو موجود نہیں تھی کہ وہ ہوا میں میری بو سونگھ ہوا ٹھیک اس جگہ پہنچ جاتا تھا جہاں میں موجود ہوا تھا؟"

"خیم نے پچھلا گیت کھل دیا تھا۔ اچھوٹے ٹھکانے اندر میرے میں ایک طرف اشارہ کیا۔ خیم گیت پر ہی کھڑی رہی۔ میں اور اچھوٹے ہوئے ٹیلیفون کے کھمبے تک پہنچے لیکن وہاں بلیک بڑ کا ناہود نشان تک نہیں تھا۔ البتہ آفتاب گزرنے کے قریب ہی چاروں خانے چت پڑا تھا۔ گھر اسے دیکھ کر میرا دل ڈوب سا گیا۔"

اس طرح اچھوٹا ہوا تھا جیسے کسی درندے نے چاڑھا ہو۔ اس کی جیکٹ اور فیض کی دائیں آستین ایک ساتھ ہی کندھے پر سے الگ ہو چکی تھی اور کھائی پر پھنسی رہی تھی۔ اس بازو پر بھی اس طرح لپے اور مگرے ڈھم پڑے ہوئے تھے جیسے کسی درندے نے سڑک میں دوڑ کر جسم سے الگ کرنے کی کوشش کی ہو۔ بازو تو الگ نہیں ہو سکا تھا لیکن اس کوشش میں درندے کے دانت اس کے پورے

مجھے زرا حد الٹی کی تکلیف دہوتی ہے لیکن اس کا دہرا فائدہ ہے۔" میں کھانا کھا چکا تو وہ بولی۔ "تم یقیناً کھگے ہوئے ہو گے فوراً کھیت دوم میں جا کر سو جاؤ۔ میں تمہارے لیے کسی سیلینگ کاؤن دفعہ کا بندوبست کرتی ہوں جو تمہیں کم از کم کڑا سے کی حد تک لطف آئے۔"

"میں راجو کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کے انتظار میں تو میں ٹھکن ہے جس میں صبح ہی ہو جائے۔ ان کھیتوں میں مت پڑو اور جا کر سو جاؤ۔ وہ بہ قانچی ہوش و دواس تو اب تمہیں کل دیکھ کر ہی لے گا۔ اس سے اسی وقت ملنا مناسب رہے گا۔" وہ بولی۔

"مجھے اسی کا مشورہ مقول محسوس ہوا۔ ٹھکن واقعی مجھ پر تھاپ آ رہی تھی۔ حالانکہ مجھے نہیں صاحب کو بھی فون کرنا تھا لیکن میں نے یہ پروگرام بھی صبح پر ڈال دیا۔ ان سے بات ذرا اطمینان سے ہی ہوئی تھی۔ صبح اور اس شخص کو خوشگوار ہونے کا امکان بھی بڑھ کر ہی تھا۔"

"وہ کوئی الگ ٹھکن گیسٹ دوم نہیں بلکہ ان کے اپنے اور غار کے بڑے رومز کے قریب ہی ایک فاضل بیڈ روم تھا جو خیم نے مجھے دے دیا اور اچھا سا ایک صاف ستھرا کاؤن بھی لگا دیا۔ میں شاید بستر کرتے ہی سو گیا تھا۔"

"مجھے کچھ یوں لگا جیسے چند منٹ بھی سونا نہیں ہوا تھا۔ کوئی بری طرح دوا دواہ پیت رہا تھا۔ ذہن پر خودی کا غبار گھرا تھا لیکن میں تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ گھڑی عام طور پر سوتے میں بھی میری کھائی پر ہی بندھی رہتی تھی۔ ٹائٹ بلیک کی مدھم مدھنی میں بھی جھللاتے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ رات کے دو بجتے والے تھے۔ شیش ہنسل ٹکے کے نیچے سے نکالنے ہوئے میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کہاں ہے؟"

"مائی! جلدی دوا دواہ کھلو۔ میں ہوں خیم۔" گھبراہٹی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک کر دوا دواہ کھولا۔ خیم شب خواہی کے لباس میں سامنے کھڑی تھی۔ اس کے عتب میں چوکیدار کا نقل سنبھالے کھڑا تھا۔

"وہ تقریباً اپنے ہوئے بولی "وہ جو تمہارے دو توہی مکان کی گرائی کرتے ہیں نا۔ ان میں سے ایک اندر آیا ہے۔۔۔ مجھے کھڑا ہے۔ مجھے دیوار چھان کر آیا تھا۔ شکر ہے چوکیدار کی کھلی کانٹا نہ جتنے سے نکل گیا۔ خان تو اسے کوئی چور سمجھ کر گولی چلانے لگا تھا۔ وہ فوراً نہیں بلا رہا ہے۔ کوئی خاص بات ہے۔"

میں بیڑیاں جھلا نکھوایا ہوا پیچھے چوکیدار اور خیم میرے پیچھے تھے۔ پیچھے اچھوٹا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں تھی۔ خیم کے کمر کی گرائی اچھوٹا اور آفتاب کھتے تھے۔ رات کو وہ دونوں طرف کی گلیں میں پھر بھی لگاتے تھے۔ اچھوٹے پال کھرے ہوئے تھے۔

ہو گئی۔ عمار کرے میں نہیں تھا لیکن اس کے بستر کی چادر زیادہ بے ترتیب نہیں تھی اور سلیمہ دروازے پر پڑا ہونے سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ خود ہی اٹھ چکا تھا اور سلیمہ بن کر غالباً دروازے پر پہنچ چکا تھا جب اسے اٹھایا گیا۔

اٹھانے والا جو کوئی بھی تھا غالباً پہلے بھت پر پہنچا تھا اور وہاں سے شرس پر کودا تھا۔ میرے بیٹے روم کا دروازہ تو کھلا ہی تھا لیکن میں اسی وقت غالباً عمار بھی اپنے بیٹے روم کا دروازہ کھول کر باہر آنے لگا تھا۔

میں نے ملازمہ کو بھیجواڑتے ہوئے پوچھا۔ "کون لے گیا ہے عمار کو؟"

بھیجواڑنے سے وہ گریا قدرے ہوش میں آئی اور وحشت زدہ انداز میں بھلائی۔ "وہ کی... چا نہیں کیا بلا بھی... رچھ تھا... بن مانس تھا... چھوٹے پلو شاید شور کی وجہ سے اٹھ کر باہر آئے تھے... میں بھی نیچے سے آئی تھی... وہ جتنور میرے سامنے آ کر مجھے سے کود کر پھاں آیا... اور چھوٹے پلو کو بھل میں دبا کر... نیچے والا چھپا پڑ کر لان میں کود گیا اور وہاں سے گیت کھول کر گڑ گیا..."

احمر نے صرف اتنی ہی سنا اور اُلٹے قدموں بیڑھوں سے چل چلا دیا۔ سلیم کا چہرہ کھنکھانے لگا تھا۔ وہ دوہرا گئی تھی ہے انداز میں مجھے تھمتی ہوئی بیڑھوں کی طرف لے گئی اور کھنکھائی آواز میں بول۔ "تمہیں ہر حال میں عمار کو واپس لاؤ... ہر حال میں... سنایا تم نے؟"

## ابلیس مصر

☆ ---- الماس ایم۔ اے

اسلامی کمائیوں کا بہترین امتزاج واضح رہے کہ اس مجموعہ کی تین کمائیاں کو نہ صرف قرآن حکیم سے اخذ کیا ہے، بلکہ ان کے بیشتر مکالمے قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں۔

قیمت: 100/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

بازو کو چیرتے چلے گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی مسخ ہو چکا تھا اور آنکھیں مٹوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ٹائیلوں کی ڈوری کھبے کے قریب ہی پڑی تھی اور آفتاب کی گن کبیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

احمر کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ وہ بے اختیار زمین پر بیٹھ گیا اور آفتاب کا سراں نے گرد میں رکھ لیا۔ "اودہ خدا یا..." وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔ "یہ کیا ہو گیا... کاش میں یہاں سے نہ ہٹتا۔"

اس دوران چوکیدار بھی قریب آ گیا۔ اس نے تازہ سے آفتاب کی لاش پر روشنی ڈالی۔ اس کی خوفناک یکدم ناقابل برداشت مد تک نمایاں ہو گئی۔ تازہ خون اور گرد پھیلا ہوا تھا۔

"اودے... خانہ خراب کا بچہ...!" چوکیدار بے اختیار بڑبڑایا اور اس نے تازہ فوراً ہی بند کر دی۔

میرے دل کو چپے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ احمد سے یقیناً غلطی ہوئی تھی لیکن غلطی دانستہ نہیں تھی۔ اپنی دانستہ میں تو اس نے عقل سے ہی کام لیا تھا کہ فوراً مجھے بلانے پہنچ گیا تھا لیکن اس کا ذہن اس امکان کی طرف نہیں گیا تھا کہ بلیک بڑ کے ساتھ شاید کوئی اور بھی موجود ہو۔ شاید وہ آس پاس ہی یا کسی دور چھپا ہوا ہو۔ مجھے کچھ یقین سانسیں آ رہا تھا کہ شاید بڑ ٹائیلوں کی ڈوری کی بندش سے آزاد بھی ہو سکا تھا اور آفتاب کا یہ حشر بھی کر سکتا تھا جبکہ آفتاب اس پر کھنکھاتا تھا۔

میرا دل ابھی بچپتاوے اور دھکے کی اس دلدل میں ہی پھنسا ہوا تھا کہ بچپے کمر کی طرف سے ایک چیخ سنا دی۔ وہ باریک تو صم اور اوصوری سی چیخ تھی لیکن اس کے بعد ایک تیز رفتاری چیخ سنا دی۔ میں اور چوکیدار داہیں گیٹ کی طرف لپکے۔ احمد نے بھی آفتاب کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور ہمارے پیچھے آیا۔

سلیم جسے ہم گیٹ پر کھڑی چھوڑ آئے تھے اندرونی دروازے کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے پوچھا۔ "یہ چھپیں کس کی ہیں؟"

"ایک چیخ تو عمار کی معلوم ہوتی تھی... دوسری شاید ملازمہ کی تھی۔" وہ تڑکے بغیر بولی۔ وہ اس طرح بدحواس تھی جیسے اس کے پیروں تلے انگارے نیچے ہوں۔ اسی لیے بگولے کی طرح دوڑی جا رہی تھی۔ مجھ سے آگے رہتے ہوئے ہی اس نے بیٹے روم کی طرف جانے والی بیڑھیاں عبور کیں۔

اور چیخ کر میں نے دیکھا سلیم کی ملازمہ شرس پر بدحواس کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ نیچے لان کی طرف اشارہ کیے جا رہی تھی لیکن اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ نیچے لان پر کچھ نہیں تھا لیکن سامنے کا گیٹ تھوڑا سا کھلا نظر آ رہا تھا۔ اوپر عمار کے بیٹے روم کا دروازہ بھی کھلا نظر آ رہا تھا اور اس کا ایک سلیمہ دروازے میں پڑا تھا۔

میرے کمرے میں جھانکا اور میرے اندیشے کی تھمتی

”ہاں... میں جا رہا ہوں۔ تم میرا گریبان تو چھوڑ دو۔۔۔“ میں نے زہی سے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ اسی دھواگئی آہیز سے انداز میں گویا تکرار شروع کرتے ہوئے بولی۔ ”تیس ہر حال میں قہار کو واپس لانا ہو گا ورنہ میں زندہ نہیں رہوں گی۔۔۔ تیس ہر حال میں اسے لانا ہو گا۔ اس لیے کہ وہ اصل میں تمہارا ہی بیٹا ہے۔“

”کیا بیکار اس ہے۔۔۔“ مجھے یکدم جھٹکا سا لگا۔ ”میں نے تو ابھی ثلثی ہی نہیں کی۔ میرا بیٹا کہاں سے آیا؟“

”یہ کمائیاں کب ہرانے کا وقت نہیں ہے۔۔۔“ وہ بدستور چلتی چلتی ہی توازن میں بولی۔ ”ایک ماں سے بہتر کون یہ بات جان سکتا ہے کہ اس کے بچے کا باپ کون ہے؟ وہ تمہارا اپنا بیٹا ہے۔ جاؤ اسے واپس لاؤ۔“

پھر یکدم اس کی آواز چیخ میں تبدیل ہو گئی۔ ”جاؤ۔۔۔“ اس نے میرا گریبان چھوڑ کر مجھے دھککا دیا اور خود تورا کر کر پڑی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی!

میں نے شیم کو اس کے حال پر چھوڑا اور دوبارہ تیزی سے بیڑمیاں اترتا چلا گیا۔ پورچ میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر میں نے اسے اشارت کیا۔ اس دوران چوکیدار نے پچھلے سے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں نے اسے اس تیزی سے چلی میں نکالا کہ تازہ بڑی طرح چچا اٹھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ احمد اور آفتاب کی گاڑی اسی طرف کی گئی تھی مڑی ہوئی، اسی لیے احمد اس طرف آیا تھا۔ لیکن میرے گاڑی کا ہر لانے تک اس کا کیس نام و نشان نہیں تھا۔ وہ یقیناً کسی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن کس طرف؟ یہ اندازہ لگانا میرے لیے مشکل تھا۔

صرف ایک لمبے کی ہچکچاہٹ کے بعد میں نے قسمت پر بھروسہ کرتے ہوئے گاڑی گلی کے اسی سرے کی طرف بڑھادی جو مجھے سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس طرف ایک چھوٹا سا گراؤ تھا اور اس کے پار ایک چھوٹی سی ماڈلنگ تھی۔ جب میں شیم کے ہاں آیا تھا تو میں نے احمد کی گاڑی اسی طرف کھڑی دیکھی تھی۔

میں سو زہد کر کے گراؤ کے قریب سے گزرا ہی تھا کہ رینگ پر سگنل موصول ہوا۔ میں نے فٹن دبا کر خفیہ خانہ کھولا اور مالنگ نکالا۔ احمد نامیہ سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا ”گاڑی مجھے نظر آگئی ہے سر! وہ پینتیری یقیناً بچے کو لے کر اسی گاڑی میں کھاس ہے۔ ابھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ گاڑی میں کتنے آدمی ہیں۔“ گاڑی ایم ایم عالم روڈ پر مڑ گئی ہے اور میں بلبلارڈ کی طرف جا رہی ہے۔

”تم تعاقب جاری رکھو احمد!“ میں نے حتی الامکان پرسکون لہجے میں کہا ”میں آ رہا ہوں۔ گاڑی کسی قیمت پر نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے۔“

لاہور کے شہری  
انکسار صحت

کایٹ اسرار  
آرڈو پچر ناول

شہری

ہولناک اور پر اسرار ماحول میں  
جنم لینے والی ایک حقیقت  
جو کمانی بن گئی۔

ایک آشفستہ حال کی داستانِ عبرت جسے  
قانون نے مجسم بنا دیا۔

ناشر:  
مکتبہ الرشیدی

نویسنہ: سرتق اویدہ زریب  
کتابت و طباعت

قیمت: ۵۰ روپے

آرڈو بازار لاہور

۲۰۲۳۶۶۶۵

پر شائیں شائیں کرتی ہوئی رگڑ محسوس کر سکتا تھا۔

یہ فکری کارچرنگ نہیں تھی، ٹانگوں کی جڑے اہٹ مثالی نہیں دے رہی تھی۔ گاڑیاں ایک دوسرے سے رگڑ نہیں کھا رہی تھیں اور نہ ہی دوسری گاڑیوں سے بال بال بچتی ہوئی یا ان کے آگے نہیں ٹکرا جاتے کا سبب بنتی ہوئی گزری تھیں۔ یہ ایک نہایت خاص نوعیت کا تعاقب تھا لیکن نہ تو گویا ہمارے ساتھ پرواز کر رہی تھی، ہمارے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

فکری کارچرنگ میں کاریں قلابازیاں کھا جاتی ہیں، ان کے بعض حصے ٹوٹ کر دور جا گرتے ہیں لیکن کار سوار صرف مٹی میں تھرنے اپنی چوٹیوں سے سلاتے باہر آ جاتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے معلوم تھا اس رفتار پر اندازے کی ایک ذرا سی غلطی گاڑی کو چٹکا چور کر سکتی تھی اور کار سوار کو لمحوں میں تبدیل کر سکتی تھی۔ گاڑی کے کٹارے بدل میں الگ ہو کر دور جا گرتے ہیں، اس سے پہلے گاڑی میں موجود شخص کی ہڈیاں نہ جاتے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہوتی ہیں۔

احمد اور اس کی گاڑی دونوں ہی نے کمال کر لیا تھا۔ وہ گاڑی کے کافی قریب پہنچ چکا تھا اور اس کی ہڈیاں ٹانگوں سے ٹکرائیں اس حد تک ضرور اس پر پڑ چکی تھیں کہ میں نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ سرسری رنگ کی کینڈلک ہی تھی، اس کی نمبر پلاٹ بھی لاہور ہی کی تھی۔

اس رفتار پر دیکھ کر احمد سے بات جاری رکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے ٹانگے کندھے اور گردن کے درمیان دبا رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ احمد کی گاڑی کینڈلک سے آگے نہیں نکل سکتی تھی اس کا کیا کارنامہ کچھ کم نہیں تھا کہ وہ بعد میں روانہ ہو کر اس کے قریب آن پہنچا تھا اور اب اسے آگے نہیں نکلنے دے رہا تھا۔ میں نے ٹانگے پر احمد سے کہا "میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں تم پیچھے ہی رہنا اس طرح اسے دونوں طرف سے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سر!" احمد کی کھٹی کھٹی سی آواز سنائی دی۔ ابھی میں نے گاڑی کو ذرا سا نیچے پر لانے کے لیے اسٹیرنگ ویل کو بال برابر حرکت دی تھی کہ سرسری کینڈلک کی کھڑکی سے آؤٹ کی طرح ایک گمن کی ٹال آتی تھی، وہ سرسری لکھے رات کے سکوت میں ہوئی شائیں شائیں گویا چٹخوں میں تبدیل ہو گئی۔ وہ گولیوں کی جڑے اہٹ تھی جس نے سکوت کا چاک چاک کر دیا تھا۔ احمد کی گاڑی پر سب مشین گمن سے برست لگ رہی تھیں۔

اس رفتار پر گاڑی کو لہرانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا اسٹیرنگ ویل پر اندازے کی ذرا سی غلطی گاڑی کو کہیں سے لے جا سکتی تھی۔ لیکن احمد نے کمال مہارت سے گاڑی کو لہرانا اس کے باوجود میں نے شیشے ٹوٹنے کا چھٹکا نہ کیا۔ اس کی گاڑی

میں اگر زندہ رہا تو نظریے اوچھل نہیں ہوگی سر! وہ بلا۔ بلاشبہ حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ ایم ایم عالم روڈ تک پہنچ چکے تھے احمد مجھ سے ایک آدھ منٹ پہلے ہی روانہ ہوا تھا۔ مجھے ایک آدھ منٹ کے لیے شیشے نے الجھا لیا تھا۔ میں ابھی غالب مارکیٹ والے موڑ پر بھی نہیں پہنچا تھا۔ اس سے ان دونوں گاڑیوں کی رفتار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی۔ گاڑی ایک طیارے کے سے انداز میں آگے بڑھی۔ مل تو اس وقت بھی چاہ رہا تھا کہ وہ گاڑی نہیں پرواز کرنے والی ہی کوئی چیز ہوتی اور میں چشم زدن میں اس گاڑی تک جا پہنچا جس کے بارے میں احمد نے اطلاع دی تھی۔

مشکل یہ تھی کہ جن سڑکوں سے میں گزر رہا تھا وہ بہت چھوٹی تھیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد موڑ تھے جن کی وجہ سے میں اپنی گاڑی سے صحیح کام نہیں لے سکتا تھا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تمام کر لیا ہی ایک بے ہودہ ساموڑ کاٹنے ہوئے میں نے احمد سے پوچھا "گاڑی کا نمبر سناشت اور رنگ وغیرہ؟" "فاصلہ کافی ہے۔۔۔ ابھی میں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ لیکن گاڑی بہر حال کینڈلک ہے اور رنگ سیاہ معلوم ہوتا ہے۔" احمد نے جواب دیا۔

احمد بڑی ٹوٹا میں تھا لیکن ٹوٹا اور کینڈلک کا بہر حال کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ تاہم مجھے امید تھی کہ احمد اسے نکلے نہیں دے گا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ کینڈلک دبا لے کھلی سڑکوں کا رخ کریں گے۔ ٹک گھبراؤں اور چھوٹی سڑکوں پر انہیں بھی وہی مسابک پیش آسکتے تھے جو مجھ سے دوڑیں تھے۔ زیادہ چھوٹی گلیوں میں بڑی گاڑیاں زحمت معلوم ہوتی ہیں۔

"وہ میں جلیانڈ پر لہری کی طرف مڑ گئے ہیں سر!" احمد نے اطلاع دی۔ میں اب ایم ایم عالم روڈ پر مڑ چکا تھا۔ سڑک اب خاصی کشادہ تھی۔ میں نے رفتار کچھ اور بڑھائی تو گاڑی ہوا سے ہانسیں کرنے لگی۔ ابھی صبح صادق کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ سڑک پر ٹریفک نہیں تھی۔ چند ہی گھنٹوں میں میں بھی میں جلیانڈ پر جا پہنچا لیکن وہ اب بھی میری نظری کی رفتار میں نہیں آئے تاہم احمد اپنی اور ان کی پوزیشن کے بارے میں مسلسل اطلاع دینے جا رہا تھا۔

ماڈل ٹائون والا راؤنڈ اپاؤٹ کراس کرنے کے بعد وہ سرخ پتیاں میری نظر میں آئیں، جو ایک دوسرے کے آگے پیچھے بھی ذرا دائیں اور بھی بائیں طرف کو لہرا رہی تھیں۔ آگے والی سرخ پتیاں جو پتیاں کینڈلک کی ٹیل لائٹس تھیں گویا ہوا میں تھر رہی تھیں۔ احمد کی سفید ٹوٹا اب مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی لیکن جس رفتار سے میری گاڑی جاری تھی اس میں مجھے سڑک کے دونوں طرف کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میرے دانت پر دانت جے ہوئے تھے۔ میں گاڑی کے بند شیشوں

میں تمام رات آرام نہ ہو سکی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ زندہ تھا۔ یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ پیش کہاں کا نوا تھا۔

احمد کی گاڑی کے ساتھ ہی میں نے بھی گاڑی کو لرایا تھا۔ لیکن میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میرے خیال میں وہی حالت ان سے آگے نکلنے کے لیے مناسب ترین تھے جب ان کا عرف احمد کی گاڑی بنی اور ان کی تمام تر قوت اسی طرف تھی۔ میری گاڑی مکمل طور پر ہلک پروف تھی اس کے باوجود میں اس عالم میں ان کے قریب سے گزرتا نہیں چاہتا تھا کہ وہ عین میری گاڑی کو ٹک کر اس پر برست راستہ۔ وہ میرا حال مشین مکن تھی، اتنے قریب سے پورا برست مارے جانے پر شیشوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا البتہ یونہی اٹھتی ہوئی وہ چار گزلیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

لیکن میں گاڑی ان سے آگے نکالنے کے لیے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں احمد کی گاڑی کو اور ایک کرچکا تھا اور کینڈلک کو اور ایک کرنے ہی والا تھا کہ وہ چری طرح لہرائی۔ شاید وہ کوشش کر رہے تھے کہ مجھے آگے نکلنے کے لیے راستہ نہ دیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس دور ان دوسرا برست بھی نہیں مارا گیا تھا۔ مالا کہ گئی کی ٹال کھڑی کے باہری تھی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ کینڈلک کے لہرانے میں شاید اس کے ڈرائیور کے ارادے کو دخل نہیں تھا کیونکہ اس کے بریک برقی طرح چرچرائے تھے۔ ہاتھوں نے اس طرح سڑک پر رگڑ لگائی کہ بیٹلا ٹنسن کی روشنی میں دھوئیں کا گھیرا فضا میں بلند ہوئی اور کھائی دیں۔ اگر میں نے بوقت اپنی گاڑی کو کنٹرول نہ کیا ہوتا تو وہ کینڈلک پر چڑھ گئی ہوتی، بہت برا ایکسپنٹ ہوتا اور شاید ہم سب کی زندگیوں کا افسانہ وہیں ختم ہو جاتا۔

کینڈلک خاصی دور تک برقی طرح لہرا کر آخر کار تپتے میں اتر گئی اور ایک قلابازی بھی کھائی۔ کینڈلک کا قلابازی کھانا آسان نہیں تھا لیکن مکی زمین میں ایسے لیے چڑے گڑھے موجود تھے کہ اس صورت حال میں کینڈلک ایک قوبہ نہیں بنی قلابازیاں بھی کھاسکتی تھیں۔

میں نے گاڑی سڑک کے کنارے چھوڑ دے ہوئے اچھن بند کیے اور باہر چلا گیا۔ مشین بائیں طرف سے ہاتھ میں تھا اور میری کوشش تھی کہ کینڈلک والوں کے سنبھلنے سے پہلے ان کے سر پر ہاتھ پڑا لیکن میری یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ میں اندھا حاضری خراب میں چلا گیا۔ وہی لگا تھا کہ سب مشین مکن کا برست آیا۔ ایک بار پھر قسمت نے ہی میرا ساتھ دیا تھا کہ میں کسی گولی کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ شاید کینڈلک کے اٹھنے کی وجہ سے سب مشین استعمال کرنے والے کے حواس کچھ ٹھکانے نہیں تھے۔ گولیاں میرے سر سے ذرا اونچی ہی گزری تھیں۔

میں فوراً پیچھے گھوم گیا اور دیکھنے کے بل گاڑی کی اوٹ میں لیٹ گیا۔ میں نے احمد کو دیکھنے کے لیے سر کھینچا اور بچا کر کے گاڑی کے

|                      |                        |
|----------------------|------------------------|
| امریکہ سے امریکہ     | طارق اسٹیل سار - 150/- |
| صوبیت اور عالم اسلام | طارق اسٹیل سار - 125/- |
| کورٹ مارشل           | طارق اسٹیل سار - 200/- |
| آخری گناہ کی سہل     | طارق اسٹیل سار - 150/- |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

بچے سے بھاگا۔ احمد کی گاڑی کچھ دور پیچھے موجود تھی اس کی ہیڈ لائٹس بھی آن تھیں لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ احمد کہاں تھا اور کیا تدبیر کر رہا تھا۔

کینڈلک کی ہیڈ لائٹس مجھ پہلی تھیں لیکن میری اور احمد کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہونے کی وجہ سے دیرانے کے کچھ حصے میں روشنی موجود تھی۔ میں نے قمار کی چٹی کٹی اور میرے دل میں جیسے کسی نے خنجر کی نوک چھو دی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کینڈلک کے عقب سے اسی بد بخت بلیک بڑ کا بھیاک سا پولا نمودار ہوتے دیکھا۔

اس نے ایک بازو سے قمار کو بغل میں دیا ہوا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی طاقتور مگن تھی۔ اس نے اندھا حاضری میری گاڑی کی طرف فائر کیا۔ ایک آدھ گولی شاید میری گاڑی کی چھت سے ٹکرائی ہوئی گزری۔ وہ اس کا نتیجہ دیکھے بغیر دوسری طرف بھاگا میں اس کا مقصد سمجھ گیا۔

وہ چاہ رہا تھا کہ اس کے ساتھی ہمیں الجھائے رکھیں اور وہ قمار کو لے کر اندھیرے میں دیرانے کی طرف کیس نکل جائے۔ قمار اس کی بغل میں برقی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مجھے تمام تر غدشات اور خطرات کے باوجود یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہشت سے بھی مقلوب نہیں تھا۔ وہ بری کوشش کر رہا تھا کہ چیچنیری کے قمار میں نہ رہے لیکن اس جسم اور طاقتور چیچنیری نے اسے گڑے کی طرح بغل میں دبا رکھا تھا۔

قمار جس انداز میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اس کی وجہ سے میرا بلیک بڑ پر گولی چلانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن جو بھی وہ ذرا میری سیوہ میں تھا میں نے اس کی بھول سی مانگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ وہ بری طرح متحرک تھا لیکن گولی اس کی ٹانگ میں لگ ہی گئی۔ وہ بری طرح لڑکھایا۔

عمار کے ہاتھ میں شاید کوئی چیز تھی۔ اسی لئے میں نے اسے اس طرح ہاتھ چلاتے دیکھا جیسے وہ خنجر سے ایک بڑی آنکھ پر وار کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی کوشش شاید کامیاب ہو گئی۔ گو کہ وہ خنجر تو یقیناً نہیں تھا لیکن اس وقت خنجر سے زیادہ کار آمد رہا تھا۔ ٹانگ پر میرے ہاتھ کی گولی، لگنے سے تو ٹانگ بڑا صرف لڑکھڑایا تھا۔ مگر عمار نے اس کی آنکھ پر جو وار کیا تھا اس پر اس کے طلق سے ایک بھیانک جھج جھج جوا آسانی اور حیوانی چیخ کا ایک عجیب و غریب مرکب تھی۔ اس نے عمار کو چھوڑا مگر اس کے سر پر اپنی گولہ کے دھتے سے وار کرنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ میں نے ایک بار پھر غار کیا۔ مگر اس کے ہاتھ سے نہ جانے کہاں جا گری۔ وہ عمار کو دھیں چھوڑ کر اپنی نظر ڈاٹ کے باؤنڈو اتنی تیزی سے غلطی روشنی کی حدود سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہوا کہ ایک بار پھر مجھے اس کو زندہ پکڑنے یا ہلاک کرنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

مجھے سخت پچھتاوا محسوس ہوا۔ ایک ٹانے کے لیے وہ بالکل صاف طور پر میرے ہار گھٹ پر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا اس کے ہاتھ سے گولہ نکالنے کے لیے غار کرنے کے بجائے عقب سے اس کے جسم میں گولیاں اندر سکاتا لیکن میں نے وہ موقع گنوا دیا تھا۔ یہ سب کچھ صرف تین یا چار سیکنڈ میں ہوا تھا۔

اس دوران سب مشین گولہ والے کو میری پوزیشن کا اندازہ ہو گیا اور اس نے ایک برست اور مارا۔ سڑک سے کچھ پتھر اڑے۔ مجھے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔ اب مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ سب مشین گولہ والا کینڈل کی ڈنکی کی طرف تھا۔

لیکن اسی لمحے عمار نے ایک خطرناک غلطی کی۔ آخر پتہ ہی تھا۔ اس نے جتنی جرات اور ہوش مندی کا مظاہرہ کیا تھا وہی ناقابل یقین تھا۔ اس کی عمر کا کوئی اور پتہ ہوتا تو شاید ان حالات میں خوف کے مارے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر پاتا۔ وہ کینڈل سے کافی فاصلے پر تھا، چاہتا تو اندھیرا دھڑکی بھی طرف بھاگ پڑتا اور اندھیرے میں پہنچ جاتا۔ اندھیرے میں وہ زیادہ محفوظ رہتا اور صورت حال واضح ہونے پر سامنے آ جاتا یا کسی اور طرف بھاگتا۔ وہ دور نکلنے کی کوشش کرتا لیکن ظاہر ہے وہ کوئی پیشہ دریا ماہر جنگجو نہیں تھا۔

بلیک بڑے سے نہایت پاتے ہی وہ یکدم میری گاڑی کی طرف آنے کے لیے دوڑ پڑا۔ اس کے لیے اس نے کینڈل سے دور رہنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ لیکن شاید قدرت جو کر رہی تھی بہتر ہی کر رہی تھی۔ اس صورت میں ممکن تھا کہ سب مشین گولہ والا اسے ہاتھ سے نکلے دیکھ کر برست مار دیتا لیکن اب اس نے عمار کو قریب سے گزرتے دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی کوشش کی۔ عمار اب غالباً کسی کے قابو میں آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پھرانے کی کوشش کے دوران لات بھی چلائی۔ سب مشین گولہ بھی غاص، ہماری ہوئی ہے۔ وہ شخص اب

یقیناً ایک ہاتھ سے گولہ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے عمار کو گھیر رہا تھا۔ اس کو شش پش وہ ایک لمحے کے لیے گاڑی کی اوٹ سے اڑا نکل آیا۔ وہ لمحہ ایسا تھا کہ عمار بھی زور نہیں تھا اور یہ صرف اس لیے ممکن ہوا تھا کہ میں جگہ بدل چکا تھا۔ میں نے اس منبرے موقع سے فائدہ اٹھانے میں تاخیر نہیں کی اور میرے ہاتھ کی گولی اسی لمحے اس کا پیچھا چلت گئی۔ وہ شخص اچھل کر گاڑی کے پیچھے گھس کر گیا اور سب مشین گولہ بھی ڈکی کے اوپر سے پھسل گیا ہاتھ کے قریب آگئی۔

لیکن اس شخص کے کرنے کے ساتھ عمار بھی بڑی طرح لڑکھڑایا گیا اور گاڑی کے عقب میں گر پڑا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی گھٹنی ٹھٹھی سی آواز سنی۔ میں سمجھا اسے چوٹ لگ گئی ہے۔ میں نے صرف اعتنا ٹاٹا ایک لمحے توقف کیا تاہم وہ شاید میری اپنی گاڑی کے عقب سے نکل کر اس کی طرف روانہ ہو چکا ہوگا۔

وہ ایک لمحے کی تاخیر میرے لیے بڑی کار آمد رہی۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ گاڑی کے عقب میں شاید اب کوئی دوسرا شخص موجود نہیں، ورنہ وہ بھی ضرور کوئی کارروائی کرنا اپنی سوچوں کی کاپی دیتا۔ میرا خیال تھا کہ اگر کوئی ہو گا بھی تو شاید وہ گاڑی کے اندر ہوگا اور غالباً کسی چوٹ وغیرہ کی وجہ سے بے ہوش ہو چکا ہوگا۔ کم از کم کسی متحرک شخص کی سوچوں کی کھینچ کوئی آثار نہیں تھے۔

لیکن وہاں نہ صرف ایک غیبیٹ موجود تھا بلکہ اس کے پاس ریوالتور یا ہاتھ بھی تھا۔ وہ بہت ہی جھل سے گھات لگائے بغیر اور غالباً کسی بہت ہی کار آمد لمحے کا شکار تھا۔ عمار لڑکھڑا کر گاڑی کے پیچھے گرا تو اس شخص کو وہ لمحہ میسر آیا۔ عمار دوبارہ مجھے دکھلا دیا تو اس عالم میں تھا کہ عقب سے اس کی گردن اس شخص نے اپنے کے گھٹنے میں بالکل اسی طرح دبوچی ہوئی تھی جس طرح میں اپنے شکار کی گردن دبوچتا تھا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے عمار کی پٹینی پر گم کی تال رنگی ہوئی تھی۔ مزید چلائی اس نے یہ کی تھی کہ عمار کو بالکل گاڑی کے ساتھ چپکا دیا تھا یعنی اپنے اور گاڑی کے درمیان سینڈوچ بنا دیا تاکہ وہ ہاتھ پاؤں نہ مار سکے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکھڑاؤ پھر تھلا تھا۔ اس نے اسے اچھی طرح قابو میں کیا تھا۔ وہ خود عمار کا آڑھے ہوئے تھا۔

رات کے سائے میں اس کی ہماری اور گھوڑی آواز گولی ٹھیک ہے دوستو! اب گولہ پھینک کر دوڑوں ہاتھ اداں اٹھا کر آرام سے سائے آجائے۔ میں صرف تین تک گولوں کا، اس کے بعد گولہ لڑکے کی گھوڑی سے گزر جائے گی۔ ایک۔ دو۔

اس نے خاصی تیزی سے گنا شروع کیا تھا۔ میں نے شاید ہاتھ سانے سڑک پر اس طرح پھینکا کہ وہ دیکھ سکے اس نے مجھے سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں دیا تھا اور اس کا لہجہ تاہم غار وہ عمار کو گولی مارنے میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی ہچکچاہٹ محسوس

نہیں کرے گا بلکہ شاید وہ مار دینا چاہتا ہو لیکن پھر اس نے اسے چارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے مجھے اور احمد کو کہیں گا ہوں سے ٹالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایک بچہ تھا جس میں اسے جینے کے قوی امکانات نظر آتے ہوں گے۔

میں دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے آگیا جہاں روشنی ذرا زیادہ تھی۔ وہ ضلیع انداز میں چلا یا ”دوسرا کہاں ہے؟ اسے بھی کو باہر آئے۔“

”دوسرا کون؟“ میں نے نری سے پوچھا۔  
وہ ایک گندی سے کالی دیتے ہوئے بولا ”اسے بھولے چوزے مت بنو۔ میں سفید گاڑی والے کی بات کر رہا ہوں۔“

کالی ایک انگارے کی طرح میری سماعت کو مجموع کرتی چلی گئی لیکن میں نے اسے ٹھہرے ٹھہرے لمحے میں کہا ”اس کا مجھے پتا نہیں۔ وہ شاید برست ٹکٹے سے زخمی ہو گیا ہے شاید گاڑی میں ہی زخمی یا بے ہوش پڑا ہو۔“ میں نے اسے اتارتے نہیں دیکھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے گویا الجھن میں پڑ گیا پھر بولا ”سفید گاڑی کی طرف ٹھہر گم کا کارڈر تو ام سے گاڑی تک جاؤ۔ بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ بھاگے تو لڑکے کو گولی مار دوں گا۔ گاڑی کا ادھر والا دروازہ کھولا اور اگر تھمرا سا سناں اور سوچو رہے تو اسے کھینچ کر باہر نکالو۔ اگر نہیں ہے تو جہاں بھی ہے اسے بلاؤ۔ اگر وہ گمن پینک کر سامنے آ گیا تو لڑکے کو قتل سمجھا۔“

میں نے پہلے قدم اٹھانا گاڑی تک پہنچا اور وہ دروازہ کھول کر میں نے اندر جھانکا۔ مجھے اپنے دل میں طمانیت کی ایک لہر اُٹھتی محسوس ہوئی۔ احمد گاڑی میں نہیں تھا۔ وہ اگر گاڑی میں یا اس پاس کہیں نہیں تھا تو پھر کسی ایسی جگہ پر ہی تھا جہاں اس کا ہونا بہت نادر و غایت ہوتے والا تھا۔ اگر وہ ابھی تک اپنا پھٹنے کے لیے ٹھہرا نہیں ہوا تھا تو مجھے معاملے کو کچھ دیر کے لیے اور لٹکانے کی ضرورت تھی۔

میں نے اپنے لمحے میں تائید پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”یہ تو زخمی پڑا ہے۔ خون بہت بہہ گیا ہے کہیں مر نہ گیا ہو۔“ میں دروازے کے سامنے ہی سیدھا کھڑا ہو گیا۔

وہ بے تابی سے چلا یا ”تو پھر وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو سو رو کر بچے نہیں لے گا تھا اسے گھبت کر باہر نکالو۔“

”تو دوسرے نہیں نکلتے گا۔ وہ لڑکے کے اسٹیپر تک واصل کے لیے بھٹس گیا ہے۔ دوسری طرف چلا جاؤں؟ اگر دوسرے دروازے سے نکلتے گا۔“ میں نے سعادت مندی سے اجازت طلب کی۔

”جلدی کھڑکے کی زندگی عزیز ہے تو چالاکی مت دکھانا اور ایسا۔“ وہ نہ جانے کیا کہنے کا تھا۔ ”مگر“ اس کی آواز کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ میں نے آہستگی سے مڑ کر دیکھا۔ کیڑ لک کے عقب سے اس کا بیلا غائب ہو چکا تھا۔ صرف عمار گاڑی کی چھت پر

دونوں بازو اور سر نکالے اس بری طرح ہانپ رہا تھا کہ میں اسے قاتل سے بھی اس کی آواز سن سکتا تھا۔

پھر گاڑی کے عقب سے احمد کا سر نمودار ہوا اور وہ یہ آواز بلند بولا ”کھیل کھیل تم ہو گیا سرا آجائے۔“

میں تیزی سے دوڑ کر کیڑ لک کے عقب میں پہنچا اور سب سے پہلے میں نے بے تابی سے عمار کو گود میں اٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں ٹھول کر دیکھے۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا صرف اس کے چہرے پر دو زخم خراشیں دکھائی دے رہی تھیں اور وہ گردن سلاتے ہوئے ذرا کھانسی رہا تھا۔ وہ مشتاقانہ لمحے میں گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا ”آپ پریشان نہ ہوں چودری اٹھل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ میں نے بے اختیار کہا۔ لفظ ”اٹھل“ گویا ایک سولہ نشان کی طرح میری نظروں کے سامنے جمولنے لگا۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ میرا بیٹا تھا۔ ابھی میرے ذہن میں اس انکشاف سے چلنے والی آندھیاں نہیں تھکی تھیں۔ لیکن نسبت تھا کہ ابھی مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

جس شخص نے چند لمحے پہلے عمار کو گود چا ہوا تھا وہ چادوں خانے جت نامہ اور زمین پر پڑا تھا اور احمد اس کے پلو سے اپنا خنجر نکال کر اسی کے کپڑوں سے صاف کر رہا تھا۔ وہ بہت بمیاک سی ساخت کا خنجر تھا۔ انسان کے جسم میں اتارنے کے بعد وہاں باہر کھینچا جاتا تھا تو جسم کو ڈھیرنا ہوا باہر آتا تھا۔

”شکر ہے تم نے گاڑی سے اتر کر میرے ساتھ ہی سوچ رہی کی کی کوشش نہیں کی۔“ میں نے احمد سے کہا۔

وہ خنجر کو بہت اچھی طرح صاف کر کے ٹانگ سے بندھی بنام میں رکھتے ہوئے بولا ”آپ کا ی تو بتایا ہوا اصول ہے کہ جب تو صحت مند ہو تو صحت مند رہو۔“

میں نے عمار کو گود سے اتارتے ہوئے کہا ”قدرت نے ہماری بڑی مدد کی۔ اگر یہ گاڑی قابو سے باہر نہ ہوتی تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ سب مشین سے فائدہ تک جاری رہتی تو ہم تقاب جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔“

عمار کھٹک کر گھگھاسا صاف کرتے ہوئے ابھی ہی کھانسی کے ساتھ بولا ”قدرت نے مجھے وہ تدبیر بھائی تھی جس کی وجہ سے گاڑی قابو سے باہر ہوئی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

عمار بولا ”میں نے اس رفتار سے چلتی گاڑی میں پوری طاقت سے بریک پر پاؤں مارا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا تھا ”اٹو کے پھو! میں تو مر رہا لیکن ساتھ تم سب کو لے کر۔“

میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا ”تم اگلی سیٹ پر تھے؟“

”جی ہاں۔ وہ بین بانس کا پتہ جب مجھے گھر سے اٹھا کر بھاگا تو



ایک بچے کو پتہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ میری معلومات اور اندازوں کے مطابق اسے کسی قسم کے انسانک حالات سے بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ تو پھر اس میں یہ سنجیدگی؟ یہ حساسیت؟ یہ بزرگی کہاں سے آگئی تھی؟

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے ہوئے گویا مجھے خیالات کی دنیا سے باہر لاتے ہوئے ہوں "اٹکل! آپ مجھے بتائیں نا... آخر یہ کیا پکڑتا ہے؟ یہ کون لوگ تھے؟ کیوں مجھے اٹھا کر لے جا رہے تھے؟"

"یہ تو ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں بیٹا! میں نے اس کا کمال تجھ بتاتے ہوئے کہا۔

"خیر مجھے کچھ اندازہ تو ہو گیا ہے۔" وہ تھپی انداز میں سر ہلاتے ہوئے ہوا "یہ لوگ یقیناً مجھے تانوں کے لیے انوا کر رہے ہوں گے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ میری کمی مجھ سے بہت بڑا رکرتی ہیں اور چاہے ان کے پاس رقم ہو یا نہ ہو لیکن میری خاطر وہ بڑی سے بڑی رقم کا انتظام کر کے دے دیں گی۔ چاہے انہیں اپنی ہر چیز کی کیل نہ بچنی پڑے۔"

پھر وہ کندھے اُچکا کر ہوا "خیر... یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔ ہر بچے کی نما اس سے اتنی ہی بڑا کرتی ہے۔"

وہ صرف اس کا ذکر کر رہا تھا باپ کا نہیں۔ باپ کا پیار شاید اسے ملا ہی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ بظلم میں چھپاتے ہوئے ہوا "لیکن کمال ہے! انوا کرنے والوں نے اب جانوروں کو بھی ٹرین کرنا شروع کر دیا۔ اتنا سمجھ دار چیچیری تو میں نے ظلموں میں بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے یقیناً اسے اس وقت سے ہی ٹرین کرنا شروع کیا ہو گا جب وہ بہت چھوٹا ہو گا۔"

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر ہوا "کاش ایسا ایک چھوٹا سا چیچیری مجھے بھی مل سکتا میں اسے بہت شاندار ٹریننگ دیتا۔"

اس کی یہ بات سن کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ مجھے اس میں اس کی عمر کے لڑکے کی بچی سی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر کہا "بیٹا! تم نے تو مجھے باتوں میں الجھا لیا۔ میرا دل چاہتا ہے تمہاری باتیں سننا ہی جاؤں لیکن یہ موقع باتیں کرنے کا تو نہیں ہے نا۔"

میں اور احمد جھٹک کر قریب سے ذرا اچھی طرح ان دونوں آدمیوں کا جائزہ لینے لگے جو ہمارے ہاتھوں میں پکڑے تھے۔ دونوں ہی وہی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں لمبے رنگے اور مضبوط جسم کے تھے۔ جو احمد کے ہاتھوں تجربے ہلاک ہوا تھا اس کی عمر میں کے قریب تھی۔ اس کے چہرے پر گھٹی داڑھی تھی۔ اس کے بال بھی لمبے تھے اور گھونگھریالے تھے۔

دوسرا جو سب مشین مکن سے فائرنگ کر رہا تھا چالیں سے اوپر کا تھا۔ اس کی صرف گھٹی موچیں تھیں۔ وہ جیٹریکٹ تھا جبکہ دوسرا جو کم عمر اور داڑھی والا تھا عمدہ قسم کی شلوار تھیں اور دواکت میں تھا۔

باہر آکر جلدی سے اس گاڑی میں ڈرائیور کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ "وہ بتائے لگا پھر اس نے پاؤں سے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو چند لمحوں پہلے اس کی کپڑی پر دیوار اور رکے ہوئے تھا "یہ تو ہی ڈرائیورنگ کر رہا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ذہن و است ذرائع تھا۔ ورنہ جس طرح اچانک میں نے بریک پر پاؤں مارا تھا ہمارا نہ جانے کیا مشر ہو نا۔"

وہ سمجھ بھری سی لے کر بات جاری رکھتے ہوئے ہوا "چیچیری مجھے دوسرے چیچیریٹ پر بیٹھا تھا لیکن میری تانیں آزاد تھیں۔ کچی بات ہے شروع شروع میں تو میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا لیکن جب میرے حواس ٹھکانے آئے اور مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے تب میں نے سوچا کہ اپنی سی بگم نہ کچھ کوشش کرنی چاہیے۔ وہ اتنا ٹھیک بڑی مکن والا تو ہی پچھلی سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔"

"تم نے جو کچھ کر لیا وہی بہت ہے۔ تمہارا ایک بہت بڑا کمال ہے کہ تم نے اپنے آپ کو بلیک بڑو... میرا مطلب ہے اس چیچیریٹ سے بچا لیا۔ میں تمہارے تعاقب میں انہیں سکتا تھا۔ کچھ میرے راستے میں سب مشین مکن مائل تھی جو گولیاں اٹھ کر رہی تھی۔ اگر چیچیریٹ نہیں لے کر نکل جاتا تو میں تمہاری ماں کو گولی دیکھانے کے قائل نہ رہتا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تم نے اس کی آنکھ میں کیا مارا تھا؟"

"انہی لنگ کی چابیوں۔" اس نے چابیوں کا ایک گچھا اٹھ میں بلند کرتے ہوئے مجھے دکھایا "جب گاڑی قلابازی کھا رہی تھی تو میں نے چابیوں نکال لی تھیں۔ میرے سوا شاید سب بولکلا گئے تھے۔ میں چیچیریٹ کی گود میں بالکل ستر گیا تھا تاکہ چوٹ لگے تو اسی منٹوں کو گئے۔" اور یہی ہوا اٹنا ہونے کے بعد اس کا سر ٹپ کے گولے کی طرح ڈیش بورڈ سے لگرایا۔ شاید اسی لمحے وہ پہلے کی طرح جھست و چلاک نہیں رہا تھا۔"

پھر عمار نہایت بزرگانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہوا "لیکن وہ تھا کوئی بہت ہی خاص قسم کا چیچیریٹ۔ اسے انسانوں کی طرح ہر بات کی سمجھ تھی۔ بلکہ وہ اشاروں سے ڈرائیور کو کچھ ہدایات بھی دے رہا تھا۔ مکن والے کو فائرنگ شروع کرنے کا حکم بھی اسی نے اشارے سے دیا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ کالا ٹریک سوٹ بھی پہنے ہوئے تھا اور اس کے جسم سے جانوروں جیسی بو کے بجائے کلون کی مٹک اٹھ رہی تھی۔"

میں ایک ٹھٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں ہی زبانوں میں نہایت روانی سے اچھے خاصے بزرگانہ انداز میں باتیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی عمر کے ساتھ یہ حساسیت، یہ بزرگی گراں گزر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پچھنے کا جو مہنہ سر حال موجود تھا اور اس کی تمام تر سنجیدگی و دیوباری کے باوجود اس کا چہرہ اس کی بزرگی کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ ویسے بھی میرے خیال میں

|       |         |                    |
|-------|---------|--------------------|
| 80/-  | اے حمید | صحرا کا چاند       |
| 250/- | اے حمید | پہلی محبت کے آنسو  |
| 100/- | اے حمید | اداس جنگل کی خوشبو |
| 200/- | اے حمید | چاند چہرے          |

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

جا کر آفتاب کی لاش اٹھواؤ اور عظیم کے مکان کی عمرانی اسی طرح جاری رکھنے کا بندوبست کرو۔ بلکہ اب عمرانی کچھ ختم کرو۔ اگر اب کسی مشکوک آدمی یا جانور کو ادھر ادھر سے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتے دیکھو تو بلا تامل کئی مار دو۔ زندہ بچانے کے چکر میں نہ پڑو۔

”احمد نے سہرا لیا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ قمار بڑے غور سے اسے جاتے دیکھا مگر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔  
”وہیے آپ لوگ ہیں بڑے کمال کے آدمی۔ بالکل کماؤ کھاتے ہیں۔ آپ نے کہاں سے یہ سب کچھ سیکھا ہے؟ کہاں سے فرسنگ لیا ہے؟“

”ہمیں حالات نے سب کچھ سکھایا ہے بیٹا!“ میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ہم نے اس کے لیے کس جاکر داخلہ نہیں لیا تھا۔“

”آپ مجھے نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتائیں بالکل! لیکن قلمی قسم کے ڈائٹنگ بول کر سنانے کی کوشش نہ کریں۔“ وہ ڈراؤنے والی حد تک سنجیدگی سے بولا۔ پھر اس نے ایک لٹری سانس لی ”اصل میں مجھے بھی بڑا شوق ہے کہ میں ان سب کاموں میں مہارت حاصل کروں۔ کوئی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے اور میں بڑے بڑے بد معاشرہ کی ایسی نجی کردوں۔ لیکن افسوس کہ مجھے اس قسم کے کام سیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ تمہاری تو بس ایک ہی نصیحت ہے کہ بنیاد لگا کر پڑھو، اعلیٰ تعلیم حاصل کرو اور بڑے آدمی بنو۔ مجھے بالی لگا کر اسٹوڈنٹ کرو فزوں میں بیٹھنے والے بڑے آدمی اچھے تو لگتے ہیں مگر کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے۔ میں تو بس تمہاری خوشی کی خاطر رہ رہا ہوں۔ اب میں ان کا حکم تو نہیں مان سکتا۔ ان کی خوشی کا تم میں ہر حال میں خیال رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن پھر بھی میں پڑھائی میں زیادہ محنت نہیں کرتا۔ معلوم نہیں کیسے ہر مرحلہ فرسٹ آجاتا ہوں۔ اب میں نے اسکول کے رائل ٹیچر شوٹنگ کلب میں داخلہ لیا ہے۔ چند دنوں میں میرا نشانہ بہت اچھا ہو گیا ہے۔

جینرٹکٹ والے کی جیب میں ایک ریو لور اور برس موجود تھا۔ برس میں بڑے نوٹوں کی صورت میں خاصی رقم تھی جبکہ شلوار بھی والے کی جیبوں میں پوشی بے پروائی سے نوٹ گھسنے ہوئے تھی۔ مجموعی طور پر اس کی جیبوں میں برس والے سے کہیں زیادہ رقم تھی لیکن ان کی جیبوں میں ایسی کوئی ایک چٹ تک نہیں تھی کہ جس سے ان کی شناخت کے سلسلے میں کوئی سراغ مل سکا۔

میں نے اور احمد نے کافی تیزی سے گاڑی کی بھی تفصیلی تلاشی لی لیکن اس میں بھی گاڑی کی رجسٹریشن تک تک نہیں تھی۔ نمبر پلیٹ دونوں طرف ضرور موجود تھی لیکن اس کے جعلی ہونے کا بھی امکان تھا۔ میں نے باؤسی سے لٹری سانس لی اور گاڑی سے نکل کر احمد کی بھی اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا۔ میں نے گاڑی کے فرش پر بھی ہوئی میٹ تک اٹھا کر دیکھی تھی کہیں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہماری نظر میں کارآمد ہوئی۔ احمد بھی کچھ باؤسی نظر آیا تھا۔ ہمارا جان بھٹلی پر رکھنا شاید بیکاری رہا تھا۔ دو لاشیں ہر حال ہمارے سامنے تھیں۔ ان کے بارے میں کوئی سراغ سامنے آنے کا انتظار کیا جاسکتا تھا۔

”ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟“ احمد نے پوچھا۔  
”کئی اہل ہرجیز کو جوں کا توں رہنے دو۔ کاتھ کباؤ بیٹھے کا کام اب ہمیں دو مہروں کے لیے چھوڑنا ہے۔“ میں نے بے زامی سے کہا اور سڑک پر ہنر اچھا مشین ہائل اٹھا لیا۔ ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ ہرجیز کا بڑے دانشورانہ انداز میں مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی قوت مشاہدہ واقعی بہت تیز معلوم ہوتی تھی۔

میں اس کا ہاتھ تمام کر اپنی گاڑی کی طرف لے لیا تو وہ اچانک ٹیلا لٹا کر اسی معلوم ہوا ہے کہ آپ کو اس پیچینیزی سے پہلے لگا واسطہ پڑ چکا ہے۔ آپ اس کا نام بھی لے رہے تھے۔ بلکہ بڑے گیارہ تھی اس کا کیا نام ہے؟“

اس کا ذہن ابھی تک پیچینیزی میں ہی پھنسا ہوا تھا۔ اس انسان لا جانور نے یقیناً اسے بہت متاثر کیا تھا۔ قیمت تھا کہ ابھی تو اس نے اس کی شخصیت کی جھلک ہی دیکھی تھی۔ بہت سے پہلو تو ابھی اس کے علم میں ہی نہیں تھے۔ ورنہ اس کے تجسس اور اشتیاق کا نہ کیا عالم ہوتا۔

میں نے بصوت بولنا مناسب نہ سمجھا اور ملاٹ سے کہا ”ہاں بیٹا مجھے اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ لیکن تم اس کے بارے میں زیادہ مت سوچو۔ وہ بڑی حیثیت چیز ہے۔ بلکہ تم ان چکروں میں ہی ملاٹ مت کھباؤ اور اس واقعے کو بھی بھولنے کی کوشش کرو۔ یہی کہہ کر تم نے ایک بے شکا خواب دیکھا تھا۔“

”وہ کوا میری غلطانہ تجویز پر بس جا اور ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔“ میں اب ایسا پتھر بھی نہیں ہوں کہ حقیقت کو خواب سمجھنے کی کوشش کروں۔“  
گاڑی کے قریب پہنچ کر میں نے آہستگی سے احمد سے کہا ”تم

ذرا اپنی گن تو دکھائیے گا۔" اس نے بڑے اطمینان سے گن لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔  
 "نہیں بیٹا رہے دو۔" میں نے ملاحت سے کہا "تسماری تما ٹھیک کتنی ہیں۔ فی الحال تم اپنی پوری توجہ تعلیم کی طرف رکھو۔ مار دھاڑیں پڑنے کی جیسے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اور اگر ضرورت پڑی بھی۔ تو ابھی بہت عرصہ پڑی ہے۔ ابھی تسماری عرصہ کیا ہے مجھے تسماری اس سعادت مندی پر خوشی ہوئی ہے کہ تم صحت کی خوشی کا خیال رکھتے ہو۔"  
 "مجھے رکھنا ہی چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "میرا دنیا میں تم کے سوا ہے ہی کون؟"

میرے دل میں کہیں خفیف سی ایک تھیں ابھری۔ وہ میرے محسوسات سے بے خبر اپنی دھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور پھر وہ بھی تو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ میری خاطر وہ دنیا کی ہر چیز چھوڑ سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ میرے سوتیلے باپ کو بھی چھوڑ سکتی ہیں لیکن میں یہ بات ان سے کہتا نہیں۔ مجھے بھلا کتنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر وہ ایک عورت ہیں اور عورت کو قدم قدم پر کسی سادھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شوہر کے بغیر عورت لندوری لندوری سی لگتی ہے، اس لیے میں سوچتا ہوں ان بے چاروں کی جوڑی جیسی بھی ہے اسے چلنے دو۔ ویسے بھی وہ بے چارہ مجھے کون سی تکلیف پہنچاتا ہے۔ اپنی دنیا میں گن رہتا ہے۔ اس کی عادتیں بس ذرا مسزاندہ نہیں ہیں لیکن میرے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہی ہے۔ بلکہ وہ میری کچھ اسی طرح عزت کرتا ہے جیسے کسی بزرگ کی کرتی چاہیے۔"

مجھے ہنسی آئی۔ میں نے کہا "وہ ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اسے اسی طرح تسماری عزت کرنی چاہیے۔"

اس کی باتیں سن کر مجھ پر چودہ طبق روشن ہوئے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی کل اذیت بزرگی کو خدایا سمجھوں یا کوئی "سینو لیکچرنگ ٹائل" تصور کروں؟

میں نے گاڑی چلاتے ہوئے گن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل نارمل اور پرسکون تھا۔ یہ تمام باتیں وہ نہایت سرسری انداز میں کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بہت بزرگ نہیں تھا اپنے آپ کو ذہین ظاہر کرنے کے لیے شعوری طور پر یا کوشش سے اس طرح کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی۔

ابناک میں نے فیرا رادی سے انداز میں پوچھا "تمہارا میں جیسے کیسا آدمی لگتا ہوں؟"

سوال میرے منہ سے نکل تو گیا لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ پوچھ نہ بیٹھے "آپ کو یہ سوال کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟"

لیکن اس نے یہ نہیں کہا اور تنہا ہی سے انداز میں میرا سر تاپا جائزہ لینے ہوئے بولا "آدمی آپ ٹھیک ہی ہیں۔ بلکہ یہ کتنا

چاہیے کہ خاصی زبردست چیز ہیں۔ لیکن آپ کو شاید پتہ نہ چلے گا بننے کا شوق ہے۔ آپ کسی پر بھی پوری طرح نہیں ٹھکنے کی اپنی شخصیت کی ایک گڑھی کھولتے ہیں کسی پر دوسری۔ کسی سامنے آپ کی شخصیت کا ایک پہلو رہتا ہے کسی کے سامنے دوسرا۔ آپ کے قریب ترین لوگوں میں بھی شاید کوئی آپ کا پہلا طرح نہ جانتا ہو۔ ایم آئی رائٹ سر؟"

اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور ناک کی سیدھ نہیں دیکھتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ مجھے واقعی اس لڑکے سے ملنا سا خواہ مخوس ہونے لگا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑا تھا میری اس پر حال نظر پڑی تھی اسی لمحے میرے دل نے کہہ دیا تھا وہ ایک غیر معمولی لڑکا تھا اور میرے دل کا مکمل درست ثابت ہو گا۔

ہم گھر پہنچے تو عیسمنہ صرف دوش میں آہٹکی تھی بلکہ گرنے لگی کھڑی تھی۔ اس کی حالت دیوانوں سے مشابہ تھی۔ بال بھر ہوئے تھے، آنکھوں میں وحشت تھی اور ہونٹوں پر پیلر جیسی "تھیں۔ بیروں میں سلپربک نہیں تھے۔ ایک ذہنہ مجھے میں ہی انہوں کی بنیاد کھانی دینے لگی تھی۔ شدت جذبات بھی کیا اثر دے ہے۔

گاڑی گیٹ کے قریب پہنچے ہی وہ گاڑی سے تقریباً لگ بھگ حلالہ تک وہ یقیناً اگلی سیٹ پر غار کو بیٹھے دیکھ چکی تھی۔ صبح کا آجیل چکا تھا۔ میں نے پورج میں گاڑی روکی تو دروازہ کھلنے لگا غار کو باہر کھینچ کر اس سے لپٹ گئی۔ آنسوؤں سے بھیگی توانوئیر کی نگرانی کے جاری تھی "میرے بچے! تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو کہ چلا گیا تھا۔"

غدار نے اپنے مخصوص بزرگانہ انداز میں اس کی کمر پر دی اور بالکی سی پائپنڈی کی کے ساتھ بولا "مما! میں نے کتنی بار تو سے کہا ہے اپنے جذبات پر ذرا قابو رکھا کریں۔ آپ سے تو کچھ نہیں کہ گئی یا بازار میں بھی خود کو قماش بنائیں۔"

"ہاں بیٹا! میں مان ہوں نا۔ میں تو اولادوں کی خاطر ہر قماش بن جاتی ہوں۔" وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "البتہ باپ! آپ پر قابو رکھتے ہیں۔ یا پھر تم بھی اولاد میں نے صرف لگ پوچھا تھا کہ تو کہاں چلا گیا تھا؟"

"میں خود تو نہیں کیا تھا ممما! مجھے تو وہ عجیب و غریب چھینزی اٹھا کر لے گیا تھا۔" اس نے اطمینان سے کہا پھر طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا "اگر انکلن آتے تو آپ کا کیا بیٹا باقی عمر شاید کسی چھینزی ٹیلی میں ہی گزارتا اور کچھ عرصے درختوں کی شاخیں پکڑ کر ٹھکا ہوا آپ سے ملے آتا۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو آ۔" وہ اسے درباہہ بیٹے سے ملتا ہوئے بولی "یہاں میں اتنی سی دیر میں نہ جانے کتنی مرتبہ ملا"

اور حتی مرثیہ زندہ ہوئی ہوں۔“  
 قادر میری طرف دیکھ کر کندھے اُچکاتے ہوئے بولا ”وکیلہ رہے  
 ہیں آپ؟ مہمانوں کو دنیا کے ہر معاملے میں بڑی مردار عورت ہیں۔  
 اب صرف میرے معاملے میں بالکل بچہ ہیں۔“  
 ”تم جو کہ خود اپنے معاملے میں بچہ نہیں ہو اس لیے تمہاری  
 ناک تو تمہارے معاملے میں بچہ بننا پڑتا ہے۔“ پھر میں نے اس کی کمر  
 چمکی دیتے ہوئے کہا ”اب تم اپنے کمرے میں جاؤ اور شادو لے کر  
 کپڑے تبدیل کرلو۔ اگر غیظ آئے تو کچھ دیر کے لیے سو جاؤ ورنہ  
 ہٹاؤ ضرور لے لیا۔“

ایک ملازمہ اسے لے جانے لگی تو خیم ایک لمبے کے لیے  
 اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی ”تم ٹھیک تو ہو نا؟ تمہیں کوئی چوٹ  
 دیو تو نہیں لگی؟“

”نہیں مٹا میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ جاتے جاتے مسکرا کر  
 بولا ”جس کے ساتھ آپ جیسی ماں کی دعا نہیں ہوں اسے کوئی  
 نقصان بھلا کیسے پہنچ سکتا ہے۔“ اس نے ماں کا ہاتھ چمکا اور  
 رخصت ہو گیا۔ اس کے انداز میں ہمارے زیادہ عقیدت تھی۔  
 ”تم اس کے بارے میں اتنی حساس ہو۔ میں خیران ہوں کہ تم  
 نے اسے بڑھنے کے لیے دوسرے شہر کیسے بھیجا ہوا ہے!“ میں نے  
 کہا۔

”اپنی زیادہ حساسیت کی وجہ سے ہی تو بھیجا ہوا ہے۔“ وہ میری  
 ماں نے کر بولی ”یہاں رہتا تو ہر بل میرے دل کو زیادہ دھڑکا کا  
 رہتا۔ وہاں رہتا ہے تو دل کو کچھ فرار سا رہتا ہے۔ بہت اچھا اور  
 محفوظ ماحول ہے وہاں کا۔ مجھے یہ اطمینان سا رہتا ہے کہ میں نے  
 اہل خانہ واری اپنے سے بہتر لوگوں کو سونپی ہوئی ہے۔ یہاں رہتا  
 ہے تو گویا یہ میری ذمہ داری رہتا ہے۔“

لشت کاہ میں پہنچ کر وہ ایک سوئے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی  
 ”میں سوئی ہوں اگر تم ویس وقت اسے واپس نہ لاتے تو میرا کیا بننا؟  
 میں تو دیوانوں سے سر ٹکرا کر جان دے دیتی۔“ پھر اس نے  
 کمر بھکی سی لے کر پوچھا ”کچھ بتاؤ تو سہی؟ کیا ہوا تم اسے کیسے  
 واپس لائے؟“

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ ڈالٹ کے بارے میں بھی  
 ابھی تک میں نے جو کچھ اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا وہ بھی  
 بتا دیا۔ میں اب کوئی بھی بات راز رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس  
 کی بھی واضح کر دیا کہ میں جہاں بھی بناؤں گا اس کمرے کی گینوں کو  
 نئے خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ میری وجہ سے کسی کے ساتھ کچھ  
 بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ ستارہ محض مجھے پناہ  
 اپنے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو چکی تھی۔

قادر کے خرد عاقبت سے واپس آجائے کے بعد خیم کے چہرے  
 پر زندگی کی خوش ناز کی خوشی کا جو رنگ بھال ہوا تو ادا لکھی یاد وہ ایک بار  
 ہر گز مٹاؤ نہ ہونے لگا مگر چند لمبے خاموش رہنے کے بعد وہ فیصلہ کن

اور مضبوط لمبے میں بولی ”لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ خیم ان باتوں  
 سے گھبرا کر چپچپے ہٹ جائے گی۔ یہ گھبرانا اہلانا ہے۔ تم جب تک  
 چاہو یہاں رہو بلکہ اب تو میں خیمیں شد کر کے یہاں رکھوں گی۔  
 تم پیسے والے ہو یوں تو تمہارے بیسیوں ٹھکانے ہوں گے لیکن تم  
 ہمارے ہاں رہو گے تو یہ بھلا کے لیے اعزاز ہو گا۔ ہم ہر تمہارا مالی  
 قرض بھی بہت زیادہ ہے اور مجھیں کا قرض بھی۔ مالی قرض تو کبھی نہ  
 کبھی اُترتی جائے گا لیکن مجھیں کا قرض شاید کبھی نہ اُترے۔“  
 ”میں قرض چرھا کر اتنی جلدی مع سود وصول کرنا نہیں  
 چاہتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں نہیں چاہتا کہ قرض  
 آگرنے آگرنے میں تم راجہ یا کوئی اور جان سے گزر جائے۔  
 مجھیں کا قرض بھی انسان پر اتنا بھاری نہیں ہونا چاہیے۔ انسان  
 ہی نہ رہے تو کھینچیں کس کام کی؟“

”نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ تم کیسے نہیں جاؤ گے۔ یہ تو محبت  
 کہنے والے لوگوں کی آگاہ کا سوال ہے۔ اور محبت کہنے والوں کی آگاہ  
 بڑی ظالم چیز ہوتی ہے، سب کچھ ناکار کرتی ہے اب تو نہیں ہر حال  
 میں نہیں رہنا پڑے گا۔“

اس معاملے میں اس نے بھی بالکل اسی موڑ پر اڑھنے ہوئے  
 کا فیصلہ کیا تھا جس پر ستارہ آگئی تھی۔ ستارہ کو میں گھبرچکا تھا۔ اب  
 خیم راجہ یا قاریتوں میں سے کسی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔  
 ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”اگر خیمیں ہمار کا ڈر ہے  
 تو اسے میں چپکے سے راتوں رات واپس مری بھیج دیتی ہوں۔ کسی کو  
 نہیں معلوم کہ یہ مری میں پڑتا ہے اور وہاں خفاختی انتظامات  
 بہت اچھے ہیں خیم تو فیضی سا ادا رہے۔“

”نہیں! نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ وہ چند پٹھانیاں مگرارنے  
 آگیا ہے، اسے مگرارنے دو۔“ میں نے قدرے الجھن کے سے عالم  
 میں کہا ”اور ہاں! یہ تم نے اسے میرا کیا کہاں سے بناؤ؟“

وہ مسکراتی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ”ایک  
 ماں کی گواہی کے بعد بھی خیمیں اس میں ٹھک ہے کیا؟“

”پھر بھی...؟“ میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے ٹھلا۔  
 ”اس کے لیے خیمیں کتاب ماضی کا ایک ورق پلٹنے کی کوشش  
 کرتی چاہیے۔“ اس نے بیڑ پڑے پاس سے ایک سگریٹ نکال

کر سٹگائی اور دھوئیں کے لہروں کو کھٹے ہوئے کھوئے کھوئے سے  
 لمبے میں بولی ”مجھیں رفاقتیں ممانتیں اور کسی کے وجود سے غرائی  
 ہوئی پڑ سرت سامعوں کے بارے میں مردوں کی یادداشت کچھ کمزور  
 ہوتی ہے۔“

”نہیں! اتنی بھی کمزور نہیں میری یادداشت۔ لیکن۔“ میں  
 نے کہا۔

”مجھ سے سننا چاہتے ہو کچھ بات کانٹے ہوئے بولی تہ میں یاد  
 رلاؤں گی تو خیمیں بہتر سے یاد دلاؤں گی جب تم میری راہوں میں  
 کھڑے ہوا کرتے تھے لیکن میں تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں

دیکھتی تھی۔ تم ہی نہیں اور بھی کئی تھے جو میری نظر التفات کے بھٹکر رہتے تھے۔ جنہیں یاد ہو گا میں اس زمانے میں جرتے پست کرتی تھی۔

”میں کیسے بھول سکتا ہوں وہ زمانہ۔“ میں نے کراہ کر کہا۔  
”مجھے حیرت ہے کہ ہر فرقے میں رہنے اور پورا خراب گرائے رکھنے کے باوجود لڑکوں کو کس طرح میری خوب صورتی کا اندازہ ہو جاتا تھا۔“

”وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ جوانی اور خوب صورتی سات پردوں میں بھی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔  
”خیر تو سب دل کا اندازہ لے لے کھڑے رہتے تھے لیکن میں نے اپنی جوانی کو ہی نہیں اپنے جلوں تک کو بہت سنبھال سنبھال کر بہت ہیست ہیست کر رکھا۔ میں سمجھتی تھی میں نے کسی کی طرف محبت کی نظر سے دیکھ بھی لیا تو میرے باپ کی عزت پر خوف آجائے گا۔ لیکن اسی باپ نے ایک دن یہاں فخر لا کر میری بات چیت۔۔۔ بلکہ یوں کہو کہ سوا مہیاں مسود سے ملے کر دیا تھا جس کی بیٹیاں عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔ لیکن اس کے پاس دولت بہت تھی۔“

”ہاں مجھے وہ سب یاد ہے۔ یہ جاننے کے بعد تم نے ایک مدت کی بے زنی کو بلائے خانہ رکھتے ہوئے ایک روز اچانک ہی خط لکھ کر چیکے سے مجھے ختمائی میں اپنے بچپن کے گھر میں بلایا تھا۔ اس رات تم نے مجھ پر کمرے کا ہی نہیں اپنی قاتلہ ترزا زشات کا دوازا بھی کھول دیا تھا اور بعد میں پھوٹ پھوٹ کر دوڑنے لگی تھیں۔“ میں نے رگ و پے میں ایک بھولی بھری سی سنسنی کی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا۔

وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کمری سانس لے کر بولی  
”میں اس عمر میں بھی کیسی ظنی ہو ا کرتی تھی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس جنم میں جانے سے پہلے کم از کم ایک گناہ کر لیا تو میرا حق بنتا تھا تاکہ میں زندگی بھر اپنے آپ کو سمجھاتی رہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میرے گناہ کی سزا ہے۔“

”ہاں مجھے تمہارا کہا ہوا ایک ایک لفظ اس رات کی ایک ایک بات اچھی طرح یاد ہے۔ میں بھولا ہوا تھا لیکن یہاں جب تم سے دوبار ملاقات ہوئی تو برسوں پہلے کی وہ سب باتیں یاد آئیں تھیں۔“ میرے لیے جسے یہ سب یاد تھیں وہی شخص تھی ڈور آئی۔

وہ بھی سر ہٹاتے ہوئے بہت ہی دیر میں ہی آواز میں بولی۔ ”مقام اندھے ظنوں کی گود میں سسکتی ہوئی اسی رات کی پیر اور ہے۔ اس کے چند دن بعد یہاں مسود سے میری شادی ہو گئی تھی۔ یہاں مسود نے قمار کو اپنی ہی اولاد سمجھا اور بہت محبت سے پالا۔ ویسے بھی مٹا ہے پورا پے کی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ شاید وہ اولاد بھی اسی ڈرے میں آئی ہے جس پر صرف اپنی اولاد کا دھوکا ہوتا ہے مگر ان باتوں کو ایک ماں سے بہتر کون جانتا ہے۔“

”مجھ تو میں بھی گیا تھا۔“ میں نے اپنی طبعی ہوئی آنکھوں کو

بیتابیوں سے ملتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔“

”میں شاید یہ بات جنہیں بھی نہ بتاتی۔ خوف و دہشت اور ہراسہ دہرائی کے سے ان لمحوں میں اچانک ہی منہ سے نکل گیا۔ ذرا کچھ تھا اور جس طرح بات نہج رہی تھی ویسی سب کے حق میں ہی تھا۔“ وہ بولی۔

”ہاں یہ انکشاف میرے لیے اچھا ثابت نہیں ہو گا۔ میری روح میری شخصیت پر ایک بوجھ بن جائے گا۔“ میں نے دھمکے میں کہا۔

وہ گویا اپنی گفتگو کی آواز دے کر زبردستی مسکرائے کی کو حائل کرتے ہوئے بولی۔ ”یہیوں۔۔۔ کیا جنہیں اچھا نہیں لگ رہا؟ اس نوجوانی میں ہی ملے پائے بیٹے کے باپ بن گئے ہو۔ پانچ سات سال بعد شاید وہ تم سے بھی لگتے ہوئے قد کاٹھ کا مالک ہو۔ اگر کسی کی اس پاس کھڑے ہوئے تو دیکھنے والے شاید جنہیں چھوڑ دیا بھلا سمجھیں۔“

میرے دل میں نہ جانے کیوں ایک عجیب سا آفت ایک بے عنوان سی آواز سی بجھ گئی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”دھوکے۔۔۔ لاطعلی اور غلط فہمی کی لڑکیوں پر مشتمل ایک عجیب سی زنجیر تیار ہو گئی ہے۔ میں اب تک اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ یہاں مسود مرحوم زندگی بھر دھوکے میں رہے۔ راز و ظاہر فہمی میں چلا ہے۔ اور ابھی یہ سلسلہ نہ جانے کہاں تک چلے گا۔ درد انگیز رسالہ نیم شب کی کہانی اتنا طویل کیجئے گی میں نے سوچا کہ میں تھا۔ کچھ دیر پہلے تک میں عمار کو گھری فخر سے دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب سی مسرت، ایک عجیب سا احساس فخر دل میں اٹھ چلا آ رہا تھا لیکن اب میں اس صورت حال کے بارے میں سمجھا ہوں تو دل ڈوبا سا جا رہا ہے۔“

”جنہیں اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم کو تو میں عمار کی یہ بات بتا دوں گی؟“ وہ اجازت طلب سے انداز میں بولی۔

”خدا کے لیے۔۔۔ یہ غضب نہ کرو۔“ میں اُچھل پڑا۔ ایک انمول لڑکا ہے۔ تم اس کی شخصیت۔ کہ تاج محل کو روکنا کہنا چاہتی ہو؟ اسے تو راجہ کے ساتھ اپنا سوتیلے باپ بننے والا رشتہ بھی بہت پیوٹ لگتا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس خاندان میں کسی کا سوتیلا باپ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کوئی عام سالو لڑکا نہیں ہے۔ اور یہ انکشاف تو شاید ایک عام سے لڑکے کے لیے بھی ناگوار ثابت ہو کہ وہ کسی کی ناجائز اولاد ہے۔ تم اس کے ساتھ یہ ظلم ہرگز نہ کرنا۔ ہماری تو خواہ جان پر بھی بن آئے۔ میں نے راز اس سے چھپانا ہو گا۔ وہ جو تک ایک غیر معمولی لڑکا ہے اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ اس انکشاف سے اس کی شخصیت اس عمارت کی طرح لمبے کا ڈیر بن جائے گی جس پر کیڑوں حیارے بمباری کرنے چلے گئے ہوں۔“

سے کندھے اچکا تے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں ذرا بچھلی گئی کا جائزہ لے لوں۔"

وہ میرے ساتھ ہی اٹھ آئی۔ ہم نے پچھلا گیت کھول کر گلی میں بھانکا۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ میرے آؤٹی آفتاب کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے۔ آفتاب کی موت میرے لیے ایک نیا صدمہ تھی۔ دینے ذات والے میرے دل پر یکے بعد دیگرے ایک نیا زخم لگا رہے تھے۔ اسی دل میں غزرت کا ہر قطرہ قطرہ جمع ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ قطرہ قطرہ جمع ہونے والے اس دریا کو ایک روز راستہ ضرور ملے گا اور پھر یہ سب کچھ ہمالے جاے گا۔ میں بظاہر بالکل پرسکون تھا لیکن میرے اندر جو شکست و ریخت برپا تھی اس کی اذیت سے میں ہی واقف تھا۔ وہ تو نینیت تھا کہ اٹلیں یہ نہیں معلوم تھا کہ غمار میرا بیٹا تھا ورنہ شاید بیک روز اسے لے کر نکل جانے کے لیے جان لڑا دیتا اور اگر اسے اس کی امید نظر نہ آتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اسے ہلاک ہی کر دیتا۔ وہ تو غالباً اسے صرف میرے دو ستوں اور پناہ دینے والوں کا بچہ سمجھ کر اٹھالے جا رہے تھے۔

ہم واپس آئے تو لازماً ناشائگانے گلی تھی۔ میرا کچھ کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن خیم ضرور تپ کر کھجے اٹھنے کی میز پر بٹھاتے ہوئے بولی "بھوکے رہو گے تو خوشوں سے کیسے لڑو گے؟ انسان کو دشمن بعد میں مارتا ہے، بھوک پلے مار دیتی ہے۔"

آخر اس کے مجبور کرنے پر میں نے جینے کا تھوڑا بہت کھایا اور کافی کے دو گ پل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قدرے حیرت سے بولی "کمال جا رہے ہو؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ان حالات میں بھی تم آفس جانا نہیں بھولے؟" اس کی حیرت بڑھ گئی۔

"ان حالات ہی میں تو آفس جانا زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ عام حالات میں تو میں اکثر گول ہو جاتا ہوں۔ مجھے وہاں جینے کا صرف کاروباری مسائل ملے نہیں کرتے ہیں" دوسرے معاملات کو بھی دیکھتا ہے۔ وہیں جینے کا سب سے رابطے کرنے ہیں۔"

"لیکن وعدہ کرو آفس سے سیدھے یہاں آؤ گے؟"

"خیم خیر! مجھے کوئی وعدہ کرنے پر مجبور مت کرو۔ مجھے خود قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ میں کوئی وعدہ پورا کر سکوں گا یا نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ میں جہاں جہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں وہاں پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں۔ اس لیے پلیز مجھ سے کوئی وعدہ مت لو۔"

میں نے درخواست کی۔

"میں نہیں چاہتی کہ میں یہ گمان بھی گزرے کہ میں کسی آڑے وقت میں تمہارا ساتھ دینے سے ڈر گئی تھی، پیچھے ہٹ گئی تھی۔" وہ اٹھ کر میرے ساتھ ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے

وہ ہنر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں قدرے پٹی تھیں۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے وقفے میں نے کہا "اور پھر یہ سوچو کہ اس کی نظر میں تمہارا اور برا کیا بچ رہے گا؟ پھر راجو کا بھی مسئلہ ہے۔ بات پھر ظاہر ہے اس سے بھی چھپی نہیں رہے گی۔ وہ کیا سوچے گا؟ یہی سب باتیں میں کو تو میں دھشت زدہ ہو رہا ہوں۔ دوسری طرف یہ احساس غریبی بھی دل میں پھٹکیاں لیتا رہے گا کہ میں کبھی اپنے خون کو اپنا نہیں کر سکوں گا۔"

اس نے سگریٹ الٹی نرے میں مسل دی۔ اس کی انگلیوں میں خف سا ارتعاش تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بھی آواز میں بولی "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے ایک غیر معمولی لڑکا ہونے کوچہ سے نہیں اس راز کی غیر معمولی حفاظت کرنا ہوگی۔"

"ہاں شکر ہے،" ہمیں معاملے کی نزاکت کا احساس ہو رہا ہے۔ "میں نے قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن تم اس کے بارے میں جتنی زیادہ حاسن جتنی زیادہ چاہتی ہو اس کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہی رہے گا۔ کسی بھی چہ بیتی یا ہسٹری سے لے کر یہ راز اکل مت دینا۔ یہ اس بچے کو قتل کر دینے کے مترادف ہو گا۔"

"تم مطمئن رہو۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "عورت کے بارے میں یہ مرد نے ہی مشورہ کر رکھا ہے کہ وہ کسی راز کو راز نہیں رکھ سکتی۔ حالانکہ عورت جب راز کو راز رکھنے پر آتی ہے تو اس کا دل سمندر سے کہیں گہرا ثابت ہوتا ہے۔"

"میری دعا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ میرے لیے خود اس خلیش کے ساتھ زندہ رہنا ایک آزمائش سے کم نہیں ہو گا کہ میں کبھی اسے اپنا نہیں کر سکوں گا۔ لیکن اس کی بستی کی خاطر میں اس آزمائش سے گزرتا رہوں گا۔"

وہ خاموشی سے ہالوں کی ایک لٹ کو انگلی پر لپیٹ رہی تھی میں نے جو کہتے ہوئے پوچھا "کیا راجو ابھی تک نہیں آیا؟"

"رات جب تم سونے کے لیے چلے گئے تھے تو اس کا فون آیا تھا۔ اس نے اطلاع دے دی تھی کہ ایک دوست کے گھر قریب سیدہ مرت پر ہو جائے گی، اس لیے وہ وہیں سو جائے گا۔ قریب آؤں گا۔ بس وہ ڈرنک ہو گیا ہو گا اور ڈرائیو تک اس کے بس کی بات نہیں رہی ہوگی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ میں سوچو ہوں وہیں سو جائوں۔ جس اوقات اس کے حق میں یہی بہتر ہوتا ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ گاڑی لے کر چلے تو کہیں مار نہ دے۔ خود بھی مرے کسی لڑکے کو بھی مروا دے۔"

"تم اس کے لیے ڈرائیو رکھو نہیں رکھ دیتیں؟" میں نے

ایک چوڑی خیم رکھا۔ صاف کہتا ہے کہ میں اپنی حرکتوں کا ایک گواہ ہر وقت ساتھ رکھنا نہیں چاہتا۔ "خیم بے پروائی

میں تم سب وہیں اکٹھے ہو جایا کرتا۔ زندگی نے مجھے ملتے  
شاید کبھی میں بھی آیا کروں۔"

"بیٹے پر باپ کی نوازشات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"  
سے انداز میں مسکرائی۔

"نوازشات کی نوبت ابھی کہاں سے آسکتی ہے۔" عمر  
لنڈی سانس لے کر کہا "ابھی تو مجھ پر اتنے برسوں کی بے ف  
قرض چڑھا ہوا ہے۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر آفس کی طرف روانہ ہو گیا  
ذہن تازہ ترین حالات میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا  
صاحب کو ان حالات سے مطلع کروں یا نہ کروں؟ کیا اس  
فائدہ تھا؟ فائدہ کے بجائے اٹنا کہیں کوئی دل جلانے والا  
تو سامنے نہیں آئے گا؟ انیس صاحب سے بات چیت کے ذرا  
تک کچھ زیادہ خوشگوار بات نہیں ہوئے تھے۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان معاملات کو خفیہ ایجنسیوں کے  
لا کر میں گویا پھنسی چکا تھا۔ اب کوئی بات ان سے خفیہ رکھنا  
میرے لیے بڑی الجھن کا باعث بن سکتا تھا۔ انیس صاحب  
خاص طور پر مجھے رہایت بھی کی تھی کہ میں انیس کی کئی کئی  
روں۔ حتیٰ کہ انیس اپنے ٹھکانے سے بھی باخبر رکھوں۔  
بچنے تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انیس ساتھ کی موت اور  
ترین مہربان سے مطلع کر دی دیا جائے۔

آفس جانے سے پہلے میں نے راستے میں ایک لڑکا  
اشور میں رک کر اپنے لیے تین ریڈی میڈ سوٹ بیک کرنا۔  
ضرورت کی چند دوسری چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ آفس  
میں اپنے پرائیویٹ کمرے میں تیار ہونے کے بعد اپنی سز  
بیٹھا۔ کام شروع کرنے سے پہلے میں نے سوچا ڈرا فون کے  
مشکل (ANSWERING MACHINE) کو چیک کروں، کچھ  
میں کوئی ریکارڈ شدہ پیغام تو موجود نہیں۔ بعض اوقات آف  
ہونے کے بعد بھی بیرون شہر یا بیرون ملک سے کوئی کال آجاتی  
تھیں میں صرف ایک ہی ریکارڈ شدہ پیغام موجود تھا  
ایڈم عرف ایڈی کی طرف سے تھا۔ پیغام یقیناً آج ہی آئے  
سے پہلے ریکارڈ ہوا تھا۔ انیس خیم کا گھر تو معلوم ہو گیا تھا  
چل گیا تھا کہ میں وہاں جا کر پناہ گزین ہوا ہوں لیکن شاید  
فون نمبر معلوم نہیں ہو سکا تھا ورنہ ایڈی کا فون وہیں گیا ہوا  
ایڈی کی ریکارڈ شدہ آواز مشین پر ابھرنی لگی۔

"کیا حال ہے چوہدری فیروز؟ کیا لگ رہا ہے۔" ایڈم  
ادھر بھاگنا؟ بس اب تمہاری زندگی اسی طرح گزرے گی ہے  
تمہیں احساس ہو گا کہ یہ زندگی تمہیں ایک سزا ہے۔  
سے نفرت ہو جائے گی۔ اتنی شدید نفرت کہ تم موت کی دعا  
کے لیکن تمہیں موت بھی نہیں آئے گی۔ تم خوشی کرنے  
کوشش کرو گے تو ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے ہم تمہارے

ہوئے بولی "میں تمہارے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو کر جان دینے کے  
لیے تیار ہوں۔ اور یہ محض کوئی کمال نہیں ہے آزاد کر دیکھ لیتا۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ میرے دل میں تفکر کی ایک لہر ابھری۔  
میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں  
جھانکا۔ ان خوب صورت آنکھوں میں دھواں دھواں سا پیلا ہوا  
تھا مگر گرائیوں میں کہیں کوئی پتنگاری روشن تھی۔

"میں تمہارا بہت احسان مند ہوں خیم!" میں نے سادگی سے  
صرف اچھا کہا اور اس کے کندھوں پر ہلکی سی چٹکی دے کر باہر جانے  
کے لیے تیزی سے مڑ گیا۔ میری آنکھوں میں ستارہ کی تصویر ابھرتی  
تھی۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ ہر حال میں میرا ساتھ دے گی،  
چاہے اس کی جان چلی جائے اور واقعی اس کی جان چلی گئی تھی۔  
میرا ساتھ دینا اب کچھ ایسا خوش قسمتوں والا کام نہیں رہا تھا۔

وہ میرے ساتھ ساتھ گاڑی تک آئی اور ایک بار پھر بولی  
"بہر حال جب بھی تم فائدہ ہو گے میں آؤں گے۔"

"کوشش میری نہیں ہوگی۔ وعدہ نہیں کرتا۔ میرے آدمی  
تمہارے مکان کے گرد موجود رہیں گے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تم انہیں  
بلا کر بات کر سکتی ہو۔ مجھے آفس فون کر سکتی ہو۔"  
"تم میری نہیں صرف اپنی فکر کرو۔"

"اب مسئلہ صرف میرا یا تمہارا ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا  
"فائدہ بھی تو ہے۔"

یکدم ہی اس کی ٹھک دار سی ہنسی ابھری "ہاں بلکہ اب ہمارا  
تمہارا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، اصل مسئلہ ہی اس کا ہے۔ وہ ہم  
دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے، متاع حیات ہے ایک عجیب... بے  
مشافقت سی محبت کی پیدوار ہے۔ اس کی تو ہم سب سے زیادہ  
حفاظت کرنی ہوگی۔" اس کا لہجہ خوابناک سا ہو گیا۔

پھر وہ چمچ بھری سٹی لے کر گویا چمکتے ہوئے بولی "لیکن شکر  
ہے وہ پیش نظر میں نہیں ہے، جس منظر میں ہی ہے۔ اس کی طرف  
کسی کا زیادہ دھیان نہیں جائے گا۔ میں اسے آج کل میں ہی  
واپس مری بھجوا دوں گی۔"

"اس بار ذرا رازداری سے بھجواتا۔ کوشش کرنا یہ بات  
آئندہ کسی کے علم میں نہ آئے کہ وہ مری میں ہوا ہے۔" میں نے  
کہا۔

"تم مطمئن رہو، مجھے اب ان سب باتوں کا اندازہ ہو چکا ہے۔  
میں نے تو سوچا ہے میں اب چھٹیوں میں اسے یہاں بلائی ہی نہیں  
کروں گی۔ میں اور راجو خود کچھ سے راتوں رات مری چلے جایا  
کریں گے۔ اس کی چھٹیوں کے دن ہم وہیں گزار آتے کریں گے۔  
کسی کو خبر نہیں ہونے دیں گے۔"

"ہاں، یہی اچھا خیال ہے۔" میں نے کہا "چاہو تو مری میں  
کوئی چھوٹی موٹی کوٹھی خرید کر ڈال دو۔ سودا کرنا تو مجھے ناقدینا  
ادائیگی ہو جانے کی جگہ چاہو تو فائدہ کے نام پر ہی خرید لیتا۔ چھٹیوں

بھی تھمارے کام نہیں آسکے گا۔ سب روٹی کے کالوں کی طرف  
جائے گا۔ زندگی کے صحرا میں تم تنہا کفرے اپنے خالی ہاتھوں  
طرف دیکھتے رہ جاؤ گے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ تھمارے  
ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ تمہیں یہ شخص ایک ڈراؤنا ڈراؤنا  
محسوس ہو گا۔ پھر خواب کا دور سراسر ختم شروع ہو گا جو اس سے  
زیادہ ہمایاں ہو گا۔ ہو سکے تو کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اپنے آپ کو  
بتائے گی کہ کوشش ضرور کرنا کہ کبھی کبھی انسان سے کوئی ایسی کوشش  
بھی سرزد ہوتی ہے جس کی خوف ناک کا اسے ابتدائیں بالکل اعوان  
نہیں ہو تا۔ خدا حافظ۔“

مشین خاموش ہو گئی۔ ابھی سی سرسراہٹ کے ساتھ نہا  
ریکاؤر میں خالی ٹیپ چل رہی تھی۔ میں نے سوچا آف کیا اور وہ  
لے لے اپنی ریو الوجک جیٹر برسات بیٹھا رہا۔ ساڈھ پروف کرے  
ساڈھ تھا۔ میں دیوار پر لگے کلاک کی نہایت خفیف سی جگ جگ  
سُن سکتا تھا۔

کچھ ایسا ہی سنا میرے اندر بھی طاری تھا اور اس میں کلاک  
کی ٹپ ٹپ کی طرح ہی ایڈی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ پہلے کم  
فون پر اس سے اس طرح کی گفتگو ہوتی تھی تو اسے میں کبھی کرا  
مناوٹ تھا اور اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا لیکن اب  
میرا اس سے کچھ کہنے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ تو ایک ریکاؤر  
پیغام تھا لیکن اگر اس نے فون پر براہ راست بھی مجھ سے یہ بات  
ہوئی تو شاید میں خاموش ہی رہتا۔

میں نے اپنے دل کو منوالا۔ کہیں یہ شکست خوردگی کی علامت  
نہیں تھی؟ میرا غلط انداز فکر یہ تھا کہ انسان کو خواہ مخواہ ہری طور  
شکست بھی ہو جائے لیکن اسے اندر سے شکست خوردہ نہیں  
چاہیے۔ شکست سے زیادہ شکست کا احساس تباہ کن ہوتا ہے۔  
اسی نتیجے پر پہنچا کہ شکست خوردگی کا احساس تو مجھ پر غالب نہیں  
لیکن اب میں خواہ مخواہ جارحانہ لفظوں میں الجھتا نہیں چاہتا تھا  
اس کا کوئی ناکمہ نہیں تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس پر بڑی حد  
عملدرآمد کی طاقت رکھتے تھے۔ میں اگر ان کے شر اور ضرر  
تھوڑا بہت بچ جاتا تھا تو اس کی وجہ محض اوپر والے کی مولا  
تھوڑی سی سخت جالی اور میرے پیچھے کچھ منظم دیا ملاج  
ساتھیں کا ہونا تھا۔ ورنہ شاید میں ان کے ایک آدھ ٹکڑے  
ہی مارا گیا ہوتا۔ خواہ وہ مجھے زندہ رکھنا چاہے۔ لیکن ایک بات  
تھی کہ اگر میں اتنی ہی آسانی سے مارا جائے والا شخص ہوتا تو  
ریڈ ذات کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی ہی نہ ہوتی اور جس شخص  
لے وہ مجھے تیار کرتا چاہتے تھے اس کی کوئی بات ہی نہ ہوتی ان  
سارا انسان ہی نہ کھڑا ہوتا۔

چند لمبے سوچوں میں الجھارنے کے بعد میں نے فون پر  
صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن پتا چلا کہ وہ

پتہ نہیں گئے۔

ایڈی کا ہونے کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی شخص میرے  
سامنے بیٹھا مجھے پتا ہوا کہ نہ کسی کی کوشش کر رہا ہو۔ اگر میں منہ  
اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو تنہائی میں اس طویل و درمیان پر سکون  
کمرے میں ابھرتی ہوئی یہ ٹھہری ٹھہری سی آواز واقعی میرے ذہن  
پر اثر انداز ہونے لگتی۔ میں شاید اسی طرح سوچنے لگتا جس طرح وہ  
چاہتا تھا۔ یا وہی کی اسی دلیل میں آتے لگتا جس کی طرف وہ مجھے  
اپنی پُرآواز کے ذریعے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آواز بدستور اپنے تمام تر صدا کارانہ آثار چڑھاؤ کے ساتھ  
ابھر رہی تھی۔

”تم نے محسوس کر لی لیا ہو گا کہ ہم تمہیں ہلاک کرنا نہیں  
چاہتے۔ ورنہ یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہم تمہیں  
زندہ دھکنا چاہتے ہیں لیکن اس لیے نہیں کہ ہمیں تمہاری ضرورت  
ہے۔ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمیں اس ملک میں تم سے  
زیادہ کارآمد اور بڑے بڑے نامور سیکڑوں لوگ میسر ہیں جو ہمارے  
ایک اشارے پر ہاتھ لگتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے پہلے آئیں گے  
اس لیے اس خوش قسمتی میں مت رہنا کہ ہم تمہیں اپنی طرف آنے  
اور درہمیکش قبول کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہم  
نے کچھ عرصہ پہلے تمہیں کی تھی۔ نہیں ڈیرہ چدہری! ایسی کوئی بات  
نہیں۔ تمہارے لیے اس دھمکی کو قبول کرنے کا وقت مگر زچہ۔  
دھمکی کو قبول کرنا یا نہ کرنا تو ایک الگ مسئلہ تھا تم نے ہماری  
دوسری ہدایات پر بھی عمل نہیں کیا۔ تم نے ہماری باتوں کو وہ اہمیت  
نہیں دی جو دینی چاہیے تھی۔“

مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ ریڈ ذات کا رد عمل یہی ہو گا۔ یہ  
بات میں نے قانون سٹر فیلڈ صاحب سے کسی بھی تھی۔ میرا خیال  
دوست ہی ثابت ہو رہا تھا۔

ایڈی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ہم نے جو کچھ تمہیں  
سمجھانا چاہا تم نے صحیح طور پر اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یا پھر  
شاید سمجھنے کے باوجود کسی ذہن میں جھلا رہے۔ یہ دونوں باتیں ہماری  
نظر میں بڑا سنگین جرم ہیں۔ مگر رے بونے لکھوں کو اب تم دوبارہ  
نہیں پکڑ سکتے چوہدری ڈیرہ معانی کی ہمارے ہاں نہ کوئی محتال ہے  
اور نہ دستور۔ تم اب اپنی کشتیاں چلا چکے ہو۔ اب تم مر نہیں سکو  
گے اور زندگی بھی تمہارے لیے اک کرب مسلسل ہوگی۔ تمہارے  
دوست احباب تمہارا ساتھ دینے والے، تمہیں پناہ دینے والے،  
تمہارا ہاتھ تھامنے والے، کاروبار میں تمہاری سرپرستی کرنے  
والے، تمہاری محبوبائیں، تمہاری تختہ راقوں کی رفیق، تمہارے  
ہودو کرم فرما سب تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ اگر ساتھ نہیں  
چھوڑیں گے تو دنیا چھوڑ جائیں گے۔ اگر دنیا میں رہے بھی تو کوئی  
عبرت بن کر رہیں گے اور سب سے بڑا عبرت کا نمونہ تم خود ہو  
گے۔ تمہاری دولت، تمہارے تعلقات، تمہاری رفقاء، ایسا ہر کچھ



میں تھامے اسے گھورتا رہا اور سوچا رہا کہ ان سے دوبارہ رابطہ قائم کرنا یا نہیں؟ ایک ٹھنڈی سانس لے کر چند لمبے بعد آخر کار میں نے ان سے دوبارہ رابطہ کر لی۔

”ذہری گد“ اس بار وہ میری آواز سن کر قد رے خوشگوار لمبے میں بولے ”اب کیسے نکلا کتا ہے۔“

”گستا کیا ہے جناب! مزید کچھ برادریوں کی داستان سنائی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”اپنا تو وہی معاملہ ہو کر رہ گیا ہے کہ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔ زندگی شاید اب کچھ زیادہ باتیں نہیں رہی۔ اور جتنی بھی باقی ہے وہ غالباً آپ کو یہ یقین دلانے میں گزر جائے گی کہ معاملہ واقعی سنگین ہے اور جی جی دیا سنی ہے جیسا میں نے بیان کیا تھا۔ اگر میرے اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد بھی آپ کو یقین آگیا تو میں سمجھوں گا کہ محنت وصول ہوگئی اور جاں سے گزر جانے کا بھی مسئلہ حل گیا۔“

”نہیں صاحب گویا خود پر جبر کے قتل سے کام لیتے ہوئے بولے“ دیکھیں چوہدری صاحب! یہ شعرو شاعری اور افسانہ طراری مجھ سے بات کرتے وقت بلائے طاق رکھ دیا کریں۔“

”بہل نوکر قاتر ہوں۔ رنہ رنہ آؤ آپ فکس سیکھ رہا ہوں۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے اور مٹنی ان مٹنی کرتے ہوئے بولے ”اس کے علاوہ آپ اس مسئلے کو بھی رہتے دیں کہ میں نے آپ کی کمائی پر یقین کیا ہے یا نہیں۔ یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کو جو ہدایات دی گئی ہیں اُن میں آپ خاموشی سے ان پر عمل کرتے رہیں۔“

”وہ تو میں کری رہا ہوں جناب! اسی لیے تو اس وقت فون پر آپ سے بات ہو رہی ہے۔ جتنی سعادت مندی سے میں آپ کی ہدایات پر عمل کر رہا ہوں اتنی سعادت مندی سے تو اگر والدین کے کہے پر عمل کیا ہوتا تو یقیناً جنت میں جا تا۔ اور یہ بھی آپ نے خوب کہا کہ میری کمائی پر آپ کا یقین کرنا یا نہ کرنا میرا مسئلہ نہیں ہے۔ چلے یہ بھی مان لیتا ہوں۔ لیکن اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھاتے رہنا تو میرا مسئلہ ہو گا یا نہ بھی میرا مسئلہ نہیں ہے؟“

”تمہیں پس باندھنے کے بجائے اصل بات سمجھنے چوہدری!“ وہ اپنے مخصوص سیات لمبے میں بولے۔ بڑے ہی سرگرم آدمی تھے مجھے حسرت ہی تھی کہ کبھی ان کے لمبے میں جذبات کی کوئی جھلک محسوس ہو سکے۔

پچھلی بار ان سے فون پر بات ہونے کے بعد سے جو نئے واقعات درخشا ہوئے تھے میں نے وہ اُن میں بتائے شروع کیے۔ سب سے پہلے سنا کہ قتل کا ذکر کیا۔ میں اس وقت دم بخود رہ گیا جب وہ بڑے اطمینان سے بولے ”ہاں اس ایکٹس کے قتل کی رپورٹ تو میرے پاس پہنچ گئی ہے۔ میں ابھی ساری تفصیل تو پوری توجہ سے نہیں پڑھ سکا لیکن اتنا پڑھ چکا ہوں کہ اسے کوئی بہت سی انوکھا قسم

سے جانچے تھے اور اسلام آباد میں اپنی سرکاری رہائش گاہ یا دفتر میں کہیں موجود تھا۔ میں نے کیسٹریک کو ان کے نمبر دیے اور چند منٹ کی کوششوں کے بعد اس نے ایجنسی کے ہیڈ آفس میں ان سے برا رابطہ کر لیا۔

فکس صاحب دیکھ سلام کرنا وغیرہ کے بعد کچھ پوچھنے کے بجائے بولے ”مسٹر چوہدری! سب سے پہلے میں ایک ضروری بات آپ کو بتا دوں جس نمبر پر اس وقت آپ بات کر رہے ہیں؟ یہ ایک ناماخذ نمبر تصور کیا جاتا ہے۔ بہت کم اور نہایت اہم لوگوں کے پاس یہ نمبر لایا جاتا ہے۔“

”ہاں لائن کا نمبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں! ہاں لائن کا نمبر تو میں آپ کو دے ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ بات لائن سے ذرا نیچے کی چیز ہے لیکن یہ بھی بہت اہم ہے اور آپ چونکہ فیصلہ صاحب کے توسط سے آئے تھے اس لیے میں نے آپ کے مسئلے کو اہمیت دیتے ہوئے آپ کو یہ نمبر دے دیا تھا۔“

”آپ کے خیال میں وہ میرا کوئی ذاتی مسئلہ تھا نہیں صاحب؟“ میں نے حیرت آمیز سچی سے پوچھا ”اور یہ صرف آپ کی نظر نہایت تھی کہ آپ نے اسے اہمیت دی ورنہ درحقیقت اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی؟“

”اس سلسلے میں“ میں ابھی کوئی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تحقیقات جاری ہیں۔“ وہ بولے۔

”آپ کی تحقیقات تو نہ جانے کب تک کمان تک اور کن خطوط پر جاری رہیں۔“ میں نے ایک بار پھر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”لیکن میرے ساتھ جو چند نئے واقعات پیش آئے ہیں، میں نے سہ ماہی آپ کو ان سے مطلع کر دیا کہ کبھی آپ کو دیگر ذرائع سے کچھ اطلاعات ملیں تو یہ کمان نہ گزرے کہ میں نے آپ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔“

اگر بارہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے ”لیکن وہ میرے فون نمبر کے بارے میں ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ اہم بات ہے سن لیجئے۔“

ان کا ذہن ابھی فون نمبر میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا ”ارشاد کیجئے جناب! میرے نزدیک تو آپ کے منہ سے نکلا ہوا ہر ٹھنڈی بات ہی لیکن میں خاموش رہا۔ میں اپنے آپ کو بادشاہ گردن کے ساتھ ٹھٹھکے آؤ اب کا عادی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے ”یہ نمبر آپ کسی ڈائریکٹ فون پر پیش خود ڈائل کیا کریں، سیکرٹری یا کسی نمبر پر وغیرہ سے مت لایا کریں اور نہ ہی ان کے پاس یہ نمبر موجود ہیں۔ جس خاتون نے کبھی یہ نمبر لایا ہے اس سے براہ کرم واپس لے لیجئے اور کسی ایسے فون پر خود نمبر لارہا بات کیجئے جس پر چاہ میں کسی کے سننے کا ایک لمحہ بھی امکان نہ ہو۔“

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں چند لمبے دیر پر ہاتھ

ان فالتوں کے کسی منزل پر پہنچنے تک کہاں کہاں کیا کیا قیاس کر جاتی ہیں، تعلیم اللہ ان اور قطعہ بد قسم کے دفتروں میں بیٹھے والوں اس کا اندازہ نہ کر ہو سکتا ہے!"

"آپ تو اچھے خاصے مطلع قوم معلوم ہوتے ہیں چہرہ صاحب!" وہ نظریہ سے لہجے میں بولے۔

"جب بھی میں نے آپ جیسے کسی بڑے صاحب اختیار قوم سے اس قسم کی باتیں کی ہیں، اس نے نظریہ انداز میں مجھ سے کہا ہے۔" میں نے ملاحت سے کہا "حالا کہ میرے خیال میں مطلع قوم ہونا کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہ اس پر طر کیا جائے۔ یہ منصب بہت اونچا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" نفیس صاحب بولے "میں بھی نہیں چاہتا تھا۔ میرا لہجہ نظریہ اس لیے ہو گیا تھا کہ ہم کرسی نشین سامنے آپ جیسے بہت سے لوگ خواہ مخواہ ہی مطلع قوم بن جاتے ہیں۔ میں بھی خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ یہ واقعی بہت بڑا منصب ہے۔ لیکن ہم لوگوں کے بارے میں یہ تاثر بھی بظاہر ہے کہ ہم مایشتان دفاتروں میں بیٹھے فالتوں چلانے کے علاوہ کرتے ہیں نہیں۔ اور یہ کہ اس نظام کے سارے الجھادے ہیں ہماری فالتوں سے ہیں دوسرے طبقوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ باقی سب چارے بہت دراز انداز ہے، سختی اور ایثار پسند ہیں۔ میں اپنے آپ کو اور اپنے جگہ کو یورو کر کسی میں شمار نہیں کرتا اور تیری یورو کر کسی کا دفاع کر رہا ہوں۔ میں آپ کو صرف اپنے بارے میں جانا چاہ رہا ہوں کہ فوکری کے شانے تو اپنی جگہ ہیں ہی، لیکن جیسا گناہ کار آدمی اپنی جگہ بیضا اپنی بساط کے مطابق اس گناہ قوم کی بھلائی کی ہر ممکن تدبیر کرتا رہتا ہے۔ ہم تو کسی کو اپنے کارنامے سے نا بھی نہیں سکتے۔ آپ کو کیا معلوم کہ جب آپ مجھ کو نیند سو رہے ہوتے ہیں تو ہم کن کن محاذوں پر اس ملک و قوم کے خلاف ہونے والی کسی کیسی حیوانک سازشوں کا قلع قمع کر رہے ہیں۔ آپ اس غیر متعلقہ بحث میں نہ پڑیں۔ ویسے بھی فون پر طویل گفتگو مناسب نہیں۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے کس لیے فون کیا تھا؟"

"میں کیا چاہتا ہوں؟ کاش اس کا جواب اتنی ہی سادہ آسان ہو تاکہ میں فون پر دے سکوں۔" میں نے غصہ کی سانسیں کر کہا "فون میں نے آپ کو صرف آپ کی ہدایت کے مطابق ترین حالات سے باخبر رکھنے کے لیے کیا ہے۔ سناؤ کہ فون کی رپورٹ تو آپ تک پہنچ چکی ہے، مزید وہ ایک واقعات سے آپ کو آگاہ کر دوں۔"

میں نے انہیں گزشتہ رات پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا جس میں تین افراد مارے گئے تھے۔ انہوں نے غائب خاموشی سے سب کچھ سنا۔ آخر میں میں نے کہا "آپ کے

کا ذہن بڑا گیا تھا جس کا کوئی خاص سراغ میں مل سکا اور جسم پر اس کے جراثیمات ہوئے تھے اس سے ہمارے ماہرین اس کے اجزائے ترکیبی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔"

انہوں نے ہماری فلم انڈسٹری کی ایک سپر اسٹار کا ذکر محض "اس ایکٹرس" کے الفاظ کے ساتھ نہایت سرسری سے انداز میں کیا تھا۔ لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے اس واقعے میں تھوڑی بہت اہمیت بس صرف اس بات کی ہو کہ ذہن کوئی انوکھا اور نامعلوم قسم کا تھا، اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ امر میرے لیے حیران کن تھا کہ رپورٹ ان کے پاس اسلام آباد پہنچ چکی تھی۔ لیکن اس وقت میرے فون کرنے پر بھی انہوں نے خود اس سلسلے میں کوئی بات شروع نہیں کی تھی۔ شاید یہ ان کی نظر میں کوئی اہم معاملہ نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ کن معاملات کو اہم سمجھ کر ان میں خاطر خواہ دلچسپی لیتے ہوں گے۔

"خاصی جلدی رپورٹ آپ کے پاس پہنچ گئی۔" میں نے کہا۔ "ہاں پچھلے بار آپ نے مجھے لاہور میں ہی فون کیا تھا تو بتایا تھا کہ آپ اس ایکٹرس کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے اسی وقت دو ایک اداروں کو ہدایت کر دی تھی کہ اس سلسلے میں کوئی بات سامنے آنے پر براہ راست مجھے تفصیلی رپورٹ بھیجوائیں۔" وہ بدستور سرسری سے انداز میں بولے۔

"اس کا مطلب ہے آپ کو اندیشہ تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہو سکتا ہے؟" میں نے قدرے ہنسنے والے لہجے میں کہا۔ درحقیقت میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ اندیشہ ہونے کے باوجود انہوں نے اس کی حفاظت کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ انہیں گویا صرف اس امر سے دلچسپی تھی کہ "کچھ" ہو چکے تو رپورٹ ان کی میز پر پہنچ جائے۔

وہ میرے ان کے الفاظ کے معلوم کو پہنچتے ہوئے بولے "مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی کچھ ہو سکتا ہے۔ دوسرے ہر طرح کے حالات میں لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا میری ایجنسی کے دائرہ کار میں نہیں آتا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہر ادارے کا اپنا اپنا ایک سیٹ اپ اور طریقہ کار ہے۔ ہمیں اسی کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ اس طرح عام لوگوں کے تحفظ کے لیے اگر ہم ضروری سمجھیں تو پولیس کے ٹکے وغیرہ کی خدمات حاصل کرتے ہیں، اگر آپ چاہیں تو اب آپ کے لیے۔ یا جن لوگوں کی آپ نشانہ بنائیں گے ان کی حفاظت کے لیے "پولیس پروٹیکشن" کا بندوبست کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔"

"بہت شکر یہ نفیس صاحب!" میں نے کہا اور کوشش کی کہ میرے لہجے سے کوئی غلطی ظاہر نہ ہونے پائے "یہ دفتری نظام کی پیروی کریں، یہ ٹھکانوں کا جال اور کسی کی سمجھ میں نہ آنے والے ان کے طور طریقے معلوم نہیں بے چارے عوام کو کہاں لے جائیں گے۔ اور سرسروں پر گولیاں چل رہی ہوتی ہیں اور اور دفاتروں میں فالتوں چل رہی ہوتی ہیں۔ وہ بھی کچھ سے کی رفتار سے۔ ظاہر ہے،

آؤں۔ امید ہے اس عاجزانہ اور شرفانہ درخواست پر وہ فوراً  
گمن جیب میں ڈال لے گا اور کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر  
اطمینان سے پولیس کا انتظار کرنے لگے گا۔

مجھے احساس ہوا کہ میں تو محض بکواس کر رہا تھا۔ نفیس صاحب  
تو فون بند کر چکے تھے۔ حالانکہ میں ابھی انہیں وہ ریکارڈ شدہ پیغام  
بھی سنوانا چاہتا تھا جو مجھے اپنی انصورت گشتیں پر ریڈ ڈاٹ کی  
طرف سے ایڈی کی آواز میں ملا تھا۔ تاہم میں انہیں اس پیغام سے  
اپنی زبان میں تو مطلع کرنی چکا تھا، صرف ثبوت کے طور پر انہیں  
اصل پیغام سنوانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اسے کوئی خاص اہمیت  
دی نہیں دی تھی۔

شام تک میں نے اپنا ذہن کام میں لگانے کی کوشش کی۔ کالی  
کام نمٹ ہی گئے۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے چاروں  
طرف عارضی طور پر گمر اسکوٹ چھا گیا تھا لیکن اس سکوت کی دہلیز میں  
کوئی پلچل چھپی ہوئی تھی۔

ٹھیک پانچ بجے شیم کا فون آیا۔ وہ ہند تھی کہ دفتر سے میں  
سیدھا گھر آؤں۔ اس نے بھی ستارہ والی شدہ چوٹی تھی۔ میں نہیں  
چاہتا تھا کہ اس کا انجام بھی ستارہ جیسا ہو یا پھر غار کسی کا ہدف  
بنے۔

میں نے اسے بتایا کہ ابھی تو میں دفتر میں ہی مصروف تھا اور  
یہاں سے اندر کر سات بجے والی فلاٹ سے مجھے اسلام آباد جانا تھا  
کیونکہ مجھے نفیس صاحب نے وہاں طلب کیا تھا۔ یہ بتانے کے بعد  
میں نے اسے بتلایا۔ تاہم اس نے وعدہ لیا کہ اسلام آباد سے واپسی پر  
میں سیدھا اسی کے ہاں آؤں گا۔

کچھ دیر میں اسے کہہ کر میں نے دفتر سے باہر کی اپنی تمام کاروباری  
اور سماجی مصروفیات ملتتی کرادی تھیں۔ مجھے عیس معلوم تھا کہ میں  
کوئی وعدہ پورا کرنے کی پوزیشن میں ہوں یا نہیں۔ اس صورت میں  
خواہ مخواہ وہ سرحد کو انتظار کر کے ہدف بن کر رہ جائے گا۔

میں اپنے تمام اشیائے وغیرہ کے جانے کے بعد بھی دیر تک  
آفس میں بیٹھا رہا۔ کچھ کام بھی تھا اور کچھ سوچوں کا جو مجھ میں تھا۔  
جس وقت میں انہیں کا کارواہ کرتا تھا میرے ڈائریکٹ نمبر پر ایک فون  
آتا۔

”میرا نام بار ہے۔“ دو سری طرف سے بولنے والے صاحب  
نے فریادیں گھمے گھمے لہجے میں بتایا ”مجھے نفیس صاحب نے  
ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو فون کر کے کچھ ضروری انفارمیشن دے  
دوں۔“ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون تھا کہاں سے بول رہا تھا۔  
میں نے بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ جینے اس کا تعلق نفیس  
صاحب والی انجمنی سے یا پھر کسی اور خفیہ ادارے سے ہو گا۔  
”جی فرمائیے۔“ میں نے سنبھل کر پوچھتے ہوئے پوچھا۔

”مگر شہ رات جھڑپ میں جو خود آؤں آپ کے ہاتھوں ہلاک  
ہوئے تھے وہ خاں صاحب نے خطرناک قسم کے پیشہ ور بد معاش اور ڈاکو تھے۔

آپ کے معاون اداروں کے مسائل بہت زیادہ ہیں۔ شاید مرنے  
والے ان دونوں بد معاشوں اور اس گاڑی کے ذریعے کوئی کارآمد  
سراغ مل سکے۔ وہ چھینٹیری زخمی ہو کر بھاگا تھا، شاید اس کا بھی  
کوئی سراغ مل سکے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے بتائے  
ہوئے کسی وقت پر آپ کو فون کر کے معلوم کرنے کی کوشش کروں  
کہ کوئی سراغ ملا یا نہیں؟ بات کچھ آگے بڑھی یا نہیں؟“

”اس کے لیے آپ کو مجھے زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔“  
وہ بولے ”میں لاہور میں اپنے کسی آدمی کی ذہنی لگاؤں کا۔ وہ آپ  
کو فون کر کے تازہ ترین حالات سے مطلع کرے گا۔ وہ آپ کو  
آفس فون کرے گا کیونکہ فی الحال آپ سے رابطے کا مستقل ٹھکانا  
وہی ہے۔“

پھر وہ ہلکا سا قندہ لگا کر جیب سے لہجہ میں بولے ”دلیہ۔۔۔  
آپ کی بات ہے مسٹر چوہدری! آپ خود بھی کچھ کم خطرناک کچھ کم  
پراسرار آدمی نہیں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کی فائل مکمل  
ہو جائے، ہمیں ایک بار پھر آپ کے ساتھ ایک تفصیلی میٹنگ کرنا  
پڑے گی۔ اس وقت تک کے لیے ہم نے آپ کو آزاد چھوڑا ہوا  
ہے۔“

”میں تو آزاد رہ کر بھی آپ کے ہاتھوں گرفتار ہوں جناب!  
ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، دستیاب ہوں۔ جہاں حکم  
فرمائیں گے چلا آؤں گا۔ بلکہ ہوں گے سر کے بل چلا آؤں گا۔“  
میں نے بھی انہی کی طرح غیر واضح لہجے میں کہا ”فائل تیار کرانے کا  
ثبوت بھی آپ کا اپنا ہی ہے ورنہ میں نے تو عرض کیا تھا کہ جو پوچھنا  
ہے مجھ سے پوچھ لیجئے۔ جو دستاویز جو ثبوت طلب فرماتا ہے مجھے حکم  
کیجئے میری زندگی میں کوئی راز نہیں۔“

”مسٹر چوہدری!“ ان کے لہجے میں ان کی مخصوص سنجیدگی  
لوٹ آئی ”میرے خیال میں یہ دعویٰ کسی شخص کو نہیں کرنا چاہیے  
کہ اس کی زندگی میں کوئی راز نہیں۔ ہر حال ہم مناسب وقت آنے  
پر مزید باتیں کریں گے۔ فی الحال آپ کے لیے میرا مشورہ یہی ہے  
کہ قتل اور مار دہ باز میں اپنا ہاتھ زور لگایا ہی رکھیے، خواہ آپ کو  
یقین بھی ہو کہ آپ کا قتل مقابل قاتل، دہشت گرد، تحریک کار،  
سازش یا آپ کے خون کا پیاسا ہے اور آپ اپنے دفاع میں اسے  
قتل کر رہے ہیں۔ قتل ہر حال قتل ہے، خواہ وہ کسی کا بھی ہو۔ یہ  
فیصلہ تو ہم میں ہونا ہے کہ وہ جائز تھا یا ناجائز۔ اس سے بچنے کی  
کوشش کیا کریں کچھ کام قانون کے لیے بھی چھوڑ دیں۔“

”بہت عمدہ نصیحت ہے۔“ میں نے ملا خمت سے کہا ”ارباب  
افتخار اپنے محفوظ کمروں میں بیٹھ کر اکثر یہ نصیحت کرتے پاتے  
جاتے ہیں۔ آپ کا مطلب ہے کہ آئندہ جب کوئی مجھ پر گولی چلائے  
تو میں ایک ہاتھ سے گولی کو بچھ کر دوں اور دوسرا ہاتھ اس کی ٹھوڑی  
کو ٹاٹے ہوئے درخواست کروں، بھائی صاحب! زورادو سری گولی  
چلانے کا پروگرام ملتوی کر لیں۔ پہلے میں پولیس کو اطلاع دے

اس وقت کسی اور طرف تھاجے یا دیر تا تھا کہ اس نے کسی دوست مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ ستم غریبی یہ تھی کہ شرم میں کیدنگ گاڑیوں کی تعداد بہت کم تھی اور تین دن سے وہ لوگ ایک مشروف اداکار کی گاڑی چڑائے ہوئے تھے مگر وہ پکڑی نہیں گئی تھی۔ ان حالات میں کیا امید رکھی جاسکتی تھی؟

”یہ سراغ کوئی سراغ نہیں ہیں مسٹر بار!“ میں نے قدرے باپوسی سے کہا ”مطلب یہی ہوا کہ ہم ایک بار پھر بند گئی میں ہی کھڑے ہیں۔“

”نہیں کیا کہہ سکتا ہوں جناب!“ وہ جھیم لیے میں بولا ”مجھے آرزو ملا تھا کہ ان باتوں سے آپ کو بھی مطلع کروں۔ سرحال اس سلسلے میں تفتیش تو جاری رہے گی۔ اگر کوئی خاص بات معلوم ہوئی تو میں آپ سے پھر رابطہ قائم کروں گا۔“

”شکریہ“ میں نے کہا اور اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریپورر دیکھ کر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ تفتیش سے کوئی اسی قسم کی ستم غریبانی ہی صورت حال سامنے آئے گی۔ اسی لیے میں نے ان بد معاشوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی۔ ان کے ہلاک ہونے کے بعد جب میں نے ان کا جائزہ لیا تھا مجھے تبھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پیشہ و قاتل اور بد معاش ہوں گے گاڑی کے بارے میں بھی کوئی مجھے یہ تو اس وقت یاد نہیں آیا تھا کہ وہ فلاں اداکار کی ہو سکتی ہے لیکن یہ اندیشہ ضرور محسوس ہوا تھا کہ وہ چوری کی ہوگی۔

اصل کام کی چیز اس وقت بھی بلیک بڑی تھا۔ وہ ہاتھ آجاتا تو شاید کوئی فائدہ ہوتا لیکن وہ بھی بے زبان تھا۔ اور سرحال بیوان تھا۔ معلوم نہیں اس سے کوئی بات جاننے میں مدد مل سکتی تھی یا نہیں؟ تعداد سے بھی ظاہر ہے اس کی زبان تو نہیں کھلوانی جاسکتی تھی۔ وہ تو ہماری بے زبان۔ لیکن وہ ہر بات پختہ سمجھتا تھا، سبھی اسے اچھی خاصی فطرتاً سمجھتا تھا۔ پر بھیجا جاتا تھا اور وہ پختہ کسی طریقے سے یا اشاروں وغیرہ سے اپنی بات بھی سمجھاتا ہوگا۔ میرا اندازہ تھا کہ جو وہ بد معاش میرے اور احمد کے ہاتھوں مارے گئے تھے، بلیک بڑاؤن کی مدد کے لیے ان کے ساتھ نہیں تھا بلکہ اُنٹا وہ بلیک بڑاؤن کا تختی میں اس کی ہدایات کے مطابق کام کر رہے تھے۔ بارے نے ابھی ابھی خون پر ان دونوں بد معاشوں کا جو پس منظر بتایا تھا اس سے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ہاں کے حالات سے بہت ہی زیادہ واقف تھے اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی خوب جانتے تھے۔ یہ وہی سادی دہشت گردی کی کارروائیوں کے لیے وہ مقامی بد معاشوں، قاتلوں، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی خدمات حاصل کرتے رہے ہوں گے۔

اس قسم کے عناصر جن کے ٹھکانوں تک ہماری پولیس اور خفیہ اہلکاروں کی رسائی نہیں تھی، ان سے ریڈ ڈاٹ بوقت ضرورت رابطہ کر لیتی تھی اور معاوضے پر یا پکے اور شرارت کے تحت

ان کی ذمہ داریاں مقررہ گرتی رہتی تھیں۔ آپ چاہیں تو انعام بھی کسکتے ہیں۔“ بار بولا۔

”خدا کی پناہ! میں نے سوچا“ میں کیا جانا چاہ رہا ہوں اور انہیں انعام کی پکڑی ہوئی ہے۔“

غیر ارادی طور پر میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا ”آپ انعام کو گولی مار سیتے۔ یہ بتائیں ان کے بارے میں مزید کیا معلوم ہوا؟“

”کسی زمانے میں ان کا تعلق اسمگلروں کے ایک بہت بڑے گروہ سے تھا اور اس گروہ کے روابط انٹرنیشنل ڈرگ مافیا سے تھے لیکن پھر حکومت کی ایک ٹیم کے دوران وہ گروہ ختم ہو گیا۔ کچھ لوگ غائب ہو گئے اور کچھ مارے گئے جو لوگ غائب ہوئے تھے، یہ دونوں ان میں شامل تھے مختلف رپورٹوں اور تفتیش وغیرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے یا قاعدہ کا زلی اور اجرت پر ہر قسم کی دہشت گردی شروع کر دی تھی۔ قتل کی کئی سٹاکاؤں و وارداتوں میں بھی وہ پولیس کو مطلوب تھے۔“

”یہ بتائیے کہ ان کی مدد سے ریڈ ڈاٹ کا کوئی سراغ ملا یا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ریڈ ڈاٹ؟“ بار نے یوں دہرایا جیسے یہ نام پہلی بار سن رہا ہو پھر جلدی سے انگریزی میں بولا ”نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی اور نہ ہی ان کے کسی ساتھی کا سراغ ملا ہے کہ تفتیش آگے بڑھ سکے۔ درحقیقت ساری بات ان کی موت پر انکر رک گئی ہے۔“

”میرا دل کہتا ہے کہ ریڈ ڈاٹ سے قتل رکھنے والا کوئی ذی روح زندہ حالت میں ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکے گا اور یوں کم از کم آپ لوگوں کے لیے یہ تنظیم بدستور ایک مٹا اور ایک ناقابل یقین سی چیز بنی رہے گی۔“ میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

”جی! کیا مطلب؟“ میری بات گویا اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ معلوم نہیں اس کی ذہنی کمزوری تک محدود تھی اور اسے کس حد تک معلومات تھیں یا کون سی چیزیں اس کے دائرہ اختیار میں آتی تھیں اور کون سی نہیں۔

چنانچہ میں نے جلدی سے کہا ”اس بات کو چھوڑیے، بتائیے اس گاڑی سے کوئی سراغ ملا جو جانے کو تھوڑے پرانے تھی؟“

”جی ہاں“ وہ اطمینان سے بولا ”وہ ہمارے ہاں کے ایک بہت مشروف اداکار کی گاڑی تھی۔ نین موڈ قفل چوری ہو چکی تھی۔ اداکار نے اس کی چوری کی رپورٹ درج کر رکھی تھی۔“

اس نے اداکار کا نام بھی بتایا۔ وہ ہمارے ہاں کا ایک مشہور اور مقبول فلمی ہیرو تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کچھ دنوں پہلے ایک تقریب میں شرکت کے بعد اسے انٹرکان سے رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی کیدنگ میں ہی بیٹھ رہا تھا۔ اس تقریب میں اس سے رکھی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ خاصی مگر جوٹی سے ملا تھا لیکن میں ہی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا تھا۔ میرا حیران

ان کی خدمات حاصل کرتی رہتی ہوگی۔ یہی لوگ بعض اوقات قربانی کے کبرے بن جاتے ہوں گے جس طرح کئی مواقع پر میرے ہاتھوں کی بد معاشر مارے گئے تھے جو مختلف مقاصد کے تحت ریڈ واٹ کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ وہ بد معاشر اگر زندہ بھی میرے یا پولیس کے ہاتھ لگ جاتے تو ان سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو پائی۔ ریڈ واٹ یقیناً بہت محفوظ طریقے سے اس قسم کے لوگوں کو استعمال کرتی تھی۔ وہ شاید ریڈ واٹ کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتے تھے۔ ریڈ واٹ والے یقیناً ہر طرح کے مقامی عناصر سے کام لیتے تھے ہر طرح کے چکنٹروں سے اچھی طرح واقف تھے۔ دفتروں میں اعلیٰ سرکاری حلقوں میں اور نہ جانے کہاں کہاں ان کے ایجنٹ موجود تھے۔

میں جیوان تھا کہ یہ سلسلہ کب سے چل رہا تھا؟ کس طرح چل رہا تھا؟ کوئی بھی ارادہ کوئی بھی حکم اب تک کیوں اس کے بارے میں پوری طرح جو کچھ نہیں ہو سکا تھا؟ اور اگر اب میں اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا تو حکومتی مشینری کیوں پوری طرح حرکت میں نہیں آ رہی تھی؟ کیوں وہ لوگ صحیح طور پر احساس نہیں کیا رہے تھے کہ کتنا بڑا فتنہ ہمارے قومی وجود میں جڑیں گاڑ چکا تھا؟

آٹا میری طرف شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس سے بھی مجھے اپنی سچائی ثابت کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں مل رہی تھی۔ میں تو قدرے باپوسی سے سوچنے لگا تھا کہ واقعی اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا کوئی بندوبست ہو بھی سکے گا یا نہیں؟ ابھی تو پوری طرح کی واضح نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی جڑیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں؟

مجھے اپنی جان کی اپنے مالی نقصانات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ اگر افسوس تھا تو صرف ان لوگوں کا جو میری وجہ سے جان سے ہار رہے تھے یا کوئی نقصان اٹھا رہے تھے لیکن میں ان خدمات کو بھی بھلانے کی کوشش کر سکتا تھا بشرطیکہ مجھے ان کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد ہوتا دکھائی دے۔ یہ احساس ہوا کہ ان قربانیوں کا جلد ہی اس ملک کو اور یہاں کے بے خبر لوگوں کو کوئی بڑا فائدہ پہنچنے والا فائدہ حاصل تو ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

بہر حال میں نے اپنے آپ کو سمجھا کہ فیثوں کے صلے کی توقع صرف دنیا والوں کی طرف سے ہی نہیں کسی اور طرف سے بھی رکھنی چاہیے تھی۔ میں نے باپوسی کو اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کی اور جانے کے لیے آٹھ گھنٹہ پوری عمارت میں طاکا سکوت طاری تھا۔ میں نے چڑا بیوں تک کو بھیج دیا تھا، صرف تین گھنٹہ پہلے عمارت کے کمپائٹر میں بیویوں کی طرح ادھر ادھر ہار رہے تھے میں نے خود ہی آٹھ کرلائش وغیرہ آف کیوں اور ”دواہ متقل کرنا“ ہوا یا برآیا۔

مجھے آنکڑی میں بیٹھے کے بعد کئی لمبے لمبے سوچا رہا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے؟ دیکھتا تھا تو اس شر میں میرے پیٹھوں ٹھکانے تھے۔ سوچتا تھا تو اپنے آپ کو بہت بے ٹھکانا سا محسوس کرتا تھا۔ آج تک میں نے بہت سے لوگوں کو ٹھکانا فراہم کیا۔ تھا لیکن آج خود اپنے بارے میں فیصلہ نہیں کیا رہا تھا کہ مجھے کس ٹھکانے کی طرف جانا چاہیے۔ فکر صرف اسی بات کی تھی کہ میری وجہ سے کیس کوئی تاحی نہ آئے۔ آخر کار میں نے راجیلہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کم از کم میرے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو کر کسی بھی ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کر سکتی تھی۔

میں اس کے ہاں پہنچا تو میری کال بیل کے جواب میں اس نے خود آنکڑیٹ کھولا۔ گیٹ کی پرل سے بھاگ کر پہلے اس نے اطمینان کیا تھا کہ آنے والا کوئی انہی نہیں۔ وہ اس وقت ڈھیلی ڈھالی پورا لہجے میں حیرانہ شرت اور نراؤڑ میں تھی جس کی وجہ میں یقیناً ہائل موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی لیکن آنکھوں نے اس مسکراہٹ کا کچھ زیادہ ساتھ نہیں دیا۔ وہ یقیناً افسردہ تھی۔

افسردگی صرف اس کی آنکھوں میں تھی اور بہت جلدی تھی۔ کسی اور کو شاید اس کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن اس کے اندر کا موسم میری آنکھ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی افسردگی کی وجہ میں ہی تھا۔ دل چاہا اگلے قدموں لوٹ جاؤں لیکن اس کے لیے مجھے کوئی جواز پیش کرنا پڑتا ہے شاید وہ قبول نہ کرتی۔ مجھے احساس ہوا کہ اسٹوڈیو میں ساتھ کی موت والے واقعے کے بعد سے اس نے مجھے فون بھی نہیں کیا تھا ورنہ ان میں کم از کم ایک بار وہ مجھے کہیں نہ کیس تلاش کر کے فون پر بات ضرور کرتی تھی۔

میں گاڑی پوسٹ میں لے آیا تو اس نے گیٹ منتقل کر دیا اور میرے ساتھ ساتھ اندر بولی دواؤں سے تک آئی۔ دواؤں سے پر رک کر میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا ”اواس ہو؟“

”تم سے کس نے کہا؟“ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

”تمہاری آنکھوں نے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آنکھوں کا زیادہ اعتبار نہ کیا کرو۔ آنکھیں دھوکا بھی کھاتی ہیں اور جھوٹ بھی بولتی ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”دھوکا شاید کھا جاتی ہوں لیکن جھوٹ نہیں بولتیں۔ جھوٹ بولنے پر انہیں مجبور کیا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا اندر چلو۔“ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولی ”بند دواؤں کے سامنے کھڑے ہو کر قلعہ نہیں بھاڑا کرتے۔“

”کیوں؟ کیا دواؤں سے ٹھکنے سے انکار کر دیتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر دواؤں کے کان اور آنکھیں ہوں تو شاید وہ واقعی بعض موقعوں پر ٹھکنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر دواؤں تو دل کا دواؤں نہیں ہوا۔“ اس نے آگے بڑھ کر دواؤں کھولا اور شامی دہان کی طرح جبک کر کورٹش بجا لاتے ہوئے بولی ”تشریف

مجھے بتایا کہ وہ کچھ خوش نہیں تھا۔

میں نے ہنسنے کہا کہ پہلے کھانا کھایا جائے پھر اسے گھر لے کر  
کوشش کی جائے۔ میں نے اسے اپنی ایک ڈبلی کنسرکشن کپڑی کا  
ڈائریکٹر بنایا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں ابھی تک مجھے کوئی  
رپورٹ نہیں دی تھی، مجھ سے کوئی بینک نمبر کی تھی۔ وہ  
کنسرکشن کپڑی پہنے بھی کچھ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ میرا خیال  
تھا کہ وہ ایک نوجوان خوش اور باصلاحیت لڑکا تھا۔ اس میں کئی  
زندگی بھونک دے گا۔ لیکن اس نے مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا  
تھا کہ خارج لینے کے بعد اس نے کس حد تک کپڑی کے سیٹ اپ کو  
سمجھا تھا، وہ اسے کس طرح چلانے کا ارادہ رکھتا تھا اور کن کن  
مسائل کے سلسلے میں اسے مدد کی ضرورت تھی۔ کپڑی اس کی  
تحویل میں جانے کے بعد سے مکمل سکوت طاری تھا کپڑی میں بھی  
پریشان رہا تھا کہ دوبارہ معاملات کی طرف مائل رہا تو وہ نہیں دے  
سکا تھا لیکن بیشتر معاملات ایک خود کار نظام کے تحت چل رہے  
تھے۔ اس نظام کے تحت بھی کنسرکشن کپڑی کی تو کوئی ناکل میرے  
سامنے آئی ہی نہیں تھی۔ کپڑی کا کام گوا دیں کا دیں کرنا ہوا تو  
جہاں میں نے راشد کے سپرد کیا تھا۔

کھانے اور کافی کے بعد راشد نے جب سے سرکٹ کا پیکٹ  
نگلا اور مجھے بھی آفری۔ میں نے انکار کرتے ہوئے اپنی خفیف و  
حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا "تم سرکٹ پہننے لگے ہو؟"

"میں ایسے ہی کبھی کبھار تھوڑی بہت لی لیتا ہوں۔" وہ ذرا  
کھینچنے سے انداز میں بولا۔ میں نے اسے کوئی نصیحت وغیرہ نہیں  
کی، بس گہری فکر سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ یہ گویا اس کے  
مضطرب، نا آسودہ اور پریشان ہونے کی نشانی تھی۔ وہ ایک صاف  
سترا، آسارٹ اور ایک لڑکا تھا۔ میں نے پہلے اسے اس قسم کے  
معنوی سامروں کا مشاخی نہیں دیکھا تھا یہ کچھ اچھی تہذیبوں کے  
آثار نہیں تھے۔

کھانے کے بعد کچھ دیر گپ شپ ہوتی رہی جس میں راشد نے  
کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ زیادہ تر وہ کھوٹے کھوٹے سے انداز میں  
مسکراتا رہا۔ آخر کار میں نے راجیل سے کہا "تم کہہ رہی تھیں کہ  
جس میں مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ ہم ضروری باتیں ہی تو کر رہے  
ہیں۔ میری فکر میں تو یہ گپ شپ، چمپڑ جھاڑ، خنجرے بازی ہی  
تھوٹو ہوئی ہے۔ کا دوبارہ باتیں تو مجھے بہت خیر انہم اور مزاحیہ  
ہیں۔"

پھر اس نے دوبارہ وہی نظروں سے راشد کی طرف دیکھا۔ مجھ  
محسوس ہوا کہ وہ حقیقت وہ اسی کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا  
تھا یا پھر شاید وہ چاہتی تھی کہ راشد خود ہی بات شروع کرے  
وہ بھی خاموش تھا۔

آخر کار میں نے جو بھی بات برائے بات کے انداز میں راہ

لائی۔

اندر پہن کر میں نے پوچھا "یہ تم آج اتنی سنجیدہ کیوں ہو؟"  
"انسان کو کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہونا چاہیے۔ ویسے بھی اپنے  
خیال میں تو میں اکثر ہی سنجیدہ ہوتی ہوں۔ میں کوئی مسخری تو نہیں  
ہوں۔" وہ نہایت سنجیدہ ہی صورت بنا کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی  
اور ایک ننگی ہری طرف دیکھنے لگی۔

"واپس چلا جاؤں؟" میں نے بھی بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔  
"مگر واپس جانے کی کوشش کی تو میں پڑوسیوں سے گئے  
اُدھار مانگ کر تم پر چھوڑ دوں گی۔ اچھا ہوا تم آگے۔ میں تو خود  
جسیں بلانا چاہ رہی تھی۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔ لیکن  
سارا دن طبیعت کچھ ایسی ڈل رہی کہ فون تک کرنے کو بھی نہیں  
چاہا۔ بستر میں دبی رہی، زیادہ تر سوئی رہی۔ اب سوچ رہی تھی کہ  
دن سو کر گزارا، رات جاگ کر گزارنی پڑے گی۔"

"چلو میں تمہارا رات جگا آسان بنانے کے لیے آیا ہوں۔  
میری شکل دیکھ کر ویسے ہی تمہاری رہی سہی نیند بھی آگئی ہوگی۔"  
میں نے ہنسنے ہوئے کہا۔

"خیر اب ایسی ڈراؤنی شکل بھی نہیں ہے تمہاری۔" وہ ٹھنڈی  
سانس لے کر بولی۔ وہ اپنی خوش مزاجی کو آواز دینے کی کوشش  
کر رہی تھی "نی الحال ان فضول باتوں کو چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ میرے  
مغز کے علاوہ کیا کھانا پسند کرو گے؟ کھانا کھایا ہے یا نہیں؟"

"کھانے والے کا آج کل کوئی خاص ہوش نہیں۔ یاد رہی نہیں  
رہتا کہ کھانا کھایا نہیں؟ کبھی کھانے کی جگہ بے خیالی میں صرف پانی  
پی کر اطمینان ہو جاتا ہے اور کبھی پیاس لگتی ہے تو کھانا کھانے کا  
خیال آ جاتا ہے۔ کچھ عجیب سے دن ہیں۔"

"میرا خیال ہے کھانا کھانا جائے۔" اس نے میرے غیرواضح  
جواب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جو درست تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں  
چل گئی اور چھ منٹ بعد ہی اس نے مجھے آواز دے لی۔ میں ڈائرینگ  
روم میں پہنچا تو میز پر سادہ سا کھانا تھا ہوا تھا گراس کی خوشبو سوگند کر  
فورا ہی میری ہموک جاگ اٹھی۔

"میں ذرا اس خنجرے کے کچھ کھائی ملا دوں۔ اپنے کمرے میں پڑا  
بند ہو رہا ہے۔" وہ دواڑے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"خنجرے؟" میں چونکا "وہ کون ہے؟"

"راشد اور کون۔" وہ گہری سانس لے کر بولی اور دوسرے  
کمرے میں چل گئی۔

چند لمبے بعد وہ واپس آئی تو راشد اس کے ساتھ تھا۔ میری  
خامی دلوں بعد اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ مجھے کچھ بدلا بدلا  
ساگ رہا تھا۔ بال کھڑے ہوئے تھے اور لباس ٹھنک آلود تھا۔ وہ  
کچھ شست دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں راجیل  
بھی اسی کی وجہ سے تو کچھ پریشان نہیں تھی؟ وہ خامی گر بخوشی سے  
مجھ سے ملا، مسکرا بھی رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرے دل نے

کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور بزرگوں کی نظر میں وہ مسئلہ قطعی غیر اہم اور فضول سا ہو۔

میں نے دوبارہ راشد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں چو تکہ باس نہیں ہوں اس لیے میں تمہیں کوئی شو کاؤز فروش نہیں دوں گا اور نہ ہی تمہاری کوئی باضابطہ اور دفتری قسم کی ایکسپلےیشن کال ہوگی۔ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کہ جوات دل میں ہے وہ کہو۔ زیادہ وضع واریں کر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ ایسا کھو فارسید کروں گا کہ آڑے ہونے باہر لان پر پہنچ جاؤ گے۔ اس کھڑکی کے راستے۔" میں نے اشارے سے بتایا۔

را حیلہ نے تقریباً "بلکہ لان پر سفیدے کا جو درخت ہے اس میں جاٹھو گے اور صبح تک جھولا جھولے ہو گے درخت سفیدے کا ہے نہیں تمہیں اتارا جائے گا تو تمہارا رنگ نکلا ہو گا۔"

راشد نے رحم طلب سی نظروں سے بڑی بسن کی طرف دیکھا "گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہ رہا ہو" "جانی! ابھی تو میرے مسائل کو سمجھدی سے کھینچنے کی کوشش کیا کریں۔"

اس نے ایک بار پھر کھٹاکر کر گھا صاف کیا اور نئی سگریٹ ملٹانے کے لیے پکٹ سے نکالا۔ میں نے وہ سگریٹ اس کے ہاتھ سے لے کر موند کر دیں ایلٹل ٹرے میں ڈالتے ہوئے کہا "سگریٹ پر سگریٹ پیٹنے سے تو مسلہ پیدا نہیں ہوتا۔ حوصلہ ہر شریف اور دانتدار آدمی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ بس وہ ادھر ادھر کیس دل کے کسی اندر میرے گوشے میں دھکا بیٹھا ہوتا ہے۔ اسے ڈھونڈ کر باہر لانا پڑتا ہے۔ سگریٹ کی مدد کے بغیر ہی بولو مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے گہری سانس لی۔ شاید اسے دل کے کسی گوشے کے کھد رے میں دبک کر بیٹھے ہوئے حوصلے کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ سر اٹھاتے ہوئے بولا "اُنی بھائی! آپ کی کنسرکشن کمپنی تو بالکل بیٹھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ کے گروپ آف کمپنیز میں یہ سب سے چھوٹی کمپنی ہے اور سب سے زیادہ خسارے میں جاری ہے۔ حالانکہ کنسرکشن سب سے زیادہ منافع بخش فیلڈ ہے۔"

"بالکل درست کہہ رہے ہو تم۔" میں نے سر ہلایا۔ "آپ کی اس کمپنی میں بہت کچھ ہے۔ یہ کام ہی کچھ ایسا ہے۔ آپ لاکھ لاکھ کوشش کریں کیسا ہی سخت سے سخت نظام بنائیں، اس میں گھمپوں کی گھٹائیں رہتی ہے۔ چنانچہ بہت سے کھیلے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ کمپنی کی کرنٹنٹ بچی ہے۔" وہ بہت اٹک اٹک کر بول رہا تھا جیسے کراؤی گولیاں نکل رہا ہو۔

"مجھے معلوم ہے یہاں کھیلے ہوئے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کمپنی کی کرنٹنٹ بچی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "اور آپ نے اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"میرے چند! ان گھمپوں کو روکنے اور کمپنی کی ٹوٹی ہوئی کر کو جوڑنے کے لیے ہی تو میں نے تمہیں کراچی سے بلایا ہے۔ تم کس

بچہ! جیسی وہ کیسی جا رہی ہے تمہاری کنسرکشن کمپنی؟ ہے ہائیڈرو پمپ ہے یا فوٹو کھینچی؟ تم نے تو اس کے بارے میں کوئی خبر گیری نہیں دی۔" میں نے اپنا صوبہ قطعی دوستانہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور صدقِ دل سے چاہا تھا کہ میرے انداز میں کسی بھی قسم کے "باس" کی ذمہ داریاں بھی جھٹک نہ آئے ہائے۔

راشد کو جیسے کچھ حوصلہ ملا۔ وہ کھٹاکر کر گھا صاف کرتے ہوئے بولا "اُنی بھائی! وہ دراصل میں چاہ رہا تھا کہ آپ مجھے..... میری ہونے والی نوکری پر کراچی واپس بھیج دیں۔"

میں ایک منٹک اس کی طرف دیکھتا نہ گیا۔ کہنے میں ایک لمحے کے لیے کھرا سکوت چھا گیا۔ را حیلہ نے شاید اس سکوت کے جو جملے اپن کر محسوس کرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور معمولی جھانک سے بولی "دراصل راشد بے چارے کی اوقات بہت چھوٹی ہے نا، اسے باس بنانا اور کنسرکشن بنانا کچھ راس نہیں آتا۔ یہ خوش نہیں ہے۔ یہ ہائیڈرو پمپ کی نوکری میں زیادہ خوش تھا۔"

"حیرت ہے!" میں نے دیکھتے لیے میں کہا "میرا خیال ہے یہ اس ملک کا واحد نو جوان ہے جو ایک بہت بڑے اور تقریباً خود مختار عہدے کے بجائے اس سے کہیں چھوٹے عہدے پر زیادہ خوش

میں نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے گہری نظر سے راشد کی طرف دیکھا۔ وہ نظر اُٹھار رہا تھا اور اس کی جن اظہار میں سگریٹ دہلی ہوئی تھی ان میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ میں نے گہری سمجھدی سے کہا "راشد! ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ صاف صاف اور سچ سچ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟ میں یہاں بیٹھا ہوں اس کی حیثیت سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے بڑے بھائیوں کی طرح یا ذرا بڑی عمر کے دوستوں کی طرح سمجھو۔"

"مجھے آپ کے غلوں کا اندازہ ہے اُنی بھائی! اہم تو آپ کا احسان بچکانہ نہیں کہتے۔"

"یہ فضول باتیں میرے سوال کا جواب نہیں ہیں۔ احسان دیکھو کہ ہمارا میں جسے ٹھوٹ جوں میں پوچھ رہا ہوں سیدھے اور آسان ترین الفاظ میں بغیر کسی گھماؤ پھراؤ کے اس کا جواب دو۔" میں نے دو ٹوک سے کہی۔

"مسئلہ کوئی نہیں ہے اُنی بھائی! وہ مضطرب لیے میں بولا "میں جو فوٹے دار ہوں آپ نے مجھے سوچائی ہیں میں اپنے آپ کو ان کا اہل نہیں سمجھتا۔ عہدہ جتنا بڑا ہوا ہے مسائل بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ان سے منٹنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس میں حیرت ہی کیا ہے۔ میں کراچی چلا جا رہا ہوں" "جانی میں کہیں رہیں گی۔ یہ زیادہ باصلاحیت اور زیادہ مضبوط اعصاب کی اورت ہیں" ہر طرح کے حالات میں داخل جاتی ہیں۔"

میں نے را حیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ یوں دیر سے اس دی جیسے (بزرگوں کے سامنے کوئی بچہ بیٹھا سمجھدی سے اپنا مسئلہ بیان

کما "میری کہنوں میں صرف کنسر کشن کہنی غلاب ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ رہی ہے کہ اسے چلانے کے لیے مجھے کوئی سچ کوئی نہیں مل سکا۔" دوسرے میں نے اسے کسی خاص منصوبہ بندی کے بغیر یکدم شروع کر دیا تھا۔ اس کی بنیاد ہی صحیح نہیں پڑی۔ شروع ہی سے مجھے سچ لوگ نہیں مل سکے۔ اصل میں اسے شروع کرتے وقت میرے ذہن میں توڑا سالانہ تھا، شاید اسی لیے یہ زیادہ نہیں پسند سکی۔ جس کام کی میں کوئی بہت مقصد نہیں بلکہ صرف لالچ ہوتا ہے اس پر ایک عجیب سی خوشی چھا جاتی ہے جو کہنوں میں نے خالصتاً منافع کے لالچ میں قائم نہیں کیوں بلکہ ان میں توڑا بہت قیمتی مقصد بھی پیش نظر رکھا وہ... زیادہ منافع دے رہا ہیں۔ کنسر کشن میں اس نے صرف کچھ لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے دولت کمانے بلکہ ٹوٹے دیکھا۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے لوگ کہہ دیتے ہیں گئے۔ میں نے سوچا میں بھی کیوں نہ ہستی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔ حالانکہ وہ لوگ بھی لالچی تھے بلکہ بے ایمان بھی تھے لیکن وہ خوب پھل پھول رہے تھے۔ شاید انہیں حرام کی دولت داسی تھی، مجھے داس نہیں تھی۔ یا شاید انہیں کہیں آگے جا کر جھکا لگے گا۔ مجھے شروع میں ہی لگ جاتا ہے جب سے میں راہ راست پر آیا ہوں مجھے لالچ داس ہی نہیں آتا۔ اگر میں اس کہنی کے مقاصد میں بھی کوئی توڑا بہت قیمتی مقصد سامنے رکھ لیتا، قہرانی کہنی میں واقعی توڑی سی قہیر بھی لے آتا۔ مثلاً یہ سوچ لیتا کہ ہر سال میں کچھ کم آمدنی والے لوگوں کو بلا منافع یا کم منافع پر اور آسان شرائط پر کچھ مکانات قہیر کر کے دیا کروں گا تو شاید یہ کہنی خوب پسند جاتی، اس کے کام میں برکت ہو جاتی اور اسے ایماندار کارکن بھی میسر آجاتے۔"

راجہ مسکرائی اور سہلاتے ہوئے بولی "ماشاء اللہ بڑے صوفیانہ خیالات ہیں۔ تمہارا نام تو محمد افضل چوہدری کے بجائے محمد افضل صوفی ہونا چاہیے تھا۔"

"خیراب میرا درجہ اتنا بلند بھی مت کرو۔ میں تو کسی صوفی کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہوں۔ میں تو بڑا دنیا دار آدمی ہوں لیکن چند برسوں سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا ہے کہ دنیا دار میں بھی اگر تھوڑے سے اچھے اصول اور ایک مقاصد شامل کر لیے جائیں تو اس میں بھی بڑی برکت ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ دیکھیں بند کر کے ہر جائز یا ناجائز ذریعے سے دولت کمانے کے لیے دوا لے ہوئے رہیں، دوسرے طریقے سے ملنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ اگر یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی ہوتی تو شاید میں اتنی جلدی اتنا زیادہ دولت مند نہ ہوتا۔"

راجہ بولی "اور یہ جو تجھیں جھٹکے کٹے شروع ہوئے ہیں۔ مثلاً تمہارا اتنا شمار ارکان آؤ گیلانی بڑا نقصان تھا یہ بھی۔"

"اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ کہ میری دولت میں جو میرے دور گرامی کا ناجائز دوا شامل ہے لگتا

مرض کی دوا ہو؟" میں نے ملاحت سے کہا "دیکھو میرے بھائی! اس اتنے بڑے بزنس میں میں ہر معاملے کو خود چاکر پنڈل نہیں کر سکتا، ہر جزو کو خود چاکر چیک نہیں کر سکتا۔"

"دوست ہے" اس نے تسلیم کیا "میں نے جب سے چارنگ سنبالا ہے تب سے میں صرف ہی کام دن رات کر رہا ہوں کہ ہر چیز کو کھال دبا ہوں، خرابی کو کھینچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ قدم قدم پر میری راہ میں مدد کے انگائے جا رہے ہیں اسی لیے میں ابھی تک آپ کو کوئی رپورٹ نہیں دے سکا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تم یہ رپورٹ تو دے سکتے تھے کہ تم رپورٹ کیوں نہیں دے سکتے۔"

"میں خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔" وہ بولا "میں نے محسوس کیا کہ اگر مجھے اس کہنی کو چلانا ہے تو مجھے نہ جانے کتنے لوگوں کی خالصتاً مول لینا پڑے گی اور اس پھر میں مجھے کوئی اچھا صلہ یا نیک نامی ملنے کے بجائے رسوائی نہ ملے۔ دفتری سیاست بڑی عجیب ہوتی ہے۔ بعض اوقات بد عنوان اور سازشی لوگ مالک کے جیتے بن جاتے ہیں اور ایماندار کارکن معوق ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن ایک اصول پیش یاد رکھنا۔ بلکہ اس پر اپنا ایمان مضبوط کر لو کہ حالات خواہ کتنے ہی خراب نظر آئیں، ظلم، جھوٹ اور خرابی خواہ کتنی ہی غالب ہو جائے لیکن آخری نتیجہ ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ چلو کہ جی جھوٹ کو شکست دے سکو گے ورنہ راستوں کی دھول بن کر دوا کے ساتھ آؤ جاؤ گے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا اس کا ذہن توڑا سا صاف کر دی دیا جائے مجھے اس کو کچھ سمجھانے کا وقت نہیں ملا تھا اور میں نے ایک مشکل کام اس کے سر پر ڈال دیا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "جسیں شاید اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ میرا کاؤدار خاصا وسیع ہے اور بڑی عمدگی سے چل رہا ہے۔ اس میں برائے نام کرپشن ہے۔ بلکہ مجھے ایک انفرادیت یہ بھی حاصل ہے کہ مجھے بڑے جاں نثار کارکن میسر ہیں ورنہ مالک اور کارکن کا رشتہ بڑا نمایاں اور ہوتا ہے۔ کہیں دوسرے پچھوا زیادہ ملے تو ملازم، ملازمت چھوڑ کر چل ویسے ہیں لیکن میرے ہاں سے کوئی دنگی پچھوا پر بھی کہیں نہیں جائے گا اور ضرورت پڑنے پر میرے پیسے کی جگہ خون بھی بہانے کے لیے تیار نظر آئے گا۔ کاؤدار کو اس مقام تک لانے میں مجھ ایکلے کا کوئی کمال نہیں۔ میری خوش قسمتی کی تھی کہ میں جو بھی ذیلی ادارے قائم کرتا چلا گیا انہیں چلانے کے لیے مجھے اچھے سامعین ملنے پڑے۔ میری ہر ذیلی کہنی کا سربراہ اس کہنی کو اسی طرح چلا رہا ہے کہ جیسے اس کی کرسی پر وہ نہیں بیٹھا ہوں، میرے تمام اختیارات اسے حاصل ہیں، میرا فائدہ اس کا فائدہ ہے اور میرا نقصان اس کا نقصان ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر میں نے مہر کی سانس لے کر



اختیارات دے دیے جائیں تب بھی تم ان سے استفادہ کرنے کی جرات نہیں کر پاتے۔"

"وہی تو میں عرض کرنے لگا ہوں۔ میں نے لوگوں کو ملازمت سے نکلنے یا انہیں ٹھیک ڈالنے کے سلسلے میں تو نہیں اہلہ کسی اور طرح سے اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کی کوشش کی تھی تب بھی ایک جگہ جا کر گرفت انگ مٹی۔"

"وہ کہاں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ ملازمین میں ٹھیکہ چانے کے بجائے کچھ انقلابی اقدامات کر کے اور کچھ منافع بخش پروڈیکٹ شروع کر کے کمپنی کو سنبھالنے کی کوشش کی جائے لیکن کمپنی کی حالت چونکہ اچھی نہیں ہے اور اس کے پاس اپنا کوئی ریزرو کیکل نہیں ہے، بینک اسے لون دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور بعض اوقات تنخواہیں تک لینے کے لیے اسے ہیڈ آفس سے سب سڈری ملنی پڑتی ہے اس لیے کمپنی کے اپنے مل بوتے پر کوئی پروڈیکٹ شروع نہیں کیا جاسکتا۔"

"درست ہے" میں نے سر ہلایا "میں نے کمپنی کے تازہ ترین حسابات نہیں دیکھے لیکن جیسے اندازہ ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ درست ہے۔"

اس تصدیق سے اس کے چہرے پر طمانیت بڑھ گئی اور وہ زیادہ اعتماد سے بولا "چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے مدد کے لیے آپ کے ڈائریکٹر فنانس سے رجوع کیا۔ پورے گروپ آف کمپنیز کے ڈائریکٹر آف فنانس چرنگ ایک ہی ہیں اور وہ بڑی توپ چیز ہیں چونکہ وہ اتنے بڑے گروپ کے فنانسز کو اکیلے ڈیل کرتے ہیں اس لیے بعض اوقات سسٹم کمپنیوں کے ڈائریکٹر کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ گویا ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہیں اور کادو بار کی شے رنگ ان کے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ داخلی توپ چیز ہیں۔ بہت سینئر آدمی ہیں۔" میں نے ملامت سے کہا "وہ تو ایک انٹرنیشنل بینک میں بہت بڑے عہدے پر تھے۔ یوں سمجھیں میں نے انہیں بڑی مشکل سے وہاں سے تولا ہے کیونکہ وہ بڑے کام کے آدمی تھے۔ بڑے بڑے کاروباری لوگ ڈائریکٹر فنانس کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھتے اور عام طور پر اس ریٹ پر لوگ کرپٹ ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے سلیکٹ صاحب کرپٹ نہیں ہیں۔ انہیں علم نہیں ہے اور اگر علم ہو گیا تو بہت سخت بڑا سانس کے ممکن ہے نوکری ہی چھوڑ کر چلے جائیں۔ لیکن میں ان کی لاطینی میں گویا کی بار انہیں محض بد سوسوں سے کچھ چکا ہوں اور کئی چھٹیوں سے گزار چکا ہوں۔ کبھی ان کی کوئی کمزوری نہیں پکڑی گئی۔ دولت کی بہتی ندی کے کنارے بیٹھ کر بھی اس شخص کا ایمان کبھی نہیں ڈگایا۔ غازی پر ہیڑ گار 'وانڈر بار' آدمی ہیں۔ انہیں جو مراعات حاصل ہیں انہی سے وہ ایک آٹھ بجے دولت مند آدمی جیسی زندگی گزارتے ہیں اور وہ ان پر مطمئن ہیں۔ زیادہ

بھی اس کی چھانی ہونے لگتی ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہونے لگا ہے۔ بچے کے ساتھ کھن بھی پس جاتا ہے شاید اس لیے چند بچے انہوں کی جائیں بھی چلے گئیں۔ یہ جو کنسرکشن کمپنی میں سسٹم نقصان ہو رہا ہے شاید یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یا علی ہے کہ کوئی اور بات ہو، ہم قدرت کے رازوں کو کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ دیے بھی انسانی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں۔"

پھر میں نے راشد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "کنسرکشن کمپنی کی حالت چونکہ زیادہ خراب تھی اس لیے اس میں مجھے زیادہ صلاحیت اور زیادہ مخلص آدمی کی ضرورت تھی۔ میں نے جنہیں زیادہ مخلص، زیادہ صلاحیت اور اپنا قریبی آدمی سمجھا تھا اس لیے یہ مشکل کام ہمارے سپرد کیا تھا۔ درجن میں کوئی بہت سیدھی سادی کاڑتے داری بھی ہمارے سپرد کر سکتا تھا۔ آرام سے فالکون پر دھکا کرتے ہوئے باجی دفتر میں بیٹھے اکیلے لوگ بندھی سی تنخواہ لیتے۔ اللہ اللہ خبر ملا۔ لیکن میں چاہتا ہوں تم بڑے آدمی کے بیٹے بڑے ہی کام کرو۔"

"ہاں آپ انگوں میں ہلکی سی بینک لیے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے بند دوا دواے یقیناً دھیرے دھیرے کھل رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "جنہیں وہاں اس لیے نہیں بھیجا گیا ہے کہ تم کمپنی کی حالت دیکھ کر پہلے کتب افسوس لو، پھر اپنے بال بچہ اور آخر میں جنہیں مارتے ہوئے کراچی بھاگ پڑے۔ نہیں اس کو ہر قیمت پر ٹھیک کرنا ہے۔ تم ڈائریکٹر ہو، ہمارے پاس تمام اختیارات ہیں۔ جس کو چاہے رکھو، جسے چاہو نکالو، کسی کی بے ایمانی پکڑو اس کی سازشیت یا مکاری کی پروا نہ کرو۔ اسے سزا دو۔ اس کے سارے کس علی نکال دو۔ میرا فرض ہے کہ کسی بھی ادارے کا سربراہ اگر خود واپس آئے اور اسے ہم ضروری اختیارات بھی حاصل ہوں تو وہ اس ادارے کو صحیح شکل سے دہرہ پھرہ بنا لے گا۔ وہ موقع ملنے کے باوجود زندگی میں لایا ہوا کام نہیں کر سکتا۔ وہ ذہنی طور پر چھوٹا آدمی ہے۔ اب یہ ناکارہ مرضی پر منحصر ہے کہ تم کیا بننا چاہتے ہو۔ راستہ ہمارے ماتھے کھلا ہے۔"

وہ کئی سانس لے کر تھکے ہوئے بدے بدے لیے میں بولا "چلے" جب تک میں نے آپ کے منہ سے سن لیا تو بات ذرا صاف ہو گئی۔ اب میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ وقت تو گئے گا لیکن سب کیا ہو جائے گا کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس سے آگے بھی کیا ایک مقام پر آسکتا ہوں۔"

وہ کئی سانس لے کر تھکے ہوئے کہا "تم جہاں جہاں آسکتے ہو آگے کل کرنا دو۔ میں اس وقت ذرا فرصت میں ہوں، ہمساری آگے سے دور کر کے کسی سونے کے لیے لیوں گا۔ میں تو سمجھا تھا آگے سے پہنچے ہو لیکن تم تو ابھی پہنچے ہو۔ جنہیں اگر طاقت و

ہوس میں چلا نہیں ہوتے۔

”میں انہیں ابھی زیادہ نہیں جانتا لیکن ظاہر ہے آپ کی رائے درست ہی ہوگی۔ بہر حال وہ میری پہلی ہی ناقص نوک کر بیٹھ گئے ہیں۔ آپ کے مریضوں کو بیروں پر کھڑا کرنے کے لیے تازہ خون کی ضرورت ہے اور سیلی صاحب اسے تازہ خون فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے سامنے جا کر میری ڈائریکٹر کی حیثیت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔“ راشد کے چہرے پر بے چارگی ابھر آئی۔

”میں ہنس دیا۔ راجیلہ بھی راشد کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔“ میں اتنی سی بات پر تم پریشان ہو گئے؟ ہسپتال کا اٹھا کر اپنی واپس جانے کی سوچنے لگے۔ یعنی تم تو چوبدری گروپ آف کپیز میں تھے کہ بالکل ہی اہل نہیں ہو۔“

”اسی لیے تو چھٹی مالک رہا تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”لیکن جنہیں میں گردن سے پکڑ کے لا آؤں انہیں میرے ہاں سے کبھی چھینی نہیں ملتی۔ یہاں تو لوگ گولیوں کی چھاؤں میں بھی میرے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے رہتے ہیں، پیچھے بیٹھے اور واپس جالے کا کبھی نہیں سوچتے۔ وہی لوگ میری ہر چیز کے مالک ہیں۔“ میں نے ایک نظر راجیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

”سیلی صاحب نے تمہاری پہلی ہی ناقص نوک لی تو تم پریشان ہو گئے دفتر کے چند گھانگ اور بد عنوان قسم کے کارکنوں کے چکنڈوں سے گھبرا گئے۔ یہ مسائل تو پتلے ہی رہیں گے رفتہ رفتہ تمہیں ان سے نمٹنے کا قلیقہ آجائے گا۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ راشد جلدی سے بولا ”میں تو اس چیز سے گھبرا رہا ہوں کہ کہیں آپ کو میرے بارے میں یہ تاثر نہ مل جائے کہ میں اہل بددیانت یا آپ سے غیر مخلص ہوں۔ میرے اٹھائے ہوئے کسی قدم یا میرے خلاف کئی کئی سی سازش کے نتیجے میں اگر آپ کو ایسا تاثر مل گیا اور آپ نے اس پر یقین کر لیا تو وہ میرے لیے ذوب کرنے کا مقام ہو گا۔ میں شرم سے سرخاؤں گا۔“

راجیلہ آخر کار قلم دے بیٹھنے نہ سکی۔ وہ مکرراتے ہوئے بولی، ”شرم سے مرنا بہر حال بے شرمی کی موت مرنے سے بہتر ہے۔“

میں نے اپنی توجہ راشد پر ہی مرکوز رکھتے ہوئے کہا ”تمہیں شاید یہ معلوم ہو گا کہ ہماری ایک فلم کبھی بھی ہے جس کا ڈائریکٹر اتفاق ہے اس نے بھی ابھی منافع دینا شروع نہیں کیا۔ اسے بھی بینک لون نہیں دیتے اور اسے تازہ ترین بینک بے لگاہے کہ محض مجھے شے توڑنے سے تعلق خاطر کی وجہ سے ہماری بیرونی قتل ہو گئی ہے ہماری جن فلمیں ادھر ہی چھوڑ گئی ہے۔“

راجیلہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ستارہ کے تذکرے پر وہ بغور میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ شاید کوئی تاثر تلاش کر رہی تھی لیکن میں نے اپنی ٹیس کرینے

میں ہی دبائے رکھا اور کاہویاری منتقلو جاری رکھی۔ میں حیران تھا راجیلہ خود میری بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن راجیلہ نے جراثیم اس کے ذہن میں پھر بھی پائے جاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا اس نے جب عالم خراج میں ستارہ کے ہاتھ سے لب انک سے کچھ گئے الفاظ دیکھے تھے ’اپنی اچھے بھولنا نہیں‘ تو راجیلہ کو شہید ہوا لگا تھا مگر وہ واقعی بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ بڑی صلاح سے اس جھٹکے کو سدھ گئی تھی۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ کچھ بھی ذرا احساس نہ ہونے پائے۔ ہر عورت کو عجیب ہوتی ہے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اتفاق کو کسی ہیڈ لائن میں درج کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ وہ بھی سیلی صاحب سے ملتا ہے مگر مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا۔ بلا ہی پالا اس کے کام پلٹے رہے ہیں۔ اس نے کبھی مجھ سے شکایت نہیں کی کہ اس کی کوئی ناکارہ نوک گئی ہے۔“

”یہ بد فیصلی میرے ہی حصے میں آئی تھی۔“ راشد خواہستہ آواز سے انداز میں مسکرایا۔

”میرے خیال میں اس کی صرف دو تین سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کنسٹرکشن کمپنی پہلے ہی ہمارا اثنا چوں پس دیا ہے کہ سیلی صاحب کو مزید فنڈز جاری کرتے ہوئے تکلیف دہ ہوئی۔ وہ کہا کرتے ہیں ’کنسٹرکشن کمپنی تو صرف اس صورت میں نقصان میں جا سکتی ہے کہ وہ سرکاری ہو۔ ورنہ کنسٹرکشن کمپنی کا نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب مل کر کھاتے رہیں تب وہ کچھ نہ کچھ منافع تو چھوڑ ہی جائے گی۔“ دوسرے وہ تمہاری عمری اور اس فیلڈ میں تمہاری نا تجربے کاری دیکھ کر بھی گھبرا سکتا ہوں گے۔ تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ پروجیکٹ بڑا ہو اور وہ انک اس کے اچھے برے پھلوں کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے ہوں۔ یہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ لائل روکے میں ان کی کچھ بددیانتی کو دخل نہیں ہو گا۔ دوسرے میں انہیں تمہارے بارے میں بریف بھی نہیں کر سکا۔ میں انہیں سمجھا دوں گا۔ تمہارا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمہیں اپنے مسائل کو بھی حل کرنے ہوں گے۔ ایک مضبوط اور روزنی شخصیت بن کر نا ہو گا۔“

”مضبوطی اور وزن ہی کی تو کسی ہے بے چارے میں۔“ ایک سو بیس پونڈ سے بڑھتی نہیں۔ حالانکہ خوب ٹھوس ٹھوس ٹھوس کر کھاتا ہے اور مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ ایک بار میں نے کرائے ایک ہاتھ مار دیا تھا تو بے چارہ ہتھوں دو اکائی ہاتھ کرنا تھا۔ بیسیوں ایکڑے ٹھوگائے تھے۔“ راجیلہ نے آہ بھر کر بتایا۔

میں نے راجیلہ کا سر تپا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”وزن تو کچھ تمہارا بھی اس سے زیادہ نہیں ہو گا۔ اصل وزن اور اصل مضبوطی تو انسان کے اندر ہوتی ہے نا۔“

”اس کے لیے کبھی میں اس سے بہت کہا کرتی تھی۔“

زمانے میں، میں کرائے سینئر جایا کرتی تھی، شوٹنگ بھی کرتی تھی، اس زمانے میں راشد سے بھی کما کرتی تھی، بھائی! تم بھی کچھ سیکھ لو، تم بھی جان کو ذرا تکلیف دے لیا کو شاید زندگی میں یہ چیزیں کبھی کام آجائیں۔ تو یہ کما کرتا تھا کہ مجھے مارڈن یا چیمنز باؤنڈ وغیرہ کا جانشین نہیں بننا ہے۔ آپ ہی جان کھاتی رہیں۔ اسے اپنی بڑھائی، تھوڑا بہت انگریزی باتوں کے معاملے اور آرام سے لیسٹر لٹ کر دی سی آر پر فٹنس دیکھنے کے علاوہ کسی کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ وہ راشد کی طرف دیکھ کر چلانے والے انداز میں مسکراتی تھی۔ راشد ایک گلف اسے گھور رہا تھا۔

میں نے حیرانانہ انداز میں کہا، ”جب تک کوئی چیز مزاج میں نہ ہو، کیونکہ سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔“

راشد بدستور راجیلہ کو گھورتے ہوئے بولا، ”مگر چکیں ساری برائیاں یا ابھی کوئی برائی باقی ہے؟“ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا، ”ان موصوفہ کو اپنے بارے میں بہت سی خوش فہمیاں اور میرے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ہم بھی پیچھے رہ سکتے ہیں بلکہ بقول چچا غالب۔“

بدل کر فقیروں کا ہم بھی غالب  
تاشائے اہل کرم دیکھتے ہیں  
انہی بھائی! اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی موصوفہ کی کھوپڑی پر کرائے کا ہاتھ رسید کر کے انہیں ایک پہنتے کے لیے بے ہوش کر کے دکھاؤں؟“

”بس، بس، بس“ راجیلہ ہاتھ بڑھا کر گویا اسے روکتے ہوئے بولی، ”میں مارخاں صاحب! آپ ہمیں بدل کر تاشے وغیرہ ہی دیکھتے رہیں۔ ہاتھ پاؤں چلانے کے پکڑ میں نہ پڑیں، ناک بکلیا میں سوچ آجائے گی۔“

مجھے خوشی تھی کہ راشد کی کلنگ لٹ آئی تھی اور وہ دونوں بس بھائی نوک جھونک کے موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔ راشد کی دل کلنگی اور انضباط دور ہو گیا تھا۔ میں نے زلفی کی طرح دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا، ”بس، بس، آپ دونوں ہی اپنی اپنی پڑی پہلی اور کھوپڑی وغیرہ کو سنبھال کر رکھیں اور اس پرمسکون کا وہ باری ماحول میں بلوے اور فساد کا منظر پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

پھر میں نے راشد کو مخاطب کیا، ”تم اب نئے حوصلے سے کنسٹرکشن کمپنی کو سنبھالنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟“

”ہاں میرا خیال ہے مجھے اتنی جلدی ہار نہیں مانی چاہیے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا، ”اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے تعلیمی صاحب کو جو فائل بھیجی ہے وہ بہت بڑا پروجیکٹ ہے۔“

”کیا پروجیکٹ ہے؟“ میں نے سرسری سے پوچھا۔

”ملتان روڈ پر آپ کی بہت بڑی زمین ہے جو غالب آپ نے کسی زمیندار سے خریدی تھی وہ بے کار پڑی ہے بلکہ اس پر ٹیکسوں

کی بد میں ہر سال اچھی خاصی رقم ادا کی جا رہی ہے۔ میں اس کے ایک حصے پر اوٹسک پروجیکٹ شروع کرنے کا پروگرام بن رہا ہوں۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو پھر اس پوری زمین سے بہت کچھ جاسکتا ہے۔ اوٹسک پروجیکٹ میں یہ فائدہ ہے کہ اپنی رقم بچا کر لوں بہت کم لگانا پڑتا ہے۔ جلد ہی پبلک کاڈیسائز آئے گا ہے۔“

”اوٹسک پروجیکٹ کے نقطہ نظر سے اور لاہور کے علاقے اعتبار سے وہ جگہ دور بہت ہے لیکن تم نے اگر سارے مسائل خود کر لیا ہے اور ان کا حل سوچ لیا ہے تو ٹھیک ہے، قدم بہ قدم فائنل تمہارے لیے مسئلہ نہیں بنے گا۔“ میں نے کہا۔

ایک لمبے خاموشی رہی پھر راجیلہ میری طرف دیکھ کر حیران آمیز لہجے میں بولی، ”داغ کے کیڑے جھانٹنے میں تمہارا جواب نہیں ہے۔ طبیعت صاف ہو گئی ہے چارے کی؟“

”ایک مرتبہ تمہارے داغ کے کیڑے بھی اسی طرح جھانٹتے تھے۔ اس کے بعد سے ٹھیک چل رہی ہو۔ اصل میں ابھی کچھ کام کو بھی بھیجی اور وہان تک کی ضرورت نہ پڑی ہے۔ اس کے بعد آرام سے چلتی رہتی ہیں دونہ گاڑی کے بجائے آؤٹ لائنڈ ہونے لگتی ہیں۔“ پھر میں نے خواہ مخواہ بنائی کے لے کر کہا، ”اتنی لمبی تقریر کی ہے، اب کم از کم کافی تو بولا۔“ راجیلہ نے جذباتی بیانی تو بالکل ہی اللہ کو یاد ہو گیا ہے۔

”پلو راشد! کافی بنا کر لاؤ۔ تمہاری وجہ سے اتنی کوئی تقریر کرنی پڑی ہے۔ ان کے داغ کی چوٹیں مل گئی ہیں۔ تم کو ٹھہ مفر کے ساتھ جاولڈ خیال کرنا کوئی آسان کام تو نہیں۔ راجیلہ جھکنا نہ لہجے میں بولی۔

”مجھے کوئی سرخورد والا کام بتائیے۔ یہ کافی چائے ملا۔ وغیرہ بنا، آپ جیسی سلیقہ شعار خواتین کا شعبہ ہے۔“ راشد اڑا بولا۔

”اب اٹھ جائیے جناب مراد صاحب! درنہ یہ سلیقہ خاں قانون ایسا سلیقہ کا جہان پر رسید کرے گی کہ نہایت سلیقے سے رانت باہر آجائیں گے۔“ راجیلہ نے آنکھیں نکالیں۔

”بیکوٹا چلے! راشد نے نہایت مسرت سے ہاتھ اٹھا۔

”لاؤ نہ کہاں ہے بھئی؟“ میں نے نرت سے پوچھا۔

”وہ چند دن کی چھٹی لے کر گاؤں گئے۔“ راجیلہ نے اشارے سے کہا، ”اودہ گاؤں پیارا گاؤں۔“ میں نے صفائی سے اشارے سے کہا، ”تو کرم سے اچھے ہیں، کبھی گاؤں سے آتا نہیں توڑتے۔“

راشد غالباً کافی بنانے کے لیے اٹھنے لگا تو راجیلہ ہاتھ اٹھا کر ہونے بولی، ”بس، بس، مجھے رہو۔ اس خوش فہمی میں جلا ہوئے ضرورت نہیں کہ ہم واقعی تمہارے ہاتھ کی کافی بنا جا رہے ہیں یہ رسک بھلا کون لے سکتا ہے؟ تمہارے ہاتھ کی کافی بنی کر ڈالنا کو کافی دونوں کے لیے کافی سے نفرت ہو جاتی ہے۔“

وہ کچھ میں چلی گئی اور جلد ہی پرکھ میں کافی بنا کر لے لے

لیول اٹھا اوجھا ضرور تھا کہ ہم گھنٹوں کے کئی ادھر ادھر جا سکتے تھے۔  
راجیل گھنٹوں کے کئی راشد کے قریب گئی اور ایک لمبے بعد  
اندھیرے میں اس کی تیز سسکی سی ابھری "یہ مرچا ہے۔"

مجھے اس تعذیب کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کی  
پیشانی میں سوراخ ہوتے دیکھا تھا۔ جہاں اسے گولی لگی تھی اس  
کے بعد اس کا پتلا ایک مجرہ ہی ہو سکتا تھا۔ ایک لمبے کے لمبے مجھے  
یہ ایک بھیاں خواب محسوس ہوا۔ ابھی تو وہ میرے سامنے بیٹھا  
باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اتنی داغ سوڑی سے اسے سمجھایا تھا تو اس  
کے چہرے پر زندگی کی چمک اور بشارت واپس آئی تھی۔ ابھی تو  
راجیل سے اس کی نوک جو بھوک چل رہی تھی اور اب وہ کرسی کے  
پاس ٹکڑہ پڑا تھا۔ میں اور راجیل بھی موت ہی کے زلزلے میں تھے۔  
راجیل نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں طوفان متحہ تھا۔  
اس کی حالت شجرے میں بندھ کر پھرنے کی سی تھی۔ دانت بچنے سے بچنے  
ہوئے تھے اور سانس تیز چل رہی تھی۔ ہلٹل اس کی مٹھی میں دبا  
ہوا تھا لیکن فی الحال اس کا کوئی ناکہ نہیں تھا۔ مٹھیں ہلٹل میرے  
ہاتھ میں بھی تھا لیکن آنونک گھنٹوں سے بری ہوئی گھنٹوں کے اس  
طوفان کے سامنے ان ہتھیاروں کی حیثیت گھنٹوں کی سی تھی۔  
وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی "کاش تمہارے پاس کوئی  
آنونک گھنٹا ہوئی۔"

"گاڑی میں ہے۔" میں نے جواب دیا لیکن گاڑی باہر کھلے  
میں کھڑی تھی اور کھلے میں جانا اس وقت گویا سیدھا موت کے منہ  
میں جانے کے مترادف تھا۔  
وہ گھنٹوں کے بل ٹھککتے ہوئے گھٹکی گھٹکی سی آواز میں بولی "میں  
جاتی ہوں گاڑی تک۔"

"مقات مت کرو۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔  
اس نے بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کا جسم اس وقت  
گویا فولاد تھا۔ راشد کو مرنے دیکھ کر اس کی شخصیت میں یکدم سی  
ایک عجیب سا تغیر آیا تھا۔ دوتے پھرنے اور آواز دھونے کا وہ خیرہ  
موقع ہی نہیں تھا لیکن ایسے بھی اس نے اس اچانک صدمے سے  
تھکتے خود کی اختیار نہیں کی تھی بلکہ فوری طور پر ایسا محسوس  
ہوا جیسے کسی نے اس کے اندر سوتے ہوئے کسی درد مند کو بیدار  
کر دیا تھا۔

"سنتے جھٹھوں سے مقابلے جذبات کے ذریعے نہیں ہوتے۔"  
میں نے تیزی سے کہا "تمہیں گاڑی تک پہنچنے اور دروازہ کھولنے کا  
موقع نہیں ملے گا۔ گھنٹے ویسے بھی خفیہ خانے میں ہے، تم نہیں  
نکال سکو گی۔ اور ایک آنونک گھنٹا آجائے سے کوئی فرق بھی نہیں  
پڑے گا۔"

وہ کچھ نرم پڑی۔ اس نے بازو چھڑانے کی کوشش ترک  
کر دی۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا "میں سامنے کی طرف جانے کی  
کوشش کرتا ہوں تم مین کے راستے پیچھے جاؤ اور دیکھو وہ لوگ

دکے چہرے برابر ہی طمانیت تھی، وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔  
بلنے اس کے قریب ہی کھڑے ہو کر کافی گھنٹوں میں اندھیرے  
اس نے مجھے دکھا دیا، پھر راشد کو دیکھنے لگی۔ مجھے وہ منظر پیش  
ہے گا۔ راشد شہر سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی  
پہنچنے ہوئے تک لینے کے لیے ہاتھ اٹھا رہا تھا جب تقریباً ایک  
دو چھانکے ہوئے۔

ایک چھانکا کھڑکی کا شیشہ ٹوٹے کا تھا اور دوسرا راجیل کے  
میں موجود ٹوٹے کا۔ اس کے ساتھ ہی راشد کی پیشانی میں  
خانہ لگا اور وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی لیے کرسی سمیت آگے

اگر راجیل نے بدحواس ہو کر یا غیر ارادی طور پر جذباتیت کا  
برکاک لہ بھی ضائع کیا ہو تا یا وہ راشد کو دیکھنے کے لیے لپکی  
تو دوسری گولی اس کا نوا چاٹ گئی ہوئی۔ مگر اس نے ناقابل  
ماندگائی کا مظاہرہ کیا اور راشد کو اٹھتے دیکھ کر فوراً بیٹھ گئی۔  
میں کرسی سے پھسل کر ڈانٹنگ ٹیبل کی آؤ لے چکا تھا لیکن  
بلنے مجھ سے پہلے ہی ہلٹل نکال کر کمرے میں روشن، مٹھیں  
کے گھرب کو گولی سے چکنا چور کر دیا۔ کمرے میں اندھیرا چھا  
لاؤنگ سے مدھم سی روشنی کمرے میں آ رہی تھی لیکن وہ باہر  
موجود کسی بھی شخص کے لیے ناکارگ لینے کی غرض سے ناکافی

تھیں دوسرے ہی لمبے مجھے اندازہ ہوا کہ باہر کوئی ایک آواز  
میں غلام و پیشہ ایک سے زیادہ تھے اور انہیں اب ناکارگ  
کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آنونک گھنٹوں سے اندھا کو ہند  
مٹھیں ہو گئی تھی۔ بروہہ چیز جو گھنٹوں کی دڑ میں آ رہی تھی  
کے پھٹے اڈ رہے تھے۔ دیواروں سے سینٹ کے کھڑے اڈ  
اڈ کر رہے تھے۔

گھنٹوں کی ترزاؤں اعصاب جھٹکن تھی۔ چند سینکڑ پہلے ہم  
اسے پیچھے ہٹا کر رہے تھے یکدم ہی گویا کوئی قیامت ٹوٹ  
گئی تھی اور راجیل ڈانٹنگ ٹیبل کے تقریباً نیچے ہی تھے۔  
بڑھکے میں بھی ٹک دیکھ سکتا تھا کہ اس کا چہرہ کھینچ کر رکھا تھا  
گھنٹوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

وہ گارڈ کا مکان تھا۔ صرف ایک طرف سے مکانوں کی قطار  
تھا اور تھا۔ تین طرف سے اوپن تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ان  
کی اطراف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ یکدم گویا پوری پالیسین  
ان لوگوں کو تھا اور یوں لگتا تھا کہ ان کا ارادہ صرف گھنٹوں  
نکالنے کا تھا کہ وہ سب کو دیکھ سکتا تھا کہ اس کا چہرہ کھینچ کر رکھا تھا  
انہیں گھنٹوں کو بھی بری گھنٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر  
کھنٹوں کے پھٹے اڈنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔  
میں گھنٹوں میں صرف کھڑکیوں کے راستے آ رہی تھیں جن  
میں سے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہاں کون سی تھیں۔ تاہم فائرنگ کا

صورت میں بکھر گیا تھا۔ میں اسے کھولنے کا کٹھن کیے بغیر  
سے گزر سکتا تھا۔

میں تذبذب کے عالم میں سانس روکے دوار سے باہر  
تذبذب بڑی ہی خراب کیفیت ہے۔ انسان کو کسی کام پر  
چھوڑی۔ میں نے چند لمحے تذبذب میں ضائع کیے اور  
کیس دور گاڑیاں اشارت ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔  
میں نے دروازے سے سر نکال کر بھاگا۔ گیت نکال کر  
پورچ میں یا لان پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں تیزی سے  
اپنی گاڑی کی طرف بڑھا لیکن برآمدے میں چلتے ہی میرا  
جس نے نہ جانے کیوں مجھے واپس چلا نکالنے پر مجبور کیا  
واپس چلا گیا لگتا میرے حق میں بعضی غایت  
اسی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور سامنے کی باؤڈری و  
سمیت ڈھیر ہو گئی۔ اگر میں برآمدے میں ہوتا تو زخمی نہ  
ہو آ کیونکہ لمبے کے خاصے بڑے بڑے ٹکڑے ٹکڑے ہوا کرتا ہے۔

میں ڈرائنگ روم میں واپس پہنچ تو کیا لیکن یہ بھی ادا  
کیس دو سراہم نہ آجائے اور ڈرائنگ روم کو ختم نہ  
میں نے ایک بار پھر بارہ دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم  
دروازے سے سر نکالی تھا کہ چھوٹے سے راکٹ سے  
چنے جو مجھے شخص ایک ہیو کے کی طرح دکھائی دی تھی اڑا  
پر اٹری۔

ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی پکار  
میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ روشنی کے ہم کی طرح  
دوسرے ہی لمحے میں نے آنکھیں کھولیں تو اندازہ ہوا کہ  
کے ہم سے۔۔۔ بلکہ کسی بھی ہم سے کوئی بہت سی ٹھک  
تھی۔ جہاں وہ پھٹا دکھائی دے چاروں طرف ابلی کی  
کے ساتھ آگ کی ایک سولی سی تہ پہیلی جاری تھی۔  
انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے آتش فشاں کا دھماکا  
لیکن ایک تو اس کی رفتار لاوے سے کسی تیز تھی۔ وہ  
ایک سمت میں یا اطلال کی طرف نہیں پھیل رہا تھا بلکہ  
چاروں طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ تیسرے وہ لاوے سے  
دھماکا دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں ایسی ہی جگ تھی جیسا  
میں ہوتی ہے لیکن وہ اس میں جو پو پھیل ہوئی تھی وہ  
کٹھن تھی اور کچھ دیر پہلے ہونے والی اندھا دھند فائرنگ  
ہو اس باؤڈری کو بھی موجود تھی۔

آگ کی اس سولی سی چادر کو اس سُرقت سے  
ایک عجیب تجربہ تھا۔ وہ گویا اپنی راہ میں آنے والی ہر  
جاری تھی۔ اس وقت مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا  
وہ چادر لان پر کھڑے ہوئے سفید سے کے دور درستی  
سے بھی گزر گئی اور درخت یکدم یوں گر پڑے جیسے

قاریک کہاں سے کر رہے ہیں۔ محض سے کام لومی تو شاید یہ کھلوتا  
تمہارے لیے کچھ کار آمد ثابت ہو سکے۔ میں نے اس کے پھٹل کی  
طرف اشارہ کیا۔ جذبات میں آگ کی توان کے لیے ترنوالا ہوئی۔ یاد  
رکھو ہمیں ترنوالا نہیں بننا ہے۔ میں نے گویا ایک ایک لفظ پر زور  
دیے ہوئے اسے پٹا باندھنے کی کوشش کی۔

اس کے حلق سے صرف غراہٹ کی سی آواز خارج ہوئی اور  
وہ اشارت میں سر ہلا کر لڑائی کے اس دروازے کی طرف ریک گئی جو  
کچن کی طرف کھلتا تھا۔ میں اس دروازے کی طرف بھٹکتے لگا جو  
ڈرائنگ روم کی طرف کھلتا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں گھس کر لان  
اور پورچ وغیرہ کا جائزہ لینے کی کوشش کرنا چاہتا تھا کہ کچھ مجھے یہ  
ایک مشکل کام لگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ مکان  
کے اندر بھی کود آئے تھے اور کچھ لوگ انہیں عقب سے کور دے  
رہے تھے۔

جس شدت اور جس رفتار سے گولیاں برس رہی تھیں ان میں  
صرف دواہریں محفوظ ہو چرں کا کام دے رہی تھیں۔ دوسری کسی  
بھی چیز کی آڑ میں ہونا محفوظ نہیں تھا۔ ٹھوس ٹکڑیوں کے دروازے  
تک چھلکی ہو چکے تھے۔

میں نے راجہ کو دوسری طرف بھیج تو راجہ تھکیں فوراً ہی مجھے  
بچتا ہوا ابھی ہونے لگا تھا۔ میں ممکن تھا کہ وہ ابھی جذبات کے زور  
سے آواز نہ ہوئی ہو اور کوئی حثات کر گزرے۔ اسے ساتھ ہی  
رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن اب میرے لیے واپس جانا بھی مناسب  
نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم کی طرف جو چند فٹ کا فاصلہ میں طے کر چکا  
تھا وہ بھی بہت اہم تھا۔

میں نے راجہ کو قہقہہ بڑی کے سپرد چھوڑا اور کیس جھٹنوں کے  
مل، کیس سینے کے مل رہتے چلا گیا۔ دواہریں ہی کی آڑ میں رہتے  
ہوئے میں ڈرائنگ روم میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پوری کوٹھی  
تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ وہ زیادہ بڑی کوٹھی نہیں تھی۔ تھوڑی  
ہی دیر میں ہر طرف جہاں پھیل چکی تھی۔ ٹائنگ سے تمام لائٹس  
وغیرہ تباہ ہو چکی تھیں۔ یہی قیمت تھا کہ ابھی تک شارٹ سرکٹ  
کے باعث کیس آگ نہیں لگی تھی۔

میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو پیسے سے شرابور تھا لیکن اسی  
اٹا میں یکدم ٹائنگ رگ گئی۔ مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے  
سینا دل میں جنگ و جدل سے بھر پور کسی قلم کا نہایت بڑا شور مچا  
دیکھتے دیکھتے اچانک ہی قلم ٹوٹ گئی ہوا آہ بڑے تمام ٹائنگ یکدم  
بند کر دیے ہوں۔ چاروں طرف گہرا سکوت چھا گیا۔

لیکن سکوت چھانے کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ میں یکدم  
دروازہ کھول کر باہر نکل جاؤں۔ اب تو اور بھی اندازہ لگانا مشکل  
ہو گیا تھا کہ موت کہاں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ دروازے کو تو اب  
کھولنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ٹوٹے چھوٹے فریم میں بس کچھ  
ٹیز سے میزے کھڑے ہی پھنسے رہ گئے تھے۔ باقی دروازہ کھینچیں کی

کے غول کا کٹی ہوئی گزرتی ہو۔  
میری رکوں میں کوسرہ ہونے لگا۔ اس متحرک آفتیں چادر کا

ایک کنارہ اصل عمارت کی دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا، دوسرا پورے  
کی طرف آ رہا تھا۔ جہاں میری اور راجیلہ کی دونوں کا گزیاں پھلوں  
پھلوں میں۔ پہلے راجیلہ کی گاڑی اس کی لپیٹ میں آئی، پھر  
میں۔ اگر وہ اصل عمارت کو بھی اسی طرح لگنا شروع کر دیتی یا  
دیواروں میں سے بھی اسی طرح گزر جاتی جس طرح درختوں کے  
غول سے گزر گئی تھی تو پھر مجھے اور راجیلہ کو بھی راکھ ہو جانے کے  
لے تیار رہنا چاہیے تھا۔

میں تیزی سے اٹھا اور ایک فکر اس آفتیں چادر پر ڈال کر  
راجیلہ کی تلاش میں نکلنے کی طرف دوڑنے ہی لگا تھا کہ وہ آگ  
یکدم ہی بجھ گئی جیسے اس کا انداز اثر ختم ہو گیا ہو۔ شاید وہ عجیب و  
غریب کم ہی مر رہا تھا۔ اگر وہ زیادہ مر رہا ہو تو کیا؟ یہ تصور ہی  
نامانوسہ خیز تھا۔

ایک بار پھر چادر کی طرف سکوت چھا چکا تھا۔ میں قدرے  
چپکے ہوئے دوبارہ باہر آیا۔ گری ہوئی باؤغری وال سے باہر کوئی  
فکر نہیں آ رہا تھا۔ اب کسی بھی قسم کی جدوجہد یا تعاقب بے کار  
تھا۔ میں گاڑی لے کر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ گاڑیوں کے عقب  
میں دھار کا لہر اور گرا ہوا گیت آؤا تھا جو کہ کچھس کر رہ گیا  
تھا۔ راجیلہ کی گاڑی کے تو پچھلے دونوں تازہ بھی برست ہو چکے تھے  
اور پیٹھ چٹنا چور تھے۔

میری گاڑی کسی آدمی کا رہے کم نہیں تھی لیکن اس وقت  
اس پر بھی گولیوں کی کٹی آڑی تڑجی گئی خراشیں نظر آ رہی  
تھیں۔ جڑ بھی بچ ہی گئے تھے ورنہ ہلکے پوف ہونے کے باوجود  
اگر زیادہ قریب سے اور زیادہ طاقتور آ تو ایک منٹوں سے مسلسل تازہ  
کے جاتے تو ان کے بھی پھٹنے کا امکان تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ گاڑی میں بیٹھ کر ریڈیو پر  
اگر کام تمام باتیں کو الٹ ہی کر دوں اور لوکیشن بتا کر ہدایت کروں  
کہ وہ خلف سمتوں سے اس طرف آتے ہوئے مشکوک گاڑیوں کو  
خلاف کرنے کی کوشش کریں لیکن پھر مجھے خود ہی یہ کام بے کار  
محسوس ہوا۔ میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انہیں کسی چیز کی کوئی  
نشتی نہیں بتا سکتا تھا، ان کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں  
سے لگنے کے پیسوں راستے تھے۔

یہ کارروائی نہایت ہی مابراہن قسم کا کاغذ ایکشن تھا۔ چند  
منٹ میں سب کچھ کر گزرتا کسی کو جو اپنی کارروائی کا موقع نہ دے  
تو اس سے زیادہ خوف و ہراس پھیلانے کا سامان کرنا اور اس طرح  
عائب ہو جانا کہ کوئی تعاقب میں نہ آسکے مکان میں موجود سب  
لوگوں کو ہلاک کرنا یقیناً ان کا مقصد نہیں تھا ورنہ یہ بھی یقیناً ان  
کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کچھ اور نہیں تو مزید دو چار اسی  
قسم کے کام بھی ممکن جاتے۔ اگر مکان کے چاروں طرف سے اس قسم

میں استیلا کا گاڑیوں کی آڑ میں رکوع کی سی حالت میں چلا  
ہوا لان تک پہنچا۔ آگ کی چادر جہاں تک پھیلی تھی وہاں اب  
سیاہی مائل سے باؤڑ کی ہست ہی باریک سی تہ جی ہوئی تھی۔  
دھواں ابھی تک ابھر رہا تھا اور فضا میں اب نہ جانے کیا کچھ چلنے کی  
بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے ایک ٹوٹے ہوئے کھانے کے کھڑے سے گریہ کر دیا۔  
لان کی گھاس راکھ بن چکی تھی اور دو تین اونچے نیچے تک زمین مجلس  
چکی تھی۔ آگ کی چادر پورے کے پتہ فرش پر بھی ایک آدھہ اڑت  
تک آئی تھی۔ وہاں تک فرش پڑی طرح بچ کر اکر گیا تھا اور کوسے  
جیسے کھڑوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سفید سے کے گرے ہوئے  
درختوں کے تنے دور سے ہی ٹپکتے دکھائی دے رہے تھے۔

دھواں مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔  
مشتیں پٹل سیدھا کرتے ہوئے میں تیزی سے گھوما۔ وہ راجیلہ تھی  
جو لمبی کی طرح دوپے قد میں ڈراٹنگ دھام سے باہر آ رہی تھی۔ اب  
اس کے پیروں میں سپر بھی نہیں تھے۔ اس کا چہرہ پتھریا ہوا سا لنگ  
رہا تھا۔ میرے لیے اعزاء کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھی کسی کو نہیں  
دیکھ سکی تھی کسی کو نشانہ نہیں بنا سکتی تھی۔

اس نے خاموشی سے ادھر پھیلی ہوئی تباہی کا جائزہ لیا لان کی  
حالت اور سفید سے کے گرے ہوئے درختوں کو دیکھ کر اس نے  
مجھے لمبے میں پوچھا "یہ کیا ہوا؟"

میں نے جو کچھ دیکھا تھا اسے بتایا۔ اس نے اس پر کوئی تبصرہ  
نہیں کیا۔ حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ راشد کی موت نے اس کا  
دل ٹو کر دیا تھا۔ باقی سب تباہی و بربادی اور چند منٹ کے لیے برباد  
ہونے والی قیامت اس کے لیے معمولی دوپے متنی تھی۔

"ہم نے حرکت میں آنے میں دیر کر دی۔" وہ سر ہٹا کر خود  
کھائی کے سے انداز میں بولی "ہمیں جان پر کھیل کر آگے بڑھنا  
چاہیے تھا۔"

"اتنے شدید اور اچانک حملے میں اس سے زیادہ تیزی کیا  
دکھائی جا سکتی تھی جو ہم نے دکھائی۔" میں نے آہستگی سے کہا "جان  
پر کھیل کر بھی ہم جان سے جانے کے سوا کوئی کارنامہ نہیں دکھا سکتے  
تھے۔"

مجھے معلوم تھا کہ روئے پٹنے والی نہیں اندری اندر کھڑو  
ہو جانے والی لڑکی تھی۔ اس وقت اس کے اندر اس کی ذات کے  
کھڑو میں انتقام کا اڈا ہلچل رہا تھا۔ بے بسی سے سرخ رہا تھا۔  
شاید راجیلہ کی سمجھ رہی تھی کہ میرے سینے میں برف جمی ہوئی  
تھی۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ جسے وہ برف دار سمجھ رہی تھی وہ  
اس کی آفتیں انتقام سے زیادہ خوف ناک تھا۔ مجھے خاکستر کی

دے رہا تھا۔

تھی۔

میں نے بازو اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا اور ٹھیک اسیٹے ہوئے کہا ”خوصلہ کرو راجہ!“

”خوصلہ؟“ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں ڈہرایا۔ ”گویا یہ لفظ اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔“ آہستگی سے اس نے اپنے آپ کو چھڑایا اور داہیں اندر چل دی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔

میرے حلق میں آنسوؤں کی ٹھیکنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ندامت کے آنسو تھے جو بہہ نہیں پارے تھے۔ میں نے کھٹک کر گھا صاف کسے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں تم سے شرمندہ ہوں۔“

”کس بات پر؟“ اس نے اُجڑی اُجڑی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

”میں! تم۔ اور میرا ساتھ بھانے کا وعدہ کر کے تم کچھ زیادہ ناکہ میں نہیں رہیں۔ خصوصاً آج جو زخم لگا ہے، اس کے بھرنے کی کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔“ میں نے ندامت زدہ لہجے میں کہا۔

”جب کسی کا ساتھ بھانے کا وعدہ کر ہی لیا تو پھر نفع نقصان کیا دیکھتے۔ وہ بدستور دیکھے لہجے میں بولی ”اور پھر یہ ساری باتیں تو تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں۔ انہیں نہ تم بدل سکتے ہو اور نہ ہی میں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں تمہاری نیت یا ارادے کو تو دخل نہیں۔ تم تو دنیا کی تمام نعمتیں، تمام آسائشیں اور تمام خوشیاں میرے لیے جمع کرنا چاہتے ہو۔ میرے لیے تو بس تمہاری یہ سوچ اور نیت اہم ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ ہو گا اسے میں اپنی تقدیر سمجھ کر برداشت کر جاؤں گی۔ تمہیں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ احساسِ جرم تمہیں برباد کرے گا۔“

اس کی باتیں سن کر میری ندامت کچھ کم ہوئی۔ ذائقہ دوم میں پہنچ کر اس نے نیچے بیٹھ کر ارشد کا سر گردنیں دکھ لیا اور کئی لمبے تک چترائی ہوئی سی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی سپاٹ سی آواز گویا کہیں دور سے سنائی دی ”ہر بسن کو اپنے بھائی عزیز ہوتے ہیں لیکن ارشد مجھے کچھ زیادہ ہی عزیز تھا۔ یہ بہت ہی پیارا، بہت ہی مختلف قسم کا بھائی تھا جسے حد معصوم اور سیدھا۔ ہر ایک کو آزادی اور اطمینان سے چھینے کا حق دینا چاہتا تھا۔ اس نے آسائشوں میں پرورش پائی تھی مگر اس میں امیر زادوں والی کوئی بڑی عادت نہیں تھی۔ میں حیران ہوں کہ اسے کس جرم کی سزا ملی ہے۔“

”سزا اسے نہیں، ہمیں ملی ہیں۔“ میں نے ٹھکی ٹھکی سی آواز میں کہا۔ ارشد کے خوب صورت بال اور چہرے کا کچھ حصہ خون میں تر تھا۔ خون زیادہ نہیں رہا تھا اور جو باقی تھا وہ بھی شینے آگ تھا اگر اس کا چہرہ صاف کر دیا جاتا اور پیشانی کا سوراخ چھپا دیا جاتا تو وہ بالکل زندہ معلوم ہوتا۔ اس کے چہرے پر موت کی کوئی علامت نہیں

”اس کی جگہ کاش میں مرگئی ہوتی!“ راجہ گھو گھر کو اواز دے بول اور آخر یکدم ہی ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اس نے ارشد کی لاش کو ذرا اوپر اٹھا کر یکدم ہی سینے سے چھپایا اور دیوانہ وار چرات ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے دوسرے دیوار کے کنارے تک اس کا نہ رونا مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

اس کے دل کا غبار نکل چکا تو وہ ارشد کی لاش کو نہایت احتیاط اور آرام سے لٹانے لگی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو بستر میں ملا کر کہیں جانے لگی ہو۔ پھر آنسو پونچھ کر وہ پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور میری طرف دیکھے بغیر آنسوؤں سے بھیگی نواز میں بولی ”اُمّی! شاید تمہیں اندازہ نہ ہو کہ میں کتنی خوشخوار محبت ہوں کیونکہ میں بظاہر بڑی نازک اندام اور نہیں دکھائی دیتی ہوں۔“

”مجھے اندازہ ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”جب مجھے کوئی گمراہی کا دم لگتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے میں دیاگو آگ لگا دوں۔ جو چیز سامنے آئے اسے جس جس کر دوں۔ یہی مشکل سے میں اپنے آپ کو روکتی ہوں کہ میرے ہاتھ کسی کے گلا کے خون میں نہ رنگے جائیں۔ خصوصاً یہ بے بسی کی اذیت نقل ناقابلِ برداشت ہوتی ہے جب انسان کو بتا دیں کہ وہ کہ اس دشمن کون ہے، کہاں ہے۔“ وہ بے وحیانی کے عالم میں ہلن کر ہاتھوں میں آگ پلٹ رہی تھی۔

”مجھ سے بہتر تمہارے احساسات کو کون سمجھ سکتا ہے۔“ میں نے کہا ”میں خود ایک عربی سے اسی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔“

”آپ میرے لیے زندگی اس وقت تک جنم ہی رہے گی جب تک میں ان لوگوں کو حلاش کر کے جبریت ناک انداز میں نہیں ماروں گی جنہوں نے آج رات دہشت گردی کا یہ نمونہ ہمیں دکھا دیا ہے اور ارشد کو ہلاک کیا ہے۔“ ایک لمبے کے لیے اس کے رات بھر کے پھر وہ حسانہ سے لہجے میں بولی ”کیا قسم طریق ہے۔ ارشد جیسے بھائی کے بدلے مجھے صرف ایک چیمپیزی کو ہلاک کرنا کا موقع ملا۔“

”چیمپیزی؟“ میں نے چونکے ہوئے پوچھا ”تمہارا مطلب ہے بلیک بڑا؟“

”شاید وہی ہے۔“ وہ بے توجہی سے بولی ”میتھائیاں توچی ہو جو تم نے میٹنگ کے دوران بتائی تھیں۔“

”کہاں ہے وہ؟ تم نے کب اور کس طرح اسے ہلاک کیا؟“ میں پُر جوش سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ سرسری سے لہجے میں بتانے لگی ”یو نیس تم نے مجھے بھیجا وہ مجھے نظر آیا تھا۔ وہ ہن کی کمری میں باہر کی طرف ایک کھانچے سے چمچا کر کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کھانچے پر چڑھ کر وہ غالباً چھت پر جانے ہی والا تھا جب میری نظر اس

کوشش کرتی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ اس کے دل پہ گھاڑا  
ہو گیا تھا اور اس سلسلے میں میں اپنے آپ کو ہی مجرم مجرم سمجھتا  
گرتا تھا لیکن سرپرست میرے سامنے اس سانس کی طمانی کا کوئی  
ذریعہ نہیں تھا۔

میں نے اسے اس اپارٹمنٹ میں منتقل کر دیا تھا جس میں کچھ  
عرصہ پہلے آجائا رہتی تھی۔ میرے خیال میں وہ کوئی محفوظ نہیں  
ہو سکتی جس میں راحیلہ نے کچھ عرصہ گزارا تھا۔ قیمتی طور پر تو اس  
اپارٹمنٹ کے بارے میں بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ محفوظ تھا یا  
نہیں۔ تاہم یونہی بس ایک احساس سا تھا کہ شاید وہ ریڈ ڈاٹ کی  
نظر سے بچا ہوا تھا۔ لیکن معاملہ کچھ ایسا رہا ہو کہ میرا کوئی ٹھکانا  
خواہ۔۔۔ محفوظ ہی ہوتا ہو لیکن وہاں میری آمدورفت شروع ہوتے  
ہی وہ ریڈ ڈاٹ کی نظر میں آجاتا ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ راحیلہ کو اس اپارٹمنٹ میں منتقل کرانے  
کے بعد اب خود وہاں بہت کم آمدورفت رکھوں گا۔ وہ کافی برا اور  
چڑاؤ سا کٹ اپارٹمنٹ تھا۔ اب وہاں فون بھی موجود تھا۔ علاقہ بھی  
اچھا تھا۔ مجھے امید تھی کہ راحیلہ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی،  
سوائے ذہنی دلی کی فیصلوں کے۔ ان کا علاج وقت کے مرہم کی سوا  
کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ خطرات ذرا کم ہوں تو اسے کسی کو بھی میں ہی  
شفقت کروں گا۔ میں چاہتا تھا اس کا رہن سہن اس کے شایان  
شان ہی رہے کم از کم وہ معیار تو رہے جو اس کے ماں باپ کے  
زمانے میں تھا۔ بلکہ ہو سکے تو وقت کے ساتھ ساتھ اس سے بہتر  
ہونا چاہئے۔

میں خود ہی لال پٹن میں منتقل ہو گیا تھا جس کے دروازے  
لے کر مالک تک مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے مالک کراچی  
میں رہتے تھے لیکن کبھی بکھار لاہور آتے رہتے تھے اور مجھ سے  
ضرورت ملاقات رہتی تھی۔ ان کے بھی کئی بزنس تھے۔ کراچی میں  
میرے ہوٹل کی وجہ سے ہم گویا ایک ہی لائن کے بزنس میں ہو گئے  
تھے۔

بولی عرف مس ٹرپ کا اصرار تھا کہ میں دو نمبر میں ہی شفقت  
ہو جاؤں۔ وہ ہمارا ایک محفوظ ٹھکانا تھا۔ وہ کسی چھوٹے موٹے قلعے  
سے کم نہیں تھا جس میں پچاسوں قسم کے انتظامات موجود تھے۔  
لیکن میں ابھی اس محفوظ ٹھکانے کو محفوظ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ میری  
حتی الامکان کوشش تھی کہ مجھے وہاں شفقت نہ ہونا پڑے۔ میں  
اسے انتہائی ناگزیر حالات کے لیے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ میں ممکن  
تھا کہ میرے وہاں شفقت ہونے کے بعد وہ محفوظ ٹھکانا بھی غیر محفوظ  
ہو جاتا۔

راحیلہ والی کو بھی پرستلے کے بعد سے ریڈ ڈاٹ کی طرف سے  
سکوت تھا۔ دیکھو ان کا طریقہ ادوارات تو زیادہ تر یہی رہا تھا کہ  
کناڈا دیکشن کے انداز میں ایک کارروائی کے بعد سکوت چھا جاتا

تھا۔ اس کی عقل تو مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ کڑی میں سے  
نہایت دکھائی دے رہا تھا۔ اچھی بجلی تو نہ تھی، جو شرٹ  
بائی ہوئی تھی پھر بھی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ چیخیز رہی تھا۔ اسے  
ماں نہیں ہو سکا کہ بچن میں کوئی آگیا تھا۔ وہ اپنے جسم کو سانپ  
پانچ میٹ کر اور چڑھتی لگا تھا کہ میں نے بھٹل اس کی توند  
رک کر نہ کر دیا۔

میں نے طمانیت کی گری سانس لی۔  
لیکن وہ گولیاں اسے مارنے کے لیے کافی ثابت نہیں ہو سکی  
تھیں۔ راحیلہ نے گویا میری غلط فہمی دور کی، کھڑکی چھوٹی تھی مگر  
گولیاں پینٹ سے گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی کڑی سے اندر کو  
نہا۔ اس حالت میں بھی شاید وہ میری گردن کو بوجھ لیتا اور توڑ کر ہی  
بھرتا۔

میرے قصور میں آفتاب کی لاش ابھرتی جس کا زخروہ آؤ اور  
براہمہ راحیلہ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ چیخیز رہی تھی۔ وقت تین قسم  
کی ظروحات کی خصوصیات رکھتا تھا۔ چیخیز تو وہ تھا ہی۔ چیخیز  
والی خصوصیات سے بھی اسے ہاتھ نہیں دھونے پڑے تھے جبکہ  
انڈوز والی سوج بوجھ اور صلاحیتیں اس میں پیدا کر دیتی تھیں۔  
لیکن ساتھ ہی اس کے وجود میں ایک دردندہ بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ  
نہایت چیخیز نہیں، اچھا بھلا غیرت تھا۔ کوئی بوجھ نہیں تھا کہ  
راحیلہ کی گردن بھی وہ توڑنے کے بجائے ادھیڑا لانا زخروہ چاہتا تھا۔

راحیلہ نہایت دھمکے لیے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "وہ  
بس اندر کو گوا تو رہا اچھی باتیں ہو رہیں۔ ایک تو اس کی کن باہری  
گرتی۔ دوسرے وہ ادوں پر آگوا جس کا چوکما جا رہا تھا۔ وہ  
اچھل کر فرش پر جاگرا۔ تب نہ جانے کیوں میرا اسے مزید گولیاں  
مارنے کوئی نہ چاہا۔ قریب ہی مارلے کے کاؤنٹر پر گوشت کاٹنے کا تیز  
دھار اور بھاری چاڑ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول چھوڑ کر وہ انڈیا  
اور پلک پلک میں اس کی کھوپڑی میں آتا رہا۔ اس کی کھوپڑی دو  
فصلوں میں تقسیم ہو گئی لیکن چاڑ دہیں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے  
اسے کاٹنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

میں نے کچن میں جا کر دیکھا۔ واقعی بلیک بڑا دیوار کے قریب  
آؤ اور چھا پڑا تھا۔ اس کی کھوپڑی میں پرست ہوئے والا چاڑ اس  
کے قریب آؤ دسے چہرے تک اتر آیا تھا۔ وہ اسپورٹس شرٹ اور  
جینٹ میں تھا۔ اس وقت نوروہ بڑا نہایت حقیر نہایت کڑھ لگ رہا  
تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جب وہ زندہ تھا تو کسی  
غریب کا مخلوق تھا۔ اسے یوں پڑے دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی  
لانیت کا احساس ہوا۔



راشد کی تدفین کے بعد بھی راحیلہ کھڑی کھڑی ہی نظر آتی  
تھی کہ کوکر میری موجودگی میں وہ اپنی کیفیت کو چھپانے کی بہت



تھا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ سکوت کتنے عرصے پر محیط ہوگا۔  
 وہ مجھے قصاصات پہچاننے کے ساتھ ساتھ چوسے پانی کے اس کھیل  
 میں گویا مجھے اعصابی طور پر بھی ناکام بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔  
 ان کی ان کوششوں کا تصور کر کے کبھی کبھی میں تنہائی میں  
 مسکراتا تھا۔ صرف وہی مجھے نہیں آزما رہے تھے، میں خود بھی  
 اس بنانے اپنے اعصاب کو آزما رہا تھا۔ میں خود بھی دیکھتا چاہتا تھا  
 کہ دنیا کی سب سے بڑی سب سے خطرناک اور سب سے زیادہ ہر  
 مگر قسم کے عزائم رکھنے والی عظیم کے ساتھ اس چوسے پانی کے کھیل میں  
 مجھ "چوسے" کے اعصاب کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔

میں اب بھی حلقہ انتظامات کے پکر میں رہتا نہیں چاہتا تھا  
 کیونکہ مجھے معلوم تھا ان کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن  
 ساتھیوں نے ایک بار پھر اصرار کر کے دو گاڑیوں میں میری گاڑی  
 کے آگے پیچھے چلنا شروع کر دیا تھا۔ چند ساتھی ہوٹوں کے ملازمین  
 کے روپ میں ہوٹوں میں بھی موجود رہنے لگے تھے۔ ایک تو قاضی  
 دیوان کے روپ میں دوڑا ہے، پری موجود رہتا تھا اور ہر آنے  
 جانے والے پر نظر رکھتا تھا، اس طور پر موجود رہتے تھے جس پر  
 میرا سوئٹ تھا۔ ایک قودھ چھت پر بھی منزل آتا تھا۔

میرے جال ٹار اپنی سی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں  
 دفعتاً قاضی سے جا رہا تھا۔ نہیں صاحب کو میں ہر دانے کی اطلاع  
 دیے جا رہا تھا۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ ان کی مشینری اپنا کام کر رہی  
 تھی لیکن ابھی تک میرے ذریعے بھی کوئی ایسا سراغ ان کے  
 سامنے نہیں آسکا تھا کہ جس سے بات آگے بڑھ سکتی۔ ان کے  
 انگریزی تجربے کے مطابق ابھی تک میری مشینری ہوئی کٹائی ہو اس  
 جھوٹے ہونے تو ہائی بیولوں کی طرح ہی تھی۔

میں اس پر خاموش رہا تھا۔ میں ابھی کچھ عرصے اور  
 خاموش رہ کر دیکھتا چاہتا تھا کہ ان کی کوششیں کچھ رنگ لاتی ہیں  
 یا نہیں؟ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر ان کا مجھے نامیتر  
 ٹھہرانے کا سلسلہ پوچھی جا رہی رہا تب بھی میں کیا کر سکوں گا؟

ایک خیال مجھے یہ آتا تھا کہ میں ایک بار پھر وزیر خارجہ حنیف  
 صاحب سے بات کر دوں اور ان کے توسط سے سربراہ مملکت کو  
 ابروچ کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن میرا یہ قدم شاید فیض صاحب  
 کی خشکی مول لینے کے مترادف ہوگا۔ اور میں فیض صاحب کی خشکی  
 مول لینے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ  
 سربراہان مملکت بھی اس پوزیشن پر فائز کسی بھی شخص کی خشکی مول  
 لینے سے گریز کرتے تھے میں تو کسی شمار میں تھا!

سربراہان مملکت بھی فیض صاحب اور ان جیسی دو چار  
 دو سری شخصیتوں کی رپورٹوں پر محدود سا کرتے تھے اور بڑے سے  
 بڑے مکی معاملات جن کا تعلق عالمی سیاست سے بھی ہوا تھا انہی  
 رپورٹوں پر چلتے تھے۔ میں اگر کسی طرح سربراہ مملکت کو ابروچ کر  
 بھی لیتا تو فیض صاحب کو یہ گمان مگر نہ تھا کہ میں نے ان سے بلائی

بلا کچھ کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں گویا ان کی کاوشوں  
 ٹکلی بخش ٹھہرانے کی سعی کی ہے تو اس کے نتیجے میں مجھ پر  
 خراب ہو سکتا تھا۔ ریڈ واٹ کی نظریں تو میں پہلے ہی مجھ پر  
 اس کے ساتھ ساتھ میں ملک کی طاقتور ترین خفیہ ایجنسیوں کی  
 میں بھی مستحب ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح کی کوششوں  
 سازش کیے بغیر میری حالت کچھ کے دو یا تینوں کے درمیان  
 ہوئے چنے سے مشابہ ہو جاتی۔ فی الحال کم از کم ایجنسیوں کی  
 سے تو مجھے چھوٹ لی ہوئی تھی۔ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں  
 حفاظت کے سلسلے میں آزاد تھا۔ جیسی بھی صورت حال ہوتی  
 اور اس میں میں جس طرح بھی مناسب سمجھتا تھا ہاتھ پاؤں مار  
 تھا۔ اگر میرے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے یا ایجنسیاں دیے عیاں  
 اپنی تحویل میں لے لیں تو میں مارا جاتا۔ میرے لیے تو میں  
 و حرکت کی آزادی ختم ہو جاتی آدمی موت کے مترادف تھا۔  
 غرض یہ کہ میں ان دونوں چاندوں طرف سے خطرات میں  
 گھرا ہوا نہیں تھا بلکہ ذہنی طور پر بھی سخت کشاکش کا شکار تھا۔  
 بظاہر میں پیشہ کی طرح پرسکون تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا  
 کم از کم ظاہری طور پر میرے معمولات میں کوئی فرق نہ تھا  
 پائے اور ریڈ واٹ کو معلوم ہو جائے کہ میں اب بھی خوفزدہ نہیں  
 میں اب بھی بال نہیں نوج رہا تھا۔ اب بھی موم دیا کر کہیں  
 نہیں تھا۔ چھپتا نہیں پھر رہا تھا پہلے ہی کی طرح سوٹ بوت میں  
 جا رہا تھا۔ ایک ٹھکانے پر گزر رہی تھی تو دوسرے ٹھکانے پر  
 ہو جاتا تھا لیکن میرے ہاتھ پر شکن نہیں آتی تھی۔ دوڑاؤ  
 آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر دیکھتا تھا کہ میرے چہرے پر کہیں  
 خود کی موت کا خوف تو جھلکے نہیں لگتا تھا؟ یہ دیکھ کر میں افسردہ  
 کی سانس لیتا کہ میرے چہرے پر سکون، نشاط اور بے غلیظ  
 کی طرح برقرار تھی۔

تیار کو بھی میں دوبارہ دیکھنے نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا  
 جیمز نے اسے واپس مری بھیج دیا تھا۔ اس کے حق میں میں سربراہ  
 جیمز کو نہیں معلوم تھا کہ میں ہوٹوں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ نہ لگا  
 کان کھاتی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں اپنے کاموں کے سلسلے  
 مختلف شروں میں پھر رہا تھا۔ کبھی اسلام آباد، کبھی کراچی اور  
 فیصل آباد وغیرہ۔ حالانکہ میں ابھی لاہور میں ہی تھا۔

لیکن پھر ایک روز چاکلی اسلام آباد سے فیض صاحب  
 کے پاس سے اسے فون آیا۔ اس کا لہجہ بظاہر ٹھکانے تو میں تھا  
 اس میں پہلے سے طے شدہ فیصلہ ضرور بول رہا تھا۔ حمایت لان  
 سے اس نے کہا "مسٹر جی جی، اگلے دن بجے سے پہلے آپ  
 اسلام آباد میں ہونا چاہیے۔ آپ اسلام آباد ہوٹوں میں ٹھہر  
 گئے۔"

"غیر مت" یہ حکم میرے لیے کہاں سے جاری ہوا ہے؟  
 نے اپنا لہجہ دو تانہ بنانے کی کوشش کر کے ہونے کہا۔

نے کھانا کمرے میں ہی منگو کر کھایا۔ آخر کار انتظار کے لمحات جب میری برداشت سے باہر ہو گئے تو کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت دستک دینے والا اگر میرا جانی دشمن بھی ہوتا تو شاید مجھے ٹرانا لگتا۔ اس نے کم از کم یہ جان لیا سکوت تو توڑا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ میرے سامنے سفید شلوار قمیصوں اور سیاہ اسٹیکٹوں میں دو لمبے ترختے آوی کھڑے تھے ایک کے سر پر جناح کیپ بھی تھی۔

”مسٹر جہد ری؟“ جناح کیپ والے نے گویا رٹنا تصدیق چاہی۔

”جی ہاں۔ آپ کی تعریف؟“

”ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔“ جناح کیپ والے نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر کہا ”میں صاحب نے آپ کو بلا یا ہے۔“ انہوں نے گویا ازراہ قواؤش اپنے کارڈ بھی نکال کر دکھائے تب میں اطمینان کی گہری سانس لے کر ان کے ساتھ ہویا۔

نیچے ہوٹل کے مرکزی دروازے کے سامنے ہی ایک سیاہ مرسڈیز ہماری منتظر تھی جس میں ہادی ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی کے شیشے آریک تھے۔ اندر بیٹھے کے بعد میں نے دیکھا کہ گاڑیوں پر خوب صورت پردے پہلے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان بھی پردہ حائل تھا۔ یعنی میں دوسرا سکرین سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ گاڑی کہاں کہاں سے گزر رہی تھی۔

دونوں افراد میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ گاڑی چند منٹ تک نہ جانے کن کن سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ میں نے ملاحظہ سے پوچھا ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں صاحب کے پاس۔“ جناح کیپ والے نے منہم بے میں جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ جو کچھ میں جانا چاہتا تھا وہ بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں نے اپنے مزید سوالات ضائع نہیں کیے اور جنم زحیلا چھوڑ کر آرام سے بیٹھ گیا۔ گاڑی پُر آسائش اور آرام دہ تھی۔ لیکن مزید چند منٹ بعد سفر ختم ہو گیا۔

گاڑی سے اتر کر میں نے دیکھا ہم سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک خوب صورت اور خاصی بڑی کوٹھی کے ڈرائیو دے میں کھڑے تھے۔ کوٹھی غالباً کسی پنازی کے دامن میں واقع تھی کیونکہ ایک طرف بلندی سے دیوار کے درخت جھانک رہے تھے۔

میرے ساتھ آنے والوں نے مجھے گرد و پیش کا زیادہ جائزہ لینے کی مہلت نہیں دی اور آگے چلے کا اشارہ کیا۔ منتظر ٹکڑی کے ایک موڑ سے دروازے سے گزر کر ہم ایک ہال میں پہنچے جو ڈرائنگ روم کی طرز پر آراستہ تھا لیکن ہم اس میں داخل ہونے کے بجائے بائیں طرف مڑ گئے اس طرف ایک اور دروازہ تھا۔ اس سے گزر کر ہم نے ایک طویل راہداری عبور کی۔ اندر روشنی بہت کم تھی جس کی وجہ سے ماحول میں خواہ مخواہ ہی کچھ

”میں صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آپ کو اطلاع دے۔“ اس کے لہجے کی طاقت پر قرار رہی لیکن کوئی دوستانہ رنگ نہیں تھا۔ ”کل بارہویں آپ کے ساتھ ایک مینگ ہوگی۔“ اور وقت کے بارے میں آپ کو ہوٹل میں ہی مطلع کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ کوئی گاڑی آپ کو لینے آئے یا د رکھیے گا کل دس بجے آپ کو اسلام آباد ہوٹل میں ہونا چاہیے۔ آپ چاہیں تو آج رات کی فلائٹ پکڑ سکتے ہیں یا علی الصباح روانہ ہو سکتے ہیں۔ لاہور سے چھ بجے بھی ایک ٹرک روانہ ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آپ فوراً سفر کرنا پسند کریں اور ہاں آپ کو سیٹ ملنے میں کسی دشواری کا اندیشہ ہو تو میں آپ کو ایک فون نمبر دے دیتا ہوں۔ اس پر صرف فون کر سکتے ہیں کہ آپ کے لیے سیٹ کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”میں آج نہیں گا۔“ میں نے اٹھنے سے کہا ”یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ میرا ٹریول ایجنٹ کہیں کے سفر کے لیے بھی مختصر سے مختصر کوئی پر میرے لیے سیٹ کا بندوبست کر دیتا ہے۔“ بہت خوب خدا حافظ مسٹر جہد ری! اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دیوید رکھنے کے بعد بھی میں دیر تک سوچتا رہا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ فیض صاحب کو ایک بار پھر مینگ منقطع کرنے کی کیا ضرورت آئی تھی ”شاید ریڈ ڈاٹ کا کوئی برا ہاتھ لگا گیا تھا اور اب وہ لوگ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔“

میں احتیاطاً رات کی فلائٹ سے ہی اسلام آباد روانہ ہو گیا اور وہ رات میں نے اسلام آباد ہوٹل میں ہی گزار دی۔ صبح میں دس بجے سے پہلے ہی کہیں بھی جانے کے لیے تیار تھا اور ناشتا بھی کرنا تھا لیکن میرے لیے کہیں سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔

ساڑھے دس بجے ایک فون آیا۔ بولنے والے نے اپنا نام بتانے کی بھی زحمت نہیں کی تاہم لہجہ مڑبانہ تھا۔ اس نے پوچھا ”کرا آپ اپنے کمرے میں ہی موجود ہیں؟“

”ہاں ہے،“ تبھی تم سے بات کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے سراسیمہ کیجیے گا نہیں۔“ اس نے نہایت لالٹ سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

مجھے اس روز اندازہ ہوا کہ بے چینی، جھٹس اور لاعلمی کی کیفیت میں انتظار کرنا کتنا تکلیف دہ کام تھا۔ تیار ہو کر ہاتھ پ پا تھ دھر کر بیٹھا اور یہ سوچتے رہتا کہ نہ جانے اب کوئی بلاوا آئے گا کہ کوئی لینے آئے گا۔ بڑی ہی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ میں زندگی میں اس عالم میں شاذ و نادر ہی بیٹھا تھا۔ برسوں سے میں نے اپنی توجہ اور اپنی تحصیل سے اخبارات نہیں پڑھے تھے جتنی تحصیل سے اس دماغ پر چند برس کاڑھیں۔

انتھاری انتظار میں وہ کھانے کا بھی وقت ہو گیا۔ میں

ان کی توجہ سنبھل کرانے کے لیے اٹا ترڈو کیا تھا۔ چند لمبے خاموشی سے کافی کی چٹکیاں لی جاتی رہیں۔ اپنا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو بات شروع کرنے کی کوئی جلدی نہیں اس سکوت سے اکتار کر آخر کار میں نے خودی کہا "نہیں ما کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کیوں یاد کیا گیا ہے؟"

نہیں صاحب آرام وہ کرسی کے پٹے سے ٹپک لگائے تھے کافی ٹانگ ان کے ہاتھ میں تھا اور اب ان کی نظر مجھ بلکہ اپنے سامنے رکھی ہوئی ٹیلی فائل پر تھی۔ کاپی آئیر سے میں انہوں نے اسے کھولا اور نہیں سے انداز میں سہلانے بولے "ہاں سوال معقول ہے۔"

انہوں نے ایک گرمی سانس لی اور ایک لمبے کے فوف بولے "سٹرچہ پوری، امانی ایک ایسا آسیب ہے جو کبھی از پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کبھی کبھار یہ فراووشی کے دھندلوں یا چٹا چوند میں پھپھ جاتا ہے لیکن معدوم بھی نہیں ہوتا۔ یہ رہتا ہے بالکل انسان کے اپنے وجود کی طرح۔"

میں ان سے ایسے انسانی یا لفظیہ آواز ٹھٹھکی کی فوف کر رہا تھا۔ ان کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی کی جگہ عجیب جھجکی بلکہ سردی نے لے لی تھی۔ میرے کسی تاریک گوشے میں کوئی حقیقی سی جگہ نہیں صاحب کی بھی فائل پر تھی اور ان کی ٹیلی آکٹیں کسی بیٹھے کی آگ طرح ساکت تھیں۔ میں خاموش رہا، بعض اوقات کوئی تہہ ہی ہمزہ ہوتا ہے۔

وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولے "میں نے آپ کو زحمت دی ہے کہ ماضی کی کچھ ایسی باتیں بتا سکیں جنہیں ساتھ ساتھ شاید آپ واقعی بھول گئے ہوں یا آپ نے بھولے انہیں بھلا دیا ہو۔ بہت سے ٹھکروں نے مل کر ایک میٹور کر کے بڑی مشکل اور بڑی محنت سے دن رات کام کر معلومات جمع کی ہیں اور ان کے لیے بڑے عجیب عجیب استعمال کیے جن کے بارے میں شاید آپ سوچ بھی نہ سکیں میرے بارے میں پوچھ کچھ کہنے کم از کم میرے میری موجودگی یا میری عدم موجودگی میں کوئی نہیں آیا تھا۔ ٹھکروں اور دفاتر میں میرے ہوردو کی خواہ موجود تھے اگر میرے بارے میں معلومات جمع کرنے پہنچا اور سیدھے روانہ طریقے سے پوچھ کچھ کرنا تو مجھے ضرور علم ہونا تھا۔ ان لوگوں نے کون سے وسائل کون سے ذرائع استعمال کیے کچھ بتائیں چلا تھا؟"

یہ بہت بڑا سوال تھا۔ ان کی طرف سے ایک طرف سے اس وقت سامنے آن کھڑا ہوا تھا لیکن اب ان سوالوں پر غور کرتے نہیں تھا۔ نہیں صاحب نے میری فائل تیار کرانے کی بات اور اپنا کہا پورا کر دیا تھا۔ ان کے سامنے جو ٹیلی فائل

پراسرار سی پیدا ہو رہی تھی۔ آخر کار ہم ایک دروازے پر پہنچے جہاں سادہ لباس میں لیکن سب مشینوں سے مسلح دو افراد تعینات تھے۔ جناح کیپ والے نے انہیں کوئی اشارہ کیا۔ انہوں نے سر ہلایا اور ان میں سے ایک نے بڑی سی چابی سے دروازہ کھولا۔ یعنی دروازہ مقفل تھا۔ دونوں افراد کے چہرے قطعی سپاٹ تھے۔ کالا کھول کر وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ میرے ساتھ آنے والوں نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود ہیں رک گئے۔ میں نے خودی باب گھما کر دروازہ کھولا اور اندر جا پہنچا۔

میں گویا لمبی شام سے یکدم صبح کے اٹھانے میں جا پہنچا۔ وہ ایک بڑا سا فٹنس ہال تھا اور وہاں تھوڑی سی بجلی ہوئی تھی، دن کا سامان تھا۔ ایک بڑی سی نمائیت خوب صورت میز کے گرد آٹھ افراد موجود تھے۔ ان میں سے تین افراد تو وہی تینوں اہم ترین خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ تھے۔ یعنی نہیں صاحب، باقری صاحب اور شہر خان صاحب۔

تین اور صاحبان کی شکلیں بھی اس حد تک میرے لیے شناسا تھیں کہ وہ بچھلی میٹنگ میں بھی شریک تھے۔ دو افراد میرے لیے بالکل ہی نئے تھے، اہم کسی سے بھی میرا تعارف کرانے کا کلف نہیں کیا گیا۔

میز کے گرد کئی کرسیاں خالی تھیں۔ وہ لوگ درمیان کی کرسیوں پر تھے۔ مجھے بھی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ میز پر کئی فائلیں بھی موجود تھیں۔ ٹیبل رنگ کی ایک فائل نہیں صاحب کے سامنے موجود تھی۔ میرے لیے یہ قدرے حیرت کی بات تھی کہ آج نہیں صاحب کے ہونٹوں پر خاصی واضح مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ لیکن وہ ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی، اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر وہ مسکرا رہے تھے تو اس کا کبھی طور پر یہ مطلب سمجھنا غلط معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوش تھے۔

کافی کا دور چل رہا تھا۔ طویل و عریض کمرے میں کافی کی خوشگوار منک بجلی ہوئی تھی۔ مستند سے ایک شخص نے فوراً ہی میرے سامنے بھی خوب صورت نیل میٹ پر خوب صورت ٹرے اور خوب صورت گرائی میں کافی لار رکھی۔

نہیں صاحب خامے خوشگوار لمبے میں بولے "آپ اس وقت دی۔ دی آئی لی ہیں۔ سٹرچہ پوری، امانک کی چند اہم اور بڑی بڑی شخصیتیں آپ کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔"

"شکریہ نرا" میں نے آہستگی سے کہا "مجھے دی دی آئی لی بنے کاشوق ہرگز نہیں۔ مجھے آپ اپنا خادم ہی سمجھیے۔"

نہیں صاحب گرمی نظروں سے میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نظرس انسان کی سطح تک میں آتا جاتی ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ریڈ واٹ کے معاملے میں شاید بات کچھ آگے بڑھی تھی اور وہ دی دی میں میری ان کاوشوں کو سراہ رہے تھے کہ میں نے اتنے بڑے خطرے کی طرف

غالباً میری ہی حیات پریشاں کا خلاصہ تھا۔ کانڈو کے اس چلنے میں میری ہی زندگی کے ٹھیس و فراز متعین تھے۔

”یہ شکر گزارہ کے ایک نہایت خوب گھرانے میں جنم لینے والے لڑکے کی کمائی ہے مسٹر چہدری!“ نہیں صاحب ہماری اور کو نجلی آواز میں بولے وہ دھپے پتلے تھے لیکن ان کی آواز نہایت بابرعب تھی۔ ویسے تو شخصیت کے اعتبار سے بھی وہ دھپے پتلے ہونے کے باوجود دہشت سے ہماری بھر کم لوگوں پر ہماری تھے۔

میں نے ایک ٹھک ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کیا آپ نے یہ کمائی مجھے ملانے کے لیے ہی اتنا ترزد کیا ہے؟“ نہیں صاحب؟“

”سن لو مجھے شاید اس میں آپ کو دلچسپی کے کئی پہلو مل جائیں“ جن پر اب فراموشی کی دھندل جہم چلی ہو۔ ”وہ چہیتے ہوئے سے لہجے میں بولے۔

”آپ نے ناحق اتنی تکلیف کی۔ میں تو آپ کو چٹکس کر چکا تھا کہ جو کچھ پوچھا ہے پوچھ لیجئے، میں خود حاضر ہوں۔“ میں کو شش کر رہا تھا کہ میرے گھبے میں کتنی آنے پائے۔

”میں کلام کو اپنے انداز میں کرنے کا عادی ہوں مسٹر چہدری!“ ان کے لہجے میں سرد مری آگئی ”انسان اپنی ذات کے ساتھ دوسروں کی طرح بے رحم کہاں ہو سکتا ہے؟ انسان خواہ سرجن ہی کیوں نہ ہو اپنا آپریشن خود نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ایسے بے ہوش کرنا اور نشتر دوسرے کے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکا انتہائی غربت میں کل کر جان ہوا۔ واجبی سی تعلیم پائی لیکن اس میں بے پناہ خدا داد ملا جیتی موجود تھیں۔ تاہم گاؤں میں رہنے تک اسے خود بھی ان کا احساس نہیں تھا۔ مختصر عرصے کے لیے وہ ایک جلی پیر کا لڑکا کر بھی بنا۔ پھر اوپر آوہر بھٹکا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران اس کا میل جول کچھ زیادہ اچھے لوگوں سے نہیں رہا۔“

انہوں نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ میں خاموش رہا۔ وہ بولے ”پھر وہ لڑکا لاہور میں نمودار ہوا اور قاسم خان نامی ایک شخص کے زیر سایہ رہنے لگا جو ذات خود ایک مشکوک آدمی تھا۔ وہ تار کو کس کنٹرول بورڈ کی لست پر تھا۔ کچھ ایسے لوگوں کے اس سے رابطے پائے گئے تھے جو اپنی امنگنگ اسکاؤٹس تصادم یا رنجیز سے مقابلے کے بعد فرار ہوئے لیکن بعد میں ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ پھر وہ خود بھی مشکوک حالات میں مارا گیا۔ اس کی بیوی سسلی بھی ایک دلچسپ نہایت خوب صورت اور ہر اعتبار سے توجہ طلب عورت تھی۔ جن دنوں ہمدت میں سکون تھا وہاں کے ایک ٹائٹ کلب میں ڈانس رہی۔ شہر کے قتل کے بعد یہاں سے امریکا چلی گئی اور حیرت انگیز طور پر انٹرنیشنل ڈرگ ٹرانز نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک عرصے تک وہ مختلف ملکوں کے درمیان پکراتی رہی اور اس دوران اس کا ٹھکانا باٹ قانچی دیہ رہا۔ وہ پورے بلز کے علاقے میں ایک شاندار محل نما گھر میں رہتی تھی جس کے ارد گرد

ہالی ووڈ کے مشہور ستاروں اور دنیا کے بعض معروف سرمایہ داروں کے گھر تھے لیکن ایک مددگار ایسے سو ٹھکانے چل میں محروم پائی گئی۔ ڈاکٹر رپورٹ کے مطابق سو ٹھکانے کرتے کرتے اس کا ہارٹ ٹھک چکا تھا۔ امریکا کی وائٹ ہاؤس اور اصول پسندی کے بڑے چرچے میں لیکن وہاں بھی ایسے ڈاکٹر پائے جاتے ہیں جو رقم کا بریف کسی وصول پا کر یا مرن کی نوک پر اس قسم کی رپورٹیں لکھ دیتے ہیں۔ ویسے بھی آج کے دور میں کسی کو اس طرح ڈیوٹا کوئی مشکل کام نہیں کہ اس کی موت ہارٹ ٹھیک کا نتیجہ معلوم ہو۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے۔ میں نے کو شش کی کر میرے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے پائے۔ وہ گہری سانس لے کر بولے ”اگر وہ عورت پاکستان میں رہتی تو شاید آپ کے لیے بہت مہربان اور کارآمد ثابت ہوئی۔“

لیکن پھر وہ خود ہی گویا اپنی بات کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے بولے ”خیر۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کو زندگی کے راتے میں قدم قدم پر دوسرے مہربان ملتے ہی رہے ہیں جن کی وجہ سے ہمیشہ آپ کے کام بہت آسان ہوتے رہے۔ قاسم خان کی موت کے بعد آپ نے زیادہ ذہانت سے اپنی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ آپ نے اسپورٹ انکسپورٹ کے رہنس کا آفس کھولا اور اپنے ابتدائی سرمائے کو جائز ثابت کر کے انکم ٹیکس میں ریزنگی کر دیا۔“ ”ہیں اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ کس طرح آپ کا اسپورٹ انکسپورٹ کا کاروبار راکٹ کی سی تیزی سے بلند ہوا اور طرف پرواز کرنا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کو زہنیوں میں غار ہونے لگے۔ اس دوران انکم ٹیکس اور ایف آئی اے والوں سے ایک بار آپ کی آن بین بھی ہوئی۔ ایف آئی اے والوں نے انکم ٹیکس والوں کے کہنے پر آپ کی فائل بھی کھلی۔ ان کی بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آپ کا اسپورٹ انکسپورٹ کا ٹرانز انڈیا میں ہے جتنی تیزی سے آپ کے دساکل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بہت سے افسران آپ سے خوش تھے اور بہت سے آپ سے مرعوب تھے۔ اس کی وجہ سمجھا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔“

پھر بھی آپ نے غالباً اس دور کو محفوظ سمجھنے کے باوجود مستقبل کے خطرات سے بھی بچنے کے لیے اس زمانے کے بھ دزدیوں سے تعلقات برصائے خصوصاً ایک وزیر کی تنگم آپ؟ بہت مہربان تھیں۔ میں ان کا نام لیتا نہیں چاہتا لیکن وہ نام ان فائلوں میں موجود ہے۔ ان نے مراسم کے بعد یکدم ہی آپ؟ انکشاف ہوا کہ آپ کے تو بہت سے سوئے باہر کے ہوئے تھے۔ سڑے پائے اور پکائیے آپ کے پاس بہت سا زہن ہوا۔ آگیا۔ بالکل جائز اور قانونی تھا۔ زہن ہار کے معاملے میں دیے بھی جاتے تھے۔ ضرورت مند رہی ہیں ان کا رویہ نرم رہا ہے۔ اس معاملے میں وہ زیادہ باریکی میں نہیں جاتیں۔ بیک بھی آپ پر مہربان ہو گئے۔ آپ نے اپنا سرمایہ بھی فراخ دلی سے استعمال کیا اور چھوٹا

ہی دھڑا دھڑا آپ کو ترے دینے دیکھتے ہی دیکھتے آپ کا شمار  
منگالوں میں بھی ہونے لگا۔

ہر حال اس میں شک نہیں کہ آپ بے پناہ خدا واد ملاحیتوں  
مالک تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں اتنی تیزی  
پہنچنے پہنچنے جو شاید کوئی بہت سے اساتذہ کی مدد سے بھی نہ  
پائی اگر ہم سرسری سی نظر میں ان انشادات کا جائزہ لیں تو یہ  
بے باطل الف لیلوی سی لگتی ہے۔ کل تک گاؤں کی گلیوں میں  
بچوں پہنے والا لڑکا چودہ برس کے عمر سے میں گلیوں میں  
چلا۔ گاؤں میں گزرتے ہوئے لوگ اس کی عالیشان عمل نما  
ٹی کو دیکھ کر لڑکے کر لیتے تھے اور رنک بھرے لہجے میں ایک  
بہت سے کہتے کہ کاش وہ بھی ایسا بکر بن سکتے۔

جس کے پاس کل شکر گڑھ سے لاہور آنے کے لیے بس کا  
اپ نہیں ہوا تھا وہ انگلینڈ امریکا اور یورپ اس طرح....  
گرا کر جانے لگا جیسے یہ سمندر پار کے ممالک نہیں بلکہ اس  
دکھنے لگے ہوں۔ ہر کاروبار میں اس کا عمل دخل ہو گیا۔ طبیعت  
باناغی بھی تھی۔ جس پر مہربان ہوا تھا اسے گندے نالے سے  
نار لگیں تخت پر بٹھا دیتا تھا۔

ہر حکم نہیں صاحب ذرا میری طرف کو مچھتے ہوئے  
ایمان سے کہتے میں بولے ”مستر چودری! کیا خود آپ کو اپنی  
طائفہ عیب نہیں لگتی؟ خود آپ کو عیبیہ نہیں لگتی؟ کیا  
ہاں کو نہیں ہوتا جیسے یہ کسی اور کی کمائی ہے؟“

میری دگ دپے میں جیسے کوئی چیز کھول رہی تھی۔ میں نے پلک  
پلک بڑھ کر ”مستر نہیں! میں آپ کے منہ سے وہی بات تو سننے  
کا انتظار میں بیٹھا ہوں جو آپ کو بہت عجیب لگی ہے۔ شاید یہ  
ہی کی ذمہ داری ہے جو آپ مجھے بے شمار خدا واد ملاحیتوں کا  
مل گئے ہیں ورنہ وہ حقیقت میں خاصا کوڑھ مغز آوی ہوں۔ میں  
کی تک نہیں سمجھ سکا کہ اس ساری کمائی میں آپ کو کیا چیز الف  
لکھی گئی ہے؟“

”آپ کا یہ تجاوی بارقہ نہ بھی آپ کی خوب صورت اداویں  
میں سے ایک ہے۔“ نہیں صاحب سرویسے میں بولے ”میں اس  
لکھنا کات کر رہا تھا جو آپ نے صرف چودہ پندرہ سال کے عمر سے  
لکھا۔“

”نہیں صاحب! اس ملک میں ایسی داستانیں تو قدم قدم پر  
لکھی جاتی ہیں۔ کیا وہ سب آپ کو الف لیلوی لگتی ہیں؟ کیا ان  
سب کا قلم تیار کرانے کے لیے آپ نے کبھی اتنا ہی تردد کیا  
جتنے سرویسے میں ہو چکا۔“

”میں سب کی نہیں“ فی الحال صرف آپ کی بات کر رہے ہیں۔  
پہلے اس بیٹھنے بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن اتنے کم عمر سے میں  
خدا واد اور آنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ ان میں سے  
کچھ ہی لوگوں کی کمائی یقیناً آپ سے ملتی چلتی بھی ہوگی۔ لیکن

عدالت میں اگر کوئی قاتل یہ کہے کہ اس نے قتل محض اس لیے کیا  
کہ دنیا میں بہت سے لوگ اس سے پہلے بھی قتل کر چکے تھے اور  
پکڑے نہیں گئے تھے تو عدالت اسے کوئی دلیل تسلیم نہیں کرتی۔  
آپ کی داستان حیات میں سے جو کڑیاں غائب ہیں؟ ہمیں ان کے  
بارے میں تشویش ہے مسٹر چودری۔ آپ ایک پراسرار آدمی ہیں  
مستر چودری! میں پہلے بھی یہ بات آپ سے کہہ چکا ہوں۔ پراسرار  
لوگ ہمیں کچھ خطرناک بھی محسوس ہوتے ہیں۔

اپنی اس قاتل پراسراریت کے ساتھ آپ ملک کے وزیر  
خارجہ کو اپروچ کر کے ایک پراسرار کمائی لے کر ہمارے پاس آئے  
تو بہت سی سوچوں نے ہمیں گھیر لیا۔ مسٹر چودری! ہمارے پاس ایسی  
اطلاعات اور ایسے شواہد قریب ہوتے رہتے ہیں کہ کسی سیاہی پائل  
کے سربراہ یا اسٹوڈنٹ لیڈر کو کسی غیر ملکی تنظیم نے خطرناک اور  
مذموم مقاصد کے تحت اپروچ کیا اور اسے آلاؤ کارہانے کے لیے  
بڑی بڑی رنکارنگ چیکٹیں کیں؟

میں نے بات کانٹے ہوئے کہا ”لیکن آپ ان کے بارے میں  
اطلاعات اور شواہد ہی جمع کرتے رہے۔ جس کو کتنا تھا وہ کب گیا؟“  
جس کو اس ملک میں غلطکار رہا کرتا تھا وہ کرتا رہا۔ بھائی بھائی کو فروغ  
کرتا رہا۔ آگ میں جھونکا رہا۔ کہیں ملک توڑنے کی نہیں صوبے  
توڑنے کی سازشیں ہوتی رہیں۔ درس گاہیں، قتل گاہیں بن گئیں۔  
اتنی کمائیں نہ بڑھی جاسکیں جتنے نوجوانوں کی کتاب زندگی وفاق  
ورق کر دی گئی۔ آپ بتائیں آپ نے اسے دھکے کے لیے کیا کیا؟

### ظفر و مزاح

|                            |           |       |
|----------------------------|-----------|-------|
| منتخب مزاح پارے            | ضیاء ساجد | 100/- |
| ممتاز ادیبوں کے منتخب خاکے | ضیاء ساجد | 120/- |
| منتخب شگفتہ شہ پارے        | ضیاء ساجد | 200/- |
| سرجیکل وارڈ                | ضیاء ساجد | 100/- |
| مزاح مزے کا                | ضیاء ساجد | 150/- |
| منتخب شاہکار عرصی خاکے     | ضیاء ساجد | 90/-  |
| منتخب مزاحیہ مضامین        | ضیاء ساجد | 120/- |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور نمبر 2

آپ صرف اعداد و شمار ہی کرتے رہے؟

"ہمارے ذمے جو کام تھا وہ ہم کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔" رئیس صاحب پر سکون لہجے میں بولے "اس ملک میں اور بھی بہت سے ادارے اور محکمے ہیں۔ ان کے ذمے بھی کچھ کام ہیں۔ کبھی ان پر بھی اپنی طرز و مزاج کی مصلحتیں آزمائے گا۔"

"ان سے بھی امید ہے یہی جواب سننے کو ملے گا۔" میں نے بلا تاخیر کہا "نی الحال تو مجھے جس سے واسطہ پڑ رہا ہے میں بھی صرف اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اس ملک کا ایک عام شہری ہوں۔ میرے پاس کسی کے اقتدار کا کوئی حق نہیں۔"

"آپ کو تمام حقوق حاصل ہیں، اسی لیے آپ اتنے آرام سے ہمارے مقابل بیٹھے سوال جواب کر رہے ہیں۔ ترکی بہ ترکی ہر بات کا جواب دے رہے ہیں۔ ورنہ اصولاً اس وقت آپ کو جیل میں ہونا چاہیے تھا۔" شہریار خان صاحب سکار کا کش لینے ہوئے پہلی بار بولے۔

"اگر آپ کے خیال میں مجھے ہی جیل میں ڈال کر اس ملک اور قوم کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے تو میں حاضر ہوں۔ براہ کرم اس نیک کام میں جلدی کیجئے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ وہ سب ایک تک مجھے گھور رہے تھے۔ مجھے اس بیشک کا اختتام بخیر دعائیت ہونا دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں نے اب گفتگو کی تمام احتیاط

بالائے طاقت رکھ دی تھی اور سوچ لیا تھا کہ جو بھی میرے دل میں ہو گا کہہ ڈالوں گا، خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ میری کپٹیاں تپ رہی تھیں۔ میں بہت خوش خوش لگا ہوا ہوں۔ براہ ذکر کے یہاں آیا تھا لیکن جو کچھ سوچ کر آیا تھا معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے مزید بات کرنا چاہی تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میری آواز گلوگیر ہو چکی تھی۔ میں نے گلے میں چھپتی ہوئی نمی کو نکلتے ہوئے کہا "رئیس صاحب! آج میری زندگی کے سب سے بڑے چھٹاوندے کا دن ہے۔ مجھے یہ سوچنے

ہوئے شرم آ رہی ہے لیکن مجبوراً سوچ رہا ہوں کہ اگر میں نے ریڈ ڈاٹ کی چیکنش قبول کر لی ہو تو کیا بہتر نہ ہوتا۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ آپ جیسے لوگوں کے ہاتھ لے

اور تقریریں بھی میرے لیے پائیں ہاتھ کا کام ہو جائے۔ میرے ذمہ داریاں ہلانے سے بڑے بڑے بہت ذمہ داریاں ہوں جو دیا کرتے لیکن پہلی بار میرے دل میں وطن کی محبت اس شدت سے جاگی کہ بادشاہ گریں جانے میں بھی مجھے کوئی کشش دکھائی نہ دی۔ اور یہ وہ خواب ہے جو اس ملک میں بہت بڑے بڑے لوگ جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں نے اس چیکنش کو ٹھکرا کر جو راستہ منتخب

کیا، اس پر چلتے ہوئے مجھے اپنے گھر کو رکھ کا ڈیرہ ہوتے دیکھنا پڑا، اپنے اپنے جاں نثاروں کو موت کے منہ میں جانے دیکھنا پڑا، اپنے ہمدردوں کو اختتام کا نشانہ بننے دیکھنا پڑا اور اس قسم کے پیشامات سننا پڑے۔"

میں نے ایک کیسٹ جیب سے نکالی اور میز پر پھینک دی اس میں ایڈی کا وہ پیغام محفوظ تھا جو مجھے آفس کی انورڈر پر موصول ہوا تھا، جس میں اس نے زندگی کو میرے لیے موت بدتر بنا دینے کے عزم کو دہرایا تھا۔

جہاں ہم بیٹھے تھے وہ ایک باقاعدہ کانفرنس ہال ہی تھا۔ نشست کے سامنے ایک بگ بھی موجود تھا لیکن آف تھا۔ شاید دلچسپ کہ اجتماع مختصر ہی تھا۔ ہم نہایت آسانی سے ایک دوسرے آواز سن سکتے تھے۔ رئیس صاحب نے مؤبانہ انداز میں ایک نوٹ لکھنے ہوئے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے کیسٹ اٹھالیام

کمرے سے ملحق ایک کیمین فرائسے میں سے لے گیا جہاں سے ساؤنڈ سسٹم کنٹرول کیا جاتا تھا۔ چند لمبے بعد وہ کیسٹ پلے کر دیواروں میں نصب شدہ اسپیکرز پر ایڈی کی آواز ابھر کر آئی سب ہر تن گوش ہو گئے۔

پیغام ختم ہونے کے بعد چند لمبے ہال میں سکوت چھایا، رئیس صاحب پہلے کی بہ نسبت ذرا لاٹھت سے بولے "ہم سب نے لے لی کسی سوال سب سے زیادہ پریشان کن ہے کہ ریڈ ڈاٹ کا واقعی کوئی وجود ہے تو آخر وہ آپ کے لیے اتنا ترڈ کر رہی ہے؟" پلے لے وہ آپ کو آمادہ کرنے کے لیے اتنا ترڈ کر رہی ہے اور

کے افکار کے بعد بھی وہ آپ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتی بلکہ آپ کو سبق سکھانے کی خاطر آپ کی زندگی کو موت سے بدتر کر کے گوش کر رہی ہے۔ اور اس کے لیے اتنا ترڈ کر رہی ہے کہ

مقاصد کے لیے ذرا دوسری طرح کے لوگ زیادہ کارآمد ہوتے؟ جن کی کوئی سیاسی اہمیت ہوتی ہے یا جو سرکاری سطح پر بہت پورے ہوتے ہیں۔ ہم سب اس پہلو پر ابھی تک مطمئن نہیں ہوئے

اس کے علاوہ بقول آپ کے؟ آپ جب سے ریڈ ڈاٹ کے ذریعہ ہوتے ہیں تب سے جس قسم کی کارروائیاں ہو رہی ہیں ان ذرا اہمیت کا مختصر غالب ہے۔

"بھئی! یہ عنصر میں نے پیدا نہیں کیا۔ میں کوئی ڈراما ڈال نہیں ہوں۔" میں نے ذہری سادگی سے کہا۔ رئیس صاحب گویا میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بات

دیکھتے ہوئے بولے "ہمارے پاس آپ کی زندگی کے بارے میں آپ کے ماضی کے جو تاریک گوشے ان فائلوں میں ہیں وہ ہمیں کچھ اور بھی سونچنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "مثلاً یہ کہ یہ کوئی ٹیگ وار تو نہیں ہے؟ انٹر نیٹیل مانیآپ کی کوئی دشمنی تو آپ کا حقیقی نہیں کر رہی؟ یا یہ کسی اور کے بدلے کی کوئی جنگ تو نہیں؟ جس میں آپ خفیہ ایجنسیوں استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟" وہ گہری شجہ کی بولے۔

مجھے ہنسی آئی لیکن یہ ہنسی ایک درد بھری کراہ تھی۔

نہی۔ آخر کار میرے اندر مزاحمت اور بحث و تمحیص کی خوشنودی  
ڈونگی۔ میں نے اپنی جھکتی ہوئی کپڑیوں کو ایک لمبے کے لیے مٹلے  
کے بعد کہا "ہیں اب بات ہی ختم ہوگئی نہیں صاحب! میں اب کچھ  
بھی کہنا نہیں چاہتا، کسی بھی بات کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ مجھ  
سے غلطی ہوئی جو میں نے اسے جوش و خروش سے آپ لوگوں کو  
اندوخت کیا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بھیاںک غلطی تھی۔ اگر آپ  
کے لیے ممکن ہو تو اس بات کو بحال جائیں کہ میں آپ کے پاس آیا  
تھا۔"

اس بار باقری صاحب نے بھی ہل کر کویا اپنی موجودگی کا  
اداس دلایا "یہ تو ممکن نہیں ہے مسترجہ ہدی! ہمارا تعلق تو اس  
مٹینز سے ہے جو ایک مرتبہ اشارت ہو جائے تو دوسری طرف  
سے کچھ پروڈکٹ برآمد ہونے کے بعد ہی رکتی ہے۔"  
"آپ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ پروڈکٹ کس قسم  
کی برآمد ہوگی۔ بہر حال میں تو اب اس بحث میں ہی رہنا نہیں  
چاہتا۔" میں نے بے زاری سے کہا "مجھے صرف یہ بتا دیجئے کہ  
میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا میں اپنے آپ کو زیر حراست  
سمجھوں؟"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے یہ نتیجہ کیونکر اخذ  
کرایا؟" نہیں صاحب حیرت سے بولے "ہمارا مقصد ہی المال آپ  
کو صرف آپ کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کرنا تھا۔ آپ  
کو حراست میں لینے کے بارے میں تو ہم نے سوچا بھی نہیں۔"  
"تو پھر مجھے اجازت؟" میں نے اٹھنے کے لیے پر توڑتے ہوئے  
کہا۔

"چلے جائیے گا" ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ "نہیں صاحب یوں  
لائسنس سے بولے گویا میں کسی سوشل ورثہ پر ان کے گھر آیا ہوا  
کوئی مسکن تھا۔"

"کیا میری گھرانی کی جائے گی؟" میں نے پوچھا۔  
"نہیں! ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" نہیں صاحب نے جواب  
دیا "ہمیں امید ہے کہ آپ کہیں نہیں جائیں گے اور جب ہمیں  
آپ کی ضرورت ہوگی آپ ہمیں آسانی سے مل جائیں گے۔"  
"جب آپ کو ریڈ ڈاٹ کے وجود پر یقین ہی نہیں تو آپ کو مجھ  
سے رابطہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے تو اب یہی شرمندگی ہے  
کہ میں نے ابھی تک خواہ خواہ آپ لوگوں کا اتنا قیمتی وقت ضائع  
کیا۔" میں نے کہا۔ مجھے وہ حقیقت اپنا وقت ضائع ہونے کا افسوس  
تھا۔

"ہماری طرف سے ابھی بات ختم نہیں ہوئی مسترجہ ہدی!"  
نہیں صاحب بولے "اگر ریڈ ڈاٹ کا کوئی وجود ہوا تو ہمیں امید ہے  
جلد یا بعد اس کا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے آئی جائے گا۔ ہم جلد  
اپس ہونے والے لوگ نہیں ہیں۔ کوئی بھی منطقی چیز کتنی ہی پوشیدہ  
کیوں نہ ہو ایک نہ ایک روز ضرور عیاں ہو کر رہتی ہے۔ آپ کے

مکان کا خیر دم، دو چار نین مسٹری خیر مزی لائیں۔ ایک چینی زری  
کی لائٹ ایک آؤٹ لیس۔ یہ جیس اس قسم کی کسی خطیم کے دور  
کا خفی اور خوش ثبوت نہیں ہیں جیسی آپ کے بیان کے مطابق  
ریڈ ڈاٹ کو ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے آپ شکریہ ہے۔" میں نے بے زاری سے کہا  
"جب گلیاں لاشوں سے پٹ جائیں تو شاید آپ کو یقین آجائے اگر  
مجھے معلوم ہوا کہ آپ لوگوں کو کسی بات کا یقین دلانا اتنا مشکل کام  
ہے تو میں ہرگز زحمت نہ دیتا۔"

"ایسی بات نہیں ہے مسترجہ ہدی!" انہیں صاحب خفی سے  
بولے "یہ بات پر حالات برآورد بات کرنے والے کی ذات بہرخصر  
ہو آ ہے کہ اس پر کب "کس طرح اور کس انداز میں یقین کیا  
جائے۔"

"ٹھیک ہے سراجیہ آپ کی مرضی۔" میں نے کد سے  
آگ نکال دی۔

نہیں صاحب فائل کے ورق اٹھتے ہوئے بولے "میں نے تو  
آپ کو صرف غلامہ ستایا ہے ورنہ اس فائل میں آپ کی زندگی کی  
کھلی کمانی محفوظ ہے۔"

مجھے کچھ شبہ ہوا تھا کہ نہیں صاحب نے میری فائل صرف  
خفیہ اداروں کے ذریعے تیار نہیں کرائی تھی بلکہ کچھ نامعلوم ذرائع  
نے ان کی مدد کی تھی کیونکہ نہیں صاحب کو مجھ سے آشنا ہونے  
زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ ان اداروں سے مجھے اتنی مستعدی کی  
توقع نہیں تھی۔ دوسرے اگر اس پیمانے پر میرے بارے میں چھان  
بین ہوئی تو مجھے ضرور بتا جاتا۔

میں سوچ رہا تھا کہیں ریڈ ڈاٹ لے تو اس کام میں خفیہ  
اداروں کی مدد نہیں کی؟ ریڈ ڈاٹ میری طرف زیادہ عرصے سے  
متوجہ تھی۔ ان کے ذرائع بھی ناقابل یقین تھے۔ ممکن ہے انہوں  
نے میرا کھیل کھیل دیا ہو۔ خفیہ طور پر میرے بارے میں ایکسیپوں کو  
اطلاعات بہم پہنچائی ہوں۔ نہیں صاحب نے صرف ان کی تصدیق  
کی ہو۔ بلکہ ضروری نہیں تھا کہ تصدیق بھی کی ہو۔ ممکن تھا ابھی وہ  
صرف شوشا پھوڑ رہے ہوں۔ میرا تو عمل دیکھنا چاہتے ہوں۔ مجھے  
ننول رہے ہوں۔ اندازے لگا رہے ہوں کہ میں کس حد تک قابل  
اقتدار ہوں۔ وہ خود بھی اس بات سے بے خبر ہوں کہ ریڈ ڈاٹ  
تلف سمتوں سے میری جڑیں کاٹ رہی تھی۔ مجھے ان کی نظر میں

سلطان نور الدین زنگی

الماس ایم اے قیمت: 250/-

خلافتِ قریب نہیں صاحب اٹھ کر میرے ساتھ ہال کے دو دروازے تک آئے اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ شفقانہ انداز میں میرے کندھے پر چھکی دیتے ہوئے بولے "سرم چہ دردی اپنی جان کی حفاظت کرنا۔"

میں نے کہا "بب آپ کو ریڈ ڈاٹ کے وجود پر یقین ہے ہی نہیں تو پھر میری جان کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" "یقین بے یقینی اپنی جگہ ہے لیکن آپ کی جان کو ہر حال خطرات لاحق معلوم ہوتے ہیں۔" وہ بولے۔

"میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں۔" میں نے صاف کوئی سے کام لیا "ریڈ ڈاٹ والوں کا کہنا ہے کہ وہ مجھے جان سے مارنا نہیں چاہتے۔ ان کی نظر میں یہ کوئی خاص سزا نہیں۔ وہ میری زندگی کو موت سے زیادہ حیرت ناک بنانا چاہتے ہیں۔"

## اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

125/- صلیب و حرم

150/- نیشاپور کا شاہین

150/- بابل کا بت شکن

175/- ظلم کدہ

150/- آتش فشاں

200/- آخری حصار

125/- بنت نیل

150/- سائبریا کا طوفان

150/- آتش و آہن

150/- ظلمات

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

تا قاتل اعتبار باری تھی اور یوں کسی حد تک انہیں بھی میرے خلاف استعمال کر دی تھی۔ اس فاکل میں بے شک میری کمائی تھی لیکن اس کے پیچھے بھی یقیناً کوئی کمائی تھی۔

نہیں صاحب سرسری سے انداز میں بولے "میں نے آپ کے ماضی کے جن تاریک پہلوؤں کا اشارہ کیا ہے ان کے بارے میں آپ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا؟" وہ واقعی مجھے ٹولنے کی کوشش کر رہے تھے میرے شہادت پختہ ہونے لگے کہ اس فاکل کے پیچھے کچھ مظلوم لوگوں کی جبری کام کر رہی تھی۔

میں نے ہر سکون لیے میں نے کہا "جب میں نے بات ہی ختم کر دی تھی تو پھر تبصروں کا کیا فائدہ؟ میں نے تو اپنے آپ کو حالات کے دم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ بتائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ تصدیق چاہتے ہیں تو میں سب باتوں کی تصدیق کردیتا ہوں۔ آپ تردید چاہتے ہیں تو میں سب باتوں کی تردید کردیتا ہوں۔ باتیں سننے بغیر۔ اس سے زیادہ تعاون بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"اتنی بے زاری؟" نہیں صاحب کے پتلے پتلے شفاک سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رشت ابھری۔

"میں کچھ لہجے میں تو صرف بے زار ہوا ہوں، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خود کشی کر لیتا۔" میں نے جواب دیا۔

"بعض اوقات بے زاری کی کوکھ سے بڑے خوشگوار واقعات جنم لیتے ہیں۔" نہیں صاحب بولے۔

"میں بے یقینی سے اس دن کا فخر ہوں۔" میں نے کہا۔ باقی سب لوگ بس ایک منگ میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ ان میں سے بعض نے تو ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ شاید منگ میں ان کی شرکت کا مقصد صرف گفتگو مٹنا ہوتا تھا اور ان کا اصل کام منگ کے بعد شروع ہوتا تھا۔

چند لمے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ شہیار صاحب سحر کے کش لیے رہے۔ باقری صاحب و میرے دھیرے اپنی خیالی مونچھوں کو کھینچ دیتے رہے اور نہیں صاحب اگلیوں پر تھوڑی ٹکائے کسی خیال میں ڈوبے رہے لیکن نظر سب کی مجھ پر تھی۔ انداز یکہ ایسا ہی تھا جیسے میں کوئی عجیب اقلیت انسان تھا اور ان کے مسائل کے لیے لایا گیا تھا۔

آخر کار میں نے ایک بار پھر اٹھنے کے لیے پرتولے ہوئے کہا "مجھے اجازت دیجئے۔"

"ٹھیک ہے" نہیں صاحب کمری سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے "آپ سے پھر ملاقات رہے گی۔ رابطہ رکھیے گا اور ہر چھوٹے بڑے واقعے کی اطلاع دیتے رہیے گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے اپنی آکٹاہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن دل ہی دل میں "میں سوچ رہا تھا کہ اب شاید اس دہانت پر عمل نہ کیاؤں۔ ابھی تک تو اس کا کوئی خاص فائدہ سامنے نہیں آیا تھا۔"



پھولوں کی سیج پر پروان چڑھنے  
والے ایک نواب زادے کی  
خودنوشت

## درخشاں

لازوال کمائیوں کے خالق انوار  
صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے  
ایک نئی سوغات تین دوستوں کا قصہ  
جن کے عزم و استقلال سے طوفان  
شکست کھا گئے تھے۔

دو حصوں میں مکمل

حصہ اول (45/-)

حصہ دوم (45/-)

نمبر 385

فون: 7224665

”اور آپ نے ان کی بات کا اعتبار کر لیا؟“ نہیں صاحب  
”نہیں“

”اب وہ غیبی ہیں، مگر وہ ہیں“ ترقی پذیر ممالک کے لیے  
مروت ہیں لیکن بد بخت اپنی بات کے برے پکے ہیں جو کہتے ہیں  
”یہ آپ کی غلط فہمی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”تو کیا آپ کو ریڈ واٹ کے وجود کا یقین آچکا ہے؟“ میں نے

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ وہ بولے ”لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ  
کوئی نہ کوئی پتہ ضرور چل رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی طاقت کہیں سرگرم  
مل ضرور ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کا نام ریڈ واٹ ہو اور  
ضروری نہیں کہ اس کے اغراض و مقاصد وہی ہوں جو آپ نے  
بانے ہیں۔“

”چلیے آپ اس حد تک تو آئے میرے لیے اتنی کافی  
ہے۔“ میں نے گرمی سانس لے کر کہا۔ ہم باہر آچکے تھے۔

ارائے دے میں وہی سیاہ سرسبز کھڑی تھی جو مجھے یہاں لائی  
تھی۔ اس کے دونوں پہلے دروازے پہلے ہی کھلے تھے اور دروازے  
الٹا پیٹ پر موجود تھا۔ وہی دونوں افراد جو میرے ساتھ آئے تھے  
نہ جانے کہاں سے برآمد ہو کر میرے دائیں بائیں آن کھڑے  
ہوئے۔ نہیں صاحب نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا۔ وہ دو پہلے پہلے  
نے لیکن ان کے ہاتھ کی گرفت آہنی تھی۔

ہم نے گاڑی کی طرف توجہ دیا اور اسی خاکہ ڈرائیور نے غالباً  
گاڑی اشارت کرنے کے لیے اس کی پیشکش میں چالی گھمائی۔ اس کے  
ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکا ہوا اور میں نے گاڑی کے پرچے  
اڑتے دیکھے۔

دھماکے پر ہمارا ڈرائیور تقریباً ایسا ہی تھا جیسے کوئی چیز تیزی  
سے آنکھ کی طرف بڑھتی ہے تو آنکھ خود بخود بند ہو جاتی ہے۔ بالکل  
ایسی طرح دھماکے کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو برآمدے کے  
پہلے سے ستون کے عقب میں گر لیا۔ نہیں صاحب نے بھی  
توجہ دیا کہ یہ کچھ ہی کا مٹا ہوا تھا۔ وہ میرے قریب ہی ڈھیر ہوئے  
تھے۔

دو افراد جو مجھے ساتھ لے کر آئے تھے اور غالباً ساتھ ہی  
ملے جانے کے لیے ہمارے عقب میں آن کھڑے ہوئے تھے  
انہوں نے فرش پر ڈھیر ہونے میں ذرا تاخیر کر دی۔ یہ تاخیر شاید ایک  
پل کے دو سو یا تیسویں حصے پر مشتمل رہی ہو لیکن ایسے موقعوں  
پاؤں تاخیر ہی مہموزہ زندگی اور موت کا فیصلہ کر دیتی ہے۔

فطامی جب دھماکے کا ارتعاش ختم ہوا اور وہاں سکوت چھا  
کیا میں اور نہیں صاحب آہنگی سے اٹھے۔ تب ہم نے اپنے  
عقب میں کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو جناح کی پ

ہو رہا ہو لیکن ہاتھ الٹا لٹکا ہوا تھا۔ وہ داخل ہو چند لمحوں پہلے ہی نہایت پر سکون اور خوب صورت دکھائی دے رہا تھا اس میں یکدم ہی موت کی خوفناکی اور بد صورتی پھیل گئی تھی۔

میں نے تو عمارت کے اندر اٹھ یا تو افراد کو ہی دیکھا تھا لیکن اب ان کے علاوہ بھی بہت سے افراد باہر آگئے تھے۔ چنانچہ ہی حالت نظر آنے لگی۔ اس وقت تو میں حیران ہوئے بغیر نہ رہا جب عمارت کے عقبی حصے سے ایک ایسا نفیس بھی نکل نکلا۔ وہ رادھہ اور دو دروئے بھاگنے لگے لیکن یہ سب کچھ نہایت خاموشی سے ہو رہا تھا۔ کوئی سارن نہیں بچ رہا تھا۔ کوئی چیخ چلا نہیں رہا تھا۔

بیشتر دیابت نفیس صاحب ہی دے رہے تھے اور وہ بھی پہلے ہی کی طرح پر سکون دکھائی دے رہے تھے۔ صرف ان کے چہرے کی کسرتی میں ٹھوڑا سا اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے سہوت گویا بالکل فراموش کر دیا گیا تھا۔ میں ایک طرف کھڑا ساری صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

سب سے پہلے ذمہ اور مگر وہ شخص کو ایسا نفیس میں ڈال کر نالٹا اسپتال روانہ کیا گیا۔ اسی دوران ایک جہب میں کچھ اور لوگ بھی آئے اور پتا چلے کہ وہ مگر وہ کار و غیرہ کا معائنہ کرنے لگے۔ ان میں ایک فوٹو گرافر بھی تھا۔ وہ مختلف زاویوں سے جانے توہ کی تصویریں بنانے لگا مگر وہ کوئی عام پیشہ ورانہ پرس کا فوٹو گرافر مسلم نہیں ہوا تھا۔ وہ تصویریں کھینچ چکا تو ذرا میوڑ اور گاڑی دونوں ہی کے کھڑے جمع کیے جانے لگے اور پتا چلے کہ سیاہ بڑے بڑے تھیلوں میں ڈالے جانے لگے۔ سب کی چروں پہ تعمیر اور ادا کی آمیز سی عجیب کی طاری تھی۔

چند منٹ بعد وہاں صرف کچھ نشانات اور کار کا آدھا ڈھانچا سا رہ گیا۔ تب نفیس صاحب دوبارہ میری طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر ہم لوگ اٹھا کانفرنس ہال میں آہٹے۔ میز کے گرد وہی چہرے تھے۔ نشین کی وہی ترتیب تھی۔ میرے چروں پر آمیزات ذرا کھیرے ہوئے تھے۔ ورنہ ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا کہ ہماری میٹنگ میں چند منٹ کے لیے غلط ہو گیا تھا اور اب سلسلہ وہیں سے نوزاد جارہا تھا جہاں سے آ رہا تھا۔

نفیس صاحب پر خیال انداز میں میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ آخر کار میں نے ہی سکوت توڑا "ریڈ ڈاٹ آپ کی دلچسپی بھی پہنچ گئی ہے نفیس صاحب!"

"آپ کا ذہن ریڈ ڈاٹ میں ہی اٹکا ہوا ہے مشورہ دہریا!" خلاف توقع وہ ملاطفت سے بولے "دیکھا میں ریڈ ڈاٹ کے علاوہ کئی بہت سے معلومات ہوتے ہیں۔"

"تو پھر آپ کا اپنا کوئی معاملہ ہو گا۔ مجھے تو اس پر ریڈ ڈاٹ ہی کی کارروائی کا کمال گزرا تھا۔" میں نے قدرے بے پروائی سے

والے کے ساتھ کو عجیب حالت میں پایا۔ اس کی ایک آنکھ میں لوبے کا جھلسا ہوا ٹکڑا اس طرح بیست تھا کہ رخسار کی ہڈی پر چبھا سا بن گیا تھا۔

دوسری طرف کا پرہار رخسار ہی غائب تھا اور جڑے کی ہڈی کے ساتھ دانت وغیرہ عیاں ہو جانے کے باعث چہرہ یکدم ہی بہت ہی بھیاں ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جیت پڑا تھا اور خون اس کے چہرے سے پھیل پھیل رہا تھا۔ کمرانے کی آواز اسی کی تھی۔ وہ ابھی ہوش میں تھا۔ جناح کیپ والا تو نالٹا گری چکا تھا۔ لوبے کا ایک ٹکڑا زمین اس کے غلوں میں بے جگہ ساخت کے کسی خنجر کی طرح بیست تھا۔ چہرے اور سینے پر بھی بہت سے ٹکڑے لگے تھے۔ کچھ دہیں بیست تھے۔ کچھ اپنے ساتھ کوٹ آڑے آڑے ہوئے لگے تھے۔

ایسے موقعوں پر انسان کو تھیر پر یقین نہ رکھنے والے بھی خدا نخواستہ ایسی صورت حال سے گزریں تو مجھے امید ہے انہیں یقین آنے لگے گا واقعی جیسے کوئی فیہی ہاتھ کسی کی ڈھال بن جاتا ہے اور کسی کو پک جھپکتے میں موت کی آغوشی وادی میں کھینچ کر لے جاتا ہے۔

یہ ایک عجیب اور قابل غور اتفاق تھا کہ میں اور نفیس صاحب ان دونوں آدمیوں کے سامنے کھڑے تھے۔ ہم گویا ان کی ڈھال تھے۔ دھماکے سے فضا میں اڑنے والے پرچے پہلے ہم تک پہنچنے چاہئیں تھے۔ لیکن ہم بس ایک سیکنڈ کا دواں میواں یا شاید پچاسواں حصہ پہلے فرش پر پھیر ہو گئے تھے۔ یا یوں کہنے کا تھیر کے نیچے ہاتھ نے ہمیں درمیان سے ہٹا دیا تھا۔ تاہم کھڑے ہونے پر مجھے احساس ہوا کہ میرے کوٹ کا کندھا فوم کے پڑھ سمیت یوں غائب ہو چکا تھا جیسے کسی نے قینچی سے کاٹ کر الگ کر لیا ہو لیکن اس کے نیچے میرے اصل کندھے پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ کندھے میں کچھ کھنڈا سا ضرور محسوس ہو رہا تھا لیکن مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ کب اور کس طرح میرے کوٹ کا وہ حصہ غائب ہوا تھا۔

گاڑی ہم سے کافی دور گیٹ کی دیوار کے قریب کھڑی تھی۔ دیوار کا کچھ حصہ بھی سٹار ہوا تھا۔ لیکن گاڑی دھماکے سے پوری نہیں اڑی تھی۔ اس کا ٹکڑا آدھا حصہ غائب ہوا تھا اور باقی آدھے حصے کی بھی حالت ناہو ہو چکی تھی۔ سرسبز جیسی مضبوط گاڑی کے آدھے حصے کے پرچے اڑنا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ یقیناً خامسا طور کار ہم رہا ہو گا۔ مدش کے نفوس پختہ فرش میں بھی گڑھا پڑ چکا تھا۔

ڈرائیور کے جسم کے کچھ ٹھٹھے ہوئے اور کچھ خون میں تھڑے ہوئے ٹکڑے رادھہ اور جا چکے تھے۔ ان میں سے کچھ سے ابھی ڈوٹھراں ہی اٹھ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کلائی کے تھوڑے سے حصے سمیت کٹ کر ایک درخت پر جا اٹھا تھا اور نرم شاخ پر اس طرح جھول رہا تھا جیسے کوئی کسی کو خدا حافظ کہہ کر رخصت

### تاریخی ناول

|       |                      |           |
|-------|----------------------|-----------|
| 100/- | دنیا کے نامور فاتحین | قمر تسکین |
| 100/- | شیر مصر              | قمر تسکین |
| 100/- | شمشیر اسلام          | قمر تسکین |
| 100/- | ترک مرو میدان        | قمر تسکین |

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

میں نے مری سانس لے کر کہا "نفس صاحب! آپ کا طرز عمل بھی نہایت ہی فطرتاً سے ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو ریڈ واٹ کے وجود پر قطعاً یقین نہیں اور کبھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ اس پر یقین کرنے پر مائل ہیں۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کی نظر میں بڑی محترم اور معتبر شخصیت ہوں اور کبھی مگر گزرتا ہے کہ آپ مجھے قطعی جھوٹا اور ناقابل اعتبار انسان سمجھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے کون سے رویے کو درست سمجھوں اور خود کیا رویہ اختیار کروں۔"

میں نے محسوس کیا کہ نفس صاحب شاید اندر ہی اندر سکرانے لگے۔ اگر چند لمحے پہلے ان کے دو آدمیوں کی موت کا انوس باک واقعہ پیش نہ آچکا ہوتا تو شاید وہ ظاہری طور پر بھی سکرانی دیتے۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ مجھے تذبذب، بے یقینی اور الجھن میں مبتلا رکھ کر خوش تھے۔

وہ اپنے مخصوص ٹھمرے ٹھمرے انداز میں بولے "ہمارا کام فطرتاً سے سروس سے زیادہ مشکل ہے۔ مسٹر جلدی! یقیناً نہ آئے تو کبھی فاران مسٹر حفیظ صاحب سے پوچھ لیجئے گا۔ آپ ہمارے اور ہمارے دوستوں کے بارے میں کسی سچے سچے پہنچنے کی کوشش نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ جو سوال زیادہ اہم ہیں انہیں ان پر غور کرنا چاہیے۔"

"تجزیہ آپ کی معقول ہے" میں نے سر ہلایا "مجھے بھی یہ سوال زیادہ اہم محسوس ہوا ہے کہ آخر گاڑی میں ہم کس وقت نصب کیا گیا؟ انجینشن کا سوچ آن ہونے سے ہم بچنا ہے اس کا مطلب ہے ہم اس وقت گاڑی میں موجود نہیں تھا جب وہ مجھے ہوٹل سے لے کر روانہ ہوئی۔ اس طرح کا ہم نصب کرنے میں یقیناً تھوڑا سا وقت بھی درکار ہوتا ہو گا۔ آپ کا یہ ٹھکانا جسے آپ نے غالباً بہت مخفیہ اور کالی محفوظ تصور کیا ہوا ہے کیا اتنی غیر محفوظ

گاہ "معاذ تو یہ ہمارا نہیں تھا۔ معاملے کا تعلق تو آپ ہی کی بات سے ہو سکتا ہے لیکن ہم فی الحال اس کی نہ میں ریڈ واٹ نام کی اس انسانی قوت کو تلاش کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کا نشہ آپ پہنچ چکے ہیں۔" وہ بولے۔

میں نے ایک بار بھر خون کا گھونٹ پیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "مجھے آپ کو اس کی نہ میں جو قوت نظر آتی ہے آپ اسے ہی تلاش کر لیجئے۔ پھر اس سے پوچھ لیجئے گا کہ اس کا نام کیا ہے۔ وہ نہ جانتے تو خود اس کا کوئی اچھا سا نام رکھ لیجئے گا۔"

کمال شخصیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفس صاحب نے میرے اس طرز کو نظر انداز کر دیا اور بولے "فرض کریں یہ ریڈ واٹ ہی کا نام ثابت بھی آپ کی ایک خوش فہمی تو دور ہو جانی چاہیے۔"

"گوں ہی خوش فہمی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔  
"تپ کہہ رہے تھے کہ ریڈ واٹ والے آپ کو مارنا نہیں چاہتے بلکہ آپ کی زندگی کو ہی آپ کے لیے موت سے بدتر بنانا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہمیں ایک کیٹ بھی سنوائی تھی جس میں پھر اس قسم کا پیغام دیا تھا لیکن آپ خود سوچیں۔۔۔ اگر آپ اس گاڑی میں ہوتے تو کیا بچ سکتے تھے؟ کہیں کوئی آپ کو خوش فہمی میں دھوکہ کرانا نہ چاہتا ہو۔"

"بھانے والی تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ بظاہر ہر حال میں نظر آتا ہے کہ اگر وہ مجھے مارنا چاہیں تو یہ ان کے لیے زیادہ مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے انہیں مجھ کو خوش فہمی یا غلط فہمی میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جب میرا قلعہ ٹاٹا کر اڑا سکتے ہیں، ملک کی سب سے بڑی فوجی ایجنسیوں کے ایک خفیہ ٹھکانے پر کھڑی ہوئی مریڈیز اڑا سکتے ہیں، بھری تباہی کے درمیان میری ایک بزنس پارٹنر راولپنڈی کے گھر کا ٹاٹا کر اڑا سکتے ہیں تو ان کے لیے اس خالی

دھوکہ کو اڑانا کون سا مشکل کام ہے۔" میں نے اپنے سر ہانک کی طرف اشارہ کیا "مجھے ان کی بات کا یقین ہے۔ وہ واقعی مجھے مارنا نہیں چاہتے۔ کم از کم فی الحال تو مارنا نہیں چاہتے۔"

تو پھر اس گاڑی میں دھماکا کرانے کی کیا تکلیف تھی؟ "نفس صاحب نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا کہ وہ سائنسی طور پر بہت فزائیاتی ہیں لیکن غیب داں تو نہیں ہیں۔ انہیں پیشگی تو یہ علم نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ بچ جائیں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اس اتفاق میں بھی شک کا پہلو ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کے اعتراض کا واقعی میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا جواب تو ریڈ واٹ والے ہی دے سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ بنا پر انہیں یقین رہا ہو کہ گاڑی اسٹارت ہونے تک میں گاڑی میں نہیں بیٹھا ہوں گا بلکہ گاڑی کے قریب بھی نہیں ہوں گا۔ ممکن ہے ان کی اطلاعات یا اندازے کچھ اور ہوں۔ ممکن ہے اس گاڑی کو اڑانے کا مقصد سرے سے کچھ اور ہی ہو۔

یہاں کے بے خبریاسیوں کی بہتری اور ان کے مستقبل کی خاطر  
حاضر ہوں۔ میرے لیے جو حکم ہو وہ بتا دیجئے اور مجھے اجازت  
دیجئے۔“

نقیس صاحب انگلی سے ٹھوڑی سیلے ہوئے چرخ خیال سے انداز  
میں ایک لمبے کے لیے خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے پھر  
سائنس لے کر بولے ”ہمیں آپ کی ضرورت تو ہے لیکن فی الحال ہم  
آپ کو کوئی خاص ہدایات نہیں دے سکتے کہ یوں کیجئے اور یوں نہ  
کیجئے بس آپ اپنے معمولات جاری رکھیے اور جس طرح آپ  
تک ہمیں ہر چھوٹے بڑے واقعے کی اطلاع دیتے رہے ہیں وہی  
رہے اور ہاں۔۔۔“

وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے ”سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے  
دماغ سے یہ خیال نکال دیجئے کہ ریڈ واٹ آپ کو ہلاک کرنا نہیں  
چاہتی۔ اپنی جان کی حفاظت اسی طرح کیجئے گویا ریڈ واٹ آپ کی  
جان لینے کے ور ہے۔ اس ضمن میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنا  
ہوں۔ آپ چاہیں تو آپ کو دس بارہ بہترین قسم کے کمانڈوز کی  
خدمات فراہم کی جاسکتی ہیں۔“

میں دھیرے سے ہنس دیا۔ نقیس صاحب نے قدرے قہر  
سے میری طرف دیکھا۔ وہ واقعی عجیب آدمی تھے۔ میرے لیے کو  
تھے سے کم نہیں تھے۔ ایک طرف انہیں ریڈ واٹ کے وجود پر  
نہیں تھا، میرا نامی ان کی نظر میں مشکوک تھا، میری باتوں کا انہیں  
کوئی خاص اعتبار نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ مجھے اپنا خیال رکھنے  
اور اپنی جان کی حفاظت کی تلقین کرتے تھے۔

میں نے لامنت سے کہا ”چند منٹ پہلے کار کے دھماکے میں  
ڈرائیور اور مجھے ساتھ لانے والے دو افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ یہ  
اندازہ ہے کہ وہ بھی کمانڈوزی تھے۔“

نقیس صاحب نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اہم  
تسلیم کر لیا ”آپ کا انداز درست ہے۔“

”جب تین کمانڈوز میں سے دو ہلاک جھپٹے میں مرتے ہیں  
ایک شدید زخمی ہو سکتا ہے تو دس بارہ کا انجام بھی یہی ہو سکتا  
ہے۔“ میں نے کہا۔

”اگر سب لوگ اسی انداز میں سوچنے لگیں تو تمام اہم  
شخصیات اپنی حفاظت کے انتظامات کرنا چھوڑ دیں۔“ نقیس صاحب  
بولے۔

”ایک بار پہلے بھی ایک جگہ یہی بات ہوئی تھی۔ اس وقت  
مجھ میں نے یہی جواب دیا تھا کہ دنیا میں بہت سی مشہور شخصیات  
کی انہی لوگوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی مثالیں موجود ہیں۔  
انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے ہمارے قتل ہوئے خود ہمارے قتل  
حفظ صاحب اپنے بیکوئی چیف اکرام بیگ کے ہاتھوں قتل ہوئے  
تھے۔ ہال بال بچ گئے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اوپر والا  
مذہب میں فرشتہ اُبلے کو ہمارے پاس بھیج دے۔ ویسے بھی میں اس

ہے کہ گاڑی کی یہاں موجودگی کے دوران کوئی اس کے انجن میں بم  
فٹ کر کے چلا گیا اور کسی کو ہتھی نہیں چلا؟“

نقیس صاحب نے یوں ٹھنڈی سانس لی جیسے انہوں نے کوئی  
خاصا چکن سوال سن لیا ہو۔ پھر وہ فنی میں سر ملاتے ہوئے بولے  
”یہ سوال بھی زیادہ اہم نہیں۔ جس دوران ہم اندر سینک میں  
مصروف تھے گاڑی دو آدمیوں کو پینڈی پہنچانے بھی گئی تھی۔ اس  
دوران ممکن ہے کچھ دیر کے لیے ڈرائیور گاڑی سے دور بھی رہا  
ہو۔“

وہ ایک لمبے کے لیے خاموش ہوئے تو شرار خان صاحب  
مگر کارکش لے کر وہ جھل آواز میں بولے ”یہ بھی ضروری نہیں ہے  
کہ ہم اسی مرتبہ گاڑی اشارت ہونے سے پہلے پہلے گاڑی میں لگایا  
گیا ہو۔ ہزاروں اقسام کے قہر ایجاد ہو چکے ہیں۔ ایسا ہم بھی ہے  
کہ آپ چاہیں تو وہ دوسری تیسری چونگی یا پانچویں مرتبہ گاڑی  
اشارت ہونے پر پھٹے ریوٹ کنٹرول ہم بھی ہیں۔ ایسا ہلاکت ہم  
بھی ہے جو قریب سے گزرتی کسی گاڑی کے ذریعے آپ کی گاڑی پر  
پھینک دیا جائے وہ گوشت کے ٹوکڑے کی طرح گاڑی کے کسی حصے  
پر چپک جاتا ہے۔ وہ بھی ریوٹ کنٹرول ہو سکتا ہے۔ ایسے ہم بھی  
ہیں جو کسی مخصوص ارتعاش سے پھٹتے ہیں۔ ایسے ہم بھی ہیں کہ  
جب تک کوئی شخص کوئی مخصوص ڈیوائس لیے ان کے قریب موجود  
ہے وہ نہیں پھٹتے لیکن جب وہ اٹھ کر دور چلا جائے تو اس کی عدم  
موجودگی میں ہم پھٹ جاتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری بہت سی  
فتنیں تو ہمارے علم میں ہیں۔ ریڈ واٹ والے اگر اسی قسم کے  
لوگ ہیں جیسے آپ بتا رہے ہیں تو پھر ان کے پاس اس سے بھی بڑھ  
کر کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے۔“

نقیس صاحب سر ملاتے ہوئے بولے ”میں بھی یہی کہنے والا  
تھا۔ گویا اہم سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کب کہاں اور کیسے نصب کیا  
گیا یا وہ کس قسم کا بم تھا۔ زیادہ قابل غور سوال یہ ہے کہ ریڈ واٹ  
چاہتی کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”گویا آپ نے تسلیم کر لیا کہ ریڈ واٹ کا کوئی وجود ہے؟“ میں  
نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ وہ اپنی ہٹ پر قائم تھے۔ ”میں تو  
صرف یہ کہتا ہوں کہ کچھ لوگ بہر حال موجود ہیں جو کسی خاص  
مقصد کے تحت کچھ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کا دل رکھنے کو  
میں ان کا نام ریڈ واٹ فرض کر لیتا ہوں۔“

”آپ کی اس عظیم مہمانی کا بہت شکریہ۔“ میں نے ایک  
خفیف سے احساس شکست کے ساتھ کرسی کے پٹے سے ٹپک  
لگاتے ہوئے کہا ”آپ جن سوالات پر غور کرنا چاہیں کرتے  
ہے۔ میں تو جو کچھ آپ کو بتا سکتا تھا بتا چکا ہوں اور تا کی کرنے  
کی بچتی کوششیں کر سکتا تھا کر چکا ہوں۔ بہر حال۔۔۔ آپ لوگوں کی  
طرف سے اپنی تمام تر دل شکنگی اور مایوسی کے باوجود اس ملک اور

لوگوں کا قلع قمع کرنا ہوتا ہے، وہ شاید مجھ سے لرزہ برائے نام رہا کرتے۔ لیکن میں نے کسی دباؤ، کسی خوف کے بغیر خود بخود وہ لائن چھوڑ دی تھی۔ میں نے اسے اپنی ماں بھی اور نااہلی کا ایک دور سمجھ کر بیٹھ بھلانے کی کوشش کی تھی۔ جو کسی اپنی دانست میں مجھے عقل آئی تھی میرے اندر کا منظر تبدیل ہو گیا تھا۔ کم عمری اور نوجوانی میں حالات مجھے اپنے بھاء کے ساتھ بھانے لے گئے تھے لیکن بعد میں میں نے اپنی راہیں خود چھین کر نے کی کوششیں کی تھیں۔ اس دوران مجھے بے شمار بڑی بڑی پیشکشیں ہوئی تھیں لیکن میں نے ان کی پروا نہیں کی تھی۔ مگر اس کا صلہ فی الحال تو مجھے یہی مل رہا تھا کہ فیض صاحب مجھے آدمی کی نظر میں نہیں محکوک اور ناقابل اعتبار قرار دیا تھا۔

تاہم میں نے جیسے انداز میں سوال کیا تو فیض صاحب جواب دینے سے کتر گئے اور موضوع بدلتے ہوئے سرسری سے لمبے میں بولے "فیروز جیسے ان باتوں کو۔ یہ وقت بحث و مباحثہ کا نہیں ہے۔ یہ بتائیے اگر آپ اب ریڈ ڈاٹ والوں کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ لیں، ان سے معافی مانگ لیں اور انہیں بتائیں کہ ان کی چند ابتدائی کارروائیوں سے سی آپ کی عقل ٹھکانے آگئی ہے اور آپ اب ان کی پیشکش قبول کر کے ان کی ہدایات کے عین مطابق چلنا چاہتے ہیں تو کیا وہ آپ کی بات نہیں مانیں گے؟"

"انہیں جتنی ملت رہا تھی وہ انہوں نے مجھے پہلے ہی دے دی تھی۔ خوب اچھی طرح سمجھنے کے لیے۔" میں نے جواب دیا "یہ بات وہ اپنے پیغام میں بھی واضح کر چکے ہیں کہ ایک بار انکار کرنے والوں کے لیے ان کے ہاں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ویسے بھی فکر انہیں یہ تک معلوم ہے کہ میری آپ کے ساتھ خفیہ میننگر چل رہی ہیں تو وہ میری اس پیشکش پر کیسے اعلان کر سکتے ہیں؟" "ہم بھی... بات کر کے، کچھ میں کیا حرج ہے؟" ان کے لیے میں ہکا سا اصرار تھا۔

"اگر آپ کا خیال ہے کہ میں ان کی تعظیم میں کھس کر خفیہ طور پر آپ کے ایجنٹ کا کردار ادا کر سکوں گا تو یہ بچکانہ امید ذہن سے نکال دیجئے۔" میں نے کہا۔ اپنی تجویز کے لیے بچکانہ کا لفظ اس کر فیض صاحب کے چہرے کی شرمیلی میں ہکا سا اضافہ ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ان کی رنگت اعتدال پر آگئی۔ وہ اپنی کیفیات اور محسوسات پر قابو رکھنے میں یقیناً کافی ماہر تھے۔ کچھ دیر پہلے ہونے والے بم کے دھماکے اور اپنے دو آدمیوں کی ہلاکت نے بھی ان کے سکون میں کوئی خلل نہیں ڈالا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "معلوم نہیں آپ نے دلی طور پر اب بھی ریڈ ڈاٹ کے دعو کو تسلیم کیا ہے یا نہیں۔ اگر کریا ہے تب بھی شاید ان سب باتوں پر یقین نہیں کیا ہو میں نے آپ کو ان کے بارے میں بتائی تھیں۔ فرض کر لیں میں آپ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ان کے سامنے کھڑے ہوں گا۔"

بحث میں تو پڑنا ہی نہیں چاہتا کہ مشورہ یا اہم شخصیات اپنی جان کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات کرتی ہیں۔ میں تو صرف اپنی بات کر رہا ہوں اور میں ایک نہایت غیر مشورہ اور غیر اہم شخص ہوں۔

فیض صاحب بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "آپ مجھے لوگوں میں ایک عجیب بات میں نے دیکھی ہے۔ جب وہ بہت ترقی کر جاتے ہیں تو عموماً ان میں ایک عجیب بے نیازی، افسردگی، کچھ صوفیانہ پن اور کچھ دوسری آجائبی ہے۔ بعض اوقات تو وہ مذہبی باتیں بھی کرنے لگتے ہیں۔ دائرہ می رکھ لیتے ہیں۔ جج کر آتے ہیں۔" "یہ سب کچھ تو ہر مسلمان کو کرنا ہی چاہیے۔ یہ تو ہماری بد فیضی اور بے راہ روی ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے لیکن یہ "آپ مجھے لوگوں" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا آپ کے خیال میں میں انہوں کے کسی خاص اور الگ ہی طبقے سے تعلق رکھتا ہوں؟" میں نے جیسے لمبے میں پوچھا۔

میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ میرے ماضی کے ایک مختصر مگر نا انہوں بحرے دور کی وجہ سے مجھے استغما کے طبقے سے نتھی کر رہے تھے جو مجھے بہت بڑی زیادتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس لائن کو بہت جلد ترک کیا تھا اور اس کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دی تھیں۔ بہت سی شخصیتوں کی تاریکیوں کی مہر لائی تھی۔

جب میں اس لائن میں قحطاب بھی میرا کردار گھما ڈا ہرگز نہیں رہا تھا۔ میں نے کبھی بے گناہوں کے خون سے ہاتھ نہیں دٹے تھے۔ منشیات کی تجارت کے میں کبھی قریب بھی نہیں چکا تھا مگر سب سے زیادہ دولت اسی میں تھی۔ بلکہ منشیات کے ناموں سے تو مجھے نفرت رہی تھی۔ میں نے کبھی ان کی کسی قسم کی مدد یا اعانت بھی نہیں کی تھی۔ حاجی عالم شیر سے میرے اختلاف اور گراؤ کی وجہ بھی یہی بنی تھی جس میں وہ اتنا آگے چلا گیا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے اس کو ختم کرنا پڑا تھا۔ وہ حاجی قاضی خانہ نمازی تھا اور اس کا بدو درگ مانیا کا آدمی تھا۔

اس لیے اگر کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ مجھ جیسے گناہ گار ان جیسے "ہریز گاروں" سے بہتر تھے تو میرے خیال میں یہ کچھ ایسا عجیب یا نامناسب بات نہیں تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان باتوں کو سلیکٹ یا بھر محض افسرانہ نظر سے دیکھنے والے لوگ فیض صاحب کی طرح تھے اور عالم شیر جیسے لوگوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے تھے میں نے صحیح اور جان بزرگی کی دنیا میں ایک طویل عرصے تک جس نسبت اور جانفشانی سے کام کیا تھا اور جس طرح اوپر والے کی سہائی سے امکانات کو ممکن کر دکھایا تھا اسے جب کوئی باطل نظر انداز کرتا تھا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔

میں چاہتا تو اس سنگت کی لائن میں رہ کر شاید اس سے زیادہ دولت کما لیتا جتنی میرے پاس اب تھی۔ اس سے زیادہ طاقتور ہو جاتا تھا اب تھا۔ وہ ادارے اور وہ چنگیز کرنا کچھ جیسے

سائنس لے کر بولے۔

”جی ہاں میرا مقصد یہی ہے۔“ میں نے تائید کی۔

”تو پھر ہمارے سامنے سروسٹ کوئی راستہ نہیں۔ فی الحال ہمیں انتظار ہی کرنا پڑے گا کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔“  
نہیں صاحب بولے۔

”عجیب بات ہے“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا ”میں ایک عام ساشری ہوں۔ میں بھی انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ ملک کی اسی اہم شخصیت ہیں“ اتنے بڑے ادارے کے سربراہ ہیں۔  
آپ بھی انتظار کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔“

نہیں صاحب قدرے سرو جھجھ میں بولے ”مطلوبین وہیں ہمارا انتظار ذرا مختلف قسم کا ہے۔ اس دوران بہت کچھ ہوا ہے۔ امید ہے جلد ہی کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔ مشینری اپنا کام کر رہی ہے۔“

”آج جو دھماکا میں آپ کی ناک تلے ہوا ہے اس کے سلسلے میں کچھ ہو گا؟“ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

”یقیناً ہو گا“ وہ اعتماد سے بولے ”اس کے بارے میں تحقیقات شروع ہو چکی ہیں۔“

”آپ نے کہا تھا کہ ملک بھر میں غیر ملکیوں پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔ اس سلسلے میں کچھ ہوا یا کوئی بات سامنے آئی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں غیر ملکیوں پر نظر رکھی جارہی ہے۔ اس پر جاری بہت زیادہ توانائی وسائل اور افرادی قوت صرف ہو رہی ہے لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔“ وہ ایک دوسری فائل اٹھا کر اس کے ورق اٹھتے ہوئے بولے ”جو غیر ملکی ہمارے ہیں غیر ملکیوں کی طور پر دیکھے ہوئے ہیں ان میں سے بعض صرف عمومی قسم کے جرائم میں ملوث ہیں۔ مثلاً اسمگلنگ، چوری، چکاری، سڑائی، جھگڑا وغیرہ۔ ان میں سے بعض اپنے اپنے ملکوں کے مفروضہ مجرم بھی ہیں۔ ان میں سے بعض اگر کچھ سازشوں میں ملوث بھی ہیں تو وہ اسی قسم کی ہیں جن سے بد امنی اور سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ان سے سننے کے لیے ہم اپنی سی کوششیں کرتے رہتے ہیں لیکن ان لوگوں کا قتل، ریڈ ڈاٹ ٹیسی، عجب و غریب اور طویل المیعاد منصوبے رکھنے والی تنظیم سے نظر نہیں آتا۔ ان میں زیادہ تر عام سے پیشہ ورہشت گرد اور تخریب کار ہوتے ہیں جو کچھ ایک ملک کے لیے کام کرنے لگتے ہیں، کبھی دوسرے ملک کے لیے یہ لوگ کبھی کبھی عام اور بین الاقوامی قسم کے سیاسی ورکرز کو بھی اپنا کاروبار لیتے ہیں اور ان کی کم علمی یا ذہنی ناچلکلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں مجرماًتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک عرصے سے چل رہا ہے مگر اب کچھ بدھ گیا ہے۔ اچھا خاصا سمجھ دار طبقہ بھی ان سازشوں سے متاثر ہونے لگا ہے۔ اس مقصد کے لیے غیر ملکی دولت بھی بہت استعمال ہو رہی ہے۔ ہم اس کی روک تھام کی اپنی

کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے قبول بھی کر لیں اور میں بظاہر ان کا آلا کار بن کر آپ کے ایجنٹ کا رول ادا بھی کرنا چاہوں تب بھی شاید نہ کر سکوں۔ انہیں ذہل کر اس کرنا مجھے تقریباً ناممکن نظر آتا ہے وہ بہرے ملو کا خیال رکھتے ہیں۔ کوئی کچا کام نہیں کرتے۔ وہ تو نہ جانے کون کون سی ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے انسان کی شکل اور اس کا ذہن تک بدل دیتے ہیں۔“

نہیں صاحب خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ میری ساری کہانی تو اٹھا کر سے من پکے تھے لیکن دل ہی دل میں اس پر کچھ زیادہ اعتبار نہیں رکھتے تھے۔ تاہم میں نے ایک سو سو م سی امید کے سارے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری ایک دوست اور بہرہ ورہنی کو وہ پرنسپس تھینکے کے روپ میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ کسی چھوٹے موٹے سرجیکل عمل اور پرنسپس وائش کے ذریعے انہوں نے اس کا ذہن بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنی دانت میں کاسیاب بھی ہو گئے تھے۔ وہ تو کھل ایک اتفاق تھا کہ شاید اس کے ذہن کے کچھ غلطیاں تباہ ہونے سے بچ گئے اور اس کی یادداشت لوٹ آئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور مخفیہ طور پر میرا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔“

نہیں صاحب سر ہلاتے ہوئے بولے ”ہاں مجھے یاد ہے۔ آپ نے بتایا تھا وہ لڑکی اب انہی کے قبضے میں ہے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا ذہن مکمل طور پر تبدیل نہیں ہو سکا تھا اور وہ آپ کا ساتھ دے رہی تھی۔“

”جی ہاں“ میں نے تائید سے کہا ”مطلوبہ نہیں ہے جاری زندہ بھی ہے یا نہیں۔ شروع میں ریڈ ڈاٹ والوں نے یہی کہا تھا کہ انہوں نے اسے کوئی سزا نہیں دی لیکن اس کے بعد سے مجھے صحیح طور پر اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

نہیں صاحب کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی دھن ابھری ”آپ تو ریڈ ڈاٹ کے کئے پر برا نہیں رکھتے ہیں۔ اس پر بھی تعین کر لیا ہو گا۔“

”ہاں۔ اس میں شک نہیں کہ ریڈ ڈاٹ والے کھڑے دشمن ہیں۔ وہ بہت سے مناطق دوستوں سے بہتر ہیں۔ کم از کم میرے ساتھ انہیں جو کچھ کرنا ہوتا ہے ڈنگے کی چوٹ کرتے ہیں۔ لیکن میں یہ بہر حال نہیں کہتا کہ وہ فرشتے ہیں۔“

نہیں صاحب ہنکارا بھر کر کہہ گئے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”دوسری مثال میں آپ کو بلیک بڈ کی یاد دلانا چاہوں گا۔ اس کے دماغ کی بھی سرجری کی گئی تھی اور اسے کچھ مخصوص تربیت بھی دی گئی تھی۔ ذہنی طور پر وہ پورا انسان تھا صرف انسانی زبان بول نہیں سکتا تھا۔“

”آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی ان کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں؟“ نہیں صاحب ہماری

ہو لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہوں۔" میں نے خیال ظاہر کیا "کیونکہ ریڈ ڈاٹ جہاں جیسے عناصر کو مناسب سمجھے استعمال کرتی ہے۔ جہاں جیسا طریقہ اسے سوزوں نظر آئے وہ اختیار کرتی ہے اور اس کا اپنا نام بھی سامنے نہیں آتا۔ استعمال ہونے والوں کو خود بھی صحیح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس کے لیے شاید بہت پرچہ طریقے اختیار کیے جاتے ہوں۔"

فیس صاحب توجہ سے میری بات سن رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اب میں دیکھ لیں کہ مجھ پر چند حلوں میں جو لوگ مارے گئے ہیں وہ خوراک بد معاش، مفرد مجرم، قاتل یا دہشت گرد وغیرہ تھے اور قتالی ہی تھے۔ ان سے تفتیش کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ وہ مارے گئے لیکن انہیں شاید خود بھی معلوم نہ رہا ہو کہ وہ درحقیقت کس کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان کے سامنے کوئی اور آتما ہو، اس کے پیچھے کوئی اور ہواں طرح سلسلہ در سلسلہ آخر میں کس ریڈ ڈاٹ کا ہاتھ ہو۔ یعنی اصل بڑا ریڈ ڈاٹ ہی ہو لیکن آپ کے ہاتھ صرف شاخص ہی آتی رہی ہوں اور آپ انہیں ہی جڑ سمجھتے رہے ہوں۔"

وہ خاموش رہے تو میں نے ایک اور مثال دیتے ہوئے کہا "ہمارے قانون مندرجہ ذیل صاحب کا سیکرٹری چیف اکرام بیگ کتنا گھماگ آوی تھا۔ اس کی پوزیشن کتنی اہم تھی۔ نہ جانے کتنی چھٹیوں سے گزر کر وہ اس پوزیشن تک پہنچا تھا۔ اس کے باوجود وہ یک گیا تھا۔ خلیفہ صاحب نے قتل کی سازش میں ملوث تھا۔ اب اس جیسا شخص آسانی سے تو نہیں نکال سکتے۔ اس نے اچھی طرح تحقیق کی ہوگی کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ کس کے مقاصد پورے کر رہا ہے۔ مگر اپنی تمام تر چالاکی اور شاطرانہ پن کے باوجود وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ریڈ ڈاٹ کے ہاتھوں کھلوایا گیا ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں مختلف حکموں میں نہ جانے کس کس اہم پوزیشن پر ریڈ ڈاٹ نے اپنے مکرے بٹھادیے ہیں لیکن انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ انہیں خریدنے والی اصل قوت کون ہے۔ ہر ایک کی نفسیات یا کمزوریوں کے حساب سے اس کے ساتھ نہ جانے کیا کھیل کھلایا ہو لیکن حقیقت اس کی نظر سے اوچھل ہی رہی ہو۔ اس کے علاوہ چلی سنا ہوا تو ہمارے ہاں بہت سی سست دامتوں تک جانے والے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو دولت کے لیے آنکھیں بند کر کے ہر کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ انہیں تو اس بات سے بھی غرض نہیں ہوتی کہ وہ کس کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ کس ڈھنگ کے مقاصد پورے کر رہے ہیں۔"

"درست ہے" فیس صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیکھتے دیکھتے میں نے کہا "بعض اوقات ایسے لوگ بھی ہمارے ہاتھ لگے ہیں جنہوں نے صرف دس ہزار یا بیس ہزار روپے کے عوض کسی گروہم مقام پر ہم رکھ دیا ہے۔ اور وہ ہمارے ہی پاکستان بھائی

نہ ششیں کر رہے ہیں لیکن یہ بہت الجھا ہوا معاملہ ہے کیونکہ یہ بات کے وجود میں گھنٹہ کی طرح داخل ہو گیا ہے۔ اور جہاں معاملہ سیاست کا آجائے وہاں مسائل بہت نازک اور بہت پہلو ہوتے ہیں۔"

پہلی بار فیس صاحب ذرا گھل کر حالات پر روشنی ڈال رہے تھے۔ انہیں اب بھی وہ بہت محتاط ہی تھے۔ میں بہت تن گوش تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "دوسرا طبقہ ان غیر ملکیوں کا ہے جو ہمارے قانونی طور پر آئے ہوئے ہیں۔ ان کا کہیں نہ کہیں اندراج موجود ہے۔ ان میں مشنری ادارے ہیں، طلباء ہیں، سفارتی ادارے ہیں اور مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں بھی بہت سے موشموں کے ایجنٹ ہیں جو کسی نہ کسی آڈ میں ہمارے خلاف کام کر رہے ہیں لیکن ابھی تک ریڈ ڈاٹ قسم کی تنظیم سے کسی کا تعلق ثابت نہیں ہو سکا۔"

"کیا ہماری ایجنسیوں کے اتنے وسائل ہیں کہ تمام قانونی اور غیر قانونی غیر ملکیوں پر چرچ معنوں میں نظر رکھی جاسکے اور ان سب کی رازداریوں کا کھنچ لگایا جاسکے؟ ان کی تمام سرگرمیوں سے باخبر رہا جاسکے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہر ایک پر نظر رکھنا تو ممکن نہیں۔" فیس صاحب نے جیسے کہا "لیکن عمرانی وغیرہ کا ایک عمومی طریقہ کار ہوتا ہے۔ اس میں اگر کسی کوئی ایک تخریب کار، دہشت گرد یا غیر ملکی ایجنٹ پکڑا جاتا ہے تو گویا ہر ہاتھ آجاتا ہے پھر اس کے ذریعے مزید بہت سی گرفتاریاں ممکن ہو جاتی ہیں۔ اس کی زبانی بہت سے افشاءات ہوتے ہیں۔ یہی تفتیش کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔"

پھر وہ ناکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ہمارے ہاں رہا رہوں گا ایک انبار جمع ہے۔ یہ صرف ان کے خلاف ہے۔ لیکن ابھی تک ریڈ ڈاٹ جیسی کسی تنظیم کی طرف سے کوئی نشانہ بھی سامنے نہیں آیا۔ میں نے آپ سے پہلے ملاقات کے دوران ہی مداف کوئی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ آپ کی کمائی مجھے شخص ممکن معلوم ہوتی ہے۔ انسانہ طرز کی دکھائی دیتی ہے۔ میرے ساتھ مل کر دیگر خفیہ ایجنسیوں کے جو سربراہان شریف رکھتے ہیں ان کی دانتیں بھی کم و بیش یہی تھیں۔ اس کے باوجود ہم نے آپ کو تائے غیر امتیاز تمام ایجنسیوں کو الٹ کر دیا۔ ایک نیٹ ورک تیار کیا اور ایک خصوصی کمیشن بنائی جس کا سربراہ غرضی طور پر میں ہوں اور اسی کمیٹی کی وجہ سے زیادہ تر میں انکیا ہی آپ سے سارے مذاکرات کرتا ہوں۔ ہم لوگ حمایت طوفانی انداز میں حرکت میں آئے لیکن انہوں نے کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔"

"ہمارے ہاں تخریب کاری اور دہشت گردی وغیرہ معمول بن گئے ہیں۔ جس کے پیچھے آپ کے خیال میں دشمن ملکوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو بعض اوقات ہمارے متناہی لوگوں کو بھی آواز کار لگاتے ہیں۔ میں ممکن ہے ان سب کے پیچھے درحقیقت ریڈ ڈاٹ

ایسے عکین مسائل پر ایسی بے نتیجہ بحثیں میں بھی شرکت کرنا پڑے گی۔

”یہ صرف آپ کا خیال ہے۔“ فیض صاحب کمری سنجیدگی سے بولے ”آپ کو اندازہ نہیں کہ ہماری نظر میں یہ بیشک حقیقی اہم اور سختی نتیجہ خیز ہیں۔ یہ صرف ہمیں ہی معلوم ہے کہ ان بیشک سے ہم کیا کچھ حاصل کر رہے ہیں۔“

میرا لے لفظی سانس لے کر کہا ”ایک طرف ریڈ واٹ ایک مقام ہے۔ دوسری طرف آپ بھی کسی مسئلے سے کم نہیں۔ عکین معاملات کی طرف آپ کوئی خاص توجہ دیتے دکھائی نہیں دیتے۔ بے نتیجہ اور خشک قسم کی بیشک آپ کو بہت اہم اور مفید معلوم ہوتی ہیں۔“

”اہم بیشک کے نتائج بعض اوقات فوری طور پر نظر نہیں آتے اور خشک تو وہ ہوتی ہی ہیں۔ ظاہر ہے اب ایسی بیشک میں کسی گھوکا کہ کوکڑا کر اس کا گانا تو نہیں سنا جاسکتا اور نہ ہی درمیان میں زندقہ کر کے کسی ڈسکو ڈانس کا ڈانس دیکھا جاسکتا ہے۔“ وہ بیشک سے بھی زیادہ خشک لہجے میں بولے۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان خشک بیشک میں کسی گھوکا کہ کے لئے یا ڈسکو ڈانس کے ڈانس سے رنگین پیدا کی جائے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہماری دونوں بیشکوں کوئی حتمی خیر فیصلہ نہیں ہو سکا جس سے رگ و پے میں کوئی پیمانہ پیدا ہوتا۔ امید کی کوئی کرن نظر آتی؟ کوئی انقلاب جنم لیتا دکھائی دیتا۔“ میں نے کہا۔

فیض صاحب کے ہونٹوں پر مریانا سی مسکراہٹ کی جھلک نظر آئی۔ وہ بہت ناب قول کر مسکراتے تھے۔ قدرے شگفتہ انداز میں بولے ”یہ قلمی قسم کے بد معاشوں یا قلمی سی آئی ڈی والوں کی بیشک نہیں تھی چوہدری صاحب! یہ ملک کے چند نہایت اہم اور نہایت سنجیدہ لوگوں کی بیشک تھی۔ باقی دوسری حتمی، پیمانہ خیزی اور انقلاب وغیرہ... تو مجھے یقین ہے یہ چیزیں آپ کی زندگی میں ”خوافر“ مقدار میں آتی رہی ہیں اور امید ہے آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ کچھ دیر ہم جسے خشک لوگوں کے ساتھ بھی گزارا لیا کریں اور زیادہ دیر نہ ہوا کریں۔ آگے چل کر شاید آپ کو بہت فائدہ ہو۔“ وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”آگے چل کر تو جو فائدہ یا نقصان ہو گا وہ بعد کی بات ہے۔ میں تو اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں جوئی الحال میرے ساتھ ہو رہا ہے۔“

وہ میرے قریب آچکے تھے۔ میرا کندھا مسکھتے ہوئے بولے ”ڈونٹ دوسری مسٹر چوہدری سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ تقریباً سیات ہی تھا اور ان کی آنکھوں میں غلوں یا اپنائیت کا کوئی سیلاب نہیں آیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں حیران تھا۔ ان سے میری شناسائی کر

تھیں ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی دانت میں بڑے ٹک مقام کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے سیاسی پارٹیوں تک میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہم کہاں کہاں ظہیر کریں؟ جہاں ہاتھ لگاتے ہیں وہیں جین لگا رہے لگتی ہے۔“

”بہر حال... اگر آپ میری تصویر کو درست تسلیم کر رہے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ کہیں نہ کہیں ریڈ واٹ کا وجود ہے اور وہ بہت ہی دور رس مقام کے لیے کام کر رہی ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”مجھے اس کو تسلیم کرنے میں عار نہیں۔“ فیض صاحب بولے ”کیا میں ہر چیز کا امکان موجود دیتا ہے اور میری گناہ گار آنکھوں نے تو اس کو دیکھا میں ایسے ایسے ہولناک اور ناقابل یقین قماشے دیکھے ہیں کہ اب ہر بات پر ہی یقین کر لینے کو دل چاہتا ہے۔“

ایک لمحے کے توقف سے وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے ”یقین ہم دل کے کتنے پر نہیں چلتے۔ ہم پر پیکٹل لوگ ہیں۔ جب تک کوئی شہادت کوئی نظانی سامنے نہ آجائے، آنکھیں بند کر کے کسی راستے پر نہیں چلتے۔“

میں نے مجھے اٹھائے انداز میں کرسی کے پٹے سے ٹک لگاتے ہوئے کمری سانس لے کر کہا ”مجھے ہمارے ہاں انسانوں کو ظلم و برہنہ کے چنگل سے چھڑانے میں اتنی تاخیر ہو جاتی ہے۔ پہلے تو کوئی موٹے پر پیچھے والا نہیں ہوتا۔ خدا خدا کر کے کوئی داؤدا بد آؤ مرگ کرنے کے لیے آتا ہے تو انصاف کے تھانے پر سے کہنے کے لیے اس کے اپنے تھانے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ انصاف بے چارہ راستے میں ہی کہیں گم ہو جاتا ہے۔ یہ ہونا چاہئے۔ وہ ہونا چاہئے۔ یہ نظانی نہ شہادت نہ گواہ نہ ثبوت سب کچھ منع کیجئے۔ اس کے بعد انتظار کیجئے کہ ہمارے نظام کی بھول بجلیں میں سے کچھ برآمد ہوتا ہے یا نہیں۔ میری نازی نے وہ قلم شاید آپ ہی جیسے لوگوں کے لیے کسی ہے۔ ”بیشک دیر کرتا ہوں میں“ اس کے علاوہ آپ سے بات چیت کرنے کے بعد مجھے وہ ضرب الطغی بھی شدت سے یاد آتی ہے۔۔۔ دبی ”مرغ کی ایک ٹانگ“ والہ۔“

فیض صاحب کے چہرے پر ناگوار کی عکس نہیں ابھری۔ وہ بلا ٹھٹ سے بولے ”کسی وجہ سے ہم نے آپ کو سب کچھ بولنے کی آزادی دے رکھی ہے مسٹر چوہدری۔ کوئی وقت آئے گا کہ آپ ہماری اور ہمارے طریقہ کار کی افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔“

”میری دعا ہے کہ وہ وقت جلد از جلد آجائے۔“ میں نے ہلکی سی دھمکی سے کہا ”مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت کے انتظار میں کہیں میں مریانا سے ہی نہ گر کر جاؤں۔ مجھے اب اجازت دیجئے۔ میرا خیال ہے اب کوئی ایسی بات نہیں رہی جس پر بناؤں خیال کرنا ضروری ہے بلکہ جن باتوں پر بناؤں خیال ہوا ہے میری نظر میں تو وہ بھی کچھ ایسا ضروری نہیں تھیں۔ میں نے تو سچا بھی نہیں تھا کبھی مجھے



آخر کار دائیں طرف والے نے گہری سانس لے کر پورے سے آنکھ بٹائی اور ڈرائیور کو حکم دیا "ٹھیک ہے گاڑی چلاؤ۔" میں نے اس دوران کسی پرے سے جھانکنے یا اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو نہایت جسم سا اشارہ کیا۔ دونوں نے حکم واپس سیٹ کے نیچے رکھ دیں۔ دائیں طرف والے نوجوان کی پیشانی پر شکنیں تھیں جیسے وہ کسی آنکھوں میں ہو۔ دو ایک مرتبہ اترنے پر خیال انداز میں سری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کا واپس اسے خاموش رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

لیکن آخر کار وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ہچکچاہٹ آمیز سے لیے میں اس نے کہا "کچھ عجیب سا ہی آدمی تھا وہ۔ دور سے تو قہقہہ بندری معلوم ہو رہا تھا۔ درمیانے فاصلے کا گھٹے کے افسانہ جتنا بند رہا۔"

"کون؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔  
"وہی جس پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔" میرا دل تیزی سے دھڑکا اٹھا۔ میں نے اسے اسے سن کر خاص خاص نشانیاں بتاتے ہوئے پوچھا "کیا وہ اس طرح کا آدمی تھا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں گہری حیرانگی سے سامنے لے کر رہ گیا۔  
"وہ ہمارا ہی تعاقب کر رہا ہو گا۔" میں نے کہا "ڈرائیور سے کہو اس کا پیچھا کرے۔"

"وہ گاڑی تو قابو ہو چکی ہے جناب!" ڈرائیور کی طرف سے جواب آیا۔

میں نے شکست خوردہ سے انداز میں سیٹ کے پیشے سے ہٹ کر لگایا۔ اسے سن اسلام آباد پہنچا ہوا تھا۔ کوئی جگہ ان سے پہچان ہوئی نہیں تھی۔ کوئی سرگرمی ان سے تھی نہیں تھی۔ کیا کسی بات کو خیر رکھنے کی کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"لیکن تھا وہ؟" دائیں طرف والے نوجوان نے تشویش سے بولے بغیر پوچھا۔

"اب پوچھنے کا کیا فائدہ؟" میں نے ہلکی سی تکی سے کہا "ہاں آپ لوگوں کو گاڑی میں یہ ہماری ہماری پرے لٹکانے کا شوق ہوا۔ میں بھی بروقت دیکھ لیا کہ کون پیچھے آ رہا ہے۔ اسے قابو کرنا شاید آج کی ہے ہو کہ آخر میں سے زیادہ اہم اور فائدہ مند ثابت ہوتا۔ سب کچھ بے کار رہا۔ خواہ خواہ دو جاہیں ضائع ہوئیں۔"

"لیکن اس بندر نما انسان نے ہمارا تعاقب جاری تو نہیں رکھا۔ بلکہ اس نے تو آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔" سیدھا لکنا چلا گیا "دائیں طرف والے نوجوان نے گویا دلیل پیش

ہیجے بھی دن گزر چکے تھے ان کے دوران نہیں صاحب کی طرف سے محبت اور قربت کا یہ پہلا مظاہرہ تھا۔ چاہے کتنا ہی معمولی تھا لیکن ان جیسے آدمی کی طرف سے یہ بھی قیمت تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھر میں جو تک لگ رہی تھی۔

باہر آکر ہم ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح برآمدے میں رُکے۔ ہمارے سامنے گویا وہی پہلے جیسا منظر تھا۔ اب ایک دوسری گاڑی مجھے لینے کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سرسبز نہیں تھی لیکن اس کی کھڑکیوں پر بھی پردے پڑے ہوئے تھے۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ ابھی دھماکے کے نشانات کئی جگہ ثبت تھے۔ ڈرائیور نے انکسٹن میں چابی گھمائی تو لا شعوری طور پر ایک لمحے کے لیے میرے اعصاب تن کر رہ گئے اور جڑے تختی سے بچنے لگے۔ لیکن ظاہر ہے تاریخ اتنی جلدی اپنے آپ کو نہیں دہرائی بلکہ اتنی جلدی کوئی واقعہ تاریخ بننا ہی نہیں۔ اس لیے خیریت ہی رہی۔ کوئی دوسرا دھماکا نہیں ہوا بلکہ گاڑی اشارت ہو گئی۔

میں نہیں صاحب اور ان کے ساتھ باہر آنے والے دیگر دو افراد سے ہاتھ ملا کر گاڑی کی طرف براہ تو سیز میوں کے قریب کھڑے ہوئے مضبوط جسم کے دو سانفلے سے جوان میرے ساتھ ہو لیے۔ وہ گاڑی میں خاموشی سے دائیں بائیں میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کا انداز مشینی سا تھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر میری صورت تک دیکھنے کی دھمکت نہیں کی تھی۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ اس میں بھی درمیان میں پردہ موجود تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں ڈرائیور کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی یہ جان سکتا تھا کہ گاڑی کن راستوں سے گزر رہی تھی۔

چند منٹ کے سفر کے بعد میرے دائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان نے اچانک گھوم کر پیچھے پردے میں ڈرائیور کی جگہ پر آنکھ لگا کر اپر دیکھا پھر سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر سیاہ رنگ کی ایک سب مشین کن نکال لی۔ میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا نوجوان بھی یکدم چپے کی طرح چوکتا ہو گیا۔ میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکا تھا تاہم ان کے انداز نے مجھے بھی مشتعل کر دیا۔

"کیا ہمارا تعاقب ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا فیصلہ کر رہے ہوں کہ کون جواب دے۔ پھر دائیں طرف والا انہیں سے لیے میں بولا "کچھ کہہ نہیں سکتے۔"

پھر اس نے بہ آواز بلند ڈرائیور کو حکم دیا "گاڑی ایک طرف روک دو۔"

چند سیکنڈ کے بعد گاڑی رُک گئی۔ وہ سب مشین کن ہاتھوں میں لیے پردے سے آنکھ لگائے بیٹھا تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے کسی گاڑی کے قریب سے گزرنے کی مدد ہی آواز سنی۔ اس دوران دوسرے نوجوان کے ہاتھوں میں بھی سب مشین کن آچکی تھی۔ کچھ دیر ہم تینوں ہی گویا سانس تک روکے بیٹھے رہے۔

ہی گئی تھی لیکن توج بے گینی دگوا سی کچھ زیادہ تھی شاید یہ میرے اندر کا موسم تھا۔ خزاں میرے اندر پہنچے گا دہری تھی۔ ایک انتہائی سڑک پر ڈرا کر ٹوٹ کر گرنے ہوئے میں نے سر جھکا اور اپنے آپ کو سمجھایا "ہر خود را چہ بدری اب استے بھی دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات اتنے بھی خراب نہیں۔ تم تو صرف اس کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتے کہ زندہ ہو" تندرست ہو اور اس خوب صورت صاف ستھری فضا میں سانس لے رہے ہو۔ جبکہ قبضیں تو دوسری آن گشت نصیب بھی حاصل ہیں۔ دنیا میں لاکھوں انسان نہ جانے کیسے کیسے ہولناک مصائب کا شکار ہیں مگر یوں ہی کو قربت نہیں پہنچتے دیتے۔ اتنے مستقبل کی آس پر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔" جب بھی اندر کی اور آواز سی مجھ پر غلبہ پانے لگتی تھی۔ میں اپنے آپ کو یہ لکچر دیا کرتا تھا۔ میں خود ہی اپنا بزرگ تھا اور خود ہی اپنا پر خود دار۔ میں جب بھی کبھی اپنے سے کہیں بدتر حالات کے شکار لوگوں کا تصور کرتا تھا تو اپنے حالات پر اطمینان ہونے لگتا تھا۔ نوعیت دور ہو جاتی تھی۔

ابن وقت بھی اپنے آپ کو سمجھانے بھانے سے ذہن ذرا ہلکا ہوا تو میں نے اپنی بے گینی مزید کم کرنے کے لیے گاڑی کے کیسٹ پیئر میں ایک کیسٹ لگا دی۔ وہ گاڑی میرے اسلام آباد آفس کے ریڈیو فٹ ڈائریکٹر کی تھی۔ وہ تقریباً پچیس کی عمر کے تھے لیکن نہایت زندہ دل تھے۔ میں نے کیسٹ لگائی تو ان کے ذوق کا بھی اندازہ ہو گیا۔ وہ نئی نسل کی ایک نہایت بے تکلف امریکی گلوکارہ کا نغمہ تھا جس کے بول بھی مجھے "لڑزہ خیز" تھے اور گانے کا انداز بھی ہو شڑا تھا۔

میں نے ریڈیو فٹ ڈائریکٹر صاحب کو بھی آواز یا دل شکستہ نہیں دیکھا۔ وہ ایک بہترین کاروباری شخص بھی تھے اور اس عمر میں بھی نہایت مستند نہایت چاق و چوبند تھے۔ میں نے اپنے آپ کو دل ہی دل میں ان کی مثال دیتے ہوئے سمجھایا "اگر وہ اس عمر میں اپنی تمام تر ذمے داریوں اور زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ اتنے چاق و چوبند اور اتنے خوش رہ سکتے ہیں اس قسم کے گانے سن سکتے ہیں تو مجھے اس عمر میں اس طرح بدتر لگا کر پھینکے گا کوئی حق نہیں۔ زندگی اب بھی اسی طرح بدتر دواں ہے جیسے پہلے تھی۔ کوئی ایسا خاص فرق تو نہیں پڑا۔"

میں اپنے خیالات میں الجھ کر اسلام آباد سے دور نکل آیا تھا۔ موصوبہ داخل رہی تھی۔ سڑک بالکل دیران تھی۔ میں گاڑی واپس موڑنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ آگے کا فیصلے پر سڑک کے وسط میں کھڑا کوئی زور زور سے ہاتھ ہلاتا دکھائی دیا جیسے کسی ہنگامی ضرورت کے تحت مجھے مدد کے لیے بلایا رہا ہو۔ اس سے ذرا آگے سڑک واپس طرف مڑ رہی تھی۔

میں نے گاڑی موڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ذرا آگے پہنچتے ہی مجھے موڑ پر ٹھیس میں چھوٹی سی ایک گاڑی لگتی ہوئی نظر آئی۔ اس

کو "پلو ٹیک" ہے۔ تم بھی سمجھ کر آرام سے بیٹھو۔" میں نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا "ویسے بھی اب کچھ کہنے نہ کہنے کا ناگوار ہی کیا ہے سانپ تو نکل گیا اب لکیر پینے سے کیا حاصل۔ اسے غالباً کچھ کھا کر گیا اور اپنی موجودگی کی اطلاع بھی دے گیا۔"

ایک لمحے کے لیے گاڑی میں بوجھل سکوت رہا۔ صرف انجن کی سرسراہٹ ابھرتی رہی۔ پھر میں نے پوچھا "ہم جہاں سے آ رہے ہیں کیا یہ تم لوگوں کا ہیڈ کوارٹر تھا؟"

نوجوان نے غبی میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا "تمہارے خیال میں یہ کس حد تک خفیہ محفوظ ٹھکانا تھا؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ محتاط لمحے میں ہلا۔

"خیر۔ میں بھی احسن ہوں جو تم سے اس قسم کے سوالات کر رہا ہوں۔ وہ محتاط تھے اور جتنا محفوظ تھا وہ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔" میں نے جمل کر کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند منٹ بعد گاڑی اسلام آباد ہوئی کے ذرائع وے میں جاڑی اور میں آ کر آیا۔ ان دونوں نے ایک نظر بھی نہ کیا اور گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔

میں چند لمحے دیریں کھڑا اور گرد دیکھا رہا۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی کسی ستون کی کوٹ سے اسے نر برآمد ہو گا اور اپنا لوہے کے پنجے جیسا ہاتھ مصافحے کے لیے بے پروائی سے میری طرف بڑھاتے ہوئے اپنے مخصوص سرسری انداز میں گے گا "اور سلا چہ بدری ذہن ایا حال حال ہیں؟ یہ کیا پیشکش دینیو کہ پیکر میں چڑے ہو۔ ان سے کچھ نہیں ہو گا۔ بابت باکر آرام سے اپنے انجام کا انتظار کرو۔"

لیکن حقیقت یہ کہ کسی طرف سے بھی آئے نہ نمودار نہیں ہوا۔ میری واپسی کی ثلاث رات کی تھی۔ میرے پاس کم از کم پانچ گھنٹے قاتل تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ میں کس طرح گزارا۔ ہوئی کے کمرے میں میرا بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں اپنے اسلام آباد آفس چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر میں نے کچھ کاروباری معاملات نمٹائے پھر گاڑی لے کر یونٹی توارہ کر دی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

ذہن میں اب بھی ایک امید سی تھی۔ موصوبہ سا ایک خیال تھا کہ شاید کوئی میرا تعاقب کرے۔ شاید کہیں اسے قہ کی کوئی جھلک نظر آئے۔ شاید وہ ابھی اسلام آباد میں ہی موجود ہو لیکن میری یہ توقع بالکل نہیں ہوئی۔ میں دیر تک سڑکوں پر بھٹکا رہا لیکن کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کوئی گاڑی میرے تعاقب میں نہیں آئی۔

سڑکوں پر عجیب و غریب سی تھی۔ درخت خزاں رسیدہ سے لگ رہے تھے۔ اسلام آباد کی فضا کسی حد تک خزاں رسیدہ تو مجھے اکثر

حصہ خون میں لتھڑا دکھائی دے رہا تھا لیکن چہرے کا بیشتر حصہ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر لمبے سفید دستاں تھے مثلاً ڈرائیو تک وہی کر رہی تھی۔ بعض لڑکیاں ڈرائیو تک کرتے وقت دستاں ضرور ہٹاتی ہیں۔

میں نے زیادہ کمری نظر سے اس کا جائزہ نہیں لیا۔ مہاراجا اس کرن میری کمری نظر کا مطلب کچھ اور سمجھے پڑا مان جائے۔ میں نے گاڑی واپس کے لیے موڑ لی۔ لڑکے نے اطمینان کی کمری سانس لی لیکن وہ اتنا مطمئن نہیں تھا جتنا نظر آتے کی کوشش کر رہا تھا۔

ابھی گاڑی نے چند فرلاک کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ عقب سے ایک سخت سی چیز میری گڈی پر آئی اور لڑکے نے قلعہ بدلی ہوئی آواز میں کہا "گاڑی اسی طرف واپس سوڑو جو بس طرف تم پہلے جا رہے تھے۔"

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں مجھے ایک چھوٹے سے ہسٹل کی جھلک نظر آئی۔ اس کے تاثرات بھی یکسر بدل چکے تھے اور تاثرات بدلنے سے گویا چہرہ بدل گیا تھا۔ اب وہ کسی آئندہ حال گھرانے کا ایک ایسا نوجوان ہرگز دکھائی نہیں دے رہا تھا جو اچانک کسی پریشانی یا حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ اب وہ اچھا خاصا خراٹ قسم کا قاتل یا ڈاکو دکھائی دے رہا تھا۔ چہرہ پر اتنی زبردست جدہلی آئی تھی کہ میں نے کبھی دیکھی تھی۔

"بڑی بات ہے پر خود ارادہ" میں نے ہچکارتے کے سے انداز میں شفقت سے کہا "اس طرح کی حرکتیں نہیں کرتے۔ کچھ پیسے دیے جائیں تو یہی ٹانگ لو۔ خیر ہسٹل وغیرہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں نکتا ہوں گاڑی واپس سوڑو۔" اس کا لمبہ زیادہ غضب ناک ہو گیا اور اس نے میری گڈی پر ہسٹل کی ٹال کا بازو بڑھا دیا۔ "تم سارے طبقے کے بعض لڑکے ایڈ پٹر کے شوق میں بھی لوٹ مار وغیرہ کرتے ہیں۔ کیا تم بھی انہی میں سے ایک ہو؟" میں نے عقب نما آئینے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملامت سے پوچھا۔ ساتھ ہی میں نے گاڑی موڑنے کے بجائے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

"طبقے اور ایڈ پٹر کی ایسی تیس۔ تم سوال جواب بند کرو اور گاڑی سوڑو۔" اس نے گویا ہسٹل کا دستہ میرے سر پر رسید کرنے کے لیے اچھا کیا لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر روک گیا۔ میں جھٹکائی دے کر اس کے وار سے بچنے کے لیے تیار تھا مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

"خود ارادہ مت ہوئی تم سارے اس خادم نے اس قسم کے کھلونوں سے ڈرا جھوڑا تھا۔ شاید مجھے اس قسم کا کوئی سیٹھ سمجھے ہو جو ہندوں ہسٹل وغیرہ کی شکل دیکھتے ہی قہر قہر کا بھڑکا کر پیتے ہیں۔ اس کھلونے کو جب میں رکھ لو اور اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو سیدھی طرح بات کہو۔ میں تمہاری اس بد نظری کے باوجود سارے کام آئے گی کی کوشش کروں گا۔" میں نے بدستور

کے قریب ہی کوئی ایک چہرہ سر نکالے لیا ہوا تھا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی لڑکی تھی۔ چہرہ پہلے ہوئے اس کے مجھ سے بال ڈوبے سو منج کی کٹنی قوسوں میں چمک رہے تھے۔ وہ کوئی عورت تھا جن کی گاڑی کو حادثہ پیش آچکا تھا۔ مجھے اچھا محسوس نہ ہوا کہ اس میں دیکھتے ہوئے بھی ان کی کوئی مدد کیے بغیر واپس لوٹ جاؤں۔ وہ میں یا میں کی عمر کا ایک دروازہ اور خود کو جوان تھا۔ محلیہ ایسا ہی تھا جیسا گھٹا کافی خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے نمائندوں کا ہوتا ہے۔ لمبے لمبے بال، ڈھیلے ڈھالے پوری جھسی شرت اور آڑی آڑی سی رنگت کی وہ چیز جسے امریکا میں جودا ہے اپنی غربت، مجبوری اور ضرورت کے تحت پہنتے ہیں لیکن ہمارے گود بچوں کے بچے فیشن کے طور پر یہ رضا و رغبت بلکہ فخر سے پہنتے ہیں، خواہ کمری کے سارے ٹانگوں پر آبلے پڑ جائیں۔

لڑکے کے گلے میں سوئے کالا کٹ اور ہاتھ میں سوئے کی جھکن دوری سے چمک رہی تھی۔ بیروں میں پھولے پھولے سے جو گیز تھے۔ ہاتھ ہاتھ ہوئے وہ تقریباً اچھل رہا تھا۔ مجھے گاڑی روکنے دیکھ کر وہ دوڑ کر قریب آیا۔ وہ گورا چٹا پاکستانی سی معلوم ہوا تھا لیکن امریکی لمبے میں انگریزی میں بولا "سرا ایک ٹرک والا ہماری گاڑی کو ساڈ مار گیا ہے۔ میری کرن کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ پلیراز سے اسپتال پہنچانے میں میری مدد کریں۔"

"ضرور۔ ضرور" میں نے گاڑی سے اترنے کے لیے دروازہ کھولا لیکن وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "ہیں بس آپ زحمت نہ کریں آپ کے کپڑے گندے ہو جائیں گے۔ آپ کی یہی مرمائی کافی ہے کہ آپ ٹرک گئے۔ میں خود بخوبی کو اٹھاتا ہوں۔"

اس کے کپڑے مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس کی کرن بھی مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی جینز اور ڈھیلے ڈھالے سفید مٹی اور میں تھی۔ یہ بھی فینٹ تھا کہ ہماری سوسائٹی میں ابھی اونچے طبقے کے لڑکے بھی مگرل فریڈ کو مگرل فریڈ نہیں کہتے تھے، عموماً کرن کہتے تھے۔ ہمارے ہاں جب کوئی لڑکا اپنی ساسھی لڑکی کو کرن کہہ کر متعارف کراتا ہے تو بہت کم یہ امکان ہوتا ہے کہ وہ واقعی اس کی کرن ہو۔ بہر حال مجھے ان کے رہنے ہاتھوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری نظر میں وہ شخص انسان تھے جنہیں اس وقت مدد کی ضرورت تھی۔

لڑکا پک کر گیا اور میری طرف پشت کر کے اپنی کرن کو بازوؤں پر اٹھائے لگا۔ اسے اٹھانے کی کوشش میں وہ آوندھے منہ کرتے کرتے پچا۔ دیکھنے میں وہ ایک خود مند اور دوزخ جہم کا لڑکا تھا لیکن بعض نوجوانوں کی جان بس غماختی ہی ہوتی ہے۔ لڑکی مختصر الجود تھی مگر ایسا لگتا تھا کہ لڑکے کو شیب سے اسے اٹھا کر چند قدم لہانے میں دانتوں بیچے آگیا تھا۔

میں نے پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے بمشکل لڑکی کو پچھلی سیٹ پر تقریباً پھینک دی یا اور خود بھی وہیں گھس کر بیٹھ گیا۔ لڑکی کا سر اس نے گود میں رکھ لیا۔ اس کے بال اور پیشانی کا کچھ

میں ہو تو زندگی چھین لیتی ہے۔ یہی لیڈر شاعریں کینسر سے جسم  
خلیات کے مرنے کے عمل کو روکتی ہیں لیکن یہی لیڈر شاعریں اس  
مکمل کے ذریعے اگر تمہاری ایک انگلی سے بھی گزر گئیں تو تمہاری  
موت یقینی ہو جائے گی۔“

”جسم میں سوراخ ہو جانا ہے ان کے کزرنے سے؟“ میں نے

موصوفیت سے پوچھا۔  
”سوراخ ہو جانا تو معمولی بات ہے۔ یہ لیڈر بیم اگر تمہارے  
جسم کے کسی بھی حصے سے گزر گئی تو سوراخ ہونے کے ساتھ ساتھ  
خلیات کے مرنے کا عمل اتنی تیزی سے شروع ہو گا کہ دنیا کی کوئی  
مشین اس کو روکا نہ نہیں کر سکتی اور دنیا کے کسی بھی ڈاکٹر یا سرجن  
کے پاس چٹائی کے اس عمل کو روکنے کی نہ تو مہلت ہوگی اور نہ ہی  
کوئی طریقہ۔ چند سیکنڈ میں تمہارا پورا جسم اس طرح گل سڑ جائے  
گا جس طرح کینسر کے مریض کے جسم کا کوئی ایک حصہ مہینوں یا  
سالوں میں گل سڑتا ہے۔ جسم کیا۔ بس سڑنا اور نقص کا ایک  
آئینہ بن جائے گا۔“

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر وہ مسکرایا۔ وہ ایک خوب  
صورت لڑکی تھی لیکن اس وقت کسی لڑکی سے مشابہ دکھائی  
دے رہا تھا۔ عقب نما آئینے میں اس کی شکل یکم اور بگڑی ہوئی نظر  
آ رہی تھی۔

بڑے ڈرامائی انداز میں وہ ذرا آگے کو بھٹکتے ہوئے بولا ”تم  
اپنے اس خوب صورت اور فزولادی جسم کو اس انجام سے دوچار  
کرنا پسند کر کے افضل چاہو رہی؟“

”تقریباً کا شکی۔“ تم نے میرے سوٹ میں چھپے ہوئے جسم کی  
خوب صورت اور مضبوطی کا اندازہ لگالیا۔ مجھے خود اس کا کوئی  
خاص احساس نہیں تھا۔ بہت ساری فکر ہے تمہاری۔ کاش تم کچھ  
اور خوب صورت ہوتے۔۔۔ اور لڑکی ہوتے۔“ میں نے مسکراتے  
ہوئے کہا۔

”تمہارے بارے میں ہماری معلومات خود تم سے بھی زیادہ ہیں  
چوہدری ڈیئر۔“ وہ ملاحت سے بولا۔

”تمہارا نام؟“ میں نے پرسکون لمحے میں پوچھا۔

”کیا اب بھی نام جاننے کی کوئی ضرورت باقی ہے؟“ وہ مجھے  
لبے میں بولا۔ بظاہر وہ بڑے انشاک سے مجھ سے باتیں کر رہا تھا  
لیکن اس کی نظر سڑک پر جمی تھی۔ اپنی بات کے جواب کا انتظار  
کیے بغیر بولا ”اب جو سبک میل آئے گا اس کے قریب سے بائیں

لیے کہنا۔  
وہ گریبا پہلی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسنا۔ انداز کچھ ایسا  
تھا جیسے کسی بھیڑیے نے ننھے سے انسانی بچے کے انداز میں  
تلاشی کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس بار وہ بولا تو لہجہ ایک بار پھر  
بہتر تھا۔

”ملا ننھی مجھے نہیں چھیں ہوئی ہے ڈیئر افضل چوہدری! میں  
نے تو جیسوں بالکل ٹھیک بچانا ہے۔“ وہ میری گدگی پر ہسپتال کی ٹال  
تلاؤ پر بڑھاتے ہوئے بولا ”اس کن کے بارے میں بھی تم ملا ننھی  
میں جلتا ہو۔ اس کی ساخت عام ہسپتال جیسی ہے لیکن تمہاری  
اطلاق کے لیے عرض ہے کہ یہ لیڈر مکمل ہے۔“

اس نے مجھے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس پر مجھے حیرت تھی  
لیکن اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے میں نے بظاہر غصہ لگاتے ہوئے  
کہا ”اوہ۔۔۔ پوری سائنس نکشن قلم چل رہی ہے۔ اب لیڈر مکمل  
ہی آگئی۔“

”ہاں“ وہ ہماری سنجیدگی سے بولا ”فرق صرف یہ ہے کہ وہ  
نکشن ہوتا ہے اور جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ ٹیکٹ ہے۔  
نہیں معلوم ہی ہے نکشن اور ٹیکٹ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا  
ہے لیڈر مکمل کا جتن کچھ پڑھنا اور نظروں میں اس کا استعمال دیکھنا  
ایک تفریح ہے لیکن حقیقت میں لیڈر بیم کا جسم سے گزر جانا بڑا  
ہولناک تجربہ ہوتا ہے اور انسان کو اس تجربے سے عبرت پکڑنے  
کی مہلت نہیں ملتی۔ اب گاڑی واپس موزوں۔ اسلام آباد کی حدود  
نہر داخل نہ ہونا تمہارے حق میں اچھا ہو گا۔“

”گاڑی تو میں موزوں لیتا ہوں۔“ میں نے اسٹیرنگ واپس  
ٹھاتے ہوئے کہا ”لیکن اس لیے نہیں کہ میں تمہاری لیڈر مکمل  
سے ڈر گیا ہوں بلکہ اس لیے کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں  
اور باہدنی علاقے میں پہنچ کر غالباً ہمارے دو میان باتیں نہیں کچھ  
اور شروع ہو جائے گا۔ میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ  
تمہارے ساتھ میں لیڈر مکمل ہے یا عام ہسپتال۔ انسان کی کھوپڑی سے  
کلی گزرنے یا لیڈر بیم دونوں صورتوں میں اسے تو مرنا ہی ہے۔“

گاڑی واپس کھوم چکی تو اس کے چہرے پر قدرے طمانیت کے  
آثار ابھرے اور وہ مسکراتے ہوئے بولا ”مجھ نہ کچھ فرق تو پڑتا ہے  
چوہدری صاحب! کوئی انسان کے جسم کے کسی بھی حصے سے گزر  
جانے اس کے زندہ بچ جانے کا کچھ نہ کچھ امکان تو رہتا ہے۔ لیکن  
یہ لیڈر بیم تو مت ہی عجیب ہے۔ اور ہم نے اسے عجیب تر بنایا  
ہے۔“

”ہم نے۔۔۔؟“ یہ ”ہم نے“ سے کیا مراد ہے؟“ میں نے بات  
کٹتے ہوئے پوچھا۔

لیکن وہ گریبا میرا سوال مٹنے بغیر مجھے گاڑی اور خود کو ایک عالم  
تصور کتے ہوئے سمجھانے کے سے انداز میں بولا ”کسی چیز کا  
استعمال اسے کتنا مختلف بنا رہا ہے۔ چھری سے پھل اور سبزیاں کاٹو  
توہ زندگی میں صحت اور تندرستی لاتی ہیں وہی چھری قاتل کے ہاتھ

آسیب زدہ

انوار صدیقی (زیر طبع)

”خود رواریہ چوہدری صاحب بہت ہنسی ہوئی تھے ہیں۔ ان غلطی تم میرے نو جوانوں کا کام نہیں۔ خواہ تمہارے ہاتھ میں لیزر ہو ہی کیوں نہ ہو۔ ان سے تو صرف ہم جیسے استاد ہی مذاکرات کرتے ہیں۔“

”دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنے چہرے سے نہایت احتیاط اور آتشکی سے ایک اسٹیک آؤٹ لیا۔ وہ واقعی ایک نہایت قدر صورت اور بے عیب اسٹیک تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبصورتی درحقیقت یہ تھی کہ اس پر اسٹیک ہونے کا کمال بھی نہیں گذر تھا۔ اس کے عقب سے اسے فن کی دسی غور سے دیکھ کر ہوتے دیکھ کر کچھ بڑی کوفت ہوئی۔ یہ واقعی ایک تکلیف دہ تھا تھا۔ ایک اتنے چہرے کے عقب سے ایک ہزار نما صورت کا یہ ہوتا۔“

اسٹیک کے ساتھ ہی خوب صورت بالوں کی وگ بھی چڑا ہوئی تھی۔ دیسے بال اسے فن کے اپنے بھی ایسے خاصے خوب صورت تھے اور شانوں تک لیے تھے۔ اب تک وہ وگ ہی ہم گھڑتھے وگ والا اسٹیک آؤٹ اس پر لگا ہوا خون بھی میری نظر سے اوچھل کر ہو گیا اور جس بدلے کے ساتھ ساتھ اس کے زخم ہونے کا تاثر بھی ختم ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں پر دستانے بھی شہرہ ہی سے ملوٹ کر گئے تھے لیکن میں نے انہیں اہمیت نہ دے کر غلط کی تھی۔ وہ اس نے اپنے ہاتھ آستخوانی ہاتھوں کو چھپانے کے لیے پٹے ہوئے تھے۔

میں نے رفتار کم کر دی اور گاڑی سے کتب دیکھا بھی نہ کر سکے۔ جب اسے فن اپنے ساتھی نو جوان سے داد طلب کیجئے تھا طلب ہوا ”دیکھا استادوں کی آؤٹ کا اثر؟“ بغیر کے چوہدری صاحب نے اٹھ بیسیاں بند کر دیں۔“

”دراصل تبدیلی جنس کے آپریشن کے بعد تمہاری تاثیر دینی ہو گئی ہے۔ اب بغیر کے ہی تمہاری بات ماننے کوئی چاہتے گا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ذرا خیر صاف ہو کر عقب لہا آئیے میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

اپنے جسم پر نسوانی اضافوں کے ساتھ وہ اب عجیب لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”تمہاری ایسی ادا تمہیں سب سے زیادہ پسند ہے چوہدری لیزر! حالات خواہ کچھ بھی ہوں تمہاری خوش مزاجی میں فرق نہیں آتا۔ اب گاڑی ایک طرف کے روک لو ہمیں تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”بات تو میں خود بھی تم سے کرنا چاہ رہا تھا لیکن گاڑی روکے گی نہیں۔ ہم چلتی گاڑی میں ہی بات کریں گے۔“ میں نے کہا۔

اس نے گاڑی روکنے پر اصرار نہیں کیا اور بے پروائی سے بولا ”جیسے تمہاری مرضی گاڑی روکنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ مگر جب چاہوں گا روک لوں گا۔ تم کیا بات کرنا چاہتے ہو؟“

ہاتھ پر کپے میں گاڑی سوز لیا۔ ”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا ”شام کا دھند کا پھیلنے لگا ہے مجھے بول دایں پوچھا ہے۔ کھانا بھی کھانا ہے۔ بول سے چپک آؤٹ کرنا ہے اور رات سارے آٹھ بجے والی غلاٹ کرنی ہے۔“

”میں نے تم سے تمہارا شیڈول نہیں پوچھا۔ جو کما ہے وہ کرو۔“ اس کے لہجے میں ایک بار پھر سختی دور آئی۔ ”ورنہ۔۔۔“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میری بے خشی اسے چار رہی تھی۔ کتنی ٹھنڈی سی آواز میں بولا ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اگر اس گین کا زکیر دپ کیا تو تمہاری خاموشی سے چند سیکنڈ میں تمہارا جسم نقصان اور غلاط کا ایک اہوار ہو کر رہ جائے گا۔“

”کوئی بات نہیں جلد یا بدیر انسان کا انجام یہی ہوتا ہے۔ یہاں نہ سنی قبر میں سکی۔“ میں نے بے پروائی سے کہا اور رفتار کچھ اور بڑھا دی۔

”ماکس اسٹون قریب آ رہا ہے“ وہ تیزی سے بولا ”میں صرف تین تک گنوں گا۔ اگر تم نے گاڑی نہ روکی تو زکیر دپ جائے گا۔“

”اس سے پہلے ہی میں گاڑی کسی درخت سے ٹکرا دوں گا۔“ میں نے دیرانگی آمیز سے انداز میں قہقہہ لگایا اور ایک سیکنڈ پر دباؤ مزید بڑھا دیا ”تمہارے ہاتھ میں لیزر کس ہے تو میرے ہاتھ میں اس گاڑی کا اسٹیرنگ دیکھ رہا ہے۔ مگر تو مجھے یہی نہیں بھی ساتھ لے کر سوں گا۔“

میں نے گاڑی کو ادھر ادھر لہریے دے کر شروع کر دیا۔ گاڑی نے مست ہاتھ کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر رخ کرنا شروع کیا لیکن یہ وہ ہاتھ تھا جس کی رفتار جواز کے برابر محسوس ہوتی تھی۔ گاڑی میرے اشاروں پر جس طرح ادھر ادھر حرکت کرتی تھی جس طرح جھٹکتے کھاتی تھی اور جس طرح یکدم غماز کر کے ہر جگہ می ”اس سے کسی اجنبی کی روح نہ ہو سکتی تھی، رگوں میں خون خشک ہو سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اور کچھ نہ ہو تو کم از کم اس کی ساتھی لڑکی تو سیٹ سے لڑکھ ہی پڑے گی اور اس طرح اگر ایک لمبے کے لیے بھی اس کی توجہ بہت سی تو میں کچھ نہ کچھ کر گزروں گا۔“

لیکن آج کا دن میری توقعات اور اندازے غلط ثابت ہونے کا دن تھا۔ میری فکر سڑک پر جمی ہوئی تھی۔ اندازے کی ایک ذرا سی غلطی سے واقعی گاڑی کسی چیز سے ٹکرا سکتی تھی لیکن اسی دوران میری نظر ایک ٹائٹ کے لیے عقب نما آئیے کی طرف گئی اور میں نے اس زخمی لڑکی کو اپنے کریشٹے ہوئے دیکھا۔ اس کا ایک دستانہ پوش ہاتھ تختی سے اٹھی سیٹ کے پٹے پر تھا ہوا تھا۔ وہ بالکل ہوش و حواس میں تھی۔

اس کے حلق سے جو آواز برآمد ہوئی وہ اسے فن کی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے اپنے ساتھی سے بولی یا ہوا



جے جان ہوں تب بھی ان میں ایک روح محسوس ہوتی ہے۔ ہر  
ہوں تو ان میں ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے جو آپ کو اپنی طرف  
کھینچتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہوں تو گویا رات کی غمازی میں آپ سے بات  
کرتے ہیں۔ نیلے ہوں تو گویا آپ کو اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ ہلکا  
ہوں تو اپنی عظمت و جبروت سے آپ کو بہشت کر دیتے ہیں۔ قدرتی  
پہاڑی والا ہوں تو اس کی شرمندہ روائی دیکھ کر پڑھو برف پوش پہاڑ  
کا خیال آتا ہے۔ آسمان ہوں تو اس کی بیکراں وسعتوں میں انسان کو  
کر دیتا ہے۔

فطرت کے سامنے انسان اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرتا  
ہے اور فطری نظاموں کی خوب صورتی اس کی مدح میں اتر جاتی ہے۔  
لیکن یہاں وہ بات نہیں تھی۔ آسمان بہت چھوٹا تھا اور حضورؐ کی  
فاصلے پر چاروں طرف ایک گنبد کی طرح زمین سے ملا ہوا تھا۔  
آسمان کی جھلکا ہٹ معنوی تھی۔ پھول اپنے نقش اور فطرت کی  
فطرت پر شرمندہ شرمندہ سے تھے۔

لوگوں کو ظاہر ہے اصلی تھی مگر اس خوب صورت اور تخیلی  
سے لباس میں وہ بھی معنوی معنوی سی لگ رہی تھی۔ شاید اس  
لیے کہ وہ کسی تخیلی دنیا کی باسی نہیں تھی۔ وہ اسی ترقی یافتہ اور  
ماہیت پرست دنیا کی مخلوق تھی جہاں جیتے پیتے پر انسان ہر لمحے ایک  
نیا فساد برپا کیے رکھتا ہے۔ وہ اپنے مخلوق جن جن اور معصومیت کے  
ذریعے اس بہرہ پر اس خوب صورت مگر معنوی دنیا کا ایک حصہ  
بننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے خیال میں اس میں کچھ زیادہ  
کامیاب نہیں تھی۔ میں نے فطری نظاموں کی آغوش میں پرورش  
پائی تھی۔ میں تو فطرت کو اس کی خوشبو اس کے رنگ اس کے  
نفس سے پچانتا تھا۔ یہ معنوی چیزیں تھیں ہی بے عیب سی لیکن  
مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔

میں نے ہنگوڑے میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ناکواری سے کہا  
"یہ کیا مذاق ہے؟"

غیر ارادی طور پر میں نے یہ سوال اردو میں ہی کیا تھا۔ لڑکی  
سفید فام تھی وہ اپنی خوب صورت آنکھیں معنوی حیرت سے  
پھیلاتے ہوئے بولی "مذاق؟ کیا مذاق؟ جہاں تو کسی نے تھامے  
ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا۔" وہ انگریزی بول رہی تھی۔  
اس نے شاید اندازہ کر لیا تھا کہ میں تھے میں ہنگوڑے سے  
اُترنے لگا ہوں۔ اس نے غیر محسوس سے انداز میں ہنگوڑے سے  
ذرا دور رہی ہوئی تپائی نما ایک چیز میں غالباً کسی شے کو چھوا۔  
ہنگوڑے پر ذرا پلندی پر چیل ہوئی ایک مستطیل سی بالی جو  
ہنگوڑے کی چھت معلوم ہو رہی تھی۔ بے آواز طریقے سے چلے  
آئی اور ہنگوڑے سے مل گئی۔ یوں ہنگوڑا گویا ایک مستطیل  
بجڑے میں تبدیل ہو گیا۔

اب میں اس بجڑے میں بند تھا۔ بجڑے خواہ کتنا ہی خوب  
صورت کیوں نہ ہو سونے کی کاکین نہ ہو لیکن انسان تو انسان۔

آسمان مل رہا تھا۔ کبھی ایک طرف کو جاتا تھا، کبھی دوسری طرف  
کہ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو چ جلا کہ آسمان تو اپنی جگہ  
ساکت تھا اور حقیقت میں خود مل رہا تھا۔ ہوا میں ہلکورے لے رہا  
تھا۔

پھر میں نے گردن ذرا اوجھڑا دھر کھائی تو خود کو ایک عجیب سی  
منظر کا حصہ بنے ہوئے پایا۔ میں درحقیقت ایک خوب صورت اور  
آرام دہ ہنگوڑے میں لیٹا تھا جو میری جسامت اور قد کاٹھ کی  
مناسبت سے کافی بڑا تھا۔ وہ خوب صورت ہنگوڑا گلابی رنگ کا تھا  
اور لکڑی کا بنا ہوا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ شاید لکڑی پلاسٹک  
دھات یا ٹائیلون وغیرہ کے قریب قریب کی کوئی چیز تھی۔ اس میں  
گلابی رنگ کا کسی کریم جیسا نرم و ملائم ہستہ تمام لوازمات سمیت بچھا  
ہوا تھا جس پر میں دراز تھا۔

قریب ہی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ خوابوں اور خیالوں کی سی ایک  
لڑکی۔ اس کا لباس بھی گلابی تھا۔ بلاشبہ وہ ایک تصوراتی لڑکی معلوم  
ہوتی تھی جیسی عموماً بچوں کی بالصورہ کمانڈوں یا انگریزی فلموں میں  
دیکھائی جاتی ہے۔ یعنی ایک خوب صورت، نرم و نازک اور رحمدل  
پری جس کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی بھی ہوتی ہے۔

فرق صرف یہ تھا کہ اس پری کے ہاتھ میں جادو کی... بلکہ کسی  
بھی جسم کی چھڑی نہیں تھی اور نہ ہی اس کے ہاتھ۔ تاہم اس کے  
سر پر گلابی ہی رنگ کا ایک تاج ضرور تھا جس میں پچاسوں تھکے تھکے  
جو اہرات سے چمک رہے تھے۔ اس کے پر نہ ہونے کے باوجود  
اس پر نظر پڑتے ہی سب سے پہلا تصور ذہن میں کسی پری کا ہی  
اُبھر آتا تھا۔

عجیب اور شاندار سے ڈھیلے ڈھالے گلابی لباس میں وہ قریب  
چھٹی خواب ناک سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے  
دھیرے ہنگوڑا ہلا رہی تھی۔ وہ اس فطرتی تھی کہ تمام تر جانوروں  
کے باوجود وہ اس کی طرف دیکھا جاسکتا تھا لیکن جیسے سے  
مجبور ہو کر کھس نے اور اوجھڑا دھکا۔

اسی دوران مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ فضا میں نہایت ہی  
وجہی اور نہایت ہی قریب تک پہنچی ہوئی تھی اور کسی ہی مذہم  
مذہم مگر مسکونہ کن سی موسیقی بکھر رہی تھی۔ میرے دائیں طرف  
ایک چھوٹا سا نیلا سی نظر آ رہا تھا جس کا کچھ حصہ خوش رنگ  
پھولوں والے پودوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے دامن میں چھوٹا سا  
ایک ٹالہ بھی رہ رہا تھا جس کا شفاف پانی آسمان کی مذہم روشنی  
میں بار بار سیال چاندی کی طرح چمک اُٹھتا تھا۔

یہ سب کچھ بلاشبہ بہت خوب صورت تھا۔ خیالوں اور خوابوں  
کی دنیا کا ایک بہت نظر گوشہ تھا لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر مجھے  
احساس ہو گیا کہ سب کچھ معنوی تھا۔ وہ خوب صورت منظر تخلیق  
کیا گیا تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ نقل مطابق اصل تھی۔  
فرق صرف یہ تھا کہ دست قدرت سے جو چیزیں تخلیق پائی ہیں وہ

حرکت کر رہا تھا۔

آخر کار میں نے زور آزمائی ترک کر دی اور دھب سے دوبارہ ستر پر بیٹ گیا۔ تب وہ تجسس اور معصیت سے بولی ”تم کیوں اپنے آپ کو تھکا رہے تھے؟“

”پلے تم بتاؤ۔ تم نے مجھے اس منجرے میں بند کیوں کیا ہے؟“ میں نے برہمی سے پوچھا۔

”محض احتیاطاً“ اس نے سادگی سے جواب دیا ”تم بہت شے میں دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے سوچا جموے سے نکل کر اداہر اور نہ دوڑنے لگو۔ توڑ پھوڑ نہ پھاؤ۔ کہیں میری ہی گردن نہ توڑ ڈالو۔“

میں نے ذرا لفٹا پڑتے ہوئے کہا ”مجھے یاد نہیں پڑا کہ میں نے زندگی میں ابھی تم جیسی خوب صورت کسی لڑکی کی گردن توڑی ہو۔ کیا میں شکل سے تمہیں اتنا بے ذوق دکھائی دیتا ہوں؟“

وہ لفٹدی سانس لے کر نہایت سنجیدگی سے بولی ”میں فلسفہ نہیں بگھارتا چاہتی لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ کسی کی صورت پر نہیں جانا چاہیے، صورتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں۔ ویسے بانی دادے یہ تم ہوش میں آتے ہی اتنا شے میں کیوں آگئے تھے؟ ہم نے تو بے ہوشی کے دوران تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ ہر طرح سے تمہارے آرام کا خیال رکھا۔ میں خود ایک غلامہ کی طرح تمہارے پاس موجود رہی۔ لیکن لگتا کی تمہارا اس ایسے سلوک کا تمہاری طرف سے کوئی اچھا صلہ ملنے کی توقع نہیں؟“

”جیسے ملے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے اس کی ٹٹلی‘ شفاف آنکھوں میں بھانکنے کی کوشش کی۔

”میرے لیے تو ایک اچھی سی۔۔۔ خوب صورت سی۔۔۔ سرواں سی مسکراہٹ بھی اچھا صلہ ہو سکتی تھی۔ میں بڑی قناعت پسند ہوں۔“ وہ معصیت سے بولی۔ مگر اس نے صبح کا تھا۔ صورت پر نہیں جانا چاہیے، صورتیں دھوکا دیتی ہیں۔ اس کی معصوم صورت کے پیچھے بھی ایک ٹوٹری چمپسی چمپسی تھی۔

”مجھے کیا اس بھگڑنے میں اتنا ضروری تھا؟ میں کیا کوئی بچہ ہوں؟“ میں نے اب بھی نکلنے سے پوچھا۔

”اور۔۔۔“ وہ ستر پر انداز میں ہنسی ”تم اسے بھگڑا سمجھ رہے ہو؟ یہ تو ہمارا ایک بہت خاص قسم کا بیڑہ ہے اور یہ ایک خصوصی بیڑہ دم ہے۔“ اس نے انہوں سے چاروں طرف اشارہ کیا۔

اس کے اشارے کے ساتھ میں نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر ڈالی۔ نیم تاریک آسمان چاروں طرف گنبد کی طرح زمین سے ملا ہوا تھا۔ وہ ایک غامض وسیع جگہ تھی۔ کوئی سو مربع گز پر محیطا رہی ہوگی۔ اس کے باوجود وہاں کچھ جتنی کا سا احساس تھا۔ شاید اس کی وجہ محض یہ تھی جو خوب صورت نظارہ وہاں سموئے کی کوشش کی گئی تھی وہ نفرت کی دستہیں مانگتا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”اس بیڑہ دم میں ان لوگوں کو

نہ بھی اس میں بند ہونے کے بعد ایک عجیب سی اہانت محسوس آئے۔ آپ شاید میری بات پر نہیں اور اسے میرے تخیل کی مثال قرار دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے زندگی میں ایک آدھہ بچہ بچا مگر ہانے کا اتنا ہی ہوا تھا تو میں نے منجرے میں بند ہر بچہ اور دوڑنے کی آنکھوں میں پڑھدی اور بے چارگی کے ساتھ ایک خرابیہ احساس اہانت کی بھی جھلک محسوس کی

میں اس وقت ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے منجرے میں رہا۔ میں نے اپنا چہرہ چٹا محسوس کیا۔ خدا نے مجھے ان گنت نیلے سے نوازا تھا۔ میں ان میں سے اپنی غیر معمولی جسمانی طاقت اور تاباں سے جتنی اناٹا محسوس کرتا تھا۔ اس کے لیے میں نے لیکن انکا دل میں جا کر ڈنٹر نہیں پہلے تھے باڈی بلڈ تک میں غیر معمولی حد تک جان نہیں کھائی تھی۔ جسمانی طاقت اور مضبوطی پہلنے کے دوسرے طور طریقوں میں بھی بہت زیادہ وقت صرف نہیں کیا تھا۔ جو کچھ بھی کیا تھا، شوقیہ حد تک نارمل انداز میں کیا تھا۔ ہانے ہانے کی توڑی بہت کوششیں تو عمر کے کسی نہ کسی حصے میں۔ خصوصاً تو عمری میں ہر شخص ہی کرتا ہے۔ میں نے بھی کی تھی لیکن وہ حقیقت میری غیر معمولی طاقت اور مضبوطی مجھے لذت کی طرف سے بڑا کئی طور پر ہی عطا ہوئی تھی۔ صحیح طور پر ہی احساس مجھے جوانی میں آکر ہی ہوا تھا۔

اس طاقت سے میں نے بار بار ناقابل یقین کام لیے تھے۔ اس وقت بھی تو ہیں کے احساس نے مجھے مطلوب کیا تو رگ دوپے میں کام کو اطرقات سے چل آئے۔ میں نے چاہا کہ بکڑے ہوئے اتریں لیکن ہوتے سائیک کی طرح اس بھگڑنے کو توڑ پھوڑ والوں جس لگائے ایک حیران کن اور کی طرح قیہ لکھایا تھا۔

اس کی چکر سلا نہیں دھات کی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے انہیں روک کر پوری قوت صرف کردالی مگر ایک لانے نے بھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ اگر وہ دھات کی ٹیوٹا شاید توڑی بہت مڑ جائیں۔ پھر میں نے اس چھت کو اوپر اٹھانے کے لیے پورا زور لگا ڈالا جو اوپر سے آکر صندوق کے ڈھکنے طرح بھگڑنے سے بڑھتی تھی اور وہ بھگڑنے کے بجائے ہلکی ہلکی تھا لیکن میں اس آدھے حصے کو بھی جنبش نہ دے سکا۔ وہ اس طرح بڑھتا تھا اسی طرح بڑھا۔

میرے ہمت سے پسند بھوت ہوا۔ شاید اس وجود کو کھنڈا کر کے لے لے تو زور آزمائی کے باعث آگ کی طرح دہکنے لگا تھا۔ لڑکی نے اس طرح میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میری طاقت آزمائی سے بھگڑا جی بھوری ہو اور اسے حیرت بھی ہو کر رہے۔ اس طرح اس سے زور آزمائی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ زور اچھے کو روک پڑے تھی۔ بھگڑا اب بھولے بھی نہیں لے رہا تھا۔ اگلے ساکت ہو گیا تھا۔ وہ گویا لڑکی کے ہاتھ کے اشاروں پر ہی



تھا۔

وہ قدرے شرارت سے مسکراتے ہوئے پہلی قسم کر  
تھے آج کل کی لڑکیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بہت تجربہ ہے  
آج کل کی لڑکیوں کا؟

”نہیں تجربہ تو کچھ ایسا خاص نہیں۔ ایسے ہی ذرا تجربہ  
ذال رہا تھا تجربہ کاری کا۔“ میں نے مسکین سی شکل بنا کر  
کوشش کرتے ہوئے کہا ”تمہیں یہ بخیر نہیں کھانا ہے تو  
کھلو۔ ویسے ہی انگارہ کھو۔ باؤل میں ٹالنے کی کوشش کیوں کر  
ہو؟“

وہ میرا سوال اُن مٹا کرتے ہوئے پہلی ”ویسے تازہ تو کسی نے  
انعام غصہ کیوں کیا تھا؟“

”مجھے اپنے آپ کو منگھوڑے میں لینا دیکھ کر غصہ آتا  
میں نے دماغ تازہ سے بنایا۔“ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ساتھ  
بڑا بچہ لڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے  
”اگر بچہ جگ کا منگھوڑا ہی ہوتا اور ہم نے تمہیں بچہ  
قرض کر لیا ہوتا تب بھی اس میں بڑا مسئلہ کی کیا بات گی؟“  
شیریں مجھے میں پہلی قسم دیکھا میں نے تو فیصد انسان دیکھی طور پر  
یہ ہیں اور انہوں نے اس دیکھا کو جس جس کر کر کہا ہے۔ ہر  
تلاشت افزا تقری اور خون ریزی پچھلائی ہوئی ہے۔ انہوں  
اس کو دنیا کو بد صورت بنایا ہے۔ وہ کسی چیز کو خوب صورت  
رہنہ دیتے۔ اسی لیے تو ہم نے دنیا پر دین اور بالغ فکر لگا  
سکرانی قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔“

”خود اس کے لیے باقی نوے فیصد کا مسئلہ کیا ہے؟“  
”نیم اسٹریٹ ایئر لیمے میں پوچھا۔“

”ہاں“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اس نے  
میں ہلا کی سفاکی تھی ”اب دیکھا کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس  
فیصد بکھرے کا مسئلہ کیا جانے یا پھر انہیں دیکھوں کسی کی طرح  
چلنا سکھایا جائے ورنہ دیکھا ایک بھیاک انجام سے دوچار ہو  
گی۔“

”دیکھا تو مجھے تم جیسے دس فیصد لوگوں کے ہاتھوں میں گیا  
انجام سے دوچار ہوئی دکھائی نہیں دے رہی۔“ میں نے کہا  
سائنس نے کر کہا ”عجب بد نصیب سیاح ہے یہ تو ارض بھی  
نہیں اس بے چارے نے کیا تصور کیا ہے ہر وقت طرح طرح  
لوگوں کے ہاتھوں میں مختصر مشق بنا رہا ہے۔“

وہ اپنے خوب صورت سر کو خفیف سا جھٹکا دیتے ہوئے  
”خیر۔ یہ باتیں میرے کہنے کی نہیں ہے۔ تم نے ابھی تک  
پوچھا ہی نہیں کہ تم کہاں ہو؟“

”میں نے اب پرکھیں شروع کر دی ہے کہ ہوش میں آئے  
بعد یہ سوال نہ کیا کروں۔ پچھل مرتبہ ہوش میں آنے کے  
سوال کیا تھا تو وہ صورت حرام اے تو قریب بیٹھا تھا۔ اس نے

لٹایا جاتا ہے جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے  
ذہن اور اعصاب پر کوئی بوجھ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے بتایا گیا تھا کہ  
تمہیں پر سبھرلی قری کے تحت بے ہوش کیا گیا تھا۔ وہ بے ہوش  
کرنے کا ایک بہت ہی تیز اور سریع اثر طریقہ ہے۔ کزور  
اعصاب کے لوگوں پر اس کے کچھ اثرات رہ جاتے ہیں۔ انہیں  
بھی خاص طور پر اس بے ہوش میں لٹایا جاتا ہے۔ تمہارے بارے  
میں مجھے بتایا گیا تھا کہ تم بے پناہ مضبوط اعصاب کے آدمی ہو اور  
اس حد تک دباؤ برداشت کر سکتے ہو جس سے عام آدمی پرین و سرج  
وغیرہ کا شکار ہو کر مر سکتا ہے۔ اس کے باوجود احتیاطاً تمہیں یہاں  
لٹایا گیا۔ یہاں کی فضا میں خاص قسم کے ان ریلز گردش کر رہے  
ہیں۔“

میں جو ایک عجیب مسکون کن سی خوشبو محسوس کر رہا تھا شاید  
وہ انہی ان ریلز کی تھی۔ لڑکی کہہ رہی تھی ”بہنی“ اعصابی اور  
جسمانی طور پر خواہ کوئی کتنا ہی تازہ حال ہو دنیا بھر کی پریشانیوں  
خواہ اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہو لیکن وہ کچھ دیر اس بے ہوش  
میں سو کر اٹھے گا تو بالکل تازہ دم اور بدشاش بدگوار ہو گا۔ ہنستا  
مسکراتا اٹھے گا۔ جانتے کے بعد بھی وہ جتنی دیر یہاں گزارے گا  
اس کے مزاج کی تازگی اور خوشگوار میں اضافہ ہی ہو گا جبکہ نارمل  
انسان پر اس کے صرف اچھے ہی اثرات ہوں گے جتنے کسی بھی  
خوب صورت اور صاف ستھرے مقام پر بیٹھنے سے ہو سکتے ہیں۔“

پھر وہ دلکشی سے مسکرائی اور فطرتی سانس لے کر پہلی  
”صرف ایک تم ہو جو اچھے ہی اتنے غصے میں آگئے تھے۔ لیکن  
تمہارے بارے میں مجھے پہلی بتایا گیا تھا کہ تم ایک ٹیڑھے آدمی  
ہو۔ میں تمہاری طرف سے کسی بھی رد عمل کے لیے تیار تھی۔“  
”در اگر میں اچھے ہی تم سے اعلیٰ محبت کر دیتا؟“ میں نے  
طاقت سے پوچھا۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ دلکشی سے مسکرائی ”میں اس کے لیے  
بھی تیار تھی۔“

”آف!“ میں نے متاثرانہ سے انداز میں مہر سانس لے کر  
کہا ”میں بھی کیسا گدھا ہوں۔ بیسویں صدی کی ایک پری میرے  
اعلیٰ محبت کی شکر بیٹھی تھی اور میں انہوں کی طرح اس بکھرے پر  
زور آزمائی کر رہا ہوں۔ جلدی سے اسے کھولو کہ میں فوراً اس منہری  
چٹکشی سے فائدہ اٹھا سکوں۔ کہیں چند سیکنڈ بعد تمہارے خیالات  
بدل نہ جائیں۔ آج کل لڑکیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔“

”اعلیٰ محبت بکھرے میں بیٹھ کر بھی تو کیا جاسکتا ہے۔“ وہ  
آرام کر کے سے مشابہ اپنی نشست پر نیم دراز ہوتے ہوئے پہلی۔  
”جہاں بکھرو وہاں محبت کا کیا کام؟“ میں نے آہ بھر کر کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو بے حد تازہ دم  
محسوس کر رہا تھا اور اب میرا سوز بے حد خوشگوار ہو چکا تھا۔ شاید  
وہاں کی فضا میں پہلے ہونے والی ریلز نے مجھ پر ذرا دیر میں اثر کیا

پہنچی تھی، تاہم اس میں شک نہیں تھا کہ وہ بھی لڑائی پر کوشش کرے گی۔  
 عزمیں فوج سے کچھ بڑی معلوم ہوتی تھی۔

"لیوٹننٹ؟" لڑکی نے حیرت سے دہرایا اور اس کی خوب صورت پیشانی پر ہلکی سی چٹکس ابھر آئیں "میں کسی لڑکے کو نہیں چاہتی۔"  
 "میرا وہی انجان بننے کا ڈراما شروع ہو گیا۔" میں نے لڑکی سے کہا "اس نے کرکھا خیر بھائی میں ڈالو لڑکے۔ جب تم سارے ہوائے لڑکے کا لڑکے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا ہی ہے تم سے تم جانتیں۔ یہ بتاؤ مجھے کب تک لوٹنے کی طرح اس بچہ سے رہنا رکھنے کا ارادہ ہے؟ نیز یہ ممکن ہو گا یا نہیں ہے۔ اسے کوئی دھم دینا اور ڈالنے کا پروگرام ہے یا نہیں؟"

"اگر تم آپ مجھے میں نہ آئے اور ایک مذہب انسان کا رویہ اختیار کرنے کا وعدہ کرو تو میں ابھی اس بچہ کا خاتمہ کر دیتی ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر پائی لٹا چنے سے چھٹی اور لڑکی کی ایک بیٹھی اٹھائی جو پائی کی ایک حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس پر چند چٹیلے سے خاتمے ہوئے تھے۔ سرسری طور پر اس میں وہ کوئی اتھالی جدید قسم کا روٹ کنٹرول یا پھر کیکس لڑکے ہو تھا۔

اسے ہاتھ میں لیے وہ پتھری نظروں سے میری طرف دیکھ گئی۔ میں نے جلدی سے کہا "دیکھ کر اسی ہو! مجھے فوراً باہر نکالو۔ مجھے دنیا کا مذہب ترین انسان پاؤ گی۔"

"اسی میں تمہارا قاتل ہے۔" وہ مکرانی اور اس مکران سے نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ کچھ دیر کے لیے مجھے اس بچہ سے میں بند رکھا جانا شاید کسی نفسیاتی سبق کا ایک حصہ تھا۔ شاید اس کا مقصد مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلانا تھا۔ چنانچہ جسمانی طاقت اور دولت کی طاقت کو دنیا میں بڑی چیز سمجھا جا رہا ہے۔ کسی کے پاس ان دونوں میں سے ایک طاقت بھی ہو تو وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتا ہے۔

جس کے پاس یہ دونوں طاقتیں ہوں وہ تو شاید کبھی بھی دنیا پر فتح لینے کے خواب دیکھتا ہو۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں سنا تھا لیکن میرے بارے میں کوئی فرض کر سکتا تھا کہ میں بھی اپنے آپ کو بڑی قوت چیز سمجھتا ہو۔ شاید قدم قدم پر میری جگہ "میں" اور کی جاتی تھی۔ مجھے بتایا جاتا تھا کہ بعض طاقتیں بعض طاقتوں کے سامنے قطعی حقیر ہوتی ہیں۔ ہر چھٹی کو شک کے لئے میں اس سے بڑی چٹیلوں بلکہ کچھ مجرموں سے ملتی ہوں۔

لیوٹننٹ ایک لمحے پر خیال انداز میں میری طرف دیکھتی رہی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود روٹ کنٹرول فٹہائی پر ایک چٹیلے کو اٹھائی سے چھوڑا اور مشغورے کا کوسا دھتے وار سا دھوا اور اٹھ چلا گیا۔ میں نے بے تابی سے باہر دیکھ کر یوں سکون کی لہر کی گویا اب تک میں کسی صندوق میں بند تھا۔ لیوٹننٹ میرے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی جس سے

مٹھکے سا اڑایا تھا کہ ہر کوئی ہوش میں آنے کے بعد پہلا سوال یہی کرتا ہے "میں کہاں ہوں؟" مجھے اپنا مٹھکا اڑوانا بالکل پسند نہیں۔ میں اس معاملے میں بہت حساس ہوں۔ بہت جلد برا مانا جاتا ہوں۔

وہ میرے سے نفس دی۔ میں نے کہا "دیکھو اگر تم خودی بتا دو کہ میں کہاں ہوں تو میں خاصا شکر گزار ہوؤں گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ میں ریڈ ڈاٹ کے کسی ٹھکانے پر ہوں۔"  
 "بس تو پھر اتنی سی کافی ہے۔ اس سے زیادہ تم کیا جانا چاہتے ہو؟" وہ قدرے حیرت سے بولی۔

"میرا مطلب تھا کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے پہچلی مرتبہ لایا گیا تھا؟"  
 "مجھے نہیں معلوم تھیں پہچلی مرتبہ کہاں لے جایا گیا تھا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"پہچلی مرتبہ مجھے انوا کیا کیا تو میں لاہور میں تھا۔ چنانچہ جب ریڈ ڈاٹ کے ٹھکانے پر میری آنکھ کھلی تو میں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ لاہور کی ہی حدود میں غالباً کس زیر زمین واقع ہو گا۔" میں نے بتایا۔

"مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔"  
 "اس بار مجھے انوا کیا کیا تو میں اسلام آباد سے چند میل دور تھا۔ چنانچہ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہ جگہ اسلام آبادی کے آس پاس کیس ہوگی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔  
 "یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔"

"انجان بننا تو کوئی تم لوگوں سے سیکھے۔ جب معلومات کا انحصار کرنے پر آتے ہو تو تمہیں یہ تک معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے بڑے دماغ میں کیا ہو رہا ہے اور جب انجان بننے پر آتے ہو تو تمہیں یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ تمہاری ناک کے نیچے تمہارا منہ ہے یا نہیں۔"

وہ جتنے ہوئے بولی "جہاں کیوں رہے ہو۔ ضروری تو نہیں کہ تمہیں ہر بات ہی معلوم ہو۔ اور معلوم ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"اچھا۔۔۔ میں کم از کم تمہارا نام تو معلوم کر سکتا ہوں۔"  
 "کیوں نہیں؟" وہ قدرے کج فہمی سے بولی "میرا نام لیوٹننٹ ہے۔"

"لیوٹننٹ؟" میں نے حیرت سے کہا "کیا تم لیوٹننٹ کی بہن ہو؟"  
 مجھے پہلی بار ریڈ ڈاٹ کے جس ٹھکانے پر لے جایا گیا تھا وہاں میری میزبانی کے سے فرائض انجام دینے والی لڑکی کا نام لیوٹننٹ تھا۔ شخصیت کے لحاظ سے بھی لیوٹننٹ اس لڑکی سے کچھ جتنی جتنی ہی چیز تھی تاہم وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی اور اس نے پریوں وغیرہ جیسا کوئی روپ بھی دھارا ہوا نہیں تھا۔ اس کا ٹھیلے اور وضع قطع تو کیڑی ڈاکڑوں یا لیبارٹریوں میں کام کرنے والی خواتین سے کچھ ملتی

”اس حسین اور دو بیشک داخل سے بھاگنے کو کس بد بخت کا دل چاہے گا۔“ میں نے والہانہ لہجے میں کہا ”میاں تم ہو۔ یہ حسین و جمیل کچھ ہے۔ یہ نیکی کھر پھول ہیں۔ یہاں بھلا کس چیز کی ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”میں یہ بتا دو کھانا کب لے گا اور رینوش کیا ہے؟“

”فحس واقعی بھوک لگی ہے؟“

”تو کیا تمہارے خیال میں میں مذاق کر رہا ہوں؟ یہ نہایت عجیبہ بلکہ سنگین موضوع ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

تب وہ اٹھتے ہوئے بولی ”چاہ میرے ساتھ آؤ۔“

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں تو چاروں طرف سی رودام نہاد آسمان زمین سے مل رہا تھا لیکن فیو شاید ایک خاص حصے کی طرف جاری تھی جہاں کچھ اور ایک تیار درخت اور اس سا کھڑا تھا۔ اس درخت کے قریب سے گزرتے وقت لیوانے ایک بار پھر اس ریموٹ کنٹرول نما چیز کو استعمال کیا اور زمین سے لٹے ہوئے آسمان میں ایک شگاف سایہ ایدہ ہو گیا۔ ایک سیڑیوں کے برف سے بنے ہوئے گھروں میں آمدورفت کے لیے اسی قسم کا دروازہ ہوتا ہے لیکن یہ دروازہ ذرا بڑا تھا جیسا دراز قد شخص بھی نہایت آسانی سے اس سے گزر سکتا تھا۔

لیوانے کے پیچھے اس خرابی دروازے سے گزرنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو عقب میں صرف ایک سیاہ دیوار تھی۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہم ایک طویل راہداری میں کھڑے تھے۔ اس قسم کی راہداری کسی بھی تجارت میں ہو سکتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ ایک انتہائی سادہ سی راہداری تھی۔ اس میں کہیں کوئی کھڑکی، دروازہ، کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ دوسرے دیوار پست فرش پر چیز کا رنگ سیاہ اسٹیل سے مشابہ تھا۔ وہ دس سیاہ اسٹیل سی کی ایک چوکور ٹرک معلوم ہو رہی تھی۔

لیوانا دیکھیں طرف مڑی اور چند قدم چل کر ٹرک لگی۔ اس کا منہ ایک دیوار کی طرف تھا۔ وہ یقیناً کسی نشان و نشانہ کے بغیر بھی تعین کر سکتی تھی کہ اسے کہاں رکھنا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ریموٹ استعمال کیا اور سیاہ اسٹیل کی سی پائ دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا۔ عجیب امر تھی۔ حصار کا ریموٹ کنٹرول تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سوال ابھرا تھا کہ کیا میں فیو سے ریموٹ چھین کر وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا؟ لیکن میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک بے فائدہ بلکہ نقصان دہ حرکت ہوگی۔ میرا اندازہ تھا کہ ریموٹ کنٹرول کے ٹھکانے میں انگریزوں کے نشانات کا بھی دخل تھا۔ میں ممکن تھا کہ میری انگلی کے لمس سے وہ کام نہ کرنا۔

اس سے پہلے مجھے ریڈ واٹ کے جس ٹھکانے پر لے جایا گیا تھا۔ وہاں میں نے لیوانا کو شخص ہاتھ کے لمس سے ایک دروازہ

پر لے گیا تھا۔ ابھی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی نظر مجھ پر ہی تھی اور وہ ایک نہیں جھپک رہی تھی۔ میں نے اپنے وعدے کا پاس کیا اور کوئی ایسا ایسی حرکت نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چھین میں پریوں اور شراذیوں کی کمائیاں بڑھ کر جو قصور میرے ذہن میں ابھرتا تھا وہ اب تک ذہن کی لاجبری کی کسی ایک گوشے میں محفوظ تھا۔ سرقد لیوانا واقعی اس قصور پر پوری اتنا تھی۔

میں اس کے متقابل کھڑا ایک ہنگام اس کی طرف دیکھتا رہتا تو اس کے رخساروں پر شرمیلی کچھ بڑھ گئی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اسے شرمنا بھی آتا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ اس نے تیار آلود سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

”تمہارے حسن کو آنکھوں میں سمونے کے لیے یہاں روشنی کم ہے۔“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا پھر اور دیکھا ”کیا یہاں پیش اس طرح نیم تاریکی رہتی ہے؟“

”میں یہاں خزاں، بہار، برسات، گرمی، سردی، دھوپ، شام، چڑھان۔ غرضیکہ ہر موسم اور ہر وقت کا سامان رکھا جاسکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں شاید غیر ارادی طور پر غمراہانک آواز۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود پتی پر ایک اور جھیلے خانے کو چھوا۔ اس طویل و عریض جگہ پر دن کا اجالا پھیل گیا۔ ٹھنڈے ستارے غائب ہو گئے۔ آسمان نکلا ہو گیا۔ سورج نظر نہیں آ رہا تھا گردوں طرف دھوپ کی سی روشنی پھیل گئی۔

”سورج کو ابھی رہنے دیتے ہیں۔ ورنہ یہاں کچھ گرمی سی ہو جائے گی۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ یعنی وہ چاہتی تو سورج بھی نکال سکتی تھی۔

روشنی پھیل کر فضا کی خوب صورتی کچھ اور اجاگر ہو گئی لیکن داخل کچھ پیکا سا پڑ گیا۔ اس کا حصہ کچھ نمایاں ہو گیا۔ میں ٹھنڈے کے سے انداز میں ایک طرف چلے نکلا۔ لیوانا میرے ساتھ تھی۔ میں ٹالے کے کنارے ایک صاف ستھرے سرسبز چھپرے جابجھا۔ لیوانا میرے سامنے دوسرے چھپرے آن بیٹھی۔

ٹالے کی تہ میں صاف ستھرے چھروں پر کچھوں کا ایک جڑوا بھی جیٹا تھا۔ پانی اور چھڑا اصلی تھے لیکن مجھے کہاں کرنا کہ شاید کچھوں کا جڑوا مصنوعی ہو۔ میرا خیال غلط نکلا۔ کچھوں کو شاید عالمی موجودگی کا احساس ہو گیا اور وہ گویا کچھ بڑا منا کر پانی کے نیچے سے پتھر تیرتے ہوئے کچھ دور چلے گئے۔

میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئی کہا ”اس جانب گھر کا دروازہ کہاں ہے؟“

”کیوں۔ کیا بھاگنے کا ارادہ ہے؟“ وہ مسکرائی۔ جب انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس کی قید سے بھاگ نہیں سکتا تو وہ اس کے سوالات سے محفوظ ہوتا ہے۔

کھولنے دیکھ کر بعد میں خود اسی طرح کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے ناکامی ہوئی تھی۔

اگر میں لٹو نہ کرے ہوش کر کے اس کی انگلی کے لمس سے ریموٹ کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا تب بھی کسی فائدے کا امکان ظہور نہیں آتا تھا۔ ریموٹ نہایت مختصر تھا اور اس پر چند ہی جھپٹے سے خانے تھے اور معلوم کیا ہوتا تھا کہ ایک ایک خانے کے کئی کئی ٹکٹن تھے۔ صرف انہیں مختلف انداز میں بھی ایک بار کسی دو بار اور بھی تین بار چھوئے سے ٹکٹن میں فرق پڑ جاتا تھا۔ تمام جھپٹے خانے ایک جیسے تھے اور لیونا اتنی بھرتی و مشاطی سے ریموٹ کنٹرول کو استعمال کرتی تھی کہ مجھے ابھی تک ایک خانے کے بارے میں بھی یقینی طور پر اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس سے کیا کام لیا جاسکتا تھا۔ میں خواہ لٹو نہ کرے ہوش کر کے اسی کے ہاتھ سے ریموٹ استعمال کرنے کی کوشش کرتا تب بھی عین ممکن تھا کہ کوئی دردناک جھپٹے کے بجائے چھت کا کوئی بھاری بھر کم ٹکڑا میرے سر پر گرا کر آیا ان آہنی سے دردناک کے عقب میں کوئی ایسا سنگ سسٹم آتا ہوتا اور میں یہاں سے آزاد ہونے کے بجائے کسی سرنگ نما راستے پر کسی چرنے کی طرح فرار کیا ہو کر نہ جاتا یا سالم کہے کی طرح دوست ہو جاتا۔

میری ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ ابھی تو اس جگہ کا سرچری میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ مجھے صحیح طور پر یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں مجھے پہلے لے جایا گیا تھا یا یہ کوئی دوسرا ٹھکانا تھا؟ میں اس سب سے بالی جگہ کو بھی مکمل طور پر نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے یقین سے بچے نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ اسی کا کوئی اور حصہ بھی ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں نے بھی یقیناً ہر پہلو پر ابھی طرح غور کر رکھا تھا۔ جسمی یوں اطمینان سے ایک نرم دناؤ لڑکی کو ریموٹ کنٹرول سمیت اپنے سرکش قدی کے پاس بٹھا چھوڑ دیتے تھے۔

یہ آہنی سی دیوار میں نمودار ہونے والے دردناک سے ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ گویا مکمل طور پر اس دیوار کی ضد تھی۔ یہاں کی دیوار میں فرنیچر ہر چیز سفید تھی اور کسی بہت ہی خاص قسم کے پلاسٹک کی بنی معلوم ہوتی تھی۔ اس میں ایک لمبی سی ڈائنگ ٹیبل پڑی تھی جس کے گرد کافی مقدار میں سادہ سی کرسیاں موجود تھیں۔ وہ ڈائنگ روم ہی معلوم ہوتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر کسی اسپتال کا سا تاثر ملتا تھا۔ شاید اس کے بے دارغ سفیدی کے وجہ سے۔ حالانکہ ہمارے اسپتالوں میں بے دارغ سفیدی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہر حال ایک روایت تو چلی آ رہی ہے۔ سفید سفید چیزوں کو دیکھ کر اسپتال کا خیال آتا ہے۔ نسبت تھا کہ وہاں اسپتال جیسی دواؤں کی بو نہیں تھی بلکہ ایک خوشگوار سی منک سی بھیل ہوئی تھی۔

اس کشادہ کمرے میں ایک طرف باقاعدہ بیٹری بھی بنی ہوئی تھی جس کی عمرانی سی کڑکی کے عقب میں ایک غصص کھڑا تھا۔ وہ

بھی سفید قام تھا۔ میں اور لیونا ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھے تھے تو وہ بیٹری سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید ٹرسے تھی جس میں سفیدی گھاس تھے اس سے ٹرسے ہمارے سامنے لا رکھی۔ اس کا اندازہ دشواریوں والا تھا۔ مگر لیونا نے یہ کوئی ڈاکٹر کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لباس جو تے سب کچھ سفید تھے۔ اس کی سفید ٹوپی سے ڈھکا ہوا تھا لیکن وہ اس قسم کی ٹوپی نہیں تھی جس میں خانہ سال پٹنے ہیں بلکہ وہ کسی حد تک فنی ویلٹ سے مشابہ تھی۔ اس غصص کا چہرہ مردوں کی طرح سیاہ تھا اور وہ بالکل خاموش کھڑا تھا۔ گھاسوں میں جو سیال اور شفاف چیز تھی وہ بظاہر برقیاتی ہی معلوم ہوتا تھا۔

مجھے پاس لگ رہی تھی لیکن میں گھاس اٹھانے اٹھانے نہ کر گیا۔ لیونا نے گھاس اٹھا کر چند گھونٹ بھر لیے پھر میری ہچکچاہٹ دیکھ کر بولی "وہاں جاؤ تو تو لیونا۔ یہ سادہ پانی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے اس میں کتے لمبوں کا جو س شامل نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے عجیبی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے بیشتر مہروں میں جن دشواریوں سے پانی آتا ہے ان میں کتے لمبیاں اور پرندے تک مرے بڑے ہوتے ہیں۔ راستے میں کہیں کہیں گزرتی پانی کی لائنوں سے ٹکلی چول پھٹا گیا ہیں اور اپنے اپنے "ٹائٹ" ایک دوسرے کو پھٹل کھینچتے ہیں۔ پانی اس قسم کی خصوصیات سے پاک ہے۔"

"یعنی صاف ستھرا پاکیزہ اور ہر نکاح سے پاک ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر یہ مجھے کہاں بھیج رہا ہو گا۔" میں نے پوچھا۔

ایک بار پھر اس کی سترم ٹیسی ابھری "تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔ افضل چوہدری۔"

"یہ جانتا اچھا محسوس ہو رہا ہے کہ جس میں میرا نام معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے تمہارا نام اور تمہارے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بتانی تھی جس۔" وہ بولی۔

"لیکن یہ نہیں بتایا گیا ہو گا کہ میں بہت اچھا آدمی ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر میں نے نہایت عجیبی سے کہا "ایسا کہ۔" تم میرے ساتھ بھاگ چلو۔ میں جس میں یقین دلانا چاہتا کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی بہت اچھی گزرے گی۔"

اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا پھر نہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں یہاں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہوئی" میری زندگی کو تو چھوڑو۔ پہلے اپنی زندگی اچھی گزارنے کی فکر کرو۔ اب مذاق چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا کہاؤ گے؟ تم مینو کی بات کر رہے تھے۔ یہ بتاؤ میں کہاں زیادہ شادمانہ پُر کھلف پینٹ پینٹے میں سیدھی سادی سی ہے۔"

جس جلتی ہیں۔ یہاں کھانے کا مقصد صرف جسم کی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر چاہو تو غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے جنس صرف دو چار کیپسول بھی دے سکتے ہیں۔

"ہرگز نہیں" میں نے سختی سے کہا "میں کھانے کی جگہ کیپسول ہرگز نہیں کھاسکتا مجھے یہی محسوس ہوگا میں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ میں رضائی آدمی ہوں۔ میرے لیے کوئی سیدھی سادی چیز ہی منگوالو لیکن وہ کم از کم خوراک تو محسوس ہو۔"

اس نے دیکھ کر اس شخص کو کچھ چیزیں لانے کا حکم دیا اور وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔ چند لمبے بعد ہی وہ ایک ٹرے لیے لوٹ آیا جس میں مختلف پلاسٹک کے چند ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ وہ دراصل نمات نہیں قسم کے کینڈیز تھے جن میں مختلف قسم کے مکرمات مادی کی کچھ سینڈویچ نما چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

فیضانہ وہ شفاف پلاسٹک کے ڈبے کھولے اور انہیں کینڈیز کی طرح چمچ کر کے ٹرے میں ڈال دیا۔ میں نے دو تین سینڈویچ کھائے۔ میرا خیال تھا ان سے میری داڑھ بھی کرم نہیں ہوگی لیکن طبیعت سیر ہو گئی۔ ذائقہ بھی اچھا خاصا ہی تھا۔ فیضانہ صرف ایک پھٹی مٹائی کھائی۔

میں نے چوتھی سینڈویچ نما چیز کی طرف متذہب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اس سے ابھی تو وہ جگہ تھی جہاں مجھے اس سے پہلے لے جایا گیا تھا۔ وہاں ہر طرح کے کھانے موجود تھے۔ جو میں نے ہینڈ کیادی پیش کیا گیا۔"

"تمہارے لیے خصوصی انتظام کیا گیا ہو گا ورنہ ہمارے ہاں کھانوں وغیرہ کے لیے اتنا انتظام اور ایسی جمیلے بازی نہیں کی جاتی جس کا تمہاری سوسائٹی میں رواج ہے۔"

"تم تو اس طرح بات کر رہی ہو جیسے یہ کوئی الگ ہی دنیا ہے۔"

"ہاں ایک طرح سے یہ چھوٹی سی الگ تھک دنیا ہی ہے کیونکہ یہاں کی ہر چیز تمہاری دنیا سے مختلف ہے۔" وہ بولی۔

ایک ناک ڈانگ دوم کا دروازہ کھلا۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ میں نے اگر بروقت اپنے آپ کو نہ روکا ہوتا تو شاید میں حیرت سے اچھل پڑا کیونکہ دروازے سے اندر آنے والا بلیک بڑا تھا۔ وہی بلیک بڑا جسے راحلہ موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی کھوپڑی میں ایک تیز دھار چاہر تو دیکھی کہ جسے تک پوسٹ دیکھا تھا۔ اس کی لاش پولیس کے قوت سے ایک انجینی نے اپنی تحویل میں لے لی تھی اور کسی لیبارٹری کو بھجوائی گئی تھی۔ مگر وہ پیچیدگی اپنے اسی مخصوص انداز میں اس وقت سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

دروازہ بند ہونے سے پہلے ایک اور شخصیت اندر آئی۔ وہ اسے نہیں تھا۔ وہاں ہر مادی جن میں آچکا تھا۔ بہت عمدہ قسم کے بہت سے کھانے۔ بال بھی نہایت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے میں نے اسے بھی اسے معززانہ طریقے میں نہیں دیکھا تھا۔

چہرے پر بھی بے پناہ حسرت اور روبرواری طاری تھی۔ وہ بدبخت بلیک بڑا بھی جینٹ شربت اور ٹائی میں تھا۔ ہاتھ جیپوں میں ڈالے ہوئے تھا اور پورا دائرہ انشور نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ میرے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا جبکہ اسے سن کھڑی رہا اور اس کی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تھو کس لیا جو کچھ ٹھوس تھا؟"

میں نے منہ بنا کر کہا "ٹھوس کے لیے یہاں رکھائی کیا تھا۔ عجیب خفائی قسم کا کھانا تھا۔ مجھے تو لگ رہا ہے میں تمہارے سوئم میں شرکت کرنے چاہر رہا ہوں۔"

"میرے سوئم میں شرکت کرنے کی تو شاید تمہیں حسرت ہی رہ جائے۔ البتہ چاند پر تم جب چاہو، ہم تمہیں بھجوا سکتے ہیں۔" اے نے سن لے لے یا نیازی سے جواب دیا مگر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فیضانہ سے مخاطب ہوا "یہ برا ہی بیٹا آدمی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کا پیٹ ابھی تک پیٹ ہی ہے تو نہ نہیں بنا۔"

"کسی نے تمہیں غلط اطلاع فراہم کی ہے۔ میں تو کبھی کبھی دن کھانے کے بغیر بھی رہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اوت کی طرح وغیرہ کر لیتے ہو گے خیر۔ اس وقت میں تم سے طبیعتی معاملات پر چارہ خیال کرنے نہیں آیا۔ تمہیں ذرا وقت کرنا ہوگی۔ میرے ساتھ آؤ۔" اے نے بولا۔

"اب کیا ذرا ماد کھانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اے نے سن کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے "اتنے پیچیدہ معاملات کو تم ذرا بازی کا کام دیتے ہو۔ تمہیں کب عقل آئے گی؟"

"تم لوگوں سے اگر اس طرح واسطہ پڑا رہا تو مجھے لگتا ہے میری تو بچی کبھی عقل بھی رخصت ہو جائے گی۔" میں نے غم ناک لہجے میں کہا مگر بلیک بڑا کی طرف اشارہ کیا "یہ غیبت تو جنم رسید ہو چکا تھا۔ وہاں کہاں سے آیا؟ کیا یہ کوئی جڑواں بھائی قسم کی چیز ہے؟"

بلیک بڑا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر خوشگین کی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شاید اردو بھی سمجھتا تھا اور لفظ "غیبت" پر بھی کا اظہار کر رہا تھا مگر اس نے اجازت طلب کی نظروں سے اسے سن کی طرف دیکھا گیا۔ زبان خوشی کہ رہا ہو "اگر تم جڑواں نہ مانتو تو میں اسے تیز کر سکتا ہوں؟"

لیکن اے نے سن کی طرف توجہ دے بغیر بولا "بھائی تو نہیں لیکن جڑواں قسم کی چیز ہی سمجھ لو۔ وہ بلیک بڑا نہیں تھا۔ یہ بلیک بڑا تو ہے۔ یہ قتل ہمارے پاس تسلی بخش قہر آدمی موجود ہے۔ یہ تم سے ختم نہیں ہوگی۔ ایک کو مارو گے دوسرا آجائے گا۔ دوسرے کو مارو گے تیسرا آجائے گا۔ یہاں کچھ لو یہ تو ہماری ایک پروڈکٹ ہے۔ ہمارے ایک کامیاب تجربے کا نتیجہ ہے جس کی تفصیل میں تمہیں فی الحال نہیں بتا سکتا۔"

درست کرتے ہوئے بولا "چند ہری ذیہرا تمہارے ساتھ کیا تو سزا ہے۔ تم نہ تو اپنی قدر سے واقف ہو اور نہ ہی میری قدر سے تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم جیسے اور مجھ جیسے انسان مدلول میں پڑا ہوتے ہیں۔"

"اب تم مجھے 'امن' خرانا بلا کر یومِ قدر مرا حاتی بگو ورنہ لاؤں پٹکا چاہتے ہو۔ مجھے تو تم عام سا انسان ہی رہتے ہو۔ میں اسی میں خوش ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تو میرا تمہارے عام سے انسان! میں تمہیں کچھ خاص انسانوں سے ملانے لے چلوں۔" اے نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کا ہاتھ دھات کے پتے سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ رنگت کچھ کچھ تانبے جیسی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بلیک بڑے بڑے عقب میں آن کھڑا ہوا۔

میں نے فیضان کی طرف جھٹکے ہوئے ناشقانہ لہجے میں پوچھا "تم نہیں چلو گی جان تمنا؟"

میں نے یہ جملہ اردو میں بولا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہ رہا تھا کہ وہ اردو بھی سمجھتی تھی لیکن وہ بدستور انتہائی نئی سی بات چہو لے میری طرف دیکھتی رہی۔ اے نے نہ تو درے بے آبی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "جب جان تمنا کو بلایا جائے گا تو وہ بھی آجائے گی۔ فی الحال تم تو چلو۔"

میں نے فیضان کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے مجھے اس سے چہ اہوئے وقت شدید صدمہ ہو رہا ہو۔ وہ قدرے شرے سے انداز میں مسکرا دی۔ میں اے نے کنکے پیچھے چل دیا۔ اے نے نہ بھی نیپ سے ویسا ہی ایک ریموٹ کنٹرول سا نکالا جیسا فیضان کے پاس تھا۔

اے نے نہ اور بلیک بڑے درمیان چلے ہوئے میں ایک بار اسی سیاہ دیواروں والی راہداری میں پہنچا۔ ان بتکوں کی ساخت اور ڈیزائننگ واقعی نہایت عجیب اور پریشان تھی۔ ایک ایسی نقاشا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کس سمت میں چل کر وہ کہاں پہنچے گا یا کس دیوار کے عقب میں کیا چیز ہے۔

اس بار مجھے ان دونوں کے ساتھ راہداری میں خاصی دور تک جانا پڑا۔ آخر کار ہم ایک سیاہ دیوار کے سامنے پہنچ کر کڑک کڑے دیوار دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس پر تھا ہا صرف ایک سرخ شیش موتی کی طرح ابھرا ہوا تھا۔ اے نے اس پر انگلی رکھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم تیز روشنی میں تھم گئے۔

ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھیں چند حیا کشی اور مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی مگر پھر نظر اٹھا کہ چھت میں ایک سفید دائیں نمودار ہو چکا تھا جس سے کمرے کی خلیش لائٹ جیسی تیز روشنی خارج ہو رہی تھی مگر وہ تین سینکڑوں سالوں کی روشنی غائب ہو گئی۔ چھت دوبارہ سیاہ ہو گئی اور ہمارے سامنے

"میں جانتا بھی نہیں چاہتا۔" میں نے منہ ہٹا کر کہا "صرف اتنا بتا دو کہ تم بھی کوئی پروڈکٹ تو نہیں ہو؟ کسی کامیاب تجربے کا نتیجہ تو نہیں ہو؟ تم بھی اگر کسی دن کسی طرح جنم رسید ہو گئے تو اسی طرح تمہارا کوئی دوسرا ہم شکل اپنی نعمت سمیت سامنے تو نہیں آجائے گا؟"

"بڑی بولی تکلیف بول رہی ہے تمہارے لیے میں۔" اس نے گویا میری امدادی کیفیت سے محفوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا تشدد لگایا۔ پھر اس نے سنجیدگی سے میرے سوال کا جواب دیا "میرا حال تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ اپنی مثال آپ۔ میرا کوئی ثانی کوئی ہم شکل شاید پوری دنیا میں بھی موجود نہ ہو۔"

اس کے لیے میں ہلکا سا فخر جھٹک آیا "اے نے ایک نہایت منفرد شخصیت کا نام ہے اپنی بارے! میں ریڈ زائنٹ کا ایک جیسی اٹاٹا ہوں۔ میرا مقابل کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"تم تو ایسے ہی جس دن پیدا ہوئے ہوئے اس دن اس دھرتی نے سوگ منایا ہو گا۔ تم جیسے ایک دو اگر اور پیدا ہو جاتے تو دنیا میں ماتم ہوا ہو جاگ۔" میں نے کہا اس سے باتیں کرتے وقت میرا ذہن مسلسل اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے اس امکان پر بھی غور کیا کہ اگر میں ان تینوں کو بھی ہلاک کر کے میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا مجھے حقیقتاً کوئی ناکہ ہو گا؟

میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس سے بھی کوئی خاص ناکہ نہیں تھا۔ یہاں کا ہر گوشہ اپنی جگہ ایک قید خانہ تھا۔ میں دیواروں سے سر کھرا کر مر سکتا تھا لیکن میکینک سے واقفیت کے بغیر ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتا تھا اور ایک دروازے کو بھی جھنک نہیں دے سکتا تھا۔ اگر میں اس میں سے دو کو ہلاک کر کے کسی ایک کو مجبور بھی کر کہ وہ مجھے باہر لے چلے اور اسے یہ مثال بنا لیتا تب بھی وہ کوئی گڑبڑ نہ کر سکتا تھا۔ مجھے باہر لے جانے کے بجائے کسی اور سنگین مصیبت میں چھنسا سکتا تھا۔ بلکہ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ جان دے دے گا لیکن میرے اشاروں پر نہیں چلے گا۔ اس کے علاوہ اے نے نہ اور بلیک بڑے کو خالی ہاتھوں سے ہلاک کرنا بھی شاید اتنا آسان کام ثابت نہ ہو تا جتنا بظاہر نظر آ رہا تھا۔ دونوں لوہے کے پتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ نرم نازک اور پری نما شخصیت فیضان بھی زخموں کا معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تو صرف ریموٹ کنٹرول تھا لیکن میں ممکن تھا اس کے ویلے دھماکے لبارے میں کچھ اور شعبہ پناہاں رہے ہوں۔

میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالنا مناسب نہیں تھا جب تک وہ مجھ پر کوئی سختی یا جسمانی تشدد نہیں کر رہے تھے تب تک مجھے بھی ہر سکون ہی رہنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیے تھا کہ اس بار وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ فیضان اس دوران بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اے نے اپنی ٹانگی

تھ کے دواؤں سے کی طرح ایک دواؤں مکمل کیا۔

جس چیز میں ہم داخل ہوئے وہ لٹھ سی معلوم ہوتی تھی لیکن کچھ عجیب ہی الجھن میں ڈالنے والی لٹھ تھی۔ جب دواؤں بند ہو چکا اور لٹھ حرکت میں آئی محسوس ہوئی تو یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اور جارہی تھی یا نہیں۔ ایک لمبے کے لیے چپے جانے کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اوپر جاتی محسوس ہوئی۔ چند سینکڑے بعد ہی لٹھ ساکت ہو گئی اور دواؤں مکمل کر گیا۔ لیکن یہ دواؤں نہیں تھا جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ اب اس کی خلاف سمت میں دواؤں کھلا تھا۔ اس سے نکل کر چند قدم چل کر ہم ایک اور سیاہ دوار کے سامنے پہنچے۔ اس میں دواؤں سے ملتا نہ دیکھا گیا۔ ایک اسکرین نظر آ رہی تھی۔ اس کے عقب میں گویا دودھیا رنگ کے دھوس کے گہرے مرغولے بکرا رہے تھے۔

یہاں بھی اسے فن نے نچھاسا ایک شرح میں دیا۔ یہاں بھی اسی طرح دو تین سینکڑے کے لیے ہم پر سفید چمکیلی روشنی پڑی جس طرح پہلے پہنچی تھی اور وہ سفید دودھیا سا دواؤں مکمل کیا۔ اس کے عقب میں واقعی کثیف دودھیا دھوس کے مرغولے بکرا رہے تھے۔ ان کے درمیان قدم رکھتے ہی مجھے لہجڑک کا احساس ہوا۔ ایک لمبے کے لیے مجھے ان مرغولوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں نرم روٹی میں دھسنے پہلے جا رہے تھے۔

چند سینکڑے بعد میرے قدم گویا سخت زمین پر جا سکے۔ ہم دھوس کے گہرے سفید مرغولوں سے بھی نکل آئے اور میں نے اپنے آپ کو لمبے عریض طویل دھوس میں ہل چڑھنے لگا جیسا میں ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ یہ دواؤں کے ٹھکانے پر لے جایا گیا تھا۔ اس خاص مقام پر اس دن وغیرہ نے مجھ سے بڑا کرات کیا تھا۔

یہاں بھی چھت کی جگہ مصنوعی آسمان تھا۔ ایک طرف نیل لکھا آسمان بنا دیا تھا۔ دوسری طرف نیل لکھا آسمان تھا۔ ہزاروں تھیں۔ ایک طرف بلند دھوا آبیو دم تھا وہ مصنوعی آسمان سے جڑا محسوس ہوتا تھا۔ اس میں خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اندر بالکل صاف کا سماں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کا پانی کسی پہاڑی چٹان سے بھی زیادہ شفاف تھا۔ ہر چیز صاف دیکھی جاسکتی تھی۔

یہاں بھی آبیو دم کے سامنے ایک شاندار سی کرسی موجود تھی۔ ایک گوشے میں سفید کاغذ پر نیل لکھی ہوئی تھی۔ غرضیکہ ہر چیز کی سی تھی جیسی میں پہلے دیکھ چکا تھا لیکن یہ جگہ ہر حال وہ نہیں تھی۔ ایک تو اس میں داخلے کا راستہ اور طریقہ مختلف تھا۔ دوسرے یہاں کی چیزوں کے ساتھ میں تو دوسرا فرق تھا۔ یہاں کی ہر چیز پہلے والے "دور بار" کے مقابلے میں ذرا بڑی نظر آ رہی تھی۔

یہاں پہنچتے ہی گویا ایک بڑی حیوانی جبلت نمودار آئی۔ یا پھر شاید اس کی کوئی اور وجہ تھی کہ وہ فوراً اپنی پینٹ، شرٹ، ٹائی اور جو گرز سمیت دو ٹانگوں پر چلتے چلتے یکدم چاروں ہاتھ پیروں پر اٹھیا اور تھوچیں بھرتا ہوا پتہ لگا راستے "بکٹ واک" پر جا چکا اور خاصی دور چلا گیا جہاں روشنی ذرا کم تھی۔ وہاں وہ کیٹ واک کی نیچی سی منڈی پر اپنی ٹمپی پر تھوڑی ٹھاکر ٹھکانے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ شاید اس انداز میں بھی کوئی خاص مصلحت تھی۔

مجھے یاد تھا کہ بالکل اسی طرح میں نے پہلی مرتبہ ایک بڑوں کو (اگر وہ واقعی ایک بڑوں تھا) کیٹ واک پر بیٹھ دیکھا تھا۔ ایک لمبے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ کیس میں بیٹھ میں تو نہیں تھا؟ کیس میں ازمین تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اس منظر کو خواب کی صورت میں دہرا تو نہیں رہا تھا؟

اسے فن میرے تاثرات دیکھ کر گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا "یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں تم پہلے گئے تھے اور نہ تم خواب دیکھ رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میری معلومات میں یہ جیس برا اضافہ مت کرو۔" میں نے بیزارگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی پھر آبیو دم وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ تمہارا اثر دیا کہ ہے کیا؟ اس جگہ یہ تمام چیزیں موجود ہوتی۔ اور یہ اسی انداز کی بیشک وغیرہ ضروری ہے کیا؟"

"ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے کاغذ پر نیل پر بیٹھنے کا اشارہ کیا "اس میں کچھ سائنسی مصلحتیں بھی ہیں اور کسی کی ذاتی پسند کا دخل بھی۔ سائنسی مصلحتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی اور ذاتی پسند کسی کی ہے یہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔" پھر ایک لمبے کے وقف سے وہ بولا "ایک بات البتہ تمہیں بتا دیتا ہوں۔ یہ ساری جگہ جس کے کچھ حصوں سے تم گزر کر آ رہے ہو اور کچھ حصے ابھی تمہاری نظر سے پوشیدہ ہیں، مکمل طور پر ایسی جگہ تک سے محفوظ ہے۔ اس پر اہم ہر براہ راست بھی مارا جائے تب بھی اس کے کسی حصے کا کچھ نہیں بگڑے گا اور اس کے اندر موجود تمام جاندار زندہ رہیں گے۔"

"ہاں اگر خدا نے ان کی زندگی نکھی ہوگی تو۔" میں نے گویا قسم کی۔

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس جگہ کے باقی حصوں کی طرح اس حصے کا بھی سرچرچہ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی چیز کہاں سے شروع ہو رہی تھی کہاں ختم ہو رہی تھی اور کس گوشے میں نظر آنے والی چیزوں کے علاوہ بھی کیا کچھ تھا جو نظر سے اوجھل تھا؟

"یہ تمام تقریرات زیر زمین ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔ "ضروری نہیں ہے۔" وہ غصہ مند انداز میں مسکرایا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اس سلسلے میں سنیوٹون اور بے نیٹنی میں ہی جھگڑا رکھنا

پہتا تھا۔

نظر آوری ہو۔ پھر وہ نہ جانے کس نادیدہ ہستی کے احرام میں اس کو کھڑا ہوا۔ اس نے سوچ ہی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ وہ ہنگواری سے بڑبڑایا۔ اس کی تم اسے سرکش نہ ہوتے۔

”میری سرکش ہی تو میرا سرمایہ ہے پیارے!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے ہونٹوں پر اٹلی رکھ کر مجھے غامض رہنے کا اشارہ کیا۔

اسی لمحے میں نے کیٹ واک کے نیچے کافی ناطے پر ایک اندھیرے گوشے سے دو افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ذرا دھڑکیں میں آئے تو میں نے دیکھا ان میں سے ایک تو ثابت معززانہ جیسے کی عمر رسیدہ سفید قام عورت تھی۔ دوسرا ایک دراز قد شخص تھو نہیں قسم کے سوٹ میں تھا۔ لیکن اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میں کمری سانس لے کر وہ کیا کیونکہ وہاں چہرے نہیں دیکھنے والے سے بھی ذرا بڑے سائز کا ایک اندازہ لگایا تھا جو میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس انداز پر داک منہ کی جگہ نہایت چلی انداز میں سیاہ رنگ میں انگریزی کا گارہا ہندو دھماکی دے رہا تھا۔ یہ یقیناً ہاس ٹو تھا۔

میں نے نیکی آواز میں اسے سن سے پوچھا ”یارا یہ تمہارے پاسوں کی سیر کرتے خبر تک پہنچے کی؟“

اسے سن نے خشکی نظروں سے میری طرف دیکھا گویا یہی اس گستاخی پر مجھے قتل کر ڈالنا چاہتا ہو حالانکہ میرے خیال میں ابھی میری آواز پاس ٹو اور اس عمر رسیدہ عورت تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ نہایت پرسکون اور باوقار انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہماری طرف آ رہے تھے۔ کسی بے چہرہ شخص کی عمر کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہی تھا، خصوصاً جب وہ عمری نہیں سوٹ میں ہو۔ تاہم جسمانی ساخت اور چال ڈھال سے وہ نہ صرف جوان بلکہ نہایت مضبوط بھی معلوم ہوتا تھا۔

پاس دن سے میری ملاقات کے موقع پر عمر رسیدہ عورت کے علاوہ ایک عمر رسیدہ مرد بھی موجود تھا۔ اس بار صرف عورت ہی تھی اور یہ عورت بھی دوسری تھی۔ وہ ہاتھ میں پرس لیے ہوئے تھی لیکن جب وہ قرب آنے کو معلوم ہوا کہ وہ پرس نہیں بلکہ کتاب کی سائز کا ایک کپیوٹر تھا تو اس نے اپنے سامنے پیڑ رکھ لیا۔

پہننے سے پہلے پاس ٹو کے انداز سے آواز ابھری ”کیسے؟“ مسز افضل چوہدری؟“ سوال اس نے انگریزی میں کیا تھا۔ اس نے گڈرنگ یا گڈرنگ ایونگ وغیرہ نہیں کہا تھا جس سے مجھے وقت کا کچھ اندازہ ہو سکتا تھا۔ اس جگہ وقت کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ وہاں جو سال دکھائی دیتا تھا اس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ رات کا وقت تھا۔ گوکہ وہاں کوئی جی۔ پلٹی دکھائی نہیں دیتی تھی تاہم اسے دن بھی سمجھا جاسکتا تھا۔

میری گھڑی البتہ میری کلائی پر ہی بندھی ہوئی تھی جس سے

میں نے کیٹ واک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ جو بلیک ہڈ اس کیٹ واک کی بلندی پر نیم تاریکی میں جا بیٹھا ہے کیا اس کی بھی کوئی سائنسی وجہ ہے؟“ میرا لہجہ استہزائیہ تھا۔

”ہاں“ اس نے عجیب کی سے جواب دیا ”وہاں بیٹھ کر وہ کچھ چیزوں پر نظر رکھتا ہے کچھ چیزوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ جو کچھ اسے وہاں بیٹھ کر نظر آتا ہے وہ تم یہاں بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے۔“

”تم نے تو میرے تجسس کو ہوا سے دی ہے۔ میں ذرا دیکھ کر آتا ہوں وہاں سے کیا نظر آتا ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اسے سن کا آہنی سا پیچہ سختی سے میرے بازو پر آہٹا ”آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ وہ بولا۔

”میں ان بغیر اجازت۔ اور بغیر کسی کی رہنمائی کے وہ دم بھی کسی طرف چلنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا انجام جبرت ناک ہو سکتا ہے اور ذی الحال ہم نے تمہیں ضائع کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ تم سمجھ رہے ہو کہ جس طرح بلیک ہڈ زندگی بسر کرتا ہو ایک واک پر چلا گیا ہے اسی طرح تم بھی چلے جاؤ گے؟ نہیں پیارے! اس خوش فہمی میں مت رہنا۔ کیٹ واک پر چند قدم چلے ہی تم فٹ پال کی طرح اونچا اچھل کر سر کے بل نیچے آ جاؤ گے۔ ہوا میں اچھل کر سر کے بل نیچے آنے کا مطلب کچھ تو ہوگا؟“

میں خاموشی سے کمری پر بیٹھ گیا۔ اسے سن میرے قریب بیٹھے ہوئے متانت سے لہجے میں بولا ”تم نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو انجمن میں ڈال رکھا ہے اگر تم نے ہماری بات مان لی ہوتی تو آج یہ جگہ اور دوسری نہ جاتے کتنی اہم جگہیں تمہارے لیے اپنے گھر کی طرح ہوتیں۔“

”جتنی حسرت میں ہے مجھے ان جگہوں کو اپنے گھر کی طرح سمجھنے کی۔“ میں نے بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”تم وہی ہو جو جل جاتی ہے مگر اس کے کل نہیں جانتے۔“ اسے سن لکھنوی سانس لے کر بولا۔

”ریساں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں اسے سن پیارے! چلنے کے بعد جن کے کل چلے جاتے ہیں وہ درحقیقت ریساں نہیں ہوتیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا اب اپنی چوچ بند رکھو۔ پاس آ رہے ہیں۔ ہونے کے تو احراز کر رہے ہو جانے۔ تمہارے حق میں اس کے نتائج خوشگوار ہوں گے۔“ اسے سن اپنی رست و راج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی رست و راج چوٹی ہی تھی جیسی عورتوں میں باندھتی ہیں اور اس کا ڈاک بھی بظاہر گھڑیوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔ میں نے اوجھڑا کر دیکھا۔ مجھے کہیں سے پاس یا کوئی اور آنا دکھائی نہیں دیا۔ معلوم نہیں اسے سن کو کیسے پاس کی آند کا احساس ہو گیا تھا۔ شاید وہ صرف وقت دیکھ کر اتنے تھکے تھکے بات کر رہا تھا۔

چند لمحوں گھڑی کی طرف ہی دیکھتا رہا جیسے اس میں کوئی تصویر



اند اور شمار اور علامات نمودار ہو رہی تھیں اور غائب ہو رہی تھیں۔ اس اشکال سے وہ نہ جانے کس حساب کتاب میں لگی ہوئی تھی۔

پاس ٹو جب بولا تو اس کا لہجہ بات تھا۔ وہ گویا مجھے میری فزور جرم سناتے ہوئے بات کر رہا تھا۔ جبکہ اور وقت کا حال دیتے ہوئے بولا "اس رات تمہارے یا تمہاری دوست کے ہاتھوں ہمارا ایک بڑا دن مارا گیا تھا۔ یہ ایک سنگین جرم تھا لیکن ہم نے ابھی تک تمہیں یا تمہاری دوست کو اس کی کوئی سزا نہیں دی۔"

"میری آنے والی خلیں اس کے لیے تمہاری احسان مند رہیں گی۔ بشرطیکہ وہ آئے ہیں کامیاب ہو سکیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ میرے الفاظ پر توجہ دے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ریڈ واٹ سے قتل رکھنے والا اگر کوئی جانور بھی مارا جائے تو ہم اسے ایک سنگین واقعہ شمار کرتے ہیں البتہ اگر حوا و حصر کے کچھ لوگ ہمارے اپنے ملک کے باشندے بن کر ریڈ واٹ سے کوئی یا قاعدہ قتل نہیں ہوئے، جن کی خدمات ہم کسی نہ کسی ذریعے سے ان وزارت طور پر بارضی ضروریات کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی موت کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ان میں دوسرے ممالک کے باشندے بھی شامل ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہو سکتا کہ درحقیقت وہ ریڈ واٹ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان کی حیثیت ہمارے لیے قربانی کے بدلے کی ہی ہوتی ہے۔"

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "ہم اور ہم جیسے نہ جانے کتنے ممالک کے باشندے بیٹھ سے ہی تم جیسے ترقی یافتہ، سازشی اور بد معاش قسم کے ممالک کے لیے قربانی کے کبرے ہی رہے ہیں۔"

"قبضاتی تقریروں اور مکالموں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا مسٹر چوہدری۔" اس کے لیے میں ہزاروں اور ہزاروں تھی "تم لوگوں کو ایک دوسرے کا گھانا کٹنے سے فرمت لے تو کبھی اس ضمن میں بھی کوششیں نہ کرو کہ دوسروں کو جس قربانی کا بکرا بنانے کا موقع نہ ملے۔ فی الحال اس بحث کا موقع نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں ایک نئی پیشکش کے بارے میں مذاکرات کے لیے بلوایا ہے۔"

"تم لوگ بھی کسی ضدی ڈکاندار سے کم نہیں ہو۔ یکے بعد دیگرے نئی سے نئی پیشکشیں کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ صرف دوسری پیشکش ہے اور شاید ہی آخری۔ پیشکش بھی ثابت ہو۔ اس پر تمہاری زندگی، تمہارے مستقبل، تمہاری ہر چیز کا دار و مدار ہے۔" اس ٹو کی گونجی آواز ابھی۔ "خیر میں لیتے ہیں دوسری پیشکش بھی۔" میں نے اپنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میری دھڑکیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔

لیے اندازہ ہوا تھا کہ میں تقریباً دو گھنٹے بے ہوش رہا تھا اور اس کے بعد بھی تقریباً ایک گھنٹہ مجھے یہاں گزر چکا تھا۔ اس حساب سے اس وقت رات تھی۔ میری گھڑی بتا رہی تھی کہ رات کے دس بجے کو تھے۔ میری صرف گھڑی ہی نہیں، تقریباً ہر چیز میرے پاس ہی موجود تھی۔ صرف میری پنڈلی سے بندھا ہوا پتھر غائب تھا۔ اس کی نیام ہوں کی تھی۔ بندھی ہوئی تھی۔ کمر کی اندر کی جیب میں شیشیں پھل بھی موجود تھا لیکن وہ کچھ لگا بگا لگ رہا تھا جس سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس میں سے میگزین نکالا جا چکا تھا۔

پاس ٹو نے پوچھا تو میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا میں تم لوگوں کی تمام تر خباثتوں اور ڈالائیوں کے باوجود زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

پاس ٹو کی آواز گویا کسی نہایت عمدہ قسم کے اسپیکر پر ابھری "زندہ سلامت تم اس لیے ہو کہ ہم نے ابھی تمہیں مارنے کا فیصلہ نہیں کیا اور ٹھیک ٹھاک اس لیے ہو کہ ابھی ہم نے تم پر ہاتھ لگا رکھا ہے۔"

"ملا۔" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "زندہ سلامت میں اس لیے ہوں کہ اوپر والے نے مجھے مارنے کا فیصلہ نہیں کیا اور ٹھیک ٹھاک ابھی میں اسی لیے ہوں کہ اوپر والے نے ابھی اپنے دست کرم کا سایہ میرے سر سے نہیں ہٹایا۔"

"اگر وہ مالی گاڑا" پاس ٹو کے لیے میں صاف طور پر بے زاری تک آئی "معلوم ہوتا ہے تمہاری کھوپڑی میں خاصی مقدار میں ذہنی جراثیم پیدا ہوتے جا رہے ہیں مسٹر چوہدری! یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔"

"جراثیم جراثیم کے بغیر انسان کا گزارا کہاں ہے ذیہ پاس ٹو! میں نے لٹریچر سائنس لے کر ششماں انداز میں کہا "اور کچھ نہ سوس لیکن کم از کم خدا پر اور اس کے رحم و کرم پر تو یقین رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اب یہی بات کہہ لو کہ تم نے بے زاری کے اظہار کے لیے بھی جو بل بولا وہ بھی تھا "اگر وہ مالی گاڑا" یہ گاڑا ذکر کیے بغیر تمہارا بھی گزارا نہیں ہے۔" میں نے ہلکا سا تھقہ لگایا۔

"میرا وقت بہت قیمتی ہے مسٹر چوہدری! میں اسے اس قسم کی بحث میں ضائع کرنے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ میں صرف اس موضوع پر بات کرنا چاہوں گا جس کے لیے تمہیں یہاں لانے کی زحمت کی گئی ہے۔"

"ارشاد۔" ارشاد میں نے نہایت شوق سے ہو کر بیٹھے ہوئے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ بے چہرہ انسان کے تاثرات نہیں دیکھے جاسکتے تھے۔ معلوم نہیں اس نے میرے استہزائیہ انداز پر کیا محسوس کیا تھا۔ عمر رسیدہ عورت نے اپنا کھٹکھٹا کمال اپنے سامنے رکھ کر بیٹھنے ہی اس کے کنٹرول خارجہ پر پہنچے ہوئے چند چٹکیں سے غافلوں کو چھڑا تھا اور اب اس کی چوٹی ہی اس کے پر فکریں حملے بیٹھی تھی۔ جس پر تیزی سے کچھ

الگ تھلک ایک چیز تھی۔ مجھے ان میں سے کسی کے چرے پر غدار کی پرچائیاں نظر نہیں آتی تھیں لیکن لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ کسی کی صورت پر نہیں جانا چاہیے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے نے بھی کہا تھا صورت پر نہیں جانا چاہیے صورتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں۔

میں نے اپنے لیے میں قرائی اور خوش دلی کا تاؤ سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمہیں یہ خوش تھی کیونکر ہوئی کہ ایجنسیوں نے میری کمائی پر یقین نہیں کیا اور اتنا ان کی نظریں میری ذات مشکوک قرار پائی ہے؟"

"اس بات کو چھوڑو" پاس ٹوٹے ہاتھ ہلایا "تم اس چکر میں مت ڈرو کہ ہمیں انتہائی اندر کی باتیں بروقت کیسے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سوال تمہیں بہت زیادہ الجھنوں میں ڈالے رکھے گا اور تم بھی صحیح جواب نہیں جان پاؤ گے۔"

"ایجنسیوں میں تمہارا کوئی خبر موجود ہے؟" میں نے پاس ٹوٹے کے چرے کی جگہ موجود اندر کے گھوڑے ہوئے پوچھا۔ میں نے یہ محض سوال برائے سوال کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کا صحیح جواب تو نہیں دے سکتا تھا۔

"نہیں۔" ایجنسیوں میں ہمارا کوئی خبر نہیں۔" پاس ٹوٹے ٹھمرے ٹھمرے لیے جس جواب دہا "فی الحال ہمیں وہاں خبر کی ضرورت نہیں پڑی۔ جب پڑے گی تو کوئی نہ کوئی تلاش کر لیں گے۔ اگر کوئی نہ ملا تو ہم اپنا کوئی نہ کوئی آدمی کسی نہ کسی طرح کسی ایجنسی میں داخل کر دیں گے۔"

میں نے سوچا ممکن ہے جس سطح کے لوگوں کی ساتھ میری میٹنگ رہی تھی ان میں کوئی ریڈ ڈاٹ کا ایجنٹ نہ ہو لیکن پتلی سٹار کیس کوئی کردار کڑی موجود ہو۔ کوئی ایسی جگہ جہاں وہ نہیں چار ہوتی ہوں۔ کوئی ایسی میز جہاں کاغذات فائلوں میں ترتیب پاتے ہوں کوئی ایسا فرد جو بظاہر نہایت معمولی نہایت غیر اہم نظر آتا ہو لیکن جس سے کوئی خفیہ ہاتھ بہت اہم کام تلے لگا ہو۔

پاس ٹوٹے ہادی رکتے ہوئے بولا "اگر ایجنسیاں تمہاری کمائی پر یقین کر کے ہماری طرف متوجہ ہو جائیں اور ہمارا کوئی سراغ ان کے ہاتھ آتا تو یہ تمہارے حق میں بہت بڑا ہوتا۔ تم ہمارا غیظ و غضب بہت بڑھ جاتے پھر شاید تمہاری معطل شدہ سزا معطل نہ رہتی۔ اگر تم زندہ بھی رہتے تو شاید اس طرح آرام سے ہمارے سامنے بیٹھے نیم بنجیدگی سے بات چیت نہ کر رہے ہوتے۔ تمہاری زندگی واقعی نمونہ نصرت بن چکی ہوگی۔ کم از کم ابھی تک تو تم نے کوئی بہت سنگین نقصان نہیں اٹھایا۔"

"گمشادہ دلی ہے تمہاری۔ ورنہ بدھ تو بہت شہینہ واقع ہوا ہے۔" میں نے انکساری سے کہا۔

وہ میری غیر بنجیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "ممكن ہے تمہیں کبھی احساس ہوا ہو کہ ہماری بات نہ مان کر تم نے اچھا نہیں

پاس ٹوٹے ایک لمبے وقف کیا چہرہ ہوا "پچھلی مرتبہ ہمیں جو پیشکش کی گئی تھی تم نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ تمام دیات کی خلاف ورزی بھی کی۔ اس پر ہمیں سزائے موت دی جا سکتی تھی۔ لیکن مسئلہ اس پر عمل درآمد ہو گیا لیکن وہ ایک معطل شدہ سزا ہے، کسی وقت بھی ہمیں دی جا سکتی ہے۔"

اس کا لہجہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی با اختیار عدالت کا جج ہو اور باقاعدہ قانونی اصطلاح میں SUSPENDED SENTENCE کی بات کر رہا ہو۔ ان لوگوں کے انداز گفتگو پر میری عقل پکڑا جاتی تھی۔ وہ بالکل اس طرح بات کرتے تھے جیسے کسی معلوم عالمی آئین کے تحت انہیں دیکھا ہے ہر فرد اور ہر ملک کے بارے میں لا محدود اختیارات حاصل ہوں اور وہ نہایت سنجیدگی سے انہی کے تحت جو کام مناسب سمجھتے ہوں وہ انجام دیتے چلے جا رہے ہوں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس معطل شدہ سزا کو مذاق نہ سمجھنا۔ وہ ایک گوار کی طرح تمہارے سر پر لگی ہوئی ہے۔ دو مری سزائیں بھی ہم نے تمہیں ہائی پتلی ہی دیں۔ ابھی ان کا دائرہ وسیع نہیں کیا گیا حالانکہ تمہارا جرم بہت سنگین تھا۔ تم دوڑے دوڑے خفیہ ایجنسیوں کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ تو قیمت دیا کہ ہماری توقعات کے عین مطابق انہوں نے تمہاری کمائی پر یقین نہیں کیا اور اتنا تمہی ان کی نظر میں مشکوک ٹھہرے۔"

میری رگ و پے میں سستی دوڑ گئی۔ گویا انہیں یہ تک معلوم تھا کہ میری کمائی پر ایجنسیوں کا رد عمل کیا رہا تھا۔ نہیں صاحب نے آج وہ میری کی میٹنگ میں ذرا مکمل کر میری ذات کو مشکوک قرار دیا تھا اور میرے بارے میں پتہ چر شدہ فائل کا خلاصہ مجھے سنایا تھا۔ انہوں نے آج ہی کی میٹنگ میں اس شک کا بھی اظہار کیا تھا کہ میرے خلاف ہونے والی کارروائیاں شاید کسی قسم کی گینگ وار کا نتیجہ ہوں۔ اور یہ سب باتیں شاید ساتھ کے ساتھ ہی ریڈ ڈاٹ کو معلوم ہو چکی تھیں۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس احساس سے میری رگ و پے میں سستی دوڑنا چاہتا تھا۔ دونوں مرتبہ میرے ساتھ میٹنگ میں خفیہ ایجنسیوں کے جو لوگ شریک ہوئے تھے وہ آپ کے عہدیدار تھے۔ ان سب کی قوی خدمات کا ایک طویل پس منظر تھا اور ملک کو ہر پردہ چلانے والے دھماکے میں ان سب کی اپنی اپنی جگہ ایک اہمیت تھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک اہم ستون تھا۔

کیا ان میں سے بھی کوئی ریڈ ڈاٹ کا ایجنٹ تھا جو ہر بات کی خبری کر رہا تھا؟ نہ جانے کیوں میرا اس بات پر یقین کرنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے ان سب کے چہروں پر غلوں اور دھاندلی کی چمک نظر آتی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی بکا ہوا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سچے اور دھاندلی آدمی کی صورت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ انہوں نے میری کمائی پر یقین نہیں کیا تھا۔ یہ ایک الگ بات تھی۔ یہ ان کے تجربے اور فہم کا مسئلہ تھا لیکن دھاندلی اس سے

نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اب بھی دیکھ لو کہ دنیا کے سب سے طاقتور ملک میں صدر کا انتخاب ہو جاتا ہے اور خون کا ایک قطرہ تک نہیں بہتا لیکن تمہارے ہاں کوئٹہ کی سیٹ کے لیے ایک کروڑ دوسرے گروہ کو گولیوں سے بھرتے کے لیے، کتنے ہی گھروں کے چراغ بجھا دینے کے لیے، کتنے ہی انسانوں کو اپاج و معذور بنادینے کے لیے، کتنے ہی گھروں کو بھونک ڈالنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

”کیا ثابت ہوتا ہے؟“ میں نے انجان بنے ہوئے پوچھا۔  
”یہی کہ تمہارے ہاں لوگ معمولی مساوات کے کر کے اپنے لیڈروں کی جمہوری تقریریں سن کر اور احمقانہ نظریات اور فلسفوں کے پرچار سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کو فائدہ پہنچنے پر تگے رہتے ہیں۔ ہمیں یہاں اپنا کام کرنا بہت آسان محسوس ہوا ہے۔“  
”لیکن یہاں مجھ جیسے لوگ بھی تو پائے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں“ اس ٹوٹے لفظی سانس لی ”یہ پہلا موقع ہے کہ ہمارا اندازہ اس بڑی طرح غلط ثابت ہوا ہے۔“  
”تو پھر اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ میں نے معنوی ناچاری سے پوچھا۔

”ہم نے سوچا کہ ہمیں جاں بخشی کی ایک اور پیشکش کر کے دیکھ لیں۔ شاید بات تمہاری عقل میں آئی جائے ورنہ انجام تو

کیا لیکن وہ پیشکش اب ہمیں دوبارہ نہیں کی جاسکتی۔ معافی کی ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں۔ تم نے اپنے آپ کو ناقابل اعتبار ثابت کر دیا ہے۔ اس لیے اب ہمیں اس بڑے منصب کے لیے تو منتخب نہیں کیا جاسکتا جو ہم نے تمہارے لیے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔“

”اللہ کا بڑا کرم ہے جو اس نے مجھے اس ”عظیم منصب“ سے ہٹا دیا“ میں نے اطمینان کی طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔  
”یہ نصیب ہو گیا“ وہ گریبا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے بولا ”نہ جانے کنی تصورات میں اچھے رہتے ہو۔ زمانے کے ساتھ نہیں چل رہے اپنا برا بھلا نہیں سمجھ رہے۔“

”درست ہے“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”میں ذرا قدامت پرست سا آدمی ہوں۔ دولت، طاقت اور وقتی اقتدار کے لیے ابھی میں نے ملک و قوم، ضمیر، غیرت اور اپنی سوچ کا سودا کرنا نہیں سیکھا۔ ابھی میں ترقی کی یہ ”اگرچی“ منزلیں طے نہیں کر سکا۔“

”تمہاری یہی بیخ تو ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارے ماضی کو دیکھتے ہوئے ہمارا اندازہ تھا کہ تم نہایت ہی آسانی سے ہماری پیشکش قبول کرنے پر تیار ہو جاؤ گے لیکن تم اندر سے ضمیر پرست، انا پرست، وطن پرست اور نہ جانے کیا کچھ نکل آئے۔ جبکہ تمہاری سوسائٹی میں نہایت سے واسطوں جتنے والے

لازوال کہانیوں کے خالق  
انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے  
ایک نئی سوغات

**رقص ابلیس**

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی۔  
ایک آشفستہ حال کی داستان عبرت جسے قانون نے مجرم بنا دیا  
قیمت - 150 روپے

ناشر - مکتبہ القریش سرکلر روڈ اور بازار لاہور 2

ہو۔ مشکل کام ہے جناب اس فوج صاحبہ لیکن خیر۔ یہ بتائیے اس خادم کے لیے کیا حکم ہے؟ اس حقیقت پر تفسیر سے اس کا عقیم کام لینا چاہتے ہیں آپ؟

”عقیم کام ہے تو تم فرار حاصل کر چکے ہو۔ اب تو صرف ایک حقیقت سا کام ہے۔“ اس نے قریب پیشی مقرر سیدہ عورت کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس نوکازہ انما سرادھر میں کھڑا تھا۔ اس وجہ سے وہ اور بھی زیادہ عجیب محسوس ہوتا تھا۔

مقرر سیدہ عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور چھوٹے سے کہیں بڑے تیزی سے اٹھ چلائی۔ کہیں نہ بٹے بلکہ ہی ”بپ بپ“ کی آواز آئی۔ یہ گویا سکل تھا۔ عورت نے کہیں بڑے جھٹکے ہوئے دھیمی آواز میں چند الفاظ بولے جو میرے لیے ناقابل فہم تھے۔ شاید اسے ٹیلی فون یا انٹر کام کی طرح رابطے کے ایک ذریعے کے طور پر بھی استعمال کر رہی تھی۔

پھر وہ کھڑکھڑکیوں سے اس طرف دیکھنے لگی جس طرف سے کچھ دیر پہلے وہ خود اس نوکے ساتھ آئی تھی۔ میں بھی غیر ارادی طور پر اسی طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحوں بعد اندھیرے کی کوکھ سے جو شخص برآمد ہوا وہ شلوار قمیض اور اور اسٹنٹ میں تھا۔ اس کے ہونٹوں میں سکار دیا ہوا تھا۔ نمائندہ طور کا انداز میں چلا ہوا جب وہ لنگی روشنی میں پہنچا تو میں حیرت کے باعث کرسی سے گرتے گرتے بھاگ آیا۔ ابھی وہ تیز روشنی میں نہیں پہنچا تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

وہ وزیر خارجہ حفیظ صاحب تھے۔ وہ تھکے تھے اور پرے اطینان سے چلے آ رہے تھے۔ انہیں پہچانتے ہی میرے ذہن پر بے شمار سوالات نے لیبار گری۔ حفیظ صاحب بھلا یہاں کیا کر رہے تھے؟ وہ یہاں اپنی مرضی سے آئے تھے یا انہیں بھی میری طرح بے خبری میں لایا گیا تھا؟

وہ تھکے اور ان کی چال سے بے پناہ غنائیت کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ اس سے تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ یہاں اپنی مرضی سے ہی موجود تھے اور یہاں کے راستوں سے بھی واقف تھے ورنہ کوئی یا تو ہی تو رہنمائی کے بغیر ان بھول، بھینس میں چند قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔

تو کیا حفیظ صاحب بھی درپردہ ریڈ ڈاٹ کے...؟ اس سے آگے میرا ذہن نہ سوچ سکا کیونکہ یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

کانفرنس خیل کے قریب پہنچ کر حفیظ صاحب نے سگار منہ سے نکال لیا اور منہ بانہ سے انداز میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ تب وہ بیٹھے۔ ان جیسے آدمی کا یہ منہ بانہ انداز میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ تب میں نے گہری نظر سے ان کا جائزہ لیا اور مجھے کئی عجیب سی باتوں کا احساس ہوا۔ ایک تو

ہمارا خراب نظر آ رہا ہے۔“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی ناپید آنکھوں سے بغور میرا جائزہ لے رہا تھا۔

میں خاموش رہا تو وہ بولا ”اگر تم ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دو تو تمہارے سر پر فلکی ہوگی منظر شدہ سزا کی نگار ہٹ جائے گی۔ ہم تمہاری جان بھی بخش دیں گے۔ اور ہمیں دوسرے نقصانات کے ذریعے سبق سکھانے کا سلسلہ بھی ترک کر دیں گے۔ یعنی ہم مکمل طور پر ہمارا چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد اگر تم نے ہمارے بارے میں کوئی شرارت نہ کی ہماری کمائی لے کر اوپر اوپر بھاگے نہ پھرے تو ہم تمہیں بالکل معاف کر دیں گے۔ ہم تمہیں بالکل بھول جائیں گے۔ تم بھی سمجھو کہ ہم سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ تم نے محض ایک خواب دیکھا تھا۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھ سے کوئی کام لے بغیر مجھے ایسا سمجھ لینے کی اجازت دے دو؟“ میں نے درخواست کی۔

”نہیں۔“ ہمیں ہمارا کوئی نہ کوئی چھوٹا سا کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہم نے تمہارے چکر میں بہت دقت بہت رقم اور بہت لڑائی بردار کی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس کی میں نے تو تم سے درخواست نہیں کی تھی۔“ میں نے ملامت سے کہا ”یہ تو ان کا طلب کرنے والی بات ہو گئی کہ کسی کو اغوا کر کے کہا جائے کہ اسے اتنی رقم کی ادائیگی تو بحال میں کوئی ہی ہوگی کیونکہ اسے اغوا کرنے پر بہت محنت ہوئی ہے۔“

”یہی سمجھ لو“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”آف خدا!“ میں نے دونوں باتوں سے سر ہٹا لیا ”ہم تو مقامی دہشت گردوں سے ہی عاجز تھے ہم سے تو انہی کا علاج نہیں ہو رہا تھا۔ اب یہ بین الاقوامی دہشت گردوں اور دھونس مٹانے والوں کا علاج کون کرے گا؟“

”ہمیں اس فکر میں ڈھلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم اپنا علاج کروانے نہیں بلکہ خود پوری دنیا کا علاج کرنے آئے ہیں۔ جب ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو دنیا میں ایک آئینہ دل حکومت قائم ہو جائے گی۔ پوری دنیا میں صرف ایک ہی حکومت ہوگی اس کا ایک ہی آئین ہوگا۔ ایک ہی میٹروپولیٹن کا نظام چلائے گی۔ ہر کوئی اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرے گا۔ نہیں بجائے گا۔ ہر کوئی زیادہ ایٹم کی سمجھ بیکار نہیں بیٹھے گا۔ دنیا سے بے شمار فضولیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان ”فضولیات“ میں انسان بھی شامل ہیں اور ممالک بھی۔ تو میں بھی شامل ہیں اور نظام بھی۔ سرحدیں بھی شامل ہیں اور افواج بھی۔ بہت کچھ ہم ہو گا تب ایک حقیر ذمہ کی صورت پیدا ہوگی۔ زمین پر بوجہ بہت بڑھ گیا ہے۔“

میں نے استغناء سے ہی فہمی کے ساتھ کہا میں کو کہ تم اس دنیا کا نظام قدرت کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ میں منتقل کرنا چاہتے

حد تک مشابہت تو موجود تھی۔ مزید مشابہت پیدا کرنے کے لیے کامیونک سرجری کا سامرا کیا گیا ہے۔ سہارے کے ہم وطن ہیں۔

”میں نے یہ سمجھ کر ہی بتایا اور دیکھا جا رہا ہے؟“ میں نے تیزی سے جواب دیا۔

”میں نے کہا تاکہ تمہیں ہمارا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔“  
اس ٹیبلٹ۔

”اس کا تعلق حفظ صاحب سے ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”ہاں یہی سمجھ لو۔ حفظ صاحب اس کے مرکزی کردار ہیں۔“  
 پاس ٹوٹے ایک لمحے کے توقف کے بعد جواہر دیا ”آج سے ٹھیک  
 چار دن بعد حفظ صاحب امرکا کے دورے پر روانہ ہونے والے  
 ہیں۔ یوں سمجھو کہ انہیں وہاں طلب کیا گیا ہے تمہاری حکومت پر  
 دباؤ ڈال کر انہیں وہاں بلوایا جا رہا ہے۔ ہم سب کی کوششوں سے  
 ویسے بھی اس وقت تمہارا ملک چاروں طرف سے زبردست سیاسی  
 اور اقتصادی دباؤ میں ہے۔“

”ہم سب سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہی تمام ممالک جن کے خفیہ اتحاد سے ریڈ ڈاٹ وجود میں  
 آئی ہے۔“ پاس ٹو نے جواب دیا ”نی الحال تمہاری انجینی طاقت کو  
 بہانہ بنا کر تم پر سب سے زیادہ رباؤں کا بار چارہا ہے اور تمہیں ایک  
 میل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ آئندہ بھی ترقی  
 یافتہ ملکوں کے ہاتھوں میں جتنے بھی چے ہوں گے وہ سب استعمال  
 کیے جائیں گے۔“

”وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے۔“ میں نے جگلی کی اس فردوس کی سے کہا ”ہمیں چاروں طرف سے گھیرا جا رہا ہے اور ہر اس عمل کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے جس سے ہمارے لیے نفع مندوں اور بیوقوف ملک ہر طرح کی رکاوٹیں اور خوشامریاں پیدا ہوں۔ وطن فروش ایجنٹ بھی اس سلسلے میں سرگرمی سے اپنا اپنا کھوار ادا کر رہے ہیں۔“

”بالکل درست ہے“ پاس ٹو کے لیے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس صورت حال کے تقویر سے محفوظ ہو رہا تھا ”تمہاری حکومت اس دباؤ سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اپنی سی کوششیں کر رہی ہے لیکن یہ کوششیں بالکل غیر منظم اور غیر مربوط ہیں۔ دوسرے ہم تمہارے ہاں ایسی صورت حال پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں کہ تمہاری حکومت تمام مزیدانہ اداری اور غلوں سے چاہے تب بھی کسی ایک مسئلے کی طرف بھی تکیوں اور دباؤ سے توجہ نہیں دے سکے۔ ویسے بھی تمہاری حکومت میں دباؤ اداری اور غلوں سے کسی مسئلے کو بائیں اور بنیادوں پر حل کرنے کا مترخان کم ہی رہا ہے۔ تمہارے پورے ملک کا نظام ایڈجاک ازم پر چل رہا ہے۔“

یہ سب باتیں مجھے معلوم تھیں۔ نہ جانے وہ کیوں ڈھیر ادا تھا۔  
شاید میرے احساس کسری کو بڑھانے کے لیے۔ یا پھر بس منظر کی بہتر

آپہودت زیادہ سچا تھا۔ دوسرے ان کی فخر مجھ سے ملی  
میں ان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے بھی شناسائی کا ہلکا سا  
لہجہ نہیں ابھرا تھا۔ تیسرے وہ سگار گویا محض رستا پی رہے  
سگار کے ماوی یا رسیا معلوم نہیں ہوتے تھے میں نے حنیفہ  
بہ کرامت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ ان کی طرح "جمیت" اور  
اکتہ سگار پیتے ہیں نے کمری لوگوں کو دیکھا تھا۔

اس جسم کی چھٹی چھوٹی خصوصیات انسان کی فطرت تانیہ بن  
 ہے لیکن انہیں کوئی بہت قریب سے جانے والا بہت گہری  
 جانہ دیکھنے والا یا پہلے سے ذہن میں ٹھوک و شبہات رکھنے  
 والا محسوس کر سکتا تھا۔

اس نو کاسخ میری ہی طرف تھا۔ اس کی مخصوص گوجیلی سی لڑکھری "تمہیں یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ تمہارے راز پر غلط صاحب بھی ہمارے ہی تو ہی ہیں۔"

میرے اعصاب میں پیدا ہونے والا ارتعاش اب ٹھہر چکا تھا۔  
 اپنے گھر کے فصرے گجے میں کہا "میں" مجھے قلعاً حیرت نہیں  
 لگے کہ یہ خفیہ صاحب نہیں ہیں۔"

میں نے پہلی بار باس نو کا ٹھکانا ہوا سا قعر بنا۔ اسے  
بہ جواب سے ناپہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو شاید اس سے کچھ  
راہ تھا۔

مجھے خوش ہے کہ تم بے وقوف نہیں بنے۔ ہم تم سے ایسا  
نہ ملتا۔ یہاں کا توقع رکھتے ہیں۔ وہ بولا۔ لیکن تمہیں یقین ہے  
اپنے کسی حکم کا اجرا محسوس نہیں کر پائے گا۔ اگر کرے گا بھی،  
اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہو گا اور اسے اہمیت نہیں دے

میرے طریت کی ایک گرمی سانس لی۔ حفظ صاحب کے  
بہائی ایک لمحے کے لیے جو شکوک و شبہات پیدا ہوئے تھے ان  
نکلی ہو جانے میرے لیے بڑی راحت کا سبب بنا تھا۔ نقلی حفظ  
نبہ نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر سکارا کاپکا سا سنس لیا۔  
آخر حفظ صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کی آنکھوں  
محرومت اب مجھ سے ممتاز اور حسد کا اضطراب، قصداً رہتا

ہوا تو اسے داریوں کو محض دفتری امور یا اپنے لیے چڑے  
 کے واسطے اعیانہ ہی جانے والی ڈھولی سمجھ کر نہیں بھگاتے تھے  
 اپنا ہر کام مل و جان سے کرتے تھے تاہم کلی معاملات کے  
 سامنے شکر رہتے تھے اور پیچیدہ مسائل کے بارے میں سوچ  
 کرتے تھے اس لیے ان کی آنکھوں میں ہر وقت ایک  
 غمناک اور ایک عجیب سی لگن کے ساتھ نظر آتے تھے جو اس  
 لگائی آنکھوں میں منتہی تھے جانے اس شخص کی آنکھوں کا  
 دفتری امور تھا یا محض کوئی دوسرا موضوع یا مہربان صحت تھا۔

میں۔" میں نے اپنے لمبے میں طرکی جھٹک بڑا کرنے کی کوشش کی  
بلکہ اصولاً میرے لمبے میں اس وقت ندامت کی جھٹک ہوتی تھی۔

"ہم جہاں کسی پروٹیکٹ پر کام کرتے ہیں وہاں کے قبرستانوں  
میں مدفون مردوں کے بارے میں بھی معلومات رکھنے کی کوشش  
کرتے ہیں۔" وہ غرے بولا۔

"لیکن ہمارے اس نے صرف منفی معلومات ہی دی ہیں  
ہیں۔ مثبت چیز جس تمہاری نظر میں نہیں آتی یا ان کے بارے میں  
معلومات تم تک نہیں پہنچیں۔" میں نے کمزور سا احتجاج کیا  
"ہمارے ہاں لوگ ایک دوسرے کے لیے جانتے ہیں جیسے تیرا کیا کیا  
ہے۔ ہمارے ہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں اور  
گودوں کی جائیدادیں خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی ہیں۔  
ہمارے ہاں محبت، پاکیزگی اور بھائی چارے کے ایسے مظاہرے ہیں  
دیکھنے میں آتے ہیں جو آسمان کا حصہ بن جاتے ہیں۔"

"اب یہ باتیں پرانی ہوئی جا رہی ہیں اگر کچھ ہوتا بھی ہے  
ضرورت سے بہت کم ہوتا ہے اور بے وقت ہوتا ہے۔ بڑا دل  
بعد دلا سے دئے جاتے ہیں۔ سوچنے کے بعد جو چاہتا جاتا ہے۔  
راکھ ہو جانے کے بعد آگ بجھانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ وہ  
کچھ نہیں کیا جاتا۔ ان باتوں سے ہمیں اپنے کام میں بڑی غلط  
رہتی ہے۔ خیر یہ باتیں تو یہی بریجٹل تھو کہ ہو گئیں۔ درجن  
میں ہمیں حنیف صاحب کے آئندہ دورہ امریکا کے بارے میں بتانا  
لگا تھا۔"

وہ ایک لمبے کے لیے غاسوش ہو گیا۔ میں نے غلی جٹا  
صاحب کی طرف دیکھا۔ اس بار اس شخص نے مجھ سے نظر نہ  
اٹائی اور اس کے ہونٹوں پر ایک لمبے کے لیے حنیف کا  
مسکراہٹ بھی ابھری۔ وہ مقامی سی معلوم ہوتا تھا لیکن بڑا دل  
سے اس کا تعلق شاید بہت کم تھا۔

باس نوکی آواز میں کہیں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
کہہ رہا تھا "ہمیں معلوم ہی ہو گا کہ امریکی سٹیشنز کی ایک ٹیم  
تمہاری حکومت پر دباؤ ہے پناہ بڑھ گیا ہے کہ اس سے انکی ٹیم  
نہ کرنے کی غرض سے وہاں مداخلت کی جائے۔"

"ہاں مجھے کچھ غیر ملکی اخبارات اور کچھ ملکی اخبارات پر  
چھپنے والے تجزیوں کے سرسری مطالعے سے کسی حد تک اندازہ  
ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم ہو گا کہ غرض میں تین ہائی  
وہاں کیا ٹیمز دی جا رہی ہے۔ حفظ صاحب اپنی حکومت کی طرف سے  
کچھ تجاویز کے بارے میں لیکن میں نہیں یہاں بیٹھے ہیں  
یہ بتا رہا ہوں کہ وہاں ان پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ انھیں  
کان سے شن کر دوسرے کان سے نکال دیا جائے گا۔" اس نے  
کہا۔

طور پر وضاحت کرنے کے لیے۔

باس ٹو بات جاری رکھتے ہوئے بولا "نفا ہمارے لیے بہت  
سازگار ہے۔ کچھ فیصلہ کن اقدامات کرنے کا وقت قریب آتا  
دکھائی دے رہا ہے۔ ایسی طاقت وغیرہ کا تو صرف بہانہ ہے۔ ورنہ  
تم کیا اور تمہاری ایسی طاقت کیلئے اصل میں چند کلکوں کا ایک ہلاک  
ہے جسے سب سے پہلے قابو میں کرنا ہے۔ ہم براہ راست ان میں  
داخلت کر کے دنیا میں بدنامی مول لیتا نہیں چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں  
مختلف جواز پیدا کر کے اس طرح ان کی کمر توڑ دی جائے اور اس  
طرح انہیں فٹس یوس کر دیا جائے کہ وہ خود ہاتھ باندھ کر ہم سے  
درخواست کریں کہ خدا کے لیے ہمیں اپنی کالونی مانجھیں ورنہ ہم  
قانون مرعیا میں گئے پھر ہم وہاں سب کچھ نئے سرے سے ترتیب  
دیں گے۔"

میرے دل میں ایک بے عنوان سا نانا پھیلنے لگا۔ اس کا ہر  
جملہ جو بظاہر چند الفاظ پر مشتمل تھا اگر اس کی گہرائی کا تجزیہ کیا جاتا  
اور کسی کو ان کے حقیقی معنوں کا ادراک ہوتا تو اس کا دل دھڑکتا  
بھول سکتا تھا۔

ذرا توقف سے باس ٹو بولا "جن ممالک کی فہرست ہم نے بنائی  
ہے اور جنہیں دنیا کے نقشے پر نشان زدہ کر دیا ہے ان میں سے بعض  
میں تو ہماری ہوئی ہوئی فصل اب پکے کو ہے۔ مثلاً فلج میں کثرت  
مراقبہ مسئلہ ہے۔ افریقہ اور افغانستان میں خاندان جنگلیاں ہیں۔ انڈیا  
میں سکھوں کا مسئلہ، ہندو مسلم تنازعات، کشمیر کا مسئلہ وغیرہ ہے۔  
مسلمان ممالک میں ہمیں ایک بڑی آسانی رہتی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں پوچھنے لگا۔

"تم لوگوں کو دو سرول سے لڑنا تو پھر بھی ذرا مشکل ہے لیکن  
آپس میں لڑنا بہت آسان ہے۔ مختلف تعصبات کی بنا پر لوگ پہلے  
سی ایک دوسرے کو بھڑکانے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ صرف  
جنگاری چھینکے کی دیر ہوتی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی لابی میں نظر پڑے یا  
فلجے کی بنیاد پر سب کے دل ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد  
سے لبریز ہوتے ہیں۔ تمہارے مذہب میں اتحاد و اتفاق پر جتنا زور  
دیا گیا ہے تم اس سے اتنا ہی دور ہو۔ ایک گل میں اگر دس گھر ہوں  
گے تو وہاں دس سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریے ہوں گے۔ اگر وہ  
سیاسی اعتبار سے متفق ہوں گے تو ان میں سماجی تضادات موجود  
ہوں گے۔ اگر سماجی طور پر وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں گے تو  
مذہبی طور پر ان کے دل ایک دوسرے سے دور ہوں گے۔ تمہارے  
ہاں بڑا دواؤں کا کیا جاتا ہے کہ دشمن کے ایجنٹوں نے یہ کر دیا کہ وہ  
اکثر اوقات تو ہمیں تمہارے ہاں کسی ایجنٹ وغیرہ سے کام لینے کی  
ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ تم تو خود ہی ایک دوسرے کو برباد کرنے کے  
لیے کالی ہو۔" اس کے لمبے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ان سب  
باتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے دل ہی دل میں بہت محفوظ ہو رہا تھا۔  
"بہت کمرا مشاہدہ ہے تمہارا۔ ہماری معاشرت کے بارے

”بہت خوب... بہت خوب“ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

”اس کے علاوہ پراسن پتائے باہمی کے ایک مجموعے کے تحت تمہاری حکومت اپنے ملک میں مستقل بنیادوں پر ایک آئین و روٹن سینٹر کے قیام کی منظوری دے گی۔ ایک کمیشن اس سینٹر میں کام کرے گا جس میں تمام شہر پارز اور امداد دینے والے ملکوں کے ایک ایک نمائندہ کے علاوہ انڈیا کا بھی ایک نمائندہ شامل ہو گا۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس کی نادریدہ آنکھیں ایک بار پھر بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے اسی پر ہنس نہیں کی اور انکشافات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس کمیشن کو اختیار ہو گا کہ جب بھی چاہے تمہاری تمام ایٹمی تخصیصات اور لیبارٹریوں حتیٰ کہ تمہارے اکلوتے ایٹمی بجلی گھر کا بھی معائنہ کر سکے گا۔ اگر اس کمیشن کو شبہ بھی ہو جائے کہ تمہارے ہاں خفیہ طور پر کوئی مصنوعی سنا ایٹمی تجربہ بھی کیا جا رہا ہے... خواہ وہ کتنا ہی بے ضرر ہو۔ تو وہ شہر پارز سے تمہارے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کی سفارش کر سکتا ہے۔ تمہارا ملک اسے جارحیت قرار نہیں دے سکے گا۔“

”بہت خوب۔ اسے کہتے ہیں عالمی انصاف۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”ترقی یافتہ ممالک خواہ اپنے ہاں مرنے کے اندولوں کی طرح ایٹم بموں کے انبار لگاتے جائیں لیکن ہمارے ملک کے

بہت خوب... مغربی ممالک کی اسی انصاف پسندی کے تو جانے کوئی جانتا ہے۔“ میں نے طنز سے لہجے میں کہا۔  
اس نے سب سابق میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بات کی کہ ”اس کی جگہ خود امریکی حکومت کی طرف سے پہلے سے شدہ ایک دستاویز حفیظ صاحب کے سامنے رکھی جائے گی اور اس کی بات کی کہ وہ اس پر دستخط کر دیں۔“  
”اس دستاویز کے مندرجات سے بھی تم واقف ہوؤ گے؟“

”میں شک میں نہیں اس کی بارے میں پتائے لگا تھا۔“  
”اے اطمینان سے جواب دو“ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں اور نہ ہی سفارتی اصطلاحات میں بات کروں گا۔ اس طرح بات ادا ہائے گی۔ مختصراً بس یہ سمجھ لو کہ اس دستاویز میں تمہاری بات کی طرف سے اعتراف کیا گیا ہو گا کہ وہ ایٹم بم بنانے کی بھی پراسن پتائے باہمی کے کسی بھی مجموعے کے تحت اب انہیں نہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے علاوہ وہ امداد دینے والے ہاں بھی ملک کے کسی بھی وفد کو کسی بھی وقت اپنی ایٹمی تخصیصات و ضرمانہ کنوینٹ پلانٹ کا معائنہ تفصیلی معائنہ کرانے کے لیے تیار ہے۔ نیز وہ اب تک ہونے والی تمام نیو کلیر سرچ کی کاغذی بیانات کی ایک ایک کاپی امداد دینے والے تمام ممالک کو فراہم دے گا اور آئندہ بھی ایسا کرتا رہے گا۔“

انکا، اقبالہ، سونا گھاٹ، کاجاری، غلام روہیں، امیر تیل، درخشاں، خبیث  
کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور پراسرار ناول

**پراسرار**

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب کتابت و طباعت

قیمت = -/150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ایشی بجلی گھر تک کا خوردبین سے معائنہ ہو گا اور ہمیں ہمارے  
مقام کے لیے بھی ایسی توانائی کے استعمال کی اجازت نہیں۔ اس  
کا مطلب ہے دنیا میں آج بھی جس کی لاگت اس کی بیٹھیس کا قانون  
رائج ہے۔ یہ تہذیب و تمدن ہے۔ یہ حق ہے۔ یہ بین الاقوامی ادارے  
۔ بین الاقوامی قوانین۔ عالمی انصاف کی باتیں۔ یہ سب محض  
ذائقہ ہیں، دیکھاؤ ہیں۔ گزروں کے لیے دل، سلاوے ہیں؟“  
”اس فضول بحث میں چلنے کی ضرورت نہیں۔ جو بات میں  
کہ رہا ہوں اس پر توجہ دو۔“ باس ٹوٹے لمبے میں ناگواری تھی۔  
”گزروں پر توجہ جب بھی کوئی سوال اٹھاتا ہے اسے فضول بحث  
ہی قرار دیا جاتا ہے۔“ میرے دل میں حیرت ایک عجیب طرح کی  
افسردگی پھیل رہی تھی۔

باس ٹو میرے الفاظ پر توجہ دے بغیر بولا ”جب یہ دستاویز سامان  
کرنے کے لیے حلیہ صاحب کے سامنے رکھی جائے گی تو یقیناً ان  
کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ وہ اس پر سامان کرنے کے لیے کسی قیمت  
پر تیار نہیں ہوں گے۔ اگر کسی آئی اے انسٹیشن ان کے اسٹاف اور  
ان کے وفد سمیت بھی اغوا کر کے کسی دور دراز جزیرے پر لے  
جائے اور ان کے سینے پر گولی رکھ دی جائے وہ تب بھی اس قسم کا  
کوئی ایگریمنٹ سامان نہیں کریں گے اور نہ ہی تمہاری حکومت  
انہیں اس کی اجازت دے گی۔“  
”یقیناً“ میں نے کہا لیکن میں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ میرا یقین تھا  
یا میری خواہش۔

”چنانچہ اس دستاویز پر سامان کرانے کا ہم نے یہی طریقہ سوچا  
ہے کہ اصل حلیہ صاحب کی جگہ ہمارے ان حلیہ صاحب کو امریکا  
بھیجا جائے۔“ باس ٹو نے نقلی حلیہ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔  
”ان نقلی حلیہ صاحب کا اصل نام کیا ہے؟“ میں نے گہری  
فکرت سے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواب اس شخص نے خود ہی دیا۔ ”مکراتے ہوئے بولا“ آپ  
مجھے عرفان کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ ویسے ضروری نہیں کہ یہ میرا اصل  
نام ہو۔ میں اب اپنے اس نئے کردار میں اتنا مہم نہیں گیا ہوں کہ  
حلیہ صاحب کے نام سے پکارے جائے یہ ہی توجہ ہونا چاہیے۔“

میں ایک تک اس شخص کی طرف دیکھ نہ گیا۔ اس کا نام  
عرفان یا جو کچھ بھی تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حلیہ صاحب  
کی حیثیت سے وہ ناناؤے لیسڈ لوگوں کو دھوکا دے سکتا تھا۔ اس کی  
آواز بھی حلیہ صاحب کی آواز سے بہت زیادہ ملتی تھی۔ صرف  
تھوڑی سی ڈکام زدہ معلوم ہوتی تھی لیکن یہ چیز بھی اس کے حق میں  
ہی جاتی تھی۔ اگر کسی کو معمولی سا کوئی فرق محسوس بھی ہوتا تو یقیناً  
وہ کسی سوچ کر نظر انداز کر جاتا کہ حلیہ صاحب کو ڈکام ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لے کر دوبارہ باس ٹو کی طرف توجہ  
ہوتے ہوئے کہا ”عرفان صاحب، حلیہ صاحب کے دستخط بھی کر لیں  
گے؟“

”یقیناً یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ باس ٹو نے اپنے کونٹ  
اندرونی جیب سے ایک شدہ کاغذ نکالا اور اسے کھول کر مجھ  
سامنے لگاتے ہوئے بولا ”یہ جیوا میں ہونے والے ایک معاہدہ  
درج ہے۔ اس پر حلیہ صاحب کے دستخط موجود ہیں۔ ان کی فہمی  
کی ٹیپوں اور سفارتی نشانات وغیرہ کا نقش بھی موجود ہے۔ عرفان  
صاحب یہ دستخط اتنی تیزی سے کرتے ہیں کہ خود حلیہ صاحب بھی  
انہیں جتنی نہیں کر سکتے۔ حلیہ صاحب کو صرف دستخط ہی کرنا ہوتا  
ہیں باقی تمام لوازمات کی تکمیل تو ان کا اسٹاف کرتا ہے جو کارپورٹ  
نقلی حلیہ صاحب کے ساتھ ہو گا۔“

”لیکن حلیہ صاحب اگر ایسا کوئی ناقابل یقین معاہدہ کرے  
چلے آتے ہیں تو ہماری حکومت تو اس کی توثیق نہیں کرے گی کہ  
شاید وہ سرے سے اسے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دے۔ اس  
صورت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ باس ٹو نے بے پرواہی سے کا  
”میں صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ حلیہ صاحب بین الاقوامی پٹری  
اور بی وی کے سامنے یہ ایگریمنٹ سامان کریں۔ اس کے بعد اگر  
تمہاری حکومت اس معاہدے کو اون (OWN) کرنے سے اس کی توثیق  
کرنے یا اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے تو ہمیں ایک اعلیٰ  
جو ذیل جانے گا۔ اگر ہم کسی ملک کو خیر سازشوں سے چاہ کرے  
کے بجائے اعلیٰ طریقہ پر چلنا چاہیں تو اس کے لیے ہمیں ایک  
اخلاقی جواز کی ضرورت ہوتی ہے جسے ہم کوئی مقفل بیانہ بھی کر  
سکتے ہو۔ اس کے بعد ہم اس ملک کے ساتھ جو سلوک چاہیں  
کر سکتے ہیں۔“ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد باس ٹو بولا ”تمہارا  
حکومت جب اپنے وزیر خارجہ کے سامنے کیے ہوئے معاہدے کو  
تسلیم کرنے سے انکار کرے گی تو پھر پھر بارز کے سامنے بہت سے  
راستے ہوں گے۔ امریکا، اسرائیل یا کسی بھی ملک سے تمہارے  
ملک پر براہ راست حملہ بھی کرایا جاسکتا ہے۔ کسی اور طرح کی فوجی  
کارروائی بھی کرائی جاسکتی ہے۔ دیگر سپر پاورز بھی حملہ آور ملک کی  
ہر طرح سے مدد کریں گے۔ اگر ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا  
مقصود ہوا تو صرف ایسی شخصیات کو چاہنا چاہیے کہ ان سے  
کارروائیوں کا خاتمہ مناسب اخلاقی جواز موجود ہو گا۔ کوئی حصار  
و ادعا نہیں مجھے کہ۔“

”کیا اچھا طریقہ ہے۔ دوسروں کو براہ کرنے کا۔“ میں نے  
مستحقانہ لمبے میں کہا ”لیکن یہ تو بتاؤ کہ جب یہ نقلی حلیہ صاحب  
ایگریمنٹ سامان کرے واپس آئیں گے تو کیا حکومت ان سے  
باز پرس نہیں کرے گی کہ آخر انہوں نے یہ کیا کیا؟“ اسلی  
سینٹ میں یہ مسئلہ نہیں اٹھے گا۔“

”جب نقلی حلیہ صاحب واپس آئیں گے تو کیا ہو گا؟“ میں نے  
تمہارا کام نہیں ہے۔ ہر حال تمہاری توقعات کے مطابق حکومت  
نے باز پرس بھی کی یا سینٹ اور اسلی میں یہ بحث اٹھی ہے۔“



بارے میں کوئی فرض کمائی نہاتے ہوئے یہ ٹیوب حقیقتاً صاحب  
معاینے کے لیے پیش کر دے گا۔

اس نے تقریباً دو اچ لی پٹی سی ایک نہایت چمکیلی ٹیوب  
جب سے نکال کر میری طرف بڑھائی۔ وہ ٹیوب نئے سے لگی  
تھوڑا سا بڑے مشابہ تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ تھوڑا سا بڑے سے مت  
تھی اور اس پر کوئی بند نہ دھروون نہیں تھا۔ البتہ اس کے ایک  
سرے پر مسور کے دانے کی طرح نچھاسا ایک سرخ اجڑا ہوا  
تھا۔

اس نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاس ٹوٹا کہ یہ ٹیوب  
حقیقتاً صاحب کو دیتے وقت تم غیر محسوس انداز میں اس میں  
کو انگوٹھے کے باغیچے سے ذرا یاد دے گے اور ان سے فرماؤں کرنا  
کہ وہ اسے سو گھن کر رکھیں۔ اس دوران اس سرخ نشان کو  
پانچ سینکڑے گزریچکے ہوں گے حقیقتاً صاحب جو بھی اس ٹیوب کو انگو  
ٹھے کے قریب لائیں گے یہ پتہ جائے گی تم اور عرفان ذرا قائل رہا  
گے اس لیے اس ٹیوب سے خارج ہونے والی کسی قسم کی دھواں  
کوئی خاص اثر نہیں کرے گی لیکن پھر بھی احتیاطاً تم دونوں  
سینکڑے کے لیے سانس روکے رکھنا۔ ناک کے راستے یہ نہیں چاہیے

صاحب کے ذہن پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ ان کے حوالہ  
جواب دے جائیں گے وہ ہوش میں رہیں گے لیکن یہ قہراً  
کے قائل رہیں گے اور نہ ہی کچھ بول سکیں گے جب تم عرفان  
میک اپ وغیرہ ان پر منتقل کرو گے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا  
عرفان کو صرف حقیقتاً صاحب سے غلط بنانے کے لیے اس کے  
چہرے پر دو تین چوڑوں کا اضافہ ہوگا۔ وہ اضافہ قسم قسم کے ہوا  
موجود یعنی حقیقتاً صاحب والی شکل میں آجائے گا۔ تم اس  
صاحب کی جگہ کمرے میں چھوڑ جاؤ گے اور حقیقتاً صاحب کو  
دے کر اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ سیکورٹی والوں کی نظر میں  
محض ہوگا جو تمہارے ساتھ آیا تھا۔ تمہیں یہ کام ذرا عمارت  
کرنا ہوگا۔ سیکورٹی والوں کو شک نہ ہونے پائے۔

وہ غالباً میرا مزہ اڑنے لگیں گے کہ لے ذرا خاموش ہو جائیں  
تک اس کی طرف دیکھا نہا۔ اس بڑی سی انداز چاروں اور اس  
تے والے سیاہ چمکیلے ہند سے کو دیکھتے ہوئے وہ گھٹلی سی آواز  
رہا ایک عجیب عجیب تھا۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے لگا  
حقیقتاً صاحب تمہارا سارا لے کر آسانی سے گاڑی تک آجائے  
گے تم انہیں لگاؤں گے لے کر جلد از جلد وہاں سے  
دوران جگہ پر پہنچ جانا اور یہ کیپول ان کے منہ میں ڈال دے  
اس وقت تک مزاحمت کے قائل نہیں ہوں گے۔ اس کے  
بار پھر داریوں کی طرح جب میں ہاتھ ڈالا اور جسمی اس ایک  
شگاف ڈیا کال۔ اس میں صرف ایک سی پھر اس کیپول  
دے رہا تھا۔ کیپول نیلے رنگ کا تھا لیکن وہ بھی رانچ  
دے رہا تھا۔ شاید اس میں کوئی سیال بھرا ہو لیکن اس کی

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں جو کچھ چاہیے وہ ہمیں مل چکا  
ہوگا۔ پاس ٹوٹے اطمینان سے جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس مقام پر وہ صرف مجھے ہی نہیں بلکہ  
شاید اعلیٰ حقیقتاً صاحب یعنی عرفان کو بھی پھنوسے رہا تھا۔ میں ممکن  
تھا کہ اس دورے سے واپس آتے ہی اعلیٰ حقیقتاً صاحب کا بھی پتا  
صاف ہو جاتا اور اس کا اصرار بھی حکومت پر آجائے کہ وہ ذریعہ خارجہ  
چونکہ انہی کچھ پوچھ کے مطابق ایک معتقل اور "امن پسند" نہ  
مجموعاً آکر آئے تھے جو حکومت کو پسند نہیں تھا حکومت کے فرمان  
کچھ اور تھے اس لیے اس نے خود اپنے وزیر خارجہ کو بھی مراد دیا۔  
معلوم نہیں خود عرفان کو بھی اپنے اس موقع کا انجام کا اور اک تھا یا  
نہیں۔ معلوم نہیں اسے کیا خواب دکھائے گئے تھے؟ وہ کس بنا پر  
ایک مطمئن اور پراثر تھا؟ کسی تصور سے مسکرا رہا تھا؟ اس کا منتقل  
انجام تو موت ہی دکھائی دے رہا تھا۔ دورے سے واپس کے بعد  
اس کا ایک دن بھی زندہ رہنا ریڈ ڈاٹ کے حق میں اچھا نہیں تھا  
اور اس کا قاتل ہو جانا بھی اس سارے منصوبے کو شکوکہ پہنکاتا  
تھا۔

"اس سارے منصوبے میں میرا کام کیا ہے؟" میں نے  
دریافت کیا۔

"کیا تم نہیں سمجھتے؟" پاس ٹوٹے لمبے میں حیرت تھی۔  
"نہیں۔ میں ذرا کوڑھ مغز واقع ہوا ہوں۔" میں نے اپنا چہرہ  
سپاٹ رکھنے کی کوشش کی۔

"اصل حقیقتاً صاحب کی جگہ اعلیٰ حقیقتاً صاحب کو پہنچانا تمہارا  
کام ہے۔ ہم نے اس چھوٹی سی دے داری کے لیے جس میں منتخب کیا  
ہے جس کا مکملہ تمہیں بت دیا گئے۔ یعنی ہم تمہارا نام ریڈ ڈاٹ  
کے مستحقین کی مختصری فہرست سے نکال دیں گے۔ ہم بیٹے کے لیے  
تمہارا چھوڑ دیں گے بشرطیکہ تم نے آئندہ ریڈ ڈاٹ کے  
مذاہرات کو کوئی نقصان نہ پہنچایا اور جو راہ ہم نے تم پر ظاہر کر دے  
ہیں انہیں تم نے اسی بیٹے میں ہی محفوظ رکھا۔"

میں نہاتے میں آگیا۔ جسے وہ معمولی کام کہہ رہے تھے وہ سختی  
ہی تھا۔ اس کی بنیاد تھی۔ اس کا اندازہ کرنا میرے لیے مشکل نہیں  
تھا۔ وہ گویا ملک کی بنیادوں میں ڈانٹنا سمیت رکھوانے کا کام میرے  
ہاتھ سے انجام دلوانا چاہتے تھے۔

"میں یہ کام کس طرح انجام دوں گا؟" میں نے دریافت کیا۔  
"نہایت سیدھے سادے طریقے سے۔" پاس ٹوٹے جواب دیا  
"تم حقیقتاً صاحب سے خدائی میں ملاقات کے لیے وقت لو گے۔ ان  
سے یہ کہو گے کہ تم ایک نہایت اہم آدمی کو ان سے ملانا چاہتے  
ہو۔ وہ اہم آدمی عرفان ہوگا۔" اس نے اعلیٰ حقیقتاً صاحب کی طرف  
اشارہ کیا۔ "معمولی سے ایک آپس میں ہوگا۔ لیکن اس وقت یہ حقیقتاً  
صاحب دکھائی نہیں دے رہا ہوگا۔ جس کمرے میں حقیقتاً صاحب  
سے تمہاری ملاقات ہوگی وہاں یہ بھی موجود ہوگا۔ تم ریڈ ڈاٹ کے

ہیے میں ہوا "تسماری ایجنسیوں کو خفیہ کمانڈو "خفیہ" کے ساتھ  
بہت بڑا ذات ہے۔ ان سے خفیہ کے لیے تو ہمارا ایک ایک بڑی  
کافی ہے۔"

"خبر اب اتنا بھی ہنس پہ مت چڑھو۔" میں نے کہا۔  
"انہوں نے تھیں صاف طور پر جھوٹا اور مشکوک آدمی قرار  
دے دیا اور تم اب بھی ان کا دفاع کر رہے ہو؟" پاس ٹوڈر سے  
حیرت سے ہوا۔

"وہ ایک اگلی بات ہے۔ لیکن اس سے ان کی اہمیت کم نہیں  
ہو جاتی۔ یہی کافی ہے کہ تسمارے دل میں ان کا خوف تو موجود ہے۔  
تم ان کی وجہ سے کچھ تو احتیاط کرتے ہو ورنہ تم نہ جانے کیا کر  
گزر رہے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں تم سے اتنے اعتقاد اندازوں کی توقع نہیں تھی۔"  
پاس ٹوڈر "ہمیں ایجنسیوں کا کوئی خوف نہیں ہے لیکن اس وقت  
ہم ایک نہایت حساس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ اس پروجیکٹ  
کی تکمیل تک ہم کسی کی بھی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا نہیں  
چاہتے۔ ہم ذرا سی بھی الجھن مول لینا نہیں چاہتے۔ جب ہمارا کام  
بغیر کسی دشواری کے چل رہا ہے تو ہمیں خواہ مخواہ اپنے لیے ذرا سی  
بھی دشواری پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم یہاں کم سے کم  
آدمیوں کے ساتھ اپنے زیادہ سے زیادہ بڑے کام مکمل کرنا چاہتے  
ہیں۔ ہمارے پاس فضول کاموں کے لیے آدمی نہیں ہیں۔ ہم یہاں  
زیادہ آدمی جمع بھی نہیں کرنا چاہتے۔ آدمی زیادہ ہوتے ہیں تو جلدی  
نظر میں آتے ہیں۔"

میں نے اب تک ریڈ واٹ کے دو خفیہ ٹھکانے دیکھے تھے۔  
دونوں کا انداز بھول بھلیوں والا تھا۔ مجھے صحیح طور پر تو نہیں معلوم  
ہو سکا تھا کہ یہ جگہیں کتنی وسیع تھیں اور یہاں بیک وقت کتنے  
آدمی رکھے جاسکتے تھے لیکن ایک احساس ضرور ہوا تھا کہ ہر امرار  
کی بناوٹ کے یہ ٹھکانے اپنے اندر بڑی وسعت رکھتے تھے۔ ان میں  
بے شمار آدمیوں کو چھپانے کی گنجائش تھی اور یہاں جتنی دیرانی  
بظاہر دکھائی دیتی تھی۔ درحقیقت یہ اتنے دیرانی نہیں تھے۔ نہ  
جانے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ یہاں کے مختلف گوشوں میں  
بہت سے افراد پوشیدہ رہتے تھے اور وہ بلا ضرورت سامنے نہیں  
آتے تھے۔ تاہم پاس ٹوڈر کے نقطہ نظر سے شاید ابھی ان کے پاس  
"میں پاور" کم ہی ہو۔ مستقبل میں وہ نہ جانے کتنے آدمیوں کا  
بندوبست کرنا چاہے ہوں۔ ابھی تو مجھے صحیح طور پر یہ بھی نہیں  
معلوم تھا کہ ہمارے ملک میں ان کے یہی دو ٹھکانے تھے جو میں اب  
تک دیکھ چکا تھا یا اور بھی کمین کاہن موجود تھیں۔ میں ان چیزوں  
کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتا تھا اتنی میرا دل ٹھکراتے سے ڈھنسا  
جاتا تھا۔ نہایت خاموشی سے نہ جانے کیسے کیسے عیب طوفان  
ہمارے ملک کی طرف بڑھ رہے تھے اور کسی کو ان کا کمان تک  
نہیں تھا۔ کسی نے شاید خواب میں بھی ان خطرات کے بارے میں

اس نہیں ہوا تھا۔  
پاس ٹوڈر "یہ سیکرٹول جیسے ہر حال میں ان کے منہ میں  
ہوگا خواہ اس کے لیے ہمیں تھوڑی بہت زبردستی یا زور  
پائی بھی کرنا پڑے۔ یہ ان کے منہ میں چھپتی ہو جاتی  
اس کے ساتھ ہی تم حقیقت صاحب کو گاڑی سے باہر نکلیں  
جس میں ان کے انجام کے بارے میں تشریش زدہ ہونے یا ان  
ہات دیکھنے کے لیے ٹرکے کی ضرورت نہیں۔"

"پھر بھی۔۔۔ ہوئی ذرا معلومات کی خاطر تا دود کہ ان کا انجام  
ہوگا؟" میں نے بظاہر سرسری سے لیے میں پرچا۔  
"کچھ بھی نہیں۔" پاس کے لیے میں بے پروائی میں تھی "وہ  
بھی چھپتی ہوئی لاش میں تبدیل ہو جائیں گے جیسی تم پہلے بھی کئی  
دیکھے ہو۔ وہ ایک کسمپاس اور ناقابل شناخت شخص کی لاش ہوگی  
ایک دو دن میں لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا جائے گا۔  
میں اس لیے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"واقعی۔ اس میں پریشانی والی تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔ یہ تو  
نہ معمولی اور آسان سا کام ہے۔" میں نے خطرہ لیے میں کہا "تم  
خود کیوں نہیں کر لیتے۔ میرا مطلب ہے کسی اور شخص کے  
لیے میری مدد کے بغیر۔"

"نی الحال ہمیں اس کام کے لیے تم سے زیادہ موزوں کوئی اور  
نہ مل سکتی نہیں دے رہا۔" پاس ٹوڈر نے اطمینان سے جواب دیا  
یہ بھی ہمیں اکثر کاموں کے لیے قربانی کے ایک کمرے کی  
دور ہوتی ہے۔ نی الحال ہمارا قربانی کا کمرہ تم ہو۔ تمہیں یہی  
صاف کوئی کی یاد دہانی چاہیے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ہوا "کوئی اور شخص اس کام کو  
اگر ہمیں مہارت ہے خوبی اور اعتماد سے انجام نہ دے سکے۔  
اسی لحاظ کام کا ڈر ہے کی اور ہم نی الحال کسی ایجنسی کو اپنی  
رف حوالہ نہیں کرنا چاہتے۔ نی الحال تو ہم اسی بات کی خوشی منا  
ہے ہیں کہ اس مسئلے میں تسماری کو ششیں ہلاک ہو گئیں۔ تم نے  
بھینوں کو ہمارے پیچھے لگانے کی سرتوڑ کوشش کر کے دیکھ لی لیکن  
انہی حکمت عملی اور احتیاطی تدابیر کا کمال تھا کہ ہمیں منہ کی  
طانی ہیں۔ کسی نے تسماری بات کا نہیں نہیں کیا لیکن اس خوش  
نام آپ سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری کوشش اب بھی یہی  
ہے کہ تم سے کوئی بے احتیاطی سرزد نہ ہو۔"

"تم سے ہو ہماری خفیہ ایجنسیوں سے؟" میں نے مسکراتے  
سے پرچا۔ میں نے اس احساس سے اپنے دل میں ہلکی بار  
سے طمانیت کی لہر محسوس کی کہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کا کچھ تو  
ڈھانڈا کو خوف تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے پاس ٹوڈر کے ٹھکانے ہوئے استہزائیہ  
شرے میری خوش فہمی رفع کر دی۔ وہ گویا میرے سوال سے بہت  
لڑا ہوا تھا۔ اس سے چھو شخص کی ہنسی تھی تو وہ حقارت آمیز سے

میں سوچا تھا۔ سب کو اپنے اپنے پسندیدہ و محبوب لیزروں کے فرمان پر چلنے ہوئے ایک دوسرے کو روکنے کھسکھسائے اور ہنسنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ ہاس ٹو جس "تمایت حساس پروجیکٹ" کا ذکر کر رہا تھا وہ ہماری جہاں کا نہ جانے کیسا منسوب تھا۔

میں نے اپنے اندیشوں سے نظر ہٹاتے ہوئے دیکھے لیے میں کہا "فرض کرو میں اس کام کے لیے ہائی بھریمان ہوں تو کیا یہ نقلیہ صاحب یہاں سے میرے ساتھ ہی جائیں گے؟"

"نہیں" ہاس ٹو نے بلا تامل جواب دیا "تم یہاں اسٹیشن ورنٹ پر آئے ہوئے کوئی مسمان نہیں ہو کہ ہم تمہیں رخصت کرنے دو اور ازلے تک جائیں گے، ہاتھ پاتے ہوئے خدا حافظ کیس گے اور عرفان صاحب کو تمہارے ساتھ کروں گے۔ تم جس طرح آئے ہو اسی طرح واپس جاؤ گے۔ ہم دو زمانہ صبح دس سے گیارہ بجے کے درمیان تمہیں تمہارے آفس میں اور شام کو چھ سے سات بجے کے درمیان ہوٹل میں فون کرتے رہیں گے جہاں تم ٹھہرے ہوئے ہو۔"

گھبراہٹ میں یہ بھی غلط تھا کہ میں آج کل ہوٹل میں رہ رہا تھا۔ ان سے کوئی بات شاید پوشیدہ رہتی ہی نہیں تھی۔ ہاس ٹو نے سلسلہ کلام جاری رکھا "جیسے ہی خلیفہ صاحب سے تمہیں ملاقات کا وقت مل جائے تم ہمیں مطلع کر دو گے۔ ملاقات سے ایک گھنٹہ پہلے تم عرفان صاحب کو کسی جگہ سے پک کر لو گے۔ جگہ تمہیں عین وقت پر بتادی جائے گی۔"

"فرض کرو میں اس کام کی ہائی نہیں بھرتا؟" میں نے پوچھا۔ "اس میں فرض کرنے اور انکار کرنے والی کوئی بات ہی نہیں۔" ہاس ٹو ناگوار سی بولا "اگر تمہاری کھوپڑی میں ذرا برابر بھی عقل موجود ہے تو تم انکار نہیں کرو گے اور ہم اس مسئلے میں کوئی بات فرض نہیں کریں گے۔ تمہیں اس کام کو کرنا ہی ہے۔ تمہیں اس سے بہتر موقع ملنا کمال مل سکتا ہے؟ صرف اتنے سے کام کے عوض تمہاری اتنی بڑی غلطی معاف کی جاتی ہے جس کی وجہ سے تمہیں زندگی بھر سکون سے نیندا نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ کام کرتے ہی تمہاری جان ہم سے بڑھ کے لیے چھوٹ جائے گی۔ کیا اس وقت اس سے بڑی بھی کوئی خوشی تمہارے لیے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں" میں نے بلا تامل کہا "اس سے بڑی خوشی میرے لیے یہی ہو سکتی ہے کہ صرف میری ہی نہیں "اس ملک کی بھی تم سے جان چھوٹ جائے۔"

"تم ملک کی فکر چھوڑو۔ نی اللال صرف اپنی فکر کرو۔" ہاس ٹو کے لہجے میں ناگوار سی تھی "جناؤ اس کام کے بارے میں تمہارا جواب کیا ہے؟"

میں نے چند لمحوں سوچا پھر ایک لمبی سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

"بہت خوب" بے چہرہ شخص کے لہجے میں طمانیت تھی "تم

## اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

200/- اندھیروں کے ساوا بان

200/- تاریک رزم گاہ

150/- مقبلہ کا مجاہد

150/- عقاب

150/- صحرا کی آگ

150/- قتیبہ بن مسلم

150/- موت کے مسافر

150/- یثرب کا ایلین

150/- سنہری غول

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

بلاشبہ ہمارا اندازہ غلط ثابت کر دیتے ہو۔ جب ہمیں پتہ کہ تم ہماری چیکنش قبول کر لو گے اور ہماری ہر بات پر عمل کر اس وقت تم نے ہمیں دھوکا دیا اور ہمارے خلاف سرگرم ہو۔ اپنی سی کو ششیں کڑوائیں۔ اس بار ہمیں اندیشہ تھا کہ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن اس بار تم نے ہائی نہیں جمان کر دیا ہے۔"

"اس بار میں نے بند بانی ہونے کے بجائے تمہاری جگہ

مجھے پچھلی مرتبہ لے جایا گیا تھا۔ یہ اس سے ذرا آٹھاد تھا اور اس میں میری میزبان لیوٹا نہیں لٹوٹا تھی۔ نہ جانے کیوں اب مجھے نہیں ہوتا جا رہا تھا کہ لیوٹا لٹوٹا اسے تن لٹوٹو وغیرہ۔ یہ سب نام فرضی تھے۔

اے تن مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ لٹوٹا مسکراتے ہوئے بولی ”اب تم آرام کرو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہوگی۔“ وہ بڑی محبت سے بستر درست کرنے لگی۔ بند لگے گلابی رنگ کے پلاسٹک کا بنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس پر گدا وغیرہ ریشم سے مشابہ نہایت چمکیلی اور سفید کسی چیز سے تیار شدہ دکھائی دیتا تھا لیکن وہ ریشم بھی نہیں تھا۔ شاید ٹیکسٹائل کی کوئی قسم تھی۔ بستر درست کر کے وہ میرا ہاتھ تمام کر رہا تھا مجھے بچوں کی طرح پکارتے ہوئے بولی ”پلو اب اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔“ لگتا ہے اب تم مجھے لوری بھی دوگی۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھ کر کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں لوری بھی دے سکتی ہوں۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولی ”یہ کوئی محبوب بات تو نہیں ہے۔ انسان کو ہر عمر میں لوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوری انسانی ذہن کی بڑی اہم ضرورت ہے۔ خصوصاً جن بچوں نے بچپن میں ماں سے لوری نہیں سنی ہوئی ان کے ذہن میں لوری کی طلب کا بڑا زبردست غلام بنا جاتا ہے۔“

شاید وہ لوری کے موضوع پر اپنا عالماتہ اور فاضلات لیکچر جاری رکھتی لیکن میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے ذہن میں کوئی خلا نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو میں کسی کے سامنے اس کے بارے میں فریاد کرنے کا جواہر نہیں کرتا۔ لوری کے بارے میں تمہارا لیکچر سننے سے بہتر ہے کہ میں چپ کر کے لیٹ ہی جاؤں۔“

میں بستر پر لیٹر ہو گیا۔ وہ افسر کی آمیزش سے لہجے میں بولی ”لوگوں میں اپنے علم میں اضافے کا قطعاً تجربہ خان نہیں رہا۔ بے ہودہ اور جھوٹی باتیں لوگ بڑے شوق سے سنتے ہیں اور ان پر سرگڑھنتے ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مشتاقانہ انداز میں مجھے کھیل اڑھانے لگی۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا ”مجھے یہاں سے نجات کب ملے گی؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ وہ ساؤگی اور معصومیت سے بولی۔ اس نے کھیل میرے جسم پر ٹھوڑا ٹپک بھلا دیا۔ بہت احتیاط سے وہ مجھے کھیل سے ڈھانپ رہی تھی۔ کھیل کے کنارے بستر سے لٹے ہوئے تھے۔ اس دوران لیوٹا نے شاید کچھ کیا ہو لیکن میں ہر حال اس کی کوئی غیر معمولی حرکت نہیں دیکھ سکا مگر شاید وہاں چیزیں اٹھاؤں پر بھی کام کرتی تھیں۔ ہوا یک کھیل جس طرح میرے جسم کو ڈھانپتے ہوئے تھا اسی حالت میں لوہے کی طرح آکر گیا۔

میں نے دل سے غور کیا ہے اور مجھے اس کو قبول کرنے کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔“ میں نے دھجے لہجے میں کہا۔  
”اس بار بھی باہر جا کر ہمیں چکر دینے کا پروگرام تو نہیں؟“  
انہوں نے دریافت کیا۔

”نہیں، میں ایک باری تمہیں چکر دینے کی کوشش سے تھک جائوں۔“ میں نے جواب دیا۔

میرے لہجے کی تحسین نے اسے خوش کر دیا۔ سرشار سے لہجے میں ”ہر حال احتیاطاً کہہ رہا ہوں کہ اگر وہاں ہمیں ڈبل کراس کرنے کا خیال ذہن میں آئے بھی تو اسے فوراً نکال دینا کیونکہ اس پر ہتھیاری جان دلوں پر لگی ہوگی اور معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“  
”مجھے صورتحال حال کا احساس ہے۔“ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”دیکھتے ہیں اس بار تم اپنی زبان پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ بس ہمیں کیا مسئلہ ملے کرنا تھا۔“ اس نویدم انگیزہ کھڑا ہوا۔ اس کے ماتھی اے تن بھی شہزادانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی ہمت نہیں کی۔

”اس نو عمر سیدہ عورت کے ہاتھ میں موجود کھینچ ریکی طرف اٹھان کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا ”تم نے ہمارا کام کرنے کا ارادہ کیا ہے اور یہ بات ریکارڈ ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں جس کام کی جی بھلی جائے اور وہ ریکارڈ پر بھی آجائے اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے یہ بات یاد رکھنا ہم اپنی اخلاقیات کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی اسی طرح پابندی کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم یقینی حاکم رکھنے کے باوجود ہمیشہ شائستگی سے اپنے معاملات کو چلانے والے لوگ تمہیں پوری دُنیا میں کہیں نہیں ملیں گے۔“

”بے شک“ میں نے تسلیم کیا۔

”خدا حافظ“ اس نے کہا اور ایزبیل کے بل گھوم گیا۔ عمر سیدہ اہمیت اس کے ساتھ چل دی۔ وہ جدھر سے آئے تھے اسی طرف باکرا نہ میرے میں غائب ہو گئے۔

میں نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اے تن سے پوچھا ”اس طرف اندھیرے میں کوئی دروازہ ہے؟“

”ہاں۔ اور وہ ایک ایسے راستے کا دروازہ ہے جو پائال کی طرف جاتا ہے۔“ اے تن نے ہماری سانس لے کر جواب دیا۔ میں نے اسے گھورا لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ گیا۔ میں نے تھوڑا پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی رہنمائی میں اس بار میں جس کمرے میں پہنچا وہ تقریباً وسطی تھا جیسا میں دینے ذات کے اس ٹھکانے پر دیکھ چکا تھا جہاں

# رقص ابلیس

انوار صدیقی قیمت - 150/-



میں نے اٹھنا چاہا تو اندازہ ہوا کہ اس کے کنارے بستر کے ساتھ گویا جڑ پکے تھے۔ میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے جسم کو سانپ کی طرح تل دے کر اس آہنی خول سے لٹکانا چاہا تو پتا چلا کہ میرے پاؤں کھل سے باہر ہی تھے اور اب انہیں کھل کے اندر نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اتنی جگہ ہی نہیں تھی۔ دونوں تختوں کے گرد جس طرح کھل لپٹا ہوا تھا اس سے پاؤں اس پوزیشن میں تھے گویا دوپاٹوں سے باہر نکلے ہوئے ہوں کیونکہ کھل اب ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھات جیسا ہو چکا تھا۔ گویا اب مجھ پر وہ خاموہ مکمل طور پر صادق آ رہا تھا کہ میں کھل کو چھوڑنا ہوں لیکن کھل مجھے نہیں چھوڑتا۔

”اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے یونانی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم مجھے غم دیتے ہو ویسے ہی سہاگت لیٹ جاتا۔ انگریز تک نہ ہلا آتا۔“

”بس۔۔۔ ویسے ہی اصراراً ہم اس قسم کے ہندوستان رکھتے ہیں۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔“ وہ بیلے کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے دخلی ہوئی دھات کے سے اس کھل کو دھیرے دھیرے جھکنا شروع کر دیا۔

”آرام سے سوئے کی تم نے خوب کہی۔“ میں نے زہریلے نیلے میں کہا ”اس آرام وہ کھل میں تو واقعی فرصت اور سکون کی بدولت میری آنکھیں بند سے جو جھل ہوئی جا رہی ہیں۔“

میں نے تو یہ بات طنزیہ طور پر کہی تھی لیکن فیونا ثابت بخجندی سے اذیت میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”ہاں واقعی اس کھل میں انسان کو بڑے آرام سے بند آ جاتی ہے۔“

مجھے اس کی بخجندی پر حیران ہونے کی سہلت نہیں ملی کیونکہ اسی لئے واقعی میری آنکھیں گویا بند سے جو جھل ہونے لگیں۔ اگر کمرے میں کسی قسم کی گیس پھیل رہی تھی تو مجھے اس کی بو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ فیونا اسی طرح میرے پاس بیٹھی ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غوغائی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اگر کوئی گیس مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی تو وہ اس پر نہ جانے کیوں اثر انداز نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس کے چہرے پر کوئی مامک وغیرہ بھی نہیں تھا۔

میں سوال ”ذہن میں لیے میں دھیرے دھیرے بے خبری کی آغوش میں آ کر گیا۔“

میری آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ میں کسی ٹک سی جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے یہی گمان گزرا کہ شاید میں اسی آہنی کھل میں پھنسا ہوا تھا لیکن پھر احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ آنکھیں ذرا تارکی سے مانوس ہوئیں اور ذہن سے خشک سی دھند چھٹی تو پتا چلا کہ میں ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ میں آنکھیں بند ہوئے اٹھ بیٹھا۔

تب مجھے پتا چلا میں اسی گاڑی میں تھا جہاں سے مجھے انوا کیا گیا

تھا۔ وہ میرے اسلام آباد آفس کی گاڑی تھی۔ گاڑی اس وقت اسلام آباد ہوشل سے کچھ ہی دور ایک بلند عمارت کے قریب کھلی تھی اور اس میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ سپیڈ سحر نمودار ہوا تھا۔

میرے ذہن پر کوئی بو جھل پڑی وغیرہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کی تحقیق کا احساس تھا۔ بس ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے میں معمول کے مطابق رات کو سو کر اٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے گمان گزرا کہ کہیں واقعی میں خود ہی گاڑی میں روک کر کچھ سیٹ پر لیٹ کر سو تو نہیں گیا تھا؟

ساری باتیں خواب لگ رہی تھیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ مجھ پر گزری تھی جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا تھا وہ کتنا ہی عجیب سی لیکن ہر حال حقیقت تھا۔ میں ذرا نیوٹک سیٹ پر آ بیٹھا۔ چایاں گاڑی میں لگی ہوئی تھیں۔ میں اسے اشارت کر کے گاڑی کی پارکنگ لائٹ میں لے آیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ پانچویں گئے ہوئے کھل کو دیکھ کر ایک لذت مجھے اندیشہ سا محسوس ہوا کہ میں خود بخود پچھل کر کچھ درجن نہ لے۔ غیر ارادی طور پر میں نے ایک طرف کو کھسکا دیا اور لیٹ کر دیر تک پاس ٹوٹے ہوئے رات منٹھو کے پارے میں سوچتا رہا۔

دن چڑھا تو میں نے کمرے میں بیٹھا سٹنگوایا پھر اپنے ذرا ایجنٹ کو فون کیا۔ رات کی فلائٹ میں مس کر چکا تھا۔ دوسرا فلائٹ میں سیٹ کا ہندوستان کے میں گاڑی آفس میں چھوڑا لا اور روانہ ہو گیا۔

لاہور میں بھی سب سے پہلے میں نے ہوشی کا منٹھا شاور لینے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد میں آفس روانہ ہوا۔

آیا۔ وہ لوگ ایک گاڑی کو گھیرے ہوئے تھے اور ان کی تعداد میں  
 لہجہ بہ لہجہ اضافہ ہو رہا تھا۔ فاصلہ کافی تھا تاہم مجھے گاڑی کی دھڑ  
 اسکرین پر چھٹائی جا بجاں سا پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سوا  
 میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ گاڑی کا رخ عین اسی کھڑکی کی طرف تھا جس  
 میں اس وقت میں اور راحیلہ پردے کے پیچھے کھڑے تھے۔  
 ”پرے از آن پس گئے ہو گئے تھے اس شخص کو وہیں گاڑی  
 میں بیٹھے ہوئے۔“ راحیلہ سپاٹ لیجے میں بولی ”میں حیران ہوں کہ  
 اس دوران کیا اسے ایک بار بھی گاڑی سے اُترنے کی ضرورت  
 پیش نہیں آئی؟“ میں نے اسے کچھ کھاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔  
 بس پتھر کے پت کی طرح گاڑی میں بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھار اپنی سی  
 نگرے اس کھڑکی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

”اور تم نے اسے گولی مار دی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا  
 ”ممکن ہے وہ بے گناہ ہو۔ ممکن ہے کسی اور کے لیے کسی اور پتھر  
 میں بیٹھا ہو۔“  
 ”تمیں وہ اس پارٹمنٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔“ راحیلہ فیصلہ کن  
 لہجے میں بولی۔  
 ”تمہی دور ہے؟“ مجھے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا ”تم  
 اتنے یقین سے یہ بات کیونکر کہہ سکتی ہو؟“

”کیا تمہیں میری حیات پر بھروسہ نہیں ہے؟“ وہ میری  
 آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ  
 خطرناک حد تک سنجیدہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کی  
 حیات ہلا کی چیز تھیں۔ اس موقع پر اس کی بات کی تردید کرنا اس  
 کے دل میں بدگمانی لا سکتا تھا۔

وہ نہایت دھمے لہجے میں ”لیکن ایک ایک لفظ پر زور دیتے  
 ہوئے بولی ”جس طرح اکثر معاملات میں تمہیں اپنی حیات پر بہت  
 بھروسہ ہے“ اسی طرح مجھے بھی اپنی حیات پر اکتاہٹ ہے۔ میری  
 چھٹی جس اور بیڑا دل مجھے دھوکا نہیں دے گا۔“

میں نے ایک بار پھر پردے میں جھری بیٹھے ہوئے دیکھا۔  
 جھوم بڑھ رہا تھا۔ عملی طور پر کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تک کسی  
 امپریفیس وغیرہ کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے اور نہ ہی غالباً اس  
 شخص کو گاڑی سے نکالا گیا تھا۔ پولیس بھی کہیں دکھائی نہیں دے  
 رہی تھی۔

”کیا وہ مر گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یقیناً“ راحیلہ نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا ”میں نے  
 اس کی چٹائی میں۔۔۔ عین دونوں آنکھوں کے درمیان سوراخ  
 نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو کوئی مجھڑی اسے چھاسکا  
 تھا۔“

میں نے پہلے براؤز کر دیا اور جھکے جھکے آنکھوں میں ایک کرسی پر  
 بیٹھ گیا۔

ساتھ ہی میں غیر ارادی طور پر گاڑی راحیلہ کے کھڑکی کی طرف موڑ  
 دیتی تھی۔ محسوس کرتا تھا کہ راشد کے قتل کے بعد مجھے اس کی دھڑکی  
 کے لیے زیادہ دیر اس کے پاس رہنا چاہیے تھا لیکن مجھے اتنا وقت  
 ہی نہیں مل سکا تھا۔

بلڈ بینک کے قریب گاڑی کھڑی کر کے میں اوپر راحیلہ کے  
 پارٹمنٹ پر پہنچا اور تیل بجائی۔ اندر بلا کا سکوت تھا۔ چند لمبے ہند  
 مجھے احساس ہوا کہ وہ دروازے کی بجلیک آئی سے شاید مجھے دیکھ رہی  
 تھی لیکن اس کے باوجود جب اس نے دروازہ کھولا تو جتنا انداز  
 میں کھولا۔ وہ ڈیپلی ڈھالی سی ایک اسپورٹس شرٹ اور ٹراؤزروں میں  
 غبی گھریں ہونے کے باوجود جو گرز پٹے ہوئے تھے۔ سر پر بی کپ  
 غبی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ زیادہ تر اس کا لباس اور جوتے وغیرہ  
 کلاڑیوں کے سے ہوتے تھے شاید وہ اپنے آپ کو ہلکی پھلکی اور  
 پُرملی رکھنے کے لیے اس طے میں رہتی تھی۔ دو تین مرتبہ ایسا  
 اتفاق ہو چکا تھا اس لیے شاید اسے دہم رہنے کا تھا کہ کسی وقت بھی  
 کوئی آواز پرکھتی ہے اس لیے لباس اور جوتے وغیرہ ایسے ہونے  
 چاہئیں کہ نہایت تیزی سے حرکت میں گرنے میں کوئی دشواری نہ  
 ہو۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں راکٹ تھی جس پر  
 دو تین گلی ہوئی تھی ”دو سرکل“ نے اسے جو چیزیں فراہم کی  
 تھیں ان میں یہ راکٹ بھی شامل تھی۔ میں نے کمرے میں خفیہ  
 کی بارڈر کی بوجھ محسوس کی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ جس وقت میں  
 عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اسی دوران اس نے راکٹ سے  
 تاز کیا تھا۔ راکٹ پر ساٹھ سرکل بھی فٹ تھا جس کی وجہ سے میں فائر  
 کی آواز نہیں سُن سکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اپارٹمنٹ  
 کے اندر روپے ہوئے راحیلہ کو دروازہ مار راکٹ سے فائر کرنے کی کیا  
 ضرورت پیش آئی تھی۔

اس نے جلد ہی دروازہ بند کر دیا۔ تاہم اس کے چہرے پر پہچان  
 نہ کی کہ کوئی بلاست نہیں تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ میں ادھر ادھر  
 جھانکا۔ کہیں کچھ نہ پایا۔ تب میں نے اسے گھورتے ہوئے  
 اچھا ”کس کی بیٹی تھی؟“

”معلوم نہیں۔ میں اسے پہچانتی نہیں۔“ اس نے کندھے  
 اٹکاتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے  
 تھے اس نے مجھے ایک کھڑکی کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کھڑکی  
 کا پردہ زرا سا ہٹا کر اس نے اشارہ کیا ”وہ دیکھو“

جس عمارت میں راحیلہ کا اپارٹمنٹ تھا وہ ایک بہت بڑے  
 رائلڈ ہاؤس کے قریب واقع کارڈز بلڈنگ تھی۔ ساتھی میں  
 ملوڈر تک بارہی تھی۔ اس مڈ پر کافی دور مجھے چھوٹا سا جھوم نظر

دیکھا۔ ”اور مجھے خبری نہیں؟“

”بیشتر سراسر میں میں سمجھتے ہیں کہ پالنے کا مطلب شادی کر لینا ہوتا ہے۔ یعنی جس سے شادی کر لی، سمجھو اسے پالیا۔ یہ بڑا ہی غلط نظریہ ہے کہ شادی کیے بغیر بھی کوئی کسی کو پاس رکھتا ہے، بعض مرد اور عورتیں میاں بیوی ہوتے ہیں مگر وہ زندگی بھر ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جسمانی طور پر کسی کو پالنا ہی پالنا نہیں ہوتا۔“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”تم تو ابھی خاصی قلمبے ہوئی جا رہی ہو۔ اس فکروے فلسفے کے سارے کب تک میری شادی کی درخواست کو ردی کی ٹوکری میں ڈالے رکھو گی؟“ میں نے گراہ کر پوچھا۔

”مگر سترہ سی سال کی عمر کو بچپنا نصیب ہوا تو پھر اس سلسلے میں سوچیں گے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”اتنی جلدی کی بھی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے جمل کر کہا۔

”قبرستان میں پہنچ کر ہی یہ زحمت کر لیں گے۔ ڈھانچے ہمارے بارانی ہوں گے۔“

”تم یہ دل دکھانے والا موضوع نہ پھیلا کر۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”ہمارے پاس تو اتنی باتیں ہیں کہ کہنے کے لئے۔“

”ہاں۔ یہ تو درست ہے۔“ میں نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

اور چند لمحے اس کی طرف دیکھا رہا۔ اس نے سر ہٹا لیا۔ میں اٹھا اور ایک بار پھر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں سے کار لاٹش اور بجوم سب کچھ غائب ہو چکا تھا۔ اگر پولیس آئی تھی تو اس کی کارروائی اتنی جلدی تو ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

مجھے افسوس ہوا کہ میں خواہ خواہ راہیلہ سے باتوں میں لگ گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہاں نہ جانے کیا ہوا تھا۔ میں نے راہیلہ کو یہ بات بتائی تو وہ بھی اٹھ کر میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس نے بھی پردے کے درمیان سے جھانک کر دیکھا اور حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

”لیکن اس سے تمہیں یہ یقین تو چھپا ہو گا کہ وہ کار سوار بہر حال ایک پراسرار شخص تھا۔“ وہ کھڑکی سے ہٹتے ہوئے بولی۔

”ہاں..... لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔“ میں سرک کا جواز دیتا رہا۔

گڑی میں سے سروس روڈ پر چھوٹے سے ایک پرائیویٹ اسپتال کے قریب گرین بیلٹ کے درختوں تلے کھڑی دیکھی تھی۔ نوٹس روڈ کے دونوں طرف کوٹھیل کی قطاریں تھیں۔ اسپتال بھی ایک بڑی سی کوٹھی میں ہی قائم تھا۔ اس کے دونوں گیٹوں پر اچھی خاصی آمد و رفت رہتی تھی لیکن اب وہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سڑک کے کنارے چند کھوکھے بھی تھے۔ میں نے پہلی بار کھڑکی سے جھانکا تھا تو وہ کھلے دکھائی دیے تھے لیکن اب بند تھے۔ یہ بھی ہمارے ہاں کی روایتوں میں سے ایک پرانی روایت تھی۔ کہیں کوئی واردات ہوئی تھی تو اس پاس کے لوگ کھسک جاتے ہیں یا اپنی عافیت سمجھتے تھے جرم نہ کرنے والے قانون کے محافظوں سے

راہیلہ نے گمن الماری کے ایک خانے میں رکھ دی اور میرے مقابل آنکھیں۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ افسردگی آمیز لہجے میں بولی۔ ”شاید تم اس بات پر ناخوش ہو کہ میں نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر لیا؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ ”میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے کہ تمہیں یہاں کچھ پتی بنا کر رکھوں اور میرے اشارے کے بغیر تم حرکت ہی نہ کرو۔ اس کے برعکس میں تو تمہیں زیادہ سے زیادہ آزاد، خود مختار اور چلک چمکتے میں فیصلہ کرنے والی عورت دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ آگے چل کر تمہیں نہ جانے کیا کیا ذمے داریاں سنبھالنی پڑیں۔“

”تو پھر اتنے خاموش کیوں ہو؟“

”بس..... کوئی..... جب میں تمہیں اس بار دہا ڈاور ہر وقت کی اصرار کشیدگی میں مبتلا دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں شاید میں نے تمہیں کراچی سے یہاں لا کر اچھا نہیں کیا، خصوصاً راشد کی موت کے بعد میرا بچھتاوا بڑھ گیا ہے۔ سوچتا ہوں تمہیں یہاں آکر کیا ملا؟ آئے دن کچھ نہ کچھ گونا گونا ہی پڑ رہا ہے۔“

”تم خواہ خواہ ان سوچوں میں الجھتے ہو۔“ وہ کمری سانف لے کر بولی۔ ”میں بہت کم وقت میں اس لئے نافک اسٹاک کی خرید و فروخت ہو گئی ہوں۔ مجھے قطعاً افسوس یا بچھتاوا محسوس نہیں ہوتا۔ خواہ راشد کی موت کا دھم میرے سینے میں تازہ ضرور رہے گا لیکن یہ بڑے ہرگز نہیں سوچتی کہ اگر وہ لاہور نہ آتا تو شاید زندہ رہتا۔ فکرت بھلا اتنے اس کی زندگی اتنی ہی کبھی تھی تو اسے ہر حال میں مرنا تھا۔ گولی سے نہ مرنا تو شاید کسی اور طرح مر جاتا۔“

اس کے چہرے پر حوصلے کی چمک تھی اور اس کے سوچنے کا یہ انداز میرے لیے حوصلہ افزا تھا۔ وہ نہ حقیقت یہی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنے آپ کو مجرم مجرم محسوس کیے جا رہا تھا۔

”کیا وہ اتنی تمہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ اچلی بھلی سکون سے زندگی گزار رہی تھی۔ اب ہر وقت گریباں..... دھماکتے..... اپنے سائے سے بھی خوف..... کچھ پتا نہیں کب وہ انش بدلتی پڑ جائے؟“ میں نے کہا۔

”میں بالکل خوفزدہ یا پریشان نہیں ہوں۔ یہ بھی زندگی کا ایک انداز ہے جسے میں نے قبول کر لیا ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ میں بالکل مطمئن اور پرسکون ہوں۔ اگر میں نے کچھ کھوا بھی ہے تو میں اپنے آپ کو نقصان میں نہیں سمجھتی۔ میں نے کچھ پایا بھی ہے۔“

”کیا؟“ میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے تمہیں پالیا ہے، میرے لیے بس یہی کافی ہے۔ اب کسی بھی حال میں زندگی گزارنا میرے لیے بہت آسان ہو گیا ہے۔“ وہ کمری کے پلٹے سے ٹپک لگاتے ہوئے بولی۔

”تم نے مجھے پالیا ہے؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف



”وہ شخص میرے ذہن میں بڑی الجھن چھوڑ گیا ہے۔ آخر وہ کون تھا اور کیوں تھما رہا تھا؟“ میں نے خود کھائی کے سے انداز میں کہا۔

”ظاہر ہے‘ ریلوے ڈاٹ کا آدمی ہو گا۔“ راحیلہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”نہیں۔“ میں نے نہ جانے کیوں نفی میں سہلاتے ہوئے دھوکے سے کہا۔ ”اتنی اچھی دیر کے لیے اس طرح قوی مقرر کر کے کسی کی نگرانی کرانا ریلوے ڈاٹ کا انداز نہیں ہے۔ اس طرح تو انہوں نے بھی میری نگرانی نہیں کی جس کے ساتھ ان کی اتنی کھینچا تانی چل رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ جب چاہے ہیں مجھے تلاش کر لیتے ہیں۔ بلکہ شاید میری نقل و حرکت ہر وقت ہی ان کے علم میں رہتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ تمہارے اس ٹھکانے سے بھی واقف ہیں۔ اس کے بعد تو وہ جیسی سامنے آتے ہیں جب انہیں کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح کھیاں مارنے کے لیے وہ اپنا کوئی آدمی نہیں بٹھاتے۔“

”لیکن لاش غائب کرنے کا اندازہ؟“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

”یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ انداز تو کسی بھی منظم جرائم پیشہ گروہ کا ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور ٹیلی فون اپنی طرف کھٹکا لیا۔ فون پر فونی سے رابطہ کر کے میں نے راحیلہ کی دی ہوئی چٹ پر لکھا نمبر سے بتاتے ہوئے کہا۔ ”اس گاڑی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور مجھے مطلع کرو۔“

میں نے ریمپرور رکھا تو راحیلہ بولی۔ ”فونی اس قسم کی معلومات آسانی سے حاصل کر لیتا ہے؟“

”ہاں۔ بہت آسانی سے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہر جگہ ہر ادارے میں اس نے کسی نہ کسی کو ’ذری سرکل‘ کا چھوٹا سا تجربہ رکھا ہے۔ دیے گئے انکوائریوں میں کچھ نہ کچھ لوگ تھوڑا بہت قصاصدہ لے کر ضروری معلومات فراہم کو پتے ہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بہت سے لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات اہم راز بھی اس طرح ایک آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات راز فروخت کرنے والوں کو علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کے

زادہ ذرتے تھے۔ راحیلہ ایک چٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اس کی مدد سے کوئی سراغ لگانا چاہو تو اپنی سی کوشش کرو سکتا۔ یہ اس گاڑی کا نمبر ہے۔ میں نے دور بین سے نوٹ کر لیا تھا۔“

میں نے چٹ اپنی جیب میں رکھ لی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آ رہا ہوں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ راحیلہ نے میرے پیچھے لپکتے ہوئے پوچھا۔

”میں اپنے طور پر تھوڑی سی تفتیش کرنے کی کوشش کرنا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

غمارت سے نکل کر میں پیدل اس مقام تک پہنچا جہاں میں نے گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ راحیلہ کے اپارٹمنٹ سے یہاں تک خاصا فاصلہ تھا۔ غیر محسوس طور پر میں نے راحیلہ کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ گولی وہاں سے آئی تھی۔

اپتال کے گیٹ پر ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ اب اپتال میں کچھ آمد و رفت بھی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے بظاہر سرسری سے انداز میں چوکیدار سے پوچھا۔ ”کچھ دیر پہلے یہاں کیسا ہجوم سا لگا ہوا تھا؟ خیمہ تھی؟“

”کیا اپتال میں کچھ ہو گیا تھا؟“

”وہی شاید وہ میرے سوال کا جواب نہ دیتا لیکن بات اپتال کی اتنی تو فوراً اس کا دفاع کرتے ہوئے بولا۔ ”میں صاحب! اپتال میں کیا ہو رہا تھا۔ ادھر گاڑی میں کوئی آدمی بیٹھا تھا۔ کوئی اس کو گولی مار کر ہٹا دیا۔ یہ نہیں چلا کون مار گیا۔“

”لاش اور گاڑی کدھر گئی؟“ میں نے تجسس سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

چوکیدار نے ٹھک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور قدرے تامل کے بعد جواب دیا۔ ”خفیہ پولیس آئی تھی وہ لاش اور گاڑی لے گئی۔“

”خفیہ پولیس؟“ میں نے دہرایا۔ ”تمہارا مطلب ہے وہ لوگ سادہ لباس میں تھے؟“

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا اور گویا میری بے وقوفی پر التوس کرتے ہوئے بولا۔ ”ظاہر ہے صاحب! خفیہ پولیس والے تو سادہ لباس میں ہی ہوتے ہیں نا۔ انہوں نے آکر لوگوں کو ڈانٹا کہ ادھر جمع کیوں لگا ہے سب جا کر اپنا اپنا کام کرو۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھے اور لاش سمیت اس کو لے گئے۔“

”انہوں نے کسی سے کچھ پوچھا نہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

چوکیدار نے نفی میں سر ہلایا اور میں کبھی سامنے لے کر وہ گیا۔ ظاہر ہے وہ پولیس والے نہیں ہو سکتے تھے۔ میرے لیے اتنا ہی جانتا گا تھا۔ میں ملحق ملحق راحیلہ کے اپارٹمنٹ میں لوٹ آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ لوگ کتنی آسانی سے لاش اور گاڑی لے کر غائب ہو گئے تھے۔



راجیلہ مسکرائی۔ "افسانوی سی باتیں لگتی ہیں۔ تو کمال تو لوگ دوسروں سے چندہ جگ کر کے کسی بیوہ کو ایک سلائی مشین بھی دیتے ہیں تو کوشش ہوتی ہے کہ سارے اخباروں کے فرزند بچا کر تصویر چبے۔"

"ہمارے ذہن افسانوی سے ہی تھے ہمارے اندر عجیب مضطرب سی دو صحن متعبد تھیں۔ ہم اس دنیا کو بدل دینا چاہتے تھے۔ ہماری بچپن کی محرومیاں ہمیں متنی راستوں پر زیادہ دور لے جانے کے بجائے مثبت اور تعمیری راستوں پر لے آئی تھیں۔ ہم جیسے بچپن گزارنے والے اور ہم جیسے حالات سے دو چار رہنے والے عمو چور ڈاکو بن جاتے ہیں اور زندگی بھر معاشرے کو کوسے رہتے ہیں کہ اس نے ان کے ساتھ یہ کچھ ادا نہ کیا لیکن ہم بڑائی سے اچھائی کی طرف آگئے۔ نہ جانے قدرت نے ہمیں یہ کس چیز کا انعام دیا تھا۔"

"نیت کا۔" راجیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم سب کے اندر ایک اچھا آدمی موجود تھا اور اچھی بات یہ ہوتی کہ وہ آدمی مرائی نہیں "ٹھانڈا ایسا ہی ہوا ہو۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم محسوس کرتے تھے کہ بعض مسائل قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے حل نہیں کیے جاسکتے اور بعض اوقات قانونی یا دوائی طریقوں سے کسی کی کوئی مدد نہیں کی جاسکتی۔ اکثر ہمیں یہ بھی نظر آتا کہ جہاں کسی کو کسی بھی قسم کی ذرا سی بھی طاقت حاصل ہے وہاں اس نے کمزور کی زندگی کو تباہ کر رکھی ہے۔ اس چیز نے ہمیں خدائی فوجدادوں کے سے انداز اور اطوار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں بھی منوج ملک ہم کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ بہت سے علاقوں کو ہم نے بد معاشرلوں سے صاف کیا بہت سے لوگوں کے دماغ درست کئے۔ بہت سے فرعونوں کے زہنوں سے فرعونیت کھینچ کر نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن۔۔۔" میں نے جملہ اوصو را وجود کرکری سانس لے کر کرکری کے پٹے سے ٹیک لگا لیا۔ "لیکن کیا۔۔۔؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔ وہ بڑے افسانہ کا سے میری کہانی سن رہی تھی۔ شاید میرا تجزیہ کرنا چاہتی تھی۔ "لیکن بھر میں تھک گئے کچھ نا امید سے ہو گئے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم نے محسوس کیا کہ ہماری کوششوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ معاشرہ جہاں کہتا تھا کھڑا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہم معاشرے میں کوئی انقلاب نہیں لاسکتے۔ اس کے لیے کٹا کی تبدیلی کی ضرورت تھی جس میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے ہماری سرگرمیاں خود بخود محدود ہوتی چلی گئیں۔ لیکن اب بھی ظلم و زیادتی کا کوئی راندہ اگر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو وہ نہیں سکتے۔ کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری زیادہ کارروائیوں کی۔ میں اب صرف یہ نظریہ دیکھتا ہوں کہ کوئی ہمارے ساتھ زیادتی نہ کرنے پائے۔ ہم زیادہ مستعدی اور طاقت کے ساتھ اسی وقت حرکت میں آتے ہیں جب کوئی ہمارے ساتھ زیادتی نہ کرے۔"

لے کتے اہم ثابت ہوں گے۔"

"وہ تنہی انداز میں سر ہلانے لگی۔ پھر بولی۔ "تم نے "دی سرکل" کو کافی منظم کر لیا ہے۔ سب بڑے باصلاحیت لوگ ہیں۔" "ہاں۔ میں نے کم سے کم آدمیوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی پکڑ لیا۔ پانے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔

"تم نے "دی سرکل" کو منظم کس لیے کیا تھا؟" اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "انڈیو لے رہی ہو میرا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ مجھے واقعی تجسس ہو رہا ہے۔ تم اپنی جس اہم میٹنگ میں مجھے لے گئے تھے اس میں تقریباً سبھی کچھ میری سمجھ میں آ گیا لیکن اس پمپو پر کوئی خاص مدد دینی نہیں پڑی کہ آخر ہمیں "دی سرکل" بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟"

"ضرورت تو کوئی خاص نہیں تھی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مگر نہ ہی میں نے اسے بنایا۔ یہ خود بخود ہی بنتا چلا گیا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا کوئی باقاعدہ خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی مجھے کچھ پٹا تھا۔ اس کے قیام کا کوئی اعلان ہوا تھا اور نہ ہی کہیں کانفرنس میں اس کا کوئی دورو ہے۔ بس یہ ایک "زبانی کھائی" قسم کی تنظیم ہے جس کا نقشہ صرف ہمارے ذہنوں میں ہے۔"

"پھر بھی ذہن میں کچھ تو ہو گا؟"

"ان میں سے بیشتر میرے پرانے ساتھی ہیں۔ بعض تو لڑکپن سے میرے ساتھ ہیں۔ ہم سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ ہم سب وہ لوگ تھے جن کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور ہم سب کا بچپن یا لڑکپن قابلِ رحم حالات میں ہی گزرا تھا۔ ابتدا میں اسی چیز نے ہمیں ایک دوسرے سے بندھا رکھا تھا۔ پھر ہماری لائنیں بھی ایسی بن گئی کہ منظم اور حیدر رہنا ہماری ضرورت تھا۔" میں نے بتایا۔ "اس زمانے کی بات کر رہے ہو جب ادرحہ کا مال اُدھر کرتے تھے؟"

"ہاں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "پھر جب ہماری زندگیوں میں سدا حار قبا تو ہم نے سوچا۔ ہمیں اپنے اتحاد و اتفاق کو نہ صرف پہلے ہی کی طرح برقرار رکھنا چاہئے بلکہ اسے کوئی مثبت اور تعمیری رخ بھی دینا چاہئے۔ پھر جوں جوں دولت آئی گئی ہم نے جدیہ سازو سامان کا بھی سارا لیا۔ زیادہ منظم ہوتے گئے۔"

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کچھ یادوں کی موندلاہٹ میں جھپٹتے ہوئے کہا "ابتدا میں ہمارا کردار کچھ خدائی فوجدادوں کا سا بھی رہا۔ کہیں کسی مظالم کو دیکھتے تو اس کی مدد کرتے۔ مالی، جسمانی اور فطرتی طور پر "فرض" یہ کہ ہر طرح سے ضرور حقدوں کے کام آئے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات ہم کسی کا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیتے اور اسے ہمارا نام تک معلوم نہ ہوتا۔"

ہے اور ہم سے اچھے کی کوشش کرتا ہے۔ ورنہ ہم اپنے کام سے اچھے نہیں ہوتے۔

"یعنی تم بھی اس معاشرے کے دھارے میں بہ رہے ہو!"  
 رابطہ حاشانہ سے انداز میں مسکرائی۔ "میاں کا اصول ہے کہ ہر طرف اسی کو سمجھا جاتا ہے جو اپنے گھر کو گئے۔ ورنہ چاہے ان ہاں سب کچھ جلتا رہے، لوگ نظر پڑا کر گزرتے رہتے ہیں۔ صرف اسی کو سمجھا جاتا ہے جو اپنے سر پر پڑے۔ کسی دوسرے کی مصیبت ہمارے لیے کوئی مصیبت نہیں ہوتی۔ اپنے دھرم میں چسپی چھانیں بھی بہت تکلیف دیتی ہے۔ دوسروں کا چاہے وہ بد چلتی ہو جائے، ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینتی۔ عجیب قسم کی کازمانہ ہے۔"

"ہاں۔ ہم سب سادھی بھی بہت عرصے تک ایک دوسرے کے سامنے ان باتوں کا دوا دوتے رہے لیکن اسی نتیجے پر پہنچے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں۔ ہماری حیثیت صرف چند قطروں کی ہے۔ ہمارے پاس اس سمندر کو صاف شفاف بنانے کا کوئی رشتہ نہیں۔ ہماری طاقت ہمارے وسائل اس کے لیے نا کافی ہے۔"

"چنانچہ تم چند قطرے بھی اس سمندر کا حصہ بن گئے!"  
 رابطہ نے گہری سانس لی۔

"نہیں۔ یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا۔" میں نے سوچتے ہوئے لہ۔ "ہم اپنے طور پر تو ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہماری پیشہ یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ ہماری ات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ہم اپنی طاقت کا کوئی ناجائز استعمال نہ کریں۔ اس اعتبار سے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس بلا کا حصہ نہیں ہیں۔ اس سمندر میں غائب نہیں ہوئے ہیں۔"

"پھر بھی۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں نے اپنی جدوجہد رک کر دی۔" رابطہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "اسی طرحی تم لوگ مایوس ہو گئے۔ اگر سب لوگ تمہاری طرح سوچتے گئے تو اس دنیا میں تیسری کام تو بالکل ہی بند ہو جائیں۔ دنیا میں لوگوں اسی طرح تو قائم ہے کہ بڑائی اپنے ہاؤں پھیلانے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور اچھائی اپنی جگہ بناتی رہتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی دنیا سے عمل طور پر ختم نہیں ہو سکتی۔ یہی قدرت کا کام ہے۔ تاریکی دنیا میں کتنی ہی بڑھ جائے لیکن اہمیت بہر حال روشنی ہی کی رہتی ہے۔ تم نے وہ کمات بھی نہیں ہوئی کہ دنیا بھر کی لوگوں کی کبھی ایک چراغ کو نہیں بجھا سکتی۔ جنہیں اپنا چراغ روشن رکھنا چاہتے تھے۔"

"پھر اب بھی روشن ہے لیکن اب وہ میرے دل میں روشن ہے۔" میں نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ "بلکہ چراغ بھی ٹکسے ایک شعلہ ہے جو ہر وقت جیسے میں دھماکا دیتا ہے، اٹھ اٹھ ہی انداز جلائے جاتا ہے۔ میں بظاہر جتنا مطمئن اور

پر سکون نظر آتا ہوں اندر سے اتنا ہی مضطرب اور بے چین ہوں۔ میرے لاشعور میں گویا ایک دھندلی سی خواہش بسی ہوئی ہے کہ مجھے کوئی بہت بڑا کام سرانجام دینا ہے۔ کوئی بہت ہی اہم اور بہت ہی بڑا کام۔ لیکن مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ وہ کام کیا ہوگا یا کیا ہو سکتا ہے؟ مجھ جیسا آدمی جس کے ساتھ صرف چند جاں نثار سادھی ہیں، بھلا کر بھی کیا سکتا ہے؟"

"آج مجھے تمہارے حوالے سے ایسی باتیں سن کر بہت حیرت ہو رہی ہے۔" رابطہ کی آنکھوں میں واقعی حیرانی تھی۔ "تم تو بہت طاقتور آدمی ہو۔ تمہارے پاس اچھے خاصے وسائل ہیں۔ دنیا میں تو نہایت کرپور اور فحشی تھی دست لوگ بڑے بڑے کارنامے انجام دے گئے ہیں بڑے بڑے انتظامات بڑا کر گئے ہیں۔ میں تو تمہیں بڑا باعزم اور بہت بلند حوصلہ انسان سمجھتی تھی۔"

"وہ تو میں ہوں۔" میں نے کہا "لیکن جن مسائل کا مجھے سامنا ہے ان کے لیے صرف یہ خصوصیات کافی نہیں ہیں۔ ان کے لیے کسی اور ہی طرح کی طاقت ضروری ہوتی ہے۔" "ممکن ہے ریڈ ڈاٹ کا خاصہ ہی قدرت نے تمہارے ہاتھ سے کرنا ہو۔ تمہارا یہ کارنامہ کیا کم اہم ہوگا؟" رابطہ نے خیال ظاہر کیا۔

"مجھے یہ بھی ممکن نظر نہیں آتا۔" میں نے دباؤ ڈالی سے کہا "میں خوش فہمیوں میں رہنے کا عادی نہیں۔ میں تکلیف دہ وہ تک حقیقت پسند انسان ہوں۔ میرے سوا ابھی تک کسی کو بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ ریڈ ڈاٹ درحقیقت ہے کیا چیز۔ دنیا کا پانچ طاقتور ترین سفید قام قوموں نے۔۔۔ پانچ طاقتور ترین ملکوں نے اپنے وسائل اس کے لیے وقف کر دیے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک ملک ایسا ہے جس کی ایک ایک کپٹی کا بجٹ ہمارے کل بجٹ سے زیادہ ہے۔"

"یہ سب تو مجھے معلوم ہے۔ تم یہ سب کچھ تمام ساتھیوں کو بتا چکے ہو۔ مجھے برسات کا اندازہ ہو چکا ہے۔" رابطہ بولی۔ "اس کے باوجود تم مجھے خواب دکھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ریڈ ڈاٹ کے پیچھے انتخابی اور بھی سچ کی عالمی سیاست کام کر رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے، ہم جیسے ملک تو اس کے دہرہ اور اس کی سرکرہ میں سے آگاہ ہو جانے کے بعد بھی اس سے چشم پوشی کریں گے۔ اٹھان بے دریں گے۔ اس صورت حال میں مجھ جیسا غیر اہم آدمی بھلا کیا کر سکتا ہے جس کا بین الاقوامی سیاست سے تو کیا، ملکی سیاست سے بھی دور دور کا کوئی تعلق نہیں۔۔۔ جن کے کوئی سائنسی وسائل نہیں، جس کی دولت ان لوگوں کے سامنے خاک کی بجلی جیسی اہمیت بھی نہیں رکھتی۔"

"واقعی بعض اوقات ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند ہونا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔" رابطہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے میں بیٹھ گئی۔ وہ گہری سوچ میں تھی۔

افسانوی انداز میں ہو جاتے ہیں۔

شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہ میرے اپنے فلسفے تھے، درود بخیر یاد دل رہی تھی۔ اس کے سر میں ہاتھ جو بظاہر نرم و نازک نظر آتے تھے، ضرورت پانے پر فولاد ہو جاتے تھے۔ یہ ہاتھ میرے کندھوں پر آتے تھے، گئے تو گویا میرے کندھوں سے منہ بوجھ رہا گیا تھا۔ ٹھنک، زہین اور بہادر صاحبی پانی پتھر تھے کی طرح ہوتے ہیں۔ جب آپ ڈوبنے لگتے ہیں، مایوسی و دل شکستگی کے

سمندر میں غوطے کھا رہے ہوتے ہیں تو وہ آپ کو سارا دیتے ہیں اور کبھی کبھی آپ کو ساحل پر پہنچانے کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ میں نے اپنا وجود ہلکا ہونے اور اپنے اندر سے کوئی زہد چھیننے محسوس کی۔

راجلہ ٹھیک کہہ رہی تھی، یقیناً خود امدادی یا جذبہ۔ میں خوار اسے کوئی بھی نام دے لیتا لیکن ہر حال وہ ایسی ہی کوئی چیز تھی، زندگی میں قدم قدم پر میرے کام آتی تھی، جس نے میرے لیے ناممکن کو ممکن بنایا تھا۔ پھر میرے پاس ایک سے ایک بڑھ کر ماضی موجود تھا۔ مجھے اتنا فکر مند نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے اندر کی ان کیفیات کو صرف راجلہ ہی محسوس کر سکتی تھی کیونکہ وہ میری آنکھوں کی کھڑکیوں سے میری مدد میں جھانک جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ انہی درجہوں سے جھانکتے ہوئے تھ۔ ”ویسے بات کیا ہے؟ بظاہر تو تم وہی افضل چودہری نظر آ رہے ہو، لیکن تمہارے اندر وہ بلبلاؤں کو گونگائی میں ڈال دیتے ہیں، تمہاری شخصیت کو غیر معمولی اور ناقابل شکست بناتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ ہوا ہے، کم از کم مجھے تو یاد ہے۔“

”میں دراصل ریڈ ڈاٹ کے ایک اور ٹھکانے کی سرک کے تار ہوں۔ ایک اور کارخانہ عجیب کا نظارہ کر کے آیا ہوں۔ کچھ اور باتیں میرے علم میں آئی ہیں جنہوں نے مجھے انصرود کر دیا ہے، مگر حیران ہوں کہ یہ الف لیلیوی دنیا میں ہماری ناک تھے کہیں آباد ہو، لیکن ہمیں کبھی نظر کیوں نہیں آئی۔ بڑی بڑی خفیہ چیزیں نظر رکھنے والوں کی نظر ان تک کیوں نہیں آتی۔“

”تم اب ان درود پاک سوالوں کو چھوڑو اور شروع سے مجھے بتاؤ، کیا ہوا تھا؟“ ”یہ تو ہے اتنی دے بولی اور دوبارہ کر رہی ہے، باتیں کر رہی ہے، کس نے میرے قریب کھڑے ہوئے؟“

میں نے ایک لمحے سوچا پھر اسے ان تمام واقعات کی تفصیل سنائی جو مجھے اسلام آباد میں پیش آئے تھے۔ میں خاموش رہا اور سر جھٹک کر بولی۔ ”واقعی یہ سب کچھ سن کر مر رہا ہوں، یہ سب ہونے لگا ہے لیکن سر قہام کر بیٹھنے سے تو کچھ نہیں ہو گا۔“ ”سوچا ہے؟ کیا تم نے وہی طور پر ان کی جھٹک قبول کر لی ہے؟“ ”جان چمڑانے کے لیے ان کے سامنے ہائی بھر کے پلے تھے، وہ ہر جہاز کے لیے ان سے جان چمڑا لیتا تو سب سے کامل تھے۔“

پھر یکدم ہی وہ میرے سامنے رک کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”افضل چودہری! تمہیں معلوم ہے؟ دنیا میں سب سے طاقتور چیز کیا ہے؟“ ”نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔“ ”میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”انجمن مت بونہ۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ اس کے دونوں ہاتھ ناز و زر کی جیبوں میں تھے اور گردن نخوت آمیز سے انداز میں اٹھی ہوئی تھی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ دنیا میں سب سے طاقتور چیز جذبہ ہے۔ جذبہ اس دنیا میں بڑے بڑے مجرّمے دکھاتا ہے۔ جذبہ طاقتور اور صادق ہو تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ اگر تمہارے اندر جذبہ سر گیا ہے تو پھر واقعی مجھے افسوس ہو گا۔ پھر میں کبھی کی واقعی تمہارے پاس کچھ نہیں دے گا، تم جی دست ہو گئے ہو۔ لیکن اگر تمہارے سینے میں جذبہ زندہ ہے تو پھر تم دنیا بھی فتح کر سکتے ہو۔“

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ میرے دل کے کسی گوشے میں جذبہ کہیں موجود تھا لیکن شاید دھول میں اٹے ہوئے ہیرے کی طرح تھا۔ بے در پے جھلکوں نے اس پر مایوسی کی دھول مٹا دی تھی۔ شاید ریڈ ڈاٹ کی شکست عملی کامیاب رہی تھی۔ شاید اس نے نفسیاتی طور پر مجھے فتح کر لیا تھا۔ شاید اس کا مقصد مجھے مرعوب کرنا ہی تھا۔ کسی کو مرعوب کر لینا اسے تقریباً فتح کر لینے کے برابری تھا۔

میں..... جو بہت سرکش تھا، بہت خود مرغا، شاید اندر ہی اندر مایوسی کی دھول میں دھنس رہا تھا۔ میں..... جو اپنے آپ کو بہت حوصلہ مند سمجھتا تھا، درحقیقت شکست کو قبول کر رہا تھا اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو ایس کے لیے تیار کر رہا تھا۔

راجلہ..... جس کا تعلق منصف نازک سے تھا، جو میرے خیال میں مدد کی محتاج تھی، جسے میں اپنی حفاظت میں رکھنے کے لیے کراچی سے لایا تھا، جسے اپنے جان سے پیارے بھائی کی موت کا سانحہ دیکھے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا، وہ راجلہ مجھے تسارا دے رہی تھی، میرا ہاتھ تمام کر مجھے ایک انتہائی دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ بھی زندگی کی ایک نئی قسم عمر تھی۔

وہ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں سے سب کچھ چھین جائے، ہمارا سب کچھ ٹٹ جائے، پروا مت کرو۔ اپنے آپ کو جی دست مت سمجھو۔ بس جذبے کو زندہ رکھو۔ اگر تمہارے اندر جذبہ زندہ ہے تو جس کسی وقت بھی تمہارا مقدر دین کچھ ہے۔ تم تو مجھے سمجھایا کرتے تھے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے کی کوشش کی۔ ”میں تو صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر رہا تھا۔“

”میری مائدہ حقیقت پسندی کو۔“ وہ جھٹکا کر بولی۔ ”حقیقت پسند ہو کر مارتے زیادہ نہیں کر بہت ہارنے لگو۔ بعض اٹھوئے کام بڑے

بولی "اور میں جنہیں یہ بھی تاہوں کہ انہوں نے بھی اگر مجھے کوئی مشکوک شخص نظر آیا جس کے بارے میں مجھے یہ یقین ہو گیا کہ وہ میرا تقابلاً شرابی کر رہا ہے تو وہ زندہ نہیں بنے گا۔"

"چاہے وہ کوئی عام سائنس کا یا دل پیچک اور فٹ اٹھا قسم کا عاشق ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آخر تم ایک خوب صورت لڑکی ہو، جنہیں سربراہ دیکھ کر کسی کی بھی رال ٹپک سکتی ہے۔ کوئی بھی تمہارے پیچھے نہیں بھاٹا، بالوں کو جھٹکے رہا، جنہیں مگر تک پہنچانے کے لیے روانہ ہو سکتا ہے۔ کسی بھی نو دہلیزے کمرانے کا چشم و چراغ اپنی قیمتی گاڑی میں ہاں ہاں کرنا تمہارے پیچھے آسکتا ہے۔ کیا تم اتنی سی بات پر انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دو گی؟ اس طرح تو فہرست بہت لمبی ہو جائے گی کیونکہ یہ قاتلا تو ہماری گلیوں بازاروں میں ہر وقت ہوتا ہے۔"

"ہیں تو وہ بھی اسی قاتل۔" وہ کافی پرکولر سے مگوں میں اٹھ پڑے ہوئے بولی "لیکن تم کہتے ہو تو میں اس جھپٹلاہٹ پر قابو رکھوں گی اور بیشہ کی طرح ان کی صرف دو چار ہیلیاں پھٹنے پر ہی استغنا کر دوں گی۔ لیکن مشکوک لوگوں کو میں نہیں چھوڑوں گی، خواہ نتیجہ کچھ بھی نکلے اور خواہ تم کچھ بھی کہو۔"

"تم نے تو شروع میں ہی 'دی سرکل' کے قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ ابھی تو تم کا تم مقام چیئر پرسن بھی نہیں بنیں۔ جنہیں مطوم ہے 'دی سرکل' میں میری ہدایات کی خلاف ورزی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔" میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

یہ تو نہیں مطوم ہے۔" میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ان آنکھوں کی چمک ذرا بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے براہِ عملہ لگا تھا۔ یہ آنکھیں اسی نوخیز اور نو عمر راحیلہ کی آنکھیں تھیں جس سے میں نے لڑکپن میں عشق کیا تھا۔ وہ کسی خیال میں گم، نہیں انداز میں سرلائے گئی۔ میں نے پوچھا "تم کیا کہتی ہو؟ کیا میں دوسرا فرد، خفیہ صاحب کو قتل کرانے اور اپنے ملک کو تباہی و غلامی کی ایک بھیانک دلدل میں دھکیلنے کا ذریعہ بن جاؤں گا امریکا میں جس دستاویز پر دستخط ہوں گے تم اس کا مطلب سمجھ رہی ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔" اس کے پتلے پتلے یا قوی ہونٹ ایک لمحے کے لیے پھینک کر رہ گئے "ہماری حالت غلاموں سے بدتر ہوگی۔ ہم اس دستاویز کے مطابق چلیں گے تب بھی مارے جائیں گے اسے ماننے سے انکار کریں گے تب بھی مارے جائیں گے ہم 'آگے کنواں اور پیچھے کھائی' والی صورت حال سے دوچار ہوں گے۔ ہمارے آباد اچھاو کی انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد، لاکھوں چالوں کی قربانی، چالیس سال کا ہمارا جیسا تیسرا سفر۔ سب رائیگاں ہو کر رہ جائے گا۔ ہم ایک بار پھر وہیں کھڑے ہوں گے جہاں سے چلے تھے۔"

"بلکہ اس سے بھی بدتر کسی مقام پر۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے کپٹیاں مسلیں پھر یکدم اٹھتے ہوئے بولی "میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

مجھے معلوم تھا، میری رام کمانی سن کر اس کے اعصاب پر بھی بوجھ پڑ چکا تھا۔ وہ چند منٹ کے لیے توجہ ہٹا کر اپنی تھی لیکن ان کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اپنے ذاتی مسائل ہوتے تو انہیں ذہن سے جھٹک دیا جاتا، یہ تو ذہن کی طرح رنگ و پے میں اتر جائے والی سوچیں تھیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے کچن کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بظاہر وہ جمیل ہی کی طرح پُر سکون تھی۔ میں نے چمک کے سارے کمرے ہوتے ہوئے کہا "الیہ یہ ہے کہ کوئی ہماری بات پر یقین نہیں کر رہا۔"

"دوسرا الیہ یہ ہے کہ ہماری کوئی بات راز نہیں رہتی۔ ہمارا ہر لفظ کا ہماری ہر سرگرمی ریڈ ڈاٹ والوں کے علم میں آجاتی ہے۔ مجھے تو سب سے زیادہ جھپٹلاہٹ اسی بات سے ہونے لگی ہے۔ اس سے ہم بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔" راحیلہ، ٹک ٹک ٹک میں رکتے ہوئے بولی۔

"شاید اسی جھپٹلاہٹ میں تم نے اس شخص کو کوئی باری۔" میں نے کہا۔

"کوئی تو میں نے اسے بہت خود غرض کے بعد بہت سوچ سمجھ کر ماری تھی لیکن تمہارا خیال کسی حد تک درست ہی ہے۔ شاید اس میں میری جھپٹلاہٹ بھی شامل رہی ہو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی سیاسی زندگی اور کارناموں پر مشتمل حوالہ جاتی کتاب۔۔۔۔۔

عظیم مدبر عظیم قائد

☆ --- زاہد حسین انجم

قیمت: 125/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

باتیں ہیں۔

”میں نے تو سب کچھ ہی ذہن سے جھٹک دیا ہے۔“  
 مسکراتے ہوئے بولی ”میں تو آج کل ایک عجیب غالی لڑائی کے  
 سے عالم میں دن گزار رہی ہوں۔ ایک لحاظ سے یہ بڑی خوش قسمتی  
 کی بات ہے کہ میں اپنے آپ کو ہر فکر سے بے نیاز محسوس کر رہی  
 ہوں۔ اس وقت تکہ اور غم و غیو بھی مجھ پر اثر انداز نہیں  
 ہو رہے۔ شاید میرا ذہن میرے محسوسات بالکل شل ہو گئے ہیں  
 لیکن تمہاری طرح میرے دل کی گمراہیوں میں بھی کہیں ایک شکل  
 ضرور روشن ہے۔“

”بس یہی نصیحت ہے“ میں نے جلدی سے کہا ”یہ اس بات کی  
 نشانی ہے کہ ابھی تمہارا انتقال چرچال میں ہوا۔ ابھی تم زندہ ہو۔“  
 پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”تم بڑا طعنہ دے رہی تھیں  
 کہ ہم لوگ ریڈ ڈاٹ کے مسئلے پر ناک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اگر  
 تمہارے ذہن میں کچھ ہے تو بتاؤ۔ نہیں کیا کرنا چاہئے؟“

”میں اگر کچھ کہوں گی تو اچانک ہی کرکڑوں گی۔ سامنے تو  
 میرے بھی کچھ نہیں ہے۔“

”دیکھا؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ باتیں کرنا بہت آسان  
 ہوتا ہے اور کچھ کر کے دکھانا بہت مشکل۔“ میں نے مسکراتے  
 ہوئے کہا ”تقید دینا کا آسان ترین کام ہے۔“

”جوش دلا رہے ہو مجھے؟“ وہ کان کانک ہونٹوں کی طرف لے  
 جاتے ہوئے مجھے گھور کر بولی ”اگر اس طرح کی باتیں کرو گے تو میں  
 تمہاری اس نصیحت کو بھول جاؤں گی کہ جوش کو ہوش پر غالب نہ  
 آنے دیا جائے۔“

”جوش میں آکر کیا کرو گی راحیلہ ڈیر؟“ میں نے لالحت سے  
 پوچھا ”وہاں سے نکلیں باؤں کی ڈانگن لے کر ہوا میں گولیاں  
 چلائی ہوئی مسکوں پر دوڑنے لگوں گی؟“

وہ چند لمحوں پر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ آخر کار  
 طویل سانس لے کر بولی ”واقعی اس معاملے میں یہی مشکل ہے۔  
 جوش بھی کچھ کام نہیں آسکتا۔“

”یہی تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوشش میں  
 میں مجھے جو بھی واقعات پیش آئے ہیں ان سے مجھے اتنی تکلیف  
 نہیں ہوئی جتنی اذیت میں نے اس بے بسی کے احساس کی وجہ سے  
 اٹھائی ہے۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی میں مجھے  
 ایسی صورت حال سے بھی واسطہ پڑے گا کہ آپ کا دشمن تو جب  
 چاہے آپ سے رابطہ قائم کر لے“ جب چاہے آپ کو اٹھالے  
 اور... جو چاہے کر کر دے لیکن آپ کے سامنے اس کا خفیہ ما  
 بھی سراغ نہ ہو“ آپ کو اس کے کسی ٹھکانے کا علم نہ ہو۔ آپ  
 اس کے احوال میں غلطو باتیں دہرائیں بیٹھے بس بیچ و تاب کھاتے  
 رہیں۔“

راحیلہ اب تھیں انداز میں سرلا رہی تھیں۔ میں نے بات

”جیسی ریڈ ڈاٹ کے مسئلے پر سب ناک ٹوئیاں مار رہے  
 ہیں۔“ وہ مت پرکربولی ”جہاں سب اختیارات کسی ایک شخص کی  
 ذات تک محدود ہو جاتے ہیں وہاں گاڑی پکھوے کی رفتار سے چلتی  
 ہے۔“

”جہاں سب مرضی کے مالک ہوں وہاں تو گاڑی بالکل ہی  
 نہیں چلتی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے ٹرے اٹھائی اور ہم قسمت کے کمرے میں لوٹ  
 آئے۔ کافی ٹاک اٹھاتے وقت وہ کمری سوچ میں تھی۔ شاید میری  
 بات پر غور کر رہی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”میں مذاق کر رہا  
 تھا۔ ہمارے ہاں اختیارات اور بے اختیاری کا کوئی چکر نہیں۔  
 ہمارا ہر آدمی کسی بھی صورت حال میں کوئی بھی قدم اٹھانے کے  
 لیے آزاد ہے۔ سامعہ اگر مجھے احترام دیتے ہیں، میرے اشارے  
 کے منتظر رہتے ہیں تو یہ ان کی محبت ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ مجھ پر بھی  
 حکم چلا لیتے ہیں۔ جہاں کسی صورت حال کو وہ زیادہ بہر طور پر سمجھتے  
 ہیں اور ان کے خیال میں میرا فیصلہ صحیح نہیں ہوتا وہاں ان کی چلتی  
 ہے۔ میں چپ رہتا ہوں۔ ہمارا کوئی نظام کوئی نگہ بندھے قاعدے  
 ضابطے یا منشور اور آئین قسم کی چیز نہیں ہے۔ اس کے باوجود  
 ہمارے ہاں سب سے زیادہ ڈسپلن ہے۔ کیونکہ بات صرف نیت  
 درست ہونے کی ہوتی ہے۔ نیت درست ہو تو انتشار اور بد فہمی  
 خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ نیت درست نہ ہو تو دنیا جہان کے  
 قاعدے، ضابطے بھی کسی پر ٹھونس کر اسے اچھا آدمی نہیں بنایا  
 جاسکتا۔ تم اپنے فیصلوں میں بالکل آزاد ہو۔ بس کوشش کرنا کہ  
 جذبات کو عقل پر غالب نہ آئے۔ دو۔“

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ راحیلہ نے فون اٹھایا اور دوسری  
 طرف سے کچھ سن کر میری طرف بڑھا دیا۔ وہ ٹوٹی تھا۔ میری آواز  
 سن کر بولا ”مرا آپ نے گاڑی کا جو نمبر یاد تھا وہ غلط ہے۔ یعنی اس  
 ترتیب سے رجسٹریشن آفس کے ریکارڈ میں کوئی نمبر موجود نہیں  
 ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ نمبر پلیٹ ہی جعلی تھی۔“

”ٹھیک ہے مجھے اسی قسم کی کوئی بات معلوم ہونے کی توقع  
 تھی۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے یہ بات راحیلہ کو بتائی تو وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دیتے  
 ہوئے بولی ”اگر تمہاری بات کو درست مان لیا جائے کہ وہ ریڈ ڈاٹ  
 کا آدمی نہیں تھا تو یہ گویا ایک اور نیا پراسرار سلسلہ شروع ہو رہا  
 ہے۔ پھر آخر وہ کون تھا اور اسے اتنے مضبوط سکون سے اس  
 اپارٹمنٹ کی گمرانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں تو اب اس کا عادی ہوتا جا رہا ہوں کہ جن سوالوں کا کوئی  
 جواب کبھی میں نہ آئے ان کے لیے وقت کا انتظار کیا جاسکے۔  
 وقت خود بخود بعض سوالوں کے جواب سامنے لے آتا ہے۔ میں  
 نے بے برداری سے کہا ”تم بھی اس بات کو ذہن سے جھٹک دو۔  
 جس قسم کے حالات میں ہم کبھی رہے ہوئے ہیں ان میں یہ معمولی

### رومانی ناول

|       |                   |                  |
|-------|-------------------|------------------|
| 100/- | اسلم راہی ایم۔ اے | لڑکی اس گلی کی   |
| 100/- | اسلم راہی ایم۔ اے | اس جلتے جہاں میں |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | خدا کہاں ہے      |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | جلتے بچتے لوگ    |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | سیرا             |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | روتے کنول        |

ایشی حلوں تک سے محفوظ ہیں۔ میرا خیال ہے یہ شہر بھی کبھی یا شہر کا اٹھار نہیں تھا۔

”کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟“ راحیلہ نے دریافت کیا۔

”ان کے الف لیلیٰ انداز و اطوار دیکھ کر مجھے سب کچھ ممکن نظر آتا تھا۔ میں ان بکوں کو ایک برے سے دوسرے تک نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی کسی چیز کا کوئی تجزیہ کر سکا لیکن وہاں کے دودھ اور تمام چیزوں کی ساخت میں استعمال ہونے والا سیزل ان بکوں کی ڈیزائننگ اور مختلف اشیاء کی تصویریں سب کچھ مجھے غیر معمولی لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ان بکوں کو دریافت بھی کر لیا جائے اور وہ لوگ ان میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائیں تو ابھی بجلی فون بھی حملہ آور ہو کر ان بکوں کو تباہ نہیں کر سکتی۔“

راحیلہ گہری سنجیدگی اور خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے بعد میں نے کہا ”ابھی تو ہمیں یہ بھی صحیح طور پر معلوم نہیں کہ ان کے پاس کیسے کیسے ہتھیار اور کیسے کیسے سائنسی شعبے موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ وہ ابھی تک ہمیں دکھاتے رہے ہیں وہ تو محض چٹکے ہی تھے ضرورت پڑنے پر وہ جو کچھ سامنے لائیں گے وہ بہت تباہ کن ہو گا۔ تمہاری طرح جذباتی ہو کر ان پر چڑھائی کرنے والے تو ایک ہی بے بس گاجر مولیٰ کی طرح صاف ہو جائیں گے۔“

”کیسے تم غیر ضروری طور پر تو مرعوب نہیں ہو رہے؟“ راحیلہ نے جانتا چاہا۔

”میں مرعوب نہیں ہو رہا“ صحیح تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان باتوں کا بھی اندازہ لگا رہا ہوں جو انہوں نے مجھے نہیں بتائیں۔ اگر تم ان بکوں کو دیکھ چکی ہو تو شاید تمہارے محسوسات بھی یہی ہوتے۔ ابھی ان کی تعداد کے بارے میں بھی

باری رکھتے ہوئے کہا ”جن دشمنوں سے ہمارا کسی نہ کسی حد تک فتنے سامنے کا واسطہ تھا“ انہیں خواہ اپنی طاقت پر کنایہ مخنث تھا لیکن ان سے نکلنے میں ہمیں کوئی خاص مسئلہ پیش نہیں آیا“ ہم نے ان کا راز نہیں ان کے انعام کو پہنچا دیا۔ لیکن ریڈ ڈاٹ ایک تو اس طرحی دشمن نہیں ہے۔ دوسرے اس کے طریقہ کار نے تو واقعی مجھے بچ کر دیا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ بس تفریح ہی کے لیے ہمارے ساتھ چھپ چھپ کر جاتے ہیں۔ محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی تفریح ہے ورنہ جو بھی ان کا مقصد ہوتا ہے وہ انہیں مال میں پورا کیے ہی جا رہے ہیں۔“

راحیلہ کافی کا محو ت بھر کر بے چارگی سے منہ مانتے ہوئے بولی ”ہم سے تو قلم کا بیڑو سا بیڑو ہی اچھا ہوتا ہے۔ بیڑو کن یا بیڑو کی کوئی بہن و بیڑو ملیں اور کسی نامعلوم مقام پر دل کی گرفت میں لگا بیٹھا کر اسے پکارتی ہے اور وہ لاٹھی لے کر یا کسی غالی ہاتھ کی گھوڑے پر بیک بیک کرنا اور کبھی پیدل ہی اچانک وہاں نمودار ہو جاتا ہے۔ اپنی گرجن دار آواز سے آدھے کھینے تک دیواروں کو لرزاتا ہے۔ پھر کھینوں کے پٹنے لگاتا ہے۔ بانجھار اور بد فیروزوں کا لیڈ ہوتا ہے۔“

اس نے ایک اور محو ت بھر کر لٹری سائنس لی ”ہم تو بالکل اگاہ سے لوگ ہیں۔ ہمارے پاس جدید اسلحہ ہے“ تو ڈاٹ بہت لہجہ بیز ہے۔ جاں نثار سا بھی ہیں۔ جوش ہے“ جذبہ ہے“ مجھلاہٹ ہے“ بے خوفی و دلیری ہے اور ہم دشمن کا بال بھی بچا نہیں کر سکتے۔ یہ احساس بھی ہے کہ دشمن ہمیں کیسے“ اس پاس“ ٹاڈ ہمارے تاک تلے ہی موجود ہے مگر ہم اسے تلاش نہیں کر سکتے۔ غیر یقینیاں بھی اپنی ہی کوشش کر رہی ہیں۔“

”ان کے بارے میں“ میں زیادہ پوچھیں نہیں ہوں۔ معلوم نہ ہو کہ کوشش بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ آدھ میٹنگ میں مجھے تو کچھ باگیاہے انہوں نے زیادہ وقت میرے پاس کو کھنگالنے میں ہی صرف کیا ہے۔ بس یہ اہم کارنامہ انہیں وا انہوں نے“ میں نے

”جہیں ذرا بھی اندازہ نہیں کہ جن خفیہ ٹھکانوں پر ہمیں لے جایا گیا وہ کہاں واقع ہو سکتے ہیں؟“ راحیلہ کے لہجے سے بھی مجھ سمجھنے لگی تھی۔

”اندازہ تو اتنا تو ہم یوں بے دست دبا بیٹھے ہوتے؟“ میں نے ”مجھے تو دس وقت ہوش تھا جب مجھے وہاں لے جایا گیا اور نہ اس وقت جب وہاں سے نکالا گیا۔ بس نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے وہ جہیں کبھی ذہن واقف ہیں۔“

ایک لمحے کی الجھن آخیز خاموشی کے بعد میں نے کہا ”ایک لمحے کے لیے بھی ہوا تھا کہ اگر کسی ہم ان بکوں تک پہنچ بھی لے تو ہمارا اسلحہ“ ہمارے دسائل“ ہمارا جوش جذبہ اور بے خوفی بھی اسے کسی کام نہیں آئے گی۔ وہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ جہیں

یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مجھے تو صرف دو ٹھکانوں کی میر کرائی مکتی ہے۔ وہ بھی کچھ محدود اور مخصوص حصوں کی۔ معلوم نہیں ابھی اور ایسے کتنے ٹھکانے موجود ہوں۔ ان پر اسرار اور الف لیلی کی ٹھکانوں کے علاوہ شاید عام عمارتوں میں بھی ان کے کچھ اڈے ہوں جو مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے ہوں۔ ہمیں ان کا بھی علم نہیں۔"

"آخر یہ ذریعہ زمین پر اسرار اور الف لیلی کی جگہیں کہاں ہو سکتی ہیں؟" راجیلہ خود کا ہی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"یہ کہا بہت مشکل ہے۔" میں نے جواب دیا "آبادیوں کے نیچے تو بہر حال نہیں ہو سکتیں۔ باقی جگہوں کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ آبادیوں سے سیکڑوں گنا بڑے ہمارے ہاں دورانے ہیں، جنگل ہیں، صحرا ہیں، میدانی اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ لاکھوں مربع میل رقبے پر پکڑے ہیں۔ کیا معلوم چیکے چیکے کہاں کہاں، کیسی کیسی طاقتوں نے پہنچے گاؤں لیے ہوں۔"

"پھر بھی۔۔۔ یہ کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔" راجیلہ اٹھٹھن آمیز سے لہجے میں بولی "آخر یہ سب کچھ کب اور کس طرح ہوا؟ چراغ اللہ دین کے جن نے راتوں رات یہ سب کچھ جادو کے زور سے تو نہیں بنالیا ہو گا۔ اتنی بڑی بڑی قیامت کیسے ہو گئیں کہ کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلا؟ ان میں ضروریات زندگی بھی ہیں۔ اور پھر آمدورفت کے ذرائع بھی ہوں گے۔ کبھی کبھی کسی کی نظر میں نہیں آیا؟"

"یہ کچھ ایسی ناممکنات قسم کی چیزیں نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں بڑا مدوں میل پر مشتمل ایسے علاقے لاوارث سی حالت میں پڑے ہوئے ہیں کہ جہاں مینوں کچھ ہو تا رہے تو کسی کو کچھ پتا نہ چلتے۔ عین ممکن ہے کہ ایسی باتوں کا علم رکھنا جن کے اختیارات اور فرائض میں شامل ہو وہ خود ان سازشوں میں آواز کار رہے ہوں۔ اس کے علاوہ مختلف پرو پینکس کی آڑ میں بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کی نظر میں کسی چیز آئی بھی ہو تو اس کو کیا پتہ دیا گیا ہو کہ وہاں کسی پروپینکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ بہت سے طریقے ہیں۔ بہت سے راستے ہیں، ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہماری معلومات اس سلسلے میں ابھی بہت محدود ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جتنے ترقی یافتہ ہیں، جتنے جدید وسائل ان کے پاس موجود ہیں، ان سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام انہوں نے راتوں رات چراغ اللہ دین کے جن کی طرح ہی نمٹائے ہوں گے۔"

کانی کا ایک گھونٹ بھر کر میں نے ایک لمبے کی خاموشی کے بعد کہا مہر حال اہم بات یہ نہیں ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ اس سوال پر تو اب بعد میں ہی غور کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو اہم بات یہی ہے کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے خواب و خیال میں نہیں، حقیقت میں کہیں موجود ہیں۔ ہمارے لیے تو قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ ہم کیا حکمت عملی اختیار کریں؟"

"اگر حکومت نے تمہاری باتوں پر شنیدگی سے توجہ دے لی ہوئی تو جیالوینیکل سروس، آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ یا ای سی کے دوسرے محکموں کے تعاون اور مدد سے ان پر اسرار ٹھکانوں کی تلاش شروع کی جاسکتی تھی۔ ان کے پاس مشینری، آلات اور مین پاور کے علاوہ تجربہ بھی ہے۔ یہ لوگ اپنے کاموں کی آڑ میں ان ٹھکانوں کی تلاش جاری رکھ سکتے تھے۔"

"مگر ریڈ واٹ کو اس کی ذرا سی بھی ہچک چڑھائی جس کا بہت زیادہ امکان تھا تو ان کی شامت آجاتی۔ نہ جانے کتنے مارے جاتے، کتنے انوا ہوئے۔ اٹالیا نے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مجھے تو ہمارے ہاں بے شمار ہیں۔ محکموں کے معاملے میں تو ہم بامشاء اللہ خود کفیل ہیں بلکہ اگر کوئی ملک اپنی معیشت کی کمر توڑنا چاہے تو ہم یہ سمجھ لیں گے اس کے لیے ایکسپورٹ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ انہیں تو پہلے وہی چیز نہیں ملتی جس کی تلاش کے لیے یہ قائم کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ کوئی دوسری اور پر اسرار چیز کیسے تلاش کریں گے؟"

راجیلہ دھیرے سے ہنسی اور بولی "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ محکموں کا تو ہمارے ہاں واقعی کوئی شمار نہیں۔ ایسے ایسے ملے ہیں جن کا لوگوں کو نام تک نہیں معلوم۔ ان کے لیے جو چاہے راتوں رات چلے ہیں، بیٹ ہیں۔ عوام کے لیے ان کی کیا افادات ہے یا ان کا کام کس حد تک انجام دے رہے ہیں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "میں جب کراچی میں تھی اور اینڈورنگز تک کا کام کر رہی تھی تو مجھے پتا چلا کہ ہمارے ہاں محکمہ بیوروں کے تحت اور ان پر اپرے وغیرہ کرانے کے لیے ایک ایک محکمہ قائم ہے جس کے ایک اعلیٰ عہدیدار صاحب ایک ہائی علاقے میں بڑی سی کوٹھی میں رہتے تھے اور سرکاری سیمینڈ میں کرتے تھے۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ مزید کیا کچھ ہو گا۔"

"میں تو برس میں ہوں، مجھے تو بہت اچھی طرح اندازہ ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ستم غلطی یہ ہے کہ جس کام کے لیے یا جس مسئلے کے حل کے لیے مجھے قائم کیے جاتے ہیں وہ کام یا مسئلہ سے زیادہ مشکل ہو جاتے ہیں، وہ مسئلہ پہلے سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ٹرانس کنٹرول کبھی نہیں تھی تو چیزوں کی پراسس زیادہ کنٹرول میں تھی۔ پولیس کم تھی تو جرائم بھی کم تھے۔"

راجیلہ باتوں میں انگلیاں پھیلاتے ہوئے لفظی سانس لے کر بولی "خیر۔ ہمارے ان باتوں پر گڑھنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم اپنا بند کمروں میں بیٹھ کر اس قسم کے مضموعات پر دل کا بخار نکال گئے ہیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"دل کا بخار نکال لیتا اپنی جگہ خود ایک فائدہ ہے کہ بات سے دل کا بخار دل میں ہی رہ جائے تو یہ لیوا بخار سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

کو گودی رکھ آئی ہے۔ ممکن ہے صدر مملکت اور وزیر اعظم اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس کے بارے میں کوئی خصوصی انکوائری کرائیں۔ ریڈ ڈاٹ یہ تمام خطرات مول نہیں لے سکتی۔

”لیکن ضروری نہیں کہ وہ اسے نقل ہی کرادے۔“ راجیلہ بولی ”ہو سکتا ہے اس صورت حال کے لیے ان کے پاس کوئی اور منصوبہ ہو۔ ہم ابھی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں؟ ہم اپنے ملک کی خلائی سازشوں اور بین الاقوامی سیاسی گورکھ و حسدوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے۔ عین ممکن ہے کوئی ایسی صورت حال تخلیق کی جا چکی ہو کہ پاکستان چپ کر کے اس معاہدے کو قبول کرنے پر مجبور پڑ جائے۔ حکومت یہ سب کچھ ہوتے دیکھے اور خاموش رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکے اسے چاروں طرف سے ایسی بندشوں میں جکڑا جائے کہ وہ اس معاہدے کو اون (own) کر لینے میں ہی عافیت سمجھے۔ اسے اندازہ ہو جائے کہ اس سے انکار کرنے کی صورت میں اس سے بھی بڑی مہمیں نازل ہو سکتی ہیں۔ خدا نخواستہ ملک کی اینٹ سے اینٹ بن سکتی ہے اور ہم ایسی ہی خوف ناک اور قاتل رزم صورت حال سے دوچار ہو سکتے ہیں جس سے اس وقت کئی مسلمان ممالک دوچار ہیں۔ کم از کم اس کے مقابلے میں حکومت یہی قیمت سمجھے کہ اپنے ایٹمی پروگرام اور اپنی چالیس سال کی محنتوں اور کاوشوں کی قربانی دے دی جائے کہ یہ بھی ان ڈائرکٹ خلائی ہی کی ایک صورت ہوگی لیکن کم از کم ہر گئی کوچے میں خون بنے اور پختے ہوتے شہروں کو بلب کے ڈیمر بنانے کے مقابلے میں تو قیمت ہوگی۔“

میں ایک تک راجیلہ کی طرف دیکھا رہ گیا۔ راجیلہ کا ذہن بھی ان معلومات میں عموماً سے کام کر رہا تھا۔ وہ جسمانی ہی نہیں ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی میرے لیے ایک کارآمد اور اہم شخص ثابت ہو رہی تھی۔

”ہاں۔ یہ سب کچھ ممکنات میں سے ہے۔“ میں نے دیکھے لمبے میں حسیں کیا۔

راجیلہ قدرے تیزی سے بولی ”اس کے علاوہ تم جو یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ کسی لوگ ریڈ ڈاٹ میں کسی اہمیت کے حامل نہیں ہو سکتے اور ان کی حیثیت قربانی کے کبروں سے زیادہ نہیں ہو سکتی تو تمہارا یہ خیال بھی غلط ہو سکتا ہے۔“

میں نے اس کی رائے کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی اور خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کئی انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں تک میں انکاڑا کا پاکستانی اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے باشندے موجود ہیں؟ کسی آئی اے اور ایف بی آئی تک میں ہم جیسے غریب ممالکوں کے لوگ بیچے جاتے ہیں اور بعض اوقات اچھا خاصا مقام پالیتے ہیں۔ ان کے خفیہ پروپیگنڈا میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر وہاں تک پہنچتے ہیں اور بعض اپنے

”بہت نکل چکا دل کا بخار اور غبار“ اب کام کی بات کو اور مل موضوع پر رہا۔ تم نے اس کام کے بارے میں کیا سوچا ہے جو ریڈ ڈاٹ والوں نے تمہارے سر پر لاوا ہے؟ کیا تم اصل حلیہ چھپا کر کسی نکل چکا دل صاحب کو پہنچانے کا کام انجام دے گے؟“

”حالات کچھ بھی سہی لیکن میں اتنا بے ضمیر کیسے ہو سکتا ہوں؟“ میرے دل میں ابھی ہی اس قدر کیور آئی۔

”ہیں تو پھر سمجھو کہ تمہارے ہاتھ میں تپ کا ایک پتہ آئے ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اسے کس طرح ہموک سکتے ہو اور اس طرح تحلیل کر سکتے ہو۔“ راجیلہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”لیکن سارے تپ کا پتہ؟“ میں نے جانا چاہا۔

”وہی شخص جسے ریڈ ڈاٹ والے حلیہ صاحب کی جگہ دلاتا ہے ہیں۔ وہ یقیناً ریڈ ڈاٹ میں بڑی اہمیت کا مالک ہوگا۔ کبھی سے اس ذہم کام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔“

”یہ ضروری نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے ”اگر وہ مقامی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ غالباً پاکستان ہی کے کسی اعلیٰ کا باشندہ ہے اور مجھے معلوم ہے کہ مقامی لوگ ریڈ ڈاٹ کے لیے صرف قربانی کے کمرے ہیں۔ وہ ان سے ایسے ہی کام لینے ہیں کہ ان کی جان جانے کا خدشہ ہوتا ہے یا کام نکلنے کے بعد وہ خود سے لٹکائے لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ دانش کا یاب ہوئی اور یہ شخص امریکا جاکر دستاویزات پر دستخط کر لائے تو وہاں آتے ہی اسے پراسرار حالات میں ہلاک کر دیا جائے گا۔ یہاں ہماری حکومت کے لیے مزید دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔“

”تمہارا یہ تجزیہ تو درست ہے کہ مقامی لوگ ان کے لیے نالی کے کمرے ہوتے ہیں۔“ راجیلہ نے تسلیم کیا ”لیکن تمہیں یہ کچھ ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کو ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ انہیں تو صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ حقیقت کس کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ جبکہ اس شخص کو اپنے پاس خود غیرت کے ساتھ ریڈ ڈاٹ کے زیر زمین ٹھکانے پر دیکھا ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے کافی حد تک قریب چاروں ان کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہے۔“

”تمہارا یہ خیال تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ میں نے بھی کئی اہم شخص اس شخص کا منتقلی انجام دینے قربانی کے کمرے والا ہی خیال دیا ہے۔“ میں نے کہا ”تم خود سوچو۔ جب یہ شخص ایسی کارروائیوں پر دستخط کرے گا جو ہماری حکومتی پالیسی کے بالکل خلاف ہوں گی تو یقیناً شور برپا ہوگا۔ بے شک اس وقت اس کی حیثیت ایک ایسے وزیر خارجہ کی ہوگی جس کا ریکارڈ بہت اچھا ہے۔ اس کی فخر میں جس کی بڑی عزت اور احترام ہے۔ لیکن اس کے بدلے اور اچانک فیصلے پر حکومت ضرور اس کی طرف متوجہ ہوگی۔ پریس یا سینٹ کے ذریعے ضرور اس سے جواب طلبی کی جائے گی۔ پریس ایک ہنگامہ برپا کر دے گا کہ یہ شخص ملک اور قوم



خدا ارادہ رُفقاات کی وجہ سے غصہ ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں ترقی یافتہ قوموں کو یقین ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ خود اپنے ملک کے خلاف کام کرنے اور اس کی جڑیں کاٹنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

”اں یہ بات مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ لیکن ان میں سے بھی بعض لوگوں کا جذبہ خُبت الوطنی جاگ اٹھتا ہے یا کبھی کوئی اور وجہ ہو جاتی ہے تو وہ رسی تڑا کر ہماگ پڑتے ہیں۔ اس صورت میں قبر تک ان کا پہنچا کیا جاتا ہے۔ انجام ان سب کا بھی مجھے قرانی کے کبرے والا ہی محسوس ہوتا ہے۔

”وہ ایک الگ بات ہے لیکن یہ تو طے ہے کہ ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ ریڈ واٹ میں بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں چُن لیا گیا ہو، ممکن ہے ان کی خدایوں کا ریکارڈ بہت عمدہ ہو، ممکن ہے ریڈ واٹ نے انہیں کوئی اور پکڑوے رکھا ہو جو انی الحال ان کی سمجھ میں نہ آتا ہو۔ تم اپنے آپ کو سی لے لو۔ اگر تم نے ان کی بات انی لائی ہو تو ممکن ہے آج تم بھی ریڈ واٹ میں کسی اہم حیثیت کے الگ ہوتے۔“

”مطلوبہ خیر“ انی الحال تمہاری بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن تم اصل میں کہنا کیا چاہ رہی تھیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اس قومی کا اصل نام کیا ہے جسے خلیفہ صاحب کی جگہ امریکا بھیجنا کا منصوبہ بنایا گیا ہے؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”اصل نام کے بارے میں تو کچھ نہیں لگا جاسکتا۔ بہر حال مجھے اس کا نام عرفان بتایا گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں یہ کہنے لگی تھی کہ عرفان تمہارے لیے ٹرپ کا پٹا ثابت ہو سکتا ہے۔ تم باس ٹوکے کے سامنے ان لوگوں کی سازش میں آواز کار بننے کی ہائی تو بھر آئے تھے لیکن درحقیقت تمہارے ذہن میں کیا تھا؟“ راحیلہ گہری کرسی پر اتلی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”سچ پوچھو تو میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تو بس ان سے جان چمکانے کے لیے ہائی بھر آیا تھا۔ لیکن درحقیقت میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔“

”میں تم اس ٹرپ کے بچے عرفان کو تیار میں کرنے کی کوشش کرو۔“ راحیلہ بولی ”مگر ہر تم سب کچھ اسی طرح کرنے کی تیاریاں کرو جس طرح ریڈ واٹ نے تمہیں بتایا ہے لیکن عین آخری وقت پر تم عرفان کو کچلاؤ۔“

”جب میں سعادت مندی سے ریڈ واٹ والوں کا حکم بجالانے کا فیصلہ کر رہا تھا اس وقت بھی میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔“

”میں نے بتایا مگر ہر تم کوئی مشکل کام بھی نہیں۔ لیکن جن جوں میں نے اس پر غور کیا اس کی خوف ناک واضح ہوتی گئی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ زندگی اور موت کی بازی ہے۔ ریڈ واٹ کی طرف سے اس کا فوری طور پر خُرف ناک ردِ عمل ظاہر ہو گا۔“

”کوئی بات نہیں“ راحیلہ بے خُشی سے بولی ”میں اس ردِ عمل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ ہم سب سا کھلی مل کر اس کے لیے منصوبہ بنائیں گے اور اس کے جواب میں جو کچھ بھی ہو گا اس کا سامنا کریں گے۔“

”اس صورت میں یہ سبھی کے لیے زندگی اور موت کی بازی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں“ راحیلہ بے پروائی سے بولی ”ہم اذکر اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے یا پھر ان کے انہوں میں ٹھکانا بنے رہنے سے تو نجات ملے گی۔ جو زندگی ہم گزار رہے ہیں اس سے تو موت ہی بہتر ہے۔“

”غیر اب ایسی بھی بات نہیں“ مجھے ہنسی آگئی ”ابھی تک تو ہمارا معاملہ ریڈ واٹ کے ساتھ کچھ ایسا ہی رہا ہے جیسے ہم شہرانی سینچے بزرگوں کے ساتھ کچھیز چھاؤ کرتے رہے ہیں اور وہ نظر انداز کرتے رہے ہیں یا یونی کبھی خود ہی بہت کوشاں کر دیتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو واقعی ہماری زندگی کو موت سے بدتر بنا سکتے تھے لیکن جانے کیوں انہوں نے ایسا نہیں کیا۔“

”بہت نیک دل لوگ ہیں۔ صبح صبح اٹھ کر ان کی درازنی کرنا دیکھا کرو۔“ راحیلہ جمل کر بولی۔

”میں اس کی جملہ باٹھ سے محفوظ ہو رہا تھا۔ میں نے ملائت سے کہا ”غیر اب میں ان پر اتنا بھی لدا نہیں ہو رہا۔ میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان کی بہت سی باتیں ابھی تک میرا کچھ میں نہیں آئیں۔“

”بہت سی کیا۔ یوں کہو کہ کوئی بھی ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔“ وہ منہ بٹا کر بولی۔

”لیکن ایک بات بہر حال میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ پچھلے بار تو میرے ان کو ٹھکانے کے باوجود تقریباً خیریت ہی رہی تھی لیکن اس بار وہ ضرور اپنی دھکی پر عمل کر کے دکھانے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے مجھے غیر معمولی سنجیدگی سے خبردار کیا ہے۔“

”ہم بھی غیر معمولی سنجیدگی سے ان کے ردِ عمل کا سامنا کریں گے۔“ راحیلہ بولی ”پوری طرح اس کی پلاننگ کریں گے اور لوگ جو کچھ بھی کریں گے اس کا نہ توڑ جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ آخر انہیں کچھ تو پتا چلے گا کہ ہم کوئی ایسے گئے گورے لوگ نہیں ہیں۔“

”ہم جو کچھ بھی ہیں اور بیٹے پانی میں ہیں“ انہیں ابھی طرح معلوم ہے لیکن تمہیں ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ ریڈ واٹ کا چر ہے۔ مجھے اپنی تو کچھ ایسی خاص پروا نہیں ہے لیکن اپنے ساتھیوں کو بے مقصد اس جنگ میں جھونکنے کو ہیرا دل نہیں چاہتا۔ ہم کتنے ہی باصلاحیت سی لیکن بہر حال ہم آج کے زمانے کے لوگ ہیں ہمارے پاس آج کے زمانے کے ہتھیار ہیں۔ جبکہ وہ گئے زمانے والے زمانوں کے لوگ لگتے ہیں اور ان کے پاس آئے زمانے

کے لیے تیار ہوں اور ان کی بھی لیکن ابھی تک ہمارے سامنے کرنے کے لیے تیار ہی کیا؟ جو چھوٹے موٹے تصادم ہوتے رہے ان میں ہم ہاتھ باندھ کر تو نہیں بیٹھے، جو ہم سے ہو سکا وہ ہم نے کیا۔ ان کے آدمی بھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے ہمارے سامنے کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

"میں میں بھی انہیں سمجھا رہی ہوں۔" راحیلہ لانت سے بولی "لیکن اب تو موقع میسر آ رہا ہے۔ اب قائمہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ خصوصاً آفتاب کی موت کے بعد سے سب ساتھیوں کے دل میں بڑا غم و غصہ بھرا ہوا ہے۔"

آفتاب کی دردناک موت کی یاد آئی تو میرے دل میں افسردگی کی ایک لہر ابھری۔ بلیک بڑے کسی درخت کے طرح اس کا زرخیز اور ڈھلا تھا۔ گو کہ راحیلہ کے ہاتھوں ایک طرح سے اس کا جاب برابر ہو گیا تھا۔ بعد میں راحیلہ نے بلیک بڑ کی کھوپڑی میں چادر اتار دیا تھا لیکن میرے دل میں ایک غلط سی بات تھی۔ اس واقعے کے اصل ذمے داروں کا ابھی تک کچھ نہیں بگڑا تھا۔

"قائمہ بڑے بڑا واقعہ تھا جس میں ہمارا کوئی ساقی ہم سے چھڑا تھا۔" راحیلہ بولی۔

"ہاں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اور میرے ساقی بے وقوف ہوں گے اگر وہ یہ سمجھیں گے کہ میں اس واقعے کو بھول گیا ہوں۔ جب انتقام کا موقع آئے گا تو ہم ضرور انتقام لیں گے۔ میں

زمانوں کی چیزیں ہیں۔ جن میں سے نہ جانے کتنی ہم نے ابھی دیکھی تک نہیں پڑا۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب دیکھ لیں گے۔" راحیلہ مسکرائی "ساتھیوں کی فکر میں تمہیں دکھلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود چرے لمبے کے اس کھیل کو کسی نتیجے پر پہنچنے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"جب سے وہ خاص پیٹنگ صنعت ہوئی ہے جس میں تم نے سب کو تمام حالات سے آگاہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ تمہاری عدم موجودگی میں "دی سرکل" اور بزنس وغیرہ کی انچارج میں ہوں گی تب سے ان کا مجھ سے رابطہ رہنے لگا ہے۔ وہ لوگ بڑی شدت سے چاہتے ہیں کہ کچھ کیا جائے۔ تمہارے سامنے تو وہ حد اب سے غاصب رہتے ہیں لیکن مجھ سے اصرار کرتے رہتے ہیں کہ میں تم سے بات کروں۔ انہیں شاید اندازہ ہو گیا ہے کہ مجھ سے تمہارا کوئی قتل خاص ہے اور تم میری بات نہیں ٹال سکتے۔"

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "بے چارے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ لیکن خیر چلو مفت میں اپنی شوخی ہوئی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ تم تو صرف اور صرف اپنی ہی مرضی کے مطابق کام کرتے ہو۔"

"زیادہ طرز مزاح فرمانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سنوئی فیس سے اس کی طرف دیکھا "میں تو تمہاری بات بھی مانتے

انکا، اقبالہ، سونا گھاٹ کا پجاری، غلام روہیں، امبر نیل، ور خشاں، خبیث کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور پراسرار ناول

پراسرار پجاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم  
خواہ صورت سرورق، دیدہ زیب کتابت و طباعت  
قیمت = -/150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ہوں وہ ان کے ہاں مٹی جاتی ہو۔ ہمارے سکتز کچ کرنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ ممکن ہے ہم لوگوں کے ٹیلی فون بھی محفوظ نہ ہوں۔ دشمن کے لیے یہ چیز سب سے بڑا ہتھیار ثابت ہوتی ہے کہ آپ کا کوئی راز اس کے لیے راز نہ رہے۔ ہماری تو فہر دیے بھی ان لوگوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن اس بات نے تو ہمیں بالکل ہی کمزور کر دیا ہے کہ ہمارا کوئی راز ان کے سامنے راز ہی نہیں ہے۔ مثلاً میرا کوئی تعاقب نہیں کرنا لیکن میں کہیں جاتا ہوں تو شاید چند منٹ بعد ہی انہیں علم ہو جاتا ہے کہ میں فلاں جگہ موجود ہوں۔ اس چیز نے مجھے بڑا عاجز کر دیا ہے۔ ہمیں کمزور بنا دیا ہے۔ ہماری تمام صلاحیتیں بے وقعت ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہر وقت ہمارے پیچھے گویا ایک آبدیدہ آئینہ لگا ہوا ہے۔

”اس آپریشن کے لیے ہم آپس میں رابطے کی غرض سے ٹرانسیرسٹر یا ٹیلی فون کچھ بھی استعمال نہیں کریں گے۔“ راحیلہ نے فیصلہ سنا دیا۔ اس نے ذہنی طور پر داخلی آپریشن کی انہماک کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا۔

”اس کے باوجود دعا ضرور کرنا کہ ہمارے ارادے راز رہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دوسری اہم بات میں ہے کہنا چاہتا تھا کہ ہم خواہ کچھ بھی کریں کوئی بھی حکمت عملی اختیار کریں لیکن اس کے رد عمل کے لیے ضرور پوری طرح تیار رہیں۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے یہ امکان ضرور ذہن میں رکھا ہو گا کہ میں اس بار بھی انہیں دھوکا دے سکتا ہوں۔ اس کاظم بھی یقیناً انہیں فوری طور پر ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں وہ کیا کارروائی کریں گے اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہر حال ہمیں ہر چیز کے لیے تیار رہنا ہو گا۔“

”ہم مرنے کے لیے بھی تیار رہیں گے۔“ راحیلہ بولی۔ ”دوسری تو میں نہیں جانتا۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں چاہتا ہوں موت تم لوگوں سے دور رہے۔“

”اس طرح کام نہیں چلے گا۔“ وہ سر جھٹک کر بولی ”موت آ نکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو دیکھنا ہی پڑے گا۔“

”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم ریڈ ڈاٹ کی ہدایات کے مطابق حفیظ صاحب سے ملاقات کا وقت لو لیکن انہیں اصل بات سے آگاہ کرنے کی قیادت کو شش نہ کرو۔ اس طرح ہمارے منصوبے کے ایک آؤٹ ہو گا۔ امکان ذرا کم ہو جائے گا۔“ راحیلہ کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

ایک لمحے کے بعد بولی ”کو شش کرو کہ حفیظ صاحب تمہاری ملاقات لاہور میں ہو۔ یہاں میں ریڈ ڈاٹ والوں سے ڈرا ہوا راز انہیں منٹ سکوں۔“

”ان سے لاہور میں ملاقات ملے کرنا تو شاید زیادہ مشکل ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ان کا آبائی گھر لاہور میں ہے اور وہ کسی غیر ملکی دورے پر روانہ ہوتے وقت خواہ ایک رات کے لیے

نے اپنے ساتھیوں کو جب بھی کسی دشمن سے ملنے کے لیے استعمال کیا ہے تو اس طرح کیا ہے کہ ان میں سے کسی کو خراش تک نہیں آئی۔ ایک ذرا سی چوک ہوئی اور ہمیں آفتاب کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اپنے جاں نثار اور آنکھیں بند کر کے حکم ماننے والے ساتھیوں کو موت کے منہ میں دھکیلنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ صرف انہیں حکم دینے کی دیر ہوتی ہے اور حکم دینے میں صرف زبان بولنا پڑتی ہے لیکن انہیں گزند سے بچاتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنا اصل کام ہے۔“

”تم مرنے والا کرو اور ادا کرنا چاہتے ہو؟“ راحیلہ مسکرائی۔

”مرنے والا....؟ کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ جب چیل اوپر سے جھپٹا مارنے کی کوشش کرتی ہے تو مرنے اپنے چڑوں کو پرل میں چھپا لیتی ہیں۔“ راحیلہ نے وضاحت کی۔

”ہاں تقریباً یہی سمجھ لو۔ گوکہ میرے ساتھی چڑوں کی طرح نرم و نازک ہے میں اور مدد کی محتاج تھکتی نہیں ہیں۔ لیکن وہ مجھے عزیز اسی طرح ہیں جس طرح مرنے کو اپنے چڑے ہوتے ہیں۔ بہر حال اگر تمہارے خیال میں نقلی حفیظ صاحب پر ہاتھ ڈالنا اہم اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے اور ساتھی بھی کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ رکھے بیٹھے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

راحیلہ تدریس جوشیلے لیے میں بولی ”مجھے نہ جانے کیوں یقین ہے کہ اگر ہم برطانوی نامی اس شخص کو درمیان سے اچٹنے میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ضرور ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہوں گی۔“

”اس کام کے لیے تمہارے خیال میں کیا طریقہ اختیار کرنا مناسب رہے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے ابھی اس پر تفصیل سے غور نہیں کیا لیکن آپس میں صلح مشورہ کر کے کوئی بھی منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔“ وہ پھر خیال انداز میں رخسار پر انگلی رگڑتے ہوئے بولی۔

”میں نہیں اس آپریشن کی انہماک بناتا ہوں۔ تم اس کے لیے پروگرام ملے کرو۔ لیکن دو تین بائیں ضرور یاد رکھنا اور انہیں بہت اہمیت دینا۔ ایک تو یہ کہ اگر ہماری کوئی ذرا سی بھی غیر معمولی سرگرمی بھاگ دوڑ یا صلح مشورے شروع ہوئے تو فوراً ریڈ ڈاٹ کو معلوم ہو جائے گا یا اندازہ ہو جائے گا کہ ہم ان کی ہدایات کی خلاف ورزی کی تیاری کر رہے ہیں۔“

”کیسے معلوم ہو جائے گا؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں معلوم“ میں نے بھنڈی سانس لے کر جواب دیا ”بظاہر تو یہ برا نہیں لگتا ہے کہ وہ ہر وقت ہماری نگرانی نہیں کرتے، ہم میں سے کسی کا بھی مستقل طور پر پیچھا نہیں کیا جاتا۔ اس کے باوجود وہ نہ جانے کس طرح اکثر ہماری اہم سرگرمیوں سے واقف رہتے ہیں۔ ممکن ہے ہم ٹرانسیرسٹر یا ریڈیو پر جو گفتگو کرتے

”میری پوری کوشش یہی ہے کہ ہمارا درد فہر لکنا جتنی دیر خفیہ رہ سکا ہے نہ جانے۔ میں نہیں چاہتا کوئی وہاں تک میرا تعاقب کرے۔ میں ویسے ہی احتیاطاً ایک مہرے سے وہاں نہیں گیا۔“ میں نے کہا۔

”ہم کسی کو تمہارا تعاقب نہیں کرتے دیں گے۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔“ راحیلہ بولی۔

”تم لوگ کیا آس پاس موجود رہو گے؟“ میں نے دریافت کیا۔

راحیلہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”ہاں۔ حفیظ صاحب سے ملاقات کا پروگرام طے ہوتے ہی تم اپنا نئی فون نمبر لکھنا دینا وغیرہ استعمال کیے بغیر کسی اور ذریعے سے صرف مجھے مطلع کرنا کہ ملاقات کب اور کہاں ہوگی۔ میں پہلے ہی ذرا اس جگہ کا جائزہ لے لوں گی اور تمام ساتھیوں کو آس پاس قیادت کروں گی۔“

”پھر تو ہو چکی ملاقات۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا ”اوشیں ذرا سامنے شہ ہو گیا یا معمولی سی بھی سرگرمی نظر آتی تو سب کچھ دھرا نہ جائے گا۔ معلوم نہیں اس صورت میں کیا ہو۔ اس معاملے میں کسی تو گویا ہے کہ ہم اپنے وسائل استعمال نہیں کر سکتے۔“

”تم مطمئن رہو، کسی کو کوئی سرگرمی نظر نہیں آئے گی، کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ آخر ہم نے اپنی انگریزی اور اردو جاسوسی فلمیں دیکھی ہیں، ناول پڑھے ہیں، تعلیم حاصل کی ہے۔ تو وزارتِ ذہن بھی ہمارے حصے میں آیا ہے اور تم سے بھی رادو رہم ہوئے خامے دن ہو گئے ہیں۔ ان باتوں کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوگا۔ بعض لوگ بڑا دواؤں ملا پاتے ہیں کہ ان چیزوں سے لوگوں کو خفیہ سرگرمیوں کے لیے رہنمائی ملتی ہے مگر ہم ان چیزوں کی مدد سے کوئی تعمیری کام کر کے دکھائیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس معاملے کو پینڈل کر سکتی تھی یا نہیں۔ وہ ایک بے پناہ صلاحیت لڑکی تھی۔ اس سے کچھ بچہ بھی نہیں تھا۔ مجھے خاموشی دیکھ کر وہ گویا مزید تسلی دینے کے لیے بولی ”جس مکان میں تمہاری حفیظ صاحب سے ملاقات ہوگی، ہم اس کے پاس بھی نہیں پہنچیں گے۔ دور دوری رہیں گے۔ تم اس کے بارے میں مجھے پہلے ہی فائدہ کے تو ہیں بھی ذرا اچھی طرح اس کا جائزہ لے لوں گی کہ آس پاس کون سی جگہ ایسی سرگرمیوں کو کون سی غارتگر ہیں۔ پھر اس حساب سے میں اپنی حکمت عملی طے کر لوں گی کہ کس ساتھی کو کہاں رہنا ہوگا۔ کس کو وہاں رہنا ہوگا اور کون سی پوزیشن سنبھالنی ہوگی۔“

وہ ایک کمانڈر کی طرح ذہنی طور پر مستعد معلوم ہوتی تھی۔ بات جلدی رکھتے ہوئے بولی ”لیکن ملاقات کی جگہ کے بارے میں ہمیں کم از کم دو دن پہلے معلوم ہو جانا چاہیے کیونکہ ہمیں کچھ

دیکھنا ہے۔ آج ہی گھر ضرور آتے ہیں۔ سنا ہے اس منصب و منصب کے باوجود وہ اپنی والدہ کا احترام نہیں بھولے۔ اس لئے میں وہ تو ہم پرستی کی حد تک ایک مذہب پہنچے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی ضعیف والدہ کی دعائیں لے کر کسی مشن پر غیر ایک کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو بعض اوقات ناممکن سے کام لے سکتے ہیں اور بعض مشکلات کا ایسا حل نکل آتا ہے کہ اس اہمیت پرست دنیا کے نقطہ نظر سے کوئی جواز نظر نہیں آتا۔“

”انسان کا بڑا بن جانا اسے والدین اور بزرگوں کے احترام سے دور کرتا نہیں ہے۔ اس کردار اور مانت پرست دنیا میں انسان ان چھوٹی چھوٹی دواہیات کو ساتھ لے کر چلا رہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔“ راحیلہ عجیبگی سے بولی ”زندگی کتنی ہی تیز رفتار سی لیکن دواہیات کو ساتھ رکھنے سے ہماری رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا کوئی فائدہ ہی ہوتا ہے نقصان نہیں۔“

”میں نے ان کی اس دواہیات پرستی کی وجہ سے یہ تو ممکن ہو گا کہ ان سے لاہور والے گھر میں ملاقات ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

”تم پروگرام کے مطابق عرفان کو ساتھ لے کر حفیظ صاحب سے ملاقات کے لیے جانا اور وہاں عرفان کو قلاب میں کر کے حفیظ صاحب کو سامنے کھائی نشانہ بنانا۔ اکیلے عرفان کو تو تم قابو میں کر لو گے۔“ راحیلہ نے گویا مجھے چیمبرے کے لیے دریافت کیا لیکن اس کے بعد رگرمی عجیبگی تھی۔

”مجھے ہنسی آگئی لیکن پھر میں نے کراہ کر کہا ”ہاں۔۔۔ اب تو تم اگلے ایسے دن دیکھانے والے سوالات کرو۔ کیا میں شکل صورت سے ایسی ہی گیا کرنا دکھائی دیتے لگا ہوں؟“ میں نے چہرے پر ہاتھ پکڑا۔

”ہنسی میں نے عرفان کو نہیں دیکھا تھا، اس لیے پوچھ رہی ہوں۔“ وہ معذرتی معصومیت سے بولی۔

”ظاہر ہے وہ حفیظ صاحب کی جگہ لینے آ رہا ہے تو حفیظ صاحب کی کالی ہو گا۔ جہازا پہلوان سے مشابہ تو نہیں ہو سکتا۔“ میں نے اس کی تمام تر تغیر عجیبگی کے باوجود اسے فائدہ پہنچایا، ہنسنے لگا۔ حفیظ صاحب ہی کی طرح ادھر عمو اور عرفان سرخ نظر آتا ہے۔ اگر تم اسے اپنے منہ میں مضبوط نہ سمجھو تو میرا خیال یہی ہے کہ اس جیسے آٹھ دس آدمیوں کو میں بائیس ہاتھ سے اور آٹھ دس کو بائیس ہاتھ سے لٹا سکتا ہوں۔“

”ہنسی بھر۔“ راحیلہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے ریفی کے سے انداز میں اپنی ”تم روانی میں اصل حفیظ صاحب کو پلٹ میں نے لے لیا۔ اگر عرفان کو قلاب میں کر لیتا۔“ اسے گویا عرفان کو دیکھتے بغیر ہی اس کے منہ سے آ رہا تھا۔ ”وقت چس کر بولی“ اس کی مشکلیں کس کراسے لکڑی کی ڈک میں ڈالنا اور سیدہ دو گھر لے جا کر دے خاتمے کے کسی غمناک خال رہنا۔ اس سے بعد میں نہیں گے۔“

ریٹ ڈاٹ کا نزلہ صرف ہم ہی کرے گا۔

”یہ تو خیر ضروری نہیں ہے۔ جو بھی راستے میں آئے گا مجھ کو  
کچھ نقصان تو اٹھائے گا۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کل ہی  
اسلام آباد میں خفیہ ایجنسیوں سے میری آواز ترین میٹنگ کے  
دوران انہوں نے ایک گاڑی ڈرائیو کے ذریعہ روکے پرچے اڑائے  
اور نہ جانے کس ایجنسی کے دو آدمی شدید زخمی بھی ہوئے اس  
کارروائی کا کوئی مقصد بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”شاید اس کا مقصد صرف ایجنسیوں کو یہ بتانا ہو کہ وہ ان کی  
تمام سرگرمیوں سے واقف ہیں اور وہ تمہارے ساتھ زیادہ پیشتر  
وغیرہ نہ ہی دیکھیں تو ان کے حق میں اچھا ہے۔“ راجیل نے خیال  
ظاہر کیا۔

”وہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ  
ڈاٹ والے ایجنسیوں سے کچھ عطا کسی لیکن وہ ان سے خوف نہ  
بر حال نہیں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ ان سے بھی قصاص مل  
لے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”فیئر ہے تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ فی الحال ہمیں اس میں الجھنے  
کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ہم اب جو کچھ بھی کریں  
اپنے طور پر کریں۔“

”حفظ صاحب سے ملاقات کے دوران جب میں وقت پر میں  
انہیں اصل کمائی سناؤں گا اور عرفان کو قادیوں میں کڑوں کا توکل ہے  
حفظ صاحب یہ چاہیں کہ میں عرفان کو اپنے ساتھ لے جانے کی  
کوشش نہ کروں بلکہ خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کر دوں۔“ میں نے  
اعادہ ظاہر کیا۔

”تم ان کی بات ہرگز نہ ماننا۔“ راجیل نے گویا مجھے نصیحت کی  
”تم ہی فوراً عرفان کو لے کر وہاں سے غائب ہونے کی کوشش کرنا۔  
ہم تمہیں چاروں طرف سے تحفظ دینے کے لیے موجود ہوں گے  
ہم دور رہتے ہوئے بھی تم سے دور نہیں ہوں گے۔“

”واہ اکیلا دو میٹنگ کی بات کی ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔  
”تمہیں اس وقت مدینس سوجہ رہا ہے؟“ راجیل نے  
خوشخوار نظروں سے مجھے گھورا۔

”مجھے تو اس وقت کچھ بھی نہیں سوجہ رہا۔“ میں نے سم  
جانے کی اینٹنگ کی ”میرا ذہن تو قلب ثنائی بنا ہوا ہے۔ ایسا لگا  
ہے میری سوجوں تک پر برف جم گئی ہے۔ اسی لیے تو کوشش کرنا  
ہوں کہ کچھ زتے دامیاں اپنے ”مضبوط“ کندھوں سے ہٹا کر  
تمہارے ڈاکہ کندھوں پر ڈال دوں۔“

”کیا کہنے تمہارے مضبوط کندھوں کے۔“ وہ جلتے سے لے  
میں بولی ”دل چاہتا ہے کہ ان کے دو ہاتھ مار کر پیشہ کے لے  
جسمیں درخون کندھوں سے ”سکندرش“ کر دوں۔“

”یہ حسرت دل میں لے کر قسمت سے گیندے اس دن سے  
رفتہ ہو چکے ہیں۔ تم کس کیمت کی بھنڈی ہو۔ مولیٰ میں نے اس

تاریاں کٹی ہوں گی اور آپس میں زابطے کے لیے ہم اپنے ٹیلی فون  
اور ریڈیو وغیرہ بھی استعمال نہیں کر رہے ہوں گے دوسرے طریقے  
اختیار کریں گے اس لیے کافی دقت متاٹھ ہو گا۔“

”میں کوشش کروں گا کہ جیسے ہی ملاقات ملے ہو، تمہیں جگہ  
کے بارے میں مطلع کر دوں۔“ میں نے چند لمبے کی خاموشی کے بعد  
کہا ”مجھے لگتا ہے کہ تم یہ کام کرنے پر تلی ہوئی ہو تو کبھی کر دو گی۔  
لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ عرفان کوئی خاص اہم  
آدمی نہیں ہے۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی جگہ دو سے اس پر ہاتھ  
ڈالیں۔ ریٹ ڈاٹ سے کھلی جنگ مولیں اور وہ محض قربانی کا ایک  
بکرا ہی ثابت ہو۔ بکرا بھی ایسا اسحق جسے علم ہی نہ ہو کہ وہ قربانی کا  
بکرا ہے۔“

”تم بھی کسی بے وقوفی کی بات کر رہے ہو۔“ راجیل حیرت  
سے بولی ”قربانی کے بکرے کو بھلا کہاں علم ہوتا ہے کہ وہ قربانی کا بکرا  
ہے اگر اسے علم ہو تو وہ قربانی کا بکرا بنے ہی کیوں؟ دہری میں بندھا  
ہو تب بھی دہری خرا کر مٹنے کی کوشش کرے۔“

”بعض بکروں کو لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ وہ قربانی  
کے بکرے ہیں لیکن وہ بہت مضبوطی سے بندھے ہوتے ہیں یا پھر شتر  
مراغ کی طرح اس حقیقت کی طرف سے انہیں بندھے رکھنے کی  
کوشش کرتے ہیں۔“

”میں نے عرفان کو نہیں دیکھا لیکن تمہاری زبانی تفصیلات سن  
کر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ اہم آدمی ہے۔“  
راجیل بولی ”فرض کر دو اہم آدمی نہیں ہے تب بھی آخر ہم کسی  
اہم آدمی پر ہاتھ ڈالنے کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہیں گے؟ اگر  
یہ آدمی غیر اہم ہوتا تب بھی ہمارے اس آپریشن کا یہ ناکہ نہ تو ہو گا کہ  
بقول تمہارے ریٹ ڈاٹ سے ہماری کھلی جنگ شروع ہو جائے گی۔  
ہو سکتا ہے اس کے بعد تیزی سے اہم واقعات رونما ہونا شروع  
ہوں اور کچھ کارآمد خاتق شخصیات سامنے آجائیں۔ معاملہ کسی  
طرف تو لگا دکھائی دے۔ فی الحال تو ہم عجیب بے مورد صورت حال  
میں پھنسے ہوئے ہیں۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی جگجگبی فطرت کی مالک ہو۔“  
میں نے سر کھمکتے ہوئے کہا۔

”میں جگجگو نہیں بلکہ ”عک“ آمد بہ جنگ آمد“ کی قائل  
ہوں۔“

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”کیا ہمیں اس  
معاٹے میں ایجنسیوں سے مدد لینا چاہیے؟“

”ہرگز نہیں“ راجیل فیصلہ کن نتیجے میں بولی ”وہ اس معاٹے  
کو اپنی مرضی اور اپنے اسٹاکس کے مطابق پھنسل کریں گے۔  
ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ عرفان کو بھی وہ لے جائیں  
گے اور ضروری نہیں کہ اس سے جو کچھ معلوم ہو وہ ہمیں بھی  
بتائیں۔ ہم اسی طرح اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں مار رہے ہیں جبکہ

طور پر ملاقات ضروری ہوتی تو ہم جس مژدہ رات اسلام آباد میں  
ہی رول لیتے۔ حفیظ صاحب ابھی اسلام آباد میں ہی موجود ہیں۔  
ہم چاہتے ہیں ان سے تمہاری ملاقات امریکا کے دورے پر ان کے  
دوانہ ہونے سے صرف ایک دن پہلے ہی ہو۔ اس وقت وہ لاہور  
میں ہوں گے۔ اس سے پہلے ہمیں ان کے ساتھ صرف فون پر  
ملاقات کا پروگرام بنانے کرنا ہے۔

”جیسے آپ کا حکم ہو گا میں تو ایسی طرح چلوں گا حضور والا! میں  
تو حکم کا غلام ہوں۔“ میں نے بدستور چلے گئے لیجے میں کہا۔

”زیادہ محروم فیہ کی ضرورت نہیں۔ بس اس چھوٹے سے کام  
کے بعد تمہاری بہت سے جان چھوٹ جائے گی۔“ وہ ملافت سے بولا  
”حرکت میں آنے سے میری مزاحمت تھی کہ تم کم از کم اسی فون  
ضرور کرلو۔ ان کے شیڈول کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کام میں  
ہمارے لیے ہر چیز کے وقت کے یقین کی بہت اہمیت ہے۔ اگر  
تمہاری ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور جو کام جس طرح ہمیں نالا  
میا ہے اس طرح نہ ہو سکا تو نہ صرف تمہارے لیے بلکہ تمہارے  
ملک کے لیے بھی بڑے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔“

”یہ کون سی نئی بات ہے جناب والا!“ میں نے غصہ کی سانسیں  
لے کر ملافت سے کہا ”جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور جب سے  
یہ ملک پیدا ہوا ہے ہم دونوں ہی سانسیں کے درمیان کی رہے ہیں۔  
اندیشہ یہی ہے کہ جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں تب تک ہم جیسے  
لوگوں کا یہی حال رہے گا۔ ہر حال تم فکر نہ کرو یہ کام تمہاری  
مرضی کے عین مطابق ہو گا۔“

”اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“ یہ کہہ کر وہ غالباً سلسلہ منقطع  
کرنے لگا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا ”ایک منٹ ٹھہرو مجھے تم  
سے ایک بات پوچھنا تھی۔“

”کوئی شش گروں گا۔ وعدہ نہیں کرتا۔ ویسے زیادہ تر ہم جی سی  
بولتے ہیں۔“

”وہ جو ایک لڑکی میری دوست ہے جس کے گھر تم نے حملہ  
کرایا تھا۔ کیا حال میں میں تم نے اس کی نگرانی کے لیے کسی کو مقرر  
کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”راہیلہ کی بات بکھر رہے ہو؟“ وہ اطمینان سے بولا۔ میں انچ  
رانت میں کم از کم راہیلہ کا نام اس سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش  
کر رہا تھا لیکن اسے تو نام پہلے ہی معلوم تھا۔ مجھے اس کے سوال  
جو اب اثبات میں ہی دینا پڑا۔

”نہیں“ وہ بلا تامل بولا ”ہم نے اس کی نگرانی پر کسی کو مقرر  
نہیں کیا۔ وہ لڑکی زبردست ہے لیکن ہماری نظر میں اس کی کوئی  
اہمیت نہیں۔ نگرانی کے پکر میں ویسے بھی ہم عام طور پر نہیں  
پڑتے۔ صرف تمہاری وجہ سے وہ ہمارے حجاب کا نشانہ بننے سے  
محنتی۔“

”تمہارا یہ احسان میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔“

لیے نہیں کہا کہ وہ پھر بھی کچھ مضبوط ہوتی ہے۔“ پھر میں نے اٹھتے  
ہوئے کہا ”اب میں چلتا ہوں۔“

”یہ اچانک ہی کیوں گھڑے ہوئے؟“ اس نے حیرت سے  
کہا ”اس کرسی میں تو اسپرنگ بھی نہیں ہیں جنہوں نے ہمیں  
اچھال دیا ہو۔“

”ضروری باتیں تو ہو چکیں۔ ویسے بھی تم اب قائم مقام ہاں  
ہو۔ تمہارا جتنی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے مصویت  
سے کہا۔

”میں تو قائم مقام ہوں۔ جب تک تم اپنی جگہ پر قائم ہو تب  
تک تو میری کوئی اہمیت نہیں۔ اب میں سوچ رہی ہوں تمہارا تختہ  
اُٹ کر ”دی سرکل“ کا اقتدار حاصل کرلوں۔ لیکن کیا کروں  
تمہارا تختہ تو تخت سے بھی زیادہ بھاری ہے۔ اٹانا ہی نہیں جا رہا مجھ  
سے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”مگر آؤ مت“ میں خود ہی اپنا تختہ اُٹھا کر ایک طرف ہو جاؤں  
گا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا اب زیادہ بے تکلیف مت باکو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔  
کسی میں واقعی کوئی تختہ اُٹھا کر تمہارے سر نہ دے اور۔ میں  
تو اب تمہارے لیے کھانا بنانے کے بارے میں ٹھیکہ کی سے سوچ  
رہی تھی۔“

”یہ دردناک منظر مجھ سے دیکھا نہیں جائے گا۔“  
”دردناک منظر تو تب ہو گا جب تم اسے کھانے بھروسے  
پکانے کی حد تک بھلا اس میں کیا دردناکی ہے؟“

”یہ بھی خاصی دردناک سی بات ہے کہ چند منٹ پہلے  
تمہارے ہاتھ میں دردناک رانا نقل ہوتی ہے اور چند منٹ بعد سانسیں  
کی ہڈیاں میں چلانے والا چپچہ۔ یہ تو واقعی زیادتی ہے۔ عورت کے  
ناؤک کندھوں پر بہت سی زیادہ وزن داناں لادو کی کیا ہیں۔“

”پھر وہی نازک کندھے!“ اس نے دانت چس کر گھرنا ہوا

میں لہرایا۔ میں اسے خدا حافظ کہتے ہوئے جلدی سے باہر آگیا۔  
اوٹل پہنچ کر میں نے کھانا کھانا ”اوپر اپنے کمرے میں جا کر  
لباس تبدیل کیا اور چار ہو کر آفس چلا گیا حالانکہ غصہ کی دقت تھا۔  
آفس میں بیٹھے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے فن کا فون  
آگیا۔

وہ بلا تمہید بولا ”میں نے سوچا جس یاد دہانی کرادوں۔ بس ٹو  
لے جو کام تمہارے سپرد کیا ہے“ جس میں اس کے سلیٹے میں حرکت  
میں آجانا چاہیے۔“

”حضور والا! آپ کا یہ ہنڈہ بے دام ابھی آفس آکر بیٹھا ہی  
ہے۔ اگر حکم ہو تو ابھی سر کے تلے دوبارہ اسلام آباد پہنچ جائے؟“  
میں نے جمل کر کہا۔

”نہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ طنز ورا بھی  
توجہ دے بغیر ٹھیکہ کی سے بولا ”حفیظ صاحب سے آکر تمہاری ذاتی

ریڈ ڈاٹ کا زلزلہ صرف ہم ہی کرے گا۔

”یہ تو غیر ضروری نہیں ہے۔ جو بھی راستے میں آئے گا بہرہ  
کچھ نقصان تو اٹھائے گا۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کل ہی  
اسلام آباد میں خفیہ ایجنسیوں سے میری تادم ترین جنگ کے  
دوران انہوں نے ایک گاڑی آڑادی ڈرائیور کے پر پٹے اڑا دیے  
اور نہ جانے کس ایجنسی کے دو آدمی شدید زخمی بھی ہوئے۔ اس  
کارروائی کا تو کوئی مقصد بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”شاید اس کا مقصد صرف ایجنسیوں کو یہ بتانا ہو کہ وہ ان کی  
تمام سرگرمیوں سے واقف ہیں اور وہ تمہارے ساتھ تادم ترین  
وغیرہ نہ ہی رکھیں تو ان کے حق میں اچھا ہے۔“ راجیلہ نے خیال  
ظاہر کیا۔

”دعہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ریڈ  
ڈاٹ واسلے ایجنسیوں سے کچھ معاملہ سہی لیکن وہ ان سے خوف نہ  
بہر حال نہیں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ ان سے بھی تصادم مسلح  
کے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”خیر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ فی الحال تمہیں اس میں الجھے  
کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ہم اب جو کچھ بھی کریں  
اپنے طور پر کریں۔“

”فیضان صاحبہ نے ملاقات کے دوران جب میں وقت رہی  
انہیں اصل کمائی بتا دی کہ اور عرفان کو قابو میں کر لیا تو ممکن ہے  
فیضان صاحبہ یہ چاہیں کہ میں عرفان کو اپنے ساتھ لے جائے کی  
کو شش نہ کر لیں بلکہ خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کر دوں۔“ میں نے  
اندیشہ ظاہر کیا۔

”تم ان کی بات ہرگز نہ ماننا۔“ راجیلہ نے گرجا جیسے صیحت کی  
”تم ہی فوراً عرفان کو لے کر وہاں سے غائب ہونے کی کو شش کر لیں۔  
ہم تمہیں چاروں طرف سے تحفظ دینے کے لیے موجود ہوں گے  
ہم دور رہتے ہوئے بھی تم سے دور نہیں ہوں گے۔“

”واہ! کیا وہ جنگ کی بات کی ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔  
”تمہیں اس وقت دینیس سوجہ رہا ہے؟“ راجیلہ نے  
خوشخوار نظروں سے مجھے گھورا۔

”مجھے تو اس وقت کچھ بھی نہیں سوجھ رہا۔“ میں نے سم  
جائے کی ایکٹنگ کی ”میرا ذہن تو قلب ٹھکیا ہوا ہے۔ ایسا لگا  
ہے میری سوچیں تک پر برف جم چکی ہے۔ اسی لیے تو کو شش کر رہا  
ہوں کہ کچھ ذستے دامیاں اپنے ”منہ بول“ کہہ دوں گے تاکہ  
تمہارے نازک کدھوں پر ڈال دوں۔“

”کیا کہنے تمہارے منہ بول کدھوں کے۔“ وہ جھپٹے کھٹے لہجے  
میں بولی ”دل چاہتا ہے کہ ان کے دو ہاتھ مار کر پیٹنے کے لیے  
تمہیں دووں کدھوں سے ”بگدوش“ کر دوں۔“

”یہ حسرت دل میں لے کر قسمت سے گزرتے اس دنیا سے  
رفتہ ہو چکے ہیں۔ تم کس گھیت کی بھڑکی ہو۔“ میں نے اسے

تیارواں کھینچی ہوں گی اور آہیں میں زرا جیلے کے لیے ہم اپنے لیلی فون  
اور ریڈیو وغیرہ بھی استعمال نہیں کر رہے ہوں گے۔ دوسرے طریقے  
اختیار کریں گے اس لیے کافی وقت ضائع ہو گا۔“

”میں کو شش کر دوں گا کہ جیسے ہی ملاقات ملے ہو۔ تمہیں جبکہ  
کے بارے میں مطلع کر دوں۔“ میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد  
کہا ”مجھے لگتا ہے کہ تم یہ کام کرنے پر تلی ہوئی ہو تو کبھی کر دو گی۔  
لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ عرفان کو کوئی خاص اہم  
آدمی نہیں ہے۔ کیوں ایسا نہ ہو کہ ہم اتنی جگہ دو سے اس پر ہاتھ  
ڈالیں۔“ ریڈ ڈاٹ سے مکملی جنگ مسلح ہیں اور وہ محض قربانی کا ایک  
بکرا ہی ثابت ہو۔ بکرا بھی ایسا احسن جسے علم ہی نہ ہو کہ وہ قربانی کا  
بکرا ہے۔“

”تم بھی کسی بے وقوفی کی بات کر رہے ہو۔“ راجیلہ حیرت  
سے بولی ”قربانی کے بجائے کو بھلا کلام ہو رہا ہے کہ وہ قربانی کا بکرا  
ہے۔ اگر اسے علم ہو تو وہ قربانی کا بکرا بنے ہی کیوں؟“ اسی میں بندھا  
ہو تب بھی اسی ترا کر بھانسنے کی کو شش کر رہے۔“

”بعض بکروں کو لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ وہ قربانی  
کے بجائے ہیں لیکن وہ بہت سنبھلے سے بندھے ہوتے ہیں یا پھر شتر  
مرد کی طرح اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کیے رکھنے کی  
کو شش کرتے ہیں۔“

”میں نے عرفان کو نہیں دیکھا لیکن تمہاری زبانی تفصیلات سن  
کر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ اہم آدمی ہے۔“  
راجیلہ بولی ”فرض کر دو کہ وہ اہم آدمی نہیں ہے تب بھی آخر ہم کسی  
اہم آدمی پر ہاتھ ڈالنے کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہیں گے؟ اگر  
یہ آدمی غیر اہم ہو تب بھی ہمارے اس آپریشن کا یہ فائدہ تو ہو گا کہ  
بقول تمہارے ”ریڈ ڈاٹ سے ہماری مکملی جنگ شروع ہو جائے گی۔  
ہو سکتا ہے اس کے بعد تجزی سے اہم واقعات رونما ہوں شورش  
ہوں اور کچھ کارآمد حقائق یا شخصیات سامنے آجائیں۔“ معاملہ کسی  
طرف تو لگا دکھائی دے۔ فی الحال تو ہم مجب ہے ہر وہ صورت حال  
میں جھپٹے ہوئے ہیں۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی جنگجوئی فطرت کی مالک ہو۔“  
میں نے سر ہلکاتے ہوئے کہا۔

”میں جنگجو نہیں بلکہ ”جنگ“ آدم بہ جنگ ”آدم“ کی قاتل  
ہوں۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”کیا ہمیں اس  
محلے میں ایجنسیوں سے مدد لینا چاہیے؟“

”ہرگز نہیں۔“ راجیلہ فیصلہ کن جیسے میں بولی ”وہ اس محلے  
کو اپنی مرضی اور اپنے اسٹائل کے مطابق چنل کریں گے۔  
ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ عرفان کو بھی وہ لے جائیں  
گے اور ضروری نہیں کہ اس سے جو کچھ معلوم ہو وہ ہمیں بھی  
بتائیں۔ ہم اسی طرح اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں مارتے وہیں جبکہ

طور پر ملاقات ضروری ہوئی تو ہم تمہیں گزشتہ رات اسلام آباد میں ہی روک لیتے۔ حفیظ صاحب ابھی اسلام آباد میں ہی موجود ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ان سے تمہاری ملاقات امریکا کے دورے پر ان کے روانہ ہونے سے صرف ایک دن پہلے ہی ہو۔ اس وقت وہ لاہور میں ہوں گے۔ اس سے پہلے تمہیں ان کے ساتھ صرف فون پر ملاقات کا پروگرام طے کرنا ہے۔

”جیسے آپ کا حکم ہو گا میں تو اسی طرح چلوں گا حضور والا! میں تو حکم کا غلام ہوں۔“ میں نے بدستور چلے گئے لیجئے کیا۔

”زیادہ خطرہ غیور کی ضرورت نہیں۔ بس اس چھوٹے سے کام کے بعد تمہاری ہم سے جان چھوٹ جائے گی۔“ وہ ملافت سے بولا ”حرکت میں آنے سے میری مراد یہ تھی کہ تم کم از کم انہیں فون ضرور کرو۔ ان کے شیڈول کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کام میں ہمارے لیے ہر چیز کے وقت کے قیمن کی بہت اہمیت ہے۔ اگر تمہاری ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور جو کام جس طرح تمہیں بتایا گیا ہے اس طرح نہ ہو سکا تو نہ صرف تمہارے لیے بلکہ تمہارے ملک کے لیے بھی بڑے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔“

”یہ کون سی نئی بات ہے جناب والا!“ میں نے غٹھڑی سانس لے کر ملافت سے کہا ”جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور جب سے یہ ملک پیدا ہوا ہے ہم درودوں ہی مسائل کے درمیان لپیٹے رہے ہیں۔ اندیشہ یہی ہے کہ جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں تب تک ہم جیسے لوگوں کا یہی حال رہے گا۔ بہر حال تم نگرانہ کرو یہ کام تمہاری مرضی کے عین مطابق ہو گا۔“

”اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“ یہ کہہ کر وہ غالباً سلسلہ متعلق کرنے لگا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا ”ایک منٹ ٹھہرو مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔“

”کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کرتا۔ ویسے زیادہ تر ہم جی جی ہوتے ہیں۔“

”وہ تو ایک لڑکی میری دوست ہے جس کے گھر تم نے حملہ کر دیا تھا۔ کیا حال میں تم نے اس کی عمرانی کے لیے کسی کو مقرر کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”راحیلہ کی بات کہہ رہے ہو؟“ وہ اطمینان سے بولا۔ میں اپنی دانست میں کم از کم راحیلہ کا نام اس سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے تو نام پہلے ہی معلوم تھا۔ مجھے اس کے سوال کا جواب اثبات میں ہی دینا پڑا۔

”نہیں۔“ وہ بلا تامل بولا ”ہم نے اس کی عمرانی پر کسی کو مامور نہیں کیا۔ وہ لڑکی زبردست ہے لیکن ہماری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ عمرانی کے پکر میں ویسے بھی ہم عام طور پر نہیں پڑتے۔ صرف تمہاری وجہ سے وہ ہمارے حساب کا نشانہ بننے سے بچ گئی۔“

”تمہارا یہ احسان میں مرے دم تک میں بھولوں گا۔“ میں

لے نہیں کہا کہ وہ پھر بھی کچھ مضبوط ہوتی ہے۔“ پھر میں نے اُٹھتے ہوئے کہا ”اب میں چلتا ہوں۔“

”یہ اچانک ہی کیوں اٹھ کھڑے ہوئے؟“ اس نے حیرت سے کہا ”اس کرسی میں تو اسپرنگ بھی نہیں ہیں جنہوں نے تمہیں اُجالا دیا ہو۔“

”ضروری باتیں تو ہو چکیں۔ ویسے بھی تم اب قائم مقام پاس ہو۔ تمہارا جتنی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

”میں تو قائم مقام ہوں۔ جب تک تم اپنی جگہ پر قائم ہو تب تک تو میری کوئی اہمیت نہیں۔ اب میں سوچ رہی ہوں تمہارا تختہ اُٹل کر ”دی سرکل“ کا اقتدار حاصل کریں۔ لیکن کیا کروں تمہارا تختہ تو تخت سے بھی زیادہ بھاری ہے۔ اُٹائی نہیں جا رہا مجھ سے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”گھر اور مت“ میں خود ہی اپنا تختہ اُٹھا کر ایک طرف ہو جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا اب زیادہ بے تعلقی مت بناؤ اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ کہیں میں واقعی کوئی تختہ اُٹھا کر تمہارے سر نہ دے دوں۔ میں تو اب تمہارے لیے کھانا بنانے کے بارے میں تنجید کی سے سوچ رہی تھی۔“

”یہ دردناک منظر مجھ سے دیکھا نہیں جائے گا۔“

”دردناک منظر تو جب ہو گا جب تم اسے کھانے بٹھو گے پکانے کی حد تک بھلا اس میں کیا دردناکی ہے؟“

”یہ بھی خاصی دردناک سی بات ہے کہ چند منٹ پہلے تمہارے ہاتھ میں درد مارا نکل ہوتی ہے اور چند منٹ بعد سانس کی بندھن میں چلائے والا چپچہ۔ یہ تو واقعی زیادتی ہے۔ عورت کے نازک کندھوں پر بہت ہی زیادہ وزن دھارنا لاوڈی کی نہیں۔“

”پھر وہی نازک کندھے!“ اس نے دانستہ نہیں کرکھنا ہوا میں لہرایا۔ میں اسے خدا حافظ کہتے ہوئے جلدی سے باہر نکلیا۔

ہوئی پہنچ کر میں نے کھانا کھلایا اور اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا اور تیار ہو کر آفس چلا گیا حالانکہ مجھے کادقت تھا۔ آفس میں بیٹھے بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے فون کا فون آیا۔

وہ بلا تمہید بولا ”میں نے سوچا تمہیں یاد دہانی کروں۔ پاس ٹو لے کر کام تمہارے پر کیا ہے تمہیں اس کے سلسلے میں حرکت میں آنا چاہیے۔“

”حضور والا! آپ کا یہ بیڑا بے دام ابھی آفس آکر بیٹھا ہی ہے۔ اگر حکم ہو تو ابھی سر کے تلے دوبارہ اسلام آباد پہنچ جائے گا۔“ میں نے جمل کر کہا۔

”نہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ طنز زرا بھی توجہ دے بغیر تنجید کی سے بولا ”حفیظ صاحب سے اگر تمہاری ذاتی



کیا۔

وہ دور ہی ہے مجھے دیکھ کر دونوں بازو پھیلا کر تیزی سے آگے بڑھے۔ ان کے زری والے کتے ہر قدم پر خوب چرچا رہے تھے۔ قریب آتے ہی وہ ایک جھنگل سے مجھ سے لپٹ گئے۔ لپٹے بھی کیا؟ تقریباً لنگ سی گئے۔ اندازاً کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی باپ برسوں اپنے بیٹے سے ہجڑا رہنے کے بعد ملا ہو اور اس دوران بیٹے پر بہت سے مددے گزر گئے ہوں۔

کافی عرصہ پہلے میں نے ان کی نگرانی میں ایک شاندار اکھاڑ قائم کرانے کے انتظامات کر دیے تھے اور اپنے ناکائس ڈائریکٹر سے کہہ دیا تھا کہ انہیں کوئی مالی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد میری ان سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ میں انہیں تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ آج انہیں دیکھا تو خیال آیا کہ میں نے اکھاڑے کے بارے میں کوئی رپورٹ ہی طلب نہیں کی تھی۔

خلیفہ نواز پری پیکر مجھ سے لپٹ کر میری پمپاں کڑکرائے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس عمر میں بھی ان میں بہت سے نوجوانوں سے زیادہ طاقت تھی۔ ان کی پکڑی کے نیچے سے جھانکے ہوئے بالوں سے چٹیلی کے تیل اور ان کے کپڑوں سے کئی عطریاتی تیز خوشبو آ رہی تھی۔

اسی دوران میں نے دیکھا ٹرک سے ایک ایک کر کے نوجوان کودنا شروع ہوئے۔ ان میں سے بیشتر بلیک میٹ تھے اور لاچوں میں ہی تھے۔ بعض شلوار قمیصوں میں تھے۔ ایک آدھ جینز جیکٹ میں بھی تھا۔ بیشتر نوجوان اچھے خرمندہ، پاڈی بلڈز ٹاپ اور کچھ پملوان ٹاپ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک سے جیکبسن تیس نوجوان اتر آئے اور میرے سامنے جلوس کی طرح جن ہو گئے۔ وہ تقریباً سب کے سب قابل رشک جوانی کے مالک تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی اور تندہی کی چمک تھی۔ آنکھوں میں آسپد کی روشنی تھی۔ وہ جھپٹس سے انداز میں بھی میری طرف اور بھی غارت کی طرف دیکھ رہے تھے۔

خلیفہ نواز پری پیکر کافی دیر تک بنگلہ رہنے اور حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکالنے کے بعد آخر کار آگ ہوئے تو میں نے دیکھا ان کی آغوشوں میں آگ ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

"خلیفہ جی! آپ کی آنکھوں میں آنسو؟" مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ "کس نے آپ کو صدمہ پہنچایا؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟ کچھ بتائیں تو سہی۔"

"میں بتائے نہیں، پوچھتے آیا ہوں چہ ذری بخیر!" وہ جلدی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولے "مجھے جو صدمہ پہنچا ہے وہ تو دراصل تمہارے صدمے کی وجہ سے ہے۔ مجھے بتاؤ، تمہیں کس نے صدمہ پہنچایا ہے؟ وہ کون بد بخت ہے جو تم جیسے اچھے آدمی کا دشمن ہو گیا ہے؟"

نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن اس جواب کی وجہ سے ذہنی غلٹ کچھ اور بڑھ گئی تھی کیونکہ یہ سوال ایک بار پھر سامنے آن کر رہا ہوا تھا کہ راجیل کے پارٹنرٹ کی نگرانی کرنے والا اگر دیے ذات کا آدمی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ کیا ہمارے لیے غصے کی ایک اور ممکنہ نرخی تھی؟ کچھ لوگ یہ کہہ کر اس کی تلاش لے کر تیزی سے غائب ہو گئے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔ لیکن خفیہ پولیس کے یہ انداز و اطوار نہیں ہوتے۔ ہماری خفیہ پولیس اتنی بھی خفیہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس شخص کی گاڑی کا نمبر بھی جعلی ثابت ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اچھی علامتیں نہیں تھیں لیکن فی الحال اس معاملے میں کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

اسے سن بولا۔ "وہ لڑکی بہت تیز معلوم ہوتی ہے۔ تم نے اسے ہیبت کدی گئی کہ ہمارے معاملے میں جتنا رہا ہے؟"

"کاش میں اسے کوئی ہیبت کر سکتا۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا "بہر حال میں نے ہمارے بارے میں اسے ضروری باتیں بتا دی ہیں وہ خاصی سمجھدار ہے۔"

"اگر اس نے سمجھداری کا ثبوت نہ دیا تو نقصان اٹھائے گی۔" اسے سن نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دانت بھیج گئے لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

دبیسوہر رکھنے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک سوچوں میں الجھا رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے گرد کوئی دایہ دار اور بدتر دنیا تک ہو رہا تھا۔ آخر کار میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر فون پر حفیظ صاحب کی اسلام آباد والی سرکاری رہائش گاہ سے رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ حفیظ صاحب کسی سینیار میں ممان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ اگر میں رات نو بجے فون کروں تو ان سے بات ہو سکتی ہے۔ میں نے پیغام چھوڑ دیا اور سوچا کہ رات کو ہوٹل سے فون کروں گا۔

چند ضروری کام نمٹانے کے بعد میں دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔ نیچے پہنچ کر میں اپنی گاڑی نکالنے پر کنگ لائٹ کی طرف جا رہا تھا کہ غارت کے مین گیٹ سے میں نے ایک ٹرک اندر آتے دیکھا۔ وہ گیٹ سے ذرا اندر تو آیا لیکن گاڑی نے اسے فوراً ہی مدک لیا کیونکہ وہ ہماری کمپنی کا ٹرک نہیں تھا۔

میں یہ دیکھنے کے لیے ٹرک گیا کہ ٹرک کس کا تھا اور کس سلسلے میں آیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ٹرک کے اگلے حصے سے خلیفہ نواز پری پیکر کو اترتے دیکھا۔ وہ رٹنا پملوان تھے۔ بھوس تک مفید تھیں۔ کافی ہماری بھر گئے تھے "تو بد بھی فعل فعل کرتی تھی لیکن ان کا ٹرک سے اترنے کا انداز تاروں کا سا تھا۔ ان کی رنگین دھوٹی اور روشنی کرنا ایک لمحے کے لیے ہوا میں بیراشٹ بن کر رہ

بھی موجود ہیں۔ میں نے انہیں شرف میں ہی بتا دیا تھا کہ دارا عالمیوں کو لکھا کرتے ہیں۔ تمام کڑا یا ہے۔ تمہارے دفتر سے ہی ہمیں سارے خزانے ملتے ہیں۔ غریب لڑکوں کو جان شان بنانے پہلوانی سکھانے اور باڈی بلڈنگ کے لیے جب فوج تک ملتا ہے۔ میری سفارش پر انہیں تمہارے دفتر سے دفتروں سے دے کر وہ کھائیں۔ جس اور دل لگا کر جان بچائیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ اکھاڑے کے یہ سب موقوفے تمہارے دم سے ہیں۔ تم نے تو پرانے زمانے کے نوابوں اور راجوں مہاراجوں کی یاد تازہ کر رکھی ہے۔

”اس میں میرا کوئی کمال نہیں غلطی تھی۔“ میں نے طاعت سے کہا۔ ”یہ سب اور والے کا کرم ہے۔ مجھے تو پتا بھی نہیں ہے کہ یہ سب کیسے ہوا ہے۔ کمال سے ہوا ہے۔ میں نے تو بس اپنے دفتر کو حکم دے دیا تھا کہ آپ جو کچھ اس پر عمل کیا جائے۔ اس کے بعد تو مجھے کچھ پتا ہی نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بہتر! ہو تا تو بس کچھ اور والے کے حکم سے ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گہری عقیدت سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ”اس کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں مل سکتا۔ لیکن نیت بڑی ضروری ہوتی ہے۔ کوئی بھی کام اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس کی نیت اور ارادہ نہ کیا جائے۔ اچھے کام۔ خاص طور پر ایسے اچھے کام جن میں بہت ساڑی رقبہ خرچ ہوتی ہیں۔ ایسے کاموں کی نیت کرنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم حوصلہ کرتے ہو۔ نیت کرتے ہو! بات کام اور والا کرتا ہے۔“

”اکھاڑہ ٹھیک خاک چل رہا ہے نا؟ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے غلطی تھی؟ کچھ ترقی ہو رہی ہے یا نہیں؟ لڑکوں میں کچھ ذوق شوق بڑھ رہا ہے یا نہیں؟“ میں نے بے باکی سے پوچھا۔

”اکھاڑے کی تو کچھ مت پوچھو بہتر! اللہ نے بڑی مدد نصیب لگائی ہیں۔ دور دور سے بچے کھینچے چلے آ رہے ہیں۔ تم اسی سے ارادہ کرلو۔“ انہوں نے جلوس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میں خاص خاص اور اچھے اچھے بچے چھانت کر لایا ہوں۔ کمزور اور سنے پٹوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ تم ہم سے پوچھ رہے ہو کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ ہمیں تو تمہارے ہوتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہے چوہڑی بہتر! ہم تو تمہاری تکلیف میں کام آنے کے لیے آئے ہیں۔“

انہوں نے بے درمیانی کے سے عالم میں اپنی گھنٹی سنبھالی۔ مومچوں کو غل دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے ”میں ان بچوں سے تمہاری اتنی باتیں کرنا رتا ہوں۔ یہ سب بھی تم سے آگے بند کر گئے محبت کرنے لگ گئے ہیں۔ انہی میں سے کسی نے کسی میں ڈالنے کے لیے ملاوٹی سے بچے منگوائے تھے۔ جس پرانے انبان میں بچے بیڑے رکھ کے لایا اس میں تمہاری کوٹھی کی تہائی کی چھوٹی سی خبر چھپی ہوئی تھی۔ مجھے بچے نے پڑھ کے سنائی۔ میرا تو خون

میں ذرا چمکا تاہم میں نے انجان بچے ہوئے کہا ”میں سمجھا نہیں غلطی تھی؟“

وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارنے ہوئے بولے ”یہ بھی تمہاری بڑائی کی دلیل ہے چوہڑی بہتر! تم مجھے بتانا نہیں چاہتے کہ کوئی تم سے دشمنی کر رہا ہے یا پھر شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ غلطی تو از پڑی جیکو تو بڑھا ضعیف آدمی ہے۔ یہ بچا تو میری کیا دھڑکے گا۔ لیکن یہ تمہاری غلط فہمی ہے بہتر! جب تک غلطی تو از پڑی جیکو کے اکھاڑے میں ایک بھی نوجوان پہلوان موجود ہے غلطی بڑھا ضعیف ہو سکتا۔ میرے ہر بچے کی جوانی میری جوانی ہے۔ میں اتنا بیکار ڈیال گیا کمزور آدمی نہیں ہوں۔“

انہوں نے پلٹ کر خامے ڈرامائی انداز میں نوجوانوں کے چھوٹے سے جلوس کی طرف اشارہ کیا ”یہ سب میری جوانیاں ہیں۔ میرے برگ بچے ہیں۔ میرے دست و پاؤں ہیں اور یہ سب تمہارے بھی دست و پاؤں ہیں۔ تم حکم تو کر رہی جان! ایک اشارہ کر دو۔ بس پھر جس میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر تم آڑا سے بیٹھ کر تماشا دیکھو کہ ہم تمہارے دشمن کو کس طرح خس خس کرتے ہیں اس کا وہ شکر کریں گے۔ وہ حشر کریں گے کہ اس کی آنے والی تسلیں جانے والی تسلیں سب یاد رکھیں گی۔“

”غلطی تھی! آپ کی باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ آخر قصہ کیا ہے؟“ میں نے تھوڑے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آتے جاتے لوگ تماشا دیکھنے لگیں لیکن قیامت تھا کہ ہم عمارت کے بظنی حصے میں تھے گاڑڈوٹ کے قریب بہت سے کھڑے تھے اور کھلے گیت سے باہر سروس روڈ پر آتے جاتے لوگوں کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔

”واہ چوہڑی بہتر! واہ۔۔۔ غلطی تھی حسانہ سے انداز میں بولے ”متم قصہ بھی اتنا ہی می سے پوچھ رہے ہو۔ کیسی کمال کی بات ہے۔ ہمیں تو زور اڑانے سے پتا چلا رہا ہے ہم پہلے ہی تمہاری مدد کو پہنچ گئے ہوتے۔ ہمیں تو آج ہی پتا چلا ہے کہ کسی نے تمہاری کوٹھی ہم سے اڑا دی ہے۔ پھر میں خود اسٹیشن آگے کر کے وہاں جا کے دیکھ کے آیا۔ وہاں تو واقعی خالوں نے اس کا کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ سنا ہے تمہارے ساڑے بندے بھی مر گئے۔ بس کچھ مت پوچھو کہ یہ سب کچھ سن کر اور اپنی آنکھوں سے وہ پتائی دیکھ کر میرے دل پہ کیا گزری!۔“

ان کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی اور وہ ایک بار پھر جھکی سے آنکھیں پونچھنے لگے۔ اب بات میری سمجھ میں آئی لیکن میں پھر بھی کچھ نہ بول سکا۔ دم بخود کھڑا ان کی طرف دیکھتا گیا۔ ان کی ناک سے شون شون کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

آخر کار وہ سنبھل کر بولے ”مجھے تو تمہارے دفتر کے کسی آدمی نے بتایا تھا کہ ہمیں وہ تو میں ان بچوں سے تمہاری باتیں کرنا دیتا ہوں۔ انہیں بتانا دیتا ہوں کہ اس دنیا میں ابھی تم جیسے لوگ





نہیں جانتے۔" انھوں نے ان کو بھی جاننے ہیں۔ تم آزما کے تو دیکھو۔" میں نے بدوہ ان نو جوانوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر صحت مندی کی تب و تاب کے ساتھ حوصلے کی چمک بھی تھی لیکن پھر بھی وہ ہر حال سادہ دل اور سادہ مزاج تھے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں گھنٹیں بھی زیادہ کار آمد نہیں ہوتیں۔ مٹی کوچوں کی سیدھی سادہ عام سی لڑائیوں اور سطحی سے جھگڑوں میں تو ان کے بخورے بدن یا ان کے ہاتھوں میں موجود گھنٹیں بہت کام آتی تھیں لیکن جن معاملات سے میرا واسطہ پڑا ہوا تھا ان میں یہ لوگ کسی کام کے نہیں تھے۔ میں انھیں اپنے صحن بنانا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خلیفہ کی کو پہلوانوں والی ایک زوردار چٹکی دی اور بٹنے ہوئے کما "خلیفہ جی! چھوڑیں اس موضوع کو کوئی اور بات کریں۔ ان مسائل سے میں خودی نشتر رہوں گا۔"

میری چٹکی سے خلیفہ جی بل کر رہ گئے۔ بڑی مشکل سے منہبل کر ڈرا کھیلانے سے انداز میں بولے "چوہڑی باڈا! مجھے تو لگتا ہے تم خود بھی کسی اکھاڑے میں جا کر بڑا زور شور کرتے ہو۔ اگر ایسا کوئی شوق ہے تو اگر اپنے اکھاڑے کے کسی مددگار بٹھانا کہو۔"

"میں خلیفہ جی! میں کماں زور شر کر رہا ہوں۔ یہ تو جو کچھ بھی ہے بس خدا دادی ہے۔ جب غریب خانہ سلامت تھا تو کچھ بدی کچھ تھوڑی بہت ایکسر سائز کر لیا کرتا تھا۔ آج کل تو ہوش میں غصا ہوا ہوں۔ کبھی گھٹنا آوہ گھٹنا سو تنگ کے لیے میرا تھانا ہے تو اسے ہی بڑی ایکسر سائز سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

"کمال ہے! خلیفہ جی بے یقینی سے بولے "تمہارے رنگ چٹوں میں کوئی بات ہے جو سالوں پہلوانی اور باڈی بلڈنگ کرنے والوں میں بھی نہیں ہوتی۔"

"مجھے تو معلوم نہیں خلیفہ جی! میں نے بے پروائی سے کہا "اگر کچھ ہے تو بس وہ قدرتی طور پر ہے۔ چلیں ان باتوں کو چھوڑیں یہ بتائیں کہ آپ کی کیا خاطر قاضی کی جاسے؟ آپ سب لوگ چل کر بار میرے پاس یہاں آئے ہیں لیکن آپ تو آفس بھی بند ہو چکا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کیا جائے۔ ایسا کرتے ہیں کیسے چلتے ہیں۔"

"جس چوہڑی باڈا! آپ کی محبت اور سرپرستی ہمارے لیے ساری خاطر قاضی سے براہ کر ہے۔ ہم آپ کی کوئی خدمت کرتے تو ہمیں زیادہ خوشی ہوتی۔"

"میں" میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ اچھا معلوم نہیں ہو تاکہ آپ لوگ میرے پاس آئیں اور کچھ کھائے پئے بغیر چلے جائیں۔ آج کل تو ہوش ملی میرا گھر ہے۔ آپ وہیں میرے ساتھ چلیں۔ کچھ نہ کچھ مشغل ہو تو ہمارے پاس آئیں۔ میں گاڑی میں چلتا ہوں آپ اپنا ٹرک پیچھے پیچھے لے آئیں۔ میں نے ان کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس چھوٹے سے جلیس کو ہٹانے کے کرنا

ہے، علم گھٹ گیا ہے۔ لیکن ہم اپنی سی کوشش کرتے رہیں گے۔ میں ان نو جوانوں کو پہلوانی سکھانے کے ساتھ ساتھ ہی تعلیم دیتا ہوں۔" انھوں نے چھوٹے سے جلیس کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے ان نو جوانوں کے دیکھنے سے چہروں کی طرف دیکھا اور میرے دل میں خوشی کی بجلی سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے خلیفہ جی کا کندھا جھٹکتے ہوئے کہا "میں اپنے ملک کے سب نو جوانوں کے چہرے ایسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج کی زندگی نے آج کے مسائل نے انہیں غمگین کر دیا ہے۔ ان کے چہروں پر آنکھ نہیں، نازکی نہیں۔ کچھ کو باپیاں گھار دی ہیں کچھ کو عیاشیاں گھار دی ہیں۔ کچھ کو سیاست گھار دی ہے کچھ کو بے روزگاری گھار دی ہے اور کچھ کو جرائم پیشہ گمبھ گھار دی ہے۔ ہم سب کو تو نہیں چاہتے۔ اگر چند کو چھانے میں بھی کامیاب ہو گئے تو سمجھیں گے ہماری زندگی کام آئی۔"

"چوہڑی باڈا! جب تک میں زندہ ہوں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم ہمیں خدمت کا موقع ہی نہیں دے رہے۔ تم صرف زبان کھولو تمہارے دشمن کو لا کر تمہارے مدد میں پیشکشنا ہمارا کام ہے۔" خلیفہ جی سینہ ٹھوٹک کر بولے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آج کل دست و پاؤ کی لڑائی کا فائدہ نہیں ہے خلیفہ جی! یہ چمکتے دیکھتے چہروں اور چوڑی چٹائیوں والے نو جوان بڑے شہ زور سی۔ لیکن اگر یہ خالی ہاتھ ہوں اور ان کے سامنے کالی، تھکوا اور سوکھی سی شکل کا کوئی ذریعہ پہلی کا رشت گرد کلاشن کوف، اوڑنی یا کوئی اور سب مشین ممکن ہے آجائے تو چند لمحوں میں انہیں ڈھیر کر دے گا۔ یہ جو انیاں ہم سرکوں پر تڑپنے کے لیے نہیں "اس زندگی کو" اس دنیا کو خوب صورت بنانے کے لیے جمع کر رہے ہیں۔ دشمنوں کی کوئی بات نہیں خلیفہ جی! وہ دشمنیاں تو چلتی رہیں گی جو ہو گا سود کھا جائے گا۔ لیکن آپ ان پہلوؤں کو منہبال کر رہیں اور ان کی تھکاشت کریں۔ چھوٹوں کو پروان چڑھانے میں بڑا وقت لگتا ہے مگر انہیں ذالیوں سے نوچنے اور گولیوں کی پھینٹ چڑھانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔"

"چوہڑی باڈا! تمہاری باتیں میرے دل میں صبح کی بارش کی طرح ٹھنڈی ڈال دیتی ہیں۔ کتنے تو تم ٹھیک ہو لیکن پھر بھی، چاہے نہیں لیکن تمہارے ساتھ علم ہوتے دیکھنا ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ ہم دل و جان سے چاہتے ہیں کہ تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔"

پھر انہوں نے مجھے کان قریب لائے کا اشارہ کیا اور رازدارانہ سے انداز میں بولے "یہ جو تم بدوقت بہنوئی کی بات کر رہے ہو۔ قریب سلسلے میں بھی ہم کوئی ایسے گمبھے کر رہے نہیں ہیں۔ اٹھ کا بڑا کرم ہے بڑی عزت ہے شہر میں تمہارے خلیفہ نواز بڑی بیکری کی۔ اسلئے شخصے کا بھی ٹھیک خاک بندوبست ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنے شے خالی خول یا ہیر چلانا

پہلوان ہی تھے۔ ان کے علاوہ غلیفہ جی میں 'نرگ' ڈورا اور راور کھیز بھی تھے۔ میں سب کو اوردے لے آیا تھا۔

زانگہ ہال میں دھڑوں نے جلدی جلدی ہمارے لیے کرسیوں کی ترتیب بدل۔ ابھی رات کے کھانے کا ورش شروع نہیں ہوا تھا اس لیے ہمیں نشستیں آسانی سے مل گئیں۔ پہلوانوں کی سہجہ دیکھ کر دیکھ کر عام آدمیوں کی نسبت ذرا بھاری ہنجر ہوئی ہے۔ ہم سب جموی طور پر اپنی اصل تعداد سے ڈیڑھ دو گنا محسوس ہو رہے تھے۔

بہشت کا مرحلہ سر ہو چکا تو دھڑوں نے مینو لاکر ہماری خدمت میں پیش کیے۔ غلیفہ جی مینو کو اچھے پلٹے ہوئے اور چمچ میچند می آگھوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولے "یہ رجسٹر کیا کچر اگیا ہے میرے ہاتھ میں؟"

"یہ مینو ہے غلیفہ جی" میں نے انہیں بتایا "اس میں ان چیزوں کے نام چھپے ہوئے ہیں جو یہاں مل سکتی ہیں۔"

"میڈرونی امیر مینو تھیں۔" غلیفہ جی نے مینو میرے ایک طرف رکھ دیا "مجھے کون سا انگریزی پرستی آتی ہے ہمارے لیے تو مجھے پادے والے کا ششم ٹھیک ہے۔ میرا آتا ہے۔ ایک سانس میں ساری چیزوں کے نام بتا جاتا ہے۔"

پہلوانوں میں جو حقوڑے بہت بڑھے لکھے تھے، وہ مینو کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ غلیفہ جی انہیں بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے بولے "میڈرونی! انہی کس چکروں پے گئے او۔ (چھوڑ بھی) اتم کس چکر میں رہ گئے (ہر) چہ دہی صاحب سے پوچھ لیتے ہیں یہاں ہمارے مطلب کی کیا کیا چیزیں ملتی ہیں۔"

میں نے انہیں چند چیزوں کے نام بتائے۔ چرنے اور دوغنی نان پر سب کا اتفاق رائے ہو گیا۔ چرنے آئے تو پھر آتے ہی چلے گئے۔ وہ لوگوں میں جیسے مرل قسم کے چرنے چلے ہیں۔ وہ ایک پہلوان کے لیے دو دو تین تین چٹ کرنا معمولی بات تھی۔ ہال میں بیڈوں کی چھوٹی چھوٹی پانیاں پتی چلی گئیں۔ ہال میں جو چند لوگ موجود تھے وہ سب بار بار سرسبز کرنا طرف دیکھ رہے تھے اور زرب لب اسکرار رہے تھے۔ سویت ڈش بھی ٹھوک کے حساب سے آئی۔

خاصی دیر میں جا کر کھانے کا سلسلہ ٹکا تو میں نے غلیفہ جی سے پوچھا "آپ جانتے ہیں گے کیا کال؟"

"جانتے؟" غلیفہ جی نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے کسی محبوب چیز کا نام لے دیا ہو۔ پھر وہ گرا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے "پاکستان بننے سے کافی پہلے جب میں چھوٹا سا تھا۔ ابرسر (اسر تر) میں تھے ہم لوگ تو مجھے ایک دفعہ نزلہ دھام ہو گیا تھا تو میری اماں نے مجھے زبردستی چائے پلائی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے زندگی میں بھی چائے پی۔ اور کافی کا بھی میں نے اب اس عمر میں آکر شام سا ہے کہ یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہوتی ہے۔" دیکھی اب بھی نہیں۔ ورنہ میں تو بس بھی کھتا تھا کہ

اچھا خاما شام ہو گا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ان سادہ سے لوگوں کے ظلموں نے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ درست تھا کہ اکھاڑہ میرے پیسوں سے چل رہا تھا لیکن آج کے دور میں ان باتوں پر کون کسی کے لیے جان قربان کرنے آتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اکھاڑے کے پہلوانوں نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے ان سے کوئی چٹنی چڑی یا تیس نہیں کی تھیں، انہیں ان محنت کھانے خراب نہیں دکھاتے تھے۔

میرے وہ ساتھی جو میری حفاظت کے لیے دور دور سے میری نگرانی کرتے رہتے تھے اور جب میں ہوٹل میں ہوا تھا تو اس کے دو دو اڈوں پر تعینات رہتے تھے یا اس پاس منتلائے رہتے تھے اس وقت بھی کہیں سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ پہلوانوں سے بھرے نرگ کو میری گاڑی کے پیچھے چلے دیکھ کر شاید ابھین میں پڑ گئے۔

کار کے ریڈیو پر ٹوٹی نے مجھ سے پوچھا "سرایہ کیا ہو رہا ہے؟ ان لوگوں کو آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی اندرونی کیفیت کا تصور کر کے محفوظ ہوتے ہوئے کہا "یہ ایک سوئٹ ملاقات ہے۔ میں ان لوگوں کو خاطر مدارات کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

"اورہ!" ٹوٹی مہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور میں نے ریڈیو کا سوچ آف کر کے خفیہ خانہ بند کر دیا۔ ہم ہوٹل پہنچے اور نرگ اندرونی دو دروازے کے سامنے جا کر کرک۔ پہلوان ایک ایک کر کے دھڑ دھڑ کر کے آتے شروع ہوئے تو دربان بھی پریشان ہو گیا۔ غلیفہ نواز پرکی دیکھ بھی پڑی اور توہنہ سنبھالتے ہوئے اتر آئے تھے۔ دربان نے جب دیکھا کہ وہ سب میرے ساتھ ہیں تو ذرا سکون کی سانس لی اور سیلوٹ کرتے ہوئے ہمارے لیے دو دروازے کھول کر کھڑا ہو گیا۔

تمام پہلوان ذرا پچلی پچلی آنکھوں سے چپکے دیکھتے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ غلیفہ نواز پرکی درست کر کے اوپر اوپر دیکھ کر نیچے آواز میں بولے "یہ تم نہیں کہاں لے آئے چہ دہی؟ پتلا ہاڑا ان کا یاؤ انشاء ہو لوگوں میں کیا کام؟ ہم تو گوا لندی کٹھنی چوک اور بھالی میں بیٹھ کر پادے کھانے اور لسیاں پینے والی مخلوق ہیں۔ ہمیں یہاں انگریزی کھانے کھا کے اور رنگ برنگے شربت پانی کے کیا مزہ آئے گا۔"

"آپ انہیں تو کسی یہاں بہت سی دیکھی چیزیں بھی ملتی ہیں۔" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دو دروازے کی طرف برکت ہوئے کہا۔ "اچھا تم کہتے ہو تو چلے چلے ہیں۔" وہ غم نہی سے بولے "وہیں یہاں کی دیکھی چیزوں میں بھی ولایتی ملاوٹ ضرور ہوگی۔" دیکھ دیکھ کرتے ہوئے ہم لوگ لاؤنج سے گزر کر زانگہ ہال میں پہنچے تو ہوٹل میں اچھی خاصی لپٹل سی پیدا ہو گئی۔ تیس تو

رف دی ہوتی ہے جو پایا گئے شاہ غلام فرید لکھے ہیں۔“  
 ”پلیں تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ کوئلہ ڈرکس لے لیتے ہیں۔“  
 ”تمہارا مطلب ہے کچھ برہمنیں خوش تھیں؟“ غلیفہ جی نے  
 ہنس کر کہا۔

”یہاں دی ریگن گلاسوں میں۔“  
 ”کئی خاص اچھی چیز تو وہ بھی نہیں ہے لیکن چلو منکولو  
 کے بعد کچھ بٹیر مہر سائیں آئے۔“ غلیفہ جی نے سر

اٹھارک کا کاروبار چل رہا تھا تو میں نے دیکھا میرے دائیں  
 بٹا ہوا ایک فرخیز اور نو عمر پملوان غیر محسوس سے انداز میں  
 روانہ تھا کہ ایک طرف دیکھے جا رہا تھا اور برہادر اُور دیکھ کر  
 چوٹیں نہ ہوتا تھا۔ ویسے بھی اس کی رنگت سرخ و سفید ہی  
 اس مخصوص سمت میں دیکھتا تھا تو بالکل ہی نماز کی طرح سرخ  
 تھا وہ ایک خوب صورت فرخیز تھا۔ آنکھیں بلوری اور  
 بے تھے۔ قد کاٹھ اور جسمانی ساخت بھی اچھی تھی۔

لانے اس سمت میں دیکھا جدھر وہ بار بار دیکھ رہا تھا۔ اُور  
 ذہن میں چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کو میں  
 فائدہ خاصی معروف اور مقبول ہی دی آرٹسٹ ثناء سعید  
 نے اسے وہ ایک مرتبہ ہی دی پر دیکھا تھا لیکن  
 مارالوں میں اس کے کئی انٹرویو سرسری سے انداز میں نظر  
 رہے تھے تو اندازہ ہوا تھا کہ خاصی معروف شخصیت تھی۔ لی

رنگو ویسے بھی بچہ پچھتا رہا ہے۔  
 نے یاد پڑا تھا کہ کئی تقریب میں بھی اس سے ملاقات ہوئی  
 دیکھ رہے تھیں پر پہلا تاثر بھی مرتب ہوا تھا کہ وہ حقیقت میں  
 شش نہیں تھی جتنی لی دی پر دکھائی دیتی تھی۔ لی دی کی  
 نکلنا کا معاملہ میں نے اس کے برعکس بھی دیکھا تھا۔ یعنی وہ  
 میں جتنی خوب صورت تھیں لی دی پر ان کے شہس کا  
 بلند بھی ان کے ساتھ نہیں رہا جاتا تھا۔ رنگ روپ کی  
 ان خوب صورتیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں صرف قدرت کی  
 اللہ انھیں ہی محسوس کر سکتی ہے۔ دنیا کے بہترین کیمروں کی  
 لائنیں اسکرین پر منتقل نہیں کر سکتی۔ جبکہ یہی کیمرے کی  
 ت ہی ایسی خوب صورتیاں اسکرین منتقل کر دیتی ہے جو  
 میں موجود نہیں ہوتیں۔ قدرتی اور کٹھن چیزوں میں یہی

ہے۔  
 انوسید کھاتے پیتے کھڑکی تھی۔ لی دی پر شوقیہ کام کرتی تھی۔  
 انہیں تو کیا بتائی تھی۔ دوسرے کچھ مقاصد رہے ہوں تو ان کا  
 اس کا۔ میرے ذہن میں اس کے بارے میں تاثر بھی تھا  
 خاصی شوخ و شنگ اور تیز و طرار چیز تھی۔ اس وقت وہ غالباً  
 بیلوں کے ساتھ تھی۔ نہ جانے کس بات پر وہ سب بے  
 کن رہی تھیں۔

ثناء سعید نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا تو نیشن ایل اور آسودہ  
 حال گھڑوں کی لڑکیوں کے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے  
 دوری سے کہا ”اے چوہدری صاحب! ہاؤ آر یو؟“

”فائن ٹھیک یو۔“ میں نے جواب دیا۔ دل ہی دل میں ہلکی  
 سی خوشی بھی ہوئی تھی کہ صرف ایک ہی ملاقات کے بعد اور خاصا  
 عرصہ گزر جانے پر بھی اس نے مجھے یاد رکھا تھا۔ وہ چاروں لڑکیاں  
 سر جوڑ کر کچھ باتیں کرنے لگیں۔

میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے نو عمر اور دبیر پملوان سے  
 پوچھا ”تم اتنی دور دور سے ہی ایک لی دی آرٹسٹ کو دیکھ کر اتنا  
 کیوں شرابے ہو؟“

”وہ جی چوہدری صاحب!“ پملوان کچھ گھڑا سا گیا۔ اس کا چہرہ  
 کچھ اور سرخ ہو گیا لیکن آخر کار اس نے گویا غیر ارادی سے انداز  
 میں اصل بات اُگل لی دی ”وہ دراصل مجھے آنکھ مار رہی تھی۔  
 جب بھی میں اس کی طرف دیکھتا تھا تو وہ مجھے آنکھ مار دیتی تھی۔“

غلیفہ جی نے آنکھیں مسکیر کر اس میز کی طرف دیکھا پھر اپنے  
 بیٹھے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے ”وہ تجھے آنکھیں مار رہی  
 تھی تو تم اس کی طرف دیکھ ہی کیوں رہے تھے؟ اگر اب تم نے اُدھر  
 دیکھا تو میں تمہیں فلائنگ بگ مار دوں گا۔ وہ بڑی چھری چیزیں  
 ہیں۔ تمہاری ان کے چکر میں پڑنے کی نہ تو عمر ہے اور نہ اوقات۔  
 آئی عقل میں؟“

”غلیفہ جی! میں تو ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔“ پملوان مسکین سے  
 لہجے میں بولا لیکن اسی دوران غیر ارادی سے انداز میں ایک بار پھر  
 اس کی نظر اس میز کی طرف چلی گئی اور میں نے خود دیکھا۔ واقعی  
 ثناء نے اسے آنکھ ماری لیکن دوسرے ہی لمحے سیبلوں کی طرف  
 متوجہ ہو گئی اور سب سر جوڑ کر کمری کھی کرنے لگیں۔

نو فریز پملوان کا چہرہ ایک بار پھر نماز کی طرح سرخ ہو گیا۔ میں  
 اس کیفیت سے محظوظ ہونے لہجہ نہ رکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی  
 خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ شرم یہ حیا اور وہ بھی مردوں میں؟ یہ خزانے  
 تو اب ختم ہوتے جا رہے تھے۔ اس فرخیز کو ثناء آنکھ مار رہی تھی  
 تو وہ اپنی جگہ بیٹھا شرم سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ راہ چلتے  
 کسی کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ لیتی ہوگی تو وہ گھبرائے اس کا پیچھا  
 کرتا ہو گا یا وہیں کھلے کا رہنے کی کوشش کرتا ہو گا۔

میں نے سر جھٹک کر خیالات کو دنیا سے باہر آنے کی کوشش  
 کی اور ایک بار پھر غلیفہ جی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابھی تک اپنے  
 پیچھے پر آنکھیں نکال رہا تھا اور وہ بڑی مسکینی سے سر جھٹکے بیٹھا  
 تھا۔

”غلیفہ جی! آپ اس عمر میں بھی فلائنگ بگ لگاتے ہیں؟“  
 میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

غلیفہ جی غصہ کی سانس لے کر بولے ”اب جس میں کیا بتائیں  
 چوہدری! ہاؤ اتم نے تو کبھی آکر اپنا اکھاڑہ دیکھا بھی نہیں۔ کبھی اپنے

اس خادم کو دیکھو تو سی آنکر کہ ان بھوں کو کیسے ٹینگ دتا ہوں۔  
پھر تھیں ہاٹے کا ٹینگ نواز پڑی بیکڑا کچڑ ہے۔ سفید ہال اپنی جگہ  
ہیں۔ مرانی جگہ ہے۔ راضیت اپنی جگہ ہے۔ فن اپنی جگہ ہے۔  
جوانی والی بات تو یہ نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہم کو پتا ہے کہ جوانی جوانی  
ہی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بڑھاپا بہت سی جوانیوں سے بہتر  
ہے۔

جرات میرے دل میں تھی، غلیظہ جی نے اپنے منہ سے کہہ دی  
تھی۔ وہ گلاس رکھ کر اپنے دونوں ہاتھ الٹ الٹ کر دیکھتے ہوئے  
بولے "مکون سا داؤ ہے جو غلیظہ نواز پڑی بیکڑا نہیں لگا سکتا۔"

ابھی ہمارا کولڈ ڈرنکس کا سلسلہ چل رہا تھا کہ لڑکیاں جانے  
کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ثناء سعید جاتے جاتے میری کرسی کے  
قرب مرگ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی "چوہری صاحب! کیا  
پلوالوں کا کنوٹیشن بلا رکھا ہے؟"

"ہاں میں نے سوچا دانشوروں کے کنوٹیشن تو بہت ہو چکے۔  
سب کئی کئی بار گفتگو کی بنگالی کر کے "ٹی اے ڈی اے" لے لے کر  
چاچکے ٹکٹ کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اب پلوالوں کا کنوٹیشن  
ی بلا کر دیکھ لیا جائے اور کچھ میں تو کم از کم اچھی جائیں ہی دیکھنے  
کو لیں گی۔ دل میں زندگی کی آنگ بکھڑے ہو گئی۔

"بہت اچھا سوچا آپ نے۔" وہ پرس کدھر سے رہنکاتے ہوئے  
بولی "بھئی ہمارے غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔" میں نے  
آپ کو اپنا کارڈ بھی دیا تھا۔

"معذرت چاہتا ہوں مجھ سے کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہو گا۔  
دوبارہ غایت فرما دیجئے۔" میں نے شائستگی سے کہا۔ اس کی  
سیلیاں ڈانٹنگ ہال کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی تھیں لیکن  
اپنے بچے خوشبوؤں کا ایک قافلہ چھوڑ گئی تھیں۔

ثناء اپنا پرس کھولتے ہوئے بولی "اتنی بے نیازی بھی اچھی  
نہیں ہوتی کہ آپ نے ہمارا کارڈ بھی سنبھال کر نہیں رکھا۔ لوگ تو  
کلی کرچوں میں، انہادوں کے دفتر میں "ٹی وی سینٹر" ہمارا فون  
نمبر پوچھتے پھرتے ہیں۔" اس نے پرس سے اپنا خوب صورت  
ورڈنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"اس بار ضرور سنبھال کر رکھوں گا۔" میں نے کارڈ کو بظاہر  
احتیاط سے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اور غریب خانے پر بھی تشریف لائیں گے؟" وہ گویا وعدہ  
لینے پر تلی ہوئی تھی۔

"ضرور جب بھی موقع ملا میں ضرور حاضر ہوں گا۔"

"اس کیونکہ ابھی اپنے ساتھ ضرور لائے گا۔" اس بار اس  
نے مجھے آنکھ مار کر اس نوجوان پلوال کی طرف اشارہ کیا جو جگہ  
مردی میں بیٹھی دھن کی طرح سر جھٹکاتے ہوئے تھا اور شرم سے  
سرخ تھا۔ اور تو اور غلیظہ جی بھی سر جھٹکائے بیٹھے تھے۔ نظر اٹھا کر  
بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔

"اس بے چارے پر رحم کرو۔ اسے ابھی زندگی میں کلی  
ڈھنگ کا کام کر لینے دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے درخواست کی۔  
"میں کون سا اسے دنیا کے کسی کام سے روک رہی ہوں۔ بلکہ  
میں تو اسے لوگوں کے کام آنا سکھاؤں گی۔" وہ ہنسی ہوئی آنکھیں  
کھلی۔ کچھ پلوالان ٹھیکروں نے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ اور اس کی سیلیاں فکر سے اوچھل ہو چکی تھیں تو غلیظہ جی نے  
سر اٹھایا۔ ان کی مونچھیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ چست کی طرف دیکھ  
کر وہ کراہنے کے سنے انداز میں بولے "مولانا یہ زمانہ کہہ کر کوہا  
ہے۔"

کولڈ ڈرنکس کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تو تھوڑی دیر بعد غلیظہ جی  
بولے "پلوال بھی چوہری بیٹیا! آج تمہاری مہمانی سے میرے اس  
اونچے ہوٹل میں بھی کھانا کھایا۔ اب اجازت دو۔ آج تمہاری  
خدمت میں حاضر ہو کر بڑی خوشی ہوئی لیکن اصل خوشی اسی دن  
ہو گی جب تم میں کسی خدمت کا موقع دوں گے۔"

"بس آپ کھائے کولڈ و جان سے چلاتے رہیں۔ اس کی  
تفریح کی کوشش کرتے رہیں یہ بھی میری اور اس قوم کی بڑی خدمت  
ہو گی۔" میں نے اٹھ کر انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ جا چکے تو ڈانٹنگ ہال میں جیسے ویرانی ہی چھا گئی  
حالا کہ ابھی خاص تعداد میں دوسرے لوگ موجود تھے۔ میں نے  
گھڑی دیکھی، آٹھ بجتے کو تھے۔ میں نے اپنے لیے کال کا آڈر دیا  
اور مزید کالنی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ میز صاف کی جا چکی تھیں  
اور کرسیوں کی ترتیب بھی بدل چکی تھی لیکن مجھے کچھ ایسا ہی  
محسوس ہوا تھا جیسے وہ لوگ ابھی وہیں بیٹھے تھے۔ شاید اس کی وجہ  
یہ تھی کہ ابھی میں انہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ غلیظہ جی نے  
اکھاڑہ شروع کر کے گویا میرے ایک اور چھوٹے سے خواب کو لپیٹ  
دے دی تھی۔ میں خود وہاں جا کر کچھ وقت صرف کرنا چاہتا تھا مگر  
عجب بد نصیبی تھی! زندگی اتنی مہلت ہی نہیں دے رہی تھی کہ  
غلیظہ جی کے توسط سے رہائی ہوئی اس چھوٹی سی دنیا کو دیکھنے ہی  
جاسکتا۔

پھر کالنی کی چٹکیاں لیتے ہوئے میرا ذہن اپنے اصل مسئلے پر  
جا پھنسا۔ میں سوچ رہا تھا اگر لاہور میں حلیہ صاحب سے ملنے  
ملاقات ملے نہ ہو سکی تو یہ ڈاٹ کا در عمل کیا ہو گا؟ اور اگر  
ملاقات ملے ہو مگر تو اس کے لیے مجھے کیا کیا تیاریاں کرنے کی  
ضرورت تھی؟ راجہ جس آپریشن کا منصوبہ بنا رہی تھی وہ اپنی جان  
تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی کچھ کاموں کے لیے تیار رہنا  
ضروری تھا۔

کچھ دیر بعد ایک ویز فونلر دھن ملنے لگے مجھ سے ملانے کرانے  
کے لیے آیا۔ میں نے فونلر کھولا تو اس میں ملے سے ذرا اونچے ایک  
چٹ بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا تھا۔  
"سراگل سے ایک مشکوک سا نوجوان ہوٹل کے گورنر



آپ کے بکرمیں ہے۔ آج کلک سے آپ کا کراہنہ  
بڑھ رہا تھا اس کا کیا کرتا ہے؟“ ذیل ایس۔

میں نے دینر کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پر مٹی سی مسکراہٹ  
کرتا تھا۔ چٹ سرور شیخ کی طرف سے تھکی۔ میں نے اسی پر  
”اسے تار میں کسے پچھلے احاطے میں لے آؤ۔ میں دیکھا  
نہیں۔“

مٹی پر سائیں کر کے میں نے فولڈر بند کر کے دینر کی طرف کھٹکا  
”رخصت ہو چکا تو میں اپنے آپ کو کچھ اور ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ  
مری نظر سے میں نے ہال کا جائزہ لیا۔ ہال میں اب کئی  
پہچان نظر آنے لگے تھے لیکن کوئی صورت میری شناسا نہیں  
گئی میری طرف متوجہ بھی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد میں اٹھ کر ہوٹل کے صدر دروازے سے باہر  
”ایک خوشگوار رات تھی۔ میں دونوں ہاتھ چلوں کی بیروں  
اٹے کھینچنے کے سے انداز میں باؤنگ لٹ کے سامنے سے  
اُور اٹھی جسے کی طرف چل دیا۔ ہوٹل اب میرے لیے گھر  
طی ہو گیا تھا اور میں گویا کمر کے احاطے میں ہی غل رہا تھا۔  
میں کمارت کے عقب میں پہنچا تو عقیبی دیوار کے قریب ٹکیے  
بے میں ایک سفید گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں ٹھٹکا ہوا گاڑی  
بب چلا گیا۔ اس جیسے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے کمر کی  
اڑی میں جھانکا تو اندر اس کی لائٹ آن ہو گئی۔ تاہم مجھے  
اُن ہونے سے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر  
موجود تھا اور عقیبی سیٹ پر فونی اور سرور شیخ اپنے درمیان  
آؤ میں کیے بیٹھے تھے۔ اس کے چہرے پر انہوں نے بڑا سا  
ہڑلا ہوا تھا۔

”لاٹ لائی تو کراؤ لسن کی۔“ میں نے دھیر سے کہا۔

کراؤ شیخ نے چادر اس کے چہرے سے ہٹائی تو تیرا سارا  
ہانگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اپنی ہونٹ سی شکل لئے و سیم احمد  
”سامنے موجود تھا۔ لیکن اس شکل میں کچھ اضافے نظر  
نہیں پڑتا نہایت سستی سی شکل سوچیں جس پر تقریباً اس  
میں کس بجلی تھی۔ ریز کا ایک سیاہ گھڑا تھا جسے غالباً اس  
مٹے سے مٹے کے طور پر کمال پر چپکا کر رکھا تھا لیکن اب وہ چپنا  
لے کے نہ میں کٹسا جا رہا تھا۔

ایک لمحے میں بھی اس نے غالباً کچھ دیا ہوا تھا جس کی وجہ سے  
لٹ سے اس کا منہ کچھ پھولا پھولا سا لگ رہا تھا۔ یہ اپنی  
میں اس نے میک اپ کیا ہوا تھا۔ ویسے شاید کوئی اس کی  
نہیں دیکھا لیکن اس میک اپ کی وجہ سے ضرور متوجہ ہو سکتا تھا  
کی جان سکتا تھا کہ یہ چیزیں نقلی تھیں۔ اس طرح وہ کسی کی  
اندازہ سلوک قرار پا سکتا تھا۔ عام حالات میں بھی اس کے  
پہچان کی آؤٹی دیکھائی دیتی تھی۔ اس وقت تو بالکل ہی  
آؤٹ تھا۔

مجھ پر نظر پڑنے ہی اس نے غالباً چی کر کچھ کہا ہاں لیکن فونی  
نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جس کی وجہ سے سوچے اس کی  
ناک میں کچھ اور کھس گئی۔ اسے جینک آئی مگر وہ بھی دب کر رہ گئی  
البتہ فونی کا ہاتھ کچھ گندا ہو گیا۔ فونی رانت میں کر رہ گیا۔

”اس ہونٹ کو کہاں سے پکڑا رہا تم؟“ میں نے لٹھڑی  
سائیں لے کر کہا ”کیا یہ شکل سے ہی تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا؟“  
”سر! اس کی حرکتیں بڑی مشکوک تھیں۔“ سرور دریا ”پھر ہم  
نے یہ بھی سوچا کہ صورت سے کچھ نظر آنے والے بعض لوگ بڑی  
پیشی ہوئی چیز ہوتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے چھوڑ دو“ اسے اپنے دوستوں ہی  
میں سے سمجھو۔ اس کا نام و سیم ہے۔ اسے پراسرار بننے کا شوق  
ہے۔“ میں نے بتایا۔

فونی نے غماز انداز میں اسے چھوڑ دیا۔ و سیم چند لمحے مری  
کمری سائیں لیتا رہا ”پھر میرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا  
”یہ اپنے ہی آدمی ہیں؟“

”ظاہر ہے بھی تو اتنے اطمینان سے گفت و شنید ہو رہی  
ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”خدا یا تمہارا لاکھ شکر ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر  
خدا کا شکر ادا کیا پھر اپنی نقلی سرانچیں ناک سے نکالتے ہوئے بولا  
”میں تو سمجھا تھا کہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ میں دل ہی دل میں  
خود سے کہہ رہا تھا کہ و سیم بیٹا! تمہیں تو وصیت کرنے کی بھی سلت  
نہیں ملی۔ مشکلی تک نہیں ہوئی تمہاری۔۔۔ اور سفر آخرت پر  
دوانہ ہوئے کا لائق بھی آن پہنچا، لیکن جب آپ کی صورت نظر  
آئی تو یقین ہو گیا کہ آپ ضرور مجھے دشمنوں سے بچالیں گے۔“

وہ ایک بار پھر تفکر میرے انداز میں لٹھڑی سائیں لے کر بولا  
”لیکن خدا کا شکر ہے یہ لوگ دشمن نہیں“ اپنے ہی آدمی ٹھیک۔  
ورنہ بڑا خون خراب ہو گیا۔“

”کون کراؤ خان خراب؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے آپ ہی کرتے ہیں تو ان کے ٹھکانے میں بے بسی  
تھا۔ میرا تو نقلی ہسپتال بھی انہوں نے چھین لیا تھا۔ میں احتیاطاً  
اصل ہسپتال لے کر نہیں آیا تھا۔ جو بھی کبھی کبھار غلط موقع پر کوئی  
چل جاتی ہے۔“ اس کی میک ناک پر آن لگی تھی اور فریم بھی کچھ  
نیز کا سا ہو گیا تھا۔ وہ اسے سیدھا کرنے لگا۔

”اگر یہ لوگ تمہیں تار میں نہ کرتے تو تم یقیناً نقلی ہسپتال سے  
مشتوں کے پٹنے لگا دیتے۔“ میں نے کہا۔

”مشتوں کے پٹنے نہ سہی کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتا۔ کبھی کبھی  
نقلی ہسپتال بھی بڑا کام آ جاتا ہے۔“

پھر وہ کراہ کر ہسپتال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا ”ویسے انی بھائی!  
آپ کے ان آدمیوں نے مجھے اچھے خاصے رگڑے دیے ہیں۔  
حالا کہ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی تھی۔“ اس کا انداز کچھ

دی ہے اور ساتھیوں کو احکامات جاری کر رہی ہے۔ مجھے یہ تو اندازہ ہے کہ آپ نے اسے اختیار کیا ہو گا۔ آپ کی اجازت کے بغیر تو ہم میں سے کوئی بھی یہ جرات نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نے سوچا پھر بھی استعمال آپ سے تصدیق کر لوں۔

”تمہارا خیال درست ہے۔ وہ میری اجازت سے ہی یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ آئندہ کسی وجہ سے اگر مجھے پیش منظر سے ہٹا دیا جائے تو میری عدم موجودگی میں ”ڈی سرکل“ کی انتہائی کی حیثیت اس کی حاصل ہوگی۔ بینک میں بھی یہ بات ہو چکی تھی۔“ میں نے اسے تسلیم کیا۔

وہ طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا ”سرا آپ سے وہاں تصدیق کر کے مجھے زیادہ اطمینان ہو گیا ہے۔ اب میں کیکرل کے کام کر سکوں گا۔ دراصل میں عادت نہیں رہی آپ کے ساتھ کسی حکم ماننے کی۔ اس لیے ہمیں عجیب سا لگ رہا تھا۔“

”میں جا رہا ہوں اس کی صلاحیتوں کا کچھ اطمینان ہو جائے اس کے کام ہونے یا اس کی عدم موجودگی کی نوبت آئے پر تم اس کی جگہ سنبھالو گے اور کسی وجہ سے اگر تم اپنی ذمہ داریاں اٹھا نہ دے سکو تو شیخ شاہ تمہاری جگہ سنبھالے گا۔ اپنے اس چھوٹے سے گروپ کا نظام چلانے کی یہ ترتیب رہے گی۔“ میں نے کہا۔

”سرا میں تو ”ڈی سرکل“ کو سنبھالنے کی ذمہ داری پر ہم اپنے سرپرست نہیں چاہتا۔ میں تو بس آنکھیں بند کر کے آپ کے کی تعمیل کرنا چاہتا ہوں اور اسی میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔“

سر جھٹکاتے ہوئے بولا۔

”لیکن ضرورت پڑنے پر حسین... بلکہ ہمارے ہر ساتھی کو بھی کرنا ہو گا۔ کوئی بھی ذمہ داری سنبھالنا ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”سرا کیا یہ آپریشن بہت زیادہ اہم ہے؟ آپ کے اندازہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے؟“

”نئی نئی فکر سے میری طرف دیکھا۔“

”بظاہر بات کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے اندیشے غلط بھی ہو سکتے ہیں اور صورت حال میرے اندیشوں سے بدتر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ جتنا ہم اس معاملے کو اہم سمجھ رہے ہیں اتنا ہی معمولی ثابت ہو۔“

”تائیس گائیس فٹش والی بات ہو جائے تو ان بھی ممکن ہے کہ یہ زندگی اور موت کی باؤنی یا ہم سمجھنے والی اہم موڑ ثابت ہو۔ میں خود بھی انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ میں نے کہا۔

”ایک احساس سا ہے جیسے ہمارے ارد گرد ایک دائرہ سا کھینچ دیا گیا ہے جو دوڑے بدوزنگ ہوا میں جس میں داخلے اصل بات بتا دی ہے کہ ہم درحقیقت کس میں ایک نئے سرے سے تسلیم ہو رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔ اس نے سب سے پہلے صرف مجھے ہی یہ صورت حال سمجھائی ہے۔ اس سلسلے میں ہم فون یا ریڈیو پر ایک دوسرے سے رابطہ نہیں کر رہے اس لیے بیٹا

ایسا ہی جیسے کوئی پتہ لڑائی میں دوسرے بچوں سے پٹے کے بعد کسی بزرگ سے شکایت کر رہا ہو۔

”اں کا ہاتھ ہی ذرا سخت پڑنا ہے اور تم ذرا نازک اندام ہو۔ لیکن جس حالت میں تم نظر آ رہے ہو، میں سمجھ کر انہوں نے جسیں پھولوں کی طرح سنبھالا ہے۔ ورنہ جو حالت تم کر رہے تھے اس میں ہمارا جان بھی جاسکتی تھی۔ اچھا یہ بات تو تم سے کس بکر میں؟ تم ہوئی کے اس پاس کیوں منتظر رہے تھے؟ میرا کراؤ نہیں دیکھو کیوں پوچھ رہے تھے؟ مجھے یہاں آتے جاتے دیکھ کر تم سیدھے میرے پاس نہیں آ سکتے تھے؟“

”میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں ذرا جاسوسوں والا طریق اختیار کر رہا تھا۔“ اس نے ذرا شرعیت سے لہجے میں جواب دیا ”میں آپ کے گھر گیا تھا۔ میں نے دیکھا آپ کا گھر تو بالکل تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ وہاں لپے کے ڈیمر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آپ دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور کھلی جنگ شروع ہو چکی ہے لیکن مجھے کوئی نہیں بتا رہا تھا کہ آپ ہیں کہاں؟ وہ تو اتفاقاً ہی میں نے آپ کو اس ہوٹل میں آتے جاتے دیکھ لیا۔ میں چھپ کر آپ کی گھرائی کرتے لگا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے معلوم تھا دشمن آپ پر نظر رکھے ہو گا۔ حکم تھا اور علی الاطلاق آپ کے پاس آنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ اس طرح میں بھی دشمن کی نظر میں آ سکتا تھا اور نہ صرف اپنی بلکہ آپ کی جان بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ اس لیے میں بڑے مربوط عمل سے مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ آپ کے اپنے آدمی بھی آپ پر نظر رکھتے ہوں گے اور وہ میرے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں آئندہ میں احتیاط کروں گا۔“

”نوئی، سردار شیخ اور حنیف تین ہی اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے کھینے کی کوشش کر رہے ہوں کہ آخر وہ کھجیا کھینچے؟ میں نے ان کے محسوسات کو سمجھنے کوئی دھیمی آواز میں کہا ”تم لوگ خواہ مخواہ اپنے ذہنوں پر زور مت دو۔ ابھی تو میں ہی کھینے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

پھر میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا ”اسے چھوڑ دو۔ میں اسے اوپر لے جاؤں گا مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

اس وقت دسیم کو دیکھ کر اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ نوئی اور سردار نے اسے چھوڑ دیا لیکن نوئی اس کے ساتھ خود بھی گاڑی سے اتر آیا اور مجھے ایک طرف چلے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ”سرا مجھے علیحدگی میں آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“

”ہم دسیم کو گاڑی کے پاس ہی چھوڑ کر ذرا آگے چلے گئے۔ نوئی دھیمی آواز میں بولا ”راہیل ایک چھوٹے سے آپریشن کا پلان بنا

ہے۔" میں نے اسے تاکید کی اور وہاں سے واپس آیا۔

مجھے اپنے سوئٹ میں آنے خاصی دیر گزر گئی۔ میں نے لباس بھی تبدیل کر لیا۔ ہاتھ منہ دھو کر ذرا دیر سستا کر ایک کولا ڈرنک بھی فریج سے نکال کر ختم کر لی۔ لیکن دسم کی آمد کے آثار دکھائی نہ دیے۔ آخر کار میں پانیس ہو کر سوچنے لگا کہ اب حنیف صاحب کو یہ فون کرنا جائے لیکن ابھی تو بھی نہیں بچے تھے۔

میں ذرا ننگ دم میں آکر کھٹنے لگا۔ اچانک دروازے پر نہایت خفیف سی دھتک ہوئی۔ میں نے دروازے کی بجک آنکی سے دیکھا۔ سامنے مجھے دسم کی دبی ہوئی سی صورت دکھائی دی لیکن اب اس کے چہرے پر سفید مویجھیں نظر آ رہی تھیں۔ سیاہ بالوں کو چھپانے کے لیے اس نے پی کیپ کا بھی سارا لیا تھا لیکن اس حق کو شاید یہ نہیں معلوم تھا بل پر بھی کڑی ٹوپی کے نیچے سے جھانکتے دکھائی دے رہے تھے۔

میرے دروازے کھولنے ہی وہیں اُپک کر اندر آ گیا جیسے کوئی کتا اس کی ٹانگ پکڑنے کے لیے لپکا ہو۔ میں حالانکہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ لیکن اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شش" کی آواز کے ساتھ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر دروازہ بند کر کے اس سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا حالانکہ باہر رابہ اری میں سا تھا۔ میں دروازہ کھولنے دقت ہی نہ دیکھ چکا تھا باہر کوئی نہیں تھا۔

ایک لمحے بعد اس نے دروازے سے پھٹے ہوئے سرگوشی میں مجھے بتایا "میں جب آپ کے دروازے پر دھتک دے رہا تھا تو برابر کے دروازے سے ایک چرا سرا رابہ سیاہ فام مجھ تک رہا تھا۔ شکل سے وہ کوئی جاوکر دکھائی دے رہا تھا لیکن مجھے معلوم ہے اس قسم کے لوگ جاسوس ہوتے ہیں۔"

میں نے ایک کمری سانسی لے کر اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر لے جاتے ہوئے کہا "احق! مجھے معلوم ہے میرے برابر والے سوئٹ میں کون کون سا قسم ہے۔ وہ نہ کوئی جاوکر ہے اور نہ جاسوس۔ وہ صرف ایک ڈپلومیٹ ہے کسی سفارتی مشن پر آیا ہوا ہے۔"

میں اس سے پوچھتا چاہتا تھا کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی لیکن اس دوران میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑ چکی تھی جو جھپٹے جھپٹے سے نظر آ رہے تھے۔ ان پر کچھ سیاہی بھی جمی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی پتلون پر بھی گھٹنوں کی جگہ رگڑ کے نشانات وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کوئی کارنامہ دکھائی آئے ہو۔ حالانکہ میں نے کہا تھا۔ سیدھے سادے طریقے سے شریفوں کی طرح آجانا۔" میں نے اسے گھورا۔

"میں تو سیدھے سادے طریقے سے ہی لفت کے راستے شرفاء... بلکہ معززین کی طرح آ رہا تھا لیکن جو نمی میں رابہ اری میں قدم رکھنے لگا مجھے سامنے میڈ کھڑی نظر آئی۔ میں فوراً اسی لفت سے واپس چلا گیا۔"

دوسرے کو پہچانے میں ذرا تاخیر ہو رہی ہے اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ غیر معمولی بھاگ دوڑ کرتے نظر آئیں۔ ہم بظاہر اپنے پیشہ کے معمولات برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ٹوٹی نے بتایا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مقبی احاطے میں اس وقت ہمارے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پہلے سے بھی شیٹی آواز میں کہا "ریڈ ڈاٹ سے آخری لمحے تک کسی بات کو غصہ نہ رکھتے ہوئے اور اس کی حکم برداری کرتے ہوئے اس کے کسی منصوبے کو کام نہ بنانا بہت مشکل کام ہے لیکن ہمیں ہر حال اپنی سی کوشش کرنی ہے۔ بس دو کام ہو جائیں اس کے بعد خواہ کچھ بھی ہو تا رہے مجھے اس کی پروا نہیں۔ ایک تو عرفان، حنیف صاحب کی جگہ نہ لینے پائے دوسرے وہ ہمارے قلاب میں آجائے۔ بعد کے حالات خواہ کچھ بھی ہوں دیکھا جائے گا۔ میں بدترین صورت حال کے لیے تیار ہوں اور تم سب لوگ بھی تیار رہنا۔ میرا دل کتا ہے ریڈ ڈاٹ کے لیے یہ معاملہ بہت اہم ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں سراسر ہم ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار رہیں گے اور عرفان ایک بار ہمارے سامنے آنے کے بعد کہیں نہیں جاسکے گا۔ ٹوٹی نے مجھے اطمینان دلایا۔

ہم واپس گاڑی کے پاس آ گئے۔ میں نے دیکھا دسم کی مویجھیں مٹا کر ہونچک گئیں۔

"یہ تمہاری مویجھیں کہاں چلی گئیں؟" میں نے پوچھا۔ "بیب میں رکھ لی ہیں۔" اس نے جب پر ہاتھ رکھتے ہوئے سارا گی سے بتایا "ہنگ میں کھسی جا رہی تھیں جس کی وجہ سے چھینکیں آ رہی تھیں۔ آپ کے تو میں نے ان کی بیٹنگ خراب کر دی۔ ورنہ بہت اعلیٰ قسم کی مویجھیں کھسی شاہو سے خرید کر لایا تھا۔" انداز کچھ ایسا تھا جیسے کہ دبا ہوئی بھڑک سے خرید کر لایا تھا۔

میں نے اسے اپنا سوئٹ نمبر اور فکوریہ بتاتے ہوئے کہا "میں اور جا رہا ہوں" ایک آدھ منٹ بعد تم میرے سوئٹ میں پہنچ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ کوشش کرنا کہ کم سے کم لوگوں کی نظر میں آؤ۔ لیکن خدا کے لیے جاسوس یا چرا سرا انسان بننے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔ اس طرح تم زیادہ لوگوں کی نظروں میں آتے ہو۔"

"آپ اطمینان رکھیں سراسر میں اس طرح آپ کے سوئٹ میں پہنچوں گا کہ میرا سایہ بھی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔" اس نے مجھے سیگنٹ کرتے ہوئے قدرے پُر جوش لہجے میں کہا۔ میں صرف دھیرے سے فح کر رہ گیا۔ لیکن اپنی ہنسی مجھے خود بھی ہلکی سی کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی۔

"میں بس سیدھے سادے طریقے سے آجانا۔ جس طرح کوئی عام سا شریف آدمی دوسرے عام سے شریف آدمی سے ملے جاتا

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے ان اونچے ہوٹلوں کے بارے میں بڑی معلومات ہیں۔“  
اس نے غصے سے لہجے میں بتایا ”مجھے معلوم ہے اکثر میڈز کسی نہ کسی  
کے لیے جاسوسی کر رہی ہوتی ہیں۔“

”ہاں خیال تو سمجھا رہی ہے۔“ میں نے سر ہلایا ”اس فکرو پر  
ڈیرٹی دینے والی میڈز کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ وہ جاسوسی  
کرتی ہیں۔“

”کس کے لیے؟“ اس نے کوئل کوئل سی آنکھیں چمکاتے  
ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔

”میرے لیے“ میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ہلکی سی پھلکی مگر چہرہ کھل  
اٹھا اور قہقہے لہجے میں بولا ”بہر حال میرا اندازہ تو درست ثابت  
ہوا۔ جاسوسی تو وہ کرتی ہیں کسی کے لیے بھی سہی۔“

”یہ کدھے اتھارے ذہن پر آج جاسوسی اتنی کیوں سوار  
ہے؟ میڈز کو دیکھ کر ہمیں واپس جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اس  
سے ہوشیار رہنا ضروری ہوتا تو میں تمہیں ہدایت کر کے آتا۔  
بہر حال واپس جا کر تم نے کیا کیا؟“

”میں پاپ کے سمارے چڑھ کر آیا ہوں۔ اس فکرو کے اسٹور  
کی فکری اتفاق سے کھلی گئی تھی ورنہ انکنڈیشننگ کی وجہ سے  
اس قسم کی عمارتیں چاروں طرف سے صندوق کی طرح بند ہوتی  
ہیں۔ یہ بڑی مصیبت ہے۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا“ اور یہ تمہاری نقل موچھیں  
اتنی دیر میں کالی سے سفید کیسے ہو گئیں؟“

”یہ دوسری ہیں۔ یہ تو میں نے انارکلی سے خریدی تھیں۔“  
اس نے قدرے شرمیلے سے لہجے میں بتایا ”میں گاڑی میں بیٹھ  
ایئر کنڈیشنل اور جی۔ میں بیٹھ اسپرنگ سوچھ ضرور رکھتا ہوں۔“

”اب یہاں سے واپس جاتے وقت کہیں سبزیاں سرخ رنگ کی  
موچھ مت لگالینا۔“ میں نے درخواست کی۔

”نہیں سر! اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔“ وہ  
دھڑ سے چٹا پھر ذرا اوپر اوپر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”بڑی  
شکراورج کہ ہے۔ میرا خیال ہے وہی آئی پی سوئٹ ہے؟“

”میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا ”واہ صاحب! کیا ٹھٹ  
یوں بڑے لوگوں کے!“

”میں نے اسے پیٹنے کا اشارہ کیا۔ اب کیا اسے اصلی مقصد یاد  
آئے۔“ وہ چمکتے ہوئے بولا ”آپ نے مجھے کسی کام کے لیے بلایا تھا!  
یقیناً وہ کوئی عظیم مقصد ہو گا جس کے لیے آپ مجھ سے کام لینا  
چاہتے ہوں گے؟“

”ہاں ہوں مجھ کو کہ ایک عظیم مقصد کا ایک حصہ ہے۔“ میں  
سکھڑے ہوئے کہا ”تم بہت اصرار کیا کرتے تھے تاکہ تم  
میرے کام کا چاہتے ہو؟“

”ہاں سر! میں تو آپ کے لیے بہت سارے کام کرنا چاہتا

ہوں۔ میں تو آپ کا دست راست بننا چاہتا ہوں۔ دست راست  
کھینچے ہیں آپ؟ لیکن راپاں ہاتھ۔“ پھر یکدم سی اس کے چہرے پر  
ہلا کی انشورنگی چھا گئی مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ وہ زائد قطار  
رہنے لگے گا لیکن وہ گویا مجھ پر رحم کھا کر پھلکی ہوئی آواز پر انکشاف  
کرتے ہوئے بولا ”مگر مجھے معلوم ہے آپ مجھے بہت بے وقوف  
سمجھتے ہیں۔ آپ مجھے کسی اہم کام کے قابل نہیں سمجھتے لیکن انسان  
کو آزمائے بغیر اس کے بارے میں رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔“

”میں اس کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت اور اداسی کے  
استراحت کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بار پھر اس کے بارے میں کچھ  
میں پڑ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی تمام تر حماقتوں کے  
باوجود اس نے میرے لیے پشلا اہم کام یہ کیا تھا کہ اس نے کو بے  
ہوش کر کے میرے سامنے کرایا تھا اور وہ یہ کام تھا جو میرا کوئی بھی  
سامعہ میرے لیے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اب یہ دوسری بات  
تھی کہ اسے تن ہمیں چا دے کہ اور ہماری مجبوری سے ناکام  
اٹھاتے ہوئے آخر کار ہمارے قبضے سے نکل گیا تھا۔

”تمہیں اس ملک سے بھی محبت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سر! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ویسے تو آپ کسی سے  
بھی پوچھیں گے تو وہ آپ کو اس کا جواب اثبات میں ہی دے گا بلکہ  
اس موضوع پر ایک لمبی تقریر بجائے گا لیکن عملی طور پر وہ آپ کو  
اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف نظر آئے گا۔ کسی کو  
مسائل کا سامنا ہو گیا کسی کے حالات خراب ہوں گے تو فوراً  
ملک کو بڑا بھلا کرنا شروع کر دے گا۔ یہ نہیں سوچے گا کہ وہ کسی اور  
ملک میں پیدا ہو جاتا تو کیا معلوم اس کے حالات اس سے بھی زیادہ  
خراب ہوتے۔ سر! میں تو عملی طور پر اس ملک کے لیے کچھ کرنا  
چاہتا ہوں لیکن مجھے کوئی گھاسی نہیں ڈال۔“ وہ تیزی سے کتا  
چلا گیا۔

”نی انال تم جنوں نے کام سے اتنا زکرو۔ اگر تم نے اسے  
ایسے طریقے سے انجام دیا تو تمہیں آئندہ اپنے وطن کے لیے بڑے  
بڑے کام کرنے کا بھی موقع مل سکتا ہے۔“

”جلدی سے بتائیں سر!“ وہ مارے اشتیاق کے ’سو نے پر  
اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت کچھ اور گہری  
ہو گئی۔

”نی انال تمہیں صرف میرے خصوصی کام کا فرائض انجام  
دینا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ قدرے ہلکی سی لیکن درحقیقت بہت اہم ہو گا اور تمہاری یہ  
خدمت میرے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے ہی ہوگی۔ کل صبح سے  
تم جوں جیٹھ اپنے گھر آؤ گے فون کے قریب موجود رہا کرو۔  
میں کسی بھی وقت تمہیں فون کر سکتا ہوں۔ دراصل مجھے شبہ ہے

”نی انال تمہیں صرف میرے خصوصی کام کا فرائض انجام  
دینا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ قدرے ہلکی سی لیکن درحقیقت بہت اہم ہو گا اور تمہاری یہ  
خدمت میرے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے ہی ہوگی۔ کل صبح سے  
تم جوں جیٹھ اپنے گھر آؤ گے فون کے قریب موجود رہا کرو۔  
میں کسی بھی وقت تمہیں فون کر سکتا ہوں۔ دراصل مجھے شبہ ہے

”نی انال تمہیں صرف میرے خصوصی کام کا فرائض انجام  
دینا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ قدرے ہلکی سی لیکن درحقیقت بہت اہم ہو گا اور تمہاری یہ  
خدمت میرے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے ہی ہوگی۔ کل صبح سے  
تم جوں جیٹھ اپنے گھر آؤ گے فون کے قریب موجود رہا کرو۔  
میں کسی بھی وقت تمہیں فون کر سکتا ہوں۔ دراصل مجھے شبہ ہے

”نی انال تمہیں صرف میرے خصوصی کام کا فرائض انجام  
دینا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ قدرے ہلکی سی لیکن درحقیقت بہت اہم ہو گا اور تمہاری یہ  
خدمت میرے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے ہی ہوگی۔ کل صبح سے  
تم جوں جیٹھ اپنے گھر آؤ گے فون کے قریب موجود رہا کرو۔  
میں کسی بھی وقت تمہیں فون کر سکتا ہوں۔ دراصل مجھے شبہ ہے

نصرت  
اسے کہ

تھے اور کسی عمو کی سے میرے آدمیوں کے ہتے چڑھ گئے۔" میں نے ذرا خشک لمبے میں کہا۔

"آپ کے آدمیوں والی بات اور ہے سرا یہ بڑے غیر معمولی لوگ ہیں ورنہ میں آسانی سے ہتے چڑھنے والی چیز نہیں ہوں۔"

"لیکن جن لوگوں سے تمہیں آئندہ واسطہ پڑ سکتا ہے وہ ان سے بھی کہیں زیادہ غیر معمولی ہیں۔ بلکہ انہیں تو تم کسی حد تک باوقوف الفطرت ہی سمجھو۔ میں تمہیں کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اس کام میں کسی معمولی سی غلطی سے تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔"

"جان کی کوئی بات نہیں سرا! جان تو کبھی راہ چلے محض ٹھوکر لگ کر گرنے سے بھی جا سکتی ہے۔ اگر کسی اچھے کام میں جلی گئی تو اس سے اچھی کیا بات ہے۔" وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

"یقین نہیں آتا کہ تم واقعی ان بڑی بڑی باتوں کا شعور رکھتے ہو۔" میں نے اسے گھورا۔

"سرا میں دنیا پر یکی تو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں بڑی بڑی باتوں کا شعور رکھتا ہوں۔ بڑے بڑے کام کر سکتا ہوں۔ لیکن کوئی مجھے موقع ہی نہیں دیتا۔ آپ جیسے بڑے آدمی کے ذریعہ سایہ ہو کر شاید میں بھی بڑا آدمی بن جاؤں۔"

"بڑا آدمی!" میں کرانے کے سے انداز میں ہنس دیا "تم مجھے بڑا آدمی سمجھتے ہو یہ بات بھی کسی لطف سے کہہ نہیں۔ آج کل تو تمہارا یہ بڑا آدمی گھن پکرتا ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ سایہ اگر تم بھی گھن پکڑ سکتے ہو۔"

"مجھے یہ بھی قبول ہے سرا! انسان کچھ نہ کچھ تو بننے حرکت میں تو آئے۔ بیل پر لٹکی ہوئی کسی توری یا لوکی جیسی غیر اہم زندگی گزار کر تو نہ مر جائے۔"

"گوشتش کرنا کہ اس کام کے دوران کسی کے ہتے نہ چڑھو۔ تمہاری پیغام رسائی پر ایک اہم مشن کا اور دور ہو گا۔ اور خدا کے لیے نقلی سوچیں، نقلی داڑھی یا اس قسم کی کوئی اور چیز استعمال نہ کرنا بد وقت نے تمہیں ویسے ہی بت مہر گیت آپ سے نوازا ہوا ہے۔ اور وہ ہے تمہارے چہرے پر برہمی ہوئی حماقت۔"

یکدم ہی وہ بالکل مختلف انداز میں مسکرایا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ہوں لگا جیسے اس کے چہرے سے حماقت کا ہر نقش مٹ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں مجھے کسی انتہائی ذہین انسان کی آنکھیں نظر آئیں۔ لیکن یہ سب کچھ جیسے محض ایک ثانیے کے لیے تھا۔ جیسے بادلوں کے عقب میں بجلی کوئندے اور محدود ہو جائے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر وہی حماقت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

وہ کسی گاؤں کی سی طرح اپنے لمبے کوداؤں سے اپنے اپنے کوچش کرتے ہوئے بولا "نقلی داڑھی سوچیں وغیرہ کچھ سمجھ کر ہی استعمال کرتا ہوں سرا! اس کا بھی کوئی مقصد عام طور پر پورا ہو جاتا ہے۔ اپنے کام کرنا

کہ میرے اور میرے ساتھیوں کے ٹیلی فون اور راجیلے کے دوسرے ذرائع محفوظ نہیں رہے۔"

میرا ارادہ تھا کہ میں اب کسی پبلک فون سے دستم کو فون کیا کروں گا۔ وہ اب خاصی توجہ اور احتیاط سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی ہوئی حماقت میرے خیال میں میرے لیے ایک منفی چیز ثابت ہو سکتی تھی۔ ریڈ ڈاٹ والے یا کوئی اور مشکل سے ہی تصور کر سکتا تھا کہ صورت سے ہی اتنا احتیاط نظر آئے والا فوجیوں میں سے لے کام کر رہا ہو گا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "مجھے اپنے ساتھیوں کے لیے جو بھی پیغام دینا ہو اسے گاؤں میں اختصار کے ساتھ تمہیں دیا کروں گا اور تم اسے لکھ کر لگائے میں بند کر کے اسکو پڑ کسی کوریئر سروس کے نمائندے کی حیثیت سے لے جایا کرو گے۔ جو اب اگر اسے بھی مجھے یا کسی دوسرے ساتھی کو کوئی پیغام دینا ہو اسے گاؤں وہ تحریری صورت میں ہی تمہیں دے دیا کرے گا۔ تم وہ بھی مطلوبہ محض تک پہنچا دیا کرنا اور قاصد ہوتے ہی ٹیلی فون کے قریب موجود رہا کرنا۔ کل دیر تک تم کسی بھی کوریئر سروس کا بیغنازم تیار کر لو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جتنے بھی رنگوں کی پینٹ شرٹ یہ کمپنیاں استعمال کر رہی ہیں وہ عام استعمال کے رنگ ہیں۔ شاید تمہارے پکڑوں میں اس طرح کی کوئی نہ کوئی پینٹ شرٹ موجود ہو۔ بس جب پر ٹیڈ مارک کی کڑھائی کر لیا اور اسکو پڑ ٹیڈ مارک پینٹ کر لیا۔"

"اگر میں اس کمپنی والوں کی نظر نہیں آگیا۔ اور کسی نے مجھے پکڑ لیا تو؟" اس نے خوف زدہ سے لمبے میں پوچھا لیکن نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ وہ درحقیقت ایسا خوف زدہ نہیں تھا۔ محض احتیاطاً پوچھ رہا تھا۔

"فکر مت کرو۔ کوئی تمہاری طرف توجہ نہیں دے گا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو میں تمہیں چھڑا دوں گا۔ چند باتوں کا خیال رکھنا۔ تمہارا انداز واقعی کوریئر سروس کے ملازم جیسا ہونا چاہیے۔ اگر تم نے اپنے انداز میں پراسراریت پیدا کرنے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے۔ جاسوسیت کا خطا ذہن سے نکال دیتا۔ اگر تم نے جاسوس بننے کی کوشش کی تو فوراً کسی کی نظر میں آجاؤ گے۔ بس یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ تم ایک سادہ لوح سے کوریئر ہو اور عام سی کاوباداری یا نجی ڈاک دوسرے دوسرے جا رہے ہو۔ کیونکہ کالیک حتملاً اور چند دوی لگائے" ایک تودہ پکٹ وغیرہ بھی ساتھ رکھ لیتا۔"

"آپ ذرا بھی تردد نہ کریں سرا! آپ نے کبھی مجھے ایکشن میں تو دیکھا ہی نہیں ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ جب میں کوئی کام کرنے کی ضمان لیتا ہوں تو اسے کتنے عمدہ طریقے سے انجام دیتا ہوں۔" وہ آنکھیں مچھاتے ہوئے بولا۔

"وہ تو میں دیکھ چکا ہوں، کیسی عمو کی سے تم میری مگرانی کر رہے

رخصت ہوتے وقت محتاط رہنا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ  
واپس ہی بھی باپ کے راستے اترنے کی کوشش کرو۔

”ہرگز نہیں سر! میرا آئے اور جانے کا راستہ بیٹھ مختلف ہوتا  
ہے۔“ دو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ”واٹکنگ ہال میں  
فون ضرور کر دیتے گا۔ میں پرس گھر بھول گیا ہوں۔ کس ایسا نہ ہو  
کہ ڈٹ کر کھانے پینے کے بعد شرکی معزز اور خوب صورت  
خواتین بادولت کی رسوائی کا تماشا دیکھیں۔“

اس نے دو دروازہ کھول کر اپنے مخصوص امتحانہ انداز میں باہر  
جھانکا اور دائیں بائیں دیکھنے کے بعد لشکر کی طرح چمک جلا لگا کر  
غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے واٹکنگ ہال میں فون کر کے  
ہینڈوٹر کو اس کے بارے میں پڑیاات دیں۔ پھر چند منٹ بعد اسلام  
آباد، حفیظ صاحب کی سرکاری رہائش گاہ سے رابطہ قائم کیا۔ حفیظ  
صاحب گھر پر موجود تھے لیکن ایک صاحب نے میرے بارے میں  
اچھی طرح پوچھ گچھ کرنے کے بعد اور چند منٹ انتظار کرنے کے  
بعد ان سے لائن ملائی۔

جب وہ بولے تو مجھے ان کے لیے میں گم جوش کی کمی محسوس  
ہوئی۔ انہیں انہوں نے خاصی خوش خلقی سے میری غیر عافیت  
دریافت کی۔ رسی جھلسوں کے چارے کے بعد میں نے کہا ”سنا ہے  
اتیس تاریخ کو آپ امریکا کے اہم دورے پر روانہ ہو رہے ہیں؟“  
وہ گویا ذرا چمک کر بولے ”نہیں کیسے پتا چلا؟ ابھی اس سلسلے  
میں پریس میں تو کوئی خبر نہیں آئی۔“

”ہمارے بھی کچھ ذرائع ہیں سر!“ میں نے خواہ مخواہ انہیں ذرا  
تجسس میں جھلا کرنے کے لیے کہا۔

انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ کئی  
سوچ میں پڑ گئے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”سر!  
اس دورے پر روانہ ہونے سے پہلے آپ لاہور آئیں گے نا؟“

”ہاں“ وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولے ”مجھے روانہ  
کراچی سے ہونا ہے۔ دو دن پہلے میں لاہور آ جاؤں گا“ پہلے میرا  
جلدی جانے کا پروگرام تھا لیکن میرا وہ کچھ قے چلا گیا ہے۔

”سر! مجھے لاہور میں آپ سے ملاقات کے لیے وقت  
چاہیے۔ میں آپ کو ایک بہت اہم آدمی سے ملوانا چاہتا ہوں۔  
ملاقات کے لیے وقت بھی مجھے کچھ زیادہ پڑے گا۔ دوڑتے  
بھاگتے ملاقات نہیں ہونی چاہیے۔“ میں نے درخواست کی۔

”گوں ہے وہ شخص؟ کس شاخ میں اسے مجھ سے ملوانا چاہیے  
ہو؟“

”یہ سب کچھ تو میں آپ کو ملاقات کے دوران ہی بتاؤں گا۔  
فون پر یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہیں معلوم ہے مجھ سے ملاقات کے کسی خواہش مند کسی  
اشیاء کو پہلے انا نہا ہوتا ملاقات کی غرض وغیرہ بتائی دیتی ہے۔ پھر

امکان کی ہے۔ لیکن آپ جو کام بتا رہے ہیں اسے میں آپ ہی کی  
ہدایات کے مطابق انجام دوں گا۔ آپ دیکھ لیجئے گا۔ آپ کو مایوسی  
نہیں ہوگی۔“

اس کی تمام تر محنت آبی کے باوجود واقعی میں پیغام رسانی کا  
کام اس کے سپرد کر کے بڑی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے  
اسے کچھ ضروری کوڈز بھی سمجھا دیے۔ ان کے بارے میں میں  
نے آزمائشی طور پر اس سے سوالات کیے تو اس نے بالکل صحیح  
جواب دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوڈز مغز نہیں تھا۔

سب کچھ سمجھانے کے بعد میں نے کہا ”ایک بات کا اور خیال  
رکھنا۔ ہمارے درمیان یہ ملاقات تو ہو گئی ہے لیکن آئندہ میرے  
اور تمہارے درمیان کوئی تعلق ظاہر نہ ہونے پائے جب تک میں  
خود پیغام نہ دوں، مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ فون پر بات ہوتی  
ہی رہے گی۔ لیکن مجھے یہاں ہوئی میں فون نہ کرنا۔“

وہ اثبات میں سر ملانے لگا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں  
نے کہا ”اب تم جا سکتے ہو۔“

وہ بیٹھ پر ہاتھ بھیرتے ہوئے دو دن تک لیے میں بولا ”سر! یہ  
کوئی انصاف کی بات تو نہیں ہے۔ آج شام دوپہاڑوں پھاڑوں نے  
آپ کے دسترخوان پر بیٹھ کر چٹنوں کا ایک بازار صاف کر دیا۔ سویت  
ڈشیں اور نہ جانے کیا کیا اڑا والا اور ہم جسے غریب غرا کر آپ پانی

کے گلاس کے لیے بھی نہیں پرچہ رہے۔ میں نے تو آپ کو آئینہ  
بٹایا ہے لیکن آپ کی اس رکھائی کے باعث میرے ذہن میں  
آئینہ کی ہی جیت بری طرح گزرنے لگا ہے۔“

”اسے گزرنے دو“ بلکہ ٹاک کے بل کر کرپاش پاش ہوجانے  
دو۔“

”سر! میں تو آپ کو اپنی عظیم تہذیبی روایات کا امین سمجھا تھا  
جن کے مطابق گھر آئے مسان کو کچھ کھانا بغیر رخصت نہیں کیا  
جاتا۔“ وہ کراہا۔

”میں امین نہیں افضل ہوں۔ افضل چوہدری۔“ میں نے  
تبجید کی ہے کہا ”اب فوراً اٹھ جاؤ۔“

”سر! آپ کی یہ حرکت آپ کو افضل نہیں رہنے دے گی اور  
آپ چوہدری کے بجائے کوئی فائدہ کش مزارع و کماٹی دینے لگیں  
گے۔“ اس نے کھنی کھنی سی آواز میں کہا ”میں سے بڑی بھوک لگی  
ہے۔ صبح سے خالی پیٹ بیٹھ رہا ہوں۔“

میں گھونسا آن کر اس کی طرف بڑھا تو وہ اچھل کر اٹھ کھڑا  
ہوا۔ اس کی عینک گرتے کرتے پڑی۔ تب مجھے اس کی صورت دیکھ  
کر ہنسی آگئی۔ وہ سوکھے سے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جلدی

کر رہا تھا۔ ”مجھے معلوم تھا آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

”ہاں لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اب زیادہ دیر کمرے میں  
مقصود۔“ واٹکنگ ہال میں فون گزرتا ہوں۔ وہاں بیٹھ کر جھول  
اسے کہا کہ وہ صبح سے کھانا نہ کھا رہا ہے۔

بارے میں تم سے زیادہ معلومات ہیں۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں حفیظ صاحب کے بارے میں اس کے اس جملے پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے تقریباً پون گھنٹے بعد اسلام آباد سے حفیظ صاحب کے ہاے کا فون آیا۔ انہوں نے سنا کہ تاریخ کی شام چھ سے آٹھ بجے تک کا وقت میرے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ ملاقات لاہور میں ہی ان کے گھر پر ہونا تھی۔

یہ پیغام ملتے ہی میں آفس سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں کسی پاپی سی او کی تلاش میں نکلا تو اندازہ ہوا کہ کوئی مناسب پبلک ریلی فون تلاش کرنا اور کسی کی توجہ مبذول کرانے بغیر اس پر بات کرنا کتنا مشکل کام تھا۔

بہر حال کافی دور جا کر ایک مناسب فون میسر آیا تو میں نے وسیم کے آفس کا نمبر ڈال کر دیا۔ وہ آفس میں موجود تھا اور گویا پتھر ہی بیٹھا تھا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس نے فون اٹھا لیا۔

"یو ز فارم کا بندوبست کر لیا؟" میں نے پوچھا۔  
"جی سربراہ تو کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اسی وقت میں یو ز فارم میں ہی بیٹھا ہوں۔ سب تیار ہیں عمل میں۔ گاڑی چھوڑ کر میں نے اپنا اسکور بھی نکال لیا ہے۔ لیکن اب بڑے پریشان ہے۔" وہ مستعدی سے بولا۔

"نہیں پریشان ہی رہنے دو۔ بے چارے ایادیں کے مندر میں اسی دن سے پریشانیاں لگھ رہی ہیں جس دن وہ ادا بنے ہیں۔" "خیر اتنے پریشان بھی نہیں ہیں۔ میں نے انہیں گولی دے دی ہے۔ میں بہت چالاک ہوں۔"

"پیغام نوٹ کر چالاک آوی؟" میں نے کہا اور راحیلہ کے نام پیغام نکھوانے کے بعد ایڈریس بھی سمجھایا۔ پیغام کے بعض جملے عام فہم ہونے کے باوجود حقیقت کو دواؤں میں تھے اور کچھ جملوں کا مطلب وہی تھا جو بظاہر ہونا چاہیے تھا۔ یہ زیادہ کنفیوژ کرنے والی ٹیکنک تھی۔ میں نے راحیلہ کے لیے یہ بھی نکھوایا تھا کہ وہ بھی چاہے تو وسیم سے پیغام رسائی کے سلسلے میں کام لے سکتی ہے۔

فون کر کے واپس آتے وقت میں نے فیصلہ کیا کہ ہر بار مختلف فون استعمال کیا کروں گا۔ کبھی کسی ہوٹل یا رستوران سے، کبھی کسی دوست کے آفس سے اور کبھی پبلک فون کے ذریعے وسیم سے رابطہ قائم کیا کروں گا۔ وسیم کے گھر اور دفتر کے فون کے بارے میں مجھے امید تھی کہ وہ ابھی محفوظ تھے، تاہم یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ زیادہ دن کے لیے مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

مجھے آفس میں واپس آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایڈم کا دوبارہ فون آیا۔

"مبارک ہو" میں نے جھنجھٹے ہوئے لمحے میں کہا۔

بیکرمی کے کچھ نظریے اس کے بارے میں رہی سی چنان بین کی جاتی ہے۔ جب ملاقات ہوتی ہے۔ اس شخص کے بارے میں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے۔" وہ ملافت سے بولے۔

"سرا! جس طرح میں غریبوں کے ساتھ چلی مرتے آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا تو میرے بارے میں اس قسم کی کوئی رسمی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح اب یہ شخص میرے ساتھ آ رہا ہے۔ میں تو اب آپ کے قریبی شاہدوں کی فہرست میں شامل ہوں۔ کیا اس شخص کا میرے ساتھ آنا کافی نہیں؟"

"کافی تو ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی۔۔۔ کچھ تھوڑی بہت معلومات ہو جائیں تو اچھا تھا۔" وہ غائبانہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ لیکن پھر یکدم ہی وہ گویا نیلے پر پہنچ گئے "خیر ٹھیک ہے۔ تم آجانا۔ لیکن وقت و فیروز کے بارے میں کل میرا ہاے یا بیکرمی خود تمہیں فون کر کے بتا دے گا۔ میری مصروفیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہی لوگ مناسب وقت کا تعین کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل پتھر رہوں گا۔ بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

دوسرے روز میں آفس پر پہنچا تھا کہ ایڈم کا فون آیا۔ "حفیظ صاحب سے بات ہوئی؟" اس نے بھی بلا تمہید پوچھا۔ "یار! تم لوگ تو اس سلسلے میں اس شوہر سے بھی زیادہ بے چین ہو جس کی بیوی پہلے بچے کے سلسلے میں لیبر روم میں جا چکی ہو۔" میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"یہی سمجھ لو" وہ بات سے لمحے میں بولا "دراصل ہم جس کام کے بارے میں طے کر چکے ہوتے ہیں کہ اسے فلاں روز فلاں وقت پر فلاں طریقے سے ہونا چاہیے اس کا زرا بھی لوہرا دھر ہونا برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم بھی کہیں جواب دہ ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ میرا کوئی بھی ریلی فون تم لوگوں کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ اس لیے نہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ کل رات میری حفیظ صاحب سے بات ہوئی ہے اور آج ان کا پی اے یا سیکرٹری مجھے اپنا منتھن کے بارے میں اطلاع دے گا۔"

"میں معلوم دو بھی جائے تب بھی ہمارا تم سے پوچھنا ضروری ہو گا۔ جو کام جس طرح طے ہو چکا ہے اس پر اسی طرح عمل ہو گا۔" اس نے میم لمحے میں جواب دیا۔ اس نے اس بات کی تصدیق یا تردید نہیں کی کہ انہیں میرے ریلی فونوں پر ہونے والی باتوں کا علم ہو آتا تھا یا نہیں؟

ایک لمحے کی توقف سے وہ بولا "ٹھیک ہے میں دوسرے تمہیں فون کروں گا۔ اس وقت تک حفیظ صاحب کے پی اے یا سیکرٹری کا فون آچکا ہو گا۔"

"امید تو یہی ہے۔ وہ بڑے بیکرمی انسان ہیں۔ جو وعدہ کر لیتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں معلوم ہے۔" ایڈم ملافت سے بولا "میں ان کے

اس کے بعد گویا ایک نادیہ سی مٹھیں حرکت میں آئی۔ وسم اس مٹھیں کے اندر بڑے کا کردار ادا کر رہا تھا۔ میں سب کچھ دیکھ نہیں رہا تھا لیکن مجھے اڑتی اڑتی سی اطلاعات مل رہی تھیں کہ راجہ کچھ تیاریاں کر رہی تھی۔ ہمارے پاس چار دن تھے اور ڈائریکٹ رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا کام کچھ دشوار ہو چکا تھا۔ ان چار دنوں میں اگر کسی کو یہ شک نہ ہوتے باناکو وسم در حقیقت کون تھا اور کیا کام انجام دے رہا تھا تب بھی شبہ نہ تھا۔ اس صورت میں راجہ کی مٹیوں کی کامیابی کی امید رکھی جاسکتی تھی۔ اس دوران میں نے اپنے ایک ساتھی مفرد سے رابطہ قائم کر کے اسے الگ سے کچھ خصوصی ہدایات بھی دی تھیں۔ مفرد کی مجھے بھی خاص طور پر ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ستائیس تاریخ تک کوئی خاص قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ اس دوران ایڈم نے دو مرتبہ فون کر کے پوچھا کہ پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی تھی۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔

ستائیس تاریخ کو احتیاط میں نے خود بھی حقیقت صاحب کو لاہور والے گھر فون کر کے تصدیق کر لی کہ میرا اپنا منتظمت برقرار تھا گو کہ مجھے امید تھی کہ اگر ملاقات منسوخ ہو جاتی تو حفظ صاحب کے اصرار میں سے کوئی نہ کوئی مجھے ضرور مطلع کرتا۔ لیکن ریڈ ڈاٹ سی کی طرح میں بھی احتیاط برت رہا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ حفظ صاحب لاہور پہنچ چکے تھے وہ آہرام کر رہے تھے اور میرا ان سے اپنا منتظمت برقرار تھا۔

اس روز میری حفاظت کے لیے آس پاس موجود رہنے والے ساتھی نائب ہو چکے تھے۔ میں معمول کے مطابق دفتر گیا تھا لیکن جلدی واپس آ گیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے ایڈی کا ہوٹل میں فون آیا "عرفان مقرر وقت پر پہنچ جائے گا تم تیار رہنا۔"

"اگر حضور کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ہار گلدستے لے کر نیچے کھڑا ہو جاؤں؟" میں نے ذہنی طور پر پوچھا۔

"نہیں" تمہیں نیچے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی تمہارے کمرے میں پہنچ جائے گا۔ ایڈی نے سخت سے لیے میں ہدایت کی۔ غالباً وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں دیکھوں "عرفان کس طرف سے آئے اور کس گاڑی میں آ رہا تھا۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "ہم نے ہوٹل اور ارد گرد کا علاقہ چیک کر لیا ہے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ وہاں کسی خفیہ ایجنسی کا آدمی یا کوئی مشکوک شخص موجود نہیں ہے لیکن احتیاطاً ہم ایک بار پھر تم سے تصدیق کر رہے ہیں کہ تم نے رازداری کا وعدہ واد رکھا ہے نا؟"

"نہیں نے اس قسم کے کسی شخص سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔" میں نے سچ بولا۔

"ٹھیک ہے" وہ طمانیت سے بولا "تم اپنے کمرے میں رہنا۔ ٹھیک پانچ بجے عرفان تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔" اس نے سلسلہ

صاحب سے ملاقات طے ہو گئی ہے" میں نے اسے تاریخ اور وقت بتایا۔

اس نے شاید یہ سن کر اطمینان کی سانس لی اور کہا "ٹھیک ہے ستائیس تاریخ کو ٹھیک پانچ بجے عرفان تمہارے پاس اسی ہوٹل میں پہنچ جائے گا۔ جہاں آج کل تم ٹھہرے ہوئے ہو۔ تم وہیں موجود رہنا۔ وہ کس طے میں ہوگا یہ تمہیں بعد میں بتایا جائے گا۔ یہ یاد دلانے کی تو غالباً ضرورت نہیں کہ اس سلسلہ میں تمہاری طرف سے کسی بھی قسم کی غیر زنجی داری کا مظاہرہ تمہارے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ ہم اس سارے عمل کے دوران کسی خفیہ ایجنسی کے آدمی تمہارے کسی ساتھی یا کسی بھی اور شخص کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔ تم یہی سمجھنا کہ کوئی نہیں آنکھ ہر لمحے تمہیں دیکھ رہی ہوگی۔"

"یہ ہدایات میں ذہن نشین کر چکا ہوں حضور والا!" میں نے کہا۔

"لیکن تمہارا لہجہ اس بات کی گواہی نہیں دیتا۔" ایڈم نے کمری سنجیدگی سے کہا۔

"اچھے لیجے میں بات کرنا میری عادت ہے۔" میں نے جواب دیا "ویسے بھی تمہیں لیجے پر تو جانا ہی نہیں چاہیے۔ تمہیں معلوم ہی ہے میں یہ کام خوشی سے نہیں، محض مجبوراً کر رہا ہوں۔ ایک مجبور آدمی اپنے لیجے میں شدت تو نہیں کھول سکتا۔"

بات شاید ایڈم کے دل کو لگی۔ نسبتاً خوشگوار لیجے میں بولا "ہاں یہ تو درست ہے۔"

"میں اب بھی وہی افضل چرہ دہری ہوں جو پہلے تھا۔ اور اب بھی تم لوگوں پر اتنی ہی انتہائی بھیجتا ہوں جتنی پہلے بھیجتا تھا۔ میں خواہ مخواہ جھوٹ بولنا ضروری نہیں سمجھتا۔ میرا دل اب تمہاری محبت میں شرارت تو نہیں ہو گیا ہے۔ بس یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ بعض کام انسان کو نہ چاہتے ہوئے بھی دل پر جبر کر کے کرنا پڑتے ہیں۔ سو میں بھی کر رہا ہوں اور دعاگو ہوں کہ اس کے بعد اگر اس ملک کی نہیں تو کم از کم میری تو تم سے جان چھوٹ جائے۔"

میں نے تیزی سے کہا۔

"چھوٹ جائے گی، چھوٹ جائے گی۔" وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر مزید انداز میں بولا۔

میں نے اپنے لیجے سے جس بے بسی کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی وہ گویا اس سے محفوظ ہو رہا تھا۔

"ستائیس تاریخ کو شام پانچ بجیں منتظر رہو گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں تمام ہدایات تو تمہیں یاد ہی ہوں گی؟" ایڈی نے تصدیق کر لی۔

منتظر رہا ہوں" میں نے بے زاری سے کہا اور اس نے سلسلہ



منتقل کر دیا۔

نیچے آکر میں نے گاڑی نکالی۔ گزری ہر ایک نظر زانی اور سست رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ ہوٹل سے پہلے شکل سوگڑ کے قافلے پر ایک درخت کے قریب کھڑا عرفان مجھے فوراً ہی نظر آیا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا فلیٹ بیسٹ اور آریک جیسے کے علاوہ اس کے چہرے پر خاصی گھٹی موٹھوں کا اضافہ بھی نظر آ رہا تھا۔

ان چند چیزوں نے واقعی اس کی شکل صورت بدل دی تھی۔ مجھے معلوم تھا ان چیزوں کے بٹے ہی وہ حقیقت صاحب دکھائی دیتے لگے گا۔ لیکن وہ بھی مکمل طور پر اس کی اصل صورت نہیں تھی۔ ان سارے پیکروں میں اس کی اصل شکل نہ جانے کہاں مقاب ہو گئی تھی۔

وہ مہذبانہ انداز میں لفٹ کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی اس کے قریب لے جا کر روکی۔ بڑک پر بڑک معمول کے مطابق رواں تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑا ہوا یہ مہذب اور خوش پوش شخص ہمارے وزیر خارجہ کی جگہ لینے جا رہا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ چکا اور گاڑی ذرا رفتار بڑھا چکی تو میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں؟ ہتھیار کی موجودگی تمہیں وہاں مشکوک بنا سکتی ہے۔"

وہ دیر سے ہنسا "ہم اتنے احمق نہیں ہیں مسٹر چوہدری! ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کون سا کام کیسے کرنا چاہیے۔ ہم مستقبل قریب میں دنیا کا نظام سنبھالنے والے ہیں۔ میرے پاس اس وقت جمل تراش تک موجود نہیں ہے۔"

"دنیا کا نظام سنبھالنے کے سلسلے میں میری طرف سے پہلی مبارکباد قبول کرو۔" میں نے خشک لبے میں کہا۔ وہ ہم کے سینے میں بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے آپ کو ریڈ وائٹ کا حصہ سمجھتا تھا اور دنیا پر حکمرانی کے پروگرام میں اس کے اپنے نہ جانے کتنے خراب شامل تھے۔ میرے لیے یہ جانتا بھی مشکل تھا کہ وہ پاکستانی تھا یا کسی اور ایشیائی ملک کا باشندہ؟ معلوم نہیں وہ مسلمان بھی تھا یا نہیں؟ بہر حال ریڈ وائٹ کے قریبی اور خاص لوگوں میں وہ مجھے پہلا شخص دکھائی دیا تھا جو اپنا ہی بھائی بندہ معلوم ہوا تھا۔

وہ جب سے شیشے کی ایک منضی سے تھراپیز نمائندہ اور نیلے رنگ کا ایک شفاف کیبیکل نکال کر میری طرف بڑھتا ہوا تھا "یہ دونوں چیزیں آپ اپنی جیب میں رکھ لیں مسٹر چوہدری! ان کے استعمال کا طریقہ آپ کو سمجھا دیا گیا تھا۔ پھر بھی اگر آپ کو کوئی بات پوچھنا چاہیں تو مجھ سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"میں آپ سے سوچا ہوا تھا کہ پوچھنا چاہتا ہوں وہ فاشی کے ڈمرے میں آسکتی ہے۔ اس لیے رہے دیں۔" میں نے وہ دونوں چیزیں لے کر جیب میں ڈالے ہوئے کہا۔

"بعض اوقات مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس دنیا میں آپ کی

میں کمرے میں موجود رہا لیکن پانچ پانچ کر پانچ منٹ تک بھی عرفان نہیں پہنچا۔ پانچ منٹ کروں منٹ پر فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف وہ منحوس ایڈی تھا۔

"تم انتظار کر رہے ہو گے۔" وہ اطمینان سے بولا "پروگرام میں ذرا تبدیلی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی ہم نے سوچا ابھی دقت تو خاصا باقی ہے۔ تمہارے ہوٹل سے حقیقت صاحب کے کمرے کا قافلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ اب تم ذرا زحمت کرو۔ کمرے سے نکل کر نیچے آ جاؤ اور گاڑی میں بیٹھ کر اپال کی طرف چل دو۔ تمہارے ہوٹل سے ذرا ہی آگے سڑک کے کنارے تھیں عرفان کھڑا نظر آ جائے گا۔ وہ آسانی رنگ کے سوٹ میں ہو گا۔ سر پر سیاہ فلیٹ بیسٹ اور آنکھوں پر ذرا گہرے رنگ کے شیشوں کا چشمہ ہو گا۔ وہ خود بھی تمہاری گاڑی دیکھ کر پہچان لے گا اور رکنے کا اشارہ کرے گا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ محض احتیاطاً انہوں نے آخری لمبے پر یہ تبدیلی کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اتنے بڑے خوف اور بے پرواہی بھی نہیں تھے جتنا اپنے آپ کو ظاہر کرتے تھے کیس نہ کہیں کوئی خوف تو موجود تھا جیسی وہ بھی ہر ممکن احتیاط کرتے تھے۔

"ٹھیک ہے میں روانہ ہو رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھنے ہی لگا تھا کہ وہ بولا "ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر راستے میں سے بھی کسی گاڑی وغیرہ نے تمہارا تعاقب شروع کر دیا تو بات دیں ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔"

"کسی کی بھی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے پیارے ایڈی!" میں نے کہا اور ساتھ ہی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ڈرنک ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا "میں نے تو کسی کو اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں کی۔ اب اگر کوئی عرفان کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کا تعاقب شروع کر دے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"میں ایک بار پھر تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس معاملے میں مذاق کی گنجائش نہیں ہے۔ افضل چوہدری! ایڈی گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میں عادت سے مجبور ہوں ایڈی ڈیرا گنجائش ہو یا نہ ہو میں خود گنجائش نکال لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ کر ایک لمبے کے لیے ڈرنک ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرا چہرہ بظاہر اب بھی ہر سکون ہی تھا۔ لیکن میری رگ ویسے میں لگا سا ارتعاش تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ حقیقت صاحب کی نئی رہائش پر بھی سیکورٹی وغیرہ کی غرض سے مختصر سا اسلaff فینٹات رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا میں یا عرفان کوئی ہتھیار لے کر اندر نہیں جا سکیں گے۔ اس لیے کچھ ساتھ رکھنا افضل تھا۔



ڈرائنگ روم میں کسی قسم کا ڈراما ان کا خطر تھا۔

ہم ان کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے خاصی گر بخوشی سے ہم سے مصافحہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ عرفان کا انہوں نے گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کے لیے میں اس وقت ویسے ہی انٹرنیشنل ڈرگ ہانڈ کے کسی نمائندے کی سی جھلک تھی لیکن میرا دل ایسی احساس سے دھڑک اٹھا تھا کہ انہوں نے اس میں کہیں اپنی مشابہت تو تلاش نہیں کر لی تھی؟

لیکن جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئے تو میں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ فون پر جھٹکوں کے دوران مجھے ان کے لیے میں گر بخوشی کی محسوس ہوتی تھی لیکن اب وہ بولے تو ان کے لیے میں گر بخوشی ہی نہیں اپنائیت اور بے تکلفی بھی تھی جس کا مظاہرہ وہ شاذ و باری کرتے تھے۔

”کیا خیال ہے پر خوردار پراسرار چوہدری؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ”کیا اس بار بھی کوئی پراسرار سی کہانی لے کر آئے ہو؟ یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں؟ یہ بھی خامے پراسرار دکھائی دے رہے ہیں۔“

”جس... کیا کہوں حنیف صاحب!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”جس طرح بد قسمتی بعض لوگوں کا تعاقب کرتی ہے اس طرح پراسرار ت میرا تعاقب کرتی ہے ویسے اسے پراسرار ت کتنا کچھ درست نہیں۔ میں نے تو پہلے بھی آپ کو حقائق بتائے تھے اور اب بھی ایک بہت بڑی حقیقت سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔“

عرفان نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ میرے برابر بیٹھا تھا۔ بظاہر میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ حنیف صاحب کے چہرے پر بھی ان کی مخصوص تنبیہ کی لہریں تھیں۔

”کیسی حقیقت؟“ انہوں نے ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ پڑان محسوس کریں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا امریکا کا دورہ کس سلسلے میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو میں نہیں جانتا سکتا اور نہ ہی میں تم سے توقع رکھتا تھا کہ تم ایسا کوئی سوال کرو گے اس قسم کے دوروں کے بارے میں بعد میں ایک کمرل مول سا نظام جاری کر دیا جاتا ہے اور ضروری سمجھا جائے تو کچھ یا نہیں بتادی جاتی ہیں۔“

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے تو معلوم ہے آپ اپنی وائٹ میں وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟“ میں نے کہا۔

”کیا ہونے والا ہے؟“ وہ چونکے اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان سے زیادہ عرفان چونکا۔ وہ سرسراہٹ سی آواز میں بولا ”چوہدری! آپ کے ارادے کیا ہیں؟ آپ جس کام کے لیے جا رہے ہیں وہ کریں۔“

ٹیلے سے کہیں اڑتا دکھائی دیا۔ وہ بڑی بھی چڑی بانہ سے ہوئے تھا اور اس کی دھرتی ٹخنوں سے اونچی تھک۔ میں اس کی طرف زیادہ توجہ سے تو نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی تھا۔

ان لوگوں نے جیکبسن خاصی عمدہ فتنہ کی تھیں۔ حنیف صاحب کی طویل و عریض اور پرانی سی کوٹھی کا رنر کی تھی۔ میرے ساتھ شاید پہلی سڑک پر بھی موجود تھے۔ انہوں نے یقیناً اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ناصح ہونے کے باوجود کوٹھی پر ہر زاویے سے نظر رکھیں۔ اپنی سی کوٹھی تو وہ اچھی کر رہے تھے۔ آگے مقد میں نہ جانے کیا لکھا تھا۔ ناصح، کم وقت میں اور رابطے کی تمام دشواریوں کے باوجود انہوں نے اپنے خاصے انتظامات کر لیے تھے۔ میں نے گاڑی حنیف صاحب کی کوٹھی کے بلند سیاہ کیت کے سامنے جا دوکی۔ دو پریس والے کیت سے باہر بھی تعینات تھے۔ انہوں نے ہمیں گارنٹے کا اشارہ کیا۔ معذرت کے ساتھ ہماری ہنگی پہنکی سی تلاش لی۔ گاڑی میں اور دھڑک رہا تھا کہ وہ کی کھلوا کر دیکھی اور ہمارے اپنا ٹنٹ کے بارے میں سن کر ہمارے لیے کیت کھول دیا۔

اندرو بائیں ہاتھ پر لان کے قریب ہی ایک کمرے میں کچھ اور لوگ موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے دوبارہ ہمیں ڈرا اچھی طرح اوپر سے پیچھے تک تجھتا کر دیکھا۔ ایک رجنر میں وقت دیکھا۔ دوسرے شخص نے ٹیلی فون پر اندر اطلاع دی اور چند منٹ بعد ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔

برآمدے میں بیٹھنے کی شلوار تھیں، کلاہ اور کلف گے کھڑے والا ایک شخص ہمارا خطر تھا۔ وہ سوہانہ انداز میں ہمیں برآمدے میں ایک طرف کو لے چلا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ حنیف صاحب کی کوٹھی میں ڈرائنگ روم سامنے کے بجائے پچھلی طرف تھا۔

وہ ایک طویل و عریض اور گارنٹے ڈرائنگ روم تھا لیکن اس کی آرائش میں قدامت کا رنگ جھلکتا تھا۔ فرنیچر ہماری بھر کم اور نوکورین اسٹائل کا تھا۔ دیواروں پر چند پورٹریٹس آویزاں تھیں وہ غالباً حنیف صاحب کے بزرگوں کی تصاویر تھیں۔

عرفان میرے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں بولا ”یہاں سیکورٹی کا انتظام کوئی خاص نہیں ہے۔ تم حنیف صاحب کو آسانی سے لے جا سکو گے۔“

”ہاں امید تو یہی ہے۔“ میں نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ اسی اثنا میں بطور انداز آیا اور پوچھنے لگا کہ ہم کیا چاہنا پسند کریں گے۔ ہم نے بے توجہی سے ٹھنڈے کی فرائٹس کی۔ اس وقت کھانے پینے میں بھلا کس کا دھیان تھا۔

چھ منٹ بعد حنیف صاحب آئے پچھتہ وہ گہرے رنگ کی شلوار تھیں میں تھے اور نمائندہ آواز ہم نظر آ رہے تھے شاید آج کل ان کے دن آرام میں گزار رہے تھے۔ سارے حسب معمول ان کی انکلیوں میں دبا ہوا تھا۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ

رہے ہوں۔

حفیظ صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "فون پر جب تم نے کہا تھا کہ کسی اہم شخص کو مجھ سے ملانا چاہتے ہو تو نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے شاید کوئی غیر متوقع چیز سامنے آئے۔ میں نے احتیاطاً کچھ لوگوں کو بلا لیا تھا۔ یونہی محض حفاظت کے نکتہ نظر ہے۔"

"آپ نے اچھائی کیا تھا" حفیظ صاحب! "میں نے عرفان کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ وہ اب بھی بالکل پر سکون تھا۔ اس پر سیکرٹری غیلا و غضب کی ایک لہر آکر گر گئی تھی۔

پھر ایک دم ہی اس کا لہجہ بد پڑا جھگڑا۔ اس نے سناٹا اڑا دیا "جو طے ہو چکا ہے وہ ضرور ہوگا مگر صاحب! چاہے آپ اس سے دس گنا آدنی اور بولا لیں۔"

پھر ایک دم ہی اس کا لہجہ بد پڑا جھگڑا۔ اس نے سناٹا اڑا دیا "جو طے ہو چکا ہے وہ ضرور ہوگا مگر صاحب! چاہے آپ اس سے دس گنا آدنی اور بولا لیں۔"

مگر ان لوگوں نے گویا اس کی آواز سنی ہی نہیں۔ ان کے چہرے پر ستور پھرتے ہوئے تھے۔ وہ کسی اور ہی کے حکم کی تعمیل کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے غیر متعلقہ آوازیں کی طرف سے گویا کان بند رکھتے تھے۔

عرفان میری طرف دیکھ کر دیے ہی جھگڑا۔ اس نے بولا "موت تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔ مسٹر جی پوری اہم حفیظ صاحب کو ہر حال میں لے جائیں گے۔"

یہ سن کر سناٹا اڑا دیا۔ میری سے حفیظ صاحب کو اپنے ٹیکرے میں لے لیا اور کتوں کا سا عرفان کی طرف کر لیا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ ہوئے بغیر مارعب لیجے میں بولا "اگر مجھے گزند پہنچا تو اس کو بھی میں موجود کوئی ذی روح زندہ نہیں بچے گا۔"

میں اس کی خود احمادی کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کے پاس یقیناً کوئی ڈراما موجود تھی جس کے ذریعے ہماری تمام مشکلوں کو حل کیا جاسکتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہاں آنے سے پہلے میں خود اس کی حفاظت نہیں لے سکتا تھا۔ وہ فوراً ہی مشکوک ہو جاتا۔

"تمہیں گزند پہنچا کر ہمیں کیا حاصل ہوگا۔" میں نے کہا "تم اپنا کردہ خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ چلے جاؤ۔" میں نے سناٹا اڑا دیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور بولا "میری کچھ میں نہیں آتا کہ اس ارمان یا اس خواب کو کس طرح تمہارے ذہن سے نکالوں۔ جانا مجھے نہیں" حفیظ صاحب کو ہے۔ تم یوں نہیں رہو گے اور اس تبدیلی کے تمام چشم دید گواہ اب مارے جائیں گے۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ ہم خود ہی اور شور شراب کے فتنے انداز کرنا چاہتے تھے۔ ہم نہایت خاموشی اور اس دسکون سے اپنا کام کرنا چاہتے تھے لیکن تم نے یہ سناٹا اڑا دیا۔" میں نے چھوڑا

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر سر دلیجے میں کہا "میں وہی کر رہا ہوں جس کے لیے میں آیا ہوں۔ لیکن تمہیں کیا معلوم کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔"

وہ بظاہر حفیظ صاحب ہی کی طرح شریف، مہذب اور بے ضرر شخص نظر آتا تھا لیکن اس وقت اس کے اثرات بیکردل تھے۔ وہ کسی ذہریلے سانپ کی طرح خطرناک دکھائی دیتے لگا۔ پتھکانے کے سے انداز میں بولا "مسٹر جی پوری! ہمیں ذل کر اس کرنے کی کوشش مت کرو۔ اس کا نتیجہ تمہاری توقعات سے زیادہ خطرناک ہوگا۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" حفیظ صاحب متوجہ سے لیجے میں بولے "آپ دونوں میں کس بات پر جھگڑا شروع ہو گیا؟" انہوں نے عرفان کو مخاطب کیا تھا لیکن عرفان کی توجہ میری طرف تھی۔ ایک کے قدرے آریک شبیروں کے غضب میں اس کی آنکھیں انکاروں کی طرح دھبک اٹھتی تھیں۔

میں نے انہیں مخاطب کیا "اگر اس شخص کا ذلیل بیٹہ پشہ اور یہ سوچیں آواز دی جائیں تو یہ بالکل آپ کا کس نظر آئے گا۔ اور یہ آپ ہی کی جگہ لیتے آئے ہیں۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" حفیظ صاحب حیرت اور غصے سے بولے۔

عرفان یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھجھکا ہو گیا۔ وہ غضبناک انداز میں فرمایا "مسٹر جی پوری! تمہارا خیال ہو گا کہ میں اس وقت غیر مسلح اور تنہا ہوں۔ اس لیے تم آسانی سے اپنے کسی منصوبے پر عمل کر لو گے۔ میں تمہیں اب بھی موقع دے رہا ہوں۔ اب بھی وقت ہے۔ اصل منصوبے پر عمل کر ڈالو۔ یہ سب کے حق میں بہتر ہو گا ورنہ جو کچھ ہو گا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"میں کشتیاں جلا چکا ہوں۔ مجبور بھی ہوں۔ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ میں خواب میں بھی نہیں کر سکتا۔" میں نے دبا انداز سے کہا "میں نے حفیظ صاحب کو مخاطب کر کے اختیاتی تیزی اور اختصار سے ریڈ ڈاٹ کے منصوبے کے بارے میں بتایا۔"

حفیظ صاحب اس دوران اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن یہ سب کچھ سن کر وہ دوبارہ جھکے جھکے سے انداز میں بوسنے پر ڈھیر ہو گئے لیکن ساتھ ہی انہوں نے ہنسنی بجائی وہ اونچے طرے والا لباڑا تھا حفیظ یکدم چہراغ کے جن کی طرح نمودار ہوا۔ حفیظ صاحب نے اسے کوئی اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی غائب بھی ہو گیا۔

عرفان اب بالکل پر سکون انداز میں کھڑا تھا۔ اسے گویا منصوبہ کام ہو جانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ دوسرے ہی لمحے سات آٹھ ٹیکسیاں انہوں میں لے دھڑ دھڑ کرتے اندر آ گئے اور انہوں نے ہم تینوں کو گھیر لیا۔ وہ سارہ لباس میں تھے۔ ان کے بارے میں یقین سے پتہ نہ تھا۔ شاید ملری انہی جنس کے آدمی

انھارے بھاگے دیکھا ہو گا تو یقیناً حیران ہوا ہو گا۔

اس کے سرخ و سپید چہرے پر خود جمائے گئے میل پھیل کے داغ چمک رہے تھے۔ وہ سخت وحشت زدہ تھی اور بے کو پہلا کھنکھانے والا زوردار چلی آ رہی تھی۔ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے وحشت زدہ انداز میں ہکار "اائی اائی تم کہاں ہو ائی تم ٹھیک تو ہو۔"

وہ شاید اس تصور سے وحشت زدہ تھی کہ کہیں اس دھماکے میں میرا کام بھی تمام نہ ہو گیا ہو۔ میں نے بے آبی سے اسے آواز دی "را حیلہ! ایس یہاں ہوں۔"

وہ کچھ ٹوٹے ہوئے دردناک کھڑکیوں کو پھلانگی ہوئی میرے قریب آئی۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر اس نے طمأنینہ کی اتنی کمری سانس لی کہ اس کے جسم سے گویا جان ہی نکل گئی۔

"لاؤ یہ کا شکیف مجھے دے دو۔" میں نے جلدی سے کہا۔  
"خبردار!۔۔۔۔۔! تم گمنانہ میں مت لینا سسٹا! میرے عقب میں موجود مسلح افراد میں سے ایک چمکا "اے عورت! تم کون ہو؟" گمنان فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب سب کی توجہ ایک لمحے کے لیے عرفان کی طرف سے ہٹ گئی۔ میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو اسے اپنی ٹالی سے ٹائی پن آتا رہے ہوئے دیکھا۔ موٹے سے کھینچے والی وہ پن اس نے زور سے تالی پر دے ماری۔ میں نے شرشر کی بجلی سی آواز سن لی جیسی عمامہ بچوں کی آتش بازی کی بعض معمولی چیزوں کے جلانے جالنے پر آتی ہے۔

"را حیلہ! سانس روک لو۔" میں نے گھٹی ٹھکی آواز میں تیزی سے کہا۔ میں نے خود بھی سانس روک لی۔ فائرنگ میں شدت آچکی تھی اور آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں لیکن اسی شور کے درمیان مجھے بلندی کی طرف سے کچھ ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بہت بڑی بجز جھمکنائی ہوئی تیزی سے قریب آ رہی ہے۔

میں اور را حیلہ دردناک کے بالکل قریب تھے۔ ہم نے ایک وقت سر اٹھا کر آواز کی سمت میں دیکھا اور میری حیرت کی انتہاء

دی۔ جب میں نے دو آدمیوں کو غوطہ خوری کے لباس میں ہوا میں اڑتے دیکھا۔ کم از کم پہلی نظر میں مجھے ان کے لباس پر غوطہ خوری کے لباس ہی کا لکھا کرنا تھا اور ان کا انداز بھی غوطہ خوروں والا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پانی میں تیرنے کے بجائے ہوا میں تیر رہے تھے اور ان کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ ان کی پشت پر آئینہ کے پلانڈروں کی طرح کچھ بندھا ہوا بھی تھا۔

وہ فضا میں پرواز کرتے تیزی سے ہماری طرف آرہے تھے۔ ان کے قریب آنے کے ساتھ ساتھ جھمکنائی کی آواز بھی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ تیزی سے نیچے آئے گئے اور چند سینکڑے میٹروں کے سامنے بے کھمبہ پر آنے لگے۔

سرخ چہرہ دی!

کوئی بھی قوت گویا انسانی الفاظ کی شہر تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک دھماکا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری سماعت زائل ہو گئی ہو۔ میری ہڈیاں تک جھنجھٹا اٹھیں۔ حفاظت صاحب تو اونٹ سے منہ کر رہے۔ مسلح آدمیوں میں سے دو نے انہیں سنبھالا۔ وہ سینے کے بل لیٹ گئے تھے۔ معلوم نہیں کر پڑے تھے یا پوزیشن لے رہے تھے۔ اگر پوزیشن لے رہے تھے تو نہ چاہتے کسی کے خلاف لے رہے تھے وہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

دھماکا یقیناً کوئی بھی نہیں ہوا تھا۔ ڈراما نگاروں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ کھلے دردناک سے میں نے دھول اور لمبے ہوا میں بلند ہوئے دیکھا تھا۔ عرفان بھی ایک لمحے کے لیے لوٹ کر آ گیا تھا۔ لیکن میں نے اسے سنبھلتے دیکھا۔ اس نے فلیٹ ہیٹ اور جینز اتار لیا تھا۔ نہایت بھرتی نے اس نے مونچھیں بھی اتار کر پیچھے کر دیں۔

میں باہر جھانکنے کے لیے دردناک کے طرف پکا تو عرفان تیزی سے بولا "اسی کمرے میں دو مسرخ چہرے! اور نہ جلدی مارے جاؤ گے۔ آؤ سے سے زیادہ کوئی ڈھیر ہو چکی ہے اور اس کمرے کے سوا یہاں کوئی جگہ محفوظ نہیں۔" وہ گویا کسی نہیں آگے سے باہر کا منتظر دیکھ رہا تھا۔

لیکن میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ قیمت تھا کہ مسلح افراد میں سے کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے باہر جھانکا۔ بائیں طرف جہاں لہائی کے رخ پر کوئی کا بیشتر خاصہ ہوتا جاسیے تھا۔ وہاں اب لمبے کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ گرد و غبار اور دھوئیں کے بادل بلند ہو رہے تھے۔

اچانک چاروں طرف سے بے تماشگر لیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ کوئی کا واقعی صرف تو زور سا حد ہی سلامت رہ گیا تھا اور ڈراما نگاروں میں سے کسی نے شامل تھا۔ نہ جانے ایک مخصوص حصے کو چھوڑ کر باقی عمارت کو اڑانے کی پلاننگ کس طرح کی گئی تھی۔

گولیاں کچھ اس طرح چل رہی تھیں جیسے اچھی بھلی دو فوجیں کہیں برسرِ پیکار ہوں۔ میں کچھ کھینچنے سے قاصر تھا۔ میرے پاس کوئی اٹھارہ نہیں تھا۔ دشمن میرے سامنے نہیں تھا اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔

اچانک میں نے ایک فونی ہوئی دیوار کے درمیان سے چلا گیا۔ لگا کر را حیلہ کو لمبے پر چڑھتے دیکھا۔ ایک کا شکیف اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن ستم خیزی یہ تھی کہ بھکاروں والا لباس اور پٹا پرانا بیوہ زندہ رہنے کی طرح اس کے جسم پر موجود تھا۔ صرف نقاب شاید اس نے نوجہ تھیک تھی اور اس بے چارے سے بچے کو بھی نہ جانے کہاں چھوڑ آئی تھی۔ اگر کسی نے ایک بھکاروں کو کا شکیف

فضائی بلند یوں سے اترنے والے دونوں افراد بظاہر غوطہ خور  
کی دکائی دے رہے تھے۔ سر سے پاؤں تک ان کا وجود غوطہ خوروں  
چمے لباس اور بانک میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ غوطہ  
خوروں سے کافی حد تک مختلف بھی تھے۔ غوطہ خوروں کا لباس عام  
لوہر پر گہرے رنگ کے کیٹن یا راز جیسے میٹرل سے بنا ہوتا ہے۔  
بیک ان کا لباس نفرتی اور چمکیلا تھا۔ کسی عجیب سی میٹرل سے بنا  
دکائی دیتا تھا۔

ان کی کمر پر بھی آکسیجن ٹینک کے بجائے مختصر مشینری سی  
بڑھی نظر آ رہی تھی۔ شاید وہی آئین تھا جس کی مدد سے وہ اتر رہے  
تھے۔ ان کے سینوں پر بھی نفرتی رنگ کا ایک ایک ڈپا سا بندھا ہوا  
نفاذ بظاہر بہت سی جدید ساخت کا وی سی آر یا کوئی خاصا بڑا  
ایئر ٹانک آلود معلوم ہو رہا تھا۔

ان کے پیروں پر غوطہ خوروں کی طرح جوڑے جوڑے فلیپر  
بھی موجود تھے جن سے غوطہ خور پانی میں آگے یا پیچھے مدد لیتے  
ہیں۔ وہ لمبے سے اتر کر نہایت اطمینان سے ڈرائنگ روم کی طرف  
بڑھے۔ بظاہر وہ خالی جگہ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے باوجود  
بہری چھٹی جس نے مجھے کسی زبردست خطرے کا احساس دلایا۔

میں راحیلہ سے کلا شکوفہ لینا چاہتا تھا لیکن حینظہ صاحبہ نے  
اپنی حفاظت کے لیے جن لوگوں کو طلب کیا تھا۔ انہوں نے عقب  
سے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں کلا شکوفہ کو ہاتھ نہ لگاؤں بلکہ انہوں  
نے راحیلہ کو بھی کوئی مشکوک عورت سمجھتے ہوئے کلا شکوفہ چھیننے  
کا حکم دیا تھا۔۔۔۔۔ وہ چھ افراد تھے اور ان کے سب کے پاس بھی  
شیشیں تھیں۔

میرے لیے ان کا حکم ماننے میں ہی عافیت تھی۔ اس دوران  
کل حینظہ یا عرفان نے اپنی ٹالی پین اتار کر تپائی پر دے ماری تھی  
جس کی وجہ سے "شش" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرے میں غالباً  
کوئی کیس بجھل گیا تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے کلا شکوفہ سے دور رہنے کا حکم دینے  
والے فرش پر گرومیں ڈالے پڑے تھے۔ ان کی گتیں ان کی گرفت  
میں نہیں رہی تھیں۔ حینظہ صاحبہ بھی کرسی سے لڑھک چکے تھے  
اور غالباً بے ہوش تھے۔ صرف عرفان ہوش میں تھا۔ شاید اس نے  
مجاہدی طرح سانس روک لی تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔

میں اور راحیلہ کمرے سے تقریباً باہر ہی تھے۔ غوطہ خور نما  
انسان ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ گیس کی وجہ سے میں کمرے میں  
ٹھکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ عرفان کو اس ساری صورت حال یا اور گرو  
بھلی ہوئی چہی پر گویا قطعاً کوئی تشویش نہیں تھی اور وہ نہایت  
اطمینان سے مسکراتا ہوا دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ اندازاً کچھ  
ایسا ہی تھا جیسے وہ کمرے سے نکل کر میرے اور راحیلہ کے درمیان  
سے گزرتا ہوا نہایت سکون سے رخصت ہو جائے گا۔ اس پاس  
کے کھاتے میں بدستور زور و شور سے فائزرنگ جاری تھی۔

میں نے راحیلہ کے ہاتھوں سے کلا شکوفہ چھیننے سے تیزی  
سے کہا "تم عرفان کو جانے سے روکو۔ میں انہیں اٹانے سے روکتا  
ہوں۔" میں نے غوطہ خوروں کی طرف اشارہ کیا۔

کلا شکوفہ میرے ہاتھوں میں پھنسل ہوئی راحیلہ نے اپنے  
تقریر نویس والے لباس سے فوراً ایک ٹی ٹی نکال لیا اور عرفان کا نشانہ  
لیتے ہوئے چلائی "رک جاؤ۔"

اس وقت تک وہ تقریباً دروازے پر ہی پہنچ چکا تھا۔ اس کے  
ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رہی تاہم وہ دروازے پر رک گیا۔ اس  
نے گویا راحیلہ کی بات مان لی تھی۔ تاہم اس کے چہرے پر تشویش یا  
فکر مندگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ بھی غوطہ خوروں کو لمبے پر  
اترتے دیکھ چکا تھا اور ان کی آمد کے ساتھ ہی گویا اس کی تمام  
تشویش دور ہو گئی تھی۔

میں کسی چیز کی آڈینا چاہتا تھا لیکن کمرے سے باہر آنے کے  
بعد مجھے کسی چیز کی آڈیٹر نہیں تھی۔ برآمدے کے ستون ذرا  
فاصلے پر تھے۔ میں نے دروازے سے لگتے ہوئے کلا شکوفہ کا رخ غوطہ  
خوروں کی طرف کیا اور پیچ کر انہیں رکے کا حکم دیا لیکن انہوں نے  
گویا سنا ہی نہیں۔

آخر کار میں نے ایک ٹھکنے کے نکل جھپکتے ہوئے ان دونوں پر  
بیک وقت برست مارا اور اس کے ساتھ ہی میری کچھ بڑی گھوم کر رہ  
گئی۔ گویا ان کے چمکیلے لابڈوں سے ٹکرائیں تو ٹیکوں سفید  
چنگاریاں فضا میں اڑیں جیسے بجلی کے بہت سے ٹکٹے مار آہیں میں  
ٹکرائے ہوئے۔ گویا شاید پھسلتی ہوئی زادہ دھڑکیں ملی گئیں۔  
انہیں صرف ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس کے علاوہ

کلا شکوفہ کے برست کا ان پر کوئی اثر دکھائی نہ دیا۔ میں نے ایک  
اور برست مارا۔ اسی طرح پنگاریاں سی اڑیں۔ گویا ان کا کچھ پتانہ  
چلا کر کہاں گئیں۔

اس قسم کے مناظر کی توقع صرف سائنس فکشن فلموں میں ہی  
کی جاسکتی ہے۔ لوگ ان فلموں میں تفریح طبع کے لیے یہ مناظر  
شاید دیکھ تو لیں لیکن ان پر یقین نہ کریں مگر ہم سے پچھلی فلموں کے  
لیے شاید آج کل کے کرشائی کمپیوٹر ریموٹ کنٹرول کی مجازی سی  
کارروائیاں اور ترقی کے دوسرے نمونے بھی سائنس فکشن رہے  
ہوں اور اس وقت ان کے سامنے اگر یہ امکان ظاہر کیا گیا ہو کہ  
آگے چل کر ایسی چیزیں بھی بنیں گی تو شاید انہوں نے بھی اس پر  
یقین نہ کیا ہو۔

دونوں غوطہ خور نما افراد کافی دراز قد اور جسیم تھے یا پھر شاید  
ابنے لباس وغیرہ کی وجہ سے ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ نہ جانے اس  
چمکیلے خول کے نیچے کیا کچھ چھپا ہوا تھا۔ وہ بدستور کسی خوب صورت  
بلا کی طرح ہماری طرف بڑھتے رہے۔

میرے جسم سے لٹخا انجین نہ پھوٹ پڑا۔ ایک موبہوم سی امید  
کے سمارے میں نے ان میں سے صرف ایک کو ہدف بناتے ہوئے

تھے لیکن اوہ رہا جس کی صورت میں بھی مغفرت ہمارا دستہ دگر  
کئے تھے۔

چنانچہ ہمیں اپنی عتب میں ڈرانگ دوم ہی قدرے بخیر  
جگہ دکھائی دی تھی حالانکہ گراسونون ریکارڈ نامہ پمکلی ہی چڑی  
جس طرح اس کی دیوار سے گزرتا رہا چلی گئی تھیں اس کے بعد  
ڈرانگ دوم کو بھی محفوظ سمجھنا محض خوش فہمی تھی لیکن نسیانی  
سارے کے لیے کوئی نہ کوئی آواز ضروری تھی۔

اندر پہنچے ہی میری نظر دوسری دیوار کی طرف مئی اور مجھے فوراً  
اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈسک نما چیزیں کسے میں سے ہوتی ہوئی دوسری  
دیوار میں سے نکل گئی تھیں۔ اس دیوار پر ایسے ہی نشانات موجود  
تھے جیسے لکڑی میں سے آری کے گزرنے کے بعد باقی رہتے ہیں۔  
آری کا نشان البتہ سوئی گھیر کی طرح ہوتا ہے جبکہ وہ نشان ہتھی  
باریک گھیر کی طرح تھے۔

راجلہ نے ایک ٹھنڈی کی۔ اس نے کمرے میں چلا گیا  
لگائی تو عرفان کو بھی اپنے ساتھ کھینچتے لے گئے۔ کمرے میں گیس کا  
اثر اب بہت کم ہو چکا تھا۔ حفیظ صاحب اور ان کے بیسیکولائی کا ڈر  
بدستور بے ہوش پڑے تھے۔ راجلہ نے عرفان کو ڈھال بنایا اور  
اس کی پسیلوں پر لیٹی کی ٹال رکھتے ہوئے چلائی ”اگر تم لوگ آگے  
بڑھے تو میں اس شخص کو کول مار دوں گی۔“

لیکن عرفان کے بارے میں اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔ وہ آواز  
ضرر اور مرتباں مرنے نہیں تھا جتنا ظفر آقا تھا۔ راجلہ نے اس کی  
پسیلوں پر گھن کی ٹال ضرور رکھی تھی لیکن اس کی توجہ نفرتی لپار  
والوں کی طرف تھی۔ عرفان نے اسی کا نامہ اٹھاتے ہوئے راجلہ  
کے گھن والے ہاتھ پر زور سے کٹھن ماری اور تپ کر اس کی گرفت  
سے نکل گیا۔

لیٹی نے فائر ہو گیا لیکن گولی فرش پر لگی۔ راجلہ بھی فائر  
چلی تھی۔ اس دوران دونوں نفرتی لباس والے ذقہ بھر کر کمرے  
میں پہنچ چکے تھے۔ وہ ہمارے اور عرفان کے درمیان جا گئے ہوئے  
تھے۔ عرفان ان کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ دونوں نے ایک بار پھر  
سینوں پر لگے ہوئے زقوں کو چمکا۔ ایک بار پھر ان میں سے کچھ  
دیکرے چار چار جھیلے ریکارڈ سے برآمد ہوئے۔

ایک بار پھر میں نے اور راجلہ۔ فرش پر لوٹ لگائی۔  
عجیب و غریب چیزیں سنسنائی ہوئی ہمارے اوپر سے گزرتی تھیں۔  
کمرے کی دوسری دیوار سے پار ہو گئیں۔ نہ جانے وہ کہاں جا کر  
کس چیز سے ٹکرا کر رہ گئی تھیں۔

کمرہ خاما طویل و عریض تھا لیکن اس میں ہماری بھر کم فرما  
بھی موجود تھا۔ سات افراد اوہر اوہر لڑکھتے پڑے تھے۔ ان  
تکڑی آڑی ترجمی پڑی تھیں۔ میں راجلہ اور عرفان بھی وہ  
تھے۔ اب نفرتی لباس والے بھی گھس آئے تھے جو دہلے  
دو قامت دکھائی دے رہے تھے۔ کمرہ گویا کچھ بھر گیا تھا۔

لبائی کے رخ یعنی سر سے پاؤں تک برست مارا کہ شاید اس کے  
پورے وجود میں کوئی ایسی کزور نہ ہو۔ اس کے عجیب و غریب لباس  
یا خول میں کوئی ہڈک حصہ موجود ہو جس پر کوئی گولی اثر کر جائے۔  
مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ میری یہ توقع پوری نہیں ہوگی۔ ایسا  
ہی ہوا۔ کلا ٹکھف ان کے سامنے بالکل بیکار تھی۔ میری تیسری  
کوشش نے شاید ان کا سوڈ بھی آف کر دیا۔ جس پر میں نے تیسرا  
برست مارا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے چوکور ڈسک کو چمکا  
اور اس میں سے یکے بعد دیگرے تین چار ڈسک تیزی سے نکلتے  
ہوئے برآمد ہو گئے۔

ہر ڈسک گراسونون ریکارڈ سے کچھ چھوٹی تھی، نفرتی تھی اور  
بے پناہ چمکیلی تھی۔ ڈسک کیا تھی۔ گویا چمکا سا ایک سورج تھا جو  
بے پناہ تیزی سے گھومتا ہوا برآمد ہوا تھا۔ یہ تقابلیں ہی کچھ اسی  
طرح گھومتی، لڑتی میری طرف، براہیں جیسے کسی بچے نے فریبی کے  
کھیل میں یکے بعد دیگرے تیزی سے تین چار فریبی پھینک دی  
ہوں۔

میں پہلے ہی کچھ جھکا ہوا تھا، بروقت ٹھنڈوں کے ٹل کر پڑا۔  
چاروں نفرتی تقابلیں ہی بالکل ایک سیدھ میں میرے سر سے  
گزرتی ہوئی ڈرانگ دوم کی دیوار میں سے گزرتی گئیں۔ میرے  
اندازے کے مطابق دیوار خاصی موٹی تھی لیکن ہر ڈسک اس میں  
سے یوں گزرتی چلی گئی تھی جیسے وہ سینٹ اور اینٹوں سے نہیں بلکہ  
کھن کی ٹکیوں سے بنی ہوئی دیوار تھی اور ہر ڈسک کا کولائی دار  
کنارا گویا کولائی طرح تیز دھار تھا۔

دوسرے غوطہ خور تھا شخص نے بھی اسی طرح اپنے سینے پر  
نصب، بکس کے کسی مخصوص حصے کو چمکا تھا اور اس میں سے بھی  
اسی طرح تین چار جھیلے ریکارڈ سے نکل کر ہوا میں تیرتے ہوئے اور  
تیزی سے گردش کرتے راجلہ کی طرف بڑھے تھے۔ اس نے بھی  
بروقت جھک کر میری طرح اپنے آپ کو بچایا تھا۔

ہم دونوں بیک وقت ہی اس عجیب و غریب ہتھیار کے حملے سے  
بچے تھے۔ غیبت تھا کہ راجلہ بھی انہیں کوئی بے ضرر اور معمولی  
چیز سمجھ کر یا محض ہیرت اور تجسس میں جھلا ہو کر سیدھی کھڑی نہیں  
رہ گئی تھی ورنہ جو جڑی سینٹ اور اینٹوں کی ٹھوس دیواروں میں  
سے اس طرح گزرتی تھیں ان کے بارے میں اندازہ کرنا مشکل  
نہیں تھا کہ وہ ہمارے جسم سے کس طرح گزرتا تھا۔ جیتنا ہماری  
گرونیس ہی الگ ہو کر کھین پڑی ہو تھی۔ مزید بھی نہ جانے جسم کا  
کون کون سا حصہ پھل کی قاشوں کی طرح الگ ہو کر گزرتا۔

فوری طور پر میں نے اور راجلہ نے کمرے میں چلا جگہ لگائی۔  
ہمیں پناہ کی ضرورت تھی اور وہاں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔  
سامنے سے وہ مغفرت چلے آ رہے تھے۔ اگر دیکھ لیتے۔ یا میں ہاتھ  
پر برآمدے کا کچھ حصہ سلامت دکھائی دے رہا تھا اور اس طرف  
ایک دو کمروں کے دروازے بھی تھاپی سے محفوظ دکھائی دے رہے

کسی چیز کی طرح توڑ مڑ گئی۔

میں اس کو نے سے ٹھٹھے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے ساتھ طاقت آزمائی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اپنی وہ غیر معمولی اور خدا داد طاقت اور سخت جانی جو مجھے اپنا قیمتی سرمایہ محسوس ہوتی تھی ان لوگوں کے سامنے بالکل بیکار تھی جو نہ جانے حقیقت میں ہی وافق الفطرت ہی مخلوق تھے یا فیصل عام سے انسان تھے مگر اپنی سائنسی ایجادات کے خول میں بند ہو کر وافق الفطرت بن گئے تھے۔

گولیاں ان پر اثر نہیں کر رہی تھیں۔ اس لیے یہ توقع رکھنا یا خوشی منی میں مبتلا رہنا بے کار تھا کہ ہم انہیں شکست دے سکتے تھے۔ فی الحال تو ان سے بچ کر کھانا ہی قیمت تھا لیکن ہمارے سامنے مسئلہ صرف اپنی جانوں کا نہیں، حنیفہ صاحب کی جان کا بھی تھا۔

اپنی دانست میں انہوں نے بڑی عقلمندی دکھائی تھی کہ مجھے بتائے بغیر غائب کیا۔ خیر! انہیں سے کہہ کر اپنی حفاظت کے لیے چھ آدمیوں کا بندوبست کر لیا تھا لیکن وہ ان کے کسی کام نہیں آسکتے تھے۔ حنیفہ صاحبہ انہی کے درمیان لڑھکے پڑے تھے۔

میں نے دیکھا راجیلہ بھی دوسرے نفرتی لباس والے کی گرفت سے بچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ بھی پشیمان اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ ان سے ٹکراتا اپنے آپ کو بلاکت میں ڈالنا قابلِ ہم دروڑوں بیک وقت ہی گمراہ سے لگے اور میں نے تیزی سے پلٹ کر دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔

ان لوگوں کو حنیفہ صاحب کے ساتھ کمرے میں تھما چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کاشکوف سیرے ہاتھ سے گر چکی تھی لیکن راجیلہ کے ہاتھ میں ٹی ٹی موجود تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میرا ہاتھ تمام لیا اور ہم لے کر طرف بھاگے۔

لے کر دوسری طرف نشیب میں پہنچ کر میں نے لے کر آؤ لیتے ہوئے راجیلہ سے پوچھا "باہر فائرنگ کون لوگ کر رہے ہیں؟"

"صحیح طور پر تو بتا نہیں چکے ہیں۔" وہ ہلپتے ہوئے بولی "ترہیت یافتہ بدست گرد معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھی مختلف پوزیشنوں سے انہیں روکے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ شاید مارے بھی گئے ہیں۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ کوئی بھی انہوں نے لاپرواہی سے راکٹ پھینکا تھا۔" اس نے ایک گہری سانس لی "ہمارے ملک کا کیا بے گناہ؟ یہاں لوگ آباد علاقوں میں، کھلی کوچوں میں راکٹ لانچر تک لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ فائرنگ فائر کی گولی اور آپس پاس گئے علاقوں کو گھیرے میں لے کر اتنی اتنی دیر تک فائرنگ کرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں!"

"آمین! یہاں رکھو۔ اللہ بڑے کرے گا۔" میں نے کہا۔

اسی لمحے ڈانٹک روم کا دروازہ چڑخا اور باہر آگرا۔ مجھے ایک اندیشہ تھا۔ شاید اسی لمحے میں وہاں دیکھا تھا۔ میں نے دونوں

دھند کے لیے "میدان" دسج نہیں رہا تھا۔

راجیلہ دیکھ چکی تھی کہ میں نے بھی مرتبہ نفرتی لباس والوں پر شکوف سے برست مارا تھا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ہمارے باوجود اس نے نہ جانے کس امید کے سارے ان پر اپنا بی گناہ کر ڈالا۔ وہ اس وقت گھنٹوں کے ٹکڑے کھڑی تھی اور اس کی نڈیاں ایک پٹائی پر لگی ہوئی تھیں جس پر گولڈ ڈرگس کے برتن بکھیرے تھے۔

ایک نفرتی لباس والے نے گویا راجیلہ کی گستاخی پر خفا ہو کر لے بڑھ کر اس کی کھوپڑی پر کرائے کا ہاتھ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس لباس والے میں اس کا ہاتھ کسی نیچے پھنسا چڑاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ راجیلہ اچھل کر پیچھے ہٹی۔

نفرتی لباس والے کا ہاتھ پٹائی پر پڑا۔ مجھے ایک اور حیرت کا ہمارا پڑا ایک زوردار چھانکے کے ساتھ تمام برتن اچھل کر پلے گئے۔ کہاں کہاں جا کر۔ کچھ آہٹیں میں ٹکرا کر ٹوٹ گئے اور زوریں اٹھائی کہ وہ پٹائی درمیان سے دو ٹکڑے ہو گئی۔ حالانکہ مجھے محسوس مضبوط اور بھاری بھر کم دکھائی دے رہی تھی، میرا بال خفا کہ کوئی بھاری بھر کم کھڑا بھی کم از کم ایک وار میں اس کا شر نہیں کر سکتا تھا۔

ان نفرتی لباسوں میں انسان یا جو بھی مخلوق چھپی ہوئی تھی کیا اتنی ہی طاقتور تھی یا یہ ان لباسوں کی کرشمہ سازی تھی؟ ان لوگوں پر غور کرنے کا یہ وقت نہیں تھا اور نہ ہی کوئی فی الحال مجھے کا جواب دے سکتا تھا۔ اس وقت تو صرف جان بچانے کی فکر رہا۔ اسکی تھی کیونکہ دوسرا نفرتی لباس والا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میری توجہ راجیلہ کی طرف سے ہٹ گئی۔ میں خود اس وقت بال ایک چوہے کی طرح کونے میں پھنس چکا تھا اور اپنی جگہ پکڑنے کے لیے بڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہم ان چنگیلی گڈا نما چیزوں سے بچ سکتے تھے۔ اپنی پھرتی کی وجہ سے ہم کسی نہ کی زد میں نہیں آتے تھے ورنہ ڈپٹے سے ان کے برآمد ہونے اور ان ایسا ہی تھا کہ سامنے آنے والی کسی بھی چیز کا کوئی نہ کوئی ٹکڑہ کسی ڈمک کی زد میں آسکتا تھا۔

اب شاید نفرتی لباس والوں نے اپنی وہ عجیب و غریب چیزیں ہمارے گنے کے بجائے ہاتھوں سے ہی ہمیں پکڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ نفرتی لباس والا میری طرف بڑھ رہا تھا اس کے دونوں بازو نیم لے میں پھیلے ہوئے تھے کہ میں کسی طرف سے نکلنے نہ پاؤں۔ ایک کونے میں پھنس چکا تھا اور اب قدرے پچھتا بھی رہا تھا کہ وہاں خواہ کمرے میں کیوں تھے تھے۔

نفرتی لباس والے نے یکدم جھپٹ کر میری گردن دونوں ہاتھوں میں دوپٹے کی کوشش کی۔ میں تو بھائی دے کر پیچھے میں آگیا ہو گیا لیکن اسٹینڈ پر لگی ہوئی پتیلی کی ایک بڑی سی ایٹش اس کے ہاتھوں میں آگئی اور میں نے دیکھا وہ گھٹے سے بنی ہوئی



نفری لباس والوں کو باہر آتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے عرفان کی بظلوں میں ہاتھ دے کر اسے یوں اٹھایا ہوا تھا جیسے کوئی کسی بچے کو اٹھا کر کسی اونچی جگہ پر چڑھانے لگا ہو۔

وہ عرفان کو اسی حالت میں لٹکے ہوئے فضا میں بلند ہوا۔ اس کی پشت پر بندھی ہوئی مختصر مشینری کی جھنڈا بنٹ کی سی آواز ذرا تیز ہوئی اور وہ عرفان کو لیے خاصی تیز رفتاری سے پرواز کر گیا۔ دوسرا ہماری تلاش میں لمبے کی طرف آ رہا تھا۔ میں خود گھنے سے قاصر تھا کہ ہم وہاں کیوں رک گئے تھے۔ شاید لا شعوری طور پر مجھے اندیشہ تھا کہ حفیظ صاحب کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے حالانکہ موجودہ حالات میں "میں ان کی مدد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال تو ہمیں خود مدد کی ضرورت تھی۔

نفری لباس والے کو گویا اچھی طرح اندازہ تھا کہ ہم کہاں چھپے ہوئے تھے۔ وہ سیدھا اسی طرف آ رہا تھا۔ راحیلہ بھانسنے کے بجائے سرگوشی میں بولی "کاش! اسے قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی!"

"فی الحال تو اس کے قابو میں آنے سے بچنے کی تدبیر کرو۔" میں نے تیزی سے کہا۔

وہ لمبے کی بلندی پر آن کھڑا ہوا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس کے غلا بازوں جیسے ہیڈلٹ میں اس کی آنکھیں کہاں تھیں لیکن وہ یقیناً ہمیں دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ تیزی سے آگے نہیں بڑھا۔ شاید اب وہ چپے بلی والا کھیل کھیل کر محظوظ ہونا چاہتا تھا۔

شاید ان کے لیے زیادہ ضروری کام صرف عرفان کو وہاں سے نکلانا تھا۔ یہ کام وہ کر چکے تھے۔ اب انہیں کوئی تشویش نہیں تھی۔ راحیلہ کی تمام تیاریاں۔ اس کا یہ خصوصی آپریشن محض ایک دوسری ثابت ہوا تھا۔ اس نے نہ جانے اس سلسلے میں کتنی محنت کی تھی۔ کتنا اسلحہ اس وقت استعمال ہو رہا تھا اور کتنی جانیں خطرے میں تھیں۔ حاصل کچھ بھی نہیں تھا۔ عرفان ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

بس ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ عرفان، حفیظ صاحب کی جگہ نہیں لینے پایا تھا۔ ریڈ وائٹ کا وہ منصوبہ فی الحال تو دھرا کا دھرا رہ گیا تھا لیکن راحیلہ اس آپریشن کی تیاریاں نہ بھی کرتی تھیں۔ تب بھی میں نے یہ تو سوچ ہی رکھا تھا کہ ان کی سازش کامیاب نہیں ہونے والی گا اور ان کا آئندہ کار نہیں بنوں گا۔

اس صورت میں شاید ان کا رد عمل بھی اتنا شدید نہ ہوگا۔ اس وقت تو شاید وہ اس جھنجھلاہٹ کا شکار تھے کہ ایک طرف تو میں نے انہیں غماز دیا تھا "ان کے کام کی ہانی بھر کر میں دقت پر اتر آئیں دھوکا دیا تھا" دوسرے بھر پور تیاریاں کر کے ان کی دانست میں "کالنگ کال" کر رہا تھا۔ "ختم۔ اور۔ انہم بھلا کسا معلوم تھا کہ

جیسے میں نے دل کی حسرت نکالنے کا موقع دیا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس کی حسرت نکالنے کی یہ کوشش ہمیں بہت سبکی پڑی تھی۔

ریڈ وائٹ کی حکمت عملی بھی بڑی عجیب اور حیران کن تھی۔ کہیں چڑھائی کرنے کے سلسلے میں وہ ایک طرف عام سڑکوں کی بھی استعمال کرتی تھی۔ یعنی باقاعدہ گھبراہٹ اور اڑاؤ کر چلا کر۔ پشاور و تانکوں ڈاکوؤں یا دہشت گردوں کو استعمال کرتا۔ عام اور صوبہ اسلحہ استعمال کرتا۔ تمام راجہ طریقے استعمال کرتا۔ جس کی وجہ سے ریڈ وائٹ کی کارروائیاں کسی بھی خطرناک مکر عام سے خفیہ کردہ کی کارروائیاں معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ متوازی سے انداز میں وہ اپنی سائنسی شعبہ بازوں کے ناقابل یقین سے نمونے بھی سامنے لے آتے تھے۔ وہ چاہے تو صرف انہی شعبہ بازوں سے بھی ان کام چل سکتا تھا۔ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں وہ ساتھ ہی دوسری عامیانہ سی کارروائیوں کی بھی ذمت اٹھاتے تھے۔ اس میں اگر کوئی مصلحت تھی تو میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔

نفری لباس والا چند لمبے کی بلندی پر قطعی ساکت کھڑا رہا۔ ہم خفیہ میں دھاکے سے تباہ شدہ فرش پر خرگوش کے جوتے کی طرح دیکے ہوئے تھے۔ اس وقت تک دوسرا نفری لباس والا عرفان کو لے کر فضا کی بلندیوں میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

نفری لباس والے نے اچانک ہی نیچے چلا ٹنگ لگائی۔ وہ لمبے دوپٹے کے لیے کودتا تھا لیکن میں اور راحیلہ دونوں ہی ایک وقت اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ وہ شخص جس خول میں چلنا ہوا تھا اور جہیز اس کے سینے اور سر پر بندھی ہوئی تھیں "ان کی وجہ سے غلطی اس کی حرکات و سکنات میں زیادہ بھرتی نہیں تھی تاہم ہر جگہ ایک عام انسان کی ہی آسانی سے حرکت کر رہا تھا اور یہ بھی کچھ حیرت کی بات نہیں تھی۔

راحیلہ اب بھی اپنی کوششوں سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے اور چمکانی دیتے ہوئے ان کی نی کی کا دستہ اس کی ہڈیوں میں رسید کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی پہلوں ضرب لگانے میں کامیاب تو ضرور ہوئی لیکن اس پر غور اتنا ہی اثر ہوا جتنا زمین کی گمراہیوں میں جہیز گاڑ کر کھڑے ہو سوسال پرانے کسی برآمدہ پر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہیں۔

اس نے راحیلہ کی اس حرکت فی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس تمام توجہ صرف میری طرف تھی۔ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے پیچھے بھی دھیان رکھنا پڑا تھا کہ کسی چیز سے ٹکرا کر

انہم اب عقب سے راحیلہ کے تابوتوں حلوں کی وجہ سے اس کی توجہ ذرا ملے گی تھی۔ جو نبی وہ ایک ٹائیے کے لیے مرکز راحیلہ کی طرف دیکھتا تھا اس لیے کا کوئی ہماری ساتواں نکلا اٹھا کر اس پر کھینچ رہا تھا۔ وہ کہاں سے آتا تھا۔ تفسیر سی لیکن ہم نے ہر حال اسے انہیں میں ڈال دیا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھے دلوچ کرے بے ہوش کر کے یا یونہی قابو میں کر کے اڑا جاتا چاہتا تھا۔ میں اب جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن میرے یونہی منہ اٹھا کر بھاگنے کا کوئی نامہ نہیں تھا۔ وہ پیرمین کی طرف انھیں اڑنے پر قادر تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اڑ کر میرا تعاقب کرے گا۔ اسے چند منٹ کے لیے الجھائے بغیر میرا فرار کی کو شش کرنا بے کار تھا۔

نفرتی لباس والے نے ایک بار پھر اپنے سینے پر بندھے ڈبے کا سارا لیا اور اس کے کسی مخصوص حصے کو چھو۔ ایک بار پھر ڈبے سے چٹکی فطرتوں سی برآمد ہوئیں اور سنسنائی ہوئی میری طرف بڑھیں۔ دوسری بار اس نے منہ پھیر کر چند فطرتوں راحیلہ پر چھوڑیں۔ ہمیں ان سے بچنے کی پڑی اور ہماری ہجر بچکنے کی کارروائی موقوف ہو گئی۔

اس کے ہمارے میں شاید اس وقت ان چٹکی فطرتوں والے شعبے کے علاوہ کچھ نہیں تھا ورنہ اس نے اب تک ضرور استعمال کیا ہوتا۔ لیکن یہ ہتھیار بھی کچھ کم خوراک نہیں تھا۔ عجیب چیز تھی جو ہر چیز کو کاتی ہوئی زرد جاتی تھی۔ اسے کسی دوسرے ہتھیار کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ خود بھی تو موجودہ شکل میں ناقابل شکست تھا۔

ہم اس بار بھی چٹکی فطرتوں کے حملے سے بچ گئے۔ اس بار تو قسمت نے میرا ہمت سی ساتھ دیا تھا۔ میں چونکہ لمبے کے نامور ڈھیر پر تھا اس لیے فطرتوں سے بچنے کی کوشش میں ایک بار توازن کھو بیٹھا تھا اور لڑکھڑا گیا تھا۔ اسی دوران میرا ایک بازو ایک چٹکی لڑکے کی زد میں آئے آتے بچا تھا۔

ڈسک میرے بازو کو تو نہیں البتہ میرے کوٹ کی آستین کو جموتے ہوئی تھری تھی اور وہیں سے آستین اس طرح کٹ گئی تھی جیسے کوئی انتہائی تیز دھار لینے اس کے درمیان سے گزر گیا ہو۔ لڑکھڑاتے ہوئے اگر میں بائیں طرف کو تھوڑا سا اور جھک گیا ہوتا تو میرا بازو کسی خرم کلکی کی طرح کٹ کر دور جا کر ہوتا۔ اچھا بھلا افضل چوہدری "فضل شذا" بن جاتا۔

میں لمبے کے جس حصے پر پہنچ چکا تھا۔ وہاں یقیناً کچھ انسان بھی رہے ہوئے تھے کہیں سے لو میں ہتھیار ہوا کوئی ہاتھ کہیں سے کوئی غلت ٹانگ اور کہیں سے کوئی پگلی ہوئی کھوپڑی جھاک رہی تھی۔ کوئی کو دھماکے سے حدمم ہوئے ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے۔ کوئی بعد میں تھا کہ کچھ لوگ لمبے سے دبے زدن کی اور موت کی کھچو رہے اگر فدا رسک رہے ہوں لیکن ابھی نہ جانے

کئی چیزوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دھواں بھی بلند ہو رہا تھا۔ نفا میں جش اور مختلف چیزوں کے پٹنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

راحیلہ نے گویا جھنجھلا کر ٹی اپنے تعمیریوں والے لباس میں بڑے ہوئے لمبے سے ایک بڑا تودا سا اٹھایا۔ وہ کئی اینٹوں اور بہت دھجوا کا مجموعہ تھا اور دیکھنے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی ہماری تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ راحیلہ اسے اٹھا سکتی تھی لیکن اس نے نہ صرف انتہائی پختی سے اسے اٹھایا بلکہ نفرتی لباس والے پر دے بھی مارا۔

جس طرح گولیاں اس کے نفرتی لباس سے ٹکرا کر پھسلتی ہوئی ابھر اور جاتی محسوس ہوئی تھیں اس طرح ٹی کا سہ اس لباس پر سے نہیں پھسلا تھا۔ اسے ضرب لگتی محسوس ہوئی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اب تو ابھی اس سے لگرایا۔ اب بھی اسے ضرب لگتی محسوس ہوئی اور وہ ذرا سا لڑکھڑا بھی گیا لیکن اس سے اس کے لیے گویا کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ بدستور میری طرف بڑھتا رہا۔ راحیلہ نے ایک اور تودا سا اٹھا کر اس پر پھینکا۔ اب اس کا مقصد میری کچھ میں آیا۔ وہ بے ہماری اس نفرتی مغفرت کی توجہ میری طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ جو خطرہ میری جان کو لاحق نظر آ رہا تھا وہ اسے اپنی طرف منتقل کرنا چاہتی تھی۔

دوستی اور محبت میں انسان کی کر سکتا ہے کہ دوسرے کی بلا اپنے سر لے لے لیکن وہ بلا راحیلہ کو اس اثر کا موقع نہیں دیتا چاہتی تھی۔ وہ بدستور میری ہی طرف متوجہ رہی۔ اس نے مرکز راحیلہ کی طرف ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

موقع پا کر وہ حتی الامکان پختی سے مجھ پر چھپا۔ میں ایک بار پھر اسے جھٹکا دیں گے اور بائیں طرف پھیلے ہوئے لمبے پر چڑھ گیا۔ راحیلہ کا پھینکا ہوا تودا اس سے ٹکرانے پر اسے ذرا سا لڑکھڑاتے دیکھ کر مجھے امید کی ایک کرن سی نظر آئی تھی۔ میں نے اس سے بھی بڑا ایک تودا سا اٹھا کر اس پر پھینچے ہوئے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔

اس وار سے وہ بچ گیا تاہم وہ تودا اس کی ران سے ٹکرایا۔ جھٹکا دیں گے کہ کھوپڑی اس نے بھالی۔ مجھے راحیلہ کو اشارہ کرنے کی صلت نہیں مل سکی لیکن وہ سمجھ گئی کہ اس وقت میں کیا چاہتا تھا۔ وہ رفاقت جس میں ایک مخلوق خاطر بھی شامل ہو "اس کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ ذہن میں ہمیشہ گویا ایک رابطہ قائم رہتا ہے۔ نفرتی لباس والے کا منہ اب میری طرف ہو چکا تھا اور پشت راحیلہ کی طرف۔ راحیلہ نے میرا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی جلدی مختلف سائز کے لمبے کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر اس پر پھینکنے شروع کیے۔ تاہم اس نے کوئی لمبا ٹکڑا نہیں اٹھایا تھا۔ میں زیادہ جلدی جلدی جھک کر لمبے کے ہماری بھر کم ٹکڑے نہیں اٹھا سکتا تھا کہ نہ کہ اس دوران وہ جھٹک لگا کر مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔

بھاگنا شروع کر دو۔ فائدہ تو کچھ نہیں ہو گا لیکن کچھ دیر کے لیے تمہارے دل کو ڈھارس رہے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی پیرمیں کی طرح زمین سے بلند ہو چکا تھا۔ چند سینکڑوں فٹ اتنی بلندی پر پہنچ چکا تھا کہ ایک گڑیا کے برابر دکھائی دینے لگا تھا۔ پھر وہ ایک طرف کو پرواز کرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں سب سے پہلی حیرت کو فراموش کرتے ہوئے زندگی میں بھرتا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ راحیلہ میرے پیچھے تھی۔ ڈرائنگ روم میں سب اسی طرح آڑے ترختے پڑے تھے۔ میں نے سب سے پہلے حنیف صاحب کو ہلا کر دیکھا۔ وہ بے ہوش تھے لیکن بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی گئی تھی۔ لیکن جو لوگ ان کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے آئے تھے

ان کی حالت پر میں دل ہی دل میں افسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ان سب کی گردنیں ٹولی ہوئی تھیں۔ ان بچے کے، نیم محم اور بھاپر کا پی سخت جان نظر آنے والے جوانوں کی گردنیں اس طرح ٹولی ہوئی تھیں جیسے کسی شدید ہتکے سے جھنجھلا کر کسی بچی کی گڑبڑ کی گردنیں مروڑاؤں ہو۔ حنیف صاحب کو نہ جانے کیوں بخٹ دیا گیا تھا۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت رہی ہو۔ وہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن انہیں محفوظ پاکر بر حال میرے دل کو قدرے اطمینان ہوا تھا۔

”راحیلہ!“ میں نے گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا ”میں یہاں سے فوراً نکل رہا ہوں۔ ساتھیوں کے لیے بھی پیغام دے دو کہ وہ فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ میرا خیال ہے حنیف صاحب نے خیر ایکشنوں کو بھی الرٹ کر رکھا تھا سبھی پولیس اتنی جلدی یہاں پہنچ گئی ہے۔ شاید پولیس کے ساتھ خیر ایکشنوں کے لوگ بھی ہوں۔ میں نہیں جانتا۔ انہیں معلوم ہو کہ ہم نے اپنے طور پر بھی کوئی آپریشن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ساتھیوں تک پیغام پہنچاؤ کہ وہ بچ کر نکل جائیں۔ کوئی سامعہ کسی سرکاری قوسی سے تصادم مول نہ لے اور نہ ہی کسی کے ہتھے چڑھے۔“

”یہ سب کچھ تو پہلے ہی سے طے ہے۔“ راحیلہ نے بتایا ”ان میں سے بیشتر تو کمک بھی چکے ہوں گے۔ تم نے محسوس نہیں کیا؟“

”فلو یہ بھی قیمت ہے۔“ میں نے اطمینان کی سانس لی ”سب تم ایک کام کرو۔ کوئی کے گیت پر۔۔۔ باہر کھلی میں میرا گاڑی کھڑی تھی۔ تپائی کی وجہ سے اوپر کا حصہ بالکل اوپر ہو چکا ہے۔ میں سٹپ چاہتا کہ میری شکل بچائے والا کوئی شخص دور سے بھی مجھے دیکھے۔ تم اوپر جا کر دیکھو۔ اگر گاڑی کو زیادہ نقصان نہ پہنچا ہو اور وہ آسمان سے اٹھارتے ہو جائے تو اسے پھیل گلی میں اس کو کھینچے ذرا آگے لے آؤ۔ اگر تم تو ابھی خطرہ محسوس نہ تو تم گاڑی کے پکڑ میں نہ پڑنا۔ خود کھینچنے کی فکر کرنا۔ میں صرف ایک

کب تک انہیں ادا و میرے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان حالات میں اس وقت تک کوئی مجھ پر کسی کو زندہ رکھ سکتا تھا۔ فی الحال تو بچے کے اوپر بھی دو انسان زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ مجھے اپنے عقب میں کچھ فاصلے پر کوئی چار دیواری کا بھی کچھ حصہ منہم دکھائی دیا تھا۔ اس طرف گلی کا کارز تھا اور اس طرف کوئٹوں کی آڑے دو طرف فائرنگ جاری تھی۔ فائرنگ کرنے والا کوئی بھی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آس پاس کے کہیں بھی شاید اپنے اپنے محفوظ ترین کمروں میں دیکھے ہوئے تھے۔ میں اس طرف بھی نہیں جاسکتا تھا۔ کھلی جگہ میں انسان کسی کی بھی فائرنگ کی زد میں آسکتا تھا۔ ہمارے لیے جس طرف سے لکنا مناسب اور محفوظ دکھائی دے رہا تھا اس طرف نفرتی لباس والا ہمارا راستہ روکے کھڑا تھا۔

دفترا میں نے کہیں دور سے لاڈا اسپیکر کی کڑکڑاہٹ سنی پھر ایک دم اور گرجھیلی آواز سنائی دی ”پولیس اس علاقے کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ جو لوگ بھی قانون کو ہاتھ میں لیتے ہوئے فائرنگ میں مصروف ہیں۔ انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ فوراً اپنے اپنے ہتھیار پیچیک دیں اور اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر آجائیں۔“

اعلان کے شروع ہوتے ہی نفرتی لباس والا بھی اپنی جگہ رک گیا تھا۔ ہم جیس گویا اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ فائرنگ بھی تو نہیں لیکن آسمانی شہادت میں نمایاں کی آگئی۔ اعلان بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ آواز سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اعلان کرنے والا فائرنگ اور ساری گڑبڑ کے اصل مرکز سے خاصا دور تھا اور علاقے کو جاہرے میں لیے جانے کے کوئی شمار کم از کم آس پاس تو دکھائی نہیں دیتے۔ نہ جانے پولیس کتنی دور سے اور کس انداز سے علاقے کو غاصرتے ہیں لے رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے منظر گویا اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نفرتی لباس والا کو اپنے ہیبلٹ نما حصے میں بھی نمائندگی ہوئی تھی۔ کڑکڑاہٹ آواز پھر کوئی ایسی آواز ابھری تھی جیسے بہت کم طاقت کے آؤپر پیغام موصول ہو رہا ہو۔ نفرتی لباس والا غالباً پولیس کے اعلان کو نہیں بلکہ اسی پیغام کو بغور سننے کے لیے ساکت ہوا تھا۔ مجھ تک صرف بچی کی آواز پہنچ رہی تھی جو کبھی کی جھنجھٹا ہٹ سے مشابہ تھی۔

چند سینکڑوں فٹ دور سے آواز ختم ہو گئی اور ایک صاف بلند واضح آواز ابھری۔ یہ آواز بھی گویا اسپیکر پر ہی ابھری تھی لیکن صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایک لمحے کی تاخیر سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ نفرتی لباس والا کی آواز تھی اور وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔ ”میں جا رہا ہوں افضل چوہدری!“ وہ کہہ رہا تھا ”لیکن موت تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔ دنیا کے کسی کو نہ میں بھی ملے جاؤ۔ کوئی طاقت تمہیں موت سے نہیں بچا سکے گی۔ چاہو تو اسی وقت سے

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے اس کا منہ میں  
تھنڑا ہوا ہاتھ چسپاتے ہوئے کہا ”ریڈ ذات کے سلسلے میں ابھی  
تک میرے اپنے اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔ سر حال اس تجربے  
سے تمہیں یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارا واسطہ کس قسم کے لوگوں  
سے ہے اور تم نے وہ دھمکی بھی سن لی ہو گی جو وہ پُرسین کا بچہ دے  
کر گیا ہے۔“

وہ گاڑی سے اتر چکی تھی لیکن کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ ذرا دور  
سے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ان حالات میں بھی بھکارن گاڑی  
والے سے بھگک لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اب تم کہاں جا رہے ہو؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بری طرح چوڑکی۔

”میری شاید اب کافی عرصے تک تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔“

میں نے کہا۔

”آخر تم کہاں۔۔۔ جا کہاں رہے ہو؟ کچھ تو بتا لیجئے۔“ کھڑکی  
کے کنارے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط ہو گئی کہ اس  
کے خاخن سفید نظر آنے لگے۔ ایک ہنگامہ بہا رہنے کے دوران وہ  
ذرا بھی متاثر دکھائی نہیں دی تھی لیکن اب یکدم ہی گویا اس کی  
آنکھوں میں دیرینا آرتھریس۔

”یہ وقت زیادہ باقی کرنے کا نہیں ہے۔“ میں نے ملازمت  
سے کہا ”مفسد تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔ مجھے جلد از جلد اس کے  
پاس پہنچنا ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔“

”کیا اسی لیے تم نے اسے اس مہم میں حصہ نہیں لینے دا  
تھا؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میں نے احتیاطاً اسے ایک  
جگہ بٹھا رکھا ہے۔ مجھے اس قسم کی صورت حال کا اندیشہ تھا۔“ میں  
نے کہا اور کچھ سے ہاؤس دھیرے دھیرے اٹھانے لگا۔ گاڑی ریگٹنے  
لگی۔

راحیلہ نے کھڑکی نہیں چھوڑی اور گاڑی کے ساتھ ساتھ  
آگے بڑھتے ہوئے بولی ”کیا تمہیں میری ضرورت نہیں؟“

”راحیلہ۔۔۔ میری جان انہی باتیں کر رہی ہو؟“ میں نے یکدم  
گاڑی روک دی ”مجھے جتنی تمہاری اب ضرورت ہے۔ زندگی میں  
پہلے کبھی نہ تھی لیکن مجھے تمہاری ضرورت نہیں اپنے ساتھ لے  
جائے کے لیے نہیں ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت یہاں ہے۔ میری  
عدم موجودگی میں تمہیں سب کچھ سننا پڑا ہے۔ جیسا کہ سینکڑوں  
طے ہوا تھا۔ اپنے آپ کو بھاری دتے داروں کے لیے تیار کرلو۔“  
میں نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ ایک بار پھر گاڑی کے ساتھ  
ساتھ بڑھتے ہوئے بولی ”میں ان دتے داروں کی اہل نہیں ہوں۔“  
”اب الہیت اور نا الہیت پر بحث کرنے کا وقت نہیں رہا۔“

”وہ منت تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر مجھے بھی محاصرہ کرنے والوں  
کی نظر میں آنے کا خطرہ محسوس ہوا تو میں گاڑی کا انتظار کیسے بغیری  
نکل جاؤں گا۔“

”بھگک ہے۔ میں گاڑی ادھر لانے کی کوشش کرتی ہوں۔“  
راحیلہ نے کہا۔

میں دونوں تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکلے اور الگ الگ  
ستروں میں بھاگے۔ میں طے کو چلا تھا بجلی کی گلی کی طرف آیا۔ ایک  
فلکس دیوار کی آڑے کر میں نے گلی میں بھاگنا۔ عقبی گلی بھی کافی  
چوڑی تھی۔ شاید اسی لیے ہائی کے اثرات دوسری طرف کی  
کوٹھیوں تک نہیں پہنچے تھے۔

گلی میں دیرانی تھی۔ کوٹھیوں سے بھی کوئی بھاگتا ہوا دکھائی  
نہیں دے رہا تھا۔ شاید سب محفوظ ترین کونے کھدووں میں دیکھے  
ہوئے تھے۔ میں نے درگاہ کی سی حالت میں دوڑنے ہوئے چند قدم  
کا فاصلہ طے کیا اور ایک کورڈے دان کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں حریف  
صاحب کی ہاتھ شدہ کوٹھی سے کچھ دور ہٹ جانا چاہتا تھا۔

محاصرہ کرنے والوں کا کہیں کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دے  
رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس حکمت عملی سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔  
لیکن قحطی الحال ان کی تعداد بہت کم رہی ہو اور وہ اعلان امنوں  
نے مرحوب کرنے کے لیے یہ کیا ہو۔ ارد گرد چھا جانے والا سناٹا  
رہا تھا کہ کتاخود ٹاپ کے جوہر شہت گرد میرے ساتھیوں سے برسر  
پیکار تھے وہ بھی نہایت آسانی سے اپنی اپنی کہیں گاہوں سے نکل کر  
فرار ہو چکے تھے۔

میرا بوجھل دماغ کورڈے دان کی بو سے کچھ اور بوجھل ہوا  
جا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سانس روک لی جس کی مجھے کافی مشق  
تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں نے اپنی گاڑی آندھ می طوفان کی طرح گلی  
میں داخل ہوئی دیکھی۔ راحیلہ ابھی تک بھکارن ہی کے طے میں  
تھی لیکن یہ بھکارن لاہور کی چند مہنگی ترین گاڑیوں میں سے ایک  
گاڑی ڈرائیو کرتی آ رہی تھی۔

میں کورڈے دان کے عقب سے نکل آیا تھا۔ ایک  
دھچکے سے میرے برابر آن رکی۔ راحیلہ ڈرائیو تک سیٹ سے کھٹک  
گئی اور اس نے اشارے سے بتایا ”پولیس بہت کم تعداد میں آئی  
ہے۔ شاید ابھی انہیں ملک کا انتظار ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ  
صرف تین ستروں میں موجود ہیں۔ تم ادھر سے نکل سکتے ہو۔“ اس  
کا اشارہ گلی کے دوسرے سرے کی طرف تھا۔

یہ کہہ کر وہ خود گاڑی سے اترنے لگی تو میں نے کہا ”تم بیٹھی  
روہو۔ میں تمہیں بھی لیے چلتا ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی ”میں یہ اطمینان کرنے کے بعد ہی  
نکلوں گی کہ تمام ساتھی یہاں سے نکل گئے ہیں۔ ورنہ اچھے افسوس  
ہے کہ اس آپریشن کا وہ نتیجہ نہیں نکل سکا جس کی مجھے امید  
تھی۔“

میں نے تیزی سے کہا۔  
”اچھا... ایک بات بتاتے جاؤ؟“ وہ گاڑی کے ساتھ تقریباً دوڑتے ہوئے بولے۔

”بھچو۔ عورت سولی پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور پونٹے گی۔“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔  
”کیا تمہارے خیال میں یہ سب کچھ میری عزت کی وجہ سے ہوا؟“ اس فولادی عورت کی آنکھوں میں نمی جھللا رہی تھی۔  
”نہیں۔ یہ سب کچھ ہماری قسمت کی وجہ سے ہوا اور اس میں پریشان یا دل شکستہ ہونے اور بچتا ہوا محسوس کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والے لوگ ہیں۔ ہماری زندگی میں شیبہ درخشاں آتے ہی رہیں گے۔ تم جو کچھ رہی ہو، میں اس طرح نہیں سوچ رہا۔ تم ہماری وجہ سے مجھ پر کوئی معیبت آئی ہے اور نہ میری وجہ سے تم پر۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے جو ساتھ رہے گی۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کا سارا میسر ہے۔ خدا حافظ۔“

اس کے ہاتھ اب بھی کھڑکی پر جھے ہوئے تھے۔  
”چلیں... راجہ کفری کچھ ڈوڑو۔ ہو سکتا ہے میں کل ہی واپس آ جاؤں۔ عام سی عورتوں کی طرح جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔“  
”قسم کھاؤ تم مجھ سے نفرت نہیں ہو!“  
”خدا کی پناہ...! دل چاہ رہا ہے میں اسٹیرنگ وکیل سے سر کھرا کر مر جاؤں۔“ میں نے بے بسی سے کہا ”تم نے تو ملی بیرونی کی طرح مجھ سے قسمیں لینی شروع کر دیں۔ تم نے ایسا کون سا کام کیا ہے جو میں تم سے نفرت ہو جاؤں؟“ وہ بے بسی سے بھی میں نے تمہارے لیے دل میں جتنی محبت جمع کر رکھی ہے اس کے بعد عقل کی گنجائش ہی نہیں رہی۔“

تب اس کی جھلن کرتی آنکھوں میں طغیانی ڈر آئی۔ مگر سانس لے کر وہ سیدھی کھڑکی پر چڑھی اور میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔  
یہ تمام واقعات درحقیقت چند منٹ سے بھی کم وقت میں گزرے تھے لیکن جب میں اس گلی سے نکلا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں جنگ و جدل اور بارود کا ڈھیر سے بھرپور ایک طویل زور گزار کر آ رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ گلی کے سرے پر شاید اپنا کام کہیں سے کوئی نکل آئے اور مجھے روکنے کی کوشش کی جائے۔ میں گاڑی کو کسی بھی قسم کی رکاوٹ سے نکال لے جانے کے لیے تیار تھا لیکن اس بات پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ دہشت گرد اکثر مقامات سے اسی لیے نہایت اطمینان سے اپنی کارروائی کر کے فرار ہوتے ہیں کہ کامیاب ہو جاتے ہیں کہ کم سے کم وقت میں انہیں روکنے اور گھیرنے کی کوئی منصوبہ بندی ہی

نہیں ہوتی۔ برسی گولیوں اور گھات میں لگی بندھتوں کے سامنے جانے کی بھی کوئی جرأت نہیں کرتا۔ سرکاری لوگوں سمیت سب اسی فکر میں ہوتے ہیں کہ ”مطلوب“ ذرا صاف ہوا تو وہ آگے بڑھیں۔ میں ایک گلی سے دوسری میں گھسنا ہوا جلدی اس ہلاک سے نکل گیا تاہم میں نے یہ احتیاط ضرور رکھی کہ زیادہ تر عینی گولیوں میں ہی رہا گو کہ اس کے لیے مجھے زک زبک کے سے انداز میں خاصا طویل فاصلے طے کرنا پڑا لیکن فائدہ یہ ہوا کہ کسی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سوائے اس کے کہ ایک بار میری گاڑی کا وکیل بغیر ڈھکے کے ایک گز میں جھٹکتے جھٹکتے بھاگ گیا۔

مازل ٹانوں پر اترنے دوڑ کر پوش علاقہ ہے۔ اس میں ہلاکوں کی سافٹ پیٹری ہے۔ زیادہ تر گلیاں اور بڑی سڑکیں نیم دائرے کی صورت میں ہیں۔ مین روڈ پر پہنچ کر میں نے گاڑی آگے منی طوفان کی رفتار سے دوڑانا شروع کی۔ مجھے خاصا طویل فاصلے طے کرنا تھا۔ بظاہر کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔

اس کے باوجود میں نے منزل پر پہنچنے سے پہلے اوھر اوھر کی سڑکوں پر کئی غیر ضروری چکر کرائے۔ تب بھی مجھے کوئی اپنے تعاقب میں دکھائی نہ دیا۔ آخر کار میں نے گاڑی وارڈ کی طرف موڑی اور پھر ایک بھلی گلی میں گھس گیا۔  
اس گلی میں ٹی وی کی ایک مشہور اور جیڑا اداکارہ رہتی تھی جو بیشتر زاموں میں بھائی یا چرباں کا رول کرتی تھی۔ اس کے مکان کے صحن عقب میں آج کل وہاں پر فیر میک اپ مین افوار رہتا تھا جو انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتا تھا۔ دوسری گلی میں محکم کرشن اس کے مکان پر بچھا۔  
افوار ٹیگ پر ہی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں مستقل طور پر یوں سرخ رہتی تھیں جیسے شیبہ بیداری یا پھر ہر وقت پینے پلانے کا مادی ہو۔ حالانکہ دونوں میں سے کوئی بات درست نہیں تھی۔ اس نے دور سے ہی مجھے دیکھ لیا۔  
وہ گیٹ کھول کر خاموشی سے اندر چلا گیا۔ میں بھی گاڑی کھڑکی کر کے اس کے پیچھے پیچھے اندر جا بچھا۔ اس کا مکان باہر سے کچھ خاص دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اندر سے اچھا خاصا شاندار تھا۔  
اس کے پیچھے پیچھے میں جس طویل و عریض ہال میں داخل ہوا۔ وہ ایک شاندار میک اپ روم تھا۔ ہمارے کسی فلم اسٹوڈیو کو بھی ایسا میک اپ روم میسر نہیں تھا۔ وہیں ایک گوشے میں ایک آرام دہ کرسی پر اطمینان سے ”میں“ بیٹھا سکرٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔  
میں نے آگے بڑھ کر ذرا جھک کر بنور ”اپنا“ جائزہ لیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں آئینہ دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت وہ مندر تھا۔ میرے قریب اور ان غار ساتھیوں میں سے ایک۔۔۔۔۔  
مندری شخصیت میں پہلے ہی مجھ سے بڑی مشابہت پائی جاتی

چوہدری سے بہت مختلف بناری ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا سر؟" وہ زرا چونکا۔

"تم اتنا دل لگا کر سرگشت پا رہے ہو۔ تم نے کبھی مجھے سرگشت

پتے دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ، وہ انگلیوں میں دلی سرگشت کی طرف دیکھ کر میری سانس

لے کر بولا۔ "یہ فرق تو مجھے یاد ہے۔ میں مجھ سے سرگشت نہیں پا

رہا ہوں۔ یہ تو میں یہاں تنہائے میں بیٹھا تھا اس لیے سوچا کہ اپنا

شغل جاری رکھوں لیکن آئندہ میں اپنی اس عادت پر کنٹرول رکھوں

گا اور دوسروں کے سامنے کبھی بھول کر کبھی سرگشت نہیں ہوں گا۔

بلکہ ہوسکا تو یہ عادت ہی چھوڑ دوں گا۔"

"میرے لیے تو تمہاری یہی قربانی کافی ہوگی۔ میں اس کا بھی

کوئی صلہ نہیں دے سکوں گا۔ کسی کی خاطر کوئی اپنا نشہ چھوڑ دے

یہ بڑی محنت کی بات ہوتی ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں

نے کہا "مفتدر میں نے بھی واضح کر دیا چاہتا ہوں کہ اس روپ میں

تمہاری جان کو شدید خطرہ لاحق ہوگا۔ خطرہ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے

ہو گا اور یہ تو اب میں سب ساحتیوں کو بتا چکا ہوں کہ ریڈ ڈاٹ

کیا چیز ہے۔ وہ مجھے اپنی ہٹ لسٹ پر رکھ لے اس کے بچنے کی

صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے سراسر بات تو آپ مجھے بتا چکے ہیں۔" مفتدر

بے خوفی سے بولا۔ اس کی منکر اہٹ پر قرار تھی۔

"اسی وقت تک تو ریڈ ڈاٹ نے مجھے مارنے کی باقاعدہ دھمکی

نہیں دی تھی۔" میں نے منکر اتے ہوئے کہا "اب تو میری موت کا

فرمان جاری ہو چکا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا ایک بار پھر تمہیں

یاد دلانی کرادوں۔ اب تو مجھے بھی یقین ہو چکا ہے کہ ریڈ ڈاٹ جب

موت کی بات کرتی ہے تو اس کا مطلب واقعی موت ہوتا ہے۔ تم

جب میرے روپ میں ہو گے تو یوں سمجھو کہ فرشتہ اہل کے زیر

سانہ پھر رہے ہو گے۔"

"اگر اوپر والے کو منظور ہوا تو فرشتہ اہل ہی میری زندگی کا

مخالف بن جائے گا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"پھر بھی، بہر حال تم اس ذمے داری کے لیے مجبور نہیں

ہو۔ یہ محض ایک تجویز تھی۔ اسے قبول کرنا یا نہ کرنا تمہارے

اختیار میں تھا۔ تم ہو تو اب بھی انکار کر سکتے ہو۔ ابھی کچھ نہیں

گجرا۔ ابھی تم صرف اپنی گھٹی مونچھوں سے محروم ہوئے ہو۔ وہ

تھوڑے عرصے میں دوبارہ آگ آئیں گی۔ فی الحال گزارے کے لیے

انوار تمہیں نقلی سوچیں لگا دے گا۔ تم یہاں سے مفتدر ہی کی

حیثیت سے واپس جاسکتے ہو۔"

مفتدر نے لگا پھر سرگشت ایٹم ٹرے میں ملتے ہوئے بولا "سرا

ایک میں ہی کیا۔۔۔ ہمارے ساتھیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ایک

بار آپ کے سامنے کسی کام کی اپنی بھر کے بیک آؤٹ کر جائے۔

میں معلوم ہے ہم آپ کے قلم نہیں۔ جانیں تو ہم اپنی خوشی سے

خوش ہیں انوار نے تو اسے ہو ہو میرا عکس بنا دیا تھا۔ مفتدر اپنی گھٹی

مونچھوں اور بھوری آنکھوں کی وجہ سے مجھ سے کچھ مختلف نظر آتا

تھا لیکن اب مونچھیں صاف ہو چکی تھیں اور کوئی ٹینٹ لینے کی وجہ

سے آنکھوں کا رنگ بھی میری آنکھوں کی طرح سیاہ ہو چکا تھا۔

انوار نے باقی چھوٹی موٹی تبدیلیاں بھی ایسی کی تھیں جو مستقل

رہنے والی تھیں اور مفتدر کو بار بار اس کے پاس آنے کی ضرورت

نہیں تھی۔ انوار تو ایسا ماہر فن تھا کہ باقاعدہ اور کوالیفائیڈ سرخس نہ

ہونے کے باوجود چھوٹی موٹی پلاسٹک سرجری بھی کر لیتا تھا۔ مفتدر کا

ذکاوت اور جسمانی ساخت بھی کافی حد تک مجھ جیسی تھی۔ جو تھوڑا

بہت فرق تھا وہ انوار نے لباس وغیرہ کی مدد سے چھپا دیا تھا۔

انوار کے کام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل فطری

نظر آتا تھا۔ مفتدر پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے روپ

میں وہ کوئی اور تھا۔

دراصل میں نے ریڈ ڈاٹ والوں کے پاس جب عرفان کو دیکھا

تھا اور پہلی نظر میں مجھے اس پر حقیقت صاحب کا شبہ ہوا تھا شاید جیسی

میرے ذہن میں ایک خیال سچ کی طرح پھوٹ چکا تھا جو بعد میں

دیر سے دیر سے ایک واضح شکل اختیار کرتا چلا گیا تھا۔ آخر کار میں

نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اشد مجبوری میں کبھی مجھے روپوش ہونا پڑا تو

میں مفتدر کو اپنی جگہ چھوڑ جاؤں گا۔

گویا یہ آئینہ مجھے ریڈ ڈاٹ نے ہی دیا تھا اور اس سے میں ریڈ

ڈاٹ ہی کو فخر دینے کی فکر میں تھا۔ زیادہ دیر کے لیے نہیں تو تھوڑی

دیر کے لیے ہی سہی۔ اگر دو چار دن کے لیے بھی ان کی توجہ میری

طرف سے ہٹ جاتی تو میں دنیا کی بھیڑ میں ریڈ ڈاٹ سے زیادہ سے

زیادہ دور نکل سکتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بھی کبھی اس بات پر

دھیان نہیں دیا تھا کہ مفتدر میں میری شخصیت کی کافی مشابہت پائی

جاتی تھی۔

مفتدر کا جائزہ لینے لینے میں انوار کی آواز سن کر چونکا۔ وہ کہہ

رہا تھا "کیا خیال ہے سر؟ کام چل جائے گا؟"

"ضرور۔ ضرور۔" میں نے پراسیدہ لہجے میں کہا "انوار تم اپنے

فن سے واقعی مجھے حیران کر دیتے ہو۔"

"یہ تو کوئی مشکل کام ہی نہیں تھا سرا۔ انوار انکاری سے بولا۔

"مفتدر صاحب میں تو پہلے ہی آپ کی بڑی مشابہت موجود تھی۔ اگر

آپ کسی ایسے شخص کو بھی بھیج دیتے جو آپ سے کافی مختلف ہو تو

میں اسے بھی آپ کے سانچے میں ڈھال دیتا۔ بس اس کے لیے

وقت ذرا زیادہ درکار ہوتا۔"

مفتدر اطمینان سے سرگشت کا ایک طویل کش لے کر

منکراتے ہوئے بولا "سرا میں آپ کے احرام میں اس لیے اٹھ کر

کھڑا نہیں ہوا کہ اس وقت میں واقعی خود کو افضل چوہدری محسوس

کر رہا ہوں۔"

"لیکن ساتھ ہی اتنی بڑی مفاقت کر رہے ہو جو ہمیں افضل

آپ پر غار کرنے کے لیے اہلی پر لے پڑے ہیں۔ مجھے یہ موقع مل رہا ہے تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھ رہا ہوں۔ آپ مجھے کیوں اس اعزاز سے محروم کرنا چاہتے ہیں کہ کبھی میں نے افضل چوہدری کی حیثیت سے کچھ وقت گزارا تھا۔

”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا یا راء میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”کچھ خواہشیں بھی میری قریبی دوست ہیں۔ کوئی ناجائز فائدہ مت اٹھا جانا۔“

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ وہ جلدی سے بولا ”میں میں سب سے پہلے ہنادوں گا کہ میں افضل مطابق اصل ہوں۔ دوسرے مال ہوں۔“

”پھر تو اس راز کا اللہ ہی حافظ ہے۔“ میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا ”خیر۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ میں بت بوجھل ذہن لے کر یہیں آیا تھا۔ تم سے بات چیت کر کے دل کو برا اطمینان ہوا ہے۔ باقی تیاریاں مکمل ہیں؟“

”جی ہاں۔ آپ کا مطلوب لباس ادھر موجود ہے۔ آپ پہلے لباس تبدیل کر لیں۔ پھر انوار اپنا کام کرے گا۔“ مصدور نے ایک پارٹیشن کی طرف اشارہ کیا۔ پارٹیشن کے دوسری طرف کا حصہ ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

وہاں پہنچ کر میں نے لباس تبدیل کیا۔ میں دایس کرے میں آیا تو ایک اچیلے ڈھالے پرانے اور معمولی سے شلوار قمیض میں تھا۔ مکے میں مفل تھا۔ پیروں میں پٹاوری پہنل۔

ان معمولی تبدیلیوں سے ہی میری شخصیت کا تاثر بدل کر رہ گیا۔ میں بڑے سے دیوار گیر آئینے کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ انوار میرے چہرے میں کچھ اور تبدیلیاں لانے لگا۔ وہ بلاشبہ ایک ذہین آدمی تھا۔ مستقل میک اپ جدید ٹیکنیک سے تو کرنا ہی تھا لیکن اس میں اپنی ذہانت سے بھی خوب کام لیتا تھا جس کا ایک نمونہ یہ تھا کہ وہ بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں لاتا تھا ”بہت معمولی اضافے کرتا تھا تاکہ میک اپ جلد خراب نہ ہو لیکن ان معمولی تبدیلیوں اور اضافوں سے زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا تھا۔“

مصدور اس دوران ڈریسنگ روم میں چلا گیا جہاں میں اپنا لباس اوڑھتے وغیرہ چھوڑ آیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ یہ جیز پہن کر باہر آیا تو مکمل طور پر افضل چوہدری نظر آ رہا تھا۔ اس کے میری شخصیت میں ڈھلنے میں جو تھوڑی بہت کی رہ گئی تھی اب وہ بھی پوری ہو گئی تھی۔

میں نے گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ بھی رکھ لو۔ یہ گاڑی مجھے بہت عزیز رہی ہے۔ بہت سادہ رہا ہے اس نے میرا۔ تمہیں معلوم ہے اس میں بہت سے اضافے خاص طور پر خود کرائے تھے میں نے۔ کچھ کھینے سے اور کچھ نہیں۔“

”میں اس گاڑی کی پوری پوری حفاظت کرنے کی کوشش کروں گا سر۔“ مصدور چابیاں لیتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ حفاظت تو تم صرف اپنی جان کی کرنا۔ جان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ جان سلامت رہے تو انسان نہ جانے کیا کچھ بیانیے کی امید رکھ سکتا ہے۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ گاڑی کو محض گاڑی کے طور پر ہی مت استعمال کرنا۔ اس سے پورا پورا کام لینے کی کوشش کرنا۔ یہ تمہاری جان کی حفاظت کے سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے سر! میں پوری کوشش کروں گا۔“ مصدور بولا۔

”جس اب تم نکل جاؤ۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ”اگر کوئی بھی آگے اس مکان کی گمرانی کر رہی ہو تو اسے زیادہ خشک نہ ہونے پائے۔“

”اوکے سر! میں چلا ہوں۔ وٹش پو گڈ نائٹ۔“

”تھینک یو۔“ میں نے مجھے لمبے میں کہا اور وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ میں عقب سے بغیر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ میری ہی طرح چلنے میں کافی حد تک کامیاب تھا۔

وہ رخصت ہو چکا تو انوار نے ایک بار پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے میرے بال تراش کر چھوٹے کر دیے۔ انہیں پچھٹائی ذہ بنایا اور اسٹائل بھی بدل دیا۔ میرے رخسار کی بڑی کے اہمار پر ایک سوٹ سے سننے کا بھی اضافہ ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں والی لیکن پٹی کی طرح چوڑی موٹھیں بھی نمودار ہو گئیں۔

”یہ موٹھیں کلائی دن تک آپ کا ساتھ دے جائیں گی۔“ انوار اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بولا ”مجھے نہیں معلوم آپ کو کس نوعیت کا خلع و لالچ ہے لیکن اس دوران شاید آپ خطرے کی زد سے نکل ہی جائیں۔ جب آپ کی اصل موٹھیں تھوڑی بہت نکل آئیں تو انہیں یہی اسٹائل دینا شروع کر دیجئے گا ورنہ نقلی والی جس حد تک باقی رہ جائیں ان سے جان چمڑانے کا طریقہ بھی سمجھ لیجئے۔ اگر یہ میک اپ خراب ہونے کے بعد بھی ختم نہ کیا گیا تو پھر پول غلے گئے گا۔“

اس نے میک اپ صاف کرنے کا طریقہ بھی مجھے سمجھا دیا۔ کچھ دیر بعد میں اس کی کرسی سے اٹھا تو ایک سیدھا سا دالکے کسی حد تک بے وقوف سا دسالتی لگ رہا تھا۔ شاید یہی اصل افضل چوہدری تھا۔ شاید انوار نے مجھ پر کوئی نیا خول چڑھایا نہیں تھا بلکہ گڑے برسوں میں مجھ پر چڑھ جانے والا خول اتار دیا تھا۔ میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ برسوں بعد میری اپنے لڑکپن کے افضل چوہدری سے ملاقات ہو رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ لڑکپن میں میری ایسی سیاہ پٹی جیسی احمقانہ موٹھیں نہیں تھیں۔

ایک کرسی پر مصدور میرے لیے ایک تھملا چھوڑ گیا تھا۔ وہ مونے کپڑے کا ایک مستطیل اور پرانا سا تھملا تھا جیسا عام طور پر پرانی وضع کے غریب رصاتی سودا سفٹ لانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

کوئی میری طرف متوجہ ہے یا نہیں؟ اس پاس کوئی مشکوک صورت موجود ہے یا نہیں؟

بظاہر تو کوئی میری طرف متوجہ نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی ان معنوں میں کوئی مشکوک صورت دکھائی دے رہی تھی جو محسوس وقت میرے ذہن میں تھی۔ ورنہ دیکھ تو شہر کی سڑکوں پر عوام وواں چروں میں سے بہت سے مجھے مشکوک ہی دکھائی دیتے تھے۔

بہر حال یہ بھی کوئی اطمینان بخش صورت حال نہیں تھی۔ دیکھ تو کانی عرصے سے یہی ہو رہا تھا کہ ریڈ واٹ کا کوئی بھی شخص یا کوئی بھی مشکوک آدمی کبھی مجھے اپنا تعاقب کرنا دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن ریڈ واٹ والوں نے جب بھی مجھ اور جہاں بھی جا رہا تھا مجھے آن لیا تھا لیکن اب اپنی ہر چیز... حتیٰ کہ اپنی اصل شکل و صورت سے بھی چونکا رہا پانے کے بعد میں ایک سوہوم سی امیڈ میں ملے جا رہا تھا کہ شاید وہ مجھے تلاش نہ کر سکیں۔ میں ایک بہت ہی عام سا بہت ہی حقیر سا آدمی بن کر اس دنیا کی بھڑ میں کھو جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا اور مجھے اس میں دقت محسوس ہونے کے بجائے کچھ لطف سا آ رہا تھا۔

واپس ہاؤس کے گرد چکر لٹ کر آخر کار ذرا مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے آپس سڑک کے راستے ریلوے اسٹیشن کی طرف سفر شروع کر دیا۔ باز کا تھیلا میری سائیکل کے ہینڈل پر لٹکا ہوا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر میں نے سائیکل ڈر میں سمیت اسٹینڈ پر چھوڑی اور تھیلا ہاتھ میں لٹکائے کھڑے کھڑے اسے انداز میں ریلوے اسٹیشن کے اس وسیع حصے کی طرف بڑھا جو تھوڑا سا کلاس کے مسافروں کے لیے ڈینگ روم کا ڈانچ "مسافر فائدہ و شہرہ کا کام دیتا تھا بلکہ بچے تو اسے ہاتھ دھو کے خود پر بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ آج کل ریلوے اسٹیشن کو صاف ستھرا رکھنے اور مسافروں میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی کالی کوششیں کی جا رہی تھیں لیکن مسافر ان کوششوں کو حسب معمول ناکام بنانے میں لگے ہوئے تھے۔

پلیٹ فارم پر وہی بھگدڑ، وہی افزائش، وہی تباہ حالی تھی ہوئی تھی جو میں وہیں سنبھالنے کے بعد سے ریلوے اسٹیشنوں پر دیکھتا آیا تھا۔ اسی طرح لوگ بدحواس "ایک دوسرے پر مگرتے پڑتے" مت اٹھائے دوسرے اوپر بھاگے جا رہے تھے۔ اسی طرح کان بڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

کلی سا دوسرا سالانہ کے انہار اٹھائے لرزاؤں و ترساں پہلے جا رہے تھے۔ لوہے کے ریلک اور بہتر ایک دوسرے کی کھوپڑیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ کہیں کہیں شور و غوغا، آدھ نقال اور فریادیں احتجاج ذرا زیادہ بلند ہو جاتا تھا۔ شوہر بیویوں پر اور بیویاں بچوں پر پختی رہی تھیں۔

کسی نے گھبراہٹ میں کوئی گود میں اٹھایا ہوا تھا اور بچے کو ہاتھ میں لٹکایا ہوا تھا۔ کہیں مسافر اس کلی کو ڈھونڈ رہے تھے جو ان کا

اس تھیلے میں سب سے اوپر ڈیڑھ دو گھونیاں تھیں۔ اس سے بچے اخبار میں لپٹا ہوا کپڑوں کا ایک فاضل جوڑا تھا اور اس سے بچے ایک پوٹلی میں بڑے ٹوٹوں کی گڈیوں کی صورت میں بندہ لاکھ دیکھ رہا تھا۔ اوپر سے کوئی تھیلے میں جھانکتا تو اسے صرف پانچویں دکھائی دیتی۔ ان کے بچے میرا زور دہا پویشہ تھا۔

انوار کا شہر یہ ادا کر کے میں اس کے گھر سے نکلا تو ٹھٹ سے ذرا آگے مکان کے کونے پر دیوار کے سارے ایک سائیکل کھڑی ہوئی تھی جس کے کیس پر دونوں طرف دودھ کا ایک ایک ڈرم لٹکا ہوا تھا۔ اس پر جو دودھ والا آیا تھا وہ انوار کے مکان میں کچھ دیر پہلے سامنے کے کیس سے داخل ہو کر پچھلے دروازے سے نکل کر جا چکا تھا۔ میں درحقیقت اب اسی دودھ والے کے تھیلے میں تھا۔ یہ انتظام بھی میرے لیے انوار نے کیا تھا۔

میں سائیکل کے قریب پہنچا تو ایک صاف ستھرا سا بچہ ٹیکریشن شرن پئے "ہاتھ میں ڈول لئے سائیکل کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے سائیکل سنبھالی تو وہ جلدی سے ڈول آگے بڑھاتے ہوئے بولا "دودھ والے اٹھ! ایک لیٹر دودھ تو دیتے جائیں۔"

مجھے معلوم تھا ڈرم خالی تھے مجھے سائیکل پر خاصا فاصلہ طے کرنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سائیکل چلانے کی مشقت کے ساتھ ساتھ مجھے خواہ خواہ دودھ سے بھرے ڈرم کھینچنا پڑیں۔ اس لیے جب میں نے مفکر کو یہ تمام انتظامات کرنے کی ہدایت کی تھی تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ڈرم خالی ہی ہونے چاہئیں۔ اس نے آگے انوار کو ہدایات دی تھیں۔

"دودھ تو ختم ہو گیا ہے بیٹا! تم دکان سے لے لیتا۔" میں نے بچے کے کال پر ہنسی دیتے ہوئے کہا اور جلدی سے سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ دودھ کے مزید طلبکار نہ آئیں۔

کچھ دیر پہلے میں ایک جیش قیمت اور مخصوص ساخت کی مرسیڈیز میں جہاں پہنچا تھا تو ہر نظر مرغوبیت زدہ انداز میں میری طرف اٹھ رہی تھی۔ اب میں دودھ والے کی سائیکل پر جا رہا تھا تو کوئی اک ٹکڑا انداز سے بھی میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں میں چاہتا تھا۔ اب میں جگہ کوچن میں حرکت کرتی زندگی کا ایک حصہ تھا "دوڑتو کے سفر میں شامل ہو چکا تھا۔ لوگوں کی نظریں ایک غیر اہم انسان ہو چکا تھا جس کی طرف کسی کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

برسوں بعد سائیکل چلانے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ وہ بھی ایسی سائیکل جس کی گویا دم سے بندھے دو ڈرم کھڑے کر رہے تھے۔ شروع شروع میں مجھے کچھ آناؤزی پن محسوس ہوا لیکن جیسے جیسے اس کے قریب پہنچے تب تک میں روانی سے سائیکل چلانے لگا تھا۔

بظاہر میں ٹھنک کا خیال رکھنے کے لیے ہینڈلوں کی طرح زور آور دیکھ رہا تھا لیکن درحقیقت میں جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ



سلمان اٹھا کر آگے روانہ ہوا تھا اور کہیں قلعی مسافروں کو ڈھونڈ رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلمان کو کس ڈبے میں چھپکے اور کہیں قلعی اور مسافروں کو مل کر ان لوگوں کو ڈھونڈ رہے تھے جو انہیں چھوڑنے آئے تھے۔ کھوکھ سے کھوا چھل رہا تھا لیکن برسے برسے "عظیم الشان" سے سجائے لیے چوڑے غلیوں والے اپنے ٹیلے اسی جھوم کے درمیان سے گزرا نہ کی گھر میں تھے۔

میری نہ تو کوئی ریزیدیشن تھی نہ میں نے کوئی ٹکٹ لیا تھا اور نہ ہی میں ابھی صحیح طور پر فیصلہ کر پایا تھا کہ مجھے کہاں جانا تھا۔ میں پبلک ایڈریس سکیم پر سفر ہونے والے اطلاعات اس خود شغب کے درمیان سننے ہوئے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان پرنس اور ریلوے اسٹیشنوں پر ان اطلاعات کے لیے استعمال ہونے والے اچھکے کچھ عجیب سی ہوتے ہیں اور آوازیں عجیب تر۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا ہے کہ غلا سے کسی ناقابلِ فہم زبان میں کوئی پیغام موصول ہو رہا ہے۔

اطلاعات سے اندازہ ہوا کہ سب سے پہلے پلیٹ فارم نمبر ایک سے تیز کام کراچی کے لیے روانہ ہونے والی تھی۔ میں بظاہر اپنی مطلوبہ یوگنی تلاش کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر اسی ٹرین کے قریب قریب پلنگ ٹکٹ ٹھونڈا اس کے ڈبے جن پر اب سیکنڈ یا کانونی کلاس کا مجموعہ لٹکا کر ان کی تباہ حالی کو چھپانے کی کوشش کی تھی میری توجہ کا مرکز تھے۔

ایک ڈبہ میں نے تاویلیا تھا۔ جس میں سب سے زیادہ رش تھا لیکن میں اس میں سوار نہیں ہوا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس وقت سوار ہوں گا جب ٹرین ذرا رفتار پکڑے گی تاکہ اگر کوئی میری طرف متوجہ ہو تو آخری لمحے تک اندازہ نہ کر سکے کہ میرا کدھر کا ارادہ تھا اور میں کس ڈبے میں سوار ہونا چاہتا تھا۔ میں اپنی داستان میں اب بھی ہر ممکن احتیاط کر رہا تھا۔

میں گردو پیش کے بارے میں اب بھی چوکنا تھا۔ غیر محسوس طور پر اب بھی چادوں طرف کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نتیجہ وہی تھا۔ اب بھی آس پاس کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کے بارے میں میں سوچ سکتا کہ وہ میرے چکر میں تھا۔ تاہم ابھی میرے دل میں یہ امید پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ریڈ ڈاٹ کی توجہ واقعی میری طرف سے ہٹ سکتی تھی۔ اب صند کو صیر جگہ ہو گئی میں رہتا تھا۔ میری گاڑی میں میرے آفس جانا تھا۔ مجھے اس کو قریب کا بکرا بیٹا اچھا نہیں لگا تھا لیکن ایک تو میری تجویز سننے لگی وہ مصر ہو گیا تھا کہ میں کتنا چاہیے کہ جان کو آگیا تھا۔ دوسرے مجھے کچھ خاص یقین نہیں تھا کہ میرے حصے کی مسیحیتیں اس کی طرف منتقل ہو سکتی تھیں۔

میری یہ کوشش محض ایک طرح کا دل بھلاوا تھی۔ آخر کار میں نے یہی سوچا تھا کہ ایسا کر دیکھ لینے میں کوئی حرج شاید نہیں تھا۔ روپوش تو مجھے ہونا ہی تھا لیکن میں نے سوچا شاید صند کو اپنی

جگہ چھوڑ کر جانے سے مجھے کچھ زیادہ سہولت مل جائے ورنہ اس قسم کی کسی کوشش کے ذریعے ریڈ ڈاٹ کو بے وقوف بنانے کی امید مجھے ذرا کم سی تھی۔

ٹرین نے ریگنا شروع کیا تو بہت سے لوگ ٹرین سے باہر لڑھک پڑے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی نہ کسی کو چھوڑنے آئے تھے۔ کچھ گردو پیش سے بے نیاز، نہ اٹھائے ہاتھ ملاتے ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ان سب کی مجموعی تعداد مسافروں سے کہیں زیادہ معلوم ہوئی تھی۔

میں بھی ٹرین کے ساتھ ساتھ بظاہر آرام سے چلا جا رہا تھا۔ جب میرا تاوا ہوا کپار ٹنٹ میرے قریب آیا تو میں اچانک ہی ٹپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ جہاں تک میری نظر گئی، میں نے اپنے بدن کی کوئی ٹرین میں سوار ہوتے نہیں دیکھا۔

میں دروازے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ آس پاس تین چار افراد اور بھی کھڑے تھے۔ رنگ پرنگے چلے اور گھما کر دہلی ایک سیاہ نام عورت بھی ہاتھ دوم کے دروازے سے ٹپک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ تین چار سیاہ نام سے بیٹھے بھی تھے جو انتہائی اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کورس کی سی صورت میں ریں ریں کر رہے تھے۔

عورت نے سفید پلاسٹک کی چوڑیاں یوں کنبیوں تک پہنی ہوئی تھیں جیسے دونوں بازوؤں پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ سیاہ جلد کے ساتھ سفید چوڑیوں کا تضاد خوب تھا۔ ٹاک، ٹانگ، گائے میں چاندی کے بھاری بھاری زیندات لٹکے ہوئے تھے۔ وہ کسی گھرے خیالی میں کھنٹی معلوم ہوئی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد وہ خیالوں سے چوٹنے سب بچوں کو ایک ایک دم کار سید گئی، تھری زبان میں تیزی سے سب کو نہ جانے کیا کچھ کہتی اور پھر اسی طرح ہاتھ رخسار پر ٹکا کر خیالوں میں کھوجاتی۔

ٹنگ سے راستے میں بہت سا سلمان بھی ٹھنسا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کس کا تھا۔ ہر حال گھریلے ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بھارڈ سے لے کر ہانڈیاں اور کسٹر تک۔ کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیوں سے لے کر چارہائیاں تک۔ چارہائیاں کے پائے نکال کر ان کے لیے لیے بھنڈل سے بنادے گئے تھے۔

اسی ساڈو سلمان کے درمیان ہم کی افراط و اس پسنائے کڑے چھل ٹرین ابھی لاہور کی حدود میں ہی تھی۔ گوٹ نکسیت کی طرف جا رہی تھی۔ آبادیوں کے درمیان سے ہی گزر رہی تھی لیکن یہ احساس ہر حال دل میں لمحہ بہ لمحہ گہرا ہو رہا تھا کہ وہ لاہور سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

اوداس کی ایک لمبے میرے دل میں پانچ گانے کی کوشش کی لیکن میں نے جلد ہی اس سے جان چھڑائی۔ دراصل دل کے کسی تاریک گوشے سے ایک مجسم سا سوال بار بار سر اٹھا رہا تھا "کیا میں دوبارہ لاہور کی صورت دیکھ سکوں گا؟"

اس سوال کا کوئی یقینی جواب میرے پاس نہیں تھا اور میری بے یقینی تجزیر کی طرح سچے میں اتر رہی تھی۔ برف کی طرح حواس پہ بھرا رہی تھی۔ لاہور کی خوشبو میری نرس نرس میں رچا چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب یہاں میری جڑیں بہت گہری ہو چکی تھیں۔ یہاں کے کھل کپے ہر لمحے گہرا میرے لیے بازو پھیلائے رکھتے تھے لیکن اب جیسے کوئی بادیدہ ہاتھ اس شہر سے مثال سے میرا رشتہ کاٹنے پر مہل ہوا تھا۔ وہ دوسری ہاتھ اشتیاقی کمرہ گھنٹاؤں سے اور سناٹا ہوتے ہیں جو ان شہروں سے انسانوں کا رشتہ کاٹ دینے میں لگے رہتے ہیں جہاں ان کی جڑیں گہری ہو چکی ہوتی ہیں۔

لاہور کے مقابلے میں کراچی کیس بڑا شہر تھا۔ زیادہ بڑا کاروباری مرکز تھا۔ بندر گاہ، انٹر نیشنل ایئر پورٹ اور بینکوں کے صدور دفاتر وہیں تھے۔ اس کے باوجود میں نے اپنا ہیڈ آفس لاہور میں بنایا تھا حالانکہ بظاہر میرا اس شہر سے کوئی رشتہ بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے انتخابی بوداں بھی بننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر قسمت میں ہوا تو ضرور دوبارہ لاہور آؤں گا۔ دوستوں کے درمیان رہوں گا۔ محبت کرنے والوں سے مجلس رہے گی۔ پھر وہی شب و روز ہوں گے پھر وہی محفل آرائیاں ہوں گی۔ میری یہ سزا مستقل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ میں راستی پر تھا۔ دلی کی محبت میں یہ تکالیف اٹھا رہا تھا۔ نادانی کا زمانہ ہوتا تو شاید میں بک چکا ہوتا۔ بد خواہوں کے ہمدردی میں آپکا ہوتا۔ میں کی بھٹکا کہ میں لوگوں پر عسکرانی کی طاقت حاصل کر رہا ہوں، بیش و آرام اور دولت کے اعتبار میرا مقدر ہوں گے لیکن درحقیقت میں ان طاقتوں کی کٹھ پتلی ہوتا جن کے چنگل میں ایک بار پھنسنے کے بعد کوئی نکل نہیں سکتا۔ ملکوں کے سربراہ بن جانے کے بعد بھی لوگ ان کے قبضے سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ جو آزاد ہونے کی کوشش کرتے تھے وہ مارے جاتے تھے۔

اب میں نادانیوں کے دور سے کل آیا تھا اس لیے اس شہر سے چال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دولت اور طاقت کی ہوس نے مجھے اپنا غلام نہیں بنایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی بات مان کر بھی مجھے چین کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی تھی تو پھر خواہ مخواہ اپنے ساتھ پوری قوم کو مروانے اور پورے ملک کے نگلے میں غلامی کا طوق ڈھلوانے کا کیا ناکہ تھا؟

میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ میری یہ تکالیف عارضی ہوں گی بلکہ اگر میں اپنی اصلیت کو یاد رکھوں تو یہ تکالیف مجھے تکالیف بھی محسوس نہیں ہوں گی۔ میرے ملک کے اسی فیصد لوگ انہی حالات میں زندگی گزار رہے تھے جن کے دائرے میں میں قدم رکھ رہا تھا۔

مجھے اگر اس ٹرین میں بیٹھنے کی جگہ میسر نہیں تھی ہاتھ دھو کر خود کو صاف کر کے اپنے اوپر موجود مہنت کشوں کے پسینے کی بو

محسوس ہو رہی تھی، ہر چیز گندی گندی لگ رہی تھی اور ناگواری کا احساس دلا رہی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے برسوں بعد ان چیزوں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ ورنہ میرے لاکھوں ہم وطن تو اب بھی روزانہ انہی حالات سے گزر رہے تھے۔ وہ انہی "مسکوتوں" کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ انہی آسائشوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور وہ سب بھی میری ہی طرح انسان تھے مگر مسئلہ کیا ہے کہ ہمیں صرف اس بے آرامی کا پتا چلتا ہے جو ہمیں خود اٹھالی پڑتی ہے۔ ہماری نظر میں تکلیف صرف وہی ہوتی ہے جو ہمیں خود اٹھالی پڑتی ہے۔ دوسرے کس جنم میں مل رہے ہیں اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔

میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ میرے لیے اچھا ہی ہے مجھے ان اتنی فیصد لوگوں میں واپس آنے کا موقع مل رہا تھا جو اس ملک کی اصل بنیاد تھے۔ مجھے اب زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع مل سکتا تھا۔ شاید گم نامی اور بے وقوفی میں میرے لیے امان اور عافیت تھی۔ اگر میں ایک حقیر قطرے کی طرح اس سمندر میں گم ہو جاتا تو شاید ریڈ واٹ کو مجھے تلاش کرنے اور کوئی اہمیت دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔

ٹرین کو لاہور سے روانہ ہونے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ آبادی کے آثار بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ دونوں طرف سرسبز کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ شام کا اندھیرا گر رہا تھا۔ میرے آس پاس کھڑے ہوئے تیلوں مو ٹھک ہار کر ابھر کر اٹھ کر چلے جاکر بیٹھ چکے تھے۔ میں ابھی سٹون کی طرح دواڑے ہی کے پاس کڑا کڑا تھا۔ کھلے دواڑے سے بے تحاشا سٹنی آنے لگی تھی اس لیے سارے مسافروں کی درخواست پر میں نے دواڑہ بند کر دیا تھا اور اسی کے قریب کونے میں سکو سٹ کر کڑا ہوا گیا تھا۔

میں زندگی کو قریب سے دیکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ زندگی جلد ہی خود میرے قریب آگئی۔ وہ ٹھٹ پٹیکر کے روپ میں آئی تھی۔ راستے میں بیٹھے ہوئے تیلوں مردوں اور سیاہ ظام سی عورت نے بس کا تعلق غالباً تھپا کر سے تھا ٹھٹ و کھٹا دیے تو پٹیکر میرے قریب آگیا۔

وہ اچھا خاصا عمر مرسدہ اور بھاری بھر کم تھا۔ شاید ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ اس کے گول شول سے چہرے پر مسکینی سی طاری تھی۔ ناک پہ موٹی سی عینک لگی ہوئی تھی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میرے پاس ٹھٹ نہیں تھا تو اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ذرا چمک اور مسکین چہرے پر کچھ تازگی آگئی۔

"کیوں نہیں ہے ٹھٹ؟" اس نے میرا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے پتلی آواز میں پوچھا۔

"میں جی۔۔۔ ذرا جلدی میں سوار ہوا تھا۔ ٹھٹ نہیں لے سکا۔ ٹرین ٹھٹ لگی تھی بڑی مشکل سے پکڑی ہے۔ آپ ٹھٹ بنا دیں۔" میں اپنا لہجہ کسی سادہ لوح مگر فیہ دار دستانی کا سار کھنے کی کوشش

کر رہا تھا۔

”گت تو اب جہانے کے ساتھ بنے گا بر خوردار!“ اس نے سر ہلایا۔

زین روانہ ہونے کے بعد سے اس جے میں بیٹھے والا وہ پہلا ہی چکر تھا۔ لیکن میں نے اس سے بحث نہیں کی کہ گت جہانے کے ساتھ کیوں بنے گا۔ میں نے زنی سے کہا ”جہانے کے ساتھ ہی ہمارے بیٹے۔“

”ادھر آؤ میرے ساتھ!“ اس نے حکم دیا اور میں سعادت مند سے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ بٹیاں روشن ہو چکی تھیں۔ کہیں کہیں سیڑیوں پر فٹن کپڑے پہن چکے تھے۔ بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چکر مجھے اس درمیانی سرگ تھاراستے میں لے آیا۔ جس کے درپے یونیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے پیروں تلے آہنی تختے چل رہے تھے۔ وہ میرے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ”اس میں کیا ہے؟“

میں نے تھیلہ اس کے سامنے اونچا کرتے ہوئے کھول کر دکھادیا۔

”وہ۔۔۔ یہ تو گڈے (پاز) ہیں۔“ وہ قدرے باؤسی سے بولا۔ ”آپ کو کیا اعدوں کی تلاش تھی؟“ میں نے مصمویت سے پوچھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس شخص کو معلوم ہو جائے اس تھیلے سے تھیلے کی۔ میں چند لاکھ روپیہ پرا تھا تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں تو یونانی ذرا چمک کر رہا تھا۔ آج کل تخریب کاری بہت ہو رہی ہے۔ تانہ زینوں میں بھی ہو رہی ہے۔“ وہ جلدی سے بولا ”ہمیں اوپر سے اندر ملے کہ کوئی مشکوک چیز نظر آنے تو اس کی ذرا تلاش ہی لیا کریں یا پولیس کو خبر دیا کریں۔“

پھر وہ جب سے واپس چمک ٹکاٹے ہوئے بولا ”گماں کا گت بنانا ہے؟“

”کراچی کا“ میں نے جواب دیا۔ حالانکہ مجھے کراچی میں جانا تھا۔ میں ایسے کسی شہر نہیں جانا چاہتا تھا جہاں میری سوجوگی کا امکان محسوس کیا جاسکتا تھا۔ میں کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں میری سوجوگی کا کسی کو گماں بھی نہ گذرے۔ لیکن ایسی جگہ کون سی ہو سکتی تھی؟ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھا۔ گت بہر حال آخری شیشیں ہی کا لے لیتا ہوتا تھا۔

اس نے بھی رقم کا گت بنایا۔ اسی جہانہ مجھ پر ڈالا جو یقیناً اس کی اپنی جیب میں جا رہا تھا کیونکہ اس کا کہیں اندراج نہیں تھا۔ لیکن میں چرنگ اس وقت ایک سیدھا سادا ان پڑھ دیہاتی تھا اس لیے زیادہ سمجھداری کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ میری جیب میں اخراجات کے لیے معقول رقم موجود تھی۔ میں نے چند نوٹ نکالے اور ادا کی گئی۔

جب وہ بنور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”کیا کام کرتے ہو؟“ مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اپنے بیروپ کے ساتھ کچھ انصاف نہیں کر رہا تھا۔ اگر میں ایک سیدھا سادا عمر فریب دیہاتی تھا تو مجھے اتنی فراخ دلی اور بے پروائی سے خرچ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بے چون و چرا کوئی ادائیگی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ خواہ مخواہ کسی کی نظر میں نمایاں ہونے یا مشکوک نظر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے ہر خرچ پر چوں چوں کرنا چاہیے تھا۔

میں نے جلدی سے کہا ”گجر ہوں باؤمی! لاہور میں مجھ (بھینس) چھ کر گیا ہوں۔ کراچی ذرا اپنے بھائی کے پاس جا رہا ہوں۔“ میں نے اپنی جیب میں رقم کی سوجوگی کا جواز گھڑایا۔ چکر پر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”سبا سفر بے گڈے کھڑے یا فرش پر بیٹھ کر کس طرح کو گے؟ اگر تم ایک سو کا پلپا (نوٹ) مجھے اور لگاؤ تو میں تمہیں سیٹ دے سکتا ہوں۔“

ابھی تک مجھے کہیں کوئی سیٹ خالی نظر نہیں آئی تھی لیکن مجھے معلوم تھا سرکاری لوگ بڑے باکمال ہوتے ہیں۔ جب چاہیں سوجو کو ناموجود اور ناموجود کو موجود بنا سکتے ہیں۔ اگر میں ایک لمبے لمبے اپنے طرز عمل کے بارے میں پوچھنا نہ ہو گیا ہوتا تو فوراً سو کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ میری نظر میں سو روپے بھی جبری رقم ہی تھی لیکن میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا ”سو کا پلپا؟ کمال کرتے ہیں باؤمی آپ! اگر مجھ چھ کریں چار پیسے لے لی آیا ہوں تو اس کا یہ سبیل تو نہیں ہے کہ آپ مجھے راستے میں ہی لوٹ لیں۔ کوئی جائزہ ہی بتائیں۔“

اس سے پہلے مجھے یہ الفاظ سن کر بھی اتنی حیرت کہ رشوت میں بھی کچھ رقم جائز اور کچھ ”نام جائز“ ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت میں نے خود نمائیت سمجھ گئی تھی ”جائز“ کا لفظ استعمال کیا تھا اور سو کے نوٹ کے مقابلے پر اس طرح آنکھیں پھیلائی تھیں جیسے میری جان ہی نکل گئی ہو۔ وہ زمانہ فی الحال میرے لیے ایک بھولتا ہوا خواب تھا جب چار آنچہ آنے کے لیے بھی اسی طرح ہماری جان نکل جایا کرتی تھی۔

سو روپے سے شروع ہونے والا سودا آخر کار میں روپے پر طے پایا اور میں خود اپنی اس سودے بازی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہا۔ چکر نے جلدی سے میرے ٹکٹ پر ایک نمبر ڈالا اور مجھے ساتھ لے کر دو سرے ڈبے میں چلا گیا۔ کھڑکی کے قریب ایک سیٹ پر ایک نوجوان بڑے آرام سے بیٹھا ہر آرمی میں جھانک رہا تھا اور غالباً کوئی ٹھکانہ دکھائی نہ دینے کے بارے میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ بھی دیہاتی معلوم ہوا تھا۔

”خجہ بھی! تم کیا یہاں لاٹ صاحب کی طرح بیٹھے ہو۔“ چکر نے تیزی سے کہا۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”یہ شریف آدمی بے چارہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے دیکھ کھا رہا ہے۔ تمہنوں سے اپنی سیٹ تلاش کر رہا ہے۔ کوئی اس کو بتائی نہیں رہا۔“

و اس اسی جگہ قایم رہا۔ اس سے کٹ چکر مجھے لے کر روانہ ہوا تھا۔  
روانے کے قریب اس اندھیرے گھٹ میں میری جگہ خالی تھی۔  
میں اپنا تھلا سنبھال کر دیوار سے ٹیک لگا کر اطمینان  
سے فرش پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے اس تجربے نے ہی مجھے عوامی  
زندگی کے قریب لانا شروع کر دیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اپنے  
سفر کے اختتام تک ہی میں مکمل طور پر ایک عام آدمی بن چکا ہوں  
گا۔ ہر سانچے میں جلد ڈھل جانے کی میری عادت نے یقیناً ابھی  
میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

خانوالہ کے اسٹیشن پر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں  
کی دیکھا دیکھی پلیٹ فارم پر پھرتے ہوئے ایک ٹیبلے سے ہاتھ  
بکڑے لیے۔ اتنے تو نہیں گئے لیکن مجھے امید تھی کہ دو چار دن  
میں اس قسم کی چیزیں اچھی لگنے لگیں گی۔

زین خانوالہ سے روانہ ہوئی تو بیشتر مسافروں نے کھانا کھا لیا  
تھا اور اوروں نے گئے تھے رات کے گیارہ بجے تک ڈبے میں خاموشی  
چھا چکی تھی۔ زین کی اپنی گڑگڑاہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی  
نہیں دے رہی تھی۔ کسی کوئی میں کوئی شیرخوار بچہ البتہ اوں  
اواں کر رہا تھا لیکن نیست تھا کہ جلد ہی چپ ہو جاتا تھا۔ زین  
اس وقت کسی تاریک دیرانے سے گزر رہی تھی۔

اچانک ہی زین کی رفتار کم ہونے لگی "ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک"  
کی وہ آوازیں جن سے انہیں کے زور و شور کا اندازہ ہوتا ہے یکدم  
ہی کمزور پڑ گئیں۔ حالات ایسے نہ ہوں اور ٹرینوں کے بارے میں  
آئے دن کوئی نہ کوئی بری خبر سننے میں آتی ہو "ایسے میں رات گئے  
ایک دیرانے میں زین کی رفتار یکدم کم ہو جانا بہت سے مسافروں کو  
چوڑھانے کا سبب بن جاتا ہے۔

جو مسافر زیادہ فوجوں میں نہیں تھے، یکدم سیدھے ہو کر چپ  
گئے۔ کوئی بہ آواز بلند خود کلائی کے سے انداز میں بول اٹھا "خیر تو  
ہے یہ زین ایک دم رکتے کیوں لگی ہے؟"

"شاید کسی نے زنجیر کھینچ دی ہے۔" کسی نے خیال ظاہر کیا۔  
سنبھل کر اٹھ بیٹھے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔

"بھئی۔ کوئی ذرا باہر تھاک کر تو کیجیو۔ ڈاکو تو نہیں آئے؟"

کوئی سہے ہوئے لمحے میں بولا۔  
"خدا کا نام لو بھائی، کوئی اچھی بات منہ سے نکالو۔" دھڑکی اور  
بکڑی والا ایک شخص بکڑی سنبھالتے ہوئے بولا۔

ایک گوشے سے رائے کا اظہار ہوا "سندھ میں ڈاکوؤں کا  
زیادہ زور ہے۔ ابھی تو ہم پنجاب ہی کے علاقے میں ہیں۔"

ایک بارش بزرگ جل کر بولے "ادھر کوئی سی کی ہے  
ڈاکوؤں کی۔ ڈاکوؤں کے معاملے میں تو ہم بھی خود کفیل ہیں۔ بلکہ  
جو ادھر سے بھاگتے ہیں وہ بھی اُدھر ہی آ جاتے ہیں۔ تو ذرا بہت سی  
فرق ہو گا۔"

زین کی رفتار اب بہت کم ہو گئی تھی۔ سبیل والے حصے میں

اور تم بغیر ریزرویشن کے ہی اس پر چڑھے ہو کر بیٹھے ہو۔"  
وہ نوجوان بادل خواست اٹھ کھڑا ہوا اور سیٹ کے پیچھے سے  
اپنا ساخوردہ سا بیگ نکال کر کچھ درد و دیوار کے سارے لگ کر کھڑا  
ہو گیا۔ کٹ چکر نے اب اس ڈبے میں کٹ چیک کرنا شروع  
کے لیے۔

میں اس سیٹ پر بیٹھ گیا لیکن مجھے وہاں سکون کا احساس نہ  
ہو سکا۔ میں بظاہر کمزور سے باہر دیکھ رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ  
نوجوان کی نفرت بھری نظرس مجھ پر لگی ہوئی تھی۔ جب میں اس  
کی طرف دیکھا تو وہ نظریں الٹا۔ اسے یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ سیٹ  
چیک کرنے بھا کر رکھی ہوئی تھی اور بعد میں مجھے دی تھی۔

حالانکہ اس سیٹ پر حق اس کا بھی نہیں تھا لیکن وہاں سے  
اٹھائے جانے پر وہ کتنا غصہ اور کتنی نفرت محسوس کر رہا تھا اس پر  
مجھے حیرت تھی۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ چند منٹوں کے سفر کا  
معاملہ تھا جب رشوت اور سفارش کے ذریعے کوئی زندگی بھر کے  
لیے کسی کی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہو گا اور محروم نہ جانے والے کی ایک  
عمر کی محنت برباد ہو جاتی ہوگی تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی! اس  
کے غم و غصے کا کیا عالم ہوتا ہو گا؟ اس اذیت سے گزرنے والے اور  
اس طرح کے قماشے دیکھنے والے نوجوان ہی ظاہر ہے سیاست کار  
مگر چھپوں کی بھڑکائی ہوئی آنک کے لیے بہترین ایجنڈا کا کام دیتے  
تھے۔ وہ یقیناً اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو چھوٹ ڈالنے کے لیے  
تیار رہتے ہوں گے۔

آخر کار میں نہ نہ سکا اٹھ کر اس نوجوان کے قریب پہنچا اور  
اس کا کندھا چھتے ہوئے غصائی میں کہا "جاؤ بھائی، لوہیں بیٹھ جاؤ دل  
برانہ کرو۔"

وہ کچھ جھل سا ہو گیا۔ سنبھل کر بولا "نہیں جی آپ بیٹھیں آپ  
کی سیٹ ہے۔ میں نے تو دل برا نہیں کیا۔ میری ریزرویشن نہیں  
ہے۔ میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ چکر پھر آکر اٹھاؤ گے گا۔"

"نہیں اب تو میں جس میں وہ سیٹ تختہ چھڑا کر رہا ہوں۔ جب  
میں ہی جس میں اٹھاؤں گا تو کوئی اور کس طرح اٹھائے گا۔"  
میں نے کہا۔

"نہیں جی آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" وہ واقعی شرمندہ  
نظر آ رہا تھا۔

"نہیں یا شرمندہ تو میں ہو رہا ہوں کسی سے چھین کر تو اپنا  
حق لینا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔ ہتھکڑی غصائی میں سی  
جاملی تھی لیکن میں کوشش کر رہا تھا کہ دوسرے لوگ ہماری طرف  
توجہ نہ ہونے پائیں۔

"لیکن پھر آپ کہاں بیٹھیں گے؟" وہ بولا۔

"میں کوئی بندوبست کر لوں گا۔" میں نے اسے سیٹ پر بٹھائی  
دا اور جب میں نے محسوس کیا کہ کسی مسافر عجیب سی نظروں سے  
میری طرف دیکھ رہے تھے میں اس ڈبے میں مزید نہیں ٹھہرا اور



کی بھی مجھے سہلت نہیں مل سکی۔ وہ سیدھا ہو گیا اور اس کی مجھ پر نظر نہ لگے۔ میرے دونوں ہاتھ ابھی دروازے کے ڈنڈوں پر ہی تھے جبکہ اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔

اس گن پر مجھے دو درجن نمائندگی تیز بھی نصب دکھائی دی جس میں گھڑی کے ڈائل سے ذرا بڑی کوئی چیز نی دی اسکرین کی طرح روشن تھی۔ کچھ ورکے سے انداز میں اس پر کچھ ہند سے تیزی سے چل بھر رہے تھے۔

چاہتا تو میں کیا تھا کہ اندھیرے میں نہایت خاموشی سے کسی طرف کو کھسک جاؤں۔ ابھی شاید وہ شیطان کی آنت کی طرح لمبی اس زین کو پوری طرح کوڑ نہیں کپائے تھے مجھے اگر کسی سے الجھنا پڑ جائے تو چند لمحوں میں دوسروں کے بھی میری طرف متوجہ ہو جائے گا امکان تھا۔

اپنے شکار کو تلاش کرنے کی مہم پر اس وقت وہاں نہ جانے کتنے افراد موجود تھے، مجھے ان کی تعداد کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور تھا کہ اگر وہ سب کے سب بیک وقت میری طرف متوجہ ہو جائے تو پھر میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اب یوں مشکوک انداز میں ڈبے سے اترے ہوئے اس بیولے کی نظر میں آجانے کے بعد بھی میرے خاموشی سے نکل جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔

یہ سب کچھ میں نے شاید ایک سیکنڈ میں سوچا ہو گا۔ بیولا گن سیدھی کرنے لگی تھا کہ میں نے ٹیب میں چھلانگ لگانے کے بجائے اُچی پر چھلانگ لگادی۔ میری پٹنڈی سے نیام تو اب بھی بندھی ہوئی تھی اور اس میں خنجر بھی موجود تھا لیکن اسے لگانے کی خاطر ہے فوٹ نہیں آسکی تھی۔

وہ بیولا بھی ڈاکوؤں ہی والے طے میں تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگاتے وقت ہی بازو کے ٹکے میں اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی تھی تاکہ ایک تودہ کوئی آواز نہ نکال سکے۔ دوسرے میں اس پر اپنا مخصوص واؤ آزما سکوں۔

میں اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ ٹیبیت تھا کہ وہ کوئی عام ہی آدمی معلوم ہوا تھا۔ تقریاً لاوے والے کی طرح کسی ناقابل شکست خولی میں بند نہیں تھا۔ اس کی گردن میرے بازو کے ٹکے میں تو آگئی لیکن میں فوری طور پر گردن توڑنے والا واؤ نہیں لگاسکا کیونکہ ہم دونوں ہی ٹیب میں لڑھکتے چلے گئے تھے۔

مگر اس دوران وہ ایک بار اپنی گن کا ٹریگر دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ گن تقریباً کلاشکوف جتنی تھی۔ وہ اس کا رخ میری طرف تو نہیں کر سکا تھا لیکن اس وقت گن کا استعمال ہوا جانا ہی میرے حق میں خطرناک تھا۔

فائر ہوتے وقت گن کا رخ ٹرین کی چھت کی طرف ہو گیا تھا۔ فائر کی نہ تو کوئی آواز آئی اور نہ ہی گولیاں برآمد ہوئیں بلکہ الیکٹریک ریجنگ کے دوران اسپارک سے جو چمکیلی نئی روشنی پیدا

رہی تھی۔ چند لمبے تک میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ شاید میں ریڈ ڈاٹ والوں کو کل دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں لیکن اب اس تصور سے میرا دل بیٹھنے لگا تھا کہ یہ محض میری خوش فہمی تھی۔ انہوں نے میرے اندازوں سے کہیں پہلے مجھے تقریباً اچھوٹ نکالا تھا۔ ان کے پاس گویا ہر طرح کی تیاریوں کے ساتھ کسی بھی علاقے میں پہنچنے اور کسی بھی قسم کا رد مار جانے کے انتظامات مکمل رہتے تھے۔ شاید اسی خود اعتمادی کی وجہ سے وہ مجھے کہیں بھی اطمینان سے چھوڑ کر چل دیتے تھے کہ یہ تو گھڑے کی چمچلی ہے جب چاہیں گے ہاتھ ڈال کر پکڑ لیں گے۔

تینوں سیاہ پوش ڈبے کے پرلے سرے سے ایک ایک مسافر کا چہرہ بخور دیکھتے آ رہے تھے۔ انہوں نے نہ تو کسی مسافر کے سامان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا اور نہ ہی کسی عورت پر کا زور اتار دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت تھا کہ وہ ڈاکو نہیں تھے۔ وہ ڈاکوؤں کا ہیروپ ضرور بن کر آئے تھے لیکن اس کے نشانے پورے نہیں کر رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے ڈاکوؤں والی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے اس دیرانے میں میں رات کے اس پہر بغیر کسی سوار کی کہاں جاؤں گا اور کس طرح جاؤں گا لیکن اس زین سے اتر جانا بہر حال ضروری ہو گیا تھا۔ میرا تو نہ جانے کیا انجام ہوتا تھا لیکن ٹرین میں میری موجودگی کی وجہ سے نہ جانے کتنے بے قصور مسافروں کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

میں نے نہایت آہستگی سے دوبارہ دروازہ کھولا۔ اس کے ساتھ ہی میرے قریب بیٹھے فرخوان نے حیرت سے منہ کھولا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔ دوسرے دروازے کی طرف بیٹھے ہوئے دو آدمی اور تھری عورت بھی پہنچی پہنچی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں اسی حال میں چھوڑا۔ اپنے تیلے کو گرہ لگائی اور اسے دانوں سے پکڑ کر لٹکاتے ہوئے دونوں ہاتھ خالی رکھ کر باہر نکل گیا۔

ٹرین گویا خاصی بلندی پر کھڑی تھی۔ پڑیاں دراصل زمین کے لیول سے اونچی تیار کی گئی ایک پٹی پر بھیجی ہوئی تھیں۔ ٹرین کے دونوں طرف نامناسب ٹیب تھا۔ میرا پاس ابھی دوسرے پائیدار پر ہی تھا کہ ایک بیولا گن میں میرے پیروں کے نیچے سے نکل آیا۔

وہ ٹرین کے نیچے ہی اس جگہ سے پڑیاں میور کر کے آیا تھا جہاں دو ڈبے پیروں کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔ جس دروازے سے میں اتر رہا تھا وہ ڈبے کے ایک سرے پر ہی تھا اور دوسرے قریب ہی تھے لیکن اس بیولے کا اچانک برآمد ہونا مجھے کچھ ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ میرے پیروں تلے سے نکل آیا ہو۔

وہ کوئی کی سی حالت میں تھا۔ اس کی نظر سے بچتے ہوئے میں ٹیب میں چھلانگ بھی نہیں لگا سکا تھا اور ڈبے میں واپس چڑھنے

نے سڑک عبور کر لی اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ لیکن کچھ دور تک بھاگنے کے بعد میں نے رخ بدل لیا اور جنگل ہی میں رہے ہوئے سڑک کے ستوازی دوڑنے لگا۔ جنگل میں تاریکی اور بھی گہری تھی۔ درختوں کے پوے بھی مشکل سے نظر آ رہے تھے اس لیے میرے دوڑنے کی رفتار خاصی کم ہو گئی تھی۔ اگر پرانے تجربات اور کچھ خدا داؤ غیر معمولی صلاحیتیں کام نہ آ رہی ہوتیں تو اس رفتار سے بھی دوڑنا ممکن نہیں تھا۔

میں سڑک کے ستوازی اسی سمت میں دوڑ رہا تھا جس طرف کچھ دیر پہلے تک ٹرین چل رہی تھی۔ جلد ہی میں رکی ہوئی ٹرین تو کافی پیچھے چھوڑ گیا تھا لیکن بدستور دوڑتا رہا۔ یہ میرے حوصلے اور طاقت کے ساتھ ساتھ میرے پیچھے پھڑوں کی بھی آزمائش کی رات تھی۔ جنگل میں رہتے ہوئے بھی مجھے بعض دھندلی دھندلی زندگی لکھوؤں وغیرہ سے اندازہ ہوا تھا کہ ٹرین کہاں کھڑی تھی اس کے انجن کی ہیڈ لائٹ بھی آف کی جا چکی تھی۔

تاریکی میں اس پر اسرار انداز میں دوڑنے میں کھڑی اس ٹرین کے مسافروں کے تاثرات اس وقت نہ جانے کیا تھے۔ ابھی تک سڑک پر یا اس پاس دوڑنے میں کیسی پہل کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ حالانکہ میرا خیال تھا میں مجبوراً جس انداز میں اس سیاہ پوش کی گردن توڑ کر بھاگا تھا اور وہ ایک بار اپنی گمن کار بیکر بھی دبا چکا تھا اس سے گویا وہاں میری موجودگی کا اعلان ہو گیا تھا۔

کسی عام سے مسافر کے اس طرح وہاں سے نکل بھاگنے اور اس طرح شہاقت انداز میں غائب ہوجانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں یقیناً میری نفل و حرکت کا اندازہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ابھی تک اور ڈر و ہر پہل کر میری تلاش شروع نہیں کی تھی۔ کیا وہ ابھی تک ٹرین ہی کو چنے ہوئے تھے؟ یا کسی مجھے تلاش کر رہے تھے؟ کیا ان سے اندازے کی کوئی غلطی سرزد ہو رہی تھی؟

مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ تاہم ایک بات کا مجھے کسی حد تک اندازہ تھا۔ وہ غالباً یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے آڑے ہوئے کارندے ٹرین کے مسافروں کی نظر میں نہ آئیں۔ وہ ٹرین پر ڈاکوؤں ہی کی پلکار کا تاثر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے شروع ہی سے محسوس کیا کہ وہ اپنی کوئی غیر معمولی چیز یا سائنسی شعبہ یا زیاں عام لوگوں کی نظر میں لانے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ وہ ایسی کسی بھی چیز کو کسی عام سی جگہ پر صرف مجبوراً یا پھر کسی مصلحت کے تحت استعمال کرتے تھے۔

میں انہی سوچوں میں غلام و بچاؤ دوڑتا رہا حتیٰ کہ ٹرین کی موجودگی کے وہ خفیف سے آثار جو مجھے دور سے نظر آ رہے تھے۔ تمام ہوتے ہوتے آخر کار غائب ہو گئے۔ پیچھے پھڑوں اور ہاتھوں نے میرا ہمت ساتھ دیا تھا۔ اب جا کر سانس ذرا چھوٹے لگی تھی اور جسم پہنے میں بیگ چکا تھا۔ میں نے رفتار کم کر لی اور جو ٹنگ کے انداز

ہوئی ہے گمن کی نال سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کی ایک دھکی ہی ٹیم ایک ٹائیپ کے لیے لگی اور آہنی ڈبے کی چھت اور دیوار کے جوڑ پر سے ایک بہت بڑے حصے کے پر پٹے آ گئے۔

روشنی کی بیم پر آمد ہونے کا تو محض ایک جھماکا سا ہوا تھا اور معدوم ہو گیا تھا لیکن ڈبے کے کچھ حصے کے پر پٹے آؤنے کی اچھی خاصی آواز بڑا ہوا تھی۔ مجھے یہ دیکھنے کی مصلحت نہیں مل سکی کہ اس آواز کا کیا اثر عمل ہوا تھا البتہ میں نے اسے دوبارہ ٹھیکہ دبانے کا موقع نہیں دیا۔

ایک ہاتھ سے میں اس کا بازو اس طرح مروچکا تھا کہ گمن اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ ہم جب لڑھکتے لڑھکتے رکے تو وہ بیٹھ کے لیے ساکت ہو چکا تھا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

میں وہاں ایک لمبے کے لیے بھی رکنا نہیں چاہتا تھا۔ تیزی سے اسے ایک طرف دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کی گن لے کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ کار آمد چیز معلوم ہوتی تھی لیکن یہ حسرتی سے وہ مجھے فوری طور پر نظر نہ آ سکی۔ نہ جانے کہاں جا رہی تھی۔ البتہ میرا تھپلا جو میرے اس شخص پر چھلا گیا تھا وہ میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ مجھے قریب ہی پڑا نظر آ گیا۔ میں نے بیٹھ کر اسے اٹھایا اور گویا اس کے تمام ریکاڈز ڈوڑنے کے لیے دوڑ پڑا۔

ٹرین میں سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک طرف تقریباً ایک فلائنگ کے فاصلے پر ریلوے لائن کے ستوازی ایک سڑک بھی جا رہی تھی۔ سڑک کے برقی طرف جنگل پھیلا ہوا تھا۔ سڑک پر بھی کھار کسی سڑک یا گاڑی کی ہیڈ لائٹس حرکت کرتی دکھائی دے جاتی تھیں۔

میں اندر سے میں اندازاً اسی سڑک کی طرف بھاگ رہا تھا مجھے اگر ایک روٹ چھوڑنا پڑا تھا تو دور سے روٹ کے آس پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ سب سے آخس کے بغیر جو کسی منہ آخرا جنگل یا دیوانے میں بھٹکا میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ کلمے آسمان تلے دوڑتے بھاگتے ہوئے میں تاریکی کے باوجود فکری لبلاوے والوں کی نظریں آسکتا تھا جو غالباً اپنی پشت پر بندھی ہوئی مختصر سی مشینری کی وجہ سے اور دھڑاڑتے پھرتے تھے۔

ذرا دور نکل آنے کے بعد میں نے سڑک دیکھا۔ مجھے اس جگہ کچھ نفل و حرکت اور ذرا روشنی نظر آئی جہاں میں سیاہ پوش کو ہلاک کر کے پھینک آیا تھا اور جہاں بوکی کے بالائی کنارے کے پر پٹے بھی آڑے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس طرف ان لوگوں کی توجہ مبذول ہو چکی تھی۔

کوئی ہمید نہیں تھا انہیں یہ انداز بھی ہو چکا ہو کہ بھاگنے والا کس سمت میں بھاگا تھا۔ ٹرینوں کے آس پاس کچھ دور تک زمین نرم ہی تھی۔ اگر کسی کو پیروں کے نشانات دیکھنے کی فرصت ہوئی تو کچھ نہ کچھ اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

میں نے کچھ اور تیزی سے دوڑنے کی کوشش کی۔ جلد ہی میں

بروقت ایک گمن کی نالی برآمد ہوئے دیکھ لی۔

اس کے باوجود شاید میں اسے ٹرک والوں کی اشتعالی اقدام سمجھ کر وہیں جم کر رہتا لیکن اندر سے اچانک ہی گویا کسی آواز نے خبردار کیا اور میں نے یکدم ہی خست کی طرف چلا نکلا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جی تو ٹرک پر میری جگہ گولیوں سے چھلنی ایک لاش پڑی ہوتی۔ کب کی چھت سے ایک زوردار برست آیا تھا۔ آواز اٹھیں گمن کی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی بڑی ہی ستم طریق ہوئی کہ ریڈ وائٹ والوں سے تو میں بچ کر نکل گیا تھا لیکن ان نامعلوم ٹرک والوں کے ہاتھوں مارا جاتا جن سے میرے خیال میں تو میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔

دوسرا برست اندھیرے میں اسی جگہ آیا جہاں میں نے چلا نکلا تھا لیکن اس قسم کی صورت حال میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں چلا نکلا گئے کے فوراً بعد وہ جگہ بھی چھوڑ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹرک کرنے والے کو خواہ مخواہ نظر نہ آئے لیکن اس کی گمن اندازاً اپنے شکار کا تعاقب کرتی ہے۔

دوسرے برست کے بعد میں نے ڈرائیور کو دوبارہ کھول کر اپنی سیٹ سے چلا نکلا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گمن تھی۔ وہ تیزی سے ٹرک کی آڑ میں ہو گیا۔ کب کی چھت پر جو گن والا موجود تھا وہیں ساکت رہا۔ وہ گویا ایک عمدہ مورچے میں تھا۔ اسے وہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈرائیور نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں لیکن انہیں اشارت رہنے دیا تھا۔

میں اندھیرے میں پتھروں کی آوٹ میں متحرک رہا لیکن دوسرے برست کے بعد گمن خاموش ہی رہی کوئی کوئی میرے تعاقب میں نہیں آئی۔ انہیں یقیناً اب اندازہ نہیں رہا تھا کہ میں کہاں تھا۔

چند لمحے یہ سکوت برقرار رہا۔ صرف انہج کی ہلکی سی گھر گھر اہٹ سنائی دیتی رہی۔ پھر اس گھر گھر اہٹ کے پس منظر میں ایک بھاری گونجی اور پرجوش آواز ابھری "وے غانہ نراب ... ڈاکو کا جی ... سامنے آؤ۔ اپنے سب ساتھی کو بھی بلاؤ۔ ام تمہارا مقابلہ کرے گی۔ امارا نام شیر خان ہے۔ ام شیر کا جی ہے۔ تمہارا باپ سے بھی نہیں ڈرتی۔"

آواز ٹرک کے نیچے سے آئی محسوس ہوئی تھی۔ یقیناً ڈرائیور کی آواز تھی جسے میں نے کب سے کوکر ٹرک کی آڑ میں پناہ لینے دیکھا تھا۔ وہ بے دردی کی حد تک سادہ لوح معلوم ہوتا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی پرجوشی سے چلا نکلا کہ ٹرک کی آڑ میں تھی لیکن وہ کب کی غلا ساڑے کو داتا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس گمن ہوتی اور میں اسے مارنا چاہتا تو میرے لیے وہ شری موقع ہوتا۔ ایک سیکنڈ کے لیے وہ میرے مارگٹ پر رہا تھا اور میرے لیے وہ ایک سیکنڈ ہی کافی تھا۔

میں ایک گری سانس لے کر رہ گیا۔ بات میری سمجھ میں نہ تھی

میں دوڑنے لگا۔

درختوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور ندی میں نے جنگل سے باہر آنے کی کوشش کی تھی۔ سرک بھی اسی طرح متوازی چل رہی تھی۔ پھر اسی سوک پر مجھے اپنے عقب سے بہت دور دو ہیڈ لائٹس نمودار ہوئی دکھائی دیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں دوڑتا رہا اور سڑک ان کی طرف دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور ہوا کے دوش پر انہج کی آواز بھی سنائی دینے لگی جوئی اٹھال ہلکی سی سرسراہٹ سے مشابہ محسوس ہو رہی تھی۔ دھیرے دھیرے آواز ذرا واضح ہوئی تو مجھے اندازہ ہونے لگا کہ وہ کوئی ٹرک تھا۔

ٹرک اسی سمت میں آ رہا تھا جس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ میں جنگل میں تھا اور ست رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ وہ سرک پر تھا اور تیز رفتاری سے آ رہا تھا۔ درختوں کے درمیان سے کبھی اس کی لائٹس دکھائی دے جاتیں اور کبھی درخت درمیان میں جا کر رک جاتے تو نظر سے اوجھل ہو جاتیں۔

آخر کار مجھے گاڑی کی اپنی ہی روشنی میں اس کا رخ سمجھ گیا وہ بھی دکھائی دینے لگا۔ وہ واقعی ٹرک تھا۔ انہج کی گھر گھر اہٹ بھی اب ساٹ سنائی دے رہی تھی۔ رات کے ساٹسے میں ویران سڑک پر وہ خاصی تیز رفتاری سے چلا آ رہا تھا۔ اونچا سا دیسی ٹرک تھا جو عام طور پر بار برداری میں استعمال ہوتا ہے۔

میں نے اب سرک پہ نکل آنا ہی ہمت سمجھا۔ میں اس ٹرک میں لفٹ لینے کی کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ رات کو اس وقت اس دیرانے میں ایک انہجی کو سوک پر کڑے دیکھ کر ڈرائیور ٹرک نہیں روکے گا بلکہ اگر میں ٹرک کے مین سامنے بھی کھڑا ہو گیا تب بھی کچھ بعید نہیں کہ وہ مجھے پکڑتا ہو ہی گزر جائے یہاں کوں دیکھنے والا تھا۔

سوک کے کنارے قیاب میں کافی بڑے بڑے پتھر بڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے چار پانچ بڑے پتھر اٹھا کر سرک پر ایک قطار میں رکھ دیے اور اپنی دانست میں اس طرح روڈ بلاک کر کے پتھروں سے ذرا نیچے ہٹ کر سوک کے مین درمیان کھڑے ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔

ٹرک قریب آچکا تھا۔ رفتار بے حد کم ہو چکی تھی۔ ڈرائیور نے یقیناً پتھروں کو اور ان کے عقب میں مجھے بھی دیکھ لیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس ٹرک پر مجھے لفٹ مل جائے گی۔

وہ تو میری قسمت اچھی تھی جو بچ گیا ورنہ ٹرک پر لفٹ ملنے کے بجائے شاید ملک الموت نے مجھے اور لفٹ کر لیا ہوتا۔ معلوم نہیں وہ محض اتفاق تھا یا میری چھٹی جس کا کمال کہ بطور ٹرک کا جائزہ لینے ہوئے میری نظر کب کی چھت کی طرف چلی گئی۔ ٹرک کی





راستے میں دو تین دن مکان رکنا اسے۔ امارا گاڑی میں اس وقت انور لوڑا اسے۔ اس کو ام مکان میں اتارے گا۔ اور دو تین دن ٹھہرے گا۔ آم لوڑے کے پھر کراچی جائے گا۔ مکان میں تم امارے ساتھ ٹھہرو۔ ام تم کو عیش کرانے کا۔ مرضی پھلی کھلائے گا۔

”ہمت بہت شکریہ خان صاحب! زندگی میں کبھی موقع ملا تو ضرور آپ کی بیویاں کا شرف حاصل کروں گا۔“

”کیا حاصل کرے گی؟“ خان صاحب نے چونک کر میری بات کاٹے ہوئے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے آپ کا مہمان ضرور بنوں گا لیکن اس وقت نہیں فی الحال میرا جلدی کراچی پہنچنا ضروری ہے آپ مجھے مکان اتار دیجئے گا۔“ میں نے کہا۔

”نیک اسے نیک اے جیسا تمہارا مرضی۔“ خان صاحب نے بے پروائی سے ہاتھ پٹایا پھر ایک لمبے کی خاموشی کے بعد بولے ”اس روڈ پر توج کل ٹرک بس والا لوگ قافلہ بنا کر چلتی اسے صرف شیرخان اپنا ٹرک اکیلا چلاتی اسے۔ ام پروا نہیں کرتی۔ ام نے سوچ لیا اسے۔ جان مال۔ سب خدا کے ہاتھ میں اسے۔ جب ڈاکو مارو سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ یا ڈاکو نہیں یا ام نہیں۔۔۔ کیوں اقبال کو جڑ ام نیک بولا کر نکلا؟“

”بالکل ٹھیک ہے خان صاحب! آپ کے اور میرے خیالات تو بہت ملتے جلتے ہیں۔“ میں نے خمیدگی سے کہا۔ خان صاحب نے ایک کو نیچا اٹھ لکایا اور ٹرک کی رفتار کچھ اور بڑھادی۔ ٹرک کسی جوبوٹ کی طرح تاریکی اور شائے کا سینہ چرے جا رہا تھا۔

”تمہارا خیالات شیرخان سے ملتا اسے۔ اسی لیے تم بھی ڈاکوؤں سے بچ کے نکل آئی اسے اور شیرخان کو بھی آج تک ڈاکو سے پالا نہیں پڑا۔ یہ سب قسمت کا ٹھیک اسے۔“ پھر یکدم جیسے شیرخان کو کچھ خیال آیا۔ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا ”یارا یہ تو تباہ ترین پروا کو لوگ نے کوئی زیادتی میا دتی تو نہیں کیا؟ کسی کو قتل مل تو نہیں کیا؟ عورت یا بچہ لوگ پر ظلم تو نہیں کیا؟“

”میں میرے سامنے تو کچھ نہیں کیا بلکہ میرے سامنے تو مال بھی نہیں لوٹا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے انہیں کسی کی تلاش تھی۔“ میں نے بچ بولا۔

”ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“ شیرخان نے سہلایا ”ڈاکو لوگ کوئی نوا مرضی تلاش کرتی ہے انوار کے آداؤں وصول کرنے کے واسطے۔“

”ترین میں موٹی سرخیاں ذرا کم ہی ہوتی ہیں۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد شیرخان پُر خیال لمبے میں بولا ”مکان اب زیادہ دور نہیں اسے مکان پہنچ کر ام کو پھیس دینا کہ اس بات کی خبر کرنی چاہیے۔“

”میرا خیال ہے خبر تو پہنچ ہی ہوگی۔“ ترین میں ریلوے پولیسر

اسے ”خان صاحب نے اپنی اسٹین گن سے اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کب میں بٹھالیا۔ کھینچو وہاں کب کی چھت پر چلا گیا۔ ٹرک ایک بار پھر تیز رفتاری سے آگے روانہ ہو گیا۔ اسٹین گن میرے اور خان صاحب کے درمیان میٹ کے سارے کھڑی تھی خان صاحب بنیادی طور پر خوش مزاج معلوم ہوتے تھے اور اب ان کی خوش مزاجی لوٹ آئی تھی۔

وہ اپنا بھاری بھر کم ہاتھ میرے کندھے پر مارے ہوئے بولے ”ادب دارا تمہارا نام کیا ہے؟“

”اقبال چودھری۔“ دیکھنے یا دوست مجھے ہلا ٹھہر گئے ہیں۔ بیٹھنوں کی خرید و فروخت اور دودھ کا کام ہے میرا۔“ میں نے بتایا لیکن فیراوادی طور پر میرے لیے میں ملاکت اور شائستگی تھی جو بیٹھنوں اور دودھ کا کاروبار کرنے والوں کے لیے میں نہیں ہوتی بعض اوقات اگر ان کا موڈ ٹھیک نہ ہو تو ان کا بات کرنا کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے بیٹھن نے سیگک باروا ہو۔

”ہلا کو جڑ۔“ خان صاحب نے دہرایا پھر میں ہاتھ سے اسٹیرنگ وکیل سنبھال کر دایاں ہاتھ مصالنے کے لیے بڑھاتے ہوئے بولے ”امارا نام شیرخان ہے۔“

”وہ تو میں جان چکا ہوں۔“ میں نے مضبوطی سے مصالنے کرتے ہوئے کہا۔ خان صاحب کا ہاتھ ہماری بھر کم اور آہنی تھا۔

”یارا۔۔۔ اگر تم بے گناہ امارا ہاتھ سے یا امارا کھینچو ریشم خان کے ہاتھ سے مارا جاتی تو ام کو بہت افسوس ہوتا۔“ شیرخان نے گویا چند لمبے پہلے کی صورت حال کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

”میں خان صاحب! آپ کو بھلا افسوس کیوں ہوتا۔ آپ تو یہی سمجھ کر گاڑی بھگاتے چلے جاتے کہ آپ نے ایک ڈاکو کو مارا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے لیے کسی شائستگی برقرار رکھی تھی مجھے یقین تھا خان صاحب ایک دودھ والے کو اتنی شائستگی سے بات چیت کرتے سن کر حیران نہیں ہوں گے۔ وہ زیادہ باریکی میں جانے والے آدمی معلوم نہیں ہوتے۔

”نہیں۔ یہ بھی نیک اسے۔“ خان صاحب نے پُر خیال انداز میں اپنا بڑا سا سر ہلایا ”یارا اقبال کو جڑ۔ تم آدمی تو ٹھکانہ معلوم ہوئی اسے۔ اور تم ریشم خان کی اسٹین گن سے بچ گیا یہ تم ہی جانتے پڑا کمال دکھایا۔“ ترخ سے تم امارا دوست اسے یارا ام کو معاف کرنا۔ ام نے تم کو بڑا تکلیف دیا۔“ شیرخان کے لیے میں یکدم ہی بے پناہ غلوں آگیا تھا۔

”سنا فی کی اس میں کیا بات ہے یا شیرخان! میں نے اس کا کدھا چھتکے ہوئے کہا“ ظلم قسمی میں ایسا ہو جاتا ہے۔“

”تم کو درد پاتی اسے؟“

”جانتا تو مجھے کراچی ہے لیکن آپ راستے میں مجھے کہیں بھی اتار دیں جہاں سے مجھے بس یا ترین مل جائے۔“ میں نے کہا۔

”جانتا تو ام کو بھی کراچی اسے۔“ شیرخان نے بتایا ”لیکن ام کو

مگر اس وقت میری تشویش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ گزری میرے وجود پر مشکوک سی لگ رہی تھی، میری تشویش کی وجہ کچھ اور ہی تھی اور میں یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا ہے کہ کوئی معنا آپ کو بہت سی پریشان کیے رکھتا ہے حالانکہ اس کا عمل آپ کے سامنے ہوتا ہے بہت معمولی اور بہت سیدھا سادا ہوتا ہے لیکن آپ کا ذہن اس کی طرف نہیں جاتا۔

لیکن کسی روز اچانک ہی گویا آپ کے ذہن میں بجلی سی کوندنی ہے اور یکدم ہی گویا کوئی گمشدہ کڑی مل جاتی ہے۔ پھر کچھ عمل ہو جاتی ہے، معاملہ حل ہو جاتا ہے۔ میں اب بھی یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ معاملہ ہو گیا تھا لیکن ایک خیال بجلی کی کوندی کی طرح ذہن میں ضرور پکا تھا۔

ایک عرصے سے ریڈیو ڈاٹ والے مسئلہ مجھے اپنا نقاب کرتے نظر نہیں آتے تھے لیکن انہیں معلوم رہتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ جب بھی ضرورت محسوس کرتے تھے میرے سر پر پہنچ جاتے تھے اور اس سلسلے نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔

اپنی گاڑی میں نے ”ڈی سرکل“ کے ایک ماہر الیٹراک انجینئر سے چیک کروا لی تھی۔ اس کے کسی حصے میں کوئی ڈیوائس فٹ نہیں تھی۔ میں اپنے جسم کے ایک ایک حصے کا امتحان میں تقریباً خود بینی سے معائنہ کر چکا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ جس دوران میں ریڈیو ڈاٹ کے خفیہ ٹھکانوں پر بے خبری میں ان کی تحویل میں رہا تھا، اس دوران انہوں نے خفیہ سی سرجری کے ذریعے کوئی ماہیکرو چپ میرے جسم میں جلد کے نیچے تو کیں نہیں چھپا دیا تھا جو کسی خاص دائرے میں کسی خاص کپیڈ ٹیڑ پر میری نقل و حرکت کی نشاندہی کر رہا تھا؟

لیکن ہاتھ دوم میں کئی بار اپنے نہایت باریک بینی سے معائنہ کے بعد بھی مجھے اپنی جلد پر سرجری کا کوئی پال برابر بھی نشان دکھائی نہیں دیا تھا لیکن ظاہر ہے اس وقت گزری میری کلائی پر نہیں ہوتی تھی اور اس کی طرف میرا دھیان نہیں جاتا تھا۔ بعد میں کہیں بھی آتے جاتے وقت بغیر کسی خاص وجہ کے تیار ہوتے وقت ردائی میں گھسی لگا تھا اور کل جاتا تھا۔

اس دوران مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ دو مرتبہ جب ریڈیو ڈاٹ نے مجھے اغوا کیا تو کبھی گزری میری کلائی پر بندھی ہوئی تھی اور اسی طرح واپس آتی تھی۔ وہ اتنی عمدہ گزری تھی کہ بے تماشاً مار دھاڑ میں بھی کسی اس کا کچھ نہیں گزرا تھا۔

ریڈیو ڈاٹ والے سائنسی طور پر بننے والے ہوتے تھے، ان کے نزدیک کوئی ڈیوائس چھپانے کے لیے گزری سے زیادہ اچھی کیا چیز ہو سکتی تھی؟ کوئی بعد میں نہیں تھا کہ اس ڈیوائس کے ذریعے میری تمام کنٹرولنگی ان تک پہنچتی رہی ہو۔

مجھے یاد آیا کہ وہ پہلے جب میں ٹرین میں تھا اور جن سیاہ پوش کپاہٹ میں داخل ہوتے تھے تو سب سے آگے والے سیاہ

بھی ہوتی ہے اور واٹر پریس وغیرہ بھی۔ آج کل تو کافی انتظامات ہوتے ہیں۔ میں نے خیال ظاہر کیا، ہر حال ہو سکے تو آپ اطلاع دے دیجئے گا میں تو جلد سے جلد کوئی ٹرین یا بس چلانے کی کوشش کروں گا۔“

میں غبار ادا ہی طور پر یہ کہہ دیا تھا لیکن وہ سرے ہی لمحے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں خان صاحب شک زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ نہ بیٹھیں کہ کہیں ڈاکوؤں کو تھاماری ہی تلاش تو نہیں تھی؟ وہ یہ بھی پوچھ سکتے تھے کہ میں کہیں پولیس کا سامنا کرنے سے کترا تو نہیں رہا تھا؟ کہیں میں بھی کوئی مفرد تو نہیں تھا؟

لیکن خان صاحب نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ ان کے بارے میں میرا اندازہ کچھ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ زیادہ باریکیوں میں جانے والے آدمی نہیں تھے۔ ہر حال اس میں شک نہیں تھا کہ خان صاحب جتنے پھلے آدمی۔ دوستی کے قابل معلوم ہوتے تھے۔

ٹرک ٹیکس رٹائر سے رواں رواں تھا۔ خان صاحب کسی خیال میں کھوئے تھے۔ چپک بھی نہیں جھپک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں انگڑی سی ہو رہی تھیں۔ میرے اعضاء اب کچھ چمک سکون ہونے لگے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں خطرے کو پیچھے چھوڑ آنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے جسم ڈھیلا چھوڑتے ہوئے سیٹ کے پچھلے سے ٹیک لگا لیا۔

میرا ہاتھ ٹرک کے ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے ایک پینل نما حصے پر تھا ہوا تھا اور میری کلائی پر خوب صورت مشینی گزری چپک رہی تھی جس کی چپکن سونے کی تھی۔ میری کھدو کی معمولی قیاس پیمائی طرح مشینی میں منتظر بجلی تھی اور آستین ہٹ کر لگ چکی تھی جس کی وجہ سے گزری نہ صرف نظر آنے لگی تھی بلکہ بہت نمایاں محسوس ہو رہی تھی۔

وہ ایک بیش قیمت اور خوب صورت گزری تھی۔ یکدم ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کسی حادثہ سرزد ہو چکی تھی۔ میرے غریبانہ چلنے اور مسکین سراپا کے ساتھ اس گزری کا تعداد بہت نمایاں تھا لیکن ایک طویل عرصے سے گویا یہ گزری میری شخصیت کا ایک جزو بنی ہوئی تھی اس لیے کبھی بطور خاص اس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں کیا تھا۔ یہ گویا میرا ایک عضوی تھا، میری کلائی کا ایک حصہ تھا۔

میرے پاس کئی اچھی گزریاں تھیں لیکن ایک طویل عرصے سے میں نے کوئی دوسری گزری نہیں لگائی تھی۔ عجیب بات تھی کہ انوار نے مجھے جب ایک گھر کا روپ دیا تھا تو اس کا دھیان بھی گزری کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس نے مجھے ہدایت نہیں کی تھی کہ مجھے اس گزری کو بھی اتار دیا جائے۔ وہ میری غریبانہ شخصیت کے ساتھ سیل نہیں کھاری تھی۔ لیکن ہے انواری کی وجہ اس طرف مئی بھی ہو لیکن اس نے اسے اہمیت نہ دی ہو۔

دے رہا ہوں کہ تم مجھے اچھے گے ہو۔ معیت کے وقت میرے کام آئے ہو۔ جلدی دوست بننے والے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ قوت کے دور میں تم جیسے آدمی کم ہوتے جا رہے ہیں اگر تم نے اسے نہ رکھا تو میں کبھوں کا تم نے مجھے دوست ہی نہیں سمجھا۔

”یارا تم تو بڑا اسی خانہ خراب قسم کا آدمی ہے۔ ارے بابا کسی کا قوت کسی دوسرے کو تو نے میں نہیں دیتے۔ یہ کوئی اچھا بات نہیں اسے۔“ اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بے جاہ و واقعی شہرندہ نظر آ رہا تھا گویا کفری کی طرف کر کے پھنس گیا ہو۔

”جی اگر کسی نے مجھے خندہ راقا تو اب یہ میری چیز ہو گئی۔ اور میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہا ہوں۔ تمہیں یہ پسند نہیں آئے گی۔“ وہ نے میں سمجھوں گا تم نے مجھے اپنا دوست نہیں بنایا۔“ میں نے کفری تجویز کی سے کہا۔

وہ گویا عاجز رہ گیا۔ دونوں کنبیاں اسٹیرنگ و ہیل پر لگا کر ایک لمبے کے لیے دونوں ہاتھ سر پر مارے ہوئے بولا ”لو! یا اقبال کو جرات تو تم بہت ظالم آدمی ہے۔ اگر تم مارے ہاتھ سے ضائع ہو جانا تو کتنا افسوس کا بات تھا۔“

میں نے کفری اس کی کھائی پر لگا دی۔ اس نے مزید احتجاج نہیں کیا اور غیروادوی طور پر اشتیاق بھری نظروں سے کفری دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے پاس کوئی ایسا چیز نہیں تھی کہ کفری کو کھول کر دیکھ سکتا تھا اس میں کوئی ذرا اس موجود تھا یا نہیں۔ کوئی بعد میں تھا کہ میں اسے کھول لیتا تب بھی ذرا اس میں اور کفری کی مشینری میں امتیاز نہ کر پاتا۔ ممکن ہے ذرا اس میں ایک دھڑکن ہو سکتی ہو۔

بہر حال مجھے ایک اطمینان تو تھا کہ اس کی وجہ سے شیرخان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کفری کی بدولت کوئی اس تک پہنچ بھی جاتا تو دیکھ سکتا تھا کہ کفری کا مالک تبدیل ہو گیا تھا۔ شیرخان کے اور میرے قد کاٹھ، جسمانی ساخت، شکل و صورت، رنگ و بو، ہر چیز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کوئی اس علاقہ میں بھی بتلا نہیں ہو سکتا تھا کہ میں نے شیرخان کا روپ دھار رکھا تھا۔

میں نے اطمینان کی سانس لے کر سیٹ کے پیچھے سے نکل آیا۔ میں اب اپنے آپ کو بہت لگا لگا محسوس کر رہا تھا لیکن کفری بہر حال ابھی میرے قریب ہی موجود تھی۔ اب میں خنجر تھا کہ جلد از جلد لہان پہنچ کر شیرخان کو خدا حافظ کہہ کر اس سے دور چل جاؤں۔

لیکن اطمینان تو شاید اب میری قسمت میں رہا ہی نہیں تھا۔ یہ لیے کب کی بھت سے ایک دھشت ذہنی چیخ مٹا دی۔ چیخ نیا رستم خان کی تھی۔ اور اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شیرخان بڑی طرح چونکا۔ اکیس بار سے اس کا پاس بھڑکی طور پر بٹ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ دیر ایک

پوش نے جو میرے اندازے کے مطابق سفید نام تھا، بڑے دھوکے سے کہا تھا ”وہ نہیں کہیں موجود ہے۔ فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں ہے۔“

ظاہر ہے ان کے پاس کوئی ایسی چیز موجود تھی جس کے ذریعے وہاں میری موجودگی کی نشاندہی ہو رہی تھی لیکن یہ میرے وجود پر بھی تو کوئی ایسی چیز تھی جس کی وجہ سے یہ نشاندہی ممکن ہو پاتی تھی۔ اس کیفیت کفری کی طرف بھی میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ شاید قسمت اسی کا نام ہے۔ انسان کی آنکھیں مکمل ہوتی ہیں مگر قسمت اسے اندھا بنا دیتی ہے۔

مکمل چہرے کے اندر میں یہ سب خیالات ایک انتہائی تیز رفتار طر کی طرح میرے ذہن میں گزر گئے۔ میرے جسم میں مستحکم سی دوڑ گئی۔ میں ساکت بیٹھا ایک ٹک اس کفری کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی ایسی یہ کفری میری کھائی پر لگا کر چلا گیا تھا۔

شیرخان جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ باریکیوں میں جانے والا آدمی نہیں تھا، وہ بھی میری کھائی پر چپکی اس کفری کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا جو اس وقت خود مجھے بہت عجیب لگ رہی تھی۔

”کفری تو بہت اچھی اے۔ وہ کی آنکھوں سے کفری کی طرف دیکھ کر بولا۔ میں نے اس کے لیے میں ٹک کا شانہ محسوس کیا۔ وہ کتنا بھی بے پروا سنی لیکن یہ اندازہ تو کر سکتا تھا کہ کفری میں جیت تھی۔ اس وقت میری حیثیت اس کے قاتل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”ایک بہت ہی مزید دوست کا خندہ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”وہ میرے لیے دینی سے لے کر آیا تھا۔“

یہ ایک فکری سی وضاحت تھی۔ جو حیثیت اس وقت میری نظر آ رہی تھی اس حیثیت والوں کے دوست دینی سے بھی ان کے لیے اتنے بیش قیمت تھے نہیں لایا کرتے لیکن یہ وضاحت کچھ کام دے ہی گئی۔ شیرخان مزید کچھ نہ بولا۔

”تمہیں اچھی لگی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اچھا جب سب کو اچھا لگتا ہے یا رارا! شیرخان ڈرا نہ ٹک سیٹ پر پہلو بہتے ہوئے بولا۔

میں نے کفری انار کر اس کے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا ”بس تو پھر آج سے یہ تمہاری ہو گئی۔ میرے دوست نے مجھے خندہ راقا تھا، میں آگے اپنے دوست شیرخان کو دی چیز تھے میں پیش کرتا ہوں۔“

”یہ کیا کر آئے یا رارا! اس نے بائیں ہاتھ سے کفری اٹھا کر میری گود میں تھپتھا ڈالی ”میں نے اس لیے تو اس کا تعریف نہیں کیا تھا کہ تمام کورے دے۔“

”میں بھی اس لیے خندہ راقی دے رہا ہوں۔ میں تو اس لیے

میں نہ آئے۔ دیکھی ہی روشنی جیسی کمرے کے خلیں جلیب سے ایک  
ٹائٹ کے لیے نکلتی ہے اور معدوم ہو جاتی ہے لیکن ہم پر روشنی  
بھرا کے کی طرح نہیں پڑی تھی۔ کب میں جیسے روشنی کا سیلاب  
آ گیا تھا۔ میری آنکھیں کھلنے لگیں۔

نقرئی لہارے والے نے جو چیز اپنی کمرے اتاری تھی وہ کوئی  
مکین نہیں بلکہ انتہائی طاقتور فلیش لائٹ یا اسپٹ لائٹ تھی۔ میں  
اس پر نظر نہیں جھانکا لیکن اندازاً میں نے اس پر برست مارا۔  
ٹرک کے دہڑا اسکرین چمکتی ہوئے کے ساتھ لائٹ بھی معدوم  
ہو گئی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ کم از کم اسپٹ  
لائٹ پر تو کتنی کاربست کارگر رہا تھا۔

روشنی شاید ایک سیکنڈ کے لیے ہی ہم پر پڑی تھی لیکن مجھے  
احساس تھا کہ نقرئی لہارے والا ہماری شکلیں تو دلچسپی سے چکا ہو گا تاہم  
امید تھی کہ فوری طور پر وہ مجھے نہیں پہچان سکا ہو گا لیکن اگر کوئی  
ذرا اس کی رہنمائی کر دے تھی تو اسے یہ یقین ضرور ہو چکا ہو گا  
کہ میں اس ٹرک میں موجود تھا بھی تو آخر کار وہ یہاں تک آتا  
پہنچا تھا جس طرح شکاری کتے اپنے شکار کی کھوجتے ہوئے آخر کار  
اس تک جانتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ شکاری کتوں کی یہ  
ملاحیت بسوں، پچاسوں یا سیکڑوں میل کے دائرے میں کارآمد  
نہیں رہتی۔ فاصلہ بڑھتا تھا تو وہ اپنے شکار کا سراغ کھو بیٹھتے تھے  
لیکن ان لوگوں کے بارے میں یقین تھے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ  
اپنے شکار کا سراغ کھوتے تھے یا نہیں۔

اس روشنی نے میری آنکھیں کھول دی تھیں اس کے معدوم  
ہونے کے بعد بھی ایک لمبے کے لیے تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ شیرخان  
تو اس دوران کوئی مطلق اور کم سم ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر  
اندر اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ شاید اس کے لیے کسی  
نا قابل یقین اور ڈراؤنے خواب کا حصہ تھا۔ اس دوران میں نے  
اتحاد بڑھا کر ٹرک کی ہیڈ لائٹس بھی آف کر دی تھیں۔ موت خول  
کتنی ہی قریب تھی لیکن حاضر دماغی سے کام لینے والا تھا کی جنگ  
میں ہر حال اپنے لیے کچھ بہتر امیدیں رکھ سکتا ہے۔

میرا یہ یقین برقرار تھا کہ قلی ہوئی موت کو کوئی نہیں ٹال سکتا  
تھا لیکن اس یقین کے بعد بھی میں اتحاد پر اتحاد دھر کر نہیں بیٹھ سکتا  
تھا۔ جدوجہد ٹرک نہیں کر سکتا تھا۔ بھاگ جنگ میں آخری سانس  
تک لڑنا بھی میرے یقین کا ایک حصہ تھا۔

باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں نقرئی لہارے والے کا ہوا ایک  
لمبے کے لیے ہی میری نظر سے اوچھل رہا جب وہ دوبارہ مجھے نظر آیا  
تو وہ دراصل بلندی پر جا چکا تھا۔ میں نے اس کے اتحاد میں کسی کھلی چیز  
کی جھلک دیکھی تھی وہ ٹرک پر چھپنے کے تھا۔ میں دھڑک رہا تھا جب میں  
اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اپنے خلیے سب سے پہلے گیا۔

میرا خیال تھا کہ میں زمین پر جا کر گروں گا لیکن مجھے نہیں  
معلوم تھا کہ اس وقت ایک برساتی نالے کے کنارے کھڑا تھا اور

انسانی جسم اوپر سے گرا اور دہڑا اسکرین پر سے چھلکا ہوا پلوٹ پر  
آیا وہاں سے فوج کا ٹرک کے آگے جا کر۔ ٹرک دھڑکتے دھڑکتے بھی  
اس کے اوپر سے گزر گیا۔

شیرخان کے قتل سے بھی خوف زدہ ہی چل نکلی تھی۔ اسے یقیناً  
اندازہ ہو گیا تھا کہ اوپر سے گرنے والا رشیم خان تھا۔ اس پر شاید  
خوف کے ساتھ ساتھ یکدم اس نے بچتا دے نے حملہ کیا تھا کہ رشیم  
خان اس کے اپنے ہی ٹرک سے آکر چلا گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ  
رشیم خان جس لمحے دہڑا اسکرین پر گرا وہ اس وقت ہی مر چکا تھا۔  
میں نے اس کی گردن اس انداز میں ڈھکی ہوئی دیکھی تھی جیسے  
مچھلی ایک بچی سی رہی کے سارے جسم سے بندھی ہو۔ صرف  
ایک لمحے کے لیے مجھے اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب نظر آیا تھا  
اور پھر میری نظر سے اوچھل ہو گیا تھا لیکن وہ ایک لمحہ مجھے یہ  
تباہ کرنے کے لیے کافی تھا کہ ہم نے جو چیخ مچی تھی وہ رشیم خان کی  
ذمہ داری کی آخری آواز تھی۔

اشیرنگ پر شیرخان کا ہاتھ بند کیا۔ ٹرک خلیب میں اتر  
اور پھر ہی طرح اوپر اٹھ کر ڈھلا ہوا درختوں کے بالکل قریب جا کر  
ایک زور دار دھچکے سے ترجمار کر گیا۔ وہ اس بڑی طرح ایک  
طرف کو جھکا ہوا تھا کہ شاید کسی کے ایک ہاتھ کے دھکے سے کر سکتا  
تھا۔

اسی لمحے ہم دونوں نے یک وقت اسے دیکھا۔ وہ بالآخر ٹرک  
کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا آیا تھا اور اب کسی جتنائی ساز کے  
چنگاڑ کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا یکدم ہی دہڑا اسکرین کے سامنے آ گیا  
تھا۔ وہی نقرئی لہارے والا۔

وہ ہیڈ لائٹس کی زد میں تو نہیں تھا لیکن تھوڑی بہت روشنی  
اوپر تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس کے لہارے میں کچھ سی جھلک لہا ہٹ  
محسوس ہو رہی تھی۔ کب میں روشنی برائے نام تھی۔ باہر سے  
بھاگنے والے کو ہماری شکلیں صاف دکھائی نہیں دے سکتی تھیں۔  
"اوسے خانہ خراب آیا کیا بلا ہے؟ یہ تو کوئی اے۔"

شیرخان کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں  
اسی لمحے اپنی طرف کا ایک کا دروازہ کھول چکا تھا لیکن میں نے باہر  
چلا گیا نہیں لگائی، فوری طور پر چلا گیا کہ میں فوری نقرئی  
لہارے والے کی نظر میں آسکتا تھا۔

نقرئی لہارے والے کے لیے ہوا میں ایک جگہ ساکت ہونا  
شاید ممکن نہیں تھا۔ وہ کسی کھڑکی پر چڑھ کر اترے ہوئے پرندے کی  
طرح اوپر اتر دھر ہوا تھا۔ وہ فٹا اس کا ہاتھ اپنی پشت کی طرف کیا  
اور وہاں تپا تو میں نے اس ہاتھ میں کسی چیز کی جھلک دیکھی۔ میں  
سمجھا وہ کوئی گھن تھی۔ اس وقت تک میں شیرخان کی اسٹین گھن  
اٹھا چکا تھا یہ ایک غیر ارادی سی حرکت تھی ورنہ میں اور رابطہ  
اس پر چلائی ہوئی گولیوں کا انعام دیکھ چکے تھے۔

دوسرے ہی لمحے میں اور شیرخان انتہائی سفید چمکی روشنی

سے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

تاہم دو تین منٹ بہ خیر وفایت گزر چکے تو مجھے احسان ہونے لگا کہ باہر بھی سکوت ہی تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے اوپر آٹا شروع کیا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ پانی میں زیادہ اچھل پڑا نہ ہونے پائے۔

تھلا اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں میں نے اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے تھے اور اسے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس میں سے پیاز وغیرہ تو سب گر چکے تھے لیکن کپڑوں کا جو ڈاڈا اور اس کے نیچے رزم کا پیکٹ اب بھی موجود تھا۔ مجھے امید تھی کہ توڑوں کا کچھ نہیں بکڑا ہو گا وہ پانچھن کی چھلی میں پیک تھے۔

شوار قبض بھی شاپک پیک میں تھے۔ مجھے امید تھی کہ وہ بھی زیادہ نہیں بیچے ہوں گے۔ کم از کم ان کی وہ حالت نہیں ہوگی جو میرے حق پر سوچو کپڑوں کی ہو چکی تھی۔

نہایت آہستگی سے میں نے سطح آب سے سر اُٹھایا اور ارد گرد دیکھا۔ موت صرف چند لمحوں میں اپنا ایک ہنگامہ چا کر کے غائب ہو چکی تھی۔ اب وہاں سکوت ہی سکوت تھا لیکن موت اپنی بد صورتی کے نقوش ضرور چھوڑ گئی تھی۔

رُک کے ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے بعض میں آگ لگی ہوئی تھی اور دم دم ہوا میں شعلے دھیرے دھیرے بھڑکنا رہے تھے۔ انگریزوں کی پینٹیاں تک بڑی طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں اور اوپر اور ہٹ چکی ہوئی تھیں کچھ شلت پینٹیاں برساتی نالے میں بھی تیر رہی تھیں۔ چوٹی ٹکڑوں میں کہیں کہیں لگی ہوئی آگ کی دھج سے دم دم سی روشنی ٹپٹپٹ گئی تھی مگر یہ روشنی گویا زندگی کا ماتم کر رہی تھی۔

میں نے آسمان کی طرف نظر دوڑائی۔ نقرئی لبادے والے کا ہولہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ کیا وہ واقعی اپنے مشن کی تکمیل سے مطمئن ہو کر لوٹ گیا تھا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں دھیرے دھیرے تیرتا ہوا نالے کے کنارے تک پہنچا۔ تالہ خاص گہرائی میں تھا۔ ریت کے کنارے پر بہ مشکل قدم بٹاتے ہوئے میں اوپر آیا تو رُک کے مزید ٹکڑے اور اوپر بکھرے دکھائی دیے۔ کہیں کہیں پامال شدہ انگریزوں کی ڈھیراں بڑی تھیں اور کہیں انگریزوں کے رس کی دھج سے چپ چاپ سا بچہ بچھلا ہوا تھا۔

کہیں کہیں مجھے گوشت کے ٹپٹے ہوئے سے لوتھڑے بھی دکھائی دیے۔ وہ شیر خاں کا تین بارہ ماہ تھا۔ وہ واقعی شیر جیسا جوان تھا۔ شیر دل بھی تھا لیکن ذہنی اچانک سی اسے دعا دی گئی تھی۔ اس کی تو شاید سمجھ میں بھی نہ آتا، وہ تو اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ وہ تو حیرانی کے عالم میں ہی بیٹھا گیا تھا اور بالکل بھٹکتے میں اس کا وجود عدم وجود میں بدل گیا تھا۔

ایک جگہ مجھے اس کی کمپوزی دکھائی دی۔ کندھے کا کچھ حصہ

اسی میں گرے کو تھا۔ برساتی نالے میں اچھا خاصا شہر چٹائی ہو رہا تھا۔ میں خاصی گہرائی میں جا کر "فریڈ" سے پانی میں گر کر اور اس کے ساتھ ہی نفاض میں ایک خوف ناک دھماکا سنائی دیا۔

میرے گہرے کی آواز اس دھماکے میں مدغم ہو کر رہ گئی۔ میں جیڑی سے پانی میں بچے جا رہا تھا لیکن برساتی کی سطح سے بچنے کے جانے سے پہلے میں نے اس طرح رُک کے ٹکڑے اڑتے دیکھے جیسے کسی طیارے نے اس پر بہت سی طاقتور بم گرایا ہو حالانکہ میں نے نقرئی لبادے والے کو جو چڑ رُک پر گرا تے دیکھا تھا وہ مرنے کے اڑنے سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ وہ اس کے ہاتھ میں بہت سی دم دم روشنی دینے والے اس بلب کی طرح چمک رہی تھی جس پر سفید پینٹ کی بہت سی موٹی سی دھندلی لگی ہو۔

میرے پانی میں گرے اور رُک کے پر بچنے اڑنے میں شاید ایک چوتھائی سینکڑہ فارق رہا ہو۔ شاید اسی لیے نقرئی لبادے والے کو اس کا پتا نہیں چل سکا۔ وہ یقیناً یہی سمجھا ہو گا کہ رُک میں جو کوئی بھی موجود تھا، جو کچھ بھی موجود تھا، سب ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر نفاض میں بکھر گیا تھا۔

میں پانی میں گرے کی دھج سے مزید بہت سے نقصانات سے بچ گیا۔ فٹل پر گرا ہوا تو شاید بچنے میرے جسم میں پوسٹ ہو جاتے۔ یا کوئی ہماری بحرم کھڑا کھڑا پر آگرتا۔ میں نالے کی دھج سے گرایا تو میں نے کوشش کی کہ میں ہی رہوں۔ فوری طور پر دوبارہ سطح آب پر ابھرنے نہ ہاؤں۔ پانی کی دھج میں ہی سب سے زیادہ وفایت تھی۔

پانی بدکردار اور کثیف تھا لیکن اس وقت مجھے بہت بھلا محسوس ہوا تھا۔ اس نے گویا مجھے اپنی تاریک آغوش میں لے کر نہ بنائے کس کس مصیبت سے بچالیا تھا۔ میں نے پانی میں اچھل محسوس کی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رُک اور اس کے سازد سامان کے کچھ ٹکڑے نالے میں بھی آکر گرے تھے۔

ایک نفوس چڑ تو میرے جسم سے رُک دکھائی ہوئی تھی دھج میں لگی۔ میں نے کہہ لیا پانی میں اسے ٹھونک کر دکھا اور میرے جسم میں لڑا ایک سو ہی لڑو ڈنگی۔ وہ رُک کا منوں دونی لوہے کا۔ اسل تھا۔ اگر وہ سیدھا مجھ پر آگرا ہوتا تو چیر پانی کی پٹا بھی نکالتی ہوئی۔ شاید میری کمپوزی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی، کمپوزی پانچ میں پورے ہی اس کے نیچے دب کر کھلا جاتا۔ موت تھی کہ بار بار مجھے چھوٹی ہوئی گوردی تھی اور زندگی تھی کہ مجھے اپنے دامن میں چھپائے اس سے گہرائی اسے نیچے دیتی چلی جا رہی تھی۔

وہی ایکمل جو میری اذیت ناک موت کا سبب بن سکا تھا، اسی ایکمل کو منسوبی سے چکر کر میں دے میں جم کر بیٹھ گیا۔ سامنے میں نے روک رکھی تھی۔ سامنے دو کتے کی مجھے جتنی بھی مشق تھی اسے میں اس وقت کام میں لایا۔ آخر کار پانی دوبارہ ساکت ہو گیا۔ پانی سے باہر کیا صورت حال تھی اس کے بارے میں میں یقین

میں نے کئی گاڑیوں کو گزر جانے دیا۔ آخر کار ایک گاڑی کو روکے گا راہ کیا۔ وہ میں معلوم ہوتی تھی۔ قریب آئی تو آگے کو نکلے ہوئے ہرن والی بی بی ثابت ہوئی۔ اس کی دینا اسکرین کے عقب میں روشنی میں چمکتی گئی ہوئی تھی جس پر نمایاں الفاظ میں "لاہور سے ملان" لکھا ہوا تھا۔

میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر دُور دُور سے ہاتھ ہلایا۔ ذرا نیچے کا روکے گا ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن پھر شاید اس کا جذبہ خرم کچھ جاگا اور اس نے کافی آگے جا کر آخر کار بیس روک ہی لی۔ میں دوڑ کر اس تک پہنچا۔ کئی کھڑے پہلے کوئی سے بھاگ کر اوپر اوپر دیکھا اور نہ جانے کس بات کا اطمینان کرنے کے بعد دوڑا کھولا۔

پایہ ان پر میرے قدم رکھتے ہی ڈرائیور نے تیزی سے بس آگے بڑھا دی اور کئی کھڑے مجھے خبردار کیا "میٹ کوئی غالی نہیں ہے۔"

"بھائی! میٹ کون مانگ رہا ہے۔ اس وقت تو میں جتنی پریشانی میں ہوں تم کو گے تو چھت پر بیٹھ کر بھی چلا جاؤ گا۔" میں نے ملاحت سے کہا۔

میرے یہ کہنے پر اس کا رویہ کچھ بدرداشت سا ہو گیا اور اس نے پچھلے حصے میں لمبی میٹ کے ایک کونے پر میرے لیے جگہ بنا ڈالی لیکن جس مسافر کے پاس میں بچس پھنسا کر بیٹھا تو گاڑی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے کپڑے ابھی تک ذرا گیلیے ہی تھے۔ کیسے میں پڑے ہوئے چند نوٹ بھی کیے ہو چکے تھے۔ میں نے پچھلے ہوئے نوٹ سے ہی کئی کئی کراہے ادا کیا تو اس نے بھائی میں مذاق کرنے کی کوشش کی "بھائی صاحب! یہ رات کو نہانے کی کیا سوچیں گی؟ وہ بھی کپڑوں سے۔"

"شاید تمہیں معلوم نہیں۔ پیچھے تیز کام پر ڈاکا پڑا تھا۔" میں نے بہ آواز بلند کہا "میں ڈاکوں کی نظر بچا کر ٹریس سے اتر کر بھاگا تھا تو آدھ میرے مین ایک ٹائے میں گر گیا۔ کئی میل سے پیدل چلا آ رہا ہوں۔"

میرے برابر والے مسافر کی ناگواری بددی میں بدل گئی۔ دوسرے کچھ ادا کرتے ہوئے مسافر بھی ذرا چونک گئے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس گاڑی والوں کو روکے لائن یا سڑک پر راستے میں ہونے والی کسی گڑبڑ کا علم نہیں تھا۔ بحال میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے مشکوک سمجھیں اس لیے میں نے تھوڑی سی وضاحت کر دی تھی۔

میرے برابر والا پارٹیں مسافر بولا "اللہ رحم کرے گی۔ منہ میں تو تیریں وغیرہ پر ڈاکو کا پڑا کر سننے تھا۔ اب تو ادھر بھی آئے دن اس قسم کی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

"منہ کوئی دوسرے ملک میں تو نہیں ہے نا؟" ایک اور عمر رسیدہ مسافر دانشورانہ لہجہ میں بولا "اسی ملک کا ایک حصہ

میں اس کے ساتھ تھا۔ اس کے چرسے سے گوشت اس طرح تانبہ تھا جیسے درندوں نے فوج کھایا ہو" گا رتا رہا۔" تو واقعی یہ درندوں ہی کا تھا۔ دو ٹانگوں پہ چلنے والے اور سانس کے میدان میں بہت زیادہ تکی کر جانے والے درندوں کا۔

میری رگ و پے میں غیظ و غضب کی آتش مجھور کی تپش پھیل گئی۔ برساتی ٹائے کا پانی یک لخت ہی میری آنکھوں میں تیزاب کی طرح چلنے لگا۔ شاید یہ ان آنسوؤں کی بطن تھی جو بہنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں روکا ہوا تھا۔

"ہو سکے تو مجھے صاف کہنا دوست! میں نے اس کی کھوپڑی کے پاس اکڑوں بیٹھے ہوئے خاموشی کی زبان میں کہا "تمہاری موت شاید کبھی تو اسی طرح ہو لیکن میں خود کو ہی اس کا منہ دار سمجھوں گا۔ بہت سے قرض مجھ پر واجب الادا ہیں۔ تمہارا نام بھی میں نے قرضوں کے اس رجسٹر میں لکھ لیا ہے۔"

پھر میں نے کچھ پیچھے سڑک پر آکر دیکھا۔ ریشم خان کی لاش سڑک کے کنارے چکی سی پٹی پر لیٹی تھی۔ اس کی گردن اس طرح ٹوٹی ہوئی تھی جیسے اسے چاقو سے دی گئی ہو اور پانی جسم میں چار جگہ سے ٹرک کے پیرن تلے چلا گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش احتیاط سے ایک طرف کو ہٹا کر سڑک کے کنارے ڈال دی کہ کہیں کوئی بدست ڈرائیور اس پر سے مزید کوئی گاڑی نہ گزراوے۔

مجھے ٹائے سے نکلے بہ مشکل تین چار منٹ ہوئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے آگے چل دینا چاہیے تھا۔ وہ تو قیمت تھا کہ خدوش حالات کی وجہ سے سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا اور اب تک شاید کوئی اس دھماکے کی وجہ سے متوجہ ہو کر اس طرف آنکلا۔ میرا سفر جاری رکھنا ہی بہتر تھا۔

میں ایک بار پھر جنگل میں داخل ہو گیا اور پہلے ہی کی طرح کچھ اندر جانے کے بعد سڑک کے متوازی چلنے لگا۔ پیچھے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے مجھے سروی لگ رہی تھی لیکن میں دانت برداشت جھانے تیز تیز چلا رہا۔ اس وقت شاید حقیقتاً تو سروی نہیں تھی لیکن میرے اندر کا موسم تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ شاید میرے اندر ہی بخ بگنی پھیل گئی تھی۔ آخر کار مجھے کچھ کا سا احساس ہونے لگا تو میں نے جسم کو گمانے کے لیے دوڑنا شروع کر دیا۔

کافی دیر تک میں دوڑتا رہا اور اپنی توانائیوں کا امتحان لیتا رہا۔ مسلسل دوڑنے سے جسم بھی گرم ہو گیا اور کپڑے بھی کافی حد تک سوکھ گئے۔ اس دوران مجھے سڑک پر دو تھوڑے تھوڑے تین چار بیس اور ٹرک گزرتے دکھائی دیے لیکن میں نے سڑک پر آکر کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان میں سے کوئی گاڑی والا شاید ریشم خان کی لاش دیکھ کر آ رہا ہو یا شاید گاڑی میں ڈال کر ہی کہیں پولیس وغیرہ کو پہنچانے کے ارادے سے لے کر آ رہا ہو اور مجھے اس دیرانے میں مشکوک ہی حالت میں دیکھ کر اس لاش سے میرا تانا بوجھنے لگے۔

ہے۔ ایک جیسے میں حالات خراب ہوتے ہیں تو دوسرے جیسے میں اس کے اثرات ضرور آتے ہیں۔“

تیسرا مسافر بولا ”اگر سچی ہوتی ہے تو ذرا کو اور دہشت گرد ادھر آجاتے ہیں“ اور سچی ہوتی ہے تو علامت غیر پلے جاتے ہیں۔ پوچھی گھومتے پکڑتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے زمین بہت بڑی ہے انہیں ہر راستہ معلوم ہے۔ ہر جگہ پناہ لینے کا طریقہ انہیں آتا ہے۔ اپنا ہر مقصد پورا کر کے پودوش ہو جاتا ان کے ہاتھیں ہاتھ کا کھیل ہے مشکل تو ہے چارے شریف آدمی کی ہے اس کے لیے آرام سے کہیں رہنا اور اپنا جائز کاروبار کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“

سیری اللہ خان نے گویا نشست پلو بحث کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مسافروں کو جیسے دل کا غبار نکالنے کے لیے موضوع لگیا۔ سب مختلف زاویوں سے حسبِ وقتیں حالات پر روشنی ڈالنے لگے۔ سب گویا جیلے دل لئے پیٹھے تھے، اپنی پھولے چھوڑنے لگے۔ بحث میں سیاست کا آئن شامل ہوتا بھی تاثر پر تھا۔ ظاہر ہے سیاسی حالات ہی کالک کے سبکی حالات پر زیادہ اثر پڑتا ہے اس لیے لوگ اسے سچ میں لائے بغیر وہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔

میں نے جسم ڈھیلا چھوڑا اور کھڑکی سے سر نکا کر دیکھنے اور سستا نے کی کوشش کرنے لگا لیکن دھچکوں اور انجمن کی جھنجھٹ کی وجہ سے سر کھڑکی پر ٹکائے رکھنا مشکل تھا اس لیے میں نے پٹالیا اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو ماحول سے لافصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مسافروں کی آوازیں مجھے دور سے آتی محسوس ہونے لگیں۔

دفتار میں چونک اٹھا۔ عتب سے سیاہ رنگ کی ایک سرسبز تیز رفتاری سے چلی آ رہی تھی۔ اس کے پیشے بھی گمرے رنگ کے مظلوم ہوتے تھے۔ اندر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے اعصاب جو بہن کے پُر حرارت ماحول اور خفیف سے ایک احساس تحفظ کی وجہ سے کچھ پُر سکون ہو چلے تھے یکدم بھرتن گئے۔ میں چونکا ہو کر بیٹھ گیا۔

بھری پری ہموں اور ٹرکوں والوں کے دھنکے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رات کے وقت ان سڑکوں کو سفر کے لیے محفوظ نہیں سمجھتے تھے لیکن ایسے میں وہ سرسبز نہ جانے کہاں سے فزائے بھرتی آ رہی تھی۔

جلدی ہی اس نے بس کو اور ٹیک کر لیا۔ میں کھڑکی سے کروں نکال کر دیکھنے لگا کہ شاید اسی وہ ترجیحی ہو کر کے کی اور بس کو بھی رکے پر مجبور کر دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا وہ تیز رفتاری سے گزرتی چلی گئی۔ وہ نظریے اور جمل ہو چکی تپ میں نے ذرا سکون کی سانس لی۔ وہ صرف چند سیکنڈ نظر کے سامنے رہی تھی لیکن میرے بے سکون اعصاب کو یکدم برقیں کر گئی تھی۔

اس کے بعد ملتان تک کا سفر کسی خاص واقعے کے بغیر گزر گیا۔ سفر طویل بھی نہیں تھا۔ صبح سے پہلے میں ملتان جا پہنچا لیکن

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسی سیاہ سرسبز کو لاری اڑنے کے کچھ ہی دور سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا۔ اس کی نمبر پلیٹ لاہور کی تھی اور نمبر میں نے ذہن نشین کر لیا تھا۔ لیکن اس کے چاروں دروازے بند تھے۔ گھڑکیوں کے آریک شیشے بھی اسی طرح پڑھے ہوئے تھے جس طرح میں نے راستے میں دیکھے تھے۔ کوئی باہر بھی نہیں کھڑا تھا۔ گاڑی کی دغا اسکرین تک گمرے رنگ کی تھی۔ یہ کتنا بھی مشکل تھا کہ گاڑی میں کوئی موجود تھا یا نہیں؟

وہ بس پُر اسرار سے انداز میں ایک طرف کو کھڑی تھی۔ وہ ایسی گاڑی تھی کہ دیکھتے ہی نظریں کھٹکتی تھی اس لیے مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ڈاٹ سے اس گاڑی کو قفل ہوسکتا تھا۔ وہ اسے بے وقوف نہیں تھے کہ نظریں کھٹکتے والی کوئی چیز استعمال کرتے۔ وہ بالکل عام سی چیزوں کو عام سے انداز میں استعمال کرتے اس طرح ادھر ادھر پھرتے تھے کہ ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی تھی۔

وہ اپنی کسی سامنے شعیبے بازی کے سانچے بھی کھٹکتے تھے تو ان کی حکمت عملی ایسی ہوتی تھی کہ عام لوگوں کی نظریں کم ہی آتے تھے۔ ان کی یہ مصلحت کوشی ان کے لیے بہت فائدہ مند تھی۔

سرسبز سے کچھ ہی دور لاری اڑنے کے دوسرے کونے پر پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی لیکن سرسبز کی طرف پولیس والوں میں سے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ جب وہ لوگ اتنی مشکوک نظر آنے والی گاڑیوں کو چیک نہیں کرتے تھے تو پھر آخر کوئی گاڑیوں کو چیک کرتے تھے؟ ممکن ہے چیک کرتے بھی ہوں لیکن جس وقت چیک کرتے ہوں اس وقت ان میں سے کوئی مشکوک یا قابلِ اعتراض چیز برآمد نہ ہوتی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چیک کرنے کے لیے بڑھتے ہوں لیکن گھڑکیوں سے جمنا کتنی کٹا شکوہیں دیکھ کر ڈوم دبا کر اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتے ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چیک کرنے پہنچتے ہوں تو ان کے ہونٹوں پر لال ٹونوں کی شپ اور آنکھوں پر نیلے ٹونوں کی پٹیاں باندھ دی جاتی ہوں۔ وہ کچھ بولتے اور دیکھنے کے قابل نہ رہتے ہوں۔

وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ ہمارے ہاں جرائم پیشہ افراد کی نقل و حرکت شریف افراد کی نقل و حرکت سے زیادہ آسان تھی اسی لیے یہاں تحریک کاری بھی بہت آسان تھی۔ جہاں گندم کے رُک تو ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے پکڑے جاتے ہوں لیکن اسٹل کے رُک ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں کسی کی نظریں آئے بغیر پہنچ جاتے ہوں وہاں تحریک کاری کی شیں تو کیا اصلاح سنا شوہ کی امید رکھی جاسکتی تھی؟

میں سب سے آخر میں بس سے اترا اور آخری مسافروں کی آڑ میں ہی رہتے ہوئے احتیاطاً جلدی سے بس کے پیچھے اس طرح



چلا گیا کہ اگر سرسبز میں بیٹھا کوئی شخص مسافروں کا جائزہ لے رہا ہو تو وہ مجھے نہ دیکھ پائے۔

لاری اڑا غصا وسیع تھا اور اس کے دو طرف کہیں کہیں دروازے تھے۔ ایک طرف کچھ عمارات تھیں اور ایک طرف پہاڑ پان سکریٹ اور نہ جانے کن کن چیزوں کے کپڑے تھے۔ پتھر رکشا اور تانے لاری اڑنے کے اندر ہی چکرا رہے تھے۔ قدرے اندر سے میں ایک رکشے کو روک کر سڑک پر اپنے بیٹے کو روک کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ اسٹیشن پہنچتے ہی مجھے مزید آگے روانہ ہونے کے لیے ٹرین مل گئی۔ کراچی ایکسپریس روانہ ہونے کے لیے دس بج رہی تھی کہ میں اس تک جا پہنچا۔ تمام ڈبوں کے دروازے مسافر بند کیے بیٹھے تھے۔ مجھ بھڑانے انسان کو بڑا خود غرض بنانا ہے جو اندر بیٹھے ہوتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ باہر والے اندر نہ آتے ہوں۔

ٹرین اس وقت رکتے ہوئے تھی جب میں کسی نہ کسی طرح اس میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس ٹرین کی بھی وہی حالت تھی جو تقریباً ہر ٹرین کی ہوتی ہے۔ میں اپنا حسیل گود میں لیے ایک کونے میں فرش پر جھک سٹ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے آئینہ میسر نہیں تھا کہ اپنا عکس دیکھتا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں کوئی تباہ حال درختان یا مزدور دکھائی دے رہا تھا۔

اب بھی میں نے کسی خاص منزل کا تعین نہیں کیا تھا۔ میں ایک بے منزل مسافری تھا لیکن میں مسلسل حرکت میں رہتا چاہتا تھا۔ سفر کے لیے میں ٹرین کو اس لیے ترجیح دے رہا تھا کہ اس میں معمولی سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے سوہم ہی امید تھی کہ میری وہ سہ دہ لوگ پوری ٹرین یا اس کے کچھ حصے کو اڑانے سے گریز کریں گے کیونکہ وہ بڑے پیانے پر کوئی کارروائی کر کے زیادہ لوگوں کی نظر میں آنے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔

لیکن یہ میری خوش قسمتی بھی ہو سکتی تھی۔ ان کے بارے میں یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ مجھے ہلاک کرنے کے لیے وہ کسی چورے شہر کو ہی تباہ کر ڈالتے۔ اس مقدمہ کے لیے اگر وہ نادان فسطح کی جی کو بھی گنیمت سمجھتا تو کبھی کر سکتے تھے۔ پک جھپٹے میں ٹرک کے پرچے اڑا سکتے تھے تو یہی ٹرین ہوائی جہاز یا بحری جہاز کو اڑانے میں بھی ایسی کوئی آٹھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ مصلحتیں زیادہ دیر تک ان کے آڑے آتی رہیں۔

ظاہر تو یہی محسوس ہوا تھا کہ خطرہ میرے سر سے مل گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ٹرین میں مجھے ہانے میں ناکامی کے بعد شاید وہ سب لوگ اُدھر اُدھر بکھر گئے تھے جو مجھے پکڑنے یا ہلاک کرنے کی سہمہ نکلے ہوئے تھے۔

جس فتنی آبادے والے نے ٹرک کو اڑایا تھا اسے تو یقیناً اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں بچ گیا تھا۔ اس نے واپس جا کر اپنی کاسیائی کی رپورٹ دی ہوگی۔ اس کے بعد بھی کئی طرح کے امکانات ہو سکتے تھے۔

اگر واقعی میری اس کفری میں ہی کوئی ڈنڈا اس موجود تھا جس پر مجھے شبہ ہوا تھا تو ٹرک کے ساتھ یقیناً وہ بھی تباہ ہو چکی تھی۔ اب وہ میرے ہاتھ پر نہیں تھی۔ اس سے میں امید رکھ سکتا تھا کہ انہیں میری نقل و حرکت کا سراغ ملنا بند ہو چکا تھا۔ میں ممکن تھا کہ جو کوئی بھی اس صبح کا انجمن رہا ہو اسے اب اطمینان ہو گیا ہو اور وہ لوگ واپس لوٹ گئے ہوں۔

لیکن یہ امکان بھی موجود تھا کہ صبح کا انجمن یا کوئی بھی دوسرا زیادہ باعتبار شخص فتنی آبادے کی رپورٹ سے مطمئن نہ ہو۔ وہ بہت باریک بین لوگ تھے۔ ممکن تھا کہ باقی لوگوں میں سے کوئی اس جگہ آیا ہو جہاں ٹرک کے پرچے اڑے تھے وہاں انہیں میری لاش کا کوئی ٹکڑا یا کوئی بھی دوسرا سراغ نہ ملا ہو جس سے انہیں شبہ یا یقین ہو گیا ہو کہ وہ میں بچ نکلا ہوں اور اب وہ کوئی ہی تم ترتیب دے رہے ہوں۔ نہ جانے کس کس سمت میں میری تلاش میں بکھر رہے ہوں۔

یہ سب میرے اندازے تھے، سوچوں کی بھول بھلیاں تھیں جن میں میں ہلکے جا رہا تھا۔ یہ اندازے غلط بھی ہو سکتے تھے اور درست بھی۔ میں فی الحال اندازے لگانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ اب مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤں۔ اپنے آپ کو تسلی دے لوں کہ ریڈ ڈاٹ والوں نے مجھے مجرماً سمجھ لیا ہے اور میرا چچا چچو ڈوبا ہے لیکن وہ جو جھٹی جس سے بھی آگے میری ایک نامعلوم جس بھی جسے میں ساتویں جس کتا تھا مجھے مطمئن نہیں ہونے دے رہی تھی۔

میری اس جس کو نہ جانے کہاں سے... شاید کہیں بہت دور سے خطرے کے سگنل اب بھی منموں ہوئے جا رہے تھے۔ سگنل بہت کمزور تھے، خفیف تھے لیکن بہر حال معدوم نہیں ہوئے تھے۔ ہوا کے دوش پر نہ جانے کس سمت سے آ رہے تھے۔ کبھی میں سوچتا کہ شاید خطرے کی گونج میرے حواس میں بھی گئی تھی ایک طویل عرصے سے میں جن حالات کا شکار رہا تھا اس کے بعد شاید اب مجھے اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ محسوس کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

میں جیسی طرح تھک چکا تھا۔ میرا جسم اور ذہن دونوں ہی شل تھے۔ میں نے خطرے کے اس خفیف سے احساس پہ لنت بھیجی اور ایک کونے میں دیوار سے ٹک لگا کر سو گیا۔ وہ جو عمارت ہے کہ خند ہوئی۔ بھی آجاتی ہے اس کا عملی تجربہ اس وقت ہوا۔ میری آنکھ ملنے تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ٹرین کسی

تھے۔ میرے ہنسے میں ایک ایسا رکشا آیا تھا جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ خود زیادہ کھٹا رہا یا اس کا زانیہ۔

وہ جوان ہی تھا لیکن نئے کاغذی معلوم ہوا تھا۔ تباہ حال اس کے چہرے پر رقم تھی۔ بظاہر کوئی اسے دیکھنا تو شاید بتا رہا تھا لیکن میں نے جس انداز سے اسے سرکٹ پیٹے دیکھا اس سے اس کی بیماری میری سمجھ میں آگئی۔ لوگ کہتے ہیں بیرونی کی کوئی بو نہیں ہوتی، سرکٹ میں کوئی لپٹا رہا ہو تو اس کا پتا نہیں چلتا لیکن میرا خیال تھا کہ تجربہ کار آگے اور حساس ناک بیرونی کے سرکٹ اور سرکٹ پیٹنے والے کو پہچان سکتی تھی۔

وہ خود بھی کھائیں رہا تھا اور اس کے رکشے کا انجن بھی کھائے ہی کے انداز میں چل رہا تھا۔ پہلی کی چڑھائی شروع ہونے سے پہلے ہی رکشے کا انجن یکے زیادہ زوردار انداز میں کھائیں کو خاموش ہو گیا۔ نوجوان نے جلدی سے اتر کر بلیک کھول کر صاف کیا اور انجن کو بھی یکے ٹھوکر بھار کر دیکھا لیکن انجن اشارت ہو کر بند۔ میں نے رکشے سے اتر کر ایک بے وجہ جذبہ ترسم کے تحت پچاس روپے اس کے ہاتھ پر رکھے اور اس کا کندھا چمکتے ہوئے کہا "جو سرکٹ تم پیٹے ہو اسے چھوڑ دو۔ ورنہ ایک روز اسی طرح اچانک تمہارا انجن بھی بند ہو جائے گا اور پھر بلیک صاف کرنے سے بھی اشارت نہیں ہوگا۔"

میں اپنا تھیلا اٹھائے آگے بڑھ گیا اور وہیں کھڑا جرت سے مجھے کھٹکا گیا۔ سرک پر ابھی تک دیر لگی تھی۔ ابھی زندگی کی ہوا ہی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ میں بتدریج بلند ہوتے راستے پر پیدل ہی پہلی کی طرف بڑھنے لگا۔ سڑک کو دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کوئی سواہی آتی نظر آئے تو ہاتھ دوں۔ دفعتاً ایک موٹر سائیکل سوار خود ہی میرے قریب آکر روک گیا۔ وہ دھمکی دھمکی اشارتوں میں تھا۔ مجھے میں گرم چادر بھول رہی تھی۔

"سکھر جانا ہے بھائی صاحب؟" اس نے خاص شائستگی سے پوچھا۔

"جی ہاں! میں نے انبات میں سر ملایا۔

"بیٹھ جاؤ! اس نے بیچے اشارہ کیا۔

میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر چڑھ گیا۔ اس وقت خاصی ٹھنڈ تھی لیکن وہ خوشگوار محسوس ہو رہی تھی اگر میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں خطرے کا ہیمنہ سا احساس موجود نہ ہوتا تو اب میں اپنی بھاگ دوڑ سے خاما خلف اندوڑ ہو سکتا تھا۔

یہ بھی گویا ایک طرح کا اندوہ نہ تھا۔ ایک طویل عرصے بعد اپنا عیش و آرام اور غائب ہونے کا ایک نہایت ہی عام سے انسان کی زندگی گزارنا ایک طرح سے نہایت دلچسپ تجربہ بھی تھا۔ راستے کی تکالیف کو کسی دلچسپ اور بے خطر کام کا حصہ سمجھ کر بھی برداشت کیا جاسکتا تھا۔ کبھی ٹرین، کبھی بس، کبھی رکشا کبھی ٹرک اور کبھی

بڑے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر خوب چل پھل اور روشنی تھی۔ بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ میرے پیروں پر سے اور ان کے آس پاس ٹکڑے ہوئے ساڑھ سالان پر سے چھلانگتے ہوئے آ جا رہے تھے۔ کوئی ٹرین میں سوار ہو رہا تھا۔ کوئی اتر رہا تھا۔

میں ہڑا کر دوں اتر گیا۔ میں نے دیکھا وہ مدہڑی، جھکشن تھا۔ میں نے سوچا میرا وہاں اترنا ٹھیک ہی تھا۔ میں اس سے آگے کراچی کی سمت میں سفر جاری رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں خاص دیر بے خبر سویا رہا تھا۔ غیبت تھا کہ میرے قبیلے کی ظاہری حقیر حالت دیکھ کر کسی نے اس پہ ہاتھ صاف نہیں کیا تھا۔

ساتھ ہی ایک ٹرک کی ٹوٹی کھلی تھی اور پانی زور شور سے بہ رہا تھا۔ بے مقصد ضائع ہو رہا تھا۔ میں نے ٹرک کی مدہڑی پر بیٹھ کر اچھی طرح ہاتھ دھوا۔ بال بکھ درست کیے اور ایک ٹی اسٹال کے قریب بیٹھ کر چائے بکٹ وغیرہ کا آرڈر دیا۔

اور ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد میں نے اپنے آپ کو کافی تازہ دم محسوس کیا۔ اس وقت تک میں دل ہی دل میں ایک ہیمنے سے لپٹے پر بھی بیٹھ چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے اندرون سندھ کے کسی نہایت غیر معروف اور بے آباد سے مقام کی طرف نکل جانا چاہیے اور کچھ عرصہ مکمل مدہڑی سے گزارنا چاہیے۔ اس دوران اگر اطمینان ہو جائے کہ کوئی حالات میری تلاش میں نہیں ہے، کوئی غلطو میرے تعاقب میں نہیں ہے تو پھر لاہور کی طرف واپس جانے یا کراچی کی طرف نکلنے کا کوئی پروگرام بنانا چاہیے۔

اپنی آوارہ گردی اور گمراہی کے دور کی کچھ یادیں اور کچھ معلومات ذہن میں محفوظ تھیں۔ جب ہم چھوٹے پٹانے پر پل ادھر سے آؤ کر کرنے کے پتھر میں پورے پاکستان کو کھٹکاتے پھرا کرتے تھے۔ ان کھندل کھندل یادوں میں سمجھتے ہوئے میں نے سوچا کہ پہلے تو سکھر پہنچنا مناسب ہوگا۔ مدہڑی اور سکھر کے درمیان صرف دوپائے سندھ جاکر تھا۔

اسٹیشن کے باہر رکشے مانگے اور سوڑوکیاں موجود تھیں جن میں بیٹھ کر مدہڑی سے سکھر جایا جاسکتا تھا۔ سکھر جانے کا کام نہ تھا کہ وہاں ٹرینوں کے انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں سے سندھ کی ہر سمت میں ہر روٹ پر ہر جگہ جانے کے لیے کوئی نہ کوئی بس پکڑی جاسکتی تھی گو کہ اسٹیشن پر اپنے ارد گرد کہیں بھی مجھے خطرے کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی لیکن فی الحال میں احتیاطاً ایک جگہ تک کر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی مجھے وہ اطمینان حاصل نہیں تھا جو کہیں تک کر بیٹھنے کے لیے ضروری تھا۔ ناشتہ کرتے ہی میں اسٹیشن سے باہر گیا۔

ایک رکشے میں بیٹھ کر میں سکھر کی طرف روانہ ہوا تو صبح کا آجلا چمکتے دکھائی دیں ابھی نضا میں مگر کئی کھندلاہٹ موجود تھی۔ سکھر جانے والے بیشتر مسافر مختلف سواروں میں بیٹھ کر سکھر جا چکے

ی مشہور تھا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا اور دریا کے کنارے سے جھٹکھوتا، اس اجنبی مہمان کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا چلا جا رہا تھا مگر شاید آج روانی اور تیزی سے سفر میری قسمت میں نہیں تھا جب ستارہ گردش میں ہوتا ہے تو ہر قدر کمزور رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عین بل کے وسط میں کچھ کر سوز سائیکل نے زور زور سے "گھوٹی گھوٹی" کی اور بند ہو گئی۔

"پیزول تو ہر مرد پر نہیں لگ گیا؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔  
"میں پیزول تو بہت سے شاید پلگ میں بکرا آیا ہے۔ ذرا احتیاط دیکھیں ہوں۔" موٹر سائیکل والے نے کہا۔

ہم دونوں اتر گئے۔ اس نے موٹر سائیکل بل کے کنارے لگا دی۔ سامنے ٹیپ میں دریا کے کنارے کھمبے کے مکانات نظر آ رہے تھے جس میں سوہنے لگا اس سے قریب تھا میں پیدل ہی چل رہا تھا۔ اس قسم کی سواریوں سے پہلے پہنچ جاتا۔

بل پر دریا کی جھ میں رنگ کے گزارنے کے لیے سڑک بنی ہوئی تھی جگہ دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لیے چوٹی تھیں۔ راستہ بنا ہوا تھا۔ آہنی پتھروں کے درمیان سے سڑک سٹ کر گزرتے ہوئے اس طرف پہنچا جا سکتا تھا۔

موٹر سائیکل والے کو کیا اچانک ہی اس طرف کوئی چیز بڑی نظر آئی اور وہ پلگ صاف کرنے کے بجائے اس طرف جانے ہوئے ہوا "ارے... یہ کیا رہا ہے!"

بل کے اس طرف وہ گویا پھٹنے میں چلا گیا۔ پھر اس نے وہیں سے ایک لگائی "عالمی صاحب! ذرا آکر دیکھو تو سہی... یہ کیا ہے!" اس کے لیے میں بے پناہ حیرت تھی۔

اس کی پشت میری طرف تھی اور وہ چلی فرش پر جکا ہوا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جو کچھ وہ مجھے دکھانا چاہ رہا تھا شاید وہ اس کی اپنی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس کا دل رکھنے کو کسی طرح پہنچا کر اس طرف چلا گیا۔

"کیا چیز ہے یہی جس نے آپ کو اتنا حیران کر دیا ہے؟" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ قطعاً حیران نہیں تھا بلکہ مجھے حیران کرنے پر تیار ہوا تھا۔ وہ یکدم تیزی سے گھوما۔ اس کے ہاتھ میں رولور تھا جس کا رخ میرے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ پہلے سے قطعی مختلف اور کمزورے لیے میں بولا "نکال دو جو کچھ تمہارے پاس ہے۔"

میں میری سانس لے کر رو گیا۔ درحقیقت یہ اطمینان کی سانس تھی۔ میرے لیے یہ خوشی کا مقام تھا کہ وہ کوئی زیادہ خطرناک چیز نہیں، محض ایک عام سا اچکا اور لٹیرا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں تو بس ایک ہی خیال تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے کسی آدمی سے کراؤ نہ ہو۔ اپنی خواہ کسی سے بھی سامنا ہو جانا، مجھے کوئی پروا نہیں

موٹر سائیکل پر سڑک کا ٹیپ و فراز سے بھر پور اس عوامی زندگی میں کوئی نئی بات نہیں تھی جو ہمارے ہاں کے قریب قریب سے زائد لوگ گزار رہے تھے اور مجھے اب میں بھولنا جا رہا تھا۔

لیکن اب اسی زندگی سے دوبارہ واسطہ پڑا تھا تو مجھے تمام بھولے ہوئے سبق تیزی سے یاد آتے گئے تھے۔ موٹر سائیکل پہنچ کر میں اچھا خاصا لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس سواری سے واسطہ پڑا تھا جو لڑائی بل کمانی "تیز ہو کا سینہ چیرتی آگے بڑھتی تھی تو وہیں سے خود کی دور ہو جاتی تھی۔

وہ پرانے بل کے راستے جا رہا تھا جسے قینچی والا بل بھی کہا جاتا تھا۔ سرخ رنگ کے اس عجیب و غریب بل میں نچوں وزلی لوہے کے پڑاؤں کرورز کا ایک جال سا بنا ہوا تھا جو ایک خاص ترتیب سے قینچی کی طرح ایک دوسرے کو کراس کر رہے تھے۔ سنا تھا کہ ہوائی حملے کی صورت میں اس بل کو درمیان سے کھول کر دریا میں لٹکا بھی جا سکتا تھا۔ اس صورت میں وہ ٹوٹنے سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

انگریزوں کے زمانے کے بنے ہوئے اس بل کے بارے میں کئی روایات مشہور تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے اسے ڈیزائن کرنے والے مسلمان انجینئر کے ہاتھ کوڑا دیے تھے تاکہ وہ کہیں اور ایسا ڈیزائن دوبارہ تخلیق نہ کر سکے۔ لیکن مجھے یہ روایت کچھ ایسی مستحکم معلوم نہیں ہوئی تھی۔ انگریز راستے بے وقوف نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اگر مسلمانوں کو کسی قابل انجینئر سے محروم کرنا ہوتا تو وہ اس کے لیے زیادہ عقلمندانہ طریقہ اختیار کرتے۔ یعنی اسے انکشاف لے جاتے۔

اس کے بارے میں ایک مستحکم روایت... بلکہ ایک طرح کی لوک داستان یہ بھی تھی کہ اس کی تکمیل کے بعد پہلی بار اس پر سے آزمائشی طور پر ٹرین گزارنے کے لیے کوئی اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آخر کار سندھ کی کسی جیل میں عرقیہ کاٹنے والے جمال نامی قیدی کو اس شرط پر تیار کیا گیا کہ اگر وہ ٹرین کو لے کر خیر و ماییت سے ملے گا تو اس کی باقی سزا صاف کر دی جائے گی۔ جمال ٹرین لے کر خیریت سے گزر گیا اور اس کے بعد سے نہ جانے کتنی ٹرینیں نہ جانے کتنی مرتبہ اس بل سے گزر چکی تھیں جو نیچے سے کسی سارے کے بغیر دیا پر مطمئن تھا۔ اسی جمال کے اعزاز میں مشہور سندھی لوک نغمہ "ہو جمال" تخلیق ہوا تھا جو امر ہو چکا ہے۔

چھوٹی چھوٹی لاپرواہیوں اور کشتیوں کو چھوڑ کر برس یا برس تک صرف یہ بل اندرون سندھ کو بائی ملک سے ملانے کا سب سے بڑا ذریعہ رہا۔ دوسرا بل جسے عام طور پر نیابل کہا جاتا تھا کمان کے ڈیزائن پر بنایا گیا تھا۔ اس کے نیچے بھی کوئی سپورٹ نہیں تھی۔ اپنی کمان کی صورت میں دیا پر مطمئن تھا۔ یہ بھی اب کچھ ایسا نیا نہیں رہا تھا۔ ایوب خان مرحوم کے زمانے میں بنایا تھا لیکن ہر حال قینچی والے بل کے بعد بنا تھا۔ اس لیے ابھی تک نیابل کے نام سے

جس سے دوبارہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

مگر اس وقت تو ہم ایک عجیب ہی مقام پہ کھڑے تھے۔ بدل چلنے والے راستے کا خاکہ قطعی دیکھا زیادہ اونچا نہیں تھا۔ تھمیلہ چلنے پر سے جوتا ہوا پیچھے پر شور دریا میں جا کر اور نظر سے اوجھل ہو گیا۔

میں اس شخص کے ہلے سے بچنے کے لیے ایک طرف کو تو ہو گیا تھا اور وہ اپنی جھونک میں کچھ آگے چلا گیا تھا لیکن میں اس پر کوئی وار نہیں کر سکا۔ میری رگوں میں لوسر ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے گویا سارا منظر میری نظر میں دھندلا گیا تھا۔

پلک جھپکنے میں میرا چندہ لاکھ روپیہ دریا برد ہو گیا تھا۔ اور جس گدھے کی وجہ سے یہ حادثہ ہوا تھا اس کے شاید تصور میں بھی نہیں تھا کہ تھیلے میں اتنی بڑی رقم تھی۔ وہ تو میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ پانچ دس ہزار کے آسیرے پر واردات کرنے کے لیے اترا تھا۔

کسی عام سراپہ دار کے لیے تو رقم کا مدد ہی کافی ہوتا۔ رقم ہر حال کچھ کی نہیں تھی۔ خواہ وہ کسی طرح کسی بھی قسم کے حالات میں ضائع ہوتی، ایک بار تو ضرور مالک کی دھڑکنیں رکنے کو ہو جاتیں۔

لیکن میرے لیے تو اس رقم کی اہمیت کسی اور کٹھن نظر سے تھی۔ میری روپوشی طویل بھی ہو سکتی تھی اور اس دوران مجھے کہیں بھی کسی بھی مقصد کے لیے رقم کی ضرورت نہ پڑ سکتی تھی۔ مگر اوقات کے علاوہ بھی سو مسائل درپیش آسکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے کسی خیرہ راستے سے لٹک سے لٹکا پڑا۔

یہ رقم ساتھ لے کر میں گویا ان تمام امکانات کے لیے بندوبست کر کے نکلا تھا لیکن محض کسی کے ذرا سے لالچ کی وجہ سے میرا یہ بندوبست دھرا کا دھرا کیا تھا۔ اب میں تقریباً قحطی دست تھا۔ رقم کی موجودگی سے انسان کو خواہ مخواہ بیجا حوصلہ سارہتا ہے۔ اب تو یکدم ہی گویا کسی نے میرے قدموں تلے سے ہل چھین لیا تھا۔ میرا تھمیلہ نہیں گویا میں خود دریا میں جا کر اٹھا۔

رقم کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں رقم کے لینے یا کسی بھی اور مقصد کے لیے اپنے کسی ساتھی کا رکن سے رابطہ قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی کو اپنا آجاتا، اپنا کوئی سراغ دے نہیں چاہتا تھا۔ میں اس طرح روپوش ہونا چاہتا تھا گویا اس کراڑی پر کبھی میرا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔ یہ میری ایک کوشش، ایک تجربہ تھا۔ کام بھی ہو سکتا تھا۔ فی الحال اسی پر میری زندگی اور موت کا دار و مدار تھا۔

صرف ایک ٹاپے میں یہ سب خیالات میرے ذہن میں آئے لیکن فوراً ہی مجھے اپنے ذہن کو اس صورت خیالی کی طرف واپس بھی لانا پڑا جس سے اس وقت میں دوچار تھا۔ رقم تو باقی بچی تھی لیکن میری غائب دماغی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ عیبٹ مجھے کوئی اور نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ میں نے بظاہر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں

تھی۔ لیکن ساتھ ہی مجھے دل میں اپنے آپ پر ترس بھی آیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا ”دیکھا ہر خوددار شخص چوہدری؟ غلامی اوقات بدلنے سے کتنا فرق پڑ گیا اب تو راہ چلنے اپنے گھٹے بھی تم پر رہا اور اتنے گھٹے ہیں۔“

اب تک میں نے یہ تو بار بار سنا تھا اور کبھی کبھار چھوٹی موٹی خبریں پڑی تھیں کہ کوئی اپکا لٹیرا یا راجن لٹ لے کر کسی موڑ سائیکل پر یا گاڑی میں سوار ہوا اور بعد میں گاڑی والے کی کینٹی پر رہا اور رکھ کر اسے لوٹ کر لے گیا، گاڑی چھین کر لے گیا لیکن اس لٹیرے اور راجن لٹ لے ایک انفرادیت ضرور قائم کی تھی کہ وہ اپنے شکار کو لٹنے کے لیے خود لٹ دے کر لایا تھا۔

میں نے خوف سے کانپنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ”ہائیں ہائیں ٹپ کو کہاں سے اس قابل نظر گیا کہ آپ مجھے لوٹ سکیں؟ میں تو ایک غریب مسکین ہاں ہی ہوں۔ میرے پاس تو ان ڈھائی تین سو روپے کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی میری کل پونجی ہے۔“ میں نے اسے جیت سے پتی پٹی رقم نکال کر دکھائی۔

”ہو اس مت کہ۔ یہ تھمیلہ ادھر سے دو۔“ اس نے اشارہ کیا ”مجھے معلوم ہے تم غریب لوگ جب کسی بڑے کام پر نکلے ہو تو زندگی بھر کی جمع پونجی ایسے ہی پیسے پرانے تھیلوں میں رکھ کر لے جاتے ہو تاکہ کوئی اس طرف توجہ نہ دے۔“

وہ اس میدان کا بارنا کھلاڑی معلوم ہوتا تھا۔ مجھا ہوا فزکار تھا۔ یقیناً اسے کچھ مفلوک احوال لوگوں سے اس قسم کے پیسے برائے تھیلے چھیننے کا تجربہ تھا جس سے موٹی روپیں برآمد ہوتی تھیں۔ بعض اوقات غریب آدمی واقعی اپنی عمر بھر کی جمع پونجی ایسے کسی تھیلے یا پوٹلی میں رکھ کر پتی کی شادی کے لیے زور ہواتے، نیز غریبے یا کسی مجموعے موٹے مکان، دکان کا سودا کرنے جا رہا ہوتا ہے مگر ایسے کسی لٹیرے کے اقبول زندگی بھر کی کمائی گنوا چیتا ہے۔

”اس تھیلے میں کچھ نہیں ہے بھائی! اس دو جوڑے کپڑے ہیں۔ سبز، نکلا ہوا ہوں اس لیے ساتھ لے لیے تھے۔ آپ چاہیں تو لے لیں۔“ میں نے تھمیلہ اس کی طرف بڑھایا۔

میرا خیال تھا کہ وہ آرام سے آگے بڑھ کر تھمیلہ میرے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرے گا اور میں اسی دوران رہا اور کسی ترکیب سے اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کی تھوڑی سی نمکالی کر کے اسے سبق سکھانے کی کوشش کروں گا۔

لیکن اندازے کی ذرا سی غلطی بھی کبھی کبھی کا پلٹ دیتی ہے۔ نہ جانے کیوں وہ محض دانت نہیں کرا چاک ہی رہا اور سمیت تھیلے پر جھپٹا۔ میں نے جھکا دیں کے لیے تھمیلہ اور اٹھاتے ہوئے کھمایا اور تھمیلہ غیر متوقع طور پر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ کچھ دور نہیں نہ کہیں ایسی جگہ جا کر آ

تھا نہ جانے ان کمرؤں میں کوئی موجود تھا یا نہیں اور اگر کوئی موجود تھا تو اس نے پل پر ہونے والا تماشا دیکھا تھا یا نہیں؟

میں اس سوال پر زیادہ غور کرنے کے بجائے جلدی سے اس جگہ پر واپس آیا جہاں ٹریک رواں رہتا تھا۔ پیدل چلنے سے پہلے میں اس پیر بخت کی موٹر سائیکل پر قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔

میں نے پوز سائیکل کو دو تین مرتبہ کلک لگائی تو وہ اشارت ہو گئی۔ اب تو ظاہر ہو چکا تھا کہ اس شخص نے موٹر سائیکل خراب ہونے کا بہانہ کیا تھا۔ اس نے خود ہی موٹر سائیکل بند کی تھی۔ مجھے

موٹر سائیکل دیکھ کر بارے میں اب زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن کچھ پر اصرار تھا کہ ان میں محفوظ تھے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں نے اسے پتلا ہی کیئر لگایا تھا یا وہ سراسیمہ میرے لیے تو بس قیمت یہ

تھا کہ وہ چل پڑی اور پھر پتلی ہی پتلی گئی۔

پل سے اتر کر کچھ دیر میں اوپر اوپر چل کر کچھ دیر میں جھکتا ہوا۔ ابھی ٹریک بہت کم تھا اس لیے مجھے کوئی خاص وقت پیش نہیں آئی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا تو میں

نے موٹر سائیکل ایک سٹیشن گلی میں چھوڑ دی۔

ایک قریبی سڑک پر پہنچ کر کچھ رکھنا ل گیا۔ رستے میں پتھر کر

میں نے ذرا نیو کولاری اوڑھے چلنے کی ہدایت کی۔

”گوں سے لاری اوڑھے بھاگی؟ جی ہاں ایس کے یا پرائیوٹ؟“

ذرا نیو رے پوچھا۔

”پرائیوٹ“ میں نے سوچے مجھے بغیر جواب دیا۔ میں اس وقت دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کس

علاقے کا رخ کرنے کے لیے پس پکڑنی چاہیے۔ مجھے یاد تھا کہ برسوں پہلے کدھ کوٹ میرا تھوڑا بہت دیکھا بھلا علاقہ تھا۔ کس

زبانے میں مختصر عرصے کے لیے وہاں کے ایک ہندو تاجر سے

ہمارے ”کاوہاری“ خراسم قائم ہوئے تھے مگر ہماری ہی کچھ دشواریوں کی وجہ سے وہ زیادہ عرصے برقرار نہیں رہ سکے تھے۔

مجھے معلوم تھا کدھ کوٹ سے سوئی (جسٹا) سے پندرہ کم تھیں

لفظی ہے مگر اس مقام کی مناسبت سے اس کا نام سوئی نہیں پڑا

(ہے) کے راستے بوقت ضرورت بلوچستان کی طرف بھی نکلا جاسکتا تھا اور غیر معروف مقامات تو راستے میں یا کدھ کوٹ کے آس پاس

بھی بیٹوں تھے۔ ہزاروں میل میں پھیلا ہوا اوپر کا علاقہ کہیں نیم دیکھ کر آتا تھا کہیں نیم شری۔ کہیں میدانی معلوم ہوتا تھا تو کہیں صحرائی، کچھ تو قلعہ تھی کہ کمرے برسوں میں اوپر کچھ زیادہ تبدیلیاں

نہیں آئی ہوں گی۔

کیا تھا اور دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے تو چلا گیا تھا لیکن دیکھ چکا تھا کہ تھیلا دریا میں جا کر اٹھا اور غائب ہو چکا تھا۔ اس چیز نے اسے بھی ذرا ہلکا دیا تھا۔ جس چیز کا جھگڑا تھا وہی جاچکی تھی۔ اس کے باوجود شاید جھنگلاہٹ کے باعث وہ ریو اور کا رخ میری طرف کرتے ہوئے تیزی سے گھومنا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ فائر کرنے میں درہنہ نہیں کرے گا۔ شاید مجھے سبق دینا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ اس بد بخت کو تو اپنی ناکامی کی جو جھنگلاہٹ تھی سو سچی لیکن اسے میری جھنگلاہٹ کا اندازہ نہیں تھا۔

میرے اندر کا درندہ بیدار ہو چکا تھا جو بلاوجہ زیادتی کرنے والوں کی گردن دوڑنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ میں اسے

سلائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا لیکن کبھی کسی کی کوئی حرکت اسے یکدم ہی غصیناک بنا دیتی تھی۔

ویسے تو اس معاشرے میں بعض اوقات پانچ روپے کے لیے بھی انسان کے ہاتھوں انسان قتل ہو جاتا ہے لیکن میں پندرہ لاکھ کے لیے بھی کسی کو قتل کرنے کے حق میں نہیں تھا مگر اس وقت

صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ اس بد بخت نے بہت سی عجیب بہت سی بے وقت اور بہت سی قسم طریقہ نامہ قسم کی زیادتی کی تھی۔

اس کے بعد شاید اس کی کچھ میں نہ آیا ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہو سکا ہو گا کہ میں کس طرح

اس پر جھجکا تھا، کس طرح میں نے اسے فائر کا موقع دیا بغیر اس کا ریو اور والا ہاتھ اس کی پشت پر ملے جاتے ہوئے بازو موڑ کر شاید

کدھ سے کا جوڑی الگ کر دیا تھا۔

وہ لٹو کی طرح گھوم چکا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کے حلق سے ایک ٹپکی مگر کرب ناک سی چیخ برآمد ہوئی۔ میں

نے اس کی کمر پر ٹھٹھا رسید کرتے ہوئے اچانک ہی غیر ارادی سے

انداز میں اسے ہوا میں اچھال دیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے تھیلے کی طرح وہ بھی جھلکے کے اوپر سے ہوتا ہوا دریا میں جا کر ا۔ اسے

دوسری چیخ مارنے کی مہلت نہیں ملی۔

میں اس کا انجام دیکھنے کے لیے وہاں رکا نہیں۔ میں جو چند

نوٹ جیب سے نکال کر اسے دکھانے کا تھا وہ چوٹی پر فرش پر گر چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں سمیٹ کر جیب میں ڈالا۔ اب یہی

میرا کل سرمایہ تھا۔ میں تو دریا بڑھ جانا والی رقم کے بل پر ابھی تک اپنے آپ کو حاکم طائی ہی محسوس کر رہا تھا لیکن اب ”حاکم

طائیت“ مجھے اپنے اندر سے رخصت ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ سب کچھ ذرا سی دیر میں ہو گیا تھا۔ اس دوران پل پر تو شانا

ہی رہا تھا۔ البتہ نیچے دریا کے کنارے جہاں پل کا ایک سراسر ٹکڑ

کے پلٹ فارم دیو میں نصب تھا۔ وہاں قریب ہی دو کمرے سے

دکھائی دے رہے تھے جن کے دروازے کھلے تھے لیکن اندر اندر چرا

نے رقم وغیرہ کا خیال دل سے نکال دیا۔ میں نے اپنے آپ کو تھیں دلا دیا کہ رقم وغیرہ مجھے اور ثانوی چیز تھی۔ اصل چیز حوصلہ تھا۔ مجھے اپنا حوصلہ ڈھٹنے نہیں دینا چاہیے تھا۔ میرے لیے لی الحال تو مستقل حرکت میں رہنا بھی ضروری تھا کیونکہ ابھی تک میرا یہ احساس باقی تھا کہ کوئی مادہ خطرہ میرے قنات میں ہے۔ اس خطرہ کے محسوسات بھی شاید یہی ہوتے ہوں جس کی بڑھ سکتے ہوئے شکاری کہتے، مختلف سمتوں سے اسے تلاش کرتے ہوئے بڑھتے چلے آ رہے ہوں۔

میں نہ صرف پوری بھر چکی تھی بلکہ کچھ لوگ کھڑے بھی تھے لیکن اس کے چلنے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے۔ انجی گھر گھر کیے جا رہا تھا لیکن ذرا بڑی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ آخر کار ایک اور غالی بس آکر اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تب ہماری بس کا ڈرائیور کہیں دور سے دوڑا دوڑا آیا اور اس نے اذکار کرم بس کو کسی ٹکڑے کچھ بے کی رفتار سے چلانا شروع کیا۔

بس جتنی دیر شری حدود میں رہی اس پر مزید سواریاں لدتی رہیں۔ غلیور دینے تک بس میں مسافر کچھ اس طرح لد چکے تھے جس طرح ٹرک میں خرو زلے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مسافر اسے کے چھوٹے چھوٹے مہات سے چڑھنے اترنے والے تھے۔ غلیور حالانکہ ایک چھوٹا سا تھبہ تھا لیکن نہ جانے کیوں بس وہاں آٹھا گھنٹا کھڑی رہی۔ شاید اس لیے کہ تھبے سے مسافروں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ تھبہ سڑک سے کالی چیمے مٹ کر تھا۔ مجھے یاد تھا کہ جناب میں بھی اسی نام کا ایک چھوٹا سا شرمو جو تھا۔

بس غلیور سے روانہ ہوئی تو اس میں دو تین بکریوں اور کئی مرغیوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا لیکن وہ بے جا مایاں بھی مسافروں کے درمیان اس طرح پھنسی ہوئی تھیں کہ اندازہ کرنا مشکل تھا آیا بکریاں مسافروں پر سوار ہیں یا مسافر بکریوں پر یا پھر دونوں کی مرغیوں پر سوار ہیں لیکن بکریاں بھی مسلسل مچا رہی تھیں اور مرغیاں بھی عالم دشت میں مستقل گڑگڑا رہی تھیں۔

میں یہی شکر کر رہا تھا کہ مجھے سینٹ ایک ایسی کھڑکی کے پاس ملی ہوئی تھی جو باجٹ بھر چکی تھی ورنہ شاید میری ناک کسی مسافر کی بٹل میں ہوئی۔ بہرین کمرہ کسی مسافر کا ٹرک ہوتا اور میری سانسیں کسی بکری کی سانسوں سے ہم آہنگ ہوتیں۔ بس کی پھت پر بھی لوگ سوار ہو چکے تھے جس کی وجہ سے وہ ناہوار سڑک پر ادھر ادھر لہرا رہی تھی۔

دیکھنے میں بس اچھی بھلی نظر آ رہی تھی لیکن پلے میں وہ خاصی کھٹار معلوم ہوتی تھی۔ جو سلوک اس کے ساتھ ہوا تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔ جس بری طرح اس کا ہر حصہ کھڑکڑا رہا تھا اس سے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ پہلے تو ایک ایک کر کے مسافر اس پر سے لڑھکیں گے جس طرح درخت سے بکے پھل کرتے ہیں۔ پھر بس کے اجڑائے تر کیبی ایک

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں شرمیں نیا ہوں اور میرا علیہ بھی مظلوم الحال ساتریوں والا تھا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے ادھر ادھر مٹھا پھرا کر کھٹکی کی کوشش نہیں کی اور دو چار سو ڈر کر تھوڑا سا حاصل ملے کہ میرے پاس لے جا کھڑا کیا جس کا کڈیکٹر زور و شور سے کھنکھہ کھٹ کھنکھہ کوٹ "کی آواز میں لگا رہا تھا۔

دن کا اجالا پھیل چکا تھا تاہم ابھی سڑکیوں پر زیادہ ٹرک نہیں تھا۔ اس کے باوجود بس تقریباً بھری ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کڈیکٹر مسافروں کو بلانے کے لیے صدا میں لگائے جا رہا تھا۔ اب میں عوامی زندگی کو قریب سے دیکھ رہا تھا تو یہ جان کر حیرت سی ہو رہی تھی کہ بیس "ٹرینیں" ہر وقت ہر جگہ کھینچ بھری ہوئی ہی ملتی تھیں۔ مظلوم نہیں دساکل اور آسائشیں کتنی بڑھی تھیں لیکن میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ ہر جگہ تنگی پریشانی اور مسائل میری غمت کے زمانے سے زیادہ بڑھ چکے تھے۔ اب تو غریب و تنگ دست کے لیے.... کچھ کاسائس لینا بہت ہی دشوار ہو چکا تھا۔

اس بس میں بھی مجھے بالکل چیمے ایک کونے میں سیٹ میسر آئی اور میں سڑک کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ رقم کے ضائع جانے کا آئنت ابھی تک میرے دل میں دھند کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا دو ڈھائی سو روپے کب تک میرا ساتھ دیں گے۔ رقم حاصل کرنے کے لیے میں کوئی مجراں طریقہ بھی اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر میں ایک عام اور جی دست انسان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لیے اور خود بھی کچھ عرصہ اسی طرح گزارنے کے لیے نکل ہی کھڑا ہوا تھا تو مجھے کتنی طرح اس آزمائش سے گزرنا چاہیے تھا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ علیہ تو ایک غریب اور مظلوم الحال شخص کا بیٹا ہوا ہے اور قہیلے میں چند روٹا کھ روپیہ رکھے گھوم رہے ہیں کہ جہاں بھی کوئی دشواری نظر آئی یا مسئلہ درپیش ہوا وہاں نوٹ نکال کر کسی کے منہ پر دے ماریں گے۔ یہ کوئی آزمائش تو نہ ہوئی۔

اس دنیا میں ان گنت لوگ ایسے تھے جن کی جیب میں دو ڈھائی سو نوٹ یا دو ڈھائی روپے کے ساری رقم نہیں ہوتی تھی۔ جنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ اگلے وقت کی دہلی کہاں سے کھائیں گے۔ قدرت کو اگر منظور ہوتا تھا تو وہ انہیں بھی زندہ رکھتی تھی۔ مجھے بھی زندگی کے اصل مسائل کا اندازہ تو بالکل تلاش ہونے کے بعد ہی ہو سکا تھا۔ مجھے اس کے لیے تیار رہنے کا حوصلہ رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے تو وہ زمانہ بھی دیکھا ہوا تھا جب شکر گڑھ سے لاہور آنے کے لیے بس کا کارایہ جیب میں نہیں ہوتا تھا۔ ہٹا کی جنگ تو اس وقت بھی لڑی تھی اور کہاں سے کہاں آن پہنچا تھا۔ ہٹا کی جنگ کے صحیح معنی ہی در حقیقت انتہائی مفلسی میں سمجھ میں آتے تھے۔

اپنے آپ کو سمجھانے بچانے سے مجھے کچھ حوصلہ ملا اور میں

ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑیں گے اور آخر میں صرف انجن  
منزل مقصود تک پہنچے گا۔

لیکن یہ سب روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ ایک عام  
آدمی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہم سب سخت جان پاکستانی  
تھے۔ ہشتم ہشتم منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہی رہے۔ لڑتے  
جھگڑتے، ہانپتے کانپتے، بھانٹ بھانٹ کی بولیاں بولتے، مچھڑ رہے۔  
کندھ کوٹ تک کا سفر مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے  
دنیا کے گرد چکر عمل کر لیا ہو۔ شہر کے آثار نظر آنے لگے تو میں نے  
ذرا سکون کی سانس لی لیکن یہ سانس کچھ زیادہ طویل ثابت نہیں  
ہوئی کیونکہ بس شہر کی حدود میں داخل نہیں ہو سکی۔

اس سے پہلے ہی سڑک کے کنارے درختوں کے چھنڈ سے  
کمرے تلے رنگ کی ایک پھاو برآمد ہوئی جس پر پخت تک دھول  
جی تھی۔ صرف شیشے صاف تھے۔ ست ہانسی کی طرح لڑاتی ہوئی وہ  
تشیب سے سڑک پر چڑھی اور ایک دھچکے سے عین وسط میں اس  
طرح آن رکی کہ بس کے ذرا نیور کے لیے بس کو روکنے کے سوا کوئی  
چاہہ نہیں تھا۔

میں نے سنا تھا سندھ کی شاہراہیں ڈاکوؤں سے کافی حد تک  
محفوظ ہو چکی تھیں لیکن یہ تو دن دہائے ڈاکے کا کوئی سین چل نظر  
آ رہا تھا۔ لگتا تھا قدرت کو میری جیب میں بیج جانے والے تقریباً دو  
سو روپے کے ”خظیر“ سرمے کا میرے پاس رہ جانا بھی منظور نہیں  
تھا۔

ہیجڑوں سے مجھے پانچ افراد اترتے دکھائی دیے۔ پانچوں کے پاس  
کلا شکو نہیں تھیں۔ وہ سب کمرے رنگوں کی ڈھیلی ڈھالی شلوار  
قیصوں میں تھے۔ سڑوں پر مخصوص انداز کی پگڑیاں تھیں۔ ان میں  
سے تین لمبے تڑپتے اور گھنی داڑھی مونچھوں والے تھے۔ دو ان  
کے مقابلے میں ذرا پست قد تھے لیکن جسم ان کے بھی جھٹکے ہوئے  
دکھائی دیتے تھے۔ ان کی صرف گھنی مونچھیں تھیں لیکن وہ اس قسم  
کی مونچھیں تھیں جن کی مونچھوں میں داڑھی کی کمی محسوس نہیں  
ہوتی۔

مسافروں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ بس میں ایک سرے سے  
دوسرے سرے تک تھڑ بڑا سٹ شروع ہوئی جو فوراً ہی دم توڑ  
گئی۔ دوسرے ہی لمحے گویا سب کو سانپ سو گئے گیا۔ حتیٰ کہ بکریاں  
بھی گویا فضا میں کسی انتہائے خطرے کی گونج محسوس کرتے ہوئے برپا  
بھول گئیں۔ صرف ایک مرنی لے صدائے احتجاج جاری رکھا۔

کلا شکوؤں والے ہیجڑوں سے اترتے ہی بس کے دروازوں  
والی سمت میں چلے گئے اور میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ ان میں  
سے ایک البتہ دوسرے ہی لمحے ذرا نیور والے دروازے پر آن  
کھڑا ہوا۔ باقی چاروں میں سے دو بس کے اگلے دروازے سے اور  
دو پچھلے دروازے سے بس میں چڑھے۔ ان میں سے ایک نے  
بھاری کونجیلی اور بامعرب آواز میں سب مسافروں کو پہلے بلوپی

# عقاب

اسلمہ علیہ السلام نے 150

نوجوان امجد علی کی  
پراسرار اور عبرت انگیز  
داستان

# روکے

م۔ الف صدیقی کے پراسرار قلم سے

ہر حصوں میں شائع ہو چکی ہے

قیمت فی حصہ ۵۰/- روپے  
مکمل سیٹ ۲۵۰/- روپے

ناشر

مکتبہ القریش، سرگرم روڈ  
اُردو بازار، لاہور ۲

یہ پھر منہ جی میں جس سے نہایت آرام سے ایک ایک کر کے  
سننے کا نظم بنایا۔ میں دونوں زبانیں سمجھ تو سکتی تھی لیکن  
پہلی پہلی بار بھی لکھا تھا اس میں ہم اردو اور کچھ پنجابی کی آمیزش  
کر کے کام چلے سکتا تھا۔

وہ پاسوں میں سے اتر کر دونوں دواخانوں پر گزرتے ہوئے  
مسافر ایک ایک کر کے اس سے اتر کر ان کے درمیان سے گزرتے  
ہوئے نہایت نظم و ضبط سے تقاریر میں ملنے لگے اتنے نظم و ضبط  
سے تو میں نے مسافروں کو حجاز سے بھی اترتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید  
بے چارے ان سلاطنت میں بہت نرغہ ہو گئے تھے نہایت  
دانشمندی سے کام لیتے ہوئے انہوں نے مغربیوں اور بکریوں کو اس  
میں ہی جموڑا کیا تھا۔

اک شگفتہ یہ وہ نہایت فور سے ایک ایک کا سر تپا ہاتھ لیتے  
بارے تھے میرا انہوں نے ذرا زیادہ توجہ سے ہاتھ لایا۔ میں سب  
سے آخر میں اترتا تھا اور اترتے ہی میں نے گردو پیش کا ہاتھ لے  
لیا تھا کہ اگر ان لوگوں سے الجھنے یا بھاگنے کی ضرورت پیش آئی تو  
کامیابی کے کتنے امکانات ہوں گے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ اس قسم کی کسی کوشش میں مارے جانے  
کے امکانات زیادہ تھے وہ تھوڑی سی پانچ تھے سب کے پاس  
اک شگفتہ نہیں تھیں۔ یہ کوئی معمولی ہتھیار نہیں تھا اور وہ اس کے  
استعمال میں تو آموڑ یا بھینچنے والے بھی دکھائی نہیں دے رہے  
تھے۔ اور گردو کوئی جگہ بھی ایسی نہیں تھی جس کی آڑ لی جاسکتی تھی  
اور چھٹا یا جاسکتا۔

آؤ لے کر مجھے کہہ بھی کیا تھا؟ میرے پاس تو ایک ہتھیار کے سوا  
کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں سب سے آخر میں اترتا تھا۔ ذرا نیور  
سمیت سب لوگ گانگن حاضر تھے۔ انہوں نے اس طرح ماہرانہ  
انداز میں ہمیں گھیرے میں لیا ہوا تھا کہ ذرا سی بھی گزریا یا ہنگامہ  
ترائی کی صورت میں بے گناہ اور سادہ لوح و سادہ بکریوں کی  
فرمانت جاسکتے تھے۔

میں نے جس کے اندر رچے ہوئے بھی ان سے الجھنے کے  
بے میں سوچا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال ذہن سے نکال دیا  
تھا اس قسم کی ہوسوں میں تو ویسے ہی انسان کی حالت چڑھ جاتی ہے  
یہ کہتے ہوئے چوہے سے مشابہ ہوتی ہے ایسے میں ایک تھا اور  
ایک سبب محض کا خود کار ہتھیاروں سے مسلح پانچ افراد سے الجھنے کے  
بے میں سوچنا خود کشی کی ایک سستی ہے یہ وہی سی کوشش تھی۔

وہی بھی مجھے گزریا شروع کرنے میں پہل کرنے کی ضرورت  
ہی تھی۔ یہ تو اپنے آپ کو خودی مشکوک بنانے والی بات تھی۔  
پہلے تو مجھے دیکھنا چاہیے تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ لے کر آئے  
تھے اس سے یہ اندازہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کون لوگ؟ اگر ڈاکو  
نہ نہ تھا یہ اپنی آخری پوچھی یعنی تقریباً دو سو روپے کا حقیر نذرانہ ان  
خدمت میں پیش کر کے ہی جان چھوٹ جاتی۔ میں تو ان کے

تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ اب زندہ بھی تھا یا نہیں۔ ضروری نہیں  
تھا کہ وہ لوگ اسے جانتے بھی ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا یہ حوالہ میرے کسی کام آنے والا  
نہیں تھا۔ بات حیت اب اردو کی زندگی میں ہو رہی تھی لیکن بہتر





معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن اردو بکس آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- 1- گروپ میں یا گروپ ایڈمن سے کوئی بھی بات / درخواست / فرمائش کرتے وقت السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کو فراموش نہ کریں۔
  - 2- ایڈمنز یا دیگر ممبرز جو بھی اچھی پوسٹ کریں اس پر کنٹنس / عکسز / انیمو جیز / رائے لازمی کریں تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور دیگر ممبران کو بھی اس کتاب / پوسٹ کی اہمیت کا اندازہ ہو۔
  - 3- گروپ ایڈمنز سے پرسنل سوالات یا بحث مت کیجئے۔ صرف کتب کے متعلق دریافت کریں یا درخواست کریں۔
  - 4- ایڈمنز اور ممبرز سے اخلاق سے پیش آئیں۔ اگر ہم ادبی گروپ میں موجود ہیں لیکن ہماری اخلاقیات معیاری نہیں تو ہمیں ادبی گروپ کا ممبر کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ کوئی ممبر کسی دیگر ممبر کے انباکس میں میسج نہیں کرے گا ورنہ ریوود کر دیا جائے گا۔
  - 5- گروپ میں یا ایڈمن کے انباکس میں وٹس میسج، ویڈیوز بھیجنے کی حرکت مت کریں ورنہ ریوود اور بلاک کر دیئے جائیں گے۔
  - 6- گروپ میں کسی بھی قسم کی مذہبی فرقہ پرستی / سیاسی / انتشار پھیلانے والی گفتگو سختی سے منع ہے
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخ رسول، گستاخ صحابہ و اہلبیت، دہشت گرد / کالعدم / پاکستان مخالف تنظیموں کے افراد یا ایسے غیر مسلم جو پاکستان اور اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے فزیکلی / روحانی / ذہنی سپورٹرز ہوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص سے گزارش ہے کہ گروپ جو ان کے کرنے کی بالکل بھی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریوود کر دیا جائے گا۔

7- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤن لوڈ کر کے وٹس ایپ گروپس میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

8- یاد رہے کہ ہمارا کوئی کتب خانہ / دوکان / شاپ / سٹور نہیں ہے نہ ہم کوئی کتب بلش کرتے ہیں نہ ہی اسکن کرتے ہیں۔ نہ ہی ہمیں کسی پبلشر کی خدمت ہی حاصل ہیں کہ ہم کسی کی کتب چھاپیں۔ جو کتب انٹرنیٹ سے نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔

گروپس میں صرف ناولز، لطائف، تاریخ، اسلام اور تدریسی کتب ہی شیعری کی جاتی ہیں کسی بھی متنازعہ / بین شدہ / پاکستان

دادارہ مخالف یا ممنوعہ کتاب سے ایڈوائس معذرت)

جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

7۔ ہمارا گروپ جو آن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں اور وٹس ایپ سلیکٹ کر کے جو آن کر لیں۔ صرف ضروری گروپ ہی جو آن کریں۔

8۔ گروپ رولز سخت ہیں لیکن ممبر کی سہولت کے لئے ہیں

گروپ فل ہونے یا لنک ریپوک ہونے کی صورت میں ایڈمن سے صرف وٹس ایپ پر لکھ / ٹائپ کر کے منیج کریں۔ وٹس نوٹ سے گریز کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل سم پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔

9. ڈیمانڈ صرف صبح 9 سے 2 بجے تک کریں (جمعہ اور اتوار کو چھٹی) اپنی ڈیمانڈ کے بعد 48 گھنٹے تک پوسٹنگ کا انتظار فرمایا نہ ہونے پر دوبارہ یاد کروادیں (ایڈمنز کی مصروفیت کی بناء پر اپنی ڈیمانڈ یاد کروانا ممبر کی ذمہ داری ہے)۔ پوسٹنگ گروپ میں ہی ہوگی انباکس میں نہیں کی جائے گی۔ شکریہ

فیمل کے لئے الگ گروپ موجود ہے جو صرف فیملیز کو ہی مہیا کیا جائے گا

اللہ کریم ہم سب کا حامی و ناصر ہو



# سکس



محمود احمد مودی

وہ کچلی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "قادر وہاں سے آیا ہے۔ اصطلیل میں فون بھی نہیں تھا کہ یہ فون ہی کدوتا۔ اور رات کے اس پہر اسے راستے میں بھی کہیں فون میسر نہیں آیا۔ کیسی ٹریجڈی ہے۔ رات گئے کسی امیر جیسی کی صورت میں بعض علاقوں میں میلوں تک فون بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ یہ وہاں سے موٹر سائیکل پر چلا تھا۔ انسان جتنی زیادہ جلدی میں ہوتا ہے، بعض اوقات اتنی ہی زیادہ رکاوٹیں راستے میں حائل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وحدت کالونی کے قریب اس کی موٹر سائیکل بھی خراب ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے ایک ٹیکسی ملی۔ ہم جس حال میں تھے، اسی طرح اٹھ کر بھاگے اس کے باوجود تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کتنا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ کیا بچا ہو گا وہاں!" اس کی آواز میں ایک سسکی سی شامل تھی۔

"وہاں مسلح محافظ موجود رہتے تھے۔ وہ کیا ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ محافظ موجود تھے۔ لیکن قادر نے جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے منظم انداز میں۔ خاص حکمت عملی کے ساتھ اصطلیل پر شب خون مارا گیا تھا۔" شیم بولی "پہلے غالباً بے خبری میں گاؤں پر حملہ کر کے انہیں بے ہوش کیا گیا۔ استاد فور عمر کو بھی بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ قادر بند کوٹھری میں سونے کا غادی ہے، یہ بے ہوش ہونے سے بچ گیا۔ آگ کی چشم محسوس کر کے اس کی آنکھ کھلی تب اس نے دیکھا اس کی کوٹھری بھی شیلوں میں گمری ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ نکلا۔"

راجو بالکل خاموش تھا اور ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ شیم نے اپنا ہاتھ گاؤں درست کیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا "قادر کے علاوہ رات کو اصطلیل میں عموماً تین چار توہی ہی موجود ہوتے ہیں۔ سب بے ہوش ہوتے ہوئے

میں صہب وعدہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر نیچے کھینچ گیا۔ گاڑی میں نے کیٹ سے باہر نکالی اور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ باہر آنے سے پہلے میں نے ایک فون بھی کیا۔ اس قسم کے معاملات میں کہیں روانہ ہونے سے پہلے میں کچھ احتیاطی تدابیر ضرور کر لیتا تھا جو اکثر کام آتی تھیں۔

چند لمبے بعد ایک گاڑی آندھی طوفان کی طرح گلی میں داخل ہوئی۔ وہ میرے قریب آکر رکی تو رات کے سانے میں اس کے بریکوں کی چرچاہٹ کچھ زیادہ ہی تیز محسوس ہوئی۔ وہ شیم ہی کی گاڑی تھی اور وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ راجو اس کے برابر بیٹھا تھا۔ کچلی سیٹ پر ایک اور شخص موجود تھا۔ وہ غالباً اصطلیل پر کام کرنے والا کوئی ملازم تھا۔

"تم گاڑی اندر گمزی کردو اور میری گاڑی میں آیاؤ۔" میں نے کمزری سے سر نکال کر کہا "وہ گاڑیوں میں جانا مناسب نہیں رہے گا۔"

میں نے کیٹ کھلوایا اور شیم گاڑی ڈرائیو سے میں نے گئی۔ وہ گاڑی وہیں چھوڑ آئی اور تینوں میری گاڑی میں آ بیٹھے۔ سڑکیں ویران تھیں اور موقع اہم تھا۔ میں نے اپنی گاڑی سے ہوائی جہاز کا کام لینے کی کوشش کی۔ جب شیم کو اطمینان ہو گیا کہ میں حتی الامکان تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا تب میں نے پوچھا "قصہ کیا ہے؟"

"قصہ تو قسم ہو گیا۔" وہ افسردگی سے بولی۔ اس نے جب فون کیا تھا تو اس کا انداز ہسرتی تھا لیکن اب وہ اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ اب بظاہر صرف افسردگی دھجکی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کا دل اب بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ "پھر بھی کچھ تفصیل تو بتاؤ۔" میں نے ایک سوڑ کاتے ہوئے کہا۔

میں ہی رہنا تھا۔ جال جس کے ہاتھ میں تھا، وہ جب چاہتا جال سیٹ کر مجھے قابو میں کر لیتا۔

اگر یہ لوگ ریڈ واٹ کے آواز کار نہیں تھے تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ میں کسی عجیب و غریب اتفاق کے تحت ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

انہوں نے کسی تصویر سے میری صورت ملائی تھی لیکن میں تو اس وقت اپنی اصل صورت سے کافی حد تک مختلف شکل صورت میں تھا۔ تو کیا میری تبدیل شدہ صورت اس تصویر سے مل گئی تھی؟

اس صورت میں بھی مجھے اپنی پہلی تصویر پر افسوس ہی کرنا چاہیے تھا کہ قسمت مجھے کتنی دور سے گھیر گھا کر اس دور افتادہ علاقے میں لائی تھی۔ کتنی روکاڑ میں پھانسا کر، کتنی جگہ موت کو جھل دے کر، کتنے معائب پروا شت کر کے میں یہاں تک پہنچا تھا۔

محض اس لیے کہ میری شکل کسی نامعلوم انجینی سے مل جائے جسے میں نے بھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا اور جو نہ جانے کس سلسلے میں ان لوگوں کو مطلوب تھا جو جب میں اس کی تصویر اور باتوں میں کاٹھنوں میں لے کر اس کی تلاش میں نکلتا تھا۔

پہلا کدھ کوٹ کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اس نامور اور تنگ ہائی روے پر فرار نے میری باری تھی جسے ہائی روے کوٹا خاصا مشکل غیر معلوم ہوا تھا۔ وہ پانچوں بھی اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے دکھائی دے رہے تھے۔

آٹھ دس میل کے سفر کے بعد میں نے پولیس کی ایک موبائل سائے سے آگے دیکھی۔ سرخی مائل داڑھی والے نے بھی دیکھ لیا کہ میں ڈرا تو جے سے موبائل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کلاشکوف کی بال خاصمی ہے رچی سے میرے کندھے پر رکڑے ہوئے بولا "خبردار جو تو آواز نکالی"۔ کچھ بار بار تھا کہ اسے پولیس کے سائے بھی اپنی پیادہ میں ایک جیتے جاگتے انسان کو لاش میں تبدیل کرنے میں ڈرا بھی آمل نہیں ہوگا۔

بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ آواز نکالنے کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوتا۔ میں پولیس والوں کو نظر بھی نہیں آسکتا تھا۔ میری آواز بھی باہر جانی مشکل تھی۔ کمزریوں کے پیشے چڑھے ہوئے تھے اور اسے سی آن تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ موبائل والے تو خود پیادہ والوں کو دور سے ہی دیکھ کر پچیس گھنٹہ کلا کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ پیادہ والوں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔

قانون کے مخالفوں کی گاڑی اس پیادہ کے قریب سے گزرتی چلی گئی جس کے فرش پر ایک شخص بھیڑ بھڑکی کی طرح رسی سے بندھا بیٹھا تھا۔ جسے تو اپنا جرم معلوم تھا اور نہ ہی یہ بتا تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا تھا۔

آخر کار سکوت سے آگاہی کرنے نے پوچھا "تم سے کم مجھے اتنا تو بتاؤ کہ آپ لوگوں نے مجھے کیا سمجھ کر پکڑا ہے؟"

"چپ کر کے بیٹھے رہو۔" سرخی مائل داڑھی والے نے مجھے

کیوں منتخب کیا تھا؟ وہ تصویر کسی کی تھی اور ان کے پاس کہاں سے آئی تھی جس میں انہوں نے میری مشابہت تلاش کر لی تھی؟

کیا وہ لوگ ریڈ واٹ کے افسادوں پر چلنے والوں میں سے تھے؟ کیا ان دور افتادہ آبادیوں میں بھی ریڈ واٹ کی رسائی تھی؟ کیا ان کا سینہ درک اتنا مضبوط اور وسیع تھا کہ وہ جب اور جہاں چاہتے تاکہ بند کر کے اپنے مطلوبہ شخص کو پکڑ سکتے تھے؟ خواہ وہ کتنا ہی علیحدہ بل لیتا، شکل صورت میں کتنی ہی تبدیلیاں لے آتا؟

یہ کام آجھہ نظر پہلے ہوئے بیکراں سمندر میں سے کوئی مخصوص مچھلی پکڑنے کے مترادف تھا اور آج تک یہ ہماری پولیس یا دوسری طاقتوں کے لیے تو ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ فرد واحد تو کیا پورے گروہ کے گروہ ان کے جانے پہچانے راستوں سے گزرتے ہوئے غائب ہو جاتے تھے، بلکہ بعض اوقات ملک سے بھی فرار ہو جاتے تھے اور ان کے ہاتھ نہیں آتے تھے۔

جو لوگ مجھے پکڑ کے لے جا رہے تھے وہ بظاہر تو ریڈ واٹ کے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن اس شخص میں یقین سے کچھ کما بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے تجربہ ہو چکا تھا کہ ریڈ واٹ نہ جانے کن کن رابطوں کے ذریعے ہر طرح کے لوگوں سے کام لے لیتی تھی اور انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ درحقیقت کس طاقت کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔ سرکاری اہل کار، پیشہ ور ڈاکو اور دہشت گرد، خاص خاص کاموں میں مہارت رکھنے والے تجزیہ کار، مگر وہ رکھنے والے یا ان کیلئے دیکھے ہی کام کرنے والے نالی گراہی بد معاشرے کوئی بھی ان کی رسائی سے باہر نہیں تھا۔

لیکن کسی سے بھی کام لینے کا ریڈ واٹ کا طریق کار یقیناً زبردست تھا۔ وہ دھچ میں اتنے چکر اور اتنی پیچیدگیاں ڈال دیتے تھے کہ کٹھ پتلیوں کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ جو ڈزیاں انہیں ہلا رہی ہیں ان کے سرے اصل میں کہاں ہیں۔ بعض لوگوں کو اس سے غرض بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف اپنے مالی یا کسی اور طرح کے مفادات سے غرض رکھتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں پہلے ہوئے انتشار، بے کرداری، کمرہ نشین، افزائش اور ہوس کی وجہ سے ریڈ واٹ کو بڑی "سوسائٹیز" میسر تھیں۔ اس نے مجھ سے بات کرتے ہوئے ذکر کیا تھا کہ تین ملکوں میں کام کرنا انہیں بہت آسان محسوس ہوا تھا۔ پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا۔ میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

یہ لوگ جو مجھے پکڑ کر لے جا رہے تھے اگر ان کی ڈزیاں بھی بہت پیچھے کیس درحقیقت ریڈ واٹ ہی کے ہاتھ میں تھیں تو میرے لیے یہ بڑی مایوس کن صورت حال تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری بھاگ دوڑ میری تمام کوششیں بے کار تھیں۔ میرا یہ سوچنا فصول تھا کہ میں کسی بہت ہی عام اور متلوک افعال سے شخص کا رد پ دھار کر انسانوں کے سمندر میں کہیں گم ہو سکتا ہوں۔ میں تو گویا ایک اکتاہی جال میں تھا۔ جتنا چاہے بھاگ لیتا، مجھے ہر حال جال

خاطب کیا گیا تھا، نفی میں سرلاتے ہوئے بولا "نہیں، وہ کھاتا نہیں ہے۔ اس کے بارے میں جتنا تمہیں معلوم ہے، اتنی ہی مجھے بھی معلوم ہے۔ میں نے بھی صرف وہی تصویر غور سے دیکھی ہے جو تمہارے پاس ہے لیکن پتا نہیں کیوں، پیراول کتا ہے کہ وہ تصویر اس آدمی کی نہیں ہے۔" اس کے لیے میں ابھن برقرار تھی۔ "لیکن میں کتا ہوں یہ وہی تصویر والا آدمی ہے۔" یعنی خان کے لیے میں خند تھی "میں نے شکل ہلا کر دیکھ لی ہے۔" "ذرا تصویر ایک بار پھر مجھے دکھاؤ۔" بلال شیدی نے ہاتھ پڑھاتے ہوئے فرمائش کی۔

وہ دونوں برابر کی حیثیت کے آدمی معلوم ہوتے تھے یا پھر شاید یہی خان کو تھوڑی سی برتری حاصل تھی لیکن وہ بلال شیدی کی بات ماننا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے جب میں ہاتھ ڈال کر تصویر نکالی تاہم کافی ناگوار سی شکل کی طرف بڑھائی۔ شاید اسے ایک نئے نمائے کام میں بلال کی رد اندازی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

بلال نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی اور از سر نو مجھ سے اس کا موازنہ کرنے لگا۔ وہ میرے قریب تھا۔ میں بھی آپک کر تصویر دیکھنے لگا۔ چند لمبے کے لیے میں نے ان کی ناگوار سی اور برہمی کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ میں خود اس تصویر کو دیکھنے کے تجسس میں مچا جا رہا تھا جو میرے لیے مصیبت کی یا میراث کی تھی۔

ایک لمبے کے لیے تو واقعی میرے جنم میں سوری امر و دھرمی۔ وہ بہت دھندلی سی تصویر تھی۔ غالباً بہت دور سے کم روشنی میں اور نامناسب زاویے سے کھینچی گئی تھی لیکن وہ کوئی پورٹریٹ یا صرف چہرے کی تصویر نہیں تھی۔ اس میں صرف اس شخص کی بائیں نظر نہیں آ رہی تھی باقی پرالائی دھڑنظر آ رہا تھا۔

وہ شخص خاصے جھنجھو یا نا انکیش میں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی خوف ناک قسم کی سب مشین مگن تھی اور وہ اس سے گولیاں چلا رہا تھا۔ تصویر بہت ہی دھندلی تھی لیکن جس حد تک بھی ممکن ہو سکا تھا، اسے اکسراج کیا گیا تھا۔ اس میں چہرہ کافی حد تک قابل شناخت لگ رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چہرہ کافی حد تک مجھ سے مشابہ تھا لیکن یہ مشابہت ان تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جو میک اپ میں انوار نے میرے چہرے پر کی تھیں جن میں سب سے نمایاں وہ سیاہی نما موچیں اور بائیں رخسار کے انچار پر نظر آنے والا موچہ سا مسند تھا۔ بال جھوٹے ہوئے اور دوسری پھولی موٹی تبدیلیوں سے بھی مشابہت پیدا ہونے میں مدد ملی تھی۔ اگر میں اپنی اصل شکل صورت اور اہل طے میں ہوتا تو اس تصویر سے بالکل مختلف دکھائی دیتا۔

لیکن ظاہر ہے انوار نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ اس نے تو شاید خواب میں بھی اس شخص کو نہ دیکھا ہو۔ اس کے علاوہ اسے

ڈانٹا۔ خیالوں میں اچھے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سب گویا بے حد بے زار بھی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں فصد دلانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن تجسس بھی مجھے بارے ڈال رہا تھا۔ میں اس کے حکم کی تعمیل میں چند لمبے تو خاموش رہا لیکن ایک بار پھر یہ سکوت تو زبے بغیر نہ سکا۔ میں نے پہلے ہی کی طرح ٹوٹی پھوٹی اور کچھ قسم کی زبان میں نہایت مانت سے سوال کیا جس کا معلوم تھا "پھر بھی... آخر کچھ تو بتا دے کہ میرا جرم کیا ہے؟ سزا جو آپ کا دل چاہے دے لیگا۔"

اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا لیکن خاموش رہا۔ میں نے اس کی خاموشی سے ذرا شاکر اسی مانت سے کہا "میں تو بارہ تیرہ سال بعد اس علاقے کی طرف آیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا مجھ سے ایسا کیا تصور ہو گیا ہے جو آپ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا ہے۔" چٹپٹ میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ کم سے کم مجھے بتاؤ کہ میں کس معاملہ میں ہوں؟ اگر جڑانے میں تھیں وہ تصویر ہی دکھادیں جس سے آپ میری صورت ہلا کر دیکھ رہے تھے۔"

ڈراؤنک کرنے والے نے یہ آواز پلٹے ڈاری سے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا جس کا معلوم میں سمجھ سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "یہی خان! اس کی کھوپڑی پر کھانکھوف مار کر اسے لٹا دو یا اس کے منہ میں کچھ ٹھونس دو تاکہ یہ آرام سے چپ کر کے سفر کرے۔"

شرعی مائل راڈھی والا جسے یہی خان کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا بدستور برہم نظروں سے میری طرف دیکھ رہا لیکن اس نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا۔ میرے دوسری طرف بیٹھے ہوئے کھانکھوف بردار کی راڈھی موچیں ہمیں سیاہ اور جھاڑ جھکاڑ کی طرح ایک دوسرے میں ابھجی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی ایک عجیب سی وحشت تھی لیکن اپنی اس ظاہری شکل و صورت کے باوجود وہ ان سب سے زیادہ متحمل مزاج اور عقل سے کام لینے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ شروع سے ہی مجھے ابھن آہیر نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ اس وقت بھی مجھ پر کھانکھوف تانے بیٹھا تھا اور اس کی شکل پر بھی خونخواری تھی لیکن شاید وہ میرے بارے میں باقی چاروں کی طرح نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں شک کا پلو تھا۔

آخر کار وہ اپنے خیال کا اظہار کیے بغیر نہ سکا جس سے مجھے اپنا اندازہ درست محسوس ہوا۔ وہ پلو پلٹے ہوئے میری طرف اشارہ کر کے یہی خان سے مخاطب ہوا "مجھے یہ وہ آدمی معلوم نہیں ہوتا یہی خان!"

"تم نے کیا اس آدمی کو دیکھا ہوا ہے بلال شیدی؟" یعنی خان نے اسے گھورا۔

جھاڑ جھکاڑ راڈھی موچہ والا جسے بلال شیدی کے نام سے

تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جاؤں گا اس علاقے کا رخ کروں گا بلکہ مدہری پہنچے تک تو خور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ میں نے تو انٹیشن پر اترنے کے بعد فیصلہ کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ بھی تھا کہ یہ محض ایک اتفاق تھا لیکن بہت ہی بد نصیبانہ اتفاق تھا۔

مگر اس تمام تر مشامت کے باوجود کوئی بہت غور سے دیکھتا تو جان سکتا تھا کہ وہ میری تصویر نہیں تھی لیکن یہ دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے کی بات تھی اور محسوسات اس قسم کے لوگوں کے پاس ذرا کم ہی ہوتے ہیں جن کے ہنسنے اس وقت میں چڑھا ہوا تھا۔ پیادہ فرمائے بھڑکی جاری تھی اور بلال شیدی تصویر میں کھوٹا ہوا تھا۔ آخر کار وہ فنی میں پھسلاتے ہوئے بولا "میں بیٹنی خان! میرا دل کہتا ہے کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ ہم غلط آدمی کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ کہیں ہماری اسے دن کی محنت برباد نہ ہو جائے۔"

بلال شیدی بخاری طور پر جتنا جاگھوس دکھائی دیتا تھا، وہی طور پر اپنے ساتھیوں سے اتنا ہی بہتر معلوم ہوا تھا یا پھر شاید اس میں دوندے والی کوئی جس تھی جو بتاتی تھی کہ شکار وہی ہے یا نہیں جس کی اسے تلاش تھی۔

اس نے تصویر بیٹنی خان کی طرف واپس بڑھادی جس نے بے زاری سے اسے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ اس بار اس نے بلال شیدی کی رائے کی تردید نہیں کی۔ بلال شیدی کی وجہ سے مجھے اُمید کی ایک دھندلی سی کرن دکھائی دینے لگی لیکن ابھی تک تو معاملہ ہی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد بیٹنی خان ذرا نرم لہجے میں بولا "راکام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ اب محنت چاہے برباد ہو یا تیار، ہمارے تجربے ہمیں سکھتے ہیں کہ یہ آدمی کدھ کوٹ کی فلاں میں سوار ہوتا دکھایا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم اس وقت کدھ کوٹ میں ہی موجود تھے اور ہم نے ناکہ لگا کر اس کو پکڑ لیا۔ ہمارے پاس بھی اس کی صرف یہی تصویر ہے اور ہمارے تجربوں کے پاس بھی۔ ہم نے شکل ملا کر دیکھی ہے تصویر اس آدمی کی گتھی ہے۔ اب ہم اسے لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کریں گے، وہ خود ہی فیصلہ کریں گے کہ انہیں یہی آدم چاہیے تھا یا کوئی اور۔ اگر وہ حکم کریں گے کہ یہ صحیح آدمی نہیں ہے صحیح آدمی پکڑ کر لاؤ تو ہم دوبارہ تلاش میں نکل جائیں گے۔ تجربہ کریں دوبارہ جاؤں طرف پھیل جائیں گے۔"

"اس وقت تک اصل آدمی توئی علاقے سے... بلکہ ملک سے ہی نہ نکل جائے۔" بلال شیدی پُر خیال انداز میں واڈھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"یہ سچا ہمارا نہیں، بیروں کا کام ہے جن کی کھوپڑی میں تم سے بھی زیادہ عقل ہے۔ ہم تو پھولے لوگ ہیں، ہمیں جتنا کام بولا جاتا ہے وہ ہم کر دیتے ہیں۔" بیٹنی خان نے انکار اس سے جواب دیا

عظیم مدر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) 150/-

(اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (زاہد حسین انجم) 150/-

(پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے حالات زندگی)

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

تاہم اس کے لیے میں اب پہلے جیسی خوشخبری نہیں رہی تھی۔ باقی تینوں بھی خاموش تھے۔

"ہم کو اگر صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔" بلال شیدی نے لامعت سے کہا۔ کام کے بارے میں اس نے بڑے ہی کام کی بات کر ڈالی تھی۔ جہاز جھکاؤ سے بالوں اور کھردری صورت والا وہ شخص یکدم ہی مجھے اس گروپ کا دانشور دکھائی دینے لگا۔ وہ گروپ میں آتا ہے وقت بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے قسمت آزمائی کے لیے اسی کا سارا لینے کا فیصلہ کیا۔

میں نے طبیعت پر جبر کرتے ہوئے اسی کمپوزر کی زبان میں خاص لاجب سے اسے مخاطب کیا "میں بلال شیدی، ان لوگوں میں آپ مجھے جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لینے والے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں قسم کھاکے بتاتا ہوں میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ کم سے کم مجھے یہ تو بتادیں کہ معاملہ کیا ہے۔ سلوک آپ جو چاہے کریں جہاں چاہیں مجھے لے جائیں لیکن مجھے اپنا قصور تو معلوم ہو جائے۔ خود ہی بات چیت کرنے میں کیا حرج ہے؟ سبزی کئے گا۔"

"مجھے بات چیت کرنے کا اتنا شوق نہیں ہے۔" خلاف توقع بلال شیدی بھی غرائے سے انداز میں بولا "میں بیٹنی خان سے صرف اس لیے بحث کر رہا ہوں کہ مجھے کسی گریز کا احساس ہو رہا ہے۔ ہم سے کوئی گریز ہو گئی ہے لیکن یہ مت سمجھنا کہ مجھے تم سے کوئی خاص محبت ہو گئی ہے۔"

اتنا ہی قیمت تھا کہ اسے گریز کا احساس تو تھا۔ اس کی محبت کی تو مجھے بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ایک خلیفہ سا اطمینان مجھے یہ بھی ہوا تھا کہ ان کا رینڈ واٹ سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا۔



زادہ صاحب اور۔۔ ان کے گارڈز پر فائرنگ کی تھی۔ نواب زادہ صاحب کے ساتھ دو گارڈز بھی مرے تھے۔ دو قاتل پکڑے گئے ہیں اور پولیس کے قبضے میں ہیں لیکن ہمیں جب بھی موقع ملا ہم خود انہیں سزا دیں گے ہمیں پولیس تھانے پکڑیوں سے اپنے معیار کے مطابق انصاف ملے کی امید نہیں۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا تو میں نے لامنت سے کہا ”لیکن اس معاملے سے میرا کیا تعلق؟“

”تیسرا آدمی جو قاتل ہو گیا تھا“ ابھی تک پکڑا نہیں گیا ہے۔“ بلال شیدی بولا ”ان تینوں کے پیچھے جو اصل لوگ ہیں ہم ان سے بھی منت لیں گے لیکن پہلے اس میرے آدمی کا پکڑا جانا ضروری ہے ہمارے پاس جو تصویر ہے اس کی ہے ہمارے سیکڑوں آدمی اس تصویر کی کاپیاں لے کر ان علاقوں میں پہلے ہوئے ہیں جہاں اس آدمی کے دھوڑ ہونے کی امید ہو سکتی ہے ہم اس وقت کندھ کوٹ میں ایک زمیندار کے گھر سے جب سکھر سے ہمارے ایک مخبر کا فون آیا کہ اس آدمی کو اس نمبر کی بس میں سوار ہوتے دیکھا گیا ہے۔ اس نے کندھ کوٹ کا ٹکٹ لیا ہے۔“

میں ایک بار پھر احتجاج کرنا چاہتا تھا کہ میں وہ شخص نہیں ہوں لیکن بلال شیدی نے مجھے اس کی ذمت نہیں کرنے دی۔ میں اسے اپنا حامی محسوس کرتے ہوئے ذرا ٹر امید ہو چلا تھا لیکن وہ بھی گویا میری امید پر پانی پھیرتے ہوئے میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی کھڑوے اور درگے سے لیے میں بولا ”تم وہ قوی ہو بھی سکتے ہو۔ میں صرف ایک شبہ ظاہر کر رہا تھا جو میرے دل میں آیا تھا کہ شاید تم وہ آدمی نہیں ہو لیکن مجھے پکا یقین نہیں ہے۔ میں بھائی بیٹی خان کی بات کو پوری طرح جھٹلا نہیں رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تصویر تو تمہاری ہی لگتی ہے۔ بڑی مشکل سے تم ہاتھ آئے ہو۔ صرف میرے دل کے کہنے پر تمہیں مجھ کو کمر لپنے کی موت کا سامنا نہیں کر سکتے۔“

اس کے اس طرح پلٹ جانے پر بھی میں مایوس نہیں ہوا۔ امید کی موبوم سی کلن ابھی پوری طرح معدوم نہیں ہوئی تھی۔ میرے اگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے تو زبان سر حال آزاد تھی۔ میں نے اس سے کوئی مفید کام لینے کی کوشش جاری رکھی اور خود پر جبر کرتے ہوئے منت آمیز کلمے میں بات جاری رکھی ”لیکن میں تو بار بار کا آدمی ہوں۔ میرا قبائلی جھگڑوں سے کیا تعلق؟“

”وہ بھی باہر کا آدمی تھا۔“ بلال شیدی تیزی سے بولا ”ہمیں پرا چلا ہے اس کا نام اکھو چاڑ ہے۔ کسی زمانے میں وہ ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا گروہ ٹوٹ گیا۔ کچھ لوگ مارے گئے کچھ پکڑے گئے کچھ بھاگ گئے۔ اب وہ اکیلا پھرتا ہے لیکن پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔“

میں غائب خان تجارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر منہ بناتے ہوئے بولا ”غضب خدا کا! ہم کو یہ دن بھی دیکھتے تھے

مجھے کندھ کوٹ کی طرف آتے وقت لا شعوری طور پر جس خفیف اور ہم سے خطرے کا احساس لاحق رہا تھا شاید وہ خطرہ میرے خالق میں نہیں تھا بلکہ مجھ سے آگے میرا کھڑ تھا۔ شاید میری نامعلوم جس مجھے اسی کے بارے میں خبردار کر رہی تھی لیکن میں اس دھندلے اور مبہوم بیٹام کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا وہ نہ میں اپنا ہڈ بدل کے کسی اور طرف کو نکل جاتا تو اس مصیبت میں چھپنے سے بچ جاتا۔“

”آپ کو بالکل صحیح احساس ہو رہا ہے سائیں بلال شیدی!“ میں نے منت نہ پاری اور بات جاری رکھی ”آپ سے گڑبڑ ضرور ہو گئی ہے اور مجھے آپ کی وہ بات بڑی اچھی لگی ہے کہ انسان کام کو اگر صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کرے تو اس کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی تو آپ نے پکڑ لیا ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ فی الحال آپ کو میری شکل بھی اس سے ملتی جلتی دکھائی دے رہی ہے لیکن جہاں کہیں بھی آپ مجھے لے جا رہے ہیں اگر وہاں جا کر ثابت ہو گیا کہ میں وہ آدمی نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش تھی تو اور کچھ ہوا نہ ہو“ تھوڑی بہت شرمندگی تو ضرور ہو گئی۔“

پیارے میں اب پہلی سی گرہ گری کی فضا میں تھی۔ خاصی خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔ ہماری گفتگو کے دوران وقفہ آتا تو انہی کی گھر گراہٹ اور اسے سی کی سرسراہٹ ذرا واضح محسوس ہوتے لگتی۔ بلال شیدی کے اختلاف رائے نے میرا حال فرق ضرور ڈالا تھا۔

”خیر۔۔ تم جو کوئی بھی ہو۔ بات کرنے میں واقعی کوئی حرج نہیں۔“ بلال شیدی سر جھک کر بولا ”بات زیادہ لمبی چوڑی بھی نہیں ہے کچھ عرصہ پہلے ہمارے قبیلے کے سردار نواب سرور کے بیٹے نواب زادہ خان کا قتل کر دیا گیا ہے۔“

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس لیے نہیں کہ یہ میرے لیے کوئی انکشاف تھا۔ یہ خبر تو میں اخبارات میں پڑھ چکا تھا۔ نواب سرور کوئی معمولی شخصیت نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے قبیلے کے سردار اور بہت بڑی سیاسی شخصیت تھے۔ ان کی زندگی میں جہاں بے شمار خوش نصیبیاں جمع تھیں وہاں انہیں ایک بد نصیبی کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

چند سال قبل ان کا چھوٹا بیٹا قتل ہوا تھا اور کچھ عرصے پہلے بڑے بیٹے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تصلیات کا مجھے علم نہیں تھا اور نہ ہی صحیح تصلیات کبھی سامنے آئی تھیں لیکن بظاہر یہ قبائلی جھگڑوں ہی کا نشانہ معلوم ہوا تھا۔ بہر حال یکے بعد دیگرے دو شیر جیسے بیٹوں کی موت نواب صاحب کے لیے ظاہر ہے دو بڑے اور ناقابل بیان سانحوں سے کم نہیں تھی لیکن میرے دویم دو گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان واقعات سے کبھی میرا بھی کوئی تعلق بچ جائے گا۔

بلال شیدی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”قاتلانہ حملہ بازار میں ہوا تھا۔ قاتل تین تھے انہوں نے مجھے بازار میں نواب

چھوٹے چھوٹے ڈاکو جو سرداروں کی جوتیاں چانتے تھے، اب سرداروں کے قتل میں حصہ لینے لگے ہیں۔" پھر اس نے سنا سناہ انداز میں سر ہلایا اور بولا "چائیں اس دھڑکی کا کیا بنے گا۔"

یہ ایک نئی کرم فرمائی تھی۔ انہوں نے مجھے نواب زادہ خاقان کا قاتل ہی نہیں، بلکہ چاچا ڈاکو بھی بنا دیا تھا۔ میری مثال تو آسمان سے کرا، کھجور میں اٹکا دالی ہو گئی تھی۔ ریڈ ڈاٹ سے بچ کر بھاگا تھا تو ان لوگوں کے ہتے چڑھ گیا تھا۔ بے بسی کی حالت میں تو یہ بھی میرے لیے ریڈ ڈاٹ سے کم خطرناک نہیں تھے۔

پیارو اب بھی سڑک کو چھوڑ کر ایک کچے راستے پر اتر چکی تھی۔ یہ راستہ بھی سڑک نمایاں تھا لیکن پکا نہیں تھا۔ تاہم بارشوں و غیرہ کی وجہ سے اس کی مٹی جم کر خاصی سخت ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں سے نرم تھی۔ پیارو ایسے ٹکڑوں پر سے گزرتی تو ہچکولے کھانے لگتی اور گرد و غبار کے بادل بلند ہونے لگتے لیکن اس کی رفتار میں کمی نہ آتی۔

میں اپنی بے کٹائی ثابت کرنے کے لیے انہیں یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ جن چیزوں کی وجہ سے اس تصور سے میری مشابہت پیدا ہو گئی ہے وہ مصنوعی ہیں۔ ضروری نہیں تھا کہ اس انکشاف کی وجہ سے وہ مجھے بے تصور تسلیم کر لیتے۔ میں ان کی نظر میں مزید مشکوک قرار پاسکتا تھا۔ بھلا دودھ اور بھینسوں کا کاروبار کرنے والے "بالاکبر" کو میک اپ میں بھرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟

زندگی میں کئی بار مجھے تجربہ ہوا تھا کہ ایک بھوٹ کو بھاننے کے لیے سو بھوٹ بولنا پڑتے تھے۔ اس لیے رُے سے رُے حالات میں بھی میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی تھی کہ بھوٹ نہ بولنا پڑے۔ اب بولا تھا تو وہ گلے کا پھندا بننا چاہ رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں انہیں اپنی اصلی شخصیت کے بارے میں بتا دوں تو کیا وہ یقین کر لیں گے؟ کیا میرا افضل چوہدری کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف کرانا کچھ سود مند ثابت ہوگا؟ کہیں مزید الجھنیں تو کھڑی نہیں ہو جائیں گی؟

یہ بات کرتے ہوئے میں اس لیے بھی چپکھا رہا تھا کہ ابھی تک خود مجھے ان کی کمائی پر پورا یقین نہیں تھا۔ وہ نظر تو ویسے ہی لوگ آ رہے تھے جیسے اپنے آپ کو تیار ہے تھے لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ بہت پیچھے کہیں ان کی ڈوبیاں ریڈ ڈاٹ ہی کے ہاتھ میں ہوں۔ ممکن تھا کہ کسی رہنمائی یا اطلاعات کی مدد میں انہوں نے مجھے راستے سے اُٹک لیا ہو لیکن اب میرے ہی منہ سے تصدیق چاہ رہے ہوں کہ میں افضل چوہدری تھا۔

کمائی انہوں نے ایسی کھڑی ہو کہ مجھے یقین آجائے اور میں اپنی دانست میں جان بچانے کے لیے بچ بولنے پر مجبور ہو جاؤں جس کے بعد انہیں کوئی تردد نہ کرنا پڑے اور وہ مجھے آگے کسی ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں کے بارے میں انہیں ہدایات ملی ہوں۔ مجھے تجربہ

تھی؟

”نکر رکھی تھی لیکن دو گامزبان سے ستم کٹھا ہوئے تھے انہوں نے لاکھو چاچہ کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسی پکڑ میں اس کا زحمتا کھل گیا تھا۔ باقی دو کو نواب صاحب نے خود بخود باہر کر کے پکڑا دیا ہے مگر ہمارے قیلے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تیسرا آدمی لاکھو چاچہ ہو گا۔ اس کا ہمارے قیلے سے ہماری دوستیوں و دشمنیوں سے ہمارے جھگڑوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے کیوں اس واردات میں حصہ لیا؟ اس بات پر ہمیں زیادہ غصہ ہے۔“

”بالا مال ملا ہو گا۔“ میں نے دھجے لمبے میں کہا۔

”مال کی ضرورت تھی تو ہمارے پاس آجاتا۔ ہم اس سے زیادہ مال دے دیتے جتنا دشمنوں نے دیا ہو گا۔“ بیٹی خان خوشنوار سے لمبے میں بولا۔

”اسے یہ بات معلوم نہیں ہوگی۔“ میں نے دھجی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لانے کی جرأت کر لی۔

”میںی خان بے چینی سے کاشکوف کو حرکت دیتے ہوئے بولا ”تم ہاں کیوں نہیں لیتے کہ تم ہی لاکھو چاچہ ہو؟“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”جس صورت حال سے میں دوچار ہوں اس سے تو بہتر تھا کہ میں واقعی لاکھو چاچہ ہوتا۔“

پھر میں نے دوبارہ عاجزانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ”اچھا یہ تو بتائیں کہ قبیلہ تو آپ کا کچھ اور ہے لیکن ایک کے نام کے ساتھ ”خان“ لگا ہوا ہے اور دوسرے کے نام کے ساتھ ”شیدی“ شاید باقی لوگوں کے نام کے ساتھ بھی کچھ اور لگا ہو۔ یہ کیا پکڑ ہے؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ جواب بالا شیدی نے دیا ”بنیادی طور پر ہم خان ہی کہلاتے ہیں۔ یہ ہماری سب کا سٹ ہے اس کے بعد خاندانوں کے لحاظ سے ہمارے اندر سب کا سٹ ہوتی ہیں۔ اور ”شیدی“ تو میری سب کا سٹ بھی نہیں ہے میرے کالے رنگ کی وجہ سے پیار سے لوگ مجھے شیدی کہتے ہیں۔ ہمارے قبیلے میں میرے جتنے کالے رنگ والا کوئی بھی کھارہی پیدا ہوتا ہے۔“

وہ خود استہزائی انداز میں ہولے سے مسکرایا۔ میں نے ایک بار پھر بنور اس کی طرف دیکھا۔ میں نے مکالے اردو میں ڈہرایا ہوں لیکن وہ حقیقت وہ پوری طرح اردو نہیں بول سکتے تھے میری سہولت کے لیے وہ لوگ بھی سمجھ قسم کی زبان میں بول رہے تھے۔ لمبے کا کھروا رہی اور خود خوار برقرار تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس لئے شہدے ہوا کہ بالا شیدی بڑھا لکھا تھا۔ زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ بڑھا لکھا ضرور تھا۔ اپنے ساتھ بول میں وہ سب سے زیادہ کھروا ”سب سے زیادہ گنڈو دکھائی دیتا تھا اور اس کی شخصیت میں وحشت اور جنگی پن سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ اس

ہو چکا تھا کہ ریڈ واٹ والے بے شک سیدھی صاف اور دونوں بات کرتے تھے لیکن زرا بازی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ بعض اوقات بڑا پکڑ دینے والا زرا مار چاتے تھے۔

صرف وہ تصویر مجھے ان کی بات صحیح تسلیم کرنے پر کسی حد تک مجبور کر رہی تھی۔ اگر وہ ریڈ واٹ کے اشاروں پر چلنے والے لوگ ہوتے تو ان کے پاس پہلے سے میری موجودہ شکل و صورت کی تصویر نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ محض چرسے کی تصویر ہوتی تب بھی شاید میں امکان محسوس کرنا کہ روپڑی یا سکھر میں کہیں دور سے کسی پولرائز کیمیرے وغیرہ سے کھینچی گئی ہوگی اور اسے ساتھ لے کر وہ لوگ پیادہ نہیں دیں سے بس کا مقابلہ کرتے آ رہے ہوں گے۔ کنگھہ کوٹ پہنچ کر انہوں نے ناکا بندی کا زرا مار چایا ہو گا۔

لیکن تصویر میں وہ محض ایکشن میں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی مشین گن تھی۔ وہ واقعی فائرنگ کرنا دکھائی دے رہا تھا اور اس کے جسم پر لباس بھی دسرا تھا۔

میں نے بظاہر سرسری سے لمبے میں پوچھا ”لاکھو چاچہ کی یہ تصویر کیا لین اس وقت کی ہے جب وہ نواب زادہ خاقان صاحب پر قاتلانہ حملہ کر رہا تھا؟“

”ہاں“ بالا شیدی نے اختصار سے جواب دیا۔ ”یہ کس طرح کھینچی گئی اور آپ لوگوں کو کس طرح ملی؟“ میں نے پوچھا۔

”لوگوں کے جس بازار میں نواب زادہ صاحب پر حملہ ہوا اسی بازار میں اس جگہ سے کافی دور ایک عمارت کی دوسری منزل پر ایک چھوٹے سے اخبار کا دفتر ہے۔ اس کا فوٹو گرافر خاقان سے دفتر کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ وہ کیمرا لے کر کس روانہ ہونے والا تھا۔ وہ صرف یہ ایک تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو سکا۔ چند سینکڑوں سب کچھ ختم ہو گیا۔ نواب صاحب نے اس فوٹو گرافر کو ایک لاکھ روپے دے کر یہ تصویر لی ہے۔ حالانکہ وہ چاہے تو فوٹو گرافر کو ایک دن کے لیے انصاف لیتے۔ وہ اپنی عمر بھر کی کھینچی ہوئی ساری تصویریں مفت میں دے جاتا لیکن جہاں شرافت سے اور روپے پیسے سے کام چل سکتا ہو وہاں نواب صاحب زور زدہ رہتی نہیں کرتے۔“

پہلی بار اس کی جھاڑ جھکاڑ غماز دھجی مونچھوں کے درمیان اس کے پتلے پتلے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی روشنی نظر آتی اور وہ پلوہ لے لے ہوئے بولا ”اگر تم لاکھو چاچہ ہی ہو تو تمہیں اس وقت بڑا قسمس دور ہوا ہو گا کہ تمہارا دھیان اس کھڑکی اور اس فوٹو گرافر کی طرف کیوں نہیں گیا۔ جہاں تین لاکھیں مگر یہ تمہیں وہاں پوچھی بھی رہا جاتا تو کیا صرح تھا۔“

”لیکن میں چونکہ لاکھو چاچہ نہیں ہوں اس لیے میں یہ نہیں سمجھ اور سوچ سکتا ہوں۔“ میں نے بھی فرش پر پلوہ لے لے ہوئے کہا ”عام طور پر اس قسم کی وارداتوں میں تانک اور ڈاکو چڑوں پر مائے باغیہ لیتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ احتیاط بھی نہیں کیا

کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ یہ اس کی اصل شخصیت نہیں تھی۔

کسی خوب صورت اور چمکیلے برتن کو بھی اگر زیادہ عرصے کے لیے جنگل یا صحرا میں پیچیدگیاں رہ جائے تو اس پر کالٹی، سیاہی، مٹی کی تھیں اور نہ جانے کیا کچھ جم جاتا ہے۔ اصل برتن کیسے چمک کر رہ جاتا ہے۔ بلال شیدی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔

تاہم میں نے اس سلسلے میں بلال شیدی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میرا ذہن اس وقت بہت سی دوسری الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔ پچھلے اس وقت جس علاقے سے گزر رہی تھی وہ تاہم نظر ویرانہ دکھائی دے رہا تھا۔ نیم صحرائی اور نیم میدانی علاقہ تھا۔ نہ جانے وہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔

آخر کار میں نے تھوڑا سا درمک لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا "برادر بلال شیدی! میں تو بالآخر گھر ہوں اور نہ ہی ماکھو چاہتا ہوں۔" "بالآخر تو تم نہیں ہو؟ یہ تو ہمیں اندازہ ہو چکا ہے۔" عینی خان میری بات کا تھوڑے سے ہنسے ہوئے ہوا۔

"لیکن میں ماکھو چاہتا بھی نہیں ہوں" اس بات کا اندازہ کیوں نہیں ہو رہا ہے تمہیں؟" میں نے خری سے کہا۔

"تصور کی وجہ سے۔" عینی خان نے جواب دیا "اگر تمہاری تصویر ہمارے پاس نہ ہوتی اور ہم نے صرف شبیہ کی بنیاد پر تمہیں پکڑا ہوتا تو شاید ہم تمہاری بات مان لیتے۔"

"اگر میں آپ کو بتاؤں کہ جن چیزوں کی وجہ سے میری شکل اس تصویر سے ملتی جلتی نظر آ رہی ہے وہ معنوی ہیں تو آپ کیا کہیں گے؟"

"کیا مطلب؟" بلال شیدی نے تیزی سے پوچھا۔ عینی خان نے زیادہ دیر نہ گزرتی تھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"میری یہ سوچیں.... میری آنکھ کے نیچے گال کی ہڈی پر یہ ستر معنوی ہے، میرے مسودوں پر معنوی مسودوں کی ایک اور تہہ بنی ہوئی ہے جس کی وجہ سے میرے ہونٹ آنکھ کو نکل آئے ہیں، میرے ایک دانت پر سونے کا ذرہ چڑھا ہوا ہے جبکہ عام زندگی میں میرے کسی دانت پر ایسا کوئی ذرہ نہیں ہے۔ میرے بال بہت چھوٹے کرپے گئے ہیں انسان کی اور رنگ بھی بدلا ہوا ہے۔ عام زندگی میں میرے بال ایسے نہیں ہیں۔ میری جلد میں بھی کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہیں لیکن میری شکل میں زمین آسمان کا فرق پرکھتا ہے۔ میں ایسا بالکل نہیں ہوں جیسا آپ لوگوں کو نظر آ رہا ہوں۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

بلال شیدی فوراً میری طرف جھک گیا۔ میری سوچوں کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے کسی بہت گھمبے ہوئے برش کی طرح چھوٹے تھے۔ بلال نے یکدم ٹانگوں سے چٹکی میں پکڑ کر میری سوچیں اکھاڑنے کی کوشش کی۔

"کیا کر رہے ہو یاد؟" میں نے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے تکلیف

سے ذرا چلا کر کہا "اب یہ اس قسم کی سوچیں بھی نہیں ہیں کہ چٹکی سے پکڑ کر اتاری جائیں۔ یہ ایک آپ دوس پندہ دن کے لیے کیا گیا ہے۔ دس پندہ دن میں آہستہ آہستہ یہ خود ہی اتر جائے گا۔ اس سے پہلے اسے اُتارنے کے لیے امون پر اسکاڑ کے ایک خاص محل کی ضرورت ہے۔ اس سے کہ اہستہ تم کسی تیز دھار چاقو یا چھری سے کٹ کر اُتار سکتے ہو، تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ معنوی ہے۔ مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ بس چاقو چھری یا بلینڈ کی دھار میری جلد سے ذرا اوپر اور پر رکھنا۔"

امون نے اس کی زحمت نہیں کی۔ دونوں ہی پر خیال نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ باقی تینوں نے بھی کئی بار مڑ مڑ کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ نہیں بولے۔

آخر کار عینی خان گمری سانس لے کر مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا "اگر تم بالآخر گھر نہیں ہو اور ماکھو چاہتا بھی نہیں ہو تو پھر تم کون ہو؟ حافی فضل؟"

"حافی تو میں نہیں ہوں۔ یہ سعادت مجھے حاصل نہیں ہو سکی لیکن بہر حال میں ایک شریف آدمی ہوں۔ اس وقت مجبوری کی حالت میں ہوں۔" میں مزید کہنے کہنے یکدم رک گیا۔ مجھے اپنے الفاظ کچھ عجیب سے محسوس ہوئے تھے۔ انداز بنایا کچھ کچھ ان لوگوں جیسا ہو گیا تھا جو راہ چلتے کبھی کبھی ٹکرا جاتے ہیں اور کسی سفید پوش کو روک کر کہتے ہیں "جناب! میں بھکاری نہیں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ یہاں مال خریدنے آیا تھا لیکن بازار میں میری جیب کٹ گئی۔ اب واپسی کا کارایہ نہیں ہے۔"

"خاموش کیوں ہو گئے؟" عینی خان نے مجھے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا "پنی مجبوریوں کا رونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرے حالات جو کچھ ہیں وہ میرا بھی حال ہے۔" میں نے کہا۔

بلال شیدی کی آنکھوں کی شرفی کچھ بڑھ چکی تھی۔ وہ ایک صمک میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے سے لمبے میں بولا "پولیس سے بھاگے ہوئے ہو؟"

"میں نے کہا نا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ مجھے پولیس سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ مت کہو۔ بعض اوقات شریف آدمی کو پولیس سے بھاگنے کی جیسی ضرورت پڑتی ہے وہ کسی بد معاش کو بھی نہیں پڑتی۔"

بلال شیدی بولا۔ "بہر حال میں پولیس سے نہیں بہت سی خطرناک قسم کے کچھ لوگوں سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔" میں نے کہا اور ایک ٹھنڈی سانس لی "لیکن جو مصیبت مقدور میں ہو وہ انسانی ہی پڑتی ہے، خواہ انسان کتنا ہی بھانگ لے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "آپ لوگوں کو میری بے گناہی کا تعین کیا گیا نہیں؟"

"نہیں" عینی خان نے ٹھہرے اور روکے لمحے میں جواب

تھے اس لئے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے ہو گے۔" ان کی کھڑیاں دلیل کے میدان میں بھی تھوڑا بہت کام کرتی تھیں۔ ان پر محض وحشت و خنواہی کا ظلم نہیں تھا۔

وہ باری باری بات کر رہے تھے۔ اب عینی خان بولا "ویسے بھی ان پگھلوں میں پڑنا ہمارا کام نہیں ہے کہ تم کون ہو اور کون نہیں۔ ہمیں جو کام سونپا گیا تھا وہ ہم نے کر لیا ہے۔ ہم تمہیں لے جا کر نواب صاحب کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اگر خوش قسمتی سے تمہیں اپنی کمائی ملنے کا موقع مل گیا تو سنار بن۔ اگر اس پر یقین کر لیا گیا تو تھماری اور بھی زیادہ خوش قسمتی ہوگی ورنہ...."

اس نے بھوس پٹکا کہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ کیا؟" میں نے اپنی دھڑکنیں ذرا مرتعش ہوتی محسوس کیں۔

"ورنہ جہاں تم ہو گے وہاں کے دروہاؤ اور بھی تمہارا مشرک و کچر کا نہیں گے۔" بلال شیدن نے جواب دیا۔

میں خاموش رہا۔ پشت پر ہاتھ بندھے ہوئے اور پیٹے پیٹے رہنے کی وجہ سے میں تھک چکا تھا۔ ویسے بھی میں گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں جن حالات سے گزر کر آ رہا تھا وہ کسی نہایت غیر معمولی انسان کو بھی تو زچہ زچہ دکھ دینے کے لیے کافی تھے۔ یہ تو صرف خدا داوخت جانی تھی جو میرا ساتھ دے رہی تھی۔

پیارو اب ایک جنگل میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ کچا سڑک نما راستہ تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔ ہر ایک طرح کی پگھلنے والی سیاب بھی باقی تھی جو جنگل میں بھی مل سکتی تھی۔ نہ جانے کہاں تک جا رہی تھی۔

دن ڈھلنے لگا تھا اور جنگل میں داخل ہونے کے بعد تو تقریباً رات سی کا سماں دکھائی دینے لگا تھا۔ ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس روشن کر لی تھیں۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" سنی منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"اسے غلاتے میں" بلال شیدن نے میم لیمے میں جواب دیا "یہ شارٹ گٹ ہے۔"

شارٹ گٹ اتنا طویل تھا، اصل راستے سے جاتے تو نہ جانے کیا عالم ہوتا۔ میری ٹانگیں تن ہو چکی تھیں اور کمر تختہ ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر گاڑی کی دیوار سے ٹیک لگائی اور ٹانگیں پھیلا لیں۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ میری عمرانی سے اب بھی غافل نہیں تھے۔ کچا سڑکوں کا رخ نواب بھی میری طرف ہی تھا لیکن اب ان کے چہروں پر اور ان کے رویے میں وہ خنواہی نہیں رہی تھی۔ اتنی دیر کی بات چیت کا یہ فائدہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ شاید انہیں اطمینان ہو چکا تھا کہ میں اب مکمل طور پر ٹاکو میں تیار ہوا ایک خشک خوردہ شکار ہوں۔ سروسٹ تو ایک ہند گاڑی میں پانچ کلا شوف برادرین کے درمیان بندھے ہوئے ہاتھوں اور ٹانگوں سے ٹوٹے جسم کے ساتھ میں کسی قسم کی مزاحمت

دیا۔ میرے دل میں امید کی جو سوہم کی کرن ابھر رہی تھی وہ ذوق مٹی۔

عینی خان بنور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "اگر تم ایک اپ میں ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہا کو چاہتے نہیں ہو سکتے بلکہ اب تو تمہارے ہا کو چاہنے ہونے کا امکان اور بڑھ گیا ہے۔ گتا ہی ہے کہ تم اس وقت بھی اسی ایک اپ میں تھے جب تم نے نواب زادہ صاحب کے قتل میں حصہ لیا اور اتفاق سے تھماری بھوس پٹھی گئی۔"

"ہاں۔ عینی خان ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میری توقع کے خلاف ال شیدن نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی "عینی خان کی کھوپڑی تل سے اتنی بھی خالی نہیں ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔"

"میرے خیال میں تو آپ ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔" میں یہ کہتے بے رہ گیا۔

عینی خان سنجیدگی سے بولا "ہا کو چاہتے اندرون سندھ کا ڈاکو، ہمارے علاقے کا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی اصل شکل صورت بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم" ہا کو چاہتے کتنا جاہل ہے۔" میں نے دلیل کا نام لینے کی کوشش جاری رکھی "لیکن وہ اتنا احتیاط نہیں ہو سکتا جس کیٹ اپ میں وہ ایک بہت بڑی اور بہت خطرناک رات کر چکا ہو اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اسے دیکھ لیا گیا تھا" بسو پ میں وہ بعد میں بھی گھومتا رہے آپ نے خود ہی بتایا کہ نواب زادہ صاحب کے ایک گاڑی نے اس کے چہرے سے اکھیچ لیا تھا اور یہ رادارات بھرے بازار میں ہوئی تھی۔"

اس بار جواب بلال شیدن نے دیا "گاڑی نے ڈھکا تو سمجھ لیا لیکن وہ کچھ تھانے کے لیے زندہ کہاں بچا تھا۔ وہ تو گولیوں سے ہوا گیا تھا۔ ویسی بات کہ رادارات بھرے بازار میں ہوئی تھی" نے شروں کے بازار کچھ ایسے زیادہ بھرے گئے بھی نہیں۔ مارکیٹ کے باہر تو چند لوگ موجود تھے، گولیوں کی تڑتڑاہو تے ہی ان میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہر ایک کو جان بچانے کی تھی۔ سب کچھ جیسے آگنا ہوا گیا۔"

عینی خان بولا "لوگوں نے اگر دیکھا بھی تو صرف اتنا کہ کچھ دیوں سے چھٹی ہو کر گئے تھے اور کچھ لوگ کلا شکو نہیں خائے گاڑیوں میں بیٹھ کر بھاگ رہے تھے۔ ہمیں کام کی بات دلا کوئی کہ وہ نہیں ملا۔ کام کی چیز صرف یہ ایک تصویر اس نے اپنی جیب کو چھتا ہا جس میں تصویر موجود تھی لے نواب صاحب نے اس کی ایک لاکھ روپے قیمت ادا کی۔ طرح سے نوٹز کرا فر کے لیے انعام تھا۔"

ال شیدن بولا "اس کے علاوہ شاید تم اس لیے بھی اطمینان بسو پ میں محسوس رہے تھے کہ اب تم اس علاقے سے بہت قتل تم نے رادارات کی تھی۔ اب تم در سرے صوبے میں

جیسے صبح کے آثار نمودار ہو رہے ہوں۔

اس دھندلاہٹ میں ہر چیز پراسرار سی لگ رہی تھی۔ چوٹی دروازہ کھولنے والے کے علاوہ بھی احاطے میں تین کا خوف برادر کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر بڑی بڑی جگزیں تھیں۔ احاطے میں مجھے دو جھپیں اور ایک چھادہ مزید کھڑی دکھائی دی۔

میرے ہم سفروں میں سے تین پہلے اتر گئے۔ پھر انہوں نے مجھے اُتار دیا۔ دو میرے پیچھے اترے۔ چوٹی گیٹ عقب میں بند ہو گیا تھا اور اس کی بڑی سی آہنی گڈڑی میں بڑا سا ڈال ڈال دیا گیا تھا۔

میں پیچھے اتر کر انکوائری لینا چاہتا تھا لیکن ہاتھ پکشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے حسرت ہی نہ تھی اور میں نے گدھے کو ڈول کا طرح صرف باتیں سمجھنے پر ہی اکتفا کیا۔ مکان کے اندر مجھے خام روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر کچلے دروازوں اور کھڑکیوں سے مجھے کمروں میں برقی لمبوں کی جھلک بھی دکھائی دی۔

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس بق ووق ویرانے میں کیا موجود تھی؟ جبکہ کہیں آدس بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ کیا پھر خلیفہ سی کھر کھر اہٹ کی طرف دھیان کیا تو میری حیرت دو ہو گئی۔ مکان میں یقیناً کسی کوئی طاقتور خنزیر چل رہا تھا۔

مکان کی حالت تباہی تھی کہ وہ بہت پرانا تھا لیکن کچا ہو کر باوجود اشد آواز نہ کا مثالبہ کر گیا تھا۔ کیونکہ وقتاً فوقتاً شاید اس کی مرمت کرائی جاتی رہی تھی۔

وہاں موجود لوگوں نے اپنی زبان میں ان لوگوں کی خرید و خانہ پوچھی جو میرے ساتھ آئے تھے۔ اپنا احوال بتایا، دو ایک خبر سنائیں جن کے پس منظر سے لگا نہ ہونے کی وجہ سے میں اس سمجھ نہ سکا۔ میرے بارے میں مختصر ان لوگوں کو بتایا گیا کہ:

نواب صاحب کا قیدی ہیں۔  
مجھے گھیرے میں لیے دو لوگ آگے بڑھے تو میں نے پوچھا:

یہ نواب صاحب کی حویلی ہے؟

لیاقت شیدی بے اختیار ہنس دیا پھر حقارت سے چاروں اط اشارہ کرتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں بولا "نواب صاحب حویلی ایسی ہوتی ہے جیسے سبھی تمہارے خیال میں؟" نواب صاحب حویلی اگر تم نے دیکھی تو آتھیں مکمل جائیں گی اور وہاں تم آسانی سے داخل بھی نہیں ہو سکو گے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "میں سمجھو کہ یہ بھی مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں دروڑوں سونوں کی سرحد ہیں۔ یہ مکان ایک طرح سے ہماری پرائیویٹ چیک پوسٹ بہت کام آتی ہے" بہت فائدہ ہے ہیں اس کے آج کل کا خراب ہیں۔ ایک قبیلے سے ٹکرائی ہوئی ہے ہماری۔ اس لیے کچھ محفوظ نہیں رہے ابھی کافی سربانی ہے۔ رات ہم ہمارا کریں گے۔ کل دن چڑھے آگے روانہ ہوں گے۔"

پھر پیچھے اسے کچھ خیال آیا "مسکراتے ہوئے بولا "لیکن

یا محتاطی کی کسی تدبیر کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ان کا رویہ اب تقریباً بے ضرر لوگوں والا سی تھا اس لیے ان کی بات تو مجھے اپنے آپ کو تن پر نقد پر چھوڑ دینے میں بھی راحت محسوس ہو رہی تھی۔

جنگل سے نکلنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا جبکہ چھادہ کی رفتار اس دوران بھی کچھ ایسی کم نہیں رہی تھی۔ ذرا تھک کے فرائض انجام دینے والا ان بل کھاتے راستوں پر گاڑی چلانے میں بہت ماہر معلوم ہوتا تھا۔

جنگل سے نکلے تو نیم کو مستانی علاقہ شروع ہو گیا۔ بائیں ہاتھ پر کافی دور ستاروں کی دھندلی روشنی میں نیچی پہاڑیوں کے پہلے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی اونچا پہاڑ بھی دکھائی دے جاتا لیکن ہم ان سے دور دور رہی رہے۔ آہم جس بل کھاتے راستے پر ہم جا رہے تھے وہ بتدریج بلند ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ راستے میں کہیں کہیں جو بڑا اور برساتی نالے بھی دکھائی دے لے۔ یہ چھادہ بھی کئی جو بڑوں سے گزری اور پانی کے چھتے اڑ کر شیشوں تک آئے دکھائی دے لے۔

سفر مزید ایک ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران پہاڑیوں کا سلسلہ ایک بار غائب ہو کر دوبارہ نمودار ہو چکا تھا لیکن اب پہاڑیاں ہمارے دائیں ہاتھ پر تھیں اور ہم شاید گھوم کر انہی کے پیچھے جا رہے تھے۔ ایک تو میں گاڑی میں بالکل پیچھے بیٹھا تھا، دوسرے راستے میں اتنے پیچ تو ختم آئے تھے گاڑی اتنی تیزی سے رخ بدلتی رہی تھی کہ سمت کا تعین کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ ان علاقوں سے بہت پرانی آتشلی رکتھ والے سی اس طرح سفر کر سکتے تھے۔

آخر کار ہم ایک ایسے میدان میں جا پہنچے جہاں طرف سے نیچی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس میدان کے وسط میں ایک طویل و عریض مکان سر اٹھائے کھڑا تھا جو کسی چھوٹے سولے قلعے سے کم نہیں تھا۔ وہ گارے اور کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا لیکن اس کی دیواریں بہت موٹی اور دروازے کھڑکیاں کسی قلعے کے دروازے کھڑکیوں کی طرح بلند ڈھالا اور ہماری ہر کمر دکھائی دے رہے تھے۔

اس دشت کی دہرائی میں اس قلعہ نما مکان کا وجود بہت عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دروازے سے عجیب آسپ ڈنگی سی جھلک رہی تھی۔ چھادہ صدر دروازے پر جا کر۔ بلند ڈھالا یہ دروازہ منتشر کھڑی کا تھا۔ ڈرائیور نے اُتر دیا۔ چند لمبے بعد ایک دروازے میں چھوٹی سی ایک چوکور درز پیدا ہوئی جس سے پہلے تو کسی گمن کی نال باہر آئی پھر کسی نے دروازے آنکھ لگا کر جھانکا۔

گمن کی نال واپس اندر چلی گئی اور چند لمبے بعد بالکی سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ دوبارہ مکمل کیا۔ چھادہ طویل و عریض احاطے میں جا کر۔ اس وقت تک آدھا چاند نمودار ہو چکا تھا۔ وہ گویا اپنے اوچھوڑے پن پر تاسف سے سر جھکائے دھم ہوا کا ہاتھ تھامے رہ گیا رہا تھا۔ چاروں طرف ایسی لگتی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی

ماکو چاہو تو حمیس سب کچھ معلوم ہو گا۔ شاید تم صرف مزے لینے کے لئے پوچھ رہے ہو۔

”کر مزے لینا اسی کو کہتے ہیں تو اللہ اس قسم کے مزے لینے کا موقع تم سب کو عطا فرمائے۔“ میں نے پھر غلوں میں سے کہا۔

نئی ہی دو انوکھی طرح بددعا کیوں دے رہے ہو۔ بلال شیدی مسکرایا۔ اس کا مدینے اب تقریباً دو ستانہ ہی تھا۔ یعنی خان اور دو مردوں کے چہروں پر بھی زیادہ کرشمی نہیں تھی۔ شاید خیر دعائیت سے یہاں پہنچنے پر ان کا اعصابی تناؤ کالہ سے نکل دور ہو گیا تھا۔ شاید انھیں اس بات سے بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ میں نے ابھی تک ان کے لئے درد سر پہنے یا کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی اور آئندہ بھی اس کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے بھی اب کم از کم یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ ان کا تعلق ریڈ وائٹ سے نہیں تھا۔ برسوں کے سردست یہ طرہیت بھی کافی تھی۔

برآمدے سے گزر کر ہم اس بڑے سے کمرے میں پہنچے جو اسے ہی نظر آ رہا تھا۔ بیشتر لوگ باہر ہی دنگے، صرف بلال شیدی ریمینی خان میرے ساتھ اندر آئے۔ وہ میرے دائیں بائیں ذرا پیچے رہتے ہوئے چل رہے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وسط میں ایک بڑی سی چٹائی لی ہوئی تھی جس پر ایک مرد اور عورت بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رت خوش شکل، قد سے فز، اندام اور گھریلو سی تھی۔ مرد دھند اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ اس کے کندھے سے خالص چوڑے۔ وہ میاں بیوی معلوم ہوتے تھے۔

یعنی خان اور بلال شیدی کو دیکھ کر وہ دونوں کھانا چھوڑ کر اٹھ رہے ہوئے اور ہاتھ باندھ کر سلام دعا کرنے لگے۔ حال دریافت نہ لگے۔

”بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ کھانا چھوڑ کر مت اٹھو۔ کھاتے رہو۔“ شیدی ہاتھ ہلا کر بولا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ عورت ہلکی ”باتی سب لوگوں کو تو میں نے اکھلا دیا ہے۔ آپ لوگوں کے لیے ابھی تیار کرتی ہوں۔“ مجھے پتا تھا کہ آپ لوگ آئیں گے۔

”تم آرام سے کھاؤ اور آرام سے تمہارے لیے کھانا تیار کرنا“ جلدی نہیں ہے۔ ”یعنی خان نے اسے تسلی دی۔ ان میاں نے سرسری نظر سے میری طرف دیکھا تھا۔ میرے ہاتھ بندھے رہو ذرا بھی نہیں چوٹے تھے۔ یہ گویا ان کے لیے کوئی نئی بات تھی۔

میرے میں ایک بہت بڑی اور بھاری بہر کم چاہائی اور کلیدی بے بہر کم کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ایک طرف پانی کے مٹکے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانا ہوا جو ذرا انتظام سنبھالنا تھا۔ آئے جانے اور ٹھہرنے والوں کے لئے پینے کا بندوبست کرتا تھا۔ دو قوی کھا شکو فی سنبھالے

کمرے کے دروازے پر ہی ایک دوسری چاہائی پر بیٹھ گئے تھے۔ بلال شیدی نے مجھے اشارہ کیا ”وہ اس کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ کوئی غلط حرکت مت کرنا“ زندگی اور بھی مختصر ہو جائے گی۔ حمیس یہ اندازہ تو ہی گیا ہو گا کہ یہاں سے تم نکل نہیں سکتے۔ نکل کر جاؤ گے؟ یہی کہاں؟ چاروں طرف دیرانے کے سوا کچھ نہیں۔ بھاگ کر کوئی کمپیں نہیں جاسکتا۔ دوبارہ ہمارے ہی ہاتھ آتا ہے۔“

میں نے سعادت مندی سے اس کے حکم کی قبول کی اور کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں سبھی مجھ پر نظر رکھ سکتے تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ مجھ سے اس قسم کا سلوک نہیں کر رہے تھے جیسا میرے خیال میں اس قبیل کے لوگ اپنے قیدیوں سے کرتے تھے۔ کسی نے مجھے ٹھنڈے نہیں مارے تھے، رات نکل کے بٹ رسید نہیں کیے تھے۔ حتیٰ کہ ابھی تک تو کسی نے مجھے گالی بھی نہیں دی تھی حالانکہ ان کے شبہات کے مطابق میں ماکو چاہو تھا اور میں نے ان کے سردار زادے کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ اس لحاظ سے تو مجھے بہت ہی مستحب و مطلوب ہونا چاہیے تھا۔

میں کرسی پر بیٹھ چکا تو میری نظر کمرے کے بڑے سے دروازے کے عقب میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہوئی عورت پر پڑی۔ وہ کچھ اس طرح دیوار سے چپکی کھڑی تھی جیسے دروازے سے داخل ہونے والوں کو اچانک زور سے ”اڑاؤ“ کر کے ڈرانے کی لیکن اس نے اس قسم کی کوئی شرارت نہیں کی تھی۔

وہ اتنے بھرپور لباس میں تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر اس پر پڑ جاتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ شاید تنکوں نے میری حسیات پر اثر ڈالا تھا۔

اسی لمحے بلال شیدی اور یحییٰ خان آگے بڑھ کر گاؤ تنکیوں کے سارے بڑی سی چاہائی پر نیم دراز ہو چکے تھے۔ ان کی نظر بھی اسی وقت اس عورت پر پڑی۔ ہم تینوں نے تقریباً ایک وقت ہی اسے دیکھا تھا۔

وہ گدرائے ہوئے جسم کی ایک سانولی سی عورت تھی مگر اس میں خاصی کشش تھی بلکہ اس نے اپنی کشش رسانی قسم کے میک اپ کی وجہ سے کچھ کم کر لی تھی۔ وہ لالہ برے، نیلے پیلے کی شرخ رگوں کے نیچے اور چوڑی میں تھی۔ گونا گونا رنگ بھی چمک رہی تھی۔ بہت کمزور ایک اپ تھا۔ ذرا سیلتے سے کیا گیا ہو تا تو وہ اوسط درجے کی کسی جھمیر کی ادا کا وہ دکھائی دیتی۔ کھڑی وہ کچھ ایسے انداز سے تھی جیسے کسی ڈرامے کے دوران اسٹیج کے دنگ میں تھی اور فخر تھی کہ اس کی باری آئے تو جا کر اپنے مکاناتے بولے یا اپنا ایک پیش کرے۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر شرخ مسکراہٹ تھی۔

یعنی خان اور بلال شیدی دونوں ہی اسے دیکھ کر بڑی طرح جھنجھکے اور آٹھ بیٹھے۔ اس عورت کو دیکھ کر انہیں گویا ایک نیا دنیا

”جی نہیں! میں کوئی بات نہیں ہے۔“ ہمیں نے تیزی سے پلکیں میچکا نہیں ”اگر تم نے کوئی بد معاشی کی تو میں حیات خان کو ماروں گی۔“

”اور حیات خان تو جیسے ہمیں بھائی پر چڑھا دے گا۔ اس سارے کو بھی آخر ہمارے علاقے میں رہنا ہے۔“ بیٹی خان سر ہنسنے کوئل دیتے ہوئے مسکرایا۔

بلال شیدی بولا ”اسے پتا نہیں تھا وہ خرگوشی کو بیڑوں کی کھار میں چھوڑ کر جا رہا ہے؟ تو تو ایسے نازدکھاری ہے جیسے اس کی بیوی میں بھی ہے۔ ارے یہ چار چاروں کی دوستیاں تو حتمی ہو کر میں بہت آتی ہیں اور آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ تیرے پڑائے اور اصل شہساز تو ہم ہی ہیں۔ اس زمانے کے شہساز جب تجھے جیسے جنگ پھول کی خوشبو بھلے سے آگے نہیں گئی تھی۔“

اس نے ہمیں کی زلفیں بھیننے کی کو خشکی کی گھراس پر پرتی سے سر پیچے پٹایا۔ بیٹی خان نے پٹائی پر بیٹھے جوڑے مخاطب کیا ”جان محمد! رکھاں بی بی! تم نے ہمیں کو کھانا دانا کھلا ہے؟“

عورت نے رکھاں بی بی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، اٹھائے بیڑی بولی ”ہاں سائیں! احیات خان نے میرا بولا تھا کسی کی خاطر ذرا متنع کی ہے۔ مرنی پکا کے کھلائی ہے اس کو۔ بیٹھا بیٹی تھا اس کے لیے۔“

”ہاں بیٹی! اب اس کی خاطر ردا لٹ کیا کرو۔ اس کا رہنا بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہونے لگا ہے۔ کیا پتا کل اس پر کمران ہو جائے۔“ بیٹی خان بدستور مومچھ کوٹھ دیتے ہوئے ہمیں کو گھورتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

ہمیں کی کھانوں میں کنبیوں تک سفید پلاسٹک کی چوڑ بھری ہوئی تھیں۔ وہ بے نیاز سی سے ان سے کھیلے ہوئے کوئی نوغہ ٹھکانے لگی۔ اس کی آواز ابھی خاصی معلوم ہوتی تھی دی پر چوں چوں کہنے والی کی بے مری، بے استادی گھوکارا سے بہتر لگ رہی تھی۔

جان محمد اور رکھاں کھانا کھا کر برتن ساتھ ہی لیتے ہوئے کھڑے ہوئے اور رکھاں ایک نظر بیٹی خان کی طرف دیکھ کر ”کھانا تو بس تیار ہے،“ صرف گرم کر کے لانا ہے۔ آپ لوگ منہ دھو لیں۔“

”تاجہ منہ دھو لیں!“ بیٹی خان استہزائیے سے انداز میں ”ری رکھاں! کیوں پانی خانے کرائی ہے۔ تجھے تو ابھی طرح پتا اس علاقے میں ایک ایک بوہن جیتی ہے۔ تیرے ہی میاں کو سے بھر بھر کے لانا پڑتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں سائیں! میں لا رہا ہوں۔ اور لے گا۔ ہم یہاں انہی کاموں کے لیے تو بیٹھے ہیں۔“ جان محمد بیٹی ہی رکھتے ہوئے بولا اور دونوں میاں بیوی کی کمرے سے چلے

کی حیرت اٹھ گئی۔ بلال شیدی مسکراتے ہوئے بولا ”ہمیں! میری بیٹی! تو یہاں کیا کر رہی ہے؟“

”تجھے بھی نہیں۔ آج رات میں تمہارے اس ڈاک بچکے میں سمان ہوں۔“ وہ بھی ایک ادائے خاص سے مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز حرم تھی۔

”تجھے بھی۔ کوئی بات تو ہوگی۔ کسی خاص وجہ کے بغیر تو یہاں اتنی دور ہمارے اس ڈیرے پر تو آنے سے رہی۔“ بلال نے گریہ۔

وہ بڑی اداس سے اپنی چوٹی اور لٹکاؤ درست کرتے ہوئے بولی ”میں آج کل ذرا الیکٹرک حیات خان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ اس کا حکم ہے کہ چند دن اور مجھے اس کے ساتھ رہنا ہو گا پھر اس کی بدلی ہو جائے گی۔ لیکن سچ میں اسے اپنے گاؤں جانا پڑ گیا۔ وہ مجھے بھی جپ میں ساتھ بٹھا کر لے آیا لیکن راستے میں یہاں چھوڑ گیا۔ کہنے لگا ”گاؤں سے واپسی پر ساتھ لے لوں گا۔“

”واہ۔ واہ۔“ اب بیٹی خان بھی بولی اٹھا ”بڑے ٹھات ہیں تمہارے۔ اب تو بڑی اونٹنی اڑان اڑنے لگی ہے۔ بڑی پہنچ ہو گئی تمہاری۔ الیکٹرکوں سے تعلقات ہو گئے ہیں۔ کیا کہنے!“

ہمیں ذرا غرا رکھانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی ”اب تو یہی ہو گا جان کی! اب چھوٹے موٹے قابیوں، سپاہیوں، کارندوں اور دھنواڑوں کو نہ لگنا میں نے چھوڑ دیا ہے۔ یوں سمجھو اس وقت میں تمہارے اس سمان خانے میں الیکٹرک حیات خان کی امانت ہوں۔“

”واہ بھئی واہ۔! ہماری دعا ہے ایسی امانتیں تو دودھ دودھ ہمارے پاس رکھوائی جائیں۔“ بلال شیدی بولا پراس نے چارپائی پر جھکی دی ”مورا اور حرو آ۔ ہمارے پاس تو بیٹھ۔ بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کوئی دلہاری کی بات کر۔“

ہمیں بڑے نازد انداز سے آگے بڑھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے بدن میں شاخ گل کا سالوچ تھا۔ بچکے سے بھونٹے بن کے باوجود وہ بھلی لگ رہی تھی۔ وہ اگر چارپائی پر ذرا ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گئی۔ پٹائی پر بیٹھے میاں بیوی سر ہٹا کائے کھانا کھانے میں مصروف رہے۔ وہ گویا کدو پیش سے بالکل لا تعلق تھے۔ کوئی آواز ان کے کان میں نہیں جا رہی تھی۔ میں بغور یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

”چھ! تو اب تو امانت ہے ہمارے اس الیکٹرک حیات خان کی؟“ بلال شیدی نے شرع نظروں سے اسے گھورا۔

”بے شک“ ہمیں نے معنوی خمیدگی سے جواب دیا جس کی تہ میں ایک شرع مسکراہٹ بکھل رہی تھی۔

”میں امانت جس میں جب چاہیں اور جتنی چاہیں خیانت کر لیں۔ ٹھیک ہے نا؟“ بیٹی خان نے تصدیق چاہی۔



زیادہ ہوگی بڑیاں ٹوٹیں گی۔“

وہ بلور میری طرف دیکھ کر تقریباً دوستانہ انداز میں مسکرایا ”تم نے بھی ابھی تک کوئشن نہیں کی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ تمہیں ہم سے محبت ہوگئی تھی بلکہ صرف اس لیے کہ تم کوئشن کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے لیکن جو غنی تمہیں ذرا سا بھی موقع نظر آیا تم کوئشن ضرور کرو گے۔ اس لیے احتیاط اچھی چیز ہے۔“

وہ اپنی لگائی ہوئی بندشوں کو آزمائشی انداز میں جھکا دے کر دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور میری سانس لے کر بولا ”ہم تمہارے ساتھ انتہائی نرمی کا سلوک کر رہے ہیں ورنہ یہاں قید خانہ بھی موجود ہے جس کی کوٹھراں ہر طرف سے پانچ بالی پانچ فٹ کی ہیں۔ اس میں نہ تم سیدھے کھڑے ہو سکتے تھے اور نہ سیدھے لیٹ سکتے تھے۔ فرش پر خشک گھاس پھوس ہوتا ہے اور قیدی کی ایک ٹانگ دوار کے ساتھ ذخیرے سے بندھی رہتی ہے۔ اصولاً ہمیں تم کو انہی کوٹھروں میں سے کسی میں ڈالنا چاہیے تھا لیکن اس وقت کوئی کوٹھری خالی نہیں ہے اور ہم ایک ایک کوٹھری میں دو دو آدمی رکھنا نہیں چاہتے۔“

جتنی دیر وہ بیٹھ کر میرے بیروں میں رہی باندھتا رہا ”میری رگوں میں لو خشک ہوتا رہا کیونکہ اس نے میری اچھلی ڈھالی شلوار کے پائپے ذرا اوپر کر دیے تھے لیکن غیبت رہا کہ زیادہ اونچے نہیں کیے اور میری پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا چھوٹا سا خنجر اس کی گھڑ میں آنے سے محفوظ رہا۔ خنجر نیام میں ذرا اوڑھنا بندھا ہوا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اس تک ہاتھ پہنچانے یا اس سے کوئی کام لینے کا موقع میسر آتا تھا یا نہیں لیکن وہ حال میرے لیے امید کی ایک موہوم سی کرن تھی۔ اس کرن کو بھی معدوم ہوتے دیکھنا میری باپوی میں بھی اضافہ کرتا اور ان کے شکوک میں بھی۔

اس اثنا میں جان محمد کھانا لاکر بیٹائی پر رکھنے لگا۔ وہ ہاتھوں افزا جو چہاروں میں آئے تھے چٹائی پر بیٹھے۔ بلال شیدی نے مجھے اشارہ کیا کہ ”تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہو۔“

یہ گویا اس کی طرف سے ایک اور عظیم رعایت یا اعزاز تھا جس سے وہ مجھے نواز رہا تھا۔ گرم گرم دونوں اور سالن کی خوشبو سے میرے پیٹ میں مل رہے تھے۔ میں فوراً اٹھا اور ان کے درمیان جا بیٹھا۔

بلال شیدی گویا میری خوش فہمی دور کرتے ہوئے بولا ”لیکن ہم تمہارے ہاتھ کھولنے کا خطوط مل نہیں لیں گے ہم کھانا اس اور سکون سے کھانا چاہتے ہیں۔“

پھر اس نے گرون کھما کر ہمیں کو مخاطب کیا ”او ہمیں! ادھر آ۔۔۔ ذرا اس قیدی کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھادے۔ کیا یاد کرے گا یہ بھی کہ کن ریموں سے پالا پڑا تھا جو قیدیوں کو بھی مہمانوں کی طرح رکھتے تھے۔ تم کو پتا نہیں اس کی زندگی کا کیا

میرا خیال تھا کہ پہلے کی نسبت ذرا زیادہ شمالی میسر آئے کے بعد ہمیں اس سے بلال شیدی اور عینی خان کی چیمیز خانی بڑھ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان کا سوا بیک وقت ہی کچھ بدل گیا۔ پہلے بھی وہ دھار تو اٹھایاں اور چیمیز ہی کر رہے تھے لیکن درحقیقت ان کی آنکھوں میں فکر مندگی کی پرتھائیاں تھیں۔ اب جیسے ان کے اندر کی قوتیں کچھ ابھر آئی۔

وہ دونوں ہمیں کے قریب ہو گئے مگر دست درازی کے بجائے نہایت سنجیدگی سے اندازدارانہ سے انداز میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ وہ تجزی سے اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ آواز میں بہت سنجی ہونے کی وجہ سے میں صحیح طور پر کچھ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اتنا اندازہ میرا مل ہو گیا کہ آج کل ان کی کسی دوسرے قبیلے کے لوگوں سے تقریباً جنگ جی چھڑی ہوئی تھی۔

ان لوگوں کو غالباً تیزیوں کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بلال اور عینی، ہمیں اسے تیزیوں کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوئشن کر رہے تھے لیکن وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بار بار یہی کہے جا رہی تھی کہ ابھی اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ کوئشن جاری رکھے گی اور جہاں بھی ہوئی کسی نہ کسی کے ہاتھ پیغام بھجوواتی رہے گی۔

اس سے بات ختم کر کے بلال شیدی کو جیسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر دوڑانے کی طرف منہ کرتے ہوئے آواز دی ”راؤھن! ایک ری تو لے آؤ۔“

”حاضر سائیں! ابھی لایا۔“ باہر سے آواز آئی۔

چند لمبے بعد ایک میانہ قامت مگر سخت جان سا نوجوان بلی ری کا ایک چمکا اٹھائے کمرے میں آیا۔ بلال شیدی نے ری اس سے لی اور اٹھ کر میرے قدموں میں آ بیٹھا۔ اس نے ہاتھوں سے ہاتھ دھو کر اپنے خنجر سے ری کا ایک کٹڑا کاٹا اور اس کے دونوں سروں سے میرے دونوں پاؤں اس طرح خاص قسم کی بندشوں میں بکڑ دیے کہ درمیان میں کچھ فاصلہ ہی موجود رہی۔ یعنی میں چاہتا تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانا اختیار سے چل سکتا تھا۔ لیکن قدم اٹھا کر تیزی سے چلنا یا دوڑنا میرے لیے ناممکن تھا۔

”کیا یہ کام بھی ضروری تھا؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا ”میں نے خود ہی کہا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا ناممکن ہے اور مجھے بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔ ویسے بھی میں نے ابھی تک بھاگنے کی کوئی کوئشن تو نہیں کی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ پکڑا گیا کوئی شخص بھاگنے کی کوئشن ہی نہ کرے۔“ بلال شیدی داغدارانہ لہجے میں بولا ”ایک دوہ صرف اس وقت کوئشن نہیں کرتا جب وہ دے زیادہ خوف زدہ ہوتا ہے۔ خوف دور ہوتے ہی وہ قسمت آزمائی ضرور کرتا ہے۔ دوسرے وہ اس وقت کوئشن نہیں کرتا جب کوئشن ناممکن ہوئی ہے لیکن اسے پتا ہوتا ہے کہ کوئشن کو کوئی فائدہ نہیں۔ ان سختی

انجام ہوتا ہے۔ فی الحال تو اس کو دو ایک دن بھی خوشی گزار لینے دیں۔

بھیمیاں منہ بنا کر بولی "اے آدمی کا عشق میرے کس کام کا جس کے ہاتھ بھی بندھے ہوں اور پاؤں بھی۔ اور سے اس کی جیب بھی خالی ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میری جیب خالی ہے خاتون؟" میں نے انتہائی ناشائستگی اور ملاحت سے پوچھا۔ مجبوری کی وجہ سے زبان اب بھی کچھ چلی رہی تھی۔

عینی خان قہقہہ لگا کر بولا "اڑے۔ اس کی شکل کی مصیبت پر نہ بانا۔ بڑی خرافت عورت ہے۔ آؤنی چڑیا کے پر کھنکھاتی ہے۔"

بھیمیاں اس کی طرف ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی "بھی کسی کو میرے بارے میں کوئی اچھی بات نہ بتانا۔"

"تم میں جو بھی اچھی باتیں ہیں وہ بتانے کے قابل نہیں ہیں۔" عینی خان مسکراتے ہوئے بولا۔

برخوں کے درمیان پانی سے بھرے، شیشے کے دو جگ بھی رکے تھے۔ بھیمیاں ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر عینی خان کو کھورتے ہوئے بولی "دل تو چاہتا ہے یہ جگ تمہارے اور اٹاں دوں۔"

"اچھی نہیں۔ یہ کام صبح کے لیے اٹھا رکھو۔" عینی خان یہ پروائی سے بولا۔

بھیمیاں اسے کھور کر رہ گئی۔ چند لمبے کے لیے کمرے میں خاموشی بھاگ گئی۔ سب لوگ کھانا کھا کر پیچھے ہٹ چکے تھے۔ تین افراد اٹھ کر اوپریں باہر بھی چلے گئے لیکن میں کھانا ہی رہا۔ پہلے کی کچی ہوئی روٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ شاید رکھنا تندور میں روٹیاں لگا کر پیچھے باندی تھی۔ جان بھر کرے میں لائے جا رہا تھا اور میں چٹ کیے جا رہا تھا۔ روٹیاں زیادہ ہماری بھر کم نہیں تھیں۔

"خدا کی پناہ! آخر کار بھیمیاں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی "میرا تو بازو شل ہو گیا نہیں کھلاتے کھلاتے تم انسان ہو یا دیو؟"

"خاتون انسان ہی، حالات نے دیو بنا دیا ہے خاتون! میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ایک بار پھر منڈیانے اور شاشت اندازہ کشنگ اختیار کرنے کی کوشش کی "تقریباً دو دن سے بھوکا ہوں اور مسلسل ایسے حالات سے گزارا ہوں کہ سر سے پاؤں تک بھوکا بن کر رہ گیا ہوں۔"

پھر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکراتے کی کوشش کی "دوسرے بھی جب تم جیسی خاتون کھلا رہی ہو تو کس کا فرقا بس کہ کوئی چاہے گا۔"

بالا شیدی اور عینی خان ہنسنے ہنسنے دھیرے دھیرے میری پیچیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ بھیمیاں اپنا توالے والا ہاتھ روکے انھیں آہستہ آہستہ میری طرف دیکھ رہی تھی گویا کھینے کی کوشش کر رہی ہے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔

بالا شیدی بولا "خبردار بھیمیاں! یہ مجنوں کا پتہ تم پر ڈرے۔"

بھیمیاں چارپائی پر بیٹھی یوں غائیکیں جھلٹاے جاری تھی جیسے رقص کرنے کے لیے بے قرار ہو۔ ساتھ ہی وہ اپنی چوڑیوں سے کھینٹے ہوئے گنگناے بھی جاری تھی۔ بالا کا حکم سن کر سر اٹھاتے ہوئے خوشی آہستہ آہستہ بولی "میں تو کہ نہیں ہوں تمہاری یا اس قیدی کی۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا تو میں صرف اپنے گھروالے کو کھلاؤں گی۔"

"گھروالا؟" بالا شیدی اور عینی خان نے ہم آہنگ ہو کر زور دار قہقہہ لگایا۔ پٹا ہر ایک کٹا کٹا کہ ان دونوں میں اکثر اختلاف رائے پایا جاتا تھا لیکن درحقیقت ان میں بڑی دہشتی ہم آہنگی تھی۔

بالا شیدی استہزائیہ لہجے میں بولا "تیرے جیسی عورتوں کی زندگی میں گھروالا نہیں آیا کرتا۔ اگر تیرے جیسی عورتوں کو بھی گھر والا ملنے لگے تو شریف عورتوں کی کوئی قدر ہی نہ رہ جائے۔"

بھیمیاں کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اُداسی کی ایک لہری آکر گزر گئی لیکن پٹا ہر اس کے آثار اب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

چمک کر بولی "میرے ہی جیسی عورتوں کے پیچھے تو سزا لوگ دم ہلاتے پھرتے ہیں۔ ہر کوئی میرا گھروالا بننے کے لیے تیار ہے مگر میں خودی ان پیسے مردوں میں سے کسی کو گھروالا بنانا نہیں چاہتی۔ مجھے پتا ہے یہ سب غرض کے بندے ہیں۔ ان کی محبت کچی ہے۔ پانی کے پیلے کی طرح۔"

"اچھا اب وہیں چارپائی پر بیٹھی بیٹھی زیادہ چھندیاں نہ جھاڑو۔" بالا شیدی نے ذرا سختی سے اسے ڈانٹا "ادھر بچے آ۔ اور اس قیدی کو کھانا کھلا۔" لگتا ہے "تیری یہ پڑ پڑ ملنے والی زبان کسی دن گڈی سے کھینچی ہی پڑے گی۔"

"اوہ نہ!" بھیمیاں نے منہ بنا کر سر جھٹکا لیکن فوراً اٹھ کر بیٹھے آہنی۔ میرے پاس بیٹھ کر پہلے اس نے بغور میرا جائزہ لیا پھر توالے توڑ توڑ کر میرے منہ میں ڈالنے لگی۔ اس نے کوئی عطر بھی لگایا ہوا تھا جس کی تیز خوشبو ناک میں چڑھی جاری تھی تاہم بڑی نہیں لگ رہی تھی۔

کھانا کھانے کے دوران میں اداس اداس سی نظروں سے ایک منگ اس کی طرف دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ منظر ہو کر پلوہ لگنے لگی۔ آخر وہ بولے بغیر نہ رہ سکی "یہ ایسی بیمار سی شکل بنا کر میری طرف کیوں دیکھے جارہے ہو تم؟"

عینی خان گویا محفوظ ہوتے ہوئے بولا "بے جاہ عاشق ہو گیا ہے تم پر۔ اس بے جاہے کا بھی قصور نہیں، تم بڑی ایسی ہو۔"

میں غم ناک انداز میں مسکرایا جس طرح عموگنا نام عاشق اپنی محبت کا مذاق اڑائے جانے پر مسکراتے ہیں۔ بھیمیاں نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں کون تھا اور مجھے کس سلسلے میں پکڑا گیا تھا۔ وہاں موجود سبھی لوگوں کے لیے یہ گویا روزمرہ کے معمولات

”یہ ہمارے علاقے میں محوم پھر کر گزری سچا کر گانے والی لڑکی تھی۔ جب تک اس کی ماں زندہ تھی اس کی کچھ حفاظت کرتی رہی لیکن ماں کے مرنے کے بعد یہ کچھ بے آسرا سی ہو گئی۔ اس کے قبیلے کے لوگ بھی اُدھر اُدھر بکھر گئے۔“ بلال شیدی اپنی داڑھی میں اٹکیاں بچھرتے ہوئے بتاتے لگا ”ہمارا علاقہ خاصا خطرناک ہے“ تمہیں پانی ہوگا۔ ویسے بھی لاوارث درخت کے نیچے پھل ہو کچھ کر راہ چلتے لوگوں کی بھی رال چٹکتے لگتی ہے۔ اکیلا لڑکی کب تک اور کس طرح اپنے آپ کو بچاتی۔ شکل صورت بھی تم دیکھ رہے ہو۔ بُری نہیں ہے۔ ناک نقشہ ذرا بھی اچھا ہو تو نوجوانی میں اور بھی اچھا لگتا ہے۔ یہ کنی پتنگ کی طرح اُدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی کوئی رنچ کر اپنے ڈیرے پر لے جاتا تھا، کبھی کوئی ڈرا دھما کر اپنے مکان میں بند کر لیتا تھا۔“

بھیمال نے مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن بلال شیدی نے بات جاری رکھی ”پھر اسے تھوڑی سی عقل آگئی۔ دھکے کھا کر، ٹھوکریں کھا کر انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اس نے سوچا، اگر یہی کچھ ہوتا ہے تو ذرا طریقے سیکھنے سے ہوتا چاہیے۔ یہ کیا کہ رشار غبت بھی شامل نہیں۔ لہذا ملا بھی کچھ نہیں اور عزت بھی کوئی نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو ذرا بنایا ستوار اور تھوڑا حوصلہ اور جرات پیدا کی۔ اپنے دو چار ساتھی اور ضرورت کے وقت کام آنے والے تلاش کیے اور اپنی مرضی سے سوچ بچ کر اس لائن پر چلنا شروع کیا۔“

بلال شیدی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر وہ سربزگائے اپنی دو ٹہنیوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کا چہرہ یکدم پات سا ہو گیا تھا مگر اب گویا اس کے چہرے پر زیادہ کمناں تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بلال شیدی مگر سانس لے کر بولا ”اب حالات کافی مختلف ہیں۔ اب چھوٹے موٹے، لالچو قسم کے لوگ اس کی مرضی کے بغیر اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ کوئی دھمکے کا اور ذرا سنجیدہ آدمی مل جائے تو کافی کافی دن ایک ہی کے ساتھ بھی رہ لیتی ہے۔ اس کا کوئی کھرا نہیں ہے لیکن سنا ہے اب اس کے پاس اچھا خاصا دیرپہ بیڑہ ہے جو پتا نہیں اس نے کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ اب بھی اس کے شب و روز اکثر خطرناک داخل میں خطرناک لوگوں میں ہی گزرتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کبھی کوئی اس کے روپے پیسے کے پکڑ میں اسے قتل ہی نہ کر دے۔“

پھر اس نے مسکرا کر بھیمال کی طرف دیکھا ”کیوں بھیمال! کہاں چھپا کر رکھی ہے اپنی دولت؟ اپنے اپنے اُڑنے دوست کو تو بتا دے۔ نیچے پتا ہے ہم تو تجھے لوٹنے سے رہے۔“

بھیمال سے کھینچتے کھینچتے اس نے سر اٹھایا۔ اس کی بہن جیسی آنکھوں میں افسردگی تھر رہی تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی ”کہاں ہے میرے پاس دولت؟ میں سب کچھ بچ کر بھی خالی ہاتھ کی خالی ہاتھ ہوں۔ دولت اب بھی دولت والوں ہی کے پاس ہے۔ مجھ

والے کی کوشش کر رہا ہے۔“

بھیمال نے بے پردائی سے ہاتھ بلایا لیکن جب وہ بول تو اس کے لیے میں ایک عجیب سی افسردگی در آئی تھی ”ارے۔ بھیمال برکوتی کیا ڈور سے ڈالے گا۔ ڈل چکے جتنے ڈور سے ڈلے تھے اب تو بھیمال بڑی چھری چیز ہے۔ صرف اپنا فائدہ دیکھتی ہے۔ بے عمل جنوں والے پکڑ میں نہیں پڑتی۔“

زیادہ چالاک اور مکار لوگ اپنی مکاری پر معصومیت کا خول چڑھاتے دیکھتے ہیں۔ انڈی قسم کے چالاک اپنی چالاک کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ وہ درحقیقت ایک طرح کے سادہ لوح ہی ہوتے ہیں۔ اصل چالاک اور مکار لوگ تو آخری دم تک کسی کو پتا ہی نہیں چلتے دیکھ کر وہ چالاک اور مکار ہیں۔

آخر کار میں نے کھانا قسم کیا اور بھیمال سے پانی کی فرمائش کی۔ وہ اصرار نہ کیا اس میرے منہ سے لگانے لگی تو میں نے کہا ”اس سے کیا نہ گائے۔ جگ ہی منہ سے لگا دو۔“

اس نے نفی سے مجھے کھورا پھر دونوں ہاتھوں سے جگ اٹھا کر میرے منہ سے لگا دیا۔ وہ غالباً چٹنے کا پانی تھا اور گڑے میں رہنے کی وجہ سے گویا ”لڈیو“ ہو گیا تھا۔ میں نے بگ خالی کر دیا۔ میرے کھانے پینے کا انداز دیکھ کر بلال شیدی اور بھیمال غان کی آنکھیں بھی پر خیال انداز میں مسکرتی تھیں۔

میں بسیار خور نہیں تھا مگر بعض حالات میں بہت زیادہ بھی کھا سکتا تھا اور بعض حالات میں دو تین دن بغیر کچھ کھائے پئے بھی نکال سکتا تھا۔ اس وقت بھی حالات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں گویا اونٹ کی طرح کچھ ذخیرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بگ خالی کرنے میں نے ایک آسودہ سی ڈکار لیٹے ہوئے کہا ”قاتل! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس منہ سے تمہارا شکر یہ ادا کروں۔“

”اسی منہ سے جس سے اتنا کچھ کھایا ہے۔“ بھیمال نے ترکی یہ ترکی جواب دیا۔

”یہ منہ صرف کھانے ہی کے قاتل ہے، تم جیسی مہربان خاتون کا شکر یہ ادا کرنے کے قاتل نہیں ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”کاش! میں تمہارے بارے میں زیادہ جان سکتا۔ میرا مطلب ہے ان لوگوں کی شکوے سے جو اندازہ ہوا ہے اس سے کچھ زیادہ۔“

بلال شیدی کا شکوہ پاس ہی رکھ کر ایک بار پھر چارپائی پر غم رواں دوا ہوتے ہوئے بولا ”تم نہ کہیں ہوتے ہو میری جان! ہم نہیں اس سے زیادہ بھی بتا دیتے ہیں۔ بھیمال سے بھیمال کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ بھیمال کے بارے میں پوچھنا ہے تو ہم سے پوچھو۔ یہ تو ایک سانس میں سمجھو نہ بول دے گی۔“

میں نے بھیمال کی آنکھوں میں جھانکے ہوئے کہا ”نہیں۔ مجھے اس خاتون سے ایسا اُمید نہیں ہے۔“ پھر میں نے بلال شیدی کی طرف دیکھا ”لیکن خیر۔۔۔ چلو تم بتا دو۔“

موجوں کی طرح تہماڑ جھکاڑ تھے۔ ان میں انگلیاں پھرتے ہوئے وہ پرنیال انداز میں جھماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہاں۔۔۔ یہاں میں بھول ہی گیا تھا۔ تم جیسی عورتوں کا بھی ایک بھرم ہوتا ہے۔ اور میرا تو خیال ہے تم جیسی عورتوں کی عزت بھی ہونی چاہیے۔ چلو۔ ایا کرتے ہیں میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کر کی۔ معاف کر دو مجھے۔"

اس نے دور ہی سے ہاتھ جوڑ دیے۔ جھماں ہولے سے مسکرا دی لیکن اب اس کی مسکراہٹ میں وہ پہلی سی قہقہہ نکلتی تھی۔

بلال شیدی بولا "بیت بھر کر کھانا کھایا ہے اور قہوہ بھی پی لیا ہے۔ قسم سے" سرور سا طاری ہو گیا ہے لیکن بس ایک چیز کی کو ہے۔"

"کس چیز کی؟" جھماں نے گویا جانتے بوجھتے جیسے دھجھے لیے میں پوچھا۔

"شہسارے گانے کی۔ اب تم اپنی شریلی سی آواز میں گویا سرگلا سا گانا سناؤ۔" بلال شیدی نے فرمائش کی۔

"ہاں بھئی" جھمی خان نے بھی اس کی تائید کی "اس سرگہ تم بہت دنوں بعد ہاتھ آئی ہو۔ گانا بھی ضرور ہونا چاہیے۔"

پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے ایک لگا "راہن! بھٹل۔۔۔ جو دنوں اپنی سارنگی اور سنجے کر تو۔"

"ابھی لایا خان! راہن کی آواز آئی۔"

چند لمبے بعد وہ دونوں ایک ایک ساز اٹھائے کرے میں آئے اور چٹائی پر اتنی پاتی مار کر بیٹھ گئے۔ جھماں گویا گرد پیش سے۔

نیا سر جھکانے دو زانو بیٹھی تھی۔ پھر بلی کی گنگناہٹ کے ساتھ اس نے سر اٹھایا اور دوسرے ہی لمبے سکوت شب کو چیرتی ہوئی اس کی پرسوز آواز ساقوں کے سینے میں اتر گئی۔

ہائے اوئے رہا نہیں گدا دل میرا  
بجائے باج ہو۔۔۔ خیرا۔۔۔!

یہ ان لوگوں کی زبان نہیں تھی مگر جب دل مضمون سمجھنے سے

لیے آمادہ ہو تو زبان کوئی مسئلہ نہیں رہتی۔ دوسرے لوگ بھی

سر جھکانے کرے میں آن بیٹھے تھے اور کم سے کم تھے۔ سارنگی تو اپنے

ساتھ دے رہی تھی مگر جو جیسے ساز کا اس لئے کے ساتھ کوئی مینا

نہیں تھا لیکن اس وقت وہ بھی بھلا لگ رہا تھا۔ جب دل میں گدا

ہو تو بے میل چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جھماں کی آواز دلوں پر۔۔۔

جیسوں کے صرف افسانے ہیں، گمانیاں ہیں۔ مجھے تو اگر کسی نے ایک ہاتھ سے چکھ دیا تو دوسرے سے لوٹ لیا۔ یا اس نے نہیں تو کسی اور سے لوٹ لیا۔ مجھے تو بھی کبھی یوں لگتا ہے یہ پوری دنیا ہی قیروں سے بھری پڑی ہے۔ بس واردات کے طریقے الگ الگ ہیں۔ کوئی کسی طرح ٹوٹا ہے کوئی کسی طرح۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ بلال شیدی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا "کھانا کیسی عقل کی باتیں کرتی ہے۔ یہ شریلی بھی بہت تھی اور اسے ڈانس بھی آتا تھا۔ اگر اسے بھی فی وی پڑ چانس مل جاتا تو یہ ریشٹاں کے بعد دوسری بلبل سحر ثابت ہوتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ریشٹاں کو شرفناہ زندگی گراسے اپنی وی پر گانے اور گانے پر محنت کرنے کا موقع مل گیا جبکہ جھماں بے چاری کو حالات نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا۔ یہ تو شاید قلموں میں بھی چلی جاتی کیونکہ بنیادی طور پر اسے ڈانس آتا ہے اور اس میں کام بڑی جلدی سیکھنے کی صلاحیت سمجھو وہ مگر افسوس۔! شہساروں کو پتا ہی نہیں چلا کہ کیسی صلاحیت دکاڑہ میں جنگلوں یا باغوں میں ہے قدروں کے ہاتھوں میں مل مل کر کے پتا نہیں کس طرف جاری ہے۔"

پھر ایک لمبے کے توقف سے وہ بولا "لیکن تم یہ نہ سمجھ لیتا کہ اس کا ریشٹاں سے کوئی تعلق ہے۔ اس کا ریشٹاں سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔"

بلال شیدی نے ایک لمبے کے لیے خاموش ہو کر گہری سانس لی اور اپنی کلا شکوف کی ٹان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "بس یہ ہے جھماں کی کہانی۔"

"بلال شیدی کی کہانی" میں نے قہقہہ دیا۔ اس دور ان جان محمد ایک رے میں قہوے کے پائے رکھ کر لے آیا تھا۔ گرم گرم قہوے کا دور چلے لگا۔ مجھے قہوہ بھی جھماں پلا رہی تھی۔ وہ اپنے پائے سے ایک چمکی لیتی پھر میرا پالہ میرے ہونٹوں سے لگاتی۔ میں نے محسوس کیا اس کے چہرے پر پچھلے ہوئے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔

بلال شیدی نے قہوہ ختم کر کے پیالا چٹائی پر تقریباً پیچکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا "تم کیوں لگ گیا تیرا؟" اس

جو گئی کیا؟

"میری کہانی سنائی بہت ضروری تھی کیا؟" وہ افسردہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "خدا، خواہ کی چیز تھماڑ سے سوتے ہوئے زخم بھی تکلیف دینے لگتے ہیں۔ تم جنگلوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہم جیسی عورتوں کا بھی ایک بھرم ہوتا ہے اور تم تو کچھ ایسے جنگلی بھی نہیں ہو۔۔۔" وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

بلال شیدی نے اپنی بڑی سی بکڑی آمادہ۔ اس کے بال اس کے کندھوں تک اترے۔ اس کے سر کے بال بھی اس کی داڑھی

انہیں فوراً ہی پناہ مل جائے گا۔ بغیر سواری کے تم ذرا دور بھی نہیں جا سکو گے اور اس علاقے میں وہ تیس پندرہ منٹ میں دھوڑ کر نکالیں گے اس لیے چپ کر کے بیٹھے رہو اور میری مدد کا نہیں اللہ کی مدد کا انتظار کرو۔“

”اللہ کی مدد بھی کسی نہ کسی روپ میں ہی آتی ہے۔“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا۔

”باہر بارن خاموش ہو چکا تھا اور چلی گیت کی چڑچڑاہٹ جاری تھی کہ اسے کسی کے لیے کھولا جا رہا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”اچھا۔ ہم دروازے میں کھڑے ہو کر یہ تو کچھ کہتے ہیں کہ کون آیا ہے۔“

”ہاں، میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔“ وہ میرے پیروں میں بندھی رہی کا جائزہ لیتے ہوئے بولی ”یہ انہوں نے اسی لیے بانٹ دی ہے کہ تمہاری طرف سے دھیان ملنا بھی رہے تو کوئی فرق نہ پڑے۔ آدمی کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوں اور وہ دوڑ بھی نہ سکتا ہو تو اس میں اور مینڈک میں کوئی فرق نہیں رہتا۔“

ہم دونوں دروازے پر آکر بے حوصلے ہوئے۔ احاطے میں اب دو آدمیوں کے ہاتھوں میں پینڈو میکس لیپ بھی موجود تھے جن کی روشنی سے احاطے کا پورا حصہ منور ہو گیا تھا۔ چلی گیت کھولا جا چکا تھا اور گھر کے رنگ کی ایک پجاردوڑائی ہوئی اندر آ رہی تھی۔ پجاردوڑائیوں سے چلتی تھی اور اس کے سامنے بیٹھے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ٹائز نہ جانے کیسے چمکے تھے جو وہ یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ پجاردوڑائی کے اندر آتے ہی گیت فوراً بند کر کے منتظر کھڑا کیا۔

پجاردوڑائی سے ذرا دور ’برآمدے‘ کے قریب ہی آکر کھڑی۔ بلال شیدی، بیٹی خان اور دوسرے دو آدمی اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے۔ انہی میں سے کسی نے اس کا دروازہ کھولا اور دھونے کے انداز میں کسی کی آواز ابھری ”یہ کیا ہوا نواب زادی صاحبہ۔۔۔؟“

ذرائع تک سیٹ پر مجھے جو چہرہ نظر آیا اس کی رنگت میں گویا چاندنی گندمی ہوئی تھی۔ اس چہرے کے گرد سیاہ اسکارف لپٹا ہوا تھا۔ اسٹینٹنگ وکیل پرنگے ہوئے اس کے ہاتھوں پر بھی سیاہ دستانے تھے۔ پینڈو میکس لیپ کی روشنی پر راہ راست چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا ”اس پر خوف، رعب، شگفتگی اور دماغی کے سارے تھے مگر انہیں چپانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔“

دروازہ کھلتے ہی وہ عورت اسٹینٹنگ وکیل پھوڑ کر پجاردوڑائی میں آ کر پڑی لیکن پھر دروازے ہی کو تھامے سر جھکائے چند لمحوں پہنچ رہی تھی جیسے پجاردوڑائی نہ کرتی ہوئی نہیں بلکہ دوڑتی ہوئی وہاں تک پہنچی ہو۔

ایک لمحے کے لیے منظر گویا ساکت ہو گیا۔ سب اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے مگر کسی میں بھی جیسے اسے چھوئے اسے سارا دھونے یا اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں تھی۔ پھر دو۔۔۔

کے ہاتھوں سے خواہوں کی کنٹر چھوٹ گئی اور سبھی گویا لب لباب ہمارے نیچے آ رہے۔ سارا ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور ان کی جگہ کلاشکو نہیں آ سکتی۔ کمرے پر چوڑ پر چھین لوٹ آئیں۔

وہ سب کلاشکو نہیں آ سکتے تھے۔ گازی کا ہارن مسلسل چلی رہا تھا۔ وہ آواز مجھے بہت کمزور لگ رہی تھی۔ اس نے ایک چھوڑ آواز کا گھنگھٹا تھا ”ایک ایسے سادہ مگر پرکار لگنے کو خاموشی میں تبدیل کر دیتا تھا۔“

ان سب کو گویا میری کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے جھپٹا کر پاس ہی بیٹھا چھوڑ کر باہر دوڑے جا رہے تھے۔ بلال شیدی نے اہستہ جاتے جاتے میری طرف اشارہ کر کے جھپٹا کر ہدایت کی ”ذرا اس کا خیال رکھنا۔“

اس طریقہ میں عریض ہال غما کرے میں صرف میں اور جھپٹا رہے تھے تو میں نے فوراً اس سے پوچھا ”تم نے زندگی میں کوئی کام ادا کیا ہے؟“

”بھی کچھ ادا کیا ہے۔“ وہ لٹھڑی سانس لے کر بولی ”نقد تو مجھے صرف رسوائیاں ملتی ہیں۔“

الفاظ ذرا مختلف تھے لیکن بات اس نے یہی کہی تھی۔ اس کے منہ سے اتنی بڑی بات سُن کر مجھے دھچکا سا لگ گیا لیکن میں نے اپنے مطلب کی بات پر رکتے ہوئے جلدی سے کہا ”مگر تم میرے ہاتھ کھول دو۔ اور میں زندہ میاں سے نکلے میں کامیاب ہو گیا تو جلدی کسی نہ کسی طرح تھیں تلاش کر کے منہ مانگی رقم دوں گا۔“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ میں نے تیزی سے کہا۔

”ہاں بات تو روکنے کی ہے۔“ وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے لٹھڑی سانس لے کر بولی ”اپنے اور تمہارے انجام پر روکنے کی۔“

اس کے لیے میں بھی یہی ہی سروسری آگئی ”اگر میں تمہاری ہڈی نہیں کھول بھی دوں تب بھی تم نے مجھے کچھ دینے کے راستے میں بڑی ادنیٰ شرط کا ہمارا کھڑا کیا ہے۔ یعنی۔۔۔“ اگر میں زندہ میاں سے نکلے میں کامیاب ہو گیا۔“ یہی تو سب سے مشکل کام ہے۔“

میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”قی الامثال تو شاید تم اکیلے سوت کے منہ میں جا رہے ہو۔ تمہارے ہاتھ کھولنے کا مجھے یہ ناکہ ہو گا کہ ساتھ میں بھی مردوں کی اور وہ بھی بہت سی ذلیل طریقے سے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”میں ایسے کہہ سکتی ہوں کہ میری زندگی ان لوگوں میں گزری ہے۔ وہ میری ایک ٹانگ ایک جیب سے باندھ دیں گے اور دوسری ٹانگ دوسری جیب سے۔ پھر دونوں جیبوں کو گٹھ مستوں میں چلا دیں گے۔ جیسے اس قیمت پر میری مدد قبول ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلادیا۔ وہ بولی ”نہ تم پھر بھی نہیں سکو گے۔“

اول تو اس مکان سے ہی تمہارا نکلا مشکل ہے۔ اگر نکل بھی گئے تو

جائے لگا۔ وہ بے ہوش تھا بلکہ صحیح معنوں میں تو وہ ایک لاش سی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کپڑے خون میں تر تھے۔  
وہ لوگ اسے جس احتیاط اور آہستگی سے پکار دے نکال کر ہاتھوں ہی ہاتھوں یہ اٹھائے گھرے میں لائے گئے اس طرح بڑا سلیکٹل اسٹاف کی ایک عمل ٹیم بھی اسے اسٹریچر پر ڈال کر نہیں لائے تھی۔

مہمیاں بڑھائی ”یہ ہے نواب زادہ عجمی کا شوہر نواب حشام۔ لگتا ہے ان پر راتے میں کیس جاتی ٹیبل والوں نے حملہ کیا ہے۔ باجیوں کے ساتھ آج کل ان لوگوں کی جنگ چل رہی ہے۔“  
میں ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھے بغیر نہ سکا۔ اس نے لفظ ”جنگ“ استعمال کیا تھا۔ مجھے باہر ایسے مناظر دیکھنے اور ایسی باتیں سننے کا اتفاق ہوا تھا جب میں حیرت سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر اس ایک ملک... جو زیادہ بڑا بھی نہیں تھا کتنی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں تھیں جن کے اپنے اپنے طور طریقے، اپنی اپنی حدود و قیود، اپنے اپنے قوانین اور اپنے اپنے مزاج تھے۔ وہ اپنی جنگیں بھی خود ہی لڑتے رہتے تھے۔ انسانی خون پانی کی طرح بہتا رہتا تھا۔ ان کے معاملات میں کبھی قوانین یا قوی مفادات کا کوئی کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو محض رسمی طور پر غائب پڑی کے لیے۔

وہ لوگ نواب حشام کو اٹھائے اسی کمرے میں لے آئے۔ شاید اس لیے کہ وہی سامنے پڑا تھا اور وہی سب سے برا معلوم ہوتا تھا۔ میں اور مہمیاں ایک طرف ہٹ گئے۔ بڑی سی چاہائی پر یوں تو صاف سترہا ہمز بچا ہوا تھا، کاؤنگیے بھی موجود تھے لیکن جان محمد اور رکھان نے حیرت انگیز پھرتی سے ایک اور صاف چادر لا کر بستر بچائی۔

نواب حشام کو بستر پر اونڈھا لٹا دیا گیا۔ اس کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کے جسم میں دو گولیاں بیوست تھیں اور دونوں ہی اسے پشت کی طرف سے لگی تھیں۔ ایک دان میں اور ایک کمر میں۔ خون ابھی تک برس رہا تھا۔ جلد ہی صاف سترے بستر شرفی پھیلنے لگی۔

نواب حشام کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی مگر وہ نوجوان نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس کی آمد و رفت بہت ڈھم معلوم ہوتی تھی۔ اس کی رنگت میں موت کی زردی آن رہی تھی۔ نہ جانے کتنا خون بہر چکا تھا اور جو باقی تھا وہ بھی گویا شرانوں کے جال سے نکلا جا رہا تھا۔

نواب زادہ اندر آکر ککڑی کی ایک بے ہنگم کڑی پر ڈھیر ہو گئی۔ دونوں بچے دو سری کڑی پر سڑک سمٹ کر اٹھنے بیٹھ گئے۔ وہ دونوں گویا ایک دوسرے سے اور ماں سے ذرا بھی دور ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں ابھی تک پھیلی ہوئی تھیں اور دہشت کے باعث وہ گویا بولنا بھول گئے تھے۔

بھی تقریباً لوٹ سکتے ہوئے پکار دے باہر آگئے۔ آٹھ فرسٹل کا ایک لڑکا تھا اور چھ سات سال کی ایک لڑکی۔ دونوں بے پناہ خوب صورت تھے لیکن اس وقت جو اس باندھ تھے۔ چھٹی پھٹی آنکھوں سے اور گرد کھڑے کلا شکوف برآمدوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس عورت نے پٹ گئے جو یقیناً ان کی ماں تھی لیکن ایک نور عمر لڑکی نظر آتی تھی۔ عرب عورتوں کی طرح اس نے برقع نہا ایک سیاہ خوب صورت ریشمی گاڈن پہنا ہوا تھا۔ پردوں میں ہلکے پھلکے خوب صورت جوتے تھے جو غیر ملکی معلوم ہوتے تھے۔

”یہ کون ہے؟“ میں نے گویا اپنے آپ سے ذرا پل پوچھا۔ ایک لمبے کے لیے مجھے یاد سی نہیں رہا تھا کہ مہمیاں میرے پاس کھڑی تھی۔

”یہ نواب زادہ عجمی ہے۔“ وہ سرگوشی میں بولی ”نواب سرور صاحب کی بیٹھی۔ یہ کسی قبائلی سردار زادہ کو بیٹھی ہوئی ہے۔ نواب حشام اس کا نام ہے۔ کشمور کے قریب ان کی بہت بڑی جائیں ہیں۔ آبائی حریف بھی وہیں ہے۔“  
پھر وہ آنکھیں آنکھ سے انداز میں بولی ”لیکن یہ اور اس کا میاں تو زیادہ تر یا ہر رہتے ہیں۔ یہ یہاں کہاں نظر آ رہی ہے۔ بچے بھی ساتھ ہیں!“

میرے پاس اس سوال کا تو کیا، کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں خاموشی سے باہر کا مظر دیکھتا رہا۔ اس وقت مہمیاں کے سوا کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ میں نے بھاگ نکلنے کے امکانات پر غور کیا۔ میں اگر کسی طرف سے مکان کی بیرونی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو جاتا تو باہر کو گویا بھاگ سکتا تھا۔

لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے کی وجہ سے میں مجبور ہو کر رہ گیا تھا۔ دیوار پر چڑھنا تو درکنار میں تھوڑے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے مکان میں داخل ہوتے وقت چھت پر بھی دو تین کلا شکوف برآمدوں کی جھلک دیکھی تھی جو یقیناً اوپر سے گرد و پیش پر نظر رکھتے تھے۔ چھت سے انہیں چاروں طرف کئے میدان کا چھپ چھپ صاف دکھائی دیتا ہوگا۔ مہمیاں سے مدد لینے کی مجھے کوئی توقع نہیں رہی تھی۔ وہ اس غلام کی طرح تھی جو خرابوں میں بھی اپنے آقاؤں سے دہشت زدہ رہتا ہے اور ان سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چند گہری گہری سانسیں لینے کے بعد نواب زادہ عجمی کے اوسان بحال ہوتے محسوس ہوئے۔ اپنے لوگوں کے مظلوم حفاظت میں پہنچ جانے کے بعد گویا اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔ وہ تھکمانے لگے میں بولی ”نواب صاحب کو گاڑی سے نکالو لیکن بہت احتیاط سے۔ پھولوں کی طرح اٹھنا۔ وہ بہت نرمی ہیں۔“

بلال شیدی، بیٹھی ٹٹان اور دوسرے دو آدمیوں نے اپنی کلا شکوف میں دوسروں کو تھمائیں اور پکار دے کھس گئے۔ چند لمبے بعد ایک شخص کو نہایت ہی احتیاط اور آہستگی سے پکار دے نکالا

نچے چپ مئے تے لیکن ہر بھی کسی لیے کوئی گولی ہمیں لگ سکتی تھی۔" اس وقت کو یاد کرتے ہوئے اس نے خفیف سی جھرمجی لی۔ کمرے میں جو جمل سکوت چھا گیا۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نواب زادی بولی "شکر ہے پیادہ اسٹارٹ رہی اور کوئی تاثر برست نہیں ہوا۔ میں نے ڈرائیور کی لاش کو باہر دھکا دیا اور اندر جاؤں گا گاڑی وہاں سے بھاگتی۔ میں ڈاکوؤں کے زرنے سے تو کل گئی لیکن راستہ بھول بیٹھی۔ ہر حال میں اندر جاؤں گا گاڑی بھاگتی رہی۔ سوچ رہی تھی کہیں نہ کہیں تو پہنچوں گی۔ پھر پٹرول ختم ہونے لگا۔ ریڑھ میں رہنے والا ٹینک بھی میں استعمال کر چکی تھی۔ پھر میں نے رک کر اوپر اڑھوڑا غور سے دیکھا تو علاقہ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا اور مجھے یاد آیا کہ یہاں کہیں قریب ہی اپنا ایک ڈیرا موجود ہے۔ جہاں تک مجھے یاد تھا اس حساب سے چلتی رہی اور آخر کار یہاں پہنچ گئی۔ مجھے اُمید تھی یہاں اپنے کالی لوگ ہوں گے۔" اس نے ایک کمری سانس لی۔

"شکر ہے۔ نواب زادی صاحب! آپ کی اور بچوں کی جان بچ گئی۔" بلال شیدی مرتضیٰ سے لمبے میں بولا "اللہ سائیں کرم کرے گا۔ نواب صاحب کی جان بھی بچ جائے گی۔ ان کی حالت ایسی تو نہیں ہے کہ انہیں گاڑی میں ڈال کر کسی قریبی شہر تک لے جایا جاسکے۔ اگر ہم کسی آدنی کو بھیج کر کہیں سے ایمر ایس اور ڈاکٹر وغیرہ بلاوائیں تو اس میں بھی بہت دیر لگ جائے گی۔ کل دوسرے تک کا وقت ہو جائے گا پھر کار شایہ یہ کسی اسپتال پہنچ سکیں اور وہاں بھی معلوم نہیں مہجر آپریشن کا بندوبست ہو یا نہیں۔"

وہ کپڑا ڈرا ہٹا کر نواب حشام کے زخموں کا بڑی بخوبی اور حسانت سے معائنہ کرنے لگا پھر قدرے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا "گولیاں کمرائی میں آڑی ہوئی ہیں۔ مہجر آپریشن کا معاملہ ہے خون کی بھی ضرورت ہوگی۔ گولیاں جسم سے نکل جائیں تو اچھا ہے کیونکہ ان کی وجہ سے جسم میں انفیکشن پھیلنا شروع ہو چکی ہے۔"

اس کا اس طرح معائنہ کرنا اور رائے دینا مجھے ذرا حیران کن لگا۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے نواب زادی کو چومسکون لمبے میں کتے منسا "بلال! اچھی بات یہ ہے کہ مجھے حشام کی زندگی کی زیادہ اُمید نہیں ہے۔ ہم چاہے ان کو گاڑی میں لے کر جائیں، چاہے کسی شہر سے ان کے لیے ایمر ایس یہاں منگوائیں، ہر طریقے میں ان کی زندگی کے لیے ایک ہی جتنا خطرہ ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم ہمیں ان کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کر دو۔"

"ہمیں؟" بلال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "یہاں کیا ہو سکتا ہے نواب زادی صاحب؟ یہاں تو ایک صاف پانی ایک صاف کچینی تک موجود نہیں ہے۔ نواب صاحب کو مہجر آپریشن کی ضرورت ہے۔ مکمل آپریشن بغیر "اسٹریلائزڈ آلات وغیرہ اور خون

بلال شیدی اور پھٹی خان سب سے آگے ہاتھ باندھے کمرے تھے۔ آخر کار پھٹی خان نے ٹھکانا کر گھلا صاف کیا اور نظریں نیچی رکھتے ہوئے بولا "یہ سب کیا ہوا نواب زادی صاحب؟ کیا باجیوں نے حملہ کیا تھا؟"

"نہیں" نواب زادی نے ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں جواب دیا۔ وہ اب سنبھل چکی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی شکستہ، وہی غمزدگ لٹ آئی تھی جو اس طبقے کے اکثر لوگوں کی شخصیت کا جزو ہوتی ہے۔

ایک لمحے کے توقف سے اس نے ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں ہی بتانا شروع کیا "ہم آج کل زمینوں پر اپنی حویلی میں ہی تھے جب ہمیں بڑے نواب صاحب کا پیغام ملا کہ باجیوں کی طرف سے حشام کی جان کو خطرہ ہے اس لیے ہم سب کچھ دن کے لیے بڑی حویلی میں ہی آجائیں۔"

بڑے نواب سے اس کی مراد یقیناً اپنے ماوی یعنی نواب سرور تھے جو قبیلے کے سرور سب سے طاقتور اور ایک طرح کی مرکزی شخصیت تھے۔ خانہ دان کی سب چھوٹی چھوٹی شاخیں خطرے کے وقت انہی کے زیر سایہ تحفظ محسوس کرتی ہوتی۔ بڑی حویلی سے مراد یقیناً ان کی وہ آبائی حویلی ہوگی جو بلوچستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں پہاڑوں کے درمیان کہیں واقع تھی اور جہاں سے درحقیقت قبیلے کا نظام چلایا جاتا تھا۔

"حشام بہت احتیاط کر رہے تھے۔ مسلح محافظ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے نواب صاحب کا پیغام ملنے کے بعد بھی ہمیں روانہ ہونے میں کچھ دیر ہو گئی۔ کئی دن لگ گئے۔" نواب زادی اب بالکل دھمے لمبے میں بول رہی تھی "حشام نے انہی دنوں اپنے کالی افانے سونے میں تبدیل کرانے تھے اور کچھ زمین بھی بیچی تھی۔ کسی وجہ سے وہ نقد رقم کے بجائے کچھ سونا لے کر چلنا چاہتے تھے۔ پہلے ہم نے سوچا "الٹا سڑ کر کے ارا میں دوڑ جا کر وہاں سے کوئی عام ملاٹ پکڑیں یا کوئی سینا وغیرہ چاندز کرائیں لیکن سراسر طرح بھی بہت لمبا پڑا تھا۔ خطرہ اس میں بھی زیادہ تھا" اس لیے ہم بالی مدوڑ چل پڑے لیکن۔"

اس نے کمری سانس لے کر کرسی کے پیچھے سے سر نکالایا۔ اس کی نظریں اپنے شوہر پر تھیں لیکن اس کے چہرے پر وہ ہستنائی ملاحظہ نہیں تھا جو ان حالات میں کسی عام عورت کے چہرے پر ہو سکتا تھا۔

"لیکن کیا۔۔۔ نواب زادی صاحب؟" بلال شیدی نے بے قابی سے پوچھا۔ نظریں اس کی بھی پچی تھیں۔

"مشایہ ڈاکوؤں کو بخیر ہو گئی تھی۔ راستے میں نے انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ چھ گاڑیاں ہمارے ساتھ تھیں سب چھگے ڈرائیور بھی مر گئے۔ حشام نے بھی مقابلے کی کوشش کی۔ دو گولیاں انہیں بھی لگیں۔ ہاتھ میں اور بچے کس طرح بچ گئے۔ ہم سیلوں کے

ہیں۔" بلال نے ہتھپڑاؤں دے پھر آواز دی "تو کہاں کسی صاف برتن میں بست سا پانی اچھی طرح ابال کر لا۔۔۔ اور جان محمد۔ وہ جو پکھیلے پیسے میں اٹھنا چاہے دو انیس سال رکھ گیا تھا وہ ساری لے آ دیکھیں ان میں سے کون سی اس وقت کام آسکتی ہیں۔"

پھر اس نے اپنے لباس میں کہیں چھپا ہوا ایک دو دھاریاں خنجر نکالا اور اسے روشنی میں بلند کر کے دیکھنے لگا۔ وہ روشنی میں وہ جھلجھل کر رہا تھا مگر اس چمک میں ایک خوفناکی پنہاں تھی۔ مجھے بھر پوری سی آگئی۔ وہ خنجر سے نواب حاتم کے آپریشن کی تیار کر رہا تھا اور یہ نواب کی اپنی ہی کی فرمائش تھی۔

میں نے نواب حاتم جانزہ لیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس پر جیسے کسی نے موسمِ لیل دیا تھا۔ سینے کی بھی خنجریں بوندیں چہرے پر چمک رہی تھیں۔ اس کے اوہ کھلے منہ سے پلے سی رال بہتی ہوئی ہست میں جذب ہو رہی تھی۔ وہ واقعی دھیرے دھیرے موت کی دلدل میں آ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر کسی اعلیٰ قسم کے اسپتال میں لے جایا جانا اشد ضروری معلوم ہوا تھا لیکن اسپتال تو درکنار اسے ایک عمل ڈگری یافتہ ڈاکٹر بھی میسر نہیں تھا۔

وہ بھی ایک کدو بچی تھا۔ نہ جانے کتنی جائیدادوں اور جاگیروں کا مالک مگر اس وقت ایک عجیب عالم بے کسی میں پڑا تھا۔ میں بھی ایک کدو بچی تھا اور اس وقت ایک تعمیر قیدی کی حیثیت سے نہایت مفلوک الحالی کے عالم میں ہاتھ پاؤں بندھوائے ایک کونے میں کھڑا تھا۔

قدرت کے ان کھیل تماشاؤں میں مہرت کے عجب پلو پنہاں نظر آتے ہیں۔ میں اس ستم ظریفانہ صورت حال پر دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا لیکن خود استغاثی کی یہ ہنسی دراصل ایک خاموش کراہ تھی جسے میرے اپنے سوا کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا شاید یہ سب عذاب انسان نے خود مول لے رکھے تھے۔

آخر انسان یہ ساری قبیلے بازیاب 'سرداریاں' جاگیرداریاں ' بڑی بڑی برنس' اور ان سے چنے ہوئے لہذا تعداد جھگڑے۔۔۔ یہ سب کچھ چھوڑ گئیں نہیں دیتا؟ ایک عام سا سید عا سادا فقیر شمس سا انسان کیوں نہیں بن جاتا؟ سب میں کھل ل کیوں نہیں جاتا۔ اتنا سا وہ 'اتنا عام' اتنا بے ضرر کیوں نہیں بن جاتا کہ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے؟ بے وقعتی میں کتنی امان تھی۔ بے حیثیت میں کتنا سکون تھا!

لیکن مجھے ایک بار پھر ہنسی آگئی۔ وہی خاموش ہنسی۔ سکون اور امان بھی دراصل مقدر کی باتیں تھیں۔ اگر مقدر میں سکون اور امان نہیں تھا تو بھلا کہاں سے لی سکتا تھا؟ میں بھی تو عام سا کھٹام سا 'غریب سا انسان بن کر امان کی تلاش میں نکلا تھا لیکن پھر بھی میرے گلے میں سزا کا چھنڈا آن پڑا تھا اور وہ بھی کسی اور کے قصے کی سزا۔

جہاں تک قبیلے بازیاب 'سرداریوں' جاگیرداروں اور بڑی بڑی

لگائے کا بندوبست۔ یہ سب ہونا چاہیے۔" لیکن یہ سب میسر نہیں ہے اور ان تک پہنچنے پہنچنے حاتم ویسے بھی مر جائیں گے حقیقت پسند بن کر سوچو۔" میں اس عورت کے اپنے شوہر کے بارے میں اس زبردست 'حقیقت پسندانہ' انداز مشکوک پر حیران ہونے لگی نہ رہ سکا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لہذا میں اپنی سی کوشش کرو۔ میں نے تو ان کی طرف سے صبر کر ہی لیا ہے اب اگر وہ کسی مجرم کے تحت قید جاتے ہیں تو یہ میرے لیے قدرت کا ایک خفہ ہی ہو گا۔"

اس کے لیے میں ایک مخصوص ضد سی آگئی "تم کچھ نہ کچھ ضرور کرو۔ آخر تم میڈیکل اسٹوڈنٹ رہے ہو۔" میڈیکل اسٹوڈنٹ؟ مجھے خفیف سا جھکا لگا۔ میں نے جھکاؤ ڈال کر اسی سوچوں میں چلے اس کدو سے 'سیاہ فام چہرے' کو دیکھا۔ بظاہر اس سراپا کدو کی کڑکوں کہ سکتا تھا کہ تعلیم اسے چھو کر بھی گزری ہوگی۔

اس کا سر جھک گیا 'چہرے پر کچھ ایسے تاثرات جھلک گئے جیسے اس نے کدو پر وہ شرمندہ ہو گیا ہو جیسے پھرے مجمع میں اس کے کسی عیب کا تذکرہ کر دیا گیا ہو۔ اس سے ایک بات یہ بھی ظاہر تھی کہ نواب زادی اسے اچھی طرح جانتی تھی۔

وہ دیکھنے کے لیے میں بولا "میں نے فوراً ایئر کیئر نہیں کیا تھا نواب زادی صاحبہ! آپریشن جھگڑ میں مجھے صرف چارچہ مرچ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اگر میں کیئر کر بھی لیتا تب بھی سرجن تھوڑا ہی بن جاتا۔ اور بغیر آلات کے تو سرجن بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"میں نے کہا تھا۔ جو تمہارے بس میں ہے وہ کر ڈالو۔ اگر کوئی اور خنچ ہو جی تو میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔ میں تو ایک طرح سے صبر ہی کر چکی ہوں۔" نواب زادی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی ضرور تھی لیکن نمی نہیں تھی۔ وہ بھی شاید اپنے علاقے کی کوئی سنگلاخ جہان ہی تھی۔

بلال خاموش تھا۔ نواب زادی بولی "تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ انٹیکشن پہلانا شروع ہو چکا ہے۔" "جی ہاں۔ نواب صاحب کا جسم بخار سے تپ رہا ہے۔" بلال بولا۔

انگوٹیاں جسم سے نکل جاتیں تو شاید انٹیکشن پہلنے کا عمل ذرا ست ہو جائے جس میں حکم دیتی ہوں کہ کوشش کر کے دیکھو۔" نواب زادی کے لیے میں وہی واضح حکم لگایا۔

"ملاحظہ سرجری اور ذہنوں سے پھینچ رہا کی انٹیکشن بھی اتنی سی خطرناک ہوگی۔" بلال نے گویا بے بسی سے خبردار کیا۔

"ان کی زندگی کا معاملہ نواب ہر حال میں خواہی ہے۔ ہم یہ برا کھیل کر دیکھ لیتے ہیں۔" نواب زادی فیصلہ کن لیے میں بولی۔ "اگر آپ کا حکم اسی طرح ہے تو کوشش کر کے دیکھ لیتے



ہو رہے ہمارے ڈیروں پر؟ کون لایا تھا اسے یہاں؟

”کوئی بھی نہیں نواب زادی صاحب! یہی غلام ہاتھ جو ذکر ہوا ہم میں سے کوئی اسے نہیں لایا۔ اسے تو ہمارے آنے سے بھی پہلے انسپکٹر حیات خان یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ اپنے گاؤں گیا ہے کہہ گیا تھا، واپس پر ساتھ لے لوں گا۔“

نواب زادی گویا کچھ اور بھڑک اٹھی ”بڑے پر لگ گئے ہیں انسپکٹر حیات خان کو بھی۔ خود تو بے زمانے بھر کا کنڈا آدمی ہمارے آدمیوں کو بھی گندا کر رہا ہے میں ذرا بڑے نواب صاحب کے پاس پہنچ جاؤں۔ ملو اس کی اس کو حویلی میں۔ اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں اس کو تو کسی کئی ہے یا نہیں۔“

بے چاری! اپنے آدمیوں کا ذکر کچھ اس طرح کر رہی تھی جیسے وہ بڑی پاکیزہ مخلوق تھے۔ انہوں نے تو دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ بے چاری کو شاید معلوم نہیں تھا کہ ان معاملات میں اس کے آدمی شاید انسپکٹر حیات خان کے بھی کان کھڑے ہوں۔ کچھ دیر پہلے میں ان کی باتیں سن چکا تھا۔ وہ سب کھائے کھیلے ہوئے لوگ تھے۔

نواب زادی یقیناً دھم کی کھنٹی تھی۔ ہمیں اچھے بتا چکی تھی کہ وہ لوگ زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ شاید تعلیم بھی باہر حاصل کی ہو۔

اس کے باوجود مزاج میں وہی سردارانہ غور، وہی کھجور دی رہی برقرار تھی جو اس طبقے کی اکثریت کی پہچان سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم زمانے کی تیز رفتاری اور بہت سے عوامل نے بہت سی روایتوں بہت سی قدروں کو بدل دیا تھا کہ بعض لوگ اندر سے بھر ہوتے ہیں۔ ٹوٹ جاتے ہیں، کسی سانچے میں نہیں ڈھلتے۔

ہمیں ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ایک طرف کو ہنی اور حمزہ سے کمرے سے نکل گئی۔ بے چاری! بڑا شوق چڑایا تھا اسے خدمت کا۔ میرا دل چاہا اس کے پیچھے باہر جاؤں اور اسے تسلی دوں لیکن وہ کا شکر فرور بدستور دروازے پر کھڑے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مجھے باہر جانے سے روک دیں گے۔ اس وقت سب نے مجھے نظر انداز کیا ہوا تھا اور میں بھی کسی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا نہیں جانتا تھا۔

نواب زادی کو یکدم جیسے کچھ یاد آچکا جیسے ہوئے بولی ”ارے ہاں۔ گاؤں میں ایک مسٹر چند سیٹھوں کے بچے پھنسا ہو گا۔ کوئی جائے اور اس کو نکال کر لائے۔“

ایک شخص فوراً مستند سے باہر چلا گیا۔ نواب زادی بطور خاص کسی کو مخاطب کیے بغیر بولی ”میرا لوسہ کا کوئی مضبوط ٹرک یا کلری کی کوئی مضبوط چینی ڈیرہ موجود ہے؟“

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ایک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ہی ہاں۔ میں ابھی لا رہا ہوں۔“

نواب زادی بولی ”ایک مضبوط ٹالا بھی ہو تو بہت اچھا ہے۔“ وہ شخص اثبات میں سر ہلا کر مستند سے رخصت ہو گیا۔ اس دوران جان محمد ایک کارٹن میں، بہت سی درائیں لے آیا۔ درائیں

کا درباری سلیقوں کا تعلق تھا شاید انہی کے دم سے دنیا کی رنگ رنگی اور ہمارے برقرار تھی۔ کچھ انسان شاید اس لیے ہر وقت انہیں وسعت دینے کی ہوس میں مبتلا رہتے تھے کہ دوسرے ان محنت انسانوں کو اگر ان کے پورے حقوق نہیں تو کم از کم رزق تو میسر آتا رہے۔

میں تو نواب صاحب یا نواب زادی گنیز کو قبیلے بازوں کا قطعہ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ ہم شہروں کی حالتیں کون سی اچھی تھیں۔ ہمیں ہمارے لیڈر قبائلی نظام کی طرف لے جا رہے تھے۔ پرانے قبیلوں کی تو پھر کچھ روایات تھیں وہاں چھوٹے کا لحاظ بڑے کا احترام اور قوموں کے انصاف یا شہنائی کی توقع رکھی جاسکتی تھی لیکن نئے زمانوں میں جو یہ چھوٹی چھوٹی گولیاں، چھوٹے چھوٹے گروہ اور مسلح قبیلے بن رہے تھے ان میں تو سوائے خون ریزی اور انتقام در انتقام کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں اس وقت چرنگا جب نواب زادی نے کرسی کے مچھنے سے نیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور آنکھیں ملے ہوئے بولی ”مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ میں یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو سکی ہوں۔“

”دونوں بچے مضائقہ ہی آواز میں اس سے پوچھنے لگے کہ کیا پاپا جانی ٹھیک ہو جائیں گے؟ وہ انہیں سینے سے لگاتے ہوئے تسلیاں دینے لگی اور چرتے ہوئے بتاتے لگی کہ وہ دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ بڑی حوصلہ والی عورت تھی۔ اپنے لیے میں ذرا ہی بھی لڑش نہیں آنے دے رہی تھی۔

بچے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے تو نواب زادی اپنی آنکھیں سہلاتے ہوئے بولی ”شاید مجھے بھی افزائش میں مانگوں پر چوٹ آئی ہے۔“

ہمیں جو اس وقت ذرا آگے جا چکی تھی اور نواب زادی کے قریب تھی، کچھ اور آگے بڑھ کر بڑے اشتیاق سے نواب زادی کے پیروں میں بیٹھتے ہوئے بولی ”میں آپ کے پاؤں دبا دیتی ہوں نواب زادی صاحب!“

نواب زادی نے آنکھیں میسر کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے گویا ہلکی بارواں ہمیں ان کی موجودگی کا احساس ہوا۔

”تم کون ہو؟“ نواب زادی نے سخت سے پوچھا۔

”دوسری۔ میں ہمیں ہوں۔“ وہ کچھ گڑبڑائی۔

”اچھا۔ تو تم ہو ہمیں۔“ نواب زادی کے لیے میں بھی حکارت آئی اور آنکھوں میں بھی ”تیرے مٹنے میں میں نے تمہارے“ پھر یکدم اس کی آنکھیں دھک اٹھیں اور گہرے میں بھی تپش آئی ”تم میری آنکھیں دباؤ گی؟ میرے جسم کو چھوؤ گی؟ کندی عورت! تمہاری یہ جرات؟“

اس نے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں یہی خان کے چہرے پر آکر ٹکیں۔ شکستہ لہجے میں وہ بولی ”یہ

نہیں تھا اس لیے وہ اسے تبدیل کر دی تھی۔

اس نے سونے کی اینٹیں ایک نئی ترتیب اور مضبوطی کے لیے اس میں لپٹا کر اس کی ایک چوکور سی بنوائی۔ اس بندہ اس نے لہرے کے رنگ میں ٹھونسنے کا حکم دیا پھر رنگ کر پڑا کر گوارا چاہی خود سلی اور اپنے ساتھ لہارے میں کیس رکھ لیا۔

میں نے غصہ کیا کہ اس دوران اس کا وہاں چند منٹ لے اپنے شوہر کی طرف سے حمل طور پر ہٹ گیا تھا جو زندگی موت کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ میرے کہنے پر یہ مشاہدہ بھی قدر حیرت کا باعث تھا کہ سونے کی اتنی بڑی مقدار کو دیکھ کر بھی وہ موجود کسی بھی شخص کی آنکھیں نہیں پھٹتی تھیں، کسی کی آنکھ میں کوئی نئی چمک نہیں ابھری تھی اور کسی کے آثار اثر نہیں بد تھے۔ ان میں سے دو افراد نہایت اشناک کے ساتھ نواب زادہ کے احکامات کی تعمیل میں مصروف تھے۔ باقیوں کے چہرے بد چھڑائے ہوئے تھے۔

وہ صرف حکم کے بندے معلوم ہوتے تھے۔ انہیں اچھی یا معلوم تھا کہ سرداروں کے غائبانہ کی کس بات سے کوئی تعلق ہے اور کس بات سے بالکل لا تعلق رہتا ہے۔ جس معاملے سے اپنا کوئی تعلق نہیں سمجھتے تھے اس کے بارے میں شاید کسی خیال بھی اپنے دماغ میں گھسنے نہیں دیتے تھے۔

نواب زادہ نے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد قدر اطمینان کی سانس لی اور بلال شیدی کی طرف دیکھا جو "آپریشن" کی تیاریاں تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ اس نے کلزی کی ایک بھار بھر کم اور کمزوری سی تپائی منگوا کر چارپائی کے پاس رکھ لی تھی اپنی منگ دو میں اس پر سیادی تھیں۔

جان محمد نے کھولنے ہوئے پانی کا بیٹل کا ایک تسلا بھی ا بے ہنگم پانی پر لاکر رکھ دیا تھا اور بلال شیدی نے ایک جراثیم کا دوا اس میں ملا دی تھی۔ اب وہ کانٹن کا ایک رول کھول رہا تھا اس کے چہرے پر گرمی بخند کی اور گھر مندو اچھائی ہوئی تھی۔ یقین تھا اس وقت اس کے محسوسات تقریباً وہی ہوں گے جو تبدی قلب کا پہلا آپریشن کرتے وقت کر سکتا رہا رڈ کے رہے ہوں گے نواب حشام جس حالت میں لیٹا تھا بلال شیدی کا ارادہ تھا اسی حالت میں اس کا آپریشن کرنے کا تھا۔ چارپائی آپریشننگ خیابا کے طور پر استعمال ہونے والی تھی۔ بلال غالباً مارفین کا انجکشن دیتا کر رہا تھا۔

انجکشن تیار کر کے اس نے نواب زادہ کی طرف دیکھا اور مڑبانہ لمبے میں بولا "آپ اور بیٹے دوسرے کمرے میں جا جائیں۔ وہاں ذرا بستر حشام کا بیڈ لگا ہوا ہے۔ آپ آرام کرنے کو مشق کریں اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیں۔"

"میں بچوں کو بھیج دیتی ہوں لیکن خود میں رہوں گی۔" نواب زادہ نے ایک لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔

بے ترتیبی سے کمرن میں انٹی سیدھی بھری ہوئی تھی۔ اس میں سرنگھیں، بیال اور روٹی بھی نظر آ رہی تھیں۔ بلال شیدی ایک ایک دوا کو اٹھا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے کا جو تھوڑا بہت حصہ نظر آ رہا تھا اس پر نظر اور تعجب کی شکلیں تھیں۔ بعض دواؤں کو وہ الگ کر کے رکھنے لگا۔

اس دوران وہ شخص واپس آ گیا جو گاڑی سے بستر بند نکالے گیا تھا۔ بستر بند اس نے کمر لہا ہوا تھا۔ وہ ایک خون مند شخص تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بستر بند کے بوجھ سے ڈھرا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بستر بند کو نواب زادہ کے سامنے بنائی پر چٹا توپا نکل یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ٹھوس چیز زمین پر پڑی ہوئی ہو۔

نواب زادہ چند لمحوں کے خیال انداز میں بستر بند کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی اثنا میں دوسرا شخص لوہے کا ایک سیاہ مضبوط رنگ اٹھائے گیا جیسا عمر آٹو بیوں یا پھر ریلوے گاڑی کے پاس ہوتا ہے جس میں وہ اپنا سفری سامان رکھتے ہیں لیکن یہ رنگ اس سے بھی زیادہ مضبوط معلوم ہوا تھا، اس ڈرامائی منظر اٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مضبوط کالا بھی موجود تھا۔ وہ شخص بنائی پر بیٹھ کر ایک کپڑے سے رنگ کو صاف کرنے لگا۔

رنگ صاف ہو چکا تو نواب زادہ نے حکم دیا "بستر بند کو کھولو۔"

وہ کلزی کی اس بڑی سی بے ہنگم کمرے پر کچھ اسی محنت سے بیٹھی تھی گویا کوئی ملکہ اپنے تختہ شاهی پر جلوہ افروز ہو اور کچھ ایسی ہی غوث سے وہ احکامات جاری کر رہی تھی۔

بستر بند کو کھولا گیا تو کمرے میں پہلی ہوئی سونے کی بہت سی اینٹیں گڈے پر ہی بکھر گئیں۔ وہ میرے اندازے کے مطابق ستر اتنی اینٹیں تھیں۔ اینٹ کے نام سے ذہن میں اس اینٹ کا تصور آتا ہے جو قبر میں استعمال ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے سونے کی اینٹ اس سازش کی نہیں ہوتی۔

سونے کی اینٹ چھوٹے سائز کے ایک مستطیل شکل کے برابر ہوتی ہے اور ایک گولگی ہوتی ہے۔ عام مروجہ بیانون میں سے یہ ایک بیانا ہے۔ دیے سونے کی شکل و اصل دوسری بہت سی شکلوں بہت سی قسموں اور بہت سے بیانون میں بھی ہوتی ہے۔

وہ کم از کم ڈھائی کلوڑ روپے کا سونا تھا۔ بستر بند نے والے کی کمرے کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ نواب زادہ نے کہا تھا کہ نواب حشام نے کچھ اٹھائے سونے میں تبدیل کرانے تھے مگر مجھے بات سمجھ اور لگ رہی تھی۔ مجھے یہ سونا کیس اور سے آیا ہوا لگ رہا تھا۔ معلوم نہیں مسئلہ یہ سونا بستر بند میں چمک گیا تھا کہ بستر بند میں سونے کی سونہرگی کا خیال کسی کو کم ہی ہوتا تھا۔ قیامت کی وجہ سے ایسا کیا گیا تھا۔ دونوں ہی باتیں ممکن تھیں۔

بہر حال اس میں نواب زادہ کی مرضی شامل معلوم نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس کی نظر میں سونے کو لے جانے کا یہ طریقہ مناسب

پٹرول موجود ہو۔ پٹرول کے اگر فالتو بے موجود ہوں تو وہ بھی اسی گاڑی میں رکھ دو۔“

اس نے اس ٹرنک کی طرف اشارہ کیا جو بظاہر ڈبک خوردہ اور معمولی سا تھا لیکن اس وقت ڈھائی تین کروڑ کا سونا اپنے حکم میں چھپائے ہوئے تھا۔ بظاہر اسے دیکھ کر شاید کوئی بھی سمجھتا کہ اس میں کسی ریکوٹ کے کپڑے یا کسی ریلے کا گڑ کا سامان ہو گا لیکن اس سے پہلے شاید ہسٹریڈ کو دیکھ کر بھی کسی کو گمان تک نہ گزرا کہ اس میں اتنا بہت سا سونا موجود تھا۔ البتہ اگر کسی کو اس کے وزن کا اندازہ ہوتا تو شاید اس کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہوتا۔

وہ دونوں آدمی ٹرنک اٹھا کر باہر جا چکے تو بلال شیدی نواب حشام کو انجکشن لگانے کے لیے اس کی خون قلوہ آستین اوپر چڑھانے لگا۔ اب نواب زادی نے اپنا تختہ شاہی چھوڑا اور اٹھ کر اس کا ہاتھ پٹانے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے بولی ”میں یہاں موجود ہوں گی تو ایک نرس کے طور پر تمہاری مدد کروں گی۔“

دوسرے ہی لمحے اس کے لیے میں خصوصاً تخت لوٹ آئی اور وہ مڑ کر دیکھے بغیر بولی ”میرے علاوہ اگر تم کمرے میں کسی کا موجود رہتا ضروری سمجھتے ہو تو اسے روک لو“ باقی سب کو باہر بھیج دو۔“

”اگر آپ ایک نرس کے طور پر یہاں میرا ہاتھ پٹانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں تو پھر کسی اور کی ضرورت نہیں۔“ بلال نے جواب دیا اور سب کو کمرے سے باہر جانے کی ہدایت کی۔

میں سب سے پیچھے باہر آیا۔ سب ابوہر اوھر بکھر گئے سب کسی نہ کسی خیال میں الجھے ہوئے تھے۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے کلا شکوفہ بردار نے فوراً اٹھ کر ہدایت کی ”میری نظر سے دور مت جانا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دائیں طرف کچھ دور دروازے کے ساتھ بڑی ایک بیچ پر جا بیٹھا جس پر جھپٹا پہلے ہی سے ایک طرف کو بیٹھی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ میری موجودگی کا احساس ہونے پر اس نے آنکھیں سے سر اٹھایا۔ پٹرول میکنس لپک کی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ابھی تک نمی جھللا رہی تھی۔

”آپ کو بھی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اس کام میں بہت دیر لگے گی اور آپ یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکیں گی۔“ بلال شیدی نظر جھکاتے ہوئے بولا۔ دینے تو بلال کی آنکھیں کسی دروازے کی آنکھوں جیسی چمک دو تھائی رکھتی تھیں لیکن میں نے محسوس کیا وہ نواب زادی سے آگے ملاتے ہوئے کھڑا تھا۔ معلوم نہیں یہ حق اور کافقہ تھا یا واقعی اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔

نواب زادی سردنگاروں سے ایک تک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”بلال! کیا تمہیں بھی میرے اعصاب کی مضبوطی اور میرے حوصلے کا اندازہ نہیں؟“

”اندازہ تو ہے نواب زادی صاحب! لیکن... یہ شوہر کا... سر کے تاج کا معاملہ ہے۔“ بلال دیکھتے لیے سر ہلایا۔

”میں اپنے حوصلوں کو وہیں آزمائنا پسند کرتی ہوں جہاں انہیں آزمائنا واقعی بہت مشکل... بلکہ تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔“ نواب زادی نے غیر حزرل لیے میں کہا۔

پھر اس نے حکم دیا ”رکھنا! تم بچوں کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ انہی کے پاس موجود رہنا اور انہیں ملانے کی کوشش کرنا۔“

رکھنا ہاتھ باندھے آگے آئی اور سنبھائی سی آواز میں بچوں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہنے لگی۔ لڑکا تو باپ پر ایک اور اس کی نظر ڈال کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لڑکی مرمیں لڑکے سے چھوٹی تھی۔ عمر کے حساب سے اسے لڑکے سے کم سمجھا جاتا تھا لیکن وہ گویا صورت حال کی نزاکت کو لڑکے سے زیادہ سمجھ رہی تھی۔

دوباب کے سہانے جاکھڑی ہوئی اور ایک ہاتھ نیچے پر دو سرا منہ پر رکھ کر ہلکے ہلکے کر دینے لگی۔ ماں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اسے نرمی سے پیچھے کھینچا اور گھبرے گھبرے لیے میں بولی ”دوڑتے نہیں ہیں! دونا بڑوں کو لوگوں کا کام ہے۔ ایسے حالات میں دوڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہارے ڈیڑھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ بلال ابھی ان کی مرنہ پائی کہنے لگا، انہیں انجکشن لگانے کا موقع تک وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم دوسرے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کرو اور اپنے ڈیڑھی کے لیے دعا کرو۔“

اس وقت بلال اپنا بیخبر چمپا چکا تھا لیکن بچی بہر حال اس کی جھلک دیکھ چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں شاید اس کی وہشت باقی تھی۔ وہ کم عمر اور نا سمجھ سہی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کے باپ کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ نواب زادی کا اشارہ پا کر رکھنا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے لے کر لڑکی لیکن جاتے جاتے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

ان کے جانے کے بعد نواب زادی نے کسی سانس لی اور دو آدمیوں کو حکم دیا ”تم یہ ٹرنک لے جا کر کسی ایسی گاڑی میں رکھ دو جس کی کنڈیٹین سب سے اچھی ہو اور جس میں سب سے زیادہ

نواب زادی کی آمد سے پہلے میں نے اس کی شخصیت میں درجہ چھلایا  
ہیں جو طغیانی دیکھی تھی وہ یکدم ہی گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی  
تھی۔

میں نے قصوری تصور میں ہلال شیدی کو خنجر سے نواب ختام  
کی چیر چاڑ کرتے دیکھا۔ بچا کچھا خون اس کے جسم سے بھل بھل  
برہ رہا تھا۔ گوشت قتلوں کی سی صورت میں گٹ گیا تھا اور ہاتھ  
یہ نہ جانے کون کون سی نہیں اور شریانیں بھی۔ اگر کھلی سرجن یہ  
دیکھ لیتا کہ یہاں کس باخول میں کن چیزوں کی مدد سے کیا کام کرنے  
کی کوشش کی جاتی تھی تو شاید وہ حیرت سے بے ہوش ہو جاتا۔

میں نے اس تصور سے ذہن ہلانے کے لیے ہمیں سے کہا  
”کوئی بات کرنا۔“

”میرا نہیں دل چاہ رہا بات کرنے کو۔ کوئی زبردستی ہے کیا؟“  
وہ ناگوار سی سے بولی۔ عجیب عورت تھی۔ اسے یہ جنس تک نہیں  
تھا کہ میں کون تھا اور کس سلسلے میں گرفتار تھا۔ اس سلسلے میں بھی  
اس نے کوئی سوال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ زیادہ اصرار اصرار  
پہرے کی کچھ اجازت نہیں تھی۔ کوئی کچھ سے بات کرنے کے لیے  
تیار نہیں تھا۔ ایسے میں انتظار کے لمحات گزارنا برا ٹھن تھا۔

لیکن وقت ”انسان سے بھی کہیں عجیب چیز ہے۔ حالات کچھ  
بھی ہوں“ وقت گزری جاتا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ میں کبھی  
اٹھ کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے ٹپٹپٹے لگتا اور کبھی دوبارہ بیچ پر  
بیٹھ جاتا۔ ہمیں اس دوران اٹھ کر رکھنا کے ساتھ غالباً کچھ  
میں چلی گئی ”بائیں ہاتھ پر کھڑے پر وہ کھڑا تھا جسے باورچی خانے کے  
طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں سے ککڑیوں کے چلنے کی بو اور  
سائن روٹی وغیرہ کی خوشبو ابھی تک آ رہی تھی۔ سب کمرہ میں  
بڑی بڑی ککڑیاں تھیں اور ان میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی  
تھیں۔

آخر کار بڑے کمرے کا دروازہ کھلا اور ہلال نے سر نکال کر  
رکھاں جان محمد اور دوسرے دو تین آدمیوں کو پکارا۔ سب دوڑے  
دوڑے آئے۔ کمرے کا دروازہ پورا کھل گیا اور وہ اندر چلے گئے۔  
ہلال شیدی انہیں مختلف کام بتا رہا تھا۔ اس کی قواز کچھ تک بیچ  
رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

میں بھی اٹھ کر دروازے تک چلا گیا۔ مٹائوں نے مجھے اندر  
جھانکنے سے منع نہیں کیا۔ رکھاں پانی کا تسلا اٹھائے باہر لاری  
تھی۔ پانی خون کی طرح رنگین ہو چکا تھا۔ ہلال نے غالباً اس میں  
روٹی بٹکے بٹکے کر نواب زادے کے جسم سے خون صاف کیا تھا۔ جو  
روشنی میں تپتی ہو رہا کھنکھن کی تین گولیاں روکھی دکھائی دے رہی  
تھیں جو ابھی تک خون میں تھری ہوئی تھیں۔

نواب زادہ اب بھی بڑی سی چارپائی پر اسی طرح ادبے جا رہا  
جس طرح میں نے اسے دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر زندگی  
رنگ اب بالکل ہی معدوم ہو چکا تھا۔ اس کی رگت اڑھٹے ہوئی

عورت تھی۔ کمال کی حد تک صابر عورت۔ میرا خیال تھا کہ دنیا میں  
کوئی انسان اتنا کہ بغیر نہیں ہوتا لیکن اتنا کسی میں تم ہوتی ہے۔ کبھی  
میں زیادہ۔ البتہ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کس کی اتنا کس وقت  
بیدار ہو اور کس وقت تک سوئی رہے لیکن اس عورت میں شاید اتنا  
تھی سی نہیں یا پھر شاید یہاں کے لوگوں میں تو ابوں اور سرداروں  
کے سامنے اتنا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے ایک  
انجینی ایک زبردست قیدی سمجھتے ہوئے اپنے محسوسات اپنے دل  
کی بات مجھ سے چھپا رہی ہو۔

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ ذرا چونکتے ہوئے بولی ”یہ مت  
سمجھنا کہ مجھ سے ہر روزی جتا کہ میرا دل بیت کر تم مجھے اپنی ریاں  
کھولنے پر آمادہ کرلو گے۔“

”جنم میں گئیں ریاں۔ اور ساتھ ہی تمہارا دل۔“ میں نے  
جل کر کہا ”مجھے نہ تو ریاں کھلائی ہیں اور نہ ہی تمہارا دل چیتنا  
ہے۔ میں نے اب یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ ہی ملتی کر دیا  
ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ مجھے یہاں سے بے جا کر بڑے نواب  
صاحب کی خدمت میں پیش کر دی دیا جائے تو بہتر ہے۔ انہوں نے  
مجھے پکڑ کر اور قید میں رکھ کر جو کارنامہ انجام دیا ہے شاید بڑے  
نواب صاحب سے انہیں اس کی داؤد اور انعام ملنے کے بجائے سزا  
ملے۔“

”اچھا۔“ اس کی آنکھیں ذرا چپیلیں ”کیا کوئی خاص آدمی ہو  
تم؟“

”خاص نہیں تو بے گناہ ضرور ہوں“ لیکن یہ فیصلہ اب بڑے  
نواب صاحب کے سامنے پہنچ کر ہی ہوگا۔“ میں نے سر جھٹک کر  
کہا۔

اچانک ہلال شیدی نے بڑے کمرے کے دروازے سے سر  
نکال کر جان محمد کو پکارا۔ وہ دونوں پہنچو بکسی لیپ اندر سکوا رہا  
تھا۔ اسے یقیناً زیادہ سے زیادہ روشنی کی ضرورت تھی۔ جہاں تک  
اس کے بس میں تھا وہ اس کام کو سمجھ لاری اور ہوشیاری سے  
کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن درحقیقت یہ ناممکن کو ممکن بنانے  
کی کوشش تھی۔

پہنچو بکسی لیپ اندر چلے گئے تو احاطے میں گنگا سا اندھیرا  
پھیل گیا لیکن اتنی روشنی ضرور تھی کہ دروازے پر کھڑا ہوا  
کاٹھکوف برادر اب بھی مجھ پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا اور زور  
اُور آتے جاتے لوگ بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

چند منٹ بعد ایک اور مسلح آدمی بڑے کمرے کے دروازے پر  
آکھڑا ہوا۔ پانی لوگوں کی آمد رفت تقریباً ختم ہو گئی۔ وہ سب اصرار  
اُور کہیں کمرہ وغیرہ میں چلے گئے تھے۔ دھیرے دھیرے ایک  
عجیب سوکار سا سکوت باخول کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ وقت  
کی رفتار جیسے سستی ہو گئی تھی۔

ہمیں نے ایک بار پھر سر جھٹک لیا تھا اور خاموش بیٹھی تھی۔

کھودا لیکن سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ درحقیقت یہ سوال تھا بھی نہیں۔ سوال وہ تھا جو میں نے اس کے بعد کیا۔  
 "واکر کریں نہیں بن سکے؟" میں نے پوچھا۔  
 "اسٹوڈنٹ ہائیکس کی وجہ سے۔" اس نے نہایت دھجے لیے میں جواب دیا۔

"کمال ہے!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اسٹوڈنٹ ہائیکس کی وجہ سے تو لوگ کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں تم واکر بھی نہیں بن سکے؟"

"ہاں۔ جس لیڈر کے پیچھے میں چل رہا تھا وہ تو یقیناً کچھ سے کچھ بن گیا، لیکن مجھے کالج چھوڑ کر جانا پڑا۔" اس کے لیے میں خود استعزائی تھی۔

"کیوں؟" میں بھی اب اس سے کچھ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے وہ کلاسکوں کے زور پر مجھے انوا کر کے اور رسیوں سے باندھ کر لانے والا نہیں بلکہ ٹرین کے سفر میں دوست بن جانے والا کوئی شخص تھا اور ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اپنے لیڈر کے حکم پر مجھ سے نہیں چار قتل ہو گئے تھے حالانکہ وہ میرے قتلے ہی کا تھا لیکن اقتدار کی جنگ میں کسی اور زاویے سے شریک تھا۔ مجھ پر جب مرادقت آیا تو وہ نہ مجھے بھاسکا اور نہ پناہ دے سکا۔ میں اور میرا گھر میرا مارا پھر اہمیت کیٹھیں اٹھا میں پھر آخر کار اپنی اصل قبائلی زندگی میں لوٹ آیا۔ بڑے نواب صاحب واقعی بہت بڑے آدمی ہیں۔ اقتدار کی جنگ میں حالانکہ یہ بھی جوش کسی نہ کسی طرح سے ایک فرتی رہتے ہیں لیکن ان کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ چاہے اقتدار میں ہوں یا اقتدار سے باہر ان کی چھاؤں میں پناہ ہے۔ عافیت ہے۔"

"لیکن اس وقت تو انہیں خود عافیت میسر نہیں۔ وہ بیٹے مرچکے ہیں، بھانجی کا شوہر اندر زندگی اور موت کی کلکش میں نازک مرچکے پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"قبائلی زندگی میں ایسے مرچکے آتے رہتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "وہ وقت بھی گزر جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیوں؟" ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے گرمی سانس لیے ہوئے کہا "اکثر اسٹوڈنٹ ہائیکس میں نہ پڑے ہوتے اور تمہارے ہاتھوں میں چار قتل نہ ہوئے ہوتے تو آج تم واکر ہوئے اور اپنے گاؤں یا شہر میں۔ یا کہیں اور باغزت طریقے سے دھبہ کمانے کے ساتھ ساتھ پڑشان حال لوگوں کے کام آ رہے ہوتے؟"

"شاید" اس نے بے پروائی سے کندھے اٹکائے "ایک ذرا سا غلط موڑ انسان کو منزل سے کتنی دور لے جاتا ہے۔"

ظہر کی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے جسم میں دو نہیں تین سرواں بیوست تھیں۔ بال انہیں نکالنے میں کامیاب تو ہو گیا تھا لیکن میرے خیال میں نواب زادی نے اپنے شوہر کی چڑچھاڑ کروا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ نواب زادی کے جسم پر چادر ڈال دی گئی تھی۔

نواب زادی اب چادرائی کے قریب ہی بڑی سی بچہ کرسی پر بٹھیں اور کیے اور ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت اپنے شوہر کی طرف دیکھنے کے بجائے کوئی کوئی نظروں سے بچت کو تک رہی تھی۔ زندگی کا رنگ اس کے چہرے پر بھی بہت پچکا پچکا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو اپنی اعصاب کی مالک ثابت کرنے کے لیے خود کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی قضاہ "سر جری" ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ ایک بار تو یقیناً اس کے آنٹی اعصاب بھی خاصے زوردار طریقے سے جھنجھٹائے ہوں گے۔

فرش پر خون میں لتھڑی روئی اور پیوں کے بہت سے گولے پڑے تھے۔ ایک آدمی انہیں سمیٹ رہا تھا۔ ایک آدمی وہاں سے دھیرو سمیٹ رہا تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھ چلاؤں آ بیٹھا۔

کچھ دیر بعد بالائی شیدی بھی کمرے سے باہر آیا اور ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ وہ دراصل صاحب سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ ایک شخص لوٹے سے اس کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا۔ "سر جن صاحب" آپریشن سے فارغ ہو چکے تھے۔

وقت کبھی کبھی انسان کو گھیر گھار کر عجیب نا قابل یقین حالات کے دائرے میں لے آتا ہے۔ نواب زادہ اس طبقے سے قتل ہو رہا تھا جس کے لوگوں کو چھپک بھی آجاتی ہے تو وہ انگلیں اور امریکا بھاگے جاتے ہیں یا پہلے ہی سے وہیں موجود ہوتے ہیں لیکن آج اس کی زندگی کا خطرناک ترین آپریشن جس پر اس کی زندگی کا دامدار تھا، بالائی شیدی نے کیا تھا اور جن حالات میں کیا تھا وہ یہی ہی دو گئے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھے۔

میں بیٹھ کر بیٹھا رہا اور قدرت کے کھیل قاتلوں پر مزید کچھ دیر حیران ہونا رہا۔ اسی اثنا میں بالائی شیدی بھی میرے قریب آ بیٹھا۔ مجھے کچھ انداز میں اس نے کچھ دیر سے ٹک لگایا۔ اس کی شخصیت اس کی فعل صورت اس کا طبع اب بھی وہی تھا لیکن اب مجھے اس میں دشت زندگی اور کڑنگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس کی کیفیات بھی بدل گئی تھیں اور میرا زاویہ نظر بھی۔ اب کچھ اسے اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں رہی تھی کہ اس کے برابر اس کا قیدی بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے گرمی سانس لے کر کہا "تم میڈیکل اسٹوڈنٹ تھے؟"

اس نے سر میری طرف گھما کر ہوئے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے کے لیے اس نے عجیب سے انداز میں مجھے



لہر اُٹھ کر وہاں میں بیٹے بھی لوگ تھے انہیں اٹھائے دوڑتے ہوئے باہر آئے تھے۔ فائرنگ کی آواز سننے ہی سب کو باہر جھری لے کر سکوت کی آغوش سے نکل آئے تھے۔ وہ تعداد میں کم تھے لیکن مکان کی اصل عمارت کے چاروں طرف پھیل کر ایک دوسرے کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑتے ہوئے چار دیواری کی آڑ میں ہو رہے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی گن چور سوراخ سے باہر نکالتے ہوئے "اسی سے آنکھ لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سچ سچ میں کوئی کوئی سوراخ خالی بھی رہ گیا تھا۔

بلال شیدی اور یحییٰ خان نے چلی گت کے دائیں بائیں پوزیشن مضاعف کی۔ میرے خیال میں کوئی شخص مکان میں بیٹھا نہیں رہ گیا تھا۔ حتیٰ کہ جان محمد جو ایک مسکین سا شخص معلوم ہوا تھا اسے بھی میں نے کلا شکوف اٹھائے دوڑ کر مکان کے پچھلی طرف جاتے دیکھا۔ یحییٰ خان ہدایت کر چکا تھا کہ چھت پر کوئی نہ جائے۔

فائرنگ اسی شدت سے جاری تھی جس شدت سے اچانک شروع ہوئی تھی۔ گولیاں نیچے سے اوپر کی طرف جاری تھیں۔ میں لائن آف فائر کی زد میں تھا نہیں تھا لیکن احتیاطاً میں فائرنگ شروع ہوتے ہی نیچے سے پھسل کر زمین پر پہنچ چکا تھا اور اب انڈوں بیٹھا دیوار سے چپکا ہوا تھا۔

نواب زادی دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی اور چی کر بولی "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون لوگ فائرنگ کر رہے ہیں؟"

"ڈاکو ہیں نواب زادی صاحبہ! بلال شیدی۔ ڈیپلٹ کر فائرنگ کے شور کے درمیان سچ کر جواب دیا "آپ اس طرح نکلے میں کھڑی نہ ہوں۔ کمرے میں واپس چلی جائیں۔"

لیکن نواب زادی نے اس کی ہدایت کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ دھڑکنے لگی رہی جہاں عقب سے اس پر نکلے دوڑاڑے سے دو دشمنی پڑ رہی تھی۔ وہ بہ آواز بلند بولی "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ لوگ میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک نہ آئیں۔ اس سے تو اچھا تھا" میں سزا جاری رکھتی۔

پھر اس کے لمبے میں ہلا کی نفرت اور غیظ و غضب سٹ آیا "ڈاکو کس کی واقعی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے اور حوصلہ بھی۔ ہم نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ہمارے ڈیروں اور چوکیوں پر بھی حملہ کرنے لگیں گے۔ ان کی مثال ان کتوں کی سی ہو گئی ہے جو دوسروں کو ڈرانے کے لیے پالے جاتے ہیں محروم ہلاکوں کو ہی کاٹنے لگتے ہیں۔ ان کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا پڑے گا۔"

یحییٰ خان نے چٹا کر حکم دیا "رکھا! اتمام جیاں بھادو۔ کیسے دو دشمنی فخر نہ آئے۔"

یہ اس کی دعویٰ کا آخری حکم تھا کہ اس کے بعد اس کے اپنے وجود سے زندگی کی روشنی رخصت ہو گئی۔ اس نے دوبارہ آنکھ سوراخ سے لٹائی ہی تھی کہ ایک جھٹکے سے چاروں خانے چت

چھت پر کھڑے کم از کم مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نیچے جھانکتے ہوئے بولا "میں سائیں! چاروں طرف کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔"

"لیکن ہوشیار رہنا۔ مجھے گاڑیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔" اس نے ہدایت کی۔ اسی لمحے یحییٰ خان بھی کسی طرف سے نکل آیا۔ وہ دونوں بیرونی دیوار کے قریب پہلے گئے۔ مکان کی طرح یہ دیوار بھی کھینچی لیکن دفعتاً موٹی تھی۔ اچھے پھلے مورچے کا کام دے سکتی تھی۔ میں دیکھ چکا تھا اس میں تھوڑے تھوڑے پھلے پر چور سوراخ بھی بنے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً گنوں کی ٹائیس اہر نکالتے کے لیے تھے۔ مکان خواہ کچا تھا لیکن اس میں مورچہ بند ہو کر بیٹھا جاسکتا تھا۔

بلال شیدی اور یحییٰ خان سامنے کی دیوار میں موجود دو الگ الگ سوراخوں سے باہر دیکھنے لگے لیکن شاید انہیں بھی کچھ نظر نہ آیا۔ پھر انہوں نے دو دروازے کا جائزہ لیا۔ دروازہ مضبوطی سے بند تھا اور اس پر ان کی طرف ایک بھاری بھر کم قفل لٹکا ہوا تھا۔ وہ بٹ آئے لیکن ان کے چہروں پر خفیف سی تشویش کے آثار تھے۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ ایک خوب صورت در پر سکون رات تھی۔ اس سیاہ رات کی ٹانگ میں ٹانڈوں کی فٹال پنک رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ میں آدھوں سے پاک اس شفاف ہوا کو سینے میں قید کر لینا چاہتا تھا جو میرے گتے ہوئے اعصاب کو گدگدا رہی تھی۔

بلال شیدی اور یحییٰ خان دونوں ہی سامنے کھڑے بغور میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اندازاً کچھ ایسا ہی تھا جیسے پھیروں کے جال سا کوئی عجیب اقلکت چیز پھنس گئی ہو اور وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے جسن کے سے عالم میں سوچ رہے ہوں کہ اس کا کیا کیا جائے۔

گاڑیوں کے انجنوں کی آواز یکدم ہی معدوم ہو چکی تھی لیکن اس کے معدوم ہونے سے کم از کم میری انجمن کم نہیں ہوئی تھی۔ ٹانگ ہی فضا گیروں کی کرج اور ترخراہٹ سے گونج اُٹھی۔ دوسرے شب کے سر سے سکوت کی چادر گویا یکدم ہی کسے نہ سمجھنے کی رات تار کر ڈالی۔

پھل اور خدا بخش جو چھت کے کنارے پر ہی کھڑے تھے، اس سے ٹوٹنے والے پھلوں کی طرح دھب سے نیچے آکر۔ بہت گرا اور ایک ادھم صاف ان کی کلا شکو خمی دور جا کر۔ جہاں گئے وہیں سہمت رہے۔

بلال شیدی اور یحییٰ خان دوبارہ دوڑ کر دیوار کے سوراخوں سے نیچے انہوں نے صرف ایک سینکڑہا باہر جھانکا اور اگلے قدموں سے اُٹے ہوئے واپس آگئے۔ وہ چیخ کر اپنے آدھوں کو گلا رہے اور انہیں پوزیشن لینے کا حکم دے رہے تھے لیکن اس کی رورت میں تھی۔

بیچے آن کر اٹھا شکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے یقیناً کسی سے لگ کر نشانہ پانچہ کر گئی نہیں ماری تھی۔ نازنگ قلعی طور پر اندھا دھند ہو رہی تھی۔

اس قلعے اندر سے میں زیادہ دور سے دوار کے وہ چھوٹے چھوٹے چوکور سوراخ دیکھے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ وہ یقیناً کوئی آواز نہ گئی تھی جو سوراخ میں سے آئی تھی اور آگہ کے راستے صحنی خان کی کھوپڑی میں بھی ایک سوراخ بنائی ہوئی گزر گئی تھی۔

لال شیدی نے صحنی خان کو کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ پتلی پتلی سی آواز میں چیخا "صحنی خان۔!" لیکن وہ اپنا سوچہ چھوڑ کر صحنی خان کے پاس نہیں آیا۔ صحنی خان ساکت تھا اور یہ اندازہ کرنا قلعہ شکل میں تھا کہ وہ مر چکا تھا۔ ہر دم سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

نواب زادی کی چیخ دیکر فوری طور پر محرم گئی تھی۔ وہ آگے آ کر صحنی خان کی لاش کا کھڑے کھڑے ہی جائزہ لینے لگی۔ اس دوران رکھال نے بچاں بھاننا شروع کر دی تھیں۔ وہ ایک ہر اسرار سامنے کی طرح ایک سے دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔

پتلی بیکس لپ بھی بچھ گئے تو مکان اندر سے میں ڈوب گیا۔ تب نواب زادی اس سوراخ پر جا کھڑی ہوئی جس پر چند لمبے پتلے تک صحنی خان آگہ لگائے کھڑا تھا۔ نواب زادی چند لمبے باہر کا جائزہ لیتی رہی۔

لال شیدی کو احساس ہوا کہ وہ صحنی خان کی جگہ کھڑی تھی تو وہ صحنی گھنٹی سی آواز میں بولا "آپ اندر چلی جائیں نواب زادی صاحبہ!"

"کیوں چلی جاؤں میں اندر؟" نواب زادی غرائی "میں کوئی گائے بکری جیسی عورت تو نہیں ہوں جو مصیبت کے وقت اندر دھک کر بیٹھ جائے کسی سے کوئی مجھے بھی ایک گن دے اسے۔"

لال شیدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے کبے بغیر ہی کوئے کی طرف سے ایک ٹھٹھس آیا اور نواب زادی کو ایک کلا شکوف تھکا کر چلا گیا۔ لال شیدی اس وقت اپنی گن کا میگزین تبدیل کر رہا تھا۔

حملہ آوروں کی نازنگ میں اب وہ شدت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے آندھی طوفان کی طرح مکان پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں سے ہر طور قوت اور شدت کے ساتھ جواب ملا تھا۔ شاید اس لیے انہوں نے ہسپائی اختیار کر لی تھی اور اب وقتے وقتے سے برست مار رہے تھے۔ کوئی بے خبر نہیں تھا کہ یہ سب ان کی اسٹراٹجی ہی رہی ہو۔ شاید ان کا مقصد تیزی سے ایویویشن ختم کرانا اور یہ اندازہ لگانا ہو کہ اندر کتنی فورس موجود ہے۔

نواب زادی نے بھی گن کی بال سوراخ سے نکال کر اندھا دھند نازنگ شروع کر دی تھی۔ وہ یقیناً ایک دو میلہ والی عورت تھی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ لڑائیاں صرف حوصلے سے ہی نہیں لڑی جاسکتیں۔ حوصلہ، ہتھیار اور حکمت عملی۔ تینوں کا یکجا ہونا

ضروری تھا۔ شاید اس کا خیال ہو کہ وہ اندھا دھند نازنگ کر کے ہر کارنامہ انجام دے رہی تھی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دھڑا دھڑا میگزین خالی کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں شاید صرف وہی دشمن مارا جاسکتا تھا جو بے چارہ خودی سے تان کر گولیوں کی بارش کے سامنے آیا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ اندر سے میں کوئی اور ہم میرے قریب آکر دھکا تھا۔ میں نے گردن کھاکر دیکھا۔ اس کے اوپر کی خوشبو نے پہلے ہی اس کی آنکھ کی خبر دے دی تھی لیکن مرکز دیکھنے سے تصدیق ہو گئی۔ وہ بھیمیں تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے تیزی سرگوشی میں پوچھا۔ "منا ہے دنیا میں سارے قیاد صرف ذر ذر اور زمین کے لیے ہوتے ہیں۔ فی الحال صرف زر کے لیے فساد ہو رہا ہے۔" میں نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا "یہ تمہاری نواب زادی کی آمد برکت ہے۔ پیچھے پیچھے ڈاکو بھی سونے کی خوشبو سونگھتے ہوئے آتے ہیں۔"

"اس سے پہلے تو ڈاکوؤں نے کبھی یہاں حملہ نہیں کیا۔" لکر منداند سے لہجے میں بولی۔ "اس سے پہلے یہاں کبھی دھائی تین کروڑ روپے کا سونا بچہ آیا ہوگا۔" میں نے اپنا خوشگوار لہجہ برقرار رکھا۔

"نواب زادی صاحبہ لے کر آئی ہیں؟" بھیمیں نے پوچھ کر اس کے لہجے میں کوئی خاص حیرت نہیں تھی۔ "ظاہر ہے۔ میں تو اس پوزیشن میں نہیں تھا۔"

"پھر کبھی... ڈاکوؤں کو یہاں حملہ کرنے کی جرأت نہیں چاہیے تھی۔ انہیں تو معلوم ہو گا کہ یہ سرداروں کی جگہ ہے وہ ابھین زدہ لہجے میں بولی۔

"دیرا جب تہ زور ہو جاتے ہیں تو کناروں کو بھی کاٹتے ہیں۔"

"تم کون ہو؟" اچانک اس نے پوچھا۔ اس نے ابھی تک جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب خطرے احساس کے ساتھ گویا اس کا جتیس بھی جاگا تھا۔ "میں بے چارہ وہ تھن ہوں جو شاید چنے کے ساتھ جاسے۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے بات تقریباً اسی کی زبان میں کی تھی لیکن شاید اس نے سمجھ میں نہ آئی۔ بدستور ابھین زدہ لہجے میں بولی "کیا مطلب؟" "مطلب یہ کہ لال شیدی مجھے ڈاکو سمجھ رہا ہے اور ڈاکو ایسا جس نے نواب زادہ خاں کان کے قتل میں حصہ لیا تھا۔" میں

محض فی سانس لے کر کہا "اور اگر ڈاکو یہاں تک پہنچے ہیں کام ہو گئے تو کس وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ کسی وجہ سے مجھ پر خطاب ہو گیا ہو گا لیکن ہر حال میں سرداروں کا آدمی ہوں۔ پتا نہیں انجام کیا ہو گا!"



باہر کو بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ میرا مطلب تھا کہ رسیاں دکھاوے کے لیے چاہے اسی طرح بندھی رہیں لیکن ان کی گرہیں کچھ ایسی ہو جائیں کہ میں خود ہی جب چاہوں کھول سکوں۔ پھر میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کروں گا۔

”تمہارا ارادہ چاہے جو کچھ بھی ہے میری طرف سے بالکل کوئی اُمید نہ رکھو۔“ وہ اب بھی اپنے انکار پر قائم تھی ”بلکہ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں بھاگتے دیکھ لیا تو میں ان لوگوں کو خبردار کروں گی۔ میری طرف سے خواہ مخواہ قتل میں مت رہنا۔ میں پہلے سے تمہیں بتا رہی ہوں کہ اگر خوش قسمتی سے تمہیں بھاگنے کا موقع مل ہی جائے تو میری طرف سے بھی وہ شہار رہنا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں اندھیرے میں بینہ کر مٹی مٹی سرکوشیاں کر کے تمہاری رازداریں مٹی ہوں۔“

”کیوں نہ کیا دھنسی ہے تمہیں مجھ سے جو تم ان لوگوں کو خبردار کرو گی؟“ میں نے خیریت سے اس کی طرف دیکھا ”میں تو اپنے دل میں تمہارے لیے محبت محسوس کر رہا تھا۔“

”اپنے پاس ہی رکھو اپنی محبت۔ مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کسی زندہ انسان کے جسم سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی چھڑی آگائی جاری ہو تو پھر کسی کی محبت اس کے کسی کام نہیں آسکتی“ اس کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ میں تمہیں بھاگتے دیکھ کر اس لیے ان لوگوں کو خبردار کرنے کی کوشش کروں گی کہ اگر تم بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تو سب کا ٹھگ پیری طرف ہی جائے گا۔ پانی بیشہ پانی زمین کی طرف مرنے والے اور میں یہاں کی بچی زین ہوں۔ ایک چاقو عورت ہوں۔“

میں نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اتنی بھی جاہل اور موٹی عقل کی نہیں تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ میں چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ منہ پھیر کر اکڑوں ہی بیشہ بیشہ کھٹک کر کمرے کے دروازے کی طرف جانے لگی۔

میں کمری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ فائزنگ اب تقریباً بند ہو چکی تھی۔ وقفے وقفے سے ”دونوں طرف سے ایک آدھ برست مارا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چٹا میں بیسی خان کی لاش کے قریب سے گزر کر ایک روزن کی طرف بڑھا جس پر کوئی موجود نہیں تھا۔ اب شاید صرف ایک دوسرے کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔

میں نے روزن سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ ستاروں کی برائے نام روشنی میں نظر جہاں تک کام کر رہی تھی وہاں تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی لاش بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ کچھ دیر پہلے فائزنگ کی آواز سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ لوگ کافی قریب آ گئے تھے۔

جس وقت میں نے گاڑیوں کی آواز سنی تھی اس وقت وہ لوگ یقیناً کافی دور پہاڑیوں سے چپے تھے لیکن انہوں نے گاڑیاں یقیناً

ایک لمبے کے وقت سے میں نے کہا ”ایک بار پھر دی گانا مناد۔“ اسے اور یہ فیصلہ لکھنا اہل میرا۔“

میں نے لمبے اندھیرے میں اس کی غزالی آنکھیں حیرت سے دیکھیں ”یہ کانا گانے کا وقت ہے؟“ اسے ضرور شبہ ہو رہا تھا کہ میرا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اسی لیے مجھے ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھا جا رہا تھا۔

”ہاں۔ وقت تو یہ نام کرنے کا ہے لیکن یہ کانا بھی خاصا ماتی سا ہے۔“ اسی لیے میں نے سوچا۔ ”میں نے جگہ ادھر اور چھوڑ دیا۔ اب فائزنگ دونوں ہی طرف سے بہت کم ہو گئی تھی لیکن فواب زادی سمیت یہی لوگ بدستور دیواروں سے چپے ہوئے تھے۔ ”تم چچا کیوں نہیں بتاتے؟ تم اصل میں ہو کون؟“ یہیں اس نے پوچھا۔

تب میں نے نہایت سادگی اور اختصار سے اسے چچا بتا دیا ”میں ایک شریف شہری اور خاصا بڑا کاروباری آدمی ہوں۔ کچھ مجبوری ایسی آن پڑی تھی کہ مجھے بدل کر بھاگ رہا تھا۔ اچانک ہی ان لوگوں کے پتے چڑھ گیا۔ یہ مجھے مانگو چڑھ کچھ رہے ہیں جبکہ میں نے کبھی خواب میں بھی اس کی شکل نہیں دیکھی اور نہ ہی کبھی اس کا نام سنا لیکن یہ لوگ میری بات میں ان کر نہیں دے رہے۔“ وہ خاموش رہی تو میں نے پوچھا ”تمہیں میری بات کا یقین آیا؟“

”کچھ کچھ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”چھانو ایسا کہو“ تم میرے ہاتھوں کی بندشیں کچھ کچھ کھول دو۔ یعنی تھوڑی سی ڈھیلی کرو“ پانی کام میں خود کروں گا۔“ ”نا بابا! اس نے گاڑیوں کو ہاتھ لگایا“ اگر مجھے تمہاری بات کا پورا یقین بھی ہو تا تب بھی میں یہ کام نہ کرتی۔ سرداروں کے کابول میں دخل دینے کی ہم جیسے لوگوں میں بہت کہاں ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھ سے اس کام کے لیے مت کے جاؤ۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

میں اس کی طرف سے بالکل ایسے ہو گیا۔ اس عورت پر قسمت آزمائی کرنا فضول تھا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”ویسے بھی تم رسیاں کھلا کر کرو گے کیا؟ یہاں سے تم بھاگ تو سکتے نہیں۔ چاروں طرف تو دیواروں کے ساتھ اندر ہی لوگ مورچہ لگائے کھڑے ہیں۔ اہل قوم دیواری نہیں چلا سکتے۔ کوئی فوراً ہی تمہیں دیکھ لے گا اور تلخ کی طرح مار گرائے گا۔ اگر کسی طرح باہر نکلے میں نکل بھی گئے تو اندرونیوں کی نظر میں بھی آ جاؤ گے اور ڈاکوؤں کی نظر میں بھی۔ تمہیں اتنی گولیاں لگیں گی کہ کچھ مر نکل جائے گا۔“

”اس وقت میری شکل کچھ ایسی ہے کہ میں کافی بے وقوف لگ رہا ہوں لیکن میں اتنا بے وقوف ہوں نہیں۔“ میں نے دھیمی گواہ میں کہا ”مجھے اتنی بے تابی بھی نہیں ہے کہ رسیاں کھلتے ہی

اور اس کمرے کی طرف چلی گئی جس میں غالباً رکھائے اس کے بچوں کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ ان حالات میں بچوں کی نہ جانے کیا کیفیت تھی۔

کچھ دیر بعد بلال شیدی نے اپنے کچھ ساتھیوں کو پوزیشن سنبھالے رکھنے کا حکم دیا اور کچھ کام لے کر انہیں پیچھے ہٹنے کی ہدایت کی۔ چار آدمی سامنے والے صحن میں اس کے پاس آکر بیٹھے اور وہ سب مل کر تین لاشوں کا جائزہ لینے لگے۔ وہ غالباً یہ دیکھ رہے تھے کہ کسی میں زندگی کے کوئی آثار تو نہیں حالانکہ یہ تو دور سے ہی اس برائے نام روحانی میں بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں زندگی کی کوئی رشت نہیں تھی۔

وہ ان لاشوں کو اٹھا کر پیچھے شاید کسی کمرے میں لے جانے لگے۔ جب بلال شیدی ایک ساتھی کی مدد سے بھٹی خان کی لاش اٹھائے میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اس کے کھڑے سیاہ رخساروں پر آنسوؤں کی چمک دیکھی۔ گو کہ اس کے رخساروں کا بہت کم حصہ ہاتھ سے خالی تھا لیکن جتنا بھی تھا وہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھٹی خان سے تمام تر نوک جھونک کے باوجود اس کی کمری دوستی تھی۔

سنگھار وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے خواہ دل بھی پھراے گئے ہوں تب بھی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بٹتے ہوئے بھوم دیر نہ کہت سے گر کر مرتے دیکھنا ایک کڑی آزمائش تھی۔ پھر لیے دلوں میں بھی ایک بار تو ڈر نہ سا آ جاتا تھا۔ یہ ستم انگیز تماشا میں نے زندگی میں کی بار دیکھا تھا۔

اس کے بعد پوری رات کوئی فائر نہیں ہوا لیکن وقت ایک عجیب کشش کشیدگی اور بیگانگی میں گزرا۔ کوئی بھی سو نہ سکا۔ بلکہ سوئے کا تو خیر ذکر ہی کیا کوئی کمر سیدی کمرے کی غرض سے چند منٹ کے لیے لیٹ بھی نہ سکا۔ گو کہ اس دوران باہر سے ایک گولی بھی نہیں آئی تھی اور چاروں طرف گہرا سکوت طاری رہا تھا لیکن کوئی مکان سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ سب باری باری دواہوں سے لگ لگ کر اُدھر سے اُدھر پھرتے رہے۔ ہر ایک کے ذہن پر غالباً اسی سوال کا بار ہو چکا کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا؟

کوئی اس آزمائش کے لیے بھی مکان سے نہ نکلا کہ ڈاکو اب بھی باہر کیسے موجود تھے یا فرار ہو گئے تھے۔ میری طرح غالباً سبھی کو لا شعوری طور پر اندیشہ تھا کہ وہ فرار نہیں ہوئے تھے۔

سیدہ سحر نواز ہونے سے ذرا پہلے نواب زادی نے بلال شیدی کو کمرے میں بلایا۔ دوسرے دو تین آدمی پہلے ہی سے کمرے میں موجود تھے۔ میں بھی پیچھے سے اندر رینگ گیا۔

نواب زادی اس وقت بڑی ہی چارماٹی پر نواب زادہ حشام کے قریب ہی اٹنی پائنتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور جہرے پر غلام تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ چٹان سے تراشی گئی وہ موت شاید پہلی بار چٹنے لگی تھی۔ اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں

وہیں چھوڑ دی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے باقی ناصلا نہایت تیزی سے پیدل ہی ملے کیا تھا کہ نک اس کے بعد کسی گاڑی کی آواز سنائی نہیں دی تھی اور نازک بہت جلد شروع ہو گئی تھی۔

چھت پر موجود محافظوں کو بھی یقیناً انہوں نے دور سے دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے خاموشی سے آکر مکان کی چار دیواری پر چڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ پہلے انہیں ہی مارا گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ انہوں نے مینے کے بل لیٹ کر نازک کی تھی اور اگر ان کا کوئی ساتھی مرا بھی تھا تو وہ اس کی لاش کھینچے ہوئے پیچھے ہی لے گئے تھے۔

میرا یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ صرف سامنے کی طرف سے آئے تھے لیکن ان لوگوں نے ہلکا بہت میں یا پھر شاید بہتر دفاع کے خیال سے چاروں طرف سے فائر کھول کر بے تحاشا میگزین خالی کیے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ بھاگ گئے۔" نواب زادی نے قدرے قانعانہ لہجے میں اعلان کیا۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکا۔" بلال شیدی نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

بلال شیدی یقیناً ان محاطات کی زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا تھا اس لیے غرض قسمی میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ جو ڈاکو اتنا طویل تعاقب کر کے یہاں تک پہنچے تھے وہ اتنی آسانی سے فرار ہونے والے نہیں تھے۔ انہیں فرار ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو چاروں طرف پھیلی ہوئی پناہوں کے پیچھے جا کر ان پر چڑھ کر مکان کے گرد گھبرا ڈال کر بیٹھ سکتے تھے۔

نکلے میں ہونے کے باوجود انہیں بالادستی حاصل رہتی۔ مکان میں موجود لوگ محصور ہو کر رہ جاتے۔ وہ صرف اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ بلکہ ڈاکو اگر پناہوں پر چڑھ جاتے اور ان کے پاس دور مار رائلنگیں ہوتیں تو مکان والوں کے لیے اپنا دفاع بھی مشکل ہو جاتا۔ کیونکہ ڈاکو بلند ہی رہتے اور مکان کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ چاروں طرف سے ٹھٹھا ٹھٹھا کھائی دیتا تھا۔

آخر کار ہمیں خاموشی ہو گئی لیکن بلال شیدی اور اس کے ساتھی دواہوں سے پیچھے نہیں بٹے۔ نواب زادی البتہ جلد ہی اس خاموشی سے شاید آگاہی یا پھر اسے اپنے شوہر کا خیال آیا۔ وہ کمرے میں دواہیں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے جی بھی جلائی۔ گو کہ اس نے کوڑی اور دو اندازہ بند کر لیا تھا لیکن رینگوں اور رودنوں سے بہر حال روشنی باہر آ رہی تھی۔ بلال شیدی نے گردن کھٹاکر ناگوار سی سے کمرے کی طرف دیکھا لیکن شاید اس میں نواب زادی کو منع کرنے کی جرات نہیں تھی۔

پھر نواب زادی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلے تو ایک لمحے کے لیے اچھی خاص روشنی پھیل گئی۔ بلال شیدی ایک بار پھر ناگوار سی سے پیچھے دیکھ کر رہ گیا۔ نواب زادی نے دروازہ بند کر دیا

کمرے میں مٹائی دی۔ کڑی کھول کر پلٹے والا شخص اپنی کھا کھوف سمیت کئے ہوئے شیشی کی طرح کرا اور ایک طرف کو لاکھ گیا۔ بال شیدی خود بال بال بجا۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو چٹائی پر گرا دیا۔ انجکشن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نہ جانے کہاں گیا۔

نواب زادی نے بھی خاصی بوکھلاہٹ کے سے عالم میں چارپائی سے چھلانگ لگائی اور کچے فرش پر گری۔ دوسرے ہی لمحے وہ بچڑ میں لٹھڑی کی کیونکہ کمرے میں رکھے ہوئے بڑے بڑے لیوٹر سے کھڑے گولیوں سے ٹوٹ گئے تھے اور پانی پھل پھل کر کے بڑے سے کمرے کے کچے فرش پر پھیل گیا تھا۔

کمرے میں میرے بال شیدی اور نواب زادی کے علاوہ تین افراد موجود تھے جن میں سے ایک کو گولی چات گئی تھی۔ باقی دو فوراً فرش پر لیٹ گئے تھے اور اپنی کھا کھوف بھی گرفت میں لینے کے بند انہیں سیدھی کر رہے تھے۔ بال شیدی نے اپنی کھا کھوف چارپائی کے سارے کڑی کی کھی ہوئی دھیرے دھیرے اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

قدرت نے ایک عجیب قماش یہ بھی دکھایا تھا کہ کئی گولیاں اس چارپائی پر سے گزر گئی تھیں جس پر نواب زادہ حشام لہنا زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا لیکن کوئی گولی اسے نہیں لگی تھی حالانکہ وہ کڑی کی سیدھ میں تھا۔ شاید کوئی گولی اسے زندگی کی اذیت سے نجات دلانے کی سزاوار بنا نہیں چاہتی تھی۔

میں اسی دیوار کی آڑ میں تھا جس میں بڑی سی کھڑکی تھی۔ میں محفوظ ہی تھا پھر بھی احتیاطاً آنکڑوں بیچ گیا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا۔ ڈاکو ہانڈوں کے عقب میں جا کر اوپر چڑھ گئے تھے اور تمام رات انہوں نے نہایت صبر و سکون سے دن کا اجالا پھیلنے کا انتظار کیا تھا۔

ان کے پاس دور مار رائفلیں بھی تھیں۔ اب انہوں نے فائرنگ انہی رائفوں سے کی تھی۔ ہم سب اب کافی بڑی پوزیشن میں تھے۔ مکان اب گویا ڈاکوؤں کے سامنے خشکی میں رکھا ہوا تھا۔ بس کڑوں کے اندر جہاں جہاں دیواروں کی آڑ میں تھیں وہی جگہ محفوظ تھی۔ جہاں بھی کسی چھلکی جگہ میں یا کڑی دودانے کے سامنے کوئی ذرا سی بھی حرکت کرنا دکھائی دیتا وہ گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ یہاں چار آدمی مرچکے تھے ایک پہلے ہی سے دم توڑ رہا تھا۔ ایک کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ کب سے بے بسی کی اذیت میں مبتلا تھا۔

بال شیدی نے کڑی کے راستے برست مار کر فائرنگ کا جواب دیا۔ جو تین چار آدمی چوری چار دیواری سے جمنے ہوئے تھے وہ بھی کافی حد تک محفوظ تھے لیکن اگر وہ اعلا عبور کر کے کڑوں کی طرف آنے کی کوشش کرتے تو ان کا بھی اللہ ہی حافظ تھا۔

انہوں نے بھی جواباً برست مارا۔ اس کے جواب میں مزید برست سے فائر ہوئے لیکن اس بار نشانہ شاید دوسرے کڑوں کی

چادر سے باہر نواب زادہ حشام کا صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھی طرح طرح کا تھا۔ ان پر پٹلا ہسٹ غالب تھی۔ اب تو ایک شکل ہی بچانی نہیں چاہتی تھی۔ چہرہ ایک نئی فٹ بال سے لپ ہو گیا تھا۔ آنکھیں ہانک اور منہ دم میں تقریباً چھپ چکا۔ معلوم نہیں باقی جسم کا کیا حال تھا۔

”بال! زار نواب زادہ صاحب کی حالت تو دیکھو“ پہلی ہی میں نے نواب زادی کے لیے ہی اور قماش بھی محسوس کیا ”ان لیے کچر کرنا چاہیے“

بال نے ایک متنازعہ سی مٹاس لے کر نواب زادہ کے جسم چادر مٹائی۔ دم سے اس کے جسم کا بھی وہی حال تھا۔ اس کی اور ٹانگ پر پٹیاں لپی ہوئی تھیں لیکن دم کے باعث وہ گویا نت میں دھنسن کر رہ گئی تھی اور خون میں رنگین ہونے کے ننگ ہو چکی تھیں۔ شاید اب نواب زادہ کے جسم میں خون ہی رہ گیا تھا جو برس سکتا۔

بال نے سب سے پہلے اس کی پٹیاں ڈھیلی کیں پھر اس کا نہ کیا اور مایوس سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”وہی ہوا کا بچھے دور تھا۔ انجکشن بہت بڑی طرح پھیل گئی ہے اور جسم دن بھی نہیں رہا۔ پٹیلیں کا ایک آدھ انجکشن باقی ہے“ وہ اڑتا ہوا۔

”جلدی سے لگاؤ“ نواب زادی لڑتی آواز میں بولی۔

بال شیدی دو آؤں کے کنارے سے انجکشن نکالے ہوئے بولا ”لگتا ہے اب پٹیلیں بھی نچلے مز میں منگن بننے کے عمل کو روک سکتی۔“

میرے خیال میں تو منگن کی زنت آنے سے پہلے ہی نواب زادہ کی کچر آج بچھے والا تھا۔ مائوس کی آمدورفت تقریباً اسی لگ رہی تھی لیکن جب تک مائوس تب تک آس، پیسے کا صحیح مفہوم ایسے ہی موقع پر سمجھ میں آتا ہے۔ نواب زادہ کی حوصلہ شکنی پر میرے فکروں سے بال کو ڈسٹورڈ اور نا کاؤڈر لگا کر انجکشن تیار کرتے دیکھ رہی تھی جیسے اسی پر زادہ کی زندگی کا انحصار تھا اور اس کے لگاتے ہی کوئی مجبور ہونے والا تھا۔

پھر اس کا دھیان جیسے یکدم ہی بند کڑی اور دروازے کی لپا۔ وہ رہی سے بولی ”دروانہ اور کڑی کو کھڑکی کو کھول دو۔ صبح ہے“ آواز ہوا کا کوئی جھوٹا انداز تھا۔

ایک لمحے کے لیے وہ گویا ڈاکوؤں کو بھول گئی تھی اور یہی بھی تھا کہ رات کس طرح کی گئی۔ ایک شخص نے سعادت سے پیچھے ہٹ کر پہلے دروازہ اور پھر کڑی کھول دی۔

”کی گئے ہی آواز ہوا سے پہلے گولیاں اندر آئیں!“

رکس فائوں کی ترزا ہسٹ لگئی اور اس کی بازو کھٹ گیا

ایک رات کے لیے یہاں رہے تھے۔

”تو یہ اس طرح زور دھر کر کہیں پھر رہا ہے؟ تم نے ان خانے میں کیوں نہیں ڈالا؟“ نواب زادی نے برہمی سے حالات خواہ مخواہ بھی تھے اس کی نکتہ اس کا حکماء اور کا مجموعی مزاج اب بھی وہی نہیں پڑا تھا۔

”موقع ہی نہیں ملا۔۔۔ دینے بھی ہر کوٹھی میں قہر ہے۔“ بلال شیدی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں پھر بھی ٹھوس دیتے کسی کوٹھی میں۔ اس طرح تو زور دھر کر نہیں پھرنا چاہیے۔“ نواب زادی برقرار رہی۔

”اچھا۔۔۔ دیکھتے ہیں۔ اب موقع ملا تو وال دیر کے میں۔“ میں نے محسوس کیا بلال کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھا میں نے پکا بندوبست کیا ہوا ہے۔ یہ کیس بھاگ نہیں سکتا کچھ کر سکتا ہے۔“

”دیے اگر آپ کے پاس ایک بھی دور مار راکفلر کا۔۔۔ میں آپ میرے ہاتھ کھولنا پسند کرتے تو میں ان ڈاکوؤں سے میں آپ کا قہور ڈالت ہاتھ ملا سکتا تھا۔“ میں نے مڑا دیا۔

”ہاں۔۔۔ میں مدد کرتے کہ راکفلر کا سارا لے کر جاتے اور ڈاکوؤں سے مل جاتے۔ آخر وہ تمہاری برادری ہیں۔“ بلال شیدی غرما۔

”یہ ڈاکو ہے؟“ نواب زادی بے یقینی سے چلائی۔

”شہادتیں تو یہی بتاتی ہیں نواب زادی صاحب! انہیں کہہ کر یہ مانگو چاہئے اور اس نے نواب زادی خاٹن صاحبہ سے قتل میں حصہ لیا تھا۔“ بلال شیدی آخر کار اپنا یہ محسوس کیے بغیر نہ رہا۔

”تو پھر اس کو زندہ کس لیے رکھا ہوا ہے؟“ نواب زادی نے ان کی خدمت میں پیش کیا جائے۔“ بلال جواب دیا۔

میں نے افسردہ سی نظروں سے نواب زادی کی طرف شہتہ انگریزی میں کہا ”آپ جیسی پڑھی لکھی خاتون مجھے اس قسم کی بات سننے کی توقع نہیں تھی۔ آپ نے اور امریکا وغیرہ میں تعلیم پائی ہوگی اور زندگی کے بہت وہاں گزارے ہوں گے لیکن بات آپ نے نہ سنا۔ والی کی ہے۔ کسی بے گناہ انسان کو درخت سے لٹکا کر

کڑیاں نہیں۔ کسی کمرے سے جیسی مٹائی دی۔ جیج نسوانی معلوم ہوتی تھی شاید کچھ اور گڑے بھی ڈالے تھے۔

مکان کا کل وقوع اس لحاظ سے بہت ہی خراب تھا کہ تقریباً چاروں طرف سے وہ بازوؤں میں گمراہ ہوا تھا لیکن اس سے پہلے یہ خصوصیت ایک عجیب کی طرح اس لیے محسوس نہیں کی جا سکی ہوگی کہ اس سے پہلے شاید یہاں قیام کرنے والوں کو اس قسم کی صورت حال سے پالا ہی نہیں پڑا تھا۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا ”آپ لوگ خواہ مخواہ بچے کچے میٹریں ضائع کر رہے ہیں۔ اب کلا شکوفوں کا کوئی ٹائمر نہیں۔ اگر آپ لوگوں کے پاس لاکہ ریچ رائفلز ہیں تو وہ استعمال کریں جس طرح ڈاکو استعمال کر رہے ہیں۔“

”ہیں نکامت سکھا۔“ بلال شیدی میری طرف گردن جھکا کر خراغوار لہجے میں بولا ”ہمارے پاس دور مار راکفلر ہوتیں تو اب تک ہم نکال چکے ہوتے۔“

کلا شکوف کی ہلاکت آخری کے باعث اس قسم کے لوگوں کا اس پر انحصار اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہر طرح کے حالات میں وہ اسی کو کافی سمجھتے تھے اور اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ محسوس کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ایسی صورت حال سے بھی واسطہ پڑ سکتا تھا جب ریچ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے کلا شکوف کا کوئی خاص ٹائمر نہیں تھا۔ جس طرح کے مکان میں، جس طریقے سے ہم محصور ہو چکے تھے، دور مار راکفلر کی عدم موجودگی میں ہمارا انجام کچھ خوشگوار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رات میرے ساتھ بلال شیدی کے بوسے میں ملافت کی جڑ جھک دکھائی دی تھی، اب اس کا کہیں دور دور تک چا نہیں تھا۔ اپنے ساتھیوں، خصوصاً بیٹی خان کی موت۔ رات بھر کی بیداری اور صورت حال کی یقینی کے احساس سے اس کے اعصاب یقیناً خشک نہیں کی طرح پتہ چل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں انگڑوں کی طرح دھبہ دھبہ تھیں۔ کشیدگی اور کھچاؤ سے اس کا کھورا چہرہ کچھ اور کمزور دکھائی دے رہا تھا۔

نواب زادی تو یقیناً حسین عورتوں میں سے تھی لیکن انہی سب وجوہات کی بنا پر اس وقت اس کا چہرہ بھی برسی طرح کھنچ کر رہ گیا تھا اور درخت زدگی کے عالم میں عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ میری آواز سن کر نواب زادی کو گویا پولی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ جھپکی پر آنکھیں کھلی اور اپنے ہاتھوں سے کچھ بوجھ رہی تھی۔ پانی کچے فرش میں تقریباً جذب ہو چکا تھا۔ اس کی نظر میرے پیروں کی بندشوں پر پڑی اور اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

”یہ کون ہے؟“ وہ ناگوار سی بولی۔

”قیدی“ بلال شیدی نے جواب دیا ”میں اسے بڑے نواب صاحب کے سامنے پیش کرنے کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں

رومانی ناول

|       |          |                 |
|-------|----------|-----------------|
| 75/-  | سلی رعنا | دل کا آئین      |
| 75/-  | سلی رعنا | کالے کنول       |
| 100/- | سلی رعنا | اور دیا جلا رہا |
| 100/- | سلی رعنا | سوج گرداب       |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

مذہب یا انصاف پسند انسانوں کا کام تو نہیں۔ قبائلی زندگی کی بھی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے صفائی پیش کرنے کا موقع تو وہاں بھی دیا جاتا ہو گا۔

”انگریزی بول کر ہمیں مرحوب کرنے کی کوشش مت کرو۔“ نواب زادی بھی تیزی سے انگریزی میں ہی بولی ”ہمیں معلوم ہے۔“ لیکن کو ایک صانع بخش انڈسٹری یا ٹریڈ سمجھ کر بہت سے بڑے ٹکے نوجوان بھی ڈاکوؤں کے گرد ہوں میں شامل ہو گئے ہیں بلکہ اندرون سندھ کے تو کسی علاقے میں ”سنا ہے ایک ایسے ڈاکو نے بھی اپنا گروہ بنا رکھا ہے جو امریکا سے ایم ایس سی کر کے آیا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے پاس پولیس ’رینجرز اور فوج تک کی دروہاں ہیں ’سرکاری گاڑیوں کی نمبر پیش بھی ہیں۔ وہ بڑے سائنٹفک انداز میں ڈاکے بھی ڈال رہے ہیں اور کروڑوں روپے کا تان بھی وصول کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ مت سمجھنا کہ جنہیں انگریزی بولتے ہیں کہ ہم نہیں ڈاکو کے بنائے کچھ اور سمجھ لیں گے۔“

یہاں تو ہمیں کا معاملہ ’مرنے کی ایک ٹانگ والا تھا۔ دل میں ایک عجیب سی آوازیں اور جھجکاہٹ کی لہر محسوس کرتے ہوئے میں نے خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا لیکن نواب زادی کی برہمی اس پر بھی کم نہ ہوئی۔ ہلال شیدی کی طرف دیکھ کر بولی ”تمہارے اس قیدی کی زبان بہت لمبی معلوم ہوتی ہے۔ ذرا ان ڈاکوؤں سے نمٹ لیں پھر اس کی زبان بھی کاٹ کر پھیل کوؤں کو ڈالیں گے۔ امید ہے بڑے نواب صاحب اپنے قیدی کی صرف زبان کم دیکھ کر برا نہیں منائیں گے۔ اس طرح وہ اس کی جموئی صفائی سننے سے بھی بچ جائیں گے۔“

ہلال شیدی کو کوئی جواب دینے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اسی اثنا میں گولیوں کی ایک اور پھجڑا آئی۔ گولیاں نواب زادہ حشام کے جسم پر پڑی چادر کو تقریباً پھوٹی ہوئی گزریں۔ کچھ فائر غالباً کسی دوسرے کمرے کی کھڑکی پر بھی کیے گئے تھے۔

نواب زادی کی توجہ میری طرف سے ہٹ گئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ ہلال شیدی سے مخاطب ہوئی ”نواب زادہ صاحب گولیوں کی زد میں ہیں۔ کیا ہم کسی طرح اس چارپائی کو کھینچ کر اس کھڑکی کے قریب نہیں لا سکتے؟“

اس نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس سے گولیاں اندر آ رہی تھیں۔ اگر چارپائی کو کھینچ کر اسی کھڑکی کے نیچے لا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا جاتا تو نواب زادہ واقعی گولیوں کی زد میں آنے سے بچ سکتا تھا۔

”کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔“ ہلال شیدی نے جواب دیا اور اپنے آدھوں کو اشارہ کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کوئی بھی کمرے میں سیدھا کھڑا ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ فرش پر پھجڑا ہو چکا تھا۔ چارپائی بہت بڑی اور بھاری بھر کم تھی۔ اس پر ایک لمبا چوڑا انسانی جسم بھی پڑا تھا جسے تقریباً لاش سی سمجھا جاتا ہے تھا۔

اس کے باوجود انہوں نے محسوس ہی کے بل رہتے ہوئے کھانسی نہیں چٹائی پر رکھ کر چارپائی کا ایک ایک بائہ پکڑا اور اسے کھڑکی کی طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تو پھر تھا پائے خود نواب زادی نے پکڑ لیا اور وہ بھی زور لگاتے لگی۔ اس کا چارپائی سا چوڑا بڑے سورج کی طرح شفق رنگ ہو کر رہ گئے۔

نواب زادہ حشام کی زندگی کا کمزور تار کسی لمحے ٹوٹنے والا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کس سوہوم امید کے سارے اسے قازم کے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

قیدی ہونے کا مجھے کم از کم یہ فائدہ ضرور تھا کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے میں آرام سے ایک طرف بیٹھا تھا۔ مجھے اس سنی رائیگاں میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی۔ آخر کار وہ چارپائی کو کھڑکی کے نیچے لانے اور دیوار کے ساتھ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے کپڑے پچھڑ میں تھپڑ گئے تھے۔ نواب زادی کا ہر قے جیسا سیاہ کاؤن بھی پچھڑ میں تھپڑ کر کے اور ہی رنگ کا دکھائی دینے لگا۔ اس نے چٹائی پر بیٹھ کر اسے آنا دیا۔ نیچے وہ جدید ترین فیشن کا لباس پہنے ہوئے تھی مگر اس وقت اس کی بھی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔

ہلال شیدی اور اس کے دونوں آدھوں نے اپنی کھانسی نہیں اٹھائی۔ ان میں سے ایک نے کھڑکی کے نیچے ہی رہتے ہوئے نہایت محتاط انداز میں ہاتھ اوجھا کر کے قدم سلاست کی اس کھڑکی کے پٹ بند کیے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ان پر اتنی گولیاں برسیں کہ دونوں ہڈوں کے بے پیرے آؤ گئے۔

کھڑکی کے کچھ ٹکڑے نواب زادہ حشام پر بھی گرے مگر وہ بے جاہ دنیا داریا سے بے خبر رہا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں دھیرے دھیرے موت کی آغوش میں آؤ رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا

کہ اس کے ارد گرد کچھ لوگ ہٹا کی ہنگ میں مصروف تھے۔  
اچانک کمرے کا دروازہ نہایت آہستہ سے تھوڑا سا کھلا۔  
روشنی اندر آئی تو بال شیدی ہڑدار کر مڑا لیکن پھر ہولے سے غوا کر  
بھا گیا۔ وہ ہمیں بھی جو گھنٹوں اور ہاتھوں کے بل چڑھانے کی طرح  
چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اندر گھسنے ہی اس نے  
جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

اس کی آنکھوں میں نمی بھی تھی اور وحشت بھی۔ نواب  
زاوی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ہنسی ہنسی سی آواز میں بولی "کیا... وہ  
رکھال مرگئی ہے۔ اسے کوئی لگ گئی ہے۔"

"تو پھر بچوں کے پاس کون ہے؟" نواب زاوی نے دیوار کی آڑ  
لے کر بے آہی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے رکھال کی موت  
کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں نواب  
زاوی کے بچوں کو سنبھالے ہوئے تھی۔  
"اس وقت تو کوئی نہیں ہے۔" ہمیں نے دھیمی آواز

میں جواب دیا۔  
نواب زاوی دروازے کی طرف لپکتے لپکتے لے کر باہر نکل گیا لیکن  
بلال شیدی غلافِ توقع سخت لمبے میں بولا "آپ کمرے سے مت  
نکلے گا تو آپ زاوی صاحب! ہم اس وقت بہت خطرناک پوزیشن میں  
ہیں۔ اگر فضا اخوات آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم بڑے نواب صاحب کے  
سامنے جواب دہ ہوں گے۔"

"لیکن میرے بچے... وہ اکیلے ڈر رہے ہوں گے۔" نواب  
زاوی نے ایک نظر دروازے کی طرف اور ایک نظر اپنے شوہر کے  
ٹیلے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ہمیں سنبھالنے کی باتیں نہ کرو۔" بلال شیدی بدستور سخت  
لمبے میں بولا۔  
"میں اسی کی اجازت لینے آئی تھی۔" ہمیں ہونٹوں پر زبانی  
پھیرتے ہوئے بولی "بڑی مشکل سے دیوار سے چپک کر رہ گئی ہوئی  
آئی ہوں۔"

"اجازت لینے؟ کیا مطلب؟" نواب زاوی نے حیرت سے  
اس کی طرف دیکھا۔  
ہمیں سر ہٹکا کر بولی "وہی... بچوں کو سنبھالنے میں مجھے ان  
کو چھوڑنا بھی پڑے گا۔ ہاتھ داتھ تو لگائے ہی پڑے گا۔" اور میں...

میرا مطلب ہے۔ میں ایک گندی عورت... اس نے بات  
اور دوسری چھوڑ دی۔ اس کے لمبے میں طنز کی دھج بھی نہیں تھی  
لیکن کسی صاحبِ دل کے لیے اس کی بات چھری کی طرح دل میں  
آتر جانے والی تھی۔

مگر نواب زاوی نے اس پر کوئی غصہ یا عداوت محسوس نہیں  
کی۔ اگر محسوس کی بھی تھی تو ظاہر نہیں ہوئے۔ غصیلے انداز میں  
ہاتھ ہلا کر بولی "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جلدی جاؤ۔ ہاتھ لگ گیا تو  
کوئی بات نہیں۔ ہم جسیں معاف کریں گے۔"

"جیسے آپ کا علم" ہمیں نے ہاتھ جوڑے پھر چپوں کی  
طرح داہیں جانے کے لیے چاروں ہاتھ چپوں پر جک کر دیے۔  
گیلا فرش دیکھ کر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ بلال شیدی کی طرف  
مڑتے ہوئے بولی "یہاں کے گھر سے بھی نوٹ لگے۔ جو بارہی خانے  
میں رکھے تھے وہ بھی نوٹ لگے۔ دو گھرے باہر رکھے تھے وہ بھی نوٹ  
لگے۔"

"یہ مجھے کیوں بتا رہی ہے؟" بلال فرمایا۔  
"ویسے ہی بتا رہی ہوں۔ ذرا یاد رکھنا کہ اب ہمارے مکان میں  
چپے کے لیے پانی کی ایک بوتل بھی نہیں ہے۔" ہمیں دھیمی لمبے  
میں بولی۔

"وہ!" بلال شیدی کے ہونٹ مسکڑ گئے۔ اب اسے احساس  
ہوا تھا کہ یہ ایک سنگین خبر تھی۔ اس صحرائے غلامی میں پانی کا  
ختم ہو جانا کوئی معمولی مسئلہ نہیں تھا۔ خصوصاً جبکہ ارد گرد کا گھبرا  
ڈالے بیٹھے ہوں۔

نواب زاوی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "مجھے تو پہلے  
یہ پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے کئی شام سے کچھ کھانا یا نہیں۔"  
اس کی آواز بھی لگے میں جھپٹنے لگی تھی۔

اسے واقعی اپنے شوہر کی حالت کی وجہ سے کھانے پینے کا  
ہوش نہیں تھا اور اب پانی ضائع ہو جانے کی خبر سن کر پیاس کا  
جاگ اٹھنا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی انسانی  
فطرت کچھ عجیب سی ہے۔ کوئی چیز انسان کے پاس ڈھیروں پڑی رہے  
تو اس کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن جو کچھ احساس  
ہو کہ وہ ختم ہو گئی ہے اس کی ضرورت کا احساس شدت سے ہانک  
اٹھتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ عموماً وہ غریب آدمی جس کے گھر میں  
کھانے کو کچھ نہیں ہوتا اس کے بچوں کو عام بچوں کی نسبت زیادہ  
بھوک لگتی ہے۔ گھر میں جو چیز موجود نہیں ہوتی شاید لا شعوری طور  
پر پھولوں کو بھی اس کی طلب زیادہ رہتی ہے۔ جن لوگوں کے گھروں  
میں مین اور فرنیچر کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے رہتے ہیں وہ خود  
اپنے یا اپنے بچوں کے بارے میں شکایت کرتے بائے جاتے ہیں کہ  
ان سے تو کچھ کھایا ہی نہیں جا تا۔ شاید ہر چیز کی فراوانی دیکھ کر  
طبیعت سیری رہتی ہے۔

خود مجھے بھی پانی ختم ہو جانے کی خبر سن کر ہلکی سی پیاس محسوس  
ہونے لگی تھی۔ گزشتہ رات نواب زاوی کے آنے سے پہلے کھانے  
پینے اور گانے بجانے کا جو خوب صورت دور چلا تھا اس کے بعد  
سے میں نے بھی پانی نہیں پیا تھا لیکن بلال شیدی نے احوال کیا اس  
خبر کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہاتھ ہلا کر بولا "ہو جائے گا۔  
ہو جائے گا پانی کا بندوبست۔ برطانیان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکو  
ریاں زندگی بھر تو گھبرا ڈال کر نہیں بیٹھے رہیں گے۔ جاؤ تم بچوں کو  
سنبھالو۔"

بھریاں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور ایک لمحے انتظار کیا  
جب کوئی فائر نہ ہوا تو وہ دھڑے سے باہر نکل گئی۔ نواب زادی  
نے ہلال شیدی سے پوچھا ”میاں پانی کہاں سے آتا ہے؟ کس طرح  
آتا ہے؟“

جو لوگ صرف حکم دیتے ہیں اور ہر چیز ان کے سامنے حاضر  
کردی جاتی ہے انہیں اکثر علمی نہیں ہوتا کہ کوئی چیز کہاں سے  
اور کس طرح آتی ہے۔

ہلال بولا ”جن پہاڑیوں کے اوپر ڈاکو چڑھے بیٹھے ہیں انہی  
میں سے ایک پہاڑی سے ذرا اوپر ہی شیبہ میں صاف اور پیچھے پانی  
کا ایک چشمہ ہے۔ جان محمد اور دوسرے دو ایک نوکر جو یہاں رہتے  
ہیں وہ کندھوں پر کھڑے لٹکا کر بھر بھر کراتے رہتے ہیں۔“

”تمہیں اس سے بہتر کوئی بندہ دست رکھنا چاہیے تھا۔“

نواب زادی کا انداز ہلکی سی ڈانٹ پلانے کا تھا ”اس مرتبہ بڑے  
نواب صاحب کے پاس جاؤ گے تو انتظامات کر کے آنا۔“ ہنسنے سے  
یہاں تک پائپ لائن ڈاکو اور یہاں ڈیل یا پیٹرول سے چلنے والا  
کوئی پمپ وغیرہ ٹھیک نہ تھا۔

میں نے ہلال شیدی کے تختائی سے ہونٹوں پر استہزائیہ  
مسکراہٹ کی ایک نہایت خفیف سی تھک دیکھی۔ میری طرح شاید  
اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ نواب زادی کو غالباً آج  
زندگی میں پہلی بار پانی کی نالی کا مسئلہ درپیش تھا تو نہایت مشکل  
مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکالنے کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

ہلال شیدی سیٹ لیٹے میں بولا ”مگر اب اس قسم کی صورت  
حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ ہی کبھی سوچا تھا کہ واسطہ پڑ سکتا  
ہے۔ اس لیے اس قسم کے انتظامات کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔“

پھر وہ مانتے سے بولا ”یہی بھی انتظامات کا کیا ہے نواب  
زادی صاحب! پائپ لائنیں بھی توڑی جاسکتی ہیں، کالی جاسکتی ہیں  
بڑے کی جاسکتی ہیں۔ جب انسان دشمنوں کے زہن میں ہو آئے تو  
اس کی ہر سلائی لائن کٹ سکتی ہے۔ مجھے تو اب اس مکان کی  
لوکیشن ہی بہت خراب لگ رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، ان  
پہاڑوں میں سے ہی کسی ایک کو اچھی طرح دیکھ بھال کر، اوپر سے  
کنوا کر اس پر مکان بنوایا جائے اور پکا بنوایا جائے بلکہ بہت سی پکائی  
چھوڑا اور کنکریٹ سے بنوایا جائے۔“

”ٹھیک ہے“ بالکل ٹھیک ہے۔ میں خود نواب صاحب سے  
کہوں گی۔ ”نواب زادی نے تائید کی“ اگر اس جگہ کوئی ڈیرا یا  
چیک پوسٹ رکھنی ہے تو وہ صحیح قسم کی ہونی چاہیے تاکہ مقصد تو  
پورا ہو۔ اب تو ان ڈاکوؤں وغیرہ کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ ان کو  
اب ہم لوگوں کا بھی کوئی لحاظ نہیں رہا۔“

وقت کچھ اسی عالم میں اور اسی طرح کی باتوں میں نہایت سست  
رفتاری سے گزرنے لگا۔ حتیٰ کہ سورج سر پہ گیا۔ مجھے ڈاکوؤں کے  
موجود محل پر حیرت تھی۔ وہ گویا نہایت اطمینان سے پہاڑیوں پر

## تاریخی ناول

|       |          |                      |
|-------|----------|----------------------|
| 100/- | قر تسکین | دنیا کے نامور فاتحین |
| 100/- | قر تسکین | شیر مصر              |
| 100/- | قر تسکین | شمشیر اسلام          |
| 100/- | قر تسکین | ترک مرد میدان        |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

زیرے ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ مکان کے کسی بھی کٹے میں یا کسی  
بھی ٹکڑے کھڑکی دروازے کے پیچھے خفیف سی بھی حرکت ہوتی تو  
زبردست توجہ ذات کے ساتھ گولیاں آئیں۔

ایک اور شخص جسے راجن کے نام سے پکارا جا رہا تھا، لقمہ  
اہل بن چکا تھا۔ اس کی تلاش بھی اٹھانے کا موقع نہیں مل رہا  
تھا۔ اس کی لاش احاطے میں، دھوپ میں ہی پڑی تھی۔ جان محمد کو  
دو منٹ کے لیے لہو پیوی رکھاں کی لاش کے پاس بیٹھنے کا بھی موقع  
نہیں ملا تھا۔ وہ انہی لوگوں میں شامل تھا جو اسی خیال کے تحت  
دیوادیوں کے روزنوں سے آنکھ لگائے اور دیوادیوں کو مورچہ بنائے  
ان کی آؤں کھڑے تھے کہ کس ڈاکو اچانک پہاڑیوں سے اتر کر  
مکان پر پھار نہ کریں۔

سورج سر پہ آیا تو بے پناہ تمازت کا احساس ہونے لگا۔ بیشتر  
کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ چکے تھے، نامور دیوادیوں بھی کھڑکیوں  
کی بوچھاڑوں سے کچھ اور نامور ہو چکی تھیں۔ نقل و حرکت بہت  
مشکل ہو گئی تھی۔ بس جو توڑی بہت پناہ میسر تھی، وہ دیوادیوں کی  
آؤں میں سر تھی۔

صرف مجھ پر قدرے محفوظ جگہ میں دیوادیوں سے چپک کر  
چھپائے کی طرح رہتی ہوئی چند ایک مرتبہ اوپر سے فوہر آئی جاتی  
نظر آئی تھی۔ اسی نے نہ بانے کس طرح بچوں کو کچھ کھلانے کا بھی  
بندوبست کیا تھا۔ یوں اس ”گھنڈی“ عورت کے ہاتھوں سے نواب  
زادی کے بچوں کا پیٹ بھرا تھا اور نواب زادی نے اس پر  
اعتراف نہیں کیا تھا۔

پاس سے سب کا بڑا حال تھا۔ اب تو نواب زادی کے آہنی  
اعصاب بھی چٹنے لگے تھے۔ اس کی چڑچڑاہٹ اور تہ ذرا کی تاب  
وہ عالم نہیں رہا تھا۔ اب وہ گویا اندر ہی اندر مل کھارہی تھی۔ اس  
کی حالت اس زخمی شیرینی سے مشابہ تھی جسے دھوکے سے پکڑ لیا گیا

علاقہ میں جھلا چلا آ رہا تھا۔ میں اپنی زندگی کے ان گنت تجربات کی روشنی میں اس گدھے کو ہودراندہ انداز میں بھی کوئی بات بتانے کی کوشش کرتا تھا تو وہ اس سے اتنا ہی مطلب اخذ کر لیتا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاؤں کہ میں نے زندگی میں کیسا کیسا وقت دیکھا تھا اور میری نامعلوم حسیات کس کس انداز میں میری رہنمائی کرتی تھیں۔

میں نے مزید کچھ کہنے کی زحمت نہیں کی اور بے کاری سے سر جھٹک کر رہ گیا۔ حالات خواہ کیسے بھی تھے لیکن ابھی تک میں نے ان لوگوں کے چروں پر خوف کی ہر چھائی نہیں دیکھی تھی مگر میری "تک" والی بات سن کر نواب زادی اور بلال شیدی تک کے چروں پر خوف کی مدھم سی ہرچھائیاں ابھر آئیں جنہیں چھپانے کی وہ ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

بہت دیر سے میری نظر گھوم پھر کر نواب زادہ حشام کے چہرے پر جمی جا رہی تھی جو اب گمراہ بنا چکا تھا۔ نواب زادی اس کے سرانے چارپائی کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی لیکن اب تک اس اندر ہلک جھپٹت سے بے خبر تھی جس کا اندازہ مجھے نواب زادہ کی بغض دیکھ کر نہیں ہو رہا تھا۔

میری کچھ بہت ہی نہیں پڑی تھی کہ وہ بات نواب زادی کو بتاؤں۔ وہ مفرد، مستکبر، قبیلہ پرست، خود پسند یا بیچھی بھی تھی لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس چہرے کی عورت کے سینے میں ہر حال ایک روحانی اور وقار پرست بڑی کا گداز پنہاں تھا۔ وہ ابھی تک نہ جانے کس آس کا دامن مضبوطی سے تھامے اپنے شوہر کے ہلک کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔

آخر کار میں ایک بار پھر بولے بغیر نہ سکا۔ میں نے بلال شیدی سے کہا "اؤ کم ایک بار نواب زادہ صاحب کی بغض تو دیکھ لو انہیں چیک تو کرو۔"

بلال شیدی نے ایک نظر چارپائی کی طرف دیکھا پھر کلا شکوفہ رکھ کر محفلوں کے محل چلا ہوا نواب زادہ کے پہلو میں آیا اور پیچھے ہی بیٹھے چارپائی پر ہاتھ لے جانے کا کردار تک نواب زادہ کی بغض دیکھنا دیا۔ پھر اس نے بہت کچھ سے تھوڑا سا اٹھایا اور دم زدہ چہرے میں دھنسی ہوئی آنکھوں کو تھوڑا تھوڑا کھول کر دیکھنے لگا۔ اس نے نواب زادہ کے محفلوں پر انگلیاں رکھیں۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ آخر کار اس کا تاریک چروامیو سی ہے کچھ اور تاریک ہو گیا۔ اس نے چار سے نواب زادہ کا چروا حنا پ دیا اور سر جھکا لیا۔ وہ دھنسی آواز میں "اتاشیہ" بڑھ رہا تھا۔

نواب زادی چند لمحے پہلی پہلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر چارپائی کی پٹی پر سر ٹکا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آخر کار اس چشمان کے سینے سے چشم پھوٹ پڑا تھا۔

میں اپنے بندھے ہوئے بازوؤں کو جس حد تک بھی ممکن تھا حرکت دیے جا رہا تھا۔ کبھی ہاتھوں کو ہلانے چلانے لگتا تھا، کبھی مٹھیاں کھولنے بند کرنے لگتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے بازو شل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ ناگہلیں حرکت دینے اور دوران خون برقرار رکھنے کے لیے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد چند ایک مرتبہ اٹھ بیٹھ لیتا۔

بلال شیدی بدستور کلا شکوفہ سنبھالے کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پیریاں جمی ہوئی تھیں۔ وقفے وقفے سے دونوں طرف سے گولیاں کا پتلا اب بھی جاری تھا۔ ڈاکوؤں کی چلائی ہوئی گولیاں تو ہر بار کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا رہی تھیں لیکن مکان میں محصور لوگ گولیاں شائع ہی کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے پاس اب میگزین بھرے کے لیے گولیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔

نواب زادی چارپائی سے ٹپک لگاتے ہوئے پہلی بار زرا متحفل انداز میں بولی "مارے لوگوں کی کوئی ٹولی، کوئی قافلہ، یا کوئی اور لوگ بھی تو اس طرف نہیں آ رہے۔" پھر اسے گویا پکویار آیا "وہ بد بخت جیسا کہ رہی تھی کہ انکسز حیات خان اسے دابھی میں لینے آئے گا۔ وہ بھی تو نہیں آ رہا۔"

"وہ دو تین روز بعد آنے کا کہہ گیا تھا۔" بلال شیدی قدرے استہزائیہ سے لہجے میں بولا "اور اگر آج بھی آجائے تو وہ اکیلا کیا کرے گا؟ وہ بے خبری میں بیٹھا سیدھا پٹاؤں کے قریب آ جائے گا اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اگر وہ وردی میں ہوا تب بھی ڈاکو اس وقت اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

جب وہ پھر بھی ڈھٹیلے لگی تو نواب زادی کے چہرے سے اندازہ ہونے لگا کہ اس کے اعصاب جراب دے رہے تھے۔ پاس کے باعث اس کا کھلا اس بڑی طرح شک تھا کہ آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ جھنسی جھنسی لیکن جھنجھلاہٹ زدہ آواز میں بولی "آخر یہ ڈاکو اتنے مبہوت چلے سے کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟ یہ سامنے کیوں نہیں آتے؟ کوئی فیصلہ کن حملہ کیوں نہیں کرتے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ وہ کسی لکھ کا انتظار کر رہے ہیں۔" میں دھیسے لہجے میں بول اٹھا۔

نواب زادی اور بلال شیدی دونوں نے بیک وقت مجھے گھورا۔ نواب زادی کھڑکائی آواز میں بولی "تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

میرے کوئی جواب دینے سے پہلے بلال شیدی بولا "میں نے اس کے بارے میں ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ یہ خود ڈاکو ہے نا؟ اسے ڈاکوؤں کی حرکات و سکنات اور ان کی فطرت کا اندازہ ہے۔" ایک لمحے کے لیے مجھے اس شخص پر قسمہ آ گیا۔ وہ مسلسل



# اسلام راہی ایم اے کے ولولہ انگیز تاریخی ناول

|       |                 |       |                  |
|-------|-----------------|-------|------------------|
| ۱۵۰/- | سنہری غول       | ۲۰۰/- | انڈیوں کے ساربان |
| ۱۵۰/- | صلیب و حرم      | ۲۵۰/- | تاریک رزم گاہ    |
| ۱۵۰/- | نیشاپور کا شاپن | ۱۵۰/- | صقلیہ کا مجاہد   |
| ۱۵۰/- | بابل کا بستان   | ۱۵۰/- | عقاب             |
| ۱۴۵/- | طلسم کدہ        | ۱۵۰/- | صحرا کی آگ       |
| ۱۵۰/- | آتش فشاں        | ۱۵۰/- | قتیبہ بن مسلم    |
| ۲۰۰/- | آخری حصار       | ۱۴۵/- | موت کے مسافر     |
| ۱۵۰/- | بنت نیل         | ۱۵۰/- | شیر کا ابلیس     |

مکتبہ القیش اُردو بازار لاہور فون: ۴۲۲۶۶۵

اس کی حالت میں بڑا حقیر آچکا تھا۔ اس کا حسن کو کبھی بھی منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ ایک آسیب زدہ سی مخلوق دکھائی دینے لگی تھی۔ پھر وہ کسی سی بدلی ہوئی اور آسیب زدہ سی آواز میں بولی "مجھے ایک کس دو۔ میں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن کس سے نواب زادی صاحبہ؟" بلال شیدی نے تعجب سے پوچھا "کیا ہر آپ کو کوئی نظر آ رہا ہے؟"

"نظر آئے یا نہ آئے؟ ہمیں کچھ تو کرنا ہوگا۔ آخر ہم کب تک بے بسی چھوٹی کی طرح دیکھے بیٹھے رہیں گے؟" وہ برہمی سے بولی اور یکدم ہی اس کے چہرے کا چہرہ ملائم دور ہو گیا۔ وہ پھر سے ایک زندہ عورت نظر آنے لگی۔ اس کا چاندنی سا چہرہ دہرے سورج کی طرح دیکھا تھا۔

"بھئی بھئی یوں بھی چھٹنا پڑتا ہے نواب زادی صاحبہ! بلال شیدی احرام اور محل سے بولا "تیرے اہلے کی نہیں" خصلے اور اعصاب کی جنگ ہے۔ اپنی قابل لڑائیوں میں ہم نے ایسا بھی وقت گزارا ہے جب ہم آٹھ آٹھ دن پاؤں پر سرور پگھلے بیٹھے رہے۔ ہمارا تجربہ تو پھر بھی بہت کم ہے۔ چیلے میں ایسے بھی لوگ ہیں جو سرکار سے جنگوں میں میچوں اور زوروں پاؤں پر رہے۔ گھوڑاؤں کے کسے کا گوشت کھاتے رہے۔ جب وہ نیچے آئے تو ان میں سے بہت سوں کو بی بی جی اور ان کے جھوں پر جو بھی اس طرح چل رہی تھی جس طرح مٹھاس سے تھوڑی ہوئی جبکہ

نواب زادی غاصی در تک روٹی رہی۔ کسی نے اسے چپ کرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ شاید کسی میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی یا پھر میری طرح وہ بھی کسی سوچ رہے تھے کہ اس پھر کے لیے کچھ اور ایک بالائی ہی ہو تھا۔

آخر کار اس کے آنسو ٹھہری گئے۔ آنسوؤں سے ہر چہ اس نے اپنے اسکارف سے اچھی طرح پونچھ لیا۔ اب اس کا چہرہ پتلا آگیا تھا۔ اس پر کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ صرف شورم اور سرخ ٹھیکرے پادوسے رہی تھیں کہ وہ روٹی رہی تھی۔

بلال شیدی کی طرف دیکھے بغیر اس نے بدلی ہوئی اور سپاٹ سی آواز میں پوچھا "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

عجیب اعتماد سوال تھا۔ وہاں تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سے کیا کرنا چاہیے۔ کوئی نواب زادی کو کیا بتاتا۔

"میں۔ میں کیا بتا سکتا ہوں نواب زادی صاحبہ!" بلال شیدی بعض آمیز سیٹھ میں بولا۔

نواب زادی کو شاید جواب کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو گویا کوئی نئی عمر کی حالت میں سوال کر رہی تھی۔ اس نے اپنے شور کا چہرہ جو اب بے حد بھیاکتا ہو چکا تھا چاروں طرف سے دھانپ دیا۔ وہ خود بھی شاید اس چہرے پر نظر ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر دوسرے دوسرے اٹھی اور یوں تن کر گئی ہو گئی کہ اس کا نہ اصل سے کچھ اونچا محسوس ہونے لگا۔ رات سے اب تک

چیز خیال چلتی ہیں۔ میل کی محسوس اس طرح جمی ہوئی تھیں کہ چاقو سے کمری جاکتی تھیں۔

”تم مجھے آسانے مانتے تھے جیسا کہ۔“ نواب زادی نے بولی ”اس وقت کی بات کرو“ اس وقت ہم کیا کریں۔ نہ وہ سامنے آ رہے ہیں اور نہ ہی ہم کوئی فیصلہ کن قدم اٹھا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔“

میں نے بلال شیدی کے چہرے ہونٹوں پر ایک لمبے کے لیے خلیفہ کی مسکراہٹ کی جھلک دیکھی۔ وہ نہایت دھمکے اور ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں بولا ”اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کو زندگی میں کبھی اس قسم کی صورت حال سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ آپ نے صرف عزم کی قیلم ہوتے دیکھی ہے، جنہیں اردو سے حالات تبدیل ہوتے دیکھے ہیں۔ بے بسی شاید پہلی بار آپ کی زندگی میں آئی ہے۔“

اسے شاید احساس ہوا کہ اس کے الفاظ اور انداز کو گنت فی نہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے لمبے میں یکدم ٹھہرا اور ملاحظہ آگئی ”خواہ آپ اسے میری گنتی سمجھیں اور خواہ سختی ہی برہم ہوں لیکن میں آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ صرف خود کشی ہوگی اور کچھ نہیں۔ نواب زادہ صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا اس وقت ہم آپ کے ساتھ نہیں تھے۔ جو لوگ ساتھ تھے انہوں نے جان دے کر اپنا فرض ادا کر لیا۔ اب آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ اگر خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا اور ہم زندہ بچ گئے تو ہم نیچلے میں واپس جانے کے قابل اور کچھ نہیں سمجھتے۔ بڑے نواب صاحب کو کیا نہ دکھائیں گے؟ اس لیے اگر اب جان دینے کا مرحلہ آئے گا تو پہلے ہمیں گے۔ موت کے سامنے بیٹہ کان کر جانے کی ضرورت ہوگی تو ہم جائیں گے۔ آپ اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کریں گی۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔“

”یہ بے بسی میرے لیے موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔“ نواب زادی طعیناں بھیج کر بولی۔ وہ یقیناً سامنے سے کام نہیں لے رہی تھی، بچ بول رہی تھی۔ اس طبقے کے لیے بے بسی سب سے بڑی سزا تھی۔

اس کا انداز دیکھ کر مجھے راجہ لالہ یاد آگئی۔ وہ سردار زادی تو نہیں تھی لیکن اس کے حزان میں بھی کیس کچھ ایسے ہی جرائم موجود تھے۔ ریڈ ڈاٹ کے مقابلے میں اسے بھی بے بسی گوارا نہیں تھی۔ ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس کے لئے سب کچھ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس نے جو کچھ کر کر کے کیا فیصلہ کیا تھا وہ بہت تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ میں جو کچھ اس دیرانے میں پہنچا بیٹھا تھا، اس میں کسی حد تک اس کی کارروائیوں کو بھی دخل تھا۔ میرا حال میں اسے زیادہ صبر و ارادہ نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی نیت نیک تھی اور سب سے بڑی چیز نیت ہی ہوتی ہے۔ وہ میری دوستی اور تعلقی خاطر میں ہی جان پر ٹھیک رہی تھی اور اپنی دانست میں اس

نے مسئلہ حل کرنے ہی کی کوشش کی تھی۔

میں نے جلدی سے یادوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی ہونا تھا وہ ہونا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے رہنے سے کوئی کام نہیں تھا۔ مجھے زمانہ حال میں ہی رہنا چاہیے تھا اور اپنی توجہ ارمی رکھنی چاہیے تھی جو میری آنکھوں کے سامنے ہونا تھا۔ نواب زادی چند لمبے اپنی جگہ طعیناں بھیجتے ہوئے رہی اور کمری سانسیں لیتی رہی۔ ایک اچھی علامت یہ تھی کہ وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آپے سے باہر نہیں ہو رہی تھی۔

آخر کار وہ قدرے شکست خوردہ سے لمبے میں بولی ”جیسا کہ بچوں کے پاس جاری ہو رہا۔“

بلال شیدی نے بے پائی سے ہاتھ بند کیا ”چلیے۔ نواب زادہ صاحب! آپ اس کمرے سے کیس بھی جانے کی کوشش نہ کریں! دیوار کی اوٹ میں ہی رہیں۔ یہ کمرہ ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ ہاتھ کے طور پر بھی اچھا ہے اور ڈاکوئیں پر نظر رکھنے کے لیے بھی۔ یہ ہم اپنا بچاؤ بھی کر سکتے ہیں اور جب ڈاکو سامنے آئیں گے تو یہ سے جوابی فائرنگ بھی سب سے زیادہ فائدہ مند رہے گی۔ اگر کراہ سب سے بڑا بھی ہے۔ فی الحال آپ یہاں سے کیس بھی جائیں۔“

”جہاں بچے ہیں وہ کراہیں گے۔ بہت دور تو نہیں ہو گا۔“ نواب زادی کے لمبے میں اب تیز رفتاری نہیں تھی ”وہ۔۔۔ جہاں بھی تو وہاں سے دو تین مرتبہ یہاں آچکی ہے۔“

”اس کی بات اور ہے نواب زادی صاحب! بلال بولا ”مگر ایک لگ بھی گئی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اس کی اور آپ کی جان برابر تو نہیں ہے۔“

کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہا۔ لیکن یہ وہ مسکراہٹ تھی جو دل میں زہر سا چھلنے کے بعد ہونٹوں پر آتی ہے۔ بلال کے خیال میں نواب زادی اور جہاں کی جان برابر نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا ”خدا نے تو سب کو برابر ہی پیدا کیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنی درجہ بندیاں ہوئی چلی گئیں۔ بارشاہ، سردار، نواب، امراء اور صاحبان حیثیت تو خلوص، قحط اور فضیلتوں میں محفوظ رہے۔ گنگے جتنے کے جتنے ان کی حفاظت، نامور رہے گئے اور بے جاہ عام، نواب اور بے حیثیت انسان کے آسمان تلے آئیں، دشمنوں، درندوں اور مہمیتوں کا سامنا کرنے کے لیے بے سارا ہو گیا۔ نہ جانے کس کس کا نوالہ بنتا رہا۔“

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جینینس اور ایڈز خواہ کتنے ہی بدل گئے تھے لیکن فرق اب بھی وہی چھوٹے بڑے کا تھا۔ وہ جو بڑے تھے ان کے گرد آج بھی مصلحتیں تھیں، محافظ تھے ان کے لیے جان دینے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جو بے جاہ رہے چھوٹے تھے بے حیثیت تھے ان کا خون آج بھی پانی سے اڑاؤں تھا۔

اس خوش فہمی میں بھی جتنا ہو سکا تھا کہ شاید ڈاکو ہمیں ہمارے حال پر محمود کر پٹے گئے ہیں۔

لیکن کم از کم میں اور بلال شیدی اس خوش فہمی میں نہیں تھے۔ مجھے ہارڈی کا جو حصہ نظر آ رہا تھا میں نے اس کے عقب میں چند لمبے پٹے ایک سیاہ سی چیز کو حرکت کرتے دیکھا تھا جو غالباً کسی ڈاکو کی پگڑی تھی۔ ہارڈیوں کے پیچھے کچھ پراسرار سی نقل و حرکت جاری تھی۔ بلال شیدی کو بھی اس کا احساس تھا۔ وہ گریخالی انداز میں اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے توجہ سے ڈاکو سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا۔

دن ڈھلنے لگا تھا۔ بھوک اور پیاس اب میرا بھی امتحان لینے لگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دوسروں کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ہارڈی خانے میں کھانے کا سامان تو موجود تھا لیکن مکان میں جس طرح لاشیں بکھری پڑی تھیں ان کی موجودگی میں کسی کو بھی اطمینان طور پر یہ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کون کون کھانا تیار کرنے کا پیغام بھیجے۔ خصوصاً جبکہ وہ کون کھان کا شور بھی ماریا جا چکا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مکان میں نواب زادہ شام کی لاش موجود تھی۔ اس کے سر ہانے بیٹھ کر تو کوئی کچھ کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بہت دیر سے جھپکی ہوئی سکوت کی چادر یک لخت ہی آدھار ہو گئی۔ ڈاکوؤں کی رائیقلیں ایک بار پھر کرج اٹھیں۔ بلال شیدی کچھ اس طرح اچھلا جیسے شکار کی کھات میں چپنے ہوئے درندے پر عقب سے کسی نے پتھر پھینچ مارا ہو۔ اس نے ہڑپڑ کر دوڑانے کی طرف دیکھا مگر دوڑا وہ نہ سہارا تھا۔

اس بار مکان میں سے کسی نے بھی ٹانگ کا جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ بلال شیدی نے بھی گولی نہیں چلائی۔ شاید ان لوگوں کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ گولیاں ضائع کر رہے تھے۔ جب تک دشمن قریب نہ آجائے ان کا کلاشکوف سے بہت دیر سے رہنا بیکار تھا۔ اُدھر ڈاکو کوئی فیصلہ کن کارروائی کرنے کے لیے مکان کے قریب نہیں آ سکتے تھے کیونکہ مکان کے چاروں طرف کھلمیڈان تھا اور کھلے میدان میں کم فاصلے پر موجود کلاشکوف نہیں ہر حال ان کے لیے خطرناک تھیں۔ اس طرح صرف محصورین ہی نہیں، غاصروں کے والے بھی ایک عجیب سی صورت حال میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ مکان والوں کے سامنے تو اس صورت حال سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ ڈاکوؤں کی طرف کیا پیچڑی پک رہی تھی اس کا کسی کو کچھ اندازہ نہیں تھا۔

شاید ڈاکو اپنی تمام ترجیحات کے باوجود اعصابی جنگ کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ شاید وہ انتظار کر رہے تھے کہ ڈیرے والوں کے اعصاب جواب دے جائیں تو وہ کوئی فحشی کارروائی کریں۔ اگر وہ کسی کلک کے انتظار میں تھے تب بھی فائدے میں تھے کیونکہ ڈیرے والوں کے اعصاب راقعی پختہ گئے تھے۔ میں جن لوگوں کو

سنم تھے تھا کہ جو قریبوں اور بے میثیتوں کے کندھوں پر سوار ہو کر بڑے بنتے تھے ان کے نام کی بالا چیتے تھے ہر دقت غریبوں کی وکالت کرتے ہوئے جن کا کلاشکوف تھا وہ بھی جب بڑے بن جاتے تھے انہیں کوئی مقام مل جاتا تھا۔ وہ لیڈر وڈر سفیر یا کچھ اور بن جاتے تھے تو ان کے گرد بھی فیسلس بہت اونچی ہو جاتی تھیں۔ ان کی جان قیمتی ہو جاتی تھی اور عام آدمی کی جان بے قیمت۔ سورے بازوؤں، عمدوں، ڈزارتوں، سفارتوں کے لئے وہ ہوتے تھے اور لاشیاں، گولیاں کھانے، خون بہانے کے لیے بے چارے عوام اور ورکر بھوں کی حفاظت کے لیے چھوٹے بے چارے اپنے سروں کی فیصل کھڑی کیے رکھتے تھے اور اسی میں خوش رہتے تھے۔ یہ بڑی پرانی کمائی تھی۔ ہزاروں سال میں بھی کھار کوئی ایسا بڑا بھی پیدا ہو جاتا تھا جس کے دل میں واقعی چھوٹوں کا درد ہو جاتا تھا، جو واقعی اپنی جان کو چھوٹوں کی جان کے برابر سمجھتا تھا تو بہت کم کھلی باتیں تھیں۔ چھوٹے غریبے تھے، دلوں کو کرمانے والے کرمان کا انداز نہ لینے والے الفاظ تھے۔

لیکن میں اب ہر حال میں بچوں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے میں ممکن ترین خدمت بھی دے دوں اب اپنے شوہر کی لاش کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ جس حد تک بھی ممکن تھا اپنی احوال وہ شاید اس حقیقت سے نظر ہٹا جاتی تھی کہ وہ بیوہ ہو چکی تھی اس کے سرے ایک منبر پر بٹ پٹلی تھی۔

”نہیں انہیں یہیں بلواتا ہوں۔“ بلال شیدی بولا۔  
”وہ یہاں آئیں گے تو کیا ان کی جان کو خطرہ لاحق نہیں ہوگا؟“ نواب زادہ کی رپ کر پڑی ”اس سے تو بہتر ہے میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال لوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے نواب زادہ صاحب!“ بلال زور دے کر بولا۔ ”آپ مطمئن رہیں ہمارے آدمی انہیں کسی ترکیب سے اور بہت حفاظت سے لائیں گے۔ وہ بچوں کی ذمہ داری بن کر چند کروڑ کا یہ قافلہ طے کریں گے۔“

کرے نہیں اب صرف وہ کلاشکوف بردار زندہ تھے اور میرا اندازہ تھا کہ باہر اچالے میں بھی چار دیواری کی اوٹ میں صرف تین چار آدمی ہی زندہ رہ گئے تھے۔ بلال شیدی نے کرے میں موجود دونوں کلاشکوف برداروں کو ہدایات دیں اور وہ دوڑانے نہایت آہستگی سے تھوڑا سا کول کر سینے کے بل باہر رینگ گئے۔ بلال نے خود نہایت محتاط انداز میں آگے بڑھ کر دوڑانہ بند کر دیا تاہم کٹھنی نہیں چڑھا لی۔

کرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔ موت اپنی تمام تر بد صورتی کے ساتھ کرے میں موجود ہی تھی۔ بہت دیر سے ڈاکوؤں نے کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ میں جس ڈاکو سے پریشا تھا وہاں سے مجھے کوئی کے راستے ایک ہارڈی کا کچھ حصہ توجہ سے انداز میں دیکھا کی دے رہا تھا۔ فضا پر جیسا کہ اس کوٹ طاری تھا اس سے کوئی

تھا کہ چارپائی پر چادر سے ڈکا ہوا ان کے باپ کا وجود اب ایک لاش میں تبدیل ہو چکا ہے۔

دروازہ ابھی کھلا ہی تھا۔ جمیماں بھی چپائے ہی کی طرف چلتی، گرتی پڑتی تیزی سے کمرے میں آگئی۔ پھر ان کا شکوفہ دروازوں میں سے ایک پر ٹکٹا ہوا اندر آئے لگا لیکن اسے اندر آنے میں بڑی وقت چیش آری تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھی کو کھینچتا ہوا لارہا تھا۔

اس کا ساتھی جو زندہ سلامت اس کے ساتھ گیا تھا اب اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مر چکا تھا۔ وہ دونوں اور شاید جمیماں بھی بچوں کی وصال تک کر آ رہے ہوں گے اور آخر کار ایک وصال کا کام آگئی تھی۔ اس کی خون میں لت پت لاش اندر آگئی۔ بلال شیدی کے چہرے کے کھنچاؤ میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے مرنے والے کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس کے سر پر پگڑی نہیں رہی تھی۔ ایک گولی اس کی ایک کھینچ میں پیوست ہو کر دوسری کھینچ سے نکل گئی تھی۔ دوسری گولی ہتھی کی ہڈی کے قریب کچھ ایسے رخ سے لگی تھی کہ غالباً سینے میں آگئی تھی۔

دوسرا شخص جو اس کے ساتھ گیا تھا اور زندہ واپس آنے میں کامیاب ہو گیا تھا، بہت دل گرفتہ تھا۔ منتقل سے شاید اس کی دوستی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا ساتھی کس طرح مارا گیا۔ کسی نے اس سے پوچھا بھی نہیں۔ شاید پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چند گز کا فاصلہ اس کے لیے موت کی مسافت بن گیا تھا جبکہ وہی فاصلہ جمیماں کی بارخیزو عافیت سے ملے کر بھیجی تھی۔ یہ بھی نصیب نصیب کی بات تھی۔ اس کا اپنا ساتھی اور بچے بھی خیریت سے آگئے تھے۔ بس صرف اسی کی موت گویا اسے کمرے سے باہر لے گئی تھی۔

نواب زادی نے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور نہایت معمولی سے آٹف سے کہا تھا "سوہو..." یہ مر گیا! اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ ہمارے ملک میں بہت سے طبقات ایسے ہیں جن کے لیے اس قسم کی باتیں نئی یا اہم نہیں ہوتیں۔ لوگ ان کے لیے جانیں دیتے ہی رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو صدقہ امانے کے لیے ایک بکرا میسر نہیں آتا اور بعض لوگوں پر سے سیکڑوں انسان بچھادو ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی نصیب نصیب کی بات ہے۔ جن پر سے وہ بچھادو ہوتے ہیں انہیں شاید دوسرے دن یا دو بھی نہیں رہتا کہ کسی نے ان کے لیے جان دی تھی۔ بہت ہوا تو اظہارِ افسوس کے لیے دو چار ٹیبلے بول دیے اور سوگوار لوہا حین کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھ دیے۔ پچھلے حق ادا ہو گیا حساب برابر ہو گیا۔

کمرے میں اس لاش کے اٹانے کے بعد ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی حالت کچھ خراب

دیکھ رہا تھا، ان میں مجھے صرف بلال شیدی کے اعصاب کچھ ٹھکانے پر محسوس ہو رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے فائدوں کی بازگشت معدوم ہونے سے پہلے دوبارہ فائدوں کی خیر خواہی کو بھی اور بلال شیدی کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس کی نظر دروازے پر جمی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ گولیاں اسی دیوار پر برس رہی تھیں جس میں دروازہ تھا لیکن کلکری کا وہ بھاری بھر کم، سوٹا اور بھدا سا دروازہ فی الحال کسی طرح گولیوں سے بچا ہوا تھا۔

اچانک دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور نواب زادی کے دونوں بچے اندر لڑھک آئے۔ وہ چپاولی کی طرح چاروں ہاتھوں بیروں کے بل چل رہے تھے۔ کسی نے عقب سے انہیں ہلکا سا ہکا دیا تھا اور وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچے تھے۔ کوئی اور موقع ہو یا تو شاید یہ حرکت کرنے والا موت کی سزا کا مستحق قرار پاتا لیکن موت کے احکامات جاری کرنے والوں کے سروں پر بھی اسی وقت موت پر پھیلائے ہوئے تھی اس لیے کسی کو اس گرفتاری کا احساس نہ ہوا۔

دونوں بچے سخت دہشت زدہ اور حواس باختہ تھے۔ فوری طور پر تو انہیں اپنی ماں بھی نظر نہیں آئی۔ نواب زادی یکدم چٹائی سے اٹھی اور انہیں منہانے کے لیے پھینچنے ہی لگی تھی کہ بلال کا شکوفہ سے اشارہ کرتے ہوئے کھنی کھنی سی آواز میں چیخا "جھک کر جھک کر"

نواب زادی کو ہدایت اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ جس طرح سیدھی کھنی تھی اگر اسی طرح تیزی سے اپنے بچوں کی طرف بڑھتی تو اسے کھنی کے سامنے سے گزرتا پڑا اور میں ممکن تھا کہ اس دوران کھنی کے راستے آنے والی کوئی گولی اس کا لوہا چاٹ جاتی۔ کھنی کے سامنے اب تک جس چیز نے بھی حرکت کی تھی اس پر گولی ضرور آتی تھی۔

دیوار کی اوٹ میں رہنے کے لیے نواب زادی کو بھی ہاتھ بیروں کے بل جھکنا پڑا۔ ان اعصاب شکن حالات میں بھی بلاشبہ یہ میرے لیے ایک دلچپن کا مقام تھا۔ بلاشبہ حالات کبھی کبھی بڑے ستم کھریا نہ متاخر دکھاتے ہیں۔ وہ گردنیں جو غوث اور ٹیکرے پریشہ اکڑی ازبقی ہیں، پل بھر میں شاخ خربار کی طرح جھک جاتی ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان کا جھک جانا... بلکہ منھکہ خیر نہ تک جھک جانا یا دلچپن معلوم ہوتا ہے۔

نواب زادی اگر چند لمبے انتظار کر لیتی تو بچے خود ہی اس کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ اتنی دیر اس کی آنکھوں سے دور رہے تھے وہ جدائی تو اس نے برداشت کر لی تھی لیکن اب سامنے آگئے تھے تو اس سے ایک لمحے کے لیے بھی چند گز کا فاصلہ برداشت نہیں ہوا تھا۔ اس نے لڑکے اور لڑکی دونوں کو یک دم وقت آغوش میں بھر لیا۔ وہ دونوں تو نہیں البتہ اس کی آنکھیں ایک بار پھر میرے ضرور ہو گئیں۔ بچے رونے لگے حالانکہ ابھی شاید انہیں یہ معلوم نہیں

ہٹ کر کسی نے ذرا حرکت کی اور فوراً گولی آئی بلکہ گولی چلے اتنی دیر گزر گئی تھی کہ بال بال شیدی کو خوش قسمتی ہوئے گئی کہ شاید ڈاکو باپس ہو کر یا کسی اور درجہ سے خاصہ ترک کر کے چلے گئے تھے۔

اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے اس نے ایک لائسنس  
روشن کر کے ایک ڈنڈے پر ٹانگ کر خود دیوار کی اوٹ میں ہی  
رہنے ہوئے کوڑی کے سامنے کی۔ دوسرے ہی لمحے ڈاڑھ کی خانہ  
ہوئے اور لائسنس کے پرچے اڑ گئے کرے میں پھیلی ہوئی عجیب  
طرح کی پو میں مٹی کے ٹکڑی کا بھی اضافہ ہو گیا۔ بلال شیدی کی  
خوش فہمی رقص ہو گئی۔ غنیمت تھا کہ وہ لائسنس لے کر خود کوڑی کے  
سامنے نہیں گیا تھا ورنہ اپنے خیال کی تصدیق اسے بہت ہی سستی  
پڑتی۔

بچے مسلسل دو رہے تھے۔ آخر کار غواب زادی پھنسی پھنسی  
 آواز میں بولی ”بھال! پانی کے لیے کچھ کرو نا۔۔۔ اب تو میرا بھی دم نکلا  
 جا رہا ہے۔“

”کیا کروں جواب زاوی صاحب؟“ بلال شیدی نے بے بسی سے پوچھا ”پانی کا چشمہ ہزاروں کی طرف ہی ہے۔ اگر چہ جانا سوت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ ذریعے میں اس وقت مجھ سمیت صرف چار مرد زندہ رہ گئے ہیں۔ دو طرف کی دیواروں سے تو اب فائرنگ کا جواب دینے والا نہ ذرا کوئی کورہ کئے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ ان میں سے بھی ایک اگر بائی لینے چلا جائے تو اس کے زندہ واپس آنے کی روپے میں چار آئے بھی امید نہیں ہے۔ ان حالات میں ہمیں کسی کو بھیجا نہیں چاہتا۔ بیچنے کا کوئی ٹانہ بھی نہیں ہے۔“

”لیکن اس طرح تو ہم پاس سے مرنا ہی گے۔ بچوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو۔“ غراب زادی کرا اپنے کے سے انداز میں بولی۔ کم از کم فی الحال ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا غلط اور نخواستہ رخصت ہو چکی تھی۔ جلال شیدی نے یہ نہیں کہا کہ باقی سب لوگوں کا بھی تو پاس سے ہی حال تھا۔

جمال نے کوئی جواب نہ دیا تو نواب زادی بولی ”آخر یہ لوگ کب تک اسی طرح کھیرا ڈالے بیٹھے رہیں گے؟“

”میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ بلال بولا ”تھی دور سے تو ان سے مذاکرات ابھی نہیں ہو سکے ورنہ میں ذور سے حج کر بی جی۔ یہاں پر یہاں تک پہنچاؤ تاکہ ہم سب کچھ ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ صرف آپ کی اور بھول کی جان بخش دے۔“

نواب زادہ کے ہر مشورہ و وجود میں گویا برقی دھاری دوڑ گئی۔  
تڑپ کر بولی ”ہم ان ڈاکوؤں سے جان بخشی کی بجائے مانتے ہیں!  
تجسار دماغ تو ٹھیک ہے؟ سوتا بھی ہم ہرگز ان کے حوالے نہیں  
کریں گے جب نواب زادہ صاحب ہی نہیں رہے۔“ پھر گویا  
اسے کچھ خیال آیا تو اس نے باقی لوگوں کا ذکر بھی شامل کر لیا  
”اور ہمارے اچھے آدمی بھی مر چکے تو اب ان کے آگے سر جھکانے  
سے کیا فائدہ؟“

ی خبر۔ وہ کچھ کھانے پینے کے لیے مانگ رہے تھے۔  
 کچھ خامی نہیں۔ البتہ ان کے لیے کھانے کی کسی چیز کی  
 ضرورت نہ تھی کیونکہ ان کے پاس ہر چیز دستیاب تھی۔

جس کے پاس مٹی جس کے شوہر کو مرے ہوئے دو گھنٹے بھی رہے تھے۔ اس نے رات کے بچے ہوئے گوشت کی ایک کھانسی لے لی۔ خوابِ فزادی بچوں کو اس طرحی گوشت کی کھانسی کی کوشش کرنے لگی۔ انہوں نے تھوڑی بہت کچھ کھالی سالن کھانے سے ان کی پیاس اور بچھڑ گئی۔

نی کے لیے ہاتھ دھوئے گلب پیاس سے بھی کچرا حال  
 پڑاؤ کی کوئٹہ پر بھی پڑیاں جم رہی تھیں اور وہ  
 بھانے کی خوش کر رہی تھی کہانی ابھی نہیں مل سکا۔  
 وقت تک شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا لیکن لوگوں کی وجہ  
 تھیں کہیں کوئی نیا روشن نہیں کی جا رہی تھی۔ لاشوں کی  
 لہجہ سے کہے میں ایک عجیب سی بو محسوس ہوتے تھی

چنے ہاتھوں کی حالت دیکھ تو میںں مسکاتا تھا لیکن مجھے ان پر اس ہونے لگا تھا۔ کندھے اور ٹانگیں شل ہونے لگی تو میری قوت برداشت بھی بڑا ب دبے لگی تھی۔ بڑی دل چاہ رہا تھا کہ اب میری بندشیں کھل جائیں۔ دھڑکا ختم ہوجائے اور میں کھلے میدان، کھلی ہوا میں طرح کٹتی دوں۔ تیرک پونسی بے مقصد پھر اوپر دوڑنا لہو کرنا ماراں۔ یہ مجھے ہی معلوم تھا کہ میں کس طرح کھے بیٹھا تھا۔

وہی بڑے ہی صابر اور مستقل مزاج قسم کے لوگ تھے۔  
 نامیں تو ان کو ان کا تصور خاصا مختلف قسم کا تھا کہ وہ  
 اپنے گھوڑے دوڑاتے آتے ہوں گے۔ چند لمحوں میں  
 کس کس کرتے ہوں گے اور لوٹ مار کر کے بھاگ  
 گئے یعنی اندھ کی طرح آئے اور بھولے کی طرح  
 یہ ڈاکو لوگوں کا خود کو پرانے زمانے کے بادشاہوں کی فریخ  
 بدھ مکان کو قلعہ سمجھ کر اس کے گرد پرانے مہر سکون سے  
 کر بیٹھ گئے تھے۔

کا، اجیر اور امرا و توپانی کے لیے بیویوں کا اصرار بڑھنے  
سب زادی بھی اب پروردہ سے مشغول نظر آ رہی تھی۔ شاید  
بوحسب تکیہ بی بی کا بھی اثر تھا۔ ابھی تک کہیں بیٹیاں  
مکمل تھیں لیکن آسمان پر ایسا آئی کاغذوں کا چاند اور  
پروردہ نارسہ بھی کچھ بے ہوش تھے۔ ان کی وجہ سے کم  
روحانی ضرور موجود تھی جتنی صبح صادق کے وقت ہوتی

راہوں نے کاتھوڑا سا لکڑہ بھی ہوا تھا۔ نقل و حرکت میں ہونے لگی تھی۔ اب ایسا نہیں تھا کہ دیوار کی آڑ سے

سکتے نہیں ہے۔ "بلال شیدی" جی سے بولا "جسم جلدی کو۔"

"میں صبح سے اس کمرے سے دوسرے کمرے طرے چاندوں ہاتھ بیروں پر چلتی ہوئی کئی چکر لگا چکی ہوں۔" مجھے لگ رہا ہے کہ اس کام کی جتنی کالی ہے۔ "وہ ایک بار پھر غاموش ہو گئی۔

"تو پھر؟" بلال شیدی نے بے تابی سے پوچھا۔ "پچھلی رات کے کھانے کے لیے یہاں ایک بیڑ کی گئی تھی۔" جمیماں بولی۔ "اس کی کھال ابھی تک میں پڑی ہے اور خراب نہیں ہوئی ہے۔ اس میں ابھی ہے۔ میں وہ کھال لیٹ کر بکری بن کر جاتی ہوں۔ اگر موجود ہے وہ آپ میری گندھی پر باندھ دیں۔ کم روٹھ میں بکری ہی نظر آؤں گی یا یوں سمجھ لیں کہ بکری کا گئی۔"

"کوئی اور موقع ہو تا تو شاید میں پڑتا لیکن اس زخمی ہے اور روتے آواز اس ہے۔" بلال شیدی بولا "ٹھیک ہے؟"

"کو شش کر کے دیکھنے میں کیا صحت ہے؟" جمیماں دیکھے بھی چھٹی دکھائی نہیں دے رہی۔ اگر میں کامیاب ذرا فخر ہو جائے گا کہ میں نے نواب زادی صاحبہ کی کو جی اور اگر جان چلی گئی تھی بھی کوئی ایسی خاص بات کون سا یہاں کوئی روئے والا بیٹھا ہے۔ ایک گندھی میں نہیں رہے گی، دھرتی کا کچھ ہو جی، یہ کم ہو جائے گا۔ اس کے لیے میں طرے چین نہیں تھی لیکن اگر کرنا چاہتا تو محسوس کر بھی سکتا تھا۔ میرا خیال تھا زوار کی پیشکش مسترد کر دے گی، اسے کسی بھی طریقے سے منع کر دے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ چرے استعمال لیے غاموشی بیٹھی رہی۔

بلال شیدی بھی ایک لمحے غاموش رہا پھر تھکے میں بولا "بکری کیا پانی کا ٹکڑا اپنے سر۔۔۔ بلکہ بری پر؟" جی۔

"ظاہر ہے" میں مٹکا تو نہیں لاسکتی۔" جمیماں کے ساتھ باندھ کر کوئی چھوٹا موٹا برتن لاسکتی ہوں ڈھکن والا برتن ہو جس میں پانی کرنے یا چھلکے سے بچا "ایسا تو یہاں کوئی برتن بھی نہیں ہو گا۔" بلال بولا۔

نواب زادی جلدی سے بولی "بابا ہر ہماری گاڑی تھرموس موجود ہے۔ وہ نوٹے سے بچ گیا ہے۔ وہ اس بہت مناسب ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ جمیماں کے ہونٹوں

میں نے دل ہی دل میں سوچا "اور یہ سب کچھ ہونے سے پہلے آپ نے اس لیے سونا ڈاکوئس کے حوالے نہیں کیا ہو گا کہ شاید آپ سب کچھ ہاتھ میں کامیاب ہو جائیں، واقعی زور، زن، زمین اور اقدار نے انسان کو بڑی مصیبت میں ڈالا ہوا تھا۔

"دوسرے ایسے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ مصیبت کا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں تو سب کچھ چھوڑ چھا ڈر تھی دست و تلاش پھر رہا تھا مگر اس کے باوجود مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ مصیبت میں پھنسا مقدر میں لکھا ہو تو انسان پھنس کر ہی رہتا ہے۔ صرف مصیبت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

نواب زادی کا بیٹا روئے روئے چند لمحے کے لیے غاموش ہو گیا۔ پھر اس نے بیٹھی بیٹھی ہی توازن میں پوچھا "مئی کیا پایا؟" وہ سوال کل نہ کر سکا۔ اسے ہلکی سی آگئی۔ وہ دونوں بھائی شاید ابھی اپنے پایا کو زندہ ہی سمجھ رہے تھے تاہم جب سے وہ کمرے میں آئے تھے انہوں نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

نواب زادی نے بیٹے کے اوجھڑے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر اسے سینے سے لگالیا اور بلال سے مخاطب ہوئی "خدا کے لیے پانی کا کچھ کرو۔۔۔ ورنہ ہم مر جائیں گے۔" ایک بار پھر اس کی توازن ٹوٹ ہی گئی۔

بلال شیدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ الجھن میں تھا۔ اچانک جمیماں نے کھٹاکر کھا صاف کیا تو گویا ایک طویل وقفے کے بعد دو سرول کو کمرے میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

وہ ہچکچاہٹ امتیز لیے میں نواب زادی سے مخاطب ہوئی "اگر آپ کی اجازت ہو۔ آپ مجرا محسوس نہ کریں تو میں پانی لانے کی کوشش کروں؟" جمیماں لڑائی میں تو حصہ نہیں لے سکتی۔ میں یہی کام کرنے کی کوشش کروں۔"

نواب زادی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس پیشکش پر شکر گزار نہیں ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک گویا اس کا بیٹا بڑا احسان تھا کہ اس نے کوئی اعتراض یا انکار نہیں کیا تھا۔

بلال شیدی بولا "تم پانی لے کر دہیں نہیں آسکتی؟" اس لیے تمہاری بھی جان کو اسے کا کیا تاہم؟" گویا اسے بھی اصل فکر اس بات کی تھی کہ پانی نہیں آئے گا ورنہ جمیماں کا مرنا تو ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی۔

"میں کوئی ترکیب کرتی ہوں۔ شاید میں زندہ واپس آ جاؤں۔" جمیماں کے لیے میں اب بھی ہچکچاہٹ تھی۔

"کیسی ترکیب؟" بلال شیدی نے پوچھا۔

"آپ نہیں تو شاید مذاق آڑاؤں۔" جمیماں نے شرمراری کے سے انداز میں سر جھٹکالیا۔ پیاس کے مارے اس کے حلق سے بھی آواز مشکل سے نکل رہی تھی۔

"ہم میں سے کسی میں بھی اس وقت کسی کا مذاق اڑانے کی

فیصد ہو جائے۔ تقدیر کے ترازو میں امکانات کے پلڑے اول بدل جاتے۔ یہ بے بسی قوت سے بدتر محسوس ہونے لگی تھی۔

بھیمال اور فقیرا آخر کار خود غایت سے لوث آئے۔ ان کے پاس بکری کی کھال، قہر مونس اور پتلی کے بت سے کڑے تھے۔ بھیمال کو بکری بانے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ بکری کی کھال خاص حد تک خشک ہو چکی تھی لیکن ابھی ترے مڑنے کے قابل تھی۔ میں ذرا فاصلے پر بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس فاصلے پر مجھے کھال میں سے ایک خاص قسم کی بدبو الٹنی محسوس ہو رہی تھی لیکن بھیمال نے کسی خاص کیفیت کا اظہار کیے بغیر کھال اپنے جسم پر لپٹوالی۔

بکری سینکڑوں دالی تھی۔ اس کی بری بھی کسی نہ کسی طرح بھیمال کے سر پر باندھ دی گئی اور اس کے گویا دو سرو ہو گئے۔ کچھ دیر بعد آخر کار ایک بھدی سی بکری تیار ہو گئی تاہم مجھے امید تھی کہ دور سے وہ محض ایک چوہے کی طرح دکھائی دے گی اور اگر اس کی زندگی کچھ لمبی ہوئی تو ڈاکوؤں کی آنکھوں کو دھوکا دے جائے گی۔ البتہ ایک دعا کرنی چاہیے تھی کہ کیسے بھون کر کھانے کے لیے ڈاکوؤں کو بھی کسی بکری کی ضرورت نہ ہو اور چشمے پر بکری کا ہولادیکھ کر وہ خوشی سے آنچل نہ پڑیں۔ کوئی چلا کر اسے شکار کر لیں اور جب اٹھانے آئیں تو اندر سے کچھ اور برآمد ہو۔ اس صورت میں شاید انہیں پچھتاوا ہو تاکہ اس بکری کو تو زندہ سلامت پکڑنا چاہیے تھا۔

بہر حال اس کے پیٹ سے بڑا سا قہر مونس بھی باندھ دیا گیا جس کی وجہ سے وہ کچھ اور بے ہنگم ہو گئی۔ اسے مکان کے عقبی دروازے سے روانہ ہونے کی ہدایت کی گئی۔ دو آدمیوں سے لگ کر سرکٹی ہوئی وہ رخصت ہو گئی۔ فی الحال وہ دو ٹانگوں پر ہی چل رہی تھی لیکن نہ جانے کتنا فاصلہ اسے چاروں ہاتھ پیروں پر طے کرنا تھا۔ میں اس عورت کی بہت سی دل ہی دل میں داد دے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ وہ اس عورت کے لیے کر رہی تھی جس نے اسے گندی عورت کہا تھا اور اپنی ٹانگیں دبائے کی اجازت نہیں دی تھی۔ عورت واقعی عجیب ہوتی ہے۔ ہر عورت!

میرے اندازے کے مطابق اسے ذریعے سے نکلے ہوئے بے مشکل چند منٹ ہونے ہوں گے کہ گریلوں کی ترزاہٹ سے ایک بار پھر فضا مرقش ہو گئی۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ شیرینی جو بکری کی کھال پہن کر شہل و مسافک انسانوں کے لیے پانی لینے تھی "زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔

لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ گولیاں تو مکان پر برسی تھیں۔ کھڑکی سے گولیاں اس کمرے میں بھی آئی تھیں جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ کھڑکی کی چوکت کا کچھ بچا کچھا حصہ بھی اڑ گیا تھا۔ شاید ڈاکوؤں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک بار پھر زور شور سے فائرنگ کی تھی۔ سکوت کا دھندہ جو تکہ بہت طویل ہو گیا

فی آخری تھی لیکن وہ میرا دہم بھی ہوسکا تھا۔ کمرے میں غصہ خاص نہیں تھی۔

میں اور مجھے لہجے میں "لوئی" ہاں قہر مونس ٹھیک رہے گا۔ آپ سے باندھ کر جاسکتی ہوں اور اس میں پانی بھی سے آسکے ہے۔" پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "میں تیری کروں؟"۔  
لوہ میری توجہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ "ہلال شیدی نے کچھ روہ سے لہجے میں اعتراف کیا۔

بڑے کو زور میرے ساتھ بھیج دیں، ہم باہر سے چیزیں لے بھیمال نے فرمائش کی۔ تب مجھے معلوم ہوا، فقیرا اس بڑا دل کا نام تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے ساتھی کے ہمراہ کمرے سے نواب زادی کے بچوں کو لینے گیا تھا۔ اس کے لاش اب کمرے میں اس کے سامنے ہی پڑی تھی اور وہ کوئی کوئی ی نظروں سے اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔

شیدی کا اٹھنا بے پارہہ تھکے تھکے سے انداز میں بھیمال مل رہا۔ رکرنگ کی سی حالت وہ نہ نہایت آہستہ سے باہر چلے گئے۔ ایک بار پھر کمرے میں اعصاب شکن کیا۔ زندگی کچھ عجیب سا ہی تماشا مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ اس بہت حال کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا جس سے میں دوچار تھا۔ میں بس ایک غصہ مغل کی طرح ایک تھا۔ ایک بے وقت جانور کی طرح مجھے باندھ کر ایک پالیا تھا۔

مجھے افسوس ہوا تھا کہ جس وقت ہلال شیدی اور اس سامنے مجھے قلاب میں کیا تھا اس وقت میں نے ذرا بھی نہیں کی تھی۔ مجھے ابھی طرح یاد تھا کہ اس وقت ذرا صحت یا زور کی کوشش میں جان جانے کا ناتانے فیصد اسی لمحے میں نے اپنے آپ کو بلا مزاحمت ان کے اٹھانے میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ بعد میں کوئی موقع نظر دس ناموں کا۔

وقت مجھے تعین تھا کہ بعد میں بھی کوئی نہ کوئی موقع ضرور برسی۔ امید پوری نہیں ہو سکی تھی اور صورت حال غریب تر ہی ہوئی تھی۔ نواب زادی گویا صرف "میں" کے لیے قوت کا بیٹام لے کر آئی تھی۔ بانے کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی بے بس ہو کر رہ گیا لوگ والا مسئلہ نہ آن پڑتا تب بھی شاید کوئی صورت۔ اب یہ حالات تھے ان کی نسبت تو مجھے ناتانے فیصد تھا۔ میں بہتر معلوم ہونے لگا تھا۔ بے شک اس وقت تھا اور ہانگ کا شکوفہ بڑا ہواں کے ترے میں تھا لیکن تو آواز تھے اور میرے ارد گرد کھلا میدان تھا۔ اگر میں شاید زندہ بچ جائے گا ایک فیصد امکان بڑھ کر ناتانے

## طنزد مزل

|             |                    |
|-------------|--------------------|
| اعتبار ساجد | انگور کٹے ہیں      |
| اعتبار ساجد | غالب کی آبرو       |
| اعتبار ساجد | ایمر جنسی وارڈ     |
| اعتبار ساجد | منہ شکافیاں        |
| اعتبار ساجد | جائیل اسے مار      |
| اعتبار ساجد | اس طرح تو ہوتا ہے  |
| اعتبار ساجد | غالب ہمیں بھی چھیڑ |

مکتبہ القریش اردو بازار - لا

تھا۔ شاید ڈاکوؤں نے سوچا ہو کہ ہم دوبارہ ان کے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو گئے ہوں کہ وہ محاصرو ترک کر کے چلے گئے ہیں۔

میں دل ہی دل میں بھیموں کی سلاحتی کی دعا کر رہا تھا جسے خواہ مخواہ ہی نواب زادی کی نظر میں عظیم عورت بننے یا اسے ایثار و احسان کے پوجتے دیانے کا شوق چلایا تھا۔ نواب زادی نے اپنی زبان سے اس کی شخصیت پر "گندی عورت" کی جو چھاپ لگائی تھی شاید وہ اسی کی زبان سے اسے صاف کرانا چاہتی تھی مگر اس کے لیے وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ ایک منگنا سودا تھا۔

ڈاکو صرف چند منیٹ زوردار فائرنگ کرنے کے بعد ایک بار پھر آرام سے بیٹھ گئے۔ اس بار سکوت کا وقفہ زیادہ مبر آؤا اور زیادہ طویل محسوس ہوا کیونکہ سب کو بھیموں کی دایہی کا انتظار تھا۔ بچوں کا رد ہوا تھا اب ہلکی ہلکی دھڑکیوں میں بدل گیا تھا۔ انہیں بھی اتنا احساس تو تھا کہ بھیموں ان کے لیے پانی لینے گئی تھی اور اس کی دایہی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ انتظار بے ثمر ثابت نہیں ہوا۔ ایک طویل انتظار کے بعد آخر کار بھیموں لوٹ آئی۔ کم از کم جان کے معاملے میں وہ عورت واقعی قسمت کی دھن تھی۔ وہ سختی سے چڑ اور بے حال تھی۔ کمرے میں پہنچتی ہی فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ بال شیدی نے اس کے پیٹ پر ہندھا ہوا بڑا سا قمرسوس چلچھڑ کیا۔

سنگیوں والی وہ بری جو اس کی نگہ پر باندھی گئی تھی اب اس کے گلے میں لٹک رہی تھی اور وہ کوئی عجیب انگشت سی چیز نظر آ رہی تھی۔ اس کے گلے اور ہاتھ چلے ہوئے تھے۔ بال شیدی نے اسے سارا دے کر چٹائی پر لٹایا اور پلے اسی سے پوچھا "پانی پوگی؟"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "میں تو شیشے پر ہی خوب پیٹ بھر کر پانی پی آئی ہوں۔ میں تو شاید اب کل تک آرام سے پیاس برداشت کر لوں۔ ہم تو ویسے بھی صحراؤں میں جھلکنے والے لوگ ہیں۔ تمہاری نواب زادی صاحبہ کو "دو۔"

بال شیدی نے قمرسوس نواب زادی کے حوالے کر دیا۔ اس نے قمرسوس ہی کے ڈھکنے میں پہلے دونوں بچوں کو پانی پلایا پھر خود پیا اور قمرسوس بند کر کے حفاظت سے ایک طرف کو رکھ لیا۔ قمرسوس بڑا تھا اور اب بھی بیچنا آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا لیکن اس نے بال شیدی تک کو پانی کے لیے نہیں پوچھا حالانکہ مجھے یقین تھا بال کے قلع میں بھی کتنے پڑ چکے تھے مگر بظاہر وہ بے نیاز بنا ہوا تھا۔ قمرسوس نواب زادی کے حوالے کرنے کے بعد وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

پانی پینے کے بعد بچوں کی دھول دھول بھی بند ہو گئی اور نواب زادی کے جسم میں بھی گویا جان سی آگئی۔ اس کے لیے میں کچھ دیر

کے لیے جو اشتعال آیا تھا وہ دور ہو گیا۔ وہ سب ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح تخت بھرے سے لیے کب تک اس طرح صبور اور مجبور سے بیٹے بیٹے ترکیب سوچنا۔ کچھ کرنا۔"

"جب سے ڈاکوؤں نے ہمیں گھیرے میں لیا مسلسل سوچ ہی رہا ہوں۔" بال شیدی کزور "لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ جو ترکیب نہ کوئی مجبوری اس کی راہ میں حاکم ہو جاتی۔ مشورہ دیتے۔" بھوک اور پیاس نے بال شیدی شروع کر دیا تھا۔

نواب زادی نے پہلے اپنے دونوں بچوں کو پانی اور پیچھے کھسکا کر بٹھایا پھر اس نے بہت جگ کرنا کر دے ہوئے آگے بڑھ کر ایک مرنے والے کی اور دوسرے کو نے جس جا کر ترشے ڈالے اسے اس کی کوشش کرنے لگی۔

وہاں سے وہ تیرے کونے میں چلی گئی۔ اپنی وہ کسی ماہر برقی کی طرح گویا اپنے مورچے جاترہ لے رہی تھی لیکن مجھے اس کا اندازہ سمجھ کر کے کے مختلف کونوں سے کڑکی کے راستے پہا کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ بال شیدی کو اپنی جگہ پہنچنے



اندازہ تھا وہ ان محاطات میں زیادہ مایوس تھا لیکن مسئلہ دینی تھا کہ وہ مجبور تھا۔

نواب زادی میرے کونے کی طرف جانے کے لیے بظاہر بڑے زبردست انداز میں گویا گھات لگائے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی تو اوجھ میں دیوار سے ٹک لگائے بیٹھا تھا۔ میں اس غلط فہمی میں رہا کہ وہ میری موجودگی سے بہت اچھی طرح باخبر ہے اس لیے خودی کھرا کر گر جائے گی۔

لیکن وہ ایکشن کی جگہ شاید اس وقت کسی تبدیلی کی تلاش میں زیادہ ہی دور نکل ہوئی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا اور میں بھی اپنی حالت کی وجہ سے بروقت اس کے راستے سے نہیں ہٹ سکا۔ وہ مجھ سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اسے سنبھالنے کا "عواد" بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ طیش اور حقارت سے اس نے مجھے ٹھوکر رسید کی۔ اس ٹھوکر کی چوٹ مجھے اپنے جسم پر نہیں دل میں محسوس ہوئی۔

نواب زادی نے ابھی سے بلال شیدی کی طرف دیکھا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے گھٹی گھٹی لیکن غیظ آلود آواز میں بولی "اے کچ تو اس نموس کو تم نے معلوم نہیں کیوں یہاں بٹھا رکھا ہے۔ آخر اس کا یہاں مصروف کیا ہے؟ کب سے یہ اس دیوار کے ساتھ بچا بیٹھا ہے اور مسلسل سب کو ٹھوکرے جا رہا ہے۔ مجھے اس کی نظروں سے ابھرنے والے گئے یہ یہ قیدی ہے تو اسے قید خانے میں پہنچاؤ۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہاں کوئی کوٹھری خالی۔" بلال نے اسے یاد دلایا تھا۔

لیکن وہ اس کی بات کانٹے ہوئے بولی "ضرورت پڑنے پر ایک کوٹھری میں چار قیدی بھی ٹھونسنے پڑیں تو نموس دبا کر۔ اسے فوراً قید خانے میں پہنچاؤ۔ میں مزید ایک منٹ بھی یہاں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"

بلال شیدی نے مزید کچھ نہ کہا۔ وہ ایک لمبے کے لیے اپنے شک بھرت چھینچ کر رہ گیا۔ پھر اس نے فقیرے کو اشارہ کیا "جاؤ رکھال سے چاہیاں لے تو اور اس قیدی کو قید خانے میں پہنچاؤ۔"

فقیرے نے انہات میں سر ملایا اور کلا شکوف چھوڑ کر کمرے سے باہر رینگ گیا۔ میرے سینے میں ہلکی سی جھنجھکی کچھ کمری ہو گئی۔ بیٹھے بیٹھے خواہ خواہ مجھے قید خانے میں بیٹھ جانے کا حکم صادر ہو گیا تھا۔ میں اس کمرے میں سب کے درمیان بیٹھا تھا تو نہ جانے کیوں میرے دل پر ہلکی سی کاغذی گھبراہٹ تھی۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب سے ہمیں یہ خبر وراثت چشمے سے پائی ہے کہ اتنی تھی تب سے تو نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک بے عنوان اور موموم سی امید کی کرن ابھر آئی تھی۔ لیکن قید خانے میں جانا کچھ میرے لیے مزید مجبور ہو جانے کے

مترادف تھا۔ ہر حال میں خاموش تھا۔ ظاہر ہے بولنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ان کوئی نقصان ہی پہنچ سکتا تھا۔ ہم میں ایک ٹھنک نواب زادی کی طرف ضرور ٹکرا رہا حالانکہ مجھے احساس تھا کہ وہ ٹک مزاج عورت ایک حقیقی قیدی کو یوں اپنی طرف جھٹکے پا کر مزید جڑ کر کلا شکوف کا برست بھی مار سکتی تھی۔ کلا شکوف اس کے ہاتھوں میں ہی تھی۔

اس نے میری طرف مزید توجہ نہیں دی۔ میرے بارے میں حکم صادر کر کے وہ گویا کچھ مطمئن ہو گئی تھی۔ چادروں کوٹوں سے کھڑکی کا جائزہ لینے کے بعد وہ اسی کونے میں واپس پہنچ گئی جہاں اس کے بچے موجود تھے۔ ایک بار پھر اس نے قہر میں کھول کر نہایت احتیاط سے دو گھونٹ پانی پیا۔ بلال شیدی ہونٹوں پر زبان پھیر کر نہ گھبرا گیا لیکن نواب زادی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

اس نے قہر میں نہایت احتیاط سے واپس کونے میں رکھ دیا اور کلا شکوف گود میں لیے اتلی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ کسی کمری سوچ میں تھی۔ کم از کم بظاہر تو یہی نظر آ رہا تھا۔

فقیرا چاہیاں لے آیا اور کلا شکوف اس نے دوبارہ اٹھالی۔ نواب زادی اس وقت بے خیالی میں دھیرے دھیرے قہر میں پڑ چلا تھا۔ پھر وہی تھی۔ وہ گندی عورت کالایا ہوا پانی دو مرتبہ پی چکی تھی اور اس نے ایک بار بھی اس "گندی عورت" کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔

ہمیں اس وقت تک بکری کی کھال اور برہی وغیرہ اتار کر ایک طرف پھینک دی تھی۔ گزشتہ رات تک وہ اچھی بھلی صاف تھری عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اب ظاہری طور پر واقعی بہت گندی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے اندر کا ابلہ پن میری نظر میں بہت بڑھ گیا تھا۔

کسی ایسے انسان کے لیے ایثار کرنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا اور بے پناہ تکلیف اٹھانا بہت بڑے عارف کی بات ہوتی ہے جس نے آپ کو حقیر سمجھا ہو۔ آپ کی عزت نفس کو بھروسہ کیا ہو۔ بہت سے لوگوں کی موجودگی میں آپ کو ذلیل کیا ہو۔ اس انسان کے لیے ایثار اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور اس ایثار پر بھی نہ کھیلنے نہ دینے والا انسان نہیں گولی چھری ہو سکتا ہے، وہ بھی نہایت بیکار قسم کا۔ ورنہ قہر تو میرے جواہرات بھی ہوتے ہیں۔

بلال شیدی نے مجھے فقیرے کے آگے آگے چلنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا "یہ تو ہمیں معلوم ہی ہو گا کہ کس طرح چننا ہے۔ اگر فی الحال تم اپنے بھائی بعدوں یعنی دادو کو کے ہاتھوں کوئی کھانگر مرنے نہیں چاہتے تو بہت احتیاط سے جانا۔"

میں اور فقیرا آگے پیچھے مشترک فی طرح بالکل ٹکڑے ہو کر دیوار سے لگ کر چلے ہوئے ٹکڑے سے نکلے اور اسی طرح دیواروں کی ساتھ لگ کر نہایت آہستہ سے قدم اٹھاتے خاصا فاصلہ طے

بھی کچی دیواری میں پوست تھا اور اس کے آہنی قبضے نہ جانے کتنی کمرائی میں گئے ہوئے تھے۔

دیواریں وغیرہ کچی سی لیکن اتنی موٹی موٹی اور ٹھوس تھیں کہ ان میں جو کچھ بھی بڑا ہوا تھا مضبوطی سے ہی بڑا ہوا تھا۔ کوٹھری میں کسی قسم کا کوئی سامان، کپڑا یا چادر تک موجود نہیں تھی جبکہ صحرائی علاقوں کی راتیں گرمیوں میں بھی خاصی سرد ہوتی ہیں۔ کوٹھروں کے دروازے سلاخ دار ہونے کی وجہ سے کھلا کھلے ہی تھے۔

یہ قیمت تھا کہ ان کوٹھروں کے سامنے نہ صرف چار دیواری کا ایک حصہ بلکہ ایک اور موٹی سی فاضل دیوار بھی موجود تھی ورنہ ڈاکو تو جس طرح چاروں طرف سے نازنیک کر رہے تھے اس سے ان قیدیوں کا تو مقابلہ ہو ہی جاتا۔ سلاخ دار دروازوں سے گولیاں سیدھی اندر آئیں۔

کوٹھریاں ذرا اونچائی پر بنی ہوئی تھیں۔ چار دیواری اور فاضل دیوار دونوں تھوڑے تھوڑے قاصلے پر تھیں اس لیے کوٹھری میں بیٹھ کر بھی آسمان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور کمرے ہو کر تو دور پہلی ہوئی پہاڑیوں میں سے کسی کی چوٹی بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود کوٹھریاں گولیوں کی براہ راست رسائی سے محفوظ تھیں۔

دوسرا قیدی بدستور خاموش تھا اور گرمی نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "معاذ کرنا

کر کے آخر کار مکان کے عقب میں جا بیٹھے۔

یہاں چار دیواری کے اندر بھی ایک اور بچی سی دیوار تھی۔ فقیرا عقب سے بچی آواز میں مجھے ہدایات دیتا رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق بہت زیادہ جگہ کھلنا ہوا جب اس دیوار کے عقب میں پہنچا تو مجھے بالکل حوالات کی طرح ایک سیدھ میں سات آنٹھ کوٹھریاں نظر آئیں۔

کوٹھریاں بہت ہی چھوٹی تھیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہر کوٹھری ایک بڑے صندوق سے مشابہ تھی جس میں سلاخ دار دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس کوٹھری میں اوسط قد کاٹھ کا آدمی بھی نہ تو سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ پاؤں پھیلا کر لیٹ سکتا تھا۔

ہر کوٹھری کے فرش پر خشک گھاس پھوس کی بے جی ہوئی تھی۔ عزم روشنی میں ذرا غور سے دیکھنے پر سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ ہر کوٹھری کے دروازے سے ایک قیدی سلاخیں تھاے باہر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً سبھی کے سر کے بال اور داڑھی مونچھیں جھاڑ جھاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھیں اور جبسوں پر چیخوڑے جھول رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مدت سے وہیں قید تھے۔

فقیرے نے پہلی ہی کوٹھری کا آٹا کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا۔ وہ اس وقت زندگی سے بے زار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی، مجھے کوئی ہدایت نہیں دی بس کوٹھری میں دھکیلا اور آٹا لگا کر وہاں چلا گیا۔

کوٹھری میں جو قیدی پہلے سے موجود تھا وہ ایک طرف کوسٹرو سٹ سا گیا۔ کوٹھری اتنی چھوٹی تھی کہ میری آبر کے بعد کچھ جگہ ہو گیا تھا اور وہ کچھ کچھ بھڑکی تھی۔ اندر اس سے بھی میری بوجھلی ہوئی تھی جیسی پڑا گھر کے کمروں سے آتی ہے۔

کوٹھری میں پہلے سے موجود قیدی نہایت افسردہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک میان قامت مگر مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا۔ کدھر کی بوسیدہ اور کہیں کہیں سے پھٹی ہوئی شلوار تھیں میں تھا۔ بال اس کے بھی بڑے ہوئے تھے مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کی شخصیت میں وہ کھڑو رہا نہیں تھا جو میں نے اب تک تقریباً سبھی کے چہروں پر دیکھا تھا۔

صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی گزارنے والوں کی شخصیت میں ایک مخصوص کھڑو رہا پن ضرور آ جاتا ہے مگر اس کی شخصیت میں وہ منظور تھا۔ اس کی جھاڑ جھاڑ اور نیلی کپیلی سی شخصیت کی بے میں گویا کوئی شری شخص چھپا ہوا تھا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ جگہ فراہم کرنے کے لیے ایک دیوار سے لگ کر انڈوں بیٹھ گیا تھا۔

میں نے دیکھا اس کی ایک ٹانگ خاصی موٹی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اور وہ زنجیر لوہے کے ایک حلقے سے خشک تھی جو کچی دیوار میں پوست تھا۔ کوٹھریاں کچی تھیں۔ سلاخ دار دروازہ

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح  
کی سیاسی زندگی اور کارناموں پر مشتمل  
حوالہ جاتی کتاب-----

عظیم مدبر عظیم قلم

☆ ---- زاہد حسین انجم  
قیمت: -/125 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

”نہیں“ اس نے غمی میں سر ہلایا۔

”پھر اتنے وقتوں سے کیوں کہہ رہے ہو؟“ میں نے جانتا چلا۔

”یہ میں نہیں کہہ رہا“ میرا دل کہہ رہا ہے۔“ اس نے جواب

دیا۔

”کمال ہے!“ میں نے گہری سانس لے کر کہا ”تم نے کسی دلیل، کسی بحث کے بغیر میری بات کا یقین کر لیا اور ان لوگوں کو میں کل صبح سے یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ مان کر ہی نہیں دیتے۔“

”یہ ہماری فطرت ہے یا شاید ہمارا قوی مزاج ہے۔“ وہ دانشورانہ لہجے میں بولا ”ایک بار کوئی بات ہمارے دماغ میں چبھ جائے بس پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے ہمارے دماغ سے نکال نہیں سکتی۔ اسی طرح جب ہم کسی انسان کو سرسری دیکھتے ہیں تو اس کی باقاعدہ پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی لاکھ ہمیں بتائے وہ ایسا نہیں ایسا ہے لیکن ہم سمجھانے والے کی بات سننا تو درکنار اسے گلے گلے سے گلے کر دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہی ہے۔ ہم کبھی کسی کی معقول بات کو معقولیت سے نہیں سنتے۔“

اب میں نے فوراً اس کی طرف دیکھا اور غیر ارادی سے اعزاز میں پوجھا ”تم کون ہو؟“

وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں ڈبسا اور بولا ”میرا حلیہ دیکھنے کے بعد تمہیں میرے منہ سے یہ باتیں عجیب لگ رہی ہوں گی۔ تم چونک گئے ہو۔ میں بھی تمہیں مذہب لہجے میں بات کرتے سن کر چونکا تھا۔ گلتا ہے ہم دونوں کو حالات نے زیادہ ہی لمبا کر دیا ہے۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ یا نہ بتاؤ بہر حال میں تمہیں اپنے بارے میں بتا رہا ہوں۔ میرا نام بابو غلام حسین ہے اور میں سیاسی قیدی ہوں۔“

”سیاسی قیدی؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”اور یہاں؟ اس دیرانے میں؟“

”ہاں۔ سیاسی قیدی کوئی صرف سرکاری جیلوں میں ہی تو نہیں ہوتے۔“ وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سچ سے لہجے میں بولا ”گلتا ہے تم نے دنیا کچھ زیادہ نہیں دیکھی۔“

”میرا خیال تو یہی تھا کہ میں نے بہت دیکھا دیکھی ہے لیکن دنیا بہت بڑی ہے جسے انسان اپنی مختصر زندگی میں نہیں دیکھ سکتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ساری دنیا دیکھ لیتا ہے لیکن اپنی ناک تلے کی چیز نہیں دیکھ پاتا اور ہمارے ہاں تو ایسے بھی بے شمار چیزیں بہت کمرے کمرے رکھیں گے۔ بہت دیر ہو رہے ہیں۔“ میں نے ہلکے سے آنکھ سے کہا۔

”یہ بڑے نواب صاحب کی حوالہ توں میں سے ایک ہے۔ پھولی اور عارضی جیل۔“ وہ گردو پیش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”یہاں سے ہم سب کو بڑے نواب صاحب کی اصل“ بڑی اور بڑی جیل میں جاتا ہے۔ باقاعدہ سزا سننے کے بعد۔ اور اگر قیدی سزا

جائی رہا ہے اگر تمہارے لیے بھی غمی پیدا کر دیں گے تم نے دیکھ لیا ہو گا کہ میں اپنی خوشی سے نہیں آیا ہوں بلکہ کیا ہوں۔“

وہ غالباً مجھے صاف اُردو بولنے سن کر ڈراؤں لگا۔ میرا حلیہ اس لیے سے بدل گیا تھا لیکن میں نے جانا بوجھ کر صاف اُردو میں بات کی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میری بات سمجھتا ہے یا نہیں۔

جھاڑ بھکا ڈاڑھی سوچھوں کی موٹ سے جھانکتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر غمی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک لمحے گویا کچھ سوجھنے کے بعد وہ بولا ”ظاہر ہے بھائی۔ اپنی خوشی سے کون پرغیب میں آتا ہے۔ سب لائے ہی جاتے ہیں“ نتیجے ہی جاتے ہیں۔“

لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اُردو اس کی مادری زبان نہیں تھی لیکن وہ بہت اچھے طریقے سے اُردو بولنے پر قادر تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اس بات کی توقع تھی ”اس لیے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔“

اس نے قدرے دوستانہ سے لہجے میں پوجھا ”تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ کیا قصور سرزد ہوا ہے تم۔“

”معلوم نہیں۔“ میں نے مختصری سانس لے کر جواب دیا۔ ”شاید میں نے اللہ میاں کے سامنے زیادہ بڑا نہ بننے کی کوشش کی تھی۔ جب تک میں نے اپنے آپ کو تنہا اللہ پر چھوڑے رکھا میں بڑے سے بڑے خطرے سے بچ کر 55 سالہ جوئی میں نے اپنی وراثت میں بہت محنت بن کر تدبیر لڑنے کی کوشش کی“ میں عجیب و غریب کرکھ دھندے میں پھنس گیا۔ میری تلوار ایک ایسے شخص سے جالی جس کا میں نے زندگی میں کبھی نام ہی نہیں سنا تھا۔ ایک ایسا جرم میرے گھاتے میں چڑھ گیا جو میں نے اب بھی نہیں کیا تھا۔“

اس کی کشادہ پیشانی پر فلکیں ابھر آئیں۔ وہ آنکھیں جھپک کر مجھے گھورتے ہوئے بولا ”بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی“ بہت لمبی ہوئی کی بات ہے۔“

”ہاں۔ اس وقت میرا ذہن بھی الجھا رہا ہے اور اس سے زیادہ میری زندگی ابھی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ایک ایسا ڈاکو سمجھ لیا ہے جس کا نام میں نے کبھی اخبار میں نہیں پڑھا۔ یا کھو چاچا۔ اور ان کا خیال ہے کہ میں نے نواب زادہ خاقان کے قتل میں حصہ لیا تھا۔“ میں نے اپنی راج کمانی کا منہ ڈر لیا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہا پھر عجیب سے انداز میں فہم دیا۔ ”معلوم ہوتا ہے تمہیں خوراسانی میری بے گناہی کا یقین آیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں“ اس نے اطمینان سے جواب دیا ”تمہیں کھو چاچا نہیں ہو سکتے۔“

”لیکن تمہیں کھو چاچا کو جاننے ہو کیا؟“ میں نے پوچھا۔

نہ ہوئی کوئی اور سزا ہوئی تو پھر۔۔۔ اس نے کندھے اُچکا کر ہلے اور دوا چھڑوایا۔

”کیا سب قیدی بہت عرصے سے یہیں پڑے ہوئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ کوئی کوئی ایسا بھی ہے جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل ہم مختلف مقامات سے پکڑے گئے ہیں۔ ہم ابھی راستے میں ہیں۔ کبھی ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی نہیں ہوتی اور کبھی ہمیں لے جانے والوں کا موڈ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں لے کر جائیں۔ اصل طور پر بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ہمارا سختی سے ملازمتی نہیں آیا۔ نواب صاحب کو تو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں قید ہیں۔ کبھی ان کا کوئی ذمے دار الیکٹرک اس سلسلے میں ان کے سامنے نہ پائی رپورٹ پیش کرے گا اور انہیں اس طرف توجہ دینے کی فرصت ہوگی تو وہ حکم صادر کریں گے۔ پھر ہمیں قنات وہاں پہنچایا جائے گا۔ اگر اس وقت تک ہم زندہ ہوئے۔“

”سب لوگ مختلف جگہوں میں پکڑے گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ کوئی کسی دوسرے اور دشمن قبیلے کا ہے کوئی زمینوں یا مال کے لین دین کے جھگڑے میں پکڑا گیا ہے، کسی سے ویسے ہی نواب صاحب کا کوئی خاص الیکٹرک اپنے کسی معاملے میں ناراض ہو گیا ہے اور اس نے اسے کسی پکڑ میں پھنسا دیا ہے۔ کوئی قبیلے کا سرور بزم ہے، قبیلے کے کسی قانون کے خلاف ورزی کر کے بھاگا تھا۔ کوئی واقعی کسی قسم کا جرم کر کے بھاگا ہے لیکن اسے سرکار یا پولیس کے بجائے نواب صاحب کے الیکٹروں نے گرفتار کیا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اور تم سیاسی قیدی کیسے ہو گئے؟“ میں نے جانا چاہا۔

”میں ایک نہایت معمولی سا غیر اہم سا اور غریب سا دور کر ہوں اس لیے شاید مجھے تو سیاسی قیدی کہلانا بھی زیب نہیں دیتا۔ یہ دو الفاظ سن کر ہمارے ذہنوں میں ’مشہور‘ بڑے اور پیشہ ور سیاست کاروں، بلکہ پول کو کہ سیاست فروشوں کے نام آتے ہیں جن کے جیل میں جاتے ہی اخباروں میں مہیاات چھپنے شروع ہو جاتے ہیں کہ انہیں وہاں اسے کلاس دی جائے، ٹی وی ریڈیو پر قراں کیے جائیں، خدمت گزار دیا جائے، اخبارات مہیا کیے جائیں۔ اور بے چارہ معمولی درجہ جو طے جیلوں میں بھی ڈھنڈے کما آئے، پھر قہرے میں چھتر کھاتا ہے، جیل میں اگر ڈنڈا بڑی لگوا آئے، بندو باؤ میں رہتا ہے یا جیل سے باہر نہ کریں تحریکوں کا بندھن نہا ہے گا جرموں کی طرح نکلتا ہے اور اپنے لیڈر کا تہ اوچھا کرتا ہے۔“

”یہ سب کچھ تو صحیح ہے، میں خود اکثر ان باتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں لیکن میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم سیاسی قیدی ہو تو اس حالات میں کیوں پائے جا رہے ہو؟ اگر جیل ہی تمہارا مقدر تھی تو تمہیں سرکاری جیل میں ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے

اپنے سوال کی وضاحت کی۔

”میں بڑے نواب صاحب کا باغی ہوں اور جو لوگ ہمارا قبائلی نظام کے دائرے میں رہتے ہیں ان پر کوئی اور قانون ہونے کی فورت نہیں آتی۔ ہمارے نواب صاحب اسے باجیکو دار، سرور اور نواب ہوتے ہوئے بھی انتھاب لائے غریبوں کی حالت بدل دینے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی پائوں منشور کی بنیاد بھی یہی تھی۔ ہم پیسے لوگوں کی سادگی دیکھ کر بہت کی حیثیت اور مقام کو دیکھتے ہوئے بھی ان سب باتوں پر اصرار کرتے تھے ان کے لیے دن رات سیاسی کام کرتے تھے۔ میں چھوٹے سے شہر میں ان کی پائوں کی شاخ کا صدر تھا اور انہی دنوں میں بہت بڑا انتھابی تھا، انتھاب کے لیے کام کر رہا تھا۔“

نظام حسین نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اپنے کپڑوں میں اٹھائیں پیرس میں عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر ”لیکن جب بالوں میں چاندی چمکنے لگی تب کچھ میں آیا کہ ہمارا تو نیچے سے اوپر تک فراخ ہوا ہے۔ کہیں غریب کے نا کہیں حقوق کے نام پر، کہیں سیاست کے نام پر، کہیں انتھاب نام پر۔ علامہ اقبال کہتے دور اندیش تھے۔ کہتے برس پہلے وہ کہتے تھے۔“

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کو حیران کیا کہ دوستی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی مکاری ان کے زمانے میں تو پھر بھی کچھ اخلاقی اقدار باقی تھیں۔ وہ آج زندہ ہوتے تو یقیناً ان میں شعر کہنے کی بھی سکت نہ رہا شدت غم سے گریباں چاک کر کے وہ بیابانوں کی طرف جاتے۔“

”بہت دیر سے انکشاف ہوا تم پر ان باتوں کا۔“ میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”الہیہ تو یہ ہے کہ بعض لوگوں پر تو اس عمر میں بھی ہوتا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”خیر۔۔۔ تم پر جب انکشاف ہوا تو تم نے کیا کیا؟“ میں پوچھا۔

”میں رتی رتا کر بھاگا۔ میں نے اقتدار کی جنگ میں کچھ اٹھائے دیکھے کہ میری انتھابی روح شدید زخمی ہو گئی۔ میں نے انتھاب کی ٹھنڈی سمیٹی اور صدمے سے استفادے کر بھاگ اُدھر اُدھر بیٹھ کر کچھ باتیں بھی کیں۔ انتھابی کی روح پر آؤنا ہے تو وہ کچھ دنوں کے لیے بہت بھگتا ہے، بکواس ہو جاتا ہے۔ بکواس کی رپورٹیں بھی اوپر پہنچیں تو مجھے باقی قرار دے دیا گیا میری گرفتاری کے احکامات جاری ہو گئے۔ نئی سب پر گرفتاری احکامات جن کے نتیجے میں اس وقت میں تمہارے سامنے ہوں۔ اس نے استہرا ایسے انداز میں اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔“ یہ تمہارے سامنے انتھاب بیٹھا ہے۔ پاؤں میں زنجیر پئے۔“

کھلے ہوں گے تو خود اہست آلودی کا احساس ضرور ہوگا۔  
 ”خود اس کے عوض تمہیں گولی کھا کر مرنے پڑے؟“

”ہاں۔ گولی کھا کر مرنے سے میں نہیں ڈرتا۔ جو ذلت اس وقت میں ظاہری طور پر اٹھا رہا ہوں اس سے زیادہ اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں۔ اس سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ انسان گولی کھا کر مر جائے۔ اس کے لیے میں گمراہ کرب نہیں تھا۔

میں نے پشٹ اس کی طرف کئی اور وہ میری ہڈیوں میں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ رشتیاں میری کلائیوں پر بہت زیادہ سختی سے تو نہیں باندھی تھیں لیکن کہیں خاص ترکیب سے لگا لی گئی تھیں کہ آسانی سے نہ کھل سکیں۔

غلام حسین کہیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں قسمت کے اس تماشے پر حیران ہوا رہا تھا کہ بعض اوقات انسان جس چیز سے ڈر رہا ہوتا ہے اسی میں اس کی بھلائی کا سبب نکل آتا ہے۔ جس چیز کو دیکھ دیکھ کر وہ گڑھتا ہے وہی اس کی بہتری کا باعث بن جاتی ہے۔

میں جب سے اس زمرے پر پہنچا تھا، کئی بار قید خانے کا ذکر سن چکا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھے لے جا کر وہیں نہ ٹھونس دیا جائے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں غلام حسین جیسا قیدی مل جائے گا جو فوری میرا دوست بن جائے گا اور اپنی بیساط کے مطابق میری مدد پر کمر بستہ ہو جائے گا۔

میں نواب زادی کی سخت اور متحیر دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کہاب ہوا جا رہا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سخت اور متحیر کی وجہ سے مجھے قید خانے جانا پڑے گا جو میرے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔

کب سے میری خواہش تھی کہ کسی طرح میرے ہاتھ نکل جائیں۔ انسان خواہ قید میں ہی ہو لیکن اس کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوں تو وہ اپنے آپ کو اپنا مجبور محسوس نہیں کرتا لیکن اگر ہاتھ بندھے ہوں تو خواہ آپ کھلے میں بھی پھر رہے ہوں آپ اپنے آپ کو واقعی ایک قیدی اور مجبور محسوس کرتے ہیں۔ اس نکتے سے غلام حسین بھی آگاہ تھا۔

بالا شیدی شاید اسی اندیشے سے مجھے قید خانے میں نہیں بھیج رہا تھا کہ اتنی تنگ سی کوٹھی میں دو قیدی موجود ہوں گے تو شاید وہ ایک دوسرے کی مدد کی کوئی صورت نکال لیں لیکن شاید دل ہی دل میں نواب زادی کی رعوت سے بے زار ہو کر اس نے اس سارے معاملے پر لعنت بھیج دی تھی اور سوچ لیا تھا کہ اس کی طرف سے سب بھلا میں جائیں جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا اسے نواب زادی کی فحشی مل لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لیے اس نے فقیرے کو مزید کسی احتیاطی تدبیر کی ہدایت بھی نہیں کی تھی۔ بس وہ بتایا تھا اور مجھے کوٹھی میں رکھا کہ اسے چلا گیا تھا۔

غلام حسین آخر کار کہیں کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند

بار دروازے کے پیچھے ہر انقلاب کی ہمارے ہاں یہی کہانی ہے جو بار بار ہرانی جاتی ہے۔“

پھر وہ ایک طویل سانس لے کر قدرے پرسکون لیے میں بولا ”تم آتے ہو تو تم سے یہ باتیں کر کے دل کی بھراس نکال کے پڑا سکون ملا ہے۔ یہ اس بات کی کوٹھڑیوں میں جو قیدی بند ہیں ان سے اس قسم کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تو اردو بھی زیادہ نہیں سمجھتے اور سیاست رفتے کی باتیں تو یہ اپنی زبان میں بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔“

پھر پیسے اسے کچھ خیال آیا، پھر روانہ لیے میں بولا ”لاڈلارا میں تمہاری رشتیاں تو کھول دوں۔ لگتا ہے بہت دیر سے بندھے ہوئے۔“

”کر کسی نے دیکھ لیا تو کیا تمہیں سزا نہیں ملے گی؟“ میں نے

پوچھا۔

”مہرا؟ سزا تو بہت سخت ملے گی۔ ہم قیدی.... اپنی اپنی کوٹھی میں رہتے ہوئے اپنی خدائی اور ذلت کے احساس سے تنگ آکر اگر کوئی آوازوں میں باتیں کرنے لگ جاتے ہیں تو اس پر بھی یہاں کے محافظ اگر مت اترتے ہیں۔ گدھوں کو بھی اگر اس طرح زخموں سے چیرا جائے تو شاید کسی کو نہ کھدے میں سوئے ہوئے یا کھڑے ہوئے ٹکڑے انداد بے رحمی حیوانات والے آجائیں لیکن ہماری چیخ و پکار پر کان دھرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسی لیے تم نے شاید محسوس کیا ہو کہ برابری کوٹھڑیوں میں قیدی بالکل خاموش ہیں ورنہ شاید تمہاری آمد پر وہ کوئی سوال کرتے، کچھ جاننے کی کوشش کرتے، حالانکہ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت کسی کو داخلہ آنے کا ہوش نہیں ہے۔ اس کے باوجود بے چارے خاموش کھڑے ہیں۔ خوف ان کے لاشعور تک میں بندھ گیا ہے۔“

”اور تمہیں سزا کا خوف نہیں ہے؟“ میں نے سسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت زیادہ ہے۔“ وہ جھرمجھری سی لے کر بولا ”ڈنڈے کھانے اور کسی بھی طرح کا تشدد سننے سے میں بہت ڈرتا ہوں۔ میری روح تڑپا ہوتی ہے میں کم تعلیم یافتہ ہوں لیکن پڑھنے لکھنے کا شوق رکھنے والا آدمی ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ کبھی یہ کچھ ہوگا۔“

”اس کے باوجود میری رشتیاں کھول رہے ہو؟“

”ہاں۔ میں یہ تو نہیں چاہتا کہ میں کوئی چھوٹی موٹی حرکت کروں اور وہ لوگ اگر میری کھال آڈیوں یا ڈھیاں توڑیں۔ میں کوئی بڑی حرکت کرنا چاہتا ہوں جس کے نتیجے میں وہ لوگ ڈر فوراً ہی مجھے میں مجھے گولی مار دیں اور میرے خیال میں تمہاری رشتیاں کھول دیاں گی یہی حرکت ہوگی۔“

پھر ایک لمبے کے وقفے سے وہ بولا ”حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس منبر سے میں تو پھر بھی تم قیدی رہو گے لیکن ہاتھ

لئے بعد ہی اس نے جکی سی وہ رتی میرے قدموں میں ڈال دی۔ رتی بچکنے کے بعد بھی میں فوری طور پر بازو سیدھے کرنے اور سامنے کی طرف لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کدھوں تک بازو گویا لکڑی کے ہو گئے تھے۔

بڑی مشکل سے بازو سیدھے کر کے میں نے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ ان پر درم سا اُٹھایا تھا اور رتیاں زیادہ سختی سے شہر می ہونے کے باوجود ان کے کمرے کمرے نشان چلد میں خوب اچھی طرح نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ ہاتھ بالکل کھن گئے تھے۔ میں نے بازوؤں کو بچاؤ سامنے دوڑوا کر دیکھنے دیے۔ ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر ان کی بالشی کی نہ جانے کتنی مزید مٹھیاں کھینچیں۔

آخر کار بازوؤں میں وہی طاقت و توانائی لوٹ آئی جس سے دل کو بڑی دھارس رہتی تھی۔ غلام حسین نے جی کا تھاب اب بھی گو کہ میں آزاد تو نہیں ہو گیا تھا، پتھرے بھی کوٹھری میں ہی بند تھا لیکن دل کو جیسے کچھ قرار سا اُٹھایا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا ”اب میں تمہاری۔۔۔ بلکہ یوں کہو کہ اپنی اور تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کوٹھری کا سلاخ دار دروازہ کھل گیا دیواروں میں نصب تھا اس لیے مجھے امید کی کرن نظر آ رہی تھی۔ میری غیر معمولی اور خدا داد جسمانی طاقت جو زندگی میں بار بار بڑے عجیب اور ناقابل یقین انداز میں میرے کام آئی تھی اس وقت بھوک پیاس اور مسلسل ذلت و خوارگی کی وجہ سے کافی متاثر ہو چکی تھی پھر بھی مجھے امید تھی کہ اس وقت وہ شاید کام دے جائے۔

میں نے ترجمے ہو کر پاؤں زمین پر جمائے، دروازے کی دو موٹی موٹی سلاخیں منہ بوٹی سے گرفت میں لیں اور پیلے تو دروازے کو جھنجھوڑ کر اس کے وہ انتہی حصے وصلے کرنے کی کوشش کی جو مٹی کی دیواروں میں بہت تھے۔

اس میں مجھے معمولی سی کامیابی ہوئی دکھائی دی لیکن ساتھ ہی کچھ کھڑکڑاہٹ بھی پیدا ہوئی۔ بابو غلام حسین فوراً گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میری کمرے ہاتھ مارنے ہوئے بولا ”کیسا کر رہے ہو یا؟ تم تو مرد اور دگے بڑا شور ہو رہے ہو لوگ کچاں گئے۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تم گولی کھا کر مرتے سے نہیں ڈرتے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”وہ تو میں نے غلط نہیں کہا تھا لیکن اب آپسی بات کی گارنٹی تو نہیں ہے کہ وہ اتنی ہی نہیں گولی مار دیں۔ ہو سکتا ہے وہ ہم پر شدید شروع کریں جس سے میں بہت ڈرتا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے دروازے کو جھنجھوڑنا بند کر دیا اور دوبارہ پاؤں منہ بوٹی سے جھکا کر خاموشی سے اسے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ سانس روک کر میں نے اس پر پوری طاقت صرف کر دی۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ اکھڑا کھڑا باہر جا کرے گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ یہ شخص میری خوش فہمی ثابت ہوئی۔ طاقت آزمائی کرتے کرتے مجھے اندیشہ

محسوس ہونے لگا کہ میری کپٹینوں کی نہیں بھٹ جائیگی۔ بابو غلام حسین ایک بار پھر میری پیٹھ چھتے ہوئے بولا ”میں نے کی کوشش مت کرو۔ یہ دروازہ نہیں اکھڑے گا۔ کچھ مکان کی اینٹوں اور مٹی سے بنا ہوا ہے لیکن یہ خاص قسم کی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھبر بھری اور گردور ہونے بجائے زیادہ محسوس ہو گئی ہے۔ تقریباً سیسٹھ کی طرف۔ پار پڑنے سے یہ کھلی کہ ہے اور مضبوط زیادہ ہوئی ہے۔“

”دروازے کو جھنجھوڑنے سے مجھے کچھ نتیجہ برآمد ہوا۔“ دے رہا تھا۔ ”میں نے زور آزمائی ترک کر کے ہونے لگا۔ نتیجہ یقیناً برآمد ہوا مگر وہ ہم دونوں کے لیے جہت ہوا۔“ غلام حسین لہجہ بھری سانس لے کر بولا۔

”اب میرے ہاتھ کھلے ہیں اب مجھے ان لوگوں کی کچھ پروا نہیں ہے۔“ میں نے سگڑا تے ہوئے کہا ”دوسری بات اس وقت ان لوگوں کا تھوڑے بہت شور کی طرف دھیان دیا جائے گا۔ ان کی جان پر مبنی ہوئی ہے۔ بہت برا حال ہے ان لوگوں کا۔“

”پھر بھی میں حسین اس دروازے کو اس طرح کھڑکڑا کر اجازت نہیں دوں گا۔ اگر ان کا حال برا ہے تو کس وہ ہم پر اور زیادہ فائدہ نہ آتا رہیں۔“ غلام حسین ویسی آواز میں بولا کہ صورت حال کیا ہے؟ میرے خیال میں تو اب ڈاکو بٹے گئے ہیں۔ ڈاکو جانے کے لیے نہیں آئے۔ وہ جو لینے کے لیے ہیں وہ لے کر ہی جائیں گے۔“ میں نے وٹوٹ لے لگا۔

پھر میں نے اسے اندر کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اسے کہ ڈیرے پر صرف تین یا چار مرد زندہ رہ گئے ہیں۔ باقی ہر بچے ہیں۔ ڈاکوؤں کو یقیناً تین چار گردوڑے سونے کی خبر ملی تھی اور لگتا ہی تھا کہ وہ ہر حال میں سونا حاصل کر کے رہیں۔ میرے خیال میں انہیں ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے لگا ہوا انتظار تھا۔

ملکی روشنی میں بھی مجھے غلام حسین کی آنکھوں میں چمکے نمودار ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ دبی دبی آواز میں ذرا جوش سے ”تمہارا خیال صحیح معلوم ہوا ہے۔“ بھیجی وہ اتنے صبر سکون گیر آواز لے بیٹھے ہیں ورنہ یہ قتل و اتار میرے دلی تو نہیں۔ لیکن اس میں ہمارے لیے تو ایسی کوئی خوش ہونے والی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”ڈاکو جب فیصلہ کن حملہ کریں گے ساتھ ہی ہم بھی شاید بے بسی کی موت مارے جائیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے تسلیم کیا اور اس کی آنکھوں کے چمک ماند پڑ گئی۔ کوٹھریوں کے سامنے موجود قاضی دیوار کے سے نظر آنے والے آدوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ گہر خیال لیجے میں بولا ”اگر میرا زندہ حالت میں ڈاکوؤں سے سامنا ہو گیا ہاتھ باندھ کر ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنے گرد رکھ دے۔“

”اگر میرا زندہ حالت میں ڈاکوؤں سے سامنا ہو گیا ہاتھ باندھ کر ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنے گرد رکھ دے۔“

کر سیدے کی سی حالت میں گر گیا۔ میں نے پیچ کر غلام حسین سے کہا ”تم بھی بڑی بچی کرو۔“

دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ میں نے فضا میں جس چیز کو پرواز کرتے دیکھا تھا وہ راکٹ ہی تھا اور اسے یقیناً راکٹ لانچر سے ہی فائر کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکوؤں کے پاس راکٹ لانچر اور مشین گنیں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان چیزوں کے ساتھ یقیناً مزید افراد بھی آئے ہوں گے۔ اب اس مکان کا اور اس میں زندہ قید جانے والوں کا اللہ ہی حافظ تھا۔

غلام حسین تو صحیح طور پر سیدے کی سی حالت میں بھی نہیں آئے پایا تھا کہ ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور مجھے ہی لگا کہ دیوار میں ہم پر ٹکریں گی لیکن ہماری قسمت اچھی تھیں جو ایسا نہیں ہوا لیکن پھٹت اور دیواروں سے ڈیروں میں ہم پر کری۔

اندروں سے کسی کے چپنے کی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں نسوانی معلوم ہوتی تھیں لیکن میرے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ نواب زادی کی آواز تھی، بھیمیاں کی یا پھر رکھال کی۔ وہ کتنی کھلی سی آواز تھی۔ اندر یقیناً کوئی اور قیامت گزر رہی تھی۔ آوازیں سے اندازہ ہوا تھا کہ مکان کا کچھ حصہ منہدم بھی ہوا تھا۔

دروازہ میں ارتعاش جیسے سے پہلے ہی میں الجھ کر ہوا۔ دوسرا راکٹ لانچ ہونے سے پہلے اگر ہم اس کو ٹھہری سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو شاید ہمارے حق میں ستر ہوتا۔ فی الحال بھی قسمت ہم پر مہربان ہی رہی تھی کہ راکٹ بال مکان کے اس حصے پر جا کر گرا تھا جہاں کچھ دیر تک پہلے میں دیگر لوگوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے اب اس سنگرز نواب زادی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا جس نے بری طرح خار کھا کر مجھے اس قید خانے میں بھیج دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کو کھڑا اور زور آزمائی شروع کی۔ مجھ پر ایک خوش کن انکشاف ہوا کہ راکٹ کی تباہ کاری نے میرا کام بہت آسان کر دیا تھا۔ اب اس شاید کچھ اس طرح جھنجھٹائی تھیں کہ آہنی دروازے کے جو حصے ان میں بہت تھے وہ مزید ڈھیلے ہو کر باہر نکل آئے تھے۔

میں نے پوری طاقت صرف کر کے ایک جھٹکا دیا جو آخری جھٹکا ثابت ہوا۔ سلاخ دار دروازہ باہر جا کر۔ اس کے ساتھ شاید اور دے منہ میں بھی جا کر آ لیکن میں نے ہر وقت اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

اس وقت تک کوئی دہاں نہیں پہنچا تھا۔ معلوم نہیں کون زندہ بچا تھا کون مر چکا تھا۔ جو زندہ بچے بھی ہوں گے انہیں یقیناً اس طرف توجہ دینے کا ہوش نہیں ہو گا۔ تاہم میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ دوسرا راکٹ لانچ ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ کوئی بید نہیں تھا کہ دوسرا راکٹ قید خانے پر ہی آگرا۔

یہ خیال چلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا لیکن میں

مثال کر لیں۔ شاید وہ میری بات مان لیں۔“  
”مجھے امید نہیں ہے کہ تم ان کے معیار پر پورا اتر سکو گے۔“  
میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم انٹرویو میں کو ایسا ہی نہیں کر سکو گے۔ اگر انٹرویو میں پاس ہو بھی گئے تو عملی امتحان میں یقیناً وہ جاؤ گے۔“

اس نے ایک طویل اور سرد آہ بھری ”گوا تم میرے اس خیال کی تصدیق کر رہے ہو کہ آئیڈیلٹ لوگ ہر میدان میں ناکام ہوتے ہیں؟“

”اب۔ کافی حد تک یہی درست ہے لیکن کبھی کبھی آئیڈیلٹ لوگ بہت حیرت انگیز کامیابی بھی حاصل کر جاتے ہیں“  
وہ یاس میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ”میں نے کہا۔“

”یاد غلام حسین نے کہا لیکن وہ جملہ عمل نہ کر سکا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کیا سوچتا تھا کیونکہ اس نے اپنے اچانک ہی گویا جسم کا ہاتھ کھل گیا۔ ایک سخت ہی اتنے خوف ناک انداز میں فائرنگ شروع ہوئی گویا کسی بہت بڑی فوج نے مکان کو زبردستی میں لے کر حملہ کر دیا ہو۔ اس بار تو مشین گنز کی ترخیزاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔“

اتنی دیر سے چھایا ہوا سکوت یک لخت ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ میرے اندیشے درست ہی معلوم ہوتے تھے۔ آخر کار فیصلہ کن حملہ ہو گیا تھا۔ ڈاکوؤں کو جس ملک کا انتظار تھا شاید وہ ٹھن پھٹی تھی میرے جسم میں سردی سردی لہر دوڑ گئی۔ ہم چڑیا کمرے کے بیڑوں سے بھی بدتر اس کو ٹھہری تھیں ہڈیاں گلی ہی مجبور اور لاچار تھے۔

غلام حسین خوف زدہ ہی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ فائرنگ کا شور خاصا تیز تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ اندر کالی بڑبڑک بچ بچ کر ہوئی۔ میں نے غلام حسین سے کہا ”اگر اس وقت کسی نے دروازے کی کڑکڑاہٹ سن بھی لی تو زور دے توجہ نہیں دے گا۔ اس لیے میں ایک بار پھر کوشش کر رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے پوری طاقت سے ایک بار پھر دروازے کو جھونکا شروع کر دیا۔ دروازہ خاصا ڈھیلہ لڑکھٹا تھا لیکن اس کے اکڑنے کے آثار اب بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے موت سے تو نہیں البتہ بے بسی کی موت سے ضرور خوف آتا تھا۔ انسان آزاد ہو اور اپنی جتا کے لیے ہاتھ پاؤں مار سکا ہو اس عالم میں اسے موت آتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کوئی خوف ناک بات نہیں تھی۔ لیکن انسان تھپہ ہوا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور اس عالم میں وہ چھپے کی طرح مارا جائے یہ تصور مجھے ضرور خوف زدہ کر دیتا تھا۔

میرے دل پر اسے اور آسان کا جتنا کھڑا دکھائی دے رہا تھا اچانک ہی میری نظراس طرف اٹھی اور میرا دل گویا دھڑکنے لگا۔ کیا۔ فضا میں کوئی چیز تیزی ہوئی تھی یا میری مکان کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے فوراً دروازے کا پیچھا چھوڑا اور دیوار کے ساتھ لگ

کنارے کو گڑائی ہوئی اندر آ رہی تھیں۔ اس بد نصیب مکان  
جانے کتنی گولیاں برسائی جا چکی تھیں کہ اس کی دیواریں اوپر  
دندانے داری ہو چکی تھیں۔

میں اور غلام حسین دیوار سے چپک کر سڑے سے بیٹھے  
میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی میرے اندر بیڑے  
مطابق دو سرا راکٹ آتا دکھائی دیا۔ اس راکٹ نے تو اس طرف  
میں ہی مکان کا خاصا بڑا حصہ منہدم کر دیا اور کہیں آگ بھی پڑ  
اٹھی۔ قیدیوں کی بھی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ حالانکہ قید  
اب بھی سلامت تھا۔

چار دیواریں کا جتنا حصہ ہم دیکھ سکتے تھے اس کے عقب  
اب ہلال شیدی کا کوئی آدمی نہینات دکھائی نہیں دے رہا تھا  
معلوم نہیں کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔ کچھ ہی دور مکان کے  
کونے پر ہمیں ایک لاش تو آدمی ترچھی پڑی نظر آ رہی تھی۔  
دو سرا راکٹ چھٹنے جانے کے بعد قازنگ بند ہو چکی تھی۔  
ڈاکو دوسرے راکٹ کی تباہ کاری کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں  
غلام حسین سے کہا ”جلدی آؤ۔ یکا موقع ہے کہ ہم دیوار چلا  
جائیں۔“

لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ جب ہم دیوار کے اوپر پہنچیں گے  
گولی روشنی میں شاید بہت دور سے بھی ہمارے پیوے دلچے  
جائیں۔ ڈاکوئیں کے پاس یقیناً دوڑ بیٹیں بھی تھیں یا پھر ان کی  
بارد انگلیوں پر دوڑ بیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اور مکان میں کہیں آگ  
لگ جانے کی وجہ سے بھی اس دیوار تک روشنی ذرا سی بڑھ گئی  
جہاں ہم موجود تھے۔

ہمارے لیے صرف وہی ایک لمحہ خطرناک تھا جب ہم دیوار  
کے اوپر پہنچتے۔ باہر چلاک لگائے کے بعد تو ہمارے عقب  
دیوار ہوتی یعنی پس منظر گویا تاریک ہو جاتا اور ہم اس میں گم  
ہو جاتے۔ بس اسی ایک دو مہائی لمحے میں اگر کوئی گولی ہمارے  
کے پار نہ ہوتی تو ہم بچ نکلنے کی کچھ امید رکھ سکتے تھے۔

میں نے غلام حسین کا ہاتھ پکڑا اور اسے چار دیواریں  
کونے کی طرف تقریباً کھینچے ہوئے چلائے۔ اس طرف روشنی  
ہونے کے برابر تھی۔ اس گوشے میں دو تین آڑے آڑے  
درخت بھی موجود تھے۔ درختوں کے پس منظر کا سہارا لیتے ہو۔  
دیوار پر چڑھنا کالی حد تک محفوظ ثابت ہو سکتا تھا۔

غلام حسین قہر قہر کانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے  
راکت گرتے دیکھ کر اور اس کا دھماکا سن کر وہ بہت ڈرہو گیا  
حالانکہ ہم ابھی مکان کے پہلی طرف ہی تھے اور دونوں راکٹوں کا  
تباہ کاری کا صحیح طور پر نظارہ نہیں کر سکتے تھے۔ دو سرا راکٹ گرنے  
کے بعد تو مکان کے اگلے حصے کی طرف سے کوئی چیخ بھی سنائی  
دی تھی۔ معلوم نہیں کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔  
کونے میں پہنچ کر میں نے انکڑوں بیٹھے ہوئے غلام حسین کو پکڑا

نوری طور پر وہاں سے نہ بھاگ سکا۔ مجھے غلام حسین کا خیال آیا  
تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے زنجیر اس کے پاؤں میں ہی نہیں میرے پاؤں  
میں بھی تھی۔ اس کے پاؤں میں قید خانے کی زنجیر تھی اور میرے  
پاؤں میں اس کے احسان کی زنجیر تھی۔ اس نے سزا کی پروا کیے بغیر  
میرے ہاتھوں کی بندشیں کھولی تھیں۔

اگر اس نے یہ زحمت اور ہمت نہ کی ہوتی تو میرے لیے اس  
وقت کو کھری کا دوواڑہ اکھاڑنا ممکن نہ ہوتا۔ قازنگ شروع ہونے  
کے بعد تو اتنی جلدی نہیں لے سکتی تھی کہ وہ میری ریتاں کھولے۔

میں تیزی سے گھوما۔ غلام حسین پر امید نظروں سے میری  
طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی زنجیر کو سرا پکڑا اور دیوار میں  
پوست کڑے سے مسلک تھا۔ میں نے ایک پاؤں دیوار پر جمایا اور  
کڑے کو دیوار سے اکھاڑنے کے لیے زور آزمائی شروع کی۔ ایک  
بہت افزا بات یہ تھی کہ آہنی کڑا بھی دیوار میں ڈھیل پڑ چکا تھا۔ کچھ  
اوپر تو دیوار میں ہلکی سی دراڑ بھی نمودار ہو چکی تھی۔

غلام حسین نے بھی حسب مقدمہ میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش  
کی۔ ہم رستا کھینچی کے انداز میں زنجیر کو کھینچ رہے تھے۔ مٹین مٹوں  
اور دور دراز انگلیوں سے قازنگ اس دوران بھی جاری تھی لیکن  
ہماری خوش قسمتی تھی کہ قید خانے کی طرف قازنگ کا زور کم ہی تھا  
اور قاضی دیوار کی وجہ سے تو ہم بالکل ہی محفوظ تھے۔

چند سیکنڈ میں ہی ہماری کوشش بار آور ہو گئی۔ کڑے کا پھٹا  
حصہ ایک بڑی سی ”ٹی“ کی شکل کا تھا جو دیوار سے آخر کار نکل آیا  
لیکن اس زور آزمائی اور لوہے کی مسلسل دگر سے میرے ہاتھوں  
میں جلن ہی ہونے لگی۔ خود پرستی سے قطع نظر میں اپنے ہاتھوں کو  
آہنی ہاتھوں میں شمار کر سکتا تھا لیکن لہا بھی اتنی دیر تک اور اتنے  
دباؤ کے ساتھ لوہے سے دگر کھانا رہے تو اس پر بھی کچھ نہ کچھ  
اثرات تو نمودار ہو ہی جاتے ہیں۔

غلام حسین نے اپنی زنجیر کا سرا ہاتھ میں تھام لیا۔ فی الحال  
اس زنجیر کو اس کے پاؤں سے نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ ہم دونوں رکوع  
کی ہی حالت میں کو کھری سے نکلے اور سامنے والی دیوار کی اوٹ میں  
جا پہنچے۔ اسی دوران بیچے سے دوسرے قیدیوں کا شور سنائی دیا۔

وہ ہمیں فرار ہونے دیکھ کر شور مچا رہے تھے کہ ہم ان کی بھی  
کچھ مدد کریں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ ہر کو کھری کا تالا تو ڈانڈا دوواڑہ  
اکھاڑا اور پھر قیدی کی زنجیر دیوار سے نکالنا ہمارے بس کی بات  
نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور قاضی  
دیوار کی اوٹ سے نکل کر چاروں ہاتھ بیروں کے مل بیرونی دیوار کی  
طرف بڑھے۔ گولیوں کی بو پھار اس طرف ایسی شدید نہیں تھی اور  
ہم چاروں کی طرح چلتے ہوئے ان کی زد سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

ہم بیرونی دیوار تک تو صحیح سلامت پہنچ گئے لیکن اس کے اوپر  
چڑھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ گولیاں اس کے بالائی



تک پہنچا اپنی جگہ ایک جان لیوا امتحان تھا۔

اس سارے طویل دائرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی آڑ لے کر انسان آگے بڑھ سکتا۔ بس یہ قیمت تھا کہ زمین سیات نہیں تھی۔ ٹیپ و فزاسے چڑھی۔ اگر کوئی زمین پر تقریباً رینگنے کے سے انداز میں سڑ کر تاویہ ٹیپ و فزاس کا ساتھ دے سکتے تھے۔ ان کی وجہ سے، محض آندوں کی مدد میں دور سے کسی کو اس کی حرکت نظر نہیں آسکتی تھی۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند بھی اب غائب ہو چکا تھا۔

دیواروں میں وہ چھوٹے چھوٹے چوکور سوراخ موجود تھے جن کے عقب میں ہم نے بلال شیدی کے آدھوں کو مورچہ بند ہو کر فائرنگ کرتے دیکھا تھا۔ ہم اتنا پیچے ہو کر گزر رہے تھے کہ ان سوراخوں سے کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے کسی سوراخ سے اب کئی تال جھانکتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بھی ہم ہر ممکن احتیاط کر رہے تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کسی سوراخ کے عقب میں اب بھی کوئی شخص موجود ہو۔

چار دیواری کے کونے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ غلام حسین اپنے ہونے سرگوشی میں بولا "اگر مزید کوئی راکٹ فائر ہو گا تو؟"

"بس۔۔۔ پھر تو اس مکان اور مکان والوں کا کچھ نہیں بچے گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے ڈاکو اس بری طرح تباہی پھیلانے کی حاکم نہیں کریں گے۔ انہیں اندازہ ہو گا کہ اس کے بعد تو سونا بھی نہ جانے کس شکل میں کہاں کہاں تک بکھر جائے۔ اسے سینٹا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ صرف مزاحمت کے امکان کو ختم کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب وہ پہاڑیوں سے اتر کر مکان کی طرف بڑھیں تو کوئی ان کا راستہ روکنے والا موجود نہ ہو۔ اور اگر وہ بھی تو اسے اپنی کوشش میں کوئی کامیابی نہ ہو۔"

اسی لمحے ایک بار پھر فائرنگ شروع ہو گئی لیکن اب اس میں شدت نہیں تھی۔ ڈاکو گویا بہت سوچ سمجھ کر ڈٹنے وقفے سے اور کہیں کہیں سے گولیاں چلا رہے تھے۔ مکان کی طرف سے اب قطعاً کوئی فائر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے ایک حصے سے شعلے بلند ہو رہے تھے جو پھیلنے دکھائی دے رہے تھے۔

مکان کے طویل و عرضی احاطے میں تین چار گاڑیاں کڑی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ آگ ابھی ان تک نہیں پہنچی تھی۔ آگ ان تک پہنچنے کے بعد تباہی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو سکتا تھا۔ سونا بھی انہی میں سے کسی گاڑی میں موجود تھا۔

میں نے سرگوشی میں غلام حسین سے کہا "میرا خیال ہے ڈاکو اس کو اندازہ ہو چکا ہے کہ یہاں مزاحمت بالکل دم توڑ چکی ہے۔ اب جلد یہ وہ پہاڑیوں سے اترنا شروع کریں گے۔ وہ لوگ مشین گنیں پہاڑیوں پر نصب کر چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کچھ ڈاکو

اپنے کندھوں پر چڑھایا اور اسے پراپرٹی کی دیوار پر ایک لمحے کے لیے بھی نہ دیکھا۔ فوراً بارود جلا۔"

وہ بری طرح حواس باختہ تھا۔ دو مرتبہ تو وہ میرے کندھوں پر چڑھنے کی کوشش میں گر پڑا۔ پاؤں میں پڑی ہوئی ہماری ڈنچر بھی اس کے لیے مصیبت بن رہی تھی۔ آخر کار میں نے ہی اسے تقریباً گود میں اٹھا کر دیوار پر چڑھایا اور وہ اپنا کانپنا دوسری طرف کھد کیا۔

میں نے ایک لمحے انتظار کیا۔ کوئی کوئی نہیں چلی تو میں نے بازو بلند کر کے ہاتھ دیوار پر بٹانے اور لمبی کی طرح جسم کو ٹکڑے ہونے دیوار پر چڑھ کر فوراً ہی دوسری طرف کودا۔ دوسری طرف بھی میں دیوار سے چپک گیا اور فوری طور پر حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے دیکھا غلام حسین قریب ہی تقریباً مجھ کی ہی حالت میں پڑا کر رہا تھا رکے رکھ رہا تھا۔

"کھیا ہوا؟" میں نے تجزی سرگوشی میں پوچھا۔

"نکلا ہے کمر میں جھکا گیا ہے۔ مجھ سے تو سیدھا کھرا ہی نہیں ہوا جا رہا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا "اصل میں مجھے پہلے بھی کچھ چو نہیں بڑی غلام جگہوں پر لگی ہوئی ہیں۔ قید خانے میں محافظوں نے کئی بار مارا تھا۔"

"فکرت کرو۔ صرف حوصلہ بلند رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اس کی بہت بڑھانے کی کوشش کی "سیدھے کھڑے ہونے کی ہمیں دیکھ ہی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو ابھی نہ جانے کتنا فاصلہ روکنے کی حالت میں یا چار پاؤں کی طرح طے کرنا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ہم دونوں بالکل کبڑے اور دیوار کے ساتھ لگ کر ایک طرف کوٹھکتے لگے۔ میں بہت زیادہ یقین نہیں تھا کہ ہم ڈاکوؤں کے کھیرے سے ذبح سلامت نکل جائیں گے لیکن میرا فلسفہ یہی تھا کہ جدوجہد آخری سانس تک جاری رکھنی چاہیے۔

صورت حال خاصی مایوس کن تھی۔ میں بہت پہلے سے ہر امکان پر غور کر چکا تھا۔ مکان چاروں طرف سے پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ پہاڑیوں اور مکان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ پہاڑیوں کی طرف سے درمیان میں ایک طرف کچھ حصہ خالی تھا۔ اسے گزر گاہ سمجھا جاسکتا تھا۔

یعنی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس پہاڑی کے عقب میں ڈاکو موجود تھے اور کس کے عقب میں نہیں۔ ہر حال پہاڑیوں کے درمیان سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ جو ایک گزر گاہ مقرر تھی، مجھے یقین تھا کہ اس کے دونوں طرف کی پہاڑیوں پر ضرور ڈاکو موجود ہوں گے اور گزر گاہ کی کڑی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ قریب کی کڑی نگرانی چاہیے تھی کہ اس گزر گاہ پر متحرک نظر آنے والے کسی سانسے پر بھی وہ گولی ضرور چلائیں گے۔ اس کے علاوہ درمیان میں ان کو عبور کر کے اس گزر گاہ تک پاسی بھی پہنچاؤ

زمین پر نہیں لگتے تھے۔

عجیب محکمہ خیزی حالت میں ہم زمین کے خلیب و فراز گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے غلام رسول کو ستانے کے لیے رکنا پڑا۔ اس کے پاس کی دلیجے کمر کی تکلیف بھی اسے تک کر رہی تھی۔ ابھی تک ہم پر کوئی نہیں ہوا تھا۔ اس سے میرا معاملہ بدھ گیا تھا۔ شاید ڈاکوؤں کی توجہ مکان کی طرف تھی۔ ہر حال ہم کھڑے ہو کر چلنے کا نظریہ نہیں لے سکتے تھے۔

اس محکمہ خیزی حالت میں چلنے چلے راستے میں کسی اک جھاری میسر آجاتی تو اس کی اونٹ میں بیٹھ کر ذرا تحفظ کا احسا ہوتا۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اب تو بیا واقعی میری برداشت سے بھی باہر ہوتی جا رہی تھی۔ پچھلے ایک آگے کے دوران میں نے جو طویل زور آزمائی کی تھی اور اس بعد سے جس طرح پُر شفقت انداز میں ہم تقریباً ایک ایک آگے بڑھ رہے تھے اس سے میری پیاس بڑھ کر اٹھی تھی۔ بھوک لگ ساری تھی۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندر چراغاں لگتا۔ ایک بار مجھے قواب زادی کا خیال آیا جس نے بڑے قہر میں بیجا ہوا پانی سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اسے چٹا فید بھی ہوا تھا یا نہیں۔

تقریباً تو احوار سستے کر کے غلام حسین بہت دیر لگا اور ذرا پر ڈیڑھ ہو گیا۔ اس کے حلق سے اب جو آواز نکل رہی تھی سرکوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس کی سانس و سوجھنی کی طرح چل رہی تھی جس میں اب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ وہ آواز ہونے لگا۔ "ہیں قواب میںیں لٹ کر انتظار کروں گا اور جو قسمت میں ہوا وہ بھگتوں گا۔ تم اپنا سفر جاری رکھو دوست۔ اہا۔ کم از کم مجھے اپنا نام قوتی تے جاؤ۔ میں نے ابھی تک تمہارا نام ہی نہیں سنا تھا۔"

"بھٹل ہے میرا نام" پیاس کی شدت سے الفاظ کا گیارہ۔ حلق میں خراشیں ڈالتے ہوئے برآمد ہوئے۔ سہار میں جیسے یہاں چموز کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ خواہ مجھے تم کو بازوؤں پر اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو کر چلنا پڑے۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔" اس کے جھٹکے ہوئے ہونٹ قہر تو رائے "اب تو بانی فاصلہ اسی طرح چلتے ہوئے بھی خیریت سے طے ہو جائیے تو یہ خدا کا خاص ہی کرم ہو گا۔ اب تو ہاڑیاں قریب ہی نظر آ رہی ہیں۔ تم سیدھے کھڑے ہونے کا رسک ہرگز مت لیتا۔ کسی بھی لمحے کسی ڈاکو کی نظر پڑ سکتی ہے۔ میں تو اسی پر حیران ہوں کہ ابھی تک زمین پر اس طرح حرکت کرتے ہوئے بھی ہم ان کی نظر میں کیوں نہیں آتے۔ ڈاکوؤں کی نظر تو بہت تیز ہوتی ہے۔" "ہم یہاں تک خیریت سے پہنچ گئے" اس کے باوجود ہم تھوڑے دور پہ ہو رہے ہو۔ "میں نے اس کا سر سلاتے ہوئے کہا مشکل مراحل

ہاڑیوں سے اتر کر مکان کو گھیرے میں لے کر اس کی طرف بڑھیں گے اور کچھ ڈاکو ہاڑیوں پر ہی نہ کر سکیں گوں کے ذریعے ان کو کور دیں گے۔"

پھر ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "اگر ہم جلد اس دائرے سے نکلے میں کامیاب نہ ہو سکے تو راستے میں ڈاکوؤں سے ہمارا آہستہ سامنا بھی ہو سکتا ہے۔"

"اور ہم بالکل نپٹے ہیں۔" غلام حسین ہونٹوں پر زبان بچھ کر پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

"ہاں" میں نے نہ جانے کیوں اس صورت حال میں بھی غیر ارادگی سے انداز میں سسراتے ہوئے کہا "لیکن تم قدرت کے ایک قلمبے پر ذرا غور کرو۔ ہم نپٹے تھے اور ایک کو غری میں مقید تھے۔ تمہاری ٹانگ اور میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن ہم اس مکان سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں۔ وہاں بہت سے کلا شکوف برادر موجود تھے جو آزاد تھے، سوہرے بندھے تھے، کروہ مرچکے ہیں۔"

غلام حسین نے آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھا۔ میری بات سے اسے گویا ایک نیا حوصلہ ملا۔ میرا اشارہ یاد رکھو اپنی کمر کی تکلیف کو بھول کر ذرا مستعدی سے میرے ساتھ ساتھ مزید آگے نکلتے لگے۔ فضا میں اب بھی اگاؤ کا کوئی کی سننا بہت محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ ہمارے سروں سے کافی اوپر اڑا کر کے کنارے کو بھرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

مطلی دیوار کے وسط میں پہنچنے کے بعد سمت کے حساب سے میں نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں مکان سے دور ہٹنا شروع کرنا چاہیے۔ دیوار سے الگ ہونے کے بعد ہم ٹنگٹوں اور ہاتھوں کے بل اس ہاڑی کی طرف بڑھنے لگے جو درتے سے مقابلہ گزر گاؤں کے قریب واقع تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم زندہ سلامت اس ہاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ڈاکوؤں کی نظر سے بچ کر اس راستے سے گزرنے کی کوئی ترکیب سوچیں گے۔

ابھی ہم نے اس طرح تو زبانی فاصلہ طے کیا تھا کہ غلام حسین منٹایا "یار اس طرح تو کھینچ چل رہے ہیں۔۔۔ میں ہی تکلیف میں ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہارا ساتھ دینا میرے بس کی بات نہیں۔"

"بہت نہ ہند غلام حسین!" میں نے نیچی آواز میں کہا "اگر ہم اس آزمائش سے سرخورد گزرتے تو شاید کبھی کسی ڈرامہ کرے میں لینے لینے اس رات کی یاد ہماری رگوں میں لہو کی گردش تیز کر دیا کرے۔"

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میرے ذہن کے تمام خانوں میں ایسی بہت سی واقعات کی یادیں محفوظ تھیں۔ اس کے بجائے میں نے کہا "اگر تمہارے کھینچنے چل رہے ہیں تو اس طرح چلو۔" میں نے اسے ہاتھوں اور پیروں کے پنجوں کے بل چل کر دکھایا جس میں کھینچنے

تو ہم نے سر کر لیے ہیں۔ انھوں نے توڑی بہت اور کرو۔ تم کیسے اٹھال ہو؟ میرا تو خیال تھا اٹھال کی روح بڑی طاقتور اور اس کی قوت ارادی بہت مضبوط ہوتی ہوگی۔

”میرے دماغ سے اٹھاب۔ سیاست۔ سب کچھ نکل چکا ہے۔ میں ہر جگہ سے تاب ہو چکا ہوں۔ میں تو شاید اس وقت زندگی سے بھی تاب ہو چکا ہوں۔ مجھے اب زندگی سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں نہیں لیت کہ آرام و سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ خدا حافظ افضل“ میرے دوست اکاش تم سے کچھ ایسے حالات میں ملاقات ہوئی ہوگی۔

اس نے پوچھا آنکھیں بند کر لیں جیسے اسے یقین ہو کہ فرشتہ اجل اس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوا زور سے جھٹکا تو اسے آنکھیں کھولنا پڑیں۔

”کچھ اس مت کرو۔“ میں نے اسے ڈانٹا ”اگر تم سے نہیں چلا جاؤ تو میری بیٹی پر سوار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لے چلوں گا پورے قسم کے اٹھال!“

”نہیں۔۔۔ اب مجھے اپنی جان پر اتنا بھی بوجھ مت عائد“ آخر کار وہ گراہ کر ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ میرے اصرار کے باوجود وہ میری بیٹی پر سوار نہیں ہوا اور ایک بار پھر پہلے کی طرح میرے ساتھ گھٹنے لگا۔

مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد زمین یکدم ہی کچھ زیادہ ٹھنکی سی ہو گئی۔ ہم اس شب میں اتر گئے۔ وہاں مٹی مٹی محلی اور مجھے پانی کی ”خوشبو“ بھی محسوس ہوئی۔ پھر سامنے نہایت خفیف سی جھلکناٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ایک بہت بڑی کڑائی سے مشابہ اس ٹھنکی جھلکے کے مرکز میں چھوٹا سا ایک چشمہ موجود تھا۔

ایک لمبے کے لیے میں بالکل دم بخود سا ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ بہت غیب کی کہی عجیب مہربانی تھی کہ ہم فطرتِ اعلیٰ میں فطرتِ خیر ارادی طور پر مجھے پر آئیے تھے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ میں نے وہ نہ تو گراہ گاہ تک پہنچنے کے لیے جو بہت تنگ ہے کہ اس کے راستے میں چشمہ بھی نہ پڑا ہو گا۔

مجھے ایک اور خیال نے بھی حیران کر دیا تھا۔ وہ جہاں کا خیال تھا۔ میں یہاں تک کا فاصلہ طے کر کے آیا تھا اور مجھے ہی معلوم تھا کہ یہ فاصلہ میں نے کس طرح طے کیا تھا۔ جہاں بکری کی کندھ کی کھال بکس پر لپیٹ کر گردن پر بکری کی ہری بانہہ کر کہاں تک آئی تھی اور پھر پانی سے بھرا تھوڑا سا بہت پر بانہہ کر واپس بھی گئی تھی۔ کیا کوئی اس کے اس احسان کا صلہ دے سکتا تھا؟ کیا کوئی اس بھگندگی و محبت کی جرأت و بہت کی داد دینے کے لیے الفاظ تلاش کر سکتا تھا؟

میں غلام حسین کو تیزی سے آگے لپکتے دیکھ کر اپنے خیالات کی دہائی سے باہر آیا۔ غلام حسین کو ذرا تاخیر سے پانی پھر آیا تھا اور اس کے ہم میں گویا زندگی کی نئی لہر دو گئی تھی۔ وہ چوہا یوں کی طرح

پانی تک پہنچا اور سنبھل نہ سکا۔ غراب سے منہ کے بل پانی میں گر گیا۔

وہ سنبھل کر اٹھ گیا لیکن چوہا یوں ہی کی طرح کھڑے کھڑے پانی سے منہ لگا کر پینے لگا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ کر اسی طرح پانی پینے لگا۔ میرے ہاتھ تقریباً کمینوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وہ میری زندگی کا عجیب سی تجربہ تھا۔ برسوں بعد شاید مجھے پانی اتنا لذت محسوس ہوا تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ پانی گندایا خراب تو نہیں۔ اس میں کوئی آمیزش یا آلودگی تو نہیں۔

غلام حسین نے زیادہ پانی نہیں پیا۔ چند سیکنڈ ہی ٹرپ ٹرپ اور غرب غرب کرنے کے بعد وہ پیچھے بہت کر جھٹکے کے کنارے جت لیت گیا وہ آنکھیں بند کیے ہاتھ رہا تھا۔ میں نے پانی سے منہ نہیں ہٹایا۔ وہ گویا آبِ حیات تھا جو گھونٹ گھونٹ میرے منہ سے میں اتر رہا تھا اور دگ دپے میں نئی زندگی کی لہر دو رہی تھی۔

اسی دوران ایک اور احساس نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس وقت اس طرح پانی پینے میں مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ اس انکشاف پر مجھے دل ہی دل میں حیرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ کیسں اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ہر انسان کے اندر ایک درندہ چھپا ہو یا ہے جو مختلف مواقع پر مختلف انداز سے سامنے آسکتا ہے اور اپنی جبلت کا اظہار کر سکتا ہے۔

مجھے اندہ میرے میں چوہا یوں کی طرح پانی پیتے ہوئے مجھے ان فانیہ اشارہ ہو گئے کہ ابھی خیال آیا جہاں میری نشست و برخاست رہتی تھی۔ میرے لیے خوشبو بھی پھلتا ہوا اور اسٹراٹوز بھی کھولتے پانی سے جراثیم سے پاک کیا گیا گلاس آتا تھا جس میں میں قطرہ شدہ پانی پیتا تھا۔ فانیہ اشارہ ہو گئی میں عموماً پانی کے لیے قطرہ لانا بھی لگا ہوتا ہے۔ میری جو کڑھی چاہ ہو چکی تھی اس میں بھی قطرہ لانا موجود تھا۔

لاہور میں پانی ٹوب دلوں کے ذریعے چلائی جاتا ہے۔ زمین کا پانی چٹا ہوتا ہے لیکن ایک بار میں نے ایک رسالے میں سائنسی رپورٹ دیکھی کہ زمین کا پانی قدرتی طور پر قطرہ شدہ تو ہوتا ہے لیکن پینے کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ اسے ایک بار پھر قطرہ کر لیا جائے چنانچہ میں نے گھر میں نصب کرانے کے لیے چھوٹا سا ایک قطرہ لانا جرمنی سے منگوایا تھا۔

مجھے ان سارے اختلاط اور اہتمام کے بارے میں سوچتے ہوئے پھر اپنی موجودہ حالت پر غور کرتے ہوئے ایسی آگئی۔ اللہ اللہ کیا تضاد تھا! کیا فرق تھا!

بہت شرمندہ خیال میں زیادہ پانی پی جانا اکثر نقصان دہ ہوتا ہے لیکن اس وقت مجھے اس بات کی بھی پرا نہیں تھی کہ میں پانی پیتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے منہ کے ایک

میں نے مگر مکان کی طرف دیکھا۔ اس کی چار دیواری میں تاریخی  
ی روشنی رقص کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ  
مکان میں یہ ستور الگ الگ ہوئی تھی لیکن زیادہ نہیں بچ سکی تھی۔  
شاید پنج گنا شیش مٹی کی ہماری بھر پور دیواروں نے آگ کا راستہ روک  
لیا تھا۔

مکان کے اندر کا منظر تو ظاہر ہے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن  
احساس ہی ہو رہا تھا کہ اندر کسی قسم کی نقل و حرکت نہیں ہو رہی  
تھی۔ جہاں ہم پہنچ چکے تھے اس واسطے سے مجھے ایک جگہ سے  
مکان کی چار دیواری بھی ٹوٹی ہوئی نظر آئی لیکن شکاف زیادہ بڑا  
نہیں تھا۔ اس میں سے صرف ایک ٹوٹی پھٹ کا ٹکڑا ہوا حصہ نظر آ رہا  
تھا جس پر ایک شعلہ پھڑپھڑا رہا تھا۔

اوپر ہمارے پاؤں پر بھی سکوت طاری تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا  
کہ ان کے پھیلنے کی طرف ڈاکو اوپر ہی چڑھے ہوئے تھے یا اتار آئے  
تھے۔ ابھی تک کوئی ڈاکو ہاڑی کے عقب سے نکل کر سامنے آنا  
بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ان کا کڑا سرا راند اچھے زیادہ تشویش میں  
جلا کر رہا تھا۔ آخر وہ کبوت کی طرح کیا کر رہے تھے؟

کیا پیش قدمی کرنے کے لیے وہ میخ کا نظارہ کر رہے تھے؟ مگر یہ  
تو ایک حماقت ہوئی۔ دن کی روشنی میں تو مکان کے اندر گرد پھلا ہوا  
میدان عبور کرتے وقت وہ خود بڑا واضح ٹارگٹ بن جاتے۔ اگر  
مکان میں کوئی ایک کلا شیف بردار بھی زندہ ہو تا تو وہ چار دیواری  
کی آؤں میں رہتے ہوئے ان میں سے بہت سوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔  
تو پھر آخر وہ کیا کر رہے تھے؟

میں نے اس سوال میں سر کھپاتا ترک کر کے غلام حسین کو  
پچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہاڑی کے دامن میں ہی رہتے ہوئے ہم  
خز کو شیش کی طرح اچھلتے دوڑے مارا رستے کی طرف بڑھے۔

ہم اس ہموار اور نہایت کشادہ گھنڈی کے کافی قریب پہنچ  
چکے تھے جب اچانک ہی ہمیں گھوڑے کی تیز بہنا ہٹ سنائی دی۔  
گھوڑا ہاڑی کے دوسرے طرف کبھ پہنچا تھا لیکن فاصلہ زیادہ  
نہیں تھا۔ تدرت نے ایک بار پھر تاری مدد کی تھی۔ یہ آواز  
ہمارے لیے گویا خطرے سے خبردار کرنے والا گنگل ثابت ہوئی۔

ہم سے چند قدم آگے ایک جھاڑی موجود تھی۔ ہم لپک کر  
اس کی آؤں میں سینے کے بل لیٹ گئے۔ ہم سے یہ احتیاط بروقت ہی  
ہو گیا ورنہ ہم تو سیدھے گھنڈی کی طرف ہی جا رہے تھے۔ اگر ہم  
مکھ اور آگے پہنچ گئے ہوتے تو وہ دن ہمارے لیے دھڑمک رہا ہوتا  
ہو تا کیونکہ دوسرے ہی لمحے بیک وقت کئی گاڑیوں کے انجن  
اشارت ہونے اور کئی گھوڑوں کے ہنسنے کی آوازیں بلند  
ہو سکتی۔

آوازیں ہاڑی کے دوسری طرف سے سنائی دی تھیں۔ چند  
ہی لمحے میں وہ تیزی سے قریب آئیں اور پھر ہم نے خاسے غلی  
سے انداز میں دوسرے سے چار جھپٹیں اور پھر گھوڑے نمودار ہوئے۔

ایک بڑی سی منگ نے لمبی لپی ہے۔  
آخر کار جب پانی طلق کے راستے اٹ کر واپس آنے لگا تب  
میں نے چٹا بند کیا اور غلام حسین ہی کی طرح جھٹے کے کنارے جٹ  
لیٹ گیا۔ نہ جانے کیوں اس وقت میرا کسی نسل کی طرح ڈگرانے کو  
پتی چاہ رہا تھا۔

آخر میں نے دل ہی دل میں خود ہی اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اب  
ایسی بھی کیا حیوانی جبلت کہ انسان کا ڈگرانے کو دل چاہئے لگے۔  
مجھے انسانی کمال میں ہی رہنا چاہیے تھا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنی  
حالت بہتر محسوس کی تو میں اٹھ بیٹھا۔

جھٹے سے مزید استفادہ کرنے کے لیے میں نے ہاتھ منہ اور  
پاؤں ابھی طرح دھوئے حالانکہ مجھے معلوم تھا اس کا کوئی خاص  
فائدہ نہیں ہوگا۔ چند منٹ بعد پھر وہی حالت ہو جانے کی لیکن اس  
سے طبیعت میں بڑی تازگی اور فرحت آگئی۔

لیکن اس کام سے فارغ ہو کر جب میں نے از سر نو اپنے  
گرد و پیش کا جائزہ لیا تو وہ تازگی اور فرحت فوراً رخصت ہو گئی۔  
قریب ترین ہاڑی جو درہ نما راستے کے بھی قریب ہی تھی ایک  
بہت بڑے پتوں کی طرح دکھائی دے رہی تھی اور اس کی بلندی پر  
چھوڑا سا ایک اور پہلا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ زراعی پڑائی تین ٹانگوں والے اسٹینڈر نصب ایک مشین  
کن کا پہلا تھا لیکن اس کے عقب میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا  
تھا۔ رات کے سناٹے اور تاریکی میں اس قسم کی چیزوں کے پتوں  
زیادہ خوف ناک سے دکھائی دیتے ہیں۔ ٹارگٹ اس وقت بالکل بند  
تھی۔ معلوم نہیں ڈاکو اس وقت ہاڑیوں کے عقب میں کیا کر رہے  
تھے اور کیا حکمت عملی اختیار کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں انہوں نے ہاڑیوں سے اتنا  
شروع نہ کر دیا ہو۔ اگر انہوں نے اب مکان کی طرف پیش قدمی کا  
فیصلہ کر لیا تھا تو واقعی راستے میں ان سے مدد بخیز کا شدید خطرہ تھا۔

میں نے غلام حسین کو اشارہ کیا اور ہم نے ایک بار پھر  
چوڑیوں کی طرح سفر شروع کر دیا۔ میں تو بانی بی کر اپنے آپ کو کافی  
تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن غلام حسین کچھ ست پر کیا تھا تاہم وہ  
میرا ساتھ دینے کی حلیا مکان کو شیش کر رہا تھا۔

غیبت یہ تھا کہ جن جنوں ہم ہاڑی کے نزدیک ہوتے جا رہے  
تھے راستے میں جھاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی وجہ  
سے لگتے اندھیرے میں ہمارے دیکھنے کے لیے جانے کا امکان بڑھ کر ہو رہا  
تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ پہلے ہم ہاڑی کے دامن میں پہنچیں پھر اس  
سے گزر کر دروازے میں چکر کاٹ کر درہ نما راستے تک پہنچیں۔ اس  
سفر کے لیے ہمیں کم از کم ایک طرف سے ہاڑی کی ادھ مینٹر

میرے لیے یہ بات خاصی حیرت کا باعث بنی کہ ہم خیر و عافیت  
پہنچاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ اس دوران سکوت ہی طاری رہا۔

تھے۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ پہاڑی کے دوسری طرف کوئی موجود نہیں ہے تو ہم نے گنڈ غڑی کے کنارے تیز دوڑنا شروع کر دیا۔ میں نے گڑھ کر یہ بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ڈاکوؤں کو مکان کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا یا نہیں۔ ہمیں تو اس وقت اپنی پڑی ہوئی تھی تاہم عقب سے فائرنگ کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔

گنڈ غڑی پر زیادہ اندراج محسوس ہوا تھا اس کے باوجود ہمیں اپنا سفر آسان نکلنے لگا تھا۔ ایک تو راستہ ہمارا تھا دوسرے ہمیں چڑیاؤں کی طرح یا خرگوشوں اور میٹھکوں کی طرح چھوک چھوک کر نہیں چلنا پڑا تھا۔

جلدی گنڈ غڑی معدوم ہو گئی۔ ست کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ چاند بھی معدوم تھا۔ میں اپنی دانت میں اسی ست میں بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جدھر سے بلال شدید دھبہ کے ساتھ جھبھٹ میں آیا تھا حالانکہ اسی ست میں سفر کرنا کوئی عقلمندانہ فیصلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت ہم جھبھٹ میں تھے اور گھنٹوں ہم نے صرف درازوں ہی میں سفر کیا تھا اور نہ جانے کتنی مرتبہ ڈرائیور نے کس کس سمت میں گاڑی موڑی تھی۔ اب بھلا یہاں اس طرف سفر کر کے میں کہاں پہنچنے کی امید رکھ سکتا تھا؟

بہر حال ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ بس چلے رہیں اور ڈاکوؤں سے زیادہ سے زیادہ دور بھاگنے کی کوشش کریں لیکن جلد ہی ہمیں ست بدلنا پڑی۔ جس طرف ہم جا رہے تھے اُدھر تقریباً چالیس پچاس قدم آگے مجھے ایک ٹیلہ سا دکھائی دیا اور میری چھٹی من سے مجھے خیوا دکھائی کہ اس ٹیلے کے عقب میں کوئی موجود تھا حالانکہ ہمیں کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی کوئی حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔

میں نے غلام حسین کا ہاتھ پکڑا اور اس ٹیلے سے کھڑا کر گرنے کے لیے حکم دیا میں طرف مڑ گیا۔ غلام حسین بے چارہ اپنے آپ کو اپنی بیاض سے بڑھ کر مضبوط آدمی ثابت کرنے کی کوشش تو کر رہا تھا لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ تقریباً گھٹک رہا تھا۔

وہ میرے ساتھ رہنے اور فرار میں کامیاب ہونے کے معاملے میں اتنا زیادہ پرجوش بھی نہیں تھا۔ قید خانے میں اس نے نہ جانے کتنا عرصہ گزارا تھا۔ اس کی روح خاص پڑمرو بھی یا پھر شاید بات مزید یہ تھی کہ وہ بہر حال ایک عام سا آدمی تھا اور جس صورت حال سے ہم گزر رہے تھے وہ ایک عام آدمی کے لیے نہایت اوصاف چکن تھی۔

لیکن میری شدید خواہش تھی کہ وہ میرے ساتھ چلا رہے اور اگر میں اپنی فرار کی کوششوں میں کامیاب ہو جاؤں تو وہ میرا ہم قدم ہو۔ وہ ایک اچھا آدمی معلوم ہوا تھا اور اچھے آدمی میری کمزوری تھے۔

دیکھ سکتے تھے کہ چارو یکدم ہی تاریا ہو گئی تھی۔ ہمیں نہایت تیز رفتاری سے گرجتی دھول آوازی اور ادھر ادھر لڑائی مکان کی طرف روانہ ہوئی تھیں اور گونے سے بھی ان کا ساتھ دینے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ چپوں میں اور گھوڑوں پر سوار کئی ڈاکو طوفانی اور خالص "ڈاکوانہ" انداز میں راستوں اور سب مشین گھول سے فائرنگ کر رہے تھے۔

انہوں نے محسوس کیا کہ شکست دینے کی کارروائی تو مکمل کر لی تھی۔ اب وہ فکار پر آخری وار کرنے کے لیے اچانک اور نہایت بھرپور طریقے سے آگے بڑھے تھے۔ انہوں نے درمیان فاصلہ بہت تیز رفتاری سے اور ایک ہی سمت سے طے کرنے کی حکمت عملی اپنائی تھی تاکہ اگر مکان میں ایک آدھ یا اس سے زیادہ کلا شخوف برادر بھی زندہ ہوں تب بھی ڈاکوؤں کو زیادہ جالی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

پہاڑیوں کے عقب میں اسی لیے اتنی دیر سے سکوت بھجایا ہوا تھا کہ وہ سب پیچھے ہی پیچھے پہاڑیوں سے انٹر کر ایک جگہ جمع ہو رہے تھے اور یکدم دھاوا بولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میری دھڑکنیں تو اس تصور سے تیز ہو رہی تھیں کہ اگر ہم چند لمبے پہلے گنڈ غڑی کے قریب پہنچ گئے ہوتے تو ہمارا کیا انجام ہوتا؟ گوکہ ڈاکوؤں نے اپنی چپوں کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں لیکن ان کی فکر ضرور ہم پر رہ جاتی اور اگر ہم اُدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرتے تب بھی بالکل اسی طرح مارے جاتے جس طرح فکاروں کے بقول وہ جنگلی خرگوش مارے جاتے ہیں جو بے خبری میں اچانک ہی بھڑاڑیں یا بھبھڈوں سے نکل کر ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اب وہ ہم سے صرف پچیس تیس قدم کے فاصلے سے گزرے جا رہے تھے لیکن اس وقت وہ یقیناً بہت جوش میں تھے۔ ان کی تمام تر توجہ صرف مکان کی طرف تھی اس لیے ہمارے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ویسے بھی ہم بھاڑی کی اوٹ میں تھے۔ کسی کو وہاں ہماری موجودگی کا شبہ ہوا تو اُدھر وہیں متلاش کرنا بھی ہم کسی کی نظر میں آسکتے تھے۔

جس وقت ہم اپنا سفر طے کر رہے تھے اس دوران ڈاکو یقیناً پہاڑیوں کے عقب میں بھاڑی سے انٹر کر جمع ہو رہے تھے شاید اسی لیے کسی ہماری موجودگی کا شبہ تک نہیں ہوا تھا۔ اب وہ ہمارے سامنے سے گزر گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم نے اپنے سفر کا مشکل ترین مرحلہ سر کر لیا تھا۔

ڈاکو ہم سے خاصی دور اور مکان کے کافی قریب پہنچ چکے تو ہمیں نے غلام حسین کو اشارہ کیا اور ہم اُنہ کر اب چڑیاؤں کی طرح چلنے کے بجائے روکڑی کی حالت میں دوڑنے ہوئے گنڈ غڑیوں کی طرف بڑھے۔

وہ خاصے میں پہنچ کر ہم رگ گئے پھر غلام انداز میں چند قدم آگے بڑھا۔ ہم چوہوں کی طرح چوک چوک کر قدم رکھ رہے

ظلمی سرزد ہوئی۔ یا پھر شاید اس کی تقدیر کا اختتامی باب کچھ اور طرح تھا کہ وہ دوڑنا چلا گیا۔

وہ چند قدم سے زیادہ نہ دوڑ سکا۔ اسٹین گن گرنی اور وہ ہاتھ وار زمین پر بہت دور تک تھابازیاں کھا گیا۔ میں نے اس کے پوشیدہ لباس میں سوراخ نمودار ہوتے اور پھر انہیں خون سے رنگین ہوتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ساکت ہو گیا۔ یہ سب کچھ گریا سلووشن میں ہوا تھا۔

وہ مڑی مڑی ہی حالت میں اس طرح مجھ سے کچھ دور پڑا تو جیسے بچوں نے کسی گڈے سے کھیلنے اور دل بھرنے کے بعد اسے تو پھوڑ کر پھینک دیا ہو۔ ایک طرف سے اس کا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ چہرہ کو مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ زبان منہ سے باہر نکلی تھی۔

میری دھڑکنیں یک لخت جیسے ختم ہو گئیں۔ اس بے چارے نے تو میری رفاقت کا سارا پار اپنی بھلا سے بڑھ کر جدوجہد کی تھی۔ نہایت جاں فدا عمل مرطوں سے وہ گزر گیا تھا اور اب بچہ بیکراں فضاؤں میں آزادی کی سانس لینے کا عمل شروع ہوا تھا۔ دس دس ہاتھ تو یک لخت ہی سانسوں کی ذور کاٹ دی گئی تھیں۔ یہ ہر ہی وحشتانہ ذائقہ تھا!

میرا جسم بھی کی طرح اکڑ کر رہ گیا تھا کیونکہ میرے خیال میں دوسرے ہی لمحے میرے جسم میں بھی گولیاں پھوسکتے تھے۔ وہاں جیسے یہ انتظار شاید ایک آدھ سیکنڈ ہی مشکل رہا ہو لیکن اس کی اذیت اور طوالت کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس اندازہ بھی صرف وہی کر سکتا ہے جسے بھی ایسا انتظار کرنے کا شوق ہوا ہو۔ موت جس کے قریب سے سرگوشی کرتی ہوئی گزری ہو۔ لیکن وہ سراپا بہت نہیں مارا گیا۔ جتنی ذہن پر زور دار مرکز آواز کے ساتھ جیب میرے عقب میں تھن رکھی۔ میں نے آٹھویں سے پیچھے دیکھا۔ وہ بیچھے ڈاکو کی جیب ڈاکو کی دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی ایک کھلی جیب تھی اور اس میں صرف انفرادی موجود تھے۔

ایک ڈراٹو کر رہا تھا دوسرا اس کے برابر اسٹین گن بٹھا تھا۔ جیب دہی تو وہ دونوں ہی چھلانگ لگا کر اتر آئے اور میرے قریب آگئے۔ اسٹین گن والا مجھے گور کیے کھڑا رہا۔ ڈراٹو کہ والا دوڑ کر غلام حسین کے قریب پہنچا۔ اس کی لاش کو سپا کر کے یوں اس کا چہرہ بخور دیکھنے لگا جیسے بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے غلام حسین کے پاؤں میں بندھی ہوئی بھاری ڈنڈا سراسیمہ ہاتھ میں اٹھا کر رکھا۔

اس کے ہاتھوں میں گن تھیں تھی لیکن اس کی کر کے مرنے رستے کی طرح جل گیا ہوا ایک سیاہ پٹا بندھا ہوا تھا۔ میں ایک ماڈر اڑسا ہوا تھا۔

غلام حسین کا معائنہ کر کے وہ واپس آیا اور اپنے ساتھی

میں جو تھک کے سے انداز میں دوڑ رہے تھے۔ سست تبدیل کر کے ہم چند قدم ہی بڑھے تھے کہ غلام حسین کا پائس کسی چھوٹے سے گڑے میں آگیا جس میں پہلا تھک چکا تھا۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھل گیا اور وہ اوندھے منہ کر گیا۔ اس کے گرنے سے ابھی خاصی دھپ کی ہی آواز پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے زوردار گراہ بھی نکلی۔

میں نے جڑوا کر گڑ کر دیکھا۔ مجھے ٹیلے کے عقب میں ہلکی سی کھڑکڑاہٹ اور کچھ حرکت کا احساس ہوا۔ اس وقت مجھے حیرت کا جھکا سا لگا جب دوسرے ہی لمحے میں نے کئی جیب کا انجان اشارت ہونے کی آواز سنی۔ اور میں غلام حسین کو بھیج کر کھڑا کرنے میں کامیاب ہوا اور دوسرے ٹیلے کے عقب سے ایک جیب نکل آئی۔ "غلام حسین... جتنا تیر بھاگ سکتے ہو بھاگ..." میں نے سرگوشی میں کہا کیونکہ ہمارے آس پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

اس نے بھی میری طرح بچوں کے بل بھاگنے کی کوشش کی تاکہ ہمارے قدموں کی آواز پیدا نہ ہو لیکن ہماری اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔ جیب ہمارے ہی تعاقب میں آ رہی تھی۔ اس کی ہڈی لاشیں تو دشمن نہیں ہوئی تھیں لیکن ہمارے پیچھے بے یقینا دیکھ لیے گئے تھے۔

میں دل ہی دل میں ڈاکو کی سی مہارت اور تجربہ کاری کی داد دیتے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ مکان میں محصور لوگوں کے لیے بھی کوئی تک پہنچ سکتی تھی۔ شاید کوئی اچانک ہی اس طرف آگیا اور وہ بال بال شدید دھیرو کا مددگار ہو آیا ویسے ہی کوئی ایسا فرد یا افراد اس طرف آجاتے جو صورت حال میں مداخلت کرنے کے قابل ہوتے۔

اسی لیے ڈاکو نے اس ایک جیب اس مقام پر بھی کھڑی کر رکھی تھی۔ یہ گولیاں ان کی جائے واردات کی "سیریز" تھیں۔ انہوں نے اپنے حکموں کے گرد جس طرح گھیرا ڈالا ہوا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی آکر ان کی کارروائی میں غلط ڈالے یا ان کی یکسوئی کو متاثر کرے۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں بہت تیز بھاگا اور غلام حسین نے بھی بہت کر کے میرا ساتھ دیا لیکن انجمن کی فراہم تیز ہوئی اور وہ اس سے زیادہ تیز رفتار دی سے ہمارے تعاقب میں آئی۔ اس کی ہڈی لاشیں بھی دشمن ہو گئیں اور ہم دونوں دشمنی میں نہا گئے۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے ہم دونوں سر ہزار مرغاں ہو گئے ہیں۔

انجمن کی فراہم سے بلند تر کسی کی گرج تھائی وہی "مرک جاؤ" اس سے آگے کچھ نہیں کہا گیا تھا لیکن ان دونوں لفظوں میں جو دھمکی پوشیدہ تھی میں نے اسے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر محسوس کر لیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر فوراً رک گیا لیکن غلام حسین سے

منٹ میں کچھ ہو جائے گا۔ قابو میں نہیں آیا تو گریڈ مار میں گئے۔  
دوسری طرف سے جواب ملا۔

ماڈر والا اسے شرم دلانے کے سے انداز میں بولا "اڑے۔  
اوجھڑے سے دو قیدی نکل کر یہاں تک پہنچ گئے، حمیس پانی  
نہیں چلا۔"

"کونسی بات نہیں، دفع کرو ان کو، کوئی مارو۔" دوسری طرف  
سے بے پروائی سے کہا گیا۔

"ایک کو تواری دی ہے دوسرے کو بھی مار دیں گے۔" ماڈر  
والے نے کہا "وہیے اس نے کام کی بات بتائی ہے۔ سونا اوجھڑے  
ہوئی گاڑیوں میں کسی گاڑی میں سے پہلے اس کو قابو کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" دوسری طرف سے جواب ملا اور ماڈر والے  
نے واکی ٹاکی دوبارہ قبضے کے نیچے کہیں اڑا لیا۔ اس دوران اس  
کی نظر مسلسل جھجھ رہی تھی۔ اس کا ماڈر اب بھی کمرے بندھے  
کپڑے میں ہی اڑسا ہوا تھا۔ اس نے اسٹین گن والے کو اشارہ  
کیا۔ یہ اشارہ اہل تھا۔

اس نے گویا بہ زبان خوشی کہا تھا "اڑا دو اسے بھی۔"  
میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھے اسے انہیں کیا خطروں کا پاش  
تھی؟ غلام حسین اگر جلد بازی میں ان کے ہاتھوں قتل ہو بھی گیا تھا  
تو اب مجھے قتل کرنے کا جتھہ کیا تھا؟ اس سے وہ کون سا فائدہ  
حاصل کرنا چاہتے تھے؟

غلام حسین کی لاش اب بھی میری نظروں کے سامنے تھی اور  
میری کھوپڑی میں اس وقت سے نہایت تیزی کے ساتھ بارود کا  
ایک ڈھیر جمع ہو رہا تھا جب سے میں نے اسے گولیاں کھا کر مرنے  
دیکھا تھا۔ اس بے ضرر اور شریف آدمی کی زندگی کا سفری یوں تو  
رائیگاں گیا تھا لیکن میرے ساتھ ایک نئی امید کا دامن تمام کمراس  
نے جیسے ہاں سوز مرے سے گزر کر آزادی حاصل کی تھی اس کے  
بعد اس کا ایک حقیر جانور کی طرح مارے جانا میرے دل پر بڑی گہری  
خراش ڈال گیا تھا۔

ماڈر والے نے اسٹین گن والے کو اشارہ کر کے میری موت  
کا حکم صادر کیا تو کچھ میری کھوپڑی میں ابھرے ہوئے بارود کے ڈھیر  
کو چنگاری مل گئی۔ میرے ملنے سے انہوں نے یقیناً مجھے ایک  
مخلوک الحال اور گیارہ گراں مالی ہی سمجھا ہو گا۔ اس کے باوجود نہ  
جانے کیوں ہلاک کر ڈالنا ضروری سمجھا تھا۔ شاید غیر ضروری ہتھیار  
ان کی نظر میں شامل ہو چکی تھی۔

بہر حال اپنی لاشوری خداداد کی وجہ سے اسٹین گن والا بے  
خیالی میں میرے کان قریب آچکا تھا جتنا اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔  
اس سے پہلے کہ ٹریڈر اس کی انگلی کا رباڑ بڑھتا "میرا ہاتھ اتنی  
تیزی سے گن کی مال پر پہنچا کہ وہ بروقت دیکھ نہ سکا۔

ایک ہاتھ سے گن کی مال آستان کی طرف کرتے ہوئے میں  
نے اس کے پیٹ میں لات رسید کی اور دوسرے ہی لمحے گن

قاب ہوا "یہ تو قیدی معلوم ہوتا ہے۔"  
اس کے لمحے میں یہ تاثر تو تھا جیسے وہ کتنا چاہ رہا ہو کہ ہم نے  
خدا خواہی اسے مارنے کی دھت کی لیکن لمحے میں تانت ہرگز  
نہیں تھا۔ غلام حسین گویا ایک بے وقت جانور یا کیرا کھوڑا تھا جو  
اپنی غلطی یا ان کی جلد بازی سے مر گیا سو مر گیا "اس میں انسو کی یا  
پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

پھر اس نے خود غواہی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے  
پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ لوگ سندھ میں بات کر رہے تھے۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی  
سندھی میں جواب دیا "میں بھی قیدی ہوں۔" پھر میں نے پیچھے کی  
طرف اشارہ کیا "میں بھی اوجھڑے پر قید تھا۔ آپ کے ساتھیوں  
نے راکٹ پیچھے تو تھاری کو فخری ٹوٹ گئی اور ہم نکل بھاگے۔"  
"لیکن تمہارے پیڑ میں ذخیرہ نہیں ہے۔" اس نے مجھے گھورا۔

"میں ابھی نیا قیدی تھا۔ کل رات ہی پہنچا تھا۔ کو فخری میں  
اس کے ساتھ بند تھا۔" میں نے غلام حسین کی طرف اشارہ کیا  
"کو فخری میں دوسری ذخیرہ نہیں تھی۔ میرے صرف ہاتھ رہی سے  
بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کھولے تھے۔"

اسٹین گن والا کچھ اور قریب آیا۔ اب وہ بھی میرے تقریباً  
سامنے ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی خیال کی چمک ابھری تھی۔  
ہمارے عقب میں بیپ کا انجن بدستور گھر گھر رہا تھا اور بیڈلائس  
آن تھیں۔

اسٹین گن والے نے کچھ کمراتی آواز میں کہا "اڑے۔ تم  
قیدی ہے اڑے سے بھاگے۔ تم کو کچھ پتا ہے اوجھڑے کو اب آزادی  
کا سونا کھڑ کر کھا ہے؟"

"آپ لوگوں کے راکٹ پیچھے سے پہلے تک کا تو مجھے پتا  
ہے۔" میں نے اوب سے جواب دیا "اڑے پر اندر تین چار  
گولیاں کھڑی ہیں۔ خواب آزادی نے اپنی بھد سے نکلوا کر ان میں  
سے کسی میں رکھ دیا تھا۔"

اب گویا اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ انہیں سونے کے  
بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ اسٹین گن والے نے ماڈر  
والے کو اشارہ کیا اور اس وقت مجھے حیرت کا لکھا سا جھٹکا لگا جب  
اس نے اپنی ڈھیل ڈھالی قبضے کے نیچے اپنے ہاتھ وال کر نہایت عمدہ قسم  
کا ایک واکی ٹاکی نکالا اور اس کا ٹین دباتے ہوئے "ایرل باہر  
نکلے ہوئے اسے منہ کے قریب لایا۔

"دوسری طرف رابطہ قائم ہونے پر پہلے تو چند قانون کی آواز  
نٹائی دلی پھر کسی کی کھوپڑی ہی تو آواز ابھری۔

"کیا پوچھ رہے ہیں؟" ماڈر والے نے پوچھا۔  
"آؤںی اندر کو دیکھتے ہیں لیکن ایک آدمی کمرے میں بند ہو گیا  
ہے۔ اس کے ساتھ شاید عورتیں بھی ہیں۔ دیکھتے ہیں منٹ دو

میرے ہاتھ میں تھی۔ ماڈور والے نے انتہائی گھڑتی سے پیچھے ہٹے ہوئے کر میں باندھا ہوا ماڈور نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اس کاموقع نہیں دیا۔

شاید اس کے دہم دکان میں بھی نہ رہا ہو کہ میں گن کے استعمال میں اتنا اہل ہو سکتا ہوں۔ دوسرے ہی لمحے ایشین گن گرتی اور ایک ہی برست میں دونوں کا قہقہہ تمام ہو گیا۔ وہ دونوں اچھل کر پیچھے جا کر سے اور ساکت ہو گئے۔

غلام حسین کی لاش کے قریب جا کر میں نے صرف اتنا کہا "صاف کرتا دوست۔"

ایشین گن میں نے اس کے قریب ہی پھینک دی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا تھا کہ ایشین گن ساتھ ہی رکھ لوں لیکن پھر ارادہ بدلتی کر دیا حالانکہ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ میں اب وہاں مزید رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں جلدی سے ڈاکوؤں کی جیب میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں اپنی دانت میں اب بھی اسی راستے پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے ڈال شیدی وغیرہ بھیجے لائے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح کھد کوٹ یا کشور واپس پہنچ جاؤں لیکن اس دیرانے اور تاریکی میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میں درحقیقت کس طرف جا رہا تھا۔

مردوست مجھے اس کی کوئی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ میرا مقصد تو کسی آبادی میں پہنچنا ہی تھا۔ کھد کوٹ یا کشور نہ سہی کوئی اور شہر سہی۔ جیب زیادہ اچھی کنڈیشن میں نہیں تھی لیکن جیب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر حال میں بھانگی رہتی ہے۔ کوئی بہت ہی بڑا نقص ہو جائے تب شاید رکتی ہے ورنہ یہ بڑا ساتھ دینے والی سواری ہے۔ میں اسے حتی الامکان تیز رفتاری سے بھگائے لیے جا رہا تھا۔

راستے میں 'میں نے جیب میں ذرا ادھر ادھر نظر ڈالی تو اگلی سیٹوں کے نیچے کیوس کا ایک بڑا سا بیگ پھنسا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے گاڑی روک کر اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں پنڈ گریڈ اور مختلف گنوں کے بہت سے بیگزین بھرے ہوئے تھے۔ میں نے وہ تھیلے بھی اٹھا کر راستے میں پھینک دیے۔ میں چاہتا تھا کہ اگر اچانک کہیں قانون کے محافظوں سے سامنا ہو جائے تو میں ایشین زیادہ سے زیادہ بے ضرر حالت میں لوں۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد بھی میں دیرانے میں ہی رہا۔ حتیٰ کہ جیب ریڑھ پر لگ گئی۔ پھر ریڑھ پٹیروں بھی ختم ہو گیا۔ جیب کے پیچھے پٹیروں کا بڑا سا ایک فاضل ڈبا لگا ہوا تھا۔ اس میں تین چار لیکن پٹیروں موجود تھا۔ میں نے وہ بھی ٹینک میں اٹھیل لیا اور سفر جاری رکھا۔

پٹیروں پر چلنے والی جیبیں پٹیروں بہت کمالات ہیں۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ پرانی ساخت کی اس جیب میں جو فاضل ڈبا میں نے

اٹھایا تھا وہ بھی زیادہ دیر ساتھ نہیں دے گا۔ صبح کا آجیلا بھلا ہوا تھا اور میں ابھی تک دیرانے میں ہی تھا۔ اب تو مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ میں اس دیرانے سے نکل بھی سکوں گا یا نہیں؟

مجھے حیرت تھی کہ کیا ہمارے ملک میں اتنے طویل و عریض غیر آباد علاقے بھی موجود تھے جن میں اتنی دیر تک اتنی تیز رفتاری سے سفر کرتے رہیں اور کسی آبادی کا نام و نشان دکھائی نہ دے۔ ٹریک سڑک سے سفر کرتے وقت تو احساس ہو جاتا تھا کہ کچھ نہ کچھ دیر کے بعد آخر کار کسی نہ کسی قسم کی آبادی کے آثار دکھائی دے ہی جائے تھے لیکن میرے راستے میں تو دیرانے کے سوا کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ کبھی چھیل میدان، کبھی صحرائی علاقہ، کبھی جنگل، کبھی نیلے، کیس برساتی جو پڑا اور تالے آتے رہے لیکن کوئی آبادی نہیں آئی۔ میں یقیناً بھگ چکا تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ میرے لیے تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا کہ میں بلوچستان میں بھگ رہا تھا یا سندھ میں۔

جس طرح کے علاقے میرے راستے میں آئے تھے ویسے دروہن ہی سہوں میں ہو سکتے تھے۔ ایک بار تو مجھے یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ میں لاطینی میں کسی ایسے سرحدی علاقے سے انڈیا میں داخل نہ ہو جاؤں جہاں کوئی چوکی، پتھر، گولی یا حدود ظاہر کرنے والا نشان موجود نہ ہو۔ یا اگر کچھ نشانیاں موجود ہوں تو وہ میرے لیے ناقابل شناخت ہوں۔

بھوک سے الگ جان نکل رہی تھی۔ اب تو بار بار آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے میں ڈرائیونگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس وقت میں جہاں سے گزر رہا تھا وہ علاقہ تو نیم صحرائی سا تھا لیکن خاصا دشوار گزار تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تو اس قدر تک وحیل پر بھی قابو نہ رہا اور جیب بری طرح غرائے ہوئے اور آدھرا لڑنے لگی۔

ایسے ہی دو ایک موقعوں پر جیب اٹھنے اٹھنے پئی۔ کوئی بھی نہیں تھا کہ جیب اٹھتی تو میں گردن یا ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھتا۔ اس اندیشے سے سہم کر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود کو زیادہ سے زیادہ مستعد رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

کبھی کبھی ایک آدھ لمحے کے لیے مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں خواب کے عالم میں سفر کر رہا ہوں۔ وہی جیب کی مستقل گھر گھر دہی باباں، وہی دیرانے، وہی سکوت، وہی تنہائی۔ بسا کبھی کبھی چیلوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی، وہ بھی روح کی آفسرو کی اور باہمی کو برصا دینے والی آواز تھی۔

میں نے گزشتہ رات جانوروں کی طرح ہیٹ بھر کے جو پانی پیا تھا، وہ بھی اندر ہی اندر نہ جانے کہاں تھلیل ہو گیا تھا۔ جس طرح اب جیب دھڑا دھڑ پٹیروں کو کھانے لگا رہی تھی اسی طرح میرے اندر بھی گویا کوئی انجمن رواں تھا جو شاید خوراک نہ ملنے کی وجہ سے بالائی کوئی دھڑا دھڑ جذب کر رہا تھا، کھانے لگا رہا تھا۔ پیاس سے ایک



اس کے بعد میرا حال کچھ عجیب ہی ہو گیا۔ میرا ذہن گویا میرے جسم کے ساتھ نہ رہا۔ میں اس دیرانے میں تیر تیر چلا جا رہا تھا لیکن مجھے واضح طور پر احساس نہیں تھا کہ میں چل رہا ہوں۔ میرا ذہن گویا زمین اور آسمان کے درمیان کیسے معلق تھا جبکہ میرا جسم مشینی انداز میں حرکت کیے جا رہا تھا۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی یہ اعزاز تھا کہ میں نے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ لا شعور میں کیسے بس یہ احساس بیٹھا ہوا تھا کہ میرے ارد گرد جیکراں ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور مجھے اس کو عبور کرنا تھا۔ میرا جسم گویا ایک مشین تھی جسے کسی کسیپوز نے پروگرام فیڈ کر دیا تھا اور وہ بس چلتی جا رہی تھی۔ میرے احساسات گویا مرچے تھے۔

جسم آخر جسم ہی تھا اور وہ بھی انسانی جسم، کہاں تک ساتھ دیتا۔ مجھے احساس ہوا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر بھی روشنی دم توڑنے لگی تھی۔ میں اپنے اندر قوت ارادی کی جو معنوی برقی دود ڈھائے ہوئے تھا وہ آخر کار جواب دینے لگی تھی۔ دیرانہ گویا جوں کا توں میرے گرد موجود تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں دودم بڑھتا تھا اور یہ چار قدم مزید پھیل جاتا تھا۔ پیٹ میں ہموک کا غریب پچھے گاڑے ہوئے تھا اور پیاس کی شدت سے حلق کچھ ایسا ہوا تھا جیسے وہ خشک کلاڑی سے بنا ہوا اور کوئی مسلسل اس پر ریک مال کر رہا ہو۔

آخر کار جسم نے مشین کی طرح حرکت کرتے رہنے سے انکار کر دیا، قوت ارادی نے ساتھ چھوڑ دیا، قوت برداشت جواب دے گئی۔ تسم غریبی یہ تھی کہ اس وقت مجھے سامنے ہی ایک خاص کشتہ پگھڑی دکھائی دینے لگی تھی جس پر گاڑیوں کے پہیوں جانوروں کے کھوپوں اور انسانی قدموں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

وہ پگھڑی اس دیرانے کا کراس کر رہی تھی جس میں میرا سفر جاری تھا۔ اچانک ہی اس پر میری نظر پڑی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ پگھڑی کسی نہ کسی آبادی کی طرف سے کسی دوسری آبادی کی طرف جاری تھی۔ ایک لاکھ سال سے سفر کے بعد مجھے پہلی بار کسی آبادی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کوئی چیز دکھائی دی تھی لیکن مجھ میں اس تک پہنچنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ مزید چند قدم کا فاصلہ طے کر کے پگھڑی تک پہنچ جاؤں اور اس پر دائیں یا بائیں کسی بھی سمت میں ایک نئی امید کے سارے سفر جاری رکھ سکوں لیکن جسم نے ساتھ نہ دیا۔ مزید تسم یہ ہوا کہ مجھے ایک پتھر سے جلی سی ٹھوکر لگ گئی۔ یوں گویا کسی کرلی ہوئی رادار کو ایک بھیجی ہاتھ نے ٹوکا رہا۔

میں اوندھے منہ کر اور پھر اٹھ نہ سکا۔ گرنے کے بعد بھی مجھے کافی دیر تک ہوش ہوا اور میں اٹھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ جسم اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر رہا تھا لیکن پھر

بار پھر میری کمزرت رات جیسی ہی حالت تھی۔ ہونٹوں پر پٹریاں جم رہی تھیں اور حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں نے کئی دنوں سے پانی نہیں پیا تھا۔

میں نے جیب کی اچھی طرح تلاشی لی۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکوئی کی کوئی نہ کوئی بھانگل کوئی تھرموس بٹول یا کوئی نہ کوئی اور ایسی چیز ضرور موجود ہوگی جس میں پانی ہو گا لیکن میرے لیے یہ انکشاف بڑی حیرت کا باعث تھا کہ اس جیب میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

آخر کار وہی ہوا جس کے اندیشے سے میرا دل پہلے ہی ذوب رہا تھا۔ جیب ایک دھچکے سے ایک ٹکڑے سے پابر آئی اور مزید صرف چند فٹ کا فاصلہ طے کر کے اس کا انجی کھر کھا کر خاموش ہو گیا۔ میں نے کئی بار سلف لگایا لیکن انجی چند ایک مرتبہ گویا صرف کھائیں کر رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا یہ کوشش فصول ہے۔ جیب کی ”رگ دپے“ میں دوڑتے ہوئے اس سیال کے سوتے خشک ہو گئے تھے جو اس کے لیے عرق حیات تھا، جو اسے زندہ و متحرک رکھتا تھا۔ ہر دست جیب مڑھ ہو چکی تھی۔

میں نے اسٹرنگ و میل پر سرنگار اور چند منٹ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے غودگی سی محسوس ہونے لگی لیکن مجھے معلوم تھا یہ غودگی میرے لیے اچھی نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور سراغ لیا۔

میں نے ابھر اوجھر نظر دوڑائی۔ تاحہ نظر وہی دیرانہ تھا۔ میں نے جو سز کیا تھا وہ محض رائیگاں ہی گیا تھا۔ میں نے جس مقام پر ڈاکوئی کو ہلاک کیا تھا، اگر میں وہیں کھڑا رہتا تب بھی میرے لیے کیا فرق پڑتا؟ اور وہ بھی ایک دیرانہ تھا اور یہ بھی ایک بیابان تھا۔ وہاں بھی میرے سامنے کوئی خطر نہیں تھی اور یہاں بھی میں کم کردہ راہ سفر تھا۔

میں جیب سے اتر آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کس سمت میں چلنا چاہیے۔ ہر سمت ایک ہی جیسی بے امان دکھائی دے رہی تھی۔ سورج اب سر پر آچکا تھا اور گویا پورے جسم کو جھلسا رہا تھا۔ خصوصاً میرے چہرے اور ہاتھوں کی کھال دو گنا جگ رہی تھی۔ سورج سر پر قادیہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا کہ شرق کو رخ تھا اور مغرب کو رخ۔

چند لمحوں کے تذبذب کے بعد آخر کار میں اندازاً مغرب کی طرف چل رہا۔ میں تقریباً ایک گھنٹہ چلا رہا۔ اس دوران کئی بار میری آنکھوں کے سامنے رنگ پرستے دائرے لہرائے اور سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں لڑکھڑاکر کرتے کرتے تباہ میں نے اپنی بوکا کی مشقوں کو کام میں لانے کی بہت کوششیں کیں لیکن صورتوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ جسم اور روح ایک دوسرے کی کچھ خاص مدد نہیں کپا رہے تھے۔

میں نے اپنی قوت ارادی سے کام لینے کی انتہائی کوشش کی۔

میں اپنی دانت میں کھڑا ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر کار مجھ میں اس بے حرکت جدوجہد کی بھی سکت نہ رہی۔ لیٹے رہتا مجھے بھلا محسوس ہونے لگا۔ میرے فکرت جسم اور کچلے ہوئے سے اعصاب کو بے حد سکون ملا۔ اور حقیقت تو میں پہلے ہی بے حس و حرکت تھا لیکن اب میں نے ذہنی طور پر بھی اپنے آپ کو بے حس و حرکت تسلیم کر لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے گویا ایک مدت کے بعد ذرا آرام کا احساس ہوا اور یک بیک ہی مجھے گہری غیز آئی۔ معلوم نہیں وہ غیز قہمی یا بے ہوشی لیکن اس وقت وہ مجھے ایک انمول راحت کی پابھر محسوس ہوئی۔

وہ بے چینی کا وقت نہایت خوب صورت اور تسکین بخش تھا کیونکہ اس کے دوران ایک ترازو تھیں کا احساس مٹ گیا اور سرے اس دوران مجھے خوب صورت اور دل فریب خواب آتے رہے۔ پرانا مجھے جھولا بھلائی رہیں اور خوب صورت کینز میرے لیے اپنے کندھوں پر خوب صورت بلوری مرا حیاں لاتی رہیں جن میں رخ بستہ آپ شیریں بھرا ہوا تھا۔ میں دھڑا دھڑا نہیں غالی کر کے ایک طرف پھینکتا رہا۔

مجھے نہ جانے کتنی دیر بعد احساس ہوا کہ خواب کچھ ایسے خوب صورت نہیں رہے تھے۔ پرانا مجھے جھولا بھلانے کے بجائے شاید اُدھر اُدھر دھکیل رہی تھیں۔ کوئی ایک طرف دھکا دیتی تھی تو دوسری فوراً واپس دھکیل دیتی تھی۔

پھر وہ پرانا بھی غائب ہو گئیں۔ بس کوئی نیلی ہاتھ تھا جو مجھے جھٹکے دیے جارہا تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی مرا حیاں لے کر آنے والی کینز میں بھی نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ کوئی نیلی ہاتھ ہی مجھے پانی پلانے کے بجائے میرے منہ پر پھینکتے لگا۔

آخر کار یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ میں گویا کسی تاریک دلدل کی تہ میں بہت دیر تک پڑا رہا۔ پھر دیرے دیرے خود بخود اوپر آئے لگا۔ جسم اب بھی دیرے دیرے ٹکڑے ٹکڑے لے رہا تھا۔ کبھی کبھی تاریخی اور کدنی سی روشنی میری آنکھوں میں جیسے لگتی۔

پھر اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور میں کسی ایسی چیز میں لیٹا ہوا تھا جو مسلسل بل رہی تھی۔ سوچ ڈوبنے کو تھا اور اس کی الدوا می کر میں میری آنکھوں میں کچھ رہی تھیں۔

میں نے گردن ہلا کر اُدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تو پا چلا کہ میں کچھ اس قسم کی ایک گھوڑا گاڑی میں لیٹا ہوا تھا جیسی پنجاب میں مگر وہ وہ کے ذرم ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں تاہم یہ اس سے کچھ بھولی اور ہلکی تھی اس میں گھوڑے کی جگہ چمڑھا ہوا تھا۔

تقریباً میرے ہی جیسے لیے کپڑوں میں ایک دیسانی اگلے تختے پر چمڑکی لگائی تھی جسے بچھا تھا اور باغ کر رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں خشک گھاس پھوس کے آرام وہ بستر لیٹا ہوا تھا۔

عیاشی کی انتہا۔ قہمی کہ میرے سہانے بھی بچنے کی کمی پوری کر کے لے لے ایک نیلی کپڑی گدی رکھی ہوئی تھی۔

میرا چو پائی سے تر تھا لیکن اب بھی تم محسوس ہوا تھا۔ پیٹ میرے چہرے پر پانی چمڑکا کیا تھا اور شاید مجھے پلانے کی بھی کوشش کی گئی تھی کیونکہ میرے منہ میں اب پہلے جیسی انتہائی خشکی نہیں تھی۔ شاید اس شخص نے مجھے ہوش میں لانے کی تدبیر کی تھی لیکن اس وقت میں ہوش میں نہیں آیا تھا۔ شاید اس کے غاصیہ بددیریری آنکھیں کھلی تھیں۔

گھوڑا گاڑی میں کوئی سامان نہیں تھا۔ گاڑی چلانے والے کا چوہا ایک طرف سے میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی اور کچی عمارت ایک سیدھا سا دوسرا سامانی مطوم ہوتا تھا۔ طیلہ دیسانی تھا جیسا عموماً غریب اور سیدھے سادے دیسانوں کا ہوتا ہے۔ چہرے پر عشقشی سی داڑھی تھی۔

میں گردن موڑنے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس نے بھی گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں تھا۔ مجھے اچانک ہوش میں دیکھ کر کچھ گزرا سا گیا۔ پھر دھکی چلا۔

تھا۔ اس نے اس کی رفتار اور بھی کم کر دی اور میری طرف کھڑا تر چھا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

”اب کسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اس نے سوال مند میٹر کیا تھا۔

”مہوش میں آیا ہوں۔۔۔ نیکی بڑی بات ہے۔“ میں نے ٹوڑ پھوٹی مند میٹر میں جواب دیا جس میں اُردو کی زیادہ آمیزش تھی ”تمہاری بڑی مہربانی کہ تم نے راستے میں سے مجھے اٹھا لیا۔“

اب وہ بھی تقریباً اُردو میں بات کرنے لگا ”ہاں ادا۔ میں نا جب تم کو راستے میں پڑے دیکھا تو پہلے تو میں ڈر گیا۔ میں نے سوچا نہیں کیا معاملہ ہے۔ مجھے اس پکڑش نہیں پڑنا چاہیے۔ غریب آدمی ہوں بلال۔ تم کو پتا ہے غریب آدمی دیسے ہی ہر بات سے ڈرتا ہے۔ میں آگے نکل گیا تھا لیکن پھر اللہ کا خیال آ گیا۔ آخر مسلمان ہوں دل نہیں مانا کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر ایسے گزر جاؤں۔“

وہ ششاندہ سے انداز میں مسکرایا۔ وہ ذرا بھی خوب صورت نہیں تھا لیکن کم از کم مجھے اس نے بہت خوب صورت دکھائی دیا۔ وہ اپنی نیلی اور قہقر بڑی درست کرتے ہوئے بولا۔

”تم نے چوڑے دھنی آدمی ہو اور بے ہوشی میں آدمی وزن کچھ اور بھی زیادہ لگتا ہے۔ میرے لیے تم کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا بہت مشکل کام تھا۔ بہت ہی مشکل۔ مگر بس ایسے کاموں میں اللہ آدمی کی مدد کرتا ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر سرسری سے لے لے لے ”تم کون ہو؟ کیوں بے ہوش پڑے تھے؟ وہاں کیسے پہنچے تھے؟“

”یہ بہت لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت سنی۔“ میں نے گاڑی میں لگا ہوا ایک باس پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں اپنے آپ

برسوں کا تیار محسوس کر رہا تھا اور اپنی آواز مجھ سے پہچانی نہیں جاسکتی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تو بیٹھ میں جیسے کوئی خوابیدہ عظمت بیدار ہو گیا۔ میں نے ساری شرم اور کلف کو پالنے والی حالت رکھنے ہوئے کہا "یہ بتاؤ تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟"

"ہاں ہاں" اس نے لگام ڈھلیں چھوڑتے ہوئے مستحضر سے کہا "میں اپنے لیے روٹی لے کر گیا تھا لیکن مجھے راستے میں دقت ہی نہیں ملا اور بھوک بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ میں نے سوچا رات کو کھرواہیں کچھ کھائیں گا۔" لوہیہ تم کھالو۔"

اس نے گاڑی کے ایک کونے سے ایک پوٹلی برآمد کی اور میری طرف دیکھی۔ میں نے بے تابی سے اسے کھولا۔ اس میں موٹی موٹی، مکی، تڑی اور ذرا سوکھی سی دو روٹیاں تھیں۔ ان کے درمیان لٹا ہوا کچھ پاؤں اور تھوڑا سا چار تھا۔

میں بتا نہیں سکا کہ پلاؤ والے منہ میں ڈالنا مجھے کتنا لذت بخش عمل محسوس ہوا لیکن خشک منہ اور خشک حلق میں وہ خشک سا کھانا اگلنے لگا۔ میرے غصے نے گویا میری مشکل کو بڑھاتے ہوئے مجھے ایک پھولی سی محک سے اگروٹھ کے ایک چمکے ہوئے سے گلاس میں پانی نکال کر دیا اور بولا "چہاتے جاؤ اور ایک ایک گھونٹ پانی کے ساتھ گلیے جاؤ۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور جلد ہی میرے نظام جسم کے دھندہ دھندہ بھی رطوبتیں بنانے لگے جو اپنا کام پھول چکے تھے۔ نہ منہ میں ہی دونوں روٹیاں میرے پیٹ میں چھج گئیں۔ "پاؤں" چار کچھ بھی نہ بچا۔ اس وقت اگر وہ چاروں کی روٹیاں اور وہیں تو رہا بھی نہ جٹ کر رہا۔

وہ شخص حضرت خزانہ سے لیے میں بولا "میرے پاس کوئی لہ ساں اور میو نہیں تھا ورنہ ضرور پیش کرتا۔ ہم لوگ تو زیادہ تر زور اور چار سے ہی روٹی کھاتے ہیں۔ سالن ہمارے گھروں میں ہی کھادی چکی ہے۔"

گویا ایک عام دیہاتی کا قریب بھی وہی حال تھا جو میرے بچپن کا ہوا کرتا تھا۔ وہ آج بھی مٹلس، تلاش اور کچلا ہوا قحطی محبت، انیت اور اڑھ کا تشکر آج بھی اسی میں تھا۔ میں نے بچے کے مکانوں، زندگی کی تمام آسائشوں کے درمیان بیٹھے ہوئے لوگوں کو بڑی شہسبزی بنا کر رکھنے ساتھ ساتھ اس ملک نے نہیں کیا رہا ہے۔ ہمیں اس مسائل کے علاوہ کیا ملا ہے۔ ہر جگہ ہماری حق تلفی ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر جو بے چارے ہر اعتبار سے واقعی ٹھیکے ملتے ہوئے اور ام لوگ تھے وہ بات بات پر خدا کا شکر ادا کرتے نہیں سمجھتے تھے۔ ایک سے کچھ نہیں مانگتے تھے، کسی سے کچھ نہیں چاہتے تھے، کسی سے نہیں ملاتے تھے، کسی کو شک میں نہیں جھوٹکتے تھے۔

میرے پیٹ کے دوڑنے کو اندھن مل گیا تھا تو رک و بے میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں دھواں سی آگنی تھی اور نظر کو تیار تیز ہو گئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر سے دیکھا تو مجھے ایک طرف نہر یا دریا کا پشتہ سا نظر آیا جو بہت دور تک جا رہا تھا۔ دیوار چین کی طرح دونوں طرف ہی اس کا کوئی سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم اس سے بہت دور رہتے ہوئے اس کے متوازی ہی سفر کر رہے تھے۔ اس علاقے میں سبزے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

"بھائی! تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"حاتو" اس نے جواب دیا۔

"بھائی حاتو! یہ کون سا علاقہ ہے اور ہم اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کچے علاقہ ہے اور ہم اس وقت کبھی مراد جا رہے ہیں۔

میں وہاں رہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ! بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ یہ میں کہاں سے کہاں نکل آیا تھا۔ اگر میری تمام تر سخت جانی کے باوجود میری حالت خراب تھی تو اس میں جسم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے جیب میں پانچ بیڑوں میں سفر کیا تھا اور اس کے بعد پیدل بھی نہ جانے کتنا چلتا تھا۔ بلکہ کمر میں اس علاقے میں آٹکا تھا جس کے بارے میں ہمیں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

حاتو، پھر کو ایک چھری رسید کر کے اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا "تم نے بتایا نہیں تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کہاں جا رہے تھے اور تمہارے ساتھ کیا راتہ پیش آیا؟"

"میرا نام افضل ہے" میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا "قصہ تو بہت لمبا ہے، میں یوں سمجھ لو کہ ڈاکوؤں نے مجھے کسی امیر آدمی کے دھوکے میں اغوا کر لیا تھا جبکہ میں ایک غریب سا آدمی ہوں۔ بہت دن وہ مجھے لیے ادھر ادھر پھرتے رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں وہ آدمی نہیں ہوں جسے وہ اصل میں اغوا کرنا چاہتے تھے پھر جب انہیں پتا چل گیا کہ ان سے غلطی ہو گئی ہے تو انہوں نے مجھے جنگل میں ہی چھوڑ دیا۔ میں کل سے پیدل چل رہا تھا۔ بھوک، پیاس اور تھکن سے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔"

"چہ۔ چہ۔ چہ۔" اس نے متاستانہ سے انداز میں سر ہلایا "ہوا! ڈاکوؤں نے تو ایسی زندگی خراب کی ہے کہ کیا بتائیں۔ کوئی زمانہ تھا کہ صرف امیر آدمیوں کو ڈاکوؤں سے خطرہ رہتا تھا۔ اب تو میرے جیسے کچھ کو بھی کھرے لٹکے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ یہ کون کچھ میں میرا پھر نہیں لے لیا اب تو ڈاکو کی کہ۔"

پسے والا ہے یا بھوٹلا۔" اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "جہیں اس وقت کیس پناہ نہیں ملے گی کوئی دوا دہ کھا نہیں لے گا۔ کوئی تمہاری دھک سن کر بھی دوا دہ نہیں کھائے گا۔ کچھ مس میں توازن کرتے جہیں گھر لیں گے اور ان کا شر سن کر ہوسکتا

جلس کو کہتے ہیں۔

"مجھے معلوم ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ شام ہوتی ہے تو گھر کاؤں میں جن پھر گیا ہے۔" وہ بولا "ہماری کبھی کبھے کے علاوہ سب سے بڑی کبھی کبھی یہاں زندگی کی ساری دہائیاں گزرنے کے بعد مکمل تباہ ہو گئے تھے۔ اب اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو منور کی اذان سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ سیلاب کے دنوں کو چھوڑ کر سب دنوں میں یہاں فصلیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ کچے کی زمین بہت زرخیز ہے لیکن ہم دوبراسائیں کے غلام ہیں ان کے فصلیں آتی ہیں تو ان کے آبی لے جاتے ہیں۔ ہمیں گڑ کے لیے کچھ ملتا ہے تو دوبرے کے آدمیوں کے بعد ڈاکو آتے ہیں۔ کسی کے پاس اگر کسی طرح چار پیسے یا زوروں ہو جائے ڈاکو لے جاتے ہیں۔ ہم تو بس دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کے دن رات خون پیوند ایک کرتے ہیں اور شاید زندگی بھر کرتے رہیں گے۔"

"فصلیں کہاں ہوتی ہیں؟" دوسرے کوئی زور سے زمین نظر آ رہی۔ "میں نے آنکھیں کھلیں کہ اندھیرے میں دور تک دیکھ کر کوشش کی۔"

"زمینیں بوندے دوسری طرف ہیں۔" اس نے اشارہ کیا "پہلے ہم لوگ بھی عارضی ہی جموں پر لڑا یا پھر دوسری زمینیں۔" جب سیلاب آتا تھا فصلوں کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر یا کھیتیاں بھی آجڑ جاتی تھیں۔ اس لیے اب ہم لوگ اس آگے ہیں۔ اگر گندہ ٹوٹے تو ہم لوگ دوسرے جگہ رہتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا اور حیران ہوا تھا کہ کسی کس حال زندگی گزار رہے تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو کبھی اساتذہ کے غمے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نہیں آتے تھے۔ کبھی کانفرنس نہیں کرتے تھے۔ بس سر جھکا کر جھانسی اور ہم ساتھ اپنا کام کرتے رہتے تھے زندگی کی مصوئیں جھیلنے اور کچھ لوگ عایشاں بیگلوں اور بڑے آسائش مکانوں میں کے نام پر سوئے کچے کرتے رہتے تھے۔ ان بے چاروں میں نہیں ہوا تھا کہ ان کے نام پر ان کے دلاؤں نے کیا کیا کر لیا۔

وہ اپنی دھن میں بولا "دو بے سائیں۔ یہ سیلاب ہے کی چیز۔ جب بھی آتا ہے کئی سال کے لیے زمینوں کو آگیا جاتا ہے کہ ساری کسریں پوری ہو جاتی ہیں۔"

"کچے کی زمینیں ہیں کس کی؟" میں نے پوچھا۔ "کئی بڑے زمینداروں نے انہیں میں ہائٹ رکھی ہے۔" وہ بڑبڑاتا "جیسے ہم دوبراسائیں مراد خان کے باری ہیں میں لگا ہوا اپری طرف بنی ہزار ایکڑ زمین ان کی ہے۔ ہم انہی کے پاس کبھی کا نام بھی کبھی مراد ہے۔"

آئے اور امام سیت سارے نمازیوں کو اٹھا کر لے گئے۔

حادثے کے آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے "ایک لمبھی سانس لی اور افسردہ لہجے میں بولا "اور اب یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے ڈاکوؤں کا بھی کچھ دین ایمان ہوتا تھا۔ عورت پر بھی ظلم نہیں کرتے تھے۔ کوئی قرآن شریف اٹھا کر سامنے آ جاتا تھا تو اسے معاف کر دیتے تھے۔ سید کو کچھ نہیں کہتے تھے اور مسجد کے سامنے تو اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتے تھے۔"

وہ ایک لمبے خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کے لہجے کی افسردگی بڑھ چکی تھی "اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھوں پر دھواں بولنے ہیں تو سب سے پہلے خوب صورت لڑکیاں تلاش کرتے ہیں۔ قرآن کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کوئی سید ہوا کچھ اور گھولوں سے بھون ڈالتے ہیں اور مسجد کا تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ امام سیت نمازیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ پتا نہیں ہمارا کیا ہے گا۔"

"فکر نہیں کرو ادا حاتو؟" میں نے ذرا آگے ٹھک کر اس کے کندھے پر چھکی دی "ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو مت جاتا ہے۔ انسان جب اپنے ہاتھ پاؤں اتنے پھیلا لیتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کے لیے مذاہب بن جاتے ہیں تو پھر ان کی گردنیں پکڑنے کے لیے ایک نئی ہاتھ حرکت میں آ جاتا ہے۔ جب نیچے والوں کی بادشاہی کا دور ہو جاتی ہے تو آسمان والے کی بادشاہی حرکت میں آتی ہے۔ آخر وہ بھی تو دنیا کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔"

"ہاں بھائی! آج کل تو ہم اسی امید پر زندہ ہیں۔" وہ ادا سی سے بولا۔ ہم ایک گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن رات کے گلیے اندھیرے میں مجھے دوسرے اس کے آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ابھی آسمان پر ایک آرا بھی نمودار نہیں ہوا تھا اور خود گاؤں کا یہ عالم تھا کہ کسی گھر میں شاید کوئی چراغ روشن نہیں تھا کوئی دو دروازہ کھڑکی کھلی نہیں تھی۔ کئی روزوں سے روشنی کی کرن نہیں بھوٹ رہی تھی۔ گلیاں دیران تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ گلیوں میں کہیں کوئی موٹی تک بندھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شہر غمناں کا سا منظر تھا۔

لیکن جب گاڑی ایک چڑی سی گلی میں داخل ہوئی تو وہ غنیمت آوارہ گھروں نے بھوک کر ہمارا استقبال کیا اور شہر غمناں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ حاتو نے انہیں ڈانٹا۔ وہ یقیناً حاتو کو پہچانتے تھے اور اس کا لحاظ کرتے تھے۔ اس کے "احرام" میں خاموش ہو کر اور دوسرے استعمال کرتے ہیں۔

گھوڑے کی جگہ چڑھتا ہوا تھا۔ طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "دیکھ تو قریب صبر ہے جیسے پہلے کپڑوں میں ایک دیوالی اسے کھینچا ہوا ہے۔" پھر کی لگائیں تھامے بیٹھا تھا اور رخ کر رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں خشک گھاس بھوس کے آرام وہ بستر لگتا ہوا تھا۔

”اور یہ مراد صاحب رہے کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ہمت ہی چنگیز پر رہتے ہیں۔ خواب شاہ حیدر آباد اور  
 کراچی میں ان کی شاندار کوٹھیاں ہیں۔ ان کی اصل ذوری زمین تو  
 باب شاہ کے قریب ہے۔ یہ بچے کی زمین تو انہوں نے یو جی فائو  
 زمین دار رکھی ہے۔ یہاں تو وہ دو چار سال میں ایک تودہ مرتبہ ہی  
 جتے ہیں۔ زیادہ انتظام ان کے آوی ہی چلاتے ہیں۔ ان کا ایک  
 اس آوی ہے دلبر خان۔ بس وہ سب کچھ کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کا  
 لک ہے۔“  
 پھر وہ پھر اُردو کرکچ کر رازدارانہ سے انداز میں بولا ”بلکہ میں  
 نے تو سنا ہے کہ ڈاکو بھی اس کی بات سنتے ہیں۔ ویسے ڈاکو تو ڈیرا  
 نہیں مراد خان کے آگے بھی ہاتھ جوڑتے ہیں اور اپنی سب  
 دولتوں میں سے ان کو حصہ بھی بھیجتے ہیں لیکن میری سمجھ میں  
 بات نہیں آتی۔“  
 ”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم تو ڈیرا سائیں ہی کے آوی ہیں اور بہت غریب ہیں۔  
 بے بارود بھی، بھکی ڈاکو کم کو بھی تنگ کرنے آجاتے ہیں۔ جس  
 پاس کچھ ہودہ لے جاتے ہیں۔ ہم دلبر خان کی بھی منت کرتے  
 اور ان کی مرتبہ ہم نے وزیر سائیں مراد خان کو بھی پیغام بھیجا  
 نا انہوں نے قریب تک ڈاکو کو روکا کہ نہیں۔ چلو وہ اپنی دنیا میں تو  
 لی جاے کہتے پھر میں لیکن کم سے کم ہم غریبوں کو تو بخش دیں۔  
 سائیں مراد اپنی رعایا کو ڈاکو سے محفوظ رکھنے کا کوئی  
 بہت کیوں نہیں کرتے؟“

اس دوران گاڑی ایک کچے گھر کے سامنے جا رہی تھی جس کی  
 چھت سرکنڈوں کی تھی اور اس پر توڑی والی مٹی کی بہت موٹی  
 تھوٹی گئی تھی۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے حاتو رازدارانہ سے  
 انداز میں بولا ”بھائی! میں تم سے کئی کئی بات کروں گا۔ تم مجھے  
 معصیت دہ اور اچھے آوی لگے میں تمہیں باتوں باتوں میں یہاں  
 تک لے تو آیا لیکن ایک تو میں بتا چکا ہوں کہ میں بہت ہی غریب  
 آوی ہوں ویسے ہی تمہاری کوئی زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔ دوسرے  
 حالات بہت خراب ہیں۔ ہمیں بڑی سختی سے بدایت ملی ہوئی ہے کہ  
 اجنبیوں کے بارے میں بہت احتیاط کریں۔ کسی اجنبی کو گھر میں نہ  
 نہ دیں۔“

”میں نے ایک لمحے  
 کر کہا“ سائیں مراد چاہتے ہیں کہ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ  
 دوسرے سے اور مالی طور پر بالکل کمزور رہیں تاکہ بیشہ ان کے  
 نہ ہاتھ جوڑتے رہیں اور کبھی بغاوت کا نہ سوچیں۔ شاید ان کا  
 ال ہو کہ ان لوگوں پر ذرا خوشحالی آنے کی تو یہ پر پڑے نکالنے  
 ہنگ۔ رتی خزا کر کے ان کی سوچنے لگیں گے۔“  
 ”یہ تو ہمیں کئی اندازہ ہے کہ شاید وہ ایسا سوچتے ہوں۔“ حاتو  
 نے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ  
 مجھے سادے اور ان جڑ سے لوگ عقل و شعور اور آگہی سے  
 بھی محروم نہیں ہوتے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بے چارے اپنی  
 مافوق، مصلحت یا کسی اور وجہ سے بندھ رکھتے ہوں یا انہیں  
 ت کئے کا سلیقہ نہ آتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں  
 وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔

”نہیں! اس کی بھی ضرورت نہیں۔ تم نے میرے لیے بڑی  
 تکلیف اٹھائی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میں  
 اب چلا ہوں۔“ میں گاڑی سے اترنے لگا۔  
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا  
 ”تمہیں اس وقت تکس پناہ نہیں ملے گی کہ وہی دروازہ کھلا نہیں ملے  
 گا۔ کوئی تہیاری دھک بن کر بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔“  
 میں آوارہ گئے تمہیں گھر لیں گے اور ان کا شور سن کر ہو سکتا

”میں نے ایک لمحے  
 کر کہا“ سائیں مراد چاہتے ہیں کہ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ  
 دوسرے سے اور مالی طور پر بالکل کمزور رہیں تاکہ بیشہ ان کے  
 نہ ہاتھ جوڑتے رہیں اور کبھی بغاوت کا نہ سوچیں۔ شاید ان کا  
 ال ہو کہ ان لوگوں پر ذرا خوشحالی آنے کی تو یہ پر پڑے نکالنے  
 ہنگ۔ رتی خزا کر کے ان کی سوچنے لگیں گے۔“  
 ”یہ تو ہمیں کئی اندازہ ہے کہ شاید وہ ایسا سوچتے ہوں۔“ حاتو  
 نے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ  
 مجھے سادے اور ان جڑ سے لوگ عقل و شعور اور آگہی سے  
 بھی محروم نہیں ہوتے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بے چارے اپنی  
 مافوق، مصلحت یا کسی اور وجہ سے بندھ رکھتے ہوں یا انہیں  
 ت کئے کا سلیقہ نہ آتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں  
 وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔

”نہیں! اس کی بھی ضرورت نہیں۔ تم نے میرے لیے بڑی  
 تکلیف اٹھائی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میں  
 اب چلا ہوں۔“ میں گاڑی سے اترنے لگا۔  
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا  
 ”تمہیں اس وقت تکس پناہ نہیں ملے گی کہ وہی دروازہ کھلا نہیں ملے  
 گا۔ کوئی تہیاری دھک بن کر بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔“  
 میں آوارہ گئے تمہیں گھر لیں گے اور ان کا شور سن کر ہو سکتا

”میں نے ایک لمحے  
 کر کہا“ سائیں مراد چاہتے ہیں کہ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ  
 دوسرے سے اور مالی طور پر بالکل کمزور رہیں تاکہ بیشہ ان کے  
 نہ ہاتھ جوڑتے رہیں اور کبھی بغاوت کا نہ سوچیں۔ شاید ان کا  
 ال ہو کہ ان لوگوں پر ذرا خوشحالی آنے کی تو یہ پر پڑے نکالنے  
 ہنگ۔ رتی خزا کر کے ان کی سوچنے لگیں گے۔“  
 ”یہ تو ہمیں کئی اندازہ ہے کہ شاید وہ ایسا سوچتے ہوں۔“ حاتو  
 نے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ  
 مجھے سادے اور ان جڑ سے لوگ عقل و شعور اور آگہی سے  
 بھی محروم نہیں ہوتے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بے چارے اپنی  
 مافوق، مصلحت یا کسی اور وجہ سے بندھ رکھتے ہوں یا انہیں  
 ت کئے کا سلیقہ نہ آتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں  
 وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔



اس وقت میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو آتے دیکھے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا "مجھے معلوم ہے" دو روپے کی آج کل کے زمانے میں کوئی وقت نہیں ہے لیکن تم ان پیسوں کو نہیں اپنے ایک مسلمان بھائی کی محبت کو دیکھنا۔" "یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اپنے حلق میں پھیلے غبار کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جو تم کہہ رہے ہو" میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی وہ سوچ رہا تھا۔ جب تم جیسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو زندگی ابھی لگنے لگتی ہے۔ میں کو خوش کروں گا کہ تمہارے ان دو روپوں کو خرچ نہ کروں۔ نکالنے کے طور پر سنبھال کر رکھوں۔"

میں نے دو نوٹ اس سے لے کر جیب میں رکھ لیے۔ وہ مجھے رخصت کرنے کے دو روزے تک آیا۔ پہلے اس نے دو روزہ کھول کر باہر اُدھر اُدھر جھانکا کہ میں مجھے رخصت کیا جیسے میں دشمن ملک کا کوئی ایجنٹ تھا جسے اس نے ازراہ ہمدردی دوسروں سے چھپ کر پناہ دے رکھی تھی۔ اس نے جلدی سے دو روزہ بند کر لیا۔ ابھی صبح کا جالا چیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ میں نے گلی میں تیز تیز چلنا شروع کر دیا لیکن گلی کے موڑ پر پہنچ کر میرے قدم خود بخود سست پڑ گئے۔ مجھے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

دوسری گلی میں دو آوازہ گھٹوں نے میرا استقبال کیا۔ پہلے انہوں نے تجسسی سی نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر باہمی اتفاق رائے سے وہ غالباً اسی نتیجے پر پہنچے کہ انہیں بھونکنا چاہیے۔ وہ غصہ زہ سے انداز میں بھونکنے لگے لیکن جب میں اس گلی سے گزر آیا چلا گیا تو انہوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

کئی گلیوں سے گزرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو اچانک سی گاؤں سے باہر دیا لیکن گاؤں سے ذرا ہٹ کر مکے میدان میں ایک بہت بڑا پھیر پھلا ہوا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک خامسا بڑا پھیر رستوران تھا جیسے عموماً گاؤں رسومات میں ہوتے ہیں۔

لیکن اس پھیر رستوران کے گرد چار دیواری نہیں تھی۔ البتہ اس کے عقب میں بہت سی لمبی اینٹیں قریب سے رکھی تھیں۔ ایک طرف چھٹی مٹی کا ڈیمبر بھی نظر آ رہا تھا۔ ان چیزوں کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت دن سے وہاں پڑی تھیں لیکن ان کے استعمال ہونے اور تعمیر شروع ہونے کی نوبت نہیں آ رہی تھی۔

رستوران کے سامنے کئی بڑی بڑی پرانی سی چار دیواریاں اور بہت سی ننھی ننھی بڑی ہوئی تھیں لیکن ابھی ان پر کوئی ٹھکانہ موجود نہیں تھا۔ چار دیواریوں کے نیچے صرف دو تین مست الوخود سے گئے گرد و خراب جھانکے کا ٹکڑا دیا گیا ہے پٹائی پر غور کر رہے تھے۔ چھپرے کے نیچے بھی چند ننھی ننھی بڑی تھیں۔ وہ زیادہ صاف ستھری

تھانے کی دو سری قسط تھی۔ اس دوسری قسط کے بعد میں واقعی شرم برہو گیا اور اٹھیں پیاد کر سکیا۔

اشعار میں چونکہ یہ احساس موجود تھا کہ مجھے صبح نہ اندر میرے اس گھر سے لگنا تھا شاید اسی لیے مرنے کی پہلی ہانگ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اب میں اپنے آپ کو بالکل آزاہ دم محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ روز کے واقعات کی محکم اور دماغ کی نے جلدی میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

چند لمبے بعد ہی میرا میزبان کوٹھری میں داخل ہوا اور مجھے پہلے سے پیدا بلکہ جانے کے لیے بتا دیکھ کر کہ شرمندہ سا ہو گیا اور غالت آہیر لیے میں بولا "میں ہرگز تجسبی جانے کے لیے نہ کتا لیکن تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔ ایک انجی کے لیے ہماری کینٹی میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم یہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرو۔ اگر تمہارے ساتھ ساتھ آگے سفر کر کے تو وہاں کی تین میل کے سفر کے بعد ایک دوسری کینٹی آئے گی۔ اس کا نام کینٹی خدا خلق ہے۔ وہاں کا ماحول ذرا مختلف ہے۔ اگر تمہیں کچھ دن گزارنا بھی پڑیں تو وہاں گزارنا۔ وہاں شاید تمہیں کچھ کام بھی مل جائے۔ جیسے ہی تمہاری مجبوری ختم ہو جائے اور تمہارے ہاتھ میں چار پیسے آجائیں" فوراً اپنے ملائے کی طرف واپس چلے جانا۔ کچھ لمحے ۲۴

"بالکل سمجھ گیا۔" میں نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا "میں بہ چکا ہوں۔" میرے ساتھ باہر آنے سے پہلے اس نے قیص کے نیچے ہاتھ الٹ کر غالباً واسکٹ کی جیب سے ایک ایک روپے کے دو ٹھوسے ٹسے نوٹ نکال کر شرمندہ شرمندہ سے انداز میں میری جیب میں اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے گھر میں اس وقت کل کی کی ہے ہیں۔ آج کتنی میرا حساب کرے گا تو ٹھوسے سے پیسے ملیں گے بھی گھر میں بھی سوا سوا آئے گا۔"

میں نے اس کی کلائی تمام کر اسے دو روپے اپنی جیب میں اٹھنے سے روک دیا۔ میں ابھی ان دو ٹھوسے ٹسے نوٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کے یہ دو روپے کی سیٹھا سیٹھا کر کے دو لاکھ روپوں سے زیادہ بنتی تھے۔

"یہ روپے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے دیکھے لیجے میں کہا "میرے تو دنیا کا کوئی کام پیسے کے بغیر نہیں چلا لیکن میں تجربہ کر کے دیکھ رہا ہوں کہ شاید انسان یہ کہے بغیر کی زندگی نہ سکے۔ میرا خیال ہے انسان پیسے کے بغیر تو نہ رہ سکتا ہے" انسانوں کے بغیر زندگی نہیں رہ سکتا۔"

"معلوم نہیں۔" شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ سادگی اور زنجب سے بولا "لیکن یہ پیسے تو تم کو ہر حال میں رکھنے پڑیں گے۔ براہ میں مان رہا کہ کوئی معیبت زندہ اور غالی ہاتھوں دھلا سا سفر کرے گا تو غالی ہاتھ ہی چلا جائے۔"

جائزہ لیا۔ عام طور پر ہوٹلوں اور رستورانوں والے کسی منہ  
الہال گاہک سے بھی شکلی نہیں پوچھتے کہ اس کے پاس پیسے  
نہیں۔ لیکن اسے میری ظاہری حالت دیکھ کر شاید کچھ شبہ گزرا  
اس نے اپنے شیعہ کی تصدیق کر لائی، مگر سمجھا۔

”کچھ پیسے دیجئے بھی ہیں، جیب میں؟“ اس نے پوچھا۔  
میری مفلسی کا ٹکس میرے چہرے پر بھی آ گیا تھا۔

”نہیں، پیسے تو نہیں ہیں۔“ میں نے بہت دھیمی آواز میں  
حاتو کے لیے ہوئے دو روپے میں واقعی خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا  
مگر پھر کیا بقیہ خانہ سمجھ کر ادھر گیا ہے؟“ چھپرہ رستوران  
کے مالک کا لوجیک سخت ہی پہلے سے کئی گنا زیادہ گھروڑا ہو گیا  
نے قدرے غریب انداز میں جاہلوں طرف اشارہ کیا ”اڑے یہ  
ہوٹل ہے، کوئی ختم خانہ نہیں ہے کہ سب حالی سوال مند  
ادھر آجاتے ہیں۔ مفت خورے میرے پاس دن میں بہت آ  
ہیں۔ اگر میں سب کو مفت کھاتاے لگوں تو میرا ہوٹل تو چار دن  
نظام ہو جائے گا۔“

اس نے ایک بار پھر حشرات سے میرا سر تاپا جائزہ لیا اور  
چڑھاتے ہوئے بولا ”حکام کے نہ کالج کے، دشمن اناج کے۔“  
چڑا آؤں ہے“ اتنی جان لے پھر رہا ہے مجھ کو جان ہے۔ تیرے  
مفت مانگ کر کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی!“

اس کے چہرے اور لیے کی تمام تر حشرات کے یاد دہا  
وقت نہ جانے کیوں مجھے بد مزگی یا توہین کا احساس نہیں ہوا۔  
انسان جب اندر سے بھرا بھرا اور آسودہ حال ہوتا ہے تو  
مفلس و تلاش کھانا اور حشرات کا برتاؤ کیا جانا زیادہ برا نہیں  
جب میں حقیقت مفلس و تلاش تھا تو اس قسم کا رویہ دل میں  
لگا دیا کرتا تھا۔

اب تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں دل ہی دل میں  
صورت حال کو تقریباً انجوائے کر رہا تھا۔ فقیریوں کا ہمیں بدل  
تھا شائے اہل کرم دیکھنے میں بھی ایک عجیب اور انگ ہی طرح  
لذت پوشیدہ تھی۔ اس کا اندازہ مجھے دھیرے دھیرے ہوا  
پرانے بادشاہ اور خلفاء اگر راتوں کو ہمیں بدل کر رعیت کا  
جانے کے لیے نکلتے تھے تو اس میں اور ایسی فرض کی دشواری  
اپنی طرف کی آزمائش کے علاوہ یقیناً ایک طرح کی دلچسپی بھی ہوتی  
ہوتی ہوگی۔

اس عالم میں انسان پر دوسروں کے کردار کے بڑے  
عجیب پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ زندگی بڑے خیر خیر انداز میں اپنے  
مکت پہلو کے سامنے آتی ہے۔ سب کچھ بہت دلچسپ بھی لگتا  
اور حیرت آموز بھی۔ لیکن یہ سب کچھ میرا حال ایک کڑی آواز  
سے کم نہیں تھا۔ اس سے گزرنے کے لیے براہ صلا چاہیے  
وہ یقیناً حشرات سے ہشتا“ اگر اسے یہ بتایا جا کہ اس  
اس کے چھپرہ ہوٹل کے سامنے کراچی کے ایک قادیانہ بازار ہو

تھیں اور ان کے سامنے نمونے نمونے چوٹی تختوں کی میزیں بھی  
موجود تھیں۔ جس طرف مٹی کے کاؤنٹر کی صورت میں چولھے  
اور انجینیاں لگی ہوئی تھیں اس طرف ایک ٹھنڈا کھڑا کچھ برتن  
اور دو سراماں سیٹ کر رہا تھا۔ وہ رستوران کا مالک معلوم ہوا  
تھا۔ اس کا لباس کچھ صاف ستھرا تھا اور سر پر کڑی بھی ذرا مزنا  
ہی تھی۔

ایک ٹھنڈا کھنڈے دور سے ایک ڈنڈے میں دو کھنڈے باندھے  
کنڈھوں پر لٹکائے پانی بھر کر لایا تھا۔ وہ غالباً مالک کے معاون اور  
میرے دھیرے دھیرے سے فراغت انجام دیتا تھا۔

میں کچھ دیر گئی کے کونے پر ہی کھڑا ان کا جائزہ لیتا رہا۔ انہوں  
نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ مالک ایک چولھے میں آگ روشن  
کرتے لگا۔ پیرا پانی لاکر ایک طرف رکھے ہوئے لیوٹرے ڈرم تھا  
ملکوں میں ڈالنے لگا۔

میں نے چند لمبے صورت حال پر غور کیا اور آخر کار فیصلہ کیا کہ  
اس چھپرہ رستوران پر قسمت آزمائی کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔  
حالانکہ گزشتہ رات میں نے ڈنڈے کر کھانا کھایا تھا لیکن اس وقت  
پھر ابھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ  
چائے یا کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ کافی کی موجودگی کا تقاضا  
یہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کسی بھی قسم کی چائے ہی میسر  
آجائی تو قیمت تھا۔

یہ تجربہ مجھے پہلے بھی ہو چکا تھا کہ غرت میں بھوک زیادہ لگتی  
ہے۔ دو تندرستی کے دور میں عموماً ڈانٹھک کرنے کو ہی چاہتا ہے اور  
غرت میں دل چاہتا ہے جو سامنے آئے کھا جاؤ۔ شاید اس کی وجہ یہ  
ہو کہ غرت میں عموماً انسان کو بھگدڑ، مشقت اور بخل خواری سے  
واسطہ رہتا ہے۔ غرت اور مشقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔  
مشقت ہوتی ہے تو کھانے کی طلب بھی بڑھتی ہے۔ گاڑی بہت زیادہ  
حرکت میں رہتی ہے تو پیڑوں بھی زیادہ مانگتی ہے۔ زندگی سے  
مصنوعی آسائش اور آرام رخصت ہوتا ہے تو فطرت کے اصلی  
تھانے بیدار ہونے لگتے ہیں۔

میں چھپرہ رستوران کے قریب جا پہنچا۔ مالک نے سر اٹھا کر  
میری طرف دیکھا اور ذرا چوٹے یقیناً اسے پہلی ہی نظر میں اندازہ  
ہو گیا تھا کہ میں یہاں ابھی تھا۔ وہ خاصا پارعب سا اور جڑ مرقض  
تھا۔ موٹی موٹی مونچھیں اور کواٹھی ہوئی تھیں۔

”کون ہو مجھے۔ اور کیا چاہیے؟“ اس نے گھوڑے اور  
نامیاں سے لیے میں پوچھا۔

”کچھ ناشا وائٹا۔“ چائے وائٹے مل جائے گی؟“ میں نے  
جھجکتے ہوئے پوچھا۔ میرے لیے سے گویا اس کے خیال کی تصدیق  
ہو گئی کہ میں وہاں قطعی ابھی تھا۔

”ضرور مل جائے گی۔ ابھی تو میں صرف اپنے لیے بنا رہا تھا“  
تھمارے لیے بھی بنا دوں گا۔“ اس نے آنکھیں سکیڑ کر میرا سر تاپا



فرانک جین چلے سے اترتے ہوئے وہ بولا "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے وزیر برتن دھونے والے یا باہر والے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں اور سوسرٹل کے سامنے کام کر لیتے ہیں۔ ہمیں کسی تیسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی شر کا ہوگی تو میں ہے۔" میں کوئی لاکھوں روپیہ تو نہیں کما رہا ہوں کہ پوری فوج بحرانی کرلوں۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن وہ کچھ سننے سے پہلے ہی ہاتھ جڑ ہاتھ مار کر جھنجھلاہٹ سے بولا "اڑے بابا۔ ماں چوٹا جھکے مانو نہ کھڑے۔۔۔ نہ گھرے۔" (اڑے بابا! میں نے کہا تو ہے کہ مجھے آدمی نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے)

میں نے اس کے پچھر کے عقب میں پڑی ہوئی اینٹوں اور مٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "در اگر میں تمہارے اس ہوٹل کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دوں تو مجھے کتنے دن تک کھانا مل سکتا ہے؟"

میں نے شاید لاعلمی میں اس کی کمزوری دریافت کر لی تھی۔ اس کی برہنہ ایک لخت ہی کافی کم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں اچھی خاصی دلچسپی کی چمک ابھر آئی تھی لیکن وہ اسے دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بظاہر بے نیازی سے بولا "تم نے پہلے کبھی چٹائی وغیرہ کی ہے؟ راج مستری کا کام کیا ہے؟ اکیلے سب کچھ کر لو گے؟"

"یہ سیدہ سادو سا کام ہے۔ اس کے لیے کوئی راج مستری یا مزدور ہونا ضروری نہیں۔ صرف محنت کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنے کوٹھ میں کئی مرتبہ اپنے اور دوسروں کے مکانوں کی دیواریں بنائی ہیں۔ ان میں کھانیاں دردانے بھی لگائے ہیں" اوپر چھتیں بھی ڈالیں ہیں۔ یہ کون سا شرمیں بلا رہا ہے؟ اس کا کام ہے۔ آسان ہی ہے۔ میں سب کر لوں گا۔ تم دیکھو گے تو طبیعت خوش ہو جائے گی۔" مجھے اس کو قائل کرنے کی کوشش میں لطف آ رہا تھا۔

"وہ تو کام دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔" اس کے لیے میں مزید زری آگئی۔ اس کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ تقریباً آٹھ سو چکا تھا "لیکن جب تک کچھ کام کر کے نہیں دکھاؤ گے، تمہارے کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے منت خوروں سے بڑی نفرت ہے۔ میں نے خود زندگی میں کبھی مفت کا نہیں کھایا اور نہ ہی کسی کو کھلاتا ہوں۔"

وہ کھڑے ہی کھڑے ایک شاندار اور پرانے کے ساتھ اپنا شاندار آئیٹ چٹ کرنے لگا۔ میں نے تھوگ لگتے ہوئے نظر چڑائی اور دیکھے لیے میں کہا "ٹھیک ہے" میں بھی جب تک تمہیں کچھ کر کے نہیں دکھاؤں گا تم سے کچھ کھانے کو نہیں مانگوں گا۔"

"ہاں" یہ ہوئی تا مودتے والی بات۔ "سوئی سوئی سو چھوٹے کے نیچے اس کے ہونٹوں پر پہلی بار خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "اگر مجھے تمہارا حقوڑا سا کام دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ تم کام ٹھیک کر لو گے تو میں تمہیں چاروں دیواریں بنانے کی اجازت دے دوں گا جب تک تم کام کر کے، تمہیں تین دن وقت کھانا یہاں سے ملے گا

مالک کرنا تھا جس کا کاروبار پاکستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کے لیے پاکستان کے کسی بھی غائیو اشار ہو مل میں مل کی ادائیگی ضروری نہیں تھی، صرف مل پر دستخط کر دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ جسے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب اس قسم کے مل اس کے اداکاروں زہار سمٹ میں جاتے تھے اور کب ان کی ادائیگی ہو جاتی تھی۔ وہ شخص رجوع کے پچھر ہو مل پر ناشے کا سوالیہ بنا کر اٹھا۔

دو کو یقیناً اپنے پچھر ہو مل پر خاصا ناز تھا۔ شاید وہ گاؤں کے خوش حال لوگوں میں سے ایک ہو۔ اس دوران اس نے غائیو رات کے بچے ہوئے ایک آدمہ سالن کا برتن چولے پر رکھ دیا تھا اور دوسرے چولے پر الوٹھم کا ایک کالا سا فراغ تک چین رکھ کر اس میں کچھ کھن ڈال رہا تھا۔

ان چیزوں کی خوشبوؤں سے میری اشتیاء ہونے لگی۔ ایک لمے کے لیے مجھے شہ ہوا کہ شاید میرے محسوسات اس درد سے کے سے رہے ہوں جو کہ یہ لمحہ شکار کے قریب جا رہا ہوتا ہے۔ میری جھوک بائیں، طلب اور توانائیاں سبھی اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ جاگ اٹھیں۔

میں نے اپنے لیے میں مسکینی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دینو سامیں! میں بھکاری نہیں ہوں۔ نامک نانک کر کھانا نہیں چاہتا۔ میں تو کام کی تلاش میں ہوں۔ آپ مجھے اپنے ہوٹل میں وغیرہ میرا مطلب ہے میرا رکھ لیں۔"

"اڑے۔۔۔ میرے کام بھی کوئی آسان نہیں ہے۔ جو بھی سوالیہ اور محنت کھانا کھانے کے چکر میں آتا ہے وہ بولا ہے ہم کو میرا رکھ لو۔ کوئی بولا ہے ہم کو برتن دھونے پر رکھ لو۔ کوئی بولا ہے ہم کو باہر والا بنا لو۔ تم نے کبھی پہلے اس طرح کا کوئی کام کیا ہے؟" اس نے ایک لمے کے لیے رک کر سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے مگھوڑا۔ وہ باتوں کے دوران اپنا کام بھی کرتا جا رہا تھا۔ کھانے پینے کی مختلف چیزیں گرم کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے لیے اچھا خاصا پرفیشن ناشتا تیار کر رہا تھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیا اندازاً ہی سے دیتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں نے پہلے یہ کام نہیں کیے لیکن میں کر لوں گا۔ انسان کرنا چاہیے تو دنیا کا کوئی کام مشکل نہیں ہے۔"

"اڑے یہ سب زبان سے بولنا آسان ہے مگر کر دکھانا بہت مشکل ہے۔" وہ بدستور حقارت سے بولا "میں نے کام چور اور حرام خورد زندگی میں اتنے دیکھے ہیں کہ اب میں دور سے ان کی شکل دیکھ کر پہچان لیتا ہوں۔"

اس کا لازم یہ بھی پائی لینے کے لیے جاتے جاتے رک گیا تھا اور جس شخص نے انہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ گفتگو سے بھی سراخا کر کچھ دیر تک میرا جائزہ لیا تھا لیکن مجھ سے گنہگار نہ بنایا تھا۔

دشمن نے کھن میں دو اینٹوں کا شاندار آئیٹ تیار کر لیا تھا۔

# بنیادی انگلش اُردو ریڈر

☆ ---- عبدالرؤف انجم

انگلش زبان سیکھنے کے لئے

ایک مفید اور لاجواب کتاب

قیمت: -/40 روپے

مکتبہ القرآن اردو بازار لاہور 2

کچھ کم ہوگی۔

دوسرے دن میں ایک طرف کی کوسی سے زیادہ دیوار تعمیر کر کے  
تھا اور دیوار کو ایسی ہی بھی نہیں تھی۔ دوسرے اعتراف تو نہیں  
کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میرا کام اور کام کی رفتار دونوں  
چیزیں دیکھ کر حیران تھا۔ لیکن میرا خیال ہے اس سے زیادہ حیران  
اس وقت ہوا ہو گا جب اس نے بڑی محنت سے مجھے کھانے کے لیے  
دعویٰ کیا۔

اس نے میری بی بی کو ہوائی دیوار کی آؤں بیچ دیا کہ سو  
کے ہاتھ میرے لیے کھانا بھجوا دیا۔ اور پھر بھجوانا ہی چلا گیا کیونکہ  
میں منگوا آئی چلا گیا۔ میں نے اس کے کھس گوشے اور دونوں  
خوب ہاتھ صاف کیا۔ اس نے بھی ہاتھ تو نہیں دیکھے۔ آخر کار  
جب میں حکم دیا تو وہ میرے پاس آیا اور بولا ”خدا کا شکر ہے“  
میں نے جیسے صرف تین دقت کے کھانے پر ہی کام پورا کیا تھا۔ اگر  
ساتھ مزدوری بھی دیتے کا وعدہ کرتا تو بڑے کھانے میں رہتا۔“  
میں نے یو ایس اس کا دل دلائے کے لیے کہا ”میں نے تو اپنی  
ہاتھ دیکھ کر کہا ہے ورنہ میری خوراک تو اس سے زیادہ ہے۔“  
”خیر“ وہ لہجہ سانس لے کر بولا ”میں اس لیے نقصان میں  
نہیں رہوں گا کہ میرے خیال میں تم تو آئی ایم اے ہو۔ کام کو کیا  
نہیں لگا رہے تم تو شاید میرے اندازے سے بھی آگے وقت  
میں چاند دیوار میں بنا دو گے۔“

”انشاء اللہ“ میں نے بڑے غلوس سے عزم ظاہر کیا۔

تین دن میں میں نے چھپے کے گرد تین دیواریں کھڑی کر دیں۔  
میں نے دو راتیں وہاں گزار دیں تھیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ  
تین دن اور دو راتیں مجھے بہت اچھی محسوس ہوئی تھیں۔ یہ اظہار

بلکہ اگر تمہارے پاس رہنے کا ٹھکانہ نہیں ہے تو رات کو تم نہیں سو  
سکتے ہو۔ یہ میرا لازم سوچ بھی ادھر ہی سوتا ہے۔“ اس نے  
بڑی بڑی چارپائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ایک بڑا سا نوالا حلق سے اُتارتے ہوئے اسے گویا کوئی  
خیال آیا اور وہ خردوار کرنے کے سے انداز میں بولا ”لیکن اس کا یہ  
مطلب نہیں ہے کہ تم اس کام میں پورا مہینہ ہی لگا دو۔ اکیلے آوی  
کے لیے یہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا کام ہے۔ اگر ساتھ ایک  
مزدور بھی مل جائے تو تین دن میں کام ہو جائے۔“

پھر اس نے اعتراف کر لیا کہ اسے اس کام کے لیے آوی  
نہیں مل رہا تھا۔ ایک لمبے کے توقف سے وہ بولا ”کئی میں آوی تو  
ہمت ہیں لیکن سب سائیں مرادی زمینوں پر مصروف ہیں۔“ اس  
نے بند کی طرف اشارہ کیا ”چاہے پیسے زیادہ ملیں پھر بھی وہاں  
سائیں مرادی زمینوں سے کام چھوڑ کر تو کوئی نہیں آسکتا۔“

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تیزی سے ناشاپٹ کر لیا۔  
سو میرے اس دوران پانی کا ایک پھرا اور لگا لیا۔ دیر ہوٹ صاف  
کر کے سوچوں پر آدھتے ہوئے بولا ”اب تم زور لگ کر کس لوہ کام  
کرنے کے لیے نہیں جس سامان کی ضرورت ہوگی وہ سب میرے  
پاس ہے لیکن کام سارا کا سارا واقعی نہیں اکیلے ہی کرنا پڑے گا  
پانی تک خود ہی بھر کر لانا پڑے گا۔ کیونکہ سو مرادیں دن چڑھتے ہی  
ادھر ہوٹل میں مصروف ہو جائے گا۔“

”وہ تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ سب کچھ میں خود ہی کر دوں گا۔“  
میں نے اسے ایک بار پھر اطمینان دلا دیا۔

”زور احتیاط بھی کرنا۔ گاؤں میں آکر اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت  
نہیں۔ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ تم کوئی باہر کے آوی ہو۔ یہ تمہارے  
ہی حق میں اچھا ہے۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کہیں خواہ خواہ  
تمہارے لیے کوئی پریشانی نہ کھڑی ہو جائے۔“ اس کا لہجہ اب اچھا  
خاصا ہمدردانہ ہو گیا تھا۔

”تم فکر نہ کرو“ میں سب سمجھتا ہوں۔ مجھے تمہارے گاؤں  
میں آکر اٹھنے بیٹھنے کی فرمت ہی کہاں ملے گی۔“ میں نے کہا۔  
وہ خاصا مطمئن اور خوش نظر آئے لگ۔ صرف تین وقت کے  
کھانے پر اسے آوی مل گیا تھا جو راج اور مزدور دونوں کے فرائض  
انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ اس نے چھپری میں رکھا ہوا سامان  
میرے حوالے کیا۔ مجھے ایک پرانی، پٹی سی، مختصر سی دعوت بھی دی  
جس کا میں نے واقعی شکر ادا کیا اور اپنی عقیم الشان شلوار  
قیس سنبھال کر ایک طرف رکھ دی۔

بھوک کے مغزیت نے میرے معدے کی دیواروں کو اپنے  
ناخنوں سے کھینچنا شروع کر دیا تھا لیکن میں کام میں لگ گیا۔ خود ہی  
پانی بھر کر لایا۔ قیمت تھا کہ کتنا زیادہ درد نہیں تھا۔ خود ہی  
میں نے بہت سا کھانا کھا دیا۔ میں نے لاد لاد کر لایا اور دیوار تعمیر کرنی  
شروع کر دی۔ جلد ہی میں کام میں لگ گیا اور بھوک کی اذیت

کھڑا۔

لے کر نکلے شخص نے خاموشی سے اپنا بڑا سا ہاتھ پھیلا دیا۔  
دینے لگے سے کچھ لوٹ نکال کر گئے اور اس کے ہاتھ پر رکھ  
دیے۔ دروازہ دے کو ٹپکی سی آواز میں سندھی میں ذرا برہمی سے  
جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا۔

”اے۔ کیا تجھ کو پیغام نہیں ملا تھا کہ اب بدستہ تین سو روپے  
ہفتہ کے بجائے چار سو روپے ہفتہ ہو گا؟ سائیں دلبر کا حکم نہیں بچپنا  
تیرے تک؟“

”پیغام تو ملا تھا سائیں!“ دینے والا ہاتھ بڑا کر بولا ”لیکن آپ  
سائیں دلبر کی خدمت میں ہماری طرف سے فریاد کرنا۔ آپ خود ہی  
بتائیں ہم چار سو روپے ہفتہ کیسے دے سکتے ہیں؟ اتنا تو اب خود  
ہمارے حصے میں نہیں آتا۔ ہم تو تین سو روپے ہفتہ ہی بدستہ کاٹ کر  
دے رہے ہیں۔ گا بنی تو مٹی وہ مٹی ہے۔ پہلے تو رات گئے تک  
محفل میں غنی تھیں، کاکب بیٹے رجب تھے۔ اب تو مغرب کے بعد  
ساتا چھا جاتا ہے۔“

تباہ۔ دن بھر شدید مشقت کا بوجھ بٹانے ٹوٹ کر کھائے اور شام  
کو کاکب کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد میں کنوئیں کے لٹھے سے  
لٹھے پانی سے نہا کر کھیلے آسمان تلے، لہلاہے درختوں کے قریب  
لیں چوڑی چارپائی پر ناخنیں پھیلا کر لیٹا تو مٹی مٹی ٹھکن کی۔  
سے ایک نئی اور انوکھی سی زندگی کی لذت میرے وجود میں چٹکیاں  
لپٹی۔ مجھے کچھ لوگ جیسے میں ایک عمدہ مضبوط اور طاقتور ناخن تھا  
مگر میرے اندر ہمیں کہیں میل نہ کر لیں اور رنگ نہ لگا تھا۔ تین  
دن میں ہی جیسے وہ میل نہ کر لیں اور رنگ موحل کیا تھا۔ میرے  
پُڑے اور کراواں اندر ہی اندر صاف ستھرے ہو کر چپکنے دیکنے  
لگے تھے۔

اس دور ان میں نے نہ صرف اپنے کپڑے دھو لیے تھے بلکہ  
سمر سے کوئیں والی اسٹری لے کر انٹیں اسٹری بھی کر لیا تھا۔ دن  
بھر لٹکوت کس کر جان تو زحمت کرنے کے بعد رات کو صاف  
خمرے لباس میں تاروں بھرے آسمان تلے بیٹھ کر دودھ پتی پیتے اور  
سمر سے باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا، بڑی فرحت محسوس ہوتی۔ وہ  
بہت سی سیدھا سادا اور صاف دل سانہ جوان تھا۔

”رستوران“ میں آنے والے کاکب نے میری طرف زیادہ  
توجہ نہیں دی تھی۔ اگر کسی نے کچھ پوچھا بھی تھا تو دینے انہیں نہ  
جانے کیا بتایا تھا۔ سرحال مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ میرا  
وقت اچھا کر رہا تھا۔

چوتھے روز دوسرے کو جب میں چوتھی دیوار تو مٹی سے زیادہ  
تھکا تھا تو ایک سی مجھے اس سوال نے آن گھیرا کہ اب کیا ہو گا؟  
کام تو ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس کے بعد دیکھ کر میری ضرورت  
نہیں تھی۔ اب مجھے کدھر کا رخ کرنا تھا؟ مجھے نہیں معلوم تھا زندگی  
کا دھارا اب مجھے کس طرف لے جانے والا تھا۔

میں نے چوتھے اور آخری نمبر سامنے کی دیوار کو دکھا تھا۔  
سامنے کی اس دیوار کی تعمیر کسے وقت میری پشت باہر بیٹھے کاکب  
کی طرف تھی۔ اچانک میں نے دو آدمیوں کو اپنی اوجھری سی دیوار  
کے قریب سے گزر کر دیکھ کے قریب پہنچے دیکھا۔ ان میں سے ایک  
خوب لباس چڑا، غم نہ تھا۔ اس کی مونچھیں دیکھ کر مونچھوں سے  
کس بڑی اور بابرعب تھیں۔ وہ نوجوان ہی تھا۔ سر پر بڑی سی پگڑی  
تھی۔

درازا رہا چھوٹے قد کا اور کم جسم تھا لیکن اس کے کندھے پر  
کاٹھنک موجود تھی۔ وہ دونوں مٹی کے کلاؤں کے سامنے دیکھ کر  
مقابلہ جاسکے میں دیوار میں ایٹیں بھی جن رہا تھا اور یہ منظر بھی  
دیکھ رہا تھا۔

دینے نے چٹکی سی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ وہ یقیناً  
دینے کے لیے انجمن نہیں تھے لیکن انہیں دیکھ کر دینے کے چہرے سے  
کچھ زندگی کی چمک رخصت ہو گئی تھی۔ تاہم بظاہر وہ حوصلے سے

اُردو کے خوبصورت شاعر اکبر الہ آبادی  
سے لے کر آج کے دور کے جانے

پہچانے شاعروں کا منتخب اور دلچسپ  
ظریفانہ کلام۔۔۔۔

اُردو کی ظریفانہ شاعری

☆ ---- ہما علی

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

لاڈلو

قمر اجنادی قیمت: -/90

”اے تقرر بند کر۔ حالات خراب ہیں اسی لیے تو مجھے کی رقم  
بڑھ گئی ہے۔ تمہیں کیا پتا، ہمیں ملائے کی حفاظت کے لیے اور تم  
لوگوں کے کاروبار جاری رکھنے کے لیے کیا کیا مصیبت اٹھانی پڑی  
ہے۔ بس سیدھی طرح بتا۔ چار سو روپے ہفتہ دے گا یا نہیں؟“  
”سائیں! چار سو روپے ہفتہ دینے سے تو بہتر ہے میں یہ ہوٹل  
ہی بند کر دوں۔“ دیکھتا ہوا پانچ سو روپے دے گا۔ اس کے ہاتھ بے شک  
بندھے ہوئے تھے لیکن اس کے لیے میں بغاوت تھی۔ اس کا لہجہ  
بلاشبہ اس شخص کا لہجہ تھا جو کسی کی مسلسل زیادتیوں سے تنگ آکر  
آخر کار زندگی سے بے زار ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی جان کی بھی پروا  
نہیں رہتی۔

”یعنی تیری طرف سے انکار ہے؟“ دراز قد نور جان پھنگارا۔  
چاروں طرف گھرا سناٹا چھا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا، رہے ستوران  
کے بیشتر گاہک کھسک کھسک چکے تھے۔

”تین سو روپے ہفتہ دینے سے میں نے انکار نہیں کیا۔ اس  
سے زیادہ دتا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“ دیکھنے والے فیصلہ کن لہجے  
میں جواب دیا۔

اچانک ہی ان دونوں نے دیکھ کر پکڑ کر کاؤنٹر کے عقب سے  
کھینچ لیا اور فرش پر گرا کر بھاری پونوں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ دیکھ  
رہا تھا، فریاد کر رہا تھا۔ آخر کار مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں  
نے گارے کا تسلا ایک طرف رکھا اور جس بیچ پر میں کھڑا تھا اس  
سے چلا نکلا گادی۔

چھپھر رہے ستوران کے اندر دینی جیسے میں اس وقت کوئی گاہک  
موجود نہیں تھا۔ نہیں دو تواروں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ بیچ میں  
بچتی بھی جگہ خالی تھی، اس میں دیکھنا ان دونوں کی ٹھوکروں کے  
درمیان فٹ بال کی طرح لڑھک رہا تھا۔ وہ دراصل ٹھوکروں سے  
بچنے کی کوشش میں تڑپ کر کبھی ایک طرف کو لڑھکتا تھا اور کبھی  
دوسری طرف کو لیکن بیچ نہیں پار رہا تھا۔

دراز قد اور پست قد، دونوں ہی تواروں کے پیروں میں بھاری  
بوٹ تھے۔ کبھی ایک کی ٹھوکری دیکھ کر دوسری کی ٹھوکری پر پڑتی، کبھی دوسرے کی  
ٹھوکری اس کی کھوپڑی پر۔ مجھے ابھی طرح اندازہ تھا کہ یہ ضربیں اس  
کے لیے کتنی اذیت ناک ثابت ہو رہی ہوں گی۔ وہ ہری طرح بلبلاتا  
رہا تھا، درد سے تڑپ رہا تھا لیکن ٹھوکریں مارنے والے دونوں  
آدھی گویا اس کی اذیت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

میں ”دھم“ کی خاصی زوردار تھوڑ کے ساتھ اندر کودا تھا  
لیکن انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔  
انہیں یقیناً پورا اطمینان تھا کہ کوئی ان کی کارروائی میں مداخلت کی  
جرات نہیں کر سکتا۔

دیکھنے والے کے حلق سے کچھ ناقابل فہم سی آوازیں نکل رہی تھیں۔  
درحقیقت ایک تو وہ معافی مانگ رہا تھا، فریاد کر رہا تھا دوسرے یہ

جب کوئی پہلی بار ان کے سامنے مراٹھا کر سید تان کر کھڑا ہوا ہو۔ اگر وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے فرانک پان اٹھاتے دیکھوں گا اور پھر بھی سعادت مندی سے کھڑا رہوں گا یا ضربیں لگوانے کے لیے اپنی کھوپڑی اس کے سامنے کر دوں گا تو یقیناً وہ سخت احمق تھا۔

اس نے کھد کھد کرتی دال سمیت فرانک پان میرے سر پر رسید کرنے کے لیے طاقت بھی غیر ضروری پر کچھ زیادہ ہی صرف کر دی۔ مجھے ایک طرف ہٹنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ نہ صرف اپنی جھونک میں بہت آگے چلا گیا بلکہ کھد کھد کرتی ساری دال بھی اس کے ساتھی کے کپڑوں اور چہرے پر گر گئی۔ بے ہوش ہونے کے باوجود اسے زبردست جھکا سا لگا۔ وہ زمین سے تقریباً اچھل پڑا۔

فرانک پان نوجوان کے ہاتھ سے پھل کر نکل گیا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ نوجوان خود بھی اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے پھا۔ فرانک پان بے شک الوہیم کا تھا لیکن جس قوت سے نوجوان نے سمجھا تھا اس سے یقیناً فرانک پان اور میری کھوپڑی دونوں ہی میں گراؤنٹ پڑ جاتا۔

وہ دیوار سے ٹکرانے سے بچا اور فوراً ہی اس نے جھک کر اپنے ساتھی کے کندھے سے اپنی ہلکا کھوپڑی نکالنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک میری لات اس کی پسیوں پر پڑ چکی تھی۔ وہ اچھل کر دوڑا چکا۔

میں نے بھی اسے ہاتھ لگانے کی زحمت نہیں کی۔ جس طرح وہ دونوں دیکھ کر ٹھوکر دینے پر رکتے ہوئے تھے، میں نے بھی اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر چند ٹھوکریں رسید کیں۔ حالانکہ میرے پیروں میں بھاری بوت نہیں تھے لیکن نوجوان ہلکا اٹھا کیوں کہ میں نے اسے جوڑو اور کراٹے کی ٹیکنیک سے ٹھوکریں رسید کی تھیں۔ تاہم احتیاط برتی تھی ورنہ نوجوان کے غرور مند ہونے اور میرے کٹے پاؤں ہونے کے باوجود اس کی ایک آدھ پہلی ٹوٹ سکتی تھی۔

وہ کسی طرح اٹھنے میں کامیاب ہو گیا اور ایک بار پھر ”ٹیکنیک“ غلطی کرتے ہوئے اندھا دھند مجھ پر جھپٹا۔ اس کی گتیش پر بھی میں نے ایک گھونسا رسید کیا لیکن پوری طاقت صرف نہیں کی۔ میری ان سے کوئی وہ دشمنی نہیں تھی۔ میں انہیں صرف زیادتی سے روکنا چاہتا تھا۔ میں نے روج کو اپنا دشمن شمار کیا تھا۔ وہ دونوں میری آنکھوں کے سامنے اس کا جو شکر کر رہے تھے وہ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

میں نے نوجوان کی خبر لینے کے سلسلے میں اس پر ہاتھ لگای رکھا تھا ورنہ میں چاہتا تو ایک گھونٹے میں وہ بھی بے ہوش ہو سکتا تھا۔ گھونسا کھا کر لڑکھایا اور ایک گھٹنے کے تل گرا۔ میں نے اس پر مزید وار کرنے کے لیے کوئی تیزی نہیں دکھائی اور اسے شیعے کا موقع دیا۔

بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ منہ مانگا جھوٹے دینے کے لیے تیار ہے اگر نہ دے سکا تو وہ سرتوران بند کر کے چلا جائے گا لیکن اب کوئی اس کی بات نہیں مٹ رہا تھا۔ اس کے لیے اب گویا معافی کا وقت گزر چکا تھا۔

میرے خیال میں پہلے بہت قد کا بندوبست کرنا ضروری تھا کیوں کہ اس کے کندھے پر کھلا کھوپڑی موجود تھی۔ میں نے اپنی تاحیر قوت گویا ایک نقطہ پر مرکوز کرتے ہوئے اس کی گتیش پر صرف ایک ہی گھونسا رسید کیا۔ اس کے لیے وہ ایک ہی گھونسا کافی تھا۔ وہ اچھل کر خاصی دور گیا اور میری ہیبتانی ہوئی ایک دیوار سے ٹکرا کر پٹ سے چھٹکی کی طرح گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔

درازد اور بارب موٹو چھوٹوں والا نوجوان یوں تو اپنے ساتھی کی گتیش پر گھونسا پڑتے ہی میری طرف گھوم چکا تھا لیکن کئی لمے تک وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس نے مجھ پر حملہ توڑ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مجھ سے خوفزدہ تھا۔ درحقیقت وہ حیرت سے بہت بن کر رہ گیا تھا۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایک ”مزور“ نے اس کے ساتھی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ میرے ہاتھ ابھی تک مٹلی میں گھڑے ہوئے تھے اور جسم پیسے سے تر تھا۔ لباس کے نام پر میرے جسم پر صرف وہی وصوفی کھنجر جوڑے تھے وہی کھنجر اور جسے میں نے لنگوٹ کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔

میں نے دراز دزد نوجوان پر حملہ کرنے میں پہل نہیں کی کیوں کہ وہ دیکھ کر ٹھوکریں مارنا بند کر چکا تھا۔ میں اس کے سامنے بالکل ساکت کھڑا تھا اور اسے گویا سوچنے سمجھنے کا موقع دے رہا تھا کہ اسے مجھ سے ”چکا لینا چاہیے یا نہیں۔“

ایک لمے کے لیے گویا نوراً منظر ہی ساکت ہو کر رہ گیا۔ میں چلکے تک نہیں جھپکا رہا تھا اور دراز دزد نوجوان بھی اسی طرح ساکت کھڑا تھا۔ صرف پس پردہ آوازوں کی طرح دیکھ کر دور بھری گراہیں ابھر رہی تھیں۔

پھر یکدم ہی جیسے اس غرور مند نوجوان کو کسی ناویدہ شگے تار سے فزودا کر کرٹ لگا لیکن اس سے وہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس نہیں آیا بلکہ اس پر اب چاکا جیسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر زورنے کے آثار نمودار ہوئے ”آنکھوں میں دھشت اور دیوانگی اور آنک۔“

اس نے چلنے پر سے الوہیم کا فرانک پان اٹھایا جس میں ”دال زوال“ تیار ہونا تھی۔ دال کو کھنکھار لگانے کے لیے دونوں چترک زالی گئی تھیں مگر اس وقت تک دال چلنے لگی تھی اور کھد کھد کر رہی تھی۔

تو گویا بیشاپ اپنی طاقت کے ذم میں رہے ہوں جنہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو جن کے سامنے بھی کسی نے سر نہ اٹھایا ہو وہ مولا لڑائی لڑائی کے معاملے میں احمق ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً

کامیاب دار میں بدلنے کے لیے فوری طور پر ایک قدم بڑھانے ہوئے خنجر والا ہاتھ اٹھا تھا لیکن اسی لمحے اس کا پاؤں چٹکیوں میں الجھ گیا۔

وہ لڑکھڑکیا۔ میرے لیے اتنی ہی سہولت کافی تھی۔ میں نے اس کی کٹھنی پر کرائے کا ہاتھ رسید کیا۔ یہ ہاتھ اس کے لیے کافی ثابت ہوا۔ وہ لہرایا اور اپنے سامنے ہی جا کر۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ دوش میں تھا لیکن تیزی سے آنکھیں پٹ چاما تھا۔ جیسے چٹائی کھو بیٹھا ہو۔

دخو کو جب تعین ہو گیا کہ وہ اب نہیں اٹھ سکے گا تو وہ لڑا ہوا اور نکلوتا ہوا کاؤنٹر کے عقب سے نکلا۔ میرے قریب آ کر چند لمحے تو وہ بے یقینی سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہا۔ اسے گویا تعین نہیں آ رہا تھا کہ میں وہی مزدور تھا جسے اس نے صرف تین وقت کی روٹی کے معاوضے پر دیوار میں قید کرنے پر لگایا تھا۔ اسے شاید شبہ تھا کہ میرے اندر کوئی اور روح حلول کر گئی تھی۔

پھر یکدم ہی وہ پھٹ پڑا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارا شکریہ ادا کروں یا تمہیں جوتے ماروں۔“

”میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”تم نے مجھے بھی مروا دیا ہے اور اپنی موت کا بھی سامان کر لیا ہے۔“ اس نے استغناء گھیرا ہٹ کے عالم میں مجھے مطلع کیا۔

”کیوں؟“ میں نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

”تمہیں ان دونوں کو نہیں مارنا چاہیے تھا۔“ اس نے فرش پر گرے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیا میں ان کے ہاتھوں تمہیں مرتے دیکھ رہا؟“ میں نے نرمی سے پوچھا۔

”نہیں... خیر۔ انہیں روکنا بھی ضروری تھا۔“ اسے اپنی چوٹیں یاد آ گئیں اور وہ ایک بار پھر پلکیاں اور کھڑکی دیکھو سلاتے ہوئے کراہ اٹھا۔ ”لیکن تم بچاؤ کرانے کی کوشش کرتے تو اچھا تھا۔ تمہیں ان پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“

”اس قسم کے لوگ بچاؤ کرانے والوں کو بھی مارتے ہیں۔ یہ تو ایک ہی زبان سمجھتے ہیں جو میں نے استعمال کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں معلوم ہے یہ لوگ کون ہیں؟“ دھونے دریافت کیا۔ ”مجھے کیا معلوم۔ میں تو یہاں اجنبی ہوں۔ میرا خیال ہے۔“

یہاں کے کوئی بائی گرامی غنڈے ہوں گے۔ عام طور پر اس قسم کے لوگ غنڈہ ٹکس یا بسترے لیتے آتے ہیں۔“

”یہ عام قسم کے غنڈے بد معاش نہیں ہیں۔ یہ ساسی دلبر خان کے آدمی ہیں۔“ دھونے خوفزدہ لمحے میں مجھے بتایا۔ ”کبھی غرا دیں بھلا ان سے بھگڑا کر نے کے بارے میں کوئی کیسے سوچ سکتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں... باہر جو گاہک بیٹھے تھے ان میں کوئی میرا مہربان تھا کوئی دوست تھا کوئی بزدلی اور کوئی آدھار کھانے والا تھا۔“

اس دوران دھونے بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کاؤنٹر کا سارا لے کر پیلوں پر ہاتھ رکھ کر کچھ ہانپ رہا تھا کچھ کھانسی رہا تھا۔ اس کی پھلکی پھلکی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے اس دھول دھبے سے روکنا چاہتا تھا لیکن ابھی اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ہم دونوں کے بیچ میں آئے۔

نوجوان سر جھٹکا ہوا تھا۔ اب اس کی عقل ٹھکانے آ چکی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر بھی آچکا تھا۔ میں نہیں دیکھ سکا تھا کہ خنجر اس نے کہاں سے نکالا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی پشت میری طرف ہوئی تھی۔ غالباً اسی دوران اس نے ٹیس کے نیچے سے خنجر نکالا تھا۔

میرا اندازہ درست تھا کہ اس کی عقل ٹھکانے آ چکی تھی کیوں کہ اس نے اندھا دھند مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ میں شخص ایک دراز قد، ٹوٹا اور درزشی جسم کا مالک دکھائی دینے والا مزدور نہیں تھا۔ میرے پاس صرف جسم ہی جسم نہیں تھا۔ مجھے اس کا استعمال بھی بہت اچھی طرح آتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ آ گئی تھی لیکن اس دھندلاہٹ کی تہ میں شبہات کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ میری طرف سے شک میں مبتلا ہو چکا تھا بلکہ شاید اسے یقین ہو چکا تھا کہ میں وہ نہیں تھا جو نظر آ رہا تھا۔ خنجر اس کی گرفت بنا رہی تھی کہ وہ اس کے استعمال میں ماہر تھا۔ ابتدا میں وہ صرف زعم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اتنی آسانی سے مار کھا گیا تھا ورنہ اتنا ترنوالا سہرا مال نہیں تھا۔

اس کی نظر سانپ کی طرح مجھ پر بھی ہوئی تھی۔ میں بھی پلک جھپکاتے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دھونے زندگی کی طرف سے یقیناً مایوس ہو چکا تھا کیوں کہ وہ جلدی سے کاؤنٹر کے عقب میں چلا گیا تھا۔

پچھلے کے بچے زیادہ جگہ میسر نہیں تھی لیکن جتنی بھی تھی اس میں وہ نوجوان نیم دائرے میں نہایت آہستگی سے چکر کاٹتے ہوئے نہایت ہی آہستگی سے میرے قریب آ رہا تھا۔

اس کے ہونٹ سختی سے میچے ہوئے تھے۔ اس کا خنجر بھی میرے خون کا پائسا دکھائی دے رہا تھا اور وہ خود بھی۔ اب میرے اعصاب تن پکے تھے۔ میرے اندازے کی ذرا سی غلطی میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔

اس بار اس کا ہاتھ میری توقع سے زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اتنی ہی تیزی سے میں پیچھے ہٹا۔ خنجر کی نوک میرے پیٹ سے بے شکل آدھ اچھ کے قافلے سے گزری ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی قدرت نے عجیب طریقے سے میری مدد کی اور میرے کام کو بہت آسان بنادیا۔ دھونے اور اس نوجوان کی پلکیاں زمین پر گر کر کھل چکی تھیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈی ہو گئیں۔

اس نوجوان نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو

کم نہیں۔ سائیں مراد کو کون سا روز روز اوہر آئے کی فرصت ملتی ہے۔ دلبر خان تو نہیں رہتا ہے۔ وہ یہاں ان کا خاص آدمی ہے۔ یہاں سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک سائیں مراد یہاں نہ ہوں، یوں سمجھو، دلبر خان ہی کبھی کا مالک ہے۔ اسی کا حکم چل رہا ہے۔ اس کے آدمی جو حکم لے کر آجائیں وہ ہمارے لیے بھتر بکیر ہے۔

”جستہ تمام کاندھاروں سے لیا جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔ صرف کاندھاروں سے ہی نہیں، چھابڑی والے اور ریزمی والے تک سے لیا جاتا ہے۔“ دھونے جواب دیا۔  
 ”یہ صرف دلبر خان کا اپنا دھندا ہے یا اس میں سے حصہ سائیں مراد کو بھی جاتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم کو کیا معلوم بلایا؟“ وہ بیڑاری سے بولا۔ ”جتنی اندر کی باتوں کا ہم کو کیا پتا۔ ہم کو تو بس حکم ملتا رہا ہے اور ہم اس کی تعمیل کرتے آ رہے ہیں۔ میرا تو اب بھی بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن کیا کر لیں۔ میرے پاس واقعی چار سو روپے ہفتہ کی تنجائش نہیں ہے۔ میں بھی بال بچے دار آدمی ہوں۔ یہ چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اوہر اُوحار کھانا بھی چلا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں ہم بھوکے مرتے ہیں۔ کیا کریں۔ کہاں جائیں۔ ہم کہیں جانے کے قابل بھی تو نہیں ہیں۔“ وہ ایک بار پھر کراہنے لگا۔

ایک اچھوتہ فقیر جو اس کے چہرے یا پیشانی پر پڑی تھی وہاں اب نیلے گومڑ نمودار ہونے لگے تھے۔ کچھ کھال بھی پھٹ گئی تھی اور وہاں سے خون برس رہا تھا۔

لیکن جیسے ہی انہوں نے دیکھا کہ مسکین علی اور محبت علی سے میری تحاراد شروع ہو رہی ہے، تو سب بھاگ گئے۔  
 پھر اس نے ایک غصہ ی سانس لے کر کہا۔ ”یہاں کو گھٹھ کیسے کے بھی ہوں۔ اب لوگوں میں قلم کے خلاف ایک ہو کر لڑنے کا جذبہ نہیں رہا۔“

میں اسے بتاتا چاہتا تھا کہ یہ بات صرف گاؤں گھوٹوں ہی کی نہیں، شہروں کا اس سے بھی برا حال تھا۔ لوگوں کو کنگی کوچوں میں بکڑیوں میں، حتیٰ کہ اکائیوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ان کے دلوں میں نہ جانے کتنی طرح کے خوف بٹھا دیے گئے تھے۔ یہ بھی پیشہ ور سازشیوں کی بہت بڑی سازش تھی تاکہ لوگ قلم کے خلاف متحد ہو کر کبھی نہ لڑ سکیں۔ لوگ متحد ہونے لگتے ہیں تو قلم مٹنے لگتا ہے۔ قلم مٹتا ہے تو بہت سے لوگوں کے بہت سے دھندے چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ اپنی سازش میں کامیاب تھے۔ اب کہیں کسی پر قلم ہوتا ہے تو بعض اوقات دیکھنے والے سوچتے ہیں، یہ فلاں حوالے سے ہمارا آدمی نہیں ہے، ہماری پائی کا نہیں ہے، ہمارے علاقے کا نہیں ہے، ہماری زبان نہیں بولتا اس لیے اس پر قلم ہونے کا کوئی بات نہیں۔ وہ قلم انہیں قلم ہی نہیں لگتا۔ بعض اوقات تماشا دیکھنے والے کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ کسی کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے تو ہونے والا کچھ نظر نہ آتا، اپنی جان بچاؤ، حالات خراب ہیں۔ بس یہی ساری خرابی کی جڑ ہے۔ قلم کا سلسلہ دراز ہونے میں اس کیفیت کا بڑا ہاتھ ہے۔

میں یہ سب کچھ دیکھ کر کتنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکا۔ مجھے معلوم تھا وہ میرا فلسفہ ہم نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ میں نے یہ سب کچھ کہنے کے بجائے دیوار کے قریب دوڑے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ”مسکین علی اور محبت علی ان کے نام ہیں؟“

”ہاں۔ چھوٹے قد والے کا نام مسکین علی ہے۔“ اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”اور یہ جو لمبا سا... بھگڑا سا نوجوان ہے اس کا نام محبت علی ہے۔ یہ آپس میں آئے چاچے کے بیٹے ہیں۔“  
 ”کمال ہے!“ میں نے تاسف سے سوچا۔ ”انہوں اور شخصوں میں بھی تضاد کتنا بڑھتا جا رہا ہے۔ مسکین علی کے پاس مسکین کے بجائے کلا شکوف تھی اور محبت علی محبت بانٹنے کے بجائے تجربے لوگوں کے پیٹ بھارتے کو بھر رہا تھا۔“

”دلبر خان کے آدمی ہیں؟“ میں نے مزید تصدیق چاہی۔  
 ”ہاں۔ اس کے سارے کام یہی کرتے ہیں۔ دلبر خان تو خالی حکم چلاتا ہے۔“ دھونے بتایا۔

”لیکن میں نے سنا ہے، دلبر خان تو خود ہر اسائیں مراد خان کا آدمی ہے؟“  
 ”ہاں۔ ٹھیک سنا ہے تم نے۔ لیکن دلبر خان خود کسی بادشاہ سے

اعتبار ساجد کی ہنستی مسکراتی  
 ہوئی شگفتہ تحریروں کا نیا انتخاب

قلم گاریاں

قیمت: 75/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

گڑھا تھا ہوا تھا جو گز کا کام دیتا تھا۔ چیمبر میں سے ایک ٹالی بھی اس میں جاری تھی۔ میگزین میں نے اس میں پھینک دیا۔  
دبوتے کو یا مجھے مزید سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں تو دیر خان کے بیروں میں کر کے اس کی منت ساجت کر کے... خدا رسول کا واسطہ دے کر شاید اپنی جان بچا لوں لیکن تمہاری جان بچنا مشکل ہے اسی لیے میں کہہ رہا ہوں تم یہاں سے نکل جاؤ۔ تم نے میری ہمدردی میں یہ سب کیا ہے۔ میں تمہیں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔"  
اسی دوران دروازہ قند نوجوان جس کا نام ذبیحہ نے محبت علی بتایا تھا، کھلایا پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے حواس تھوڑی ہی دیر کے لیے ختم ہوئے تھے۔ وہ میرے انداز سے کم وقت میں ہوش میں آیا تھا۔ میں چپکنا ہو گیا۔

لیکن محبت علی نے اپنی فطرت کو قابو میں رکھا اور مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ کوئی بے ہوش نہیں تھا کہ اس دوران اس کے حواس کام کرتے رہے ہوں۔ وہ میری اور ذبیحہ کی گفتگو بھی سنتا رہا ہو، سمجھتا رہا ہو، تاہم اس وقت اس کا چہرہ تاثرات سے عاری اور پتھریا ہوا سا لگ رہا تھا۔

اس نے جھک کر مسکین علی کو کندھے پر اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں بصر میگزین کی کلا شکوف پکڑی اور باہر چلا گیا۔ اس کی چال غیر متوازن تھی لیکن وہ گرا نہیں۔ دبو ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا اور قیادی سے انداز میں بولا۔ "ساتھ میں محبت علی... میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ کے پاؤں پڑنا ہوں۔ اس آدمی کو میں نے نہیں بولا تھا کہ یہ آپ سے اڑے یا بڑ تیزی کرے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ میں اس کی طرف سے بھی معافی مانگتا ہوں ساتھی... اور اپنی طرف سے بھی۔ آپ کو اللہ سائیں کا واسطہ مجھ کو معاف کر دیں۔"

اس کی فریاد جاری رہی لیکن محبت علی گویا اس کی آواز سن ہی نہیں رہا تھا۔ دستوران کی چارپائیوں اور میزوں سے ذرا ہٹ کر درختوں کی چھاؤں تلے ایک صاف ستھرا چمکتا ہوا رنگ برنگ سا ٹانگا کھڑا تھا۔ اس میں رہتا ہوا گھوڑا خوب صحت مند تھا اور وہ بھی گویا چمک رہا تھا۔

محبت علی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو تانگے میں ڈالا اور اس میں سوار ہو کر خود ہی چلا تا ہوا اسے گھما کر ایک کٹی کی طرف لے گیا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ذبیحہ میری رہائی ہوئی اور حویلی دوبار کے قریب سے میری طرف چلا۔ اب تو اس کا چہرہ خوف سے ہانکلی ہو کر گرہ لیا تھا۔ وہ بھی نیچھی سی آواز میں بولا۔ "محبت خان کے اس طرح جانے کا مطلب میری موت ہے۔ اور تمہاری بھی۔ وہ کچھ بول لیتا۔ اپنا غصہ نکال لیتا۔ بے شک مجھے مار بھی لیتا تو اچھا تھا لیکن وہ جس طرح خاموشی

وہ اپنے جوتی تخت پر بیٹھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "تم نے جو کتنا تھا کر دیا؟ اب ادھر کھڑے ہو کر تمہاری ادول کی طرح پوچھ کچھ مت کرو بلکہ اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ کپڑے پہنو اور فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ جدھر منہ اٹھے پلے جاؤ لیکن یہاں مت ٹھہرو۔"

پھر اس نے خوفزدہ سی نظروں سے ان دونوں افراد کی طرف دیکھا اور تقریباً دو سوپے والی آواز میں بولا۔ "دیر خان کو سارے دانے کی خبر مل چکی ہوگی اور وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہو گا۔ خدا کے لیے تم فوراً یہاں سے پلے جاؤ۔"

"اور تمہیں اس کے ہاتھوں مرنے کے لیے جھوڑ جاؤں گا؟ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بابا! ہم کو اگر اس کے ہاتھوں سے مرنا ہو گا تو تم کیا ہمیں بچالو گے؟ وہ پریشانی اور تیزاری کے عالم میں تقریباً چلا اٹھا پھر اس نے مسکین علی اور محبت علی کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر تم نے ان دونوں کو مار لیا ہے تو یہ مت سمجھنا کہ تم دیر خان کو بھی مار لو گے۔"

"کیا وہ بہت طاقتور ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
"بات طاقت کی نہیں۔ طاقت میں تو شاید وہ محبت علی سے کم ہی ہو گا۔" اس نے دروازہ قند نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن وہ ساتھی مراد کا کھرا رہے۔ یہاں کا بادشاہ ہے۔ ہم تو اس کے سامنے سر اٹھا کر بات بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہر وقت دو کلا شکوف والے ہوتے ہیں۔ وہ بات بعد میں کرتے ہیں گولی پیلے چلاتے ہیں۔ تمہیں بتا ہے گولی کے سامنے بیاضی واڈی... یہ جان دان کام نہیں آتی۔" اس نے میرے سر پر ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔  
"مجھے معلوم ہے۔" میں نے طاقت سے کہا۔

"معلوم ہے تو پھر یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ جان بچانے کی فکر کرو۔ ادھر کھڑے ہو کر باتیں مت بناؤ۔" اس نے بے اعتدال ہاتھ پر ہاتھ مارا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکلی تھی کیوں کہ اس کا ہاتھ گومر پڑ گیا تھا۔

"میں بیروں کہاں تک بھاگوں گا۔ اور کتنا بھاگوں گا۔" میں نے معذرتی اداسی سے کہا۔ "میری جیب میں تو کوئی پیسہ بھی نہیں ہے۔"

"ارے بابا۔ جو سودو سو روپیہ لیتا ہے مجھ سے لے جاؤ۔ جتنی جتنی مقدار میں کبھی ہے وہ وہاں برداشت کرنی ہے۔" وہ تیزاری سے بولا۔ "مجھے کے سلسلے میں جن توپوں کا لین دین ہو رہا تھا وہ فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک پچاس کا اور کچھ دس دس کے نوٹ اٹھا کر میری طرف پھینکا۔

میں نوٹ لینے کے بجائے جھک کر وہ کلا شکوف اٹھانے لگا جو مسکین علی کے نیچے دلی ہوئی تھی۔ کلا شکوف اس کے نیچے سے کھینچ کر میں نے اس کا میگزین نکال لیا۔ چیمبر کے باہر ایک خامسا بڑا



بڑے بے معاش تھے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ”وہ تیزی سے بولا۔  
”کوئی تمہاری کمائی پر یقین نہیں کرے گا۔ میں تمہاری  
معیت کو بڑھاتا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں نے زندگی میں کبھی کسی  
سے اس طرح رقم نہیں لی۔ میرا دل نہیں مان رہا۔ ایسی رقم لینے  
سے بہتر ہے کہ میں خالی ہاتھ ہی رہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ کوئی خیرات یا عسیت تو نہیں ہے۔“ دینو جرح سے لہجے میں  
بولا۔ ”اس سے زیادہ کا تو تم نے میرے لیے کام کر دیا ہے۔ میرا  
ارادہ تو ویسے بھی تمہیں مزدوری دینے کا تھا لیکن میں نے تمہیں  
آزمائے کے لیے صرف تین وقت کی روٹی کا وعدہ کر کے کام پر لگایا  
تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کام چور یا مفت خور ہے تو نہیں ہو لیکن  
تم تو جس نکلے تم نے چار آدمیوں کا کام کیا ہے۔ اس رقم کو اپنی  
آزادی مزدوری سمجھ کر لے جاؤ۔“

”اس کام کو میری طرف سے خفیہ سمجھا۔ اگر کبھی تمہارے  
حالات بدل جائیں، تمہارا یہ رستوران ترقی کر جائے تو بھی تمہارا  
یاد کر لیا کرتا کہ ایک پروسی کیا تھا جو یہاں تمہارے چھپرہ بوتل کی  
پسلی چار دیواری بنا کر گیا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں ابھی لباس تبدیل نہیں کر پایا تھا کہ آٹھ دس آدمیوں کی  
ایک بڑی چھپر کی طرف آن کر دکھائی دی۔ ان میں مختلف عمروں اور  
مختلف محلوں کے لوگ تھے۔ وہ خامے جوش میں دکھائی دیتے تھے۔  
وہ چھوٹا موٹا سا ایک جلیس تھا جو چھپر کی طرف چلا آ رہا تھا۔

میں بری طرح چونک۔ شادوار تھیں میرے ہاتھوں ہی میں وہ  
مچی۔ میرے اعصاب ایک بار پھر تنے گئے لیکن وہ سسرے ہی لے گئے  
مجھے احساس ہوا کہ وہ دلیر خان کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی  
خود دلیر خان ان میں شامل تھا۔

وہ جوش و خروش میں ضرور تھے مگر پھر بھی ان کی شخصیتوں میں  
ایک بے عنوانی سی مسکینی کی خشک مچی جو عموماً لکھے اور پے ہوئے  
لوگوں کے وجود کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ ان کے مٹلے کچھ زیادہ  
ایٹھے نہیں تھے۔ ان میں سے دو تین کو بہ مشکل صرف سفید پوش  
کہا جاسکتا تھا سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی  
جھنڈا نہیں تھا۔ وہ دلیر خان کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے نیچی آواز میں دینو سے پوچھا۔ ”یہ کون لوگ ہیں؟“  
وہ آنکھیں سیڑھے سے ان لوگوں کو آتے دیکھ رہا تھا۔ خود کلامی  
کے سے انداز میں بولا۔ ”یہ تو کمیٹی کے دکاندار ہیں۔ لیکن یہ یہاں  
کیوں آ رہے ہیں؟“ وہ لوگ چھپر کے قریب آ پہنچے۔ ہم دونوں آگے  
بڑھ کر ادھوری دیوار کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ آدھے حصے میں  
دیوار نہیں تھی۔ گویا چھپر میں آمد و رفت کے لیے اب بھی راستہ  
کھلا ہوا تھا۔ سب نے باہر باری دینو سے یوں معافہ کیا گویا عید کی  
نماز پڑھ کر قید گاہ سے نکلے ہوں۔

پھر ایک بھاری بھر کم ”ادجیٹر عمر“ آگے بڑھا جو دو مردوں کی  
نسبت زیادہ سفید پوش تھا۔ وہ گویا ان لوگوں کی قیادت کر رہا تھا۔ وہ

سے کہا ہے وہ بہت بری نشانیاں ہے۔“  
وہ ایک بار پھر نوٹ میرے ہاتھ میں تھمنے کی کوشش کرتے  
ہوئے بولا۔ ”تو بھائی! یہ لے لو۔ اور خدا کے لیے اب یہاں سے  
چلے جاؤ۔ تم کیوں میری جان کو آگے ہو۔“

”دینی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔“ میں نے نوٹ لیے بغیر ٹھنڈی  
سانس لے کر کہا۔ ”مگر میں تمہیں نہ بچاتا تو وہ تمہارا لمبیہ بنا  
دیتے۔“

”وہ تو ٹھک ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تم صرف بچ  
چاہو بھی تو کراتے تھے۔ انیس مارٹیا ضروری تھا؟“

”مگر میں صرف بچ چاہو کرانا تو وہ مجھے بھی مارتے۔ شاید  
تمہیں چھوڑ کر وہ مجھے فٹ بال بلیٹے۔“ میں نے کہا۔ ہر حال۔  
میں جا رہا ہوں۔ اور یہ پیسے بھی تم اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے ان کی  
ضرورت نہیں۔ جب میں بغیر پیسے کے یہاں تک آں پہنچا تو آگے  
بھی کہیں پہنچ ہی جاؤں گا۔“

میں چھپر کے پچھلے حصے کی طرف بڑھا جہاں رستوران کے  
اکھوٹے ملازم سو مر کا ایک ٹرک، بہتر اور ضرورت کی چند دوسری  
چھوٹی موٹی چیزیں رکھی رہتی تھیں۔ سو مر کا کوئی گھر نہیں تھا۔ وہ  
چوبیس گھنٹے چھپر رستوران میں رہتا تھا۔ یہ چند چیزیں ہی اس کا کل  
اثاثہ تھیں۔

”اٹھاؤ“ کے معاملے میں سروس میں اس سے بھی کیا گزارش  
تھا۔ میرا کل اثاثہ تو بس کپڑوں کا ایک جوڑا تھا جو اب صاف  
ستھی حالت میں اس کے ٹرک پر ہی رکھا رہتا تھا۔ کسی اور چیز کی  
ضرورت پڑتی تو وہ میں سو مر کی استعمال کرتا تھا۔

میں نے ٹرک پر سے اپنی شادوار تھیں اٹھائی تو دینو میرے  
قریب آ گیا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دل میں ناراضگی لے  
کر مت جاؤ۔ یہ مت سمجھو کہ میں تمہارا احسان مند نہیں ہوں  
لیکن میں کیا کروں؟ غریب آدمی ہر طرح سے مجبور ہوتا ہے۔ تمہارا  
احسان انا ہوں تو اپنی جان پر بھتی ہے۔ اگر دو سروں کے سامنے یہ  
کہتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا تو خود میرے ساتھ بہت  
برا ہو گا۔“

”چھپاؤ شاید تمہارے ساتھ اب بھی نہ ہو لیکن میں تمہیں  
آزاد میں نہیں ڈالوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے سلوک پر  
مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ تمہارے دل کا حال مجھے معلوم ہے۔  
جس نظام میں تم لوگ زندگی گزار رہے ہو اس میں ظاہر ہے تمہارا  
حال کیا رہے گا۔ مجھے تم سے کوئی جگہ نہیں۔ تمہارا اس میں کوئی  
تصور نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے حالات بدل  
دے۔“

”اگر تمہیں مجھ سے کوئی جگہ نہیں ہے تو یہ پیسے رکھ لو لگے یہ  
میرے پیسے جو میں عبت علی کو دیتے کے طور پر دے رہا تھا۔ تم لے  
جاؤ۔ جو ہو گا دکھا جائے گا۔ میں کہہ دوں گا کہ تم ان سے بھی

سندھی میں دیو سے مخاطب ہوا۔ ”بھئی سنا ہے تمہارے ہاں کوئی شیر جوان آیا ہے جس نے دلبر خان کے آدمیوں کی پائی کر دی؟“

”تمہارے خیال میں کیا یہ کوئی بہت اچھا کام ہوا ہے؟“ دیو کراہ کر بولا۔ ”اس کے جواب میں اب میرا جو حشر ہو گا وہ دنیا دیکھے گی۔“

”اسی کوئی بات نہیں ہے دیو بھائی!“ ادیجر عمر غصص اس کا کندھا تھمک کر بولا۔ ”ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں کو پتا ہے کہ دلبر خان کے چکروں سے ہم کتنا تنگ آ گئے ہیں۔ اب اس نے بہتہ ایک دم ہی دھمکا کر دیا ہے۔ ہمیں تو بیٹ پانا مشکل ہو رہا ہے۔ ہم کہاں سے دیں اسنے پیسے۔“

دیو اپنی چونٹوں کو سسلاتے ہوئے بولا۔ ”جن شہروں یا گونھوں میں جتے لینے والے اور لوگوں سے اپنے غلاموں جیسا سلوک کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں وہ کبھی نہیں بنتے۔ وہ آہستہ آہستہ دیران ہو جاتے ہیں، اُٹھ جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، کیٹی مراد بھی اب دیران ہو جائے گی، اُٹھ جائے گی۔ ظاہر ہے ہم جتے نہیں دے سکتے اور دلبر خان کے آدمی ہم پر رحم نہیں کر سکتے تو ہمیں آہستہ آہستہ یہاں سے کوچ کرنا ہو گا۔ اب ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینے کی تیار کرنی چاہیے۔“ اس کے لمبے میں بلا کی دانشمندی بھی تھی اور انفرادی بھی۔

ادیجر عمر غصص اس کا کندھا تھمتے ہوئے بولا۔ ”ہر ظلم کی ایک حد ہوتی ہے دیو بھائی! ہماری حالت اب غلاموں سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ دلبر خان اور اس کے آدمی جب جہاں اور جس کو چاہیں مار مار کر اودھ مار کر دیتے ہیں۔ ڈیرے پراٹھا کر لے جاتے ہیں اور وہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کو دیکھ کر شاید آسمان بھی کانپ اٹھتا ہو۔“

”نہیں کانپتا۔“ دیو اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ یہاں کوئی ایسا عذاب نازل ہو چکا ہو تا جو غلاموں کو ہمارے لے جاتا اور مظلوموں کو ان سے نہایت دلا دتا لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔“

”ہو جائے گا۔ ہو جائے گا۔“ ادیجر عمر خود ارادے دیو کو تسلی دی۔ ”تم دیکھنا جب اوپر والے کی لامبھی حرکت میں آئے گی تو ایک منٹ میں کایا پلٹ جائے گی۔ جب تک ظلم اور زیادتی بھگتی پھولتی رہتی ہے، وہ بہت طاقتور لگتی ہے اور ایسا مظلوم ہوتا ہے کہ اسے کوئی نہیں روک سکتا لیکن جب اس کے منٹے کا وقت آتا ہے تو اس کے اپنے ہی آپ پاس سے کوئی آندھی سی اٹھتی ہے جو اس کو ریت کے ڈنڈوں کی طرح آڑا کر لے جاتی ہے۔ آنکھوں کو لینے نہیں آتا کہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا۔“

”میرا تو اب اس جگہ سے دل کھتا ہو گیا ہے بھائی غلام حسین۔“ دیو ہزار سی بولا۔ ”اب تو یہاں ظلم بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ ذرا اس ماں کی حالت پر غور کریں جس کو پتا ہو کہ اس

کے سولہ سترہ سال کے لڑکے کو دلبر خان کے آدمی اٹھا کر ڈیرے لے گئے ہیں اور وہاں تین راتوں اور تین دن سے اس پر وہ تشدد رہا ہے جو پولیس والے بھی نہیں کر سکتے۔ آپ سوچیں اس ماں! وہ تین دن اور تین راتیں کیسی گزری ہوں گی! اور پھر اس ماں کو بھی پتا ہو کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ آپ سوچیں اس بے بسی سے اس کا کیا حال کیا ہو گا؟“ کرب سے دیو کی آواز ڈیٹھ سی گئی۔

ادیجر عمر غصص نے غلام حسین کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا افسردگی سے بولا۔ ”میں سمجھ گیا، تم دیدار علی اور اس کی ماں کی بات کر رہے ہو۔ میں اس بات کو بھولا نہیں ہوں۔ مجھے یاد ہے سترہ سال کا وہ معصوم دیدار علی کنویں کے پاس پڑا ملا تھا۔ اس کا جسم زخموں سے چھڑ تھا اور ان میں مرچیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے جسم کے ٹاؤک جھوں کو پتھروں سے چکلا گیا تھا۔ مظلوم نہیں کہاں کہاں کیلیں ٹھوکی گئی تھیں، ناخن کھینچے گئے تھے، نہیں کافی محی تھیں، زبان کاٹی گئی تھی، آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ پتا نہیں اس بچے نے کس طرح سسک سسک کر جان دی ہو گی۔“ غلام حسین کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ سب لوگوں کے سر افسردگی اور بے بسی سے جھک گئے تھے اپنے جسم میں چوخیں سی رنگتیں محسوس ہوئیں۔

دیو تلخ لمبے میں بولا۔ ”اور اس جو شیلے لڑکے کا قصور صرف یہ تھا کہ جب اس کی پیٹھ پر بلا وجہ چاک مار دی گئی تو اس نے بھی پلٹ کر دلبر خان کے آدمی کے منہ پر ٹھونسا مار دیا تھا۔ اب اس کی ماں باپل ہو چکی ہے۔ گئے کے ایک لے کو سینے سے لگائے پھرتی ہے۔ کوئی اسے کھانے کو کچھ دینے کے لیے بھی اس کے قریب جاتا ہے تو دھشت زدہ ہو کر بھاگتی ہے اور اپنے بچے کو اپنے سینے کے ساتھ بھیج کر گزر گزرتی ہے۔“ نہیں۔ نہیں۔ میرے دیدار علی کو مجھ سے مت چھیننا۔ اس کے پھل سے بدن کو مت بھجرتا۔ مت چکھنا۔ اس کے زخموں میں مرچیں مت بھرتا۔ کیلیں مت ٹھونکتا۔ وہ بھوک پیاسی جنگل میں ماری ماری پھرتی ہے۔ ایک دن وہ بھی اسی طرح مر جائے گی۔“

”میرا دل کتا ہے، یہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے، حالات بدلنے والے ہیں۔“ غلام حسین کے لمبے میں عجیب سا یقین تھا۔ ”کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ظلم کرنے والوں کی اپنی بھل سے ہی کوئی ہاتھ نکلا ہے اور ان کی گردن دبوچ لیتا ہے۔“

دیو استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا لیکن اس کی ہنسی گویا ایک درد بھری کراہی میں دھل گئی۔ ”غلام حسین! مجھے نہیں پتا تھا تم اپنی دکان پر بیٹھے کپڑا بیچتے بیچتے دن میں خواب بھی دیکھتے رہے ہو؟“

”مجھے امید کی کرن نظر آئی ہے۔“ غلام حسین بولا۔ ”ہم تو انتظار کر رہے تھے کہ کوئی ہمارے آگے ملے والا ہے، ہمارا ساتھ دینے والا ہے تو ہم دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے سامنے سینہ

”میرا تو اب اس جگہ سے دل کھتا ہو گیا ہے بھائی غلام حسین۔“ دیو ہزار سی بولا۔ ”اب تو یہاں ظلم بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ ذرا اس ماں کی حالت پر غور کریں جس کو پتا ہو کہ اس

ہم سب کبھی والے حمد ہو جائیں تو دلبر خان کو اپنا مدیہ بدلنا پڑے گا اور ہماری کچھ خبر جراثیم مراد تک بھی پہنچے گی جنہوں نے ہمیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

دیکھو گویا اس کی سادگی پر ترس کھاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس کتنی کٹاکٹھ لٹکے ہیں؟ لڑائی جھگڑا اور توڑ پھوڑ، ظلم زیادتی کرنے والے کتنے بٹے کتنے بد معاش ہیں؟ کتنی دولت ہے؟ ضرورت پڑنے پر کتنے ڈاکو، قاتل، خونی اور بد معاش تمہاری مدد کو پہنچ سکتے ہیں؟ تم لوگوں کو سائیں مراد کی کتنی سرپرستی حاصل ہے؟ آخر تم لوگ کس خیال پر دلبر خان اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے جا رہے ہو؟"

"یار دیندا تم تو بہت ہی بے وقوف آدمی ہو۔" غلام حسین بولا۔ "ہم کوئی ان سے مقابلہ کرنے کی بات تمہوڑی کر رہے ہیں۔ ہم تو بل جل کر انہیں سمجھانے کی بات کر رہے ہیں۔ ہم انہیں صرف یہ احساس دلانے کی کوشش کریں گے کہ ہم ان کی جائز و ناجائز زیادہ تر باتیں آج تک ماننے آ رہے ہیں لیکن اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ اب انہیں رک جانا چاہیے ورنہ..."

"ورنہ کیا؟" دینو نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ "ورنہ اب ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے جیسے جتنا ہم دے سکتے ہیں اتنا ہی دیں گے اور ظلم و زیادتی کا جواب ہم سب مل جل کر دیں گے بلکہ ہم انہیں یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اب پوری کھیتی کے لوگ ان سے تنگ آ چکے ہیں اور اگر انہوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا تو سب ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔" غلام حسین نے جواب دیا۔

"تم اپنے ساتھ کھیتی کے باقی لوگوں کو بھی مرواؤ گے۔" دینو بولا۔ "ہم سب کا تو ہمیں موقع ہے جی جو شہر ہو گا سو ہو گا لیکن میری ایک بات لکھ لو کہ آج رات ہی ڈاکو کھیتی پر دھاوا بول دیں گے اور لوگوں کا جو حشر کریں گے اس کے بعد وہ ڈاکوؤں کو نہیں، ہمیں بدعائنیں دیں گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا، تم دیکھ لیتا۔ آج تک ہوتا ہی آیا ہے کہ ایک کو مار دیتی ہے تو دوسرا کھٹک لیتا ہے۔ آج ہم کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہوں گے تو ہماری حیثیت ایک دیواری ہو جائے گی۔ اس دیوار کے سامنے انہیں رکنا ہی پڑے گا۔" یہ بات اس شخص نے کہی تھی جسے یار محمد کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ "اچھا، خیر..." دینو ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "تھوڑا بھی بیٹھیں ہے اور میدان بھی بیٹھیں۔ مجھے یقین ہے دلبر خان اور اس کے آدمی جیپ اور ٹمپو وغیرہ میں بھر کر یہاں پہنچنے والے ہی ہوں گے جو کچھ ہونا ہو گا تمہوڑی دیر میں ہو جائے گا۔"

ایک اور جوان اس شخص بولا۔ "میری کچھ میں تو یہ بات نہیں آتی کہ دلبر خان کے اشاروں پر چلنے والے... چند دن میں بٹے کتنے اور شکل سے ہی خطرناک بد معاش نظر آنے والے ان آدمیوں کے

ہاں کر کھڑے ہوں اور اس سے کھل کر بات کریں کہ آخر یہ ظلم اور زیادتیوں کب تک چلیں گی..."

وہ زرا خاموش ہوا تو ایک اور اسی جیسا قدرے سفید پوش شخص آگے بڑھ کر بولا۔ "مصیبت یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی تھانہ ہے نہ بھڑی ہے، ہم اپنی فریاد لے کر جاسمیں تو کہاں جاسیں۔"

دینو تلخ لہجے میں بولا۔ "تمہارے بھڑی کی بات رہنے دو یار محمد! جہاں تمہارے بھڑیاں ہیں وہاں کون سا لوگ ظلم سے بچے ہوئے ہیں؟" وہ اس وقت پوری دنیا سے بیزار معلوم ہو رہا تھا۔

"پھر بھی... دل کو ڈھارس ہی تو رہتی ہے۔" یار محمد بولا۔ "یہاں تو وہ بھی نہیں ہے۔ سائیں مراد خان بھی اگر ہماری کوئی خیر

خبر نہیں لیتے۔ کسی زبردستی زمینوں کے مالک بنے ہوئے ہیں لیکن ہر کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ ہم یہاں کس حال میں رہ رہے ہیں اور ہمیں کیا کیا مصیبتیں پہنچتی پڑ رہی ہیں۔ وہ اگر آتے بھی ہیں تو بس دلبر خان کی حویلی پر ایک آدھ دن رہ کر حساب کتاب کر کے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں تو ان کی صورت دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ دوسری جگہوں میں حالات پھر بھی کچھ بہتر ہیں۔ سختی وہاں بھی ہوتی ہے لیکن اتنا ظلم نہیں ہوتا۔ دذیرے لوگ اپنی رعایا کی خیر خبر رکھتے ہیں۔"

"وہ سائیں مراد جتنے بڑے دذیرے نہیں ہیں نا۔" دینو کے لہجے میں بدستور کٹنی تھی۔

غلام حسین بولا۔ "خیر... اس بحث کو چھوڑو۔ فی الحال تو ہم اس بات کا فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اب اس کے جواب میں ہم تمہارے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اکٹھے ہو کر اور ایک زبان ہو کر دلبر خان اور اس کے آدمیوں سے بات کریں گے اور اسے ہماری بات سختی پڑے گی۔ ہم کن بجلی یا حمد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس سے ضرور فرق پڑے گا۔"

دینو ہنسنے لگا۔ یہ عجیب ہنسی تھی۔ شاید وہ ہنسنے کے انداز میں رد ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "ہاں۔ فرق تو ضرور پڑے گا۔ پہلے سب کو الگ الگ مار پڑتی تھی، آج سب کو اکٹھی پڑے گی۔"

"یہی سوچ کر ہم نے آج تک اکٹھے ہو کر بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔" غلام حسین بولا۔ "اسی لیے ان کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے، دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم پر ظلم بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں یاد ہو گا، کسی زمانے میں اس علاقے کی زمینیں آباد کرنے کے لیے ہم کو منت خوشامد کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ سیلاب کے ڈر سے کوئی اور کارخ نہیں کرتا تھا۔ ہمارے بزرگوں، بھائیوں اور رشتے داروں نے یہ علاقہ آباد کیا ہے۔ پہلے ہم سے محبت کی جاتی تھی، ہمارا خیال رکھا جاتا تھا لیکن اب انہیں احساس ہو گیا ہے کہ ہماری جڑیں یہاں گہری ہو گئی ہیں۔ ہم کہیں جا نہیں سکتے تو میرا بیٹاں کم ہوتے ہوتے آہستہ آہستہ ظلم میں بدل گئی ہیں۔ میں تو کتا ہوں اگر

کیوں کچھ نہیں کرتے جو دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ذرا اس کو بلاؤ تو کسی۔ کہہ رہے وہ؟ اگر وہ ہمارے ساتھ کھڑا ہو تو قوم اور زیادہ امت کے ساتھ دلبر اور اس کے آدمیوں سے بات کریں گے؟  
میں ان لوگوں کو کہنے لگی کہ رو کر انشاہدہ پارکسٹی کے کاؤنٹر کے پیچھے چلی گئی تھی پر جا بیٹھا تھا۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا لیکن انہیں شاید صرف آنکھوں میں میرا چہرہ نظر آ رہا تھا اس لیے انہوں نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں ابھی شلوار قمیض بھی نہیں پہن سکا تھا۔ مختصر دھوئی کو ٹکٹوں کی صورت میں ہی جسم پر کئے ہوئے تھا۔

”میں اس کو یہاں سے بھاگ رہا تھا۔“ دینو بولا۔ ”میں ایک بے گناہ کا خون اپنے سر نہیں لے سکتا۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اس کو جانے دیں اور اپنے جھگڑے خود ہی طے کریں۔ ہم دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے سامنے ہاتھ باندھ لیں گے، معافی مانگ لیں گے۔ ان کے پاؤں پکڑ لیں گے شاید وہ ہمیں معاف کر دیں لیکن اس جوان کا یہاں رہنا ہمارے لیے زیادہ مصیبت کنی کر دے گا۔ ایک تو ان لوگوں کو اسے دیکھ کر غصہ زیادہ آجائے گا۔ دوسرے یہ بے گناہ مارا جائے گا؟ بچے کا نہیں۔ اور ایسے شیر جیسے جوان کی موت کا مجھے بہت افسوس ہو گا۔ میں اپنے آپ کو زندگی بھر معاف نہیں کر سکتا گا۔“

اپنے لیے شیر جیسے جوان کے الفاظ سن کر میں مسکرا دیا۔ یہ دیکھ کر دینو نوازی بھی رو نہ میں تو اس وقت اپنے آپ کو اول درجہ کا لکھو حامی محسوس کر رہا تھا۔ میری زندگی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو کس بیکر میں الجھا لیا تھا۔ ان لوگوں کی باتوں سے تو میری ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اندیشوں کے جال سے نکل آیا۔ میرا یہ یقین تو بیشہ ہی سے پختہ چلا آ رہا تھا کہ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن گشت چند دنوں میں یہ یقین پختہ ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کو جانا بوجھ کر تو موت کے منہ میں پھینکا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ حفاظت کی تدبیر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن موت کے خوف سے ہر قدم کا پتہ نہ رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ کو تنہا بے نقاد پر چھوڑا ہوا ہی تھا، ایک بار پھر میں نے ہر خوف کو ذہن سے جھٹک دیا۔

غلام حسین، دینو سے مخاطب ہوا۔ ”یار میرا تم بڑی بڑی باتیں چھوڑو اور اس جوان کو بلاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میری حاشی میں ادھر ادھر نظر دوڑائی پھر اس کی نظر مجھ سے ٹکی۔ اس کے ساتھ ہی غالباً یہی نے مجھے دیکھ لیا لیکن صرف آنکھوں کی حد تک۔ دینو نے شکست خوردہ سے انداز میں آواز لگا لی۔ ”آج بھائی افضل خان۔“ میں نے اسے اپنا نام صرف افضل بتایا تھا۔ ”خان“ اس نے خود ہی لگا لیا تھا۔ وہ بیٹھ مجھے افضل خان ہی کہہ کر بلا لیا تھا۔

خرچے اور ٹھٹھا پاٹ کھانا اسے چلتے ہیں۔ یہ لوگ کوئی کام نہیں کرتے، کوئی کاروبار نہیں کرسکتے، زمینوں پر کام کرتے ہیں، نہ دکانداری کرتے ہیں۔ دن رات دیرے پر پڑے ایڈزے رچے ہیں۔ ہر عجیبی کرتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ آخر ان لوگوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا ہے؟“

دینو استغنائیہ انداز میں ہٹکا رہا تھا کہ بولا۔ ”لو جی۔ یہ بھولا بادشاہ ابھی اسی سوچ میں الجھا ہوا ہے۔ بھائی ان کو دلبر خان کے ذریعے ساتھی مراد کی طرح سے بھی وظیفہ ملتا ہے۔ زمینوں کے حساب میں بھی کچھ ہیرا پھیراں ہوتی ہیں جس میں سب کا حصہ ہوتا ہے۔ حتمی سے حاصل ہونے والی رقم کے مجھے بخرے ہوتے ہیں۔ ڈاکوؤں سے بھی انہیں سوا کچھ ملتا ہے بلکہ مجھے تو یہ خود بھی ڈاکو ہی لگتے ہیں۔ شاید ضرورت کے وقت یہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ ڈھاتے ہیں اور کبھی معلوم نہیں کیا کیا ناجائز دھندے ہوں گے۔ بہت لمبے چوڑے کٹے چوڑے ہیں جو نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔“

میں دل میں ایک عجیب سے تائف کی لہر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ چاہے امریکا اور یورپ کے چلتے دھکتے شہر تھے یا الیٹیا کے بے ہنگم بستیوں ہمارے اپنے رنگ رنگ شہر تھے یا دور افتادہ اور کامیاب گاؤں، وسعت۔ ہر جگہ چھوٹی یا بڑی، کسی نہ کسی قسم کی مافیا ضرور موجود تھی۔ ہر جگہ دوسروں کا خون چوس کر اور ناجائز دھندوں کے جال پھیل کر چلنے والے چھوٹے یا بڑے گروہ ضرور موجود تھے، دن بدن یہ سلسلہ زیادہ ہی پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر جگہ کسی نہ کسی قسم کی مافیا اپنی پیچھے گاڑ رہی تھی۔ آپ تو وہ چھوٹی چھوٹی معصوم بستیوں اور آبادیاں بھی اس کی لپیٹ میں آئی جا رہی تھیں جنہوں نے کبھی منظم قسم کے شہر نشاد اور بے معاش کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی اور وہاں رہنے والوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان پر ایسے بھی دن آئیں گے۔ معلوم نہیں یہ جھڑکس قسم کی ترقی کے ساتھ آ رہی تھیں؟ یا سائنس کی ترقی کے ساتھ؟ تمدن کی ترقی کے ساتھ یا سیاست کی ترقی کے ساتھ؟

وجہات خواہ کچھ بھی رہی ہوں لیکن زیادہ افسوسناک بات یہی تھی کہ کوئی اس سیلاب کو روکنے میں دلچسپی لیتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باقی دنیا تو اجتماعی خود کشی کی طرف جا رہی تھی لیکن اپنے معاشرے کا انجام بھی کچھ اچھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”اچھا خیمہ۔ ان باتوں کو چھوڑو۔“ میں بار محمد کی آواز سن کر چونکا دینو سے مخاطب تھا۔ ”تم ہمیں اس جوان سے تو طواؤ جس نے دلبر خان کے آدمیوں کی لٹکانی لگائی۔ اسی کے بارے میں تو سن کر ہمیں اچھے ہونے اور یہاں آنے کی ہمت ہوئی۔ ہم نے سوچا جب کوئی اکیلا بروہی اپنی ہمت دکھا سکتا ہے تو ہم سب تعداد میں اتنے زیادہ ہوتے ہوئے اور یہاں کے پرانے باشندے ہوتے ہوئے بھی کیوں مار کھاتے رہتے ہیں اور اس مصیبت کو روکنے کے لیے

کھڑے ہوں گے اور بات کریں گے۔ آج کے بعد وہ اپنا رویہ ٹھیک کرے گا، ظلم اور زیادتی بند کرے گا یا پھر ہم بھی اس کے خلاف جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کریں گے اور سائیں مراد کے پاس بھی اپنی فریاد لے کر جائیں گے۔ ہم ان سے صاف کہہ دیں گے کہ اس طرح کئی کا نظام نہیں چل سکتا۔ ہم بغاوت کریں گے یا کہیں اور کوچ کر جائیں گے کہیں نہ کہیں تو اللہ روزی لگای دے گا۔

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آپ لوگ حوصلہ کریں گے تو مجھے امید ہے جلدی نہ سہی کچھ دیر سے سہی، لیکن سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“

ابھی میں انہیں یہ نوید سنایا رہا تھا کہ بہت دور ایک سمت میں غبار بلند ہو تا دیکھا گیا دیا۔ دیکھ کر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ لوگ آ رہے ہیں۔“

میں نے دیکھا، سب کی رنگت خستہ ہو گئی اور آنکھوں میں خوف اُتر آیا۔ سب سے زیادہ حالت دیکھ کر خراب تھی۔ وہ مجھے دھکیلے ہوئے بولا۔ ”جاؤ، جلدی سے جا کر میرے مکان میں چھپ جاؤ۔ جب تک ہم جہیز دوس کے لیے نہ بلا سکیں، تم مت آنا۔ تمہارے یہاں ہونے سے بات زیادہ خراب ہو گی۔ ہم پہلے منت خوشامد کر کے ان کے پاؤں پکڑ کر انہیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔“

وہ اپنے موقف پر قائم تھا اور جیڑی سے بات کرتے ہوئے مجھے دھکیلتا بھی جا رہا تھا۔ ”خدا کے لیے چلے جاؤ۔ تم ان کے سامنے کچھ نہیں کر سکو گے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ مجھے اب افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ کچھ زیادہ ہی بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکین علی کی کا کھکھوف سے صرف بیگزین نکال کر گمن داہیں پھینک دی تھی جسے محبت علی

میں نے کاؤنٹر کے عقب میں ہی رہتے ہوئے شلوار قمیص زیب تن کی۔ یوں اپنے چھلنے کو حتی الامکان معززانہ بنایا اور ان کے سامنے چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سب بالکل مبسوٹ سے میری طرف دیکھ رہے تھے حالانکہ میں اس وقت خود کو خاصا چمچد محسوس کر رہا تھا۔ میرے خیال میں تو میری حالت تباہی تھی۔ میری لپس کے لبوں ٹوٹے ہوئے تھے مگر بیان لو فروں کی طرح نکلا تھا۔

پچھر رستوران میں ایک عجیب مروجہ بیت زدہ سا سکوت چھا گیا تھا جو مجھے بہت ہی گراں گزر رہا تھا۔ بالآخر یار محمد میرا بازو پھینکے ہوئے بولا۔ ”دوست! دیکھو ٹھیک کتنا تھا۔ تم واقعی شیر جوان ہو۔“

دیکھو ایک بار پھر اپنی چوٹیں سلا تا ہوا بولا۔ ”لیکن کلا کھکھوف کے سامنے شیر اور بکری سب برابر ہیں۔ ایک ہی برست میں دونوں کا کام تمام ہو سکتا ہے۔ ابھی جب دلبر خان اور اس کے آدمی کلا کھکھوف میں لے آئیں گے تو اس شیر کی جوانی ایک منٹ میں اس مٹی میں لٹی نظر آئے گی۔“ اس نے پچھر رستوران کے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر ہم زندہ رہے تب بھی شاید اس کے جنازے تک کو کا نہ ہا نہ دے سکیں۔ اور کیا خبر جنازہ اٹھے بھی یا نہیں۔ ایسے گستاخ دشمن کی لاش تو وہ جنگل کے قریب لے جا کر پھینک دیتے ہیں جہاں اسے چیل کوٹے، گمدہ اور گیدو کھا جاتے ہیں۔ پڑاں تک نہیں چھوڑتے۔“

پچھر دھنڈی سانس لے کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس غریب کے پاس تو چاقو تک نہیں ہے۔“ غلام حسین بولا۔ ”لیکن اس کے پاس حوصلہ ہے اور حوصلہ اسلئے سے زیادہ طاقتور ہے۔“

میں نے اپنی تحریض پر انکساری سے سر ہٹا لیا۔ آخر کس قسم کی کوئی چیز تھی لیکن وہ بیرونی حقیقت پسند یا پھر حالات کا کچھ زیادہ ہی ستایا ہوا اور دل جلا انسان تھا۔ اپنی اسی درد بھری سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”دیکھیں اس بے چارے کو بائیں پرچہ کا کروانے کی تیاری کر رہے ہو۔ بے چارہ غریب پر دسی ہے۔“

پچھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہماری بک بک میں بڑا غلام ضائع ہو گیا ہے لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے، تم چاہو تو بھاگ جاؤ۔“

میں نے کو کا نہ آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ اب زیادتی کے خلاف دیوار بن کر کھڑے ہونے کے لیے آئے ہیں تو میرا دل نہیں چاہ رہا کہ انہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میں ان کا۔ اور تمہارا۔ میرا مطلب ہے تم سب کا ساتھ دوں گا۔“

”شاباش فوجوان۔“ غلام حسین نے آگے بڑھ کر مجھے گھٹے لگا لیے۔ ”تمہارا ذکر سن کر ہی ہمارا تو حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اب جہیز دیکھا ہے تو ہم بھی اپنی آپ کو شیر محسوس کر رہے ہیں۔ اب ہم کچھ نہیں نہیں کے آج ہم دلبر خان کے سامنے سینہ تان کر

### تاریخی ناول

|                |                      |
|----------------|----------------------|
| ایلیس مصر      | الماس ایم۔ اے۔ 100/- |
| حسن بن صباح    | الماس ایم۔ اے۔ 125/- |
| راجا بھکاری    | الماس ایم۔ اے۔ 150/- |
| نور الدین زنگی | الماس ایم۔ اے۔ 250/- |
| سلطان عادل     | الماس ایم۔ اے۔ 150/- |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

جاتے وقت اٹھا کر لے گیا تھا۔ مجھے کم از کم وہ ایک کلا شکوف تو رکھ لینی چاہیے تھی۔

دینو کا گھر سامنے ہی چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اسے بار بار دہاں آتے جاتے دیکھا تھا لیکن گزشتہ چار دنوں میں مجھے ایک مرتبہ بھی اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دینو تیزی سے بولا۔  
”دروازے کے پاس ہی بیڑھیاں ہیں۔ اور پھت پر جا کر چھپ جانا۔ اگر وہاں سے بھاگنا پڑا تو آسانی رہے گی۔ دوسرے مکانوں کی چھتوں پر سے چھلانگتے ہوئے اور ہی اور کسی طرف نکل جانا اور چھلانگ لگا کر بھاگ جانا۔ اپنی جان کی فکر کرنا۔“

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس شخص کے دل میں یہ خواہش شدید تھی کہ مجھے دلبر خان اور اس کے آرمیوں کے ہاتھوں موت نہ آئے۔ وہ مجھے چھپرے کے پچھلے حصے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں پچھلی طرف سے نکل کر بھاگوں اور تھوڑا سا پلر کاٹ کر اس کے مکان تک پہنچوں تاکہ دور سے آتے ہوئے لوگوں کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ کوئی یہاں سے نکل کر بھاگتا تھا۔

دوسرے لوگ کچھ نہ بولے۔ سب کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ جو تقریریں کر رہے تھے وہ سب ان کے ذہنوں سے محو ہو چکی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ دینو کی ہدایت پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا بلکہ شاید کچھ فائدہ ہی ہو جاتا۔ ویسے بھی وہ میرا دشمن تھا دل کا بہت اچھا تھا اور جو کچھ بھی وہ کہہ رہا تھا اس کے پیچھے اس کا بے پناہ غلوں بول رہا تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تھا تو وہ شخص مجھے بے پناہ روکھا اور بدلتا نظر آ رہا تھا لیکن اب مجھے اس کے انداز سے وہی فکر مند کی وہی تشویش جھلکی نظر آ رہی تھی۔ جو کسی باپ کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے ہو سکتی ہے۔

میں چھپرے کے عقبی حصے میں پڑی بیچ پر چڑھ کر اس مستقل شگاف سے باہر کود گیا جو میں نے دیوار میں گھڑی کے لیے چھوڑا تھا۔ چھپرے کے عقب سے دوڑتا ہوا میں ایک کنویں کے قریب سے گزر کر ایک چھٹی اور ٹیڑھی سی گلی عبور کر کے گویہ محکمہ کر واپس آیا اور دینو کے مکان کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

دروازے کی کوئی گنڈی وغیرہ چڑھی ہوئی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا دینو کی کوئی قیچی یا نہیں۔ میں نے گزشتہ چار دنوں میں دینو کے مکان سے دینو کے علاوہ کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

دروازے سے چھٹے ہی میں نے اپنے آپ کو دیوڑھی لٹا ایک حصے میں پایا لیکن دیوڑھی کی نسبت یہ جگہ کافی کشادہ تھی۔ ایک طرف ایک کمری اور بیچ میں بندھی ہوئی تھی۔ کتر کاٹنے کی ہاتھ کی مشین گھڑی تھی۔ پینڈ پل لگا ہوا تھا اور وہیں سے کچی بیڑھیاں اور جاری تھیں۔

میں نے دیوڑھی سے آگے دیکھنے کی زحمت نہیں کی بیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ وہ ایک نیم پختہ مکان تھا۔ پھت کچھ کچھ لیوں اور اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ اوپر پھت پر گارے کی تھی۔ پھت پر میں نے اپنے آپ کو تقریباً تین فٹ اونچی منزل عقب میں پایا۔ انہیں اس ترتیب سے رکھ کر منڈیر بنائی گئی تھی اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکور سوراخ موجود تھے۔ میں اس منڈیر کے عقب میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میرے رستوران کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ دور سے دھول اڑاتے تیزی سے آتے ہوئے لوگ بھی اب مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک جیب تھی جس میں لوگ کتیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ اس پیچھے ایک کتلی تقریباً جیب ہی کی رفتار سے دوڑی آ رہی تھی۔ میں بھی لوگ بھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی مسلح تھے۔ کسی کے پاس تھری ناٹ تھری تھی، کسی کے پاس کلا شکوف، کتلی کے پیچھے آدمی گھوڑوں پر بھی آ رہے تھے۔

ایسا لگتا تھا جی نوع انسان کے حالات کبھی نہیں بدلے۔ آج تک یہی تھی۔ کسی مجھے بے ریکارڈ کی طرح وہ خود کو ڈھرا جاری تھی۔ ایک دائرے میں گھومے جاری تھی۔ ان لوگوں آتے دیکھ کر میرے ذہن میں دونوں، چنگیزوں اور تاتاریوں دور کے تصور راتی مناظر گھومنے لگے۔ پرانے زمانوں میں بھی یہ طاقتور اور صاحب اقتدار لوگوں کے نمائندے گھوڑے اور دروازے ہوئے آتے تھے اور محکمہ اور کمزور لوگوں کی بیخ تاراج کرتے چلے جاتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے ہاتھ میں گلواریں، نیزے، بھالے اور کوڑے ہوتے تھے جبکہ آج لوگوں کے پاس جیب اور کلا شکوف تھے۔ آئے کا انداز وہی چروں پر غیظ و غضب اور خوشنوازی وہی تھی۔ صدیاں خواہ کتنا بیت گئی تھیں لیکن نہ انسان بدلا تھا نہ انسان کے نصیب۔ ہر میں کمانی وہی جلی آ رہی تھی۔

میں نے جانے کس دور کے اور کس طبقے کے انسان کا نام تھا جو شاید دینو کے مکان کی پھت سے نہیں، تاریخ کے جھوٹے سے بھاگ کر یہ سارا نشانہ دیکھ رہا تھا۔ وہ آٹھ دس واکاؤ کے ساتھ چھپرے کے باہر اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی شہر۔

باشندے کسی خاص وفد کے استقبال کے لیے کھڑے ہوں۔ فرق صرف یہ تھا کہ وفد کا استقبال کرنے والوں کے چروا تجسس، مسکراہٹ، مسخوئی اشتیاق یا حقیقی مسرت ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے چرواں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں خوف و وحشت پر چھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ وہ گویا کچھ لوگوں کو نہیں، اپنی ہمت کو سامنے سے آتے دیکھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ حالت غم خراب تھی۔ اس نے تو اگر اوجھری دیوار کا سارا نہ لیا ہوتا۔

ان کی حاضر خوفزدگی اور کرداروں کے باوجود ان کی غلط

”بھدھر ہے وہ؟“ دلبر خان گرجا۔ فاصلہ محض چند قدم کا تھا۔  
میں آسانی سے ان کی آواز سن سکتا تھا۔

”وہ تو بھاگ گیا سائیں!“ دیکھتا ہوں جوڑے کا چنٹی ہوئی آواز  
میں بولا۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ خود زیادہ  
کانپ رہا تھا یا اس کی آواز۔ اس نے حتی الامکان تیزی سے بولنے  
کی کوشش کی۔ ”ہم نے اس کو بہت سمجھایا سائیں! اس کو  
جھڑے سے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن سائیں! وہ انہماں تھا۔  
پرہی تھا۔ آپ کو آپ کے آدمیوں کو نہیں جانتا تھا۔ کتنا ہی کر  
بیٹھا لیکن بعد میں جیسے ہی اس کو پتا چلا کہ اس نے کس کے ساتھ  
گستاخی کی ہے تو بھاگ گیا۔ فوراً بھاگ گیا۔ میرا تو اس میں کوئی  
قصور نہیں۔“

”تیرا کوئی قصور نہیں؟“ دلبر خان نے اس کا گریبان چھوڑ کر  
اس کے منہ پر گھونسا رسید کیا اور وہ دور جاگرا۔ اس بے چارے کا  
گڑا ہوا چہرہ اور گڑا گیا۔ ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔ وہ کافی  
ٹھنڈے پہلے ہی کھا چکا تھا اب دلبر خان نے بھی اسے ایک ٹھنڈا  
رسید کیا تو وہ ہلکا اٹھا۔

دلبر خان نے اس کے سینے پر اس طرح ہاتھ رکھ لیا جس طرح  
بعض شکاری شیر کا شکار کرنے کے بعد اس پر ہاتھ رکھ کر قصور  
کھینچتے ہیں۔ دلبر خان گرجا۔ ”تیرا یہ قصور کم ہے کہ تو نے کبھی  
میں ایک اجنبی کی آمد کی ہمیں اطلاع تک نہیں دی اور پھر اس کو  
کام پر بھی لگا لیا۔ سنا ہے تیرا یہ اکثر کاغذی فیصلے بنایا ہے۔“  
اس نے چھپر کی ناکملم مٹی چار دیواری کی طرف اشارہ کیا۔

کردار کا ایک پہلو مجھ پر ضرور واضح ہوا تھا۔ وہ اگر اتنے ہی خوفزدہ  
تھے تو یہ بھی کر سکتے تھے کہ مجھے بھاگ کر چھپنے کا موقع فراہم کرنے  
کے بجائے قریبی کا بڑا بنا کر ان لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی  
کوشش کرتے اور ہاتھ جوڑ کر کہتے۔ ”سائیں! جو کچھ کیا ہے اس نے  
کیا ہے۔ ہم تو بالکل بری الذمہ ہیں۔ آپ کے نوکر ہیں“ آپ کی  
رعایا ہیں“ آپ کے حکم کے غلام ہیں“ آپ کا جرم حاضر ہے لیکن  
انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے وہاں سے بھاگنا  
پڑا تھا اور اپنی جان پر عذاب سنبھالنے کے لیے تیار تھے۔ میں سوچ رہا تھا  
کہ کیا میں ایسے لوگوں کو چھوڑ کر بھاگ سکتا تھا۔

”جیب“ بھئی اور گھوڑے چھپرے ستوران کے قریب آ کر کے  
جیب کا انچنی غرا رہا تھا گھوڑے ہنسا رہے تھے اور ان پر سوار  
لوگوں کے چہرے دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی  
پھانسنے لگیں گے۔

دلبر خان سے کسی کو بھی میرا تعارف کرانے کی ضرورت نہ  
ہوئی اگر میں وہاں موجود ہوتا اور میرے لیے بھی دلبر خان کو پہچاننا  
زرا مشکل نہیں تھا۔ وہ جو اس قسم کے گروہوں کے سرخیل ہوتے  
ہیں دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شان اور ٹھٹھا الگ ہی  
ہوتا ہے۔

وہ بوسنی کی سفید بے داغ شلوار قمیض اور کلف مٹی اونٹنی  
پگڑی میں تھا جس کا کچھ حصہ حلقے کی سی صورت میں اس کے سینے پر  
جھول رہا تھا۔ کندھوں پر اجرک تھی۔ وہ کھلی جیب میں ایک ہاتھ  
میں کلا شگوف اور دوسرے ہاتھ سے جیب کا ایک آہنی پائپ  
تھامے ڈرائیو کے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا تھا۔

بعض لوگوں کی بد اعمالیوں کا اثر ان کی شخصیت پر ضرور نظر  
آنے لگا ہے۔ وہ خواہ خوش شکل ہوں لیکن شکل سے ہی غیبت  
دکھائی دیتے ہیں مگر بعض لوگوں پر دست قدرت بڑا مہربان رہتا ہے۔  
دلبر خان کو بھی قدرت نے اچھی شخصیت سے نوازا تھا۔ وہ کوئی فلمی  
وہن قسم کی شخصیت ہرگز نہیں تھا۔ کھلا ہوا رنگ، موٹی موٹی سیاہ  
آنکھیں، اوپر کو اٹھی ہوئی موٹی موٹی بارعب مونچھیں، دراز قد اور  
منہ بولا کاٹھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ پنٹیس اور چالیس کے  
درمیان ہوگی۔ وہ کسی بڑے جاگیردار کا نمائندہ ہونے کے بجائے  
خود کوئی چھوٹا موٹا جاگیردار دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ آنے والوں میں محبت علی اور مسکین علی بھی  
شامل تھے۔ ان کی حالت اب بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن  
شاید جوئی انتقام نے انہیں جلدی سنبھالنے میں مدد دی تھی۔ وہ بھئی  
میں تھے سب لوگ سواریوں سے کود پڑے تھے۔ دلبر خان نے  
ایک ہی نظر میں چھپرے ستوران کا جائزہ لے لیا تھا۔

اس نے یکدم ہی دنگ کو گرجاں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اگر دنگ  
زرا بھاری مگر کم نہ ہوتا تو شاید اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے  
ہوتے۔

## عشق اور چھکا

☆ --- ستار طاہر

ظن و مزاح پر لکھا جانے والا

ایک دلچسپ ناول

جس میں کرکٹ اور مزاح ساتھ ساتھ ہیں۔

قیمت :- 75/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں یہ بھی اسی قبیل کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔

وہ تمام دکاندار جو کچھ دیر پہلے بڑے جوش و خروش اور ہمت و اعتبار کر رہے تھے کہ وہ اب دلیر خان اور اس کے آدمیوں کو زیادتی نہیں کرنے دیں گے کدھ سے سے کدھا جو ذکر اس راستے کی دیوار بن جائیں گے ان کے سامنے دیواریں گر تھیں لیکن وہ دم بخود کھڑے تھے۔ دیکھ کر پٹائی ہوتے بھی انہوں اسی خاموشی سے دیکھی تھی۔

وہ کدھ سے سے کدھا ضرور جوڑے کھڑے تھے مگر کچھ حق مزاحمت کے اعتبار کے لیے نہیں بلکہ وہ در حقیقت خوف کے ایک دوسرے سے تقریباً جتنے کھڑے تھے وہ دیوار ضرور بننے لگے تھے مگر یہ راستہ روکنے والی نہیں بلکہ آؤ فراہم کرنے والی تھی۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ یقیناً اپنی ہمت و تقریریں بھول چکے تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر اب تو کھجے ہو رہی تھی کہ وہ ابھی تک دم دبا کر بھاگے کیوں نہیں تھے۔ دہشت کے باعث وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنا بھی بھول گئے تھے دیکھتے ہی دیکھتے دیواریں بے جا ڈھیر بن گئیں۔ وہ رستہ کے ساؤ سالانہ پر ہی گر گئی تھیں۔ اپنے آدمیوں کی کارگزار کر دلیر خان کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھری آئی۔ دوران اس نے دیکھا چھوڑا تھا اور وہ ہاتھ باندھ کر ان اکڑوں بیٹہ گیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لیے وہ اپنے چھپر رستہ کی تباہی دیکھ رہا تھا۔

”یہ لے... تیرا اترکان ہم نے ٹھیک کر دیا ہے۔ ابھی اور اچھا بناتے ہیں...“ دلیر خان نے کہا اور اپنے آدمیوں کو اشاروں میں اپنا مقصد سمجھایا۔

وہ لوگ بیٹوں پر چڑھے اور چند ہی لمحوں میں انہوں نے بھی بے پروا کر دیا پھر انہوں نے اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر دی۔ ان کاموں میں وہ واقعی بہت مشاق معلوم ہوتے تھے۔ یہی پھرتی سے وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ باقی آدمی کلا شکوہ چاروں طرف کھڑے تھے اور عقاب نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے گویا انہیں اندیشہ ہو کہ کوئی وہاں آکر ان کے کام میں مداخلت کرنے کی کوشش نہ کرے حالانکہ دور دور تک ایسی کسی بھی دشمن نہیں تھا لیکن وہ بہر حال ایسی کسی بھی طاقت سے اپنے تیار کھڑے تھے۔

دنوب باقاعدہ سر پر دو ہتھ مار مار کر اور فریاد کے ساتھ میں بار بار آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر رو رہا تھا اور دلہ مسکراتے ہوئے سوچے کوئل رو رہا تھا۔

اس دوران ایک عجیب احساس نے نہ صرف مجھے ملتا تھا بلکہ میں اپنی اس کیفیت پر بے پناہ حیران بھی تھا۔ احساسات اس وقت بالکل دبی تھی جو اس وقت تھے جیسا

”سائیں!“ دھو زمین پر پڑے پڑے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”وہ بھوکا پیاسا تھا۔ پوری تھا۔ ہم سندھیوں کی روایت ہے بھوکے پیاسے پر کسی اور مسافروں کی مدد کرنا۔ میں اس کی مدد کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ میرے خیال میں تو کسی بھی مسلمان کو دی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔ لیکن اگر آپ ناراض ہیں تو میں معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

”اکیسی تیسری روایت کی۔ سالے! مولوی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ تجھے جو کچھ بھی کرنا تھا ہم سے پوچھ کر کرنا تھا۔ یہ بات بھول گیا تھا کیا؟“ دلیر خان نے اسے ایک اور ٹھوکہ رسید کی۔

میری رنگوں میں لو کی گردش تیز ہو رہی تھی لیکن مجھے اس صورت حال میں اس طرح مداخلت کرنے کا کوئی طریقہ نہیں سوچ رہا تھا جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو۔ اپنی منہ اٹھا کر کچ میں کود پڑنے اور مارے جانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ جن لوگوں کے میں کام آنا چاہتا تھا اس طرح تو انہیں بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں اس مکان میں آکر چھپنے کے بجائے چھپری میں کسی طرح چھپنے میں کامیاب ہو جانا تو شاید کوئی ایسا موقع مل جاتا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں پانا لپٹنے کی کوشش کرنا لیکن فی الحال تو میں بے بسی سے تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا تاہم میں ہر ذریعے سے جائزہ لے رہا تھا اور میرے ذہن میں کھد بد جاری تھی۔

دلیر خان کو دیکھنے حالانکہ یہی بتایا تھا کہ وہ انہی یعنی میں فرار ہو چکا تھا لیکن اس کے آدمی پوری طرح چونکا نظر آ رہے تھے۔ وہ ہر طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ شاید انہیں دیکھ کر بات کا یقین نہیں تھا اور توڑا بہت اندازہ اس بات کا بھی ہو گیا تھا کہ جس ماسلوم شخص نے کلا شکوہ بردار مسکین علی اور محبت علی کی شھنائی کر ڈالی تھی وہ یقیناً کوئی عام آدمی نہیں تھا۔

اچانک دلیر خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ اس کے اس خیف سے اشارے کا مطلب اس کے آدمی گویا نہایت تفصیل سے سمجھ گئے۔ ان میں سے پانچ چھ آدمی کلا شکوہ نہیں لیے چھپر رستہ ران کے گرد گھیر ڈال کر کھڑے ہو گئے اور پانچ چھ آدمیوں نے وہیں پڑی ہوئی وہ تمام چیزیں اٹھالیں جن کی مدد سے میں نے گارا تیار کیا تھا اور کچھ بیٹوں کی دیواریں تعمیر کی تھیں۔ کدال‘ تیشہ‘ لوہے کی سلاخیں‘ لکڑی کی بلیاں جس کو جو بھی ملا وہ اس نے اٹھا لیا اور دیواریں پہل پڑے۔

وہ تو غیر شہہ بھی دیواریں تھیں۔ ابھی تو پوری طرح خشک بھی نہیں ہوئی تھیں‘ تیزی سے فوجی چل گئیں۔ ویسے بھی تعمیر کے مقابلے میں عجیب آسان کام ہے۔ چیزیں تعمیر ہونے میں بڑا وقت لگتا ہے لیکن انہیں تیار کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ یوں بھی کچھ لوگ تعمیر میں اور کچھ تجزیہ میں زیادہ ماہر ہوتے ہیں۔ چیزیں توڑنے پھوڑنے‘ جلانے اور تیار کرنے میں وہ نہ صرف مہارت و



دلبر خان غضب ناک غصوں سے ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے  
مگر جا۔ یہیں آئے۔ تم سب اور کس لیے جمع ہوئے ہو؟ کسی  
نے کوئی جواب نہ دیا۔

غلام حسین جو کچھ دیر پہلے تک ان سب کا کایہ نظر آ رہا تھا  
اب سب سے پیچھے دھکا ہوا تھا۔ باقی لوگوں کا حال تو تھا ہی خراب۔  
اس وقت نئی شلوار قمیص والا ایک مڑاچا اور عمر فضل بد قسمتی  
سے دلبر خان کے عین سامنے کھڑا تھا۔ دلبر خان نے اسے ہی گریبان  
سے پکڑ لیا۔

گریبان مڑی طرح مٹھی میں پکڑے ہوئے اس نے اس سے  
چارے کو دھمکائیے جھٹکے دیے کہ اس کی آنکھیں باہر آئے  
نکلیں۔ ”اے بتا۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ تم لوگ اور کس لیے  
جمع ہو؟ جلد کر رہے تھے اور؟ اسکیسٹیم بنا رہے تھے دلبر خان کے  
خلاف؟“

ظاہر تھا ”دلبر خان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بیک وقت اتنی تعداد  
میں ان لوگوں کے وہاں جمع ہونے کا مقصد کیا تھا۔ یقیناً کوئی چھری  
یک رہی تھی لیکن دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے آتے ہی وہ  
چھری جس طرح دانہ دانہ ہو گئی تھی، اس پر مجھے حیرت بھی تھی  
اور السوس بھی لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ ذخیل پر  
مدد یوں سے بجا ہوا خوف آسانی سے نہیں پھلتا۔

وہ اگر اپنے ارادے پر عمل کرتے ہوئے دلبر خان کے سامنے  
سراٹھا کر کھڑے ہو جاتے اور دل کی بات کہہ گزرتے تب بھی شاید  
انہیں اتنی ہی مار کھانا پڑتی جتنی اس وقت ان کے حقدار میں نظر  
آ رہی تھی۔ اس صورت میں کم از کم ان کے دل کا غبار تو کھل جاتا  
اور شاید دلبر خان کے دل میں بھی خوف کا بیج پڑ جاتا کہ اس کے  
خلاف بھی بھارت ہو سکتی ہے۔ لوگ اس کے جبر اور زیادتیوں سے  
تک آکر اس کے سامنے بھی تن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

نئی شلوار قمیص والا خوف سے قمر حرقہ کھاتے ہوئے ہاتھ جوڑ  
کر کھٹی کھٹی سی آواز میں بولا۔ ”سامیں! ہم تو یہاں جائے پینے کے

میں نے اپنے پڑھنے مکان کو لینے کا ڈھیر بنے دیکھا تھا۔ اس  
مکان کی مالیت کروڑوں میں تھی۔ اس کا اور اس معمولی پچھر کا کوئی  
مقابلہ نہیں تھا مگر میرے دل میں وہی سوچ، وہی غم وہی غصہ تھا اور کچھ  
دیے ہی نقصان کا سا احساس تھا۔

شاید وہ دیکھ کر وہ احساس زباں در حقیقت دیکھ کر تھا جو میرے دل  
میں نکل رہا ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے دیکھ کے لیے تو اس کا پچھر رستوران  
اتنی ہی اہم رہا ہو گا جتنا میرے لیے میرا کروڑوں کا بنگلہ یا پچھر میرے  
اس بے اندازہ دھوکہ کی شاید ایک اور وجہ تھی۔ یہ کہ میں نے کئی  
ایٹھن اور گارے کی اس چار دیواری کو اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا  
تھا۔ کوئی شاید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ چار دیواری بنانے کے  
لیے ملک کے ایک معروف گروپ آف کپینز کے مالک، ایک  
نایت ہی سرکش قسم کے کوڑوچی نے زمین کھودی تھی، مثلی نکال کر  
کارا بنایا تھا، تسلی میں گارا اور اینٹیں ڈھولی تھیں پھر ایک ایک  
اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھی تھی۔ چار دیواری تک ایک راج مزدور کے  
روپ میں اس نے اپنا خون پیلا۔ اس چار دیواری کی بنیادوں میں  
رہا تھا۔

یہ سب کام اس شخص نے کیے تھے جسے پانی پلانے کے لیے  
بھی تھکائی، ملازم، بھڑیا قاتیہ اشارہ بولنے کے دھڑ مسندہ کھڑے  
رہتے تھے کیا کوئی اس پر یقین کر سکتا تھا؟ مجھے امید نہیں تھی۔

وہ چار دیواری میری تخلیق تھی۔ نہ جانے کتنے برسوں بعد میں  
نے اس قسم کی مصلحت میں اپنا ہاتھ ڈالا تھا اور یہ سچ تھا کہ میں نے  
اس کام کو مصیبت یا پیار سمجھ کر نہیں بھٹکایا تھا۔ میں اس سے  
لفظ اندوز ہوا تھا۔ دیکھنے والے کے لیے وہ ایک معمولی سی جگہ  
چار دیواری تھی اور کسی معمار یا کارگر کو شاید اس میں ہزاروں  
فلس نظر آتے لیکن میری نظر میں وہ بہت خوبصورت تھی۔  
بد صورت دل و دماغ رکھنے والے اور انسانی احساسات سے محروم  
ان لوگوں نے ذرا سی دیر میں اسے لینے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔

بہتری تھا کہ میرے ہاتھ میں اس وقت کوئی گن نہیں تھی  
ورنہ ان میں سے جتنے لوگ اس وقت مجھے نظر آ رہے تھے، کم از کم  
ان سب کو تو میں ضرور ڈھیر کر چکا ہوتا۔ میرے غم و غصے کا یہ عالم تھا  
کہ میرے لیے مندرجہ کی آڑ میں چپ کر بیٹھنا ناممکن ہو جا رہا تھا۔  
شاید قدرت مجھے بے جا خونریزی سے باز رکھنا چاہتی تھی اس لیے  
میں ڈھیر سے میرے ہاتھ میں گن نہیں آئی تھی۔

پچھر رستوران کا معمولی سا دیوانہ سا زرد سامان اور اشیائے  
خود نوش کا حقوڑا سا ڈھیر کچھ تو دیواریں گرنے سے تباہ ہو چکا تھا  
وہی کسی چپرس پچھر کو آگ لگنے سے برباد ہونے لگیں۔ سب لوگ  
اب پچھر رستوران سے کچھ دور ہٹ گئے تھے۔

اب دلبر خان ان دکانداروں کی طرف متوجہ ہوا جو اس سے  
”فیصلہ کن“ مذاکرات کرنے آئے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے  
کہ اگر وہ دلبر خان کے زہن میں نہ ہوتے تو اب کے وہاں سے ذرا  
بہتر ہوتے۔ ان کی کسی گم تھی۔

### تاریخی ٹاڈل

|                        |                    |
|------------------------|--------------------|
| خالد بن ولید           | الماس ایم۔ اے۔ 200 |
| سلطان نیو شہید         | الماس ایم۔ اے۔ 200 |
| نواب حیدر علی خاں      | الماس ایم۔ اے۔ 200 |
| سلطان صلاح الدین ایوبی | الماس ایم۔ اے۔ 450 |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

بخار چڑھ گیا تھا۔ میرے جسم میں گویا چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے خود اپنا چہرہ اپنے ہاتھ پاؤں آگ کی طرح دہکتے محسوس ہو رہے تھے۔

باقی بندوق بردار اب بھی سب لوگوں کے گرد حصار بنا کر کھڑے تھے۔ ان میں سے بعض گویا اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور بعض کے چہرے بالکل سیاہ تھے۔ آہم وہ سب کے سب اب بھی ارد گرد نظر رکھے ہوئے تھے۔ کلا شکوہ نہیں سنبھالے ہوئے پہلے ہی کی طرح مستعد کھڑے تھے کہ کوئی اس تڑائے میں مداخلت کرنے کے لیے آئے تو وہ اسے بھون کر رکھ دیں۔

میں نے محسوس کیا کہ ہستی کی سمت جو بھی دو سرے کچے کچے سے مکان آس پاس موجود تھے ان کی چھتوں پر بھی منڈیروں کے عقب میں کچھ نہ کچھ لوگ ضرور دیکھے ہوئے تھے لیکن کسی کو منڈیروں سے سراونچا کرنے کی بھی جرأت نہیں تھی۔

یہ بھی غیبت تھا کہ دیوان لوگوں میں شامل نہیں تھا جن کی پٹائی ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی حالت پہلے ہی بہت خراب تھی اور وہ ایک طرف کو لڑھکا ہوا تھا اور دلبر خان کے درندوں نے اس پر رحم کھایا تھا یا پھر شاید اس لیے کہ پٹائی کرنے والوں میں محبت ملی اور مسکین علی شامل نہیں تھے۔

وہ دونوں اگر پٹائی کرنے والوں میں شامل ہوتے تو شاید اب بھی دیکو کی حالت پر ترس نہ کھاتے اور میرے جیسے کاغذ اسی پر نکالتے۔ پٹائی کرنے والوں میں شاید وہ اس لیے شامل نہیں ہوئے تھے کہ ان کی اپنی حالت ابھی تک کچھ زیادہ اچھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ بس کلا شکوہ نہیں سنبھالے کھڑے تھے اور اپنے دو سرے ساتھیوں کی طرح گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

چند ہی منٹ میں سب کے سب دکاندار دھیر ہو گئے۔ ان میں سے بعض ایک دو سرے پر گر پڑے تھے۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ مار کھانے کے دوران انہوں نے بہت فریادیں کی تھیں کہ ہاتھ جو ڈبو ڈکڑ کر کم کی بجائے مٹ گئی تھی لیکن کسی نے ان کی توازدن پر کان نہیں دھرا تھا۔ اب ان میں سے بعض خڑا ہیں اور بعض اپنی ہی گندگی میں لتھڑے پڑے تھے۔ سب کے سب بے حال تھے۔ دلبر خان کے آدمیوں نے گویا بادل خواست ہاتھ دوک لیے۔ انہیں شاید اس کام میں بڑا لطف آ رہا تھا۔

دلبر خان موچھہ کو بل دیتے ہوئے گونجیلی ہی آواز میں بولا۔  
”جائے پیئے آئے تھے تا تم لوگ؟“ جائے تو میں نے تم لوگوں کو پلٹا دی ہے۔ ابھی بولو تو تیک بھی کھلاؤں؟ میرے خیال میں ابھی تم لوگوں کو اور خاطر تواضع کی ضرورت ہے۔“

زمن پر گرے ہوئے افراد میں سے دو تین نے ہاتھ جوڑ لیے اور دھیمی آواز میں کچھ کہا جو میں سن نہیں سکا۔ غالباً معافیاں ہی مانگ رہے ہوں گے۔ دلبر خان بدستور موچھہ کو بل دیتے ہوئے اونچی اور بار بار آواز میں بولا۔ ”اے... میں ابھی طرح سمجھتا

لیے آئے تھے... صرف جائے پیئے... تیر مرشد کی قسم... ہم نے تو آپ کے خلاف ایک بات بھی نہیں کی۔ ہم آپ کے خلاف بھلا کیوں بات کریں گے؟ آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔“

”جائے پیئے آئے تھے...! دلبر خان نے استہزاء سے لہجے میں ڈھرایا اور ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے اس کے منہ پر اپنے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ ایک ہی تھپڑ میں بڑی طرح جھنجھٹے، معافیاں مانگنے اور دلبر خان کے بیروں میں گرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس مقدمہ میں اسے کاسیائی نہیں ہوئی۔

دلبر خان نے لات مار کر اسے فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھال دیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ دلبر خان ایک طاقتور شخص تھا لیکن ایسے لوگوں کی طاقت نے مجھے کبھی مرعوب یا حائر نہیں کیا تھا جو اپنے سے کہیں کمزور، بے بس اور مجبور لوگوں کو مارتے تھے اور مارتے ہی پلٹے جاتے تھے۔

طاقتور انسان تب ہی اچھے اور متاثر کن لگتے ہیں جب وہ بہادر بھی ہوں اور یہ کوئی بہادری نہیں کہ انسان کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے مارنا شروع کر دے یا ایسے لوگوں پر مشق ستم کرنے لگے جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ آٹھ اٹھ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھ سکتے۔

مٹی شلوار قمیص والا فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھلا لیکن دلبر خان نے اس کا گریبان نہیں چھوڑا۔ جو بھی اس کے پاؤں دوبارہ زمین پر گئے، دلبر خان نے اس کے پیٹ پر ایک اور زوردار لات رسید کی اور ساتھ ہی اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ اچھل کر دوڑ جا کر گرا۔ اس کا سر ایک تنچے سے ٹکرایا۔ وہ زمین پر گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور ہونٹ نیم دارہ مچے۔

میرے خیال میں وہ دماغی چوٹ سے فوری طور پر مر گیا تھا لیکن شاید کسی کے لیے بھی یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کسی نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی۔

دلبر خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ تین چار آدمی ان مسکین سے دکانداروں پر چل پڑے۔ وہ انہیں گھونسن، ’اتوں‘ تھپڑوں اور گھونٹوں کے دستوں سے نہایت بے رحمی سے مار رہے تھے۔ وہ آٹھ دس آدمی، تین چار آدمیوں کے ہاتھوں بڑی طرح پٹ رہے تھے۔ کسی کو ایک طرف سے گھونسا پڑتا، وہ دوسری طرف جا کر گرنے لگتا لیکن فوراً ہی دوسرے لات پڑتی۔ ابھی وہ تکلیف سے ڈھرائی ہو تاکہ کمر کسی کی گن کا دست پڑنا۔

وہ ایک عجیب، تکلیف دہ نظارہ تھا۔ میرے دل کو پیسے کوئی مسلسل ٹھٹھی میں مسل رہا تھا۔ انسانوں اور انسانیت کی ایسی تخیل اور اذیت رسانی کے ایسے مناظر میری رگوں میں آتش فشاں دھکا دیا کرتے تھے۔

چند ہی لمحوں میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے مجھے تیز

اندازہ تھا کہ آس پاس کے مکانوں میں بھی اس کی آواز جاری تھی اور اگر ان میں چند افراد بھی موجود تھے تب بھی اس کا "پیغامِ محبت" پوری ہستی میں پہنچ جائے گا۔  
وہ ایک چھوٹی سی راجدھانی کا چھوٹا سا فرعون تھا۔ اسے اپنے

میں کوئی ایسا چر نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ یہاں میرے خلاف اسکیمن بنانے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ بھتہ دیتے سے انکار کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ باہر کا کوئی آدمی اگر دروازے سے اسکیمن علی اور محبت علی کو چوٹ دے گیا تو تم نے سمجھ لیا کہ دلبر خان کا تختہ الٹ گیا۔ دلبر خان ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا ہے۔ دلبر خان سے تو دوسری کیٹیوں والے بھی کانپتے ہیں۔ تم کیا چاہو ہو۔"  
زمین پر گرا ہوا ایک شخص ابھی تک ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔ دلبر خان اس کے ہاتھوں پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے یکدم گریز کر بولا۔ "اڑے۔۔۔ تم لوگ جس کو بھتہ کہتے ہو۔۔۔ خبیثانہ کوئی میری جیب میں تو نہیں چلا جاتا۔ یہ سب روپیہ تمہاری بھلائی کے لیے۔۔۔ تمہارے ہی کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ لوگ پتو اچم کو اتنا بھی احساس نہیں ہے کہ ہم کبھی کا انتظام چلاتے ہیں۔ تم لوگوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، تمہارے کاروباروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کاموں پر خرچ ہوتا ہے نا۔۔۔"

لازوال کمائیوں کے خالق  
انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے  
ایک نئی سوغات

## رقص ابلیس

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی  
ایک حقیقت جو کمائی بن گئی۔

ایک آشفستہ حال کی داستان عبرت جسے

قانون نے مجرم بنا دیا

قیمت - 150 روپے

ناشر - مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور 2

اس کے یہ الفاظ کچھ زیادہ ہی ستم گردانہ تھے۔ لوگوں کی وہ جیسی "دیکھ بھال" کرتے تھے، وہ زمین پر گرے ہوئے لوگوں کی حالت سے ظاہر تھا اور لوگوں کے کاروبار کی وہ جیسی "حفاظت" کرتے تھے، اس کا اندازہ دو کے چھپرے ستوران سے ہر آسانی لگایا جاسکتا تھا جس سے ابھی تک شعلے اور دھواں بلند ہو رہا تھا۔  
دلبر خان کسی غضب ناک سانس کی طرح زمین پر پاؤں بچ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اڑے حرامزادہ۔۔۔ اگر اصرہر تھانہ پکڑی ہوئی۔۔۔ سرکاری دفتر ہوتے۔۔۔ محصول چکی ہوئی۔۔۔ پھر بھی تو تم لوگ طرح طرح کے ٹیکس دیتے۔ تم لوگوں سے ہی پیسے لے کر گورنمنٹ تمہارا انتظام چلاتی۔ اب گورنمنٹ کے بجائے ہم یہاں کا انتظام چلاتے ہیں۔ ہم یہاں کا ہر کام کرتے ہیں۔ ہم تمہارے اپنے لوگ ہیں۔ تو ہم کو پیسہ دیتے ہوئے تم لوگوں کو اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے؟"

پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "یاد رکھو مسائیں مرادو مجھے اس علاقے کا حاکم بنایا ہے۔ میں صرف کمزور نہیں ہوں میں ان کا خاص آدمی ہوں۔ انہوں نے مجھے ہر طرح کا اختیار دیا ہے۔ مجھے اس علاقے کا انتظام چلانا ہے اور میں اپنا کام کرنا بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں جس طرح ہتھکڑیوں کا اپنا کام کروں گا۔ جو کوئی زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرے گا۔۔۔ میری پیٹھ پیچھے بیٹھیں گے گا۔ لوگوں کو بھڑکائے گا۔۔۔ میرا حکم ماننے سے انکار کسے گا؟ اس کا شہر اس سے بھی زیادہ خراب ہو گا۔" اس نے زمین پر پڑے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

معلوم نہیں وہ اپنی تقریر کے ساتھ ہاتھ کیوں کہ وہاں سامعین تو موجود نہیں تھے وہی لوگ اس کی بات سننے والے تھے جو بارگاہ کھا کر پہلے ہی عبرت پکڑ چکے تھے اور جن میں بدعات کی لہر ان لوگوں کی آمد کے ساتھ ہی دم توڑ چکی تھی لیکن دلبر خان کو شاید

کی شناخت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ زیر میں بھی آواز کا تیر میری ساعت میں آن ہیست ہوا۔

”اب تو غلط رہ گئی تمہارے دل میں؟ سب کچھ تباہ کرادیا۔ سب کو ادھر مرا کر دیا۔۔۔ سب کو ابھی طرح ذلیل کر دیا۔ اب خوش ہو؟“

وہ ایک نسوانی آواز تھی۔ میں اس آواز میں پہلا لفظ سننے بجلی کی سی تیزی سے گھوما تھا اور باقی الفاظ میں نے بولنے والی کی صورت دیکھتے ہوئے مٹنے تھے۔ وہ ایک دلیلی تھی اور لمبی سی سالہ لڑکی تھی۔ بعض سافلی لڑکیوں کی آنکھیں نہ جانے کیوں غضب ہوتی ہیں۔ وہ ان ہی میں سے ایک تھی۔

بلکہ یہ کتنا بے جا نہیں ہو گا کہ اس کے چہرے پر آنکھوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں لیکن یہ دو آنکھیں ان گنت تجلیے نقش ہر بھاری تھیں۔ وہ منہ می کرھاکی والی لمبی سی چامنی تھیں اور پہلے رنگ کی پرانی سی سولی شلوار میں تھیں۔ تھیں کے گلے پر چھوٹا چھوٹا شیشے چمک رہے تھے۔

اس کا کئی رنگوں کا سونے کا سونے ڈھلک کر اس کے گلے میں آ ہوا تھا اور سیاہ رہ گئی تھیں پریشان تھیں۔ اس کے رخساروں پر ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور ایک رخسار پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ بلکہ اور شخصیت تو یہی بتاتی تھی کہ وہ ایک سیدھی سادی ان بڑھ کر دیہاتی لڑکی ہے لیکن اس کی آنکھیں ایک بے پناہ ذہین لڑکی کی آنکھیں تھیں۔ بہت سی بڑھی گئی لڑکیوں کی آنکھوں میں جو ذہانت کی وہ چمک نہیں ہوتی جو ان کا چہرہ پر آنکھوں میں تھی۔

لیکن ان آنکھوں نے اس کا ایک نقصان بھی کیا تھا اس کا عمر غالباً بیس یا تیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان دائروں آنکھوں نے اس کی عمر بڑھا دی تھی۔ دیکھنے والے کو یہ یوں لگتا آنکھیں گویا سب سے پہلے یہی بتانے کی کوشش کرتی تھیں کہ اس کم عمر جو دیں ایک نہایت کمند و عمر سیدھ روح مقید ہے۔

اس کی آنکھوں کے بعد جو چیز مجھے قدرے عجیب لگی وہ یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک کھڑائی تھی جس کا پھل پٹا اور چمکا تھا۔ گویا ابھی ابھی کسی کارخانے سے پالش ہو کر نکلا ہو۔ دست لگا اور پتلی لاٹھی کی طرح تھا جس پر سرخ اور سیاہ رنگ چمک رہا تھا۔ دہی رنگ جو بعض علاقوں میں پرانے وقتوں سے چارباہوں اور بیڑیوں وغیرہ کے پایوں پر کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ہلکی پھلکی خوبصورت کھڑائی تھی۔ نگریاں کانٹے کی قیدی نہیں تھیں۔ کلا خشک کے سلاب نے جب تک سندھ کو لپٹ میں نہیں لیا تھا زیادہ تر لڑکیاں ایسی ہی کھڑائیوں سے لڑی جاتی تھیں۔

معلوم نہیں کب وہ لڑکی بے آواز قدموں سے بیڑیاں چاہ کر میرے حجب میں آن پہنچی تھی۔ ایک لمبے۔۔۔ بے اس خیال سے میرے جسم میں سر دی لہر دو گئی کہ وہ چاہتی تو اس کھڑائی سے میری کھوپڑی کو دو حصوں میں تقسیم بھی کر سکتی تھی۔ یہ کوئی اچھا

فرمان ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانے کے لیے اخباروں میں اشتہارات یا خبریں چھپوانے اور ٹی وی پر اطلاعات یا مذاکرے نشر کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایسے ہی نہ جانے کتنے چھوٹے اور بڑے مختلف درجوں اور مختلف گرجوں کے فرعون میری سرزمین پر بکھرے پڑے تھے۔ میں کس کس سے لڑ سکتا تھا؟ کس کس پتھر سے سر چھوڑ سکتا تھا؟ میرا غیظ و غضب فصول تھا، میرا غصہ بیکار تھا۔ یہ ایک مجبور آدمی کا غیظ و غضب، ایک بے بس آدمی کا غصہ تھا۔

یہ باتیں اس سے پہلے بھی زندگی میں ایسے ہی کی موقعوں پر میں نے سوئی تھیں۔ اپنے آپ کو بار بار سمجھایا تھا لیکن کھوپڑی میں نہ جانے کون سی ایسی رگ تھی جو ہر بار میری طرح پھڑکنے لگتی تھی۔ قابو میں نہیں آتی تھی۔ نہ جانے وہ کون سی اضافی روح تھی جو میرے اندر گھسی ہوئی تھی اور میرے قابو میں نہیں آتی تھی۔ مجھے مجبور کرتی تھی کہ ایسے فرعونوں سے جا کر لڑاؤں خواہ انجام کچھ بھی ہو۔

یہ مدح مجھے قلیاں دیتی تھی کہ اس راہ میں اگر میں ناجی ہو جاؤں تو رہا نہیں اس میں بھی میری ہمت ہے اور اگر سبھی نے عقل کی پیروی کرتے ہوئے صرف اپنے لیے عافیت کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو یہی نوع انسان کی بقا ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہر عقل کی پیروی کرنے والوں کو بھی کہیں عافیت کا راستہ نہیں ملے گا۔ میں اس مدح کی سرگوشیاں سننے سے باز رہنے کی بہت کوشش کرتا تھا لیکن نہیں رہا تھا۔ اس کی سرگوشیاں مسلسل سنائی دینے والی بازگشت بن جاتی تھیں۔ شاید پیدا ہونے کی طور پر ہی میرے ذہن کی ساخت میں کوئی نقص تھا، کوئی پڑھ لکھا لگ گیا تھا۔ میں اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا جس طرح معاشرے میں۔۔۔ بلکہ پوری دنیا میں سوچنے کا وہ ادب تھا۔ یہ میرا ”سینو فیکچرنگ ٹالٹ“ تھا۔ اسے دور کرنا میرے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے دونوں ہاتھ جھٹ پر پڑی پتھر کی ایک چھوٹی سی بیل پر بنے ہوئے تھے اور کچھ ایسی تختی سے جم چکے تھے کہ میں سوچ رہا تھا شاید انہیں دہاں سے ہٹانا میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ ان کی حالت ان آہنی شکنجوں کی سی تھی جو کسی چیز کو اپنی انسانی مضبوط گرفت میں لیے وہیں دمک آلود ہو گئے تھے کسی نے انہیں کھولا نہیں تھا اور اب وہ جام ہو چکے تھے۔

شاید لا شعوری طور پر میری کوشش یہ تھی کہ پتھر کی وہ بیل میری گرفت میں مزید مزید ہو جائے۔ میں انسانوں کی سنگدلی کا بدلہ پتھر کے اس گلے سے لینا چاہتا تھا جو شاید انسانوں کی سفاکی کے مظاہرے دیکھ کر شرمندہ تھا۔

ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ میرے اندر غیظ و غضب کے جو تلے رتھال تھے وہ دیسے ہی مجھے راکھ بننے پر تلے ہوئے تھے لیکن اسی لیے ان شعلوں کو ہوا دینے کا بھی سامان ہو گیا۔ میں اپنی کشتیوں

سے بولی۔ ”اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ تم جنت میں کران کے سامنے جاؤ اور بے تک مارے جاؤ۔ عزت کی خاطر جان دینے میں بھی ایک شان ہوتی ہے۔ تم یا تو باپ کی حمایت اور مدد کرنے کی کوشش ہی نہ کرتے ہیں اپنے کام سے کام رکھتے یہاں تو یہ تماشے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اب تم نے ان کی مدد کی کوشش کی ہے تو اسے انجام تک پہنچاؤ۔“

”خدا! انجام یکی ہو کہ میں مارا جاؤں؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں۔ خدا! انجام یکی ہو۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ”میرا تم سے وعدہ ہے، میں تمہارے سوگ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گی اور روز شام کو ننگے پیر تمہاری قبر پر دیا جلائے آیا کروں گی۔ میں جب تک زندہ رہی اپنی ہر رات تمہاری قبر پر گزارا کروں گی۔“

مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آگئی۔ وہ سندھی میں بات کر رہی تھی اور میں ٹوٹی پھوٹی سندھی میں جواب دے رہا تھا لیکن اس کی بات پر مجھے پریم وار برائی کا ایک شعراء یاد آیا تھا۔ شاید وہ آسان آندو کا یہ شعر سمجھ بھی لیتی تھی مگر وہ شعر سنائے گا تو کیا، نثر میں بھی اتنی باتیں کہنے کا وقت نہیں تھا، جتنی ہم کر رہے تھے لیکن اب ضرور تھا کہ یہ سب باتیں بہت تیزی اور بہت اختصار سے ہوئی تھیں۔ شعر بھی صرف میرے ذہن میں ہی گونج کر رہ گیا۔

کون آئے گا مجھے پیوں شمع جلا کر شام ڈھلے پریم، محبت کی حزل کے بولے بھیاک رستے ہیں  
”میرے رنے کے بعد تم کیا کرو گی؟“ اسے رہنے دو۔ یہ چلاؤ  
دو تمہارا بابا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ میرا باپ نہیں لیکن میرے لیے باپ سے بڑھ کر ہے۔ اس نے مجھے پالا ہے اور بہت عزت سے پالا ہے ورنہ شاید میں بہت چھوٹی عمر میں مر جی ہوتی اور اگر زندہ بھی نہ ہوتی تو شاید کسی کے گھر میں نوکری یا ذرخیز کتھر جیسی زندگی گزار رہی ہوتی۔ شاید ایسے بچوں کو جنم دے دی ہوتی جن کے باپوں کے ناموں کا بھی مجھے پتا نہ ہوتا۔“ وہ بڑی تیزی سے کہتی چلی گئی۔

اس نے اپنی عمر سے بڑی بات کی تھی۔ اس کا اندازہ شکوہ کی اپنی عمر سے کہیں بڑی لڑکیوں والا تھا۔ معلوم نہیں بعض لوگ دنیا کے سمندر میں کدے بغیر اتنی پتلی سے بات کرنا کہاں سے سیکھ لیتے ہیں ورنہ آقاہد کو شوں اور بند گھروں میں بیٹھے بیٹھے زندگی کا ہر راز ان پر کیسے مکشوف ہو جاتا ہے۔ شاید عقل و دانش بھی آسمانی پیغام کی طرح ہے۔ خود خود اوپر سے اترتی ہے۔

اچانک وہ برہنہ سے بولی۔ ”اب جاؤ گے بھی؟ یا اس وقت تک نہیں کھڑے ہائیں کرتے رہو گے جب تک وہ سب کو اپنے پیوں تلے روند دے ہوئے یہاں سے رخصت نہیں ہو جائے؟“  
”تمہارا نام کیا ہے لڑکی؟“ میں نے ایک بار پھر اس کا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ چہرہ ہی گھوٹ میں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ

بات نہیں تھی کہ مجھے اس کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ لیکن پھر ان موٹی موٹی سیاہ اور غیر معمولی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ عقب سے میری کھوپڑی کو وہ حصوں میں تقسیم کرنے کا شاید خیال بھی اس کے دل میں نہیں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے صرف برہنہ تھی، نفرت نہیں تھی۔

”کون ہو تم؟“ میں نے تیز سرگوشی کے ساتھ پوچھا۔  
”یہ سوال وجوہ کا وقت نہیں ہے۔“ وہ زخمی ناگن کی طرح پھکاری۔ ”تمہاری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ اب تم ہی جا کر جو بھی کر سکتے ہو وہ کرو۔“

اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ تمام حالات سے واقف تھی۔ شاید کہیں سے سارا قاتلا دیکھتی رہی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا وہ سوال وجوہ کا وقت نہیں تھا پھر بھی میں اس سے پوچھنے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”تمہیں سب کچھ کیسے معلوم ہے؟“

اس بار اس نے بادل خواست میرے سوال کا جواب دے دیا۔ ”جس دن سے تم آئے تھے اور وہوش کی دیواریں بنا رہے تھے اس دن سے میں تمہیں اسی پھت کی منظر کے پیچھے سے مل رہی تھیں چھپ کر دیکھ رہی تھی۔ اگر یہ جان کر تمہیں تسلی ہو گئی ہے تو اب جاؤ اور ان تھوڑی پرلٹ بڑو۔“

”میرے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ وہ کلا شکوفوں سے سلج نہیں اور چوکتا ہے۔ میں قلمی بیو نہیں ہوں کہ۔“  
میرا جملہ ٹھل ہونے سے پہلے اس نے کلاڑی میری طرف اچھال دی۔ میں نے کلاڑی کو کچھ کر لیا اور حیرت سے کہا۔ ”اس سے میں کلا شکوفوں کا مقابلہ کروں گا؟“

”نہیں، مقابلہ تو تم صرف اپنے حوصلے اور مردانگی سے کرو گے یہ تو میں تمہیں صرف دل کی تسلی کے لیے دے رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے، تم حوصلے، مردانگی یا اس کلاڑی سے اتنے بہت سے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جن کے پاس کلا شکوہ بھی ہے اور اور دلبر خان کی حمایت بھی، سائیں مراد کی ٹھکیاں بھی ہیں اور روپے پیسے کی طاقت بھی۔ یہ سب اس علاقے کے حاکم ہیں، ان کے اشارے پر یہاں سب کچھ ہوتا ہے اور برسوں سے ہو چلا آ رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم یہ کلاڑی لے کر ان کے سامنے جاؤ گے تو ایک منٹ میں مارے جاؤ گے۔ اور مجھے تمہاری موت کا دکھ بھی بہت ہو گا۔“ اس نے ایک طویل سانس لی جو شاید اس کے دل کی گھرائیوں کو چرتی ہوئی باہر آئی تھی۔

اس احساس سے نہ جانے کیوں مجھے اپنی رگ و پے میں لطیف سی سسٹنی محسوس ہوئی کہ اسے میری موت کا بہت دکھ ہو گا حالانکہ جب انسان مرے گیا تو کسی کو دکھ ہو یا خوشی، مرنے والے کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے باوجود اس دنیا میں ان گنت لوگ کسی کو خوش یا افسردہ کرنے کے لیے جانتے دیتے آتے ہیں۔ وہ گویا اپنے حوصلے کو بچھ کر دے ایک لمحے کے وقف

آدی اس وقت زمین پر گرے ہوئے دکانداروں کی جیبوں سے پیسے نکال رہے تھے۔ جس کی جیب میں جتنی رقم بھی موجود تھی وہ نکال کر ایک جگہ جمع کرتے جا رہے تھے۔ دکاندار نقدی تو وہ پہلے ہی چھین چکے تھے اور اس کے گٹے میں بھی جو کچھ موجود تھا وہ نکال چکے تھے۔ حتیٰ کہ لڑائی جھگڑے کے دوران جو نوٹ زمین پر گرے تھے انہوں نے وہ بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اٹھا لیے تھے۔ اس کے بعد دکانداروں کو توڑنا تھا اور پچھڑ کو آگ لگانی تھی۔

میں دنیا میں اتنے عجیب عجیب تماشے دیکھ چکا تھا کہ اب مجھے کسی بھی تماشے پر حیران ہونا چھوڑنا چاہیے تھا پھر بھی نہ جانے کیوں میں اس منظر پر حیران ہوئے بغیر نہ سکا۔ اس دنیا میں میرے لیے جیسا جیٹھی کا ہر جگہ ایک عجیب ہی عالم تھا۔ وہ بے پیسے کی لوٹ مار کے جو مناظر دیکھنے میں آتے تھے اس پر آنکھیں پھٹکی کی پھٹی رہ جاتی تھیں اور دل اڑنے لگتا تھا۔ اس میں وہ لوٹ مار بھی شامل تھی جو ہندو یا غنچہ کی لوٹ پر نہیں کی جاتی تھی۔

ان سب مناظر کا عادی ہو جانے کے باوجود نہ جانے کیوں اب بھی کوئی کوئی منظر مجھے حیران کر دیتا تھا۔ آپ نے گناہیے والی مشین تو دیکھی ہی ہوگی۔ گئے گا رس نکالنے والے اس میں گنا ایک بار دو بار اور بھی بھی تین مرتبہ بھی پیل دیتے تھے حتیٰ کہ گنا کا بالکل ہی طرہ نکل جاتا تھا اس کا ایک ایک قعرہ پڑ جاتا تھا اور صرف پھوک باقی رہ جاتا تھا۔ آخر کار وہ لوگ گئے کا پیچھا پھوڑی دیتے تھے اسے بخش دیتے تھے۔

لیکن ہماری سوسائٹی میں غریب کوئی کا پھوک نکل جانے کے بعد بھی اسے کوئی نہیں چھوڑتا۔ کوئی نہ کوئی حالات، کسی نہ کسی طریقے سے اس کی رکوں سے اس کا کوئی نہ کوئی بچا کھچا قتلوا نچوڑنے کی کوشش میں رہتی ہے۔ اور مردہ کسی ظلم کی ششیں سے نکلتا ہے اور اسے دوبارہ اس میں پھیل دیا جاتا ہے۔ پلے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ کتنا ظالم انسان جب بالکل ہی چوک رہ جائیں گے، جب ان میں مال و دریا زندگی کے رس کا ایک قطرہ بھی نہیں رہے گا تو وہ کیا کریں گے؟ شاید انہیں بھی گتے والوں کی طرح یہی اطمینان رہتا ہے کہ یہ کتنا ظالم انسان ختم ہو جائیں گے یا کسی قابل نہیں رہیں گے تو اور انسان آجائیں گے۔ انسان بہت سستا ہے اور دنیا میں اس کی بڑی بہتات ہے۔

دہلی خان کے آدمی ابھی ان گھوڑوں سے رس کے بچے کچے  
قصرے نچوڑی رہے تھے۔ میرا مطلب ہے ابھی وہ ان کی جیبوں  
سے ان کی چھوٹی موٹی رقیں نکال ہی رہے تھے کہ موہل جلتے ہوئے  
چھپرے ستوران کے گرد پکر کاٹ کر ایک جھڑکی سی تیزی سے یکدم  
ان لوگوں کے قریب جا پہنچے۔

وہ اپنے سر پر دو ہنزار دی تھی، بال نوچ دی تھی، دُبانیاں  
دے دی تھی اور ان لوگوں کو بری طرح کوس دی تھی۔ اس کے  
لیے اسے اداکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ ظاہر تھا اس کے حقیقی

وہ کوئی عام سی، ان پڑھ سی، دماغی لڑکی بہر حال نہیں تھی۔ اس کا ظاہر بے شک ایسا ہی تھا لیکن اس کے اندر کوئی بہت مختلف روح مقید تھی۔

”موئل“ اس نے مظلومانہ انداز میں منڈیر کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

”مومن!“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں نے اپنی جان کی بڑی حفاظت کی تھی۔ بڑا مومن سفر کر کے اور بڑی مصیبتیں اٹھا کر اس جان کی حفاظت کرتا ہوں۔“

آج اسے موت کے منہ میں پھونک کر بھی دیکھ لیتا ہوں۔ کبھی کبھی کسی اجنبی کی بات مان لینے... کسی انجان بستی کے لیے جان دینے میں بھی بڑی لذت ہوتی ہے۔ تم کہتی ہو تو میں زندگی کی یہ آخری لذت حاصل کرنے چلا جاتا ہوں۔“

میں نے اپنی پھٹکی کھڑی کو ہاتھ میں تولیہ پھراپنے دل کو ٹٹولا۔ عجیب بات تھی، میں زرا ابھی خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ اندیشے بھی رخصت ہو چکے تھے جو چند لمحے پہلے تک بیروں کی دھنجر بنے ہوئے تھے۔ مثل وہن کی وہ سرگوشیاں بھی معدوم ہو چکی تھیں جو زرا دیر پہلے تک اندازے اور تخمینے پیش کر رہی تھیں کہ جب دشمن کی تعداد اتنی ہو، اس کے پاس تھیں اتنی ہوں، وہ ایسی جگہ پر کھڑا ہو، اس کا موڈ ایسا ہو اور اس کی حرکات و سکنات سے اتنی مہارت جھٹکتی ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ اب وہن گویا سارے سوالوں، ساری دلیلوں اور قطع نقصان کی آجھنوں سے آزاد ہو چکا تھا۔

میں اس کے قریب سے گزر کر سیرجھوں کی طرف بڑھا۔ وہ گھڑی کی سوئی کی طرح میری ہی طرف گھومتی چلی گئی۔ میں نے ابھی پہلی ہی سیرجھ پر قدم رکھا تھا کہ وہ تیزی سے بولی۔ "غصہ...."

آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی لیکن اس میں اضطراب بے پناہ تھا۔ میں رک گیا تو وہ قریب آ کر بولی۔ "پہلے میں وہاں جاتی ہوں۔ محل بہت شور شرابا کروں گی۔ رونا بیٹھا دوں گی۔ میں سب کا دھیان، سب کی توجہ اپنی طرف کروں گی پھر تم کسی طرح نظر بچا کر آنا اور صرف دلبر خان کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر وہ قابو میں آگیا تو مجھ کو سب قابو میں آجئے۔"

گویا اب اس کے دل پر داغ غالب آ گیا تھا۔ اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں بالکل حق آنکھیں بند کر کے موت کے گڑھے میں چلاٹک لگا دوں۔ وہ زندگی کا قہقرا بہت امکان باقی رکھنے کی تدبیر کرنا چاہتی تھی۔

میں مسکرایا لیکن اس نے مجھے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس نے میرے جواب کا انتظار کیا۔ وہ کسی ٹی کی سی پُھرتی سے کچی اور تھوڑا سیڑھیاں اتارتی چلی گئی۔ پھر میں نے دھڑے دروازہ کھول کر گبولے کی طرح اسے باہر جاتے دیکھا۔ اس کا رنگ برنگہ دونا اس کے عقب میں ہوا میں لہرا رہا تھا۔

میرا پس منظر کے قریب آگیا۔ میں نے دیکھا، دلبر خان کے

اور خیالت سے لال بھبھو کا ہو رہا تھا مگر اس سرخی پر اس کی رنگت کے سانولے پن کا ہلکا سا دھواں چھایا ہوا تھا۔

شکار اس وقت درندے کے قابو میں تھا۔ فائدہ عتاب کے بچوں میں تھی۔ دبو کے لیے یہ نظارہ ناقابلِ برداشت تھا اور کچھ کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کا جسم جھٹکے کھارہا تھا۔ شاید وہ چھپا لے رہا تھا۔ ممکن تھا دل میں مول کو کوس بھی رہا ہو کہ آخر وہ اس جھگڑے میں کیوں کھس آئی تھی۔

دلبر خان کے آدمیوں نے مول کو یوں اس کی گرفت میں دیکھ کر ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔ نضا عمر شمس ہو کر رہ گئی۔ مول قہقہہ ایک نرم دناؤ کی سی لڑی تھی۔ وہ جوڑو کرانے لیا اس طرح کے کسی اور بہرے یقیناً واقف نہیں تھی کہ اس وقت اپنے آپ کو چھڑا بھی لیتی اور دو چار کی ہڈیاں پٹلیاں بھی سینک دیتی لیکن یہ بھی اسی صورت میں ممکن ہو تا جب اتنی کلاٹھکوں کا رخ اس کی طرف نہ ہوتا۔

اتنی کلاٹھکوں کے سامنے تو مارشل آرٹس کا بڑے سے بڑا ماہر بھی صرف فلوں میں ہی گشتوں کے نچنے کا سکنا تھا۔ اس صورت حال میں تو صرف کوئی حکمت عملی، کوئی تدبیر ہی کچھ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔

سب سے زیادہ بری چیز اس وقت مجھے چھپرے ستوراں کا حمل وقوع محسوس ہو رہا تھا جو عام حالات میں یقیناً اس کی خفیہ رہی ہو گی۔ یعنی اس کے چاروں طرف کھلی جگہ تھی۔ گاہک وہاں بیٹھ کر چاروں طرف سے ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے لیکن میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ میں کسی چیز کی آڑ لیتے ہوئے ان لوگوں کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔

اگر وہ صرف چند درخت تھے جو تھوڑے بہت کا آمد ثابت ہو سکتے تھے سب سے بڑی آڑ خود چھپرے ستوران کا لمبہ تھا جس کے پالائی حصے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چھپرے کا گھاس چھوٹا تو جمل چکا تھا اب صرف لہیاں جل رہی تھیں۔

دلبر خان گویا مول کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو بڑا اچھا چوزہ ہے۔ اڑے دبو! کبھی کی ساری عورتیں لڑکیاں زمینوں پر کام کرتی ہیں۔ تو نے اس کو کیوں پردے میں چھپا کر رکھا ہوا تھا؟“

دبو نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس نے دلبر خان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ بدستور منہ پھیرے بیٹھا رہا اور اس کا جسم بولے ہوئے جھٹکے سے کھانا رہا۔ دلبر خان نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ ”اوسے آجرا اس کو گاڑی میں ڈال۔ ہم تو اس کو بھول ہی گئے تھے۔ ہمیں تو ابھی نہیں تھا یہ چوزہ اتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔ ادھر سے اس کا یہ جھوٹ موت کا باپ ہمارے خلاف بناوٹ پھیلا رہا ہے۔ ایڈر رہنے کی کو شش کر رہا ہے۔ اب ذرا اس کو کچا قسم کا سبق

چڑات بھی اس وقت ہی تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ جب تک وہ میرے سامنے کھڑی تھی، اپنے آپ پر پوری طرح قابو رکھے ہوئے تھی۔

دبو جو اس وقت تک بے جان سے انداز میں ایک طرف لڑکھا رہا تھا اٹھ بیٹھا اور لوٹ کر آتا ہوا اس کے قریب آیا اور کانپنے ہاتھوں سے اسے دھکیل کر دایں پیچھے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ اس وقت گویا اپنے آپ میں نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر دلبر خان کو کوسنے دینے لگی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے وہاں جاتے ہی ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ دلبر خان اور اس کے سب آدمیوں کی توجہ اسی کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ خیانت بھری مسکراہٹ قرآن کے چوڑے پہلے ہی موجود تھی لیکن اب یہ مسکراہٹ کچھ اور معنی خیز ہو گئی تھی۔ اس کا شیطان رنگ کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔

دلبر خان ایک ہاتھ سے اپنی منجھون کو بل دے رہا تھا۔ یہ غالباً اس کا مخصوص انداز تھا۔ اس کے ہاتھ اس وقت خالی تھے۔ اس کی کلاٹھکوں اس کے قریب ہی اس کا ایک آوی تھاے کھڑا تھا۔ وہ گہری نظروں سے مول کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے خیال انداز میں مسکرا رہا تھا۔ دبو اپنی تباہ حالی کی وجہ سے مول کو کھڑکی طرف دایں دھکیلنے میں ناکام ہو چکا تھا۔

اچانک مول کی پیچ و پکار کے درمیان دلبر خان کی گونجی آواز ابھری۔ ”اڑے دبو! ہم کو تو ابھی نہیں چلا تیرا یہ پیٹ تو بہت بڑا ہو گیا۔ بڑی ٹھیک ٹھاک جوائی آئی ہے اس پر تو۔ کسی نے ہم کو بتایا ہی نہیں۔“

لجھ کچھ ایسا ہی تھا جیسے یہ جانتا اس کا پیرا مٹی جن تھا اور اس خبر سے محروم رکھ کر اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی گئی تھی۔

دبو کا ٹیل زوہ چوہ پکڑم کچھ اور تار یک پڑ گیا۔ شاید وہ اس وقت سے ہی ڈر رہا تھا۔ اس کے جسم سے دسی سخی جان بھی نکل گئی۔ وہ شاید کر پڑا مگر مول نے اسے سارا دے کر کچھ دور ایک چٹخار بٹھایا۔ روتے روتے اس نے دبو کی پیشانی اور ہاتھ چوسے۔ دلبر خان اور اس کے آدمیوں کی نظرس اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نہیں ہٹیں۔ وہ لڑکی نہیں گویا چٹا پھر تالالی باپ تھی جو بہت سے ندیے بچوں کے درمیان پھرا رہی تھی۔

دبو کو ہٹا کر اچانک ہی وہ پھری ہوئی شریفی کی طرح چلی اور دلبر خان پر چھپ گئی۔ اس کے آدمیوں کی کلاٹھکوں کا رخ اس کی طرف ہو گیا لیکن کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلبر خان نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ یوں اس نے صرف ایک ہاتھ سے اسے روک لیا۔

اس نے دوسرے ہاتھ سے دلبر خان کا منہ فوجنا چاہا تو اس نے اس کی دوسری کلائی بھی پکڑ لی اور اسے کسی گڑیا کی طرح ہٹھا کر یوں قابو میں کر لیا کہ اب اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس کا چہرہ

دنا پڑے گا۔ آئندہ ادھر رہے گا تو سر جھکا کر رہے گا۔“  
پتہ۔ میرے اندر جیسے کوئی اور ہی مدح نامی تھی رگ و پے میں  
بکلیاں ہی بھر گئی تھیں۔

جھٹ پر سے میں نے دلبر خان کو اپنے ساتھیوں سے ذرا دور  
بٹ کر ایک درخت کی طرف بڑھتے دیکھا تھا وہ غالباً سارے میں کھڑا  
ہوا چاہتا تھا۔ اس وقت تک اس نے اپنے ساتھی سے اپنی  
کلا خشک بھی واپس نہیں لی تھی۔ اسے اس کی ضرورت بھی کیا  
تھی؟ اس کے سامنے تو پچھلے، سسے اور شکستہ حال انسانوں کا ایک  
چھوٹا سا ”انبار“ تھا جو اس کے ساتھیوں کے کھیرے میں لٹے جلتے  
کی بھی جراثیم نہیں کر رہے تھے۔ دلبر خان کے ساتھی خواہ خواہ ان  
بے چاروں پر کلا خشک نہیں ٹانے کھڑے تھے۔ بدقول، راکھوں کی  
کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان بے چاروں کے لیے تو دلبر خان  
اور اس کے ساتھیوں کی بدبشت ہی بہت تھی۔

مسل ہو امیں لا تمں چلا رہی تھی کمر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔  
وہ پرانے شکاری تھے۔ مسل جیسی نازک و ناتواں لڑکی کا شکار پھلتا  
اور مل کھانا شاید ان کے لیے زیادہ ٹھیک اندر دوڑنے کا ذریعہ بن رہا  
تھا۔

مسل نے اس وقت صرف ایک لمحے کے لیے منڈیر کی طرف  
دیکھا لیکن اس ایک لمحے میں ’میں اتنی دور سے بھی نہایت آسانی  
سے اس کی آنکھوں میں اس کی سوچ کا پتہ پا چڑھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً  
یہی کتا چلا رہی تھی۔“ دے گئے تھو کا آخر۔ نہیں آئے تھاری  
مدد کے لیے۔ ذر گئے؟ بزدل کیوں کے!“

وہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھی۔ وہ تو نہیں جان سکتی تھی کہ  
ان چند لمحوں میں میرے ذہن میں کیسی آندھیاں چلی رہی تھیں۔ جو  
کچھ میں دیکھ رہا تھا اس نے میرے حواس پر کیسا غلبہ ڈھایا تھا۔ وہ  
نہیں جان سکتی تھی کہ میں نے یہ چند لمحے ضائع نہیں کیے تھے۔ میں  
نے اس مقام کے چپے چپے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ کون سی  
چیز کہاں تھی، کن کن چیزوں کے درمیان کشاکش تھا، کون کہاں  
کھڑا تھا، کسی کی طرف سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی،  
کس صورت حال میں کس طرف سے کیا رد عمل ظاہر ہونے کا امکان  
تھا، ان تمام پہلوؤں کا جائزہ میں نے اچھی طرح لے لیا تھا۔

میں تھا تھا غیر مسل تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اندھاوند  
منہ اٹھا کر جاؤں اور کسی سبک آوارہ کی طرح ان کے ہاتھوں مارا  
جاؤں۔ جان و پی ہی تھی تو اپنے متعدد میں تھوڑی بہت کامیابی  
حاصل کرنے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔ میرے جان دینے سے  
بھی ان مظلوموں کو ظلم سے نجات تو شاید نہیں مل سکتی تھی لیکن  
خاندانوں کو بھی تھوڑا سا احساسِ دلایں ہو جاتا تو یہ بھی میری چھٹی  
مونی کامیابی ہی ہوتی۔

میرے حرکت میں آنے کا لمحہ آچکا تھا۔ کھانڈی ہاتھ میں لیے  
میں تیزی سے گھبرا اور آندھی اور طوفان کی طرح میز میاں اتر کر  
پلک جھپکتے میں دروازے سے نکل کر ایک درخت کی اوٹ میں  
گھس گیا۔

میرے اندر جیسے کوئی اور ہی مدح نامی تھی رگ و پے میں  
بکلیاں ہی بھر گئی تھیں۔  
جھٹ پر سے میں نے دلبر خان کو اپنے ساتھیوں سے ذرا دور  
بٹ کر ایک درخت کی طرف بڑھتے دیکھا تھا وہ غالباً سارے میں کھڑا  
ہوا چاہتا تھا۔ اس وقت تک اس نے اپنے ساتھی سے اپنی  
کلا خشک بھی واپس نہیں لی تھی۔ اسے اس کی ضرورت بھی کیا  
تھی؟ اس کے سامنے تو پچھلے، سسے اور شکستہ حال انسانوں کا ایک  
چھوٹا سا ”انبار“ تھا جو اس کے ساتھیوں کے کھیرے میں لٹے جلتے  
کی بھی جراثیم نہیں کر رہے تھے۔ دلبر خان کے ساتھی خواہ خواہ ان  
بے چاروں پر کلا خشک نہیں ٹانے کھڑے تھے۔ بدقول، راکھوں کی  
کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان بے چاروں کے لیے تو دلبر خان  
اور اس کے ساتھیوں کی بدبشت ہی بہت تھی۔



مجاہد ہی اس جگہ سے اپنے شکار تک کا فاصلہ نظروں ہی نظروں میں باپ چکا تھا۔

میں نے اپنی قاتر توانائی مجتمع کرتے ہوئے اس آتش زدہ بلے کے اور سے اس شخص پر چلا گیا۔ میرے پاؤں زمین پر لگنے سے پہلے کھانڈی کے پھل کا پھٹا آہنی حصہ جھوڑے کی طرح اس کی کھوپڑی پر پڑ چکا تھا۔ غیبت یہ تھا کہ اس کے سر پر پکڑی نہیں تھی۔ اس کے لیے لیے بھورے بال بڑے سلیقے سے بے ہوئے تھے۔ ہانگ اس نے درمیان میں سے نکالی ہوئی تھی۔

میں اس ہانگ کو ہی نشانہ مقرر کرتے ہوئے میں اسی جگہ سے اس کی کھوپڑی کھانڈی سے دو حصوں میں تقسیم بھی کر سکتا تھا لیکن میں غیر ضروری طور پر کسی کو بھی قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی دانت میں تو میں نے اس کی کھوپڑی ذرا سی چٹکا کر ہی اپنا کام نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن ہاتھ اگر اندازے سے ذرا بھاری پڑ گیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس شخص کے زمین پر گرنے سے پہلے میں کھانڈی پیچک کر اس کی کلا شکوفہ میں اس لیے تمام چکا تھا جب وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے فوراً ہی دوسری چھانک مجھے دلبر خان کے عقب میں لے گئی۔

یہ ایک ایسا کام تھا جس کے لیے چھلاوے کی سی پھرتی اور شیر کی سی بے خوفی درکار تھی۔ شخص ایک سیکڑے اندازے کی غلطی کے نتیجے میں میرے پیچھے بھی آؤ سکتے تھے۔ دلبر خان کی گردن میرے ایک بازو کے شائبے میں آگئی۔ دوسرے ہاتھ سے کلا شکوفہ سے لگا سا ہوائی برست مار کر میں نے اس کی ٹال دلبر خان کی بلیوں میں گھسیڑ دی۔

وہ سب دم بخود رہ گئے تھے۔ انہیں یہ اندازہ تو یقیناً ہوا ہو گا کہ ان کے گرتے ہوئے ساتھی کے قریب سے کسی نے دلبر خان کی طرف چھانک لگائی تھی لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ یہ ان کی سمجھ میں نہیں کیا ہو گا۔ اس کے علاوہ انہیں میری آدھا پالنے میں بھی ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی تھی اور وہی ایک لمحہ میرے لیے زندگی یا موت کا فیصلہ کرنے والا لمحہ تھا۔

دلبر خان میری اڑھال بن گیا تھا اور میں اسے گھسیٹتا ہوا مزید دو قدم پیچھے لے گیا تھا۔ میں نے پشت درخت کے تنے کے ساتھ نکالی تھی۔ دینے بھی اس طرف کوئی موجود نہیں تھا۔ عقب سے کوئی مجھ پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔

مول اس وقت آخر کی گرفت میں مغل رہی تھی۔ وہ اسے روکے جب کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مول کے ساتھ کھینچا تانی میں اس کی کلا شکوفہ زمین پر گر چکی تھی۔ کسی نے اسے نہیں اٹھایا تھا۔ مول کا رنگ برنگ ہونا بھی ایک طرف پڑا تھا۔ اس کا پرانا سا سولہا لاس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ غیبت یہ تھا کہ کسی نے غیر مصلحتی طور پر برست نہیں مار دیا تھا ورنہ دلبر خان کا اور میرا

ایک ساتھ ہی کام تمام ہوتا۔

”ٹھکی کو چھوڑ دو۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے ورنہ دلبر خان زندہ نہیں رہے گا۔“ میں نے یہ آواز بلند کیا۔ انہیں میری آواز کے انداز اور میرے لیے کی سفائی سے اندازہ ہو گیا کہ میں چو کچھ کہہ رہا تھا وہ کرگرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ سب اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ آخر نے مول کو چھوڑ دیا۔ ان سب کی حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسے وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی ناقابل یقین خواب دیکھ رہے ہوں۔ مول نے اپنا دوپٹا اٹھا کر اپنے جگہ جگہ سے پھینے ہوئے لباس پر ساری کے انداز میں لپیٹ لیا۔

دلبر خان میری گرفت میں ساکت تھا۔ ایک تو اس کی گردن پر بازو کا کھینچہ بہت سخت تھا۔ اس گرفت میں جو بھی آتا تھا اگر اس میں تھوڑی بہت عقل موجود ہوتی اور اسے لڑائی بھڑائی کا کچھ تجربہ ہوتا تو اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اگر اس نے ذرا بھی غلط انداز میں زور آزمائی کی تو اس کی گردن ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی بلیوں پر بہت سختی سے کلا شکوفہ کی ٹال جمی ہوئی تھی جس کا دست میرے پھلو میں دبا ہوا تھا۔

تاہم درخت سے پشت نکالنے کی وجہ سے ایک تو مجھے اس طرف سے کچھ تحفظ کا احساس میسر آ گیا تھا گو کہ اس طرف کوئی موجود نہیں تھا لیکن وہ پگڈنڈی اسی طرف تھی جس کے راستے وہ لوگ آئے تھے۔ دوسرے درخت کی وجہ سے مجھے کلا شکوفہ اور دلبر خان دونوں کو بیک وقت قابو میں رکھنے میں مدد بھی مل رہی تھی۔ دلبر خان کوئی مرل یا معمولی آدمی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا اسے ذرا بھی موقع ملا تو وہ پھرے ہوئے درندے کی طرح حرکت میں آئے گا۔ فی الحال تو اسے سانس بھی مشکل سے آ رہا تھا۔

”کلا شکوفہ بھی پیچک دو۔“ میں نے دوسرا حکم دیا۔ کسی نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی۔ صورت حال صحیح طور پر اب ان کی سمجھ میں آئی تھی اور اب وہ کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ ان میں سے ہر ایک یقیناً یہ سوچ رہا تھا کہ جس پوزیشن میں وہ کھڑا ہے کیا وہاں سے وہ کچھ کر سکتا ہے؟ میں چاہتا تھا کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے وہ نہیں پیچک دیں۔

اچانک مول نے آگے بڑھ کر آچر کی گری ہوئی کلا شکوفہ اٹھائی اور اسے چاروں طرف گھما رہے ہوئے مجھ کو انداز میں چبکی۔ ”میں ان سب کو مار دوں گی۔ ذیل... کیسے... کئے... انہوں نے ہماری زندگی حرام کر دی ہے۔“

تب ان سب نے قطعی غیر متوقع طور پر کلا شکوفہ بھی پیچک دیں اور ہاتھ اٹھا دیے۔ مول کے مجھ کو اندازے انہیں خونخوار کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اس سے پہلے مول نے بھی کوئی ہتھیار استعمال کیا تھا یا نہیں لیکن اس وقت کی معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے سامنے توپ بھی ہوتی تو وہ اسے چلا سکتی تھی۔ اس کی ٹال بلی سائوٹی اور نازک سی لڑکی کے اندر ان گنت طوفان متحیر معلوم

ہوتے تھے۔ نہ جانے کتنی صدیوں کا غصہ اس کے اندر جمع تھا۔  
 ”لڑکی! کوئی نہ چلا۔“ میں چلا اٹھا۔ میرے خیال میں نیں الحال  
 اس کی ضرورت نہیں تھی۔

”لڑکی! کوئی نہ چلا۔“ مول نے نہایت برہمی کے عالم میں  
 میری نقل اتاری۔ ”اگر تم انہیں کوئی نہیں مارو گے تو کیا ان کا  
 اچار ڈالو گے؟ تمہارا خیال ہے کہ تم انہیں چھوڑ دو گے تو یہ بھی  
 تمہیں چھوڑ دیں گے؟“

مول ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ گھٹیا ذہنیت رکھنے والے لوگ  
 تھے اور مجھے بھی کافی حد تک یقین تھا کہ وہ کہنے دشمن ثابت ہوں  
 گے۔ ان کی نفرت سانپ کی طرح ہوگی۔ اگر میں ان پر احسان  
 کروں گا تب بھی وہ مجھے زندہ ہی ماریں گے۔ وہ جب اپنی پناہ اور  
 اپنی امان میں رہنے والے لوگوں پر اتنا ظلم کرتے تھے تو مجھ جیسے  
 انہیں کو کہاں بخش سکتے تھے؟ جب کہ انہیں نے ان کے حضور میں  
 زبردست گستاخیاں بھی کی تھیں۔ ان کے کارندوں کو مارا تھا اور  
 اب ان کے سرخیل کو ان سب کے سامنے بے بس کیا تھا۔

ان کی پناہ اور امان میں رہنے والے وہ لوگ جن کی حفاظت  
 ان پر فرض تھی، جو بہت کمزور اور سادہ لوح تھے، جو ہر وقت ان کے  
 سامنے ہاتھ باندھے رہتے تھے، اب ان پر ان کے ظلم کا یہ عالم تھا تو  
 مجھے بھلا وہ کیوں کر معاف کر سکتے تھے؟

لیکن میں مجرے سے مجرے آدمی کو بھی ایک سوتیلے دینے کا  
 قائل تھا کہ اس میں کبھی کبھی مجھے نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا لیکن  
 اچھے نتائج کی امید میں اکثر ایسا کرتا تھا۔

کلا شکوف مول کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا  
 اس پر دوا لگی کی سی جو کیفیت طاری تھی وہ زیادہ دیر برقرار نہیں  
 رہے گی اور وہ ایک بار پھر وہی نرم دوا باز اور کمزور سی لڑکی ہوگی  
 جو کچھ دیر پہلے دلیر خان اور آچر کی گرفت میں فاختہ کی طرح پھنک رہی  
 تھی۔ میں چاہتا تھا اپنا جنون ٹھنڈا کرنے سے پہلے وہ ایک اہم کام تو  
 کر دے۔

”ہاں۔“ میں نے بے آواز بلند کہا۔ ”میں ان کے ساتھ  
 اچھائی کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ اس کے جواب میں  
 میرے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ تم صرف اتنا کر دو کہ دو تین چکروں میں  
 یہ سب کلا شکوف میں اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ آؤ۔ جلدی کرو۔“  
 ساتھ ہی میں نے ایک بار پھر ان لوگوں کو خبردار کیا۔ ”تم میں سے  
 کوئی بھی چلا لک دیکھانے کی کوشش نہ کرے ورنہ دلیر خان زندہ  
 نہیں بچے گا۔“

ان سب کی خوشخوار نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مول نے  
 بادل خواتم میری ہدایت پر عمل شروع کر دیا۔ میں نے دیکھ کر آواز  
 دے کر کہا۔ ”تم بھی مول کی مدد کرو۔ یہ کلا شکوف میں اٹھا کر جلدی  
 سے گھر میں پہنچا دو۔“  
 وہ دور ہی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر چڑھے سے انداز میں بولا۔

”نہ بابا! مجھے تو معاف ہی رکھو۔ میں مالکوں کے خلاف کسی کام میں  
 جسے دارنشا نہیں چاہتا۔ جو تمہارا دل چاہے کہ پھر خود ہی بھگتو  
 میں اس بھگتے سے بالکل الگ ہوں۔“

پھر اس نے دانت پیس کر ہاتھ بچاتے ہوئے مول کی طرز  
 اشارہ کیا۔ ”اس کمبختی کو بھی آج کچھ زیادہ سی جوش چڑھ رہا ہے  
 اور۔۔۔ چری! میں کہتا ہوں تو مالکوں کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤ  
 جس خود جا کر گھر میں بیٹھ جا۔ تجھے کس نے باہر آنے کے لیے کہا تھا؟  
 تیرے باہر آنے سے تو مصیبت اور بڑھ رہی ہے۔“

شاید یہ عمر کا اثر تھا۔ دیر غلامی کا رنگ گمراہ تھا اور مول  
 حرارت کہ مول خواہ لڑکی تھی لیکن کم عمر تھی۔ اس کے دل میں  
 غلامی کے بچے زیادہ گرمے نہیں کڑے تھے اور اس کے دل میں  
 بغاوت کی حرارت بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس نے دیکھ کر طرف کی  
 توجہ نہ دی اور ہنسی کا شکوہ میں اٹھا اس کی اٹھا کر گھر کی طرف دوڑ لی  
 چلی گئی تاہم دیکھ کر بات سن کر میں نے دلیر خان کے آدمیوں کے  
 ہونٹوں پر خفیت سی مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔

وہ طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گویا خاموشی کی  
 زبان میں کہہ رہے تھے۔ ”دیکھ لے تم نے ہماری دہشت؟ تم ہمارے  
 گلے سے بچ کر نہیں جاسکو گے۔“

مول نے انتہائی ہمت اور پختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذرا  
 دیر میں دو چکروں میں نوکلا شکوف میں گھر میں پہنچا دیں۔ دوسویں میرا  
 ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ دوسرے چکر  
 بعد گھر میں ہی رہے، ”اپس نہ آئے لیکن لگتا تھا کہ آج وہ کسی کام کی  
 کشمکش کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ آندھ کی طرح تھی اور طوفان  
 کی طرح پھردا رہی تھی۔“

”میں نے تم سے کہا تھا گھر میں رہنا۔“ میں پوچھا۔  
 ”میں اپنے بابا کو لینے آئی ہوں۔“ وہ دیکھ کر قریب کچھ  
 اسے سارا دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

لیکن دیکھنے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”میں تیرا بابا نہیں بولا  
 بیٹیاں وہ بولی ہیں جو باپوں کا کہنا مانتی ہیں، انہیں کا نہیں۔“  
 مالکوں کے سامنے سر نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں ادا کیا  
 ہے گا۔ ”وہ ایک بار پھر رونے لگا۔“

مول اسے پل سنبھالنے بچھانے اور پھنکارنے لگی جیسے  
 بزرگ ہو اور دیکھتے لیکن دیکھان کر میں دے رہا تھا۔ دلیر خان  
 خود خاصی سعادت مندی سے میری گرفت میں تڑپا کھڑا تھا  
 کسمپاسا تک نہیں تھا۔

مول کے وہاں سے جانے کے بعد میرا ارادہ دلیر خان کو چھوڑ  
 دینے کا تھا۔ میرا سب سے بڑا مقصد ان لوگوں کو غیر مسلح کرنا  
 غیر مسلح لوگ اگر تعداد میں زیادہ بھی ہوتے تھے تو مجھے ان کی  
 زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی، خواہ میں خالی ہاتھ بھی ہوتا جب کہ  
 الحال تو میرے پاس کلا شکوف موجود تھی جو میرے زیادہ ہاتھ بٹاتا

نکل گئی تھی اور اسے گردن ٹوٹنے کا خطرہ بھی لاحق نہیں رہا تھا۔

وہ اس موقع سے ناکوڑا اٹھانے میں بچو کا نہیں۔ اس نے پوری قوت سے میری ہڈیوں میں کئی رسید کی اور تڑپ کر میرے بازو کے نیچے سے نکل گیا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ شاید میری کھوپڑی بری طرح چٹختی ہوئی کیوں کہ درخت کے عقب میں جو نامعلوم شخص نہ جانے کہاں سے پہنچا تھا، اس نے کلا شکوف ٹال سے ہی پکڑے پکڑے ہتھوڑے کی طرح اس کا دست میری کھوپڑی پر رسید کرنا چاہا تھا لیکن دلبر خان کی زور آزمائی کی وجہ سے میری کھوپڑی وہاں سے ہٹ چکی تھی اور دست ٹھک کی زوردار آواز کے ساتھ نٹے سے نکرایا تھا۔

دلبر خان نے فوراً مجھ پر کوئی حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تیزی سے مجھ سے دور ہو گیا۔ میں تیزی سے اس شخص کی طرف گھوما جس کی وجہ سے مل بھر میں اپنا پلٹ گیا تھا لیکن اس پر حملہ کرنے کے بجائے مجھے رک جانا پڑا کیوں کہ اس کے ہاتھ میں موجود کلا شکوف کا رخ میری طرف ہو چکا تھا۔

وہ ایک عجیب و غریب ڈراؤنی سی شخصیت تھی۔ اس قسم کی شخصیتوں کو عام طور پر ہلکے ہاں ٹکڑوں میں جن کا کردار دیا جاتا ہے۔ میک اپ وغیرہ سے انہیں مزید ہیک بھایا جاتا ہے اور کبیرا رُک سے انہیں ان کی اصلی جسامت سے بڑا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تاہم وہ شخص اپنی اصلی جسامت میں بھی چھوٹا سا ناخن ہی تھا۔ قد تو اس کا تقریباً میرے برابر ہی تھا لیکن چوڑائی میں وہ مجھ سے تقریباً دو ڈھائی گنا پھیلا ہوا تھا اور اس کی توند کسی گنبد سے کم نہیں تھی۔ قتل تحمل کرتا یہ گنبد یا جلی کا چھوٹا سا پاڑا اس وقت بھی دھیرے دھیرے حرکت رہا تھا۔

وہ شخص جو شلوار پہنے ہوئے تھا اس میں یقیناً ایک خیمے جتنا کپڑا صرف ہوا ہوگا۔ جسم کے بالائی حصے پر صرف واسٹ تھی جس کے نیچے کیلے تھے۔ اسی لیے اس کی گنبد نما توند کا نظارہ بار کاوت کیا جاسکتا تھا۔ گلے میں دو تھن بڑے بڑے تعویذ بھول رہے تھے۔ اس کی کھوپڑی پر بالوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ گلابی چندرا دھوپ میں آنکھیں کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کی رنگت سرخ و سپید تھی مگر مجموعی طور پر وہ ایک بد صورت شخص تھا۔

اس کے ہونٹ موٹے موٹے تھے اور رخساروں پر اس قدر گوشت تھا کہ آنکھیں تقریباً چھپ کر رہ گئی تھیں۔ بھوئیں برائے نام تھیں۔ داڑھی سو گھنٹیں بھی صاف تھیں۔ عجیب چھٹا چھٹا سا چہرہ تھا۔ وہ گندمی انسانوں اور پُرکشش نقوش والے چہروں کی سرزمین سندھ کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ تبت کے پہاڑوں سے اترے ہوئے کسی لاما سے ملتی جلتی قسم کی چیز نظر آ رہا تھا۔ تاک بھی چینی تھی لیکن اس جسامت اور تن و توش کا کوئی جینی باشندہ میں نے کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بازو شہرے والے سے کم

بلے بغیر بھی سب کو قابو میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔ دلبر خان کو چھوڑنے کے بعد میرا ان لوگوں سے بات چیت کا ارادہ تھا۔ مجھے کامیابی کی امید تو نہیں تھی پھر بھی میں تجزیہ کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کی خرافت کی زبان اثر کرتی تھی یا نہیں۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آ سکی۔ مجھے اپنی فاضی دکھانے اور اپنے تہات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ موٹل اس وقت دیکھو سے اُڑ چکا کہ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی پشت میری طرف تھی کہ اچانک ہی ایک جھٹکے سے کلا شکوف میرے ہاتھ سے نکل گئی اور اس جھٹکے کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے میرا توازن بھی خراب ہو گیا۔

جس داؤ سے میں نے دلبر خان کی گردن دبوچی ہوئی تھی اس میں توازن ہی کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ گرفت میں دبوے ہوئے شخص کی گردن ایک خاص زاویے پر ہونی چاہیے۔ یہ ضرورت پڑنے پر ایک خاص انداز میں جھٹکا دے کر اسے توازن پر رکھنا تھا۔ توازن بگڑ جانے کے بعد گردن گرفت میں تو رہ سکتی تھی اور آلات استعمال کرتے ہوئے دشمن کو قابو میں بھی رکھا جاسکتا تھا لیکن پھر ضروری نہیں تھا کہ میں گردن توڑ بھی سکتا۔ اگر حریف لا تقویٰ ہوتا تو اپنے آپ کو زانو کرانے کے لیے جدوجہد بھی کر سکتا تھا لیکن گردن اگر خاص زاویے سے گرفت میں رہتی تھی تو وہ مل بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے خود بھی احساس ہو جاتا تھا کہ اگر اس نے زیادہ ہلے بھلے کی کوشش کی تو اس کی گردن ٹوٹ جائے گی۔

میرے ہاتھ سے بیک وقت دو چیزیں نکل گئی تھیں۔ ایک تو بلی خاص توازن جس کی وجہ سے دلبر خان تازک پوزیشن میں تھا اور دلی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے کلا شکوف جو صرف دلبر خان کوئی نہیں ان سب کو سیزہ مار کھنے کے لیے ضروری تھا۔

میں نے اپنے عقب کی طرف سے مطمئن رہ کر غلطی کی تھی۔ لی بروقت نہیں دیکھ سکا۔ پیچھے سے ہی کوئی ہاتھ آیا تھا اور میرے ہاتھ سے کلا شکوف ایک جھٹکے سے نکل کر لے گیا تھا۔ میں اس تھک کی طرف ایک جھٹکے ہی دیکھ سکا اور وہ بھی ایک ثانیے کی تاخیر کے ساتھ۔ اس ہاتھ نے کلا شکوف کی مختصر سی ٹال کو گرفت میں لیا نا اور اسے ہٹا کر ہی تیزی سے پیچھے کی طرف گھمایا تھا، اسی لیے دیکھ آسانی سے میری گرفت سے نکل گئی تھی اور زبردست جانے کا خطرہ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک چوڑا چٹکا ہاتھ تھا جس کی میں نے جھٹک دیکھی تھی اور اس کے کام کے اس مختصرے نمونے ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ کسی اناڑی کا ہاتھ نہیں تھا۔

میں نے ہاتھ کی تیزی سے دلبر خان کو گھماتے ہوئے بدستور اپنے سامنے ڈھال بنائے رکھوں تاکہ کلا شکوف چھیننے والوں کو اس کا کوئی غامض ناکوڑا نہ پہنچ سکے لیکن توازن خراب ہونے کی وجہ سے ایک تو دلبر خان پر میری گرفت پہلے جیسی نہ رہی۔ دوسرے دلبر خان کو فوری طور پر احساس ہو گیا کہ کلا شکوف میرے ہاتھ سے

نہیں تھے۔ کلا شکوف اس کے ہاتھوں میں کھلوتا معلوم ہو رہی تھی۔

پس منظر میں خاصی دور مجھے ایک گھوڑا گھاس چرتا نظر آیا۔ جب میں دنگ کے مکان کی چھت پر تھا تو مجھے آس پاس کہیں کوئی گھوڑا نظر نہیں آیا تھا۔ اس طرف زمین بھی کچی اور نرم تھی۔ موصول آؤ رہی تھی۔ شاید وہ دبو زاد کچھ دور تک گھوڑے پر آیا تھا اور باقی فاصلہ اس نے پیدل طے کیا تھا۔

دو باتیں میرے لیے خاصی حیرت کا باعث تھیں۔ ایک تو اس گھوڑے کا مبرد استقامت اور مضبوطی جو اس دیو زاد کو پشت پر اٹھا کر لایا تھا۔ دوسرے اس دیو زاد کی چالاکی اور مشاطہ قاتل داو تھی جو کچھ فاصلہ گھوڑے پر اور کچھ پیدل طے کر کے میرے عقب میں آئے پچھا تھا اور مجھے بتائیں چل رہا تھا۔

ایک لمحے میں میں نے یہ سب کچھ سوچا، سب کچھ دیکھا اور دوسرے ہی لمحے دلبر خان کے آوی فاختانہ غرے بلند کرتے چاروں طرف سے میری طرف بڑھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ غالی ہاتھوں سے ہی میری تنکا بونی کر ڈالیں گے۔ میں اس یلغار کے لیے تیار تھا۔ نئے لوگوں کے حملے سے میں زیادہ خوفزدہ نہیں تھا۔ غیبت یہ تھا کہ اس قتل قتل کرتے دیو زاد نے کلا شکوف کا ٹیکر نہیں دیا تھا۔

شکل صورت سے نہ جانے کیوں وہ اتنی طور پر مجھے کچھ ہراساں سا دکھائی دیا تھا لیکن اس نے کم از کم اتنی عکسندی ضرور دکھائی تھی کہ اندھا گھنڈ کلا شکوف نہیں چلائی تھی۔ اسے غالباً احساس تھا کہ اندھا گھنڈ مجھ پر برست مارنے کی صورت میں دلبر خان یا اس کے آوی بھی گولیوں کی زد میں آسکتے تھے۔

دیے مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اس شخص کی محض شکل دیکھ کر مجھے اس کی ذہنی حالت کے بارے میں زیادہ خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ ایسے نظر آنے والے لوگ بعض اوقات ہلا کے مکار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی آمد کا انداز اس بات کی دلیل تھا۔

میں اپنی پوری قوت کو جمع کیے ان لوگوں کے زرخے سے نکل جانے کے لیے تیار تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو سکوں گا یا نہیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ دلبر خان نے چیخ کر اور دونوں ہاتھ بلند کر کے اپنے آویوں کو مجھ پر حملہ آور ہونے سے روک دیا۔

دو روک تو مجھے لیکن انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے بیٹھنوں کے سامنے سے اچانک ان کا شکار ہونا لیا گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے گویا سارا منظر ساکت ہو گیا۔ ہر ایک جہاں تھا وہیں گھڑا گیا۔ میرے اعصاب دامن کے تاروں کی طرح جتنے ہوئے تھے میں اب بھی شہر تھا کہ کوئی مجھ پر حملہ آور ہو تو میں کچھ کروں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دلبر خان کے ایک اشارے اور حکم نے گویا مجھے ہونے

اس وقت صرف میں ہی نہیں، موئل بھی ان لوگوں کے زرخے میں تھی اور اسے بھی صورت حال کی غشی کا احساس ہو چکا تو اس کی تندی و تیزی جیسے یکدم ہی ہوا ہو گئی تھی۔ شاید وہ اس کے لوگوں میں سے تھی، جن پر جذبات آندھی طوفان کی طرح آور ہوئے ہیں اور جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کی پہلی آنکھیں پتا رہی تھیں کہ اس طرح اچانک پائنا پلٹ جانے پر سخت خوفزدہ تھی اور شاید فرار کے لیے رات تلاش کر رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ جس میں منظر ساکت ہو کر رہ گیا تھا، مجھے بے طویل محسوس ہوا۔ پھر جو بھی دلبر خان کے اوپر اٹھے ہوئے باڈر آئے گویا سکوت یک دم ہی ٹوٹ گیا۔ دلبر خان مسکراتا ہوا انداز ڈرامائی انداز میں میری طرف بڑھا۔ تب اچانک ہی ایک غیا میرے ذہن میں ابھرا۔

شاید دلبر خان نے اس لیے اپنے آویوں کو میری نگاہ کرنے کا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ خود مجھ پر "طبع آزمائی" کرنا تھا۔ اسے چند لمحے کے لیے جو زلت سی اٹھنا پڑی تھی اس جواب میں شاید وہ خود میری ڈرگرت بنانا اور اس کام سے لا اندوز ہونا چاہتا تھا۔ وہ اس لذت میں کسی اور کو شریک کرنا چاہتا تھا۔

میرے لیے اس کا یہ ارادہ زیادہ پریشانی کے بجائے اطمینان کا باعث تھا۔ اس قسم کی صورت حال سے مجھے کو واسطہ نہ چکا تھا کہ کسی وحشی ٹولے کا سردار اپنے ذمہ میں ساتھیوں کو پیچھے بنا کر مجھے "سبق سکھانے" کے ارادے سے آگیا۔ مجھے اس کو قابو میں کرنے کا کوئی نہ کوئی موقع ہی با آویوں صورت حال میرے حق میں پلٹ جاتی تھی۔

مجھے کچھ امید ہی نظر آئی کہ شاید دلبر خان اپنی کسی عائدہ وجہ سے ایک بار پھر میرے قابو میں آجائے اور میں اسے ذرا لوں لیکن اب اس کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور زوا کی آمد نے اب صورت حال بالکل بدل دی تھی جس کے میں کلا شکوف تھی۔ اب میں ہر طرف سے گھرا ہوا تھا۔ کلا ساؤ غالی نہیں تھی۔ اس صورت میں میرا دلبر خان کو دھالنا کا حربہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اگر اسے ڈھال بنا کر مجھ کے سامنے کرنا تو پیچھے سے دلبر کے باقی آویوں میں سے کوئی گھو شکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ بھی کر سکتا تھا اور اگر نہ رخ ان لوگوں کی طرف رکھتا تو دیو زاد اپنی کلا شکوف سے کلا کام دھک سکتا تھا۔

اس کے باوجود میں کچھ نہ کچھ کمزورنے کے ارادے مستعد رہا لیکن اجماعی ہوا کہ میں نے دلبر خان پر ہاتھ چھوڑنا زیادہ پھرتی نہیں دکھائی اور پہلے یہ دیکھنے کا خطرہ رہا کہ وہ کیا

دلبر خان نے قریب آکر مجھے تھپڑ کھونسا یا لات رسید کر

دروندوں کی یلغار کو روک دیا تھا۔

بھی جس کی آنکھوں میں امید کی کرن نہیں ابھری تھی۔ ”یہ بے چارہ ننگ دل انسان۔ ایک جوان لڑکی کا باپ۔“ پھر میں نے مولیٰ کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک دم بخود کھڑی تھی۔ ”یہ جذباتی اور سادہ لوح سی لڑکی۔ یہ سب لوگ بھی تمہاری پناہ اور ایمان میں تھے۔ یہ سب کمزور اور تمہارے قربان برادر بھی تھے۔ ان کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا؟ اس کے بعد بھی کیا میں اپنی لیے کسی اچھے سلوک کی امید رکھ سکتا ہوں!“

دلبر خان کے تاثرات ایک لمحے کے لیے تھیل ہوئے۔ اس کے چہرے پر دی خست گیری اور سفاکی داہیں آنے لگی جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ معلوم ہوتی لیکن پھر اس نے گویا اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس کے انداز میں یکدم برا ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہم اس علاقے کے حاکم ہیں اور حکمرانی کے ہمارے اپنے کچھ طور طریقے ہیں۔ ہم اس زمین کو۔۔۔ اور اس زمین پر رہنے والوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تم یقیناً یہاں اجنبی ہو۔ میں نے نہیں پوچھوں گا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے ہو لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تم ان معاملات میں دخل نہ دو۔ جب تک ضرورت محسوس کرو ہماری سیزانی کا لطف اٹھاؤ اور پھر اپنی جان سلامت لے کر اپنا راستہ پکڑ لو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ خدائی فوجدار بننے کی کوشش مت کرو۔ آج کے زمانے میں خدائی فوجداروں کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔“

”درست کہا تم نے۔“ میں نے بھی ملاٹھ سے کہا۔ ”لیکن خدائی فوجداری کے جراثیم خود بخود خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دودھ یا زانہ نہیں دیکھتے۔ ویسے بھی۔۔۔ ہو سکتا ہے جو تمہاری نظر میں خدائی فوجدار ہو وہ دراصل اسن، انصاف اور سب انسانوں کے لیے عزت و آبرو کا کوئی ادنیٰ سا خطرہ کار ہو۔“

دلبر خان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی انداز میں منہ کی طرف چلا گیا۔ نہایت انتہائی سے منہ کھول دیتے ہوئے وہ پر خیال اور کمری نظروں سے گویا از سر نو میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”بڑے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ شر سے تو نہیں بھاگے ہو؟ کوئی مغزور لیڈر تو نہیں ہو؟“

”نہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور صرف اپنے لیے نہیں، سب کے لیے اسن، محبت، انصاف اور سکون کی تلاش میں ہوں۔“ میں نے پلٹیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”خیرو۔۔۔ وہ بدستور منہ کھول دیتے ہوئے کمری سانس لے کر بولا۔ ”ہم جب معلوم کرنا چاہیں گے کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو تو کسی نہ کسی طرح معلوم کر ہی لیں گے۔ فی الحال تمہاری دلدادگی کے لیے ہم ان لوگوں سے کچھ محبت کا سلوک کر دیتے ہیں۔“ اس نے دبو اور دوسرے دوکانداروں و دیوگی کی طرف اشارہ کیا۔ ”سب ہمارے ایسے ہی لوگ ہیں۔ ان کے

کوشش نہیں کی بلکہ کچھ یوں میرا جائزہ لینے لگا جیسے کسی میکینک کے سامنے کوئی نئی قسم کی مشین آگئی ہو اور وہ اس کی ساخت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میرا گریبان کھلا ہی نہیں بلکہ اب تو کچھ پھٹا ہوا بھی تھا اور میں غلغلہ حالی کا ایک خاصا قابل رحم سامنہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی حالت پر ذرا شرم بھی محسوس ہوئی لیکن پھر میری حیرت بڑھتی چلی گئی۔ دلبر خان کی آنکھوں میں میرے لیے سائنس و تحقیق کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ میری شکلہ حالی اور بے بسی پر ہنسنے کے بجائے مجھ سے بے پناہ مرحوب اور متاثر نظر آ رہا تھا۔

پھر اس نے ایک اور عجیب کام شروع کر دیا۔ اس نے میرے بازوؤں کو ٹٹولا، ان کے مصلزہا کر اور دونوں ہاتھوں سے گویا ان کی پائش کر کے دیکھی، میرے سینے پر یوں ہولے ہولے گھونے مار کر دیکھے گویا کسی دیوار کی مضبوطی کا اندازہ کر رہا ہو۔ کئی لمحے تک اس نے کچھ اسی طرح مجھے ٹٹولا اور پرکھا جیسے قصائی قربانی کے لیے کسی عمو جانور کا جائزہ لے رہا ہو۔

بالآخر اس کا معائنہ مکمل ہو گیا اور وہ میرے سینے پر ہاتھ اڑتے ہوئے بولا۔ ”دوست! تم واقعی شیر جوان ہو۔ نہیں جب موقع میسر تھا تو تم نے ہم پر کوئی نہیں چلائی، ہمیں قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ اچھائی کرنا چاہتے ہو اور دیکھنا چاہتے ہو کہ ہم اس کے جواب میں کیا کرتے ہیں۔“

میں کہنا چاہتا تھا۔ ”ہاں۔ میں نے کہا تو تھا لیکن مجھے جواب میں تم سے اچھائی کی کوئی توقع نہیں تھی۔ بس ایک نہایت ہی سادہ دلی امید تھی۔ شاید وہ خود فریبی ہی کی کوئی صورت تھی۔“

لیکن میں نے زبان سے یہ بات نہیں کہی اور خاموش ہی رہا۔ اس کی تمام حرکات و سکنات پر میری نظر تھی۔ مجھے اب بھی اندیشہ تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اچانک اور غیر متوقع طور پر مجھ پر کوئی خطرناک وار کر سکتا تھا۔

مکروہات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم اس کے جواب میں یہ کر رہے ہیں کہ تمہیں اننگلی بھی نہیں لگاؤں گے۔ تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا اس کے لیے ہم نے تمہیں معاف کیا۔ اب تم ہمارے سنبھالو۔ اس لمحے اور اس گھڑی سے تم ہماری پناہ میں ہو، ہماری امان میں ہو۔“

میں نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو بری طرح مار کھا کر زمین پر پڑے تھے۔ ابھی تک انہوں نے زمین سے اٹھنے کی جرأت نہیں کی تھی اور اب خوفزدہ نظروں سے حالات کی اس نئی صورت کا جائزہ لے رہے تھے۔

”یہ شریف لوگ۔۔۔“ میں نے ملاٹھ سے کہا پھر دبو کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک بیٹھ رہا تھا اور حالات کو پٹا کھاتے دکھ کر

ساتھ کبھی بیماری نری، کبھی بختی، کبھی گرمی چلتی ہی رہتی ہے۔ ہم سب کو میس رہتا ہے اور ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

دلبر خان کم از کم لب و لہجے سے اب ایک قطعی بدلتا ہوا انسان معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو تیزی سے ہدایات دیں۔ وہ ان ہدایات پر کچھ خوش نظر نہیں آئے ان کے چروں پر ہلکی سی ناگواری تھی تاہم انہوں نے ان پر عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے زمین پر بڑے ڈکانداروں کو ایک ایک کر کے اٹھایا، ان کے کپڑے جھاڑے اور محضرت خواہانہ انداز میں سارا دے کر کچھ درپردہ پنہوں اور چارپائیوں پر بٹھادیا۔

انہوں نے دینو کے چہرے سے رستا ہوا خون بھی ایک کپڑے سے صاف کیا۔ اس کی کمر چھپتائی، ہاتھ پاؤں سلائے۔ وہ بے چارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کی دلجوئی محبت علی کر رہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے بے رحمی سے اس کی دھناتی کی تھی اور پھر میرے ٹانگ اڑانے پر ہی اس کی جان بچی تھی۔

میں نے ان لوگوں نے دینو اور دیگر ڈکانداروں سے چھپے ہوئے پیسے بھی نکال کر، ان سے پوچھ پوچھ کر کہہ کہ اس کی کتنی رقم تھی، واپس کرنے شروع کر دیے۔ وہ بے چارے کانپتے ہاتھوں سے اپنے پیسے واپس لے رہے تھے۔

مول کو بھی آچرے ہی نہ صرف شفقانہ انداز میں چمکی دے کر گھر جانے کی ہدایت کی بلکہ ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی بھی مانگی۔ مول گرتی پڑتی گھر کی طرف چل دی۔ ان کا طرز عمل بلاشبہ حیرت انگیز تھا۔ دلبر خان نے انہیں یہ احکامات اس وقت دیے تھے جب وہ میرے قابو میں نہیں بلکہ میں اس کے قابو میں تھا اور وہ مجھ سے جو سلوک چاہتا کر سکتا تھا کم از کم کو مشل تو کر سکتا تھا۔

میں نے دینو کے سہار شدہ چھپرہ ستوران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس غریب کا ہونٹ بھی توتا ہوا ہے۔ بیچے دب کر ساری چیزیں بھی خراب ہو گئیں۔“

میرا خیال تھا کہ اس کے جواب میں دلبر خان کے کا۔ ”یارا! اب اتنا بھی پھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ جو کچھ میں نے کر دیا ہے وہی کیا کم ہے؟“

میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ چلو موٹے سے ٹانگہ اٹھاتے ہوئے بات کرنے میں کیا حرج ہے لیکن اس وقت مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب دلبر خان نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بے پردائی سے کہا۔ ”اڑے۔۔۔ یہ بھی غوا دس گے یا یہ کون سا تاج محل تھا۔“

”میرے لیے تو تاج محل ہی تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی چار دیواری اٹھائی تھی۔“ میں نے اپنے کندھے سے اور مشی میں تنہرے ہوئے ہاتھ پھیلا کر ان کا بازو لیتے ہوئے کہا۔

وہ دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام کر گویا اس کی مضبوطی کا اندازہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ہاتھ انہیں اور گارا دھونے کے لیے نہیں ہیں۔ ان سے کوئی برا کام لینا نیکو۔ بڑے لوگوں سے دوستی کرو۔ ان ہاتھوں کے صرف اشارے سے بڑے بڑے ہونٹ تھیر جاسکتے ہیں۔“

اسے نہیں معلوم تھا کہ ان ہاتھوں نے کیا کیا کام کیے تھے اور ان کے اشارے پر واقعی ایک نائیو انسان ہونٹ تھیر ہو چکا تھا۔ ہر ہاتھ اس نے تھا ہوا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے دستوں سے کتنی دولت ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی نا انہی میں بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ وہ جسے بڑے آدمیوں سے دوستی کا سبق سکھا رہا تھا، بہت سے بڑے آدمی اس سے دوستی رکھنے کے کتنے خواہش مند تھے، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے محسوس کیا کہ میں اس صورت حال اور دلبر خان کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلانے ہوئے کہا۔ ”کیا واقعی...؟“

پھر میں نے اپنے چہرے پر ایسی طاری کر لی اور کہا۔ ”غیروں کی بڑے آدمیوں سے دوستی کہاں ہو سکتی ہے!“

وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”ہم کر انہیں گے بڑے آدمیوں سے تمہاری دوستی۔ ہم خود یہاں بہت بڑے آدمی ہیں۔ سائیں مراد! بعد ہم ہی یہاں کے حاکم ہیں۔ بہت دلدور تک اپنا حکم چلاتے اور اثر رسوخ ہے۔ ہم کہیں سائیں مراد سے بھی ملوانہیں گے شرط بس یہی ہے کہ تم ہمیں اپنا دوست سمجھو اور خود کو بھی ہمارا دوست ثابت کرو۔“

شبہ تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن اس لمحے اندازہ ہو گیا کہ وہ گویا جال بچھا رہا تھا، میرے لیے دانہ پیچک رہا تھا مگر یہ اندازہ کرنا ادا الحال میرے لیے مشکل تھا کہ وہ جال کس قسم کا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھے محض طاقتور اور لڑائی بھرائی میں ایک امیر شخص سمجھا اپنے مکرگوں میں شامل کر لینا چاہتا ہو۔ اسے یہ اندازہ تو مجھے ہونا ہو گا کہ میں اس کے لیے بہت کارآمد آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے شائع کرنے کی نسبت اپنا اثاثہ بنانے میں زیادہ فائدہ تھا۔

”اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھنے کے لیے تیار ہو تو مجھے اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“ میں نے اپنے لیے میں سعادت مندی کی جھلک پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو تم سے... کیا کسی سے بھی دشمنی مول لینے کا کوئی شوق نہیں مجھ میں بس یہ بڑی خرابی ہے کہ میں کمزور پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

”یہ تو بڑی اچھی عادت ہے۔“ دلبر خان نے سر ہلایا۔ ”ٹانگ صرف وہاں اڑانی چاہیے جہاں انسان لوگوں سے اور مال سے واقف ہو۔ بعض جگہ لوگ بھار بھر کے کمزور اور محظوم ہیں۔“

طرف ہی رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی ٹخن جھکی  
آنکھیں بست کم جھپکاتا تھا۔ اب تک میں نے اسے بولتے نہیں سنا  
تھا۔ وہ خاموشی کے معاملے میں اتنا ثابت قدم تھا کہ مجھے اس پر  
گوں کا ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا۔

دلبر خان نے پہلے مجھے بٹھایا پھر خود بیٹھا۔ اس کا اشارہ پا کر  
اس کے آوی بھی ارد گرد کی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ دیو زاد بین  
میرے سامنے تقریباً پانچ فٹ کے فاصلے پر بچھ پر کلا شکوفہ مان کر  
کھڑا ہو گیا۔ اس کی حرکات و سکنات کسی حد تک رپوٹ سے  
مشابہ تھیں مگر اس کی ہنسیوں جیسی آنکھیں تاثرات سے ماری نہیں  
یہ دل میں ایک عجیب قسم کی کینٹکی پٹائی تھی۔

دلبر خان کی توجہ اب جیسے اچانک ہی اس کی طرف گئی۔ اس کا  
دھیان اب تک اس کی طرف سے ہٹا رہا تھا۔ وہ یکدم چمک کر  
بولاً۔ ”ارے ہوشو خان! تم ابھی تک کلا شکوفہ اٹھائے کیوں چل  
رہے ہو؟ تم نے سنا نہیں، اب اس سے ہماری صلہ ہو گئی ہے۔“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”اب یہ ہمارا سمان  
ہے۔۔۔ شگتی ہے ”مانت“ (عزیز) ہے۔۔۔ درہی اب اس کے اوپر  
بندوق تان کر ہماری بے عزتی نہیں کر دے گی۔ یہ کیا سوچے گا کہ  
ہمارے ہاں سمان کی عزت اس طرح ہوتی ہے؟“

تب مجھے معلوم ہوا کہ اس دیو زاد کا نام ہوشو تھا۔ پہلی بار میں  
نے اس کے مولے مولے اور گھٹے ہوئے سے اونٹوں پر مسکراہٹ  
نمودار ہوتے دیکھی جس کی وجہ سے اس کی ٹخن جھکی آنکھیں  
رخساروں پر پڑے ہوئے گوشت میں کچھ اور چھپ گئیں۔ اس  
نے کلا شکوفہ بھال۔

دلبر خان نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس نے اپنے  
لیے ایک چارپائی کسی کھلونے کی طرح کھینچی۔ وہ ہمارے عین  
مقابل بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں کیوں وہ بغور میری طرف دیکھے جا رہا  
تھا۔ دلبر خان اس کی ٹانگ پر جو کسی ہاتھی کی ٹانگ سے کم نہیں  
تھی، کھینک دیتے ہوئے بڑے پیار سے بولا۔ ”آج تو میرے پیارے  
ہوشو خان نے وہ کام دکھایا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا اسے کیا  
انعام دوں؟“

تب میں نے پہلی بار اس دیو زاد کی آواز سنی۔ اس نے قہقہہ  
لگایا تھا اور بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے ایک ڈرم میں دست سے  
چھڑا کر اسے سڑک پر لڑا دیا گیا تھا۔ اسی گڑگڑاہٹ کے  
درمیان وہ بولا۔ ”میرا انعام تو آپ کو معلوم ہی ہے سائیں!“

اس کی ایک آنکھ معنی خیز انداز میں بالکل ہی دب گئی اور  
گڑگڑاہٹ سے مشابہ قہقہہ کچھ مزید طول کھینچ گیا۔ دلبر خان جلدی  
سے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھٹنا کھینکے ہوئے بولا۔ ”میرے۔۔۔ میرے کہ وہ  
بھی ہو جائے گا۔ ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تو دیکھ نہیں رہا  
کبھی میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔“

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔“ دیو زاد نے منہ پھاڑ کر حلق سے عجیب سی آواز

آئے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے بد معاش ہوتے ہیں۔ خیر۔۔۔  
چھوڑو ان باتوں کو۔ اور آؤ چارپائی پر بیٹھتے ہیں اور کچھ کام کی  
باتیں کرتے ہیں۔“

اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک درخت کی چھاؤں میں  
پہنچا ہوتی چارپائی کی طرف لے چلا لیکن پھر حرکت کر دیا اور اسوں سے  
غائب ہوا۔ ”تم لوگ بھی اپنے اپنے کام و صندے پر جاؤ بابا!۔  
رہبان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ جس حساب سے پہلے  
نیکس دیتے رہتے تھے اسی حساب سے دیتے رہنا۔ ہمارے اس ”شگتی“  
(دوست) پہلوان سے ملاقات کی خوشی میں ہم تمہاری ہر بات  
تمہارے کھنے سے پہلے ہی ماننے کے لیے تیار ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے  
اس نے غریب سے انداز میں میرا کندھا چھو دیا جیسے واقعی برسوں  
سے مجھ سے ہونے کسی دوست سے ملاقات ہو گئی ہو اور وہ اس پر  
بست خوش ہو۔

مگر کاندھوں میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ کچھ تو مار پائی سے  
ان کی حالت خراب تھی۔ شاید وہ آسانی سے اٹھنے اور چلنے پھرنے  
کے قابل نہیں تھے۔ کچھ انہوں نے ویسے ہی گویا خود کو دلبر خان کا  
قیدی بنا لیا تھا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دلبر خان نے  
اسے نہیں مناف کر دیا ہے، رہائی دے دی ہے۔ وہ ابھی ذرہ نظروں  
سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”اڑے بابا۔۔۔ انا نہیں کیا؟“ دلبر خان گرجا۔ ”میں بولتا ہوں  
جاؤ بھائی جاؤ۔ اپنا اپنا کام دھندا دیکھو۔ اور ہاں۔۔۔ دیکھو۔۔۔ یہاں  
چو کچھ ہوا ہے اس کا دوسرے لوگوں سے ذکر کرنے کی ضرورت  
نہیں۔ سمجھ گئے؟“

سب نے خوفزدہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور کرتے  
پڑتے وہاں سے رخصت ہو لیے۔ تب دلبر خان، دیو سے مخاطب  
ہوا۔ ”بھئی تمہارا یہ اعتراف تو اب کل برسوں تک ہی مرمت ہو  
سکے گا۔ لی احوال تم ایسا کرنا، اپنے گھر سے ہی کوئی چائے پانی کا  
بندوقست کرو۔ یوں سمجھو آج ہم سب تمہارے ہوش پر نہیں بلکہ  
تمہارے گھر پر سمان آئے ہیں۔“

”بھئی کسے کیا سائیں!“ دیو ہاتھ جوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا پھر  
وہ کراہتا اور لنگراتا ہوا تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

دلبر خان نے عقب سے آواز دے کر اسے روکا اور کہا۔ ”یہ  
آج بھی تمہارے ساتھ آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ ساری کلا شکوفہ نہیں  
بھی بیچ رہا۔ بس۔۔۔ اب بھول جاؤ کہ یہاں کوئی لڑائی جھگڑا ہوا  
تھا۔“

دیو نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور کرتا پڑتا چل دیا۔ آج  
اس کے پیچھے ہو لیا۔ دلبر خان میرا بازو تھامے چارپائی کی طرف  
بڑھلا۔ وہ دیو زاد جو ابھی تک کلا شکوفہ سنبھالے بیٹھ کی طرح  
ساکت کھڑا تھا، عجیب انداز میں قدم اٹھاتا، دھب دھب کرتا  
ہمارے پیچھے آئے گا۔ کلا شکوفہ کا رخ اس نے ابھی تک میری

نکالی۔ ”کب تک مبر کروں؟ اس دنیا میں سب عیش کر رہے ہیں، ایک مجھے ہی اکثر مبر کرنا پڑتا ہے۔“ اس نے مٹھیاں پہنچ کر چارپائی کی پٹی پر جگہ سے گھونٹے مارے۔ چارپائی جو اس کے بوجھ تلے پہلے ہی چڑھ اڑی تھی، بری طرح لرز کر رہ گئی۔

”کیا کریں۔ تیری لاش ہی بڑی لالچی ہے۔ اگر تو بھی سیدھے سارے انسانوں کی طرح کسی انسان کا بچہ ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔“ دلبر خان مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اور کچھ نہیں ہوتا تو کوئی تیرے جیسی دیوانی و صوفی کر تیری شادی ہی کر دیتے۔ لیکن خیر۔ فی الحال تو زبان بند رکھ۔ ابھی تو تجھے بڑے ضروری کام کرنے ہیں۔“ میں ان کی گفتگو کا مضمون سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے قیاس کے گھوڑے دوڑانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تاہم مجھے ان الفاظ سے کسی گھٹیا بین کی بڑھن ضرور آ رہی تھی اور شاید میری ہی وجہ سے دلبر خان نے موضوع بدل دیا تھا۔ دلبر خان کے آدمیوں میں سے بعض کے ہونٹوں پر بڑی متنی خیر سی مسکراہٹ تھی۔

اچانک دلبر خان میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”یارا میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔ میں تمہیں کریدنا نہیں چاہتا۔ اپنے بارے میں جو بھی مناسب سمجھتے ہو بتاؤ۔ میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔“

”میرا نام افضل خان ہے۔“ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”میں کسی مجبوری کی وجہ سے اپنا شرچہ چھوڑ کر نکلا ہوں۔ بہر حال میں کوئی مفور مجرم نہیں ہوں۔ پولیس میرے پیچھے نہیں ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔“ دلبر خان نے طمانیت سے پہر لایا۔ ”میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال تھا۔ تمہارا ٹھکانہ دسائیوں والا ہے لیکن میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آدمی تم شری ہو۔“

اس دوران آجہ دینو کے گھر سے تمام کلا خشک نمیں لے آیا تھا اور سب نے اپنی اپنی کلا خشک نمیں لیں۔ ان کی جھنجھٹیں ان کے ہاتھوں میں داہیں آتے دیکھ کر ایک بار پھر میرے اعصاب میں الجھن سی ہوئی کہ امن پسندی اور دوستی کا ڈراما اب ختم ہونے کو تو نہیں ہے لیکن میرا اندیشہ غلط ہی ثابت ہوا۔ ماحولی پر سکون ہی رہا۔ سب نے اپنی اپنی گن گود میں رکھ لی تھی۔ بالکل بچائیت کا سامان تھا۔

دلبر خان ہوشو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”افضل خان! یہ ہوشو خان ہے۔ اس کا پورا نام ہوش مردان خان ہے لیکن یہ ہماری کنبی اور آس پاس کی گلیوں میں صرف ہوشو کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پوری دنیا کا۔ ہمارے ملک کا۔ یا اس صوبے کا نہ سہی لیکن کم از کم اس علاقے کا ایک عجوبہ ضرور ہے۔ بہت طاقتور آدمی ہے۔ یہ اپنے اور بھتیجے رکھ کر ٹرکیز کو زور دے سکتا ہے۔ سینے پر چتر کی پٹلیں رکھ کر ترزا سکتا ہے۔“

دلبر خان بڑی اپنائیت سے ہوشو خان کی طرف دیکھ کر

مسکرایا۔ ہوشو خان کی بھی باجھیں مکمل تھکیں اور نہ جانے کیوں بن مانس کی طرح دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں ہی پہنچ کر اپنا سیر پڑا لگا۔ ”بھد بھد۔“ کی کچھ ایسی ہی آوازیں بلند ہوئیں جیسی گوشہ اور چلی کے انبار کو کوٹنے پینے سے برآمد ہو سکتی تھیں۔

دلبر خان شاید اس کا کچھ زیادہ ہی تفصیلی تعارف کرا سنے پڑا ہوا تھا، بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”بیادنی طور پر یہ ایک غم ہے۔ لمحہ سمجھتے ہو نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن وہ پھر بھی وضاحت کرنے ہوئے بولا۔ ”مخصوص سندھ میں کشتی ملاحزائے والے پہلوان! ملے کا جاتا ہے۔ بہت سیدھی سادی سی کشتی ہوتی ہے۔ دونوں پہلوان ایک دوسرے کی کمر بندھا ہوا کپڑا یا شلوار پہن کر ایک دوسرے کو اٹھا کر کھینچنے اور جت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہوشو کو اب اس کشتی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی بلکہ ہوشو کو یہ کیا اب تو کشتیاں دیکھنے والوں کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس قسم کے مقابلے صرف سرکاری سرپرستی ہی میں منعقد ہوتے ہیں اور زیادہ لوگ انہیں دیکھنے نہیں آتے۔ تماشاخیوں کی تعداد دن بہ دن کھتی جا رہی ہے۔“

”تو اب کیا یہ لڑنے کے لیے میڈی سن گارڈن اسکوائر جانا ہے۔“ ورلڈ رینگلڈ نڈریشن کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے؟“ میں نے طمانیت سے پوچھا۔

وہ میرے لیے میں جیسے ٹھکر کو شاید نظر انداز کرتے ہوئے بیان سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”ظاہر ہے وہاں تک تو ہماری رسائی نہیں ہے۔ ہم ہمیں اپنا فضل میلہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنا اور اپنی رعایا کا دل خوش کرنے کا بندوبست کرتے رہتے ہیں۔“

میں ایک بار پھر دل ہی دل میں حیران ہونے لگا۔ وہ مکالمہ گفتگو میں نہایت اطمینان سے وہاں کے لوگوں کے لیے کر رہا تھا! لفظ استعمال کرتا تھا۔ غیبت تھا کہ وہ اپنے لیے بادشاہ سلامت کا لقب استعمال نہیں کرتا تھا تاہم اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے ”حاکم“ اور ”حکومت“ وغیرہ کے الفاظ تو استعمال کر چکا تھا۔

وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ظاہر ہے، اس ویرانے میں لوگوں کے لیے تفریح کے کوئی خاص ذرائع نہیں ہیں لیکن ہم اپنی سی کوشش کر کے کچھ نہ کچھ فضل میلہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اب ملاحزے وغیرہ سے لوگ زیادہ خوش نہیں ہوتے۔ لی وی اور اخباروں کے ذریعے دنیا بھر کی باتیں دور دراز کے کونے کونے تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں بھی لوگوں کو ایکٹرونا ایکٹروں اور لی وی پر کام کرنے والوں کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہے۔ فری اسٹائل رینگلڈ کا بھی کافی پتا ہے۔ میری حویلی کے علاوہ بھی جب سے کنبی میں بجلی آئی ہے، دو چار لی وی بھی آگئے ہیں۔ جب حالات ذرا اچھے تھے تو ان کے سامنے رات تک لوگوں کا رش رہتا تھا اور ہم بھی اپنے لوگوں کی تفریح کا کوئی نہ کوئی



سامان کرتے رہتے تھے۔" کیا ویسا ہی سامان جیسا کچھ دیر پہلے دیکھا تھا پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اجنبی ماحول میں اور دوسرے دکا گارڈوں کے لیے کیا تھا؟ لیکن اجنبی ماحول میں کچھ نہ کچھ معلومت کوئی برتتے رہنا چاہیے تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

دلبر خان کہہ رہا تھا۔ "کبھی ہم قریب کے شہروں سے چھوٹے موٹے سستے اور غیر مشہور قسم کے اسٹیج کے آرٹسٹ وغیرہ بکڑلاتے تھے لیکن یہاں ان کی زبردست شہرت کروڑپتے تھے کہ ٹی وی اور فلم کے مشہور ترین آرٹسٹ آتے ہوئے ہیں حالانکہ ان بے چاروں نے ٹی وی اور فلم اسٹوڈیو وغیرہ کی شکل صرف باہر سے دیکھی ہوئی تھی۔ بہر حال لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ دوسری کیٹیوں سے بھی لوگ آتے تھے کیوں کہ اور کہیں اس طرح کے فنکار ملے نہیں ہوتے تھے۔ یہ ساری اسٹیجیں صرف میں اور میرے ساتھی ہی سوچتے تھے۔ چارپے کی آلتی بھی ہو جاتی تھی اور محنت کر کے تھکے ہارے رہنے والے لوگوں کو چارچہ مینس میں دو چار دن کی قیصر بھی میسر آ جاتی تھی۔"

دلبر خان کے معاملے میں جن لوگوں کا ذہن کام کرتا ہے، ضروری نہیں ہوتا کہ وہ بڑے بڑے بارون، صنعتی یا ثقافتی شہروں میں رہیں۔ کبھی وہ پیداکر سکیں۔ وہ دنیا کے نہ جانے کون کونے کھدروں اور دور افتادہ گاؤں و مسات دیہاتوں میں بھی وہ پیدابا لیتے تھے۔ دلبر خان اور اس کے ساتھی بھی غالباً وہ پیداکرتے کا ہنر جانتے تھے وہ ہر فن مولا تھے اور جائز یا ناجائز، کوئی بھی ذریعہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ معلوم نہیں ان لوگوں نے اس پسماندہ اور دور افتادہ علاقے میں رہتے ہوئے بھی کتنی دولت اکٹھی کر لی تھی۔

دلبر خان سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن جب سے حالات زیادہ خراب ہوئے ہیں اور بعض باتیں ہمارے اختیار سے بھی باہر نکل گئی ہیں تب سے کوئی ہمارے ساتھ یہاں آنے پر تیار نہیں ہوتا۔ آخری پروگرام جو ہم نے یہاں پیش کیا اس میں جانو واؤ ایک گلوکارہ کو اکٹھا کر لیا تھا۔ اچھی خاصی عمر کی تھی۔ کالی سی تھی۔ شکل و صورت کوئی خاص نہیں تھی لیکن تیز روشنیوں میں اسٹیج پر ظاہر ہے وہ کچھ اور نظر آتی تھی۔ بالی بھی اس نے سسرے رنگے ہوئے تھے۔ جانو سائیں اپنے گروہ کا سردار تھا۔ شراب کے نشے میں ممت تھا اور ہماری فرمائش پر پانچ سو روپے کا دی آئی لی ٹکٹ خرید کر آیا ہوا تھا۔ گانے کے دوران ہی گلوکارہ پر ناش ہو گیا۔"

"مثلاً اس نے آپ لوگوں کی فرمائش پر محرومت میں پانچ سو روپے کا ٹکٹ تو خرید لیا تھا لیکن بعد میں خیال آیا کہ ذرا اچھی طرح پیسے پورے کرنے چاہئیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "جب نشر اکڑا ہوا کہ تو اس نے ضرور اس بے چاری کو کہیں چھوڑ دیا ہو گا۔"

"معلوم نہیں۔" دلبر خان بے پروائی سے بولا۔ "اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ ہم نے جانو کو ایک آدھ مرتبہ پیغام بھی بھیجا کہ بے چاری کو چھوڑ دے لیکن سائلے نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔" پھر اس نے گویا ایک نئے تصور سے ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا برا زمانہ آ گیا ہے۔ اب تو ذرا کبھی ہماری بات نہیں مانتے جنہیں ہم نے ہی ڈاکو۔" اس نے نہ جانے کیا سوچ کر جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ "میں نے اس بے چاری کو با زیاب کرانے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بعد سے جانو اور اس کے گروہ کا ہی کچھ پتا نہیں کماں ہے۔ با زیاب اگر کرا سکتے تھے تو ہم لوگ ہی کرا سکتے تھے اور کون کرا سکتا تھا؟ پولیس تو ادھر کارنہ نہیں کرتی۔ اگر کوئی بہت سی اہم مسئلہ ہو جائے تو کبھی آ جاتی ہے اور ہر غیاں شرعیاں کھا کر ہمارے مشورے سے رو پورٹ وغیرہ لگ کر چلی جاتی ہے۔ پولیس شہروں سے آتی ہے اسے یہاں کے سربراہ کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ اس عورت کی فیملی کے کچھ لوگ آئے تھے۔ ادھر ادھر کریں مار کر پٹے لگائے۔"

پھر اس نے مسافرانہ انداز میں کمری سانس لی۔ "بہر حال۔۔۔ اس کے بعد ہمارا دورانی پروگراموں وغیرہ کا دھندا ختم ہو گیا۔ اب تو کوئی یہاں سرکس سیلے وغیرہ لگانے کے لیے بھی نہیں آتا۔ یہ باتیں تو یونیٹی میں آگئیں، میں اصل میں تمہیں ہوشو کے بارے میں بتا رہا تھا۔" اس نے ایک بار پھر بار بار بھرے انداز میں اس دیو زاد کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں عمریں تقریباً برابر ہی ہوں گے لیکن نہ جانے کیوں دلبر خان کی آنکھوں میں ہوشو کے لیے پدرانہ سی شفقت تھی۔ ہوشو نے بھی اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر فوراً باجھیں کھلا دیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد دلبر خان بولا۔ "ہوشو کی کشتی اور فری اسٹائل ریسٹنگ سب میں خوب ماہر ہے۔ ہماری کشتی اور آس پاس کی تمام کیٹیوں میں جسے بھی پہلوان ہونے کا دعویٰ تھا یا جو بھی اپنے آپ کو شہ دور سمجھتا تھا ان سب کو ہوشوری طرح برا چکا ہے۔ دو تین کی ہڈیاں بھی توڑ چکا ہے۔ ملا کوڑے میں جواب لوگوں کو زیادہ دلچسپی رہی نہیں۔ فری اسٹائل ریسٹنگ کے ہم کئی مقابلے کرا چکے ہیں۔ لوگ بہت شوق سے آتے ہیں۔"

"یہاں؟" میں نے حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہاں۔" دلبر خان مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے لیے میں فخر جھک آیا۔ "اسی تم نے شاید اس کشتی کو ہی اچھی طرح نہیں دیکھا۔ آس پاس اس سے بھی بڑی آبادیاں ہیں پھر ہم انتظامات بھی بہت شاندار کرتے ہیں۔ اچھا بھلا سامان باعدہ دیتے ہیں۔ بڑی رونق ہوتی ہے۔ منادیاں ہوتی ہیں۔ ٹانگوں اور تیل گاڑیوں پر بڑے بڑے بورڈ لگا کر پھرائے جاتے ہیں۔ شہرے پوسٹر

بھی چھوڑ کر منگوا لیتے ہیں۔ کیٹیوں میں جو کچھ سے سنبھا وغیرہ موجود ہیں ان میں سلاٹریں چل جاتی ہیں۔ ہم جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس کو بہت اچھی طرح کرتے ہیں۔ ہمارا ساتھ دینے والے کو بھی مزہ آتا ہے۔

اسی دوران دبو کے ہاں سے ہمارے لیے چائے آگئی۔ دبی دبو جو بے چارہ کچھ دیر پہلے ان کے ہاتھوں مارا کرتا تھا اب ان کے لیے چائے لے کر آ رہا تھا۔ کچھ کپ تھے، کچھ گلاس اور کچھ کس۔ دبو کو جو بھی برتن میسر آئے تھے پورے کر کے لے آیا تھا۔ دو چمکوں میں چائے دے کر اور اجازت پا کر دبو لنگڑاتا اور کراپتا ہوا واپس چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دلبر خان نے مجھے اپنے علاقے کی ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کے بارے میں اور خصوصاً اپنے پروموتور کے سے کاروبار کے بارے میں کیوں بتانا شروع کر دیا تھا۔ تاہم میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا اور اس گفتگو کے نتیجے کا منتظر رہا۔

دو ایک زور دار پھیکوں کے بعد دلبر خان نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب ہوشو کے ساتھ لڑنے والا کوئی نہیں رہا۔ کچے کے پورے علاقے میں گنتی کے چند چھوٹے موٹے پہلوان تھے ان سب کا ہوشو کے ہاتھوں مضر خراب ہو چکا ہے۔ اب نہ تو ان میں سے کوئی ہوشو کے ساتھ لڑے گا اور اگر ہم زبردستی کسی کو تیار کر بھی لیں تو کوئی کٹ لے کر مقابلہ دیکھنے نہیں آئے گا جب کہ ہم ایک عرصے سے یہاں کوئی زور دار قسم کا ہلاکلا کرنے کے لیے بے چین بیٹھے ہیں۔“

میری دھڑکنیں کچھ تیز ہونے لگیں۔ اب مجھے کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ ”شنگو کس طرف آ رہی تھی تاہم میں خاموش رہا اور چائے کا گلاس ہوتنوں سے لگائے گئی نظروں سے دلبر خان کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ مجھ خیال انداز میں ایک بار پھر میرا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا جسم شاندار ہے۔ ہم تمہیں یہاں کراچی یا لاہور سے آیا ہوا کوئی نامی گرامی ریسلر بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔“

گو مجھے اب اس قسم کی بات سننے کی توقع ہو چلی تھی اس کے باوجود چائے کا گھونٹ میرے حلق میں اٹکنے اٹکنے رہ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ”تمہارا مطلب ہے میں ہوشو سے ریسلنگ کا مقابلہ کروں۔؟“

پلک کے سامنے۔۔۔؟

”ہاں۔ اس میں حیران پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟“ اس نے اطمینان سے پوچھا۔

”حیرانی پریشانی یہ ہے کہ میں نے کبھی اس قسم کا کوئی کام کیا نہیں اور نہ ہی مجھے امید ہے کہ اب کر سکوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”بھئی تمہیں اس طرح صاف جواب تو نہیں دینا چاہیے۔“

وہ گویا ذرا برا مانتا ہوئے بولا۔ ”تم اس وقت موت کے منہ پر تھے جب ہم نے تمہاری جان بخشی کی اور تمہاری طرف دوسری ہاتھ بڑھایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم میرا احسان مانو لیکن انسان کو اس سے کم دوستی کا بھرم تو رکھنا چاہیے۔ دوستی میں اگر اسے کوئی کام جانے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تم پر پہلی نظر پڑنے پر تمہارے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ تم ایک شیر جوان ہو۔ اور شیر جوان تو دوستی میں۔۔۔ محبت میں۔۔۔ جان دے دیتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ہلاکی ملاکت تھی۔

میں ایک لمحے کے لیے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کیا یہ وہی دلبر خان تھا جس کا ایک روپ میں نے کچھ دیر پہلے دبو تھا؟ اس وقت وہ زوردار و مجبور انسانوں کے لیے سرایا قزو غیب تھا جنہوں نے اس کا کچھ بکاڑا نہیں تھا اور اب وہ اس شخص کے لیے سرایا لطف و عنایت تھا جس نے سب کے سامنے اس پر حملہ کیا تھا اور اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس قبیل کے لوگوں کے ہزاروں اس طرح کے واقعات کا نظم یاد رکھا کرتا ہے۔ ایسی حرکت کرنے والے کو وہ آسانی سے معاف نہیں کرتے مگر اس نے تو ظاہر نہجہ صرف فوری طور پر معاف کر دیا تھا بلکہ یکدم ہی اس کے دل میں ”دوستی اور محبت“ اُڑ آئی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم صرف دوستی میں ہی اپنی جان رکھو۔ اس علاقے کے لحاظ سے تمہیں معقول معاوضہ بھی ملے گا۔ دس ہزار روپے تو ہم ہر حال میں تمہاری خدمت میں پیش کریں گے۔ اور اگر اس مقابلے نے اچھا رش لے لیا۔۔۔ آس پاس کے علاقوں سے بھی لوگ بڑی تعداد میں آئیں گے تو بعد میں مزید مل سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تم جن حالات کا شکار ہو ان میں یہ رقم معمولی نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے بہت اچھا وقت دیکھا ہے۔ شاید اس وقت دس ہزار روپے ہزار کی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن بات اس وقت کی ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر شاید میرے رویہ عمل کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن میرے چہرے سے شاید اسے کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ جب وہ مجھے قائل کرنے کی مزید کوشش کرنے ہوئے بولا۔ ”یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ تمہیں اس کام میں لطف آئے گا۔ تم تو چھلواؤ ہو چھلواؤ۔ جب تم عام لڑائی بھڑائی میں اتنے پاکمال آدمی ہو تو ریسلنگ تو عام لڑائی بھڑائی کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اس میں لطف آئے گا۔“

”اپنی ڈرگت بڑانے میں کے لطف آتا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”سب سے اہم کتے کی توہمیا وضاحت کرنا ہی ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں خود ہی اندازہ ہو گا۔“ پھر ادھر ادھر کچھ کر وہ رازدارانہ سے انداز میں بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے... کیا یہ سچ ہے؟“

”کلام ہے۔ رینگ تو رینگ ہی ہوتی ہے۔“ میں نے غیر واضح سا جواب دیا۔

تب وہ میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”یارا دیوے تو آدمی ہو سیکر لگتے ہو لیکن اس معاملے میں واقعی انہی معلوم ہوتے ہو۔ یعنی یہ ایک نورا داشتی ہوگی۔ ہم تمہیں سب سمجھا دیں گے۔ مجھے یقین ہے، تم جیسے شہ زور اور لڑائی بھڑائی میں ماہر آدمی کو اس میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ مقابلے کی خوب اچھی طرح پہلے سے ریسرچ وغیرہ بھی کر لیں گے۔ رینگ میں بظاہر خوب مار دیا تو نظر آئے گی۔ لوگوں کے پیچھے بھی تو حلال کرانے ہیں تاہم حقیقت میں تم دونوں کو کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئے گی۔“

میں نے اپنے چہرے سے زرا حیرت کا اظہار کیا تو وہ تیزی سے بولا۔ ”باہر کے گلوں میں بھی سب اسی طرح ہوتا ہے۔ میں تو دوسرے گلوں میں بھی کافی دھکے کھا چکا ہوں۔ میں نے یہ سب چکر بہت قریب سے دیکھے ہیں، ہر چیز کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ یہ جو اتنی بڑی بڑی کشتیاں ہوتی ہیں جن کے ہمارے ہاں لوگ ڈوبتے ہیں، یہ بھی دس میس سے نو جہلی ہوتی ہیں۔“

یہ بات مجھے معلوم تھی لیکن میں نے اس پر حیرت کا اظہار مناسب سمجھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”لیکن یار بات یہ ہے کہ یہ کشتی گورے جو بھی کام کرتے ہیں بڑے سلیطے سے کرتے ہیں۔ ان کے فراڈ میں بھی سلیف ہوتا ہے۔ مقابلوں میں اگر کوئی کسر لڑ بھی جاتی ہے تو وہ دو ڈیو ٹھیس بنانے والے پوری کر دیتے ہیں۔ وہ جہاں کوئی بات نمایاں کرنا چاہتے ہیں وہاں نمایاں کر دیتے ہیں۔ جہاں چھپانا چاہتے ہیں وہاں چھپا دیتے ہیں۔“

پھر وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ ”یقین کر لو، تمہارے لیے یہ کام بالکل آسان ہو گا اور تمہیں بہت مزہ آئے گا۔ تمہاری جان شان ایسی ہے کہ ہم تمہیں یہاں بہت بڑا رولسر بنا کر پیش کریں گے تو کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہو گا لیکن تمہیں ہوشو خان سے ادا ہو گا۔ بہت زبردست مقابلے کے بعد۔“ اس نے فیصلہ پہلے ہی سنایا۔

میں نے ہوشو خان کی طرف دیکھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ کھدے انداز میں پھیل گئے۔ وہ مسکرایا تھا۔

میں نے دھمکے لیے میں کہا۔ ”ہوشو خان کی طاقت کا جو عالم تم غار ہے تو یہ ویسے ہی مجھے ہرا دے گا۔“

”سو سکا ہے۔“ دلیر خان ہنس لہے میں بولا۔ ”لیکن پھر بھی میں ہر بات... ہر تفصیل... حتیٰ کہ ہر ڈاؤنچنگ تک پہلے سے طے کر کے چلا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں سچ لڑنے کی کوشش کرو اور دونوں کو زیادہ چوٹیں آئیں اور میں خاص طور پر تم سے کہہ رہا ہوں۔“ اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ ”کہ تم ہوشو

خان پر ہاتھ بالکل ہکا دکھو گے۔ تم جو کچھ بھی کرو گے، محض دکھاوے کے لیے۔ ہوشو خان کو سچ سچ کوئی ضرب نہیں لگتی چاہیے۔“

”اس چیل کے پہاڑ پر کوئی ضرب اثر ہی کہاں کرے گی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی... احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ دراصل میں نے تمہیں یہ پیش کش کرنے میں کچھ زیادہ ہی جلت دکھائی ہے۔ ہم نے صحیح طرح تمہارے ہاتھ نہیں دیکھے، صرف اندازہ لگایا ہے۔ بس... تمہیں دیکھنے سے نہ جانے کیوں یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں نے اس پر عمل کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن آدمی تم مجھے غاصے پیچھے ہونے لگتے ہو، اس لیے احتیاطاً ب کچھ سمجھا رہا ہوں۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے متنی خیز انداز میں مسکرایا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے بارے میں اندازے لگانے کے معاملے میں حقیقت کے قریب قریب تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ خود ہی پہنچی ہوئی چیز تھا۔ اس نے تقریباً فرض ہی کر لیا تھا کہ میں اس کی تجویز پر عمل کر دوں گا۔ لے آؤں گا۔ میں نے اس کے تاثر کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

مجھے اس تجویز کے بارے میں سوچ کر ہی نہیں آ رہی تھی لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس تجربے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ میں اب ایک گمراہ اور بے حیثیت آدمی تھا۔ مجھے اپنی ہیئت کڈانی پر کوئی شرمندگی، کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی بلکہ میں تو گویا اپنی اصل حیثیت سچ کر زندگی کے رنگارنگ تجربات حاصل کرنے کے لیے ہی گھر سے نکلا تھا۔ اب تو ہر چیز میرے لیے ایک ایڈونچر تھی اور میں اس پر خون چلانے یا گھرنے کے بجائے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے نرمی سے کہا۔ ”اگر یہ ایک نورا داشتی ہی ہوگی تو تم ہوشو خان کو ہی جتوانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ افضل خان کو ہی کیوں نہیں جتوا دیتے؟“

”یہ تو سارا کیم ہے دوست! دلیر خان مضطربانہ انداز میں پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”اگر ہوشو خان ہی اور گیا تو پھر سارا کیم ہی ختم ہو جائے گا۔ ہوشو خان اس علاقے کی ایک زندہ روایت ہے۔ باتیں اس کا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں۔ یہ آج تک کوئی مقابلہ نہیں ہارا۔ تم تو آج یہاں ہو، کل چلے جاؤ گے۔ پس تو یہاں اپنے ریکارڈ اپنے نام اپنی ساکھ... اور اپنی دوشیت کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہے۔“

پھر وہ شفقانہ انداز میں میرا کندھا چھوتے ہوئے مسکرایا۔ ”میں آؤ دینے کے لیے تو سارا ڈراما چاہتا ہے کہ باہر کا بھی ایک نامی گراہی ہو، لو ان اتنے بڑے بڑے دعویٰ کے ساتھ آکر کھار چکا۔“

”لیکن میں تو ایسا کوئی دعویٰ نہیں کر رہا۔“ میں نے کہا۔

”جانتے ہو؟“

”ہمیں۔ جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہمیں میں نے چار دن چار راتیں گزار لی ہیں۔“

”یہاں کھلے میں ٹھہرنا تو مناسب نہیں۔“ دلبر خان اوجھڑا

دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم دینو گے گھر میں ٹھہرنا۔ میں دینو سے کہتا

ہوں۔ اب تم راج مزدوری والی کوئی حرکت نہ کرنا۔ مجھے پتا

ہے۔۔۔ اور تم خود بھی بتا رہے تھے کہ تم اس چمچ کی یہ دیواریں

میں لگے ہوئے تھے۔ ابھی ہمیں اس کے بارے میں بھی کوئی گمان

مشہور کرنی پڑے گی کہ دراصل تم ہمیں بدل کر حالات کا جائزہ

رہے تھے۔ اصل میں تو ہمیں بہت دن پہلے بلوایا گیا تھا لیکن

تم آئے تو تم نے اپنی آدمی اطلاع نہیں دی۔ تم اپنے حریف کے

بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے

راج مزدور رہنے ہوئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی کوئی بکواس

گھر لیں گے گاؤں کے لوگ بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ لاہور

معاظلوں میں نہ سہی لیکن جھوٹی بچی کہانیوں پر یقین کرنے کے

معاملے میں بہت سادہ ہوتے ہیں۔ کہانی جتنی زیادہ جھوٹی ہوگی

ی زیادہ مقبول ہوگی اور سید ٹوٹ کے ذریعے سڑکتی ہوئی آگ

سرسے سرے دو سرے تک جا پہنچے گی۔“

وہ مسکرایا اور میری طرف سے غالباً کسی تبصرے کا شکریہ

لیکن میں خاموش ہی رہا تب وہ اپنا سلسلہ دریافت جوتے ہوا

بولا۔ ”اب تم کوئی گھٹیا کام نہ کرنا اور بڑے رعب واپ سے رہنا

میں اپنے کومیوں کو بھیج کر یہاں درختوں کی چھانوں میں تھما

لیے جھوٹا موٹا سا اکھاڑ اکھڑا دوں گا اور باڈی پلاننگ کا کچھ سالا

بھی بھجوا دوں گا۔ تم ذرا لوگوں کو دکھانے کے لیے اور قہر کھانا

پھیلانے کے لیے روزانہ شام کو فکر لکھو کس کریاں کچھ

ایکسر ساز کر لیا کرنا اور اگر لوگ جمع ہو کر تم سے بات چیت کرنے

”تم تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہو بھولے بادشاہ!“ دلبر خان بولا۔

”ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے جو کچھ بھی کریں گے، ہم کریں گے۔

یقین کرو یہاں کے دساتیوں کے لیے ہم تمہاری حیثیت کچھ ایسی بنا

دیں گے کہ جیسے نیوارک سے کوئی عالمی چیمپئن کسٹم کار میکر آیا ہوا

ہے۔ دلبر خان ہر فن مولا ہے۔ یقین کرو، ہم لوگ بڑے شہروں میں

یکدم کرنے والے بڑے پروموتوں سے کم نہیں ہیں۔ تم یہاں سے

بہت خوش خوش جاؤ گے۔ تمہارے لیے یہ ایک خوبصورت تجربہ ہو

گا بلکہ عین ممکن ہے تم فرمائش کرو کہ آئندہ کے لیے ہم تمہیں

اپنے ساتھیوں میں ہی شامل کر لیں اور تمہیں فائدہ پہنچانے والے

ایسے ہی کچھ اور منصوبے بھی بنا دیں۔“

میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ اس نے ابھی تک مجھے

کوئی دھمکی نہیں دی تھی کہ انکار کی صورت میں کیا ہو گا لیکن مجھے

ویسے ہی اندازہ تھا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میرے

چاروں طرف کلا مشکوف بردار بیٹھے ہوئے تھے۔ دلبر خان شاید

صرف اپنی اسکیم میں اچھا رزلٹ لینے کے لیے میرے ساتھ بیٹھ کر

اجنے پار سے منصوبہ بندی کر رہا تھا ورنہ وہ سیدھے سادے طریقے

سے مجھے حکم بھی دے سکتا تھا۔

میں نے اسے ٹوٹنے کے لیے پوچھا۔ ”مجھے سوچنے کے لیے

کچھ وقت مل سکتا ہے؟“

”صوبہ تو ہمیں ہے۔ ہمیں پچاسوں تیارواں کرنی ہیں سب

انتظامات کرنے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں یہ کام جلدی کر لیں۔ اس

دقت ییزن ہے۔ فصلوں کی کٹائی کا زمانہ ہے۔ لوگوں کی بیویوں میں

کچھ پیسے ہیں۔ میں تو تب سے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ تم سے ملاقات ہو گئی اور وہ بھی اتنے عجیب

حالات میں۔“

”تم کب یہ پروگرام رکھنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بہتے دس دن کے اندر راندر۔“ دلبر خان نے جواب دیا۔

”اور یہ بہت دس دن میں کہاں گزاردوں گا؟“ میں نے چاہتا

چاہا۔

”میری حویلی میں۔“ دلبر خان نے جواب دیا۔

”میں تمہارے ہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔“ میں نے صاف گوئی

سے کام لیا۔

”انتہار نہیں ہے ہم پر؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”بات اعتبار کی نہیں۔“ میں نے ملازمت سے کہا۔ ”اگر میں

تمہاری حویلی میں مسان روہوں گا تو پہلے ہی اس شہر کے بارے میں

نور انگشتی ہونے کا تاثر پھیل سکتا ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ دلبر خان بولا۔ ”یہاں کی روایت

یہ ہے کہ شہر وغیرہ سے جب بھی کوئی اہم مسان آتا ہے تو میرے

پاس حویلی میں ہی ٹھہرتا ہے۔ اس سلسلے میں لوگ کسی شک و شبہ

میں نہیں پڑتے۔ ہر حال میں تم پر زور نہیں دوں گا۔ تم کہاں ٹھہرنا

### رومانی ناول

|      |                   |                  |
|------|-------------------|------------------|
| 10/- | اسلم راہی ایم۔ اے | لڑکی اس گلی کی   |
| 10/- | اسلم راہی ایم۔ اے | اس جلتے جہاں میں |
| 5/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | خدا اکمال ہے     |
| 5/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | جلتے جھٹے لوگ    |
| 5/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | سمیرا            |
| 5/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | روتے کنول        |

کوشش کریں تو خود ہی بہت دیکھیں بھی ماروا کرنا کہ تم ہو شو خان کی  
بڑی بلی ایک کر دو گے اس کی تھاپی کر دو گے۔ وغیرہ وغیرہ۔  
برا مطلب سمجھ رہے ہو نا ذرا شاہد اور مقابلے کے لیے فضا تو تیار  
کلی ہے نا۔

میں نے اثبات میں سر ملایا۔

میرا بڑا "مرکا" وغیرہ میں بھی کام کر رہی ہوئی دی اخبارات وغیرہ  
کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہمیں یہاں سب کچھ بہت چھوٹے چٹانے پر  
جنگل کے ذریعے کرتا ہے۔ تم اپنا کاروبار جتنی اچھی طرح ادا کرو  
گے اتنی ہی اچھی طرح ہم اپنی اسکیم پر کام کر سکیں گے اور روپیہ  
فائدہ آئے گا۔ ہمیں بھی حصہ زیادہ ملے گا۔

میں اپنی سی کوشش کروں گا۔ میں نے تو ہم لمبے میں کہا۔  
"لیکن میں کوئی دھندہ یا دعویٰ نہیں کر سکتا کیوں کہ اس سے پہلے مجھے  
پلک کے سامنے قماش بننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میری طرف سے

ہمیں ہر قسم ہدایات ملتی رہیں گی۔" دلبر خان نے مجھے تسلی دی۔  
"جو سکا ہے ہمیں اس پہلے تجربے میں ہی اتنا لطف آئے کہ تم میں  
لاٹ پکڑو اور سچ کچھ کوئی بڑے ریسرلر بن جاؤ۔ بظاہر تو تمہاری باڈی  
میں ہر وہ خوبی نظر آ رہی ہے جو کسی ریسرلر میں ہونی چاہیے۔ باقی  
انداز آنے والے دنوں میں ہو جائے گا۔ مقابلے سے ایک دو دن  
پہلے رات میں کسی وقت ہم ہو شو کو لے کر یہاں آ جائیں گے اور  
دن کے مکان کے اندر ہی خفیہ طور پر تم دونوں ذرا مقابلے کی  
ریسرلر کر لیتا۔ ویسے تو ظاہر ہے رنگ میں مقابلہ اس سے کافی  
تھک ہو جائے گا لیکن پھر بھی بنیادی باتیں ملے ہو جائیں گی۔ وغیرہ  
کے مکان میں کافی ٹنگ ہے۔ وہاں یہ کام آسانی سے ہو جائے گا۔"

وہ ایک لمبے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "میرے چار آدمی  
بروقت یہاں موجود رہیں گے۔ جب تم مکان کے اندر ہوؤ گے تو وہ  
مکان کے باہر چاروں طرف گشت کیا کریں گے اور جب تم  
اٹکائے میں باڈی ملے گا اور ایکس ساز وغیرہ کو گتے تب بھی وہ  
تمہارے اور گرد موجود رہیں گے۔"

"مجھ پر اخبار نہیں ہے کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے اسی  
کے لیے کہیں اس کا سوال اس پر لٹا دیا۔

"اخبار تو ہے لیکن انسان کا ارادہ بدلنے دیر نہیں لگتی۔" وہ  
برا مناسے بغیر بولا۔ "ویسے تو مجھے یقین ہے تم خیر جوان ہو اور شیر  
جوان وعدہ کر کے بیٹھے نہیں دکھایا کرتے" اخذہ انہیں جان سے جانا  
پڑا۔ لیکن پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔ یہ محض ایک احتیاطی قدم  
ہے لیکن ہے تم کسی کے ہتھکڑے میں آ جاؤ اور ارادہ بدلنے کے  
باسے میں سوچنے لگو۔ خود بخود برا بکواس اور سازشی ہے۔ لیکن ہے  
وہ تمہارے دل میں کوئی دھم ڈال دے۔ تم اس کی باتوں پر دھیان  
مت دینا۔"

میں نے سعادت مندانہ سے انداز میں سر ملایا دیا حالانکہ میں

دل میں اس کی رائے سے متفق نہیں تھا۔ مجھے صرف چار دن دینو  
سے واسطہ رہا تھا اور ہمارے درمیان بہت کم بات چیت ہوئی تھی۔  
اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہ بکواس یا سازشی آدمی نہیں تھا  
جب کہ یہ دونوں صفات "دلبر خان" میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد دلبر خان بولا۔ "میں تو پھر میں  
تمہاری طرف سے ہاں سمجھوں نا؟"

"میرا خیال ہے میرا ہاں گردنا ہی بہتر ہے۔" میں نے ایک بار  
پھر اپنے ارد گرد موجود کلا مشکوک ہر آدمی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔  
ان سب کے ہاتھ اپنی گول پر تھے اور وہ پھرائے ہوئے تھے چروں  
کے ساتھ میری ہی طرف ایک ٹنگ دیکھ رہے تھے میرے اور دلبر  
خان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے گویا انہیں کوئی سروکار نہیں  
تھا۔ ان کا کام جیسے صرف مجھ پر نظر رکھنا تھا۔

"آدمی سمجھ دار ہو۔" دلبر خان مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ

مسئلہ نمائندہ دوستانہ اور خوشگوار انداز میں ملے ہو گیا۔"

دلبر خان کے جس آدمی کی کھوپڑی پر میں نے اتنی طرف سے  
کھاناڑی رسید کی تھی وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ اسے ایک  
چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا اور سر پہرے پر ٹھٹھا پانی ڈالا گیا تھا لیکن وہ  
ہوش میں نہیں آیا تھا۔ تاہم دلبر خان نے اس کی طرف کوئی خاص  
توجہ نہیں دی تھی۔

اب اس کی بات چیت اس کے مطلوبہ انداز میں پھیل کر پہنچ  
چکی تھی شاید اسی لیے اب اس نے اپنے اس گڑھے کی طرف توجہ  
دی اور اسے ہاتھ لگا کر دیکھنے کے بعد میری طرف مڑتے ہوئے بلی  
سی تھوٹھیں سے بولا۔ "یہ مرقہ نہیں جائے گا؟"

"میرا ارادہ تو مارنے کا نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "تورہ  
میں کھاناڑی پھل کی طرف سے رسید کرتا۔ میں نے تو ہاتھ بھی ذرا  
پکڑا ہی رکھا تھا۔"

میں نے خود اٹھ کر اس کا معائنہ کیا۔ اس دوران دلبر خان  
بولا۔ "میرا خیال ہے اس کو شہر کے اسپتال لے جائیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے تجربے کے  
مطابق اس کی حالت تھوٹھیں ٹانگ نہیں۔ ایک آدھ گھنٹے میں ہوش  
میں آ جائے گا۔"

"چلو۔" خیر۔ دیکھا جائے گا۔" دلبر خان کچھ سوچتے ہوئے  
بولا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ بس سمجھو ہماری اسکیم پر عمل شروع ہو  
گیا ہے۔"

ہو شو خان نے آگے براہ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ  
منہبوط تھا لیکن میں نے اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی  
کمزور آدمی سے ہاتھ مل رہا ہے پھر وہ مجھ سے مصافحہ بھی کرنے پر تیار  
گیا۔ اس نے گویا وہیں اچھی خاموش زور آزمائی شروع کر دی۔ وہ  
مجھے بازوؤں کے قید میں پکڑ کر بچھنے لگا۔ اگر اس کے بازو لیے نہ  
ہوتے تو شاید اس کی گنبد نما تہ کی وجہ سے میرا صبح طور پر اس سے

مخالفت ہی مشکل ہوتا۔

وہ بہ مشکل میرے بازوؤں کے حلقے میں تباہا لگین میں نے جواہر اس پر طاقت صرف نہیں کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابھی وہ میری طاقت کا صحیح اندازہ کر سکے۔ میں نے اسے پورا موقع دیا کہ وہ مجھ پر زور آزمائی کا شوق پورا کر لے۔ بالآخر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور ایک بار بحیرن مانس کی طرح کھونٹوں سے اپنا سینہ پٹینے لگا۔ دلبر خان پر دراندہ شفقت سے اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”آج یہ بہت خوش ہے۔ بڑی لذت سے بیکار بیٹھا تھا۔ اب یہ بھی دھندے سے لگے گا۔“

پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ دینو کو بلا لائے اس کے جانے کے بعد دلبر خان میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”دینو کے گھر میں رہو گے اس کی لڑکی کے چکر میں نہ پڑنا۔ کم از کم فی الحال نہ پڑنا۔ مقابلے کے بعد جو دل چاہے کرتے پھرنا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لڑکی کے چکر میں پڑ کر آدمی کے خیالات بہت بدل جاتے ہیں، اسی لیے ہم اس چکر میں نہیں پڑتے۔ بس۔۔۔ اگر کوئی پسند آئی، اٹھالیا، دل بٹلایا، چھوڑ دیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ لڑکیاں اس سے زیادہ کسی قابل نہیں ہوتیں۔ دیکھو یہ دینو کی لڑکی بڑی چاٹا مظلوم ہوتی ہے۔ اس کے اندر کوئی کھلی بھری ہے۔ تمہاری وجہ سے ہم اسے چھوڑ رہے ہیں۔“

”بہت شکریہ۔“ میں نے اس کے ”ارشادِ عالیہ“ سے دل ہی دل میں خاصی نفرت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے بعد دینو ہاتھ باندھے نکلوا آ ہوا اٹھیا۔ دلبر خان نے مختصر اسے ساری بات سمجھائی اور حکم دیا کہ وہ میرے قیام و طعام کا خاص خیال رکھے اور ہر طرح سے میری خدمت کرے۔ خوی کی سے ضرورت کی ہر چیز آجائے گی۔

پھر اس نے اپنے مخصوص انداز میں مونچھ کو گل دیتے ہوئے بہت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کچھ خاص ہی انداز میں دجو کو ہدایت کی۔ ”افضل خان کے ساتھ فالو باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اپنے کام سے کام رکھنا اور افضل خان کی صرف خدمت کرنا۔ باتیں مت گھڑنا۔ اور اپنی چھوکی کو بھی ہماری طرف سے حکم دے دینا کہ اس مسافر پر زور سے ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ اب یہ ہماری امانت ہے۔“

دینو نے بھروسہ جی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ ہاتھ باندھے انابت میں سر ہلاتا رہا۔

آخر کار دلبر خان نے ساری باتیں طے کرنے کے بعد اپنے چار آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ وہیں رک گئے، باقی لوگ واپس روانہ ہو گئے۔ جب ان لوگوں کی جیب بھی اور گھوڑا نظریے اور جمل ہو گیا تو دینو میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”آؤ افضل سائیں! اندر چلے ہیں۔“

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ دلبر خان کے چاروں مسلح آدمی

ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ مکان کے قریب پہنچ کر ان پر مکان کے سامنے کے دونوں کونوں پر کھڑے ہو گئے اور طرف چلے گئے۔ اب گویا میں دلبر خان کا قیدی تھا اور دروازے میں نظر بند تھا۔

کچھ دیر پہلے میں اس مکان میں تباہا تھا تو ڈیوڑھی بیڑھیاں چڑھ کر بچت پر چلا گیا تھا۔ اس بار دینو کے ساتھ پہنچا۔ وہ ویسا ہی مکان تھا جیسے عام طور پر گاؤں کے مسکنات ہیں لیکن خاصا خوبصورت و عریض تھا۔ بڑے سے صحن میں ایک ذرا اونچے چوڑے پر ایک پتھر تلے کھانے پکانے کی یکہ تھی۔ دیوار کے ساتھ مٹی کے دو چولہے بنے ہوئے۔ انیکٹھیاں بھی رکھی تھیں۔ وہیں مولیٰ بیٹی ایک تنگ زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس نے ہر آتے پتینا دیکھا لیکن اٹھا لگن سر نہیں اٹھایا تھا۔ وہ لباس تہہ تہی چولہے میں آگ دم توڑ رہی تھی اور مولیٰ کی ٹکلیوں تاک پر بیٹنے کی منہمی منہمی بوندیں دور سے چپکے دکھائی دے تھیں۔

دینو وہیں چولہے کے قریب جا بیٹھا۔ مجھے بھی اس نے بڑے ایک موزے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تب مجھے اندازہ چولہے پر کوئی تیل سا گرم کر کے غالباً اپنی چوٹی کی شکل کرتے اندھ کر باہر گیا تھا۔ وہ کراہ کر ایک ٹانگ زمین پر ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اب مجھے تفصیل سے بتاؤ تمہارا خان سے کیا باتیں ہوئیں۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ آؤ ابا بالکل سچ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

مولیٰ بدستور تنکے سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ دینو نے لڑکیوں کو جب اپنی سوچ کے اظہار کی راہ نہیں

عظیم مدبر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) - ۱۱

(قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (۱۱ حسین انجم) - ۱۱

(پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے حالات زندگی)

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

وچلے کے قریب پہنچ کر شکے سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی  
 میں نے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں دیکھ کر وہ ساری  
 باتیں بتادیں جو میرے اور دلبر خان کے درمیان ہوئی تھیں۔ انہیں  
 سن کر وہ متحاشانہ انداز میں سر ہلاتا رہا۔ اس دوران موٹل نے کئی  
 بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی چادر گر آنکھوں میں لگا بی  
 ذورے حیر رہے تھے شاید وہ روٹی رہی تھی یا پھر اس کی آنکھوں  
 میں خون اتر رہا تھا۔

میں خاموش ہوا تو دیکھ بولا۔ "ہوش کی طاقت کے بارے میں وہ  
 بکواس کرتا ہے۔ وہ اتنا طاقتور نہیں ہے جتنا دلبر خان اور اس کے  
 نزلے لے اے مشہور کر رکھا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ بالکل  
 ہی ہوا ہے۔ کچھ نہ کچھ طاقت اس میں ہے۔ اور اسنے ذیل ذول  
 کے آوی میں ہونی بھی چاہیے لیکن اس کی زیادہ طاقت بس اس کا  
 وزن ہی ہے۔ یعنی جس پر وہ گر جاتا ہے اس کے لیے اتنا محال ہو  
 جاتا ہے لیکن اس کے بارے میں باقی سب افسانے ہیں۔ اس نے  
 آج تک جتنے بھی مقابلے کیے ہیں سبھی نور افشیاں تھیں ورنہ اس  
 پاس کے علاقوں میں دو ایک جوان ایسے موجود ہیں جو اسے مار سکتے  
 تھے۔"

"لیکن وہ بھی مقابلے میں ہار گئے؟" میں نے پوچھا۔  
 "ہاں۔ کسی کو روپے دیا گیا کسی کو دھکیلا۔ انہوں نے بھی باقی  
 پہلو انوی کی طرح جعلی مقابلہ کیا۔ دلبر خان نے قتل کے طور پر  
 وہ ایک دو ہلا ہوا ہے۔ یونہی۔ بس لوگوں کو ڈرانے کے لیے۔  
 حالانکہ دلبر خان کی دہشت دینے ہی کچھ کم نہیں ہے مگر بتا نہیں  
 کیوں ہوش خان کو بھی رکھا ہوا ہے۔ کچھ اس کی شکل بھی ایسی ہی  
 ہے کہ اس کے بارے میں مشہور کیے ہوئے افسانے سچ لگتے ہیں۔  
 شاید وہ دلبر خان کو اس لیے بھی عزیز ہے کہ اس کے لیے وہ بھی  
 روپے کاغذ کی ایک مشین ہے۔"

"مجھے کچھ یقین سامنے آ رہا کہ مجھے دیکھتے ہی دلبر خان کے  
 زہن میں یہ اسکیم آئی ہوگی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔  
 "اسکیم تو آئی ہوگی۔" دیکھو اپنے رخسار پر بالٹ کرتے ہوئے  
 بولا۔ "لیکن مجھے بات صرف نور افشیاں کی نہیں لگتی۔ نور افشیاں تو  
 اتنی جگہ ایک سازش ہے ہی لیکن مجھے اس میں سے کسی اور سازش  
 کی بھی آہٹ آ رہی ہے۔ سازش در سازش۔"

"تم کی کتنا چاہ رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے بھی  
 بکواسیاتی محسوس ہو رہا ہے لیکن وہ کیا سازش ہو سکتی ہے؟"  
 "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" دیکھو بے بسی سے بولا۔ "یہ شیطان  
 لوگ ہیں۔ ان کے دماغ شیطان کا رخانے کی طرح چلتے ہیں۔"  
 موٹل نے ایک بار پھر انگارہ ہی آنکھوں سے میری طرف دیکھا  
 اور پھر اپنا اپنے ہونٹوں پر لگی سکوت کی مروتی۔ وہ کھنکھاتی  
 لیکن مصلیٰ آواز میں بولی۔ "تم نے مقابلے کی ہاں کیوں بھری؟"

"اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر۔  
 کہا۔ "مجھے ہر حال میں کسی نہ کسی سے مقابلہ کرنا ہی تھا۔ یہ مقابلہ  
 بہتر تھا۔ اس میں مجھے سوچ بچار اور تیار کی کہنے کا وقت مل گیا  
 ہے۔ باقی ہر طرح کا مقابلہ اس سے زیادہ خطرناک تھا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ انہی باتوں اور ان کی کوکھ سے جنم لینے  
 والے سوالوں پر غور کرتے ہوئے ہمارے سروں پر رات اتر آئی۔  
 دیکھنے پھیلنے ایک کوٹھڑی میں میرے قیام کا انتظام کیا تھا جس کی  
 کھڑکی صحن میں تھکتی تھی اور اس میں کھڑکھڑاتا ایک رانا سا نیل  
 فین بھی موجود تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ دیکھنے گھر میں بجلی تھی۔  
 رات کو میں تمام نظرات ذہن سے جھٹک کر چٹھے کی بجلی سی  
 کھڑکھڑاہٹ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں ٹنگا  
 اندھیرا تھا۔ کھلی کھڑکی سے ادھورے چاند کی مدھم سی چاندنی کمرے  
 میں آ رہی تھی۔ موسم خشک نہیں تھا اس کے باوجود میں نے  
 دروازہ بند کر کے کھڑکی پر چھائی تھی۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں  
 تھیں۔ اس سے کوئی اندر نہیں گھس سکتا تھا۔

رات جی جاری تھی اور میں سونے میں کامیاب نہیں ہو رہا  
 تھا حالانکہ میں کچھ ایسا خاص پریشان بھی نہیں تھا۔ اچانک  
 دروازے پر ہلکی سی دھک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے چٹکے کی  
 کھڑکھڑاہٹ سمجھا لیکن ایک لمحے کے توقف کے بعد دھک دوبارہ  
 ہوئی تب میں نے اندر دروازے کی بھری سے جھانکا اور باہر  
 موجود ہونے کو دیکھ کر دواڑہ کھول دیا۔

موٹل جلدی سے اندر آ گئی۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی  
 تھی۔ دروازہ بند کر کے اس سے ٹپک لگا کر اس نے ایک طویل  
 سانس لی اور مرتعش لیجے میں بیوی۔ "میں رات کو یوں چھپ کر  
 تمہارے کمرے میں آئی ہوں۔ تم نے مجھے آواز نہ اور بد چلن تو  
 نہیں سمجھا؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے دباؤ داری سے جواب دیا۔ "میں  
 عورتوں کے بارے میں بہت زیادہ تجربے کا ر ہونے کا دعویٰ نہیں کر  
 سکتا۔ لیکن... ہر حال۔ مجھے تمہارے چہرے پر آوارگی اور بد چلنی  
 کی کوئی پرچھائیں نظر نہیں آئی۔ تم ایک اعلیٰ لڑکی ہو ساروٹی ہوئے  
 کے باوجود۔"

اس نے ایک اور گہری سانس لی۔ اس سانس میں طمانیت  
 تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ "میں صرف یہ پوچھنے کے لیے آئی ہوں  
 کہ کیا تم یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو؟ اگر تم بھاگنا چاہو تو میں  
 تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں ٹپکے اندھیرے میں بغور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے  
 جواب کی منتظر تھی۔

میں نے چند لمحے سوچا پھر دھیمے مگر فیصلہ کن لیے میں کہا۔  
 "نہیں... میں بھاگنا نہیں چاہتا۔"

انکا اقبالہ سونا گھاٹ کا پجاری

غلام روہیں، امبریل، درخشاں، خبیث

کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور

پراسرار ناول

## برہمچاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب

کتابت و طباعت

قیمت - - 150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

"اس کے باوجود جب مجھے یہ احساس ہوا کہ تمہارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے تو میں رو نہیں سکی۔ میرے دل نے مجھے بتایا کہ میں تمہیں کچھ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں چاہتی تو تھی کہ تم میرا سے بھی نہ جانتے، زندگی بھر میں رہے۔ لیکن مسئلہ زندگی تھا، ان دنوں ہے تو میں چاہتی ہوں، تم میرا سے ملے جاؤ۔ تم چاہو

"کیوں؟ کیا تمہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر میں اب اس جگہ اندھیرے میں اس کا ایک ایک نقش ہی نہیں، اس کی آنکھوں میں تیرے جذبات کی پڑچائیاں بھی دیکھ سکتا تھا۔

"جان تو عزیز ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "لیکن اسے بچانے کے لیے میں نے جب بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگنے کا راستہ اختیار کیا ہے تو میں بچتا ہوں۔"

"کیا اس وقت بھی بھاگے ہوئے ہو؟" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ دن کے آجائے میں مجھے اس کی آنکھوں میں اتنی نہایت کی چمک نظر نہیں آتی تھی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی۔

"ہاں۔" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اعتراف کیا۔ "لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی جرم کر کے قانون سے بھاگا ہوا ہوں۔ وہ ایک اور مسئلہ ہے۔ لہذا چکر ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

اس نے مجھے اس موضوع پر کرینے کی کوشش نہیں کی اور منظرانہ سے انداز میں، چھٹی انگلیوں سے میرا بازو دباتے ہوئے تیز سی سرکوشی میں بولے۔ "میں کہتی ہوں بھاگ جاؤ۔ اس وقت تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں مگر کل کیا ہو گا، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" "کل کیا ہو گا؟ اس کے بارے میں تو کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے غلوں کا شکر

گزار ہوں لیکن اگر مجھے بھانکا ہوتا تو میں تمہاری مدد کے بغیر بھی بھاگ چکا ہوتا۔"

"تمیں بھاگ سکتے تھے۔" وہ دھوکے سے بولی۔ "اب چار دوسرے تازہ دم آدمی گورانی کے لیے پہنچ چکے ہیں۔ وہ کلا شکو میں لے کر مسلسل مکان کے چاروں طرف گشت کر رہے ہیں۔ مکان کا کوئی گوشہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نظر سے اونچل نہیں ہو رہا۔"

"اس کے باوجود تم مجھے بھاگنے کے لیے میری مدد پر تکی ہوئی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اگر میں تمہاری مدد کے بغیر بھی تمہارے گھر سے بھاگ گیا تو تم باپ بیٹی کا کیا حشر ہو گا؟"

"مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔" وہ سر جھکاتے ہوئے افسردگی سے بولی۔ "اس کے باوجود میں تمہاری مدد کے لیے آگئی ہوں۔"

"اگر انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ مجھے بھاگنے میں تمہاری مدد بھی شامل تھی پھر تو وہ تمہارے انجام کو اور بھی زیادہ عہدت ناک بنانے کے لیے نہ جانے کیا کر گزریں گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اور اس تصور سے میری روح لرز اُٹھتی ہے۔" وہ دھیرے دھیرے ہلکی کی جھلکیں اٹھاتے ہوئے بولی۔



تھا۔ میں محبتوں کی کچھ عجیب اور ناقابل تشریح شدتوں کا متلاشی تھا لیکن جب کبھی کہیں محبتوں کی یہ شدت اچانک ہی مجھے نظر آتی تھی تو میں خود فرود سا ہو جاتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اگر اس کی آنکھوں کے سامنے مجھے کچھ ہو گیا تو وہ بھی زندہ نہیں رہے گی۔ اور وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کی صورت میں نے آج پہلی بار دیکھی تھی جسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ معلوم نہیں محبت نے اس کے ذہن میں میرا کیا ثابت تراشا تھا۔

میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن جب وہ لوگ آکر تمہارے بابا اور دوسرے لوگوں کو مار رہے تھے تو تم نے خود کلناڑی میرے ہاتھ میں دے کر مجھے ان کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیجا تھا جب کہ ان سب کے پاس کلاشنکوف تھیں۔ اس وقت بھی تو تم مجھے موت کے من میں ہی بیچ رہی تھیں۔“

”نہیں۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ میں ناممکن کو ممکن محسوس کر رہی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”اور اب تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں ہوشو خان کا مقابلہ کر لوں گا؟“ میں نے دل کا بوجھل پن کم کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہوشو خان سے تو تم دس مرتبہ مقابلہ کر لو گے اور دس مرتبہ ہی جیت جاؤ گے۔“ وہ ہوشو سے بولی۔ ”لیکن اس مقابلے کے پیچھے جو سازش کام کر رہی ہے اس کا مقابلہ شاید نہ کر سکو کیوں کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہے وہ سازش ہے کیا؟“

”لیکن تمہیں یہ یقین ہے کہ کوئی سازش ہے ضرور؟“ میں نے اس کی جھلکاتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں۔ یہ مجھے یقین ہے ورنہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہوشو خان سے... بلکہ اس علاقے کے کسی بھی شہ زور سے تمہارا مقابلہ ہونا... یعنی سچ کچھ کا... اصلی... اور ایماندارانہ مقابلہ ہوتا تو مجھے بالکل فکر نہ ہوتی۔ یہ تو نورائشی ہے اس میں تو مجھے بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نورائشی کے مقابلے میں تو مجھے کیا، کسی کو بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں تو خطرے والی کوئی بات ہی نہیں۔ لوگوں کو بے خوف بنانا ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیوں اس سے میرا دل زیادہ ڈر رہا ہے۔ اگر بے طے پاؤں کہ تمہیں ہوشو خان سے مردوں کی طرح بالکل صحیح مقابلہ کرنا ہے تو شاید میرا دل نہ ڈرے۔“ اس نے بے آواز سے انداز میں طویل سانس لی۔

”دل کے کہنے پر بہت چلتی ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی کیوں لگی تھی۔ وہ بھی میرے ہی ”فیصلے“ کی معلوم ہوتی تھی۔ غربت میں پرورش پانے والی مگر نہ جانے کہاں سے بے پناہ ذہانت سمیٹ لینے والی۔ تلخ حقائق کے بھیاں بھیاں رنگارنگوں میں رہنے والی مگر دل کے کہنے پر پلٹنے والی۔

جہاں بھی رہو... لیکن زندہ رہو...“ وہ بھٹیانی میرے کندھے پر ٹکا کر چپکے چپکے رونے لگی۔ اس کے آنسو میرے دل کے صحرایہ کی پیش کچھ اور بڑھانے لگے۔ چند لمحے کے لیے میری دم بخود سا کھڑا رہ گیا۔ مجھ میں اسے چھوٹنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

مجھے زندگی میں سب کچھ ملا تھا۔ محبتیں بھی، نفرتیں بھی۔ دولت کی آسائشیں بھی اور غربت کی سختیاں بھی۔ دوستوں کی جان نثاری بھی اور دشمنوں کی دل نکاری بھی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود دامن دل بالکل خالی محسوس ہوتا تھا۔ انسان اپنے آپ کو بالکل تہی دست و تہی دامن محسوس کرتے ہوئے زندگی کے خار داروں میں دوڑتا چلا جا رہا ہو اور یکدم ہی کسی بے عنوان سی محبت کا گھٹان اس کے سامنے آجائے، چاہت بھرے آنسوؤں کے تھینے اس کی بھولی میں آگرس تو پیچھے کچھ یقین سا نہیں آتا۔

میں نے بہت آہستہ سی اس کا سراپہ اٹھایا۔ اس کے سائو لے چہرے پر آنسوؤں کی سیال چاندی چمک رہی تھی۔ میں نے سر کو تھپے سے بھی دھیسے لیے ہو پوچھا۔ ”کیا یہ پہلی نظر کی محبت ہے؟“

”معلوم نہیں۔“ اس نے سادگی اور بے بسی سے جواب دیا۔ ”میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ میں تمہیں مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ تم بابا کے ہوش پر آئے تو میں پہلے دن سے چمپ چمپ کے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ تم سارا دن کارا رہتے، انٹینس ڈھونڈتے اور دیوار بناتے۔ میں منڈیر کے پیچھے چھپی تھیں، دیکھتی رہتی اور دل ہی دل میں سوچتی نہ جانے کس دن تم یہاں سے چلے جاؤ گے اور تمہیں پتا بھی نہیں ہو گا کہ کوئی کہاں سے اور کب تک تمہیں چمپ چمپ کر دیکھا رہا۔ تمہاری ہر جنبش پر کسی کا دل الٹ پلٹ ہوتا رہا۔“

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے مسکائی سی لب پھر لیے میں مردوں کا بچناؤا سہیلے ہوئے بولی۔ ”کاش ایسا ہی ہوا ہو! کاش تم اسی طرح چلے گئے ہوئے، تمہیں کچھ پتا نہ چلا۔ میرے دل میں حسرت کا زخم آخر کب تک تازہ رہتا؟ کبھی نہ کبھی تو بھری جاتا لیکن اب تم درود آجیے، وہ تم سے سب بات ہو چکی ہے... اور اب تم پہلے جاؤ گے تو یہ زخم کبھی نہیں بھرے گا، ناسور بن جائے گا۔“

مگر پیسے وہ کسی امید افزا خیال کے تحت دھیرے سے مسکرا دی۔ ہنسی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مسکراہٹ کا یہ امتزاج عجیب تھا۔ وہ انگلی سے گویا میرے چہرے کے گرد لکیر کھینچتے ہوئے بولی۔ ”لیکن چلو۔ یہ اطمینان تو ہو گا کہ تم جہاں بھی ہو، زندہ ہو۔ اگر پہلی آنکھوں کے سامنے تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی گی۔“

یہ اس نے عجیب بات کی تھی یا شاید میں آدمی ہی کچھ عجیب

نہیں کی تھی۔ مجھے مستقبل کے بارے میں کچھ جاننے سے خوف تھا۔ لندن میں میری کاروباری شناسا جوڑی فوسٹر جو بعد میں میرا بہت گہری دوست بن گئی تھی، لندن ہی میں قیام کے دوران ایک بار مجھے دسٹ اینڈ کے علاقے میں لگنے والے ایک بہت بڑا میلے میں لے گئی تھی۔ وہیں وہ زبردستی مجھے شیشے کے گولے میں جھانک کر قسمت کا حال بتانے والی ایک عورت کے ٹینٹ میں لے گئی تھی۔

اس نے مجھے کچھ انٹرنل ٹینٹ ہاتھ میں ہائی تھیں جنہیں میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا تھا لیکن اس میں ٹھک نہیں تھا کہ اس کا انداز بے پناہ متاثر کن تھا اور اس نے ٹینٹ کے اندر ہی ایسا ماحول تخلیق کر رکھا تھا کہ اندر قدم رکھنے والا حیران ہو کر رہ جاتا تھا۔ وہ عورت چھپی تھی مگر اپنے عالمانہ انداز سے کسی ڈاکٹر کی ڈگری رکھنے والے کو بھی مرعوب کر سکتی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس کی علمیت محدود اور مکمل نہ رہنے سے تھی..... لیکن ان چیزوں کو صرف مجھ جیسے آواہن گرد ہی محسوس کر سکتے تھے۔ بات پھر وہی آجاتی تھی کہ گورے فراڈنگی کرتے ہیں تو بڑے سلیفٹ بڑی تیاروں سے کرتے ہیں۔

مگر مجھے اس سفید قام، خراث، سرور گرم چہرہ اور دنیا کی خاک چھاننے والی عورت نے خوفزدہ نہیں کیا تھا، ایک دور انڈیا دیہاتی علاقے کی اس ان بڑھ اور فوئیر لڑکی نے ضرور ڈرا دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری ذات کے شفاف گولے میں جھانک کر سچا ہر بات جان سکتی تھی۔

”اس گھر میں تمہارے اور دیو بابا کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔ ”دیو بابا کی بیوی بھی زندہ نہیں ہے کیا؟“ ”نہیں۔ وہ بیماری سے مر گئی تھی۔ ٹی بی ہو گئی تھی اسے۔ علاج نہیں ہو سکا۔“ مول نے افسردگی سے جاپا۔ ”وہ بہت خوبصورت عورت تھی لیکن بیماری اسے کسی آدم خور ہلاک طرح کا کر لی۔ میرے ہاتھوں میں ہی جان دی تھی اس نے۔ وہ بھی دیو بابا کی طرح ایک اچھی انسان تھی۔ دیو بابا نے مجھے باب کا چارہ دیا اور اس نے ماں کا لیکن مجھے زیادہ عرصہ اس کے پیار کی چھاؤں میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔“

”اور تمہارے اپنے ماں باپ؟“ میں نے پچھانیے ہوئے پوچھا۔ وہ لڑکی اس قابل تھی کہ اسے ہنر طور پر جاننے کی کوشش

”ہاں۔ دل کے سوا میرے پاس ہے ہی کیا۔ اس کے کہنے پر بھی نہ چلوں تو کسی کے کہنے پر چلوں؟ دل نے کبھی مجھے دھوکا بھی نہیں دیا۔ یہ مجھے جو کچھ بھی کہنے کو کہتا ہے، وہ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ بہت اچھا دل ہے میرا، مجھے کبھی بھگتا نہیں، کوئی غلط کام نہیں بتاتا، کوئی غلط راستہ نہیں دکھاتا۔“ نئی اب صرف اس کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ اس کا چہرہ میں نے اپنے ہاتھوں سے پونچھ دیا تھا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا، ذرا چمکتے ہوئے بولی۔ ”اور ہاں۔۔۔ دیو بابا بھی بہت اچھا ہے۔ اس کا کتا بھی میں بالکل نہیں مانتی۔ ایک دل.... اور ایک دشا بابا.... دنیا میں بس یہی دونوں میرے ہیں۔“

”اور میں؟“

”تم؟ تم تو شاید اپنے بھی نہیں ہو۔ معلوم نہیں دل میں کیا کیا بھید چھپائے پھر رہے ہو۔ تم اس دنیا میں شاید صرف بھٹکنے کے لیے آئے ہو۔ حالات تمہیں ایک خزاں دریدہ پتے کی طرح آوازے پھر رہے ہیں۔ تمہاری کوئی منزل نہیں ہے۔“ وہ میرا ہاتھ تھامے، اسے دونوں ہاتھوں سے پچھلائے یوں تک رہی تھی جیسے لکڑیوں کی مدد سے میری قسمت کا حال پڑھ رہی ہو۔ ایک پیشہ ور نجومی ہی کی طرح روانی سے وہ مجھے میرا اسی حال اور مستقبل بتا رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پیشہ ور نجومیوں کی طرح جھوٹی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، سچ کہہ رہی تھی۔ میں خود اپنے بارے میں اکثر یہی محسوس کرتا تھا لیکن اس کے منہ سے یہ سب کچھ سن کر میں دم بخود رہ گیا۔

”تم نجومی ہو کیا؟ تمہیں ہاتھ دیکھنا آتا ہے کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں.... بالکل نہیں۔ مجھے ہاتھ دیکھنا نہیں آتا۔ ہاتھوں کی ٹیڑھی میزجی لکیریں مجھے بیشہ صرف بھول جھلیاں لگی ہیں۔ میں ان میں کبھی کوئی مطلب تلاش نہیں کر سکتی۔ ہاتھ تو میں یوں ہی دیکھ رہی تھی۔ شہت کرنے والے اور خرمون صفت لوگوں کا کریبان پکڑنے والے ان آہنی ہاتھوں کی خوبصورتی کا اندازہ کر رہی تھی۔“

”پھر مجھے میرے بارے میں یہ سب باتیں کیسے بتا رہی ہو؟“ ”یہ سب کچھ تو اس وقت ہی میرے دل میں آیا تھا جب میں نے پہلی بار تمہاری صورت دیکھی تھی۔“ وہ بولی۔ ”گھر کے کوپے شک تم ہر کام کر لیتے ہو لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تم محنت مزدوری کرنے والے آدمی نہیں ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“ اس نے ہاتھوں کی چلن اٹھا کر ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

مجھے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی پاسٹ کو ہاتھ نہیں دکھایا تھا، کبھی کسی ماہر نجوم سے اپنا زائچہ نہیں بنوایا تھا، کبھی کسی بے اپنے مستقبل کا حال جاننے کی کوشش

سنہری غول

اسلم راہی ایم اے قیمت =/ 150

کے نیچے ہی چھپی بیٹھی رہی۔ ادھر ادا کھلوتا میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ گولیاں چلنے لگیں۔۔۔ مکانوں کو آگ لگائی جانے لگی۔۔۔

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے وہ منہ ابھرتا تھا اور اس کے حواس پر پر ہی جم گئی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ دھالے ہوئے بڑی سادگی سے پوچھا۔ ”ہمارے ہاں لوگ اتنی بے رحمی سے ایک دوسرے کی جانیں کیوں لیتے ہیں؟ ایک دوسرے کے گھر کیوں اجاڑتے ہیں؟ ہم ایسے انسانوں کو درد سے کتے ہیں مگر دردے تو ایسا نہیں کرتے۔“

میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں تو خود عرصے سے ان سوالوں کے جواب تلاش کر رہا تھا۔ اسے جب اندازہ ہو گیا کہ میں ان سوالوں کے جواب دینے کا اہل نہیں ہوں تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”پانچ چھ سال کی وہ بچی اپنا ادھر ادا کھلوتا ہے تل کاڑی کے نیچے بیٹھی رہ گئی اور اس کے ارد گرد کچے کچے مکانوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ کیوں میں لائیں بکھر گئیں۔ میں اس وقت تل کاڑی کے نیچے سے نکل جب اسے بھی آگ لگ گئی۔ اس وقت تک دشمن قبیلے کے لوگ جا چکے تھے۔۔۔ اور میرے ہاں باپ بھی۔“

وہ میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ”میں انہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی مگر ان کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ہماری جنگی بھی تل کر راکھ ہو چکی تھی مگر اس میں ان کی لائیں نہیں تھیں۔ میں نے گھول میں پڑی ہر لاش کا چہرہ دیکھا مگر میرے ہاں باپ کیس نہیں تھے۔ وہ شاید بھاگ گئے تھے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ امن و سکون ہو جانے کے بعد بھی وہ مجھے ڈھونڈنے نہیں آئے۔ کوئی میری طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ دبو بابا وہاں مسمان آیا ہوا تھا۔ وہ اس گاؤں کا رہنے والا نہیں تھا۔ صرف اس کا دھیان میری طرف کیا۔ اس نے مجھ سے ساری بات پوچھی اور مجھے ساتھ لے کر میرے ہاں باپ کی تلاش میں ابھر ادا پھر آ رہا۔ پھر اس انتظار میں وہ مدت دن وہاں ٹھہرا کہ شاید میرے ہاں باپ مجھے ڈھونڈنے آئیں مگر وہ نہیں آئے۔ آخر کار راپوس ہو کر دبو بابا اور اس کی بیوی مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہاں لے آئے؟“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ اس وقت دبو بابا نواب شاہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا اور غربت کے ہاتھوں پریشان تھا۔ یہاں تو ہم صرف تین چار سال پہلے آئے ہیں۔ اس سے پہلے کچے کے علاقوں میں برائے نام آبادی تھی۔ اب تو رونق بہت بڑھتی جا رہی ہے۔“

پھر اسے جیسے یاد آیا۔ ”ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”دبو بابا کی بیوی بیمار رہتی تھی۔ جب ہم گاؤں میں تھے تو سب لوگوں کا خیال تھا ’دبو‘ مجھے اس لیے ساتھ لایا ہے کہ یہاں پوس کر مجھ سے شادی کر لے گا۔ یہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ دبو بابا۔ جو اس وقت کچھ ایسا ’بابا‘ نہیں تھا‘ سب کو سمجھا کہ اس کے اولاد نہیں ہے اور اس کی بیوی سے اولاد ہونے کی امید بھی نہیں ہے‘ اس

کی جانی۔ ”مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔“ اس نے سر جھکا کر انہیں سے جواب دیا۔

”چھوڑ کر بھاگ گئے تھے؟“ میں نے بے یقینی سے دہرایا۔

”یہاں باپ بھی اپنی اولاد کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں؟“

”ہیوں نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”حالات کی بات ہے۔ اس دنیا میں لوگوں پر ایسے بھی حالات گزرتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کو بچھڑتے ہیں۔“

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھا رہا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود پہلے سے بھی دھیمے لہجے میں بولی۔ ”اس روز ماں باپ ابھی بھیک مانگنے کے لیے نہیں نکلے تھے۔ گاؤں سے کافی دور لاری ادا تھا۔ ہم لوگ وہاں بھیک مانگنے جاتے تھے۔ مجھ سے بڑی بھی ایک بہن تھی اور مجھ سے چھوٹی بھی۔ مجھ سے چھوٹی تو گود میں تھی۔ صرف اسے ماں گود میں رکھتی تھی ’بانی‘ سب الگ الگ ہو کر ابھر ادا پھر جاتے تھے اور شام ڈھلے آگئے ہو جاتے تھے۔ دن بھر بھیک مانگنے لاری اڑے پر اور اس کے آس پاس ہی پھرتے رہتے تھے۔ اس روز ابھی جنگی سے روانہ ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ گاؤں میں شور مچا دیا۔ دوسرا قبیلہ حملہ کرنے آ رہا ہے۔ اس گاؤں میں جو قبیلہ آباد تھا اس کی برسوں سے کسی دوسرے قبیلے سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔“

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔ ”ایک قہم لوگوں کو دشمنوں نے آجاؤ کر رکھا ہوا ہے۔ دشمنوں کا تو مجھے پتا نہیں لیکن ہم روایت والوں کے حالات تو ایسے ہیں کہ دوست بن کر بیٹا بھی خاصا مشکل کام ہے مگر یہاں نہیں کسی کسی معمولی باتوں پر دشمنیاں پالتے رہتے ہیں۔“

”دشمنوں کا بھی یہی حال ہے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ بات باری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں اس وقت کھیلنے نکل ہوئی تھی اور گھر سے کافی دور نکل گئی تھی جب شور مچا کہ دشمن قبیلے کے لوگ آ رہے ہیں۔ میں نے لوگوں کو خوفزدہ انداز میں ابھر ادا پھر

گمیں اس پر خوشی فراہم کرنا نہیں چاہتا۔

”تم ہماری فکر نہ کرو“ میں نے تو سوچا ہے، میں اب باپ لے کر کچھ لوگوں سے ملوں گی اور ہم مل کر کسی طرح سامنے کے پاس شہر جائیں گے۔ ہم فریاد دے کر ان کے سامنے آئیں گے اور انہیں یہاں کے حالات سے آگاہ کریں گے، انہیں گے کہ یہاں ہم پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے، انہیں یہ حالات کا پتا نہیں ہے۔ ورنہ وہ بھی یہ سب کچھ برداشت کرتے۔ سائیں مراد برے آدمی نہیں ہیں۔ سب دوسرے نہیں ہوتے۔ یہ خواہ مخواہ کا پردہ بگڑا ہے۔

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بھی طبقہ بولا نہیں ہوتا۔ ہر طبقے میں اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔“

”تجسس دوسرے تو اپنے باریوں کے لیے فرشتوں سے کم ہیں۔“ مولیٰ بولی۔ ”میں سائیں مراد کو نہیں جانتی۔ میں نے دیکھا تک نہیں لیکن ان کے بارے میں جو چہ باتیں میں نے ہیں، ان کی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ وہ ایک اچھے آدمی ہیں۔ لیکن انہوں نے دلبر خان جیسے آدمی کو تمہاری جھجکاؤ بھارتا دیا ہے، یہ کیا کم بڑی برائی ہے؟“ میں نے کہا۔

”یہ اس علاقے کی بد قسمتی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو مراد سے خود میل ملاقات کا موقع نہیں ملتا اور انہیں یہاں حالات کا صحیح پتا نہیں چلتا۔ وہ مصروف بھی بہت ہوتے ہیں۔ اصل زمین تو دوسری ہیں، یہ تو یونہی خالو کی ہیں۔ اور وہ دینے کا تو ان کو وقت ہی نہیں ملتا۔ وہ سیاست میں بھی حصہ ہیں۔ میں نے سنا ہے شہر میں بڑے مشہور ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے دیکھے لیے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے، تم بھی شہر سے آئے ہو؟“ اس نے گھورا۔

”نی الحال مجھے رہنے دو، سائیں مراد ہی کے بارے میں کرتی رہو۔“ میں نے مسکرا کر اسے ہانے کی کوشش کی۔ اس میری بات مان لی۔

”دلبر خان نے انہیں بڑی طرح اپنے جال میں جکڑا ہوا ہے وہ واپس اسی موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ ”اس نے سائیں مراد یقین دلا رکھا ہے کہ وہ یہاں کا انتظام بہت اچھا چلا رہا ہے اور ان کے علاوہ یہ انتظام کوئی چلا ہی نہیں سکتا۔“

”ان کا یہ یقین کیسا گہرا ہے، ان کا بہت بوجھ ہے۔ یہاں اوپر والا یہ یقین کیسے اپنے کاموں میں لگن ہے کہ بچے والا اچھا داریاں بڑے اچھے طریقے سے ادا کر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ اگر کچھ دلبر خان سے پتہ چلے کہ سائیں مراد سے ملاقات کرنے اور یہاں حالات سے انہیں اچھی طرح آگاہ کرنے میں کامیاب ہو جائے

لے وہ مجھے منہ بولی بیٹی بنا کر لایا ہے اور بیٹی ہی کی طرح پالنا چاہتا ہے مگر کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کرتا تھا لیکن اس نے سہرا مال مجھے باپ ہی کی طرح پالا ہے بلکہ شاید میں غلط کہہ رہی ہوں۔ میرا باپ بھی مجھے اس طرح نہ پالا۔“

پھر وہ جھرمجھری سی لے کر بولی۔ ”مگر میں اپنے ماں باپ کے پاس ہوتی تو شاید اس وقت بازو پر تچہ لگائے نہیں نہ کیوں بھوک مانتی پھر رہی ہوتی۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جو بھی باتیں کرتی تھی، ذرا نونے پھونے سے انداز میں کرتی تھی لیکن مفہوم کم و بیش یہی تھا جو میں بیان کرتا جا رہا ہوں اور اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ میرا یہ خیال ایک بار پھر پختہ ہو گیا تھا کہ ذہانت واقعی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ ذہانت ایک بھکاری کے گھر میں جنم لینے والی بچی یا بچے کے پاس بھی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے اپنی ذات کے اظہار کا موقع ملے۔ کوئی اس کے پاس بیٹھ کر اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جھانکے، اس کی بات سنے۔

ہمارے ارد گرد ان گنت لوگ ہوتے ہیں جن کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ انہیں کسی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا، ان کی سوچیں بھی نہ مکمل کئے والے پھولوں کی طرح ان کے ذہنوں میں مر رہا کر رہ جاتی ہیں۔ وہ بوبا کے اس لڑکی پر دوسرے احسانات تو اپنی جگہ سہی لیکن یہ احسان سب سے اہم تھا کہ اس نے اس لڑکی کو زبان دے دی تھی سوچنا سکھا دیا تھا۔

”تمہیں اپنے ماں باپ کی یاد نہیں آتی؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے آتی تھی لیکن پھر ان کی یاد سے زیادہ یہ بات یاد آنے لگی کہ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور پھر تلاش کرنے بھی نہیں آئے۔ اب صرف یہی بات یاد رہ گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا پھر کچھ چونک کر بولی۔ ”یہ تم نے مجھے کن باتوں میں لگا دیا ہے۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ۔ کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تم یہاں سے نہیں بھاگو گے؟“

”ہاں۔“ میں نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔ ”میرے اندر صدیوں چرائے انسانوں والی انا بیدار ہو گئی ہے۔ میرا یوں منہ چپا کر بھاگنے کو دل نہیں مان رہا۔ دوسرے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تم لوگوں کے گھر سے میرے بھاگنے کے بعد تم پر کیا کرے گی، تو میرا بھاگنے پر بالکل ہی ضمیر آزاد نہیں ہوتا۔ میری وجہ سے دیر باپا پہلے ہی بہت تکلیف اٹھا چکا ہے۔ لگتا ہے، دلبر خان نے مجھے جان بوجھ کر تمہارے ہاں ٹھہرایا ہے۔ اس میں دونوں طرح اس کے کینے انتقام کی تحسین کا سامان ہو سکتا ہے۔ اگر میں یہاں ٹھہرا رہتا ہوں تو اسے اپنی سازش پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر میں بھاگ جاتا ہوں تو اسے تم لوگوں پر اچھی طرح غصہ ٹکانے کا موقع ملتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کی غیث فطرت کو خوشی حاصل ہوگی

جن سے اس کی ذات کے دور تک پہلے ہوئے ویرانے کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔

”تم خواہ وعدہ نہ کرو۔ لیکن اگر میں زندہ رہی تو تمہارا انتظار کروں گی۔“ بالآخر وہ سرگوشی میں بولی۔

”کس لیے؟“ میں نے ملاحت سے پوچھا۔ اس کے آنکھیں دل پر بقیہ بہت سی خراشیں تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے ایک اور شخص لگے۔

”ضروری نہیں ہو تا کہ ہر انتظار کا کوئی مقصد ہو؟“ وہ سر جھکا کر اپنے دوپٹے کے پلو سے دھاکا کھینچتے ہوئے بولی۔ ”مجھے معلوم ہے، شرمیں کسی اور کو بھی تمہارا انتظار ہو گا۔ اس سے تمہارا کوئی وعدہ بھی ہو گا۔ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں لے رہی۔ میں اس قاتل ہوں بھی نہیں۔ ایک غریب، معمولی اور ممکن ہار لڑکی۔ میرے یہ نصیب کہاں کہ تم سے کوئی وعدہ لے سکوں لیکن تم مجھے اپنا انتظار کرنے سے قانع نہیں کر سکتے تھے۔“ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔

”دیکھو۔ شرمیں میرا کسی سے کوئی وعدہ نہیں ہے۔“ میں نے الجھن سے کہا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اپنے بارے میں اسے کس حد تک بتاؤں اور کس حد تک نہ بتاؤں۔

اس نے خود ہی میری الجھن حل کر دی۔ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہارے بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔ تمہیں کوئی مفاتیح پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم کوئی سیدھے سادے، غریب دیہاتی نہیں ہو لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ تم اصل میں کیا ہو۔ میں جانتا بھی نہیں چاہتی۔ تم سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی، تم کو بھی ہو، جہاں سے بھی آئے ہو، جب وہاں داپس جاؤ تو اس کبھی کبھی مجھے یاد کر لیا کرتا۔ شاید کبھی تمہارا واپس آنے کو اور مجھ سے ملنے کوئی چاہے۔“

وہ خاموش ہو گئی اور گویا دھیرے دھیرے ریٹکی ہوئی رات خاموش ہو گئی۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک جھوم تھا۔ الفاظ کا ایک رٹا ہونٹوں تک آتا تھا اور لوٹ جاتا تھا۔ ہر بات پر کی خیال آتا تھا کہ یہ مجھے اس سے نہیں کہنی چاہیے، اس کا کیا فائدہ۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے سراٹھایا اور سسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”یقین کرو، یہ سب باتیں کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو بس ہوئی چلی گئیں۔ اصل میں تو میں تم سے صرف یہی کہنے آئی تھی کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

پھر ایک لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ”تمہارا فیصلہ یہی ہے کہ نہیں بھاگے؟ مقابلہ کرو گے؟“

”ہاں۔ میرا فیصلہ یہی ہے۔“ میں نے دھمے مگر مضبوط لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

میری جان دلبر خان سے چھوٹ سکتی ہے۔“ وہ بولی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے کمزور سے وجود میں ایک انقلابی مدح چل رہی تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔

”اور تمہارا خیال ہے تم یہ کام کر سکتی ہو؟“ میں نے سسکاتے ہوئے پوچھا۔

”میں کوشش تو کر سکتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ مجھے کبھی آنکھیں

”وہ سات آٹھ سفید پوش سے دکاندار بھی کوشش کرنے آئے تھے جن کی پٹائی رکوانے کے لیے تم مجھے بھیجا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”دلبر خان کی صورت دیکھتے ہی ان کی گھٹکی بندھ گئی تھی۔ وہ دلبر خان سے بات کرنے، احتجاج کرنے منع ہوئے تھے۔ دلبر خان کی صورت دیکھتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور کاپٹن آوازوں میں جاتے لگے تھے کہ وہ تو چاہے اپنے کے لیے غصہ ہوئے تھے۔“

”کیا کریں۔۔۔ ان کی بھی مجبوری ہے۔“ موٹل حسانہ سے لہجے میں بولی۔ ”یہاں سب لوگوں کے ذہنوں پر دلبر خان کی دہشت ہی ایسی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس دہشت کو ان کے ذہنوں سے کھرچنے کے لیے کوئی بہت ہی طاقتور ہاتھ چاہیے۔“

”وہ ہاتھ تمہارا برہم حال نہیں ہو سکتا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”تو کیا تمہارا ہو سکتا ہے؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”ہو سکتا تھا۔“ میں نے دلبر خان کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ”دلبر خان کوئی ایسی توپ چیز بھی نہیں ہے۔ ایک معمولی سا بدعاش ہے۔ صرف کمزوروں پر ظلم اڑھانے والا۔“

”تو کیا تم اس کا کوئی علاج کر سکتے ہو؟“ اس نے پرامید لہجے میں پوچھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ مجھے یہاں سے بھاگنے پر تلے ہوئی تھی مگر اب جانتا چاہ رہی تھی کہ کیا میں دلبر خان کا کوئی علاج کر سکتا۔

”میں ان جھگڑوں میں برتا نہیں چاہتا۔“ میں نے صاف کوئی سے کام لیا۔ ”میری جان پہلے ہی نہ جانے کتنے جھگڑوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں بس دلبر خان کی یہ نورانی شقی والی خراش پوری کرنے کے لیے لڑا ہوں۔ اس کی۔ میں کیا چھپا ہے، وہ بھی دیکھا جائے گا۔ اگر زندہ رہا تو اس کے بعد میں آگے روانہ ہو جاؤں گا۔“

”اور اگر زندگی نے کبھی فرصت دی تو کیا لوٹ کر آؤ گے؟“ اس نے ایک لمحوں کی خاموشی رہنے کے بعد پوچھا۔

”شاید۔ یہ وعدہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ پلک جھپکاتے بغیر چند لمحوں کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک بیک صدیوں کی حتمی رنگ آئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی بالوں پر آنکھیں جیسے کسی ٹھنڈی دو ٹکڑے ٹکڑیاں بن گئی تھیں

"ظاہر ہے۔" میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔ "اب تک بھی وہی میری مخالفت کرتا رہا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بے آواز قدموں سے واپس چلی گئی۔ رات کے سناٹے نے ایک بار پھر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا لیکن اس سے زیادہ سناٹا میرے دل میں تھا۔ مولیٰ سے میرا ملنا کچھ ویسا ہی تھا جس کے لیے سارے لگاؤ تھا۔۔۔ مجھ سے ملنا خوشی کی بات تھی۔۔۔ مجھ سے مل کر اس رہتا ہوں۔۔۔ میں بھی اس اداوی کو سنے سے لگائے اس چارپائی پر سکرٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا جو میرے قدم کٹھ کے لیے پھولتی تھی۔

کہتے ہیں غنیمت سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ وہ تو ہر حال سولی بھی نہیں تھی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ اندر ہی اندر البتہ شاید میں اپنی الجھنوں کی سولی پر مصلوب تھا۔ دیر تک میں مولیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ انسان قطعاً پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ زندگی کے سفر میں کس کو شے میں اسے کس قسم کی شخصیت ٹکرا جائے۔ اپنے دل میں ایک بے عنوان سی لکک کو دبائے پلا خرمیں سوئی گیا۔

مجھے یوں لگا کہ میں بہت کم سویا تھا۔ کوٹھری میں کسی کی موجودگی کے احساس سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں تیزی سے اٹھنے لگا لیکن پھر دروازے پر دبو کو کھڑے دیکھ کر کشن نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ کھلے دروازے سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ دبو کا چوکھل سے زیادہ سو جا ہوا لگ رہا تھا۔ ٹیل بھی زیادہ نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے بے دار ہوئے دیکھ کر وہ کل سے زیادہ لگوا لگوا اور زیادہ گرا ہوا میرے قریب آ گیا۔ جو تین ٹھنڈی ہو کر شاید زیادہ تکلیف دے رہی تھیں لیکن وہ کل جتنا خوفزدہ نہیں تھا بلکہ کسی حد تک خوش سا نظر آ رہا تھا۔

"کیا تم کافی دیر سے میرے جاگنے کے انتظار میں کھڑے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں نے تو ابھی آکر دروازہ ہی کھولا تھا کہ تم جاگ گئے۔ بہت جلدی خیر ہے تمہاری۔ میں تو صرف دیکھنے آیا تھا، تمہیں جگانا نہیں چاہتا تھا۔"

"مجھے تو کافی پہلے جاگ جانا چاہیے تھا۔" میں نے کوٹھری میں آتی ہوئی دھوپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر میں نے بغور دبو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "تم کچھ کتنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے متورم ہونٹوں کے ساتھ ذرا مسکراتے کی کوشش کی۔ "میں تمہیں جگانا چاہتا تھا۔" معصوم انداز سے ہی دلبر خان کے پیچھے ہوئے آئی آگئے تھے۔ میرا ہونٹوں کی دوبارہ۔۔۔ پہلے سے زیادہ اچھے طریقے سے بنا شروع ہو گیا ہے۔ ہونٹوں کے قریب ہی درختوں کی چھاؤں میں زمین تھوڑی تھوڑی کھوکھ اور مٹی نرم کر کے ایک اکھاڑ بھی بنا دیا گیا ہے۔ دلبر خان نے تمہارے لیے بہت ساری چیزیں بھی بچھوائی ہیں۔ انڈے۔۔۔ کھن۔۔۔ دودھ۔۔۔ کھجی۔۔۔ مرغیاں۔ وغیرہ۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ ہمارے مہمان کو کوئی



|                        |           |       |
|------------------------|-----------|-------|
| اردو کے شاہکار سفرنامے | ضیاء ساجد | 200/- |
| منتخب مشہور سفرنامے    | ضیاء ساجد | 250/- |
| منتخب مشہور افسانے     | ضیاء ساجد | 150/- |
| منتخب اعلیٰ افسانے     | ضیاء ساجد | 125/- |

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور اس کی خوراک کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔"

میں مسکراتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ "لگتا ہے دلبر خان کو سندھ کا مہمان نوازی کی روایتوں کا خیال آ گیا ہے۔" میں نے جمائی لے کر کہا۔ "چلو خیر۔ آگے تو جو ہو گا دیکھا جائے گا، فی الحال تو اس کا مہمانیوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اب تم تینوں وقت اپنے اپنے خادم کو خوب زبردست کھانے کھاؤ۔ قریانی کے بکریے کو خوب کھا پلا کر مونا کرو۔"

جس قسم کی پُر مشقت زندگی آج کل گزر رہی تھی، اس میں مجھے کسی پرہیز کی ضرورت تو تھی نہیں۔ میں تو شرمیں بھی اپنے لیے مشتاق تلاش کیے رکھتا تھا تاکہ میرا جسم ایک آرام طلب دولت مند کا رنگ اکھڑ جسم نہ بن جائے۔

دبو ایک بار پھر کچھ شکر نظر آنے لگا۔ "چا نہیں یہ دلبر خان کیا پکڑ چلا رہا ہے۔" وہ بولا۔

"جو بھی پکڑ چلا رہا ہے، چلانے دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ ہر حال یہاں کے لوگوں کے لیے دلچسپ کا سامان کر رہا ہے۔ ہمیں بھی اس میں حصے لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں جو لکھا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔"

”چاہا! تم آرام سے جا کر لیٹ جاؤ اور اس بات کی بالکل پروا نہ کرو کہ تمہارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اپنے کام خود کرتا رہوں گا۔ جس چیز کی ضرورت ہوگی، مول سے لے لوں گا۔“ میں نے محبت سے اس کا کاندھا چھتھانے کی کوشش کی مگر وہ اس پر بھی کراہ اٹھا۔

”آرام سے لیٹنا ہی تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”دس سال کی عمر سے لے کر توج تک رات کی چند گھنٹے کی نیند کے سوا کبھی آرام سے لیٹ کر نہ کھایا نہیں۔ دکھ بیماری میں بھی آرام سے لیٹنا نصیب نہیں ہوا۔ یہ فرمائش تم مجھ سے مت کرو۔ اسے پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں آرام سے لیٹنا چاہتا بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں صرف اس وقت آرام سے لیٹوں جب مجھے موت آنے والی ہو۔ آرام ہو تو بس پھر بیٹھ ہی کے لیے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ اگر تم اسی طرح ہائے دہائی کرتے ادھر ادھر پھرتے رہنا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آؤ ذرا جھٹ پر چلیں۔“ میں نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کوٹھری سے نکل آیا۔ مول مجھے اس چھپرے نما حصے میں جو کچن کا کام دیتا تھا چلے ہی کے قریب بیٹھی نظر آئی۔ وہ گزشتہ روز کی طرح تنگ سے کچی زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بیٹھے کی مستقل جگہ دی تھی اور تنگ سے زمین پر لکیریں کھینچنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

میں قریب سے گزرتے دیکھ کر اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں شب رنڈ کا نثار تھا۔ دیر تک جاتے کے باعث اس کی پلکیں جو جھل چھیں اور ان بڑی بڑی آنکھوں میں گہائی ڈورے پھر رہے تھے لیکن اس کا چہرہ صاف تھا۔ بعض چیزیں شاید آجائے کی نسبت تاریکی میں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ذہانت کی وہ چمک جذبات کا وہ توج جو میں نے گزشتہ رات گلیے آنڈھیرے میں اس کے چہرے پر دیکھا تھا اب دن کے آجائے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں دینو کے ساتھ جھٹ پر پہنچا تو اس کے چھپرے رستوران میں اور اس کے آس پاس بڑی بڑی روٹی بڑی سرگرمی نظر آئی۔ کل جہاں قریب نے اپنے بچے کاڑے ہوئے تھے آج وہاں حقیر اپنی بارگاہی رہی تھی۔ چار آدمی بڑی تندہی اور مستندی سے میری پٹائی ہوئی وہ دیواریں از سر نو تعمیر کر رہے تھے جنہیں گرا دیا گیا تھا۔ چھتری مٹائی کی جانتی تھی اور قابل استعمال سامان کو بھاڑ پونچھ کر ٹھیک ٹھاک کر کے رکھ دیا تھا۔

دو گدھا گاڑیاں بھی قریب کھڑی تھیں۔ ان میں غالباً ضرورت کا سامان لایا گیا تھا اور وہ غالباً اب مزید سامان لانے کے لیے تیار تھیں۔ کچھ دور درختوں کی چھاؤں میں اکھاڑہ تو تقریباً تیار بھی ہو چکا تھا۔ اس کے ارد گرد باڑھ لگائی جا رہی تھی۔ اکھاڑے میں باڈی بلڈنگ کا سامان بھی ڈال دیا گیا تھا۔

”عجیب آدمی ہو تم۔“ دینو ایک رخسار پر ہاتھ رکھ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ عجیب آدمی تو میں ہوں۔“ پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی ذرا جھٹ پر سے دیکھ لوں گیا مرکز میاں ہیں پھر نہادو کر زبردست حس کا نشانہ بنایا جائے۔“ میں نے ایک انگوٹھی لائی۔ ”شکر ہے دینو چاہا! مجھے تمہاری مشقت سے تو ثابت ملی۔ اب دیکھ رہے ہو کیا حالت ہیں مابدولت کے؟“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے ادا افضل! چار دن تم نے ہماری خدمت کی اب ہمیں پتا نہیں کتنے دن تمہاری خدمت کرنی پڑے۔“ دینو کراہ کر بولا۔

”تغیر آؤ نہیں دینو چاہا! میں زیادہ دن کا سہان نہیں ہوں۔“ غالباً وہ یہ نہ ہو نہیں جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”میں تو ذائقہ کر رہا تھا۔ تمہاری خدمت میرے لیے روج نہیں ہے۔ بے شک تم ساری زندگی یہیں رہو۔۔۔ سرائیوں پر رہو۔ ہم ساری زندگی تمہاری خدمت کریں گے۔ ہم تو ذرا ہی بات پر کسی کے غلام بن جانے والے لوگ ہیں۔ تم نے تو پھر مجھے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔“

”احسان؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”میری وجہ سے تو نہیں اتنی تکلیفیں اٹھانی پڑ رہی ہیں اور آئندہ بھی نہ جانے کیا کچھ سہا پڑے تمہارے احسان سمجھ رہے ہو؟“

”ہاں۔ بات کو سمجھنے کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ تکلیف اور زحمت تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔ سمجھنے کی بات تو یہ ہے کہ تم ہمارے جھگڑے میں ہمیں پھانسنے کے لیے کدے تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ ہم اس بات کو نہیں بھول سکتے۔ توج کل دو سڑوں کے لیے اپنے آپ کو ڈھال بنانے والے لوگ کہاں ملتے ہیں؟ توج کل تو وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے بھائی اپنے بھائی کے گھر کو آگ لگتی دیکھ کر اپنے گھر میں دیک کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

اس نے میرے دل کی بات کر دی تھی۔ مجھے اس سے اتنی سمجھ اور کی توقع نہیں تھی۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ اب بعض لوگ بہت سخی اور عام سے نظر آتے ہیں مگر وہ بہت گہرے ہوتے ہیں اور بعض لوگ بہت گہرے دکھائی دیتے ہیں مگر وہ بہت سخی ہوتے ہیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پھر کراہتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اندھنی چوٹیں کافی شدید لگی ہیں۔ اس برعہاے میں اتنی چوٹیں برداشت کرنا آسان کام نہیں۔ میں صرف ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے چل پھر رہا ہوں ورنہ میری چلنے پھرنے والی حالت ٹھیک ہے۔“

تھا۔ انہوں نے کن انہیوں سے ہمیں دیکھا وہ پوری طرح منحرف اور چونکتا ہے لیکن بظاہر بے پروائی سے مثل رہے تھے۔ دلبر خان نے اپنی دانست میں مجھے نظر بند رکھنے کا پورا پورا بندوبست کیا تھا۔ غمرانی کرنے والے بھی غالباً ششوں میں کام کر رہے تھے مگر تاہم اور چاق و چوبند رہیں۔

میں نے دیکھ لیا کہ "ہم ذرا محظوظ قسم کا ہاشمیتاں کرنا اور اٹھانے کا اقتدار کر آئیں۔ دلبر خان نے اکھاڑ تیار کر کے اپنی پھرتی دکھائی ہے تو مجھے اس کو استعمال کرنے میں بھی پھرتی دکھائی جا رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" دیکھ کر سمجھاتے ہوئے بولا۔

"بازئی بلندنگ کا سامان دیکھ کر جسم ذرا چمکے گا ہے کہ اسے استعمال کر ہی لیا جائے۔ برا ہی عجیب قسم کا جسم دیا ہے اللہ نے مجھے ہر وقت زیادہ سے زیادہ مشقت مانگتا رہتا ہے۔ جتنی مشقت کرتا ہوں اتنی ہی ٹھیک رہتا ہوں۔ چار دن عیش و آرام سے گزار لیتا ہوں تو بری ہے جیسی ہی رہنے لگتی ہے۔ ویسے بھی اگر میں انکی سے تیار دیکھو شروع کروں گا اور دلبر خان کو اس کی خبر ملے گا وہ برا خوش ہو گا کہ میں سنجیدی سے اپنے کام کر رہا ہوں۔"

میں نے جواب دیا۔  
"تمہیں کون سا اس سے صحیح مقابلہ کرنا ہے جو تیار ہوں گی بات کر رہے ہو؟" دیکھتے ہوئے بولا۔ "دلبر خان تو صرف تمہارے قد کاٹھ اور ورزشی جسم کی وجہ سے تمہیں پھلانگ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔"

یہ بالکل یہ مستعدی بہت بھلی لگ رہی تھی کیوں کہ کچھ بگڑا نہیں بنا دیکھا اسے رہا تھا۔ میں آج کل چونکہ کچھ ٹھنکن وقت گزار رہا تھا شاید اس لیے ذہن پر غور سے خیالات کی کچھ زیادہ ہی بیلار تھی۔ اپنے سامنے اس چمکتی سی مثال کو دیکھ کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہمارے ہاں دساکل طاقت اور اختیار رکھنے والے لوگ واقعی "تغیر" اور صرف "تغیر" پر کمر بستہ ہونا چاہیں تو کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا کچھ تغیر نہیں ہو سکتا۔

دلبر خان کی شہرہ آفاق میں نہیں تھا مگر جب حیرت اور غصہ پر آڑا ہوا تھا تو بی بیائی بھتیجیاں اس کے ہاتھوں آجڑا سکتی تھیں۔ لوگوں کی زندگیوں پر یاد ہو سکتی تھیں۔ البتہ وہ خواہ اپنی کسی غرض یا سازش کے تحت ہی ذرا سی "تغیر" پر آمادہ ہوا تھا تو یکدم جیسے کبھی کا یہ گوشہ خوبصورت، بارودنی اور تیار آباد سا نظر آنے لگا تھا۔

اگر ہمارے ہاں دلبر خان سے نہیں زیادہ بڑے نہیں زیادہ با اختیار نہیں زیادہ طاقتور اور کہیں زیادہ بادیلوں کو بھی قوی ہوئی، انہیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل، سازشوں، سازشوں اور اپنے اپنے مفادات کے لیے لڑنے مرنے سے فرصت ملتی اور کسی مجرے کے تحت ان کے دلوں میں بھی تغیر کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ لوگوں کے لیے کچھ کرنے اور ذرا سی بھی قربانی دینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا؟ میرے خیال میں تو اس ملک اس معاشرے کا نقشہ ہی بدل سکتا تھا۔

زمانہ کچھ ایسا کن لگا ہے کہ آج کل قریب بات پر ملک اور معاشرے وغیرہ کے بارے میں سوچنا بھی بیماری سمجھا جاتا ہے۔ مجھے تو یہ بیماری کافی عرصے سے خاصی شدت سے لاحق تھی۔ سراسر میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر دیکھ کر طرف دیکھا اور کہا۔ "مبارک ہو۔ اردو بازار کو کافی ہوئی، کئی آدمیوں کو چونش بھی کھائی پڑی لیکن نتیجہ اچھا نکلا۔ کچھ بگڑنے کے بعد کچھ بن رہا ہے۔"

"لیکن مجھے اب بھی خوف آ رہا ہے۔" دیکھ بولا۔

"مقصود تمہارا نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں نے آج تک کچھ نہ کچھ نوٹے بگڑتے ہی دیکھا ہے۔ کچھ بننے دیکھتے ہیں تو دل زرنے لگتا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا۔"

"یہ مسکراتے کی بات نہیں ہے۔" دیکھ کر ہی سنجیدی سے بولا۔ "دلبر خان کسی کا بھلا چاہے کسی کو کچھ بنا کر دے؟ یہ اس کی فطرت نہیں ہے۔"

"چلو خیر۔ وہ بھلا کر تو دے رہا ہے۔ سنی الماں تو ذہن میں تک رکھو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اس سے آگے کیا ہو گا؟ یہ ابھی مت سوچو۔"

مکان کے گرد چار آدمی اس وقت بھی کلا شکوہ نہیں لے کر گشت کر رہے تھے اور یہ وہ نہیں تھے جنہیں میں نے مگر گشت رات دیکھا

فکائیہ ادب میں منفرد اہمیت کے حامل  
ادیب اعتبار ساجد کی نئی تصنیف

ایمر جنسی وارڈ

قیمت: -/80 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2



دیا۔ پھر اس نے لنگوٹ اور نیکر منڈا نہ انداز میں میری طرف بڑھا دی۔ دونوں چیزیں نئی تھیں۔ نیکر خاصی خوبصورت تھی اور ریڈی میں مضمون ہوتی تھی میں دلبر خان کے انتظامات پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے ہاں ہر چیز کا پچھلے ہی سے بندوبست تھا۔ وہ گویا کوئی کمی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمبے سوچا پھر وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیں اور اُدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ ”آرام سے گھر جا کے یمن آئیں سائیں! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

میں ایک بار پھر گھر کی طرف چل ڈیا۔ چاروں کلا شکوف والے اس دوران اکھاڑے کے گرد جم کر کھڑے ہو چکے تھے لیکن جوئی میں اکھاڑے سے نکلا، وہ ایک بار پھر میرے ساتھ ہو گئے۔ وہ ایک لمبے کے لیے بھی مجھے اپنے دائرے سے نکلنے نہیں دے رہے تھے۔

گھر جا کر میں نے ایک ڈبا لٹا ہوا تھوڑے دم میں لنگوٹ لگا کر مائیں کی فرمائش کے مطابق تیار ہو کر دوبارہ اکھاڑے میں آیا۔ اس نے تیل کا ایک چلو بھر کر میرے جسم پر دو ہنتر سا مار کر تیل کو پھیلایا اور جوش و خروش سے ماش شروع کر دی۔ وہ پیش دریا نشیا مضمون ہوتا تھا اور لگا ہی تھا کہ اسے پہلوانوں کی ماش میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے اپنے ہاتھوں میں خاصی جان اور مہارت تھی۔ وہ کچھ اس طرح رگ پھوں کو چھیڑتا جانتا تھا جس طرح ماہر بہار نواز ریلو کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔

ساتھ ہی اس کی تعیدہ گولی بھی جاری تھی۔ ”واہ سائیں واہ! کیا سوتا بدن ہے آپ کا۔“ پھر اس نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دی۔ ”نہیں سائیں! سوتا نہیں۔ فولاد ہے فولاد۔ سوتا تو نرم ہوتا ہے۔“

اس کی ماش نے جسم میں واقعی ایک نئی حرارت دوڑا دی تھی۔ اس نے مجھے اونٹن چالنے کی ہدایت کی اور کچھ اس طرح رگڑے لگائے لگا چیسے بڑھی رہنے سے کسی بڑے سے شہتیر کو چھیل رہا ہو۔ نرم، ٹھنڈی اور سوندھی مٹی کا لمس مجھے بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے پیچے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ اپنے ہاتھ مجھے واقعی ہاتھوں کے بجائے نیچے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے ایک بار پھر کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے میرے اندر کوئی حیوانی قوت سر اُبھار رہی تھی۔ ذہنی میں یہ احساس بھی کبھی اچانک ہی نہ جانے کیوں میرے ذہن کو کسی انوکھے شمار کی طرح گرفت میں لینے لگا تھا۔

”سائیں! ہوشو خان اس فولادی جسم کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گا۔ آپ کا ہر پٹھا فولاد ہے۔“ مائیں اپنی تعیدہ گولی جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”کیو اس مت کر۔“ میرے حلق سے عجیب غراہٹ ناسی آواز نکلی۔ ”اس دنیا میں کوئی جسم نہ سوتا ہے نہ فولاد۔ یہ صرف

”تھوڑی بہت اٹھا بیچ بھی آتی ہے مجھے۔“ میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔“

”میں نے کہا تھا کہ میرا جسم تو مشق کے لیے بے چین رہتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ لوگوں کو ہانسنے کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہے۔ یہ سارا لوگوں کو بے وقوف بنانے کا ہی ذوق ہے۔“

میں اس کے ساتھ نیچے آ گیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہی میں نے کہا۔ ”ماشا خدا دیر سے تیار کرانا اور جب تیار ہو کر آئے تو مجھے بلا لیتا۔“

میں نے چپے ہی دروازے سے باہر قدم رکھا، مکان کے آگے والے دونوں کونوں سے دو کلا شکوف ہوا دروازے میرے لیے کھلیے ہوئے نظر آئے۔ دروازے کے انداز میں میرے ساتھ چلتے گئے۔ درحقیقت ان کی نظر مجھ پر اور ان کی ٹھیک کے قریب ہی تھی۔ اسے ہی لے دے دے دو کلا شکوف ہوا دروازے بھی لپک کر آن پہنچے۔ ہوں گے مجھے سے کچھ بھی نہیں کہا لیکن غیر محسوس سے انداز میں مجھے گھیرے میں لے کر چلتے گئے۔

میں پھر رستوران کے گرد گھومتا ہوا اکھاڑے کی طرف چلا۔ وہاں کام کرتے ہوئے لوگ کن انکھیں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اکھاڑے کے گرد دو آدمی چہرہ بانش گاڑ کر ہلکی ہلکی سی آواز تقریباً تیار کر چکے تھے۔ اکھاڑے میں آمدورفت کے لیے ہولن نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔

میں اکھاڑے میں داخل ہو کر وٹ اور ڈبلز وغیرہ کا جائزہ لینے لگا اور دیکھنے لگا کہ میرے لیے ہر چیز میں کتنا وزن کافی رہے گا۔ ابھی ان چیزوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ محل چل کر ایک سیاہ فام دروازہ قدامت سامنے نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا اور اکھاڑے کی آواز۔ وہ تیرے لنگوٹ، تیل کی شیشی اور سرخ رنگ کی ایک نیکر وغیرہ اٹھاے ہوئے تھا۔

”ایسے نہیں سائیں۔“ وہ خوشامد سے انداز میں اپنے لیے چلے پھر دے والوں کی فرمائش کرتے ہوئے بولا۔ ”پہلے لنگوٹ کس کسے اس کے اوپر لال رنگ کی یہ نیکر پہن کر آئیں۔“

”میں آپ کے بدن پر تیل کی ماش کروں گا۔ پھر آپ کمرٹ کر کے کھڑے ہوئے گا۔“

”کون ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔

”میں آپ کا مائیں ہوں سائیں۔ مجھے دلبر خان نے بھیجا ہے۔“

”کب کی خدمت کروں گا۔“ اس نے باجھیں کھلاتے ہوئے جواب

”سائیں! یہی بات بتاؤ؟“

”ہاں۔ خوشامد نہیں چاہیے۔“

”سائیں! اس میں شک نہیں کہ طاقت اس میں بہت

اتنے موٹے اور نعل نعل کرتے آدمیوں میں اتنی طاقت

نہیں ہے۔ اور وہ کچھ زیادہ کسرت و فیر ہو بھی نہیں سکتا لیکن

قدرتی طور پر یہ وہ کچھ جہات قسم کی چیز ہے۔“

گویا اور بھی کچھ ویسا ہی ”قدرتی“ سا معاملہ تھا میرا

ساتھ تھا۔ دیکھنے کو زیادہ طاقتور آدمی قرار نہیں دیا

اس کا خیال تھا کہ اتنی جسامت کے آدمی میں تھوڑی بہت طاقت

ہونی چاہیے تھی لیکن بالمشق کے باتوں سے غلام ہوتا تھا کہ

خاصا طاقتور آدمی تھا۔ دیکھ کر اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے سیاہ قلم ہاتھ سے پوچھا۔

”میرا نام حاکم ہے سائیں!“ وہ باجھیں پھیلاتے ہوئے بولا

”ہاں باپ بھی کبھی کبھی برا بھلا کرتے ہیں۔ غلاموں کا نام

رکھ دیتے ہیں۔“ گفت اور بھی بات کر گیا تھا۔ شاید اتنا احمق

تھا جتنا شکل سے نظر آ رہا تھا۔

”حاکم! تمہیں تمہاری سب سے پیاری چیز کی قسم کھا چکا

اور اور حاکم کی مت بالکل کیا تمہارے خیال میں ہوشو خان نے

سکا ہے؟ دل رکھنے والی بات مت کرنا۔ کبھی یہاں کہہ دو کہ

خان کا تو مجھ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں میں تو ایک ہاتھ سے اسے

دونوں گانوں اور ہوشو خان کے پاس جا کر میرے بارے میں پوچھ

میں تو اس کے ایک ہاتھ کی مار ہوں۔“

”نہیں سائیں! میں تو جو کھوں کا خدا کو حاضر ناظر مان

کوں گا۔“ وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میں

پہلے بھی آپ سے یہ نہیں کہا کہ ہوشو خان کمزور آدمی ہے۔

ایک ان پڑھ جاہل سا آدمی ہوں۔ میری جتنی سمجھ ہے اس

حساب سے جو مجھے ٹھیک لگا وہ میں نے بتا دیا۔ وہ غلط بھی ہو

سکتا ہے۔“

”اسی لیے تو میں تم سے رائے لے رہا ہوں۔ تم کوئی

ٹھیک ہی لگے ہو؟“ میں تھوڑے سے خوشامد ہی ہوں۔ ”میں نے

بات اس پر ظاہر کر دی۔

اسے گویا جھکا سا لگا۔ اس صدمے سے سنبھلتے ہوئے وہ مجھ

لیے میں بولا۔ ”سائیں! آپ نے تو میرا دل ہی توڑ دیا۔ میں

خوشامد ہی ہوتا تو شاید ہوتا بلکہ دلبر سائیں کا کوئی خاص

ہوتا۔ میں نے تو یہی کچھ کہا تھا جو دل میں محسوس کیا تھا۔

غلط تھا یا صحیح۔“

”جھٹو! مان لیا۔ اب تم میرے سوال کا جواب دو۔“ میں

کہا۔

”سائیں! آپ اتنے بڑے پهلوان ہیں۔ شر میں آپ

دلیک کے اتنے بڑے بڑے مقابلے جیتے ہیں۔ آپ کو تو خود

مٹی ہے۔ مٹی جسے اس مٹی میں مل جاتا ہے۔“ میں نے سوچ

سوچ کر خوشبو دینے والی نرم مٹی کی ایک ٹھکی بھر کر اس کے سینے پر

کھینچ ماری۔

وہ ایک لمبے کے لمبے خاموش ہو کر حیرت سے منہ کھولے

میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ایک رخسار مٹی پر ٹکا کر آنکھیں بند

کرتے ہوئے کہا۔ ”اس دنیا میں کوئی نہیں شطرنج بدلتا ہے کسی

کا بدن چاندی اور کسی کا بدن چاندی نظر آتا ہے کسی کے جسم کو

ہم سوتا کتے ہیں اور کسی کے جسم کو فلاں لیکن یہ سب مٹی کی

ڈھیراں ہیں۔ چلتی پھرتی ڈھیراں۔ تمہیں کبھی قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی

اور تھوڑے قبروں میں جھانکنے کا موقع تو جھانک کر دیتا۔

تمہیں ٹھوٹی پھوٹی اور کئی مڑی چند پڑیاں مٹی میں رستی نظر آئیں

گی۔ ان میں سے کوئی کبھی شطرنج بدن تھا۔ کوئی چاندی بدن۔ کوئی

سونا بدن اور کوئی فلاں بدن۔ انعام سب کا یہی ہوتا ہے۔ مٹی بھر

پڑیاں باقی رہ جاتی ہیں جنہیں دیکھ کر جیت بھرے کتے بھی گھبرا

کھاتے ہیں۔“

میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود تھا۔

ایک کبھی اس کے گلے منہ کے قریب جھینٹا کی تودہ چوٹا اور ہاتھ ہلا

کر اسے اڑاتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! آپ کی بات تھوڑی

تھوڑی سمجھ میں آئی ہے لیکن جتنی سمجھ میں آئی ہے اتنی ہی کافی

ہے۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی پهلوان کے

منہ سے ایسی باتیں نہیں سنی۔ دیکھو نعل نعل کرتے گوشت کا پھاڑ

ہے مگر وہ بھی اپنے بدن کو فلاں کہتا ہے۔“

میں ہنس دیا پھر میں نے لیٹے لیٹے اس کی سیاہ کلائی اپنی

گرفت میں لے لی۔ وہ بڑی طرح گراہ افشاں میں نے اس کی کلائی

پلاتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہارے بدن کو کیا کہیں گے؟“

”کوئی نہ بدن۔“ وہ ہلا تاں ہلا بولا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آئی۔

آدمی ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا بڑے سے بڑا

آدمی اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے مگر وہ خوش فہم

معلوم نہیں ہوتا تھا البتہ کچھ خوشامد ضرور تھا۔

وہ کراچے ہوئے بولا۔ ”سائیں! میری کلائی چھوڑ دیں۔ ٹوٹ

جائے گی تو ماش کے کاٹل نہیں رہوں گا۔ دلبر سائیں میرا خرچہ پانی

بند کر دیں گے۔ مفرد لوگوں کو وہ اپنے آس پاس بالکل برداشت

نہیں کرتے۔“

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ اسے سہلانے لگا پھر وہ

جھکے دسے کر دوبارہ ماش میں جٹ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے

ہوشو خان کی بھی مالش کی ہے؟“

”بہت دفعہ کی ہے سائیں!“ اس نے جواب دیا۔

”اور اس کی کشتیاں بھی دیکھی ہیں؟“

”ہاں سائیں! ہر کشتی دیکھی ہے۔“

”کیسا پهلوان ہے وہ؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

دارم اب کرنے لگا۔ حاکم آلتی پالتی ہارے بیٹھا ایک تک میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے جو لنگ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”حاکم! کیا واقعی ان ملاقوں میں لوگ فری اسٹائل رینگنگ شوق سے دیکھنے لگے ہیں؟“

”ارے صاحب! کچھ نہ پوچھیں۔ رینگنگ کے قواعد اور لوگ دہرائے ہیں۔ مرد تو مرد بہت ہی غور میں شوق سے دیکھتی ہیں۔ اور حرمین چار جگہوں پر بی بی وی موجود ہیں۔ ویسے بھی شام کو بی بی وی دیکھنے کے لیے ان سب جگہوں پر جھڑ لگ جاتی ہے۔ ایک بی بی وی تو اندر کھینچ میں ایک دوسرے سے ہوش میں بھی ہے اور صرف بی بی کی وجہ سے اس کی کمانی اپنے دوجے کے اس ہوش سے کم سے کم چھ گنا زیادہ ہے۔ وہ بی بی دیکھانے کے بھی پیسے لیتا ہے۔ جس دن رینگنگ کا پروگرام ہوتا ہے اس دن تو بی بی وی پر رش بہت زیادہ جاتا ہے۔ مردوں نے بی بیوں کی ریسز دیکھ کر اور فحش کی لڑائی مرغیوں کی لڑائی اور ملاکڑا دیکھنے کے لیے جانا کم کر دیا ہے۔ کبھی کبھار کہیں دی سی آر پر کوئی آس پاس کے ملک کی فلم یا رینگنگ کی کوئی فلم لگ جاتی ہے تو اس دن لوگوں کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔“

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”کیا کریں سائیں! اور لوگوں کی بی بی تفریح ہے“ یہی غیاشی ہے۔ ”شہروں میں تو۔۔۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”شہروں میں بھی لوگوں کی بی بی تفریح ہے بھائی! بی بی سی آر پر فلم دکھائی دی کے آگے لیٹ جاتے ہیں۔ وہاں بھی اور کیا رکھا ہے؟ وہاں بھی لوگ گھروں سے نکلے ہوئے ڈرنے لگے ہیں۔ جو دو چار تفریح گاہیں ہوتی ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر لوگوں کے دل بھر جاتے ہیں اور ان کی حالت بھی دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ پارکوں میں خاک ڈھونڈتی ہے۔ کھیل کے میدانوں میں چرسوں اور ہیروین پینچروں نے ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں۔“

”چھ سائیں! ایسی بات ہے؟“ حاکم نے حیرت سے آنکھیں پھیلانے ہوئے پوچھا۔

”شہر کی تفریح گاہوں میں ہمیں شہری لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ گھر سے باہر کے دیوالوں سے یا چھوٹے چھوٹے شہروں سے آئے ہوئے لوگ زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان ہی کے لیے ان جگہوں میں تھوڑا بہت تنہا ہی اور دلچسپی ہوتی ہے۔“

”سائیں! آپ کراچی سے آئے ہیں؟“ حاکم کی آنکھوں میں ایک نئی چمک ابھری۔ میرے خیال میں دلیر خان نے اسے یہی بتایا تھا۔ میں نے اثبات میں ہی جواب دیا۔

”اللہ کرے آپ کتنی جیت جائیں سائیں!“ وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا۔ ”اور جب آپ جیت کر واپس کراچی جائے گئیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلیں میں آپ کی بی بی خدمت کروں گا سائیں!“

کافی تجربہ ہو گا کمانی اندازہ ہو گا۔“ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ دلیر خان کی بددیانتی، مشہوری حرکت میں آچکی تھی۔ اس نے مجھے ”عظیم ریسلر“ مشہور کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنا ہر کام پروگرام کے مین مطابق اور بہت تیزی سے کر رہا تھا۔ حاکم نے چار شاہی سوچ بھی نہیں سنا تھا کہ میں نے کبھی رینگنگ میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو یہ تجربہ بھی ضرور ہو گا کہ اگر کشش جی اور اصل جی ہو تو میدان کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کی جاسکتی کہ وہاں کیا ہو گا۔ خاص طور پر فری اسٹائل کشش میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بعض اوقات کردار پهلوان کا بھی کوئی زبردست واڈ لگ جاتا ہے۔ کبھی بھی بڑے پهلوان کو کوئی خطرناک چرٹ لگ جاتی ہے۔ آپ کے اور وہ شو خان کے بارے میں بھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اگر آپ نے اس کو کوئی بے ایمانی کرنے کا موقع نہیں دیا تو آپ اس کو ہرا بھی سکتے ہیں۔ اگر اس نے کوئی بے ایمانی کر لی یا اچانک وہ کوئی خطرناک واڈ لگانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ جیت بھی سکتا ہے۔ بہر حال میں یہی کہوں گا کہ اسے ہر اٹا کوئی اتنا زیادہ آسان کام بھی نہیں ہے۔“

اس کی رائے دیکھ کر رائے سے کافی مختلف تھی اور مجھے یہ حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی تھی۔ حاکم نے ہوش کو زیادہ قریب سے دیکھا ہوا تھا اور وہ بالکل سچا تھا۔ پھر اس نے ایک اور ایسی بات بتائی جس کی وجہ سے میں اس کی رائے کو زیادہ وزن دینے پر مجبور ہو گیا۔

اس نے شریلے سے لیجے میں بتایا۔ ”سائیں! میں تو خود پهلوان بننا چاہتا تھا۔ بڑا شوق تھا مجھ کو چھاتی چوڑی کر کے اور گرز کھڑے پر رکھ کر اکھاڑے میں اترنے کا یقین دو پاؤں سے مار کھا گیا۔“

”تو کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک غوث“ دوسرے قد۔ ”اس نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ ”غوث کا یہ عالم تھا کہ صبح کھاتے تھے تو یہ پتا نہیں ہوتا تھا کہ شام کو کہاں سے کہاں گئے۔ پهلوانوں والی خوراک تو کیا کھاتے؟ دو کھانے بھی بڑی مشکل سے میسر آتی تھی۔ قد بھی آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس قد کے آدمی کو تو لوگ کوئی ہی نہیں سمجھتے پهلوان کیا سمجھیں گے۔“

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آئی۔ وہ بھی فٹس دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”سائیں! میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ آج پہلی بار آپ کو دیکھا ہے لیکن آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔“

”جیت شہرے بھائی!“ میں نے آٹھ کر اس کا کدھا چھپکنے ہوئے کہا۔ ”آج کے دو دیش کوئی بغیر غرض کے کسی کو اچھا لگ جائے یہ اس کی خوش قسمت ہے۔“

میں آٹھ کھڑا ہوا اور ہلکی ہلکی ورزش کے ذریعے اپنے آپ کو



دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے پرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا پھر تیل "ہستے اور مٹی میں تھڑے ہوئے میرے کندھے تھکتے ہوئے بولا۔ "ہمت اچھے افضل خان صاحب... ہمت اچھے... اچھی تیزی سے ہم اپنے حصے کا کام کر رہے ہیں" اچھا ہوا کہ آپ بھی اسی تیزی سے حرکت میں آگئے ہمیں جلد ہی ملائے کے لوگوں کو ایک بہت بڑی تفریح دینی ہے۔"

"میں تو ترجیح بھی مقابلے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری طرف سے تو خواہ توجہ شام کو ہی رکھ لیں مقابلہ۔"

"ہمیں آپ سے یہی امید تھی خان صاحب" دلبر خان شاید لوگوں کو ننانے کے لیے مجھ سے بہت مضبوط انداز میں بات کر رہا تھا۔ "لیکن ہمیں اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ ہمیں بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔"

"آپ کی مرضی۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اٹکا دیے اور ذمہ دار تھا کہ ایک بار پھر ورزش کرنے لگا۔ وہ میرے جسم میں چلتے ہوئے پتھوں کو چند لمبے غور سے دیکھا رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو ایک ٹائٹ کے لیے مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سے جذبے کی پرجائیں نظر آئی جسے میں کوئی نام نہ دے سکا۔ وہ حسد بھی ہو سکتا تھا، کینکھی بھی، سازشیت کی خواہش بھی۔ ممکن ہے وہ کوئی اور جذبہ رہا ہو۔ بہر حال جو نمی میں نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں سے وہ پرجائیں معدوم ہو گئی اور اس کے چہرے پر دوبارہ وہی دوستانہ اور تخلیقی مسکراہٹ چیل مٹی جو پہلے ہی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ آنے والے کلا مشکوف برداروں میں سے ایک نے جھوم کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کے سے انداز میں بتانا شروع کر دیا تھا کہ ان کے حسن و صبا دلبر خان نے ان کی تفریح طبع کے لیے ہو شر خان کے ساتھ ایک زبردست اور یادگار مقابلہ منعقد کرانے کی غرض سے کتنے بڑے ریسر کو بلوایا تھا "اب وہ عظیم ریسرمان سب کا صمان تھا اور اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا سب کا فرض تھا۔

دلبر خان کے ساتھ جو شخص گلے میں کیرا ڈالے آیا تھا اس نے کیرا سیدھا کر لیا تھا اور فوس دغیو صحیح کر کے مجھے پوز دینے کے بارے میں ہدایات دینے لگا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے دلبر خان سے پوچھا۔

"بہن!۔۔۔ وہ... ہم ایک بہت اچھا سار تھیں جو ستر بھی چھو رہے ہیں نا۔" دلبر خان نے ذرا فخر سے بتایا۔ "وہ ہماری کئی میں... آس پاس کے سارے علاقوں میں" دیواروں پر "درختوں پر" ہوٹوں "چائے خانوں میں" دکانوں میں اور دوسری خاص خاص جگہوں پر لگا جائے گا۔ آنکھوں پر بورڈنگ کرنا دی کرادی جائے گی۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ آدمی ان رتھ ہو، چال ہو، بہر وقت ہو، بے ہنر ہو تب بھی جھگڑے کا پتہ بھی بن کر رہنا بھی ممکن نہ رہا۔ اسے بہت مشکل محسوس ہونے لگا ہے۔ پھر اس نے گویا اس قسم کے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے تیل کی لکٹی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "سائیں! میں آپ کی اور مالش کر دلاؤ؟"

"خدا کا خوف کرو یا ر حاکم! میں نے جلدی سے کہا۔ "مالش بھی بہت ہو چکا ہے اور تیل میں بھی تم نے مجھے سٹلا دیا ہے۔"

میرے انکار کے باوجود وہ تیل کی شیشی لے کر میرے قریب آئے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "کشتی والے دن بھی آپ اچھی طرح تیل کی مالش ضرور کر کے جائے گا۔ آپ ہو شر خان کے قابو میں نہیں آئیں گے، چمکی کی طرح پھسل کر نکل جائیں گے۔"

"اگر اس نے بھی مالش کر رکھی ہوگی تو وہ بھی اسی طرح نکل جائے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ نکل کر کہاں جائے گا؟ اس میں پھرتی بالکل بھی نہیں ہے۔" حاکم نے بتایا۔ بہر حال اس نے مجھے بخش دیا، مزید مالش پر اصرار نہیں کیا اور اکھاڑے کے ایک گوشے میں پاڑھ کے قریب جا بیٹھا۔ پاڑھ اب مکمل ہو چکی تھی لیکن کام کرنے والے وہیں کھڑے ہو کر مجھے ورزش کرتے دیکھ رہے تھے۔ کھینڈوں پر جاتے یا ٹیڈ کھینڈوں سے آئے ہوئے کچھ اور لوگ بھی ٹرک چکے تھے۔ اچھا ٹھانسی مالگ چکا تھا۔

میں نے ورزش جاری رکھی۔ مجمع دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ کیا کہ اس میں کچھ عورتیں بھی شامل ہو گئیں۔ دو سب لوگ آنکھوں میں خاموش حیرت، رشک اور نہ جانے کن کن جذبات کے اخراج کے ساتھ ایک تک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اب یوں ایک جھوم کا مرکز لگا، ہنا قطعاً عجیب محسوس نہیں ہو رہا تھا اور مشقت سے اپنے جسم کو پانی پانی کرنے میں بھی مجھے لطف آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب میں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر بھجور دیا ہے تو اب میں ہر چیز سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔

اچانک دور سے دلبر خان کی جیب دھول آڑا قی آئی دکھائی دی۔ اس طرف سے جھوم خور کالنی کی طرح پھٹ گیا۔ چند لمبے بعد جیب اٹھا کر کے قریب آکر رکی۔ میں نے ورزش جاری رکھی۔ جیب دلبر خان خود ذرا سید کر رہا تھا۔ ایک کلا مشکوف بردار اس کے ساتھ والی سیٹ پر اور ایک پیچھے موجود تھا۔ پیچھے سٹالوا اور لہا سا ایک دھات چٹا شخص اور بھی تھا جس کے گلے میں کیرا لٹکا ہوا تھا۔

دلبر خان کے آتے ہی جھوم میں باتوں کی، جھنجھٹا ہٹ ختم ہو گئی اور کراسکوت چھا گیا۔ صرف میرے ورزش کے آہنی سامان کی ٹھکناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ دلبر خان جیب سے آڑا کر اکھاڑے میں آ گیا۔ میں نے ورزش روک دی۔ اس کے ہونٹوں پر

اپنے آپ کو عظیم فوٹو گرافر ظاہر کرنے کی جدوجہد کرتے، کیرے سے آنکھ لگا کر بلا۔ ”دور ایکشن تو دیکھ۔ آپ کے سے تو پتا ہی نہیں چل رہا کہ آپ نے کوئی خاص وزن اٹھایا ہے۔“

میں نے وٹ اچانک نیچے پھینک دیا۔ وہ خوفزدہ سے اوجھڑا اچھل پڑا۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں ریسرے ایکٹر نہیں۔“

اس بار اس نے رحم طلب انداز میں دلبر خان کی طرف پھر گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ نے تو بارہ کے کلین بھی مقابلے کیے ہیں۔ لی دی پر بھی دیکھے ہوں گے۔ آپ نے نہیں بارہ کے ریسرے کتنے اچھے ایکٹر ہوتے ہیں۔“

میں نے استہزاء سے انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر نیو یارک سے ہی ہٹا لیا ہوا کسی ورلڈ کلاس ریسرے یہاں میڈیسن اسکوائر گارڈن والا اسٹینڈرڈ لانا چاہتے ہو؟“

اس بار جواب دلبر خان نے دیا۔ وہ قہقہے سے منگرتے ہوئے بولا۔ ”کوشش کرو کیونکہ میں کیا حرج ہے۔“

میں نے مصنوعی ہانکواڑی سے وٹ اٹھاتے ہوئے اور دل میں فوٹو گرافی کیلپیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کچھ ”یکم دینے کی کوشش کی۔ وہ کیرے کے دیو فائٹرز میں میرا عکس دکھتے ہوئے طمانیت سے بولا۔ ”ہاں۔ آپ اپنی تابعدار“

ایک تصویر اس نے مجھے بالکل سیدھے سادے انداز میں کر کے کھینچی اور ایک اس طرح اٹھائی اٹھائے ہوئے کھینچی جیسے کسی کو پتہ چلے رہا ہو۔ اس کے لیے اس نے مجھے چہرے پر سے زیادہ خوفناک تاثرات لانے کی ہدایت کی۔

بالآخر تصویریں کھینچنے کا مرحلہ سر ہو گیا۔ اس دوران میں بڑھ چکا تھا اس میں ہر عمر کے لوگ، بچے، عورتیں، بوڑھے تھے۔ کلاشن کوف والے کی تعداد تقریباً نصف تھی۔ سب اہمیت دلچسپی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جو کھڑے تھے وہ آج آج کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اچانک میری نظروں کے مکان کی طرف اٹھی اور میں محسوس کیا کہ منبر کے عقب میں کہیں سے دو آنکھیں اور میری جانب گھراں تھیں۔ وہی عالم آنکھیں جن میں نہ جانے افسانے نہایت تھے۔ میں ان آنکھوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن نظروں کی حرارت اپنے وجود پر محسوس کر سکتا تھا۔

”کیا اس وقت دیکھ کر میں نہیں تھا جو مول جھٹ پر ہوا تھی؟“ میں نے سوچا اور اوجھڑا اور دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ وجود واقعی گھر نہیں تھا۔ وہ مجھ پر قریب کھڑا اپنے ”ہوٹل“ کی ”قیر“ کے کام کا جائزہ لے رہا تھا۔ دلبر خان نے بھی اسے دیکھ لیا اور بار بار انداز میں آواز دے کر قریب بلایا۔

ان بورڈوں پر بھی وہ پوسٹر لگے تھے۔ اس کے لیے آپ کی دو چار شاندار سی تصویریں گامریں گے۔ ان میں سے جو سب سے اچھی ہوگی وہ پوسٹر چھپے گی۔ ہم چاہتے ہیں پوسٹر جلد سے جلد چھپنے کے لیے شرمچلا جائے۔“

میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ صبح میں نے دیکھ کے گھر میں آئینہ دیکھا تھا۔ انوار نے میرا جو میک اپ کیا تھا وہ گزشتہ دنوں کی جھل خرابیوں میں ختم ہو چکا تھا۔ میں اب اپنی اصل شکل میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اصل شکل کے ساتھ میری تصویر چھپنا مناسب ہوگا؟

یہ مسئلہ خیر تو اپنی جگہ تھی کہ میں اس میں ایک مقامی گرامی، ریسرے طور پر ایکشن دکھا رہا ہوں گا اور میرا نامی گرامی ہونا محض ایک فراڈ ہو گا لیکن اس سے قطع نظر مجھے تشویش یہ تھی کہ پوسٹر سے کہیں کسی ایسی شخصیت کو تو یہاں میری موجودگی کا علم نہیں ہو جائے گا جو میرے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہو؟

دوسرے ہی لمحے میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس دور افتادہ اور غیر معروف سے علاقے میں ہونے والی کسی سرگرمی کے سلسلے میں کسی چھوٹے موٹے شر کے پھیلنے سے چھپنے والے معمول سے پوسٹر کی رسائی ان باتوں تک نہیں ہو سکتی تھی جن سے مجھے خطرہ تھا۔ اب جب میں نے اس مسئلہ خیر میں ٹانگ اڑا دی تھی تو اس کے کھاتے بھی پورے کسے چلائیں تھے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی بھی کوشش کرنی چاہیے تھی۔

میں نے کمری سانس لے کر اپنے آپ کو اس شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جو اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا ایک انتہائی اہم اور ماہر فوٹو گرافر سمجھ رہا تھا۔ اس نے پہلے اس انداز میں میری ایک تصویر اٹائی جس طرح پاؤں پلٹر پڑتے کرتے ہیں اپنے جسم کا ایک ایک پٹا نمایاں کرتے ہیں۔ اپنے رنگ پتوں کی اس طرح نمائش کرتے وقت میں اپنے آپ کو الٹا پٹا محسوس کر رہا تھا لیکن کبھی کبھی اپنے آپ کو الٹا پٹا محسوس کرنے میں بھی ایک انوکھا ہی مزہ آتا ہے۔

دوسری تصویر اٹارنے کے لیے اس نے فرمائش کی۔ ”آپ جتنا بھی زیادہ سے زیادہ وٹ اٹھا سکتے ہیں وہ اٹھا کر کھڑے ہو جائیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہاں زیادہ وٹ موجود نہیں ہے۔ جتنا وٹ پڑا ہے اس کے ساتھ میں جیس بھی اٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہوں۔“ اس نے کچھ اس طرح ایک قدم پیچھے ہٹایا جیسے اسے ہلکا سا جھٹکا ہو پھر اس نے یوں دلبر خان کی طرف دیکھا جیسے شکایت کر رہا ہو۔ ”یہ آپ کیسا بد تمیز ریسرے پکڑا لے ہیں؟“

دلبر خان نے کندھے اچکا دینے کو یا یہ زبان خوشی کہہ رہا ہو۔ ”کوئی بات نہیں بھائی! انی اچال برداشت کرو۔“ میں نے تمام وٹ اٹھا لیا تو وہ آزار ترچھا ہوتے ہوئے اور

بالآخر میں خودی دیو سے پوچھے بغیر نہ سکا۔ "تمہیں مجھ کو اس طرح کھاتے دیکھ کر حیرت نہیں ہو رہی؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" دیو اطمینان سے بولا۔ "اس سے غم نہ گنا تو ہو شو خان کھا جاتا ہے۔ ایک وقت میں سالم بکرا کھا جاتا ہے۔ دودھ پینے لگتا ہے تو پوری بائٹی لپ جاتا ہے۔ روٹیاں کھاتے لگتا ہے تو تھوڑی روٹیاں لگانے والی عورت کو غش پڑنے لگتے ہیں۔ سنا ہے اپنے پرانے پہلوان بھی کچھ اسی طرح کھاتے تھے اور جو تھوڑے بہت خاندانی پہلوان اب باقی رہ گئے ہیں وہ بھی اسی طرح کھاتے ہیں۔"

میں اپنے کھانے پر کچھ شرمندہ تھا۔ خصوصاً مول کی موجودگی کی وجہ سے لیکن دیو کا جواب سن کر میری شرمندگی کچھ کم ہو گئی۔ اس کے بعد دودھ و دشب تقریباً اسی طرح گزرنے لگے۔ بظاہر میں دلبر خان کا معزز سمان تھا اور اس نے میری حفاظت کے لیے کلا شکوف برادر تیناٹ کر رکھے تھے لیکن درحقیقت میں نظر بند تھا۔ میرے مسلح عہدکار دو مشغول میں کام کر رہے تھے۔ دن میں کوئی اور ہوتے رات میں کوئی اور۔

ان کی وجہ سے مجھے یہ فائدہ بھی تھا کہ علی الصبح جب میں اکھاڑے میں جا کر ورزش شروع کرتا اور دن چڑھے تک وہاں خاصا جھوم مچا ہوا جاتا تب بھی مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ ان کلا شکوف برادران کی وجہ سے جھوم مجھ سے ذرا دور رہتا اور لوگ آنکھوں میں تجسس و اشتیاق لیے ذرا قافلے سے ہی مجھے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ جھوم خود بخود ہی چھٹ جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ جھوم میں اچھی خاصی تعداد عورتوں کی بھی شامل ہوتی تھی حالانکہ میرا خیال تھا عورتوں کو خصوصاً دیوات کی عورتوں کو رینگنا یا رسلرز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی لیکن جھوم کو دیکھ کر تو میرا خیال کچھ غلط ثابت ہوا تو کھائی دے رہا تھا۔

رات کو میں اپنی کچھار کے بجائے کہیں سر راہ سوئے ہوئے درندے کی طرح سوتا کھرئید میں بھی گویا چڑکنا رہتا اور بعض اوقات تو کسی خقیف سے ٹککے کے بغیر بھی اٹھ بیٹھتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے کسی قسم کا خوف لاحق تھا۔ خوف کو تو میں نے قریب پہنچنے ہی نہیں دیا تھا اور اپنے آپ کو تو بہ تقدیر چھوڑ دیا تھا۔

مجھے دراصل مول کا انتظار تھا لیکن وہ اس پہلی رات کے بعد نہیں آئی۔ دل میں بس ایک بے عنوان سی غش چکا کر اس نے قطعی چپ سادھ لی تھی۔ میں نے اس کے ہر سوال کا سیدھا صاف اور سچا جواب دیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اسے کوئی جھوٹی آس نہیں دلائی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ بلا وجہ دل میں ایک زخم ایک جبرست پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جو خود بخود ایک کلک نے جنم لیا تھا بس وہی کافی ہے۔ اس کلک کی جگہ دل پر ایک زخم ایک گناؤ کھانا کیا ضروری ہے؟ یہ

وہ دوا دوا تھا۔ دلبر خان نے گویا احتمالی مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا کندھا چمک کر پوچھا۔ "اب تو خوش ہوتا؟ اب تو بکھ چک ہو گیا ہے؟"

دہانچہ جو ذکر اسے دماغ میں دینے لگا مگر یہ دعائیں کسی فقیہ کی زبان کی طرح طلوس سے غلال تھیں۔ دلبر خان ذرا چچی آواز میں بولا۔ "آئندہ تم بھی ہمارے خلاف کسی قسم کی سازش کرنے کا خیال دل میں نہ لاتا۔ ہم بھی تمہارے ساتھ سیدھے چلیں گے۔"

"جیسا سائیکس! آپ ہمارے سر ہاتھ رکھیں؟ ہم تو آپ کی لائی کے لیے تیار ہیں۔ کل بھی آپ کے گم کے غلام تھے؟ آئندہ ہی غلام رہیں گے۔" دیو لچکاتے سے بولا۔

دلبر خان کے چہرے پر غمناہت تھی۔ وہ میری طرف مڑتے دے بولا۔ "میں اب چلا ہوں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو میرا ہی منی آدمی سے کہہ دو۔" مجھے پیغام مل جائے گا۔

"ہو شو خان کی تصویریں کھینچ چکی ہیں یا ابھی کھینچیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہو شو خان کی تو ہمارے پاس پہلے ہی بہت شاندار تصویریں وجود ہیں۔ اگر آپ کی تصویروں کا بھی رزلٹ اچھا نکلیا تو شاید ہم نئی طرح کے پوسٹر چھپوا لیں۔" دلبر خان نے جواب دیا پھر اس نے ہلٹ کر جھوم کو منتشر ہونے کی ہدایت کی تو لوگ گویا پاؤں غواستہ پڑ اپنے راستوں پر ہو گئے۔ چند لمبے بعد دلبر خان بھی اپنے اکیلے کے ہمراہ رخصت ہو گیا جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔

میں بیچ پرہس کے لیے لیٹنے لگا تو دیو مصنوعی شکل سے ہاتھ جوڑ بولا۔ "اڑے بابا۔ بس بھی کرو۔ بہت ہو گئی ورزش۔ کیا آج اپنا خون پیسہ ایک کر دو گے؟ پلوٹہ کھر پڑنا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

میں نے مزید بیچ پرہس کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لپا لپا توڑا تو کیا لے کر لپکا اور سر سے پاؤں تک میرا جسم صاف سٹنگ۔ اس سے جان چھڑا کر پہلے میں نے سوچا کہ کنویں پر جا کر ڈالنے اور کسی زندگی کا پورا پورا اہلک اٹھایا جائے لیکن پھر میں سوچا کہ کڑھت چند دنوں میں ایک مزدور کی حیثیت سے میں اس کی گئی کا غلام الخلف اٹھا چکا ہوں اب مجھے ایک معزز سمان کی بت سے جو سوکھیں میرے نہیں ان سے بھی تھوڑا بہت فائدہ ٹانگا ہے۔ ان میں سے ایک عظیم سولت یہ تھی کہ میں دیو کو کھینچ کر ڈالنا ہاتھ دلام میں پینڈ پپ سے نکالوں۔

میں نے کیا کیا۔ پینڈ پپ سے نہانے میں بھی برا الخلف آیا۔ اس کے بعد خاص پہلوانوں والا ناشتا میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے لے لگنے میں قلعہ سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مجھے اس بات پر تھم کی کہ دیو اور مول کو مجھے اس طرح کھاتے دیکھ کر خیریت نہ ہو رہی تھی۔ وہ بڑے آرام سے پاس بیٹھے مجھے دیکھ رہے

میں نے حالات میں بہت جلد دخل کیا تھا اور شاید پہلے ہی دخل کیا تھا۔ میں واقعی اپنے آپ کو کوئی ریسرٹی کر کے لگے تھا جو حقیقت کسی ذہن پرست مقابلے کی تیاریوں کو دیا مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہوشو خان کیا کر رہا تھا۔ بہر حال دوسرے روز ملاقات ہوئی تھی اور اس کی تیاریوں کی رپورٹ مل رہی تھی جس جس انداز سے بھی اس پاس کے ملاقاتیوں تک پہنچا تھی وہ ہو رہی تھی۔ کچھ سینما ہاؤسز میں سلاٹریں بھی چلی تھیں۔ آگے رنگا رنگ بورڈ لے کر بھی گھوم رہے تھے۔ ملاقات جاری تھی پوسٹر بھی لگ چکے تھے میرے خیال میں تو ان ذرائع کے بغیر ہی کئی میں اور اس پاس کے تمام ملاقاتیوں کو اس مقابلے کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔

دوسرے دن میں میرے لیے بھی جیسے تھے وہ طریقے کام چھپے تھے۔ دونوں میں میری اور ہوشو خان کی بڑی تصویریں دائروں میں آگے سامنے لگائی گئی تھیں۔ مزید کچھ تصویریں ہم دائروں میں اوپر اور نیچے لگائی گئی تھیں۔ پوسٹر کا مضمون سنڈی تھا اور لوگو کو اس بارے میں ڈالا تھا۔

اس مضمون میں میرے بارے میں جو دعویٰ کیے گئے تھے ان کو پڑھ کر بھی بہت ہنسی آئی اور اپنی تصویریں دیکھ کر بھی اپنی اصل شکل میں تصویریں کھینچنے سے ہتھارتا رہا تھا۔ اب اندازہ ہوا کہ میرا خوف فضول تھا۔ کچھ تو میرا حال ہی ان دنوں تھا کہ آئینے میں مجھے خود اپنی صورت دیکھ کر پچھانے میں چھلکتے تھے۔ اس کے بعد تصویروں میں اس "عظیم فوٹو گرافر" کا بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہی سہی کس ایک چھوٹے سے شہر کے گلیوں میں چھپائی میں پوری کر دی تھی۔

پوسٹر میں کبھی ہوئی میری تصویروں میں میری اصل صورت اور شخصیت کی بس ذرا سی جھلک ہی باقی رہ گئی تھی۔ میں خود بھی کسی کو یقین دلانا چاہتا کہ یہ میری ہی تصویریں ہیں اس کے لیے خاصی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اوپر سے فوٹو گرافر سے جو پوز ہوائے تھے اور جو "ایکشن" دلوائے تھے وہ مجھے زیادہ مشکوک خیر لگ رہے تھے۔ بہر حال میں پوسٹر دیکھ کر زیادہ حالت سے خاموش نظر ہوا۔ زندگی کے ذرا سے میں نے بچا ہوا ہوشو خان میں نے بھرا تھا یہ بھی ایک کراہ تھا جو مجھے لگا تھا۔

ہوشو خان اپنی تصویروں میں ایک قلبی غیر انسانی کا لگ رہا تھا۔ اگر اس کے چہرے اور جسم پر بال ہوتے تو ان کا ہیک "مائی ہائلین مین" معلوم ہوتا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہائلین مین کی اتنی بڑی قوت نہیں تھی۔ ہر تصویر میں اس ہائوس والا انداز اپنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ غالباً فوٹو گرافر کی ہدایات کو بھی دخل تھا۔ بہر حال میں نے محسوس کیا کہ پوسٹر میری نظر میں ڈالا

طے تھا کہ غلاب مقدر میں نہیں ہے تو پھر روز ملنے سے خود کو انہی میں جلا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک تشبیہی تعبیر خواب کی حسرت کو ایک بچھڑائے ایک عذاب میں بدلنا کہاں کی فکری ہے؟ لیکن کیا حلق میں حلق کا بھی دخل ہو جاتا ہے؟ کیا مولیٰ اس حد تک فکرت ہے؟ کیا وہ اتنی کراہی میں جا کر سوچ سکتی ہے؟ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری اس سے غرض کیا تھی۔ میں اپنے اور اس کے تعلق کو کیا عنوان دینا چاہتا تھا۔ کیا ہمارے درمیان کوئی تعلق پیدا ہوا تھا یا نہیں؟ اس کے باوجود میرا خیال میں اس سے ملنے کو ان گنت باتیں کرنے کو بہت ہی چاہتا تھا۔

"لیکن وہ نہیں آئی۔"

اس... پہلی رات کے بعد چھ راتیں اور گزر گئیں مگر وہ نہیں آئی۔ کوئی لمبی بھی مہین میں کوئی دیکھے کہاں گزرا کہ شاید وہ رہی ہے۔ کوئی خفیہ سا ٹھکانا ہوتا تو مجھے اس کی آمد کا شبہ ہوتا۔ کوئی نہ سمجھی آواز ابھی تو میرے دل میں اُمید کی چنگاری چمک دے لگتی تھی۔ کہیں پتہ بھی ملتا تو مجھے اس کی آمد کا کہاں گزرتا۔

میں کچھ سوچا، کچھ جاگا سا رہتا۔ اسی عالم میں اب سپردہ سحر نمودار ہونے کے ساتھ پرندوں کی چھٹاٹ کافوں میں بڑتی تو ایک عجیب سی مایوسی کا اندازہ رکھنے میں آتا تھا۔ میں خود بھی حیران تھا کہ حالات میرے گرد کیا بنا رہے تھے اور میرا ذہن کہاں الجھا ہوا تھا۔ میں کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ زندگی نے میرے دامن میں کیا کچھ نہیں ڈالا تھا مگر ایک لیکن ہار لڑکی میرے حواس پر شب خون مار رہی تھی۔

دن میں زیادہ تر اس سے سامنا رہتا لیکن وہ میری طرف بہت کم دیکھتی۔ سر جھکائے بھی کھانا دے دیا، بھی پانی۔ کوئی اور ضرورت کی چیز مانگی تو وہ دے دی لیکن وہ شاذ و نادر ہی ہوتی اور شاذ و نادر ہی نظر اٹھاتی۔ میری طرف دیکھتی بھی تو آنکھوں میں ایک عجیب سا سوناہن ہوتا۔ کوئی وعدہ نہ پیام کوئی آس نہ اُمید۔ کوئی شوق نہ شرارت کوئی اُشامہ نہ کوئی خاموشی مکالمہ۔ اس نے تو میں ایک بار گویا میرے پاس آکر مجھے حیران کرنا تھا سو کر دیا۔ اس کے بعد وہ جیسے اس رات کو اور اس رات کی ہر رات کو ایک خواب کی طرح بھول گئی تھی۔

دینے سے بھی ابھی تک اپنا چہرہ ستور ان دنوں دوبارہ شروع نہیں کیا تھا حالانکہ تمام تیاری ہو چکی تھی۔ اوپر جا کر با لٹیا بھی دن بھر سامنے کی طرح میرے ساتھ رہتا۔ گھر میں بھی کھسا رہتا۔ پتا ہر وہ میری ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے میرے ساتھ رہتا تھا اور غلاموں کی طرح میرے آگے پیچھے پھرتا تھا لیکن کوئی بید نہیں تھا کہ وہ دوسرا خان کی ہدایت پر ایسا کرتا ہو۔ بہر حال وہ اور دینو زیادہ تر گھر میں ہی رہتے۔ اس لیے بھی مولیٰ سے کوئی خاص بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔



مکملہ خیر تھے لیکن عوامی مزاج کے قریب تر تھے۔ مجھے اطلاعات ملی رہی تھیں کہ ان دنوں کلی کچوں، بازاروں، چائے خانوں اور دکانوں میں موضوع گفتگو یہی کشتی تھی۔ روزانہ اس پاس کی کہیں اور شاید کچھ دوسری جگہوں سے بھی لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ مجھے دیکھنے آ رہے تھے۔ پوچھوں میں کشتی کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا تھا اور اب اس میں صرف دو دن باقی تھے۔

اس شام ہمیں دلبر خان کا پیغام ملا کہ رات کا سنا چھا جانے کے بعد وہ ہوش خان کو لے کر دھوکے ہاں آئے گا تاکہ مقابلے کی فائل ریسرسل کر لی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ سب تو یہی تھا کہ یہ ریسرسل بھی رنگ میں ہی کی جاتی لیکن رنگ چونکہ ایک بہت بڑے مکمل میدان میں تیار کیا گیا تھا اس لیے وہاں رات کے وقت بھی ریسرسل کا نظریہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا کیونکہ پول کھلنے کا ڈر تھا۔ رات کو دلبر خان دو گھوڑوں والی کشتی میں خاموشی سے آیا۔

اس کے ساتھ ہوش خان، دو کلا شکوفہ بردار اور پینٹ شرٹ میں ایک شخص تھا۔ دھوکے روزانہ کھلائی چھوڑا تھا۔ وہ لوگ خود دیے قدوں اندر آ گئے، ہم انہی کے انتظار میں صحن میں جا رہے تھے۔

دو گھنٹہ کر دو اذانہ بند کرنے گیا اور واپس آ کر دلبر خان سے کہنے لگا۔ ”آپ کی اس دو گھوڑوں والی کشتی کو تو سب پہچانتے ہیں۔ کسی نے دیکھ کر تو سب کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو صبحی رات کے قریب اس خادم کے گھر آئے تھے جہاں افضل خان ٹھہرا ہوا ہے۔“

”میرے آنے کی کوئی بات نہیں۔ بے رفق! دلبر خان نے بچی آواز میں اسے ڈانٹا۔ ”میں تو یہ مقابلہ کر رہا ہوں۔ بے لگ ہوش خان میرا آؤی ہے لیکن افضل خان میرا سمان ہے۔ میں تو اس سے ملنے کی بھی وقت آسکتا ہوں۔ اصل میں کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہوش خان یہاں آیا تھا۔“

پھر وہ میری طرف دیکھ کر تھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”میں تو ریسرسل کے لیے افضل خان کو اپنی حویلی میں بلانا چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ کیسے اسے یہ وہم نہ ہو کہ ہم اس کے ساتھ کسی سازش کر رہے ہیں اور وہاں کچھ کر گزریں گے اس لیے ہم خود ہی یہاں آ گئے۔ اب شاید افضل خان کو یقین آ جائے کہ ہمارے دل بالکل صاف ہیں۔ وہ تو پہلے پہل غلط فہمی میں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تو بالکل ایماندار ہیں۔۔۔ سیدھے سادے طریقے سے اسے نورافشائی کرائی ہے۔“

”ایماندار! سے“ نورافشائی“ والی اصطلاح پر میں مسکرائے۔ ”خیر نہ سکا۔ ہمارے ہاں بعض لوگ واقعی بے ایمانی بھی بڑی ایماندار! سے کرتے ہیں۔“

ہوش خان آج بالکل خاموش اور نہایت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ دو گھنٹوں اور پندرہ منٹوں والی کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ حتیٰ

کہ اس کی سانسوں کی خراہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی البتہ اس کی شکل ہی کچھ عجیب اور وحشت زدہ سی تھی تو اس میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔

دلبر خان نے پینٹ شرٹ والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ماسٹر عبداللہ ہے۔“ وہ خاص طور پر اس شخص کا تذکرہ مجھ سے کر رہا تھا۔ ابھی تک میں نے وہاں بیٹے لوگوں کو بھی دیکھا تھا، وہ ان میں پینٹ شرٹ والا پہلا شخص تھا۔ لگا تھا کہ کسی زمانے میں اس شخص کو ورزش اور باڈی بلڈنگ وغیرہ سے شغف رہا ہو گا لیکن اب شاید اس نے مدت سے کوئی مشقت نہیں کی تھی۔ گوشت ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ رہا تھا اور وہ بے ذول نظر آنے لگا تھا۔ دلبر خان نے اس کا تعارف جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ماسٹر عبداللہ دکن اور فری اسٹائل، دو فوٹ طرح کی کشتیوں کا بہت بڑا ماہر ہے۔ خود بھی کسی زمانے میں بڑا ٹھیک تھا کہ ریسرسل رہا ہے لیکن کمر کا ایک چمچا پھٹ جانے کی وجہ سے اکھاڑہ اور ورزش دونوں چھوڑنا پڑے۔ یہ تھیں اور ہوش خان کو نورافشائی کی ریسرسل کرائے گا۔ اگر تم اس کی ہدایات پر صحیح طرح عمل کرو گے تو کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکے گا کہ یہ نورافشائی ہے۔“

دلبر خان تمام جزئیات کا خیال رکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ مجھے اس سے اتنے اہتمام کی امید نہیں تھی۔ ماسٹر عبداللہ نے ہر جوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بیان بھی چارہا تھا اور سرگرم بھی پل رہا تھا۔ شاید اکھاڑہ چھوڑنے کے ساتھ ہی پهلوانوں والے طور طریقے بھی چھوٹ گئے تھے۔

لیکن پھر مجھے خود ہی احساس ہوا کہ میری حیرت بے جا تھی۔ میں نے تو اس دور میں بعض پهلوانوں کو اکھاڑے میں بھی پان کھاتے اور سرگرمیتیں دیکھا تھا۔ سرگرمیت بھی سادہ نہیں، بھری ہوئی۔ اب اکھاڑے بھی شاید اکھاڑے نہیں رہے تھے۔ دوسری بہت سی اعلیٰ اقدار کی طرح پهلوانی کی روایات کو بھی دیکھ لگ چکی تھی۔ جس قسم کا اکھاڑہ میں نے ظیفہ نواز پری پیکر کی نگرانی میں کھلایا تھا اس قسم کے اکھاڑے اور ظیفہ نواز جیسے استاد اب معدوم ہوتے جا رہے تھے۔

ماسٹر عبداللہ کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کی نظریں گویا میری ہڈیوں تک میں اُتری جا رہی تھیں۔ وہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا ایکسرے انارے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمارے عقب میں برآمدے میں نہایت کم طاقت کا ایک بلب جھول رہا تھا جس کی مدھم اور تیار سی روشنی صحن میں پہنچ رہی تھی۔ ہم پراسرار پہلوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ مول اندر اپنے کمرے میں تھی۔

دلبر خان نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ غالباً یہ اطمینان کر رہا تھا کہ اس پاس کے کسی مکان سے کسی کی نظریں صحن تک تو نہیں پہنچ سکتی لیکن دیکھ کر مکان اس لحاظ سے مفرد تھا کہ

بعض موقعوں پر مجھے قائل کھینے پر مجبور کر دیا اور میں غصے میں آ کر اس کی حرکتوں کا جواب اسی کی طرح دینے لگا ہوں لیکن بیابان طور پر بیڑ ہونے کی وجہ سے دوبارہ بیزری کھینے لگتا ہوں۔ ہم ایک ایک سرطے کو ذہن نشین کرتے جا رہے تھے۔

اسی دوران ماسٹر عبداللہ بولا۔ ”ظاہر ہے کشتی کافی لمبی ہوگی۔ اس سے پہلے چند چھوٹے موٹے مقابلے ہوں گے تو وہ منکوں میں ختم ہوتے رہیں گے۔ اصل میں لوگ اسی کشتی کے لیے اہل استطاعت سے زیادہ پیسے خرچ کر کے آئے ہوں گے۔“ اس لیے ہمیں اس کو کافی طول دینا ہو گا۔ آخری لمبی کشتی میں ایک ایک بات ذہن نشین نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی تمام ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرنا ممکن ہے۔ رنگ میں جا کر اس ساری طے شدہ کشتی میں بہت سی تبدیلیاں آجائیں گی۔ بہت سی باتیں اچانک ہو جائیں گی۔ ہمیں اس وقت حاضر و غائبی کے ساتھ صورت حال کے مطابق اپنا رد عمل ظاہر کرنا ہو گا۔“

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”تمہارا فن اس یہ ہو گا کہ کسی کو اندازہ نہ ہونے پائے کہ یہ نور کشتی ہے۔ ہر وار اس طرہ کرنے کی ٹیکنیک میں نے جسیں سمجھا دی ہے کہ بظاہر بھی معمولی ہو گا کہ وار پوری قوت سے کیا گیا ہے لیکن درحقیقت اس سے بہت معمولی سی چوٹ آئے گی۔ تقریباً ہر وار ہمیں اسی ٹیکنیک سے کرنا ہے۔“

پھر اس نے بطور خاص مجھے مخاطب کیا۔ ”ہوش خان کو تو پھر بھی اس کام کی بڑی پرنسپل ہے لیکن ہمیں خاص طور پر خیال رکھنا ہے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ہوش خان پر ہتھیار اٹھانے بھی وار چرچ جگ جگالت کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہوش خان کے ہاتھ سے غلطی سے ہمیں کوئی زور وار ضرب لگ بھی جائے تو ہمیں اس کو برداشت کر جانا ہے۔ جج جج غصے میں آکر اصل حالت کے ساتھ اس کا جواب نہیں دیتا ہے۔ ہتھیار غصہ مصنوعی ہونا چاہیے اور ہر وار ٹیکنیک کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ سمجھ گئے؟“

میں نے اہمیت میں سر ہلایا۔ ”دیو دلبر خان اور اس کے نکلا ایک طرف دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ رنگ کے درمیان صرف میں، ہوشو اور ماسٹر عبداللہ ہی تھے۔ ماسٹر عبداللہ ہمیں تمام ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ اس وقت ریفری کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ میں اور ہوشو اس بنیادی روشنی میں دیوڑی کی طرح ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے اور نہایت خاموشی سے زبردست ”ہار“ کی سرسر کر رہے تھے۔ ہماری لمبی چوڑی پرچھائیاں ہوشو کی طرح گھن میں اور دیواروں پر پڑ چکی تھیں۔

ماسٹر عبداللہ مزید بولا۔ ”بابر کے ٹکوں میں رنگ میں ٹھونک ر رہی ایک موٹی تہ چھٹی ہوتی ہے جس پر کیوں چڑھا ہوا ہے۔ چوٹ تو اس پر گرنے سے بھی خاصی گنتی ہے لیکن ہر حال ہڈی کی ٹوٹنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے رنگ میں روز کی ٹھونک

چاروں طرف سے کوئی اور مکان اس کے ساتھ جڑا ہوا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جہاں تک میں دیکھ سکا تھا، وہاں تک مجھے تو کوئی دو منزل مکان نظر ہی نہیں آیا تھا۔

مطمئن ہو کر دلبر خان نے دیو کو محسن سے چار پائیاں ہٹانے کا حکم دیا۔ محسن کافی لمبا چڑھا تھا۔ زمینی لمبی لیکن سخت تھکی۔ ماسٹر عبداللہ نے ایک نوکیلی لنگڑی سے زمین پر چاروں طرف گیر کھینچ کر بڑا سا ایک مربع بنا دیا اور بولا۔ ”یوں سمجھ لو کہ یہ رنگ ہے۔ رنگ کا سائز تقریباً یہی ہے۔“

پھر وہ مجھے اور ہوشو خان کو باقاعدہ عملی مظاہرے کے ساتھ ہدایات دینے لگا کہ ہم کس طرح غیظ و غضب کا مظاہرہ کرتے، اچھلتے کودتے، داڑتے رنگ میں داخل ہوں گے۔ ہوشو خان کس طرح میری نظر بچا کر باضابطہ طور پر کشتی شروع ہونے سے پہلے ہی مجھے قائل کے ذریعے مار گرانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی اس حرکت سے کس طرح میرا غیظ و غضب بڑھے گا اور پھر میں اس پر کیا کیا واؤ چیخ آزماؤں گا۔

بڑی مشکل سے ریفری جو درجہ میں ایک سابق بطلان ہو گا، بیچ میں پڑ کر اس مار ہیٹ کو روکوانے کا اور باضابطہ طور پر کشتی شروع کرائے گا۔ ہمیں یہاں تک سب کچھ سمجھانے اور کر کے دکھانے کے بعد اس نے ہمیں عملی طور پر یہ سب کچھ دہرانے کے لیے کہا۔ ہم نے یہ سب محض ایک ٹینک کی حد تک اسے کئی بار کر کے دکھایا اور پوری کوشش کی کہ ایک دوسرے کو چوٹ نہ لگنے پائے۔ ہوشو خان بہت سوئے دماغ کا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی ہدایات پر وہ زیادہ عمدگی سے عمل کر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کی کشتیاں لڑنے کا اس کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ اسے لی دی اور وی سی آر کے ذریعے دیکھی ہوئی سیکڑوں کشتیوں کی تفصیلات اذہر میں اور وہ ہماری کشتی کو ان میں سے کئی مہرے کی کشتیوں کا ملغوبہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے باضابطہ کشتی کی سرسر شروع کرائی تو ترتیب سے تمام مراحل ہمیں ذہن نشین کرائے لگا کہ ہوشو خان کیا کرے گا اور میں اس کے جواب میں کیا کروں گا۔

کس طرح مقابلے میں نہایت خطرناک، سپنس فل اور ایکشن سے مجبور ہو ڈلائے جائیں گے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ سرسر میں ماسٹر عبداللہ کی ذہانت کا پیکو شامل تھا۔ وہ زیادہ تر قائل ہوشو خان کے جیسے میں ڈال رہا تھا۔ بعض لوگوں پر قائل ہی چلتے ہیں۔ ان کی صورت دیکھ کر ہی قاتلانہ قوت قوت ہوتی ہے کہ وہ قائل کھلیں گے۔ میرے خیال میں ہوشو خان بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ خود پرستی سے قطع نظر، میں ریسر تھا یا نہیں لیکن شاید میں صورت سے ہی زیر کھیلنے والا نظر آ رہا تھا۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو، ہر حال ماسٹر عبداللہ نے میرے جیسے میں قائل کم ڈالے تھے اور وہ بھی کچھ اس طرح جیسے ہوشو خان نے۔

دیو میرے قریب ہی دوسری چارہائی کھینچ کر بیٹھ گیا اور یوں ایک تک میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں سرکس سے بھاگا ہوا کوئی جانور تھا۔ اسی دوران مول بھی اندر سے نکل کر یوں کی چارہائی پر پانچ کی طرف آ بیٹھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ رات کو اس وقت کپڑے پر ایکہ لپوٹی کا کاڑھ رہی تھی۔ معمولی طاقت کے بلب سے اتنی دور وصلی سی روشنی میں بیٹھ کر بھی اس نے کڑھائی کا کام جاری رکھا۔ وہ کچھ اس طرح کڑھائی میں مصروف تھی جیسے وہاں اس کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

”کیوں اپنی آنکھوں کی دشمن ہوئی ہو؟“ میں نے بالا سر کوٹ سے تنک آ کر کہا۔ ”اس وقت اتنی کم روشنی میں کڑھائی کرنی ضروری ہے کیا؟“

اس نے موٹی موٹی آنکھوں سے پلکوں کی جھاریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ میں موجود موٹی گویا کپڑے کے بجائے میرے دل میں اتر گئی۔ ان آنکھوں میں ان گنت ان کی باتیں تھیں، شکوے تھے، تاسف تھا، حسرت تھی۔ یا پھر شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ میں غلط سمجھ رہا تھا۔

وہ چات لہجے میں بولی۔ ”مگر میں کڑھائی نہیں کروں گی جب ضرور میری آنکھوں کو کچھ ہو جائے گا۔ کڑھائی سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہمارے ہاں تو لڑکیاں دن بھر کام کاج کرتی ہیں اور راتوں کو لائٹیں یا دیے کی روشنی میں کڑھائی کرتی ہیں۔ یہ تو پھر بلب کی روشنی ہے۔“

دیو مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اس لڑکی کو تم کچھ مت کہا کرو۔“ یہ تو جڑی ہے جڑی۔

وہ اسے پاگل کہہ رہا تھا۔ میرے خیال میں تو اس کے سامنے ہم دونوں پاگل تھے۔ شاید وہ اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کی انیت سے بچانے کے لیے کڑھائی میں پناہ تلاش کر رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے پھر گرا سکوٹ چھا گیا مگر یہ ایک ایسا سکوٹ تھا جس کا شور ہماری سامعین کے پردے تار تار کیے دے رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم سب کے ذہنوں میں ان گنت سوال گونج رہے تھے لیکن کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سوالات کیا تھے کون کس سے کیا ہو چکا تھا۔

بالآخر دیو گہری سانس لے کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے یہ مقابلہ ہو کر رہے گا۔“ یہ کوئی سوال تھا اور نہ ہی کوئی بیان۔ بس اس نے اپنے خیالات کے اگلے اگلے جھل میں ہاتھ مار کر چند الفاظ کے پردوں کو زبان کے جال میں پھنسا لیا تھا اور میرے سامنے چھوڑ دیا تھا۔

”ہاں۔ مقابلہ تو ہو گا۔“ میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا۔

بزدلت تو نہیں کر سکے لیکن ہر حال کیوں کے بچے لکڑی کے تختوں پر اور بچے دو چالیں چپکے ہوئے ہوں گے۔ ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ کافی اور پتالی سے کرنے کے باوجود کم ہو گا۔“

اس نے اب تک جو ہدایات دی تھیں ان سے نقشہ کچھ ایسا بنا تھا کہ مقابلہ تو کانٹے کا ہو گا۔ تماشائی سانس روکے بیٹھے رہیں گے اور ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ کون جیتے گا لیکن پھر میری اپنی غلطی کی وجہ سے مجھے ایک خطرناک چوٹ لگ جائے گی جس سے ناحق آگاہے ہوئے ہوشو خان جیت جائے گا۔

یوں دلبر خان کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا ہوشو خان کی ہمت بھی برقرار رہے گی اور میرے ساتھ بھی تماشائیوں کی ہمدردیاں برقرار رہیں گی۔ یعنی پلڑے کو تھوڑا بہت برابر رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس ”خطرناک چوٹ“ کی بھی سرسر مل کر لی گئی۔

ایریک کے روکر اموں میں آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ ایک ریسلر نے بازو سے مچھکے کر دوسرے ریسلر کو کارن میں پھینکا۔ وہ دھمکی دھمکے اوجاڑیں سر جھٹکا۔ ابھی وہیں بد حال کھڑا ہے کہ پلار ریسلر اسے گھر سید کہنے دوسرے کارن سے دوڑا۔ وہ پوری قوت سے آیا لیکن عین آخری لمحے میں بد حال ریسلر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور۔۔۔۔۔

بالکل اسی طرح مجھے ایک کارن میں رسیوں کے جوڑے ذرا نیچے زمین میں گڑے ہوئے ایک گول شیشے سے ٹکرا کر خطرناک چوٹ لگنا تھی جس کے بعد ہوشو خان مجھے بن کر دیتا اور مجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر رینگ سے لے جایا جاتا۔

سرسر مل بظاہر ایک معمولی کام تھا لیکن اس میں ڈھائی تین گنے لگ گئے۔ خدا خدا کر کے تمام تقصیلات تمام تر باریکوں کے ساتھ طے ہو گئیں۔ ایک ایک چیز کو بار بار دہرایا گیا۔ بالآخر ماسٹر عبداللہ مطمئن ہو گیا اور دلبر خان غالباً اس کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔

میں جب اپنے قلم اسٹوڈیو والے آفس میں تھوڑی بہت دیر بیٹھا تھا تو میں نے سنا تھا کہ ماسٹر عبداللہ ہماری قلم اسٹوڈیو کے ایک باہر ہو رہے تھے۔ ان کے کئی مقبول عام گیتوں کا بھی ذکر کیا تھا لیکن یہ ماسٹر عبداللہ جس سے مجھے واسطہ نہ رہا تھا کچھ دوسری طرح کا ماسٹر عبداللہ تھا۔ یہ گاؤں رسومات کے سیدھے ساوے لوگوں کے لیے فراڈ کی سی دھن تیار کر رہا تھا۔ آنکھوں میں دھول لپونگے والی ہنس پر وہ موسیقی دینے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

سب سمجھ لے ہو جانے کے بعد بالآخر ان لوگوں نے میری جان چھوڑ دی پھر ان سولہ سالے وہاں مزید وقت ضائع نہیں کیا اور فوراً رخصت ہو گئے۔ میں نے فوراً محن میں چارہائی بچائی اور دم سے اس پر کڑھائی۔ چت لیٹ کر میں ایک تک آسمان کو دیکھنے لگا۔ آج پھر رات کی مانگ میں ماروں کی افواہیں چنک رہی تھیں۔ کچھ تارے بھلا رہے تھے اور کچھ شاید میری رشتہ کنڈی پر مسکرا رہے تھے۔

اپنے آپ کو ان چکروں میں پھنسا رہے ہو؟

”میں اپنے بارے میں تمہیں مختصراً بتا چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور چکروں میں اپنے آپ کو میں نہیں پھنسا رہا۔ چکر خود آگے بڑھ کر مجھے اپنی پیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میں تو بالکل سیدھے سادے انسانوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھنا چاہتا ہوں۔“

دیو خفگی آہستہ انداز میں مہری سانس لے کر بولا۔ ”ٹھیک ہے بابا۔ تم اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ لیکن ہمیں بھی چکر تو مت دو۔ جو کچھ تم نے ہمیں بتایا ہے وہ صرف ٹرٹھانے کے لیے بتایا ہے۔ ہم سیدھے سادے دیہاتی ضرور ہیں مگر بے وقوف نہیں ہیں۔“

اچانک مول نے سر اٹھا کر باب کی طرف دیکھا اور تنبیہ کے سے انداز میں بولی۔ ”چھوڑو بابا! جب کوئی اپنے بارے میں نہ بتانا چاہے تو اسے کیرا نہیں کرتے۔ اس طرح دوسرا بھی شرمندہ ہوتا ہے اور خود کو بھی شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

”ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو میری عقلمند بیٹی!“ دیو دھیمی مگر استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ میں خاموش رہا۔ میرے خیال میں اب خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ کوئی بھی بات کرنا مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

چند لمحے کے بعد دیو انگڑائی لے کر بولا۔

”اب چل کر سوتے ہیں۔ جو تھوڑا سا وقت مل رہا ہے اس میں آرام ہی کر لیں۔ صبح سے اٹھ کر میں بھی ہوٹل چلا کر رہا ہوں۔ آجکل اس کشتی کی شہرت کی وجہ سے کئی کی روٹنی کچھ بڑھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے، چار پیسے کمایں لے جائیں۔ امید ہے سارا نقصان پورا ہو جائے گا۔ ہم غریبوں کو صرف اپنے دھندے پانی اور سیدھی سادی باتوں سے غرض رکھتی چلی ہے، زیادہ گہرے چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے، مشکل باتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔“

میں اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں آگیا۔ نہ جانے کیوں اس رات مجھے کچھ زیادہ ہی امید تھی کہ مول آئے گی اور شاید کوئی ضروری بات کرے گی مگر وہ اس رات بھی نہیں آئی۔ وہ تو بس پہلی ہی رات اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ کر چلی گئی تھی، پھر کبھی نہ آنے کے لیے۔ کبھی زبان نہ کھولنے کے لیے۔ ابے بس جوں ہی یہ معلوم ہوا کہ میں زندگی کے سفر میں اس کا ہاتھ قحط کر نہیں چل سکتا تو گویا بات ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کچھ کتنے سننے کی محتاج ہی نہیں رہی تھی۔

رات کے پچھلے پر مجھے وہم سا ہوا جیسے مول میری کوٹھڑی کے دروازے تک آئی تھی اور پھر لوٹ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اب تو میں کنڈی لگا کر بھی نہیں سوتا تھا۔ لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ طویل و عریض خالی مکن میں سرسراتی

ہوا گویا میرے کان کے قریب استہزائیہ سے انداز میں ہنس رہی تھی۔ میں واپس آ کر دھم سے بستر پر گرا اور خند کی دوا دی میں آٹا یا پھر شاید وہ مایوسی کی تاریک دلدل تھی جس کی گہرائیوں نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

اس کے بعد مقابلے میں صرف ایک دن اور ایک رات تھی۔ آخری رات میں نے مول کا بالکل انتظار نہیں کیا۔ میری زندگی کی کتاب میں کئی ورق ایسے تھے جن پر غلٹی کی خراشیں سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک ایسا ہی تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر میں اسے چھوڑ کر نہ پیسے کا تو کم از کم بارپٹ کر تو نہیں دیکھوں گا اور یہ کوشش میں نے ابھی سے کر دی تھی۔

بالآخر مقابلے کا دن آگیا۔ اس روز جمعہ تھا اور آجھا ہلا! موسم یکدم حرارت زدہ ہو گیا تھا۔ میں ناشتے سے فاسخ ہوا ہی تو مول، دیو کی موجودگی میں ہی خلاف معمول مہری نظروں سے طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ”آج لوگوں کے سامنے اہلا پیش کرنے جا رہے ہو؟“

”یہ میرا نہیں، دلبر خان کا ڈراما ہے۔“ میں نے ہنسی کے ڈرامے کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو اس میں مجبوراً صرف اداکار کے طور پر کام کر رہا ہوں۔“

وہ ایک لمحے شریر سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی جانے کیوں آج شوخی اور شرارت اس کے چہرے سے پھولتی ہوئی تھی لیکن مجھے یہ شوخی اور شرارت کچھ مصنوعی معنی ہی لگ تھی۔ جیسے وہ اپنی کسی اندرونی کیفیت کو چھپانے کے لیے اپنے کوئی بہت ہی مہری نہ چڑھا لیتا چاہتی تھی۔ دیو بھی میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سی مسکین اور افسوس تھی۔

مول بولی۔ ”اگر تمہیں ہوشو خان سے جھگڑنا مقابله کرنا پڑتا تو تم کر لیتے؟“

”وہ میں زیادہ خوشی سے کرتا۔“ میں نے بلا تامل جواب دیا۔ ”میں نے زندگی میں کبھی، کسی بھی قسم کا کوئی جعلی مقابلہ نہیں یہ کشتی صبح ہوئی تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں جھگڑنا ہوشو خان ہار جاتا تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا۔ اس جگہ سے اور دلبر خان سے چھڑانے کی مجھے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ خواہ لوگوں کے سامنے ہوشو خان سے ہارنا قبول کرنا پڑا ہے۔“

مول بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذرا سے بولی۔ ”اگر ہوشو سے تمہارا صبح اور سچا مقابلہ ہوتا تو تمہارا خیال ہے، تم جیت جاتے؟“

”میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا۔ بہر حال صبح شیش بجے دو دنوں ہی کا امکان ہوتا ہے۔ میں ہارنا یا جیتنا کم از کم مطمئن رہتا۔“

بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بس یونہی ذرا زبان بھل گئی تھی کہ دن ہمیں ایسی بے کار اور بے ہودہ باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ آج کا دن میرے لیے بے ہودہ ہے۔ آج میں وہ کام کرنے جا رہا ہوں جس کے بارے میں بے زندگی میں بھی سوچا بھی نہیں تھا۔

دو بکے چہرے کی زدوں پر کچھ کم ہوئی لیکن مول کے چہرے معنوی شوخی و شرارت کا جو رنگ یک لخت غائب ہوا تھا وہ نہ آسکا۔ دوز کی طرح وہ ایک بار پھر تنگے سے زمین پر آڑی لکیریں کھینچنے لگی۔

میں نے مائل کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے گلوں کا لیتے ہوئے خوشگوار لمبے میں کہا۔ ”نکلت تو اچھے خاصے چچا ہیں دلبر خان نے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی ٹھیک ٹھاک لکے چڑے انتظامات کر رہا ہے۔“

دو کھار کر گلا صاف کرتے ہوئے دھمے لمبے میں ”ہاں۔۔۔ اس میں کیا شک ہے۔ اس نے تو شر سے کیڑا کھینچا اور کرسیاں بھی کرائے پر منگوائی ہیں۔ وہ ان کاموں پر باہر ہے۔ پہلے بھی جنگل میں مشکل والے بست سے قماشے کرتے رہے۔“

”ہاں۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔“ میں نے بھی دھمے لمبے اور نکتہ تر کر کے واپس مول کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے

اٹھا کر میری طرف دیکھے بغیر نکتہ دو بانہ پل میں باندھ لے۔

چند لمبے بند ہونے لگے ہوئے بولا۔ ”آؤ ہو کر پر پلٹے ہیں۔ وہ کو شش کرتا تھا کہ مجھے مول کے پاس تھانہ بھروسہ

بھی قطعاً ہی ظاہر نہیں کرتا تھا کہ مجھے تنگے میں مول کے پاس۔ یا اس سے بات کرنے کا خاص اشتیاق ہے۔ اس کا چہرہ تنہا

اب کل چکا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آگیا۔ میرے ہاتھ قدم رکھتے ہی مکان پر حیوانات چاروں کا مشکوف پرواز

معمول مجھے گھیرے میں لے کر ساتھ ہوئے۔ میں چہرہ تنہا کی اس لمبی چوڑی اور بھاری بھر کم چارہائی پر جا بیٹھا جو صبر و

بیٹھنے کے لیے مخصوص کردی گئی تھی۔

مقابلے کا وقت شام چار بجے کا تھا لیکن وہ بھر کے کھاتے۔ فوراً بعد ہی دلبر خان اپنے دو تین آدمیوں کے ساتھ مجھے لے چلا

اس نے بڑی تعظیم اور احترام سے مجھے جپ میں بٹھایا۔ پہلے وہاں موجود کا مشکوف پرواز ایک الگ کبھی میں جو دلبر خان کی

گئی جپ کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ بہت سے لوگ راستہ میں کھڑے میری روانگی کا قافلاً دیکھ رہے تھے۔ دلبر خان کے آگے

نے مجھے بہت سے پھولوں اور نوٹوں کے ہار بھی پہنائے۔ جپ میں ایک شخص داخل بھی جاتا جا رہا تھا اور جپ نہایت ست و گار

سے چل رہی تھی۔ جن راستوں سے ہم گزرے ان پر بڑی رونق اور چل چل نظر آتی۔

”ویسے میرا خیال ہے تم جیت ہی جاتے۔“ مول بدستور سنجیدگی سے بولی۔ ”اگر دلبر خان اور ہوشو خان کو تمہارے چیتے کا خلو نہ ہوتا تو انہیں تمہاری ہار کا ڈراما چلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”خیر۔۔۔ چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تم لوگ یہ ڈراما دیکھنے آرہے ہو یا نہیں؟“

”نہیں نہیں۔“ مول کی ذہین آنکھوں میں وہی شرری مسکراہٹ لوٹ آئی۔ ”ہمیں تو دلبر خان نے اسٹیشن تک بھجوائے

ہیں۔ سب سے آگے کے ٹکٹ ہیں۔ سو سو روپے والے لیکن اس نے ہمیں بالکل مفت بھجوائے ہیں۔ اس نے ہمیں اپنے خاص

سہانے طور پر بلوایا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”دیر بابا اب مجھے تو کوئی بات بتانا ہی نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے دیر بابا کی

طرف دیکھا۔ ”یہی ہی اور معلوم نہیں کیا کچھ کرتا رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ بھی دشمن کے کیمپ سے مل گیا ہے۔“ دلبر خان کا آدھی

بن گیا ہے۔

”خدا! نہ کہے کہ ایسا ہو۔“ دیر بابا سنجیدگی سے بولا۔ ”خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں دلبر خان کا دوا دار ہوں۔ دراصل میں تو

کشتی دیکھنے جاتا ہی نہیں چاہتا لیکن مول کی ضد ہے کہ ہم ضرور چلیں گے۔“

”ہاں۔ اسے تو میری ذلت کا تماشا ضرور دیکھنا ہو گا۔“ میں نے گہری نظروں سے مول کی طرف دیکھا۔ وہ دیر سے یہی مکر یہ

گویا خود اپنا مذاق اڑانے والی یا خود کو دھوکا دینے والی ہنسی تھی۔

”ضروری نہیں ہے کہ ہم تمہاری ذلت کا تماشا دیکھنے ہی آئیں۔“ وہ اپنے دوپٹے کے پلو میں بندھی کوئی چیز کھولتے ہوئے

بولے۔ ”ہو سکتا ہے ہم اس لیے آ رہے ہوں کہ کوئی ہمیں اتنی محبت سے بلا رہا ہے۔ ذرا دیکھو تو۔“ دلبر خان نے ہمارے لیے وہ نہیں

پورے چھ ٹکٹ بھیجے ہیں۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ ہم اپنے دو چار پڑوسیوں کو بھی ساتھ لاسکتے ہیں۔“

اس کے دوپٹے کے پلو میں دراصل یہ شہدہ نکتہ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے وہ میری طرف بڑھا دیا۔ اپنی دانستہ۔۔۔ دلبر

خان کی ”محبت“ کا ذکر کر کے مجھے جلاتا جا رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا ان الفاظ کا اس کی سوچوں سے دور دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

اس لیے مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن میں نے گویا اس کی توقع پوری کرنے کے لیے جلتے کتے سے لمبے میں کہا۔ ”ہاں۔۔۔ دلبر خان

واقعی بہت محبت کرنے والا آدمی ہے۔ اس کی محبت کا مزہ تو ہم اس روز ہی چکے تھیں جس روز وہ ہمیں اٹھوا کر لے جا رہا تھا۔“

دیر کا رنگ یکدم زرد پڑ گیا اور مول کو بھی دھچکا سا لگا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ مجھے مذاق میں بھی یہ بات نہیں کرنی چاہیے

تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”معاف کرنا۔۔۔ مجھے مذاق میں بھی یہ

وہ میدان دیکھ کر مکان سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں مقابلے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بہت بڑی جگہ تھی اور جس طریقے سے وہاں انتظامات کیے گئے تھے، میں اس دور افتادہ اور سماجی علاقے میں ان کا دیکھ کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بہت بڑے رتبے میں دائرہ در دائرہ بیٹھیں اور فولڈنگ چیئرز چالی سی تھیں اور ایک قطار کو دوسری قطار سے اونچا رکھنے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ وسط میں رنگ کے قریب کچھ حصے میں صاف ستھری دریاں بھی ہوئی تھیں۔ دو تین قطاریں صوفوں کی بھی نظر آ رہی تھیں۔ شاید وہ زیادہ سی محزون کے لیے تھیں۔

رنگ سے دوسرے سے پیچھے کئی اینٹوں سے اسٹینڈیم کی طرح کچھ بیڑھیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ یہ غالباً سب سے سستی کلاس تھی۔ آمد رفت اور درجہ بندیوں کے لیے بائیں اور دے بائیں کر کے راستے بنائے گئے تھے۔ ابھی ٹائٹل ٹیبلٹ کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی لیکن بہت سے لوگ جو غالباً منتظر تھے، تیزی اور ہستہ سے دوسرے دوسرے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ میدان کے اوپر کچھ کھائے، سائیکلس اور موٹر سائیکلس بھی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ خواتین اور بچے والوں نے بھی آکر ابھی سے آس پاس برا بھلا کیا تھا۔

میدان کے وسط میں بہت بڑا اور رنگارنگ قیم کارنگ تیار کیا گیا تھا۔ اس کے اوپر کئی بلندی پر ایک بہت بڑا گول ٹینٹ بھی بہت کی طرح تانایا گیا تھا جس نے رنگ کے علاوہ آس پاس کی فضا کلاس، نشستوں پر بھی سایہ کیا ہوا تھا۔ ایک طرف سے کئی کئی آریں لاکر بڑی بڑی لائٹس کا بھی بندوبست کیا گیا تھا لیکن سب سے نمایاں میں بدگرام میں بہت زیادہ تاخیر ہونے کی صورت میں ان کی ضرورت پیش نہ تھی۔

”صرف ایک کشتی کے لیے بہت زحمت اٹھائی ہے تم نے۔“  
میں نے اپنے برابر بیٹھے دلیر خان سے کہا۔ ”بہت لمبے چوڑے انتظامات کیے ہیں۔“

”کلی بات تو یہ ہے کہ کشتی صرف ایک نہیں ہے۔“ دلیر خان نے مزید اعزاز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”فزی اسٹائل ریلنگ“ کشتی کی اور ہر کنگ کے کئی مقابلے رکھے گئے ہیں۔ بہت بڑے اسٹے کے بہت سے جوانوں کو اپنے دل کے ارمان نکالنے اور اپنی لائٹوں کے اظہار کا موقع ملے گا لیکن اصل شو گھمراہ اور ہوشو ان کا ہی ہے۔“

پھر اندر گدراشاہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ سارے انتظامات میں بالکل سٹے سٹے سے نہیں کیے گئے۔ یہ میدان ایک طرح سے طائر اسٹینڈیم ہے۔ بہت سی چیزیں ای طرح موجود رہتی ہیں۔ سال کے سال انہیں کچھ محنت و محیرو کے ٹھیک ٹھاک کر لیا جاتا ہے۔ صرف بیٹھیں اور کرسیاں ضرورت کے وقت کرائے پر منگوائی جاتی ہیں۔ یہاں سال چھ مہینے میں کوئی نہ کوئی فٹل ہوتا رہتا ہے۔

کبھی سیٹلنگ کیا، کبھی سرکس۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔“  
”سب کے انتظامات تم ہی کرتے ہو گے؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ظاہر ہے۔ اس علاقے میں اس قسم کے کام اور کبھی کون سکا ہے؟“ وہ مونچھ کو تازہ کر بولا۔ ”ہم اپنے لوگوں پر سختی کرتے ہیں تو ان کی تفریح اور خوشی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔“  
”اور ساتھ ہی ان دھندوں سے روپیہ بھی کمایا جاتا ہے۔ فٹل سیٹلنگ کرتا ہے۔ سب سے زیادہ تفریح تو تم خود ہی لیتے ہو گے۔“

”میں نے دل ہی دل میں سوچا لیکن اس سے نہیں کہا۔“  
میدان میں ایک طرف کئی اینٹوں سے دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں سے لے کر رنگ تک راستہ خالی چھوڑا گیا تھا۔ اس راستے کے دونوں طرف بائیں لگے ہوئے تھے۔ دلیر خان نے چپ کمروں کے قریب لے جا کر دیکھا۔

جس کمرے میں ہم داخل ہوئے وہ باہر سے کچھ چھوٹا ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن اندر پہنچ کر خاصا کشادہ نظر آیا۔ اس میں کئی پڑا سٹل چنگے چل رہے تھے، اس کے باوجود بہت جیس تھا۔ یہاں کئی اچھے جیسوں والے نوجوان نیکروں میں اُدھر اُدھر بیٹھے نظر آئے۔ کچھ لوگ کپ شپ کے انداز میں بائیں کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے اور کچھ کے درمیان تیز و تند انداز میں بحث و تجویس کی جاتی تھی۔

اندر سے اس کمرے کا جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ درحقیقت مقابلے میں حصہ لینے والے تمام ریسر اور باکسرز وغیرہ کا مشترکہ ڈریسنگ روم تھا۔ ان میں سے تین چار نوجوان ایک دوسرے پر کچھ دوا چھڑک رہے تھے۔ معلوم نہیں ان کے مقابلے بھی منسحب تھے یا وہ بھی نورافشاں ہی لانے جا رہے تھے۔

کمرے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن دلیر خان کے وہاں پہنچنے ہی شور یکدم ختم کیا۔ وہ کلاٹھوف بدو اسٹے کی طرح ہمارے پیچھے تھے۔ بائی دواڑے پر ہی رک گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ دلیر خان کے ساتھ ساتھ میں بھی تمام لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔

تاہم دلیر خان نے کسی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور ایک بظلی دواڑے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس دواڑے سے گزرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی چھوٹے سے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ اس کمرے میں ہوشو خان موجود تھا۔ وہ فرش پر بیٹھی ایک وری پر لیٹا ہوا تھا اور وہی حاکم مالیشا زور و شور سے اس کی باتیں کر رہا تھا جو کل تک ہر وقت میری خدمت میں حاضر رہتا تھا لیکن کل سے ٹرا سرار انداز میں غائب تھا۔ بہر حال میں نے نہ اس کی موجودگی کو کوئی خاص اہمیت دی تھی اور نہ ہی اس کے غائب ہونے کو۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے

ہوا۔ "میں تو صرف نام کا حاکم ہوں، اصل حاکم تو یہ ہیں۔" اس نے دلبر خان کی طرف اشارہ کیا۔ "انہوں نے مجھ کو تو میں ہوش خان کی خدمت کے لیے آگیا۔"

"تو اس میں صفائی پیش کرنے کی کیا بات ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ مار کر کہا۔ وہ اس جگہ سے ہاتھ سے ہی لڑکھڑکیا۔ میں نے خود ہی اسے جلدی سے سنبھالا اور تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "متم ہوش خان کی خدمت کو یا میری بات تو ایک ہی ہے۔ کیوں ہوش خان؟" میں نے ہوش خان کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔

ہوش خان اٹھ بیٹھا تھا اور دوری پر آتی پلٹی مارے کچھ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے پہلی بار مجھے دیکھ رہا ہو۔ وہ ہر حال وہاں کی ایک "ڈی آئی بی" شخصیت تھا کیوں کہ وہ اکیلا، ایک الگ تھلک، "ڈریک دم" میں لٹا ہوا تھا جب کہ مقابلوں میں حصہ لینے والے دوسرے سب لوگوں کو ایک ہی کمرے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ہوش خان نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔ "اسے چپ چپ کیوں ہو ہوش خان؟ کوئی بات نہ کرو۔ ہم آپس میں کوئی دشمن تو نہیں ہیں نا۔ میں صرف ایک نورا کشی ہی تو رہی ہے مگر اس ایک دوسرے کا خون پیتا ہے۔"

"شش۔؟" دلبر خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور ذرا آنکھیں ٹٹکاتے ہوئے بولا۔ "یو ایل کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تمہیں نورا کشی کا ذکر بھی زبان پر نہیں لانا ہے۔ درنگ میں تم اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے آؤ گے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو۔"

اس دوران ہوش خان بھی ہاتھی کی طرح ڈکرائتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرا سر آ پازو لے رہا تھا۔ آج وہ گویا ایک نئے ہی زاویے سے مجھے نظروں ہی نظروں میں تول رہا تھا۔ ایک جگہ کھڑے کھڑے بھی اس کے شبیر جیسے بازو اور پٹے جیسے ہاتھ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔

"تمہیں سیرنگ کی ہیرات ابھی طرح یاد ہے؟" دلبر خان نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔ یاد تو ہے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "میں بھی یاد ہوگی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ موٹے پر ہی صورت حال کے مطابق کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ اب ہم دونوں اتنے گئے کر رہے بھی نہیں ہیں۔ کیوں ہوش خان؟"

ہوش خان نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ محض ڈکرا کر وہ گیا۔ دلبر خان نے حاکم ہاتھی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ماسٹر عبداللہ کہاں ہے؟"

"وہ کسی کام سے گئے ہیں جی۔ کہہ رہے تھے کہ آج کل تک آجائیں گے۔" حاکم نے جواب دیا۔ وہ دوری پر بیٹھ کر ہوش خان

کی موٹی موٹی پنڈلیوں پر ماتل کرنے لگا۔ اس نے ٹھیک سہی کہا۔ والدین کا اپنی اولاد کے نام رکھنا بھی کبھی کبھی بڑی ستم خیز جاتا ہے۔ اب اس کا نام حاکم اور کام پلو انوں کی ماتل کرنا نہیں اگر غور کیا جائے تو شاید یہ کچھ ایسی زیادہ ستم خیز کی بات نہیں تھی۔ بعض حاکم واقعی دہشت گردوں کو ہاتھی نظر آتے ہیں۔ دلبر خان نے گویا مجھے مطلع کرنے کے لیے کہا۔ "تمہیں یاد ہے، تمہارے اور ہوش خان کے مقابلے میں ماسٹر عبداللہ کے فرائض انجام دے گا؟"

"معلوم تو نہیں تھا لیکن۔ ہر حال۔۔۔ اس سے کوئی فرق پڑتا۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

دلبر خان مجھے ٹھوٹے ہوئے بولا۔ "تم بہت بے پروا آدمی ہو؟"

"تو کیا اب تمہیں میرا بے پروا نظر آتا بھی یا گوارا کر رہے؟" میں نے ذرا حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ تمہارے خیال میں مجھے نورا کشی کے لیے بھی گھر بند ہونا پڑا تھا؟

"تم بار بار اس کے نورا کشی ہونے کا اعلان مت کیے جاؤ۔ دلبر خان وادنت میں کرکھنی کھنی سی آواز میں بولا۔ "تمہیں ایسی حقیقت کا رنگ بھرا ہے۔ آس پاس کے علاقوں سے کئی ذبیحہ بھی آج کے مقابلے دیکھنے آ رہے ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ میں نے انہیں بھی اشارہ تک نہیں دیا کہ کسی بھی مقابلے میں گھٹایا ہو رہا ہے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" میں نے مزید انداز میں سراہا ہوئے کہا۔ "انسان کو اپنی سازشوں اور اپنی خیانتوں کو دوستوں سے بھی چھپانا چاہیے۔" ٹھنڈی کا تھا خاک میں ہے۔ دلبر خان نے مجھے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے کلمہ نے خاصا سہا چرا و اہتمام کر لیا ہے۔ اپنے پاس سائیں مراد کو بلا لیا ہوتا۔"

"نہیں مراد خان آج کل ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔" لیے تو میں نے جلدی جلدی میں سے سب کچھ کیا ہے۔ وہ اگر کلمہ ہوتے ہیں تب بھی ہم کوئی اس قسم کا فضول میلہ کرتے وقت اطلاع نہیں دیتے۔ میں مراد زیادہ بلا کلا پسند نہیں کرتے۔" خان نے بتایا۔ "ان کا حکم تو صرف یہ ہے کہ یہاں کبھی ملا کھڑے، دیکھ کر کسی یا کبڈی وغیرہ کے چھوٹے موٹے ملا کر آئے جائیں۔ وہ بھی سال میں صرف ایک آدھ مرتبہ ہم رہیں گے کلمہ پر عمل نہیں کرتے۔"

وہ تو اب تک میں بھی اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ دلبر خان عملاً کبھی کو اپنے قبضے میں لیا ہوا تھا۔ مالک کے طور پر تو مراد کام صرف نام ہی چل رہا تھا۔ عملاً تو دلبر خان کا جود مل چاہا تھا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو کچھ دیکھتا تھا اس کے ہنسا

تاکہ کچھ اور ہوتے تھے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے ملاوٹ کی  
مل لگات رہا تھا۔

اقل تو مجھے امید نہیں تھی کہ رئیس مراد خان، دلبر خان کے  
مل کرتے سے کبھی واقف ہو سکے گا اور اگر واقف ہو بھی گیا تو یہ  
بغیر دیکھنا فضول تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرے گا لیکن اگر یہ  
میں بھی کر لیا جائے کہ کبھی مراد خان ان سب چکروں سے واقف  
ہو جائے گا اور دلبر خان سے چھکارا بھی حاصل کرنے کا تب بھی  
بہتر نہیں تھا کہ اس وقت تک دلبر خان خود ایک ایسے بھلے زمیندار  
منا مضبوط ہو چکا ہو گا۔ وہ کہیں اور چٹے گاڑ کر تقریباً وہی کچھ کرنا  
رہے گا جو وہ اب کر رہا تھا۔

میں اور ہوشو خان ایک دوسرے کے آنے سنانے جن کر  
کرتے تھے۔ دلبر خان ہم دونوں کے سینوں پر ہاتھ مارتے ہوئے  
کہتا: "میں ایک بار پھر تم دونوں کو یاد دلا دوں کہ سچ سچ ایک  
دوسرے پر کوئی مسلک دار نہیں کرتا ہے۔ بظاہر تمہارے وارہت  
خطرات کا نظر آئے چاہئیں لیکن ایک دوسرے کو زیادہ چوٹ نہیں  
آتی چاہیے البتہ اگر تکبر پھوٹنے سے تمہارا بہت خون نکل آئے تو  
کوئی صدمہ نہیں۔"

"اگر یہ یارا تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" میں نے ذرا بے تکلفی  
سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "جب ایک بار طے ہو گیا کہ  
ذرا ہی کرتا ہے تو میں ذرا ماہو جائے گا تم فکر مت کرو۔ تم یہ بتاؤ  
کہ تم نے ہمیں اتنا پہلے ہی یہاں بلا کر کیوں بٹھا لیا ہے؟ پوچھوں  
میں وقت چار بجے لکھا تھا کہ اسی وقت وہ بھی نہیں پہنچے تماشائیوں کی  
آگے آکر بٹھاری نہیں ہیں۔ ابھی تو تیاریاں مکمل ہو رہی ہیں۔"

"میں اس میدان کا راز انا کھلاڑی ہوں۔" دلبر خان مسکرایا۔  
"جب بھی ہم کسی قسم کا کوئی پروگرام کرتے ہیں تو اس میں حصہ  
لینے والوں کو اتنا ہی وقت سے بہت پہلے ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں۔  
بہت سے تو ہیں تو ایک جمع کرتا بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ کوئی چیز کم  
جائے تو اس کی کوئی بات نہیں اس کی کمی پوری کرنے کے بہت  
سے طریقے نکل آتے ہیں لیکن میں وقت پر کوئی آدمی کم ہو جائے تو  
بڑی مصیبت ہو جاتی ہے۔ آج کے پروگرام کے سپر اسٹار ہی تم اور  
ہوشو خان ہو۔ تم دونوں وقت سے کافی پہلے یہاں موجود ہو گئے تو  
تھرے دل کو اطمینان رہے گا۔"

"لیکن اس وقت تک میں یہاں کیوں گیا؟ بے معرف اور  
بے اعتماد بیڑہ کر تو میرے لیے ایک گھنا گزرا تا بھی برا مشکل ہوتا  
ہے۔ استغناء سے بیکار بیڑہ کر اتنا وقت گزارا ہے کہ اب چند لمحے  
گزارا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ جلد از جلد تمہاری  
فرمائش پوری کریں اور تم سے اجازت چاہوں۔" میں نے مضطربانہ  
انگوٹھیں ادا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب ایسا بھی کیا جلدی ہے۔" دلبر خان مسکرایا۔ "جس  
استغناء گزار لے وہاں چند گھنٹے اور گزار لو۔ ہم سے نجات پانے

میں تجسب اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تب تک تم یہاں آرام کو  
حاکم سے مائل کرو۔ کچھ گھنٹا بیٹا ہے تو یہاں کسی کو بھی حکم دو  
حاضر ہو جائے گا۔"

"یہ سب کام یہاں بہت مشکل ہیں۔" میں نے لٹھڑی سانس  
لے کر اس تنگ اور جس زور کرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جس میں  
سب سے زیادہ جگہ ہوشو خان کے وجود نے گہری ہوئی تھی۔

بہر حال اپنی تماشہ رہے چینی اور اضطراب کے باوجود مجھے کئی  
گھنٹے وہاں گزارنے پڑے۔ کسی نہ کسی طرح وقت گزری گیا۔ دلبر  
خان مجھے وہاں چھوڑ کر خود تازیوں کا جائزہ لینے باہر چلا گیا۔ بعد میں  
بھی دو دفعہ وقفے وقفے سے آ رہا اور بڑے اصرار سے پوچھتا رہا کہ کسی  
چیز کی، کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حکم دوں لیکن میں نے کوئی  
حکم نہ دیا۔ صرف ایک بار فرمائش کی۔ "یارا مجھے باہر نہیں کھلی ہوا  
میں بیٹھ جائے دو" یہاں تو میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ یہ تو مقابلے سے  
پہلے ہی ریسٹ کرادو ہوا کر دینے والی جگہ ہے۔"

"یہ تو بھائی تم نے بڑی نیرمی فرمائش کر دی۔" دلبر خان مونچھ  
کو بل دیتے ہوئے پُر خیال لہجے میں بولا۔ "اس جگہ کو از کزنڈیشن  
کراٹا میرے بس میں نہیں تھا ورنہ ضرور کراوتا۔"

"از کزنڈیشن کی خواہش کس کیفیت کو ہے۔" میں نے اس کی  
بات کا تھوٹے ہوئے کہا۔ میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ از کزنڈیشن چکروں  
سے تو میرا دل بھر چکا ہے۔

"لیکن اب تو پبلک جمع ہو چکی ہے۔ اب تمہارا اگلی جگہ پر  
بیٹھنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ لوگ تجسب قریب سے دیکھنے کے لیے جمع  
ہونے کی کوشش کریں گے اور بعض اوقات کلا فکروں کے باوجود  
جو کم کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب تمہارے باہر جانے سے  
مقابلے کا سہنس ختم ہو جائے گا۔ اب تو تجسب اور ہوشو کو مقابلے  
کا اعلان ہونے کے بعد اسی طرح آگے پیچھے ان کردوں سے نکل کر  
دوڑتے ہوئے رنگ کی طرف جانا ہے جیسے وہ خطرناک بلائیں اپنی  
کھجارت سے نکل کر دوڑتی ہیں۔"

یہ کہ کر وہ ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ باہر سے تماشائیوں کا  
شور سنائی دے رہا تھا لیکن کمرے میں کوئی کھڑی نہیں تھی کہ میں  
باہر جھانک کر دیکھ سکتا۔ صرف ایک دو واڑہ تھا جو بڑے کمرے میں  
گھٹا تھا۔ ہوا کے لیے کمرے میں پینڈلشن مین کھڑا رہے تھے جو  
کمرے کی جس زور فضا میں کوئی تبدیلی لانے سے قاصر تھے۔  
تماشائیوں کو شاید گمان بھی نہیں تھا کہ آج کے سب سے بڑے  
مقابلے کے دونوں حریف اندر ایک ہی چھوٹے سے کمرے میں  
آنے سانسے بیٹھے تھے اور مزاحم کر ایک دوسرے کو تنگ رہے تھے۔  
حاکم مائشی نے اس دوران مجھے تیل سے چڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں  
مائش نہیں کرنا چاہ رہا تھا کیوں کہ اس کمرے میں مجھے جتنا ہی نہ آ  
رہا تھا میرے خیال میں وہی جسم کا جو زور کھول دینے کے لیے  
کافی تھا، مائش کی ضرورت نہیں تھی لیکن حاکم ہر حال میں مائش پر



”میں تو آٹھ دن سے تیار ہوں۔“ میں نے تو لیے سے ہر صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ قدرے مطمئن انداز میں سر ہلاتا اندر چھوٹے کمرے میں ہوش کے پاس چلا گیا۔ چہرے بعد وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچھ کاغذات تھے۔ وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا وہ ٹاپ میں اسٹامپ پیڑز تھے۔ ایک اسٹامپ پیڑز اسٹول پر میرے نام لکھتے ہوئے ہوا۔ ”معاف کرنا یا رامیں اپنے کاموں میں الجھا ہوا تم سے اس پر مائن کرنا تو بھول ہی گیا۔“

”یہ کیا ہے؟“ میں نے کاغذ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”یہ بس یونہی ایک رسمی کارروائی ہے۔“ خانہ پڑی ہے۔  
 بے پروائی سے ہوا۔ ”ہمارے کاموں میں قریبی شرکی انتظام کیا گیا۔ دخل تو نہیں رہی لیکن بعض کاموں کے لیے ہم اسٹامپ کاغذ کارروائی مکمل کر کے رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہم ٹکٹ رکھ کر پروکار کرتے ہیں لیکن ہمیں کبھی ایسا سزا والوں نے بھی ذکر نہیں پوچھا۔  
 ریلنگ کے مقابلوں کے لیے ہم یہ افراد نامہ سائن کرنا کر رہے ہیں۔“

افراد نامہ انگریزی میں تھا اور میں سرسری نظر سے اسے دیکھا تھا لیکن میں دلبر خان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے انگریزی پڑھنا آتی ہے۔ اس لیے میں نے ساوکی سے پوچھا۔ ”اس میں کیا لکھا ہے؟“

”بس۔۔۔ یہ تمہاری طرف سے افراد نامہ ہے کہ میں اپنی فوڈ اور اپنی مرضی سے اس مقابلے میں حصہ لے رہا ہوں اور کسی قسم کے مالی، جسمانی یا ذہنی نقصان کی ذمہ داری خود مجھ پر ہوگی۔ کوئی دوسرا اس کا ذمہ وار نہیں ہوگا۔“ دلبر خان بے پروائی سے ہوا۔

افراد نامہ تقریباً اسی مضمون پر مشتمل تھا۔ لفظوں کی مزید شوریٰ ہی بھرا پیچیری تھی۔ دلبر خان گویا مجھے تسلیم دینے کے لیے اسٹامپ پیڑز کی گڈی کو چھتیا تے ہوئے ہوا۔ ”باتی سب لوگوں سے تو میں نے پرسوں ہی سائن کرنا لے لیے تھے۔ صرف تمہارے اڈے ہوش خان کے افراد نامے سائن ہونے سے رہ گئے تھے۔ ہوش خان نے بھی اب کر دیے ہیں۔“

اس نے گڈی میں سب سے اوپر والا کاغذ مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رہا ہوش خان کا اسٹامپ پیڑز۔ اب صرف تمہارا باقی ہے۔“

ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا میں نے اس سے قلم اُٹھایا اور ارد میں یونہی ایک جھلی سائن کر دیے۔

”مشائقی کارڈ ہے تمہارے پاس؟“ دلبر خان نے بظاہر سرسری سے ليے میں پوچھا۔ وہ غالباً اس بارے میں شائستگی کی تصدیق بھی کرنا چاہتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ فی الحال تو میں اپنی شائستگی بھلائے رکھنے کے لیے ہی اپنے شر سے نکلا ہوا تھا۔ میرے پاس

نکلا ہوا تھا۔ اسے میرے جسم کو فولاد قرار دینے اور اس پر سے مادہ زہک اُتارنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔

ابتدائی مقابلے شروع ہوئے تو میں دوسرے کمرے میں آگیا اور نوجوانوں کو مقابلوں کے لیے رخصت ہوتے اور واپس آتے دیکھتا رہا۔ اس دوران کبھی باہر سے زبردست شور سنائی دینے لگا اور کبھی گمراہ سکوت چھا جاتا۔ کمرے کے دروازے کا رخ کچھ ایسا تھا کہ میں صحیح طور پر مقابلوں کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دروازے پر کھڑا محکوم بردار قیامت تھے اور کمرے کے اندر موجود تمام افراد بار بار ہمت سی نظروں سے میری طرف دیکھتے تھے۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کر رہا تھا۔ چھوٹے مقابلوں میں حصہ لینے والے ریسررز اور باکسز کی آنکھوں میں بھی بے پناہ مروجیت نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا میرے بارے میں جو افسانے اڑائے گئے تھے ان سے وہ بھی بے حد متاثر تھے۔

باکسنگ کے صرف دو مقابلے تھے۔ انہوں نے کچھ زیادہ وقت لیا جب کہ ریلنگ کے مقابلے صرف چند منٹ میں ختم ہوتے رہے۔ ایک مقابلہ تو شروع ہونے کے بعد فوراً دو منٹ میں ہی ختم ہو گیا اور اس میں حصہ لینے والے ایک نوجوان کو چارپائی پر ڈال کر کمرے میں لایا گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پتا چلا کہ وہ دوڑنا ہوا اپنے پی زور میں دھوکے کے درمیان سے گزرا سر کے بل باہر جا کر اٹھا اور اس کا سر ٹکڑی کی ایک بیچ کے ٹکڑے کرنے سے ٹکرا گیا تھا۔ نوجوان بے ہوش تھا۔

قیمت تھا کہ دلبر خان نے انتظامات میں اس پلو کا بھی خیال رکھا تھا۔ کمرے میں میڈیکل کٹ اور خاصی دواؤں کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا اور اہتمام کا یہ عالم تھا کہ وہ سفید اور آٹل بھی پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں اسٹیتھو سکوپ بھی لٹکائے ہوئے تھا۔ دور دراز دستانی علاقوں میں عمداً اسپنڈروفیرو بھی بڑی شان سے ڈاکٹر بنے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ شخص بھی کوالیفائڈ ڈاکٹر تھا یا نہیں۔

اپنی صحت، شجیرگی اور خود اعتمادی کی وجہ سے وہ کچھ کوالیفائڈ ہی لگتا تھا۔ اس نے فوری طور پر نوجوان کا سر صاف کر کے جینٹل جیج کیا اور اسے آنکھیں لگا دیا۔ اس دوران پر دو گرام کے مطابق اگلا مقابلہ جاری رہا اور باہر وقت وقفے سے شور برپا ہوتا رہا۔

اس وقت غالباً آخری چھوٹا مقابلہ جاری تھا جب دلبر خان کمرے میں آیا۔ اس کے چہرے سے اضطراب نمایاں تھا۔ وہ پیشتر اوقات پُرسکون رہنے اور اپنے تاثرات چھپائے رکھنے پر قادر تھا لیکن اس وقت کچھ عجیبان زدہ خطر آ رہا تھا۔ یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں تھی۔ اس وقت پورے ماحول پر ہی یکجان غالب تھا۔

میرے قریب آکر وہ جھلی جھلی آواز میں ہوا۔ ”بس۔۔۔ اب اس مقابلے کے بعد تمہاری باری ہے۔ تم تیار ہونا؟“

برہم تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بارے "پسندیدگی" کے مجھ پر "ٹوٹ" رہا چاہتے تھے۔ ہمارے ہاں بعض اوقات محبت میں بھی لوگ اپنی محبوبہ ہستی کی شکایتوں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

معلوم نہیں لوگوں میں میرے بارے میں کیا افسانے مشہور ہو چکے تھے۔ اور لاڈلا ستیکر پر میرے بارے میں ہوشو خان سے بھی زیادہ مبالغہ آرائی کی جاتی تھی۔ چند لمبے لمبے ڈگ بھر کر اور چار بیڑھیاں چڑھ کر میں رنگ میں جا پہنچا۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور ایک لمبے کے لیے دم بخود سا رہ گیا۔

جب میں وہاں پہنچا تھا تو میدان تقریباً خالی ہی تھا اور چاروں طرف روشنی بجلی ہوئی تھی لیکن اب شام کا اندیرا کرا ہو چکا تھا اور میدان میں جہاں تک میری نظر کام کر رہی تھی، سرری سر نظر آ رہے تھے۔ رنگ میں اور اس کے چاروں طرف کچھ لمبے میں تیز روشنی تھی۔ اس کے بعد اندھیرے کا دائرہ بتدریج گہرا ہوتا گیا تھا لیکن دھندلے دھندلے سر بہ حال دیکھ جاسکتے تھے۔

اتنے بڑے جھوم کے لیے مرکز نگاہ بن کر کھڑے ہوا میرے لیے پہلا اور نہایت اٹوکھا سا تجربہ تھا۔ اپنی حالت کچھ معکھ خیز بھی لگ رہی تھی۔ میں سرخ نیکر پہنے، تیل سے چمکا جسم لیے اتنے بڑے جھوم کے سامنے اچھل کر رہا تھا، غیظ و غضب کی اداکاری کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ اتنے بڑے جھوم کے سامنے اداکاری کرنا کچھ ایسا آسان کام بھی نہیں تھا۔ خصوصاً اس جھوم کی اداکاری جو مجھے کرنا پڑی تھی۔

جب اس سارے کام کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ اس علاقے میں اتنے بڑے مجمع اکٹھا ہو جائے گا۔ یہ اچھا خاصا پراجہ تمام قشاشا تھا جس کے مرکزی کردار میں اور ہوشو خان تھے۔

ہوشو خان مجھ سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ وہ زیادہ سبز اداکاری کر رہا تھا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں خود اپنی اداکاری کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ بہر حال میں بھی شروع ہی سے مقابلے میں جان ڈالنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ جہڑوں کی معنوی تخلیق بہر حال کوئی آسان کام نہیں تھا۔ غیظ و غضب یا کوئی اور جذبہ واقعی انسان کے دل سے پھوٹ رہا ہو تو کچھ اور بات ہوتی ہے۔ میں تو دیے بھی شروع ہی سے حقیقی جہڑوں پر یقین رکھنے والا، ان ہی پر انحصار کرنے والا اور ان ہی کو اہم سمجھنے والا انسان تھا۔ میں نے اداکاری کو کبھی کوئی اچھا کام نہیں سمجھا تھا لیکن آج احساس ہوا تھا کہ یہ بہر حال ایک فن تھا۔ بعض لوگ اس کی خدا واد صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ بعض سیکہ لیتے ہیں اور کمال مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض میری طرح بوقت ضرورت اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔

میں اپنی دانست میں صرف ضرورت کے تحت اپنی سی کوشش کر رہا تھا لیکن بھر میں نے محسوس کیا کہ ہر ماحول کے اپنے کچھ

خفاقی کارڈوں یا کسی بھی قسم کا کوئی کارڈ، سادہ محض کا کوئی ٹکڑا بھی نہیں تھا۔

"میری بھانگ دوڑ میں کارڈ کس کر گیا ہے۔ زندگی نے مہلت دی تو دوبارہ خواہاں گا۔" میں نے جواب دیا۔

زیر موچے اس کے پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر کشیدہ سی سکرابٹ نمودار ہوئی اور وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے خیال سے انداز میں سر ہلا کر ہلا۔ "ہاں... زندگی نے مہلت دی تو ضرور بخلا۔"

لاڈلا ستیکر پر میرے اور ہوشو کے مقابلے کا اعلان ہونے لگا۔ ہاں ہر چیز کی سہرمل تو ہو چکی تھی، سب کچھ ملے ہو چکا تھا۔ اسی کے مطابق پہلے ہوشو خان چھوٹے کمرے سے نکلا۔ اب اس کے رہے سے محنت اور سنجیدگی غائب ہو چکی تھی۔ وہ ایک بار پھر شت زدہ مغریت نظر آ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خاروں کے گوشت میں کچھ اور چھپ گئی تھیں یا چھیں بھیل گئی تھیں۔ چہرہ سرخ نظر آ رہا تھا اور شدت غیظ و غضب سے اس کے رہے اور جسم کے ٹپے بھڑک رہے تھے۔

میں اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ غیظ و غضب کی کامیاب اداکاری رہا تھا یا جھج جھج جوش میں آچکا تھا۔ بہر حال اگر وہ اداکاری کر رہا اہمیت مہم کر رہا تھا۔ وہ بڑے کمرے سے سب کے درمیان سے لڑتے ہوئے دروازے سے نکلا اور باہر قدم رکھتے ہی جڑی طرح پٹنے کا ڈانے اور سینہ پٹنے لگا۔

دروازے سے نکل کر وہ بائیں طرف مڑا اور میری نظر سے محال ہو گیا۔ اس کے پیچھے اور دھانے کی آوازیں نہ رہے کہ دور آئی گئیں۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا کہ وہ درمیانی راستے پر دوڑتا ہوا کس رفتار سے رنگ کے قریب تھا۔ قشاشاں کا شور بھی کچھ کم نہیں تھا لیکن ہوشو کی گرج رہا آواز اس میں بھی نمایاں محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے اور ہوشو دونوں ہی کو چونکہ کوئی فیروزہ میسر نہیں تھا جو دس بیچے بیچے دوڑا جاتا چنانچہ ہوشو کے پیچھے تو حاکم مہاشاہی نے چلا دیا تھا اور مجھے اکیلے ہی دوڑتے ہوئے جانا تھا۔ میرے تالو ڈاڈا ستیکر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ لاڈلا ستیکر پر کوئی ہوشو ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ اسی کے خوشہ شراب بھی جاری تھا۔

لاڈلا ستیکر پر میرا نام لایا گیا۔ تب میں بھی اپنے چہرے پر الاسکان جوش و خروش اور غیظ و غضب کے تاثرات لاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اچھل کر کمرے سے نکلا۔ کمرے سے باہر ایک اور قدیم بھری شہر تھی۔

دروازے کے راستے کے دونوں طرف لوگوں کا ایک جھوم تھا جسے میں ہانسیں دینے کی رکاوٹوں نے روکا ہوا تھا۔ درندہ شاید وہ کی شکایتیں کر رہے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مجھ پر

یہ سب کچھ گویا میرے حواس پر چھا رہا تھا، مجھے خواب و خیال کی کسی اور ہی دنیا میں لے جا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو جھجکا، میرا محسوس کر رہا تھا۔ ہوش خان نے اچانک ہی کسی سائے کی طرح جھکا کر میرے سینے پر پوری قوت سے گھر سید کی۔ میں رستے سے نکل آیا اور اپنے ہی زور میں تیزی سے آگے آیا۔

اس کی فکر مجھے کچھ ایسی ہی محسوس ہوئی تھی جیسے کوئی ہمارا اچانک منہ پر کر رہا ہو کہ نہ جانے کتنی قوت سے میرے سینے سے آکر آیا تھا۔ ایک لمبے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ میری کئی پہچان ٹوٹ چھوٹ کر دل اور پیچھڑوں میں گھس گئی تھیں، آئینے کا پتلا پتلا ہوتی تھیں اور مددہ حلق میں آگیا تھا۔

رنگ میں بجلی کے موٹے تاروں جیسا سما استہلال کیا گیا تھا۔ باریک باریک تاروں کو ٹک کر بنایا جاتا ہے۔ اسے بڑی ٹھنکی اور مضبوطی سے رنگ کے چاروں کونوں میں آہنی کڑوں سے گوارا ہوا تھا اور ان کڑوں کو زمین میں گڑے ہوئے بت موٹے شیشے سے باندھا گیا تھا۔ غیر ملکی انداز میں ہی ان آہنی کڑوں پر فوم ہوا تھا۔ لیٹ کر اور اوپر چڑھا لیٹ کر انہیں کم ضرر رساں اور گھٹا ہوا کی کوشش کی گئی تھی۔ آہنی رسوں پر سائیکل کی ٹیڑھوں سے باندھ کر چڑھا کر ان کی دھڑک کو بھی کم تکلیف دہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن ان سب چیزوں کے نیچے سے اصل چیزیں کیسے نہ بچ سکتی تھیں۔ میں نے رنگ میں داخل ہوتے ہی ہر جگہ باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔

آہنی رستے نے کافی طاقت سے مجھے آگے دھکیلا اور اس پہلے کے میں اپنے پچھاڑ کے لیے کچھ کرنا، ہوش خان نے اپنا شہہ جیسا بازو پوری قوت سے میری گردن پر رسید کیا۔ میں چپٹ فرما کر اور ایک لمبے کے لیے میرا سر گھوم گیا۔ فرش پر کسی ہونٹ کے نیچے یقیناً ایک یا دو قاتلین موجود تھے لیکن اتنی طاقت سے کہ پران کی زنی گویا کوئی خاص تحفظ فراہم نہیں کر رہی تھی۔

یوں تو ہوش خان نے دونوں واردہ سرسل کے مطابق ہی تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس نے طاقت غیر ضروری طور اتنی استہلال کی تھی جتنی اس کے بس میں تھی۔ اس کے واردہ رکھانے کے نہیں تھے۔ اس نے اپنا پورا پورا زور لگایا تھا، سادہ بے خلاف درزی کی تھی۔

میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ مجھے رنگ میں جو تجربہ نہیں تھا۔ رنڈ کے گھر پر خواہ میں نے ہوش کے ساتھ کیا سرسل کی تھی لیکن رنگ میں لڑنا اور بات تھی ہوش کو گھر کی مرتبہ لڑنے کا تجربہ حاصل تھا۔ ہر حال مجھے تجربہ کا ملنا لے اس کے دوداری کافی تھے۔

چت کرنے سے مجھ پر چودہ طبق روشن ہوئے تو جیسے ما کچھ خوابیدہ سی حسرت بھی ہوا ہو گئیں۔ اندر سویا ہوا گویا جھرمجھری کے گرد ہوا اور میں نے دل ہی دل میں

اثرات بھی ہوتے ہیں۔ فضا میں گویا کچھ جراثیم، کچھ ناپیدہ لہریں پھیل جاتی ہیں جنہیں ذہن اور جسم جذب کرنا چلا جاتا ہے۔

میرے سامنے ہوش خان زمانہ غار کے کسی انسان کی طرح دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ رہا تھا اور حلق سے عجیب غریبناکی سی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی درندے کے سامنے اس کا شکار موجود ہو لیکن کسی ناپیدہ رکاوٹ کی وجہ سے وہ فوری طور پر اس پر چھٹ پڑنے کے قابل نہ ہوتا ہم بے تابی سے رکاوٹ کے پھٹنے کا منتظر ہو۔

وہ بار بار غرا کر میری طرف بڑھ رہا تھا لیکن ریفری ماسٹر عبداللہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیتا تھا اور بظاہر مقابلے کے کچھ اصول سمجھانے لگتا تھا لیکن ہوش خان اس کا بیضیہ ایک لفظ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا۔ میری توجہ بھی ماسٹر عبداللہ کی طرف نہیں تھی۔

میں بظاہر میرے دھیرے اچھلنے کودنے اور حقارت سے ہوش خان کی طرف دیکھ کر چھٹکارنے میں مصروف تھا۔ میری فکر رنگ کے چاروں طرف بھی بھٹک رہی تھی۔ سو فوں پر بچنے اونچے اونچے طرلوں، عمدہ سندھی ٹوبیوں اور ایلے لباسوں والے کچھ لوگ بیٹھے نظر آئے۔ وہ یقیناً معزز اور دوی آئی بی شخصیات تھیں۔ اسی دارے میں دوسری طرف کچھ مردوں اور عورتوں کی قطاریں موجود تھیں۔

وہ غالباً دوی آئی بی نہیں، صرف آئی بی تھے اس لیے انہیں جگہ تو رنگ کے قریب ملی تھی لیکن وہ نشستوں پر نہیں بلکہ دریوں پر تھے۔ ان ہی میں سب سے اگلی قطار میں مجھے دیکھو اور موئل بھی نظر آئے۔ تجرہ دہنی میں موئل کا سانولا چودہ دھواں دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ویسے ہی بڑی بڑی تھیں۔ اس وقت کچھ اور پھیل جاتی تھیں۔ وہ سرد اور نچا کیے جھوت سے انداز میں رنگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سرسل کے عین مطابق ہوش نے ریفری کی بات ختم ہونے اور باضابطہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی اپنی دانست میں آگے بچا کر دھوکے سے مجھ پر دار کرنا چاہا لیکن سرسل کے عین مطابق ہی میں بروقت ہوشیار ہو گیا اور جھکا کر دے کر اس دارے سے بچ گیا۔ ہوش کا زبردست کچھ نسا ریفری کے منہ پر پڑے پڑے گیا لیکن یہ بھی سرسل کے عین مطابق ہی تھا۔ تماشاخیوں میں زبردست شور بلند ہوا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ہر داخل کے اپنے کچھ اثرات ہوتے ہیں۔ ہوا میں گویا کچھ جراثیم، کچھ ناپیدہ لہریں پھیل جاتی ہیں جنہیں ذہن اور جسم جذب کرنا چلا جاتا ہے۔ میرے ساتھ اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ اتنا بڑا مجمع۔ تجرہ دہنیوں۔ رنگوں میں لوہ کی گروش تیز کر دینے والا شور و غل۔ کسی بین ماس کی طرح شور مچاتا ہوا ہوش خان اور دھواں دھواں سے چہرے سے جھانکتی ہوئی وہ کنول سی آنکھیں۔ موئل کی آنکھیں۔

تب کو خبردار کیا۔ ”برخوردار افضل! ہوشیار ہو جا۔ صرف سیرسل کے دائرے میں قید مت رہ۔ اپنے حواس کو پوری طرح بیدار کر لے اور اپنی تمام قوت کو جمع کر لے۔ جذباتیت کی دلدل سے نکل آ۔ مول کو کچھ دیر کے لیے بھول جا۔ اس کی آنکھوں کی حیرانی اور اس کی نظروں کے سحر میں نہ آجھ۔ فی الحال سب کچھ ذہن سے جھٹک لے اور صرف ہوش پر نظر رکھ۔ اسی کو ذہن میں رکھ۔“

یہ سب باتیں میں نے صرف ایک لمحے میں اپنے آپ سے کہیں۔ اس دوران ہوشو خان میرے سینے یا شاید منہ پر کبھی رسید کرنے کے لیے اچھل کر پورے وزن سے مجھ پر گرنے لگا تھا لیکن میں اس ایک لمحے کے دوران ہی گویا کسی عجیب سی وندنا ہٹ سے یکدم بدخشی میں آچکا تھا۔ میں پھجلی کی طرح تڑپ کر وہاں سے ہٹ چکا تھا۔

ہوشو خان کا وزن اس کے لیے جتنا فائدہ مند تھا اس سے زیادہ نقصان دہ تھا۔ اگر وہ مجھ پر گر کر کبھی مارنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے وزن کا اسے بے پناہ فائدہ پہنچتا۔ بے درپے اس کا یہ نیروار اسے بہت سارا دھچ اور مجھے ابتدا ہی میں کافی زوردار جھٹکے لگ جاتے لیکن چونکہ وہ مجھ پر نہیں گر سکا تھا بلکہ ایک ہاتھی کی طرح فرش پر گرا تھا اس لیے اس کے اپنے وزن نے اس کا جو شرمیلیاں کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے حواس ختم سے ہو گئے۔ میں جانتا تو اس دوران اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کی حالت مزید خراب کردیتا لیکن میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ وہ سر جھٹک کر بہ مشکل اٹھا تو اس کی ہڈی جیسی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ اس کا شکوہ بجا تھا۔ میرا اس کی کنسی کے نیچے سے نکل جانا سیرسل کے خلاف تھا لیکن اگر موقع ہو تا تو میں اس سے پوچھتا کہ اس نے مجھ پر جو پہلے دو دار اپنی پوری طاقت سے کیے تھے انہی وہ حرکت سیرسل کے مطابق تھی؟ اس کے علاوہ میں نے اسے گرنے کے بعد سنبھلنے کا بھی موقع دیا تھا میرا یہ احسان کم اہم نہیں تھا۔

چند لمحے ہم بھوکے شیروں کی طرح دو جگہ میں ایک دوسرے کے سامنے نیم دائرے میں پکراتے رہے پھر جھپٹ کر ایک دوسرے سے اٹھے۔ ہوشو خان نے مجھے دھکیل کر ایک بار پھر وہاں سے کھرانے کی کوشش کی لیکن اس بار میں نے اس کی کوشش کامیاب نہ ہونے دی اور میں بھی اس سے کیس جلتے جسم کے باوجود اپنی ہی طرح اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ شروع میں مجھے ماری پڑنے دیکھ کر تو شائیں میں سکوت پھیل گیا تھا۔ لاڈلا پتھر پر جیڑی سے کنسی ہلائی تھی لیکن اس کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر میں نے سنبھل کر ہوشو خان سے نمٹنا شروع کیا تو چاروں طرف سے یکدم حمیس آہیر شور بلند ہونے لگا۔

یہ بات میرے لیے حیران کن تھی۔ کیا تماشائیوں کی

ہمدردیاں میری ساتھ تھیں؟ مگر میں توان کے لیے قطعی اطمینان تھا۔ توڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر اپنی سب تو میری صورت ہی پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ ان تک تو شاید صرف میرے افسانے ہی پہنچے تھے جو دلیر خان نے معلق پھیلائے تھے۔ وہ ان افسانوں سے لوگوں کے ذہنوں میں میرے بارے میں یہ اثر تخلیق کرنا چاہتا تھا کہ میں ناقابل شکست ہوں۔

اس اثر کے بعد جب اچانک مجھے ہوشو خان کے ہاتھوں شکست ہوتی تو لوگوں کو شدید دھچکا لگتا اور اس قسم کے کاموں میں دھچکے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی کیفیت میں لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے یہ بات نقش ہو جاتی کہ ناقابل شکست تو درحقیقت ہوشو خان ہے۔ اور ہوشو خان، دلیر خان کا ایک ادنیٰ نظام تھا۔ اس سے دلیر خان کی دہشت اور بھی مضحک ہوتی۔ بہر حال میرے لیے یہ خوشی ہی بہت تھی کہ تماشائیوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ ان کا حمیس آہیر شور میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی آنکھ سیال کو مزہ دے رہا تھا۔

ہوشو خان گویا کسی نئی سوچ کے ساتھ اپنے تمام تربیاری تن و قوت کے باوجود استعفیٰ پھرتی ہے اچانک مجھ پر بھجنا۔ میں نے اس کی ہٹل میں ہاتھ دے کر اسے قلابازی کھلائے ہوئے فرش پر چنا تو تماشائیوں نے آسمان سر اٹھالیا۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے ہماری ہجر کم اور بے چارے انسان کو ایک بازو سے قلابازی بھی کھائی جا سکتی ہے۔

اتنے ہماری رسل کے لیے باڈی سلیم (BODY SLAM) خاص ہوش اڑا دینے والی چیز ہوتی ہے۔ خصوصاً جب یہ سیرسل کے مطابق کوئی جیلی باڈی سلیم بھی نہیں تھا جس میں اس کے لیے اپنے بچاؤ کا موقع نہیں ہوتا۔ یعنی وہ اپنے پاؤں پہلے زمین پر گئے رہتا جس سے دھچکے کی شدت کم ہو جاتی اور اسے جلی چوٹ آتی لیکن میں نے تو اس کی توقع کے خلاف اسے باڈی سلیم دیا تھا۔

اس کی ریزہ کی ہڈی کے صرے یقیناً مجھنا اٹھے تھے۔ وہ چت پڑا آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ اس وقت اسے پتہ نہ تھا کہ سیرسل میں شامل نہیں تھا لیکن میرے خیال میں اسے خبردار کرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ میں اسے چت کرنے کے لیے اس کے اوپر جا کر۔ اس کا سینہ دھونکی کی طرح پھول پھٹ رہا تھا۔ میں نے اسے پوری قوت سے دبا کر اس کی سانس تقریباً روک دی اور اس کے کان میں اس طرح سرگوشی کی کہ کسی کو میرے ہونٹ بچنے نظر نہ آسکیں۔

”سیرسل کے مطابق چلو ہوشو خان! اور نہ۔۔۔“ میں نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ ماسٹر عبداللہ ایک لمحے کے لیے دم بخود کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے شاید بالکل قوت نہیں تھی کہ میں ابتدائی مراحل میں ہی ہوشو خان کو پتہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے لیے ہدایات یہی تھیں کہ میں مقابلے کو زیادہ سے زیادہ طویل دینے کی کوشش کروں تاکہ لوگوں کو اپنے پیچے وصول ہونے کا بھی

احساس ہو سکے اور جو تاثر قائم کرنا مطلوب تھا وہ بھی صحیح طور پر قائم ہو سکے۔

بہر حال اب تو میں ہوش خان کے سینے پر جا ہی گرا تھا اس لیے ماسٹر عبداللہ کو لپک کر آگے آتا ہوا۔ وہ تقریباً سینے کے بل گر کر کیوس پر ہاتھ راتے ہوئے چلایا۔ ”دن۔۔۔“ اس کے بعد اس نے مقررہ یعنی ایک سیکنڈ کے وقفے سے کہیں زیادہ وقفہ دیا۔

چھٹی چھٹی سی آواز میں گویا بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلا۔ ”ٹٹ۔۔۔“ وہ ہوش خان کو پورا پورا موقع دے رہا تھا کہ وہ سنبھل جائے اور مجھے سینے پر سے اچھال چھینکے لیکن ہوش خان کے حواس تو شاید کچھ زیادہ ہی غلغل ہو گئے تھے۔ وہ تو بالکل بے دم پڑا تھا۔

ایک لمبے کے لیے تو مجھے بھی اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ بچ بچا پن نہ ہو جائے۔ میں تو صرف اس کے کان میں سرگوشی کرنے کے لیے اس کے سینے پر گرا تھا۔ ابھی سے اسے بچ بچا پن کرنا نہیں بلکہ صرف خیر وار کرنا، وارننگ دینا میرا مقصد تھا۔ میں نے تو اب اس کے سینے پر سے وزن بھی ختم کر دیا تھا لیکن اب میں خود تو اچھل کر دور جا کر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو فراڈ کی انتہائی ہو جاتی۔ ہوش کا تو عوازا بہت ہاتھ پلانے تو ضروری تھا۔

ایک لمبے کے لیے میں نے سوچا کہ خود ہی اٹھ کر ہوش خان کی گردن پکڑ کر اسے دوبارہ اٹھاؤں اور ہلکی پھلکی مار لگانا شروع کر دوں جس طرح بعض ریسر اس اپنے حریف کو کچھ زیادہ ہی سبق سکھانے کے لیے کرتے ہیں لیکن اسے مکمل طور پر پین نہیں ہونے دیتے، ریفلی کے ”تھری“ کہنے سے پہلے ہی خود دوبارہ اٹھا لیتے ہیں اور سٹے سرے سے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔

غیبت رہا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ماسٹر عبداللہ کی سیکنڈ کے وقفے کے بعد غالباً انتہائی مجبوری کی حالت میں اس وقت اپنا بازو نیچے لاکر تھری کہنے ہی والا تھا جب ہوش خان نے بچ بچ مجھے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے سے اچھال کر دور پھینک دیا۔

حقیقت میں تو وہ پین ہو چکا تھا لیکن ریفلی کے فیصلے کے مطابق بہر حال نہیں ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ناقابلِ یقین پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا بلکہ میری توقع کے خلاف اس نے میرے اٹھنے سے پہلے ہی میری پٹلیوں میں ایک زور وار ٹھوک بھی رسید کر دی۔ ایک لمبے کے لیے مجھے یہی محسوس ہوا کہ میری کوئی پٹلی ٹوٹ کر جھبھڑے میں ہو سکتی تھی یا میرا دل اچھل کر مٹنے میں آگیا تھا۔

میرے خیال میں مجھے اب اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے تھا کہ ہوش خان گوشت اور چربی کا حصّہ تھل تھل کر آ ایک پہاڑ تھا۔ حاکم ماسٹھے نے دے دے الٹا میں مجھے صحیح بتایا تھا کہ طاقت بہر حال اس میں کچھ کم نہیں تھی اور اب اپنے طور پر میں نے ایک بات اور محسوس کی تھی کہ ہوش خان میں بہر حال ایک ریسر کی روح بھی موجود تھی۔ وہ کس معیار کا ریسر تھا، یہ ایک

الگ بحث تھی لیکن مجھے اس کے ریسر ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس یقین کے بعد مجھے اور زیادہ غماخ ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے کسی ترقی یافتہ ملک میں ریسنگ کے میدان میں داخل ہونے کا موقع ملتا۔ تمام ضروری حدود اور رجسٹری میر آئی، ریسر ٹینگ ملتی تو کوئی بعد نہیں تھا کہ وہ نای گرامی ریسر کی صف میں شامل ہو جاتا۔ اس میں قدرتی قسم کا کوئی غیر معمولی پین موجود تھا۔ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے میری پٹلیوں پر دو بار ٹھوک رسید کی۔ میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ سانس میرے ز میں الگ محسوس ہوئی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس وقت رسول کے قریب تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے رسا پکڑ میرے سینے پر چڑھ گیا اور اچھلنے لگا۔

مجھے یہی لگا کہ میں کسی ہاتھ کی پیروں سے ٹکرا جا رہا ہوں میری آنکھیں دلی گرے اور معدے وغیرہ سب ایک دوسرے گڈ گڈ ہو گئے ہیں اور ان کا کچھ سر ہن گیا ہے۔ شاید تھلائی شو رہے تھے۔ شاید ماسٹر عبداللہ باطلی غراستہ لٹتی کن رہا تھا جو وہ خان کے لیے دراصل رسا چھوڑنے کا حکم تھا۔

لیکن اسے اس کی شاید کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے آوازیں کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ریسر مل پڑا یا تو سب کہیں دھری رہ گئی تھیں۔ ہوش خان جو کچھ کر رہا تھا ریسر مل میں شامل ہو تھا کیوں کہ ہمیں بہر حال ایک طویل کشی تھی اور اس میں ہر رنگ، ہر دروازہ پیش کرنا تھا لیکن سب چیزوں کا ترتیب الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ہوش خان کوئی بھی کام دکھاوے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ ہر حملے، ہر وار میں پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ اس کے پیش نظر یقیناً کوئی اور مقصد تھا۔ میرے سینے پر چڑھنا ضرور چاہیے تھا لیکن صرف ایک پاؤں اور وہ بھی وقفے وقفے سے تاکہ مجھ پر پورا وزن نہ پڑا لیکن وقت ہوش خان کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جسے وہ مجھے پیروں سے کرگوشت اور خون کا مغلوب بنا دینا چاہتا تھا۔

یکدم اگر یوگا کی مٹن میرے کام نہ آئی ہوتی تو شاید جسم میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا ہوتا۔ میں نے روکی اور ایک لمبے کے لیے آنکھیں بند کر کے ذہن دھماکے سے ہٹا لیا۔ اس ایک لمبے میں میرا جسم گویا چرکا ہو گیا۔ میرے جسم پر اچھل کود رہا تھا لیکن مجھے تکلیف کا احساس نہ تھا۔

تکلیف کا احساس ختم ہوا تو میں نے ہوش خان کی شینے تاگ پکڑ کر اسے اتنے زور سے دوڑ دھکیلا کہ رسا بھی اس سے چھوٹ گیا۔ وہ اتنے زور سے دوڑ جا کر گر آئے کہ ایک بار رسا فرش میں بھی اترناش سا آگیا۔ ایک لمبے کے لیے گویا ساعت نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور کوئی آواز مجھے سنا

وہ دی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا گویا دنیا سے رابطہ ہی منتقل ہو گیا تھا۔

میں نے ہوش خان کو دہر پھینکا تو مجھے یک لخت تشاہدات کا شور مٹائی دیا۔ میرے لیے یہ کچھ ایسی ہی کیفیت تھی جیسے برقی رو منتقل ہو جانے کی وجہ سے کسی سینما ہال وغیرہ کے اسکرین پر کیم غائب ہو گئے تھے اور بجلی آجاتے پر آوازوں کا سلسلہ بحال ہو گیا تھا۔

میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت ہوش بھی اٹھ رہا تھا۔ اس کے اور میرے تن و فوج میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن وہ اٹھنے میں تقریباً مجھ جتنی ہی بھرتی دکھایا تھا۔ معلوم نہیں ابھی مجھے ایسی کتنی چیزیں کا سامنا کرنا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ گرائے کے لیے اس پر چلا ٹنگ لگائی۔ اس وقت تک وہ رسا پھوکر توڑا کھڑا ہو چکا تھا۔

مجھے کچھ ایسا ہی لگتا جیسے میں ذرا نرم قسم کے کسی پہاڑ سے کرایا تھا۔ وہ ٹوٹ کر آیا۔ اس نے مجھے ساتھ لے کر گرنے کی کوشش کی لیکن میں فرش پر لڑھک کر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ فزکاب انداز میں ڈکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے اس کی کچلی پر پوری قوت سے ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ ایک بار پھر اچھل کر گرا۔ میں نے محسوس کیا کہ بار بار گرنے ہی اس کی حیوانی سی طاقت کو انسانی سطح پر لا سکتا تھا۔ اس کی شکل پر اب درد کی برس رہی تھی۔

اس بار وہ گرا تو میں نے اسے پناہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ برسے خیال میں ابھی وہ پناہ ہونے کی حالت کو نہیں پہنچا تھا۔ جس لمحے میرے اندر بھر فحش سی قوتیں سر اٹھا چکی تھیں اسی طرح اس نے اندر کی کوئی زبردستیدار ہو چکا تھا۔

میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا لیکن یہ میری غلطی تھی۔ اس نے جسم بھر چلی کی اتنی موٹی چھاتی تھیں کہ میں سمجھ گیا کہ ٹھوکروں سے اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اس کی کچلی پر ٹھوکر رسید کرنا چاہی۔ وہ بدحواس سا غلغلہ اڑا رہا تھا لیکن اس وقت اس نے اچانک ہی ایک کریمیری ٹانگ پکڑ لی۔

تو ان خراب ہونے کی وجہ سے میں دھپ سے گرا۔ وہ میری ٹانگ کو گرفت میں رکھتے ہوئے اچھل کر اٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دوسری ٹانگ کی ضرب سے اسے پیچھے بدھکیل دیا ہوتا۔ یہی وہ ٹانگ تھیں جو ٹھٹھکی ہوئی جو اس کی گرفت میں تھیں۔

اسے سے جا کر لایا اور اس کی ٹانگ کی وجہ سے تیزی سے اٹھ گیا۔ اس وقت تک میں اچھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ہم دونوں غیر زائل طور پر آگے سامنے سے آتی ہوئی گاڑیوں کی طرح گھرا گئے۔ اس لمحے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ہم انسان نہیں تھے کسی نامعلوم قوت سے چلنے والی فولادی سی مشینیں ہی تھیں۔ وہ برسے برسے دہرے یا کچھ اور۔ مجھے تو یہ شہ بھی

ہوا کہ اگر ہم دوبارہ اسی طرح ٹکرائے تو شاید ہمارے جسموں سے چنگاریاں بھی پھوٹیں گی۔

حالاں کہ ہوش خان بہت تیزی میں آیا تھا اور میں غیر ارادی طور پر اس سے ٹکرایا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میں گرا نہیں تھا۔ اس ٹکراؤ پر داشت کر گیا تھا اس سے میری خود اعتمادی کو سارا ملا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس متحرک پہاڑ کی ٹکراؤ کو سہر سکتا تھا اور اپنی جگہ جاکھڑا رہ سکتا تھا۔

اس نے میری کھوپڑی پر کرائے کے انداز میں اپنا پیچہ نما ہاتھ رسید کیا۔ میں اس دوار سے بچا نہ سکا۔ ایک لمحے کے لیے میری کھوپڑی جھجھکا مچی لیکن ٹوٹنے سے پہلے میں نے بھی اس کے چہرے پر اندھا دھند گھونسا رسید کیا۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے سے وہ تلاہٹ صاف ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو کارنر میں پایا۔ ہوش خان کسی ریلوے انجن کی طرح میری طرف آ رہا تھا۔ اس کا چوڑھن سے تر تھا۔

اب شاید اس کے حواس پر خون ہی سوار تھا۔ وہ مجھے کارنر میں پھنسا رہا تھا لیکن میں ہر وقت ہٹ گیا۔ وہ کارنر کی بندشوں سے ٹکرایا۔ غیرت تھا کہ اس رنگ میں ستون کارنر سے کافی دور رکھے گئے تھے۔ اس رفتار سے بچ بچ کسی ستون سے ٹکرا جانے کے بعد تو اس کا اللہ ہی حافظ تھا۔

کارنر سے ٹکرا کر ہوش خان پری طرح ڈکرایا مگر اس سے پہلے کہ میں اس پر کوئی وار کر سکتا، وہ گھوم گیا۔ میں اس لمحے اس پر جھپٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے زوردار لات رسید کی۔ میں دور جا کر آ میرے حواس کے ساتھ ساتھ ایک لمحے کے لیے میری خود اعتمادی بھی زیر و زبر ہو گئی۔

میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ہوش خان میرے سر پر تھا۔ اس نے پوری قوت سے میرے بائیں گروے پر گھونسا رسید کرنا چاہا لیکن یہ شخص ایک اتفاق تھا کہ میں ٹوٹ کر اڑنے ہوئے تھا تو اسے سبک گیا۔ گھونسا میرے کندھے پر پڑا۔ میں کچھ اور ٹوٹ کر اڑا ہوا دور چلا گیا۔

مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرا باڈی تو شل ہو گیا تھا یا جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ یہ گھونسا اگر واقعی میرے گروے پر پڑا ہوتا تو یقیناً گروہ پھٹ گیا ہوتا یا شاید پیشے کے لیے ناکارہ ہو گیا ہوتا۔ گھونسا کیا تھا میرے کندھے پر پڑا سا ایک آہستہ جھوڑا تھا۔

رہا سر اور بدھات وغیرہ تو میں تاجکا ہوں کہ کئی منٹ پہلے ہی دھری رہ گئی تھیں لیکن اب تو شاید سب کچھ ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب میں چاہتا بھی تو کسی چیز کو طے شدہ منصوبے کے تحت نہیں رہ سکتا تھا۔ اب یہ ایک خونریز مقابلہ تھا۔ ذہنی اور موت کی بازی تھی۔

خصوصاً ایک لمحے پہلے کا وہ گھونسا جو اصل ہدف پر نہیں پڑ سکا تھا، اس کا انداز مجھے بہت کچھ بتا گیا تھا۔ یکدم جیسے ساری سازش

## طنز و مزاح

|      |             |                    |
|------|-------------|--------------------|
| 10/- | اعتبار ساجد | انگور کھتے ہیں     |
| 10/- | اعتبار ساجد | غالب کی آبرو       |
| 0/-  | اعتبار ساجد | ایمر جنسی دارڈ     |
| 5/-  | اعتبار ساجد | مٹہ شکافیاں        |
| 5/-  | اعتبار ساجد | جائیل اسے مار      |
| 0/-  | اعتبار ساجد | اس طرح تو ہوتا ہے  |
| 10/- | اعتبار ساجد | غالب ہمیں بھی چھیڑ |

## مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

اس کی سازش نہایت سادہ ہوتے ہوئے بھی اس کی بہت پہلو کا انداز رکھتی تھی۔ میرا اور ہوشرو خان کا جو زہر اس نے کشتیوں کے پروگرام میں جان ڈال دی تھی اس سے کمالیہ تھا اور اپنی فطرت کی حکمتیں کا سامان بھی کر لیا تھا۔ اس نے مجھے چند لمحے کے کسی جھگڑے میں گولی کا ٹھکانہ کے بجائے یا کسی طرح اغوا کر کے مردانے کے بجائے ایک بڑے ہجوم کے سامنے اپنے معزز دوستوں کے سامنے ڈھکے سکا سکا کر مارنے کا بندوبست کیا تھا۔ یوں اس نے گویا اپنے معزز دوستوں اور اپنے گروگوں کی تفریح کا بھی انتظام کیا۔ یہ بلاشبہ اس کے لیے ایک دلچسپ کام تھا۔ اگلا سہ سے اور غصے سے جل نہیں ہوا تھا۔

لیکن اب رنگ میں ذرا تاخیر سے سہی، تاہم حقیقت مشکف ضرور ہو گئی تھی۔ مقابلہ شروع سے ہی خواہ مخواہ نہیں ہوا تھا۔ سرسمل اور ہدایات بلاوجہ ہی دہری تھیں۔ سرسمل اور ہدایات درحقیقت صرف میرے لیے تھیں۔ چار منٹ بھی ان کی پابندی میں اُلجھا رہا جاتا تھا۔ ہوجانا۔ گوشت نے لالعلی میں ان کی پابندی کی کوشش کی قدرت نے مجھے بچا لیا تھا۔

دلیر خان شاید اس وقت اپنے گروگوں، مصاحبین اور خاص معزز دوستوں کے ساتھ اعلیٰ صف میں صوفے کے لگائے قدیم دو من پادشاہوں کے انداز میں جڑواں جھگڑا سامنے مجھے مرتے دیکھنے کا شہر تھا۔ یہ دونوں کے درمیان شر سہل جھگڑا تھا جو ہمیں کسی معنوی فائدہ

الہامی سے انداز میں کسی روشن تصویر کی طرح میرے سامنے آگئی تھی۔ ہوشرو خان کے چہرے پر پھیلی ہوئی درندگی نے بھی مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ یہ درندگی محض اداکاری نہیں تھی۔

ہوشرو خان نے شروع ہی سے ہردار پوری طاقت سے کیا تھا۔ محض اتفاق نہیں تھا اور نہ ہی اس پر وقتی جذباتیت غالب آئی تھی۔ شروع سے یقیناً منصوبہ ہی یہی تھا۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ کوئی دارغالی چلا گیا تھا، کوئی صحیح ہدف پر نہیں پڑ سکا تھا اور کوئی میری غیر معمولی خوش برداشت کی وجہ سے وہ نتیجہ نہیں دے سکا تھا جو ہوشرو خان یا اس کے آگے سوچا ہوا تھا۔

میں نے جواب محسوس کیا کہ ہوشرو خان نے تقریباً ہردار ہی میرے جسم کے کسی ایسے حصے پر اس شدت سے اور اس انداز میں کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ میرے لیے ملک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسے کسی بھی ایک وار سے میں بے ہوش ہو کر گر پڑتا تو پھر کھار کشتی ہی کشتی میں میرا خاتمہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

سازش بہت سادہ ہی تھی شاید اسی لیے شروع میں میری کچھ میں نہیں آئی تھی۔ بعض اوقات ہم، شاطروں کا گروگوں کی ہر بات میں چھوڑ کر تلاش کرتے رہ جاتے ہیں جبکہ وہ نہایت سیدھا سادا دار کر جاتے ہیں۔ بات بالکل سامنے کی ہوتی ہے لیکن ہماری کچھ میں نہیں آتی۔

تاہم سازش کی ماحر سادگی کے باوجود مجھے دل ہی دل میں دلیر خان کی ذہانت کی داد دینی پڑی۔ وہ اصل مالک کے ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ ہی اس علاقے پر حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اور جوہر جبران و پریشان تھے کہ آخر دلیر خان اپنے آدمیوں سمیت میرے ہاتھوں ڈک اٹھانے کے بعد اچانک ہی مجھ پر مہمان کیوں ہو گیا تھا؟ اس قبیل کے لوگ تو بہت کینہ پرور ہوتے ہیں۔ ان کے حضور میں کسی سے غیر ارادی طور پر معمولی سی گستاخی بھی سرزد ہو جائے تو وہ بات دل میں رکھ لیتے ہیں۔ اگر اس وقت کسی مصلحت یا مجبوری کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکیں، کچھ نہ کر سکیں تو بھی نہ کبھی اس بد نصیب کو سبق ضرور سکھاتے ہیں۔

میں تو ایک ایسی اور بظاہر بے حیثیت آدمی تھا۔ میں نے تو اس کے خاص کارندوں کو مارا تھا اور غالباً پوری کشتی میں یہ بات پھیل چکی تھی۔ وہ مہلا مجھے کیسے بخش سکتا تھا؟ میں اور جوہر جبران تھے کہ کیا علاقے میں کشتیوں کے مقابلے کرانا اس کے لیے اسی اہم تھا کہ ان میں محض ایک نوراکشتی لڑنے کے عوض وہ میری جان بخشی کہنے پر تیار ہو گیا تھا؟

دلیر خان کا ذہن یقیناً کچھ بڑی طرح کام کر رہا تھا۔ میں جب جا کر اس کے آدمیوں سے اُلجھا تھا تو اس نے ایک لمحے کے اندر اندر واقعی میرے لیے بڑے کمال کی سزا سونپی تھی۔ میرا سراپا اور لڑائی جڑواں کا انداز دیکھتے ہوئے اس نے جو مجبور پیش کی تھی وہ بظاہر بے

کے کچھ زیادہ ہی قریب جانا پڑ گیا۔

وہ لمحہ میرے لیے کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکا کیوں کہ عین اسی لمحے اس نے بھی دونوں ہاتھوں کے درمیان میرے سر کو غریبوں کے طرح چپکانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ادھر میرا کراٹے کا وار اس کی کھوپڑی پر پڑا، ادھر دائیں بائیں دونوں طرف سے اس کے گھونٹے ایک دقت میری دونوں گتھیں پر برسے۔

میری کھوپڑی کی جگہ اگر کوئی تیزوز ہو آ تو ہوش خان کے دونوں گھونٹوں کے درمیان شاید اس کے ٹکڑے اڑ جاتے لیکن کھوپڑی اللہ نے بڑی مضبوط چیز بنائی ہے، تمام اس مضبوط چیز کی قوت برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کپٹیاں دیے بھی کھوپڑی کا ذرا نازک حصہ ہوتی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے بھی محسوس ہوا کہ میری کھوپڑی کوئی تیزوز ہی تھی اور اس کے پرچھے اڑ چکے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دھم کی آواز سے مجھے احساس ہوا کہ میں گر چکا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ آخری خیال ذہن میں بس یہی تھا کہ یہ میری پہلی اور آخری کشتی کا بھی اختتام تھا اور میری زندگی کا بھی۔ میرا خیال تھا کہ یا تو میں موت کی آغوش میں جا رہا ہوں یا پھر بے ہوش ہو رہا ہوں لیکن اس بے ہوشی کے دوران ہی ہوش خان میرا کام تمام کر دے گا۔

میں نے اپنی قوت ارادی کو ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہوئے بے ہوشی سے بچنے کی کوشش کی لیکن مجھے آخری ہو چکی تھی اور وار بھی شدید تھا۔ تاریکی نے ایک نکتہ ہی میرے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔ میرے وجود میں جیسے شارٹ سرکٹ ہو جانے کی وجہ سے کوئی لمب بجھک سے اڑ گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے حواس پر وہ بلیک آؤٹ کتنی دیر طاری رہا۔ شاید وہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی۔ میں نے ایک مانوس شاعر رستاؤ احساس ہوا کہ میں زندہ تھا۔ مرنے کے بعد تو ایسا شور سنائی نہیں دے سکتا تھا کیوں کہ وہ تماشا خانوں کا شور تھا لیکن میری کیفیت پانی میں ڈوبے ابھرے انسان کی سی تھی۔ کبھی مجھے یہ شور سنائی دیتے لگا اور کبھی معدوم ہو جاتا۔ میں سچ آب پر ابھرنا تو شور صاف سنائی دیتا لیکن دوبارہ سچ آب سے نیچے چلا جاتا تو شور تقریباً ختم ہو جاتا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو احساس ہوا کہ میں قلبی غیر ارادی طور پر بے خبری میں ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے سر جھٹکنا تو آنکھوں کے سامنے سے گھنٹی صاف ہوئی اور ارد گرد کا منظر ذرا صاف ہوا۔ بات کچھ سمجھ میں آئی۔ میں نے اور ہوش نہ کیا۔ دقت ایک دو سرے پر دار کیا تھا۔ میرے کراٹے کے وار سے وہ بھی چکر اکر کر پڑا تھا۔ اب وہ بھی اٹھ کر میری طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا وجود اس کے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے ذرا تاخیر ہو گئی تھی۔ میں اس سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اگر وہ

شر کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے سامنے چار مانگوں والا نہیں دو مانگوں والا درندہ تھا اور میں بالکل ہی کمزور بے بس اور عام ساقی کی نہیں تھا۔ مجھے خدا نے خاصی طاقت سے نوازا تھا لیکن مجھے فوراً کشتی کے بھانسنے میں رکھ کر میری اس طاقت کو بکا رہانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اب جب کہ اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی کا گوند سا پاکا تھا اور اندھیرے میں چھپی ہوئی یہ تصویر میری نظر کے سامنے آگئی تھی تو میرے جسم میں ایک نئی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ کشتی بے قابو ہو جانے کا احساس ہونے کے بعد بھی میں الجھن میں تھا۔ میں جاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ پشیری پر آجائے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر کشتی اس طرح طے شدہ پروگرام کے بغیر بھی جا رہی تو مجھے اس میں جان بوجھ کر ہارنا ہی چاہیے یا فتح حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ امکان بھی موجود تھا کہ کسی اتفاق کے تحت یا اپنی تجربہ کاری کی وجہ سے ہوش خان ج ج ج ج مجھے ہر ادتا۔

لیکن اب میں یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ مجھے تو مسئلہ ہی کوئی اور درپیش تھا جو اب میری سمجھ میں آیا تھا۔ قیمت تھا کہ ابھی تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے جو چوٹیں لگ چکی تھیں وہ میرے لیے قابل برداشت تھیں۔

میں تو صرف پسینے میں ہی شرابور تھا لیکن ہوش خان کے جسم سے بلند اور چرے سے خون بھی ٹپک رہا تھا۔ میں نے اندھ حاضند بو گھونسا اس کے چرے پر رسید کیا تھا وہ شاید اس کی ناک پر پڑا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ اس کی دردنگی میں ایک طرح کی یوگا لٹ کی آبرش بھی تھی۔ وہ یقیناً پریشان تھا کہ سازش اس اعزاز میں آگے نہیں بڑھ رہی تھی جس طرح اس نے اور اس کے آگے سوچا تھا۔

سوجن کا یہ سیلاب جو میرے ذہن کے کپیڈ ٹرسے ایک لمحے میں گزرا تھا اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی جگہ ٹن کر دیا تھا لیکن اسی لمحے ہوش خان ایک نئے جوش سے خوفناک انداز میں اڑکنا ہوا میری طرف ہوا تو میں گویا حواس میں آ گیا۔ میرے جسم میں اب ایک اور ہی طاقت کوٹ کے لرزیدار ہوئی تھی۔ بات جب انسان کی سمجھ میں آجائے تو کام آسان ہو جاتا ہے۔ آگئی ایک اگلی طرح کی طاقت ہے اور نا آگئی ایک اگلی طرح کی۔

میں تڑپ کر اپنی جگہ سے ہٹا اور ساتھ ہی میں نے پوری قوت سے ات مٹا کر اس کے پیٹ پر رسید کی لیکن میری لات گویا ایک لمحے کے لیے چپلی کے گھنڈ میں دھنسن کر واپس آگئی۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کے وار سے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن میں نے تکلیف کی شدت سے اس کے پیٹ ناک چرے کو مزید بیت ناک ہونے دیکھا۔ اس لمحے سے فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے فوراً اس کی کھچ چھو پر کراٹے کا ایک وار کیا لیکن اس کے لیے مجھے اس



میں زیادہ توجہ سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنا دھیمان اور خان اور ماسٹر عبداللہ کی طرف رکھنا تھا۔

ہوشو خان چہرے سے لبو پونچھ کر ہاتھ جھٹک کر غماز شاطرانہ انداز میں میرے سامنے نیم وارے میں نہایت آہستہ چکرا رہا تھا۔ میں وہ بڑی تھا جو ان لوگوں کے حلق میں اٹھ نہ سکتی۔ وہ مجھے نہ تو نگں پارے تھے اور نہ ہی اگلے کے لیے چارے ہو شرفان شاید اپنے طور پر اس کا کوئی حل سوچ رہا تھا لیکن نا ہے اس کے جسم کی طرح اس کا دماغ بھی موڑا تھا۔ اس کی نظر ایک ہی حل تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہ مجھے ہلاک ہی کرے۔

اپنی دانست میں وہ بڑی چالاکي دکھاتے ہوئے بظاہر مجھ پر لیکن درحقیقت اس نے خود مجھے گر کر میری ٹانگوں میں اڑا کر مجھے گرانے کی کوشش کی لیکن وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہ سکا۔ میں نہ صرف اُچھل کر ہٹ گیا بلکہ میں نے زور سے اگرتے ہوئے گئی اس کے پیٹے پر رسید کی۔

اب وہ صاف طور پر لاڈل پر آڑ آیا۔ اس نے میری آغ میں پچھ مارنے کی کوشش کی لیکن میں تیزی سے سر پیچے ہوئے بچ گیا۔ اس نے مجھے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور کمر دار کرنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ نہایت غصناک انداز میں میں نے اٹھتے اٹھتے ایک ایڑی پر گھوم کر اس کی گدے پر لٹا کی۔ وہ اوجھڑے منہ کر اور اس کی غصناکی وحری کی دھڑکی دیا

بھی میرے ساتھ ہی چکرا کرتے گرا ہوتا تو میں اپنی چند سیکنڈ کی بے ہوشی کے دوران ہی اس دار فانی سے کوچ کر چکا ہوتا۔

میں اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ زندگی اور موت کی ٹکٹھن میں اگر میں کسی وجہ سے ذرا بھی کمزور پڑ جاتا تو میری موت یقینی تھی۔ بس یہی ایک احساس اس وقت میرے لیے ناممکن نہ رہا تھا۔

ہوشو کی کھوپڑی پر میرا کرانے کا ایک وار خاصا کامیاب رہا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے اٹھنے سے پہلے اس کی سبھی کھوپڑی پر ایک اور وار کیا۔ وہ بیٹھے ہی بیٹھے اُدھر اُدھر جھولنے لگا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں سے درپے دو ٹھن ٹھوکریں رسید کیں۔

ماسٹر عبداللہ اُچھلتا کودتا ہمارے گرد چکرا رہا تھا۔ میں اگر دو ٹھن ٹھوکریں ہوشو کی پسلیوں پر اور رسید کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید وہ دوبارہ لپٹ جاتا لیکن ماسٹر عبداللہ درمیان میں آگیا اور پیچھے ہٹ کر مجھے جانے لگا کہ کسے ہوئے حریف کو مارنا قائل ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اگر یہی کچھ ہوشو خان میرے ساتھ کر رہا ہوتا تو وہ بھی اسے منع نہ کرتا۔ ایسا ہوتا میرے لیے تعجب کی بات نہ ہوتی۔ آخر ماسٹر عبداللہ اس سازش کا اہم موڑ تھا۔ اس کا چہرہ پیٹنے سے تر تھا۔ وہ خاصا حواس پاشہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی پریشانی اور حواس باختگی بجا تھی۔ جیسا انہوں نے سوچا تھا، مقابلہ اس سچ پر نہیں جا رہا تھا۔

اس کا شاید بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر پشت پر باندھ دیا اور ہوشو خان کو موقع دیا کہ وہ میرا قیسمت دے۔ میرا پیچھا چا ہا کہ ایک آدھ ہاتھ اس کے بھی رسید کر دوں لیکن پھر بھی سوچ کر رہ گیا کہ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ حد سے بڑھتا تو دیکھا جاتا۔ مجھے ابھی اپنا فیزیکلے والے کھلاڑی کا تاثر برقرار رکھنا تھا۔

ماسٹر عبداللہ کے روکنے پر میں پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ہوشو خان کو اٹھنے کا موقع دیا۔ اس بار وہ دروے کی طرح اندھاؤ صند مجھ پر نہیں بچتا۔ کم از کم کسی بے وقوف دروے کی طرح نہیں جھپٹا۔ اسے سنبھلنے کے لیے کچھ مہلت بھی درکار تھی جو ماسٹر عبداللہ اسے فراہم کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا اور ہمارے درمیان حائل ہو کر خواہ مخواہ ہی مہلتی مجھے جا رہا تھا حالانکہ ٹیکسیکلی اب کتنی مہلت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ مجھے خود بھی سنبھلنے اور تازہ دم ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ میں نے رنگ کا پکڑ لیا تو بے گئی گہری گہری سانسیں لیں۔ قماشائیوں کا شور اب مخدوم ہو چکا تھا۔ کشیدگی اور تازگی بھی شاید مٹا طیس نہیں ہوتی ہیں جو اس وقت مجھے پورے میدان میں بھیل محسوس ہو رہی تھی۔ سب سے زیادہ تازہ شاید اگلی منوں میں تھا۔ میں نے پہلے دلبر خان اور پھر مول کی تلاش میں نظر دوڑائی لیکن وہ دونوں ہی مجھے دکھائی نہیں دیے۔

## ابلیس مصر

☆ ---- الماس ایم - اے

اسلامی کہانیوں کا بہترین استخراج واضح رہے کہ اس مجموعہ کی تین کہانیاں کو نہ صرف قرآن حکیم سے اخذ کیا ہے، بلکہ ان کے بیشتر مکالمے قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں۔

قیمت: -/100 روپے

مکتبہ القریش، اردو بازار لاہور 2

یہ نکلتی کسی کنارے گئے کے آثار پیدا ہوں۔ میں اُچھل کر اُٹھا اور انتہائی تیزی سے اس کار میں پہنچا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں اسے اوپر کی رستے سے اُچھال کر پھینکوں گا تو اسے زیادہ چوٹ آئے گی اس کے کس مل نکل جائیں گے اور شاید میں شرفیہ طرے سے اسے پھینکوں گا۔

اس نے دونوں بازو ہوا میں لہراتے ہوئے میری گرفت سے بچنے اور رنگ میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے اُچھل کر اسے ہاتھوں پر اُٹھاتے ہوئے ہوا میں اُچھال کر پھینکا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ میں اس جینے کو اس طرح اور اتنا اونچا اُچھال سکوں گا۔

لیکن اس وقت میں کڑا دیکھتا رہ گیا جب وہ چوٹ یا اوندھا کرنے کے بجائے سر کے بل نیچے آیا۔ رنگ میں کچھ ایسی ہی آواز پیدا ہوئی جیسے چمڑی کوئی سل بلیڈ سے رنگ میں مری ہو۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی کے ٹوٹنے کا سا لگا کر کانٹائی رہا۔

ہوش خان دھب سے گر کر دو تین بلکے سے جھٹکے لے کر ساکت ہو گیا۔ میں نے دیکھا اس کی گردن عجیب ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر اس کے کندھے سے بالکل مڑ گیا تھا۔ اس کی گردن اتنی چھوٹی تھی کہ عام حالات میں یہ بات ممکن نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں اُنت زہ انداز میں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور زبان منہ سے باہر تھا کہ دسی تھی۔ تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا!

چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت لاؤڈ اسپیکر پر کُنسٹی کے نالہ ابھی خاموش تھا۔ شاید وہ بھی کُنسٹی کرنا بھول گیا تھا۔

ماسٹر عبداللہ اُچھل کر ہوش کے پاس پہنچ چکا تھا اور اسے چلا کر دیکھ رہا تھا پھر اس نے اس کے سینے سے کان لگا کر دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ اچانک ہی سیدھا ہوتے ہوئے وہ دونوں بازو پھیلا کر پٹی پٹی سی آواز میں چیخا۔ ”وڑے دلبر خان۔۔۔ یہ تو مر گیا ہے۔“

اتنا بڑا مجمع وہاں سر جود ہونے کے باوجود سکوت اتنا گہرا تھا کہ ماسٹر عبداللہ کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجی محسوس ہوئی۔ حالانکہ حقیقت میں وہ لاؤڈ اسپیکر پر نہیں گونجی تھی۔ مایک تو وہاں سے بہت دور تھا۔

میں نے دھشت زدہ سا ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ رنگ کے چاروں طرف کئی کلا خشکوف بردار نمودار ہو چکے تھے اور نپے تھے قدموں سے رنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی نظریں مجھ پر تھیں اور انگلیاں اُٹھ رہی تھیں۔

میرا دل ڈوب سا گیا!

شاید اس وقت میں اسے سیدھا کر کے پن کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن ماسٹر عبداللہ ایک بار پھر اس کے اوپر میرے درمیان آیا۔ اس نے ایک بار پھر ہوش کو سمیٹنے کے لیے چند سینکڑی ملت دی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ست پر چکا ہو گا لیکن اس بار وہ میری توقع کے بالکل برعکس یکدم اتنی تیزی سے ناک کی سیدھا میں میری طرف آیا کہ ماسٹر عبداللہ بھی اس کی لپیٹ میں آئے آئے ہوا۔

میں اسے نہیں روک سکا اور اس سمیت اس طرح رستے سے جا کر گر گیا کہ اس کے اوپر رستے کے درمیان میٹر وچ پن کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا کہ میری ریزہ کی ہڈی ڈھری ہو کر ٹوٹنے لگی ہے لیکن اوجھڑتے ہی میں دھکیلا اور اوجھڑنے لگے بازو پھیلے ہوئے قلابازی کھا کر باڈی سلیم کیا۔

یہ بہت زوردار باڈی سلیم تھا۔ میں دوسری طرف رسوں کے قریب جا کر گرنا تھا۔ بالکل اسی طرح میں نے ہوش کو باڈی سلیم کیا تھا۔ میرے جسم کے تمام جوڑ گویا بل کر رہ گئے۔ میری آنکھیں کھلی تھیں، میں سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن چند سینکڑے کے لیے میں مختصر کوشش کے باوجود اُٹھ نہ سکا۔

اس دوران ہوش خان نے ایک ملک غلطی کی۔ وہ کچھ زیادہ ہی بے بسی آیا۔ شاید وہ خود کو امریکی ریلیزر کا ہم پلہ ظاہر کرنے کے لیے رشوں پر چڑھنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی اناکس لے مجھے سبق سکھانا چاہتا تھا لیکن رشوں پر چڑھنے کا فیصلہ کر کے درحقیقت اس نے بہت ہی بڑی حماقت کی تھی۔

ایک تو اس وقت وہ تازہ دم نہیں تھا، دوسرے اس کا بھڑ ایک عجیب چیز تھی۔ رشوں کے آس پاس سہارے کے لیے کوئی دوسری چیز بھی میسر نہیں تھی۔ فاضل رشوں کے ذریعے انہیں جن شہر دلانے سے باز رکھا گیا تھا وہ بھی کچھ دور تھے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اسے رشوں پر چڑھنے میں کئی سینکڑے لگ گئے۔

مجھے یقین ہے کہ اس دوران ماسٹر عبداللہ ”دلبر خان اور اس کی پشت ہٹانی کرنے والے دوسرے لوگ دانت ہیں ہیں کر دیں ہی دل میں اسے گالیاں دے رہے ہوں گے جب وہ اوپر رستے پر کارنر میں کھڑا ہو کر میری طرف گھبراہٹ مری طرح ڈنگ رہا تھا۔ چند سینکڑے اس وقت میں میرے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ میرے سامنے اب دور راستے تھے۔

میں چاہتا تو ہوا ہر خواہی پخت بنا دیتی پر اُڑتا ہوش خان کو اپنے اوپر چھلانگ لگانے کا موقع دتا اور میں آخری لمحے میں اپنی حرکت سے ہٹ جاتا۔ یہ طریقہ بھی اسے چوڑی چھلانگ دینے کے لیے اچھا تھا لیکن میں اس نکلتی سے اب اکتا رہا تھا۔ جھکن مجھ پر غلبہ پڑ رہی تھی۔

میں نے ہوش خان کو اور بھی شدید جھکا دینے کا فیصلہ کیا کہ

# صاحب طرز ادیب قمر اجنالوی کی تاریخی کتب

|       |                         |       |                |
|-------|-------------------------|-------|----------------|
| ۲۰۰/- | نئی دنیا                | ۱۲۵/- | پرتھال         |
| ۹۰/-  | لاڈو                    | ۱۰۰/- | پنڈارے         |
| ۶۰۰/- | بغداد کی رات (اول دوئم) | ۱۵۰/- | ولی عہد        |
| ۶۰۰/- | دھرتی کا سفر (اول دوئم) | ۱۵۰/- | شمشیر          |
| ۴۰۰/- | منقذس مورتی (اول دوئم)  | ۲۰۰/- | چاہ بابل       |
| ۱۷۵/- | جہان لوح و قلم          | ۲۰۰/- | سلطان          |
| ۱۵۰/- | غزلہ                    | ۱۵۰/- | جنگ مقدس       |
|       |                         | ۱۲۵/- | اور خان الغازی |

مکتبہ القریش، اردو بازار لاہور، فون: ۲۲۴۶۵

معتوب تو پہلے ہی تھا اب تو بالکل ہی ناقابل معافی ہو گیا تھا۔  
لے اس نے سارا ڈراما بالائے طاق رکھ دیا تھا اور اتنے بہت  
لوگوں کی نظروں کے سامنے ہی میرا قصہ پاک کرنے کا فیصلہ کر  
تھا۔

ہنگ کے صرف ایک طرف بیڑیاں تھیں لیکن ان سے  
کسی نے اوپر آنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہنگ کے چاروں طرف  
کچھ فاصلے پر ہی رک گئے۔ وہ تعداد میں دس تھے اور ان کا  
کلا شکوفوں کا ٹیغ میری طرف تھا۔ ان کے چہروں پر خوشخواری آ  
لیکن وہ گویا کسی حکم کے انتظار میں تھے ورنہ ان کی انگلیاں ہلا  
زیر باندے کے لئے بے چین تھیں۔

میں نے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی راہ فرار نظر نہ آئی،  
طرف کوئی نہ کوئی کلا شکوفہ بردار موجود تھا۔ میں نے اپنے آپ  
سزائے موت کا وہ قیدی محسوس کیا جسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے  
کھڑا کیا جا چکا تھا۔ دلبر خان کیسے نظر نہیں آ رہا تھا یا پھر شاید میں  
نظری ہی کچھ صحیح طور پر کام نہیں کر رہی تھی۔ سارا منظر ہی جیلا  
نظروں کے سامنے دکھائی دے رہا تھا۔

میں مرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا لیکن اسی لمحے میری آنکھوں  
نے عجیب قہارہ دیکھا۔ وہ ہجوم جو کچھ اندھیرے میں مجھے محسوس  
نظر نہیں آ رہا تھا نہایت خاموشی سے روشنی میں آ گیا۔ وہ فنا  
صرف اگلی چند منٹوں تک دائرے میں محدود تھی۔ ان منٹوں میں

میں بڑی طرح الجھ رہا تھا۔ جسم پسے میں تھا اور ذہن میں  
آندھیاں ہی چل رہی تھیں۔ ہوشو خان سے مقابلے نے میرا جوڑ  
جوڑ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد میں ایسی شدید  
جسمانی مشقت سے گزرا تھا جس کی بنیاد زندگی اور موت کی کشمکش  
تھی۔ ابھی مجھے سنبھلنے اور اوسان بحال کرنے کے لئے تھوڑی سی  
مصلحت کی ضرورت تھی لیکن لگتا یہی تھا کہ حالات مجھے یہ مصلحت  
دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ ہوشو خان بخشی کے کسی مرحلے میں  
رسول پر چڑھنے کی بھی کوشش کرے گا اور یہ اندیشہ بھی مجھے ہرگز  
نہیں تھا کہ میں اس بد بخت کو رسے سے اچھال کر پھینکوں گا تو وہ سر  
کے تل جا کرے گا اور گردن ترخواہیجھے گا۔ یہ سب کچھ قلبی اچانک  
اور نہایت غیر متوقع طور پر ہو گیا تھا۔ میں تو اگر اسے صرف شکست  
دینے میں ہی کامیاب ہو جانا تو میرے لئے کافی تھا۔ میری طمانیت  
کے لئے یہی کافی ہوتا کہ میں نے دلبر خان اور اس کے حواریوں کی  
سازش کا سیلاب نہیں ہونے دی۔ ہوشو خان کو ہلاک کرنے کا تو میں  
نے سوچا بھی نہیں تھا۔

لیکن ظاہر تھا اب معافی پیش کرنے کا موقع نہیں تھا اور کسی  
کو میری معافی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہوشو خان، دلبر خان کا  
ایک جیتی سہا بی تھا۔ اسے مزید جیتی بنانے کے لئے اس نے یہ سارا  
کھڑا کیا تھا۔ وہ سہا بی اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ میں اس کا

آئے ہوں گے جب جہوم کے سیلاب نے تارخ کا رخ بدل دیا ہوگا۔  
 کزور، نئے اور کچلے ہوئے لوگ ایک جہوم کی صورت میں، ایک  
 سیلاب کی صورت میں ڈھلتے ہوں گے تو کتنی بڑی طاقت بن جاتے  
 ہوں گے۔

کلا شکوف برادر اس جہوم میں چھپ کر رہ گئے تھے۔ شور  
 بدستور برپا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک  
 عجیب افزا تقری ہی پکی ہوئی تھی۔ لوگ ایک دوسرے میں الجھ کر رہ  
 گئے تھے لیکن اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ میں اس جھگڑ  
 سے کوئی فائدہ اٹھانے کے بجائے دم خورد سا کرا رہا تھا۔

دھن میں نے انسانوں کے اس سیلاب سے مول کو نمودار  
 ہوتے دیکھا۔ وہ تیزی سے بیڑیاں چڑھ کر رنگ میں آ رہی تھی۔  
 وہ بڑی طرح انہ پ رہی تھی اور اس کے چہرے پر عجیب سی دشت  
 تھی۔ اس کھینچاٹائی میں اسے رنگ تک آنے کے لئے نہ جانے  
 کتنی دور آزمائی کرنا پڑی ہوگی۔

میدان میں اس وقت گو کہ کوئی لڑائی جھگڑا یا مارباڑ نہیں  
 ہو رہی تھی لیکن ایک سنگم سا بحر حال برپا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ  
 ہنگامہ شروع ہونے کے بعد وہاں مول کے سوا کوئی لڑکی یا عورت  
 باقی نہیں رہی تھی۔ جمائیاہوں میں جتنی بھی عورتیں شامل تھیں  
 مجھے یقین تھا کہ اب تک وہاں سے بھاگ چکی تھیں۔

میرا اندازہ تھا کہ یہ مزارعے، یہ غریب لوگ دلبر خان اور اس  
 کے آدمیوں کے لئے غلاموں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور  
 وہ ان پر بے دریغ کوئی چلا دینے یا ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک  
 کرنے کے حامی تھے لیکن عجیب بات تھی کہ یہ لوگ جب ایک  
 سیلاب کی سی صورت میں اکٹڑ کر آئے تھے تو کلا شکوف برادر  
 میں سے کسی کی کلا شکوف نہیں کرتی تھی۔ ایک بھی کوئی نہیں چلی  
 تھی ورنہ لوگوں کا سیلاب جب آکر ان کے راستے میں جا ملے ہوئے  
 لگا تو میرا دل اسی تصور سے کانپ گیا تھا کہ اگر انہوں نے اندھا  
 دھند فائرنگ شروع کر دی تو کیا ہوگا؟

وہاں دس یا دھ کلا شکوف برادر موجود تھے۔ اگر وہ بوکھلا کر  
 غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر، کچھ سوچے بچھے بغیر یا بھر دلبر خان  
 کے حکم کی تعمیل میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتے تو میدان میں  
 نہ جانے کتنی لاشیں بکھر جاتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ بے قابو  
 جہوم کے سامنے کلا شکوف خشن خاموش ہی رہی تھیں۔ ایک دوسرے  
 سے جو بھی کہا جا رہا تھا، زبانی کا ہی ہی کہا جا رہا تھا۔ کوئی کی زبان میں  
 بات نہیں کی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دلبر خان اور اس کے  
 آدمیوں کا حکم، دیوانگی یا طاقت کا زعم اور مطلق العنانی ابھی اس  
 حد کو نہیں پہنچی تھی کہ وہ عقل عام ہی شروع کر دیتے۔

مول میرے قریب نہیں آئی۔ کچھ دیر ہی رک کر ایک ہاتھ  
 سے رسا تمام کر رہے ہوئے حج کر دیں۔ ”تم تمہیں ماں سے ملو گے  
 بھی یا بت کی طرح تمہیں کھڑے رو گے؟“

مجھے پشیمون اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔  
 رنگ کے گرد کلا شکوف برادر ایک دوسرے سے خامے  
 میلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی حیثیت اس چار دیواری کی سی  
 تھی جس میں بے بے شکاف تھے اور جہوم اس وقت گویا بہتا ہوا  
 آبیان تھا جو ان شکافوں کے درمیان سے لہریں کی سی صورت  
 میں آگیا تھا۔

پچاسوں آدمی یکدم ہی میرے اور کلا شکوف برادر کے  
 سامنے حائل ہو گئے تھے اور لمحہ بہ لمحہ ان میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔  
 کلا شکوف برادر نے جہوم کے چور کھینچے اور اپنے آپ کو رنگ  
 سے دور ہونے محسوس کیا تو بڑی طرح کڑبڑا گئے۔

انہوں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو غائب و حسیکیاں اور احکامات دے دیے  
 لیکن کوئی ان کی بات نہیں سن رہا تھا۔ لوگوں کا مٹا عجیب سے  
 غراؤ میں آگے آئے جا رہا تھا اور انہیں تیزی سے پیچھے لے جا رہا  
 تھا۔ ان کی چیخ دیکار کے جواب میں جہوم میں بھی چیخ دیکار شروع  
 ہو گئی تھی۔ بے پناہ شور برپا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی  
 تھی۔

اس رات مجھے اپنی زندگی کا ایک انوکھا ہی تجربہ ہوا جسے میں  
 انہوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ جہوم کوئی بڑا یا تاریخی قسم کا جہوم  
 نہیں تھا لیکن اس رات مجھے معلوم ہوا کہ جہوم کی طاقت، بہت بڑی  
 ہوتی ہے۔ جب یہ طاقت متحرک ہوتی ہے، خوف کا خیل اپنے اوپر  
 سے اُتر بھیجتی ہے تو ایک عجیب طوفان بلاخیز کی طرح بڑے بڑے  
 تار و درختوں کو بجلی اپنے ساتھ ہمالے جاتی ہے۔ بڑے بڑے  
 پہاڑوں کے پاؤں اکٹڑ جاتے ہیں، ان کا غیظ و غضب دھرا رہ جاتا  
 ہے۔

میں نے اس جہوم کو جب ایک خاموش سیلاب کی طرح رنگ  
 کی طرف بڑھتے دیکھا تو میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اتنا خوفزدہ میں  
 کلا شکوف برادر کو دیکھ کر نہیں ہوا تھا جتنا نئے لوگوں کے اس  
 نئی دہان کو دیکھ کر ہو رہا تھا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ  
 میری حمایت میں آگے آ رہے تھے۔

اس لحاظ سے بھی یہ ایک عجیب تجربہ تھا کہ میں تو کبھی مراد  
 کے لوگوں کے لئے بھی ابھی تھا جبکہ اس جہوم میں تو اکثریت اس  
 پاس کے علاقوں کی تھی جنہوں نے پہلی مرتبہ مجھے رنگ میں ہی دیکھا  
 تھا۔ انہیں مجھ سے کیا ہمدردی محسوس ہوئی تھی جو وہ اپنے آکاؤں  
 کے ٹوٹے سے تعلق رکھنے والوں ان سفاک اور بے حس لوگوں کے  
 سامنے سیلاب کی طرح اسٹڑ آئے تھے اور کلا شکوف خشن کلا بھی خاطر  
 میں نہیں لائے تھے۔

میرے لیے یہ سب کچھ کسی عجیب سے کم نہیں تھا۔ مجھے  
 جانے کے لئے نئے لوگوں کا سیلاب چہر کلا شکوف برادر کے  
 ہاتھ لے جا رہا تھا۔ مجھے پہلی بار صحیح معنوں میں یقین۔۔۔۔۔ آئے لگا کہ  
 انسانی زندگی میں نہ جانے کب کب اور کہاں کہاں ایسے مواقع



رہنمائی کرتی رہیں گی چنانچہ مجھے کسی طرح ان لوگوں کو ڈانچ دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں نے لائسنس آف کرپس اور گاڑی بائکل ہی کے میں آثار لی۔ میں نے ہیڈ لائسنس کے بغیر گاڑی چانا تقریباً خود ہی کے مترادف تھا۔ کہیں درخت تھے کہیں بڑے بڑے گڑھے اور کہیں سخت مٹی کے اونچے اونچے ٹوٹے سے بنے ہوئے تھے۔ آسمان پر محض آندھ کی مدھم دھمکتی تھی۔ چاند بھی نہ جانے کہاں چھپا ہوا تھا۔ بہر حال میری آنکھیں اس اندھیرے میں کسی نہ کسی حد تک میرا ساتھ دے رہی تھیں اور میں ذرا کم رفتار سے گاڑی کو کسی چیز سے ٹکرانے اور زور سے اٹھنے سے بچاتا ہوا نامعلوم سمت میں لے جا رہا تھا۔

جلدی مجھے احساس ہوا کہ میں سڑک سے بہت دور کسی طرف نکل آیا تھا۔ وہ روشن نقطہ یا گاڑی کی کوئی بھی اور نشانی مجھے کہیں دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ تاہم میں نے سمت کا تعین کئے بغیر ابھر اُدھر چکر لاتے ہوئے کم رفتار سے ہی اندھیرے میں اپنا سفر جاری رکھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میرے لئے اس ٹیم پختہ اور ناہموار سڑک سے دور نکل جانا ہی بہتر تھا۔ وہ علاقہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ کسی نہ کسی حد تک بھٹکا تو میرا مقصد ہی تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اُمید تھی کہ گاڑی میں اگر ڈریل فٹم نہ ہوا تو میں بھٹکا بھٹکا بھی آخر کار کسی نہ کسی پگڈنڈی یا سڑک تک جا ہی پہنچوں گا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے ایسے ہی پیچ دو پیچ سفر کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا عقاب کرنے والے میرا نشان کبھی بیٹھے ہیں تو میں نے ایک جگہ جھاڑیوں کے قریب جیب روکی اور سیٹ کے نیچے سے شلو اور قمیص نکال کر پہنے لگا۔ ابھی تک میں سرخ بیکری میں موجود سفر تھا اور پیچ پیچ کشتی کے میدان سے بھاگا ہوا ریسرہی دکھائی دے رہا تھا۔ اگر کوئی دیکھتا تو یقیناً حیران ہو تاکہ یہ بگوارا ریسرہ اس دیرانے میں کیا کر رہا ہے۔ پسند سوکھ چکا تھا۔ اب تو کھلے علاقے کی بھیگی بیگی سی ہوا میں تنگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

قدرے شرفانہ چلنے میں آنے کے بعد میں دوبارہ جیب میں بیٹھا۔ اب میں نے ہیڈ لائسنس بھی اُن کر لیں یوں سڑکانی آسان ہو گیا۔

میں کسی پگڈنڈی یا سڑک تک تو نہیں پہنچ سکا لیکن ایک جنگل کے قریب ضرور جا پہنچا۔ خاصا گھٹا جنگل تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہاں سے جنگل شروع ہوا تھا وہاں درخت تاحیر نظر اس طرح ایک سیدھ میں چلے گئے تھے جیسے کسی نے سیدھی بیکر پیچ کر ان کے پیچ بولے ہوں اور اسی لئے جنگل کے باہر کی طرف کے درخت بالکل ایک دیوار کی طرح سیدھ میں اُگے ہوں۔

جنگل کے ساتھ تقریباً سات آٹھ فٹ چوڑی نینک کی پٹی بالکل ہموار اور ریتیلی سی نظر آ رہی تھی۔ یہ گویا ایک اچھا بھلا صاف ستھرا

سے جھٹ کر میں اُڑنے کے سے انداز میں بھاگا ہوا کرے سے نکلا۔ دراصل جو کرپوں سے رنگ تک جا رہا تھا اس پر میں نے چند لوگوں کو دڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کے پاس قمیص نہیں تھیں لیکن ان میں سے دو تین کے پاس مجھے جھپٹے پھولوں والی کٹاڑیاں دکھائی دیں۔

وہ کچھ بھی نہیں بولے تھے لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے اپنے دست یا ہمدرد دکھائی نہیں دیے۔ وہ تیزی سے دوڑے آ رہے تھے راستے کے دونوں طرف حد نبیوں کے لئے جو پائس اور سے ڈیڑھ لگے ہوئے تھے سب ٹوٹ کر گر چکے تھے۔ انسانوں کے نیلاب کار یا اپنی طرف بھی پھینکا دکھائی دے رہا تھا۔

میں بچنے کی طرح کمرے کے عقب میں پھپھا۔ اس طرف ابھر آقا لیکن دلبر خان کی جیب کا ہیڈ لائسنس نظر آ رہا تھا۔ میں اچھل کر جیب میں بیٹھا۔ اندھیرے میں چابی بھی اگیشن میں مشکل سے لگی۔ اس وقت تک شور میرے قریب آنے لگا تھا۔ میں نے ہیڈ لائسنس روشن کیے بغیر جیب کریموں اور دوسری دو تین گاڑیوں کے درمیان سے تیزی سے اُڑتے ہوئے نکلا۔

تک اور ٹوٹی پھوٹی سی وہ ٹیم پختہ سڑک اسی طرف سے زیادہ قریب چلی تھی جو میرے خیال میں اس علاقے سے گزرنے والی میں شاہراہ کا کام دیتی تھی۔ یہ سڑک ذرا اونچائی پر تھی۔ جیب پگڈنڈے دکھائی اس سڑک پر چڑھی اور میں نے اسٹیرنگ وھیل تیزی سے دائیں طرف کھمایا۔ اس سمت سفر کرتے ہوئے میں اپنی راست میں کبھی مراد سے دور نہ جاسکا تھا۔

میرے عقب میں جو شور بلند ہوا تھا، جلدی وہ بہت پیچھے رہ گیا اور آخر کار معدوم ہو گیا۔ صرف جیب کی گھر گھر ابٹ میری ہم سفر تھی۔ سڑک بہت تنگ اور کانی خراب حالت میں تھی۔ کئی بار جیب خیم میں اُترے اور اُٹھے اٹھتے پتی۔ اس لیے میں نے ہیڈ لائسنس آن کر لیں۔

جیب دیرانے میں اس ناہموار سڑک پر اچھلتی کودتی چلی جا رہی تھی۔ چند میل کے سفر کے بعد میں نے سڑک دیکھا تو بہت پیچھے کہیں دو روشن نقطے متحرک نظر آئے۔ وہ یقیناً کسی گاڑی کی ہیڈ لائسنس تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میرا عقاب شروع ہو گیا تھا۔ دلبر خان اور اس کے آدمی یقیناً تمام تر مزاحمت کے باوجود میرا پچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

میرے اور اس گاڑی کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ تھا تاہم میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ دلبر خان کی جیب کچھ زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھی لیکن بہر حال جیب تھی اس لیے اس ناہموار راستے پر بھی اس رفتار سے چلی جا رہی تھی مگر وہ روشن نقطے مجھے اپنے عقب میں دکھائی دیتے رہے بلکہ کچھ واضح ہونے لگے۔

جب میں نے سوچا کہ سڑک جیسی بھی ہے ایک ہی ہے اور بچپ کی ہیڈ لائسنس اگر روشن رہیں گی تو میں لائسنس ان لوگوں کی

لنگر

اقلیم علیہ قیمت 300/-

پاکستانی، انڈین اور چائینز  
کھانوں پر مشتمل اپنے طرز  
کی واحد اور مکمل کتاب

سپیشل چین گائیڈ

قیمت: 75/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

تاکل ہی نہیں رہا تھا۔ ذہن بھی جسم کی طرح تھکا تھا۔ اس کا ہوا  
تھک ہوا کے جھوٹے اسے خود کی آغوش میں لے جا رہے تھے۔  
کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ میں اپنے آپ کو وہ شرابی  
محسوس کر رہا تھا جو دائی خمار میں پسلا قدم رکھنے کی لگا تھا کہ میرے  
اچانک ہی میرے ہاتھ سے جام پھین لیا گیا۔ مجھے اپنے حواس میں  
لگا سا ارتعاش محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور ادھر ادھر  
دیکھا۔ گرد و پیش اسی طرح سرمئی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔  
اگر کہیں ایسی کوئی چیز نمودار بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے  
چہرے حواس میں ارتعاش پیدا ہوا تھا تو اسے دیکھنا بہت مشکل تھا۔  
لیکن میں اٹھ بیٹھا۔ تھکن کا پیدا کردہ وہ شمار جو میرے ذہن اور  
جسم کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اسے میں نے اپنے وجود  
سے جھٹکنے کی کوشش کی اور تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا  
چونکنا بے سبب نہیں تھا۔  
کسیں دور سے ایک خفیف سی آواز بڑے تسلسل سے آ رہی  
تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ نرم زمیں

راستہ تھا۔ اس پر کہیں کہیں صرف خزاں رسیدہ پتے گھرے ہوئے  
تھے، کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ یہ راستہ نہ جانے کہاں تک چلا گیا  
تھا۔ میں نے جیب اسی راستے پر ڈال دی۔ یوں جنگل کے متوازی  
میرا سفر شروع ہو گیا۔ اب جیب دھچکے اور پتھولے نہیں کھاری  
تھی۔ میں نے ذرا سکون کی سانس لی۔

لیکن سکون میری قسمت میں کچھ زیادہ نہیں تھا۔ کم از کم ان  
دنوں نہیں تھا۔ اس راستے پر میرا سفر کافی دیر تک جارہا۔ ایسا  
معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک نہ ختم ہونے والا راستہ تھا لیکن میں اس  
یقین اور اطمینان کے ساتھ اس پر رواں تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی  
منزل کی طرف ضرور لے جائے گا۔

اچانک جیب کے انجن میں ایک زوردار کڑا کا ہوا گاڑی کو  
زبردست دھچکا لگا۔ ایک لمحے کی تیز گھبراہٹ کے ساتھ جیب  
رک گئی اور انجن خاموش ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے گویا میرا دل  
بھی دھڑکنے بھول گیا۔ راست کے اس پیر 'اس درانے میں' جنگل  
کے قریب نامعلوم مقام پر سواری سے محروم ہو جانے کا تصور ہی  
خاصا ہولناک تھا۔ انجن سے مجھے دھویں کی خفیف سی گیسریں بلند  
ہوتی دکھائی دیں۔

چند لمحے ساکت بیٹھے رہنے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے  
دوبارہ جیب کو اشارت کرنے کی کوشش کی لیکن سیلف کی  
گھبراہٹ کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ کافی دیر تک میں اسے  
اشارت کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ کوشش بالکل فاصل ثابت  
ہوئی۔ اندھیرے میں انجن کا جائزہ بھی نہیں لیا جاسکتا تھا۔ ویسے  
بھی مجھے انجنز کی ٹوٹ پھوٹ سے مننے کا کوئی خاص تجربہ نہیں  
تھا۔ اگر میں انجن کا جائزہ لے بھی لیتا اور کسی طرح مجھے نقص کا علم  
ہو بھی جاتا تو بغیر آوازوں کے میں اس درانے میں کیا کر سکتا تھا؟  
اگر کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی تو اسے تبدیل کرنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے ہیڈ لائٹس بھی آف کر دیں اور سیٹ کے پٹے سے  
ٹیک لگا کے کمری سانس لینے لگا۔ یکدم ہی مجھ پر بے پناہ تھکن  
لے غلبہ پایا تھا۔ ہوشو خان سے ایک طویل اور جالی مسلسل  
کشتی۔۔۔۔۔۔ بلکہ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد مجھے ایک لمحے  
کے لئے بھی سسٹانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن رگ دپے میں  
طوفان برپا تھا اور جسم زندگی کی طلب میں مسلسل حرکت میں تھا۔  
ایک جیب سا باؤ تھا جو مجھے خود بخود ساتھ لے جا رہا تھا۔

لیکن اب گھر گھرا ہوا انجن کیا خاموش ہوا، گویا سواری  
سرگرمی دم توڑ گئی۔ رگ دپے میں جو طوفان برپا تھا وہ یکدم ہی ٹھنڈا  
ہو گیا۔ حتیٰ کہ شور میں بیجان اور ایڈجسٹڈ پھر پسند کی جو چنگاری کہیں  
راکھ تلے سگنی رہتی تھی وہ بھی ایک بار تو بیسے بجھ سی گئی۔

میں اگلی سیٹ پر لیٹ گیا۔ فوری طور پر تو پیدل چلنے کو بھی دل  
نہیں چاہ رہا تھا۔ میں کم از کم چند منٹ ضرور سسٹان چاہتا تھا اور کچھ  
سوچنا چاہتا تھا لیکن لینے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے ذہن سوچنے کے

کیا تھا

اس دیرانے میں گریلوں کی بازگشت کئی سینکڑ تک گونجی محسوس ہوتی رہی۔ آخر کار وہی پہلا سا سکوت چھا گیا۔ وہ پہلے دھیرے دھیرے زمین سے اٹھنے میں نے انہیں جیب کے عقب سے نمودار ہوتے دیکھا۔ انہیں شاید اب بھی یہ یقین نہیں آیا تھا کہ جیب میں کوئی نہیں تھا۔ وہ بہت مختار انداز میں جیب کی طرف آ رہے تھے۔

جیب کے قریب پہنچ کر جب انہیں یقین ہو گیا کہ جیب میں کوئی نہیں ہے تب وہ صحیح طور پر سیدھے کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک نے تاج سے جیب میں روشنی ڈالی اور مزید اطمینان کیا۔ تاج کی روشنی توڑی بہت شکس ہو کر ان پر بھی پڑی اور مجھے ان کی شخصیتوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا۔ وہ ڈاکو ہی معلوم ہوتے تھے۔

تاج والے نے آگے بڑھ کر روشنی جیب کی نمبر پلٹ پر ڈالی اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”خیر وہ تو نہ پولیس کی جیب ہے نہ رنجیروں کی۔ پھر یہ کس کی ہے؟ کون یہاں تک آیا ہے؟“

نئے خیر کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا وہ داؤد می کہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہے؟“ اس نے بوٹ پر ہاتھ رکھا اور ایک دم ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”انجی گرم ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے جیب سے اترے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ زیادہ دیر نہیں گیا ہوگا۔“

پھر اس نے اپنے ساتھی کو ڈانٹا۔ ”تاج رنجیروں کو ڈانٹا۔“ اس کے ساتھی نے تاج رنجیروں سے کہہ کر اسے رنجیروں کی طرف کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے رہے مگر اس اندھیرے میں بھلا انہیں کیا نظر آتا۔ وہ یقیناً بڑی الجھن میں تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کھانسی انہوں نے کندھوں سے اُتار کر ہاتھوں میں لے لی تھیں۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد رنجیروں سے بولا۔ ”چھوڑو یا رانجیروں کو۔ جب کوئی سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ہم جس کام کے لئے نکلے تھے وہ کر کے چلیں۔“

میں اس وقت تک درختوں کی آڑ لیتا ہوا شکار پر نکلے ہوئے درخت کی طرح نہایت خاموشی سے ان کے قریب جا پہنچا تھا۔ مزید قریب ہونے کے لئے میں ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر رنجیروں کی حالت میں بچوں کے بلے دوسرے درخت کی طرف بڑھاؤ اچانک ہی کچھ خزاں رسید ہوئے جو شاید کچھ زیادہ ہی خشک تھے میرے قدموں تلے چرچ اٹھے۔

میں اس وقت تک درخت کی اوٹ میں تو بیٹھ چکا تھا لیکن بالکل اس طرح اپنی جگہ میں ہو کر رہ گیا جیسے دن کی تیز روشنی میں اچانک ہی ڈاکوؤں کے سامنے جا پہنچا ہوں۔ میں اب گویا بھل چکا تھا کہ رات کے سناٹے میں جنگل میں قدموں تلے خشک پتوں کے

راگھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گھوڑے تھے۔ آواز جنگل کے اندر سے آ رہی تھی۔

میں آہستگی سے جیب سے اُتر آیا۔ اب میں نے پہلی بار انہیں پہاڑ چاڑ کر جیب میں ادھر ادھر مچا کر شاید اس میں کوئی گن یا گولی اور ہتھیار موجود ہو لیکن اس میں پشاور کی چپلوں کی ایک جوڑی اور موٹی سی ایک زنجیر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ جیب میں معلوم نہیں کس کی تھیں اور موٹی وہ عام ہی زنجیر جیب میں نہ جانے کیوں پڑی تھی۔ وہ اسی قسم کی زنجیر تھی جس سے بیٹھنوں وغیرہ کو باورجا جاتا ہے۔

میں نے اسے اٹھالیا۔ میری یہ حرکت تقریباً خیر ارادی سی تھی۔ زنجیر کی ٹکٹناہٹ بھی اس سناٹے میں مجھے کچھ بلند محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے اسے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا اور دوسرا دھیرے دیکھا۔ اس پاس چپنے کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ بس لکڑی کے چند ٹوکے تھے۔ وہ بھی زیادہ اونچے نہیں تھے۔

ٹاپوں کی آواز کچھ بہت قریب آئی جاری تھی اور اب خاصی واضح ہو گئی تھی۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ چپنے کے لئے اس وقت سب سے بہتر جگہ جنگل ہی ہے۔ ٹاپوں کی آواز جس طرف سے آ رہی تھی میں وہی قدموں تیزی سے کچے راستے پر اس سے کچھ آگے چلا گیا اور پھر درختوں کے درمیان گھس گیا۔ درخت زیادہ گنجان نہیں تھے لیکن جتنا بھی دور کھڑے ہو کر دیکھا جاتا ہے جنگل اتنی ہی گھٹا نظر آتا ہے۔

میں ایک تار در درخت کے عقب میں دیک کر بیٹھ گیا۔ میں اب جیب سے غامض آگے تھا۔ ٹاپوں کی آواز اب مجھے بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں درخت کے عقب سے جھانک کر جیب کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے چند قدم کے فاصلے سے تار درختوں کے درمیان سے دو گھڑ سواروں کے پیوے آگے پیچھے باہر آتے دیکھے۔ باہر آنے کے بعد وہ کچے راستے پر جیب کے عقب میں آئے۔

کچھ اندھیرے میں انہوں نے جیب کو فوراً دیکھ لیا اور یکدم لٹک کر رہ گئے۔ ان کے کندھوں پر گولوں کے پیوے نظر آ رہے تھے۔ جیسے فوراً ان کے ہاتھوں میں آگئیں اور انہوں نے گھوڑوں سے ہٹا لیں۔ گاریوں پر تیز رفتاری سے لی جیسے کوئی ان دیکھا دشمن ان پر حملہ کرنے لگا ہو۔

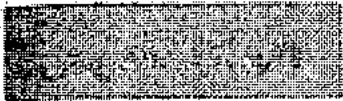
ایک لمحے بعد ان میں سے ایک نے کڑکدار آواز میں لنگار مارا۔ ”کون ہے؟ سامنے آؤ۔“ میں تو ہم گولی چلا دیں گے۔“

انہوں نے دو تین سینکڑ انتظار کیا۔ جب انہیں جیب میں کوئی حرکت دکھائی نہ دی تو انہوں نے وہی سہی سرپور ہی کر دی۔ انہوں نے جیب پر ایک برست مار دیا۔ گولیوں کی ترخاٹ کے علاوہ دو دھماکے سنائی دیے۔ غالباً پچھلے دو ٹپوں ہی تازہ برست ہو گئے تھے۔ گولیوں کی ترخاٹ سے اعلان ہوا کہ برست کھانسی مارا



# گنگا کے پنجابی ناک

۱۰۰/۰۰ قیمت



اردو بازار لاہور

اس کے علاوہ اس علاقہ میں میرے گزشتہ چند دن جس طرح گزرے تھے انہوں نے میری درودوں بھی خوابیدہ حیات کو کہا جگا دیا تھا۔ ان چند دنوں میں ہی مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے میری زندگی انہی دیر انوں میں کچھ اسی قسم کے خطرات سے کھیلنے لگی ہو رہی تھی اور اب نہ صرف ہر طرح کے خطرات مجھے معوا نظر آنے لگے تھے بلکہ ان سے کچھ کرکڑیاں میں اپنی پراسراری جیلا جیلت کی تسکین کا سامان کرتا تھا۔

ان دونوں کی پشت میں نظر پڑی تھی۔ جنگل سے باہر آنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان محض دو قدم کا فاصلہ ہو گیا۔ ایک ہی وقت میں بحر کران میں سے ایک کو تلو کر کے یہ ہوش کر کے گرا سکا تھا۔ مسئلہ ایک وقت دونوں کو گرائے کا تھا۔ جبکہ دونوں کے ہاتھوں میں کلاں تھے تو انہیں اور اٹھایا جیتا نہ کر دینے کے لئے بے تاب تھیں۔

ایک لمحے کے گہرے سکوت کے بعد خود بہر پیراڑی نے حمل کیا اور وہ اپنی کلاں کھوکھلے کندھے پر لٹکاتے ہوئے بولا۔ ”پھر دوایا چلتے ہیں۔ وہ جو کچھ بھی تھا“ فیض دور نکل گیا ہے۔ ہمیں سردار نے جو کام بتایا ہے اس کی فکر کرنی چاہیے۔“

دوسرے ڈاکو نے بھی گویا بالکل خواست کلا کھوکھلے کندھے پر لٹکا لیا اور آخری بار سلاخی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنے گھوڑوں کی طرف قدم بڑھایا۔ میرے لئے دیا مناسب ترین لمحہ تھا۔ کم از کم اب ان کی انگلیاں کلا کھوکھلے ٹریکوں پر نہیں رہی تھیں اور ابھی وہ گھوڑوں پر سوار بھی نہیں ہوئے تھے۔

میں بچوں کے بل دوڑتا ہوا اور درختوں کے درمیان سے نکلا اور دونوں باند پھیلانے ہوئے ان پر چلا گیا۔ ان کی انگلیوں میں ان دونوں کو

چرچانے کی آواز کتنی بلند محسوس ہوتی ہے۔

لیکن قدرت نے مجھ پر انداز میں میری مدد کی۔ میں اسی وقت ڈاکوؤں کے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا نہ جانے کیوں بری طرح ہنسا اٹھا۔ بچوں کے چرچانے کی آواز ابھری ہی تھی کہ گھوڑے کے ہنسانے کی آواز اس پر غالب آگئی۔ یوں بچوں کے چرچانے کی آواز کی طرف ڈاکوؤں کا رخیاں نہیں گیا۔

لیکن جو گھوڑا ہنسیا تھا وہ تو سختی فضا میں بلند کیے مجھ سے انداز میں دانت نکال رہا تھا اور تھپے پڑ پڑا رہا تھا۔ وہ یقیناً میری بو پا چکا تھا اور اپنے مالک کو اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں اس وقت حیران ہوں بغیر نہ رہ سکا جب میں نے دیکھا کہ ڈاکوؤں نے گھوڑے کے انداز پر قہقاہہ نہیں دی تھی۔

وہ جنگلوں میں زندگی گزارنے والے لوگ تھے۔ انہیں ان باتوں کا زیادہ علم ہونا چاہئے تھا مگر ان کے نزدیک شاید گھوڑا صرف ان علاقوں میں سواری کا ایک ذریعہ تھا جہاں گاڑی یا جپ وغیرہ نہیں جاسکتی تھی۔ اور بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ شاید انہیں کبھی گھوڑوں کی خصوصیات کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی یا پھر ان کے ذہن ان باریکیوں میں جانے کے اہل نہیں تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ موت سے گھوڑے بڑے بڑے معاملے میں تقریباً کتنے ہی جتنے حساس ہوتے ہیں۔

گھوڑا انہیں اشارہ دے رہا تھا کہ آس پاس کوئی موجود ہے لیکن انہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ میں نے ان کی اس غفلت پر دل ہی دل میں ان کا نمون ہوتے ہوئے بچوں کے بل دو قدم آگے بڑھ کر ایک اور درخت کی آڑ میں لحد یہ کہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

مجھے ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں چاہتا تو درختوں ہی درختوں کے درمیان سے گزرتا اور پستے راستے کے حوازی چلتا ہوا ان سے دور نکل سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جپ کے ناکارہ ہونے کے بعد مجھے سواری کی اشد ضرورت تھی۔ مجھے دور دور تک کسی ہستی کے آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے اور میں ان اجنبی دیر انوں میں پیدل جینے کا خلوص مول نہیں لیتا چاہتا تھا۔ اس کی نسبت مجھے یہ خلوص کم تک نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ میں ان ڈاکوؤں کو قابو میں کر کے یا بے ہوش کر کے ان میں سے کسی کا گھوڑا حاصل کرنے کی کوشش کروں۔

وہ اگر واقعی ڈاکو تھے تو یقیناً ان اندھروں سے اور اس ماحول سے زیادہ مانوس تھے۔ یہاں کے متوجہ خطرات سے نمٹنا اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ اس کے باوجود ان سے الجھنا مجھے کچھ زیادہ خطرناک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید خود میرے اندر وہ افضل چہدہری جاگ اٹھا تھا جو کبھی اس طرح ان گت خطرات سے بچتا بچتا رات کی تاریکی میں نہ جانے کن کن دیر انوں میں پھٹکا پھرتا تھا۔

مرے دیکھنے کے بعد مشکل سے اس شخص کے قابو میں آتا ہے جس نے مالک کو مارا ہو۔

تادم میری نظریں پر تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ اسے قابو میں کرنا میرے لیے زیادہ مشکل مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس کے لئے طاقت اور تجربہ دونوں درکار ہوتے ہیں۔ میرے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ گو کہ ایک عرصے سے میں اس قسم کے کاموں کے سلسلے میں پریکٹس میں نہیں تھا لیکن اب زندگی کا پھلن بدلا تھا تو گویا کئی غیبہ اور غفہ ملا جھٹیل بھی بیدار ہو چکی تھیں۔

دو سزا گھوڑا کچھ زیادہ حساس معلوم نہیں ہوا تھا۔ وہ قدرے بے نیازی سے کھڑا تھا لیکن اس کی جھلجھلائی سی آنکھوں میں میرے لیے پائندہ نگہ تھی۔ وہ زیادہ اچھی نسل کا اور زیادہ مضبوط معلوم نہیں ہوا تھا۔

میں جو تھی ان کے قریب پہنچا، اچھا گھوڑا ایک بار پھر ہنسا کر اچانک پھیلنے لگا لیکن پھر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ پر حملہ آور ہونے لگا ہے۔ میں ہنسا کر ڈرا پیچھے ہٹا لیکن گھوڑا دو ٹانگوں پر ہی گھوم کر جنگل کی طرف بھاگا اور دوسرے ہی لمحے دوڑنا چلا گیا۔ جنگل میں داخل ہو کر وہ غائب ہو گیا اور میں کھڑا رہ گیا۔

میرے حق میں یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ گھوڑا اتنا جذباتی ہو جائے گا اور اچانک ہی بھاگ کھڑا ہوگا۔ اب زیادہ امکان یہ تھا کہ وہ سیدھا اپنے ٹھکانے پر جائے گا اور وہاں موجود لوگ اسے خالی اور تھرا واپس آتے دیکھ کر فوراً حرکت میں آجائیں گے۔

میرے لئے نہ صرف خطرے کا امکان بڑھ گیا تھا بلکہ اب مجھے قناعت بھی کمتر گھوڑے پر کرنا تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کی نگاہ پکڑ لی کہ کہیں وہ بھی اپنے ساتھی کی تھلید میں بھاگ نہ جائے اس کا پہلے تو ایسا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن جو تھی میں نے اس کی نگاہ پکڑ لی اس نے اچھل کود شروع کر دی۔

وہ شاید ذرا تاخیر سے فیصلے پر پہنچے گا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جب اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں آگئی تھی اس نے تیب علی احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب نگاہ کسی کے ہاتھ میں چلی جائے تو احتجاج عموماً بے کار ہوتا ہے۔ اس کے احتجاج میں کوئی خاص شدت بھی نہیں تھی۔

میں نے نگاہ کو دو تین جھٹکے دیے اور موقع پاتے ہی اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے ذرا اچھل کود کر اور پھیلنے لگا لیکن پھر کھڑے ہو کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے یہ حربے مجھ پر کارگر نہیں رہے۔ میں نے اس کی پسیوں کو ٹانگوں کے درمیان دبا دیے ہونے چند زوردار گزے دیے۔ اس کام کے لئے ذرا طاقت درکار تھی۔ میری یہ تدبیر ضرورت کے وقت بیشہ کارگر رہی تھی۔

مزید چند سیکنڈ کی جھل جھٹ کے بعد گھوڑا سیدھا ہو گیا اور

اپنے ساتھ لے کر گرتے گرتے دونوں کے سر پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرا دیا چاہتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ دوائی قسم کے ڈاکوؤں کی طرح ان کے سرول پر پگڑیاں نہیں تھیں ورنہ ان کے سر آپس میں ٹکرانے کا کوئی ناکدہ نہیں ہوتا۔

میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ ان کے سر پوری طرح ایک دوسرے سے ٹکرائے اور میں انہیں لپٹے ہوئے زمین پر ڈبیر ہو گیا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوئے لیکن ان کے خواں بڑی جھل ضرور ہوئے۔ انہیں شاید اندازہ نہیں ہو سکا کہ عجب سے ایک انسان نے ان پر جھلانگ لگائی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کے منہ سے کچھ ایسی کھٹکیاں ہوئی سی آواز برآمد ہوتے محسوس کی جیسے وہ کسی ہلاک گرفت میں آگیا ہو۔

اس سے پہلے کہ اس کا سر زمین سے اٹھتا میں نے اس کی کپڑی پر جھٹکے کی طرح ایک گھونسا رسید کیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا۔ دوسرا اس وقت تک میرے پیچھے سے نکلے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن ابھی صحیح طور پر سیدھا بھی نہیں کھڑا ہو سکا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔

وہ دوبارہ اوندھے منہ گرا اور میں نے اس کا بازو مروڑتے ہوئے کلا شکوف اٹھانے کی ہن کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کی کلا شکوف اس وقت تک کندھے سے اتر کر زمین پر گر چکی تھی۔

وہ کچھ زیادہ جاندار آدمی نہیں تھا۔ آسانی سے میرے قابو میں آچکا تھا۔ میں نے اس کے لیے بال مٹھی میں پکڑتے ہوئے اس کا سر تھری سے کئی بار زمین سے ٹکرا ڈالا۔ زمین کو کہ نرم اور چمکی تھی لیکن اس طرح کئی بار سر ٹکرانا اس کے لئے کافی ثابت ہوا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ بھی اپنی جگہ ساکت ہی رہا۔

تادم میں چند لمحے غماز رہا کہ ان میں سے کوئی ذرا بھی حرکت کرے تو ایک آدھ ہاتھ اور نکلاد لیکن وہ ساکت ہی رہے۔ مجھے خوشی تھی کہ یہ چھوٹی سی مسم آسانی سے سر ہو گئی تھی۔ کوئی ہنگامہ بہا نہیں ہوا تھا۔ ایک ناز تک کی آواز نہیں گونجی تھی۔ ایسی کوئی آواز کسی کو متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے تھری سے ان دونوں کی تلاشی لی۔ ان دونوں کی پیروں میں سوسے کی ٹوٹ موجود تھی۔ ایک کی جیب میں پتول بھی تھا۔ میں نے رقم اور پتول نکال کر جیب میں ٹھونس لیا۔ ان میں سے ایک کی کلا شکوف بھی میں نے اٹھائی اور دوسری کا میگزین نکال لیا۔ ان کی ٹانج بھی میں نے اٹھالی۔ ٹانج اور میگزین نیچے میں اتر کر اور کلا شکوف کندھے پر لٹکا کر میں گھوڑوں کی طرف متوجہ ہوا جو کچھ اور پیچھے ہٹ گئے تھے۔

ان میں سے ایک گھوڑا ہنسا ہے جا رہا تھا۔ وہی گھوڑا زیادہ طاقتور مضبوط اور اچھی نسل کا دکھائی دے رہا تھا۔ جو کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا اس پر یقیناً احتجاج کر رہا تھا۔ گھوڑا قانسا سمجھدار جانور ہوتا ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے مالک کو

وہ مشینری کی مخصوص گھر گراہٹ تھی۔ کسی گاڑی کے آواز کی آواز۔ میں نے مڑ کر دیکھا، عقب میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ آواز عقب سے ہی آ رہی تھی۔ پھر اندازہ ہوا کہ آواز ایک نیم گاڑیوں کی تھی۔ آوازیں اب بھی مجھے محض اس حد تک دے رہی تھیں جیسے مجھ سے کافی فاصلے پر کسیں دو کھلیاں بجھ رہی ہوں لیکن اب مجھے اس میں شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ گاڑیوں ہی آواز تھی۔

میں نے پیچھے مڑ کر ایک بار پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اندر میرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ آواز البتہ تھوڑی سی دیر تک کچھ اور واضح ہو گئی۔ اب میں اور بھی بہتر طور پر پہچان سکتا تھا۔ یقیناً جیپوں کی آواز تھی۔ ان کی ہیلڈ لائٹس آن نہیں تھیں لیکن یقیناً تیز رفتار سے آ رہی تھیں۔

ایک تھا کہ اوگھوڑا رفتار میں جیپوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا عقاب میرے اندازے سے زیادہ تاخیر سے شروع ہوا تھا مگر بہر حال شروع ہو گیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ لوگ ہیلڈ لائٹس بجھا کر بھی بالکل صحیح سمت میں، یعنی میرے پیچھے و آ رہے تھے۔

میں نے گھوڑے کی پہلیاں مسل کر اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر اسے مزید تیز دوڑانے کی کوشش کی لیکن وہ بے چارہ پہلے تو اپنی سیڑ سے بڑھ کر تیز دوڑ رہا تھا۔ اس کے ہانپنے کی آواز سانپ کی چھٹکاہٹوں کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ اس کی رفتار تیز ہونے کے بجائے کچھ اور سست ہوئی جا رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ اس بار اچانک ہی دور اندر میرے میں کسی بہت بڑے اور غفیفٹاک درندے کی شکل بار آنکھوں کی طرح دو ہیلڈ لائٹس آن ہوئیں اور وہیں ساکت ہو گئیں۔ فاصلہ ابھی بہت زیادہ تھا۔ میں روشنی کی رسانی سے بہت دور تھا لیکن پھر بھی ایک لمحے کے لیے میرا دل ڈب سا گیا۔

روشنی زندگی کی علامت ہوتی ہے لیکن اس وقت وہ مجھے موت کی بنا ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکوؤں کو بے ہوش کر کے کچھ ذرا دور ہتھیار اور گھوڑا تو حاصل کر لیا تھا لیکن یہ چیزیں شاید مجھے بھگتی پڑنے والی تھیں۔

جیب صرف ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی اور اسی دوران اس کی ہیلڈ لائٹس آن ہوئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے ہیلڈ لائٹس آف ہو گئی تھیں اور آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ جیپیں دوبارہ حرکت میں آگئی تھیں۔

میرے لیے ان کا مقصد سمجھنا دشوار نہیں تھا۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے رک کر اور ہیلڈ لائٹس آن کر کے یقیناً میرے گھوڑے کے سمول کے نشانات دیکھ تھے۔ میں تو اس طبقے اندر میرے میں دوڑتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اپنے عقب میں وہ نشانات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ضرور تھا کہ نرم زمین

سیتلے راستے پر دوڑنے لگا۔ دو تین منٹ بعد ہی وہ میرے اشاروں پر چل رہا تھا۔ میں نے اسی سمت میں سرخا رہی رکھا جدھر جیب میں جا رہا تھا۔ یعنی جنگل کے متوازی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جنگل کہاں ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کدھر مڑنا چاہیے تھا۔

عام لوگ جنگل سے گھبراتے ہیں لیکن میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ مجھے آس پاس جنگل کی موجودگی سے ڈھراس رہتی تھی کیونکہ میری زندگی کے تجربات کے مطابق کسی سے گھراؤ کی صورت میں جنگل بڑی عمدہ پناہ گاہ ثابت ہوتا تھا۔ حملہ کرنے میں بھی اس سے بڑی مدد ملتی تھی اور اپنا پھاڑ کرنے میں بھی۔ جنگل جتنا گھنا ہوتا تھا اتنی ہی مجھے تحفظ کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔

میرے ہاتھ پر موجود جنگل بھی کافی گھنا تھا۔ شاید اسی لیے ڈاکو اس میں سواری کے لیے گھوڑے استعمال کر رہے تھے۔ مجھے اب جنگل کے علاوہ چند دوسری چیزوں کی موجودگی سے بھی طمانیت کا احساس تھا۔ ایک قواب میں کچھ دیہیلے کی طرح بالکل ہی تکیا دست نہیں تھا۔ میری جیب میں کچھ رقم موجود تھی اور میں نسبتاً بھی نہیں تھا۔ ایک کٹا کٹو اور ایک پتول میرے ہاتھ آچکا تھا۔ سواری کے لیے گھوڑا میرا گیا تھا۔ گویا اب حالات پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر تھے۔ خطرات اب بھی کم نہیں ہوتے تھے لیکن اب بالکل ہی بے سرد سامانی کا احساس نہیں تھا۔

میں گھوڑے کو جتنا تیز بھاگتا تھا، بھاگتے جا رہا تھا اور دوڑتے دوڑتے سے مڑ کر بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ لی الحال تو میرے عقب میں دور تک اندر میرے کی دلدل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آخر کار میں مطمئن ہو گیا کہ اب اگر کوئی میرے تعاقب میں آئے گا بھی تو اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ ہو گا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک گھوڑا اسی رفتار سے دوڑتا رہا لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کی رفتار میں کمی آنے لگی۔ وہ پہلے بھی کچھ تازہ دم معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ جب میں اس پر سوار ہوا تو اس کے جسم پر پسینے کی نمی تھی۔ اب وہ بڑی طرح اب رہا تھا لیکن حتی الامکان تیز دوڑنے کے لیے جان لڑا رہا تھا۔

اوجر جنگل تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں میرا جنگل کے ساتھ چلتے رہنے کا فیصلہ غلط تو نہیں تھا؟ کہیں میں آباد علاقوں سے اور بھی دور تو نہیں ہوتا جا رہا تھا؟

ابھی میں اس الجھن سے ہی نکل نہیں پایا تھا کہ بہت دور کہیں سے مجھے ایک نہایت مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں چاہتا تو اسے اپنا دبا دھم بھی سمجھ سکتا تھا لیکن فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ وہ میرا دبا دھم نہیں تھا۔ میں نے اپنی سماعت کی حتمی طاقت اس آواز پر مرکوز کر دی۔ پھر اس کی ضرورت نہ رہی، آواز خود ہی دھیرے دھیرے واضح ہونے لگی۔

گھوڑا سوں کے تازہ اور خاصے واضح نشان چھوڑتا ہوا آ رہا۔ ہنسنا رہا ہوگا۔

اس وقت اور ان حالات میں یہ بھی اس کے ساتھ ایک نیکی ہوئی کہ میں اسے کوئی مارنے یا لگنے میں یہ بھی نہ کر سکا۔ میں اسے اسی حال میں چھوڑ کر پلٹ کر بھاگا۔ اس دوران چھپوں کی آواز کچھ اور قریب آچکی تھی۔ میرے لیے اب جنگل میں داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس سیدھے راستے پر بھاگتے رہنے یا بیکراں میدان علاقے میں کسی بھی سمت دوڑتے رہنا اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کر دینے کے مترادف تھا۔

میں جنگل میں کھس گیا لیکن میں نے اندر کی طرف زیادہ دور جانے کی کوشش نہیں کی اور اندازاً ریتلے راستے کے متوازی ہی بھاگنے لگا۔ لیکن جنگل بڑا بڑا قریب ہوتا ہے۔ خصوصاً رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا جنگل۔

درختوں سے بچتے ہوئے دوڑنے کی کوشش میں انسان کو درختوں کے درمیان اس طرح پکڑا پڑتا ہے کہ آخر کار سمٹ کا احساس ذہن سے محو ہوتا ہے اور انسان کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے لیکن میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ مجھ سے یہ غلطی نہ ہونے پائے۔ چھپوں کی آوازیں بھی میری مدد کر رہی تھیں۔ وہ آوازیں تھیں کہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ریتلے راستے سے دور نہیں جا رہا تھا۔ گوکہ میں اس راستے کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا کہ میں اس کے قریب رہتے ہوئے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر چھپوں کی آوازیں سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک جگہ رک گئی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھیں جہاں گھوڑا ٹانگ بڑا ہے برا تھا۔ چند لمبے سکوت رہا۔ چھپوں کی خفیف سی گھر گھراہٹ سنائی دیتی رہی لیکن جھپیں بہر حال حرکت میں نہیں تھیں۔ پھر اچانک ہی فضا گولیوں کی رزخا بہت سے گونج اُٹھی۔

میں حیرت کے باعث دوڑنا بھول گیا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ میں تو وہاں نہیں تھا پھر وہ لوگ کس پر ناز کر کر رہے تھے؟ اگر گھوڑے کو تکلیف سے نجات دلانے کے لیے گولیاں ماری جاری تھیں تو اس کے لیے ایک گولی کافی تھی۔ بہت ہوتا تو دو تین گولیاں ماری جاتیں لیکن وہاں تو برسٹ بہ برسٹ مارے جا رہے تھے۔ اتنی گولیوں سے تو ہاتھی چھلکی ہو سکتا تھا۔ بے چارے ایک زخمی گھوڑے کی کیا وقعت تھی۔ اگر میں وہاں ہوتا تب بھی شاید اتنی نازت کی ضرورت پیش نہ آتی۔

یہ نازتک جنگل سے باہر ہی ہو رہی تھی تاہم میں نے احتیاطاً کلاحتکف کندھے سے اتار کر ہاتھوں میں لے لی۔ پھر میں نے نازتک کے انداز پر غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ حقیقت میں دو گروہوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ لاگوں کا قافلہ کسی نامعلوم پارٹی کے ساتھ مقابلہ ہو رہا تھا۔ ویسے میں تو یہ بھی نہیں سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جن لوگوں کو میں نے اپنے حلقہ میں آتے دیکھا تھا

اگر مجھے گھوڑے پر سواری کرنا تھی تو سرسوت ان نشانات سے بچتا رہے گا کوئی طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے گھوڑے کو چھوڑ دینے کے بارے میں بھی سوچا۔ جس رفتار سے اس وقت گھوڑا دوڑ رہا تھا میں اس سے زیادہ تیز دوڑ سکتا تھا اور جنگل میں داخل ہو کر اس راستے کے متوازی سفر کر سکتا تھا۔

جنگل میں ان کے لیے میرے قدموں کے نشانات تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا اور جب مجھے درختوں کے درمیان تیزی سے داخلے کی بھی نہیں سکتی تھی لیکن پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی توانائی آخری لمحے تک بچا کر رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک گھوڑا میرا ساتھ دے سکتا تھا تب تک مجھے اسی پر سفر کرنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد اپنے جسم و جان پر قوت نہ جانے کب تک اور کہاں تک بھروسہ کرنا ہی تھا۔

لیکن قدرت کو میرے اس فیصلے سے اتفاق نہیں تھا۔ مجھے فیصلہ کے چند سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے کہ اوپر سے کچھ اور فیصلہ آگیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ انسانی فیصلے کتنے حقیر ہوتے ہیں۔

ایک بار پھلڈائٹس آن ہوئے دیکھنے کے بعد میں باہر مڑ کر دیکھا جا رہا تھا کہ اچانک گھوڑے نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی درخت کا ٹکڑا تھا۔ حالانکہ وہ کچھ ایسا راستے میں حائل بھی نہیں تھا لیکن گھوڑا نہ جانے کس طرح گھوڑا سالار کا اکلے ٹانگ اس سے ٹکرا بیٹھا تھا۔

گھوڑا بہت بڑی طرح کاٹی آگے جا کر۔ میں اس وقت بھی پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ قوت نسبت رہا کہ گھوڑے کا توازن خراب ہونے کا احساس ہوتے ہی میں نے اس کی نگاہ چھوڑ دی تھی اور خود کو سنبھال لیا تھا ورنہ شاید میری بھی گردن ٹوٹ گئی ہوتی۔

میں غیر ارادی طور پر اپنے سر کو بازوؤں کے حلقے میں چھپاتے ہوئے لٹکا ہوا تھا اور میری دور جا کر گرا۔ کلاحتکف میرے پہلو میں بڑی طرح چھپی لیکن اس وقت وہ چوتھے معمولی محسوس ہوئی اور معمولی چٹوڑوں پر دھیان دینے کا وہ وقت نہیں تھا۔

میں تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس امید کے ساتھ گھوڑے کے قریب پہنچا کہ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہو گا لیکن قریب سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے جھرمجھری سی آگئی۔ اپنے ہی زور میں اور اپنے ہی وزن سے اس کی اٹلی بائیں ٹانگ اس بڑی طرح ٹوٹی تھی کہ ہڈی کھال چاڑھ کر باہر نکل آئی تھی۔

وہ بے چارہ اس کے باوجود اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی شاید تکلیف کا احساس صحیح طور پر اس کے پورے وجود میں سرایت نہیں کر سکا تھا۔ اس کی کھال سے جھانکتی ہوئی نوکیلی مسفید ہڈی کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ چند لمبے بعد وہ تکلیف سے بڑی طرح

دو ڈاکوئی تھے۔ یہ تو محض میرا اندازہ تھا۔

بہر حال یہ تو جنگ کے اسرار تھے۔ معلوم نہیں اندھے میں کہاں کیا ہو رہا تھا۔ میرے لیے تو یہی غیبت تھا کہ میں فی الحال خطرے سے دور تھا اور خاصی تیز رفتاری سے جنگ میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔

رفتہ رفتہ میں نے ہوا کی لہروں کے دوش پر کہیں بہت دور سے آتی ہوئی مدھم سی آواز سنی۔ وہ آواز یقیناً میگافون سے ابھر رہی تھی۔ بہت دور کی آواز تھی اور الفاظ میرے لیے ناقابل فہم تھے لیکن میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی قسم کا اعلان تھا جو میگافون پر بار بار دہرایا جا رہا تھا۔

خفا بہرے ڈاکو تو میگافون استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اس کی بھلا کیا ضرورت پیش آ سکتی تھی؟ میگافون عموماً پولیس یا قانون نافذ کرنے والے دیگر ادارے مخصوص قسم کے حالات میں استعمال کرتے ہیں۔ تو کیا ڈاکوئیں کا پولیس یا اس قسم کے کسی دیگر ادارے سے رکن ہو گیا تھا؟ لیکن پولیس یا اس طرح کی کوئی اور فورس کہاں سے کھل آئی تھی؟ مجھے تو کہیں دور تک ایسی کسی فورس کی موجودگی کے کوئی آثار و کھالی نہیں دیکھے تھے۔

میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے ان سوالوں میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو جلد از جلد اس مقام سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کی فکر کرنی چاہیے تھی جہاں فائرنگ یا میگافون پر کوئی اعلان ہو رہا تھا۔ شاید دست قدرت نے ایک بار پھر میری مدد کی تھی کہ میرے قاقب میں آنے والا خطرہ ٹل گیا تھا۔

آخر کار میگافون پر ابھرنے والی آواز معدوم ہو گئی لیکن اس کے بعد بھی وقفے وقفے سے ایک آدھ برست کا تاراج جاری رہا مگر آوازیں اب مجھے اتنی مدھم سنائی دے رہی تھیں کہ محض واہمہ محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ جنگل میں بے آرام ہو جانے والے پرندے اور دیگر جانور بھی رفتہ رفتہ اپنے گھکانوں میں دھب گئے اور رات کی تاریکی و سائے میں جنگل اپنی تاحیر و اسراریت کے ساتھ سائیں سائیں کر رہ گیا۔

ایسا لگتا تھا جیسے درختوں کے اس لافانی سے سلسلے میں صرف ایک میں ہی متحرک جاندار تھا۔ کبھی کبھی خشک پتے میرے پیروں تلے آکر چرچا اٹھتے۔ اس کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کہیں کوئی کبشت بھیٹر بھی نکلے سرائی کر رہا تھا۔ کبھی کبھی رات کے سکوت میں مدھم سی آوازیں بھی بڑی لگتی ہیں اور کبھی استغناء سکوت سے گھبرائے ہوئے انسانوں کو آوازوں کی طلب محسوس ہونے لگتی ہے۔

میں بہت تیز رفتاری سے دوڑنا چاہتا تھا لیکن ایسے اندھے میں کھینچے جنگل میں اندھا دھند نہیں دوڑا جاسکتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں سیدھے اور پیستے سے اس راستے کے متوازی اپنا سفر جاری رکھا جسے میں پھوڑا تھا۔

میں اسی طرح تقریباً ایک گھنٹہ دوڑا رہا۔ آخر کار سامنے ایک طرح پھول گئی۔ بہت دور سے صرف صوبتیں میری ہم سفر گیارہ کی مشقیں، دیگر تھوڑی بہت درختیں اور قدرت کی حکاک بے پناہ سخت جانی بھی آخر کہاں تک میرا ساتھ دیتی۔ ایک دور آتا ہے کہ مشین بھی تھک جاتی ہے، میں تو پھر بھی انسان تھا۔ میری طرح پناہ رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں کسی درخت کے نیچے چٹ لٹ جاؤں اور دنیا جہاں کے ہر سسکے سے بیگانہ ہو کر گناہ نیند سو جاؤں۔

جنگل سے اب مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ جنگل کیا تھا؟ درختوں کا ایک سمندر تھا جو فہم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ جہاں کوئی کنارہ ہی نہیں تھا۔

آخر کار قدرت کو شاید میری بیزاری پر ترس آ گیا۔ نے اندھرا نہایت معمول حد تک ہلکا ہوا محسوس ہوا اور پھر چند لمحوں بعد میں نے اپنے آپ کو درختوں کے سلسلے سے باہر پایا۔

کھلے آسمان تلے دک کر میں نے یوں گہری گہری چہرہ سامنے لیں گویا ابھی ابھی مجھے کسی قید سے رہائی ملی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی تارا جھلما رہا تھا اور تاریکی میں وحند لہٹ آتی تھی۔ شاید صبح کلاب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔

میں نے آنکھیں میاڑ میاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ آنکھیں اب بھی زیادہ دور تک دیکھنے سے قاصر تھیں۔ بہر حال محسوس ہوا ایسا ہی ہو رہا تھا جیسے میں ایک ایسے مقام پر کھڑا تھا جہاں دن کی روشنی میں بھی شاید مجھے ماحول نظر نہ چلے ہوئے میدان کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ جنگل اب میرے عقب میں تھا اور بائیں طرف نہ جانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

میں نے جبکہ کر زمین پر اچھی طرح ہاتھ پھر کر دیکھا۔ وہاں کی مٹی نرم کھود اور نیم ریتلی سی تھی۔ مٹی بہت سی بالوں کا پتہ دیتی ہے۔ وہاں کی ہوا میں پانی کی خوشبو بھی شامل تھی۔ ان سب بالوں سے اندازہ ہوا تھا کہ وہاں بائیں ہاتھ پر دور کہیں شاید دریا بہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کس سمت میں چلنا چاہیے۔ آخر کار میں نے تن بہ تقدر ہو کر دائیں طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ گو کہ اب مجھ میں دوڑنے کی بہت نہیں تھی لیکن دل اپنے جسم پر جبر کرتے ہوئے دوڑ رہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح جلد از جلد جنگل سے دور نکل جاؤں۔ جنگل یقیناً ایک ابھی پناہ گاہ ہوتا ہے لیکن اس جنگل میں بہت سے خطرات کا پتلا تھا۔

تھوڑے جھکن اور لکھن کے باوجود میں تقریباً ڈھائی میل کا فاصلہ دوڑتے دوڑتے مزید تلے کر گیا۔ آخر کار آنکھیں جواب دے گئیں۔ دوڑنا نہیں نہ رہا تو میں نے چلنا شروع کر دیا۔ لگتا تھا کہ دنیا ایک لافانی میدان میں تبدیل ہو گئی تھی جو کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت جس چیز نے مجھے

وہ قریب آئی تو اس کی کھڑکڑاہٹ بھی واضح ہو گئی۔ وہ دیکھی ایک بس تھی جیسی عمارت ہمارے ملک کے اندرونی دروازوں اور درائی علاقوں میں چلتی ہیں۔ اس قسم کی بسیں دیکھنے اور ان میں سفر کرنے کا تجربہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ بس اس لحاظ سے قیمت تھی کہ اس کی قیمت پر مسافر نہیں بیٹھے تھے۔

میں سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوا اور زور زور سے دونوں ہاتھ ہلانے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید بس ڈرائیور مجھے مٹھوک سمجھ کر بس روکنے کی زحمت ہی نہ کرے۔ میرا حلیہ کچھ اچھا نہیں تھا اور میرے کپڑے پر کلاخون بھی تھی۔ گو میرا اندازہ تھا کہ اس علاقے میں کسی کا اس قسم کے ملے اور کدے پر کلاخون کے ساتھ نظر اٹا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہوگی لیکن میں کوئی خطہ مول لینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ بس کو روکنے کے لیے سڑک کے کنارے میں جا کھڑا ہوا تھا۔

بس کھڑکڑاتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ کڑکھٹ بچھلے دروازے پر کھڑا میرا منتظر تھا۔ میں دوڑ کر بس میں چڑھ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بس میں مسافر کم ہی تھے۔ پچھلی سیٹ تو خالی ہی بڑی تھی۔ میں تھا اس بسی سیٹ پر جا بیٹھا۔ بس ہلکی سی لے کر کھڑکڑاتی ہوئی آگے بڑھی۔ کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کئی مسافر سر جھکا کر اوٹے رہے تھے۔

کڑکھٹا تھا میں چند منٹ چائے قریب آیا اور بیوس اچکاتے ہوئے پڑا ہوا۔ ”کڑھے دیندیں؟“ ”کماں جاؤ گے؟“ ”یہ بس کماں جائے گی؟“ میں نے ٹوٹی پھٹی سندر میں اُٹا اس سے سوال کیا تب اس نے چونک کر ذرا ٹھک ذرا ہی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر گویا بے نیازی برتنے کا فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وُحل مٹھا۔“

”وُحل مٹھا۔۔۔؟“ میں نے غیر ارادی طور پر دہرایا۔ یہ میرے لیے ایک عجیب نام تھا لیکن یہ معلومات حاصل کرنے کا وقت نہیں تھا اور معلومات سے میرے لیے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تو کسی بھی بستی تک پہنچنا تھا جہاں ضروریات زندگی میرے ہوں۔

ایک لمبے کے وقفے میں نے جب سے سو کاؤٹ نکالے ہوئے تھا۔ ”ایک کلٹ وُحل مٹھا کارے لا۔“

اس نے پیسے نکات کر بتایا میری طرف بڑھاتے ہوئے تھا۔ ”کلٹ نکات وُحل کوئی نہیں ہوتا بس کراہے ہوتا ہے۔“

مجھے ہلکا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ مجھے کون سا کلٹ کو چاہا تھا۔ میں نے تو محض رقم کا کیا تھا۔ وہ آگے ڈرائیور کے پاس جا بیٹھا۔

بس اب ڈرائیور پر پکڑ چکی تھی اور اس کے تمام اجزاء نے زمین سے صدارے احتجاج بلند ہو رہی تھی۔ ہر جہہ کھڑکڑا رہا تھا لیکن میں جب اس شکستہ حال اور پرانی سی سیٹ پر ڈرائیور کیل کر بیٹھا تو مجھے راحت کا جو احساس ہوا اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سب سے زیادہ سارا دیا ہوا تھا وہ شہم سحرانی علاقے کی ہوائے آخر شب تھی جو اتنی ٹھک اور فرحت بخش تھی کہ اس کا ہر جھونکا میرے تن میں جاں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتا تھا اور میرے رکتے ہوئے قدم پھر اٹھنے لگتے تھے۔

اس وقت ناہوی کے عفریت نے میرے ذہن میں چمچے گاؤں شروع کر دیے تھے جب اچانک ہی مجھے اپنے سامنے ذرا بلندی سی نظر آئی۔ بالکل قریب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ٹھک اور ذرا خشک ہی ایک سڑک تھی جو سرمئی پٹی کی طرح میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں طرف سے وہ اندھیرے کی کوکھ سے نمودار ہو رہی تھی اور بائیں طرف اندھیرے کی آنکھوں میں غائب ہو رہی تھی۔

میرے نیچے ہوئے وجود میں امید کی ٹھنڈک اُتر آئی۔ سڑک آبادی کی نشانی ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں سڑک نہ ہو وہاں آبادی نہیں ہوتی۔ لیکن سڑک کی موجودگی سے کہیں بچنے کا تصور آسان محسوس ہونے لگتا ہے، رہنمائی بھی سہجائی ہے کہ کس طرف جانا چاہیے۔ اس دیرانے میں پھیلی ہوئی ٹھک سی سڑک یہ ہے حیرتی اس وقت مجھے بہت اہم محسوس ہوئی۔

زندگی میں پہلے بھی کئی بار شدت سے احساس ہو چکا تھا کہ سڑک انسانی تمدن کی کتنی اہم علامت اور ضرورت ہے۔ اگر چھوٹی سے پھلتی آبادی کو دوسری آبادی سے ملانے کے لیے سڑک موجود ہو انسانی زندگی کتنی آسان ہو جائے لیکن اس دل باتوں میں تو حریف کا ابار تھا۔ میں کس کس حسرت کا دوتا ہو سکتا تھا؟ چنانچہ میں اپنی حسرتوں اور اس قسم کی سوچوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے سڑک کے کنارے کنارے چلتے لگا۔

دھیرے دھیرے صبح کا اجالا نمودار ہونے لگا اور آخر کار لاٹھیاں سے چھڑ کو اچال دیا لیکن اس وقت تک میری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ دھنک دھنکی لے میرا دل بندھ جانے کے بجائے یکدم ہی کھٹکے تھا۔ قریب تھا۔ میں سڑک کے کنارے اوسپنے سے ایک پتھر پر بیٹھ کر سناٹے لگا۔ درحقیقت میں اپنی قوت ارادی کو کلک پچھانے اسے سارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

گو دلچسپ کا منظر اب واضح ہو چکا تھا لیکن وہاں دیکھنے کو کھائی کا یہ سڑک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تقریباً بغیر اور سم و تصور کی باتیں ہوتی تھیں جس میں کہیں گڑھے اور کہیں نیلے نظر آ رہے تھے۔ کس کس سحرانی سی خادروں جھانپاں بھی پھیلی ہوئی تھیں جس کے درمیان میں سے ایک آدھ گرگٹ کو پھٹتے اور نیچے کو ہلانے کی دیکھا۔

وہ ایک عجیب لوار سی سڑک تھی۔ ابھی تک میں نے اس سے ملنے والی سواری گزرتے نہیں دیکھی تھی۔ جب تک میں کچھ تازہ کی پھل آٹا کھائیوں ذرا بحال ہو میں تب تک میرے گل آرزو پر ملنے کی آواز دھنکی دھنکی لگے۔ یہی سڑک پر دور سے ایک ڈھنگ کی ملنے کی آواز تھی وہاں کی۔

اس وقت وہ کھڑکڑاتی ہوئی بس مجھے دنیا کے کسی انتہائی جدید اور پرکشش عیار سے فائدہ آرام نہ محسوس ہوئی۔ میں نے کلا حکوف کو دیکھ کر بھی اپنے سے سرگایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرا گویا دنیا سے رابہ کٹ گیا اور میں نشنہ آسمان کے درمیان کہیں بھوکے پلنے لگا۔

میں کھجلی سیٹ پر بالکل کونے میں ٹکس کر بیٹھ گیا تھا۔ حکن مجھ پر اس بڑی طرح سوار تھی کہ شاید میں آنکھیں بند کر کے چند سیکنڈ بعد ہی سو گیا تھا۔

پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے صرف ایک سیکنڈ کے لیے آنکھ چپکی تھی۔ باہر ابھی غاسی دھوپ چہہ آئی تھی۔ بس رکی ہوئی تھی۔ اس میں کئی مسافروں کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ سڑک سے کچے میں اتر کر درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب کھڑی تھی جہاں کئی ٹیلے اور خواتین والے کھڑے مختلف چیزیں بیچنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔

اچھا خاصا شور مہا سا رہا تھا۔ شاید اسی شور کی وجہ سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میری سیٹ پر بھی تین مسافروں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں ہڑوا کر سیدھا ہوا کہ بیٹھ گیا۔ میرے ہڑوانے کی وجہ وہ سیاہ نام اور چھوٹے قد کا پولیس والا تھا جو دروازے میں کھڑا قراؤدی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ امراؤ کچھ ایسا تھا جیسے میں نے چند لمے پہلے اس کی شان میں کوئی گستاخی کی ہو۔ شاید وہ میری مدھوشی پر برم تھا۔

میں نے ہنور اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظر میرے چہرے سے ہٹ کر کچھ نیچے آگئی۔ میں نے بھی اس کی نظروں کی تھلید میں اپنی گود کی طرف دیکھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میری گود میں کلا حکوف رکھی ہوئی تھی جو نیند میں بھی میری گود سے نیچے نہیں گری تھی۔

پھر میں نے دیکھا بس کے اگلے دروازے میں بھی ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ وہ غالباً نظروں ہی نظروں میں پوری بس کی تلاشی لے چکے تھے اور آخر کار ان دونوں کی نظر مجھ پر آن لگی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ والے مسافر کی طرف دیکھا جو میری نیند کے دوران نہ جانے کس وقت وہاں آ بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے اور میرے درمیان حتی الامکان فاصلہ رکھا تھا۔

”کیا اصل مضار کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ ایک سادہ لوح اور مجھ سے بھی زیادہ مظلوم الحال سا رسائی منظم ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ کھلی ہوئی سی تھیں۔ اس نے ایک نظروں پولیس والے کی طرف دیکھا پھر تیس سر ہلا دیا۔ منہ سے وہ کچھ نہ بولا۔ شاید وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں پولیس والا اسے میرا سا بھی مسافر نہ سمجھ لے۔

پولیس والے کے ایک ہاتھ میں تھری ٹاٹ تھری کی پرائی سی رائفل تھی جس کے دتے پر میں بھی ہوتی تھی۔ دوسرے ہاتھ

سے اس نے اشارہ کیا اور نہایت عذارت سے بولا۔ ”دستے میں نیچے آ جاؤ۔“

بیشتر مسافر گردنیں موزے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہر صورت حال سے بالکل لائق نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگلا دروازہ دوسرا پولیس والا دوڑ کے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بلی اور پرائی سی تھری ٹاٹ تھری تھی۔ گوکہ دونوں حالت کسی رائفل کا رخ میری طرف نہیں تھا لیکن دونوں پولیس والا گویا انہیں استعمال کرنے کے لیے بالکل مستعد تھے۔

میں نے صرف ایک لمے کے لیے صورت حال پر غور کیا۔ تو چاہا کہ یکدم اچھل کر پولیس والے کو دروازے سے دھکیلا اس کے پتے پر پاؤں رکھ کر دوڑنا ہوا چھلاؤ کی طرح غار ہو جاؤں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ہٹوی کر دیا۔ کئی باتیں یاد میرے ذہن میں آگئی تھیں۔

ایک تو دروازے کا احرام غالب آ گیا تھا۔ دوسرے یہ خیال کہ اگلے دروازے پر کھڑا ہوا کاشییل میری رسائی سے بہت دور تھا اور میرے بھاگنے کی صورت میں اسے رائفل استعمال کرنا بہت مشکل ہو سکتی تھی۔ تھری ٹاٹ تھری ٹاٹ قسودہ کس میں ہر حال خطرناک تھی۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ فی الحال مجھ سواری کو چھوڑ کر منہ آٹھا کر ابھی درازوں میں گھسٹ بھاگنا بہت نہیں تھی۔ میں جب تک کہیں سستا نہ لے سکے گا تو میں اب تک درازوں میں مسلسل دوڑتا ہی رہا تھا۔ راستے میں کہی والی رکاوٹوں اور مصیبتوں سے بھی نمٹنا رہا تھا لیکن اب کچھ آرام کر کے احصاب کو یکدم ہی ڈھیلے کر دیتے تھے۔

آخر کار میں نے پولیس والے کے حکم کی قبول کا فیصلہ کیا۔ کلا حکوف گود سے اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جو تھی۔ کلا حکوف کو ہاتھ لگایا۔ دونوں کاشییل نے تھری ٹاٹ تھری ٹاٹ رائفلوں کا رخ میری طرف کر دیا۔ میں نے اس لمے محسوس کیا بس میں گویا سکوت طاری تھا۔ اس کا گھر گھراٹا اور کھڑکڑاتا بھی خاموشی ہو چکا تھا اور باہر شور مچاتے ٹیلے والے اور خواتین نے بھی سروس آوازیں لگانا بند کر دی تھیں۔

کاشییل الٹی چلائنگ لگا کر بس سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ رائفل سے میرا نشانہ لیتے ہوئے چپک۔ ”کلا حکوف باہر نکال دو۔“

امراؤ کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں نے اس پر بہت اہلے کوشش کی تھی اور اس نے کمال مہارت سے اپنے قبضہ میں ہاتھ میرا جو کچھ اس پر کوئی ”دو“ ہاتھ چلانے کا بھی کھانکھا نہیں تھا اس لیے میں نے کلا حکوف بے غازی سے اپنے قبضہ میں دیا۔ وہ اس پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھری ٹاٹ تھری ٹاٹ رائفل اس نے بدستور میری طرف رکھا۔

ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہتھیار کا ہونا بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس شخص کے ہاتھ میں تو نہ صرف ہتھیار تھا بلکہ اس کے جسم پر دردی بھی تھی اور اس کے پیچھے پولیس کے لامحدود اختیارات بھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ مجھے اس کے سامنے ذرا چوکنا ہو کر کھڑا ہونا چاہیے۔ وہ ریوالور سے عین میرے دل کا نشانہ بنے ہوئے تھا۔

”میں نے تم سے ہمارا نام پوچھا ہے۔“ وہ مجھے خاموش پار کر رہا۔

”افضل خان۔“ میں نے اب بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

دوسرا کانٹیل جو بس کے اگلے دروازے میں کھڑا تھا میری پہچان ہوئی کلاکتوف اٹھا کے آگے آیا تھا۔ وہ کافی سناٹا اور مشکیزہ خیزی شخصیت کا مالک تھا۔ توند باہر کو نکلی ہوئی تھی، چلوں نیچے ٹھکس جاری تھی۔ اس کا چہرہ جھوٹا اور سوجھیں پڑی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کے پولیس والے صرف بعض فی دی پروگراموں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے دکھائے جاتے ہیں لیکن اب احساس ہوا کہ بھی کبھی حقیقی زندگی میں بھی اس قسم کی صورتیں نظر آتی ہیں۔

وہ کانٹیل میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ ”سائیں! مجھے خیال میں یہ ہی دھاڑیل آئے۔“ (جناب! میرے خیال میں تو یہ ڈاکو ہے)

اے ایس آئی نے سندھی میں ہی اسے ڈانٹا۔ ”تم چپ رہو۔ میں نے تم سے رائے مانگی ہے کیا؟“

وہ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں کندھے اُپکا کر اور سوجھیں پڑ پڑا کر رہ گیا۔ اے ایس آئی کلاکتوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ کہاں سے آئی تمہارے پاس؟“

”ایک ڈاکو سے جھین ہے۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔ ”کیا کہنے؟“ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا پھر احتمالی عقارت سے میرے سر پر بے نظروں والے بعض لوگوں کو اس کام میں بڑا کمال حاصل ہوتا ہے۔ وہ خود پست قامت اور کمزور ہونے ہوئے بھی اپنے سے کہیں زیادہ جسم اور طاقتور انسانوں کا کچھ اسی طرح جائزہ لیتے ہیں جیسے ہانگی چوہے کو دیکھ رہا ہو۔ ان کے پاس خود کو بڑا محسوس کر کے لیے کوئی اور طاقت ہوتی ہے۔

اس کے لہجے میں اس کی نظروں سے بھی زیادہ عقارت سن آئی۔ ”بہت بڑے شیر جوان تو تم ڈاکوؤں سے کلاکتوف نہیں جیتنے پھرتے ہو۔ ماشاء اللہ! اب ہماری تو کوئی ضرورت ہی نہیں رہ گئی ہے۔ بس جہاں سے بھی ڈاکوؤں کے ختم کی خبر آئے گی، تمہیں بھیج دیا کریں گے سب ڈاکوؤں سے کلاکتوف نہیں جیتیں گے آئے کرتا۔“

میں بس سے اتر آیا اور تب میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے کانٹیل کو بس کے دروازے سے نیچے خنجر بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ بس کے پیچھے عین قریب نہایت پرانی سی ایک چپ کھڑی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک کانٹیل موجود تھا۔

پوسٹ کے قریب ذرا کھلتی ہوئی روگت کا ایک میانہ قامت اور ذرا اسٹارٹ سا پولیس والا کھڑا تھا جو اے ایس آئی معلوم ہوتا تھا۔ وہ پیش کے فریم کا تاریک چشمہ لگائے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں ہماری پولیس ریوالور تھا جس کا رخ بس کے دروازے کی طرف تھا۔

اس نے غالباً سن لیا تھا کہ پولیس والا بس سے کسی کو گانا رہا تھا اور کلاکتوف جھپٹنے کا حکم دے رہا تھا چنانچہ وہ پہلے ہی استقبال کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے چونکہ معلوم نہیں تھا کہ باہر مزید پولیس والے موجود ہیں اس لیے عین ممکن تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش کرنا اور دروازے سے باہر آتے ہی اچانک کوئی کا نشانہ بن جاتا۔

کانٹیل نے قہری ثات قہری سے مجھے چپ کی طرف پھرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے قطعاً کوئی مزاحمت نہیں کی تھی لیکن کانٹیل نے قہری ثات قہری کی زور پٹھے یوں اے ایس آئی کے سامنے پیش کیا جیسے میں زبردست پولیس مقابلے کے بعد اس کے قابو میں آیا تھا۔

نوجوان اے ایس آئی تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ توند میں مجھ سے کافی جھوٹا نظر آ رہا تھا اور میرے خیال میں یہ بات اسے ابھی نہیں لگ رہی تھی۔ غیر محسوس سے انداز میں اس نے بچوں کے کئی بھی کڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے بھی کوئی خاص فائدہ نہ پڑا اور شاید اسے خود بھی اپنی یہ حرکت کچھ مشکیزہ خیزی لگے۔ میں اس کے سامنے سیدھا کھڑا تھا اور ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں کیوں وہ پہلے ہی ہمت غصے میں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کی اور میری کوئی پرانی دشمنی چلی آ رہی ہو۔ اس کے سختے پہلے ہلکے رہے تھے۔

”لوگوں تو تم؟“ اس کے لہجے میں رعونت بھی تھی، عقارت بھی۔ اور کسی بے عنوان شخص کی پرتکار بھی۔ سوال اس نے غصے میں کیا تھا۔

”سائرفرم۔“ میں نے وہی آواز میں جواب دیا۔

”سائرفر کا کوئی نام بھی ہوتا ہے۔“ وہ ریوالور اٹھا کرتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔ وہ ٹریگر دبانے کا سخت شوقین معلوم ہوا تھا اور اس وقت شاید ہی مشکل سے خود کو ٹریگر دبانے سے باز رکھ سکے تھا۔ اسی قسم کے لوگوں کے لیے انگریزی میں ”ٹریگر ڈیپ“ کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ وہ لوگ جو ذرا سی بات پر ٹریگر دبانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔



آپ کو ذہنی طور پر آمادہ محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے بھی تھے، ہر حال ہمارے ملک کے پولیس والے تھے۔

میں چاہتا تھا کہ کم از کم اپنی ذات کی حد تک وردی کے احترام کی روایت قائم رکھنے کی کوشش کروں۔ میں نے دوسرے کلکٹ میں دیکھا تھا کہ پولیس ایک محدود دائرے میں نہ کر کام کرتی تھی۔ اس سے باہر جاتی تھی تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ عوام کو زیادہ حقوق حاصل تھے اور انہیں اپنے حقوق کو استعمال کرنے کا شعور بھی تھا۔ ہر جگہ ان کی شنوائی بھی تھی۔ اس کے باوجود کسی پولیس والے کے بارے میں نقل کرنے کا تصور کوئی شریف آدمی تو کیا، بڑے سے بڑا بد معاش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں سوچتا تھا ہمارے پاس بھی احترام کی کوئی ایسی ہی فضا بن جائے۔ ہم بھی وردی کا احترام کریں، دواڑا بھی ہمارا احترام کرے۔ میرے ان گنت خوابوں میں سے یہ بگ ایک خواب تھا۔

میں نے بھاگنے یا پولیس والوں کو کوئی گزند پہنچانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا لیکن میں سوچا، یہاں کے تھانے کی بھی شکل دیکھ لی جائے۔ تجربات اضافہ ہو گا۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ بعض اوقات لوگ تو قہات کے بالکل برعکس بھی نکل آتے ہیں۔ مجھے کئی ایسے ہی لوگ والوں سے زندگی میں واسطہ پڑا تھا جنہیں میں بہت برا آدمی تھا لیکن وہ بہت اچھے ثابت ہوئے تھے۔

میں کاشیہلوں کے زرنے میں نہایت شرفانہ انداز میں جب میں جا بیٹھا۔ جب میں پچھلی سیٹیں آگے سائے تھیں۔ ان کے آگے میں میرے سائے آ بیٹھا۔ وہ پر خیال انداز میں مسلسل با طرف دیکھے جا رہا تھا اور دھیرے دھیرے اپنی فیوضرت سی سوجا کر بل دیے جا رہا تھا۔

جب مجھے لے کر آبادی کی طرف روانہ ہو گی۔ قسمت میرے ساتھ یہ بھی عجیب ہی مذاق کر رہی تھی۔ کدھ کوٹ میں بھی ایک نواب کے آدمی ہاکو چاڑ نامی ڈاکو سمجھ کر پکڑ کر لے گئے لیکن انہیں میرے ڈاکو ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں غلط فہمی تھی کہ میں نے ان کے ایک نواب زادے کے قتل میں لیا تھا۔ ان کے پاس تو ہاکو چاڑ کی تصویر بھی موجود تھی اور وہ ستم خطرناک قسم کا اتفاق تھا کہ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اور آپ کو ناقابل شناخت بنانے کے لیے جس سبک آپ کا سہارا رکھا تھا وہی میرے لیے اُنکا مصیبت بن گیا تھا۔ اس کی وجہ میری شکل ہاکو چاڑ سے مل گئی تھی۔

اب پولیس والوں نے مجھے ڈاکو سمجھ کر پکڑ لیا تھا۔ جگوں، دہرائوں، شہر اور دیہات میں کسی نہ کسی روپ میں آ رہے تھے۔ اب تو میں بھی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے آزمانی طور پر ڈاکو بن جانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا کیا دشواریاں ہیں اور کیا کیا "سہولتیں" پیش آ رہی ہیں۔

میں کہنا چاہتا تھا۔ "ہاں میرے بھائی! تم لوگوں کو اپنے دسائل اور اختیارات سمجھنے کا شکوہ رہتا ہے۔ اکثر یہی دوتا دوتے رہتے ہو۔ پولیس کے پاس یہ نہیں ہے۔۔۔ وہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ ڈاکوؤں کے مقابلے میں بے بس ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہی ناگانی دسائل اور اختیارات تم عام آدمیوں کو دے دو تو وہ ڈاکوؤں کو ان کے بلوں سے نکال لائیں یا انہیں ٹھکانے لگا دیں۔ بات دسائل کی نہیں، نیت اور عزم کی ہوتی ہے۔ پہلے نیت صحیح اور عزم پختہ ہو، دسائل کا سوال تو بعد میں آتا ہے۔ جب عمل اور کردار دونوں ہی ٹھیک نہ ہوں تو پھر خواہ دسائل کے پہاڑ جمع کر لیے جائیں، وہ بے کار ہوں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ پولیس کی فہمی اور دسائل میں اضافہ ہوتا ہے تو وہاں جرائم کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے ہیں۔"

لیکن یہ موقع اے ایس آئی کو اس قسم کا بچہ پلانے کے لیے سوزوں نہیں تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ وہ یک دم گریا "لو کے پٹھے! سیدھی طرح بتا۔۔۔ اس کا لائنس ہے تمہارے پاس؟" میں نے بدستور سادگی سے کہا "میں نے ڈاکو کی تلاش تو لی تھی لیکن مجھے اس کی جیب میں کسی بھی قسم کا کوئی لائنس نہیں ملا۔" ضرور لے آتا۔"

اے ایس آئی نے دانت پیسے اور تاریک چشمہ اتار لیا۔ شاید وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ وہ اب بولا تو اس کا لہجہ ہر سکون تھا لیکن اس کی آنکھوں میں غصہ و غضب کو نہیں لے رہا تھا۔ "تم بہت بڑے فنکار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم سے ذرا چوکی پر چل کر ہی سوال جواب کریں گے۔ چلو بیٹو جیب میں۔" اس نے ریوالتور سے اشارہ کیا۔

میں نے بھاگ جانے کے امکانات پر ایک لمحے کے لیے غور کیا۔ میرے سامنے ٹھکا میڈان تھا جس میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ عقب میں سڑک تھی۔ دائیں ہاتھ پر بہت دور کچھ کچے کچے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر جیب کے عقب میں کالی ناسٹل پر کھیت پھیلے ہوئے تھے۔

بھاگنا مجھے کچھ زیادہ مشکل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں کاشیہلوں تو مجھے دھیلے ہی معلوم ہوتے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ میں ان کے فائزوں کی زد میں آنے سے بچ جاؤں گا لیکن اے ایس آئی نے مجھ پر تلا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گو کہ صرف ریوالتور تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ میرے لیے کاشیہلوں کی قہری ناٹ قہری سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ وہ لوگ جیب میں میرا تعاقب بھی کر سکتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے کلا فکوف اتنی آسانی سے پیچھے دینے پر افسوس بھی ہوا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اگر کلا فکوف میرے ہاتھ میں بھی ہوتی تب بھی مجھے پولیس والوں کو کورنگ کرنا پڑتا ہے۔ اس کام کے لیے میں نے بھی کئی ایسے

کچھ عرصے کے لیے اس معاملے میں قرآن نے آپ کو آزمایا لیا تھا کہ میں انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں 'جنگل میں' دیہات میں' ہیرودوں کے درمیان اور دشمنوں کے گھیرے میں کسی نہ کسی طرح وقت گزار رہی سکتا تھا۔ اپنی ہاتھ کی لچک لے سکتا تھا۔ وہ بھولی بھری سخن جانی ابھی مجھ میں موجود تھی جو کسی زمانے میں میرا گل سراپہ ہوا کرتی تھی۔

جب مجھے لیے آبادی کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ وہ اچھا خاصا قصبہ معلوم ہوتا تھا۔ مکانات کافی پیچھے رہ گئے جب بھی کہیں غائب کی صورت دکھائی نہ دی۔ جیپ کچے میدان میں وصول کرائی چلی جا رہی تھی۔

آبادی کافی پیچھے رہ گئی تو جیب درختوں کے ایک بڑے سے  
جھڑکی طرف مڑ گئی۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ درختوں کے  
اس جھڑکے درمیان نہایت گہرا سا ایک نیم چست مکان موجود تھا  
جو کبلی نظر میں آسیب زدہ معلوم ہوتا تھا۔ صرف اس کے زنگ  
خوردہ گیٹ پر تھوڑے سے حصے میں لال اور نیلا رنگ موجود تھا جو  
پلیس کی نشانی تھا۔ اسی حصے پر سفید سے سفید نیڑے الفاظ  
میں لکھا تھا ”تھا۔ جمال“

یہ کچھ عجیب گرا سرار ساتھ نہ تھا۔ آبادی سے دور درختوں کے جھنڈ کے درمیان اس آسپب زدہ سے مکان کو ایک نظروں کے کرتو کسی کو گمان بھی نہیں مگر رک سکتا تھا کہ وہ تھانہ ہے۔ ایک لمبے کے لیے البتہ مجھے یہ گمان ضرور گزرا کہ کہیں یہ تھانہ اور پولیس والے جلی تو نہیں ہیں؟ ہمارے ہاں جیلسازوں نے نہ جانے کس کس کام میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ کوئی بچید نہیں تھا کہ وہ اس حد تک بھی آگئے ہوں۔ اور ان دنوں علاقوں میں جہاں قبیوں اور رسالت کے نام بھی اس قدر غیر معروف تھے، اس قسم کی جیلسازیوں کے پکڑے جانے کے لیے بھی ایک مدت درکار تھی۔

ڈراؤ نیک کرنے والے کا نشیلا نے پیپ گیٹ کے قریب  
سے جا کر دو کی اوڑھ لوگ مجھے گھیرے میں لیے اُتر آئے گیٹ  
ابورے بند تھا۔ ایک کا نشیلا نے اسے بری طرح دھڑوڑایا۔ چند  
لمحے ہو ایک عجیب و غریب شخصیت نے گیٹ کھولا۔ وہ سیاہ قام  
کھڑا اور تنہا تھا۔ اس کے جسم پر میلی پگٹ دھوئی اور واسٹ  
تھی۔ اس کی گول گول آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں لیکن  
یہ انگارے کی میس ڈوبے ہوئے تھے اور ان کے گوشوں میں کچھ جما  
ہوا تھا۔ یہ آنکھیں نہ جانے کون کون سی ذہنی اور جسمانی بیماریوں  
کی لاشیں کمری تھیں۔

اس کی انگلیوں میں سگریٹ دینی ہوئی تھی اور وہ دھوئیں کے  
 رازے چھوڑ رہا تھا جس کی بو چاروں کی تھی کہ اس کی سگریٹ جس  
 سے بھرنی ہوئی تھی۔ وہ پیست، تامت اور گینڈے کی طرح بگھکا ہوا  
 دکھائی دے رہا تھا۔ اسے ایسے تھکی کو دیکھ کر بھی وہ بے تکلفی سے  
 جس بھری سگریٹ کا منہ لے رہا تھا۔

حالانکہ اس نے گیت کھولے میں تاخیر نہیں کی تھی لیکن جب ڈرامو کر کے آنے والے کا ٹیبل نے اس کے سر پر ایک دھول رسید کرے ہوئے کہا ”بے کہیں مر گیا تھا کیا۔۔۔“ جیلے کا احتیام اس نے ایک موٹی سی گالی پر کیا۔

میں آتا تھا ذرا لڑکھڑاکا۔ اس نے اپنی چند سلاخی، ناگوار سے  
کاغذ کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب دینے کی زحمت نہیں کی  
اور گیت بند کر کے دھوا کے قریب پڑی بیچ رہا تھا۔

سانے ہی سلاخوں والا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک کشادہ کمرے کا دروازہ تھا۔ ہم اس کمرے میں پہنچے تو مین وسط میں ایک کاشٹیل یا شاہی بیڈ کا ٹیبل دونوں پاؤں میز پر رکھے، کرسی پر نیم دراز، منہ کھولے خزانے کی طرح نظر آیا۔ اس کے پیروں کے قریب ایک رجسٹر کھلا پڑا تھا۔ ایک خالدار کوٹے میں کھڑا وہ ہے کی الماری سے کچھ نکال رہا تھا۔

اے ایس آئی کو دیکھ کر اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں سیلوٹ کیا اور میز کے قریب آکر یک دم ہیڈ کاٹشیل کے پاؤں میز سے نیچے ڈھیل دیے۔ ہیڈ کاٹشیل ہڑبڑا کر ٹوٹ بیٹھا اور کرسی سے گرتے گرتے پھا۔ آنکھیں مل کر اس نے چڑاری سے اے ایس آئی کو سیلوٹ کیا۔ اے ایس آئی نے کسی کے سیلوٹ کا جواب دینے کی ذمّت نہیں لی۔

حوالدار سے میرے بیٹھ کر رجسٹر اپنے سامنے سیدھا کر لیا۔ وہ الماری سے کوئی بوٹلی نکال کر لایا تھا جو اس نے جلدی سے میز کی ورازمیں رکھ دی۔ اے ایس آئی نے اپنی داستان میں مجھے زور سے میز کی طرف دھکا دینے کی کوشش کی لیکن میں اس کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کا دھجکا مجھ اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکا۔

اس کی برہمی شاید کچھ اور بڑھ گئی لیکن وہ اسے ضبط کرتے ہوئے جو والد ارے مخاطب ہوا۔ ”اس لعنتی کی تلاشی لو۔“

خوالدار مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کا شیشیل اپنی "بادشاہی" میں آجانے کے باوجود جھپ پر راتھلیں مٹانے کھڑے تھے۔ میری ایک جیب میں روپو اور تھوڑا دوسری جیب میں ڈاکوئیں کی پیسوں سے نکالی ہوئی رقم تھی۔ میری جیب سے یہ دونوں چیزیں پولیس نے نکال لیں۔ میں پھر خالی کا خالی رہ گیا۔

خود اذرتے فاقحانہ انداز میں رقم اور ریواں اور اے ایس آئی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اندازاً کچھ ایسا ہی فاقحانہ اور داؤ طلب تھا جیسے کوئی مسطورہ میٹھی کی محنت سے کوئی شاہکار تخلیق کر کے کسی فن شناس کی خدمت میں پیش کر رہا ہو اور اپنے فن کا صلہ پانے کا منتظر ہو۔

اے ایس آئی ریپورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طعنے لگے  
 میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ بھی تم نے ڈاکو کوں سے جیسا ہوگا؟“  
 ”ڈاکو کوں کو نے ہوش کرنے کے بعد ان کی جیب سے نکالا

تھا۔ میں نے معمولی سی تھکی کی پھر ان کے پوچھنے سے پہلے ہی مزید بتایا "اور یہ رقم بھی میں نے ڈاکوؤں کی جیب سے نکالی تھی۔"

"اب ہم بھی تمہارے اندر سے بہت کچھ نکالیں گے بچو!" اسے ایسی آنی موندھ کوئل دے کر مہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے لمبے میں بڑے خطرناک عزائم بول رہے تھے۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ میری بات کو جھوٹ سمجھ کر مجھے سزا دینے کے ارادے کا اظہار کر رہا تھا یا اسے ڈاکوؤں کی شان میں میری گستاخی پر غصہ آ رہا تھا۔

پھر وہ کاشیوں سے مخاطب ہوا۔ "اسے لاک اپ میں ڈالو۔ رات کو اس سے "تفتیش" کریں گے۔ تم سب تیار رہنا۔ ذرا ٹھکرا جانور ہے۔" اس نے ایک پار پھر میرا سر تپا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی نفرت موجود تھی جو رنگ حسد اور نہ جانے کس کس طرح کی تشنہ۔۔۔ تشناؤں کی پیدوار ہوتی ہے۔

وہ الفاظ کو چباتے ہوئے بولا "ایک آدھ آدمی اس سے تفتیش کے لیے کافی نہیں رہے گا۔ تم سب جوان تیار رہنا۔ آج رات جمن رہے گا۔ سب وہی بھر کے تفتیش کرنا۔ بھلو جعدار سے کتنا کہ ذرا اچھی طرح تیار رہے۔ ابھی دن میں تو ذرا میں مصروف ہوں اور اس سے تفتیش اپنی ٹھگرائی میں کر اؤں گا۔ فی الحال تو میں وڈیرا صاحب کے کام سے کیا تھا۔ یہ تو پونہ راستے میں بس میں سے ہاتھ لگ گیا۔"

میں اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ بھلو جعدار غالباً وہی اتنی شخصیت تھی جس نے کٹھ کھولا تھا۔ میں شاید اسے ایسی آنی کی باتوں میں کچھ زیادہ اُلجھ گیا تھا۔ میں اس وقت چونکا جب ایک کاشٹیل نے آگے بڑھ کر پھرتی سے مجھے ہتھ کڑی لگا دی۔ میرے خیال میں یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا لیکن میں نے تنہا یہ نظریہ رہے ہوئے اب بھی ہاتھ پاؤں ہلانے کا ارادہ ملتوی رکھا۔ یہ تو میں نے دیکھ ہی لیا تھا کہ میرے بارے میں کسی بھی قسم کا اندراج کیے بغیر کوئی پرچا کالے بغیر نہ صرف مجھے لاک اپ میں ڈالا جا رہا تھا بلکہ رات کو مجھ سے "تفتیش" کرنے کے لیے جتنا بھی علم میرا تھا، ان سب کو تیار رہنے کا حکم دیا جا رہا تھا اور اس کارروائی کو جمن کا نام دیا جا رہا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا اس معاملے میں ابھی اور کیا کیا "کارنامے" انجام دیے جاتے تھے۔

مجھے ہتھکڑی لگا کر چابیوں کا گچھا کاشٹیل نے پلٹ میں لٹکایا۔ میری جیبوں سے برآمد ہونے والا دوا دوا اور رقم حوالہ دار نے اطمینان سے اپنی دراز میں ڈال دی۔ دو کاشٹیل مجھے اپنی رانگوں سے لٹو کے دیتے اندر لے چلے۔

مکان خاصا وسیع تھا لیکن بالکل خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ عملہ بھی بہت کم تھا اور فرنیچر بھی۔ دو کاشٹیل رانگھیں لیے میرے پیچھے آ رہے تھے اور دو میرے دائیں بائیں تھے۔ لگتا تھا کہ وہاں کا کل عملہ مجھ سے ہی نکلنے لگا ہوا تھا۔

وہ مجھے ہال کے پیچھے ہی راقع ایک کمرے تک لائے کر ابھی کیا تھا بس ایک کچی کوٹری ہی تھی جس میں سلاخ دوا دوا ڈالنا ہوا تھا۔ اس دوا دوا کے آٹا کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔

میں نے کوٹری کا جائزہ لیا۔ اس کا فرش اور دیواریں کچی تھیں۔ دیواروں سے مٹی جھڑی تھی۔ اندر عجیب سی سٹیل اور تختن پچھلا ہوا تھا۔ دو مغلوں کی حالت سے نوجوان دیواروں سے لگے لگائے حشرت ویسا اور بے چارگی کی تصویر بنے بیٹھے تھے ایک اوجیز مرخص فرش پر بے حال سالیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹیل نظر آ رہے تھے۔ دونوں آنکھوں کے گرد بھی دھم اور ٹیلا بہت تھی۔

وہ تینوں عام اور سیدھے سادے سے نہاتی معلوم ہوتے تھے لیکن ایک جو تھا شخص جو کوئے میں اکڑوں بیٹھا بیڑی پل رہا تھا ذرا بد محاش معلوم ہوتا تھا۔ وہ سالوا اور جسم تھا۔ اس نے کئی اور دلچسپی آمیز نظروں سے میرا جائزہ لیا لیکن نہ تو کچھ بولا اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلا "اسی طرح اتنا شک سے بیٹھا بیڑی پل رہا۔"

لیکن میں اس کو ٹھکری میں جس شخص کو دیکھ کر درحقیقت چونکا تھا وہ اونڈھا چڑا تھا اور ساکت تھا۔ وہ لمبا اور غلاط میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ایک مختصر سی دھوئی کے سوا کچھ نہیں تھا اور اس کے جسم کے جو جیسے نظر آ رہے تھے ان کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اس کی حالت مجھ جیسے مضبوط اعصاب کے انسان کے کبھی روکنے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھی۔ دونوں جوان بھی خوفناک سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

مجھے ایک نظر میں ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ مرد تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ اس تفتیش کا شاہکار تھا۔ ہمارے بہت سے تھانوں میں اکثر جاری رہتی ہے۔ شاید دوسرے زندہ حوالہ جوں کو جبرٹ، لانے کے لیے اسے اس حالت میں آئی کوٹری میں ڈال دیا گیا تھا۔

میں ایک سو سو سی امید کے سارے اس کے قریب بیٹھ گیا کہ شاید اس میں زندگی کی کوئی رشتہ موجود ہو۔ پتھروں کی وجہ سے مجھے ایک وقت دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھانے پڑے لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے چھو، دو درار کے سارے پیچھے ہوئے دونوں نوجوانوں میں سے ایک بے گامی سے بولا "۳۰ سے مت چھو۔"

مجھے اس کے لیے کی بے گامی پر حیرت ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھے لیے میں پوچھا "کیوں؟"

نوجوان چہرے ہرے سے سیدھا سا دوا دوا اور ان بڑھ نظر آتا لیکن اس نے عجیب بات کی۔ کہ یہ زندہ لیے میں بولا "۳۰ سے مت چھو۔" اس نے بڑا اشت کر چیں کہ شاید اب اس کے بے جان جسم کو کبھی چھوئے سے اذیت محسوس ہو۔

میں نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ نوجوان سسکی لے کر ہلا

”اپنے بھی جب یہ مرچکا ہے تو اسے ہلانے ہلانے سے کیا فائدہ؟“  
”تسارا سا سچی تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ ہمیں تو معلوم بھی نہیں یہ کون ہے۔۔۔ لیکن کسی راتوں سے ہم برابر والے کمرے سے اس کی چٹخیں سن رہے تھے۔“ اس نے افسروں سے جواب دیا۔

وہ دونوں نوجوان مضمحل اور خوفزدہ ضرور تھے لیکن ابھی ”نقش“ کی زد میں آئے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے جیسے ہیچ میں پوچھا ”تم دونوں کیسے بچے ہوئے ہو؟“

اس نے زمین پر مردہ پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ابھی وہ اس کے ساتھ مصروف تھے۔ انہیں اُمید نہیں تھی کہ یہ میرے لگے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اتنی خوفناک اہمیت سننے کے بعد بھی اسے زخمہ رونا چاہیے تھا۔ اب وہ اس کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اسے کسی پولیس مقابلے میں ہلاک دکھائیں گے۔ پانچ نہیں کون کون سی وارداتیں جن کا کوئی سراغ نہیں ملا ہو گا وہ اس کے کھاتے میں ڈالیں گے“ پھر ذرا قانع ہوں گے تو ہمارے باری آئے گی۔“

”تمہیں کس الزام میں پکڑا گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”ابھی انہوں نے فیصلہ نہیں کیا کہ ہم پر کون کون سا الزام والا جائے۔ دیے ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نے ڈیڑا سا میں کا کٹنا ماننے سے انکار کیا تھا اور اس سے جھگڑا کیا تھا۔ بہت لمبا قصہ ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ زبردستی ہمیں ایک ناجائز کام میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے انکار کر دیا اور جب ہمارے ساتھ سختی کی گئی تو ہم نے جھگڑا کیا جس کے نتیجے میں ہم دونوں یہاں ہیں اور آئندہ نہ بانے کمال ہوں گے۔“

پھر اس نے دوسرے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ”ہم دونوں بھائی ہیں۔ ہمارا دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں۔“

میں نے ایک بار پھر مردہ شخص کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک رخسار زمین پر نکلا ہوا تھا اور دوسرا رخسار جو مجھے نظر آ رہا تھا وہ چرا ہوا تھا۔ شاید دوسرا رخسار بھی چرا ہوا ہی ہو۔ اس کے علاوہ بھی صرف چہرے ہی چہرے پر نہ جانے کس کس قسم گری کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ باقی جسم کا حال دیکھنے کو تو میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔

انسان کا انسان پر اس طرح تشدد کرنا آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ انسان کو جسے کی طرح ہے بس کر کے ”اپنے“ کھینچنے میں جکڑ کے یہ دیکھنا کہ کون کون سے طریقوں سے اسے زیادہ سے زیادہ زخمہ رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اہمیت پہنچائی جاسکتی ہے۔ جبکہ اس انسان کا قصور بھی کوئی خاص نہ ہو۔ اس کے پیچھے یقیناً بہت سی جنگ جسم کی نفسیاتی گہریں کام کرتی ہیں۔

ان نفسیاتی پیچیدگیوں کے بارے میں خود کرتا ہر منہ نفسیات

کا کام ہے۔ میں تو صرف یہ سوچتا ہوں کہ اس قسم کے لوگوں کو معاشرے میں چھوڑ دینا۔۔۔ اور وہ بھی بہت سی طاقت یا اختیارات دے کر چھوڑ دینا۔ اکثر تعداد میں پاگل کتوں کو کھلا چھوڑ دینے سے زیادہ خطرناک تھا لیکن میرے یہ سب کچھ سوچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جن کے سوچنے سے فرق پڑ سکتا تھا ”ان کے پاس سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔“

میرے ذہن میں جب اس قسم کے خیالات کا جھوم ہوتا تھا تو میرے اندر ہی اندر وجود کے کسی گوشے سے ایک شعلہ سا لپکتا تھا جو چند لمحوں میں ہی ہر سامان جاں کو لپیٹنے میں لے لیتا تھا۔ ظلم اور زیادتیوں کرنے والے کے ساتھ کچھ بھی ہوتے دیکھ کر مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ جو دوسروں کے ساتھ جیسا کرتا تھا اس کے ساتھ ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ میرا نظریہ حیات تھا۔ لیکن بے قصور ”محمولی“ قصور وار اور گزروں بے بس کو اس قسم کے انجام سے دوچار دیکھ کر میرا ذہن دیوانگی کی سرحدوں کو چھوئے لگتا تھا۔

میرا تخیل کسی اور ہی دنیا کی طرف سفر کرنے لگتا تھا۔ میں اپنی سوچوں کی شدت کو ذرا کم کرنے کے لیے اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جو کونے میں بیٹھا بڑے اطمینان سے اب نی بیڑی سلگا رہا تھا۔

”تم کس سلسلے میں اندر ہوئے ہو بھائی؟“ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

وہ پُر خیال نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے غامض رہا گویا فیصلہ کر رہا ہو کہ جواب دینے کی رحمت کی جائے یا نہیں۔ پھر اس نے مجھے جواب دے تو اڑنے کا فیصلہ کیا اور بولا ”میرا تو تین سو دو کا کیس ہے۔ میں نے ایک آدمی کو چھری اڑی تھی۔“ پھر اس نے گویا مجھے تسلی دی ”لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اپنا تو ادھر آنا جانا لگ ہی رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں بڑی بے نیازی تھی۔

اتنا اندازہ تو مجھے اس کی صورت دیکھ کر ہی ہو گیا تھا کہ جیل، قہانہ پکری اور حوالات اس کے لیے نئی چیزیں نہیں تھیں۔ شاید اسی لیے وہاں سب سے زیادہ آرام میں وہی نظر آ رہا تھا۔ میں اب مردہ شخص کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے بغیر ہی مجھے اپنے دل میں اٹھتے ہوئے آبال سے خوف آ رہا تھا۔ میں اس آبال کو تابو میں رکھتے ہوئے ہی اس سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ آبال بے تابو ہو اور میں کچھ زیادہ ہی تباہی پہنچا دوں۔ اس صورت میں مجھے فائدے کے بجائے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

دوری کا احترام میرے خیال میں کافی ہو چکا تھا۔ ایک کو غری پر مشتمل اس حوالات کا منظر دیکھنے اور زمانے کے حالات سے آگاہ ہونے کے بعد میرے نظریات کچھ حیرت لے ہو گئے تھے۔ دیے بھی اے ایس آئی نے مجھے بخیرا شکار قرار دے دیا تھا اور مجھ سے ”نقش“ کے لیے پورے ملے کو تیار رہنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے

مجھے اپنے مستقبل کا اندازہ لگایا تھا۔  
اب مجھے اپنے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑیوں کو دیکھ کر افسوس ہوا  
تھا۔ مجھے کانٹیل کو اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگانے کا موقع نہیں  
دیا جاسیے تھا اور اسی وقت کچھ کر کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے  
لبے دھواڑی بیدا کر لی تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہر  
سکے کا کچھ نہ کچھ حل تو ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہوا سا انتظار  
کرنے سے بھی مسئلے کا حل نکل آتا ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے کچھ زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ میرے  
مسئلے کا حل خود ہی چلا ہوا حوالات کے قریب آیا۔ یہ وہی  
کانٹیل تھا جس کی پلٹ میں چابیوں کا گچھا بندھا ہوا تھا۔  
اس دوران آوازوں سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اے ایس  
آئی اور وہ کانٹیل دوبارہ باہر جا چکے تھے جو مجھے لے کر آئے تھے۔  
اس پراسرار سے تھانے میں دوبارہ پراسرار سا سکوت چھا چکا تھا۔  
اب شاید وہاں صرف دو تین افراد ہی رہ گئے تھے۔

کانٹیل اس نام نہاد سی حوالات کے دروازے پر آن رکھا۔  
کوٹے میں بیٹھا ہوا بد معاش اسے دیکھ کر فوراً اٹھا اور دروازے کی  
طرف لپکا۔ اس نے سلاخوں کے درمیان منہ پھنسا لیا۔ کانٹیل  
رازدارانہ انداز میں اس سے کچھ کھسپھر کرنے لگا۔

میں بھی اڑھٹکی سے اٹھا اور سلاخوں والے دروازے کے  
قریب جا پہنچا۔ کانٹیل نے اپنی رازدارانہ ہتھکڑیوں کو کرختگیوں  
نظروں سے میری طرف دیکھا اور کھردرے لبے میں بولا۔ ”وئے!  
تم کیا نچ میٹھ کر رہے ہو۔ چلو جیسے ہو۔۔۔ بات کرنے دو۔۔۔“  
ساتھ ہی اس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دی۔

میں نے دل ہی دل میں گالی اس کے کھاتے میں لکھ لی اور  
بظاہر سعادت مندی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ان کی کھسپھر پھسپھر  
تھی۔ چند لمبے بعد کانٹیل انہماک میں برہانے ہوئے واپس جانے  
لگا تو میں جلدی سے دوبارہ آگے بڑھ آیا۔

”سنتری بادشاہ! ہماری بھی ایک عرض سنئے جائیں۔“ میں نے  
لجارت آمیز لہجے میں کہا۔ سانولا بادشاہ معاش اس وقت تک دوبارہ  
کوٹے میں جا بیٹھا تھا اور ایک بار پھر کالے انجن کی طرح بیڑی کا  
دھواں پھوڑنے لگا تھا۔ جب سے میں اسے دیکھ رہا تھا وہ بہت ہی  
استہاک سے بیڑی بنا رہا تھا۔ بظاہر وہ پڑسکون تھا لیکن اس کے اندر  
پتھیکا کوئی کچھڑی پک رہی تھی۔ وہ کبھی پتھر میں تھا اور اس کانٹیل  
سے یقیناً اس کا کوئی گتہ جوڑ تھا جس کے پاس حوالات اور ہتھکڑیوں  
دیوڑی کا چابیاں تھیں۔

میری درخواست سن کر کانٹیل نے شک زدہ سی نظروں سے  
میری طرف دیکھا اور دوری سے کہا ”بولو۔ کیا بات ہے؟“  
میں نے ایک بار پھر اپنے لبے میں ان گتہ استجائیں سموتے  
ہوئے کہا ”دوراً قریب اگر تمہیں راز کی بات ہے۔۔۔ اور آپ کے  
فائدے کی بھی ہے۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں شریف بھائی ہی نہیں بد معاش  
بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بیڑی بیٹا بھول گیا تھا۔ دونوں  
بھائی چپ چاپ آکھڑوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ چڑھاخص

دیں۔ ہم بھاگ بھی گئے تو پولیس ہمیں ڈھونڈ نکالے گی۔“  
بحث کا وقت نہیں تھا۔ میں نے انہیں ان کے محل پر مجبوراً  
اور ملی کی طرح دبے قدموں کو ٹھہری سے نکلا۔ بد معاش ابھی تک  
باہر ہی کھڑا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا ”تم ابھی تک یہیں کھڑے  
ہو؟“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا ”سائیں! باہر جانے کا راستہ ایک ہی ہے  
اور اُدھر خوالدار موجود ہے۔ شاید ایک آدھ کانٹیل بھی ہو۔ وہ  
مجھے گولی مار دے گا۔ آپ نہ جہاں آنا کیا ہے وہاں آگے کا راستہ  
بھی آپ ہی ملے گا۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے ہوں۔“ اس  
وقت وہ بد معاش نہیں، خاصا مسکین آدمی دکھ رہا تھا لیکن اس میں  
کم از کم پیچھے چلنے کی ہمت تو تھی۔ یہی غیبت تھا۔ بے چارے  
شریف آدمی میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی۔

بھگلی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں دبے قدموں ہال کی طرف  
بڑھا۔ دروازائی دروازہ کھلا ہی تھا۔ میں نے نہایت محتاط انداز میں  
اس دروازے سے جھانکا لیکن اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔  
خوالدار لوہے کی الماری کے قریب کھڑا پہلے ہی اس دروازے کی  
طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے شہ ہو گیا تھا کہ حوالت کی طرف کچھ  
گزر رہا ہے۔ وہ کان لگائے کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی  
کئی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مجھے دروازے سے جھانکنے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں  
اور حلق سے ہلکی سی ایک چیخ نکلی۔ کرسی پر اس کا ہوش لٹکا ہوا  
تھا جس میں ردِ الور موجود تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔  
خوالدار نے ابھی کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے بھگلی  
چمکا کر اس کی کھوپڑی پر رسید کی۔ وہ ایڑیوں کے بل مستحق گڑے  
کے سے انداز میں گھبرا اور آواز دے نہ فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔  
میں ایک لمبے سانس کے لیے اس پر جھک گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ  
کسیں دار ناگانی ثابت نہ ہو اور وہ آئندہ نہ جائے لیکن اس کی حالت  
دیکھ کر مجھے اندیشہ محسوس ہو کر شاید وہ مرنے چکا تھا۔ اچانک میں  
نے بد معاش کی چیخ سنی۔ ”سائیں! وہاں!“

میں اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے تیزی سے چلا۔ اپنی جگہ سے ہٹا  
میرے کام آ گیا کیونکہ میں اس جگہ جہاں میں ایک لمبے کھڑا تھا  
ایک موٹی سی لاشی جس کے سر پر لوہا چڑھا ہوا تھا، ٹھک سے  
زمین پر پڑی۔ وہ بھلو جعدار تھا جس نے نہایت خاموشی سے اگلے  
دروازے سے آکر حملہ کرنے میں بڑی ہوشیاری اور جرأت دکھائی  
تھی۔

مجی سی وہ ٹھوس لاشی شاید میری کھوپڑی پر پڑی ہوئی لیکن  
بد معاش کا بد وقت مجھے ہوشیار کر دیا کہ آگے نہ بڑھا۔ شاید اس لیے  
کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی کوٹنا تک بھی کام آ جاتا ہے۔  
میں نے بھلو جعدار کو لاشی دوبارہ ادا میں بلند کرنے کا موقع  
نہیں دیا۔ لاشی کا سرا ابھی زمین پر ہی تھا جب میں نے زور سے

ایک لمبے کے قابل ہی نہیں تھا اس لیے وہ بد ستور لاش کے قریب  
چلتا رہا تھا۔ مرنے والا تو مرکزِ اذیتوں سے نجات پا گیا تھا لیکن  
”دور“ سرافقہ ابھی اذیتوں کے انگڑوں پر سبک رہا تھا۔  
دووں بھائیوں میں سے ایک سرسراہی سی آواز میں بولا ”یہ تم  
نے کیا کیا؟“

میرے سوا کو ٹھہری میں کسی کے ہاتھوں میں بھگلی نہیں تھی۔  
میں نے قدرے برہمی سے کہا ”سوالات بعد میں کرنا جلدی سے  
سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ گزار کر اس کی بیلٹ سے چابیاں  
نکالو۔“ میں نے باہر پڑے کانٹیل کی طرف اشارہ کیا۔ ایک تو اس  
قدی نوجوان کے ہاتھوں میں بھگلیاں نہیں تھیں، دوسرے وہ دوپٹا  
چلا تھا۔ اس کا ہاتھ سلاخوں سے باہر دو رنگ جاسکتا تھا۔

”نہیں سائیں! میں یہ کام نہیں کروں گا۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ  
کر بولا ”ہم پر تو پولیس پہلے ہی پتا نہیں کون کون سا ملہ ڈالنے والی ہے“  
یہ پکڑ میں ہمارے کھانے میں پڑ گیا تو پولیس سات فلوں تک ہمارا  
بچھا نہیں چھوڑے گی۔“

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن پھر ترس بھی آ گیا۔ دونوں بھائی قہر  
قر کاٹ رہے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی شریف معلوم ہوتے تھے۔  
معلوم نہیں وزیر اسائیں سے کیسے لڑے تھے۔ میں نے بد معاش کی  
طرف دیکھا۔ اس نے بھی ایک لمبے کے لیے جھکنا ہٹ کا مظاہرہ  
کیا۔ جب ستم خیزی تھی۔ ایک ہاتھ کے ناملے پر آزادی کا پرچم  
پڑا تھا لیکن کوئی اسے اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بڑے کمرے سے خوالدار کے کھنڈر کرنے اور بھلو جعدار  
سے ہاتھیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی کچھ نہیں  
فائدہ دے رہی تھی۔ اس طرف آنکلا۔ اس کے بعد مجھے اپنے  
انجام کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیے تھا۔  
خوش قسمتی بھی ہر وقت انسان کا ساتھ نہیں دیتی۔

لیکن بد معاش صرف ایک لمبے کے لیے تذبذب کا شکار رہا۔  
اس نے فیصلے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ سر جھک کر بڑی پیچیدگی  
کر دہ تیزی سے آگے آیا اور ٹھنڈوں کے بل پہنچ کر اس نے ہاتھ  
سلاخوں سے باہر نکال کر کانٹیل کی بیلٹ میں پھنسا دیا اور اسے  
سلاخوں کے قریب ٹھیک لیا۔ اس کے بعد اس نے نہایت  
الطیمان سے چابیوں کا کچھا نکال کر پہلے میری بھگلیوں کو لیں پھر  
حوالت کا کالا کھول دیا۔

وہ خود کو ٹھہری سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ فرش پر پڑا  
ہوا ٹھنڈی تو پہلے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے شریف بھائیوں کی  
توڑی سے کہا ”آؤ میرے ساتھ۔“ میں تمہیں تھانے سے باہر  
سلے چلا ہوں۔ اس کے بعد جدمر تھارامی چاہے بھاگ جانا۔“  
ان میں سے جو بھائی مجھ سے ہاتھیں کر رہا تھا، ہاتھ جوڑتے  
ہوئے بے چارگی سے بولا ”ہماری بھانجے کی ہمت نہیں پڑ رہی  
سائیں! سب الزامات ہم پر آجائیں گے۔ ہمیں آپ یہیں رہنے

رسید کیا۔ اس کے لیے وہ ایک گھونسا ہی کافی ثابت ہوا۔ وہ ابھی  
کر کافی دور جا کر گرا اور وہاں سے اٹھ نہیں سکا۔ وہیں ساگر  
ہو گیا۔

بد معاش صورت سا شخص ہاتھ جوڑ کر بولا "سائیں! آپ  
بڑے بادشاہ آدمی ہیں۔ اللہ نے آپ کو شیر جی طاقت اور دیا  
ی حوصلہ دیا ہے۔ دل چاہتا ہے میں آپ کے ساتھ چلوں۔ آپ  
کی غلامی کروں۔ آپ کی جاگرتی کر کے شاید میں بھی کسی قابل  
ہو جاتا لیکن میری کچھ مجبوریات ہیں۔ مجھے کچھ ضروری کام کرنا  
ہیں۔ وہ کام کیے بغیر میں اس علاقے سے بھاگ کر کہیں نہیں  
جاسکتا۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا بھی نہیں سکتا میرے چاہنا۔"  
میں نے نہایت شیریں لہجے میں کہا "میری قوائی بڑی مجبوریات  
ہیں۔"

وہ مجھے کوئی بہت بڑا بد معاش سمجھ رہا تھا اور میری شاندداری  
میں کچھ جتنا چاہتا تھا۔ شاید اسے ابھی اس حقیقت کا ادراک نہیں  
ہوا تھا کہ بد معاش تو در حقیقت بہت کمزور اور بڑول ہوتا ہے۔  
صرف لوگوں پر اس کی جو دھاک چٹتی ہوتی ہے، اس نے اپنی  
دہشت پھیلا رکھی ہوتی ہے وہی اس کی اصل طاقت ہوتی ہے۔  
جس روز اس کی ہوا اٹھ جائے اس روز وہ زہر نکلے سانپ کی طرح  
ہو جاتا ہے۔

کاشمیل کی سائیکل ایک طرف گری پڑی تھی۔ بد معاش اس  
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اجازت ہو تو میں یہ سائیکل  
چاہوں؟"

"ضرور۔ بلکہ تم چاہو تو سائیکل کے مالک کو بھی اٹھا کر لے  
جاؤ۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تو جہاں بڑا ہے وہیں ٹھیک ہے سائیں!" وہ مسکراتے  
ہوئے بولا اور سائیکل کی طرف بڑھا لیکن پھر جیسے اسے کچھ خیال  
آیا "پلٹ کر اس نے میرے دونوں ہاتھ تمام کر جوئے" آنکھوں سے  
لگائے پھر ہاتھ جوڑ کر عقیدت بھرے لہجے میں بولا "سائیں! میرا  
دعا ہے کہ زندگی میں پھر بھی آپ سے ضرور ملاقات ہو لیکن"  
تھانے پچھری، حوالات باخیل میں نہ ہو۔"

پھر اس نے سائیکل اٹھائی اور اس پر بیٹھ کر تیزی سے پڑا  
کھڑکھڑاتا ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے  
خیال آیا کہ سائیکل خود میرے بھی کام آسکتی تھی لیکن پھر ہی سہا  
کہ مجھے سائیکل چلانے اور دوڑنے میں تقریباً ایک ہی جتنی مشقت  
محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور دو سرکی سے  
میں دوڑ لگا دی۔

میں سڑک ہی کی طرف جا رہا تھا لیکن اس مقام پر پہنچنا نہیں  
چاہتا تھا جہاں سے مجھے پکارا گیا تھا۔ وہ خاصی بارود جگہ تھی اور  
وہاں بسوں کا اسٹاپ بھی تھا۔ میں اس سے ایک آدھ میل آگے

اس پر پاؤں مارا۔ لاٹھی، بیلو، جھدار کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ اتنا  
ڈھیلا آدمی نہیں تھا جتنا بظاہر نظر آتا تھا۔ اتنا ہی پچھلی سے پلٹ کر  
اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ گھبرا اور پھٹکی نے  
اسے بھی اپنی زو میں لے لیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چندرا کو  
چھپاتے ہوئے دوواڑے کے قریب ہی لڑھک گیا۔ دوسرے ہی  
لمحے اس کی چندرا خن سے تر ہونے لگی۔ وہ سکر سٹ کر بالکل  
محسوس ہی بین کر رہ گیا اور خفیف سا ایک جھٹکے لے کر اسی حالت  
میں ساکت ہو گیا۔

بد معاش میرے عقب میں نہایت اطمینان سے بظلوں میں  
ہاتھ دبے کھڑا تھا۔ اس نے اس دوران انگلی بھی نہیں ہلائی تھی۔  
وہ آگے آگے مجھے گریا اپنے باڈی گارڈ کے طور پر لیے چل رہا تھا۔  
تاہم مجھے اس کی یہ "آرام طلبی" بڑی نہیں لگی۔ اس کا بھی ایک  
کام کافی تھا کہ اس نے بیلو جھدار کے نلے سے مجھے بروقت خبردار  
کر دیا تھا۔ باقی رہا ہاتھ پاؤں ہلانے کا مسئلہ۔ تو میں اپنے لیے  
راست صاف کرتا ہوا چلی رہا تھا۔ اگر وہ بھی میری آڑ لے چلا  
آ رہا تھا تو اس میں میرا کچھ نہیں جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں ڈاکو سے چھینی ہوئی  
کلا خفوف بھی ساتھ لے لوں لیکن وہ کرے میں کہیں نظر نہیں  
آ رہی تھی۔ حوالدار نے نہ جانے کہاں رکھ دی تھی۔ میں نے اس  
کی تلاش میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے محسوس کیا  
تھا کہ میں جس طرح کی بھگدڑ میں پڑا ہوا تھا اس میں کلا خفوف کو  
اٹھائے پھرنا اپنی جگہ ایک "مہیت" تھا۔ میرا ریوالتور بھی حوالدار کی  
دواڑ میں تھا اور دروازہ کھولا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چکر میں  
پڑنے کی کوشش نہیں کی اور کرسی کے پیچھے پر لٹکے ہوئے بولسٹر سے  
ہی ریوالتور نکال کر جیب میں ڈال لیا۔

اس ساری کارروائی میں بمشکل چند سیکنڈ صرف ہوئے تھے۔  
میں نے فوراً ہی بیرونی دواڑے کی طرف چلا ٹیک لگائی۔ اچانک  
میں ہمیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں نے تیزی سے گیٹ کھولا۔ اسی لمحے  
ایک سائیکل کھڑکھڑائی ہوئی گیٹ پر آکر رکی اور ایک کاشمیل اس  
پر سے اتر آیا دکھائی دیا۔ وہ کہیں باہر سے آ رہا تھا۔

میں تو اس کے لیے ابھی تھا کیونکہ میری "مگر فوری" اس کی  
عدم موجودگی میں عمل میں آئی تھی لیکن بد معاش کو وہ یقیناً ابھی  
طرح پہنچاتا تھا اور اسے باہر جاتے دیکھنے کی بھی یقیناً اسے توقع  
نہیں تھی کیونکہ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور وہ سائیکل سے  
اُترتے اُترتے لڑکھڑکیا تھا۔

میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ اسے بھی "بہ کاٹی ہوش و  
حواس" چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔ اس نے کچھ کہنے  
کے لیے بند کھولا۔ شاید وہ بہ آواز بلند تھانے میں سے کسی کو پکارنا  
چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد  
ہوتی، میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی کونپلی پر نپا حلا سا کھوسا

ایک جگہ کچھ قافلے پر بھی کچھوں میں کچھ لوگ کام کرتے بھی دکھائی دیے لیکن انہوں نے میری طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ تقریباً ایک فرلانگ آگے جا کر میں ایک برساتی ٹانے کی جی پٹیا پر چڑھ کر دوسری طرف اترنے لگا تو ٹھیک میں مجھے ایک ٹانگا کھڑا دکھائی دیا۔ ٹانگے میں کوئی نہیں تھا۔

میں نے اوپر اور مگر نظر دوڑائی تو کچھ دور جھانپوں کے جھنڈ میں ایک شخص کا سر دکھائی دیا۔ کوچان تالاب جھاڑوں کو ہاتھ دہم کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ مجھ پر ٹھکن کا غلبہ تھا۔ دل بے ایمان ہونے لگا۔ مجھے اچھا تو نہیں لگا رہا تھا کہ ایک غریب ٹانگے والے کا ٹانگے لے کر بھاگ جاؤں لیکن ایک طرف تو مسلسل بھاگتے رہتا اب میرے بس سے باہر ہونا چاہتا تھا۔ دوسرے میں نے جیب کو واپس تھامنے کی طرف جانے دیکھ لیا تھا۔

میں تھک کر کہیں بیٹھنے کا بھی تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کہیں بیڑہ کر سستا مجھے منگ پر نہ نکلتا تھا۔ ٹانگے میں بیڑہ کر میرا ستر بھی جاری رہ سکتا تھا اور کچھ دیر مجھے دوڑنے سے نجات ملتی تو وہ میرے لیے سستانے ہی کے حراف ہوتا۔ میں نے سوچا کہ چار چوبیس میل دور جا کر ٹانگا چھوڑ دوں گا ایک آدھ دن بعد شاید مالک کو مل ہی جائے۔

میں آجمل کر اچانک ٹانگے میں جا بیٹھا۔ چابک بھی ٹانگے ہی میں موجود تھا۔ لگام کو زور دیا تو جھٹکا دیتے ہی میں نے گھوڑے کو زوردار چابک رسید کیا۔ گھوڑا کوئی خاص محنتا نہیں تھا۔ اس کی پٹلیاں لمبیاں تو نہیں تھیں لیکن کئی جاکتی تھیں۔ اسے یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ ٹانگے میں بیٹھنے والا اس ٹانگہ میں نہیں تھا کیونکہ لگام میرے ہاتھ میں آتے ہی وہ بڑی طرح جھٹکتا تھا لیکن چابک کھاتے ہی وہ بڑھ کر دوڑا اور پھر دوڑائی چلا گیا۔

کوچان کو میں نے کافی دور تک گرتے پڑتے چھینے چلائے اور اپنی شلوار میں الجھ کر گرتے اور پھر اٹھ کر بیچھے آتے دکھا۔ بالآخر وہ تھک کر بیچھے نہ گیا۔ میں نے گھوڑے کو زیادہ سے زیادہ تیز بھاگنے کے لیے دو چار چابک رسید کیے لیکن ہاتھ زرا ہلکا ہی رہا۔ ساتھ ہی میں لگام کو بار بار جھٹکے دے رہا تھا۔ گھوڑے میں اگر جان ہو تو عام طور پر یہی طریقہ ایک لہر کا کام دیتے ہیں لیکن وہ گھوڑا پہلے ہی اپنی بساط سے بڑھ کر تیز بھاگ رہا تھا۔

راستہ ہموار تھا اور اس قافلہ میں نہیں تھا کہ اس پر ٹانگا اس رفتار سے دوڑایا جاتا لیکن میں اگر ٹانگے کو تیز نہ دوڑاتا تو میرا اس غریب کوچان کو اس کے ٹانگے سے محروم کرنا بے مقصد ہی ہو جاتا۔ چنانچہ جس حد تک بھی ممکن تھا میں اسے تیز دوڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے انچر بھر پہلے ہی بڑی طرح لے ہوئے تھے اب تو اس کی ہر چیز اس بڑی طرح مل رہی تھی کہ مجھے خود کو سنا سنا مشکل محسوس ہوا تھا اور ٹانگے کے ساتھ مجھے خود اپنے انچر بھر بھی پہنے

کہیں جا کر سڑک پر ٹھٹھا چاہتا تھا۔ میں اس وقت کسی سواری کی ضرورت تو محسوس کر رہا تھا لیکن ایسی سواری میں نہیں چاہتا تھا جس میں خود شقت کرنی پڑے۔

دو رختوں کے جھنڈ سے نکل کر میں نے اپنی سست متحین کر لی تھی اور میدانی علاقے میں دوڑا جا رہا تھا۔ ملاقات کچھ ایسا ہموار بھی نہیں تھا۔ کہیں جھاڑیاں کہیں درخت اور کہیں کڑھے بھی تھے۔ ان سے بچتے ہوئے میں نے دوڑ جاری رکھی لیکن اب میں خود محسوس کر رہا تھا کہ میری رفتار میں وہ تیزی اور مستندی نہیں تھی۔ اس وقت دھوپ ڈھلنے لگی تھی۔ میں کچھ کھانے پینے اور آرام کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا تھا لیکن یہ چیزیں گواہی والا تو میرے نصیب میں نہیں تھیں۔

میں ابھی چند فرلانگ ہی دوڑ رہا تھا اور بہت دور مجھے سڑک کے آثار دکھائی دیتے لگے تھے لیکن میں نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں سڑک سے بہت دور رہتے ہوئے ہی دوڑتا رہا لیکن میری کوشش یہی تھی کہ سڑک میری نظروں سے اوچھل نہ ہوئے پانچ میرے بائیں طرف کیت نظر آنے لگے تھے لیکن میں ان سے بھی دور ہی رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مزید آدھا گھنٹا دوڑنے کے بعد میں نے سڑک کا رخ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے خیال میں اب سڑک کی طرف جانے میں زیادہ غلط نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایک درخت کی آڑ میں رگ جانا پڑا۔ سڑک پر اچانک ہی مجھے ایک جیب نمودار ہوئی دکھائی دی تھی۔ فاصلہ کافی تھا اور جیب مجھے محض ایک بڑے کھلنے کی طرح دکھائی دے رہی تھی لیکن میں نے آنکھیں کھینک کر بغور دیکھا تو میرا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ پولیس ہی کی جیب تھی۔ یقیناً وہی تھی جس میں سواری کا مجھے شرف حاصل ہو چکا تھا۔

اس میں سواری پولیس والوں کو اتنی دور سے پہچاننا تو مشکل تھا لیکن میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ وہی لوگ تھے جو مجھے بس سے اتار کر لے گئے تھے۔ وہ شاید کہیں دور سے آ رہے تھے اور اب آبادی کی طرف جا رہے تھے۔ جیب سڑک پر ہی رہی کچھ میں نہیں آئی۔ مسلسل دوڑنے کی وجہ سے میرا دل پہلے ہی تیز دھڑک رہا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ جیب کو دیکھ کر میری دھڑکنیں تیز ہوں گی نہیں یا نہیں۔

میں درخت کے عقب میں ہی رہا حتیٰ کہ جیب میری نظر سے اوچھل ہو گئی لیکن میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اب ان لوگوں کا تھانہ پہنچنا اور صورت حال سے آگاہ ہونا زیادہ دیر کی بات نہیں تھی۔ میں نے سڑک کی طرف جانے کا ارادہ بخوشی کر لیا اور ایک بار پھر کچے ہی میں بھاگنے لگا۔ کچھوں کا سلسلہ اب کچھ جھک گیا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ قافلے پر نہیں رہے تھے۔ اب زمین تیزوڑہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس لیے زور کاشت رہنے کا پہلا زور دھتا جا رہا تھا۔



دیکھ لیتا تھا کہ پولیس کی جیب میرے تعاقب میں تو نہیں آ رہی تھی ابھی تک کوئی میرے تعاقب میں آتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اس دوران سڑک بدترج خراب سے خراب تر ہوتی گئی تھی۔ ٹانگا پھر سے بُری طرح پھٹکولے کھانے لگا تھا اور گھوڑے میں بھی اب بالکل ہی دم نہیں رہا تھا۔ اب تو وہ بے چارہ چاک کا کر بھی اپنی رفتار بڑھانے پر قادر نہیں رہا تھا۔ اس لمحے میں نے اسے چاک مارنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے میرا جتنا ساتھ دیا تھا وہی کافی تھا۔

اس دوران مجھے سڑک سے کافی دور بائیں ہاتھ پر کافی طویل عریض رستے میں پہلے ہوئے کھیتوں کے عقب میں کسی بستی کے آثار نظر آنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ اور آگے جانے کے بعد ٹانگے کو کچے میں اُتاروں گا اور اس بستی کا رخ کروں گا۔ وہ بچہ سا کوئی گاؤں معلوم ہوتا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ ٹانگے کو ایک زوردار ہٹکا لیا اور وہ یک دم ی گویا ایک طرف کو گر گیا۔ میں نے اُتر کر ٹانگے کا ٹانگہ تختہ مضبوطی سے نہ پکڑ لیا ہوتا تو میں ٹانگے سے باہر جا کرتا۔ میں جب اس جھٹکے سے سنبھلا تو احساس ہوا کہ ٹانگا اب بھی کھڑکڑاہٹ کے ساتھ سڑک پر گھٹ رہا تھا لیکن اس کا ایک پہرہ نکل کر لڑتا ہوا آگے چلا جا رہا تھا۔ شاید اسے کسی نامعلوم منزل پہنچنے کی کچھ زیادہ سی جلدی تھی۔

ایک پہرہ نکل جانے کی وجہ سے ٹانگا بالکل ہی ترچھا ہو گیا تھا اور سڑک پر رزوا کھا رہا تھا۔ گھوڑے کے لیے اب اسے کھینچا دشوار تھا لیکن وہ گویا اپنی ہی دھن میں کسی نہ کسی طرح اسے کھینچا لیے جا رہا تھا۔ اس کی حالت دسے کے مریض جیسی تھی۔ گردن زور زور سے ہلاتے ہوئے بُری طرح اپن رہا تھا۔

ٹانگے کا رخ خود بخود تھوڑا سا بدل گیا تھا اور وہ کچے میں اُترنے لگا تھا۔ میں اسے کچے میں اور دور تک لے گیا پھر میں نے اسے ایک درخت کے نیچے روک لیا۔ وہ سراسر کالی آگے جا کر گر گیا تھا۔ میں اسے بھی اٹھالیا اور ٹانگے کے سارے کھڑکڑاہٹ اس کے بعد میں نے دل ہی دل میں گھوڑے کا شکر ادا کیا اسے خدا حافظ کہا اور بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ ٹانگے والا اگر کسی اور سواری میں بیٹھ کر میرے تعاقب میں روانہ ہوا ہو گا تو شاید اسے آج ہی اس کا ٹانگا مل جائے۔

میں ابھی گھوڑے کو ہانپتا چھوڑ کر چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ عقب سے ایک لڑائی آواز سنائی دی۔ "بنا ایات منوب"

میں نے پلٹ کر دیکھا، چھوٹی زہ چرے والی ایک دلی بلی، سر رسیدہ عورت سر پر ٹکڑیوں کا بڑا سا گھنٹا ڈھانے چلی آ رہی تھی۔ اس عریض اتنا وزن اٹھانے چلنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی یقیناً رقت محسوس کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کا گھبراہٹ کے درمیان پسینے کی لکیریں بہہ رہی تھیں لیکن اس کی چال

محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے تانگے میں بیٹھ کر سستانے کا جو تصور کیا تھا وہ اب محض فزعی محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت میں نے اس پبلر پر غور نہیں کیا تھا کہ راستے میں اسے نشیب و فراز اور جھانڑاں وغیرہ تھیں۔ یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ مرسلز اور بیسیوں سال پرانے تانگے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تانگے سے واسطہ برسوں بعد پڑا تھا۔ اس کی خصوصیات ذہن سے محسوس ہو گئی تھیں۔ ایک زیادہ سی کمرے گڑھے سے اُچھل کر اور ترچھا ہو کر ٹانگا

باہر آیا تو ٹکڑی کی ایک پٹی جو بہت دیر سے سیٹوں کے نیچے کھڑکڑا رہی تھی، بالآخر نکل کر نیچے جا گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے تین کا ایک ڈبلا ہٹکا اور کھڑکڑاتا ہوا نیچے جا رہا۔ میں نے سنبھلنے کے لیے دائیں طرف کے ایک تختے کو پکڑا تو اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ تختہ اکڑ کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے اسے اندر ہی سیٹوں کے نیچے پھینک دیا لیکن چند لمحے بعد وہ بھی باہر جا کر۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اگر اب جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنا شروع ہو گئیں تو کب آخر میں ہی گاؤں کے سارے گھٹنا نہ رہ جاؤں گا۔ ٹانگا غائب ہی ہو جائے لیکن غیبت رہا کہ ایسا نہیں ہوا۔ ٹانگے کے پھٹکولے تو مزید بڑھ گئے کیونکہ اس کے انجرجر لہو بہ لہو مزید اچیلے ہوتے جا رہے تھے لیکن وہ صحیح سلامت رہا اور بالآخر سڑک پر پہنچ ہی گیا۔

سڑک بھی کو کہ سڑک کے نام پر محض ایک دھبائی تھی لیکن جس راستے سے میں گزر کر آ رہا تھا اس سے بہر حال بہتر تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھے سمجھنا پڑا اور شاید گھوڑے کو بھی کچھ سکون کی سانس آئی لیکن یہ سکون کی سانس گھوڑے کو کچھ ست آگئی۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ ابھی وہ بالکل ایک میل ہی دوڑا تھا لیکن جان توڑ کر اندھا دھند دوڑا تھا شاید اسی لیے بے چارے کا ابھی سے تپل نکل گیا تھا۔ میں نے بائیں خواستہ اسے دو تین چاک اور رسید کیے تب اس نے دوبارہ کچھ رفتار پکڑ لی۔

ٹانگے کو دھچکے لگنے ذرا کم ہوئے، میرے پسینے میں جھٹکے ہوئے جسم کو خشک خشک ہوا لگی تو طبیعت میں ذرا فرحت آئی۔ بُری طرح کھڑکڑاتا ہوا وہ ٹانگا تھوڑی دیر بعد مجھے مرسلز سے بہتر محسوس ہونے لگا۔

اس تانگے پر میرا پانچ چھ میل کا سفر نہ خیر عافیت طے ہو گیا۔ اس دوران کئی گاڑیاں، سائیکلیں، ٹانگے اور تیل گاڑیاں میرے قریب سے گزریں مگر کسی شہر فرارنے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ ایک موٹر سائیکل پر دو یادردی پولیس والے بھی میرے قریب سے گزرے لیکن انہوں نے بھی میری طرف ایک آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

ٹانگا کھڑکڑاتا ہوا نامعلوم منزلوں کی طرف بڑھتا رہا۔ میں اب پرسکون تھا اور اتنے سے سفر کے بعد ہی خود کو کھلے کی حدود سے باہر محسوس کر رہا تھا۔ تاہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد مراکز ضرور

ہے میں نے جلدی سے کہا "میں آپ سے اس کام کی کوئی مزدوری نہیں مانگوں گا۔"

"یہ بات نہیں ہے بیٹا! وہ ملائت سے بولی "مجھے معلوم ہے تم مزدوری لینے کے لیے یہ بات نہیں کہہ رہے۔ مجھے غریب سے تم مزدوری بھی کیا لوگے۔ اور یہ لکڑیاں ہیں بھی کتنے کی! مجھے معلوم ہے تم مجھ پر ترس کھا کر میرا بوجھ اٹھانا چاہتے ہو لیکن میں یہ بوجھ تمہیں دینا نہیں چاہتی۔ پتا نہیں کتنے برسوں سے میں یہ اور اس قسم کی دوسری شخصیں کر رہی ہوں۔ ان مشقوں کی وجہ سے ابی میں چل رہی پھر رہی ہوں۔ جس روز یہ مشقت چھوڑ دوں گی، بستر پر گر جاؤں گی اور پھر سسک سسک کر مروں گی کیونکہ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ مجھے تو کوئی پانی کا گلاس دینے والا بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس مٹھین کو چلتے ہی رہنے دو۔ ویسے بھی تم تو صرف ایک دن میرا بوجھ بنا جاؤ گے، بہت زیادہ ہوا تو دو دن میری مدد کرو گے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اپنی زندگی کی کاڑی مجھے خودی کھینچنے دو۔"

وہ بے پناہ روائی سے یہ سب کچھ کہتی چلی گئی۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا عزم اور حوصلہ قابلِ تعریف تھا۔ اس کی بھوس تک سفید تھیں اور چہرہ بھروسے سے بھرا ہوا تھا لیکن سر پر وزن ہونے کے باوجود اس کی کمر میں خم نہیں تھا۔ شاید وہ قوت ارادی کے سہارے اس طرح تن کر چل رہی تھی۔ اس کا جسم اتنا مضبوط نہیں تھا جتنی اس کی قوت ارادی مضبوط معلوم ہوتی تھی۔ وقت کے ہاتھوں اس کے وجود کی غمارت کھنڈ رہ رہی تھی لیکن بنیادوں میں ابھی اتنا خودداری اور خود اعتمادی کا کنکریٹ موجود تھا۔

اپنی باتوں سے وہ مجھے اور بھی اچھی لگنے لگی۔ میں اس کے سر سے لکڑیوں کا گھڑ لینے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ میرا بچپن حالانکہ غربت و افلاس کے اسی طرح کے روائی تھا شے دیکھتے نہ کرنا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور افسوس بھی ہوتا تھا کہ آج بھی محض اپنا چھارو شن کرنے کے لیے ہمارے ہاں اس عرشِ لوگوں کو نہ جانے کہاں کہاں سے لکڑیاں بچ کر لائی پڑتی تھیں۔ پیاس بجھانے کے لیے عورتوں کو میلوں دور سے گھرے سر رکھ کر لانا پڑتے تھے۔ میرا بچپن برسوں پہلے کی بات تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ کیا اتنے برسوں میں معاشرے نے ایک ایسا حائل بھی ملے نہیں کیا تھا؟ کیا معاشرہ آج بھی وہیں کھڑا تھا جہاں میں نے اسے برسوں پہلے دیکھا تھا؟

مجھ جیسے کچھ لوگوں کے گھروں میں اگر دولت آج بھی تھی تو کیا ہوا تھا۔ جموئی طور پر تو ظارے وہی کے وہی تھے مسائل وہی کے وہی تھے۔ بلکہ شاید اور زیادہ جھجک اور زیادہ خوفناک ہو گئے تھے۔ ترقی اسے تو نہیں کہتے۔

میرے اصرار پر بڑھیا مجبور ہو گئی۔ بلکہ مجبور کیا ہوئی "میں نے

کچھ زیادہ غناہت اور کمزوری عیاں نہیں تھی۔ وہ خاصی سندی سے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ تاہم میں دل ہی دل میں اس پر ترس کھائے بغیر نہ رہ سکا۔ انسان کو کم از کم عمر کے اس جیسے میں تو اس قسم کی مشقوں سے نجات مل جانی چاہیے۔

میں سمجھا "وہ مجھ سے درخواست کرے گی کہ میں اس کا لکڑیوں کا گھڑ اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دوں۔ میں اس پر نظر نہ کرتی تھی۔ وہی طور پر اس کام کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں اس کے کہنے سے پہلے ہی اس کے سر سے لکڑیوں کا گھڑ لے کر اس کے گھر پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

لیکن بڑھیا قریب آ کر مجھ سے اس قسم کی کوئی درخواست کرنے کے بجائے ہمدردانہ لہجے میں بولی "تمہارا تانگا ٹوٹ گیا ہے تو تم میرے ساتھ قادر کے گھر چلو۔ وہ ہمارے گاؤں کا بہت اچھا بڑھیا ہے۔ تمہارا تانگا بالکل ٹھیک کر دے گا۔" بات کرتے ہوئے وہ بغور میری صورت دیکھ رہی تھی۔ "تم یہاں اب بھی دکھائی دیتے ہو۔" انہیں ہمیں قادر کے گھر لے چلتی ہوں۔" ایک ہاتھ سے اس نے لکڑی کا گھڑ سنبھال رکھا تھا "دوسرے ہاتھ سے اس نے بڑی اہمیت سے میرا ہاتھ تمام لیا۔ اس کے استخوانی ہاتھ میں مشقت کا کردار اپن اور سختی تھی۔

میں نے زری سے اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑانے ہوئے کہا "نہیں اماں! اس کی ضرورت نہیں۔ یہ تانگا میرے دوست کا ہے۔ تم شام یا کل تک وہ یہاں پہنچ جائے گا اور خود ہی اس کی مرمت کرالے گا۔ میرے پاس تو اس کی مرمت کرانے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔" اپنی جیب خالی ہونے کا تذکرہ میں روائی میں ہی کر گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

بڑھیا ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہاں کس لیے آئے ہو؟"

"میں یہاں نہیں آیا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا "تانگا ٹوٹ جانے کی وجہ سے رکتا پڑ گیا ہے۔ مسافر سمجھ جیتے۔ مجھے آگے بلا ہے۔ کام کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی لیکن گردن موڑے بدستور میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ میں غیر ارادی طور پر گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنی ذات کی طرف سے اس کا وہ بیان ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لائے۔ یہ لکڑیاں میں آپ کے گھر پہنچا لاؤں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" وہ جلدی سے کہہ کر ہٹ گئی۔ "میں خودی لے جاؤں گی یہ لکھناں۔" مجھے شبہ ہوا کہ شاید میرے خالی جیب ہونے کا میں کردہ ڈر میں

غل وقوع کے اعتبار سے بھی اس وقت بہت اہم تھا۔ یہ عام گور  
گاہوں سے بالکل ہٹ کر تھا۔ کسی کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس  
کی موجودگی سے واقف کوئی شخص بطور خاص ہی اس طرف آنے  
اسے دیکھ سکتا تھا۔ نہ ایک طرح سے یہ "ہاسٹو جڈ" ہی تھا۔

وہ مکان میرے لیے بہت اچھی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔  
بڑھیا مجھے اپنے ہاں مسلمان ٹھہرانے پر رتی ہوئی بھی تھی۔ مجھے اگر  
ایک رات بھی آرام سے یہاں گزارنے کا موقع مل جاتا تو میرے  
لیے بہت تھا۔ تازہ دم ہو کر میں کسی طرف بھی نکل سکتا تھا۔ دینے  
ہی اب رات سر پر ہی آئی تھی۔ میں نے قہقہہ سی ہنچا ہٹ کے  
بعد بڑھیا کی دعوت قبول کر لی اور صحن میں چڑی چارپائی پر بیٹھ  
ہو گیا۔

وہ آگ جلا کر کھانا تیار کرنے لگی۔ اس کی حرکات و سکنات  
میں پھرتی تھی لیکن کام کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی مسلسل  
چلی رہی تھی۔ مدتوں تیار بننے والوں کے سینے میں عموماً ان کی باتوں  
کا سہرا مقید رہتا ہے جو بہرے نکلنے کے لیے راست تلاش کرتا ہے۔  
کوئی سامع میسر آتے ہی یہ سندھ روانی سے بہہ نکلتا ہے یا پھر شاید  
بڑھیا فطرتاً ہی باتنی تھی لیکن اب میرا زبانیان اس کی باتوں کی  
طرف کبھی تھا۔ دیے بھی زیادہ تر وہ فضول باتیں ہی کر رہی تھی۔  
میں اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا اور کچھ ست بھی بڑھیا تھا۔  
آرام کے لیے جگہ میسر تھی تو یکدم ہی حواس دھبے پڑ گئے۔  
لکڑیوں کے دھوس کے ساتھ ساتھ صحن میں پہلے سالن اور پھر روٹی  
کی خوشبو ابھری تو آہستہ جوبھوک سے کھلبلا تے ہوئے بالا تر ہو گئی  
تھی "ایک بار پھر جاگ اٹھیں۔"

"بھئی آجائے۔" بڑھیا نے پہلی روٹی اُتارتے ہوئے مجھے  
چولھے کے قریب بلایا "بھئی روٹیاں اُتارتی جاؤں گی" تم گرم گرم  
کھاتے جانا۔ مجھے معلوم ہے تم بہت بھوکے ہو۔"

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے ایک بہت بڑے پالے  
میں شرابے والا آلو گوشت ڈالا تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی  
اور دایا میں اس نے پھولی پھولی سی جو روٹی توتے سے اُتار کر دھکی  
تھی وہ بھی ہمازی ساز کی تھی۔ بڑھیا کو یقیناً میری بھوک کی شدت  
کا ہی نہیں بلکہ اس کی "دوست" ڈابھی اندازہ تھا۔

میری والدہ کا انتقال ہوا تو میں بہت ہی چھوٹا تھا۔ میرے ذہن  
میں ان کی کوئی ایسی یاد محفوظ نہیں تھی کہ انہوں نے اس طرح  
چولھے کے قریب بیٹھ کر تازہ تازہ روٹیاں توتے سے اُتار کر مجھے  
کھلائی ہوں لیکن میں چشمِ تصور سے دیکھتا تھا کہ اگر میں زندہ ہوتا  
اور میں گاؤں میں ہوتا تو کمر میں شاید روزانہ کچھ اسی قسم کا منظر ہوتا  
کہ میں کھانا چاربا تھا اور وہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ  
تھا کہ اس نے نہ صرف مجھے ایک عمدہ پناہ گاہ تک پہنچایا تھا بلکہ  
کچھ دیر کے لیے اس تصور سے بھی لذت اُمدوز ہونے کا موقع دیا تھا  
جس کا میری زندگی میں کوئی گزر نہیں تھا۔

مگر اس کے سر سے تقریباً بچھی لیا۔ ہم باہر کرتے چلے جا رہے  
تھے۔ زیادہ تر وہی بول رہی تھی اور بہت تیزی سے بول رہی تھی۔  
اس نے میرے بارے میں بھی بہت سے سوالات کیے۔ میں نے  
گول مول جوابات دے کر اسے مطمئن کرنے اور کچھ بھلانے کی  
کوشش کی۔

ہم بہت دیر تک چلتے رہے۔ پہلے اس نے کھیتوں کے ساتھ  
ساتھ پگڑی پر خاصا فاصلہ طے کیا۔ پھر گاؤں کی طرف مڑی لیکن  
گاؤں میں داخل نہیں ہوئی۔ باہر ہی باہر سے گزرتی چلی گئی۔ میں  
شہر تھا کہ وہ کسی گلی، کسی گھر میں داخل ہو گئی لیکن وہ چلتی ہی جا رہی  
تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں کا آخری مکان بھی پیچھے ہو گیا۔

ایک جگہ کنویں کے قریب میں نے چھوٹی سی مسجد دیکھی۔ ہم  
اس سے بھی آگے گزر گئے۔ اور درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب  
میں پیچھے۔ وہاں مجھے گاؤں سے الگ تھلک ایک کچا مکان نظر آیا۔  
"یہ ہے میرا گھر۔" وہ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے  
گہری سانس لے کر بولی۔ میں حیران ہونے لگا۔ "یہ نہ سکا۔"

"تم اتنی دور سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لائی ہو ناں جی؟" میں  
نے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ تم حیران کیوں ہو رہے ہو؟" اس نے گویا میری  
حیرت پر حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔ اگر تم کو شش کو تو تمہیں ضرورت کے  
مطابق تو شاید لکڑیاں یہاں آس پاس سے بھی مل سکتی ہیں۔" میں  
نے گھڑبیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"یہاں زمین کی صرف یہ۔۔۔۔۔ چھوٹی سی پٹی میری ہے جس پر  
مکان بنا ہوا ہے۔ باقی ساری زمین رئیس کی ہے۔ میں اس پر سے  
کوئی چیز نہیں لے سکتی۔ میں زمیندار سے درخواست کروں تو شاید  
وہ اجازت دے بھی دے لیکن میں کسی بھی چیز کے لیے کسی کی منت  
کرنا نہیں چاہتی۔ میں جان بوجھ کر اتنی دور جاتی ہوں۔ جہاں میں  
جاتی ہوں وہاں مجھ پر کوئی نوک ٹوک نہیں ہے۔ لکڑیاں بھی سمیٹ  
کر لاسکتی ہوں، سبزیاں بھی توڑ کر لاسکتی ہوں اپنی کمبری کے لیے  
گھاس بھی کاٹ کر لاسکتی ہوں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ  
اس بنانے میں مشقت کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا کہ مشقت  
میری زندگی ہے۔"

ہم مکان میں داخل ہوئے۔ چھوٹے سے صحن میں شستہ  
کے درخت تلے ایک صحت مند مگر بڑھی ہوئی تھی۔ ایک طرف  
چارپائی چڑی تھی، اگلی پر کبوترے لڑا رہے تھے۔ مکان ایک بڑے  
سے کمرے اور صحن پر ہی مشتمل تھا لیکن اس میں قدم رکھتے ہی  
مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں  
اپنے گاؤں میں لوٹ آیا تھا۔ شاید میرے لاشعور میں بچپن کی یادوں  
کے خزانے میں ایسے بہت سے مکانوں کی تصویروں محفوظ تھیں۔  
میں نے ایک اور نقطہ نظر سے بھی غور کیا تھا۔ یہ مکان اپنے

کے دوران کوئی خواب نہیں دیکھا تھا لیکن آٹھ بجتے ہی مجھے  
ہوا کہ شاید میں کوئی بھیاک خواب دیکھ رہا تھا۔

بڑھیا مجھ پر جھکی ہوئی تھی لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں اٹھا ہوا  
اور اس ہاتھ میں تقریباً ایک فٹ لمبی خوفناک سی چھری تھی۔  
پالش شدہ چھری نہیں تھی لائین کی مدھم روشنی میں چمک  
رہی تھی لیکن اس کی دھار کی طرف کاچھ حصہ ضرور جھلکا ہوا تھا۔  
وہ کچھ اس قسم کی چھری تھی جیسی ہمارے ہاں قصائی عموماً بکری وغیرہ  
ذبح کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

اس مدھم روشنی میں چھری سے زیادہ خوفناک بڑھیا کا چہرہ  
آ رہا تھا۔ بھروسہ بھرا وہ چہرہ اس وقت سرخ شدہ دکھائی دے رہا تھا۔  
اسے شاید نفرت نے سرخ کر دیا تھا۔ وہ چہرہ جس پر میں نے مسکا  
اور شفقت کے اُجالے دیکھے تھے اس وقت نفرت کی شدت  
تاریک تھا اور انا خوفناک دکھائی دے رہا تھا کہ اس پر اچانک نظر  
پڑنے پر کسی کی چیخ بھی نکل سکتی تھی۔

اس نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور اس کا استخوانی بازو  
اس وقت تیزی سے نیچے اُتے گا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ میرا بازو  
شاید اضطراری طور پر اٹھا تھا اور میں نے یک دم اس کی کلا  
پکڑ لی۔ اگر میری آنکھ کھلتے ہی یا مجھے اس کا بازو پکڑنے میں ایک  
لحظے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید وہ چھری میرے سینے میں اتر  
ہوتی۔

جب میں نے اس کا بازو پکڑا اس وقت چھری کی نوک میرے  
سینے سے نکلتی تھی اچانک دور تھی۔ اس کا استخوانی بازو جتنا کمزور  
آتا تھا۔ وہ حقیقت اتنا کمزور نہیں تھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ  
میں اس کی طرف ہاتھ نہ اٹھاؤں اور وہ فاصلہ بھی طے ہو جائے۔

دوسرے ہی لمحے وہ کسی چیز کی طرح اچھل کر چلائی۔  
مجھی اور اس نے چھری کو نیچے لانے کے لیے پورے جسم کی طاقت  
صرف کر دی۔ اور یہ طاقت کچھ کم نہیں تھی۔ شاید یہ نفرت کی  
طاقت تھی۔ جس طرح محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اسی طرح  
نفرت میں بھی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ شاید فرق صرف یہ ہے کہ  
ایک طاقت مثبت ہوتی ہے اور دوسری۔ ایک کسی کو مارتا  
مالتی ہے دوسری کسی کو دوزخ میں لیتی ہے۔

اس نے جب دیکھا کہ وہ چھری میرے سینے میں نہیں آ رہی  
تو اس نے چھری کو ہاتھ ہی میں تھماتے ہوئے میرے بازو کو  
کسے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی یہ کوشش بھی ناکام باطل  
میں اس کا یہ دھم دیکھ کر اس قدر حیرت زدہ تھا کہ فیرا دلی طور  
میں نے اپنا دفاع تو کر لیا تھا لیکن ابھی تک کوئی دھم کارروائی نہیں  
کی تھی۔ میں نے تو اپنی جگہ سے اٹھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔  
ابھی تک جت ہی لیٹا ہوا تھا۔ میرے لیے میرا تصور نوٹے کا  
خاصا شدہ تھا۔

بڑھیا ایک ہلاک طرح میرے سینے پر چڑھ گئی تھی۔

بڑھیا کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور وہ ایک غریب عورت ہی تھی  
نام اس کے گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔  
اس نے بتایا تھا کہ اس عمر میں بھی وہ باقاعدگی سے کھیتوں میں کام  
کرتے جاتی تھی اور جو مزدوری ملتی تھی اس سے گزراوقات کرتی  
تھی۔ شام کو کھیتوں سے واپس آتے وقت وہ ضرورت کی کسی نہ  
کسی چیز کا ٹھکانا کر سب لاد کر لے آتی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے مجھے بکری کے دودھ کی چائے بھی بنا کر  
پلائی جو شاید عام حالات میں مجھے اچھی نہ لگتی لیکن اس وقت بڑی  
لذت لگی۔ پیٹ بھرے ہی مجھے کدم کا شمار چڑھنے لگا۔ ٹھکن اور  
رواغب کی ویسے ہی کچھ کم نہیں تھی۔

بڑھیا میری صورت دیکھتے ہوئے بولی "تم بہت بُری طرح کھتے  
ہوئے ہو۔ چلو۔ اندر چل کر سو جاؤ۔"

اندر کمرے میں دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں لیکن بستر صرف  
ایک پر تھا۔ اس نے لوہے کے ایک ٹک ہے فوراً دروازے پر دھکی  
دیوہ نکالا اور دوسری چارپائی پر صاف ستر اہیتر لگا دیا۔ لائین کی  
چنی اس نے بچی کر دی۔ کمرے میں زبرد کے بلب جیسی روشنی نہ  
تھی۔

وہ نہایت شفقتانہ لہجے میں بولی "تم آرام سے سو جاؤ میں ذرا  
برتن وغیرہ دھو لوں اور کچھ دوسرے ضروری کام نسا لوں۔"

اس کا انداز انا رہا تھا کہ اس کا اس وقت مجھے لوری دینے کو  
بھی جی چاہ رہا تھا۔ اگر میں چھوٹا ہوتا تو شاید وہ یہ بھی کر گزرتی۔ بستر  
پر لیٹتے ہی میری تھکن ہوئی بڑوں میں آرام و سکون کی ایسی لہر آتی  
کہ ایک لمحے کے لیے تو وہ کھر کھٹے جنت محسوس ہوا۔

صبح سے بڑھیا کے کام کرنے کی بجلی کھڑکی میں صرف  
چند لمحے ہی گئی تھی اس کے بعد دینا مانیا سے بے خبر ہو گیا۔ مجھے  
اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر سویا تھا۔ جو حالت میری تھی اس میں  
انسان پوری رات بھی سوئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ چند منٹ  
سویا ہے۔ اس حالت میں آسانی سے آنکھ کھلنا بھی کسی مجبڑے سے  
کم نہیں ہوتا۔

میرے لیے یہ معجزہ نہ جانے کس طرح ممکن ہوا کہ اس حالت  
میں بھی اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اسے آپ میری خوش قسمتی  
سمجھیں یا کچھ اور۔ لیکن میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کبھی  
کبھی مجھے اپنے اندر کسی جس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا جو چھٹی  
سے بھی آگے کی کوئی چیز معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ دیوے تو چھٹی  
جس ہی ایک فرضی چیز ہے لیکن میں اپنی اس جس کو ساتویں جس کہا  
کرتا تھا۔

شاید وہ اس ساتویں جس کا ہی کمال تھا کہ اس وقت میری آنکھ  
کھل گئی۔ چھٹی جس تو مجھے اس نیند سے یوں اچانک جگانے میں  
کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس قدر کہ نیند میں تو شاید چھٹی جس  
بھی انسان کے ساتھ ہی سو جاتی ہوگی۔ میرا خیال ہے میں نے نیند

ہی تھی، پتل رہی تھی، زور آزمائی کر رہی تھی اور پھر سے کسی نہ کسی طرح مجھے گزند پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔  
پھر اچانک ہی اس نے بیٹھا بھی شروع کر دیا۔ ”تم میرے بیٹے کے قاتل ہو۔۔۔ تم میرے بیٹے کے قاتل ہو۔۔۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔“

یہ ایک نئی افتاد تھی۔ فوری طور پر تو مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ مکان آبادی سے خاصا دور تھا اور اس کا شرر شرابارات کو اس وقت شکل سے ہی کسی کو متوجہ کر سکتا تھا۔ مجھے تو یہی اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کی کرشت تو آواز ایک جھوم جھوم کر لے گی اور میں جب شکل میں پھنس جاؤں گا۔ رات کے سنانے میں اس کی آواز بے بھی کچھ زیادہ ہی کرشت، تیز اور آہستہ سی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا نہ جانے وہ کون سا بیٹا تھا جس کا اس نے مجھے قاتل بنا دیا تھا۔ میں نے شاید اسے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو۔ اس کے زور جانے پر مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ میں نے اس کی ٹھکانی پر صرف ہاتھ کی گرفت سخت کی۔ پھر ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ہرے ہاتھ سے میں نے اس کی سونگھی کی گردن دوپٹی اور رات کے سکوت کو مرتعش کرتی ہوئی اس کی کرشت آواز بند ہو گئی۔

میں اب بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس پر میرا سخت ہاتھ پڑے۔ لیکن نہیں چاہتا تھا کہ بڑھیا مر جائے۔ تاہم وہ میرے لیے محبت بن گئی تھی۔ اب بھی میرے سینے پر اچھل رہی تھی۔ دم گھٹنے کے باعث وہ بڑی طرح پھلنے لگی تھی۔ میں نے اسے اچھال کر رادہ پر پھینک دیا۔ وہ دیوار کے قریب جا کر گری اور وہیں سناکت لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

میں سر ہٹک کر اٹھ کھڑا ہوا اور قریب جا کر دیکھنے لگا کہ کیس ل کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے تو بند نہیں ہو گئیں لیکن اس کی سانس ل رہی تھی بلکہ وہ سوتی ہوئی لکی طرح خرخر رہی تھی۔

میں نے اسے وہ پردہ چھوڑ دیا۔ میرے خیال میں اب میرا وہاں برا ٹھیک نہیں تھا۔ یہ ٹھکانا بھی مجھے راس نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے بھی خدا حافظہ کہا اور باہر آیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سپیدہ انور اور بویا تھا۔ بڑھیا نے بھی برا کر م کیا تھا کہ مجھے چند گھنٹے کے ساتھ ساتھ دیا تھا اور اپنا دراصلی الصباح شروع کیا تھا۔ مکان سے نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں علاقوں

میں سے اندر سے ہی آمدورفت شروع ہو جاتی ہے لیکن وہاں کی کوئی فکر نہیں کرتا تھا۔ میں۔۔۔ مگر احتیاط سے مکان کا دائرہ بند کرنے لگا۔ میں کندی بھی چڑھانے ہی لگا تھا لیکن پھر ایسا ہی کر دیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ کہیں بڑھیا ہوش میں آئے لیکن وہ ہوش چلائی ہی نہ وہ جائے اور اوھر سے کسی کا زور ہی نہ ہو ڈاکٹر کے لڑکی کھول دے۔

مگر دوا نہ بند کر کے پلایا ہی تھا کہ درختوں کے عقب سے

ایک شخص نمودار ہوا تو دکھائی دیا۔ درختوں نے اس مقام پر گڑبڑ کی کے قریب ایک مڑ سا بنایا تھا اور وہ شخص اس موڑ پر ہی نمودار ہوا تھا۔ اس نے مجھے بڑھیا کے گھر کا دروازہ بند کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔

وہ غالباً مجھ سے ٹکا تھا اور گاؤں کی طرف واپس جانے کے بجائے چل قدمی یا کسی کام کے ارادے سے اوھر آ رہا تھا۔ صبح کا اجالا اس حد تک پھیل چکا تھا کہ میں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک اوجڑ عمر پاریش شخص تھا۔ اس کے سر پٹوئی اور ہاتھ میں شیخ تھی۔ شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی طراست تھی جو آج کے دور میں چروں پر ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

اس کی صورت دیکھنے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھ سے کوئی نہ کوئی سوال ضرور کرے گا اور مجھے خواہ مخواہ وضاحتوں میں اٹھنا پڑے گا۔ ایک لمبے کے لیے مجھے خیال آیا کہ فوراً دوسری طرف جست لگاؤں اور ٹھگے اندر چرے میں دوڑنا ہوا اس کی نظروں سے اوچھل ہو جاؤں لیکن فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ وہ ایک شریف آدمی تھا اور میں نے بھی کوئی جرم نہیں کیا تھا تو خواہ مخواہ مجھے خود کو اس کی نظر میں منگولک بنا کر بھانسنے کی کیا ضرورت تھی۔

”تم کون ہو بھائی۔۔۔ کیا روشتن بلالی کے مسمان ہو؟“ اس نے نہایت محبت سے پوچھا۔

”جھاس۔۔۔ تو اس بڑھیا کا نام روشتن بلالی تھا جو مجھے موت کی تار کیوں سے روشتاں کرانے لگی تھی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں نے اس کے ساتھ اس کے گھر میں خاصا وقت گزارا تھا لیکن مجھے اس کا نام معلوم ہی نہیں تھا۔

شیخ والا پاریش شخص ایک تک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دل ہی دل میں وہ مجھ پر چور ہونے کا شبہ کر رہا تھا لیکن بعض لوگ اتنے مہیاں، نرم خو اور نیک دل ہوتے ہیں کہ وہ بلا تحقیق چور کو بھی اس کے منہ پر چور نہیں کہہ سکتے۔ وہ پہلے مجھے بولنے کا موقع دینا اور پھر کوئی نتیجہ اٹھ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمبے کے اندر اندر فیصلہ کیا کہ اس شخص کے سامنے اوھر اوھر کی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صاف سیدھی اور سچی بات کرنا سب سے بہتر تھا۔ اس میں سب سے کم آنکھیں تھیں۔

”میں ایک مسافر ہوں بھائی۔۔۔ اور کچھ پریشان حال بھی ہوں۔۔۔“ میں نے طاعت سے کہا۔ اس سے آگے میں نے اسے کل شام سے اب تک کا قصہ سنایا کہ کس طرح بڑھیا سے ملاقات ہوئی تھی، کس طرح اس نے مجھے مسمان رکھا تھا اور پھر چند منٹ پہلے کیا ہوا تھا۔

میں خاموش ہوا تو اس نے مہری سانس لے کر ”استغفر اللہ“ کہا اور قریب آکر مشفقانہ انداز میں میرا کندھا جھٹکے ہوئے ہوا

”اللہ نے بڑا کرم کیا کہ تمہاری جان بچ گئی۔ آؤ ذرا دیکھ لیں روشن بابی کو کچھ زیادہ چوٹ وغیرہ نہیں آئی۔“  
 میں دوبارہ بڑھیا کے مکان میں جانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے اتنی محبت سے اسرار کیا تھا کہ میں چلا گیا۔ بڑھیا وہیں فرش پر بڑی تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا لیکن اب وہ کسمارہ تھی۔ شاید ہوش میں آ رہی تھی۔ اس شخص کی فرمائش پر میں نے اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔۔۔ لکڑی کوئی بات نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے یہ جلد ہی ہوش میں آجائے گی اور اس وقت تمہیں اس کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔ آؤ تم میرے ساتھ آؤ۔“ وہ روانہ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”کہاں؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔  
 ”میرے گھر۔۔۔ اور کہاں؟“ وہ نہایت اطمینان سے بولا۔ گویا یہ بات مجھے پہلے ہی سمجھ لیتی تھی۔  
 مجھے متذبذب دیکھ کر بولا ”بہن! تم مسافر ہو۔۔۔ پریشان حال ہو۔۔۔ میرا خیال ہے تمہاری جیب میں کوئی۔۔۔“ وہ پیچھے مگر نہیں بڑھا۔ جب یہ باتیں نہیں معلوم ہوئی تھیں تو پھر ہم جیسے اس طرح تو نہیں جانے دے سکتے۔ یہ مسلمانوں۔۔۔ اور خاص طور پر ہم سندھیوں کی روایات کے خلاف ہے۔ اب تم میرے صمان ہو۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ ہم تمہاری جو بھی خدمت ہو سکے گی انکریں گے۔“

میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ ایک جگہ سے بے ٹھکانہ ہوتے ہی قدرت نے فوراً دوسرا بندوبست کر دیا تھا لیکن اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال نے سر اُبھارا۔ میں تو روشن بابی کی بھی شکل، صورت اور انداز و اطوار سے متاثر ہو کر اس کی آنکھوں میں ہمت کی بڑچھائیاں دیکھ کر اس کے ساتھ آیا تھا لیکن اس نے عجیب ہی پلٹا کھایا تھا۔ کہیں اس انجینی کے روشن روشن چہرے کے پیچھے بھی کوئی اور ہی قصہ تو میرا شکر نہیں تھا؟

یہ سوچنے کے بعد وہ میں ایک لمحے کی چھپکھا ہٹ کے بعد اس شخص کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ جس راستے پر میں نکلا ہوا تھا اور جس قسم کی زندگی میں جان بوجھ کر فی الحال اپنائے ہوئے تھا اس میں مجھے قدم قدم پر ہر قسم کے اندیشوں و دشواریوں اور صعوبتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔  
 باہر آ کر وہ شخص اسی راستے پر واپس چل پڑا جس سے میں نے اسے آتے دیکھا تھا۔ اس نے غائب آگے جانے کا ارادہ ہٹو کر دیا تھا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے بیٹھ بیٹھا چلا رہا۔ پھر بیٹھ کر کہنے لگا اس نے جیب میں ڈالی اپنے سراپا پر چھوٹ ماری اور گویا کسی دوسری دنیا سے واپس آتے ہوئے بولا ”میرا نام رُرم تھ ہے۔ میری اس گاڑی میں کپڑے کی دوکان ہے۔“

میں نے ایک کامیابی آوی ہوں۔۔۔ کچھ خطرناک لوگوں کی دشمنی لپیٹ میں آ گیا ہوں۔۔۔ مجھے اچانک ہی سب کچھ چھوڑ چھاؤ کر دینا پڑا۔۔۔“ گول مول انداز میں یہ تقریباً بی بی تھا۔ میں نے سہماتا کہ ”خطرناک لوگوں“ کا ذکر نہیں کر اگر اسے بدکنا ہے تو اسی پر کر جائے۔ مجھے گھر تک لے جا کر میریانی کی زحمت نہ اٹھائے۔  
 اس نے اپنی تھی جھوٹیں اچکا تے ہوئے میری طرف دیکھا اور گویا شکر رہا کہ میں مزید کچھ بولوں لیکن میں خاموش رہا۔ اس نے بھی مجھے مزید کر دینے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اتنا ضرور کہا ”میرا خیال ہے جتنا تم نے مناسب سمجھا ہے مجھے بتا دیا ہے۔“  
 ”جی ہاں۔“ میں نے اختصار سے کہا۔  
 ”جاننے کو اور کچھ نہیں ہے؟“ اس نے ملائمت سے پوچھا۔  
 یہ گویا ایک ششمانہ درخواست تھی کہ اور کچھ بتانا ہے تو بتا دیجیے میرے خیال میں فی الحال ایسی کوئی بات۔  
 ”جی نہیں۔“ میں نے دھجے لہجے میں کہا۔  
 ”ٹھیک ہے۔۔۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا ”چرٹان ہوتا کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔۔۔ بڑی قدرت بڑی رحمت والی ہے۔ اگر تم نے کسی کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔“

مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے چہرے پر پریشانی کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی وہ اپنی پیشکش پر کچھ دکھائی دے رہا تھا۔  
 ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”اس بڑھیا۔۔۔ مطلب ہے روشن بابی کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ رات اسے کیا ہو گیا تھا؟“  
 وہ کندھے پر بڑا دوپٹا چہرے پر بٹھرتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے ابھی اس دنیا میں ابھری ہوئی لافندہ گمانوں میں سے ایک گمان ہی کہانی ہے۔ یہ جوانی میں ہی پیو ہو گئی تھی۔ اس کا ایک بڑا تھا۔ اس نے محنت مزدوری کر کے بڑی مشکلوں سے اسے بڑا گاؤں کے کسی مرد اس سے شادی کرنا چاہے تھے مگر اس نے شادی نہیں کی۔ اس کا بیٹا بڑا مجبور جوان تھا۔“  
 رُرم عمر نے تنقیدی سے انداز میں میرا سراپا جائزہ لیا۔  
 تشبیہ دی۔ ”کچھ کچھ تم جیسا ہی تھا وہ۔ وہ بھی ادنیٰ تھا۔ میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ ہمارا گاؤں ایک بہت اچھا گاؤں ہے۔ یہاں کسی بھی قسم کے چکر نہیں ہیں۔ سیاست زیادہ زور نہیں ہے۔ ہمارا رئیس بھی اچھا آدمی ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے، دکھ سکھ میں کام آتا ہے۔ یہاں غریبی ضرور ہے لیکن بے سکوتی نہیں ہے۔“  
 میرے خیال میں وہ ایک آئیڈیل گاؤں کا نقشہ سمجھتا تھا۔

ہے 'لوگ سچ بھادو کرا دیتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کوئی اجنبی رہے بھی کبھی بھاری آتا ہے۔ عام حالات میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہتی تھی۔ اس لیے کبھی کسی نے اس کا کوئی اور بندوبست کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ جس طرح تم ہوتا رہے ہو، اس طرح کی کوشش اس نے پہلی بار کی ہے۔"

"انتقام کی خواہش میں اب عقل کا بھی دخل ہو گیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس نے سوچا ہوگا، ہر بار لوگ سچ بھادو کرا کے قاتل کو چھڑا دیتے ہیں۔ اس بار ذرا تدبیر سے کام لیتا جاوے۔"

"بے چاری۔۔۔" اور محمد متاسفانہ انداز میں بولا۔ "اللہ تعالیٰ اس پر اپنا رحم فرمائے۔"

ہم اب گاؤں کی گلیوں سے گزر رہے تھے۔ اکاؤنٹانوں گلیوں میں آتے جاتے دکھائی دینے لگے تھے۔ ہر کوئی دُرُ محمد کو سلام کر کے گزرتا تھا اور تجسّسی نظروں سے میری طرف دیکھتا تھا۔ مجھے کچھ الجھن سی ہونے لگی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد دُرُ محمد کا گھر آجائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس گاؤں میں زیادہ لوگ میری اجنبی صورت دیکھیں۔ یہ گاؤں بحرال سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں میں قحطانے میں خاصی بارودھاؤ کر کے بھاگا تھا۔ میرے حساب سے تو پولیس کی تلاش کا دائرہ کم از کم یہاں تک تو کافی دیر پہلے ہی پھیل چکا ہے۔ تھا۔ اگر پولیس اب تک میری تلاش میں یہاں نہیں پہنچی تھی تو یہ محض میری خوش قسمتی تھی۔ خوش قسمتی اور بد قسمتی دونوں میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ لیکن شاید یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ خوش قسمتی اور بد قسمتی بیش ہی انسان کے ساتھ اسطرح سفر کرتی ہیں۔ کبھی ایک کا اثر بڑھ جاتا ہے، کبھی دوسری کا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد دُرُ محمد بولا "دو بے روشن لی لی ہے بڑی خوددار عورت۔ کبھی کسی سے مدد نہیں مانگتی، کبھی کسی کے سامنے اپنے اکیلے پن 'بے چارگی یا بے بسی کا رونا نہیں روتی۔ سر جھکا کر کام کرتی ہے اور اپنی دنیا میں گمن رہتی ہے۔ کوئی اس کی مدد کرنے کی کوشش کرے تو تاراش ہوتی ہے۔ کہتی ہے، تم مجھے محتاج سمجھتے ہو۔ میں اللہ کے سوا کسی کی محتاج نہیں۔" اگر لوگ روشن لی کی بی طرح سوچنے لگیں تو معاشرے میں فساد برپا ہو جائے۔ یہاں تو لوگ زمانے بھر کی آسائشیں میسر ہوتے ہوئے بھی مظلوم اور مدد کے طالب بنے رہتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ اس نے میرے دل کی بات کی تھی۔

بالآخر وہ ایک ٹیڑھی لیکن کشادہ سی گلی کے وسط میں جاکر اور ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ ہے میرا غریب خانہ۔"

اس کے مکان کے سامنے ہم کا ایک گنا درخت موجود تھا

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر لھنڈی سانس لے کر بولا "میں روشن لی لی کے بیٹے کو شہر جانے کا شوق چڑھ گیا تھا جس طرح وہیں کے اکثر لڑکوں کو چڑھ جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں، ہر دوسرائی کے لیے شہر میں ایک جیتنی زندگی انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اکبر بھی شہر چلا گیا۔ اکبر روشن لی لی کے بیٹے کا نام تھا۔ وہ پہلے حیدر آباد گیا۔ پھر سنا ہے کہ کراچی چلا گیا تھا۔ دولت وغیرہ تو وہ کچھ نہیں کاسا تھا۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ ہم نے روشن لی لی کے گھر میں تو خوش حالی کے کوئی آثار نہیں دیکھے۔ اکبر کی زندگی بھی شر جاکر معلوم نہیں نہیں ہوئی یا نہیں! البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ جہاں تین سال بعد وہ واپس آیا تو اس کی شکل پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ سو کہہ کر کاٹھا ہو گیا تھا۔ وہ کلا جھجک نظر آ رہا تھا۔ شاید اسے کوئی لت لگ گئی تھی۔ لیکن بے کوئی بیماری لگ گئی ہو۔ مجھے صحیح معلوم نہیں ہے، کسی کو بھی صحیح معلوم نہیں کیونکہ واپس آنے کے بعد وہ گاؤں کے کسی آدمی سے نہیں ملا۔ اس نے گھر میں ہی منہ پچھپا لیا تھا۔ گھر سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ لیکن یہ وہ واپس آ گیا تھا نہ چاہتا ہو۔ کسی مجبوری میں آیا ہو۔۔۔"

راستے میں ایک کتہہ ملا، ہوا ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ دُرُ محمد نے اسے ہٹا کر اور اصل بات ادھوری چھوڑ کر بولا "اس کتے کے سامنے میں نے صرف دو تین مرتبہ کھانے کو کچھ پھینکا ہے لیکن یہ بدل بھی مجھے دیکھ لیتا ہے۔ دُرُ ملا ہوا پیچھے ہولیتا ہے۔ میں دُرُ ملا ہوں، کیسے مجھے منہ نہ لگا دے، کپڑے ناپاک نہ کر دے۔ اس دُرُ سے میں نے عرصہ ہوا اس کے سامنے روٹی یا بوٹی پھینکنا چھوڑ دی ہے لیکن یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

پھر وہ لھنڈی سانس لے کر بولا "ہم تو اپنے رب کے اس کتے پر بھی شکر گزار نہیں ہیں۔"

"بے شک۔۔۔" میں نے اس کی آنکھ میں سر ہلایا اور ایک لمحے کے وقف کے بعد پوچھا "وہ اکبر کا کیا ہوا؟"

"ہاں۔۔۔" اسے اصل موضوع یاد آیا تو وہ کچھ اور آسف سے بولا "ایک شخص کہیں سے اکبر کو ڈھونڈتا ہوا اور اس کے پاس میں پوچھا پوچھا یہاں آیا۔ اکبر کے گھر پر پچ۔ رات کو وہیں تھا۔ میں روشن لی لی بیدار ہوئی تو اکبر اس حالت میں بڑا تھا کہ اس کی گردن تو کسی سے زیادہ لمبی ہوئی تھی اور چھری اس کے پاس لی گئی پر رکھی ہوئی تھی۔ اجنبی غائب تھا۔ نہ تو اس کا کچھ پتا چلا اور نہ ہی اصل بات کا کچھ سرچر کسی کی سمجھ میں آیا۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں شاید اب بھی اس کے سوال کی نظر آ رہی ہوگا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کے بعد سے روشن لی لی کے دماغ میں تو دوسرا فرق آ گیا ہے۔ کافی اہم قیہ عالم رہا کہ گاؤں میں وہ کسی بھی اجنبی کو دیکھ لیتی تھی تو اس کے اکر بان پکڑ کر چیختے لگتی تھی۔ تو میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ تو میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" ظاہر

توڑنی ہو، کوئی بٹائی ہو۔ بے شک مزدوروں والا کام ہو، میں کھول  
گا۔ میں اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ تم بھی تکلف محسوس  
نہ کرو۔“

وہ مزید ان انداز میں مسکرایا۔ ”میں سمجھ گیا“ تم اپنے کپڑے  
بچھ پر بوجھ محسوس کر رہے ہو۔ تم یہاں رہنے اور کھانے پینے کا کام  
چکانا چاہتے ہو۔ مجھے تمہاری بات میں کراؤ محسوس ہوا ہے۔ تم میرے  
سمان ہو۔ سمان بوجھ نہیں ہوتا اور سمان اگر گھر میں رہتا ہے  
کھانا پیتا ہے تو اس کے بدلے اس سے مزدوری نہیں کرائی  
جاتی۔“ اس کی مسکراہٹ میں انفرادی تھی اور اس کے لیے  
واقعی دکھ نمایاں تھا۔

میں نے جلدی سے کہا ”اگر تمہیں میری بات سے رنج پہا  
ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے یہ بات کسی خاص خیال کے  
وقت نہیں کی تھی۔ تم میرا سر پایا دیکھ رہے ہو؟ اچھا بھلا سا پیر  
فٹ کا جوتان ہوں۔ اس قدر کا کٹھ اور جان کے ساتھ فارغ ہونے  
ہوئے مجھے عجیب لگتا ہے۔ میں خود اپنی نظریں شرمندہ ہونے لگا  
ہوں۔ دل چاہتا ہے بروقت معصوف رہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن ایک کدوہ دن بعد آرام سے  
بیٹھ کر اس موضوع پر بات کریں گے بلکہ میں تو کہتا ہوں ”ابھی تم  
نہیں چار دن آرام کرو“ اپنے حالات پر غور کرو پھر کسی وقت فون  
میں بیٹھ کر مجھے بتانا تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم کیا چاہتے ہو۔ چلا  
والی کوئی بات نہیں۔ تم در محمد کے سمان ہو۔ اللہ نے در محمد کو بلا  
بھی دیا ہے اور رزق بھی۔ تم یہاں رہ کر میرا کچھ ضیق کھاؤ  
اپنے مقدر کا کھارہے ہو۔“

وہ میرا کدوہا تھبتہا کر رخصت ہو گیا۔ میں وہاں بیٹھا جنت  
سے سوچتا رہ گیا، کیا واقعی ابھی دنیا میں اس طرح کے لوگ موجود  
ہیں؟ کیا ابھی تک اس طرح کے خیالات کے ساتھ لوگ اٹھنا  
گزار رہے ہیں؟ میں ایسے شخص کے گھر میں سمان بیٹھا ہوا تھا  
لیکن مجھے اس کے وجود پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ خواب و خیال کی  
دنیا کا آدمی معلوم ہوا تھا۔

لیکن بھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اسی رنگارنگی ۱۹۴۷  
دنیا تھا۔ دنیا میں ہر رنگ کا انسان موجود تھا اور شاید یہ اچھے لوگ  
ہی کے اعمال کا نتیجہ تھا کہ یہ زمین اپنی برائیوں اور خرابیوں  
ظالموں اور فسادوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے فتنہ پیٹم اپنی گردن میں  
معصوف تھی ورنہ شاید اپنا توازن کھو کر اب تک کسی دھرم  
سیارے سے گرنا چکی ہوتی۔ اور اس حادثے کا نام ہی ملا  
قیامت ہوتا۔

میں تخت پر گئے آرام وہ بستر دروازہ ہو گیا اور نہ جانے کب  
وقت میری آنکھ لگ گئی۔ شاید ابھی مجھے جسم کو واقعی مزہ تھا  
کی ضرورت تھی۔ وہ سر کو در محمد نے ہی آکر مجھے بگایا۔ اس بار  
کھانا کھا کر کان پر چلا گیا تھا اور وہ گھر آیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا

جس کے نیچے گائے بندھی ہوئی تھی۔ مکان نیم چلتے تھا اور اس کا  
چوبی دروازہ اچھا خاصا لپا چوڑا تھا۔ اندر لے جا کر اس نے مجھے  
اوقات میں بٹھایا جہاں چند کرسیاں اور ایک چولی تخت موجود تھا  
جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ اندر کے کسی کمرے سے کسی عورت کے  
طلاوت کرنے کی نہایت دھیمی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد در محمد نے مجھے اپنے بیٹے سے ملوایا۔ وہ بیس بائیس  
برس کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر بھی واڈھی تھی۔ سر پر ٹوپی  
شلوار ٹخنوں سے اوپر کی اور ہاتھ پر عراب نظر آ رہی تھی۔ در محمد نے  
بتایا کہ بیٹا اس کے ساتھ دکان پر بیٹھتا تھا اور مسجد میں شام کو بچوں  
کو بلا تھوڑا قرآن بھی پڑھاتا تھا۔ اس سے چھوٹی در محمد کی دو بیٹیاں  
تھیں۔ وہ بھی کم عمری سے ہی نماز روزے کی پابند تھیں۔

”انشاء اللہ آپ کا پورا گھر اندھ دھب کے بہت کمرے رنگ  
میں رنگا ہوا ہے۔“ میں نے تبصرہ کیا۔

”گھر رنگ اسے نہیں کہتے افضل معالیٰ!“ اس نے نفی میں  
سہلاتے ہوئے صبح کی ”گھر رنگ تو خوش نصیبوں پر ہی چڑھتا  
ہے۔ وہ اللہ کے بہت ہی بڑے بندے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف  
عام سے مسلمان ہیں۔ بنیادی ارکان کی پابندی کی کوشش کرتے  
ہیں۔ وہ بھی پانچ نہیں صحیح طور پر ادا ہو رہے ہیں یا نہیں۔ ہر حال اللہ  
بڑا غفور و رحیم ہے۔ شاید ہم جیسے گناہ گاروں کو بھی بخش دے۔“

میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ وہ خود کو گناہ گاروں میں شمار کر رہا تھا۔  
اس حساب سے مجھ جیوں کا شمار تو نہ جانے کن لوگوں میں ہوتا  
تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد در محمد بولا۔ ”اصل میں تو ہم  
سب کو کم از کم ایک ایما ہونا چاہیے تھا جیسے ہم ہیں لیکن چونکہ اکثریت  
ایسی نہیں ہے اس لیے آج کی دنیا میں ہم جیسے لوگ مجبورہ لگتے ہیں  
حالانکہ ہم میں مجبورہ والی کوئی بات نہیں۔“

پھر وہ مسکرا کر اٹھتے ہوئے بولا ”میں زیادہ ایسی باتیں کر کے  
حمیں بور نہیں کروں گا۔ کہیں تم سمجھو کہ میں نے تبلیغ شروع  
کر دی ہے۔ میں تمہارے لیے ناشائلا ہوں۔“

ہم نے اکٹھے بیٹھ کر نہایت بڑ تکلف ناشائلا کیا۔ دسی گھی کے  
گرم گرم پرائے، دسی انڈے، ساکن، لسی، ٹکسن اور دوسری کئی  
چیزیں تھیں۔ اس بڑ تکلف ناشائے پر میں نے بلا تکلف ہاتھ صاف  
کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کھانے دیکھ کر شاید در محمد میری میزبانی کا  
خیال دل سے نکال دے لیکن اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں  
آئی۔

ناشتے کے بعد در محمد بولا ”میں اب دکان پر جا رہا ہوں۔ تم  
آرام کرو۔ دوسرے کھانے پر تم سے ملاقات ہوگی۔“

”آرام تو میں رات بھر کر رہا ہوں۔ اب میں اپنے آپ کو تھکا  
ہوا محسوس نہیں کر رہا۔“ میں نے کہا کہ گھر میں کوئی محنت مشقت کا  
کام ہو تو مجھے جانا جاتا۔ میں بڑی آسانی سے کر سکتا ہوں۔ کوئی چیز



بیٹھا تو میں نے اپنے آپ کو اچھا بھلا بادشاہ سلامت محسوس کیا۔  
میں نے گویا کوئی نیا جنم لیا تھا۔ ذہن پر ایک عجیب سرور سا طاری  
ہوئے لگا۔

دُر محمد میری کلایا پلٹنے کے بعد ایک بار پھر دکان پر چلا گیا۔ مجھے  
پلٹنے کے سوا کوئی کام نہیں مروجہ رہا تھا۔ میں گاؤں کیسے پر سر رکھ کر  
پلٹنے لگا تو مجھے قیاس کی جیب میں کچھ کنڈکٹراٹس ہی محسوس ہوئی۔  
میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ جیب میں سو سو کے دو نئے  
نوٹ موجود تھے۔ میں دیر تک انہیں ہاتھ میں لیے دیکھتا رہا اور  
میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ دُر محمد نے ان کا ذکر تک نہیں کیا  
تھا۔ وہ شاید انسان کے مذہب میں کوئی فرشتہ تھا جسے قدرت نے  
میری مدد کے لیے بھیجا تھا۔ گوکہ میں گناہ گار اس قاتل نہیں تھا۔

میں دیر تک گم صم سا بیٹھا رہا۔ دُر محمد نے مجھ سے میرے  
حالات نہیں پوچھے تھے لیکن کما تھا کہ مجھے اپنے حالات پر غور کرنا  
چاہیے۔ سو میں اپنے حالات پر غور کر رہا۔ میں نے دل ہی دل  
میں کئی فیصلے کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے دو تین دن تو...  
دُر محمد کی سیرانی سے استفادہ کرنا چاہیے اور سُن گن لینی چاہیے کہ  
اس علاقے میں پولیس مجھے تلاش تو نہیں کر دی؟ اگر راستے صاف  
محسوس ہوں تو پھر مجھے یہاں سے نکل لینا چاہیے۔

لیکن انسان کے فیصلے اکثر دھڑے رہ جاتے ہیں!  
مغرب کے کافی دیر بعد دُر محمد گھر آیا تو اس کے چہرے سے

ایک ساتھ ایک نہایت معقول قسم کا نیا سلا ہوا شلوار قمیص بھی لایا  
تاجور کا خاص طور پر میری ہی جسامت کے شخص کے لیے سلا گیا  
تھا۔

دُر محمد بولا ”میری دکان کے تھوڑے پر ایک نوجوان وردی  
میں لے کر بیٹھا ہے۔ بعض لوگ میری دکان سے کپڑا خریدتے  
ہیں اور وہیں کے وہیں ملتے کے لیے دے دیتے ہیں۔ برا اچھا کام کر  
یہ وہ لڑکا۔ میں نے صرف اسے اندازاً تھمرا تاپ بتایا اور  
دیکھو۔ دو دھائی کھٹے کے اندر اندر اس نے اچھا خاصا جوڑا سی  
لا۔“

”لیکن آپ نے یہ تکلیف کیوں کی بھائی دُر محمد؟“ میں نے  
قدرے شرمندگی سے کہا۔

”تم نے اپنے کپڑوں کی حالت دیکھی ہے؟“ اس نے اپنا تیت  
برے انداز میں مجھے ہلکا سا ڈٹا تو میں نے اپنا بازو لیا۔ میں جن  
حالات سے گزر کر آ رہا تھا، ان کے بعد تو میرے جسم پر جو تھوڑے  
بولے چاہیے تھے لیکن قیمت تھا کہ تھوڑے جھوٹے میں ابھی  
بک کر پائی تھی۔ لیکن حالت ظاہر ہے خاصی شرمناک تھی۔

اوطاق کے سامنے ہی ڈبوڑھی کے دو سری طرف غسل خانہ  
موجود تھا جس میں ہینڈ پیپ لگا ہوا تھا۔ دُر محمد کے اصرار کرنے پر  
میں وہاں جا کر تازہ تازہ پانی سے نہا کر نئے کپڑے پہن کر نکلا اور  
شلوار کمانا کھانے کے بعد گاؤں کیسے کے سارے تخت پر گئے بستر

## حسن بن صباح

☆ شہنشاہ شیش اور ابلیس وقت

جو چھتیس (36) سال تک قلعہ الموت میں ایک نظر فریب جنت ارضی بنا کر بیٹھا رہا اور  
مسلمانوں کے بڑے بڑے جید علماء کرام اور محدثین، مفسرین، مفکرین اور ارکان سلطنت کے  
خون سے ہوئی کھیل رہا۔۔۔۔۔ مسلمان والیان ریاست اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔۔۔۔۔

اسی ساحر اور مُرد کی رنگین اور خوفناک داستان

الماس ایم۔ اے کے سحر انگیز قلم سے۔۔۔۔۔

قیمت -/ 125 روپے

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

دُر محمد ایک لمحے حنذب سے انداز میں کھڑا رہا پھر مجھے  
سے لے کر بولا "تیرا آخری فیصلہ ہے؟"  
"نی الحال تو آخری ہی ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور ہو گا۔"  
اس سے اجازت چاہی۔

"جی ہاں۔" وہ چکری درست کرتے ہوئے بولا "تم نے  
جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں تمہیں نہیں روک سکتا لیکن اگر  
میرے لائق کوئی اور خدمت ہے تو تباؤ میں پوری کوشش کرو  
گا۔"

"میں کرو بھائی دُر محمد اب مجھے اپنے احسان کے بوجھ  
بالکل ہی زمین میں گاڑنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے اسے بچ  
سے لگا لیا اور فرخ جذبات میں بے اختیار تھوڑا سا بھونکا۔  
بھاری بھر کم اور مضبوط چنے کا آدھی تھانگین یکدم اس کے منہ  
سے گھٹی گھٹی ہی جھٹک نکلی۔

میں نے جلدی سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ہوئے ہوا  
نے توپیلیاں ہی توڑ ڈالیں۔ ہم جیسے سیدھے سارے لوگوں پر  
زرا ہلکا ہی رکھا کرو۔

"معافی چاہتا ہوں بھائی! میں نے دلی طور پر معذرت کر  
لی تھی تو بھائی رکھا تھا۔"

اس کی سانس اعتدال پر آئی تو بولا "آؤ میں تمہیں باہر  
چھوڑ آؤں۔"

وہ برطان ضرور تھا لیکن خوفزدہ نہیں تھا مگر دوسرے  
اس کا بیٹا گھر سے داخل ہوا۔ وہ کافی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ  
تیشی سی آواز میں باپ سے مخاطب ہوا۔ "میں نے ابھی اچانک  
دوسرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے  
آری کھا شکو نہیں لے کرے ہیں اور سرکاریوں میں باتیں کر  
ہیں۔"

دُر محمد اب بھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ اس نے زرب شاہ کا  
آیت پرستی پھر بڑا ہاتھ پکڑتے ہوئے تیزی سے بولا "میرے  
میں پچھلا دروازہ بھی ہے۔ آؤ۔۔۔ اور سے نکل جاؤ۔"

وہ مجھے لیے تیزی سے دیوڑھی کے راستے اندر بچھا۔ اس کا  
بیوی اور بیٹیاں محسن میں بیٹھی کچھ کام کر رہی تھیں۔ وہ انہیں  
ہنس دیکھ کر کچھ گڑبڑا سی گئی لیکن دُر محمد ان سے کچھ سے بچنے  
ساتھ لیے محسن عبور کر کے دوسروں کے درمیان بنے ہوئے ایک  
ٹھک سے راستے کی طرف بڑھا۔ اس ٹھک سی راہداری کے انتہا  
پر کھڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دُر محمد نے پہلے خود دروازہ  
کے باہر گلی میں جھانکا اور گواہ مجھے منتظر دیا۔ "کوئی نہیں ہے۔"  
جاؤ۔ "یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ میں بھٹی گلی میں نکل  
دروازہ آؤنگی سے میرے عقب میں بند ہو گیا۔ در حقیقت میں  
اور دُر محمد نے کافی وقت باتوں میں ضائع کر دیا تھا۔ مجھے اس کی  
دلبر خان کے آدمیوں کے بارے میں اطلاع لے لی تھی۔

برطانی ہوا تھا۔ گو کہ وہ اسے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ  
ایک سوڑھے پر جیسے ہوئے بولا "افضل خان! یہ مت سمجھنا کہ میں  
تمہیں گھر سے رخصت کرنا چاہتا ہوں لیکن میں تمہیں خیر وار کھانا  
ضروری سمجھتا ہوں کہ آج شام مغرب کی نماز سے واپس آتے  
وقت چائے خانے پر میں نے چھ سات خط پاک سی ٹکڑوں والے  
آدمیوں کو دیکھا۔ کھا شکو میں ان کے پاس تھیں۔ مجھے ان کی باتیں  
بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کا دھیان میری طرف نہیں گیا۔ وہ ایک  
فحص کو تلاش کر رہے تھے اور معلومات کر رہے تھے کہ وہ اس  
گاؤں میں تو نہیں آیا۔ انہیں جس طے کے فحص کی تلاش تھی وہ  
تم ہو۔ وہ صرف طے ہی نہیں، افضل خان نام بھی بتا رہے تھے۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دُر محمد بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔  
وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "وہ کئی مراوے آئے ہیں۔ ریش  
مراوے آئی ہیں۔ تمہارا کھوج لگاتے ہوئے آئے ہیں اور انہیں  
کافی حد تک یقین ہے کہ تم اس گاؤں میں داخل ہوئے ہو۔"

اس نے ٹوپی کے اوپر اپنی چکری درست کرتے ہوئے گہری  
سانس لی۔ "کچھ لوگوں نے تمہیں میرے ساتھ آنے دیکھا ہے۔  
اس گاؤں میں کسی اچھی کا اتنا ایک خبر ہوئی ہے۔ جلد یا بدیر وہ  
یہاں تک آجائیں گے۔"

میں جرات کے تھانے سے جو دیوڑھی اٹھا کر بھاگا تھا وہ اس  
وقت میرے سینے میں اڑسا ہوا تھا۔ میں تمہیں کے اوپر سے ہی اس  
پر ہاتھ پھیر کر اس کی موجودگی کا اطمینان کرتے ہوئے اٹھ کھڑا  
ہوا۔

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میں اب  
پہن ہوں بھائی دُر محمد! زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ تمہاری  
محبت اور تمہارا احسان مجھے یاد رہے گا۔"

اس نے مصافحہ نہیں کیا اور ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے تیزی  
سے بولا "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم یہ مت سمجھنا میں تمہیں  
جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔۔۔ اور بچے  
دل سے کہہ رہا ہوں۔۔۔ فحص دلی طور پر نہیں کہہ رہا ہوں کہ اگر  
تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو اور جب تک  
جی چاہے جب تک حالات اجازت دیں میں یہیں رہوں۔ اگر کچھ لوگ  
کھا شکو میں اٹھائے آگئے ہیں تو کیا ہوا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔  
اللہ اپنا کرم کرے گا۔"

"میں دُر محمد! تم میرا آؤ ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ  
سے تم معصیت میں پڑو۔ تم نے جو کچھ کر دیا میرے لیے وہی بہت  
ہے۔ میں اپنی مرضی سے چاہتا ہوں۔ خود میرے اپنے حق میں بھی  
میری بہتر ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

دل ہی دل میں مجھے کچھ حیرت بھی تھی کہ پولیس تو مجھے تلاش  
کرتی ہوئی یہاں تک نہیں پہنچی تھی لیکن دلبر خان کے آؤی پہنچ  
گئے تھے۔ شاید دلبر خان بھی ان کے ساتھ تھا۔

تو کرچکا تھا۔ ریوالور لوکل میڈ نہیں تھا۔ اعشاریہ چار پانچ کا عدد کوٹ تھا ورنہ سرکاری لوگوں کے پاس عموماً لوکل ہوتے ہیں۔ تاہم میں اس کی طرف سے زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے زندگی اور موت کے فیصلہ کی لحاظ میں خدا کی ذات کے بعد اس پر انحصار کیا تھا۔ اس نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا تھا لیکن کم بہت کی گرج کچھ زیادہ ہی تھی۔

اس نے گویا اس بڑے سکون کلی میں تمام مکانوں کے ردو دیوار ہلا دیے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دوسری طرف کی گلی میں بھی اسلحہ آوی موجود ہوں گے اور وہ اب ادھر ہی دوڑے آ رہے ہوں گے۔ ایک جگہ جہاں تاریکی زرا کمری تھی، میں وہاں دیوار سے چپک گیا لیکن اسی لمحے ایک گتے نے زیادہ بہتر سمت میں میری رہنمائی کی۔

در حقیقت وہ نائزوں کے دھماکوں سے خوفزدہ ہو کر دم دبا کر بھاگا تھا اور شاید گھبراہٹ میں بھونکنا یا چیخاؤں کرنا بھی بھول گیا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ مکانوں کی سانے والی قطار میں ایک مقام پر دو مکانوں کے درمیان گھسا اور غائب ہو گیا۔

وہاں بھی تاریکی زیادہ تھی، اسی لیے میں ابھی دیکھ نہیں سکا تھا کہ مکانوں کے درمیان وہاں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ اب گتے کے ادھر بھاگنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تنگ سی ایک دروازہ نما گلی تھی جس سے ایک وقت میں شاید ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ میں نے مزید کا شکوفہ ریواروں کی آمد کا انتظار نہیں کیا اور گتے کے پیچھے پیچھے اسی طرف لپک پڑا۔

اس تنگ سی گلی نے مجھے دوسری طرف ایک کشادہ گلی میں پہنچا دیا جہاں ایک کھلی سی جگہ پر کئی بیٹھیں بندھی ہوئی تھیں جو غالباً دھماکوں کی بازگشت پر گردیں اٹھائی کر کے شکرانہ سے انداز میں کان ہلا رہی تھیں۔ اس وقت تک کچھ لوگ بھی خوفزدہ سے انداز میں گھروں سے بھاگنے لگے تھے لیکن باہر گلی میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔

میں کسی کی پروا کیے بغیر بیٹھوں سے کھڑا کر نکلا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔ میں ایک اور کشادہ گلی میں جا پہنچا جہاں مکان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نہیں تھے۔ نہ جانے کیوں بیچ میں کافی جگہ خالی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے رکا۔ میں اس سمت میں بھاگنا چاہتا تھا بدھ سے میں گاؤں سے باہر نکل جاتا۔

اچانک میرے عقب میں کہیں کا شکوفہ گرجی۔ معلوم نہیں انہوں نے کس پر گولیاں چلائی تھیں۔ شاید یونہی دہشت پھیلانے

تھا۔ لیکن اس ایک دل گھٹس سے کچھ کے لئے بغیر یک دم ہی اسی ڈرا کر بھی تو بھاگا نہیں جاسکتا تھا۔

اس تاخیر کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے گلی کے اپنی سرے کی طرف دو قدم بڑھائے۔ تیسرا قدم بڑھانے کی نوبت نہیں آئی۔ اسی لمحے گلی کے سرے پر دو سانے نمودار ہوئے۔ ان کے انگوٹوں میں کلا شکو نہیں بھی مجھے نظر آگئیں۔ اسی لمحے کسی مکان کی کڑکی سے گھنٹہ کی روشنی ان میں سے ایک کے چہرے پر پڑی اور میں نے اسے پہچان لیا۔ میرے جسم میں خفیف سی سنسنی دوڑ گئی۔ وہ بہت علی تھا۔

انہوں نے بھی یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ کلا شکو نہیں بندھی کرنے ہی لگے تھے۔ زندگی یا موت کے انتخاب کے لیے وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔ میرے پاس شاید ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت تھا۔ اگر میں لپٹ کر بھاگتا تو یقیناً وہ دونوں برسٹ مارتے۔ تاہم زیادہ نہیں تھا۔

ریوالور میرے ہاتھ میں اچکا تھا۔ تمام تر جھلٹ کے باوجود میں نے نہایت ٹھنڈے دل سے دو نائز کیے۔ دونوں کے لیے ایک ایک گولی لگی تھی۔ میں نے دونوں کو اچھل کر گرتے دیکھا۔ جو کام میں کئی مرا میں ادھر اچھوڑ آیا تھا، وہ گویا اب پورا ہوتا دکھائی دیا۔

جس طرف وہ دونوں گرے تھے اب اسی طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ میں مشتقی سے انداز میں گلی کے دوسرے سرے کی طرف گویا اور نہایت بروقت ہی گویا کیونکہ میں اسی لمحے ادھر سے گئی، وہ کلا شکوفہ نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ وہ دو کلا شکو نہیں بندھی بھی کیے ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھتے اور ان کی انگلیاں ٹریگر دیا میں، میرے ریوالور سے تقریباً ایک ساتھ ہی نکلنے والی دو گولیاں ان کا بھی لمو چاٹ گئیں۔ وہ دونوں ہی اونڈے سے منہ کرے۔ شاید اس لیے کہ دونوں بہت تیزی میں تھے۔

مجھے خوشی تھی کہ میرا نشانہ بے خطا رہا تھا۔ ایک گولی بھی غلط نہیں گئی تھی۔ مجھے بڑی کنایت شعاری سے کام لینا تھا۔ ریوالور میں صرف چھ گولیاں تھیں۔ اس سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی تھیں اور اسے دی لوڈ کرنے کے لیے میرے پاس فاضل گولیاں نہیں تھیں۔ ان چھ گولیوں میں سے چار خرچ ہو چکی تھیں۔

بہر حال ریوالور سے صرف چار نائزوں میں چار کلا شکوفہ نمودار ہو کر ڈیر کوئی کوئی بڑی کارکردگی نہیں تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو اور اس ریوالور کو شاباش دی۔ مجھے اس ریوالور کی فزکس سے ذرا ہی تھا۔ وہ پولیس والے کا ریوالور تھا۔ دھوکا بھی دے سکتا تھا۔ مجھے پولیس والوں کے اسلحے کی برسوں استعمال کی نوبت نہیں آئی تھی اور اسے تنگ لگ جاتا تھا۔

میں اس ریوالور کو ڈر محمد کی بیٹھک میں آرام کے دوران چپک

پرتھال

قمر اجنالوی قیمت: =/125

کے لیے ہوائی فائرنگ کی گئی۔ اس وقت تک میں ایک سے متنبہ کر کے دو ڈراپ تھا۔ ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ چنر سیکڑہ بعد ہی میں ایک گلی کے سرے پر پہنچا تو سامنے ہی مجھے گھلا میدان سا نظر آیا۔ اس گلی کے کونے پر خوب روشنی تھی۔ دراصل اس کونے پر ایک چائے خانہ تھا جس کے سامنے لکڑی کی بیچیں دو در تک بچلی ہوئی تھیں۔ یہ دیو کے چھپرے ستودان سے کافی ملتا جلتا تھا۔

فائرنگ کی گواہیں پوری شدت کے ساتھ تو نہیں ابلتے کسی نہ کسی حد تک یہاں بھی کچھ گچا کچھ تھیں کیونکہ یہاں سکوت پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سکوت ہوتا نہیں چاہیے تھا کیونکہ کافی لوگ موجود تھے۔ کچھ دیر پہلے تک وہ یقیناً خوش گھول میں مصروف تھے لیکن اب سر اٹھائے اور دھڑکے رہے تھے۔

اسی لمحے میدان کی طرف سے ایک نو عمر لڑکا چم چم کرتی ایک نئی موٹر سائیکل پر بیٹھا نہایت کم رفتار سے اسے چلاتا ہوا ایک تنچے کے قریب آکر رکا۔ وہ خود بھی صاف شہرے لباس میں تھا اور خوب کنگھی پٹی کر کے نکلا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ موٹر سائیکل اسے اسی روز ملی ہو اور وہ چائے خانے پر اپنے دوستوں کو دکھانے لایا ہو۔

اچانک کھانکھوف ایک بار پھر گئی۔ اب بھی اس کی آواز قریب سے ہی آئی تھی۔ اگر وہ لوگ میرے متناقب میں آ رہے تھے تو یہ کام یقیناً میرے حق میں بہت اچھا کر رہے تھے کہ اپنی آمد کی اطلاع دیتے آ رہے تھے جس طرح پولیس والے خوب سائزن بجاتے کہتے فرے آتے ہیں اور راستے بھر گویا مجرموں کو خبردار کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی حفاظت اور فرار کا کوئی معقول برآمدہ دست کر لیں۔ اس کے باوجود اگر وہ نہ بھاگ پائیں تو یہ ان کی بالائقی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد پولیس کو باڈی تحراست ان ٹالانقوں کو پکڑنا ہی پڑتا ہے۔

نئی موٹر سائیکل والا لڑکا بھی چائے خانے پر آکر رک گیا تھا لیکن قدرے خوفزدہ تھا اور دھڑک دھڑک رہا تھا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ مجھے ابھی کوئی بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔

میں نے اس ایک لمحے میں جو فیصلہ کیا وہ مجھے اچھا تو نہیں لگا لیکن مجبوری آن پڑی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے یکدم اندھیرے سے نکل کر لیے لیے دو تین ڈگ بھر کر لڑکے کے قریب پہنچا۔ ریوالور اس کی پولیس پر رکھ دیا اور پہلی آواز میں حکم دیا۔ ”موٹر سائیکل چھوڑ دو۔“

میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ ایک خطرناک شخص کا لہجہ محسوس ہو جو اپنے حکم کی تعمیل نہ ہونے پر قتل بھی کر سکتا تھا حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لڑکے کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں لیکن وہ موٹر سائیکل چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ شاید اس کی آرزو بڑے جتن سے پوری ہوئی تھی اور شاید موٹر سائیکل پر وہ اس کا پہلا ہی دن تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے پینڈل زیادہ

بنتی سے پکڑا تھا۔ تاہم اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ دو تین جیتی سیکڑہ ضائع ہو چکے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ سے پینڈل پکڑتے ہوئے ریوالور زیادہ سختی سے اس کی پولیس میں چھوڑا۔ اس نے پینڈل چھوڑ دیا لیکن موٹر سائیکل سے نہیں اُترتا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ درحقیقت اس کے جسم سے یکدم ہلان سی نکل گئی تھی۔ اس میں موٹر سائیکل سے اُترنے کی بھی ممکن نہیں تھی۔

میں نے اسے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کچھ دور کچی زمین پر جا کر میں نے ریوالور داغوں میں دبا دے ہوئے موٹر سائیکل سنبھال لی۔ موٹر سائیکل ابھی اسٹارٹ ہی تھی۔ میں نے اسے دائرے میں گھمایا اور دائرہ مرکز کی طرف روانہ ہو گیا۔ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں کھٹ کھٹ گیس پد پد لڑا اور رفتار بڑھا تا چند سیکڑہ میں چائے خانے سے دور نکل آیا۔

میرا دائرہ درست ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد میں اندھیرے میں ایک سڑک تک پہنچا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے موٹر سائیکل کو اس کی انتہائی رفتار سے دوڑانے کی کوشش کی۔ وہ بہت کم طاقت کے انجن کی موٹر سائیکل تھی لیکن وہ سڑک بھی کچھ ایسی شاندار نہیں تھی۔ اس پر جا بجا کڑے تھے، گیس عجیب و غریب قسم کے اُبھارے اور کہیں سے وہ شلکتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے لیے وہ سڑک اجنبی بھی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس میں کہاں موڑ آجیائے کہاں کوئی رکاوٹ ہو۔ اس صورت میں اتنی جلدی موٹر سائیکل کو کچھ پوری رفتار سے دوڑانا کم خطرناک نہیں تھا۔ کہیں بھی کوئی جھیرے لڑھکنے کا باعث بن سکتی تھی جس کے نتیجے میں کوئی کتا یا شیش پاش ہو سکتی تھی اور ہاتھ پاؤں بھی ٹوٹ سکتے تھے۔ لیکن میں تنہا تقدیر چلا جا رہا تھا۔

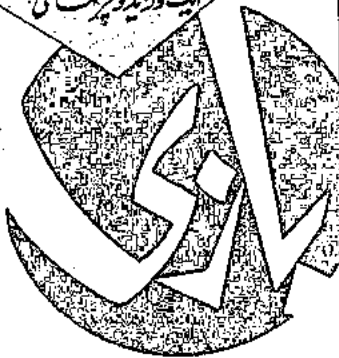
شکستراش

اعظم علیہ قبت - 300

شیو سینگ کے رہشت گرد

اسے عہد قبت - 600

لا تعدلوا دینکم بغير ما نزل به  
ایم اے واحث کی  
ایک وراید وچرکائی



- ایک ایسی کہانی جس کو مکمل کئے بغیر  
رکنا ناممکن ہے۔
- چار حصوں میں شائع ہو گئی ہے۔
- کتابیں پیپر بیک پرنٹڈ بکسٹ مرزق  
کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

قیمت فی حصہ: ۰۰/۰۰ ۶ روپے  
مکمل سیٹ: ۰۰/۲۸ ۲ روپے

مکتبہ القرآن

۱۰۰ بازار لاہور

کئی بار میں نے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی گاڑی اپنے تعاقب میں  
آئی دکھائی نہ دی۔ ویسے بھی مڑ کر پر کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ صبح ہی  
دور میرے گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ ان علاقوں میں سر شام مڑ کر  
پر ٹریفک بند ہو جاتا تھا۔

مطمن ہو کر میں نے رفتار ذرا کم کر لی۔ اس رفتار سے چند  
منٹ کے سڑک کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں خطرے کی حدود سے  
نکل آیا تھا لیکن میں اس وقت جب یہ خیال میرے ذہن میں آیا  
مجھے موز سائیکل کے عقب نما کیلئے میں دو روشن نقطے سے نمودار  
ہوئے دکھائی دیے۔

میں نے مڑ کر دیکھا وہ دو ہیڑلائٹس تھیں اور جس تیزی سے  
وہ پہلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی  
گاڑی بہت تیز رفتار تھی۔ میرے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر موز سائیکل کی رفتار بڑھائی اور چند لمحوں  
بعد مڑ کر دیکھا۔ ہیڑلائٹس کچھ اور قریب آچکی تھیں۔ اب میں  
انہیں پہچان بھی سکتا تھا۔ وہ یقیناً کسی جیب کی ہیڑلائٹس تھیں۔  
میں اس مڑ کر پر اس موز سائیکل پر تیز رفتاری کے معاملے میں  
جیب کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے ایک بار پھر گردن ہٹا کر دیکھا۔ جیب کچھ  
اور قریب آچکی تھی۔ اس وقت میں موز سائیکل کے ساتھ ساتھ اس  
کے انجن کی خفیف جگ جگ جگ بھی سن سکتا تھا۔ پھر ایک دھماکا  
سنائی دیا جو اس دیر سے اس کو شکست میں بہت بلند محسوس  
ہوا۔ اس کے بعد جیب نے دو اور دھماکے کیے۔

دو اصل واقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لیکن میری خوش  
حسی تھی کہ جیب اور موز سائیکل دونوں ہی جیبز پر مڑ کر ہوئے۔  
اور فاصلہ اب بھی اچھا خاصا ہونے کی وجہ سے گولیاں میرے  
پیشانی پر نہیں سے گزر رہی تھیں۔ موز سائیکل کی ہیڑلائٹ کی روشنی  
سڑک پر لمبائی تھی اور ٹیل لائٹ بھی روشن تھی۔ انہی دو چیزوں  
کو ڈھونڈ جاتے ہوئے وہ فائدہ کر رہے تھے۔ ان کے پاس یقیناً  
کلاشنکوف کے علاوہ رائلین بھی تھیں۔ اب تو جیب سے فاصلہ  
بچے ایک اور گاڑی کی ہیڑلائٹس بھی نظر آنے لگی تھیں۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تن پر تدبیر  
ی ٹیل لائٹ آف کر کے کہے میں آڑ پاؤں۔ ہیڑلائٹ کے ساتھ  
ی ٹیل لائٹ بھی آف ہو جاتی۔ اس کے بعد ان کے لیے یہ یقین  
کرتا مشکل ہو جاتا کہ میں کہہ رہا تھا؟ میری خوش حسی تھی کہ اب  
بھی مڑ کر کے دونوں طرف ناہوار لیکن میدانی علاقہ پھیلا ہوا  
تھا۔ فی الحال میرے اور تعاقب کرنے والی گاڑیوں کے درمیان اتنا  
فاصلہ ضرور تھا کہ اگر میں اچانک ہی اندھیرے کی آغوش میں آڑ  
جاتا تو ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہ کس سمت میں میرا

عقاب جاری رکھیں۔

میں نے سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ زندگی تو ہر طرح سے خطرے ہی میں تھی۔ اسی اثنا میں دو نماز مزد ہوئے ایک گولی تو میرے بالوں کو تقریباً چھوٹی ہوئی ہی گزرتی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ آف کر دی۔ انہیں یہ گمان بھی گزر سکتا تھا کہ ان کا فائر کار گر ہو گیا ہے اور میں موٹر سائیکل سمیت سڑک پر گر گیا ہوں مرنے کی وجہ سے موٹر سائیکل کی لائٹ بجھ گئی ہے۔

اسی امید کے ساتھ میں نے موٹر سائیکل کپے میں اُتار لی اور سڑک سے بالکل ہی مختلف سمت میں موڑ لی۔ موٹر سائیکل چھوٹے کھائی ہوئی بڑھی چلی گئی۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ موٹر سائیکل نئی ہونے کی وجہ سے اس کے انجن کی تواز برائے نام تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں ایسی چیز سے نہ ٹکرا جاؤں جو میرے لیے خطرناک ثابت ہو۔ راستے کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو رہا تھا لیکن اندھیرے میں اس بات کو دیکھنے علاقے میں اس رفتار سے موٹر سائیکل پر نہیں جانا چاہیے تھا جس رفتار سے اس وقت میں جا رہا تھا۔

میں نے کئی بار سڑک بھی دیکھا۔ سڑک کافی پیچھے رہ گئی تھی لیکن اس پر سڑک دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس مجھے نظر آ رہی تھیں لیکن کبھی زاویہ ایسا ہو جاتا کہ وہ میری نظر سے اوجھل ہو جاتیں۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس مقام سے آگے نکل گئی تھیں جہاں سے میں کپے میں مڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اندھا دھند چلے جا رہے تھے اگر وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ میں گولی کھا کر کہیں لڑھک گیا ہوں تب بھی انہیں صحیح اندازہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں تلاش کرنا چاہیے۔

مجھے امید تھی کہ کافی آگے جا کر انہیں احساس ہو گا کہ ان کا شکار سڑک پر کہیں گرا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ سوچیں گے کہ میں کپے میں سڑک کے دائیں یا بائیں کچھ دور جا کر اہوں گا۔ شاید وہ گاڑیاں واپس موڑ کر ہیڈ لائٹس کی مدد سے مجھے سڑک کے آس پاس تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

ظاہر ہے سڑک کے آس پاس میں کہیں بھی انہیں نہیں مل سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد ان کے لیے بڑی الجھن کھڑی ہو جائے گی۔ اس وقت تک میں اور دور نکل چکا ہوں گا۔ ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ اس بیکراں دیر انے میں میں نے کس طرف کاربند کیا ہو گا؟

گویا میں انہیں زاج دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ صرف اس لیے ممکن ہو سکا تھا کہ میں نے ہیڈ لائٹ آف کر کے اپنی زندگی کے لیے خطرہ مول لیا تھا۔ اگر میں ہیڈ لائٹ آن رکھتا تو مجھے راستہ دیکھنے اور خشیب و فراسے خبردار رہنے کی تو سہولت رہتی لیکن وہ آسیب کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے اور جلد یا بدیر آخر کار مجھ

تک ان پیچھے اب انہیں یہ یقین آنے میں بڑی دیر لگنا شروع میں نے ہیڈ لائٹ آف کر کے کپے میں اُترنے کی جرأت کی ہوگی۔ یہ سب کچھ سوچنے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہو گیا اور میں رفتار کچھ کم کر لی تاکہ حادثہ پیش آنے کا امکان ذرا کم ہو جائے مجھے اب خاطر خواہ سہولت میسر آچکی تھی۔ اب مجھے صرف یہ دکھا کر قسمت کمال تک میرا ساتھ رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سفر تھا بہت دشوار۔

کبھی موٹر سائیکل اچانک کسی گڑھے میں گر کر بری طرح الجھ گیا اور میں گرتے گرتے پچھا۔ کبھی اتنا برا لگتا تھا کہ موٹر سائیکل اس میں آڑی جاتی اور مشکل سے باہر آتی۔ کبھی اچانک ہی کڑا قورا سامنے آ جاتا اور اس سے ٹکرانے سے بچنے کے لیے مجھے اچانک ہی ہینڈل گھماتا پڑتا۔ اس طرح بھی میں گرتے گرتے پچھا۔ کسی گڑھے میں برساتی پانی موجود ہوتا اور جھینٹے اُڑتے تو مجھے ان ہاتھیں بھیجی محسوس ہوتیں۔ کہیں زمین نرم اور ریتیلی ہوتی۔ گڑھے میں موٹر سائیکل کی رفتار بالکل کم کرنا پڑتی۔

غرضیکہ بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں موٹر سائیکل پر سفر نہیں کر رہا تھا بلکہ سرکس میں کرتب دکھا رہا تھا۔ موٹر سائیکل کا فائر نہیں کیا حال تھا لیکن مجھے اپنا تجربہ خیرات محسوس ہو رہا تھا۔ دایرہ چولیس بھی گویا مل گئی تھیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ موٹر سائیکل ساتھ دیے جاری تھی اور جو خوراک میں برداشت کر رہا تھا وہ کانا منہ ثابت ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

یعنی مجھے اپنے عقب میں اب گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میں سڑک سے بہت دور نکل آیا تھا اور گاڑیاں بھی اب مجھ سے کہیں بہت زیادہ فاصلے پر تھیں۔ اس کے باوجود میں نے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ آن کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ البتہ اب میں ذرا اور کم رفتار سے زور اتحاد انداز میں سفر کرنا لگا۔

میں تقریباً ایک گھنٹا بچہ سفر رہا۔ پھر اندھیرے میں میرا سامنے ذرا اور گہرے اندھیرے کی ایک دیواری آگئی۔ قریب تھا کہ میں نے دیکھا وہ ایک نمر کا پیشہ تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو گلی کے پتھر پر چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اسے نیچے پھوڑ کر خود پیٹھے پر چڑھ کر دیکھا۔

نہر زیادہ چڑی نہیں تھی لیکن ظاہر ہے میں موٹر سائیکل سمیت تو سہارا نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں تک نظر کام کر رہی تھی وہاں تک کوئی پل و فیروہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نہر کے متوازی سفر شروع کر دیا۔ اب یہاں سمت بدل گئی اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ سمت بدلنا میرے لیے کیا منہ ثابت ہو گا یا نقصان دہ؟

تو دوسرے پونے گھنٹے کے سفر کے بعد آباد زمینوں یعنی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا اب کوئی نہ کوئی آبادی بھی

|       |         |                    |
|-------|---------|--------------------|
| 80/-  | اے حمید | صحرا کا چاند       |
| 250/- | اے حمید | پہلی محبت کے آنسو  |
| 100/- | اے حمید | اداس جنگل کی خوشبو |
| 200/- | اے حمید | چاند چہرے          |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

بہر حال اب بچتا فضول تھا۔ وہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے موٹر سائیکل وہیں چھوڑی اور پیدل آگے روانہ ہو گیا۔ دوڑنے کی اب ضرورت نہیں تھی۔ میں شخص تیز تیز چلنے پر اکتفا کر رہا تھا۔ کم از کم جالا پھیلنے تک تو میرا ہی رفتار سے چلنے کا ارادہ تھا۔ اس کے بعد مجھے از سر نو سست کا فیصلہ کرنا تھا۔

لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مجھے چلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پایا جہاں سائے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ درخت زیادہ گنجان نہیں تھے۔ وہ کوئی چھوٹا سا جنگل سا معلوم ہوا تھا لیکن میں نے اس میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں باہری باہر اس کے ساتھ ساتھ چلتے لگا۔

میں نے جنگل کے گرد گھومنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ جہاں درختوں کا سلسلہ ختم ہوا وہاں بھی میں سیدھا ہی چلتا رہا۔ رات کے اس سکوت میں 'ان انجی اور ان دیکھے دیرانوں میں' ایک بے سست اور بے منزل مسافر کے طور پر چلتا بھی عجیب سی تجربہ مجھے اس تجربے سے گزرتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اب میں کسی آبادی تک پہنچ جاؤں اور مجھے کوئی پناہ گاہ مہتر آجائے۔ اب مجھے یہ اطمینان تو ہو چکا تھا کہ میں دلبر خان اور اس کے آدمیوں کی رسائی سے بہت دور نکل آیا تھا اور اب میرا ان سے سامنا ہونے کا امکان بہت کم تھا۔

اس سمت میں سڑک میرے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ جلدی میں نے اپنے آپ کو سڑک پر پایا۔ یہ بھی تنگ سی ہی سڑک تھی لیکن اس کی حالت اس سے بہتر تھی جس پر میں اس سے پہلے سڑک کر چکا تھا۔ معلوم نہیں یہ اسی سڑک کا کوئی حصہ تھا یا یہ کوئی دوسری سڑک تھی۔ اس کے دونوں طرف کہیں کہیں بے ترتیب سے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔

میں نے اس کے کنارے کھڑے ہو کر دائیں بائیں نظر دوڑائی

زب ہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ درمیان پلڈیٹوں پر سڑک نہ رہا۔ جلدی مجھے تاریکی میں ڈوبا ہوا ایک گاؤں دکھائی دیا لیکن میں نے اس کا رخ نہیں کیا بلکہ سیدھا ہی نکلتا چلا گیا۔ گاؤں کی طرف سے بھی کچھ لوگ آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو کہیں کہیں کھیتوں کے درمیان بھی موجود تھا۔ ان میں سے ایک تو بے چارے بھی لپکا لیکن کچھ دیر کے عتاب کے بعد پچھا پچھو گیا۔ میں نے ابھی تک ہیڈ لائٹ روشن نہیں کی تھی اور گاؤں میں بھی غصہ احتیاطاً نہیں رکھا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ عتاب کرنے والوں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جاؤں۔ اب سست تبدیل ہونے کے بعد مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ جو سڑک میں نے چھوڑی تھی اگر اس میں زیادہ جھج و خم ہوئے تو کہیں میں دوبارہ اسی پر نہ پہنچ جاؤں 'اسی سے جڑی ہوئی کسی اور سڑک پر نہ جا نکلوں جس پر دلبر خان اور اس کے آدمی بھی غور فرمائیں۔

کھیتوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد ایک گاؤں اور آیا لیکن یہاں کے بھی قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اس سے چند میل آگے چلاؤ موٹر سائیکل میں پٹرول ختم ہو گیا۔ وہ ریزرو پر گھ گھنی اور باہر چل تو پڑی لیکن اب اس کے انجن سے دھواں نکلتا محسوس ہوا تھا۔ ظاہر ہے جس قسم کا سفر میں اس پر کر رہا تھا وہ اس کے لیے سڑوں نہیں تھی تاہم اس نے میرا دبا ساتھ دیا تھا۔ اب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریزرو پر مزید کتنے میل چل سکے گی۔ چنانچہ لمبے لمبے لیے میں انجن میں پڑ گیا کہ کیا مجھے اس گاؤں کی رہنمائی دیا جائے جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا؟

اندر سے آواز گونگ کر رہی تھی کہ میں نے اس سے پٹرول ختم نہ جانے اس لیے عقل کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں اسی گاؤں کی رہنمائی مانگاں جس سے میں ابھی زیادہ دور نہیں آیا تھا لیکن بعض حالت میں میں عقل سے زیادہ اپنی حسرت پر مجبور ہو کر رہا ہوں۔ میری حسرت نہ جانے کیوں ابھی کچھ مطمئن نہیں تھیں۔ میں نے آپ کو ابھی خطرے سے محفوظ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میرے دل کی سوچ یہی آواز کہہ رہی تھی 'ابھی چلتے رہو۔ ابھی چلتے رہو۔'

اندر کی یہ آواز گونگ کر رہی تھی لیکن میں نے اس کے دے پر عمل کیا اور موٹر سائیکل واپس نہیں گھمائی البتہ اب اس نے اس حد تک خطرہ ضرور مول لیا کہ ہیڈ لائٹ آن کر لی۔ اس نے میں ہی آسانی ہو گئی۔

لیکن اس سولت سے میں زیادہ دیر تک استفادہ نہ کر سکا۔ سب ریزرو ختم ہو گیا۔ میں سلسلے سے لپکا ہوا گاؤں کی طرف ختم ہوا۔ موٹر سائیکل بیکار تھی اور وہی ہوا تھا جس کا اندازہ تھا۔ کوئی ایک آبادی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کوئی رسائی سے دور اندھیرے میں کیا کچھ تھا اس کے بارے میں کچھ جاننا تھا۔

تو بائیں طرف بہت دور کہیں مجھے روشنی کے آثار نظر آئے۔ میں نے اس طرف چلتا شروع کر دیا۔

وہ جگہ میرے اندازے سے زیادہ دور تھی تاہم مجھے بھی کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ جگہ میری نظر میں واضح ہوتی چلی گئی۔ وہ ایک نامسا بڑا چمچر رستوران تھا جس کے سامنے بڑی بڑی اور بھاری چارپائیاں منجھیں اور بے ہتھم میزیں بکھری ہوئی تھیں۔

چاروں طرف بانسوں پر چند ٹیوب لائٹس روشن نظر آ رہی تھیں جو غالباً بیڑے سے منسلک تھیں۔ خاصے فاصلے پر ہی مجھے انجن کی سی بجلی سی گھر گھراہٹ سنائی دیتی تھی۔ وہ جگہ خاص طور پر ٹرک ڈرائیروں کی پسندیدہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ چمچر کے آس پاس صرف چند ٹرک ہی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ دو چار افراد چارپائیوں پر بیٹھے اور دو چار دھڑا دھڑا آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے تاہم کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اوپر دھڑا آتے جاتے آدمیوں کی حرکات و سکنات میں بھی ایک مخصوص سی کابلی کی جھلک تھی جو رات بھر جانتے والاں میں رات کے پچھلے سپردیکھنے میں آتی ہے۔ رات کے سکوت اور خاموشی نے ماحول کو اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔

میں روشنی کی رسائی سے دور ہی رک گیا لیکن ایک ایسے زاویے پر پہنچ گیا تھا جہاں سے میں بہتر طور پر چمچر رستوران کا جائزہ لے سکتا تھا لیکن مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ میں اندھیرے میں تھا۔

ابھی میں صحیح طور پر جائزہ نہیں لے پایا تھا کہ ایک لمبی چوڑی چارپائی سے میں نے تین افراد کو اٹھتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے قریب کھڑے ہوئے ایک ہیرے کو کچھ اوائٹنگی کی اور وہ ہاتھیں کرتے ہوئے ٹھٹھنے کے سے انداز میں ایک ٹرک کے قریب آگئے جو چمچر کے ایک طرف اندھیرے میں کھڑا تھا لیکن میں کسی حد تک اس کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس پر تھپال تھی ہوئی تھی۔

ان میں سے دو افراد ٹرک کے اگلے حصے (کب) میں سوار ہو گئے۔ تیسرا کب کی چھت پر چڑھ گیا جہاں تابوت جیسا ایک خانہ سہا ہوتا ہے جس میں عموماً کلیئر سوتا ہے۔ وہ غالباً کلیئر ہی تھا۔ اوپر پہنچے ہی وہ غالباً اس حصے میں لیٹ گیا تھا کیونکہ فوراً ہی مجھے اس کا ہیولا نظر آئیندہ ہو گیا تھا۔

چند لمبے بعد خوفناک سی غراہٹ کے ساتھ ٹرک کا انجن جاگ اٹھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس اور ٹیل لائٹس بھی روشن ہو گئیں۔ ٹرک والے بیٹھا اس اوڑے پر کھانے پینے اور سنانے کے بعد اپنے سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔ اسی لمحے میں نے انسانی غلٹ میں ایک فیصلہ کیا۔

ٹرک تو وہاں ابھی کئی اور کھڑے تھے لیکن کسی کی روانگی کے آثار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں وہاں جا کر

سیدھے سادے طریقے سے کسی ٹرک والے سے لٹ کے درخواست کروں گا تو کوئی مجھے نہیں بھائے گا۔ اس علاقے میں حالات کچھ ایسے تھے کہ لوگ اپنے سامنے سے بھی بدکتے تھے شہر اہوں پر تو ان کی روشنی میں کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا رات کے پچھلے پراساں و پرانے میں اچانک ہی کسی ماسٹرم سے سے نمودار ہونے والے انتہائی کوکون اپنے ٹرک میں بٹھا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور ٹرک کے روانہ ہونے کی نوبت نہ جانے کب آتی۔ اس ٹرک کی لائٹس آن ہونے کے بعد مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پچھلے حصے میں توڑی بہت بگ خالی تھی۔ میں نے فوری طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ آگے بھاگ کر مجھے اس میں سوار ہو جانا چاہیے۔ راستے میں اپنے نکتہ نظر سے میں کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اتر سکتا تھا۔

ابھی ٹرک وہیں کھڑا گھوم گھوم کر رہا تھا۔ میں اندھیرے ہی میں رہتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھلا۔ اندھیرے میں اس کی ٹیل لائٹس کی سرخ سرخ روشنی بھی خاصی تیز محسوس ہوتی تھی۔ اس کے عقبی حصے کے قریب پہنچ کر میں روک کر ہی مائل میں آگیا تاکہ اگر کہیں کی چھت پر لینا ہوا کلیئر گردن اونچی کرے اوپر اُٹھ کر دیکھ بھی رہا ہو تو میں اس کی نظر میں نہ آؤں۔

قریب پہنچ کر تھد تھد ہو گئی کہ ٹرک کے پچھلے حصے میں کچھ بگ خالی تھی اور اس پر جن رسیوں سے تھپال بندھی ہوئی تھی ان کے درمیان بھی اتنا فاصلہ موجود تھا کہ میں ذرا آڑا تر تھا ہونے ہوا ٹرک میں داخل ہو سکتا تھا۔ اسی لمحے ٹرک نے رنگنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچ بچار میں مزید ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور لپک کر ٹرک کے پیچھے لٹ گیا۔

ٹرک ٹھم وائرے میں محسوس کر سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے پچھلے حصے کا رخ رستوران کی روشنیوں کی طرف ہوتا تھا میں اس کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ٹرک میں تھپال کے اتنی جگہ موجود تھی کہ کلیئر کی طرح میں بھی آرام سے لیٹ سکتا تھا۔ اور میں نے یہی کیا۔ یعنی آرام سے لیٹ گیا۔

ٹرک میں پھلوں کی بیٹیاں لدی ہوئی تھیں اور پھلوں کی بو بھی آ رہی تھی لیکن اس میں اس طرح کی گند کی نہیں تھی جیسی کہ ٹرکوں میں... اور خصوصاً پھلوں کی بار برداری کرنے والے ڈکان میں نظر آتی ہے۔ فرش بھی صاف ستھرا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی مستطیل صندوق میں لینا ہوا تھا۔ پچھلے حصے میں ہونے والے دھج سے جھکے ذرا زیادہ لگ رہے تھے لیکن یہ ان جھکوں کے مقابلے میں کچھ نہیں تھے جو میں اب تک برداشت کر چکا تھا۔ ماسٹرم منزلوں کی طرف میرا سفر جاری تھا۔ وقت اب بڑھ رہا تھا۔ گزرنا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں مسلسل سفر میں تھا۔ انسان حرکت میں رہے بھی زندگی کا احساس رہتا ہے وہاں لینے لینے کچھ گمان سا گزرا کہ شاید میں اس مسئلہ کا



میں ایک اور خیال نے سر اُٹھایا۔ کہیں میں لاشعوری طور پر اپنے ایک نوعیت کے حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے دوسری نوعیت کے حالات میں بناد تو تلاش نہیں کر رہا تھا؟ مجھے بھولنا نہیں چاہیے تھا کہ میں تو ریڈ ذات کی نظروں سے غائب ہونے کے لیے اپنے شہر سے بھاگا تھا جو کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ محسوس ہو گیا تھا جیسے ریڈ ذات کی نظروں میں کی توں میں بھی اپنے مطلوبہ انسان کو تلاش کر سکتی تھیں۔ تاہم ابھی تک آثار کی تلاش ہے تھے کہ میں انہیں واضح دینے میں کامیاب ہو چکا تھا ان کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا دنیا کی بھیر میں غائب ہو چکا تھا۔

شاید ان سے نمٹنا میرے لیے زیادہ دشوار زیادہ خوفناک کام تھا اس لیے اس کے مقابلے میں میں نے ان دشواریوں میں ان صعوبتوں کا انتخاب کر لیا تھا جن سے میں گزر رہا تھا۔ یہ گویا ایک طرح کا فرار تھا ایک قسم کا اعتراف شکست تھا۔

مجھے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ میں اپنے انتہائی قیمتی اور جاں نثار ساتھیوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا تھا۔ مجھے خصوصاً راجیل اور ٹونی کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا جنہوں نے غامض طور پر میری خاطر اپنے آپ کو قربانی کے بکرے بنالیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں یہ باتیں بھولنا نہیں تھا۔ زندگی خواہ سستی ہی منتشر گزروی تھی روز و شب خواہ کتنے ہی دشوار تھے لیکن میں نے اپنا ان کے بارے میں سوچا تھا۔ تاہم میں نے اسی خیال سے کچھ اطمینان محسوس کیا تھا کہ وہ سب میری ہی طرح حالات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے تھے دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی کی بھی ذات کو اصل خطروں میں نہیں تھا۔ ریڈ ذات کا اصل معتب صرف میں ہی تھا۔ وہ غیر ضروری کاموں میں الجھنے اور بے مقصد اپنی توانائیاں ضائع کرنے والے لوگ نہیں تھے۔

مجھے یقین تھا کہ ان کی توجہ صرف اور صرف مجھے تلاش کرنے

اور انفرادی تفری، موت و حیات کی کشمکش اور صعوبتوں سے لاشعوری طور پر کچھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شاید صدمہ پسندی میری فطرت کی بنیادوں میں کہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید خطرہ پسندی میری طبیعت کا ایک حصہ تھی لیکن یہ لاشعوری رجحانات میری مصروفیات میں کچھ رعب کر رہے تھے۔ بلکہ شاید دیے نہیں تھے ہر روز میں ہی کسی نہ کسی انداز میں ان کی تسکین کا سامنا ہو رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد تھا میں نے کبھی ہر سکون زندگی تو گزاری ہی نہیں تھی۔ مجھے یکساں اور سپاٹ انداز میں زیادہ دن گزارنے کا تو کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اس لیے شاید میں سطحی طور پر تو ہر سکون زندگی گزارنا پسند کرتا تھا لیکن میرے اندر گہرائی میں کہیں کوئی پارہ صفت، سیلابی اور دشواریوں کی طلب رکھنے والا شخص چھپا ہوا تھا جو لاشعوری طور پر خود قدم قدم پر اپنے آپ کو آزمائنا چاہتا تھا ہر گزری اپنی صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ شاید اسی میں اس کے لیے کوئی لطف کوئی لذت نہاں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ موجودہ حالات میں میں اتنا زیادہ پریشان نہیں تھا جتنا کہ ان حالات میں ایک عام شخص کو ہونا چاہیے تھا۔

جس طرح میں خود کو بھنگا رہا تھا اس میں قدم قدم پر ایک نئی دشواری سامنے آتی تھی ہر روز گویا زندگی کا ڈھب بدل جاتا تھا ہر روز پر ایک نئی ہی مصیبت ٹھکرتی تھی۔ اسی لیے شاید تھوڑے ہی دنوں میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے گھر سے نکلے ایک نانا بیت گیا تھا۔ شاید میں مدتوں سے یونہی گنماں اور بے حیثیت تھا۔ گنماں اور بے حیثیت رہتے ہوئے اپنے مسائل کو حل کرنا اور مصائب کا سامنا کرنا ایک الگ ہی ہنر ہے۔

آپ شہر کے ممتاز شخص ہوں، آپ کے پیچھے دولت اور اثر و رسوخ کی طاقت ہو، آپ کے اشارے پر حرکت میں آجائے والے بہت سے باصلاحیت اور وفادار لوگ موجود ہوں، آپ ٹائڈار کو ٹیٹی میں رہتے ہوں، عالی شان آفس میں بیٹھتے ہوں، آپ کے ایک ٹیلی فون پر بڑے بڑے کام ہو جاتے ہوں تو اس میں آپ کا کوئی خاص کمال نہیں ہوتا۔

آپ کی صلاحیتوں کی آزمائش اسی وقت ہوتی ہے جب آپ ایک گنماں اور بے حیثیت شخص ہوتے ہیں، آپ کے جسم پر چھنے پڑنے کے بڑے ہوتے ہیں، موت ہر روز نہ جانے کتنی بار عقاب کی طرح آپ پر چھنچھتی ہے لیکن آپ ہر بار اسے ٹھل دے جاتے ہیں۔ اپنی اپنی تلبہ بڑی طاقت رکھنے والے لوگ آپ کے خون کے باہر ہوتے ہیں لیکن آپ انہیں ادھر سے ادھر پھرتے ہیں۔ یہی بات چلتا ہے کہ آپ میں واقعی کچھ صلاحیت ہے، آپ زندگی کا ہنر جانتے ہیں۔

شاید میں انہی سوچوں، انہی محسوسات سے لذت اندوز ہو رہا تھا لیکن پھر اس کموں کموں کرتے ٹوک میں لیٹے لیٹے میرے ذہن

|                                   |                           |
|-----------------------------------|---------------------------|
| امریکہ سے امریکہ                  | طارق اسماعیل مارگر، 150   |
| مسیحیت اور عالم اسلام             | طارق اسماعیل مارگر، 125/- |
| کورٹ مارشل                        | طارق اسماعیل مارگر، 200/- |
| آخری گناہ کی سلسل                 | طارق اسماعیل مارگر، 150/- |
| مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2 |                           |

اندازہ ہوا کہ کلیر انٹر بیٹا تھا اور کیم کی چست سے اترتا تھا۔ میں بھی سمجھا کہ شاید محنتی پولیس کی کوئی گاڑی اس سڑک پر پہنچی ہے اور انہوں نے کانفرنس وغیرہ دیکھنے کے چکر میں ٹرک کو روک لیا ہے۔ ایسے موقعوں پر عام طور پر کچھ اور ہی قسم کے "باتھ روم کانفرنس" دیکھنے کے بعد معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے اور ڈرائیور کو پروانہ دیا دیا مل جاتا ہے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے نیچی آواز میں کسی کو پوچھ لیا۔ وہ نہ تو آواز سے پولیس والا معلوم ہوتا تھا اور نہ ہی اس نے بات پولیس والوں جیسی کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "میر خان! ٹرک آگے مت لے کر جانا۔ آگے رنجیز نے روڈ بلاک کر رکھا ہے۔ شاید اس ٹرک کی بجھی ہو گئی ہے۔"

"اے خانہ خراب! مرادو!۔۔۔ اب کیا ہو گا؟" کوئی تیزی سے بولا۔ وہ غالباً میر خان تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ہر مسئلے کا حل تلاش کر رکھا ہے۔" پلی آواز نے کہا۔ وہ آواز بالکل پرسکون تھی "تم ابھی اس کام میں تے ہو اس لیے پریشان ہو گئے ہو لیکن ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جہاں سے انہوں نے روڈ بلاک کیا ہے اس کے دوسری طرف سے ایک خالی ٹرک آ رہا ہے۔ دو چار منٹ میں وہ یہاں پہنچ جائے گا۔ صرف اسلئے کی بیٹیاں اس میں لا دو۔ وہ واپس شیراز کے اڑے پر چلا جائے گا۔ ہم کل پرسوں یا پھر کسی اور وقت اسے یہاں سے گزرا دیں گے۔ تم صرف فروٹ لے کر اپنا سفر جاری رکھو۔ رنجیز کو تلاش لینے دو۔ وہ سمجھیں گے انہیں غلط خبر ملی تھی لیکن اگر تم اس موڑ سے نہ گزرو گے تو وہ پڑواؤں کرتے ہوئے اس روڈ پر آجائیں گے اور بہت دور تک تمہارے ٹرک کو دھوونے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن اسلئے کی بیٹیاں تو فروٹ کی بیٹیوں کے بالکل بچ ہیں اور کانی بچے چھپی ہوئی ہیں۔ یہ میر خان کی آواز تھی "سارا مال اٹانا پڑے گا یہ کام دو چار منٹ میں تو نہیں ہو سکتا۔"

"کوئی بات نہیں" پرسکون آواز نے جواب دیا "دو چار منٹ نہ سہی، دو آدھ منٹ میں کام ہو جائے گا۔ دو آدھ منٹ ہمارے پاس ہیں، دو آدھ میرے پاس بھی ہیں۔ سب مل کر کام کرتے ہیں۔ ویسے اگر رنجیز اس ٹرک کا انتظار کرتے کرتے اوپر چل بھی پڑے تو ہم نے راستے میں انہیں الجھائے گا بندوبست کر رکھا ہے ہم اب اس میدان کے پرائے کھلاڑی ہو چکے ہیں۔ ہمیں جو کام کرنا ہوتا ہے ہر حال میں کرتے ہیں۔ ان چھوٹی موٹی رکاوٹوں سے ہمارے کام نہیں رک سکتے۔"

میں نے ٹرک کی سائڈ کی دیوار سے ذرا سا سر نکال کر۔ کئی ایسکین احتیاط سے اس طرف دیکھا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اوپر کسی آدھ کھڑے تھے۔ تین تو غالباً اس ٹرک سے تھے۔

پر مرکوز رہی ہوگی۔ میرے ایک ساتھی مندر نے خود ہی بے پناہ اصرار کر کے میرے لیے قربانی کا بہت ہی خاص القاص بکرا بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی شخصیت مجھ سے کافی ملتی جلتی تھی۔ ایک آپ میں انوار کی مدد سے میں اسے اپنا ڈپٹیٹ بنا کر چھوڑ دیتا تھا لیکن اس کو شش کا شاید کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ جب میں فرار ہوا تو میری شکل اور حلیہ وغیرہ سب کچھ تبدیل شدہ ہونے کے باوجود ریڈ ڈاٹ کے موت کے ہر کاروں نے بہت دور تک میرا ہی تعاقب کیا تھا۔

موت کے ہر کارے جو غوطہ خوردوں کے سے لباس میں گہر کوئی مختصر سی مشین باندھے اڑتے ہوئے آئے تھے انہوں نے لاہور سے بہت دور بھی مجھے تلاش کر لیا تھا اور وقتی طور پر شاید انہیں اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر انہوں نے تحقیق کر لی ہوگی کہ میں مرا نہیں تھا اور نہ ہی وہ ڈپٹیٹ وغیرہ بھی چیزوں سے بے وقوف بننے والے تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ فی الحال وہ میرا سراغ کھونچتے تھے۔ میرے وجود کے ساتھ شاید اب کوئی ایسی جگہ نہیں رہی تھی جو میرے بارے میں اس کی رہنمائی کرتی تھی۔

یہ سمجھ کچھ سوچ کر ہی میں اپنے آپ کو ان اجنبی اور دور افتادہ علاقوں میں گم کیے ہوئے تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں تھی۔ اس وقت بھی ٹرک میں لینے لینے میں نے یہ سب کچھ سوچا اور اپنے آپ کو سمجھا یا کہ فی الحال مجھے صرف درپیش حالات کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔

کانی دیر تک سفر بہ خیر و عنایت جاری رہا۔ میں ٹرک کے پچھلے تختے اور پہلوں کی بیٹیوں کے باقریب انبار کے درمیان لیٹا ہوا تھا۔ میرے اوپر تیرال کی ترجمی چھت تھی۔ بڑی محفوظ سی جگہ تھی۔ ٹرک بھی کچھ ایسی یکساں رفتار اور گھوں گھوں کی ایسی مسلسل آواز کے ساتھ رواں دواں تھا کہ مجھے اونگھ سی آنے لگی۔ شاید کچھ دیر کے لیے میرا ذہن خود کی سے منسوب بھی ہو گیا تھا۔

"دوبارہ میرا ذہن مستعد ہوا تو میں نے ٹرک سے ذرا بھاگ کر دیکھا۔ ابھی صبح صادق کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ اچانک ہی ٹرک کی رفتار کم ہو گئی اور وہ تھوڑا سا بچے میں اترنے لگا۔ اس کے دوسری طرف کچھ روشنی بھی لہرائی دکھائی دی۔ غالباً مخالف سمت سے کوئی دوسری گاڑی آ رہی تھی۔ ٹرک اسے راستہ دے رہا تھا۔

لیکن پھر ٹرک پوری طرح ہی کچے میں اتر کر رک گیا اور آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ مخالف سمت سے آنے والی گاڑی ٹرک کے قریب ہی آن رکی تھی۔ کسی نے یہ آواز بلند کچھ کہا۔ ٹرک کی گھر گھر اسٹ میں، میں الفاظ نہ سمجھ سکا لیکن دوسرے ہی لمحے ٹرک کا انجن بند کر دیا گیا۔

میں نے کیم کی چست پر بھی ہلکی آوازیں سُنی جن سے

میں نہیں تھا۔ وہ لوگ اس ٹرک میں سے کچھ بینیاں اُتار کر دوسرے ٹرک میں لادنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اب وہ دوسرے ٹرک کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اب اس ٹرک سے اتر کر کھٹک لینا چاہیے تھا۔

اسٹے کی اسٹلگ اور نقل و حرکت میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا ہمارے ہاں پچاسوں ایسی قوتیں کام کر رہی تھیں جو ملک کو اسٹیل خانہ بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ لوگ ہر وقت بارود کے ڈھیر بیٹھے رہیں گھروں میں کھائے کو نہ ہو لیکن اسٹے کے انبار ضرور ہوں اور ہر لمحہ ایسے شوشے بھی چھوڑے جاتے رہیں جن کی بنیاد پر اس اسٹے سے لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں بالکل نہ ہچکچاتے۔

لیکن نہ جانے کیوں اس سیاہ سرسبز کی موجودگی مجھے احساس دلادی تھی کہ معاملہ اس سے بھی کچھ آگے کا تھا۔ اس کی جڑیں کچھ اور بھی گہری، کچھ اور بھی تنگ تھیں۔ میرا پی ہاں کہ ٹرک سے اتر کر کسی طرح آگے جاؤں اور ریجنز کو صورت حال سے خبردار کروں لیکن ظاہر ہے یہ کام میرے لیے تقریباً ناممکن تھا اور ایک لمحے بعد تو بالکل ہی ناممکن ہو گیا جب گاڑی سے اترے ہوئے شخص نے ٹرک ڈرائیور کو حکم دیا کہ ٹرک اور دھڑو فحش کے پیچھے لے جاؤ۔

یہ کہہ کر وہ چلنے کے سے انداز میں ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف آئے۔ ٹرک کے حرکت میں آنے کے بعد بھی اس کے پچھلے حصے کا رخ ان لوگوں کی طرف ہو سکا تھا۔ تب میرا اُترنا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں ان کی نظر میں آئے بغیر نہیں اُتر سکا چنانچہ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور دوسرے ہی لمحے غمایت تیزی سے ٹرک سے اُتر گیا۔

میں نے پوری کوشش کی تھی کہ ذرا سی بھی توجہ پیدا نہ ہونے پائے اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جس تیزی سے میں اُترتا تھا اسی تیزی سے ٹرک کے پیچھے گھس جاؤں گا اور اس کے اشارت ہوتے ہی اس طرف کو رخ جاؤں گا پھر زیادہ اندر میرا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت تک اگر کوئی پیچھے آجھی گیا تو اس کا دھیان ٹرک کی طرف ہی رہے گا، نظر ذرا اونٹنی ہی رہے گی اور میں سینے کے بل رینگتا ہوا کچھ دور نکل جاؤں گا۔ جہاں میں اپنے آپ کو ذرا محفوظ محسوس کرنا وہاں سے اٹھ کر دوڑنا شروع کر سکتا تھا۔

لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میری بد قسمتی یہ رہی کہ ٹرک سے نیچے پاؤں رکھتے ہی براہِ سارا ایک چمڑائی جگہ سے اچھا خاصا بل گیا۔ ٹرک نیچے میں ذرا ترچھا کرنا تھا اور میرا پاؤں اس چمڑے پر گیا تھا۔ میں نے توجہ اپنا توازن نہیں کھوایا لیکن وہ چمڑا لڑھک کر ایک اور چمڑے تک گیا۔

غایت خفیف سی آواز بیدار ہوئی۔ اگر اس وقت ٹرک

اُترے تھے جس پر میں چھپا ہوا تھا۔ ایک دو شاید اس گاڑی سے اُترے تھے جو مخالف سمت سے آئی تھی۔

اس گاڑی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے جسم میں سنسنی کی جلی جی لہر دوڑ گئی۔ میں جب لاہور سے فرار ہوا تھا اور راستے میں اپنی بیٹیاں اُٹھانے کے بعد ایک بس میں بیٹھ کر لاہور اُڑے پچھا تو وہیں نے اُڑے کے باہر 'ٹرک' کے دوسری طرف ایک سیاہ سرسبز کھڑی دیکھی تھی۔ اس کے پیچھے بھی ٹرک تھے۔ اس میں کوئی بیٹھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس ویران سڑک پر دھندلی مدھنسی میں ایک طرف کو کھڑی تھی لیکن نہ جانے کیوں بے حد پراسرار' بعد نظر تک محسوس ہوئی تھی۔ کسی مغربی کی طرح۔

اس وقت میری حسیات شاید کچھ زیادہ سی کام کر رہی تھیں، ان میں ضرورت سے زیادہ تنگنائیاں آچکا تھا، اس لیے مجھے وہ گاڑی محض ایک بے جان یا مشینی ڈرائیو تصور نہ تھی بلکہ ایک خاص ماننے میں مدہنی ہوئی شخصیت یا مخلوق محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس گاڑی کا تعلق کسی ہستی یا خطرناک معاملے سے تھا اور میری کوئی حس اس کے بارے میں مجھے متنبہ کر رہی تھی۔ بہر حال۔۔۔

تنگائی میں کبھی کسی گاڑی کو دیکھ کر میرے جسم میں اس طرح سنسنی نہیں دوڑتی تھی۔ سرسبز میرے پاس بھی تھی اور میری پسندیدہ زین گاڑی تھی لیکن کبھی کسی سرسبز کو دیکھ کر میں اس طرح متنبہ نہیں ہوا تھا۔

تاکل و کربات یہ تھی کہ اس وقت بھی ٹرک کے پاس بالکل لگائی ایک سیاہ سرسبز کھڑی تھی۔ اس کے بھی پیچھے ٹرک تھے اور ٹرک کی چھوٹی بیٹوں کی مدھن مدھن میں وہ اور بھی زیادہ سیاہ اور کئی زیادہ پراسرار لگ رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں نے بلب کے علاقے میں یہ سیاہ سرسبز دیکھی تھی اس پر لاہور کی گہرے نیل تھی اور اس وقت اندرون سندھ کے اس علاقے میں جو یہ سرسبز دیکھ رہا تھا اس پر کراچی کی گہرے نیل تھی۔

سرسبز کے چاروں طرف دوڑاڑے بند تھے اور کھڑکیوں کے پیچھے سے ہوتے تھے نہ جانے کیوں مجھے ایک احساس یہ بھی تھا کہ اس سے اتر کر بات کرنے والے قطعی غیر اہم لوگ تھے۔ اصل اہم شخصیت گاڑی میں ہی موجود تھی اور ٹرک والوں کو شاید اس کی غور کا احساس بھی نہیں تھا لیکن مجھے اتنی دور بیٹھ کر بھی صحیح انداز پر دیکھ بھری نہ جانے کیوں یہ سب کچھ محسوس ہوا تھا۔

لی گھوسات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں کوئی جواز یا جرم نہیں کی جاسکتی۔ خصوصاً میرے معاملے میں تو بار بار ایسا آ رہا تھا۔

لیکن اس وقت درحقیقت میں ان سب کے بغور کرنے کی

توجہ میں نہیں تھا۔ میرے لیے تو سب سے اہم اور قابلِ غور

درد تھا ان لوگوں کی تنگ کوئی جگہ کے نیچے میں سامنے آیا تھا۔ ثابت

وہ تھا کہ اس سواری کو کبھی زیادہ دور استعمال کرنا میرے نصیب

میں درخت پر چڑھ جانا کئی بار میرے کام آچکا تھا لیکن اس کے  
ضروری تھا کہ انسان کو گھری کی طرح تیزی سے درخت پر چڑھ  
میں مہارت حاصل ہو۔

مجھے یہ مہارت حاصل تھی۔ میں نے ایک بار بحیرا سی ندیر  
کام لینے اور اسی انداز میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ایک درخت  
مجھے کافی تیار اور گھنٹا دکھائی دیا۔ میں تیزی سے اسی پر چڑھ کر  
کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب تک روشنی قریب آئی ٹھانڈی  
اور پتے دوبارہ ساکت ہو چکے تھے میرے درخت پر چڑھنے سے  
تھوڑی سی ہلچل برپا ہوئی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔

وہ لوگ سرخ لائٹ اور ادھر ادھر کھاتے نہایت مختار انداز پر  
چلے آ رہے تھے۔ تعداد میں وہ چار تھے اور ان میں سے ہر ایک  
ہاتھ میں کوئی نہ کوئی گین تھی۔ وہ جین میرے نیچے سے گزرتے اور  
برہتے چلے گئے لیکن چند قدم آگے جا کر وہ رک گئے۔ سرخ لائٹ  
چند لمبے ٹکنا ہوا اور انی علاقے میں گردش کرتی رہی۔

”آب ہو گیا۔“ کاچہ! ”بالا خزان میں سے ایک ہوا۔  
وہی تھا جس کی آواز اب تک سب سے زیادہ سنائی دیتی رہی تھی  
اس خطاب پر ایک بار تو ہل چا کہ نیچے اتر پڑیں اور ان سے  
ہاتھ کرنے کی کوشش کریں والوں۔ اس وقت ان کی پشت اور  
درخت کی طرف تھی جس پر میں چھپا ہوا تھا۔ میں اگر خاموشی  
درخت سے اترنے یا یکدم چھٹانک لگانے اور اچانک ان پر چھ  
پڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو ان میں سے کسی سے بھی صرف ایک  
گین چھین کر بات سے منت سکتا تھا۔

لیکن میں نے اپنے آپ کو اس ارادے پر عمل درآمد نہ  
رکھا اور اپنے دماغ کو بھی ٹھنڈا ہی رکھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں  
کہ میں ان لوگوں سے اس درخت خوف زدہ تھا کہ مجھ میں کوئی  
اٹھانے کی جرأت ہی نہیں تھی۔ بلکہ مجھے صرف اور صرف  
سیاہ مرید کے تصور نے خطا دینے پر مجبور کیا تھا جو ذرا  
فرلانگ پیچھے سوک کے قریب کھڑی تھی۔

”آخر وہ کون تھا؟“ ایک اور آواز ابھری۔ آواز بلند  
لیکن انداز خود کلائی کا ہی تھا۔

جواب میں ایک لمبے کے لیے خاموشی رہی پھر کوئی ہلچل  
چراغ اچکا ہو گیا کوئی مغرور مجرم کسی سے بچنے کے لیے رک  
چھپ کر بھاگ رہا ہو گا۔ سرکاری آدمی۔۔۔ کوئی اور ہم تو  
نہیں ہو سکتے۔ وہ لوگ اتنی زحمت نہیں اٹھاتے۔“

وہ واپس پلٹ پڑے لیکن درختوں کے درمیان اب بھی  
سرخ چھٹاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر طرف سرخ  
سے روشنی ڈال رہے تھے۔ بالا خروہ اس درخت سے جس پر  
چھپا ہوا تھا، زاری دور ایک دوسرے درخت کے نیچے آتا رہا  
”آب کیا کرنا چاہئے؟“ سب سے زیادہ بولنے والے نے کہا  
اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا۔

اشارات ہوتا تو وہ آواز اس میں دب جاتی، کسی کو ذرا بھی پتا نہ چلا  
لیکن اس لمحے وہاں مکمل سکوت تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس آواز نے  
ان سب کو رک کے بچھلے حصے کی طرف متوجہ کر لیا ہو گا چنانچہ میں  
رک کے نیچے گھسنے کے بجائے پیچوں کے بل رکوع کی ہی حالت میں  
گہرے اندھیرے کی طرف دوڑا جہاں درختوں کی موجودگی کے  
آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔

”کون ہے؟“ کوئی شاید بڑی طرح چوکتے ہوئے تقریباً چلا  
اٹھا۔ یہ غالباً اسی کی آواز تھی جو اب تک رک ڈرا رہے باتیں  
کرتا رہا تھا لیکن شاید حیرت کے جھگکے، پتیاں اور اضطراب کے  
باعث پٹ سی گئی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے ایک ناز ہو۔ آواز زیادہ بلند نہیں  
تھی۔ ناز قیقاہم کیلبر کے کسی ہاتھ سے کیا گیا تھا۔ اس جگہ میں  
بھی شاید انہوں نے خیال رکھا تھا کہ ہتھیار وہ استعمال کیا جائے  
جس کا دھکا زیادہ دور دار نہ ہو۔ اس ایک لمحے میں میں کافی آگے  
پہنچ چکا تھا۔

کوئی نہ جانے کہاں سے گزری تھی لیکن ایک بات طے تھی کہ  
انہیں معلوم ہو گیا تھا کوئی رک سے اتر کر اس طرف بھاگا تھا قد سر  
چھدرے چھدرے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ صحت سے مجھے  
کسی کی گھٹی گھٹی اور دور ہوتی ہوئی آواز سنائی دی ”سرخ لائٹ  
نکالو۔ جلدی کرو۔“

اس کا مطلب تھا وہ میری تلاش سے باز رہنے والے نہیں  
تھے اور سرخ لائٹ تو میرے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتی تھی۔  
تاہم میں درختوں کے درمیان دوڑتا چلا گیا۔ درختوں کا سلسلہ ٹھیل  
نہیں تھا۔ چند لمبے بعد میں ایسی جگہ پہنچ گیا جس سے آگے اڑاؤ کا ہی  
درخت تھے۔

اسی وقت میں نے اپنے عقب میں سرخ لائٹ روشن ہوتے  
دیکھی لیکن اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ اگر اس کا رخ میری  
طرف ہوتا تب بھی شاید اس کی روشنی مجھ تک نہ پہنچتی۔ میں کافی  
دور نکل آیا تھا اور وہ غالباً بیڑی سے چلنے والی سرخ لائٹ تھی۔  
اس کی رسائی بہت دور تک نہیں تھی۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھا۔ اس علاقے میں  
زیادہ دور تک دوڑنا مناسب معلوم نہیں ہوا تھا۔ سرخ لائٹ ان  
کے پاس تھی۔ اگر وہ ذرا بھی ہوشیار ہوتے تو جلد مجھے تلاش کر سکتے  
تھے۔ روشنی تیزی سے ادھر ادھر لڑائی ہوئی میری طرف براہ روی  
تھی۔

بھاگتے ہوئے غصے کے بارے میں تعاقب کرنے والوں کو  
بہت کم ہی یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ راستے میں کسی درخت پر چڑھ گیا  
ہو گا۔ یہ ایک بہت ہی باریک سانسائی نکتہ تھا اور میں بھی  
جگہ سے فرار کے سلسلے میں انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے  
استفادہ کرنے سے نہیں چرکتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک راستے

حساب سے اس قسم کے کام اس کے شایان شان نہیں تھے۔ عام قسم کے اسٹے کی تو شاید ان کی نظر میں کوئی وقت بھی نہیں تھی۔ ہمارے لوگوں کو آپس میں لڑوانے کے لیے البتہ وہ عام قسم کا اسلحہ اور ہارم پھیلاتا بھی چاہتے تو شاید یہ ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا۔ اس کے لیے انہیں اتنا تردد اٹھانے اور ریخڑ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس قسم کے مسائل کے سلسلے میں ان کے وسائل تقریباً طلبہائی سے تھے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کہاں کہاں ان کے مرے موجود تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ اسٹے کی نقل و حمل کے لیے پناہ چیلے ہوئے سلسلے کا جو یہ چھوٹا سا نیٹ ورک تھا انہیں نے دیکھا تھا۔ یہ کسی اور ہی طاقت کی سرگرمی کا ایک حصہ تھا۔ شاید کسی غیر ملکی انجینیئر کی فوازشات کی ایک کڑی...

اس احساس سے مجھے جبرجہری سی اچھی کہ آخر کتنی تو قہیں ہمارے اس ترقی پذیر، نامحکم، کمزور اور انتشار زدہ ملک کی جڑیں کاٹنے میں لگی ہوئی تھیں؟ انہوں کی مرزباں اس کے علاوہ تھیں۔ اس کے باوجود ملک قائم تھا تو یہ اللہ کا نام ہی خاص کرم تھا۔

دو تین منٹ تک میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میرا کچھ نہ کچھ کرنے کوئی پناہ رہا تھا لیکن آخر کار میں اسی نیچے پر پھنکا کہ اس سلسلے میں میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، سوارسی نہیں تھی، راپٹے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

ایک اور مایوس کن خیال بھی میرے دل میں جاگزیں تھا۔ اسٹے کی یہ کیپ پٹلوں کی بیٹیوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا یہ زیادہ بڑی کیپ نہیں تھی۔ بالفرض میں کسی طرح اس کیپ کو پکڑانے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو کیا اس سے کوئی خاص فرق پڑ سکتا تھا؟ میں نے تو سنا تھا کہ اسٹے کے پورے ٹرک کے ٹرک دوسرے دوسرے، دوسرے دوسرے اور ہرے تھے۔ اس سلسلے کو روکنے اور اس کی جڑیں تلاش کرنے کے لیے تو بہت بڑے پیمانے پر منظم کوششوں اور بہت ہی بڑے منصوبوں کی ضرورت تھی جن کی امید ذرا کم ہی تھی۔

انہی سوچوں میں الجھا میں درخت سے اترنے لگا۔ درخت سے اترتا، اس پر چڑھنے کی نسبت زیادہ مشکل اور مہارت طلب کام ہوتا ہے۔ تار کی کوجہ سے میرے لیے دشواری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ہر حال میں سب سے نیچے والی شاخ پر پہنچ گیا تھا جس سے میرا ارادہ براہ راست نیچے چلا گیا۔ لگنے کا تھا لیکن اس شاخ پر میرا توازن ذرا ہلکا گیا۔

سارے کے لیے میں نے اندھا دھند ہاتھ مار کر ایک شاخ کو پکڑا اور یوں میں نے اپنی شامت کو دعوت دے دی۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں دیسے ہی زمین پر گر جاتا۔ اس سے شاید مجھے کوئی خاص نقصان نہ پہنچتا۔ غضب یہ ہوا کہ جس شاخ کو میں نے

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سب ابھی تک گردنیں جھکا کر اور اُرد گردیہ رہے تھے۔ میری حیثیت اس وقت گویا سلیبائی ٹوٹی رکھنے والے کی سی تھی۔ یعنی میں تو ان کی تمام حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ سب غالباً واپس جانا چاہتے تھے لیکن انہیں میں تھے۔

ان کی انجمن جلد ہی رخص ہو گئی۔ بگلی سی ایک، پپ سنائی دی۔ یہ شاید کسی ٹرانسیر یا واکر کی کاسٹل تھا۔ میں نے زیادہ باتیں کرنے والے کو جو غالباً انچارج کی سی حیثیت رکھتا تھا، اپنے لباس میں سے واکر کی نما ایک آلہ نکالنے دیکھا لیکن وہ سائز میں واکر کی سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس نے کوئی ٹپن دیا اور دوسرے ہی لمحے جو تراز ابھری اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واکر کی نہیں، نہایت عمدہ قسم کا کوئی ٹرانسیر ہی تھا۔ واکر کی پر ایک مخصوص سی کوئی سنائی دیتی ہے اور آواز اتنی صاف نہیں ہوتی جتنی اس پر تھی۔

کوئی ہماری اور گونجنے کی آوازیں، انگریزی میں پوچھ رہا تھا، "وہ بلا انہیں؟" وہ کسی انگریزی دان یا انگریزی گو پاکستانی کا لہجہ نہیں تھا۔ وہ خالص انگریزی برلش ہی معلوم ہوتا تھا۔

"نہیں سر، وہ غائب ہو گیا ہے" انچارج ٹائپ شخصیت نے بولنا۔ انداز میں جواب دیا۔

"موتو! تو پھر تم وہاں کیا کر رہے ہو؟" ٹرانسیر پر غراہٹ ابھری، "خالی ٹرک آیا ہے۔ جلدی واپس آؤ اور لوڈنگ ان لوڈنگ کا کام کراؤ۔"

"سے اور سب، وہ محض ہے!" انچارج نے ہچکچاتے ہوئے پچھا۔

"جنم میں ڈالو اس کو۔ کوئی چرچا نہ ہوگا۔ جب کوئی آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ تم واپس آ جاؤ اور اپنا کام کرو" انگریزی کی نہایت ٹھکانے آواز ابھری۔

انچارج نے ٹرانسیر آف کیا، جب میں ڈالا اور سب کو واپس بلانے کا اشارہ کیا۔ سرچ لائٹ غالباً ٹرک ڈرائیور کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اسے بھی آف کر لیا اور میں نے اندھیرے میں ان کے ڈنکے سے واپس جانے کی آوازیں سنیں۔

میں جس دو شاخ پر بیٹھا تھا وہیں ساکت رہا۔ ٹرانسیر پر ڈال دینے والی آواز نے مجھے متحیر کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ماسے ہو گیا، کیا یہ ریڈ واٹ کا کوئی پکڑ تھا؟ لیکن پھر میں نے خود ہی پتا اس خیال کو مسترد کر دیا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے آپ کو یہی پتہ چھو رہا تھا کہ ریڈ واٹ کی سرگرمیاں اس سے کیسے زیادہ خطرے کی گھنٹی تھیں۔

اسٹے کی اسٹنگلک اور اس کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے سے ہاں دہشت گردوں کی ایک عام سی سرگرمی بن گئی۔ ریڈ واٹ کو جہاں تک میں دیکھ سکا تھا، سمجھ سکا تھا، اس

بڑھ جاتا ہے۔ میری گردن میں گویا بیک وقت زہر کے دو تین انجکشن لگا دیے گئے تھے۔

اس سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ تیز بھجنا ہٹ میرے نقاب میں تھی۔ یہ بھجنا ہٹ ریکوٹ کنٹرول سے پلے والے کسی چھوٹے موٹے کھلونا جہاز کی آواز سے مشابہ تھی۔ میں دروازوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں رہی تھی کہ میں کسی پتھر کسی ٹیلے سے ٹکرا کر یا کسی بجائی میں الجھ کر بہت بری طرح گر بھی سکتا تھا۔ میں اس خطرے کو خاطر میں لائے بغیر دوڑا جا رہا تھا لیکن میرے اور بھجنا ہٹ کے درمیان گویا فاصلہ بڑھ ہی نہیں رہا تھا۔ بھجنا ہٹ نہایت مستقل مزاجی سے کسی آسیب کی طرح میرے نقاب میں تھی۔

میں نے گاؤں میں پرورش پائی تھی۔ مجھے معلوم تھا شہر کی کھیاں اگر کسی کے بارے میں یہ محسوس کر لیں کہ اس نے ان کے چھتے پر حملہ کیا تھا تو وہ بالکل تک اس کا بچھا نہیں چھوڑیں۔ میں 'ٹرک اسلٹ' سیاہ سرسبز سب کچھ بھول گیا اور میں نے اپنی تمام توانائی دوڑنے کے لیے جمیع کر لی۔

میں زیادہ سے زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بڑا خیال ہے، میرا دایاں پاؤں میرا ساتھ صحیح طور پر نہیں دے رہا تھا۔ میں زبردستی اس سے کام لے رہا تھا۔ اب تو دور ایک تیز دوڑاؤ شعل سے میرے نچنے میں دانت کا ڈر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری ٹانگ بے کار ہوئی جا رہی تھی۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس حالت میں مسلسل دوڑنا میرے لیے ٹھیک نہیں تھا لیکن میرے لیے یہ غلطی کیے جانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

یہ بھی نیت تھی کہ کھیاں زیادہ تیز اڑنے والی مخلوق نہیں تھیں۔ دوسرے اس وقت ہوا بھی غائب تھی جس سے انہیں بڑا مزاحمت کا سامنا تھا۔ آخر کار آوازوں سے اندازہ ہونے لگا کہ ان کے اور میرے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا لیکن وہ میرا بچا چھوڑنے پر تیار معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ آخر میں اس پاؤں کے ساتھ کہاں تک بھاگ سکتا تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی درندہ اسے اپنے جیزے سے منسلک چارہا تھا۔ اس حالت میں بھی میں یقیناً ایک طویل فاصلے پر پہنچا تھا۔

بالآخر میرے سامنے ایک پتہ سا نکلا۔ پانی کیا؟ ہم ی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ یقیناً کوئی نہر تھی۔ معلوم نہیں وہی نہر تھی جس کے قریب میں ایک مرتبہ پہلے بھی پہنچا تھا۔ کوئی دوسری تھی۔ امکان تو یہ بھی تھا کہ وہی نہر تھی کھائی یا نہر بھی گزر رہی ہو۔

بھجنا ہٹ کی مدد میں آواز بتا رہی تھی کہ شہر کی کھیاں اب بھی میرے نقاب میں آ رہی تھیں۔ شہر کی موجودگی کے آثار محسوس کرتے ہی میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی تھی جس پر

پکڑا وہ بہت بڑی طرح مڑی اور ٹوٹ گئی۔  
میں زیادہ بڑی طرح بچے گرا اور میرے نچنے سے دور کی ایک لمبے کر اس طرح ران تک پہنچ گیا کسی نے کندہ نچر نچنے کے قریب گھونپا ہوا اور اسے کھینچا ہوا ران تک لے گیا ہو۔ میں نے سختی سے دانت سمجھ کر اپنے آپ کو کراہنے سے باز رکھا لیکن اصل معیت یہ نہیں تھی اصل معیت اس کے فوراً بعد نازل ہوئی۔

میں ابھی زمین سے اٹھ نہیں پایا تھا کہ میں نے بھجنا ہٹ کی تیز آواز سنی جو تیزی سے میرے قریب آ رہی تھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ جو شاخ میرے ہاتھ میں آکر ٹوٹی تھی اس کے کسی حصے پر شاید شد کا چھتا تھا جو اس جھکے سے اٹھن پھیل ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا درخت پر چڑھنا تو برداشت کر لیا تھا لیکن کھیاں کی راجد حالی میں اس حد تک غل اندازی برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔

میرے پاؤں میں شاید موج آئی تھی لیکن میں اس تکلیف کو بھول گیا۔ ویسے بھی موج ابھی آ رہی تھی۔ ابھی اس کی طرف کی واضح نہیں ہوئی تھی لیکن پچھتے کی تمام کھیاں کے جھ پر ٹوٹ پڑنے کا تصور اٹتا ہوا ناک تھا کہ میں موج کو بھولتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اس گھوڑے کی طرح دوڑا جس کے اسٹال کا گیت اسی لمحے کھلایا ہو۔

لا تعاد اور شہر کی کھیاں کے ڈبک مارنے کی اذیت تو ناقابل بیان ہی ہے لیکن ایک اہم بات یہ تھی کہ اس کے نیچے میں انسان کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ چلے انسان زندہ بھی رہ جائے لیکن اس کا حشر کیا ہوتا ہے اس کا تصور شاید آپ نہ کر سکیں۔ آپ صرف اس کی ظاہری حالت کا ہی تصور کر سکتے۔ وہ تصور بھی میرے روٹنے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں یہ بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس وقت میں بے بارود دھماکا ایک دیرانے میں بھگ رہا تھا جہاں دور دور تک طبعی انداز میں کسی چیز کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس دیرانے میں ایک طرف میرے اٹھانے دشمن موجود تھے جو میرے خون کے پیاسے تھے۔ میری حالت خواہ کچھ بھی ہوتی وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس پہنچانے کے بجائے اللہ میاں کے پاس پہنچانے میں مستعدی دکھاتے۔

یہی سب سوچیں تھیں جو بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لگیں اور جنہوں نے مجھے پاؤں کی تکلیف کو بھول کر بجٹ دوڑنے پر مجبور کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے پاؤں پر کیا گزر رہی تھی۔ مجھے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ وہ پاؤں میرے جسم کے ساتھ بھی تھا یا نہیں؟ مجھے بس یہ احساس تھا کہ میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔

لیکن اس دوران میری گردن میں دو تین ڈبک اتر چکے تھے۔ مجھے گردن پر کھیاں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا اور میں نے فوراً ہاتھ مار کر انہیں مسل کر پھینک دیے تھا لیکن وہ اپنا کام دھکا لگا چکی تھیں اور کبھی جب غصہ ناک ہوتی ہے تو شاید اس کے ڈبک میں زہر بھی

بار بار میرے تختے میں اتر رہا تھا۔ دائیں پاؤں کو حرکت دینا میرے لیے ایک مصیبت بن گیا تھا۔

بڑی مشکلوں سے میں کسی نہ کسی طرح کچھ تیرتا، کچھ کھنتا دو سرے کنارے تک پہنچا۔ اس کے بعد پٹے پر چڑھنے اور دوسری طرف اترنے کی ضرورت پیش تھی۔ میں نے شاید کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی میں یہ کام کبھی انسان کے لیے اتنے مشکل بھی ہو سکتے تھے۔

میں نے تقریباً ایک ٹانگہ ہی کے سارے ٹکڑاوتے ہوئے وہ پہاڑ سر کیا۔ پٹے سے اتر کر ٹکڑاوتے ہوئے ہی میں نے تھوڑا سا فاصلہ طے کیا۔ دائیں پاؤں کو تو زمین پر محض ٹکنا بھی دیر ہو تا جا رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے پس ہوا میں معلق رکھوں۔ ذرا سی حرکت بھی نہ دوں اور اس پر ذرا بھی وزن ڈال کر چلنے کی کوشش کرنا تو ایک قیامت تھا۔

جلدی مجھے ایک سوکھا اور ٹنڈ سنڈ سا دلخت نظر آیا۔ میں اس سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ دور کہیں سے آکاؤ کا پرندوں کی چھپا ہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ کپڑے ہلکے ہونے کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی لگ رہی تھی۔ کوئی اور وقت نہ تھا تو شاید وہ مقام وہ سال وہ وقت مجھے بت اچھا لگتا۔ میں نفسا میں رچی ہوئی ناز کی اور اچھوٹے پن سے مفلوظ ہوتا لیکن اس وقت مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

میرے کانوں میں شاں شاں ہی ہوری تھی حالانکہ وہاں تیز ہوا نہیں چل رہی تھی۔ میں نے اب دانت مستقل بھیج رکھے تھے کیونکہ تختے میں اٹھنے والی ہر ٹپس اب گویا میری پٹیلوں تک پہنچ رہی تھی۔

جلدی ہی پرندوں کی چھپا ہٹ بھی معدوم ہو گئی اور ساتھ ہی دھیرے دھیرے چاروں طرف آجلا جھل گیا۔ پرندے وہاں دو چار ہی تھے اور شاید وہ بھی رزق کی تلاش میں اس ماحول کی دستوں میں بکھر گئے تھے۔

میں نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ ایک نم آلود سا صحرا میرے ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔ شاید اسے صحرا کہنا زیادہ درست نہیں تھا کیونکہ اس میں کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں لیکن زمین ریتلی ہی تھی اور تازہ ٹھنڈی ہوائی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میری دائیں ٹانگہ کا تختے کے ارد گرد کافی حد تک چکا تھا اور اس میں سرخی بھی تھی۔ گردن میں بھی اذیت ناک لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ میں نے گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو وہ مجھے اپنی گردن کے بجائے کسی مینے کی گردن محسوس ہوئی۔

چند منٹ بعد میں دانت پر دانت جمائے ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی منتظر ہوتی ہوئی قوت ارادی کو جمع کیا اور صرف ایک ٹانگہ کے سارے چلنے کی کوشش کی لیکن دوسرا پاؤں سر حال زمین

پر چھٹا مجھے پاؤں پر چڑھنے کے برابر لگ رہا تھا حالانکہ پٹے کی اونچائی زیادہ نہیں تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے رکتے کا فائدہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔

کچھ منٹوں میں پاؤں کسی نہ کسی طرح جاکر میں پٹے پر چڑھ گیا اور ایک گہری سانس لے کر میں نے سر میں چھلانگ لگا دی۔ سانس روک کر میں پانی کی سطح سے نیچے چلا گیا اور پھر نیچے ہی رہتے ہوئے دو سرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ وہ کافی بڑی سر معلوم ہوتی تھی۔ پانی خاصا گہرا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ گہرائی میں ہی رہوں تاکہ میرے متحرک ہونے کی کوئی نشانی سطح آب پر نظر نہ آ سکے۔

چند لمحوں بعد مجھے پانی کی گہرائی کم ہونے کا اندازہ ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں دو سرے کنارے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن میں نے پانی سے سر نہیں نکالا۔ میں زیادہ سے زیادہ دیر تک پانی میں قابض ہی رہنا چاہتا تھا۔ یہ کہیں کو ٹپا دینے کی ایک کوشش تھی۔ اللہ کی ہر خلق کے پاس دماغ ہوتا ہے اور وہ یقیناً اپنے اپنے حساب سے اپنے اپنے انداز میں سوچتی ہو گئی ہوگی۔

میرا خیال تھا کہ کھیاں شاید یہ محسوس کر لیں کہ میں ڈوب گیا ہوں۔ میں نے گاؤں میں لڑکھن میں اسی قسم کی صورت حال کا شکار ہونے والے دو تین لڑکوں سے سنا تھا کہ انہوں نے یہی تدبیر کی تھی اور کھیاں جلد ہی ان کا پیچھا چھوڑ کر واپس ہو گئی تھیں۔

میں پراگندہ غور کی مشغول اور اپنی دیگر ورزشوں کی وجہ سے بہت دیر تک سانس روکنے پر قادر تھا لیکن اس وقت بہت دور سے اور وہ بھی موج زدہ پاؤں کے ساتھ دوڑ کر آنے کی وجہ سے میری سانس پکے ہی پھول ہوئی تھی۔ آہم میں نے بہت نہیں ہاری اور کسی منٹ تک سانس روکے رکھی۔ حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ مائیں ہمیشہ کے لیے ہی سینے میں نہ اٹک جائے۔

میں نے دوڑتے دوڑتے سر زرا پانی سے نکالا۔ ارادہ یہی تھا کہ اگر اب بھی اوپر کہیںوں کی چھپا ہٹ سنائی دی تو جتنی بھی طویل مائیں لے سکا، لے کر غراب سے دوبارہ سطح آب سے نیچے ہوجاؤں گا۔ اس کے بعد بار بار یہی کرتا رہوں گا۔ آخر کھیاں کب تک اوپر منتظر نہیں کی۔ تھک ہار کر ملی ہی جائیں گی۔

میں پانی سے سر نکالنے کے بعد مجھے پانی کی بدھم سی راز مٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کھیاں نے جلد ہی میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

میں نے دو تین گہری گہری سانسیں لیں۔ اس وقت تک سپیدہ تر نمودار ہونے لگا تھا۔ سر کا دوسرا کنارہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ کچھ چھوٹ کا فاصلہ تھا لیکن مصیبت سر سے کیا ٹپائی تھم ہی گویا بہت سی ٹوٹ گئی۔ پاؤں کی تکلیف یک لخت ہی ناقابل برداشت سی ہو گئی۔ مٹتی آنکھیں دوڑتے دوڑتے اچانک ٹھنڈے پانی میں کود پانا گویا اس عایدہ بخیر کی دھار کو تیز کرنے کا باعث بن گیا تھا۔

درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ میرا لباس اب سوکھ چکا تھا لیکن مجھے تیز بخار محسوس ہونے لگا تھا۔ نذر اور اس کے آس پاس کا حصہ صبح کر گیا ہو چکا تھا۔ گردن میں بھی تکلیف تھی اور شاید..... یہ درم چہرے تک آپسچا تھا۔ میں اپنے تختے ہوئے چہرے میں بھی ایک عجیب سا بھاری پن محسوس کر رہا تھا۔

لیٹ کر میرے جسم کا بیشتر حصہ دھوپ میں آ گیا جو مجھے بہت جلدی لگ رہی تھی لیکن مجھ میں اتنی بہت نہیں تھی کہ اٹھ کر کسی زیادہ سایہ دار درخت تک چلا جاتا۔ کچھ دیر بعد میرے ذہن پر غنودگی کی طاری ہونے لگی لیکن یہ وہ غنودگی نہیں تھی جو انسان آرام کے وقت محسوس کرتا ہے۔ وہ حقیقت میرے خواص کھٹ کھارے تھے۔ بالآخر جسم وہاں کی ساری مضبوطی جواب دینے لگی تھی۔

وہ قلعہ جو اب تک تقریباً ناقابلِ شکست سا محسوس ہوا تھا گویا دھیرے دھیرے زمیں بوس ہونے لگا تھا۔ بالآخر اس کے ردیو وار کر زونے لگے تھے۔ اندر ہی اندر جو تصور مجھے سب سے زیادہ دہشت زدہ کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ یہاں دو در و دو تک کوئی ہڈ پٹر آنے کے آثار نہیں تھے۔

اس طرف سے شاید کسی انسان کا گزر ہوتا ہی نہیں تھا۔ تھوڑی بہت آمدورفت اگر رہی بھی ہوگی تو غالباً نسر کے دو سرکل طرف کے علاقے تک ہی محدود تھی جہاں سے میں افزائش میں گزرتا تھا اور نسر بھی عبور کرتا تھا۔ اس طرف تو سرک بھی زیادہ دور نہیں تھی لیکن میں وہاں دو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ نہراہ کرنے اور سرک تک پہنچنے کا تصور کس طرح کرتا؟

میں نے غیر ارادی سے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ برا ذہن آسمان اور زمین کے درمیان کسی تاریک سے خلا میں بھڑکنے لپٹنے لگا۔ ایک سوال لا شعور کے نہاں خانوں میں کھجورے کی طرح رینگ رہا تھا "کیا میں اسی طرح یہاں پڑا ہوں؟ اسی بے بسی کے عالم میں..... بھوک پیاس اور تکلیف سے مرعوب کیا؟"

اس سوال کے ساتھ ہی بہت سے دھندلے لیکن لڑنے خیز تصورات چلے آ رہے تھے شاید میری لاش بھی دریافت نہیں کی جائے گی۔ گودھ اسی پر سے گوشت توچ لیں گے۔ اس کے بعد آؤ جانچا کسی کو پڑا لی بھی گیا تو اسے بھلا کون پہچانے گا؟

تقدیر کی اس ستم غریبی پر میرا ہنسنے کوئی جگہ نہیں رہ سکتی تھی۔ البتہ اندر ہی اندر شاید میں ہنسا تھا۔ میں زندگی میں کئی ایسے سوالات کو ذلت کی موت مارا تھا جو اپنے آپ کو موت طاقتور بہت بار صبح اور ناقابلِ شکست سمجھتے تھے۔ میں ریڈ واٹ جیسی افوق الفطرت سے ذرائع رکھنے والی تنظیم کی بہت شاندار پیش کش قبول نہیں کی تھی اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوا تھا اس سے ٹکر لے لی تھی۔ ابھی خیرات پہلے ہی میں نے ایک درندہ نما انسان کو ہوش خان کو موت کے گھاٹ

پر نکال پڑا تھا اور لازماً اس پر ذرا سا دباؤ تو ہنی جاتا تھا۔ یہ دباؤ آجائتا رہتا ہے کہ نہیں تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً چھین مارنے لگتا۔

میں نے صرف بائیں ٹانگ پر اچھل اچھل کر بھی چلنے کی کوشش کی لیکن اس طرح دائیں ٹانگ کو جو جھکا سا لگتا تھا اور اس میں جو دھک سی ہوتی تھی وہ بھی نٹنے کی تکلیف کو اسی طرح بڑھاتی تھی جیسے کوئی آواز زخم پر رہتا رہتا ہو۔

پندرہ بیس قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میری بہت جواب دہ لگی اور میں ایک دوسرے درخت کا سارا لے کر بیٹھ گیا۔ میں دے کے مریض کی طرح ہانپ رہا تھا اور میرے کپڑوں کی نمی میں میرے پسینے کی نمی بھی شامل ہو گئی تھی۔

میں نے زندگی میں بار بار صبح کا تذکرہ سنا تھا اپنی لوگوں کو صبح آنے دیکھی بھی تھی۔ میری نظر میں یہ ایک معمولی سی عادتائی چیز تھی۔ میں نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ صبح اتنی خوفناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ شاید میں نے صبح آنے کے بعد دیوانہ وار دوڑ کر ایک خطرناک غلطی کی تھی لیکن اگر میں یہ غلطی نہ کرتا تب بھی شاید میرا کچھ ایسا ہی..... یا اس سے بھی برا ہوتا۔

میں بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ اس صحرائی سے غلامے میں تیز دھوپ پھیل گئی۔ اس دوران میرے سینے اور گردن کا درم مزید بڑھ چکا تھا۔ پاؤں کی چھوٹے سونے پاؤں کی صورت اختیار کرنا چاہا تھا۔ مجھے کچھ کچھ حرارت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ چہرہ کچھ زیادہ ہی تپ رہا تھا۔ دھوپ مجھے بہت جلدی لگ رہی تھی اور جس درخت کے سارے میں بیٹھا تھا وہ کچھ زیادہ سایہ دار نہیں تھا۔

بھوک کا عفریت بھی معدے میں پچنے کاڑنے لگا تھا۔ عام حالات میں اپنی جسامت کے اعتبار سے میری بھوک کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مجھے زیادہ کھانے والوں میں گرگشتار نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن جب سے میرے دودھ بھ میں نقل خواری کا دل زیادہ ہوا تھا تب سے میری بھوک کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جسم ہر وقت مشغول ہی میں رہتا تھا۔ ویسے بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ غریبی میں انسان کو بھوک زیادہ لگتی ہے۔ کل دیر میں نے زور بھگنے ہاں ڈٹ کر کھانا کھایا تھا۔ رات کا کھانا کھانا نصیب نہیں ہوسکا تھا اور اس کے گھر سے نکل کر بھاگنا پڑا تھا۔ لیکن اس وقت حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسے کرکشی کی مدد سے میں نے کچھ بھی نہ کھایا ہو۔ صرف رات کا ہی فائدہ گزرا تھا اور اب ہانٹے کا وقت تھا لیکن دیگر تکلیفوں کے ساتھ ساتھ بھوک بھی ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ تکلیف کے عالم میں انسان کی بھوک مرعوب ہے لیکن یہاں تو بھوک خود خود مرنے کے بجائے مجھے مارے زال رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے بیٹھنا بھی برا محسوس ہونے لگا اور میں اسی



آزار تھا۔ گزشتہ دنوں میں ہی میں نہ جانے کتنے اسلحہ برداروں کو بل جتا، کسی کو مارا، کسی کو چٹا کرنا طویل سفر طے کر چکا تھا۔ لاہور اور کراچی میں میرے کتنے ہی جاں نثار سو جوتے جو میرے پیسے کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتے تھے اور اس وقت بھی شاید بے رحمی کے لڑائی لڑ رہے تھے۔

لیکن یہ سب کس لیے تھا؟ اس کا حاصل... اس کا انجام کیا تھا؟ صرف یہ کہ میں اس صحرائ میں آٹن کروں اور بے بسی سے ایک درخت کے نیچے لیٹ کر موت کا انتظار کروں؟ وہ بھی ٹانگ میں صرف موج آجانے کی وجہ سے۔ وہ خدا داد وقت جس پر کبھی کبھی لمحے خود بھی حیرت ہوتی تھی، صرف ایک موج کی وجہ سے بے صرف ہو کر رہ جاتی تھی۔

انسان کی بنائی ہوئی مشینوں میں تو کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔ محض ہائی کا ایک حقیر سا آرٹھٹ جانے سے سیکڑوں اہل بس پار کا ٹرک لوٹا جاتا تھا۔ کسی دیو پیکل مشین کے معمولی سے پڑنے کا کوئی زماں کا ٹارٹوٹ جانے سے مشین کھڑکی کی کھڑکی رہ جاتی تھی۔ نول لوہے کا حصّہ ایک بے مصرف انبار بن کر رہ جاتی تھی۔

لیکن کیا خدا کی بنائی ہوئی مشین میں بھی ایسا ہوتا تھا؟ خدا نے لڑائی مشین میں بڑے متبادل رکھے تھے۔ ایک پرزہ ذرا گزیر کر نہ لگا تو فوراً دوسرا پرزہ اس کی جگہ کر دیتے لگے۔ ایک چیز کمزور پڑی تو فوراً دوسری نے سارا دے دیا۔ اسی لیے تو انسان ابھی خاصی خرابیوں کو ایک عرصے تک برداشت کرنا چلا جاتا تھا۔ بہت ہی سنگین مسائل اگر ایک دوسرے میں اُلجھ جاتے تھے تب جا کر یہ عظیم طبیعی ناکارہ ہوتی تھیں۔

شاید قدرت اس بے بسی، اس بے کسی سے مجھے کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔ یکدم ہی مجھے اس طرح جس شکست خوردگی نے گھیرا تھا، اس میں اوپر والے کی کوئی مصلحت تھی۔ میرا ذہن آریک غلا میں بکھوڑے ضرور لے رہا تھا لیکن ناکارہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے لکھو لیا کہ یہ آریک غلا جس میں میرا ذہن بکھوڑے لے رہا تھا، درحقیقت ایسی کا غلا تھا۔

ایسی تو مرتے ہوئے انسان کو کچھ اور جلدی ماموتی ہے۔ مجھے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اس تاریکی میں بھی امید کی کرن تلاش کرنی چاہئے۔ ایسی کو تو دیکھتے ہی میرے بالکے نے کفر قرار دیا تھا۔ جس دہانے بڑے بڑے مشکل مواقع پر نہایت عجیب اور اقلیم نہیں انداز میں میری مدد کی تھی وہ اب بھی میری مدد کرنے سے قاصر تو نہیں تھا۔ اس کے قبضہ قدرت سے تو کچھ بھی باہر نہیں تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا دل ایک نئے اور انوکھے گداز سے تنگ ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو سر رہے تھے لیکن میں نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا تو وہ خشک تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو معمولی سی نمی کا احساس ہوا لیکن آنکھیں

بست ویر تک میں سانسٹ لینا نہا۔ اسی عالم میں شاید میں کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر بھی ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ غشی تھی یا مجھے نیند آگئی تھی۔ آخر میں رات بھر کا جاگا ہوا بھی ہوا تھا۔ اچانک میں چ نکلا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ کوئی مجھے بلارہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ پہلے تو مجھے اپنے قریب دھندلی پرچھائیں کے سوا کچھ نظر نہ آیا لیکن جلد ہی یہ دھندلاہٹ دور ہو گئی۔

میں نے دیکھا، ایک شخص اکڑوں بیٹھا مجھے بلارہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک سفید گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔ اس پر زمین کسی ہوئی تھی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو کسی غور کے دہانے پر لینا محسوس کر رہا تھا لیکن اس شخص کو دیکھ کر میری رگ دپے میں معمولی سی ٹھنک اتر آئی۔ اس دیر نے میں کم از کم ایک انسان کی صورت تو نظر آئی تھی ورنہ مجھے تو یہاں اس کا امکان ہی نظر نہیں آتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرا دوست ثابت ہونے والا تھا یا دشمن؟ وہ میرے لیے کوئی زحمت اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا یا شخص تجسس سے مجبور ہو کر رک گیا تھا اور میری چٹائی میں معذرت کر کے آگے بڑھنے والا تھا؟ ان سب سوالوں سے قطع نظر میرے لیے اتنی سی بات ہی طمانیت کا باعث تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر گھوڑے سے اتر آیا تھا۔

اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اب بہت ہو چکی تھی۔ میرا یوں پاگوں کی طرح بھاگے پھرتا کوئی دانش مندانہ عمل نہیں تھا۔ ایڈوکر بھی اب بہت ہو چکا تھا اور جن مصلحتوں کے تحت میں نے گناہم آدے حیثیت ہو کر اپنے آپ کو وطن کی نیکاراں فضاؤں میں گم کرنے کی کوشش کی تھی، اب انہیں ترک کر دینا ہی بہتر تھا۔ جب میرا ایمان تھا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں تھی تو میں ریلے ڈاٹ سے چھٹا کیوں پھر رہا تھا؟

میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اس شخص نے میری مدد کی اور میں اپنی اس تکلیف سے نکل آیا، زندہ بچ گیا تو لاہور لوٹ جاؤں گا جہاں شاید میرے ساتھی بھی میری ہی طرح زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہوں۔ مجھے ان کی خبر لی چاہیے تھی۔ جو ہو گا، دیکھا جائے

اٹھا۔

اس نے ذرا پیچھے ہٹے ہوئے قمیسی انداز میں سر ہلایا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا "تمہاری گردن پر قوشہ کی کھیموں نے کا ہے لیکن تمہارے گتے میں بہت بڑی موج آئی ہے جسے تم نے دوڑ بھاگ کر اور بھی دیکھا لیا ہے۔"

میں اس کی ماہر بنا پر اعتماد اور "درست" رائے سن کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کافی سلجھا ہوا اور خوش حال دکھائی دیتا تھا لیکن ہر حال میں اتنی ہی معلوم ہوتا تھا مگر اس کا مجھے بیک کر کے رائے دینے کا انداز کسی ماہر سرجن یا ڈاکٹر ہی جیسا تھا۔ بلکہ ماہر ڈاکٹر اور سرجن بھی عموماً یقین سے کوئی رائے نہیں دیتے۔ ابتدائی سنانے کے بعد تو ان کی ہر بات "شاید" سے ہی شروع ہوتی ہے یا پھر وہ بیماری بھر کم طبی اصطلاحوں سے مریض کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس نے تو بالکل سیدھی سچی اور دونوں بات کر دی تھی۔ مجھے یاد آیا "تھوڑا عرصہ پہلے ہی زندگی کے اسی ہنگامہ خیر سفر میں بلال شدید مایہ ایک کو ار مجھ سے کرایا تھا جسے میں دیر تک محض ایک ان پڑھ "خود بخوار قابل کھتا رہا تھا۔

بعد میں پتا چلا تھا کہ قابل تو وہ بے شک تھا لیکن کبھی میڈیکل اسٹوڈنٹ بھی رہا تھا۔ اب اس ایجنسی کی بات سن کر مجھے شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی ویسا ہی معاملہ تو نہیں تھا؟ کہیں اس شخص کا بھی میڈیکل لائسنس کوئی حلقی تو نہیں تھا؟

"تم ڈاکٹر ہو؟" میں نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

وہ "تھوڑے انداز میں جیسا کہ اتنی ہی بات بتانے کے لیے ڈاکٹر ہونا ضروری ہے؟"

"بعض اوقات تو خود ڈاکٹر بھی اتنی ہی بات نہیں بتا سکتے" میں نے لٹھری سامنے لے کر کہا۔

"ڈاکٹر لڑنے وہ سبق نہیں سیکھے ہوتے تھے جو دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کے درمیان ایک آزاد چمچی کی طرح رہنے والے انسان سیکھتے ہیں" وہ چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے گرمی سانس لے کر بولا "حادثے اور طرح طرح کی تکلیفیں انسان کو ذرا اور طرح کا ڈاکٹر بنا دیتی ہیں۔ اس کی آنکھیں ابھرے کا کام دیتی ہیں اور کسی کے درد سے کراہنے کی آواز اس کے لیے نیست و بربوت بن جاتی ہے۔"

اس کی باتوں نے مجھے چوکا دیا۔ تکلیف کا احساس کچھ کم ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ابھی ہی سرخی اور اضطراب تھا۔ اس کے سامنے کمر پر کشش چہرے پر بھی لگا سا کھنڈ تھا۔ وہ جیسے کسی خیال سے چمکتے ہوئے بولا "آؤ میرا سارا لے کر کھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ میرا گھر یہاں سے کافی دور ہے اور میں مگر بیچ کر ہی تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔"

میں صرف ایک لمبے میں سب خیالات میرے ذہن میں آئے۔ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔ میں اس شخص کے سامنے زیادہ کثرت خوردہ، زیادہ اذیت زدہ، زیادہ کھرا کھرا نظر نہیں آتا ہوا تھا۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا یا نہیں ہر حال اس شخص کے چہرے پر فکر مندی برقرار رہی۔ مجھے آنکھیں کھولنے دیکھ کر بھی اس کی فکر مندی کم نہیں ہوئی تھی۔

میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے پاس کافی حد تک صحیح کام کر رہے تھے۔ یہ احساس میرے لیے کچھ اطمینان بخش تھا۔ وہ ایک صحت مند اور وجہ شخص تھا۔ عمر تو میرے برابر ہی رہی ہوگی۔ صحت میں بھی شاید وہ مجھ سے کچھ کم رہا ہو لیکن اس کی روح مت سائلو تھی اور ہیٹ بھی ذرا نکلا ہوا تھا۔ کھٹی اور اوپر کوا بھی ہوئی مگر میں اس کے چہرے پر بچ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے زمانے کی سختیاں مردانہ وار جملی جھیلیاں۔ وہ کمرے رنگ کی شلوار قمیض میں تھا۔ سر سیاہ رنگ کی پٹری تھی۔

اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور کیہ کر رہی حال کو پوچھا تھا۔ شاید اس نے اپنے جنس پر قابو رکھا تھا اور یہی سوچا تھا کہ مجھے سوالات کی نہیں مدد کی ضرورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی مخصوص سی بوتل تھی جو عموماً محرابوں میں سفر کرنے والے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

بوتل میرے منہ سے لگانے کے لیے اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے میرا سراپے زانو پر رکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے آنکھ کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ میری حالت اتنی خراب بھی نہیں" مجھے خود اپنی آواز خف محسوس ہوئی۔ یہی حالت شاید اس سے زیادہ خراب تھی جتنی نظر آ رہی تھی لیکن میرا ذہن ابھی تک اپنی بے بسی اور معذوری سے سمجھتا نہیں کر سکا تھا۔ ایسا بے بسی اور معذوری مجھ پر زندگی میں کبھی آئی بھی نہیں تھی۔

تھوڑی سی کوشش سے میں آٹھ کر بیٹھ گیا لیکن کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اپنے سوچے ہوئے گتے کو کم سے کم حرکت دینی پڑے۔ غمزہ کیا تھا کہ ایک بہت بڑا چوڑا تھا۔ ذرا سی حرکت اس میں اٹھتی ہوئی نہیں لکھو خوف ناک بنا دیتی تھی۔

اس نے بوتل میرے ہونٹوں سے لگائی اور میں نے آپ حیات کے چند گھنٹے حلق سے اٹا کر۔ جسم میں نئی زندگی کی گرمی "ڈونگی" اس نے بوتل کو دھکا لگا کر گھوڑے کے پہلو میں لٹکایا اور دوبارہ میری طرف پلٹا۔ اب بھی اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ کسی ماہر ڈاکٹر یا سرجن کی طرح میرا معائنہ کرنے لگا۔

اس نے میری ستورم گردن کو اٹھکیوں سے دبا کر دیکھا۔ میں نے آف نہیں کی۔ اس کے بعد اس کی نظر میرے ستورم گتے پر آگئی۔ اس نے اسے بھی اٹھکیوں سے دبا دیا تو میں نے اختیار گراہ

کو سنبھال گیا تھا اور نہ میں نے تو خواب کے سے عالم میں گر جانے کو اپنا جسم بھی نوچے دیکھ لیا تھا۔

گھوڑا کچھ دیر یکساں رفتار سے چلا رہا تو گویا میرے پاؤں کی تکلیف کا بھی ایک دو دم سہا بن گیا۔ ایک بار پھر گھڑی کی ٹنگ ٹنگ کی طرح درد کی خیر خیر جاری تھی لیکن کچھ دیر تکلیف یکساں انداز میں جاری رہے تو گویا انسان اس کا عادی سا ہونے لگا ہے۔

• میں نے ہمت کر کے دھیرے اپنا جڑا ڈھیلایا اور پوچھا ”کیا یہاں آس پاس کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟“

”ڈاکٹر نہ۔“ اس نے یوں ڈھرایا گویا اسے مجھ سے اس سوال کی تصفیح توقع نہیں تھی۔ پھر وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسا اور بولا ”شکر کے اس طرف تو نہیں تھیں میل کا علاقہ ایسا ہے کہ کوئی ڈاکٹر یہاں سے نہیں گزرے۔“ تباہی تو اس سے بھی زیادہ دور دور تک نہیں ہے۔ تم ڈاکٹر کی بات کر رہے ہو، شکر کرو کہ میرا بھی اوجھڑے کمرہ ہو گیا۔ یہ محل ایک اتفاق ہے ورنہ میں بھی اس طرف آتا نہیں ہوں۔“

مجھے یاد آیا کہ میں نے ماہوسی کے عالم میں آنکھیں بند کرتے وقت جب امید کی کوئی کرن تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تو میرے ذہن میں صرف رب کا تصور تھا اور امیدوں کو حقیقت میں بدلنے کی قدرت رب کی کم سے زیادہ کون رکھتا ہے؟ یہ شخص اگر کہیں اور بھی جا رہا تھا تو یقیناً اللہ نے اس کا رخ اس طرف موڑ دیا ہو گا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا مجھے قہری دیتے ہوئے بولا ”لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا مسئلہ زیادہ سنگین نہیں۔ تمہارے لیے تو میں ہی بطور ڈاکٹر کافی ثابت ہوں گا۔ لیکن ابھی تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ تمہیں میرے گھر پہنچا کر ہی بتا دے گا۔“

”کچھ کچھ اندازہ تو ہو چکا ہے“ میں نے کہا۔ مجھے اس کی ”تشخیص“ یاد آگئی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”تم نے تو فی الحال میرے بارے میں کچھ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا لیکن مجھے تو اپنے بارے میں کچھ بتا دو۔ تم کون کون سے تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ میں نے سڑک اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر گھٹاؤ کچھ بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا اور کہیں دور دیکھ رہا تھا۔ لگا تھا میرے ہاتھ میں تھیں۔

دونوں ہاتھوں سے زین کا پچھلا حصہ پکڑے بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے میرے سوال کا جواب دیا ”نام میرا مدخل خان ہے۔ میں چھوٹا سا ایک زمیندار ہوں۔

میرے ہی چھوٹا سا“ اس نے ہاتھ آگے لاکر انگلی اور انگوٹھے سے کچھ ایسا اشارہ کیا جیسے کسی کیڑے کوڑے کا ساز بنانے کی کوشش کر رہا ہو ”یہاں سے چند میل دور بائیس ایکڑ زمین ہے میری۔“ میرا سر پکڑا ہوا تھا اور مجھے بابا ایریش محسوس ہوتا تھا کہ

”تم نے یہ تو بوجھای نہیں کہ میں کون ہوں کہاں سے آیا ہوں کس طرح اس حال کو پہنچا ہوں؟“ میں نے کہا۔ اسے یقیناً یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ میں اس کی زبان بولنے والا نہیں تھا لیکن اس نے اس پر آشوب دور میں بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں اس کے لیے قہقہے اٹھتی تھا لیکن وہ صرف میری تکلیف دیکھ کر کچھ پوچھنے بغیر مجھے اپنے گھر لے جانے پر تیار ہو گیا تھا۔

”پوچھ لیں گے۔ پوچھ لیں گے۔ سب کچھ پوچھ لیں گے۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”پوچھ کچھ بھی اپنے وقت پر ہی اٹھتی گئی ہے۔ یہ کچھ پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے ہی یہ اطمینان کر لیا ہے کہ تم میرے دشمن نہیں ہو۔ میں صرف دشمنوں کا دشمن ہوں لیکن دشمن بھی اگر مجھے اس حالت میں ملتا جس میں تم بڑے ختمے تو شاید میں اسے انگلی نہ لگاتا۔ اور کوئی پوید نہیں تھا کہ میں اپنے دل کو اس کی مدد پر بھی تیار کر لیتا۔“

اس نے سارا دے کر مجھے اٹھایا۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک مضبوط اور سخت جان شخص تھا۔ میں صرف ایک پاؤں پر وزن ڈالتے ہوئے اٹھا اور دو سر پاؤں زمین پر ٹکائے بغیر اس کی گردن میں بازو ڈال کر سیدھا کھڑا ہوا۔ وہ گھوڑے کو قریب لے آیا تھا۔ میں نے بایاں پاؤں رکاب میں نکالیا اور اس نے مجھے قریب آٹھ گھوڑے پر سوار کر لیا۔

جلتے جلنے سے میرے نچے میں پھر تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ جسم بخار سے بھی تپ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ گھوڑے پر اوجھڑا لیٹ جاؤں۔ میں نے بے مشکل خود کو اس سے باز رکھا۔ مجھے بھاننے کے بعد وہ ایک لمحے کھڑا کچھ سوچا رہا۔ زین پر ہم دونوں کے بیٹھے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ میرے پیچھے زین سے پیچھے بیٹھ گیا۔ وہاں پر گھڑ سوار معلوم ہوا تھا۔ زین کے بغیر بھی سفر کرنا شاید اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

”یہ گھوڑا شاید اور بھی ہے اور جانور اور بھی“ وہ خود ہی اپنے گھوڑے کی تعریف کرنے لگا۔ ہر حال اس کی تعریف سناٹے پا خوش تھی پر جتنی نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”لیکن ہم دونوں ٹکڑے جوان ہیں۔ ہمارا ایک ساتھ اس گھوڑے پر چڑھ بیٹھنا زیادتی ہی ہے۔ نیزہ میں اسے تیز دوڑانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ تیز دوڑنے سے دیے بھی تمہیں تکلیف ہوگی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ ذرا دیر سے گھر پہنچیں گے۔“

”کوئی بات نہیں۔ گھر پہنچ تو جائیں گے“ یہی بڑی بات ہے“ میں نے غماز سے کہا اور ایک بار پھر مسکانے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو سکا یا نہیں۔

گھوڑا دھکی پٹنے لگا۔ ان معمولی جھکوں سے بھی میری ٹانگ میں تکلیف ہونے لگی لیکن میں رانت سمجھنے اسے برداشت کر رہا تھا۔ یہی کیا کہ تھا کہ کوئی میری مدد کے لیے آن پوچھتا تھا۔ اس احساس سے ہی جسم میں کچھ جان سی اٹھتی تھی اور دم توڑتی ہوئی قوت برداشت

اسے جانے دو۔

”ہر بحث بڑی لمبی ہوتی ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا  
”اس لیے میں کو شش کرتا ہوں کہ بحث میں نہ اُٹھوں لیکن نہ  
چاہتے ہوئے بھی انسان سمجھتی نہ سمجھی بحث میں اُلجھتی جاتا ہے۔“

”بحث بڑی چیز نہیں ہے“ انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس  
ہے کم علم لوگوں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، ذہن کے بند درختے  
کھلتے ہیں۔ بشرطیکہ انسان دوسرے کی بات سننے، سمجھنے اور اس پر  
غور کرنے کی خواہش رکھتا ہو لیکن اب کوئی ایسی خواہش رکھتا ہی  
نہیں۔ بحث اور محاکمہ اب ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہ دور جنابالت  
ہے۔ انسان کو خوش محی ہے کہ اس نے اپنی ترقی کیلی ہے لیکن  
درحقیقت وہ پیچھے جا رہا ہے۔ لوگوں کے ہاتھ میں وہ چیز آگئی ہے جسے  
وہ سب سے بڑی دلیل سمجھتے ہیں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے ایک بار پھر گردن ترجمی کرتے ہوئے  
پوچھا۔

”اس نے قیاس کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس  
میں ایک ماڈر تھا“ یہ ہے آج کے دور کی سب سے بڑی دلیل۔“  
”تم نے بھی یہی دلیل اپنالی؟“ میں نے قدوسہ حریت سے کہا  
”تم تو دارودہریہ کی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ میں تو سمجھا تھا۔“

”یہ فکر رہو۔ یہ دلیل تم جیسے انسانوں کے لیے نہیں ہے جو  
گھلا اور کشادہ ذہن کے کر زندگی کے راستے پر چل رہے ہیں۔“  
اس نے گویا مجھے تسلی دی ”لیکن مجھے مجبوراً اس طرح کی دلیلیں  
ساتھ رکھنا پڑتی ہیں۔ میں بڑے پُرخطر علاقے میں رہ رہا ہوں اور  
بڑی پُرخطر زندگی بسر کر رہا ہوں۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”وہ شاعر دہلی اور  
اس علاقے والی بات سچ میں ہی نہ تھی۔“

”ہاں۔“ وہ ماڈر دوبارہ قیاس کے نیچے چھپاتے ہوئے بولا  
”تم نے دہلی کی بات کی تھی تو مجھے ایک مصرع یاد آیا تھا۔ بدلتا  
ہے رنگ آسمان کیسے کیسے“ میں کساتا چاہتا تھا کہ رنگ صرف  
آسمان ہی نہیں بدلتا، زمین بھی بدلتی ہے۔ یہ زمین جو تم دیکھ رہے  
ہو۔ زیادہ برائی بات نہیں یہ بڑی ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ شاعر نے تو  
آسمان کے رنگ بدلنے کی جویات کی تھی ”اس سے مراد زمانے کے  
تغیرات تھے لیکن میں جو زمین کے رنگ بدلنے کی بات کر رہا ہوں وہ  
صرف شاعرانہ رنگ میں نہیں کر رہا۔ اس زمین کا رنگ عاود تبا  
نہیں، سچ بچ بدل گیا ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”بہی میاں دو چھوٹے چھوٹے قصبے آباد تھے جو گنوں کی طرح  
آہیں میں لڑتے رہتے تھے حالانکہ اصلاً اور نسلہ وہ ایک ہی تھے  
لیکن نہ جانے کب اور کس طرح ان کی شاخیں جدا ہو گئی تھیں۔  
اس کے بعد سے انہیں گویا ایک دوسرے سے لڑنے کے سوا دنیا  
میں کوئی کام نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کون کون انہیں آکر چھڑانا اور

گھوڑے سے نیچے نہ گر جاؤں لیکن میں کسی نہ کسی طرح خود کو  
بھالے بچھا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو باتوں میں مصروف رکھنے  
کے لیے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”میاں گنتی ویرانی ہے! میں  
لے بہت سی ایسی جگہیں دیکھی ہیں جہاں انسان نہیں ہوتے لیکن  
وہاں اتنی ویرانی کا احساس نہیں ہوا۔“

”ہاں۔ بہت سی جگہیں ہوتی ہیں جہاں انسان نہیں ہوتے مگر  
وہ آباد گنتی ہیں۔ بہت سی جگہیں ہوتی ہیں جہاں انسانوں کا جھوم  
ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ ویران گنتی ہیں اور بہت سی جگہیں ہوتی ہیں  
جہاں انسان بھی نہیں ہوتے اور ویرانی بھی دُورے دُورے سے چلتی  
ہے۔ یہ انہی جگہوں میں سے ایک ہے“ اس نے ارد گرد اشارہ کیا  
پھر گہری سانس لے کر بولا ”وہ تمہارے ارد گرد کے ایک شاعر نے کہا  
ہے۔“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”یہ تم نے ارد گرد کے شاعر  
کو برا شاعر کیوں بتایا؟ ہر زبان کے شاعر ہم سب کے شاعر ہیں۔  
شائلیف صرف تمہارے شاعر نہیں، ہم سب کے شاعر ہیں۔ بلکہ  
پوری دنیا کے شاعر ہیں۔ شاعر ادب اور دانشور تو وہ لوگ ہیں جو  
پوری دنیا کے انسانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں  
پونے کی باتیں کر رہے ہیں۔“

وہ ایک لمحے خاموش رہا پھر نہ جانے کیوں دھیرے سے ہنسا اور  
بولا ”بہت خوشی ہوئی تمہارے منہ سے یہ باتیں سُن کر۔ بہت مدت  
بعد کسی کے منہ سے اس طرح کی بات سننے کو ملی ہے۔ آج کل ایسی  
باتیں کا زمانہ نہیں رہا۔ یہ چرانے و تھنوں کی باتیں ہیں جب شاعر  
ادب اور دانشور پوری انسانیت کے نمائندے ہو کر کرتے تھے۔  
اب پوری دنیا کے تو کیا، پورے ملک کے انسانوں کو بھی ایک لڑی  
میں پونے والے شاعر ادب اور دانشور شاید شرم سے منہ چھپا کر  
کئی اور طرف کو نکل گئے ہیں، مرکب گئے ہیں یا کہیں سے بیٹھے  
ہیں۔ اب تو اس طبقے نے بھی اپنی اپنی دُور دُور دُورے والے کی لڑی  
پونے کو ہی بہت پروا اور عظیم کام سمجھ لیا ہے۔ مذہب کے ٹکے دار  
بھی پہلے تو صرف مذہبی عقائد کی بنیاد پر ہی دُور دُور دُورے کی مسجد  
الگ ہائے بیٹھے تھے اب انہوں نے زبان کی بنیاد پر بھی انسانوں کو  
نیم گننے کی خدمت اپنے ذمے لے لی ہے۔“

میں نے مرکز اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں منگ رہی  
تھیں۔ میں نے دھیرے سے کہا ”تم کالی پڑھے لکھے تھے ہو۔“

وہ گویا چمک کر کسی دنیا سے واپس آتے ہوئے بولا ”اس بات  
کو جانے دو۔ کچھ انسان ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی بڑی بات کر سکتے  
ہیں اور کچھ عالم فاضل اور دانشور ہوتے ہوئے بھی بیحد جھولی بات  
ہی کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہونا اب اس بات کی ضمانت نہیں رہا کہ  
انسان کا ذہن بھی وسیع ہو گا۔ وہ زمانہ گیا جب تعلیم، تعلیم ہوتی تھی  
اور انسان کے ذہن کو وسعت دیتی تھی۔ اب تو تعلیم حاصل کرنے  
کے طریقے بھی بدل گئے ہیں اور مصروف بھی۔ یہ بڑی سی بحث ہے“

اشاہ کیا۔

دو میل کا وہ سفر تھے بے حد طویل محسوس ہوا۔ کئی بار ایسا کہ جیسے مجھ پر بھر پوری چھائی گئی ہے لیکن عقب سے دو میل خان کی ذرا بھی دھملا ہاتھ دیکھتا تو اس کے مضبوط بازو مجھے سارا دھتے۔ میری ہونٹ چھٹکتی، انھوں سے میری ہمت بندھ جاتا اور مجھے اوپر اڑنے کی باتوں میں لگنے کی کوشش کرتا۔

زمین کا رستہ بن اب ختم ہو چکا تھا اور اب وہ ویسے ہی دکھائی دینے لگی تھی جیسی عموماً زرخیز زمین ہوتی ہے لیکن کمیت وہاں اب بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے البتہ ایک بہت بڑے ریتے پر کھس آگئی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسی گھاس کے درمیان سے ایک نہایت تنگ سی پگڑی پڑی سفر کرتے بالا خرہ ہم گویا اچانک ہی ایک مکان کے سامنے پہنچے۔

مکان چھوٹا مگر تقریباً پختہ ہی تھا۔ کئی اینٹوں اور کھڑکی کی اینٹیں وغیرہ سے بنا ہوا تھا۔ گاؤں دیہات میں ایسے مکانوں کو پختہ ہی کہا جاتا ہے۔ تین طرف سے وہ مکان درختوں میں گھرا ہوا تھا اور سامنے ایک بہت بڑی جگہ گھاس کے طور پر چھوڑ دی گئی تھی جس کے ارد گرد بازو لگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کی اینٹوں سے بنی ہوئی اس بازو میں چھوٹا سا ایک چوٹی کی گٹ بھی تھا جسے آلا لگا ہوا تھا۔ مکان کے سامنے ہی کچھ فاصلہ چھوڑ کر کھیت پھیلے ہوئے تھے جس میں مجھے کی فصل سر اٹھاتی دکھائی دے رہی تھی۔

ان کھیتوں کا سلسلہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ دو میل خان کی بائیں ایلز زمین پختہ ہی تھی اور بارانی معلوم ہوتی تھی۔ مکان کی بازو کے اندر چند مویشیوں کے سوا اور کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

دور دور تک کوئی آبادی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ دو میل خان کی زمین کے ارد گرد کی زمین بھی ہلکا کار آمد معلوم ہوتی تھی لیکن اس پر گھاس پھوس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صرف دو میل خان کی زمین بہت عمدہ حالت میں نظر آ رہی تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر کھیتی باڑی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ میرے اور دو میل خان کے سوا وہاں بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہاں دورانی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہاں کی خاموشی اور نہانے میں ایک عجیب سا سکون تھا۔

”تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟“ میں نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔ اور یہ بڑا دل گردے کا کام ہے“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ اس نے مجھے بھی تقریباً اپنے بازو لاد کر ہی گھوڑے سے اتارا اور سارا دے کر اندر لے جانے ہوئے بولا ”یہاں قریب ہی ایک گاؤں ہے۔۔۔ اور وہاں تمام کھیتی باڑی کے سلسلے میں کبھی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو سناؤ گا۔ وہاں سے دو چار آدمی لے آتا ہوں۔ کام ختم ہوتا ہے تو انہیں

سمجھاتا ہوں۔ غرت اور فائدہ کشی نے یہاں ڈیرے ڈال لیے۔ چار دن اس رہتا چھوڑ دی خوریزی۔ جن کے دل میں خوریزی دیکھنے اور سننے کی تاپ نہ رہی وہ رات کی تاریکی میں دھیرے دھیرے یہاں سے کوچ کر گئے۔ اس وقت اس علاقے سے یہ نہر بھی نہیں گزرتی تھی۔ اس کے باوجود زمین زرخیز تھی۔ پھر نہر بھی آگئی لیکن زمین خنجر اور ریشمی ہوتی گئی۔ شاید یہ اس انسانی خون کا اثر تھا جو خواہ خواہ برپا کیا تھا اور برسوں اس مٹی میں جذب ہوتا رہا تھا۔ اس مٹی کو شاید انسانی نہیں تھا جتنا اسے لوہا پایا گیا تھا۔ آخر کار سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے اس علاقے کو آباد کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ حتیٰ کہ وہ سردار بھی علاقہ چھوڑ کر چلے گئے جن کے حکم پر لوگ کھنڈ کی طرح لڑتے رہتے تھے۔ شاید ان دونوں سرداروں کا انجام بھی بہت بُرا ہوا تھا۔ دونوں خود اپنی اولادوں کے ہاتھوں کٹنے کی موت مرے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی گردنوں پر بہت سے بے گناہوں کا خون تھا۔“

میں نے اوپر اڑ کر دیکھتے ہوئے کہا ”حیرت ہے! اس مقام کو دیکھ کر ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہاں کبھی کوئی آبادی تھی ورنہ اُڑنے والی آبادیوں کے بھی کچھ نہ کچھ آثار صدیوں تک باقی رہتے ہیں۔“

”یہی تو غور کرنے والی باتیں ہیں۔ یہ تو پھر بھی ایک پرانی کچی اور قبائلی آبادی تھی“ مجھے یقین ہے جہاں ”علم“ زیادتی اور پہلے گناہوں کا خون پینے کا سلسلہ حد سے بڑھ جائے گا وہاں خواہ کھکھرت اور فواد کی فلک بوس عمارتیں بھی ہوں، شاید دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس طرح اُڑ جائیں، مضمحل ہستی سے مٹ جائیں کہ آثار قدیمہ کے ماہرین کو ان کا نشانہ بھی نہ ملے۔ قدرت بہت برداشت کرتی ہے۔ انسان کو بڑی دھیل دیتی ہے لیکن اگر وہ جلال میں آجائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا ”دنیا میں جہاں جہاں بھی لوگ کھنڈ کی طرح لڑتے رہتے ہیں، میرا دل چاہتا ہے ان سب کو لا کر یہ جگہ دکھاؤں۔ یہاں اب وہ جانور بھی دکھائی نہیں دیتے جو عموماً صحراؤں اور دریاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ پرندے بھی ان کا ذکر ہی نظر آتے ہیں۔ وہ بھی شاید بجھتے ہوئے آجاتے ہیں۔ تمہاری طرف۔“

میں تکلیف کے باوجود مسکرا دیا۔ مجھے خوشی تھی کہ بعد کے لیے آدمی بھی میسر آیا تھا تو ذرا ڈھٹک کا۔ اس سے کم از کم بات چیت ہوئی جاسکتی تھی۔ جاہل نہیں تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا ”ہمیں کتنی دور جانا ہے؟“

”میں دو میل اور“ اس نے یوں وٹوٹ سے جواب دیا گویا ناصلاً اس نے بالکل ٹھیک ٹھیک ٹاپ رکھا تھا ”شکر کہ وہ دیرانے کا زیادہ برا حصہ تو اس طرف رہ گیا تھا“ اس نے پیچھے کی طرف



قدوت کا عجیب تماشا تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے ہاتھوں سے میری بھرپور مدد کردی تھی جو خود اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ رحم دل اور مہربان نہیں تھا۔

مالش سے فارغ ہو کر وہ باہر جا کر بیٹھ رہا تھا و جو کر آیا اور ڈسٹر وائر ملا کر میرے لیے ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔ نہایت مہارت سے اس نے مجھے انجکشن لگایا اور اپنی کارروائی پر گویا نہایت اطمینان محسوس کرتے ہوئے بولا ”یہ انجکشن بخار کے لیے تھا۔ اب میں اپنے اور تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں نیند کا انجکشن دوں گا تاکہ تم لمبی نیند لے سکو۔ کل ہی تم اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرو گے“

اس نے میرے لیے مرنی کی بجائی تک تیار کر ڈالی۔ کھانا اس نے پکا پکا بنایا تھا جو طبی لحاظ سے میرے لیے بہتر تھا۔ میں اپنے آپ کو واقعی ایک ماہر اور مخلص ڈاکٹر کے زیرِ نگرانی محسوس کر رہا تھا۔ کھانا اور بخاری وغیرہ بہت ہی مہربان سے منسلک وجود میں آسانی کی لہری دوڑ گئی۔ میں اس سے کچھ دیر اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا اور نیند کا انجکشن لگا دیا۔ چند منٹ بعد ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا لیکن یہ تاریکیاں اپنے دامن میں گویا راحت کا احساس لیے آتی تھیں۔

دوسرے دو دن جیسے میری آنکھ کھلی تو مجھے بخار محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے پاؤں کی تکلیف بھی اب قابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ دو میل خان اس وقت باہر صحن میں کسی کام میں مصروف تھا۔ اپنی کل اور آج کی حالت کے بارے میں سوچتے ہوئے تفکر کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بات بہت بھرتی تھی لیکن موت مجھے گویا چھو کر گزر گئی تھی۔

دو میل خان اندر آیا تو اس نے مجھے بیوا رہا ہے ہی ایک بار پھر پرلا کام یہ کیا کہ میرے پاؤں پر کریم کی مالش کی، مجھے انجکشن لگایا پھر ناشتا بنایا۔ میری طرف سے مطمئن ہونے اور مجھے آرام سے لٹانے کے بعد وہ زمین پر چلا گیا۔ دوسرے دن وہ مصروف رہا واپس آیا تو شفقت کے پستے میں شربور تھا لیکن اس نے میری دوا داد میں ایک لمبے کی تاخیر نہیں کی۔ ایک بار پھر میری مالش کی۔ چند گولیاں کھانے کو دیں۔ کھانے وغیرہ کے بعد کچھ دیر آرام کے وہ دوبارہ زمین پر چلا گیا۔

تین دن اسی طرح گزرے۔ اس نے نہایت باقاعدگی اور توجہ سے میرا علاج کیا۔ ہر طرح سے میری خدمت کی۔ مجھے جس طرح کی بھی مدد کی ضرورت تھی وہ اس نے مجھے فراہم کی۔ ظاہر ہے میں ایک طرح سے مسندِ حق تھا لیکن وہ میرے کسی بھی کام میں ذرا بھی نہیں جھجکیا۔ اس کی پیشانی پر کبھی غصہ نہیں کئی۔ حد تو یہ تھی کہ مجھے اس سے کسی کام کے لیے کہنا نہیں پڑا تھا۔ اسے گویا خود بخود معلوم ہو جاتا تھا کہ کسی وقت میری ضرورت کیا تھی۔

میں نے اس سے منونیت کا ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ وہ اس موقع ہی نہیں دتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں اس کی نوازش کے بوجھ تلے رہا ہوا تھا۔

اس کے پاس تمام ضروری اوزار موجود تھے۔ اس نے مجھے کمرے لائے ایک بیساکھی بھی تیار کر دی تھی لیکن ابھی مجھے بیساکھی کے سارے بھی جلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ بیساکھی کے سارے میں چل سکتا تھا لیکن جب میں نے جلنے کی کوشش کی تو وہ چلا اٹھا اور بیساکھی اس نے میرے ہاتھ سے چھین لی۔

”حق“ اس نے مجھے ڈانٹا ”تمہیں معلوم ہے کہ صوف آنے کے فوراً بعد دور و دور سے دوڑنے کی وجہ سے تمہاری گھٹنیں خستہ ہو رہی ہیں کو جوڑنے والی نادر بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن طرح خراب ہو چکی ہوگی۔ اسے ٹھیک ہونے کے لیے وقت دو۔ ایک شدید بے احتیاجی تو کر چکے ہو۔ اب دوسری بھی کرو گے اور بھر کے لیے نقصان پہنچ جائے گا۔ پھر شاید آپریشن کرانے سے ہی مسئلہ حل نہ ہو۔“

”آپریشن بھی کرایا تو تم ہی سے کرانی گا۔ تم سے اچھا سبھی مجھے کہاں ملے گا“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں“ وہ بخندیدگی سے بولا ”لیکن اگر تم نے میری ہدایات پر عمل نہ کیا تو میں دراصل ہی سے تمہارا آپریشن کروں گا۔“

”تمہارے ہاتھ سے مجھے وہ بھی قبول ہو گا“ میں نے کہا۔ وہ بیساکھی میرے بستر سے دور دیوار کے سارے کھڑی کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر ایک بیڑی سلگائے لگا۔ میں نے گہری نقرے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جیسے دو میل خان! تم نوازاؤ اور لیکن تمہارا میں نے کل کی لائن سے کوئی تعلق ہے ضرور۔“

”ہاں۔ اتنا تعلق تو ہے کہ زندگی میں کی بار مجھے ڈاکٹروں سے واسطہ پڑا ہے۔ انہوں نے جس مسئلے میں میرا علاج کیا میں نے اسے یاد رکھا۔ پھر ضرورتاً بھی کچھ سیکھا، کچھ معلومات کیں کچھ کتابیں پڑھیں۔ غیر مستند اکثر بنانا مشکل نہیں ہے۔“

”تمہارے جتنی معلومات اگر کسی کے پاس ہوں تو گناہا نہات میں وہ کیونکہ کھول کر بیٹھ جاتا ہے“ میں نے کہا۔ ”میں نے بھی کھولا ہوا ہے“ وہ الٹا ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”لیکن صرف اپنے لئے۔“

چند لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”دو میل خان! ایک بات بچ بچ بتاؤ“ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟“ ”شادی؟“ اس نے یوں چونک کر میری طرف دیکھا کہ اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ پھر جیسے اس پر کسی اضطراب نے حملہ کیا اور وہ کھڑکی کی جاکھڑا ہوا۔ باہر دیکھتے ہوئے وہ کھوٹے کھوٹے سے لیے میں بولا ”

ہے "وہ بے پروائی سے بولا۔

"نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے اسکول سے آگے تک پڑھا ہے" نہ چاہے ہوئے بھی میرے لیے میں ہلکا سا اصرار شامل ہو گیا۔

"کوئی کسی کے خیالات اور اندازوں پر پابندی نہیں لگا سکتا" وہ بے پروائی سے کہنے لگا "اچھا کہ بولا "تم مجھے اپنی اچھی سمجھا چاہے تو سمجھتے رہو۔" کوئی اعتراض نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنی اسکول سے نکال دیا گیا تھا اور اس طرح نکال دیا گیا تھا کہ کسی اور اسکول میں بھی تین سال تک داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔

اس وقت کو یاد کرتے ہوئے اس کے کچھ کچھ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہونے لگی "میں شروع ہی سے ذرا خودمختار اور فھیلا تھا۔ ہمارے انکس کے مندرجہ ذیل تھے۔ بات بات پر بید سے کمال ادرج کر رکھ دیتے تھے۔ ایک بار میں نے ان کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ شہر سے ایک لہسا سا فو بھی خرید لیا تھا۔ کئی دن تک اسے چھپائے پھر تیار ہوا۔ آخر ایک روز وہ نیچر دوم میں اکیلے بیٹھے مل گئے۔

اس کی مسکراہٹ نمایاں ہوتی تھی۔ وہ لڑکھن کے دور میں واپس پہنچ گیا تھا۔ اب وہ کمزوری کی طرف پست کیے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "میں نے وہ قدموں کرے میں گھس کر چاٹو نکال کر پیچھے سے ٹمپرر حلہ کرنا چاہا لیکن وہ بوقت خردوار ہو گئے۔ وہ بھی باڈی ملڈر ٹائپ تھے۔ پڑی باقاعدگی سے ورزش کرتے تھے اور سر کے کنارے کی میل بوڑ لگاتے تھے۔ وہ ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ انہوں نے میری کلائی پکڑ کر مجھے قابو میں کر لیا۔ چاٹو چمین لیا اور بید سے وہ پٹائی لٹکی کہ ہڈیاں تک چٹ چٹ گئیں پھر انہوں نے مجھے تین سال کے لیے اسکول سے نکال دیا۔ ظاہر ہے تین سال بعد ہم جیسے دیوانوں کی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ چرنے کا امکان ذرا کم ہی ہوتا ہے۔"

پھر وہ ایک گرمی سانس لے کر مسافرانہ سے انداز میں بولا "میرے ساتھ اچھا ہوا بیڑا لیکن ایک بات طے ہے کہ اس دور میں قبول اور دیہات تک کے اسکولوں میں بڑا ڈپلن تھا، بڑا رعب تھا استاد کا۔ بڑے بڑے پٹے خان طالب علموں کی مدد کرتا ہوتی تھی استاد سے۔ کالجوں تک میں لڑکے سر جھکا کر رہتے تھے اور واقعی طالب علم معلوم ہوتے تھے، فڈزے نظر نہیں آتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاست دانوں کے منہوں بچے درس گاہوں میں زیادہ کرے نہیں کھڑے تھے اور سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے مقصد کا ذہر اتنے بوت بنانے پر تعلیمی اداروں میں نہیں پہنچایا تھا۔ بس کبھی کبھار رجب جیسا ہی کوئی ایک آدھ بد نصیب صحیح راستے سے بھٹکتا تھا اور وہ بھی دل ہی دل میں اپنے گروار پر شرمندہ ہوتا تھا۔ اب تو دہشت گردوں کی پوری قلم کی کپکپ برآمد ہوئی ہے اور اپنی دہشت گردی پر فخر کرتی ہے۔ تعلیمی اداروں

کیا سکوت چھایا ہوا ہے۔ اس سے بھی گہرا سکوت میرے دل کی دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ سکوت "ہوش سنبھالنے کے بعد سے میرے ساتھ ہے۔ دل کی وہ گزرونی سنیان پڑی ہے۔ کچھ پانچ چلا کہ کس انجانی "اُن دیکھی ہستی کا انتظار ہے۔"

پھر اچانک وہ میری طرف مڑا اور بولا "لیکن معلوم نہیں تم میری بات سمجھ سکو گے! نہیں۔ شاید تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جنہیں اپنے ہر سوال کا سیدھا سا جواب چاہیے ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ میں ایسا نا سمجھ بھی نہیں" میں نے کہا "اور جو بات تم کر رہے ہو وہ کچھ ایسی انوکھی بھی نہیں۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ہیں جن کے دل کی وہ گزرونی سنیان رہتی ہے۔ وہ ٹارواں بھی کر لیتے ہیں اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انہیں جس انجانی "اُن دیکھی ہستی کا انتظار تھا وہ ان کی زندگی میں آگئی ہے لیکن کچھ عرصے بعد پتا چلتا ہے وہ تو محض دھوکا تھا۔ یوں انتظار پیشہ انظار ہی رہتا ہے۔ ذہن میں جو ایک ظلا ہوتا ہے وہ بھی بھرنے نہیں پاتا۔"

دور کر جم جو شی سے بولا "تم۔ تم حقیقت بات سمجھ سکتے ہو۔ تم سے بات کی جا سکتی ہے۔ میں نے فیملہ کر رکھا ہے کہ اس اُن دیکھی "انجانی ہستی کا انتظار کروں گا اور دھوکا نہیں کھاؤں گا۔ میرے ذہن کے کسی کونے میں چھپا ہوا امید کا فرشتہ کہتا ہے کہ وہ اسطرح ہستی ایک دن ضرور آئے گی۔ تاامیدی کا شیطان مجھے بھی ڈراتا ہے کہ خوابوں کی تعمیریں اس دنیا میں کہاں لیتی ہیں۔ یہ انتظار یہ تھکی تو شاید لہر تک ساتھ جائے گی لیکن میں اس شیطان کی بات نہیں سن سکتا۔ میں کہتا ہوں "میں اس انتظار اور تھکی کو سنبھالنے سے لگاتے ہی جیوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یار تم تو اچھے بھلے انسانہ شمار ہو سکتے تھے۔ اور اگر یہ الفاظ تمہیں نہیں سے پڑھ کر یاد دیکے ہیں تب بھی تم ایک اچھے صداکار اور اداکار تو کھلا ہی سکتے ہو۔ تم نے ان کلاموں کی ادائیگی بہت خوب صورتی سے کی ہے۔"

میں نے یہ الفاظ کہیں پڑھ کر یاد نہیں کیے "وہ خفیف سی ٹوکاری سے بولا "اور تم تو یہ بات مذاق میں کر رہے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انسانہ ٹگا۔ اداکار۔ موزاکنس۔ یا کچھ اور۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میں کاشٹاکار بن گیا۔ جب میں طالب علم تھا۔"

وہ کدیم سی خاموشی ہو گیا۔ اسے گویا اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ وہ کھٹکوی دوائی میں کچھ دور نکل گیا تھا۔ کسی ایسی سمت میں بٹک گیا تھا کہ وہ صدمہ ہو گیا۔ اس کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کا چوکیدم پانے سا ہو گیا۔

میں نے گرمی سانس لیتے ہوئے کہا "تو میرا خیال درست تھا۔ تم طالب علم ہی رہے ہو۔"

"بالہ ظاہر ہے۔ اسکول تک تو اکثر ہی لوگوں نے پڑھا ہوتا۔"



خواب۔

میں خاموش رہا۔ اس نے گردن کھما کر میری طرف دیکھا اور  
قد سے حیرت سے بولا "تم نے نہیں مجھے پر؟"  
"نہیں۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے" میں نے آہستگی سے کہا  
"خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ ان پر کسی کا کیا زور؟"

میں اس سے تو یہ کہہ رہا تھا لیکن میں کچھ حیران ضرور تھا۔  
چیزیں اس کے خوابوں کا درجہ رکھتی تھیں "میرا وہ اوڑھنا بھرا  
تھیں لیکن میں اپنے آپ کو ان سے اکٹایا اکٹایا محسوس کرنے کا  
تھا۔ کبھی کبھی مجھے فائدہ مستی کی زندگی بہت یاد آتی تھی۔ لگتا تھا  
کہ اس وقت زیادہ بے فکر رہی تھی۔ دل میں زیادہ تنگ تھی۔

عام کاروباری لوگوں کی طرح پریشان تو میں اب بھی نہیں تھا۔  
دولت اپنے ساتھ جو مسائل لے کر آتی ہے میں نے انہیں قریب  
نہیں پھٹکنے دیا تھا اور بڑی کوششوں سے انہیں خود سے دور رکھا تھا۔  
سب سے بڑی چیز جس نے مجھے سکون میں رکھا تھا۔ یہ تھی کہ میں  
دولت کا اتنا ضرور تھا لیکن اس پر جان نہیں دیتا تھا۔ اس کی فکریں  
مرا نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ میں فائدہ مستی  
کے زمانے بے تعلق سکون نہیں تھا۔ وہ اتنی تنگ کبھی کبھار  
محسوس ہوتی تھی۔ میں اب بھی ایسی جگہوں پر نہ خوشی سکون اور  
طمینان محسوس کرتا تھا جیسی جگہ پر روئیل خان رہا تھا۔ مجھے  
اب بھی ایسی زندگی زیادہ دلچسپ اور پرکشش لگتی تھی جیسی روئیل  
خان گزار رہا تھا۔

لیکن روئیل خان کے خواب دوسرے تھے۔ مجھے اسی پر بھی  
پر حیرت ہو رہی تھی۔ انسان کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس پر کبھی  
خوش نہیں رہتا، کبھی شاکر نہیں رہتا، کبھی قناعت نہیں کر سکتا۔  
کسی اور ہی صفت میں دیکھتا رہتا ہے۔ روئیل خان بھی اور ہی صفت  
کے خوابوں کا قیدی تھا۔

میرے نہ ہنسنے سے حوصلہ پا کر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا  
"لیکن مسئلہ پھر وہی متضاد کیفیات کا آجاتا ہے۔ میں کئی بار شہر  
میں بھی گیا ہوں۔ سکھر، نواب شاہ، حیدر آباد۔ حتیٰ کہ کراچی تک  
بھی ہو آیا ہوں لیکن ہر جگہ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ساگر  
تک لینے میں دقت ہو رہی ہو۔ ہوا گندمی گندمی اور گاڑھی گاڑھی  
سی لگتی تھی۔ سانس لینے میں گویا زور لگانا پڑتا تھا اور ہوا گویا  
پیمپھیزوں میں انک جا رہی تھی۔ پیمپھیزوں کو چھلنی ہوا پار آتی  
تھی۔ یوں سمجھو "شرکی ہوا سے میرے پیمپھیزوں کو بدبو بھی ہوتی  
لگتی تھی۔" "دو دھڑ سے قبل"

پھر اس نے کھڑکی میں سر اٹھا کر کہنے ہوئے گہری سانس لیا۔  
گویا ساری ہوا پیمپھیزوں میں بھر گئی جا رہا تھا۔ طمانیت کی محسوس  
سانس لے کر وہ بولا "یہاں کی بات یہی اور ہے۔ یہاں سانس لینا  
فرحت بخش کام محسوس ہوتا ہے۔ تھکے ہوئے جسم میں ہی زندگی  
لہر دڑ جاتی ہے۔ یہ علاقہ ہے بھی بڑا خوب صورت لیکن یہاں خود

میں رہت کر دینے ان کر گھومتے ہیں اور شریف طالب علم کان  
دباے "سر جھکائے ان کی نظر سے بچتے پھرتے ہیں۔"  
"تم بھی صبح زاتے سے بھٹکے تو نہیں۔ زیادہ تعلیم نہیں حاصل  
کر سکتے تو کیا ہوا۔ تم محاشرے کے لیے کام تو نہیں بنے ہوئے  
ہو۔ انک تھک اس دیرانے میں اپنی تھوڑی سی زمین سنبھالے  
بیٹھے ہو۔ محنت مشقت کرتے ہو اور حلال کی کھاتے ہو۔ یہ تو بہت  
اچھی زندگی ہے۔ اسے صحیح راہ سے بھٹکا تو نہیں کہتے۔"  
"ہاں۔۔۔ شاید" وہ ہنسنے سے لہجے میں بولا اور ایک بار پھر میری  
طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا "لیکن میں بہت سی  
متضاد کیفیتوں کے درمیان پھنسا ہوا انسان ہوں۔ میں آج تک خود  
اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا۔"  
"اپنے آپ کو سمجھنے میں زیادہ مغل نہیں کھانا چاہتے۔ یہ بڑا  
مشکل کام ہے۔" میں نے مشورہ دیا۔

وہ دھیسے لہجے میں بولا "ایک طرف مجھے یہ جگہ اذیتوں کی  
دیرانی بہت اچھی لگتی ہے۔ تم نے محسوس کیا ہے "یہاں کی مٹی  
میں ایک عجیب سوندھی سی خوشبو پڑی ہوئی ہے؟"  
"ہاں۔ جس دھرتی سے محبت کرنے لگو وہ دھرتی خوشبو دینے  
لگتی ہے۔ جن انسانوں سے محبت کرو وہ انسان خوشبو دینے لگتے  
ہیں۔ یہ دراصل محبت کی خوشبو ہوتی ہے" میں نے کہا۔  
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اس  
خوشبو نے مجھے اپنا امیر کیا ہوا ہے جو میں اس دیرانے میں پڑا جوانی  
کی راتیں گزار رہا ہوں۔ یہ چھوٹا سا مکان۔۔۔ یہ تھوڑی سی زمین۔۔۔  
پراماٹرکٹر۔۔۔ چند سوئیں۔۔۔ بس یہی میری جنت ہے لیکن کبھی کبھی  
میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میرے خواب نہیں ہیں یہ میری  
امیدوں، آرزوؤں کا حاصل نہیں ہے۔ میرے خواب تو اس سے  
بہت مختلف ہیں۔"

گزشتہ تین دنوں میں پہلی بار ہمارے درمیان تفصیلی بات  
ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کھل رہا تھا۔ ان تین دنوں میں مجھے بھی آج ہی  
اپنی طبیعت بہت بہتر محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں بھی گفتگو میں  
دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔

"مثلاً۔۔۔ کیا ہیں تمہارے خواب؟" میں نے پوچھا۔ وہ بدستور  
میری طرف پٹنے کے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دھیسے لہجے میں بولا "جوڑی  
چٹک۔۔۔ چٹکی دہکتی شاہراہوں والا کوئی شہر۔۔۔ اس کے کسی صاف  
ستھرے پر سکون علاقے میں شان سے سراٹھائے کھڑا ہوا کوئی عالی  
شان سا مکان۔ غیر ملکی سازو سامان سے آراستہ ویراست خواب  
گاہیں۔ کھڑکیوں پر پھیلے ہوئے بھاری روشنی پردے۔۔۔ بیش قیمت  
سات میں لینے ہوئے مرمریں بدن۔۔۔ اڑکنڈ ہنسنے کی خشک  
سربراہت۔۔۔ ٹیلی فون کی ہتھیلی۔۔۔ مترجم ہنسی۔۔۔ شائستہ لہجوں کے  
موتی۔۔۔ امپورنڈ پرفیومز۔۔۔ جھللاتی کاریں۔۔۔ یہ ہیں میرے

”میں نے کہا کہ میں تمہارا بھتیجا ہوں۔ لون ولف“  
 مسکراتے ہوئے بولا ”میں اگر اتنی بڑی زمین سنبھالنا چاہوں گا  
 مجھے اپنی خدائی کی قربانی دینا پڑے گی“ لوگوں کو یہاں آباد کرنا پڑا  
 گا۔ لاکھوں روپیہ اس زمین پر لگانا پڑے گا جو فی الحال میرے پاس  
 نہیں ہے۔ بہت محنت کرنا پڑے گی اس زمین پر۔ کئی سال بعد جا  
 اس محنت اور سرمایہ کاری کا پھل کھانا نصیب ہوگا۔ کون جانے گا  
 سال بعد میں یہاں ہوں گا بھی یا نہیں۔ ویسے بھی اب کچھ  
 صاحب یہاں پھیلے ہوئے مرغیوں، بھینٹوں اور نہ جانے کن کن  
 جانوروں کا قارم بنانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ پان امریکن  
 ٹورکی کر کے وہ کچھ امریکی سے ہو گئے ہیں۔ امریکی قسم کے منصوبہ  
 بناتے ہیں۔“

”کیا تم اپنی اس پُر سکون جنت کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟“  
 نے حیرت سے کہا۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جو خوراک  
 اپنے بارے میں کوئی تش کوئی نہیں کر سکتا۔“ وہ جیم لیمے میرا  
 ”اس زمین سے کچھ زیادہ آسانی بھی نہیں ہے۔ میرے شادی  
 کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی ایک  
 عام سے رہائی کا شکار کی بیوی کی طرح میرا ہاتھ پائی میرے  
 میرے بچے دنیا کی آسائشوں کو ترستے ہوئے پرورش پائیں۔ میر  
 اپنی بیوی کو رکھ اور اپنے بچوں کو شہزادے بنا کر رکھنا چاہتا ہوں  
 میرے خواب ذرا اونچے ہیں۔“

”خواب سبھی کے اونچے ہوتے ہیں لیکن تعبیروں کے لحاظ  
 میں جو انی تو نہیں گمانی جاسکتی تھی۔ یہ کم جنت کو توٹ کر نہیں آتی  
 میں نے ایک عجیب سی دوستانہ ہمدردی سے مطلوب ہو کر کہا۔  
 اسی وقت ”خود را نصیب دیکھیں نصیب“ کا بہت عمدہ مظاہرہ  
 تھا۔ مجھے تو خوابوں کی تعبیر بھی میٹر جیمس لیکن میں نے خواب  
 تک شادی نہیں کی تھی۔

”ہاں۔ شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میری عمر پینتیس سال ہے  
 اکثر و بیشتر مجھ پر ایسی راتیں آتی ہیں جب سوئے میں اچانک  
 کھل جاتی ہے۔ جسم پیسے میں تر ہوتا ہے مگر گلا خشک۔ ہر سام  
 سے آگ چھوٹی ہے۔ میں آٹھ کر کوڑے سے ٹھکے سے ٹھکے ہوتی  
 کئی گلاس پین ہوں مگر بدن کا دوزخ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔“ وہ غریب  
 ٹھہرے لیمے بولا۔

”ظاہر ہے۔ وہ تو ہوگا۔ اس میں تو کوئی عجب کی بات نہیں  
 میں نے دیکھے لیمے میں کہا۔

”لیکن شادی کے معاملے میں خوابوں خیالوں اور ارباب  
 ترقیوں کے علاوہ بھی کئی مسئلے ہیں۔ یہ علاقہ فصلوں کے معاملے  
 بھی کچھ زیادہ دوزخ نہیں اور چاند چروں مستانہ آنکھوں کے معاملے  
 میں بھی خاصا عجیب ہے پھر مجھے پیسے چھڑے چھانٹنے کے لیے کون  
 کی کو شش کرے؟ اب میں خود تو کسی شریف آدمی کو راستہ

صورتی کسی ایک جگہ جمع نہیں ہے، کھڑی پڑی ہے۔ یہاں جیمس  
 کہیں میلوں تک صحرا سا دکھائی دے گا کہیں زرعی زمینیں اور  
 لہلہائی فصلیں دکھائی دیں گی کہیں ایسی چٹانیں بھی ملیں گی جن پر  
 سبزے کا نام و نشان نہیں ہوگا اور کہیں سرسبز چراگاہیں اور جنگل  
 بھی ملیں گے جن میں سے بعض اچھے گنے ہیں کہ سویرے کی کرنیں  
 بھی زمین تک مشکل سے پہنچتی ہیں۔ ایک عجیب سی وسعت اور  
 رنگارنگی ہے اس علاقے میں۔ کہیں یہ علاقہ دیکھی گئی ہے کہیں  
 پاؤں اور کہیں صحرائی۔ آبادیوں میں اچھا خاصا شری رنگ بھی  
 جھلکتا ہے۔ یعنی یہاں ہر رنگ موجود ہے۔ کبھی کبھی یونسی میلوں  
 تک اور حوض کھوڑا دوا پھرتا ہوں اور اپنے آپ کو ایک آزاد  
 پنچھی محسوس کرتا ہوں۔ میں چلتے دیکھتے شہروں کے خواب تو دیکھتا  
 ہوں لیکن اس علاقے کو چھوڑ کر جانا بھی مجھے بہت مشکل کام  
 محسوس ہوتا ہے۔“

”اس جگہ کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”کس جگہ؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔ وہ باتوں کی روانی  
 میں گویا کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔

”اسی جگہ کا۔۔۔ جہاں تمہاری یہ زمین اور مکان ہے؟“  
 ”سرکاری کاغذات میں یہ ذریعہ حسام خان سی کا ایک گوشہ  
 ہے۔ اس کا نام نہیں، نمبر ہے۔ لیکن عملاً اس کا ذریعہ حسام خان  
 سے کوئی تعلق نہیں۔ فاصلہ بھی کافی ہے۔ ویسے یہ جگہ نئی کھائی  
 ہے۔ حالانکہ ”جی“ کا مطلب صرف زمین ہے۔ یہاں کے موسموں  
 میں بھی بڑی شدت ہے۔ گرمی پڑتی ہے تو جسم و جان کو جھلکا کر رکھ  
 دیتی ہے اور سردی پڑتی ہے تو اچھا بھلا برفانی علاقہ لگنے لگتا ہے۔  
 مجھے موسموں کی یہ شدت بھی پسند ہے۔ شاید میں فطرتاً شدت پسند  
 ہوں۔“

”تمہاری زمین کے چاروں طرف جو یہ اتنی بہت سی زمین بیکار  
 پڑی ہوئی ہے، یہ کس کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پان امریکن اٹلانٹ میں کوئی کیپٹن صاحب ہیں۔ پاکستانی  
 ہیں مگر شاید بہت اچھے ہواباز ہوں گے۔ جو پان امریکن میں پہنچے  
 ہوئے ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں۔ بہت امیر آدمی معلوم ہوتے  
 ہیں۔ چاہے ان کو کس طرح یہ زمین ملا ہو سکتی ہے حالانکہ وہ  
 ان لوگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں جنہیں زمین کی نہ کوئی خاص  
 ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی قدر۔ یہ بارانی زمین ہے۔ اسے  
 آباد کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے جو کیپٹن صاحب نہیں  
 کر سکتے۔ وہ تو ملک میں رہتے ہی بہت کم ہیں۔ لیکن وہ کسی کو ٹھیکے پر  
 بھی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں ”لوگ قبضہ کر لیں گے۔ حالانکہ قبضے کا  
 مکان اب بھی موجود ہے۔ ذریعہ حسام خان کے ایک زمین کی نظر  
 اس زمین پر ہے۔ کیپٹن صاحب البتہ مجھے یہ زمین شاید ٹھیکے پر دینے  
 کے لیے تیار ہو جائیں لیکن میں لینے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔“  
 ”کیوں؟“ میں نے جانا چاہا۔

یک کر نہیں کہہ سکا کہ جناب میں آپ کی صاحب زادی سے  
لڑی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے" میں نے حلیم کیا "میرا خیال ہے ایسے  
ی گمراہے تک تمہاری رسائی میں ہوئی ورنہ شاید کوئی خودی  
میں نے اس کی ابتدا کر دیتا اور تمہارا کام آسان کر دیتا۔"

"مثلاً؟" اس نے کہا اور میرے قریب کر رہی پر آدھیا پھر  
پلی سٹاگے ہوئے بولا "تم سناؤ۔ تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں  
فل خان؟"

مجھے ہلکا سا دھچکا لگا۔ مجھے پہلے ہی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میں  
اس موضوع کا چیخڑوں کا تو مجھے بھی اس قسم کے کسی سوال کا  
بازار پر مسکا ہے۔

"میرے بیوی بچے؟" معلوم نہیں کہاں ہیں "میں نے آہستگی  
کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا تمہیں معلوم نہیں؟ تم انہیں کہاں چھوڑ کر  
تھے؟"

"کہیں بھی نہیں" میں نے سادگی سے جواب دیا "میں نے  
ہاگ انہیں نہ کبھی نہیں۔"

اس نے جاہلی پر ہاتھ مارتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا  
ہلکے میں سمجھ گیا۔ یعنی جناب خود بھی ابھی تمہارے ہی پیسے ہیں  
بارے بڑے اور بزرگ بن کر ہم کو نصیحتوں سے نواز رہے۔

میں نے مسکینے سے سر جھکا لیا۔ بالآخر میرے دوستوں کو  
تو اور خود کو ضحیت والے معاملے کا پول کھل ہی گیا تھا۔

"وہ عجیب بے نیاز سا آدمی تھا۔ اس نے ابھی تک میرے بارے  
میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اسے اپنا نام بھی میں نے ضرورتاً خودی  
تک آج رات یا جس چل چلی تھی اور بے تکلفی کا احساس ہو رہا  
تھا۔ خودی کا "تم نے میرے بارے میں کچھ پوچھا نہیں؟"

میں ہنسنے لگا کہ تمہاری طبیعت بہتر ہوئی تو خودی بتا دے گا۔  
بہی بھی شکرت ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے اسے اپنے بارے میں کافی حد تک سچ بتا دیا۔ میں نے  
بتا دیا کہ میں لاہور کا ایک آجر ہوں جو خطرناک لوگوں سے  
آگے ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے بھاگنا پڑا تھا۔ لاہور سے  
اور نکل جانے اور گمراہی اختیار کرنے کی کوششوں میں "میں  
ابھی شکلات کا کارخانہ ہو گیا تھا۔"

خوفناک لوگوں کا ذکر کیا تو وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا  
"اسی خادم کو ان کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ان کی خطرناکی  
کو مجھے غلط فہمی کر دیتے ہیں۔ تمہارے اس خادم کی بھی کچھ  
سوالوں سے سلام دعا ہے۔ اب تم کو دوست کہہ دیا ہے  
کہہ لیا ہے تو ضرورت پڑنے پر تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کر  
دیتا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ بس اب اس کی ضرورت نہیں" میں نے بے  
پردائی سے کہا "بس میرا پاؤں ٹھیک ہو جائے تو میں وہاں چلا جاؤں  
گا۔ میرا خیال ہے اب وہ مسئلہ حل ہو ہی جائے گا کوئی صورت  
نکل ہی آئے گی۔"

"کوئی صورت نہ نکلے تو اپنے اس خادم کو ضرور یاد کر کے دیکھ  
لیتا" وہ بولا۔

"تمہارے احسان کے بوجھ تلے تو میں پہلے ہی رہا ہوں۔  
سوچتا ہوں کیسے گناہوں کا "میں نے حقیقی مومنیت سے کہا۔

"کیا ہر احسان انکارنا ضروری ہوتا ہے؟" اس نے تجھے بے  
میں کہا "کچھ احسانوں کو منجھال کر بھی رکھ لینا چاہئے۔ کبھی کبھار  
کسی کا ممنون رہنے میں بھی ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم" میں نے گہری نظر سے اس کی  
طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم جتنے گمراہ آدمی ہو اتنے گمراہ لگتے  
نہیں ہو۔"

"اکثر گمراہ آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو گمراہ نظر آتے  
ہیں وہ دراصل گمراہ نہیں ہوتے" وہ مسکرایا "خیر۔۔۔ ان باتوں کو  
چھوڑو۔ تمہاری داستان غم خاصی دلچسپ ہے۔ تم اسے جاری  
رکھو۔ ویسے بریجکل تذاکر ایک بات اور بتاؤں "میں ابھی تک خود  
نہیں سمجھ سکا کہ میں جنہیں بے ہوش پڑے دیکھ کر کیوں روک گیا  
تھا۔ میں جنہیں بتائی چکا ہوں کہ میں کوئی غاصر و غم دل آدمی نہیں  
ہوں۔ زندگی میں کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ راستے میں لاش پڑی  
دیکھی اور پھر ہلاک کر آگئے۔ یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ  
مرنے والا کون تھا، کیسے مرا؟ مگر اگر اس کے بارے میں سوچا تک  
نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ اوپر والے کے فیصلے ہوتے ہیں کہ کہاں کس کے  
پاؤں میں توخیر ڈالنی ہے اور کہاں کس کو چلنے رکھنا ہے" میں نے  
شکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ تم بتا رہے تھے کہ تم بس بیٹے کر کدھ کوٹ  
پہنچے۔ وہ ہاتھ دلاتے ہوئے بولا "اس کے بعد کیا ہوا؟"

جب میں نے اسے بتایا کہ کس طرح چند قبا کیوں نے مجھے  
ماکو چاچا ڈاکو سمجھ کر پکڑ لیا تھا اور کس طرح وہ یقین کیے بیٹھے تھے  
کہ میں نے ان کے ایک سردار زادے کے قتل میں حصہ لیا تھا تو  
رویل خان کو گویا حیرت کا شہید بھجوا لگا۔ وہ یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ  
گیا۔ اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا کاتم نے؟" اس نے تصدیق چاہی "میں نے  
جنہیں ماکو چاچا سمجھ کر پکڑ لیا تھا؟ ماکو چاچا ڈاکو؟"

"ہاں۔۔۔ وہ تو یہی کہہ رہے تھے" میں نے کہا۔  
"لیکن وہ کس بنیاد پر جنہیں ڈاکو سمجھ رہے تھے؟ کیا ثبوت تھا  
ان کے پاس؟"

"ان کے پاس تو عقل ہی ایک تصور تھی۔ انہوں نے آخر  
"میں نے کہا۔

"لیکن وہ کس بنیاد پر جنہیں ڈاکو سمجھ رہے تھے؟ کیا ثبوت تھا  
ان کے پاس؟"

"ان کے پاس تو عقل ہی ایک تصور تھی۔ انہوں نے آخر  
"میں نے کہا۔

سے میری شکل ملائی تھی "میں نے بتایا۔  
 "کیا واقعی تمہاری شکل اس سے ملتی تھی؟" اس نے گہری  
 دلچسپی سے پوچھا۔

"اس وقت ملتی تھی" میں نے جواب دیا۔  
 "اس وقت ملتی تھی؟ کیا مطلب...؟ کیا اب تمہاری شکل  
 بدل گئی ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ کسی حد تک" میں نے جواب دیا "میں اپنی دانست میں  
 بڑا بدبو ست کر کے چلا تھا۔ اپنے خطرناک دشمنوں سے بچنے کے  
 لیے میں نے تو خود اہستہ بہت تک ایک آپ کا سارا لے رکھا تھا۔ اس وقت  
 میری شکل میں کچھ تبدیلیاں آچکی تھیں۔ بد قسمتی سے انہی تبدیلیوں  
 کی وجہ سے وہ خدا سا وہ ٹوٹو مجھ سے بہت ملتا جلتا نظر آ رہا تھا۔ شاید  
 ایک آپ میں نے کبھی نہیں ماکھو چاچڑ کی تصویر دیکھی ہو اور اس  
 کے لا شعور میں وہ ملتی ہو۔ غیر ارادی طور پر اس نے میرا دماغی  
 ایک آپ کر دیا ہو۔ اپنی دانست میں تو اس نے مجھے دودھ والا بنانے  
 کی کوشش کی تھی۔ دے دیے ایک آپ بہت عمدہ تھا۔"  
 "پھر بھی... کس قسم کا ایک آپ تھا؟ کیا تبدیلیاں تھیں  
 تمہارے چہرے میں؟" اس نے جانتا چلا۔ وہ اب جیسے دنیا کی ہر  
 بات بھول گیا تھا۔ مجھے اس کی دلچسپی اور حیرت غیر معمولی لگ رہی  
 تھی۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایک آپ سے میری  
 شکل میں کیا ایسی بھگلی تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے تھے اس وقت  
 میری شکل کسی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس بات کو کافی  
 دن گزر چکے تھے اور اس دوران مجھے مسلسل دشواریوں کا سامنا  
 رہا تھا، مجھے کہیں بھی صحیح معنوں میں آرام اور احتیاط سے بیٹھنا  
 نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میرا ایک آپ اپنی معیاد سے پہلے ہی  
 ختم ہو چکا تھا۔

وہ آئینیں کیسے پڑ خیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے  
 بولا "اس کے باوجود ان لوگوں کو تمہیں ماکھو چاچڑ نہیں سمجھا  
 چاہیے تھا" یہ بات سن کر اس کی تو کوا حیرت ہی دور ہوئے میں  
 نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اس کے اس قدر حیران ہونے کی توقع نہیں  
 تھی۔

"کیوں... کیا تم ماکھو چاچڑ کو جانتے ہو؟ اس کی شکل دیکھی  
 نہیں تھی جیسی میں نے بتانے کی کوشش کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بات نہیں ہے" وہ تیزی سے بولا "ماکھو چاچڑ کو تو میں  
 نہیں جانتا لیکن تمہیں تو ان تین دنوں میں ہی اچھی طرح جان گیا  
 ہوں۔ خیر۔ جاننے کی بات بھی چھوڑو۔ تم شکل سے ہی ڈاکو نہیں  
 کہتے۔ ایک آپ کی جو تبدیلیاں تم بتا رہے ہو ان کے باوجود تم میرے  
 اندازے کے مطابق ڈاکو نہیں لگ سکتے تھے۔ میں نے جب تمہیں  
 دیرانے میں بے ہوش پڑے دیکھا اس وقت بھی جالا تکھ میں بیٹھوں

اس وقت بھی نہیں لگ رہے تھے۔ میں نے تو ایک نظر دیکھی  
 اندازہ کر لیا تھا کہ تم کوئی شریف آدمی ہو اور تمہارا عقلی شہرے  
 ہے۔"

"تمہاری بات اور ہے" میں نے کہا "تم دماغی ہو۔ اس  
 دیرانے میں زندگی گزار رہے ہو اس کے باوجود شہروں سے زیادہ  
 مذہب پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ وہ کرنت  
 قسم کے قبائلی تھے جنہوں نے مجھے بڑا تھا۔ وہ دوسرے کی بات سننے  
 کے تو مادی ہی معلوم نہیں ہوتے تھے۔"

پھر میں نے طویل سانس لے کر گادھکے سے نکل نکلتے ہوئے  
 کہا "وہی مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ عقل  
 و صورت سے کسی کے ڈاکو ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ لگایا جاسکے  
 ہے۔ ڈاکو کا وہ تصور تو اب صرف نظموں اور پرانی طرے کے قے  
 کماندہوں میں رہ گیا ہے کہ وہ کالے کپڑوں میں ہو مگھوڑے پر سوار  
 ہو، چہرے پر زامانہ عینہ عا ہو اور ہاتھ میں توڑے دار عینہ ہو۔ اب  
 تو دور دراز ساتوں میں بھی ڈاکو بہترین اور جدید قسم کی جینوں میں  
 آتے ہیں ان کے پاس جدید ترین راتھیں مشینیں بھی مگر یہ  
 بعض اوقات راکٹ لانچر تک ہوتے ہیں۔ بلکہ پولیس اسٹیشنوں  
 دہائی پائی جاتی ہے کہ ان کے پاس وہ جدید وسائل نہیں ہیں  
 ڈاکوؤں کے پاس موجود ہیں۔ اس لیے ان سے غائب شکل  
 ہو رہا ہے۔"

وہ خاموشی سے بخور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان  
 جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ ڈاکو بہت بدلے ہوئے نام  
 میں بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے ایک ہائے والے چھوٹے ہوائی  
 برنس میں ہیں۔ کراچی میں کلشن اقبال میں رہتے ہیں۔ ایک  
 بتا رہے تھے کہ سالانہ نو سو سال سے ان کے برابر والے بیٹے  
 کرائے پر ایک ٹیلی آکر رہے گی۔ اس میں وہ نہیں مارتے  
 نہایت شریف نہایت اس پرست۔ برنس میں کی جیلی سے ان کے  
 تعلقات بھی ہو گئے۔ ایک کے گھر میں اچھے کھانے پک رہے ہیں  
 ٹرے جاکر دوسرے کے گھر میں جاری ہے۔ شائق کا چلا کر  
 ہے۔ عید پر عید پر چڑس بجتی جاری ہیں۔ ایک رات پولیس  
 بیٹنگ کے گرد موچہ بندی کر کے چھاپا مارا اور جب بے جا  
 ہمارے برنس میں دوست کو پتا چلا کہ اس ٹیلی کے مرنے والے  
 درجے کے ڈاکو تھے۔ قتل اور ڈاکوئی کی کم از کم چھپ چھپ دار  
 پولیس کو مطلوب تھے۔ بے چارے برنس میں کے درجے کو  
 ہو گئے اور کافی عرصے تک کھڑے ہی رہے۔"

وہ دلچسپی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے  
 گہری سانس لے کر کہا "لہذا برابر عزیزیہ کہنا بہت مشکل ہے  
 ڈاکو کیسے ہو سکتے ہیں اور کیسے نہیں۔ زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے  
 بھی اصلیت جاننا بہت مشکل ہے۔"

گئے۔ احمات بھی اکثر ماندھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ڈاکوؤں کے لیے ان چیزوں کی افادت آج بھی قائم ہے۔ کالی گاڑیوں اور لباس کی وجہ سے انہیں رات کے اندر چرے میں غائب ہونے میں مدد ملتی ہے۔ ڈھانے سے اصل شکل چھپی رہتی ہے۔ یہ ایک الگ معاملہ ہے کہ بے شمار حوالے نے ڈاکوؤں کو اب بے خوف بنادیا ہے۔ انہیں اپنی شکل ظاہر ہو جانے کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ان کی اکثریت یہی سوچتی ہے کہ اصل شکل چھپی ہی رہے تو کیا حرج ہے؟ کبھی کبھی یہ اعتقاد بہت فائدہ دے جاتی ہے۔

”تمہیں تو ڈاکوؤں کی نفسیات اور ان کی سوچ سے کافی آگاہی حاصل ہے، میں نے سنا کہ تمہیں نے سنا کہ تمہیں نے سنا کہ۔“

”میں جس علاقے میں رہتا ہوں وہاں ڈاکوؤں سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”بعض اوقات تو ہمیں ان کے سامنے بالکل مسکین اور ان کے ہمدرد بن کر بھی رہنا پڑتا ہے کیونکہ فی الحال مجھ جیسے لوگوں کو انہی علاقوں میں کہیں نہ کہیں رہنا ہے۔ میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔ یہاں اب بھی گھڑ سوار ڈاکو ہی زیادہ پائے جاتے ہیں کیونکہ ضرورت پڑنے پر انہیں جس طرح کے تیل اور جگہوں میں دھوپوش ہونا پڑتا ہے وہاں گھوڑے ہی زیادہ کارآمد رہتے ہیں۔ گاڑیاں تیز رفتار ضرور ہوتی ہیں اور ان کے بہت سے فائدے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کے بہت سے مسائل بھی ہوتے ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا ”بلکہ میں تمہیں خبردار کرنے والا تھا۔ دو چار دن میں ذرا تم کسی مرد اور سارے کے بغیر چلنے کے قابل ہو جاؤ تو شاید مجھے ڈیرہ حسام خان جانا پڑے اور ایک آدھ رات کے لیے شاید مجھے وہیں رکنا پڑے۔ اس دوران تم ذرا ہوشیار رہنا۔ کبھی کبھار کچھ ڈاکو بھٹکتے بھٹکتے اس طرف بھی آتے ہیں۔ ویسے تو خیر یہاں کیا رکھا ہے جو وہ لے جائیں گے لیکن کبھی کبھار ڈاکو جنگلی جانوروں کی طرح محض شرارتا بھی راستے میں آنے والی چیزوں کو آجاڑتے چلے جاتے ہیں۔ تمہیں میری عدم موجودگی میں ڈاکوؤں سے..... اور ان کے اس موڈ سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی۔ ویسے تو اس علاقے کے بیشتر ڈاکوؤں کو میرے اور میرے اس ڈیرے کے بارے میں ساری معلومات حاصل ہیں۔ وہ ادھر کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن کچھ بعد نہیں کہ کوئی اکیلا اکیلا یا فٹکا۔ یا نئے فٹکاروں کا کوئی ٹولہ اس طرف آئے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ میں نے غیر ارادی طور پر بے پروائی سے کہا ”ویسے تمہارے خیال میں مجھے کتنے دن یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟“

”جب تک تم اپنے دونوں بیروں پر صحیح طرح دوڑنے بھاگنے اور اچھلنے کودنے کے قابل نہ ہو جاؤ اس وقت تک تمہیں یہاں سے چلنے کے بارے میں بھی نہیں سوچنا چاہیے اس کے بعد کا قیام تمہاری مرضی اور غرض ہوگا۔ تم جاؤ تو پیشہ بھی یہاں رہ سکتے ہو۔“

ناراضے تھے ”کیا وہ پکڑے گئے تھے؟“

”نہیں۔ نہ جانے کس وقت وہ پورے کا پورا غائب ان غائب ہو چکا تھا۔ سبایا کھر خالی چھوڑ گئے تھے۔ پولیس خواہ خواہ گمشود ہو چکا۔ بنڈیاں اور گا بنڈیاں کرتی رہی۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ویسے لی والی جلی رہا تھا۔ لیکن میں چلے جلی رہے تھے۔“

”جس طرح پولیس کو ان کی موجودگی کی خبری ہوئی تھی اسی طرح انہیں بھی پولیس کے چھاپے کی خبری ہو گئی ہوگی۔ صرف پولیس کا ہی نہیں ڈاکوؤں کا بھی خبری کا نظام کام کرتا ہے۔ دونوں کے نظاموں میں مقابلہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کا نظام بہت لے جاتا ہے، کبھی کسی کا۔“ وہ مریضانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”یہ بتاؤ وہاں سے ڈکیتیوں کا کچھ حال بھی رہا ہوا تھا یا نہیں؟“

”نہیں۔ وہاں نقدی زبور کچھ نہیں تھا۔ بھولے سے کہیں وردے بھی چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ضروری نہیں ہے۔“ وہ نہ بنا کر بولا ”ممکن ہے انہیں بہت کچھ چھوڑ کر جانا پڑا ہو لیکن کاغذات میں اس کا ذکر نہ کیا ہو۔“

میں نے اس پر کوئی تبصرو نہیں کیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا مگر یہ واقعہ میرے کسی شناسا پرس میں کے پردوں کا نہیں بلکہ لاپٹی میں میرے اپنے ہونٹوں کے جزل شجر کے پردوں کا تھا۔ میں نے اس کی روڈ میں خان کو اپنی اصل شخصیت کے بارے میں بتانا ستر میں سمجھا تھا اور اپنے آپ کو چھوٹا مونا تاہر ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

”خطرناک لوگوں“ سے اپنی دشمنی کی بات کرتے وقت بھی میں نے ریڈ واٹ کے بارے میں اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ ان باتوں کی میلالت میں جانا ہے کہ خطرناک۔ میں اس وقت مدجیل خان کی کلا علمی اسٹوڈیو سے محظوظ بھی ہوا تھا جب اس نے ان خطرناک لوگوں کے سلسلے میں اپنی مدد کی پیش کی تھی۔ اس نے چارے کو کیا معلوم اگر جن لوگوں سے میرا تعلق تھا ان کے سامنے مدجیل خان یا ان کے وہ شناسا جنہیں وہ ”خطرناک“ سمجھتا تھا، انہوں سے زیادہ بہتر نہیں رکھتے تھے۔ ان سب باتوں میں اچھے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے معاملات اور بات چیت کو زیادہ سے زیادہ دور عام فہم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں ہر جگہ اپنے اصل اگلے کے بارے میں گاتے بھرتے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا اور یہ تیرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

مدجیل خان تیری کو اگلیوں میں تھمتاے ہوئے بولا ”..... لیکن تمہیں ایک بات بتا دوں۔ نہانہ خواہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔“

ان کی بھی طے کا اپنی مدد بات سے ایک نفسیاتی مصلحت بن جاتا ہے۔ وہ تو نہیں سکتا۔ مثلاً ڈاکو آج بھی کالے رنگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں۔ چاہے وہ بیپ میں ڈاکا مارنے لگا یا بھارو میں۔ عموماً ان کی گاڑی سیاہ یا کسی دوسرے گہرے رنگ کی ہوتی۔ پکڑے بھی سیاہ یا پھر کسی اور گہرے رنگ کے ہوں۔

”چلو خیر۔۔۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”چند دن مزید ساتھ رہیں گے تو شاید ہم ایک دوسرے کی شخصیت کی گہرائی مانپنے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”شاید“ اس نے ہنس لہے میں کہا اور مجھے دوا دے کر میرے کے لیے لیٹ گیا۔ اس نے میرے دل میں کچھ ٹھنکا سا پیدا کر دیا تھا۔ شاید اسے میری کمائی پر پوری طرح یقین نہیں تھا حالانکہ اس میں کوئی ایسا جھوٹ بھی نہیں تھا۔ میں نے صرف اتنا ہی کیا تھا کہ اپنی حیثیت اور حقائق کی سنگینی کو بہت کم کر کے بیان کیا تھا۔

بہر حال دو میل خان کے دعوے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور نہ ہی اس کا ظلم کم ہوا نہ کھائی دیا۔ دو تین دن مزید گزرے تو میری مقامی خاصی کم ہو گئی۔ اب میں کسی سارے کے بغیر چل رہا تھا۔ سکا تھا۔ پاؤں پر ہوا وزن نہیں آتا تھا اور میں تیز تیز چل رہا تھا۔ سکا تھا لیکن پچھلے دن کے مقابلے میں ذہن آسمان کا فرق تھا کہ بوئیل خان اب بھی میرا ہر کام خود کرنے اور ضرورت کے وقت میری خدمت میں حاضر رہنے کی پوری پوری کوشش کرتا تھا۔ اس نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں صرف ہلکی دوزش کے طور پر چلوں۔ بلا ضرورت چل پھر کر اپنے ٹھیک ہوتے ہوئے پاؤں کو خراب کرنے کی کوشش نہ کروں۔

مجھے اس حد تک تندرست ہوتے دیکھ کر وہ کیا مطمئن ہو کر ایک شام زہرہ حسام خان چلا گیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے کام بھی تھے اور کچھ سودا سلف بھی لانا تھا۔ کچھ لوگوں سے ملاقات بھی کرنا تھی اس لیے وہ دوسرے دو دن چڑھے ہی واپس آئے گا۔ مجھے گمان گزرا کہ جن لوگوں سے اسے ملاقات کرنا تھی ان میں شاید چلن سے بھاگنے والی کوئی دیر پا کوئی خوش ارا بھی ہو لیکن میں نے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ کسی کی نجی زندگی کو کربنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ مناسب جگہ پر خودی کچھ بتا رہا گا۔

وہ کلا شکوفہ اور ریحہ الورا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ماؤز میرے سرانے چھوڑ گیا تھا اور مجھے ہوشیار رہنے کی تلقین کر گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کی تلقین سے پہلے بھی ہوشیار رہتا تھا۔ میرا پاؤں ٹھیک نہیں تھا لیکن میں ضرورت پڑنے ہی دوڑ کر پوزیشن لینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اب تو خیر میرا پاؤں بہت تیز تھا۔ مجھے کافی اطمینان تھا۔

دو میل خان دوسرے روز شام کو ہی واپس آیا۔ وہ بہت تھکا مایوس اور مضطرب لگ رہا تھا لیکن غماں نے اور میرے ہاتھ کی کٹاؤں سے بچنے کے بعد وہ آہ دم نظر آنے لگا لیکن اس کی آنکھوں میں گلابا دورے بدستور تیر رہے تھے جو اس کی شب بیداری کی جھلک دکھا رہے تھے۔ اس روز وہ سر شام ہی سو گیا۔

چار دن اور گزر گئے۔ میں ہلکا ہلکا دوڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔ تیز دوڑنے کی کوشش کرتا تھا تو مجھے میں درد کی لہری لگتی تھی۔

غریب خانہ حاضر ہے لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ اس دیرانے میں تمہارا دل نہیں لگے گا۔ شہری آدمی یہاں صرف مجبوری میں ہی رہ سکتا ہے۔ خوشی سے نہیں۔“

میں نے لٹھری سانس لے کر کہا ”اب تمہیں کیا بتاؤں کہ میرا تو اس سے بھی زیادہ کسی دور دراز مقام پر۔۔۔ قلب شمالی یا قلب جنوبی قسم کی جگہ پر رہنے کو ہی چاہتا ہے لیکن اب جان بہت کمبختیوں میں پھنس چکی ہے۔“

”جینٹر لوگوں کے ساتھ ایسی ہی مجبوریاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ کہیں رہتے ہیں گو کہ ان کا دل کہیں اور رہنے کو چاہتا ہے“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے صرف آٹھ بجے تھے لیکن وہ چنچے ہوئے بولا ”بہت رات بہت گئی بھی“ اب سو جانا چاہئے۔ لاؤ تمہاری ٹانگ پر دوا کی مالش کروں۔ اس کے بعد اپنی گولیاں اور کینڈل کھاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔“

اس دیرانے میں آٹھ بجے واقعی ایسا محسوس ہوا تھا جیسے آدمی رات بہت چکی تھی۔ میں نے اپنے تختے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”تم کرم کی ٹیپ مجھے دے دو۔ اب تو میں خود بھی مالش کر سکتا ہوں۔ اب درم بھی کم ہو گیا ہے اور تکلیف بھی قابل برداشت ہو گئی ہے۔“

وہ نوب لاکر مجھے دیتے ہوئے بولا ”دل تو چاہ رہا تھا کہ تمہاری باقی داستان غم بھی آج ہی گنتا لیکن مجھے صبح نہ اندھیرے اٹھنا ہوتا ہے اس لیے باقی کل میں گے۔“

”داستان غم تسکون ہی میں سنی چاہئے۔ یکشت سننے سے خواہ خواہ سننے والے کا دل بھی غم زدہ ہو جاتا ہے“ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ میری آنکھوں میں بھاگتے ہوئے گہری بخیدگی سے بولا ”دوپے استاد! آدمی تم بھی اس سے زیادہ مرے ہو جتنے نظر آتے ہو۔“

”تمہیں یہ شبہ کیونکر ہوا؟“ میں نے استہزائیہ سے انداز میں پوچھا۔

”تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں کہ تم کوئی چھوٹے آدمی نہیں ہو“ وہ چلک چمکائے بغیر بولا۔

”آنکھیں!“ میں نے معنوی حیرت سے کہا ”یار! جب میں ایک نو عمر لڑکا تھا“ اپنے گاؤں میں آواہ گھومتا تھا۔ میرے جوتوں کے گھون میں سوراخ ہوتے تھے اور جب میں ایک اٹھنی بھی نہیں ہوتی تھی“ آنکھیں تو میری اس وقت بھی مٹی تھیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن وقت اور حالات کے ساتھ انسان کے چہرے اور آنکھوں میں۔۔۔ بلکہ پورے وجود ہی میں کچھ خاص قسم کی تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں جنہیں وہ خود بھی محسوس نہیں کر سکتا مگر دیکھنے والی آنکھ انہیں دیکھ سکتی ہے۔“

زندگی ری تو میں پھر کبھی تمہارے پاس ضرور آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

”ضرور... ضرور... لیکن میں اپنے دُھور و نگر ساتھ لے کر چلوں گا۔ میرے پیچھے کون ان کا خیال رکھے گا؟ یہ تو مجھ کے مر جائیں گے“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم سمجھ رہے ہو میں اس بات سے ڈر جاؤں گا اور تمہاری میزبانی کا خیال دل سے نکال دوں گا؟ ہرگز نہیں برادر عزیز! ہم نے تو اوٹنوں والوں سے پاری کرنے سے پہلے ہی اپنے دواؤں سے اونچے رکھے ہوئے ہیں۔ تم بھی آؤ! اپنے دُھور و نگر کو بھی لانا۔ تم ذرا مجھے گردش سے نکل جانے دو۔ تمہارے دُھور و نگروں سمیت تمہیں جہاز چارٹر کر کے بلوالوں گا۔ میں صرف تمہاری ہی نہیں تمہاری گائے بھینس تک کا نمون ہوں۔ میں نے ان کا بہت دودھ پیا ہے۔۔۔ اور ان مرغیوں کو بھی میں نہیں بھول سکتا جنہیں تم اور میں ذبح کر کے چٹ کر گئے“ میرا لہجہ مقوم ہو گیا۔

”بے چاریاں۔۔۔ اس نے بھی ٹھنڈی سانس لی“ اب کیا ہو سکتا ہے۔ جانے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔ خاص طور پر۔۔۔ پیٹ میں جانے والے تو بالکل ہی لوٹ کر نہیں آتے۔“

پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا ”چچا! یہاں سے کچھ جگہ تھکاؤ۔ کیا واقعی اب تمہارے تختے میں ذرا بھی درد نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں“ میں نے سچائی سے جواب دیا ”تم چاہو تو مجھے کہیں لے جا کر میرے تختے کا ایکسرے کروا دیکھ لو۔ بالکل ٹھیک آئے گا۔“

”تو کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنی بڑی ایکسرے مشین تمہارے سامنے جو کھڑی ہے“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ اُدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس وقت ہم اس کے باڑے کے جنگل سے باہر کھڑے تھے۔ وہ کئی سو قدم کے فاصلے پر موجود ایک درخت کو نظروں ہی نظروں میں منتخب کرتے ہوئے بولا ”چچا!۔۔۔ ایسا کر۔۔۔ تم ذرا کم رفتار سے دوڑتے ہوئے اس درخت تک جاؤ اور تیز دوڑتے ہوئے واپس آؤ۔ واپسی میں تم جتنا بھی تیز دوڑ سکو دوڑنا۔“

”یہ کون سا مشکل کام ہے“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔ مجھے اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ وہ باقاعدہ ڈاکٹر تھا یا نہیں! مجھے اس سے کوئی غرض نہیں رہی تھی۔ میرے لیے وہ معالج ہی تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ تمام تر خلوص کے ساتھ میرے پاؤں کو مکمل طور پر ٹھیک و ٹھیکنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں کوئی خلل و مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں اس درخت تک گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں واپس آ گیا۔ وہ بغیر میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ میرے چہرے پر درد یا تکلیف کی کوئی علامت تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے واقعی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی! اسے علامت کہاں سے

دیکھ جان کی طرف سے ابھی مجھے تیز دوڑنے کی ممانعت تھی۔ میں نے میرا علاج واقعی عمرگی سے کیا تھا اور میری بے مبری کو انت ڈیٹ کے ذریعے کنٹرول میں رکھا تھا۔ وہ میرے لیے کسی ایسے ڈاکٹر کا مقابل ہی ثابت ہوا تھا۔

میں نے اس حد تک ٹھیک ہوتے ہی عمارتِ نارخت سربازہ جئے کو پیش کی تھی کیونکہ حقیقتاً تو میرے پاس ایسا کوئی رخت سرفراہ نہیں بنے باندھنے کی ضرورت پیش آتی لیکن روئیل نے مجھے ہٹ کر بٹھا دیا ”یہ فیصلہ میں کروں گا کہ تمہیں کب جانا چاہیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں پھر دوڑنے بھاگنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے اور اس پلٹر میں تمہارا پاؤں دوبارہ خراب ہو سکتا ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ کا مریض اب بالکل ٹھیک ہے“

”میں نے اصرار کیا“ اپنے پورے دو پیروں پر کھڑا ہو چکا ہے۔“

”پورے دو نہیں“ پورے دو پیروں پر کھڑا ہے“ وہ سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی مگر تم عمر بھر کے لیے ٹانگ میں نقص بٹھانا چاہتے ہو اور بے شمار مریضوں کے اقبال اپنی درگت بنانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔“

میں اس کے غلوں کے سامنے مزید اصرار نہ کر سکا۔ آج کے درمیں کون کسی اجنبی کے لیے اتنا تیز دوڑ کرنا ہے اور کون کسی کو اسے داری بنا کر سر پر بٹھاتا ہے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بہت دھمے لہجے میں بولا ”تمہیں روکنے میں تمہاری بھلائی کے علاوہ میری غرض بھی پوشیدہ ہے۔ تمہیں آئے چند دن گزرتے ہیں لیکن لگتا ہے تمہارے ساتھ اپنے ایک بہت گزر گئی ہے۔ جلدی دوست لگتے لگے ہو تم۔“

نہانی وجہ سے اب یہاں زیادہ دل لگنے لگا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر میں بھی تنہائی سے آگاہ ہوں لیکن شاید اپنے آپ کو عموماً دے رہا ہوں کہ یہ تنہائی مجھے بہت پسند ہے۔“

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر ہلکی سی انفرادی تھی۔ اس کے گونگے برا قابلِ رحم محسوس ہوا۔ دنیا واقعی ایک گورکھ دھندا ہے۔ دینا کے ہنگاموں سے دور رہنے والا بھی خوش نہیں دینا کے ہنگاموں کے درمیان رہنے والا بھی خوش نہیں! تنہا بھی خوش نہیں انسانوں کے ہجوم میں گھرا ہوا بھی خوش نہیں! تہی دست بھی خوش نہیں! دولت کے انبار سیٹھنے والا بھی خوش نہیں۔ تو پھر خوش کون ہے؟ خوشی کہاں ہے؟ یہ ایک عجیب بھید ہے جس کے کھلنے کے انتظار میں زندگی بہت جاتی ہے۔

اس شام دو روئیل پھر ذریعہ حسام خان چلا گیا۔ اس بار بھی وہ دو گز سے دو گز پر کو واپس آیا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی وہ جھکا ہوا تھا اور چپ چاپ دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ذریعہ حسام اگر اسے آرام کرنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

میں دن مزید گزر گئے تو میں نے دوپہر کے کھانے کے بعد کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب مجھے اجازت دو روئیل خان!

نظر آئی۔

”زیر کی گد“ اس نے قدرے علمائیت سے سرھلایا ”لیکن ابھی تمہارے اور نیسٹ بھی باقی ہیں۔ اب ذرا بچوں کے بل جتنا بھی اونچا اچھل سکتے ہو اچھل کر دکھاؤ۔“

میں نے اس کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔ میں گریا اس وقت ایک طالب علم تھا اور اپنے پی ٹی کے نیچری ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ میں بچوں کے بل اس کی توقع سے زیادہ اونچا اچھلے گا۔ اس کی نظر میرے چہرے پر گزری ہوئی تھی۔ میرے چہرے پر تکلیف کی کوئی رشتہ نہ پا کر اسے شاید خوشی کے ساتھ ساتھ ہلکی سی مایوسی بھی ہوئی۔ یہ غالباً اپنا اندازہ غلط ثابت ہونے کی مایوسی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میرا پاؤں ٹھیک ہونے میں ابھی کچھ نہ کچھ کمر لگائی تھی۔ اب تم ایک اور مشکل کام کر کے دکھاؤ۔ اس نے مزید فرمائش کی ”زور دیکھیں تم اپنی ٹانگ کو زوالی ہمزائی میں بھی استعمال کرنے کے قابل ہو گئے ہو یا نہیں۔“

وہ دونوں بازو ذرا پھلاتے ہوئے اس طرح تھوڑا سا جھک گیا جیسے کوئی ماہر لڑاکا کسی شخص کے چاقو کے وار سے بچنے کے لیے مستعد ہو رہا ہو۔ وہ ٹانگ جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے نیم دائرے میں حرکت کرتے ہوئے بولا ”اب تم اپنی ٹانگ مجھے رسید کر کے دکھاؤ جس میں تکلیف تھی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! یہ گستاخی میں کس طرح کر سکتا ہوں؟“ میں نے احتجاج کیا۔

”یہ گستاخی نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب خود ٹھہرے رہے ہیں۔“ وہ بولا۔

”یہ فزق تھرابی کی کون سی قسم ہے ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا ”میں نے علاج کے بعد آج تک کسی ڈاکٹر کو مریض سے یہ فرمائش کرتے نہیں سنا کہ وہ اسے لات رسید کرے۔“

”یہ مریض بھی ذرا مختلف ہے اور ڈاکٹر بھی۔“ اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا ”پلٹے لات رسید کرو۔ اس خوش فہمی میں مت رہو کہ وہ لات واقعی مجھے لگ جائے گی۔ میں اپنا بچاؤ کروں گا۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔“ اگر آپ مجھے گدھا سمجھتے ہیں اور دولتی چلو اگر میرا نیسٹ لینا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی“ میں نے لٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”دولتی نہیں“ صرف ایک لٹی“ اس نے ہنسی کی۔

میں بھی اس کے سامنے اس طرح نیم دائرے میں گھومنے لگا جیسے لات مارنے کے لیے مناسب موقع تلاش کر رہا تھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ میں اسے پیٹ یا سینے پر لات رسید کرنے کی کوشش کروں گا اور وہ نہایت آسانی سے اس سے بچ جائے گا لیکن میں نے اپنی کمر کے بل ٹھہر کر اچانک ہی اسے لات رسید کی لیکن یہ جوڈ

کا وار ”چاپ سولی“ تھا۔ لات اسے سامنے لگنے کے بجائے کمر کی تھی۔

میں نے وار نہایت ہلکائی کیا تھا لیکن وہ اونٹ سے متاثر نہ ہوا۔ کپڑے بھاڑتا ہوا جب وہ اٹھا تو اس کے چہرے پر ہلکی سی غیبت تھی لیکن وہ میرا کندھا ٹھپکتے ہوئے بولا ”مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ آؤی تم خطرناک ہو۔“

”گستاخی کی معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب! ویسے میں نے ہاتھ میرا مطلب ہے لات ہلکی ہی رکھی تھی“ میں نے ہاتھ جڑ کر کہا۔

”لات زوردار بھی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ جس لات کو انسان نے خود دعوت دی ہو اسے مہر شکر کے ساتھ کھانا چاہیے۔“ وہ لٹھنڈی سانس لے کر بولا ”مجھے تو خوشی ہے کہ تمہارا پاؤں اب واقعی ٹھیک ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے میں نے ایک اور کس کامیابی سے بینڈل کر لیا ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے میں نے ایک اور مشکل کس کامیابی سے بینڈل کیا تھا۔ ایک شخص کو سانپ کا کھا تھا۔ میں نے خود ہی اس کا علاج کیا۔ معمولی سی سرخری بھی کی۔ چونکہ زور ہی پتا چل گیا تھا کہ اس شخص کو سانپ نے کاٹا ہے اس لیے میری احتیاطی تدابیر اور علاج سے ہی کام چل گیا۔ اسے اسپتالی نہیں لے جانا پڑا۔ چند دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔“

”کون تھا وہ شخص؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”میں خود“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

میری آنکھوں میں بے چینی سی رینگو کر اس نے جوتا اُتار کر مجھے اپنا پاؤں دکھایا جس پر سانپ نے کاٹا تھا۔ اب اس پر صرف دو نقطوں جیسے پارک سے نشانات باقی تھے جن کے درمیان چھوٹا سا ایک کر اس لگا ہوا تھا۔

”بہت سے سانپوں کے زہر سے انسان نہیں مرتا“ ان کی دہشت سے مرعہ آئے ”وہ دوبارہ جوتے پہنتے ہوئے بولا۔“

”تم اب بھی چاہو تو پیش بدل سکتے ہو۔ گاؤں میں تو تم گاؤں سول سرجن سمجھا سکتے ہو۔ مستقبل کا نئی روشن ہو گا اس بچے میں تمہارا۔“ میں نے کہا۔

”ذرا تم جیسے اور اپنے جیسے مریضوں پر مزید کچھ ہاتھ صاف کرلوں پھر سوچیں گے“ اس نے اطمینان سے جواب دیا ”اپنی ٹانگ تو ذریعہ حسام خان میں ایک جعلی ڈاکٹر مریضوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ صحیح معنوں میں ”پریٹینس“ کر رہا ہے۔ کسی زمانے میں شرمین کسی ڈاکٹر کے پاس کام کر چکا ہے۔“

”ڈاکٹر رہا ہو گا؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ لٹھنڈی سانس لے کر بولا ”ڈاکٹر ہو تا تب بھی قیمت نہ وہ تو کسی ڈاکٹر۔ ہاں چڑا اسی قسم کی چیز تھا“ معافی و شہرہ کرام۔ اسے صرف تین چار گولیوں اور تین چار کپڑوں کے نام معلوم ہیں۔ وہی مرتبائیوں میں بھرے بیٹھا رہتا ہے۔ سارا دن غائب



مانا کہ اپنے محسن سے صحیح طور پر اجازت لیے بغیر اس کی عدم موجودگی میں چوروں کی طرح چلا جاؤں۔ ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ اگر میری روانگی کے بعد وہاں کوئی چوری ہوگئی تو وہ میرے ہی کھاتے میں جائے گی، تو دلیل مجھے کس قدر گھٹیا انسان تصور کرے گا اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری سی آنی تھی۔

ہم مکان میں واپس آئے تو دلیل نے ایک الماری سے بڑا سا ایک نقشہ نکال کر میرے سامنے پھیلا دیا۔ نقشہ بوسیدہ مگر کافی تفصیلی سا تھا۔ اسے شاید کسی ماہر نقشہ نویس نے تو نہیں، کسی عام شخص نے ہی بنایا تھا لیکن رہنمائی کے لیے وہ مقصد ہی قلم تھا۔ اس کے ایک کونے میں نہایت باریک الفاظ میں کچھ ہدایات بھی درج تھیں۔

”یہ تمہارا بنایا ہوا نقشہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا بنایا ہوا ہے جو اس قسم کے کاموں میں مجھ سے کہیں زیادہ ماہر تھا لیکن اب وہ بے چارہ اس دنیا میں نہیں ہے“ دلیل نے جواب دیا۔

”یہ غالباً اسی علاقے کا نقشہ ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔ اور یہ میں تمہارا تھیں پیش کر رہا ہوں“ وہ نقشے پر جھکتے ہوئے بولا ”تم نے اپنی جو داستان غریب مزہ مجھے سنائی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک تم بغیر سوچے سمجھے منہ اٹھانے اور حسرت اور پشیمانی سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑی غلطی نہیں۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت تم زندہ سلامت نظر آ رہے ہو۔“

”مجھے سوچنے سمجھنے کی مصلحت ہی کہاں ملی۔ ایک کے بعد دوسری آفتاؤں کی دہری میرے سر“ میں نے گویا اندر پیش کیا۔

”میرا خیال ہے اب بھی تم سر جھکا کر لوگوں کی توجہ سے... حتی الامکان بچتے ہوئے اور اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے واپس جانے کی کوشش کرو گے تاکہ اندازہ ہو آ رہے کہ کہاں تمہارے لیے کتنے خطرات موجود ہیں؟“ اس نے تصدیق چاہی۔ وہ میرے حالات کو کافی حد تک سمجھ رہا تھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا ”اس صورت میں یہ نقشہ تمہارے بہت کام آئے گا۔ اجنبی علاقوں میں انسان پر افتادہ لوگوں کی بھی پرکشتی ہے۔ اور حالات جب پہلے ہی خراب ہوں تو خواہ مخواہ کی مشقتیں بھی راستے میں آتی رہتی ہیں۔ آئندہ اگر تم پر کوئی آفتا بھی پڑے تو اس نقشے کو کھانا مت بھولنا۔ اس پر نظر دوڑانے کے لیے ضرور کسی نہ کسی طرح وقت نکال لینا۔ اس سے تم دو ڈھائی سو میل کے دائرے میں پھلے ہوئے علاقے کو اچھی طرح سمجھ سکو گے اور کسی بھی سمت میں جب تم کسی شہر کی طرف دھکنا چاہو گے تو جس شہر کا انتخاب کرنے میں بھی مدد ملے گی کہ اس وقت کون سا شہر قریب دے گا اور اس کے لیے ٹرین، بس یا کون سی سواری دستیاب ہوگی۔ اگر جنہیں اس قسم کے نقشوں کی ضرورت ہی بھی

منجیدگی سے مراد نہیں ہو رہی ہے۔ تم اہل کیپٹول اور چلی گولیاں تین مرتبہ کھانا۔ کسی کو ہدایت کرے گا، تم ہرے کیپٹول اور نیلی گولیاں لیتے رہو۔ میرا خیال ہے اسے نام بھی صحیح طرح معلوم نہیں لیکن وہاں چوٹکے بھی بنیادی طور پر اپنی بات نہ کہ بنی کلر اور ڈھکڑھکڑ ہیں اس لیے اکثر امراض میں کام کرباتی ہیں۔ لوگ اس کے بڑے معتقد ہیں۔“

”کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا؟“ میں نے پوچھا۔

”یقیناً پہنچا ہو گا لیکن دیکھا ہے چارے سخت جان ہوتے ہیں۔ لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہوئی جاتے ہیں۔ معاملہ زیادہ بگڑ جائے تو اسے قدر کر لکھا سمجھ کر سبڑ بڑا اٹھا کر شہر چل دیتے ہیں اور کسی اسپتال میں داخلہ ملنے کے انتظار میں فٹ پاتھ پر لیٹے رہتے ہیں۔“

دلیل نے جواب دیا۔

”اس قسم کے ڈاکٹروں کو کبھی کوئی ہیلتھ انسپیکٹر وغیرہ چیک کرنے نہیں آتا؟“ میں نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔ میں نے تو سمجھ دیکھا یا نہ نہیں۔ ہر حال میں چونکہ اتفاق سے اس کے بیک گراؤڈ سے واقف ہوں اس لیے میری بڑی خاطر تواضع کرتا ہے اور اکیلے میں میرے آگے ہاتھ بانٹتا رہتا ہے کہ میں اس کا پول نہ کھولوں۔ کبھی کبھی مجھ سے معلومات بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دواؤں کے بارے میں میری معلومات اس سے زیادہ ہیں۔ میں اسے ڈرا تا بھی رہتا ہوں کہ گاؤں والے قبائلی سے لوگ ہیں۔ جس روز بھی اس کے غلط علاج سے اچانک کوئی مر گیا اور گاؤں والوں کے بارے میں یہ بات آگئی کہ وہ اس کے غلط علاج کی وجہ سے مرا ہے تو وہ بڑی دھوم دھام سے ”ڈاکٹر صاحب“ کا بھی بتا دیتا نکال دیں گے۔“

ہم باڑے کے گرد فٹیلے ہوئے باتیں کر رہے تھے بالآخر میں نے کہا ”کیا خیال ہے دلیل خان... میں آج روانہ ہو جاؤں؟“

”مجھے معلوم ہے تم جانے کے لیے بے چین ہو لیکن ایک دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ مجھے آج بھی گاؤں جانا ہے۔ میرے پیچھے تم یہاں موجود ہو تو اچھا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ گاؤں کے کسی آدمی کا بندوبست کر کے آؤں۔ اب میں کہیں جاتا ہوں تو مجھے آدمی کی کمی محسوس ہوتی ہے جسے میں یہاں بچھڑ کر جا سکوں۔ چند دن پہلے کوئی میری گائے اور بھیجنے دونوں بچرا کر لے گیا تھا حالانکہ اس سے پہلے بھی میرے ہاں چوری نہیں ہوئی۔“

”ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سہارا تو ہوتا ہی ہے“ میں نے کہا۔ میں نے یہ سوچ کر اس کی فرمائش رد نہیں کی کہ جہاں اتنے دن گزر چکے تھے وہاں مزید ایک دو دن سے کیا فرق پڑتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ میں جانے کے لیے بے قرار تھا بلکہ جھجکی مرتبہ ہی جب وہ گاؤں گیا ہوا تھا تو میرا خیال تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں چپکے سے کھٹک جاؤں گا کہ اس کے امرا کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن پھر مجھے خود ہی یہ خیال اچھا محسوس نہ ہوا۔ میرا دل نہ

میں دیر تک باہر ٹھٹھا رہا پھر اندر آکر سو گیا۔ رات کے بچلے پر آنکھ کھل گئی۔ پھر وہ دن نیند آنے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو میں اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں لالین لگی ہوئی تھی جس کی لونچنگ تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں میں نے وال ٹاکاک کے چیلے ڈاکٹر پر نظر ڈالی۔ ابھی چار بجی نہیں بجے تھے۔ سورج طلوع ہونے میں کافی وقت تھا۔

مزید چند منٹ تک مجھے نیند نہ آئی تو میں ایک بار پھر اٹھ کر باہر آیا۔ اگر نیند آنے کے آثار نہیں ہوتے تھے تو میرے لیے بہتر لینے رہا۔ اشارہ ہوتا تھا اور اس وقت تو طبیعت میں کچھ بے چینی بھی تھی جس کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر تھا۔

باہر دبی تاریکی، دبی سکوت اور مدھم ہوا کی وہی سرسراہٹ میری شکر تھی جس میں پہلے بھی میں خاصا وقت گزار کر گیا تھا۔ اب خنکی بڑھ چکی تھی لیکن مجھے پہلے لگ رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی تارا ٹھٹھا رہا تھا۔

میں باڑے میں پڑی ایک بیچ پر بیٹھ گیا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب یہاں سے میری روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ شاید طبیعت میں اسی لیے اضطراب تھا۔ مجھے اپنے بارے میں اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ فیصلے کرنے تھے جبکہ میرا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ میری عدم موجودگی میں لاہور میں نہ جانے کیا ہوا تھا؟ میں نے اب تک کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور مجھے اس کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

مجھے اس سلسلے میں کچھ جاننے کی زیادہ خواہش بھی نہیں تھی۔ میں اپنی روپوشی کو صحیح معنوں میں روپوشی بنانا چاہتا تھا۔ میں اس دنیا سے واقعی بالکل کٹ کر رہنا چاہتا تھا جہاں ریلے ڈاٹ سے میرا سکون جاہ کے رکھ دیا تھا اور بدیختی سے میری آرزو تھی کہ وہی ہر جگہ کو نہ دہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں واقعی چاہتا تھا کہ مجھے اس دنیا کی کوئی بھی اچھی بڑی خبر نہ ملے۔

اب میرا دہلیس جانے کا ارادہ بن رہا تھا تو وہ جیسے جسے میں نے ٹھٹھا ہوا تھا اور ٹھٹھا ہوا تھا، جاگ اٹھا تھا۔ شاید میرے اضطراب کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں بہت کچھ جانا چاہتا تھا تاکہ اپنے آئندہ کے اقدامات کے بارے میں کچھ فیصلے کر سکوں۔ باہر کوئی اور بات تھی جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔

میں اپنے اضطراب کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دھیمی ہوا کے دوش پر آنے والی کچھ خفیف سی آواز میں سن کر چونک اٹھا۔ کچھ زمین پرست دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سننا بہت مشکل ہو رہا ہے لیکن ایک تو میری سماعت جو پہلے ہی کافی حساس تھی، ان دور آواز علاقوں میں گھومتے پھرتے کچھ اور حساس ہو چکی تھی۔ دوسرے اس وقت چاروں طرف غصب کا سکوت پھیلا ہوا تھا۔ کوئی جھینگر بھی نہیں بول رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز معلوم ہوتی تھی جو دوسرے

کچھ بوجھ ہے تو اس سے ہمیں بہت رہنمائی مل سکتی ہے۔ میں اسے جتنا نہیں سکا تھا کہ کسی زمانے میں اسی قسم کے نقشوں سے ہم نے کتنا استفادہ کیا تھا۔ اس کے بجائے میں نے کہا "لیکن ہمیں بھی تو اس کی ضرورت ہوگی؟"

"مجھے...؟" وہ ہنسا "میرے تو دل پر چھپا ہوا ہے یہ نقش۔ بلکہ صرف یہی نہیں۔ اس سے دوردراز کے علاقوں کے پتے و مخم بھی میرے دل پر نقش ہیں۔ مجھے تو یہ یاد ہے کہ ان علاقوں کی کس جگہ غڑی میں کتنے گڑے ہیں۔ ایک عرصہ گزر گیا ہے اس قسم کے نقشوں کی ضرورت سے بے نیاز ہوئے۔"

مجھے نقشے پر سرسری نظر ڈالتے ہی وہ سارا دیکھ علاقہ کافی حد تک سمجھ میں آنے لگا تھا لیکن مدیئل خان موٹی موٹی باتیں سمجھانے لگا تو وہ میں نے توجہ سے سنیں۔

پھر وہ ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہاں... ذریہ حمام خان تک تو برسوں میں ہمیں چھوڑنے شمارے ساتھ چلے گا۔ یہاں سے ہمیں جانی کر یا حاصل آباد... یہاں کی بس میں کوئے" اس میں بٹھا دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی ہوگی جو روٹ چاہو اختیار کر لیتا؟ اس نے نقشے میں مجھے وہ دونوں مقامات بھی دکھائے۔

"لیکن اگر تم آج شام ہی ذریہ حمام جا رہے ہو تو مجھے بھی ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ مجھے ترجیح ہی آف کر دینا۔ کل تم جھٹلے بارے آؤ گے برسوں دوبارہ مجھے چھوڑنے جاؤ گے" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ گویا قفل سے سکرایا اور بولا "نہیں۔ آج تو میرا کیلئے ہی جانا ضروری ہے۔ دوسری بات میں ہمیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اب میں اس جگہ کو ایسے ہی چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ تیسری بات یہ کہ ذریہ حمام سے بس سروس سرشام ہی بند ہو جاتی ہے۔"

شاید وہ اپنی کسی نئی مصروفیت کی وجہ سے فی الحال مجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ شام ہوئی تو وہ رخصت ہو گیا۔

میں رات کا ٹھٹھا کھا کر دیر تک باہر اندھیرے اور سناٹے میں ٹھٹھا رہا۔ میں سوچ رہا تھا شاید یہ اس جگہ میری آخری رات ہو۔ میں یہاں کی فرحت بخش ہوا کوئی بھر کے، جیسے پھولوں میں جذب کر لیتا چاہتا تھا اور یہاں کے سکوت سے بہت سی سرگوشیاں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کی فضا میں بظاہر کوئی دلکشی نہیں تھی "یہاں کوئی رنجین نہیں تھی، دیکھی سوئیں اور آسمان میں نہیں تھیں جو شہروں میں ہوتی ہیں لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں دلوں اس جگہ کو بھول نہیں پاؤں گا۔ یہاں مجھے پناہ اور آرام میسر آیا تھا۔ میں نیم جاں یہاں آیا تھا اور تندرست ہو کر جا رہا تھا۔ افراد ہوں یا مقامات جو بھی ہم پر مہربان ہوتے ہیں وہی یاد رہ جاتے ہیں، دل میں بس جاتے ہیں۔

ہے۔

”ہوا کیا ہے؟“ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ اس نے سنجے سے انداز میں لگام کو ہاتھ میں بکڑا ہوا تھا۔

”میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے“ الفاظ گویا اس کے دانتوں سے رگڑ کھاتے ہوئے برآمد ہو رہے تھے۔

”کیسے؟“ میں نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”گھوڑا بہت تیز رفتار ہے دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھا کر۔“

گرہڑا تھا۔ اور میری ٹانگ اس کے نیچے آگئی تھی۔ اس نے

کراہتے ہوئے بتایا ”لیکن افضل یار۔۔۔! خدا کے لیے فی الحال

سوال جواب چھوڑو۔۔۔ اور مجھے اندر لے چلو۔ گھوڑے سے

آگے۔“ وہ بھینکا ہڑی مشکل سے تکلیف جیلا کر رہا تھا۔

”کون سی ٹانگ ٹوٹی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بائیں“ اس نے جواب دیا۔

میں اس کے گھوڑے کی لگام تھام کر اندر لے آیا اور اسے

اس طرح پینٹ پر لاؤ کر گھوڑے سے آگے اس کی مجروح ٹانگ کو

ذرا سا بھی دھکا نہ لگے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ میں اسے کمرے

میں لے گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ دو ذیل خان کا طبع بھی بدلا

ہوا تھا۔

وہ مکر سے گیا تھا تو نہ صرف اس کا گھوڑا سفید تھا بلکہ اس کی

شلوار قمیص بھی مونچا سے رنگ کی تھی لیکن اب اس کے جسم پر

جزبے کی سیاہ جینٹ پینٹ اور شرٹ تھی۔ تینوں چیزیں سیاہ رنگ

کی تھیں۔ بیروں میں شکاریوں جیسے قل بوت تھے اور ذمہ داری

پتلون کے پائینے اس نے بوتوں میں ہی اڑس رکھے تھے۔ اس ایک

سیاہ نقاب کی کئی تھی ورنہ وہ مکمل طور پر پرانی میکینک اور وہیٹرن

ظہوں کا ڈاکو معلوم ہوتا۔

اس کے کپڑے سینے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پتلون تو منی میں

بھی تھنڑی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے اسے آرام دہ بستر

لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کمری کمری سانس لینے لگا۔ اس کے

سافٹ چہرے پر پینے کی بوتلیں چمک رہی تھیں۔

کئی منٹ میں نہایت آہستگی سے میں نے اس کے جوتے

آگے مجھے معلوم تھا۔ زرا بھی ہلے ہلے سے اس کی تکلیف میں

اضافہ ہوگا۔ پھر میں نے اس کی مضبوط ٹانگ کا پانچا اور چمکار

معائنہ کیا۔ پتلی کی ہڈی بلاشبہ ٹوٹ چکی تھی لیکن قیمت تھا کہ

گوشت نہیں پھلتا تھا۔ ٹانگ میں خم ضرور نظر آ رہا تھا لیکن کھال

سلامت تھی۔

وہ کراہتے ہوئے تیز سرکوشی کے سے انداز میں بولا ”کیا ڈاکٹر

فریکے نہیں ہے۔۔۔ سہیل فریکے۔“ وہ خود بھی اپنا معائنہ کرنے

کی کوشش کر رہا تھا لیکن بابا ر تکلیف سے آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

اسی عالم میں وہ کراہتے ہوئے ایک ایک کر بولا ”ہڈی ٹوٹنے

زیادہ دیر نہیں گزری۔۔۔ ابھی یہ آسانی سے بڑھا جائے گی۔ لیکن یہ

دیر سے قریب آ رہی تھی۔ دو ذیل خان نے تو خود ہی بڑے وقتوں

سے بتایا تھا کہ دوپہر سے پہلے اس کی داہنی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

تو پھر یہ کون ہو سکتا تھا؟ دو ذیل نے بتایا تھا کہ کبھی کبھار کوئی بھولا

بھٹکا ڈاکو بھی اس طرف آ سکتا تھا۔ وہ جتنی مرتبہ بھی ڈیرہ حسام گیا

تھا ڈاکو دیر سے سپرد کر گیا تھا جسے احتیاطاً میں سہانے رکھتا تھا۔

میں دو ڈاکو اندر گیا اور جلدی سے نیچے کے نیچے سے ڈاکو

نکال لایا اور مویشیوں کو چاہ ڈالنے والی کھڑی کی اوٹ میں پھپک کر

بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد میرے سامنے تلخے آسمان کے پس منظر میں ایک

گھوڑے کا بیولا نمودار ہوا۔ اس کی پشت پر بھی کچھ تھا ضرور لیکن

اسے گھڑسوار نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کوئی بوری سی ہلدی ہوئی تھی۔

میں خنجر رہا۔ دیر سے دیر سے بیولا واضح ہوا گیا۔ گھوڑا

مکان کی سمت میں ہی آ رہا تھا اور بہت کم رفتار سے دوڑ رہا تھا۔

مکان کے قریب پہنچتے تک اس کی رفتار کچھ اور کم ہو گئی۔ اب میں

دیکھ سکتا تھا کہ گھوڑے کی پشت پر کوئی شخص ایک بازو گھوڑے کی

گردن میں سما کر کے اوڑھنا لیتا تھا لیکن وہ دو ذیل نہیں ہو سکتا

تھا کیونکہ دو ذیل کا گھوڑا سفید تھا جبکہ یہ گھوڑا گہرے رنگ کا

معلوم ہوا تھا۔

”غیر ارادہ میں رک جاؤ“ میں نے لگادیا۔

سوار یقیناً ہوش میں تھا کیونکہ میں نے اس کا دوسرا بازو

حرکت میں آتے دیکھا۔ اس نے لگامیں کھینچ کر گھوڑے کو روک

لیا۔ وہ میری گن کی زد پر تھا۔

”کون ہو تم؟“ میں نے قدرے خستہ لہجے میں پوچھا۔

سوار گھوڑے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور آواز کی سمت دیکھنے

لگا۔ وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ پایا تھا۔ میں اب بھی کھڑی کی اوٹ

میں ہی تھا۔ مکان کے چاروں طرف گڑی کا مضبوط جنگلا موجود

تھا۔ بازو اور مکان دونوں کے گرد یہ ایک حفاظتی فیصل کا کام

دیتا تھا۔ اس کے دروازے میں اس وقت آلا پڑا ہوا تھا۔ سوار

جنگل سے باہر ہی تھا۔

بالا خر وہ بول اٹھا لیکن اس کی آواز کراہ سے مشابہ تھی۔

”افضل یار! دروازہ کھولو۔ مجھے اندر آنے دو۔۔۔ میں بڑی تکلیف

میں ہوں۔“

میں کمری سانس پے کر رہ گیا۔ وہ دو ذیل تھا۔ شاید اسے کوئی

حادثہ پیش آ گیا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکو میں نے نیچے میں اڑس

لیا۔ چابیوں کا گچھا میری جیب میں موجود تھا۔ آلا کھول کر میں تیزی

سے باہر گھوڑے کے قریب پہنچا۔ وہ واقعی دو ذیل کا سفید گھوڑا

نہیں تھا۔ کم از کم میں نے وہ گھوڑا اس سے پہلے وہاں نہیں دیکھا

تھا۔ وہ سیاہ جھیلے رنگ کا ایک خوب صورت اور توانا گھوڑا تھا۔

دو ذیل کے سفید گھوڑے سے بھی زیادہ توانا اور خوب صورت۔

دو ذیل رانت بچھتے ہوئے کراہا پھر بولا ”بہت تکلیف ہو رہی

خوف زدہ اور پریشان تھا۔ ٹانگ کے مسئلے اور تکلیف نے مجھ دیر کے لیے اس کی توجہ کسی اصل مسئلے کی طرف سے ہٹا دی تھی لیکن اب ٹانگ کے بارے میں ذرا اطمینانیت میسر آتے ہی اس کے ذہن میں وہ مسئلہ ابھر آیا تھا۔

”بات کیا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”جیسے کوئی آواز تو سنائی نہیں دے رہی؟“ اس کی آواز غیر ارادی سے انداز میں رازدارانہ سرگرمی میں دخل گئی حالانکہ اس پاس کوئی اور سننے والا موجود نہیں تھا۔

میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ مجھے اندازہ تھا کہ روٹیل نے بھی کچھ کم درانوں کی خاک نہیں چھائی تھی۔ جیسے یقیناً اس کی بھی خبر تھی لیکن اسے میرے بارے میں بھی بہت سے اندازے ہو چکے تھے۔ وہ مجھ سے تصدیق چاہتا تھا۔ میں کوئی آواز تو نہ سُن سکا لیکن میری معلومات جس بتا رہی تھی کہ وہاں سے دور کہیں کوئی لچل ضرور تھی۔ شاید میری اسی جس نے مجھ دیر پہلے مجھے مضطرب کر رکھا تھا۔ یہ جس شاید مجھے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تمہیں کچھ گزربوگئی؟ روٹیل کے ساتھ کچھ ہو رہا تھا لیکن ظاہر تھا کہ جس کے بیانات اسے واضح نہیں تھے۔ میں انہیں صاف طور پر نہیں سمجھ سکتا تھا۔

”نہیں۔ مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی“ میں نے کمری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

میری تصدیق سے شاید اسے ذرا اطمینان ہوا۔ ایک کمری سانس لے کر اس نے گاؤں کے اور ہنگ کے سہانے والے تختے سے ٹیک لگایا۔ اب وہ مجھ سے نظر اڑا رہا تھا۔

میں نے ایک کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں کہا ”کیا اب بھی تم مجھے اصل کمائی نہیں سناؤ گے روٹیل خان؟“

وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا ”میرا خیال ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تمہارا ذہن یقیناً بہت سے آئے بٹے ہیں رہا ہو گا۔ کاش میں نے جیسے آج وہ میری جانے دیا ہوتا۔ لیکن نہیں۔ تمہارا رکنا شاید میرے حق میں بہتری تھا۔ اگر تم اس وقت یہاں موجود نہ ہوتے تو یہ کام کون کرتا۔“ اس نے ٹانگ پر ہلکی پٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

ایک بار پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف سے اس کے چہرے کے عضلات کھینچ کر رہ گئے۔ تکلیف کی لہر زار دلی تو وہ بولا ”کیا تمہارا حقیقت جاننا بہت ضروری ہے؟“

”ہاں۔ شاید اس کے بعد میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”میں سچائی کو پسند کرتا ہوں۔ خصوصاً وہ لوگ جنہیں میں دوست سمجھتا ہوں اور جو مجھے دوست سمجھتے ہیں“ اگر وہ بھی میرے ساتھ سچ نہ بولیں تو مجھے برا غصہ آتا ہے میرا ان

کام میں اپنے ہاتھوں سے نہیں کر سکتا۔ پہلے تم دو اداں والی الماری سے چند ضروری چیزیں اور دو انہیں نکال لاؤ پھر جس طرح میں کہوں اس طرح کرتے جاؤ۔ یہ کام تمہارے ہاتھ سے ہو گا تو میں تکلیف برداشت کر جاؤں گا۔ میں اپنے ہاتھ سے ہڈی میچ نہیں بٹھا سکوں گا۔“

اس کی ہدایات کے مطابق میں الماری سے لکڑی کی چند ٹیپیاں، ٹیپوں کے رول اور دو انہیں نکال لایا۔ ایک دھکی سے لٹی کی شیشی تھی۔ اس نے ہدایت کی کہ پہلے میں وہ نہایت آہستگی سے اس کی پوری پٹلی پر تل دوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تیل ہڈی جوڑنے کے معاملے میں انگریزی دو اداں سے بہتر تھا۔

تاش کرنے کے بعد اس نے مجھے صبر آزا مرحلہ شروع کرنے کا حکم دیا اور اشارے سے بتایا کہ کس طرح میں اس کی قم کمائی ہوئی ٹانگ کو دھیرے دھیرے سیدھا کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل شروع کیا تو اس نے رات تھی سے پہنچ لے اور اس کے چہرے پر ہیند یوں پھونکنے لگا کیا کوئی پینکٹی ہوئی روٹی کو دھیرے دھیرے دبا رہا ہوں لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ فوت برداشت اس میں بھی ہلاکی تھی۔

بالآخر وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے کھنٹی کھنٹی آواز میں بولا ”بس۔ ہڈی بندھ گئی ہے۔“ پھر اس نے اشارے سے بتایا ”اس پر یہاں یہاں لکڑی کی پٹیاں رکھو اور۔۔۔ بیڑیچ نہایت احتیاط سے۔۔۔ اس حد تک کس کر باندھ دو کہ دوران خون نہ رکنے پائے۔۔۔ بہت سی پٹیاں لپیٹ دو۔“

میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ بڑے صبر آزا انداز میں کام ختم ہوا۔ بیڑیچ کی کئی تھیں بنائے اور گرہیں لگانے کے بعد میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ کمری کمری سانسیں لے رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چند لمبے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔

”سمجھو۔ یہ دیکھی قسم کا بیڑیچ چھ گیا ہے۔ انشاء اللہ بارہ بارہ دن میں ہڈی جڑ جائے گی“ وہ انک انک کر بولا ”اب مجھے انفیکشن سے بچانے اور درد کم کرنے کے لیے کچھ کر لیاں دے دو۔“

اس نے گولیوں کے نام مجھے بتائے۔ میں نے پانی کے گلاس کے ساتھ وہ گولیاں اسے دے دیں۔ گولیوں نے ظاہر ہے فوری طور پر فوثر شروع نہیں کیا تھا لیکن نفسیاتی طور پر اسے سکون مل گیا اور اس کے ذہن زدہ چہرے پر تھوڑی سی اطمینانیت آنی لگی۔ لیکن میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور ظاہر تھا ”میری آنکھوں میں سوالات تھے۔“

لیکن وہ میرے سوالات سے نظر ہٹاتے ہوئے گویا کان لگا کر کھنسنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے غصہ سے کہا کہ اندر ہی اندر وہ

کی کوئی مدد کرنے کو قنطار دل نہیں چاہتا۔۔۔ اور میرا خیال ہے تمہیں اس وقت مدد کی سخت ضرورت ہے۔  
 ”ہاں“ اس نے تسلیم کیا ”لیکن مجھے ذرہ ہے“ اگر میں نے تمہیں حقیقت بتادی تو تم میری مدد کرنا تو درکنار، کہیں مجھے دوست سمجھنے کا فیصلہ بھی واپس نہ لے لو۔“

”ایسا نہیں ہو گا۔ حقیقت خواہ کتنی بھی تلخ اور بد صورت ہے لیکن تم اسے بیان کرو۔ گوکہ تم نے اس میں تاخیر کر دی ہے لیکن اب بھی وقت ہے۔ اب بھی بچ بول دو گے تو میرے دل سے ہر دم گائی دور ہو جائے گی اور تم میری نظر میں اچھے ہی رہو گے۔“  
 ”چھا رہا تو مشکل ہے۔“ وہ کمری سانس لے کر بولا ”لیکن میں بہر حال حقیقت بیان کرتا ہوں تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ میں ایک ڈاکو ہوں۔“

”مجھے صرف شبہ ہو رہا تھا لیکن میں دل ہی دل میں اسے جھٹلانے کی کوشش کر رہا تھا“ میں نے جواب دیا۔

”تم نے کہا ہے حقیقت خواہ کتنی بھی تلخ اور بد صورت ہو، میں اسے بیان کروں۔“ اس نے کوئی مجھے یاد دلایا ”ایک کردہ سے میرا تعلق ہے لیکن میں نے اپنی یہ آزاد حیثیت اور چھوٹے سے زمیندار والے روپ بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ میرا اصل روپ یہی تھا، ڈاکو میں بد میں بنا تھا۔ وہ ایک الگ اور طویل کہانی ہے“ اس وقت میں مٹائی جاسکتی تمام میں یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ مجھے ڈاکو بنانے میں ظالم معاشرے وغیرہ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میرے ساتھ کسی نے کوئی ایسے ظلم و ستم نہیں کیے تھے کہ میں بھگ ڈاکو بن جاتا۔ بس۔۔۔ میں اکیلا تھا۔۔۔ نا سمجھ تھا۔۔۔ مجھ سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں۔۔۔ کچھ غلط فہموں سے آشنائی ہوئی۔۔۔ کچھ خواب ذہن میں شروع سے پیٹھے ہوئے تھے جن کی تعبیریں ملنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ ساری باتیں سچا ہونا نہیں اور میں دھیرے دھیرے ایک ایسے راستے پر چل پڑا جس میں میرے خیال میں طاقت اور دولت میری منتظر تھی۔ یہ بھی ایک خواب ہی تھا۔ دھوکا ہی تھا۔ جس سطح کا میں ڈاکو بن گیا وہ معمولی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میرے پاس زیادہ دولت جمع نہیں ہو سکی۔ وہ ایک جگہ محفوظ ہے۔ میں اس کے مزید بڑھنے کے انتظار میں تھا۔ میرا خیال تھا، ایک نہ ایک دن میرے پاس اتنی دولت ہو جائے گی جتنی میں چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ لائن چھوڑ دوں گا۔“

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا ”یہ ایک ناقابل یقین بات ہے کہ زیادہ تر ڈاکوؤں کے پاس اتنی دولت نہیں ہوتی جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ کیوں نہیں ہوتی؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ فی الحال ہم اس پر بھی بات نہیں کر سکتے۔“

میں ایکے تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر چمکاتے ہوئے بولا ”تمہیں یہ جان کر مدد نہ ہو اے تاکہ میں ایک ڈاکو ہوں؟“  
 ”ہاں“ میں نے اعتراف کیا ”جس طرح جنگلوں میں کہیں

کہیں بڑے خوب صورت اور نفیس پھول کھلے نظر آتے ہیں ایسے کی سمجھا تھا کہ اتفاق سے مجھے بھی اس دیرانے میں ایک نمایاں ذہین ”بڑھا کھٹا“ مل گیا ہو، نفیس اور شائستہ انسان مل گیا ہے۔“  
 ”کیا محض اس انکشاف سے میری یہ سب خوابیں ختم ہو گئیں کہ میں ایک ڈاکو ہوں؟“ اس نے افسردگی سے میری طرف دیکھا۔  
 ”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن میرے تصورات کو شدید دھچکا ضرور لگا ہے۔ لیکن خیر۔۔۔ تم پوری بات ضرور سننا۔“ میں نے کہا۔  
 ”اس سے پہلے بھی میں تمہارے سامنے دو مرتبہ ذریعہ حاکم کا قاتل دو چھوٹے موٹے ڈاکوؤں میں ہی حصہ لینے گیا تھا۔ ذریعہ حاکم کے قریب ہی ہمارا ایک اڈا ہے۔ میں وہاں لباس اور گھوڑا تبدیل کرتا تھا۔ یا اگر کسی دوسری سواری میں بیٹھ کر جاتا ہوتا تھا تو اس میں بیٹھتے تھے کام سے فارغ ہو کر میں اپنا حصہ لے کر اسے ایک خاص جگہ پر پہنچا کر حلیہ تبدیل کر کے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ میں جب اکیلا ہوا تھا تب بھی مجھے اس طے میں یہاں نہیں کیا۔ میں نے اپنی دونوں خصوصیتوں کو الگ رکھنے کی بجائے ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن کوئی بھی راز بیٹھ راز نہیں رہتا۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ کچھ کر رہ گئے۔ پھر وہ آنکھیں کھولتے ہوئے بولا ”کیا عجیب اتفاق ہے کہ یہ راز کھانا بھی قاتل تمہارے سامنے۔۔۔ اور وہ بھی جین اس وقت جب تم جانے کی تیاری کر رہے تھے۔“ پھر وہ آنکھ سے سر ملاتے ہوئے بولا ”لیکن شاید یہ بھی اچھا ہی ہوا۔“  
 ”آج کیا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں دے پر ہم ایک بس کو روک کر مسافروں کو لوٹ رہے تھے کہ اتفاقاً پولیس اور آئلنگ۔۔۔ اس کی آواز کچھ اور بچی ہوئی ”وہ ہائی دے کا وہ حصہ قاتل جانی گھروالے جنگل کے قریب سے گزرتا ہے۔ وہاں جیلوں تک کوئی قاتل۔ کوئی پولیس چرکی نہیں۔ پولیس کی آمد کا وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ اگر کبھی گشتی پولیس والے گزرے ہیں تو وہ عموماً بڑی پک اپ یا جیپ میں ہوتے ہیں لیکن یہ پولیس والے گھوڑوں پر تھے اور ہمیں ان کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔“

پولیس کو اگر کہیں آتا ہوتا ہے تو عام طور پر ہمیں اس کی اطلاع ہوتی ہے۔ گھڑ سوار پولیس ویسے بھی صرف اس وقت آتی ہے جب انہیں جنگل میں کسی قسم پر جانا ہوتا ہے۔ وہ معلوم نہیں کس چکر میں جا رہے تھے۔ وہ ان کی عمل داری بھی نہیں تھی۔ پولیس والے تو اپنی محلہ اسی میں بھی کوئی داماد ہوتے دیکھ کر اکثر نظر چڑھ جاتے ہیں۔ دامادات ہونے کے بعد ذرا تیار ہوں اور ترک و احتیاط سے آتے ہیں۔ ہم نے اس دوران ایک پرائیوٹ گاڑی بھی روک لی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے ایک فائر کر دیا۔ بس اس کے بعد ہنگامہ شروع ہو گیا۔“

اب اس کے لیے سے شرمندگی کا تاثر بھی کم ہو گیا تھا

جاتا۔ اس مسئلہ پر غور میں ڈیرہ حسام خان کی طرف بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہاں فی الحال خطرہ زیادہ تھا۔ مجھے فوری طور پر امداد کی بھی ضرورت تھی چنانچہ میرے لیے یہاں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن مجھے معلوم ہے جلد یا بدیر وہ اس طرف آئیں گے ضرور۔ اس پر بے علاقے میں میرے ڈیرے کے علاوہ کوئی ایسی مناسب جگہ نظر نہیں آتی جہاں کوئی ڈاکو چھپ سکے۔“

”واردات تو ناکام ہی رہی ہوگی؟ تمہارے پاس لوٹ کا مال تو نہیں ہے؟“ میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے پر چھڑا۔

”نہیں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ اس نے کڑوری آواز میں جواب دیا۔

”کوئی مسافر ہلاک یا زخمی تو نہیں ہوا؟“

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا“ وہ چٹکیا ہٹ سے بولا ”گوگیاں تو وہاں کافی چلیں۔ ذرا سیر کا کوئی پلانا بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ روشنی وہاں نہ ہونے کے برابر تھی اور فائرنگ شروع ہوتے ہی ہم لوگوں نے ٹارچیں وغیرہ بچھا دی تھیں۔ پولیس نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ سب کو جان بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔ شکر ہے قلعیدار میرا چوہ نہیں دیکھ سکا۔ میرے چہرے پر ڈھانچا تھا۔ الیکٹرک میرے عقاب میں چلا تو اسے دور رکھنے کے لیے مجھے کافی فائرنگ کرنا پڑی۔ حتیٰ کہ میرے پاس میگزین بھی ختم ہو گیا اور کچھ دور آنے کے بعد کلا شیفور بھی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں اسے

اور حلیف کی جھٹک۔ بھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ہم نے بس اور پرائیویٹ دین کے مسافروں کو گاڑیوں سے اتار لیا تھا۔ انہیں کلا شیفور اور دیوالیوں سے گور کر کے بال جع کر رہے تھے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی نافر کرنے کی جرأت کرے گا۔ ہمیں اس ڈرائیور کے پاس دیوالیوں پر بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے شاید پولیس کو آتے دیکھ لیا تھا اس لیے اسے شل مٹی تھی۔“

ہنگامہ شروع ہونے کے بعد ہم نے بھی پولیس والوں کو دیکھ لیا۔ وہ قعداویں چندہ سولہ ہوں گے اور جرائن کی قیادت کر رہا تھا وہ بیٹیا انیکلر تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ موٹی موٹی موچھوں والا ایک بارعب گورا چٹا شخص تھا۔ معلوم نہیں کس علاقے کے تھے اسے اس کا تعلق تھا۔ وہ اس علاقے کا آدمی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس واردات میں کوہ پڑا ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ ان علاقوں میں کہیں کہیں جو پولیس چڑھیاں ہیں ان میں سے کسی چوکی پر اگر کوئی مرا کپتا کسی واردات کی خبر ملے کر بھی جائے تو پولیس والے وہ دن تو یہی ملے کرنے میں گزار دیتے ہیں کہ وہ علاقہ کس چوکی کی حدود میں آتا ہے۔“

یہ باتیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ اب تو شاید یہ باتیں ہمارے پاس آنے والے غیر فیکلوں کے لیے بھی نئی نہیں رہیں۔ دہلی خان چہرے سے ہنس پونچھنے کے بعد ایک بار پھر گویا کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ سکوت آخر شب اسی طرح برقرار تھا۔

قدوسہ مطمئن ہو کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا ”خیر۔ سارا معاملہ جھگڑا اور افزائش تقری میں خراب ہو گیا۔ ہم سب تجویز ہو گئے جس کا جدھر منہ اٹھا، جھگڑا نکلا لیکن پولیس والوں نے ہمارا ہتھیار نہیں چھوڑا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ڈیرہ حسام خان کی طرف جانے والے راستوں پر ہرگز کوئی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔ ہمارے کسی ساتھی۔ اور میں خود ان کے ہتھے چڑھتے چلتے چکے شاید یہ کوئی اور ہی آپریشن یا اسی قسم کا کوئی دوسرا سلسلہ تھا جس کی زد میں اتفاقاً ہم آ گئے تھے۔“

”برخاست میں جہاں انسانوں پر ایک نہ ایک وقت تو ایسا آتا ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”میرا خیال تھا کہ میں وہ وقت آنے سے پہلے اس دلدل سے علی باز کی جگہ خیر۔ بانی لوگوں کا تو مجھے معلوم نہیں کہ بعد میں کیا واقعہ میرے پیچھے تو وہی انیکلر موت کی طرح لگ گیا تھا۔ اس کے ساتھ شاید ایک سپاہی بھی تھا۔ وہ اس علاقے سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ بہت دیر وہ میرے عقاب میں رہے لیکن آخر اس سے اسے فوج دینے میں کامیاب ہو گیا اور وہ موت پیچھے رہ گئے لیکن پھر میرا کھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ شکر ہے کھوڑے کی کوئی بڑی ٹھکانہ نہیں وہاں اس سواری سے بھی محروم ہو جاتا اور وہیں براہ

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح  
کی سیاسی زندگی اور کارناموں پر مشتمل  
حوالہ جاتی کتاب۔۔۔۔۔

عظیم مدبر عظیم قائد

☆۔۔۔۔۔ زاہد حسین انجم

قیمت: -/125 روپے

مکتبہ القرآن اردو بازار لاہور 2

اٹھانے کے لیے بھی نہیں رکا۔

وہ خاموش ہو گیا۔ میں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میرا ذہن کہیں اور تھا۔ میں چشم تصور سے اس ساری صورت حال کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے وہ گزر کر آ رہا تھا۔ اس نے پلو بدلنے کی کوشش کی اور اس کی کوشش میں بے اختیار کراہ اٹھا۔

درد کی لہر زلزلوں کی ایک بار پھر جڑ سے پہنچ پڑتی ہوئی بولا "میں نے اس انڈیکس کو آج پہلی بار دیکھا ہے لیکن میرا دل کتا ہے کہ وہ کوئی بہت سی مختلف قسم کا پولیس آفیسر ہے۔ مجھے یقین ہے" وہ قبر تک میرا چچا نہیں چھوڑے گا۔

"مجھے یقین تو نہیں ہے لیکن بہر حال دنیا میں امنیٹیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ بعض انتہائی بدنام ٹھکانوں میں انتہائی فرض شناس لوگ بھی موجود ہیں جو بعض اوقات ناقابل یقین مثالیں قائم کر جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"میرا دل کتا ہے وہ آفیسر انٹی میں سے ایک ہے۔ اس نے موت کی پروا کیے بغیر میرا تعاقب جاری رکھا تھا۔ وہ انتہائی بڑا اور جان پر کھیل جاننے والا شخص معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہاں تک ضرور آن پہنچے گا۔ اور میں اس حال میں ہوں۔" اس نے ٹیچس میں اپنی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔

"چمک؟" میں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کتنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے گویا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کے چہرے پر زردی سی چھانے لگی۔

"تم جو کتنا چاہے ہو کہہ ڈالو" ارادہ ملتوی مت کرو" میں نے کہا۔

"نہیں" وہ تھکے تھکے سے لمبے میں بولا "تم مجھے خود غرض سمجھو گے۔ اس سے بہتر ہے میں گرفتاری اور موت کے خطرے کو ہی قبول کر لوں۔"

"تم بولو تو سہی۔" میں نے اصرار کیا۔

"میں تم پر اپنا کوئی احسان نہیں سمجھتا اور نہ اس کا بدلہ چاہتا ہوں۔" میرے بہت اصرار پر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "بلکہ میں تم سے پوچھتا چاہتا ہوں کہ کیا تم مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہو؟"

"میں اگر تمہارے کسی کام آسکا تو ضرور آؤں گا" میں نے کہا "لیکن جیسا کہ تم کہہ رہے ہو وہ ایک فرض شناس آفیسر معلوم ہوتا ہے جو اپنی جان پر کھیل کر تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔ میں کسی فرض شناس آفیسر کو ہلاک نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہیں اس کو قتل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا" وہ بیل بولا "میں اسے صرف مس گاڑ کر چاہتا ہوں۔ اس نے میری شکل تو دیکھی نہیں ہے۔ اس کی نظریں صرف سیاہ گھوڑے پر سوار ایک سیاہ پوش کو کھینچ کر رہی ہیں۔ اگر تم میرے یہ کپڑے پہن کر میرے سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر تین اس وقت یہاں سے نکلو جب

وہ قریب پہنچنے والا ہو تو وہ تمہارے پیچھے لگ جائے گا۔"

میں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہچکچا ہٹ آ کر میرے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر وہ یہاں آئے گا میں۔ تو ایک منظور کو لینا ہوا دیکھنے گا۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں تو دردن سے یہاں صاحب فراش ہوں۔ ایک نوکر میری دیکھ بھال کر رہا ہے جو اس وقت گاؤں گیا ہوا ہے" صبح آجائے گا۔ میں اسے یہ بھی بتاؤں گا کہ ڈاکو یہاں آیا تھا لیکن یہاں چھپنے کی کوئی مناسب جگہ نہ دیکھ کر میری جان چھوڑ کر آگے روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین ہے" وہ گھوڑے کے سہلے کے نشانات دیکھتا ہوا تمہارے تعاقب میں روانہ ہو جائے گا۔"

"اس کے بعد کیا ہو گا؟" میں نے سیات لمبے میں پوچھا۔ "تم ایک آدھ دن اسے ادھر ادھر ٹھہرانے پھر انے کے بعد ڈاکو دے کر یہاں واپس بھی آسکتے ہو یا کسی اور طرف بھی نکل سکتے ہو۔ وہ نقش تو میں تمہیں دے ہی چکا ہوں۔ اگر تم محسوس کرو کہ تمہاری واپسی یا کسی محفوظ مقام کی طرف لگانا مشکل ہو رہا ہے اور غلطی تمہارے قریب پہنچ رہا ہے تو اس سڑک کی طرف نظر کی کوشش کرنا جو ہائی وے سے حاصل آباد کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک پر حاصل آباد اور ڈیرہ حسام کے درمیان ایک جگہ ہے جسے "ہاؤس" کاؤا کہتے ہیں۔ وہ ایک طرح سے رستوران بھی ہے۔ راکوں کا ڈاکو بھی ہے اور ڈرائیووں کے لیے وہاں ایک بڑے سے کچے ہال میں مسافر خانہ ٹائپ جگہ بھی بنی ہوئی ہے۔ جانو اس اڈے کا مالک ہے۔ کبھی کبھار تمہارے گروہ کے آدمی اس کے ہاں پناہ لینے رہتے ہیں۔ وہ ہمارا خیال کرتا ہے۔ میرا نام لے کر تم اس کے پاس پناہ لے سکتے ہو۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو تو اس کے ہاں چلے جاؤ۔ ہو سکتا ہے اس کے ہاں تمہارے لیے اس گھوڑے اور سیاہ لباس سے چھٹکارا پانے کا بھی بندوبست ہو جائے اس سے کہہ دو "تم میرے خاص آدمی ہو۔ ایک طرح کے پارٹنر۔"

میں نے غیر ارادی طور پر آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ کہنا کچھ سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میں تمہیں ایک اور ضروری بات بتا دوں۔ اب تم سے کوئی بھی بات راز رکھنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔"

"ہاں۔" میرے دل پر کوئی اور خراش ڈالتی ہے تو دل کو "میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ کسکو چاہو دراصل میں ہی ہوں" اس نے نہایت دھجے سے لمبے میں کہا۔ "مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سر پر کچھ رسید کر دیا تھا" میں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "تم مجھے یہ لائق نہیں کر رہے؟"

نے کہا۔ ”یہ محض اتفاق ہے۔ اور تم خود ہی کہہ چکے ہو یہ دنیا اتفاق و اتفاقی کی لامتناہی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہے۔“

”نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی کچھ زیادہ طویل نہیں ہوگی لیکن ہر حال بس۔ جب تک بھی زندہ رہا“ آپ کا احسان مند رہوں گا۔“ پھر پیسے اسے کچھ خیال آیا۔ ذرا چونکتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی آپ نے تصدیق تو کی ہی نہیں ہے کہ آپ میری مدد کریں گے بھی یا نہیں۔ میں نے خود بہ خود ہی آپ کا جواب اثبات میں فرض کر لیا ہے۔“

مجھے بھلے دوستانہ اور بے غلغلانہ انداز میں بات کرتے کرتے نہ جانے کیوں یکدم ہی اس کے دل میں میرا احترام اُٹھ گیا تھا اور اس نے مجھے ”آپ جناب“ سے خطاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس تبدیلی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

میں نے کہا۔ ”دوستوں کو دوستوں پر ایسا ہی مان ہونا چاہیئے انہیں بے یی سے یقین ہونا چاہئے کہ وہ جب دوست سے کچھ مانگیں گے تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ تمہاری تو خیر اب بات ہی کچھ اور ہو گئی ہے لیکن اگر تم میرے لیے انجینی ہوئے اور اس حالت میں مجھ سے مدد کی درخواست کرتے جس حالت میں تم اس وقت پرے ہو تو میں ضرور تمہاری مدد کرتا۔“

”لیکن جس مدد کی میں درخواست کر رہا ہوں اس میں جان کا بھی خطرہ ہے۔“ اس نے گویا مجھے احساس دلایا۔

”کوئی بات نہیں۔ کئی بار تمہارے اس غلام نے انجینیوں کے لیے بھی جان کو خطرے میں ڈالا ہے۔ تمہاری فرمائش کوئی بڑی فرمائش نہیں۔“ میں نے کہا۔

”فضل بھائی! آپ واقعی کچھ عجیب سے آدمی ہیں“ وہ گردن ذرا ترچھی کیے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
”ہاں۔ عجیب تو میں ہوں۔“ میں نے بلا تامل کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسنا کھنکھرا کر رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی تمام تر تکلیف کے باوجود اب اس کے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ یہ جواب اثبات میں پا کر یقیناً اسے بڑا اطمینان حاصل ہوا تھا۔ میں جو کہنا چاہتا تھا میرے خیال میں اس کا مناسب موقع بھی تھا۔

”لیکن میں ایک شرط پر تمہاری تجویز پر عمل کروں گا“ میں نے کہا۔ ”وہ کیا؟“ وہ چونکا۔

”وہ یہ کہ اگر تم اس چکر سے بہ نیرِ غایت نکل آئے اور تمہاری ٹانگ بھی ٹھیک ہو گئی تو پھر خواہ میں واپس آؤں یا نہ آؤں لیکن تم لا کا زنی پھوڑ دو گے۔ ماکھو چاچا کا کردار نکلتی بھی تم نے کیا تھا اب تم خود ہی اسے کہیں دفن بھی کر دیتا۔“ میں نے کہا۔

”اور“ اس نے گہری سانس لی تیسے اسے اس سے زیادہ مشکل

نے مسکرائے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ کرب انداز میں کھینچ کر رہ گئے۔ وہ ذرا ہلکا پلٹتے ہوئے بولا۔  
”نہ تو موقع ہے اور نہ ہی اس وقت مجھ میں مذاق کی سکت

لیکن تم ماکھو چاچا کیسے ہو سکتے ہو؟“ میں نے غیر ارادی سے کہا۔ شاید وہ میری خود گلائی تھی۔ اپنا سوال مجھے خود بھی

یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے ہو سکتا ہوں لیکن میں ادا بولا۔ ”ایک بات اور بھی یاد رہی۔ ماکھو چاچا درحقیقت نئی کردار ہے۔ اس نام کا کوئی ذاکہ موجود نہیں۔ میں نے ہی لوگوں کی دنیا میں اس نام سے مشہور کر رکھا ہے۔ وہ میرا نام بھی جانتے ہیں لیکن اسے تو تقریباً بھولے ہی رہ چکے ہیں۔ کوئی کے نام سے پکارتے ہیں۔ پولیس والوں کے لیے بھی پہچاننا ہے لیکن بس نام کے سوا انہیں کچھ معلوم نہیں۔“

لیکن پھر وہ تصویر کس شخص کی تھی جس کے ساتھ قابیلیں بصورت ملائی تھی اور مجھے پکڑ کر لے گئے تھے؟ وہ اسے کہہ رہے تھے اور اس وقت میرے میک اپ کی وجہ سے مجھ سے ل بھی رہی تھی لیکن درحقیقت وہ نہ میری تصویر نہ ہی تمہاری ہو سکتی تھی“ میں نے اس وقت گویا ایک نئے رستے اس کی صورت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میں نے جو لوگوں کے پاس دیکھی تھی میں میں روٹیل خان عرف ماکھو رامی شہادت نہیں دے سکتا۔

میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔“ وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ تصویر دیکھ کر کسی نے ان سے کہہ دیا ہو گا کہ یہ ماکھو چاچا لت کسے والا ان لوگوں کی نظر میں مستند آدمی ہو گا اس شخص مند کر کے ماکھو چاچا کو کشاں کر رہے ہوں گے۔“

”اب اتفاق ہے۔!“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔ ”بلکہ اتفاق ہے۔ میری مدد کو بھی تمہیں ہی پہنچنا تھا۔“

”یہ اتفاق و اتفاقی کی لامتناہی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہے۔“ لیکن اب میں نے تم سے مدد کی جو درخواست کی تم اس کا جواب تو نہیں سمجھو گے؟ یہ تو محسوس نہیں سمجھتا۔ تمہاری مدد کچھ اسی طرح کی تھی جیسے کسی کو چند لمحوں میں قتل کیا جائے؟ اور پھر چند دن گزرتے اور اُدھر غلغلہ ہو گیا؟“

”میں ایسا ہرگز نہیں سمجھوں گا۔“ میں نے اسے یقین

دیا۔ ”میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”اب ہے تمہیں قسم کھاتے کی ضرورت نہیں۔“ میں



فرمان کی توقع تھی۔ ”آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہوگی کہ ایک بار تو پولیس بھی ماکھو چاچا کو دفن کر چکی ہے۔ آپ مجھ سے اس کی صرف فرضی تدفین کی فرمائش کر رہے ہیں پولیس نے تو اسے بچاؤ دفن کر دیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے تیزی سے کہا۔

”انہوں نے بہت سے مل نہ ہونے والے کیس ماکھو چاچا کے کھاتے میں ڈال رکھے تھے۔ پھر ایک روز پولیس مقابلے میں نہ جانے کون بد نصیب ان کے ہاتھوں مر گیا۔ معلوم نہیں پولیس مقابلے میں مرقا کیا کوئی اور پکڑا تھا۔ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ بہر حال انہوں نے اس ڈاکو کو سہا جو کوئی بھی وہ تھا۔ اسے ماکھو چاچا قرار دے کر دفن کر دیا۔ انعامات اور سرٹیفکیٹ بھی وصول کر لیے۔ وہ تو بعد میں اس بے چارے کے لواحقین نے کچھ بہت کر لی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب اس معاملے کی نئے سرے سے تفتیش ہوئی اور پڑے ڈھکے چھپے سے انداز میں حقیقت کھلی گئی کہ وہ ماکھو چاچا نہیں تھا۔ ماکھو چاچا کے بارے میں درحقیقت پولیس کو بھی کچھ معلوم نہیں۔ بس یہ ایک نام ہے جو گردش کر رہا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”لیکن تم اس کے نام پر بھی مٹی ڈال دو گے اور اس کے کاموں پر بھی۔“ میں نے کہا۔ ”قدرت نے تمہیں اتنی خوبصورت زندگی دی ہے، تمہارے پاس تو حویلی ہی زمین ہے ذاتی مکان ہے، قابل رشک خزانہ ہے اور تم دنیا کے ذیل قسم کے ہنگاموں سے دور اس گوشہ عافیت میں بیٹھے ہو۔ تم چاہو تو اس زندگی کو اور خوبصورت بنا سکتے ہو۔ اسے بد صورتیوں کے جنم میں مت پھینک دو۔ تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ ڈاکوؤں کے پاس زیادہ دولت بھی نہیں ہوتی۔ تو پھر کس لیے کر رہے ہو یہ سب کچھ؟“

”میں مختصر آپ کو بتا چکا ہوں کہ بہت سے عوامل تھے جنہوں نے مجھے اس پکر میں پھنسا دیا۔ میرے خراب تھے۔ غلامی تھی۔ کچھ لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں استعمال ہو گیا۔ میری نا سچی تھی۔ اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ تفصیل میں جانے کا اب وقت بھی نہیں ہے اور نامہ بھی کچھ نہیں۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

”تفصیل میں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ صرف تمہاری نہیں ہے شمار بد نصیبوں کی کہانی ہے۔“

”بہر حال۔۔۔ ان میں سے کچھ عوامل اب بھی ایسے ہیں جو مجھے ماکھو چاچا سے دوبارہ فاصلہ روئیل خان بننے نہیں دیں گے۔ یہ جڑ ان کے مفاد میں نہیں ہوگی۔ وہ مجھے اس کی سزا دیں گے۔ میری زندگی ان پر منحصر ہے۔“

”اس کے باوجود تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔“ میں نے اصرار کیا۔

”میں آپ کی فرمائش سے بھی پہلے خود اس موضوع پر غور تھا، اس سلسلے میں غور کر رہا تھا۔ میں اس کو اس سے اور اس اہمال سے جان چھڑانا چاہتا ہوں لیکن یہ قسمت کے طوق کی دھڑکتی میرے گلے میں پڑ گیا ہے۔“

”قسمت کے اس طوق کو تم خود ہی گلے سے اتار سکتے ہو۔ اور اگر نہیں اتارے گا۔“ میں نے کہا۔

”اس صورت میں یہ جگہ۔۔۔ جسے آپ گوشہ عافیت جنت وغیرہ قرار دے رہے ہیں، یہی میرے لیے جہنم بن جائے۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کے لیے مجھے یہ سب کچھ چھوڑنا کہیں غائب ہونا پڑے گا، پائال میں اترا پڑے گا جہاں کوئی شکاری کتا میری کوسو گھٹا ہوا نہ پہنچ سکے۔“ وہ بولا۔

”کوئی بات نہیں، یہ بھی کر سکتا۔ جب انسان کی بھی سے ذلت اور بُرائی کی دلیل میں جا دھستا ہے تو دوبارہ اچھا سچائی تک پہنچنے کے لیے اسے کچھ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ قیمت بہت زیادہ بھی ہوتی ہے۔ کبھی بھی ادا نہیں ہونے کی صورت میں بھی ادا کرنی پڑتی ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاؤں اگر انسان ایک بار سچے دل سے صرف غم کرنے کو یہ سوزا دے گا نظر آتا ہے اور نہ ہی مشکل۔ بعض اوقات کوئی اور آدمی بھی میسر آ جاتی ہے اور سب کام آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک تنگ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ذرا افسوس کہا۔ ”ابھی وقت ہے، ابھی تم یہ مرحلہ نسبتاً آسانی سے سر کر ہو کیونکہ تمہارے پیوی بچے نہیں ہیں۔ ابھی تمہارے چار بچے بھاری ذخیرہ نہیں ہے۔ ابھی تمہارے لیے بھانپنا بھی کچھ ہے۔ ہے۔ انتظار مت کرو۔ دلیل تو آخر دلیل ہے، تمہیں بالآخر مل جائے گی۔“

دھندلاہ مکر آیا۔ اپنی تمام تر تکلیف کے باوجود وہ مکرانے میں کامیاب ہو گیا۔

”میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔۔۔ آپ یقین کریں گے اس نے پوچھا۔

”میں پہلے بھی تمہاری ہر بات پر یقین کرتا آیا ہوں۔“

”اب بات اور ہے۔ اب میری زندگی میں کوئی راز نہیں ہے۔ کم از کم آپ کے لیے۔“ وہ بولا۔ ”آپ کریں، آپ کی نصیحت سے پہلے میں خود ہی سوچ رہا تھا کہ ماکھو چاچا کو ان لوگوں کو دینا چاہئے لیکن مجھے یہ کام بہت مشکل آ رہا تھا۔ آپ کی باتیں سننے کے بعد کچھ آسان محسوس ہونے لگا۔“

”تو پھر وعدہ۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ وعدہ ہے۔“

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ تپ رہا تھا۔

آنکھوں میں جھانکا تھا۔ اس کی آنکھیں اس شیر کی آنکھیں تھیں جس کے ہاتھوں سے اس کا شکار لنگا جا رہا ہو۔  
 ”ہاتھوں سے نہیں..... بچوں سے۔“ میں نے تفسیح کی۔  
 وہ گرا بنے کے سے انداز میں ہنسا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر اس کے دیوالوں میں گولیاں ختم نہ ہو گئی ہوتیں تو وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہوتا۔“  
 ”لیکن تمہارے پاس تو کاٹھکھٹ تھی۔ تم نے اسے کیوں نہیں مارا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ایسی بات پر میں حیران ہوں۔ ابھی تک حیران ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے سے مجھے میں بولا۔ ”اس ایک لمحے کے لیے میں گویا بالکل خالی الذہن سا ہو گیا تھا۔ میں بالکل فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے پتا چلا کہ وہ اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ مجھے بھی فوراً نارنج بھٹکانا پڑی ورنہ دوسرے پولیس والوں کی راکٹوں سے نگلی ہوئی گولیاں مجھے پھینکی کر جاتیں۔“

”شاید اس کے بارے میں تمہارا اندازہ درست ہی ہو۔ شاید وہ واقعی ایک دانا اندازہ آفیسر ہو۔ اسی وجہ سے اس پر اوپر والے کی نظر کرم ہو جو اسے بچا کر لے گئی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ کچھ بھی ہو، سر حال ایک بات تو ظاہر ہے کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ بھی دیگر سارے معاملوں کی طرح اوپر والے ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی اس کا تمہارے ہاتھ سے یا تمہارا اس کے ہاتھ سے مرنا شاید اس کو منظور نہیں تھا۔“

”لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں آسے گا ضرور۔“ روٹیل خان دھوکے سے بولا۔ ”وہ تو خیر دیسے بھی گھاگ قسم کا پولیس آفیسر معلوم ہوتا ہے نہ جانے کس کس سربراہ کی مدد سے تعاقب کر رہا ہو گا لیکن دیسے بھی اس علاقے میں جھپٹنے ہوئے لوگ آخر کار یہاں تک ضرور پہنچتے ہیں۔ میری یہ گنیا لوگوں کے لیے گویا نیکراں سمندر میں کھڑے ہوئے لائٹ ہاؤس کی طرح ہے۔“

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”مجھے معلوم تھا اسے پہنچنے میں کچھ دیر لگے گی اسی لیے تو میں اتنے اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بے شک جان بھٹیلی پر لیے پھر رہا ہے لیکن احتیاط تو سر حال کر رہا ہو گا۔ اس علاقے میں پولیس والے اوائل تو قوا کو پس کا تعاقب نہیں کرتے، مگر کرتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی بھی قدم پر موت ان پر بھجکتی ہے۔ آپ کو جتنا بھی دقت میسر ہے اتنی دیر کے لئے ذرا اس نقشے پر ایک نظر ڈال لیں جو میں نے آپ کو دیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں تو آپ کو کچھ خاص پتا نہیں چلے گا لیکن دن کی روشنی پھیلے تو آپ بتائیں گی کہ مدد سے ڈیرہ حسام پہنچنے کی کوشش کیجئے گا۔“

”میں اس نقشے کو بہت غور سے دیکھ چکا ہوں اور تقریباً ذہن نشین کر چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس وقت تو خود کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اپنی محسوس ہو رہی تھی۔  
 ”میں نے کہا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارے محلے میں یہاں بیٹا ہوں لیکن اس حالت میں تمہارا خیال کون رکھے

مخالف سے میں محسوس پر روانہ ہونے سے پہلے ہی ڈیرہ حسام میں نص سے بات کر چکا تھا۔ وہ صبح یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ پہلے بے لے ہاری کے طور پر کام کرتا رہا ہے مجھے یہاں کوئی پتہ نہیں ہو گی۔ وہ سب کچھ سمجھا لے گا۔ میری سب سے بڑی ناکامی ہے کہ وہ انشیکر یہاں ضرور پہنچے گا۔ میرا اس سے بچنا رہا ہے تو باقی سب مسائل سے میں نمٹ لوں گا۔“

بڑھ کر ٹوٹی ٹھکانے ہوئے پُر خیال لمبے میں بولا۔ ”میں چاہتا تھا اس وقت یہاں سے روانہ ہوں جب اس کے گھوڑے بال ٹائی دیتے لگیں تاکہ وہ میرے پاس زیادہ نہ ٹھہرے۔ جتنا دیر ٹھہرے گا اتنے ہی اس کے ذہن میں شکوک پیدا ہوں

اس کی تم گزرتہ کرد۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں تم پر یقین کر رہی ہے اس پر عمل درآمد ہو جائے گا۔ میں انشیکر دیکھنے لگے جاؤں گا۔ ضرورت پڑنے پر اس سے نمٹ لیتی ہوں مجھے تمہاری طرف سے تشویش رہے گی۔ اس مفدوری کی تمام اس ویرانے میں اکیلے پڑے ہو گے۔“

آپ قطعاً پریشان نہ ہوں۔ وہ شخص کل علی الصباح یہاں لگا۔ اسے یقینی طور پر پتا ہے۔“ وہ بولا۔

اسے تو معلوم نہیں ہے کہ یہاں کیا صورت حال ہو چکی ہے۔ وہ کہتا ہے وہ اتنے میں مستحکم کر جائے گا۔“ میں نے اندیشہ

نہیں۔ اسے ضرور پتا ہے۔“ وہ دھوکے سے بولا۔ ”یہ اس کی شہ ہے اسی یقین کی بنیاد پر تو یہ تجویز میرے ذہن میں آئی نہیں کہ اتنا خطرہ کہاں مولنے لے سکتا تھا۔ صرف چند گھنٹوں کی مدد سے اس سے فنی جھپٹتی صورت حال سے میں اس سے پہلے بھاگتا ہوں۔“

”نیک ہے۔ تم مطمئن ہو تو میں بھی مطمئن ہو جاتا ہوں۔ لاؤ ڈیرہ حسام پہنچنے اور پکڑی ڈیرہ حسام۔“ میں تجھیں کچھ اور بولا۔ ”میں نے کہا۔“

”میں نے کہا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کان لگا کر اس کی باتیں کی۔ ہاویں کی قوا اب تک سنا ہی نہیں دی تھی۔“

”شاید اس انشیکر نے تمہارے تعاقب کا ارادہ ہی کیا ہو۔ ہم خواہ مخواہ فکر میں ڈبلے ہو رہے ہیں۔“

”میں اسے جانتا نہیں ہوں کہ وہ پتا لیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسے جانتا نہیں ہوں کہ وہ پتا لیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسے جانتا نہیں ہوں کہ وہ پتا لیا۔“ میں نے کہا۔

میں لوہے کی الماری میں لگے ہوئے بڑے سے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بدلے ہوئے کھٹے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس اور لمبے جوتوں کے ساتھ میں نے چہرے پر ڈھانچا بھی باندھ لیا۔ اب ردیئل خان کی جگہ میں خود ڈاکو لگ رہا تھا۔

ردیئل خان بولا۔ ”کھلا شکوف تو مجھ سے راستے میں گر چکی ہے، آپ ماؤزر لے جائیں۔“

”نہیں۔“ میں نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ ”میرے پاس ایک اچھا ریو اور اور کچھ فاضل گولیاں موجود ہیں۔ میں اپنے پاس صرف وہی رکھوں گا۔ ماؤزر کو لباس میں چھپانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔“ میں نقشہ اور ریو اور دونوں ہی چیزیں اپنے پاس رکھ چکا تھا۔ اچانک ردیئل خان تیز سرگوشی میں بولا۔ ”آپ نے سنا؟“

”یہاں سننے کو کیا رکھا ہے؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اور جہہ تن گوش ہو گیا۔ ہوا کا ایک بھولا بھلا جھونکا اپنے دوش پر کچھ آٹھنیں سی لایا تھا۔ پھر ہوا کا رخ بدل گیا اور دابے جیسی آواز معدوم ہو گئی لیکن وہ اتنا تباہ ضرور دے گئی تھی کہ کافی دور کو گھنٹہ سوار محو سفر تھا اور اس کا رخ غالباً اسی طرف تھا۔

ردیئل خان کو اب اسیلٹر کی آمد پر خطرے سے زیادہ اپنا اندازہ صحیح ثابت ہونے پر فخر تھا۔ وہ دابہ طلب سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا تھا.....؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوا کے ایک اور جھونکے کے ساتھ ٹاپوں کی نہایت ہلکی آواز گویا جھلکی ہوئی ہم تک پہنچی۔ آواز اب بھی اتنی مدھم تھی کہ عام آوی شاید اسے حسن بناتا لیکن میری اور ردیئل خان کی سماعت جنگلوں دیہاتوں سے بڑی مانوس تھی۔ میری طرح یقیناً اس نے بھی برگد و شجر تک کی سرگوشیاں سنی ہوئی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ردیئل خان بولا۔ ”ہو سکتا ہے کچھ آگے آنے کے بعد وہ گھوڑا چھوڑ دے اور پیدل مکان کی طرف بڑے مکان کی دوشی تو اسے شاید نظر آتی چلی ہوگی۔“ وہ بدستور سرگوشی میں بات کر رہا تھا حالانکہ اس پاس ہماری بات سننے والا کوئی موجود نہیں تھا۔

”تمہیک ہے۔ میں چلا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پستلے کچھ دیر مکان کے باہر چھپ کر صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں پھر مناسب موقع دیکھ کر پٹا ہر مکان سے نکل کر بھاگوں گا۔“

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ ایک لمحے کے لیے میرا ہاتھ تھامے میری طرف دیکھا گیا پھر بیٹھی بیٹھی ہی توازیں بولا۔ ”میرا سا بھائی بھی ہوتا تو شاید اس سو فٹ پر میرے کام نہ آتا۔“

”ان بیکار باتوں کو چھوڑو۔“ میں نے کہا۔ ”اور کام کی بات سنو۔ ابھی تو مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کب تک اوپر اوپر بھٹکا رہا ہوگا۔ کچھ عرصے کے بعد اگر کچھ تھرا لارہ آتا ہو تو کسی بھی

کاروباری شخص سے میرا آپا معلوم کر کے آجائے لیکن ایک سی تصحیح میں بھی کرنا چاہوں گا۔ میرا نام افضل خان نہیں ہے چوہدری ہے۔ کسی کاروباری آدمی سے چوہدری گروپ اس کے دفاتر کا تاج ہے۔“

وہ گھسی نظر سے میری طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے ”میں نے کہا تھا کہ آپ اتنے معمولی آدمی نہیں ہیں جتنا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”یہ تمہارا خیال ہے، تمہاری ذہن نوازی ہے لیکن میں آپ کو معمولی شخص ہی سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ایک اٹھائے کمرے سے نکل آیا۔ میں نے سڑکی تھوڑی بہت تیار تھی۔ اس تھیلے میں دو تین چھوٹی موٹی چیزیں ”اس دوا کا کھانا پانی کی ایک بوتل اور کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔ ردیئل خان لباس تبدیل کرانے کے بعد میں نے یہ چیزیں تھیلے میں ڈالیں۔ مجھے ان کی ضرورت پیش آنسکتی تھی۔“

اس وقت تک ٹاپوں کی آواز خاصی واضح سنائی دینے لگی اور گھڑسوار ایک نہیں دو معلوم ہوتے تھے۔ مکان سے نکلنے کے بعد احتیاط سے دروازہ بند کیا اور اندر جہرے میں بہت دور تک کی کوشش کی لیکن مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔

دخشا ٹاپوں کی آواز معدوم ہو گئی۔ شاید گھڑسوار کسی را کوئی اندازہ لگا رہے تھے یا کسی حکمت عملی پر خود گرہے تھے بات تو طے تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی تھے اب تک مکان کو دیکھ چکے تھے اور منہ اٹھائے اس کے قریب آنے کے بجائے تمام انداز اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

ردیئل خان کا سیاہ گھوڑا باہر موجود تھا اور دھندلی کا کرتے ہوئے پانی کی ایک بڑی پانی خالی کر چکا تھا۔ اب سوچ کر کھل کر گھڑا کھاس پر ت مار رہا تھا۔ غالباً وہ حکم سہ ہوا جہر جہری سی لے کر اس نے مستند انداز میں میری طرف اشارہ میں نے قریب جا کر اسے چکارا اور چھٹی دکی۔ گھوڑا میرے لیے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا لیکن بد کام نہیں تھا توڑا بہت آڑا تب بھی میں اسے کابو میں کر لیتا۔ گھوڑوں میں کرنے میں مجھے خاصی سمارت حاصل تھی اور مجھے اس بڑا لطف آتا تھا۔ لڑکپن میں بھی یہ میرے محبوب مقامات ایک مشتعل تھا۔ کسی کا بھی گھوڑا اچھا آجائے تھا میں اس کی کوشش ضرور کرتا تھا خواہ وہ کتنی ہی سرکشی دکھائے۔ گھوڑوں کے مالکان خود بعض اوقات گھوڑوں کے بارے میں مشورہ کرتے تھے جبکہ میرے پاس گھوڑا نہیں تھا۔

ایک مناسب لمحہ دیکھ کر میں ایک کرکٹ کھانسی سے اس کے سیاہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اور تو کسی بھی نہیں دکھائی لیکن قدرے مشرب انداز میں بیٹھا تھا۔ رات کے گھرے سناتے میں اس کے ہنسنے کی آواز دیکھ

یہ بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ میرے تعاقب میں آنے والا تھا نہیں تھا۔ وہ کم از کم دو افراد تھے اور کوئی بید نہیں تھا کہ ان کے پیچھے تیسرا بھی ہو۔ باپوں کی ایک قسمی آواز سے مجھے تیسرے گھڑسوار کی موجودگی کا بھی شبہ ہو رہا تھا۔ ہر حال میرا مقصد تو حاصل ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں اپنے پیچھے لگایا تھا۔ دو میل خان کے سر سے خطرہ ختم کیا تھا۔ اس کی ترکیب کار گر رہی تھی۔

میں حالات کی ستم خرابی پر ایک بار پھر حیران تھا۔ میری زندگی تو ہر قدم پر اچانک ہی بڑے عجیب انداز میں چلا کھاتی تھی۔ دیئے تو کوئی بھی انسان یقین سے نہیں کہہ سکا کہ آئندہ لمحے اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آئے والا ہے لیکن میرے ساتھ تو زندگی کچھ زیادہ ہی مذاق کرتی ہے۔

کچھ دیر پہلے میں اطمینان سے دو میل خان کے گھر کے سامنے ٹھل رہا تھا اور دل کی اداسی سے مکمل رہا تھا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک عجیب ہی کہانی لے کر میرے سامنے آجائے گا اور کچھ دیر بعد میں دورانے میں ایک نئے سبز روانہ ہو جاؤں گا۔ وہ بھی اس طرح کہ میرے کندھوں پر کسی اور کی "مکڑی" کا بوجھ ہو گا اور قانون کے لحاظ سے مجھے کوئی اور سمجھ کر میرے تعاقب میں ہوں گے۔ خیر... اب ان باتوں کے بارے میں سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

زمین بدترج کچھ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس پر گھوڑوں کے ٹھوں کے نشانات بھی رفتہ رفتہ غیر واضح ہوتے جا رہے ہوں گے لیکن اس فائدے کے ساتھ ہی یہ نقصان شروع ہو گیا تھا کہ باپوں کی آواز واضح ہونے لگی تھی جو سامعین سامعین کرتے ان دیر انوں میں تعاقب کرنے والوں کو دور تک اپنا پانچا دے سکتی تھی۔

اس دوران میں نے اپنے عقب میں بہت دور ایک مرتبہ روشنی کا دائرہ بھی نمودار ہوتے دیکھا۔ وہاں تاجروں کی گلی تھی جس کا رخ زمین کی طرف تھا۔ تاجروں سے ہی لمحے بچھ گئی لیکن مجھے خیال آیا کہ اگر میرے پاس را نقل ہوئی تو میں اس روشنی کی مدد سے ہدف یا کافر کو سکا تھا لیکن فوراً میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو رو کر دیا۔

مجھے اس پولیس والے کو بلاک نہیں صرف مس کا ہڈ کرنا تھا، کچھ دیر دوڑائے رکھنے کے بعد اس سے بچھا چھڑا تھا۔ وہ ہر حال ایک نایاب پولیس والا تھا۔ اس ٹکے میں اگر ایسے فرض شمس اور جناس لوگ موجود تھے تو انہیں زندہ رہنا چاہیے تھا۔ ان میں سے کسی کو کم از کم میرے ہاتھ سے نہیں مرنے چاہیے تھا۔ میں تو ان کا تہہ روان تھا۔ میری ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

میں تقریباً دو گھنٹے جو سفر رہا۔ اس دوران میرے تعاقب میں آنے والی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ شاید پولیس والوں نے میرے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا یا وہ دھوکا کھا کر کسی اور سمت

محسوس ہوئی جیسے کسی نے عین میرے قریب توپ داغ دی ہو۔ جو کوئی بھی اس طرف آ رہا تھا اس نے بھی یقیناً یہ آواز سن لی ہوگی۔ میں نے ایک خاص انداز میں جھک کر اسے مزید بہتانے سے باز رکھا اور ایزدنگائی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہلکا ہلکا پھر دوڑنے لگا۔ میں اسے ہٹکے سے باہر لے آیا اور مکان کے گرد ایک پکر لگایا۔ میں چاہتا تھا اس طرف آنے والے اگر پولیس انسپکٹر اور اس کا ساتھی ہی تھے تو وہ محسوس کر لیں کہ کوئی گھڑسوار مکان سے نکل کر فرار ہوا ہے۔ وہ انداز میرے میں را نقل سے مجھ پر نشانہ ایزدنگائی بھی کر سکتے تھے لیکن میں نے یہ خطرہ مول لے لیا تھا۔ تمام احتیاطا میں گھوڑے پر بالکل جھک کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے مکان کے گرد پکر کاٹ لیا، کسی طرف سے کوئی نہیں آئی۔ میں نے گھوڑے کو اس طرف موڑ لیا جہاں مجھے نقشے کے حساب سے جانا چاہئے تھا۔ وہ اچھی نسل کا ایک سبک بدن گھوڑا تھا۔ اسی اس کے بدن سے پہلی ہی مشقت کا سینہ خشک نہیں ہوا تھا لیکن اس نے دوبارہ تیز دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

خشک ہوا میرے کانوں میں بیٹھان سی عمارتیں تھیں۔ میں شبہ نہ کر رہا تھا۔ راستہ میں ڈیرہ حسام کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ آسمان پر صرف چند ستارے چھلکا رہے تھے۔ ان سے مجھے بہت کے یقین میں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی لیکن میری کوشش تھی کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو۔ دو میل خان اس علاقے کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتا چکا تھا۔ اس میں بیک وقت ہزاروں "مکڑی" دیکھنا توں و فیوہ کی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ یہاں اصل بہت سے جھگ جانا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں جھگتے جھگتے بھوک اور پیاس سے مر بھی سکتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہونے لگا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ دو میل خان اس طرف نکلا تھا۔

چند منٹ بعد میں نے گھوڑے کو روک کر ہوا کی سرکوشیاں بننے کی کوشش کی۔ باپوں کی آواز میرے تعاقب میں تھی اور قاصد اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا جتنا اس وقت تھا جب میں دو میل خان کے گھر سے روانہ ہوا تھا۔ اس پر میں حیران ہوں بے غیر نہ رہ سکا۔

اس کا مطلب تھا اگر وہ دو میل خان کے مکان پر گرا بھی تھا تو اس نے وہاں چند لمحے سے زیادہ وقت صرف نہیں کیا تھا۔ اس شخص کی تیزی مجھے کچھ عجیب لگ رہی تھی اور میں ایک بار پھر سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی وہ پولیس والا تھا؟ اتنا پختہ ارادہ...؟ اتنی تیزی...؟ وہ مجھ گھوڑے پر بیٹھ کر بہت کی طرح ایک ماسلوم ڈاکو کے پیچھے لگ گیا تھا اور بچھا چھوڑنا نظر میں آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب ہمارے ملک میں اس قسم کے پولیس والے نہیں پائے جاتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر گھوڑے کو ایزدنگائی اور وہ ہوا ہو گیا۔ اب

ستر کچھ طول بھی بچا سکتا تھا۔ تو ڈرا سا جو کھانا پانی میرے پاس تھا اسے احتیاط سے ختم کرنا ہی ستر تھا۔

میں نے کوشش کی کہ نیم بیداری کی ہی حالت میں رہوں۔ اور اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ ایک بار ایک پرندے کی ہلکی سی چڑچڑاہٹ اور ایک بار ایک نیولے کے زمین گرنے کی آواز پر میں کمر میں اٹھ بیٹھا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔

مجھے کافی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ انفلکٹر نے میرا پیچھا چھوڑا تھا۔ فرض شناسی بھی آخر کہاں تک اس کا ساتھ دیتی۔ اس دیرانے میں گھوڑوں پر ڈاکوؤں کا تعاقب جاری رکھنے کے لیے ہڈیہ فرض شناسی کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت تھی۔

موسم خشک ہی تھا اور نیم صحرائی سے علاقوں میں تو گرمیوں کی راتیں بھی خاصی سرد ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی ابھی خاصی لفظ تھی لیکن چڑے کی جھلک اور مولیٰ ڈیم کی جینز نے مجھے ٹھنڈے سے بچائے رکھا۔ صبح صادق کے آثار نمودار ہونے سے پہلے غیر ارادی طور پر مجھے گرمی خیز آگئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو چاروں طرف گندنی دھوپ، پھیلی ہوئی جھمی اور شاید دھوپ کی چٹن محسوس کرتے ہوئے ہی میں بیدار ہوا تھا۔ گھوڑا میرے سرانے ہی کھڑا تھا اور اب بالکل تازہ دم معلوم ہو رہا تھا۔ میں اس کی باگ تھاں سے دھولان سے اتر آیا۔

ایک چھوٹے سے گڑے میں مجھے بارش کا پانی کچھ صاف نظر آیا۔ اس سے میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ رات گئے میں نے چند نوالے ہی کھائے تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ ناشتا اور دوپہر کا کھانا کھانسی کھالوں کا کیونکہ میرا اندازہ تھا کہ مجھے خاصا لمبا سفر درپیش تھا۔ بجھنے کی وجہ سے میرا سفر طویل ہو گیا تھا۔ اب ستر کا صبح سمت میں نئے سرے سے آغاز کرنے کے لیے میں نے ابھی طرح تشنگ دیکھا۔

کچھ ہی بھیم سی نشانوں سے اندازہ ہوا کہ میں اس وقت کہاں کھڑا تھا اور ذریعہ حسام جانے کے لیے مجھے کون سی سمت اختیار کرنی چاہیے تھی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر میں نے اڑا لگائی اور دوپہر کے بے زبانی ایک بار پھر مجھ گراں بار کو اٹھائے ٹیک پیچھی کی طرح وہاں سے بائیں کرنے لگا۔ چند سیکنڈ میں ہی گھوڑا سیم دائرے میں پھاڑی کے گرد گھوم گیا اور سوچ سمیٹ پر پشت پر اٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے سورج چلا گیا کہ گھر میرے سامنے آ گیا تھا۔

میں نے گھوڑے کی نگاہ اتنے زور سے سمجھنی کہ وہ غلبناک انداز میں ہڈناک پیچھی دوڑنے لگا تو میں پر کھڑا ہو گیا۔ پھاڑی کے گرد گھوم کر میں درحقیقت دو گھڑ سواروں کے عین سامنے پہنچ گیا تھا۔ نہایت مہربان سکون سے یقیناً میرے ہی انتظار میں کھڑے تھے۔ میں گھوڑے کی تیز رفتاری کے سبب کدم ہی ان کے آگے

میں نکل چکے تھے۔ دونوں ہی صورتوں میں میرا مقصد حل ہو چکا تھا۔ میں انہیں پکار دینے بھانکنے یا بائوس کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ انہیں بھانکنے بھانکنے میں خود ہلک گیا تھا۔ میں ایک ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں پھر پھر کسی پھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر نہیں کہیں سبزے کی موجودگی کا بھی احساس ہو رہا تھا جبکہ نقشے کے حساب سے میرے راستے میں ایسا کوئی مقام نہیں آتا چاہیے تھا۔ یہاں بعض جگہ بڑے بڑے گڑے بھی موجود تھے جو برساتی پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ دیکھے بجائے بغیر تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑانے پر یہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتے تھے۔

گھردو سرا مسئلہ یہ بن کھڑا ہوا تھا کہ گھوڑے کو تیز رفتاری سے دوڑانا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اس بے چارے کی بڑی حالت تھی۔ آج ہی رات جب وہ وہیل خان کے پاس تھا تو نہ جانے کس رفتار سے۔۔۔ اور کتنا دوڑ چکا تھا۔ ایک بار گھر بھی چکا تھا۔ میں نے بھی اسے مسلسل اور تیز دوڑایا تھا۔ اب حالت یہ تھی کہ اس کا جسم ہلک چکا تھا۔ اس کے تھنوں سے گویا سانس نہیں گرم گواں بڑا ہوا رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو تقریباً گھٹیت رہا تھا۔

اسی دوران ادھر دوسرا چاند بھی بادلوں کی اونٹ سے نکل آیا اور تقریباً چاندنی نے دیرانے کے چرے پر غارہ سال دیا۔ میں نے آنکھوں سے دوپہر کا کام لیتے ہوئے حتی الامکان دور ٹک دیکھنے کی کوشش کی لیکن کہیں کوئی سایہ کوئی ہولا متحرک نظر نہ آیا۔ مجھے کچھ اطمینان ہو گیا۔ اگر میں ہلک بھی گیا تھا تب بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ نقشہ میرے پاس موجود تھا۔ دن کی روشنی میں میں اس سے مدد اور رہنمائی حاصل کر سکتا تھا۔

فی الحال پولیس والوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اب میرا پاگلوں کی طرح منہ اٹھائے جاسکتے رہنا ضروری نہیں تھا۔ گھوڑے سے اتر کر میں نے اس کے کندھے سے لگام نکال دی اور اسے ادھر ادھر کھونے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ واقعی کچھ اس طرح گردن ہلا ہلا کر ہانپ رہا تھا گویا اس کے پیچھے پھڑپھڑنے کے قریب ہوں۔

جب وہ کچھ سستا چکا پانی لی چکا اور گھاس میں توڑا دستہ مار چکا تو میں اس کی باگ تھاں کر پھیل ہی ایک پھر پھر کی پھاڑی پر چڑھنے لگا جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا تاکہ تازہ دم ہو کر دن کی روشنی میں نئے سرے سے ستر کا آغاز کروں۔ میرا اندازہ قدرے بلند ہی پر جا کر لینے کا تھا تاکہ شیب کی طرف سے کوئی آنے سے فوراً دیکھا جاسکے۔

اوپر پہنچ کر میں نے گھوڑے کی ذہن سے بندھا ہوا تھیلہ اتارا اور ایک صاف سی جگہ پر بیٹھ کر توڑی سی روکی سوکھی کھاکر دو گھونٹ پانی پیا اور گھوڑے کی نگاہ اس کی اٹلی ناگوں میں باندھ کر لیٹ گیا۔ میرا ہر کھانا میں نے اس لیے نہیں کھایا تھا کہ کہیں گرمی خیز نہ ہو جاؤں یا مجھ پر رستی طاری نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ میرا

مہارت کو کام میں لاتے ہوئے ٹنڈر دینے سے پہلے نہ صرف جیب سے ربوہ اور نکال بلکہ گولی چلانے میں بھی ہل کر دی۔ ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے آٹ کر گھوڑے سے گرتے دیکھا۔ گولی بھینا اس کے سینے میں لگی تھی۔

رجیم گل فوراً اپنے گھوڑے پر چھک گیا اور اسی عالم میں اس نے فائر کیا۔ میں اور میرا گھوڑا چونکہ اس وقت بھی متحرک تھے شاید اسی لیے نشانہ خطا گیا۔ گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ یہ سب کچھ صرف اتنی سی دیر میں ہوا جتنی دیر میں گھوڑے نے واپس کے لیے رخ موڑا۔ ایک ایک ہل میں یہ سب کچھ رونما ہو رہا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے سلوموشن میں کوئی فلم چل رہی تھی۔

میں نے جواباً رجیم گل پر فائر نہیں کیا اور گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لیے اس کی ہلکیاں اپنی ٹانگوں سے پوری قوت سے رگڑا لیں۔ گھوڑا کچھ اس انداز سے آگے بڑھا کہ وہ انپیکٹر رجیم گل کے ربوہ اور سے ٹکلی ہوئی گولی کو جالے گا۔

جس حیرت انگیز انداز میں وہ تیز رفتاری سے دوڑتے دوڑتے ایک ٹنٹ رہا تھا جس تیزی سے گھوما تھا اور جس انداز میں اس نے دوسری سمت میں ابتدا ہی سے رفتار بڑھائی تھی وہ اسے ایک غیر معمولی گھوڑا ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔ موت کو اس طرح صرف چھو کر پٹ آنے میں نہ اند کی مرضی اور میری بھرتی کے علاوہ اس گھوڑے کے برقی صفت ہونے کو بھی بڑا دخل تھا۔

رجیم گل میرے تعاقب میں نہیں آیا۔ شاید وہ ہیڈ کانسٹیبل کو دیکھنے بھاٹنے میں لگ گیا تھا جسے میرے ربوہ اور سے گولی لگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مر چکا ہو گا۔ اب میں اندھا دھند گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ سب کا بھی مجھے کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ گھوڑا کچھ اس رفتار سے دوڑ رہا تھا کہ اوروں کے نیلے یا اگاڑا کارڈ رشت اور جھانپاں لپٹنے جھپکتے ساروں کی طرح قریب سے گزرتے محسوس ہو رہے تھے۔ بہت دور نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں آیا تھا۔ تاہم میں نے گھوڑے کو اسی جوش و خروش سے دوڑنے دیا۔ مجھ پر ایک لمحے کے لیے جو جیہاں کی کیفیت آئی تھی وہ گزر چکی تھی اور اب میں دوبارہ پرسکون تھا۔ منتقلی انداز میں سوچ لگا تھا۔

چند لمحے پہلے جو کچھ ہوا بالکل اضطرابی اور غیر ارادی سے انداز میں ہوا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ رجیم گل اور ہیڈ کانسٹیبل میری آہ سے باخبر ہونے کے باوجود کچھ جتنی بھرتی تھیں دیکھا سکے تھے لیکن یہ بھرتی مجھے بہت مست مہلکی پڑی تھی۔

میں تو صرف مدجیل خان سے پولیس کی توجہ بھاٹنے کے لیے سیاہ پوش بن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں انھیں ڈانچ دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا، اگرچہ میرے درمیان ٹکراؤ ہوا بھی تو دور دور سے ہو گا۔

قریب پہنچ گیا تھا کہ مجھے یہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ زمین کا سینہ چر کر طلسمی سے انداز میں میرے سامنے آٹن کھڑے ہوئے ہوں۔ حالانکہ وہ یقیناً پھاڑی کے گرد دوسری طرف سے محسوس کر میرے لیے ہی آرہے تھے اور میرے گھوڑے کی ٹانگوں کی آواز سن کر گھات لگا کر کھڑے ہو گئے تھے کہ جب شکار خود ہی چلا آ رہا تھا تو رجعت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے اپنی حسیات پر برا بھروسہ تھا۔ ذرا سی بھی آواز نہیں سن سکا تھا۔ شاید انہوں نے اپنے گھوڑوں کے ٹھنوں پر کپڑا لپیٹ لیا تھا۔

جس چیز کو دیکھ کر دردِ حقیقت میری آنکھوں کے سامنے جھماکا ہوا وہ پولیس کی دوسری تھی۔ میں ان کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا کہ انپیکٹر کے چوڑے چنگے سینے پر آ رہاں پگی سی پٹی پر نام بھی صاف پڑھ سکتا تھا۔ ذرا لمبا سا نام تھا۔ رجیم گل خانا زادہ۔

یہ یقیناً وہی انپیکٹر تھا جس کا مدجیل خان نے ذکر کیا تھا۔ وہ تقریباً میری عمر ہی کا تھا لیکن میری ہی طرح اسے بھی فوجیوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی شخصیت میں وہ کلندرا رہی نہیں تھا جو عموماً میری شخصیت سے جھلکتا تھا۔ میری شخصیت سے کلندرا رہی صرف اسی وقت مفقود ہوتا تھا جب میں واقعی تنہید نظر آنے کی کوشش کرتا تھا اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

لیکن انپیکٹر رجیم گل خانا زادہ انتہائی بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے دیکھنے ہوئے سے سرخ و سپید چہرے پر مولی مولی سیاہ موٹھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں پر سہرے فریم کا تاریک چشمہ تھا۔ اس وقت بھی وہ ہوں صاف ستھرا نظر آ رہا تھا جیسے رات بھر بھول میں میں میرا تعاقب کرنے کے بجائے صبح کھر سے تیار ہو کر دفتر آیا ہو۔ معلوم نہیں اس نے کیا کر اپنا ٹیلیڈ اس حد تک درست رکھا تھا۔

اس کی شخصیت جتنی خوبصورت تھی، اتنی ہی بد صورت وہ ربوہ اور تھا جو اس کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا اور جس کا رخ میری طرف تھا۔ اس کے ساتھ غالباً ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں میں قہری ٹانٹ قہری کی راکٹل تھا جسے اس کا ہٹ کندھے سے لگائے میرا نشانہ لیے ہوئے تھا۔ یہ سب کچھ بس میں نے اتنی سی دیر میں دیکھا جتنی دیر میں بجلی کا کوڈر اپنا لپکا ہے اور معدوم ہو جاتا ہے۔

راہی لمحے میں نے گھوڑے کو کھمانے کے لیے لگام کو جھکا دیا۔ رجیم گل دوڑا۔ ”مرک جاؤ۔“

میں ہلکا کیسے رک سکتا تھا لیکن گھوڑے کے گھومتے گھومتے میں نے دیکھا کہ انپیکٹر کا اشارہ باکر کانسٹیبل راکٹل کا ٹنڈر دبانے لگا تھا۔ حالانکہ ربوہ اور رجیم گل کے ہاتھ میں بھی تھا لیکن اس نے فوکل گولی چلانے کے بجائے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا تھا۔

میں ان کے اتنے قریب تھا کہ نشانہ خطا جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس لمحے میں نے اپنی زندگی بھر کی مشاقی و

باہر تھی۔

سو نے پرسا گایہ ہوا تھا کہ ذہن سے بندھا ہوا میرا کپڑے کا وہ  
دیکھا تو یوں ساٹھٹھا بھی راستے میں کہیں کر گیا تھا جس میں میرا بچا کچھا  
کھانا کپڑے کا ایک جوڑا اور پانی کی بوتل تھی۔ اب میرے لیے  
فوری طور پر اس سیاہ لباس سے چھٹکارا پانا بھی ممکن نہیں تھا جو مجھے  
کسی کی بھی نظر میں مشکوک بنا سکتا تھا۔ رحیم گل کی نظر میں تو خیر  
اب میرے لباس تبدیل کر لینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

رات کی تاریکی میں سیاہ لباس بعض مخصوص حالات میں بڑا  
بھلا لگتا ہے۔ اندر میرے میں مدغم ہو جانے میں بڑی مدد دیتا ہے لیکن  
دن کے آجائے میں جسم پر الزام کی طرح چلتا ہے۔ مجھے اب اس  
لباس سے الجھن محسوس ہو رہی تھی لیکن فی الحال اس سے چھٹکارا  
پانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

ایک جگہ جہاز یوں کے قریب گھوڑا روک کر میں نے ایک بار  
پھر جیب سے نقشہ نکالا۔ سورج ابھی سر نہیں آیا تھا۔ ابھی اسے  
دیکھ کر اندازہ ہو سکتا تھا کہ مشرق کس طرف تھا۔ نقشے میں سمتوں  
اور کچھ نشانوں کی مدد سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں مشرق ہی کی  
سمت میں سڑکوں کو پیچے ڈیرہ حنام سے حاصل آباد جانے والی اس  
چھوٹی سڑک کی طرف جا کر کھانا چاہیے جس پر جانو کا اڈا تھا۔ روٹیل  
نے کہا تھا کہ اگر میں زیادہ ہی خطرے میں گھر جاؤں یا مجھے کسی قسم کی  
ضرورت ہو تو میں جانو کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں، وہ میری مدد  
کرے گا۔ اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔

میرے خیال میں خطرے کا گدھ میرے سر پر اپنے پر پھیلا چکا  
تھا۔ میرے آس پاس ہی پڑ پڑا رہا تھا۔ اب میرا کسی ایسے ہی  
ٹھکانے کی طرف رخ کرنا بہتر تھا جہاں سے تو قوی دست مدد کی امید  
رکھی جاسکتی ہو۔ میں نے اپنا رخ صحیح طور پر مشرق کی طرف کر لیا  
اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کو ایک بار پھر دوڑانے لگا۔

میرا سفر مزید ایک گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران نیلیوں اور  
بھربھری پازاریوں کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔ اب میں ایک بار پھر  
اُجاڑے میدانی علاقے میں جو سفر تھا۔ یہاں کی زمین سخت اور  
ناہوار تھی۔ یہاں صرف کہیں کہیں غاروار جھاڑیاں نظر آ رہی  
تھیں جن کے درمیان ندولے دوڑتے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے  
دو غار پشت بھی نظر آئے۔

چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چھوڑے سے درختوں کا  
سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ مختصر سا جنگل تھا۔ اس سے گزر کر مزید دو  
ڈھائی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بالآخر وہ پگڈنڈی نظر آئی تھی  
جس کی مجھے تلاش تھی۔ سمتوں کے حساب سے میرا اندازہ درست  
ہی رہا تھا حالانکہ اس علاقے کی دو سمتوں اور رنگاری کو دیکھتے  
ہوئے مجھے اپنے اندازے غلط ثابت ہونے کا خطرہ محسوس  
ہو رہا تھا۔ محض سمت کے قہین سے نیا ہوتا ہے۔ ذرا سا ترچھا  
ہو جانے سے انسان کہیں کا کہیں نکل سکتا ہے۔ وہ تو قیمت تھا کہ

دیر گلیوں کا تانہ لوگا اور بالآخر میں انہیں پکڑے کر نکل  
کا لیکن کچھ بھی اس طرح نہیں ہوا تھا جس طرح میں نے  
تھا۔

اب ایک پولیس والا میرے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ الپنیز  
مگل واضح طور پر نہایت قریب سے میری شکل دیکھ چکا تھا  
تہ جب میرا اس سے سامنا ہوا اس وقت میرے چہرے پر ڈھانسا  
ہوا تھا۔ میں تو نہایت مطمئن ہونے کے بعد ڈھانسا نار کا تھا اور  
تو وہ سیاہ کپڑا بھی بھگدڑ میں کہیں گر چکا تھا جس سے گزشتہ  
میں ڈھانسا باندھ کر چلا تھا۔

رحیم گل اور ہیڈ کانسٹیبل نے یقیناً اس وقت مجھے دور سے دیکھ  
ہو گا جب میں پھاڑی پر سو رہا تھا اور دوپٹہ پکچل چکی تھی۔ وہ  
گات کر پھاڑی کے عقب سے غالباً کسی ایسی جگہ سے اوپر چڑھنا  
چہ تھے کہ میں جاگ بھی جاؤں تو انہیں نہ دیکھ سکوں اور وہ  
مک میرے سر پر پھینک کر مجھے قابو کر لیں لیکن ہوا اس طرح بھی  
رہا تھا جس طرح انہوں نے سوچا تھا۔

بہر حال یہ اچھا نہیں ہوا تھا کہ رحیم گل سے اتنے قریب سے  
آہنا سامنا ہو گیا تھا۔ اب میں اس کی نظر میں صرف ایک ناکام  
تی کے سلسلے کا مفلور مجرم یا ڈاکو نہیں رہا تھا بلکہ ایک پولیس  
لے کا قاتل اور مزید نہ جانے کتنی جاہیں لینے کا اہل قرار پا چکا

تھا۔ پھر جس انداز میں میں صرف ایک من کے لئے اس کے  
سے اس کے تحت کو گولی کا نشانہ بنا کر نکل بھاگا تھا اس سے  
لی کی اتنی بھی مجروح ہوئی ہوگی۔ وہ جس قسم کا پولیس آفیسر معلوم  
رہا تھا اس قسم کے پولیس والے کی اتنا مجروح ہونا کچھ اچھی بات  
نہیں ہوئی۔ وہ میرے لیے وہی رہبر ثابت ہو سکتا تھا۔

پہلے میں صرف دو میل خان کے لیے بھاگ رہا تھا اب بھاننا  
بہی ڈاکی مجبوری ہو گیا تھا۔ اب تو میں گویا پچھو دو میل خان ہو چکا  
تھا۔ دو میل خان کا کیا دھرا میرے کھاتے میں منتقل ہو چکا تھا۔  
نیل داروات ہوئی تھی وہاں کسی نے دو میل خان کا چہرہ نہیں  
لکھا تھا۔ وہاں دوسرے ڈاکوؤں کے ساتھ اس سیاہ پوش کو دیکھا  
لیا تھا جو سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور جس کے چہرے پر بھی سیاہ  
بھانا تھا۔

اب رحیم گل اسی سیاہ پوش کو بغیر ڈھانسنے کے اپنی آنکھوں  
کے سامنے مزید ایکشن میں دیکھ چکا تھا۔ یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا  
لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔  
انہیں جانا بھی اب میرے لیے ٹھیک نہیں تھا۔

اسی منٹوں میں میں کئی میل کا فاصلہ طے کر گیا۔ بالآخر ایک  
بگڑ کر کہیں نے ہواؤں سے سن کر لینے کی کوشش کی لیکن کچھ  
معلوم نہیں ہو سکا۔ اگر رحیم گل اب بھی میرے خائب میں تھا تو  
اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز میری سماعت کے دائرے سے

بھر کم چار ہائیاں پڑی تھیں۔ کٹڑی کی چند بے ہنگم میزیں اور کرسیاں بھی موجود تھیں جن پر چند لوگ کھانا کھا رہے تھے یا چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ ان کے سامنے کھانے کے برتنوں کے ساتھ بک کی جگہ چھوٹے چھوٹے ٹبلے رکھے ہوئے تھے۔ اڑا بکھ بکھو کے چیمبر ستروران سے بھی مشابہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ لہجہ ڈال تھا۔ ویسے اس قسم کے بھی اڑے ایک دو سرے سے مشابہ نظر آتے ہیں۔

اڑے کے سامنے بیچ کر میں نے بھی کھوڑا ایک درخت کی شاخ سے باہر حال اور ایک چارپائی پر بیٹھا۔ ایک چھوٹا نما کرے پر کسی گڈز زنا سپورٹ کھینک کا ٹوٹا چھوٹا اور دھندلا سا بورڈ بھی لٹکا ہوا تھا۔ مجھے کچھ ہوں گا جیسے یہ جگہ میری کئی بار کی دیکھی بھالی تھی لیکن مجھے معلوم تھا یہ محض میرا فریب نظر تھا۔ بات بس وہی تھی کہ میں اپنی زندگی کی آوارہ گردیوں کے دوران ایسے بہت سے اڑے دیکھ چکا تھا۔

وہاں موجود تقریباً سبھی لوگوں نے کن انکھیں سے، فلک وہ سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی وجہ میرا لباس تھا۔ حتیٰ کہ دو بیرونی سے آؤر لینے آیا وہ بھی پہلے دوڑ کھڑا چلے میرا جائزہ لیتا رہا تھا۔ میں نے اسے کھانے کا آؤر دیا۔ اس نے آؤر نو لے لیا لیکن کچھ اس انداز میں واپس چلا گیا جیسے مجھ سے کوئی پرانی تنگی چلی آ رہی تھی۔

کاؤنٹر پر واپس جا کر اس نے بہ آواز بلند بادری کو میرے آؤر سے مٹھ لیا اور خود بیچ آواز میں کاؤنٹر والے سے کوئی بات کرنے لگا۔ کاؤنٹر والے نے بھی دور سے ہی دو تین مرتبہ سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ مٹھ تو میرا ڈاکوئیں والا تھا لیکن شخصیت کے اعتبار سے وہ محض صحیح معنوں میں بحر پر ہم کا ڈاکو لگ رہا تھا۔

اس کا قد درمیانہ لیکن جسم گھٹا ہوا تھا۔ سیاہ مٹھی واڑھی سوچیں اور سر کے لیے بے بال تنل سے چڑے ہوئے تھے اور خوب چمک رہے تھے۔ انہیں بہت محنت سے سمجھیں کیا گیا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں کچھ خونخواری سی تھی لیکن اس وقت کا دہار کے اڑے پر وہ گویا اس خونخواری کو دبائے بیٹھا تھا۔ اس کے کندھوں پر اجرک پڑی تھی اور مضبوط نظر آنے والے ہاتھ کی دو تین انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے شبہ گزرا کہ شاید وہی اس اڑے کا مالک جانو تھا تاہم مجھے اس کے بارے میں جاننے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اطمینان سے کھانا کھا لیتا جاؤں پھر چائے پی کر محسن اور دو باغی دور کرنے کے لیے کچھ دیر لیٹا جاؤں۔ جب چار ہائیاں میز پر تھیں تو ان سے کچھ استفادہ کر لی لیتا جاؤں۔ اس کے بعد کچھ اور سوچتا جاؤں گا۔

کھانے کے اختتام میں میں نے اڑے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس

نقشہ اس علاقے کی مناسبت سے ہی بڑی محنت اور باریک بینی سے بنایا گیا تھا۔ اس میں بہت سی چیزوں کے لیے جو نشانیاں مقرر کر دی گئی تھیں، ردِ خیال سے انہیں سمجھ لینے کے بعد مجھے واقعی اس سے بڑی مدد مل رہی تھی۔

میں نے کھوڑا گڈنڈی پر ڈال دیا اور اسے محض دھکی پٹنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس بے چارے کی کچھ زیادہ ہی شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ تو محض ایک "ہارس" تھا، اس کی جگہ کئی ہارس پادری کوئی مشینی سواری بھی ہوتی تو اب تک اس کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔

گڈنڈی کی حالت بتا رہی تھی کہ اس پر کمزور دست رہتی تھی۔ برسات کے دنوں میں اس گڈنڈی پر سے گزرنے والے گھوڑوں اور دیگر مویشیوں کے ٹھوں اور گھوڑوں کے نشانات اب مٹی سخت ہو جانے کے بعد بد نما داغوں کی طرح چمک رہے تھے۔ گڈنڈی نہ جانے کہاں سے شروع ہو رہی تھی اور کہاں جا رہی تھی۔ میں اس کے کسی درمیان میں سے پرہیز نہ کر رہا تھا۔ میں سڑک تلاش کرنے کے بجائے اسی گڈنڈی پر سڑک کرتے ہوئے "عقب سے جانو کے اڑے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ گڈنڈی شیطان کی آنت ثابت ہوئی۔ اس پر سڑک کرتے کرتے دھیر دھیر ٹھٹھکی۔ دن میں اچھی خاصی گرمی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اوپر سے مسلسل دھوپ میں سڑ جا رہی تھی۔ بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ گڈنڈی کے دونوں طرف بھاڑ بھنکا ڈھبھلا ہوا تھا۔ کئی بار میں نے سوچا کہ اس بھاڑ بھنکا ڈے قریب جو کھوڑا بہت سایہ میسر ہے، اس میں بیٹھ کر کچھ دیر سناٹوں اور گھوڑے کو بھی سناٹے کا موقع دوں لیکن نہ جانے کون سا احساس مجھے مسلسل حرکت میں رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کہیں رکنے کو میرا دل نہیں بلان رہا تھا۔

بالآخر وہ گڈنڈی ختم ہو گئی یا یوں کہنے کہ ایک بہت بڑے میدان میں دم نہ ہو گئی۔ اس میدان کے اختتام پر مجھے کچھ ٹیم پتہ کرے سے بہتے نظر آئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں جانو کے اڑے کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ یہ کبرے بڑے بڑے پلڑی شیڈز سے مشابہ تھے۔ دیواریں سرخ اینٹوں کی تھیں جن پر سینٹ یا پسترو وغیرہ نہیں تھا۔

ان کمرؤں کے دواڑے وغیرہ دوسری طرف تھے جدھر سے چھوٹی سی لڑک گزر رہی تھی۔ تاہم سڑک اور ان کمرؤں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اڑے کے آس پاس بہت سے گھنے درخت تھے جن کے نیچے کئی ٹرک آڑے ترتیب سے کھڑے تھے۔ بہت سے درختوں نے کمرؤں پر بھی سایہ کیا ہوا تھا۔ ویرانوں میں اس قسم کے اڑے ایسے ہی لگتے ہیں جیسے صحرا میں ٹھکانے۔ فلک بھر میں آوارہ گردی کرنے والوں اور خصوصاً سڑکوں کے راستے سڑک کرنے والوں کو ایسے اڑے اکثر نظر آتے ہیں۔

اڑے کے سامنے درختوں کے سامنے لمبی چوڑی بھاری



ماصل ہوئی تھیں ان کے مطابق تو یہاں آس پاس کوئی بہتی نہیں تھی اور یہیں یہاں نہ تھی نہیں تھیں۔

حالانکہ اس قسم کے اڈوں پر ہمیں کرکوانے کے لیے بڑی کوششیں کرے جتن ہوتے ہیں۔ اڈوں کے مالکان، بس ڈرائیوروں کو نذرانے پیش کرتے ہیں، مفت ان کی خاطر تواضع کرتے ہیں تاکہ وہاں بس روکنے کو اپنا معمول بنائیں لیکن مدخل خان نے مجھے بتایا تھا کہ جانو کے اڈے کا معاملہ الٹ ہی تھا۔ یہاں بسوں کو روکنے سے منع کیا جاتا تھا۔ اگر کسی مجبور کی وجہ سے کوئی قسمت کی ماری بس روک بھی جاتی تھی تو باہل نگر اس کے مسافروں و دیو کی فرمائش پر ماری کی جاتی تھیں۔ یہ گویا ایک الگ ہی چھوٹی سی دنیا تھی جس کا نظام جانوائی علی رضی سے چلتا تھا۔

سوالات یا شاید دباے اپنی جگہ تھے لیکن جانو کا ڈاڑا ہر حال اس وقت میری حریف تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے کچھ نہ کچھ غمانیت کا احساس ضرور ہوا تھا۔ دیرانے میں زندگی کی علامتیں نظر آتی تھیں۔ فضا میں اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وقت میرے لیے یہ جگہ ایک چھوٹی سی جنت سے کم نہیں تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری آمد کے ساتھ ہی وہاں کی ہنگامہ خیزی کچھ کم ہو گئی تھی۔ آوازیں گویا کچھ دم پر مچی تھیں لیکن میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ کسی دور افتادہ علاقے میں بہت سی اجنبی سی کوئی شکل نظر آئے تو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں میز پر روکے ہوئے چھوٹے سے گھرے سے شیشے کے برے سے گلاس میں پانی اٹھال کر پیتے لگا۔ کورے گھرے کا معمولی ٹھنڈا پانی بھی اس وقت خوب ٹھنڈا لگا۔ دو تین گلاس پلٹ سے اترے تو گویا آنکھوں کی مٹھلاہٹ دور ہو گئی اور زندگی ایک بار پھر کچھ خوبصورت نظر آنے لگی۔

چند لمبے بعد کھانا میرے سامنے آگیا۔ آرڈر لے جانے والا بیڑا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ کھانا لانے والا بیڑا دو سرا تھا۔ میں نیدرلینڈ کی طرح بیٹے ہوئے گوشت اور تندور سے نکلی ہوئی گرم گرم روٹی پر پل پڑا۔

گرم گرم روٹیاں آتی تھیں اور میں ان پر ہاتھ صاف کرنا گیا۔ خاصی دیر کے بعد میں نے ہاتھ روکا اور خود کو سمجھایا کہ اب ایسا بھی کیا عہدہ ہیں۔ زندگی رسی تو آئندہ بھی کھانے کو لے گا۔ کھانے کے بعد میں نے جائے کی میٹک کا آرڈر دیا۔

انہیں والی اس گاڑی کا ڈھکی چائے کی دو سری پیالی سے چشیاں لینے وقت میں بڑے سرور اور بڑی ترنگ میں تھا جب مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہاں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی مگر دوسری لے لے جی چارپائی کو کوخیف سا محسوس تھا جیسے کوئی اس پر کن بیٹھا ہو۔ میں گڑ گڑ دیکھنے میں خاطر خواہ غمی کا مظاہرہ نہیں کر سکا اور اسی لیے ایک ٹھوس سی چیز میری ہڈیوں سے اٹکی۔ مجھے کسی سے

میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے آج تک اس طرح کے جتنے بھی اڈے دیکھے تھے وہ ان سب میں بڑا اور کافی "ترقی یافتہ" تھا۔ یہاں کافی روٹنی تھی۔ میں نے عقب سے اسے دیکھا تھا تو اس کی وسعت اور روٹنی کا اعزاز نہیں ہوا تھا۔

اڈے کے سامنے کافی بڑے رتبے کو ہموار کر کے اس پر چمڑکاؤ کیا گیا تھا۔ غالباً دو زانہ کے چمڑکاؤ کی وجہ سے وہ زمین کافی پختہ ہو چکی تھی۔ ٹرکوں و دیو کی آمد و رفت سے دھل نہیں اڑتی تھی۔ ارد گرد کھڑی کی ہڈیوں اور خادوار آدموں سے ہاتھ بھی بنائی جتی تھی اور اس میں اتنا بڑا دو زانہ چمڑکاؤ کیا تھا کہ ٹرک گزر سکیں۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ پھولدار پودے تک موجود تھے۔ ٹرک وہاں گھڑے بھی تھے اور آمد و رفت بھی جاری تھی مگر موٹل آؤں اور گریس کی سیاہی یا اس طرح کی کوئی اور گند کی پھیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بڑی تھکی اور کچھ "شدھری شدھری" سی جگہ دکھائی دے رہی تھی۔

"معیار" بھی یقیناً اس قسم کے اڈوں سے کافی اونچا تھا۔ کلاڑی کی بے ہنگم میز کرسیاں تو کم ہی تھیں، زیادہ تر لوہے کی صاف جھڑی کرسیاں اور ماربل کے ٹاپ والی میزیں تھیں۔ میدان میں دو پینڈ پب لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ کے ساتھ گھڑوئی پر بہت سے گھڑوں کی قطار تھی۔ چارپائیوں پر لوگوں کی ٹولیاں کھانے پینے کے ساتھ ساتھ نہ صرف کپ شپ میں مشغول تھیں بلکہ ایک چارپائی پر تماش کی بازی بھی چل رہی تھی۔

بڑا سا جو شیڈ ایک طرح سے اصل ریسٹوران تھا، خوب طویل و درمیان تھا۔ اس میں بھی کرسیاں میزیں لگی ہوئی تھیں۔ لفٹ کی بات یہ تھی کہ ایک طرف تو تھیں لی وہی جگہ بھی ہوا تھا جس پر دی سی آر کے ذریعے قلم چل رہی تھی۔ پاس ہی جڑی بوٹی رکھا نظر آ رہا تھا جس سے یہ چیزیں چل رہی تھیں۔ کچھ لوگ دلچسپی سے فلم دیکھ رہے تھے۔ گویا جگہ میں مشکل کا ساں تھا۔

جس شیڈ سے مجھ کا کام لیا جا رہا تھا اس کا بھی بیشتر حصہ باہر سے دکھائی دے رہا تھا۔ چڑیلوں پر دیکھے چڑھے ہوئے تھے تین چار افراد وہاں مصروف تھے۔ دیکھنے سے پہچان کے گھرانے کی ٹن ٹن کے ساتھ ان لوگوں اور بیروں و دیو کی بھانت بھانت کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

وہ شیڈ جو ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر کا کام رہتا تھا اس کی حالت بھی کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ اندر ایک میز کرسی اور لوہے کی بڑی سی الماری نظر آ رہی تھی۔ میز پر ایک ٹھوس ریشٹروں پر چمڑکاؤ کام میں بھی مصروف دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں مجموعی طور پر جتنے لوگ بھی موجود تھے وہ سب کے سب ٹرک ڈرائیور یا کیز تو تھیں ہو سکتے تھے۔ بیشتر ڈرائیور اور کیز تو اپنے ٹکٹے و فیو سے ہی پچانے جا رہے تھے۔ ہائی لوگ نہ جانے کون تھے گلاس سے آئے تھے کیونکہ مدخل خان سے مجھے جو معلومات

بوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیا چیز تھی۔ وہ بلاشبہ گمن کی ٹال تھی۔ میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ میں نے اسے ہونٹوں تک لانے کی کوشش نہیں کی۔

البتہ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ ضرور سوچا کہ میرے پیچھے جو کوئی بھی تھا گرم گرم چائے کی پیالی اس پر کھینچ ماروں۔ ایسے موقعوں پر بلا سوچے سمجھے فوری طور پر کچھ کر گزرتا فائدہ مند بھی ثابت ہو سکتا ہے اور نقصان دہ بھی۔ اگر میرے پیچھے صرف ایک ہی شخص تھا تب بھی گرم گرم چائے منہ پر پڑنے ہی اس سے اضطرابی طور پر ڈیگر دب سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اکیلا نہ ہو۔ اس صورت میں اس سے ڈیگر نہ بھی دیتا تو اس کا ساقی کوئی چلا سکتا تھا۔ انسان تہذیب میں رہے تو فعلی کی گھڑی گزر جاتی ہے۔ میرے لیے بھی فعلی کی گھڑی گزر گئی تھیں میں زیادہ پریشانی یا بچھتاؤں کا شکار نہیں تھا۔ میں دیکھتا تھا ہاتھ تھا کہ میرے عقب میں کون تھا اور وہ کیا چاہتا تھا۔

"ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ۔۔۔ چائے تو پی لو۔" میرے عقب سے گھڑوں اور استہزائیہ لہجے میں کہا گیا۔ "ہو سکتا ہے یہ تمہاری زندگی کی آخری چائے ہو۔"

میں نے گویا اس نادیدہ دوست کے مشورے کو قائل قدر جانے ہوئے پیالی ایک بار پھر منہ سے لگا لی اور نہایت ہی آہستگی سے چمکیاں لینے لگا لیکن میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے دیکھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ انسپکٹر رجم گل خانزادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر حال وہ جو کوئی بھی تھا، میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے مجھ کو یکدم گمن کی زد پر لینے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ البتہ انسپکٹر رجم گل ایسا کرتا تو قائل فہمات تھی۔

اسی دوران ایک شخص میرے عقب سے محوم کر سامنے آیا لیکن اس دوران گمن کی ٹال بدستور میری پیلیوں سے لگی رہی۔ میرے دونوں ہی اندازے درست نکلے تھے۔ میری پیلیوں پر گمن رکھنے والا تھا نہیں تھا اور وہ انسپکٹر رجم گل نہیں تھا کیونکہ دوسرا شخص جو میرے سامنے آیا تھا وہ انسپکٹر رجم گل کا ساقی نہیں ہو سکتا تھا۔

پیچھے والے کو تو میں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن سامنے آنے والے کو بھی نہ ہی دیکھتا تھا چہاں ہوتا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی نسواری قبض شلوار میں تھا اور ایک قد آور شخص تھا۔ سر پر ذرا میٹلی سی پگڑی کس کر بندھی ہوئی تھی لیکن اس کے بال بقیعہ بہت لمبے تھے اور ان کی لٹیں پگڑی کے دائرہ اختیار سے باہر جاری تھیں۔

واؤمیں مونچھیں جھاڑ جھکاڑ کی طرح جھلکی ہوئی تھیں اور پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ واؤمیں مونچھیں شروع کہاں سے ہو رہی تھیں اور ختم کہاں ہو رہی تھیں کیونکہ بالی چرے کی رنگت بھی بالوں ہی کی طرح سیاہ تھی اور ری سہی کسر چمک کے سیاہ داغوں نے پوری

کردی تھی۔ اس چمک زدہ سیاہ چرے پر اس کی سرخ آنکھیں انگڑوں کی طرح دھک رہی تھیں۔

جیسا ہوں کا میری زندگی میں بھی کافی عمل دخل چلا تھا۔ لیکن اس شخص کے ہاتھ میں جدید ترین ساخت کا جو جرم لیڈ کر مشین پھنسل نظر آ رہا تھا اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گن میں نیگی صرف دیکھی ہی تھی، کبھی استعمال نہیں کی تھی اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جنگل بیابان میں مجھے ایک گنوار ہے شخص کے ہاتھ میں وہ جدید اور جنگی گن نظر آئے گی۔

اس نے مشین پھنسل کی ٹال میری پیشانی پر رکھ دی۔ اب ایک نہیں، دو تھیں میرے جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ اس کا دوسرا ہاتھ سیدھا اس جیب کی طرف بڑھا جس میں میرا رولہ اور موجود تھا۔ اس کی مہارت قابلِ وار تھی۔ اس کی نظروں کو اٹھ کرے تھیں۔ اسے چھپی طور پر سلوم ہو گیا تھا کہ ہتھیار کس جیب میں تھا۔ دوسرے ہی لمحے رولہ اور اس کے ہاتھ میں تھا۔ کسی اور جیب میں ہاتھ مارنے کی اس نے زحمت ہی نہیں کی۔

میری جیب سے جو رولہ اور برآمد ہوا تھا وہ جس جڑال کے تھانے سے لے کر بھاگا تھا۔ وہ اعشاریہ چار پانچ کا ایک برانا۔۔۔ بلکہ شاید انگریزوں کے زمانے کا کوٹ تھا۔ اس سیاہ اور شخص نے حکارت سے شخص ایک ہی نظر اس کی طرف دیکھا اور مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ اسے کس دور پیسے دے گا۔ اندازہ نہ کیا ہی تھا جیسے کسی معزز، مسودہ حال اور یک چرے سے شخص نے غلطی سے کباڑی کے ٹیلے سے کوئی بیکاری چیز اٹھالی ہو۔

تاہم اس نے رولہ اور کو پھینکا نہیں۔ گویا رولہ اور کرم اسے اپنی ڈھیلی ڈھالی داسٹک کی جیب میں رکھ لیا اور یوں اس کی عزت بڑھادی لیکن اس شخص کی مونچھوں میں خفیف سی حرکت ہوئی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ طنز سے انداز میں مسکرایا تھا۔ ہونٹ تو اس کے نظری نہیں آ رہے تھے۔

ان کے اس طرح آنے آسانی سے مجھے درج لینے میں ایک تو میری سستی کو دخل تھا، دوسرے وہ اس قسم کی کارروائی میں غیر معمولی طور پر باہر بھی معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا، ظاہری طور پر تو اس کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی زندگی جنگوں، پانڈوں، بیابانوں میں گزری تھی اور وہ درندوں کی جیتر خصوصیات اپنا چکا تھا لیکن عملی طور پر اس نے درندوں کی طرح اپنی جسمانی طاقت پر بھروسہ نہیں کیا تھا۔ عموماً یہی ہوتا تھا کہ جیتر شہری درندوں کی طرح اس کا اٹھنا بھی چھپنا پر ہی زیادہ تھا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" عقب سے گھڑوری آواز آئی اور گمن کی ٹال میری پیلیوں میں زیادہ دھور سے جھونک گئی۔ میں نے کالی سعادت مندی کا سٹاپا ہو کرتے ہوئے ان کی اس ہدایت پر بھی عمل کر ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس حکم کی عمل

ہوں گا؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"مصیبت پہنچنے کے لیے جانے والا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم نے بھی دیکھ لیا ہے کہ تمہاری شکل اس علاقے میں نئی ہے اسی لیے تو ہم ذرا تمہاری اصلیت معلوم کرنے آئے ہیں۔ تم یقیناً کسی خاص مقصد سے ابدھر محروم رہے ہو۔" سیاہ روپلا۔

"یقیناً میں اس علاقے میں نیا ہوں۔" میں نے تسلیم کیا۔  
"اور میرا مقصد بھی خاص ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ میں کچھ دشمنوں سے جان بچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہاں پھر رہا ہوں۔"

"پرانی کمائی ہے؟" پتہ قد لیکن خوشخوار سی صورت والے نے کہا۔

"جھوٹی، نئی کمائی سے بہر حال پرانی، سچی کمائی بہتر ہوتی ہے۔" میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔

سیاہ روپلا گویا میری یہ جرات پسند نہیں آئی کہ میں ان لوگوں کے سامنے مسکراتے کی کوشش کروں۔ وہ بے تابی سے مشین ہنسل کو حرکت دیتے ہوئے اپنے ساتھی سے غائب ہوا۔ "میرا خیال ہے، یہ خفیہ پولیس کا ہی آدمی ہے۔ میں اس کو ٹھٹھا کر دیتا ہوں۔ تم دونوں لاش اور ہنگل میں پیچیدگی آتا۔ کچھ گیدڑوں کا دانہ پانی چل جائے گا۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"خیال تو میرا بھی یہی ہے۔" آجے کی سی رنگت والا سرلاتے ہوئے بولا۔

"میں تو پھر میں اس کو ٹھٹھا کرتا ہوں۔" سیاہ روپلا اور مشین ہنسل سے میرے دل کا نشانہ لیا۔ ایک لمبے کے لیے میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ وہ مجھے ٹھکانے لگانے کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی بے تاب معلوم ہوتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر میرا تعلق خفیہ پولیس سے تھا تب بھی انہیں مجھ پر اتنا برہم ہونے کی کیا ضرورت تھی کہ فوری ٹھکانے لگانے پر تل گئے تھے؟

آجے بھی رنگت والا ان میں زیادہ اہم آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ نہایت پیچیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس میں خوشخواری بھی کم تھی۔ وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے خود ڈاؤن فور کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پہلے تو سیاہ روپلا کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی لیکن جب سیاہ روپلا نے گمن سیدھی کر لی تو وہ گویا سوچ میں پڑ گیا۔

"غصہ؟" اس نے سیاہ روپلا کی گمن پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ نیچے کی طرف کر دیا۔ تاہم خوشخوار شکل والا بدستور اسٹین گن مجھ پر تائے کھڑا تھا۔

آجے جیسی رنگت والا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گویا میرے خیالات چرمنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "خفیہ پولیس والے اتنا سوچ بولنے اور یہاں تک آنے کی زحمت کہاں کرتے ہیں؟ اور اگر کریں بھی تو اکیلے اکیلے نہیں پھرتے۔ اس کے علاوہ خفیہ پولیس والے اتنے خفیہ بھی نہیں ہوتے۔ وہ اگر کسی مہم پر نکلے ہیں تو ہفتے پہلے ہمیں خبر مل جاتی

مجھے سنائی پڑی۔ گمن کی نال صرف ایک لمبے کے لیے میری ہیلیوں سی جلی اور اسی ایک لمبے میں کسی نے عقب سے میرے بازو آہنی گرفت میں لیتے ہوئے میرے ہاتھوں میں کوئی پھندا سا ڈال دیا۔ میرے ہاتھ گویا پلک جھپکتے میں میری پشت پر باندھے جا چکے تھے۔ ایک لمبے کے لیے میرا دل ڈوب گیا۔ یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا لیکن پھر میں نے دل ہی دل میں خود ہی اپنی زحار سے بندھ جالی۔ گمن فوراً ہی دوبارہ میری ہیلیوں پر آگئی تھی لیکن میرے سامنے کھڑے ہوئے سیاہ روپلا نے اپنے ساتھیوں کو مقامی زبان میں ہدایت کی کہ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی اب انہیں سامنے آنا چاہیے تھا۔

میری ہیلیوں سے گمن کی نال ہٹ گئی اور میرے عقب سے دو افراد سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ اسی گمن کی نال اب تک میری ہیلیوں پر لگی ہوئی تھی۔ جس شخص کے ہاتھ میں وہ گمن تھی وہ پتہ قد تھا اور اس کی جسامت بھی کوئی خاص نہیں تھی لیکن سناکی میں وہ بھی اپنے شب و دجور قسم کے ساتھی سے کم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک عجیب قسم کی خوشخواری ٹپک رہی تھی جیسے وہ دنیا کی ہر جگہوں سے خستہ غامض ہو اور رواں آنے والی ہر چیز کے ٹکڑے کر دیتا چاہتا ہو۔ مختصر الوجود ہونے کے باوجود وہ ایک خطرناک شخص معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی قاتر خطرات کی غالباً اسلحہ کی مرہون منت تھی۔ اس کی رنگت گوکہ گندمی سی تھی لیکن اپنے سیاہ روپلا کے مقابلے میں تو اسے گورا ہی کہا جاسکتا تھا۔ اس کی صرف موچیں تھیں، واڑھی صاف تھی۔

تیسرا ساتھی نیلے سے رنگ کی شلوار قمیض میں تھا۔ وہ بھی سیاہ قامت تھا لیکن سمجھے ہوئے جسم کا تھا۔ خصوصاً اس کے کندھے اس کی جسامت کے مقابلے میں بہت چوڑے تھے۔ اس کے کندھے پر کھڑکھوکھ تھی۔ میرے ہاتھوں میں پھرتی سے پھندا ڈالنے کا کام غالباً اسی نے انجام دیا تھا۔ وہ گورا چٹا تھا لیکن شاید دھوپ میں زیادہ وقت گزرنے کی وجہ سے اس کی رنگت آجے جیسی ہو گئی تھی۔ بال بھروسے بھروسے سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی مختصری واڑھی سوچھے تھی۔

"کون ہو تم؟" شب و دجور نے گویا حقیقت کا انکشاف کیا۔ عجیب کہہ کر تائی ہوئی سی آواز تھی اس کی۔ گویا کسی بددلت کے طلق سے برآمد ہو رہی ہو۔

"ایک مصیبت کا مارا۔۔۔" میں نے جواب دیا۔  
"مجھے تو تم خود مصیبت لگتے ہو۔ شاید ہمارے لیے مصیبت بن کر آئے ہو۔" وہ مقامی زبان ہی بول رہا تھا لیکن لہجہ نہایت گھڑوا اور اکڑا اکڑا تھا۔ میں بھی اسی زبان میں جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔  
"میں گھسیں جانتا ہی نہیں اس تمہارے لیے مصیبت کیوں

ہے۔ اس کے علاوہ خفیہ پولیس کے آدمی کو تو ایسے ٹکے ملے ہوتے  
چاہیے تھا کہ کسی کی نظر اس کی طرف نہ اٹھتی لیکن یہ قوس میل  
دور سے نظر آنے والے ٹکے میں آیا ہے۔“

وہ کافی حد تک دلیل پسند آدمی معلوم ہوتا تھا۔ دلیل دے بھی  
سکتا تھا، دلیل سن بھی سکتا تھا اور یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث  
تھی کیونکہ اب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ لوگ کون  
ہو سکتے تھے اور اس طبقے میں دلیل کا گزردہ آدمی ہوتا ہے۔ حیرت  
کی بات تھی کہ میرے ٹکے کی وجہ سے انہوں نے مجھے اپنے طبقے کا  
آدمی نہیں سمجھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا تعلق مشرقی  
نہیں بلکہ کافی حد تک مشرقی ڈاکوؤں والا تھا۔

سیاہہ رو ہوا۔ ”ہو سکتا ہے اسے بہرو بننے کا شوق ہو اس لیے  
دماغ میں کوئی اسکیم لے کر پیدل چلا آیا ہو۔“ اس نے ایک بار پھر  
مشین ہائل سیدھا کیا۔ ”بات کچھ بھی ہو“ ہمیں بحث کی کیا  
ضرورت ہے۔ آدمی ہے تو ٹھیکوٹا، بس اتنا ہی کافی ہے۔ اس کو  
لفٹا کر دو اور ٹھکانے لگاؤ۔“

وہ مجھے دھمکانے کے لیے ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا۔ وہ حقیقتاً  
بندوق سے انسان کو لفٹا کرنے کا بہت شوقین معلوم ہوتا تھا۔  
اس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے لکھی  
ہوئی گمانیاں چمکی جا سکتی تھیں۔

تاجپے کی حرکت والے نے ایک بار پھر اس کے بے تاب  
ارادوں پر بند باندھ دیا۔ ”میں اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔  
ایک بار پھر اس سے پوچھ لیتے ہیں۔“

وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کیوں جرات اچ بولنے کا ارادہ  
ہے یا نہیں؟“

”مسٹر اچ بولنے کا نہیں، مسئلہ تم دونوں کو یقین دلانے کا  
ہے۔“ میں نے اپنی مسامتہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے  
کہا۔

میں سوچ رہا تھا، ”انہیں بتا دوں کہ میں جانو سے ملنے آیا ہوں  
لیکن اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہ جانو کے دشمن یا مخالفین وغیرہ نہ  
ہوں اور مجھے اس کا ہر دیا سامھی سمجھ کر لفٹا نہ کریں۔“ اس قسم  
کے لوگوں کا۔۔۔ اور خود جانو جیسے انسانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں  
کسی سے بھی ملا نہیں تھا کسی کو جانتا نہیں تھا۔ میں میاں کے  
معاملات کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔

تاجپے کی سی حرکت والا خطاط مجھے میں ہوا۔ ”اچھا۔۔۔ چلو یہ  
بتا دو کہ یہ لباس اور گھوڑا تمہارا اپنا ہی ہے یا کسی کو ٹھکانے لگا کر  
مائل کیا ہے؟“

اس سوال پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ  
روہیل خان کو جانتے تھے اور اس خوالے سے بھی انہیں مجھ پر  
شک ہو رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب خود ادا بہت مشکل ہی جانا  
چاہیے تھا اور اس کے بعد ان کا مقرر محل دیکھنا چاہیے تھا۔

میں نے دھمکے لہجے میں کہا۔ ”یہ لباس اور گھوڑا میں نے کسی کو  
ہلا کر کے نہیں“ اسے زندہ رکھنے کے لیے حاصل کیا ہے۔ اگر  
میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت تک وہ موت کے راستے پر روانہ ہو چکا  
ہوتا۔ اسی نے مجھے تاکید کی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو میں جانو  
سے مل لوں۔ اسی لیے میں اس طرف آیا ہوں۔ یہ جانو ہی کا ادا  
ہے نا؟“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے میری  
آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کس نے تاکید کی تھی؟ نام کیا  
تھا اس کا؟“

”یہ میں صرف جانو کو ہی بتا سکتا ہوں۔“ میں نے احتمالی نری  
سے کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میری بے خفیہ بھی ان کی دشمنی  
ان پر خراشیں ڈال رہی تھی۔ جن کی فطرت میں کرتلی اور سفاکی  
ہوتی ہے اور جو ہتھیاروں کے زور پر خود کو عطا کرنے کا بادشاہ سمجھتے  
پھرتے ہیں، ان کے سامنے اگر بے خفیہ سے بات کی جائے تو اس  
سے بھی ان کی بھڑی ہوتی انجموت ہوتی ہے۔ اسی لیے میں اپنے  
لہجے میں حتی الامکان نری۔۔۔ بلکہ کسی حد تک عاجزی برقرار رکھنے  
کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا جواب سن کر ان کے چہرے کی کرتلی اور خود غواہی میں  
اضافہ نہیں ہوا۔ اس سے مجھے کم از کم یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وہ جانو  
کے مخالفین میں سے نہیں تھے۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد سیاح  
رو کا مشین ہائل میری پیشانی سے اور پستہ قد کی اسٹین گن میری  
پایلوں سے ہٹ گئی۔

انہوں نے صرف ایک لمحے کے لیے آنکھوں ہی آنکھوں میں  
مشوہ کیا پھر تاجپے کی سی حرکت والا ہوا۔ ”ٹھیک ہے، ہم تمہیں  
جانو کے پاس ملے چلتے ہیں۔ تمہارے بارے میں فیصلہ دے کرے  
گا۔“

اس کے لہجے سے تصدیق ہو رہی تھی کہ ان تینوں میں زیادہ  
برا اختیار وہی تھا۔ سیاح رو غالباً اشارہ پا کر صرف مار دیا کرتے والا  
آدمی تھا۔ اس کی بالائی منزل تقریباً خالی ہی معلوم ہوتی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس ساری کارروائی کے دوران کسی نے  
ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی  
تھا تو اس طرح لا متعلق سے دیکھا تھا جیسے اس کے لیے ان باتوں کی  
کوئی اہمیت نہیں تھی یا پھر گریبا اس کے سامنے کچھ ہو ہی نہیں رہا  
تھا۔ کوئی ذرا بھی چونکا نہیں تھا۔ اگر کوئی ناش کیل رہا تھا تو ایک  
نظر مجھ پر ڈال کر دوبارہ پتوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اگر کوئی نہیں  
والا چائے کھا نا لانے لے جانے میں مصروف تھا تو یہ سب کچھ دیکھ  
کریں اپنے کام میں مصروف رہا تھا جیسے یہ روز نظر آنے والا کوئی  
مقرر تھا۔

میں نے مزید بات لہجے میں کہا، ”میں کوئی سوال کرنے کی پوزیشن  
میں تو نہیں ہوں لیکن اگر برا محسوس نہ کرو تو بتا دو کہ تم لوگ کون

تھی۔ تیرہ کرخت صورت اور خطرناک نظر آنے والے افراد بڑے اطمینان سے ایک شخص کے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے اٹھا کر لے جا رہے تھے اور وہ اسی طرح اطمینان سے کھانے پینے اور خوش گپیں میں مصروف تھے۔ انہوں نے صرف کن انکھیں دیکھنے پر انکشاف کیا تھا۔

یہ میرے لیے نیا تجربہ نہیں تھا۔ اس مسئلے پر بھی میں بار بار گڑھ چکا تھا کہ لوگوں نے اپنی اجتماعی کت کی طاقت کھودی تھی۔ شخص دو چار اسلحہ بردار بہت بڑے جہوم کے سامنے جو چاہتے تھے، کر گزرتے تھے۔ جہوم ایک بہت بڑی طاقت ہوتا ہے لیکن جہوم اپنی طاقت سے بے خبر یہ تمنا دیکھتا رہتا تھا۔ اس وقت تو اڑے ہر لوگ موجود تھے ان کے بارے میں مجھے دیے بھی نہیں تھے تھا کہ عام شریف اور بے ضرر سے شری یا رہمائی تھے۔ وہ خود بھی مجھے مشکوک سے ہی لگ رہے تھے۔

اڑے کے عقب میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ آدم گھاس کے قریب ان کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ چہرہ قدم کے فاصلے پر ایک جوڑ میں مینڈک رہا تھا۔ ادرادھر ادرادھر چلا نکلیں لگا رہے تھے۔ گھوڑے گھاس پر منہ مارنے کے بجائے دلچسپی آمیز نظروں سے مینڈکوں کو دیکھ رہے تھے۔

ان تینوں نے سارا دے کر مجھے میرے گھوڑے پر بٹھایا۔ سیاہ روئے اس کی نگاہ اپنی زمین سے باندھ لی اور آگے آگے چل دیا۔ اس کے دونوں سامنے میرے دائیں بائیں گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں جس میدان سے گزر رہا تھا، ہم اسی میں چل رہے تھے لیکن سمت تبدیل ہو چکی تھی۔ ہم اس پگڈنڈی کی طرف نہیں جا رہے تھے جس سے میں آیا تھا۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ اسی دیرانے میں طے کرنے کے بعد انہوں نے گھوڑے روک لیے۔ سیاہ روئے خوشخوار پرست قد کی طرف ایک سیاہ کپڑا اچھالا جو ابھی تک اس نے اپنی کر کے گرد باندھا ہوا تھا۔

آئیے کی سی رنگت والے نے گویا وضاحت کی۔ ”یہاں سے آگے ہم نہیں آ سکتے۔ انکھوں پر کپڑا باندھ کر لے جائیں گے۔“ میں کوئی احتجاج کرنے کی کوشش نہیں کیا۔ خوشخوار پرست قد نے وہ کپڑا کس کر میری آنکھوں پر باندھ دیا اور سڑا یک بار پھر شروع ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب انہوں نے جلدی جلدی دائیں بائیں گھومتا شروع کر دیا تھا۔ معلوم نہیں مجھے دھوکے میں رکھنے کے لیے خواہ مخواہ ادرادھر ادرادھر گھومنے یا غاردار جھانڑوں سے بچنے کے لیے۔ ورنہ وہاں کوئی سڑک یا پگڈنڈی تو تھی نہیں جس پر وہ ادرادھر ادرادھر گھوم رہے تھے۔ بہر حال میں ہر نوز اور فاصلے کا اندازہ لگا کر اسے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہم جانو ہی کے آوی ہیں۔“ مانے کی سی رنگت والے کے لیے میں اب نری اپنی تھی لیکن سیاہ رو ابھی تک کسی باراض بن مانس کی طرح میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اپنے دل پسند کام سے باز رہنے کا فکوس تھا۔

تو پھر مجھے اس طرح رتی سے جانوروں کی طرح باندھ کر لے جانا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ کیا جانو کے آوی پیشہ جانو کے مہاتوں کو اسی طرح اس کے سامنے لے جاتے ہیں؟ میں نے موقع ذرا مناسب پاتے ہی دوستانہ لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

”زیادہ خوش فہمی میں چلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ زیادہ خوشخوار پرست قد بول اٹھا۔ ”یہ فیصلہ جانو خود کرتا ہے کہ کون اس کا مہمان ہے اور کون نہیں۔ بعض لوگ بھی سمجھ کر منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں کہ وہ جانو کے مہمان ہیں لیکن انہیں کسی دایں جانا نصیب نہیں ہوتا۔“

”مہمان تو وہ بھی ہوتے تھے۔ پیشہ کے مہمان۔“ میں نے بے خوفی کے اظہار کے لیے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سیاہ روئے اپنا مشین پائل نیچے میں اڑس لیا۔ خوشخوار پرست قد نے اپنی اسٹین گن کندھے پر لٹکالی۔ اب وہ میری طرف سے قدرے مطمئن ہو چکے تھے۔ مانے کی سی رنگت والے نے بے آواز بلند کاؤنٹر پر کھڑے شخص سے پوچھا۔ ”گھوسہ! جانو کہاں ہے؟“

”ذمیرے پر۔“ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے سپاٹ لیے میں جواب دیا اور ایک دیر سے سے پیسے لینے لگا۔

ان تینوں نے ایک بار پھر مشورہ طلب ہی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مانے کی رنگت والا بولا۔ ”چلو اسے ڈرے پر ہی چلے ہیں۔“

جہاں ہم کھڑے تھے وہ جانو کا اڈا تھا۔ جانو کا ڈیرہ انہیں اور تھا۔ اڑے اور ڈیرے میں کیا فرق تھا؟ فی الحال میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

سیاہ روئے ہم دلی سے سہرا کر تادیبی ظاہر کی۔ وہ اس قسم کی ذمت اٹھانے کے تصور سے خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا گھوڑا کچھ دور ایک نیچے سے درخت کی شاخ سے بندھا کر تشویش نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہ رو کو گویا جتنی طور پر یہ بھی معلوم تھا کہ وہ میرا ہی گھوڑا تھا۔ اس نے سیدھا اس کے قریب جا کر اس کی بائیں درخت کی شاخ سے کھول لیں اور اسے قریب لے آیا۔ گھوڑا بڑی سعادت مندی سے اٹھیا۔ مجھے ان بد بختوں کے سامنے اس کی یہ سعادت مندی اچھی نہیں لگی۔

وہ تینوں مجھے اور میرے گھوڑے کو زرنے میں لیے اسی طرف چل سیدھے جدھر سے میں آیا تھا۔ اڑے پر بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کے چہرے پر اب بھی تشویش یا الجھن کی کوئی نشانی نظر نہیں آ رہی

ہیں کافی دیر سفر کرنا پڑا جبکہ اس دوران انھوں نے رفتار بھی  
تیز کر لی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ جانو کا ڈیرا وہاں سے اتنی دور  
ہوگا۔

خدا نفع کر کے وہ ایک جگہ رکے پھر انھوں نے میری آنکھوں  
سے کپڑا کھول دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ ہم ایک  
کھیتے جنگل میں کھڑے تھے لیکن سامنے ہی زمین کا ایک طویل و  
عریض ٹکڑا ایسا تھا جس پر سے غالباً درخت کاٹ دیے گئے تھے یا  
قدرتی طور پر ہی وہ جگہ خالی تھی۔ اس مستطیل قطعہ زمین پر چوٹی  
تینوں سے ہٹ کی سی ساخت کا ایک بہت بڑا اور بے حد مضبوط ٹھہر  
آنے والا مکان تیار کیا گیا تھا۔ ہم اس مکان کے دروازے پر  
کھڑے تھے اور دروازہ بند تھا۔

سیاہ رو اب بھی خفگی آمیزی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا  
تھا اور اس کے دونوں سامھی گویا سوچ رہے تھے کہ دروازے پر  
دستک دی جائے یا نہیں۔ سیاہ رو ٹھوکرسی سے آنے کی سی رنگت  
والے سے مخاطب ہوا۔ ”تمہیں ابھی اس کی آنکھوں سے کپڑا  
نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ اندر جا کر کھولنا چاہیے تھا۔“  
”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ”آجائے کی سی رنگت والے  
نے بے پروائی سے جواب دیا اور آگے بڑھ کر دروازے پر دستک  
دی۔ یہ غلام دستک دینے کا مخصوص انداز تھا۔

چند لمحوں بعد دروازہ ہلکی سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ کھلا لیکن اس  
سے کسی انسانی چہرے کے بجائے گھن کی ٹال نے باہر بھانکا۔  
دھیرے دھیرے پوری اسٹین گھن باہر آئی اور پھر اسے تھامنے والا  
فحص برآمد ہوا۔ وہ کسی ڈرم سے مشابہ تھا جسے ہاتھ پاؤں اور  
کھوپڑی لگا دی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی تھیں  
اور ان میں حد سے زیادہ وحشت تھی۔ وہ آنکھیں انسان کی نہیں  
کسی اور ہی مخلوق کی معلوم ہوتی تھیں۔

ان تینوں کو تو اس نے نہایت سرسری نظروں سے دیکھا لیکن  
میرا بغور جائزہ لیا اور غالباً میرے ہاتھ بندھے ہوئے دیکھ کر اس نے  
گھن پر اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر لی اور اسے زمین کی طرف جھکا لیا۔  
پھر اس نے سوالیہ نظروں سے آنے کی سی رنگت والے کی طرف  
دیکھتے ہوئے پوچھا ”کون ہے یہ بیل؟“

اب مجھے معلوم ہوا کہ آنے کی سی رنگت والے کا نام بیل  
تھا۔ بیل ذرا بے پروائی سے متنباتے ہوئے بولا۔ ”ہم کو خبر ملی  
تھی کہ ایک مشکوک آدمی علاقے میں آیا ہے۔“ اس کو جا کر پڑا۔ یہ  
بولتا ہے میں جانو کا مسمان ہوں۔“

”نام کیا ہے تمہارا؟“ ڈرم نے اسے میری طرف دیکھا۔ اس کی  
آواز بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے ایک ڈرم میں بہت سے چہروں کی  
بلاتے جارہے ہوں۔

”افضل خان۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں روئیل خان کا  
دوست اور پارٹنر ہوں۔“

ڈرم نما فحش اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ دروازہ بند کر گیا  
تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس نے مجھے گرفتار کر کے لائے والی  
کے لیے بھی دروازہ نہیں کھولا تھا۔ پہلے اندر اجازت لینے گیا تھا۔  
اس سے ڈچلن کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوا  
تھا کہ ڈچلن اب صرف مختلف قسم کی بائیاں میں ہی بالی ہو گیا تھا۔  
جلدی ہی دروازہ دوبارہ کھل گیا اور ڈرم نما فحش برآمد ہوا۔  
اس نے اسٹین گھن سے اشارہ کیا۔ پستہ قد اور سیاہ رو نے مجھے  
سارے کے گھوڑے سے اُتارا اور چاروں گھوڑے قریبی درختوں  
سے پائندہ دیے۔ پھر وہ مجھے گھیرے میں لیے اس لیے چوڑے چوٹی  
مکان میں داخل ہوئے اندر پہنچے ہی مجھے اس مکان کی مضبوطی کا  
اندازہ ہوا۔ اس کی تعمیر میں جابجا موٹے موٹے شہیر استعمال کیے  
گئے تھے اور وہ پائیداری میں سینٹ اور سرے سے بے ہوش  
مکانوں سے کم معلوم نہیں ہوا تھا۔

بائیں طرف ایک اور دروازے سے گزر کر ہم ایک چھوٹے  
سے کمرے میں پہنچے جہاں بہتر قسم کا فرنیچر چھایا ہوا تھا لیکن اس  
کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یہ انتظار گاہ یا ڈرائنگ روم معلوم ہوا  
تھا۔ یہاں بھی بتی جتلیاں روشن تھیں اور کھس دور سے ٹالی دیئے  
والی خفیف سی گھبراہٹ پتلا رہی تھی کہ یہ بھی جزیرہ کا کمال تھا۔  
اس کمرے سے گزر کر ہم ایک طویل و عریض ہال میں داخل  
ہوئے جہاں اتنا دیوار تالین بچھا ہوا تھا کہ میرے جوتے اس میں  
دھسنے لگے۔ اس کی غصات دیکھتے ہوئے بے اختیار میرا پیچھا  
جوتے اُتار دوں لیکن میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور کسی  
میرے مٹی میں لٹھرتے ہوئے جوتوں کی طرف توجہ بھی نہیں دے  
سکتی۔

دو دروازوں کے ساتھ نہایت نفیس قسم کے اور مٹھلیں پوش  
والے سوئے بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کے آگے تالین پر چھوٹے  
موٹے گاؤں کیے پڑے تھے اور ہال میں جو آٹھ دس افراد موجود  
دوانی گاؤں کیوں سے ٹپک لگے بیٹھے تھے۔

اس کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا مگر جتنا بھی تھا اس نے  
دولت کی چکا چوند عیاں تھی۔ چاروں کونوں میں آرائشی لائٹیں  
نصب تھیں جن کی دسٹ میں چھوٹا سا ایک فانوس بھی لٹکا ہوا تھا۔  
دو دروازوں پر خوبصورت کھنڈیوں پر جدید ساخت کی اسٹین تھیں  
جی سیون ”ایم بی“ کی اور کھنڈیوں میں لٹکی ہوئی تھیں۔

خوبصورت پائش شدہ دیوار پر ان سیاہ گھنوں کی موجودگی  
سوت کی بد صورتی نمایاں ہو گئی تھی اور کراچوٹا سونا اسلٹو خانہ  
آ رہا تھا۔ کمرے میں جو آٹھ دس افراد موجود تھے وہ سب دائرے  
صورت میں بیٹھے تھے۔ دسٹ میں دس چڑخوٹاں پر دلائی ہوئی  
بوٹھیں کھلی رکھی تھیں۔ گھاس تھے، بھن ہوئی مرغیاں تھیں  
ڈوگے میں برف تک نظر آرہی تھی جو میرے خیال میں اس علاقہ  
میں پایید تھی۔ فضا محسوس ہی دور چل رہا تھا۔

ساحرائے قوت جی اور سانپ کی طرح وہ شاید بک بھی نہیں جھپکا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس نے ایک بک میری طرف دیکھا اور میرے جسم میں بکلی سی پھیری دوڑ گئی۔

”بکلی نام نہیں سنا تھا۔ اور نہ ہی بکلی روخیل خان نے ذکر کیا کہ اس کا ہمارے علاوہ بھی کوئی قریبی دوست اور بارگزر موجود ہے۔“ وہ بھاری اور گونجی آواز میں بولا۔ اس کا چہرہ ہر اثر سے عاری رہا۔

”میں روخیل کے پاس کم ہی رہتا ہوں۔ چند دن پہلے ہی آیا ہوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”وہ گھوڑے سمیت گر گیا ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ صورت حال ایسی تھی کہ میں اس کے پاس نہیں ٹھہر سکتا تھا۔“

میں ابھی انہیں پوری بات بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہیں خود کہاں تک معلومات حاصل تھیں اور روخیل خان کے ان سے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ میرا ان سے کہاں تک بات کرنا مناسب تھا اور کہاں سے خطرے کی حدود شروع ہوتی تھیں۔ ان معاملات پر روخیل خان سے تفصیل سے بات کرنے کی سہولت نہیں ملی تھی اور وہ خود بھی کچھ زیادہ نہیں گھٹا تھا۔ شاید بعض معاملات میں اس نے مجھے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت اس کی جسمانی اور ذہنی حالت بھی اس قابل نہیں تھی کہ وہ ہر بات مجھے تفصیل سے سمجھا سکے۔ اس نے جتنی باتیں کہی تھیں وہی نسبت تھیں۔ اس کی جگہ اگر کوئی عام سا آدمی ہوتا تو اس حالت میں سوائے ہائے کرنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو پھر بھی جسمانی اور اعصابی طور پر مضبوط انسان تھا کہ کافی مہرہ سکون سے ہمتی باتیں کر سکتا تھا اور ہائے ڈھائی بالکل نہیں کی تھی۔

جانو نے روخیل خان کی ٹانگ ٹوٹنے کی اطلاع سن کر بھوکوں کو صرف خفیف سی حرکت دینے پر اکتفا کیا۔ اس نے نہ تو کوئی تبصرہ کیا اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ باقی لوگ اس طرح بے پروائی سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے گھر کے نوکر کسی موٹی کو تھان پر باندھنے کے لیے لائے ہوں۔ ذمہ نما شخص اسٹین مگن ہاتھ میں لیے ہال کے دروازے پر ہٹا کھڑا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد جانو نے پیرل کو مخاطب کیا۔ ”اس کے ہاتھ کھول دو۔ تم نے سنا نہیں یہ روخیل کا دوست اور پارنٹر ہے۔“

پیرل نے خاموشی سے اس کے حکم کی قیبل کی۔ جانو نے سیاہ رو کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا تم نے اس کے ساتھ کوئی خفیہ تو نہیں کی؟ تم اس معاملے میں بہت جلد باز ہو۔“

اب مجھے معلوم ہوا کہ سیاہ رو کا نام فیسر تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ سائیں اپیل نے مجھے روک دیا تھا۔“

”پیرل نے اچھا کیا۔ پیرل عقل والا ہے۔“ جانو نے سر کو

ان کی جسامت، شکل صورت اور رنگت ایک دوسرے سے مختلف تھی مگر کوئی واضح سی چیز تھی جو انہیں ایک جماعت، ایک گروہ، ایک ٹولے کے لوگ ظاہر کرتی تھی۔ کوئی غیر ملکی ڈوری تھی جو ان سب مشکوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھی۔ ان سب کی حرکات و سکنات میں ایک عجیب شائستگی، قسم کی خود اعتمادی تھی۔

میں ان لوگوں کو ”اس ٹھکانے کو دیکھ کر دم بخود تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے جنگوں میں کوئی اس ٹھکانے سے رہنا ہو گا۔ درختوں میں چھپے اس خوبصورت مکان میں جدید اسلحہ، مہکونوں کی طرح سجا ہوا تھا۔ یہ سب درحقیقت کیا تھا؟ کیا یہ سب لوگ واقعی صرف ڈاکو تھے؟ ان کی جڑیں کہاں تھیں؟ شاید دنیا انہی سادہ نہیں رہی تھی جتنی میں سمجھتا آیا تھا۔ یا پھر شاید مجھ پر ہر قدر ہر ایک دنیا کا مختلف ہو رہی تھی۔

کیا جانو بھی کوئی ڈاکوؤں کا سردار، قسم کی چیز تھا؟ اس کا وہ باؤنڈ اڈہ جہاں سے میں آ رہا تھا، کیا وہ محض دکھاوے کی چیز تھی، ایک آڑھی؟ شاید اس سے بھی بہت سے مقاصد حاصل ہوتے تھے۔ جس طرح روخیل خان نے چھوٹی موٹی زمینداری کی آڑ لے رکھی تھی۔ یہ سب چیزیں بہت سی کثیر المقاصد قسم کی تھیں۔

وقت، زمانے اور شاید کچھ نامعلوم افراد نے ڈاکوؤں کو بھی نہ جانے کیا کچھ سکھا دیا تھا۔ ترقی تو ساری دنیا ہی کر رہی تھی لیکن برائی کچھ زیادہ ہی ترقی کر رہی تھی، زیادہ جت پڑ رہی تھی۔ میرے ذہن میں ڈاکوؤں کے بارے میں ابھی تک جو تصورات تھے وہ اس وقت خاصے فرسودہ محسوس ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا، جنگوں یا بابائوں میں رہنے والے ڈاکو غامض اور کچھ انہوں میں بہاد گزریں ہوتے ہوں گے، بڑی کٹھن زندگی گزارتے ہوں گے۔

ایک شخص کی طرف میری توجہ غیر ارادی طور پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ میرے خیال میں وہی جانو تھا۔ وہ سب سے الگ تھلک، میرے مجلس نظر آ رہا تھا۔ اس کا لباس سب سے نفیس اور قیمتی تھا۔ اس کی پکڑی میں کلف لگا ہوا تھا۔ واڈھی میں شاید کنگھی کر کے بال سیٹ کرنے والا جل لگا گیا تھا۔ واڈھی نمائندگی، مستوری ہوئی اور لٹلش کرتی نظر آ رہی تھی۔

اس کی موچیں پچھو کی دم کی طرح اوپر کھڑی ہوئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اتنی موٹی دم کسی انسانی صحت مند پچھو کی بھی نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اتنا سونا تو کوئی پچھو خود بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ عام سی شکل صورت کا ایک ساڈلا سا سبز قامت شخص تھا لیکن اپنے رکھ رکھاؤ سے ایک طاقتور آدمی نظر آ رہا تھا۔ میری گھراؤ اس طاقت سے نہیں جو جسموں میں ہوتی ہے۔ اس کے پاس نامعلوم اختیارات کی کوئی بے عنوان قوت تھی۔

اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ حالانکہ وہ آنکھیں بہت چھوٹی اور بنوں کی طرح کچھ گول گول سی تھیں لیکن ان میں سانپ کی آنکھوں جیسی کوئی پراسرار

”ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے، بعد میں بات کر لیں گے پہلے تم منہ میٹھا کرو۔“ وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے گردن گھما کر پکارا۔ ”سوئی!“

ہال کا دو سرا دروازہ جو اندر کی طرف کھلتا تھا، اس وقت بند تھا۔ ایک لمبے بعد اس کے عقب میں سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ میرا خیال تھا کہ اس دروازے پر جو عورت نمودار ہوگی وہ انہی دو عینوں سے ملتی جلتی کوئی ”سر معاذ منہ بھار“ قسم کی چیز ہوگی لیکن جب دروازہ ایک جھلکے سے کھلا تو ایک ٹائیپ کے لمبے لمبی آنکھوں میں برق سی لہرائی۔

بات یہ نہیں تھی کہ وہ عورت بہت حسین تھی اور اس کی آنکھوں سے چاند زکین پر اتر آیا تھا۔ وہ سانولی سی ایک ایسی عورت تھی جسے محض مجھ کو خوش شکل کہا جاسکتا تھا لیکن کچھ چیزوں نے اسے شل جوال بنا دیا تھا۔ اپنے ایک ایک پر کہیں اس کا اختیار اور کہیں بے اختیاری، اس کے خدو خال کا عجیب، اس کا ہنستاؤ، یہ سب کچھ حشر خرچ تھا۔ شکل صورت کچھ ایسی قیامت نہیں تھی۔

اس چھوٹی سی دنیا میں یوں تو ہر لمبے ایسے متاعِ سامنے آتے تھے جو بظاہر معمولی لیکن درحقیقت چونکائے والے تھے مگر اس کی حیرت نے رگ دوپے میں سنسنی بھی دوڑادی تھی۔ میری حیرت کا ایک وجہ یہ تھی کہ وہ عورت جدید ترین تراش تراش کا ایک سرا، بھر پور اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔

اس کے بال بھورے، تراشیدہ اور انتہائی نرم تھے۔ اس کے سر کی ہر جھلک کے ساتھ ایک روٹھی آہٹاری طرح اوجھرتے اوجھرتے لہرا رہے تھے۔ یہاں میں اون کی ایڑی کے سرخ سینڈل تھے لیکن جو اس عورت میں ہر قدم کے ساتھ دو سروں کے دلوں کو اصل چٹکل کرنے کی صلاحیت تھی، وہ ان سینڈلوں کی مروہ بنی ہوتی تھی۔ وہ قوت اس کے خدو خال، اس کے شیب و فراز میں، کچھ یہاں کچھ وہاں پوشیدہ تھی۔ میں یہاں اس جنگل میں اس لمبے کی عورت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی مٹھوہ کہ وہ ایک لمبے سے ہولڈر میں سکرٹ لگائے قطعی ظہر، انداز میں لمبے لمبے لے رہی تھی۔

میں چونکہ دروازے کی سیدھ میں بیٹھا تھا شاید اس لیے اس کی نظرب سے پہلے بچھ رہی۔ اس نے کمری نظرب سے میرا سرا پکارنا لیا پھر جانو کی طرف دیکھ کر قدم بے غریبے سے لمبے میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”سمان آیا ہے۔“ جانو نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”کھانے پینے کو پاں نہیں کرتا۔ کم سے کم اس کا منہ میٹھا کرانے کے لیے ہی کچھ لے آؤ۔“

جانو اس عورت سے ملاحت سے بات کرنے کا عادی سلیم ہونا تھا۔ نہ جانے وہ اس کی بیوی تھی یا بیوی نہ۔ وہ کبھی جواب دینے بغیر کھٹ کھٹ کرتی دواں چلی گئی۔ دروازہ وہ ایک جھلکے

خفیف سی حرکت دی۔ اس دوران پھل میری کلائیوں کی بندشیں کھول چکا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ روٹیل خان سے فرضی تعلق میرے کام آگیا تھا۔ کم از کم بندشوں سے تو نجات مل گئی تھی۔ میری کلائیوں پر گہرے نشان پڑ گئے تھے۔ کم بختوں نے ڈوری بہت جتنی سے باندھی تھی۔

”نیمس“ پھل اور ان کا تیسرا خونخوار صورت ساتھی میرے ہاتھ کھولنے کے بعد باقی لوگوں کے ساتھ جا بیٹھے تھے اور اپنے لمبے گھاسوں میں دھسکی اندھینے لگے تھے۔ کسی نے انہیں دعوت نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے اجازت لینے کی زحمت کی تھی۔ سردار کا احترام وہاں یقیناً بے پناہ تھا لیکن شاید غیر ضروری مصلحتات رائج نہیں تھیں۔

میں نے چند لمبے اپنی کلائیوں پر پالش کرنے کے بعد جانو کی طرف دیکھا۔ اس کی سانپ جیسی آنکھیں بدستور میری جانب گھراں تھیں۔ ہاتھ کھلنے ہی میں نے خود کو آزاد محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس سے نظر نہیں چرائی اور بدستور اس کی طرف دیکھا رہا۔

اس نے ایک کھونٹ حلق میں اٹھایا اور آنکھوں سے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ہینہ جاؤ۔“

میں ایک طرف جگہ خالی پا کر بیٹھ گیا۔ وہ سامنے رکھی بوتلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”پوہ گے؟“

”ٹھکرے۔ میں پیتا نہیں ہوں۔“ میں نے مذہبانہ لہجے میں کہا۔ ”اوہ۔۔۔ پارسا ہو!“ اس کے لمبے میں ہلکا سا مسخر بھی تھا اور بے چینی بھی۔ میرے کچھ کہنے سے چشموں بولا۔ ”لیکن کچھ کھانہ ضرور لو۔ جانو نے برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کے ڈیرے پر آئے اور بغیر کچھ کھائے پیے چلا جائے۔ ہمیں تو دشمن کو بھی مارنا ہوتا ہے تو کھانا پانا کرتے ہیں۔“

اس پر سب نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا اور چوٹی درود پوار جھنجھٹا اٹھے۔ میں کچھ کھانا بھی ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دھبی آواز میں کہا۔ ”میں تمہارے ہی آؤے پر اٹ کر کھانا کھا کر آیا ہوں اور اچھی بات یہ ہے کہ مجھے اس کے لیے کوئی ادائیگی بھی نہیں کرنی پڑی۔ علی ادا کرنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی تمہارے آؤی مجھے یہاں لے آئے۔“

”تو پھر توڑی سی صفائی ہی کھال۔ منہ جھاک لو۔ تمہارے لیے بھی خوشی کا موقع ہے کہ تمہارے قدم جانو کے ڈیرے تک پہنچے ہیں۔ بہت سی کم خوش نصیب ہیں جن کے قدم یہاں تک پہنچنے میں اور تمہارے لیے بھی خوشی کا موقع ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے۔ ہم بھی روٹیل خان کے بارے میں بڑی الجھن میں تھے کہ کیا کیا جائے۔ امید ہے تمہارے آنے سے ہماری الجھن دور ہو جائے گی۔“ جانو نہایت غمگین نظروں سے انداز میں بولا۔

”کیسی الجھن؟“ میں نے ذرا چرچکتے ہوئے پوچھا۔



بڑھ کر مٹی تھی۔

خیال میں ان لوگوں کو صحیح بات بتا دینے میں کوئی سرج نہیں تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں روئیل خان کا دوست تھا۔ گزشتہ رات روئیل خان نانگ مٹوا کر گھر پہنچا تھا اور میں نے اس کے کام آنے کے لیے اس کا ہروپ بھر کر انسپکٹر کو مس گاڑ کر لے کر اس کی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ حادثاتی سے انداز میں ایک ہیڈ کاسٹیکل میرے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔

جانو نے بڑے تحمل اور توجہ سے میری باتیں سنیں۔ میں خاموش ہوا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف لیکن عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ پلو بدلتے ہوئے وہ بولا۔ ”واہ! دوست ہو تو تم جیسا برا کمال کیا تم نے!“

مجھے اس کا جواب کچھ استہزائیہ سا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ دہشتاؤ بالکل بدلے بدلے مجھے میں ”سرسری سے انداز میں بولا۔ ”تمہیں روئیل خان نے ذہنی کی کچھ تفصیل نہیں بتائی؟“

”کیسی تفصیل؟“ میں نے جانا چاہا۔

”یہی کہ اس میں کتنے آدمی مرے۔ ان میں کتنے پولیس والے تھے اور کتنے مسافر وغیرہ۔؟ کتنے کا مال لوٹا گیا۔؟ کروہ میں کون کون شامل تھا؟“

”نہیں۔ زیادہ تفصیل تو نہیں بتائی اس نے۔ تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک ناکام ڈکیتی تھی۔ کھیل بگڑ گیا تھا۔ اور عرصے انداز میں سب کچھ چھوڑ چھا کر بھاگنا پڑا۔“

اس نے بڑے تعبیر سے انداز میں ہنکارا بھرا اور پھر خیال سے انداز میں مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ابھی تک میں نے اسے شادو اور سی پلک جھپکاتے دیکھا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ ”میرا اندازہ غلط تھا یا روئیل خان کا بیان درست نہیں تھا؟“

”دونوں ہی باتیں تھیں۔“ جانو کے پتلے پتلے ہونٹ سفاکانہ انداز میں کھینچ گئے۔ اس کے لمبے سے مجھے اپنے اعضاء میں خطرے کی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور میرے ہاتھ پیروں میں مضطربانہ سا کھچاؤ پیدا ہونے لگا۔

جانو گھاس قالین پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں جھساتے ہوئے بولا۔ ”یہ درست ہے کہ پولیس اس ڈکیتی کے دوران اچانک ہی آگئی تھی لیکن ہم چاہے تو بڑی آسانی سے انہیں پھانسی دے کر کھل سکتے تھے۔ ان کا بھی مقابلے کا موڈ مضبوط نہیں ہوتا تھا۔ وہ کسی اور قسم پر چاہے تھے مگر روئیل خان نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ صرف اس لیے کہ ڈرائیور نے ایک فائر کر دیا تھا جس کی وجہ سے پولیس نے بھی تھیں سیدھی کرنی شروع کر دی تھیں۔“

جانو اور دوسرے لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے لیکن اب وہ کسی عجیب سی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو میری سمجھ سے بالا تر تھی۔ میں پاکستان کی تقریباً تیسری علاقائی زبانوں سے واقف تھا اور ان کے لفظوں بول بھی لیتا تھا۔ سمجھتا تو ابھی طرح تھا لیکن یہ زبان ان میں سے کوئی نہیں تھی۔ یہ بھی میرے لیے ایک نئی حیرت تھی۔ ان میں سے ایک دو بے کس آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ شاید باتیں میرے ہی بارے میں ہو رہی تھیں۔

اسی دوران سونیا نامی وہ عورت ایک چھوٹی سی رُے میں مٹھائی کی پلیٹیں سجائے لے آئی۔ مٹھائی دیکھنے میں ہی عمدہ محسوس ہو رہی تھی لیکن میں مٹھائی کھانے کا کچھ ایسا شوقین نہیں تھا۔ مجھ جیسے تو کم از کم پیاس افراد کے لیے وہ مٹھائی کافی تھی۔ مجھے تو یہی دیکھ دیکھ کر حیرت ہوئے جاری تھی کہ اس جگہ میں انسانی ضرورت اور آسائش کی ہر چیز میسر تھی۔ کم از کم اس لحاظ سے پرتو میسر تھی۔

سونیا میرے سامنے رُے قالین پر رکھنے کے لیے مجھ کی توہیری آنکھوں کے سامنے گویا زمین و آسمان آن لے۔ میں تھوک نکل کر رہ گیا اور اسی دوران منظر بدل گیا۔ اس کی آنکھوں میں سرگرتہ ہولر بدستور دیا ہوا تھا۔ وہ سب لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جانو کے سوا کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے لیے یقیناً وہ محترم تھی۔ جبکہ خود جانو کی نظروں میں اس کے لیے زیادہ دلچسپی نہیں تھی جس سے مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید وہ اس کی بیوی ہی ہو۔ داشتہ کو انسان اس سے زرا زیادہ دلچسپی سے دیکھتا ہے۔

میں نے جانو کی خوشنودی کے لئے تھوڑی سی مٹھائی کھالی۔ اس قسم کے لوگوں کے دماغ میں کوئی نہ کوئی ”شیرہ“ ضرور ہوتی ہے۔ کچھ پچ نہیں ہوتا۔ کس بات کا براستانہ جاتیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں بد مزگی شروع ہو جائے۔ اب اگر ماحول خوشگوار ہو چکا تھا تو اسے خوشگوار ہی رہنا چاہیے تھا۔ جب تک میرے بس میں تھا تب تک تو میں اسے خوشگوار رکھنے کی کوشش کر ہی سکتا تھا۔

میں نے مٹھائی سے ہاتھ کھینچ لیا تو جانو قدرے حیرت سے بولا۔ ”یہ؟ اتنے لمبے چوڑے جو ان ہو، صرف اتنی سی مٹھائی کھا لی ہے!“

”اس وقت طبیعت میرے ہے۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

چتر لے کر عجیب بو جھلی سی خاموشی رہی۔ اس دوران ان لوگوں کا شکل باری باری۔ بالآخر جانو گھری سانس لے کر بولا۔ ”چھ۔ تو روئیل خان نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟“ گھاس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا مگر اسے وہ بولی نہیں رہا تھا۔ یہ تو ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ لوگ روئیل کے دوست تھے۔ میرے

تھا۔ صورت حال کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ اپنی اپنی جان بچانے کے لیے باقی لوگوں کو بھی اسی کی طرح اندھا دھند سبک کرنا پڑا۔ پولیس والوں میں سے شاید انسپکٹر رحیم گل اور اس کا ایک آدمہ ساتھی ہی زندہ بچا تھا۔ دوسرے بھی معلوم نہیں کتنے لوگ مارے گئے۔ اخبار آئے گا تو صحیح بتا چکے۔ حالانکہ اس واردات میں ایک آدمی بھی مارے بغیر گزارا ہو سکتا تھا۔ مال تو سمیٹا جا چکا تھا۔ پولیس والوں اور دوسرے لوگوں کو صرف خوفزدہ کر کے وہاں سے نکل بھاگنے کی ضرورت تھی۔

بات یہ نہیں ہے کہ میں یا میرے یہ ساتھی۔ میرے یہ دوست جو یہاں بیٹھے ہیں بہت شریف لوگ ہیں اور ہمیں واردات میں مرے والوں کا بہت افسوس ہے یا ہمارے دل خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اس مقام سے اب بہت آگے نکل آئے ہیں لیکن اب بھی ہم اپنے لیے نفٹ کی مشکلات مول نہیں لیتے۔ جس ذہنی میں اتنی خوریزی ہو جائے وہ گلے پڑ جاتی ہے۔ دو میل خان اور اس کے ساتھیوں کا بھی سارا پروگرام دھڑے کا دھڑا رہ گیا۔ انہیں نہ اٹھا کر اور نہ بھاگنا پڑا۔ سب بکھر گئے لیکن انسپکٹر نے یقیناً دو میل خان کو نظر میں رکھ لیا تھا۔ وہ اسی کے تعاقب میں روانہ ہوا۔

جانو کی یہ سب باتیں سن کر میرے دل میں خانا سا جھل گیا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ یقین گھر کر چکا تھا کہ دو میل خان مجھ سے بھٹ نہیں ہل سکتا۔ گزشتہ چند دنوں کی رفاقت کے بعد ہی میں اسے اپنا دوست اور قریبی ساتھی محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں نہ جانے کیوں کچھ ایسا گمان سا بھی تھا کہ میں انسانوں کے بارے میں اتنی آسانی سے دھوکا نہیں کھا سکتا لیکن اس مرتبہ کیا میں واقعی دھوکا کھا گیا تھا؟

میں نے سروسٹ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے خیال میں مجھے تعصبات کا غبار دھو جانے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بظاہر بالکل پُر سکون لیجے میں کہا۔ ”تم تو یہ سب کچھ اس طرح بیان کر رہے ہو جیسے یہ تمہاری آنکھوں کی دیکھی بات ہے۔ تمہیں یہ سب کس طرح معلوم ہوا؟ یہ تو یہاں سے بہت دور کا واقعہ ہے اور ابھی اخباروں میں نہیں آیا۔“

”ہم اگر بے خبر ہوتے تو یہاں اتنے غمات سے نہیں رہ سکتے تھے۔“ وہ استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ہم اپنے چادروں طرف ٹیکوں کیل تک کے علاقوں کی خبر رکھتے ہیں۔ باہر رہنا ہی ہمارے لیے زندگی ہے۔ بے خبری ہماری موت ہے۔ تم اس فکر میں مت پڑو کہ ہمیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے۔ تم اپنی تہ کا مقدمہ بناؤ۔ کیا دو میل خان نے تمہیں صرف یہی بدانت کی تھی کہ تم اپنے آپ کو مصیبت میں محسوس کرو تو میرے پاس چلے آنا؟“

”ہاں۔ اس نے یہی کہا تھا۔“ ہم نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا تمہارے پاس آنے کا کوئی ایسا خاص ارادہ نہیں تھا۔ اگر یہ لوگ

وہ ایک لمبے کے لیے خاموش ہوا تو کیا اسے توقع ہو کہ میں کچھ یوں لگا لیکن میں خاموش رہا۔ وہ بولا ”دو میل خان نے سب سے پہلے ڈرائیور اور کنڈکٹر کو قتل کیا پھر پولیس والوں پر بھی برسات مارا۔ معلوم نہیں کتنے مرے۔“ کتنے زخمی ہوئے۔ دو میل خان نے مسافروں کے سلسلے میں بھی کوئی احتیاط نہیں کیا۔ ان پر بھی اندھا دھند فائرنگ کی حالانکہ ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ظاہر ہے اس کے بعد پولیس والوں کے لیے بھی اندھا دھند فائرنگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ وہ تو شکر ہے، ڈاکا ڈالنے والوں نے اپنے حواس بجا رکھے ورنہ ان میں سے بھی۔۔۔ کم از کم آدھے تو کام اتنی گنتے ہوتے اور باقی آدھے تو زخمی ہو کر موت کی دعا مانگتے۔ یہ بھی شکر کا مقام ہے کہ پولیس والے دو میل خان کی کسی اور کی شکل نہیں دیکھ سکے تھے۔ سبھی نے دھانے پانے سے ہوتے تھے لیکن دو میل خان کے بارہو خاص طور پر ان کی نظر میں آگیا تھا اور وہ اسے ہی سردار سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسے گھیر کر زندہ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش میں انہوں نے اپنے دو تین آدمی اور مرنے والے۔

اس قسم کے کاموں میں یہ حساب تو نہیں رکھا جاتا کہ کس نے کتنوں کو مارا یا کس نے کیا فعلی کی یا کام و درحقیقت کس کی وجہ سے مگرا۔ جب کوئی کردہ کسی واردات پر روانہ ہوتا ہے تو یہ خطرے مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ کام تو کسی وقت بھی، کبھی بھی وجہ سے مگر سکتا ہے لیکن دو میل خان نے تو کل رات مدتی ہی کر دی تھی۔ وہ تو جیسے پاگل ہو گیا تھا یا پھر بالکل پتہ نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جی جی کی واردات پر نہیں نکلا تھا کسی قسم کی شوکت کر رہا تھا۔ مجھے شک سا ہوتا ہے کہ کہیں وہ جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہا تھا؟ اس کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ تو نہیں تھا؟ وہ بہت تجربہ کار بہت گھانا آدمی ہے۔ اس طرح بد حواس نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر اس نے تمہیں یہی بتایا ہے کہ وہ نامیج کی روشنی میں صرف ایک لمحے کے لیے انسپکٹر کی صورت دیکھ سکا تھا اور صرف یہ ایک جھٹک دیکھ کر اس نے انسپکٹر کے بارے میں سارے اندازے لگا لیے تھے کہ وہ عزم کا پیمانہ اور بالکل ناکل بجزموں کا چچھا کرنے والا آدمی ہے تو یہ سب باتیں بکواس ہیں۔ دو میل خان اس انسپکٹر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ انسپکٹر کا نام واقعی رحیم گل خازنادہ ہے اور دو میل خان کو اس کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک مثالی افسر ہے۔ کبھی نہ کہنے والا، کبھی نہ جھگڑنے والا، کلا دلیور اور جبر تک بزم کا چچھا کرنے والا۔ یہ سب دو میل خان کے اندازے نہیں تھے۔ ایک سیکڑ میں کوئی قسمی کے بارے میں اتنے اندازے نہیں لگا سکتا۔ یہ سب باتیں دو میل خان کو اچھی طرح معلوم تھیں۔ انسپکٹر رحیم گل کی جھٹک دیکھ لینے کے بعد ہی دراصل اس کی برکلاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

اس دن سائیکل کے لیے بھج کر آکر راستہ میں دھوڑا

”ہیں۔ آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کوئے کھد رے میں ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور سرواؤ بھی کر جاتے ہیں۔“ جانو کو گویا اس بات پر افسوس تھا۔ وہ بات چیت مقامی زبان میں کر رہا تھا لیکن سچ میں انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتا جا رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی کچھ سمجھ رہا تھا کہ وہ کچھ دھما لکھا شخص تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم رحم کل جیسے جیسے پگے لیتا ہے اس حساب سے اسے اب تک مرچکا جاسکے تھا۔ بہت عرصہ پہلے اس دنیا سے اس کا ستر لوریا گول ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ زندہ ہے اور بڑی دلیری سے زندہ ہے۔ شاید قدرت اس پر مہربان ہے۔“ ”حقیقتاً ہوگی۔“ میں نے لقمہ دیا۔ ”آخر قدرت کو بھی تو اپنے نظام کی حفاظت کرنی ہے۔“

جانو نے کمری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا ”میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمارے ہاں تو بے لحد لوگ۔ بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ لوگ کسی نہ کسی انداز میں اپنی اپنی جگہ لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ جس کا جہاں، جس حیثیت میں، جس حد تک ہاتھ پڑا ہے، وہ لوٹ مار کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہے اور اگر کسی کے ہاتھ میں اختیارات آجائیں اور موقع بھی میسر ہوں، وہ تو دونوں باتوں سے گونا گونا ہے۔ غریب اور ملال کھایا اس لیے گونا گونا ہے کہ وہ بھوکا ہوتا ہے۔ اس میں کئی نسلوں سے دولت کی بھوک موجود ہوتی ہے اور دولت مند اس لیے گونا گونا ہے کہ کئی نسلوں سے دولت کی ہوس اس کی فطرت میں شامل ہو چکی ہوتی ہے لیکن اس وقت مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب سچ میں کوئی رحم کل جیسا نمونہ نکل آتا ہے۔ دولت اور آسائشیں اس کے تعاقب میں ہوتی ہیں مگر وہ ان سے بھاگتا ہے۔ اپنے لیے تکلیفیں، ”میںشیں“ پریشانیاں اور لوگوں کی ناراضگی مول لیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے لیے انہی چیزوں میں کوئی زبردست لذت نہ پائے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اپنے گلاس میں سے آخری گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔ ”تمہیں شاید حیرت ہو رہی ہوگی کہ میں تمہیں یہ سب کچھ اتنی تفصیل سے کیوں بتا رہا ہوں؟“

”ہاں، گھونڈی سی حیرت تو ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس لیے کہ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے، اب تمہارا واسطہ کس قسم کے آڑی سے ہے۔“ جانو سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے قریب بیٹھا ہوا ایک کرخت صورت سا شخص اس کے لیے وہ سری ڈرنک بنا کر رہا تھا۔ ”اب تم رحم کل کی نظریں نہ صرف کئی پولیس والوں بلکہ دوسرے بھی کئی سے کناہ اور نیٹے لوگوں کے قافلہ ”ڈاکو“ پر۔ اب تم اس کے لیے ایک چیلنج ہو اور چیلنج قبول کرنے میں رحم کل کا جواب نہیں۔“

اس نے نئی ڈرنک سے ہلکی سی چٹکی لی اور اپنے ساتھیوں کے چہروں پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالی۔ ان سب کے احوال میں اب بھی گلاس تھے لیکن وہ ہمہ تن گوش تھے۔ چپے چپے پلانے کا ان پر بہت

مجھے نہ پکڑ لینے تو شاید میری قسم سے ملاقات نہ ہوتی۔“ ”یہ تو بہت بُرا ہوتا۔“ جانو میری بات کانٹے ہوئے عجیب سے آواز میں مسکرایا۔ ”مہم سے تمہاری ملاقات ہونا تو بہت ضروری تھا کیونکہ فی الحال ہم بدلیل خان سے تو ملنے نہیں جاسکتے اور نہ ہی اس کی طرف اپنا کوئی آدمی بھیج سکتے ہیں۔ اس کی طرف جانے میں بلا خطرہ ہے۔ وہ انجینئر رحیم گل کو تمہارے پیچھے لگا کر سمجھ رہا ہوگا کہ غلطو اس کے سر سے ٹل گیا ہے لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔“

پھر وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”خیر۔ چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔۔“

”الٹال تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟“ ”مگر مجھے دو جوڑے کپڑے اور اس کانٹے گھوڑے کے بجائے کسی اور رنگ کا گھوڑا مل جائے تو میرے لیے بڑی آسانی ہو جائے گی۔ اگر تم اسے اپنی توہین نہ سمجھو تو میں اس کے بدلے توڑی بہت رقم بھی تمہاری خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ معمولی کی پونجی ہے میرے پاس۔“

”باس اور گھوڑا بدلنے کا اب کیا فائدہ؟“ جانو نے گویا میری کم عقلی پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ ”تم خود ہی بتا چکے ہو کہ انجینئر رحیم گل سے اچانک تمہارا سامنا ہو گیا تھا اور وہ تمہاری صورت قریب سے دیکھ چکا ہے۔ رحیم گل کی آنکھیں کھرا اور داغ کھینچ رہے ہیں۔ وہ ایک پارہ خویش دیکھ لے کہ وہ اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ قاتلوں کا پاتال تک واقعی بچھا کر آتا ہے۔ جو علاقہ اس کی حدود میں نہیں آتا وہاں بھی دخل اندازی کرتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کا اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ بس اس کے سامنے کوئی واردات ہو جائے، علاقہ خواہ کوئی بھی ہو، وہ پہنچے جہاز کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔ پڑاؤں میں میں میں پہلے ہوئے اس علاقے میں وہ داند چھوٹا سا آفسیر ہے جو آج تک کسی کے قاتلوں میں نہیں آیا۔ ورنہ ہر آفسیر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی لڑائی سے بندھا ہوا ہے۔“

پھر وہ ایک لمحے گویا کچھ سوچ کر بولا۔ ”میرا خیال ہے، میں نہیں انجینئر رحیم گل کے بارے میں مزید دو چار ضروری باتیں بتاؤں تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اس کا تعلق ایک کھاتے چنے اور بار سوخ و میسر اور گھرانے سے ہے مگر وہ صرف شوق میں ہی پھول کی نوکری کر رہا ہے۔ بلکہ شاید ایڈیٹر کے لیے۔ اس کے داغ ملے پڑاؤں کے خلاف جہاد وغیرہ کا بھی کچھ خٹاس ہے۔ اس طبقے کے لوگ اگر اس قسم کی نوکریوں میں آتے بھی ہیں تو صرف مال بٹانے کے لیے آتے ہیں لیکن اس بد بخت کو مال بٹانے کا بھی شوق نہیں۔“

”اس قسم کے لوگ تو اب ہمارے ہاں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جو کچھ تم بتا رہے ہو اس سے تو وہ کسی الف لیلوی داستان کا کردار معلوم ہونے لگا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

معمولی سا اثر دیکھنے میں آ رہا تھا۔

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد جانو بولا۔ ”ہم تک تو رجیم کل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہو بھی جائے تو ہم اس سے نکلنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن تم کیا کر گے؟ تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ تم تک پہنچے گا ضرور۔“

اس کی باتیں سن کر میرے دل میں ایک لمبے کے لیے ہلکی سی کھد بہ ضرور ہوئی لیکن پھر میں نے اپنے انڈیٹوں کو ذہن سے جنگ دیا۔ زندگی اگر رجیم کل کے لیے ایڈو بھر بھی تو میں بھی اسے ایڈو بھر سمجھ کر ہی گزار رہا تھا۔ میری دعا بھی کہ وہ مجھے کسی موڑ پر مجبور نہ کر دے کہ میں اسے کوئی گزند پہنچاؤں یا خدا نخواستہ وہ میرے ہاتھوں مارا ہی جائے۔ اس قسم کے لوگ اب نایاب تھے، بیش بہا سرمایے تھے۔ اس سرمایے کو ضائع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے تو اپنے ہاتھوں اس کے ساتھ ہی بڑے کاشٹیل کے مارے جانے کا ہی بڑا افسوس تھا۔ وہ ایک شخص مہم میں رجیم کل کے شانہ بہ شانہ تھا۔ کوئی بھید نہیں تھا کہ وہ بھی ایک اچھا انسان رہا ہو۔

میں نے ہوا لیے میں کہا۔ ”تم اپنے آپ کو میرے ساتھ کیوں تیار کر رہے ہو؟ تم تک پہنچنے کی اسے کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟“

جانو کے ہونٹوں پر استہزائی سی مسکراہٹ کچھ واضح ہو گئی لیکن پھر ایک سی وہ مسکراہٹ اس طرح غائب ہو گئی جیسے کوئی لقمہ جھگ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں مسکنتی ہوئی چنگاریوں کو گواہ تیز ہوا لی گئی۔ ان آنکھوں میں اچانک ہی وحشت سی جاگ اٹھی۔

وہ یک دم بدلی بدلی اور کھر کھرائی سی آواز میں بولا۔ ”تم واقعی اسے معصوم ہو یا نہیں یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم کتنے اچھے اداکار ہو؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں!“ میں نے کہا۔ میں واقعی کچھ گڑ بڑا سا کیا تھا۔

”تم نہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ مدحیل خان نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ وہ گویا اپنا غصہ خفیا کرتے ہوئے بولا۔

”میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ مدحیل خان نے مجھے کچھ نہیں بتایا؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”اس نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“

اب گویا قفل کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اب تک وہ جتنا پر سکون نظر آ رہا تھا، کیا ایک اتنی ہی تیزی طرح جھڑک اٹھا۔ اس کی سانپ جیسی آنکھوں میں سرخ زردے تو پیلے ہی تیر رہے تھے۔ اب تو آنکھیں بالکل ہی لال لال لال ہو گئیں اور وہ گھونسا ہوا میں لڑا کر بولا۔ ”اب کو اس بند کو اور مال نکالو۔ اور اصرار کرنا کہ تمہیں بہت ہو گئیں۔ یہ بتاؤ مال کہاں چھپا کر آئے ہو؟“

”مال؟“ میں ہکا بکا رہ گیا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر تم ایک ٹنگ جاری رکھنے پر اسے ہی بعد ہو تو

میں تمہاری خوشی کے لیے وہ باتیں دہراؤں گا ہوں جو تمہیں یقیناً معلوم ہوں گی۔“ اس کا لہجہ بھی سانپ کی پٹکار سے مشابہ تھا۔ ”جس کردہ نے ہوں پر ڈاکا ڈالا تھا وہ ہمارا ہی کردہ تھا اور اس کے تقریباً سب لوگ تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ صرف میں اس واردات میں شامل نہیں تھا۔ مدحیل ہمارا خاص آدمی ہے لیکن ہم نے اسے اس کے اپنے اسٹائل سے کام کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ یعنی بظاہر وہ چھوٹا سا زمیندار ہیں کہ زندگی گزار رہا تھا لیکن ضرورت کے وقت ہمارے پاس پہنچ جاتا تھا اور ہر واردات میں حصہ لیتا تھا۔ بعض وارداتوں میں تو سردار رہی ہوتا تھا۔ میرے بعد سب سے زیادہ حصہ اسی کا ہوتا تھا۔“

میں خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا اور مدحیل کا قہقہہ سا چہرہ میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ جانوبات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم مدحیل کے دوست اور پارٹنر ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک نہایت دولت مند آدمی ہیں چکا ہے۔ اس وقت وہ بلاشبہ کرڈنٹ ہو گا۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس دیرانے میں تمہارا۔ ایک عام مدحیل کی سی زندگی گزارنے والا وہ شخص کرڈنٹ تھا؟

جانو کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ”کل رات کی واردات ہماری بڑی وارداتوں میں سے ایک تھی۔ اس میں بہت مال ہاتھ آیا تھا۔ گڑ شروع ہونے سے پہلے مدحیل نے سارے مسافر مردوں اور عورتوں سے نقدی، زیورات وغیرہ چین کر کیوں کے ایک قفل میں ڈال لیے تھے اور جس وقت وہ رجیم کل سے جان بچا کر بھاگا ہے اس وقت بھی تھیلا اسی کے پاس تھا، گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بڑی حاضردہائی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر اسے بھاگنے میں ایک لمبے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ رجیم کل کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس کی خوش قسمتی ہے کہ رجیم کل کو نہ تو

اس کی حقیقت معلوم ہے اور نہ ہی وہ اس کی شکل دیکھ سکا۔ مدحیل خان کا ایک ڈاکو کی حیثیت سے پولیس کے پاس نہیں کوئی سراغ نہیں ہے۔ میرے ان ساتھیوں نے اگر مجھے تفصیل رپورٹ دی۔ میں تو خوش تھا کہ مدحیل خان اپنی جان اور مال بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب تم آئے تو میں سمجھا تھا کہ مدحیل خان نے اپنے حصے کا مال رکھ کر باقی مال تمہارے ہاتھ میں سمجھا ہو گا کہ

یہ سب لوگ اپنا اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے بے تاب بیٹھے ہوئے ہیں۔“ اس نے بازو پھیلا کر دو ٹوکوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سب ناگوری کے سے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔

جانو نے بات جاری رکھی۔ ”مدحیل ہمارا بہت پرانا اور تجربہ کار ساتھی ہے۔ اسے معلوم ہے حصول کی تقسیم میں رہ نہیں کی جاتی کیونکہ ہم لوگوں کے حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ صرف ہم لوگوں کے حصول کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ ایک دو جگہ پر اور

بھی حصے جانے ضروری ہوتے ہیں۔ مدحیل پر ایک مدت سے میں

تھا اور زیادہ تر بڑے نوٹ تھے۔ دو تین کلو سونے کے زور تھے اور کم از کم چار کلو سونا نگینوں کی شکل میں تھا۔ گھڑیاں وغیرہ اس کے علاوہ تھیں۔  
"نگینوں کی شکل میں سونا؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"ان میں سے ایک میں میں دو ہزار اسی سو ستر کر رہے تھے۔ نگینوں کی شکل میں سونا لے جا رہے تھے۔ سکر سے خرید کر لائے تھے اور انہوں نے اسے سبزی کی دکانوں میں سبزیوں سے چھپایا ہوا تھا۔ بہت عرصے بعد ہمارا ادا اچھا ہوا تھا۔"

میں اس کی بات سن رہا تھا لیکن میرا ذہن اب بھی دو میل خان میں ہی الجھا ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے اتنی محنت دکھانے کے بعد نہ صرف یکدم مجھ سے ادا بہت سا جھوٹ بولا تھا بلکہ احتمالی شاطرات انداز میں مجھے کسی سازش میں بھی استعمال کر ڈالا تھا اور اس کے بعد سیدھا موت کے منہ میں بھیج ڈالا تھا۔ مجھے وہ اس قبیل کا آدمی لگا نہیں تھا۔ ابھی تک میری حیرت ہی دور نہیں ہو پاری تھی۔

بہت سی باتوں پر ماتم بھی کرنے کوئی چاہ رہا تھا۔ ماتم میں اپنی عقل پر بھی کر سکتا تھا اور زمانے کے تحریات پر بھی۔ کیا عجیب بات تھی کہ ڈاکو میرے سامنے آئے فخر سے اپنے ڈاکو ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اتنے عجیب بات سے بیٹھے تھے اور میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں تو خریدیے ہی آج کل ہر اداوت گزار رہا تھا اور اپنی بٹا کی جنگ لڑ رہا تھا لیکن ان کا تو شاید پولیس اور دوسرے ادارے بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ کسی کی طرف سے بھی خوفزدہ نظر نہیں آتے تھے۔ مجھے یہ یقین کر بھی حیرت ہوئی تھی کہ ان کے ایسے جتن بھی تھے جو انہیں اس قسم کی اطلاعات بھی دے سکتے تھے کہ ان کے لیے کون سی بیس زیادہ "بار" اور "ٹائٹ" ہوں گی۔

"ہاں۔ تو پھر تباہ نامہ مال ساتھ لائے ہو یا کہیں چھپا کر آئے ہو؟" جانو بے تابی سے بولا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں، میرے پاس کوئی مال وغیرہ نہیں ہے۔" میں نے اپنے دل پر لگنے والی قریب خودی کی گانہ خواہش کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ساری کہانی میرے لیے سچی ہے۔ دو میل خان نے مجھے باتیں اس طرح نہیں بتائی تھیں۔" "میں نہیں مان سکتا۔ تم اپنے آپ کو اس کا دوست اور پارٹنر کہہ رہے ہو، دوست اور پارٹنر کے ساتھ کوئی اتنی غلط بیانی نہیں کر سکتا۔" جانو ہوا میں ہاتھ جھٹک کر بولا۔

"تم تو دوست اور پارٹنر کی بات کر رہے ہو، اس دنیا میں تو بھائی بھائیوں کے ساتھ اس سے بڑا سلوک کچھ ہے، جن میں پیسوں کے بھائی بھی شامل ہیں۔ میں تو پھر بھی ایک گناہ کار سا انسان ہوں اور صرف دوست کے جھوٹ کے جال میں پھنسا ہوں۔" میں نے مسکرا کر ماحول کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کرتے

پڑا بھروسہ رہا ہے کیونکہ وہ بہت ہی شاطر، بہت ہی تیز و طرار اور بہت ہی چکر تلّا سا بھی تھا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ہمارے گروہ نے اسی کی وجہ سے بہت ترقی کی ہے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ کچھ عرصے سے وہ کسی چکر میں تھا۔ اگلے تھک سکی اپنی کوئی چھجڑی پکا رہا تھا۔ ال میں بھی مسلسل ڈنڈی مار رہا تھا لیکن میں ان سب باتوں کو نظر انداز کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایسی باتوں کی وجہ سے دو میل خان پیسے سا بھی کو چھوڑا نہیں جاسکتا لیکن اب اس نے کچھ مشکوک سے انداز میں مجھیں بھیجا ہے۔ مال بھی ہمارے پاس نظر نہیں آ رہا۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی لہا چکر چلا رہا ہے۔ وہ اس قسم کی حرکتیں میں بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ رجم کل ہے آدمی سے پٹالے کر اس نے پہلے ہی گروہ کے لیے بہت بڑا گروہ کڑا کر دیا ہے۔"

مجھے اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ دو میل خان جیسا سچا اور لڑا نظر آنے والا جوان پرنسج قسم کے سازشوں کے جال بھی بن لگا تھا لیکن اس دنیا میں ایک تو دینے ہی کسی کے بارے میں یقین نہ کچھ نہیں لگا جاسکتا، دوسرے جو لوگ دھڑی دھڑکی گزارنے کی بات دیکھتے ہیں ان پر بھروسہ کرنا تو بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔

انام میں اب بھی خاموش رہا۔ میں جانو کو زیادہ سے زیادہ لے کر موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ جتنا بول رہا تھا، صورت حال اتنی ہی بے سامنے واضح ہو رہی تھی۔

جانو مجھے خاموش پا کر بولا۔ "مجھے اب بھی بڑی حد تک یقین ہے کہ دو میل خان نے مال ہمارے ہاتھ ضرور بھیجا ہو گا لیکن اسی نیت خراب ہو گئی ہے۔ اگر ہمارا نیت خراب ہوئی گئی تو ہمیں اس علاقے کی طرف نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ تو شیروں کا گھاڑ ہے۔ یہاں آنے کے بعد تم ہمارے منہ کا ٹوٹا لیجیں کر مارے جاسکتے۔"

"کتنا قحط کا مال؟" میں نے دیکھ کر بے بسی سے پوچھا۔  
"میں نے محسوس نہیں کر پوچھ رہے ہو، جانو! ستر اسی لکھ میں۔" لیکن غیبت۔ اگر ہمارے دل میں ہم سے پیچھے خالی کرنے کا زیادہ ہی شوق پیدا ہو گیا ہے تو ہم تو اداوت ستر ہزار ساتھ دے دیں۔ ہمارے محسوس سواٹوں کے جواب دے دیتے ہیں۔"  
میں نے دیکھا، اس دوران جانو کے ساتھیوں میں سے کسی نے گردن اڑوں پر کھنٹیوں سے لگی تھیں اتاری تھیں اور انہیں مل کر رکھ کر بچھ گئے تھے۔

جانو بولا۔ "ہمارے تجربے ہمارے لیے بہت اچھی بیس منتخب ہیں۔ آج کل ہائی دے پر چار چار چھ بیس قافلہ سا بنا کر سفر لگ گئی ہیں۔ بھولے لوگ ہیں وہ۔" مجھے ہیں، قافلوں کو شاید لوٹا جاسکتا حالانکہ اس سے ہمارے لیے آسانی ہو گئی ہے۔ بہت سا شکار ہاتھ آجاتا ہے۔ بس ذرا بددوست اچھا کر کے لگے۔ رات والی واردات میں آدھا تھلا تو فزوں سے بھر گیا۔

ہوئے کہا۔

”مجھے غصہ نہیں، مال چاہیے۔“ جانو نے ہاتھ پھیلا یا حالانکہ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر بیٹھا تھا اور کیوس کے جس قصبے کا وہ ذکر کر رہا تھا وہ یقیناً کافی دُراں ہو گا لیکن جانو کا ہاتھ پھیلانے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں وہ تھپلا ایسی جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

”جھاکش میں تمہیں اپنی بات کا یقین دل سکتا۔“ میں نے اپنے لیے سے بے بسی ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ جانوان تین افراد کی طرف متوجہ ہو گیا جو مجھے لے کر آئے تھے۔ اس نے اس نوجوان کو مخاطب کیا جو عام سے قد کاٹھ کا مالک ہونے کے باوجود نہایت خوشنور صورت اور کچھ جنونی سا نظر آتا تھا۔ ”مستی خان! تم لوگوں نے کھوڑے کا جائزہ لے لیا تھا؟ اس پر کوئی چیز لڈی ہوئی تو نہیں تھی؟“

”نہیں جانو سامیں!“ مستی خان نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ”اس کے پاس صرف ایک روپو اور تھا، وہ ہم نے لے لیا۔ کھوڑے پر کچھ نہیں تھا۔“ مستی خان کو اس وقت سے سے شغل کرنے کے باوجود مستی چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ معلوم نہیں کیوں وہ شروع سے ہی مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے مجھ سے اس کی کوئی پرانی دشمنی چلی آ رہی ہو۔ شاید وہ اپنے گروہ کے آدمیوں کے علاوہ باقی سب کو اسی طرح دیکھنے کا عادی تھا۔

”دیکھو میری جان!۔“ جانو سمجھانے والے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اب یا تو اصل بات مجھے بتا دو یا کہیں سے بھی مجھے مال پیدا کر کے دو۔ یہ سب لوگ اپنا اپنا حصہ لینے کے لیے بے چین ہیں اور فیس تو نہ جانے کیوں تمہارا پتہ ہی صاف کر دینے کے لیے بے چین ہے۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی بار اشارہ کر کے مجھ سے اجازت طلب کر چکا ہے۔“

فیس اس سیاہ رو کا نام تھا جو مارڈاڑ کا بہت شوقین مظلوم ہوتا تھا۔ وہ انکار ہی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی قدرے پھٹکی ہوئی سوجھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے قتل کرنے کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گویا صرف مستی خان ہی نہیں بلکہ فیس بھی مجھ پر دانت چکا رہا تھا۔

میں نے کمری سانس لے کر کہا۔ ”حقیقت یہ ہے جانو!۔ مجھے یہ پدایت بھی روٹیل خان نے ہی کی تھی کہ میں تمہارے سامنے اپنے آپ کو اس کا دوست اور پارٹنر ظاہر کروں ورنہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو اب تک اس کا دوست تو شمار کر رہا تھا لیکن تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اگر وہ سچ ہے اور روٹیل خان نے واقعی مجھے اپنی کسی سازش میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تو میں اس دوستی سے بھی دست بردار ہوتا ہوں۔ میری اس سے شامانی صرف چند دن کی ہے اور میں یہ اعتراف کرنے میں

کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اگر وہ میرے کام نہ آتا تو میں دیرانے میں بھوکا پیاسا بڑا مرچا کہ اس کا یہ احسان ادا ہوا ہے کہ اس کے عوض میں روٹیل خان کے لیے بری سے بری تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں لیکن اس کے لیے اس گدھے کی طرف غلط اختیار کیا۔ وہ مجھ سے کچھ بچ چکا تھا اور میں اس کی خاطر اندھے کنوئیں میں بھی چلا گیا۔ گدھا کھٹکا لیکن مجھے چکر دینے کی کوشش کر کے اس نے میری نظر میں اپنی عزت کھائی ہے۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں، میں کسی بھی معاملے میں اس کا پارٹنر غور نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ بھی کل رات ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ دراصل ڈاکو ہے۔“

جانو خاموشی سے۔۔۔ لیکن برہمی آمیز سے انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے ذرا توقف کے بعد کہا ”میں اس کا جتنا احسان مند تھا، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں اس کی فرمائش پر ڈاکوئیں والے کپڑے پہن کر نکل کھڑا ہوا اور میں نے باقاعدہ کوشش کر کے انشپور رجیم کل کو اپنے پیچھے لگا لیا۔“

”ہاں۔۔۔ یہ تو روٹیل خان نے بڑا کام کیا۔ اسے مظلوم تھا کہ رجیم کل جیسے بھرت سے چھپا چھڑانے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اسے کسی اور راستے پر ڈالا جائے۔ رجیم کل اسے نہیں جانتا لیکن وہ رجیم کل کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ جانتا ہے جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے۔“ جانو نے تمہیں سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے یہ سب کچھ کہا لیکن پھر وہ یکدم خاموش ہو گیا اور اس کی نظریک بار بار پلٹ گئی۔ اس کا موڈ ایک فٹ پلٹا کھاتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ قفل بدلے بدلے سے اپنے میں بولا۔ ”مجھے بار بار اپنا بیان بدلنے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔ ظاہر ہے وہ لوگ جھوٹے ہی ہوتے ہیں جو بھی کچھ کہتے ہیں اور کچھ۔۔۔ میں تمہیں صرف ایک موقع اور دے رہا ہوں۔ مجھے بتانا مال کہاں ہے؟ یہ میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔“

”اس سوال کا جواب تو روٹیل خان ہی دے سکتا ہے۔“ میں نے غامض عاجزی سے کہا۔ ”میرے پاس تو صرف چند سو روپے کی رقم ہے، وہ میں بلا جیل و جنت تمہاری خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن میرا ہاتھ میرے اوپر آنے سے پہلے جانو اس سیاہ رو فیس کو اشارہ کر کے قاتل ہوا وہ یوں اچھل کر میرے سامنے پہنچ چکا تھا جیسے کسی بچے کو اس کی مرغوب ترین چیز نظر آگئی ہو۔ وہ جھکی لی سی تیزی سے حرکت میں تھا اور اسی چمکتی سے اس نے میری غوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ اچھل کر پیچھے جا کر وہ دھڑمک رہی تھی کہ اس وقت میرا ایک ہاتھ جیب میں تھا اور فیس کو چھلانگ لگا کر آگے آئے دیکھ کر میں اپنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میں نہ تو جھجکا ہوا تھا نہ

نہ ہی کھڑا تھا جب گھوڑا میری ٹھوڑی پر رہا۔ اسی لمحے میں اتنی آسانی سے پیچھے جا کر اگلے گئے کہ مجھ کو صرف غیسو کو ہی نہیں، گویا سب کو دلی اور دماغی شہرت ہوئی۔ وہ سب وحشیانہ انداز میں بچ گئے۔

پھر وہ اس طرح پیچھے ہٹ کر دیواروں سے لگ کر بیٹھ گئے جیسے دو پہلوؤں کا دلچسپ مقابلہ دیکھنے کی توقع لیے اپنی ششیں سنبھال رہے ہوں۔ یہ غیبت تھا کہ وہ غیبت کو تھامی، مجھ سے منٹے کا موقع دے رہے تھے، کوئی اور اس کا ہاتھ پٹانے کے لیے نہیں اٹھا تھا۔ غیسو کی گویا دلی کی مراد ہی اتنی تھی۔ اس کے لیے یقیناً یہ ایک دلچسپ کام تھا اور وہ پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے انجام دیتا جا رہا تھا۔ میرے کرنے سے تو شاید اس کی خود اعتمادی میں ہمت ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس دوران اس نے مجھے نہیں مارا بلکہ ہنسنے سے انداز میں کھڑا رہا۔

اس کے ہونٹ تو نظر نہیں آتے تھے، صرف اس کی مونچھوں کے پھیلاؤ سے پتا چلتا تھا کہ کس وقت وہ مسکراتا تھا اور کس وقت سنجیدہ ہوتا تھا۔ اس کی لال لال آنکھیں بھی اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ تاہم اس وقت وہ مسکرا رہا تھا۔

اس کا گھوڑا بلاشبہ ایک بھڑوڑے کی طرح میری ٹھوڑی پر پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل غل گیا تھا اور دانت بھی گویا منہ سے باہر آنے کو بے تاب ہو گئے تھے۔ گوکہ میں دوسرے لمحے ہی سنبھل گیا تھا لیکن نہایت آہستگی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچا۔ وہ قدم مجھ سے اونچا نہیں تھا لیکن وہ جو ہانڈوں میں ایک خاموش سا تکبر اور غرور ہوتی ہے، وہ اس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ وہ میرے قدم کا ٹھہر اور جسمانی ساخت کو قطعاً خاطر میں نہیں لارہا تھا۔ اس کے سامنے گویا کوئی بچہ کھڑا تھا۔

میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تب بھی اس نے مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ وہ گویا مجھے پورا پورا موقع دے رہا تھا کہ میں بھی جواباً اس پر حملہ کرنے کی کوشش کروں۔ آثارات کچھ ایسے ہی تھے جیسے بہ زبان غشوئی کہہ رہا ہو۔ ”آؤ چہرے! تم بھی اپنے دل کے ایمان نکال لو۔“

مجھے اس کا دھڑ نہیں، اس کی خود اعتمادی سا ٹارگن محسوس ہوئی۔ آدمی خواہ جسمانی طور پر دیوانہ ہو لیکن اگر اس میں ایک دیوانہ کی ہی خود اعتمادی موجود ہو تو کوئی بے حد نہیں ہوتا کہ وہ دیوانہ جیسا کوئی کارنامہ انجام دے جائے لیکن اس بد بخت کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے اندر کیسی اگلی سٹ آئی تھی۔ کس طرح میرا غیلا و غضب ایک قتلے پر مرکوز ہو رہا تھا۔

میں ان لوگوں کے ساتھ جتنی بھی محبت و ملامت سے کام لے سکتا تھا، لے چکا تھا۔ شاید کسی کو بھی صحیح طور پر اندازہ نہ ہو سکا ہو کہ کب میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور کب اس کے منہ پر گھوڑا پڑا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ اس گھوڑے کے پیچھے صرف میری ہی

طاقت مرکوز تھی یا کوئی اور پُر اسرار طاقت بھی سٹ آئی تھی۔ جب مجھے کچھ زیادہ سی تو بین کا احساس ہوا تھا تو پھر میرا جوابی حملہ کچھ ایسا ہی ہوا کہ آگیا تھا۔

گھوڑا اس کے منہ پر پڑا تو خود کو ہماڑ کھینچنے والا اپنی جگہ سے کم از کم ایک فٹ اونچا اچھلا اور یوں جا کر چھپل دیوار سے ٹکرایا جیسے کسی نے ریز کے گڈے کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا ہو۔ دیوار سے ٹکرا کر وہ عمرہ چھپکلی کی طرح ہٹ سے ٹکرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ مجھے خود بھی ایک لمحے کے لیے یقین نہ آیا کہ میرے صرف ایک گھوڑے نے یہ کام دکھایا تھا۔ اس طویل و عریض ہال میں موت کا شناں تھا کیا۔

بس وہ چند لمحوں ہی سکوت میں گزرے، اس کے بعد قہال میں گویا بھونچال سا آگیا۔ وحشیوں کا وہ پورا غولی یکدم مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ صرف جانور الگ ہو کر ایک کونے میں کھڑا ہو کر گویا تماشا دیکھنے لگا یا پانی سب مجھ پر مل پڑے لیکن میں ان کے قہال میں نہیں آیا۔

کسی کو میں نے ہوا میں اچھالا اور کسی کو ایسا گھوڑا رسید کیا کہ وہ بری طرح ڈر کر اپنا ہوا ڈھیر ہوا اور اپنے ہی سلاخیوں کے پیروں تلے پکڑا جانے لگا۔ میں نے خود بخود غری صورت والے کو بھی اپنے اوپر بھینچنے دیکھا لیکن اس میں جتنی تیزی تھی اور خود بخود غری نظر آ رہی تھی اتنی ہی جلدی اس کی چٹنی ہو گئی۔ ایک ہی گھونٹے میں اس کی شکل بدلتی ہوئی سی دکھائی دی۔ وہ ہجوم میں ایک طرف کو گرا اور پھر دکھائی نہیں دیا۔

میں گھونٹے ”ٹائٹس“ نکریں سب کچھ چلا رہا تھا اور جس جگہ آؤ گا بھی موقع مل رہا تھا وہ استعمال کر رہا تھا۔ ہال میں چھپیں، غرائیں اور کارہاں ابھر رہی تھیں۔ گلاس ٹوٹ رہے تھے، بوسلیں لڑھک رہی تھیں۔ غیبت تھا کہ ہال میں فرخچر نہیں تھا ورنہ فرخچر بھی ٹوٹا اور اس کے ماتھے پر زیاں بھی زیادہ تیزی سے ٹوٹتے۔

مجھے خود بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں کتنی تیزی سے چل رہے تھے۔ فوری طور پر تو میرے سامنے بس ایک ہی مقصد رہ گیا تھا میں انہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ اگر میں ان کے سامنے اتنے قہل ”آئی ٹی“ ہی بلکہ عاجزی سے ہنسنے لگا رہا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے انسان کے نبھائے کیزا کوڑا سمجھ لیا جاتا۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر بھی گھونٹے اور لائیں وغیرہ برس رہی تھیں یا نہیں۔ اسی دوران میں نے ان میں سے کسی کو چھت کی طرف اچھالا۔ چھت دیکھنے بھی کچھ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہ سیدھا چھت سے ہی جا کھڑا اور مجھے دایمں آیا تو اپنے ساتھ تھوڑے فاصلے پر بھی لے آیا۔ فائوس بچے کر کہ کچھ بھر سکیا۔

اس دوران ہال کا اندرونی دروازہ کھل چکا تھا۔ میں نے سونا کو دروازے پر کھڑے دیکھا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ ظاہر تھا اس وقت میں اس کی طرف جھلکی باندھ کر نہیں دیکھ

مجھے آنکھ ماری۔ میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

میں نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا لیکن جانو کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے عقب میں موجود تھا۔ اس نے گردن ذرا ترچھی کر کے سونیا کی طرف دیکھا اور باگاری سے حکم دیا۔ ”تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ اندر جاؤ۔“

”شو فیم ہو گیا کیا؟“ وہ اطمینان سے بولے۔

”شو کی بچی۔“ جانو نے دانت پیسے۔ ”میں کتا ہوں اندر جاؤ۔“

وہ ذرا بھی محروپ ہونے بغیر اسے بھی آنکھ مار کر بولے۔ ”میں تو کہتی ہوں تم اب گردہ کی سروائی سے دناڑ منٹ لے لو اور اس جوان کو سرواڑنا دلو۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس کی انگلیوں میں بیروں کی انگوٹھیں جگکا رہی تھیں۔ ”۳۰ سے سرواڑنا کر شاید تم زیادہ فائدے میں رہو۔ یہ تو پورا قلمی ہیرو ہے۔ ریڈی میڈ سڑا کر ثابت ہو گا۔ اس پر محنت نہیں کرنی پڑے گی۔“

”ایک تو ہمیں سوچ محل دیکھے بغیر ہر وقت بکواس کرنے کی عادت ہے۔“ جانو بھی سے بولا۔ ”میں کتا ہوں اندر جاؤ۔“

”تجارتی ہوں۔ جاری ہوں۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ”میں جانتی ہوں مجھے تو اندر ہی پڑے پڑے کل سڑا کر رہا ہے۔“

اس نے کٹ سے دو تازہ بند کر لیا۔ اس دوران جانو کے ایک آوی نے میرے قریب پڑی ہوئی کلا خوف اور دوسری دو تین تھیں بھی اٹھائی تھیں۔ اب کوئی گن میری رسائی میں نہیں تھی۔ کم از کم آسمانی سے تو میرے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی۔ مجھے اپنے جسم میں کی جگہ چوڑوں کا درد محسوس ہو رہا تھا۔ چہرے پر چپ چاپت بھی محسوس ہوئی۔ ہاتھ پیر کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میرے نچلے ہونٹ سے خون برس رہا تھا۔

جانو کے تین ساتھی بے ہوش تھے جنہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اب مجھے صرف دو تازے پر کھڑے ہوئے طورم نما شخص نے اپنی آشین گن سے گور کر رکھا تھا۔ دھیمکا دھیمکا میں اس نے حصہ نہیں لیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی درگت بننے دیکھ کر بھی گولی نہیں چلائی تھی۔ تاہم اس کے چہرے سے اندازہ لگنا مشکل نہیں تھا کہ وہ صرف جانو کے اشارے کا حکم دیتا رہا۔ اب کا مجھے چلتی کر چکا ہو گا۔

جانو نے ٹی دو بارہ اپنے لباس میں کہیں جھپٹا تھا اور کسی بڑ جلال لیکن شکر شمشاد کی طرح کمر ہاتھ باندھ کر ٹھٹھے لگا تھا۔ غیر سراسر طرح بے حس و حرکت رہا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں لیکن وہ ابھی تک کسمپاسبھی نہیں تھا۔ شاید دیوار سے ٹکرا کر اس کے سر میں کچھ زیادہ جوت آئی تھی لیکن جانو کو اس کے پاؤں سے کسی بھی بے ہوش ساتھی کے بارے میں شاید کوئی تشویش نہیں تھی۔

چند لمحے بعد جانو ٹھٹھے ٹھٹھے رک گیا اور پھر خیال انداز میں

سکنا تھا تاہم اس ایک جھٹک میں بھی میں نے اسے مسکراتے دیکھا۔ یقیناً وہ عام عورت نہیں تھی۔ درندوں کی اس بکھار میں رہنے والی عام عورت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر وہ عام عورت ہوتی تو بال میں برا خوشنک بنگامہ دیکھ کر روئے اور جھپٹ مارنے لگتی۔

اس نے روئے اور چپختے کے بجائے ایک ڈاکو کی کمر لٹا رسید کی جو پہلے ہی میری لٹا کھا کر دو تازے تک چا گیا تھا اور اگر سونیا بروقت اسے لٹا رسید کر کے دوبارہ آگے نہ بھیجی تو وہ اٹلے قدموں اس سے جا کھرایا ہوتا۔

میرے گرد بھیر بھٹ گئی۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ سب مل کر بھی مجھے قابو میں نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان میں سے دو تین نے تھیں اٹھائیں تاہم انہوں نے فائر کرنے کے بجائے انہیں ٹال کی طرف سے پکڑ کر بھیر ڈوں کی طرح استعمال کرنا چاہا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ کسی بھی گن کا دست اگر میری کھوپڑی پر پڑ جاتا تو ایسے ساری جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا۔

میں نے چند سیکنڈ ان دامنوں سے بھی نہ صرف اپنے آپ کو بچایا بلکہ ایک کی کھوپڑی ہونے کی گن کا دست دوسرے کی کمر بھی پڑوا دیا۔ وہ بلبلار کر اندر سے منہ دھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اگر میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹک گیا ہوتا تو میرے آوی کی تھمائی ہوئی گن کا دست میری کھوپڑی کو کم از کم دو حصوں میں تو تقسیم کر دیتا لیکن اور اس کی گن نیچے گئی اور اوپر میں نے اس کی پیلیوں پر لٹا رسید کی۔ وہ تقریباً جانو کے قدموں میں جا کر۔

د فٹا جانو دھاڑا۔ ”بند کرو یہ دھیمکا دھیمکا۔“

اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اب تک وہ کوئی دلچسپ تماشہ دیکھ رہا تھا لیکن چونکہ وہ ایک عجیبہ و شگن شخص تھا اس لیے تماشے کے بارے میں کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکا تھا لیکن اب تماشہ اس کی مرضی کے بالکل برعکس منہ اختیار کر گیا تھا۔ اب اسے روکنا ضروری ہو گیا تھا۔

جو لوگ ابھی تک حرکت کرنے کے قابل تھے وہ رک گئے۔ مجھے اپنے سامنے ہی ایک کلا خوف پڑی نظر آئی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے کھکا ہی تھا کہ جانو کی سرو آواز سنائی دی۔ ”اب زیادہ ہوشیار بننے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے اس لیے لڑائی بند نہیں کرائی ہے۔“

میں جھٹکتے جھٹکتے بروقت ہی رک گیا کیونکہ مجھے جانو کے ہاتھ میں ٹی نظر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی تھی۔ یہ برہمی شاید میرے لیے بھی تھی اور اپنے ساتھیوں کے لیے بھی لیکن اس کے عقب میں کھڑی سونیا میری طرف دیکھتے ہوئے دو تازہ سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ غمور سی تھیں اور ان کے گرد ملتے تھے۔ وہ اب بھی سرگند ہو لہذا انگلیوں میں دباؤ کھڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سرگند کا کش لیتے ہوئے



میری طرف دیکھتے ہوئے بڑا آیا۔ ”مجھے لگتا ہے تم بچ بول رہے ہو۔“

پھر وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”شاید درجیل خان نے اس شخص کو بھی اپنی سازش میں استعمال کیا ہے۔ اصل گڑبڑ یہی کر رہا ہے۔ مجھے پہلے ہی شک ہو رہا تھا کہ کچھ عرصے سے وہ کسی لیے چکر میں ہے۔ شاید وہ ہم سب کو بھانگنا لگا ہے۔“

”مکن ہے مال کا تھیلہ اس سے راستے میں کہیں گر گیا ہو؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ میں اب بھی درجیل خان کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ محض ایک رائے تھی۔ مجھے درجیل خان پر اب زیادہ بھروسہ نہیں رہا تھا۔

جانو عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ”اس نے ہمیں مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور تم اب بھی اس کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ بہت سی سادہ آوی معلوم ہوتے ہیں۔“

”شکر ہے ہمیں میری سادگی اور سچائی کا احساس تو ہوا۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”تم پہلے بھی اتنی ہی معقولت سے بات کر سکتے تھے۔ اتنی دھماچہ کڑی چانے اور آٹا بنگامہ بڑا کروانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”سچائی کو ذرا پرکھنا بھی پڑتا ہے نا۔“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ وہ بدبخت کچھ اذیت پسند معلوم ہوتا تھا۔ وہ گویا مجھ سمیت سب لوگوں کی حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ”کوئی کے بارے میں اگر دل مان بھی رہا ہو کہ وہ بچ بول رہا ہے تب بھی شوک بھار کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟“

”تمہارے خیالات پولیس والوں سے بہت ملتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بعض اوقات انہیں بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظلم بچ بول رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے عقیدت خاؤں میں اس کا شکر خراب کرتے رہتے ہیں۔“

”پلس۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ ہمیں پولیس والوں کی عادات کا اندازہ ہے۔ اب تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ جب تم ایشپز رجیم کل کے پتے چھو کہ تو تمہارا کیا مشر ہوگا۔“ جانو گویا اس وقت کا تصور کرتے ہوئے محفوظ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ بخیرہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہم یہ اعتقاد خیال دل سے نکال دو کہ مال کا تھیلہ درجیل خان سے کہیں گر گیا ہوگا۔ ڈاکوؤں کے اختیار کر جاتے ہیں وہ جان دے دیتے ہیں لیکن مال کو گرنے نہیں دیتے۔ اگر کسی طرح ایسا ہو بھی جاتا تو درجیل خان سیدھے سادے طریقے سے ہمیں پیغام بھیج سکتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے لیکن اسے معلوم ہے کہ اگر ایسا کوئی واقعہ ہو جائے تو ہم ڈاکو لوگ اپنے طور پر اس کی تحقیقات کرتے ہیں کہ واقعی ایسا ہوا ہے یا تمہارا کوئی ساتھی ہمیں چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ درجیل

خان کے دل میں چور ہو گا اس لیے اس نے ایسا پیغام نہیں بھیجا۔“ پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”خیر۔ اس شخص کو صرف درجیل خان ہی مل کر سکتا ہے لیکن فی الحال ہم اس کی طرف نہیں جاسکتے۔ اس میں بڑا غلطی ہے۔ شاید اب تک علاقے میں پولیس ہی نہیں، ریجنز بھی پھیل چکے ہوں اور اگر درجیل خان کا ذہن سازش کے راستے پر چل ہی پڑا ہے تو شاید اس نے ہمارے لیے بھی کوئی بندوبست کیا ہو۔ ہمیں چننا سونے یا مروانے کی کوئی ترکیب سوچ رکھی ہو۔ ابھی کچھ دن ہمیں اپنے اپنے بل میں سر جھپکا کر رہی رہنا ہوگا۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور کچھ سوچ کر بڑی بے پروائی سے بولا۔ ”اب تم جاسکتے ہو۔“

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی سیٹھ صاحب ملازمت کے کسی امیدوار کا رسمی سا انٹرویو لے کر قانع ہوئے ہوں اور جان چمڑانے کے لیے کہہ رہے ہوں۔ ”اب تم جاسکتے ہو۔“

”یہ بات تم پہلے بھی کہہ سکتے تھے۔ اتنی مہارت کرنا ضروری تھا؟“ میں نے ناگوار سے کہا۔

”شکر کہ اب بھی کہہ رہا ہوں۔“ وہ تھکے لہجے میں بولا۔ ”تم تو بہت سی ناگہم معلوم ہوتے ہو۔ اپنے پیروں پر چل کر صحیح سلامت جا رہے ہو۔ اس پر خدا کا شکر ادا نہیں کر رہے۔“

”خدا کا شکر تو میں ادا کر رہا ہوں۔ کاش تم نے ایسا سلوک کیا ہوتا کہ تمہارا شکر بھی ادا کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

”جئے مفلوک۔“ نظر آنے کے باوجود اس ڈیرے سے زندہ جا رہے ہوئے۔ ہمیں انداز ہی نہیں ہے کہ یہ کتنا زیادہ شکر کا مقام بھی ہے اور شکر کے کا بھی۔“ جانو غرایا۔

اسی دوران میری نظر اندرونی دوازے کی طرف گئی۔ میں نے دیکھا۔ سو یا ایک بار پھر دوازے پر کھڑی تھی۔ اب اس کا انداز ذرا مختلف تھا۔ شکر تھک ہوا اور اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ بٹلوں میں دسے گردن ٹیڑھی کیے کچھ اس طرح کھڑی تھی گویا کوئی نئی کٹاس مدام میں بلیک بورڈ پر لکھا ہوا سوال سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہر دو دوازے سے انداز میں مسکرا دی۔ اس نے صرف مسکراتے ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑی آواز سے میری طرف قدم بھی بڑھانے لگی۔ اس کی چال میں بڑا ظلماتی سا دھم تھا جیسے وہ کسی ایسی موسیقی کی دھن پر قدم اٹھا رہی ہو جو صرف اسے ہی سنائی دے رہی تھی۔

مگر دوسرے ہی لمحے مجھے کچھ یوں لگا جیسے اس کا توازن وجود ہی مختلف سازوں کا ایک حسین مجموعہ تھا۔ ہر ساز کی اپنی ایک لہر اپنی ایک دھن تھی جو ساز کی گرفت سے نکل کر اگ لگ ستروں میں پھوڑا کر جانا چاہتی تھی مگر نہ جانے کون سی قوت ان سازوں کو تھکی مدام میں کو ایک سراپا میں بیٹھے ہوئے تھی۔

جاؤ گے۔ رحیم گل جلدی کلک طلب کر کے اس علاقے کو کھنگال ڈالے گا۔ چاہے اس کام میں اسے مینوں لگ جائیں۔ کوئی بعید نہیں کہ اب تک وہ کلک طلب بھی کر چکا ہو۔ وہ خود بھی کسی گروہ سے کم نہیں۔ وہ اکیلا ہی ایک پلٹن کے برابر ہے۔ اس سے ٹھنڈا تو صرف ہم جانتے ہیں۔ تم اس کی دسترس سے دور جانے کی فکر کرو۔ مجھے تم پر رحم آیا ہے اس لیے تمہاری جان بھی بخش دی ہے اور صبح مشورہ بھی دے رہا ہوں۔“

حالا کہ اس وقت مجھے فصد نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنا فصد ان لوگوں پر نکال چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔ ”اے پاس ہی رکھو! ہمارم بھی اور اپنا مشورہ بھی۔“ میں ان میں سے ہر ایک کی شکل بہت غور سے دیکھ چکا تھا اور میری آنکھیں کمرے کی طرف دوسرے بے ہنگم سی شکلیں یادداشت کے انتہائی محفوظ خانوں میں ترتیب وار ڈال رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں ان میں سے کوئی ہی بھی شکل بھی نہیں بھولوں گا۔ محبت بھی بڑے کرشمے دکھائی ہے اور نفرت بھی۔ محبت کے بنائے ہوئے نفرت بھی بھی نہیں بننے اور نفرت کے بنائے ہوئے بھی۔ ان سب سے مجھے بڑی نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ سب سخرانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور شاید میرے مجبور غصے سے محفوظ ہو رہے تھے۔

میں تیزی سے مڑا اور دو آنے کی طرف بڑھا لیکن ڈرم فمائنٹس اسٹین گن کا مرغ میرے سینے کی طرف کیے میری راہ میں حائل تھا۔ عقب سے چار اور ڈاکو تھیں لے میرے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”یہ نہیں میری جان! ایسے آئے ہو پیسے ہی جاؤ گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“

وہ مجھے باہر لائے۔ تین آدمی مجھے گھول کی زد پر لے کر لڑے رہے جبکہ ایک نے دو بارہ میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور میری آنکھوں پر سیاہ کپڑا بھی لپیٹ دیا گیا۔ سارا دے کر مجھے گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ چند لمحوں بعد گھوڑا چل پڑا۔ میں دوسرے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی سن رہا تھا۔ وہ چاروں ہی غالباً میرے ساتھ جا رہے تھے۔ ”ہیل“ تمیسا اور مستی خان میں سے کوئی ان میں شامل نہیں تھا۔

اس بار ستر مجھے پہلے سے زیادہ طویل محسوس ہوا۔ خدا خدا کر کے ایک جگہ گھوڑا رکا اور انہوں نے میری آنکھوں سے کپڑا کھول دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے وہیں لے جا کر چھوڑیں گے جہاں سے لے کر آئے تھے۔ جانو کہ اس اڑے سے میرے لیے حاصل تباہ بانا آسان ہوا لیکن وہ ٹوک اب مجھے کہیں اور ہی لے آئے تھے۔

شام کے سامنے کمرے ہو چلے تھے اور اس دھندلے کے میں جہاں تک نظر کام کر رہی تھی وہ اتنی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ بہت دور کہیں چٹانوں کے بولے دکھائی دے رہے تھے۔ سورج تقریباً ڈوب

قریب آ کر اس نے سب کی چھٹی ہوئی نظروں کو غفلت انداز کرتے ہوئے اپنے اسکرٹ کی جیب سے ایک خوبصورت اور خوشبو دار دو مال نکالا اور میرا منہ پونچھنے لگی۔ میری قمیص کے ٹخن ٹوٹ گئے تھے۔ ایک سچن باقی تھا وہ بھی لٹک رہا تھا۔ گریبان پست چکا تھا ٹخن سونے سے چھڑھ پونچھنے کے بعد اس فکے ہوئے ٹخن کی مدد سے ی میرے گریبان کو کسی حد تک بند کرنے کی کوشش کی۔ یہ سارا عمل بے حد خوبصورت تھا۔

چہرہ سزا خیز کر نکلی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم شہزادی نہیں خوش قسمت بھی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس وقت قریب ہی جنگل میں کہیں اس کی قبر کھد رہی ہوتی لیکن ہوشیار رہنا، شاید جانو نے تمہارے لیے اس سے برا کوئی انجام سوچ رکھا ہو۔“

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جانو کے سامنے ہی مجھے جانو کے کہنے میں سے خبردار کر رہی تھی۔ وہ واقعی عجیب عورت تھی۔ جانو شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دبا ڈالا۔ ”اب بس بھی کر فکور نس مانتا۔ شکل کی اولاد۔ اب کہیں اسے بلا کر اس کی مرہم پٹی مت شروع کر دیتا۔ کوئی بھی اچھا سا چودہ دیکھتے ہی تمہاری ہوسریاں جاگ اٹھتی ہیں۔ اپنے آپ میں رہا کر دو ورنہ کمال کھینچ کر کسی درخت پر لٹکوا دوں گا۔“

میں اس کی زبان سے فکور نس مانتا۔ شکل کا نام صحیح تلفظ کے ساتھ سن کر چونکا۔ شب مجھے پہلے بھی ہو رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا شخص تھا اب تو یقین سا ہونے لگا۔

سونیا نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ اسے جانو کی کوئی پروا نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں لرزتی ہوئی کچھ پڑھائیاں بتا رہی تھیں کہ دل ہی دل میں وہ اس سے خوفزدہ ضرور تھی۔ اس نے برا سامنا کرنا ”آدمہ!“ کہنے ہوئے ہاتھوں چٹا لیکن واپس دوواڑے پر چلی گئی۔ ”آدمہ وہ اندر نہیں گئی“ چو کھٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

جانو برہمی سے میری طرف دیکھتے ہوئے گر جا۔ ”اب دفع بھی ہو جاؤ یہاں سے۔ یہاں کھڑے کھڑے تم بہرہ نہیں بن جاؤ گے۔ اس عورت کے چکر میں نہ آنا۔ مردوں کو پونسی اٹوٹانا اس کا مشغلہ ہے۔ یہ مت سمجھو لیا کہ کچھ تم پر فدا ہو گئی ہے۔“

میں خاموش رہا۔ اگر سونیا کچھ بھی مجھ پر فدا ہو جاتی تو میرے لیے کیا فرق پڑتا تھا؟ میں تو اس وقت کچھ اور ہی طرح کے حالات میں پھنسا ہوا تھا۔ میری ضرورتیں کچھ اور ہی تھیں۔ زندگی کی کھٹائیاں میں دہانے کے تصور کی سستی بھی کہیں کھو گئی تھی۔

جانو اب بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرا چہرہ سیاہ رہے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ تیزی سے بولا۔ ”مگر تم واقعی سچے ہو اور اس علاقے میں انہی ہو تو جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ کسی شہر کا رخ کر دو ورنہ بے موت مارے

یہی کہہ نہ سکے کہ جاتا تھا۔ میں پوری طرح چونکا تھا کہ میرے الفاظ پر کسی کی غیرت یا ایک کچھ زیادہ نہ جاگ اٹھے اور وہ اسٹین گن یا گلاشکوف استعمال کرنے کا فیصلہ نہ کرالے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ اپنے سردار کے احکامات پر حرف بہ حرف عمل کرنے کے عادی تھے میں نے جسے گالی دی تھی وہ بھی جواباً مجھے اس سے موٹی گالی دے کر گھوڑے سے چلا گیا لگاتے ہوئے بولا ”ڈرا پیچے آ۔“ میں گھوڑے سے اترنے لگا تو ایک اسٹین گن والے نے بال میرے سینے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ”بس۔ بس۔ زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔“

پھر وہ اسی گن کا رخ اپنے ساتھی کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔ ”رک جاؤ گلاب! جانو نے جتنا بولا ہے اتنا ہی کرو۔ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ ہم میں سب سے زیادہ عقل والا دی ہے وہ بہتر سمجھتا ہے کہ ہمیں کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ اگر اس آدمی کو مارنا ہو تو زیادہ اپنے سامنے نہیں مروا سکتا تھا؟“

وہ شخص جسے گلاب کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوا گویا بادل خواست اپنے گھوڑے پر جا بیٹھا۔ سردار کا نام سننے ہی گویا اس کی عقل اور حواس دوبارہ اعتبار سے کام کرنے لگے تھے ہاتھوں کے سلسلے میں مجھے اکثر دیشرائی زندگی میں قدم قدم پر جو قصائد یاد کیئے کا موقع ملتا تھا وہ بھی اس کی ایک مثال تھا۔ نام اس کا گلاب تھا لیکن وہ سر تپا ایک خاردار جھاڑی تھا۔ بادل تھا۔ وہ اور کچھ بھی ہو سکتا تھا گلاب ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ گلاب والی کوئی ایک خصوصیت بھی اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔

وہ سانولہ اور کرشت صورت تھا۔ اس کی آواز تک گھردری تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بخیر اور درخش جسم کا مالک تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنی جسمانی طاقت کے بل پر کچھ کارنامے بھی دکھائے ہوں جن کی وجہ سے وہ اپنے ہاتھوں میں غمخیز میں جلا ہو۔ اس کی شخصیت میں کچھ کچھ رائل خان کی جھلک تھی۔

جس گھڑسوار نے گلاب کو زیادہ بھڑکنے سے روکا تھا میں نے اس سے پوچھا۔ ”اگر میں حاصل آباد جانا چاہوں تو مجھے کس سمت میں سفر کرنا چاہیے؟“

”اس سمت میں۔“ اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”تو میرے ایک بات چادروں۔ حاصل آباد جا کر بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جدھر دل چاہے۔ منہ اٹھا کر بھرتے رو۔“

صاف ظاہر تھا کہ وہ میری رہنمائی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے مزید کچھ نہ پوچھا۔ یہ بات بھی عجیب سی تھی کہ انہوں نے زیادہ تفصیل سے میری حاشا نہیں لی تھی۔ نقش میری جیب میں

یہی چکا تھا تاہم ابھی شفق کی سرخی سے سمت کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

میرے ساتھ آنے والے چاروں افراد کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکو تھے۔ وہ نہایت نفیس قسم کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ پیروں میں شاندار جوتے تھے۔ عمدہ واسطیں زیب تن کیے ہوئے تھے۔ سروں پر کلف لگی سفید چپڑیاں تھیں۔ میرے ساتھ دھینگا مٹی میں ان کے میلے ذرا خراب ہوئے تھے لیکن زیادہ میرا ہی غلبہ خراب ہوا تھا کہ یہ کسی اکیلا تھا۔ تاہم وہ اب بھی معززین ہی نظر آ رہے تھے جبکہ میں ڈاکو دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ معاشرے کا چلن ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا۔ ڈاکو معزز دکھائی دیتے تھے! شرفا خچر جوڑے نظر آتے تھے۔

جس نے میری آنکھوں سے کپڑا ہٹایا تھا اس کا گھوڑا میرے گھوڑے سے تقریباً بڑا کھڑا تھا۔ وہ عمارت اسپر انداز میں میرے منہ پر طغیہ رسید کر کے بولا۔ ”جاؤ جا رہے ہو بھی کہ اب یہ دیکھنا ہو ایگنہ۔ پیش کر رہے امیری قسمت! اچھی تھی۔“

میرے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے تھے میرے اندر مل کھاتے ہوئے قدرت کے آتش فشاں نے ایک مجبوری کر ڈالی۔ میں نے طغیہ مارنے والے کو موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”تم جیسے لوگوں کی بچکانی ہوتی ہے کہ وہ تعداد میں کہیں زیادہ ہوتے ہوئے ہاتھوں میں اسلحہ رکھتے ہوئے بھی ایسے نیٹے لوگوں کو مارتے ہیں جن کے ہاتھ تک بندھے ہوتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کے منہ پر تھوکنے کی بھی کوشش کی لیکن اس نے پھرتی سے سر جھٹکا کر اپنے آپ کو بچالیا۔

وہ سیدھا ہو کر سفاکانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اسی تمہاری حسرت پوری کر دیتا ہوں۔“ اس نے پھرتی سے میرے ہاتھوں کی بندشیں کھول دیں اور بولا۔ ”تمہیں شاید اپنے ہاتھوں میں بہت خوش قسمتی ہوئی ہے۔ اس بے ہودہ جھگڑے اور افراد تقری میں ہم تمہیں جلاوطن نہیں کر سکے اور اتفاق سے غیصہ پر بھی تمہارا ذرا صبر ہاتھ پر نہ گیا لیکن میں غیصہ نہیں ہوں۔ یہاں ذرا کھلے میدان میں دیکھ لیتے ہیں تم کتنے پانی میں ہو۔“

”تم واقعی غیصہ نہیں ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسے نظروں ہی نظروں میں ڈولا۔ ”وہ تو ایک گھونسا بھی گیا تھا تم شاید وہ بھی نہ سہہ سکو۔ تم آٹھ دن گتے کے پلے لی کر کچھ نہیں کر سکتے۔ اب اکیلے تم کو من سا ہوا تو زلو گے؟“

میرے ہاتھ کھل چکے تھے پاؤں پہلے ہی آزاد تھے اور جب میرے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے تھے تو میں آٹھیں بھٹیادوں کے سامنے بھی اپنے آپ کو پُر اعتماد محسوس کرتا تھا۔ گودھن کے کسی نادر یک گوشے میں اندیشے تو موجود رہتے تھے لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ بعض اوقات کسی کی فروغیت دیکھ کر میرے لیے خاموش رہنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اپنے آپ پر ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے

تھیں کہ اب ان کے آسمان ہونے کا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا کہ شاید لاشعوری طور پر میں اس سارے طیلے کو اپنے لیے معیشت کے بجائے ایٹوم بومب محسوس کرتے ہوئے اس سے محفوظ ہوا تھا۔ شاید میں خود بھی ان کے مصائب سے نکلنے کا کچھ زیادہ شدت سے خواہش مند نہیں تھا۔ یہ ایک عجیب سی کیفیت تھی۔

صبح بیدار ہونے پر میں اپنے آپ کو بالکل چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے جو چوبیس گنگ چکی تھیں وہ ٹھنڈی ہونے کے بعد تکلیف دہ کی لیکن تکلیف اناکم ہو چکی تھی۔ کچھ کھانے کی طلب ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن بھوک اتنی نہیں تھی کہ میں بے چین ہو جاؤں۔

میں ایک بار پھر منہ آتھہ دھو کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا بھی تازہ دم نظر آ رہا تھا۔ میرے تین طرف ہاڑیوں نے دائرہ سا بنایا ہوا تھا۔ چوتھی سمت میں گویا ویران، چھیل اور نیم صحرائی میدانوں کی طرف جانے کے لیے دروازہ کھلا تھا۔

اب سوچ نکل آیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر نقشہ یاد آیا۔ میں نے گھوڑے پر بیٹھ ہی بیٹھے اسے جب سے نکال کر پھیلایا۔ اس میں ایک نہیں بلکہ تین مقامات پر اس طرح نیم دائرے میں ہاڑیوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اب میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ان میں سے کس طیلے کے پاس کھڑا تھا۔ جانور کے آدھیں نے ایک طویل سبز کے دوران میری آنکھوں پر پڑی باندھ کر گویا مجھے بھکا دیا تھا۔ اگر تمام نشانیاں میری نظر سے گزرتی تو میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل نہ ہو کہ اس وقت میں کہاں کھڑا تھا۔

سوچ کر کچھ کر میں نے سمتوں کی مدد سے جبکہ کاتھین کرنے کی کوشش کی۔ میں ذریعہ حسام خان یا حاصل آباد جانا چاہتا تھا لیکن سمت کے بارے میں یقین نہیں تھا۔ میں دیر تک تھکے گئے ہوئے تھا۔ اب ایسا لگتا تھا کہ اب وہ بھی میرے لیے بیکار ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ سُرخی ہاڑیوں کا جائزہ لیا مگر وہاں مجھ سبز چند پردوں کے سوا مجھے کوئی بھی ذی روح دکھائی نہ دیا اور نہ ہی کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر آئے لیکن میری رنگ دہے میں ایک خفیف سا اضطراب برہم حال جاگ اٹھا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے بالکل پُر سکون ہو کر اپنی حیات پر ذرا زیادہ بوجھ ڈالنے کی کوشش کی، 'میں کسی ایک خطلے پر مرکوز کرنا چاہا۔ تب مجھے ہوا کا سینہ دھڑکن ہوا محسوس ہوا۔ شاید یہ کسی اور کے دل کی دھڑکن تھی جس کا ارتعاش ہوا کے ٹھیک خرام جھونکوں کی مدد سے مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ میرے اعصاب شاید الیکٹرک آلات کی طرح غیر منظمی شکل وصول کر رہے تھے۔ میں اگر کہیں چھپنے یا آڑ لینے کی کوشش کرتا تو اس نامعلوم

اب بھی موجود تھا لیکن میں ان کی موجودگی میں اسے کھول کر دیکھتا نہیں چاہتا تھا۔

جب تک وہ رخصت ہوئے تب تک اندھیرا کچھ اور گہرا ہو چکا تھا۔ نقشہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کے رنگ بہت رند لے اور حروف و نشانیاں بہت باریک تھیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ اس کا سائز زیادہ بڑا نہ ہونے پائے اور اس میں زیادہ سے زیادہ علاقہ گور کر لیا جائے۔ وہ نقشوں والے مخصوص کاغذ پر بنا ہوا تھا اس لیے خاصا بوسیدہ ہونے کے باوجود ابھی پڑنا نہیں تھا۔

میں نے نقشے والی جیب کو خوب چھپایا اور گھوڑے کو اڑا رکھا۔ بری اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا 'قافی' الحال میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ ہاڑیوں کی سمت میں ہی سڑکوں۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا لیکن سُرخی آسمان کے پس منظر میں ان ہاڑیوں کے ہونے مجھے اب بھی نظر آ رہے تھے۔ ہاڑیوں میں عام طور پر کوئی نہ کوئی ایسی جگہ ل جاتی ہے جہاں موسم کی نامرانیوں سے قدرے محفوظ رہتے ہوئے رات گزارا جاسکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اسی سمت میں سڑ

میرے ہاڑیوں کے قریب پہنچنے تک ایڑا کی آہنیوں کا چاند بھی نکل آیا۔ چاروں طرف نہایت معمولی سی روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا، ہاڑیاں تو سنگلاخ تھیں لیکن نیچے ارد گرد ہرگز موجود نہ تھیں۔ چھوٹی موٹی کھانیاں بھی تھیں جن میں بارش کا پانی جمع تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگام نکال کر اسے کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک کھائی کے کنارے بیٹھ کر ذرا 'تفصیل' سے ہاتھ منہ دھوئے گا۔

میرا یہ ہاتھ منہ دھونا آدھا نمانے کے برابر تھا۔ پانی کی آغوشی فرحت بخش سی تھی۔ قدرت نے اپنے بعض جوہروں اور مٹی خاؤں میں بھی نہ جانے کیا کیا خصوصیات سمیٹی ہوئی ہیں۔ ہاتھ نہ دھونے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بے حد تازہ دم محسوس کیا۔ اب مجھے صرف اپنا سیاہ لباس گراں گزر رہا تھا لیکن فی الحال اسے جسم پر چھانے دیکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

چند منٹ اور دھو کر گھومنے پھرنے کے بعد آخر کار مجھے شب نکالنے کے لیے بھی ایک مناسب جگہ مل گئی اور میں ایک چھر پڑنے لگا۔ دیکھ کر ایٹم گیا۔ گھوڑا مٹا کڑے کڑے سی سوجاتا ہے۔ میں نے اسے قریب ہی ایک ہموار جگہ پر بٹھایا تھا۔ قافی الحال ہو کر میرے لیے بہت اہم تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رات کے گہرے تاریکی میں اندھیرا کسی طرف نکل جائے۔ لگتا تو یہی تھا کہ وہ یہ مجھ سے ہٹے ہو چکا تھا لیکن حیوان بہر حال حیوان ہے۔ اس لحاظ سے میں یقین سے کوئی بات نہیں کہیں کسی جاسکتی۔ ویسے بھی میں ان کا اصل ٹانگ نہیں تھا۔ فی الحال وہ میرا جتنا ساتھ دے رہا تھا تو بڑی نعمت تھا۔ پیدل تو بیکار ویرانوں میں پھرتے پھرتے نہ ملے میرا کیا ضرورت پڑے۔

غلابہ فوق مجھے بڑی اچھی نیند آئی۔ شاید مشکلیں اتنی بڑی

تھی۔ میں نے امید کے سارے سخر چاری رکھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا کہ ابھی تک میرا کسی انسان سے سامنا نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ انسان انشکڑ وجم کل بھی ہو سکتا تھا لیکن انسان کی شکل نظر نہ آنے کی وجہ سے میرا دل بھی گھبرائے ساگ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دنیا سے میرا رابطہ کٹ گیا تھا اور میں کسی انہنی سیارے پر بھر رہا تھا۔

آخر کار وہ ہرے کے قریب میں ایک جنگل تک جا پہنچا۔ ایک بار پھر میں نے نقشہ نکالا۔ اس میں جنگلات کے ایک بہت طویل سلسلے کے علاوہ چھوٹے موٹے کئی جنگلات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ میں نے سمتوں اور فاصلے وغیرہ کی مدد سے تعین کرنے کی کوشش کی کہ یہ کون سا جنگل ہو سکتا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو اس جنگل کے پار آبادی ہونی چاہیے تھی۔ آخر کار میں اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گیا۔

شاید جنگل ایک لمبی سی پٹی کی صورت میں تھا۔ نقشے سے کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا اور مجھے اس کی لمبائی نہیں پتہ چلائی تھی۔ پڑی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اس میں جھٹکا نہیں تھا۔ درخت چھوڑے ہی تھے۔ صرف آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد میں دوبارہ مکھلے میں پہنچ گیا۔

میرا ایک میل کا سفر کرتے ہی مجھے بہت دور تک ہرے ہرے کھیتوں کا سلسلہ بچھلا ہوا دکھائی دیا۔ انہی کے میں مشرقی کالی دور مجھے درختوں میں گھری ہوئی ایک حویلی کی جھلک بھی دکھائی دی۔ کھیتوں کے دوسری طرف کالی چھپے بہت کراک ایک گاؤں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کالی بڑا گاؤں معلوم ہوتا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے صحیح طور پر دیکھنا مشکل تھا کہ مکانات کا سلسلہ کہاں تک بچھلا ہوا تھا۔ اگر نقشے کی مدد سے میں صحیح سمجھ رہا تھا تو اس کا نام ذرا تاج تھر ہونا چاہیے تھا۔

حویلی سے کچھ دور چلے اور ہوا میدان میں کچھ لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اگر یہ زمینیں کسی ایک ہی شخص کی ملکیت تھیں تو وہ یقیناً کالی بڑا زمیندار تھا۔ میں کچھ آگے بڑھا تو منظر کچھ اور واضح ہوا۔ میدان میں باہر چندہ افراد قماشائیوں کے سے انداز میں کھڑے تھے۔

ان کے سامنے ایک شخص کتہنی رنگ کے گھوڑے کی نگام پکڑے کھڑا تھا۔ گھوڑا ہر لمحے دو لمبے بعد غصہناک سے انداز میں ہنسا کر دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تھا اور کبھی دو ٹپ پلانا تھا۔ وہ شخص اس کی نگام سے تقریباً لگ کر اسے اپنی جگہ پر کھڑا رکھنے کی سلسل کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ غالباً اس پر سوار ہونا چاہتا تھا لیکن اسے نہ تو اس کا موقع مل رہا تھا اور نہ ہی شاید اس کی جگہ پڑی تھی۔

ان سب سے بہت کراک ایک طرف کو کوئی عورت کھڑی تھی۔ ایک تو اس کا رخ میری طرف نہیں تھا۔ دوسرے اس نے سر

انسان کو معلوم ہو جائے کہ میں اس کی موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہوں پھر شاید وہ فوری طور پر ہی کچھ کرگزرتا۔ اگر میں اس کے نشانے پر تھا تو وہ بڑے اطمینان سے مجھے کوئی مار سکتا تھا۔ میرے پاس تو اس وقت کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

اگر کوئی شخص واقعی کہیں موجود تھا تو نہ جانے وہ کس انتظار میں تھا۔ میں چند لمبے بالکل ساکت گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ میرے اعصاب پر سخت جاکو تھا۔ میں تو انسان تھا اور اپنی حیات کو غیر معمولی سمجھتا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس وقت تو شکل اس بے زبان گھوڑے کو بھی موصول ہو رہے تھے۔ یا پھر شاید وہ میرے ہی اعصاب کی کشیدگی تھی جو میرے کس کے ساتھ اس کے بدن میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ وہ بھی بالکل ساکت کھڑا تھا۔ دم تک نہیں ہلا رہا تھا۔ اس کے کان بھی بالکل سیدھے اور ساکت تھے۔ وہ کان نہیں کھولا۔ چھوٹے چھوٹے انتباہ تھے جو کسی دم سے مدھم مدھم آواز کا شکل دینے لگے تھے۔

آخر کار یہ جاکو یہ کشیدگی یہ سکوت میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ میں نے تن پر تھوڑے ہو کر گھوڑے کو اڑا لگادی۔ وہ رفتی بے زبان یکدم کان سے لٹکے ہوئے تھری طرح ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں شکر رہا کہ کسی سمت سے کوئی کوئی آئے کی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دیرانے میں گھوڑے کی ٹاپوں کے سوا کوئی آواز نہ ابھری۔

آخر کار ہا زباں کافی پیچھے رہ گئیں۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے گھر کر دکھا۔ اگر ہا زباں میں کبھی کوئی چھپا ہوا تھا تو اب تک اسے نکل آنا چاہیے تھا لیکن اپنے عقب میں مجھے اب بھی کوئی نظر نہ آیا۔ میں حیران تھا کہ کبھی اسے مختصر سے عرصے میں صوبتیں اٹھا کر میری حیات ناقابل اعتبار تو نہیں ہو گئیں گی۔ کبھی مجھے دھوکا تو نہیں دینے لگیں گی۔ مجھے یہ مذاق تو نہیں کرنے لگیں۔

جب مجھے اپنے سوالوں کا کوئی قسلی جتنی جواب نہیں ملا تو میں نے بے مہرئی وقت کی دعوں میں سڑکے کرتے کرتے ایک بار چھپے پردائی کی چادر اوڑھ لی۔ سورج سر پر آگیا لیکن کسی آبادی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ قیمت تھا کہ موسم میں اتنی جدت نہیں تھی۔ خوشگوار اور قاصی تیز ہوا چل رہی تھی۔

اسی دوران ایک بار پھر اس احساس نے مجھے متحرب کرنے کی کوشش کی کہ کسی نہ کسی سمت سے وہ آگئیں میری جانب ٹھہرائیں جس میں جب میں نے رک کر ہا زباں طرف کا جائزہ لیا تو کبھی کسی کو موجود نہ پایا۔ آسیب اور بھوت بہت پر فحشے تعین نہیں تھا ورنہ شاید اسی جواز سے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔

دن دھنٹے لگا تو مجھے کچھ تشویش ہی ہونے لگی کیونکہ ابھی تک کسی آبادی کی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے ہوک بھی سامنے لگی

ہو جاتی تھی۔

اس کی رحمت میں چاندنی اور گلاب گندے ہوئے تھے۔ اس کا تھ چھٹ سے کچھ کم ہی رہا ہو گا اور اگر عورت کا تھ اتنا ہو تو وہ کچھ زیادہ ہی دراز تھ معلوم ہوئی ہے۔ وہ جیسے جیسے دیکھتے دیکھتے اور شرح رنگوں کے لباس میں تھی اگر وہ لباس کی اور عورت پر ہوتا تو شاید وہ کچھ گھوار معلوم ہوئی لیکن اس پر وہ لباس کچھ اس طرح چھب رہا تھا جیسے وہ چیزیں ہی صرف اسی کے لیے ہوں۔ بعض لوگوں کی شخصیت لباس کی وجہ سے گھر آتی ہے اور بعض شخصیتوں کی وجہ سے لباس کو نکھار لی جاتا ہے۔

بظاہر وہ گلاب کی زانی کی طرح نازک اور پیکلی نظر آتی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر ایسا احساس بھی ہوا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ فواد کی دیوار بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے زندگی میں دو یا تین عورتیں ہی ایسی دیکھی تھیں جنہیں ہلاکی حسین کہا جاسکتا تھا۔ آج میری اس مختصری فرست میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی انفرادیت یہ تھی کہ اس کا حسن غاصتاً مشرقی تھا۔ میرا خیال تھا کہ اتنا بھرور مشرقی حسن اب صرف ہندوستان میں ہی باقی رہ گیا تھا۔ آج کے دور میں اگر قدرت نے کسی عورت کو بھرور مشرقی حسن سے نوازا بھی ہوتا ہے تو وہ خود ہی اسے کوئی نہ کوئی مغربی بچہ دے لیتی ہے۔ لیکن اس عورت نے اپنے حسن اپنے بچہ اپنے گھلے اپنے لباس میں کیس بھی مغربیت کی طاوت نہیں کی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک خاص اور شانہ مشرقی حسن کا شاہکار تھی۔

وہ ایک ٹنگ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میرے خوابیدہ سمندروں میں جیسے بخار بھاتا سا پہل چلائے لگا تھا۔ وہ کچھ ایسی حکمت سے کھڑی تھی جیسے کوئی ٹنگ اپنے دوپار میں داخل ہوئی ہو لیکن سامنے ہی کسی ایسی کو موجود پا کر اس کی چاندی جبین پر سوالیہ حنن ابھر آئی ہو۔ قہرے کمانوں میں شیرازوں یا ٹنگوں کا ذکر پڑھ کر ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے وہ اس پر پورا اترتی تھی۔ لی دی یا ظم والے اس تصور میں رنگ بھرے کی اپنی ہی جو کوششیں کرتے ہیں وہ اس عورت کو دیکھنے کے بعد محض مذاق محسوس ہونے لگی تھیں۔ اس کے سر پر صرف ایک آنچ کی کٹی تھی ورنہ یہ گمان گزرتا کہ کوئی شیرازی تاج کے اوراق سے یا خادوں کے جموگوں سے نکل کر چپکے سے اس جہان خرابی میں چلی آئی ہے۔

وہ شخص جو گھوڑے کی گام پکڑے اس سے دور آزمانی میں مصروف تھا اس دوران میری آمد سے بے خبر رہا تھا۔ وہ جست لگا کر گھوڑے پر سوار تو ہو گیا لیکن سرخس اور طاقتور گھوڑے نے فوراً تحفہ ناک انداز میں ہوا میں اچھل کر اور کئی بار دو تیاں چلانے کے بعد آخر کار اسے پشت سے جیسے بچا لیا لیکن آدمی بہر حال جاندار تھا۔ اس نے گام نہیں چھوڑی۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور دوبارہ گھوڑے سے دور آزمانی کرنے لگا۔

مگر وہاں موجود سب افراد نہایت خاموشی سے مجھے ٹھہرے میں

اجرک نما ایک چادر لی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں اس کے بہنے کی صرف معمولی سی ٹھنک دیکھ پا رہا تھا اور اتنے فاصلے سے بھی نہ دیکھنے کے برابر تھی لیکن اس کے لباس کے رنگ بہت تیز اور بھلے تھے۔ اتنی دور سے بھی کپڑوں کی چمک دمک کا احساس ہوا تھا۔

کچھ منظر سے اشارت کی لمبی سی گھیر وار لیس تھی جس میں کئی ایک نظر آ رہے تھے۔ سبز سامن کی شلوار تھی اور ذری کے کام والے نہایت خوبصورت جوتے تھے جو دوڑے ہی چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سر ہاتھ تک دمک تھی۔

وہ یقیناً ایک دراز تھ عورت تھی اور تن کر کھڑی ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی دراز تھ لگ رہی تھی۔ وہ سب لوگ آپس میں کچھ اپنی اپنی کر رہے تھے لیکن ہوا کے دوش پر مجھ تک شخص ایک بے انتہا اور تھم سی جھنجھٹا ہٹ سی پہنچ رہی تھی۔ تماشاخوں کے سے اوڑھیں کھڑے مردوں میں سے مجھے دو کے پاس رانٹیں اور ایک کے پاس کا شکوف نظر آئی۔ کا شکوف ان دور آٹھ علاقوں میں کی نہ جانے کس کس کو شے تک پہنچ چکی تھی۔

چند لمے میں وہیں ایک درخت کی اوٹ میں گھوڑا دو کے رہنا رہا کہ مجھے ان کے قریب جانا چاہیے یا نہیں؟ اگر میں ان لوگوں کی نظر میں آئے بغیر گاؤں تک پہنچا چاہتا تو مجھے بہت ہی طویل پر کاٹنا پڑتا۔ پھر بھی امکان یہی تھا کہ دوسری طرف کیتوں میں ہر دو لوگ مجھے دیکھ لیتے۔ گھوڑا ایک بار پھر نہ حال نظر آ رہا تھا۔ اسے مزید کئی میل کا پھر لگانا فزادتی محسوس ہوا تھا۔

آخر کار میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ میں اتنی دیر سے لاپرواہی اور انسانوں کی تلاش میں تھا۔ اب آبادی اور انسان نظر آ رہے تھے تو ان سے کھڑانے کی کیا ٹنگ تھی؟ میں نے گھوڑے کو ابھانکی اور وہ بے جاہ اپنا کاپٹا ایک بار پھر گھڑائی پر لگایا۔

چند لمے بعد میں ان لوگوں کے قریب جا پہنچا۔ سب سے پہلے اوٹ نے گھوڑے کو میری طرف دیکھا اور میں نے بے اختیار گھوڑے کی گام کھینچی۔ گھوڑا وہیں جم کر رہ گیا اور اس کے ساتھ لگا لگا میرا دل بھی ساکت ہو گیا، دھڑکنہ بھول گیا۔ میں بالکل بہت سا ہو کر رہ گیا۔

وہ عورت تھی ہی ایسی۔! بیہوش کر دینے والی! مگر کر دیکھنے والی! کچھ رہنا دینے والی!

اس کی حوتی موٹی سیاہ، لفظی ہی آنکھوں میں شاید قدرتی کاہل کا ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں ان سمندروں کا سا گھبراہٹ تھا جن کے گھاؤں پر طوفان دھک دے رہے ہوں۔ بے پروائی سے سر ہٹائی ہوئی چادر تھی اس کے بال سیاہی کے آشکار کی طرح پہلے اترتے تھے اور ہوا کے دھبے جموگوں کے ساتھ اس آبشار میں لڑکی کی پیرا ہوتی تھیں تو ذوق سے سوچنے کی گھنٹی بکروں کی وجہ سے ان بالوں میں آئینے کی سی جھلک ثابت پڑا ہوتی تھی اور معدوم

لے چکے تھے۔ اب میں نے دیکھا وہ تھوڑا دیر چار تھے۔ ان میں سے دو کے پاس کھانسی لیس اور دو کے پاس چائے کی راکھیں تھیں۔ چاروں گھنوں کا رخ میری طرف تھا اور وہ چاروں افراد گویا اس عورت کے لب بٹے کے خنجر تھے جو اپنی لمبی گیلی سیاہ گھنیری چکل کو حرکت کی زحمت دیے بغیر نہایت خاموشی سے پُر خیال انداز میں میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی تھیں نے ٹھیکانہ سے لمبے میں کہا۔ ”یہ کون امتحان ہے جو گھوڑے کے رگ پٹوں سے واقفیت حاصل کیے بغیر اسے زیر کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟“ میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو کچھ تو شقت کے باعث اور کچھ شاید خجالت کی وجہ سے بیٹے بیٹے ہو رہا تھا مگر اوڑھل گھوڑے کے ساتھ خود بھی بدستور اوڑھل رہا ہوا تھا۔

میں نے اسے اندازہ خطاب سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ جو لوگ مجھے گھیرے میں لے کر گھنوں کی زد پر لے چکے تھے ان کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس مرد قامت عورت نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ چلکیں چمکائیں اور ان جمیل سی آنکھوں میں گویا لہریں پیدا ہوئیں جو فوراً ہی معدوم ہو گئیں۔ وہ بولی تو اس کی آواز میں آبشاروں کا سا زخم بھی تھا اور باؤنچک خرام کا سا گھراؤ بھی۔ اس نے بھی گویا باقی ہر چیز کو نظر انداز کر دیا اور اسی موضوع پر رہتے ہوئے بول۔ ”تم غالباً یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم اس گھوڑے سے بہتر طور پر نمٹ سکتے ہو؟“

وہ بدستور ایک ٹنگ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں گویا چٹروں کو بھی شق کر سکتی تھیں۔ بہت اونگھی بہت تالیب عورت تھی وہ۔ معلوم نہیں اس آبیاز اور بے ہودہ سے علاقے میں کہاں سے آئی تھی۔

”آپ بالکل درست سمجھیں۔“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی اور اپنا لہجہ دانستہ طور پر مٹوایا۔ رکھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں ان سوالوں سے کم از کم سرورست توچ گیا تھا جن کا مجھے اندیشہ تھا۔ میرا لباس میری قد کا انداز سب کچھ مشکوک تھا۔ میری صورت میرا لہجہ اپنی تھا۔ اگر مجھ سے بے دریغ سوالات کیے جاتے تو یہ ایک فکری ہی بات ہوتی لیکن میں کم از کم دو ترقی طور پر انہیں دوسری طرف الجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”آؤ۔۔۔ تم بھی اپنی حسرت نکال لو۔“ عورت نے اشارہ کیا۔ میں نے گردن کو ذرا خم دیا اور گھوڑے سے اتر آیا۔ میں نے دیکھا گھوڑے سے زور آزمائی کرنے والا شخص خون آشام نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے سے زور آزمائی اس نے بند کر دی تھی تاہم گام بہ دستور مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

اسی دوران گھوڑے نے بھی شاید یہ دیکھ کر کہ وہ شخص اس کی طرف متوجہ نہیں تھا گام کو مزید ایک زوردار جھٹکا دیا جس سے وہ منہ کے بل زمین پر جاتے جاتے پھل۔ اس کی خجالت کچھ اور بڑھ

گئی۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید وہ گھوڑے پر چاکیوں کی بارش کر دیتا۔

میں نے لگام اس کے ہاتھ سے نہیں لی بلکہ پہلے گھوڑے کے گرد ایک چکر لگایا۔ حیوان اتنے بے عقل نہیں ہوتے جتنا ہم انہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے زندگی میں یہ بھی ایک قیمتی تجربہ حاصل کیا تھا اور اکثر اس سے استفادہ کیا تھا۔ خاص طور پر میں نے سرکش گھوڑوں کو اچھا خاصا ذہین محسوس کیا تھا تاہم میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ ذہین ہونے کی وجہ سے سرکش ہوتے تھے یا سرکش ہونے کی وجہ سے ذہین ہوتے تھے۔

جس طرح بعض ذہین انسانوں میں بھی متاثر ذہانت کے باوجود ایک طرح کی شیطانیت اور خجالت سی ہوتی ہے، اسی طرح سرکش گھوڑے میں بھی بے شمار خوبیوں کے ساتھ ساتھ قہوڑی سی خجالت ہوتی ہے۔ اگر ذہین انسان کی خجالت دب جائے اور وہ تعمیری راہ پر لگ جائے تو وہ بڑے روشن کارنامے انجام دے سکتا ہے ورنہ دنیا میں بڑا خفاہ چھانچا ہے۔ اسی طرح سرکش گھوڑے کی خجالت اگر دب جائے تو وہ بے مثال گھوڑا ثابت ہوتا ہے ورنہ انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔

اس گھوڑے نے گویا میرے عزائم کو سمجھتے ہوئے کئی بار مجھے بھی دو ترقی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے نہایت آسانی سے خود کو بچاتے ہوئے اس کا معائنہ جاری رکھا۔

اسی طرح ایک چکر کے دوران اس کی گردن کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی ایال ایک ٹنگھی میں جکڑتے ہوئے اچانک ہی زلف لگا لی۔ دوسرے ہی لمحے میں اس پر سوار تھا اور لگام بھی میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ گھوڑا بھی اسی لمحے پچھلی پانچوں پر کھڑا ہو چکا تھا اور مجھے پیٹھ سے گرانے کے لیے جسم کو جھک رہا تھا لیکن افضل چوہدری نے ایک بار گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر اتنی آسانی سے گرا نہیں سکیا تھا۔

گھوڑا اب جھنٹانے کے بجائے گویا پھینکا رہا تھا مگر جب اس کے جڑے جڑے کرنے کو ہوئے اور پسیلوں پر مخصوص بہتر مندی کے ساتھ دو چار دھڑکے لگے تو اس کے کس بل لکھنا شروع ہوئے۔ میں نے اس کی پسیلوں پر مختلف زاویوں سے دباؤ ڈالنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ساتھ ہی میں اسے چکارنا بھی جاری رکھا۔

میں اس پر قری اور سختی دونوں حربے بیک وقت استعمال کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو گئی لیکن آخر کار اس نے چاروں گھڑیوں پر ٹا ہی لے لی اور اس کے انداز میں تدریجاً شکست خوردگی آگئی۔ کچھ دیر ایک شخص چاک لے لے کھڑا تھا میں نے اس سے چاک لے لیا۔ اس کے بجائے میں نے ایک ہاتھ سے لگام قابو میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کے جوڑ پر کرانے کا ایک ہلکا سا وار کیا۔

گھوڑا تڑپ کر دوڑا لیکن وہ اب میرے قابو میں تھا۔ وہ سہ

”میں آپ کے حقائق کچھ جان سکتا ہوں؟“ میں نے بدستور اپنا لہجہ مڑواتے رکھا۔

”میرا نام ذرا تاج ہے۔۔۔“ وہ ہماری سانس لے کر بولی۔ اس کے سر پر تاج کی کمی تھی۔ یہ کسی اس کے نام سے پوری ہو گئی تھی۔ ”میں بھی ایک چھوٹی سی زمیندار ہوں۔“

اصلی ذمہ داری زمینیں میں اس کی گوری کھائی حرکت میں آئی۔ اس نے بے نیازی سے زمینوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تھوڑی سی زمین میری ہے۔“

وہ تامل نظر پھیل گئی ہوئی زمینوں کو تھوڑی سی زمین، کہہ رہی تھی۔ بعض لوگوں کے حکمرانی کوئی حد نہیں ہوتی اور بعض لوگوں کی انکساری کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے نقشے میں دیکھا ہوا نام یاد آیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گاؤں اور کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیس یہ ذرا تاج غمرو نہیں ہے؟“

”ہاں۔۔۔“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ برقرار تھی۔ ”کیا اس سے پہلے بھی اس طرف آنا نہیں ہوا؟“

”نہیں۔۔۔ یہ میری انتہائی بد قسمتی تھی کہ میں کبھی بوجھ نہیں آیا۔ آج راستہ بھول کر آگیا ہوں۔ اس طرح بھٹکا بار بار شیبہ ہو تو بہت اچھا ہو۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس نے گویا میرے الفاظ میں چپے باز کو نظر انداز کر دیا اور زراہٹ آہستہ آہستہ سے بولی۔ ”میری پیدائش سے پہلے اس گاؤں کا نام کچھ اور تھا۔ میں پیدا ہوئی تو والد مرحوم نے میرا نام ذرا تاج رکھا اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کا نام بھی بدل کر ذرا تاج غمرو رکھ دیا۔“

میرا خیال تھا کہ ایسی حشریہ داماں عورت اور اس کے گاؤں دونوں ہی کو بہت مشہور ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں کا ماحول بتا رہا تھا کہ اس نے خود کو بہت محدود رکھا ہوا تھا۔ اس کی شہرت کی خوشبو شاید زیادہ دور تک نہیں پہنچی تھی۔ ویسے یہ ممکن نظر تو نہیں آتا تھا کہ اس پختہ عمر لڑکی نے ابھی تک کوئی قیامت نہ ڈھائی ہو، کسی افسانے کو اپنا پتا نہ دیا ہو، کسی دستِ طلب نے وہاں نہ وار اس کا چھپانہ کیا ہو۔

جہاں ایک ایسی سراب قیامت رہتی تھی وہاں تو بچے سے بڑا ہونے چاہئیں تھے۔ یہاں اتنا سکوت، اتنا سکون، اتنا انفرادیت کیو کر برقرار تھا۔

اس کی بیٹھانی پر غلٹیں نمودار ہوتے دیکھ کر میں چونکا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے خیالوں میں گم ایک ننگ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

ہا تو تھا لیکن شاید کسی اور کا مطلع تھا۔ میں نے اسے طویل و عرض میدان میں تین چار چکر لگوائے اور آخری ہی دوڑ بھاگ میں اس نے مجھے مصالحت کر لی۔

میں نے گھوڑا اس عورت کے سامنے لا دیا اور دستِ نکا کر لیے اٹھا۔ رکاب میں پاؤں رکھنے کی میں نے ذہن نہیں کی تھی۔ اورت کے یا توئی ہونٹوں پر اب تبسم کا ہلکا سا سرا مل رہا تھا مگر اس کی آنکھیں گریا مسکرائے پر آمادہ نہیں تھیں۔ ان میں وہی بلی کی شجیدگی تھی۔ چاندوں مسلخ افزا نے ایک بار پھر مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔ میں ان کی طرف سے اب بھی بے پروا نظر آتے کی اٹھ کر رہا تھا۔

”کون ہو تم؟“ عورت نے پوچھا۔ اس کا لہجہ نامرمان نہیں تھا۔ آخر کار مجھے اس سوال کا سامنا کرنا ہی تھا۔

میں نے اس وقت روٹیل خان والی حیثیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تاہم میرا ارادہ تھا کہ میں اپنا نام روٹیل خان نہیں بتاؤں گا۔

”میرہ حسام خان کے قریبی علاقے کا ایک بہت چھوٹا نامت معمولی سا زمیندار ہوں۔ چند ایک زمین ہے میری۔“

اس نے جواب دیا۔ ”اس وقت ذرا مصیبت میں گرفتار ہوں۔“

”ذرا۔۔۔؟“ عورت نے ڈھیرا اور مسکراہٹ اس کے دھڑلے پر روشن ہوتی گئی جیسے دھیرے دھیرے اچھ پر سورج طلوع ہوا ہو۔ وہ اس لحظے سے محظوظ ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب مزاح بھی رہ گئی تھی۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ ”میں شریف آوی ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو۔ تم تو کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے۔“ اس کے لہجے میں شانہ نمکنت آگئی۔

”کیا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”تم اچھے بھلے، مستقل قسم کے، تجربہ کار ڈاکو مظلوم ہو رہے ہو۔“ اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ”صرف ایک نشانی تمہارے گھوڑا کو دیکھ والی نہیں ہے۔“

”کہ کیا نشانی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری آنکھیں۔“ اس نے ہماری شجیدگی سے جواب دیا۔ ”ان آنکھوں سے واقعی تھوڑی بہت پریشانی جھلک رہی ہے۔ پریشان ہوا شریف آدمیوں کی نشانی ہے۔“

”گھوڑا آپ نے میری بات کا یقین کر لیا؟“ میں نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کے کوشش مت کرو۔“ اس نے کہا۔

”میرے حال یہ بات ہے کہ آپ نے ڈاکوؤں کا تجربہ خالص ہے کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یقیناً۔“ اس نے بلا جھجک کہا۔ ”میں ان سے بہت واسطہ نہیں کرتا۔“



# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                    |
|-------|--------------------|
| 200/- | اندھیروں کے سادبان |
| 200/- | تاریک رزم گاہ      |
| 150/- | صقیلہ کا مجاہد     |
| 150/- | عقاب               |
| 150/- | صحرا کی آگ         |
| 150/- | قتیبہ بن مسلم      |
| 150/- | موت کے مسافر       |
| 150/- | یثرب کا ابلیس      |
| 150/- | سنہری غول          |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

”مفضل خان۔“ میں نے جلدی سے کہا۔  
”مفضل خان۔“ اس نے پر خیال انداز میں ذریعہ دہرایا  
اور اس لیے مجھے اپنا یہ آدھا سچا آدھا جوتا نام بے حد خوش بخت  
محسوس ہوا۔  
”ہم تو سنا ہوا نہیں لگتا۔“ اس کی چاندی پیشانی پر شکستیں  
اُبھر آئی تھیں۔

”آپ ناخن ذہن پر زور دے رہی ہیں۔ میں اتنا برا اتنا اہم یا  
اتنا بدنام آدمی نہیں ہوں کہ مجھ سے پہلے میرے انسانے آپ تک  
پہنچ جاتے۔ میں تو ایک بہت سی چھوٹا سا غیر اہم اور بے بھر سا  
آدمی ہوں۔ کوئی خوبی نہیں ہے مجھ میں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے  
کہا۔

”آپ نے یقین سے مت کہو۔ میں ممکن ہے تم نے ابھی تک  
اپنے آپ کو دریافت نہ کیا ہو۔“ وہ تنبیہ کی سے بولی کراہ اس کی  
آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”یہ آپ کا حسن ظن ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار  
ہوں۔“ میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔ ”خوبصورت دل والے  
لوگ ہی دوسروں کے بارے میں خوش گمان ہوتے ہیں اور جن کی  
صورت کے ساتھ ساتھ دل بھی اچھا ہو وہ لوگ ایسے بُرے دلوں  
میں مشکل سے ہی ملتے ہیں۔“

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ٹٹا ہٹا۔ شکنت سے گردن اٹھائے  
بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ پھر وہ یونہی ہاتھ پیچھے رکھے اور دوسرے ٹٹے  
گلی لیکن نظریہ دستور مجھ پر تھی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا گویا وہ مجھے  
شروع سے آخر تک حرف بہ حرف پڑھ لیتا چاہتی ہو تاکہ کہیں  
مفہوم و معنی میں دھوکا کھانے کا امکان نہ رہے۔

میں نے اندر ہی اندر ذرا بے چینی سی محسوس کرتے ہوئے  
ادھر ادھر دیکھا۔ راکھل بردار بدستور مجھ پر رانٹیں کرتے کھڑے  
تھے لیکن ان کے کثرت چہرے ہر آثار سے ماری تھے۔ وہ حکم کی  
تعمیل کرنے والے مشین نما انسان معلوم ہوتے تھے۔ اکثر بڑے  
لوگوں، زمینداروں، چاکیرداروں، مرابیانوں، دادوں اور اسی قسم کے  
دوسرے لوگوں کی حفاظت کرنے والے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

باقی لوگوں کے چہروں پر زندگی کی چمک تو تھی مگر ایک عجیب سی  
مستکبی کی شے بھی ہوتی تھی۔ ایسی مستکبی شاید پرانے زمانوں  
میں ذر خرید غلاموں کے چہروں پر ہوتی ہوگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے  
انہیں اپنے طور پر کچھ ہونے یا محسوس کرنے تک کی عادت نہیں  
رہی۔ یا پھر ان کے محسوسات ان کے ذہنوں سے چہروں تک نہیں  
آتے تھے۔ بات خواہ کچھ بھی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ کم از کم  
دیکھنے میں تو انسان کے بجائے گوشت پوست کے دو ٹوٹ معلوم  
ہوتے تھے۔

ان میں سے صرف ایک ہی شخص کے چہرے پر آواز دی اور

خود بخود کی جھلک تھی اور یہ وہی شخص تھا جس کے ہاتھ سے میں  
نے کھوڑے کی باگ لی تھی۔ وہ کینہ بھری نظروں سے میری طرف  
دیکھ رہا تھا۔ دنیا میں زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ خود کو کم از کم  
کرنے کے انداز اور اگر کوئی دوسرا اسے عموماً سے انجام دے تو وہ بھی  
ان کی نظروں میں گردن ذلی قرار پاتا ہے۔  
ٹٹے ٹٹے ذرا تاج رک گئی۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ اب  
تک گویا باطل بھی دھیرے دھیرے بکھرے بکھرے رہا تھا۔ اس کی  
سلطنت جاں کے خیب و فراز میں سکوت آیا تو اس کے ساتھ ہی  
جیسے دھرتی کے سینے کا زیر و بم بھی ختم کیا۔  
اس کی جھلک دار آواز نے ایک بار پھر میری آنکھوں سے  
دروازوں پر قہر کی گھنٹیاں بجا دیں۔ وہ اپنے مخصوص غور سے

مجھے اس کا لے گھوڑے کے بدلے کوئی اور گھوڑا مل سکے۔ اور ایک جوڑا کپڑوں کا مل جائے تو بہت شکر گزار ہوں گا۔“ وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے فوراً صفائی پیش کرنے کے لئے انداز میں کہا ”اس گھوڑے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ بہت اچھی نسل کا گھوڑا ہے۔ بس اس کا رنگ مجھے پسند نہیں ہے۔ مجبوری میں لے بیٹھا تھا۔ میں اس کے بدلے میں کوئی بھی گھوڑا لے لوں گا“ خواہ وہ میں یا تم ہو۔“

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بدستور ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے“ میں اب اتنی کم عمر نظر نہیں آتی کہ مجھ سے اس طرح بات کی جائے جس طرح بچوں کو بلانے کے لیے کی جاتی ہے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ بولوں اس نے گویا ایک نئے زاویہ نگاہ سے میری اور میرے گھوڑے کی طرف دیکھا پھر بات کو گھمٹائے پھر اے بغیر بالکل سیدھے اور دو ٹوک انداز میں بولی۔ ”قتل کر کے بھاگے ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اضطرابی طور پر پولیس والے پر گولی چل جانے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو قاتل تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔

”کسی اور وجہ سے پولیس پیچھے لگی ہوئی ہے؟“ ذرا تاج نے اسی پرسکون لہجے میں پوچھا۔ اس سے صرف گھوڑا اور لباس تبدیل کرنے کی بات کرنا ہی کافی ثابت ہوا تھا۔ باقی حقائق تک اس نے خود ہی جست لگائی تھی۔

”نہیں۔“ میں نے اس بار بھی بلا تامل نفی میں گردن ہلا دی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انکبوتر رحیم کل اب بھی میرے حواقب میں لگا ہوا تھا یا نہیں۔ اس لیے میں نے شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود ہی اپنے ختمی میں فیصلہ دے دیا تھا۔ ویسے بھی مجھے یہاں پیچھے رہ رہی تھی ہوئی تھی۔ اتنی جلدی ہر بات پوری پوری سچائی کے ساتھ تیار ترقی مصلحت معلوم نہیں ہوا تھا۔

”آپ میرے بارے میں شکوک و شبہات اور اندیشوں میں مبتلا نہ ہوں۔“ میں نے اپنی وکالت کی۔ ”میری مدد کرنے سے آپ کے لیے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوگی۔“

”میں الجھن اور شبہ کے بارے میں نہیں سوچ رہی۔ اور نہ ہی میں پریشان ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہم جب کسی کی مدد کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے نتائج کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ میں دراصل کچھ اور سوچ رہی تھی۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ”میرا خیال ہے“ تمہیں کام کی بھی ضرورت ہے اور پناہ کی بھی لیکن تم اس لیے درخواست نہیں کر رہے ہو کہ تمہیں مشکوک سمجھ کر تمہاری درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ تم چاہتے ہو کہ بات کہہ کر گمراہی نہ جائے تمہارے الفاظ بے آہود نہ ہوں۔“

لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”فرض کر لو میں نے یقین کر لیا کہ تمہارا نام افضل خان ہے۔ تم ایک شریف آدمی ہو“ چھوٹے سونے زمیندار ہو اور کسی مصیبت میں پیچھے ہوئے ہو۔ تو کیا میں مصیبت کی نوعیت پوچھ سکتی ہوں؟“

”کئی احوال تو اسے مجھ تک ہی محدود رہنے دیجئے۔ شکر گزار رہوں گا۔“ میں نے اگر درگزرے لوگوں پر نظر ڈال کر کہا۔ میں نے تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ میں اسے لوگوں کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ سرور سے تو میں اسے تختے میں بھی اصل بات بتانا نہیں چاہتا تھا۔ بشرطیکہ تحلیہ میسر آنے کی منت آتی۔

وہ گویا میرا مطلب سمجھتے ہوئے برا منائے بغیر بولی ”یہاں کس لیے آئے ہو؟“

”میں ارادہ نہیں کیا، بھٹکا ہوا اٹھلا ہوں لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ ایسا بھٹکا تو کاش وہ ذقیب ہو۔“ میں نے ایک ”تک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک نہایت خفیف سارنگ اُبھر کر گیا۔

لیکن قطعی غیر متزلزل سے لہجے میں وہ بولی۔ ”بہت عام سی باتیں بہت سلیقے سے کہیے ہو۔ کہاں سے سیکھا یہ سلیقہ؟“

”بعض صورتیں پہلے میری ہر چیز کا سلیقہ سمجھا دیتی ہیں۔“ میں نے بلا جھجک کہا۔ ماحول بتا رہا تھا کہ اس کے سامنے پہلی طاقت پر اس قسم کی باتیں کرنے کی جرأت شاید ہی کسی نے کی ہو۔ یہ جرأت گردن بھی کٹا سکتی تھی اور دل میں گھر بھی کر سکتی تھی۔ میں دونوں کے لیے تیار تھا۔

اس کا جواب بدستور کسی خاص تاثر سے عاری رہا۔ سرسری سے انداز میں وہ بولی ”تو پھر اب کیا خیال ہے؟ بھٹکتے ہوئے اور حیران آئے ہو۔ اب بھٹکتے ہوئے ہی کسی اور طرف کو نکل جاؤ۔“

”ہاں۔۔۔ آخر کار تو شاید یہی کرنا پڑے گا۔“ میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ”لیکن کیا آپ کے ہاں مصیبت زدہ لوگوں یا بے سروسامان مسافروں کی تھوڑی بہت دلجوئی کرنے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے؟“

”دلجوئی دینیو تو ذرا مشکل کام ہے۔“ وہ مسکراتی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ ”کوئی مدد دینیو چاہیے تو بولو۔“

میرے جواب دینے سے پہلے اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اُتر آئی اور وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”روایتیں تو ہماری بہت عظیم ہیں لیکن ہوا اکثر یہی ہے کہ مصیبت زدہ لوگوں اور بے سروسامان مسافروں کی مدد کے ہم نے اکثر نقصان ہی اٹھایا ہے۔“

پھر اس نے سر کو شانہ نے انداز میں خفیف سا جھکا دیا اور مزید بولی ”میں نے ان باتوں سے گھبرا کر ہم اپنی شاندار روایات نہیں چھوڑ دیں گے۔ تم بولو“ تمہیں کیا مدد چاہیے؟“

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ذرا تھک دہیزب سے لہجے میں کہا ”اگر

ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے شاید میرے چہرے پر کوئی تو عمل تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن میری کوشش بھی میرے چہرے سے ہلکے سے تجسس کے سوا کچھ ظاہر نہ ہونے پائے۔

وہ بات کے ساتھ ساتھ چل قدمی کا سلسلہ جوڑتے ہوئے بولی۔ "تمہیں بالکل یہ محسوس کرتے ہوئے یہاں رہنا ہو گا جیسے یہ زمین تمہاری اپنی ہے۔ اس زمین کے سینے پر کھڑے ہو کر اگر کوئی اس زمین کے..... یہاں کے لوگوں کے..... یا میرے مفادات کے خلاف قدم اٹھانے لگے تو تمہیں اس کو روکنا ہو گا۔ اگر کوئی ہم پر اپنی طاقت کا رعب جمائے آئے تو اسے زبانِ دور بازو سے یا گولی سے روکنا تمہارا اولین فرض ہو گا۔ ایسے کسی وقت پر شاید تمہیں یہ سودا مینکا محسوس ہونے لگے۔" اس کے لمحے میں کچھ زیادہ ہی عجیبی گئی تھی۔

مجھے معلوم تھا زمینداری جتنی پی پی ہو، خطرات بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں۔ زمینداری اپنی جگہ ایک پھولی سی سلطنت ہوتی ہے اور جس طرح سلطنت میں خلائی سازشیں ہوتی ہیں، جو تڑوڑ ہوتے ہیں، یہودی ملے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی کشت و خون ہوتا ہے، بالکل اسی طرح یہ کچھ زمینداروں میں بھی حسبِ حیثیت ہوتا ہے۔

اگر زمینوں کی مالک ایک سرمایہ دار قیامت قسم کی لڑکی ہو تو ظاہر ہے خطرات اور بھی بڑھ جاتے ہیں لیکن اس نے جو بات کی تھی وہ مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ میری دلچسپی بڑھانے کے لیے کالی تھی۔ میں تو ان لوگوں میں سے تھا جو اس قسم کے حالات میں زبانی معاہدوں پر نگاہوں کی رضامندی سے و خطہ کر دیتے ہیں۔

مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس کے لمحے میں مجھ جیسے اجنبی کے لیے بھی اخلاص تھا اور اخلاص کی ایک نشانی یہ تھی کہ وہ مجھے اندھیرے میں نہیں رکھ رہی تھی۔ سارے اسباب اس نے صاف طور پر بیان کر دیے تھے۔

میں نے ایک ہی لمحے میں مت کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "ہاں! پہلی بات تو یہ کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اول تو سودا ہی نہیں کرتے..... اور اگر کر لیتے ہیں تو پھر سستا اور منگوا نہیں دیکھتے۔ دوسری بات یہ کہ ہر وقت صرف اپنا ہی فائدہ دیکھتے ہوئے سینے میں کم از کم مجھ جیسے آدمی کے لیے کوئی ایسا خاص لطف بھی نہیں۔ میری عمر یا تجربہ اتنا تو نہیں کہ مایوں جیسی باتیں کر سکوں لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا میں کسی کو اپنا بنا کر یا خود کسی کا بن کر بیٹھنے میں ہی بہتری ہے جو دنیا میں کسی کا بھی نہیں، کسی سے بھی غفلت نہیں، جس کی نظر میں صرف اپنا آپ ہی ہوتا ہے، جو صرف اپنے لیے ہی بیٹھا ہے، کبھی کبھی اس کی زندگی بہت ہی قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔"

"باتیں تم بہت اچھی کر لیتے ہو لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے انہیں ہی سے میری ذہنی ساخت ایسی رہی ہے کہ میں باقیوں سے

"آپ کا تجربہ بالکل درست ہے۔" میں نے حتمی آہیز مگر قدرے شرمسارے لہجے میں کہا۔ ایسی عورت کے سامنے انسان اپنی کم مائیگی بے سرو سامانی اور جی دامن پر شرمساری ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی عورت تھی جس کے سامنے کچھ بن کر جانے کو کبھی چاہتا ہے تاکارہ، نگارہ اور مدد کا طالب ہو کر کھڑے ہونا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ممکن الحال معلومت اسی میں تھی۔

"گھوڑے سدھانے میں تم یقیناً ماہر ہو؟" وہ نیم سوالیہ لہجے میں بولی۔

"میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج تک مجھے کوئی ایسا گھوڑا نہیں ملا جو میرے اشاروں پر نہ چلا ہو۔"

میں نے جواب دیا۔

"کاشت کاری سے بھی ظاہر ہے واقف ہی ہو گے؟" وہ گویا میرا تڑپو لے رہی تھی۔

"کاشت کاری تو پتہ ہی پتہ کام ہے۔ زمین کی رنگ رنگ سے واقف ہوں۔ بیشہ زمین سے پیدا ہونے والی ہے۔" میں تیزی سے کہتا چلا گیا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی بھی بات کا جواب پچھچھاہٹ آہیز انداز میں نہ دوں۔

"یقیناً بندوں کو بھی تمہارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی۔ ضرورت پڑنے پر زبرد کر دے، دھڑک دہا ہی کہتے ہو گے؟" اس کا لہجہ اب بھی نیم سوالیہ ہی تھا۔ تمام ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ایک بار پھر ظاہر ہونے لگی تھی۔

"بندوق سے بھی رش بہت پاتا ہے۔ گولی کا جواب گولی سے دینے میں کبھی دیر نہیں کی۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اس کے سوا زندہ رہنے کا کوئی طریقہ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"زندگی کبھی۔ اور زندگی گزارنے کے فن کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ تم ہر اعتبار سے ہمارے کام کے آدمی ہو۔ تمہیں سازج، انداز اور صلاحیتیں رکھنے والے شخص کی ہمیں بیشہ ہی ضرورت رہتی ہے۔" وہ ایک بار پھر جیسے کسی سوچ میں آگئے کر خاموش ہو گئی۔

لیکن ایک لمحے بعد گویا فیصلہ پر پہنچتے ہوئے بولی "تمہیں رہائش بھی مل جائے گی اور حسبِ خواہش کھانے، پہنے کو بھی۔ تھوڑی بہت تنخواہ بھی مل جائے گی لیکن شاید تمہیں یہ سودا مینکا محسوس ہو۔" وہ ٹھٹھکے ہوئے بات کر رہی تھی۔

"وہ کیوں؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس وقت مجھے رہائش اور کھانا چاہی ہی تھی قیمت پر بھی منگوا محسوس نہیں ہو رہا تھا جبکہ وہ تو تنخواہ کی بھی بات کر رہی تھی۔ "تمہیں کھانے پر سوچ کر نہیں رہنا ہو گا کہ تم میں ایک کارندہ ہو بلکہ جب بھی تم نے محسوس کیا کہ تمہیں اس پانہ گیری کی ضرورت نہیں تو تم اتھ جھاڑ کر آگے چل دو گے ایسا نہیں ہو گا۔" آخری الفاظ پر اس کا لہجہ کچھ زیادہ ہی فیصلہ کن ہو گیا تھا۔

رومانی ٹاول

|      |           |              |
|------|-----------|--------------|
| 75/- | حیدہ جبین | زیب          |
| 75/- | حیدہ جبین | شاخ بریدہ    |
| 75/- | حیدہ جبین | حنا اور پتھر |
| 75/- | حیدہ جبین | گیت یہ میرے  |

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

زرتاج اپنی حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھی "آؤ... میں خود ہی تمہیں فارم دکھا دیتی ہوں۔ شیر محمد! تم بھی آؤ۔" بندو ق برادر کچھ فاصلہ چھوڑ کر اس کے دائیں بائیں چلے گئے۔ شیر محمد نے سرکش گھوڑے کی نگاہ قمارے ساتھ چلنے کی کوشش کی لیکن گھوڑے نے اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے چاروں کمر کر دین میں گڑھے تھے۔ شیر محمد اسے اپنا جگہ سے ہلانے میں ناکام رہا۔

بلا خریش نے کہا "تم میرے گھوڑے کی نگاہ قمار لو اس کی نگاہ مجھے دو۔"

شیر محمد نے بادل غراستہ میرے سیاہ گھوڑے کی نگاہ قمار لی جو در حقیقت میرا بھی نہیں تھا۔ یہ گھوڑائے حالات اور نئے لوگوں سے بھگونا کرنے میں دیر نہیں لگاتا تھا۔ چپ چاپ شیر محمد کے ساتھ چل رہا تھا۔ سرکش گھوڑے نے بھی میری عزت رکھی اور جیسے ہی میں نے اس کی نگاہ قمار کے نتیجہ کے سے انداز میں ذرا سا بل دیا وہ فوراً میرے ساتھ چلے لگا۔ زرتاج غریبانہ سے انداز میں مسکرا دی۔

میں دانستہ طور پر زرتاج سے ایک قدم پیچھے رہتے ہوئے چلے لگا۔ اس کے پیروں میں چاندی کی خوبصورت پازنپ تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کبھی بگلی ی جھن جھن کے ساتھ چلتی رہے، حتیٰ کہ ہم افق تک جا پہنچیں لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہیں تھا۔ حقیقت کی دنیا میں تو قدم قدم پر رکنا پڑتا ہے۔

زرتاج گویا دھول مٹی پر نہیں، فرش خلیں پر چل رہی تھی یا پھر شاید وہ ہوا کے جھوکوں پر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور میرے محسوسات سے بے خبر سرسری سے انداز میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

"خاص خاص گھوڑوں کے ہم نے نام بھی رکھے ہوئے ہیں۔" وہ تارہی تھی۔ "یہ گھوڑا جس سے تمہیں آج سب سے پہلے واسطہ پڑا ہے اس کا نام مختار ہے اور یہ واقعی اپنی مرضی کا

کبھی متاثر نہیں ہوتی۔" وہ پُر سکون لہجے میں بولی۔  
"میں یہ باتیں آپ کو متاثر کرنے کے لیے نہیں، اپنا تعارف کرانے کے لیے کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بہر حال... یہ فیصلہ بعد میں ہو گا کہ تم کیا ہو، کیسے ہو اور اپنے نظریات سے کس حد تک متعلق ہو۔ فی الحال تمہارے ذمے صرف گھوڑوں کو سدھانے کا کام ہو گا۔ ان کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے دوسرے لوگ موزوں ہیں۔ میں گھوڑوں کی فارمنگ کرتی ہوں۔ میرے پاس گھوڑوں کا خاصا پروگرام ہے جس سے نیچے چھوٹی موٹی انڈسٹری جتنی کمانی ہوتی ہے۔ میرے پاس گھوڑے سدھانے والے دو آدمی تھے۔ ایک کو کسی مجبوری کی وجہ سے کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ واپس آجی سکتا یا نہیں۔ دوسرا آدمی یہ ہے۔" اس نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو میری آمد کے وقت گھوڑے سے اٹھ رہا تھا۔

"اس کا نام شیر محمد ہے۔" زرتاج بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ہمارے ہاں گھوڑے سدھانے کا جتنا کام ہے وہ اس کیلئے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمارا جو آدمی جا چکا ہے اس کی رہائش فارم پر ہی تھی۔ وہ ہمیں مل جائے گی۔ فارم میرے مکان کے پیچھے ہے۔ پلوں تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ارادے تو ان سے پوچھ جاتے ہیں جن کے سامنے کئی راستے ہوں۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ بس آنکھیں بند کر کے بے ارادہ بے منزل سفر کر رہا تھا۔ راستے میں آپ فرشتہ رحمت کی طرح مل گئیں۔ میں کو شش کھوں گا کہ جو کچھ بھی میرے بس میں ہو وہ آپ کے لیے کر سکوں۔"

"سوچ لو۔ کام بہت مشکل اور مشقت طلب ہے۔"

"اب تو مشکلات اور مشقت میں ہی زندگی کا لطف آنے لگا ہے۔"

میرے جواب پر اس نے ہنسا بھرتے ہوئے قدمے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور آنکھ کے اشارے سے گویا "مجلس" برخاستہ کر دی۔ شیر محمد اور بندو ق برادرین کے علاوہ باقی سب لوگ گاؤں کی طرف چل دیے۔ وہ سب لوگ اشاروں پر پانچنے والی کچھلیاں معلوم ہوتے تھے۔ اتنی دیر سے میری دہاں سوجھ گئی کہ دو دران کسی نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

شیر محمد نے اب تک سرکش گھوڑے کی نگاہ قمار ہوئی تھی اور گھوڑا اب اس کا کم از کم اتنا لحاظ ضرور کر رہا تھا کہ کھنکھانے سے بڑے جانے پر اچھل کود نہیں کر رہا تھا۔ شیر محمد کی نظروں میں میرے لیے ناپسندیدگی تھی اور جو کام میرے ذمے زرتاج لگا رہی تھی اس کے بعد تو یقیناً مجھے مستقل طور پر شیر محمد کی ناپسندیدگی ہی نہیں بلکہ شاید نفرت و رقابت کا سامنا کرنا تھا۔ چھوٹے ذہن کے لوگ اپنے سے بہتر تو کیا، اپنے جیسا کام کرنے والوں کو بھی برداشت نہیں کرتے۔

تھے اور بے فکر بھی۔

حویلی کے قریب سے گزرتے وقت میں اس کی دست دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ کم از کم تین ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے تین اطراف میں باغ تھے۔ بیرونی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی مگر اس پر خاردار آمارنگے ہوئے تھے بہت سے درخت ان خاردار آماروں کے درمیان سے جھانک رہے تھے۔

اصل عمارت زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی لیکن پختہ اور خوبصورت تھی۔ اس کے جو دروازے باہر سے نظر آ رہے تھے وہ محرابی تھے اور اس حصے کی ساخت میں سپانوی طرز تعمیر کی جھلک تھی۔ حویلی کا بیرونی دیوانہ خاصا اونچا بھاری بھر کم اور کسی قلعے کے صدر دروازے سے مشابہ تھا۔

اس وقت وہ بلند بالا چوٹی گیت بند تھا اور باہر اس کے قریب ہی ایک بہت لمبی چوڑی بھاری بھر کم چارپائی پڑی تھی جس کے پائے پتھروں جیسے تھے۔ اس چارپائی پر بھی تین کلا شکوفہ بردار بیٹھے تھے پلے رہے تھے اور شاید کسی خوش کن موضوع پر کپ شپ بھی کر رہے تھے مگر زور آج کو دور سے ہی آتے دیکھ کر وہ تھک چموا کر صورتیں بنجیدہ بنا کر منڈپ سے ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ مستند انداز میں گنوں پر پہنچ گئے تھے۔

زور تاج نے حویلی کے سامنے سے گزرتے وقت بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم دو دروازے کے سامنے میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہمیں حویلی کے برابر سے گزر کر عقب میں جانا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اوپر ایک عقی گیت بھی تھا جو میں گیت کی نسبت کافی چموا تھا اور اس پر تالا بھی پڑا ہوا تھا مگر ایک سنگ خانہ یہاں بھی چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔

سامنے تقریباً ایک فرائنگ کے فاصلے پر بہت بڑے رقبے پر ایک اونچی مگر کچی چار دیواری پھیلی ہوئی تھی۔ اندر کھڑکی کے تختوں کے مضبوط شیڈ نظر آ رہے تھے۔ یہ یقیناً زور تاج کا گھوڑوں کا فارم تھا۔ اندر سے گھوڑوں کے بھتانے کی آوازیں بھی سنائی دہیں۔ حویلی کا عقی گیت اور فارم کا گیت ایک دوسرے کی سیدھ میں تھے۔ حویلی کے عقی گیت پر موجود خانہ فارم کے گیت پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔

فارم کے اندر بھی درخت لگائے تھے اور باہر بھی اس کے اطراف میں دور تک سرسبز گھاس پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید یہ حصہ گھوڑوں کے لیے چراگاہ کا کام دیتا تھا۔ لگائے درخت، میزہ کشاؤ کی صاف صاف سی فضا اور بالکل فطری سے مناظر۔ یہ سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس اجول میں مجھے کلا شکوفوں اور راتھکوں کے سوا کئی بھی چیز بدصورت نہیں لگ رہی تھی۔

فارم کے گیت پر پہنچ کر زور تاج رک جی اور شیر محمد نے آگے بڑھ کر تالا کھولا پھر لوٹے کہ بھاری بھر کم زنجیر بنا پڑ گئی تھیں۔

فکر ہے۔ ہمارا جو آدمی جا چکا ہے اس گھوڑے کو انہی نے سدھایا تھا۔ اس کے بعد سے یہ کسی کے قابو میں نہیں آیا۔"

دفعاً اس نے ایک لمبے کے لیے گردن تھماتے ہوئے پوچھا "فضل خان! سرکش گھوڑوں کو قابو میں کرنے کے لیے صرف طاقت کی ضرورت ہوتی ہے یا کچھ ہنرمندی بھی درکار ہوتی ہے؟"

اس نے سوال بالکل سرسری سے لمبے میں کیا تھا۔ انداز دوستانہ تھا۔ ایک نکتہ زدہ یا جاگیردار مالکن اور ایک نئے بھرتی ہونے والے ملازم کے درمیان اس لمبے میں گفتگو ہونے کی جیسے توقع نہیں تھی۔ اس انداز میں گفتگو تو کافی پرانے شناساؤں کے درمیان ہوتی ہے۔

میرے خیال میں اسے اس سوال کے جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے گھوڑوں کا فارم کھول رکھا تھا، نہ جانے کب سے گھوڑے پال رہی تھی اور نہ جانے کب سے گھوڑے سدھانے والے اس کے ملازم تھے۔ اسے یقیناً اتنے سادہ سے سوالوں کے جواب تو معلوم ہوں گے۔

کوئی بعید نہیں تھا وہ خود بھی سرکش گھوڑوں کو قابو میں کرنے کی باہر دی ہو لیکن اسے بظاہر سادہ اور بے ہنری عورت نظر آتا بہتر لگا ہو۔ سوال کرنے کا مقصد یقیناً مجھے صرف یہ احساس دلانا تھا کہ اس نے مجھ پر اصرار کر لیا ہے اور اس لمبے میں بات کرنے لگی ہے جس لمبے میں جانتے پہچانتے لوگوں سے کی جاتی ہے۔

میں کوئی پیشہ ور گھوڑے سدھانے والا نہیں تھا۔ میں نے تو صرف ذاتی دلچسپی کی بنا پر بہت سے کاموں میں ٹانگ اڑا کر ان میں کچھ نہ کچھ دسترس حاصل کر رکھی تھی جو بعض اوقات پیشہ وروں سے زیادہ میرے کام آجاتی تھی۔ تاہم میں نے بھی ویسے ہی شناسائی آئیز کر پیشہ وروں جیسے پراختاد لمبے میں جواب دیا۔ "دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔" اس نے اثبات میں سہلایا پھر شیر محمد کی طرف اشارہ کر کے بولی "شیر محمد کے پاس بہتر تو ہے طاقت نہیں۔"

میرے خیال میں اس نے اچھا نہیں کیا تھا کہ شیر محمد کے منہ پر یہ بات کہہ دی تھی۔ اپنے بیروں، خاسیوں اور زوروں کی نشاندہی کے انہی گنتی ہے؟ تاہم شیر محمد کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بدستور نظر دیکھنے ہمارے ساتھ چلتا رہا۔

باتی فاصلہ خاموشی سے طے ہوا۔ اس دوران میں نے دوسرے لوگوں کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی۔ انہی تک تو مجھے زور تاج ہی کا جائزہ لینے سے فرصت نہیں ملی تھی۔ کلا شکوفوں اور راتھکوں والے بدستور خاموشی اور لاشعری سے زور تاج کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ ان کا انداز پیشہ ور باڑی کا ڈوڑ کا تھا۔ اپنے دستانے تلے اور سیدھے سپاٹ چھوٹی کی وجہ سے وہ زیادہ تیز و طرار نظر نہیں آتے تھے مگر یہ اصل کہ رہا تھا کہ وہ اسے کام میں لیتا بھی

برسوں کا دوست محسوس کر رہا تھا۔ بات افسانوی سی ہونے کے باوجود انوکھی نہیں تھی۔ انسان کی زندگی ہے ہی کیا؟ محض ایک افسانہ ہی تو ہے لیکن زرتاج کے محسوسات کیا تھے؟ یہ میں نہیں سے نہیں بتا سکتا تھا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہوا بولے۔ ”جیسے یہ جان کر باہر نہیں ہوئی کہ میں ایک فرسودہ لڑکی ہوں؟“

”فی الحال میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ آپ کے بارے میں یہ جان کر خوش ہو سکوں کہ آپ بہت مازوں اور آزاد خیال ہیں یا یہ جان کر باہر ہو سکوں کہ آپ بہت فرسودہ لڑکی ہیں۔“ میں نے جھکا لیجے میں کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی۔ ”ویسے بعض لوگوں کو یہ جان کر باہر ہوئی ہے کہ میں ایک فرسودہ لڑکی ہوں حالانکہ میں آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہوں۔ یونیورسٹی میں ایک بار تھوڑے روز کے کوریڈور میں ایک گورے نے مجھے دھچکا لیا حالانکہ آکسفورڈ کی اپنی روایات ہیں۔ وہاں پڑھنے والے نسبتاً نرم خور اور مذہب ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی لڑکی پسند آجائے تو زبردستی اس کے گلے پڑنا ان کے نزدیک بھی کوئی معیوب یا زیادہ غیر مذہبانہ حرکت نہیں ہوتی۔ میں نے اسے بھی یہی بتانے کی کوشش کی تھی کہ میں بہت فرسودہ لڑکی ہوں لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔“

”پھر کیا ہوا؟“ میں اسے خاموش دیکھ کر اپنا تجسس نہ چھپا سکا۔

”ہو کیا تھا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”مجھے گھونسا مار کر اس کے دو رات توڑنے پڑے تھے۔ میرے بیڑوں میں قتل و کشت تھا۔ دو تین لائیں میں نے اس کے ہیٹ پر رینڈ کیں تو ساری دھسکی باہر آئی جو اسے بدست بنائے ہوئے تھی۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں اس وقت ان جیسے لباس میں تھی۔ شاید اس نے سمجھا تھا کہ میں لباس ان جیسا پہنے ہوئے ہوں تو میرے خیالات بھی ان جیسے ہی ہو گئے ہوں گے۔“

میں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن اسی انکشاف میں پھنسا ہوا تھا کہ وہ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”بات بہت بڑھ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آخر بڑے بڑے انصاف پسند ہوتے ہیں لیکن کم از کم میرے معاملے میں انہوں نے ذرا سی بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خصوصاً اس لڑکے کے رات توڑنے کا انہوں نے بہت برا مانا اور خاصے تعصب سے کام لیتے ہوئے مجھے ایک سال کے لیے یونیورسٹی سے نکال باہر کیا۔ میں واپس آئی۔ ایک سال بعد میرا دوبارہ داخلہ لینے کو دل ہی نہیں چاہا۔“

وہ میری حیرت سے بے نیاز، میری طرف دیکھے بغیر ایک لمبے کی خاموشی کے بعد اسی ہوا لیجے میں سلسلہ کلام ہوتے ہوئے بولی۔ ”میرے بارہ دے پیچھے کی کمی نہیں ہے۔ میں زیادہ مشینری بھی

مجھے ایک بار پھر ایک چھوٹے سے جہان حیرت کا سامنا تھا۔ میں نے اس سے پتلا اتارنے بہت سے خوبصورت اور رنگارنگ گھوڑے بھی ایک جگہ پر نہیں دیکھے تھے جتنے اس فارم میں موجود تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے اسٹال بنے ہوئے تھے۔ ہر اسٹال میں ایک ایک گھوڑا اٹھان پر بندھا ہوا تھا۔ تین بیویں اسٹال میں ایک سے ایک تھیں گھوڑا موجود تھا۔ گھوڑوں کے بچے بھی تھے۔ فارم کے وسط میں ایک بہت بڑا اونچا اور پختہ حوض تھا جس میں صاف شفاف پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی کی موٹریں، پائپ وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ فارم میں بہت مکانی، سترائی نظر آ رہی تھی۔ ظاہر کی ہوا تھا کہ فارم کا نظام کافی سلیطے سے چلایا جا رہا تھا۔

”یہ ہے میرا چھوٹا سا فارم۔“ زرتاج بولی۔ ”میری فارم تک بہت اونچے پیمانے کی تو نہیں ہے پھر بھی یہاں بعض کیاب نسلوں کے بھی چند گھوڑے موجود ہیں۔ ان تمام گھوڑوں میں سے بہت کم مدد سے ہوئے ہیں۔ مدد سے ہوئے گھوڑے بہت جلد پک جاتے ہیں۔“

”کون خریدتا ہے انہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”دروگد کے علاقوں میں زمینداروں میں ابھی تک پھجرو کے ساتھ ساتھ ایچے گھوڑے رکھنے کا بھی ذوق موجود ہے۔ میں نے سنا ہے۔“ میرے فارم سے گئے ہوئے بعض گھوڑے دوسرے ملکوں سے لائے گئے گھوڑوں کے شانہ بشانہ دیں کو دوسری میں بھی دوڑ رہے ہیں۔ مجھے زیادہ صحیح طور پر معلوم نہیں کیونکہ میں یہیں اپنی دنیا میں گمن رہتی ہوں، کہیں آتی جاتی نہیں۔ میرا دل نہیں لگتا ہے۔“

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ”عام سے گھوڑوں کو ہم کاشتکاری اور پاریرادری میں اشتغال کرتے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ ہماری زمین پر ٹریکٹر اور مصنوعی کھادیں کم سے کم استعمال ہوں۔ ہم اب بھی زیادہ تر گھوڑوں کی مدد سے چلاتے ہیں اور ہمارے ہاں ان کی کارکردگی بیلوں سے بہتر رہی ہے۔“

”حیرت ہے! میں نے مجھے لیجے میں کہا۔“ آپ کی اتنی بڑی زمیندار کی میں مجھے واقعی ٹریکٹر اور دوسری مشینری بہت کم نظر آتی ہے۔ آپ کا زیادہ تر انحصار پرانے طور طریقوں پر ہی ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے پلاٹا مل کہا۔ ”میں بہت فرسودہ سی لڑکی ہوں۔“

پھر وہ فارم میں داخل ہو گئی۔ باقی سب لوگوں کو اس نے دواؤں سے پری رکھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ صرف ہم دونوں ہر گھوڑے کا جائزہ لینے کے سے انداز میں رک رک کر آگے بڑھتے جا رہے تھے لیکن حقیقتاً ہم دونوں ہی کا ذہن ان گھوڑوں کی طرف نہیں صرف ایک دوسرے کی باتوں میں تھا۔

وہ ایک افسانوی سی شخصیت تھی اور میں نہایت افسانوی سے

منگو اسکتی ہوں اپنی کھیتی باڑی کی رفتار تیز کر سکتی ہوں، زیادہ دھیرے  
کا سکتی ہوں مگر دھیرے ہی تو زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ میں اپنی  
جگہ بہت خوش ہوں، مطمئن ہوں۔ میرے ہاں بھی خوش ہیں۔ مجھ  
سے بھی..... اور میرے حالات سے بھی۔“

”ہر ایک عجیب سی بات ہے کہ انسان دولت کا مزہ کچھ چکا ہو اور  
اس کے سامنے مزید دولت پڑی ہو لیکن وہ ہاتھ بڑھا کر اسے نہ  
اٹھائے۔ ناقابل یقین سا لگتا ہے۔“ میں نے اس کے نظریات کو  
زور بہر طور پر جاننے کے لیے کہا۔

”دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ  
جنسیت ہماری مختصر سی زندگی میں ہر طرح کا انسان ٹکرائے ہر  
انسان اپنی زندگی جس دائرے میں گزارتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے،  
وہ سمجھتا ہے کہ بس یہی دنیا ہے اور یہی دنیا کے لوگ ہیں حالانکہ  
اس نے دنیا کا ایک گوشہ بھی نہیں دیکھا ہو۔“

”ماں لیا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن کیا معیشتیں  
واقعی بری چیز ہیں؟“

”معیشتیں اگر بری چیز نہیں ہیں تو کچھ زیادہ اچھی چیز بھی نہیں  
ہیں۔ زندگی میں معیشتوں کا عمل دخل بڑھتا ہے تو انسانوں کا عمل  
دھل گھٹ جاتا ہے۔“ وہ میری سانس لے کر بولی اور بالوں میں  
اٹھکاپاں پھیرنے لگی۔ اس کی چادر کے حوالے پر دھلک آئی تھی۔ اس  
کی ڈانٹیں کیا تھیں، سیاہ روٹم کا ایک آثار تھا۔ اس نے بالوں میں  
ہاتھ پھیرا تو اس آثار سے خوشبو ہی پھوٹنے لگی۔

وہ میری طرف ہنسنے ہوئے بولی۔ ”اچھا..... ایک بات بتاؤ۔  
انسان نے وقت بچانے کے لیے معیشتیں ایجاد کی تھیں لیکن آج  
انسان کے پاس بقیہ نہیں ہے۔ بتاؤ وہ وقت کہاں گیا تھا اس نے  
معیشتیں ایجاد کر کے بنایا تھا؟“

”معلوم نہیں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔ یہ بہت تفصیل  
طلب موضوع تھا۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

زور تاج کھوئے کھوئے سے انداز میں سہکراتے ہوئے بولی۔

”میرے والد مرحوم ایک مقام تک بہت بڑے دانشور تھے۔ کوشش  
کرتے تو بڑا نام پا سکتے تھے۔ انہوں نے بہت پے لے کر دیا تھا کہ ایک  
وقت آئے گا جب دنیا میں معیشتیں زیادہ ہوں گی، انسان کہ انسان  
معیشتوں کو اپنے اوپر اتنا مسلط کرے گا کہ ان کے بغیر وہ ایک قدم  
بھی نہیں اٹھا سکے گا۔ درحقیقت اس وقت انسان معیشتوں پر نہیں  
بلکہ معیشتیں انسان پر حکمرانی کر رہی ہوں گی اور انسان اپنی زندگی  
سے اتنا بیزار ہو گا کہ دروازوں سے سر کھرائے گا۔ طاقتور ترین  
خواب آور دور انہیں کہا کر بھی اسے خیر نہیں آئے گی۔ وہ خود راگ  
کم دور انہیں زیادہ کھائے گا۔ صرف مغربی ممالک میں ہی نہیں بلکہ  
جلد یا بدیر دنیا کے بیشتر ممالک میں ہر قوم اپنی تہذیب کے تجزیے  
خود بخوشی کرے گی۔ اس وقت لوگ فطری زندگی کی طرف واپس آنا  
چاہیں گے، سادہ زندگی کی طلب کریں گے۔ ایک کاماں، دو چار

پھر وہ آسمان کی طرف دیکھ کر گویا خشکی کی سرفی سے محروم ہی  
ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میرے گرد انسان کم  
ہو جائیں اور معیشتوں کا شور بڑھ جائے۔ معیشتیں زیادہ ہو جاتی ہیں تو  
انسان سے انسان کی وابستگی کم ہو جاتی ہے۔ میں ماحول کو اس کے  
اصل اور قدیم رنگ میں دیکھ کر لطف محسوس کرتی ہوں لیکن اس  
بات کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ہر ایک اس سے انجوائے نہیں  
کر سکتا۔ جس طرح کھانسی کو سستی ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتی اور  
اس سے ہر کوئی محفوظ نہیں ہو سکتا، اسی طرح فطری زندگی کی  
خوبصورتی اور دلکشی کو بھی ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔“

پھر وہ میری طرف دیکھ کر سہکراتے ہوئے بولی۔ ”تم میری  
باتوں سے بور ہو رہی ہو، پورے ہو۔“

”جو آپ کے پاس کہنے کو نہ رہا ہو، وہ دنیا کا نہایت

بد نصیب انسان ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب میرے حسن کی تعریفیں نہ شروع کر دیتا۔ وہ میں زندگی میں بہت سن چکی ہوں اور مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"شاید آپ دنیا کی پہلی خاتون ہیں جسے اپنے حسن کی تعریف سننا اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

"اس دنیا میں بہت کم تعریفی الفاظ بچے دل سے ادا کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ کی غلوں کی ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

"خیر... میں اگر غلوں اور بچے دل سے بھی تعریف کرنا چاہوں گا تب بھی اتنے پاکلی پن کا ثبوت نہیں دوں گا کہ پہلی ہی ملاقات میں ایسا باتیں کرنے لگوں۔"

"یعنی آگے چل کر ارادہ ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔  
 "مستقبل کا حال اور والا ہی بتہر جانتا ہے۔" میں نے ردیاتیانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

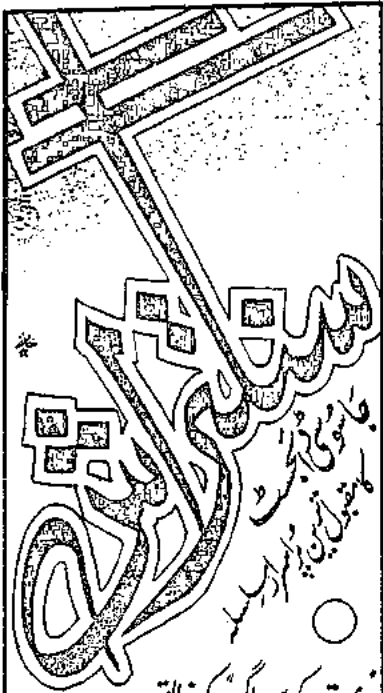
وہ چادر کندھوں پر کچھ اور پھیلاتے ہوئے بولی۔ "میں شاید تمہیں باتوں کی لگوں لیکن میں پہلی ہی ملاقات میں ہر ایک سے اتنی زیادہ باتیں نہیں کرتی۔ آج شاید اس لیے کر رہی ہوں کہ مدت بعد کوئی ایسا سامع میرے تیار ہے جو مشکوک سے ملے اور مشکوک سے انداز میں یہاں پہنچا ہے لیکن جس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور لہجے میں تہذیب کی جھلک ہے۔"

"اب مجھے ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ اب تعریف آپ کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تعریف نہیں صرف روائے تمبر ہے۔" پھر وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "خیر... چھوڑو ان باتوں کو۔ میں فطری خوبصورتیوں کی بات کر رہی تھی۔ جس طرح موسیقی میں بھی لوگ جدید دھنوں کی تیزی، شور شرابے اور وقتی پہچان تیزی سے متاثر ہو کر پاپ میوزک کو پسند کرنے لگتے ہیں مگر یہ پسندیدگی طویل عرصے کے لیے نہیں ہوتی، اسی طرح لوگ آج کل دنیا کے بڑے بڑے اور پُر آسائش شہروں میں جو زندگی بسر کر رہے ہیں وہ بھی گویا "پاپ" زندگی ہے لیکن یہ بہت طویل عرصے تک پائوکر نہیں رہے گی۔ میرے بابا اور ان جیسے دوسرے دانشوروں کی چشموں کو یہاں درست ثابت ہوئی گی۔ انسان اپنے اصل کی طرف واپس آنے کی کوشش ضرور کرے گا کہ اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ وہ جدت اور فطرت دونوں کے درمیان پھنس کر رہ جائے گا۔"

اس نے ایک بار پھر بغور میری طرف دیکھا اور بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ میری باتیں تمہاری سمجھ میں آ رہی ہیں۔"

"اگر آپ کو یہ یقین نہ ہو تا تو آپ یہ باتیں ہرگز نہ کرتیں۔" بے شک۔ "اس نے تہذیب کی اور ایک بار پھر اسی موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہیں پڑھنے لکھنے کا تھوڑا بہت شوق رہا ہے تو شاید تمہیں معلوم ہو کہ مغرب میں تو انا سفر شروع



موت کے سوداگر کے خالق  
 اقلیم علیم کے پراسرار قلم سے لکھی گئی  
 ایک سلسلہ وار پراسرار اور ایڈنچر کہانی جس  
 نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کیے۔  
 کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

ناشر:  
**مکتبہ القریش**  
 اردو بازار لاہور  
 جلد اول: ۵۰ روپے  
 جلد دوم: ۱۵۰ روپے  
 فون: ۴۲۲۴۶۶۶۵



بھی ہو چکا ہے۔ پہلے وہاں بھی ہمارے ملک کے بیشتر حصوں کی طرح  
دعوات میں غریب کا شکار وغیرہ رہا کرتے تھے اور ضرور کی فکر  
پوس، جنگلاتی عمارتوں اور چوڑی چٹنی سڑکوں کو سہت سے دیکھا  
کرتے تھے۔ اب لکھ پتی اور کوڑھتی لوگ دہانوں کا رخ کر رہے  
ہیں، فارمگ کر رہے ہیں۔ لوگوں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے اور بہت  
گھڑت سے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ ہر چیز سے اکتا گئے ہیں۔ غفلت کی  
طرف لوٹ رہے ہیں۔

پھر وہ پانی کی ایک سڑکی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔  
”مصنوعی آسائشوں کا آرام تو بہت ہے لیکن ان پر انحصار کرنے کی  
لگنیں بھی بہت ہیں۔ یہ سونپائی تو بہت تیزی سے دھڑا دھڑا کر رہی  
ہے لیکن بجلی کے بغیر بے کار ہے۔ اگست ۱۹۷۹ء میں پہلی بار  
پورے نیویارک کی بجلی کٹ ہو گئی تھی تو اس مذہب شہر میں کیا کیا  
فتاحیں برپا ہوئی تھیں، تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان  
واقعات کے بارے میں ایک ضخیم کتاب بھی چھپی تھی۔ میرے  
پاس ہے۔ ضخیم ہونے کے باوجود وہ ان تمام واقعات کی محض ایک  
تفصیل ہے لیکن اس جنگ سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنوعی  
آسائشیں اور جدید ترین زندگی کی کشاکش انسان کو کہاں لے  
جادی ہے۔ انسان کے اندر کیا گیسواور عمدہ چھپ کر بیٹھ گیا ہے جو  
موقع پاتے ہی نکل آتا ہے۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس پسماندہ علاقے  
میں رہتے ہوئے وہ اپنے غفلت اور غناات اور ذوق کے اعتبار سے  
ایک بے مثل لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت  
محسوس کر رہا تھا کہ فطرت حالی کے عالم میں جھکتے ہوئے ایسی شخصیت  
کی محفل اری میں آنکلا تھا اور وہ مجھ پر مہمان بھی نظر نہیں تھی۔ وہ  
اپنے آپ کو فرخندہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ شاید انوکھا لوگ انکساری کہہ  
رہی تھی۔ میرے خیال میں تو وہ آنے والے زمانوں کی لڑکی تھی۔  
اچانک ہی وہ بولی۔ ”میں وہ کتاب چھپیں بھی دوں گی؟ ذرا  
پڑھا۔“

اس نے میری شخصیت سے ایک تودہ پرت آمارنے کے لیے  
اچانک ہی ہاتھ مارا تھا۔ میں نے بیٹھنے سے روک لیا۔ ”آپ نے  
کیونکر سمجھ لیا کہ میں انگریزی کتابیں پڑھ سکتا ہوں؟ میں اب اتنا  
بھی پڑھا سکتا نہیں ہوں۔ واجبی سی تعلیم ہے میری۔ ہاں اتنا ضرور  
ہے کہ اچھے لوگوں میں اچھے بیٹے کا موقع ملتا رہا ہے۔“

”اچھا۔ کیا واقعی تم انگریزی نہیں پڑھ سکتے؟“ اس نے  
میری آنکھوں میں جمائے ہوئے پوچھا۔  
”بہت معمولی حد تک پڑھ سکتا ہوں۔ باقاعدہ کتابیں وغیرہ  
نہیں پڑھ سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔  
وہ گردن کو خنیف سا جھکا دے کر رہ گئی لیکن آنکھوں ہی  
آنکھوں میں گہرا درد رہی تھی۔ ”تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں ورنہ  
میرے اندازے غلط نہیں ہوتے۔“

اس دوران ہم فارم کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے۔  
یہاں کچیل دیوار میں ایک راہداری سی نظر آ رہی تھی جس کے  
انتہام پر دروازہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھلا تب مجھے  
معلوم ہوا کہ وہ فارم سے شملک دو کمروں کا ایک چھوٹا سا سرونٹ  
کو از نائپ مکان تھا۔ اس میں دو کمرے، ”اچھا بھلا مکان“ ونڈ پپ  
والا ہاتھ دھام اور یاد رہتی خانہ وغیرہ تھا۔ مکان میں ضرورت کی ہر  
چیز بھی موجود تھی۔ اس کا ایک الگ دروازہ بھی تھا۔ باہر سے باہر  
بھی اس مکان میں آمدورفت رکھی جا سکتی تھی اور فارم کے اندر  
سے بھی۔

”یہاں قائم دین اپنے بڑی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔“ ذرا تاج  
نے بتایا۔ ”قائم دین اس شخص کا نام ہے جس کا میں نے کچھ دیر  
پہلے ذکر کیا تھا کہ وہ ہمارے لیے کھوڑے سو دھالیا کرتا تھا اور اس  
فارم کا شیخ رہا تھا۔ وہ کچھ نئی مجبوریوں کی وجہ سے یہاں سے بہت دور  
چلا گیا ہے۔ میرے پاس سمجھ دار اور زیادہ پُرمندانہ لوگوں کی کمی ہے  
ورنہ شاید میں کھوڑوں کی فارمگ کو بہت آگے لے جاتی اور کچھ  
دوسرے جانوروں کے بھی قائم بناتی لیکن اکیلے عورت اتنے زیادہ  
کچھنوں میں نہیں پڑ سکتی۔ میرے پاس ایسے لوگ کم ہیں جنہیں  
ایک بار کام شروع کر کے دے دیا جائے اور پھر ان کی طرف سے  
آپکھیں بند کر لی جائیں۔“

پھر اس نے گویا وضاحت کی۔ ”میں زیادہ سے زیادہ دولت کے  
لاٹ میں اپنے کام پھیلانا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں، مجھے بے  
شک کوئی خاص منافع نہ ہو لیکن زیادہ سے زیادہ لوگ روزگار سے  
لگیں۔ میرے گاؤں میں ’میری‘ زمینوں پر زیادہ سے زیادہ مویشی اور  
چمیل چلے۔ زندگی یہاں مختلف رنگوں میں مختلف شکلوں میں  
زیادہ سے زیادہ پھیلے پھولے کھنے کو تو یہ ایک دیکھی عطا ہو لیکن  
لوگ روزگار کی تلاش میں یہاں دور دور سے آئیں۔ میں اسے  
ایک مائل علاقہ بنانا چاہتی ہوں لیکن بہت سی مجبوریوں آڑے  
آجاتی ہیں۔“

وہ ایک لمبے کے لیے خاموش ہو کر بولی۔ ”میں ایک بار پھر  
تصدیق چاہوں گی کہ تم میری باتوں سے پور تو نہیں ہو رہے؟“  
”اور میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ آپ کی باتوں سے پور ہونا  
بڑی ہی بد فہمی کی بات ہوگی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”مجھے تو یہ خواب و خیال اور افسانوں کی دنیا کی باتیں لگ رہی ہیں۔  
آپ کی خواہش ہے کہ لوگ دور دور سے روزگار کی تلاش میں  
یہاں آئیں جبکہ ہمارے ہاں لوگوں کا بس نہیں چل رہا کہ وہ ایک  
دوسرے کو اپنی اپنی گلیوں، گلیوں اور شہروں سے نکال باہر کریں۔“  
”ہاں۔“ اس کے چہرے پر افسردگی کی ایک لہری آکر گر رہی۔  
”لوگ نظام کی خرابیوں کی سزا ایک دوسرے کو دینے پر تلے رہتے  
ہیں۔ لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ جہاں انسان ہوتے ہیں وہاں برکت  
ہوتی ہے۔ جہاں سے انسان کو ہٹ کر دے گئے ہیں وہ جگہیں رتہ رتہ

اُڑ جاتی ہیں۔“ پھر اس نے کندھے اُپکائے اور اس کے دو تڑپے پر وہ خفیف سی مسکراہٹ لوٹ آئی جو اس کی اُچلی اُچلی شخصیت کو کچھ اور اُجال دیتی تھی۔ ”نہیں یہ بتاؤ تمہارے لیے یہ مکان مناسب رہے گا؟“

”مناسب؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ ”میرے لیے اس وقت یہ کسی بڑے آسائش محل سے کم نہیں۔ اب میں محض گفتگوں میں آپ کا شکر یہ ادا کرتے رہتا نہیں چاہتا۔ اب میں آپ کے لیے کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔“

”اس کے ہمیں بہت سے مواقع ملیں گے۔“ وہ بولی۔ ”اب میں چلتی ہوں۔ یہاں ضرورت کی زیادہ تر چیزیں موجود ہیں۔ دو ملازم دن بھر یہاں رہتے ہیں۔ رات کو گاؤں چلے جاتے ہیں۔ اس وقت وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ ہمیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، ان سے کہہ دیتا۔ یہاں کا ہر کام، صفائی ستھرائی وغیرہ دی کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ تم سارے ماحول سے آشنا ہو جاؤ گے۔ آدھ رشتہ کے لیے یہاں ایک الگ گھوڑا اور کتھی بھی موجود ہے۔“

میں اس کے ساتھ ساتھ وہاں ٹارم کے گیٹ تک آیا۔ اس وقت تک شیر محمد کسی نہ کسی طرح سرکش گھوڑے اور میرے سیاہ گھوڑے کو دو غالی اسٹار میں باندھ چکا تھا۔ وہاں اور بھی کئی سیاہ گھوڑے موجود تھے۔ میرا گھوڑا بھی گریا انھی میں شامل ہو گیا تھا۔ اب اس کی کوئی الگ شناخت نہیں رہی تھی۔

زرتاج نے مجھے خدا حافظ کہا اور اپنے آدمیوں کے گھیرے میں اپنی چوٹی کی طرف چل دی۔ میں دو دوڑے پر کھڑا اور ایک سوچتا رہا کہ میری خوار دیو کی کرسی قیامتہ خدا کو کچھ پر سن چکیا تھا جیسی میرا ہر مسئلہ ہوں بالکل غیر متوقع طور پر حل ہو گیا تھا۔

○●○

میں نے دو دن وہاں بغیر کوئی کام کیے گزار دیے۔ میں تو دوسرے دن سے ہی کام شروع کرنا چاہتا تھا لیکن شیر محمد نے امتحانی ناگوار پی سے مجھے بتایا۔ ”رئیسانی نے بولا ہے ابھی آرام کرو۔ تمہارے لیے جب کام شروع کرنا ضروری ہو گا ہم تمہیں بتا دیں گے۔“

رئیسانی سے مراد زرتاج تھی۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ شیر محمد مجھ پر زرتاج کی نوازشات سے خوش نہیں تھا اور اس نے یہ بات چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن غیبت یہ تھا کہ اس کی ناگوار پی اور ناخوشی صرف اس کے لیے تک محدود تھی۔

ان دونوں کے دوران میں بہت محتاط رہا تھا۔ ہر آہٹ اور ہر غصے پر میری نظر رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں وہاں کے ماحول کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید انپکڑ زخم کل اس طرف بھی آئے لیکن کم از کم ان دونوں میں تو وہ مجھے

پوری معلوم ہوا تھا۔ اس کے دونوں کندھوں پر دو کلا شکو نمی بھڑکی رہی تھیں۔ ایک کلا شکوف انار کر اس نے بڑے اطمینان اور بے پروائی سے

کھینچ دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ ہی کسی درپے سے اس کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔

اس دوران میرا ٹیبلر بھی بدل چکا تھا۔ پہلے ہی دن گاؤں سے ایک درزی آکر میرا ٹاپ لے گیا تھا اور دوسرے دن میرے لیے دو بڑے بیل کر آگئے تھے۔ درزی نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ وہ پتلون بیل شرٹ وغیرہ بھی سیسکا ہے اور دو تین دوڑیں میرے لیے بھڑکی اس کے ”انگریزی اسٹائل“ کے بھی دو تین جوڑے سی کر بیٹھے گا۔

غالباً اس میٹر آتے ہی میں نے اپنے جسم سے آسیب کی طرح چمکی ہوئی سیاہ پینٹ شرٹ کو عمار نا نہیں، حقیقت چوٹے میں جموٹک دیا تھا۔ چڑبے کی بیکٹ کو البتہ میں نے جلانے کی کوشش نہیں کی۔ خواہ مخواہ اس کی بو بہت دور تک پھیل جاتی۔ اس کے لیے مجھے اصطبل میں ایک نہایت مناسب گڑھ حاصل کیا اور میں نے اسے وہاں دفن کر دیا۔

صفائی ستھرائی وغیرہ کرنے والے دونوں ملازموں میں سے ایک میرے لیے کھانا پکانا تھا۔ وہی سوا سلف بھی لاتا تھا۔ میں تو ان دونوں میں ایک بار پھر خود کو اچھا بھلا ”صاحب“ محسوس کرنے لگا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ زر تاج نے میرے لیے چند کتابیں بھی بھجوا دی تھیں۔ قابلِ غور بات یہ تھی کہ میرے یہ بتانے کے باوجود کہ میں انگریزی کتابیں نہیں پڑھ سکتا، ان میں دو تین انگریزی ویٹرن ناول بھی شامل تھے۔ شاید اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا اور شاید اس نے ان کی نہایت سے ناول بھجوائے تھے کہ جب میں یہاں پہنچا تھا تو خود کسی ویٹرن قلم کار کو در معلوم ہو رہا تھا۔

بہر حال میں نے یہ چیزیں میٹر آتے ہی دیکھی قالب میں ڈھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ زر تاج کی بھیجی ہوئی کتابوں کے مطالعے میں بھی میں نے خاصا وقت گزار لیا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکے لیٹا پڑھتا رہتا تھا۔ مجھے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں اپنی کسی جنت گم گشتہ میں پہنچ گیا تھا۔

لیکن آرام کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے ”تھکا“ دینے کے لیے دو دن کا ”آرام“ ہی کافی تھا۔ میرے دن آرام سے تنگ آکر میں نے خودی زر تاج کو پیغام بھجوایا کہ میں گھوڑوں کو سدھانے کا کام کرنا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے۔

پیغام کے جواب میں شیر محمد میرے پاس آیا۔ آج اس کی آنکھوں میں کینہ نہیں، صرف سرد مہمی تھی۔ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ امید بھی رکھی جاسکتی تھی کہ چند دن میں یہ سرد مہمی اس کی آنکھوں سے رخصت ہو جائے گی لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی کینہ پروری لوٹ آئی۔ آدمی کینہ پروری معلوم ہوا تھا۔

اس کے دونوں کندھوں پر دو کلا شکو نمی بھڑکی رہی تھیں۔ ایک کلا شکوف انار کر اس نے بڑے اطمینان اور بے پروائی سے

جلدی تم پر مہمان ہوئی ہیں لیکن اس سے تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو جانا۔ ریسمانی جی اپنی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والے کی آنکھیں نکلوا کر پیروں کے مسل سکتی ہیں۔ اگر وہ اس کام میں چوک جائیں یا رحم کما جائیں تو ہم خود ہی یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔“

”لا حول ولا قوت.....“ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”کیا کوئی اتارے وقف اور احسان فراموش بھی ہو سکتا ہے کہ ریسمانی کی طرف میلی نظر سے دیکھے؟“

”ابھی تک ایسا ہوا تو نہیں لیکن وقت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ ہم ہر طرح کے وقت کے لیے تیار رہتے ہیں۔“ اس نے شاطرانہ لہجے میں کہا پھر اپنی منچ پر مڑتے ہوئے بولا۔ ”نہیں..... جوڑوان باتوں کو۔ آؤ آج کام شروع کریں۔ شاید ہمیں بھی تم سے کوئی نئی چیز سیکھنے کا موقع ملے۔“

”یقیناً۔“ میں نے ذرا بھی انکساری ظاہر کیے بغیر کہا۔ ”اگر انسان میں سیکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ ہر شخص سے ہی کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔“

ہم فارم پر آگئے۔ وہاں گھوڑوں کو سدھانے کا مزدوری سامان موجود تھا۔ شیر عمر نے بتایا کہ کون کون سے گھوڑے سرکش تھے اور سدھے ہوئے نہیں تھے۔ ہم نے ان میں سے دو گھوڑے منتخب کیے اور باہر اسی میدان میں آگئے جہاں میں نے تین دن پہلے شیر عمر ذرا تاج اور دو سرے لوگوں کو دکھا تھا۔

وہاں تک پہنچنے کے لیے ہم حویلی کے قریب سے بھی گزرے۔ حویلی کے دو دروازے سکوت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بہت دور کھیتوں میں مردوار غور میں کام کرتی نظر آ رہی تھیں۔

”آج ریسمانی جی نظر نہیں آ رہی ہیں۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

”ریسمانی جی تو اکثر ہی نظر نہیں آتیں۔“ شیر عمر بولا۔ ”وہ تو تمہاری خوش قسمتی تھی کہ اس روز وہ تمہیں نظر آ گئیں۔ ان کا باہر چل قدمی کا سواڑ تھا۔ ورنہ وہ تو چل قدمی بھی حویلی کے اندر ہی کرتی ہیں۔ ان کا تو یہ عالم ہے کہ سامنے زمین میں گمراہ معائنہ پر نہیں نکلتیں۔ کبھی کبھار پوچھی بیکر کرنے کے انداز میں ادھر نکل آتی ہیں۔ لیکن لوگوں کی سستی اور غفلت پر انہیں سزا دینا تو درکنار ڈانٹ لپٹ تک نہیں کرتیں۔ یوں پیار سے سمجھاتی ہیں جیسے سب ان کے عزیز رہتے دار ہیں۔“

پھر وہ گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہاں دیکھو۔ گاؤں چند قدم کے فاصلے پر ہے مگر وہ کبھی کبھار سی ادھر جاتی ہیں۔ عجیب دو ٹول کم کی لہائی ہیں وہ۔ اپنے والد کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ بڑے باہر و جلال والے آدمی تھے بہت دھڑکتے تھے لوگ ان سے لیکن جب سے ان کا اختلال ہوا ہے اور ریسمانی جی نے ولایت سے آکر زمینوں کا انتظام سنبھالا ہے تب سے لوگ اپنے آپ کو بہت

فاضل سمجھتے ہیں سیت میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ریسمانی نے تمہارے لیے بھیجی ہے۔ ہمارا علاقہ ذرا خطرناک ہی ہے۔ ہمیں اپنی اور اس جاگیر سے متعلق رکھنے والے ہر شخص کی حفاظت کے سلسلے میں چوکنا رہنا ہو گا۔ یہ مت سمجھنا کہ ہمیں صرف گھوڑوں کی ہمناسی میں ہی تمہیں رہنا ہو گا۔“

”نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ مجھے کچھ انسانوں کی ہمناسی بھی سنبھانے کی۔“ میں نے چھیڑتی سی کہا۔

اس نے کڑی نظر سے مجھے گھورا لیکن میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر بولا۔ ”دو باتوں کا خیال رکھنا۔ ایک تو اس گمن کے علی ہوتے پر کوئی واردات نہ کر دینا۔ صرف اپنی ریسمانی جی ان کی جاگیر ان کے مال و دولت اور ان کے لوگوں کی حفاظت کے لیے یہ گمن استعمال ہونی چاہیے۔ خاص طور پر یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اس گمن سے کسی پولیس والے پر کسی بھی حال میں کوئی نہیں چلی چاہیے۔“

میں ذرا چونکا۔ شیر عمر بطور خاص مجھے یہ نصیحت کیوں کر رہا تھا؟ میں نے اس کے چہرے پر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا چہرہ ساٹ تھا۔ وہ بات جلدی رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس گمن کا لائنس نہیں ہے۔ یہاں موجود بہت کم اسلحے کا لائنس ہے لیکن تم سے کوئی لائنس کے بارے میں پوچھنے کا بھی نہیں۔ ہمارے علاقے میں پولیس کا عمل دخل بہت کم ہے۔ یہاں کے زیادہ تر بھڑے ہم خود ہی طے کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی کسی خاص معاملے کی تحقیقات کسی کا چھپا کرتے ہوئے پولیس ادھر آ نکلتی ہے۔ کبھی باگوار حالات میں بھی ان سے سامنا ہو سکتا ہے لیکن جب تک ریسمانی کا حکم نہ ہو ان سے بچنا نہیں پڑتا ہے۔“

میں نے گمن چارپائی کے سارے کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ احکامات واقعی ریسمانی کے ہیں یا تمہارے اپنے؟“

”بات ریسمانی کے دل کی ہے“ صرف الفاظ میرے ہیں۔“ اس نے بے پردائی سے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے الفاظ سے ہی کافی فرق پڑ گیا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں شکل سے واردات یا نظر آتا ہوں جو ان ہدایات کی ضرورت پیش آئی؟“

”شکل کا کیا ہے بھائی!“ وہ بے غشی سے بولا ”شکل سے تو تم غلطی پیدا کرتے ہو مگر اعمال شکل پر نہیں لگتے ہوتے۔ اور پھر ریسمانی جی کا کیا ہے۔ وہ بہت بڑی عورت ہیں مگر بہت ہی بھولی اور سادہ دل ہیں۔ کوئی دن سے ذرا بیٹھی بیٹھی باتیں کر لے اس کے لیے مہمانوں کے دریا بہا رہی ہیں۔ ابھی باتیں ان کی کمزوری ہیں۔ ایک منٹ میں مٹاڑ ہو جاتی ہیں۔“

”چھابا؟“ میں نے دلچسپی سے کہا۔ ”کیا اس سے پہلے بھی وہ لوگوں سے متاثر ہوتی رہی ہیں؟“

”بے شک لیکن اس طرح۔۔۔ اور اتنی جلدی نہیں جتنی

شیر محمد باتیں کرتے کرتے ایک سخت خاموش ہو گیا جیسے اس کے ارادے کے بغیر کھنگو غلطی پر چل گئی ہو اور اس قسم کی باتیں کرنا اس کے خیال میں مصلحت کے خلاف ہو۔ مجھے یاد آیا، ذرا تان نے مجھے خود اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک مہاکبت پسند لڑکی تھی لیکن شیر محمد جو نقشہ کھینچ رہا تھا وہ کسی مہاکبت پسند انسان کی فطرت کا نقشہ نہیں تھا۔ مہاکبت پسند لوگوں کو تو اپنا حکم ماننے والوں کے جھرم میں جانے اور اپنی مہاکبت کا اظہار کرنے کی بڑی عادت ہوتی ہے۔ ان کے انداز گفتگو میں ایک خاص غوث ہوتی ہے۔ شیر محمد جن خصوصیات کا ذکر کر رہا تھا وہ ٹوکش نہیں اور درویش صفت لوگوں میں پائی جاتی تھیں۔

میں ممکن تھا، ذرا تان اپنی حویلی میں محدود رہتے ہوئے بس اس احساس سے ہی لطف اندوز ہوتی ہو کہ اسے اتنے لوگوں پر مہاکبت کا حق حاصل تھا لیکن وہ اس حق کو خواہ مخواہ استعمال کرتے پھرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی ہو۔ بہر حال میں نے شیر محمد کو ذرا تان کے بارے میں کڑی لے کر گوشش نہیں کی۔ ایسی غلت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرا فی الحال یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اگر کچھ دن یہاں ٹکنا میرے نصیب میں تھا تو مجھے یقین تھا کہ رفتہ رفتہ ہر بات میرے علم میں آجائے گی۔

پہلے ہم دونوں نے مل کر ایک گھوڑے کی گردن میں اس طرح رستے کا حلقہ ڈالا کہ وہ اس کے سینے پر چسب گیا۔ اس کے عقب میں دو رستوں کی مدد سے میں نے تختہ باندھا اور اس پر خود کھڑا ہو گیا۔ گھوڑا بہت سرکش تھا لیکن میں نے اس سے ذرا آزمانی نہیں کی۔ بہت پیار سے اسے چکارا اور سلام کیا تھا۔ شیر محمد نے رستوں کی مدد سے اس کی گردن قابو میں کی ہوئی تھی۔ میں نے شیر محمد کی مدد سے رستہ دہی سے گھوڑے کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ گھوڑے نے میدان کے دو تین چکروں آرام سے کاٹ لیے لیکن پھر وہ مضطرب ہونے لگا۔ طاقتور اور غیر مدعا گھوڑا تھا۔ اپنی طاقت اور سرکشی دکھانے کے لیے بے چین تھا۔ شیر محمد کو بھی یقیناً اس بات کا اندازہ تھا۔ ایک موقع پر اس نے جان بوجھ کر۔۔۔ لیکن اس طرح کہ بظاہر ہر اتفاق نظر آئے۔۔۔ رستوں پر اپنی گرفت ڈھکی لکی۔

گھوڑا بڑی طرح بھڑکا اور بظاہر "غیر ارادی" طور پر ریتیاں شیر محمد کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ گھوڑا پہلے تو پچھلی دونوں ہاتھوں پر کھڑا ہوا پھر اس نے اگلی ہاتھیں زمین پر ٹکاتے ہی مجھے دو فنی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میرے لیے یہ قاتلے غیر متوقع نہیں تھے۔ میں سخت سے جھلاٹک لگا کر ایک طرف ہو چکا تھا اور اس سے پہلے کہ گھوڑا بے تحاشہ دوڑنا شروع کرے میں اس کی گردن کے قریب پہنچ کر شیر محمد کی چھوڑی ہوئی ریتیاں گرفت میں لے چکا تھا۔ گھوڑا کچھ دور تک مجھے اپنے ساتھ کھینچنے لگا لیکن بالآخر میں نے اس کی گردن کے گرد رستوں کا پھندا سخت کرتے ہوئے اسے ٹکے پر

شیر محمد نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس طرح اسے ایک وقت دو فائدے ہوئے۔ میں ذرا بھی مضبوط ہو کر اس کے راستے سے ہٹ سکتا تھا اور گھوڑوں کے معاملے میں اس کی چوہدری بہت بلا شرکت غیرے بحال ہو سکتی تھی۔ دوسرے اس لائن میں میری بالائقی غایت ہو سکتی تھی۔ ذرا تان کو یقین دلایا جا سکتا تھا کہ میرے دعوے محض لغالی تھے۔

تاہم میں نے شیر محمد پر ظاہر نہیں کیا کہ میں اس کی حرکت کو محسوس کر چکا ہوں۔ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "گھوڑا بے شک طاقتور ہے لیکن اسے افضل خان کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ انسان اور جانور، دونوں ہی اکثر افضل خان کی طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی کا جاتے ہیں۔"

شیر محمد ہم قسم کھا کر تھا۔ میں نے سرسری لیے میں کہا۔ "اب جہیں ریتیاں کڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اس گھوڑے سے نمٹ لوں گا۔ تم جاؤ تو دوسرے گھوڑے کے ساتھ ذرا آزمانی شروع کر دو۔"

میں نے دوبارہ گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلانا شروع کر دیا۔ اس کی سرکشی نہ جانے کیوں جلدی ہو چکی تھی اور وہ ذرا مجھے انداز میں چلنے لگا تھا۔ شیر محمد چند لمبے دھبے کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس درخت کی طرف چل دیا جس کے ساتھ دو سرا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے کو ضروری بندشوں میں بکڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کافی دور جا کر دوسرے گھوڑے کے ساتھ کھینچا آتی میں مصروف ہو گیا۔

گھوڑا کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا لیکن شیر محمد میری نظر میں غرت دیکھنے کی خاطر اپنی بھلائی سے بڑھ کر اس کے ساتھ ذرا آزمانی کر رہا تھا۔ وہ گھوڑے سے نہ جانے والا پیشہ و آدمی تھا اور مظلوم نہیں اس کام میں کتنا وقت گزار چکا تھا لیکن مجھے اس کے انداز و اطوار میں ذرا بھی ہنرمندی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دوسرا تک ہم گھوڑوں کے ساتھ جان مار رہے تھے۔ غیبت تھا کہ میں کسی بھی تے یا پڑشقت کام سے بور نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کام میں بھی دلچسپی محسوس کرنا شروع کر دی۔ میں شیر محمد اور گھوڑے یعنی چاروں ہی اس طرح پیسنے میں شرابور ہو گئے کہ پسینہ ہمارے جسموں سے ٹپک کر زمین میں جذب ہونے لگا۔

اسی اثنا میں ایک شخص حویلی کی طرف سے آنا دکھائی دیا۔ اس وقت تک میں گھوڑے پر زمین کس چکا تھا اور اسے زمین کا عادی بنادیا تھا تاہم میں نے اس پر بیٹھنا شروع نہیں کیا تھا۔ قزاق میرے قریب آکر سیٹھ سے لیے میں بولا "جہیں دیکھائی دے حویلی میں ملایا ہے۔"

میں نے ایک بار پھر پٹائی سے پسینہ پونچھا اور گھوڑے کو باندھنے کے لیے درخت کی طرف چل دیا۔ میں شیر محمد کے قریب سے گزرا تو وہ پُر خیال انداز میں مونہہ کوئل دیتے ہوئے بولا

”قسمت بہت صبران معلوم ہوتی ہے تم پر۔ بعض لوگ برسوں سے ریجسالی جی کے کارندے ہیں مگر انہیں آج تک حویلی میں جانے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔“

اس کے لہجے میں طنز و معنیت با کسی اور عکسے تاثر کی جھلک نہیں تھی۔ بس ایک طرح کی رشک آمیزی سی تھی۔ حالانکہ میری اپنی مطلوبات کے مطابق اس کا اپنا بھی بلا دوک ٹوک حویلی میں آنا جانا تھا مگر شاید اسے یہ اعزاز میری طرح روزِ اوّل سے حاصل نہیں ہوا تھا۔

میں اس شخص کے پیچھے چل رہا۔ ناک کی سیدھ میں حویلی کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ گیٹ کے قریب لمبی چوڑی چارپائی پر چار بچے بکے محافظ بیٹھے آتش کھیل رہے تھے۔ ان کی ہمیں قریب ہی چارپائی کے ہمارے زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے شخص ایک نظر میری طرف دیکھا اور دو ہاں پٹوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے اطہیان کے لیے شاید یہی کافی تھا کہ حویلی کا ایک شخص میرے ساتھ تھا۔ میں اپنے رہنما کے ساتھ چلتی گیٹ سے گزر کر اندر پہنچ گیا۔

اندر پہنچ کر وہ شخص تو بظاہر کٹ بند کسے مجھے وہیں چھوڑ کر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف کو چل رہا۔ سامنے ہی ایک اوچڑ عمر بچیدہ صورت سی خادمہ کھڑی تھی۔ وہ بڑے شائستہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ میرے ساتھ آئیے۔“

وہ اس کشادہ روش پر موزوں کیونکہ سے اندر کی طرف باری تھی۔ یہاں فرش سبز اینٹوں کا تھا۔ سبز سرنگھاس کے بڑے بڑے چقلات پھولدار پودوں کی کیا ریاں اور ان سے بہت کتنا دور قطار سفیدے اور سرخے گزشت نظر آ رہے تھے۔

حویلی کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔ شخص ایک دیوار کے اس پار گویا ہوا سی مختلف تھی۔ تنگی اور خوابناک سی خوشبو سے بو جھل ہوا۔ باہر کی تپتی دھوپ اور گھوڑے سے زور آزمائی کی مشقت نے میرے جسم میں گویا آگ سی لگا دی تھی۔ کپشالی لمبی طرح تب رہی تھیں مگر اس خوبصورت راستے پر قدم رکھتے ہی گویا ہر سام جہاں میں لٹھڑکی اترنے لگی اور پسینہ خشک ہوتا محسوس ہونے لگا۔

اس عورت کے پیچھے چلتا ہوا میں حویلی کی اصل عمارت تک پہنچا جو باغ کے عین وسط میں بالکل زرتاجی کی طرح بگی سی فرحت سے سراٹھائے کھڑی تھی۔ سامنے باغ کی چند بیڑیاں تھیں اور بلندی پر جالی دار دروازہ نظر آ رہا تھا۔ خادمہ میرے لیے متوہانہ انداز میں دروازہ کھولے کھڑی رہی۔ میں اندر قدم رکھ چکا تب اس نے دروازہ بند کیا۔

میں نے اسے آپ کو ایک بہت بڑے گول کمرے میں بلایا لیکن اس میں کچھ نہ تھا۔ یہاں روشنی بہت کم تھی۔ صحن کراٹا نظر آ رہا تھا۔

سامنے کی دیوار میں محراب دار دروازے بھی نظر آ رہے تھے جو غالباً دوسرے کمروں کے تھے اور اس وقت بند تھے اس بڑے سے گول کمرے کا واحد مصرف بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے بیڑیاں اوپر جاری تھیں۔

خادمہ بیڑیوں کی طرف ہی باری تھی۔ بیڑیوں کے انتظام پر وہ ایک بھاری بھر کم چوڑی دروازہ کھول کر جس طویل و عریض کمرے میں داخل ہوئی وہ ڈانٹنگ ہال معلوم ہوتا تھا۔ اس میں وکٹوریئن اسٹائل کی ایک بہت بڑی اور بھاری بھر کم میز موجود تھی جس کے گرد بیٹیں یا بیٹیں یا شاید اس سے بھی زیادہ کرسیاں موجود تھیں۔ نہ جانے کب یہاں آئے تو میوں کے کھانا کھانے کی فہمت آئی تھی؟

اس ہال کے دوسرے سرے پر باریک پردہ اور نقلی سرتیوں کی لالائیں بچھول رہی تھیں۔ پردے کی تھاریراہ کی کے باوجود دوسری طرف کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خادمہ ڈانٹنگ ہال میں ہی رک گئی اور اس لیے چوڑے پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”ریجسالی جی اس طرف ہیں۔“

میں نے غیر ارادی طور پر کئی دن کی بڑھتی ہوئی واڈھی اور بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں پھر گردن میں لتھڑے ہوئے اپنے جوتوں کی طرف دیکھا۔ کسی رشک خزالاں کے سامنے جانے کے لیے یہ کوئی مستقل ملکہ نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔ میں نے ایک گرمی سانس لی اور پردے کی طرف بڑھ گیا۔

پردے پر میں نے عین وسط میں ہاتھ مارا تو وہ گویا دہاں سے شق ہو گیا اور میں ایک لمبے کے لیے وہیں بھوت سا کھڑا رہ گیا۔ دوسری طرف بھی تقریباً اتنی ہی بڑا کراٹا کھڑے کراٹے سے مشابہ تھا۔ اس میں سامنے کی دیوار کی جگہ بڑی بڑی عمارتیں بنی ہوئی تھیں اور ان عمارتوں پر تھیں۔ پتیلی بڑی ہوئی تھیں۔ قدیم سپانوی اور منلیہ طرزِ تعمیر کا استخراج تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ان چٹخوں کے پیچھے کھڑے ہو کر نہ صرف اس میدان کا جائزہ لیا جاسکتا تھا جہاں میں اور شہرِ محمد گھوڑے سدا حارے تھے بلکہ کھیتوں میں بھی آخر نظر دیکھا جاسکتا تھا۔ ایک محراب کے قریب وہ بچی کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اسے یقیناً معلوم تھا کہ میں تیس میں پہنچ چکا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اپنی جاگیر کا جائزہ لینے کے لیے اسے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ عین کھڑے کھڑے گھٹے گھٹے کھسکے کھسکتی تھی اور اگر وہ درمیان استعمال کرتی تو گاؤں پر بھی نظر رکھ سکتی تھی۔ اس حویلی کے محل وقوع اور ساخت میں یقیناً بہت سی باتوں کا خیال رکھا گیا تھا۔

مجھے زرتاج کا ٹھیلہ دیکھ کر بھی چونکا کا تھا۔ چلی بار میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ مشرقیت کا شاہکار تھی لیکن آج اس کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت چُست خالی جینز میں تھی۔ بیروں میں



”نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میرے ساتھ سات آٹھ ملازم اور دو خادماں جاری ہیں۔ میں اب اتنی بھی ایڈمنسٹریشن نہیں ہوں کہ اہل شکار پر چل دوں۔“

میں زیادہ دیر اس کی طرف دیکھنے کا قاتل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے جتنے کے بار دیکھنے لگا۔ بہت دور تک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں بری طرح چونک اٹھا اور ایک کرسی کے پیچھے پری کرکٹ غیر ارادی طور پر مضبوط ہو گئی۔

جتنے کے بار میں جس تبدیلی آئی تھی وہ مجھے بری طرح چونکا گئی تھی۔ تبدیلی یہ تھی کہ جس پگڈنڈی کے راستے میں اس علاقے میں پہنچا تھا اسی پگڈنڈی پر دو گھڑ سوار بڑے سطسن انداز میں اپنے گھوڑوں کو ڈوگی چلاتے ہوئے حویلی کی سمت تھے۔ فاصلہ کافی تھا لیکن میں انہیں پہچان سکتا تھا۔ میں انہیں بڑا دلوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ بلکہ اگر وہ جب بصارت سے آگے ہوتے شاید تب بھی پہچان لیتا۔

وہ جانو اور فیروز خان تھے!

جانو اس وقت بھی خاصا معزز آدمی نظر آ رہا تھا جب میں نے اسے جنگل میں اس کے ڈاکوؤں والے مسکن پر دیکھا تھا کمراب تو اور بھی زیادہ معزز دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے تن پر دھوپ میں چمکتا ہوا نہایت نفیس شلوار قمیص کا سوٹ اور شاندار واسکت تھی۔ سر پر کلف لگی ”اونٹنی“ کے گڑے والی پگڑی تھی۔ کندھے پر سیاہ رنگ کی کوئی اونٹنیوٹ مٹن لگی ہوئی تھی۔ گھوڑا بھی نہایت شاندار قسم کا تھا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ڈاکو تھا۔ بڑے لمبے کا جاگیردار معلوم ہو رہا تھا لیکن زرا پرانے وقت کا۔ اس دور کا جب زمینداروں کو بغیر دے کے کو بیٹلکس نے گرفت میں نہیں لیا تھا۔ فیروز خان بھی نہایت اچلے اور معزز زانہ لباس میں تھا لیکن اس کی صورت ہر حال ڈاکوؤں والی تھی۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ کسی سلطنت کا والی ہوتا تب بھی ڈاکو ہی معلوم ہوتا۔ گو کہ اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ اکثر سلطنتوں کے والی ڈاکو ہی ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔

ذرا تاج نے محسوس کر لیا تھا کہ میں کسی بات پر چونکا تھا اور میرے اعصاب میں یکایک تار سا اٹھیا تھا۔ اس کی نظر نے میری نظر کا تعاقب کیا اور دونوں گھڑ سوار اسے بھی نظر آ گئے۔ وہ بھی چونک لیکن اس کا چونکاؤ ذرا مختلف تھا۔

”ارے۔۔۔ یہ تو جانو اور فیروز خان ہیں۔“ وہ خود کالی کے سے انداز میں بولی۔ ”مجھے میں پانچ دہائی کی بس ایسی ہی تھی جیسے آپ تیار ہو کر کمر سے کہیں جاتے گئے ہوں اور میں وقت پر کوئی ایسا مسلمان آپ پہنچا ہو جس سے ملاقات کا آپ کو قطعاً کوئی اشتیاق نہ ہو۔ میرے لیے یہ بھی کچھ کم حیرت کی بات نہیں تھی کہ ذرا تاج ان لوگوں کو جانتی تھی۔“

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”تم ان دونوں کو دیکھ کر مضطرب سے کیوں ہو گئے؟“

انداز کشا ہی سرسری سہی لیکن مجھے میں ہر حال تجسس چھپا ہوا تھا۔ میں یک دم گویا مکشش میں پھنس گیا۔ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مضطرب ہونے کا اقرار کروں یا انکار؟ اگر اقرار کروں تو کیا وجہ بتاؤں اور انکار کروں تو کس جواز کا سہارا لوں؟ فی الحال مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے سامنے جی پونا مفید ثابت ہو گا یا نقصان دہ؟ معلوم نہیں جانو اور فیروز سے اس کی شناسائی کی نوعیت کیا تھی؟

میں نے دیکھے لیے میں کہا ”مجھے ان لوگوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ کوئی خوشگوار واقعہ نہیں تھا۔“

اس نے تھکی انداز میں سر ہلایا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ تفصیل جاننے کی خواہش مند تھی لیکن شاید وہ سوچ اسے خود بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔ ڈاکو اور ڈاکوؤں کا سہارا دونوں قریب آچکے تھے۔ جانو سر اٹھائے حویلی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ فاصلہ کمراب بھی خاصا تھا لیکن میں اس کے چہرے پر شہرت کی چمک دیکھ سکتا تھا۔

”آپ انہیں جانتی ہیں؟“ میں نے پچھنا ہے ہوئے پوچھا۔ دراصل میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ انہیں کیسے جانتی تھی؟ لیکن یہ سوال مجھے کچھ موزوں نہ لگا اور زبان پر آتے آتے رہ گیا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ غالباً اس نے کسی قسم کی وضاحت کرنے یا اس شناسائی کا پس منظر بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پھر وہ مہربانہ انداز میں بولی۔ ”اگر تمہاری ان سے کوئی دشمنی چل رہی ہے یا کسی اور وجہ سے تم ان سے خوفزدہ ہو تو میں جانو سے کہہ دوں گی کہ یہ ہمارا آدمی ہے۔ اس کے بعد وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ جہتیں ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”نہیں۔ میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اگر آپ ان کے سامنے برے سے میرا تذکرہ ہی نہ کریں تو آپ کی نوازش ہوگی۔ میں ان سے خوفزدہ نہیں ہوں لیکن فی الحال کچھ مصلحتوں کی وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کو میرے ٹھکانے کا پتہ چلے یا وہ مجھے یہاں دیکھیں۔ کیا آپ ان سے نہیں گئی؟“ میں حویلی میں بلا تھیں گی؟“

”ہاں۔“ اس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”جانو آئے تو اس سے ملنا تو بڑا ہی ہے۔ ہر حال۔۔۔ اگر تم نے ان کا کوئی خاص نقصان نہیں کیا ہے تو تمہیں ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اس دوران وہ دونوں حویلی کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے لیکن اب ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ گیٹ اور دیوار اونچی تھی۔ وہ

”گئے“

جس طرف وہ اشارہ کر رہی تھی اور ایک مشتق چوٹی دودانہ تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار سے لگی ہوئی ایک لمبی چوڑی چوبلی الماری تھی جس کے دودانوں میں شیشے لگے ہوئے تھے اندر بہت سے خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں ایک گن رکھی تھی۔

ذرتاج ٹھکری حدود میں داخل ہونے کے بعد مجھے قدم قدم پر اسلحہ دیکھنے کو مل رہا تھا۔ میں نے دور افتادہ دیکی علاقے زیادہ تو نہیں دیکھے تھے لیکن جتنے بھی دیکھے تھے ان میں اتنا اسلحہ نہیں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں یہ اسلحہ کہاں سے آتا تھا؟ میں ابھی یہ سوال کرنے کی ہڈیشن میں نہیں تھا۔ ممکن تھا ذرتاج اس سوال کو ہی پسند نہ کرتی یا پھر اس کا جواب دیا پسند نہ کرتی۔ ایسے سوالوں سے بہرہیز کرنا ہی بہتر تھا۔

ذرتاج بولی۔ ”میرے ہاں ٹھہرنے والے سیمان ٹائڈ نادری آتے ہیں ٹھکراؤ پر یہ کی پوری منزل دراصل سیمان خانہ ہے۔ میں تمہیں جس کمرے میں جانے کے لیے کہہ رہی ہوں وہ سیمانوں کا بیڈ روم ہے۔ بائیں ہاتھ پر دو سرا بیڈ روم ہے۔ تم جس میں چاہو جا سکتے ہو اور کوئی نہیں آئے گا۔“

میں اسی طرف چل دیا جہاں اس نے پہلے اشارہ کیا تھا۔ اس وقت تک بیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر دودانہ اس طرح بند کیا کہ بالکل ہی ایک جھری برقرار رہے۔ وہ تمام ضروری فرنیچر سے آراستہ ایک کشادہ بیڈ روم تھا کہ اس میں پھیلی ہوئی بالکل ہی بولتا رہی تھی کہ اس کمرے کو عرصے سے کھولا نہیں گیا تھا۔ تاہم بولتا رہی نہیں تھی۔ اس بیڈ روم کی ایک بڑی سی ٹھکری بھی حویلی کے سامنے کے رخ پر نکلتی تھی مگر اس وقت وہ بند تھی۔

میں دودانے کی جھری سے آنکھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمبے بعد میں نے جانور اور قیسہ خان کو آگے پیچھے اس ٹیس پر آتے دیکھا۔ ہانوی باہیں کھلی جا رہی تھیں جیسے کسی بد اطوار شخص کے سامنے اس کی من پسند چیز خدائوں بعد آئی ہو۔ اس کا مدھم مدھم دینا تھا۔ لگتا تھا اس کا بس نہیں چل رہا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ذرتاج کو کھانا جائے۔

اس کی نظروں نے ذرتاج کے سر سے پاؤں تک یوں فھر فھر کر سڑکیا تھا جیسے قریب و قریب اس کے قدموں کی ڈھچھ بٹنا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ کی پلک تھی۔ وہ غاصا و جبہ آدمی تھا لیکن اپنے اثرات کی وجہ سے اس وقت بد صورت لگ رہا تھا۔ شاید صرف مجھے لگ رہا تھا۔ قیسہ خان کے اثرات بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن وہ شاید اپنے پاس کی موجودگی میں رسمی طور پر تھوڑا بہت محتاط نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا حال ہیں رئیسانی؟ بہت دن بعد تم سے ملاقات ہو رہی

اس کی اوٹ میں تھے۔ تاہم ایک خادمہ ان کی آمد کی اطلاع لے آئی تھی اور یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی کیونکہ میں نے نہ تو گیت کھلے دیکھا تھا اور نہ کسی کو اندر آتے دیکھا تھا لیکن پھر بلازمہ کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ گیت پر اکثر کام موجود تھا اور بلازمہ کو ان لوگوں کی آمد کی اطلاع اکثر کام پر مل تھی۔

”انہیں اوپر ہی لے آؤ۔“ ذرتاج نے خادمہ کو حکم دیا۔ لیکن راستے میں باتوں باتوں میں انہیں بتادینا کہ رئیسانی جی کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شکار پر جانے والے نیچے ان کے انتظار میں کھڑے ہیں۔“

”بہت بہتر رئیسانی جی!“ خادمہ نے سمجھ وادی سے سر ہلایا اور وہ بھی کے لیے نرگزی۔ وقت کی کمی کا تاثر بھی ذرتاج نے بلازمہ کی ذہنی دشا چاہا تھا۔ کیا وہ خود یہ بات جانو سے کہنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی؟ وہ ان سے خوفزدہ تھی یا ان سے اس کا روت کار شرت تھا؟

میرے ذہن میں یہ سوالات ابھر رہے تھے لیکن فی الحال میرے لیے اس شخص میں کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ اور کسی حد تک میں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ چکا تھا کہ بعض بڑے زمیندار، ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے تھے بعض ان کو اجاہدہ ”پالنے“ تھے بعض انہیں ممنون رکھتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ وقت بڑنے پر ایک دوسرے کا سر چاٹتے تھے۔ کیا ذرتاج اور جانو کا قتل بھی کچھ اسی قسم کا تھا؟ میرا دل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس دوران خادمہ گیت پر پہنچ چکی تھی۔ جانور قیسہ خان اور آجکے تھے۔ ان کے گھوڑے باہری روگھے تھے۔ درختوں کے درمیان گھنٹہ بڑی پر وہ اس طرح اکڑتے ہوئے چل رہے تھے جیسے لٹائی جاگیر کے معائنے پر نکلے ہوں۔ جانو نے تو اس خصوصیت کو لکڑی نما روش پر پڑے ہوئے آکاؤ کا چھوٹے چھوٹے پتھروں کو غارت سے فھر کر رہی رسید کی۔

میں نے ذرتاج کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پسند ناپسند، خوف، مجبوری یا مصلحت۔ کوئی بھی تاثر گردہ چہرہ کی طرح حسن میں اپنی مثال آپ تھا اسی طرح اپنے برتاؤ کی غارت کرنے میں بھی بے مثل تھا۔ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کلامت مشکل تھا کہ وہ کس وقت کیا سوچ رہی تھی۔ وہ جب تک ذہنی اپنی سوچ کا راز افشاء نہ کرتی، اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔

میں اور حرا دھر دیکھنے لگا کہ پیرا کہاں چھٹا مناسب رہے گا۔ بچے جانے کا تو ایک ہی راستہ تھا۔ اگر میں اب بیڑھیوں اترتا تو لگتا تھا کہ کچھ راستے میں میرا ان سے سامنا ہو جاتا۔ ذرتاج بلا مطلب سمجھ کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تم اس دھڑکے میں جا سکتے ہو۔ ظاہر ہے تم ان کا سامنا کرنا نہیں چاہو



کی۔ "جانو کسی شے پر غیبا قسم کے قسمی دہن کے اندر آئیں بولا۔

"اس وقت تم کہاں سے آ رہے ہو؟" زرنج نے گویا سوچ کر بدلنے کی کوشش کی۔ "اڑے سے۔۔۔ یا کہیں اور؟"

"ہم اگر دور سے بھی آئے ہوتے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہم بہت دور تک مار کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "اب تمہیں جاننے کے لیے تیار دیکھ لیا ہے تو ہم تمہارا

زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ ویسے تمہارے لیے ایک مشوہ ہے۔ اتنی جلدی جلدی شکار پر مت جایا کرو۔ حالات کا کیا بھروسہ؟ خور

اپنے آدمیوں کی نیت بدلنے پر نہیں لگتی۔ اوپر سے تم ایسی سرکاپا قیامت میں کر شکار پر جاتی ہو کہ خود تمہارے شکار ہو جانے کا خوف

دھڑکا رہتا ہے۔"

"میری فکر میں بدلے ہونے کے لیے تم سے کس نے کہا ہے؟" زرنج ملاحت سے بولی۔ "میں اپنی حفاظت کرنے کی پوری طرح

اہل ہوں۔۔۔ اور دور حقیقت میں یہی دیکھنے کے لیے شکار پر جاتی ہوں کہ میری اس اہلیت میں کمی تو نہیں آئی؟ جو لوگ مجھے جانتے

ہیں وہ میرے بارے میں نیت بدلنے سے پہلے کم از کم سو بار سوچیں گے۔۔۔ اور اگر نہیں سوچیں گے تو خود ہی دیکھ جائیں گے۔" اس

نے بے پروائی سے کندھے اچکا کرے۔

"ہاں۔۔۔ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" جانو آئندہ میں سہلے ہوئے بولا۔ وہ سر تو آئندہ میں ملا رہا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ

استہزائیہ اور شرارت بھری تھی۔ "ویسے۔۔۔ شک مزاج تو تم پیش سے چلی آ رہی ہو لیکن آج مجھے میں ایک نیا چمکا ہوا ہے۔ لگا ہے

ہماری پچھلی ملاقات سے اب تک کے دوران کوئی تبدیلی آئی ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے۔"

"ہر چیز میں۔۔۔ ہر داخل میں۔۔۔ ہر فرد میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں تو آتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ان تبدیلیوں کا

احساس تک نہیں ہوتا۔ مجھے خود معلوم نہیں ہے کہ مجھ میں کمال تبدیلی آئی ہے۔" زرنج کے لیے میں اب بھی ملاحت تھی۔

"ہاں۔۔۔ تبدیلیاں تو آتی رہتی ہیں۔" جانو بدستور مسکرایا تھا۔ "لیکن تم میں نہ جانے وہ تبدیلی کب آئے گی جس کا میں

انتظار ہے۔" ریشیا ایسی بھید کی سے کہہ رہا ہوں۔ اپنے بارے میں سوچو۔ عمر کا شمار اور بچپنی تیزی سے گزرتا جا رہا ہے اس کا شاید

تمہیں ابھی احساس نہ ہو لیکن ایک روز چاکر سراٹھار کر بھوکے عمر کی ساری بات تمہی سے بھل چکی ہوگی۔ تم اب بڑے عمر کو

چکی ہو تو فریبا کس نہیں رہیں۔ میرے بارے میں سوچو؟ یہ بات نہیں ہو تو فریبا کس نہیں ہو لیکن کسی کے بارے میں تو سوچو۔ ہم بھی تو بچپنی میں

تمہاری فکر کہاں جا کر ٹھہرتی ہے۔ کسے تمہاری زندگی کا سامنا ہے۔ کا شرف حاصل ہوتا ہے۔"

ہے۔" جانو کے لیے میں بے تکلفی تھی۔ بے تکلفی یک طرفہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی باتیں بدستور پھیلی ہوئی تھیں۔

"میرے وہ دن عام طور پر اچھے گزرتے ہیں جن میں تم سے ملاقات نہیں ہوتی۔" زرنج نے بھید کی سے جواب دیا۔ "ہم

اس نے چہرے سے نا پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"تمہاری ذہنی کی عادت نہیں گئی۔" جانو نے بلند آہنگ فقرہ لگایا۔ "اور تم دنیا میں واحد ہستی ہو جس کا مذاق جانو برداشت کرتا

ہے۔" میں تمہیں برداشت کرتی ہوں تو تمہیں کم از کم میرا مذاق تو برداشت کر ہی لیتا چاہیے۔" زرنج بدستور سنجیدہ تھی۔

جانو نے بلاوجہ ہی ایک اور اونچا فقرہ لگایا پھر یک دم سی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "تو کرانی نے بتایا تھا کہ تم شکار پر جانے کے

لیے بالکل تیار کبھی ہو۔ تمہیں شکار پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے تو چاندن طرف شکاری شکار بھرا ہوا ہے۔"

زرنج ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملا تامل بولی۔ "اگر تمہارا اشارہ اہلی طرف ہے تو گزارش ہے کہ میں حرام

جانوروں کا شکار نہیں کرتی۔"

جانو نے ایک بار پھر فقرہ لگایا۔ وہ برہم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی یہ ظاہر ہوا تھا کہ اس نے کیا بات چہانے کے لیے فقرہ لگایا

تھا۔ کم از کم زرنج کے معاملے میں وہ خاصا سبب معلوم ہوا تھا۔ کوئی اور اس قسم کی باتیں کرتا تو شاید جانو اسے کہیوں سے چٹلی

کر دیتا۔

"بہت شر ہوئی جا رہی تو تم۔" بلاخود بولا۔

"وہم ہے تمہارا۔ میں تو بہت سنجیدہ ہوں۔ بیشک کی طرح۔" وہ واقعی کمری بھید کی سے بولی۔

"خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا تمہارا آج ہی شکار پر جانا ضروری ہے؟"

"میں جب کوئی پروگرام بنا لوں تو عام طور پر اسے بولا نہیں کرتی۔" زرنج نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "لیکن تم بھینٹو۔ بتاؤ

کیا کھاؤ پیو گے؟ تم چاہو تو میرے جانے کے بعد بھی یہاں ٹھہر سکتے ہو۔ کھانا وغیرہ کھا کر شام تک چلے جانا۔ اتنی دور سے آئے ہو میں

تمہاری قہوری بہت خاطر تو واضح تو کر کے ہی جاؤں گی۔"

"نہیں۔ ہم تم سے اتنا دور بھی نہیں رہتے۔ جس شاد کٹ سے ہم آتے ہیں اس نے تو تمہارے اور تمہارے درمیان فاصلہ بہت کم کر دیا ہے لیکن انیس کے تم دلوں کے درمیان فاصلہ کم کرنے کی کوئی کوشش کا مہیا نہیں ہونے دیتیں۔" جانو ایک

کر ہی پر کچھ پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔! تمہارے پاس دل بھی ہے؟ یہ میرے لیے ہی

اطلاع ہے۔" زرنج بولی۔

"نہیں۔ تمہاری یہ بے نیازی کسی روز ہماری جان لے لے

اس کی ہموکی نظریں اب بھی ذرا آج کے سراپا پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی نظریں اس کی کامیابی میں مشکوک بن گئیں۔ میرے جسم و جاں میں شرارے سے دوڑا رہی تھی۔ وہ دونوں گویا تیسرا خان کی سونو دی سے بالکل ہی بے خبر تھے جو خاموش بیٹھا ہنسی آنکھوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ شاید وہ اس صورت حال سے اس مشکوک سے بہت محفوظ ہو رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے" سونیا بھی کبھی تمہارے خیال میں بڑے غضب کی عورت تھی۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔" ذرا آج نظریہ لیے میں بولی۔

"اس میں کوئی شک نہیں مگر اس نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے۔" جانو پلوید لے ہوئے ہوا۔ "ہمارا ان لوگوں میں اٹھنا بیٹھا ہے جو دنیا بھر کی منشیات اور سرے اور کرتے ہیں مگر ہم خود بھی چکے بھی نہیں۔ ایک شراب کا شغل ضرور ہے مگر اسے بھی اپنی مجبوری نہیں بننے دیا۔ اگر میسر نہیں آتی تو ہنسنے نہیں پیتے۔ مگر وہ عورت منشیات کی عادی ہو گئی ہے۔ اسے پیار سے بہت سمجھایا، بچھایا، کوئی اثر نہیں ہوا۔ مارا پیٹا بھی لیکن لگتا بھی ہے کہ وہ جان دے دے گی۔" نشہ نہیں چھوڑے گی۔ میں نے اس کی سپلائی بند کر دی تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔"

جانو نے ایک لمبھی سانس لی اور ذرا توقف کے بعد بولا "اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ نشہ پرانہ ہوا تو وہ مر جائے گی اور میں اسے رسک رسک کر، تڑپ تڑپ کر مرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر دھیرے دھیرے خود کشی کر رہی ہے۔ اپنے آپ کو لڑائی اور آوازوں کے درمیان مار رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ مرنا گوارا کر لے گی لیکن اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے ہاتھوں سے مرے یا میرے ہاں مرے۔ اس کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا ہے۔ اور پھر ان جنگوں جاپانوں میں تو ہی عورت کے بغیر وہ بھی تو نہیں سکنا اس لیے میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔"

"عورت تمہارے لیے کون سا مسئلہ ہے۔" ذرا آج بولی۔ "تم تو جب چاہو کسی عورت کو اٹھا کر لاسکتے ہو۔"

"افغانی ہوئی عورت کی وہ بات نہیں ہوتی۔" جانو منچوں کو بل دیتے ہوئے مسکرایا۔ "تھیں تو معلوم ہی ہے سونیا اپنی خوشی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ ہمارا باقاعدہ تھان ہوا تھا۔ اس وقت وہ چڑی کچھ اور تھی۔ ایک ایسا سمندر تھی جس میں ان گنت طوفان جھل رہے تھے۔"

"اور اب وہ ٹھہرا ہوا جو بڑے جس کی قہ میں کچھ کے سوا کچھ نہیں ہے؟" ذرا آج نے نظریہ سے لیے میں پوچھا۔

جانو نے اس کے طہرے شربت ہوئے بغیر بلا تامل اثبات میں سر ہلا دیا اور سرور سے لیے میں بولا "تم بالکل ٹھیک سمجھی ہو۔"

تھی۔ "آج تمہیں یہ باتیں غیر اہم لگتی ہیں لیکن کل بہت اہم لگیں گی۔" جانو کی آنکھوں میں بھی اب سنجیدگی اترنے لگی تھی لیکن یہ سنجیدگی بھی درحقیقت درد کی ہی کی ایک شکل نظر آتی تھی۔

"ہمارے ہاں ایک بڑی مشکل ہے۔۔۔۔۔" ذرا آج لمبھی سانس لے کر بولی۔ "مکہ زندگی کسی کی ہوئی ہے مگر اسے بسر کرنے کی کوشش کوئی اور کرتا ہے۔ لیکن کم از کم تم تو میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ تمہیں ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ تم میری زندگی بچھو گی۔ بسر کرنے دو۔ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ میری بڑھتی عمر کی تم فکر مت کرو۔ یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے کسی کا انتظار ہے۔" "کون ہے آخر وہ؟" جانو نے گویا بے مشکل اپنی جھجکا ہٹ کر دیا تھا۔

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" ذرا آج اطمینان سے بولی۔ "میں نے شاید اسے ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بتانا چاہتی ہوں۔"

"اور ابھی تک تم اسی بات پر قائم ہو؟" جانو حیرت سے بولا۔ "حالا کہ میں نے اسی وقت تمہیں سمجھایا تھا کہ ان افسانوی باتوں کو چھوڑو۔ تم خوفناک حقیقتوں کے جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ باتیں ٹیم تار ایک اور زندگیوں میں رہنے والی سولہ سترہ سال کی ان غل گلکس لڑکیوں کے منہ سے اچھی لگتی ہیں جو زمانہ رسالوں میں افسانے پڑھتی ہیں، درد بھرے اشعار جمع کرتی ہیں اور ریڈیو پر فراٹھی لے گئے سنی ہیں۔ تم اس دنیا کی باسی نہیں ہو اور نہ ہی عمر کے اس دور میں ہو۔"

"یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے اور بہت سی باتیں ہونی چاہئیں۔ تمہارے اپنے یقینا بہت سے مسائل ہوں گے ان کے بارے میں سوچا کرو۔ اور پھر تمہاری بیوی بھی تو ہے اس کے بارے میں سوچا کرو۔"

"وہ تو خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسی کی وجہ سے تو میں تمہارے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ کوئی دھنگ کی عورت ہوئی تو میں اس کے بارے میں کیوں سوچا؟" جانو بڑھکی سے بولا۔

"اگر خدا انکسارت تم مجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو کچھ عرصے بعد تم کسی تیسری عورت کے سامنے کھڑے کی جاؤ گے کہ وہ بے ہو گے۔" ذرا آج ہنستے ہوئے لیے میں بولی۔

"تمہیں۔ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" جانو پڑھتی لے لیے میں بولا۔ اس کے دل میں گویا کوئی خفیف سی امید پیدا ہو چلی تھی۔ "تم جیسی لڑکی کے ہوتے ہوئے کون کبھت کسی اور عورت کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟ زندگی بھر نہیں سوچ سکتا۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں ٹہنی میں سر ہلایا۔

ذرتاج کے لیے میں ماسف تھا۔

"لیکن صورت حال کچھ ایسی المیہ ناک بھی نہیں۔" جانو  
 ٹھنڈے شراب کا تھیرا گلاس خالی کر کے تپائی پر تقریباً دھنکے ہوئے  
 ہوا "انسان کا آئینہ خیل خواہ کچھ بھی ہو۔۔۔ اچھا برا۔۔۔ اصل  
 اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان اسے اپنے میں کامیاب  
 ہو جائے۔ انسان خواہ واکو بنے لیکن ایک کامیاب واکو بنے۔ اصل  
 اہم چیز کامیابی ہے۔ کامیابی کے بغیر نہ تو شریف آدمی کچھ ہے اور نہ  
 ہی بد معاش۔ اگر آپ کامیاب نہیں ہیں تو کسی شمار تقار میں نہیں  
 ہیں۔ آپ خود ہی سے بھی بد نہیں۔ کسی وقت بھی کوئی یادیں آپ کو  
 چٹکتا ہوا آکر جائے گا۔"

اس کی رنگت اتنے جیسی ہو گئی تھی اور باپ جھوں سے گویا کف  
 بننے کو بے تاب تھا۔ وہ اپنے لیے جگ سے خود ہی مزید شربت  
 گلاس میں اترنے لگے۔ وہ نہ جانے کیوں باہر بار دانت میں رہا تھا۔  
 وہ خاصا غصہ ور شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جڑے اور بازوؤں  
 کے عضلات خطرناک انداز میں جھل رہے تھے۔ ان عضلات سے  
 اس کی مضبوطی اور طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔

غیب بات یہ تھی کہ زیادہ جوش و خروش میں آنے کے بعد  
 اس کے لیے سے وہ واکوؤں والا ٹھوراپن ناپ ہو گیا تھا۔ گو کہ  
 آواز اب بھی پچھلی پچھلی ہی تھی لیکن کافی حد تک منہ باندھ  
 ہو رہی تھی۔ وہ کوئی بکرا ہوا مقرر معلوم ہوا تھا۔ بے حد چڑچڑ  
 اور جذباتی مقرر۔

دھنوں کی طرح شربت کا چڑھا گلاس بھی خالی کر کے وہ تپائی  
 پر بیٹھ ہوئے ہوا "سونا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں جو کچھ بھی  
 ہوں کم از کم اپنی جگہ کامیاب تو ہوں۔ بڑا واکو بننا بھی اتنی  
 مشکل ہے جتنا بہت بڑا برنس مین یا صنعت کار بننا۔ بعض بے  
 چارے تو واکو بننے کی حسرت لے کر بڑے جھجلا کر اچھے ہیں لیکن  
 سپاہیوں کے آگے ہاتھ جوڑتے 'قانون میں اپنی کمال کھاتے اور  
 حوالات میں انہیں رگڑتے مہراتے ہیں۔"

"جب دونوں ہی کام یکساں مشکل تھے تو تم برنس مین یا  
 صنعت کار کیوں نہیں بن گئے؟" ذرتاج کے لیے میں دلچسپی کی  
 جھلک تھی۔

"میرے لیے دوسرے تمام راستے بند کر دیے گئے تھے۔  
 میرے پاس صرف فرار کا راستہ رہ گیا تھا۔" جانو اپنے لیے کے  
 جوش و خروش پر کچھ قابو پاتے ہوئے ہوا۔ "وہیے بھی میری زندگی  
 میں عجیب مقام اچکا تھا۔ میں نے بنایا تاکہ مجھے ساری سوسائٹی سے  
 سارے سیٹ اپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں اس کچلے ہوئے  
 معاشرے کا خوفزدہ فرد بن کر نہ بنایا تھا۔"

ذرتاج ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا  
 تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے ہوا "میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ  
 ہنگل کے قانون کے مطابق ہی رہتا ہے تو ہنگل ہی میں کیوں نہ رہا

"یہ میں نہیں سمجھی میں تو تمہاری رائے بیان کر رہی ہوں۔"  
 ذرتاج جلدی سے بولی۔ "تم نے یہ تو فرض کر لیا کہ وہ سمندر سے  
 جو ہرگز نہیں چکا ہے لیکن کبھی تم نے یہ سوچنے کی زحمت کی کہ اس کے  
 دل میں کچھ تاروں کا کیسا سمندر موجزن ہو گا؟ تم نے اسے کیا دیا؟  
 واکوؤں کا ایک ڈیزن۔۔۔ چاروں طرف پھیلا ہوا ہنگل۔۔۔ چھاپوں  
 اور آپریشن کا مرکز۔ یہی کچھ دیا ہے تا تم نے اسے؟"

جانو کے چہرے پر ذرا سرخی آگئی۔ وہ قدرے تند لیے میں بولا  
 "وہ جب بھاگ کر میرے ساتھ آ رہی تھی اس وقت بھی اسے  
 معلوم تھا کہ اس کا مقدر کیا ہو سکتا ہے۔ اب اس طرح ہر وقت  
 ڈپریشن کی تصویر بنی رہنے کی کیا تنگ ہے؟ اسے معلوم ہے کہ مجھے  
 اس طرح زندگی گزارنے والوں کو دیکھ کر غصہ آتا ہے اس کے  
 باوجود وہ اپنے طور طریقے نہیں بدلتی۔ وہ پوری پوری کوشش کرتی  
 ہے کہ کسی طرح میرے اقصوں ماری جائے۔ یہ میری وضو داری  
 ہے کہ میں اسے جان سے مارا تو درکنار اس پر سختی بھی نہیں  
 کرتا۔"

"بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ میں اس کی طرف سے تمہارا شکریہ  
 ادا کرتی ہوں۔" ذرتاج اس پر طنز کرنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔  
 پھر وہ مسافانہ سے انداز میں بولی "جانو! تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ  
 بڑے کچلے ہوئے کے باوجود تم انسانی محسوسات سے محروم ہو۔  
 تمہارے اندر ایک درد نے کی روح ہے۔"

میرے لیے یہ انکشاف زیادہ حیرت کا باعث نہیں تھا کہ جانو  
 پڑھا لکھا تھا۔ مجھے اس کی تمام تر حرکتیں اور دردنگی کے باوجود شبہ  
 اور اٹھا کہ وہ پڑھا لکھا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ میرے بے گھر بنے  
 در ہونے اور آواز دے بے منزل پھرنے کے مختصر سے دور میں یہ  
 دو سرا پڑھا لکھا واکو تھا جو میرے سامنے آیا تھا۔ دو میل خان بھی  
 زیادہ نہیں لیکن کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا ضرور تھا۔ جانو مجھے اس سے  
 زیادہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھی البتہ پورے جاہل  
 ہی لگتے تھے۔

جانو چیز سے بولا۔ "درد نے کی مدد میرے اندر اس وقت  
 بھی موجود تھی جب سونا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے  
 جبکہ زندگی بھر میرا ساتھ دینے کے عہد و پیمان کرتے ہوئے میرا ہاتھ  
 تھا تھا اور ہم شادی کے بندھن میں بندھے تھے اس وقت بھی  
 اسے معلوم تھا کہ میں اس معاشرے کا باغی ہوں۔ میں نے اس  
 سوسائٹی پر اس نظام پر اس سارے سیٹ اپ پر لعنت بھیج دی ہے  
 اور میں اپنی ایک الگ دنیا بنانے جا رہا ہوں۔ اسے بہت اچھی  
 طرح اندازہ تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں اور وہ اس پر بہت خوش  
 تھی۔"

"وہ اس کی بے وقوفی تھی، تو جو اپنی کا جوش و خروش تھا۔ وہ  
 بھی اپنی دانست میں بہت بڑی انقلابی تھی۔ اس کی انقلابی روح  
 نے اسے صحیح راستہ دکھانے کے بجائے راستے سے ہٹا دیا۔"

میٹ لیں بعد میں دیکھا جائے گا۔

جانو نے ذرا تاج سے مشکو جباری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے گردہ کا اصول ہے کہ آخری کوئی خود اپنے لیے بھاکر رکھو۔ اگر قرار کا کوئی راستہ نہ رہے تو آخری کوئی اپنی بھینجی میں اکر دے زندگی بھنی بھی ہے اسے بے خوفی اور عیش و عشرت سے گزارو۔ پولیس کے جتنے چڑھ کر اذیتیں اٹھانے کے مقابلے میں ہر حال موت کو ترجیح دو۔ میرے ساتھیوں نے مجھے بھی بائیس نہیں کیا۔ جتنے ساتھی بھی اب تک مرے ہیں اپنی آخری کوئی اپنے اوپر استعمال کر کے ہی مرے ہیں لیکن انہوں نے مجھے پولیس والوں نے لاش کے سہانے کھڑے ہو کر بیٹھے تان کر گرد پھونک دیا اور خیریں بھی چھین کر وہ پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے۔“

”خیر۔۔۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ پولیس کے ہاتھوں کوئی ڈاکو مرنا ہی نہیں ہے۔“ ذرا تاج بولی۔

”خیر۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ جانو نے تسلیم کیا۔ ”پولیس“ رنجیز اور دیگر فورسز کے ہاتھوں بھی ڈاکو مرے ہیں لیکن میں صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔ ہمارا گردہ اور ہمارے گردہ کے طور طریقے سب سے مختلف ہیں۔ اسی لیے کسی ایجنسی کے پاس بھی ہمارے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ہیں۔“

”تم اپنے طور طریقوں پر خواہ کتنے ہی خوش ہو لیکن انجام تو ایک نوڈ تیار ہوا بھی ہوگا۔ تمہارے سہانے بھی پولیس والے ایک نہ ایک نوڈ کھڑے ہو کر بیٹھے تان کر گرد پھونک دیا اور خیریں بھی چھین کر وہ پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ جانو نے مضطربانہ انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کی ٹوٹ پھوٹ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تم خواہ خواہ یہاں بیٹھ کر اندازے لگانے کی کوشش مت کرو۔ باقی رہی انجام کی بات۔ تو انجام بھی کا موت ہے۔۔۔ اور جب انسان مرے گا تو اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی کہ وہ عزت کی موت مرا ہے یا ذلت کی؟ اصل اہمیت تو اس بات کی ہے کہ آپ نے زندگی کسی گزاری ہے۔ سب سے قابل رحم زندگی اس شخص کی ہے جو کسی شار تظار میں نہیں۔“

”اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی دنیا بنائی ہے۔ اس میں ان محنت انسان پیدا کیے ہیں۔ اگر کبھی شار تظار میں آجائیں، یہی قابل ذکر اور خاص لوگ بن جائیں تو پھر دنیا کی گاڑی کو آگے دھکیلنے کے لیے عام لوگ کہاں سے آجائیں گے؟ دنیا کا اصل برجہ تو عام لوگ اٹھاتے ہیں۔“ ذرا تاج بولی۔

”خیر۔۔۔ یہ ایک الگ اور طویل بحث ہے۔ میں اس میں نہیں جڑنا چاہتا۔“ جانو نے پروا لی سے ہاتھ ہلا کر بولا ”میں تو سونیا کی بات کر رہا ہوں۔ اگر وہ سوچے تو اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ بیسیوں شیر جیسے جوان ہیں جو اس کے سامنے ٹوکھوں کی طرح

جائے تم پر بس میں یا صنعت کاری بات کرتی ہو۔ بڑے نعمات ہوتے ہیں ان لوگوں کے، سیکڑوں لوگوں پر شکرانی کرتے ہیں، ایسی لمبی کاریں اور عالی شان مکان ہوتے ہیں ان لوگوں کے گرد ہزار خزانہ پائے والے کسی سرکاری کارندے سے بے چاروں کی مدد کا ہتھ دیتی ہے۔ تمہاری سوسائٹی میں بے ایمان نہیں ڈرتا، ایماندار زیادہ ڈرتا ہے۔ کیا قاعدہ ایسی سوسائٹی میں رہنے کا جہاں ایماندار کا کوئی صلہ نہیں۔ جن کے ہاتھ میں طاقت یا اختیار ہے وہ جب بھی چاہے آپ کو جھوٹا، بے ایمان، چور یا غدار قرار دے دیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوگی۔“

ذرا تاج بدستور ملاحت سے بولی ”جہاں تک ڈرنے کی بات ہے تو ڈرنے سے کہیں نجات نہیں۔ کیا جہیں اب پولیس کا خوف لاحق نہیں رہتا؟“

”پولیس میرے نام سے کافی ہے۔ ان کے لیے میں صرف ایک ہوا ایک بولا ہوں۔“ جانو نے بولے والے ”کی حیثیت سے مجھے سب جانتے ہیں لیکن راہول ڈاکو کی حیثیت سے مجھے کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ راہول اور جانو ایسی شخصیت کے دو نام ہیں۔ راہول ان کے لیے بس ایک کردار ہے جس کی صورت انہوں نے نہیں دیکھی۔ ہم نے خود اس کردار کو مشہور کیا ہے۔ میرے گردہ کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ میرے کسی آدمی کا حلیے ان کے پاس نہیں۔“

”لیکن ہم چھپے خفی لوگوں کو تو یہ سب کچھ معلوم ہے۔“ ذرا تاج بولی۔

”بہنیں یہ باتیں معلوم ہیں انہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس حلیے میں زبان کھولنا یا بھری کی کوشش کرنا ان کے حق میں کتنا برا ثابت ہوگا۔“ جانو مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ سے اب بھی روندگی جھانک رہی تھی۔

اس کے اس انکشاف نے مجھے چٹکا دیا تھا کہ ڈاکو کی حیثیت سے اس کی بھی معرفت کچھ اور تھی۔ یہی بیکرو حیل خان نے چلائی ہوا تھا۔ کہیں یہ بھی بڑے ڈاکوؤں کی ٹیکنک تو نہیں تھی؟ کہیں اس طرح وہ ایک نام کی دہشت کو طویل عرصے تک تو استعمال نہیں کرتے تھے؟ اس طرح اگر اصل ڈاکو مارا بھی جاتا تب بھی کوئی اور اس معرفت کو استعمال کرتے ہوئے وہی دہشت، وہی خوف برقرار رکھ سکتا تھا۔ شاید جتنی ایک آدھ مرتبہ اس طرح کا کشیدہ بھی نہ پیدا ہوا تھا کہ پولیس نے اعلان کیا کہ اس کے مقابلے میں فلاں مشہور ڈاکو کو مار ڈالا لیکن بعد میں اس کی تردید سامنے آئی اور پتا چلا کہ وہ ڈاکو تو زندہ ہے اور بدستور اپنی ”عظیم الشان“ سرگرمیوں میں مصروف ہے۔

میں ممکن تھا کہ یہ پولیس ہی کے چلائے ہوئے چکر ہوں۔ انہوں نے سوچا ہو کہ کسی نامعلوم بد فیض پر فلاں مشہور ڈاکو کا لیبل لگا کر فی الحال تو شرت، ٹیک نامی، انعامات اور سرٹیفیکٹ وغیرہ

میں مسکراتی رہی۔ وہ مقررانہ انداز میں سلسلہ کام جوڑتے ہوئے بولا۔ "معاشرہ اصل میں یہ ہے جو تم اور میں اپنی اپنی جگہ تشکیل دے رہے ہیں۔ ہم اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے اپنے انداز میں انسان کو اس کے اصل کی طرف واپس لارہے ہیں۔ اگر ہم کافی عرصہ زندہ رہے تو لوگ دیکھیں گے کہ استحکام اور سکون صرف اور صرف اس معاشرے میں رہ جائے گا جو میں اور تم تخلیق کر رہے ہیں۔"

پھر میں نے اسے ایک عمدہ سامگا مسلگاتے دیکھا۔ سگار کا کش لے کر وہ بولا "باقی شروں اور مرقاں سے میرا ڈاکوؤں کا ذہن بہتر ہے۔ ہم ڈاکوؤں کی کم از کم زبان تو ایک دوتی ہے۔ زبان سے بھر جانا ہزار فسادوں کی جڑ ہے۔ ہم اگر کسی سینہ کو انوار کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ دس لاکھ روپے ادا کر دیے جائیں تو رقم وصول پانے کے بعد ہم واقعی سینہ کو دبا کر دیتے ہیں۔ ہم زبان سے نہیں پھرتے لالچ میں مبتلا نہیں ہوتے کہ سینہ تو کروڑوں کی اسامی ہے۔ اب اس سے کیوں نہ دس بیس لاکھ مزید اینٹ لے جائیں۔"

اس نے ایک اور گمراہ کش لے کر بات جاری رکھی۔ "ہم کبھی اس طرح نہیں سوچتے۔ وعدہ نہیں وعدہ ہے۔ اس کے علاوہ ہم ڈاکو کبھی آپس میں ایک دوسرے کا خون نہیں بہاتے۔ ڈاکوؤں کا ایک گروہ کبھی دوسرے گروہ کا جانی دشمن نہیں ہوتا۔ ہم صرف مال و دولت لوٹتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو مال و دولت کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہیں اور اسی کی خاطر مزاحمت کرتے ہیں۔ ہم ڈاکوؤں کا اوّل تو دولت کے سوا کوئی نعرہ نہیں ہوتا لیکن اگر ہو بھی تو ہم محض نظریاتی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے ہم تمہارے معاشرے کے معززین سے بہتر ہیں۔"

"اپنے آپ کو انسانیت کا نمائندہ قرار مت دو۔ دیکھو یہ بھی یہی ڈاکو تو تمہارے جیسے نہیں ہوتے۔ اور تم بھی کوئی ایسے سلطان ڈاکو نہیں ہو۔ اوّل درجے کے خبیث ہو تم۔!" زرنج مسکراتی۔

"عزت افزائی کا نعرہ۔" جانو بھی مسکرایا۔ "تمہارے منہ سے بُرا منشا بھی بھلا ہی لگتا ہے۔"

زرنج ہولے سے خمی۔ "یوے تمہارا لیڈرانہ انداز ابھی تک نہیں گیا۔ اپنے موقف کے حق میں دلیلیں خوب دیتے ہو لیکن معصیت یہ ہے کہ دلیلیں بھی اکثر بہت بڑا دھوکا ہی ہوتی ہیں۔ دنیا کے جڑے سے جڑے آدمی نے اپنی بڑی سے بڑی دالات کے حق میں بھی کچھ نہ کچھ متاثر کن دلیلیں گھڑ رکھی ہوتی ہیں اور لوگ بے چارے اپنا سر دھتے رہتے ہیں۔"

دختا نے اپنی سٹول سرسریں کلائی پر بندھی سیاہ گھڑی میں وقت دیکھا۔ "تم نے مجھے باتوں میں خوب الجھایا۔ میرا ارادہ تمہاری خاطر صرف چند منٹ رکے گا تھا۔"

سرگودھہ کھڑے ہوتے ہیں۔ ضرورت کی زیادہ تر چیزیں وہ سپورٹ استعمال کرتی ہے۔ لاکھوں روپے کی چوڑی اس کے پاس ہے۔ ان گنت ملبوسات ہیں۔ کسی بھی شے کے کسی بھی شاندار علاقے کے مکان میں رہنے والی کوئی عورت جن چیزوں کی خواہش کر سکتی ہے اور جو کچھ اپنی ملکیت میں رکھ سکتی ہے وہ سب سونیا کے پاس موجود ہے۔ طاقت اس کے پاس یوں کے طور پر موجود ہے۔

"لوگوں سی طاقت؟" زرنج نے پوچھا۔ "میری طاقت اسی کی طاقت ہے۔" جانو نے وضاحت کی۔ "اگر کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیکھے تو اس کی آنکھیں نکالی جاسکتی ہیں۔ طاقت کا یہ احساس بہت بڑی قوت ہے لیکن سونیا کو کسی چیز کی قدر نہیں۔" اس کے لیے میں شکوہ تھا۔

زرنج کچھ نہ بولی۔ وہ خاموشی سے پُر خیال انداز میں جانو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں بازو و کمر پر انشائلی کی بھاری بھر کم کرسی کے جھتوں پر لٹے ہوئے تھے۔ وہ اس ملک کی طرح سنجیدہ اور پُر تمکنت نظر تو رہی تھی جس کے دربار میں کوئی مقدمہ پیش کیا گیا ہو۔

جانو زرنج کے لیے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "فلکوں میں عام طور پر جو ڈاکو دکھائے جاتے ہیں ان کے ذہن میں ایک رقاہ ضرور موجود ہوتی ہے یا پھر ضرورت پڑنے پر سہوار کی محبوبہ ہی رقاہ کے فرائض انجام دیتی ہے۔ سونیا بالکل ایسی ہی عورت بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے انداز و اطوار بالکل فلمی رقاہوں والے ہو گئے ہیں۔ اس کی حرکات و سکنات میں وہی یاداری ہیں آگیا ہے۔ وہ لیے ہولڈر میں جڑیں بھری سگریٹ لگا کر جب اچانک سامنے آتی ہے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی طبلہ پر تھاپ پڑے گی اور ابھی وہ شکار کا کرنا چاہتا شروع کر دے گی۔ بالکل و لگ کر لگتی ہے۔" "یہ بد عمل ہے۔" زرنج نے گویا کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح مرض کی تشخیص کی۔ "وہ معاشرے سے کٹ گئی ہے۔ اس سے سبچ چھن گیا ہے۔ وہ ماحول چھن گیا ہے جہاں اس کی جڑیں ختم۔"

"انسان کی جڑیں صرف جنگل میں ہیں اور رفتہ رفتہ اسے واپس اپنی طرف آنا پڑے گا۔" جانو نے بھی عجیب فلسفیانہ بات کر ڈالی۔ "مشری معاشرے کی حالت نہیں دیکھو؟ تم؟ لوگ کسی نہ کسی دوس میں کس طرح ایک دوسرے کا گھلا کاٹ رہے ہیں ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بھالے جا رہے ہیں۔ سوسائٹی پر ایک عجیب سا جنون طاری ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی جنون میں مبتلا ہے۔ کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ جو لوگ جنون میں مبتلا نہیں ہیں ان کا سکون دوسرے جنونیوں نے غارت کر دیا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کر رہا۔ کیا اس سوسائٹی اس معاشرے کو تم جنگل سے بہتر سمجھتی ہو؟"

زرنج کچھ نہ بولی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہم سے انداز

”میں سمجھی نہیں! ذرا وضاحت سے بات کرو۔“

”ہم سے بڑی زبردست حماقت ہوئی۔ وہ خود چل کر ہمارے ذریعے پر آیا تھا۔ ہمارے قابو میں تھا لیکن ہماری عقلوں پر پردہ پڑ گیا۔ ہم نے دقی طور پر اس کی بات کا تعین کر لیا اور اسے نکل جانے دیا۔ اب ہم بچتا رہے ہیں۔“

”تو اب بھی پیلیاں بھجوا رہے ہو۔“ ذرا تاج ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ جانو سکار کی راگ الاٹل نے اسے میں بھاڑتے ہوئے بولا ”ہمارا ایک خاص آدمی تھا۔ وہ دخیل خان۔ وہ ہر وقت ہمارے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ اس نے بھی ایک چھوٹے سے شریف زمیندار کا روپ دھارنا ہوا تھا لیکن جو تھوڑی سی زمین اس کے پاس تھی وہی بڑی حقیقت اس کی نہیں تھی۔ وہ اس کے پاس کسی کی امانت تھی۔ بڑا باصلاحیت اور زبردست فوجوان تھا اس لیے کہ وہ میں اسے تقریباً میرے نائب کی حیثیت حاصل تھیں۔“

یہ انکشاف بھی میرے لیے چونکا دینے والا تھا کہ وہ دخیل خان جو زمین سنبھالے ہوئے تھا وہ اس کی اپنی نہیں تھی۔ اس نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ بہت سی ایسی باتیں سامنے آنے والی تھیں جو اس نے مجھے نہیں بتائی تھیں۔

”تین روز پہلے ہمارے گروہ نے ایک بہت بڑی واردات کی۔“ جانو سکار تھا۔ ”اس واردات میں لوٹے ہوئے لاکھوں روپے اور لاکھوں کالہ دخیل خان کے پاس تھا۔ وہی اس واردات میں گروہ کی قیادت کر رہا تھا۔ اچانک ہی پولیس کی ایک پابندی کسی اور پکڑ میں اس طرف اٹکل۔ سالہ بگڑ گیا۔ اگر میں اس واردات میں شامل ہوتا تو شاید گزیر نہ ہوتی لیکن کسی وجہ سے نہیں جاسکا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ گزیر بھی دخیل خان نے ہی جان بوجھ کر کی تھی۔ تمام سامنے بچھڑ گئے۔ ہر حال ہمیں فکر نہیں تھی۔ ہمیں تو یہی اطمینان تھا کہ مال ہمارے بھروسے کے آدمی کے قبضے میں ہے۔“

اس نے سکار کا گمراہ کن لیا اور اسے اگلیوں میں کھماتے ہوئے بھورا اس کا بازو لیتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس سے اگلے روز دخیل خان والے چلے اور اسی کے لباس میں ایک اور شخص ہمارے علاقے میں پہنچا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے پکڑ کر میرے پاس پہنچایا گیا تو اس نے عجیب ہی کہانی سنائی کہ دخیل خان گھوڑے سے گر کر ٹانگ ٹوڑا بیٹھا تھا اور بڑی مشکل سے اپنے ذریعے تک پہنچا تھا۔ انشپور جسم کل اس کے تعاقب میں تھا۔ اس شخص نے اپنا نام افضل خان بتایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دخیل خان کا گمراہ دوست اور ”پارٹنر“ بتا رہا تھا جبکہ ہم نے اس سے پہلے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

اس نے بتایا کہ دخیل نے اس سے مدد کی درخواست کی تھی

”میرے کی بات یہ ہے کہ وہ بات وہی تھی جس کی خاطر میں آیا ہوں۔ باقی دنیا بھر کی باتیں ہو سکیں۔“ جانو بھی گھڑی دیکھ کر متنبہ کر بیٹھے ہوئے بولا۔

”حقیقتاً وہ کوئی خاص بات ہوگی جس کے لیے تم نے خود زحمت کی ہے۔“

”نہیں۔۔۔ کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں۔ خاص بات تو یہ ہے کہ اس بات کے ہمارے سے تم سے ملاقات ہو گئی۔“ ایک بار پھر جانو کے ہونٹوں پر وہی بھوک مسکراہٹ لٹ آئی جس کی وجہ سے وہ اچھا بھلا وجہ ہونے کے باوجود غرت اٹھنے نظر آتا تھا۔ یا شاید وہ صرف مجھے ہی ایسا نظر آ رہا تھا۔ شاید میں لاشعوری طور پر چاہتا تھا کہ وہ ذرا تاج کو ایسی نظروں سے نہ دیکھے۔

جانو نے بات جاری رکھی۔ ”مسئلہ کوئی خاص تو نہیں لیکن آگے چل کر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے اس لیے میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ پچھلے تین دن کے دوران ہمارے ہاں کوئی ایسا گھوسوار تو نہیں پہنچا جس کا گھوڑا بھی سیاہ ہو اور لباس بھی؟“

”کیوں۔۔۔ خیریت؟“ ذرا تاج نے چرسکے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔

”پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔“ جانو اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ شاید حقیقت تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر انہی سٹاک نظروں سے ذرا تاج کو تھیں کر رہا تھا کہ وہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرے۔

”نہیں۔ میرے علم میں تو نہیں۔“ ذرا تاج کے لیے میں سرد مری آگئی۔ ”وہیے گاؤں میں اور زمینوں پر بھی سب لوگوں کو سختی سے میری ہدایت ہے کہ ہمارے علاقے میں کوئی ایسی داخل ہو تو فوراً اسے روک کر اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں اور اگر اس کے بارے میں ذرا بھی بے اطمینانی ہو تو اسے میرے سامنے پیش کیا جائے۔“

”جیسے یقین ہے کہ ہمارے احکامات پر واقعی عمل ہوتا ہے؟ کیسے وہ گاؤں میں کسی کے گھر میں پناہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو گیا ہو؟“ جانو بولا۔

”یہاں نہیں ہو سکتا۔“ ذرا تاج کے لیے میں اب بھی سرد مری تھی۔ ”مجھے یقین ہے کہ میرے احکامات پر اچھی طرح عمل ہوتا ہے۔ اگر وہ گاؤں میں کسی کے ہاں پناہ گزیر ہوتا تو مجھے ضرور اطلاع مل چکی ہوتی۔“

”جھڑواؤں سے وہ بولی۔“ جس دن مجھے یہ شبہ ہوا کہ میرے احکامات پر عمل نہیں ہوتا اس دن میں اس گاؤں اور زمینوں کا نظام کسی اور کے سپرد کرنے کے بارے میں غور کروں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ تمہیں کس سلسلے میں اس سیاہ پوش کی تلاش ہے؟“

”مال کے سلسلے میں۔“ جانو ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

معلوم ہی ہوگا کہ وہ کسی کے پیچھے لگ جائے تو پھر کسی قیمت پر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

”ہاں۔“ زرتاج مسکرائی۔ ”وہ ان عجیب و غریب قسم کے افسروں میں سے ہے جو اب پولیس میں نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔“

”لیکن ہم چاہتے ہیں کہ افضل خان اس کے بچے چڑھنے سے پہلے ہمارے بچے چڑھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کونسا نکمیا۔ میرا اندازہ تو یہی تھا کہ وہ اور میری آیا ہوگا اور کسی طرح پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔ میں تو بڑا خوش تھا کہ یہاں آئے ہی ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہمیں جس کی تلاش ہے وہ ہمیں مل جائے گا لیکن تم نے تو ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔“ خانو پر خیال انداز میں ٹھوڑی ٹھکارتے ہوئے بولا۔

میں اپنی جگہ بیٹھا کھڑا تھا اور دو دانے کی بھری سے آنکھ لگائے ٹیڑس کا منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے زرتاج کے چہرے پر کوئی رد عمل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ کیا اس نے جانو کی باتوں پر یقین کر لیا تھا؟ کیا میرے بارے میں اس کے دل میں بدگمانی آج بھی تھی؟ زرتاج کے چہرے سے میرے لیے ان باتوں کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ کم از کم ایک بات تو میرے حق میں جاری تھی کہ زرتاج نے اپنے گھر میں تو کیا اپنے گاؤں اور زمینوں کی حدود میں بھی میری موجودگی کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ اب میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے سہلانا دیا کیا تھا یا اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود تھا اور میرے بارے میں اس کی رائے کی تھی کہ میں کوئی بڑا آدمی ہوں یا محض ایک غائب؟

دوہیل خان کے غائب ہونے کے انکشاف نے مجھے بھی اچھا خاصا چوٹ کا دیا تھا۔ میں خود اسے گھر میں لانا چاہتا تھا۔ اس کی ٹانگ کی بڑی واقعی ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے خود اس پر ہلتر نہا بیڈنگ کی تھی۔ اس نے ذکر تو کیا تھا کہ زورہ حسام خان سے کوئی اس کے پاس آنے والا تھا۔ کیا اسی کی مدد سے وہ کہیں نکل گیا تھا؟

میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور مجھے یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ دوہیل خان نے واقعی مجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ وہ تو اتنی اچھی اچھی باتیں کرنے والا پُر غلوں سا نوجوان تھا۔ کیا میرے ساتھ وہی پرانی کمائی نہ رہا لی گئی تھی جس سے سبق ملتا ہے کہ کسی کی مسموم صورت دیکھ کر اور غلوں بھری باتیں سن کر دھوکا نہیں کھانا چاہیے؟ میرا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ دوہیل خان تو یادوں کا یار اور زبان پر جان رہنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ پروردہ ہے شک و شک کا تو تھا اور اس نے میرے سامنے اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن اس کی فطرت میں سازشیں اور کینکسی نظر نہیں آتی تھی۔

اس کے برعکس خانو اور غیسو کی شکلیں ہی دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں غصہ آ رہا تھا۔ دونوں پورے صورت حرام نظر آتے

اور تجویز یہ پیش کی تھی کہ وہ دوہیل خان کا لباس پہن کر اس کے گھوڑے پر بیٹھ کر انسپکٹر رحیم گل کو اپنے پیچھے لگا کر لے جائے۔ رحیم گل کو یقین ہو جائے گا کہ جو شخص اپنے گھروسے ٹوٹی ہوئی ٹانگ لے لے پٹیاں لینے پڑا تھا وہ تو کچھ دیر پہلے ڈاکا مارنے والا ڈاکو نہیں ہو سکتا۔ یعنی افضل خان اپنے دوست دوہیل خان کے لیے ایثار کر رہا تھا۔ تم ہی بتاؤ! آج کل کوئی کسی کے لیے اس قسم کا ایثار کرتا ہے؟“

”تم ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ انسانی احساسات کی باتیں ہیں اور تم احساسات سے عاری انسان ہو۔ تم اصل تصدیق کرو۔“ زرتاج نے مشورہ دیا۔

”ہم یہ سمجھے کہ دوہیل خان نے افضل خان کو لوٹ کا مال دے کر ہمارے پاس بھیجا ہوگا۔“ جانو سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس نے بتایا کہ اس کے پاس تو کوئی مال وال نہیں تھا اور نہ ہی اسے مال کے بارے میں کچھ علم تھا۔ کیا اس کا تو کتنا تھا کہ جب دوہیل خان ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ اپنے ڈیرے پر پہنچا اس وقت بھی اس کے پاس کوئی مال وغیرہ نہیں تھا۔ اس بات پر ٹھوڑی بہت بک بک جھجک ہوئی لیکن آخر کار ہم نے افضل خان کی بات پر یقین کر لیا۔ ہم نے اسے جانے کی بھی اجازت دے دی۔ ہمارا خیال تھا کہ دو چار دن میں دوہیل خان کے ڈیرے پر جائیں گے اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”تو کیا مسئلہ حل نہیں ہوا؟“ زرتاج نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”مسئلہ تو اور بھی زیادہ بڑا سراور اور تشویش ناک ہو گیا۔ کل ہم دوہیل خان کے ڈیرے پر گئے تو پتا چلا کہ وہ غائب ہو چکا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اس کی ٹانگ واقعی ٹوٹی ہوئی تھی تو وہ کہاں غائب ہو گیا؟ کسی نے اس کی مدد کی؟ ظاہر ہے کسی کی مدد کے بغیر تو وہ غائب نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ ہم تک یہ جھوٹی اطلاع پہنچائی گئی تھی تاکہ ہم مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں اور اس دوران دوہیل خان کو غائب ہونے اور ان علاقوں سے بہت دور نکل جانے کا موقع مل جائے۔“

وہ خاموش ہو گیا اور کچھ اس طرح زرتاج کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ ان باتوں پر کوئی تبصرہ کرے گی لیکن وہ خاموش رہی۔ تب جانو کرسی کے پتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا ”اب سارا دام مدار اس شخص پر ہے جس نے اپنا نام افضل خان بتایا تھا اور جو ہماری محنت کی وجہ سے ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب اس پر ہمارے کسی مساقفوں کی پولیس والوں اور خصوصاً ایک بیٹے کا شبہیل کے قتل کا الزام ہے۔ وہ بیٹے کا شبہیل انسپکٹر رحیم گل کے ساتھ تھا۔ رحیم گل کی شہرت تو تم نے سنی ہی ہوگی۔ وہ بڑی کھلی قسم کی چیز ہے۔ وہ چاروں طرف افضل خان کی بوسھن پھیر رہا ہے۔ نہیں

ہوئے بولا۔ ”تمہیں شکار رہ جانے میں دیر نہیں ہوگی؟“

”نہیں۔“ آج تو شکار شروع کئے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ آج تو جا کر صرف کھپ لگنا تھا۔ کل سے ہی کچھ کریں گے تم کیا اب واپس جا رہے ہو؟“

”نہیں۔“ مجھے تو آج ایک اور زمیندار سے ملنے جانا ہے۔ اسے کچھ ”سیاسی“ مسائل درپیش ہیں۔“ جانو استغناء میں ہوا۔ ”تمہیں معلوم ہے؟“ آج کل بعض زمینداروں کے بعض سیاسی مسائل بھی ہم ڈاکو مل کر رہتے ہیں۔ یہاں سے میں اور غیسو الگ ہو جائیں گے۔ غیسو کو تمہارے گاؤں سے ہم سب لوگوں کے لیے کچھ شاہک کرنی ہے۔ ذرا آج عمر کسے گاؤں سے ہم گراس کی یہ بڑی خوبی ہے کہ یہاں بروہ چہرل جاتی ہے جو شہروں میں مل سکتی ہے۔“

”میں نے اس کی ترقی کے لیے بہت کوششیں کی ہیں۔ ہر کام سرکار کے آسرے رہ نہیں چھوڑا۔ خود بڑی بڑی رقبے خرچ کی ہیں تاکہ یہاں کے لوگ بھی شہروں کا رخ کرنے کے بارے میں نہ سوچیں۔“ ذرا آج قدرے خوشگوار لہجے میں بولا۔

”تم ایک عجب و غریب زمیندار بنی ہو۔“ جانو عجب سے انداز میں ہنسا۔ ”اگر ملک میں تم جیسے طور طریقے آوے زمیندار بھی اختیار کریں تو دیہاتی معاشی کے حالات بدل جائے۔ دوسروں کی تلاش کے لیے اپنے لیے سے دولت خرچ کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام ہے۔“

وہ دونوں اس پردے کے قریب پہنچ چکے تھے جو ڈانٹنگ ہال اور ٹیئرس کے درمیان حائل تھا۔ ذرا آج بولی۔ ”میں تمہیں یہیں سے خدا حافظ کہوں گی۔ خادمہ تمہیں گیٹ تک چھوڑ آئے گی۔ مجھے اپنے آؤمیں کو کچھ ضروری باتیں دینی ہیں۔“

”فیک ہے۔ حفاظت کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔“ جانو بے پردائی سے بولا لیکن بروہ ڈرامائی سے انداز میں گھومتے ہوئے ذرا آج کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا۔ ”میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم دنیا بھر کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ کبھی اپنے بارے میں سوچو۔ میرے بارے میں سوچو۔“

میں ذرا آج کے آثارات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب اس کا چہرہ میری طرف نہیں تھا تاہم میں نے نہایت لہجے میں اسے کہنے سنا۔ ”خدا حافظ۔“ اس نے جانو کی بات کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔

جانو اور غیسو خان آگے بڑھ گئے۔ چند لمبے بعد بیڑیوں پر ان کے قدموں کی آوازیں معدوم ہو گئیں تو ذرا آج بولی۔ دونوں ہاتھ بظاہر میں دیے وہ کبھی کبھی سوچ میں تھی۔ اس دردناک کی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے میں سوچ رہا تھا۔

میں آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آیا اور بھروسوں کی طرح اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ پلکیں جھپکاتے بغیر میری آنکھوں

تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی رنگ و بے میں آتش فشاں جھلکے محسوس ہو رہے تھے اور میرا ذکر آتے ہی ان کی آنکھوں میں بھی ایسی ہلک جھلکی تھی جیسی کسی شکار کو دیکھ کر درندے کی آنکھوں میں آتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کا شکار ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں چار قدم کے فاصلے پر ایک تاریک بیڑہ میں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

تاہم مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ اگر یہ منحوس کدو مجھ سے نہ گرائے ہوتے تو شاید ذرا آج سے بھی میری ملاقات نہ ہوتی۔ اور یہ ایک بڑا نقصان ہوتا۔

ذرا آج کی گفتگو سے جانو کی شخصیت بھی میری نظر میں کچھ اور واضح ہوئی تھی۔ مجھے یہ اندازہ تو پہلے ہی تھا کہ وہ کچھ بڑھا کھٹا تھا لیکن اب یہ واضح ہوا تھا کہ اس کا اپنا ایک الگ سی فلسفہ حیات بھی تھا۔ وہ صحیح تو کیا غلط یہ بعد کی بات تھی لیکن وہ کوئی اچھا آدمی بہر حال نہیں تھا۔ وہ ایک قابلِ عزت کدو تھا اور مجھے اس سلسلے میں بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ اگر میں اس کے یا غیسو کے پیچھے چڑھا تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرے ذہن میں ایسے ہی ان گنت خیالات کا ڈراما تھا۔

ایک لمحے کے وقف کے بعد جانو بولا بغیر۔ ”اگر وہ شخص ابھی تک یہاں نہیں پہنچا تو آئندہ کے لیے خیال رکھنا۔ ممکن ہے کسی دن وہ جھٹکا بھٹکا ادھر آئے۔“ اسے تمہارے علاقے میں پناہ نہیں ملنی چاہیے ورنہ یہ تمہارے حق میں بھی برا ثابت ہوگا اور تمہارے حق میں بھی۔“

”یہ فیصلہ کرنے کا اختیار فی الحال میرے پاس ہی رہے دو کہ کسی کے ساتھ مجھے کیا سلوک کرنا چاہیے۔“ ذرا آج سرد لہجے میں بولی۔

”میں کوئی ہدایت یا حکم نہیں دے رہا۔ یہ ایک دوستانہ مشورہ ہے۔ تم بہت ذہین ہو بلکہ کبھی کبھی تو مجھے دانشور لگتی ہو لیکن بہت نادان بھی ہو۔ تم جیسے لوگ کبھی کبھی اپنی مادی اور مصیبت میں کوئی اعتدال قائم نہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی نظر میں ہے۔ حد اعتدال نہ ہوتا ہے۔“ جانو ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں یہ کہتے ہوئے مسکرایا۔ ”بھگت جیسا ہمدرد تمہیں ملے گا نہیں لیکن فی الحال تمہیں میری قدر نہیں ہے۔“ ایک نہ ایک دن قدر ہو ہی جائے گی۔ اسی آس پر ہم زندہ ہیں۔“ اس نے ایک معنوی آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جتنی کے عقب سے باہر جھانکتے ہوئے بولا ”ہم نے تمہارا بہت وقت لے لیا لیکن غیرو۔۔۔ ہمارا آنا تمہارے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ ہم نے تمہیں ایک خطرے سے خبردار کر دیا ہے۔“

”شکریہ۔“ ذرا آج کے لہجے میں اب بھی سرد مہمی تھی لیکن جانو کو شاید دوسرے کے لہجے سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف اپنی بات کہنے سے غرض رکھتا تھا۔

ذرا آج بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جانو ابھی کے لیے سڑتے



کہا۔ ”یقین اس کے علاوہ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں واقعی دو میل خان کی ایک مرہائی اور چند دن کی دوستی کے جواب میں اس کی خاطر اپنا رکسنہ لگا تھا۔ میں نے اس کے ڈاکوس والے کپڑے پہن کر ذاتی انشپکزر جم کھل کواپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ راستے میں ایک ہیڈ کاشیبل میرے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا لیکن وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ میں اسے قتل کرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کے مرنے کا مجھے افسوس ہے۔ اس کے علاوہ میرا کسی دیکھنے، بکھنے، قتل، کسی برائی، کسی واردات سے کوئی تعلق نہیں۔“

”مصلحتی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولے۔ ”جیب بے نیاز قسم کی لڑکی تھی۔ یا پھر شاید اسے اپنی حرم شہادی پر حد سے زیادہ اعتماد تھا۔“

وہ اس وقت جن کے پار دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی گردن تھما کر دیکھا۔ حویلی کی دوش پر جانو اور نیسہ خان گیٹ کی طرف جارہے تھے۔ ایک بار پھر میں اس صورت حال سے محظوظ ہوئے بغیر نہ سکا کہ جس کی تلاش میں وہ شکاری کتوں کی طرح پھر رہے تھے وہ تیس پر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

پھر میں نے ذرا تاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے تو ایک بھید کی طرح مجھے چھپایا لیکن آپ کے آدمی تو یقیناً انہیں میرے بارے میں بتا دیں گے۔“

”مجھے پہلے ہی کچھ اندیشہ تھا کہ شاید کوئی تمہاری تلاش میں یہاں آئے“ اس لیے میں نے محض احتیاطاً اپنے آدمیوں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ کسی سے تمہاری آمد کا ذکر نہ کریں۔ میرے آدمی میرے حکم کی صحیح طور پر تعمیل کرتے ہیں۔ ویسے بھی انہیں غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت نہیں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے جواب نے میرا بوجھ کچھ اور کم کر دیا لیکن وہ گھوڑے سدھانے والا شرمچہ میرے ذہن میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ پوری طرح ذرا تاج کا ولادار ہو لیکن وہ کچھ زیادہ خیر خواہ نہیں لگتا تھا۔

”آپ جانو کہ خاصی اچھی طرح جانتی ہیں؟“

”ہاں۔ خاصی اچھی طرح۔“ ذرا تاج نے کرسی سے اپنی راکٹل اٹھا کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ ”اس نے جب بتایا تھا کہ وہ تیار کیا تھا اور اس میں صرف چند ڈاکو شامل تھے تو اپنی ابتدائی وارداتوں میں اس نے ہمیں بھی شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ بڑے زور و شور سے اس نے حویلی پر ڈاکو ڈالا تھا۔ اس وقت پاپا زندہ تھے۔۔۔“ وہ گویا اس وقت کی یادوں میں الجھنے لگی۔

پھر خفیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”ہمارے آدمیوں نے اس کے گردہ کو مار بھیجا اور جانو کو قابو میں کر کے خوب پانی لگائی۔ یہ بہت گڑ بگڑایا۔ ہمیں کیوں اور اس دوران اس نے اپنی کچھ کمائی

میں بھانک رہی تھی۔ جیسے میری ذات کی کتاب کو آخری سطر تک پڑھ لیتا جانتی ہو۔“

”کیا آپ نے اس کی باتوں کا یقین کر لیا؟“ چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے پوچھا۔

”جہیں کیونکر یہ خیال آیا؟“ اس نے اُٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ اس کے اونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ واپس آ رہی تھی اور آنکھوں سے دھند چھٹ رہی تھی۔

”آپ کا ایک کچھ فکر مندی نظر آنے لگی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں فکر مند نہیں ہوں، صرف سوچ رہی ہوں۔ تمہارے بارے میں نہیں، جانو کے بارے میں۔“ وہ استہزائیہ سے انداز میں کہی۔ ”اس نے کہا تھا کہ میرے بارے میں سوچو۔ میں اس کے حکم کی تعمیل کر رہی ہوں۔ گدھا کہیں کا؟“

”اس کا مطلب ہے، جانو نے میرے بارے میں جو کچھ کہا اس پر آپ نے یقین نہیں کیا؟“ میرے دل میں خوشی کی ایک لہری اٹھی۔ کیا اتنی جلدی وہ واقعی اس حد تک مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی؟

”کچھ سچ اس نے بولا ہے، کچھ سچ تم نے بولا ہے۔ کچھ باتیں اس نے چھپائی ہیں، کچھ باتیں تم نے چھپائی ہیں۔ اس کے سامنے بھی کچھ مصلحتیں ہیں، تمہارے سامنے بھی کچھ مصلحتیں ہوں گی۔ وہ بھی کچھ حقائق جاننا چاہتا ہے۔۔۔ اور میرا خیال ہے تم بھی کچھ حقائق کی تلاش میں ہو۔“ وہ تھوڑے بے نیازی سے بولے۔ ”لیکن تم بطور انسان میری نظر میں ہر لحاظ سے اس سے بہتر اور قابل اعتبار ہو۔ اس کا کیا ہے، وہ تو اب مکمل طور پر ڈاکو بن چکا ہے۔ وہ جو اس کے اندر ایک سمجھدار اور تعلیم یافتہ انسان تھا وہ اب کہیں گمراہی میں دفن ہو گیا ہے اس لیے اس کی بات کا میں زیادہ اعتبار نہیں کرتی۔“

”اگر میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں تو آپ اعتبار کر لیں گی؟“ میں نے پوچھا۔ اس کے دہانے کی دوجہ سے گویا میرے سینے سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔

”بتاؤ؟ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولے۔ ”بہر حال اتنا ضرور جان لیجئے کہ میں نے آپ سے جھوٹ صرف اس حد تک بولا تھا کہ میں اس علاقے کا ایک چھوٹا سا زمیندار ہوں۔ میں زمیندار نہیں ہوں۔ نہ چھوٹا اور نہ ہی بڑا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ اطمینان سے بولے۔ ”یہ اندازہ تو مجھے شروع ہی سے ہو گیا تھا۔ دور دور تک کے تمام چھوٹے بڑے زمینداروں کو میں جانتی ہوں اور وہ مجھے جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ میں دو میل خان کو بھی جانتی ہوں۔“

مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔ بہر حال میں نے بات جاری رکھتے ہوئے



”بھئی نہ کبھی غادر درخت نہیں گے طاقت اصل میں جزی پہ  
ایسی ہے طاقت ہاتھ میں آنے کے بعد احساس نہیں رہتا کہ  
انسان کس کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔“ چھوڑا ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔  
”خیر۔ چھوڑو یہ باتیں۔ یہ بد بخت جانو بھی کیا بے دقت آیا۔  
مجھے روانہ ہونے میں غامی دیر ہو گئی۔“

”لیکن اس کا ایک فائدہ ہوا کہ میرے بارے میں آپ کی  
مطلبات میں اضافہ ہو گیا۔ کیا آپ میرے بارے میں جانو کی باتیں  
سننے کے بعد بھی مجھے یہاں چھوڑ کر جانے میں کوئی اندیشہ محسوس  
نہیں کر رہیں؟“ میں واقعی اس کے بعد سے پر حیران تھا۔ مجھے یقین  
نہیں آیا تھا کہ کوئی ان حالات میں بھی مجھ پر اس حد تک بھروسہ  
کر سکتا تھا۔

”میں اگر کوئی اندیشہ محسوس کروں گی تو اس کا کوئی نہ کوئی  
بندوبست کروں گی۔“ وہ ہلاتا ہوا بولی۔ رات نکل دواورہ کرے  
اتھا کر اس نے کندھے پر لٹکالی۔

”میں نے جلدی سے پوچھا۔“ جانو کا اصل نام کیا ہے؟ جانو تو  
اصل نام نہیں لگتا۔“

”اس کا اصل نام جان مراد ہے۔“ ذراتج نے جواب دیا۔  
”اپنے آپ کو جانو کے نام سے بھی اس نے خودی منظور کیا ہے۔  
وہ نہیں چاہتا کہ اس کے کسی بھی نام سے اس کے بڑے تھکے ہوئے  
کا احساس ہو۔ اسے اپنے بڑے تھکوں والے ٹیک گراؤں سے بھی  
نفرت ہو چکی ہے۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ بلکہ شاید  
پیچھا چھڑا رہا ہو۔ اب کے باورہ گیا ہے کہ وہ ایک بڑھا کھٹا  
نوجوان ہے۔ اب تو یہ بات شاید اسے خود بھی یاد نہ ہو۔ اچھا۔۔۔  
میں اب چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔“

”میں اس کے پیچھے پیچھے بیڑھیاں اتر کر چلے آیا اور ہم حویلی  
سے باہر آگئے۔ وہاں آٹھ دس افراد دو بیچوں اور ایک بیچرو کے  
ساتھ موجود تھے۔ ان میں اویز عمر کی دو لمبی ترنگی مضبوط عورتیں  
بھی تھیں۔ بیچوں میں کچھ سالانہ لدا نظر آتا تھا۔ سب منہ بانہ  
انداز میں کھڑے تھے۔ ایک رات نکل برادار نے جلدی سے آگے بڑھ  
کر بیچرو کا دروازہ کھولا۔“

ذراتج نے اپنی رات نکل بھی کندھے سے اتار کر اس شخص کو  
تھمائی اور کچھ اس طرح سیارہ بیچرو میں سوار ہو گئی جیسے کوئی مشاق  
گھڑ سوار بلک جھپٹنے میں اپنے گھوڑے پر جا بیٹھا ہو۔ کسی لمحے وہ  
فلوڈی لڑکی نظر آتی تھی اور کسی لمحے اس کے جسم میں شاعر کی  
سی چلک نظر آتی تھی۔ گمان گزرتا تھا کہ شاید اس کے جسم میں  
ہڈیاں بھی بید بختوں کی طرح چمکی ہیں۔ اس نے بیچرو میں  
ذراتج تک سیٹ سنبھال لی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ویش بوز پر  
بڑا ہوا خوبصورت سیاہ چشمہ اتھا کر لگایا۔ اس کے ہاتھ پر  
گھڑا سیاہ دھندلی آکر ٹھہر گئی۔

گردن تھما کر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر تمہاری

”اپنی کمائی کچھ اس نے خود شالی تھی اور کچھ ادھر ادھر سے  
تصدیق ہوئی ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی لیڈر ٹاپ چڑ  
تھا۔ مختلف پابندیوں کے خلاف اس کا وہ عمل بہت شدید ہوتا تھا۔  
خوشحال والدین کی اولاد تھا۔ باہر بھی جانا دیتا تھا۔ سیاست میں  
بہت سرگرم تھا لیکن مزاج میں اتنا پسندی تھی۔ اس قسم کے  
نوجوانوں کو میرنگلی ایجنسیاں اچانک لیتی ہیں۔ اس دوران اس کے  
والدین کا بھی اشتغال ہو گیا جو اسے کچھ کام سنبھال رکھتے تھے۔ گیارہ  
وہ گرفتار ہوا۔ اس پر بہت خطرناک قسم کے مقدمات تھے۔ ایک بار  
جیل توڑ کر بہت سے خطرناک مجرم فرار ہو گئے۔ ان میں وہ بھی  
شامل تھا۔ اس کے بعد وہ مذہب پوش ہو گیا۔ دوبارہ سامنے آیا تو ڈاکو  
بن چکا تھا۔“

ذراتج نے ایک کمری سانس لی اور منہ پھیرتے ہوئے بولی۔  
”اس کی مذہب پوشی کے دوران ایک ایسے اور رونما ہوا جس نے نہ  
صرف اس کی زندگی کا رخ بدلے جسے اب ہم کو مارا گیا بلکہ میرا  
خیال ہے اسی کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت میں بھی کچھ فرق آیا۔  
وہ ناراض انسان نہیں ہے۔“

ذراتج کو اس ایسے کے بارے میں بتانے کے لیے مناسب  
الفاظ تلاش کرنے لگی۔ ذراتج کے بعد بولی۔ ”اس کی ایک بہن  
تھی۔ اس کی مذہب پوشی کے دوران کچھ بد معاشوں نے اسے اغوا  
کر لیا۔ سننے میں آیا کہ انہیں پولیس کی پشت پناہی حاصل تھی۔  
وہ علم بالصواب۔ بہر حال۔۔۔ کچھ دن بعد وہ ایک مکان میں گھر  
پائی گئی۔ اس کی لاش ایک چمٹ سے بندھ رہی تھی کے پھندے میں  
جھول رہی تھی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے خود کشی کی  
تھی۔ اس ایسے کے ذمے وار گرفتار نہیں ہو سکے۔ شاید اس واسطے  
کی وجہ سے۔۔۔ یا پھر دوسری کچھ وجوہات کی بنا پر جانو کو پولیس سے  
بڑی شدید نفرت ہے۔ کوئی پولیس والا اگر اس کے بچے چڑھ جائے  
اور موقع مناسب ہو تو اس کا بہت برا اثر کرتا ہے۔“

”اس کے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہوں گی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن  
اس کے ساتھ ہمدردی محسوس نہیں ہوتی۔ انسانوں کے ساتھ اس  
کا اپنا رویہ کون سا اچھا ہے۔ یہ تو کوئی انصاف پسند بات نہیں ہے  
کہ آپ معاشرے اور نظام کی زیادتیوں کی سزا اپنے سامنے آنے  
والے ہر شخص کو دیتے رہیں۔ ممکن ہے وہ ایک اچھا انسان ہو جس  
کے ساتھ آپ ظلم کر رہے ہوں۔ ممکن ہے وہ بھی آپ ہی کی طرح  
کوئی مظلوم ہو۔ اور پھر مظلوموں کی کوئی ایک قسم تو نہیں  
ہوتی۔“

”ہر بد معاش اور انتقام پسند کے پاس اپنے کچھ فلسفے کچھ جواز  
ہوتے ہیں۔ اگر نہیں ہوتے تو وہ کھڑے ہیں۔ اس کے علاوہ جس  
قسم کی زندگی جانو نے گزار دی ہے اس کے بعد تو انسان کا مزاج ہی  
پرل جاتا ہے۔ اب اسے بالکل احساس نہیں ہو گا کہ وہ خود ظلم کی  
کتنی کمائیاں تخلیق کر رہا ہے۔ انصافوں کے کتنے بچ ہو رہا ہے جو

واقعی ایک بدلی ہوئی نصیحت نظر آ رہا تھا۔ اب میری شخصیت میں پہلے والے صاف ستھرے افضل چہرہ کی جھلک تھی۔ غصے کے لیے اب میں انہی ثابت ہو سکتا تھا۔ تھوڑا بہت غصہ مول لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے کھانکھٹ کدھے پر لٹکائی۔ پتلی سے بندھا رہنے والا میرا مخصوص خنجر ابھی تک میرے پاس تھا۔ وہ میرا وفادار ساتھی ثابت ہوا تھا۔ میں مٹھن سے انداز میں اپنے سر پا پر تاندانہ نظر ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ فارم کے گھوڑے میں سے میں نے ایک گھوڑا کھولا۔ یہ ایک توانا مگر نرم ڈھکھڑا تھا۔ مجھ سے کچھ بانوس سا بھی نظر آنے لگا تھا۔ چند لمبے بعد میں گھوڑے پر بیٹھ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاؤں میرے اندازے سے کچھ برا ہی تھا۔ گاؤں کیا اچھا بھلا قصبہ تھا۔ اس کا میں بازار بہت برا اور بددینی تھا۔ بازار کی سڑک کی اور ڈکانوں کی اچھی خاصی مستقل قصیں۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ ڈکانوں پر ہجوم اور بازار میں گھما گھی نظر آ رہی تھی۔ شاید آس پاس کے بھڑے گوشت و نباتات کے لوگ بھی خریداری کرنے نہیں آتے تھے۔ زرتاج گھر کی صرف اپنی آبادی کی بدولت اتنی رونق نہیں ہو سکتی تھی۔ مجموعی طور پر مجھے اس بازار میں آسودہ حالی کی جھلک نظر آئی۔ زرتاج گھر یقیناً ایک خوشحال گاؤں تھا۔

میں اپنے سفید گھوڑے کی رگام تھامے اور وڑھوہر دیکھنا پھیل چلا جا رہا تھا۔ پھیل بھاڑ میں کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ڈکاندار اپنی ڈکانداری میں مصروف تھے اور خریداروں کو اپنی خریداری سے مطلب تھا۔ غصہ خان کو تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک ڈکان کے قریب مجھے بجلی کے صمبے سے ایک گھوڑا بندھا نظر آیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ غصہ خان کا گھوڑا تھا۔

میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ قریب جا کر میں نے پہچان لیا، وہ غصہ خان کا ہی گھوڑا تھا۔ ایک جام کی ڈکان کے قریب کھڑا تھا۔ میں ڈکان کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا تو آئینے کے سامنے اونچی سی ایک گدے دار کرسی پر غصہ خان بیٹھا نظر آیا۔ غصہ خان کی عنت سے اس کے سرخ بدن کو ستورے میں مصروف تھا۔ اب اس کا کام اب آخری مرحلے پر معلوم ہوتا تھا۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ڈکان میں جاؤں اور ڈکاندار مجھے یاد رکھے۔

اس سے اچھی ڈکان جو توں کی تھی۔ کالی بڑی ڈکان تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ گاؤں میں واقع تھی۔ ڈکان میں خریداروں کا ہجوم تھا۔ کچھ ٹاک باہر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ البتہ چند لمبے بعد ایک نوربان نے گردن موڑتے ہوئے ستائی زبان میں کہا۔ ”بھائی!

نشانے کی مٹکن چھوٹی ہوئی ہے تو اب شروع کرلو۔ شاید اگلی مرتبہ تمہیں بھی ہمارے ساتھ شکار جانا پڑے۔“

میں نے گردن کو خم دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ زرتاج کا اشارہ پا کر سب لوگ گاؤں میں سوار ہو گئے اور چند لمبے بعد تینوں گاؤں وصول ہوئے۔ اڑانی مشرق کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ گاؤں میری نظر سے اوجھل ہو گئیں تب میں چلا۔ چوٹی کے چوکیدار دوبارہ اپنی جہازی چارپائی پر بیٹھ چکے تھے اور اپنی نہیں انہوں نے چارپائی کے سارے کھڑی کردی تھیں۔ ان میں سے ایک کیم جیم چوکیدار اپنی موٹھی کو مل دیتے ہوئے گردن ترجمی کیے خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ان لوگوں میں واقعی یہ خصوصیت موجود تھی کہ وہ غیر ضروری گفتگو نہیں کرتے تھے۔

شیر عمر آس پاس کیس نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں گھوڑے بھی اس نے غالباً فارم میں لے جا کر باندھ دیے تھے۔ میں سست روی سے فارم کی طرف چل رہا۔

گھوڑے فارم میں موجود تھے۔ شیر عمر البتہ وہاں نہیں تھا۔ شاید گاؤں چلا گیا تھا۔ فارم پر رہنے والے دونوں ملازموں میں سے بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ وہ میرے لیے کھانا تیار کر کے رکھ گئے تھے۔ میں نے ذرا جلجت کے سے عالم میں کھانا کھایا۔ کھانے میں کچھ بھی شامل تھی اور ایک کچھڑی میرے ذہن میں بھی پک رہی تھی۔

جانو کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ غصہ خان گاؤں میں کچھ خریداری کرنے جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ غصہ خان کو خاصی دیر گاؤں میں موجود رہنا تھا۔ شاید اسے شام ہی کو واپس جانا تھا۔ جانو کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ اپنے ذمے سے کسی شارت کٹ کے راستے یہاں آتے تھے۔ وہ شارت کٹ مجھے بھی معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ اس رویہ غصہ خان کے تصور سے دگ دپے میں ابل سا آتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں چرنی الماری کے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنی صورت کا جائزہ لینے لگا۔ شیوہ کی دن کی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں اسی ٹیلے میں جانے کے اڑے پر گیا تھا۔ اگر میں شیوہ لیتا، سر پہ کپڑی باندھ لیتا تو ٹیپو پن لیتا اور تاریک شیشوں کی ٹیک لگا لیتا تو میری صورت کالی بدل جاتی۔ میں جانو اور اس کے ساتھیوں کے لیے ناقابلِ شناخت ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے جن چیزوں کی ضرورت تھی، وہ اب اس وقت کو اور نہیں دیکر سامان کے ساتھ پہلے سے موجود تھیں۔

میں نے جلدی جلدی شیوہ بٹا، غسل کیا، کپڑے بدلے پھر ایک اڑک لے کر اسے کپڑی کی طرح سر پر لپیٹا، سیاہ چشمہ لگایا اور از سر نو تنہی کی نظر سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ پہلے کی نسبت میں

اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ مجھے پہچان لیتا تو کوئی رد عمل ظاہر نہ کرتا۔

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "نفس خان! تم بڑے آدمی ہو اس لیے تم مجھے پہچانتے نہیں ہو گے لیکن میں تمہیں پہچانتا ہوں۔"

خوشامد جنب جادو اثر چڑھے۔ عاقل اور احمق دونوں پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور دکھائی دیا۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے لیے "بڑے آدمی" کے الفاظ میں کر نفس خان کے سنے ہوئے اعصاب ذلیلے چڑھ گئے۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ نیچے کی طرح چڑھا اور تقریباً ریاضی خت تھا لیکن میں نے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کا ہاتھ کسی کمزور ہاتھ میں گیا تھا۔

میں نے رخسار کھجائے کے سامنے اپنا چہرہ مزید چھپاتے ہوئے کہا "میں ریسمانی زر آج کے ہاں گھوڑے سدھانے پر نوکر ہوں۔ اس کام پر گئے مجھے زیادہ دن نہیں گزرے۔ پہلے میں ان کی زمینوں پر باری تھا۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ زمین کاشت کرنا بڑی مشقت کا کام ہے لیکن اب اس سے بڑی مشقت گھڑی چلن خیرہ۔ بیٹ بادلنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہم تو ریسمانی کے غلام ہیں جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کرنی پڑے گی" میں کھوکھلے سے انداز میں ہنس رہا۔

میں اپنے آپ کو ایک ایسا شخص ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اپنے حالات سے اندر ہی اندر ناخوش ہوتا ہے مگر کسی مجبوری مصلحت یا اندیشوں کی وجہ سے اپنی ناخوشی کا اظہار کھل کر نہیں کرتا لیکن موٹے کا شکر دیتا ہے کہ کوئی اس کی ہاں میں ہاں ملائے۔ اس کی تھوڑی سی ہمت افزائی کرے تو وہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اس کو ڈھ منفر اور درندہ صفت شخص کے ذہن تک یہ تاثر پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا تھا یا نہیں۔ بہر حال کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ قائم دین کے جانے کے بعد ریسمانی کو اس کام کے لیے کوئی آدمی نہیں مل رہا اور فی الحال سارا کام شیر محمد کے ذمے ہے" وہ ٹک زدہ سے مجھے میں بولا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ زر آج کے محادثات سے اسی حد تک واقف تھے!

"ہاں بھئی۔ کوئی باقاعدہ اور صحیح آدمی تو نہیں ملا" میں نے تسلیم کیا۔ "مجھے تو ویسے ہی پکڑ کر بیگ رہ لگا دیا ہے۔ کو تو مجھے تھوڑا بہت یہ کام آتا تھا لیکن یہ بار خرابی انتظام ہے۔ کوئی ٹھیک آدمی مل جائے گا تو ہمیں کان سے پکڑ کے کسی اور کام پر لگا دیا جائے گا۔ ہمیں تو کوئی آدمیوں میں شمار بھی نہیں کرتا۔" میں نے مسنوی آہ بھر کر کھوکھلا صدقہ لگایا "ہمارا تو ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آدمی کی تلاش تو ابھی باری ہے۔"

اس گھوڑے کو تو پیچھے کرلو۔ میرے کان میں باتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے خاموشی سے گھوڑے کو پیچھے ہٹا لیا۔ تب وہ بولا۔ "اگر اس کو بازار سے باہر ہی باندھ آتے تو کیا برائی تھی؟ یہاں کوئی گدھے گھوڑوں کو چوری نہیں کرتا۔"

میں کہنے لگا تھا۔ "بھائی! یہ ذرا جذباتی قسم کا گھوڑا ہے۔ چند لمبے کے لیے بھی مجھ سے جدا نہ پسند نہیں کرتا، لیکن میں نے اپنی زبان پر قابو رکھا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ مذاق کا موقع نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ نوجوان ذرا باتوں میں ملوث ہوتا تھا۔ لگتا ہی تھا کہ وہ کسی کے ساتھ باتوں میں الجھنے کا موقع تلاش کر رہا تھا اور میں اس وقت کسی کے ساتھ باتوں میں الجھتا نہیں چاہتا تھا۔ میں بازار کی بھیڑ بھاڑ میں شامل ایک عام آدمی سے شناخت شخص ہی رہنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد نفس خان کا شب بدخبر جیسا چہرہ جام کی دکان سے طلوع ہوا۔ اس نے ارد گرد کوئی خاص توجہ دے بغیر مجھ سے اپنا گھوڑا کھولا اور اس کی نگاہ تھا میرے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔

جاننے زر تاج کو حویلی میں باتیں کرتے ہوئے بتایا تھا کہ نفس خان کو ضرورت کی بہت سی چیزیں خریدنی ہیں لیکن نہ تو اس کے پاس کوئی چیز نظر آ رہی تھی اور نہ ہی وہ کسی چیز میں دلچسپی لیتا دیکھائی دے رہا تھا۔ میں قدرے حیرت سے اس کے پیچھے چل رہا۔ اس وقت تک وہ بازار کے سرے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ ابھی تک گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کے برابر پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں کہا "کیا حال ہے نفس خان؟"

نفس خان بری طرح چونک کر پلٹا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار کندھے پر لگی ہوئی کلا شکوف کی طرف بڑھا لیکن شاید یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا کہ کسی بددق کی نال اس کی طرف اٹھی ہوئی نہیں تھی اور اسے غائب کرنے والا نہ تھا۔ میں پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ میری شکل پر مسکین برستی نظر آئے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب تھا۔

میں نے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اور اپنی آواز کو بدلنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے کہا "تم تو اس طرح گھبرا کر مڑے ہو جیسے یہاں کسی دشمن سے سامنا ہونے کی توقع تھی۔"

اس نے آنکھیں میچ کرے ہوئے ٹک زدہ سی آنکھوں سے مجھے گھورا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا "دشمن اور موت کا کیا مجھ سے... کہ کس وقت تمہیں جگ اور کس روپ میں آکر لائے؟" آدمی بے وقوف سا تھا لیکن کبھی کبھی بے وقوف بھی کام کی بات کر جاتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھے پہچان تو نہیں کیا تھا؟ لیکن پھر میں نے خودی



فیہو خان ہی گیا ہے کوئی قیامت تو نہیں آئی۔

اس نے اپنے پرانے سے سلیر بنے اور دواڑے کی طرف بڑھتے ہوئے فیہو خان کے قریب ذرا رگ کر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی یا بولا "اے کیسے ہو فیہو خان! بڑے عرصے بعد دیدار ہوئے ہیں۔"

اٹھلانے ہی اٹھلانے میں اس نے فیہو خان کے قریب ہونے کی کوشش کر دالی تھی۔ فیہو خان نے اس کے منہ پر پھنجر رسد کر دیا۔ اپنے حساب سے اس نے پھنجر زیادہ طاقت سے نہیں مارا تھا لیکن درمیانی مخلوق دو بار سے جا ٹکرائی اور فرش پر لڑھک گئی۔ اس دوران تینوں مرتبہ کسی سے بیڑھیاں اتر گئیں۔ کسی نے بھی رگ کر درمیانی مخلوق کو اٹھانے یا سارا دینے کی ہمت نہیں کی تھی۔

وہ خود ہی کھل سکتا ہوا اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور سروسٹ وہ تابی بھانا بھول گیا تھا۔ گلوگیر آواز میں بولا "ہم پر ہاتھ اٹھانا اچھا نہیں ہوتا فیہو خان! ہم تو انہ سیال کی جڑیاں ہیں۔۔۔ اللہ تجھے۔۔۔" اس نے شاید کوئی بد دعا مانا چاہی تھی لیکن خوف کے مارے جملہ کھل نہ کر سکا اور جھل قتل کرتے سر ہارے کو سنبھالے بیڑھوں کی طرف تقریباً لڑھک گیا۔

ان لوگوں کے خالی کیے ہوئے دھیلے ڈھالے سے صوفوں پر ہم پھیل کر بیٹھ گئے۔ فوراً ہی ایک ہزار دہاں آکر تپائی کی مستندی سے چکانے لگا پھر تلانہ سے انداز میں اس نے فیہو خان سے آؤز لیا۔ فیہو نے کڑی کوشت اور نان وغیرہ کا آؤز دیا تھا۔ اس رستوران میں سب سے اچھا کھانا شاید یہی میسر تھا۔ تجلیہ میسر آچکا تو فیہو خان مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا "اب بولو کیا بات ہے؟ پرائیویٹ بات چیت کے لیے یہ جگہ بہتر کن ہے۔"

"کیا یہاں سب لوگوں کو معلوم ہے کہ تمہارا اصل کا دیار کیا ہے؟"

"نہیں۔ عام لوگوں کو تو۔۔۔ ہرگز معلوم نہیں لیکن انہیں یہ ضرور معلوم ہے کہ فیہو خان کوئی خاص آدمی ہے۔ اس کے سامنے کوئی چوں کرے تو وہ زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ کوئی دکان دار ٹیڑھا ہونے کی کوشش کرے تو اس کی دکان خس و خاشاک بن جاتی ہے۔" پھر وہ آنکھیں میڑھتے ہوئے بولا "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہمارا اصل کا دیار کیا ہے؟"

"میں نے بتایا تاکہ کچھ آؤٹی آؤٹی سی باقی نہی تھیں۔ کچھ میرے اپنے انداز سے بھی تھے۔ اور پھر ایک مرتبہ میں نے ریشمیائی کو بھی ایک بزرگ کے ساتھ کچھ گول مول سی باتیں کرتے سنا تھا۔ ان باتوں سے بھی میں نے کچھ نتیجہ نکالا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے ریشمیائی کو بھی سمجھانا پڑے گا کہ اسے

صورت سے دہائی تھے جو اس کرے میں بڑے ہوئے معمولی اور کمزور سال جسم کے صوفوں پر پاؤں اوپر نگائے بیٹھے تھے۔

دہاں ایک چو تھا چو بھی موجود تھا لیکن وہ نہ تو دھشت زدہ تھا اور نہ ہی مردانہ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ زنانہ چو تھا۔ وہ درمیان کی چیز تھی۔ تیسری جنس کا وہ نمائندہ خاصا جسم تھا۔ رنگت کمری ساٹولی تھی لیکن ہونٹوں پر اس نے بڑے سرخ رنگ کی اپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ حسبِ توقع کچھ اور سنگار بھی کر رکھا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے ٹیڈے تھے اور کندھوں تک بھولے پتل میں لٹل لٹل کرتے بالوں میں پلاسٹک کا سرخ پھول بھی لگا رکھا تھا۔ لباس بھی اس کا کچھ نیم زنانہ اور نیم مردانہ قسم کا ہی تھا۔

ان کا انداز چارہ تھا کہ ہم ان کی عظمت میں غفل ہوئے تھے جس کا مجھے بلاشبہ افسوس تھا۔ تاہم وہ لوگ چوٹی بیڑھوں پر ہمارے قدموں کی دھڑ دھڑکن کو خراب ہو گئے تھے اور اب دم بخود سے بیٹھے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ فیہو خان کو کچھ کر دہائیاں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ تیسری جنس البتہ بے خنی سے تپتی تھی۔ بے چارے دہائیاں کی تقریبات۔۔۔ اور اس میں ہم جیسے ناممقول لوگوں کا دخل در معقولات میں کھینے سے انداز میں کھائیں کر رہ گیا۔

فیہو خان کی آنکھیں عام حالات میں بھی ابورنگ رہتی تھیں اور جب وہ کسی کی طرف ایک ٹھگ دیکھتا تھا تو اس سرفی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ان چاندوں کو پلک بچھپائے بغیر گھور رہا تھا۔ بالآخر تینوں مرد کو پیا چک کر زمانہ حال میں واپس آئے اور اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے مجھے نہ جانے کیوں ان پر ترس آ رہا تھا۔

وہ اگر فیہو خان کی اصلیت سے واقف نہیں تھے انہیں اگر یہ بات معلوم نہیں تھی کہ فیہو خان ڈاکو تھا تب بھی ان پر فیہو کی دہشت ضرور تھی۔ سبھی وہ اس انداز میں دواڑے کی طرف کھٹک رہے تھے۔ درمیانی مخلوق بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن اس نے دواڑے کی طرف کھٹکنا شروع نہیں کیا تھا۔

مردوں میں سے ایک نے دواڑے کے قریب پہنچ کر گویا ہمت کر کے درمیانی مخلوق کو آواز دی "آؤزیا! بھلیں۔"

زیبا؟ یہ نام سن کر تو دل پر قیامت ہی گزرتی۔ وہ اس کا سراپا۔ اور نام اس کا زیبا! اس قسم کی ستم ظریفی پر سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ہنسے یا روئے۔ زیبا اگر اس مخلوق کو دیکھ لیتی اور سن لیتی کہ اسے کس نام سے پکارا جا رہا تھا تو شاید وہ اپنی زندگی اور اپنے نام کے بارے میں بہت سے اہم فیصلے کرنے کے بارے میں غور کرنے لگتی۔

درمیانی مخلوق نے اپنے مخصوص انداز میں تابی بھا کر ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "اے آدمی ہوں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

کسی سے بھی ہمارے بارے میں گول مول 'شیر سی' ترجمی یا سیدھی کسی بھی قسم کی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ غزیا۔

"تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟" میں نے اس پہلو سے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ "میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں کہ اگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے تو ادھر ادھر کا کام چھوڑ دوں۔ ویسے بھی مجھے تو تم سے ایک کام ہے اور مجھے صرف اسی کام سے مطلب ہے۔ اگر میرا کام ہو جائے تو مجھے اور کسی بات کی پروا نہیں ہوگی۔"

"اور تمہارا کام کیا ہے؟" وہ مونچھ کو مل دیتے ہوئے مسکرایا۔

"صرف یہ کہ تم مجھے بھی اپنے ساتھیوں میں شامل کرو" میں نے التجائیے سے لہجے میں کہا "مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ تم جانو کے خاص الخاص آدمی ہو۔ اسی لیے اس کے ساتھ ہر وقت تم نظر آتے ہو۔ اگر تم جانو سے سفارش کرو گے تو وہ ضرور مجھے اپنے ساتھیوں میں شامل کر لے گا۔ ظاہر ہے وہ تمہاری بات تو نہیں ٹال سکتا۔"

وہ مسرت پر کچھ اور بھیل کر بیٹھ گیا۔ "بات کرنے کی تو کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں۔ اس قسم کے کاموں میں میں خود بھی فیصلہ کر سکتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم تمہیں کیوں اپنے ساتھیوں میں شامل کر لیں؟ میں کیا ضرورت پڑی ہے؟ ہمارے پاس آدمی بہت ہیں۔ ہمیں نی اچال کسی کی ضرورت نہیں۔ ہمارا معاملہ کوئی فیکٹری کارخانے والا تو نہیں ہے کہ بھرتی چل رہی ہے تو چلو تم بھی مزدوروں میں بھرتی ہو گئے۔"

میں نے اپنے چہرے سے ایوی کا اظہار کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ سوہیلور میرا چہرہ لیتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں بولا "کسی بھی نوکری پر گئے کے لیے کسی نے کسی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ شامل ہونے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ قابلیت چاہیے۔ کسی کوئی واردات کی ہے تم نے؟"

"واردات کی تو نہیں۔ کبھی موقع ہی نہیں ملا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے اندر جذبہ بہت ہے۔ میں پتا نہیں کیا کچھ کر سکتا ہوں یا نہیں۔ اگر مجھے صرف ایک مضبوط کردہ کام سارا مل جائے تو میں چاہی چاروں گاہ میرا نشانہ بے خطا ہے۔ بازوؤں میں طاقت ہے اور دل رحم سے خالی ہے۔ میرے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے جو میرے پیروں کی ذمہ داری نہ لے۔ کیا میں اس مقصد کے لیے بہتر بن امیدوار نہیں ہوں؟ کیا میں ایک اچھا ڈاکو نہیں بن سکتا؟" مجھے لگا کہ مجھے میں کسی اچھی ساکھ کی فرم میں اپنے عہدے کے لیے درخواست لے کر آیا تھا اور اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پت تو تمہاری ٹھیک ہے" وہ اپنا برا سا۔۔۔ مگر عقل سے خالی سر ہاتے ہوئے بولا "مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایک

بڑا مسئلہ مجھ سے اور اعتماد کا ہوتا ہے تمہارے ہاتھ ابھی تک صاف ہیں۔ یہ کوئی اچھی نشانی نہیں۔ جن کے کھاتے میں چارچہ بڑی وارداتیں ہوتی ہیں ان کے لیے واہسی کے دیواڑے بند ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے لیے زیادہ بھروسے کے قابل ہوتے ہیں۔"

اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے پہلے سے ہی وارداتیں ہوتی ہیں ایک اچھی کوالی ٹیکشیں تھی تو میں چارچہ شاندار قسم کی وارداتیں اپنے ریکارڈ میں شامل کر لیتا۔ میری غیر تحریری درخواست برائے ملازمت ذرا زیادہ معتبر ہو جاتی۔

نیمو خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "نئے نئے اور ذرا صاف تھمرے قسم کے لوگوں کے بارے میں خلیہ ہوتا ہے کہ اگر غلطی سے وہ کہیں پہلی سی واردات میں پولیس وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئے تو اپنی جان بچانے کے لیے کہیں کچھ بگڑنے لگیں۔ یادہ کسی کے ایجنٹ نہ ہوں، تجربی کے لیے نہ آئے ہوں۔ حالانکہ پولیس وغیرہ ہمارے لیے کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے لیکن کبھی کبھی کوئی سرگرم قسم کا فسر ملائے میں آ جاتا ہے تو ہمیں ذرا دلچسپ بھال کر اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔"

"کوئی نیا ساتھی گروہ میں شامل کرتے وقت تمہارا بہت خلیہ تو مول لینا ہی پڑتا ہو گا۔ تم لوگوں کے لیے ایسے خطروں کی بھلا کیا اہمیت ہے؟ ایک بار مجھ پر مجبور سا کر کے تو دیکھو میں بہت کام کیا۔ اور بہت فرمایا۔ ذرا آدمی ثابت ہوں گا۔ اس سے پہلے میں نے اکیلے اکیلے کبھی اس لیے واردات کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میں اس لائن میں ذرا صحیح طریقے سے آنا چاہتا تھا۔ میں چھوٹی موٹی چوکیاں کر کے یا دو چار گانے کر کے ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے یا پولیس کے ہتھے چڑھ کر پھنستا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ میرے ارادے ذرا اونچے ہیں۔ میں بڑے اور مضبوط لوگوں کے ساتھ مل کر کچھ بڑے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دل میں بڑے امان کل رہے ہیں" میں نے گویا اتنے اپنے بلند عزائم کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہے؟ کیا کچھ زیادتیاں وغیرہ ہوئی ہیں تمہارے ساتھ؟" اس کا جواب اب ذرا دوستانہ سا ہو چلا تھا۔ "یہ زندگی اپنی جگہ خود ایک زیادتی ہے" میں نے سنجی سے کہا "یہ بھی کوئی جینا ہے کہ ہر جگہ گھومیں کی طرح مشقت کرتے رہو، کیزے کوٹوں کی طرح زندگی گزارتے رہو۔ کسی شمار میں نہ تیار میں۔ آخر کار ایک روز کسی جھوپڑی میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اڑیاں دگڑتے مر جاؤ۔ اس ہونے یا نہ ہونے کا کیا فائدہ؟"

وہ میرے دھیرے دھیرے مونچھ کو مل دیتے ہوئے پُر خیال انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے لیے کو زیادہ سے زیادہ سٹارٹ کر کے باتیں کرتے ہوئے بات جاری رکھی "میرے بہت سے خواب ہیں، اونچی اونچی خواہشیں ہیں۔ میں نے بہت سوچا ہے" بہت سر کھپایا ہے۔ مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے اور اپنی



خواہشیں پوری کرنے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں آج ہی تمہارے ساتھ چلے کو تیار ہوں۔ میں بہت دقت متاع کر رہا ہوں۔ فوج دانی تیزی سے گزرتی جا رہی ہے۔ کئی عمر آگئی تو حوصلہ کچا ہو جائے گا۔ میں ابھی تک کچھ نہیں بنا سکا۔ صرف یہ کلا شکوف اور ہانچا چھ سو روپے میری کل پونجی ہیں۔ کلا شکوف بھی ریسیائی کی ہے۔ میری اپنی نہیں ہے۔ دو گروہوں کا ایک مکان ہے میرے پاس۔ وہ بھی اپنا نہیں ہے۔ وہ ریسیائی کے کوارٹر ہے۔ میں جب اکیلے میں بیٹھ کر اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے۔ کیا فائدہ ہے اس زندگی کا؟ اب تو اس حال میں مجھے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس دوران کھانا ڈھلیا اور ہم دھینوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ میں گھر سے بلکا بھکا کھانا کھا کر چلا تھا لیکن اس وقت تازہ تازہ کچے ہوئے گوشت کی بڑی سی کڑائی اور تندہ سے نکلے ہوئے گرم گرم ٹان سانے آئے تو ان کی خوشبو وغیرہ نے گویا ایک بار پھر بھوک بگڑی اور میں نے غیسو خان کا ساتھ دینے میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ کھانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ غیسو خان کسی نہ کسی فیصلے پر توجیح چکا تھا لیکن مجھ پر اس کا اعتراف نہیں کر رہا تھا۔

ہم نے جو کھانا چٹ کیا وہ عام ہے۔ چھ سات افراد کے لیے کافی ہوتا۔ اس کے بعد ہم نے پانی کے دو جگ خالی کیے پھر دودھ پی کر دور چلا۔ غیسو خان کو گویا سرور سا آیا۔ کچھ اور پھیل کر بیٹھے ہوئے اس نے حسب عادت مونچھ کو گل دیتے ہوئے مجھے گھورا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہو چکی تھی۔ اس نے واسکٹ کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ ایک بیڑی واسکٹ میں دبا کر اس نے بنڈل میری طرف بڑھایا۔

”شکریہ۔ میں سرکٹ بیڑی نہیں چتا“ میں نے معذرت کی۔ ”اچھا کرتے ہو“ اس نے مڑتا نہ انداز میں سرکٹا ”غریب آدمی کو ایسے شوق پالنے بھی نہیں چاہئیں لیکن ہمارے ساتھ رہو گے تو بہت کچھ پینے لگ جاؤ گے۔“

”اگر ساتھ رہنا نصیب ہوا تب کی بات ہے نا“ میں نے حسرت سے کہا۔

”کیوں نہیں رہو گے“ اس نے کثیف دھواں ہوا میں اٹکا ”بس سمجھ لو کہ تم ہمارے گروہ میں شامل ہو گے۔ غیسو خان نے تمہیں اندر دیو میں پاس کر دیا۔“

”لیکن جانو تو یہ بات یقین سے نہیں کسی باسکتی نا“ میں نے شک کے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔

”پلے تم خود ہی کہہ رہے تھے کہ جانو میری بات نہیں ٹال سکتا“ وہ غرا ”اب تمہیں اس میں شک محسوس ہونے لگا ہے کیا؟“

”نہیں۔ نہیں۔ شک کی تو کوئی بات نہیں“ میں نے جلدی سے کہا ”میں تو دیسے ہی تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔“ وہ ذرا توقف سے بولا ”لیکن میں جو تمہاری سفارش کروں گا اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“

”میں ایک معمولی سا۔ چھوٹا سا آدمی ہوں“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”میں اس قابل کہاں ہوں کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکوں لیکن میرا وعدہ ہے کہ زندگی بھر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گا۔ جانو سے۔ اور گروہ سے زیادہ میری وفاداری تمہارے ساتھ ہوگی۔ میں ایک طرح سے تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ جو حکم کرو گے تمہارا قیام کروں گا۔“

”بالکل ٹھیک“ اس کے چہرے پر طمانیت جھلک آئی ”مجھے گروہ میں ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے جس سے میں اپنا خاص آدمی سمجھ سکوں۔ جس طرح تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی میں بھی تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ جی بات یہ ہے کہ اس وقت نہیں گروہ میں دو تین ہی دار اور شیر خرم کے جوانوں کی ضرورت ہے۔ پچھلے دو تین میمنوں میں ہمارے تین آدمی مارے جا چکے ہیں۔ حالانکہ ہمارا گروہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں دو تین آدمیوں کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا جیسے لیکن بات اصل میں یہ ہے کہ کام بھی بہت بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ وقت بھی ہم لوگوں کے لیے بہت اچھا ہے۔“

”اچھا ہے...؟“ میں نے حیرت سے کہا ”میرا تو خیال تھا کہ آج کل ڈاکوؤں پر سختی آئی ہوگی۔“

”تھوڑے سے دنوں کے لیے آئی تھی اب تو صرف بائیس ہی بائیس ہیں۔ ہم بڑے مزے میں ہیں۔ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ شہروں میں ہمارے بھائی بند سرگرم ہیں۔ اوزر جنگل ریسات میں ہمارا راج ہے۔ اور والوں کو آپس میں لڑنے سے فرصت نہیں ہے۔ ہماری طرف کسی کا دھیان نہیں ہے۔ ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہے لیکن شاید کچھ عرصے بعد ہم پر سختی کا دور آئے“ اس لیے ہم جلدی جلدی بہت سا کام کر کے کچھ عرصے کے لیے اس طرح ہونا چاہتے ہیں جیسے ہمارا کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ ہم سب مرکب کھگے ہیں۔ حالات سازگار ہوتے ہی ہم سب اپنی اپنی کچھانوں سے دوبارہ سر نکال لیں گے۔ ویسے میں ممکن ہے ہمارے لیے سختی کا دور نہ آئے۔ ابھی دیکھتے ہی کچھ افواہیں سی سننے میں آ رہی ہیں۔“

پھر اس نے بے پروائی سے سر جھکا ”غیرہمیں ان باتوں کا پروا نہیں ہے۔ زیادہ فکر ہمیں چار زمینداروں کی ہے جو ہمارے ساتھ ٹیڑھے دورے ہیں۔ انہیں ہم نے ہی طاقتور بنایا۔ ہم نے ہی ان کے علاقوں میں ان کی دہشت پھائی۔ توج دیو ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ ان کو زرا سیدھا کرنا ہے۔ ان کی طرف سے یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی بڑی کارروائی شروع

گول ہوتا تھا۔ اس لیے بالکل مشکل نہیں ہوگا۔ آئندہ تم وہاں ہمارے تجربہ کر رہو گے۔“

”ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ دیے۔ آج کل کیا بھی ڈاکو ایسی طرح ڈہری شخصیت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں؟ یعنی بظاہر ان کا دھوپ کچھ اور ہے، وہ کچھ اور کام کرتے ہیں لیکن راتوں کو اکٹھے ہو کر، منظم ہو کر ڈاکے مارتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے گویا میرے سوال سے محظوظ ہوتے ہوئے گھورا سا قہقہہ لگایا پھر میرے کھنے پر ہاتھ مار کر ذرا رازدارانہ لہجے میں بولا ”سب ڈاکو اتنے مشکل مند نہیں ہیں۔ زیادہ تر میں نے سب ڈاکو ایسی ہیں۔ یہ صرف ہم جیسے کچھ ذہین ڈاکو ہیں جنہوں نے یہ طریقہ اپنایا ہے اور بہت ترقی کی ہے۔ ہم لوگ ہر لحاظ سے فائدے میں ہیں۔ ہماری ڈہری ڈہری... بلکہ ہم میں سے بعض کی تو سہری شخصیت ہے ہمارے جائز اور قانونی کاموں میں بھی ہیں۔ ایک حیثیت میں ہم پر برا وقت آجائے تو ہم اپنی دوسری حیثیت کے سامنے میں پناہ لے سکتے ہیں۔ پولیس ہمارے بارے میں کبھی کسی نیٹیل پر نہیں بھیج سکتی کہ ہم کون ہیں، کیا ہیں۔ ہر جگہ ہمارے جاسوس اور تجربہ موجود ہیں۔ ہمارے جیسا سسٹم کسی کا نہیں ہے۔ جانو کے بارے میں یہ بات بہر حال مجھے بھی مانی پڑتی ہے کہ اس نے بڑے شاندار طریقے سے سارا سلسلہ سیٹ کر رکھا ہے۔ ہم کبھی عام ڈاکو کی طرح ہمارے مارے نہیں پھرتے۔“

میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ وہ اپنی مخصوص شناخت، بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”تم شاید سوچ بھی نہیں سکتے کہ کیسے کیسے لوگ ہمارے گردہ میں شامل ہونے یا ہمارے مددگار بننے کی درخواست لے کر آتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو مختلف ٹھکانوں میں... مختلف گھروں میں بیٹھے ہیں جہاں بڑی بڑی رقبوں کے لین دین ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے چھٹی موٹی خدمات انجام دیتے ہیں اور گھر بیٹھے بڑی بڑی رقبے حاصل کرتے ہیں۔ ہم بظاہر بہت معمولی اور دھمکی سے لوگ نظر آتے ہیں لیکن ہمارے پاس بڑی دولت ہے۔ بڑا واسطہ ہے۔ ہمیں ان علاقوں میں کھوٹے پھرتے دیکھ کر کوئی ہماری اصل طاقت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔“

”میں تو بہت حیران اور بے وقعت سا آدمی ہوں“ میں نے گویا اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہوتے ہوئے کہا ”میں تو شاید ریستانی کے بارے میں تمہیں کوئی کام کی بات نہ بتا سکوں۔ وہ ہم جیسوں کو اپنے قریب کماں کرنے دیتی ہیں۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو“ غصے نے مجھے تھلی دی ”تم سے کام لینا ہمارا کام ہے۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ کون سی خبر ہمارے لیے اہم ہوگی اور کون سی بے کار۔ ہم کسی جو کچھ بھی دیکھا کرو جو کچھ

ہوئی تو یہی ذمہ دار جن کی ہم نے بڑی خدمت کی ہے، کہیں ہماری چیز میں بھڑکی نہ گھونپ دیں۔“

دفعاً اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور ذرا سیدھا ہوتے ہوئے بولا ”تمہیں کچھ بات ہاں... حقیقت یہ ہے کہ تمہاری یہ ریستانی بھی ہماری آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ حالانکہ اس نے ہمارے ساتھ بھی کوئی برائی نہیں کی، بہت اچھی طرح پیش آتی ہے لیکن کم از کم مجھے یہ لڑکی بالکل اچھی نہیں لگتی۔ بس ہمارا جانوسی اس کے عشق میں مبتلا ہے۔ برسوں ہو گئے ہیں جانو کہ جنگوں اور صحرائوں کی خاک چھانٹتے ہوئے لیکن بڑھا لگتا ہے۔“ اس لیے بڑھے ٹھکانوں والی فوج ابھی تک نہیں گئی۔ بڑھے ٹھکانوں کی طرح ہی شرافت سے عشق کیے جا رہا ہے لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن تو اس کے ممبر کا پتا نہ بھی چھٹک سکی جائے گا۔“

اس نے پٹائی سے پلاسٹک کی ایک پلیٹ اغاں جس میں کھانے کے ساتھ سلاؤنڈیو آئی تھی۔ پلیٹ اپنے چوڑے پٹے ہاتھ پر رکھتے ہوئے وہ تیز دھڑلے میں بولا ”اگر جانو کی جگہ میں ہو تو اب تک اس عورت کو یوں تو زبردستی چھینک چکا ہوگا۔“ اس نے پلاسٹک کی پلیٹ ہاتھ میں پکڑ کر کمر کے خمار سے ایک طرف پھینک دی۔

اس شخص پر مجھے پہلے ہی بتانا غصہ آ رہا تھا، اب تک کم لوگوں پر آتا تھا لیکن اب تو نہ جانے کیوں میری کپٹیاں منگ اٹھیں۔ یہ مشکل میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور نہ جانے کس طرح سناٹائی انداز میں مسکرا کر کہا۔ اس وقت تو مجھے یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ میرا بہتر تھا، میرا آئیڈل تھا۔

پھر وہ کچھ سوچ کر ذرا طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا ”غیر... اب جانو تمہاری ریستانی پر پہلے جتنا مہیاں نہیں رہا۔ کسی وقت بھی اس کی محبت کی گاڑی کو رو رو کر میرے ٹکٹ ملتا ہے۔ اس نے شاید دیکھ لیا ہے کہ پتھر میں ٹوک نہیں لگ سکتی۔“

اچانک اسے گویا کوئی خیال آیا۔ وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولا ”مگر تمہیں ہم لوگوں میں شامل ہونا ہے تو تمہاری ہمدردیاں ریستانی کے ساتھ ذرا بھی نہیں رہتی چاہئیں۔“

”میں اب اتنا ہی کچھ نہیں ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”مجھے معلوم ہے کہ اگر آدمی کی تھوڑی بہت عزت ہو سکتی ہے تو وہ کسی ایک کام کر رہے ہیں ہی ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ٹھیک“ اس نے دوبارہ جھیل ڈھالے صوفے کے پٹے سے ٹپک لگایا ”یہ تو تمہیں ریستانی کے بارے میں ہر بات معلوم ہوتی رہتی ہے لیکن تم بہر حال اندر کے آدمی ہو، تم سے ہمیں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ تم ریستانی کی نوکری مت چھوڑنا۔ بظاہر تم اسی طرح اس کے غلام ہیں کہ اپنا وقت گزارتے رہنا۔ ہمیں جب تمہاری ضرورت ہو اگر کسی کی ہم تمہیں پیغام بھجوایا کریں گے ایک آدھ رات کے لیے کسی بہانے وہاں سے

بھی نصیب نہیں ہوتا۔

”کسی بھی میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے خطرات قبول لینے ہی پڑتے ہیں“ میں نے ثابت قوی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

”جھک ہے۔ تو پھر تو میرے ساتھ۔“ وہ یکدم ہی ہنسنے لگا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تن رتوش اور کافی آمیزہ کو دیکھتے ہوئے اس کا یوں یک لخت ہی اٹھ کھڑے ہوا ناقابل یقین تھا۔ اس کی پگھلی حیرت انگیز تھی۔ میں نے اس کی تھلکی کی۔

چولی بیڑی میں ایک بار پھر ہمارے بوجھ تلے لڑی اور چڑائی۔ رستوران میں اب روتی بہت کم ہو چکی تھی۔ کاؤنٹر موجود شاطر صورت شخص نے ایک بار پھر خشاہد انداز میں ہاتھیں پھیلائیں۔ غیسو خان نے سوسو کے دو تین کڑکڑاتے ہوئے نوٹ اس کی طرف اچھالے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نہ پر مارنے کے انداز میں اس کی طرف چھپکے اور حساب کتاب پوچھنے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔

باہر آکر غیسو خان نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کو براؤنگری۔ مجھے اس کے تعاقب میں بہت تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑا دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا لیکن اس کا یوں یکایک بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آ جانا میرے لیے حیرت انگیز تھا۔

جلد ہی ہم دریا کے کنارے کی حدود سے نکل آئے۔ بل کھائی پگھنڈی پر دریا نے میں ہمارے گھوڑے دھکیل ڈھاتے پلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد غیسو نے گھوڑے کی رفتار بے حد کم کر دی۔ مجھے اتنا اندازہ بہر حال ہو گیا تھا کہ وہ جانور کے اڑے کی طرف راہیں نہیں جا رہا تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ بالآخر میں نے آواز بلند پوچھ لیا۔ ”تم گروہ میں شامل ہو سکو یا نہ ہو سکو۔ لیکن جہاں ہم جا رہے ہیں اس جگہ کے بارے میں تمہیں کسی کے سامنے بھی زبان نہیں کھولنی ہے۔ میں نے تم پر اعتبار کر لیا ہے۔ اگر تم نے میرے اعتبار کو دھوکا دیا تو پھر تمہیں زمین پر نہیں آسمان پر ہی پناہ لے لی۔ غیسو خان کی یہ بات یاد رکھنا“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے ہوئے کہا۔

”میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں غیسو خان!“ میں نے بالکل اسی طرح بے وقوف نہ ہونے کا دعوایا جس طرح دنیا کے اکثر بے وقوف کرتے ہیں۔

اس نے مطمئن انداز میں ایک بار پھر گھوڑے کی رفتار بڑھادی۔

بھی سنا کر ہمیں بتاتے رہا کہ اس کے ساتھ ساتھ ہم تمہیں وار اور اتوں پر بھی ساتھ لے جا کر تمہاری زندگی شروع کرتے ہیں۔“ ”تو کیا میں سمجھ لوں کہ تم نے مجھے اپنے ساتھیوں میں شامل کر لیا؟“ میں نے گویا امید اور ناامیدی کے درمیان ہر چاروں جانب سے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ روپے میں بارہ آنے تو تم اپنا مسئلہ حل ہی سمجھو باقی چار آنے فیصلہ جانو کہ اتھ میں ہے۔ آخر وہ سردار ہے لیکن تم خود بھی ایک بار پھر غور کر لو“ اس کا لہجہ ناگھانا سا ہو گیا۔ ”مجھے بھی طرح غور کرنے کے بعد ہی تو میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”ہمارے ساتھ شامل ہونے میں فائدے تو بہت ہیں۔ کافی روپیہ بہرہ تمہارے حصے میں آئے گا۔ انھی جنگوں یا باتوں میں تمہیں ہر میاشی بھی میسر ہوگی کیونکہ عیاشی کا تعلق روپے پیسے سے ہے۔ جہاں دولت ہے وہاں عیاشی ہے۔ جنگل میں بھی مشکل ہے۔“ میں نہایت اطمینان سے سب کچھ سنتے ہوئے سر ہل رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اگر کبھی بہت برا وقت آجائے تب بھی تم اپنی جمع پونجی سمیٹ کر کسی شہر کا رخ کر سکتے ہو اور کسی زمیندار یا افسر غریب کی مدد سے اپنی ایک مٹی کو دولت میں تبدیل کر کے کوئی کاروبار شروع کر سکتے ہو یا اپنی دولت کیسے افزائش کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تم اور تمہاری آنے والی ششیں عزت و آبرو سے زندگی گزار سکتی ہیں۔“

پھر وہ جیسے کسی تصور سے محکوم ہوتے ہوئے مسکرایا ”میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو آج شہروں میں بڑے بڑے عہدوں پر ہیں یا بڑے بڑے کاروبار کر رہے ہیں یا پھر سیاست میں سرگرم عمل ہیں لیکن ان کے آقا و اجداد ڈاکو تھے۔ ہماری لاش کے بعض بوڑھے اور قریب الہرگ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو بڑی دلچسپ باتیں اور عجیب کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔“

”جن لوگوں کا تم ذکر کر رہے ہو کہ شہروں میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں بڑے بڑے کاروبار کر رہے ہیں یا سیاست میں سرگرم ہیں شاید اسی لیے ان میں آج بھی ڈاکوؤں والی خصوصیات باقی جاتی ہیں کہ ان کے آقا و اجداد ڈاکو تھے۔ میں انبار پڑھتا ہوں تو کی ان اندازہ ہوتا ہے۔“ میں نے دانشورانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ویسے ان کے آقا و اجداد ان سے لاکھ روپے بہتر تھے۔“ غیسو خان اطمینان سے بولا۔ اس خردیاب کے منہ سے میں نے پہلی بار ایک ایسی بات سنی تھی جس کی بنیاد بہت ہی باریکپوں پر تھی۔

وہ مسکاتی تیزی سے پروائی سے ایک طرف پیچہ کر رہی تیزی سے ملتا ہوا بولا ”ہمارے گروہ میں شامل ہونے کا برا پھلو یہ ہے کہ تمہاری ساری امیدیں دھری کی دھری بھی رہ سکتی ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ تم پہلی ہی وار دات پر ہنگو اور کوئی آوارہ گول تمہاری گھوڑی سے گزر جائے۔ ہمارے بعض ساتھیوں کی لاشوں کو کھن

نہیں گئے تھے اونچے نیچے راستے تو کیا کسی ایک سرکش  
کھنکھارے سرگرم آواز کا جھار تھا۔ کافی لمبا فاصلہ  
سے آتوں جیسے ہلکے پھلکے پھلکے۔

# سکس



محمود احمد سودی

ہم اسے نظر نہ آتے۔ مجھے ایک بار پھر شبہ سا ہوا کہ اس جنگل کی نشوونما میں انسان کی ہر خیریت تک اور منصوبہ بندی شامل تھی۔ میرا خیال نا اچھی ہو سکتا تھا۔ دست قدرت نے بھی اس دنیا میں قدم قدم پر عجیب عجیب چیزیں تخلیق کر رکھی ہیں اور ہر دور میں انسان انہیں نہ جانے کتنے کتنے اچھے اور بُرے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔

درختوں کے درمیان مل کھاتے اس راستے پر ہم نے تھوڑا فاصلہ مزید طے کیا تو اچانک ہی اپنے آپ کو کھلی جگہ میں کھڑے پایا۔ اسی دوران درختوں کے عقب سے دو افراد اچانک ہی نکل کر ہمارے سامنے آکر کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں دو سارے راٹھلیں تھیں جن پر دو درختیں بھی فٹ تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں کسی نہ کسی جگہ سے بہت دور سے ہی ہم کو آتے دیکھ چکے تھے۔

وہ دونوں یحیم یحیم اور چرے سے ہی بد فطرت سے نظر آنے والے افراد تھے۔ ایک کے چہرے پر غیسر خان ہی کی طرح جھاڑ جھکاڑ داؤھی تھی اور موٹھیں کچھ اس طرح اس میں گڑاؤ تھیں کہ وہیں نظری نہیں آتا تھا۔ تاہم اس مقام پر بالکی ہی لپٹل ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ مسکرا رہا تھا۔

دوسرے کے کھڑوے چہرے پر صرف موٹی موٹی موٹھیں تھیں۔ وہ بیٹنے مسکراتے کا قطعاً عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے پر ٹنگیں اور آنکھوں میں برہمی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا سے ناراض ہو۔ تاہم ان دونوں میں سے کسی کی بھی راکھل کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔

ان دونوں نے ہماری نظروں سے صرف میرا جائزہ لیا لیکن کچھ بولے نہیں۔ غیسر خان نے نہایت خفیف سے اشارے سے گویا بتایا کہ میں اس کے ساتھ تھا اور انہوں نے بھی نہایت خفیف سے اشارے سے ہی ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میرے لیے یہ اعزازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کوئی انہیں اس جنگل میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

سامنے کسی پرانی اور نہایت طویل و عریض حویلی کا کھنڈر نظر آ رہا تھا۔ کھنڈر بھی کیا تھا، حصّہ چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور ستون

میں غیسر خان کے پیچھے کھڑا دوڑتا جا رہا تھا۔ مل کھائی گڈبڑکی بھی پٹا خر ختم ہو گئی اور ہم ناموار کٹے علاقے میں سڑک بنے لگے۔ زرنج کی زمینیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ ہم قدرے ٹھیک سے علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

پھر مجھے سامنے بہت بڑے طول و عرض میں درخت پھیلے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دست قدرت نے خاص طور پر ایک محدودے حصے میں بڑا بڑا ترتیب سا جنگل اُگا دیا تھا۔ حالانکہ جنگل میں ترتیب کا کیا کام؟ اور اگر وہ نیم ریتلا اور ناہوار میدان ہی تھا۔

اسی بڑا ترتیب سے جنگل کو دیکھ کر کچھ شبہ سا گزرتا تھا کہ شاید اس کی خیم بری اور پرورش پر دانت انسانی ہاتھوں ہی سے ہوئی تھی اور کسی خاص مقصد کے تحت برسوں کی منصوبہ بندی سے یہ جنگل اُگایا گیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس سوہوم سے خیال کو بد روایا۔ کسی کو اس دیرانے میں یہ ذمت اٹھانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا آتا اور زمین سے مٹی اُڑاتا ہوا لے جاتا۔ اسی وجہ سے یہاں کسی کا نقش پاہ جانے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مجھے دھندلے دھندلے کچھ ایسے نشانات نظر آ رہے تھے جیسے کاریں یا ایسی ہی کچھ دوسری سواریاں اور حیرت گزرتی رہی ہوں۔ سواریاں یا تو اس مختصر جنگل کی طرف جتی تھیں یا دوسرے آگے تھیں اور مختلف سمتوں میں گئی تھیں۔ سورج اب زوال پذیر تھا۔ اور اسی کی مدد سے میں نے اب تک کے سفر میں سب کچھ متعین کرنے اور اسے ذہن میں رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر کبھی اپنے طور پر بھی ادھر آنے کی کوشش کر سکوں۔

اس مختصر سے جنگل کے قریب پہنچ کر ہم اس کے گرد چکر کاٹنے ہوئے دوسری طرف آگئے۔ یہاں ایک مقام پر جنگل میں داخل ہونے کے لیے مل کھاتا ایک راستہ موجود تھا۔ لیکن اگر دور سے دیکھا جاتا تو یہ راستہ الگ سے دکھائی دیتا حالانکہ اچھا خاصا کشادہ راستہ تھا۔

اس راستے پر ذرا دور چلنے کے بعد ہی گویا ہم بھی جنگل میں غرق ہو گئے۔ اب کوئی جنگل سے کچھ دور کھڑا نہ ہو کر دیکھتا تو شاید

جیسے زمین میں کوئی گڑھا بن گیا ہو۔

نمیسو خان نے نہایت مطمئن انداز میں جب سے ایک ستر چالی نکالی جس پر ایک نیر کندہ تھا۔ اس چالی سے اس نے دروازہ کا ٹکڑا نکالا۔ دروازہ کھلتے ہی مجھے سامنے ایک چوڑا چلا چٹا ٹکڑا چوہ نظر آیا جس کی رنگت چمے ہوئے تانبے جیسی تھی۔ وہ مجھے ہوئے جسم کا ایک پست ڈنکر گوریلے کی طرح مضبوط نظر آئے۔ نمیسو خان۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں جیسے چمک تھی۔

اس نے ایک ہاتھ میں کلا شگوف کھلنے کی طرح اٹھائی ہوئی تھی۔ نمیسو خان کو دیکھ کر اس نے منہ بے پردائی سے جھکا دیا۔ اس کا سر اس کی ہنسات کے متنازعے میں بہت چھوٹا تھا۔ سر بیان کھلا اور اس کے سینے پر گوریلے کی طرح بال نظر آ رہے تھے۔

اس کے ہاتھ میں کلا شگوف نہ ہوتی تب بھی ایک عام گھڑی سے دیکھ کر خوف زدہ ہو سکتا تھا۔ وہ اکلیں شیو تھا اور اس کا سوجھ بوجھ سا معلوم ہوا تھا۔ بال بہت چھوٹے، چھوڑے آدلوں کی طرح کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہوشو خان یاد آیا۔ ہوشو خان جیسا کہ اذیل نہیں تھا لیکن اس کی شخصیت میں ہوش کی جھلک تھی۔ بلکہ اس کی آنکھیں ہوشو خان کی نسبت ذہن خیز تھیں۔

نمیسو خان کو دیکھ کر اس کے چہرے سے چہرے سے مسکراہٹ کی صرف ایک رت اُبھری۔ نمیسو نے اس سے آواز بھی نہیں کہا۔ بس شگاف سے انداز میں اس کا کندھا چھو کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا چوکر کمر تھا جہاں وہ گوریلے نمیسو خان تھا۔

اس کے عقب میں زمین سے چھت تک ایک دیوار تھی۔ اس میں ایک چوکر شگاف موجود تھا۔ اس شگاف کی وجہ سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ دیوار بہت موٹی تھی۔ شگاف اتنا بڑا تھا کہ آدھرت میں صرف ایک نمیسو خان آسانی سے گزر سکتا تھا۔

نمیسو خان کی دھڑائی میں اس شگاف سے گزرتے ہی یکدم گویا کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ ہم ایک طویل و عریض میں کھڑے تھے جس کا فرش ماربل کی ٹائیلوں کا تھا اور اس چاروں طرف اوپر نیچے دو منزلوں پر کمروں کی قطاریں نظر آ رہیں۔ ان منزلوں کی اوچائی بیڑاٹس فلور کی طرح کم تھی۔ بہر حال وہ دو منزلیں تھیں اور یوں کمروں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ بالائی منزل کے سامنے ٹکڑے بالکونی بھی چاروں طرف موجود تھی۔

چھت اور فرش کے درمیان کئی موٹے موٹے ستون بھی آ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ اس تباہ شدہ قدیم عمارت کا خزانہ جو اصل عمارت کے کم از کم آٹھویں حصے جتنا لہجہ چڑھا تھا۔ عمارت کی چلی منزل تھی جو عمارت کی طور پر یا وقت کے ساتھ

تھے یا پھر ان کے درمیان لمبے کے بہت سے دھیر جو بارشوں اور موسم کے دوسرے تغیر و تبدل کے باعث چھوٹے بڑے نیلوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

جنگل گویا اس طویل و عریض کھنڈر کے گرد فصیل کا کام دے رہا تھا۔ جنگل نے نہایت خوبصورتی سے اس کھنڈر کو اپنے درمیان چھپایا ہوا تھا۔ اس کھنڈر کے گرد بہت سی چمک و خروش سے خالی بھی تھی اور اس جگہ میں چھ سات فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں دو پیچیدہ سرسبز پر اور لاکار جیسی گاڑیاں شامل تھیں۔ صرف ایک گاڑی ذرا کم قیمت تھی۔

ان پر دھول جی ہوئی تھی لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ دیکھی علاقوں میں زمینداروں وغیرہ کی گاڑیوں پر عموماً اسی طرح دھول جی رہتی ہے۔ کسی گاڑی میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ درختوں کی اس لمبی چوڑی فصیل میں کمرے ہوئے اس کھنڈر کے پاس کھڑی وہ گاڑیاں عجیب لگ رہی تھیں۔ میں نے بنیادی طور پر سادہ مزاج رکھنے والے دیہاتی کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر حیرت ظاہر کرنے کی آوازیں جاری رکھی۔ لیکن وہ حقیقت یہ خالص آوازیں بھی نہیں تھیں۔ مجھے کچھ بھی کچھ حیرت تھی۔

نمیسو خان نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کو بے پردائی سے دیں کھڑا چھوڑ کر کھنڈر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بھی گھوڑے کو کہیں بانڈے بغیر وہیں چھوڑا اور اس کے پیچھے لپکا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے اعصاب میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

کھنڈر کے قریب پہنچ کر دیواروں کی ساخت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی پرانی عمارت تھی اور کسی شاہی محل سے کم نہیں تھی۔ اس کا تعلق کسی ایسے دور سے تھا جب عموماً عمارتوں، قلعوں اور عمارتوں میں دیواروں پر رنگین تصویریں بنوانے کا بھی رواج تھا۔ اعتبار زمانہ کے باوجود ان تصویروں کے رنگوں میں ابھی تک چمک پائی تھی لیکن دیواروں پر ہی طرح شکست و ریخت کا شکار تھیں اور پلستر بھی جگہ جگہ سے جڑ چکا تھا۔ اس لیے تصویروں کا بھی کوئی کوئی حصہ ہی باقی تھا جس سے سرسری نظر میں کوئی اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ کم از کم میرے لیے تو ناممکن ہی تھا۔

لمبے کے کئی اونچے نیچے ڈھیروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسی شکستہ دیوار کے قریب پہنچے جس کے عقب میں پتھر کی بیڑیاں نیچے جاری تھیں۔ بیڑیاں اتنے کم ایک راہداری میں پہنچے جس کے اختتام پر ایک لہجہ چڑا دروازہ نظر آ رہا تھا لیکن یہ دروازہ اس تباہ شدہ عمارت کا حصہ نہیں تھا۔

وہ جدید ساخت کا ایک مضبوط فلش ڈور تھا جس میں جدید ساخت کا ہی ایک فلش لاک اور تاب وغیرہ بھی موجود تھی۔ اوپر لمبے پر کھڑے ہونے والے کی نظر اس دروازے تک نہ گیا۔ بیڑیوں تک بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اوپر سے کچھ ایسا ہی لگتا تھا

بہادر اور معلوم ہوتی تھیں۔ کم از کم ان کے ملنے دیکھ کر تو یہی گمان  
گزر آتا تھا لیکن ان کے چہروں پر دھانوں والی جوانی اور صحت  
مندی کی چمک موجود تھی۔ گو کہ یہ چمک رخت منہ باندھ رہی  
تھی۔ اور زیادہ عرصے کی سہان معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن  
بہر حال اس کی سوجھ بوجھ اور خوشگوار تھی۔ ان کے لباس خاصے اچھے  
اور فیشن اہل تھے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ عورتیں انہی  
مردوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں یا ان کا تعلق اسی جگہ سے تھا۔

وہ سب تین تین چار چار کی ٹولیوں میں مختلف میزوں پر ناش  
کھیل رہے تھے۔ ان کے سامنے پلاسٹک کے ٹوکٹوں کی پھولی پھرنی  
ڈبھریاں تھیں۔ کھانے پینے کا شعل جاری تھا۔ ساتھ ساتھ چنے  
بھی گردش میں تھے اور پلاسٹک کے ٹوکٹوں یا پیس اوھر سے اُدھر ہو  
رہے تھے۔

ہوا میں سگریٹوں کا دھواں اور دھسکی وغیرہ کی بو پکرا رہی  
تھی۔ باتوں کی خفیف سی سبھانٹ کے درمیان بھی کوئی غمور اور  
شرم نامہ تقبیہ کی سی لگتی تھی۔ بالکل بے اثر میز ابھی خالی تھیں۔ گلشن کا  
کاؤنٹر شاپ پر نہیں تھا شاید ابھی اس کا وقت نہیں تھا۔

میزوں پر موجود افراد نے کھل اک نگاہ انداز سے ہماری  
طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے اپنے شعل میں منہمک ہو گئے۔ میں  
غیر خان کی رہنمائی میں میزوں کے درمیان سے گزرتا آگے  
برہا۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر حقیقت میں تھوڑی بہت حیرت کا  
احساس ضرور ہوا تھا اور اس وقت میرے لیے چہرے سے بھی  
تھوڑی بہت حیرت کا اظہار کرنا ہی بہتر تھا۔

میں ارد گرد دیکھتے ہوئے تھوڑا سا ہوش نظر آنے کی کوشش  
کر رہا تھا اور غیسہ خان کی انھیں سے میری طرف دیکھتے ہوئے یقیناً  
دل ہی دل میں میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جن کمر  
کے دروازے بند نظر آ رہے تھے ان کے صمرف کا اندازہ کرنا بھی  
مشکل نہیں تھا۔ یہاں یقیناً ہر قسم کی عیاشیوں کا بندوبست تھا۔

اسی اثنا میں ایک لمبا ترنگ شخص کدھے پر دو مال ڈالے اور  
اور گلاسوں سے بھی ایک ٹرے اٹھائے سامنے سے آتا دکھائی دیا۔  
اس کے انداز سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ وہاں وغیرہ کے فرائض انجام  
دے رہا تھا۔ غیسہ پر نظر پڑے ہی وہ یکدم متوجہ سا ہو کر اس کے  
لیے راستہ چھوڑ کر ایک میز سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تاہم وہ کچھ بولا  
نہیں۔ حتیٰ کہ اس نے سلام دعا وغیرہ بھی نہیں کی۔ معلوم ہوتا تھا  
کہ وہ لوگ غیر ضروری گفتگو کے قائل نہیں تھے۔ مجموعی طور پر  
وہاں بڑا سکون تھا اور ہال میں موجود لوگ اس ٹھکانے پر یقیناً اپنے  
آپ کو بے حد محفوظ محسوس کر رہے ہوں گے۔ وہ آتش اور سے  
فوشی کے شعل کے علاوہ اپنی ساتھی لڑکیوں سے گاہے گاہے اس حد  
تک دراز دستی بھی کیے جا رہے تھے جو عام بنگلوں پر عام حالات میں  
قانونی دست اندازی پائیس بھی ہو سکتی تھی۔  
لیکن اس کے برعکس کے طور پر غمور سے تعجبوں کے سوا کچھ

میں محسوس کر محفوظ ہو گئی تھی جبکہ اوپر کی منزل رفتہ رفتہ منہم  
ہو گئی تھی۔ بعد میں اس ذریعہ منزل کی سرعت اور تزئین کے بعد  
اسے ایک نئی شکل دے دی گئی تھی۔ اب یہ محل وقوع اور ساخت  
کے لحاظ سے گویا ایک چھوٹا سا محفوظ قلعہ تھا جو اول تو اس دروازے  
میں ذریعہ زمین اور دوم بنگلوں میں پمپا ہونے کی وجہ سے لوگوں کی  
نظروں سے محفوظ تھا۔

اس کے باوجود اس کی حفاظت کے انتظامات بھی موجود تھے  
جن کا اندازہ مجھے یہاں آتے وقت ہو گیا تھا۔ بالخصوص محال کسی کی  
رسائی میز میوں تک بھی ہو جاتی تھی۔ ابھی اس ٹھکانے کو تیار کرنا  
آسان کام نہیں تھا۔ اگرچہ لوگ یہاں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاتے تو  
انہیں نکالنا انہیں ہلاک کیے بغیر اس ٹھکانے پر کنٹرول حاصل کرنا  
تقریباً ناممکن تھا۔

جس کسی نے بھی اس جگہ کو کار آمد بنانے کی منصوبہ بندی کی  
تھی اس کی ذہانت کو داد دینی چاہیے تھی۔ افسوس کی بات صرف یہ  
تھی کہ وہ ذہانت یقیناً اچھے ستادم میں استعمال نہیں ہو رہی تھی۔

یہاں بجلی بھی موجود تھی۔ چاہے کھسے روشن تھے۔ اس کا  
انتظام تو شاید جزیرہ کے ذریعے کر لیا گیا ہو لیکن ہوا کی آمد رفت کا  
نہ جانے کیا انتظام تھا کہ یہاں گھنٹیں اور جس محسوس نہیں ہو رہا  
تھا۔ بلکہ باہر سے یکدم یہاں آنے پر تو نہایت خوشگوار قسم کی خشکی  
محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی اندیزہ رنگ سسٹم بکے درجے پر کام  
کر رہا ہو۔ ذریعہ زمین بگنیس دیے بھی نہایت عمدہ ہی ہوتی ہیں۔

لیکن ان سب چیزوں میں سے کوئی بھی میرے لیے اس قدر  
حیران کن نہیں تھی جتنا یہاں کا ماحول باعث حیرت تھا۔ ان  
لاٹاشی سے ویرانوں میں گھنٹیں چند میز میاں اتر کر اچانک ہی  
دوسری دنیا میں پہنچ جاتے۔ والا شخص پہلے تو یہی محسوس کرتا ہے کہ  
اس کی آنکھیں اسے دھوکا دے رہی ہیں۔ لیکن خواب دکھا رہی  
ہیں۔

انگریزی ویسٹرن فلموں میں پرانی طرز کے ٹائٹ بکلوں، سیلونوں  
وغیرہ کے ماحول کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں ان میں تھوڑی حد سے  
کچھ رنگ آمیزی کی جاتی تو یہاں کے ماحول کا نقشہ کھینچنا جاسکتا تھا۔  
قریب صرف یہ تھا کہ یہاں کے ماحول میں ذرا کسی بچ شامل تھا۔  
پہلی نظر میں یہ گمان بھی گزر سکتا تھا کہ شاید وہ کسی بڑے بحث کی فلم  
کا سیٹ لگا ہوا تھا اور شوٹنگ جاری تھی۔

ہال میں تقارور تقارور چھوٹی چھوٹی غریب صورت میز کرسیاں لگی  
ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر خالی تھیں لیکن کچھ پر لوگ موجود  
تھے۔ میرے لیے بہت دور حیرت کا سامان یہ تھا کہ ان افراد میں چار  
لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

مرد بھی بچی گروں کے تھے۔ ان کے چہروں اور لباسوں سے  
آسودہ حالی کی محسوس ہنک عیاں تھی۔ اپنے ٹیبلوں اور دھکے رکھنا  
سے وہ زمیندار معلوم ہوتے تھے۔ لڑکیاں البتہ شہری علاقوں کی

اعتبار ساجد کی ہنسی مسکراتی  
ہوئی شگفتہ تحریروں کا نیا انتخاب

قلم گاریاں

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

مثالی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی ہلچلی شہر شہر نہیں تھا۔ نہایت  
مذہبانہ ماحول تھا۔ بظاہر غور نظر آنے والے شخص کے قریب سے  
گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس کی داسک کی جیب سے کسی  
مکمل کا دست بھاگ رہا تھا۔

میزوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک ستون کے قریب سے نمبر  
وائیں طرف ٹوکریا۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا کاؤنٹر تھا۔ اس کے  
عقب میں مجھے جو بار نظر آیا تھا "آٹا بڑا بار میں نے اس سے پہلے  
کبھی حقیقی زندگی میں یا فلموں میں نہیں دیکھا تھا۔ چھت تک پہنچنے  
والے لمبے چوڑے شیٹ "رنگ رنگ اور ایک سے ایک منگلی  
ولا جی شرابوں کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے اتنی زیادہ بوتلوں  
کی موجودگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ یہاں طلبہ کاؤنٹر کو جام  
کے حساب سے نہیں بھرتے تھے بلکہ حساب سے چلائی جاتی تھی۔

کاؤنٹر کے عقب میں ایک دروازہ اور دوسرے نوجوان موجود  
تھا۔ وہ ہمیں مجھ سے چھوٹا معلوم ہوتا تھا صاف ستھری شلوار  
قیس اور داسک میں تھا اگر وہ چند کتابیں یا فائل لیے یہاں کے  
بیانے کسی سڑک پر گزرا ہوتا تو کائنات یونیورسٹی کا طالب علم معلوم  
ہوتا۔ وہ یہاں کا پہلا شخص تھا جس کی طرف دیکھ کر نمبر خان  
باقاعدہ مسکرایا۔ اس نوجوان سے نمبر نے مصافحہ بھی کیا۔

نمبر کا اشارہ پاکر میں بھی اس کے ساتھ .... کاؤنٹر کے  
عقب میں چلا گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کالی کٹارہ جگہ موجود تھی وہاں  
چند کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ نمبر نے اپنی گن ایک کرسی کے  
سارے کھڑکی کی اور اسی کرسی پر اپنے مخصوص انداز میں پھیل کر  
بیٹھنے ہوئے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں دوسری کرسی پر بیٹھ چکا تو نمبر تیزی سے لگا لگا۔ میں نے  
غیر محسوس طور پر کاؤنٹر کے پیچھے موجود بڑے بڑے شیٹس کا جائزہ  
لیا۔ کئی شیٹوں میں تو چھوٹے بڑے کارٹن ٹھسے ہوئے تھے جن  
کے بارے میں مجھے اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کس چیز کے تھے لیکن  
ایک چیز مجھے عام طور پر چمپا کر رکھا جاتا ہے وہ ایک شیٹ میں بے  
پردائی سے نکلی ہوئی تھی۔ وہ چیز نقدی تھی!

وہ یقیناً تین لاکھ روپے کی رقم تھی جو تھیں اور پرانے نوٹوں کی  
گڈبول کی صورت میں بے ترتیبی سے شیٹ میں پڑی تھی۔ نمبر  
نے بھی ایک نظر رقم کی طرف دیکھا اور طہائیت سے مسکرایا۔  
اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر مجھے یاد تھی۔

ٹانک پٹانک رک رک کر وہ مذہبانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے  
نوجوان سے مخاطب ہوا "کیسا بڑا بڑا ہے وہ؟"

"خیر کلاس۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"اور حالات کیسے ہیں؟"

"حالات بھی بالکل ٹھیک ہیں۔"

"کوئی پریشانی تو نہیں؟" نمبر نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے

پوچھا۔

"تم جیسے مالکوں اور سرپرستوں کے ہوتے ہوئے ہمیں کب  
پریشانی ہو سکتی ہے؟" نوجوان مسکرایا۔

یہاں میں ایک بار پھر وضاحت کرتا چلوں کہ ان علاقوں میں  
ہم سب کے درمیان منگھڑ ستائی زبان میں ہی ہوتی تھی۔ میرے  
بارے میں یہ تو ظاہر ہو ہی چکا تھا کہ میں غیر مقامی تھا لیکن اس سے  
کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں بھی مقامی زبان ہی بولنے کی  
کوشش کرتا تھا اور ہر دن گزرنے کے ساتھ نہایت تیزی سے اس  
پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تمام مکالمے آپ  
اردو میں کرنا جن میں بات کا اصل معلوم سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔  
ستقد تو محض معلوم ہی آپ تک پہنچاتا ہے۔ زبان سے کوئی فرق  
نہیں پڑتا۔ زبان تو محض رابطے کا ایک ذریعہ ہے۔ بہر حال اتنا  
ضرور ہے کہ کم از کم پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں میں سے  
جتنی بھی زیادہ سے زیادہ نہ نہیں آپ کو آتی ہوں "اتنی ہی اچھا ہے۔  
ہر علاقے کے لوگوں سے کھلے گٹے میں آسانی رہتی ہے۔ آپ جہاں  
بھی جاتے ہیں جلد ہی اپنا تہیت بھرا ماحول تخلیق کرنے میں کامیاب  
ہو جاتے ہیں۔

وہاں ملازم ٹائپ دو تین افراد اور بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک  
طرف ایک کھلا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے عقب سے مجھے ہوئے  
گوشت اور کھانے پیچے کی دوسری چیزوں کی خوشبو بھی آ رہی  
تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہاں کا جو ایک مخصوص  
ساجس اور چش ہوتی ہے اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس بند  
جگہ میں ہوا کی آمد و رفت کا یقیناً کوئی معطل ذریعہ موجود تھا۔



نہیں خان نے گویا نوجوان کے جذبات سے مطمئن ہو کر میری  
کا ایک کمرہ لیا اور ایک کمرے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "دو ذریعہ  
خان نے مال بکھوایا تھا؟"

"جی ہاں۔ اس نے دوسرے کے مطابق ڈیویری دی ہے۔  
ملا کہ سنا ہے سرحد کے قریب سے اس کے ٹرک روانہ ہوئے تو  
بادرو کے راستے میں ہی پکڑے گئے تھے لیکن اس نے جس سے جو  
دعویٰ کیا تھا وہ پورا کر دیا۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"ان کاموں میں اس طرح تو ہوتا رہتا ہے۔" فیصلہ ہے  
پردائی سے مسکرایا۔ "ٹرک دو رک تو پکڑے ہی جاتے ہیں مگر وزیر  
خان جیسے اچھے کاروباری لوگ اپنے وعدے پورے کرنے کا کوئی نہ  
کوئی طریقہ نکال لیتے ہیں۔ ویسے بھی وزیر خان نے دوسرے کے  
کاروبار میں ہمت سکایا ہے۔ ایک دوسرے جالے سے اسے کیا فرق  
پڑتا ہے۔ ویسے تو وہ ہمت سمجھدار اور بڑی چچی والا ہے۔ مجھے  
امید ہے جو ٹرک پکڑے گئے ہیں وہ بھی نکھلا لے گا۔"

"اب تو ذرا مشکل ہی ہے۔ اخباروں میں خبریں دیکھو وہی  
ہیں۔" نوجوان نے غصہ سے لیے میں کہا۔

فیصلہ خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کے بازو پر ہاتھ مارے  
ہوئے بولا۔ "ظاہر شاہ! تم اب بھی کبھی پڑھے لکھوں والی۔  
میرا مطلب ہے بے وقوفوں والی باتیں کر جاتے ہو۔ اخباروں میں تو  
چشمیں کیا کیا خبریں آتی رہتی ہیں۔ اس سے کیا وہ کام رک جاتے  
ہیں جو دنیا میں ہو رہے ہیں؟ اسے بابا۔۔۔ اخباروں کا کام شور مچانا  
ہے۔ وہ جانتے رہتے ہیں۔ یعنی اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ دوسروں  
کو جو کتا ہے وہ کرتے رہتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کام میں گئے  
ہوئے ہیں۔ کسی کی وجہ سے کسی کے کام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔  
اگر پڑتا ہے تو وہ خود ہی اس کو ٹھیک کر لیتا ہے۔ آج کل سب نے  
اپنے راستے کی راکٹ دور کرنا سیکھ لیا ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی  
ہر راکٹ ہٹنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ ہر قانون ٹوٹنے کے لیے ہی  
بننا ہے توڑنے والے ہاتھ مضبوط ہونے چاہئیں۔ ہماری یا وزیر  
خان جیسے آدمیوں کی جڑیں جہاں جا کر ملتی ہیں وہاں اخباروں کی  
حیثیت تڑکی کے پتھروں سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ماسٹر! ظاہر شاہ ہاں اس  
نوجوان نے کچھ خیال انداز میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ تباہ دوس بیٹیاں نکلی ہیں نا؟"  
فیصلہ نے بے پروائی سے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! تو پورا ہے۔ میں نے چیک کر لیا تھا۔ اس مرتبہ  
کا شکوف کا جو نازل آیا ہے وہ پہلے والی سے بہتر ہے۔" ظاہر شاہ  
بولا۔

"ہر جہت پرانی سے بہتر ہوتی ہے۔ سوائے شراب کے۔"  
فیصلہ نے ایک بار پھر مونچھ کو مل دیا۔  
"لیکن اسے ہاں تو اگر کوئی چیز پا کر ہو جائے تو اس کا معیار گر

جاتا ہے۔ صرف نام کے سارے لوگوں کو لوٹنے کی کوشش شروع  
ہو جاتی ہے۔ یا پھر اس چیز کی چار چھ نقلیں سامنے آ جاتی ہیں۔"  
ظاہر شاہ بولا۔

"ہاں لیکن یہ بد بخت غیر مسلم ایسا نہیں کرتے۔ ان کی کوئی چیز  
دنیا میں مقبول ہو جائے تو یہ اسے کچھ اور بہتر بنا کر ایک میں لانے  
کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نقل بنانے کا دل تو سلسلہ ہی  
میں ہے اور اگر کوئی نقل بنا کر پکڑا جائے تو رشوت دے کر چھوٹ  
نہیں سکتا اور نہ ہی لوگوں کے امانت دہیچے یا نہہ کر اپنا کاروبار جاری  
رکھ سکتا ہے۔ یہ بڑی خرابی ہے ان بے ایمانوں میں۔" فیصلہ خان  
مسکرایا۔

ظاہر شاہ بھی مسکرایا۔ اس دوران وہ ہمارے لیے ٹھنڈی  
بیر کے دو گلاس بھر چکا تھا۔ اسے مزید ٹھنڈی کرنے کے لیے اس  
نے اس میں برف بھی ڈالی تھی۔ اس دیر سے میں نے ضرورت کی ہر چیز  
ی موجود تھی۔

فیصلہ نے تو اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگا لیا  
لیکن ظاہر شاہ نے دوسرا گلاس میری طرف بڑھایا تو میں نے ہونٹ  
نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے تھی میں سر ہلا کر کہا۔  
"میں تو ساہو بانی ہوں گا۔"

فیصلہ اپنا چلی تھا ہاتھ میرے گھٹنے پر راتے ہوئے بولا۔ "اے  
اٹو! یہ ساہو بانی ہی ہے ایسے ہی ذرا شوبانے کے لیے ٹیکسری  
والوں نے اس میں تھوڑا سا رنگ ڈال دیا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے پتا ہے یہ بہتر ہے۔" میں نے اپنے آپ کو عقیدہ  
ظاہر کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی امرار کیا۔ "میں تو ساہو بانی  
ہی ہوں گا۔"

ظاہر شاہ نے سواہر نظروں سے فیصلہ کی طرف دیکھا۔ فیصلہ  
کندھے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "دے دو یا را اس بد نصیب کو ساہو بانی  
ہی دے دو۔ یہ ہمارا نیا رجحوت ہے۔ دیے اس نے اثرو پاس  
کر لیا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر ظاہر شاہ سے دوسرا گلاس بھی  
لے لیا۔

ظاہر شاہ نے ایک برے سے کور سے پانی کا گلاس بھر کر مجھے  
دیا۔ پانی خوب ٹھنڈا تھا۔ وہ جگہ کو باجنگل میں منگل کی تصویر تھی۔  
دولت میں واقعی بڑی طاقت ہے۔ دولت اپنی آسائشیں اپنے ساتھ  
کہیں بھی لے جاسکتی ہے۔

ایک گلاس خالی کر کے فیصلہ خان نے ظاہر شاہ کی طرف بڑھایا  
اور سوچ میں ڈوبے لمحے میں بولا۔ "یہ ڈیویری بڑے صحیح وقت پر آئی  
ہے۔ اسے کی ضرورت بدعت جاری ہے۔ اگلی مرتبہ وزیر خان  
کو پیغام بھجوانا ہے کہ کچھ راکٹ انداز میں کاغذ دست کرے۔"  
"کیا تم کوئی کسی سے جنگ لڑنے کی تیاری کر رہے ہو؟" میں  
نے مصمویت سے پوچھا۔

فیصلہ خان نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا جس میں

نظر آ رہی تھیں۔ اس کمرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ  
سپاہی اور قاربازی کے کسی ذریعہ زمین اڑے کا حصہ تھا۔ یہ بڑا سا  
کمرہ کسی تاجر کا گودام معلوم ہوتا تھا۔

پیشیاں چھت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر شاید  
شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان پر صرف شیشے کے  
سامان کا علامتی نشان یعنی جام نظر آ رہا تھا اور احتیاط سے پنڈل  
بکھینچنے کے الفاظ چمپے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا تھا۔  
ٹکڑی کی کئی پیشیاں تو غیر معمولی طور پر بڑی تھیں اور ٹین کی پیشوں  
کی بدو سے بڑی مضبوطی سے بند تھیں۔ اسی کمرے میں ایک طرف  
مجھے اوپر بچے چار جڑ بزرگئے نظر آئے۔ لیکن وہ جگہ نہیں رہے  
تھے شاید وہ فاضل تھے۔

ان کے قریب ہی کھردری ٹکڑی کی دس پیشیاں رکھی تھیں۔ وہ  
بظاہر چٹلوں کی پیشیوں سے مشابہ تھیں لیکن ان سے کچھ بڑی اور  
بستر کو الٹی کی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان  
میں سے ایک کا اوپر کا تخت کھولا جا چکا تھا اور وہ اس کے اوپر ہی  
رکھا تھا۔ اس طرف سے کانڈ کی لڑن بھی جھانک رہی تھی۔ ان  
پیشیوں پر نہ تو کوئی نشان تھا اور نہ ہی کچھ لکھا ہوا تھا تاہم وہ بالکل  
عام اور بے ضروری دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسی پیشیاں بہت سی

بھڑبھڑے کی سی غراہٹ نمایاں تھی پھر وہ آئینیں سکڑتے ہوئے  
میری طرف دیکھ کر بولا "ہم تو ہر وقت ہی حالت جنگ میں ہوتے  
ہیں میرے چاندیا پولیس کے سر پھرے افسروں سے۔۔۔ رنجرز  
سے۔۔۔ شریف شہریوں اور رہائشیوں سے۔۔۔ موٹی اسامیوں سے۔۔۔  
بھیس بدل کر آنے والے دشمنوں سے۔۔۔ اور نہ جانے کس کس سے  
ہر وقت ہی ہماری جنگ جاری رہتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سہلا کر گویا اس کی  
دافنٹرا نہ بات کی دلاوری۔

چند لمحوں میں اس نے نیز کا در سرائگلاس بھی غالی کر دیا اور  
یکدم اٹھتے ہوئے ظاہر شاہ سے مخاطب ہوا "آؤ۔۔۔ راجا مال تو  
دکھاؤ۔"

ظاہر شاہ نے ایک اور شخص کو بلا کر کاؤنٹر پر کھڑے ہونے کا  
اشارہ کیا۔ فیسو خان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہم بھی آؤ۔"

ہم گھوم کر کاؤنٹر کے آئیں طرف واپس دیاوار کے عقب میں  
پہنچے۔ اس طرف ایک تنگ گلی سی تھی جس کے اختتام پر ایک  
اوپر چڑھنے والا دروازہ تھا جو دیکھنے میں ہی بڑا مضبوط۔ لوم ہوتا تھا۔

ظاہر شاہ نے ایک بڑی سی چابی نکال کر اس کا آلا کھولا اور ہم  
اندر پہنچے۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے زمریں اور چابی پیشیاں

دو ہار قدم اٹھا کر رہ جاتا تھا۔

ادھر ان ہتھوں کا جذبہ اور جوش و خروش دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان پر کسی ناریہ دشمن ملک نے خدا نخواستہ تسلط بنا رکھا ہو۔ انیس اپنا نظام بنا رکھا ہو اور وہ بڑے زبردست جذبہ جہاد کے ساتھ خلائی کی زنجیریں توڑنے کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کے حریت پسندوں کی طرح گورلا جنگ میں مصروف ہوں یا پھر اس کی تباہیاں کر رہے ہوں۔ آخر یہ سب کیا مذاق تھا؟ ملک کے بچے بچے میں پھیلتے ہوئے یہ جتنے کیا کسی کی نظر میں کوئی مسئلہ نہیں تھے؟ آخر یہ سیلاب کہاں جا کر کے کا؟ اسلحہ تیار کرنے والوں کو تو صرف منڈیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ہم صرف منڈی بننے اور جنازے اٹھانے کے لیے رہ گئے تھے؟

ظاہر شاہ اسلحے کے کسی سٹیشن کے سے انداز میں غیسو کو بتا رہا تھا "یہ مال صرف بلکی مشین گن کے طور پر استعمال نہیں ہوتا" یہ رائفل کا کام بھی دے سکتا ہے۔ بڑی اچھی چیز بنائی ہے کشتیوں نے اس میں چار قسم کی گولیاں استعمال ہو سکتی ہیں۔ ایک تو کم رینج کی گولیاں ہوتی ہیں جو قریب کے دشمن کے پرچے اڑانے کے علاوہ راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے بھی کام آتی ہیں۔ "پھر اس نے وضاحت کی "ان گولیوں کا اگر آپ ایک ہی لیڈل پر برست ماریں تو وہ درخت کو کاٹ کر رکھ سکتی ہیں۔ لوہے کے ٹیٹ وغیرہ توڑ سکتی ہیں۔ دوسری قسم کی گولیاں لمبی رینج کے لیے ہوتی ہیں۔ دور کے دشمن سے مقابلے کے لیے۔ تیسری قسم کی گولیاں تباہی پھیلانے کے ساتھ ساتھ زبردست قسم کی آواز بھی پیدا کرتی ہیں جسے سُن کر انجنے پھٹے سوراخوں کے دل بھی دھل جاتے ہیں۔"

وہ استغناء سے انداز میں مسکرایا "سنا ہے پولیس والوں کو ہو گانے کے لیے تو وہ آواز کی کافی ثابت ہو رہی ہے۔ چوتھی قسم کی گولیاں میں نے آتما کر توئیں دیکھیں لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ بھی بڑی ٹھیک ٹھاک اور کارآمد ہیں۔ وہ پورے والی ٹیکنیک سے نکلتی ہیں یعنی برے کی طرح ٹھوس ہوتی جاتی ہیں اور بڑی موٹی موٹی ٹھوس رکاوٹوں سے بھی گزر جاتی ہیں۔"

ظاہر شاہ نے یہ سب سنا کر داد و طلب کی نظروں سے غیسو خان کی طرف دیکھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ گن اسی نے ایجاد کی ہو اور درحقیقت وہ ایک مملکت ہتھیار نہیں بلکہ فی نوع انسان کے لیے بہت سی فائدہ مند قسم کی سائنسی ایجاد ہو۔

"چیز واقعی کام کی ہے۔" غیسو خان گن کو اٹھتے پھرتے ہوئے بولا "اپنے جانو کو کتنی ہی چیزوں کی فوراً خبر ہو جاتی ہے اور وہ انہیں سکھانے میں بھی ذرا دیر نہیں کرتا۔ جس طرح دولت کاتا ہے اسی طرح خرچ بھی کرتا ہے۔ اس کی عقل کا کوئی جواب نہیں۔"

"اسی لیے تو وہ مردار ہے۔" ظاہر شاہ متانت سے بولا۔ "اپنے بچے اور اندازہ نگشت سے پراسا نکلا معلوم ہوتا تھا لیکن جہاں وہ موجود تھا اور جہاں نہ تھا اسے دیکھ کر فی الحال میں صرف جہاں

چیزوں کی نقل و حمل میں استعمال ہوتی تھیں۔ ظاہر شاہ کھلی چٹنی کے پاس جا کر اُکھڑا ہوا جھنڈے رکھ کر اس نے کمرن میں ہاتھ مارا اور پوچھیں گے مونے جھیلے میں لپٹی ہوئی ایک سیاہ کلا شکوفہ نکال۔ اسے جھیلے سے نکالتے ہوئے وہ بولا "پانی کنوں کی معمولی سی اسلٹک ہوتی ہے۔ میں نے صرف یہ ایک ہی گن جوڑی تھی۔"

"آتما کر بھی دیکھی ہوگی؟" غیسو نے ملاحت سے پوچھا۔ "ہاں" ظاہر شاہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا "جیسی تو اندازہ ہوا ہے کہ یہ مال اس سے بہتر ہے جو ہمارے زیادہ استعمال میں رہا ہے۔"

سیاہ اسٹیل کی گھنٹیں۔ خصوصاً جب وہ غنی ہوتی ہیں تو خاصی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں لیکن اگر انہیں ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک عجیب و غریب خاموشی یا بد صورتی نمایاں ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہ موت کی بد صورتی ہوتی ہے۔

میں اپنے ملک میں مختلف جگہوں پر اور مختلف موقعوں پر مختلف اتفاقات کے تحت جس طرح اسلحے کی ریل چل دیکھ رہا تھا اور جیسی جیسی باتیں سننے میں آ رہی تھیں یا سنے سے میرے علم میں تھیں "ان سے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہماری آگوشی قوم حالت جنگ میں تھی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ جنگ کس کے خلاف تھی؟ کیا پانی آگوشی قوم کے خلاف تھی؟

ایسا لگتا تھا جیسے ہر جگہ کسی نہ کسی روپ میں کسی نہ کسی بہانے سے کسی نہ کسی جواز کے ساتھ چھوٹی چھوٹی متوازی فوج تیار ہو رہی تھی۔ کہیں یہ فوج لاکھوں کی صورت میں تھی، کہیں بڑے بڑے لوگوں کی ذاتی اور نجی فورس کی صورت میں۔ کہیں ان کے محافظوں کی صورت میں۔ کہیں قبیلوں کی صورت میں۔ کہیں سیاہی پاریوں کے کسی دھبے کی صورت میں۔ کہیں ڈرگ ٹافیا کی صورت میں۔ کہیں بد معاشرے کے گردہوں کی صورت میں۔

یہ سب چھوٹی چھوٹی فوجیں نہایت منظم تھیں اور حیرت انگیز حد تک اپنے آپ کو منظم کر چکی تھیں۔ کبھی کبھی میں گولیاں میں جا کر سوچتا تھا تو تشویش سے میری راتوں کی نیند حرام ہونے لگتی تھی کہ آخر یہ بڑے بڑے مسلح جتھے ملک کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؟ ان کی موجودگی کا جو انداز کیا تھا؟ انہیں اس قدر مستحکم اور مسلح ہونے کی ضرورت کیا تھی؟

ایک آواز ملک میں اپنے ہی بھائیوں اور ہم وطنوں میں رہتے ہوئے یہ جتنے کیوں زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے؟ یہ صرف اپنے اعمال کا خوف تھا یا کچھ اور مقاصد کی تباہیاں تھیں؟ اگر اب انہیں رائے دیں کہ اس طرف سے آنکھیں بند کر رکھیں گے؟ آخر ہمارے ہاں قانون اس وقت ہی کیوں حرکت میں آتا تھا جب پانی سر سے گزر جاتا تھا؟ بلکہ صحیح معنوں میں تو اس وقت بھی حرکت میں نہیں آتا تھا۔ لکڑے والے انداز میں

ی ہو سکتا تھا۔

غیر خان گن کا اچھی طرح سمجھنے کے بعد گویا مطمئن ہو کر طاہر شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "تمک ہے۔ فی الحال تو اسے رکھو اور اس چینی کو بھی بیک کر دو۔ میں جانو کہ تبادلوں کا کمال آگیا ہے۔ وہ خود ہی شکرانے کا بندوبست کر لے گا۔ ان کے ساتھ ایویشن تو تمک لٹاک تیا ہے؟"

"جی ہیشیاں ہیں۔" طاہر شاہ مطمئن لہجے میں بولا "اب تو ویسے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آؤں جوابیال کیا ہے۔ اور پیسے دو اور دو سرسے دن ڈیواری لے لو۔"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے۔ جانو زندہ باد۔" غیر نے پھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ طاہر شاہ نے مسکراتے ہوئے گن چینی میں واپس رکھ دی اور ہم دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے آگئے۔

طاہر شاہ جس شخص کو اپنی جگہ پر کھڑا کر کے گیا تھا وہ نہایت افسانہ سے لگا س صاف کر کے ایک ٹرے میں سجایا تھا۔ وہ ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے یقیناً اپنے ہاتھ کی رسائی میں موجود رقم کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہن میں چلا گیا۔ ہم اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

طاہر شاہ نے نوٹوں کی گڈیاں کاؤنٹر کے نیچے سے نکال کر ترتیب سے ایک اخبار پر رکھنی شروع کیں۔ سلیپ سے سب گڈیاں کم سے کم جگہ میں رکھنے کے بعد اس نے پیکٹ بنایا اور اس پر اچھی طرح ڈوری لپیٹی۔ پیکٹ اس نے ایک شاپنگ بیک میں ڈال کر اسے گرہ لگائی اور غیر خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "چانگ لاکہ ہیں۔"

غیر خان نے مطمئن انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پیکٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن بھر پیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ خشکی جیڑی بے پروائی سے اپنی آنکھوں سے مسل کر چمکتے ہوئے بولا "ابھی اسے میس رکھو۔ میں ذرا جان تمنا سے تول آؤں۔"

"جان تمنا اس سے نہایت معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ تاہم دونوں کے چروں پر خمیگی سی طاری رہی تھی۔ طاہر شاہ نے رقم کا بڈال اٹھا کر کاؤنٹر کے نیچے رکھا وہ پھر وہ پیسے ایک بہ شدہ کانڈ کال کر غیر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "اس پر حساب ہے۔ اب چیک کر لیں۔"

غیر خان کانڈ کھول کر دیکھے بغیر اس کا ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا "اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ تم اب ان لوگوں میں سے ہو جس سے حساب لیا جاتا ہے" اپنی ایمانداری کی وجہ سے بہت جلدی ہم لوگوں کی نظر میں بڑا مقام بنایا ہے۔ ہم ڈوری نذر کرتے ہیں۔"

"اب لوگوں کا مہربانی ہے۔" طاہر شاہ عجیب سے انداز میں بولا "ایماندار اس سے قدر دان لے بھی تو کہاں لے۔ میں باہر آؤں۔ میں انیس ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔"

غیر خان نے گویا ساققہ لگایا اور نصابیں ارجعاش را پیدا ہو گیا۔ تاہم وہ طاہر شاہ کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اٹھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "آؤ تم کچھ دیر ہال میں لوگوں کے درمیان چھو، کچھ بیو پلاڈا کسی محبوب بننے کے ساتھ اچھا وقت گزاریو، کپ شپ کرنا۔ تیار اچھ خرقہ نہیں ہوگا۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہال میں آگیا۔ یہاں اب بہت سے مردوں اور عورتوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ باتوں کی جھجھکتاں اور حرم و محرم قبتوں کی ٹھٹھکتاں کچھ بڑھ گئی تھی۔

ایک میز پر ایک لڑکی تنہا بیٹھی تھی۔ بنیادی طور پر وہ رسائی معلوم ہوتی تھی لیکن شری سامنے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے گلے سیاہ ٹھٹھکا لے بالوں کی ٹیس بے ترتیبی سے اس کے کھدھل اور کمر پر پھیلا ہوئی تھیں۔ اس کی رنگت چینی جیسی تھی اور اس میں سوم کی سی دھندلی ہلک تھی پیسے وہ دھوپ اور روشنی میں بہت کم جاتی ہو۔ اپنی رنکت کی اس خفیف سی زردی کے باعث وہ کچھ تیار تیار سی لگ رہی تھی۔

اس کی موٹی موٹی آنکھیں بھی خوبصورت تھیں لیکن ان آنکھوں میں ہلکی سی خمی اور گلابی زور سے جھرپے تھے۔ اس کی انگلیوں میں سرکٹ دبی ہوئی تھی جس کے دھوئیں کی بو تیار رہی تھی کہ سرکٹ سادہ نہیں تھی۔ وہ دھیلے زھالے موٹی لباس میں تھی مگر اس کے جسم کا خزانہ بوند جانے کب سے لٹ رہا تھا اس بے چارے چند گز پکڑنے سے سنبھالے نہیں سنبھیل رہا تھا۔

وہ لڑکی بھی تو اس ہال میں تھی لیکن اس کا ذہن نہ جانے کہاں تھا۔ لمبی لمبی پکیلیں اٹھا کر اس نے بے پروائی سے ہماری طرف دیکھا۔

"تم اس کے پاس چھو۔" غیر نے گویا مجھے بہت اہم مشورہ دیا۔ "اس کا نام توری ہے لیکن یہ وہ توری نہیں ہے جس سے جام تاجی نے عشق کیا تھا۔ وہ بڑی شریف توری تھی۔ یہ زور دوسری طرح کی توری ہے۔ یہ شر جاکر نور بن گئی ہے۔ بڑے غضب کی عورت ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس رسائی لڑکی کے سامنے سفید چڑی والی میس بھی کچھ نہیں۔ میں کسی اور سے ملنے جا رہا ہوں ورنہ میں خود اس کی قربت کی چھاس میں بیٹھا پسند کرتا۔"

اس کی بات سن کر بھی لڑکی کا چہرہ پاٹ ہی رہا۔ پھر وہ بے پروائی سے دوسری طرف دیکھ کر سرکٹ کا کش لینے لگی۔ غیر خان نے میرا کانڈھا جاتے ہوئے مجھے اس کے مقابل بٹھارایا۔ اس نے اپنی بھوکی نظریں گویا بہ مشکل لڑکی کے وجود سے ہٹا دی اور ایک آنکھ داکر مسکراتے ہوئے بولا "میرا آنے کا جو کچھ کہا: چٹا ہو" بے دھڑک منج لیتا۔ زندگی موت کا کچھ پتا نہیں۔ جو سوچتا میرا آتا ہے اس سے ہر اہر اور افاقہ اٹھاؤ۔"

میں نے اچھا ہٹ آمیز سے انداز میں ہٹ کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا "میں تو صرف کولڈ ڈرینک پیوں گا۔"

اس سے سرور کشیدہ کرنے کی کوششوں میں لگی رہتی تو شاید کچھ پنکھاریاں ہی اس کی انگلیوں اور ہونٹوں کو جلاتی ہوئی اس کے حلق میں جاتیں۔

وہ انگلیاں ایک دوسری میں پھنسائے مٹھنیاں میز پر نکالے ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گول مٹول اور کھانیاں سڈول تھیں۔ ایک کھانسی میں چاندی کا ایک ڈھیلہ سا کلنگ اٹکا ہوا تھا۔

"تو تمہارا نام نورہی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ درحقیقت میری کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا بات کروں۔

اس نے نہایت آہستگی سے پگلیں جھپکاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بیٹنی بیٹنی سی آواز میں بولی "نورہی نہیں، نورین۔" نورہی تو تہمت ہوئی مگر یہی ہے۔

اسی اثنا میں وہ ہر اٹھا شخصیت ہماری طرف آتی دکھائی دی جس سے چند لمحوں پہلے غیسر خان نے بات کی تھی۔ نورین کو کیا کسی اور سی دنیا سے واپس آئے ہوئے سر جھک کر مٹھنی سے اعزاز میں بول۔ "ہاں... بول۔ کیا کھیل گئے؟ کیا کھاؤ گئے؟ کیا پیو گئے؟" پھر اوجھڑا جانا ہے؟ "اس نے کمرہ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں غریب سا آدمی ہوں، میں نے اپنے لیے سے مسکینی کا انعام کرنے کی کوشش کی۔" "کھیلے کھاتے؟" پتے پلانے اور اس قسم کے کمرہ کی طرف جانے کے شغل میری بے بسا ہے؟ ہر پتے۔

"جسین غیسر خان یہاں بٹھا کر گیا ہے۔ تم اس وقت اپنے آپ کو بادشاہ سمجھو۔" وہ استہزائی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "جسین اپنی جیب اور اپنی حیثیت کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف حکم کو، ہر چیز اس میز پر پہنچ جائے گی۔ اور میں تو یہاں پہلے سے ہی موجود ہوں۔" اس نے اپنے سر اپنی طرف اشارہ کیا۔ پھر ذرا توقف سے بولی "ویسے اتنی اکھاڑی کی ضرورت نہیں۔ غریب آدمی کا بھلا یہاں کیا کام؟ یہ بہت مٹگی جگہ ہے۔"

اسی اثنا میں میرا مٹو بٹانہ انداز میں ہماری میز کے قریب آگھڑا ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے ماتر مٹو بٹانہ انداز کے باوجود اسے صرف ہذا سمجھاؤ مشکل تھا۔ یقیناً وہ اور اس جیسے دوسرے تین چار افراد صرف ہرے نہیں تھے ضرورت پڑنے پر حافظہ پازرا کے بھی من جاتے ہوں گے۔

"میرے لیے صرف کوئی ڈرنک لے آؤ۔ ان خاتون کی مرضی انہی سے پوچھ لو۔" میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی نے ہنسی سے ہاتھ ہاتھ کر تیرے کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ میز پر اس کا پرس رکھا تھا۔ اس نے پرس کھول کر سکرٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور نئی سکرٹ لگا کر عیدے انداز میں طویل کش لے کر کھول کر میرے چہرے پر اٹھائی۔

میں نے تاکاری محسوس کرتے ہوئے سانس روک لی۔ اس

"زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔" غیسر نے جانے کیوں ایک بار پھر بتایا۔ شاید یہی ان کا فلسفہ حیات تھا۔ "جو بھی کچھ میسر ہو" سمیٹ لیتا چاہئے۔ کہیں بعد میں صرف پچھتاوا نہ جائے۔" ایسا لگتا تھا کہ صرف ڈاکوؤں کا ہی نہیں بلکہ ملک کی اتنی فیصد آبادی کا نظریہ حیات آج کل میں ہو گیا تھا جو غیسر خان کہہ رہا تھا۔ "میں نے اب کسی بھی بات پر پچھتاوا نہیں کر رہا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تب لڑکی نے نہایت آہستگی سے گردن مٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرفی کچھ کھسکی ہو چکی تھی۔ اس میں شاید کچھ خلقت خوابوں کے خون کی سرفی بھی شامل تھی۔ اس کی سکرٹ تقریباً ختم ہو چکی تھی مگر وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ تسکین کشیدہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

غیسر خان نے ہاتھ ہلایا اور دائیں طرف والی کمرہ کی قطار کی طرف چل دیا۔ ایک ستون کے قریب میرا ٹاپ ایک شخص کھڑا معتدل نظروں سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ غیسر اس کے سامنے جا کر اس نے زرا چرک کر غیسر کو دیکھا اور ہنر ہذا کر یک دم مذہب سا ہو گیا۔ غیسر نے اس سے کچھ پوچھا۔ اس شخص نے ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

غیسر خان نے جا کر اس کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور میں نے ایک گوری جتنی قد اور خوبصورت عورت کی جھلک دیکھی۔ وہ شاید نیند سے اٹھی تھی۔ اس کے بھروسے ہال منتر تھے اور وہ کھانسی رنگ کی ایک خوبصورت ٹائی میں تھی۔ یہ سب نظارے میرے لیے غامض حیران کن تھے۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس دیرانے میں 'ڈپر زین' مجھے یہ سب کچھ دیکھنے کو ملے گا۔

عورت غیسر کو دیکھ کر جھٹکتے جھٹکتے سے انداز میں مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں جھٹکن کے علاوہ شاید مجبوری بھی شامل تھی۔ غیسر خان نے اسے انداز میں قدم اٹھا کر "موتو کھل دیتا کرے" میں داخل ہو گیا اور کمرے کا دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ میں نے زندگی میں بہت سے ہماری بھر کم افراد دیکھے تھے لیکن ان کے چلنے سے زمین میں دھک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جبکہ غیسر خان کچھ ایسا کراؤٹیل بھی نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ اپنے مخصوص پتے سے انداز میں قدم اٹھا تا تھا تو زمین میں بھی سی دھک ہوتی تھی۔ لگتا کچھ ایسا تھا جیسے اس کا ایلیسی سا وجود ٹھوس ٹھوس سے ہٹا ہوا تھا۔

چند لمحوں تک اس کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میں نے گردن سیدھی کی اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ لڑکی نے بالآخر سکرٹ کے اس ٹوٹے کا بیچا چھوڑ دیا تھا جس کی لمبائی بہ مشکل ایک چوتھائی رہ گئی تھی۔ اگر وہ اب بھی

"بالکل۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "مجھے بھی تو دیکھو۔ میں نے تمہارا نام تک نہیں پوچھا۔ میں تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا چاہتی۔ پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے تین میں بیٹھا ہوا مسافر اور راستے میں پڑی کے قریب کھڑا ایک درخت۔ شاید تم زندگی کی تیز رفتار میں بیٹھے مسافر ہو اور میں باہر کھڑا درخت۔ یا پھر میں مسافر ہوں اور تم درخت۔ بہر حال اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ قابل غور بات صرف یہ ہے کہ ہم صرف ایک پل کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے اور پھر ایک دوسرے کی نظر سے اوچل ہو جائیں گے تو پھر سوالوں میں آکھیں گی ضرورت کیا ہے؟ زمین میں بیٹھے مسافر درختوں سے یا درخت مسافروں سے ان کے نام نہیں پوچھتے ان کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔"

زندگی بعض لوگوں کے لیے بڑا سناٹا استعارہ ثابت ہوتی ہے۔ بہت کم وقت میں انہیں جانے کیا کچھ دکھائی جاتی ہے۔ سگرت کا ایک گھرا سٹل لے کر وہ عجیب سے انداز میں مگھرائی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ کچھ پینے سے ٹھنک آئے تھے۔ ایک لمحے کے وقف سے وہ بولی۔ "اگر تمہارا خیال ہے کہ میں نشے میں ہوں، اس لیے کچھ سوالوں کے جواب دے جاؤں گی۔ تو تم غلطی پر ہو۔ میں نشے میں اور خواہ کچھ بھی کرگزردوں لیکن سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔"

پھر وہ بیزاری آمیز سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا لہجہ بہر حال قیامت تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل بے ایمان ہوا کہ میں بھی اس کا ہاتھ قیامت کھڑا ہوا جاؤں لیکن اسی ایک بے عنوان سی استیلا نے دامن قیامت لیا کہ یہ کھڑا کچھ ایسی سنہری بھی نہیں تھیں۔

وہ اپنا پس اٹھاتے ہوئے صحیح طور پر یہی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "گناہی ہے کہ تم اور اُدھر کی باتوں کے علاوہ کچھ نہیں کہو گے بالکل بیکار آدمی ہو تم۔"

وہ ایک اچھے بیڑ پر رکھ کر ڈرا کھینچی اور نیچی آواز میں بولی۔ "میں بے شک سٹ نظر آتی ہوں لیکن میں اتنی سٹ نہیں ہوں۔ میں زندگی کے راستے پر بہت تیز چل رہی ہوں۔ بہت جلدی میں ہوں۔ جوانی بہت تیزی سے میری منجھی سے تلخی جاری ہے اور میرے لیے اس کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔ تم آرام سے بیٹھ کر کھیاں مارو۔ خدا حافظ۔"

وہ پہلی تو اس کا انگ انگ گویا ہوا میں بلکھورے لے رہا تھا۔ وہ غالباً غاصی دور کی بیڑ پر جا بیٹھی لیکن وہ بیڑ مجھے وہاں سے صحیح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی جہاں میں بیٹھا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جہاں میں اپنا سامنے لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔

غاصی دیر تک میں یونسی ہو کر غصے کی طرح بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ جہاں میرے سامنے کوئلہ ڈرنگ کی بوٹی رکھ کر چلا گیا۔ اور گلاب بستر

پکٹ میں شاید ساری سکرش پہلے ہی سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ عام سکرشیں نہیں تھیں۔ کیف اور بدبودار دھواں ہوا میں تحلیل ہو گیا تو میں نے دھیرے سے سانس لیا۔

لڑکی نے ایک بار پھر گویا تقدیر چاہی "تمہیں کچھ پتا چلا نا بھی نہیں ہے۔ کھلیا بھی نہیں ہے۔ وہاں بھی نہیں جاتا ہے۔" اس نے انگوٹھے سے کمر کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ یہ میرے فضل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ عشقی سے انداز و اطوار اختیار کرنا میری عادت نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔

"تم تو بہت ہی بیکار آدمی ہو۔ یہاں کس لیے آئے ہو۔ جگہ مارنے؟" اس نے جملہ آئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

زندگی کی حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ اگر ہم دونوں کسی انسان کے کردار ہوتے تو وہ میری سادگی اور کیشیات سے میری بے نیازی دیکھ کر یقیناً بہت متاثر ہوئی۔ میں اس بیڑ میں اسے ایک منفرد اور الگ تھلک محض نظر آتا اور وہ بڑے اشتیاق سے پوچھتی۔ آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ آپ اب تک کہاں تھے۔؟ وغیرہ وغیرہ۔

پھر اس پہلی ہی ملاقات میں، میں اس کے سن مندر کا دیو تارین جاتا۔ لیکن حقیقی زندگی کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ انسان آپ کے خوابوں کا دوسرا نام ہے۔ جبکہ حقیقی زندگی میں آپ کے خواب قدم قدم پر ٹوٹتے ہیں۔

تو رین شاید انفرادیت، شرافت اور سادگی میں دلچسپی لینے کی حد سے بھی گزر چکی تھی۔ اس کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن شاید اس نے زندگی کو ہر پہلو سے رت لیا تھا اور ہر چیز سے اس کا اعتبار اٹھ کر تھا "دو اور دو چار" کے علاوہ سب باتیں اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھیں۔

یہاں کے داخلی نے میرے ذہن میں بے شمار اندیشوں پر چڑچڑاہٹیں اور نہ جانے کیسے اچھے اچھے خیالات کی جھپٹ پیدا کر دی تھی۔ اس جھپٹ سے نجات کے لیے میں نے تنگسو کے واس میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"تم کون ہو۔ اور اس جگہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے ملاحت سے پوچھا۔

"سوالات کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔" اس نے قہقہہ کرکائی سے کہا "اس چار دیواری میں سوالات کرنا سخت متعجب ہے۔ خصوصاً غیر ضروری سوالات۔ سوالات کرنے والے عموماً بے وقوف ہوتے ہیں۔" کھلے لوگ سوال کیسے بغیر سب کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک لمحے کے لیے میں دم بخود سا رہ گیا۔ پھر میں نے قدرے حیرت اور آستیت سے کہا "میں نے جو کچھ پوچھا کیا وہ غیر ضروری تھا؟"

تھی۔ وہ شاید تصویر کھینچا جائے جس کی تک اس کا ایک ہاتھ مضطربانہ انداز میں اس کے کندھے تک پہنچا ہوا تھا جہاں اس نے اپنے دوپٹے کا ایک حصہ کھینچ کر لیا تھا۔ اسی ہتھکڑی اور اضطراب کے عالم میں کیمبرے کی آنکھ نے اس کا عکس قید کر لیا تھا۔ مجھے کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ اس کی ہتھکڑی کی وجہ غالباً یہ نہیں تھی کہ وہ بہت شرمیلی تھی بلکہ شاید اس کی عزت نفس اسے ڈسنے لگی تھی کہ اخبار میں اس کی تصویر آئے گی تو اس کی بے بسی، ناداری اور کسمپرسی یا اس کا فحش مسئلہ دنیا کے لیے ایک تماشا بنے گا۔ لوگ اس پر قس کھائیں گے اور کچھ شاید اس کی عمر میں سے بھی لذت اندوز ہوں گے۔ اس کی بڑی بڑی وحشی آنکھوں میں اقوام بھی تھا، فجالت بھی اور شرمندگی بھی۔

لڑکی کے برابر دو چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے تھے۔ ان کی عمروں میں شاید ایک دواڑہ سال کا ہی فرق تھا۔ دونوں بچوں کے ہاتھ گود میں تھے اور وہ گردنیں ذرا ترچھی کیے معصوم اور حیران آنکھوں سے کیمبرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی تماشگر عمری، معصومیت اور حیرانی کے باوجود ایک تاثر ان کے چہروں پر بھی نمایاں تھا۔ اور وہ تھا کوئی چیز جنھن جانے کا تاثر، وہ محروم اور معظوم بچوں کے چہرے تھے۔

ان کے پیچھے ایک فریسی ماہل عورت سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بھی دوپٹے کے تلے میں گھرا ہوا تھا۔ سر جھکا ہونے کی وجہ سے چوہے صبح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن جتنا بھی نظر آ رہا تھا اس پر وزن و ملال اور رنج و شکست کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے وجود پر شاید افسردہ سوچوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے سر اٹھانے نہیں اٹھ رہا تھا۔

گروپ ٹوٹو میں عموں چہرے اتنے واضح نظر نہیں آتے کہ ان کے پیچھے پیچھے جذبول کی کمائیاں پڑی جا سکیں لیکن ایک تو اس گروپ ٹوٹو میں زیادہ افراد نہیں تھے، دوسرے اسے نمایاں کر کے چھاپا گیا تھا۔ شاید اس بڑا اخبار کے پاس قلمبش کرنے کے لیے اس سے زیادہ اہم کوئی 'اسٹوری' نہیں تھی۔ ان چہروں کے بارے میں جو تاثر میں نے لیا تھا وہ بھی درحقیقت اسی وقت کھرا ہوا تھا جب میں نے اس تصویر سے متعلق تفصیلی خبر پڑھی تھی۔

جای عمرانی چھوٹے سے قصبے سے تانہ نگرارے بڑے دل نشیں انداز میں کمائی بنا کر بھیجی تھی۔ اس میں 'نبوت' اہم تھی اور جذبات نگاری زیادہ۔ لیکن یہ حقیقی جذبات نگاری تھی۔ اس میں کوئی انوکھی یا انسانی بات نہیں تھی۔ جن پر ایسے واقعات گزرتے ہیں 'ان کا عالم عموماً یہی ہوتا ہے۔

وہ اخبار بے شک چھپتا تھا اور اس واقعے کا تعلق بھی ایک قصبے سے تھا لیکن اس نا معلوم تانہ نگر کو قبیح قلم سے انبیت تھی، ان کو دادیں سے کچھ دابھلی تھی۔ لکھنے کا کچھ نہ کچھ سلیقہ تھا یا پھر شاید بات صرف اتنی تھی کہ اس کا احساس زندہ تھا اور اس نے

جیسے بھر چکی تھیں۔ سب اپنے اپنے فاضل میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں نوجوان 'ادبیز' مراد پور سے بھی تھے۔ ان میں سے کوئی کبھی کبھار گردن تھما کر میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ ان کی نظرس پتائی تھی کہ انھیں یہاں میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ کمرلوں میں بھی مزید چند لوگوں کی آمد رفت نظر آتی تھی۔ کچھ مزید مدد و خوں کی موجودگی کا بھی ظہور ہوا۔ وہاں ہر طرح کی عیاشیوں کا سامان خامے وسیع پیمانے پر موجود تھا۔ کیا ستم غریبی تھی۔ شہروں میں قریب خانوں، قمار خانوں اور ناش کجوں پر پابندی تھی لیکن جنگل میں ان سب کا کسمپور موجود تھا۔

میں نے دو دن پرانا ایک غیر معروف سا علاقائی اخبار پڑھا تھا۔ کہا کہ میرے لیے وہ غیر معروف ہی تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قدرے مضطرب محسوس کرتے ہوئے اس کی اوٹ میں پناہ لے لی۔ پہلے اور آخری صفحے پر اسی قسم کی خبریں تھیں جو برسوں سے چھپ رہی تھیں۔ بڑے لوگوں کے بیانات، نٹالوں کو نٹالوں کا کام کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نٹالوں کی منتی سرگرمیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے اپنی ہاتھ سے نشانہ جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ میں ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے خوبصورت، پرسکون اور محفوظ ٹھکانے پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اپنی ہاتھ نہ جانے کہاں تھا اور کون سے روٹی غلافوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس ستم غریبانہ صورت حال پر ہنسنا چاہتا تھا لیکن سینے میں صرف ایک نہیں ہی محسوس کر کے رہ گیا۔

کوئلہ ڈونک ختم کرنے کے بعد میں اطمینان سے اندرونی صفحات پر نظر دوڑانے لگا تو کچھ غیرسختان کی دواہی کے فی الحال آواز نظر نہیں آ رہے تھے۔ وقتا فوقتے کے وسط میں چورٹہ ماٹھے میں چھپی ہوئی ایک تصویر پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ بظاہر وہ ایک عام سا گروپ ٹوٹو تھا۔ نچلے طبقے کے کسی کیمبرے کا گروپ ٹوٹو لیکن اس میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی۔

اس اخبار کی چھاپائی دیکھ کر مجھ پر زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ تصویر نہایت صاف، واضح اور نمایاں چھپی ہوئی تھی۔

تصویر میں دواہی ہاتھ پر ایک بارش پڑھا تھا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس نے زندگی بھر ڈھانے اور ٹھکانے میں گزار دی تھی لیکن راحت اور شکر گزاری اس کی فطرت میں شامل رہی تھی مگر شاید اب وہ شکر گزاری اس کا ساتھ چھوڑی تھی، رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت دواہیاں تھیں۔ وہ گویا کیمبرے کی آنکھ کی طرف نہیں پوری دنیا کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں پوری دنیا کے لیے غرت تھی۔

اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی جس کا چہرہ دوپٹے کے تلے سے گھرا ہوا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور معصوم لڑکی

مجبوری کو متاثر بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی کوتاہی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے یوز سے اور تیار باپ کے کندھوں پر اس کا وجود ایک بوجھ ہے مگر کھٹے دلوں کو کھٹے کے لیے۔ اور بڑے دلوں کو بڑے کے لیے کمائیاں چاہئیں، افسانے چاہئیں، خبریں چاہئیں۔

لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے دو معصوم بچوں کو صحیح طور پر زندہ اور نہیں ہوگا کہ ان پر کیا قیامت گزر چکی تھی لیکن ان کی سوچوں کی پھول ہی دنیا میں بھی انجیل تو یقیناً ہی تھی۔ اسی لیے تو ان کو سرے چوہوں پر بھی عروسی کی ایک نادیہ خبر ابھرتی تھی۔ ان کو بھی یقیناً احساس ہو چکا تھا کہ ان سے کوئی بیش قیمت ہتھیار نہیں چلے گا۔ ان سے ایک پتھر تقریباً بیچ سال کا تھا اور دوسرا تقریباً چار سال کا۔ اس عمر میں ذہن کے وقت پر نقش بننے بچنے کا عمل تو شروع ہو ہی جاتا ہے۔

ان کے پیچھے جو بیوہ سر جھکائے کھڑی تھی، اس میں تو شاید طاقت ہی نہیں رہی تھی کہ کسی کو صحیح طور پر اپنا دکھتا سکے۔ اسی لیے اس کا سر تو شاید عمر بھر کے لیے شکست خوردہ سے انداز میں جھک گیا تھا۔ عورت کتنی بھی غریب ہو مگر شوہر زندہ ہو تو شاید اس خیال کے سارے سرا و نثار کھتی ہے کہ اس کے سر پر تاج ہے مگر اس عورت کے سر کا تاج کھسک کسی کی دولت کی ہو س کا نشانہ بن کر موت کی نامرکب وادی میں جا کر اٹھا۔

ایک فرد کی نامگانی موت سے پورا ایک خاندان برباد ہو جاتا ہے۔ مرے والا اپنے پیچھے نہ جانے کتنی المناک کمائیاں، کتنے زندہ کرداروں کے ساتھ چھوڑ جاتا ہے مگر ہم مردانہ ایسے بیسیول افراد کی نامگانی موت کی خبریں اخباروں کے کوٹے کندھوں میں پڑتے ہیں اور بے بسی سے اخبار ایک طرف پیسک کرنا شکار کرنے لگتے ہیں کہ کہیں جانے لکھڑی نہ ہو جائے، اگرچہ بد مزہ نہ ہو جائے۔ وہ کمائیاں نہ جانے کتنے برسوں تک اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہیں لیکن ہم ان کے بارے میں نہیں سوچتے کیونکہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی یہ دنیا۔ اپنا آپ۔ گرد و پیش کے لوگ۔ سب کچھ مجھے بہت عجیب لگتے لگتے تھا۔ عجیب نظام تھا۔ یا پھر شاید ہم لوگ ہی عجیب ہو گئے تھے۔

کبھی کبھی کوئی لمحہ کوئی موڑ انسان کے لیے بہت خاص ہوتا ہے۔ یہی نظریں مسلسل اس تصویر اور اسٹوری میں ابھی ہوئی تھیں۔ نامہ نگار نے لکھا تھا کہ قصبے میں شاید وہ واحد گرانہ تھا جس کا مکان ذاتی نہیں تھا۔ مالک مکان پہلے ہی ان سے خوش نہیں تھا، اب کچھ اور تھا ہو گیا تھا۔

کچھ اور بھی قرض خواہ تھے جنہیں بہت تشویش تھی کہ اب کسانے والا نہیں رہا تو ان کی پختی ہوئی رقبوں کا کیا ہے؟ اگر قرض معمولی تھیں مگر جس کے پاس بدیمانہ ہو اس کے لیے کوئی رقم معصوم نہیں ہوتا۔

اس کہنے کا احوال لکھتے وقت صرف اغراض سے کام لیا تھا۔ اس لیے اس تحریر اور تصویر میں اتنی تاثر پیدا ہو گئی تھی کہ میں بار بار سب کچھ پڑھے جا رہا تھا بار بار تصویر کو دیکھے جا رہا تھا۔ ورنہ اس سفاک دنیا کے خطہ فطرت سے بات کچھ اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ آپ آئے دن اخبارات میں نہایت اختصار سے ایسے واقعات پڑھتے رہتے ہیں۔

یہ زمین کی اسی واردات کا شاخسانہ تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا مگر جس نے لی احوال مجھے زندگی کی ایک عجیب سی ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ ہائی وے پر بیس لوٹنے جانے کی یہ وہی واردات تھی جس میں جانور کے کردہ کے ساتھ دو میل خان بھی شامل تھا۔ اخبار میں جس کہنے کی تصویر تھی وہ ایک بس کے کنڈیکٹر کا تھا جو بیٹی شاہدوں کے مطابق ایک سیاہ پوش ڈاکو کی کرلوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ وہ سیاہ پوش ڈاکو سیاہ رنگ کی کھڑے برسات تھا۔ سب سے زیادہ تازہ گ اسی نے کی تھی اور اسی کے ہاتھوں سب سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ ڈاکو دو میل خان ہی تھا لیکن یہ بات صرف چند افراد کی معلوم تھی۔

نامہ نگار نے اس خبر میں یہ بتایا تھا کہ کنڈیکٹر کے قتل کے بعد اس کے لواحقین اور پسماندگان پر کیا زبردستی تھی۔ تصویر میں جو بوڑھا نظر آ رہا تھا وہ مختل کنڈیکٹر کا باپ تھا۔ کنڈیکٹر اس کا کلونا بیٹا تھا اور گھر کا واحد کفیل تھا۔ کئی سال ہیروز گار رہنے کے بعد اسے چند ماہ پہلے ہی نوکری کی تھی اور بد حال کہنے کی ساری توقعات اسی سے وابستہ ہو گئیں تھیں کہ اب وہ جوان بہن کے ہاتھ پہلے کرے گا اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کرائے گا اور اپنی بیوی کے وہ چند زیورات بھی بنوائے گا جو اس کی بیکاری کے دوران کپ گئے تھے۔

بڑے سماں کے برابر بیٹھی ہوئی وحشی آنکھوں والی لڑکی کنڈیکٹر کی بہن تھی جس کے چہرے پر امیدوں کی پرچھائیاں دم توڑ چکی تھیں۔ یہیں ممکن تھا کہ اس کا بھائی زندہ رہتا تب بھی اس کی ڈول رخصت نہ کر پاتا۔ آخر وہ ایک بس کنڈیکٹر ہی تھا۔ کس کس کی مڑاویں، کس کس کے اسان پورے کر سکتا تھا۔ لیکن گھر میں کم از کم ایک فرد بھی روزگار سے لگا رہے تو سارے سادہ لوح اور افلاس زدہ کہنے کی آس امیدیں اسی کی ذات سے بندھ جاتی ہیں کہ آنا نہیں تو کل اس کے دم سے یہ کام ہو جائے گا، وہ کام ہو جائے گا۔ سب کو زندہ رہنے کا ایک سارا ملنا تھا۔ امید کا یہ مہووم سارا سمجھ جانا ان سیدھے سادے لوگوں پر کیسی قیامت ڈھانسا ہو گا؟ یہ صرف وہی جان سکتے تھے۔

تصویر چھپوانے میں اس لڑکی کا اضطراب اس کی پچھلے ہاتھ قابل فہم تھی۔ وہ غالباً ان چہرے ہی تھی۔ دنیا اس نے یقیناً نہیں دیکھی ہوگی لیکن عزت نفس اور شعور اس کے پاس ضرور تھا۔



آسانی سے اس اڑے تک لاسکتی ہے اور ٹھنک دے سکتی ہے۔  
اس نے کروڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

اس کا انداز خود کلاسی کا تھا لیکن یہ چند الفاظ جب اپنے صحیح معنائی اور مفہوم کے ساتھ میرے ذہن تک پہنچے تو میری روح کانپ اٹھی۔ گویا یہ لوگ بعض خاندانوں کو ایک انداز میں برباد کرنے کے بعد بھی ان کا چہرہ نہیں چمڑوتے تھے۔ انہیں مزید برباد کرنے کا بھی نہ جانے کتنے کتنے طریقوں کا ان کے ہاں بندوبست تھا۔

ان کے تمام سلیبے بہت منظر تھے۔ ان کی کوئی جھلنائی ایجنٹ بھی تھی جو ہمسایہ حالات میں گہری ہوئی بخور لڑکیوں یا پھر ان کے مطلوبہ رعایات رکھنے والی لڑکیوں کو گھیر گھار کر اس قحبہ خانے تک لاتی تھیں۔ پھر نہ جانے کس طرح انہیں خاص سامنے میں ڈھالا جاتا تھا۔

اس سارے عمل کے دوران اور اس کے بعد وہ نہ جانے کہاں رہتی تھیں۔ اپنے گہروں میں یا کہیں اور؟ کس حد تک ان کے گہروں میں جھڑی ہوئی تھیں؟ اس طرح کے بہت سے سوالات میرے ذہن میں چکرانے لگے تھے لیکن اتنی جلدی ہر سوال کا جواب نہیں مل سکتا تھا۔

میں ان سوالوں کو زبان پر آنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف تھا جب غیسو خان اخبار ایک طرف کھٹکا کر اٹھتے ہوئے بولا "میں ذرا کاغذ سے اپنی چیزیں لے آؤں پھر ملے ہیں۔"

وہ لمبے لمبے ڈنگ بھرا کاغذ کی طرف چلا گیا۔ میں نے اخبار ایک بار پھر اپنی طرف کھٹکا لیا۔ ایک بار پھر تصویر سے ہوتی ہوئی میری نظر اس رپورٹ کی آخری سطروں پر جا اٹھی۔ افسانہ نگاری کے سے رعایات رکھنے والے اس نامہ نگار نے آخری سطروں میں لکھا تھا:

"... یہ شقی القاب ڈاکو، یہ انسان غدار دے محض رقم کی خاطر، اور بعض اوقات صرف دہشت پھیلانے کی غرض سے کسی کی زندگی کا چراغ بجھ کر دہشت کی وقت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ ان کی اس زندگی سے کتنے گہروں میں آدمی کی جھل جائے گی، کتنی زندگیوں برباد ہو جائیں گی۔"

قدرت اور قانون دونوں ہی انہیں ڈھیل دیتے ہیں۔ بہر حال کبھی نہ کبھی تو قدرت یا قانون کا ہاتھ انہیں گرفت میں لے لیٹا ہے۔ کئی کئی عبدالرشید اور کئی بے کناہ مسافروں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا ڈاکو نہ جانے کب اپنے انجام کو پہنچے۔ لیکن سب سے بدتر تو یہ ہے کہ اندھیرے کی دلدل میں اترتے ہوئے یہ بے کناہ افراد یعنی کئی کئی عبدالرشید کے یہ اہل خانہ جانی مگر کے میرانی بازے کے ایک پرانے سے مکان میں کئی مچھوے کے پھرنے جو ان کی زندگیوں سے اندھیرے سمیت نکلے۔ وہ دھنکی کی کسی کرن کے انتظار میں ہیں جو انہیں جیل کا چمکے پادے سکے۔

یہ تمام الفاظ اور تفصیلات گویا میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی

کئی کئی باب گروے کی تکلیف میں جلا تھا۔ اس کی دوا دوا خرچ خاصا مگر اب تو دوا کے لالے بڑے تھے، دوا کہاں سے آتی۔ چنانچہ رات کو بڑے سیال تکلیف کے باعث ارنجی آواز سنا کر اچھے تھے تو درہمیں کی نیند خراب ہوئی تھی۔

ایک آدھ کئی کئی سے مجھے حال ہی میں بلا پڑا تھا۔ اس سے ملے برسوں سے کسی کئی کئی سے واسطے نہیں پڑا تھا لیکن جب پڑنا بابت بھی وہ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ چہرہ بھی انسان کی ذات پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور مرتب کرنا ہے کئی کئیوں پر ان کے پیشے یا تہ جانے کیوں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عجیب گہروں سے انسان بن جاتے ہیں۔ یا پھر شاید وہ پہلے ہی سے ایسے ہوتے ہیں اور اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس پیشے کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بھرنے جانے کس کس مزاج کے لوگوں سے یک یک جک جک کرنے کی وجہ سے ان کے دماغ میں مستقل گہروں پر اپنا آجاتا ہو۔

بات خواہ کچھ بھی تھی لیکن اس وقت میری زندگی بھر کی آکڑی نہ جانے کہاں چلی تھی۔ وہ نامعلوم اور ان دیکھا کئی کئی مجھے اپنا کوئی قریبی دوست محسوس ہونے لگا۔ وہ ہمارے معاشرے کا ایک عام سا انسان تھا، اس کے بچے ایک عام سی کہانی تھی۔ "ابو" آکڑوں اور مصائب کی کہانی لیکن اس وقت میری نظر میں وہ خاص انسان بن گیا تھا۔ اسے قتل کروا گیا تھا یہ اس پر تو ایک ظلم تھا ہی لیکن اس کے خاندان پر بھی بہت برا ظلم تھا۔ اس وقت میرے اندر شاید گداز کا موسم تھا۔ وہ ایک ساکت تصویر اور اخباری فچر گویا مجھے اس گیا۔

میرے اندر کا موسم اتنا عجیب تھا کہ مجھے یہ بھی پتا نہ چلا کہ غیسو خان کب آخر میرے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی محسوس کر لیا کہ میں اس نمایاں ترین تصویر اور رپورٹ میں اٹھا ہوا تھا۔

میں اس وقت چونکا جب اس نے اخبار میرے ہاتھ سے اچک لیا اور اسی رپورٹ پر نظر دوڑاتے ہوئے میرے سامنے آکر بیٹھا۔ ذہن بڑی دوائی سے وہ پوری رپورٹ پڑھتا چلا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ چھانکھا ضرور تھا۔

پوری دھڑل پڑھ کر اس نے بغور میری طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس رپورٹ کو اتنی محنت سے کیوں پڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اخبار میرے پچھلا کر اس پر نظر پڑا کر بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اس گروپ فوٹو سے صرف اس لڑکی کے چہرے کو گھور رہا تھا۔

آخر اس کی سوچ اس کے ہونٹوں پر چبکی جو میرے اعدائے سے بہت مختلف تھی۔ لڑائی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے وہ بولا "وہ اچھا ہے۔ اور اس کے حالات بھی ہمارے حق میں بہت اچھے ہیں۔ ان حالات میں تو ہماری ایجنٹ جہاں اس لڑکی کو بڑی

بالکونی میں تلاش کر رہا تھا۔

پھر وہ نشتے میں سٹائی ہوئی سی زبان کے ساتھ سوتی سوتی گالیاں دیتے ہوئے گر جا۔ ”کمال گئی سالی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے تو آن میں گتوں کے آگے پھینکواؤں گا۔“

اس وقت تک عورت دھڑ دھڑ میڑھیاں اتر کر پیچے آ پہنچی تھی۔ ہم میڑھیوں سے زیادہ دور نہیں تھے عورت غیسو خانہ کی طرف لپکی آ رہی تھی۔ وہ دھڑ دھڑ اس وقت ہال میں خدمات انجام دے رہے تھے اپنی اپنی ٹرے میڑوں پر رکھ کر اپنی میڑوں سے فی ٹی ہاسٹل نکال چکے تھے اور بالکل اتر آئے لیکن شاید وہ غیسو خانہ کے حکم کے منتظر تھے اپنی اپنی جگہ راکت کھڑے تھے۔ آخر غیسو خانہ بھی بالکل ساکت کھڑا عورت کو اپنی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ ہال میں سکوت چھایا تھا۔ لیکن عورت غیسو خانہ کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر بد عواسی میں پھنکی۔ ”بھانڈے بھانڈے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ نہ جانے کس چیز سے غصہ کرکھا کر گر پڑی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ مرد اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے ٹھکر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کرتے ہی وہ زیادہ بد عواسی سے پھنکی۔ ”بھانڈے بھانڈے۔“

غیسو نے ہاتھ بڑھا کر اسے بازو سے پکڑا اور یوں اٹھائیا جیسے وہ بڑے سائز کی گویا ہو۔ حالانکہ وہ ذرا بھاری تن و فٹ کی عورت تھی لیکن یہ بھاری پن مناسب جیسوں پر تھا اور اسے ایک الگ انداز کی خواہشوں کی بخش دیا تھا۔ غیسو نے نہایت آہستگی سے اسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے ڈانٹا۔ ”جیسو مت۔ تم تو ابھی بجلی چولہے کو کھنکھات ہو۔ یہ ایک دم تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اس کا چہرہ قطعی تر سکون تھا۔ سنی ایک اس نے تیز پر رکھ دیا تھا۔ اس کی نظر بالکونی کی طرف پھنکی۔

”عورت اچھے ہونے والی۔“ عادل شاہ پاگل ہو گیا ہے شاید۔ اس نے تو مجھے تقریباً باری دیا تھا۔ تم لوگوں کو شاید پتا بھی نہ چلا۔۔۔ دوپٹے کا بھندا اس نے ہانک سی میرے گلے میں ڈال دیا تھا۔“

وہ ایک بار پھر اپنی گردن مٹنے لگی۔ میں نے دیکھا اس کی مرضیں گردن پر سرخ حلقہ نمودار ہو چکا تھا۔ ”بات کیا تھی؟“ غیسو نے اس کی طرف دیکھے بغیر پھر سکون لیے میں پوچھا۔

عورت دشت زدہ نظموں سے ہنسنے کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسی جیسی سی آواز میں بولی۔ ”بات معمولی سی تھی۔ لیکن تا۔ والی نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی سے پانچ نہیں کت بات پر غار کھا ہوئے تھا۔ میرا ذرا سا انکار نہیں کر آپ سے باہر ہو گیا۔۔۔ اے نے دھوکے سے میرے گلے میں دوپٹا ڈال دیا تھا۔“

اس دوران وہ غصے میڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہنگلے سے ہانک کر اس نے آنکھیں چاڑ چاڑ کر کھینچے دیکھا۔ اس

غیسو خانہ کے قدموں کی دھک سن کر میں نے اخبار ایک طرف کھٹکا دیا۔ غیسو نے میز کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر تصویر کی طرف دیکھا۔ کھینے ہالوں میں گھرے ہوئے اس کے ہونٹ ہوس زدہ سے انداز میں پھیل گئے، آنکھوں میں نشہ سا اتر آ۔ وہ جب سے کمرے سے واپس آیا تھا پورا آسودہ سا نظر آ رہا تھا لیکن اب جیسے ایک بار پھر بیا سانیخا سا دکھائی دیتے لگے۔ مجھے معلوم تھا تصویر میں اس کی نظر صرف لڑکی کے چہرے پر تھی۔

ایک بار پھر وہ خود کالی کے انداز میں بڑھایا۔ ”وانہ اچھا ہے۔۔۔“

میرا دل چاہا کہ اسی وقت اس کی گردن دھونچ لوں اور اس وقت تک دبا آ جاؤں جب تک اس کی آنکھیں مٹلوں سے باہر نکل کر اس کے چہرے پر نہ انگ آئیں۔ لیکن ایک بار پھر میں نے اپنے آپ پر ضبط کر لیا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا اس کے لیے مجھے مناسب موقع کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت تک میری معلومات میں مزید نہ جانے کتنا اضافہ ہو سکتا تھا۔

غیسو کے کندھے پر اب ایک چھوٹا سا سفری بیگ نظر آ رہا تھا۔ اس میں یقیناً رقم کا بیگٹ اور شاید کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ وہ بیگ کے لیے تیار تھا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ پہنچے بغیر کہ کہاں جانا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ رقم بچانے اور اپنے دوسرے کی رپورٹ دینے جانے کو ڈیرے پر جائے گا جو ایک طرف سے ان کا بیگ گوارا کرتا تھا۔

غیسو ابھی الی پر ایک الوداعی سی نظر ڈال رہا تھا کہ بالائی قطار کے ایک کمرے سے ایک ٹھنی ٹھنی سی چیخ سنائی دی۔ دو واہ بند ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی گھٹ کر رہ گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے دو واہ کھل گیا۔ بالائی کمروں کی ہنگلے دار بالکونی سے میں اوپر کا منظر آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک عورت لڑکھاتی ہوئی کمرے سے نکل دی جنھیں بارہی تھی۔ وہ کچھ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اس کے جسم پر لباس نامعقول تھا لیکن اس وقت اسے لباس کی نہیں شاید اپنی جان کی فکر تھی کیونکہ وہ بالکونی کے راستے میڑھیوں کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔ بالائی کمرے صرف چند میڑھیوں کی بلندی پر تھے۔

دوسرے ہی لمحے۔۔۔ لہذا رنگ اور قدرے بھاری جسم کا ایک پتلا العصر مرد بھی لڑکھاتا ہوا کمرے سے برآمد ہوا۔ عورت کا دوپٹا اس کے ہاتھ میں تھا جس کا اس نے پھندا بٹا رکھا تھا۔ وہ عورت غالباً اسی پھندے سے اپنی گردن آزاد کرنا کر نکل کے بھاگی تھی کیونکہ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک گردن پر تھا۔

مراہیقہ نشتے میں ڈوبت تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ عورت میڑھیوں کی طرف بھاگ چکی تھی۔ وہ اب بھی دوپٹے کا پھندا اس کے گلے میں ڈالنے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھانے کیے اسے



اردو کے خوبصورت شاعر اکبر الہ آبادی  
سے لے کر آج کے دور کے جانے  
پچانے شاعروں کا منتخب اور دلچسپ  
طریقہ کلام۔۔۔۔

اردو کی طریقہ شاعری

☆ --- جماعی

قیمت: 75/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

میں چہ کر صرف عورت کو تلاش کر رہی تھیں شاید اس لیے  
سے صرف عورت ہی نظر آئی۔ اس کے دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ  
اس نے غمخیز خان کو نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ شاید اس کی بد قسمتی  
کی بنا۔

وہ جگہ پر پہنچے ہوئے ایک بار پھر مندی گا لیاں دیتے ہوئے  
پلایا۔ "وہاں چھپی بیٹی ہے۔۔۔ ابھی تجھے سمجھ کر آہوں۔۔۔  
نہی یہ جرات۔" وہ منکلمات کہتے ہوئے بیڑیوں کی طرف  
بڑھا۔

میں ایک ستون کے قریب ساکت کھڑا تھا۔ غمخیز میری طرف  
مڑتے ہوئے چمک سکون لیے میں بولا۔ "دیکھ رہے ہو؟ ٹہنی زندگی میں  
تمہارے عزیزین اور شرفا کی یہ حالت ہوئی ہے۔ کافی برا اور مسرور  
زمیندار ہے یہ غلطی میں بڑی عزت ہے اس کی۔ عادل شام۔  
ادرس۔" اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے عمارت سے  
فرش پر قنوک دیا ہو لیکن وہ حقیقت اس نے تو کتا نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ عادل شاہ خیر عافیت مجھے نہیں پہنچ سکے گا  
اور بیڑیوں سے لڑھک جائے گا لیکن وہ جنگا پڑ کر بیڑیوں سے  
نیچے اتر آیا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کا بیڑیوں سے اتر  
آنا کسی کارنامے سے کم نہیں تھا۔ غمخیز نے اتنی جگہ سے قطعاً  
حرکت نہیں کی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے وہیں کھڑا انتظار کر رہا  
تھا۔ اسے گویا یقین تھا کہ عادل شاہ سید حاسی کی طرف آئے گا۔

عادل شاہ لڑکھڑاتا ہوا واقعی اس کے قریب پہنچا۔ بالکل اسی  
طرح پیسے کھسی بے خبری میں کھسکی ہوئی مرنی کے بال کے قریب جا  
پہنچتی ہے۔ اس بد بخت کی نظر ابھی تک غمخیز پر نہیں پڑی تھی  
حالانکہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھ رہا تھا لیکن اسے شاید  
عورت کے سوا کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ کچھ اور قریب پہنچا تو غمخیز خان کا بازو اچانک کچھ اس طرح  
حرکت میں آیا جیسے کسی شیشی کا اسپرنگ ٹوٹ گیا ہو۔ اتنے زور کا  
چھپر عادل شاہ کے منہ پر پڑا کہ ہال میں ناز کی سی آواز گونج کر سن  
گئی۔ وہ "دع" کی زوردار آواز کے ساتھ دور جا کر گرا اور وہیں  
ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ کہیں ایک ہی چھپر میں اس کی مدد  
فرضی غصی سے بڑا تو نہیں کر گئی لیکن پھر میں نے اسے حرکت  
کرتے دیکھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئی  
تھیں اور ہونٹ خون میں لتھڑ گئے تھے۔

غمخیز خان لمبا سا ڈنگ بھر کر آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر  
خاموش غیظ و غضب کے آثار تھے اس نے جھک کر اس اچھے  
نکلتے ذیل ذیل کے آدمی کو گردن سے پکڑ کر وہیں ایک جھگے سے اٹھا  
لیا جیسے وہ سب سے سلف کا کوئی چھوٹا موٹا تھا۔

عادل شاہ کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں اس کا جواب  
غمخیز خان کے چہرے سے یہ مشکل دوا کچھ دور تھا اس کے حواس

پلے ہی ٹھکانے میں تھے غمخیز کے منہ توڑ قسم کے چھپنے بیٹھا  
اس کے حواس کچھ اور متعلیٰ کھسکے تھے لیکن اچھا خور تھا کہ اس  
نے غمخیز کو پہچان لیا تھا کیونکہ اس کے منہ سے خرخرات کے  
سے انداز میں غمخیز کا نام برآمد ہوتے ہوئے تھا۔ گردن غمخیز کی  
گرفت میں ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طور پر بول نہیں پاتا تھا۔  
شاہ یہ سانس بھی مشکل سے ہی لے پاتا تھا کہ اس کی  
آنکھیں کچھ پر لمبے حلقوں سے کھلی آ رہی تھیں۔ اس نے غمخیز کی  
گرفت سے گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے  
کوئی پتھر زامی کے جڑوں سے گردن چھڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔

غمخیز نے اس کے دوسرے رخسار پر اٹنے لگا ہاتھ کا ایک اور  
چھپر پھیر دیا۔ پھر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ ایک بار پھر کھڑا  
غمخیز نے اس بار ہاتھ ہلا کر رکھا تھا وہ شاید وہ بے ہوش ہو گیا  
ہوگا۔

اس کا چہرہ خون میں لکھ اور تھمر گیا۔ اس نے سر کو جھٹک کر گویا اپنے حواس کچھ ٹھنکے لائے کی کوشش کی اور پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ "فیسمو! اتیری یہ جرات۔۔۔ اس کے ہونٹوں سے خون کے چھینٹے اڑے۔

فیسمو کے ہونٹ پیچھے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر عادل شاہ کی پٹیلیں پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ ایک جھج کے ساتھ اچھلا۔ فیسمو اس پر جھٹکتے ہوئے کچھ مری چلا گیا۔ "اے فرامزاد۔۔۔ اتنی پتہ ہی کیوں ہو جتنی تم سے جھگڑ نہیں ہوتی؟"

جتنی نے ایک اور ٹھوکر عادل شاہ کے کولہے پر رسید کی۔ وہ درد سے ہلکاتے ہوئے چلا گیا۔ "فیسمو۔۔۔ تو دنگے کی عورت کے لیے عادل شاہ پر ہاتھ اٹھا رہا ہے۔" اسے گویا اس اصولی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

فیسمو عجیب سے انداز میں مسکرایا اور جوتے سمیت اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر ڈرا جھٹکتے ہوئے بولا۔ "بڑی غلط بات کر رہے ہو عادل شاہ! اس اڑے پر کوئی عورت دونگے کی نہیں ہوتی۔ وہ جو بھی ہیں۔۔۔ جھکی بھی ہیں۔۔۔ اپنا کام کر رہی ہیں۔ تمہیں بھی صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ قاتل تم بھول گئے تھے کہ اس اڑے کا زچہ کتنا سخت ہے۔ جیسا قاتل شام نے لگایا ہے اس پر تمہاری سزا تو زیادہ سخت ہونی چاہیے تھی۔ میں تم پر دم کر رہا ہوں۔"

عادل شاہ کمزور آدلی نہیں تھا۔ ٹپے میں نہ ہوتا تو شاید وہ فیسمو خان سے تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ کاپٹی ناگوں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے گویا ابھی تک یقین نہیں تھا کہ فیسمو نے اس کے منہ پر چھڑک گئے تھے۔ وہ شاید ان لوگوں میں سے تھا جنہیں کسی کے ہاتھ سے بھی چھڑکنا ایک ڈراؤنا خواب تو محسوس ہو سکتا تھا لیکن وہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ کسی نے حقیقت میں انہیں مارا تھا۔

"فیسمو۔۔۔ فیسمو۔۔۔ تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔۔۔؟" وہ اپنے چہرے سے خون پر غصہ کر تھمرے ہوئے ہاتھ کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"ہاں۔۔۔ میں نے بڑی غلطی کی۔" فیسمو نہایت بر سکون لہجے میں بولا۔ "یہ کام میرے شاہانِ شان میں تھا۔ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

اس نے اشارے سے ان دونوں قوی المیہ نوجوانوں کو بلایا جو ہال میں دیگر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ بائبل لے کر الٹ کھڑے تھے۔ اس کا اشارہ پا کر مستعدی سے قریب آ گئے۔ فیسمو نے انہیں حکم دیا کہ اس کے منہ پر ٹھوکر۔

دونوں نے نہایت سعادت مندی سے ایک وقت عادل شاہ کے منہ پر ٹھوکر دیا۔ اب تو عادل شاہ کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی۔ اس نے اپنی نیچھی کچھی توانائی جمع کرتے ہوئے جھٹ کر ایک دیگر نوجوان سے بائبل چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ ان

معاملات میں اتنا اپنا ڈی نہیں تھا۔ اس نے جھٹکی دے کر ہاتھ پکڑ کر لیا۔ عادل شاہ بائبل کو چھوٹی ہتھکڑی سے۔

دوسرے نوجوان نے اس کی ٹھوڑی پر چٹا چھوڑا رسید کیا۔ وہ ایک بار پھر دم سے گر پڑا۔ اب گویا اس میں دم ختم ہو گیا۔ وہ بے ہوش تو اب بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس نے آنکھیں کی کوشش نہیں کی۔

فیسمو نے دونوں نوجوانوں کو حکم دیا۔ "۳ سے ڈنڈا اڑائی کرنا باہر لے جاؤ۔ اس کی گاڑی میں ڈالو اور تم میں سے کوئی ایک گاڑی ڈرائیو کر کے اسے سڑک تک چھوڑ آئے گاڑی سڑک تک کنارے کھڑی کر کے تمہیں شاہد کو گھٹے سے اپنی کوئی گاڑی دینا یا گھوڑا لے کر واپس آ جانا۔ اس میں بہت ہوگی تو ڈرائیو کر کے کھڑے چلا جائے گا ورنہ کوئی اسے پکڑا دے گا۔ جو بھی اس کی قسمت میں ہوا وہ ہوا جائے گا۔"

دونوں نوجوانوں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور بائبل جیبوں میں رکھتے ہوئے جھٹ کر ایک دم ہی عادل شاہ کو نہایت مثالی و مہارت سے ڈنڈا اڑائی کرتے ہوئے اٹھا لیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی لیکن فیسمو کی طرف دیکھ کر خروانی سی آواز میں بولا۔ "میں تمہیں چھوڑ دوں گا نہیں فیسمو! میں یہ اڈاؤں کر دوں گا۔ اور تمہیں بھی دیکھ لیوں گا۔"

فیسمو نے ایک دم جھٹ کر اس کے گریبان کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے جھٹک دیا اور بولا۔ "فرور دیکھنا۔ لیکن مجھے دیکھنے سے پہلے اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو ضرور دیکھ لیتا۔ دو لڑکے ہیں۔ اور ایک لڑکی ہے جس کی آنکھیں انگریزوں کی طرح نیلی ہیں۔ میں ٹھیک کر رہا ہوں؟ تم انہیں ڈنڈا دیکھنا چاہتے ہو؟ اس کے علاوہ تمہاری ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ کراچی میں میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ ڈینٹس میں رشتہ داروں کے ساتھ رہتی ہے۔ بچے کا نمبر بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ تمہاری اس کے بارے میں بھی پتہ چلے گی خرائش ہوگی کہ وہ ڈنڈا رہے۔ اور عزت و تہجد کے ساتھ ڈنڈا رہے۔ میں ٹھیک کر رہا ہوں؟"

عادل شاہ کو جیسے سانپ سو گھ گیا۔ فیسمو اس کے گریبان کو ایک اور جھٹکا دے کر سانپ کے سے انداز میں پکڑا رہا۔ ایک اور اہم بات تو میں تمہیں بتانا بھولی ہی گیا۔ ہمارے پاس تمہاری کچھ تصویریں ہیں۔ بہت قیمتی تصویریں ہیں۔ تم سیاست میں بھی توجہ دارتے ہو؟ ابھی سیاست میں تمہارا کوئی مقام نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ تصویریں ہم نے کچھ خاص خاص جگہوں پر پھانسیں تو سیاست میں تمہارا مقام راتوں رات اتنا اونچا ہو جائے گا کہ تم خود بھی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکو گے۔ کچھ سمجھ میں آیا؟"

عادل شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اس میں اب آنکھیں کھلی رکھنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ فیسمو خان نے پکڑی بجائی۔ دونوں نوجوان عادل شاہ کو

# تاریخی ٹاول

|       |                |                |
|-------|----------------|----------------|
| 100/- | الماس ایم۔ اے۔ | ایلیس مصر      |
| 125/- | الماس ایم۔ اے۔ | حسن بن صباح    |
| 150/- | الماس ایم۔ اے۔ | راجکاری        |
| 250/- | الماس ایم۔ اے۔ | نور الدین رنگی |
| 150/- | الماس ایم۔ اے۔ | سلطان عادل     |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

اے اس موٹی سی دیواری طرف بڑے جس میں مشعل شگاف رہا تھا۔ گورنر نما عائد اس شگاف سے جھانک کر دلچسپی آمیز لڑ میں۔ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

دھنسا فیسو کو جیسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ایک بار پھر نوجوانوں

رکنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر عادل شاہ کی جھینٹ ٹٹولنے لگا۔

ہاں کی داکٹ کی جیب سے اس نے دیکھی ایک مٹری چالی نکالی

پہی چالی سے وہ خود دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ وہ چالی اس نے

جی جیب میں رکھی اور عادل شاہ پر ٹھٹکے ہوئے بولا۔ ”میں معلوم

میں تھا کہ تم اتنے کم حرف انسان ہو عادل شاہ ہم تمہارے

اے میں یہ شخصیت ملی سے بات کریں گے جس نے ہمیں مہر

شب دلائی تھی۔ کبھی کبھاری میں تم جیسا کہی کرتے مہر تھا ہے۔“

عادل شاہ کسمپاسا لیکن خود مند نوجوانوں نے اسے دو چا ہوا

تھا۔ فیسو پکڑنے کی سی کے سے انداز میں مزہ بولا۔ ”تم ہمارا سب

سے اہم اصول بھی بھول گئے۔ کہ جب تک ہمارے ساتھ رہو“

چے دو خوں کی طرح رہو اور جب ساتھ چھوڑنا ہو تو خاموشی سے

چالی واپس کر کے عزت داروں کی طرح رخصت ہو جاؤ۔ تماشا

لگانے والوں کو تو ہم بنائیں تماشا بنا دیتے ہیں۔“

اس نے ہاتھ نیچے لے جا کر عادل شاہ کی کمر میں ٹھونکنا سیر

کیا۔ عادل شاہ تپ کر ایک لمبے کے لیے اور کو کمان کی طرح اٹھ

کر رہ گیا۔ پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ نوجوانوں نے اسے اپنی گرفت سے نکلنے

میں دیا تھا۔ الوداعی ٹھونکنا سیر کر کے فیسو کو اطمینان ہو گیا اور

اس نے نوجوانوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

ہال میں بدستور ٹانا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اپنی جگہ سے ہٹنے

اور اس کا رد واپس میں دراخت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

فیسو میز پر واپس آگیا اور حور سے مخاطب ہوا۔ ”مگر میں

واپس جاؤ اور اپنی حالت ٹھیک کر۔“

وہ عورت اٹھی اور واپس اوپر چل دی۔ اب اس کی حالت

صنبل چکی تھی۔ اندر سے ایک اور نوجوان نے ہال میں آکر وٹ

کے فرائض نبھال لیے تھے۔ فیسو نے اس سے اپنے لیے لٹری

بیکر کا ایک گلاس منگو لیا اور بیڑی منگوا کر بیٹھ گیا۔

اس نے مجھے بھی پیٹنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”مسلے نے دماغ

مگرم کر دیا ہے۔ اب ذرا دماغ کو ٹھنڈا کر لیں تو پھر چلیں گے۔“

بانی سب لوگ بھی دھیرے دھیرے دیوان اپنے مشاغل کی

طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ کچھ کمرہ کے دروازے بھی تھوڑے

تھوڑے کھل چکے تھے اور ان سے مختلف چہرے جھانک رہے تھے۔

اب وہ دروازے بھی دیوان بند ہو رہے تھے۔ پر سکون جمیل میں ذرا

دیر کے لیے جو اہل پیدا ہوئی تھی وہ اب معدوم ہو رہی تھی۔

چند لمبے بعد بیکر کا سستا ہوا سا گلاس آہنچا۔ فیسو خان نے

نمائت اطمینان سے اسے ختم کیا۔ اس نے اس دوران ٹھنڈے پانی

کا ایک گلاس پیا۔ اس وقت تک ہال میں سب کچھ معمول پر آچکا

تھا۔ پھر کا گلاس ختم کر کے فیسو کے شب تاریک سے چہرے پر کچھ

روشن چمکی۔ اس نے بڑی کو اٹھیں ٹٹولنے میں مسلا اور پٹنے کے لیے

انگوٹھ کھڑا ہوا۔ مٹری بیک انفا کر اس نے کندھے پر ٹھٹکایا۔

جس راستے سے ہم اندر آئے تھے اسی سے واپس باہر آئے۔

ہمارے گھوڑے وہیں موجود تھے جہاں ہم نے انہیں چھوڑا تھا۔ دو

راکتی برادوں کو میں نے اب بھی درختوں کے درمیان ٹھٹکے

دیکھا لیکن یہ وہ نہیں تھے جنہیں میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ معلوم نہیں

یہاں کتنے افراد باری باری ڈھولی دیتے تھے۔ کئی جگہ میں بہت سی

گاڑیوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

ہم واپس اسی طرف چل دیے جو حور سے آئے تھے۔ رات

اپنا دامن پھیلا چکی تھی لیکن آسمان پر غریب کے لباس کی طرح

ادھورا سا چاند موجود تھا۔ رصدی دھندلی چاندنی میں خاصی دور تک

کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ فیسو خان گلت میں نہیں تھا۔

گھوڑے کو دوڑی چلا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ان گنت سوالات

ڈبک بار رہے تھے مگر میں پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ

جتنی نظر نہ آئیں۔ زیادہ جتنی نظر نہ آئے تھے۔ ٹھٹک رہا تھا۔

لیکن چند لمبے بعد فیسو گویا ایک انسانی سی سرت محسوس

کرتے ہوئے ایک نظر مجھے دیکھ کر خودی فٹ سے بولا۔ ”کوئی سوچ

بھی نہیں سکا کہ یہاں کوئی ایسا اڈا موجود ہے جس سے میں

لاکھوں روپے مینے کی آمدنی ہے۔ وہ بھی لوٹ مار اور کل وقارت

کے بغیر۔“

اس نے وار طلب سی فٹوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے

سکراتے ہوئے اس کی تائید میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”مکی علاقے کی

پولیس کی حدود میں اس قسم کا اڈا عادتاً تو نہیں بھاری ہوتا ہے۔

ہے۔ وہ ایک طرح کے پارٹر ہو جاتے ہیں۔ اور پارٹر بھی

خطرناک قسم کے جیسے مگر کہ بھڑکی ہوئے ہیں جو کبھی لگاؤ کا

دیتے ہیں۔ ان پر زیادہ سختی آتی ہے تو کبھی کبھی وہ اپنی سر سرتی میں

لاتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

پھر ایک لمحے کے لیے ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ "جانو نے ہی یہ سارا سسٹم سیٹ کیا ہے۔ لیکن یہاں آنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے پیچھے جانو ہے۔ ہر حال مہسوں پر دہشت قائم ہے اگر وہ کبھی اس کا راز افشا کرنے یا اسے نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچیں۔ کیونکہ اس میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ اچھا بھلا پہننے خان ہوتا ہے۔"

پھر اس نے اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے کچھ اور قریب لاتے ہوئے گویا جہری معلومات میں اضافہ کیا۔ "اس کا نام 'گولڈ کی کلب' ہے۔ یورپ 'امریکا وغیرہ کے شہروں میں کی کلب ہوتے ہیں لیکن اتنی رنگینیاں وہاں بھی نہیں ہوتیں جتنی جانو نے یہاں جمع کرائی ہیں۔"

"پچھا۔؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھلپھلائیں۔ وہ سر ہلا کر بات چاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمت خاص خاص اور مجھوسے کے آدمی چھنے کے بعد انہیں ممبر شپ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں کلب کے دروازے کی چابی ملے دی جاتی ہے۔ باہر کے گلوں میں تو لوگوں نے لپاڑے اس قسم کے جو چھوٹے موٹے کلب بناتے ہیں، ان میں تو کوئی بھی چابی لے کر دروازہ کھول کر اندر آسکتا ہے لیکن ہمارے ہاں شرطیں ذرا اور سخت ہیں۔ ہر ان چینگ بھی ہوتی ہے۔ ممبر اپنی چابی کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ البتہ کسی کو ممبر بنانے کی سفارش کر سکتا ہے۔ اس کی سفارش پر اچھو طرح چھان بینک کرنے کے بعد ممبر شپ دی جاسکتی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر وہ نظریے سے انداز میں مسکرا پھر بولا۔ "گولڈ کی کلب کی ممبر شپ بہت مہنگی ہے۔ صرف ممبر شپ ہی نہیں۔۔۔ اس کے بعد یہاں آنا جانا 'الٹا چیتنا' بھی بہت مزا ہے۔"

اس کے باوجود اچھے خاصے لوگ نظر آ رہے تھے۔ اتنے زیا ممبر کیسے ہونے لگے؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ اس کے بلند آنکھ تھمتے سے فضا سرخس ہو کر رہ گئی۔ "مگر میں بڑی لذت اور کشش ہے۔ ٹانگی اور مہارت کی دعوت دہ والے اپنے ٹھکانوں پر ہر آرام مہیا کرتے ہیں۔ نیچے لگاتے ہیں قالین بچاتے ہیں۔ وہاں جانے میں کوئی ڈر کوئی خوف بھی نہیں ہوتا بلکہ دیکھنے والوں کی نظر میں عزت بڑھتی ہے۔ اس کے باوجود وہاں کم لوگ چلتے ہیں لیکن جس 'ہیروئن اور ہیڈ گارڈ' کے اڈور لوگ کھوں کی طرح بٹوسکتے ہوئے 'لوگوں کی نظروں سے چھپچھپاتے جوتی در جوتی بچے جاتے ہیں' خواہ اس کی کوئی پہلٹی نیچہ راستہ کتنا ہی مشکل ہو اور خواہ وہ ٹھکانا کیسے دور دراز مقام گندے نالے یا کچرا گھر کی بٹل میں واقع ہو۔ یہ تو پھر بھی ہا متعلق 'آرام' اور پھر سکون جگہ ہے۔" اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

کام کرنے والوں کو بھی قربانی کا مرتقا بنانے ہیں۔"

اس نے کھلی فضا میں غالباً آزادی کے احساس سے ایک مہری سانس لی اور سرور لیے جس بولا۔ "مگر میں جیتے و میوے کا کوئی چکر نہیں۔ ہر وقت پولیس کی کھوار بھی سر نہیں ہٹتی۔ زمین سرکار کی ہے لیکن یہاں مالک صرف ہم ہیں۔ یہاں کوئی آکر ہم سے کچھ پاچھے کی جرات نہیں کر سکتا۔ دیکھو بھی ادھر سے برسوں کسی عام اور ناواقف شخص کا گزر نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو لوگ ددردی سے دیکھ کر اسے کوئی چھوٹا موٹا جھک جھک کر کترا کر گزرتے ہیں۔"

"جگہ دیکھو تو لوگوں کو خوب ملی ہے۔" میں نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔ میں حد سے زیادہ خاموش رہ کر بھی خود کو مشکوک بنانا نہیں چاہتا تھا۔

"بہنیں تو دنیا کے کونے کونے میں نہ جانے کسی کسی مسوور ہیں لیکن اصل کام تو کسی جگہ کا کار آمد بنانا اور اس کا انتظام بہترین طریقے سے چلانا ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑے صارف کی ضرورت ہوتی ہے۔ صارف کی۔" اس نے اپنی کھینچی پر انگلی ماری۔

پھر اس کے لہجے میں مضبوط جھٹک آئی۔ "دور دراز اپنے جانو کے پاس بہت برا ہے۔ بڑے کمال کا صارف جاتا ہے اللہ نے اسے۔ اس کا نام سن کر لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی ان پڑہ بہت جاہل دہائی ہو گا لیکن وہ بہت بڑا کھلا ہے۔"

پھر وہ بڑے سرور سے انداز میں مسکرایا۔ اس کا ذہن گویا مرکزہ دھڑکنے کی بھل بھلیوں میں بیٹھ رہا تھا۔ ایک لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ "ان دنوں ہمارا کردہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور ہمارے پاس دولت بھی زیادہ نہیں تھی جب ایک واردات سے واپس آئے وقت رات کی طرفانی بارش کے دوران اتفاق سے ہم نے اس کھڑکے کا خانہ دریافت کر لیا تھا۔ اس وقت یہ اتنی اچھی حالت میں نہیں تھا لیکن بہت بڑا تھا اور اس کی بخاوت بڑے کام کی تھی۔"

"خواہ۔" میں نے خواہ خواہ سر ہلایا۔

"جانو کے ذہن میں اسی وقت اسے استعمال کرنے کا آئیڈیا آیا تھا۔" تبسیر نظریے لیے جس بولا۔ "اس وقت کھڑکے گرد زیادہ درخت بھی نہیں تھے اس جنگل کو ہم نے بڑا کیا ہے۔ سیکڑوں مزید درخت لگائے ہیں۔ جس وقت جانو نے آئیڈیا دیا تھا اس وقت کسی کو بھی امیر نہیں تھی کہ اس پر عمل ہو سکے گا۔"

"کافی محنت کرنی پڑی ہوئی اس جگہ کو سیٹ کرنے میں۔" میں نے خیال لگا کر کہا۔

"ہمارے کام ہم لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کیے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی کام آتا ہے۔ اپنے خاص خاص ٹھکانوں پر اکثر کام ہم خود ہی کرتے ہیں۔ رازداری بھی رہتی ہے اور جن دنوں فرصت ہو ان دنوں وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے۔ اگر زیادہ ہی کسی کی ضرورت آئے پڑے تو اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر

### طنز و مزاح

مظفر بخاری - 125/-

مظفر بخاری - 75/-

مظفر بخاری - 90/-

مظفر بخاری - 100/-

مظفر بخاری - 100/-

مظفر بخاری - 200/-

چچ در چچ

قصہ مختصر

ایک سوا ایک (کالم)

گستاخی معاف

ایک سونو (کالم)

چچ کو چلے

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور نمبر 2

اس کے باوجود میرزا کی اتنی تعداد حیرت انگیز ہے۔ میں

لے گیا۔ "یہ کوئی پورے ممبر تو نہیں تھے" فریو گویا میری حیرت سے

ملاحظہ ہوتے ہوئے اس کہہ دیا۔ ایک وقت میں تو آدھے سے بھی

کم ممبر موجود ہوتے ہیں۔ سارے تو ایک وقت میں جمع ہوتے ہیں

لیکن کوئی کبھی ہوتا ہے کوئی کہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی مصروفیات

ہوتی ہیں۔

"پھر بھی اس دورے میں اتنے لوگ کہاں سے آجائے ہیں؟

یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے حیرت کا اظہار جاری رکھا جو کافی حد

تک جیتی رہی تھا۔

"تم شاید غلطی سے زیادہ اچھی طرح واقف نہیں ہو۔" وہ

ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "میں جانتے ہیں کہ میرے نظریات ہیں

اتنی ہی زرخیز ہیں جیسا کہ اوپر کے ساتھ شریک کے غلطی سے

چھوٹے بڑے زمیندار سمجھے ہوئے ہیں۔ اکثر زمینداروں کا کسی

نہ کسی شہر میں بھی مکان، ٹھکانا اور دوسری جائیداد یا کامیاب اپنی

اپنی حیثیت کے مطابق موجود ہوتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"ان شہروں میں جو بھی مشکل کیلئے میسر ہوں ان سے تو وہ لطف

اٹھاتے ہی رہتے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ عرصہ انہیں اپنی زمینوں پر

دناؤں میں بھی رہنا ہی پڑتا ہے۔ چھوٹے زمینداروں کو زیادہ رہنا

پڑتا ہے اور ان بھگیوں پر عیاشی یا تفریح کے کچھ زیادہ ذرائع میسر

نہیں ہوتے۔ سوائے اس کے کہ گھر میں بیٹے کر رہی ہوں۔

کسی ایسی دیکھنا۔" اس کی حیثیت کی لڑکی پر ہاتھ ڈال لیا لیکن ظاہر

ہے ان بھگیوں میں ان کے لیے کوئی خاص لطف نہیں ہوتا۔

ایڈووکیٹ نہیں ہوئے۔ ذرا اچھی قسم کی چیزوں تک ان کا ہاتھ نہیں

پہنچتا۔ پھر وہاں ہونے والے بچے بھی ہوتے ہیں، گاؤں دیہات کے لوگ

بھی ہوتے ہیں۔ بعض کا بار سالی کا عرصہ بھی ہوتا ہے۔ سو بھائی سو

مسائل ہوتے ہیں۔ گولہ کی گولہ ان کی رسائی سے زیادہ دور بھی

نہیں ہے اور یہاں وہ دنیا کی ہر گھر سے بے نیاز ہو کر آتے ہیں۔"

میں نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بارے

میں میرے اعزاز کے کافی تیزی سے تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ اس

کا پاس تو جو کچھ تھا سو تھا خود بھی مجھے اتنا کوڑھ مغز چاہی اور زرا

جانور معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسے تو انسانی نفسیات کی باریکیوں کا

بھی علم تھا۔ یا پھر شاید ان لوگوں نے جانو کے ذریعہ یہ سیکھ کر ڈاکٹری

اور فنل دھارت کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔

اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "چھوٹے سے چھوٹے

زمیندار کے پاس بھی کافی مدد ہوتا ہے اور چونکہ ان لوگوں کو

کمانے کے لیے خود اپنی جان نہیں کھانی پڑتی، اس لیے ان کے

پاس وقت بھی کافی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ طبقہ سیاست میں زیادہ

حصہ لیتا ہے اور کبھی کبھار اس کا سوا نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے یہ

لوگ جو کچھ ہمارے اڑے پکڑتے ہیں، اس کی کسر کہیں نہ کہیں

سے نکال لیتے ہوں گے۔"

پھر وہ میری سانس لے کر بولا۔ "میں زمینداروں کی دیکھا

دیکھتا ہوں۔ صنعت کار، سرکاری اہل کار۔ کوئی بھی کم نہیں ہے۔

یہ سب لوگ ہم سے بڑے ڈاکو ہیں۔ ہمارا تو نام زیادہ بدنام ہے۔

زیادہ بڑے ڈاکو تو معزز لوگوں والے لباس پہن کر اچھے اچھے

دفتروں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ بہر حال۔ ہمارا واسطہ زیادہ تر

زمینداروں سے ہے، اس لیے ہم انہی کی بات کرتے ہیں۔ ہم نے

ان کے لیے ہر تفریح کا بندہ دست کر رکھا ہے۔ ہر بندہ دن بعد سال

ایک زبردست طور شو ہوتا ہے جو کسی زمانے میں بیوت کے ٹائٹ

کپڑوں میں اور آج کل یورپ ویسٹ میں ہونے والے طور شو سے کم

نہیں ہوتا۔"

اگر میں وہ ٹھکانا دیکھ کر نہ آتا ہوتا تو شاید یہی سمجھتا کہ میں

کسی خفیہ پوست غصے کی باتیں سن رہا ہوں۔ چند لمحے کم گم رہنے

کے بعد میں نے سرسری سے لیجے میں کہا۔ "ممبر بنانے کے لیے

لوگوں تک رسائی کیسے ہوتی ہے؟"

"شہر میں ذرا مسئلہ تھا، اب تو خود ہی ایک بھڑکے چچے

دوسری بیوی چلی آ رہی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "وہیں بھی جانو

کو کسی بھی چیز کا نظام چلانے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ امریکا

کے بڑے مسائل کے گرد ہوں سے وہ کیا سب سے بڑا کام سیکھ کر آیا

ہے۔ ہمیں شاید معلوم ہو کہ وہ امریکا میں کئی سال رہ کر آیا ہے۔"







### تاریخی ناول

|                        |                      |
|------------------------|----------------------|
| خالد بن ولید           | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| سلطان شیو شہید         | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| نواب حیدر علی خاں      | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| سلطان صلاح الدین ایوبی | الماس ایم۔ اے۔ / 450 |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

زادہ پنچمارے لے لے کر چھیں گے۔ ذرا بج کی اپنی شخصیت کچھ ایسی ہے کہ اس قسم کی کمائی اس سے وابستہ ہوگی تو اس کی منفی کئی گنا بڑھ جائے گی۔ کیا خیال ہے؟ اس نے دو طلبہ کی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ میں نے سکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”جانو واقعی بہت ذہین آدمی ہے۔ اس کے زیر سایہ رہ کر انسان کچھ نہ کچھ بن سکتا ہے۔“

فیصلہ آئینہ میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کمائی پر لوگوں کو اس لیے بھی آسانی ہے یقین آجائے گا کہ وہ زمین جس میں وہ اڑا بنایا گیا ہے کسی زمانے میں ذرا بج کے باپ ہی کی ملکیت تھی۔ ان کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے حکومت نے زرعی اصلاحات کا کافی شور شرابا مچایا تھا۔ دولت والے چالاک تو مت ہوتے ہیں اپنی زمین ہلاکس نے چھوٹی تھی؟ جب نے زمینیں پچائے گا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اگر کسی نے تھوڑی بہت زمینی دی تھی تو بھر اور بے کار زمین کی دہی تھی۔ ذرا بج کے باپ نے بھی وہ بھر اور بے کار زمین چھوڑ دی تھی اور زرعی اصلاحات کے ذرا سے میں تھوڑی سی ٹیک ٹائی کمائی تھی۔“

اب ہمارے گھوڑے ایک خامے اوسنے نیلے پر چڑھ رہے تھے۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ ایک لمبے کے توقف سے بولا۔

”مے ناجزی سے کہا۔ ایک لمبے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”جس رفتار سے ہم نے کام شروع کیا ہے ان حالات میں جانو جیسے آدمی کو اگر پانچ سال اور مل گئے تو اس پورے صوبے میں اس کا راج ہو گا۔ اس کے حکم کے بغیر یہاں پتہ بھی نہیں بے گا۔“

اس کے لمبے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میری رگ و پے میں منفی کی لہری دوڑ گئی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ محض لاف دہی نہیں کر رہا تھا۔ یہاں معاشرے اور نظام کے متوازی بظاہر خاموش سے انداز میں ایک اور ہی معاشرہ، ایک اور ہی نظام تشکیل پا رہا تھا اور کسی کو اس کا کوئی خاص احساس نہیں تھا کہ بلوے طوفان کس طرح پہنچے ہیں اور جو کچھ آندھیلوں کی صورت کس طرح اختیار کرتے ہیں۔ کسی کو شاید مسئلے کی عقل کا احساس ہی نہیں تھا۔ شہر ہولناکیاں بہت بڑے جگہ بیٹھ ایسے لوگ بھی نہ بھی ایک سنگین مسئلہ بن جاتے ہیں جن کے ذہن میں ہے جو نہ تو خواہش ملتی ہوئی ہے کہ ان کے حکم کے بغیر کس پتہ نہ ملے۔ ایک وقت آتا ہے کہ ایسے لوگ سوسائٹی کے طبقے میں چھو بند رہن جاتے ہیں۔ سوسائٹی انہیں نہ تو نگہ کرتی ہے اور نہ ہی انہیں سکتی ہے۔

تیسرے طبقے میں بولا۔ ”ابھی اصل مزے کی بات تو میں نے جسیں بتائی ہی تھیں۔“ اس نے مسکرتی چہرہ ہوا میں اچھال کر وقفہ لگایا۔ ”یہ ہمارا گولڈ کی بلب ہے۔ یہ کسی طبقے سے کم نہیں ہے۔ اس پر قبضہ کرنا تو کیا۔ اس تک پہنچنا بڑا مشکل ہے لیکن اگر کبھی کسی طرح کوئی طاقت اس ٹھکانے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو سکی جائے تو اسے وہاں کچھ ایسے کاغذات اور دیگر ثبوت ملیں گے جن سے ظاہر ہو گا کہ اس آلے کی مالکین حساری و سیاسی ذرا بج ہے۔“

دورانے میں اس کا جتنا سا اقتدار گونج کر رہ گیا۔ وہ مجھ پر یہ انکشاف کر کے گویا بہت سھلکا ہوا تھا۔ میں ایک لمبے کے لیے گھوڑے کی پشت پر ہل دی ہوئی برف کی ایک ریل بن کر دو گیا تھا۔ میرا گھوڑا سیدھا جا رہا تھا لیکن میں گردن موڑے ایک ٹنک فیصلہ خان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کسی وجہ سے میرا گھوڑا ہنستا تو میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ میرا اس قسم کا تو عمل ظاہر کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

فیصلہ بولا۔ ”خدا انخواست اگر کبھی پولیس یا کوئی اور ایجنسی اس آلے تک پہنچے میں کامیاب ہو بھی گئی تو اس کے پاس اخبارات کو دینے کے لیے بڑی رہنمائی۔ بڑی سنگین اور بہت لمبی کمائی ہو گی جسے اخبارات ایک عرصے تک چھاپے رہیں گے۔ سرخشاں گلیں گی۔“ بے شکل حسن کی مالک ایک بہت بڑی جاگیر دار لڑکی ایک انوکھا شہرت کردہ چار دی تھی ”دہاں کیا کچھ ہوتا تھا؟“ اخبار والے اس کی تعصبات پنچمارے لے لے کر گلیں گے اور پڑھنے والے اس سے



نکل جائیں تو بڑے غصہ کے زاکو ثابت ہوتے ہیں۔ وہ خوش دلی سے بولا۔ ”بھئی تم سب لوگ دھماکے دنیو باندھ کر جاؤ گے۔ ساری احتیاجیں جو اس قسم کے کاموں میں ضروری ہوتی ہیں وہ کرو گے۔ ہمیں نہ اٹھا کر دھماتے ہوئے جانے اور نہ بھی بھانٹنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنے کام سے مطلب ہے۔ کام سمجھ کر ہونا چاہیے اور بال ہمارے ہاتھ آتا ہے۔“

پھر وہ گویا مجھے قہری دیتے ہوئے بولا۔ ”تمام احتیاطوں کے باوجود اگر کبھی کسی واردات میں کوئی تھمارا یہ پیارا سا کھنڈا کچھ بھی لے کر برطان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تم ہمارے زیر سایہ آ جاؤ گے تو ہمیں اس قسم کی چھٹی موٹی باتوں پر برطان ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

پھر اس نے گویا میری ڈیوٹی کی فوجیت کا بھی فیصلہ کر دیا۔ ”تم جنگ کا دوا دوا نہ سنبھالنے کے لیے موزوں رہو گے۔ باہر سے کوئی بھی شخص کسی بھی صورت میں اندر نہ آئے پائے۔“

”بے فکر رہو! اگر میں دوا دوا نہ پر تم کر کڑا ہو گیا تو پھر کہاں سے نکلا ہوا تھیں گے؟“ سے نکل ہوئی کوئی بھی اندر نہیں آ سکے گی۔“ میں نے اسے اطمینان دلا کر پھر گویا منالے میں مزید دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ ”جنگ میں کل کتنے آدمی ہوں گے؟“

”چار۔“ فیصلہ جڑا پڑا۔ ”سوئی تو نہ دالا تھل تھل کرنا شہت اور ڈر پرک فیکر۔ ایک سو گھاسا کیشیف۔ وہی بکھ تھڑ طرار سا ہے۔ اسی سے ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی لیکن ہمیں نہیں۔ یہ ہمارے ان آدمیوں کی ذمہ داری ہوگی۔“

”اندرو جانیں گے ایک بے ضرور سا فکر کا شاید انکاؤ شہت ہے۔ ایک قریب الرگ قسم کا کمن مین ہے جو قوڑے دار بدعت سنبھالے ایک طرف بیٹھا اور گنگا رہتا ہے۔ چھٹی سوئی پر انچل پر عام طور پر اسی قسم کے کمن مین دیکھنے میں آتے ہیں جن کی ہندو قہیں شاید پہلی جنگ عظیم کے زمانے کی ہوتی ہیں اور انہیں ”زنگ لگا ہوتا ہے۔“ خصوصاً کمن

ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے فائر کرنے کی کوشش کی تو بدعت پھٹ پڑے گی اور کسی دوسرے کو مارنے کے بجائے وہ خود ہی مارے جائیں گے۔ شاید اسی لیے بے چارے ڈاکے دنیو کی صورت میں فائر نہیں کرتے اور بڑی آسانی سے ڈاکوؤں کے قابو میں آ جاتے ہیں۔ یہ صرف دکانے کے دانت ہیں۔ وہ بھی کھڑا گئے ہوئے۔“

میں ہنس دیا۔ فیصلہ بولا۔ ”جنگ والے بالکل مطمئن اور بے فکر رہتے ہیں کیونکہ ذرا تاج ٹھہریں چھوٹے سونے جھڑوں کے سوا برسوں سے کوئی قابل ذکر واردات نہیں ہوئی۔ وہاں ہم ہی کوئی واردات کر سکتے تھے لیکن ہم نے اب تک اس گاؤں پر نظر کرم رکھی تھی لیکن اب دقت آگیا ہے کہ وہاں کی دولت میں سے بھی آٹھ دس لاکھ کا خراج وصول کر لیا جائے۔“

اس نے ایک اور بڑی ٹٹائی۔ ”خوڑا لوگ کر اس نے بڑی کو ٹٹائی۔ کیونکہ ہوا اب کچھ تیز ہو گئی تھی۔ دور کہیں سے گیدڑوں کی

آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک کش لے کر وہ ٹھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”شاید تمہیں معلوم ہو۔ جنگ کے بعد دوا دوا ہے۔ ایک پچھلی گڑ میں کھلا ہے۔ احتیاطاً ہمارا ایک آدمی اور بھی کھڑا ہوگا۔ وہ گڑ بہت چھٹی اور گندی ہے۔ روزانہ ہم چھٹی لگی اور جری کھڑی کر سکتے۔ فرائز کے لیے تم لوگ جب استعمال کرو گے۔ ایک آدمی ذرا توجہ دے۔“

سیٹ پر ہی موجود رہے گا اور جیب کو اشاریہ نہ لگے گا۔ وہ آدمی اندر جائیں گے۔ پانچویں تم ہو گے جو دوا دوا نہ پر رہو گے۔“

پھر اچانک ہی اس نے پوچھا۔ ”تمہیں ذرا توجہ لگ آتی ہے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ بولا۔ ”لیکن اس واردات میں ہر حال وہی ذرا توجہ لگے گا جس کی پہلے سے ڈیڑی لگ چکی ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہے کہ رقم کہاں لے کر جانی ہے۔ وہ رقم اڑے پر نہیں جائے گی۔“

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”لیکن کسی اندر جی کی صورت میں ذرا توجہ لگ کے لیے تمہاری ضرورت بھی پیش آ سکتی ہے۔“

”میں تو ہر کام کے لیے حاضر ہوں۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”جس جگہ موقع ملتا ہے۔“

”میں سمجھ لو نہیں موقع مل گیا۔“ وہ شامانہ انداز میں بولا۔ ”اس نے اپنی حد تک دیکھا لیکن غور پر اس قسم کے مسئلے میں میرا ”تقرر“ کرنا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے سب کچھ سمجھا رہا تھا اور بدلیات دے رہا تھا۔“

میں نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ ”خلاف تو میرا اپنا ہے۔ لیکن چونکہ مجھے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اور جتنا عرصہ بھی گزرا ہے وہ صرف انڈیا میں ہی گزرا ہے۔ اس لیے مجھے پولیس دنیو کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں چنانچہ تم سے ہی پوچھ رہا ہوں کہ ذرا توجہ میں پولیس کی کیا پوزیشن ہے؟“

”پولیس۔“ کیا ڈر رہے ہو؟“ فیصلہ سے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں ایک دم اس انداز سے لے کر ابھارا تھا کہ میں بزدل قہاریت نہیں ہوں گا۔

”ارے نہیں! یا۔“ میں نے قہر لگایا۔ ”اب اس لائن میں رہتا ہے تو میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”ذرا توجہ میں ایک تھا۔ تو ہو رہا ہے۔ وہ تو تم نے دیکھا ہی ہوگا؟“ اس نے جانا چاہا۔

”ہاں۔“ باہر سے تو دیکھا ہے۔ شکر ہے اندر سے نہیں دیکھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہاں انکو صرف ایک انسپٹر، ایک ایس ایس آئی، ایک محرم اور دو کانسٹیبل بیٹھے ناٹھ کھینچتے رہتے ہیں یا خدائے میں آتی ہوئی حریفانہ ہون کر کھاتے رہتے ہیں۔ وہ بے چارے تو اس جگہ سے بڑے بھڑا رہیں جہاں کوئی خاص واردات نہیں ہوتی۔ وہ تو بد سناشی

کارخانہ رکھنے والے کسی لوگوں کو بھیجی دے چکے ہیں کہ وہ کچھ بہت پکڑیں اور فلا فلا دھندے شروع کریں مگر بڑا کام دکھانے یا فلا فلا دھندے شروع کرنے کی کسی کی بہت ہی نہیں پڑی۔  
 فلا فلا پر ذرا تاج کا کنٹرول کافی سخت ہے۔

”ہاں کیوں ہے؟“ میں نے بڑا امی سے کہا۔ ”میں اس کا کاروبار ہوتے ہوئے بھی اس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ وہ عورت ہو کر بھی اپنا خفیہ کنٹرول قائم رکھنے میں کیسے کامیاب ہے؟ جبکہ وہ اپنی دہشت پھیلانے کے لیے کچھ خاص حرکتیں بھی نہیں کرتی۔ باہر بھی کم چلتی ہے۔“

”مولا تم نے صحیح بات ہے۔“ میں نے آئینہ میں سر لایا۔  
 ”اگر ذرا تاج اس واردات کے لیے آئینہ کی کسی بھی واردات کے سلسلے میں کچھ کرنے میں کامیاب بھی ہوگئی تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔ ہمیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ چار وارداتوں کے بعد خود ہی تمہارا حوصلہ اتار دیں گے تاکہ تمہیں کسی مشورے اور تسلی کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”میں نے غلطی میں سر لایا تو وہ بولا۔“ وہ خود ہانڈا رہے اور دولت کی لاپٹی نہیں ہے۔ یہی ان دو خصوصیات کی وجہ سے وہ فلا فلا پر اپنا خفیہ کنٹرول قائم رکھنے میں کامیاب ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ ایک بار کوئی بڑی واردات ہوگئی اور اس کے ذمے دار لوگ پکڑے نہ گئے تو پھر سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جرم ایک ایسی کشتی ہے کہ ایک بار کہیں اس کا جھ پڑ جائے تو بڑی تیزی سے چلتی پھرتی ہے۔“

اب میرا یہ یقین پختہ ہو چکا تھا کہ وہ اتنا جاہل اور کوڑے مشر نہیں تھا جتنا اپنے سر پر اسے نظر آ رہا تھا۔ جالو جیسے شاطر ہمیں نے پونہ کی تو اسے اپنا نائب نہیں بنا رکھا تھا۔ اس اعتبار سے گویا وہ اور بھی بڑی چیز تھا۔ عیار اور مکار لوگ جب خیانت کے راستے پر نکلتے ہیں تو بہت دور تک جاتے ہیں اور دنیا کو زیادہ آزار پہنچاتے ہیں۔ وہ زیادہ دھت سے ہتھکنڈوں سے دبا کر ستاتے ہیں۔ ان کے ذہن سے کسی شیت سوچ کا گزر نہیں ہوتا۔

میں اس کی باتیں نہ رہا تھا اور میرے تصور میں ذرا تاج کا چھوٹا موصوفہ رہا تھا جس پر صرف طریت کی چاندنی تھی اندیشوں کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ اس سے چاروں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے اندر گرد کیسے خستے جڑ پکڑ رہے تھے۔ کسی کیسی بلائیں اپنے جال بن رہی تھیں۔ وہ اپنے انڈیل انڈیل آدم میں نکلن اور اپنے مصلحت میں منہمک تھی۔

دھت وہ سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ سرکنڈوں کا جنگل سا فخر آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے بہت بڑی دلیل ہے۔ اور وہ بائیں ہاتھ پر اونٹنی اونٹنی پھاڑاں ہیں۔ گھوڑوں کے لیے ان پر چڑھنا۔ اور خاص طور پر جنگل کی حالت میں چڑھنا پھر دوسری طرف احتیاط کا نشانہ ہے۔ اگر ہم ان کے گرد چکر کاٹ کر جائیں تو دسوں میل کا فرق پڑ جائے گا اور اس طرف کا راستہ بھی بڑا ہی غراب ہے۔“

”فیسو کہ رہا تھا۔“ تھانے والے خانہ پڑی کریں گے۔ ریسیائی کا کوئی خاص اثر دوسرخ بھی نہیں ہے جو وہ زیادہ آگے جانے کی کوشش کر رہا۔  
 ”اس کا اثر دوسرخ نہیں ہے؟“ میں نے حیرت اور بے چینی سے پوچھا۔

”مستقل کے ساتھ میں نے یہ سب کچھ ذہن نشین کرتے ہوئے پوچھا۔“ پھر ہم اب کیا کریں گے؟“  
 ”مقتدرت کا کمال دیکھو۔ سرکنڈوں کے جنگل اور پھاڑوں کے درمیان یہاں سے تو کافی فاصلہ نظر آ رہا ہے نا؟ لیکن آگے چل کر صرف ایک پٹی ہی رہ جاتی ہے جو نفوس ہے۔ اپنی سب دلیل ہے۔ تقریباً ایک میل تک وہ صرف اتنی چوڑی ہے کہ اس پر سے ایک گھوڑا گزر سکتا ہے۔ وہ بھی احتیاط کے ساتھ۔ اگر اس کا سب ذرا مایہ دلا تو سیدھا دلیل میں۔“

”ایسا اثر دوسرخ نہیں ہے جو اس کے کام آئے۔ بس دکھاؤ دے دیکھاؤ کہ ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”اس نے کئی اثر دوسرخ صحیح معنوں میں بوجھانے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ اس جیسی عورت تو نہ جانے کیا قیامت اڑھاتی۔ اس نے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ وہ سوچتی ہوگی کہ جب وہ کوئی فلا فلا کام نہیں کرتی کسی میرا گھیری جس لوٹ نہیں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی تو اسے آؤ وقت میں کام آئے والے لوگوں سے تعلقات بوجھانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”دلیل ہے یہ خود غایت مگر ذمے کا وہی ایک راستہ ہے۔ اس قسم کی بہت سی جگہیں ہیں جہاں سے گزرتے وقت ہمیں زیادہ صحیح طور پر سمجھ آ جائے گی کہ ہم سوادری کس لیے اکثر گھوڑے کیوں استعمال کرتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ہاں۔ اس طرح کی قیامیں کرتے اسے میں نے بھی سنا ہے۔“ میں نے سر لایا۔  
 ”لیکن اسے نہیں معلوم کہ ترجیح کل کے زمانے میں یہ

”میں پہلے ہی مت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”جہاں سے میں تمہیں بتاؤں گا وہاں سے تم میرے برابر چلے کے بجائے بالکل میری سیدہ میں پیچھے پیچھے آؤ گے۔ اس پٹی پر چلنے کے دوران ہم آپس میں بات بھی نہیں کریں گے۔“

”سمت بستر۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان کے اڑے اور زور آج صبح کے درمیان شارٹ کٹ میں تھا۔ اور یہ ایک ایسا شارٹ کٹ تھا جس سے ان کے اپنے علاوہ کوئی استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ شاید فطرت کے اس نفاذ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میری زندگی کا زیادہ تر حصہ دیرانوں، جنگوں اور ہزاروں میں گزرا ہے۔ انسان کو زندگی کا سلیطہ نہیں آتا ہے۔ شرکی مردوں پر نہیں۔ لیکن اتنی زمین دیکھنے اور بڑی عجیب عجیب چیزوں کا نظارہ کرنے کے باوجود اس طرح نین چڑیں مجھے کیسے اکٹھی نظر نہیں آئیں۔ یعنی سرکنڈوں کا جنگل۔ ہزار اور دہل۔ جہاں ہزار ہوتے ہیں وہاں عموماً دو در تک دہل نہیں ہوتی۔“

پھر وہ پیچھے کسی خیال سے مگھوٹا ہوتے ہوئے بولا۔ ”ان کے درمیان ٹھوس زمین کی جو پٹی ہے وہ تو بہت ہی کام کی چیز ہے۔ اگر تمہیں اس پٹی پر گھوڑا دوڑانے میں مہارت ہو تو تم اپنے تعاقب میں آنے والی پوری فوج کی فوج کو بھی دہل میں دھنسا سکتے ہو۔ بہت دیر میں کسی کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ تم کیسے صحیح سلامت گھوڑا دوڑائے جا رہے ہو اور تمہارے تعاقب میں آنے والے کیوں زمین میں غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ دہل اور ٹھوس پٹی کے رینگ میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کوئی ان کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ غصے سے لہجے میں بولا۔ ”یہ گزر گا صرف ہماری دیوانت ہے اور فی الحال صرف ہمارے ہی استعمال میں ہے۔“

پالا خر سرکنڈوں کے جنگل کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم محفوظ پٹی پر جا پہنچے۔ وہاں سے میں دھندلی دھندلی میں غیسو کے بین جیسے اعتبار سے گھوڑے کو چلانے لگا۔ واقعی یہ اعزازہ کتنا مشکل تھا کہ پٹی کتنی چوڑی تھی۔ وہاں تاحہ ٹھنڈی کارنگ نیلا سا ہی تھا۔ کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہاں کوئی دہل موجود تھی۔

میں راستے کے بارے میں پوری طرح چوک تھا اور اپنی توجہ مکمل طور پر اوپر ہی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پھر بھی مختلف خیالات ذہن پر بٹھار کیے ہوئے تھے۔ درحقیقت میں بے حد شکر تھا۔

پہلی بات یہ تھی کہ میں ذہن میں کوئی واضح منصوبہ لیے بغیر غیسو سے آن ملا تھا۔ میرے ذہن میں بس ایک دھندلا سا خاکہ تھا

کہ اگر غیسو خان بے وقوف بن گیا تو میں اس کے ساتھ ان لوگوں کے اڑے تک جا پہنچوں گا اور ایک آدھ دن میں کوئی مناسب موقع پا کر ان کی غفلت کے کسی لمحے میں ان سب کو یا ان میں سے زیادہ سے زیادہ ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہاں بھاگ آؤں گا۔

لیکن اب مجھے اپنا یہ ارادہ بچکانہ سا لگ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ان کے بارے میں یہی تصور تھا کہ وہ ڈاکوؤں کا کوئی چھوٹا موٹا گروہ تھا۔ میں نے جنگل میں جانور کیسے گاہ بگاہ جن آٹھ دس افراد کو دیکھا تھا اور جن کی صورتیں بھی ذہن میں محفوظ کیں تھیں۔ میرے خیال میں گروہ کل انہی پر مشتمل تھا اور ان کا احتیاج کرنے سے گروہ کا قلع قمع ہو سکتا تھا۔ میرے لیے چرچے کی کا پھیل ختم ہو سکتا تھا اور کم از کم ایک طرف سے تو میں مطمئن اور بے فکر ہو سکتا تھا۔

لیکن غیسو خان کی باتوں نے میری آنکھیں کھل دی تھیں اور میری خوش فہمی دور کر دی تھی۔ وہ لوگ بظاہر تعداد میں تھوڑے اور معمولی ڈاکو نظر آتے تھے لیکن درحقیقت وہ معمولی ڈاکو نہیں، ”بچے بچے دہشت گرد تھے اور باپا کی طرح بڑے مظالم اور مہربان انداز میں نہ جانے کہاں کہاں پہلے ہوئے تھے۔ چارچو کو مارنے سے گروہ کھلی طور پر ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ اٹھارہ ان لوگوں میں یا کھنڈا خود میرے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ حد سے زیادہ خود اعتمادی میرے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ اتنا آسان اور سیدھا سادہ معاملہ نہیں تھا۔ اس میں کا تو ہم نہیں اٹھا جانا چاہیے تھا۔

غیسو تو نہایت سنجیدگی سے مجھے گروہ میں شامل کرنے کے لیے ملنے چلا تھا اور پرسوں سے شاید وہ لوگ مجھے ”کام“ پر بھی بھیج دیتے۔ کام بھی سب سے پہلے اپنی غصہ کی گھر میں قب لگنے کا تھا لیکن میں اب محسوس کر رہا تھا کہ میرے لیے غیسو سے جان چھڑا کر وہاں چلے جانا ہی بہتر تھا۔ لیکن اس کے لیے کون سا طریقہ مناسب ہو سکتا تھا؟ میں اسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے خود اپنے لیے کوئی راہ قرار نہیں بنوڑی تھی۔

بہر حال میں نے یہ ضرور محسوس کر لیا تھا کہ ان کے اڑے پر جانے سے میرے لیے کسی بھی طرح کی آئی واپس چلے جانا ہی بہتر تھا۔ خواہ اس کے لیے مجھے غیسو خان کو لکھائے ہی نہ پڑا۔ دینے بھی میرا ارادہ اسے ختم رہا کہ نہ ہی کا ہی تھا لیکن اس کام کے لیے اب ان کے اڑے پر جانے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے کے بجائے اس ویرانے میں ہی کچھ کر گزرا۔ بہتر تھا اس کام کے لیے مناسب ترین وقت تو یہی معلوم ہو رہا تھا جبکہ میری طرف پشت کیے سیدھا آگے چلا جا رہا تھا۔

اتنے قریبی دھوکے کے لیے تو یہ پوری کافی تھا اور میں قیاس کے نیچے رہا۔ مجھ سے ہوئے تھا لیکن پھر میں نے مناسب کیا سمجھا کہ میں آگ پٹی غیسو کی رہنمائی میں ہی عبور کر جاؤں۔

اور سوچا رہا کہ مجھے فیصلہ کن قدم کب اٹھانا چاہیے۔ اب زمانہ آخر مناسب نہیں تھی۔

چنانچہ کر کے وہ کاشف ایک طرف رکھ کر لیتے ہوئے بولا۔ "میرزا کریم سیدھی کر لیں۔" پھر اسے ہنگی آئی اور وہ مومچوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "یار! وہ میرے کھوڑے کی زین سے پانی کی بوتل بندھی ہوئی ہے وہ تو کھول لاؤ۔"

اس کا کھوڑا جھارپوں پر منہ مارا اور زور دے چلا گیا تھا۔ میں نے لمبے ڈنگ بھرا اس کے قریب پہنچا اور پانی کی بوتل زین سے کھول کر جوئی مڑا میری رگوں میں لٹو بخیر ہوا گیا۔

خیر خان جسے میں نے ایک لمبے پتلے جھکے جھکے سے انداز میں بے پروائی سے لینے دیکھا تھا، وہ اب ایک کھٹنے کے بل کسی درندے کی طرح چمکا چکا کھڑا تھا۔ اس کی کاشف تو بدستور ایک طرف چادر پر ہی پڑی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ایک بیک بد صورت سا رو اور نظر آ رہا تھا جس کا رخ میری ہی طرف تھا۔

میری کاشف بھی چادر پر ہی پڑی تھی۔ اضطرابی طور پر میں نے فیصلے کے پیچھے میرے چادر کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن غصہ فوراً بولا۔ "ہٹا۔۔۔ تاہم خود اس! غصہ خان کے سامنے اس قسم کی حماقت نہ کرنا۔ میرے نشانے کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ دیکھو۔۔۔ میں ایک قاتل کر رہا ہوں۔ اگر تم اپنی جگہ سے ہٹ کر رہو تو کوئی تمہارے ہاتھ میں کان کے پاس سے گزرے گی۔ بالکل پاس سے۔"

میں اپنی جگہ مامکت کھڑا تھا۔ اس دیرانے کے خانے میں قاتل کا دھماکا خاصا خوفناک محسوس ہوا۔ گولی میرے ہاتھ میں کان کی نوک تقریباً چھوئی ہوئی گزری۔

میرے تاثرات شاید کچھ اس قسم کے تھے کہ غصہ کو پتہ تھا کہ تمہارا غصہ آ رہی تھی لیکن وہ ایک مختصر قہقہے پر اکتفا کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تم واقعی مجھے اتنی احمق سمجھتے تھے افضل خان؟"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے ابتداء ہی سے اسے ایک جاہل، احمق اور کوڑھ منہ سمجھا تھا کہ اب محسوس ہو رہا تھا کہ احمق وہ نہیں، میں تھا۔ اس کے بارے میں میری رائے تو کافی دیر پہلے سے بدل چکی تھی لیکن ابھی میں اس بدلی ہوئی رائے کی روشنی میں کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس نے پانسا پلٹ دیا۔

بہر حال۔۔۔ جو غلطی سرزد ہوئی تھی وہ تو اب ہوئی چکی تھی۔ اس پر پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ انسان زندگی کے میدان میں خود اکتفا کرنا کامیاب ہو ہی نہ سکتا تھا۔ اس کا اٹھنا ہوا ہر قدم ہی درست ثابت ہو گا۔

بعض اوقات ہمتی رو کا جھکا گئے سے انسان کے اعصاب صبرنا اٹھتے ہیں لیکن وہ جھکا اس کے لیے مفید بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کی ہمت ہی خفیہ اور خفیہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں اگر

میں قاتل کرنے کا کوئی خطرناک رد عمل بھی ظاہر ہو سکتا تھا۔ ابھی خرابی تھا اور اس سفر کے دوران اسے کوئی مارنے کے بہت سے اچھے مواقع میسر آنے کی امید تھی۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔ اس شخص کو کوئی مارنے کا تصور میرے لیے بڑا طمانیت بخش تھا۔

ایک میل کا وہ کھڑا مجھے بڑا طویل محسوس ہوا۔ پانا خراک بیک ٹرک کر غصہ نے ٹرک میری طرف دیکھا اور مطمئن لہجے میں بولا۔ "اب تم میرے برابر آ سکتے ہو۔"

میں اپنا کھوڑا ڈاؤن ڈرتے ڈرتے اس کے برابر لے گیا۔ اس بٹی اور دلدل کے درمیان اب بھی کوئی فرق ظاہر نہیں ہوا تھا۔ تاہم میں نے اس کی سیدھ ذہن نشین کر لی تھی۔

چند لمبے ہم خاموشی سے سو سفر رہے۔ پانا خرا غصہ نے ہی سکوت توڑا۔ "کس خیال میں چھپنے ہوئے ہو؟"

"میرا ذہن پھر اس اڑنے کی طرف چلا گیا تھا۔" کولڈ کی کلب کی طرف۔" میں نے مجھے لمبے میں کہا۔ "جو لوگ وہاں ضرورت کی چیزیں وغیرہ پہنچاتے ہوں گے وہ بھی تو اس ٹھکانے سے واپس ہوں گے؟"

"وہاں کوئی بھی شخص کوئی چیز پہنچانے نہیں آتا۔ ہر چیز ہمارے آدمی اپنی گاڑیوں میں لے کر آتے ہیں۔ اگر کبھی ان کا شکوکوں کی طرح کوئی خاص کیپ آتی ہو تو ان کے لیے الگ ٹھکانے ہیں۔ پہلے پتہ وہاں آتی ہے، وہاں سے ہم کلب میں منتقل کرتے ہیں۔ کلب سے وہ چیزیں تحیم ہو کر وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں ہمارے انتظامات میں سرکھانے کی ضرورت نہیں۔ سب کام بڑے شاندار طریقے سے چل رہا ہے۔"

"بہت خوب؟" میں نے ایک بار پھر مرغیت کا اظہار کیا۔  
وہ نفا غصہ اور اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کچھ کہا ہی لینا چاہیے اور تھوڑی دیر سنا لینا چاہیے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"کہا میں گے کیا؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔ "تمہارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" وہ مسکرایا۔ "مجھے معلوم تھا رائے میں بھوک لگے گی۔ میں بندوبست کر کے چلا تھا۔" وہ کھوڑے سے اتر آیا۔

ایک صاف سی جگہ دیکھ کر غصہ نے چادر بچائی اور اس پر بیٹھ کر اس بیک میں سے ایک بڑا سا بیکٹ نکالا جس میں میرے خیال میں رقم کا بیکٹ بھی موجود تھا۔ انباروں کی تمہیں وغیرہ کھولنے کے بعد اس بیکٹ سے دو چرتے برآمد ہوئے۔ غصہ نے ایک چمکا کاغذ پر میزے سامنے رکھ دیا اور دو سرا خود مشیائہ انداز میں اڈھرتے ہوئے بولا۔ "داؤدہ ڈگر مہو ہوئی خانے کی۔"

میں آہستہ سے مڑ کر اس کی ٹانگ چٹا رہا، غصہ کی طرف دیکھتا رہا

جھٹکا مناسب دو لٹچ کا ہو تو بعض اوقات اس سے فالج کے مریضوں کو بھی فائدہ ہو جاتا ہے اور دماغی مریضوں کی حالت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح خیمہ خان نے مجھے جو جھٹکا لگایا تھا وہ کچھ فائدہ مند بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میرے اندر جو ایک درندہ سویا ہوا تھا میں نے ایک جھٹکے سے اسے بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میں سر تپا آکھ بن گیا۔ بظاہر میں ساکت ہی رہا لیکن میرے اندر نہ جانے کتنی تو تہیں متحرک ہو گئیں۔ صرف ایک ٹائیے کے لیے میں نے اپنے آپ کو خوفزدہ محسوس کیا تھا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خوف ہوا میں غلیل ہو گیا تھا۔

صرف یہ احساس نہ کیا تھا کہ میں اچانک ذرا مشکل صورت حال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جس طرح اچھے بھلے سمجھدار اور باصلاحیت شخص کا پاؤں بھی راہ چلتے وقت اچانک کسی گڑھے میں پھنس سکتا ہے بالکل اسی طرح مجھ پر بھی ذرا مشکل آن پڑی تھی اور مجھے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اس سے لکھنا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موت اور زندگی کے درمیان صرف بال جیسی باریک لکیر ہوتی ہے لیکن اس حد فاصل کے ایک طرف رہنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں۔ کم از کم مجھے اب بھی زندگی والی سانس پر ہی رہنا نا ممکن محسوس نہیں ہو رہا تھا، لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی غلطی نہ کروں۔

خفیف سی جنبش ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی محنتی مونچھیں بھی ذرا پھیل گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میری نظر ریوالور کی نال پر جمی ہوئی تھی اور میں نے ابھی تک پلک نہیں جھپکی تھی۔ اس نے یقیناً میری دونوں آنکھوں کے عین درمیان کا نشانہ لیا تھا۔ میں نے سانس روک لی اور ٹریگر پر اس کی انگلی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا اندازہ کرنے لگا۔

جھٹکائی دے کر گولی سے بچنے کے آرٹ میں ساری اہمیت وقت کے تقین کی ہوتی ہے۔ اگر ریوالور کی نال سے گولی برآمد ہونے کے بارے میں آپ کا اندازہ ذرا بھی غلط ہو گیا اور آپ ایک پل پہلے جھٹکائی دے گئے تو ایک ماہر نشانے باز کی گن کی نال بھی اسی لمحے جھٹک سکتی ہے اور آپ کی کوشش رائیگاں جاسکتی ہے۔ اگر آپ کو جھٹکائی دینے میں ایک پل کی تاخیر ہو گئی تب بھی آپ بچ نہیں سکتے۔ خیمہ خان کو شاید مجھ سے اندازے کی درستگی کی توقع نہیں تھی۔ گولی چلی اور میں جھٹکائی دینے میں کامیاب رہا۔ میرے عضلات نے اس خفیف سی حرکت میں تقریباً گولی ہی کی رفتار سے میرا ساتھ دیا تھا۔ میدان میں فائر کی بازگشت گونجی لیکن اس میں میری چیخ یا کراہ شامل نہیں تھی۔

خیمہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ یہ گولی تو صرف تمہارے بالوں کو چھوتی ہوئی گزرتی۔ میں تمہیں اتنی جلدی ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ تمہاری کھوپڑی یا دل میں

میدان میں دھندلی دھندلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن میں اس کی نمودوں کی خفیف سی جنبش بھی صاف دیکھ رہا تھا اور غالباً یہی عالم اس کا تھا۔ ایک درندہ یقیناً اس کے اندر بھی رہتا تھا بلکہ وہ درندہ اس کے اندر تو کم ہی رہتا تھا۔ زیادہ تر باہری جھانک رہتا تھا۔ اس وقت وہ درندہ بھی پوری طرح چوکس تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بھی مزید کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کی نشانیاں غائب ہو چکی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد آٹھ گھنٹوں میں آنکھیں ڈالے ساکت کھڑے رہے۔ درندوں کی بہت سی حیات انسانوں سے کیسی زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ فیسو نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ میرے اندر بھی کوئی درندہ بیدار ہوا ہے۔ ایک درندہ دوسرے درندے کی موجودگی کو فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن وہ شاید اس دوسرے درندے کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اس کی سفاک آنکھوں میں حکمرانوں کا رویہ تھا۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے تمہارے اندر کوئی قوت بیدار ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود تم کیا کر سکتے ہو؟ میرے لیے تمہاری حیثیت ایک بیوقوفی سے زیادہ نہیں۔ میں جب چاہوں گا تمہیں مسلہ دوں گا۔“

اس تصور سے وہ گویا محفوظ ہو رہا تھا۔ ریلوے کی ٹال میں

اتارنے کے لیے تو میں صرف آخری گولی کام میں لاؤں گا۔ اس سے پہلے تو میں ایک ایک کر کے تمہارے دونوں بازوؤں میں پھر دونوں ٹانگوں میں۔ اور پھر تمہارے پیٹ میں گولی ماروں گا۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ پیٹ میں گولی گھسنے کے بعد موت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اذیت ہی کی موت مرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آسان موت نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ موت جب تمہارے وجود کو سر سے پاؤں تک آدمی کی طرح چیرتی ہوئی گزرے گی تو تمہارے تاثرات کیا ہوں گے۔“

میری نظراب بھی اس کی انگلی پر ہی جمی ہوئی تھی جو رگ پر تکی ہوئی تھی۔ اگر اس نے دوسری گولی ضائع کرنے کے بعد اندھا دھند بھی تیسرا چوٹا فائر کیا ہوتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ گو کہ وہ محض ایک جڑواں ہی ہوتا۔ ایسا جڑواں جس میں بازی جیتنے کا ارمان صرف ایک فیصد ہی تھا، لیکن بعض اوقات ایک فیصد بھی بہت کام آجاتا ہے۔ تنائوے فیصد دھڑلے رہ جاتے ہیں۔

میرے ہونٹ غیر ارادی طور پر سختی سے بھنے ہوئے تھے۔ میں نے قدرے کوشش سے انہیں حرکت میں لاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری کمرہ آنکھوں نے تو نہ جانے کتنی مرتبہ دیکھا ہو گا یہ تھا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو تم نے ایسی ہی موت مارا ہو گا۔“

”بے شک۔“ وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی درندے کی خراہٹ سے مشابہ تھی۔ ”لیکن دوسروں کی بات اور تمہاری بات کچھ اور



جھٹکا مناسب دینے کا ہو تو بعض اوقات اس سے نالہ کے مریضوں کو بھی ناکہ ہو جاتا ہے اور دائمی مریضوں کی حالت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح خیمہ خان نے مجھے جو جھٹکا لگایا تھا وہ کچھ ناکہ مند بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میرے اندر جو ایک درد مند ہوا تھا میں نے ایک جھٹکے سے اسے بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میں سر ہاتھ اٹھ بن گیا۔ بظاہر میں سہکتا ہی رہا لیکن میرے اندر نہ جانے کتنی قوتیں متحرک ہو گئیں۔ صرف ایک ٹائپ کے لیے میں نے اپنے آپ کو خوفزدہ محسوس کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خوف ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

صرف یہ احساس نہ رہا تھا کہ میں اچانک ذرا مشکل صورت حال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جس طرح اچھے بھلے سمجھدار اور مصلحت فحش کا پاؤں بھی راہ چلتے وقت اچانک کسی گڑھے میں پھنس سکتا ہے بالکل اسی طرح مجھ پر بھی ذرا مشکل آن پڑی تھی اور مجھے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے ہوئے اس سے لکھنا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موت اور زندگی کے درمیان صرف بال جیسی باریک کلیہ ہوتی ہے لیکن اس حد فاصل کے ایک طرف رہنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں۔ کم از کم مجھے اب بھی زندگی والی سائنس پر ہی رہنا نا ممکن محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی غلطی نہ کروں۔

میدان میں دھندل دھندل چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن میں اس کی نمودیں کی خفیف سی جنبش بھی صاف دیکھ رہا تھا اور غالباً یہی عالم اس کا تھا۔ ایک درد مند یقیناً اس کے اندر بھی رہتا تھا بلکہ وہ دردندہ اس کے اندر تو کم ہی رہتا تھا زیادہ تر باہری جھٹکا رہتا تھا۔ اس وقت وہ دردندہ بھی پوری طرح چوکس تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بھی مزید کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کی نشانیاں غائب ہو چکی تھیں۔ چند لمحے ہم آگھوں میں آنکھیں ڈالے سہکتا کھڑے رہے۔ وہ دونوں کی ہمت سی حیات انسانوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ فیمو نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ میرے اندر بھی کوئی دردندہ بیدار ہوا ہے۔ ایک دردندہ دوسرے دردندے کی موجودگی کو فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن وہ شاید اس دوسرے دردندے کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اس کی مسافک آگھوں میں جھکے ہوئے تھا۔

آگھوں ہی آگھوں میں گویا وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے تمہارے اندر کوئی قوت بیدار ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود تم کیا کر سکتے ہو؟ میرے لیے تمہاری حیثیت ایک بیوی سے زیادہ نہیں۔ میں جب چاہوں گا تمہیں مسئلہ دروں گا۔“ اس تصور سے وہ گویا محفوظ رہا تھا۔ رولور کی نال میں

خفیف سی جنبش ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی گھٹی موچھیں بھی ذرا پھیل گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میری نظر رولور کی نال پر جمی ہوئی تھی اور میں نے ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس نے یقیناً میری دونوں آنکھوں کے عین درمیان کا نشانہ لیا تھا۔ میں نے سانس روک لی اور زہر پر اس کی انگلی کے پڑنے سے ڈباؤ کا اندازہ کرنے لگا۔

جھٹکا دے کر گولی سے نیچے کے آرٹ میں ساری اہمیت وقت کے تقین کی ہوتی ہے۔ اگر رولور کی نال سے گولی برآمد ہونے کے بارے میں آپ کا اندازہ ذرا بھی غلط ہو گیا اور آپ ایک پل پہلے جھٹکا دے گئے تو ایک ماہر نشانہ باز کی گن کی نال بھی اسی گنے جھٹکا سکتی ہے اور آپ کی کوشش رائیگاں جا سکتی ہے۔ اگر آپ کو جھٹکا دینے میں ایک پل کی تاخیر ہو گئی تب بھی آپ کچھ نہیں سکتے۔ خیمہ خان کو شاید مجھ سے اندازے کی درستگی کو توقع نہیں تھی۔ گولی چلی اور میں جھٹکا دینے میں کامیاب رہا۔ میرے عضلات نے اس خفیف سی حرکت میں تقریباً گولی ہی کی رفتار سے میرا ساتھ دیا تھا۔ میدان میں فائر کی بازگشت کو بھی لیکن اس میں میری توجہ یا کراہ شامل نہیں تھی۔

خیمہ سہرہ ستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم نے خوابواہ تکلیف کی۔ یہ گولی تو صرف تمہارے بالوں کو چھوئی ہوئی گزرتی۔ میں تمہیں اتنی جلدی ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ تمہاری کھوپڑی یا دل میں امارے کے لیے تو میں صرف آخری گولی کام میں لاؤں گا۔ اس سے پہلے تو میں ایک ایک کر کے تمہارے دونوں بازوؤں میں۔ پھر دونوں ٹانگوں میں۔ اور پھر تمہارے پیٹ میں گولی ماروں گا۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ پیٹ میں گولی گتے کے بعد موت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اذیت ہی کی موت مرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آسمان موت نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ موت جب تمہارے وجود کو سرے پاؤں تک آری کی طرح چیرتی ہوئی گزرتی گی تو تمہارے اثرات کیا ہوں گے۔“

میری نظر اب بھی اس کی انگلی پر ہی جمی ہوئی تھی جو زہر پر لگی ہوئی تھی۔ اگر اس نے دوسری گولی ضائع کرنے کے بعد اندھا دھند بھی تیسرا چھٹا فائر کیا ہو تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ گو کہ وہ محض ایک جڑا ہی ہوتا۔ ایسا جو! جس میں بازی جیتنے کا امکان صرف ایک فیصد ہی تھا لیکن بعض اوقات ایک فیصد بھی بہت کلام آجاتا ہے۔ نشانوں کے فیصد دھڑلے رہ جاتے ہیں۔

میرے ہونٹ غیر ارادی طور پر سختی سے بٹھے ہوئے تھے۔ میں نے قدرے کوشش سے انہیں حرکت میں لائے ہوئے کہا۔ ”تمہاری کمرہ آگھوں نے توجہ جانے کتنی مرتبہ دیکھا ہو گا یہ تمہارا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو تم نے ایسی ہی موت مارا ہو گا۔“ ”بے شک۔“ وہ ہنسنا۔ اس کی ہنسی درد کے کی خیر خواہی سے مشابہ تھی۔ ”لیکن دوسروں کی بات اور تمہاری بات کچھ اور

ہے۔ تمیں تڑپ تڑپ کر مرنے دیکھنا شاید میری زندگی کی سب سے بڑی خوش ہوگی۔ اسی لیے تو میں نے کلا شکوف کے بجائے ریو اور اٹھایا ہے کہ کلا شکوف کا اگر ہلکا چمکا برست بھی چل گیا تو کہیں تم فوراً نہ مر جاؤ۔“

شاید یہ قدرت کے نظام کا ایک حصہ ہے کہ بعض اوقات بے گناہوں کو تنگیز اور غیثت قسم کے لوگوں کے عقلم و تشدد سے بچانے کے لیے وہ ان درندوں کے دماغ میں عجیب عجیب خناس پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ان کے دماغوں میں وہ خناس پیدا نہ ہوں تو شاید وہ چند سیکنڈ میں بغیر کسی رکاوٹ اور مزاحمت کے اپنا کام کر گزریں۔

فیصل خان کا مقصد بھی اگر صرف مجھے ہلاک کرنا ہوتا تو اس کا آسان ترین اور سہو حاسرہ راستہ یہی تھا کہ جب میری پشت اس کی طرف تھی وہ کلا شکوف اٹھا کر ایک برست مارا اور میرا قصہ تمام ہو جاتا لیکن قدرت نے اس کے دماغ میں ایک خناس ڈال دیا تھا۔ قدرت کے یہی اسرار درموز ہوتے ہیں جن تک اکثر ہماری نظر نہیں جاتی۔

”مجھ پر اتنا غصہ کیوں ہے تمہیں؟“ میں نے اس کی ٹریگروائی انگلی سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا۔

”تم نے مجھے گھوٹا مارا تھا۔ مجھے۔ یعنی فیصل کو۔ جس پر آج تک کسی کو ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی“ اس کے منہ سے نکلنے والا بر لفظ قدرت کے ذہن میں بگڑا ہوا تھا ”مجھے ایک گھوٹے سے بے ہوش کر کے تم اپنے آپ کو بہت بڑا فخر خان سمجھ رہے تھے؟ وہ ایک اتفاق تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ گھوڑی کے کسی نازک حصے پر ہاتھ پڑ گیا ہو گا۔ دوسرے میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے تمہاری طرف سے جوانی حملے کا خطرہ ہی نہیں تھا۔ تم حملے سے بالکل مسکین لگ رہے تھے۔“

”میں مسکین لگ رہا تھا۔ اس کے باوجود تم سب ٹی ٹریمری ڈیاں توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”تم لوگ اسی لیے تو مجھے زیادہ قابلِ فخرت لگے ہو کہ تمہارے ہاں مسکینوں سے وہ سلوک ہوتا ہے جو خالوں سے ہونا چاہیے۔ روزہ ڈاکو ہونے کی وجہ سے تم مجھے اتنے بڑے نہیں لگتے تھے۔“

”مگر تم مسکین کہاں ہو؟ تم تو بڑی محسوس چیز ہو۔ میں نے تمہیں عام سا آدمی سمجھ کر خفت ظلمی کی تھی۔“ اس کے ہاتھ میں ریو اور ساکت تھا۔

”میں کوئی تک اپنے آپ کو عام سا آدمی ہی سمجھتا تھا ہوں“ میں نے بے سکون لیے میں گما۔ ”لیکن قدرت شاید فرعونوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کے لیے عام آدمیوں کو خاص بنا دیتی ہے۔“ ”میں نے تمہیں عام سا آدمی سمجھنے کی جو ظلمی کی تھی اس پر میں حد سے زیادہ بچتا رہا تھا۔ میں نے اپنی پیاری مرحوم ماں کی قسم کھائی ہوئی تھی کہ تمہیں ہر قیمت پر تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔“ وہ بھی غصے سے لہجے میں بولا۔

”ایک گھوٹے پر اتنا غصہ؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس احساس سے مجھے حیرت ہوئی کہ میں اس صورت حال پر کچھ زیادہ فکر مند نہیں تھا۔

”ہاں۔ میں نے بتایا تاکہ اس سے پہلے کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی فیصل خان پر ہاتھ اٹھانے کی۔“ وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں پولیس کے پتے بھی پڑھا ہوں۔ جیل بھی گیا ہوں۔ جیل توڑ کر بھاگا تھا۔“ تمہیں معلوم ہو گا کہ ہم جیسے لوگ اگر پولیس کے قابو میں آجاتے ہیں تو ان کا کیا حشر ہوتا ہے لیکن یہ فیصل خان کی دہشت تھی کہ قاتلے میں۔ جیل میں۔ حالات میں۔ کسی بڑے سے بڑے پتے خان نے بھی اسے انگلی تک نہیں لگائی تھی۔ مار پیٹ تو دور کی بات ہے کسی نے آگھ میں آنکھ ڈال کر بات بھی نہیں کی تھی۔“

اس نے ایک طویل سانس لی لیکن اس کے ریو اور والے ہاتھ میں جھنجھ نہیں ہوئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں بھلا میں کیسے صاف کر سکتا تھا؟ جب تم خود بخود ہی مجھ سے آن کر اے تو میں نے دل ہی دل میں بڑا شکر ادا کیا تھا کہ مجھے تم کو تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔“

”یعنی تم نے مجھے شرع میں ہی پہچان لیا تھا؟“ میں نے دوستانہ سے لہجے میں پوچھا۔

”ہے شک۔“ فیصل نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے بعد کی سب باتیں تم مجھے بھلانے اور مجھ پر غصہ بھالنے کے لیے کر رہے تھے؟“ میں نے جاننا چاہا۔

”تمہیں۔ باتیں سب ٹھیک تھیں۔ میں نے تم سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولا، کوئی گپ نہیں ماری۔ سچ بول کر کسی کو بے وقوف بنانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ میں تمہیں ساتھ ساتھ لے پھر رہا تھا، ہر بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں مزہ لے رہا تھا۔ تم سمجھ رہے تھے میں تمہارے ہاتھوں بے وقوف بن رہا ہوں۔ میں حوسے لے رہا تھا کہ کس طرح تمہیں ساتھ ساتھ لے پھر رہا ہوں اور تمہیں شبہ تک نہیں کہ میرے روپ میں دراصل تمہاری موت تمہیں اپنے ساتھ لیے... پھر ہی ہے۔ میں نے سوچا سمجھا میرے ہاتھوں سے مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ تمہیں اس دنیا سے رخصت کرنے سے پہلے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بتا دوں۔ بڑا لطف آ رہا تھا وہ باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے بارے میں باتیں کرنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔“

ایک بار پھر وہ فرخ خانے کے سے انداز میں ہنسا۔ ”لیکن مجھے تمہاری بے وقوفی پر یقین نہیں آ رہا۔ کیا تم واقعی سب سمجھ رہے تھے کہ راہ چلنے جانے کے تابک کو پکڑ کر درخواست کرو گے کہ وہ تمہیں گروہ میں شامل کر لے اور وہ تمہاری بات مان لے گا؟ تمہیں اس وقت بھی شک نہیں ہوا جب میں نے اس پہلی ہی ملاقات میں ان بڑے بڑے معاملات تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیے؟ چلو!

موقع ہے؟“

”یہ سیاسی تقریر نہیں ہے، یہ تمہاری ہی کہانی ہے۔ تمہاری۔ اور تم جیسے بہت سے لیڈروں کی جو اندر سے ایک ہیں لیکن جنہوں نے اس سوسائٹی کو ختم بنانے کے لیے خلفِ لبانہ اور دھڑکے ہیں، خلفِ غریب اپنا رکھے ہیں۔ اس دنیا میں خدا نے بھی انسانوں کو چھوڑا پڑا پیدا کیا ہے لیکن بعض کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتے، شکر نہیں کرتے۔ ان کی نظریں دوسروں کی طرف لگی رہتی ہیں۔ وہ ان سے سب کچھ چھین لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تم بھی انہی بے شمار لوگوں میں سے ہو۔ واردات کے طریقے الگ الگ ہیں۔ گالیاں دینے کے لیے بے چارہ معاشرہ کیا ہے۔ کسی بھی قسم کی سیاست کی آزمائش لوگوں کے گھر اجاڑنے والے تم جیسے ڈاکو۔ یا دوسرے دہشت گرد۔ درحقیقت تم سب ایک ہو۔“

وہ دھڑکے دھڑکے میرے قریب آ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کا ارادہ کیا تھا لیکن میں نے بات جاری رکھی۔ ”جو حقیقتاً مظلوم ہوتے ہیں وہ کچھ اور طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں درد اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ وہ تم لوگوں کی طرح شقی القلب نہیں ہوتے۔ اگر اس نظام میں تمہارے ساتھ واقعی کوئی زیادتی ہوئی ہو تو تمہیں جا کر ان کا کہنا پڑنا چاہیے جو اس نظام کی حتمیت کے ذمے دار ہیں لیکن ان سے تم کوئی انتقام نہیں لینے پاتے، ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ ان کے گرد فصیلیں مضبوط ہیں۔ ان کی حفاظت کے لیے دنیا جہاں کے انتظامات موجود ہیں۔ تم بظاہر بہت غضب ناک اور بہت طاقتور نظر آتے ہو لیکن درحقیقت تم لوگ بہت کمزور اور بزدل ہو۔“

”وہ کیسے؟“ ہمیشہ پوچھا رہا۔

”وہ اس طرح کے تم لوگوں کے غیظ و غضب اور انتقام کا نشانہ بھی مجھ جیسے تنہا اور کمزور لوگ بنے ہیں یا پھر تم ریسمانی زر تاج جیسے سیدھے سادے اور اصول پرست لوگوں کے خلاف سازشیں کرتے ہو، بے گناہ لوگوں کو گولتے کے درپے رہتے ہو۔ کبھی کسی بھی ایسے شخص کو۔ یا اس کے بچے کو اغوا کر لیتے ہو جس کے پاس تمہیں دینے کے لیے کوئی دہم ہو۔ خواہ وہ اس نے باجز طریقوں سے اور محنت ہی سے کمائی ہو۔ کبھی ان ہوں یا گاڑیوں کو لوٹ لیتے ہو جن میں بے قصور لوگ اپنی عمر بھر کی پونجی یا محنت کی کمائی سے بنائی ہوئی چیزیں لے کر نہ جانے کس کس ارادے سے کن کن منزلوں کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض تمہارے انصوں مارے بھی جاتے ہیں۔ تم گاڑیوں بھی اجاڑتے ہو تو بے گناہ لوگوں کے۔ یہ سب لوگ تمہارے جرم تو نہیں ہیں۔ انہوں نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ ان میں سے تو بہت سے خود مظلوم ہوتے ہیں۔ یہ اچھا انتقام ہے تم لوگوں کا۔ انتقام پچھتہ ظالم سے لیا جاتا ہے۔ اگر تم لوگوں نے آج تک ایک بھی طاقتور

باقوں کو بھی چھوڑ دیا۔ تم نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا تھا؟“

میں خاموش رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجھ سے صاف مرزد ہوئی تھی لیکن کم از کم فیس کے سامنے اس کا عزائم کرا ضروری نہیں تھا۔

وہ نرم آہیز سے انداز میں بولا۔ ”وہی تم کیا سوچ کر مجھ سے ملے تھے؟ تمہارے ذہن میں کوئی بات تو ہوگی؟“

”ہاں۔ میرا ارادہ تھا کہ تم سب کو ہلاک کر دوں گا۔۔۔ ایسے ہی دیگر انوں میں تمہاری قبریں بنائیں گا، ان کے سرہانے باقاعدہ کیے نصب کروں گا اور سب سے اونچا کتبہ تمہاری قبر پر لگا دوں گا۔“ میں نے سنجیدگی اور دانتہاری سے کہا۔

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ فضا قرعش ہو کر رہ گئی۔ وہ میری بات سے کچھ زیادہ ہی محفوظ ہوا۔ میں نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی میں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا ہے۔“

بچتے بچتے اس کی آنکھوں میں پانی آنے لگا۔ میں دھندلی چاندنی میں اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلکا ہٹ دیکھ رہا تھا۔

”تم ڈاکو کیوں بنے تھے فیروز خان؟“ میں نے اچانک ہی دھمکے لیے میں پوچھا۔

”نام نہاد میں پیدا کر کے کے لیے، برا آدمی کھلانے کے لیے، ایکشن لانے کے لیے۔“ وہ استغاثہ سے لیے میں بولا پھر یکدم جیسے اسے غصہ آگیا۔ زمین پر پاؤں مارنے ہوئے بالکل بدلے ہوئے لیے میں بولا۔ ”بے گدھے آغا ہرے مجبور یوں کی وجہ سے بنا تھا۔ اس معاشرے نے بنایا تھا مجھے ڈاکو۔“

”جو اس ہے یہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم۔“ میں نے غیر متزلزل

لیجے میں کہا۔ ”اپنے گناہوں کا پشاندہ معاشرے کے کندھوں پر لادنے کا یہ بہت اچھا فارمولہ ایجاد کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ تم جیسے لوگوں میں ڈاکو بننے کے جراثیم پہلے سے موجود ہوتے ہیں، تم صرف ہمارے کی تلاش میں ہوتے ہو۔“

وہ خاموش رہا۔ میں نے تیزی سے کہا۔ ”ہمارے ان زیادہ تر لوگوں نے توبہ نہ لیا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی برائے مکر کر اپنے بے قصور ہم وطنوں، اپنے بھائیوں پر ظلم شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی شور مچا کر یا کھانے پینے کے حقوق دبا رکھے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی مار کٹ اور آتشزدگی شروع کر دی۔ کبھی معمولی ہوا گلاں لوگ ہمارے حق تلفی کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی بے گناہوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ یہ مظلومیت کا مزہ عمل نہیں، یہ صرف خباثت ہے۔ اگر کسی کو نظام سے شکایت بھی ہے تو نظام گل ٹھکوں میں رہنے والوں نے تو نہیں بنایا۔ پالیسیاں اور نظام تو ادنیٰ لوگوں کو ورتوں میں بنا ہے۔ ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں پاتا۔ عام لوگوں کو مارنا شروع کر دیتے ہیں۔“

وہ ایک ٹک مجھے ٹھہرتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ سیاسی تقریر کا

عالم، قیام، مکار اور صاحب اختیار سے انتقام لیا ہوتا تو میں تمہارے سامنے گردن بھجائتا، تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتا، تم سے محبت کرتا۔“

”چم۔ چم۔“ اس نے ڈک کر متاسفانہ انداز میں سر ہلایا۔ اب وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا شہنشاہ معظم! ہم آپ کی محبت سے محروم ہو گئے۔ اب ہمارے لیے زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے گا۔ موت ہمارا مقدر ہو گی۔ ہم پر رحم فرمائیے میرے آقا!“ اس نے قہمی انداز میں گڑ گڑاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس پر ہنسی کا دودھ سا پڑ گیا۔ اسے میرے خیالات، فکرات اور ان کی سچائی یا اغلاص سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر یکدم اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا اور وہ بالکل بدلے ہوئے لیے میں غرا کر پڑا۔ ”سن بے چارے! میں چاہتا ہوں کہ مرتے وقت تم یہ خوش فہمی دل میں لے کر نہ جاؤ کہ تم زندہ رہ جاتے تو نہ جانے کون سا تیرا مار لیتے۔ اگر میں تمہیں مزید دس سال بھی زندہ رہنے کا موقع دے دوں تب بھی تم اکیلے تو کیا، تم جیسے سودو سول کر بھی ہم سب کی قبریں نہیں بنا سکتے۔ صرف ایسے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے گروہ و غرہ کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، تمہاری جڑیں اس سے زیادہ کمری ہیں۔“

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب پروا کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اب موت جو تمہارا مقدر ہو چکی ہے..... لیکن زندگی کے آخری لمحوں میں تمہیں یہ پہچانا ضرور ہو گا کہ آخر قسمت نے تمہیں کیوں ہم سے لا کر لیا تھا۔“

”پہچانا تو میں نے ایک عرصے سے چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہیں پہچانتا ہے پر مجبور کر دوں گا۔“ وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے ہیٹ میں گولی مارنے کے بعد تمہارے قریب ہی بیٹھوں گا۔ جتنی دیر تم ہوش میں رہو گے، بہت ترپو گے میں تمہاری ہر سسکی، ہر کراہ، ہر فریاد سننا چاہتا ہوں۔“

متوقع لذت کے تصور سے اس کے ہونٹ ہنچ کر رہ گئے۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ سخت اذیت پرست انسان تھا۔ درندے ایسے انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ وہ اذیت پرست نہیں ہوتے۔ وہ صرف زندگی، موت یا اپنی ہٹا کی جنگ لڑتے ہیں۔ اپنے حریف کو اذیتیں دے کر میں مارتے۔ کم از کم روانہ طور پر وہ ایسا نہیں کرتے۔

اس بار اچانک ہی اس کے رپوٹور کی ٹال جھکی اور میں اچانک ہی بجلی کی سی تیزی سے اچھلا۔ اس نے میری ٹانگ میں گولی مارنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں باتوں میں الجھا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکیں گا۔

گولی کی بازگشت ختم ہونے کے بعد ایک لمبے کے لیے میدان میں مگر اسکوٹ چھا گیا۔ ہم دونوں بھی اپنی جگہ ساکت تھے۔ بالآخر اس نے تھکی انداز میں سر ہلایا اور گمری سٹیج کی سے بولا۔ ”تم ہا شہر فکار ہو۔ تمہارا زندہ رہنا ہمارے حق میں بالکل اچھا نہیں۔ تمہیں سر خان کی چلائی ہوئی گولی سے بچ جانے والا ہم سب کے لیے بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے۔“

بات کرتے کرتے ہی اس نے اچانک ایک اور فائر کیا۔ اب اس نے غالباً مجھے تڑپا تڑپا کر مارنے کا پروگرام ملتے کر دیا تھا کیونکہ اس بار اس نے جس لائن پر فائر کیا تھا اگر میں اس پر موجود رہتا تو گولی میری گردن سے گزر جاتی۔ لمبے کے صحیح طعین کے ساتھ ذرا سی جھکاؤ دیتے ہوئے میں بچ گیا لیکن دائیں کے آدوں کی طرف سے ہوئے میرے اعصاب کو ٹوٹنے کو تھے۔ مجھے احساس تھا کہ میرے جسم پر پڑنے کی دھاریں رینک رہی تھیں۔ یہ دھاریں میرے اعصاب میں اور بھی گند گند سی کر رہی تھیں..... لیکن میں ان کی سرسراہٹ سے بے نیاز رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بہت دیر سے پلک بھی نہیں جھپکی تھی۔ اس وقت میں اپنی زندگی کی اہم ترین گھنٹی بھی کر رہا تھا۔ چار گولیاں ضائع ہو چکی تھیں۔

اس کے رپوٹور میں صرف دو گولیاں باقی تھیں اور اب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ میرے جسم کے کس حصے پر۔ اور کس تہ سے گولی مارنے کی کوشش کرے گا لیکن اس میں اس کی شک نہیں تھی کہ اندر ہی اندر وہ دوس ہو چکا تھا۔ اس کی خود استیغزی میں دراڑ پڑ چکی تھی لیکن اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ شاید اس کی کوشش تھی کہ اگر میں رپوٹور سے خوفزدہ نہیں ہوں گا تو تو کم از کم اس کے چہرے کی خوشخواری سے ہی ڈر جاؤں۔

اب مسئلہ کیا ہے نہیں رہا تھا کہ اسے رپوٹور کے استعمال میں کتنی مہارت حاصل تھی اور میں گولی سے بچنے کے آرٹ میں کتنے ماہر تھا بلکہ اب یہ گویا اعصاب کی جنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر اس وقت میرے اعصاب مجھے دھوکا دے جاتے تو موت میرا مقدر تھی۔

اس عالم میں، میں مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ نے اس کی رگ و پے میں خفیہ خفیہ و غصہ کے بارود کو چنگاری دکھا دی۔ اس نے اپنے اعصاب پر کنٹرول کھو دیا۔ باخواب فائر اس نے شدید جھنجھلاہٹ میں کیا۔ جھنجھلاہٹ میں چلائی گئی گولی سے پچا میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔

اگر وہ چھٹی گولی بھی اسی جھنجھلاہٹ میں ضائع کر دیتا تو میرے حق میں اچھا ہوتا لیکن وہ فوری سنبھل گیا۔ اس کے ہونٹ اس طرح ہنچ گئے کہ جھاڑ جھکاؤ و اڑھی موجھوں کے درمیان غائب ہو کر رہ گئے۔

میرے جسم سے مایہ نہ بری طرح پھوٹ رہا تھا اور چتر منٹ کی اس آزمائش نے میرے اعصاب بچھا دیے تھے لیکن میں فیہو کے



روالور پر نظر جائے بدستور مسکرا رہا تھا اور یک نہیں جھپک رہا تھا۔ خیر نان آخری گولی کو ہر حال میں صبح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اب اسی مسئلے پر مرکوز تھی۔ اس سے ایک لفظی ہوئی تھی کہ وہ جذبات کی شدت میں ذرا آگے آگیا تھا۔ وہ اپنی اور میری دونوں ہی کا شکوہ نہیں پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ میرے اور کا شکوہ کے تقرباً درمیان تھا۔ اس کا خیال ہاتھ غیر ارادی طور پر ہوا میں بلند ہو گیا تھا اور اس نے نیم دائرے میں کھسکا شروع کر دیا تھا۔

اپنی دانست میں وہ کسی مہتر زادے کی تلاش میں تھا لیکن اس کی ہر کوشش فہل نہ تھی کیونکہ میں نے بھی وہیں کھڑے کھڑے ہتھیلی سے گھرنا شروع کر دیا تھا۔ یوں علامہ ہادی پوریشن میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کی طرف اسی طرح دیکھ رہے تھے۔

اب میری زندگی اور موت کا دور دراز رخا کی مرضی کے بعد صرف اس بات پر تھا کہ وہ مجھے غاویہ ہوئے کتنی پھرتی سے نماز کر سکتا تھا اور میں کتنی تیزی سے گولی کے رخ کو سمجھتے ہوئے اپنا پھاڑ کر سکتا تھا۔ میں نے اب سانس بھی روک لی تھی۔

چھپیلی کا یہ کیل چند لمحوں سے زیادہ جاری نہیں رہا۔ اس نے اپنا تک ہی آخری دائرہ کھیل لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ دائرہ کھلی کی تیزی سے کھیلنا تھا۔ اسی بار توصاف طور پر ہی مجھے کسی غیبی قوت نے پہنچا تھا۔ مجھے خود صبح طور پر احساس نہیں تھا کہ میں کس طرح بدوقت لائن آف فائر سے بچنے میں کامیاب ہوا تھا۔

آخری گولی اس نے میرے پیٹ میں آمارنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ میرے بازو کو چھوئی ہوئی تھری۔ مجھے اپنے بازو پر ہلکی سی تپش کا احساس ہوا۔

روالور اس نے وہیں ہاتھ سے چھوڑ دیا اور تیزی سے کا شکوہ اٹھانے کے لیے پلٹا لیکن میں اسے اتنی آسانی سے کا شکوہ اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اسی ایک لمحے کے انتظار میں تو میں اتنی طویل آزمائش سے گزرا تھا۔ میں نے اپنا روالور بھی نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میری تپش کے نیچے سوئی دامن کی جیب میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے نکالنے میں زیادہ وقت صرف ہو گا۔ اس وقت ایک سیکنڈ کے دوسو حصے کی بھی بہت اہمیت تھی۔

میں نے روالور نکالنے کے بجائے اس پر زبرد لگائی۔ اس وقت اس کا ہاتھ کا شکوہ کو تقریباً چھوٹا تھا جب میں نے اس کندھے پر کرائے کا ہاتھ رسید کیا۔ اور ساتھ ہی کا شکوہ کو ٹھوکر مار دی۔ کا شکوہ اس کی دسترس سے نکل گئی اور کرائے کے دار سے دوڑ کر اگیا گریلا کا سخت جان تھا۔ اس نے آف تک نہ کی اور فوراً ہی میری کا شکوہ کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی

|                        |         |      |
|------------------------|---------|------|
| اسلام کے نامور مجاہدین | قرتسکین | 50/- |
| اسلام کی نامور خواتین  | قرتسکین | 40/- |
| سومسلمان مشاہیر        | قرتسکین | 75/- |
| ملک ملک کی عورتیں      | قرتسکین | 35/- |

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

لیکن اس وقت تک میں اس کی پٹیلیں پر ٹھوکر رسید کر چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر لڑکھایا اور روندنے کی طرح غرایا۔ کا شکوہ کا خیال اس نے چھوڑ دیا اور کسی عفتیت کی طرح پٹ کر کچھ پر جھپٹا۔ اب اس کے پاس کوئی حکمت عملی نہیں رہی تھی۔ شاید اس کے خیال میں اب سوچ سمجھ کر لڑنے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ جبکہ میرے خیال میں ہوش و حواس کا قائم رہنا اور اعصاب کا قابو میں رہنا ہر حال میں ضروری تھا اور کسی بھی معرکے میں فیصلہ کن اہمیت اس کی تھی۔

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب اس نے نہایت ہی اطمینان سے اپنے اوڑھے میں دو ٹوٹا ہوا تھوڑے سے میری گردن دھرنے کی کوشش کی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میری گردن اس کے ہاتھوں میں آگئی تو وہ تپتی ہی کسی خشک نشی کی طرح اسے توڑ دے گا۔

میں نے اپنی گردن اس کی گرفت میں جانے سے بچانے کے لیے اس کے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ اس کی گردن ایک لمحے کے لیے نیچرھی ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ فاس کا سا بازو گھمایا۔ میں نے بازو پر ہی اس کا یہ وار روکا۔ اس کا بازو کسی شہتیر کی طرح میرے بازو سے ٹکرایا۔ اسی لمحے میں نے اس کے پیٹ میں لات رسید کی۔ یہ لات کھا کر بھی وہ صرف ذرا سا لڑکھایا

اگر لے گئے اور جہاز جھکا ڈالوں سے نہ ڈھکی ہوئی تو شاید اس وقت ٹوٹے ہوئے تیروں سے مشابہ نظر آتی۔ اس کا چہرہ اور گردن خون میں لتھڑپکے تھے شاید اس کے منہ اور ناک سے بھی خون اُبل رہا تھا۔

اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی نہ کئی تھیں اور ان میں بھی خون بھرا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود کلا شکوف کا آہنی دستہ بھی خون میں لتھڑپکا تھا۔ میں نے اسے غصہ کی لاش کے قریب پھینک دیا اور مٹی کے ایک ٹوٹے پر بیٹھ کر مہری مہری سانسیں لینے لگا۔ بالآخر میں نے موت سے یہ مہر کہ بیت لیا تھا۔ دھیرے دھیرے میری رگ دپے سے تھپان رخصت ہو گیا اور چند منٹ بعد میں نے اپنے آپ کو دوبارہ پُر سکون محسوس کیا۔

دھندلی چاندنی میں اس ویرانے میں توڑے پر بیٹھ ہوئے مجھے اپنا وجود کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہاں دو انسان..... یا شاید دو دروغے زندگی کی جنگ میں مصروف تھے۔ اب ان میں سے ایک باقی نہ رہا تھا۔ یہ لاکھوں سال پرانی کمانی تھی۔ کوئی بچہ نہیں تھا کہ اس توڑے پر میری جگہ غصہ خان بیٹھا ہو تاکہ تقریباً کچھ ترازوئی کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی پڑا اور کبھی کھٹک گیا، کبھی اُڑھ کر۔

بالآخر میں مہری مہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تھوڑی بہت احتیاطی تدابیر ہی اقتدار کرنا بہتر تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک طرف مجھے گڑھے کی موجودگی کے آثار محسوس ہونے میں لے لے ڈگ بھرتا ہوا بیچ گیا۔ گڑھا واقعی موجود تھا اور میرے مقصد کے لیے کافی حد تک موزوں بھی تھا۔ اس کی میں شاید کافی عرصہ پہلے کی بارش کا تھوڑا بہت پانی بھی موجود تھا۔

میں غصہ کی لاش کو گھینتا ہوا وہاں تک لے گیا۔ میں لاش کو آسانی سے اٹھا کر بھی لے جاسکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا خون میرے کپڑوں پر لگے۔ خون دھیرے دھیرے ٹپکے گا تھا۔ نعت، تکبیر اور اذیت پرستی کا وہ جیکر اب میں میں لتھڑپکا زمین پر پڑا ہے۔ حد حیرانہ قائل رہ کر لگ رہا تھا۔ مجھے اب اس پر ترس آ رہا تھا۔ جی ہاں وہ تھا کہ باعزت طور پر اس کی تکفین اور تدفین کروں لیکن مجبوری تھی۔ سردست میں اسے اعزاز کے ساتھ دفنانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے اس کی لاش کو گڑھے میں دھکیل دیا۔ گڑھا اتنا گہرا نہیں تھا کہ لاش اس میں سیدھی لٹائی جاسکتی۔ وہ درمیان سے خم کھا گئی۔

”صاف کرنا غصہ خان!“ میں نے صغرت کی۔ ”میں اس وقت تمہیں اس سے زیادہ آرام دہ قبر بتا نہیں کر سکتا۔“

پھر میں نے اوپر اُڑھ کر غصہ کی مٹی کے چھوٹے پوتے ڈھیلے اور توڑے اس گڑھے میں ڈالے۔ خون آلود کلا شکوف بھی میں نے

اور فوراً سنبھل گیا۔ وہ واقعی کسی جنگلی سانپ سے کم نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے مجھ پر جھست لگا لی۔

میں اس کی طاقت سے مرعوب نہیں تھا لیکن فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی گرفت میں آنے سے بچا ہوں تو میرے حق میں اچھا ہوگا۔ میں نے جھکا لی دے کر اپنے آپ کو بچایا۔ وہ اونٹ سے منہ زمین پر گرا اور میں نے اس کی پٹلیوں میں ایک ٹھوکر سید کی۔

اس کی پھرتی حیرت انگیز تھی۔ وہ مٹھنی انداز میں اچھل کر اٹھا۔ اس کی پکڑی کھل کر گر چکی تھی۔ اور لے لے ہٹھکرائے بالوں کی نہیں کندھوں پر پھیل چکی تھیں۔ چہرہ اور داڑھی کے بال مٹی میں لتھڑپکے تھے۔ ہاتھوں سے ہستا ہوا کف بھی ان بالوں پر چمک رہا تھا۔ وہ سر تا پا دھشت تھا۔ بالکل فاضلہ غار کا انسان دکھائی دے رہا تھا۔

نہایت ہی غضبناک انداز میں بازو بٹایا کہ وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا اور میں نے ایک بار پھر کامیابی سے جھکا لی دیتے ہوئے اس کی کپٹنی پر گھونسا سید کیا۔ وہ دوبارہ منہ کے زلزلہ میں پڑ چلا گیا۔ اس بار وہ پہلے جیسی پھرتی سے نہیں اٹھ سکا۔ لیکن میں نے اس سوچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

اس بار وہ اٹھ کر چلنا تو غصے سے پائل ہو رہا تھا۔ لیکن میں چاہتا تھا۔ زیادہ طاقتور لوگ جب غصے سے پائل ہوتے تھے تو انہیں قابو میں کرنا آسان ہوتا تھا۔ وہ عجیب بے مٹھی سی توازنیں نکالنا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن اس بار اس نے پھر مجھ سے ہیٹ پر لالت کھائی۔ وہ دوبارہ ہو گیا اور ایک بار پھر کرتے کرتے بچا۔ اس سے پہلے کہ وہ شعلہ غصہ کی نظر ایک کلا شکوف پر پڑی۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

میں نے جھٹ کر کلا شکوف اٹھائی لیکن وہ ٹال کی طرف سے میرے ہاتھ میں آئی۔ مجھے اس کو سیدھا کرنے کی صلت نہیں ملی کیونکہ غصہ نے مجھے آواز روکا تھا۔ اس نے مجھ سے کلا شکوف پھینکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ عقب سے میری کمر کے گرد بازوؤں کا غلیظ ڈال دیا۔ وہ واقعی آہنی جکڑے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم درمیان سے کھلا جائے گا۔ میں نے یہ مشکل ذرا اچھا ہوتے ہوئے پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر راکھ کا پت مارا۔

اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو اچھا کر کلا شکوف کو جھوڑے کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس کے سر پر دھری اور پھر تیسری ضرب لگائی۔ وہ دانیس پائیں لڑا لیکن اس کے زلزلہ پر ڈھیر ہونے سے پہلے میں اس کی کھوپڑی پر نہ جانے کتنی ضربیں لگا چکا تھا۔ زندگی اور موت کی اس جنگ میں آخری لمحوں میں مجھے بھی اپنے ہاتھ بیروں پر کچھ اختیار سا نہیں رہا تھا۔

میں اس وقت اپنی عجیبانہ ہی کیفیت سے باہر آیا جب میں نے اسے بے حس و حرکت اپنے سامنے پڑے دکھا۔ اس کی کھوپڑی

وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں چادر پر جا لیٹا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے، جت لیٹا میں در تک چاند کی طرف دیکھا رہا اور سوچتا رہا کہ زندگی مجھے کیا کیا تماشے دکھا رہی تھی۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ زیادہ سوچ بچار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری حالت بہاڑے اترتے ہوئے شخص کی سی تھی جس کی رفتار اس کے اپنے قابو میں نہیں رہتی۔ اس عالم میں اگر وہ رکنے کی کوشش کرتا ہے تو اوندھے منہ گر جاتا ہے۔

کچھ دیر سنانے کے بعد میں نے اٹھ کر وہ بیگ کھول کر دیکھا جو خیمہ اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس میں ایک شائینگ بیگ موجود تھا جس میں توٹوں کی کئی گڈیاں موجود تھیں۔ یہ وہی رقم تھی جو خیمہ گولڈ کی کلب سے لے کر چلا تھا۔ میں نے وہ بیگ اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکایا اپنی کاٹھکوف کتے پر بٹھائی اور گھوڑے پر بیٹھ کر زرتاج عمر کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔

میں گاؤں پہنچا تو صبح کا ڈوب کا وقت تھا۔ ہر طرف سکوت اور سناٹے کا راج تھا۔ منہ اندر چرے کھینچوں کو جانے والے یا تھکے کے لیے مسجد کو جانے والے دسائی بھی ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ادھر ادھر پھرتے ہوئے چند آوارہ گئے زندگی کا احساس دلانا رہے تھے۔ اس بات پر میں حیران ہونے لگا۔ یہ سنا کہ وہ گاؤں کے نیچے دیکھ کر صرف غرائے پر اکتفا کیا۔ ان میں سے کوئی بھونکا نہیں۔ شاید میں ان کے لیے انہی نہیں رہا تھا۔ چند دن میں ہی گاؤں کی باس میرے وجود میں رچ گئی تھی۔ یا پھر شاید وہ گئے آوارہ ہونے کے باوجود سمجھ دار تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ پر بھونکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

مجھے گاؤں سے گزر کر ہی فارم کی طرف جانا پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت حلی کے محافظوں کی نظر میں آؤں۔ اس لیے میں عقیی دروازے کی طرف سے فارم پر پہنچا تھا۔

میں عقیی دروازے کا آلا کھول رہا تھا جب بائیں طرف کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں مجھے سرسراہٹ سی سائی دی۔ میں ایک کر درختوں تک پہنچا اور اندر چرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن نہ تو کوئی دکھائی دیا اور نہ ہی کہیں حرکت کا احساس ہوا۔ شاید کوئی جانور تھا جو مجھ جکا تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھنے کا تردد نہیں کیا۔ مجھ پر ایک عجیب کالی آمیز بے نیازی غالب آ رہی تھی۔ اندر کوادر میں پہنچ کر میں بسز پر گرا اور چند لمحوں بعد اپنے آپ کو دنیا کا سب سے آسودہ حال اور بے وسوسہ انسان محسوس کرتے ہوئے کسی نیند سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دروازے پر دھبک ہو رہی تھی۔ کمرے کی سلاخ دار گھڑکی سے کھنکھ سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ میں نے سر کو کھینچنے کے لیے کھینچا اور دروازے کی کوشش کی۔ کڑختہ رات کے واقعات مجھے خواب ہی محسوس ہو رہے تھے۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے عبدل نامی وہ شخص کھڑا

ایسی گڑھے میں بیٹھ چکا تھا۔ بڑی تیزیوں سے ادھر ادھر سے کچھ مٹی بھی گڑھے میں ڈالی۔ گڑھا بھر گیا اور لاش اچھی طرح چھپ گئی۔ مجھے امید تھی کہ ایک آدھ بارش یا چند راتوں کی دوس اس گڑھے کو بھرا کر گڑھے کی اور زمین میں یہ پوند کاری نظر نہیں آئے گی۔ مگر میں نے زمین پر وہ نشان بھی کافی حد تک خراب کر دیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں سے کوئی چیز کھینٹ کر لے جاتی تھی۔

اس کام میں کافی دیر لگ گئی لیکن نتائج سامنے قلمی بخش تھے۔ میں ہاتھ پاؤں جھاڑ کر اس چادر پر بیٹھا جس پر بیٹھ کر کچھ دیر پہلے میں نے اور خیمہ نے اُسے کھانا کھایا تھا۔ ابھی سے یہ بات کچھ پرانی ہے پرانی ہی لگنے لگی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ خیمہ خان کا گھوڑا بڑی خاموشی سے ایک طرف کھڑا اس لو اس سی آنکھوں سے میری ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ گھوڑا بہت ذہین جانور ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ گھوڑا جو جنگلوں یا باغوں میں سرگرم رہنے والے لوگوں کے ساتھ پُرخطر زندگی گزارتا ہے۔

خیمہ خان کا گھوڑا کبھی بندھا ہوا نہیں تھا مگر اس نے بھانسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ گھوڑا خفا اپنے ٹھکانے پر واپس جاسکتا تھا اور اگر کوئی اس کے اشاروں کو سمجھتا تو وہ اسے یہاں تک لاسکتا تھا جہاں خیمہ خان دفن تھا۔ یہ کوئی خوش آئند بات نہیں تھی۔ میرے حق میں بہتر تو یہی تھا کہ میں اس گھوڑے کو بھی گولی مار دیتا۔

گھوڑا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ بول گا جیسے وہ میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ اس حیوان کی موٹی موٹی آنکھوں میں مجھے انسان سے زیادہ غم محسوس ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں اس خوبصورت مگر بے زبان جانور کو مارنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی زین کھول دی اور لگام اس کے جیزوں سے نکال کر پیچک دی۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ میں نے اس کی ایال پر ہاتھ پھیرا، گردن پر چھکی دی تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"جیاد دوست! تمہاری مرضی ہے۔۔۔ خواہ اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ جاؤ یا جنگلوں کا رخ کرلو۔ چاہو تو کسی کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے خیمہ خان کی قبر تک لے آنا۔۔۔ اور چاہو تو اس سارے تماشے کو بھول جانا۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔" میں نے اس کی کمر چھینکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہ ایک بار ہنسیا۔ جیسے اس نے میری بات کا جواب دیا ہو۔۔۔ پھر وہ دوڑتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔ کم از کم اس وقت تو اس کا رخ ادھر نہیں تھا جس طرف کچھ دیر پہلے میں اور خیمہ خان مجھ ستر تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ فی الحال وہ اپنے ٹھکانے کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

# لالہ رخ

قمر جٹالوی قیت = 200

لا ضرورت اور بے وجہ دانت نکال رہا تھا جو میرے لیے کھانا وغیرہ  
پانے اور باہر کے کام کاج پر مامور تھا۔ امپبل کی صفائی اور  
گھوڑوں کو راتب وغیرہ دینے پر دو سرا شخص مامور تھا۔ عدیل کے  
پاس قارم اور میرے کوارٹر کی چابیاں ہوتی تھیں لیکن اس کمرے  
کی چابی نہیں تھی جس میں میرا زیادہ وقت گزرتا تھا اور جو خواب  
کاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

”آپ کارات کا کھانا بھی اسی طرح رکھا ہوا ہے۔۔۔۔ اور  
اب دن چڑھے تک آپ سو کر نہیں اٹھے تو میں نے سوچا معلوم  
کروں کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ نے برا تو نہیں متایا  
سائیں؟“ اس کا لہجہ پہلے کی نسبت زیادہ منہایت ہو چکا تھا۔ اس  
سے پہلے اس کا طرز عمل کچھ زیادہ منورانہ نہیں رہا تھا۔ بلکہ جب  
میں پہلے دن یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے کسی حد تک ٹائپنڈی کی ہی  
کی نظر سے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کزشتہ رات کے دوران کس وجہ  
سے اس کی نظر میں میری توجیر بڑھ گئی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں نے بالکل برا نہیں متایا۔۔۔ اور میری طبیعت  
بھی بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”میں آپ کے لیے ناشتا تیار کروں؟“ اس نے اپنے چوڑے  
چوڑے دانتوں پر ہونٹوں کا پردہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ ضرور۔“ میں نے کہا۔ ”میں اتنی دیر میں تیار ہوتا  
ہوں۔“

وہ باورپی خانے کی طرف چلا گیا اور میں غسل خانے کی  
طرف۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے چھوٹے سے ٹیبل کلاک  
میں وقت دیکھا تھا۔ دس بجے کو تھے۔ مجھے یقین تھا کہ آج زرتاج  
نعر کے بینک میں ڈاکا ضرور پڑے گا۔ جانو کے جن آدمیوں کی انجلی  
اس کام پر لگ چکی تھی انہیں تو طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے  
نشانے آنا ہی تھا۔ ایک بچے ڈاکا پڑنے کا امکان تھا۔

مجھے اب کئی معاملات میں اندازوں سے کام چلانا تھا۔ میرا  
ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ فیروز خان کی گمشدگی کو شاید تین چار روز  
تک تو تشویش کی نظر سے نہ دیکھا جائے اور یہ امکان تو شاید کافی  
دنوں تک کسی کو قابل قبول محسوس نہ ہو کہ وہ مرنے کا ہو گا۔

مجھے زیادہ بہتر یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس بینک ڈیوٹی کو میں  
خود ہی روکنے کی کوشش کروں۔ پولیس کے پاس جا کر خود مصیبت  
میں پھنسنے کا امکان تھا۔ فیروز بچا چکا تھا کہ خانے کی کل ٹھری چار  
پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ وہ خود بھی زنگ خوردہ تھے اور ان کے  
انتخاب بھی۔ ان کا جانو کے آدمیوں کے سامنے رکنا ذرا مشکل ہی تھا  
جو بڑے خرافات و ہشت گرد اور قاتل تھے اور جدید ترین اسلحے سے  
بھی لیس تھے۔ پولیس پر مجھے ویسے بھی زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔  
معلوم نہیں اس مختصرے محلے میں کون جانو کا زور خرید تھا۔  
زرتاج خود گھر پر نہیں تھی۔ ویسے تو اس کی عدم موجودگی میں  
اس کا کوار رب نواز تمام معاملات کو دیکھتا تھا۔ وہ جوبلی میں ہی

ایک سرورٹ کوارٹر میں رہتا تھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔  
بڑے زمینداروں کے کوار خود بہت بڑی چیز ہوتے ہیں۔ بہت مال  
بناتے ہیں اور بہت دور تک پھینک دیتے جھرتے ہیں۔ ان کا بڑا دیدہ  
اور رعب ہوتا ہے۔ مالک کے علاوہ شازادہ ہی کسی کو ان کے  
سامنے دم مارنے کی جرأت ہوتی ہے۔

لیکن رب نواز اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ سرجھا کر چلا تھا  
اور اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ میں اسے بھی اس فکر سے آگاہ  
کر سکتا تھا لیکن اس کی زبان پر یقیناً سب سے پہلا سوال یہی آتا کہ  
مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ میں فی الحال چھوٹے سے چھوٹے  
سوال سے بھی بچتا چاہتا تھا اور اپنی ذات کو ہر معاملے میں محل خور  
پر پس منظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ میرے لیے یہی منظر میں رہتے ہوئے  
ہی کچھ کرنا بہتر تھا۔

عدیل نے ہماری بھرم اور جنتی قسم کا ناشتا مجھے کمرے میں  
ہی لا دیا۔ ناشتا کر کے میں نے فیروز خان کا چھوڑا ہوا رقم کا بینک  
الٹاری میں رکھ کر تالا لگایا اور کمرے سے نکلنے سے پہلے اپنے طے کو  
بسم اور غیر واضح سامانے والی چند چیزیں ساتھ لے گئیں۔ ابھی میں  
کمرے سے نکلا نہیں تھا کہ عدیل برتن اٹھانے آیا۔

وہ ہچکچاتا ہوتے ہوا۔ ”سائیں! شیر عمر کا پیغام آیا تھا کہ آج  
دھ کام پر نہیں آسکیں گے۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“  
”کوئی بات نہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں خود  
بھی شاید گھوڑوں کو سدھانے کے لیے رات نہ نکال سکوں۔ میں  
ریسٹائیٹی کے ہی ایک اور ضروری کام سے جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے سائیں! ویسے یہ جو اپنے شیر عمر صاحب ہیں  
اے۔۔۔ ان کی طبیعت ان دنوں میں اکثر ہی خراب ہوتی ہے۔ جب  
ریسٹائیٹی جی یہاں نہیں ہوتیں۔“ عدیل معنی خیز انداز میں  
سمکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ہوا۔ ”سائیں رب نواز بھی  
انہیں کچھ نہیں سمجھتے۔“

وہ مجھے ”ملازمتی سیاست“ میں الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔  
میں نے سرسری سے سبجے میں کہا۔ ”ان مسائل پر کبھی فرصت میں  
غور کریں گے۔“

میں نے قارم سے اپنا گھوڑا نکالا اور گاؤں کی طرف روانہ  
ہو گیا۔ کچھ دور بیچ کر میں نے آریک شیشوں والا چشمہ لگایا۔ سر پر  
اچرک پگڑی کے انداز میں لپی ہوئی تھی۔ گلے میں ریڈی منظر بھی  
تھا۔



بازار میں سب سے بہتر غمارت بیگ بی کی تھی۔ دروازے سے لوہے کی گرل اس وقت ہٹی ہوئی تھی۔ دروازہ لکڑی کا تھا مگر اس میں پینٹنگ بھی لگا ہوا تھا۔ دروازہ تین میڑھوں کی بندی پر تھا۔ سامنے کے رخ پر سلاخوں والی ایک لکڑی بھی تھی جو اس وقت بند تھی۔

بیگ کے دروازے پر باہری ایک کڑی پروڑھا اور کزور سا گھن میں بیٹھا تھا۔ وہ ٹیٹیا کی شلوار قمیض میں تھا۔ اس کی بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی انگریزوں کے زمانے کی توڑے دار بندوق بھی دیوار کے سارے کھڑی کی ہوئی تھی۔ کاروس کی چٹنی کڑی کے پٹھے پر لگی ہوئی تھی۔ شاید اسے خود بھی احساس تھا کہ بندوق اس کے انھوں میں ہو یا دیوار کے سارے کھڑی ہو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ وزن اٹھا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ گرد و پیش سے بے نیاز بیٹھا مندی سے دنگی ہوئی سرخ موٹھوں کو بل دے رہا تھا اور نہ جانے کن ٹکرات میں الجھا ہوا تھا۔ شاید اس کی ریٹائرمنٹ قریب تھی یا ویسے ہی رعایتی مدت پوری کر رہا تھا۔

میں جب بیگ کے سامنے سے گزرا تو میں نے رب نواز کو بیگ سے نکلے دیکھا۔ وہ ایک چری بیگ بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ شاید رقم جمع کروا کے واپس جا رہا تھا۔ رب نواز ایک اوجھڑا بھاری بھر کمز تھا۔ بظاہر خاصا مارب نظر آتا تھا لیکن میں نے اسے کسی پر مارب والے نہیں دیکھا تھا۔

گھن میں نے ہڑرا کر اسے سلام کیا۔ رب نواز نے نیم توڑی سے جواب دیا اور اپنی پیشوں والی ٹوپی درست کرنا رخصت ہو گیا۔ اس نے اصرار دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

بازار کا چکر لگا کر واپس آتے وقت میں بیگ سے کچھ دوری رک گیا۔ وہاں ایک گلی کے کونے پر کسی کی ٹوٹی پھوٹی سی بیل گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے اس بیل گاڑی کے پیچے سے اپنا کھوڑا باندھ دیا۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک چائے فروش ایسا سوار لیے بیٹھا تھا جس کے پیچھے کوئلوں والی انگلیٹھی فٹ تھی۔ وہ میرا چائے پیچ رہا تھا۔ میں نے اس سے ایک پیالی لی اور ایک طرف کھڑے ہو کر دھیرے دھیرے چکیاں لینے لگا۔ میرے پاس ابھی خاصا وقت تھا۔ چائے والے کو بھی وہاں سے جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اگلا دکانا کھلے آئے جارہے تھے۔

میری نظر غیر محسوس طور پر بیگ ہی کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں وہ جگہ بھی منتخب کر چکا تھا جہاں مجھے پوزیشن لینا تھی۔ بیگ کے تقریباً سامنے دو غمارتوں کے درمیان ایک نہایت ٹھک سی گلی تھی۔ بازار کے اس حصے میں زیادہ تر مکانات ہی تھے لیکن ان کے نیچے دکانیں تھیں۔

جو گلی میں نے دیکھی تھی وہ درحقیقت دو اونچے مکانوں کے درمیان پریشی فالتو سی جگہ پھوٹی ہوئی تھی جہاں لوگوں نے کوڑا کرکٹ پیننگا معمول بنالیا تھا۔ مجبوری کی حالت میں اس راستے سے دوسری گلی میں پہنچا جاسکتا تھا۔ اس گلی میں روشنی کی رسائی بھی کم تھی۔ اگر میں اس سے زیادہ آگے نہ جاتا تو وہاں سے بیگ بھی بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے صرف کچھ کے کیڑے برداشت کرنا پڑتی۔ وہ اتنی ٹھک گلی تھی کہ مجھ جیسی صحت کا آدمی ترجیحاً ہو کر ہی اس سے گزر سکتا تھا۔ سیدھا چلنے کی صورت میں شاید میرے کندھے دونوں طرف کی کھدوی اور گندہ سال دیواروں سے رگڑ کھاتے۔ بازار میں قہوڑی بہت چمچل پھل ہونے کے باوجود اس قدر سکون تھا کہ کوئی قصوری نہیں کر سکتا تھا یہاں کوئی گڑبہ ہونے والی تھی۔ ایک لمبے کے لیے تو میں نے بھی اپنے آپ کو خوش گمانی سے بھلانے کی کوشش کی کہ یہاں کچھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن میری نامعلوم حس کچھ ادھی کہہ رہی تھی۔

میں نے جتنی دیر میں سبز چائے کی وہ پیالی ختم کی اتنی دیر میں دو تین گاہک بیکے بعد دیکرے آکر چائے کی گرجا بھی چکے تھے۔ میں چائے بھی گھساری دیتا تھا لیکن اس روز وقت گزاری کی خاطر اس چائے والے سے دوسری پیالی بھی لے لی اور اپنی طلب کو برقی ثابت کرنے کے لیے مجھے اس کی چائے کی ٹریف میں چند الفاظ بھی بولنا پڑے جنہیں سن کر وہ خوشی سے پھولا نہ سیا۔ ایک پالی میں گدھے سے پانی میں پیالی دھو کر دے گا وہ مجھے سبز چائے تیار کرنے کے نہایت مایاب اور خاندانی نسخوں سے آگاہ کرنے لگا مگر اب میری توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ دوسری پیالی ختم کر کے بازار کا ایک پکر اور لگاؤں گا۔ مگر اس کے بعد بھی وقت گزاری کا مسئلہ درپیش رہا تو جام کی دکان میں گھس جاؤں گا جو قریب ہی واقع تھا۔ یہ کل میں نے فیس کو بھی اسی دکان میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ جام گے پاس جانے کا قائل تو مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس دکان میں اس کی موجودگی بھی توجہ کی دیکھنے کے سلسلے ہی کی کوئی کڑی رہی ہو۔

پچھلے چند دنوں میں میری دماغی پختہ بھی بڑھی تھی وہ میرا قیمتی اثاثہ بن چکی تھی کیونکہ اس سے مجھے اپنا ٹھیلے پہلے کی نسبت مختلف بنانے میں بہت مدد مل رہی تھی۔ چنانچہ اس سے محرومی کا فیصلہ تو میں ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ جام سے خطا خوانے میں کچھ وقت ضائع کر سکتا تھا۔

میں ابھی اس مسئلے پر غور و خوض کر رہا تھا کہ اچانک پیالی میرے ہاتھ سے گرنے لگے۔ ہجی۔ دراصل بیگ سے ایک شخص برآمد ہوا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید ہتک لگا تھا۔ وہ اسپیکر رحیم کل تھا!

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خودنوشت

## دہشت گرد

سلیم فاروقی

- وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
- وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہلہاں ہو گئے تھے۔
- ”چی کمائیاں“ کا ایک مقبول ترین ایڈوچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

پیش کش: ادارہ فکری سربلند، لاہور۔ فون: 37224663

میرا ہراس لگتا ہوا یہاں تک آں پہنچا تھا پھر اسے ڈاکے کی بھڑی ہو چکی تھی، مگر یہ تو اس کا علاقہ ہی نہیں تھا۔ وہ کیوں اتنی دوسری مول لیتا؟ پولیس والے تو اپنے علاقے کی وارداتوں کے سلسلے میں ہی کوئی زحمت کر لیں تو قیمت ہوتا ہے۔ دوسرے اس وقت رحیم گل، ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے محسوس بھی اعتبار سے تیار نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور عجیب سا خیال آیا۔ کس ایسا تو نہیں تھا کہ میں نے اس کی بے پناہ دیانت داری، دلیری اور کبھی نہ بھگتے کبھی نہ بکنے کی جو باتیں محسوس تھیں وہ محض قصے کمائیاں تھیں، پروپیگنڈہ تھا؟ درحقیقت کسیں ذہنی کے اس منصوبے سے ہی تو اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟

سوالات، شبہات اور امکانات کن کجگوں کی طرح میرے ذہن سے پٹنے جا رہے تھے اور کسی بھی بات کا کوئی تسلی بخش جواب میرے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ نہایت اطمینان سے چائے والے کو اراٹنگی کی اور بے حد آہستگی سے گردن گھما کر بینک کی طرف دیکھا۔ رحیم گل جاچکا تھا۔ وہ بازار میں بھی کس نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور اپنے گلیا سے

انسپیکٹر رحیم گل سادہ لباس میں تھا لیکن میں اسے ہزاروں کے ٹکے میں پہچان سکتا تھا اور شاید یہی معاملہ دوسری طرف بھی تھا، اس لیے میں نے فوراً دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ رحیم گل نے اس طرف دیکھا ہی نہیں تھا جدھر میں کھڑا تھا۔ میری جب اس پر نظر پڑی اس وقت اس کی پیشانی پر ٹٹنیں تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

دوبارہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا میں نے بہتر نہ سمجھا۔ اتنی ہی قیمت تھا کہ اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ اب یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی کہ میں خود اسے اپنی طرف دیکھنے کی دعوت دیتا۔ یہ ایک عجیب ہی موقع تھا۔ میں اس سے الجھنے کا غلطہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ گلیا میں پہلے ہی ایک خطرے کی آہٹیں ابھری تھیں۔ رحیم گل کے معاملے میں میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے ہرگز ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا مگر دیانت دار آدمی تھا۔ دیانت دار اور دلیر آدمی ہمارے معاشرے میں پہلے ہی تقریباً نایاب تھے اس سے اچانک سامنا ہونے پر جہت کے باعث ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

آخر وہ یہاں نظر ہی کیوں آیا تھا؟ کیا اسے یہاں میری موجودگی کا شبہ ہوا تھا یا اسے یہاں میری آمد کا کوئی امکان نظر آیا تھا؟ کیا وہ

سیاہ چشمے کو تاک پر کچھ اور اچھی طرح جالیا۔ ایک بار پھر غلام انداز میں ادھر ادھر کا جائزہ لے کر میں آگے چل دیا۔ اس بار میں نے یوں بازار کے سرے تک فاصلہ طے کیا جیسے مجھے کچھ خریدنا تھا لیکن اپنے مطلب کی چیز مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی یا میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہا تھا۔ درحقیقت مجھے اس قسم کی اداکاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں کسی کی بھی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن میں محض اسیا حال ایسا کر رہا تھا۔

اس پکڑ میں وہاں ہی پر میں نے سوچا کہ ایک بار اس دروازہ نمائگی میں کھس کر بھی دیکھ لینا چاہیے جہاں مجھے پوزیشن لینا تھی۔ مجھے چند لمبے بعد اندازہ ہوا کہ میرا اس گلی میں گھسنا کیسا بدوقت تھا۔ شاید کسی شہنشاہ تاجہ نے مجھے اس گلی کی طرف دیکھا تھا۔

گلی میں گھسنے ہی بدو کے ہنسنے کے بعد میرا استقبال کیا۔ شاید اس پاس کے گھروں والے اس گلی میں کچرا جھپکنے تھے لیکن مجھے تاک جہوں چڑھانے کی سہلت نہیں ملی کیونکہ اپنے عقب میں بازار کی طرف سے مجھے کسی انجن کی گھر گھر اہٹ سنائی دی تھی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ گزریگا سا احساس ہوا۔

میں نے پلٹ کر غلام انداز میں دروازہ نمائگی سے سرنگال کر دیکھا۔ سیاہ رنگ کی ایک جپ کسی غصیناک دروازے کی طرح غرائی ہوئی بازار میں چلی آ رہی تھی۔ ذرا نیور سمیت اس ٹنگی جپ میں پانچ توئی نظر آ رہے تھے اور پانچوں کے چوہوں پر ڈھانے تھے۔ کلا شکوہ نہیں انہوں نے ہاتھوں میں بلند کر رکھی تھیں۔ وہ بڑے دھڑلے سے بازار میں پلے آ رہے تھے۔

بھر فضا گولیوں کی ترخا ہٹ سے مرتضیٰ ہو گئی۔ انہوں نے غالباً لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ لوگ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ چند افراد دیواروں سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ بازار میں عورتیں اگاؤ کا ہی نہیں۔ بچے والی ایک عورت کو میں نے دہشت زدہ ہو کر ایک دکان میں گھبتے دیکھا۔ ایک عورت میں شاید کہیں بھاگنے یا پناہ حاصل کرنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ وہ ایک دکان کی دیوار سے چپک کر آڑوں بیٹھ گئی اور غالباً اپنی ٹانگیں دوکنے کے لیے اس نے جھکی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

چند لمبے پہلے میں نے بازار میں تین چار ایسے افراد کو بھی دیکھا تھا جن کے کندھوں پر کوئی نہ کوئی کمن تھی لیکن اب وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔

میں نے سر جھپکے کیا اور مشتاقی سے انداز میں اپنے چہرے پر بھی اپنی اجڑک کا ڈھانچا باندھ لیا۔ کلا شکوف کندھے سے اتار کر ہاتھوں میں تقامی۔ میں ایک گھنٹے کے بل کھڑا ہو چکا تھا اور میری کلا شکوف کی بل اس دروازہ نمائگی سے باہر جھانک رہی تھی مگر کسی کامیابان میری طرف نہ نظر تھا۔

ڈاکوئیں کی جپ میں جیک کے سامنے آن کی تب بوڑھا کمان میں بڑبڑا کر اٹھا وہ شاید اس کا خیال تھا کہ جپ میں آنے والوں کا ہدف کوئی اور ہے یا پھر شاید وہ دوسرے ہی دہشت پھیلانے آئے ہیں فائرنگ کرتے ہوئے گزرتا جا میں گئے۔ اس نے جلدی سے اپنی پرانی سی شات گن سنبھالی لیکن دوسرے ہی لمبے گولیوں کی ترخا ہٹ ابھری اور وہ بے جاہ پڑھوں سے پیچھے لڑھک گیا۔

چار ڈاکو جپ سے کود کر نیچے آ گئے پانچواں اسٹیرنگ سنبھالے بیٹھا رہا۔ جپ اسٹارٹ ہی رہی۔ ایک ڈاکو نے حثارت سے بوڑھے کمن میں کی لاش کو ٹھوکر سے ایک طرف کیا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ اپنی راہ میں حائل ہونے والے کسی بھی شخص کو گولیوں سے پھینچ کرے میں انہیں زبردستی چٹکا پٹ نہیں ہوگی۔

میں نے ایک لمبے انتظار کیا کہ وہ چاروں پڑھیاں چڑھ چکیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی جپ کے عقب میں پناہ لینے میں کامیاب ہو جائے۔ میں مورچہ بندی اور زیادہ دیر کی لڑائی کا محتمل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ مجھے اپنی ذات کو پوشیدہ ہی رکھنا تھا۔ مجھے توجہ گولیوں کے اندر اندر اپنا کام دکھا کر قاتل ہو جانا تھا۔

ایک ڈاکو نے زوردار ٹھوکر مار کر جیک کا دروازہ کھولا اور دوسرا بازار کی طرف رخ کرتے ہوئے کلا شکوف تان کر کھڑا ہی ہوئے لگا تھا کہ میں نے پستل برست مارا۔ دروازے کو ٹھوکر مارنے والے ڈاکو کو اندر جانے کا موقع نہیں ملا۔ رائفل تان کر باہر اب انداز میں کھڑے ہوئے ڈاکو کی حشریں بھی دلی ہی میں رہ گئیں۔ ایک تو ہوا میں اچھلا اور سر کے بل سرک پر گیا۔ دوسرا اپنا سینہ تھامے اس انداز میں پڑھوں سے لڑھکا جس انداز میں بوڑھا کمان میں لڑھکا تھا۔

مجھے بوڑھے کمن میں کی بے وجہ موت کا افسوس تھا۔ اگر میں نے ایک لمبے بھی انتظار نہ کیا ہوتا اور ڈاکوئیں کی جپ رکتے ہی فائرنگ شروع کر دی ہوتی تو شاید وہ مرے سے بچ جاتا لیکن اس صورت میں بھی اس کے فائرنگ کی زد میں آئے گا اسکاں برمالی موجود تھا۔

تیسرا ڈاکو کچھ پھرتا تھا۔ اس نے تیزی سے گھومتے ہوئے کچھ جیک کے اندر داخلہ جولائی فائرنگ شروع کی لیکن اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ گولیاں کس طرف سے آئی تھیں۔ اس نے ایک ایسے جگہ مکان کی کالی کڑی پر برست مارا تھا۔ اسے بیٹھا ادھر سے فائرنگ کا شبہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صحیح طور پر کچھ سکڑا بیٹھی کلا شکوف کی گولیوں نے اس کا لہو بھی پھانٹ لیا۔

اسی دوران ذرا نیور نے اسٹیرنگ رکھ کر پستل چھوڑ کر اپنے قریب سے ہی ایک کلا شکوف اٹھا لیا۔ اسے غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ گولیاں کہاں سے آئی تھیں لیکن اس کے اپنے سامنے وعدا سکریں تھیں۔ اسے پچھاتے ہوئے فائرنگ کرنے کی غرض سے اسے کھڑا ہونا پڑا اور کھڑا ہوتا اسے بہت مرنگ پڑا۔ اس کی کمر بڑی اور چہرے میں بیٹھا

بیک سے اور کوئی بھی باہر نہیں آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ علی کے لوگ اندر بیٹھے قہر کرا رہے ہوں گے میں نے کلا شکوف کدھرے پر لٹائی، چرے سے ڈھانا ہٹا کر اڑک کدھوں پر ڈالی اور بازار میں نکل کر دیوار سے لگ کر یوں کھسکا ہوا آگے بڑھا جیسے میں بھی اس ساری کارروائی سے خوف زدہ ہو جانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ کچھ آگے جاتا میری مجبوری تھی کیونکہ میرا گھوڑا ادھر بندھا ہوا تھا۔

بچے کچھ لوگوں میں سے زیادہ تر ادھر ادھر کھسک رہے تھے۔ چند ایک مت کر کے اب جائے واردات کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ لاشوں کی طرف یا پھر اس طرف دیکھ رہے تھے جہاں جیپ داخل آرائی ہوئی غائب ہوئی تھی۔

کھسے کے قریب پہنچ کر میں نے اپنا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہو کر گھوم کر دوسری گلی کے راستے گاؤں سے واپس روانہ ہو گیا۔ اس گلی میں چند عورتیں دوواڑے ذرا سے کھول کر صورت حال جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا "انہوں نے مجھے بھی ایک خوف زدہ شخص ہی سمجھا ہو گا جو جلد از جلد اس بجائے سے دور نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کم از کم اداکاری تو ایسی ہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آدمی اور طوفان کی طرح گھوڑا دوڑاتے ہوئے میں ایک بار پھر فارم پر پہنچا اور عقبنی دوواڑے سے فارم میں داخل ہوا۔ اپنے گھوڑے کو اسٹبل میں بندھ کر میں نے کلا شکوف وغیرہ کمرے میں رکھی۔ کپڑے تبدیل کیے پھر ایک اور گھوڑا ہارس فارم سے نکال کر میدان کی طرف چل پڑا۔ اس گھوڑے کو میں ان دنوں سدھا رہا تھا۔

میدان میں پہنچ کر میں نے جیسٹا کر دوش سے اپنا دھیان بالکل ہٹایا اور یوں گھوڑے کو سدھانے میں مصروف ہو گیا جیسے دنیا کا سب سے ضروری کام کی تھا اور میں گھنٹوں سے اسی کام میں مصروف تھا۔

سپر تک میں اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہا۔ مگر پرے کے قریب مہل نہ جانے کہاں سے دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اس کا چہرہ جوش و خروش سے تھم رہا تھا۔ شاید اسے برسوں میں پہلی بار کسی کو سنانے کے لیے کوئی سنی غیر میٹر تھی تھی۔ اس کی ہاتھیں کھلی جارہی تھیں۔

قریب آکر وہ بولا "معاف کرنا خان صاحب! آج تو میں نے آپ کے لیے دوپہر کا کھانا ہی نہیں بکایا۔ دراصل میں بازار گیا ہوا تھا اور وہاں جا کر ایسا پھنسا کہ اب واپس آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے کھانے کی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ صبح کی پٹی کبھی کبھ جیسٹا کھاتی تھیں۔ میں نے اسے قسلی دی۔ لیکن تم اتنے گھبراے ہوئے کیوں ہو؟ تمہاری تو

فی سوراخ ہوئے ہوں گے۔ اگر اس کے سر اور چہرے پر ڈھاننا نہ آتا تو شاید اس کی گھوڑی کا بیٹھ حصہ غائب ہی ہو جاتا۔ وہ پہلے بٹ، اور پھر اس سے نیچے لڑھک گیا۔

یہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا تھا جیسے کوئی انتہائی مختصر رائے کی ایکشن فلم ہوئے زور و شور اور گھن گھن سے شروع دی ہو لیکن اس کا انجام نفس ہو کر رہ گیا ہو۔ سب کچھ جیسے پلک پلک میں ختم ہو کر رہ گیا تھا اور بازار میں ایک لمبے کے لیے سوت اسما سکوت پھیل گیا تھا۔

باغیچہ ڈھانا پوش نے لپک کر بیک میں گھسنے کی کوشش کی۔ کسی غیر متوقع صورت حال میں کوئی اچھی حکمت عملی اختیار کرنے کے معاملے میں وہ لوگ زیادہ ہوشیار معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میرا پنا اندازہ اور تجربہ یہی تھا کہ اس قسم کے ڈاکوؤں کی درہشت زادہ ہوتی ہے اور اسی کا وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عام لوگوں کا وہشت زدہ ہونا بھی بجای ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ سامنے آنے والے کسی بھی نقص کو بلا ضرورت بھی چھٹی کر دیتے ہیں۔

میں نے اسے بھی بیک میں داخل ہونے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دوواڑے کے سامنے ہی ڈھیر ہو گیا لیکن اس وقت میری حیرت کی تہا نہ رہی جب میں نے بیک کا دوواڑہ کھلے دیکھا۔ ایک اور ڈھانا پوش اپنی دانست میں "مستط" انداز میں باہر جھانک رہا تھا۔ اس کی کلا شکوف کی نال حلاشی انداز میں اوڑھنا دھرم رہی تھی۔

میں نے کسی ڈاکو کو اندر جانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ میں سوچے بغیر نہ دسکا کہ آخر وہ بد بخت جیسا ڈاکو اندر سے کیسے جھانک رہا تھا؟ مجھے امکان یہی نظر آیا کہ جب جیپ بازار میں داخل ہوئی ہوگی تو اس کے ہاتھوں نے اسے بازار کے کمرے پر ہی اتار دیا ہو گا۔ اس کی ڈیوٹی بیک کا عقبنی دوواڑہ سنبھالنے کی ہوگی لیکن وہ غلاف توقع نازک کی آواز سن کر اوڑھ گیا تھا۔ بیک میں بیٹھ گئی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اب وہ مجب دوواڑہ کھولے جھانک رہا تھا۔

لیکن اسحق ہونے کے باوجود وہ یقیناً بے حد خوش قسمت تھا کیونکہ جب میں نے اسے ملک بدم کے راستے پر روانہ کرنے کے لیے زنگ بک دیا تو معلوم ہوا کہ میری کلا شکوف کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔

اس ڈاکو نے کوئی ناز کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے اپنے ہاتھ کی سکوت کو یقینت جانا۔ اسی طرح جھٹکے جھٹکے وہ تیزی سے جیسٹا کے آگے جیپ میں گھسا اور اسٹیرنگ وھیل سنبھال کر تیزی سے ہٹائی سے جیپ وہاں سے نکال لے گیا۔ اپنے ساتھیوں کی مدد سے بیک کے سامنے ہی پڑی چھوڑ گیا تھا۔ میرے کلا شکوف ابھی توڑ کر گئے تھے وہ جان بچا کر نکل چکا تھا۔ بلاشبہ وہ خوش قسمت تھا۔ پہلی تھیں سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مجھے اس دروازے سے کیسے دیکھا تھا یا نہیں؟



پکڑی گری جا رہی ہے۔  
”دھم! سامیں! میں تمہارا ہوا نہیں ہوں“ اس نے کھپکھپا  
ہو کر جلدی سے پکڑی درست کی پھر قدرے سنبھل کر بولا ”آپ  
نے کچھ سنا سائیں؟“

”نہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔  
”بہت خاص ہے سامیں!“ وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔  
”تو پھر مجھے کہاں سے معلوم ہوگی“ میں نے باہمی سے کہا  
”مجھے ابھی یہاں کی خاص باتیں کون بتاتا ہے؟ میں ابھی یہاں نیا  
ہوں نا۔ اور پھر میں کوئی اہم آدمی بھی نہیں ہوں۔“

”نہیں جی۔ اہم تو آپ ضرور ہیں“ عبدل نے کوا تلی دی  
کہ مجھے دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ بہت ہندھالے والے لہجے  
میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولا ”تو یہ سبانی جی نے سب کو خاص  
طور پر حکم دیا تھا کہ آپ کا بہت اچھی طرح خیال رکھیں اس لیے  
ہماری نظر میں تو آپ خاص آدمی ہوئے۔“

”نہیں۔ تم وہ بات بتاؤ جو بتانے لگے تھے؟“ میں نے کہا۔  
”ادھر ادھر کچھ کر رہے آکھیں پھیلاتے ہوئے بولا ”سامیں! وہ  
بات یہ تھی کہ آج ہمارے گاؤں کے چنگ پر ڈاکا مارنے لگا تھا۔  
بڑے خطرناک قسم کے پانچ ڈاکو آئے تھے اور آج ریشمائی جی کی  
فصلوں کا بہت رویہ چنگ میں تھا۔ وہ تو آج یقیناً ساری رقم لوٹ  
کر لے جاتے لیکن پتا نہیں کون کھس رحمت کا فرشتہ بن کر آیا۔  
اس نے پانچ ڈاکوؤں کو گولی مادی۔ چھٹا پیپ لے کر فرار ہونے  
میں کامیاب ہو گیا۔“

”اچھا۔“ میں نے دل ہی دل میں اس کی باتوں سے محفوظ  
ہوتے ہوئے بظاہر حیرت سے کہا ”لوگوں تھا وہ نیک دل اور بہادر  
آدمی؟“

”جی تو کمال ہے کہ اس کا کچھ پتا نہیں چلا“ عبدل نے جوش  
لے میں بولا ”صرف ایک بڑھیا نے اس کی جھٹک دیکھی تھی جو  
اپنے چہرے کی کڑکی میں کھڑی تھی مگر اس کی نظر زیادہ اچھی  
نہیں ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ بھی ڈاکوؤں کی طرح ہی ڈھانٹا  
باندھے ہوئے تھا اور ایک تنگ سی گندنی لگی سے گولیاں چلاتا نظر  
آتا تھا۔ بڑھیا فائرنگ سے ڈر کر اندر جا کر چھپ گئی تھی۔ سکون  
ہونے پر وہ دوبارہ کھڑی میں آئی تو وہ گھٹس غائب ہو چکا تھا۔“

پھر عبدل نے خیال ظاہر کیا ”مکن ہے وہ بھی ڈاکوؤں ہی کا  
ساتھی رہا ہو لیکن کسی بات پر آخری وقت میں ڈاکوؤں سے اس کی  
جھڑپ ہوئی ہو گی یا ہو اور اس نے اپنے ساتھیوں پر ہی فائر  
کھول دیا ہو۔“ وہ خاصا خطرناک خیال ظاہر کر رہا تھا۔ معلوم  
نہیں کس نے اس کے دماغ میں یہ بات ڈالی تھی۔

”تم سے کس نے کہا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی بھی ہو سکتا تھا؟“  
میں نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسری سے لہجے  
میں پوچھا۔

- اردو کے شاہکار سفرنامے ضیاء ساہد -/00  
منتخب مشہور سفرنامے ضیاء ساہد -/50  
منتخب مشہور افسانے ضیاء ساہد -/10  
منتخب اعلیٰ افسانے ضیاء ساہد -/15

مکتبہ القرآن اردو بازار - لاہور 2

”یہ تو میں خود سوچ رہا ہوں سامیں!“ وہ ذرا غصے سے ا  
میں بولا ”گوئی اور ایسا دیکھ دیکھا تو اسے پوشیدہ رہنے کا  
ضرورت تھی؟ وہ تو یہ سبانی جی سے انعام حاصل کرتا۔“

”ذبحہ عبدل!“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے  
ہوئے روانہ لہجے میں کہا ”تم زیادہ سوچ بچار نہ کیا کرو۔ تمہارا ہمار  
تمہارا خواہ خواہ اتنا سوچنے میں خرچ ہو جائے گا۔“  
”وہیکھیں خان صاحب! میں ادھر ادھر کسی سے فلاحیات  
نہیں ہوں لیکن انسان کو سوچ بچار تو کرنی چاہیے نا“ وہ دبا  
سے لہجے میں بولا۔

”چھا خیر۔“ میں نے اس کا کندھا حلقہ ”یہ بتاؤ پھر کیا ہو  
کچھ نہیں صاحب! اس پانچ دس سیکڑ میں ہی سب  
ہو گیا۔“ وہ ابھی تک بھان زدہ لہجے میں ہی بات کر رہا تھا  
سامیں! اللہ نے ہوا کریم کیا کہ چنگ کھنے سے بچ گیا۔ بڑی  
کھلی گئی تھی۔ سارا گاؤں ادھر جمع ہو گیا تھا۔ رب نواز اور  
کے دوسرے کئی آدمی ادھر ہی تھے۔ وہ بھی سوئے پر بچ  
پولیس کے جوچے آدمی تھا نے ہوتے ہیں ان کی تو سمجھ نہ  
نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ پھر حاصل آباد سے بھی کچھ پولیس  
تھی۔ ڈاکوؤں کی لاشیں بھی دی لے گئے ہیں۔ ابھی کچھ بچ  
چل رہا کہ وہ کس گروہ کے ڈاکو ہیں اور کس علاقے سے آئے

کردوں گا کہ اس پڑھے لکھے انگریز کے ذمے واقعی کوئی اور ہی کام لگا دیں۔ یہ کام تو میں اکیلا ہی کر لیں گا۔ جتنے گھوڑے اس وقت قارم میں موجود ہیں، ان کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں لیکن اس وقت میرے پہلے کے کچھ کام رکے ہوئے ہیں، وہ منٹ جائیں تو میں گھوڑوں کی طرف پوری توجہ دوں گا۔ جب میں اس کام میں پوری طرح لگوں گا تو گھوڑے مجھ سے پناہ مانگیں گے۔

”ہاں سائیں! میرا خیال ہے گھوڑوں کو اس بات کا اندازہ تو ہو چکا ہے“ عبدال مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے“ میں نے سنجیدگی سے اس کی تائید کی۔ ”گھوڑا اچھا خاصا ذہین جانور ہے۔ بہت سی باتوں کا اندازہ کر لیتا ہے۔ اسی لیے تو گھوڑوں کو سدھانا میری نظر میں کوئی مشکل کام نہیں۔ البتہ گڑھوں کو سدھانا بہت مشکل کام ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ“ عبدال مسکراتے ہوئے سر ہلا کر بولا اور صفائی کرنے قارم کی طرف چلا گیا۔

میں نے ایک سفری بیگ اٹھا کر بائیں کندھے پر اور کلا مشکوف دائیں کندھے پر لٹکانی، کمرے کو تالا لگایا اور عقیبی راستے سے نکل کھڑا ہوا۔ بیگ میں سب سے اہم چیز اس رقم کا پیکٹ تھا جو گزشتہ روز قیسر خان اپنے اہلے پر پہنچانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس میں سے کچھ رقم تو میں نے اپنے متوقع اور غیر متوقع اخراجات کے لیے رکھ لی تھی لیکن بیشتر رقم اب بھی پیکٹ میں موجود تھی جو کسی حراسِ نصیب کے حالات بدلنے کے لیے کافی تھی۔

میں خاصا لمبا چکر کاٹ کر رسائی ٹالے پر پہنچا اور اس کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ میں حاصل آباد سے آنے والی بس پکڑنا چاہتا تھا لیکن گاڑی کے اڑنے سے اس بس میں سوار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ بس پر بھنی معمولی سی احتیاط کے پیش نظر میں نہیں چاہتا تھا کہ مقامی لوگوں میں سے کوئی مجھے بس میں بیٹھ کر کہیں جاتے دیکھے۔ میں اس کو راستے ہی میں روک کر سوار ہونا چاہتا تھا۔

میں سمتوں کی مدد سے اندازاً اپنے مطلوبہ مقام کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ذرا رخ آمدرفت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں۔ حاصل آباد سے آنے والی ایک بس مختلف قصبوں اور مقاموں کے قریب سے گزرتی ہوئی جامی ٹھہر چکی تھی۔ جامی ٹھہر اس کا آخری اسٹاپ تھا۔ خاصا طویل سفر تھا اس لیے میں گھوڑے پر نہیں جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آج ہی اپنے ٹھکانے پر واپس بھی آجائوں۔

برسائی ٹالے میں خاصا پانی موجود تھا۔ پہاڑی علاقوں کی طرح یہاں بھی کسی زمانے میں لوگوں نے کچھ ایسا انتظام کیا تھا کہ فاضل اور بے کار زمین میں بڑے بڑے گڑھے گھوڑا بارش کے پانی کو محفوظ کر لیتے تھے۔ پھر اسے ٹالوں کے ذریعے اور دوسرے پہنچاتے تھے مگر اب یہ علاقہ نہری نظام سے منسلک ہو چکا تھا اور بجلی بھی اب تک تھی اس لیے کہیں کہیں نیوپ دہل بھی لگ گئے تھے۔ چنانچہ یہ

زمان کے بارے میں کچھ بتا چلا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں میں نے انہیں جنم رسید کیا ہے۔“

”پھر خیر۔ اچھی بات یہ ہے کہ بیک لٹنے سے بچ گیا“ میں نے

”ہاں سائیں!“ اس نے تائید میں سر ہلایا۔ ”ریشمائی جی سنیں لی تو بہت خوش ہوں گی۔ بیک میں زیادہ دھوپ ہے۔ جیسے انہی کا ہوتا ہے لیکن شاید وہ فکر مند بھی ہوں کیونکہ اس سے پہلے کبھی ڈاکوؤں نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ یہاں آج تک اس قسم کی کوئی اذیت نہیں ہوئی تھی۔“

میں نے دلی دلی میں کہا: ”ڈاکو تو کب سے اس پہاڑی ورت کے گرد سائشوں کے جال میں رہے ہیں مگر اسے کچھ پتا ہی نہیں۔ کسی روز اچانک ہی اس کا یہ گوشہ غایت شعلوں میں گر کر تباہ ہوا۔“

”آدم جیل سے میں نے کچھ نہیں کہا اور گھوڑے کی دھم پکڑ کر اسے واپس ہارس قارم میں لے آیا۔ میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اب مجھے خواہ خواہ وہاں اپنے آپ کو حروفِ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف یہی جانتا چاہتا تھا کہ میرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا۔“

دوسرے روز صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے عبدال سے کہا: ”میں ذرا ایک کام سے جا رہا ہوں۔ شاید شام تک واپس ہو۔“

”نہ آئے تو اس سے کتنا اکیلا ہی کام کرتا رہے۔ جس گھوڑے کو میں سدھا رہا تھا اسے ہی سدھانے کی کوشش کرے۔“

”شیر محمد تو شاید آج نہ آئے“ عبدال ٹھوڑی کھپاتے ہوئے

”کیا بات ہے؟“

”میں نے یہ بات ہے سائیں کہ اسے گھوڑے سدھانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ وہ تو بس ایسے ہی ناگہم پاس کر رہا ہے۔ اس کے خیال میں یہ بالکل بے کار اور جاہل آدمیوں کا کام ہے۔“

”کیسی بات! اس کی نظر میں بے کار اور جاہل آدمی ہو گئے۔“ میں نے سچے پرانے روک کر مسکراتے ہوئے پوچھا: ”مجھے واقعی اس بات کا حصہ نہیں آتا تھا بلکہ میں لطف اندوز ہوا تھا۔“

”عبدال بہ دستور ٹھوڑی کھپاتے ہوئے بولا: ”سائیں! وہ تو خود بہت جاہل ہے لیکن اب میں کیا کروں۔ میں تو چودہ آدمی ہوں۔ اسے سبھی تو اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے، چپ کر کے سن لیتا ہوں۔ بہر حال اس کا اب اس کام سے بالکل دل ہٹ چکا ہے۔ اسی لیے وہ ہمارے ہمارے سے غوطے مارنے لگا ہے۔“

”آج وہ کدو رکھنا صاحب کے پیچھے لگا ہوا ہے کہ اس کے آگے کوئی اور کام لگا جائے۔“

”میں نے تو بہت اچھی بات ہے“ میں نے خوش دلی سے کہا: ”میرا سنا کہ کدو صاحب سے ہوا تو میں بھی شیر محمد کی ساداش

لاڈو

قصر اجناسوی قیمت: = PD



پرانا، مٹنی نظام متروک ہو چکا تھا لیکن ان گزروں اور خانوں میں اب بھی اکثر برساتی پانی جمع رہتا تھا اور اودھو آتے جاتے مویشیوں کے پینے میں کام آتا تھا۔

میں زرنج کے بارے میں سوچتا ہوا ٹالے کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ میں اپنی دانت میں دل پیچک نہیں تھا۔ زندگی میں وہ کچھ دیکھ لیا تھا کہ دل تو مشکل سے ہی کسی پر آتا تھا اور میرا خیال تھا کہ مستقل طور پر تو میرا دل راحیلہ میں ہی اٹکا ہوا تھا کیونکہ وہ میرا لاکھن کا خواب تھی لیکن نہ جانے کیوں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہایت ہی غیر معمولی لڑکی نظر آتی جاتی تھی جو دل میں ایک بے عنوان سی عین جگا دیتی تھی۔

زرنج قیقا تھا ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اسی دن ہو گیا تھا جس دن میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ آج کے دور میں اس قسم کی لڑکیاں خوابوں کی دنیا میں ہی کچھ نہیں لیکن میں اس کے بارے میں کچھ سوچتا نہیں چاہتا تھا اپنے ذہن کو الجھاتا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ کسی نشے کی طرح میرے حواس پر نہ چھا جائے۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے خواب کیا تھے، آئینہ بڑا کیا تھے، اس کا مرکز نظر اس کی سوچوں کا محور کیا ہو سکتا تھا؟ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ میں اندازہ کرتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری سوچوں اور میرے حالات میں انتشار پیلے ہی کچھ کم نہیں تھا۔ میں اپنے ذہن کو مزید الجھاتا نہیں چاہتا تھا۔ آخر انسان کتنے خوابوں کے غار اردوں میں الجھ سکتا تھا اور کتنے خوابوں کی تعینا سکتا تھا؟

میں ایک معمولی بے وقعت اور بے حیثیت شخص کے طور پر اس سے ملتا تھا اور چاہتا تھا کہ اسی طرح رخصت ہو جاؤں۔ میں بھی چند روز بعد اسے بھول جاؤں، وہ بھی میرے بارے میں کچھ نہ سوچے لیکن نہ جانے کیا بات تھی، کسی نہ کسی ہمارے اس کا خیال ذہن میں کھسا چلا آتا تھا۔ ان لحاظ میں دل میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہو جاتا تھا جو مجھے ڈراتا تھا۔ اس طرح کا گداز کوئی اچھی علامت نہیں ہوتا۔

ایسے لحاظ میں، میں اپنے آپ کو راحیلہ کے تصور میں الجھانے کی کوشش کرتا تھا جس میں زندگی اور موت کی ایک عجیب جنگ لڑتے چھوڑ آتا تھا جس میں اسے صرف اپنے بارے میں ہی نہیں، اپنے تمام ساتھیوں کے بارے میں بھی فیصلے خود ہی کرنے تھے۔ وہ اس قسم کے معاملات میں صرف میری وجہ سے ابھی تھی۔ درنہ وہ در کراچی میں اپنی چھوٹی سی ملازمت میں مصروف مگر ہر سکون زندگی گزار رہی تھی۔ میں راحیلہ کے بارے میں سوچتا تو زرنج کا تصور ذہن میں ڈرا دم پڑ جاتا لیکن عموماً نہیں ہوتا تھا۔ میں اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش جاری رکھتا مگر کڑے کے گرد گھم جاتے تو وہ بھی آسانی سے نہیں چھوٹی۔ یہ تو پھر بھی ایک نایاب سی لڑکی کا خیال تھا!

میں انہی خیالات میں الجھتا ہوا ٹالے کے کنارے کنارے برساتی جو ہڑ کے قریب پہنچ گیا لیکن وہیں ٹھک کر رہ گیا۔ جو قریب ڈھلوان اور ریتی سی زمین پر ایک پرانی جیب ترچھی تھی۔ اس کے چاروں پینے دیکھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ہو چکے تھے یا ان میں سے ہوا نکلی ہوئی تھی۔ دراصل اس دیکھ کر ہی میں ایک لمحے کے لیے ٹھک کر رہ گیا تھا کیونکہ اس پینٹ پر واضح حروف میں "پولیس" لکھا ہوا تھا مگر پولیس کی اس متروک سے انداز میں دیرانے میں کیوں کمزری ہوئی تھی جیب خالی تھی اور اور گرو بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیب میں تھا اور اس کے کنارے ڈھلوان تھے۔ پہلے میں کہہ تھا وہاں چکر کاٹ کر جیب اور جو ہڑ سے کھو اڑا اس جا گزرا جوں مگر پھر شاید تجسس نے حوصلہ بھی دلا یا اور مجبور ہو میں جیب کے قریب چلا گیا۔ اسی دوران میری نظر ٹھیک میں طرف مچی تو مجھے دوسری ہجرت کا سامنا کرنا پڑا۔

جو ہڑ میں کالی پانی موجود تھا لیکن گولا تھا اس لیے اگھرائی کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ہڑ کے کنارے نیم ڈھلوان زمین پر ایک شخص اور دوسرے منہ پڑا تھا۔ وہ ڈھلوان واکس میں تھا۔ سر سے پاؤں تک گندے پانی اور کچھڑ میں تھا۔ وہ بیٹھا جو ہڑ میں گرنے کے بعد باہر آیا تھا لیکن عجیب تھی کہ اس کے اچھے اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں بھی ریتی کی بندشیں تھیں۔

وہ قطعی ساکت تھا۔ معلوم نہیں زندہ بھی تھا یا مر چکا تو پھر میں نے بغور دیکھا تو اس کے اوپر ہی دھڑ میں مودوم بی نظر آئی جو نشانہ ہی کر رہی تھی کہ وہ سانس لے رہا تھا۔ میں

سے کوسوں دور یہاں شاید میری تلاش میں۔۔۔ یا پھر کسی اور جرم کی تفتیش میں مارا مارا بھرا رہا تھا۔

یاد ہے کہ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا مگر اس دور میں اپنے فرائض کے یاد رکھتے تھے؟ ہر کوئی صرف حقوق کا طلب گار تھا۔ فرائض کے لیے جن کو سرکاری کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا ان میں سے کچھ لوگوں کا تقرر ہوا، تھریروں، رپورٹوں، فائلوں اور دستخطوں سے کام چل رہا تھا۔ کچھ صرف ڈیڑے سے کام چلا رہے تھے۔ رجم مکمل بھی چاہتا تو آرام سے اپنے علاقے میں اپنے تھانے میں بیٹھ کر ماسکی کرنا، موج اڑانا اور صرف رجسٹر کالے کروا کر آمدمد جان پھیلی پر لیے پھرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی یہ ادا مجھے پسند آتی تھی۔ ایسے شخص کو اس عالم میں نہیں مرنے چاہیے تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور وہ گندے جوڑے کے کنارے پڑا ہو۔

میں نے اس کی بند شمش کھولیں۔ تھیں کے نیچے اس کی کمر سے بولسٹر بھی بندھا ہوا تھا مگر اس میں رپوٹور نہیں تھا۔ میں اسے اٹھا کر جوڑے کچھ دور ہموار زمین پر لے آیا۔ اس کے چہرے اور جسم پر گلی ہوئی کچھ خشک ہو چکی تھی۔ اسے جوڑے باہر آئے یقیناً کافی دیر گزر چکی تھی۔ میں نے اسے کسی جھٹکے کی طرح بھاڑا پوچھا، اس کا نام منہ صاف کیا اور ہاتھ پیروں کی تھوڑی سی ماسی کی کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سرد تھے۔

وہ بالکل بے دم لگ رہا تھا مگر ہاتھ پاؤں کی ماسی کے دوران قطعی غیر متوقع طور پر وہ کھسکا یا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے پل شاید وہ خالی الذہن سا رہا اور میری صورت اسے دھندلی نظر آئی کیونکہ اس نے کئی بار پلٹیں جھپکائیں پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے بے مشکل اپنے ہاتھ پیروں کو ذرا سی حرکت دی اور اٹھنے کی کوشش کی۔

میں اطمینان سے اس کی کوششوں کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ اٹھنے میں ناکام رہا تو میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”آرام سے لیٹے رہو۔ تمہارے اٹھ کھڑے ہونے سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔“

”تم کون ہو؟“ اس نے نہایت ذرا سی آواز میں پوچھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ ”گڈی“ سیاہ جھٹے اور بڑھی ہوئی شیو جیسی سادہ سی چیزوں سے میک اپ کی کمی پوری کر دی تھی لیکن رجم گل اپنی تمام تر شگفتہ حالی کے باوجود جتنی توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس سے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچان رہا ہے۔ چاہے میں نے گلے میں پڑی ہوئی اجرک کچھ اس طرح جھکی کہ اس کا کچھ حصہ چہرے کے سامنے بھی آگیا۔

”میں تو ایک راہ گیر ہوں“ میں نے جسم جو اب رہا پھر انجان بیٹے ہوئے پوچھا ”تم ہذا کون ہو؟ اور حرجو جیب کھڑی ہے کیا وہ تمہاری ہے؟“ اس کی تیریلیٹ پر پولیس لکھا ہوا ہے۔

اس کے قریب پہنچا اور ایک ہاتھ سے اپنی مگن اور چادر ہٹھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میں نے اسے سیدھا کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کا چہرہ اور بال گوکہ پچھڑے تھے مگر اس شخص کو رجم گل تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانسوں کی آمد و رفت مست تھی۔ گل میں نے اسے بڑے فطرتاً سے صاف ستھرے گلے میں چمک سے نکلنے دیکھا تھا۔ توجہ اس حال میں پڑا تھا۔ معلوم نہیں کیا اجرا تھا؟ جب وہ میرے تعاقب میں تھا تو دردی میں تھا اور کھڑے پر تھا لیکن اب شہارہ ایس میں تھا اور قریب ہی اس کی سرکاری جیب بھی کھڑی تھی۔ شاید اس نے کسی قریبی پولیس اسٹیشن پہنچ کر مدد حاصل کی تھی لیکن کیا اس نے میری۔۔۔ یعنی اپنی راست میں ایک خطرناک ڈاکو کی تلاش جاری رکھنے کے لیے مزید پولیس فورس کی مدد حاصل نہیں کی تھی؟ گلٹا بھی تھا کہ وہ کچھ بھی کر رہا تھا، اکیلا ہی کر رہا تھا اور اکیلا ہی ہونے کی وجہ سے اس حال کو پہنچا تھا۔

ایک بار تو میں نے سوچا کہ اسے پوچھ کر اپنی راہ لوں۔ اول تو مجھے اس صورت حال پر خوش ہونا چاہیے تھا کیونکہ کسی اور نے میرے جیسے کام کر دیا تھا۔ اسے یقیناً بہت زیادہ مار پیٹ کے بعد ہاتھ پاؤں باندھ کر جوڑ میں پھینک دیا گیا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ کھنسا ہوا جوڑے نکل آیا تھا۔ اس کی ناخنیں اب بھی گھٹنوں تک پانی میں ہی تھیں۔ اس کے کپڑے جھٹے ہوئے تھے۔ جسم اور چہرے پر کچھ کے باوجود ضربات کے نشان نظر آ رہے تھے۔ چھاتی کی کھال چٹنی ہوئی تھی اور وہاں سے یقیناً کافی خون بہہ چکا تھا۔ چہرے پر نسل پڑے ہوئے تھے۔

بہت سے طہان کا تھانوں اور حقارت خانوں میں دوران تفتیش کیا حال ہوتا تھا جو اس وقت انسپکٹر رجم کا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک سخت جان، مضبوط اور قد آور شخص تھا۔ یقیناً بے پناہ قوت برداشت کا مالک تھا۔ نہ جانے اس نے کتنی مار پیٹ برداشت کی تھی۔ اس وقت وہ نیم جاں نظر آ رہا تھا۔

یہ بات یقینی تھی کہ اگر میں اسے پوچھ کر آگے روانہ ہو جاتا تو وہ موت کے منہ میں چلا جاتا۔ گلٹا بھی تھا کہ دوسرے شاؤنڈاؤر ہی کسی کا گزر ہوتا تھا۔ انسپکٹر رجم گل تو خیر ایک اچھا آدمی تھا لیکن اس طرح بے بسی کے عالم میں کسی کو بھی مرنے چھوڑ کر آگے بڑھنا ہمارے فطری طور پر نہیں تھی۔ اگر مجھے یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ وہ ایک کرہٹ اور کمزوروں پر ظلم کرنے والا پولیس آفیسر تھا تو میں دل میں ذرا سی بھی غلٹ محسوس کیے بغیر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔

لیکن اب تک اس کے بارے میں جو شواہد میں ملی تھیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی پولیس آفسرز میں سے ایک تھا جو اب تکیا بے ہوشے جا رہے تھے۔ وہ اپنی عمل داری اپنے علاقے



”ہاں۔۔۔ میں پولیس انسپکٹر ہوں۔۔۔“ اس کی آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی۔ لیکن یہ میرا علاقہ نہیں ہے۔۔۔ میں ایک ضروری کام سے آیا ہوا تھا۔۔۔ توجہ منحہ اور سرے گزر رہا تھا کہ

ڈاکوؤں سے سامنا ہو گیا۔۔۔ انہوں نے اچانک ہی مجھے گھیر لیا۔۔۔ وہ تعداد میں سات تھے۔۔۔ انہوں نے مجھے راتھوں کے کندوں سے مارا۔۔۔ پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر جوہڑ میں پھینک دیا۔۔۔ وہ گولی بھی مار سکتے تھے۔ لیکن وہ چاہے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ تکلیف سے مر جاؤں۔ جب انہوں نے مجھے پانی میں پھینکا اس وقت میں بے ہوش تھا لیکن پانی میں گرتے ہی مجھے نہ جانے کیسے ہوش آیا اور میں نے سانس روک لی۔۔۔ وہ مجھے کہ میں ڈوب دگا ہوں۔۔۔ اس لیے وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی طرح کھینٹا ہوا باہر آیا۔۔۔“

وہ اپنے کے سے انداز میں کمری کمری سانس لینے لگا۔ میں نے تائب زدہ لبے میں کہا ”۱۳“ ڈاکوؤں کی اتنی ہمت بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے راہ چلنے ایک پولیس آفیسر بلا دیا۔۔۔ تعداد کر کے اور اپنی دانست میں اسے ہلاک کرنے کے لیے جوہڑ میں پھینک دیا۔ حالانکہ آپ نے ان کو گرفتار کرنے کی فکر کو پیش نہیں کیا ہوگی؟“

”میں اگر خبردار ہوتا تو شاید کوئی کارروائی کرتا۔۔۔ کیونکہ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔۔۔ مگر اس وقت تو میں کسی اور ہی خیال میں۔۔۔ اپنے دھیان میں جا رہا تھا۔۔۔ انہوں نے اچانک ہی مجھے آنا گھیرا تھا۔“ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے قدرے کمری نظر سے میری طرف دیکھا اور خود استغاثہ کے سے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔ اس نے زخمی ہونٹ کھینچ کر کہے

پھر وہ پہلے سے قدرے بہتر آواز میں بولا ”جہاں تک ہمت کی بات ہے۔۔۔ ڈاکوؤں کی ہمت تو اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔۔۔ میں تو اکیلا تھا۔۔۔ اُمیں موقع ملے تو وہ پولیس کی کسی بڑی پارٹی پر بھی حملہ کر سکتے ہیں۔۔۔ حوصلے تو شرٹا کے پست ہوتے ہیں۔۔۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ اس میں کسی حد تک ہم پولیس والوں کا قصور ہے۔۔۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں۔۔۔ جن کا ہم پولیس والوں سے بھی زیادہ قصور ہے۔۔۔ ہر حال میں تو ظالی کی اپنی ہی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ میری زندگی تو ظالی ہی کے لیے وقف ہے۔۔۔ لیکن میں تنہا ہوں۔۔۔ بہت تنہا۔“

اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر اس کی مسکراہٹ میں شکست خوردگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ مجھے مزید اچھا لگا۔ اس حال میں اس طرح کی باتیں کرنا اور مسکرانے کی کوشش کرنا کوئی انسان کام نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس شخص سے کبھی میرا مقابلہ آئے گا اور وہ مجھے ہلاک کرنے پر بھی قائل نہ ہوگا۔ یہی شاید ہی جواب اسے باز رکھنے کے سوا اس کے خلاف کچھ نہ کر سکوں۔

میں نے اپنی رائے پر جاتے ہوئے پولیس آفیسر اس طرح حلسہ اس طرح اسے جان سے مارنے کی کوشش۔۔۔ یہ معاملہ میری کچھ کچھ میں نہیں آیا۔“ وہ ٹانگوں کو حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”مجھے مارنے وقت وہ جو باتیں کر رہے تھے ان سے مجھے کسی حد تک دلچسپی اندازہ ہوا ہے۔۔۔ اگر تم زور ناچ گھر کے رہنے والے ہو تو شاید جیسے معلوم ہو کہ کل وہاں کے بینک میں چند ڈاکو آئے تھے۔ اچانک کہیں سے فارنگ ہوئی۔۔۔ وہ بینک لوٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ پانچ ڈاکو مر گئے۔ ایک بھاگ گیا۔ بد قسمتی سے۔ اس واقعے سے کچھ دیر پہلے میں ایک اور کام سے اس بینک میں تھوڑی دیر کے لیے گیا تھا۔ ڈاکوؤں کو اس بات کی اطلاع ہو گئی۔۔۔ وہ سمجھے کہ مجھے کسی ذریعے سے جبری ہو گئی تھی۔ اور میری ہی وجہ سے ذمہ داری نکال دی گئی۔ انہوں نے مجھے کوئی رضامند کرنے یا کسی سوال کا جواب دینے کی مصلحت نہیں دی۔ لیکن اُن مجھے واقعی اس ذمہ داری کے بارے میں پہلے سے خبر لاتی تھا۔۔۔ مجھے اکیلے اسے روکنے کی کوشش کرنا پڑی“ میں ضرور کرنا۔ معلوم نہیں وہ کون نیک آدمی تھا جو پولیس کے جیسے کام کر گیا۔“

میں اجڑک کی اوٹ میں مسکرایا۔ وہ میرے لیے ”چہ آدمی“ کے الفاظ استعمال کر رہا تھا اور اسی ”بینک آدمی“ کو گرفتار کرنے کے لیے بار بار مارا پھرتا تھا۔ شاید اسے گمان بھی نہیں تھا اس وقت وہ اسی بینک آدمی سے ہم کام تھا۔

میں نے محقق کے اس پہلو سے کھڑے ہونے پر چما ”آؤ“ نے اگر آپ کو بے خبری میں گھیرا تھا۔ تو اس کا مطلب ہے وہ کو پچھتاہے؟“

”ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے بہت اچھی پہچانتے تھے۔ لیکن میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہر حال کبھی نہ کبھی جان جاوے گا۔ بشرطیکہ زعمہ رہا۔۔۔ میں ضدی انسان ہوں۔“ اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی مگر اندر سے پہلے ہی کی طرح مضبوط تھا۔ وہ زیادہ زخمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اندرونی چوڑوں اور درہنک بندھا ہوا رہنے کی وجہ سے اسے حالت خراب تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جاری تھیں۔ بار بار کوشش کر کے نہ صرف انہیں کھلی رکھ رہا تھا بلکہ بغور طرف دیکھنے کی کوشش بھی کیے جا رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھ سے سہا پشیمانہ آتارے اور

کے سامنے سے اجڑک بنانے کی بھی فرمائش نہ کر دے۔ میں نے کمری سانس لینے ہوئے کہا ”میں ایک بہت ضروری کام سے جا رہا تھا۔ بہت جلدی میں ہوں ورنہ جیسے گھر کے چلے۔ ہر حال میں جیسے کسی ایسی جگہ پہنچانے کا بندھ کر کے جاؤں گا جہاں نہیں مدد میسر آسکے۔“

”ہاں۔۔۔ میں پولیس انسپکٹر ہوں۔۔۔“ اس کی آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی۔ لیکن یہ میرا علاقہ نہیں ہے۔۔۔ میں ایک ضروری کام سے آیا ہوا تھا۔۔۔ توجہ منحہ اور سرے گزر رہا تھا کہ ڈاکوؤں سے سامنا ہو گیا۔۔۔ انہوں نے اچانک ہی مجھے گھیر لیا۔۔۔ وہ تعداد میں سات تھے۔۔۔ انہوں نے مجھے راتھوں کے کندوں سے مارا۔۔۔ پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر جوہڑ میں پھینک دیا۔۔۔ وہ گولی بھی مار سکتے تھے۔ لیکن وہ چاہے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ تکلیف سے مر جاؤں۔ جب انہوں نے مجھے پانی میں پھینکا اس وقت میں بے ہوش تھا لیکن پانی میں گرتے ہی مجھے نہ جانے کیسے ہوش آیا اور میں نے سانس روک لی۔۔۔ وہ مجھے کہ میں ڈوب دگا ہوں۔۔۔ اس لیے وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی طرح کھینٹا ہوا باہر آیا۔۔۔“

وہ اپنے کے سے انداز میں کمری کمری سانس لینے لگا۔ میں نے تائب زدہ لبے میں کہا ”۱۳“ ڈاکوؤں کی اتنی ہمت بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے راہ چلنے ایک پولیس آفیسر بلا دیا۔۔۔ تعداد کر کے اور اپنی دانست میں اسے ہلاک کرنے کے لیے جوہڑ میں پھینک دیا۔ حالانکہ آپ نے ان کو گرفتار کرنے کی فکر کو پیش نہیں کیا ہوگی؟“

”میں اگر خبردار ہوتا تو شاید کوئی کارروائی کرتا۔۔۔ کیونکہ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔۔۔ مگر اس وقت تو میں کسی اور ہی خیال میں۔۔۔ اپنے دھیان میں جا رہا تھا۔۔۔ انہوں نے اچانک ہی مجھے آنا گھیرا تھا۔“ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے قدرے کمری نظر سے میری طرف دیکھا اور خود استغاثہ کے سے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔ اس نے زخمی ہونٹ کھینچ کر کہے

پھر وہ پہلے سے قدرے بہتر آواز میں بولا ”جہاں تک ہمت کی بات ہے۔۔۔ ڈاکوؤں کی ہمت تو اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔۔۔ میں تو اکیلا تھا۔۔۔ اُمیں موقع ملے تو وہ پولیس کی کسی بڑی پارٹی پر بھی حملہ کر سکتے ہیں۔۔۔ حوصلے تو شرٹا کے پست ہوتے ہیں۔۔۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ اس میں کسی حد تک ہم پولیس والوں کا قصور ہے۔۔۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں۔۔۔ جن کا ہم پولیس والوں سے بھی زیادہ قصور ہے۔۔۔ ہر حال میں تو ظالی کی اپنی ہی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ میری زندگی تو ظالی ہی کے لیے وقف ہے۔۔۔ لیکن میں تنہا ہوں۔۔۔ بہت تنہا۔“

اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر اس کی مسکراہٹ میں شکست خوردگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ مجھے مزید اچھا لگا۔ اس حال میں اس طرح کی باتیں کرنا اور مسکرانے کی کوشش کرنا کوئی انسان کام نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس شخص سے کبھی میرا مقابلہ آئے گا اور وہ مجھے ہلاک کرنے پر بھی قائل نہ ہوگا۔ یہی شاید ہی جواب اسے باز رکھنے کے سوا اس کے خلاف کچھ نہ کر سکوں۔

میں نے اپنی رائے پر جاتے ہوئے کہا ”ساہہ لباس میں۔۔۔ میں نے بھاری درست کرتے ہوئے کہا ”ساہہ لباس میں۔۔۔

والے خود ہی اسے سنبھال لیں گے۔  
 ”تم بھی ساتھ چلو گے؟“ بڑے میاں نے جیسے جیسے میں  
 پوچھا۔

”میں اس وقت ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔  
 میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ شاید میں اسے کدھے پر ہی  
 لے جاتا۔“ میں نے جواب دیا اور گردن ذرا ٹیڑھی کر کے رجم گل  
 کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں بند  
 تھیں۔

بڑے میاں اپنی مختصر سی چوڑی درست کرتے ہوئے بولے  
 ”دیکھو بر خوردار! تم زور آور آؤی گئے ہو۔ کلا شکوف بھی تمہارے  
 پاس ہے۔ تم چاہو تو اس مرے ہوئے یا ادھ مرے آؤی کو ذریعہ  
 بھی میری گاڑی میں ڈال سکتے ہو لیکن تمہیں اس قسم کی ہمارے  
 بازی کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں کیوں کسی چکر میں پھنسانے کی  
 کوشش کر رہے ہو؟ اس سے جان بچرانی ہے تو گنڈبازی سے دور  
 کہیں جھاڑیوں میں پھینک دو۔“

بڑے میاں اتنے سیدھے سادے نہیں تھے جتنے نظر آ رہے  
 تھے۔ میں ذرا شرمندہ سا ہو گیا کیونکہ انہوں نے مجھے جھوٹا سمجھا  
 تھا۔ رجم گل بدل سمجھ دھیلے ڈھالے انداز میں میرے کدھے پر لٹکا  
 ہوا تھا۔ شاید وہ بے ہوش ہو چکا تھا اس لیے میری بات کی تصدیق  
 نہیں کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں متذبذب میں پڑ گیا کہ کیا  
 کروں؟

اسی دوران بڑے میاں ذرا توقف کے بعد بولے ”اگر میں  
 تمہاری بات پر یقین بھی کروں کہ یہ پولیس انسپکٹر ہے۔ تب بھی  
 اسے اس حالت میں تھانے پہنچانے کا تجربہ میں حوصلہ نہیں ہے  
 بیٹا! تھانے والے تو مجھے ہی دھریس گئے۔ اگر یہ مرنے نہیں ہے لیکن  
 راستے میں اللہ کو پیارا ہو گیا تو میں بالکل ہی مارا جاؤں گا۔ ہم غریب  
 لوگ ہیں۔ ہمیں معاف ہی رکھو۔“

اسی لمحے رجم گل کسمایا پھر غایت میرے انداز میں میرے  
 بازو پر کچھ سیدھا ہوتے ہوئے آگئی سے آنکھیں کھول کر غایت  
 دہم آواز میں بڑے میاں سے مخاطب ہوا ”کھیراؤ نہیں بابا! یہ  
 نقص جو کچھ کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم مجھے لے چلو۔  
 تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ بلکہ شاید کچھ انعام ہی مل  
 جائے۔ اور اس کے علاوہ میں زندگی بھر تمہارا شکر گزار بھی رہوں  
 گا۔ چاہا! ہمارا معاملہ بدامنام براؤں والا ہے۔ ہم پولیس والے  
 اسے بڑے نہیں ہیں جتنے بدنام ہیں۔“

اب بڑے میاں کے کہنا ہونے کی باری تھی۔ انہوں نے  
 اشارے سے رجم گل کی گاڑی میں لٹانے کی اجازت دے دی۔  
 میں نے اسے بوریوں کے قریب لٹایا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے میری  
 طرف دیکھتے ہوئے مھل سے انداز میں مسکرایا۔ اس مسکراہٹ  
 میں تشکر کی آمیزش تھی۔

”تم مجھے صرف زرتاج مگر کے تھانے تک پہنچانے کا  
 فہم دست کرو۔ بس تمہاری ہلکی سروانی کافی ہوگی۔“ وہ مجھے تھکے سے  
 انداز میں آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے کدھے پر اٹھایا اور تلی و طحوان زمین پر احتیاط  
 سے پاؤں جاکر مزید اوپر اگیا۔ وہ ایک جیسیم آؤی تھا اور اس وقت  
 بے جان سے انداز میں میرے کدھے پر لدا ہوا تھا اس لیے اس کا  
 وزن کچھ اور زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ بے ہوش یا مرنے والے شخص کو  
 اٹھا کر چلتا را مشکل ہوتا ہے۔ ہر حال میں اسے اٹھانے زرتاج مگر  
 کی طرف واپس چل دیا۔

خوش قسمتی سے مجھے زیادہ دور تک نہیں چلنا پڑا۔ ابھی میں  
 نے فلائنگ ڈیزے فلائنگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ تل کھائی  
 گنڈبازی کے ایک طرف سے آئی ہوئی چوں چوں کی ہلکی سی آواز  
 نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔  
 ڈگگالی سی ایک تیل گاڑی گنڈبازی کی طرف چلی آ رہی تھی۔

میں روک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ تیل گاڑی میں ایک بوڑھا  
 جوڑا سوار تھا۔ مرد بڑوں کا رنگ رہا تھا اور عورت ڈھیلے ڈھالے  
 سے انداز میں قریب پیچھی تھی مگر مجھ پر نظر پڑنے ہی وہ دونوں کچھ  
 متنبہل کر بیٹھ گئے۔

فاصلہ کچھ اور کم ہوا تو گاڑی کے پچھلے حصے میں دو بھری ہوئی  
 بوریوں بھی لدی نظر آئیں۔ بڑے میاں نے اب شک ذہنی  
 نظروں سے میرا جائزہ لیتا شروع کر دیا کیونکہ میرے کدھے پر ایک  
 شخص بے جان سے انداز میں لٹکا ہوا تھا۔

مجھے کچھ کرنے کی ضرورت چش نہیں آئی۔ بڑے میاں نے  
 قریب پہنچ کر خود ہی متذبذب سے انداز میں گاڑی روک لی اور  
 سولہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں چاچا؟“ میں نے غایت نرمی سے  
 پوچھا۔ میرے لیے سے غالباً بڑے میاں کو کچھ حوصلہ ہوا پھر بھی  
 انہوں نے مشورہ طلب سے انداز میں اپنی ہم سفر کی طرف دیکھا  
 جس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے غیر ارادی سے  
 انداز میں آدھا چوہا چادر میں چھپا لیا تھا۔ بڑے میاں گویا نظروں ہی  
 نظروں میں اس سے اجازت طلب کر رہے تھے کہ سوال کا جواب  
 دینا بہت دیر۔

یہی کی طرف سے کوئی واضح اشارہ نہ پا کر بڑے میاں دوبارہ  
 میری طرف متوجہ ہوئے اور ہچکچاہٹ آمیز لیے میں بولے ”زرتاج  
 کچھ بتا رہا ہوں۔“

میں نے اپنے کدھے پر لداے رجم گل کی طرف اشارہ کرتے  
 ہوئے کہا ”یہ شخص پولیس انسپکٹر ہے۔ ڈاکوؤں نے اسے بے ہوش  
 کر کے جوڑ میں پھینک دیا تھا۔ آپ صرف اتنی تکلیف اٹھائیں کہ  
 اتنے اپنی تیل گاڑی میں ڈال کر لے جائیں اور زرتاج مگر کے  
 تھانے پہنچا دیں۔ بس آپ کو اور کچھ نہیں کرنا ہے۔ وہاں پولیس

و نہایت دھیمی آواز میں ہوا "میں تمہارا بھی شکر گزار ہوں گا۔"

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور تیل گاڑی سے اتر آیا۔ بڑے میاں کا شکر یہ ادا کر کے میں تیزی سے واپس اسی طرف روانہ ہو گیا۔ بدھ مرے آیا تھا۔ میں عقل کی روشنی میں فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے رحیم گل کی جان بچا کر اپنے حق میں اچھا کیا تھا یا برا؟ لیکن میرا ضمیر مطمئن تھا۔ فی الحال میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا۔ میں اب زیادہ دور کی سوچوں میں نہیں الجھتا تھا۔

سمتوں کی عدد سے سفر کرنے کے معاملے میں میرے اندازے ہمیشہ درست ہی رہتے تھے۔ میں سوک پر اسی مقام پر پہنچ گیا جہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے وہاں خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار جانی نگر کی طرف جانے والی بس آتی دکھائی دی۔ بس کیا تھی؟ انسانوں کا ایک بچہ تھا جو لڑھکلا چلا آ رہا تھا۔

بس قریب آئی تو یہ چلا کہ اس کے اندر بھی انسان بھیڑیں کیوں کی طرح ششے ہوئے تھے اور صرف عمارتوں ایسا نہیں تھا بلکہ حقیقتاً بس میں انسانوں کے ساتھ کئی بھیڑیں کھڑی بھی موجود تھیں۔ مسابرات کے ذریعہ اصولوں پر کچھ زیادہ ہی عمل کرتے ہوئے دو پایوں اور چپایوں کو یکساں انداز میں ٹھوس کیا تھا۔ بعض جگہ تو فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ انسان کون سا ہے اور بکرا کون سا۔ جھٹ پر بھی لوگ اپنی پٹلیوں، صندوقوں اور دیگر سازو سامان کے ساتھ موجود تھے۔ جہاں جہاں لنگے کی مچائش تھی وہاں لنگے ہوئے بھی تھے۔ بڑے شہروں میں رہنے والے سمجھتے ہیں کہ ان کے مسائل سے بڑھ کر کسی کے مسائل نہیں لیکن دیکی اور دور افتادہ علاقوں میں جا کر پتا چلتا ہے کہ انسان کس حال میں زندگی گزار رہے ہیں اور انہیں قدم قدم پر کتنے مسائل اور کتنے مصائب سے دوچار پڑنا پڑتا ہے۔

اس عبرتناک صورت حال کے باوجود ذرا نیچے والے انتہائی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ ہلانے پر بس روک لی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے یہ بس چھوڑ دی تو دور سری بس کے لیے شاید مجھے زیادہ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑے۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح باتوان کے ایک کونے پر پاؤں پھینکا کہیں بھی ٹک ہی گیا۔ زیادہ فکر مجھے اس بات کی تھی کہ اس حکم پیل میں کبیں رقم اور دھار نہ ہو جائے۔ اس صورت میں تو ساری تک دودھ بے کار چلی جاتی۔

چند ایک دہائیات اور فیصے گزر چکے تو بس پر بوجھ کافی کم ہو گیا۔ میری حالت میں اتنی "تہی" ہوئی کہ میں اندر پہنچ گیا اور ایک سیٹ کے نیچے کا سارا لے کر قدرے باعزت انداز میں کھڑا ہو گیا۔ مزید ایک گھنٹے کے سفر کے بعد تو مجھے سیٹ بھی میسر آئی لیکن اس وقت تک میں جانی نگر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

جانی نگر کے اسٹاپ پر میرے سوا کوئی نہیں اُترا۔ بس اپنے کسی ٹھکانے یا اڈے کی طرف روانہ ہو چکی تو میں نے سر جھٹک کر

اُدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے میں ریلنگ کے کسی چھوٹے موٹے مقابلے میں حصہ لے کر رنگ سے باہر گیا تھا۔ جسم میں ابھی جھنجھٹا ہٹ باقی تھی۔

غیبت تھا کہ ایک طرف چھوٹا سا ایک ٹیڑھا میز چھاسا کھانگڑا زمین میں گڑا ہوا تھا جس پر "جانی نگر ٹاؤن" لکھا ہوا تھا اور جڑکا نشان بھی بنا ہوا تھا۔ میں کچے میں اُتر کر لیے لیے ڈگ بھرتا اس طرف چل رہا۔ تین چار فلائنگ کا قاصد ملے کرنے کے بعد جانی نگر کے مکانات نظر آنے لگے۔

جانی نگر اچھا خاصا قصبہ معلوم ہوا تھا اور اس کا میں انعام بھی باوثوق تھا۔ میرا پی پائوس تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک شخص سے ملاقات کرنا ہی پڑی۔ نہ جانے کیوں اس نے راست بتانے سے پہلے میرا سر آ پاجازہ لیا۔ بہر حال اس نے راست مجھے سمجھایا۔ وہ تو میرے ساتھ چلنے پر بھی کمر بستہ نظر آئے گا تھا۔ میں نے بہ مشکل اسے باز رکھا۔

اس کے بعد مجھے میرا پی پائوس تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ خانے عسکرت زوہ سے مکاؤں پر مشتمل ایک مختصر سی گلی تھی جس میں چار پانچ بچے کھیل رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا "یہاں! تمہیں معلوم ہے کہ کنڈ عبدالرشید کا گھر کون سا ہے؟" لڑکا اپنے ساتھیوں کی نسبت ذرا بڑا تھا۔ دس بارہ سال کا ہو گا۔ وہ آخریوں سے کھیل رہے تھے۔ میرا سوال سن کر بڑا لڑکا کھیل کو بھول بھال کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے مستعدی سے پولا "جئے ڈاکوؤں سے قتل کر دیا تھا؟"

"ہاں" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

وہ چاروں بچہ وقت مجھے گھبراتے پر تل گئے اور مجھے گویا گھبرا کر آگے چل دیے۔ ان سے پوچھ کر سن تو مجھ ہی گیا تھا۔

عبدالرشید کا مکان گلی میں دائیں ہاتھ پر آخر میں تھا۔ اس سے آگے گلی بند تھی۔ وہ نیچی سی دیواروں والا ایک نیم پلٹہ مکان تھا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ ہوا تھا جس کا خلا حصہ آٹا تھا۔ مجھے دھک یا آواز دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قیام نیچے دھڑو دھڑو کرتے دروازے دار اندر کھس گئے اور چند سیکنڈ بعد اپنی رفتار سے واپس آگئے۔ وہ میرے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور بڑے نمبرانہ انداز میں میرا جائزہ لینے لگے۔

چند لمحوں بعد ٹاٹ کا پردہ ذرا ایک طرف کو سرکا اور میں نے عقب سے دی موٹی موٹی آنکھیں کھلیں جو میں جو بھی سمت دیکھتا رہتا ہوں کی لیکن اب غم کے غبار سے دھندلائی ہوئی سی تھیں۔ وہ صحیح چہرہ خنہ میں نے ایک چھوٹی سی اخباری تصویر کی صورت میں دیکھا تھا "اس وقت سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک اور اس چاند تھا جس کے گرد نامی بادلوں کا حلقہ تھا۔ ان افسردہ آنکھوں نے میرا سر تاپا جائزہ لیا اور ٹاٹ کے پردے پر سر میں اٹھیل کی گرفت غیر

رومی طور پر خفت ہو گئی۔

”ہائیات ہے بھائی؟ کون ہو تم؟“ اس کے لب  
”ہائیات“ اس لفظ کی طلاوت اور شیرینی میری رنگ

پے میں اتر گئی۔  
میں نے ہچکچاہٹ سے ایک نظر بچوں کی طرف دیکھا جو یوں  
سراٹھائے مجھے دیکھ رہے تھے جیسے کسی بیٹار پر کھد کسی اجنبی زبان  
کے الفاظ کا سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔  
”میں ایک منٹ کے لیے اندر آ سکتا ہوں؟“ میں نے اجازت

طلب کی۔  
ایک لمبے کے لیے اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار دکھائی  
دے پھر وہ فیصلہ کن لمبے میں بولی ”مگر میں اس وقت کوئی مرد نہیں  
ہے۔“

”چچا! تم جا کر کیلو۔ مجھے بہن سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں“  
میں نے بچوں کے لیڈر کو پیار سے چھکی دینے ہوئے کہا۔ ان کے  
چہروں پر پائیدگی کی اور ناگوار کی کے تاثرات ابھر آئے لیکن وہ باہل  
ناخواستہ گئی کہ اس سرے پر واپس چلے گئے جہاں وہ کچھ دیر پہلے  
اخروں سے کھیل رہے تھے۔ ان کا لیڈر وہاں پہنچ کر بھی کچھ  
دیکھو اس سے اصرار نہ کیا۔

میں نے اپنے بیگ سے اس رقم کا پیکٹ نکالا جو غمیر خان  
”کوئی کلب“ سے لے کر چلا تھا اور جو اسے ہلاک کرنے کے بعد  
میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس میں اب بھی تقریباً پانچ لاکھ کی  
رقم موجود تھی۔

میں نے پیکٹ اس کی طرف پوچھتے ہوئے کہا ”عبدالرشید  
نے یہ پیکٹ کسی کے پاس امانت رکھوایا ہوا تھا۔ اس شخص نے  
اخبار میں عبدالرشید کے قتل اور اس کے کنبے کے حالات کے  
بارے میں پڑھا تو میرے ہاتھ یہ چیز آپ لوگوں کے لئے بھجوائی  
تھی۔ اس نے کہا ہے کہ اب جبکہ عبدالرشید اس دنیا میں موجود  
نہیں ہے تو آپ لوگ ہی اس کی امانت کے وارث ہیں۔ ویسے بھی  
عبدالرشید نے یہ آپ لوگوں کے لیے ہی رکھوائی تھی۔ اس نے کہا  
تھا کہ وہ کسی مناسب وقت پر لے جائے گا لیکن اس کی زندگی نے  
پتہ نہیں کیا۔“

”لوگ کہا تھا یہ پیکٹ تھانے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔  
میں نے سنا ہے اس میں؟“ اس کے لمبے میں ایک بے عنوان سا  
تعلیق تھا۔ ”کیا نام ہے ان کا۔ جنہوں نے یہ بھیجا ہے؟“

”میں نے سنا ہے ان کا نام بتانے سے منع کیا ہے اور مجھے یہ بھی  
معلوم نہیں کہ اس پیکٹ میں کیا ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا  
کہ اس میں ایک ایسی چیز ہے جو آپ کے بہت کام آئے گی۔ یہ چیز  
صرف عبدالرشید کو واپس نہیں لاسکتی لیکن آپ کے باقی تمام  
سہاکیں حل کر دے گی۔ آپ سے رکھ لیں۔“  
عبدالرشید کا محض نام سن کر ہی لڑکی کی آنکھیں بھرنی تھیں

حالا کہ اس کے قتل کے بعد سے اب تک اس کا وقت یقیناً آنسو  
بہاتے ہی گزرا ہو گا لیکن آنسوؤں کے سوتے شاید خشک ہونے کا  
نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ گھو گھیر تو آوازیں بولی ”جو چہز عبدالرشید کو۔۔۔ میرے بھائی  
جان کو واپس نہیں لاسکتی وہ ہمارے کس کام کی۔“  
”بہر حال یہ تم لوگوں کی امانت ہے“ اسے رکھ تو لو“ میں نے  
زور دیا۔

اس نے پیکٹ بے دلی سے قیام لیا اور ایک طرف بٹھے ہوئے  
بولی ”اندرا آ جاؤ بھائی!“ اب گویا اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ  
کر لیا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں اب میرے اندر آنے کی ضرورت نہیں رہی۔  
میں چل رہا ہوں۔ خدا حافظ“ میں نے کہا اور تیزی سے مڑ کر واپس  
چل دیا۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ دو اس آنکھیں  
ابھی تک میری جانب ٹھہراں تھیں۔ اب ان آنکھوں میں آوازی  
کے ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

میں جس راستے سے آیا تھا، تیزی سے اسی راستے سے واپس  
چل دیا۔ ایک عجیب سی سرشاری ”ایک عجیب سی خوشی کی خوشبو پر  
مسام جہاں سے رنج کی گہرائی میں اتر آئی تھی۔ میں اپنے آپ کو  
بے حد ہلکا چھلکا محسوس کر رہا تھا اور اس وقت گویا چل نہیں رہا تھا“  
اُڑ رہا تھا۔ کسی کی مدد کرنے میں ایک عجیب ہی لذت چھان بھنی  
ہوئی۔ کوئی اور خوشی اس کا ضمیر ابدل نہیں ہو سکتی۔ غمیر خان والی  
رقم میں نے قبضے میں تو لے لی تھی لیکن اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار  
دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ مجھے ایک بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ رقم کیسی بھی ہو، چھپکی نہیں جاتی۔ میں  
شروع سے ہی سوچ میں تھا کہ اس رقم کا اچھا مصرف کیا ہوتا  
چاہیے۔ یک دم مجھے کنڈکٹر عبدالرشید کا خیال آ گیا تھا۔ کنڈکٹر کی  
جس واردات میں عبدالرشید مارا گیا تھا اس میں اور بھی کئی لوگ  
بارے گئے تھے۔ ان میں سے بھی کچھ یقیناً مدد کے مستحق ہوں گے  
لیکن میرے پاس ان میں سے کسی کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ میرے  
سامنے صرف کنڈکٹر عبدالرشید کا تھوڑا بہت سراغ موجود تھا  
اور مجھے امید تھی کہ میں کوشش کروں تو اس کے گھر تک پہنچ جاؤں  
گا۔ وہ رقم یقیناً نہایت ہی ناجائز اور گھنیا قسم کی کمائی تھی۔ مجھے  
نہیں معلوم تھا کہ یہ رقم عبدالرشید کے بہنہ باز کان یا اہل خانہ کو  
پہنچا کر مجھے ثواب ملے گا یا نہیں۔ میں گناہ و ثواب کے پتھر میں تھا  
بھی نہیں۔ میں صرف یہی چاہتا تھا کہ کمالی اس معصیت زدہ کنبے  
کے مسائل حل ہو جائیں۔

میں تقریباً پہلے ہی کے سے انداز میں سڑک کے رات گئے  
زرتاج ٹھہرا واپس پہنچ گیا۔ حالا کہ سڑک خراب نہیں تھا لیکن اس میں  
وقت بہت ضائع ہوا تھا۔  
زرتاج ٹھہرا واپس پہنچ کر دوسرے روز سے میں اپنے کام میں

مصروف ہو گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا لیکن بچنے کے انتظام پر ایک شام گاؤں کے ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے مجھے ایک ایسا جھٹکا لگا جس نے کافی دیر کے لیے میرے اعصاب شل کر دیے۔

بات کچھ بھی نہیں تھی۔ بس ایک اخباری خیر نظر سے گزری تھی۔ کاش میں نے وہ اخبار نہ دیکھا ہوتا۔ یہ وہی غیر مصروف سا علاقائی اخبار تھا جس نے شہر خان کے ساتھ ان کے خیر اڑے گلوں کی قلمب میں دیکھا تھا اور اس میں مقتول کنڈکٹر عبدالرشید کے اہل خانہ کے بارے میں فحش و خفا تھا۔

اس روز ذرا تاج مگر کے ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے مجھے اسی اخبار کا تازہ شمارہ میسر ہوا اور نظر آیا تو میں نے خیر راوی طور پر اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پچھلے دنوں سے چھوٹے سے ایک پاس میں اس روز بھی کنڈکٹر عبدالرشید کے اہل خانہ کے بارے میں ایک خبر موجود تھی جس نے مجھے ایک عجیب طرح کے حلال میں مبتلا کر دیا۔

نامہ نگار نے چالی مگر سے رپورٹ دی تھی کہ گزشتہ دنوں وہاں اپنی نوعیت کا عجیب سی واقعہ پیش آیا۔ کوئی پراسرار اجنبی مقتول کنڈکٹر عبدالرشید کے گھر پہنچا اور یہ کہہ کر پہلے پانچ لاکھ کی رقم کا چیک دے گیا کہ عبدالرشید نے وہ کسی کے پاس امانت رکھوایا ہوا تھا۔

خبریں سناں تک بھی ہوئی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اصل جھٹکا مجھے اس سے آگے بڑھنے کے بعد لگا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ عبدالرشید کے اہل خانہ کو یہ معاملہ مشکوک معلوم ہوا تھا۔ بھلا ایک غریب کنڈکٹر کسی کے پاس بڑے پانچ لاکھ روپے امانت کیسے رکھوا سکتا تھا؟ اگر وہ امانت بھی تھی تو یقیناً کسی اور کی ہوگی۔ عبدالرشید کی نہیں۔

چنانچہ عبدالرشید کے بیمار باپ نے وہ رقم گاؤں کی کھیتی کے جیڑیوں صاحب کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دی تھی جو کوئی حاجی صاحب تھے۔ وہ نہایت دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے علاقے کے تحصیل دار صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے گئے تھے۔ انہوں نے بھی نہایت دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سرکاری تحویل میں لے لیا تھا اور علاقے کے صحافیوں کو فخر سے یہ بات بتا دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کچھ دنوں تک اس رقم کا کوئی دعوے دار سامنے نہ آیا تو وہ اس میں سے عبدالرشید کے اہل خانہ کو پچیس ہزار روپے بطور انعام دینے کے بارے میں منظور کر دیں گے۔

پوری خبر مزہ کر میں نے اخبار میں واہیں پڑھ لیا اور دونوں ہاتھوں سے سرعام لیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ شاید میں نے ان لوگوں کی مدد کرنے کے لیے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنی کا دو باہری زندگی میں بھی تجربہ ہو چکا تھا، مجھے اس کو یاد رکھنا چاہیے۔

تھا کہ بعض اوقات حد سے زیادہ غریب اور مصیبت زدہ لوگوں زیادہ بڑی امداد "بھم" بھی نہیں ہوتی۔ مجھے کنڈکٹر کے گھر والوں کی مدد میں پچیس ہزار روپے سے ہی کوئی چاہیے تھی اور اگر کچھ رقم انہیں پہنچانی تھی تو صحیح طور پر بات کہنے کے انہیں ذاتی طور پر مطمئن کر کے پہنچانی چاہیے تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط تھا تھا کہ اسے "مادہ افیشی" سمجھ کر کچھ سے رکھ لیں گے۔

حرام کی رقم گویا حرام راستے ہی چلی گئی تھی۔ کافی دیر تک اس اسی طرح تانت کے عالم میں بیٹھا رہا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب اس کی غلطی کا کوئی طریقہ کم از کم میرے لیے قابل عمل نہیں تھا اس لیے میں نے اس بات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی کہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر ان لوگوں کے مقدرمیں وہی تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ پھر میں نے دودھ پتی کی ایک سیبک منگوا کر "مظہر" کرنے کی کوشش کی اور شام دھلے اٹھ کر اپنے ٹھکانے واپس آ گیا۔

اس ہفتے میں اس کے علاوہ کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ حویلی اور زرتاج کی زمینوں پر کام کرنے والے پشتر لوگ اب مجھے تو ذرا بہت جانتے لگے تھے۔ گو میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان کی نظریں غیر نمایاں اور بے نشانی ہی رہوں۔

شیر خرم نے اس دوران اپنی بیوی کیس اور گلوں کی تھی۔ یوں اسے میرے ساتھ کام کرنا کواری نہیں رہا تھا لیکن میرا دل کتابت کہ اس کے اس اقدام میں کوئی اور بھی مصیبت نہیں تھی۔ اور زرتاج ابھی تک شکار سے واپس نہیں آئی تھی۔ رب نواز اسے چیک پر تاناکم ڈھکتی کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین تھا۔

اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ شکار پر جانے والوں نے جنگلوں میں کہاں کہاں تکپ لگائے ہوں گے اور کس سمت میں ان کا سفر جاری ہو گا۔ وہ چاہتا تو آبی بھیج کر ان کا کچا کر سکتا تھا اور زرتاج کو وہیں یہ خبر پہنچا سکتا تھا مگر شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرتاج کی تقریر میں غلط پڑے۔

اسی دوران مجھے باتوں باتوں میں رب نواز سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جانو اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ زرتاج سے ملنے آیا تھا۔ اس نے اپنی آواز کا مقصد نہیں بتایا تھا لیکن وہ سخت فتنے میں معلوم ہوا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ زرتاج ابھی شکار سے واپس نہیں آئی تھی تو وہ مزید ایک منٹ بھی رستے بغیر واپس روانہ ہو گیا تاہم یہ کہہ گیا تھا کہ چند دن بعد وہ دوبارہ آئے گا اور اس وقت تک زرتاج شکار سے واپس آچکی ہو تو اس کے حق میں بہتر ہو گا۔ رب نواز نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لیے میں دھمکی ہی پوشیدہ تھی لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ جانو کس وقت آیا تھا اور کب واپس گیا تھا حالانکہ میں جس میدان کھوڑے سدھا تھا تھا وہاں تقریباً چاروں طرف سے ہی آنے جانے والے لوگ دکھائی دیتے

اور وہ سب اس وقت تک لاہور ہی میں تھے جب میں لاہور سے فرار ہوا تھا۔ میں نے ہی سب ساتھیوں کو وہاں جمع کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کراچی میں ان افراد کی عدم موجودگی میں اور کسی کو بھی علم نہیں ہو گا کہ میں یا میرے قریبی ساتھی کس حالات سے دوچار تھے۔

فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ میں زرنج کو مطلع کیے بغیر یہاں سے رخصت ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے محض ایک نظر مجھ پر ڈال کر جس غلوں سے مجھ پر بھروسہ کیا تھا، جس طرح میرا مسئلہ جنگی بجائے میں حل کیے تھا، جس طرح پورا پارس فارم میرے سپرد کر کے یہاں سے چلی گئی تھی، اس کے بعد اسے اطلاع تک دیے بغیر نہ چھوڑا کہ اس طرح بہت سی سے رخصت ہو جانے پر میرا دل آمادہ نہیں تھا۔ اس طرح بہت سی ناکردہ فطائیں بھی میرے کھانے میں پڑ سکتی تھیں۔

زرنج پورے دس دن بعد واپس آئی۔ اس کی واپسی کی بھی میں نے صرف خبر ہی لی اسے واپس آتے نہیں دیکھا۔ وہ رات میں کسی وقت آئی تھی۔ دوسرے دن سے حویلی میں لوگوں کی آمد و رفت بے پناہ بڑھ گئی۔ لوگ بڑے پرجوش انداز میں اندر جاتے اور مستعدی سے واپس آتے دکھائی دیتے۔

اسے دنوں میں زرنج کی عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا تھا، شاید اس کی رپورٹیں دی جارہی تھیں اور جو کچھ نہیں ہو سکا تھا، اس کے لیے امکانات لیے جا رہے تھے۔ فریڈک بڑی سرگرمی نظر آ رہی تھی لیکن مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ زرنج کا کوئی پیغام مجھے نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس نے مجھے طلب کیا تھا۔

البتہ اس دوران رب نواز کچھ رقم مجھے دے گیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا "تمہیں ضرورت ہوگی۔ رکھ لو"۔ یہ کہہ کر وہ جگت میں رخصت ہو گیا تھا۔ اس نے یہ بھی وضاحت نہیں کی تھی کہ یہ میری تنخواہ تھی یا کچھ اور۔ اگر تنخواہ تھی تو کس حساب سے کیونکہ ابھی تو مجھے وہاں ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا جبکہ رقم خاصی تھی۔ کم از کم گھوڑے سدھانے والے کو چند دن کی اتنی تنخواہ تو نہیں دی جاسکتی تھی۔

زرنج کو واپس آئے جب پارے چار دن گزر گئے اور میں نے اس کی جھنگ تک نہیں دیکھی۔ نہ ہی اس دوران اس کا کوئی پیغام ملا تو میں نے اپنے آپ کو خود اپنی ہی نظر میں خاصا بے وقعت محسوس کیا۔ میرے خیال میں ابھی اس کی نظر میں میری اتنی وقعت نہیں تھی جتنی میں سمجھتا تھا۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ میرے حق میں یہ اچھا، خراب تھا۔

پانچویں دن جب سورج دھل رہا تھا اور میں میدان میں بیٹھ وقت دو گھنٹوں کو سدھار رہا تھا تو ایک شخص حویلی کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ گویا ابھی اندر جا کر انہیں ہوا تھا لیکن میرے اندر شام آخر آئی تھی۔ ایک اور اس شام نہ جانے کیوں اچانک ہی میں

بٹھے شاید وہ کسی ایسے وقت آیا تھا جب میں کھانا کھانے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ شاید یہ ہم دونوں ہی کے حق میں اچھا ہوا تھا کہ ہمارا ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

بہر حال میں نے اس سلسلے میں رب نواز سے زیادہ کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید وہ میری طرف سے شک میں پڑ جائے کہ آخر اس کارندے کو جانو کی آمد وغیرہ سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ میرے حساب سے روز دسب سکون سے ہی گزر رہے تھے لیکن وہی میری نامعلوم ہی حس کبھی کبھی میرے اعصاب پر ہولے ہوئے دھک دینے لگتی تھی۔ گھڑی کی تک ٹک کی طرح!

خفہ کا احساس تو محض ایک احساس ہی ہوتا ہے، اس کا کوئی رد و رد نہیں ہوتا مگر مجھے یوں لگتا جیسے خفہ کوئی جسم اوڑھ کر آس پاس کہیں رات کے اندر میرے میں ٹھل رہا ہے، میری گھات میں ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں رات کو زبرد کا بلب روشن رکھے کا انتظام کیا تھا لیکن ایسے لمحوں میں میں وہ بلب بھی بجھاتا تھا اور اندر سے میں کسی دروازے کی طرح چوکنے ہو کر بیٹھ جاتا۔ اندر سے میں اسے اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتا لیکن یوں ہی بہت دیر گزر جاتی کچھ بھی نہ ہوتا۔ میرے کشیدہ اعصاب بالآخر دھیلے پڑ جاتے اور میں وہاں سو جاتا۔

میں زرنج کی واپس کا منتظر تھا۔ میں اب یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ میرے پاس اب کچھ رقم بھی موجود تھی۔ میں سنا بھی چکا تھا۔ ایک آدمہ کار آدم حتم کا ہتیار بھی یہاں سے ساتھ لے جاسکتا تھا۔ میرے یہاں سے جانے کا ارادہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ زرنج کو دیکھ کر میرے سینے میں کوئی غش سی سر ابھارنے لگتی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس عروسی کی غش تھی۔ میں اس سلسلے میں اپنے تحت الشعور یا الشعور کو گریہ نہیں چاہتا تھا۔ ذہن کی بھول بھلیاں عجیب ہوتی ہیں۔ آپ یونی او حرو اور میرے اندر سے میں ٹانگ ٹوٹیاں مارنے بیٹھیں تو نہ جانے کیا کیا لکھا چلا جائے۔

میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ بے عنوانی غش اور زور پڑنے کچھ اور گہری ہو۔ یا محض غش نہ رہے کچھ اور میں چاہتا ہوں ان سب تغیرات سے بہت پہلے میں یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے راجیہ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی بھی یاد تھی۔ وہ لوگ نہ جانے کس حال میں تھے۔ معلوم نہیں میرے غائب ہونے کے بعد وہیے ذات نے ان کا چچا چھوڑ دیا تھا یا نہیں؟

سب باتیں صحیح طور پر تو لاہور جا کر ہی معلوم ہو سکتی تھیں لیکن میں فی الحال سیدھا لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلے کراچی جا کر نوٹن اور دیگر ذرائع سے لاہور کی صورت حال جاننے کی کوشش کروں گا۔ کراچی میں صرف شفیق شاہ اور دو تین دوسرے ساتھی میرے تمام غیر کاروباری معاملات سے واقف تھے

اور اس خفیف سی تبدیلی نے اسے مزید دلکش بنا دیا تھا۔  
وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو ہر دوپ میں دلکش لگتی تھیں۔  
جن پر ہر چیز جتنی پسند وہ نوع انسان کو خوش نہیں لگتی تھی۔  
خاموش بیٹھی ہوتی تھی تو اس کی آنکھوں میں بچپن کی مصیبتیں  
ہلکے سے لپکتی نظر آتی تھیں لیکن جو نیو وہ بولنے کے لیے ہوتا تھا  
تھی وہ مصیبت کہیں میں سفر میں چلی جاتی تھی اور وہ لہجہ  
بکھرا اور نہایت عجیبہ نظر آنے لگتی تھی۔

”بیٹہ جاؤ افضل خان! اس نے صوفے کی طرف اشارہ کر لیا۔  
میں بیٹہ چکا تو اس نے ظیق میرانوف کی طرح پوچھا کیا لگا  
یہ ہے؟“

”میں تو صحرا کا اونٹ ہوں پھر طے کمالی لیتا ہوں اور نہ طے  
کئی کئی دن کھائے پئے بغیر کمال لیتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
اس کے ریلے ہوئوں پر وہ ہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔  
در حقیقت یہی تھی جس کا اس نے نہ جانے کیوں لگا کھونٹ دیا تھا۔  
مگر اس کی ہلکے سے ایک لمبے کے لیے آنکھوں میں پانی رہ گئی تھی۔  
وہ خوش دلتا سے بولی ”اب یہاں ایسی بھی کوئی آفت نہیں آ  
ہوئی ہے کہ کئی کئی دن کھائے پئے بغیر گزارنے پڑیں اور نہ ہی؟“  
صراحت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلا حلف بیٹا۔“

میں نے ایک لمبے کے توقف سے کہا ”پینے کے لیے کو  
لھڑی سی چیز منگو اور پیو۔“ گلا خشک ہو رہا ہے۔“  
میں اسے بتا نہیں سکا کہ یہ صرف شفقت اور دھپ کی  
تفاوت کا اثر نہیں تھا کہ گلا خشک ہو رہا تھا بلکہ یہ اس کی قربت کا  
حرارت کا بھی نتیجہ تھا۔

”تمہیں اور تو کچھ پینے پلانے کا شوق نہیں ہے؟“ اس نے  
میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ  
پوچھا۔

”اور کچھ؟ کیا مطلب؟“ میں بالکل انجان بن گیا۔  
”کی کوئی چیز؟ دھکے۔ دامن وغیرہ۔“ اس نے ہلکے  
چھپکاتے بغیر پوچھا۔

”یہ تو شاید آپ شرابوں کے نام لے رہی ہیں۔“ میں نے  
آنکھیں ذرا پھیلاتے ہوئے کہا ”قرب کریں جی۔ میں تو سیدھا  
سادا انسان چھاسا۔ غریب سا۔ پیڑو آدمی ہوں۔ اس قسم کے  
مٹکے اور بے کار شوق پالنے کے بارے میں میں نے کبھی سمجھ  
سوا۔“

”اچھا۔ واقعی؟“ وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی  
تھی۔ نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ ہوئوں پر خفیف سی  
مسکراہٹ برقرار تھی۔

”کی ہاں“ میں نے مسکین سے سلام کیا۔ اس نے ایک طویل  
سانس لی ”آواز دے کر ملازمہ کو بلایا اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ  
منگوائیں۔“

اپنے آپ کو بے حد غما ہے وہ اندر سے محسوس کرنے لگا تھا۔  
وہ شخص قریب آکر بولا ”خان صاحب! آپ کو ریسیائی جی نے  
یاد کیا ہے۔“

ایک لمبے کے لیے میرے اندر پھیلے ہوئے ستارے میں نقلی سی  
کھینچاں بکھیں۔ پھر میں نے اپنا جائزہ لیا تو یہ کھینچاں خاموش  
ہو گئیں۔ میرے پاؤں مٹی میں گھسے ہوئے تھے جسم سینے میں تر  
تھا اس لیے کپڑے کہیں کہیں جسم سے چپکے ہوئے تھے اور اگر میں  
آہستہ میں اپنا چوڑے کے سلاخ تھپتھپاتا اس پر گرد کی تہ کے ساتھ شفقت  
کی دھندلی سی نظر آتی۔ بال بھی یقیناً گھرے ہوئے ہی تھے۔

عجیب اتفاق تھا کہ مجھے ابھی تک درناج کے سامنے جانے کا  
جتنی مرتبہ بھی موقع ملا تھا ایسے ہی حال میں ملا تھا۔ یہ کچھ بے ہودہ  
سامی اتفاق تھا۔ پھر میں نے اس تائف کو خود ہی ذہن سے جھٹک  
دیا۔ بجلا مجھے کسی بہتر حال میں اس کے سامنے جانے کی ضرورت  
بھی کیا تھی؟

میں اس شخص کی رہنمائی میں چوہلی میں پہنچا۔ اس بار زرنج  
مجھے چلی منزل پر ہی لی۔ اصل نشست گاہ چلی منزل پر ہی تھی۔ یہ  
پرانی طرز پر آراستہ دیراستہ ایک طویل و عریض کمرہ تھا۔ دو سو  
تارنگ کے پس حجر میں بنے والی انگریزی قلموں میں اس قسم کی  
آرائش نظر آتی تھی۔

نور کچھ دیروازے تک چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ میں اپنے  
انصرے ہوئے پیروں کا خیال ذہن سے جھٹک نہ سکا اور چونک  
کے قریب پڑے ہوئے چھوٹے سے ٹاپے پر بیٹھ گیا۔ کمرے  
میں اتنا خوب صورت اور صاف ستھرا تاقین بچھا ہوا تھا کہ اس پر  
کندے پاؤں رکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

زرنج شاید میری ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھ گئی تھی۔ کمرے کے  
دوسرے سرے سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہی آواز جسے سن کر  
سماعت میں پھول سے کھل جاتے تھے۔

”بجلا جھک چلے آؤ“ وہ کہہ رہی تھی ”میرے تالین میری زمین  
کی مٹی سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہاں میرے قریب آ جاؤ۔ مجھے تم  
سے بہت ضرورت ہے تمہیں کرنی ہیں۔“

تب میں آگے چلا گیا اور اس صوفے کے قریب پہنچ گیا جو اس  
کے دامن ہاتھ پر رکھا تھا۔ اب میں نے سر اٹھا کر صحیح طور پر اس کی  
طرف دیکھا۔ میں اندر سے محسوس کرنے لگا تھا کہ ہر وہ لمحہ میرے  
ذہن میں مقید ہو جائے گا جب بھی میں اس کی طرف دیکھوں گا۔  
میں اپنے ذہن کے شکل میں ایسا یادوں کے سوائی جمع کرنا نہیں  
چاہتا تھا۔

وہ کدھر کے مردانہ شلوار قمیض میں تھی۔ لمبے ریشی پاؤں کو  
قابو میں رکھنے کے لیے ان کا جو ڈامایا ہوا تھا۔ پیروں میں کیڑوں  
کے جو تھے۔ پندرہ دن جنگل میں رہنے سے اس کی رعیت کی  
چاندنی میں جو ہلکا سا نولہا پن آیا تھا اس کے اثرات ابھی باقی تھے

ہست منون ہوں۔“

میں نے اپنے دل میں خوشی کی ایک دھیمی سی لہر ابھرتے محسوس کی۔ اچانک وہ زرا بلند آواز میں بولی ”میں دونوں ہی فریقوں کے بارے میں الجھن میں ہوں۔ اس شخص کے بارے میں تو خوشگوار حیرت اپنی جگہ ہے جس نے ڈاکوؤں کو مارا لیکن میں ڈاکوؤں کے بارے میں بھی پریشان ہوں کہ وہ کس کردہ کے تھے؟ کس علاقے کے تھے؟ اس قسم کی کوشش میرے لیے اور میرے اس گوشہ عافیت کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ڈاکوؤں کا قتل کس کردہ سے ہو سکتا ہے؟“

”میں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے پلوید لٹے ہوئے کہا ”میں تو ابھی علاقے کے شرقا کو ابھی طرح نہیں جانتا ڈاکوؤں کے کردہوں کے بارے میں مجھے کیا معلومات ہو سکتی ہیں؟“

در حقیقت میں یہ کہتے کہتے رہ گیا تھا کہ جانو کہ علاوہ بھلا وہ کس کے آدمی ہو سکتے تھے لیکن فوراً ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ابھی ان معاملات میں میرا اظہار خیال مناسب نہیں تھا۔ پہلے مجھے وہ سب کچھ سن لینا چاہیے تھا جو زرنج کما جا رہی تھی۔

وہ ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے روشن انداز میں منکرائی اور گفتہ جیسے میں بولی ”کچھ زیادہ سی محتاط بن رہے ہو۔ بالکل فیلوٹ معلوم ہو رہے ہو۔“

میں نے ایک بار پھر منکراہٹ کی ڈھنڈی بٹا دی ”میں تو ایک معمولی سا آدمی۔ ایک غیر اہم سا کاڈیو ہوں ریسیائی جی! میں اس قسم کے معاملات میں کیا رائے ظاہر کر سکتا ہوں؟“

اس بار وہ کھل کر بولی۔ میں نے بولی بار اسے قہقہہ لگاتے ٹیٹا۔ کرا کر گویا عجیب بستی سی ہوں گے۔ بھر گیا۔ یہ کسی بے عنوان سُرٹ کی لہریں تھیں۔ سُرٹ کی شعاعوں کی طرح میرے وجود میں بھی جذب ہوئے لگیں۔

”ہاں۔“ وہ سر ملاتے ہوئے بولی ”مجھے کچھ اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ تم کتنے معمولی اور کتنے غیر اہم آدمی ہو۔ اور ہاں۔ اگر تم دو سروں کی طرح مجھے ریسیائی جی نہ کہو کہ تو مجھے خوش ہوگی۔ تم مجھے حرف زرنج کہہ سکتے ہو۔“

”لیکن یہ اچھا معلوم نہیں ہوگا“ میں نے کہا۔ ”اگر یہ مجھے اچھا معلوم ہوگا تو پھر یہاں اور کون ایسا موجود ہے جسے برا محسوس ہوگا؟“ اس نے جیسے جیسے میں پوچھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ آزاد اور خود مختار تھی لیکن اس کے معاملات میں دخل دے سکتا تھا؟

اچانک وہ اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے بولی ”کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ ڈیکٹی کی اس ناکام کوشش کے دوسرے ہی دن جانو اپنے چار آدمیوں کے ساتھ بہت غصے میں یہاں آیا تھا لیکن میں یہاں موجود نہیں تھی۔ وہ رب نواز سے کوئی خاص بات کہے بغیر تھیں دو چار پتھکارس مار کر چلا گیا۔ کل رات وہ اپنے چھ

فصلے کا دور چل چکا تو وہ گویا کسی غیر اہم سے واسطے کا تھکا۔ پھرتے ہوئے سرسری سے لہجے میں بولی ”تمہیں معلوم ہی ہوگا۔“

”نیک پروا کا ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی؟“

”جی ہاں۔ پتا چلا تھا۔ لیکن ڈاکو بہت نقصان میں رہے“ میں نے کہا۔ ”میں بہت خوش قسمت ہوں“ وہ سرور انداز میں دھیرے سے بولی۔ ”میرے علاقے میں کبھی کبھار ہی کسی بڑی واردات کی کوشش ہوتی ہے اور اس کا انجام کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اتفاق ایسا ہو جاتا ہے کہ واردات خود مجرموں پر آگٹ جاتی ہے یا مجھے کسی ایسے ذریعے سے کوئی مدد میسر آ جاتی ہے جس کے بارے میں میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ سرخال میں نقصان سے بچ جاتی ہوں۔“

”مثالیہ آپ کی نیک نیتی کا ثمر ہے“ میں نے کہا۔ ”مثالیہ۔“ اس نے ہنس سے لہجے میں کہا۔ ”دونوں باتوں کی اگھیاں ایک دوسرے میں جھنسنے“ ہاتھ گود میں رکھ کر وہ پرخیاں سے انداز میں ایک لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر سر اٹھائے بغیر بولی

”میں نے اُڑتی اُڑتی سی خبر سنی ہے کہ ڈاکوؤں کی طرح وہ بھی کوئی ڈھانچا پوش ہی تھا جس نے ڈاکوؤں کو گولیاں ماریں اور چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ صرف ایک پوچھا نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔“ اس نے سراٹھا کر ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا لیکن مزید کچھ نہیں بولی۔

”ٹھیک۔ وہ جو کوئی بھی تھا“ ہمارے حق میں تو اچھا ہی کر گیا“ میں نے گویا اس پہلو کو غیر اہم سمجھتے ہوئے کہا۔

”کسی حلقہ کسی خاص جذبے یا کسی ذاتی غرض کے بغیر کون ایسا دم بٹا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اس کام کے لیے بڑے حوصلے کی بھی ضرورت تھی۔ یہ کسی عام آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔“ وہ پرتو پری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ میں نے پلک نہیں جھپکائی۔

”ٹھیک“ مجھے بعد اس نے خود ہی فکر چرائی اور ذرا بادلے ہوئے لہجے میں بولی ”ڈیکٹی کی یہ رائج زیادہ تر میرے کش پر ہی چل رہی ہے لیکن اس کے کہنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نقصان کا وہ دار تو بیک پی ہوتا لیکن ظاہر ہے“ اس قسم کے باتوں کے اثرات اچھے نہیں ہوتے۔ ایک بار کوئی بھی واردات نہ ہو جائے تو مجرموں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرے چیز کی باری آتی چلی جاتی ہے رفتہ رفتہ نیت یہاں تک لگی پہنچ سکتی ہے کہ کھلی کھلی گھر گھر ڈاکے پڑنے لگیں۔ میں اسی بات کی قائل ہوں کہ واردات کو کامیاب ہونے سے روکا جائے۔ بعد میں بڑے کر گھیر پینے کا کچھ زیادہ ناکدہ نہیں ہوگا۔ اس قسم کی وارداتوں سے لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی کسی قیمت پر نہیں چاہی۔ اس لیے میں اس معلوم شخص کی



آپ کو اور بھی زیادہ مشکوک بنالیتا۔

وہ گویا کسی خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے مسکرائی اور بے پروائی سے بولی "ان دو نشانوں کی بنیاد پر بھی کسی پر اتنی نہیں رکھی جاسکتی۔ اور میرے خیال میں یہ بھی ایک اچھی ہی بات ہے۔ میرا حال جانوئے جو "قتیش" کی ہے اس کی بنیاد پر اس کا دوا ہے کہ اس سے ملنے کا کوئی آدمی زمینوں پر۔ فارم پر یا کسی اور جگہ۔ یہیں کہیں؟ اس پاس ہی موجود ہے اور مجھے اس کے بارے میں معلوم ہے لیکن میں پچھاری ہوں۔ بلکہ میں نے جاننا ہی ممکن نہ کیا ہے۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

"ظاہر ہے میں نے اس سے انکار کیا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں جس نے غینو کو قاتل کر دیا ہے لیکن وہ بدستور آگ بگولا رہا۔ اس دوران میں نے بڑے غل سے بات کرتے ہوئے اسے گریڈ نے کی کوشش کی کہ بیک پر ڈاکا ڈالنے کے لیے آنے والے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے والے ڈاکو کون ہو سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں وہ کوئی جواب دینے کے بجائے مزاح برہم ہو گیا جیسے میں نے اس کا کوئی زخم پھیر دیا ہو۔ اس نے بڑی لمبی چوڑی باتیں کیں۔ میں انہیں دہرا نہیں سکتی۔"

"شاید آپ مجھے پانا مناسب نہیں سمجھتیں؟" میں نے آنکلی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ اگر میں تم سے بات کرنا ٹھیک نہ سمجھتی تو ان میں سے کوئی بھی بات نہ کرتی جو میں نے اب تک کی ہیں۔ اس طرح تمہیں اپنے پاس بلا کر بیٹھنا پڑے گا۔ اسی لیے تمہیں نے تمہیں سب سے آخر میں اطمینان سے بلایا ہے کہ مجھے تم سے ساری ہی ضروری باتیں کرنا ہیں۔" وہ تیزی سے بولی "جانو کی باتوں کی تفصیل میں اس لیے نہیں دہرا رہی کہ وہ محض ایک جاہل آدمی کی خرافات کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ مختصراً تمہیں بتا رہی ہوں۔ بڑے بارے میں عزائم تو ایک عرصے سے اس کے دل میں پل رہے ہیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے۔ اب اس آتش فشاں کو پھٹ پڑنے کے بجائے میٹر آ رہے ہیں۔ جلد یا بدیر ایک نہ ایک دن میرا حال یہی کچھ ہوتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے مشورہ دیا کہ مجھے اپنی اوقات میں رہنا چاہیے، اس سے منکر کر سکتی چاہیے، اپنی جوانی کو یوں فضولیات میں نہیں گوانا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اس نے اپنی قیاس کا دامن اپنے گھٹنوں پر پھیلایا اور نظر جھکاتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں بولی "ایک تو اس بے چارے کو میری جوانی کی بہت فکر لاحق رہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا میں وہی ایک خیر خواہ جوان مرد اور طاقتور انسان ہے جس کی نوازشات کی بدولت میری جوانی بھل کر ادا ہو سکتی ہے۔ گدھا کیسے کہتا؟"

مجھے ذرا تاج کا جواب سن کر خوشی بھی ہوئی لیکن جانو کی باتوں

ساتھیوں کے ہمراہ ایک بار پھر آیا۔"

میں چونک گئی تھی اس کی آمد کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے اضطرابی انداز میں اس کی بات کانٹے ہوئے پوچھا "آپ سے ملاقات ہوئی؟"

"ظاہر ہے" وہ بولی "اور یہ ملاقات مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوئی ہے۔ میں نے جانو کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا۔ اس بار تو وہ جیسے کچھ کرنے کا ارادہ لے کر آئے تھے لیکن شاید کسی مصلحت کے تحت واپس پلے گئے۔ وہ بچوں میں آئے تھے۔ بہت سی کلا جنکو نہیں ان کے پاس تھیں۔ بچوں میں شاید گریڈ وغیرہ بھی موجود تھے۔ اور یہ صرف نمونہ تھا۔ وہ مجھے صرف ڈیڑھ دکھانے اور بتانے آئے تھے کہ اصل غم کی وقت بھی چل سکتی ہے۔"

"تو کیا اس نے حلیم کو لیا کہ بیک پر ڈاکا ڈالنے والے اسی کے آدمی تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اب اس بات کے اعتراف کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے غیظ و غضب کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ اس نے پُر خیال انداز میں ہاتھ ملے۔ اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر بیک وقت گراؤ کا بھی احساس ہوا تھا اور مضبوطی کا بھی۔"

"دیکھی وجہ؟" میں نے اپنے اضطراب کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا ایک نہایت قریبی ساتھی تھا۔ خیمہ خان۔ اسے تم جانو کا دایاں ہاتھ کہ لو۔ نائب کہ لو۔ نمبر نو کہ لو۔ تم نے اسے دیکھا ہی تھا۔ پچھلی مرتبہ تمہاری موجودگی میں جب جانو مجھ سے ملے آیا تھا تو تم چپ کر اٹھیں دیکھ ہی رہے تھے۔ وہ جو شکل سے ہی انتہائی حیثیت اور خطرناک لگ رہا تھا۔ وہ خیمہ خان تھا۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے" میں نے سر ہلایا۔ مجھے ابھن ہو رہی تھی کہ وہ بہت ٹوک ٹوک کر خیمہ خیمہ کر رہی تھی لیکن میں اپنی بے چینی اور اضطراب کو چھپاتے ہوئے تھا۔

"جانو بتا رہا تھا کہ خیمہ خان خاصی بڑی رقم سمیت پراسرار انداز میں غائب ہو گیا ہے۔" ذرا تاج کمری سانس لے کر بولی "آخری بار اسے غیر واضح سے ملنے والے ایک شخص کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایسا قلیلہ جو نہ جانے کتنے لوگوں پر فٹ آسکتا ہے۔ کچھ دنوں کی بڑھی ہوئی دائرہ میں تو نہیں۔ سربراہ کی چوکی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ۔ یہ عجیبہ تو کسی بھی شخص کا ہو سکتا ہے۔ وہ ایک نشانیاں ہیں جنہیں کسی حد تک اتنا ہی سمجھا جاسکتا ہے لیکن ان سے بھی کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ دوسرے اس کا تھکے غیر معمولی تھا۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر کمری نظر سے میرا جائزہ لیا۔ میں کسی مجرم کی طرح سارکت بیٹھا رہا۔ اگر میں اس وقت ذرا تاج کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتا تو شاید اپنے

ہے "اگر ان چیزوں کی طرف جمعیگی اور خلوص سے توجہ نہ دی گئی اور سب اپنی اپنی سی لوث مار میں لگے رہے تو ایک عجیب سا سفر رپا ہو جائے گا۔ جنگوں میں آگ بھڑکی تو شہر کی بلند و بالا عمارتوں تک بھی جانے کی عمر تھے لگتا ہے کہ کسی کو ہم جیوں کی بات سننے کی فرصت نہیں ہے۔"

"شہر ہوں یا دیہات۔ بات تو ایک ہی ملک کی ہے۔ ہم سب ایک ان دیکھی سی دور میں بندھے ہیں۔ ایک ہی ذبحہ کی کڑیاں ہیں۔ کوئی بھی کڑی کمزور ہوگی نقصان پائی کڑیوں کو بھی پہنچے گا۔" میں نے دھمکے لیے میں کہا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا یہ باتیں ہم کس کو جا کر سمجھائیں۔ نہ عوام سننے کو تیار ہیں اور نہ ہی خواص۔ سب اپنے اپنے گلے غلوں، لڑائی، جھگڑوں، جھپٹا جھپٹاؤں اور کھینچا کھانی میں لگے ہوئے ہیں۔ موقوفات کی بات پر تو کوئی کان ہی نہیں دھرتا۔" وہ باہمی سے بولی "جہیں شاید زمین نہ آئے ڈاکوؤں اور مختلف قسم کے گروہ بازوں کے حوصلے یہاں تک بڑھ چکے ہیں اور وہ اتنے منظم ہو چکے ہیں کہ انہوں کے سلسلے میں تانوں جیک ڈرافٹ تک کی صورت میں وصول کیے جانے لگے ہیں۔ دھاندلی اور لاف زبانی نہ جانے کہاں تک جانے لگی۔ ڈاکو، زمینداروں کے ساتھ مل کر اپنی دولت کو "دہانت" کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ دولت ختمف جائز کا دہاڑوں میں انفرسٹ کی جارہی ہے۔ شہروں اور قصبوں میں جائیدادیں بن رہی ہیں، عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، بیڑوں پمپنگ مل رہے ہیں، پلازا بن رہے ہیں۔"

"چلیں۔ تیری تو ہوری ہے" میں نے مسکراتے ہوئے اس کے ٹکرات کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کی۔

"یہ تو تیری ہے جو رفتہ رفتہ ہمارے معاشرے اور اس کی تمام اچھی قدروں کو کھا جائے گی۔" وہ بدستور افسردگی سے بولی "عوام مارا، افرا، افری، پیسے کے لیے ایک دوسرے کی گردن کاٹنا ہمارا کلچر بن جائے گا۔"

"یعنی آپ کے خیال میں صورت حال بہت مایوس کن ہے؟" میں نے نقد بنی چاہی۔

"ہاں۔ کسی کے تصور سے بھی زیادہ۔ لیکن عوام اور خواص سب نے اس طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ کوئی اپنی روش ترک کرنے پر آمادہ نہیں۔" وہ بولی "لیکن کیا تم بھی مایوس ہو؟"

"میں مایوس نہیں ہوں۔ میرے سینے میں کوئی آگ بھڑک رہی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اضطراب کی یہ آگ مجھے جلا کر راکھ کر دے گی" میں نے کہا۔

"باہمی کی موت مرنے سے تو بہتری ہے کہ انسان اپنے ہی اضطراب کی آگ میں پروانے کی طرح جل کر مرے۔ یہ موت خواہ آج بے مقصد نظر آئے لیکن آنے والے کسی دور میں ضرور اس کے اثرات مرتب ہوں گے" وہ یقین سے بولی۔

انصاف کے مہری کنشیاں بننے لگیں تاہم میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "کیا وہ حکمیاں سے بہا تھا وہ؟"

"جی ہاں۔ وہ جب چاہے ذرا آج مگر کو خاستر کر سکتا ہے، چوٹی کو زمین ہوس کر سکتا ہے اور مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے ہوئے لے پاسکتا ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ میرا یہ مختصر سا علاقہ گوشہ فانیٹ بنا ہوا ہے ورنہ یہاں بھی بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح بکھا عالم ہوتا کہ لوگ اپنے گھر بار اور مویشی تک چھوڑ کر ہجرت کر جاتے۔ اسی قسم کی نہ جانے کتنی باتیں جو وہ اس سے پہلے ذرا نرم لہجے میں "ذرا غلام الفاظ میں کرتا تھا اس بار اس نے سخت اور صاف لہجے میں کہیں۔ اس نے اب کشت اور دو ٹوک الفاظ میں اپنے مزاحم کا اظہار کر دیا ہے۔"

"کیا آپ کے خیال میں وہ اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے ایک لمحے سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں۔ کافی حد تک۔"

"آپ اس کی حقیقت جانتے ہوئے بھی اس کے خلاف پولیس کی مدد حاصل نہیں کر سکتیں؟" اس سوال کی گہرائی میں میری حیرت بھی پنہاں تھی۔

"ان طاقتوں کی پولیس توان کے سامنے جانے کے تصور سے بھی خستہ کر پاتی ہے۔" وہ منہ بند کر لی۔

"علاقے کے دوسرے زمینداروں کے ساتھ مل کر جلاؤ کا کچھ بددست نہیں کیا جاسکتا؟" میں نے اپنی کپٹین میں چشم محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بہت سے بڑے زمیندار خود بڑے بڑے ڈاکوؤں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اپنی دانست میں وہ اپنی طاقت اور دولت بڑھا رہے ہیں لیکن انھیں معلوم نہیں کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک جہنم تیار کر رہے ہیں جس میں خود ان کے اپنے بچے بھی ایک نہ ایک دن جلیں گے۔ بڑے زمیندار اور بڑے ڈاکو دونوں طبقے ایک دوسرے کی ملی جلتی سے بڑے بڑے دھندے کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔"

اس کے چاند چرے کو کرب نے گمنا مارا۔ افسردہ سے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولی "ڈاکو آئے دن جن شریف اور دولت مند شہروں یا دیہاتوں کو انہوں کے جو بڑی بڑی رقبے تانوں کے طور پر وصول کرتے ہیں ان زمینداروں سمیت ان میں نہ جانے کتنے طبقوں کا حصہ ہوتا ہے۔ اسلئے اور منشیات کی تجارت ہے۔ اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ شہروں میں رہنے والے اپنے دوسرے دوست رہتے ہیں۔ انہیں کچھ اندازہ نہیں کہ ان علاقوں میں لاف زبانی کا کیا بازار گرم ہے۔ حالات کے تہ و بیکہ کرکھے لگا

پوچھا ”آپ نے جانو کا مطالبہ پورا نہیں کیا۔ باہر گئے گزر چکے ہیں۔ کیا اس کا کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا؟“

”تمہیں ہے رد عمل ذرا گھر کر سامنے آئے لیکن میرا دل کہ رہا ہے کہ اس بار جو کچھ بھی ہوگا بہت شدید ہوگا۔ میں اپنے آپ کو بہت غما غما محسوس کر رہی تھی اسی لیے میں نے خاص طور پر جنہیں بلوایا ہے یہ ایک ایسا احساس تھا جسے میں نے خاص طور پر کلا خوف برداروں کو ہلکا کرانے اور گڑ بھڑکانے سے بھی دور نہ ہوتا۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتی ہوں کہ محض کلا خوف نہیں کسی کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔“

”آپ کا خیال ٹھیک ہے“ میں نے کسی وضاحت کے بغیر کہا ”اور آپ نے ایک بے عزت انسان کے گھروں میں مجھے بلوایا۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں۔ آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ جانو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ آپ جیسے وسائل اور آپ جیسے وابہ گزار رکھنے والی لڑکی اس کی طرف سے پریشان ہو۔ اس کا جو بھی رد عمل ہوگا دیکھنا جائے گا۔ میں ایک حقیر سا آدمی ہوں لیکن جس قابل بھی ہوں اپنی جان کے نذرانے کے ساتھ حاضر ہوں۔“

وہ ایک لمحے کے لیے گویا کھو سی گئی۔ ایک ٹھک میری طرف دیکھتی رہی پھر یک دم گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے خوش گوار لمبے میں بولی ”اب میں تمہیں ایک اور سزے کی بات بتاتی ہوں۔ دو دن پہلے یہاں حاصل آباد کا ایک پولیس انسپکٹر بھی آیا تھا۔ اس کا نام رحیم گل تھا۔“

اس نے خاموش ہو کر گویا میرے رد عمل کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت مجھے حیرت کا شدید ہتھکاٹھا تھا لیکن میں نے یہ مشکل اپنے آپ کو کوئی رد عمل ظاہر کرنے سے باز رکھا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”مجھے یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ رحیم گل کو بھی غیر واضح سے چلنے والے اس شخص کی تلاش تھی جس کا میں ذکر کر چکی ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ شخص ایک زبردست ڈانکے ایک کنڈکٹر اور کسی مسافروں کے قتل کے علاوہ ایک ہیڈ کانٹیلین پر قاتلانہ حملے کا مجرم ہے۔ ہیڈ کانٹیلین خوش قسمتی سے جان بڑھ گیا ورنہ اس کے ہلاک ہونے میں بھی کوئی کسر نہیں رہتی تھی۔“

میں نے یہ سن کر ذرا غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی کہ جس ہیڈ کانٹیلین پر میں نے اضطرابی انداز میں گولی چلائی تھی وہ بچ گیا تھا۔ درحقیقت وہی میرا واحد جرم تھا اور وہ بھی میرے نقطہ نظر سے جرم نہیں، اپنے دفاع کی ایک کوشش تھی۔ اگر میں نے اضطرابی انداز میں گولی نہ چلائی ہوتی تو وہ ہیڈ کانٹیلین یقیناً مجھے گولی مار دیتا۔ جبکہ میں مجرم نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں یہ خبر آئی ”خطرناک ڈاکو پولیس مقابلے میں ہلاک۔“

”کیا حالات اتنے ہی خراب ہیں جو آپ اپنی مایوسی کی باتیں کر رہی ہیں؟“ میں نے جاننا چاہا۔

”میں فضا میں طوفان کی بوسوکتہ رہی ہوں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے“ اس نے گویا مجھے جھوٹی امید دلانا بہتر نہ سمجھا ”جانو سے اپنی گفتگو کا کلا ٹھکس تو میں نے جنہیں بتایا ہی نہیں۔ اس نے فوری طور پر مجھ سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔“

”وہ کس لیے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ لوگ اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کے لیے کسی بھی مطالبے کی کوئی وجہ بتانا ضروری نہیں رہا“ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور بولی ”جانو نے مجھے جو سلسلہ دی تھی اسے بھی ختم ہوئے باہر گئے گزر چکے ہیں۔ مجھے پچاس لاکھ روپے اس کے ایک ٹھکانے پر پہنچانا تھا لیکن میں نے نہیں پہنچایا۔“

وہ گہری سانس لے کر اٹھی اور دھیرے دھیرے پلٹی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ پر وہ زرا سا سر کا گردہ باز دیکھنے لگی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دھیمے لمبے میں بولی ”یہ بھی گویا ایک طرح کا تموان تھا۔ کچھ ایسے نقصانات کا معاوضہ جن کا ذمہ دار وہ مجھے سمجھ رہا تھا لیکن زبان سے ان کا ذکر بھی نہیں کر رہا تھا۔

بات رقم کی نہیں ہے، میں چاہوں تو پچاس لاکھ اسے دے بھی سکتی ہوں۔ اور ایک بار میں نے ایسا سوچا بھی تھا لیکن پھر میں نے فوراً ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ اسے ایک بار رقم دے دینا سیکلے کا حل نہیں تھا۔ یہ تو ایک طرح سے صرف چلی قسط ہوتی۔ اس کے بعد تو مطالبے پر مطالبہ چلا آتا۔ حرام خوروں میں ایک یہ بھی بڑی منحوس عادت ہوتی ہے کہ کوئی ایک بار ان کا مطالبہ پورا کر دے تو وہ اسے سونے کا انڈا دینے والی مرنی سمجھ لیتے ہیں اور کبھی کبھار تو مرنی کو ہی ذبح کرنے پر تیار جاتے ہیں۔ اور پھر یہ تو صرف رقم کا مطالبہ تھا یہ پورا ہونا تو شاید کل کو مجھے اس کے کسی اور مطالبے کے سامنے بھی جھکنا پڑتا۔ دینے بھی میں عورت سی۔ لیکن میری غیرت یہ قبول نہیں کرتی کہ میں کسی کی خراج گزار بنوں۔“

اس کے لمبے میں یہ پناہ مضبوطی تھی۔ اس نے گھر کی میری طرف دیکھا اور اس لیے وہ مجھے بہت بلند قامت نظر آئی۔ کسی چمڑا کی چوٹی پر استراہ کسی پر کھڑے اور عظیم الشان جیسے کی طرح۔

”کیا میں نے غلط کیا؟“ اس کی آواز مجھے سرگوشی سے مشابہ محسوس ہوئی۔

”ہرگز نہیں“ میں نے بھی اسی جیسے مضبوط لمبے میں جواب دیا۔

ایک دم اسے گویا بے پناہ ملانیت حاصل ہو گئی۔ گہری سانس لے کر وہ آسودہ سے لمبے میں بولی ”اس وقت مجھے ایک ایسی ہی محسوس“ نہیں“ کی ضرورت تھی۔“

اس کے ہونٹوں پر وہ دلکش مسکراہٹ لوٹ آئی جو دیکھنے والوں کو یقیناً اپنا دوانہ بنا لیتی ہوگی۔ میں نے تھوک نچتے ہوئے

نہ تو زرتاج کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی رحیم گل کو۔ میں دم بخود بیٹھا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف بڑی حیرت کا باعث تھا کہ رحیم گل نے بلا غراس وقت مجھے پہچان لیا تھا جب میں نے اسے تل کاڑی میں لٹایا تھا۔

زرتاج بولی ”لیکن اس خوشگوار حیرت کے باوجود اس پنکڑ رحیم گل کے عرا میں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس میں سے کو بھی حل کرنا چاہتا ہے لیکن ہر حال میں اس ڈاکو کو بھی گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ وہ ہمیں کہیں آس پاس پناہ کریں۔ وہ اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ زمینوں میں وہ اور فارم و فیو پر کام کرنے والے تمام لوگوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ گویا ایک غیر رسمی شناختی پریکٹس کرنا چاہتا تھا۔“

”پھر آپ نے کیا جواب دیا؟“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”میں نے اسے اس کی اجازت نہیں دی“ زرتاج نے اطمینان سے جواب دیا ”پہلے میں نے اسے نری سے یہی سمجھایا کہ یہ علاقہ اس کی عمل داری میں نہیں ہے اور اس کے پاس تلاشی کا وارنٹ بھی نہیں ہے۔ جو اب اس نے مجھے قانونی دفعات کے ساتھ سمجھایا کہ بعض مخصوص حالات کے تحت کوئی بھی علاقہ کسی بھی علاقے کی پولیس کی عمل داری میں آجاتا ہے اور وہاں اگر وہ خود نہیں تو اس علاقے کی پولیس کے تعاون سے کسی بھی جرم کی تفتیش کے سلسلے میں کارروائی کر سکتا ہے۔ وارنٹ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ایک آدھ دن میں کوئی بھی وارنٹ لے کر آسکتا ہے لیکن اسے اندیشہ ہے کہ اس دوران اس کا مطلوب آزادی غائب کر دیا جائے گا۔ مختصراً یہ کہ آخر میں مجھے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔ وہ ذرا مختلف قسم کا پولیس والا ہے۔“

”اس کے باوجود آپ کہتی ہیں کہ پولیس ڈاکوؤں کے سامنے جاتے ہوئے قہر خور کا نہیں ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”رحیم گل نے اس علاقے میں زیادہ عرصہ نہیں گزارا ہے۔ اس کے تجربات محدود ہیں۔ اس کی سروس بھی زیادہ پرانی نہیں۔ تو آموز تفسیر ہے۔ ابھی اسے ڈاکوؤں کے مضبوط کردہوں سے واسطہ نہیں پڑا اور شاید اسے خود بھی حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ اس کے تفسیر اور ماتحت دونوں ہی شاید اس سے تنگ ہوں اس لیے اسے موقع دے رکھا ہو کہ وہ منہ اٹھائے اور حرا پر بھرتا رہے اور یونہی کسی روز کام آجائے۔ اگر اس کی زندگی کچھ لمبی ہوئی تو کچھ عرصے میں یقیناً بہت کچھ سمجھ جائے گا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی اپنے جھگے کے دوسرے بہت سے لوگوں جیسا ہو جائے۔“

”بہر حال۔ آپ نے اسے واپس بھیج دیا؟“ میں نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ چلا گیا لیکن ظاہر ہے کافی ناخوش تھا“ زرتاج نے جواب دیا۔

زرتاج کہہ رہی تھی ”رحیم گل جائے واردات سے ہی اس نوجوان کے تعاقب میں تھا۔ جائے واردات سے ملیں دور رحیم گل کا اس نوجوان سے سامنا ہوا۔ اس وقت وہ ڈاکوؤں والے ٹکڑے میں ہی تھا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو گولی ماری اور ایک بار پھر بھاگ نکلا۔ رحیم گل نے جوں توں زخمی ہیڈ کانسٹیبل کو ایک اسپتال پہنچایا اور ڈاکو کا سراغ کھودا لیکن اس نے دوبارہ اندازاً اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی۔“

میں بڑی توجہ سے رحیم گل کی سرگزشت زرتاج کی زبانی سن رہا تھا۔ اس نے بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی ”رحیم گل کو امکان نظر آیا کہ شاید اس ڈاکو نے یہاں۔۔۔ زرتاج عمر میں پناہ حاصل کی ہو۔ رحیم گل اور حرا پھر تباہ اور پھراس کا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ اسے زرتاج عمر کے نواح میں دیے ہی غیر واضح سے ٹکڑے میں وہ ڈاکو دکھائی دیا جیسے ٹکڑے میں وہ شخص تھا جس کے ساتھ فیصلہ خان کو آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا لیکن اس مرتبہ رحیم گل کا اس سے سامنا نہایت عجیب حالات میں ہوا۔ رحیم گل کچھ ڈاکوؤں کے غیبت و غصب کا نشانہ بن کر زخمی حالت میں جہڑ کے کنارے دیر اسے پڑا تھا اور موت کا شہر تھا جب وہی ڈاکو وہاں آن پہنچا اور اس بار اس نے رحیم گل کی جان چٹائی۔“

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ زرتاج نے ایک بار پھر گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے ٹھونکنے کی کوشش کی۔ میں نے پوری پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے فطری ہی دلچسپی کے علاوہ کسی آثار کا اظہار نہ ہونے پائے۔

زرتاج سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی ”کافی دیر تک رحیم گل نے اسے نہیں پہچانا لیکن جب وہ رخصت ہونے لگا تب اس نے پہچان لیا لیکن ظاہر ہے اس وقت رحیم گل اس حالت میں نہیں تھا کہ اسے گرفتار کر سکتا۔ گرفتار کرنا تو دور کی بات ہے۔ وہ اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا۔ وہاں سے اس کے لیے حیرت کا بھی ایک نیا باب کھل گیا۔ اس سے یہ سمجھا مل نہیں ہو رہا تھا کہ ایک بار سامنا ہوا تو اس ڈاکو نے اس کے سامنے ہیڈ کانسٹیبل پر گولی چلا دی اور دوسری بار سامنا ہوا تو اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں پڑے ہوئے اسپنڈر کو موت کے منہ سے نکالا۔“

اب میں اسے کیا بتا کہ اس میں میرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ چلی بار اس ”ٹاکو“ کو اس لیے گولی چلائی تھی کہ اسے اپنا جان چٹائی تھی اور دوسری بار اس نے اس لیے رحیم گل کی جان چٹائی تھی کہ رحیم گل اس کی جان لینے یا اسے گرفتار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اس نے اس لیے بھی رحیم گل کی مدد کی تھی کہ وہ درحقیقت ڈاکو نہیں تھا۔ اس کی رحیم گل سے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ رحیم گل کے مثالی کردار کے بارے میں محض محن کرنا تھا۔ طور پر اس کا قدر دان بن چکا تھا مگر فی الحال میں یہ باتیں

”میں شاید اب بھی اپنے منہ سے اس کا اعتراف نہ کرنا  
کیونکہ اب میں یہاں سے جاتی رہا تھا۔ میں آج کل میں یہاں سے  
جانے کے لیے آپ سے اجازت طلب کرنے ہی والا تھا۔“

اس کے باوجود چہرے پر ایک رنگ بدلی کی طرح اگر گور  
گیلا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”لیکن اب میں نے آپ  
کی باتیں نہیں۔ کچھ میری معلومات میں اضافہ ہوا اور میں نے  
سوچا کہ آپ کو الجھن میں پھونکا کر جانا مناسب نہیں۔ آپ کو یہ  
یقین ہے تاکہ میں مجرم نہیں ہوں؟“

”مگر مجھے یقین نہ ہوتا تو میں کہیں بھی اس حد تک تحفظ نہ  
دیتی۔ یہ یقین تو مجھے پہلی بار تمہاری صورت دیکھتے ہی ہو گیا تھا۔ پہلی  
نظر میں ہی تم پر مجھ کو سارے کوئی چاہنے لگا تھا۔ وہ بلا تامل بولی۔  
”بہت فکریہ۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے“ میں نے حقیقی  
منونیت سے کہا۔

”میرے دل نے کہا تھا کہ اگر میں تمہارے ساتھ کوئی بھلائی  
کروں گی تو تم اس کا صلہ مجھے برائی کی صورت میں ہرگز نہیں  
دو گے“ وہ شوق سے بولی۔

”آپ کی مردم شناسی پر مجھے حیرت ہے۔ میں جتنے دن بھی  
یہاں رہا ہوں“ آپ کے مقدمات کی حفاظت کی تنگ دودھیں ہی لگا  
رہا ہوں“ میں نے کہا۔

”اس کا اندازہ تو مجھے اسی بات سے ہو گیا ہے کہ کس طرح تم  
نے پتک کو کٹنے سے بچایا اور اس کے باوجود اس بات کہ اپنی  
ذات کو راز میں رکھتے رہے۔ ایک عام آدمی میں اتنا ظرف کہاں  
ہوتا ہے؟“ وہ شہر میں لہجے میں بولی۔

”آپ کو یہ بھی یقین ہے تاکہ میں ایک شریف آدمی ہوں؟“  
میں نے اس سے مزید تصدیق چاہی۔

”ہاں“ وہ پُر خیال لہجے میں بولی ”لیکن تم کوئی عام قسم کے  
شریف آدمی نہیں ہو۔ کچھ الگ ہی طرح کے شریف آدمی ہو۔ اور  
تم یقیناً اس طبقے کے فرد بھی نہیں ہو جس طبقے کے بننے کی کوشش  
کر رہے ہو لیکن تم میں یقیناً ہر طبقے میں کھل جاتے ہر مشقت  
اور صعوبت نہ جانے کی صلاحیت ہے۔“

”شکریہ“ میں نے ہولے سے اس کر کہا ”لگتا ہے آپ تو میری  
شخصیت کی د تک پہنچ چکے ہیں اور یہ بات مجھے بڑی خطرناک  
لگتی ہے کہ کوئی میری شخصیت کی د کو پہنچے لگا ہے۔ میں نہیں چاہتا  
کہ مجھے مکمل طور پر بوجھ لیا جائے۔ مجھے خود اپنے آپ کو مکمل طور  
پر جاننے سے خوف آتا ہے۔“

”چرا خیال ہے؟“ یہ شخص تم بن رہے ہو۔ مجھے ادھر ادھر کی  
باتوں میں الجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔“ وہ آنکھوں کے راستے  
گولیا میری شخصیت کی گمراہیوں میں اُترنے کی کوشش جاری رکھتے  
ہوئے بولی ”تمہاری شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تمہیں  
مکمل طور پر بوجھ لے جائے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر جاننے سے

اس ایک نامعلوم شخص۔ اس غیر واضح محلے والے  
نوجوان کی وجہ سے آپ کے لیے کچھ زیادہ ہی مشکلیں کھڑی نہیں  
ہو رہیں؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ مشکلیں جن کا سبب جانو ہے وہ تو مجھ پر ہر حال میں پڑتی ہی  
تھیں۔ یہ تو گوارہ بہت عرصے سے میرے سر پر لٹ رہی تھی۔  
کچھ تو مجھے نہ پہلے کرنا تھا اور نہ ہی اب کرنا ہے۔ چنانچہ میں اس  
محلے کو ذرا مختلف زاویے سے دیکھ رہی ہوں۔ شاید قدرت نے  
اس نامعلوم شخص کو میرا بوجھ کم کرنے اور میرے شانہ بہ شانہ کھڑا  
ہونے کے لیے بھیجا ہو۔ شاید اس کے بارے میں جو باتیں مجھ تک  
پہنچ رہی ہیں“ اس کی اصیت ان سے بہت مختلف ہو“ اصل بات  
کچھ اور ہی ہو۔“

وہ بیٹھ چکی تھی اور ہاتھ پیر سکون تھی لیکن اس کے اندر چیخا  
اضطراب مڑن تھا اس لیے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمر  
پر ہاتھ باندھ کر کھٹنے لگی۔

ایک لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ بولی ”لیکن مسئلہ یہ ہے  
کہ وہ نامعلوم شخص۔ وہ غیر واضح محلے والا نوجوان اگر مجھ سے مل  
ہی نہیں رہا“ مجھے ساری حقیقت بتانی نہیں رہا۔ میں صرف سوہوم  
سے اندازوں کی بنیاد پر ملک خطرات مول لے رہی ہوں لیکن  
میں کس تک ایسا کر سکتی ہوں؟ مجسم چیزوں کے لیے انسان کب  
تک بے سبب سبیل سکتا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تے سرے سے غور  
کرتے اور اپنے لیے کوئی محفوظ راستہ تلاش کرنے پر مجبور  
ہو جاؤں۔“

چند لمحے گزرے میں بوجھل سکوت جاری رہا۔ وہ بدستور ٹھل  
رہی تھی لیکن میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں  
حاکم سا رہا تھا۔ بالآخر میں نے کسی سانس لی۔ میرے خیال میں  
اب وقت آ گیا تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ بتاؤں۔ یہ  
ہم دونوں ہی کے حق میں بہتر تھا۔

”آپ چہنہ جائے۔“ میں نے نیچی آواز میں کہا ”بات شاید  
ذرا لمبی ہو جائے۔ لیکن میں آپ کو اپنے بارے میں تقریباً سب  
کچھ بتاؤں دیتا ہوں۔“

اس نے پلٹ کر میری طرف نہ دیکھا، مسکرائی اور اپنی شانہ سی  
کر سی پر شانہ سے انداز میں آن بیٹھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے دوبارہ سراٹھایا۔ وہ ایک  
تک میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے کہا ”میرے  
خیال میں یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں رہی کہ وہ نامعلوم شخص جس  
کی بیک وقت پولیس اور ڈاکوؤں کے سردار دونوں کو تلاش ہے وہ  
میں ہی ہوں۔“

”میں سمجھ تو چکی تھی لیکن میں تمہارے منہ سے سنا چاہتی  
تھی“ وہ فکریہ فکریہ لہجے میں بولی ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا  
کہ آخر تم کب تک اس حقیقت کو پوشیدہ رکھو گے۔“

خوف آئے۔ ہر حال تم لوگوں میں بات کرنے کے بجائے مسل  
اور پوری بات کیوں نہیں کرتے؟

چنانچہ میں نے پوری بات کر ڈالی لیکن درحقیقت وہ بھی پوری  
نہیں تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں درحقیقت کون تھا۔  
بس اپنا اصل نام پورا بتایا۔ یہ بتایا کہ میں ایک چھوٹا موٹا بروس  
میں تھا۔ کچھ احتمالی خطرناک لوگوں کی دشمنی کی وجہ سے مجھے ہانکا  
پڑا تھا اور حالات نے مجھے دو جیل خانے سے لا کر لیا تھا۔ وہاں سے  
میں نے اپنی تمام باتیں اسے سچ بتادی تھیں۔ دو جیل خانے سے  
ملاقات کے بعد سے اب تک مجھے جو بھی واقعات پیش آئے تھے وہ  
سب میں نے بالکل وکالت سے سنائے۔

اس کے چرنے پر کئی بار تفتیش کیا لیکن وہ درمیان میں کچھ نہ  
بولی نہایت چھوٹا سکون سے اس نے سب کچھ سنا۔ میں نے اسے  
ڈاکوئس کے "گولڈ کی کلب" کے بارے میں بھی بتادیا اور یہ بھی  
بتادیا کہ اگر کبھی پولیس یا کوئی اور ایجنسی اس کلب کو دریافت کرنے  
میں کامیاب ہو بھی گئی تو وہاں سے کچھ ایسے کاغذات یا کچھ ایسے  
جملی ثبوت برآمد ہوں گے جن سے وہ کلب اس کی ملکیت ظاہر  
ہو گا۔ یہ سن کر اس کی رحمت ایک لمحے کے لیے پھٹی پڑ گئی لیکن  
پتا ہر وہ چھوٹا سکون ہی رہی۔

"اور اب میں آپ کے سامنے ہوں اور آپ سے  
اجازت چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو کچھ بھی زحمت ہوئی ہو  
اس کے لیے میں جس قدر مل سے معذرت خواہ ہوں" میں نے دونوں  
ہاتھ پھیلا کر گروں کو خم دیتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنا بھی رنجی ہوئے کی ضرورت نہیں" وہ جرات مندی  
سے مسکرائی "آپ جبکہ جسے معلوم ہو چکا ہے کہ میں کس قسم کے  
حالات میں گھری ہوئی ہوں۔ تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

"مجھے اندازہ ہے کہ آپ ایک مضبوط لڑکی ہیں۔ آپ کے  
پاس بہت دسائی ہیں۔ آپ ان حالات سے آسانی سے نمٹ لیں  
گی" میں نے کہا۔

"نہت تو شاید لوگ لیکن آسانی سے نہیں" اس نے پُر خیال  
انداز میں ٹوڑی میلے ہوئے ہاتھ سے کہا "بے شک میرے پاس  
دسائی موجود ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ میں لڑکی  
ہوں۔ لوگ مجھے لڑکی ہونے کی سزا دینا چاہتے ہیں۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ وہ انگلی اٹھا کر ہونے والی "اور  
بالکل تم ہرگز یہ مت سمجھنا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی زحمت  
ہوئی ہوگی یا میرے لیے کوئی مصیبت کٹنی ہوئی ہوگی۔ میں لیکن  
نہت تمہاری وجہ سے تو میری کوئی مصیبت نہیں گئی ہوگی۔ میرا اصل  
مسئلہ کیا جالو ہے۔ میری کچھ باتیں نہیں آتا کہ میں اس سے کیسے  
نجات حاصل کر لوں۔ یہ مردود کسی بھوت کی طرح میرے پیچھے لگ  
گیا ہے۔"

مردود یہ لائق کا بھوت ہے۔ باتوں سے نہیں مانے گا" میں نے

کہا۔

میں خون خرابہ نہیں چاہتی۔ ایک انسانی جان کا نقصان بھی  
میری نظر میں ناقابل طائی ہے۔ میں اپنے گاؤں کو ایک مٹائی گاؤں  
بنا چاہتی تھی۔ میرے خواب بہت اونچے تھے لیکن مجھے نہیں  
معلوم تھا کہ مجھے جانو جس بلاؤں سے واسطہ پڑے گا۔ میرے  
خوابوں میں اس کی تجاویز نہیں تھیں۔ میں اپنے آپ کو ابھی تک  
ذہنی طور پر ان لوگوں سے اچھے کے لیے تیار نہیں کر سکی۔

"اس دنیا میں قدم قدم پر جانو بھی بلائیں موجود ہیں۔ کہیں  
کسی روپ میں، کہیں کسی روپ میں۔ یہ دنیا آئینہ عکاس لوگوں کے  
رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی خوش قسمتی ہے کہ جس قسم کی  
آپ لڑکی ہیں۔ اور جس پوزیشن میں ہیں۔ اس میں آپ کو  
صرف ایک بلا سے ہی واسطہ پڑا ہے۔ بات صرف وہی ہے کہ آپ  
نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس بلا سے بچنے کے لیے تیار نہیں کیا۔  
جس دن آپ ذہنی طور پر تیار ہو گئیں اس دن منت لیں گی۔"

"مجھ بات یہ ہے کہ میں اس سے خوف زدہ نہ بھی نہیں ہوں۔"

وہ الجھن آئینہ سے مجھے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے" میں نے اثبات میں سر ہلایا "یہ بس ایک  
گزینہ ایک جھگ ہے جو طاقتور شرٹاس میں پائی جاتی ہے۔ گزور شرٹا  
میں تو اتنا خوف پایا جاتا ہے۔"

"تم نے جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟" اس نے اچانک ہی  
پوچھا۔

"میں اپنے کچھ ہمدرد اور جاں نثار قسم کے دوستوں کو ان  
خطرناک لوگوں سے برسرِ پیکار چھوڑ آیا تھا جن کا میں نے ذکر کیا  
ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں خوش منظر سے ہٹ جاؤں گا تو کم از کم کچھ  
عرصے کے لیے ضرور سکون ہو جائے گا۔ میں نے ان لوگوں کو یہ تاثر  
بھی دینے کی کوشش کی تھی کہ میں آخری تجربہ میں ہلاک ہو چکا  
ہوں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ کوشش کس حد تک  
کامیاب رہی کیونکہ اس کے بعد میں کچھ محضوں میں روپوش ہو گیا  
تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کسی بھی ذریعے سے رابطہ کرنے کی  
ذرا سی بھی کوشش نہیں کی لیکن اب میں عسوس کر رہا ہوں کہ  
میری یہ حکمت عملی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔"

"میرے خیال میں تو اچھی تھی" وہ بالائے مال بولی "میں تمہارے  
حالات سے پوری طرح ابھی واقف نہیں ہو سکی اور میں جس  
زیادہ کر کے نا بھی نہیں چاہتی۔ جتنا تم نے بتایا" اتنا ہی کافی ہے۔  
ظاہر ہے تمہاری کچھ عجیبواریاں یا "مصلحتیں" ہوں گی۔ لیکن میرا دل  
کہہ رہا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ شاید اس طرح تمہارے  
سر سے کوئی مصیبت نہیں گئی ہو لیکن اب تم اپنے ساتھیوں کے پاس  
واپس جانا چاہتے ہو۔ کیا تمہارے خیال میں حالات تبدیل ہو گئے  
ہوں گے؟"

"میں فوری طور پر ان کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔ پہلے میں

حال میں گرفتار تھیں بھی! اس لیے میں نے جان بوجھ کر ذرا تاج کو اپنا کوئی پتہ فون نمبر یا رابطے کا ذریعہ نہیں بتایا تھا۔ شعوری طور پر تو میری کوشش کی تھی کہ ایک بار اس کے پاس سے رخصت ہونے کے بعد آئندہ میری اس سے ملاقات نہ ہو لیکن لاشعوری طور پر میں کیا چاہتا تھا؟ یہ ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

میں ذرا تاج کی آواز سن کر اپنے خیالات سے چونکا۔ وہ پوچھ رہی تھی "مجھے بتاؤ... میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"آپ نے جو کچھ کروا، میں زندگی بھر اسی کا احسان نہیں چکا سکتا۔"

"اب شرمندہ مت کرو" وہ سچ فحاشیات زدہ می اور بولی "میں نے تم سے تمہارے شلمان شان کوئی سلوک نہیں کیا۔ میں یہ تو سمجھ گئی تھی کہ تم جو کچھ اپنے آپ کو ظاہر کر رہے ہو وہ نہیں ہو لیکن میں تمہارے بارے میں کوئی واضح فیصلہ بھی نہیں کر پاری تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے آنکھیں بند کر کے تم پر اعتماد کر لیا تھا۔"

"میں تو وہ احسان ہے جس کا میں بدلہ نہیں چکا سکتا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب آپ مجھ پر صرف اتنا احسان اور کچھ مجھے کسی ایسے قریبی قصبے یا شہر پہنچانے کا بندوبست کر دیجئے بہال سے میں ڈائریکٹ ہمارے وارنٹس یا ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچ سکوں۔"

"تمہیں کراچی بھی پہنچاؤں گے" ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ وہ مسکراتے ہوئے بولی "دن کا انتظار تو کرو۔ ابھی تو رات ہے۔ چاہو تو تمہیں ہجیرہ میں اسی روز بھجوا دیا جائے گا۔ پانچ چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ وہاں سے جنازے کے ذریعے کراچی چلے گا۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں بالکل عام اور گناہ سارا آدمی بن کر رات کے اندھیروں میں ہی گواہی دینے سے باز کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہلبدولتے ہوئے دھڑے سے ہنس کر بولی "ویسے تم نے آدھی بیٹے میں بھی حد ہی کر دی۔ اور کچھ نہیں تو گھوڑو۔ سدھانے والے ہی بن گئے۔ اب اس وقت کوئی تمہیں اس طرح دھول بیٹے میں لٹھڑا ہوا دیکھے۔ تمہارے ہاتھ میں یہ لگام نہ چاؤ۔ دیکھو تو رات ہی تمہیں جڈی ہنسی کو چنانچہ گھوڑے سدھانے والا سمجھے گا۔"

"ہنس... فوری طور پر جس کا موقع نظر آیا وہ بن گیا۔ چ۔ میں یہاں پہنچا تو گھوڑا آپ کے آدھے کے قابو میں نہیں آ رہا تو میں نے سوچا۔ چلو یہی کر کے دکھا دیتے ہیں۔ پھر فیصلہ کیا کہ چلو بہرہو اپنے اوپر لا دیا جائے۔" پھر ایک لمبے کے وقفے سے نے کہا "ویسے... آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ میں نے زندگی کبھی کوئی گھوڑا نہیں سدھایا۔"

"ادھ۔ نو۔" حیرت سے اس کی خوبصورت آنکھیں پھل

ذرا دور ہی نہ کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے میں کراچی جاؤں گا۔ وہاں سے اپنے کچھ رابطے بحال کرنے کی کوشش کروں گا" میں نے بتایا۔

"آپ تم سے تعارف ہوا۔" تم نے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تو ساتھ ہی تم چل دیے "وہ ہم سے انداز میں مسکرائی۔"

"زندگی بڑی تو بھر ملاقات ہوگی" میں نے کہا۔

"شاید۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔ اس نے یہ شکوہ نہیں کیا کہ میں نے تو اسے اپنے کاروبار اپنے ٹھکانے اپنی رہائش وغیرہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ کوئی فون نمبر نہیں دیا تھا۔ رابطے کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا تھا تو بھر ملاقات یا رابطے کا کیا امکان ہو سکتا تھا؟ محض اتفاقی ملاقات ہو سکتی تھی۔ اور اتفاقات کا کیا ہے۔ ہونے لگیں تو آئے دن ہو سکتے ہیں۔ نہ ہوں تو زندگی بھر نہ ہوں۔ میں خود ہی چاہتا تو اس سے رابطہ کر سکتا تھا لیکن اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت سمجھدار تھی۔ اس سے زیادہ کچھ پوچھنا نہیں چاہتی تھی بتنا میں بتانا چاہتا تھا۔

اور میرا عجب ہی معاملہ تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میرے حواس پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ دل دہلا کر پچھا جانے والی لڑکی تھی۔ بہت تیز فکری طرح حواس کو تسخیر کرنے والی۔ اسی لیے میں اس سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ جلد از جلد اس سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کے ظلم سے بچنے کا شاید یہی ایک طریقہ تھا۔

معلوم نہیں اسے خود احساس بھی تھا یا نہیں کہ اس کی شخصیت اس کا وجود مجھ جیسے لوگوں پر کیا قیامت ڈھا سکتا تھا؟ میرا خیال تھا کہ احساس تو یقیناً ہو گا۔ حسن والے اپنے حسن کی تباہ خیریں سے بہت اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لیکن اس کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ کھل حسین نہیں تھی اور میں صرف حسن سے متاثر ہونے والوں میں سے تھا بھی نہیں۔ وہ تو کئی پیلوؤں سے ایک غیر معمولی اور نایاب لڑکی تھی۔ رابطہ کی طرح۔

بہت سے معاملات میں وہ رابطے سے بہت مختلف تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنی جگہ ایک منفرد شخصیت تھی۔ یہ انفرادیت اسے میری نظر میں اور بھی زیادہ دلکش بناتی تھی لیکن مسئلہ یہی تھا کہ صرف رابطہ کا خیال مجھے ذرا تاج کے بارے میں سوچنا بھی تھا تو میں اگر بے اختیار میں بھی ذرا تاج کے بارے میں سوچنا بھی تھا تو اپنے آپ کو رابطہ کا مجرم محسوس کرنا تھا۔ستم ظریفی یہ تھی کہ رابطہ کا مجھ سے کوئی مددگار نہیں تھا "ازرا نہیں تھا۔ وہ تو صحیح طور پر کبھی کوئی بات مان کر ہی نہیں دیتی تھی۔ کئی بار وہ نہایت سنجیدگی سے مجھے مشورہ دے چکی تھی کہ میں کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لوں۔ اور میرا یہ حال تھا کہ اگر میں نے ایک اچھی لڑکی دیکھ لی تھی تو رابطہ ہی کے تصور کی وجہ سے اس لڑکی کے سامنے اپنے آپ کو مجرم مجرم محسوس کرنا تھا۔ عجب ہی صورت

اپنے مفتوحہ علاقوں میں داخل نہیں ہوتے ہوں گے اس کی گردن  
ٹھیکرانا انداز میں اکرزی ہوئی تھی اور چہرے پر خوشنوازی تھی۔ میں  
دو پروں کے درمیان بال بھی باریک تھی۔ صورت حال کا  
جائزہ لے رہا تھا اور اپنے اعصاب کو سکون رکھنے کی کوشش کر رہا  
تھا۔ اس وقت اپنے آپ کو سکون رکھنا نہایت ضروری تھا۔

جانور اور اس کے سامنے ڈاکو اس وقت خامے معززانہ لباس  
میں تھے۔ چاروں ڈاکوئیں نے جانور کو حیرے میں لے رکھا تھا اور وہ  
شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح چمکے نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں  
داخل ہوتے وقت بھی ان چاروں کا رخ مختلف سمتوں میں تھا۔ وہ  
اس طرح جانور کو اپنے ہتھکے میں لے آ رہے تھے جیسے اسے کسی دشمن  
کے ترسے سے نکال کر لے جا رہے ہوں۔ ان کی نظریں بتا رہی  
تھیں کہ انہیں کسی کی تلاش تھی۔ وہ اس کمرے میں زرنج کے  
علاوہ بھی کسی کی موجودگی کی توقع لے آ رہے تھے یا پھر شاید وہ حد  
سے زیادہ محتاط تھے۔ آخر وہ زرنج کی حویلی میں گھسے چلے آ رہے  
تھے۔ کہیں غیر متوقع طور پر کسی سے بھی ان کا سامنا ہو سکتا تھا۔ ان  
کا انداز اتنا آہستہ تھا کہ وہ ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھے۔

جانور میں زرنج کے سامنے پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گیا۔  
اس نے خباثت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے زرنج کی لمبوزی  
کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی لیکن زرنج نے اس کا ہاتھ بری طرح  
جھٹک دیا اور حیرت انگیز خوشنوازی کے ساتھ بولی "ہنا ہاتھ پیچھے  
رکھو کسی نامعلوم جھٹک کی اولاد!"

جانور کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں خون  
آ کر آیا۔ اس کی کلا شگوف اس کے کندھے پر گئی۔ اس کا ہاتھ اس  
کی طرف بڑھا لیکن نہ جانے کیا سوج کر وہ کلا شگوف کندھے سے  
اٹارتے اٹارتے رہ گیا۔ اس کے چاروں ہاتھوں نے اپنی  
کلا شگوفوں کا رخ زرنج کی طرف کر لیا تھا لیکن زرنج کے چہرے  
پر خوف کے بجائے غیظ و غضب ہی نمایاں رہا۔ چاروں ڈاکوئیں  
دبانے کے لیے گویا جانور کے اشارے کے شہرے تھے لیکن جانور نے  
انہیں ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا بلکہ ایک ٹھٹک زرنج کی طرف دیکھتے  
ہوئے خطرناک حد تک سکون لیے میں بولا "میں حد سے زیادہ  
بد تمیزی برداشت نہیں کرتا۔"

"تم تو حد سے زیادہ کی بات کر رہے ہو۔ میں تو معمولی  
بد تمیزی بھی برداشت نہیں کرتی۔" زرنج ترکیبہ ترکیبوں  
"لیکن اب تمہارے لیے نہ جانے کیا کچھ برداشت کرنے کا وقت  
آ گیا ہے۔ ہم تمہیں جیسی ذمیل دے سکتے تھے دے چکے۔ اس  
وقت میں تم سے صرف پچاس لاکھ دوپے لینے آیا ہوں" باقی باتیں  
بعد میں ہوں گی۔"

"کون سے پچاس لاکھ دوپے؟ یہ رقم تمہارے نامعلوم باپ  
نے میرے پاس امانت رکھوائی تھی یا مجھے قرض دی تھی؟" زرنج  
نے اسی بے خوفی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلک جھپکے بغیر

"ہیں بچپن میں میں نے اپنے گاؤں میں کچھ لوگوں کو بہت  
سے گھوڑے سداہتے دیکھا تھا۔ میں بہت غور سے وہ منظر دیکھا  
کر آیا تھا۔ وہ ساری باتیں میرے ذہن میں نقش تھیں۔"

"پھر بھی۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔" اس نے گردن  
ہلائی۔ وہ شاید مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ  
گیا۔ بغیر ہانے ایک ملازمہ نہایت گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے  
میں داخل ہوئی تھی۔

"وہ قدم آگے آکر وہ کمرے کرتے چکی اور ہاتھ باندھ کر  
پر کھلائے ہوئے لیجے میں بولی "ترجیباتی جی! جانور حاذیل اپنے چار  
پاؤں آدمیوں کے ساتھ سیدھا اندر رکھا چلا آ رہا ہے۔ اسے کیٹ پر  
بھی کسی نے نہیں روکا۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔۔۔ ایسا لگتا ہے جیسے  
کیٹ پر کوئی موجود ہی نہیں ہے۔"

زرنج اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ  
اس کا چہرہ خوف سے زرد نہیں بلکہ برہمی سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس  
نے فوری طور پر ملازمہ کو حکم دیا "تم بھاگ جاؤ اور کہیں چھپ  
جاؤ۔"

"اور میرے بارے میں کسی کو کچھ مت بتانا۔" میں نے گڑا  
لگایا۔ اس وقت تک میں اچھل کر صوفے کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔  
صوفوں کے پیچھے چاروں طرف اوپر سے نیچے تک دیواروں کو بھاری  
دھڑکنی پر دونوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے ان پروں کے پیچھے  
پناہ لی۔ میں اپنے ساتھ گھوڑے کی لگام اور جاک پودے کے پیچھے  
لاٹا نہیں بھولا تھا۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز صوفے پر پڑ جاتی تو  
دہاں میری موجودگی کا راز کھل جاتا۔

ملازمہ کھڑی ہوتی کمرے سے بھاگ گئی اور میں پودے کے پیچھے  
چھپ گیا۔ اس میں بہ مشکل چند سیکنڈ ہی لگے تھے۔ اس دوران باہر  
برآمدے کی ماربل کی ٹائلیوں پر کئی افراد کے بھاری قدموں کی ٹھٹک  
ٹھٹک اور دھم دھم سنائی دینے لگی۔ زرنج دونوں ہاتھ کمرے کے  
تخت کھڑی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی شاید ضرورت  
نہیں سمجھی تھی یا اس کے خیال میں کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ  
کرنا مناسب نہیں تھا۔

وہ کوئی احتیاطی تدبیر لینے کے لیے نہیں لگی تھی۔ شاید ڈرائنگ  
روم میں کوئی احتیاطی تدبیر نہیں تھا۔ حویلی کے ارد گرد کچھ مسلح  
حفاظہ قیادت رہتے تھے شاید اس لیے زرنج اطمینان سے  
ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے زندگی میں یہی تجربہ حاصل  
ہوا تھا کہ انسان کو خواہ کتنی مسلح حفاظہ میسر ہوں لیکن اپنے خود  
مکمل ہر وقت کسی بھی قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا  
چاہیے۔

جانور مسلح آدمیوں کے ساتھ جس طرح کمرے میں داخل  
ہوا اس طرح شاید پرانے زمانے میں جنگجو اور شاک پادشاہ بھی



آئے ہیں جو تم نے اسے رہنے کے لیے دیا ہوا ہے۔ مجھے بتا چلا ہے تم نے کچھ در پہلے اسے شرف ملاقات بخشے کے لیے بلایا تھا۔ لاہ اسے حویلی میں ہی کہیں ہونا چاہیے۔ جلدی بتاؤ تم نے اسے کلا چھایا ہے۔ ہمارے پاس اتنی بڑی حویلی کو کھگانے کا وقت نہیں ہے۔

زرتاج نے حکارت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بولی "میری نظر میں تم کوئی ایسی توپ چیز نہیں ہوئے کہ تمہارے ذمے میں کسی کو ابوہریرہ چھپانے لگوں۔ میں تو اب تک تم سے خواہ خواہ کے ٹکراؤ سے بچنے کے لیے تمہارے ساتھ اخلاق سے پیش آتی رہی ہوں لیکن اب تم بالکل ہی سرسبز آئے ہو تو ٹھیک ہے۔ اخلاق و خلاف را ایک طرف۔ اب تم سے بددق کی زبان میں ہی بات ہوگی۔ تم نے اب میرے لیے کو راستہ نہیں چھوڑا۔ تم خون پیتے دیکھنا چاہتے ہو تو چلو یو کسی۔"

جانو گویا اس کی بات سے محفوظ ہوئے ہوئے دھیرے سے بے اور از سر نو اس کا سر تاپا جائزہ لینے ہوئے بولا "تھپاس میں اگر اوہ اوہ کوئی چھوٹا موٹا ہسپتال وغیرہ چھپا رکھا ہے تو اسے نکالنے کو شش نہ کرنا، جسم چھپتی ہو جائے گا۔ اور فی الحال میں اس حسین جسم کو چھپتی ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"تم صرف حویلی کے محافظوں کو مار کر بے ہوش کر کے رہے ہو کہ زرتاج اگر مسلح مردوں سے خالی ہو گیا؟" زرتاج بولا "اگر زندہ وہاں میں جانا چاہے ہو تو اب بھی ملے جاؤ اور آئندہ کبھی نہ آنا۔ میں تمہاری اس گستاخی کو معاف کر دوں گی۔"

جانو نے لحظی سانس لی۔ "رہتی مل جاتی ہے مگر اس کا نہیں جاتا۔ تم تو ابھی جلی بھی نہیں ہو۔ میری کچھ میں نہیں آئیے کیسے تمہارا مل نکالوں۔ کیسے جیسں سمجھاؤں کہ اس وقت تم زندگی کے ایک انتہائی خطرناک دوراے پر گزری ہو۔"

پھر وہ گویا انتہائی حیل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے "تم کہہ رہی ہو میں نے تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا بالکل غلط ہے۔ حالانکہ میں تم سے انتہائی شک تیا ہوا ہے تمہاری وجہ سے مجھے ہتھ پھنسان پھنچا ہے اور تم بار بار میری بے عزتی کر رہی ہو۔ جتنی ضد دکھا رہی ہو۔ اگر تمہاری جگہ اور ہوتا تو میں اس کا نام و نشان مٹا چکا ہوتا۔"

"مجھے سمجھ کر کہہ مت بولو۔" تاج اس کی بات ہوئے پہلی "مقام و نشان مٹانے کی طاقت اللہ نے صرف اپنے رکھی ہے۔ قبرستان ایسے لوگوں کی قبروں سے بھرے پڑے جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں نہ جانے کس کس کا نام مٹانے کی کوشش کی۔ آج کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا۔" "وہاں بددق اور زیادہ کھاتی بننے کی کوشش مت کرو۔ نرمی سے بولا "جو بات میں کہہ رہا ہوں اس پر توجہ دو۔ میں۔"

پوچھا۔ میں دلی ہی دلی میں اس کی بے خوفی اور جرأت کی داد دے رہا ہوں۔ مگر کہ ابھی میں تمہیں سے نہیں کہہ سکتا تھا اس کی یہ جرأت اسے اور مجھے کیا کچھ دکھانے والی تھی۔

"زرتاج۔" جانو ایک دم ہلاڑا۔ اس کی مٹھیاں ہفتے کے انداز میں کھینچ گئیں اور چہرہ لال سمجھو کہ ہوا لیکن اس سے آگے نہ ایک لفظ نہ بولا۔ چند لمبے کے لیے اپنی جگہ ساکت ہی ہو گیا۔ کمرے میں پرجھل خاموشی چھا گئی لیکن یہ سکوت جانو کی پیچ و پکار سے زیادہ خطرناک محسوس ہوا تھا۔ وقت گویا اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔

جانو دوبارہ بولا تو اس کا لہجہ حیرت انگیز طور پر بگڑ گیا تھا۔ "تم نے پچاس لاکھ کا بندوبست کر کے نہیں رکھا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ مجھے معلوم ہے تم بہت ضدی لڑکی ہو۔ تم اپنی ضد کی آگ میں اپنا سب کچھ جلا کر خاک کر لوگی۔ مجھے معلوم تھا تمہارا جواب کچھ اسی قسم کا ہوگا اس لیے میں پہلے ہی سب بندوبست کر کے چلا تھا۔"

"جیسں اندر کسی نے آئے یا؟" زرتاج کے غیظ و غضب اور جاہ و جلال میں کی نہیں آتی تھی۔

"شاید تم ان مسلح گارڈز کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہی ہو جن میں سے کچھ گیت پر پڑے اینٹرتے رہتے ہیں اور کچھ حویلی کے گرد گشت کرتے رہتے ہیں۔" جانو استہزائیہ لہجے میں بولا "وہ سب اس وقت آرام کی خیمہ سو رہے ہیں۔"

مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ کیا ان سب کو مارا گیا تھا؟ لیکن میں نے ایک بھی گولی چلنے کی گواہی نہیں سنی تھی۔ میرے ذہن میں جو سوال ابھرا تھا وہ زرتاج کی زبان پر لگیا۔

کھیا تم نے ان سب کو مار دیا؟ اس نے غضبناک لہجے میں پوچھا۔

"میں نے کہا کہ وہ سب آرام سے سو رہے ہیں۔ تم جاو تو انہیں مڑوہ بھی۔ کچھ سستی ہو کیونکہ میرے خیال میں سوئے ہوئے اور مڑوہ انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" جانو نے غیر واضح سا جواب دیا پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ "تم یہ سوال جواب چھوڑو میں یہاں سوالوں کے جواب دینے نہیں آیا۔ مجھے ہر حال میں دو چیزیں چاہئیں۔ پچاس لاکھ روپیہ اور افضل خان۔"

میرے اعصاب کچھ اور تن گئے اس کا مطلب تھا "اسے میرے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ زرتاج نے ایک لمبے کے لیے اپنے غیظ و غضب کو بھول کر ذرا حیرت کی ادراکاری کی۔ "تو کن افضل خان؟"

"تم اپنی جلدی بھولنے والی لڑکی نہیں ہو۔ میں نے پچھلی ہی ملاقات میں تو ذکر کیا تھا کہ اس نام کا ایک شخص کسی طرح لنگھنے سے ہمارے ہاتھوں سے کل گیا ہے۔" جانو بولا "اب جیسں اتنا بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے تم نے اسے کھوڑے سداہنے پر ملازم رکھا ہے۔ ہم تو اس سروٹ کو مار کر کبھی نکال

میری بات کو اتنی اہمیت بھی نہیں دینی چاہیے۔ ہرمال میں جس خبردار کر رہا ہوں کہ تمہارے پاس صرف پانچ سنت کی مہلت ہے۔"

اس نے گڑی دیکھی اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "ٹھیک پانچ سنت بعد میں مسئلہ دے دوں گا۔ تمہاری حویلی اور تمہارا گاڈن ایسی تباہی کی لپیٹ میں آجائے گا جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ اب تم مجھے آخری جواب دے دو۔"

اس نے جیب سے موبائل فون نکال کر چیز نکالی لیکن وہ موبائل فون نہیں ہو سکا تھا کیونکہ موبائل فون اس علاقے میں کام نہیں کرتا تھا۔ وہ غالباً وہاں کی ٹائی سیٹ تھا۔ وہ اسے ہاتھ میں ڈرا اونچا کرتے ہوئے بولا "میں اس پر صرف دو لفظ بولوں گا اور آپریشن شروع ہو جائے گا۔ بولو کیا کہتی ہو؟"

زر تاج چلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی تھی۔ میرے مساموں سے بہتہ بھوت پڑا تھا۔ میں اس وقت بالکل منتہا تھا اور جانو کے ساتھ کھٹکھٹ نہیں سیدی کیے کرے کے چاروں کونوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں اگر اچانک پردے کے عقب سے نکل کر ان پر چھلانگ لگا تب بھی شاید ان میں سے ایک یا دو کو روک پڑے ہوئے اخیر ہوتا۔ اس دوران اگر ان کی اپنی گتیں چل جائیں تب بھی میرے لیے موت کا خطرہ تھا اور اسی دوران باقی دونوں تینوں افراد بھی آسانی سے مجھے چھپتی کر سکتے تھے۔ وہ بالکل ہی مکارہ نور ست توفیق نہیں تھے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ میرے اور ان کے درمیان آئندہ دس فٹ کا فاصلہ تھا اور اس وقت ایک ایک انچ فاصلے کی بڑی اہمیت تھی۔ اگر میں ان کے بالکل قریب ہوتا تو میری چھٹی میرے کام آجاتی اور میں پلک جھپکنے میں ان میں سے کسی کی گت چھیننے ہوئے باقی لوگوں سے پہلے کم از کم ایک برست تو ماری سکتا تھا لیکن اس صورت میں بھی میرے لیے زر تاج کو بھانپنا بڑا بازو مسئلہ ہوتا۔ بے بسی کے احساس سے میرے اعصاب جھٹنے لگے۔

دعا ایک شخص نہایت خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی کھٹکھٹ تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں امید کی ایک کرن لڑائی۔ وہ عبدل تھا جو سرون کو از میں میرا کھانا وغیرہ پکانے پر مامور تھا۔ وہ اس وقت بالکل بلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ مسکین اور بدحواس عبدل نہیں تھا جسے میں اب تک دیکھتا آیا تھا۔ وہ تو اس وقت لومڑی سے زیادہ عیار و مکارہ نظر آ رہا تھا۔

جس خاموشی سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا، میرا خیال تھا وہ تو نقشہ ہی بدل دے گا یا زکیلیت دے گا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ان چاروں ڈاکوؤں کی نظر میں آئے بغیر تو وہ کمرے میں داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا اور وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد چند قدم آگے بھی آچکا تھا لیکن ڈاکوؤں میں سے کسی

بھی تمہارے لیے راستہ چھوڑا ہوا ہے۔ کسی بھی شکل میں پچاس لاکھ روپیہ مجھے دے دو۔ جتنی نقد رقم ہے وہ دے دو۔ زیور، پرائز بانٹ۔ اور کوئی قیمتی چیز۔۔۔ بھی قابل قبول ہوگی۔ بس پچاس لاکھ کا حساب پورا کر دو اور افضل خان کو میرے حوالے کر دو۔ میرا تمہارا جھگڑا یہیں ختم ہو جائے گا۔ میں پُر امن طور پر واپس چلا جاؤں گا۔"

"تو ان نہ میرے باپ نے کبھی وا تھا اور نہ کبھی میں دونوں کی۔ میں پچاس لاکھ روپیہ غریبوں کی مدد اور فلاح کے لیے خرچ کر سکتی ہوں ایک ڈاکو اور بدبخت گرد کو نہیں دے سکتی جس کے پاس پہلے ہی حرام کی دولت کے انبار موجود ہیں۔" زر تاج فیصلہ کن لہجے میں بولی "میں جسے تو ان دسے کہ تمہاری بگلی ہوئی عادتوں کو مزید بکا زنا نہیں چاہتی۔ مجھے پلے کو ایک بار جہاں سے نکار مل جائے وہ بار بار پلٹ کر وہاں آتا ہے۔"

"میں تمہارے حسن کے دیدار کے لیے۔۔۔ تم سے ملاقات کے لیے تو آتا رہوں گا۔۔۔ لیکن کوئی مطالبہ۔۔۔ لے کر نہیں آؤں گا۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" جانو کے لہجے میں خاص ملاشتہ لگتی۔

"میں آئندہ زر تاج مگر اور اس حویلی کے آس پاس تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔" زر تاج نفرت سے بولی۔

"تم پچاس لاکھ روپیہ اور افضل خان مجھے دے دو تو اس سلسلے میں بھی غور کیا جاسکتا ہے لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔ میں تمہارا سچا عاشق ہوں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر چلا آؤں گا۔" جانو کا لہجہ اب خاصا بدل چکا تھا۔

"تمہاری یہ باتیں سن کر مجھے انکاکی آئے گی ہے۔ مجھے نہ تمہارے کسی وعدے کا اعتبار ہے اور نہ ہی کسی اور بات کا۔ آج اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ آئندہ تم زر تاج مگر کی حدود میں قدم نہیں رکھو گے۔" زر تاج کے لہجے میں اب بھی کوئی پلک نہیں تھی۔

"تم مجھے اپنی شرائط بتا رہی ہو؟ تم مجھے حکم دینا چاہتی ہو؟" جانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں کیونکہ اس وقت تم میری جاگیر کی حدود میں۔۔۔ میری حویلی میں کھڑے ہو۔" وہ بدستور رعب اور دہانے سے بولی۔

"لیکن۔۔۔ میری جان۔۔۔ میں نے ایک اہم بات تمہیں ابھی تک نہیں بتائی۔" جانو نہایت ملاشتہ سے بولا لیکن اس ملاشتہ کی تہ میں سفاکی چھپی ہوئی تھی۔ "میرا خیال ہے اب میں جسے وہ بات بتاؤں دوں تو بہتر ہو گا۔ جسے یہ تو معلوم ہی ہے کہ میرا گروہ کافی بڑا ہے اور آج میں پورے گروہ کے ساتھ اس خاص مقام پر آٹھا ہوں۔ میرا پورا گروہ ایک ساتھ کسی خاص سو۔۔۔ قعر پر ہی آٹھا ہے۔ اس وقت تمہاری حویلی اور تمہارا گاڈن خاص خاص زانوئوں سے میرے آدمیوں کے گھیرے میں ہے۔ تم زندگی بھی ہو اور شاید تم

پہنی رہی تھیں۔ شاید اسے آخری سانس لینے تک یقین نہیں آیا تھا کہ اسے کوئی تک پہنچی تھی۔

”آخر تم ایک خطرناک قدم اٹھانے سے باز نہیں رہ سکیں۔“ جانو بو مجھل آزاد میں بولا ”اس حرکت میں تمہاری جان بھی چاکنی تھی۔ میرے آدمیوں نے احتیاط برلی ہے۔“

”بڑا احسان ہے ان کا۔“ ذر تاج زہر خند کے ساتھ بولی ”مجھے تو خوشی ہے کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ آستین کے سانپ کو پیل مارنا ضروری تھا۔ سامنے کھڑے ہوئے دشمن کا معاملہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔“

”تم بہت خطرناک لڑکی ہو۔“ جانو کے چہرے پر اب شیطانی مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ ”اب تمہیں مزید تھا نہیں رہنا چاہیے۔ میں اب تمہارے سامنے دو کے بجائے تین راستے رکھ رہا ہوں۔ تم مجھے پچاس لاکھ کی ادائیگی کر دو یا پچاس گھنٹے شوہر کے طور پر قبول کر لو۔ میرا جب دل چاہے گا میں یہاں آجایا کروں گا اور جتنے دن چاہوں یہاں قیام کیا کروں گا۔ ورنہ کچ پھر اپنی اس بادشاہی کی تباہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”تم اس رشتے کو شادی جیسا مقدس نام کیوں دے رہے ہو۔ سیدھی طرح کہنا کہ تم مجھے داشتہ رکھنا چاہتے ہو۔۔۔“ ذر تاج کے چہرے پر سرخی بڑھ رہی تھی۔

”تم جو چاہے سمجھ لو۔ ہر حال میں تو اس بندھن کو شرفانہ اور معززانہ شکل دینے کے لیے تیار ہوں۔“ جانو اس کے کچھ اور قریب آگیا۔

”بہت اونچے خواب دیکھتے ہو تم۔“ ذر تاج کھنٹی کھنٹی سی آواز میں بولی ”تم میرے شوہر بننا چاہتے ہو میں تو جس زرنج عمر میں کمزوری کی صفائی کے لیے بھی ملازم نہ رکھوں۔ اس کے لیے بھی میں کوئی تھوڑا بہت باکدار آدمی مقرر کرنا پسند کروں گی۔“

”اونچے خواب میں نہیں تم دیکھتی ہو اسی لیے اب تک تمہا زندگی گزار رہی ہو۔ آخر میں تمہارا شوہر کیوں نہیں بن سکا؟“ جانو گویا محل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”ایسا خرابی ہے مجھ میں؟ چھانکھا ہوں۔۔۔ دولت مند ہوں۔ بہت دور تک میری دہشت پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ تمہیں ہر طرح سے خوش رکھ سکتا ہوں۔ تمہیں اور کیا چاہیے؟“

”پڑھ لکھ کر بھی اگر آدمی کو کسی کچھ بننا ہو جو تم بنے ہو تو پھر ان پڑھ تم سے لاکھوں گے۔۔۔“ ذر تاج نے جواب دیا۔

”اچھا۔۔۔ اب باتیں بہت ہو چکیں۔ تم ہمارا مزید وقت ضائع نہ کرو۔ بات کو کسی کنارے لگاؤ۔“ پھر جیسے وہ کچھ سوچ کر بولا ”میرے خیال میں تم سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ تم ہی میرے ساتھ چلو۔ اس طرح کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ سب سمجھ میں رہیں گے۔“

”کہاں لے چلو گے مجھے؟“ ذر تاج نے نہایت رساں

نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی اور نہ ہی عیدل کی کھا شکوفہ کا رخ ڈالو کی طرف تھا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب تو کچھ اور تھا۔

دوسرے ہی لمحے یہ مطلب واضح بھی ہو گیا جب عیدل نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں جانو کو مخاطب کیا ”سامیں! میں نے تمام نوکروں اور نوکرانوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے لیکن افضل خان حویلی میں کہیں نہیں ہے۔۔۔ اور وہ واپس بھی نہیں گیا ہے۔۔۔“ وہ پانچوں ایک گشت پہلے سے زیادہ چرکتے ہوئے اور جانو سے ملتا ہوا بولا ”اس کا مطلب ہے وہ اسی کمرے میں ہے۔۔۔“

وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ صرف ان کی آنکھیں حرکت تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی نظریں عسکری باز کی طرح کمرے میں موجود ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کمرے میں دو کمزیریں اسٹائل کا بست سا بھاری بھر کم فرنیچر موجود تھا۔ تقریباً ہر چیز کے پیچھے سی کوئی آسانی سے چھپ سکتا تھا لیکن میں فرنیچر سے بھی ذرا پیچھے پردے کے عقب میں تھا۔ وہ پردوں کے کناروں کو میں نے صرف دیکھ کر دیکھا ہوا تھا اور بال برابر بھی کوزرا بھی کشادہ نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ ایک کھا شکوفہ پیدا کر کے نظر میں اسی مقام پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

لیکن میں اسی لمحے زرنج کی آتشف زورہ آواز ابھری۔ ”عیدل۔۔۔ کیا واقعی تم۔۔۔“ اس نے ہلے ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید بے یقینی کی شدت کی وجہ سے الفاظ اس کے ہونٹوں پر دم توڑ گئے تھے۔ اس کے لیے میں سسکی سی پناں تھی۔ شاید اسے زندگی میں پہلی بار کسی کی غداری کے مزے سے واسطہ پڑا تھا۔

عیدل نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جانو کا تھانہ لہجے میں بولا ”ہاں۔۔۔ عیدل ہمارا آدمی ہے۔ اسی کی وجہ سے تو حویلی کے کھانڈور کو قابو میں کرنا ہمارے لیے ممکن ہوا ورنہ یہ کام کافی مشکل تھا۔“ عیدل نہایت ڈھٹائی سے زرنج کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مجھ سمیت ایک لمحے کے لیے شاید یہی عیدل کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں بھی صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کہ زرنج نے کب اور کہاں سے چھوڑا سا وہ پینٹا ہسٹل نکالا تھا۔ میں تو غازی کی بجلی سی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

اسی لمحے عیدل ہٹ سے فرش پر گرا۔ گولی میں اس کے سینے پر دل کے مقام پر لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سرفراز کر لی یا ہسٹل کا رخ کسی اور کی طرف کرتی جانو نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی کلائی پر ٹھوکہ ماری۔ اس کے پیروں میں بھاری بوٹ تھے۔ ہسٹل زرنج کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا بازو بے جان سے انداز میں جھولی گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوئی تو شاید گراہ کر بازو تھام کر بیٹھ جاتی لیکن اس نے آف تک نہ کی۔ البتہ شاید اسے اس بات کا انوس تھا کہ وہ ہسٹل نکالنے میں تو کامیاب ہو گئی تھی لیکن اس سے مزید کام نہیں لے سکی۔ عیدل کے ہاتھ سے کھا شکوفہ چھوٹ گئی تھی اور وہ جانو کے منہ میں چب چکا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی

وہ میری طرف نہڑتے اور مجھے صحیح طور پر دیکھ پاتے تھے۔ میں کلا شکوف  
اٹھاتے ہوئے کچھ اور آگے لڑھک چکا تھا۔

اب چاروں ہی ڈاکو بیک وقت میری طرف گھوسے میں نے  
اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں سے دو میری گن کی زد میں آچکے  
تھے۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے برست مارا۔ اگر مجھے ایک ٹائٹ کے آخر  
ہو جاتی تو وہ دونوں برست مار چکے ہوتے۔ وہ دونوں آڑے ترچھے  
ڈھیر ہو گئے۔

باقی دونوں صرف اس لیے گولی چلانے میں ایک لمحے کے لیے  
جبک لمحے کہ ان کے اپنے ساتھی ان کی زد میں تھے۔ ان کی تو وہ  
رکاوٹ دور ہو گئی کیونکہ ان کے وہ دونوں ساتھی ڈھیر ہو گئے تھے  
لیکن میں اندھا دھند دو سرا برست نہ مار سکا کیونکہ اس طرف  
زر تاج کے بھی گولیوں کی زد میں آنے کا اندیشہ تھا۔

میں نے باقی دونوں ڈاکوؤں کی حوثق قاتر تک سے بچنے کے لیے  
دوسری طرف لوٹ لگائی۔ اسی دوران زر تاج نے ایک اہم کام کر  
دکھایا۔ اس نے ایک ڈاکو کی کمرہ اٹھتے زور کی لات رسید کی کہ وہ  
قریبی کے کمرے کی طرح تین میرے سامنے آ گیا۔ اس دوران اس  
کی کلا شکوف نے گولیاں اٹھیں لیکن گن کا رخ فرش کی طرف  
ہو چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ہلکا سا برست مارا اور وہ بھی ڈھیر  
ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی میں لوٹ لگا کر ایک بار پھر اپنی جگہ سے ہٹ  
گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اتنی بھرتی دکھانے میں کامیاب  
ہو گیا تھا کیونکہ جوئی میں اس جگہ سے ہٹا وہاں برست پڑا۔ میں  
بال بال بچا تھا۔ دوسری بار میں گن سیدھی نہیں کر سکا تھا کہ چوتھے  
ڈاکو نے گن کا رخ بدل لیا۔ اس بار شیشہ میں گولیوں کا نشانہ بن گیا  
ہو تا کیونکہ میں بروقت اپنی گن کو فائرنگ پوزیشن میں نہیں  
لا سکا تھا۔

اسی لمحے زر تاج کی ٹانگ ایک بار پھر حرکت میں آئی۔ اس  
نے نہایت حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ڈاکو کی کلائی پر اس طرح  
لات رسید کی تھی کہ کلا شکوف اوپر کی طرف اچھلی۔ وہ گولیاں جو  
شاید میرے جسم میں بیست ہوتیں پھٹت میں لگیں۔ ایک فانوس  
کا تھوڑا سا حصہ ان کی زد میں آیا۔ کچھ پسترا اور شیشے کی کچھ کچیاں  
پھینک گئیں۔ تقریباً ان کے ساتھ ہی ڈاکو بھی فرش پر گر ا کیونکہ اس  
دوران میں برست مارنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

جانو کی طرف سے میں اس دوران اس لیے تین چار سینکڑے  
گھر رہا تھا کہ جب زر تاج نے اس کے جیزے پر لات رسید کی تھی تو  
اس کے لڑکھانے کے دوران اس کے کندھے سے گن گر چکی  
تھی۔ میں نے یہ خیال تو رکھا کہ اس دوران وہ گن اٹھانے کے لیے  
نہیں جھکا تھا۔ بائی یوں یکدم اٹھتی دیکھ کر وہ شاید بدحواس ہو گیا  
تھا۔ لیکن جب تک میں چوتھے ڈاکو سے منٹے میں کامیاب ہوا

پہچان میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے کی سرفی بڑھتی ہی  
جاری تھی۔

”جیس اس سلسلے میں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہت  
فکارتے ہیں میرے۔“ جانو شانہ انداز میں بولا ”جیس کوئی  
تکلیف نہیں ہوگی۔“

”تو خیال ہے جیس میرے آرام کا۔“ زر تاج زہریلے لہجے  
میں بولی۔ اس کی آواز سانپ کی چھکار سے مشابہ ہوئی جیسا تھی۔  
لیکن جانو کو شاید اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ زر تاج کی کلائی  
پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ”تو میری جان بابت میں  
پہچوڑو اور میرے ساتھ چلو۔“

زر تاج اسے کلائی تھامنے کا موقع دیے بغیر اڑی کے ٹلی  
گھومی۔ دوسرے ہی لمحے جانو کے جیزے سے اپنی لات پڑی کہ میرے  
انداز سے کے مطابق اس کا جیزا کھینچ گیا ہو گا یا اپنی جگہ سے ہل گیا  
ہو گا۔ وہ میری طرف لڑکھڑایا۔

اس لڑکی کو واقعی اپنی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جانو کے  
ساتھیوں کا غیظ و غضب سے بڑا حال ہو گیا۔ یکدم انہوں نے  
زر تاج کے گرد گھیرا ٹنگ کر لیا اور ان چاروں کی کلا شکوفوں کا رخ  
زر تاج کی طرف ہو گیا لیکن شاید وہ سردار کے اشارے کے بغیر  
لڑکھ نہیں دیکھتے تھے۔ کم از کم زر تاج کو گولیوں سے چھلنی نہیں  
کر سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سردار اس جسم شعلے کو زندہ  
ہی قابو میں کرنے کے لیے کس طرح تڑپ رہا تھا۔ اس لیے وہ اب  
بھی لڑکھ دیتے دیتے رہ گئے لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ وہ خود  
بے مشکل سے پھوڑے ہوئے تھے۔

تاہم زر تاج نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے وہ موقع فراہم کر دیا  
تھا جس کا میں شہر تھا۔ میں ایک چٹا تھا کہ خواہ ایک لمحے کے لیے  
ہی سہی لیکن کلا شکوفوں کا رخ کسی ایک طرف ہی ہو جائے۔  
میرے لیے سب سے زیادہ وہ کلا شکوف خطرناک تھی جس کا رخ  
ہی اس پردے کی طرف تھا جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ کو کہ  
اس کلا شکوف والے ڈاکو کو یہ معلوم نہیں تھا لیکن جوئی میں پردہ  
ہٹانا لڑکھ دے سکتا تھا۔ اب کم از کم ایک آدھ لمحے کے لیے یہ  
خطرہ ٹل گیا تھا۔

زر تاج نے جانو کو کرائے کا جو واؤ دکھایا تھا اس سے سنبھلنے  
کے لیے اسے کئی سینکڑے روپے دیے۔ وہ تو آدمی مضبوط تھا۔ نہ شاید  
ڈھیر ہو چکا ہو۔ میں اسی لمحے پردے دونوں طرف ہٹا کر صوفے کے  
اوپر سے چلا نکلا گاچکا تھا جب کلا شکوفوں کا رخ زر تاج کی طرف  
ہوا تھا۔

میں نے اس کلا شکوف پر چلا ٹنگ لگائی تھی جو عدلی کے ہاتھ  
سے نکلی تھی۔ اسے کسی نے اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ  
مجھ سے قریب تھی۔ ڈاکوؤں کو فوراً ہی معلوم ہو گیا تھا کہ پردوں کے  
مضبب سے کوئی چیز تقریباً اڑتی ہوئی نکلی تھی لیکن اس سے پہلے کہ



جسم کو جھٹک کر کافی تیزی سے اس کے پیچھے سے نکل آیا تھا لیکن اس وقت تک میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ بجلی سی چمکی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ میں نے اس کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا۔

اگر زرنج کی لات سے کوئی کسر وہ جتنی قوت میرے گھونے سے پوری ہو جانی چاہیے تھی اور اس کا جہاز کم از کم اب تو ٹوٹ جانا چاہیے تھا۔ وہ اسی اٹلے ہوئے صوفے پر سے اُلٹ کر دوسری طرف واپس جا کر۔ میرا خیال تھا، وہ اب نہیں اٹھے گا لیکن وہ بدتر بھرتہ اٹھ کھڑا ہوا البتہ اب اس کے حواس یقیناً قفل ہو چکے تھے کیونکہ اب اس کے اٹھنے کا اندازہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔

میں صوفے کو پھلانگ کر دوبارہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اناڑوں کی طرح دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر گویا مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے جھٹک کر ایک دم ہی اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اب تک میں نے اپنی حرکات و سکنات پر پوری طرح قابو رکھا تھا اور اپنے اوسان پنجہ رکھتے ہوئے نہایت پنے تلے انداز میں ہر کام کیا تھا لیکن اس لمحے ایک لذت ہی گویا مجھے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔ میرے اندر گویا غیظ و غضب کا ایک آتش فشاں بہت ڈرا۔

میں نے بجلی بار بار اب اسے دیکھا تھا اور اس نے میرے ساتھ جو سلوک کرایا تھا، اسی وقت سے اب تک میرے دل میں قطرہ قطرہ جو نفرت جمع ہو رہی تھی وہ گویا پھول کا ذخیرہ بن گئی اور اسی لمحے اسے گویا کسی دلدیہ ہاتھ نے تلخا دکھادی۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔ میں نے اسے یوں ہی اٹھائے اٹھائے گھمایا اور کسی چھوٹے مڑے شہتیر کی طرح دیوار پر دے مارا۔

وہ صدم سے نیچے گرا۔ فوج ہونے والی مڑی کی طرح ایک لمحے کے لیے پھرا اور سناکت ہو گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اسے دیوار پر نہیں ایک کھڑکی میں دے مارا تھا۔ وہی کھڑکی جس میں کچھ دیر پہلے زرنج کھڑی جا بد رکھ رہی تھی۔ اس کھڑکی میں سوئی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور جانور سر کے بل ان سلاخوں سے جا کر کھرا تھا۔ اس کی کھوپڑی کسی تیزوز کی طرح چمکی تھی اور دو تین جگہ سے پچک گئی تھی۔ گاڑھا گاڑھا مواد آمیز سانوں اس کے بالوں کے درمیان سے پھسلنا پارتے لگا تھا۔

میں نے گھوم کر زرنج کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک ایک ہاتھ سے اپنی گردن مصل رہی تھی اور دوسرے بازو کو جھٹکے دے رہی تھی۔ اس کی گردن سرخ اور چوکھ چوکھ صورت سا نظر آ رہا تھا۔ میں ہلک کر اس کے پاس پہنچا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ ٹھیک ہی ہوں۔۔۔“ اس نے بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں

جواب دیا اور مسکراتے کی کوشش کی۔ ”البتہ میرا یہ بازو چند سینکڑ اور اس کی گرفت میں رہتا تو شاید میرا کندھا اتر جاتا۔“ وہ بازو کو بدستور جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ ”اور شاید گردن کا سٹکا بھی ٹوٹ جاتا۔“

پھر وہ گہری سانس لے کر آگے بڑھتی ہوئی بولی ”کیا یہ غیثت مر گیا؟“

”اگر اب بھی نہ مرا ہو تو میں اسے کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہی سمجھوں گا۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں جانور کے قریب آکھڑے ہوئے جو قالمیں پر چت پڑا تھا۔ اس کی شکل بری طرح مست ہو گئی تھی۔ وہ کافی ڈراؤنا لگ رہا تھا حالانکہ خوش شکل آدمی تھا۔ اس کے ہاتھوں سے بھی خون بہہ رہا تھا اور کھوپڑی تو پوری ہی سرخ سے لٹوے میں تھنچ چکی تھی۔ اس کا سینہ سناکت دکھائی دے رہا تھا۔ سانوں کے زیر و بم کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

”میرا اسے چھوٹے کر دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ ورنہ میں اس کی نبض دیکھنے جا دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتی۔“ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد زرنج بولی۔ اس کے لمبے میں اب بھی نفرت تھی۔

”لیکن۔۔۔ میرا خیال یہ ہے میری چکا ہے۔۔۔“ جانور کی رات کے بعد بھی زرنج کے لمبے میں نفرت کم نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں۔۔۔“ میں نے بھی جانور کو چھوٹے بغیر دٹوٹی سے جواب دیا ”یہ واقعی مر چکا ہے۔“

تب گویا زرنج پر یکدم ہی ممکن نے غلبہ پایا۔ وہ قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور جھٹکے جھٹکے سے انداز میں پیٹنے سے ٹپک لگائی۔ کرا بچ ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ پانچ لاشیں اور اچھر آڑی تر جمی پڑی تھیں۔ جگہ جگہ خون پھیلا نظر آ رہا تھا۔ گو کہ قالمیں رنگین اور دھڑکتا خون اس میں تیزی سے جذب ہو چکا تھا، اس کے بازو دھڑکے دھڑکے جھیلے داغ نظر آ رہے تھے۔

میں بھی زرنج کے قریب جا بیٹھا۔ چند لمحے کے لیے میرے اعصاب کو بھی سکون کی ضرورت تھی۔ زرنج گہری سانس لے کر بولی ”حد سے زیادہ فرعونیت پر اترنے والوں کی کمائی کبھی کبھی یوں صرف چند لمحوں میں ختم ہو جاتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن بانی فرعون اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ تھا اس نے گردن موڑ کر مجھ ہی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب وہ گویا ایک نئے ہی زاویہ نظر سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر وہ جیسی ہی آواز میں بولی۔ ”تم یقیناً ایک غیر معمولی شخص ہو۔ تمہارے اندر بھی کوئی شیطانی مدون متید ہے۔“

”شیطانی۔۔۔؟“ میں نے مجروح سے لمبے میں کہا۔ ”یہ شبہ آپ کو کیوں ہوا؟“

”جس سٹاکی سے تم نے جانور کو اٹھا کر ایک کھلونے کی طرح

ایک کھڑکی سے دسے مارا مجھے اس پر یقین نہیں آ رہا۔ اس وقت میں نے ایک لمحے کے لیے ہمارا چہرہ دیکھا تھا۔ میں نے زندگی میں ایسی سفاکی شاید کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھی۔۔۔ اس نے خفیف سی جھرجھری لی۔

فرعونوں سے سننے کے لیے ایسی ہی سفاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔ ”جس کے دل میں فرعونوں کے لیے بھی نرم گوشہ ہوگا وہ طاقت ور ہونے کے باوجود اس سے نہیں منٹ سکتا۔۔۔“

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے اندر جو روح مقید ہے اسے آپ شیطانی ہرگز نہیں کہہ سکتیں۔ وہ تو ایک شریف روح ہے۔ اس سے آج تک کسی شریف آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔“

”لیکن فرعون صفت لوگ ضرور انجام کو پہنچے ہیں؟“ اس نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔“ میں نے انکار نہیں کیا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ میں اپنے وہ شیطانی روح والے الفاظ واپس لیتی ہوں۔“

”شکریہ۔“ میں نے گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔

اچانک وہ چرکی اور جھرجھری سی لے کر یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اف۔۔۔ خدا ہا۔۔۔! ہم تو یوں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ہیں گویا ہلکے پر آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں حویلی کے محافظوں کی خبر لگنا چاہیے۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔۔۔ اور ہا۔۔۔ جانو نے کہا تھا کہ اس کے آویسوں نے حویلی کو بھی گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس کی بات کا کچھ زیادہ یقین نہیں لیکن ہمیں بہر حال محتاط رہنا چاہیے۔ اگر باہر واقعی آدمی موجود ہیں تو فائرنگ کی آوازیں یقیناً ان تک پہنچ چکی ہوں گی اور وہ صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔“

زرتاج نے جھک کر ایک کلا شکوف اٹھالی۔ میں نے دوسرے ڈاکو کی گمن اٹھالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اس وقت اگر ہمارے پاس دو مارا نکلیں موجود ہوتیں تو اچھا تھا۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس تھانے میں چند رائفلیں موجود ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”اس طرح یکدم مت اٹھا کر باہر نہ نکلیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ ”اور پہلے اس کمرے کی بیتیاں بچھا دیں۔“

وہ ایک لمحے کے لیے ہلکی پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اندھیرے میں ہم دونوں شانہ بٹانہ کمرے کے دروازے تک

”ثناء اللہ۔“ میں نے غلو میں سے جواب دیا۔

کافی دور تک ہم دیکھے رہے لیکن ہمیں اور کسی قسم کی نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ ہم نے برآمدے کے کونے سے جھانک کر اندر دیکھا۔ ہر طرف سکوت تھا۔

”میرا خیال ہے اب اندر کی بٹیاں روشن کر دی جائیں۔“  
 ذر تاج مشورہ طلب انداز میں بولی۔

”نہیں۔“ میں نے اسے روکا۔ ”اندھیرے میں ہی بارہل کر دیکھتے ہیں کہ کیا صورت حال ہے۔“

وہاں اندھیرا کچھ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں آسانی سے کافی دور تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ مجھے روشنی کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں اس سے گہرے اندھیرے میں بھی خاص دور تک کی چیزیں دیکھ لیتا تھا اور اندھیرے میں ہی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتا تھا۔ کسی خطرناک صورت حال میں روشنی میں پچھتے ہی ٹپکے کچھ ایسا احساس ہوتا تھا جیسے میں کسی کے لیے آسان ہدف بن گیا ہوں۔

برآمدے سے نیچے اترنے سے پہلے ہم نے احتیاطاً کمروں کے گرد ایک پتھر لگایا تاکہ چاروں طرف کچھ اور بہتر طور پر جائزہ لے سکیں۔ اسی دوران ایک کمرے سے ٹھیکاباٹ آتیری کچھ کھنکی کھنکی آوازیں سنائی دیں۔ باہر سے اس کمرے کے پرکٹ چڑھے ہوئے تھے۔

ذر تاج اس کے سامنے رکتے ہوئے بولی۔ ”اس میں یقیناً گھبراہٹ اور طمانہ نہیں بند ہیں۔“

اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا تو کمرے میں بیک وقت کئی خوفزدہ سی آوازیں بلند ہوئیں۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہی تھا۔ ”دروست۔ یہ میں ہوں۔“ ذر تاج نے کمرے میں جھانکتے ہوئے نہایت نیچی آواز میں کہا۔ دھڑکنا چھوٹا سا تھا لیکن اس میں بہت سے افراد کی چیز بکریوں کی طرح فٹنے ہوئے تھے۔

”ریشائی جی! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ نصیحت سے ہیں۔“ کسی عمر رسیدہ مرد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ بس ذرا جلی میں کچھ ڈاکو گھس آئے تھے۔ وہ سب مارے جا چکے ہیں۔“ ذر تاج نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”تم لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پر جاؤ۔ ذرا دیر کی ضرورت نہیں۔ جس جس کو جو ہتھیار مل سکے وہ اپنے ساتھ رکھ لیں۔“  
 ہاں۔ خیال رہے۔ ذرا ٹنگ روم میں اور باغیچے کے قریب اداخانے میں کچھ لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ فی الحال کوئی انہیں ہاتھ نہ لگائے۔“

”ریشائی جی! ہمیں تو عدیل نے دھوکے سے یہاں لاکر بند کر دیا تھا۔“ ایک اور شخص نے گویا منٹائی پیش کی۔  
 ”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ ذر تاج نے گویا اندھیر

”کرکوع کی سی حالت میں چوکھٹ سے لگ کر باہر نکلیں اور نکلے ہی پہلے چند لمحوں کے لیے دیوار سے لگ کر صورت حال کا جائزہ لیں۔“ میں نے سرگوشی میں اسے ہدایت کی۔

یہ احتیاط ہمارے کام آئی اور یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم بڑے صحیح وقت پر کمرے سے نکل آئے تھے۔ اگر ہم صرف چند لمحوں پہلے نہ چڑھ جاتے ہمارا کیا انجام ہوتا۔

باہر نکلے ہی ہم کمرے کی دیوار سے چپک گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحوں میں ذر تاج میری ہدایت کے بغیر ہی گھنٹوں کے بل بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ میں نے بھی گلیبے اندھیرے میں چند سائے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ میں اور ذر تاج اس وقت برآمدے میں تھے جو ذرا اونچا تھا۔ دو بیڑیاں چڑھ کر اس میں قدم رکھا جاتا تھا۔

اس وقت جلی کی شاید سبھی بٹیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہر طرف پراسرار، ٹھپکا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا جو اپنے دامن میں نہ جانے کیا کچھ چھپائے ہوئے تھا۔ قیپ میں وہ سات آٹھ سائے تھے جو آہستگی سے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن کمرے کی بٹیاں بجھنے کے بعد شاید انہیں کسی کڑبو کا احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے کھڑکا شروع کر دیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ سیدھے دو دروازے کی طرف آنے کے بجائے چاروں طرف سے کمرے کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔

”کیا یہ آپ کے آدمی ہیں؟“ میں نے سرگوشی میں ذر تاج سے پوچھا۔

”نہیں۔ میں بولے دیکھ کر ہی مانگتی ہوں کہ یہ میرے آدمی نہیں ہیں۔ ویسے بھی انہیں اس طرح کمرے کی طرف بڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟“ ذر تاج نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

”تو پھر بے دریغ انہیں آزاد چاہیے۔“ میں نے بلا تامل کہا۔ ”اگر یہ جلی میں اندھیرا کمرے اور اندھیرا کمرے کی آواز کے سامنے چھوڑ دے تو ہمارے لیے ان سے تشنہ مشکل ہو جائے گا۔“

سائے کرکوع کی سی حالت میں اندھیرا کمرے بڑھ رہے تھے۔ میری اور ذر تاج کی کھا جھکوئی بیک وقت گہریں اور یہ سائے تقریباً ایک ساتھ ہی اندھیرا کمرے لگے۔ کوئی ہوا میں اچھلا کوئی لہرایا اور کوئی جہاں کا تھنڈا ڈھیر ہو گیا۔ فضا میں کھنکی کھنکی دو تین جھینجھیں بھی ابھریں۔ اس کے بعد گہرا سکوت چھا گیا۔ موت جیسے بار بار اس خوب صورت جلی میں جھانک فتنہ بلند کرتی تھی، کچھ لوگوں کا لبو جانتی تھی اور اس کے بعد سکوت چھا جاتا تھا۔

”کیا یہ سب مر گئے ہوں؟“ ذر تاج نے عجیب سا دلی اور مصیبت سے پوچھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ جیسے ہم نے کھا جھکوئیوں سے گولیاں نہیں برساتی تھیں، کھلونے چلائے تھے۔



# نظمی شعری

اسلم راہی ایم اے قیمت =/150

## طنز و مزاح

- منتخب مزاح پارے ضیاء ساجد 10/-  
 ممتاز ادیبوں کے منتخب خاکے ضیاء ساجد 20/-  
 منتخب قلمی شہ پارے ضیاء ساجد 00/-  
 سر جیکل وارڈ ضیاء ساجد 30/-  
 مزاح مزے کا ضیاء ساجد 50/-  
 منتخب شاہکار شخصی خاکے ضیاء ساجد 10/-  
 منتخب مزاحیہ مضامین ضیاء ساجد 20/-  
 مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور نمبر 2

نسل دی۔ "عبدل بھی مرکا ہے۔" پھر آگے بڑھنے سے پہلے وہ بولی۔ "گوئی جی نہ چوائے مار چیں وغیرہ تلاش کرو۔ اگر زیادہ ہی ضرورت پڑے تو ان سے کام چلانے کی کوشش کریں۔ میں اور افضل خان حالات کا جائزہ لینے باہر جا رہے ہیں۔"

ہم دردناک کھلا چھوڑ کر بیڑھیوں کی طرف چل دیے۔ راستے میں ذرا تاج بولی۔ "یہ سب بے چارے گھلے جسم کے کام کاج کرنے واسلے سیدھے سادے لوگ ہیں۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ڈاکو اس حویلی میں بھی ٹھس کتے ہیں۔"

ہم ابھی بیڑھیوں سے اترے ہی تھے کہ دو درمیں یکدم خوفناک فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم دونوں ہی ٹھک کر رہ گئے۔

"یہ آوازیں تو گاؤں کی طرف سے آ رہی ہیں۔" ذرا تاج بولی لیکن اس کے لیے میں کچھ زیادہ تشویش نہیں تھی۔ "میرا خیال ہے جانو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس نے حویلی کے باہر بھی آوی کھڑے کیے ہوئے تھے اور شاید گاؤں کو بھی کچھ لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ انہیں چونکہ بہت دیر سے شعل نہیں ملا اور انہوں نے حویلی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنی ہوں گی۔ انہوں نے اندازہ لگایا ہو گا کہ حویلی میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے لہذا انہوں نے اب جانو کے بغیر ہی گاؤں پر حملہ کر دیا ہے۔"

"تمہارا خیال صحیح معلوم ہوا ہے۔" ذرا تاج بولی۔

"میں جلدی ان کی مدد کو پہنچا چکا ہوں۔ ڈاکو کہیں بے گناہ اور سیدھے سادے نئے دستانوں کا قتل عام نہ شروع کریں۔ ہم جس حد تک بھی انہیں روک سکتے ہوں چل کر دیکھنے کی کوشش کریں۔" میں نے تجویز دی۔

ذرا تاج غالباً میرے لیے کی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکو نہ تو آسانی سے گاؤں میں ٹھس کتے ہیں اور نہ ہی کوئی بڑی کارروائی کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے جانو کے طور دیکھتے ہوئے کافی عرصے سے خطرہ تھا کہ گاؤں میں کبھی اس قسم کی کوئی صورت حال پیش آسکتی ہے اور ڈاکو عام طور پر وار کرتے۔ کسی ہستی والوں کو ستانے یا انتقام لینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ شب خون مارنے کے انداز میں حملہ کرتے ہیں۔ گھروں اور ٹھکانوں کو آگ لگاتے ہیں لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔ کئی رہائش اور قبیلوں وغیرہ میں ایسا ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں نے احتیاطاً نہایت خاموشی سے گاؤں کی حفاظت کا ایک نظام ترتیب دیا تھا۔ گاؤں میں چاروں طرف چند خاص خاص مکانات منتخب کیے گئے تھے جن کی چھتوں پر مورچے بھی لگے ہوئے ہیں اور وہاں کے مردوں کو اسلحہ بھی فراہم کیا گیا تھا۔ وہ لوگ باری باری ایک ایک رات چھت پر پیرا دیتے ہیں اور اور کو نقل و

حرکت پر نظر دیکھتے ہیں۔ لہذا آج ڈاکوؤں کو نہ تو جواب ملے اور وہ گاؤں میں داخل نہیں ہو سکیں گے جو لوگ پہرے پر ہوں گے وہ تو مقابلہ کر رہے ہوں گے لیکن جن لوگوں کی آج پہرے کا باری نہیں ہو گی وہ بھی مکانوں کے اندر ہی اندر ان کی مدد کو پہنچا جائیں گے۔"

پھر وہ ایک لمحے کے لیے کان لگا کر سننے کے بعد بولی۔ "ذرا غور سے سنو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ فائرنگ دو طرفہ ہو رہی ہے۔" ہاں۔ مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "کتے الموس کی بات ہے۔ ہم اپنے ہی ملک میں بعض مقامات پر تو گونا گونا جنگ میں زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" ایک لمحے کے لیے اس کے لیے بھی الموس کی جھلک آئی لیکن پھر وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ "بہر حال۔ ہم ان کی مدد کے لیے ضرور چلیں گے مجھے امید ہے کہ ہم دونوں کے جانے سے کافی فرق پڑ جائے گا۔"

"یقیناً۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "لیکن کم از کم دو عدد دربار راستیں اور کافی مقدار میں ایجوکیشن ضرور ساتھ لے لیں۔"



”معد سے زیادہ محنت خوردہ ہے اکثر اسی طرح ہوت کے کر کے  
میں جا کرتے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”وہ مجھے شاید کوئی  
گائے جیٹس سمجھتا تھا کہ جب جی چاہے گا، رہی گئے میں ڈال کر  
کھینچا ہوا لے جائے گا۔ میں ہی اس علاقے میں اس کے راستے  
میں سب سے بڑی دریا بھی تھی ورنہ باقی سب زمینداروں میں سے  
کچھ کو تو اس نے ٹیکل ڈال رکھی تھی اور کچھ سے گھ جوڑ کر رکھا  
تھا۔ اب وہ مجھے سرگول کرنا چاہتا تھا۔“

”بے چارے کی بازی بالکل ہی اٹل تھی۔“ میں نے کہا۔  
”اور اس کے ساتھیوں نے بھی گاؤں کو بالکل محفوظ علاقہ سمجھ کر  
مہینے کی کوشش کی ہوگی تو گولیوں نے ان کا استقبال کیا ہو گا۔“

”شکر ہے میں نے رات کی چوکیداری کے اس منصوبے کی خبر  
عام نہیں ہونے دی تھی۔ عدول کو تو بالکل پتا نہیں تھا ورنہ یہ  
اطلاع بھی جانو کو پہنچ چکی ہوتی۔“ ذرتاج بولی وہ ایک پرچہ میں  
کی طرح میرے برابر بیٹھی تھی اور ہم کئے درختوں کے درمیان  
ایک اور ہی ناہوار راستے سے گاؤں کی طرف چارہ تھے۔ میری  
کوشش تھی کہ کسی بھی کہیں گاؤں میں موجود کوئی بھی ڈاکو ہماری  
گاڑی کو آتے نہ دیکھ سکے۔ ویسے اس کا خطرہ کم ہی تھا کیونکہ گاڑی  
کارنگ سیاہ تھا اور وہ اندھیرے میں تو کچھ فاصلے سے مشکل سے ہی  
نظر آسکتی تھی۔ اس کے انجن کی آواز بھی برائے نام تھی۔ ٹائرنگ  
کی قوا زائد بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔

درختوں کا سلسلہ ختم ہونے کا قریب نے کہا۔ ”بس۔ گاڑی  
میں مدد دیجئے۔ باقی فاصلہ ہم پیدل طے کریں گے۔ اس دوران  
شاید کچھ اندازہ ہو جائے کہ ڈاکو کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔“  
ذرتاج نے گاڑی روکی تھی کہ ایک زوردار چمکا کا ہوا اور  
ذرتاج یکدم مجھ پر آن کر رہی۔

میں نے ہولکا کرانہ حیرے میں ذرتاج کو ٹھٹھا لیا کہ وہ  
میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے جلدی سے بولی۔ ”بس۔ بس۔ میں  
ٹھیک ہوں۔“

میں نے اطمینان کی طویل سانس نہ۔ گولی اسے نہیں  
کلی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا اور جب دوسری  
گولی نہیں آئی تو وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اس وقت تاراج  
روشن کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ پہلی گولی تو شاید

”آوارہ“ تھی۔ بونٹی ہلک کر ادھر اٹکی تھی لیکن روشنی دیکھ  
کہ دوسری گولی کوئی نشانہ باندھ کر بھی چلا سکتا تھا۔

میں نے اندھیرے میں اتنا ضرور دیکھ لیا کہ وہ اسکرین  
کے ایک کونے میں سوراخ ہو چکا تھا اور کافی بڑے حصے میں  
کھڑکی کا جالا سا پھیل گیا تھا تاہم پوری وہ اسکرین نہیں ڈھکی  
تھی۔ گولی شاید ذرتاج کے کندھے پر سے ہوتی ہوئی گزر گئی  
تھی۔ وہ اپنی گرد میں ہاتھ مار کر کچھ بھانڈنے لگی۔ شاید کچھ

لازوال

کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

۷

شاہکار ناول

نجیث (۵ حصے) ۱۰۰/-

برہمچاری ۵۰/-

درخشاں (۲ حصے) ۱۰/-

رقص ابلیس ۵۰/-

آسیب زندہ ۱۰/-

دستک ۲۰/-



مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

فون ۶۶۶۶۲۲

## رومانی ٹاول

|       |          |                  |
|-------|----------|------------------|
| 75/-  | سلی رعنا | دل کا آنگن       |
| 75/-  | سلی رعنا | گالے کنول        |
| 100/- | سلی رعنا | اور دیا جلتا رہا |
| 100/- | سلی رعنا | موج گرداب        |

مکتبہ القریش اُردو بازار - لاہور 2

ہلاک کر سکیں کہیں اور بند رہ آگے بڑھتے رہیں حتیٰ کہ بارغ کے گیٹ کی طرف ہم ایک دوسرے کے سامنے آجائیں لیکن فی الحال اسے محض ایک خواب یا تمنا بھی کہا جاسکتا تھا کیونکہ راستے میں خود ہمارے ارے جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ ہم کسی درخت کو مورچہ نہیں بنا سکتے تھے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس درخت پر ڈاکو موجود ہیں یا کہاں درختوں کے درمیان کوئی مورچہ بند ہو۔

اس تجویز کا ایک اچھا پلو یہ تھا کہ اگر ہم دونوں کمانڈوز کے مخصوص انداز میں تیزی سے فائرنگ کرتے اور گریڈ پھینکتے ہوئے ساتھ ہی نہایت پھرتی سے پوزیشن بدلتے ہوئے اپنے آپ کو بھا کر آگے بڑھ سکتے تو ڈاکوؤں کو یہ تاثر مل سکتا تھا کہ انہیں گھیرے میں لینے کے لیے کچھ لوگ یا پولیس فورس وغیرہ بارغ میں کھس گئی ہے۔ اور انہیں جانو کی طرف سے کوئی شکل نہیں ملتا تھا۔ وہ بولکھا ہٹ کا شکار ہو سکتے تھے۔

اس درشن پلو کے باوجود میں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور کہا۔ ”ہم اسٹھ ہی رہیں گے۔ خواہ زندہ رہیں یا مری جائیں۔“

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ بارغ میں تاریکی ذرا گہری محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے بھی دور تک کی چیزیں دیکھنے میں دقت پیش آنے لگی تھی لیکن میں کم از کم اس کا چرچہ اس کی آنکھیں تو ابھی طرح دیکھ ہی سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے درختی سی آبی اور محدود ہو گئی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”آپ کا میرے ساتھ رہنا اس لیے ضروری ہے کہ اس بارغ کے راستوں سے آپ زیادہ

کرپیاں اس کی گود میں آن گری تھیں۔ چند لمحے ہم دونوں ساکت رہے لیکن ہماری سمت میں مزید کوئی فائر نہیں ہوا۔ گاؤں کی طرف سے البتہ دو طرفہ فائرنگ کی آوازیں اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ میں اور ذرا تاج دور مارا فٹکلیں ہاتھ میں لیے اور ایک ایک بیگ کندھے سے لٹکائے پیچھے دوے اتر آئے۔ خاصا فاصلہ ہم نے کمانڈوز کی طرح رکوع کی سی حالت میں طے کیا اور ایک بجی دیوار تک جا پہنچے۔

”دو در حقیقت ایک بہت بڑے بارغ کی چار دیواری تھی۔ ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ڈاکو اس بارغ میں مورچہ بند تھے۔ وہ یقیناً بڑے اونچے اور طے شدہ منصوبے کے تحت آئے تھے اور ”جنگ“ حکمت عملی کے اعتبار سے انہوں نے بہت اچھی جگہ عقب کی تھی۔ بارغ میں وہ یقیناً چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ شاید درختوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ یوں گاؤں کا بیشتر حصہ ان کی فائرنگ کی زد پر تھا جبکہ وہ خود گویا بنے بنائے مورچوں میں تھے۔

میں نے چند لمحے فائرنگ کی آوازیں سن کر کچھ اندازے قائم کیے اور پہلی آوازیں ذرا تاج سے کہا۔ ”میں زمین پر بیٹھتا ہوں“ تم میرے کندھوں پر چڑھ کر اس دیوار سے اندر کود جاؤ۔“

”اس دیوار پر چڑھنے کے لیے مجھے تمہارے کندھوں پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ اس نے اپنی گن اور بیگ مجھے تھمایا اور بازو اونچے کر کے ہاتھ دیوار پر جھانک دوسرے ہی لمحے اس کے جسم نے تاکن کی طرح ٹپل کھلایا اور ایک بندوباز کی سی پھرتی سے وہ دیوار پر چڑھ گئی۔ گو کہ اس کے لیے میرے ذہن میں آنے والی یہ دونوں تجویزات مجھے قطعاً اچھی نہیں لگی تھیں۔ وہ نہ تو تاکن کی طرح زہریلی تھی اور نہ ہی بندوباز کی طرح مضحکہ خیز لیکن صرف چمک اور پھرتی اس میں ان دونوں جیسی نظر آئی تھی۔

دیوار پر بیٹھ کر اس نے جبکہ کمرچھ سے منہیں اور بیگ لیے۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی دیوار پر چڑھ گیا۔ ہم یہ خبر عافیت بارغ میں کوڈے میں کامیاب ہو گئے کسی گولی نے ہمارا استقبال نہیں کیا۔ گو کہ گاؤں کی سمت میں فائرنگ بدستور جاری تھی۔

ہم عقب سے بارغ میں داخل ہوئے تھے اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے تھے۔ ذرا تاج پہلی آوازیں بولی۔ ”میں اس طرف جاتی ہوں۔ تم اس طرف جاؤ۔ قسمت میں ہو تو دروازے کی طرف ہم پھر آن ملیں گے۔“

اس کا مقصد تھا کہ ہم دونوں دائیں بائیں طرف سے بارغ کے گرد ہوتے ہوئے جتنے بھی ڈاکوؤں کو تلاش کر کے

اچھی طرح واقف ہیں اور میرا خیال ہے لڑائی کی ٹیکنک میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔"

"تمہیں ہے یہ محض تمہارا خیال ہی ہو۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔" وہ مسکرائے۔ ان حالات میں بھی وہ وحشت زدہ نہیں تھی۔ انسان کو تو جی تو اسی طرح حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے اعصاب شکست نہ کھائیں۔

"بہض اوقات خیال، حقیقت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے دوسری طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہم دونوں دیوار سے ٹک کر ٹھیکے لگے۔

قانون کی آوازوں سے مجھے اب کافی حد تک اندازہ ہونے لگا تھا کہ ڈاکو کہاں کہاں موجود تھے لیکن درختوں کے جھنڈ میں سے انہیں ٹھکانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کوشش میں خود ہماری موجودگی ظاہر ہو سکتی تھی اور ہم لی الجال کسی محفوظ پوزیشن پر نہیں تھے۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں نے بارگ کے ایک حصے میں ایک ٹانگے کے لیے روشنی کا جھماکا دیکھا۔ ہم کچھ اور پیچے ہو کر دیوار کی جڑ میں دیک گئے۔ بے درپے دو تین اور ایسے ہی دھماکے ہوئے۔ فائرنگ کی آواز ان میں دب کر رہ گئی۔

"یہ تو گریڈ استعمال ہو رہے ہیں!" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ میرے گاؤں کے لوگ استعمال کر رہے ہیں۔" زرنج اطمینان سے بولی۔ "ڈاکوؤں کی دہشت گردیوں نے انہیں بھی پورا پورا کمانڈو بنادیا ہے۔ حالانکہ ہمارا گاؤں آج تک محفوظ ہی چلا آ رہا تھا لیکن دہشت گردیوں کے قصے بہر حال سننے آرہے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ میں نے ان لوگوں کو اس قسم کی صورت حال کے لیے تیار رکھا تھا۔ تم دیکھ رہے ہو؟ حملہ بالکل اسی طرح ہوا ہے جیسے دشمن ملک کی فوج چڑھائی کرنے کے لیے آئی ہو۔"

اسی دور ان گاؤں کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں مجھے قریب آتی محسوس ہونے لگیں تھیں۔ زرنج بولی، "گاؤں والے پیش قدمی کر رہے ہیں۔" تب مجھے معلوم ہوا کہ اندازے لگانے میں زرنج بھی کچھ ایسی اناڑی نہیں تھی۔ ہم خاصا آگے پہنچ چکے تھے لیکن ابھی تک ہم نے ایک بھی فائر نہیں کیا تھا۔

ہم ایک لمبے کے لیے رکے تو زرنج سرگوشی میں بولی۔ "درا آگے مانی کا کمر ہے۔ اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ بہت اچھا موڑ پر ثابت ہو سکتا ہے۔ دعا کرو کہ ہم خیریت سے اس تک پہنچ جائیں۔" اس بار میں گولیوں کی ترخترابت کے

درمیان اس کی سرگوشی بہ مشکل سن پایا۔ جب سے بارگ مگرینڈ آکر گرے تھے مجھے بارگ میں کچھ ہچکچاہٹ کا سا احساس ہو رہا تھا۔ میں درختوں کے درمیان کچھ دیکھ تو نہیں پا رہا لیکن محسوس کر رہا تھا کہ وہاں کچھ بھاگ دوڑی شروع ہو رہی تھی۔

اچانک زرنج کا گرم دھندلا ہاتھ منظر پر اندازہ میرے ہاتھ پر آکا اور وہ مجھے ایک طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ دیکھ رہے ہو؟"

میں نے اس کے اشارے کی سمت میں دیکھا۔ وہ ایک کمرے کا بیلا نظر آ رہا تھا جس کے آس پاس شاید کچھ ہاتھ وغیرہ بھی تھے۔ وہ بولی۔ "میں مانی کا وہ کمرہ۔ ہے جیسے مورچہ پستانے کی بات کر رہی تھی۔"

لیکن اب یقیناً اس کا اشارہ کمرے کی طرف نہیں۔ کی چھت کی طرف تھا جس پر چند ہولے متحرک نظر آ رہے تھے۔ ان بیرونیوں کے درمیان ایک غیر متحرک چیز بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انسانی بیروں کے تین ٹانگوں والی اس چیز کو کر رہے تھے۔

"تمہیں اندازہ ہوا وہ کیا ہے؟" زرنج نے پوچھا۔ "ہاں۔ راکٹ لانچر ہے۔ آخر وہ گاؤں والوں۔ مگرینڈ کا جواب تو دیا گئے۔" میں نے کہا۔ میں اندیشہ میں ان بیرونیوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے کچھ عرصہ ایک دور دراز مقام پر دیکھا ہوا تقریباً ایسی ہی ایک منظر آ رہا تھا جب بلوچستان کے قریب سندھ کے ایک دور افتادہ علاقہ ڈاکوؤں نے اسی طرح ایک مکان کے گرد محاصرہ ڈالا ہوا تھا۔ تب بھی میں نے اسی طرح ایک پھاڑی پر راکٹ لانچر کا نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ بعض ڈاکو تو لانچر کے لیے ٹانگی بھی فٹ کرنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ وہ لانچر کندہ رکھ کر ہی راکٹ فائر کر دیتے تھے۔

"یہ تو بہت دور دور تک تباہی پھیلا سکیں گے۔" زرنج نے انداز میں بولی۔

"قدرت نے ہمیں بروقت ہی یہاں بھیجا ہے۔" نے کمنٹیوں کے بل لیتے ہوئے کہا۔ "اور ہم یہاں ان کارروائیوں کا صرف معاہدہ کرنے نہیں آئے۔"

اس نے بھی میری تقلید کی۔ کمرے کی چھت زیادہ اٹھیں تھیں۔ سینے کے بل لیٹنے کے باوجود بیروں کی ہماری نظر رہے۔ اس سے پہلے کہ وہ راکٹ فائر کرتے ہماری راکٹ نے گولیاں اٹھیں اور وہ چاروں کے چاروں کمرے کی گتوں سے لڑھک پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی تھوڑا لڑھک کر اپنی پوزیشن بدل لی۔ اس کے بعد کچھ فاصلے پر جا کر ایک لمحہ پہلے سے ہمارے ہاتھوں کی

”یہ ہمارا مالی تھا۔“ اس نے سرگوشی میں بتایا۔ اس کی نیچی آواز میں بھی نیچے غیظ و غضب کی لہر چلتی محسوس ہوئی۔ ”ان گتوں نے اس بے چارے بے ضرر سے آدمی کو بھی مار ڈالا۔ اتنا شریف۔ نمازی اور پرہیزگار شخص تھا۔ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ معلوم نہیں ان بے چاروں کا کیا بنا ہوگا۔“

اس سوال کا جواب بھی ہمیں چند سیکنڈ بعد ہی مل گیا۔ دیوار کے ساتھ تین لاشیں اور بڑی خنجریں۔ ایک عورت بھی اور دو نو عمر لڑکے۔ میرے دل میں بھی ماسف کی ایک لہر ابھری۔ کسی شریف اور بے ضرر انسان کا بے جواز اور ظالمانہ قتل بیشہ میرے دل میں ایک جیپن اور اضطراب سا پیدا کر دیتا تھا۔

زر تاج بھی اب گویا بھر پکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گمن بے درختوں کے درمیان جا گھسی اور چاروں طرف گولیوں کی ہوجھاڑ کر دیتی لیکن ظاہر تھا کہ اس موقع پر یہ شخص ایک حماقت ہوتی۔

اس دوران درختوں میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مالی کی کونھری کی سمت میں گریز ہو چکی تھی۔ اس طرف گولیوں کے برسٹ پڑنے لگے تھے۔ میں اور زر تاج جلدی سے کونھری کی آڑ میں ہو گئے۔ کونھری کیا تھی، اچھا خاصا پکا کمر تھا اور اس وقت ایک بہت عمدہ مورچہ ثابت ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مورچے کی آڑ میں ہمارے دے گے رہنے کا کوئی ناکہ نہیں تھا اور ڈاکو ہماری نظروں سے آڑھل تھے۔

اچانک مجھے درختوں کے درمیان کچھ سائے متحرک نظر آئے۔ میری نظروں اندھیرے میں بھی کافی بہتر طور پر کام کرتی تھی، اس موقع پر میرے بہت کام آ رہی تھی۔ میں نے راقفل استعمال کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ درختوں کے درمیان کہیں فراہٹ آمیزی ایک بیج ابھری۔ میری چلائی ہوئی گولیاں کن نہ کسی حد تک کار آمد رہی تھیں۔

اس دوران دو تین گریزندے اور باغ میں پھٹے۔ باہر سے فائرنگ کی آواز بھی قریب آئی جا رہی تھی۔ ڈر تھراہٹ کے درمیان جو بھی ذرا ذرا سا وقت آتا تھا اس میں مجھے زر تاج کی وہی سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”گاؤں والے پیش قدمی کر رہے ہیں۔ آج کی رات ڈاکوؤں پر بھاری ہوگی۔ زر تاج ٹھکر مارے گا۔“

انہی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے۔ ایک گریزندہ ہم سے کچھ دور ہی درختوں کے درمیان گر کر پھنسا اور روشنی کا جھکا سا ہوا۔ اب میں نے پہلی بار ڈاکوؤں میں سے کسی کی آواز سنی۔ وہ بیچ کر کسی سے کچھ کہہ رہا تھا۔

میں آئی کرے کی چھت پر موجود ڈاکوؤں کو توجہ دینا نہیں ملا ہوگا کہ موت نے کس بہت سے انہیں آن رو چکا تھا لیکن باغ میں موجود ڈاکوؤں کو بھی شاید کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔ نہیں غالباً یہی اطمینان تھا کہ اس وقت باغ پر ان کا قبضہ تھا۔ ان کی اور باغ میں داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا تھا تاہم نہیں ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ کمرے کی چھت پر کوئی گریز دلی تھی کیونکہ میں نے کچھ ہی دور درختوں کے درمیان جب سے کسی کے کودنے کی آواز سنی پھر اچانک ہی دو سیاہ پوش درختوں کے درمیان سے بھاگتے ہوئے باہر آئے۔

ان کی یہ حرکت قطعی اضطرابی اور بے وقوفانہ تھی۔ ان کے ہاتھوں میں خنجریں تھیں۔ وہ اس طرح اندھا دھند بڑے ہوئے نکلے تھے کہ ہم بھی فوری رد عمل پر مجبور ہو گئے۔ رت شاید وہ انجانے میں ہمارے سروں پر ہی آن پڑتے۔ میں نے اور زر تاج نے بیک وقت فائر کیا، وہ دونوں بھی ڈھیر ہو گئے۔

ہم نے تیزی سے پھر پوزیشن بدلی اور کمرے کے مزید ریب ہو گئے۔ وہیں باغبانی میں کام آنے والی بہت سی چیزیں مین پر پڑی تھیں۔ ہم نے ان کی آڑ لینے کی کوشش کی۔ میں اپنے نیچے ساتھ رکھنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی لیکن ہم انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں فاضل بھون اور گریزندے تھے جن کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مقابلہ دل چنچ سکتا تھا۔ ڈاکو تو اس بے دردی سے ایمونیشن ضائع کر رہے تھے گویا ان کے پاس ٹرکوں کے حساب سے موجود ہے۔

میں حکم کرے کے قریب جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ڈاکو کمرے کے اندر بھی موجود ہو۔ اس دوران ہم چند بورڈوں کے قریب پہنچ چکے تھے جن سے پوٹری تھی۔ شاید وہ تھوڑی بوریاں تھیں۔ میں نے انہیں درجہ بنانے کے ارادے سے ان کی آڑ میں ہونا چاہا تو پانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی ہو۔

میں اچھل کر ایک طرف ہٹا اور زمین کی طرف فائر کرتے کرتے رہ گیا۔ بورڈوں کی آڑ میں ایک شخص آواز چھا اٹھ رہا لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ یہ گماندہ ایک طرف کو پھیلا ہوا تھا اور میرا پاؤں اس میں پھنس گیا تھا۔

پھر مجھے اپنے پیروں تلے خون کی چھچھاہٹ محسوس دلی۔ اس دوران زر تاج بھی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے اندھیرے میں جھک کر اس کا جائزہ لیا اور بے اختیار اس کے ہاتھوں سے دبل دبلانی سسکی نکلی۔

کہا۔ ”گریڈ اب ہمارے بھی قریب آکر گرے ہیں۔ ایک آدھ گریڈ ذرا اور ادھر کو آن گرا تو اپنا کام تمام ہو جائے گا۔“

”ہاں۔“ اس نے بے آوازی ہی نہیں کے ساتھ کہا۔ ”ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں بھی باغ میں آن گم ہوں۔“

”واقعی۔ میرے ہونے نہ ہونے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن آپ کے احرام میں شاید وہ کچھ محتاط ہو جائے۔“

”لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ محتاط ہوں۔ یہ موقع ہی ہونے کا نہیں ہے۔ اگر انہیں یہاں میری موجودگی کا پتا ہو جائے اور وہ محتاط ہو جائیں تو ان کا اور ہمارا کام تمام سمجھو۔“ وہ بولی۔

”میں تو اب بھی کم از کم اپنا کام تمام ہی سمجھ رہا ہوں میں نے کہا۔“ اگر مجھے معلوم ہو تاکہ آپ کے گاؤں والوں کے حوصلے اتنے بلند ہیں اور وہ دفاع کے بجائے ڈاکوؤں کی کرمانے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے تو ہم بھی یہاں آ کے بجائے ان سے ملنے کی کوشش کرتے تاکہ انہیں یہ

ملا۔ اب انہیں بھی ہم سے کوئی خاص وعدہ نہیں مل رہی ہم دونوں برسرِ کار فریبوں کے درمیان پھنس گئے ہیں۔

”خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”ہمارے یہاں آنے کا فائدہ تو بہت ہوا ہے۔ ہم بہت بروقت پہنچے تھے۔ آتے ہی ہم نے راکٹ لانچر استعمال کرنے کا کوٹھکانے لگا دیا، یہی بہت اہم کام تھا۔ گاؤں والوں کے باغ سے دور رہتے ہوئے یہ کام کرنا بہت مشکل تھا اور

ڈاکو چند راکٹ فائر کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو گاؤں کی پیش قدمی کی بہت ہی نہ پڑتی۔ ان کے لیے اپنے گھر بچانا ہی مشکل ہو جاتا۔ نہ جانے کتنے لوگ مرتے اور مکان تباہ ہوتے۔ اس کے علاوہ ہم نے دو تین دن ڈاکوؤں کو بھی ہلاک کیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں گاؤں کا انتابا تھ تو بنا دیا ہے۔ یہ کیا کم ہے؟“

”رپورٹ تو بہت افزا ہے آپ کی۔“ میں نے بے ایکس گریڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں ذرا اس ایکشن چاہتا تھا۔“

”جتنا کچھ ڈاکوؤں کے ساتھ ہو چکا ہے میرے بہت امید افزا ہے۔ آوی تو انہی کے مارے جارہے سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ وہ منحوس جانور مارا جائے اس کا گردہ اس علاقے میں سب سے بڑا تھا۔ آج ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو اس علاقے سے ایک

”ایک ریٹائرڈ میجر۔“ زرتاج نے جواب دیا۔ ”میں نے گاؤں کو ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے رات کی چوکیداری کی جو اسکیم شروع کر رکھی تھی وہ اس کا انچارج ہے۔ آدمیوں کو ٹریننگ بھی اسی نے دی ہے۔ وہی ٹریننگ تو اس وقت کام

اب تک ان کا سکوت قائم تھا۔ ان کا بول اٹھنا ان کی بولکلاہٹ کی نشانی تھی۔ الفاظ پوری طرح تو میری سمجھ میں نہ آئے لیکن اندازہ ہو گیا کہ وہ راکٹ لانچر والوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک راکٹ کیوں فائر نہیں کیا تھا۔ جواب میں کسی نے چیخ کر نالیا اے یہ بتایا کہ ادھر

گڑبڑ ہو چکی تھی۔ یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں نے اندازاً آواز پر فائر کیا۔ ایک لمحے کے لیے ڈاکو کی طرف سے فائرنگ گویا بالکل ہی ختم ہو گئی۔ ان کا جانی نقصان

بڑھتا جا رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے ہائی کے کمرے کی سمت میں برست آیا۔ ہم سے کچھ دور ایک ٹوٹے ہوئے درخت کا تنہا تھا۔ میں نے اس میں بھی گولیاں بہت سے ہونے کی آواز

سنی۔ اس کے فوراً بعد مجھے دائیں طرف کافی دور سے بے در بے کئی دھماکے سنائی دیے پھر دیوار کا ایک حصہ نیچے آن گرا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے میری سمجھ میں آیا کہ باغ کا

دروازہ گریڈ مار کر توڑا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں کی فائرنگ کے باوجود محض اپنے دفاع کے لیے گھروں کی چھتوں تک محدود نہیں رہے تھے نہ جانے کس طرح وہ باغ کے قریب آتے جا رہے تھے۔ تاہم اگر وہ گیٹ کے راستے اندر

داخل ہونے کی کوشش کرتے تو یہ ان کی حماقت ہوتی کیونکہ نکلے اندھیرے میں وہ شکاف کسی حد تک نظر آ رہا تھا جو نکلنے کا گیٹ کرنے سے پیدا ہوا تھا۔ قیمت تھا کہ گیٹ نے آگ

نہیں پکڑی تھی۔ اگر وہ لوگ اس شکاف سے داخل ہونے کی کوشش کرتے تو ان کے پیوٹے ڈاکوؤں کی نظر میں آسکتے تھے۔

کسی نے گیٹ سے داخل ہونے کی کوشش نہیں کی لیکن فائرنگ کی آوازیں اس طرف سے بر حال آتی رہیں۔ ایک گریڈ اور ہائی کے کمرے سے ذرا ہی فاصلے پر آکر بچا۔ اس کے دھماکے سے تو کمرے کی دیوار سے کچھ مٹی جھڑک رہا ہے

اوپر گر کر۔ زرتاج خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”سلیم کی ٹریننگ کام آ رہی ہے۔ امید ہے ہمارے آدمی ڈاکوؤں کو باغ میں گھیر لیں گے اور انہیں ماریں گے۔“

”یہ سلیم کون ہے؟“ ”ایک ریٹائرڈ میجر۔“ زرتاج نے جواب دیا۔ ”میں نے

گاؤں کو ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے رات کی چوکیداری کی جو اسکیم شروع کر رکھی تھی وہ اس کا انچارج ہے۔ آدمیوں کو ٹریننگ بھی اسی نے دی ہے۔ وہی ٹریننگ تو اس وقت کام

آ رہی ہے۔ امید ہے ہمارے آدمی ڈاکوؤں کو باغ میں گھیر لیں گے اور انہیں ماریں گے۔“

”یہ سلیم کون ہے؟“ ”ایک ریٹائرڈ میجر۔“ زرتاج نے جواب دیا۔ ”میں نے

"آپ طاقت لوٹنے کی بات کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے آج کی رات یہ گروہ ختم ہو جائے گا۔" میں نے اعتقاد سے کہا۔ اس اعتقاد کی بنیاد کیا تھی؟ یہ فی الحال مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" وہ بولی۔  
میں نے ایک گریڈ کی بین نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "خس وقت میں گریڈ بھنگوں، میں اسی وقت آپ کو یہ گریڈ پوری قوت سے اس سمت میں پھینکنا ہے۔" میں نے اشارت ہے اسے سمجھایا۔

"لوگیا ہمیں ڈاکوؤں کو اپنی موجودگی کا پوری طرح یقین دلانا چاہیے؟" اس نے خیم سوالہ انداز میں کہا۔

"اچھا! ہماری موجودگی کا ختم تو ہو چکا ہے۔ وہ دوسری طرف اٹھتے ہوئے ہیں اس لیے ہماری طرف بھروسہ نہ کر رہے ہیں۔ اب ہمیں ان کو یہ تاثر دینا ہے کہ یہاں کئی افراد موجود ہیں۔ تاہم توڑ ان پر گریڈ پھینکنے ہیں، خواہ چند نیکو ہی ہوں، ہمارے پاس گریڈ ختم ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ بھی کرنی ہے۔ اس مورچے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے۔ اس طرح گاؤں سے جو لوگ باغ کو گھیرے میں لے رہے ہیں انہیں بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اندر ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود ہیں۔ دوسرے ڈاکوؤں پر دو طرف سے دباؤ پڑے گا۔ ہمیں کسی طرح ان کو ان درختوں کے درمیان سے نکالنا ہے۔ درخت ان کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ بن گئے ہیں۔"

وہ میرا منصوبہ سمجھ گئی۔ میری طرح اس نے بھی ایک وقت دونوں ہاتھوں میں اپنی ننگے ہوئے دو گریڈ سنبھال لیے۔  
راکتیں ہم نے زمین پر رکھ دی تھیں۔ میرے اشارہ کرنے سے پلک بولیں۔ "اگر جواباً انہوں نے بھی گریڈ استعمال کیے تو کیا ہوگا؟ ہم تو محدود دی جا۔ میں چاہتے ہوئے ہیں۔ یہ کمرابھی نوٹ کر ہم پر کر سکتا ہے۔"

"میں اتنی دیر سے یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے ان کے پاس گریڈ نہیں ہیں ورنہ وہ اب تک ضرور استعمال کرتے۔" ہمیں اندازہ ہو چکا ہے، گاؤں والے دیوار کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکو شاید راکٹ لانچر پر ہی تکیے کیے ہوئے تھے اور وہ ان کے لیے بیکار ہو گیا۔

زور تانے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے فائرنگ کی سزاؤں سے اندازے قائم کیے تھے کہ درختوں کے درمیان ڈاکو کس کسں موجود تھے۔ گریڈ پھینکنے کے لیے میں نے ایسی ہی چند جگہیں منتخب کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے زور تانے کو بھی اشاروں کے ساتھ انہی جگہوں کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ میرا مقصد یقیناً اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔  
ہم نے نہایت تیزی سے گئے بعد دیگرے چار گریڈ پھینکے اور ان کے دھماکوں کا ارتعاش ختم ہونے سے پہلے مختلف سمتوں میں چند راکٹ فائر کیے۔ درختوں کے درمیان مجھے کچھ الجھل کا احساس ہوا پھر ہماری طرف بھی فائرنگ ہونے لگی لیکن وہ نہایت معمولی تھی۔ پلے کرے کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کی کوئی خاص پروا نہ تھی۔

اچانک مجھے باغ کی دوسری دیوار کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ گاؤں والوں نے کیا ہوشیاری دکھائی تھی۔ انہوں نے ڈاکوؤں کی توجہ گیت کی طرف مبذول رکھی تھی لیکن درحقیقت کچھ لوگ باغی دیوار سے باغ میں آگے تھے۔ اب ڈاکوؤں پر ایک طرف سے ہم حملہ کر رہے تھے اور دوسری طرف سے گاؤں والے۔

ڈاکوؤں کے خوابوں کی تعبیر بالکل الٹی نکلی تھی۔ انہوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ وہ باغ میں مورچہ بند ہو کر پلے گاؤں پر فائرنگ کر کے اور راکٹ برسا کر لوگوں کو خوفزدہ کر کے گھروں میں دھنکے پر مجبور کر دیں گے۔ اس طرح وہ خود بھی جوانی سنہ سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے بعد وہ فلی کریں میں ٹھس کر تباہی پھیلا دیں گے، مکانوں کو آگ لگا دیں گے۔ جو سات آگے کا آت باک کریں گے اور جو ہاتھ لگے گا وہ لوٹ لیں گے۔ ان حالات میں ڈاکو عموماً اسی طرح تباہی پھیلاتے تھے۔ خصوصاً جس گاؤں میں وہ جذبہ انتقام کے ساتھ داخل ہوتے تھے وہاں وہ چیلنجی اور آتاری دور کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے گاؤں میں گھسنے کی ٹوٹ نہیں آتی تھی۔ وہ خود مصیبت میں گھر گئے تھے۔ یہ وقت وقت کی بات تھی۔

اُدھر ہم نے اپنی حکمت عملی کے مطابق اپنا اسلحہ استعمال کیا اور دھماکے کی پری دیوار کی طرف سے بھی دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مزید چند گریڈ استعمال ہوئے حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ باغ میں آگ نہ لگ جائے زیادہ ہوشیار اور نرمی کے باعث ابھی تک باغ میں آگ لگی تو نہیں تھی لیکن کئی بار ایسے آثار دکھائی ضرور دیے تھے۔

جلدی ہی ڈاکوؤں نے اس احساس کو بھی شاید خیابانہ کہہ دیا کہ درختوں کے درمیان وہ زیادہ محفوظ تھے۔ میں نے چند بدلوں کو درختوں سے اُگل کر روکنے کی سی حالت میں باغ کی عقبی دیوار کی طرف دوڑتے دیکھا۔ میری نظر اتفاقاً تباہی اس طرف چلی گئی تھی ورنہ میں اس وقت دوسری طرف متوجہ تھا۔ زمانہ اس وقت گزرے کہ دوسرے گوشے پر بھی۔  
میں لڑچک کر اس کے قریب پہنچا اور اسے



بوزیشن تبدیل کرنا تھی۔ تاہم ڈاکوؤں کی طرف سے تب کوئی کوئی نہ چلی۔

اس وقت تک زرتاج بھی ایک سے تاراج نکال چکا تھی۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "میرا خیال ہے میں بھی اپنے لوگوں کو یہاں اپنی موجودگی کا سہارا دے ہی دوں۔ اسیں آگاہ قدم اٹھانے میں آسانی رہے گی۔" (ابھی چند لمحوں اور ٹھہر جائیو۔) میں نے مشورہ دیا۔

وہ چند لمحوں کے بعد ایک عجیب قسم کے تناؤ میں گزر رہے تھے۔ دونوں دیوار کے ساتھ چلے نہایت آہستگی سے۔ گردن کھٹکھٹا ہوئے جہاں تک نظر جاتا تھی کسی متحرک ہوسلے کو علامت کر سکتی کی کو شش کر رہے تھے لیکن کبھی کوئی چیز حرکت کر دکھائی نہ دی۔ اتنے زبردست ہنگامے اور ٹھن کر جانے کے ایک دم ہی ہر طرف موت کا سکوت پھیل گیا تھا۔ فضا خون اور بارود کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

بالآخر زرتاج نے ایک لمحوں کے لیے تاراج و دشمن کی فوراً ہی بھاگ کر کمرے کی آڑ میں ہو گیا۔ درختوں کے درمیان جب بھی سکوت ہی رہا۔ کوئی روئش ظاہر نہ ہوا۔

"میرا خیال ہے معرکہ ختم ہو چکا ہے۔ ڈاکوؤں کا وہ ہو گیا ہے۔" زرتاج سرگوشی میں بولی۔

"لگتا سی ہے۔" میں نے تاکید کی۔ "تاراج نے ایک پھر رو شنی کا مسئلہ دیا۔ اس بار بارش کے ایک حصے سے رو ہی کے مسئلہ کی صورت میں جواب ملا۔ شاید چند لمحوں انتظار کے بعد ان لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور کسی نے پوچھا۔ "ادھر کون ہے۔"

"میں ذرا تاراج سے اندر تاراج نے چیخ کر دیا۔

دوسری طرف رہی پسا سا سکوت چھا گیا۔ ان لوگوں شاید اپنے کانوں پر ٹپٹپٹ نہیں آیا تھا کہ اس معرکہ دوران زرتاج بارش میں ٹھنک آئی تھی۔ انہوں نے مزید لمحوں انتظار کیا۔ بالآخر وہ جن گوشوں میں زمین یا دیوار چپکے ہوئے تھے وہاں سے نکلے گئے۔ میں نے ایک طرف چند بیولوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

ان میں سے ایک نے احتیاطاً اندھیرے میں آگائی۔ "گولی مت چلائے گا۔"

پھر دیر سے دھیرے دھیرے آدھر آدھر تے اندھیرے کی آواز سے بہت سے لوگ نکل آئے۔ ان کے پاس مختلف تھیں۔ انہوں نے تاراجیں و دشمن کیں اور کمرے کے میں ہم دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میری تو انہیں خاص ہوا انہیں بھی لیکن زرتاج کو بہ خیر و عافیت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔

کی طرف متوجہ کیا جدھر بندوق بردار ہوئے تیزی سے دیوار پر چڑھنے لگے تھے۔ ہم ان سب کو گولیوں کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں دیوار کے آس پاس اندھیرے میں جہاں کہیں خفیہ سی حرکت کا بھی شبہ ہوا وہاں ہم نے گولیاں برسائیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جتنے ڈاکوؤں نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی وہ سب کے سب مارے گئے تھے۔

ہم جس دیوار کی طرف تھے وہاں سے نہیں گھٹ اور حق دیوار کا بیشتر حصہ سرمنی آسمان کے پس منظر میں کسی نہ کسی حد تک دکھائی دے رہا تھا۔ اگر بائیں کی دوسری دیوار یا کسی اور راستے سے گاؤں کے کچھ لوگ باغ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے تو باقی حصوں پر ان کی نظر وہ سکتی تھی۔ اس طرح ڈاکوؤں میں سے اگر کچھ باقی بچ گئے تھے تو باغ ان کے لیے محفوظ سوراخ کے بجائے چوہے دان بن چکا تھا۔ گاؤں والوں کی اور ہماری جرات ہمارے کام آگئی تھی۔ اگر سب لوگ سم کر گھروں میں دیک جاتے تو اس وقت ان کی وہی حالت ہوتی جو ڈاکوؤں کی تھی۔

ایک دم باغ کے دوسری طرف سے بھی فائرنگ بند ہو گئی۔ باغ میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں موت کی سرگوشیاں رچی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں نے قابلا ڈاکوؤں کے دھمکیل کا جائزہ لینے کے لیے اچانک فائرنگ بند کر دی تھی۔ شاید وہ بھی جانتے کی کوشش کر رہے تھے کہ باغ میں چند ڈاکو باقی ہیں یا سب کا ہی سفایا ہو چکا ہے۔ انہیں یہ اندازہ تو یقیناً ہو گیا تھا کہ باغ میں دوسری طرف ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود تھے جن کی وجہ سے ان کا کام آسان ہو گیا تھا۔

سکوت کئی لمحوں پر پھیل گیا۔ درختوں کے درمیان سے کوئی فائر نہ ہوا۔ ابھی نہیں سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ڈاکو بھی کوئی چال چل رہے تھے یا واقعی کوئی ڈاکو زندہ نہیں بچا تھا۔ ادھر گاؤں والوں نے سکوت سے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ صبح تک انتظار کرنے پر کمر بستہ تھے صبح کا اجلا سونے پر یہ مقابلہ واضح صورت اختیار کر سکتا تھا۔ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے سوریوں کا صحیح اندازہ ہو سکتا تھا لیکن دن کی روشنی میں گاؤں والوں کا جانی نقصان بڑھ بھی سکتا تھا۔

آخر کار گاؤں والوں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے بہت دور باغ کے ایک گوشے میں دو تین تاراجیں روشن ہوتے دیکھیں۔ وہ یقیناً طاقتور تاراجیں تھیں۔ میں نے ان کی روشنی درختوں کے درمیان بھی دور تک پہنچتے دیکھی لیکن تاراجیں صرف ایک لمحے کے لیے روشن ہوئی تھیں۔ روشن کرنے والوں نے یقیناً انہیں بھاگ کر فوراً ہی

بڑی عمر کا ایک قد آور اور صحت مند شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی رئیسائی جی؟ ہم لوگ جو موجود تھے خادموں کے ہوتے ہوئے مالکوں کو بد وقت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”صرف خادم ہی مالکوں کے محافظ نہیں ہوتے، مالک بھی خادموں کے محافظ ہوتے ہیں۔ جب تک دونوں میں شانہ بہ شانہ لڑنے کی اہلیت نہ ہو، دونوں ہی خطرے میں رہتے ہیں۔“ ذرا تاج نے جواب دیا۔ ”وہیے بھی اگر میں یہاں نہ آئی تب بھی خطرہ تو میرے گھر ہی پہنچ چکا تھا۔ تم لوگوں کو تو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ جانو ہمارے ایک غدار ملازم کی مدد سے تمام محافظوں کو بے ہوش کر کے حویلی میں آن گھسا تھا۔ اس نے تو مجھے پریشان بنایا تھا۔“

پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”اگر یہ صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو شاید آج کے معرکے کا نتیجہ بد مختلف ہوتا۔“

ان میں سے بیشتر نے حیرت سے میری طرف اور پھر رئیسائی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کھوڑے سدا جانے والے کی حیثیت سے جانتے تھے انہیں شاید اس بات پر حیرت تھی کہ ذرا تاج میرے لیے ”صاحب“ کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ ذرا تاج بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”جتنی بھی ٹارچیں تم لوگوں کے پاس ہیں وہ سب روشن کر کے فلیوں میں پورے باغ میں پھیل جاؤ اور جائزہ لو کہ کیا صورت حال ہے۔ محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ سب ڈاکو گتے کی موت مارے جا چکے ہیں۔ پولیس وغیرہ کے حصے کا کام ہم لوگوں نے انجام دے دیا ہے۔“

”ان علاقوں میں اگر دو چار جگہ بھی ڈاکوؤں کو اس قسم کے معمول کا سامنا کرنا پڑ جائے تو مجھے امید ہے کہ ان کا زور ٹوٹ جائے۔“ ان میں سے ایک شخص بولا۔

بڑی عمر کا قد آور اور صحت مند شخص جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ریٹائرڈ میجر سلیم تھا، ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”ایسا ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر گاؤں ذرا تاج نگر نہیں ہوتا۔“

ہم سب لوگ ٹارچیں لے کر فلیوں کی صورت میں باغ میں بکھر گئے باغ میں واقعی میدان کا رزار کا سا سماں تھا۔ چند کرینڈز نے کافی تباہی پھیلانی تھی۔ میں ڈاکوؤں کی تعداد دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بست سے ڈاکو ہم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے بعض لاشوں کے چہرے سب سے ہو گئے تھے اور بعض کے اعضا الگ ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس پیمانے پر ڈاکوؤں کی ہلاکت

میں ہماری حکمتِ عملی کے علاوہ کسی نجی امداد کو بھی دخل تھا۔

”محفوظ مقامات پر تو یہ لوگ بھی تھے۔“ ذر تاج ارد گرد بکھری ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔  
”انہیں دہشت گردی کا ججزہ بھی زیادہ تھا اس کے باوجود قدرت نے ہماری مدد کی۔“

”اسی امید کے سارے تو میں آپ کو مزید قدم بڑھانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اوپر والا زیادتی سینے والوں کے ساتھ ہوتا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں بھی قدرت ہماری مدد کرے گی۔ ان لوگوں کو جتنی ڈھیل ملنا چھی مل چکی۔ کچھ لوگوں کے لیے یومِ حساب ذرا دیر سے آتا ہے مگر آتا ضرور ہے۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے تو شبِ حساب آتی ہے۔“

اس دوران گویا پورا گاؤں باغ کی طرف اُلٹ آیا تھا۔ کمدار وغیرہ بھی آچکے تھے۔ لوگ مختلف ہتھیار، لاطینس، ٹارچیں، کلکٹایاں، ڈنڈے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے ہوئے تھے مگر اب ان کا سامنا کرنے کے لیے لاشوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

ذر تاج نے کمدار اور دوسرے دو تین لوگوں کو تمام صورت حال سمجھا کر مختلف کام ان کے ذمے لگائے۔ بیجر سلیم کو بھی اس نے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے خیال میں وہاں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ البتہ جن لوگوں نے باغ میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کے خلاف کمانڈو ایکشن کی طرز پر کارروائی کی تھی ان میں سے دس افراد کو ذر تاج نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتخب کر لیا۔ ہم نے تیزی سے کچھ تیار کیا۔ گیس اور دو گاڑیوں میں روانہ ہو گئے۔

میں ذر تاج اور تین دوسرے افراد بھید میں تھے۔ باقی لوگ ایک چھوٹے ٹرک جیسی پک اپ میں تھے۔ گاڑی ذر تاج ڈرائیو کر رہی تھی اور میں اپنی یادداشت کے سہارے اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ آسمان پر لاکڑ کا تاروں کی موجودگی کی وجہ سے اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا جتنا عموماً دیرانوں میں ہوتا ہے۔

میں صرف ایک بار گولڈ ٹی کلب تک گیا تھا لیکن یادداشت نے میرا ساتھ دیا اور آثار بتائے گئے کہ میں صحیح سمت میں جا رہا تھا۔ جنگل بایان میں کوئی ایسی خاص چیز تو موجود نہیں تھی جن کی نشانیاں مقرر کی جاسکتیں پھر بھی میں درختوں اور ٹیلوں وغیرہ کو دیکھ کر ایک غیر واضح سی مانوسیت کے سہارے ذر تاج کی رہنمائی کرتا جا رہا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ ذر تاج کو خیابا نہیں تھا کہ اس کے مرحوم باپ کی وہ زمین کس طرف ہو کر گئی تھی۔

جب مجھے احساس ہوا کہ ہم مطلوبہ مقام کے بہت

اپنے اس ”سروے“ کے دوران بھی ہم ذرا محتاط ہی رہے۔ اندیشہ تھا کہ کوئی ڈاکو زندہ نہ ہو اور ہمیں چھپا ہوا نہ ہو۔ ہم پر اچانک ہی گولیوں کی بوچھاڑ بھی ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہوئی۔ ڈاکوؤں کا قطعی غیر متوقع طور پر مقلایا ہو گیا تھا۔

لاٹینس جہاں جہاں تھیں اور جس حالت میں تھیں ہم نے انہیں اسی طرح وہیں رہنے دیا۔ بالآخر ایک جگہ رکتے ہوئے میں نے ذر تاج سے کہا۔ ”آج کی رات ہمارے لیے بہت مبارک رہی ہے۔ ہمارے دو تین آدمی کامِ ضرور آئے ہیں لیکن اس قربانی کے بعد ایک بہت بڑے فتنے کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا لیکن میرے خیال میں ابھی کچھ کام باقی ہے۔ اس وقت ہمارا لہو گرم ہے اور ہمارے سر پر خون سوار ہے۔ گئے ہمارے وہ کام بھی نمٹا لیا جائے تو آپ کے حق میں بہت اچھا ہو گا۔“

”کیا مطلب؟“ ذر تاج چونکتے ہوئے بولی۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان لوگوں نے ایک ویرانے میں زیرِ زمین ”گولڈ ٹی کلب“ بنایا ہوا ہے جہاں خاصی شرمناک اور خاصی خطرناک سرگرمیاں جاری ہیں۔ اگر کبھی وہ کلب کسی کی گرفت میں آتا تو اس کی مالک آپ ظاہر ہوں گی۔ ویسے بھی وہ جہاں واقع ہے وہ زمین کبھی آپ کے والد کی ہی ملکیت ہو کر گئی تھی۔“

”ہالہ۔“ وہ پُر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔  
”یہ بات تو فی الحال اس ہنگامہ اجل میں میرے ذہن سے نکلی ہوئی تھی۔“

”یہاں اگر خوش قسمتی سے دن چڑھے تک پولیس پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو اس سے نکلنے اور تمام حالات بتانے کا کام آپ کمدار وغیرہ کے سپرد کر دیں۔ ہم یہاں سے آٹھ دس منتخب آدمیوں کو لے کر چلتے ہیں اور ”گولڈ ٹی کلب“ والا قبضہ بھی نمٹا آتے ہیں ورنہ گل کھل کھل کدہ بھی آپ کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ وہ نیم رضامندی سے بولی۔

”آج ہماری خوش قسمتی سے جانو اور اس کے گردہ کے بیشتر آدمیوں کا خاتمہ ہو گیا ہے تو اس کی باقیات کا بھی خاتمہ ہو جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ہم رات کی تاریکی میں ہی وہاں پہنچ جائیں تو شاید ان سے نکلنے میں آسانی رہے کیونکہ وہ محفوظ جگہ میں ہوں گے اور ہمیں کھلے میدان سے دھتکا ہو گا۔ ہمارے لیے خطرات زیادہ ہوں

مستطیل شکاف تک پہنچے جس کی گہرائی میں فولادی دروازہ موجود تھا۔ اس وقت وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔ تاہم میں نے بائچ افراد کو اس شکاف کے گرد گھڑا کیا۔ زرتاج میں اور باقی افراد کے بعد دیکرے شکاف میں اترے۔

میں جب پچھلی مرتبہ تھیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میں نے ایک خاص انداز میں لیور کے ذریعے محافظ کو یہ دروازہ کھولتے دیکھا تھا۔ اسی طریقے سے میں نے بھی وہ فولادی دروازہ کھول لیا۔ اس میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔

اس سے آگے ایک اور بھاری بھر کم مضبوط چوٹی دروازہ ہمارا منتظر تھا۔ یہ دروازہ اس طلائی چابی سے کھلتا تھا جو مجھوں کے پاس ہوتی تھی۔ میں نے ایسے ہی کسی یونٹ کے لیے وہ چابی خاص طور پر اپنے پاس محفوظ رکھی تھی جو تھیسو خان کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی جیب سے نکالی تھی۔ اس چابی سے دروازہ کھول کر دبے قدموں مزید چند میٹر چلایا اور کریم بنے پہنچے۔

تمہ خانے میں گہری تاریکی تھی۔ ہم سب چند لمحوں اپنی کلاشکوفوں اور رائفلوں کے رخ مختلف سمتوں میں کیے، دم سادھے کھڑے رہے لیکن کلب میں بدستور گہرا سکوت چھایا رہا۔ بالآخر ہم نے تاریکیوں میں روشنی کر لیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

زرتاج حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے واقعی یہ ایک دنیائے حیرت تھی۔ اسے شاید ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اس دیرانے میں زیر زمین ایک باقاعدہ کلب موجود تھا۔ تاریکیوں کی روشنی میں ہم سب کلب کا جائزہ لے رہے تھے۔

اچانک کہیں کھٹک سا ہوا۔ ہم نے فوراً تاریکیوں، بجھا دیں اور سینے کے بل فرش پر لیٹ گئے۔ دوسرے ہی لمحے رات کے سکوت میں دو دروازوں میں خفیف سا ارتعاش محسوس ہوا۔ کہیں دور شاید کوئی مشین اسٹارٹ ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہال میں تیز دھن دھن پھیل گئی۔ ہمارے سینے کے بل فرش پر لیٹے ہوئے ایک دم ہی کچھ مضحکہ خیز سا محسوس ہونے لگا۔ ہماری آنکھوں کی پائلیں اوپر اُدھر محسوس رہی تھیں لیکن ہمارے سامنے کوئی نہیں تھا جسے ہم نشانہ بناتے۔

پھر بلندی پر کہیں ایک آہستہ سا تھپہ سنائی دیا۔ آواز نسوانی تھی۔ اس ہال کے تین اطراف میں بلندی پر سیڑیاں کی گہلی کی طرح گرے ہی کرے بنے ہوئے تھے۔ آواز انہی میں سے ایک کرے سے ابھری تھی۔ ہم سب کی آنکھیں کاملاً اسی طرف ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے ہلکے ہوئے پیچھے راہداری میں کھنکے کی کوشش کی لیکن ہم سب ایک ہی جگہ

قریب پہنچ گئے جس تو میں نے دونوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن کر دیں۔ کلب کے گرد میں نے ایک چھوٹا سا جنگل دیکھا تھا۔ قلعے اندھیرے میں مجھے اس کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ انجن کی خفیف سی آواز ان مسلح محافظوں تک نہ پہنچ جائے جو درختوں کے درمیان گھٹ کرتے رہتے تھے۔

میری ہدایت پر گاڑیاں وہیں چھوڑ دی گئیں اور ہم خاصے بڑے دائرے میں بکھر کر پیدل آگے بڑھے۔ اس وقت تک صبح کلاب کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ درختوں کے عقب میں موجود لوگ ہمارے پیچھے دیکھ سکتے ہیں لیکن خطرہ سولے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ہم سینے کے بل رنگ کرنا فاصلہ طے نہیں کر سکتے تھے۔ فضا کا سکوت کسی بھی لمحے گولیوں کی تڑتارہٹ سے مرتعش ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ وقت اور جگہ ایسی تھی کہ وہاں گہرا سکوت ہی ہونا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ سکوت شب کی چادر کچھ زیادہ ہی دبیز تھی۔ یہ سکوت غیر معمولی تھا۔

درختوں کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے سوچا کہیں وہ لوگ گھات لگانے انتظار نہ کر رہے ہوں کہ ہم بالکل ہی قریب پہنچ جائیں تب وہ ہمیں گولیوں سے بھون ڈالیں۔ میں نے سب کو اشارہ کیا اور ہم سینے کے بل لیٹ کر اپنی اپنی گتیں سنہالے بیٹھ گئے۔

ہم نے بلاوجہ یہ مشقت اٹھائی۔ ہم درختوں کے دائرے میں داخل ہونے والے راستے سے بہ تیز عافیت اندر پہنچ گئے، ایک بھی گولی نہ چلی لیکن اس سے ہم نے فکر اور ہراسمکن ہونے کے بجائے مزید مضطرب ہو گئے۔ بالآخر میرا اشارہ پا کر ایک ایک کر کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور رکوع کی اسی حالت میں ہم لوگ اس مختصر سے جنگل کے وسط میں واقع کھنڈر کی طرف بڑھے۔

چند لمحوں بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم خواہ مخواہ ہی اس احتیاط پسندی میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں تو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اگر درختوں میں بھی کچھ لوگ چھپے ہوتے تو اب تک وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہمارے کھنڈر تک پہنچنے کے دوران درختوں میں چھپا ہوا کوئی ایک شخص بھی کاشکوف وغیرہ سے نہایت آسانی سے ہمارا خاتمہ کر سکتا تھا لیکن ابھی تک کوئی غائب نہیں ہوا تھا۔ بلکہ سکوت گویا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔

تاہم میرے اشارے پر سب لوگوں نے اپنا مختار انداز برقرار رکھا۔ ہم چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھے اور کھنڈر کی دیواروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے لمبے پرچہ کر اس

تھا۔

میرے ساتھ آئے ہوئے افراد میں سے دو آدمی اچانک اٹھے اور میرے بازو آج کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی دوڑنے ہوئے میڑھیوں تک پہنچے اور تین تین میڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے نہایت تیزی سے اوپر جا پہنچے چند سیکنڈ بعد وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قابو میں کیے کالی بے دروازے سے کھینچتے ہوئے نیچے لے آئے۔ اس دوران کسی اور کمرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ ان پر کسی نے فائر نہیں کیا۔ میری جلا میں جان آئی۔ مجھے خود سے زیادہ ان کی فکر لاحق ہو گئی کہ کیونکہ وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دوڑ رہے تھے۔ نوری عرف نورین کو کہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی کیونکہ وہ لوگ اسے تقریباً کھینچتے ہوئے ہی لائے تھے۔ اس کے پیروں سے جوتیاں اتر گئی تھیں۔ دروازے کے آدمیوں نے اس کے بازو بھی موڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر تعقیف کے آثار تھا۔ اس وقت تک ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ کلب میں اس وقت اس عورت کے سوا کوئی نہیں تھا۔

”اسے چھوڑ دو۔“ میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔  
 دروازے کے آدمیوں نے میرے حکم کی تعمیل کی۔  
 نوری عرف نورین بہ مشکل سیدھی کھڑی ہو کر اپنے بازوؤں کو کھینکے دیتے ہوئے انتہائی سی مسکراہٹ لے کر ساتھ بولی۔ ”معلوم نہیں ہم جیسے لوگوں کو نیکی کا صلہ بھی کیوں دیا جاتا ہے۔“

معلوم نہیں کیوں مجھے اس کے اس طرح بے رحمانہ انداز میں کھینچ کر لائے جانے پر افسوس ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر عذرت خواہانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل ہمارے آدمیوں سے صرف کھبراہٹ میں یہ حرکت مرزد ہوئی ہے۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔“

اس نے گویا تدریسے چونک کر میری طرف دیکھا اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ ”تم تو وہی ہو جسے اس شام خمیسو خان نے میری میز پر لا کر بٹھایا تھا۔“

اس سے آگے وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔۔۔ ہاں میں وہی ہوں۔“

”مجھے اس وقت ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔ اور اب تم نے مجھ سے عذرت چاہی ہے۔ یہ بھی تمہاری شرافت کی دلیل ہے۔“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن مجھے خوشی ہے

اس میں میں تمہیں ملے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ اگر اس وقت بلندی پر کوئی خود کسی محفوظ جہزیں آڑ میں رہتے ہوئے ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تو آسانی سے بنا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میری دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ ہائی لوگوں کا نہ جانے کیا حال تھا۔

کلب کی دیرانی کا ایک جواز میری سمجھ میں آیا تھا۔ جس کے بعد میں مطمئن ہو چکا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کلب کو چلانے والے تمام لوگ بھی حقیقت میں چونکے ڈاکو ہی تھے اس لیے آج دروازے کے رکن پر حملے میں شامل ہونے کے لیے گئے ہوئے تھے کیونکہ یہ ان کا ایک بہت ہی خاص مشن تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس میں حصہ لینے کے لیے گروہ کا ہر رکن پہنچا ہو گا۔ دروازے کے رکن میں جتنے ڈاکو مارے گئے تھے شاید اس میں ’گولڈ کی کلب‘ کو چلانے والے تمام ڈاکو بھی شامل تھے۔

اب میرا یہ خیال لفظ ثابت ہوتا نظر آرہا تھا۔ شاید یہاں کچھ لوگ موجود تھے اور ہم غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایک قسم کے ٹرپ میں آن پھنسے تھے۔ بلندی پر ایک کمرے کا دروازہ کھینکے سے کھلا اور ایک عورت بالکونی کے ڈنگل پر آن کھڑی ہوئی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سر دست یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں نے کوئی مشین سی اشارت ہونے کی جو دھیمی آواز سنئی تھی وہ جزیرہ کی تھی۔ جزیرہ غالباً اسی عورت نے اشارت کیا تھا۔

وہ بڑی بے خوفی سے ڈنگل پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ ہمیں اونڈھا لیتے اور ہمیں اونچی کیے دیکھ کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک بار پھر بلند آہنگ تھمہ لگایا۔ اس کا انداز اب بھی کچھ بڑبائی اور کچھ آہستہ تھا۔ شاید اسے ہماری حالت بہت مضحکہ خیز لگی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

جب وہ ذرا سیدھی ہوئی اور اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تو مجھے اس کی صورت شناسائی کی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ جب میں خمیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے اس عورت کی میز پر بٹھایا تھا اور یہ صدا اصرار عیاشی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس عورت کا نام بھی نوری ہوا کرتا تھا لیکن اس نے کالی عرصہ شہر میں گزارا تھا جہاں وہ نوری سے نورین ہو گئی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس وقت وہ نشے میں تھی۔

وہ جس کمرے سے برآمد ہوئی تھی اس میں اور کسی کی موجودگی تو ظاہر نہیں ہو رہی تھی لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ لا، کمرہ کے بند دروازوں کے پیچھے کیا تھا یا کون چھپا ہوا

”میں ابھی منگوا دیتا ہوں۔“ میں نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ چہرے پر قدرے ناگواری کے آثار لے کر اُپر چلا گیا۔ شاید وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم ایک قیامت خیز ہنگامے سے گزر کر آرہے ہیں یہاں بھی ایسی نہ جانے کیا حالات پیش آنے والے تھے اور مجھے دشمن کے اڈے پر موجود ایک مشکوک قسم کی عورت کی سرکٹ کی فرمائش پوری کرنے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے احساس تھا کہ زرنج بھی عجیب سی نظیروں سے کبھی میری طرف اور کبھی نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے طاقت سے نورین سے پوچھا۔ ”تم یہاں اکیلی ہو؟“

”ہاں۔ کاش تم بھی اکیلے آئے ہوئے!“ وہ آنکھ مارستے ہوئے مسکرائی۔ مجھے کسی نیک پرہیزگار قسم کی لڑکی کی طرح اپنے کانوں کی لوہیں جتنی محسوس ہوئیں۔ میں نے کھسپانے سے انداز میں زرنج کی طرف دیکھا۔ وہ ایک تک نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسی لمحے نورین بھی زرنج کی طرف متوجہ ہوئی اور سر تاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ”یہ نیگم صاحبہ کون ہیں؟“

حالانکہ اس وقت ہم خامسے بُرے حال میں تھے سر

کہ تم میرے ہاتھوں مرنے سے بچ گئے۔ تم سب کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے ایک اشارے پر تم سب کے ہاتھ اڑ سکتے تھے۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو ہاتھ ہلانے سے باز رکھا۔ اس کا صلہ مجھے یہ ملا۔“ اس نے ایک بار پھر اپنے بازوؤں کو جھٹکا دیا جنہیں کافی بری طرح سوزا گیا تھا۔

میں نے اس کا مطلب پوری طرح سمجھے بغیر کہا۔ ”میں ایک بار پھر ان لوگوں کی طرف سے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تم خود ہی کہہ چکی ہو کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ امید ہے کہ تم ایک شریف آدمی کی معذرت قبول کر لو گی۔“

اس نے ایک بار پھر بغور میری طرف دیکھا۔ اس کی موتی موتی آنکھوں میں سرخ زور سے تیر رہے تھے۔ اچانک وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”سرکٹ ہو گی تمہارے پاس؟“

”نہیں۔“ میں نے طاقت سے کہا۔ ”میں اتنا شریف آدمی ہوں کہ سرکٹ بھی نہیں بیچتا۔ ویسے بھی تمہارا سادہ سرکٹ سے کیا بھلا ہوتا تھا۔ تم تو کچھ اور طرح کی سرکٹ بیچنے کی عادی ہو۔“

”اس وقت تو کسی بھی قسم کی سرکٹ کی طلب ہو رہی ہے۔ میرا پیکٹ اوپر رہ گیا ہے۔“ وہ مڑ کر کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

## اسلم راہی ایم اے کے ولولہ انگیز تاریخی ناول

|       |                 |        |                             |
|-------|-----------------|--------|-----------------------------|
| ۳۰۰/- | سراہوں کے صحرا  | ۱۵۰/-  | سائبیریا کا طوفان           |
| ۳۰۰/- | رقص درویش       | ۱۵۰/-  | آتش و آہن                   |
| ۲۵۰/- | دشت کے بھڑیئے   | ۱۵۰/-  | ظلمات                       |
| ۳۰۰/- | غرناطہ کا چوپان | ۵۰۰/-  | سراج منیر (اول دوم)         |
| ۲۵۰/- | شیر شاہ سوری    | ۲۵۰/-  | طارق بن زیاد                |
| ۲۵۰/- | مذہب کا سورما   | ۱۷۵/-  | مقدس دیوداسی                |
|       |                 | ۱۹۵۰/- | ایلیکا (سات جلدیں مکمل سیٹ) |

مکتبہ القریش ۵ اردو بازار لاہور فون: ۷۲۲۶۶۵

ساتھوں میں سے ایک کا شکوفہ بڑا اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں ذرا تاج اور دوسرے لوگوں کو لے کر آگے بڑھا۔ پورے زیر زمین کلب میں بقیں روشن ہو چکی تھیں۔ میں انہیں کلب کا ہر گوشہ دکھانے لگا۔ اس وقت کو کہ وہاں وہ رونق میل نہیں تھا جسے دیکھ کر شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ آج اس کے باوجود ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی جا رہی تھیں۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس دیرانے میں زیر زمین ایسی بھی کوئی عمارت موجود تھی جس میں عیاشی کے تمام لوازمات سجے ہوئے تھے شراب کا ذخیرہ دیکھ کر ہی ذرا تاج کی رنگت متغیر ہو گئی۔

پھر اس کا ذہن شاید دوبارہ نورین کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لمحے میں بولی۔ ”یہ عورت کون ہے؟“ ”اسی ان گنت باغیچہ عورتوں میں سے ایک۔ جو ستاروں پر کندھ لائے نکلتی ہیں اور دلدلوں میں جا گرتی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔“

”ہاں۔۔۔ اندازہ تو ہو گیا ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کچھ عورتیں تو خود بخود جھٹکتی ہیں ان منزلوں پر پہنچی ہوں گی لیکن اس گروہ نے ایسے چکر بھی چلائے ہوئے تھے کہ مجبوراً بے سارا یا ضرورت مند عورتوں کو بھی گھیر گھا کر ان راستوں پر لایا جاتا تھا اور جو کسی نہ کسی طرح ان کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں، ان کا حشر تو آپ سوچ ہی سکتی ہیں کیا ہوا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ذرا تاج نے مسافانہ سے انداز میں سر ہلایا۔

بلندی پر جو کمرے واقع تھے وہ کسی معقول ہوٹل کے کمروں کی طرز پر آراستہ تھے۔ میں ذرا تاج کو ان کمروں میں بھی لے گیا جہاں میں نے اسٹیم کی پیٹیاں دیکھی تھیں۔ پیٹیاں اب بھی وہاں موجود تھیں لیکن خالی تھیں۔ ہم نے بہت تیزی سے سب جگہوں کی تلاش کی لیکن ہمیں وہاں کوئی فائل یا کاغذات وغیرہ نہیں ملے۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت اس جگہ کو بالکل خالی کر دیا گیا تھا۔

ہم واپس آئے تو نورین اسی میز پر بیٹھی غور انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بولی۔ ”یہاں سے بہت سی چیزیں جانو نے منگوالی تھیں۔ اگر تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش تھی تو تمہیں مایوسی ہو گی۔“

”تمہیں۔۔۔ ہم تو یہی ہی ذرا اس جگہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ جانو کی کاوشوں کی داد دے رہے تھے۔ زندگی میں اتنی محنت کرنے والے اور ایسے ایسے ”شاندار“ پروڈیوسر تخلیق کرنے والے لوگ روز روز تھوڑا سا پیدا ہوتے ہیں۔“ میں نے دھتھے لمحے میں کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ ”تم ہمیں کیا بتانے اور دکھانے والی تھیں؟“

سے پاؤں تک پہنے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی ذرا تاج کی شخصیت سے ایک شان جھلک رہی تھی۔ شاید اسی لیے نورین نے اس کے لیے ”ہیکم صاحب“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

”تم اسے چھو دو۔۔۔“ میں نے ملامت سے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہارے ایک اشارے پر ہمارے پرچے کیسے اڑ سکتے تھے؟“

”یہ جاننے کے لیے تمہیں میرے ساتھ اس کلب سے باہر کچھ دور چلنا پڑے گا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ اس دوران ہمارا آدمی اوپر کے کمرے سے اس کی مخصوص سنگینوں کا پیکٹ اور لائسنس لے آیا تھا۔ اس نے سرعش انگلیوں سے ایک سنگین سٹاک کر گرائش لیا۔ اس کے چہرے پر کچھ طمانیت سی پھیل گئی۔ اس نے مضمون کا ایک کیٹیف خرغولا ہوا میں پھوڑا تو ذرا تاج ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تاہم اس نے اپنے چہرے سے ناگواری ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں نے ہیروئن کے نشے کے عادی توئی افراد دیکھے تھے جن کا نشہ ٹوٹنے لگتا تھا تو ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی لیکن نورین اس لحاظ سے کچھ عجیب نشے باز تھی کہ اسے جس کا نشہ بھی کچھ اسی شدت سے ستانا تھا اور معلوم ہی ہوتا تھا کہ وہ تقریباً ہر وقت ہی نشے میں رہنا چاہتی ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ ”ہم تمہارے ساتھ چلیں گے اس سے پہلے ہم ذرا یہاں کا جائزہ لے لیں۔“

”یہاں اب جائزہ لینے کو کیا رکھا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”کیا مطلب۔۔۔؟ کیا اب یہاں کوئی خاص قابل ذکر چیز نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہر شخص کا نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اب تمہاری نظر میں کون سی چیز خاص اور قابل ذکر ہو۔“ وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”دور نہ یہاں خاص اور قابل ذکر چیز تو میں بھی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر غمور سے انداز میں مسکرائی۔ معلوم نہیں اس وقت اتنے لوگوں اور خصوصاً ذرا تاج کی موجودگی میں وہ بار بار کیوں اس طرح قہریان جانے والے انداز میں مسکرا کر جا رہی تھی ورنہ جب محسوس خان نے مجھے اس کی میز پر بٹھایا تھا اس وقت تو وہ ہر بات بڑے سچاٹ اور کاروباری انداز میں کر رہی تھی۔

”تم چیز نہیں۔۔۔ تم ایک بہت اچھی عورت ہو۔“ میں نے اسے بچوں کی طرح چمکارتے ہوئے کہا۔ ”تم ادھر ایک میز پر بیٹھ جاؤ۔ ہم چند منٹ میں واپس آتے ہیں۔“ وہ ایک میز پر جا بیٹھی۔ میرے کسے بغیر ہی ہمارے

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ہم اس کے ساتھ ہو لیے اور جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے باہر آ گئے۔ کھنڈر کے گرد و خروش کا دائرہ غائب ہوئے جسے میں پھیلا ہوا تھا۔ نورین کی رہنمائی میں ہم اس مختصر جنگل سے نکل کر ایک طرف بڑھے۔ تب میں نے دیکھا اس سمت میں ایک جھونپڑی سی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت تک صداقتی کے آثار نذر آ رہے تھے۔ اندھیرے میں روشنی کی آمیزش براہ گئی تھی۔

ہم کچھ اور آگے بڑھے تو اندازہ ہوا کہ وہ جھونپڑی نہیں، ایک چلی کین تھا جس کے ارد گرد خورد و بھاشاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نورین سب سے آگے چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہمارے آوی تھے۔ انہوں نے غیر محسوس سے انداز میں اسے اپنی گنوں کی زد پر لیا ہوا تھا۔ میں اور زرتاج سب سے پیچھے تھے۔

زرتاج سرگوشی میں بولی۔ ”یہ ہمیں کسی جال میں پھنسانے کے لیے تو نہیں لے جا رہی؟“

”جال میں پھنسانے کے لیے تو وہ ترخانہ ہی سب سے اچھی جگہ تھی جہاں سے ہم آ رہے ہیں۔ یہ کین تو دریں ہی معلوم ہو رہا ہے۔ بہر حال..... اگر کوئی جال بھی ہوا تو دیکھا جائے گا۔ ہم سب الٹ تو ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

کین کے قریب پہنچ کر نورین نے فلی بی معاشوں والے اسٹائل میں آلات مار کر اس کا دائرہ کھولا۔ میں کو گرد کرنا تھا اور کین کے اندر تاریکی تھی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ کین میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس وقت شاید میرے ساتھ ساتھ زرتاج کو بھی حیرت ہوئی جب نورین نے کین میں داخل ہو کر کوئی سوچے آن کیا اور وہاں پتلی روشن ہو گئی۔ اندر لوہے کی ایک چارپائی اور ایک پتلی نظر آ رہی تھی۔

میں اور زرتاج بھی آگے بڑھ کر کین میں داخل ہو گئے۔ وہ کچھ ایسی قسم کا کین تھا جیسے بعض مقامات پر چوکیداروں یا گیٹ کپروں کے کین ہوتے ہیں۔ اس میں بے سرو سامانی کچھ زیادہ تھی۔ پتلی پر ریڈیو نما کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ وہ دائیں بھی نہیں دوسرا تھا کیونکہ دائیں میں موجود تھی۔ چلی سی ایک آواز اس سے منسلک تھی جو کین کے ایک کونے میں جا کر غائب ہو گئی تھی۔

”واہ..... اس دیر میں تم لوگوں نے بجلی کا خوب بندوبست کر رکھا ہے۔“ میں نے اوپر اُڑھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کین سے بھی زیر زمین آواز اس ترخانے تک جا رہی ہے۔ وہاں کے ہنر مندوں سے سلسلہ جڑا ہوا ہے۔“ نورین نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”لیکن میں تمہیں ایک دوسرا سلسلہ دکھانے کے لیے لائی ہوں۔ یہ جو تم پر ریڈیو سارا دکھا دیکھ رہے ہیں..... مجھے اس کا صرف ایک ٹیپ دینا تھا اور پورا ترخانہ ہلک سے اُڑا جاتا۔“ مجھے ٹیپ دینے میں اس وقت دینا تھا جب تم سب لوگ اندر جا

چکے تھے۔ ترخانے کے ساتھ ہی تم لوگوں کے بھی پر پٹھے اُڑ جاتے۔“

”لیکن تم خود بھی تو ہیں موجود تمہیں۔ ساتھ تمہارے بھی تو پر پٹھے اُڑ جاتے۔“ میں نے کہا۔

”الحق! اگر مجھے اس پروگرام پر عمل کرنا ہوتا تو پھر میں وہاں کیوں موجود ہوتی۔ میں تو تیس اس آلے کے پاس ہی موجود رہتی۔ تم لوگوں کے آنے سے پہلے میں یہیں موجود تھی۔ میں نے بہت دور سے تم لوگوں کی آمد کے آثار محسوس کر لیے تھے۔ مجھے تم لوگوں کی گاڑیوں کے ہولے حرکت کرتے دکھائی دیے تھے۔ اسی وقت میں جلدی سے جا کر ترخانے میں چھپ گئی تھی۔ کاش میرے پاس میک اپ وغیرہ کا سامان ہوتا تو میں چڑیل بن کر تم لوگوں کو ڈراتی۔ آج میرا کسمی سے مذاق کرنے کو بی چاہ رہا تھا۔ برسوں گزر گئے ہیں۔ کہ میں نے کسی سے کوئی مذاق نہیں کیا۔“

”اس مذاق میں تمہاری جان بھی جا سکتی تھی۔“ میں نے کہا۔

”جان.....! اس نے اسٹریٹ سے انداز میں قہقہہ لگایا۔

”یہاں جان تو بغیر مذاق کے بھی جا سکتی ہے۔“

”تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ پوری بات بتاؤ.....“ میں نے کہا۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بیزار سی ہوئی۔ ”بات کچھ بھی نہیں ہے۔ بس جانو کی طرف سے کچھ احکامات آئے تھے۔ سب لوگ جنگی طور پر یہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ بہت سا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے اس کین میں موجود رہنے کا حکم ملا تھا۔ اس کے علاوہ حکم یہ تھا کہ میں چاروں طرف نظر رکھوں۔ اس کین سے دو زبردست کا سنٹر نظر آتا ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں کچھ لوگوں کو کلب کی طرف آتے دیکھوں اور مجھے اندازہ ہو جائے کہ وہ کلب میں داخل ہو چکے ہوں گے تو میں اس ٹیپ کو دبا دوں۔“ اس نے ریڈیو نما چیز کے ایک ٹیپ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ یقیناً ترخانے میں نصب کسی ڈائنامائٹ کوڈیٹو نیٹ کرنے کا آلہ تھا۔

میرے لیے جانو یا اس کے گردہ کا یہ اندیشہ باعث حیرت تھا کہ کچھ لوگ یہاں پہنچ بھی سکتے تھے۔ انہوں نے یقیناً اس بات کا امکان محسوس کر لیا تھا۔ جانو کو یہ اطلاع قتل ہی کی ہوگی کہ فیروز خان یہاں سے ایک ایسی کے ساتھ روانہ ہوا تھا جس کے بعد وہ راستے ہی میں رٹھ سمیت غائب ہو گیا تھا۔ اس سے ہی اسے کسی گزیر کا احساس ہو گیا ہو گا۔

انہوں نے ایسے انتظامات کر رکھے تھے کہ اگر کبھی پولیس وغیرہ کی اس اڑے تک رسائی ہو تو زرتاج اس کی مالک ظاہر ہو لیکن آج انہوں نے اس مشرت کو بے کو خالی کر دیا تھا۔ اسلحہ وغیرہ بھی یہاں سے ہٹا دیا تھا اور یہ انتظام بھی کر گئے تھے کہ اگر کچھ لوگ اس اٹھانے تک پہنچے، دکھائی دیں تو ان لوگوں سمیت اس اڑے کو



اس کی دھمک اور گرج اتنی تھی کہ باہر کھڑے ہوئے دو افراد میں سے دو اندر سے منہ مگر رہے۔  
 ”یہ تم نے کیا کیا؟“ زرتاج سنبھلتے ہوئے بولی۔  
 ”کیا اس جگہ کا کوئی اور مصرف تھا آپ کے ذہن میں؟“ میں نے معصوم بنے ہوئے پوچھا۔ وہ گویا جواب ہی ہو گئی۔  
 میں نے لیکن سے نکل کر دیکھا، درختوں کے درمیان سے اس طرح ٹوٹو حوالا بلند ہوتا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا سونا آتش نکل پڑا ہو۔

میں نے راتقل کندھے پر لٹکا کر گویا کسی چھوٹے موٹے کام سے فارغ ہو کر ہاتھ بھانڈے ہوئے کہا۔ ”چلے اب واپس چلے ہیں۔“ میں نے نورین کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔  
 ”مجھے ساتھ لے جا کر کیا کرو گے؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”تمہارا بھی کوئی نہ کوئی مصروف نکال ہی لیں۔ نہ تم بلو تو سہی۔“ میں نے جواب دیا۔ وہ گویا بادل غواہے ہمارے ساتھ ہوئی۔

راتے میں وہ بولی۔ ”تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“  
 ”زرتاج نگر۔“ میں نے جواب دیا۔

اچانک وہ چوکی اور زرتاج کی طرف گویا ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیس آپ ریشمانی زرتاج تو نہیں ہیں؟“  
 زرتاج تو جگہ نہ بولی۔ اس کی طرف سے میں نے جواب دیا۔  
 ”ہاں۔ یہ ریشمانی زرتاج ہی ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آ رہا کیا؟“  
 ”ہاں۔ مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا کہ اتنی بڑی زمیندار اپنی خود بھی بددق اٹھا کر اس طرح مٹی اور پیسے میں تنہزی اپنے دشمنوں اور ڈاکوؤں سے مننے کے لیے نکل سکتی ہے۔“ بے یقینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ ”میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ صاف ستھرے، اچلے اچلے کپڑے پہن کر اپنے عالیخان ذراتنگ دوحس میں بیٹھ کر احکامات صادر کرنا جانتے ہیں اور ان کے احکامات پر لوگ ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح بھنبھوڑتے اور ایک دوسرے کی ہونیاں نوچتے مر جاتے ہیں۔“

زرتاج اب بھی غاموش تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔“ پھر میں نے زرتاج کو غائب کرتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”بعض کام کتنے مشکل نظر آتے ہیں لیکن کتنی آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ آج کی رات گو کہ بہت ہماری گزری ہے لیکن اہم کام میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سر سے اتنے بڑے بڑے بوجھ بٹ جائیں گے۔ جانو کہ گردہ کا خاتمہ بھی ہو جائے گا اور اس کا یہ خطرناک ٹھکانا بھی تباہ ہو جائے گا۔“

”امدادیوں بھی اسی کو کہتے ہیں۔“ زرتاج مذہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اس وقت تک ہم لوگ گئے درختوں کی اس بی بی تک پہنچ چکے

دھماکے سے اُڑا دیا جائے۔ اس میں یقیناً جانو کی کچھ اور مصلحت رہی ہوگی لیکن اب جانو اس دنیا میں نہیں تھا اور شاید اس کے بیشتر ساتھی بھی ٹھکانے لگ چکے تھے اس لیے اس مصلحت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں تا سکا تھا صرف اندازے قائم کیے جاسکتے تھے۔ میں نے نورین کی آنکھوں میں بھانکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے احکامات پر عمل کیوں نہیں کیا؟“ میں نے دبانے کے لیے یہاں موجود کیوں نہیں رہیں؟“

”یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔“ وہ بے نیازی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولی۔ ”بس۔۔۔۔۔ میرا دل نہیں چاہا۔ حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ کون ہو۔ میرے لیے تم اندھیرے میں حرکت کرتے ہوئے ٹھس چڑھ ساتے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا تو تم لوگ میرے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک بھی کر سکتے ہو۔ اس کے باوجود میں نے جن دبانے کا ارادہ نہیں کیا اور خود کلب میں جا کر چھپ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس حکم بدولت پر جانو میرا نہ جانے کیا حشر کرے۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو جن دبانے پر آمادہ نہ کر سکی۔“

”جانو کا تو اپنا حشر بہت خراب ہو چکا ہے۔“ میں نے اسے بتا دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

”کیا ہوا اسے؟“ نورین نے چوختے ہوئے پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں۔ بس وہ مر چکا ہے۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔

”مجھے کی سوت مر چکا ہے۔“ زرتاج نے گویا صدمہ کی۔  
 ”اوہ۔۔۔۔۔“ نورین نے ہونٹ سکڑتے ہوئے کھلی سہائی۔ ”ان علاقوں میں دور دور تک رہنے والوں کے لیے یہ اس سال کی سب سے بڑی خبر ہے۔“

”میرا خیال ہے اس کا پورا گردہ بھی جنم رسید ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ نورین کی حضور آنکھیں پھلک گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ طمانیت کی گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”معلوم۔ اب کم از کم میں اس کے عتاب سے توجہی دہوں گی۔ میں نے تم لوگوں کو مرنے سے ہٹا دیا تھا لیکن اب دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ یہ نیکل مجھے شگنی چڑے گی۔ زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی نیکی کی تھی۔ میری زندگی میں تو چھوٹی مولی نیکیوں کا گزر بھی کم ہی رہا ہے۔“

”تمہارا یہ نیکی رانیکاں نہیں جائے گی۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ کر دیکھ بونا آئے کا وہ سرخ شبن دیا دیا جس کی طرف چند لمحے پہلے نورین نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرح اچانک کسی کو بھی مجھ سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ یک دم زوردار دھماکا ہوا اور زمین لرز کر رہ گئی۔ دھماکا چونکہ زیر زمین ہوا تھا اس لیے اس کی آواز تو ایسی نہیں تھی کہ کانوں کے پردے پہنچے محسوس ہوتے لیکن

کے ساتھ جگہوں سے لے رہے تھے۔ اس وقت شاید وہ کافی خوبصورت اور پرکشش نظر آتی لیکن غیظ و غضب سے اس کا چہرہ کچھ بگڑا ہوا تھا۔ درمیان میں اس کے ساتھ تھے ان پر نظر ڈالنے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاکو تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جانو کے گردہ کا عمل خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی اس کی نہ جانے کتنی نشانیاں باقی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سونیا کو دیکھتے ہی نورین کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

سونیا بھی غضبناک نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دانت پیس کر بولی۔ ”تھو اور کہیں کی! تجھے جو آؤ رہا تھا تو نے اس پر عمل نہیں کیا اور ان کے ساتھ چل دی۔ تیرا کیا خیال ہے؟“ ان کے ساتھ جا کر تو لکڑی کا پل بن جائے گی؟“

”میڈم! میں نے تو تم پر عمل کیا تھا۔۔۔ لیکن یہ لوگ بچ گئے۔۔۔“ نورین نے ہکلاتے ہوئے جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔

”کیوں اس مت کرد۔“ سونیا گئی۔ ”میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تم لوگوں کے چہرے دیکھ کر جھوٹ بچ کا فرق بھی نہ سمجھ سکوں۔“ دوسرے ہی لمحے دھماکا ہوا اور نورین دھیر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے بھی محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر گولی مار دی ہو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونیا گولی چلانے میں اتنی تیزی دکھائے گی۔ اس نے تو دیرینہ قتلوں کی ہیروئینوں کو بھی مات کر دیا تھا۔

نورین اور وہ منہ مری تھی اور کرتے ہی ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی پشت پر کندھے کے نیچے سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے خون اُبل رہا تھا۔ گولی بھینا اس کے دل سے گزر گئی تھی۔ میں نے اس پر جھٹکنے کی کوشش کی لیکن سونیا خطرناک انداز میں ہتھول کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ”تم بالکل سیدھے اور ساکت کھڑے رہو ورنہ تمہارا بھی یہی انجام ہو گا حالانکہ تمہارے لیے میرے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔“ گوجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ میرا شوہر اور گردہ کے زیادہ تر لوگ تمہاری وجہ سے مارے جا چکے ہیں لیکن شاید میں تمہیں معاف کر دوں۔ شرط صرف یہی ہے کہ میرے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا۔“

میں ساکت ہو چکا تھا لیکن اسے یقیناً اندازہ نہیں تھا کہ میرے دل میں کیسا شعلہ سا بھڑک اٹھا تھا۔ نورین بلاشبہ ہماری ٹھنڈ تھی۔ اس نے موقع حاصل ہوتے ہوئے بھی ہماری ہلاکت کا سامان نہیں کیا تھا۔ ہم جس وقت ترخانے میں تھے، ہمیں گمان تک نہیں تھا کہ محض ایک من بدانے سے ہمارے پرچے بھی اڑ سکتے تھے۔ نہ جانے اس کی کس سوچ نے ہمیں دوسری زندگی دی تھی اور اسے ہمارے سامنے کسی حقیر جانور کی طرح مار دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت میرے لیے ناقابل برداشت تھی لیکن میں اسے اپنے سینے میں امنڈتے ہوئے غیظ و غضب کو دبائے بٹھا ہوا لکڑی پر سکون کھڑا تھا۔ میں نے کن انکھیں سے زور تاج کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پاٹ تھا اور

جو دائرے کی سی صورت میں بچھلی ہوئی تھی۔ ان کے درمیان بڑبڑاتے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اس طرف بچنے کے لیے اس دائرے میں داخل ہونے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اس راستے پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ درختوں کے درمیان کھنڈر کا بیشتر حصہ اب فل ہی تباہ ہو چکا تھا۔ وہاں ایک بڑا سا گڑھا بن گیا تھا جس سے دھواں اور پھڑپھڑاتے ہوئے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ زمین شش ہو گئی تھی اور زیر زمین کوئی آتش فشاں پھٹ گیا۔ گو کہ اوپر سے زمین زیادہ نہیں پھٹی تھی اور شعلے بھی زیادہ بلند نہ تھے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن چشم ہم لوگوں تک پہنچ رہی تھی۔ زمین میں پڑا ہونے والے شگاف سے بار بار کینٹ دھوئیں کے رخوے باہر آتے گلتے تھے اور کبھی کبھی ہلکی سی گڑگڑاہٹ بھی مانی دے رہی تھی۔

چند لمحوں تک خاموشی سے یہ نظارہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ اس طرف واپس چل دیے۔ جدھر ہم اپنی گاڑیاں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس وقت تک صبح کا ایلا پھیل چکا تھا۔ اب وہ رات بھی خوبصورت اور پرسکون لگ رہا تھا۔ کہیں کہیں جھاڑ جھنکار اور درخت نظر آ رہے تھے مگر اس وقت وہ بھی گھبرے گھبرے دکھائی دے رہے تھے شاید ہمارے اندر کا موسموں بدل چکا تھا۔ کم از کم میں اس وقت خود کو بہت لگاؤ لگا محسوس کر رہا تھا۔ رات بھر کی اعصابی کشیدگی کے بعد اب صبح کی تازہ ہوا میں سکون کی سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ ہم سب نے رائفلیں وغیرہ کندھوں پر لٹکائی تھیں۔

”دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہوا کہ سکون میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے نہیں تھا۔ پندرہ جہاں ایک لمحے کے لیے قائل ہوا ہے، گھوٹا صاف دہریں چھپا ہوا ہے۔ ہم گاڑیوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ایک گھوڑی سی آواز سنائی دی۔“ ”پہنڈ زاپ!“

میں نے رائفل کندھے سے اتارنے کے لیے تیزی سے ہاتھ پڑھایا ہی تھا کہ قاتر کی آواز کوئی اور گولی میرے بالوں کو چھوئی ہوئی گزری۔ دونوں گاڑیوں کے عقب سے گنوں کی ٹائیں جھانک رہی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آہستگی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ گاڑیوں کے عقب سے دو مرد اور ایک عورت فٹل آگے۔ چلی نظریں تو عورت بھی مرد ہی دکھائی دی تھی۔

میں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ جانو کی بیوی تھی۔۔۔ بلکہ یہ وہ سونیا تھی لیکن اس وقت وہ دیرینہ قتلوں کا کوئی کردار معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس نے راکیل وینچ کو کسی فلم میں اس طرح میں دیکھا تھا۔ وہ دو یا تین تھیں۔ جینز اور جیکٹ میں تھیں۔ جھول میں فل بوٹ تھے۔ سر پر صرف فلیٹ ہیٹ کی ٹپی تھی۔ اس کی جگہ وہ کھلاڑیوں جیسی بی کیپ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی کمر کے گرد گولوں کی پٹی لپی ہوئی تھی اور ہاتھ میں ٹال اور لمبی ہی ریش کا ایک نہایت خطرناک پیرا پٹسل تھا۔

لی کیپ کے نیچے اس کے ریشی تراشیدہ بال ہوا کے جھرمکوں

وہ ایک ٹھک سونیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سونیا کے دونوں ساتھی ڈاکوؤں نے ہمیں گود کیا ہوا تھا اور دو پلک نہیں چپک رہے تھے۔ سونیا عمارت آئینہ نظروں سے زرتاج کا سر آیا جائزہ لینے ہوئے ہوئی۔ ”تم یقیناً زرتاج ہو۔۔۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا لیکن جانو کی زبان تمہاری باتیں سن سن کر اندازہ ہو چکا تھا کہ تم کیسی عورت ہوگی۔ تمہارے عشق میں پاگل تھا وہ۔۔۔۔۔ تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچ گیا۔۔۔۔۔“

”میں ابھی تک کچھ نہیں سکی کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

زرتاج نہایت چمکوں لہجے میں بولی۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جانو کو مار کر تم یہ مت سمجھ لیا کہ تمہیں اس علاقے میں دشمنوں سے نجات مل گئی۔۔۔۔۔“ سونیا ہند لہجے میں بولی۔ ”اب میں تمہیں پاکستانی چھوٹ دیوی بن کر دکھاؤں گی۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔۔۔ تم بھلا یہ سب کیسے دیکھ سکو گی۔ سب سے پہلے تو میں تم ہی کو ہلاک کر دوں گی۔ ابھی اور اسی وقت۔۔۔“

زرتاج بے ساختہ ہنس دی لیکن نورانی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو سنا تھا کہ تم خاصی پڑھی لکھی عورت ہو۔۔۔۔۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“ سونیا اس کی بات کاٹتے ہوئے جھڑی سے بولی۔

”اس کے باوجود تم نے اسے گھٹیا آئیڈیل بنا رکھے ہیں۔“

زرتاج عمارت سے بولی۔ ”چھوٹ دیوی بننا چاہتی ہو تم لغت ہے تم پر۔“

میری توقع کے برعکس سونیا نے لغت کا زیادہ برا نہیں مٹایا تاہم کشیدہ سے لہجے میں بولی۔ ”تم جیسے لوگوں نے اور تمہاری اس سوسائٹی نے اس کے علاوہ نیزے لیے راستہ ہی کون سا چھوڑا ہے۔“

زرتاج نے میری طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ ”دبی معاشرے کا رد تھا۔۔۔۔۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے لوگوں نے اپنی خواتین کا جواز گزرنے کے لیے یہ اچھا افسانہ تراش رکھا ہے۔ بہت کم لوگوں کو بڑا بنانے میں معاشرے یا حالات کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن اپنے آپ کے لیے سب کو یہی راگ مل جاتا ہے۔“

نظر سے تو میرا اپنا بھی یہی تھا تاہم میں خاموش رہا۔ سونیا پر زرتاج کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کھردرے لہجے میں بولی۔ ”کیو اس بند کرو۔۔۔ اور تم سب اپنے اپنے ہتھیار سامنے پیچہ تک دو۔“

زرتاج اس کا حکم ان سنا کرتے ہوئے بولی۔ ”میں چاہتی ہوں“

تمہیں مجھ جیسے لوگوں اور اس معاشرے سے شکایت نہ رہے۔ میں تمہیں موقع دیتی ہوں کہ تم اب بھی چھوٹ دیوی بننے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم میرے ساتھ چلو۔ تمہیں باعزت زندگی گزارنے کے لیے جو بھی مدد درکار ہوگی وہیں فراہم کر دیں گی۔ تم زوراد بنگ قسم کی عورت معاشرہ ہوتی ہو۔ میں تمہیں اپنی زمینوں کی میزبانوں

کی۔ میں چاہتی ہوں عورتیں اس قسم کے کاموں میں بھی آئیں۔ یہ پہلی مثال ہوگی کہ ایک بڑی زمیندار سٹی کی زمینوں کی بچہ بھی عورت ہوگی۔“

”مجھے چارہ مت ڈالو۔ مجھے معلوم ہے تم اس قسم کے خزانے دکھا کر مجھے لے جا کر پولیس کے حوالے کر دو گی۔ جانو کی بیوی اور اس کی شریک کار کی حیثیت سے میں بھی پولیس کو مطلوب ہوں۔ سونیا منہ بھر کر بولی۔

”میں اتنی چھوٹی عورت نہیں ہوں کہ جان بچانے کے خوف سے جھوٹ بولنے لگوں۔ جھوٹے وعدے کرنے لگوں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو وعدہ بچانے کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔ تمہیں پولیس سے بچانے کی ذمہ داری بھی ملتی ہوگی۔ اب تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ تم اپنے شوہر کے ڈاکو ہونے سے بیزار ہو۔۔۔۔۔ تم اس دلدل میں آکر پھنس گئی تھیں۔۔۔۔۔ تمہارے آئیڈیل نہیں تھے۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب تم خود ڈاکو بننے نکل کھڑی ہوئی ہو۔“

”جانو ڈاکو تھا یا دہشت گرد وہ بہر حال میرا شوہر تھا۔ میں اسے ہلاک کرنے والوں کو معاف نہیں کر سکتی۔ میرے ہاتھ اس سے پہلے بھی خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ اب یہ غدار بھی میرے ہاتھوں مارنی چاہتی ہے۔۔۔۔۔“ اس نے نورانی کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”اب تم لوگوں کو بھی زندہ چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میرے سامنے واپسی کا راستہ نہیں رہے گا۔“

”نی لال تو راستہ موجود ہے لیکن اپنے لیے راستہ تم خود بنا کر رہی ہو۔“ زرتاج بولی۔

”ان دو آدمیوں کے علاوہ بھی ابھی کچھ آدمی میرے ساتھ ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر مجھے اپنی سوامنی سمجھ کر جانو کی چھوڑی ہوئی بادشاہت کی حفاظت کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر تمہارے سامنے میں پناہ نہیں لے سکتی۔ یہ میرے لیے جانیں دینے والے لوگ ہیں۔ میں بھی ان کی خاطر جان دے سکتی ہوں۔“

”دیکھا۔۔۔۔۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اصل میں تم جیسے لوگوں کا خمیر ہی خراب ہوتا ہے معاشرے اور حالات کے تو صرف بھانے ہوتے ہیں۔ صرف بڑے لوگ ہی بڑے لوگوں کے لیے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں۔“ زرتاج بولی۔

سونیا کے ساتھی ڈاکوؤں میں سے ایک بے تابی سے کھانکھنکھ کر حرکت دیتے ہوئے ہم پر سے نظر ہٹائے بغیر سونیا سے مخاطب ہوا۔ ”میں! اس قصبے کو جلدی ختم کریں۔ ابھی نہیں اڑے پرواہیں جا کر بہت سے کام نشتا ہے۔“

سونیا اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اسے گویا تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”تم نہ کرو۔ میں بات ان سے کر رہی ہوں لیکن میرا دماغ دوسری طرف بھی کام کر رہا ہے۔ ہمارا بڑا نقصان

طاقتور بنائیں۔ زرتاج کے ساتھ ہر کہ جس کیس کیا لے گا؟ اگر اس نے تم سے شادی کر بھی لی ہو تو تمہاری عمر اس کی جو تیاں سیدھی کرتے ہی گزرتی..... اور اب تو اس کا بھی کوئی اسکان نہیں..... کیونکہ تمہاری زندگیوں اب میرے ہاتھ میں ہیں..... جب کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں کی زندگی اس کے ہاتھ میں ہے تو مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ نہ جانے کیوں اسی لئے مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی انجام کے قریب پہنچ چکی ہے۔ میں نے زرتاج کی طرف دیکھے بغیر محسوس کیا کہ شاید اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ گھٹے گھٹے لیکن برہم سے لہجے میں بولی۔ ”تم اب حد سے زیادہ ہی بکواس کر رہی ہو۔ افضل خان سے میرا کوئی معاشقہ نہیں چل رہا..... ہم شادی کی تیاریاں ہرگز نہیں کر رہے..... اور اگر ایسی کوئی بات ہوئی تب بھی میں اس طرح سرد راہ کھڑے ہو کر اسے ڈسکس کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔“ جسے افضل خان سے جو بھی پوچھا ہے ویسے ہی پوچھ لو۔ اتنی بکواس اور دلیل بازی کی کیا ضرورت ہے؟“

سونیا نے لگا ہوا تھکا لگایا۔ وہ بھی نشے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی مجھے پنک میں لگتی تھی لیکن اسے اپنے اوپر خوب قابو تھا۔ آہم نشے نے اس کے ذہن کو متاثر ضرور کیا تھا۔ اس کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سنگی پن کی جھلک ضرور تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں میں دھچکی کی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اب اس دل ہی دل میں اس کی تجویز پر غور کرنے لگا تھا۔ سونیا کی نظر اب مجھ پر تھی۔ وہ پھسل کو خفیف سی جھنجش دیتے ہوئے بولی۔ ”کیا کہتے ہو؟“

”کیا اس ختم کی باتوں کا بڑا بڑا بدوقت کی ٹوک پر لیا جاتا ہے؟“ میں نے اتنی دریں میں چلی بار زبان کھولی۔ ”مجھوری ہے۔ نیں! الحال تو تم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔“ سونیا نے گھٹے اچکائے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر وحشت و درد کی کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔

”اگر اب مجھو سا کرنا مشکل ہے تو پھر آگے چل کر بھی مشکل ہی ہو گا۔“ میں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ بات ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں دھچکی کی چمک دیکھ لی تھی۔

”خیر..... ہم دیکھیں گے اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے..... نیں! الحال تم سب اپنی اپنی نہیں اپنے سامنے زور دے رہی ہو۔“ سونیا نے شاندار انداز میں حکم دیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ کم از کم مجھے اور زرتاج کو زندہ ساتھ لے جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تو اس کی شکست قبول کرنے کا ڈراما رچا سکتا تھا اور ان کے خفیہ اڈے تک پہنچ کر ان کے بچے بچے گروہ کا بھی خاتمہ کرنے کی کوئی تدبیر کر سکتا تھا لیکن میں اب کسی لیے جکڑیں پڑنے کے لیے تیار

نہیں تھا۔ سارا نقصان تو پورا نہیں ہو سکا لیکن اگر ہم زرتاج کو دلے چلیں تو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پورا ہو جائے گا۔“ شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہے کہ فلاں کی بڑی بلا ہے۔ بلا میں سونیا کے جو عزم نظر آ رہے تھے اگر وہ ان پر قائم رہتی تو وہ جانوں کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ جسے اب بھی ہمارے کندھوں میں لیکن جس طرح سونیا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں کور کیا تھا اور جس طرح ہم پر نظر رکھی ہوئی تھی ہمارے لیے نہیں انھوں نے اپنا بے سیدھی کرنا اور فائر کرنا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا۔ یہ معمولی سا کام ایک طویل اور پیچیدہ عمل نظر آ رہا تھا لیکن اگر سونیا صرف زرتاج کو بھی زندہ لے جانے کے چکر میں پڑتی تھی ہمارے لیے اس کی کوئی کٹن نظر آنے کا امکان یہاں ہو گیا تھا۔ سونیا کی نظر زرتاج پر ہی مرکوز رہی لیکن وہ پھسل کی خفیف سی جھنجش سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”مگر تم یہ آدمی مجھے دے دو تو میں واقعی جسے پاکستانی پھول دیوی بن کر دکھا دوں گی۔“

زرتاج ناگوار سی سے بولی۔ ”یہ آدمی کوئی ٹھیلے پر رکھا ہوا امرو نہیں ہے کہ میں اٹھا کر جھین دے دوں۔ تم اس آدمی سے خود ہی کیوں نہیں پوچھ لیتیں کہ یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا نہیں..... اور جسے پھول دیوی بنانے کے ”عظیم کارِ خیر“ میں تمہارا ہاتھ لگانا چاہتا ہے یا نہیں۔“

”مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے بار میں پھنسا ہوا ہے اس لیے تم سے ہی پوچھ رہی ہوں۔“ سونیا بولی۔ ”اسے جب میں نے بولی بار اپنے اڈے پر جانے کے دروازہ دیکھا تھا اور ہمارے آدمیوں نے اسے مارنے پینے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں مار کھائی تھی اس وقت عیاں نہ جانے کیوں میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ یہ شخص جانو اور اس کے گروہ کی تباہی کا سبب بنے گا۔“

”اس کے باوجود تم اسے ساتھ لے جانا چاہتی ہو؟“ زرتاج جھنجھٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اں۔ میرے خیال میں یہ من موہی ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ اسے اپنا فائدہ نظر آئے یا کسی طرف اس کا دل چلے جائے تو یہ کسی کا بھی ساتھ بن سکتا ہے۔“

اس الٹی ٹپنی نے میرے بارے میں بہت ہی غلط اندازہ قائم کیا تھا۔ نام میں خاموش ہی رہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ اچانک اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا اور دو ٹوک لہجے میں بولی۔ ”میں نہیں بچے بچے گروہ کا سردار اور اپنا مالک و مختار تسلیم کر سکتی ہوں.....“ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ سب معاف کر سکتی ہوں۔ ہماری طرف بے اعتنائی۔ زرتاج بے شک ایک دولت مند زمیندار ہے لیکن ہمارے پاس بھی کافی دولت موجود ہے۔ تم میرے ساتھ مل جاؤ تو ہم اس گروہ کو شاید پہلے سے بھی بڑا کر لیں..... زیادہ مضبوط زیادہ

نہیں تھا۔ میں اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ میں تو شاید کئی دن پہلے یہاں سے نکل جاتا لیکن حالات عجیب سے عجیب تر منہ اختیار کیے جا رہے تھے۔ اب میں ان حالات میں مزید اُلجھتا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا، فوری طور پر کرنا تھا۔

ذرا تاج سے گویا میرا کچھ ذہنی رابطہ سا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں، جو کچھ کرنے لگا ہوں، ذرا تاج کو اس کا اندازہ ہے اور وہ اس میں میرا ساتھ دے گی۔

ہم نے اپنی اپنی گھنٹیں اتارنے کے لیے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑھائے۔ ہمارے آویں ہم سے ذرا پیچھے تھے اور ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہیں تھے۔ گو کہ میں مگر ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے کسی حد تک ان کی پوزیشن کا اندازہ تھا۔ ایک سوہوم سی امید تھی کہ شاید وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کر سکیں۔ تعداد بہر حال ہماری زیادہ تھی۔ ہم سوینا اور اس کے ساتھیوں کو اکثریت دے کر دیکھتے تھے۔

جوئی ہمارے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑے، سوینا اور اس کے ساتھی کچھ اور مستعد ہو گئے۔ ٹرگرز پر ان کی آنکھوں کا دیاؤ بڑھ گیا۔ سوینا نے تو پہل دونوں ہاتھوں سے قیام لیا تھا اور اس کا نشانہ میں تھا۔ زیادہ نشہ کرنے والوں کی آنکھیں عموماً دھندلائی دھندلائی ہی رہتی ہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس وقت سانپ کی سی چمک تھی۔

”نہایت آہستگی سے گھنٹیں کندھے سے اتارنا..... ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ تمہاری زندگی اور موت کا سوال ہے۔“ سوینا نے خبردار کیا۔

کندھوں سے گھنٹیں اتارنے تک ہم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا یعنی ہاتھوں کو نہایت آہستگی سے حرکت دی۔ پھر ہمارے گھنٹیں اپنے سامنے پھینکتے گئے اور اسی لمحے ہمارے ہاتھوں نے تقریباً یکساں انداز میں حرکت کی۔ میں نے اپنی گھنٹیں سوینا کے منہ پر دے ماری تھی اور ذرا تاج نے اس کے ساتھی کے منہ پر پھینکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے زمین پر گرے ہوئے لوٹ لگائی تھی۔

گھنٹوں کی ٹرزا بہت نفا میں گونجی۔ ہمارا صرف ایک آوی خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کر سکا۔ وہ کندھے سے گھنٹے اتارنے اور گر کر لوٹ لگاتے ہوئے برست مارنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس برست نے سوینا کے دونوں ہی آویں کا بیک وقت کام تمام کر دیا لیکن اس دوران دارا ایک آوی بھی کام آگیا۔ باقی اتفاقاً ہی بیچ گئے قسمت ان پر مہربان تھی۔

سوینا نے مزید فائر کرنے کے بجائے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ آگ ہماری رسائی سے نکل جائے۔ چند قدم ہٹ کر وہ ہمیں دوبارہ نشانہ بنانے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت تک اس کی ٹانگ میری رسائی میں آچکی

تھی۔ میں نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔

وہ گر پڑی لیکن گرتے گرتے بھی اس نے پسٹ کر فائر کیا۔ میرے سر سے ذرا ہلنے سے ہی گزر گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ میں اچھل کر اس پر جا کر اٹھ اس کا ہٹل والا بازو میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے اسے کی درخت کی ٹنکی کی طرح مردو کر رکھ دیا۔ اس کے حلق سے نرنگا ہونے بکے کی سی آواز نکل۔ شاید اس کا بازو جوڑپ سے ہی ٹکڑ کیا تھا۔

پہل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے چھوٹ کر اسے اٹھالیا۔ اس آخری لمحے میں میں نے اس کے چہرے پر سچے دہشت اور بے یقینی دیکھی لیکن میں نے وہ لمحہ سوچ بچار میں ضائع نہیں کیا۔ میں نے اسی کے پستول کی گولی اس کے سینے میں اندر دی۔ گولی بالکل اسی طرح سین اس کے دل سے گزر گئی جس طرح نورین کے دل سے گزری تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا اور ان معاملہ میں میرے اندازے شاذ و نادر ہی غلط ہوتے تھے۔ وہ گولی بھی اس کے پستول کی آخری گولی تھی۔ میں نے دوبارہ ٹرگر دیا تو صرف ہٹل کی آواز سنائی دی۔

میں آہستگی سے گھوما۔ وہ جگہ اب کچھ اچھا منظر پیش نہیں کر رہی تھی۔ ایک لمحے پہلے تک جہاں زمین بے درخھی اب وہاں خون پھیلا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے جذب بھی ہو رہا تھا۔ اس زمین پر شاید بہت ہی مخصوص قدموں کی آمد و رفت رہی تھی جو خون کی بجائی ہو گئی تھی ورنہ زمین ایسی ہوتی نہیں۔ وہ تو اپنی کوکہ سے انسان کے لیے رزق اور دولت اکٹھی کر رہے۔

ذرا تاج میرے برابر ان گھڑی ہوئی تھی۔ وہ متاثرہ سی نظروں سے سوینا کی لاش کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ عورت تھی۔ اور ذرا غلط قسم کی عورت تھی۔ لیکن تم نے اسے ہلاک کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔“

میں نے نورین کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بھی عورت تھی۔ اور ہماری محسنہ تھی۔ سوینا نے بھی اسے ہلاک کر کے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا تھا۔“

”اوہ۔“ ذرا تاج نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اس کے علاوہ..... اگر میں ایک لمحہ تامل کرنا تو شاید سوینا کی جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔“

”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ ذرا تاج ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”ہماری گاڑیوں میں ان سب لاشوں کو لے جانے کی گنجائش نہیں۔“

”کھڑی تو شاید ان لوگوں کی بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ہمیں لاشوں کو نہیں چھیننا چاہیے۔ کچھ کام پولیس کے لیے بھی چھوڑنا چاہیے۔“

اس نے جرت سے میری طرف دیکھا۔ ”آپ ایسی بھی کیا آؤت آری ہے؟ یہ کون سا وقت دعوٰی ہے تم نے رخصت ہونے کا؟ ہم اتنی خطرناک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ تم کم از کم ایک آؤدہ دن تو سنا لو۔ پولیس کی تم فکر مت کرو۔ ان سے میں نمٹ لوں گی۔ اب میں اتنی بھی کچھ گزری نہیں ہوں۔ شرارت اور اس سے رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا یہاں کوئی دیدہ نہیں ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دیسے عی۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں یہاں مزید ایک آؤدہ گھنٹا بھی رگوں کا تو مزید اُلٹا چلا جاؤں گا۔ اب میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔“

تھوڑی سی جھڑپ چھین کے بعد بلا خراس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور بولی۔ ”کم از کم اپنا ٹیڈ تو کچھ ٹھیک کرتے جاؤ۔۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کسی ڈھنگ کے لباس کا تو فوری طور پر بندوبست نہیں کر سکتی لیکن کم از کم صاف شلوار قمیض مہیا کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔“

اس نے ملازمہ کو ذرا بڑے ساڑی کی ایک شلوار اور قمیض کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ میری حالت اس وقت واقعی خانہ بدوشوں سے بدتر تھی۔ میں جب لباس تبدیل کر کے اور ذرا تازہ کی طرح اپنے آپ کو تھوڑا بہت ”جھاڑ پونچھ“ کر دو بارہ اس کے سامنے آیا تو وہ کسی سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔

میری آہٹ سن کر سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”سڑک کے لیے تمہیں کچھ رقم کی بھی تو ضرورت ہوگی؟“

”میں نے کچھ انتظام کر رکھا ہے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے مجھے جو سروٹ کارڈر دے رکھا ہے وہاں ایک الماری میں میں نے کچھ رقم چھپائی ہوئی ہے۔“

”اے تو بھول جاؤ۔“ ذرا تازہ دھوکے سے بولی۔ ”تمہیں یاد نہیں جو وہاں تمہارا کھانا وغیرہ پکا تھا؟ غدار تھا۔۔۔۔۔ جانو کا ایجنٹ تھا۔۔۔۔۔ جب وہ اور جانو وغیرہ حویلی میں گھسے تھے تو وہ خود اپنے من سے کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکے تھے جب ڈاکو بہت اچھی طرح تلاشی لے چکے ہوں تو تمہیں وہاں رقم محفوظ نہ بنانے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔“

اس کی بات معقول تھی۔ میں تذبذب کے ست عالم میں کھڑا رہ گیا۔ وہ انہی اور ہاتھ کرے میں جلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آئی اور نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ رکھ لو۔۔۔۔۔ گھر میں اس وقت زیادہ کیش نہیں ہے۔ تم آج کا دن رکتے تو جتنی رقم کا چاہئے بندوبست ہو سکتا تھا۔“

وہ بڑے نوٹوں کی سریر مرگڈی تھی۔ ایک لاکھ دو ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ اسے کم سمجھ رہی ہیں؟ میرے لیے تو یہ بہت زیادہ ہے۔ میں اتنی رقم کا کیا کروں گا؟ مجھے

میں نے کچھ دور تک ادھر ادھر گھوم پھر کر دیکھا۔ ہمیں ایک بگ درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں ایک جیب کھڑی نظر آئی۔ جس وقت ہم لوگ گولڈ کی کلب کی چابی کے نظارے میں خنڈے ٹاپا اس وقت سونا اور اس کے سامنے اس جیب میں یہاں پہنچے تھے۔ میں نے اس جیب کی تلاشی لی لیکن اس میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ ہم نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور اپنی دو گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔

ہم ذرا آج تھرو واپس پہنچے تو ایک پولیس پارٹی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ڈی ایس پی ان کی قیادت کر رہا تھا۔ پولیس گاڑی کے ان لوگوں میں سے چند کے بیانات قلمبند کر رہی تھیں جنہوں نے واکوں سے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ کدو ان سے نمٹ رہا تھا۔ پولیس کا سامنا ہونے سے پہلے ہی ذرا تازہ کو ان کے بارے میں تمام اطلاعات مل چکیں۔ وہ ابھی یاغی ہی میں تھے۔

جو شخص ان کے بارے میں اطلاع لے کر آیا تھا، ذرا تازہ نے اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ انہیں اپنا کام کرنے دو۔ میں اس وقت سخت جھکی ہوئی ہوں۔ حویلی میں جاری ہوں۔ پہلے میں ذرا سناؤں اور اپنا ٹیڈ تھوڑا بہت ٹھیک کرلوں، اس کے بعد ڈی ایس پی صاحب کو میرے پاس لے کر آؤں۔“

”ٹھیک ہے ریسمانی جی۔“ وہ شخص ہاتھ بانٹ کر ہولا اور ذرا تازہ نے مجھ کو کارخ حویلی کی طرف موڑ دیا۔

حویلی میں چلی منزل پر چلی لاشیں اسی طرح پڑی تھیں۔ ذرا تازہ نے اپنے آدمیوں کو مختلف کام سنبھالنے کے سلسلے میں ہدایات دیں اور میرے ساتھ اوپر کی منزل پر آگئی۔ مجھے اوپر کی منزل کے ذرا ٹھیک مقام میں پہنچا کر وہ چند ہی منٹ میں لباس تبدیل کر کے اور اپنا ٹیڈ کالی حد تک درست کر کے واپس آگئی۔ اس کام میں اتنی بھرتی دیکھا کہ اس نے گویا غور توں کی روایت کو توڑ دیا تھا۔

میں اس وقت اسی بالکنی میں جتن کے پیچھے کھڑا تھا جہاں سے میں نے کچھ دن پہلے جانو اور تھیو خان وغیرہ کی آمد کا نظارہ کیا تھا۔ مجھے یقین کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان لوگوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب یہاں میرا کام بھی ختم ہو چکا تھا۔ قدرت مجھ سے جو کام لینا چاہتی تھی، لے چکی تھی۔ اب مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے پولیس کی نظر میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے میرے لیے الجھنیں کمزری ہو سکتی تھیں اور میرے یہاں سے نکلنے کے پروگرام میں تاخیر ہو سکتی تھی۔

ذرا تازہ مجھے تنگ سے انداز میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ میں نے داخل اس کے صوفے کے سارے کونے کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے میرے رخصت ہونے کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔ میں پولیس کے چیکروں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں ظاہر شہ سے رخصت ہو جاتا ہوں۔ آپ جس طرح مناسب سمجھیں پولیس کو کمانڈی سنا دیجئے گا۔“

تہدید بولا۔ اس وقت تک وہ طویل و عریض احاطے کے وسط میں پکا تھا۔

”میں اس وقت خود اپنے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں جاسکتا۔“ میں نے لٹری سانس لے کر کہا۔ درحقیقت میں اس کی کسی صورت حال کے اندیشے کی وجہ سے یہاں مزید نہیں جاسکتا تھا لیکن اس قسم کی صورت حال پھر بھی میرے سامنے آئی تھی۔

”میں ہر حال میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ وہ صلی انسانوں کے سے انداز میں بولا۔ معلوم نہیں وہ اکیلا کس چکر میں کی طرف نکل آیا تھا۔ باقی پولیس والے شاید ابھی باغ اور گاؤں میں ہی اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رحیم گل ان کے ساتھ نہیں بلکہ الگ ہی اپنے طور پر آیا ہو۔ احاطے میں اس وقت بھی کئی لاشیں پڑی تھیں اور رحیم گل کے تیرے کچھ ایسے تھے جیسے وہ ان میں ایک اور لاش کا اضافہ کرنا چاہتا ہو۔

”آخر تم کیوں مجھے ساتھ لے جانے پر تے ہوئے ہو؟“ میں نے ملائمت سے پوچھا۔

”کیونکہ تم ایک خطرناک مجرم ہو۔ قتل اور ڈکیتی کی کئی وارداتوں میں مجھے مطلوب ہو۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔

”تمہیں یا قانون کو؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ بولا۔ حالانکہ اس بدبخت کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے باوجود وہ جانے کیوں اپنے خیال پر اڑا ہوا تھا۔

”میں مجرم نہیں ہوں۔۔۔۔۔ نہ ہی میں نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے اور نہ ہی میں نے کوئی ڈاکا والا ہے۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”مجھے جانے دو۔“

”اگر یہ باتیں اتنی ہی آسانی اور سادگی سے طے ہو جاتا کرتا تو پھر پولیس اور عدالتوں وغیرہ کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ استہزاء لہجے میں بولا۔

”تمہیں یقین ہے کہ میں ایک خطرناک مجرم ہوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ بڑبڑایا۔ ”میرے یقین کو چھوڑو۔ فیصلہ عدالت میں ہوگا۔ میرا نام جس میں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرتا ہے۔ واقعاتی اور گواہی شہادتیں تمہارے خلاف ہیں۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”بعض اوقات انسان کی آنکھیں اسے دھوکا دیتی ہیں اور تم بھی ہر حال ایک انسان ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ وقت ضرور ملے گا لیکن حقائق ہر حال تمہارے علم میں آجائیں گے۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ میں یہاں اکیلا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔“ میں نے چلنے کے لیے قدم بڑھایا۔ میری نظر اس کی اس انگلی پر جمی ہوئی تھی جو زمین پر تھا۔ ”مگر پھر اس کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔“

کون سا جواز سے سفر کرتا ہے اور نائیو اشار ہوٹلوں میں ٹھہرتا ہے۔ میں تو آج کل صحیح معنوں میں حوامی زندگی گزار رہا ہوں اور لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ مجھے تو پانچ دس ہزار روپے دے دیجئے۔ میرے لیے بہت ہوگا۔ کافی دن عیش و عشرت سے گزر جائیں گے۔“

”مذاق مت کرو۔“ مجھے معلوم ہے یہ رقم تمہارے لیے نہایت معمولی ہے لیکن تم اسے بوجھ سمجھ کر قبول نہیں کر رہے۔ خدا کے لیے اسے بوجھ مت سمجھو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم خود مجھ پر کتنے بڑے احسانات کا بوجھ چھوڑ چکا ہے ہو۔“ وہ منجید کی تے بولی۔

”میں نے اگر کوئی اچھا کام کیا ہے تو اسے خود پر احسان مت سمجھیں۔ یہ سب کچھ بس خود بخود ہوتا چلا گیا۔ جہاں تک رقم کا تعلق ہے تو ان دنوں میرے لیے بڑی سے بڑی رقم بھی جھری ہو کر رہ گئی ہے۔ میں جن حالات سے گزر رہا ہوں ان میں کئی بار مجھے احساس ہوا کہ بعض اوقات فلوں کی گڈیاں انسان کے لیے ترقی کاغذ کے پر زوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔۔۔۔۔“ میں نے کہا تاہم اس کے اصرار پر مجھے وہ گڈی اپنی واسٹ کی جیب میں رکھنا پڑی۔

”میں نے ملازمہ کی زبانی پیغام بھجوایا ہے۔۔۔۔۔“ ذرا تاج بولی۔ ”خوبی کے بارڈر میسر آپکا ہوگا۔ وہ مجھ میں تمہیں بس اڑے تک لے جائے گا۔ بس سے تم ڈہری چلے جانا اور وہاں سے کراچی جانے کے لیے کوئی بھی ٹرین پکڑ لینا۔“

”میں آپ کی عنایت کو بیش یاد رکھوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر کب ملاقات ہونے کی امید رکھی جائے؟“ اس نے منہ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اس کے لیے میں انسر دہی کی جھلک محسوس کی۔

”زندگی رہے تو ملاقات کی امید رہتی ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ اس نے شکوہ نہیں کیا کہ میں نے اسے اپنا کوئی ایڈریس نہیں دیا تھا۔ اس نے لگا بھی نہیں تھا۔ اوہرا نا تھی اور اوہرا ایک بے وجہ سی احتیاط۔

میں نیچے گیا ابھی تک گیٹ پر گاڑ ڈرائیو بیٹھ کر واپس نہیں آسکے تھے اور گیٹ کھلا ہی تھا۔ میں خوبلی کی باگلی کے نیچے سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دو تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک بادری پولیس والا اچھا پھاٹ آئیر سے انداز میں اندر داخل ہوا۔ کسی طرف سے ایک ملازمہ اسے روکنے کے لیے آگے بڑھی لیکن اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔

ایک لمحے کے لیے ہم دونوں ساکت رہ گئے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ اینکڑ رحیم گل تھا اور خوبلی کی طرف جانبا نہاسی کیا تھا۔ نہایت پھرتی سے اس نے دو اور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ میں اس وقت بالکل منت تھا۔ میں نے پلٹ کر بھاگنے یا اوہرا دھر ہونے کی کوشش نہیں کی۔

”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ رحیم گل نے بازو بچھا کر راستہ روک لیا۔ ذرتاج نے دوسرا فائر کیا۔ اس کی ٹپلی جاگری۔ ذرتاج سولہ بیس میں بولی۔ "میں اس ٹپلی کی توہین نہیں چاہتی تھی لیکن تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ دوسری گولی اسی ایک انچ نیچے بھی آسکتی ہے۔"

رحیم گل اپنی جگہ ساکت ہو گیا لیکن اسی بے خوف لے بولا۔ "آپ سرکاری کام میں مداخلت اور ایک پولیس اہل قاتلانہ حملے کی سرکوب ہو رہی ہیں ریڈیائی! آپ کو اس کے سامنا کرنا ہو گا۔"

"میں اپنی نرم مزاجی کو بالائے طاق رکھتے پر مجبور ہو گیا۔ انپیکٹر! اب میں بھی تیار ہوں اور تم بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار کہ کس کو کتنے حجاج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" ذرتاج کے لیے پہلی بار میں نے فواد کی سی سختی محسوس کی۔ پھر وہ مجھ سے ہٹا ہوئی۔ "تم ناواضل خان! میں اور رحیم گل ایک دوسرے بننے نہیں گئے۔"

رحیم گل قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ریڈیائی! اب مجھے مجھے گولی مار دو۔ میں غالی ہاتھ ہی اس شخص کو روکنے کی کوشش کروں گا۔"

"تم افضل خان کو روکو گے؟" ذرتاج نے استہزائیہ سا لگایا۔ "یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے رحیم گل! یہ بالکل باہر ہے جیسے کوئی بچہ کسی بچہ سے ہونے والی باتیں کرے گا۔ اگر تمہیں راستہ روکنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ان ڈاکو اور بدشت گردوں کا راستہ روکا ہوتا جتنوں نے پچھلی رات ذرتاج پر دھاوا بولا تھا۔"

"اگر مجھے بروقت اطلاع مل جاتی تو میں ان کا راستہ روکنے کو شش بھی ضرور کرتا۔" رحیم گل نے ذرتاج سے یہی کہا کہ طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس کو بھی ڈاکو ہی سمجھتا ہوں۔"

"اس وقت مجھے تم میں اور عام سے پولیس والوں میں فرق نظر نہیں آ رہا۔" ذرتاج نے حاسنہ سے لہجے میں کہا۔

رحیم گل کو نہیں معلوم تھا کہ دو گراؤنی افراد اس کے ذہن میں بیچ چکے تھے۔ وہ دے قدموں آگے بڑھے اور غالباً ذرتاج اشارہ پا کر انہوں نے اچانک رحیم گل کو روک لیا۔ انہوں نے گل کے دونوں بازو اور گردن قابو میں کر لی۔ وہ کھٹی کھٹی آواز میں چیخا رہا اور اپنے موقوف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

میں نے پلٹ کر اشارے سے ذرتاج کا شکریہ ادا کیا اور رحیم گل بڑے پیار سے خدا حافظ کہہ کر نکل آیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس سے اچھی طرح نمٹ لے گی۔ وہ اپنی طاقت استعمال کیا کرتا تھا۔ اب اس کے لیے اس قسم کے مسائل کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

اچانک ایک ناز ہوا۔ مجھے جھٹکا سا لگ گیا لیکن پھر احساس ہوا کہ گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ ناز رحیم گل نے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ سے تو دیوار نکل کر دور جا کر اٹھا۔ میں نے گردن ہٹا کر دیکھا۔ بالکونی کی بجلی اٹھی ہوئی تھی۔ ذرتاج رات نکل لیے بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کے نشانے کی داود بے بقدر نہ رہ سکا۔ رحیم گل بھی اپنے غالی ہاتھ کی طرف اور بھی ذرتاج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کا ہاتھ ذہنی نہیں ہوا تھا۔

"میں جانے دو رحیم گل! ذرتاج بلند لیکن چرسکون آواز میں بولی۔ "یہ تمہارا مطلوبہ آدمی نہیں ہے۔ اس نے تو اتنا تمہاری جان بچائی تھی۔ یہ اتنا رکا تیدی ہے۔ اس نے بڑے افسانوی انداز میں کسی کے لیے اپنا رکنے کی کوشش کی تھی اور تمہاری نظر میں مجرم بن گیا۔ میں تمہیں اس کی پوری کمائی سادوں کی لیکن فی الحال اسے جانے دو۔"

"کمائیاں بعد میں ملتی جاتی رہیں گی اور ان کی حقیقت کا بھی پتہ چل جائے گا لیکن فی الحال میں اس کو گرفتار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" رحیم گل بلند آواز میں بولا۔ وہ اپنی شد پر قائم تھا۔ اس سے جو کہ کہا جا رہا تھا، ذکر وہ کسی حد تک اس کی صداقت کا قائل تھا تب بھی کارروائی وہ اپنی مرضی کے مطابق ہی کرنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کسے مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ قانون کو اپنی انا کو یا اپنی فکری طبیعت کو؟

"اسے خواہ مخواہ اپنی انا کا مسئلہ مت بناؤ رحیم گل! میرا ہمان جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دو۔ یہ تو تم پولیس والوں پر بھی بہت سے احسانات کر کے جا رہا ہے۔ تمہارے مجھے کا بہت سا کام نشتا کر جا رہا ہے جو شاید تم جیسے بہت سے آفیسرل کرڈنگ بھر میں بھی نہ نشتا پاتے۔" ذرتاج جذبات میں آکر ایسی بات کر گئی جو میرے خیال میں غیر ضروری ہی تھی۔

رحیم گل چونکا۔ اسے یقیناً یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہو گا کہ گزشتہ رات ذرتاج گھر میں کسی خونخیزی ہوئی تھی۔ یہ ذرتاج گھروالوں کی خوش قسمتی تھی کہ خون ڈاکوؤں کا بھارتا تھا۔ اگر ڈاکو اپنی حرکت عملی میں کامیاب ہو جاتے تو صورت حال اس کے بالکل الٹ ہوئی۔ گاؤں والوں کا تو صرف جانی ہی نہیں مالی نقصان بھی بے اندازہ ہو سکتا۔ جانے کتنے گھروں کو آگ لگتی اور کیا کچھ اڑتا۔

رحیم گل سر کو خفیف سی حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "اس صورت حال میں تو اس شخص کا میاں رکنا اور بھی ضروری ہے۔ ہمیں اس سے بہت کچھ پوچھنا ہو گا۔"

"نہیں جو کچھ پوچھنا ہو گا وہ مجھ سے پوچھ لیا۔ میں جواب دوں گی۔ اس کے بعد مجھے بھی پولیس کے مجھے سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔ ہو سکے تو تم بھی ان کے جواب دینے کی کوشش کرو۔" ذرتاج بولی۔



کو کسی جواز سے مطمئن کرتے ہوئے جیسی اشارت کی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔  
ہوٹل کے دروازے پر اتر کر میں نے اسے بھاری شپ دی تو اس کی باجیس کھل گئیں اور اسے شاید اطمینان بھی ہو گیا کہ مسافر خواہ "پینڈو" اور بد حال تھا مگر اس کے پاس رویہا بہر حال موجود تھا۔

ہوٹل کا دربان جو ہر آتے جاتے کو دیکھ کر باجیس پھیلا کر دروازہ کھولتا تھا مجھے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر گویا شش و پنج میں پڑ گیا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ میں نے اس کی ابھین دور کر دی اور خود ہی دروازہ کھول کر اندر جا پہنچا۔

فائبر اشار ہوٹل میں عموماً رات کو دن سے زیادہ رونق ہوتی ہے لیکن اس رات وہاں خاص رونق نظر نہیں آ رہی تھی۔ لابی اور لاؤنج خالی پڑا تھا۔ دائیں ہاتھ پر کانی بار میں بھی صرف دو تین نوجوان جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ریسپشن پر صرف ایک سی کلرک موجود تھا اور وہ بھی اونگھ رہا تھا۔

میری آہستہ سن کر اس نے سر اٹھایا اور ذرا چونک کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک مفلوک الحال، میلا پھیلا، وسعتی سا شخص منہ اٹھائے فائبر اشار ہوٹل میں کیوں گھسنا چلا آ رہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے یہ بتائے کی کوشش کرنا کہ یہ میلا پھیلا، وسعتی سا شخص اس ہوٹل کا مالک ہے تو شاید وہ اسے ایک پچھانہ مذاق سمجھتا۔ دیے بھی وہ مجھے کوئی نیا ہی رہی سپشنٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سامنے تو اگر میں "سچ" ملنے میں بھی جاتا تو اس کے لیے اجنبی ہوتا۔ بلکہ ایک اسی پر کیا موقوف ہوٹل کا بیشتر عملہ مجھے صورت سے نہیں پہچانتا تھا۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر جب میں نے ہوٹل میں قیام کا ارادہ ظاہر کیا اور اپنے لیے ایک گھڑی سوئٹ طلب کیا تو استقبال کلرک کچھ پریشان ہو گیا۔ شاید وہ مجھے سوئٹ تو کیا، مسئلہ کرا بھی دینے سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ایسا کرے۔ محض ظاہری چٹکے کی بنیاد پر کسی کو کمرہ دینے سے انکار کرنا ہوٹلوں کی دیوانیات کے خلاف تھا۔

اس نے بابل خراست کا دروازہ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے جان بوجہ کر نہایت کم پڑے لکھے افراد کی طرح اس سے پوچھ پوچھ کر اسے اُردو میں پڑ کرنا شروع کیا۔ خانہ پڑی مکمل کر کے میں نے اس طرح گہری سانس لی گویا کوئی بہت تنگیں مرحلہ سر کر رہا ہو۔ پھر میں نے چاروں طرف سرگھما کر چمکتے دسکے دروازے، جھللاتے فرش اور جھنگاتے فانوسوں کا جائزہ لیا اور کچھ مرحومیت، کچھ طماعت سے سر ہلایا گویا میں اپنے خوابوں کی سرزمین پر پہنچ گیا تھا۔ استقبال کلرک نے غالباً مجھے مزید مرحومیت کہنے کے لیے انگریزی میں پوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی سامان دنیو نہیں ہے؟"

جوابی کے باہر دیا ر کی اوٹ میں ذرا تھوڑا بھروسہ لے کھڑا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ دیر کے سفر کے بعد ہم اس مرکز آتے پہنچے جو آگے جا کر ہائی وے سے ملتی تھی۔ جب تک بس نہیں آئی اور ذرا تھوڑے سے اسے روک کر مجھے اس میں سیٹ نہیں دلا دی جب تک وہ جیس کھڑا رہا۔

بس سے میں ڈھیر کی پچھانہ ڈھیر کی کے ریلوے اسٹیشن پر مجھے دو بھائی لگنے انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر ایک ٹرین آئی جو کراچی جاتی تھی لیکن اس کی وہی حالت تھی جو عموماً ہمارے ہاں ٹرینوں کی ہوتی ہے۔ کہیں مسافر ایک دوسرے سے گھٹم گھٹاتے اور کہیں سامان سے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چڑھنے والے کون تھے اور اترنے والے کون۔ جو لوگ ٹرین کے اندر تھے ان میں سے بیشتر کی کوشش تھی کہ کوئی سوار نہ ہونے پائے۔ انہوں نے دروازے بند کر کے تھے کیونکہ اندر بھل دھرنے کو چھ نہیں تھی۔

بالآخر میں نے ریلوے کے ایک "اعلا افسر" یعنی قلی کی خدمات حاصل کیں جس نے معتقل "حق اللحد مت" کے عوض مجھے ان مسائل سے نجات دلائی اور پلیس میں ایک سیٹ سیار کی۔ ٹرین چلتے چلتے تک میں چونکنا ہی رہا لیکن مجھے اسٹیشن پر کوئی بھی عام شخص یا پولیس والا آبیاد دکھائی نہیں دیا جس کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا کہ وہ میرے قاتل میں وہاں آیا ہوگا۔ ٹرین چل پڑی تو میں ذرا بے فکر ہو کر اپنی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ گزشتہ شام سے میں مسلسل مسرکہ آرائی میں لکھنا ہوا تھا۔ اب حالت سفر میں آرام میسر آیا تھا۔

میری دجہ سے اس روز تمام ٹرینیں بہت تاخیر سے کراچی پہنچ رہی تھیں۔ میں جس ٹرین میں تھا وہ بھی اپنے اصل وقت سے کہیں بعد میں رات گئے کراچی پہنچی۔ اس وقت تک میرا محلیہ دروازہ بہت خراب ہو چکا تھا۔ شیو تو پیلے ہی بڑھی ہوئی تھی جو تقریباً داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بال منشر تھے اور مٹی میں اُٹے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران شلوار قمیض میں بری طرح شکنیں پڑ چکی تھیں اور راستے میں اس قدر مٹی اور گری تھی کہ وہ کپڑے ایک ادھیلے کے پنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پلٹ فارم پر اترنے کے بعد سوچنا شروع کر دیا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اس سے پہلے میں نے اس موضوع پر غور کرنے کی اہمیت نہیں کی تھی۔ میں نے چند ہی لمحوں میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے ایک عام کوئی کی حیثیت سے اپنے ہی فائبر اشار ہوٹل میں چلے جانا چاہیے۔

باہر مگر جیسی میں چمک کر جب میں نے ذرا تھوڑا کو مطلوب ہوٹل چلنے کے لیے کہا تو اس نے مڑ کر ذرا غور سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے سے ایک پریشان حال اور بے سوسامان وسعتی نظر آئے والا شخص فائبر اشار ہوٹل کا مسافر کس لیے کر رہا ہے؟ پھر اسی نے گویا دل ہی دل میں اپنے آپ

اس کے لیے میں بظاہر ملائمت تھی لیکن درحقیقت اس کا لہجہ گھٹتا ہوا سا تھا۔

”ہیں جی... کیا فرمایا؟“ میں نے ہونٹوں کی طرح پوچھا۔ حالانکہ میرا اس قسم کی اداکاری کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس صورت حال سے میں خواہ مخواہ ہی کچھ لطف اندوز ہونے لگا تھا اور میں نے ان کی توقعات کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

”میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کچھ مسلمان وغیرہ نہیں ہے؟“ کلرک نے اپنے سوال کا ترجمہ کیا۔

”مسلمان...؟“ میں نے اپنے اورد گرد دیکھا مگر اس سے پہلے میں نے اپنی پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ میرے پاس کچھ مسلمان بھی ہونا چاہیے تھا۔ ”مسلمان فی الحال تو نہیں ہے جی... لیکن یہ کون سا مسئلہ ہے... مسلمان بھی آجائے گا۔“

میں نے لفٹ کی طرف سے ایک دو از قد سفید نام غیر ملکی کو کاؤنٹر کی طرف آتے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے ذراے کو طول نہیں دینا چاہیے۔ کہیں خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول ہونے لگے۔ پہلے ہی ایک دیگر ایک طرف دیوار کے سارے کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”آپ کب تک ٹھہرس گئے؟“ کلرک نے کارڈ کے اندر راجات میں اس سوال کا جواب لکھا ہونے کے باوجود مجھ سے پوچھا۔ شاید دل ہی دل میں وہ دعا گو تھا کہ میرا قیام مختصر سے مختصر ہو۔ غیر ملکی اپنے کمرے کی چابی کلرک کو دے کر دواڑے کی طرف بڑھ چکا تو میں نے کہا۔ ”بہت دس دن... اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی...“ میں نے محسوس کیا کہ غیر ملکی نے بھی جاتے جاتے مگر کرایہ نظر میری طرف دیکھا تھا۔

کلرک کچھ اچکچاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو کم از کم پچیس ہزار روپے ایڈوانس جمع کرانے ہوں گے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ قایمہ اشار ہوٹلوں کی روایات سے انحراف کر رہا تھا اور ریلوے اسٹیشن یا لامری اڈے پر واقع ہوٹلوں کی طرح ایڈوانس مانگ رہا تھا حالانکہ قایمہ اشار ہوٹلوں میں اپنے معزز گاہکوں پر اعتبار کرنے کا ”مرکب“ لیا جاتا ہے۔ انہیں زیادہ تر مسافروں کے ساتھ میزبان کی اعلیٰ ترین روایات کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے لیکن کلرک یقیناً مجھے ذرا الگ ہی ”کیس“ سمجھ کر ڈیول کر رہا تھا۔

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر پچیس ہزار گن کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ تب اس نے کچھ اطمینان کی سانس لی اور غائب یقین کر لیا کہ میرا حلیہ خواہ کیسا ہی سکی لیکن میں نکال نہیں ہوتا۔

اس نے اشارت سے دھڑک بایا اور چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”مہاجر کی اوپر پوچھاؤ۔“

وہ مجھے ادا نکلی کر گئے دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ نیم دل

سے میرے ساتھ روانہ ہوا۔ لفٹ میں بھی میں رہا تھا۔ حیران سا ہو کر اُدھر دیکھتا رہا گویا پہلی بار لفٹ میں سوار حالانکہ میں مزید اداکاری کا ارادہ ترک کر چکا تھا لیکن یہ کیوں مجھے دیکھ کر عجیب سی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پھر رہا سا رہا تھا۔

پانچویں منزل پر مجھے گھڑی سوئٹ میں پہنچا کر اس میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے مجھے سمجھا۔ کوشش کی کہ کسی چیز کو کس طرح استعمال کرنا ہوگا؟ فون سروس والوں سے کس طرح رابطہ کرنا ہوگا... دیکھو دیکھو میں آنکھیں پھیلانے، سر ہلاتے ہوئے گویا اس کی باتیں نشین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے نہایت مؤدبانہ انداز میں سو روپے ٹپ پیش کی تب اس کا خاصا بدلہ گیا۔ اس کی پیشانی سے ٹکٹیں دور ہو گئیں اور ام لہجے میں جو چلی سی کات تھی وہ معدوم ہو گئی۔ وہ کافی مؤدبہ آنے لگا۔ مجھے میں دافقی برا جا رہا ہے۔

وہ رخصت ہو چکا تو میں نے چند سیکنڈ بعد دواڑے کی آہنی سے آنکھ لگا کر باہر دیکھا۔ میرا سوئٹ لفٹ کے قریب تو دیکھ ابھی لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسی اثنا میں دوسری سے ایک اور دیکھنے پر ہاتھ پر اٹھائے آگیا۔ دونوں ہاتھ لگے میرے کمرے سے نکلے والا دیکھ نوجوان تھا۔ دوسرا دیکھ کا تھا۔ نوجوان دیکھ باہر میرے ہی کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی بارے میں بات کر رہا تھا لیکن ساڈھ پروف ہونے کی وجہ سے آواز اندر نہیں آتی تھی۔ نے بے آواز طریقے سے دواڑہ نہایت ذرا سا کھول کر اس کاں لگایا تو آواز میں سنائی دینے لگیں۔

نوجوان دیکھ رہا تھا۔ ”... اللہ کی شان ہے ایسے لوگ قایمہ اشار ہوٹلوں میں آنے لگے ہیں۔ بس اب میں قیام پناہیں کہ کیسا عجیب تھا... بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کچھ کھیتوں میں کام کرتے کرتے یکدم منہ اٹھا کر دھڑکنا ہو...“

پھر ذرا رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”لیکن یار ایسے اس پاس ضرور ہیں۔ کھلے دل سے خراج کر رہا ہے۔“

”کوئی نو دودھ لیا ہوگا۔“ بڑی عمر کے دیکھنے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”لیکن نو دودھ لیتے تو پناہ علیہ وغیرہ اچھے سے اچھا بنا کر کھانا کوشش کرتے ہیں۔“ نوجوان دیکھ بولا۔ ”یہ آدمی تو سنائی میں ہوا تھا... کھڑے پڑے پڑے... کچھ خاک پڑی ہوئی تھی... شاید بے ہمارے کو منہ دیکھنے بھی دیکھتے ہیں مگر نہ دیکھتے ہیں۔“

”تو پھر کس کوئی دیکھ نہ ہو۔“ بڑی عمر کا دیکھ بولا۔ ”لیکن یہی نام...“

کی اور نہ ہی اپنا نام بتایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شہر میں کوئی بھی میری موجودگی سے آگاہ ہو۔ میرے لئے یہ اطلاع ذرا تشویشناک تھی کہ شیخ شاہ وغیرہ ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آئے تھے اور نہ ہی وہاں ان کا کچھ پتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے براہ راست لاہور فون بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے آپرٹر کے توسط سے لاہور کے چند نمبروں پر بات کرنے کی کوشش کی۔ یہ نمبر ٹونی راجیلہ اور شیخ وغیرہ کے تھے۔ آپرٹر بے چارے نے اپنی ہی بات کو شش کی لیکن ہر نمبر پر بار کو شش کے باوجود کامیابی نہ ہوئی اور وہ بھی جواب دہ نہ رہا۔ آخر دسپانس سر!

میرے حواس میں کچھ لٹریک سی آن ہوئی اور میں رہنچور رک کر چتر لے کے لیے سائیکل بیٹھا گیا۔ میں فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے لاہور جانا چاہیے یا نہیں؟ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اعصاب پر کچھ سستی سی چھا رہی تھی۔ جنگلوں اور دیہات میں مارا مارا پھرنے کے دوران میں شکار پر نکلے ہوئے دو بدمعاش کی طرح چاق و چوبند اور مستعد رہا تھا لیکن شہر کی پرفیش رہائش نے مجھے فوراً ہی سست کر دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں یہ سوچے بغیر نہ سکا کہ یہ محبتات یہ طرز زندگی میرے لیے یا تو نہیں تھا۔ میں تو برسوں سے ان کا عادی تھا اور میں نے بھی اپنے آپ کو اس طرح سست محسوس نہیں کیا تھا۔ کہیں یہ ماقبیلوں سے رابطہ نہ ہو سکے گا اثر تو نہیں تھا؟ شاید یہ میرے لیے ایک ایسی بری خبر تھی جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے تو میں نے پیش یہی محسوس کیا تھا کہ میں بحران کا آری تھا یعنی بحران کے دوران میں زیادہ مستعد رہتا تھا اور میری صلاحیتیں زیادہ ابھر کر سامنے آتی تھیں۔ میں اپنے آپ کو زیادہ پُر اعتماد محسوس کرتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں بد خبری کے آثار محسوس کرتے ہی میرے اعصاب پر شکن سی سوار ہو گئی تھی۔

میں نے دوام سروس کو فون پر بلک کافی کا آمڑا روا اور کمرے میں ٹپکنے لگا۔ ہمارے کچھ غیر کاروباری سے ٹھکانے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بذات خود ان ٹھکانوں پر جا کر اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ میری اسی اوجیز بنی کے دوران دفتر کالی نے کر لیا۔ یہ وہ دفتر نہیں تھا جو گزشتہ رات مجھے کمرے میں چھوڑ گیا تھا لیکن یہ بھی عجیب مجھے برے حال میں دیکھ چکا تھا اس لیے اس وقت دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ سکا بلکہ پہلے تو وہ مجھے اس سوئٹ میں ٹھہرے ہوئے شخص کا کوئی علاقائی سمجھا۔

مجھے بیان لینے کے بعد اس نے حرف خوشگوار سی حیرت کا اظہار کیا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے اندر اذوا اذوار کی دلچسپی میں وہیوں کی نظر میں آ رہا تھا۔ مجھے اس حد تک بھی کسی کی نظر میں آنے سے بچنا چاہیے

اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ خیر۔ ڈاکو بھی تو نہیں کیا۔ ان معاملات کو ہوٹل والے جانیں۔ ہمیں تو ہماری پہلی رہتی چاہیے۔ ہمارے لیے تو وہی اچھا آدمی ہے جو ہمیں ہمارے۔ اور دل کھل کر دے۔

اسی دوران لفٹ اٹھی اور وہ دونوں اس میں کھس گئے۔ میں ایک لمبی سانس لے کر واپس آیا اور بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں ایک بچا خاصا طویل عرصہ جنگلوں بیابانوں میں جن قسم کی صعوبتیں فٹائے گزار کر آیا تھا اس کے بعد قانع اشار ہوٹل کے گلزدری دہک کی آرام دہ اور پرفیش چیزیں عجیب لگ رہی تھیں لیکن مجھے اس محل سے مانوس ہونے میں دیر نہ لگی اور چند لمحے بعد ہی میں سب کچھ بھول بھال کر کھوڑے چ کر سو گیا۔

دوسری صبح میں نے ڈن کرنا شروع کرنے کے بعد اپنی حالت ایک کرنے کی قسم شروع کی۔ سب سے پہلے کلنٹن جاکر ایک فیشن بیل ٹاپنگ سینٹر سے اپنے لیے کچھ ڈھنگ کے کپڑے خریدے پھر ہوٹل کی بار ٹاپ میں شیو بوائے پال ترشائے اور ایک نہایت طویل پڑا ہوا جام شل کے بعد بے لباس میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو تین محسوس ہوا جیسے میں نے ایک نیا جنم لیا ہو۔ مجھے کچھ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی شہر واپس پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنے لیے ایک سیاہ چشمہ اور خوب صورت مائلیٹ بیٹ بھی لے آیا تھا۔

میں نے اپنی شخصیت میں ان دونوں چیزوں کا اضافہ کر کے نئے سرے سے اپنا جائزہ لیا۔ بعض انگریزی فٹوں میں ذرا بارعب قسم کے کردہ بازیائے ٹائٹ کیلیوں کے جو ان مضبوط قسم کے بالک دکھائے جاتے ہیں، میں کچھ اسی قسم کی چیز دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اس قسم کی اڑاے بازی سے بدمعاشی محسوس ہوتی تھی لیکن فی الحال اس طرح کے چھوٹے موٹے سمارے لیے رکنا بہتر تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل میں کوئی مجھے پہچانے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والوں کو جس اسٹاف سے زیادہ تر واسطہ پڑتا ہے یا سامنا ہوتا رہتا ہے وہ لوگ تو دیے بھی مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ میرے لیے بھی بیشتر شکلیں انجینیئر تھیں۔ خاص خاص عہدوں پر کام کرنے والے لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ ان سے سامنا ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ ہوٹل کے گاؤں میں میں نے اپنا نام ایم۔ ایف خان درج کر لیا تھا۔ وہاں باہر نکلنے سے پہلے میں نے ٹیلی فون پر راپٹوں کی کوششیں شروع کیں۔ میں نے اپنے مقامی آفس فون کیا اور شیخ شاہ وغیرہ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ پتا چلا کہ وہ لاہور ہی میں تھے ابھی تک واپس نہیں آئے تھے لیکن لاہور میں بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسی کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

کراچی آفس میں صرف چھوٹی سا مٹی "دی سرکل" میں شامل تھے۔ پانی دفتر میں کام کرتے نہ ملنے عام سے لوگ تھے۔ انہیں "دی سرکل" یا ہماری چند کھرباری خبریاتیات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس لئے میں نے انہیں مزید کرینے کی کوشش نہیں

تھا۔

گرم گرم کافی قلع سے اُتری تو وہیں کی رخ بنگلی کچھ کم ہوئی۔ میں کسی فیصلے پر توجہ نہ دیتے تھے بلکہ اپنے سوخت سے ضرور نکل کھڑا ہوا۔ مجھے گھرے میں بیٹھے بیٹھے کچھ وحشت سی ہونے لگی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ان خشک ہواؤں اور بند کمروں سے نکل کر سوچ بچار کرنا چاہیے۔

میں سوخت سے نکل کر لٹ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک کونے سے دادو چوہدری برآمد ہوا۔ وہ میرے ہوٹل کا سیکرٹری انچارج تھا۔ اس وقت وہ غالباً غیر محسوس سے انداز میں گفت پر تھا۔ میں نے جلدی سے منہ پھرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

”سرا! آپ یہاں؟“ وہ تجزی سے میری طرف لپکا۔ میں نے ہوٹلوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جب وہ قریب آگیا تو نہایت ہنجی آواز میں کہا۔ ”مجھے اصل نام سے مخاطب کرنے اور زیادہ منسوب نظر آنے کی ضرورت نہیں۔ محض رسمی سالا قاتی نظر آنے کی کوشش کرو۔ مجھے صرف خان صاحب کے نام سے مخاطب کر سکتے ہو۔“

”کیوں سر؟“ غیرت تو ہے؟“ وہ ذرا چونکا پھر اس نے غیر ارادی طور پر یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے توقع ہو کہ ہمارا کوئی دشمن اس پاس ہی کھڑا ہوگا۔

”ہاں۔۔۔ یہ ظاہر خیریت ہی ہے۔۔۔ لیکن شاید کچھ اتنی خیریت بھی نہیں ہے۔“ میں نے ہمم نیچے میں کہا۔ ”میں یہاں ایک عام سمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”سر۔۔۔ اپنے ہی ہوٹل میں۔۔۔“ وہ بھلایا۔

میں نے سخت نظروں سے اسے گھورا۔ ”میں نے تمہیں احتیاط برتنے کی ہدایت کی تھی لیکن تم اس ہدایت پر بالکل عمل نہیں کر رہے۔“

”آئی ایم سوری سرا!“ اس نے جلدی سے اپنے تاثرات بدلنے کی کوشش کی۔

”میں نے“ سر“ وغیرہ سے بھی پرہیز کرنے کے لیے کہا ہے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”جی۔۔۔ خان صاحب۔“ وہ بھلایا۔ ”پھر بھی۔۔۔ آپ کچھ تو بتائیں۔ کیا چکر ہے؟ میرے لائق کوئی خدمت؟“ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے بازو کے دستے پر تھا۔

”نہیں۔۔۔ خدمت وغیرہ تو کچھ نہیں ہے۔ بس تم یہاں میری موجودگی کو راز رکھنے کی کوشش کرنا۔ خوش میں آکر اسٹاف کو مت بتانا کہ چوہدری صاحب یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ میں نے ہدایت کی۔

میں اسی لمحے تلفت ہمارے سامنے آکر رکی۔ کسی طلسمی دواؤں کے طرح غلاموٹھی سے دو فلپ ہات ایک دوسرے سے جدا

ہوئے اور ایک تھلاڑی اس چوکور قفس میں کھڑی دکھائی دیا۔ ایک لمبی لمبی ایسی سفید قام لڑکی تھی۔ سنہلی لڑکیوں کا وزر میں کر کے اپنے آپ کو ڈبلے پن کی اس سطح پر لے جا جہاں سے بدنامی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

وہ لڑکی ابھی اس سطح پر نہیں پہنچی تھی۔ اسے خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ وہ کسی تھیں مگر سونے سے نیوی بلو پڑوسے سے اسکرٹ میں تھی جو اس پر نہ جانے کیوں بہت فخریہ تھا۔ کے بال عجیب رنگ کے تھے چاندی اور سونے کا ملا جلا سار اور اس میں چمک آئینے جیسی تھی۔ ہونٹ بھرے بھرے رخساروں کی بنیاں کچھ زیادہ سی ابھری ہوئی تھیں۔

سب سے عجیب اس کی آنکھیں تھیں۔ پہلی نظر میں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کا کوئی رنگ ہی نہیں تھا۔ شے کی دو شفاف مصنوعی آنکھیں اس کے چہرے پر بڑی تھیں ذرا توجہ سے دیکھنے پر بتا چلا تھا کہ اس کی آنکھیں نمایاں اور شفاف نیلے رنگ کی تھیں۔ آئینی اور خوشاک جسم کی اگر قلموں میں بعض کروادوں کو ذرا ڈاؤن مائے کے لیے ان کی آنکھ کچھ اسی قسم کے رنگ کی دکھائی جاتی ہیں یا اچانک ان کی آنکھ کا رنگ تبدیل ہوتے دکھایا جاتا ہے۔

تاہم اس لڑکی کی شخصیت کا تاثر آسانی یا ایسا خطرہ نہ تھا۔ اس میں سر حال ایک خوش شکل لڑکی والی کشش موجود اور وہ لٹ کے تجھنی دوار سے چپک چپک بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے ایک نکل اپنی طرف دیکھتے پایا۔ وہ گویا بہت اٹھوٹی ہو گیا۔ لڑکی پلک جھپکاتے بغیر لٹ کے باہر اور چند قدم چل کر راداری میں دائیں طرف مڑ گئی۔

”یہ لڑکی کون تھی؟“ دادو چوہدری نے پوچھا۔

”معلوم نہیں سر۔۔۔“ اہوٹل کی کوئی گیسٹ ہوگی۔“ وہ

گڑبڑا کر بولا۔ ”معلومات کروں اس کے بارے میں؟“

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے خدا حافظ اور لٹ کے ذریعے نیچے آگیا۔ میں کچھ دیر ہوٹل کے آس پاس فٹ پاتھ پر ٹھٹھا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے مقابلے میں میرے ساتھیوں کی جدوجہد کس مرحلے میں تھی اور وہ خود کہا تھے لیکن مجھے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ شاید ریڈ ڈاٹ اب بھی کراچی اور لاہور میں ان تمام ٹھکانوں کی گھرائی کر رہی ہو جن سے برا تعلق تھا۔ گھرائی کرنے کا بھی ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ عجیب و غریب اور ناقابل یقین سے دساکل ان کے پاس موجود تھے۔ کچھ نہیں کہ جاسکتا تھا کہ کہاں سے کوئی بھی آگئے تھے دیکھ کر ہی ہو۔ میں ذرا ایسا جائزہ لینے کے لیے ہوٹل کے بیرون نکلا تھا کہ گرد و پیش کے بارے میں میرے محسوسات کیا کہتے ہیں۔

میں ٹھٹھا ہوا غلاموٹھی کے چلا گیا اور چند منٹ بعد لوٹ آیا۔ مجھے کسی گھڑی کا احساس ہی نہ ہوا۔ میری حیات میں کوئی پہلا

ہوئی آہم ذہن کے کسی تاریک گوشے میں اضطراب کی  
نہایت خفیف سی لہر کوٹیں لے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ  
کی ایک تبدیلی تھی۔ میں اندرون ملک کے جن دور آئندہ  
میں وقت گزار کر رہا تھا وہاں کم از کم ریڈ واٹ کی حد تک  
خطرے کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہاں خطرات کی نوعیت بدل  
گئی تھی۔ جن خطرات کا سامنا کرنا رہا تھا وہ مجھے زیادہ اہم  
نہیں ہوتے تھے لیکن ریڈ واٹ کی بات سمجھ اور تھی۔

کچھ دیر بعد میں ہوٹل واپس آگیا۔ گوکہ مجھے کسی گریڈ کا کوئی  
احساس نہیں ہوا تھا اس کے باوجود میں نے اپنے دو ایک  
لٹاکوں پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں ہوٹل کے کافی بار  
پا بجھا۔ کافی میں پی چکا تھا۔ اب طبیعت میں سستی اور  
نال نہیں تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے جس کا ارادہ کیا  
تو اخبار کی اوٹ سے غیر محسوس طور پر ارد گرد کا جائزہ لینے

ایک اخبار کے اوپر سے میری نظر انہی شفاف آنکھوں پر  
آئی۔ آئی سی آنکھوں والی وہ لڑکی ایک نیک میری ہی طرف دیکھ  
رہی تھی۔ مجھے یاد پڑا تھا کہ ایک لمحہ پہلے وہ اس کرسی پر موجود  
تھی اور چند منٹ پہلے میں نے اسے پانچویں منزل پر جاتے  
اٹھا۔ لیکن یہ خبر۔ یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ میں  
بہاؤدین ابھی اگر جیٹی ہو۔

میرا اس سے سامنا چند لمحوں کے لیے ہوا تھا لیکن میں نے  
بس کیا تھا کہ وہ شاید پگلیں بہت کم جھپکتی تھیں۔ اب اس کی  
پلکیں کے لیے میں نے بھی ایک ایک نیک اس کی طرف دیکھنا شروع  
کیا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر عام طور پر عوام بھی نظر اٹھالیتے تھے  
نہ اس نے نظر اٹھانا تو درکنار پلک تک نہیں جھپکی۔ اس کا  
از کچھ غیر فطری سا تھا۔ میری رگ دے میں ایک سروس لیڈر دوڑ  
بہ انتہائی بری شرت رکھنے والے کسی خطرناک اور بد شکل  
حاشی کو دیکھ کر بھی میرے جسم میں بھی اس طرح سرد لر نہیں  
ڈلی تھی۔ وہ تو ایک اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن گلتا  
بہ تھا کہ اس میں واقعی کوئی آئی سی خصوصیت موجود تھی۔  
ایک اس کے سامنے ایک دبیر آگیا۔ تب میں نے اس کی طرف  
نظر پھرایا۔ دبیر سمجھا اور اخبار کی اوٹ میں ہٹا لے لی۔

اس قسم کے وہوٹوں میں جس طبقے کی نشست در خواست ہوتی  
ہے اس میں کسی لڑکی سے تعارف حاصل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں  
رہتا۔ مگر تب بے غار سے ہاں بھی بہت سے خوبصورت اور  
نیز خلقتات با حیات ختم کر کے لے جاتے ہیں۔ دولت کی فراوانی نے ہمیں  
تھی رسم اور حدود و حدود سے بے نیاز کر دیا ہے۔ پھر وہ لڑکی تو  
پہلے ہی مفید ثابت ہوئی تھی۔ اس کی تہذیب و معاشرت میں تو کوئی  
کاوٹ ہی نہیں تھی۔ کوئی بھی اس کی میز پر جا کر اپنا تعارف کرا  
لیتا تھا اور اس کے تعارف کی فراوانی کر سکتا تھا۔ میں ایسا شرمیلا

بھی نہیں تھا کہ مجھے اس طبلے میں کوئی چھپکا ہوا ہو۔ اس کے  
باوجود میں اٹھ کر اس کی میز پر نہیں جا سکا۔ حالانکہ میرا دل چاہ رہا  
تھا مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔

چند لمبے بعد دوسرا دبیر میرے لیے جس لے کر آیا۔ میں نے  
اخبار چرے کے سامنے سے بنایا تو وہ لڑکی اس نشست سے عتاب  
رہی تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے 'غیر محسوس' سے انداز میں سر  
سمٹاتے ہوئے پورے کافی بار کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہ  
دی اور نہ ہی لاؤنچ وغیرہ کی طرف جاتی نظر آئی۔ میرے دل میں بے  
عنوان سی غلطی اور اضطراب کچھ بڑھ گیا۔ آہم بظاہر میں سکون  
سے بیٹھا ہوں کی چسکیاں لیتا رہا۔

وہ دن میں نے جوں توں ہوٹل میں گزارا۔ وہ لڑکی مجھے کافی بار  
میں نظر آنے کے بعد کہیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی کوئی خاص واقعہ  
پیش آیا۔ رات کو میں سونے کے لیے لیٹا۔ میرے دوہم دکان میں  
بھی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کو خواب میں دیکھوں گا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ نوکیلی اندری والے سینڈل پہنے  
میرے سینے پر گھڑی تھی اور اس کا وزن شاید کسی پہاڑ کے برابر تھا۔  
وہ کھانا گوشت پوست کی لڑکی نہیں کسی انتہائی ذہنی دھات سے بنا  
ہوا کوئی محسوس جسم تھا۔ میری سانس سینے میں ڈکی جاری تھی۔  
مجھے حیرت تھی کہ اس کے سینڈلوں کی نوکیلی ایڑیاں میرے سینے میں  
کیوں نہیں اترتی تھیں!

وہ سرور اٹھائے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور مجھے  
یوں لگ رہا تھا گویا وہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے میری طرف دیکھ  
رہی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا۔ اس کے باوجود اس کی شکل نہ  
جانے کیوں بہت خوفناک لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ  
میرے چہرے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ مخروٹوں انگلیوں والے  
یہ ہاتھ اس وقت نہ جانے کیوں عتاب کے پنجوں کی طرح بد صورت  
دکھائی دے رہے تھے اور ناخنوں کے زروں سے دودھیا دھواں مل  
کھانا نفا میں بلند ہو رہا تھا۔

ایک لڑکی نے کرسٹ اور راؤنی آواز میں ایک طویل تھپتھپ  
لگایا جس سے مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹنے محسوس ہوئے۔ بالکل  
کسی ہارم کا سا منظر تھا۔ اس تھپتھپ کی وجہ سے میری آنکھ کھلی  
گئی۔ خواب میں بھی انسان کو یہ احساس تو نہیں ہو سکتا کہ وہ خواب  
دیکھ رہا ہے۔ مجھے بھی یہ احساس نہیں تھا لیکن آنکھ کھلنے کے بعد  
بھی میرا یہ احساس برقرار رہا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سینے  
پر وہی لڑکی نظر آتی رہی جس کا وزن پہاڑ کے برابر محسوس ہو رہا  
تھا۔ گویا خواب کا تسلسل اسی کا نام تھا۔

میں نے اپنی تمام تر توانائی جمع کر کے ہلنے کی کوشش کی۔  
جو خنسی میں ذرا سا ہلنے میں کامیاب ہوا۔ خواب کا تسلسل ٹوٹ گیا۔  
لڑکی یک دم عتاب ہو گئی اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے  
ٹکلی اندر چرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھواں دیکھا۔ کمرے

میں میرے سوا کوئی نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایک عجیب سی بو کا احساس ہوا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ کمرے میں کوئی جیکس بھر رہی تھی اور اسی کی وجہ سے میرے حواس پر کھنکھاہٹ سی چھانے لگی تھی۔ اس اعتبار سے وہ ڈرائیو خراب میرے حق میں بہت اچھا ثابت ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ورنہ شاید میں سوئی ہو جاتا اور میری عارضی نیند ابدی نیند میں تبدیل ہو جاتی۔

میں نے فوراً سانس روک لیا۔ میں اسی روز بازار سے چھوٹا سا ایک ناسٹری بیگ لایا تھا۔ میں نے اسے بھی وہیں چھوڑ دیا۔ اپنی بیٹی ہوئی رقم اپنے اندر روٹی جیب میں ڈال لی۔ میں شب خوابی کا کوئی لباس اپنی شاپنگ کے دوران خرید کر نہیں لایا تھا اور خطرے کے لا شعوری سے احساس کے تحت پینٹ شرٹ میں ہی سوا تھا۔

سانس روکنے کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ پوگا کی مشقیں میرے بہت کام آتی تھیں۔ میں بہت دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ میں ممکن تھا کہ مجھے دوبارہ اس کمرے میں آنے کا موقع ملے اس لیے میں ذرا اطمینان سے اس پر الوداعی نظر ڈال کر دووازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت میرے ذہن پر نیند کا آثار اور گھیس کے اثرات کافی حد تک کم ہو چکے تھے۔ میں اپنے آپ کو چوکتا محسوس کر رہا تھا۔

جب دووازے پر پہنچ کر میں نے ٹاپ ہتھا کر دووازہ کھولنا چاہا تو میرا اطمینان رخصت ہو گیا۔ ٹاپ بالکل جام تھی اور ذرا بھی نہیں گھوم رہی تھی۔ دووازہ نیچے سے تقریباً آدھا ٹٹ تھا۔ شاید چابی کے سوراخ کے ذریعے ہی کمرے میں گیس بھری گئی تھی اور پھر اس میں کوئی خاص سیال داخل کر کے جام کھول گیا تھا۔ گویا میرے لیے ایک کشادہ "آرام دہیہ راستہ" آرام دہ قہر تار کھدی گئی تھی۔

ایچڑا ہوا اور وال ڈوال ڈوال کا بہت دالی تھر۔ اس قسم کی کسی کوشش کا مطلب یہی تھا کہ ریڈ وائٹ ابھی تک کراچی میں بھی میری تلاش کے سلسلے میں سرگرم تھی اور یہاں پہنچے ہی مجھے ان کی نظر میں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاہور میں شاید صورت حال اس سے زیادہ خراب ہو۔ میرے لیے یہی تشویش کچھ کم نہیں تھی کہ ریڈ وائٹ کا مسئلہ ابھی جوں کا توں برقرار تھا لیکن فی الحال کمرے سے نکلنے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک تھا۔

میں نے کافی پہچھے ہٹ کر دوڑ کر دووازے پر کھڑے سے فکر رسید کی۔ بجلی ہی دھمک کے ساتھ کمرے کی دیوار تک لڑ گئی لیکن دووازہ چول کا توں قائم رہا۔ دووازہ محسوس اور مضبوط تھا لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ اگر میں اس پر باہر سے ٹکر رسید کرنا تو صرف تالا ہی رکاوٹ ہوتا لیکن اب آنے کے ساتھ ساتھ پوری دی پر کھٹ بھی رکاوٹ تھی کیونکہ باہر کی طرف دووازہ اس میں پھنستا تھا۔

دوسری کمرے کے بعد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ یہ صرف آپ کو تھکانے والی بات تھی اور اس کوشش میں میرے سانس روکنا بہت مشکل ہوا جا رہا تھا۔ میں نے فون پر کمرے کے دروازے پر کھٹ کرنا چاہی لیکن فون ڈیٹ پر آ تھا۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی کیونکہ ہوش کے کمروں میں استعمال ہونے والے فون کی تاریں باہر تو نظر نہیں آتیں جنہیں کاٹ دیا جائے۔

اب میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ مجھ سے خوف نہیں آتا تھا۔ بے بسی میرے لیے موت سے بڑا خوفناک تھی۔ میں نے کسی کار آمد چیز کی تلاش میں کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میرے مطلب کی کوئی چیز نہیں مل سکی۔ میں ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب تھا لیکن آخر کب تک میرا ساتھ دے سکتی تھی۔

میں نے ایک سوہوم سی امید کے سارے ہاتھ روم کا در کھول کر وحشت زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ایک کینٹ ادھر سے مجھے ایک ٹوکلی سی چیز چھاتی نظر آئی۔ میں نے چابی ادھر ہاتھ مارا اور وہ چیز میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اگر میں نے سام روک رکھی ہوتی تو شاید اس وقت میں اطمینان کی کمری سانس بغیر نہ رو سکتا۔ وہ چیز گویا کسی دستر بھی نے خاص طور پر میرا کے لیے وہاں رکھی تھی۔

بظاہر وہ ایک حقیری چیز تھی۔ عام حالات میں بھی اس اہمیت کا قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارے میں کئی محسوسات کم از کم ویسے نہیں ہو سکتے جیسے اس وقت میرے تھے۔ وہ ذرا بڑے سائز کا ایک پرائیوٹ اسکرپڈ زرائیو تھا۔ دستہ تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ ہاتھ روم کی بیسی لائٹس بالکل ٹپ آ رہی تھیں۔ شاید حال ہی میں تبدیل کی گئی تھیں اور ایکٹریشن وہ اسکرپڈ زرائیو وہاں بھول گیا تھا یا بے کار کچھ کر بوجھ کر چھوڑ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں اس کی موجودگی کا مظہر کچھ اور رہا ہو۔ بہر حال مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ مجھے تو اس کا میٹر آجانا ہی کسی مجبور سے کم نہیں تھا۔

میں لپک کر دووازے تک پہنچا۔ باہر کی طرف سے آتا ساخت میں مضبوطی کا زیادہ بندوبست کیا گیا ہو گا لیکن اندر طرف نواز کی طرف ایک پلیٹ تھی۔ اس کے چاروں طرف کھولنے میں مجھے کچھ وقت پیش آنی لگتا پھر بھی شاید میں اس کے کم سے کم وقت میں کھولنے کا ایک ریکارڈ قائم کر سکوں۔

اس کے نیچے ٹکڑی کا ایک مختصر سا ٹکڑا تھا جو "زبان" یا (LATCH) کو دھکے دے کر ہلکے سے تھک میں نے زرائیو ہی کے ذریعے اسے توڑ ڈالا۔ اسکرپڈ زرائیو اس میں کر ایک جھکا رہا تھا۔ کئی ثابت ہوا۔ "ٹکڑی" کی بجلی کی آواز ساتھ ساتھ مل رہی تھی۔

اب میں دووازہ کھول سکتا تھا لیکن میں نے اسے کھولنے

طرح بیست ہو کر غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اس ہتھیار کی ایک بڑی  
خوبی تو یہ تھی کہ اس سے ہلکی سی "ٹنگ" کے علاوہ کوئی آواز پیدا  
نہیں ہوتی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسرا ناکرہا "امیری ٹھوکر اس کے ہاتھ  
پر پڑی۔ وہ چیز اس کے ہاتھ سے چوٹ کر کہیں جاگری۔ میں چونک  
اس کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا اس لیے دوسرا شخص ناکرہے سے  
باز رہا۔ ویسے مجھے اس وقت تک صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ  
اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ موجود تھا یا نہیں۔

سیاہ فام نے بائیں غماز ہاتھ سے نکل جانے کے فوراً بعد  
ایک طرف کھینچے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن  
میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کی گردن پر  
کراٹے کا ہاتھ دسید کیا اور فوراً ہی اس کی انٹ میں ہونے کی  
کوشش کی تاکہ اس کے ساتھی کے حملے کے سامنے اسے ہی ڈھال  
پنا سکوں لیکن جو نمی میں اسے اپنے سامنے لاتے ہوئے تیزی سے  
گھبرا تو میں حیرت سے گرتے گرتے پہا۔ اس کا دوسرا ساتھی غائب  
ہو چکا تھا۔

اس کا غائب ہونا اس کی سبب دہی سے زیادہ خطرناک محسوس  
ہوا۔ میں نے سیاہ فام کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ کچھ اسی قسم کی آواز  
پیدا ہوئی جیسے میں نے لوہے کا گولہ دیوار سے ٹکرایا ہو۔ نہ جانے  
وہ کس کے کمرے کی دیوار تھی۔ اس سے پہلے میں اپنے کمرے میں  
"دوسرے کندھے سے دروازے پر گھر دسید کر چکا تھا" اس سے بھی  
ابھی خاصی دھمک پیدا ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کوئی  
کسی کمرے کا دروازہ کھول کر نہ بھاگتے گئے اور خوفزدہ ہو کر چھپنے نہ  
لگے۔ اس طرح میں میرے آنے کے بجائے میرے حق میں صورت  
حالی خراب ہو سکتی تھی۔

سیاہ فام کا تین پر ڈھیر ہو گیا اور میں نے لٹ کی طرف چلا گیا  
لگا۔ وہ لمبائی سا کھٹکے تھے تاہم تھا کہ کچھ ہونے والا تھا۔ مجھے  
جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ خوش قسمتی سے لٹ  
اسی گھر پر موجود تھی اور اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک تیز رفتار  
لٹ تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی رفتار بہت کم محسوس ہوئی۔  
آہم میں چھپتے سے بچے پہنچ گیا۔

لاڈلج میں کوئی نہیں تھا۔ دھپش پر ایک طرک سٹ انداز  
میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ شاید وہ  
سمجھا کہ میں اس کی طرف آ رہا ہوں لیکن میں بھرتی دروازے کی  
طرف نکلا چلا گیا۔ میرے اعصاب تاروں کی طرح تھکے ہوئے  
تھے۔ ہر قدم پر مجھے دھڑکا سا محسوس ہوتا تھا کہ کسی کو نہ کھدے  
سے کوئی عجیب سی چیز میرے لیے نمونہ کی یا مہربان کر نہ نکل  
آئے۔

دربان نے میرے لیے دروازہ کھولنے سے قندے سے تجسس  
سے میری طرف دیکھا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آہم مجھے جاتے

ت نہیں کی۔ میں ابھی کچھ دیر اور سانس روک سکتا تھا۔ میں نے  
نہ پر مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ باہر کوئی موجود  
دقت سے یہ اثر نہ لے کر بالآخر میری جدوجہد دم توڑ چکی تھی اور  
میں مجھ پر اثر کر چکی تھی۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس دوران  
کوئی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش تو نہیں کرتا۔

میں دروازے کے عقب میں مزید دو دھماکی منٹ دیوار سے  
پکا کھڑا لیکن کسی نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں  
کی اور نہ ہی باہر کوئی آواز سنائی دی۔ سکوت کے وہ لمبے اعصاب  
لگنے لگے۔

آخر کار میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ صرف اتنا کھولا کہ  
ٹانگ باہر نکال سکوں۔ میرے پیچھے دروں میں اب سانس کو مزید  
روکنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے  
پچھلے دروں میں مقید ہوا یا کارن ڈاکی ایگسائیڈ خارج کی۔ اس وقت  
آہستگی سے اس ہوا کو خارج کرنا بھی ایک مہر آزا کام تھا۔  
دھپش گویا پھٹ پڑنے کو تھی لیکن میں نے اپنی سانس کی آمد  
رفت کی آواز پیدا نہ ہونے دی۔

جب تک میری ٹانگ دروازے اور پوٹھ کے درمیان رہی  
تک خیریت رہی جو نمی میں نے گردن باہر نکالی "ٹنگ" کی ایک  
ہلکی آواز سنائی دی۔ میں کچھ دیکھنے سے پہلے ہی اضطرابی طور پر  
گردن نیچے کر چکا تھا۔ یہ حرکت میرے کام آگئی۔ کوئی چیز میرے  
بالوں کو چھوئی ہوئی گزری لیکن وہ کوئی یقیناً نہیں تھی اور نہ ہی  
"ٹنگ" کی وہ آواز اس قدر دالے کسی ہٹل وغیرہ کی تھی۔

میں نے چھوٹے چاقو کے پھل جیسی کسی چیز کی جھلک دیکھی جو  
دروازے کی چوٹ میں پڑی تھی۔ وہ جیسی تھی لیکن میں صحیح طور پر  
نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز تھی کیونکہ اس وقت میں کمرے سے نکل  
چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے دائیں بائیں دونوں طرف  
دو افراد دیوار سے چپے ہوئے تھے۔ اگر میں ان سے بچ کر لٹ کی  
طرف بھاگنے کی کوشش کر تا تو ان دونوں کے پاس جو بھی ہتھیار  
موجود تھے وہ انہیں استعمال کر سکتے تھے۔ ان سے ابھنے میں بھی  
جان کا خطرہ تھا لیکن اس طرح بھاگنے میں زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے  
دروازے سے نکلنے ہی میں لٹ کی طرف بھاگنے کے بجائے دائیں  
طرف والے شخص کی طرف بھاگا۔

میں اس وقت اتنی تیزی سے تھا کہ چپس مجھے بالکل اسی طرح  
دکھائی دے رہی تھی جیسے چلتی ٹرین سے دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے وہ  
شخص سیاہ پوش دکھائی دیا تھا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ گمرے رنگ  
کے نمونے میں تھا اور نہ ہی سیاہ فام تھا۔ اس کے ہاتھ میں زرا بڑے  
ہٹل سے مشابہہ کوئی چیز تھی جس کی نال فام ہٹل سے کہیں زیادہ  
مسلحہ تھی۔ اس نے ہیچا اسی چیز سے مجھ پر ناکرہا تھا اور اس سے جو  
مکھ کی نکلا تھا وہ یقیناً میری کھوپڑی ہے اسی طرح گزر جانا جیسے  
کھس سے بلینٹس۔ لیکن میں نے اسے گزری کی چوٹ میں اسی

میں نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھاتے ہوئے ذرا سخت رہا  
میں کہا۔ ”آرام سے پیچھے رہو۔ مجھے نہ تمہاری ضرورت ہے نہ  
تمہاری گاڑی کی۔۔۔۔۔ میں تو ڈری دیر کی بات ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں  
تمہاری گاڑی سمیت چھوڑ دوں گا۔“

اسے شاید کچھ اطمینان ہوا۔ مزید کچھ نہ بولا لیکن اس کی پم  
اس کی گاڑی نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ زیادہ اچھی حالت  
گاڑی نہیں تھی۔ میں نے رفتار بڑھائی تو اس کی نہ جانے کیا  
چیزیں کھڑکھڑانے لگیں۔ سڑکیں خالی ہونے کا یہ قاعدہ تو تھا کہ یہ  
اس پرانی سی گاڑی کو بھی کافی رفتار سے چلا سکتا تھا لیکن ساتھ  
یہ مشکل بھی تھی کہ خالی سڑک پر کسی کو اجازت نہ زیادہ مشکل تھا۔  
میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ابتدائی میں کافی دور رکھ کر  
موقع مل گیا تھا۔ جب تک مجھے دوبارہ وہی بیڑا نہیں عقب  
آئیے میں دکھائی دیں جب تک میں ایک اور موڑ پر پہنچ چکا تھا۔  
میری چونکہ کوئی خاص خطر نہیں تھی اس لیے میں نے قیصر  
کرنے والوں کو کسنیوز کرنے کے لیے یہی ٹیکٹ اپنائی کہ میرا  
سائڈ پر جو بھی موڑ آتا تھا میں اسی طرف گاڑی موڑنا چاہتا تھا۔

جس انداز میں میں موڑ کاٹ رہا تھا اس سے ذرا نیچے پر حوا  
ہو رہا تھا اور اس کی گاڑی نہ جانے کس کس انداز سے صوبائے  
استحباب بند کر رہی تھی۔ اس کھارا گاڑی کو اس طرح استعمال کر  
بھی اپنی قسمت کو کچھ زیادہ ہی آزمائے والی بات تھی تاہم گاڑی  
نے۔۔۔۔۔ یا پھر شاید قسمت نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔

مسئلہ دگ دیک کرتے کرتے بالآخر میں نے محسوس کیا کہ  
عقب نما آئیے میں وہ بیڑا نہیں نظر آتا نہ وہ چلی تھی۔ میں اس  
دوران ایک تنگ گزروں سے گزر رہا تھا۔ پھر ایک چھوٹے  
سے راؤنڈ ایڈٹ کے قریب سے گزر کر اچانک ہی میں نے خود کو  
کینٹ انشیشن کے سامنے پایا۔

میں نے مین بیڑیوں کے سامنے ٹیکسی لے جاؤ کی۔ رات  
کے اس پر بھی ایک پولیس والا سٹیج ہانا ٹیکسی کی طرف لپکا۔  
ذرا نیچے روک کر ایک مصیبت سے تو نجات ملتی نظر آئی لیکن ساتھ ہی  
دوسری مصیبت اپنی طرف لپکی نظر آئی اور وہ کراہنے کے سے  
انداز میں بولا۔ ”مروا بھائی۔۔۔۔۔ میرے پاس تو اس کو دینے کے لیے  
بھی کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب تو شاید چالان ہی ہو جائے۔۔۔۔۔“

میرے پاس اس وقت کوئی چھوٹا نوٹ نہیں تھا۔ میں نے ہزار  
کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بچے  
گھر رہو۔۔۔۔۔ میں مفت کی سواری نہیں ہوں۔۔۔۔۔ ایسا سفر تمہیں  
بزدل نہیں لے گا جو گاڑی خود ہی چلا کر بھی لائے اور میں تک  
ہزار روپیہ کرایہ بھی دے۔ اس پولیس والے سے اب خود ہی سنتے  
رہنا۔۔۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی سے اتر چکا تھا۔ ذرا نیچے کودم چھوڑ  
کر میں بیڑیوں کی طرف بھاگا۔ اس وقت تک مجھے مزید کوئی گاڑی

کچھ کر اس کے چرے پر کچھ زیادہ حیرت نہیں تھی۔ ہوٹلوں میں ڈ  
ان رات لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے لیکن ان آنے جانے  
والوں کے طور طریقے اور انداز ذرا مختلف ہوتا ہے۔ میرا رخصت  
ہونے کا انداز کچھ اور تھا۔

میں صحیح سلامت ہوٹل سے باہر بھی آگیا۔ شاید میرا تعاقب  
کرنے والے ابھی نیچے نہیں پہنچ سکے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ابھی  
مجھے اور ہی تلاش کیا جا رہا ہو۔ شاید انہیں توقع نہ رہی ہو کہ میں  
اتنی جلدی ہوٹل چھوڑ چکا ہوں گا۔ بہر حال میں اس خوش قسمتی میں  
بلا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مجھے تلاش نہیں کیا جا رہا ہو گا۔  
ہوٹل کی حدود سے باہر سڑک کے کنارے ایک ٹیکسی کھڑی  
تھی مگر اس کا ڈرائیور ریٹ پر اس طرح لینا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں  
ٹانگیں سے نکل ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ بعض  
سڑکوں سے ٹرکوں کو صرف رات میں گزرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

بنا یہ اس لیے گاڑی کا گزرنے کی گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔  
میں نے محسوس کیا کہ اگر میں ذرا نیچے روک کر مجھوڑ کر جاؤں گا تو  
اس کے خواص صحیح طور پر بنیاد ہونے اور اسے یہ سمجھنے میں کئی  
لگے لیکن کے کہ میں مسافر تھا اور کہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد  
پہلی ممکن تھا کہ وہ خود ہی ذہن کے ساتھ ہی گاڑی چلا تا۔ چنانچہ  
نے اس چکر میں چلنے کا مختلف ہی نہیں کیا۔ میں نے ایک  
لگے سے دوڑا نہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ کر  
اسے سیٹ سے ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے ذرا نیچے سیٹ سنبھال لی۔

مجھے امید تھی کہ چابیاں اس کی قبضے کی سامنے والی جیب میں  
ہوں گی۔ میں نے اس جیب میں ہاتھ مارا۔ میرا اندازہ درست ہی  
نہیں۔ چابیاں فوراً ہی میرے ہاتھ میں آگئیں۔ میں نے خود ہی ٹیکسی  
بائٹار کی اور اس طرح آگے بڑھائی کہ کار چیمک کے فلی منظر  
کی طرح اس کے ٹائز ہی طرح چرچا اٹھے۔

جس وقت تک ذرا نیچے رو پوری طرح ہوش میں اگر سیدھا ہو کر  
چلا۔ اس وقت تک ہم ہوٹل سے کافی دور نکل آئے تھے۔ میری  
پھر عقب نما آئیے پر تھی۔ جب میں موڑ مڑ رہا تھا تو مجھے عقب نما  
آئیے میں ایک گاڑی کی بیڑا نہیں کی نہایت تیز چمک دکھائی دی۔  
وہ گاڑی ہوٹل کے پار ٹنگ لائٹ سے نکل کر سڑک پر مڑ رہی تھی۔  
اور دوران میں نے موڑ عبور کر لیا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک  
ہی دیکھ گیا۔

اس دوران ذرا نیچے سنبھل چکا تھا۔ وہ قدرے خوفزدہ لگے  
میں بولا۔ ”صاحب! تم کو گاڑی چاہیے تو لے جاؤ۔۔۔۔۔ مگر ام کو تو اصر  
چاہیے۔۔۔۔۔“

اسے اتنا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس پوزیشن  
تھا کہ چاہتا تو کسی جیٹا ہارنیوہ کا سارا لیتے ہوئے مجھے دھمکانے  
کی کوشش کر سکتا تھا لیکن شاید وہ اچانک اتفاق سے خوفزدہ ہو گیا  
تھا۔



ضرورت اپنے ہوٹل میں دیکھ کر طور پر بھی خدمات انجام دیتا تھا۔ چند منٹ بعد میں اس ہوٹل کے نہایت چھوٹے سے بیڑ پر لینا ملاات کے قہقہے غور کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں اپنے قایمہ اسٹار ہوٹل کے مالیشان گلزری سوٹ میں لینا تھا اور اب اس ڈیبا لٹا کرے میں موجود تھا لیکن یہاں میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میرا صاحب گننے والے اگر اسٹیشن کے سامنے کھڑی ٹیکسی تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ بھی سمجھیں گے کہ میں نے اندر جا کر کسی ٹرین کے واسطے قیام ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ اگر انہوں نے ڈرائیور سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تب بھی انہیں یہی بتا چلے گا کہ میں اندر گیا تھا۔ اپنے آپ کو یہ اطمینان دلا کر میں سو گیا تاکہ میری نیند میں جو کی رہ گئی تھی وہ پوری ہو سکے۔

دوہر کے بعد اٹھ کر میں نے کمرے میں کھانا منگوایا۔ اس ہوٹل کے کمروں میں فون نہیں تھا۔ ہر طور پر صرف ہٹے کے لیے فون کی ایک ایکٹیشن رکھی تھی۔ فون کرنے کے لیے مجھے نیچے استقبالیہ کلاٹر پر جانا پڑا۔ ڈائریکٹری دیکھ کر میں نے ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ لاہور پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کراچی میں میرے پہنچنے کے ایک رات بعد ہی روئے ذات کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تھا تو پھر میرے لیے کراچی اور لاہور میں یکساں ہی خطرات تھے۔ لاہور میں کم از کم میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ جس پہلے ٹریول ایجنٹ سے میرا رابطہ ہوا، اسی نے مجھے رات کی ایک فلائٹ میں ٹکٹ دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہ مجھے میرے بچے پر بھی ٹکٹ بھجوا سکتا تھا لیکن میں نے احتیاطاً اس سے یہی ٹکٹ میں فلائٹ سے ڈیڑھ دو گھنٹا پہلے اس کے پاس سے ٹکٹ لے کر ان پورٹ چلا جاؤں گا۔

باقی وقت میں نے ایک قیدی کی طرح اس ہوٹل میں گزارا اور شام کا اندر جیرا ہونے پر ہوٹل سے نکلا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر میں ٹریول ایجنسی پہنچا۔ دفتر میں مجھ پرے ہالوں والی ایک ٹیک اپ وہ لڑکی چند ٹیکسی لیے مسافروں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس سے اپنا ٹکٹ لے کر ادائیگی کر کے میں اپنی روکی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر ان پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

میں تمام راستے چوتھا رہا لیکن مجھے کسی گاڑی پر یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ میرا قاتل کر رہی تھی۔ مجھے اطمینان ہونے لگا لیکن میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے اطمینان نہیں تھا۔ گاڑی ابھی ٹریول کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ میری نظر انکاراڑی بوٹھ کی طرف پٹی گئی۔ حالانکہ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی اور قاصد بھی خلاصا تھا اس کے باوجود میں نے بوٹھ کے قریب کھڑی شخصیت کو پہچان لیا۔ وہ وہی آستہی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ ٹولڈر تک لٹکائے

شیش کی طرف آتی دکھائی نہیں دی تھی لیکن میں اسی طرح تقریباً دوڑا ہوا پلیٹ ٹارم پر آگیا جیسے مجھے کوئی گاڑی پکڑنی تھی لیکن پلیٹ ٹارم پر دائیں طرف کچھ دور تک چلنے کے بعد میں یک دم یہی انہیں طرف بنے ہوئے سیکڑ کھاس کے ایک نئے دیشنگ روڈم کی طرف مڑ گیا۔

اس دیشنگ روڈم سے گزر کر میں دوبارہ باہر گیا لیکن اب میں مرکزی دوواڑے سے کافی دور تھا اور یہاں اسٹیشن کی سیڑھیوں سے لے کر فٹ پاتھ تک خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ سڑک پر مختلف سواریاں بھی موجود تھیں حتیٰ کہ دو بیکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں تیزی سے اس ساری بھیڑ بھاڑ سے گزرتا اور اپنے چاروں طرف غیر محسوس طور پر نظر رکھنے آگے بڑھتا چلا گیا۔

عوامی قسم کے دستوروں پر ناشے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ برتن اور کڑاہیاں ٹھنک رہی تھیں۔ دیشوں کی بھارت بھارت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ فٹ پاتھ پر پڑی میڑوں پر بھی کافی لوگ نظر آنے لگے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا اسٹیشن کی قریبی گلیوں میں جا کھسا جہاں ٹھلے درپے کے کئی ہوٹل موجود تھے۔ یہ دارا بتر قسم کے۔ بلکہ شاید خاصے معززانہ مسافر ٹانے تھے۔

میں آنکھیں تقریباً بند کر کے اور قسمت پر تکیہ کر کے ایک ہوٹل میں ٹکس گیا۔ ریسپشن پر ایک فوجوان بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ذرا انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ میں ذرا ایک طرف کو ہو کر کھڑا ہو گیا تاکہ باہر سے مجھے نہ دیکھا جاسکے۔ ریسپشن پر چاروں طرف محدس ستاات کی قریم شدہ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ میں سانس درست کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید میں کچھ ٹیکسک جگہ پر ہی کھج کیا تھا۔ شاید میرے لیے یہاں پناہ اور حفظ دایان ہو۔

کلرک پارلیش فوجوان تھا۔ اس نے دو کورن فتح کر کے قرآن پاک کو بوسہ دے کر ایک شیفت میں رکھا اور مذہبانہ سبے میں بولا۔ ”قرآن ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ مجھے کھرا چاہیے۔ اس نے مجھے اپنے ہوٹل کے آداب کے بارے میں ایک مختصر سا لیکچر دیا کہ کھرا تھجے ل مل جائے گا لیکن میں وہاں کوئی بد معاشی کوئی غلطی سلا حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں اور ہوٹل کے واجبات ادا کیے بغیر بھاگنے کا خیال دل میں نہ لادوں ورنہ میرے ساتھ بہت بڑی بری ہوگی۔ میں نے نہایت سعادت مندی سے وعدہ کیا کہ میں اس قسم کی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گا۔ اس نے واضح کیا کہ زمانہ خواہ کہیں بھی پہنچ چکا تھا اور دنیا میں خواہ کچھ بھی ہو رہا تھا لیکن وہ گاؤں میں اعلیٰ درجات پر قرار رکھنے کے لیے کوشاں تھا اور اپنے اصولوں پر قائم تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے خراج تحسین پیش کیا۔ میں یہ بیان کر چکا تھا کہ وہ خود اس ہوٹل کا مالک تھا لیکن بوٹھ

ڈرائیو رہا۔ وہ کافی ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔

”در اصل وہ سیاسی تھ۔ اور ”سیاہ سی“ شخصیات زیادہ ہوتی ہیں لیکن میں نے سیاسی شخصیت ہوں اور نہ سیاہ سی۔ میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے مجھے ان پورٹ سے واپس آنا پڑا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ شاعر فیصل پر کافی آگے آ جانے کے بعد ایک بار پھر میرے سامنے یہ سوال آئے گا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں نے خواہ مخواہ ٹیسی کو ادھر ادھر کھانا شروع کر دیا۔

اس وقت میں ڈنٹس کی ایک گلی سے گزر رہا تھا جب میری نظر ایک جانے پہچانے جھگڑے پر پڑی۔ وہ ذرا عجب اور منفرد لباس کا ایک خوبصورت بھگتا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ وہ سینہ رمضان کا بھگتا تھا۔ سینہ رمضان کسی زمانے میں ہو گئی تھی میرا پارٹنر تھا۔ بعد میں ”میں نے اس کی خواہش پر اس کے حصے کے شیئر خرید کر اسے الگ کر دیا تھا لیکن اس سے دو سنی برقرار تھی۔ بارہا اسی آدمی تھا۔ ذرا الگ سی قسم کی طبیعت پائی تھی۔ مدت ہوئی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کام بھی آسکتا تھا۔

کچھ آگے جا کر میں نے ٹیسی کو روک لیا اور ڈرائیو کو فریخ دی۔ اسے اور ابلی کے رخصت کیا اور ایک دو سنی گلی میں کھس کر ڈرا محکمہ کر دیا۔ میں نے رمضان کے بیٹے تک آیا۔ ٹیسی جا چکی تھی۔ گلی سے اکاؤنٹا کابریں گزر رہی تھیں اور نہ جانے کیوں مجھے ہر کار کچھ پراسرار سی لگ رہی تھی۔ اس گلی کا موٹل بھی کچھ پراسرار سا ہی تھا۔ دو سنی بہت کم تھی اور چاروں طرف عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے گلی ٹائمنگ کالٹ اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود در ان در ان سے لگ رہے تھے۔

میں نے کال میں بھائی کو ایک شخص نے بلند و بالا گیت کی مخصوص جھری سے میرا جائزہ لیا، نام پوچھا، پھر گیت گویا۔ وہ سا گاؤ تھا اور چھوٹے گیت ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے گیت ہاؤس میں بٹھایا اور انٹر کالم پر سینہ رمضان کو اطلاع دی کہ کوئی افضل چہدری صاحب اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

چند لمبے بعد سینہ رمضان اس عالم میں داخل کے خوبصورت فرش پر دوڑتا ہوا آؤ کھائی دیا کہ اس کے جسم پر صرف ایک ڈھلے ڈھال کی بنیان اور دو عورتی تھی۔ اس کے پیروں میں چیل تک نہیں تھی البتہ ہاتھ میں لوٹا ضرور تھا جس سے پانی کی دھار دوٹپوٹے سے بہتی آ رہی تھی۔ اس وقت کوئی اسے دیکھتا تو شاید کسی سمجھتا کہ وہ گھر کا کوئی بد خواص قسم کا نوکر ہو گا۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس محل لہا بیٹھے لوڈ اس بھی کسی دو سنی اہلاک اور کاہنہ دار وغیرہ کا مالک تھا۔ اس کی تعلیم بھی اسی طرح تھی اور انداز و اطوار ان پرچوں والے ہی تھے۔ اس کے باوجود اس کے بہت سے کاموں میں برا سلیف نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے جفاواری قسم کے لوگوں

جو مجھ کے قریب ایک جیسے کی طرح کھڑی تھی۔ ٹرمین پر اگر کوئی مکمل تاریک گوشہ ہوتا تو شاید وہ وہاں کھڑی ہوتی۔ جہاں وہ کھڑی تھی وہاں سب سے کم روشنی تھی۔

”گٹاڑی روک دو اور ہیڈ لائٹس آف کر دو۔“ میں نے ڈرائیو کو ہدایت کی۔ اس نے گاڑی روک لی لیکن کچھ پریشان سا ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس مجھے خود ہاتھ پر صاعک آف کرنا پڑیں۔

میں اسے محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اب بھی آنکھوں والی لڑکی اس وقت ان پورٹ پر موجود تھی۔ یقیناً ان پورٹ کی عمرانی ہو رہی تھی اور وہ لڑکی وہاں خاص نہیں تھی۔ اس پر جھوم مقام پر اس کے سامنے نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا طریقہ ذرا دات بھی کچھ اونکھائی ہوتا تھا۔

صرف ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے واپس ہو لینے کا فیصلہ کیا لیکن ڈرائیو اگر دن دے کی پابندی کرتے ہوئے واپس مڑنا چاہتا تو اسے ٹرمین کے قریب جا کر راکٹ ایبٹ کے گرد چکر کاٹ کر دو سنی سڑک پر آنا پڑتا۔ ٹرمین کے سامنے تیز چمکی روشنی چمکی ہوئی تھی۔ میں ٹیسی کو وہاں تک لے جانے اور واپس کھانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

”گٹاڑی واپس موڑ لو۔“ میں نے ڈرائیو سے کہا۔ ”میں سے گھما لو۔“

”کیوں مولا میں گے صاحب! یہ دن دے ہے۔“ ڈرائیو کراہا۔

”ادھر اندھیرا ہے اور ٹریفک سارینٹ ٹرمین کے پاس کھڑا ہے۔ اگر کوئی ادھر آیا تو میں خود اس سے ٹک لوں گا۔ میں جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کرو۔ تمہیں بہت اچھی دھاڑی ملے گی۔“ میں نے کہا۔ تب وہ خطرہ حول لینے پر آمادہ ہوا اور اندھیرے میں ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر اس نے گاڑی واپس موڑی۔ کچھ دور پہنچ کر اسے درمیان میں راستہ میڑ لگایا اور وہ دوسری طرف ہو گیا۔ میں گردن کھمٹے پیچھے دیکھ رہا تھا۔

چھ لمبے کی خاموشی کے بعد ڈرائیو رہا۔ ”صاحب جی! اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟“

”ضرور پوچھو بھائی! میں آج کل کسی بھی بات کا برا ماننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کیا کوئی سیاسی شخصیت ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”اللہ نہ کرے۔ تمہیں یہ شبہ کیسے ہو گیا؟“ میں نے جلدی سے سیدھا جواب دیا۔ ”مجھے کافی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ کوئی گاڑی میرا تعاقب نہیں کر رہی تھی۔“

”صاحب! میں نے دوسرے ڈرائیووں سے سنا ہے۔۔۔ ادب مجھے خود بھی دو تین بار تجربہ ہوا ہے کہ بعض سیاسی شخصیتیں اسی طرح ہر گم ہماگ ان پورٹ پہنچتی ہیں لیکن وہاں انہیں معلوم نہیں کیا نظر آتا ہے کہ ایک دم غلط جھوڑ کر دیاں ہر گم لینے ہیں۔“

تھا اور مدد کی درخواست کی تھی۔ میں نے اس کی مدد کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی کیا مدد کروں۔

”تمہارا خیال ہے کہ میں۔۔۔ یعنی ایک ایسا شخص جو خود جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا ہے۔ وہ اس کی مدد کر سکے گا؟“ میں نے سینئر رمضان کو گھورا۔

”جو پوری بار تمہاری بات سمجھ اور ہے۔“ اس نے پیار سے میرا بازو چھو لیا۔ ”تم تو ذبحے ذبحے بھی دو چار کوڈ ہونے سے بچا سکتے ہو۔“

”ممکن مت لگاؤ۔ یہ بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

وہ سر کھائے ہوئے بولا۔ ”میں جس انگریز دوست کا ذکر کر رہا ہوں اس سے پرانی اور خاندانی دوستی چلی آ رہی ہے۔ اس کا باپ میرے باپ کا دوست تھا۔ پارٹیش سے پہلے اس کا باپ بمبئی میں ہائی کسٹر تھا۔ ظاہر ہے اس زمانے میں اس حیدر کے انگریز بڑی تو بچ چڑ تھا۔ کئی بات ہے ہمارے خاندان میں دولت و اعلیٰ ہی اس وقت ہوئی تھی جب اس انگریز نے میرے باپ کے سر ہاتھ رکھا تھا۔ اس سے پہلے میرا باپ چٹل کی قالیوں پر نقش و نگار بنانے کا کام کرتا تھا۔ اس کی طرح ہمارے ابا جان کی اس انگریز کے بچکے میں رسائی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہمارے دن بھر نے شروع ہو گئے تھے۔“

”یہ پرانے قصبے جو تیرے۔۔۔ اب کا قصبہ بتاؤ۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”وہا بنانے لگا تھا۔ اس کے بننے چارلس سے میرے بھی مراسم چلے آ رہے ہیں۔ اس نے مجھے نوٹس دیا ہے کہ اس کی بیٹی کیسٹرن ایک بحری جہاز پر سفر کر رہی ہے جو اس وقت کیرلیبی کی بندرگاہ پر ٹکرا اڑا ہے۔ جہاز کو کہ بارہوا کی گا ہے مگر اس قسم کے جہازوں میں سے ہے جو بارہوا کی کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی ہمارے ہر بندرگاہ سے دو چار مسافر بھی اٹھا لیتے ہیں اور کم کرائے میں ایک سے دو سرے ملک پہنچا دیتے ہیں۔ چارلس کو بتا چلا ہے کہ اس کی بیٹی منشیات کے دھندے میں لوث ہے اور اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ شاید ترکی جا رہی ہے۔ وہ ایک معزز خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ اس لیے بھی کسی سے درو طلب نہیں کر سکا کہ کہیں اس کی بیٹی کے منشیات کے دھندے میں لوث ہونے کا معاملہ سامنے نہ آجائے۔ اس صورت میں بیٹی بچ بھی گئی تو انہیں انگلینڈ میں سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا اور رسوائی الگ ہوگی۔ ہمیں معلوم ہی ہے مغرب کے والدین اپنی اولاد کو دی ہوئی آزادیوں کی سزاؤں کس طرح بھگت رہے ہیں۔“

میں نے فحش سی سانس لے کر کہا۔ ”تم چاہتے ہو کہ ان کے حصے کی کچھ سزا میں بھگتوں؟“

جی ہر فیکٹریوں تک سے اس کے مراسم تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے لونا لان پر پیچک دیا اور اچھل کر مجھ سے تن لپٹا۔ اپنے استخوانی بازوؤں سے وہ مجھے جھجھورنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”جو پوری اُمیرے پاس۔۔۔ تم کہاں مر گئے تھے؟“ اس نے میرے سے تھمائی شکل نہیں دیکھی۔ ”مجھے فون تک نہیں کیا تم نے۔“ میں نے کئی بار فون کیا تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلا۔“

”میں تقریباً سری گیا تھا رمضان یار! میں نے اس کی بیٹہ تھکتے ہوئے کہا۔ ”میں یوں سمجھو کہ دوسری زندگی ملی ہے تو تم سے ملنے آ گیا ہوں۔“ بیٹہ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔“

وہ زندہ تھا۔ اس کی شاید ایک شادی شدہ بیٹی اور بیٹا اس بچے میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے شاندار اربڑ دم میں لے گیا۔ نوکروں کو اس نے میری خاطر تواضع کے لیے دوڑا کا شروع کر دیا تھا۔ کرا بند کے وہ ایک صوفے پر اکڑوں بیٹھ چکا تو اس کی فرمائش پر میں نے اپنی داستان غم شروع کی۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ لیکن تمام واقعات صحیح طور پر بتا دیے۔ میں نے اسے اسے ریڈ لائٹ کے بارے میں بھی صحیح بتا دیا۔ اس کے ہوش آؤ گئے آنکھیں بھی کئی کئی نہ گئیں۔ رگت زور پڑ گئی۔

بنیادی طور پر وہ ایک ڈرپوک آدمی تھا۔ جس دنوں اسٹریٹنگ کے دھندوں میں لوث تھا ان دنوں بھی ایک طرف تو ایسے خامے خطرناک معاملات میں ہاتھ ڈالتا رہتا لیکن دوسری طرف اس کے ڈرپوک ہونے کا یہ عالم تھا کہ وقت بے وقت کال مل جاتا تھی جی تو یہ کہ کچھ کس جاتا تھا۔ اس کی شخصیت میں یہ ایک عجیب تضاد تھا۔

بہت دیر تک ہم ان حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پتا آخر وہ بولا۔ ”جو پوری یار! میرا معذور ہو گیا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تم کو صحرانوحہ ہوا۔“ اپنے کسی زائر وغیرہ کے ذریعے مل ایسٹ کی طرف نکل جاؤ۔“

”زار یا لاچ کے ذریعے میں جانا نہیں چاہتا۔ انہیں اکثر کوٹ گاڑ دالے دو کہ لیتے ہیں کیونکہ ان ریاستوں کی طرف انسانوں کی اسٹریٹنگ انہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ میں خود بھی یہاں آئے سے زور دے پہلے کسی سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے باہر ہی نکل جائوں لیکن کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ جعلی پاسپورٹ پر بھی میں سفر کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ کسی سیدھے راستے سے سفر کرنا ہی میں چاہتا۔ میرا خیال ہے باہر جانے کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کی عمرانی دوسری ہوگی۔“

وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ ”ایک ترکیب ہے جس میں تمہارا ایک بندہ دست کر سکا ہو۔“ بلکہ اس طرح تم میرے ایک جائے والے انگریز کی بھی کچھ مدد کر سکو گے۔ وہ سب چارہ لون میں بہت پریشان بیٹھا ہے۔ اس نے کل ہی مجھے فون کیا۔

قلم نگار کیا لیکن جب اس نے پڑھا میرے حوالے کیا تو میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس پر صرف چند آڑی ترچھی لکیر سی چھٹی ہوئی تھیں۔

”تم اس چکر میں مت پڑو کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک مکمل پیغام ہے۔“ سیٹھ رمضان بولا۔ ”تم چاہو تو اسی جہاز سے گھومتے گھاتے واپس بھی آ سکتے ہو۔ آتے ہی مجھ سے فون پر رابطہ کرنا۔ مجھے خوش ہے کہ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو رہے ہیں۔ جب سے چارلس کا فون آیا تھا میں پریشان تھا کہ کیا کر لوں۔ خود جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی، کسی دوسرے پر مجھے بھروسہ نہیں تھا کہ وہ مسئلے کو صحیح طور پر پنڈل کر سکے گا۔“

پھر چچے اسے کچھ خیال آیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ جنہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟“

میں نے اپنی ذرا پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے پاس ابھی اچھی خاصی رقم موجود ہے۔“

اس نے مجھے تاریک ٹیشوں والی ایک گاڑی میں مسلح گھڑو کے ساتھ کفٹن کی طرف روانہ کر دیا۔ ذرا تیر رہنے مجھے ساحل سے کافی دور ہی اتار دیا۔ ابھی کفٹن پر تقریب کے لیے آنے والوں کا رش تھا۔ پلے لینڈ کے اس رش سے گزر کر میں اس طرف آیا جہاں چھٹی کی دکانیں تھیں۔ ہوا میں پھیلی اور تیل کی ٹانگوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے مطلوبہ دکان کا پورہ دور سے دیکھ لیا اور اس کی طرف بڑھا۔ دکان کے بڑے سے چھپرے تلے بڑا جھوم تھا۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی کہ کیا پھیلی ہوا اس قدر رش لگا ہوا تھا؟ کیا یہاں بہت سی اچھی پھیلی پتی تھی جو لوگ اس طرح ٹولے پڑے تھے؟

لیکن قریب جا کر اندازہ ہوا کہ وہ جھوم پھیلی خریدنے والوں کا نہیں تھا۔ وہاں کچھ گھڑا معلوم ہوتی تھی۔ میں بیہوش کوچر ہوا آگے پہنچا تو مجھے جھوکا سا لگا۔ جھوم کے درمیان وسطی زمین پر ایک شخص اس طرح پڑا تھا کہ اس کی گردن تن سے بالکل علی جدا تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی جلاد نے چند لمبے پہلے ہی اس کا سر قلم کیا تھا۔ گاڑھا گاڑھا خون رت میں جذب ہو چکا تھا۔

”کون ہے یہ بد نصیب؟“ میں نے غیر ارادی طور پر خود کھائی کے سے انداز میں پوچھا۔

دو ٹرٹرا ایک شخصیت نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور گویا مجھ پر خس کھاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دے دیا۔ ”اس کا نام عاشق بھی تھا۔“

”یار! جنہیں بھی تو خزاں کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں جنہیں اس جہاز پر سوار کرانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ بس تم راستے میں ذرا دیکھ لیتا کہ مسئلہ کیا ہے۔ البتہ اس کو مٹانے سے مشتق لڑائے مت بیٹھ جانا۔ میں نے اسے دیکھا تو نہیں کہ کیسی ہے لیکن اگر خوبصورت ہوگی تو تم پھسل مت جانا۔ مجھے معلوم ہے تم کفرانِ نعمت نہیں کر سکتے۔ حسن والے مہربان نظر آئیں تو ذرا دل کے دروازے کھڑکیاں اور روشن دان وغیرہ کھول دیتے ہو۔“

”دیکھ لیتا۔ اس لڑکی کو مشتق سے پرہیز ہے کیا؟ یا اس کی نظر میں منشیات کا دھنداشتق کے دھندے سے زیادہ بہتر اور معززانہ ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں یار! میں تو اس لیے متعجب رہا ہوں کہ تم کیسی کسی اور خطرناک چکر میں نہ پھنس جاؤ۔ تم تو پہلے ہی ریڈ ڈاٹ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔ جنہیں معلوم ہے ڈرگ کے دھندے میں بھی کچھ ایسی قسم کی بڑی بڑی میٹھی گینٹس کام کر رہی ہیں۔ اب تو ایک نہیں، تین بیویوں مانا نہیں ہیں۔ تم بس شرافت سے صرف اپنی جان بچانے سے غرض رکھنا۔“

”ٹھیک ہے حاجی رمضان صاحب! میں آپ کے قیمتی مشورہ پر دل و جان سے عمل کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ جنہیں محض غلط فہمی ہے کہ میں ہر اچھی صورت دیکھ کر عاشق ہو جاتا ہوں یا مہربان چہرے کے سامنے دیدہ و دل فرشتہ راہ کر دیتا ہوں۔ ہم ہمارا اسی سے کرتے ہیں جو ہمارے کاٹل ہوتا ہے۔“

”اچھا۔“ مجھے یہ گاڑھی اردو کی مارا سنے کی کوکوش مت کرو اور نہ ہی گاڑھی اردو میں پتلے فلمی گانے گائے کرو۔ یہ جہاز تم جانے کے لیے تیار ہو؟“ سیٹھ رمضان نے پوچھا۔

”ہاں یا۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں چند دن کے لیے ادھر ادھر ہو ہی جاؤں گا۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تم اس دوران میرے ساتھیوں کا پناہ کرنے اور انہیں کسی ٹھکانے پر جمع کرنے کی کوشش کرنا۔“

میں اسے سمجھانے لگا کہ وہ کسی طرح میرے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ وہ سر ہلاتا رہا۔ بظاہر وہ بھی نفیر آتا تھا لیکن درحقیقت بھی نہیں تھا۔

یہ باتیں ختم ہو چکیں تو میں نے پوچھا۔ ”اس جہاز پر سوار ہونے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”آج آدھی رات کو ہی یہ جہاز روانہ ہو جائے گا۔ جنہیں فوری طور پر کفٹن جا کر ایک چھپرے والے میں عاشق یعنی نامی ایک شخص سے ملنا ہو گا۔ اس چھپرے والے میں کئی ہوئی پھیلی وغیرہ فروخت ہوتی ہے۔ تم آرام سے جا کر ایک گاؤں کی طرح بیٹھ جانا اور میرا کھانا ہو ایک سا پکا عاشق بھی کو رہا۔ وہاں کسی بھی دوسرے پوچھنا۔ وہ جنہیں عاشق بھی ہے ملو اسے گا۔“

سیٹھ رمضان نے جلدی سے نوکری سے ایک رائٹنگ پیڈ اڈن

پروفیسر محمد شرف

پروفیسر محمد شرف

رومانی ناول

|      |           |              |
|------|-----------|--------------|
| 75/- | حیدہ جبین | زیب          |
| 75/- | حیدہ جبین | شلیخ بریدہ   |
| 75/- | حیدہ جبین | حتا اور پتھر |
| 75/- | حیدہ جبین | گیت یہ میرے  |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

نہیں دیا اور نہ ہی کوئی مشکوک محسوس ہوا۔ اگر کوئی ناویدہ سی آنکھ بھی میری طرف دیکھ رہی ہوتی تو شاید میری کوئی نامعلوم جس نے خبر دار کر دی لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ شاید میں غلط سوچ رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ عاشق بھی کو میری ہی وجہ سے قتل کیا گیا ہو۔ معلوم نہیں وہ کس قسم کا قوی رہا ہو۔ کس قسم کے لوگوں سے اس کا تعلق رہا ہو۔ کن کن پیکروں میں طوط رہا ہو۔ مجھے میرے دوست سینڈ رمضان نے اس کے پاس بھیجا تھا لیکن سینڈ رمضان خود اپنی جگہ ایک شاہکار چیز تھا۔ اس کے تو ہر طرح کے لوگوں سے تعلقات تھے۔ اور بہت قریبی تعلقات تھے۔ آدمی وہ سہرا جام کام کا تھا۔

ان خیالات کی روشنی میں تو امکان یہی نظر آتا تھا کہ شاید عاشق بھی اپنے ہی کسی چکر میں مارا گیا ہو اور یہ شخص ایک اتفاق تھا کہ عین اس وقت میں اس سے ملنے آیا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے غالباً دو چار سیکنڈ میں ہی سوچا اور اپنے قریب کھڑی ہوئی اس دہڑکنے شخصیت سے سرگوشی میں پوچھا۔ ”اس نے کس نے اور کس طرح قتل کیا؟“

دبڑنے پہلے شک زدہ سی نظروں سے میرا سراپا جائزہ لیا۔ شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے بیان کو گواہی کے طور پر تو استعمال نہیں کروں گا۔ پھر وہ شاید کچھ اطمینان محسوس کرتے ہوئے سرگوشی میں ہی بولا۔ ”کچھ پتا ہی نہیں چلا بھائی۔ بھئی صاحب وہاں ایک کونے میں آرام سے بیٹھ بیٹھے کولڈ ڈرنک پیا رہے تھے۔“ اس نے انکھوں سے چہرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کرسی الٹی پڑی تھی۔

دبڑیات جاری رکھتے ہوئے بولا ”کسی کا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ بھئی صاحب کافی دیر سے بیٹھے تھے۔ شاید کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک ہی کسی نے پیچ ماری۔ وہ کوئی عورت تھی۔ وہ پیچ

میں نے بغور اس شخص کی طرف دیکھا جو اس پیچ پر نما رہ سوزان کا دیگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گندی سی ایک رنگ آلود ٹری بھی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہا تھا۔ کیا یہ ضروری تھا کہ عاشق بھی کو عین اس وقت قتل کیا جاتا جب میں اس سے ملنے کے لیے پہنچنے والا تھا؟

پھر مجھے احساس ہوا کہ دیگر افراد میں تو ایک دوسرے کے لیے انہیں تھے۔ وہ بھلا مجھ سے مذاق کیوں کر کر سکتا تھا؟ اگر وہ کہہ رہا تھا کہ مقتول عاشق بھی تھا۔ تو پھر وہ یقیناً عاشق بھی ہی ہو گا۔ میرے سامنے اب سوال یہ آتا کہ کڑا ہوا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں تو آج کی سیدھ میں عاشق بھی سے ملنے کے لیے دوڑا چلا آ رہا تھا اور عاشق بھی یہاں سرگیدہ پڑا تھا۔

ماحول پر ایک عجیب سوگوار سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ باتوں کی وہ پرجوش سی جھنجھٹا بہت بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جو ایسے موقعوں پر عموماً سننے میں آتی ہے۔ واردات یا حادثے کے بارے میں ہر شخص حسب توہین اظہار خیال کرتا ہے لیکن وہاں سب خاموش تھے۔ بیشتر چہروں سے ایک بے عنوان سا خوف جھانک رہا تھا اور شاید اسی خوف نے ان کی زبانیں بند کر رکھی تھیں۔

واردات سے پہلے اگر وہاں چمچلی کھانے کے کچھ شائقین موجود تھے تو وہ یقیناً گھٹک چکے تھے۔ یہ بیخبر امنی لوگوں کی معلوم ہوئی تھی جن کا اس جگہ سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ میری یہ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسی ناویدہ قوت کو یہ علم کس طرح ہو سکتا تھا کہ میں عاشق بھی سے ملنے آیا تھا؟ اگر علم ہو بھی گیا تھا تو اسے طاقت سے نقل ہی ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے میری سوزوگی میں بھی قتل کیا جاسکتا تھا۔ یا کم از کم کوشش ضرور کی جاسکتی تھی۔ بلکہ ان کا اصل نشانہ تو میں تھا۔ مجھ پر کاٹنا حملہ ہونا تو بات کچھ میں آتی تھی۔

کیس ایا تو نہیں تھا کہ میرے اب تک کے ریکارڈ کے پیش نظریہ بات میرے دشمنوں کی کچھ میں آتی ہو کہ قدرت فی الحال مجھ پر مہمان تھی۔ ان کی تماشہ طاقت اور تماشہ سانسٹی رسا کی کے بارہو میں ان کے ہر حملے سے بچ نکلتا تھا۔ ان کی ہر کوشش اب تک ناکام رہی تھی۔ انہوں نے سوچا ہو کہ اب بھی اگر میری سوزوگی میں عاشق بھی کا مقنا کیا کرنے کی کوشش کی گئی تو میں شاید اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی پھانے میں کا سیاب ہو جاؤں اس لیے پہلے اس کا پتا تو صاف کر دیا جائے بعد میں مجھ سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ خطہ ملا نہیں تھا۔ آس پاس ہی کیس موجود تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں چاروں طرف کا جائزہ لیا لیکن کوئی شخص مجھے بطور خاص اپنی طرف متوجہ نہ کیا۔

دفعہ مجھے کچھ خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے غاسا فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن اس نے ابھی تک گاڑی میرے برابر لا کر نہیں پوچھا تھا کہ مجھے ٹیکسی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ٹیکسی ڈرائیور اس طرح پوچھتا ابنی شان کے خلاف سمجھے تب بھی گاڑی قریب سے گزرتے ہوئے کم از کم سوالیہ سی نظروں سے دیکھ کر تھکتا ہے لیکن اس نے یہ ذمت بھی نہیں کی تھی۔

میں نے غیر ارادی طور پر سانس روک لی۔ وہاں بائیں ہاتھ پر فٹ پاتھ سے نیچے ریت پر چند چھوٹی موٹی چیزیں سجائے ایک شخص ایئر مین سے نشانے لگا رہا تھا اور ایک کے بدلے دس روپے دے کا اعلان کر رہا تھا۔ یہ غریبان قسم کا بچہ تھا۔ قوم میں چونکہ پلک جھپکنے میں ایک کے بدلے دس حاصل کرنے کا بار بار رجحان پایا جاتا ہے اس لیے اس کے پاس شائقین کا ایک بھوم تھا۔

اس بھوم کے پاس رک کر میں ایک دم محکوم گیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر کوئی مجھے گولی مارنے کی فکر میں تھا تو شاید بھوم کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے ہٹ گیا جائے۔ حالانکہ یہ بھی محض میری خوش فہمی تھی۔ مارنے والے محض اس لیے نہیں روکنے کہ ان کے شکار کے علاوہ کچھ بے گناہ بھی مارے جائیں گے بلکہ اب تو شکار نہ بھی موجود ہو تب بھی بے گناہوں کے بھوم کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ زرا اور طرح کے ہوتے ہیں۔

میں تقریباً اس بھوم میں جا کھٹا تھا جو ایک کے دس بنانے کے لیے بے چین تھا۔ ایک کے دس ان میں سے شاید ہی کسی خوش نصیب کو ملنے۔ نشانے کی وجہ سے تو نہیں ایڈمنسٹریشن کے لیے جلا لیا جاتا ہے کہ مجھے معلوم تھا ایئر مین کی مثال میں نہایت معمولی ماحول غم ہو گا جس کی وجہ سے صحیح نشانہ لگ ہی نہیں سکتا تھا۔ بھوم میں سے بھی شاید بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو لیکن ایک کے دس لے جانے کی امید بڑی ظالم ہوتی ہے۔ بڑے بڑے سمجھ دار لوگوں کو نہ جانے کہاں کہاں پہنچ لے جاتی ہے۔

میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بچھی ہوئی تھیں اور میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار تھا لیکن کچھ بھی کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ٹیکسی فٹ پاتھ کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے روشنی ڈرائیور کے چہرے پر پڑی۔ چہرہ سوکھا اور کھٹا ہوا سا تھا۔ اس کے باوجود کسی درزشی انسان کا چہرہ معلوم ہوا تھا۔ اوپر کو اٹھی ہوئی موٹی موٹی نوکیلی مونچھوں نے اس چہرے کو خنوا سا رنگ دیا تھا۔

اصلی حیرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ جس وقت وہ میرے سامنے سے گزرا اس وقت وہ موبائل فون کان سے لگاتے ہوئے تھا۔ ان کے بغور میری طرف دیکھا لیکن گاڑی بدستور رکتی رہی۔ میں داناں کھڑا تھا وہاں روشنی بہت کم تھی۔ نشانہ بازی کرانے والے کے پاس ایک پیڑو کس لیپ روشنی تھا لیکن اس کی روشنی گویا 150 کے دائرے میں محدود تھی۔ فٹ پاتھ پر کچھ اور لوگ بھی جا رہے

رہی تھی۔ 'ارے اس آدمی کو تو دیکھو۔ اس کی گردن کس نے کاٹ دی۔' ہم نے سڑک دیکھا تو بھٹی صاحب اس طرح یہاں پرے ہوئے تھے۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس مختصرے بھوم میں کوئی عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ 'وہ عورت کہاں گئی؟ کیسی تھی وہ؟'

وہ نے ایک بار پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید میرا جنس مجھے اس کی نظر میں مشکوک بنا رہا تھا۔ تاہم اس نے ازراہ گرم جواب دے دی دیا 'موتی سی عورت تھی۔ بچوں کے ساتھ تھی۔ شوہر بھی ٹیکسی سے اڑ کر پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ شاید وہ لوگ چھٹی کھانے آ رہے تھے کمرہاں یہ معاملہ دیکھ کر اٹنے قدموں کھٹک لیے۔'

'اوہ۔۔۔' میں نے متاثرانہ سے لمبے میں کہا۔  
اسی لمحے کسی نے ذرا تیزی سرگوشی میں کہا۔ 'پولیس آ رہی ہے۔'

میں نے پلٹ کر دیکھا موبائل پولیس کی ایک نیلی گاڑی ایک موڑ سے ریت اڑاتی آ رہی تھی۔ ایک پولیس والا گاڑی میں نصب شدہ مشین گن پر کھڑا تھا۔ گاڑی ابھی خاصی دور تھی۔ بمبیریکدم ہی گاڑی کی طرح پھٹ گئی۔ میں خود بھی وہاں سے کھٹک جانے والوں میں شامل تھا۔ میں چیمبر کے گرد محکوم کر دوسری طرف ہٹ گیا۔ ادھر چیمبروں کی دوسری قطار موجود تھی۔ میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔ میں واقعی بڑی الجھن میں چھن گیا تھا۔ سیٹھ رمضان کی گاڑی مجھے بھی اتار کر وہاں جا چکی تھی۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیکسی چلا کر دوبارہ سیٹھ رمضان کے پاس جاؤں اور اس سے مشورہ کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ایک پہلی ٹیکسی میرے تعاقب میں رہ گئی چلی آ رہی ہے۔ میں اس وقت ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے گردن ذرا سی گھما کر کن انجینوں سے اس کی کھٹک دیکھی تھی۔

پلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید وہ قیادت کی گھڑی تھی۔ میں نے کسی سبز اور انہم چیز کے بارے میں سوچا ہوتا تو شاید وہ بھی مجھے مل گئی ہوتی۔ میں نے صرف ٹیکسی کے بارے میں سوچا تھا۔ وہی میرے پیچھے کھینچی چلی آ رہی تھی۔ شاید ٹیلی ویژنی راقی کوئی چیز تھی اور اس کے زور لیے میرا رابطہ ٹیکسی ڈرائیور سے ہو گیا تھا۔ میرے ذہن کی آوارہ لہریں اس کے ذہن سے جا کھرائی تھیں 'اسے معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے اس وقت ٹیکسی کی ضرورت ہے اور وہ بے چارہ میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ یا پھر یہ محض ایک اتفاق تھا کہ جس وقت میں ٹیکسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کوئی ٹیکسی والا ٹیکسی خالی ہونے کی وجہ سے۔۔۔ اور خصوصاً مجھے تیز تیز چلنے دیکھ کر میرے پیچھے آیا تھا۔

ورزشی جسم کا مالک تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں بھی اس کے ورزشی جسم کے عضلات نمایاں محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے شاید چوڑی چھائی کی نمائش کے لیے جان بوجھ کر ٹائی میں لگاٹی تھی۔ گریبان کھلا تھا۔ گلے میں سونے کی مولیٰ چین چمک رہی تھی۔

اس کی نظریں نہایت حنظلانہ انداز میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ یقیناً مجھے تلاش کر رہا تھا لیکن وہ شاید اس تلاش کو خطرناک بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری طرح اسے بھی آس پاس کسی خطرے کی موجودگی کا احساس ہو۔ میں اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے ورزشی جسم کے باوجود مجھے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے تو کسی اور ہی نادیدہ خطرے کا احساس تھا لیکن وہ شاید مجھے ہی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میری تلاش میں تھا۔

اسے شاید یہ احساس تھا کہ میں فٹ پاتھ پر ساحل کی طرف واپس نہیں گیا ہوں بلکہ وسیع ریتے میدان میں اسی طرف نکل گیا ہوں۔ جدھر اندھرا پھیلا ہوا تھا تو کچھ جھوم کا جائزہ لینے کے بعد وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ میں تیزی سے کچھ اور آگے رینگ گیا۔

میرا غالباً کسی پرانی عمارت کو کرا کر اس کا بیشتر حصہ بھی اٹھایا جا چکا تھا لیکن ٹوٹے پھوٹے پلڑے کے کچھ ٹکڑے اب بھی سر اٹھائے کھڑے تھے جن سے سونے موٹے اور مڑے مڑے سے سرے نکلے ہوئے تھے۔ میں ایسے ہی ایک ٹوٹے ہوئے ہڈی لوٹ میں ٹکڑے کر بیٹھ گیا۔ میں اندھیرے میں ان چیزوں کو کٹائی حد تک صاف طور پر دیکھ سکتا تھا لیکن اس شخص کو شاید کچھ دیکھنے میں وقت پیش آرہی تھی۔

وہ تھوڑا آگے آ کر ہی رک چکا تھا۔ میں اس کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھنسن زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بالخصوص میدان اسی طرف آنے لگا۔ جدھر میں گھات لگائے اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں اس کی قسمت ہی اسے گھیر کر لاری تھی یا اس کی بھی کسی جس نے اسے احساس دلایا تھا کہ میں اس طرف موجود تھا۔

اس کا موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ چند قدم اور آگے آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ موبائل فون نہیں سنا لے گا ہوا ریور اور تھا۔ میرا ایک طویل سانس لینے کو جی چاہا لیکن میں نے اٹا سانس روک لی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اسے ریور اور کے میری تلاش میں لگنا ہی تھا تو پہلے وہ میری طرف دیکھ کر گزر آئیوں چلا گیا تھا؟

وہ ٹوٹے ہوئے ایک اور ہڈی کے قریب آن لگا۔ اس نے صرف ایک لمبے رک کر ادھر ادھر دیکھا پھر شاید وہ واپس ہو کر واپس جانے کے لیے مڑا تھا لیکن اسی لمحے میں نے عقب سے اس

تھ۔ سب کا رخ پلے لیز کی طرف معلوم ہوا تھا۔

میرے عقب میں ریت پر بھی بہت سے لوگ ہیولوں کی طرح رواں دواں تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہی ہیولوں کے درمیان کہیں موت بھی اپنا تاریک وجود لیے رینگ رہی تھی۔ میرے حواس کی گھڑی دھیرے دھیرے بیک بیک کر رہی تھی۔ کہیں دور سے خطرے کا کوئی نہایت مدھم سا کٹکل موصول ہو رہا تھا لیکن آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خطرہ تھا کمال۔

وہ جیسی ڈرائیو ر موبائل فون پر بات کرتے ہوئے اتنے غور سے میری طرف دیکھا کیوں گزرا تھا؟ اول تو ایک ڈرائیو ر کے پاس موبائل فون ہوتا ہی خاص حیرت کی بات تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ آدھی سے زیادہ پہلی ٹیکسیاں بھی تو خوش حال طبقے لے آ رہا تھا۔ ہم ٹکسوں کو تو تیرا بھلا کتے رہتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ ٹکسوں بھی تو آخر ہم میں سے ہی ہوتی ہیں۔ سرکار تو اپنی جگہ ہے، عوام بھی تو بے ایمانی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ضرورت مندوں کے لیے جس اسکیم کا بھی کبھی خدا خدا کر کے اعلان ہوتا ہے، اس پر بھی غیر مستحق طبقہ ہی ٹوٹ پڑتا ہے۔ زیادہ تر ضرورت مند تو بے چارے قطاروں میں پیچھے ہی کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اس کا کیا علاج ہو؟ قوم کو قوم بننے کے لیے جس کردار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے پاس نظر نہیں آتا۔ ذرا سافٹ کور دیکھ کر ہم سب کچھ بھول بھال کر فوٹ پڑتے ہیں۔ بھوکوں کے بھوکے کی مدد بھی دی کھا جاتے ہیں جنہیں پہلے سے زیادہ کھا کھا کر بھسی ہوتی ہے۔

جیسی ڈرائیو ر کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے خیالات کی وہ جھلکتی گئی تھی۔ شاید وہ جیسی ڈرائیو ر نہیں، کوئی خوشحال گاؤں والی شخص ہی رہا ہو۔ جیسی اس نے ایک ناقص گاڑی کے طور پر رکھی ہو۔ جیسی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ بدھت میں نے اس کی ریورس کی تھی روشن ہوتے دیکھی۔ وہ واپس آرہی تھی۔ ون وے کی وجہ سے اس شخص نے جیسی واپس نہیں تھکائی تھی بلکہ ریورس کیئر میں لارہا تھا۔

میں ٹپکے اندھیرے میں کھلے میدان کی طرف کچھ اور آگے چلا گیا۔ میرے جوتے ریت میں دھنسنے جا رہے تھے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ آگے اور بھی کھیل تھا۔ وہ بے چارے تھے۔ سب میں کچھ لگائے اور زیادہ کسانے کا پتہ تھا۔ سب کے سامنے کچھ نہ کچھ لوگ موجود تھے۔ میرا شاید کسی کو علم بھی نہیں تھا کہ اس جگہ سے کچھ ہی دور ایک شخص قتل ہو چکا تھا۔

جیسی ان سب کھیل تماشوں کے سامنے سے ہوتی ہوئی وہیں آ کر لڑکی جہاں ڈرائیو ر نے مجھے پھور دیکھا تھا۔ میں جھوم کی آڑ میں کچھ اور آگے چلا گیا۔ اب میں گھرے اندھیرے میں تھا۔ ڈرائیو ر جیسی سے آخر آ کر اور جھوم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ واقعی دراز زد اور



پر چلتا نگہ لگاں۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ربوہ اور والا بازو میرے ایک ہاتھ کی گرفت میں اور گردن دوسرے بازو کے گھٹنے میں پکڑی۔ اس کا دوسرا بازو بھی میرے اسی بازو کے گھٹنے میں پکڑی چکا تھا جس کو عقب سے لاتے ہوئے میں نے اس کا ربوہ اور والا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس نے طاقت آزمایا چاہی ربوہ اور والے ہاتھ کو موڑتے ہوئے پیچھے کی طرف ناز کرنا چاہا لیکن افضل چوہدری کے گھٹنے میں حرکت کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ اس لمحے اسے یقیناً احساس ہوا ہو گا کہ اس کی ورزشیں اس کے کچھ کام نہیں آتی تھیں۔ اس کی کلائی پر میرے ہاتھ کا ٹھکچہ اور گردن پر میرے بازو کا ٹھکچہ سخت تر ہو آگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ربوہ اور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

”ربوہ اور چھوڑ دو میری جان..... ورنہ گردن ٹوٹ جائے گی۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

اس نے بات نہ مانی۔ ابھی اپنی طاقت سے اس کی کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ اپنی داستان میں اس نے مجھے کمر سے اٹھتے ہوئے آگے پیچھنے کی کوشش کی لیکن میں جب بھی کسی تھوڑے بہت طاقت ور شخص کو اس طرح دوپٹا تھا تو مجھے پہلے ہی اندیشہ رہتا تھا کہ وہ مجھے اس طرح اٹاکر پیچھنے کی کوشش کرے گا لہذا میں پہلے ہی اس کا ”بندوبست“ کر رکھتا تھا اس کے لیے تیار رہتا تھا۔ میرے پاؤں گویا زمین میں ہی کڑے رہتے تھے۔

”تمہیں اپنی گردن بڑوانے کی بہت جلدی ہے۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی زور آزمائی کے باعث اس کی گردن پر دباؤ خود بخود کچھ اور بڑھ چکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر بھی ہاتھ کا ٹھکچہ مزید سخت کر دیا۔ بالآخر اس نے ربوہ اور چھوڑ دی۔

میں نے اس کی پیٹھ پر ٹھٹھا سید کرتے ہوئے اسے آگے پیچھا اور جھپٹ کر اس کا ربوہ اور اٹھالیا۔ میں اس کے ساتھ زیادہ دھچکا مٹتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گوکہ یہاں اندھیرا تھا لیکن کچھ دور ٹھیک قماشوں میں مشغول لوگ زیادہ اٹھا بچھ کی صورت میں اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ فی الحال تو کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہاں سے کچھ دور بچھا جھکاڑ کے دوسری طرف اندھیرے میں کیا ہو رہا تھا۔

وہ شخص لمبے پر جا کر اور فوری طور پر نہیں اٹھ سکا۔ چند لمحے گردن گھٹنے میں رہتے سے اس کے کسٹل ٹکڑے گئے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے گردن پکڑے گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ پھر وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

”خیال رکھنا..... تم اپنے ہی ربوہ اور کی زور پر ہو۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔ مگر اندھیرے میں وہ ابھی صحیح طور پر نہیں دیکھ پا رہا ہوا ابھی اس کے حواس ٹھکانے پر نہ آئے ہوں۔

اس نے گہرا سانس لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھا اور بدستور گردن سلاتے ہوئے جھٹکے دار سے لمحے میں بولا۔

”اے..... آپ افضل چوہدری تو نہیں؟ میں تو آپ کو تلاش کر

رہا تھا۔“ الفاظ گویا اس کے حلق سے رگڑ کھاتے ہوئے نکل رہے تھے۔ اگر وہ زرا جاندار آدمی نہ ہو آقا بھی کچھ دیر زمین پر لیٹا رہتا۔ اب مجھے جھکا گئے کی باری تھی۔ وہ ہیرا نام جانتا تھا لیکن کسی حیثیت سے؟ دوست کی حیثیت سے یا دشمن کی حیثیت سے؟ میں نے ٹائٹ سے کہا۔ ”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم مجھے دھونڈ رہے تھے۔ سائیکس رگربوہ اور ہاتھ میں لے کر۔“

”اوہ..... اب میں سمجھا.....“ وہ گویا کھانسی کی آواز دہلے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”ربوہ اور کی وجہ سے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن یہ ربوہ اور آپ کے لیے نہیں تھا..... یہ تو کسی اور خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تھا۔ آپ کو تو میں آپ کی مدد کرنے کے لیے دھونڈ رہا تھا۔ مجھے سینئر رمضان کی طرف سے آپ کے لیے حکم ملا تھا۔“

”اوہ.....“ اب میں بے اختیار گہری سانس لے کر وہ لمبے بات کچھ اور ہی تھی۔ میرا ربوہ اور والا ہاتھ جھکا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ معذرت خواہانہ سے انداز میں اس کی کمر تھپکی دی اور کہا۔ ”کھن غلط فہمی کسی ہمساری جان بھی جاسکتی تھی۔ تم زور اور زور آزمائی کرتے تو ہمساری گردن ٹوٹ سکتی تھی۔“

”سرا جان تو اب بھی جاسکتی ہے۔ موت یہیں نہیں نہ جانے کس روپ میں گھوم رہی ہو۔“ وہ سیدھا ہوا کر اندھیرے میں اوجھل اوجھل کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”کمال ہے!“ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ موت صرف میرے تعاقب میں ہے لیکن یہاں تو تم گناہ موت سے بھاگے پھر رہے ہو۔ تم کس پکڑ میں اس حال کو پہنچے ہو؟“

”یہ پوری کائنات ہی پکڑ میں ہے سر۔ آپ کو معلوم ہے؟ سب تیارے ایک دوسرے کے گرد پکڑا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ کائنات کے سب جاندار بھی ہر وقت کسی نہ کسی چیز کے گرد پکڑا رہے ہوتے ہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی پکڑ میں ہیں۔ یہ دنیا قدرت کی بڑی عجیب تماشا گاہ ہے۔“ وہ بھی بھٹی بھٹی سی آواز میں تیزی سے کہتا چلا گیا۔



”بہت خوب۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”پہلی بار تم جیسا باڈی بلڈر قسم کا فلفلی دیکھا ہے۔“

”یہ فلفلہ نہیں سزا زندگی کی ایک بیداری کی حقیقت ہے۔“ وہ جھک کر زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا موبائل فون کہیں گر گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

وہاں ابھی تک سہار شدہ عمارت کا کچھ لمبا باقی تھی جس پر وہ جا کر گرنا تھا۔ وہ اس طرف جا کر فون تلاش کرنے لگا اور چند سیکنڈ بعد لوٹ آیا۔ اس کا ٹیبل فون سیٹ مل گیا تھا۔ وہ اسے جیب میں رکھنے کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میرا رولور بھی دے دیجئے۔“

”اسے ابھی میرے پاس ہی رہے دو۔“ میں نے اس کا رولور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت تک ہم اس کی جیسی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس کے غیر محسوس سے انداز میں چاروں طرف کا جائزہ لیا اور دووازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بھارہ بریکوں انداز میں گاڑی اشارت کی لیکن اس کی نظر پچھلے میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ بے ہنگم اور بے ترتیب انداز میں پچھلے چلتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گاڑی نکالتے ہوئے وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر قدموں پر رشک آہستہ سے لمبے میں بولا۔

”آپ یقیناً سینئر رمضان کے قریبی دوست ہوں گے۔ وہ آپ کے لیے بہت پریشان تھا۔“

”ہاں..... جی مری دوستی رہی ہے اس سے۔“ میں نے مبہم

”اب تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”جو پروگرام طے ہے اس کے مطابق آپ کو بھوانے کا  
 بندوبست کرنا ہے۔ آپ مجھے عاشق بیٹی کا تبادلہ سمجھئے۔ بس یوں  
 سمجھئے کہ آپ کے لیے کوئی فرق نہیں پڑا۔ سچ میں یونہی توڑ دی سی  
 پریشانی ہو گئی۔“ اس نے جواب دیا۔

دفعۃً اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جیب سے فون نکالا اور ایک لمحہ سے اسٹریمک سنبھالے ہوئے فون پر بات کرنے لگا۔ وہ ایک ایسی زبان میں بات کر رہا تھا جو میرے لیے اجنبی تھی اس کے باوجود میں اس کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ فون سیٹھرم رمضان کا تھا اور وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ شخص اسے بتا رہا تھا کہ میں اسے مل گیا ہوں۔ وہ غالباً اس شخص کی کوشش کا بھی تذکرہ کر

”بہت خوب“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”پہلی بار  
 تم جیسا بازی لٹڈر قسم کا فلفلی دیکھا ہے“  
 ”یہ فلفلہ نہیں سہرا زندگی کی ایک بیدھی سادی کی حقیقت  
 ہے۔“ وہ جھک کر زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔  
 ”کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”میرا موبائل فون کہیں گر گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔  
 وہاں ابھی تک سہارا شدہ عمارت کا کچھ لمبہ باقی تھی جس پر وہ جا کر  
 گرا تھا۔ وہ اس طرف جاکر فون تلاش کرنے لگا اور چند سیکنڈ بعد  
 لوٹ آیا۔ اس کا ٹیلی فون سیٹ مل گیا تھا۔ وہ اسے جیب میں رکھنے  
 کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میرا ریو الوور بھی  
 دے دیجئے۔“  
 ”اسے ابھی میرے پاس ہی رہنے دو۔“ میں نے اس کا ریو الوور  
 اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”اور..... ابھی آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔“ وہ قدرے حیرت سے بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بے پروائی سے کندھے پر چڑھا لیا۔ ”خیر..... جیسے آپ کی مرضی۔ ہمیں تو سینئر رمضان کا حکم ملا ہے کہ آپ کی کچھ مدد کرنی ہے۔ سو ہم کر دیں گے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہی ہے۔ آپ ہم پر اعتبار نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔“ پھر وہ فٹ پاتھ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ آئیے۔“

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ گلے اندھیرے میں پہنچ کر میں نے پوچھا۔ ”میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چکر ہے۔ مجھے تو عاشق بھٹی سے ملنے بیٹھا گیا تھا لیکن میں یہاں پہنچا تو وہ کل ہونچکا تھا..... اور اب تم مجھے ڈھونڈتے ہوئے مجھ سے آن کرارہے۔“

"یہ ایک نہیں بہت سے چکر ہیں اور ایک دوسرے میں گھلڑا ہوا۔ ساری باتیں جانی بھی نہیں جا سکتیں اور بتانے کا وقت بھی نہیں ہے۔ آپ کو یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔۔۔ کیونکہ آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ دمکی آواز میں بولا۔ "آپ بس اتنا سمجھ لیں کہ ہم سیٹھ رمضان کے باضی کے دوستوں میں سے ہیں۔ سیٹھ رمضان پہلے بھی محتاط آدمی تھا، اب اور بھی زیادہ محتاط ہو گا۔ ہم سے مواب کل فونک بن پر بھی رابطہ نہیں رکھتا۔ اسے ڈور رہتا ہے کہ کہیں ہم میں سے کسی کا فون شیپ نہ آتا ہو۔ اسی لیے اس نے آپ کو عاشق بخش کے نام رقم دے کر بھیجا تھا۔"

میں نے ذرا چرک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ مجھے عاشق بننے کے نام زد دے کر بھیجا گیا تھا۔ آہم میں نے اس پر کوئی تبصرو نہیں کیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "اشفاق کی بات ہے کہ جس وقت آپ یہاں پہنچے تو ہم جن بہت سے چکروں میں اٹھے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک چکر نے عاشق بننے کی جان لے لی تھی۔ میرا اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ مجھے اسی

میں ایک باہلی نے اس میں بچوں کے لیے بے لینہ کھولا تھا۔ کم زمانے میں میں خود لاہور میں اس قسم کی عمارتیں بنوانے کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ یہ کراچی میں ہوٹل بنوانے سے پہلے کی بات تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اس میں یکسینو ہوتا۔ اس میں کسی اور طرح کی تفریح کا باہلی جاسکتی تھی لیکن اس عمارت کا مشورہ دیکھ کر جانے کیوں میری ہمت نہیں پڑی۔

اس شخص نے عیسوی چار دیواری سے باہری چھوڑ دی اور ہم مکے سے مشابہ راستے پر چلتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ واکمیں بائیں دونوں طرف کھیل کود کی مینڈوں پر بچوں اور ان کے والدین کا ہجوم تھا۔ تیز بھینٹاٹ سے مشابہ شور مٹاتی دے رہا تھا۔ وہ درمیانی راستے پر چلتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک رستوران بھی ہے۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔“

ہم دوسری طرف عمارت کے ٹیرس نما حصے پر پہنچے جہاں سے سمندر کا نظارہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ یہاں اوسط درجے کا ایک رستوران بنایا گیا تھا۔ رستوران میں بھی خاصی بھڑ بھڑ تھی لیکن خوش قسمتی سے ہمیں ٹیرس کے ایک کونے پر الگ تھلک سی ایک میز خالی مل گئی۔ شاید میرے ساتھی کو ایسی ہی کسی میز کی تلاش تھی۔ وہاں دو شیشی کم تھی۔ معلوم نہیں وہ میز دو ماٹس اور تحفے کے حلال شیشی ٹول کی نظر سے کیسے نکلی تھی۔

ہم وہاں جا بیٹھے اور اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد ہم آلود ہوا میں ایک گرمی مافس لی۔ اب وہ یقیناً خود کو خاما۔ مینس محسوس کر رہا تھا۔ ایک دیگر نہایت مستعدی سے ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس شخص نے میرے مشورے سے اسے کچھ میٹرو پڑ اور گالی کا آرزو دیا۔

دیگر کے جانے کے بعد وہ بولا۔ ”وہ رقعہ آپ مجھے دے دیجئے جو سیٹھ رمضان نے آپ کو عاشق بھی کے نام دیا تھا۔“

رہا تھا جو ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ پھر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ ”سیٹھ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

میں نے سیٹ اس سے لے کر پیلو کا تو سیٹھ رمضان سیدھی سادی اردو میں بولا۔ ”معاف کرنا چہ پدری یار! تمہیں تھوڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔“

”تکلیف مجھے نہیں تمہارے اس مریاں کو اٹھانی پڑی۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”ایک میرے بچنے سے پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ دوسرا میرے ہاتھوں مارا جاتا۔ بعد میں اصل بات پتا چلتی تو اس غلط فہمی پر زندگی بھر افسوس رہتا۔“ میں نے کن انگلیوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمبے کے لیے کچھ تکلیف کے سے آثار ابھر آئے تھے لیکن فوراً ہی اس کے اثرات معمول پر آ گئے۔

”شیر۔ اب جس طرح یہ بتائے اس طرح کرنا۔ تم آرام سے نکل جاؤ گے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ سیٹھ رمضان بولا۔

”میں تو پہلے ہی پریشان نہیں تھا۔“ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”ویسے بھی جس کے لیے تم مجھے پریشان ہونے والے دوست موجود ہوں اسے خود پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ ”خیر۔۔۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ اس وقت تم دوبرے خطرات کی زد میں ہو۔ ایک تو وہ خطرات ہیں جو تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ دوسرے وہ خطرات ہیں جو ان لوگوں کو عموماً لاحق رہتے ہیں جن کے پاس میں نے تمہیں بھیجا ہے۔“

”کوئی بات نہیں! اب خطرات میرے معمول میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”ہو سکے تو اسی جہاز سے واپس آ جانا۔ میں کو شش کروں گا کہ واپسی تک تمہارے لیے یہاں خطرات کچھ کم ہو چکے ہوں یا کوئی خوشخبری تمہاری ہتھک ہو۔ میں یہاں تمہارے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق تمہارے لیے کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم وہاں جہاز پر اس لڑکی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرنا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔۔۔“ وہ اپنے انگریز دوست چارلس کی بیٹی کیسٹرن کا ذکر کر رہا تھا۔

”تم گھر مت کرو۔ فی الحال تم کو کہ میں خود مدد کے قابل ہوں لیکن مجھ سے اس کی جو بھی مدد ہو سکی ضرور کروں گا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”میں فون پر زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس حد تک بے احتیاطی بھی تمہاری وجہ سے کی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔“ اس نے سلسلہ منتقل کر دیا۔ میں نے فون اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو واپس کر دیا۔

اس وقت تک اس نے عیسوی یکسو کے سامنے جاو کی تھی جس کی نامکمل عمارت برسوں تک دیران پڑی رہی تھی۔ حال ہی

### تاریخی ناول

|                      |          |       |
|----------------------|----------|-------|
| دنیا کے نامور قاتلین | قر تسکین | 100/- |
| شیر مصر              | قر تسکین | 100/- |
| شمشیر اسلام          | قر تسکین | 100/- |
| ترک مرد میدان        | قر تسکین | 100/- |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

خبریں سنیں مٹی گئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ترکی کے راستے تو ڈرگزر کا ٹھیک محلے بھی دوایں تھا لیکن دوس کی راستوں کی خود بخوداری کے بعد گویا مزید سرحدیں کھلی جاری ہیں۔ بے ضرر سامان اسمگل کرنے والوں کو بھی نہیں بلکہ ڈرگ مافیا کو بھی نئے روٹ نئے کیڑے مل رہے ہیں۔ کوئی امید نہیں یہ جہاز بھی استعمال ہوا ہو لیکن اس کی شہرت بری نہیں ہے اس پر بھی چھاپا نہیں پڑا۔"

"نہیں اب نہ پڑ جائے۔ میں جو اس پر جا رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج کل میرے ستارے ذرا گردش میں ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔" وہ دھڑک سے بولا۔ "جہاز صرف اسٹیل تک ہی تو جا رہا ہے۔ ابھی تک تو اس کے بارے میں کوئی غلط خبر نہیں آئی۔ امید ہے اسٹیل تک بھی خیریت سے ی پہنچ جائے گا۔ ہماری اطلاع کے مطابق تو اس پر کچھ نہیں ہے۔"

میں ابھی تک اس شخص کی حیثیت کا تعین نہیں کر سکا تھا کہ وہ خود کیا تھا۔ اسی دوران دفتر اسٹینکس وغیرہ لے آیا اس لیے میں اس سے کچھ پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ ویسے بھی یہ پوچھنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خود کیا تھا۔

میں نے سینڈوچز کی ایک پلیٹ اس کی طرف کھدائی تو وہ بولا۔ "میں قطعاً کچھ نہیں کھاؤں گا۔ میرا نکل دل نہیں چاہ رہا۔ یہ تو میں نے آپ کے لیے سنگیا ہے۔ آپ کھا لیں۔ میں اس دوران آپ کا کام کرتا ہوں۔"

میں نے بہت اصرار کیا لیکن اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ "میرا کام" کرنے سے اس کی مراد کیا تھی۔ یہ بات کچھ دیر بعد میری سمجھ میں آئی۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جب سے نمایت چھوٹے سائز کے بریف کیس سے مشابہ ایک چرمی جھلی نکالی تھی عموماً لوگ اپنی چھوٹی موٹی چیزیں رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہاتھ میں لٹکائے رکھتے ہیں۔

وہ جھلی میں رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ شاید دنیا کا مختصر ترین دفتر ہے لیکن بہت ہی اہم کام میں استعمال ہوتا ہے۔"

اس نے جھلی کی زپ کھول کر چھوٹے سائز کی چند چھپی ہوئی پرچیاں نکالیں پھر دو تین مرسز اور ایک پنڈ نکالا۔ "ہم ہاتھ میں لے کر ایک پرپی سامنے رکھ کر وہ نیچی آواز میں بولا۔ "آپ کس نام سے سر کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے ایک لمبے سوچا لور کہا۔ "میں مجھے چوہدری سے خان بنا دو۔ یعنی افضل خان۔" کالی دلوں سے میں یہی نام استعمال کر رہا تھا۔ اپنے نام میں معمولی سی تیرا بھیرے سے ہی کام چلا رہا تھا۔ ابھی تک مجھے نام بدلنے کی کوئی خاص ضرورت پیش بھی نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ زیادہ مشور اور عوامی قسم کی شخصیات کو ایسے حالات میں نام کے بارے میں زیادہ محتاط

میں نے جب سے وہ مڑاڑا واقعہ نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے اسے اپنے سامنے میز پر رکھ کر نمایت احتیاط سے اس کی ہر طرف دور کی اور جھک کر انشا کہ اسے اس تحریر کو پڑھنے لگا جو میرے لیے تیار تھا۔ قسم قسم۔ وہ آڑی تر بھی لکیریں گویا اس کے لیے کوئی کتاب نہیں تھیں۔

وہ حفاقت سے تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے وہ سر ہلا کر بولا۔ "اچھا۔۔۔ تو آپ کو "جیراڈونٹ" پڑ جاتا ہے۔"

"جیراڈونٹ۔۔۔؟" میں نے دہرایا۔

"یہ اس جہاز کا نام ہے جس پر سینڈو صاحب آپ کو بھیجا جاتے ہیں۔ اس پر تو کئی تحریک بھی موجود ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا تمہیں رمضان نے بتایا ہے؟" میں نے پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے سینڈو رمضان نے نہیں بتایا لیکن ہمیں ویسے ہی کراچی سے روانہ ہونے والے ہر جہاز "جیراڈونٹ" حتیٰ کہ ٹھیک ٹھاکر تک کے بارے میں ضروری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ کیتھرن کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سینڈو صاحب نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"ڈرگ مافیا کی کیریئر تھی لیکن یہ کس قسم نہیں ہے کہ آج کل بھی کام کر رہی ہے یا نہیں۔ میں تو سمجھا تھا شاید سینڈو صاحب آپ کو اس کی وجہ سے اس جہاز پر بھیج رہے ہوں ورنہ یہ جہاز اس قابل تو نہیں ہے کہ آپ اس پر جائیں۔ آپ کے لیے اس سے اچھا بدتر بات بھی ہو سکتا تھا۔ رقم تو خیر اتنی ہی خرچ ہوئی تھی۔" وہ بولا۔

"وہ اصل میں جلدی میں ہوں زیادہ غرے باز یوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو مل جائے غیرت ہے۔ میں تو ٹھیک ٹھاکر ٹھاکر میں جانے کے لیے تیار تھا لیکن اس میں خطرات ذرا زیادہ تھے۔ ویسے یہ جیراڈونٹ کس قسم کا جہاز ہے؟"

"تھوڑا سا سال بردار جہاز ہے۔ اس کو چار چھ مسافر بھی لے جانے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ محلے نے اس کو ذرا اور طرح کا سائیز بڑھایا ہے۔"

"کس قسم کا لال لے جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تیل کے لیے کھدائی میں استعمال ہونے والی بھاری مشین کی۔ کچھ کسانیں جاسکا اس کی آڑ میں اور کیا کچھ لے جاتا ہے۔ افغانستان میں روسی جو اسلحہ چھوڑ گئے تھے اس میں سے جو تارے ابل بکٹے سے رہ گیا تھا، میں نے سنا ہے اس جہاز نے اس کے کئی لوگ ایک پھرے لگائے تھے۔"

"کیا بھی ڈرگزر کے محلے میں بھی اس کے استعمال ہونے کی

ہوتا پڑتا ہے۔ میں تو خاصا گناہ آدمی تھا۔

اس نے جب کر پرتی پر بچہ خانہ پڑی کی اس پر باقاعدہ دو ٹرسنگ لگائیں اور انہیں خشک کرنے کے لیے چھوٹا مار کر پرتی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے اپنی واپسی تک سنبھال کر رکھیے گا۔"

"کیا ہے؟" میں نے جانتا تھا۔

"اسے اپنا سپورٹ سمجھ جیتے۔ ویرا سمجھ لیتے۔ پروانہ راہاری سمجھ لیتے۔ جہاز کے کپٹن کو یہ دکھانے کے بعد آپ مکمل طور پر اس کی ذمہ داری ہوں گے۔ کوئی آپ کو نہیں پکڑ سکتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ آپ کو اپنے عملے کا رکن بھی بنا سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پرتی تھکر کے جیب میں رکھی اور ایک لمحے کے لیے خاموش سا بیٹھا رہ گیا۔ یہ تو صرف ایک نمونہ تھا۔ ملک سے بھاگنے کے اور نہ جانے کیا کیا طریقے ہیں۔ اسی لیے تو خطرناک مجرم دہشت گرد، اسلحہ راقون رات فرار ہو جاتے ہیں، کوئی انہیں روک نہیں پاتا۔ بعض تو خفیہ طریقوں اور خفیہ راستوں سے بھی جانے کی زحمت نہیں کرتے۔ سپورٹ ویزے پر جاتے ہیں۔ کتنے ہی ملکوں میں انہیں نہ جانے کتنی طرح کے ویزے اور دوسرے کاغذات مل جاتے ہیں۔ مشکلات تو صرف شرٹا کے لیے ہیں۔

میں نے پچھتاہے تو بے چارہ۔ "اس کے لیے مجھے کچھ اداکاری کرنی ہے؟"

وہ مفہوم سے انداز میں مسکرایا۔ "ہمارا حساب کتاب سینہ رمضان کے ساتھ چلتا ہے۔ البتہ جہاز کے کپٹن سے آپ کو خود تعینا پڑے گا۔ آپ یہاں سے سیدھے بندرگاہ چلے جائے گا۔ برتھ نمبر میں ابھی آپ کو فون پر معلوم کر کے بتا دیتا ہوں۔" اس نے ہمارے اپنے موبائل فون کو پتھریا اور ایک ہانچ پر تلفیاد سے لے لیا۔ "اس قسم کی تمام آئیکٹنگ اور دوسری سائنسی ایجادات کا شرٹا کو اتنا قاعدہ نہیں ہوتا جتنا ہم جیسے لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمارے ناجائز دھندوں میں کچھ اور تیزی آجاتی ہے۔ ہمارے لیے بڑی آسانیاں ہوجاتی ہیں۔"

"مجھے ابھی تک تمہارا نام نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ بالآخر میں نے یہی سوچا تھا کہ کم از کم نام پوچھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔ "آصف بھٹی۔" اس نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "آصف بھٹی۔؟" میں نے خیر ارادی طور پر پوچھا۔ "کیا عاشق بھٹی سے تمہارا کوئی؟" میں نے جلد ادھر اچھوڑ دیا۔

"جی۔ وہ میرا سا بھائی تھا۔" اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

میں ایک لمک اس کی طرف دیکھا وہ گیا۔ وہ افسروں سے مسکرایا اور بولا۔ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

میں خاموش رہا۔ وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔ "آپ جیسا ہو رہے ہوں گے کہ اُدھر میرا بھائی قتل ہو گیا ہے اور میں یہاں پہنچ رہا ہوں۔ مجبور ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ آپ کی مدد کرنا بھی ضروری تھا۔ یہ رمضان کا حکم تھا اور ابھی مشکل میں تھے۔ اس کام کو ایک دن کے لیے ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری طرف بھی مجبوری تھی کہ میں فی الحال بھائی کی لاش کے پاس پھلک بھی نہیں سکتا تھا کچھ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ دیکھا جائے گا۔"

اس نے بڑے پروانے سے کندھے اچکائے لیکن ایک لمے کے لیے اس کا چہرہ چتر سا گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا گلے میں پھنسی ہوئی لگا چیز نکلتے ہوئے بولا۔ "شرکے! لاشیں اذیت محسوس نہیں کرتیں۔ عاشق کی لاش کو خالی کی کارروائیوں سے گزر لینے دیں۔ سب موقع مناسب دیکھ کر چاکر لاش حاصل کر لیں گا۔ پھر مرنے مناسب دیکھ کر ذرا ان کی طرف بھی رخ کر لیں گا۔ جیٹوں نے سب شیر جیسے بھائی کی لاش گرائی ہے۔ شاید ان کے سامنے میری جیٹا وی ہو جو ابھی کے سامنے چھوٹی کی ہوئی ہے لیکن کبھی کبھی جیٹا بھی عاشق کو بلوائے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"اگر میں یہاں رہتا تو شاید تمہاری کچھ مدد کر سکتا لیکن میں کچھ عجیب سی حالات کا شکار ہوں۔ میں یہاں رکے کا رنگ لیا لے سکتا۔" میں نے ہمدردانہ انداز میں اس کا مضبوط ہاتھ پتھرتا ہوتے کہا۔

"اگر میں نہیں جانتی۔" وہ کھوکھلے سے انداز میں ہمارے ہنسی کسی درخت کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔ "آپ ہمارے پریشان نہ ہوں۔ آپ اپنی فکر کریں۔ زندگی رہی تو شاید آپ دوبارہ ملاقات ہوں۔ اگر اس وقت مجھے مدد کی ضرورت ہوئی تو دیکھتے گا۔"

پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو اپنی ٹیکسی چھوڑ آتا لیکن وہ گاڑی اب کچھ مشکوک ہو چکی ہے۔ آپ دوسری ٹیکسی میں جائیں۔ دوسرے بھی آپ کا اکیلے ہی جائے۔ آپ آپ روانہ ہو ہی جائیں۔ آپ کے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ جہاز آدھی رات کے قریب روانہ ہو جائے گا۔" ٹھیک ہے۔ میں چلا ہوں۔ تم نے میری جودگی ہے۔ کے لیے میں ہمیشہ تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" میں نے اتنے بڑے کہا۔

"محطرت خواہ ہوں کہ میں آپ کو خدا حافظ کہنے کے نہیں اٹھ سکتا۔ انھوں کا تو میرے چہرے پر روشنی پڑے گی۔ کچھ دیر یہاں ٹیم مارکی میں ہی بیٹھنا چاہتا ہوں۔" اس نے مصالحتی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں اس سے ہاتھ ملا کر سر جھکائے اپنے لیے قہ کو ملا

آیا تھا۔

میرے جسم میں خفیف سی سرد لرزہ ہو گئی۔ ایک وقت کئی اندیشے میرے ذہن میں آئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ ابھی میرے عقب سے آواز آئے گی۔ "ہینڈ زاپ" میں مڑ کر دیکھوں گا تو کوئی پولیس باپنی میرا راستہ روکے کھڑے ہوگی۔ سب سے آگے جو پولیس آفیسر ہوگا اس کے ہاتھ میں ریو لوریا کوئی دوسری گن ہوگی جس کا منہ میری طرف ہوگا۔ پھر میری جیب سے سائنٹر لگا ریو لور بھی برآمد کر لیا جائے گا۔ کوئی بھید نہیں تھا کہ اس میں پیلے ی سے ایک آدھ گولی کم ہوتی۔ گویا قاتل رگے ہاتھوں گرفتار کر لیا جاتا۔

دوسرا امکان یہ بھی موجود تھا کہ کسی بھی لمحے عقب سے گولی میرے جسم میں بھی پیوست ہو سکتی تھی۔ اس احساس سے میرے اعضاء تن گئے۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر خالی کر سی کے پٹے پر پڑتی تھیں۔ جم گئے۔ میرے لیے مڑ کر دیکھنا دشوار ہو گیا۔ بڑی مشکل سے میں اٹھ کھڑی ہو گئی۔

کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ کم از کم ظاہر تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ میزوں پر بٹنے بھی لوگ موجود تھے ان میں سے ہر ایک اپنی بات میں اپنی ذات میں یا اپنی کلمات میں مگن تھا۔ مذہم روشنی میں سب اپنے اپنے شغل میں لگے ہوئے تھے۔ شاید وہ محض اب وہاں موجود نہیں تھا جو آصف کے لیے اجل کا پیا ہیرنا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے انہیں میں پر گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ آصف کو یوں چھوڑ کر جانا مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اگر مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع میسر تھا تو نکل ہی لینا چاہیے تھا۔ میں خاموشی سے واپس روانہ ہو گیا۔ میزوں کے درمیان سے گزرتے وقت ہر لمحے مجھے یہی اندیشہ محسوس ہوتا رہا کہ کوئی دیر عقب سے پہنچے گا۔ "ارے۔۔۔ اس آدمی کو پکڑو۔۔۔" اپنے ساتھی کو گولی مار کر ہٹا کر رہا ہے۔ لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ ایسا نہیں ہوا۔

پچھلے چار گھنٹوں میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو منہ مانتے کرانے پر ہائی بھر کر بندرگاہ چلنے کے لیے کہا۔ بندرگاہ پہنچ کر اب مجھے خود ہی معلوم کرنا تھا کہ ہیرا ماؤنٹ کس پر کھڑا تھا۔ تمام راستے میں مڑ مڑ کر دیکھا رہا۔ مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا۔ آصف کی صورت بار بار میری نگاہوں میں پھرتی رہی۔ چند لمحے پہلے وہ زندہ سلامت مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مجھے "جروانہ" راہداری "تیار کر کے دے رہا تھا اور بھائی کے گل کا انتقام لینے کا عزم ظاہر کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کا جسم روح سے خالی تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان حائل لیکر کچھ زیادہ ہی باریک تھی۔ بندرگاہ پہنچ کر مجھے ہیرا ماؤنٹ کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کسی جہاز کے سٹرے پہری رہنمائی کر دی۔ ہیرا ماؤنٹ دو نمبر پر کھڑا تھا۔ مجھے زیادہ چلنا نہیں پڑا۔ ہر تھ

چوڑا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میزوں کے درمیان سے گزرا واپس پلے لیٹنے کے درمیانی راستے پر آگیا۔ اس راستے سے گزور کر میں پلے لیٹنے کے دروازے پر پہنچا تو اچانک مجھے یاد آیا میں نے آصف بجلی سے یہ توپ چھادی نہیں تھا کہ ہیرا ماؤنٹ کون سی برتھ پر کھڑا ہو گا۔

میں ایک لمحے تذبذب کے سے عالم میں کھڑا رہا۔ والدین اور بچے میرے دامن بایں دگر کھاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ بالآخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تھوڑی سی زحمت کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مجھے واپس جا کر برتھ نمبر پوچھ لینا چاہیے تھا۔ یہ جھوٹی سی زحمت مجھے خاصی بڑی زحمت سے بچا سکتی تھی۔

میں واپس روانہ ہوا اور ایک بار پھر دستوران میں جا پہنچا۔ میں نے دروری سے دیکھ لیا تھا کہ آصف بجلی ابھی اسی کونے میں قلمی اندھیرے میں اپنی کرسی پر موجود تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر جھکنے ہوئے تہی آواز میں کہا۔ "یار تم نے مجھے برتھ نمبر تو بتا ہی نہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ غیر فطری سے انداز میں ساکت تھا اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈرا لگی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار کسی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں مکلی ضرور تھیں مگر ان سے زندگی رخصت ہو چکی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ تک اسی طرح نمود ہو کر رہ گئی تھی جس طرح میں نے رخصت ہوتے وقت دیکھی تھی۔ کرسی کا پکڑتے جس سے وہ لنگ لگائے ہوئے تھا، نیم دائرے کی طرح گولائی لیے ہوئے تھا اس لیے آصف کا ٹھوڑا جسم اس کے درمیان ہی ٹکا رہ گیا تھا، کرسی سے لڑکا نہیں تھا۔ مجھے اس کی ٹھیکس پر سین دل کے مقام پر دو دو جا بھی نظر آچکا تھا جو دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں وہ سیاہی نظر آ رہا تھا مگر حقیقت میں سرخ ہو گا۔ گولی بقیہ اس کے دل سے گزر چکی تھی۔

اچھا ہوا میں نے اس کا تھکا پھوڑا کرسیں ہلایا تھا ورنہ شاید وہ کرسی سے لڑکھائی کیا ہوتا۔ ارد گرد اسی طرح ناؤں کی جھنجھٹا ہٹ نور قسموں کی دبا دلی سی آواز میں سنائی دے رہی تھیں۔ پلے لیٹنے کے بڑے بڑے شیشی کھلونوں میں سے بعض کی تدریسی آوازیں بیان پہنچ رہی تھیں۔

اگر کسی نے گولی چلنے کی آواز سنی ہوئی تو یقیناً وہاں لپچل ہوئی۔ بیشتر لوگ کھسک جاتے ہوتے اور کچھ آصف کی میز کے گرد جمع ہو جاتے ہوتے لیکن وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سب کچھ اسی طرح تھا جس طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا ہم گولی سائنٹر لگے ریو لور سے چلائی گئی تھی اور آصف بجلی کا سائنٹر لگا ریو لور میری جیب میں موجود تھا جو شاید وہ اپنی پریشانی میں مجھ سے واپس لینا بھول گیا تھا اور مجھے بھی اسے واپس کرنے کا خیال نہیں

سے ایک چوٹی بل جہاز تک پہنچا ہوا تھا۔ اس بل کے اختتام پر تقریباً چھپن کی عمر کا ایک بھاری بھر کم فحش کھڑا تھا۔ وہ سفید نام تھا لیکن سمندری ہواؤں، تیز دھوپ اور موسیٰ تغیر تبدل نے یقیناً اس کے چہرے کی سفیدی کو بہت متاثر کیا تھا۔ اب اسے سفید فاموں میں شمار کرنا ذرا مشکل ہی محسوس ہوتا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو میرے کچھ بولنے سے پہلے اس نے خودی پوچھ لیا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“

”جہاز کے کپٹن ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اسی لئے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً کپٹن ہی تھا۔ اس کے جسم پر کپٹن کی دردی تھی اور سینے پر کپٹن کا کچ بھی آویزاں تھا۔ اسے یقیناً معلوم ہوا تھا کہ میں نے اسے کپٹن کی حیثیت سے نہیں پہچانا تھا۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے غم ناک سا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ دونوں طرف کے جنگلوں پر رکھے کھڑا تھا گویا اسے پہلے ہی کسی کی آمد کی توقع رہی ہو اور وہ اس کا راستہ روکنے کے لیے کھڑا ہو۔ ”میں ہی کپٹن ہوں۔“ اس نے گویا میری بیانی پر شک کرتے ہوئے کہا۔ وہ جھٹکے دار لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ لگائی تھا کہ انگریزی اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ ”میرا نام کوثر ہے۔“

میں نے معذرت خواہانہ سے انداز میں اس سے معافی لی اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا تعلق کس ملک سے تھا۔ مجھے آم کھانے سے مطلب تھا، پچھنے سے نہیں۔ اس نے غم خوابیدہ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے نیم پزار سی سے معافی کیا۔ اس کا ہاتھ کیا تھا گویا لکڑی کا ایک موٹا سا بے جان ٹکڑا تھا۔

میں نے جلدی سے جیب سے پرچی نکال کر اس کی خدمت میں پیش کی۔ اس نے پہلے پرچی کو اور پھر مجھے بغور دیکھا۔ اسے گویا یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آخری لمحوں میں بھی اس کے جہاز پر سفر کرنے کا کوئی خواہش مند بیچ سکتا تھا۔

”ہمارا یہ مال بردار جہاز کالی چھوٹا ہے۔ زیادہ تر ہم ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک سامان پہنچاتے ہیں۔ ہمارے پاس مسافروں کو لے جانے کے لیے زیادہ جگہ نہیں ہے۔“ اس نے واضح کیا۔

میں جہاز کا جائزہ تو چوٹی بل پر چڑھنے سے پہلے ہی لے چکا تھا۔ وہ میں لوڈنگ ایریا سے کالی ہٹ کر کھڑا تھا۔ تقریباً دو سو فٹ لمبے اس رنگ خوردہ سے جہاز کی حالت بتا رہی تھی کہ اس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ کپٹن کوثر کے چہرے سے کچھ بول لگا تھا جیسے اسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

”مجھے تو بتایا گیا تھا کہ آپ کو مجھے لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

”میں اعتراض نہیں کر رہا۔“ وہ بے دلی سے بولا۔ ”میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس جہاز پر ہم کچھ زیادہ آرام دہ سفر کی توقع مت رکھنا۔ یہ کوئی پُرکشش اور مسافر بردار جہاز نہیں

لازوال  
کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

۷

شاہکار ناول

خبیث (۵ حصے) ۲۰۰/-

برہمچاری ۱۵۰/-

درخشاں (۲ حصے) ۹۰/-

رقص ابلیس ۱۵۰/-

آسیب زندہ ۱۱۰/-

دستک ۱۰۰/-



مکتبہ القلش

اردو بازار لاہور

فون ۶۲۲۳۶۶۵

کریٹ کا روڈ یا ٹرولر چیک وغیرہ قبول نہیں کرتا۔ تم آئے بھی اچھے وقت پر ہو۔ جہاز روانہ ہی ہونے والا ہے۔  
 عین اسی وقت میں نے ہوا اٹھا کر دیکھا۔ بالائی عرشے کے ننگے سے ایک لڑکی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت سفید فام لڑکی تھی۔ اس کے سر پر زرشادہ بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اس کے چہرے کے گرد لگورے لے رہے تھے۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بلندی زیادہ نہیں تھی۔ میں اس کی آنکھوں کا رنگ تک دیکھ سکتا تھا۔ نیلی شفاف آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں شک کی پرجھپٹیں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل گویا مڑھکتا بھول گیا تھا کیونکہ مجھے گماں گزرا تھا شاید وہ سی آئینی سی آنکھوں والی لڑکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی اور اس کی شخصیت کا تاثر آئینی سا ہرگز نہیں تھا۔

”مجھے معلوم ہے۔ میں یہاں بیٹھ دو آرام کی تلاش میں نہیں آیا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ دو آرام تو زندگی میں بہت دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ میرے لیے ذرا بے آراہی اٹھانے کے دن ہیں۔ مجھے بہر حال انتہیل جانا ہے۔“  
 ”ہوائی جہاز سے تم چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ سکتے ہو۔ اس جہاز پر تم نہ جانے کب تک خوار ہوتے رہو۔ ہمیں انتہیل پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔“ وہ پوری طرح میری ہمت شکنی پر ملاحظہ ہوا تھا یا پھر شاید میرا حوصلہ آزما رہا تھا۔  
 ”میں ذرا سمندر کی سیر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے انتہیل پہنچنے کی کچھ ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ ایک طرف کا کرایہ کتنا ہو گا؟“

اس نے جو کرایہ بتایا وہ کم از کم اس وقت میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ سینہ رمضان نے تو کہا تھا کہ وہ لوگ کم کرایے پر مسافر لے جاتے ہیں لیکن وہ کرایہ ہوائی ٹکٹ سے بھی کم از کم چار گنا زیادہ تھا لیکن ایک لحاظ سے شاید سینہ رمضان نے ٹھیک کہا تھا۔ اگر میں قتل و غارتگری ہوا کرایے اسٹنگل کے دھندل میں لٹو رہنے یا کچھ اور خطرناک قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے بعد قانون کے قہقہے سے بچنے کے لیے ملک سے بھاگ رہا ہوتا تو شاید یہ کرایہ مجھے زیادہ محسوس نہ ہوتا۔ عام حالات میں بھی شاید یہ مجھے کرایہ نہ گزرتا بشرطیکہ میرا پیسہ میرے استعمال میں ہوتا۔ میرے پاس تو فی الحال ذرا تاج کی دی ہوئی رقم بچ رہی تھی۔ سینہ رمضان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ رقم کی ضرورت تو نہیں۔ میں نے کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی اور دم میں انکار کر دیا تھا اب میں سوچ رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ہی انکار کیا۔ اگر اس حساب سے اخراجات ہونے لگتے تو مجھے رقم لے لی جانی چاہیے تھی۔

بہر حال ابھی کچھ ایسی تشویش کی بات بھی نہیں تھی۔ کیپٹن کوڑک تو میں آسانی سے ادا کیجی کر سکتا تھا۔ بلکہ اگر راستے میں یہی زیادہ کمال نہ تھیں جتنی جاتی تو میں واپسی کا کرایہ بھی دے سکتا تھا۔ میں نے چہرے سے تکلیف کا اظہار نہیں ہونے دیا اور نہ ہی سوارے بازی کی کوشش کی بلکہ رقم گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس کے چہرے کی مڑوٹی میں کچھ کی آگئی۔ رقم اپنی بڑی سی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے مجھے اپنے جہاز کے بارے میں مزید معلومات لکھا کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا جہاز پاناما میں رجسٹر ہے اور ہمارا کپو صرف نو افراد پر مشتمل ہے۔ ہمارے پاس چار فاضل کپٹن ہیں جن میں سے دو اس وقت مجھے ہوتے ہیں دو خالی ہیں۔ کمانڈر ہی ملے گا جو کپو کے لیے بکاتا ہے اور زیادہ تر ہمیں کپو کے ساتھ ہی کمانڈر ہے گا اور اخراجات کی ادائیگی روڈ کے روڈ کنک ہوگی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم کیپٹن ساتھ لائے ہو۔ میں

”خوش آمدید سر! رات بڑی خوشگوار ہے۔۔۔۔۔ آسمان پر چاند بھی نکلا ہوا ہے۔۔۔۔۔“ وہ فحاشی نے قریب ہی سے زرا شکستہ سی انگریزی میں لیکن کچھ جھپٹے ہوئے سے لمحے میں کہا۔  
 میں نے اوپر سے نظر ہٹا کر دیکھا۔ اسی دوران کچی رگھت کا ایک جوان امرتھن ہمارے قریب آن لکڑا ہوا تھا۔ وہ ذرا مکلی سی سفید یونیفارم میں تھا۔ پیروں میں سفید کیڑوں کے جوتے تھے۔ شاید وہ کچھ دیر توں آیا تھا جو مجھے اس کی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی وہ بکے جسم کا تھا۔

اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ گولٹا پلا ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ میں مضبوطی تھی۔ لمحے اور نفوس سے وہ جگہ دیکھ دیکھ کر اس کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا۔ ابتدائی آنسوؤں کا دھندلا سا چاند کسی قدم چھوڑ کر اس کی آنکھوں کی تاریکی پیشانی پر آؤں توں تھا کہ شاید اس سیاہ فام نوجوان کا اشارہ اس کی طرف نہیں چھانڈی چہرے کی طرف تھا۔

اس نے جانے کس طرح معلوم ہو چکا تھا کہ میں جہاز پر سوار ہونے کے لیے آیا تھا جو وہ مجھے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وہ شاید خطر تھا کہ میں اس سے اپنا تعارف کراؤں گا لیکن میں نے اس کی دقت نہیں کی۔ میرا ذہن اس لڑکی میں اُلجھا ہوا تھا جو اوپر ننگے سے جھانک رہی تھی۔ یقیناً وہی کیپٹن تھی۔ کیا میں جہاز پر قدم رکھتی ہی اس کی نظر میں مشکوک ہو گیا تھا؟ وہ کچھ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا چاہے مجھے اس سے راہ و رسم پوچھا نہ میں دقت پیش آئے گی۔ حالانکہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کام میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کیونکہ وہ ایک مغربی لڑکی تھی۔

میں نے بھی صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈرگ ہانا کی کیرئیر بھی ہو سکتی تھی۔ بھارتو یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک ”مزدور“ کے نام سے مندر لڑکی تھی۔ خود کو لے دے رکھتی تھی لیکن پھر میں نے سوچا ”اس میں حیرت کی

میں بیٹھ چکا تو کپٹن گونز محلے کے آوی کی طرف اشارہ کر کے  
ہوئے بولا۔ "یہ میرا فرسٹ میٹ جیٹر ہے۔"

میں مسکرا دیا۔ جیٹر ایک عجیب نام تھا۔ ایک پاکستانی کے ذہن  
میں اس کے ساتھ لفظ "سنٹر" اتنا لازمی تھا لیکن اس نے چاروں کو  
شاید معلوم نہیں تھا کہ ہمارے پاس یہ بھی کوئی اصطلاح تھی۔ جیٹر  
بھی ڈیلا پتلا ہی تھا۔ وہ سفید قام تھا لیکن مرثیہ پر کم روشنی میں بھی  
اس کی رنگت کی زردی نمایاں نہیں۔ رنگت کی یہ زردی بنیادوں  
والی تھی۔ تاہم اس سے مصافحہ کرتے وقت اندازہ ہوا کہ ہاتھ اس  
کے بھی مضبوط تھے۔

"ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے ساتھ جا  
کر رہے ہیں مسٹر کان! جیٹر نے رسی سے لیے میں کہا۔ انگریزی  
میں بات کرتے وقت اس نے مجھے خان سے ٹکانا دیا تھا۔ لیے  
سے وہ جرم معلوم ہوا تھا۔ وہ مزید رسمیات نبھاتے ہوئے بولا۔  
"آج کی رات بڑی خوش گوار ہے۔ آسمان پر تارے چمک رہے  
ہیں۔"

بحری جہاز والے شاید آسمان کی طرف کچھ زیادہ ہی دیکھتے تھے  
اور انہیں آسمان پر چاند ستاروں کا بہت خیال رہتا تھا۔ کپٹن گونز  
نے سگار کا گرامش لیا تو اس کے سگار کا سراوب اکٹھا۔ میں نے  
باری باری ان دونوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے دھبے لیے میں کہا۔  
"مجھے تو کالی زون سے زمین نے ہی کچھ ایسا اُبھایا ہوا ہے کہ آسمان  
کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔"

پھر میں نے کہا اس کا دل رکھنے کو کھلے آسمان کی طرف دیکھا۔  
تاروں پر آسمان واقعی بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ نیچے سمندر  
پر سکون تھا۔ جہاز پانی کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس لیے آسمان پر  
تھوڑی دور تک تو ظالم سا محسوس ہو رہا تھا لیکن اس سے آگے  
سکوت ہی تھا۔ کہیں کہیں پانی سیال چاندی کی طرح ہلک اٹھتا تھا۔  
"سمندر پر سکون ہو تو کتنا خوبصورت لگتا ہے اور پھر ہونے لگا  
خونک۔" میں نے ایک گرمی سانس لے کر مرطب ہوا کو رگ  
پے میں سموتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ غور کریں تو آپ کو قدرت کی ربانی ہوئی ہر چیز کا ایک  
حساب نظر آئے گا مسٹر افضل خان! عجیب بات تھی کہ وہ میرے  
نام کا صحیح تلفظ ادا کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "شیر  
ہے اس خطے میں زیادہ ریش نہیں ہوئیں۔ ہمارے سفر کی نہ کہ  
حد تک شیڈول کے مطابق ہو جاتے ہیں۔"

جیٹر اٹھتے ہوئے مذرت خرابانہ لیے میں بولا۔ "میں ذرا  
دھیل پاؤں میں جا رہا ہوں۔"

وہ جا چکا تو میں نے کہا۔ "لگتا ہے تمہارے جہاز کے محلے  
ہر ملک کا آدمی شامل ہے۔"

"جہازوں پر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔" کپٹن گونز سگار کی رائی  
جھاڑتے ہوئے بولا۔ "جہاز میں اقوامی بھائی چارے کا جتنا پھر

کوئی بات نہیں تھی۔ جیٹر کالے دھندے کرنے والوں کی سہولت  
سے اندازہ لگاؤ کا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے کہ ان کے کروت کیا ہیں بلکہ  
بعض تو ایسی پارسوں والی شخصیت بنا لیتے ہیں کہ ان کی طرف انگلی  
اٹھانے سے پہلے کسی کو سوجھنا پڑتا ہے۔

میں نے دوبارہ اوپر دیکھا تو کپٹن جیٹر کی جانب ہو چکی تھی۔ کئی  
رنگت والا نوجوان بولا۔ "آئیے میں آپ کو آپ کے کہیں تک  
چھوڑ آؤں۔"

میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ میں ایک قوی دست  
مسافر تھا۔ میرے پاس کوئی رشتہ سفر نہیں تھا۔ وہ مجھے جس کہیں  
میں لے گیا وہ بظاہر مجھے ہی کے کسی فرد کا کہیں معلوم ہوا تھا۔ اس  
میں دیوار گیر بستر کے نیچے کچھ ادا رہا بھی پڑے تھے۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ کو خود باہر آنے کی تظلیف کرنا  
ہوگی۔" کئی رنگت کے نوجوان نے "مگر تارے لائق" انگریزی میں  
کہا اور رخصت ہو گیا۔ شاید اسے میری خاموشی اچھی نہیں لگی  
تھی۔

دو اندازہ ہند ہوتے ہی میں دیوار گیر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس  
وقت بری طرح تھکا ہوا تھا۔ ہر بات کو بھول جانا چاہتا تھا۔ بستر پر  
گرنے کے شاید چند سیکنڈ بعد ہی میں سو گیا۔ عام حالات میں شاید وہ  
بے ہودہ سا دیوار گیر بستر مجھے اپنی جسامت کے حساب سے بہت  
چھوٹا اور ناگانی محسوس ہوتا لیکن اس وقت مجھے اس پر گر کر کچھ  
ہوش نہ رہا۔

جہاز کی تیز دھڑل سے میری آنکھ کھلی۔ کہیں گو کہ چاروں  
طرف سے بند تھا جس طرح عموماً جہازوں کے کہیں ہوتے ہیں لیکن  
آواز گویا اس میں بلا رکاوٹ آ رہی تھی۔ میں نے گڑی دیکھی۔ میں  
بہ مشکل جین سمجھنے سوچا تھا لیکن خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اتنی  
تیز بھی میرے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔

میں کہیں سے نکل آیا اور رنگت پر جا کھڑا ہوا۔ برقعہ سے  
جہاز کی بند شیش کھلی جا چکی تھیں اور جہاز اپنے وقت سے قدرے  
تاخیر کے ساتھ روانہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جہاز بندرگاہ سے دور  
ہونے لگا۔ اس وقت کپٹن جیٹر کی یا کوئی اور مسافر کہیں دکھائی نہیں  
دے رہا تھا۔ بالآخر جہاز بحیرہ عرب کے کھلے پانیوں میں گھل گیا تو میں  
بالائی عرشے پر چلا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ کپٹن  
گونز اس وقت بھی دھیل دم کے بجائے آرام سے عرشے پر بیٹھا  
ہوا تھا۔ محلے کا ایک اور فرد بھی اس کے ساتھ تھا۔ گونز جس سگار  
کے کش لے رہا تھا اس کی بو کھلی فضا میں بھی نہایت تیز اور ناگوار  
محسوس ہو رہی تھی۔

"آئیے مسٹر افضل خان! کپٹن گونز کے لیے میں اب معمولی  
ی گرم جوٹی تھی۔ اس نے مجھے ایک گرمی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔  
کریوں کے پائے اسکرپوز کے ذریعے عرشے کے فرش سے پڑے  
ہوئے تھے۔



"وہ..... کیا ہوا ہے؟" میں نے رگتا پوچھا۔

کیپٹن گز ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "وہ ایڈز کی ابتدائی اسٹیج پر ہے۔ اگر تجھے یہ بات پہلے معلوم ہوتی تو میں اس سفر پر بھی اسے ساتھ لے کر نہ آتا۔"

"یہ تو بڑی موزی بیماری ہے۔" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔  
"اس میں کیا شک ہے۔ خدا جنت پر رحم کرے۔ اسے تو کوئی معیوب عادت بھی نہیں تھی۔ نہ جانے اسے کہاں سے اور کیسے لگ گئی یہ بیماری۔ بعض اوقات ڈاکٹروں کی تھیریاں بھی غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔" کیپٹن متحفظانہ لہجے میں بولا۔

"بعض اوقات نہیں..... بلکہ اکثر اوقات غلط ہی ثابت ہوتی ہیں لیکن ہم اس وقت تک آنکھیں بند کر کے ان پر یقین کیے رکھتے ہیں جب تک وہ خود ان کی تردید نہیں کر دیتے یا ان میں کچھ نہیں کر لیتے۔ ہمارے لیے یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"شاید تم صحیح کہہ رہے ہو۔" وہ مسکرایا۔ مجھے خوش تھی کہ اس نے جس رکھائی سے پیرا استقبال کیا تھا، اب اس کا رویہ اس کی نسبت بہت بہتر نظر آ رہا تھا۔ وہ خاصی بے تکلفی سے گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے موقع قیمت جانتے ہوئے کہا۔ "مجھے باقی دو مسافروں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ابھی تک میں نے انہیں دیکھا نہیں۔"  
"کیا بتاؤں؟ میں خود ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "دو ایسے بھی ہمارے جہاز پر سفر کرنے والے اس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے۔ بہر حال مجھے اتنا معلوم ہے کہ ان میں سے ایک نوجوان انگریز لڑکی ہے۔ دوسرا مسافر فرانسیسی مرد ہے۔ شاید صبح ناشتے پر تمہاری ان سے ملاقات ہو۔"

اس نے سگار کا ٹوٹا سمندر میں پھینک دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس جہاز پر مسافروں کو لے کر جانا ہے تو جینٹل..... خواہ ان کے پاس پورے سفری کاغذات بھی موجود ہوں..... لیکن کیا کریں..... ساری دنیا میں ہر طبقے میں موتنے سے ناگوار اٹھانے اور ناقض دولت کمانے کی دوڑ لگی ہے۔ میں اور میرا عملہ بھی اسی لیے سارے خطرات مول لیتے ہیں۔ میری تو دوسرے بھی رٹائرمنٹ قریب ہے۔ میں چاہتا ہوں زندگی سمندروں میں دھکے کھاتے گزر گئی، کم از کم پڑھ لکھا تو کسی اچھی سی جگہ پر پیشے سے گزر جائے اور اولادیں لگیں۔ یہ کہیں کہیں ہمارے سے پہلے کافی کچھ چھوڑ گیا۔ گوکہ اولاد سے شکرگزاری کی کوئی امید تو نہیں ہے۔ خصوصاً ہم یورپین لوگوں کے ہاں۔"

"اب تو مشرق میں بھی یہی حال ہے۔" میں نے کہا۔

بہر حال جتھے مسافروں کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ کیپٹن گز نے گویا مجھے مطلع کیا۔ "ہم کوشش تو کرتے ہیں

نہ ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ لوگ غیروں کے جہازوں پر غیروں کے ساحلوں پر..... غیروں کے ملکوں میں تو مل جل کر رہتے ہیں لیکن اپنے ملک میں اپنے بھائیوں اور اپنے ہم وطنوں سے جہازوں کی طرح ٹڑتے رہتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ میرے لیے خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ شاید اس نے یہ جو آ میرے ہی منہ پر مارا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

"دو ایسے اس جہاز پر صرف میں اور جنتی یورپین ہیں باقی سات افغانی اور بنگلہ دہی ہیں۔ افغانستان کا تو ہمیں علم ہی ہو گا کہ کوئی ساحل اسے نہیں لگتا اس لیے اس کی زیادہ تر تجارت تمہارے ہی ملک کے راستے ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کو سمندر میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے، کچھ چلے آتے ہیں اور آج کل تو دیکھے ہی وہاں کے حالات بڑے خراب ہیں۔ پہلے وہ دوسروں کے خلاف جہاد کر رہے تھے، آج کل ایک دوسرے کے خلاف "جہاد" میں مصروف ہیں۔ بنگلہ دہی کی حالت بھی یہی ہے۔ پہلے ان لوگوں کو کھوکھو تھا کہ تم لوگ ان کا احتمال کر رہے ہو۔ اب پتا نہیں کون ان کا احتمال کر رہا ہے۔ اب وہاں پہلے سے زیادہ غربت، پہلے سے زیادہ روزگاری، پہلے سے زیادہ مرگائی ہے۔ ہمیں بھی وہاں فکر اڑاؤ ہونا پڑتا ہے تو بڑے تکلیف دہ مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ بہت سے بھگت مند نوجوان آتے ہیں جو صرف روٹی اور کپڑے کے عوض جہاز پر کام کرنے اور ہمارے ساتھ چلنے کے لیے پیش کرتے ہیں۔" اب میں اسے کیا بتاؤں کہ اب وہی لوگ اور ان کی اولادیں یہاں خانسار گیری اور معمولی گھریلو نوکریاں کرنے چل آ رہی تھیں جنہیں کل سو مار بنگلہ کا خواب دکھایا گیا تھا اور جو مغربی پاکستان والوں کی لاشیں گرا رہے تھے۔

میں خاموش ہی رہا۔ وہ کینٹ فیلڈ کے حالات کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ میں اس قسم کے تکلیف دہ موضوعات پر بات چیت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بات بہت دور نکل جاتی ہے۔ زخم آؤ ہوتے ہیں۔ میں نے بات بدلنے کی ایک دھیمی سی کوشش کی۔ "موسم خوشگوار ہو تو ہمیں بحری سفر ایک دلچسپ تفریح محسوس ہوتا ہو گا؟"

"زندگی سمندری سفر میں گزر گئی۔" وہ کندھے اڑکا کر بولا۔  
"اب اس میں کم از کم میرے لیے تفریح والی کوئی بات نہیں رہی۔ بعض اوقات خوشگوار موسموں میں بھی بڑے مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پچھلے دنوں سمندر پر سکون تھے مگر طغج میں جنگ جاری تھی۔ ہمیں طغج میں کئی جگہ امریکیوں نے روکا اور ہمارے جہاز ہمارے پر لہ کر اوجھڑے ہو کر جاتے رہے۔ جنگی سامان بھی ڈھرتے رہے۔ شکر ہے جنگ جلد ختم ہو گئی۔ اس سفر سے واپسی پر مجھے نیا فرسٹ میڈ بھی بھرتی کرنا ہے کیونکہ جتھے نے مجھے دیانت داری سے بتاؤا ہے کہ وہ پیار ہے۔"

پرندوں کے بارے میں کوئی فراہمی کتاب معلوم ہوئی تھی؟  
جیری کلارک بات انگریزی ہی میں کر رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی  
اس کی انگریزی میں فراہمی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس سڑک کے دوران پر  
ساحلوں سے زیادہ دور نہیں جاتا۔ خصوصاً بچہ احمد سے گزر  
وقت..... چنانچہ ساحلی پرندوں کے مشاہدے کے لیے یہ بہتر  
موقع ہوتا ہے۔"

اس نے دوہرین مجھے تھادی۔ میں اسے آنکھوں سے لگا کر  
نورس کر کے دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً ایک طاقتور دوہرین تھی۔ بہت  
آپ پر کچھ پرندے اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ کلارک مجھے ان کی  
قسموں اور نسلوں کے درمیان باریک باریک ماسٹر فرق سمجھانے لگا  
جس سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میرے خیال میں  
پرندے بس پرندے تھے۔ اور کچھ نہیں۔ انہیں قدرت کی  
دوسری ان گنت اور درکار رنگ خوبصورت مخلوقات کی طرح دیکھ کر  
لطف اندوز ہونا چاہیے تھا۔ ان کے بارے میں باریکیوں پر غور کر  
سانس دافوں کا کام تھا۔

میں کلارک کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے ٹکائی  
ہوئے دوہرین کو آہستگی سے ادھر ادھر کھارہا تھا کہ اچانک  
غیر ارادی طور پر دوہرین کا سر کانٹے نیچے کی طرف اڑ گیا۔ ہوں  
سمندر میں دو درودر تین چار چھوٹے بڑے جہاز رواں تھے جو دور  
کے بغیر بھی دکھائی دے رہے تھے لیکن اس طرح وہ محض بڑے  
بڑے کھلونے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

اب دوہرین کے ذریعے ان میں سے ایک اچانک ہی میری  
میں آیا تو کچھ یوں لگا جیسے میں اچانک چملا لگا کر اس کے قریب  
پہنچ گیا تھا۔ وہ جہاز نہیں، ایک بڑا سا خوبصورت اسٹیر تھا۔ اس میں  
اصل ڈیک کے علاوہ ایک چھوٹا سا بیڈی ڈیک بنا ہوا تھا جس کے  
گرد بٹکا تھا۔ یہ ڈیک سب سے اونچا تھا اور اس پر گھنٹوں تک  
اوپرچی چست نیلی چیز اور تاریخی بلاڈز میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس  
کے سر پر بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ گلے میں نیلا اسکارف  
باندھے ہوئے تھی۔ ابھرے سورج کی کندی کرنوں میں اس کا دور  
کسی پہاڑ کی چوٹی پر (ستارہ حسین مجھے کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ بھی آنکھوں سے دوہرین لگائے ایک اور جہاز کی طرف دیکھ  
دی تھی۔ اچانک ہی اس نے آنکھوں سے دوہرین ہٹائی۔ گو کہ وہ  
دوسرے جہاز کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن زاویہ کچھ ایسا تھا کہ  
اس کی آنکھیں دیکھ سکتا تھا۔ دوہرین میرے ہاتھ سے چھوٹے  
چھوٹے بچے اور میرے جسم میں ایک سڑی لہر دوڑ گئی۔ وہ وہی بچہ  
رنگ اور آہستہ ہی آنکھوں والی لڑکی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مجھے اپنے اعصاب پر ہوا چھو رہا تھا لیکن  
اس نے مجھے اپنے اعصاب مرقعش محسوس ہوئے۔ بعض اوقات  
کسی بہت بڑے بد معاش اور پختے خال جسم کی شخصیت کا وہ ناز

کہ انہیں مسافر جہاز جیسا آرام مہیا کر سکیں لیکن اگر کوئی زحمت  
ہو تو اس کے لیے پیشگی حذر دے۔ "وہ اٹھ کھڑا ہوا۔" "اب میں بھی  
دھیل اڈس میں جاتا ہوں۔"

میں بھی اپنے کیمپ میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیمپ  
میں پہنچ کر کچھ دیر کی کوشش کے بعد میں سونے میں کامیاب ہو ہی  
گیا لیکن صبح بہت جلد میری آنکھ کھل گئی۔ سمندر پر سکون ہونے  
کے باوجود مجھے بحری سڑک پر اچھا محسوس نہیں ہوا تھا۔ باہر سے  
کچھ خفیف سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے دروازہ  
کھول کر جھانکا۔ وہی بنگہ دیکھ کر مجھے گذشت رات کیمپ تک چھوڑ  
گیا تھا، کیمپ کے سامنے ڈیک پر پوپا لگا رہا تھا۔ اس نے گردن  
گھما کر میری طرف دیکھا اور سیاسی مائل ہونٹوں کے درمیان اس  
کے پیلے دانت چمک اٹھے۔

"تمہارا نام کیا ہے برادر؟" میں نے انگریزی میں پوچھا۔  
"مہبل۔" اس نے جواب دیا۔

"مہبل! کیا ناشتا تیار ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا اور باہر  
آگیا۔

"جلدی ہو جائے گا۔ ٹھیک سات بجے ناشتا میں ملے گا  
جائے گا۔" مہبل نے جواب دیا۔

"ہیلو سسٹر!" دھتتا عقب سے ایک مردانہ لیکن نہایت  
طاعنی آواز سنائی دی۔ "تم پاکستانی ہو؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا، جنگلا جہاں ذرا گولائی میں محسوس رہا تھا  
وہاں ایک سفید فام دروازہ اوپر سرٹھس کھڑا تھا۔ اس کے بالوں  
میں سفیدی کی جھلک تھی۔ وہ گلے میں دوہرین لٹکائے ہوئے تھا۔  
ہاتھ میں کوئی اہم سامان تھا۔

"جی ہاں میں پاکستانی ہوں۔" میں نے اس کا سر تاپا جائزہ لینے  
کے بعد کہا۔ "آپ کی تعریف؟"

"میں جیری کلارک ہوں۔ فرانس کے شہر مارسلز سے میرا تعلق  
ہے۔" وہ آگے آکر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا پیرا وائٹ میں یہ  
تمہارا پہلا سفر ہے؟"

"ہاں۔ تم کیا اکثر اس پر سفر کرتے رہے ہو؟" میں نے ایک  
ٹھک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔  
"اس سے پہلے میں نے صرف دو مرتبہ سفر کیا ہے۔"

معلوم نہیں اسے دو مرتبہ بھی مسافر جہازوں کو چھوڑ کر اس  
جہاز سے سفر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ ایک لمحے کے لیے  
مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ بھی ڈرگ مافیا کا آدمی تو نہیں تھا؟

"یہ تم دوہرین سے کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے دوستانہ لہجے  
میں پوچھا۔

"ساحلی اور سمندر کی پرندے۔" اس نے جواب دیا اور ہاتھ  
میں پکڑی ہوئی بڑی سی اہم کتاب بلند کر کے مجھے دکھانے لگا۔ وہ

نیچے اتر کر وہ کہیں غائب ہو گئی۔ میں نے اس اسٹیر کا جائزہ لیا۔ وہ سفید رنگ کا نہایت صاف ستھرا اسٹیر تھا۔ اسٹیر بڑی پرانی چیز ہے مگر وہ جدید دور کی چیز نظر آ رہا تھا۔ اس کی جو سائڈ مجھے نظر آ رہی تھی اس پر دائرے میں صرف "ایس 117" لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے "ایس 117" سے کیا مراد تھی؟

میں کچھ دیر دوڑیں آنکھوں سے لگائے کھڑا رہا لیکن لڑکی دوبارہ دکھائی نہ دی۔ کلا کر کی تو اواز نے مجھے چوکھا دیا۔ "کلا ہے آپ کو بھی پرندوں سے خاص دلچسپی ہے؟"

اب میں اسے کیا بتا کر مجھے پرندوں سے کسی اور سستی دلچسپی تھی۔ شاید وہ بے چارہ مجھے اپنا ہم وزن سمجھنے کے باوجود کچھ بے چین ہو گیا تھا کیونکہ میں اس کی دوڑیں سے چپک کر رہ گیا تھا۔ جو نمی میں سے دوڑیں آنکھوں سے ہٹائی "اس نے جلدی سے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔"

دھن ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ کہیں کلا کر اس لڑکی کا ساتھی تو نہیں تھا؟ کہیں اس نے جان بوجھ کر تو میں اس وقت مجھے دوڑیں میں تھما لی تھی؟ کہیں وہ مجھے دکھانا تو نہیں چاہتا تھا کہ میں خواہ کچھ بھی کر لیتا کسی طرف بھی نکل لیتا لیکن ان کی رسائی سے دور نہیں تھا؟

میں نے کسی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن وہ مجھے ایک عام سے سیاح اور آواہ گرد کا چہرہ ہی دکھائی دیا۔ اس پر مکاری اور سازشیت کی کوئی جھلک مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں نے بے خیالی کے سے عالم میں دوڑیں اسے تھما دی۔ وہ اسے ہڑے کے کہیں میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم ناشتا کرنے کیجئے میں چلو گے؟"

"عبدال تبار تھا کہ ناشتا سات بجے لگے گا۔"

"سات تو تقریباً بج ہی چکے ہیں۔" وہ گڑبڑ دیکھتے ہوئے بولا۔

میں اس کے ساتھ نیچے میں میں گیا۔ وہ بھی شاید کوئی بڑا کہیں ہی تھا جسے میں کسی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کا بیڑہ ایک ڈانٹک ٹیبل نے تعمیر رکھا تھا جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ چہ چہ کڑیاں اس کے دونوں طرف اور ایک ایک کرسی اس کے سروں پر تھی۔ کپٹن کو تڑپنے کے دو آدمیوں کے ساتھ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ خانہ سالانہ افغان معلوم ہوا تھا۔ اس نے ناشتے کے لیے کچھ شہتی اور کچھ مغربی چیزیں میز پر سجا دیں۔ ان میں سے ایک آدھ کے بارے میں تو میں اندازہ بھی نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کیا تھی۔ میں نے انہیں چھوڑنے پر ان کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور آئیٹ سلاش کانی وغیرہ پر مشتمل سیدھا سا دانا ناشتا کرنے لگا۔

میں نے ابھی ناشتا ختم نہیں کیا تھا جب میں کا دروازہ کھلا اور کیتھرین اندر داخل ہوئی۔ میرا ذہن آہستہ آہستہ والی لڑکی میں کچھ ایسا لکھا ہوا تھا کہ کیتھرین کو میں بھول ہی گیا تھا۔ یہ دیکھ کر

میں ہونا تھا جو کسی نرم و نازک قسم کی شخصیت کا ہوتا ہے۔ خوف سے زیادہ میرے اعصاب اور حقیقتے حیرت کے حملے سے غرق ہوتے تھے۔

آخر یہ لڑکی تھی کیا لڑکا؟ کیا وہ واقعی کوئی آہستہ قسم کی چیز تھی؟ میں ہاں بھی جاتا تھا۔ آخر وہ کسی طرح اس پاس ہی کہیں نہ کہیں دکھائی دے جاتی تھی؟ کیا وہ میری بوسہ کھتی ہوئی میرے تعاقب میں چلی آ رہی تھی؟ کیا اس کا واقعی ریڈ ڈاٹ سے کوئی تعلق تھا یا یہ کوئی اور پیکر تھا؟ میں اس نے پیچھے ہٹ دیر کے لیے میرا سراں کھو دیا تھا۔ اب وہ دوبارہ میرے پاس کسی طرح پہنچی تھی؟ کیا اس نے مجھے تلاش کر لیا تھا؟

اس کے انداز سے لگتا تو یہی تھا کہ ابھی اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن کیا اب میں پورے سفر کے دوران اس کی نظروں سے بھڑکانا سکتا تھا؟ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بیسیوں سوالات میرے ذہن میں ابھرے اور ایک گشت ہی انہوں نے میرے ذہن میں اتار بیجان ہر کیا کہ میرا جی چاہا۔ سمندر میں چھلا تک لگا دوں اور تیرتا ہوا اس تک جا پہنچوں۔ اسے پکڑ کر جھنجھوڑاؤں اور اپنے تمام سوالات کے جوابات انکوائری کی کوشش کروں۔

تمام میرا ہر عمل میری خواہشات کے بالکل عکس تھا۔ زندگی میں اکثر ہونا کیا ہے انسان کا دل کچھ اور چاہ رہا ہوتا ہے مگر وہ کر رہے اور رہا ہوتا ہے۔ میں بھی سمندر میں چھلا تک لگنے کے بارے میں سوچنے سے گولی پانی کی آواز میں ہو گیا۔ دوڑیں میں نے بہ دستور آنکھوں سے لگائے رکھی۔ لڑکی بھی دوڑیں دوبارہ آنکھوں سے لگا چکی تھی لیکن اب اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ اب کسی اور ہی سمت میں دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ میرے کہیں سے نکلنے سے پہلے تھامے جہاز کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس اسٹیر اس کے سوا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بڑی کلا کر کالج پڑھ رہی تھی۔ "یہ پرندے جو قہر دیکھ رہے ہو یہ گل نہیں بلکہ "زن" کہلاتے ہیں۔ گل ان ایشیائی علاقوں میں بہت کھائے جاتے ہیں۔"

میں اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال رہا تھا۔ اس احمق کو نہیں معلوم تھا کہ میں اس وقت کون سا پرندہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس وقت دوڑیں کا رخ اس طرف تھا ہی نہیں کہ صرف اپنی پرندے دوڑیں کے بغیر اصل غفلت کی طرح حرکت کر رہے تھے۔

دھن لڑکی نے دوڑیں آنکھوں سے ہٹا کر کندھے پر لٹکائی اور اپنے کیٹل کھائی ہوئی تنگ سی بیڑیوں سے نیچے اترنے لگی۔ اس کے اترنے کا نظارہ خاصا دلچسپ تھا۔ اگر میں اس کے بارے میں اس کی طرح انکوائری کا خیال نہ ہوتا تو یقیناً اس نظارے سے خاصا لطف اندوز ہوتا۔

افضل خان ہیں۔ یہ کراچی سے سوار ہوئے ہیں۔

اس نے باری باری ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور دسی دسی کر  
 جلا دیا کیا۔ ”آپ سے مل کر خوش ہوئی مسٹر کا کر اور مسٹر کا  
 آپ لوگ تحریف رکھیے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آنکھوں  
 سے سب کے ہاتھ میں غلط پڑ جائے گا۔“ وہ ایک مسکرا  
 انسان کی طرح حقیقتاً شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ  
 اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ اس جیسی لڑکی کے ہاتھ کا لمس  
 ہونا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک  
 عجیب سی سردی تھی کہ وہ گرم جوشی اور خوش خلقی کا آثار  
 کرنے کی بڑی بڑی کوشش کر رہی تھی۔

اس کی عمر چھپیں اور تمہیں کے درمیان کہیں تھی۔ چرے  
 ٹرے اور شخصیت کے اعتبار سے وہ بے عیب حسن کی مالک تھی۔  
 لیکن اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے جنہیں اس نے ہلکے ہلکے  
 اپ میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ مظلوم نہیں یہ حلقے ظلمتوں کا  
 پیداوار تھے شب بیداریوں کا نتیجہ تھے یا صحت کی کسی خرابی کا  
 علامت تھے۔ حلقے یوں تو کسی کے چہرے پر بھی اچھے نہیں لگتے۔  
 اس کے چہرے پر کچھ زیادہ سیڑھے لگتے تھے۔ شاید اس نے  
 کہ اس کے چہرے یا سراپا میں اضمحلال، تنگی یا خرابی صحت کا  
 کوئی علامت نہیں تھی۔ دل چاہا کہ کسی جاووں کی عمل سے اس کے  
 بے عیب چہرے کی یہ خامی فوراً دور کر دوں۔

اس کی آمد سے کراچم دو دن دو دن سا ہو گیا۔ اور چڑھ کر  
کلا کر بھی باجیس کل تھیں اور اس نے خوراک کھین کر کاغذ  
شراب کو دیا کہ وہ کیوں سندری سڑ کر رہی تھی اور کیسا بخوبی  
رہی تھی۔

”مجھے ویسے ہی سندری سزا شوق ہے۔ مجھے یہ خوب یاد ہے اور وصیاء میاں ایڈیٹر محسوس ہوتا ہے۔“ وہ صاف اور کٹھن قسم کی انگریزی میں بات کر رہی تھی ورنہ آج کل تو انگریزوں کی معاملات کی طرح زبان میں بھی اپنی روایت پرستی اور وضاحت بھول چکے ہیں۔ وہ بھی امریکیوں کی طرح منہ اور لہجہ بگاڑا کر انگریزی بولنے لگے ہیں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں کسی سے غلطی  
جاری ہوں۔ ممکن ہے میں وہیں رہ جاؤں۔ ویسے میرا انگلیٹ  
شمر ریڈنگ میں ہے۔ ہوائی سفر مجھے پسند نہیں ہے اور زمین  
ڈوبنے میں ایران کے راستے جانا نہیں چاہتی تھی۔ پروگرام  
اچانک ہی بنا تھا۔ سندھوی سفر میں بھی میں عام مسافر جہاز کی  
بجائے کاساسنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لہذا مجھے صرف یہی جہاز مناسب  
نظر آتا ہے۔“

میں سوچ رہا تھا شاید وہ ایران کے راستے سے اس لیے نہ چلائی ہو کہ ایران میں منشیات کے سلسلے میں سزا میں مبتلا ہو چکی تھیں اور عام مسافر جہاز کی بھیڑ بھاڑ سے بچنے کا قصد؟

مجھے حیرت کا ایک خفیف سا جھٹکا لگا کہ کیسے تین ساری میں تھی۔ وہ ایک سرو قد اور تناسب والا عضلا لڑکی تھی۔ بے پناہ خوبصورت تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس قبیل کی سفید قام لڑکی ساری میں اس سے زیادہ قیامت ڈھا سکتی تھی، جتنی وہ مغربی لباسوں میں ڈھا سکتی ہوگی۔

سوئے پر شاگاہ..... یا پھر شاہدِ سہاس کے پر سوانا یہ تھا کہ پاکستانی لڑکیوں ہی کی طرح وہ سوئے کا سیٹ بھی پہنے ہوئے تھی۔ بڑے بڑے شہیکے اس کے کانوں میں کچھ زیادہ ہی بھگورے لے رہے تھے۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا حالانکہ اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

کیا اس نے یہ اہتمام خاص طور پر کیا تھا؟ کیا اس کے پاس اور بھی پاکستانی لمبوسات و فزیرات وغیرہ موجود تھے؟ کیا اس کا کوئی خاص مقصد تھا؟ اس نے گزشتہ رات مجھے جہاز پر سوار ہوتے تو دیکھ لیا تھا اور اسے یہ اندازہ بھی پیشہ ہو گیا ہو گا کہ میں پاکستانی ہوں۔ کیا اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے پاکستانی روپ دھارے کیا؟

انہی سوچ مجھے خوش فہمی پر مبنی محسوس ہوئی۔ اگر وہ ایک بار بھی پاکستان آجکی تھی تو اسے معلوم ہوتا چاہیے تھا کہ ہمارے ہاں تو کسی کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اس کا صرف لڑکی ہونا ہی کافی ہوتا تھا۔ صورتِ شکل کا سوال تو بعد میں آتا تھا۔ اور اگر لڑکی نہ صرف خوبصورت بلکہ سفید فام بھی ہو تو اچھے بھلے معززین کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ جاتی تھیں۔ اس کے لیے پاکستانی لباس کے کثف کی کیا ضرورت تھی؟ ہم پاکستانیوں کو خود اپنے لباس سے ڈرامہ کی دلچسپی تھی۔ سفید فام لڑکیاں ہمیں ان کے اچے لباس میں ہی زیادہ دلچسپی ملتی تھیں۔۔۔ بلکہ کچی بات تو یہ تھی کہ درمیان میں لباس کا عمل دخل جتنا کم ہوتا دلچسپیاں اتنی ہی زیادہ ہوسکتی تھیں۔

فریخ شیون کی گہری نیلی ساری میں اس کا مرضیں وجود جس طرح مقید تھا اور ہر قدم پر اس کے خدو خال میں جو چلک 'جو لہراؤ پیدا ہو اور اس خاص پرست سے شاعر شعر کہتے کہتے دم توڑ سکتے تھے۔ اس نے میری طرف سے... بلکہ کیپٹن گونز کے ہوا کسی کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور میرا خیال تھا کہ اسی طرح وہ میرے آپٹیکس کی کیپٹن کے ہوا کسی سے بات نہیں کرے گی اور جو ناشیائے کر کے رخصت ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ کیپٹن گونز اسے دیکھتے ہی اجڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی تین افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب اگر صرف میں بیٹھا رہتا تو کچھ میوہب لگتا چنانچہ میں بھی اٹھ ہی کھڑا ہوا۔

میں کیچن گزرتے ہیں ایک دوسرے سے متعارف کرائے لگے۔ یہ مس کیتھرن چارلس ہیں۔ یہ ہمارے دوسرے مسافر مسٹر پیری کا کار ہیں۔ مارسلو، فرانس سے ان کا تعلق ہے۔ اور یہ مسٹر

سوسائیل کا واسطہ ملے کر پائیں گے۔ اس طرح ہمیں اس سفر میں تقریباً ایک ہفتہ لگ جائے گا۔“

”میں تجھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ عجیب کیپٹن تھا۔ ایک طرف ساڑھ برس کے طور پر زیادہ رقم کمانے کی فکر میں بھی رہتا تھا اور دوسری طرف اپنے جنازے سے سفر کرنے کے متعلق پہلو بھی بتاتا رہتا تھا۔

”کیچرس مسکراتے ہوئے بولی۔ ”جہاں بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی جلدی میں نہیں ہے۔ ہم سب بڑے پُر سکون..... بڑے پُراہن لوگ ہیں..... اور ایسا ہی پُر سکون سا جنازہ ہمیں مل گیا ہے۔“

اسی قسم کی گپ شپ میں ناشا ہو گیا۔ سب سے پہلے کیہ قمرین نے اجازت چاہی اور اٹھ کر چل دی۔ میں بھی تقریباً اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس سے مزید بات چیت کے لیے مڑنے کا تلاش میں تھا۔ وہ ذیک کی طرف جارہی تھی۔ میں نے بظاہر خوشی بے مقصد سے انداز میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ ”تو پاکستانی لباس اور زیور میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

”پاکستانی لباس...؟“ وہ زور چو کی۔ اس نے اپنے سروا پر نظر ڈالی اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اوہ... ہاں... یہ لباس پاکستان میں بھی پہنا جاتا ہے۔ ویسے میں نے اسے انڈین سمجھ کر پہنا ہوا ہے۔ بہر حال... تعریف کا شکریہ۔“ وہ گویا محض اظہار فاسکرائی۔

”تم بھی پاکستان گئی ہو؟ میرا مطلب ہے، ہندو گاہ سے آگے کسی شہر وغیرہ میں؟“ میں نے پوچھا۔

آگے..... کسی سرور و مروت میں..... اس کے پوچھنا.....  
 "نہیں..... لیکن اب شاید جانا ہو....." وہ مجسم لہجے میں  
 بولی۔ شاید وہ ابھی کچھ اور کہتی لیکن اسی لمحے ایک طرف سے جواز  
 کا فرسٹ میٹ جنرل نکل آیا۔ وہ یقیناً اس سے پہلے ہی سے متعارف  
 تھا۔ وہ اس سے گپ شپ کرنے لگا۔ تم خبریں ہی ذکیک پر جانچنے  
 کیہ خبریں نے بنتر سے بھی کچھ زیادہ بات چیت نہیں کی اور ایک  
 کرسی پر سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ وہ شاید دھوپ بیٹھنا  
 چاہتی تھی۔ پھر اس نے ہماری سامنے لے کر کرسی کے پٹھے سے ٹیکہ  
 لگا کر یوں آنکھیں بند کر لیں گویا وہ اب کسی سے بات نہ کرنا چاہتی  
 ہو اور محض درخواست ہو چکی ہو۔ اب خواہ مخواہ تکمیل ہونے کا کوئی  
 فائدہ نہیں تھا چنانچہ میں بنتر کو اس کے پاس بیٹھا چھوڑ کر وہاں پہر  
 آگیا البتہ ایک لمحے کے لیے نہ جانے کیوں میرا کیہ خبریں کو بنتر سے  
 بارے میں کہنے کوئی جاہ۔ "خاتون! ذرا ہوشیار رہنا..... یہ ایڈر  
 مریض ہے۔"

میں نے کہا: "خاطر ہے میں یہ کہہ نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی سے اپنے کبیرین میں آگیا۔"

یہیں میں اکیلا۔  
 اہل بیت کے دو مے روز مجھے کیسے ترن سے بچ بات چیت کا  
 موقع ملا۔ اس وقت ہم عمان کی سندھ کی حدود سے گزر رہے  
 تھے۔ میں یہیں سے نکل کر ذیک پر آیا تو میں نے اسے رنگ کے

کراس کی شخصیت اور سرگرمیاں زیادہ لوگوں کی نظر میں نہ آنے  
 ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دلکش انداز میں مسکراتے  
 ہوئے نکلا کر سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ بھی تو اپنے بارے میں کچھ  
 بتائیے“

ہیں ایک سابق مجسٹریٹ ہیں اور تعلیمات گزارنے لگا ہوا  
ہوں۔ یہی فلاں کا جیس کھاتے ہوئے ہوا۔ "ساحلی پرندے  
یہی گزروں کی ہیں۔ میں نت نئے پرندوں کے مقابلے اور مطالعے  
کے لیے سفر کرتا ہوں۔ جس روٹ سے یہ جہاز سفر کرتا ہے اس  
سے کوئی مسافر جہاز نہیں گزرتا اور میرے مقصد کے لیے یہ روٹ  
سب سے زیادہ مناسب تھا۔"

سب سے زیادہ مناسب تھا۔  
 ”— اور آپ مسٹر کلان؟“ اس نے صراحتی وار گردن کو خم  
 دیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔  
 ”مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں کراچی میں رہا تو میرا انجام کچھ اچھا  
 نہیں ہوگا۔“ میں نے نہایت دیانت داری سے جواب دیا۔ ”اس  
 لیے میں ہجرت کر رہا ہوں۔ پورا جائیداد میرے ہاتھ لگا اور میں اسی پر  
 سوار ہو گیا۔“

سوار ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے کمانے کے کمرے میں سکوت چھا گیا۔ سب ایک ٹھک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ کپٹن گورے کے اثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی تاہم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے گویا انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ لوگ اطمینان رکھیے۔ میں کوئی مفہور مجرم نہیں ہوں۔ میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

انہیں اس تسلی اور یقین دہانی کی چاہن کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب اپنے مسائل خود حل کرنے اور اپنی پریشانیوں خود دوز کرنے کے پوری طرح اہل معلوم ہوتے تھے تاہم سب گویا میرا دل رکھنے کو مسکرا دے۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ”میرا مقصد صرف جان بچا کر بھگانا ہی نہیں تھا بلکہ میں نے سوچا کہ اس برائے دنیا کی سیاحت بھی کر لی جائے ورنہ چھپنے کے لیے تو کراچی بھی کچھ چھوٹا شہر نہیں تھا۔ ہزاروں مفرد مجرم وہاں چھپے ہوئے ہیں جنہیں کوئی تلاش نہیں کر پاتا۔ ایک میں بھی روپوش ہو سکتا تھا جبکہ میں تو مجرم بھی نہیں تھا لیکن میں نے سوچا کہ سوچ اچھا ہے۔ یوں تو زندگی کی مصروفیتیں سو فیصد ہی نہیں دیں گی۔ اس طرح ہی کچھ سیاحت ہو جائے گی۔“

”اس کے لیے تم نے براست طریقہ اختیار کیا ہے۔“ کہیں کوثر پر سکون لہجے میں بولا۔ ”بھیا احمد اور سرسوتر کے راستے اشتہیل تقریباً چار ہزار میل کے فاصلے پر ہے اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور موسم خوش گوار رہا تو ہم ایک دن میں زیادہ سے زیادہ

قریب کھڑے پایا۔ اس نے خودی بات جیت کا آغاز کیا۔ ”یہ مکان ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت چھوٹا سالک معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ارد گرد صحرا کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ اس نے تبصرہ کیا۔

”ہاں۔ لیکن خوش حال ریاست ہے۔ بیشتر عرب ملکوں کی طرح اس کا انحصار بھی تیل کی کمائی پر ہے۔“ میں نے اپنی دانست میں اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

اس نے یوں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا گویا کوئی بزرگ کسی بچے کی بہت افزائی کے لیے مسکرایا ہو۔ آج وہ سیدھی طرح انگریز بن گئی تھی۔ کل والے پاکستانی خلفات کی کوئی جھلک اس کے جسم پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ڈھلی ڈھالی سفید اسپورٹس شرت اور ٹیکر میں تھی۔ پیروں میں کیوس شوز تھے اور سر پر سے نیچے والا بیٹ۔ آج وہ ایک انگریز سیاح لگ رہی تھی۔

”مسٹر کان! آپ کرتے کیا ہیں؟“ اچانک اس نے پوچھا۔

”میں چھوٹا سا بزنس میں ہوں۔ لاہور اور کراچی دونوں شہروں میں میرا خود بخود بڑا بزنس ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جب انڈیا تقسیم نہیں ہوا تھا..... تمہارا پاکستان نہیں بنا تھا..... میں نے سنا ہے اس وقت میرے دادا، بسنتی میں ہائی کنسٹر تھے۔“ وہ دیکھنے لگے میں بولی۔ ”اس وقت سے اب تک انڈیا اور پاکستان دونوں جگہ بہت سے افراد سے ہمارے..... خاندانی مراسم چلے آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، ایشیائی بڑے تعلقات نبھانے والے لوگ ہوتے ہیں اور ہم انگریز بھی کافی وسعت ہیں۔ خصوصاً جن انگریزوں نے غیر منظم ہندوستان میں طویل وقت گزارا تھا، ان میں اس مٹی اور ممالک کی روایات کی بھی کچھ خوشبو رہی ہوگی۔“

”اب تک ان روایات کی خوشبو یقیناً مٹ چکی ہوگی۔ نئی نسل کو بھلا وہ باتیں کہاں معلوم ہوں گی..... اور اگر معلوم بھی ہوں گی تو انہیں ان کی کیا پروا ہوگی۔ یہ بڑا ظالم بڑا ہنگامہ پروردہ ہے۔ آج کی خباثتوں نے مغرب تو مغرب..... مشرق کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ سب قدریں مٹی جی جادی ہیں۔ سب کچھ چاہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہر طرف کسی نہ کسی طرح کی وحشت اور جنون کا دور دورہ ہے۔ دولت کی دوڑ ہے۔ دولت کے لیے لوگ سب کچھ کر گزرتے کو تیار ہیں.....“

اس کی نئی آنکھیں جھیل کی طرح پُر سکون رہیں۔ میں بنور اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی خیر نمودار نہ ہوا۔ نہایت دبیسی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی۔ ”مسٹر کان! آپ نوجوان ہیں لیکن بوڑھوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری اگر کبھی اپنے پیٹا سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ بھی اسی قسم کی مایوس کن باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

”دراصل..... زندگی کے سفر میں نہ جانے کس موڑ پر میرے اندر کوئی بوڑھی روح طویل کر گئی تھی۔ اب اسے بار بار نکلے کا راز نہیں ملتا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ویسے بھی عمر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ انسان کو ہر عمر میں ہی اچھی روایات اور اچھی قدروں کی پاس داری کرنی چاہیے۔ ہم اب بھی اس دنیا کو خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ اب بھی ایک اچھی زندگی کا خواب پورا کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان لوگوں کی باتوں پر کان دھرتا چھوڑ دیں جن کا پیشہ دوسروں کو برباد کرنے کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا اور انہی خواہشات کا اندھ من بنانا ہے۔ ایسے لوگ ہمیں زندگی میں کسی بھی موڑ پر کسی بھی روپ میں مل سکتے ہیں۔“

”میرے پیٹا بھی جب مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو جیسے معلوم ہے میں ان سے کیا کہتی ہوں مسٹر کان؟“ وہ کچھ زیادہ واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اعتماد سے کہا۔ ”تم کہتی ہوگی میں بچی نہیں ہوں یا پیٹا میں اپنا بڑا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ کیا کہتی ہو؟“

”انکل۔“ اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں۔ ”لیکن تمہیں کیسے معلوم؟“

”مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے پیٹا جواب میں کیا کہتے ہوں گے۔“ میں نے اسی اعتماد سے کہا۔ ”وہ کہتے ہوں گے، ہر عمر کے انسان کے اندر ایک چھوٹا..... نا سمجھ اور بے وقوف بچہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ شکایت اور غیبت قسم کے لوگوں کو اسی بچے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اس کے ذریعے انسان سے عجیب عجیب کام کراتے ہیں۔ اسی لیے تو دنیا میں بعض اوقات اچھی بھلی عموں کے لوگ جو جو کام کرتے نظر آتے ہیں، انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے تمہارے پیٹا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

”واقعی۔“ وہ آنکھیں کچھ اور پھیلاتے ہوئے بولی۔ ”وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا مسٹر کان؟“

”کچھ تو میں بخوبی ہوں اور کچھ میرا ذہنا بھر کے روز مرہ انسانوں سے ذہنی رابطہ ہے۔“ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

وہ دیکھ کر رگے ہوئے چھوٹے سے بیک سے ایک ضخیم کتاب نکال کر کرچی پر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب اس کا کچھ پڑھنے کا موڑ تھا۔ میں کتاب کا نام پڑھ کر حیران ہونے لگی۔

سکا۔ خاصا لمبا سا نام تھا اور اس کا ترجمہ کچھ یوں ہوا تھا۔ ”مستقبل و حلی کے معاملات پر تھیل کے اثرات کی تاریخ۔“

کیا وہ واقعی اس قسم کی کتابیں پڑھتی تھی یا یہ محض دکھاوا تھا؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ بعض لوگوں میں یہ نفسیاتی بیماری ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے بیماری بھرم قسم کی کتابیں اٹھائے بھرتے ہیں اور ذرا موقع پاتے ہی..... بلکہ بعض

اوقات تو زبردستی موقع نکال کر انہیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔

میں نے جھنگے سے ٹپک لگا کر اس کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم خود بھی تو خاصی سنجیدہ لڑکی ہو۔ اس قسم کی عالمانہ کتابیں پڑھتی ہو۔“ میں نے اس کی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

”انسان والدین سے خزاہ کتابیں باقی کیوں نہ ہو جائے“ ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو آئی جاتے ہیں۔“ وہ بیٹ کا چھپا اوپنا کرتے ہوئے بولی۔ ”میرے دادا اسول سروس میں تھے۔۔۔ والد لندن میں ہو دو کرٹ تھے۔۔۔ عالمی حالات کے بارے میں جاننے کا کچھ نہ کچھ شوق تو مجھ میں بھی آتا ہی تھا۔“

اگر اس قسم کی لڑکی واقعی ڈرگز کے دھندے میں لوٹ جاتی تو یہ بڑے ہی افسوس کی بات تھی۔ آخر اس کا رویہ کار کو کس حد تک پھیلنا تھا؟ کس دنیا میں قیامت اسی دھندے کے ذریعے تو نہیں آتی تھی؟ قیامت کا ایک روپ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ دنیا کی بیشتر آبادی میں سے کوئی منشیات تیار کرنے والا ہو، کوئی پھیلانے والا، کوئی بیچنے والا، کوئی خریدنے والا اور کوئی استعمال کرنے والا۔ کچھ لوگ منشیات کی وجہ سے۔۔۔۔۔ اور کچھ ہو لٹاک تیار یوں کی وجہ سے اڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہوں۔۔۔۔۔ یہ بھی تو ایک قیامت ہی تھی۔

آہم میں ابھی تک کیتھرن کے بارے میں صحیح طور پر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس جہاز پر اس کے سفر کا مقصد کیا تھا۔ وہ بہت مری لڑکی تھی۔ وہ کتاب کھول کر بظاہر اس کے مطالعے میں کھو گئی تھی۔ یہ گویا میرے لیے واضح اشارہ تھا کہ وہ مزید بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

میں نے جہاز کے مختلف گوشوں میں کھڑے ہو کر اس سفید اسٹیر کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی جس پر میں نے آئیں آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا لیکن پھر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ کیا وہ کسی اور سمت نکل گیا تھا یا پیچھے رہ گیا تھا؟ اگر اس لڑکی کو واقعی میری تلاش تھی تو اس نے کس طرح تعین کر لیا تھا کہ میں ارد گرد نظر آنے والے کسی جہاز پر نہیں ہوں؟

ان سوالوں میں سے فی الحال کسی کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے برعہ دیکھنے کے بجائے ہیری کلا کر سے دو درمیں لے کر بھی اس اسٹیر کو تلاش کیا لیکن وہ دو درمیں سے بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے باقی وقت کلا کر کے ساتھ ہی پرندوں کے بارے میں اس کے ایڈو پٹر سننے میں گزارا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کے بارے میں واقعی میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

تیسرے روز جب کہ جہاز عرب ریاستوں کے گرد گھومتا ہوا بحیرہ احمر میں داخل ہونے والا تھا، ایک طرف سے خشک کا ایک چھوٹا ٹرار جہاز کے بالکل قریب آگیا۔ میں اس وقت ریگ پر ہی

کھڑا تھا۔ میں چونکا ہوا گیا لیکن اس میں سے کسی نے آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی جہاز کے غلطے میں سے کسی نے؟ مجھ سے فرمائش کی کہ میں وہاں سے ہٹ جاؤں۔

بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے درمیان کوئی دلہن ہو رہا تھا۔ فرسٹ میٹ جنرل جیجے کھڑا ان سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس طرح دن کی روشنی میں علی الاطلاق ان کے درمیان مال اور رقم کا تبادلہ ہوگا۔ میں اوپر کھڑا دیکھتا ہوں کہ ان کے درمیان کوئی لین دین نہیں ہوا اور چند منٹ بعد ٹرار اڑا چلا گیا۔

جنرل اوپر آگیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”لوگ کون تھے اور کس لیے آئے تھے؟“

”مائی گیر تھے۔ پچھلیاں ہمارے ہاتھ فروخت کرنا چاہے۔ لیکن ان کے پاس مال اچھا نہیں تھا اور قیمت بھی زیادہ آگیا۔ تھے ان سے عدیل ہی صحیح طرح منتا ہے۔“ جنرل نے جواب دیا۔ اسی روز کچھ دیر بعد ایک اور خشک ٹرار اڑا جہاز کے قریب اور گویا وہ منظر دہرایا گیا۔ عدیل رستے کی سڑکی کے ذریعے ہوا پر گیا۔ اس بار وہ واپس آیا تو اس کے کندھے پر پچھلیوں کی ایک لہری ہوئی تھی۔ جہاز پر آکر وہ باسکٹ خانہ سالن کے حوالے کر ہوئے بولا۔ ”پچھلیاں اچھی ہیں۔۔۔۔۔ تازہ بھی ہیں اور سستی بھی ہیں۔“

خانہ سالن نے باسکٹ کھول کر اس میں جھانکا۔ باسکٹ میں اوس بڑی بڑی پچھلیاں موجود تھیں۔ خانہ سالن نے ان میں سے ایک کو نکال کر گویا انھوں ہی اہلوں میں توڑا اور معنی خیز سے انہوں کو ٹرار اوپر بھر دیا باسکٹ اٹھا کر کچن میں لے گیا۔

میرے ذہن میں شکوک کا سنبھلا رہنے لگا تھا۔ اس کے میں موقع کی تلاش میں رہا لیکن افغان خانہ سالن مجھے زیادہ دے لیے کچن سے واپس آکر وہ ہوتا کمانی نہ دیا۔ وہ اگر کچن سے کھانا بہت ہی تھوڑی دیر کے لیے۔۔۔۔۔ اور اس پاس ہی نہیں ہوگا۔ وہ اپرین باندھے ہوئے تھا اور پچھلے تین دنوں کی نسبت کچھ زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے بہت ہی رات کے کمانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

بالآخر میں نے اسے انجمن دوم کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے اپرین اتارا ہوا تھا۔ شاید وہ ٹیپٹن کو تھوڑے سا وقت لیے جا رہا تھا۔ میں نے دسک لینے کا فیصلہ کر لیا اور تنگ سے دلوں پر انہوں کے بل تقرباً دوڑتا ہوا سیر میزوں تک پہنچا اور وہ چلا گئیں میں سیر میزیاں اتر کر کچن میں جا پچھا۔

کچن کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے یہ کہہ کر اچھا دھچکا لگا کہ ہم ایسے کچن میں پکاتے جاتے رالے کھاتے۔ کھانے تھے بس ذرا برتن پونچھ پانچھ کر گھارہی طور پر صاف کرتے تھے۔ سامنے سامنے جاتے تھے جیسے کچلے درجے کے ہوئے ہوئے

چاک تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے گھوا۔ افغان خاندانوں دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت کچھ زیادہ ہی سرخ نظر آ رہا تھا اور آنکھیں نفرت سے دھک رہی تھیں۔

مجبب بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں گوشت کا ٹکڑا کا ہماری چاب تھا۔ چاب اسٹیل کا تھا اور اس وقت دھب میں چمک رہا تھا۔ مجھے اپنی جلد کے نیچے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا کہ عقب سے مجھ پر نظر پڑے ہی خاندانوں کا جلال میں آگیا تھا اور شاید اس نے یہ مشکل اپنے آپ کو چاب کے استعمال سے باز رکھا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں تیزی سے نہ گھومتا اور مزید ایک آدھ لمبے اس کی آمد سے بے خبر رہتا تو وہ چاب استعمال کر ہی مگررتا۔

خاندانوں خواہ کبھی بھی ملازمت کریں، عام طور پر وہ بچن کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھتے ہیں اور بلا اجازت وہاں کسی کی دخل اندازی کو بہت برا محسوس کرتے ہیں۔ ان کی اس نفسیات کا مجھے احساس تھا اور اس وقت تو میں دیکھ ہی کچھ مشکوک نظر آ رہا تھا۔ ان سب باتوں کے بارے میں مجھے خاندانوں کا اس طرح حد سے زیادہ جلال میں آجائے کچھ غیر فطری سا محسوس ہوا۔

میں نے پچھلی احتیاط سے کاؤنٹر واپس رکھتے ہوئے مسکرا کر ہوا رہے ہیں کہا۔ ”دراصل کانی پنے کا موزو ہوا تھا۔۔۔ تم نہیں نظر نہیں آئے۔۔۔ میں نے سوچا خود ہی جانے کی کوشش کی جائے۔“ خاندانوں کو اپنا مقصد سمجھانے کے لیے اس سے آسان انگریزی میں بات کرنا پڑی تھی۔ کچھ ایسی ہی انگریزی میں وہ جواب دیتا تھا۔

”کیا آپ کوئی نئی قسم کی کانی بنانے لگے تھے مشرا فضل خان؟ کوئی ایسی کانی جس میں پچھلی بھی دلتی ہے؟“ اس نے گویا ایک ایک لفظ کو جپانے ہوئے پوچھا۔ ویسے اس نے بہت تیزی سے اپنے جلال پر قابو پایا تھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ میں نے گویا اس کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے اس پر ذرا ہنسنے کی کوشش کی۔ ”پچھلیاں تو میں ویسے ہی دیکھنے لگا تھا۔۔۔ کسی ایسی نسل کی معلوم ہوتی ہیں۔۔۔ رات کے کھانے میں شاید پچھلی ہی لے گی؟“

”صرف رات کے کھانے پر ہی نہیں۔ بلکہ اب تو اکثر پچھلی ہی کھانے کو ملے گی۔“ اس کا چہرہ بہت تیزی سے اعتراض پر آ رہا تھا۔ تاہم اس کا جواب اب بھی جھپٹا ہوا ہی تھا۔ ”اس پچھلی کو آپ کے پاکستان میں ہیرو کہا جاتا ہے اور انگریزی میں ہیرو ہیرنگ۔۔۔ اور کچھ جانا چاہتے ہیں آپ؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں جان کر کیا کروں گا۔ میں تو تم کھانے سے غرض رکھتا ہوں۔“ پچھلے نے نہیں۔۔۔ میں نے سادگی سے کہا۔ ”پچھلے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے البتہ پچھلے کاٹنے سے انسان کو بچنا چاہیے۔“ وہ مچھلے سے لمبے میں بولا اور مچھلے خیر سے انداز

ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اس کو نٹ کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پچھلا کچھ عرصہ جس طرح گڑبگڑا تھا اس میں میں نے جانے کیا کچھ بدداشت کر چکا تھا۔ اس بچن کی حالت تو پھر بھی قیمت تھی۔ مجھے وہ پچھلیاں تلاش کرنے کے لیے کسی فرزند وغیرہ میں جھانکنا نہیں پڑا۔ وہ کوئٹہ رینج کے قریب ماربل کے کاؤنٹر نمائیت کرتے تھے اور ترتیب سے رکھی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک پچھلی کو دو انگلیوں سے پکڑ کر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا ہیٹ چاک تھا۔ پھر میں نے جھٹک کر دیکھا تو سچی پچھلیوں کے ہیٹ چاک نظر آئے۔ انہیں خوب صاف کر کے رکھا گیا تھا۔ میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ پچھلیوں کے ہیٹ تازہ چاک کیسے کئے تھے یا پہلے سے چاک شدہ تھے، تاکوں وغیرہ کے ذریعے بند تھے اور اب صرف ٹانگے کو لے گئے تھے۔

میں نے ٹانگوں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئے۔ میں انہیں میں پڑ گیا۔ ایک بار پھر میرا یہ شبہ قوی ہونے لگا کہ پچھلیوں کے ہیٹ میں کچھ آیا تھا۔ میں نے خاندانوں کو بچن سے باہر کچھ لے جانے نہیں دیکھا تھا۔ اگر کچھ آیا تھا تو زیادہ بچن میں ہی چھپایا گیا تھا؟

بظاہر وہ زیادہ لمبا پڑا بچن نہیں تھا لیکن اگر غلط کے عالم میں کوئی ماسٹرم چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی تو بڑی دھواں پھیل آسکتی تھی۔ اس میں چیزیں رکھنے کی گنجائش تو کافی تھی۔ بہت سی کیبنٹس تھیں۔ فریج اور فریڈر تھے۔ کوئٹہ رینج تھی۔ سامان رکھنے کی اور کی چیزیں تھیں۔

میں نے حتی الامکان تیزی سے مچی چیزوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن میں کوئی مشکوک چیز تلاش نہیں کر سکا۔ میں تو ابھی صحیح طرح بچن ہی کی تلاش میں لے رہا تھا اور اگر وہ چیز بچن سے باہر چاکی تھی پھر تو اسے تلاش کرنا کم از کم اکیلے آوی کے لیے تو تقریباً ناممکن ہی تھا۔ اتنا برا جہاز تھا۔ اس میں تو ابھی بھلے حجم کی چیزوں کو چھپانے کے لیے اتنی بہت سی جگہیں تھیں۔ مختصر حجم کی چیز کا تو مسئلہ ہی کچھ نہیں تھا۔

اس تمام افرا تفری کے دوران ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں گردش کیے جا رہا تھا۔ جس وقت وہ ’ٹرار‘ جہاز پر پچھلیاں دینے آیا تھا، اس وقت ہم عرب ریاستوں کی حدود میں تھے۔ عرب ریاستوں میں تو بیرون اندر لانے کی کوشش کی جاتی تھی اور عرب ممالک اپنے سخت قوانین اور سخت رویتے کی وجہ سے اس پلٹار کو حتی الامکان روکے ہوئے تھے لیکن یہاں سے بیرون کا ٹریفک باہر کی طرف جانے کا کوئی سلسلہ ابھی تک کم از کم میرے علم میں تو نہیں آیا تھا۔ تو پھر یہ کیا چکر تھا؟ کہیں میں خواہ مخواہ ہی شکوک اور دباہوں کا شکار تو نہیں ہو رہا تھا؟

میں ایک بار پھر پچھلیوں کی طرف پلٹ آیا۔ میں نے دو تین نوٹری پچھلیاں بھی اٹھا کر دیکھیں۔ سب کے ہیٹ کیساں انداز میں







نہیں لی تھی۔ وہ کہیں خالی تھا۔ جہاز پر اور کوئی ضرورت مند مسافر نہیں تھا جسے وہ کہیں الاٹ کیا جاتا۔ میں نے سوچا، جہاں ان کا وقت برباد ہو چکا تھا، اسی بے ہودہ کام میں تھوڑا سا مزید وقت برباد کر لیا جائے تاکہ دل میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔

چوتھا کہیں ایک کونے میں تھا۔ اس کا تالا کھولنے میں بھی مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مجھے جو دیوار گیرینڈ نظر آئے گا اس پر کوئی بستری چادر وغیرہ نہیں ہوگی لیکن مجھے وہاں نہ صرف بستری ہو ا دکھائی دیا بلکہ وہاں ہی کھل بھی پھیلا نظر آیا جیسا ہم قیوں مسافروں کو دیا گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سانس روک لیا۔ کھل بستری پر تھی نہیں پڑا تھا بلکہ کسی کے جسم پر تھا یعنی کوئی کھل لینے لیا ہوا تھا۔ میں اندر پہنچ چکا تھا۔ میں نے وہاں نکل بجائے کی کوشش نہیں کی۔ یہ حرکت شاید زیادہ غلط ہوئی۔ فی الحال تو میں کوئی بہانہ کر کے جان چھڑا سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں تھا کہ مجھے حیرت کا خاصا زور دار جھٹکا لگا تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ جہاز پر چھٹا مسافر بھی سفر کر رہا تھا مگر ہماز کے عمل نے اس بات کو خفیہ رکھا تھا اور وہ شخص بھی چرس میں تھے شاید کہیں ہی میں رہتا تھا اس لیے اب تک دوسروں کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔

میں نے اپنے عقب میں دو واہ آہٹنگی سے بند کر دیا۔ تالے کی بجلی سی جھلک کے بعد بھی جب اس شخص نے حرکت نہ کی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ بدستور ساکت رہا۔ بالآخر ایک خفیف سا شبہ محسوس کرتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر آہٹنگی سے اس کے اوپر سے کھیل اٹھایا۔ وہ کوئی مسافر نہیں، عملے کا آدمی عدول تھا اور وہ مژدہ تھا۔ کسی نے اسے زندہ کر دیا تھا۔ اس کی گردن آؤسی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں اسی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ کئی مناظر کسی تیز رفتار فلم کی طرح میری آنکھوں میں گھوم گئے۔ کراچی میں کلفٹن کے ساحل کے قریب دیکھی ہوئی عاشق بھی کی لاش.....

اس کی گردن تو تن سے بالکل ہی چھ اکر رہی تھی۔

پھر افغان خاندان فہید کی صورت میری نظروں میں ابھری۔

مجھے وہ منظر یاد آیا جب وہ اسمیل کا پکتا ہوا تیز دھار چار لے میرے عقب میں کھڑا تھا لیکن جس وقت میں نے کلفٹن پر عاشق بھی کی لاش دیکھی تھی اس وقت خاندان فہید تو وہاں سے میلوں دور بندرگاہ پر اپنے جہاز پر امانت پر موجود ہو گا..... مگر یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ میں بھی تو اس وقت جہاز امانت سے میلوں دور کلفٹن پر موجود تھا لیکن بعد میں آصف بھی سے جہاز اور پھر خاکرات سے بھی فارغ ہو کر کلفٹن سے بندرگاہ پر کھڑے ہوئے "جہاز امانت" تک پہنچ گیا تھا۔ جس طرح ٹیکسی سے میں آسکتا تھا اسی طرح کوئی اور بھی تو آسکتا تھا۔

..... تو کیا یہ فہید کا کام تھا؟ لیکن فہید کو اپنے ہی ایک سارے کارکن کو قتل کرنے کی کیا ضرورت آتی تھی؟ پھر مجھے احسام ہو ا کہ یہ وہاں کھڑے ہو کر اس قسم کے سوالوں پر غور کرنے کا بہتر نہیں تھا۔ میں نے عدول کی لاش کو کھیل سے ڈھانپ دیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ میں کہیں گوز کو تالا بھی نہیں سکتا تھا کہ نہ کہیوں کی تلاش ہی لیتا پھر رہا تھا اور مجھے عدول کی لاش مل گئی تھی یہ بھی درست نہیں تھا کہ میں اسی طرح کہیں کو تالا لگا کر چلا جاؤ اور اپنی زبان بند رکھتا۔ کہیں واقعی خالی اور مقتل تھا۔ شاید وہ دن تک عدول کی لاش دریافت نہ کی جاسکتی۔ اس قسم کے کیوں میں سے تو لاش مڑنے کے بعد بھی باہر والوں کو سزاوار کا احسام شاید بہت تاخیر سے ہوتا۔ قاتل کا مقصد بھی شاید یہ تھا۔ اس لاش اسی لیے اس خالی کہیں میں ڈال کر اسے مقتل کر دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تاخیر سے اس کا پتہ چلے۔ اس دوران شاید وہ غائب بھی ہو جاتا۔

دوسرے ہی لمحے میں فیصلے پر پہنچ گیا۔ مجھے ایک درمیانی راز پر سوچہ گیا تھا۔ مجھے سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور عدول کی لاش کی طرف اشارہ بھی دیا جاسکتا تھا۔ میں نے کہیں کا دروازہ پر اکر کھول دیا اور خود وہاں سے کھٹک آیا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی کوئی وہاں سے گزرے گا تو اندر جھانک کر ضرور دیکھے گا کہ دروازہ کیوں کھلا تھا۔ اس کے بعد لاش کی موجودگی راز نہیں رہ سکتی تھی۔

میں انجن روم کے قریب جہاز کے لی نماٹھے پر پہنچ گیا جہاں کہیں گوز موجود تھا۔ میں نے اس سے کپ شب کرتے ہوئے دیوار پر تو وہاں چارٹ کی طرف دیکھا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ جہاز کس رفتار سے سفر کرتے ہوئے کس مقام پر پہنچا تھا۔ "ہم نے خاصی تیز رفتار سے سفر کیا ہے" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ موسم خراب نہیں ہوا اس لیے ہم اچھی رفتار پر گزار رکھنے میں کامیاب رہے۔" کہیں گوز نے گردن ہلائی۔ "ان دنوں تیز رفتار بھی پر سکون رہتا ہے۔"

"ہمیں اسی طرح کپ شب کرتے ہوئے تین چار منٹ گزرے تھے کہ فرسٹ سیٹ جہز پر کھلایا ہوا وہاں پہنچا اور گوز سے مطالبہ ہوا۔ "کیٹین! بہت ہی خیر ہے۔ عدول مارا گیا ہے۔"

"مارا کیا ہے؟" کیٹین نے حیرت سے پوچھا۔ "ہم کیا اس وقت میدان جنگ میں ہیں جو وہ لڑتے ہوئے مارا گیا ہے؟"

"میرا مطلب ہے اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔" جہز پر اکر ہوا۔ "کسی نے اس کا گھٹا کٹ دیا ہے۔ قاتل تیز رفتاری کے ساتھ آہٹا تھا تو اس نے خالی کہیں کا دروازہ کھلا دیکھا۔ اس نے اندر جھانکا تو پھر ہر کوئی لینا نظر آیا۔ وہ اندر گیا تو اسے عدول مڑہا۔ "قاتل بھی اتفاقی تھا اور جہاز پر تالا پیل تھا۔

"تم وہیل سنبھالو۔ میں ذرا جا کر دیکھتا ہوں۔" کہیں گوز نے

بزرگ کو صدمہ دیا۔

میں بھی بظاہر تجسس سے مطلوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے لگا۔  
مال کیمن کے دروازے پر کسی افراد جمع تھے۔ ان میں کئی تین بھی شامل تھے۔

”ابھی ہوا؟“ میں نے معصوم بنے ہوئے کیتھرن سے پوچھا۔  
”کریو کے ایک آدمی عدول کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ بے  
ہامہ۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں نے بھی آفس زدہ لمبے میں کہا۔“

کیتھرن کوڑھ مارتا سا گارڈ انٹوں میں رہا ہے بالکل غلطی جا سوس  
کی طرف لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اسے یقیناً عدول کی موت سے  
دھمکانا تھا لیکن وہ غمزہ نظر آنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا  
سرافرمان نظر آنے کی بھی پوری پوری کر رہا تھا حالانکہ  
مجھے اندازہ تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

چند لمبے بعد میں رینگ کی طرف چل دیا۔ میں نے دیکھا  
کیتھرن بھی میرے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ ابھی تھراکی کے لباس میں  
ی تھی لیکن اس کے اوپر اس نے ایک سفید اسپورٹس شرٹ پہن  
لی تھی جس کے ٹخنہ کھلے تھے۔ اس کے بے ترتیب ہاتھوں میں وہی  
نئی تھی اور کچھ نہیں اس کی بیٹانی اور رخاؤں سے چپکی ہوئی  
تھی۔ میں اسے آتے ہوئے دیکھ کر رک گیا۔

”قرب پڑی کر وہ مجھے لیکن سمجھنے کے بدلے سے لے بیٹھ میں بولی۔  
”بڑا افضل چر پڑی۔! میرا خیال ہے اب تم اپنی ڈرائے بازی  
بڑ کر دو۔“

اس نے مجھے مسٹر کان یا افضل کان کے بجائے افضل  
چر پڑی کہہ کر خطاب کیا تھا۔ یعنی وہ میرے اصل نام سے واقف  
گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میں نے سمجھ کر کہا ”میرا نام افضل  
چر پڑی نہیں“ افضل خان ہے۔“

”غزہ غزہ کہیں اپنا سر شیم بدلے کا کلف کر رکھا ہے؟ اس  
سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بس ویسے ہی تمہارے دل کو قتل رہی ہوگی  
کہ تم نے اپنا نام بدل رکھا ہے۔ بہر حال مجھے معلوم ہے تمہیں  
میرے والد سے میرے پیچھے لگایا ہوگا۔ انہوں نے شاید کراچی میں  
سیٹھ رمضان سے رابطہ کیا ہوگا اور سیٹھ رمضان نے میری عمرانی  
کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہوگا۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو برا کہیا تا محسوس  
کیا۔ واقعی میرا سارا ڈراما اڑھا کر اڑھا رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر  
دیکھا۔ ہری کار کو قدم کے ناسٹے پر ہی موجود تھا۔ میں نے دھبی  
کواڑ میں کہا ”میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتا۔ رات کے کھانے  
کے بعد جنازہ کے پچھلے حصے میں فین ٹیل کے قریب مجھ سے ملنا پھر  
اطمینان سے بات کریں گے۔“

”اس نے بے پروائی سے کہہ دیا کہ آج کے اور واپس کیمن کی  
طرف چلی گئی جہاں کیمن کوڑا اپنے محلے سے جاؤں خیال کر رہا تھا۔

قتل اپنی جگہ تھا لیکن بیٹ بہر حال کھانے کو مانتا تھا اس لیے  
اس شام بھی حسب معمول کھانے کا بندوبست ہوا۔ کھانے کے  
دوران اس بات پر بحث ہوئی رہی کہ کیا قتل کی رپورٹ درج  
کرانے اور تفتیش کے لیے جنازہ کو کسی قریبی ہندو گاہ پر رکھا جائے؟  
کیتھرن کا کہنا تھا کہ قتل کی واردات بین الاقوامی سمندری حدود  
میں ہوئی تھی اس لیے ہمارا ایتھوپیا یا کیمن کی ہندو گاہ پر رکھنا  
ضروری نہیں تھا۔ اس وقت ہمارے دائیں بائیں کی دو ممالک  
تھے۔ میں تو بغیر کانڈاٹ کے سر کر رہا تھا اور حالات بدلے ہی میرے  
کچھ زیادہ حق میں نہیں تھے۔ میں تو خدا سے چاہتا تھا کہ ہم کسی قسم  
کی پولیس کارروائی میں لوٹ نہ ہوں لیکن میں نے محسوس کیا کہ  
باقی دونوں مسافروں اور بیشتر محلے کی بھی ملٹی خواہش یہی تھی کہ  
انہیں کم از کم ایتھوپیا یا کیمن کی پولیس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آخر کار سارا معاملہ ”ساری ڈس واری اور فیملے کا اختیار  
کیمن کو سونپ کر چھوڑ دیا گیا جس کے بعد یقیناً سب نے اپنے آپ کو  
بلا کچھکا محسوس کیا۔ کیتھرن نے حکم دیا کہ لاش کو برف میں محفوظ کر  
دیا جائے، جنازہ کے ترکی یعنی اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد ہی پولیس کو  
اس معاملے کی اطلاع دی جائے گی۔ مجھ سمیت غالباً ابھی نے  
سکون کی سانس لی۔

کھانے کے بعد میں شٹل ہوا جنازہ کے عقب میں باہر کو نکلے  
ہوئے گول حصے میں چلا گیا جو فین ٹیل کھاتا تھا۔ کچھ دیر بعد  
کیتھرن بھی آن پہنچی۔

”وہ گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ”تم  
یقیناً تڑپ رہے ہو گے۔ کسمار یہ ہو گے کہ میں نے تمہیں  
پہچان لیا؟“

”نہیں۔ اس قسم کی باتیں مجھے لائق نہیں ہیں۔“ میں نے  
خفک لہجے میں کہا۔ ”میں نہ تڑپا ہوں اور نہ کسمار ہوں۔ توڑا سا  
تجسس ضرور ہے۔ اور وہ فطری ہی بات ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم نے  
یہ اندازہ تو لگایا کہ کراچی میں تمہارے والد کا دوست سیٹھ رمضان  
موجود ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے والد تمہارے  
بارے میں پریشان ہیں۔ انہوں نے شاید سیٹھ رمضان سے رابطہ کیا  
ہو اور سیٹھ رمضان نے کسی کو بھیج دیا ہو۔ یہاں تک تو بات سمجھ  
میں آتی ہے۔ انسان خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے اور کبھی  
کبھی وہ گھوڑے صحیح سمت میں بھی دوڑ پڑتے ہیں لیکن توڑی بہت  
حیرت مجھے اس پر ہے کہ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ یعنی صحیح  
نام؟“

”محض اتفاقاً۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”میں نے تم سے  
جسٹ بولا تھا کہ میں پاکستان نہیں گئی ہوں۔ میں پاکستان“ لڑائی اور  
بگڑے دلش، تین ملکوں سے گھومتی ہوئی آ رہی ہوں۔ مجھے ان ملکوں  
میں کی کام بھی تھے۔ مجھے سیٹھ رمضان کو دیکھنے کا بڑا تجسس تھا  
لیکن میں اپنی اصل حیثیت میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے

مند ہونے کے باوجود سیٹھ رمضان کو چلتی کاٹھن کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کی فطرت میں بھی شہرت پسندی نہیں تھی اور ویسے بھی اس خاص طبقے میں سے تھا جو احتیاطاً اور مصلحتاً بھی شہرت سے دور بھاگتا ہے۔ اس جیسے لوگ سرگتھکا کرنا یا کام کرتے رہتے ہیں۔ اسے ٹکلی یا غیر ٹکلی پرسوں والوں سے ملنے کا ٹھٹھا کوئی شوق نہیں تھا۔ البتہ خواہسورت اور سفید چھڑی والی لڑکی کو دیکھ کر ذرا ریشہ خطی ہو رہا ہو تو بات اور تھی۔ اس بد نصیب کو کیا معلوم تھا کہ وہ اس کے دوست کی بیٹی ہے۔ وہی بیٹی جس کی بہتری کے غم میں وہ بھی ڈبلا ہوا تھا۔ میں نے فحش سیٹھ سانس لے کر کہا۔ ”تم فحش لوگوں میں ایک یہ بھی بڑی خرابی ہوتی ہے کہ جھوٹ بول کر ہم بے چارے سیدھے سادے شہتی لوگوں سے اپنا کام نکال لیتے ہو۔ ہم اپنے آپ کو ہر طرح سے قربانی کا بکرا بنا کر پیش کر دیتے ہیں اور تم لوگ بعد میں ہم پر ہستے ہو ہماری سادگی کا مذاق اڑاتے ہو۔“

”میں مذاق نہیں اُڑا رہی تھی تو صرف توڑا اسلاف اندوز ہو رہی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی ”وہ خاصا دلچسپ آدمی ہے مجھے تو حیرت ہو رہی تھی کہ اس جیسے آدمی کی میرے پایا جیسے نہایت سنجیدہ اور بارعرب آدمی سے کس طرح دوستی ہو گئی۔“

”سیٹھ رمضان کی ہر طرح کے آدمیوں سے دوستی ہے اور اس کی دوستیاں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔“ میں نے کہا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ سیٹھ رمضان جتنا سادہ لوح... بلکہ بے وقوف نظر آتا ہے۔ اتنا بے وقوف ہے نہیں۔ اکثر اوقات کیا پتا چلنا مشکل ہوتا تھا کہ وہ بے وقوف بنا رہا تھا یا بن رہا تھا۔

کیسٹرین ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”بہر حال... اس نے مجھے انہی کے لیے بہت سی پر تکلف کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے سے پہلے اس نے مجھے اپنا پورا بنگلا دکھایا۔ بہت شاندار بنگلا تھا۔“

”یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اصل بات تو سچ میں ہی رہے گی۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہیں میرے صحیح نام کا کیسے پتا چلا؟“ میں نے اس کی بات کاٹھٹے ہوئے کہا۔

”وہی تو بتانے لگی تھی۔ اب میں اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ مجھے اپنا شاندار گھر دکھا رہا تھا تو ظاہر ہے اسٹڈی میں بھی لے گیا۔ تمہارے ہاں دولت مند لوگوں کو خواہ کتنے بڑھنے کا شوق ہو بلکل نہ ہو لیکن گھر میں شاندار اسٹڈی ضرور ہوتی ہے۔ اس اسٹڈی کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اس کی ایک دیوار پر تمہاری تصویر لگی ہوئی تھی۔ جڑی سی۔۔۔ رنگیں۔۔۔ قریب شدہ تصویر۔“

”میری تصویر؟“ میں نے بے یقینی سے کہا پھر بے اختیار اُردو میں کہا ”اے یہ خواہاں بد بخت!“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ ”میں شاید کبھی سمجھتی کہ وہ اس کا کوئی بیٹا ہو گا مگر وہ مجھے پتا چکا تھا کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ کس کی تصویر

معلوم تھا کہ اگر میرے گھر منہ پایا اسے میرے بارے میں مطلع کر چکے ہوں گے تو وہ پہنچے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائے گا اس لیے میں اس سے ٹکی ضرور۔ لیکن کیسٹرین کی حیثیت سے نہیں۔“ وہ گویا اس ملاقات کے قصور سے محفوظ ہوتے ہوئے مسکرا دی۔

”تو پھر کس حیثیت سے ملیں؟“ میں نے لگتی مدھنی میں ایک ٹھٹھک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ایک غیر ٹکلی نامہ نگار کی حیثیت سے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”میں بظاہر اتفاقاً ایک ہوٹل میں اس سے ٹکرائی۔“

”کون سے ہوٹل میں؟“ میں نے اس کی بات کاٹھٹے ہوئے پوچھا۔ اس نے ہوٹل کا نام بتایا۔ وہ میرا ہی ہوٹل تھا۔ تاہم میں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اسے بتایا کہ اس ہوٹل کا بے سروساں بے گھر اور بے در مالک اس کے سامنے کھڑا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس سیٹھ رمضان کا وہ ذکر کر رہی تھی وہ بھی ابتدا میں اس ہوٹل میں پارٹر تھا۔

وہ سلسلہ کام جوڑتے ہوئے بولی۔ ”میں اس کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کیے ہوئے تھی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت وہ اس ہوٹل میں موجود ہو گا۔ میں اتفاقاً میرا مطلب ہے بظاہر اتفاقاً اس سے جا ٹکرائی۔ میں نے اس سے اپنا تعارف ڈیلی ”سن“ کی غماندہ خصوصی سوزن فورڈ کے نام سے کر لیا جو میری توڑی بہت شناسا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دنیا کی بد قسمتی ہوئی آبادی کے موضوع پر ایک بہت ضخیم قسم کی رپورٹ تیار کر رہی ہوں جو پہلے اخبار میں قسط وار اور پھر کتابی شکل میں چھپے گی۔ یہ بڑا سنجیدہ اور اہم کام ہے۔“ مجھے اس سلسلے میں اس کی طرف سے کچھ بدلے کیے تو میں بیش شکریہ گزار رہی تھی۔“

وہ ذرا ہنسی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی ”ویسے سیٹھ رمضان ہے بہت دلچسپ آدمی۔ سب سے پہلے تو معذرت کرنے لگا کہ دنیا کی آبادی بڑھانے میں اس کا ہرگز کوئی قصور نہیں“ اس کی تو صرف ایک سی بی بی ہے اور بے چارہ اس کی بیوی نے بھی اس معاملے میں یہاں تک اس کا ساتھ دیا کہ جرانی میں سی بی بی سے رخصت ہو گئی کہ کہیں دنیا کی آبادی بڑھانے کے سلسلے میں اس سے کوئی بھول جھگ نہ ہو جائے۔“

مجھے یقین آ گیا کہ وہ سیٹھ رمضان سے ٹکی چکی تھی۔ سیٹھ رمضان اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”بہر حال وہ بے چارہ فوراً میری مدد پر کمر بستہ ہو گیا اور سب سے پہلے اس نے مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کر ڈالا۔ میں اس کے ہاں پہنچی تو وہ نیا سوٹ پہن کر بڑے اہتمام سے بیٹھا ہوا تھا۔ خوشی سے اس کے پائس زمین پر نہیں بلکہ رہے تھے کہ ایک غیر ٹکلی جرنلسٹ اس کے ہاں آئی ہوئی تھی۔“

یہاں وہ یقیناً توڑا سا سہانے سے کام لے رہی تھی یا پھر اس نے سیٹھ رمضان کے انداز و اطوار سے کوئی غلط تاثر لیا تھا۔ دولت

کہ

ہے اس نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ وہ اس کے عزیز ترین دوست کی تصویر ہے جس پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ سینئر رمضان کہ۔۔۔ اور تصویر والے شخص کی عمر میں بہت فرق تھا۔ پھر میں نے سوچا شاید وہ اس دوست کی جوانی کی تصویر ہوگی۔ اس نے خودی مجھے تمہارا نام بتایا اور بڑی تعریفیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی نظر میں تمہاری حیثیت ایک ہیرو کی سی تھی۔ شاید تم اس کا آئیڈل ہو۔

پھر وہ ذرا شوخی سے گویا از سر نو میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ”تم میں ہیروز والی کوئی بات نظر تو نہیں آتی۔“

”ہوتی تو نظر آتی۔“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔ ”میں تو برا مسکین سا آدمی ہوں۔ اس گدھے سینئر رمضان کو اظہار عقیدت کے لیے اور کوئی تصویر نہیں ملی ہوگی۔ چھڈنے اٹھا کر میری تصویر ٹانگ دی ہوگی۔ یہ بات مجھے تو معلوم ہی نہیں تھی ورنہ تصویر کی جگہ میں اسے ٹانگ دیتا۔ خیر۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔“

”میں نے تمہیں جواز پر قدم رکھتے ہی پہچان لیا تھا۔“ وہ بولی۔

”اس کا مطلب ہے تم اداکار اچھی ہو۔“ میں نے کہا۔

”انہماج بنی رہنے کی اداکاری اچھی کی تھی تم نے۔“

”صرف کا شکر یہ۔“ وہ مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف سے

بولی ”دیے میں نے سینئر رمضان سے کچھ زیادہ جھوٹ نہیں بولا

تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں

بہت عجیبہ تحقیقی کام کر رہی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں ذیلی

”میں“ کی نمائندہ نہیں ہوں اور میرا نام سوزن نہیں ہے۔ یہ کام

میں ایک تحقیقی ادارے کے لیے کر رہی ہوں۔“

میں ایک بار پھر انہماج کے عالم میں اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔

اتنی عزیز جیسی سے تعلق رکھنے والی۔۔۔ اتنی عجیبہ نظر آنے والی۔۔۔

بڑی کھسی دکھائی دینے والی۔۔۔ اور بہت زیادہ بڑے لمبوں جیسے

کام کرنے والی لڑکی کیا واقعی ڈرگ افٹاکا تالہ کا شکر ہے؟

میں سوچ رہا تھا کہ میری شخصیت تو اس پر مکمل ہی چکی تھی

اب اس سے مکمل کر کے بات کر لینی چاہیے تھی۔ ویسے تو سیدھے

سبواؤ پہنچے پر کوئی اپنی زندگی کے راز داخل نہیں دیکھتا لیکن جب

وہ جواز پر میری موجودگی کا مقصد سمجھ ہی چکی تھی تو پھر سیدھی طرح

بات کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ شاید بات کچھ آگے

بڑھتی۔ شاید اصل بات کی طرف کوئی اشارہ ملتا۔ شاید کوئی اندازہ

کام کرنے میں مدد ملتی۔

اصل موضوع پر آنے سے پہلے میں نے خواہ مخواہ بھر جھری

کی سارے کر کہا۔ ”میں اس طرح نہیں ہنس کر باتیں نہیں کرتی

چاہتا ہوں۔ ہمیں تمہارا بہت تو سوگوار نظر آتا چاہیے۔ اس جواز پر

ایک لاش موجود ہے۔“

”صرف لاش ہی نہیں۔۔۔ ایک قاتل بھی۔“ اس نے صہج

کہ ”ہاں۔ ایک قاتل بھی۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”میرا خیال ہے

قاتل کے سوا باقی سب کی سوج رہے ہوں گے کہ قاتل کون ہو سکتا

ہے۔ جواز کے کڑی میں اب آٹھ آدمی رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم

تین مسافر ہیں۔ یعنی مشتبہ افراد کی کل تعداد گیارہ ہے۔“

”آخر کسی کو اسے قتل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟“ کیترین

نے سوال کیا۔

”میرا خیال تھا کہ تم اس موضوع پر کچھ روشنی ڈال سکو گی۔“

”میں۔۔۔؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”تمہیں یہ خیال

کیونکر آیا؟“

”میں ویسے ہی۔۔۔ کبھی کبھی مجھے عجیب عجیب خیال آتے رہتے

ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض درست بھی ثابت

ہوتے ہیں۔“ میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

وہ پھلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ایک لمحے مجھے گھورتی رہی پھر

ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”سنو جوبڑی اہلیا میں پوچھ

سکتی ہوں کہ تم اس جواز پر کیا کر رہے ہو؟“

”کیا واقعی نہیں۔ پوچھنے کی ضرورت ہے؟“ میں نے اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہماج سے سوال کیا۔ ”تمہیں اچھی

طرح معلوم ہے تمہارے والد تمہارے بارے میں بہت پریشان

ہیں۔ تمہارا اندازہ صحیح ہے کہ انہوں نے فون پر سینئر رمضان سے

مدد کی درخواست کی تھی۔ تمہارے معاشرے میں اولاد کے اٹھانہ

سال کی ہونے کے بعد۔۔۔ بلکہ اب تو اس سے پہلے بھی والدین

انہیں کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ اگر وہ چاہی کے کڑھے میں

گر رہے ہوں تب بھی انہیں نہیں روک سکتے۔ اولاد ہر کام کی

سمجھ کر کرتی ہے کہ اس سے زیادہ عقلمندی کا کام کوئی ہو نہیں سکتا۔

بعض اوقات پھنجالا کر بھی اپنے آپ کو تباہ کرنے والے کام کرتی

ہے اور اس کے لیے بیسیوں جواز گھڑتی ہے۔“

”محترمہ واعظہ چوہدری صاحب! تمہیں جو کچھ کہنا ہے سیدھے

اور صاف طریقے سے کہو۔ نامحلتان قسم کی تقریر مت کرو۔“ وہ

لائٹ سے بولی۔

”تو جوان نسل فصاحت سے کتابھا جاتی ہے۔“ میں نے لفظی

سانس لے کر کہا ”سیدھی“ جی اور صاف بات یہ ہے کہ کیترین

نہیں کہہ کر تمہارے والد کا خیال ہے کہ تم ڈرگ کے دھندے میں پڑ

گئی ہو اور اس کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنسنے والی ہو۔“

اس کی پیشانی پر چٹکلیں ابھر آئیں لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اس

نے مجھے بولنے کا موقع دیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا

”کوئی بعید نہیں کہ یہ بات درست ہو۔ میں اس جواز پر سوار ہونے

کے پہلے میں جن دو آدمیوں سے ملا۔ پہلے وہ دونوں کے بعد دیگرے

قتل کر دیے گئے اور اب عبدال قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ مجھے ڈرگ

مانیا کا کام معلوم ہوتا ہے۔ کراچی کے ساحل پر میں جن دو افراد

سے بھی اہم بات یہ ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد غواہ کو وہی تمہارا خیال رکھنے کوئی چاہئے گا۔

”بس... بس رو مینٹک ہوئے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے اتھ اٹھا کر گریا جیسے روکا۔ حالانکہ میں اس کی طرف بڑھ نہیں رہا تھا۔ میں تو اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بڑی ان رو مینٹک لڑکی ہوں۔“  
”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”اگر تم لڑکی ہو تو پھر ان رو مینٹک نہیں ہو سکتیں۔ خیر۔ یہ معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ یہ تادم پاکستان“ بھگہ دیش اور اغڑا میں کیا کرتی پھر رہی تھیں؟“

”میں نے بتایا کہ میں بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں تحقیق کام کر رہی ہوں۔ ان تین ملکوں میں جائے بغیر تو اس موضوع پر کوئی مشاہدہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کی پناہ... کس بڑی طرح ان ملکوں کی آبادیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں جیجر بکریوں کی طرح انسان بھرے ہوئے ہیں۔ کپڑے مکوڑوں کی طرح سڑکوں پر رینک رہے ہیں۔ بھگہ دیش میں میں نے دیکھا ایک ایک جمو پیزی میں ایک ایک جوڑے کے بارہ بارہ بچے ہیں اور کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اغڑا کے تمام بڑے شہروں میں مجموعی طور پر کروڑوں انسان فٹ ہاتھوں پر رہ رہے ہیں۔ وہیں شادی بیاہ ہو رہے ہیں۔ بچوں کو جنم دیا جا رہا ہے۔ لوگ گندے جوڑوں کا پانی پی رہے ہیں۔ بعض جگہوں کے حالات دیکھ کر تو مجھے رات کو اپنے ہوٹل کے کمرے میں نیند نہیں آتی۔“

”درست ہے۔“ میں نے تسلیم کیا ”اس خفے کے حالات لرزہ خیز ہیں لیکن جنت تو مسلمانی ممالک بھی نہیں ہیں۔ ان کے بھی بے شمار حصے ایسے ہیں جہاں کے حالات دیکھ کر راتوں کی نیند اڑ سکتی ہے لیکن ایٹمیائی ملکوں کی آبادی کے بارے میں تم سب والوں کی تشویش دیکھ کر مجھے کچھ شک سا ہونے لگتا ہے۔ سفید فام قومیں تو غرض کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں کرتیں۔ تم لوگ جس طرح آبادی کو کنٹرول کرنے کے سلسلے میں ان ملکوں کے لیے پیشان رہتے ہو“  
”اے اودوہینے کے لیے بھی تیار رہتے ہو اس سے کیا واقعی تمہیں ان ملکوں کی ہمتی مطلوب ہے یا اس کے پیچھے کوئی خوف کا رفا ہے؟“  
”خوف؟ ہمیں کیا خوف لاحق ہو سکتا ہے؟“ وہ تیزی سے بولی ”جس رفتار سے بھگہ دیش جیسے چھوٹے سے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے... اندازہ یہی ہے کہ ۲۰۰۵ء میں وہاں کی آبادی امریکا سے زیادہ ہو جائے گی لیکن اس سے امریکا کی صحت پر کیا اثر پڑ جائے گا؟ مخلوک الخال لوگوں کی آبادیاں بڑھنے سے پُرسر اور زکی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ ہم صرف غلامی نقطہ نظر سے اس کے بارے میں شکرت ہیں۔“ اس کا لہجہ خاسا انتھورا نہ اور دُرمانہ نہ ہوا۔  
”بہت خوب... بہت خوب۔“ میں نے جیسے ہوئے لیے میں کہا ”اچھا یہ بتاؤ تم نے ستر کے لیے اسی جہاز کا انتخاب کیوں کیا؟“

”ماتھا! تمہیں اس جہاز پر تمہاری موجودگی کا علم تھا۔“  
”کون تھے وہ؟“ اس نے سپاٹ لیے میں پوچھا۔

”عاش بھی اور آصف بھی۔ وہ دونوں کے بھائی تھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ دونوں مارے جا چکے ہیں؟“ اس نے آنکھیں مسکرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں... اور اس کا مطلب ہے تم انہیں جانتی ہو۔ کون تھے وہ؟“ اور انہیں کس نے ہلاک کیا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔  
”کوئی کسی کے بارے میں کچھ پوچھ لے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو تا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ میں کسی بھی دُغیر کو نہیں جانتی اور مجھے نہیں معلوم کہ انہیں یا عبدل کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”شاید وہ کوئی اہم بات جان گئے تھے اور اس سلسلے میں ان کے زبان کھولنے کا خطہ تھا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”خیر... ان باتوں کو چھوڑو۔ ہم صرف تمہاری بات کرتے ہیں۔ تم کس چکر میں پھنسی ہوئی ہو؟ اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

وہ مسخرانہ سے لیے میں بولی۔ ”میں کسی چکر میں پھنسی ہوئی نہیں ہوں لیکن افضل چر پوری اہم از کم منشیات کے چکر میں تو ہرگز نہیں پھنسی ہوں۔ ابھی مجھے اس قسم کے ایڈونچر میں ٹانگ اڑانے یا زیادہ دولت کمانے کا جنون نہیں چڑھا۔ میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں اور بڑے مزے میں ہوں۔ میرے والد کو میرے بارے میں فکر مند رہنے کی عادت ہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے سے نفسیاتی مریض ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سیٹھ رمضان نے ان کی باتوں کا صحیح اثر نہ لیا ہو۔“

”اس قسم کے جہاز اکثر بیرونی لے کر یورپ کی طرف جاتے ہیں۔ کہیں تم اس قسم کی کسی کمپنی کی عمرانی تو نہیں کر رہی؟“ میں نے بہت نہیں ہاری تھی اور سیدھے سادے انداز میں براہ راست اس سے ہر بات پوچھتے جا رہا تھا۔

”میں ابھی اتنے اہم عہدے پر فائز نہیں ہوئی اور میں نے زندگی میں کبھی بیرونی نہیں دیکھی۔“ وہ استہزائیہ سے انداز میں جس کر بولی پھر اس نے یوں میرا کال چیلنجا یا جیسے کسی بچے کو بھلائی کے کوشش کر رہی ہو۔ ”آخر تم اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے؟ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے بعض اوقات ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔“

”ٹانگ کیا بعض اوقات تو گردن بھی ٹوٹ جاتی ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں اپنا کام سمجھ کر ہی پوچھ رہا ہوں۔ ایک تو تم خود دیکھ کر آجکی ہو کہ سیٹھ رمضان میرا کیسا دوست ہے۔ اس نے میری ذہنی لگائی ہے کہ تمہارا خیال رکھوں۔ اب تم خود ہی بتاؤ میں اس کا کیا کیسے حال سکتا ہوں؟ اس

”وہ کہیں ایسا ہی تو نہیں ہیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”نہا ہے“ ایجت عملی طور پر کبھی رٹا نہیں ہوتا۔  
 ”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ خوش دلی سے ہنسی۔  
 ”وہ ایجت وغیرہ ہرگز نہیں ہیں۔ وہ تو سیدھے مادے، شریف سے آدمی ہیں البتہ سفارتی معاملات کے بڑے ماہر ہیں اس لیے حکومت کو اکثر ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔“

میں سوچے بغیر نہ سکا کہ اس روپ میں بھی نہ جانے کتنے لوگ ایسا ہی کے طور پر کام کر چکے تھے۔ بظاہر وہ سفارتی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور سفارتی شعبوں سے ہی متعلق ہوتے تھے لیکن درحقیقت ایسا ہی ہوتے تھے۔ کہیں باپ بیٹی دونوں ہی تو شاہکار قسم کی چیز نہیں تھے اور دنیا بھر میں گل کھاتے تو نہیں پھر رہے تھے؟ ممکن تھا دونوں کو ایک دوسرے کی لائن پابند رہی ہو اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی لائن پر لانے کے لیے کوشاں ہوں۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، فرسٹ میٹ جنتر نے ہمیں وہاں کھڑے دیکھ لیا اور ٹھٹھا ہوا ہماری طرف اٹھایا۔  
 ”آج کی رات خوشگوار ہے۔ شکر ہے گری نہیں ہے۔“ اس نے حسب معمول موسم سے بات شروع کی۔

”جنازہ جب استنبول پہنچے گا تو کیا ہوگا؟“ کیتھرن نے اس سے پوچھا۔ ”کیا ہم سب کو پوچھ چکے ہیں؟“ وہ روکا جاتا ہے؟“ پھر سے وہ خواہ مخواہ تھی ہی بے فکر نظر آدمی تھی لیکن مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اندر ہی اندر وہ فکر مند ضرور تھی۔ آخر اسے کیا فکر تھی؟ فکر مند تو مجھے ہونا چاہیے تھا جس کے پاس پاپیورٹ تک نہیں تھا۔

”ہاں۔ میرا خیال ہے پوچھ چکے تو ہوگی۔“ جنرل حذب لہجے میں بولا۔ ”دیے مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ میں نے جتنے بھی جہازوں پر ملازمت کی ہے، ان میں سے کسی پر کبھی قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ بہر حال کیتھن کو تزکا خیال ہے کہ استنبول چونکہ دارالکائنات ہے، وہاں کچھ زیادہ ہی اشران موجود ہوں گے اس لیے وہاں زیادہ انجمن پیش آنے کا اندیشہ ہے۔ استنبول سے پہلے ہمیں بودرم کی بندرگاہ پر رکتا ہے۔ وہ چھٹی جگہ ہے۔ کیتھن نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم وہاں قتل کی رپورٹ درج کرا دیں گے۔“

پھر اس نے غامض طور پر گریبا میری معلومات کے لیے بتایا۔  
 ”یہ جزیرہ روزڈ سے ذرا آگے، کیتھن کی سی کی ایک بندرگاہ ہے۔ ہمیں کچھ سامان وہاں بھی آنا ہے۔“

”میں تو اسے کیتھن میں جاری ہوں۔“ کیتھرن ہنسنے چھٹکے سے اٹھ اڑی تھی انکارا لائی لیتے ہوئے بولی۔ ”صبح تم دونوں سے ملاقات ہوگی۔“

میں بھی جلد ہی اپنے کیمین میں لوٹ آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جہاز پر ایک قاتل کی موجودگی کے احساس نے مجھے تک

دھوکئی خاص وجہ نہیں تھی۔ ”وہ اطمینان سے بولے۔“ میں نے بھی تو میں نے کچھ لوگوں کو ہاتھیں کرنے سنا تھا کہ اس کے جہازوں پر انسان زیادہ سکون سے سفر کر سکتا ہے۔ چینگ  
 ”نہیں چینگ سے کیا خوف تھا؟ میرا خیال ہے تمہارے

س تو پاپیورٹ ورا وغیرہ سب کچھ ہوگا۔“ میں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں نے جنس اس کے سامان میں دیکھ چکا تھا۔

”ہاں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے چینگ کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ تو میں ویسے ہی لوگوں سے کتنی ہوئی بات تارہی ہوں۔ مجھے تو صرف سکون کی تلاش تھی۔ یہ میں جنہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ مجھے پتا چلا کہ گراچی پورٹ پر یہ جہاز کھڑا ہے جس پر افغانستان سے تیل کی کھدائی کی مشینری لشکر کے راستے لاکر لادی جا رہی ہے۔ میں نے سوچا، استنبول جانے کے لیے یہ روٹ ٹھیک رہے گا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ جھوٹ، کچھ سچ بول رہی تھی لیکن میرے اس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے میں اس کے جھوٹ سچ کو الگ کر سکتا۔ میں نے اس کی باتوں پر کسی شے کا افسار کیے بغیر پوچھا، ”تم بتا رہی تھیں کہ ترکی میں تم کسی سے ملنے جا رہی ہو جس کے بعد شاید تم ترکی میں ہی رہ جاؤ۔ اگر تم اسے زیادہ ذاتی سوال نہ سمجھو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کون ہے؟“

وہ ایک بار پھر گویا میری کسی نامعلوم کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسی۔ شاید اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ میں اندر سے بہت رشتان اور بے چین ہوں۔ حالانکہ میری کم از کم فی الحال یہ کیفیت نہیں تھی۔ یہی تھی تو وہ بولی ”میری بات سن کر تم مجھے بونے کے شاید ترکی میں میرا کوئی بوائے فرینڈ میرا انتظار کر رہا ہوگا جس سے ملاقات کے بعد میں مستقبل کا پروگرام طے کروں گی اور شاید ترکی میں ہی رہ جاؤں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ استنبول میں میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں بلکہ میرے والد ہی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ وہاں کسی شہم سرکاری مشن پر آئے ہوئے ہیں۔ میرے وہاں پہنچے تک وہ خارج ہو چکے ہوں گے۔ وہاں سے شاید ہم دونوں ٹکے ہو پور تک جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مزید کچھ عرصہ ترکی میں گزرائے کے بعد انگلینڈ واپس چلے جائیں۔ ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”لیکن میٹر رمضان نے تو مجھے بتایا تھا کہ تمہارے والد نے است انگلینڈ سے فون کیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا۔ اس وقت وہ انگلینڈ ہی میں ہوں گے۔ وہ بھی ملک در ملک کھوتے رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ سرکاری یا غیر سرکاری دونوں پر ہوتے ہیں۔ وہ رٹا ہو چکے ہیں لیکن حکومت کو اب بھی ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔“



بھر مجھے یاد آیا کہ میں خود اس کے سامان کی نہایت باریک بینی سے تلاشی لے چکا تھا۔ اگر مجھے کچھ شے ملتا تھا تو اسے بھی ملنا مشکل تھا۔

بہر حال میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کہیں آتا کھول کر وہ سیدھی دیوار کی کمر بستر کے پاس پہنچی۔ اس نے بستر سے کھینچ کر اور چادریں ہٹا دیں۔ نیچے فوم کا گڈا تھا اور اس پر عجیب رنگ کا ایک بڑا سا خشک و جھبا نظر آ رہا تھا۔ مجھے فوری طور پر اندازہ ہوا کہ وہ خشک شدہ خون کا داغ تھا۔

”جھیس یہ کب نظر آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”تو ج میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”رات مجھے صبح صبح طور پر بیدار نہیں آئی۔ میں کچھ زیادہ ہی کوٹھ میں بدلتی رہی۔ گڈے سے ہمارے ہٹ گئی اور آج صبح میری اس داغ پر نظر پڑی۔ میرا خیال ہے“

عبدل کو میرے کہیں میں قتل کیا گیا تھا۔“

”لگتا تو کیسی ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی ”تمہارے کہیں سے کوئی چیز غائب تو نہیں ہے؟“

”اگر غائب بھی ہوئی تو ابھی مجھے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے میں اپنے سامان کا جائزہ لے لوں۔“

وہ سامان کا جائزہ لینے لگی لیکن جھریک دم ہی اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ ایک کمری پر بیٹھ کر دونوں فاقوں میں منہ چھڑکا کر رونے لگی۔ سسکیوں کے درمیان وہ بولی۔ ”میرے تو اس قصور سے روکنے کڑے ہو رہے ہیں کہ میں رات بھر اس بیڈ پر سوئی رہی جس پر ایک شخص کو ذبح کیا گیا تھا۔“

”جو ہو چکا۔ اب اس کے بارے میں سوچ سوچ کر رہنا پڑا ہے۔“ میں نے کچھ مشتقانہ سے انداز میں اس کا کندھا چھتے ہوئے کہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی پریشانی کی وجہ محض احساس نہیں تھا کہ وہ لاعلمی میں رات بھر اس بیڈ پر لیٹی رہی تھی جس پر کسی شخص کو ذبح کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور بھی تھی کوئی اور خیال بھی اسے ستا رہا تھا۔

”میرا خیال ہے تم واقعی کسی مشکل میں ہو۔ تمہارے والد کا خیال صحیح تھا۔“ میں نے بہر دردانہ لہجے میں کہا۔

”مشکل؟“ دیکھ تو کوئی مشکل نہیں ہے۔۔۔“ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”میں مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے اس جہاز پر سوار ہو کر غلطی کی ہے۔ یہ کچھ عجیب۔۔۔ پر اسرار سا جہاز ہے۔ معلوم نہیں اس پر کیا ہو رہا ہے۔“

”دیکھ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ایک قتل ہو گیا ہے جس کے سلسلے میں جھیس پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کوئی اور پریشانی ہے تو بتاؤ۔“

”خدا نہ کرے کہ مجھے کوئی اور پریشانی ہو۔“ وہ دہکا بھول کر جلدی سے بولی۔

”میرا خیال ہے کل تک بس لوگ پر سکون ہو جائیں گے۔“

خوفزدہ کر دیا تھا۔ ذہیک پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی جلدی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک ہی چابی سب کیبنز میں لگتی تھی۔ میں نے اٹھ کر احتیاطاً ایک کرسی دروازے کے پینڈل کے نیچے پھنسا دی۔

سڑکی پر جانچیں صبح ناشتے کی میز پر کینٹن گورنر نے اعلان کیا کہ وہ جہاز کی رفتار بڑھا رہا ہے تاکہ مقررہ شیڈول سے کمی کھینچنے کے لیے ہم اسی شام سرسبز میں داخل ہو جائیں۔ جہاز پر ایک لاش کی موجودگی کے باعث یا پھر شاید کسی اور وجہ سے وہ کچھ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جلد از جلد کسی بزدل جگہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ شاید بزدل گاہ پر وہ کچھ تحفظ محسوس کرتا تھا۔

اس وقت ہم بحیرہ احمر کے وسط میں سڑ کر رہے تھے۔ چری کھاکر کو شکوہ تھا کہ دونوں طرف ساحل اتنی دور تھا کہ اسے پرہے دیکھنے کو نہیں مل رہے تھے۔ ویسے وہ شخص صحیح معنوں میں اپنے شوق کے ساتھ مطلق تھا۔ سب اپنے اپنے نظرات میں اٹھے ہوئے تھے لیکن اسے پرندوں کی بڑی ہونے لگی۔

کیتھرن کائی آخر سے ناشتے کے لیے میس میں آئی اور اس نے ناشتا بھی صحیح طور پر نہیں کیا۔ وہ کچھ پریشان معلوم ہوتی تھی۔ میں نے جلی بار سے پریشان دیکھا تھا۔ اتنی پریشان میں نے اسے اس وقت بھی نہیں دیکھا تھا جب عبدل کی لاش دریافت کی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں تباہی نہیں کر رہی تھیں کہ وہ صحیح طور پر سوچیں نہیں سکی تھی۔

میں ناشتا کر چکا تھا اس لیے میں اٹھ کر جانے لگا تو وہ ایک لمبے کے لیے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”ذہیک پر ذرا میرا انتظار کرنا“ میں کائی لپا کر آمري ہوں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ اس نے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں یہ بات کی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ذہیک پر اٹھایا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بھی ذہیک پر آگئی۔ اس وقت وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ میں اسے اس ٹریک سوٹ میں اس سے پہلے دو زمانہ علی الصباح ایک پر جو ٹنگ کرتے دیکھ چکا تھا لیکن آج گویا وہ جو ٹنگ کو بھول گئی تھی۔

”کیا بات ہے۔۔۔ کیوں اتنی پریشان نظر آ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ذرا میرے کہیں میں چلو“ میں جھیس ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر قدرے متوجہ نہ لے کر کہا۔ اس لمحے وہ مجھے ایسی لڑکی دکھائی دی جس کا واقعی مشیات کی اسٹنگ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی نے اس کی لاعلمی میں اسے مشیات لے جانے کے لیے تو استعمال نہیں کر لیا تھا۔ میں ممکن تھا کسی نے اس کے سامان میں بیرونی یا کوئین چھپائی ہو۔ اسے علم نہ ہو اور اب اچانک اس نے اندازہ جو چیز دریافت کر لی ہو اسی لیے خوفزدہ نظر آ رہی ہو لیکن

ہوا ہے۔ اوپر سے سحابی حالت تباہ ہے چنانچہ انہوں نے یہ مشینری  
ترکی کے ہاتھ بچا دی ہے جہاں تیل موجود ہے۔“

مزید چند منٹ اس سے بات چیت میں گزرے پھر میں اپنے  
کیمپن کی طرف واپس آیا اور آرام کرنے لگا۔ سزا کا اختتام قریب  
تھا اور ابھی تک میں کیمپن کے مسئلے کے بارے میں کچھ نہیں  
جان سکا تھا تاہم میں کچھ اندازے قائم کرنے کی بساطا بھر کوشش  
کر رہا تھا۔

دوسرے روز علی الصبح جہاز نرسوز سے نکل آیا اور ٹیکے  
سمندر میں داخل ہوا۔ میں اپنے کیمپن سے نکل کر ریٹنگ پر جا کھڑا  
ہوا۔ تھوڑی دیر میں یکے بعد دیگرے کیمپن اور کلا کر بھی اپنے  
کیمپن سے نکل آئے اور طلوع آفتاب کا نظارہ کرنے لگے۔  
کیمپن آج بھی جو رنگ نہیں کر رہی تھی تاہم اب اس کی طبیعت  
کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔ کلا کر بھی شاید اس صورت سے کچھ مطمئن  
نظر آ رہا تھا کہ وہ لوگ اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے تھے۔ سزا  
کے طے شدہ شیڈول سے پہلے ہی ختم ہو نا دکھائی دے رہا تھا۔

بانتے کی میز پر کیمپن کو سزا نے اعلان کیا۔ ”ہم لوگ آج صبح  
رات کے قریب۔۔۔ یعنی شیڈول سے بارہ گھنٹے پہلے پورم پہنچ  
جائیں گے۔ اگر سمندر کا آرتھ ہاؤ ٹھیک ہو تو ہمیں فوراً برتھ ل  
جانے کی اور ہم علی الصبح وہاں سامان اتارنا شروع کر دیں گے۔  
اس دوران میں مہل کے محل کے سطلے میں حکام سے منت لیں  
گے۔ میرا خیال ہے وہ پوچھ گچھ تو سب سے کریں گے لیکن امید ہے  
ہم بہت کم ہونے بغیر آگے روانہ ہو جائیں گے۔“

جب دوسرے لوگ ہماری طرف متوجہ نہیں تھے تو میں نے  
بچی آواز میں کیمپن سے پوچھا۔ ”میرا کیا ہے گا؟ میرے پاس تو  
پاسپورٹ تک نہیں ہے۔ مجھے تو فوراً مشکوک سمجھ لیا جائے گا۔“

”جیسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے دوستانہ  
انداز میں مجھے تسکین دی۔ ”میں نے تم سے اتنی رقم نہیں اس قسم  
کی پریشانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے لی لی ہے۔ جیسے سامنے  
آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں کسی سے ذرا نہیں کروں گا کہ تم  
بھی جہاز پر موجود ہو۔ اتنے بڑے جہاز پر چھپے رہنا کوئی مشکل مسئلہ  
نہیں۔“

”اگر کسی نے میری موجودگی کی خبری کر دی؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے کریو میں سے تو کوئی ایسا نہیں کر سکا۔“ بانی صرف دو  
سافر وہ جاتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ تم سے پوچھ گچھ  
ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ جس محل سے وہ گزرے  
ہیں اس سے تم بھی گزرے ہو۔“ اس نے اطمینان دلایا۔ میں نے  
سوچا ”وہ جہاز کا کیمپن تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں فکر مند نہیں تھا  
تو مجھے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے خود کو تنہا  
تھکے چھوڑ دیا۔“

کیمپن کو سزا کا خیال تھا کہ ٹیکے سمندر میں اگر سزا زیادہ پر سکون

نہ تھا۔ کیمپن کو سزا دیا تھا کہ آج رات ہم نرسوز سے گزر  
یں گے اور کل پُر سکون سمندر میں ہوں گے۔ سمندر پُر سکون ہو  
ناز بھی پُر سکون ہو جاتے ہیں۔“

میں مزید چند منٹ اسے تسکین دے کر باہر آیا۔ اس روز گویا  
ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے گزرا ہے تھے۔ ایسا مہلوم  
آقا کہ محلے سیت ہر شخص کو دوسرے پر قائل ہونے کا شہ تھا۔  
فرق اور کلا کر دونوں اپنے اپنے کیمپن تک محدود ہو کر رہ گئے  
۔ حیرت تھی کہ اب تو کلا کر بھی پُر سکون کا نظارہ کرنا بھول  
بتا۔ اس روز اس مقام پر بھی مایگیروں کی ایک لالچ چھل  
رفت کرنے کے لیے جہاز کے قریب آئی لیکن اسے نہایت بے  
نتیجہ جواب دے دیا گیا۔

اس سے پہلے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں بدھ بھی جاتا تھا  
مذاہب ٹیکہ کی نظرس میرا تقاب کرتی تھیں لیکن آج کو یاد بھی  
وہ نظر دکھنا بھول گیا تھا۔ میں موقع مناسب دیکھ کر ٹھیک کے نیچے  
لا گیا۔ پھر میں ابھی دوام کی طرف جا رہا تھا لیکن راستے میں میں  
نہیں کی طرف مڑ گیا جس میں سامان لاوا جاتا تھا۔ جہاز کے  
بانتے نہایت بڑا حصہ اسی صندوق کے لیے وقف تھا۔

جہازوں کے ان حصوں میں مٹوں کی انٹرنی کے حساب سے بھی  
کوئی چیز اصل کی جاسکتی ہے۔ یہ جہاز کو کہ زیادہ پڑائیں تھا لیکن  
اس میں بھی بہت تنگنائش تھی۔ اس بڑے ہال نما حصے میں مٹوں کی  
پانی کی سیفٹو پیشیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک مٹی کو  
پانی جگہ سے ہلانا شاید آٹھ دس آدمیوں کے بھی بس کی بات نہیں  
تھی۔ وہ ہماری مشینری ہی کی پیشیاں مہلوم ہوتی تھیں جنہیں لوہے  
کا ٹیوں کی مدد سے بیک کیا گیا تھا۔ ان پیشیوں کو کھول کر دیکھنا  
میرے بس کی بات نہیں تھی۔

تاہم میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ تیل کی گھڑائی کے  
لے استعمال ہونے والی مشینری افغانستان سے آ رہی تھی جبکہ  
افغانستان میں شہری معلومات کے مطابق تیل نہیں پایا جاتا تھا۔

میرا دیکھ کی طرف واپس جا رہا تھا تو راستے میں مجھے کیمپن کو سزا  
لا گیا۔ میں اس سے پوچھنے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ تیل کی  
گھڑائی کی مشینری افغانستان سے آئی ہے لیکن افغانستان میں تو  
تیل نہیں پایا جاتا۔“

”سے شک۔“ کیمپن نے تسلیم کیا۔ ”اسی لیے تو انہیں اس  
مشینری کی ضرورت نہیں ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے انہوں  
نے کسی امید کے سارے یہ مشینری خریدی ہوگی لیکن جنگ کے  
بہت سے اب تک وہاں صرف عوام کا تیل نکلا ہے۔ زمین سے کہیں  
تیل نہ نکلیں ہو سکا اور جس حساب سے اس سرزمین پر خون بہا  
ہے مجھے اندازہ ہے کہ اب وہاں گھڑائی ہو تو کہیں زمین سے خون  
کے بجائے یہ نہ آئیں پڑیں۔ اب تو خریدیے ہی انہیں گھڑائی کی  
فہم نہ ہو۔ پورا ملک تو پورے دھوہ کے گروں اور بھوس کے گھڑا

|                          |                      |
|--------------------------|----------------------|
| طارق اسٹیل سارگر - 50/-  | امریکہ رے امریکہ     |
| طارق اسٹیل سارگر - 25/-  | صومیت اور عالم اسلام |
| طارق اسٹیل سارگر - 200/- | کورٹ مارشل           |
| طارق اسٹیل سارگر - 150/- | آخری گناہ کی سلسلہ   |

## مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

بڑا شت نہیں ہے۔

”اس کے باوجود تم نہیں یا ہوائی جہاز سے سڑک پر پہنچ کر تم۔ ویسے تم انداز اور نگہ دیش وغیرہ کیسے مٹی نہیں پوچھا۔“

”میں نے ہوائی جہاز سے سڑک پر کیا تھا۔“ اس نے قدر شریعے سے انداز میں اقرار کیا۔ ”لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہوائی سڑا چھا نہیں گتا۔ صرف مجبوری میں کرتی ہوں۔ پھر یہ ملاقات جت سے ہوئی۔ اس نے اپنے جہاز کا ذکر کیا اور میں محسوس کیا کہ میرے سڑک کے لیے یہ ٹھیک رہے گا۔“

”جہاز سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”سری سے لیے میں پوچھا۔“

”بہن کی قرب و واقع ایک ریسرچ لیبارٹری میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بعض شعبوں میں انڈین سائنس دان بڑا ذہین کام کر رہے ہیں۔“

”تم کس سلسلے میں ان کا کام دیکھنے چلی گئی تھی؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں بڑھتی ہوئی آبادی کے موضوع پر جو تحقیقی کام کر رہی ہوں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہر جہت کنٹرول کی دوائیں بھی اس سلسلے کا ایک موضوع ہیں۔ انڈین سائنس دان اس میدان میں بڑی محنت کر رہے ہیں۔ میں ذرا ان کے کام کا جائزہ لینے چلی گئی۔ اس نے اطمینان سے بتایا۔

”ریسرچ لیبارٹری کے کام تو عام طور پر عامے خفیہ قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ہر ایرے غیرے کو تو اپنے ہاں نہیں گھسنے دیتے۔ میں نے کہا۔

”میں کوئی ایرا غیرا تو نہیں ہوں۔“ وہ گویا برا مٹاتے ہوئے

بولی۔ ”میرے پاس ایک بین الاقوامی ادارے کا تعلیمی خط ہے۔

میں اسی ادارے کے لیے کام کر رہی ہوں۔ دنیا میں جہاں بھی تعلیمی کام ہو رہا ہوگا وہاں مجھے خوش آمدید کہا جائے گا اور جہاں تک

اس ادارے کے سکے یا ان کے ملک کے قوانین اجازت دیں گے

مگر رے کا لیکن اس کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ سمندر پر سکون نہیں تھا۔ طاعون کی وجہ سے دوسرے کیتھرن کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ اس نے دوسرے کا کھانا بھی نہ کھایا۔ اسے ایک آدھ گھنٹے ہوئی اور اس کے بعد بھی اُنکائیاں آتی رہیں۔ شام تک کھار کی رکھت بھی ذرا نظر آئے گی۔

مجھے اس دوران جتنے نظر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے سمندر تک اس طرح رہے گا؟ بے چارے مسافروں کی حالت خراب ہو رہی ہے۔“

”تم تو بالکل ٹھیک نظر آ رہے ہو۔“ وہ میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں تو ذرا ڈھیٹ اور سخت جان واقع ہوا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میری بات چھوڑو۔ میں تو کیتھرن اور کلا کر کی بات کر رہا ہوں۔“

”سوچ غروب ہونے تک وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ تمہارے حساب سے تو سمندر پر سکون ہی ہے۔ یہ طاعون تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ شام کے سامنے مگرے ہونے لگے تو ہوا کے ٹھنڈے دھبے بگنے اور سمندر کو گویا قرار سا آنے لگا۔ ہلکی ہوا کے ڈھم ڈھم جھونکے گویا اسے تھکیاں دے کر اُٹھانے لگے اور اس کے ساتھ ہی کیتھرن اور کلا کر کی طبیعت بھی سنبھلنے لگی۔ تھائی کے خوف سے وہ اپنے کیتھرن میں بھی نہیں جا رہے تھے۔ مہادان کی طبیعت خراب ہو اور کسی کو چاہی نہ چلے اس لیے وہ دیک پر ہی موجود تھے تاکہ آتے جاتے لوگوں کی نظر میں رہیں اور مدد کی ضرورت ہو تو وہ آسانی سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

کیتھرن کی حالت بہتر دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا لیکن ساتھ ہی ایک اور اضطراب سالاق ہو گیا۔ میں رنگ کے پاس کھڑا اتنی کی طرف دیکھ رہا تھا جب مجھے شب ہوا کہ میں نے کسی بڑے جنگلی جہاز کا بیولا اپنے جہاز کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ میں اسے زیادہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس وقت تک سورج مکمل طور پر غروب چکا تھا اور آفتاب بہت تیزی سے اندر ہر اچھا رہا تھا۔ میں اسی سمت میں دیکھ رہا لیکن جب اندر ہر اچھا ہو گیا تو بھی مجھے کسی جہاز کی روشنائی نظر نہ آئی۔ بالآخر میں نے یہ سوچ کر اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا کہ شاید وہ جہاز کسی اور سمت میں سڑک رہا ہو۔

رات کو دس بجے کے قریب میں جہاز کے فین بیل والے حصے

میں کھڑا تھا کہ کیتھرن بھی غصی ہوئی ادھر آگئی۔

”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اسی لیے تو کوئی بھری ہوں۔“

یہ دیکھ کر ہنسنا ہوا بہت بھلی لگ رہی ہے۔ ”اس نے سڑا تھا کہ ایک

کسی سائنس دان اور بولی ”سمندر کی سڑک کے لیے مجھ میں زیادہ قوت

تو کیپٹن بولا ہمیں کوشش کروں گا کہ کوئی تہمداری طرف متوجہ نہ ہو اور تم سے زیادہ پوچھ سچو نہ کی جائے۔ تم خود بھی کوشش کرنا کہنا چاہا ضرورت کسی کی نظر میں نہ آؤ۔

"اوکے کیپٹن! میں نے اسے سیلنٹ کیا اور پائلٹ دوم سے نکل آیا۔ اس وقت تک جہاز کی سرچ لائٹس روشن کی جا چکی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ریڈیو دو کشتیاں جہاز کے اشارہ روز کی طرف چلی آ رہی تھیں۔

کیپٹن نے مجھے پوچھا ہم میں دیکھ کر جہاز سے ہولی۔ "یہ اتنی سی دیر میں تہمداری کا کیا عجیبے پلٹ گئی؟"

"دراصل میں کر رہا تھا تو ہی ہوں۔" میں نے ذرا شرعاً سے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں پچھنی رہ تھا اس لیے عام مسافر کی حیثیت سے ہی سزا کر رہا تھا۔ اب چونکہ کچھ ایمر جیسی نظر آ رہی ہے اس لیے کیپٹن نے کہا کہ پچھنی وغیرہ کو بھول جاؤ اور فوراً اپنی ڈیوٹی سنبھال لو۔ رہنے پر مبنی تم بھی اب مجھے سی میں ہی سمجھنا۔ بھول جانا کہ میں مسافر کی حیثیت سے سزا کر رہا تھا۔"

اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے میری بات کا تعین تو نہیں کیا تھا لیکن امید نظر آ رہی تھی کہ میرا ساتھ دے گی اور جہاز انہیں بھڑکے گی۔ شاید اس میں اسے اپنا کچھ بھی بھلا نظر آ رہا ہو۔

پائلٹ کی جو دو کشتیاں جہاز کی طرف چلی آ رہی تھیں ان میں چھ چھ سیاہ پوش سے افراد موجود تھے۔ وہ غلط ایک طرف سے افغان خائناں سمیر برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں راکٹ تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کیپٹن یا کسی اور نے کوئی قدم اٹھانے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے طور پر ہی کوئی کارنامہ دکھانے پر مائل ہوا تھا۔

اس نے راکٹل کدھ سے لگائی اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی ٹال کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔ قیمت رہا کہ اس نے ٹریگر دبا یا نہیں ورنہ شاید ہوائی فائر کی

یہ ممکن نہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ "بہت خوب۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن جہز وہاں کیا رہا تھا؟ کیا وہ بھی کوئی رہسرخ اسکار ہے؟ وقت کڑا رہی کے لیے اب ملازمت کر رہا ہے؟"

"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا۔" اس نے گویا میرے ستر اپنے لیے بر دھیان دیے بغیر تجویز کی سے جواب دیا۔ "مجھے اب وقت۔۔۔ بلکہ ابھی تک خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب تم نے بتا دی ہے تو خیال آیا ہے۔۔۔"

اس نے جملہ ادھر اُدھر چھوڑ دیا کیونکہ میں جہاز کے برج کی طرف دیکھنے لگا تھا جس پر مجھے دو تین افراد کے دوڑنے کی آواز ٹال دی تھی۔ وہ غلط ہمارے جہاز سے تقریباً ایک میل آگے کے بعد دیکر دو چہرے دھماکے سے پھٹیں اور ایک دو سیکنڈ کے لیے مندر کا بہت بڑا حصہ روشنی میں نہا گیا۔ پھر وہ روشنی معدوم ہو گئی۔

"یہ کیا تھا؟" میں نے چکر پوچھا۔

کیپٹن کو ترو پائلٹ ہاؤس سے باہر آیا اور برج سے جھانکتے ہوئے بولا۔ "تکیر لانے کی کوئی بات نہیں۔ ترکی کے ایک جنگی جہاز نے ہمیں خوار کرنے کے لیے دو فائر کیے ہیں۔ کچھ لوگ جہاز پر آ رہے ہیں۔ پھر اس نے مجھے غائب کیا۔" مسٹر فان! تم رادار پر آنا۔ تم مجھ سے کچھ بات کہتی ہے۔"

"یہ آدھی رات کو ہمارے جہاز پر کون لوگ آ رہے ہیں؟" کیپٹن نورفہ سے لہجے میں بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے خود نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ذرا کیپٹن کو ترکی بات سن کر آتا ہوں۔"

وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ "مت جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں اس کی سسی ہوئی سانسوں کی حرارت اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا۔ میرا گریبان کھلا تھا۔

"میں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی آیا۔ تم یہیں ٹھہرو۔ اگر مجھے دیر لگی تو میں تمہیں بھی وہیں بلاؤں گا۔" میں نے اس کے گواہ کدھ سے چھتیا پاتے ہوئے کہا۔

میں دوڑتا ہوا پائلٹ ہاؤس میں پہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کیپٹن کو ترو کچھ ایسا پریشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں سب معمول ہوا سا گہرا ہوا تھا۔

وہ اندرونی کیمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں ٹھہرا ہوا ہمارا ہمارے ہونٹے ہیں۔ ان میں سے جو ہمیں اپنے لیے مناسب نظر آئے وہ ہمیں لو۔ اب تم اس جہاز کے سی میں ہو۔ اب تم اس سے بھی بات کرو گے اسی حیثیت سے کرو گے۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں تاخیر نہیں کی اور اندر جا کر انتہائی بڑکی سے پوچھا اور دو سرے ہونٹے ہیں کہ کیا یہی ہے جو جہاز سے ہونے میں دیکھیں کیپٹن کی طرف جانے لگا۔

|                    |         |       |
|--------------------|---------|-------|
| صحرا کا چاند       | اے حمید | 80/-  |
| پہلی محبت کے آنسو  | اے حمید | 250/- |
| اداس جنگل کی خوشبو | اے حمید | 100/- |
| چاند چہرے          | اے حمید | 200/- |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

# منظوم

الماس ایم اے قیمت :- 150/-

## سلطان نور الدین زنگی

الماس ایم اے قیمت :- 250/-

میں نے ایک دراز قد سفید قام کو ایک خطرناک گمنام والا  
ڈیک پر آتے دیکھا۔ یہ گمنام "ایم اے سی ٹین" یا "میک ٹین"  
کہلاتی تھی اور کسی زمانے میں امریکی فوجیوں کے استعمال میں رہا  
تھی۔ وہ شخص بھی امریکی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بے پروا  
اعلان کیا "میرا نام میک ٹین ہے اور میں امریکی ڈرگ انفورس  
ایجنسی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں چھاپے کی اس قسم کا کاروا  
ہوں۔ ہمیں صرف ہمارے کی تلاش سے دلچسپی ہے۔ اگر کچھ برآمد  
ہو تو کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ زحمت کے لیے  
پیشگی معذرت خواہ ہوں۔"

کمپن کوڑے نرم سے میرے لیے احتجاج کیا "تم لوگ کم از  
ہمارے ہندو گاہ پر پہنچنے کا انتظار تو کر سکتے تھے خواہ اس دروازے  
ہمارے ہمارے حراست میں لے کر ساتھ ساتھ سفر کرتے۔"

"ہم پچھلے ماہ ایک چوٹ کھا چکے ہیں" میک ٹین نے اطمینان  
سے جواب دیا۔ "ایک ہمارے کو ہم نے حراست میں لیا تھا اور  
کے ساتھ ساتھ ہندو گاہ تک گئے تھے لیکن اس کا عملہ ہمیں چار  
گیا۔ راستے میں آٹھ ہمارے چاکر اس نے اپنا مال سمندر میں کیسے پھینک  
دیا۔"

"ہمارے ہمارے پر تل کی کھدائی کے سلسلے میں استعمال ہوا  
والی مشینری کے سوا کچھ نہیں ہے" کمپن کوڑے نے اسے یقین دلایا  
کی کو شش کی۔

میک ٹین نے اپنی گمنام بے پروائی سے بشل میں رہائی  
اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہمارے کوئی ان سے اچھے کے مؤامدے میں  
تھا۔ صرف خائنوں کا قہر ہے تو وہی سی تیزی کی کھدائی تھی اور  
میں نے ہی اٹھا تھا اور میرے جسم پر مٹلے کی دوری تھی۔ جس  
کا ہوا تھا کہ ہمارے کا عملہ مزاحمت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آواز سن کر بھی آنے والے لوگ یہی سمجھتے کہ ان پر حملہ کر دیا  
گیا ہے۔

خائنوں کا قہر بھی کے عالم میں میری طرف گھوما لیکن میں  
اسی لمحے پری کلا کر روشنی میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بھاری شیش  
بازل تھا جس کا رخ قہر کی طرف تھا۔

"گمنام پچھلے دو۔" اس نے قہر کو حکم دیا۔ "ہمارے اس وقت  
زنگی نیوی اور ڈرگ انفورس منٹ ایجنسی کے گھر میں ہے۔"  
پھر میں نے دیکھا "وہاں حراست سے لوگ ہمارے چڑھے  
آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گمنام تھے۔"

خائنوں کا قہر اب بھی رانقل پھینکنے کے لیے تیار نہیں  
تھا۔ وہ کچھ ہنسنی اور غرور کا آدی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی  
رانقل کی مال ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک موہوم  
سے اندیشے کے تحت رانقل چھوڑی نہیں تھی۔ اس شخص کا کچھ  
بھروسہ نہیں تھا کہ کوئی ایسی حالت نہ کرے جو سب کے لیے مصیبت  
بن جائے۔

اس لمحے نے مجھ سے زور آزمائی کی کوشش کی اور ایک  
جھکا دے کر رانقل کی مال میری گرفت سے نکال لیتا چلا۔ میں  
نے محسوس کیا "اب موقع تھا کہ اسے اپنے زور بازو کی ایک آدھ  
جھک دکھا دی جاتی۔ اس کے جھکا دینے سے تو رانقل کی مال  
میرے ہاتھ سے نہ نکل سکی لیکن میں نے اسی طرح مال پکڑے  
پکڑے اسے ایک جھکا دیا تو وہ دور جا کر۔ رانقل اس کے ہاتھ  
سے میرے ہاتھ میں آگئی اور اس کا سر ڈیک کے چنگے سے  
جا کر آیا۔ اگر چنگا نہ ہوتا تو شاید وہ پھلتا ہوا سیدھا سمندر میں  
جا کر آتا۔ اس کی آکڑوں کا ٹی حد تک نکل گئی اور وہ دیں پڑا ہوا گیا۔  
میں نے رانقل ایک محفوظ کونے میں پھینک دی۔

پری کلا کر کو میری یہ حرکت یقیناً پسند آئی تھی۔ اس نے میری  
کمر بھگی سی چٹکی دی۔ میں نے قہر سے رانقل چھین کر گھوما کلا کر  
سے تعاون کیا تھا۔ کلا کر کی شخصیت میں تبدیلی نے خود مجھے حیران  
کر دیا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ ہمارے زنگی نیوی اور ڈرگ  
انفورس منٹ ایجنسی کے گھر میں تھا لیکن خود پری کلا کر کون تھا؟

مجھے اس سے یہ پوچھنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اس دوران  
میرے رنگ کے لباس میں بہت سے مسلح افراد ہمارے چڑھے آئے  
تھے۔ وہ نہایت پرتی سے ہمارے مختلف حصوں میں اس طرح بکھر  
گئے کہ ہمارے ایک ایک کونے پر نظر رکھی جاسکے۔ وہ اپنے کام  
میں بہت باہر معلوم ہوتے تھے تاہم ان کا رویہ باوجود ان میں تھا۔  
انہوں نے کسی شخص پر ہندو نہیں تھی۔ لی الحال انہیں گویا  
مٹلے وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں ہمارے کی تلاش  
لینے سے زیادہ دلچسپی تھی۔

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پوری کلا کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولا "یہ کوئی پاکستانی ہے بغیر کافدات سز کر رہا ہے لیکن اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے شاید پاکستان میں کوئی چھوٹی موٹی حرکت کر کے بھاگا ہے لیکن ہمارے نقطہ نظر سے مشکوک نہیں ہے۔ البتہ کیپٹن نے شاید اس بے چارے کو ہمارے شک و شبہ سے بچانے کے لیے وردی پٹاوی ہے۔"

اس نے گویا میرے بارے میں اپنے پاس کو مختصر لیکن مکمل رپورٹ دے دی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ پر ادور کیپٹن گورنر پر ترس آیا۔ بے چارے نے خواہ مخواہ ہی مجھے یونیفارم پہنانے کا تردد کیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چھاپا مارنے والوں کا ایک ایجنٹ تو ہمارے ساتھ ہی سز کر رہا تھا اور بظاہر بڑی مصروفیت سے پردوں کا مشرقین ایک بے ضرر سائینج بنا ہوا تھا۔

میک نیل نے بھی میرے بغیر کافدات ہونے کو گویا قطعاً اہمیت نہ دی۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا مسئلہ شاید صرف منشیات تلاش کرنا تھا۔ اس کے سوا وہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سہلاتے ہوئے طبیعی انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا "شاید تم نوکری کی تلاش میں یورپ وغیرہ کی طرف نکل رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں تو ڈورگ فافا کا آدمی ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میک نیل اور پوری کلا کر دونوں خوش دلی سے ہنسے کلا کر بولا "ڈورگ فافا کے آدمی بغیر کافدات کے سز نہیں کرتے۔ دو چار پاسپورٹ اور دس بیس ویزے تو ان کی جیبوں میں فالتو پڑے رہتے ہیں۔" پھر وہ میک نیل کو بتانے لگا "یہ نوکری کی تلاش میں نہیں جا رہا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ چھوٹا موٹا بزنس من ہے۔ اور میرا خیال ہے جی جی کہہ رہا تھا۔"

میک نیل نے بے پروائی سے کندھے اچکائے گویا کہ رہا ہو "ہمیں ان باتوں سے کوئی غرض نہیں۔"

وہ خلاشی کے کام کی گھرائی کرنے لگا۔ وہ تقریباً چالیس کی عمر کا آدمی تھا اور لگتا تھا اس کی عمر انسی کاموں میں گزری تھی۔ وہ سبھی لوگ خلاشی کے کام میں بہت ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اس کام میں بہت دیر لگ گئی۔ آخر کار وہ بکری جہاز تھا۔ خواہ چھوٹا ہی تھا لیکن اس کی ہر چیز کو کچیک کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کام میں سچ کے چار بیج لگتے تھے ہمارے کیپٹن کی بھی خلاشی لائی گئی۔ ایک بات البتہ مجھے کچھ حیرت انگیز لگی کہ میک نیل یا اس کے کسی آدمی نے کیپٹن سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کیپٹن کی خلاشی بھی وہی ہے۔ جانے اور پوچھنے بغیر اپنے چلے گئے تھے کہ کون سا لیجن کس کا تھا؟ شاید کلا کر انہیں بہت کچھ چاہتا تھا۔

میک نیل اپنے آدمیوں کو مختلف احکامات دینے کے بعد پوری کلا کر طرف مڑا اور بولا "تم نے کیا دریافت کیا؟"

"کچھ بھی نہیں" پوری کلا کر نے قدرے مایوسی سے جواب دیا البتہ وہ دن پہلے ان کے محلے کے ایک آدمی کی گردن کاٹ دی گئی تھی۔ لیکن نے ابھی تک کہیں اس واقعے کی رپورٹ درج نہیں لائی۔"

"تو قہر کے وقت ہم لوگ بین الاقوامی سمندری حدود میں تھے۔ کیپٹن گورنر فوراً احتجاج سے لیے میں بولا "میں کسی بندرگاہ پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ بندرگاہ پہنچنے ہی میں اس واقعے کی رپورٹ کرنا۔"

میک نیل نے قتل کا تذکرہ کر کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ لگتا تھا کہ اسے اپنے مشن کے علاوہ کسی بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کیپٹن گورنر سے مخاطب ہوا "ہم خاص طور پر جہاز کے اس حصے کی تلاش لیتا چاہتے ہیں جہاں لنگر کی ذخیریں رکھی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک جہاز کے اس حصے میں سے ارنیفا کی چابی میں استعمال ہونے والا بنیادی کیپٹل دو ٹن کی مقدار میں ملا تھا۔"

"تم جس حصے کی جاہو خلاشی لے لو۔ ہمیں اس جہاز پر کچھ نہیں ملے گا۔" کیپٹن گورنر ناگوار سی بولا۔

میک نیل اور پوری کلا کر ایک طرف کو چلے گئے۔ شاید وہ نکلنے میں کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ چھ لمبے بعد ہی وہ واپس آگئے تب میں میک نیل سے مخاطب ہوئے بغیر نہ رہ سکا "یہ امریکیوں کو ترکی کی سمندری حدود میں چھاپے وغیرہ مارنے کا اختیار کب مل گیا ہے؟"

میک نیل نے جواب دینے سے پہلے میرا سر تباہوازہ لیا۔ شاید اسے محسوس ہو گیا کہ اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔ لیکن وہ شاید یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان لوگوں کو جیٹا اس کا نہیں مقرر معلوم ہو گا۔

تاہم میک نیل بڑے تھکنے سے بولا "ڈورگ افنور منٹ" انہی "امریکی امداد ہے لیکن پچھلے ایک سال سے منشیات کی اسمگلنگ روکنے کی غرض سے ریکس پولیس کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے۔ ہم یورپ اور امریکا کی طرف منشیات کی اسمگلنگ کے لاڈ سے روک بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سمندری روک پڑی پار ہم نے بہت بڑی مقدار میں منشیات پکڑی ہیں۔ منشیات کی سب سے زیادہ اسمگلنگ اس وقت سمندری راستوں سے اور خصوصاً بحری جہازوں سے ہوتی ہے۔"

پھر جیسے اسے کوئی خیال کیا۔ اس نے آنکھیں سیڑ کر پھور لگے دیکھا اور بولا "مگر تم واقعی محسوس آدمی ہو تو ہمیں یہ باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ کچھ جیٹا تم کون ہو؟" اس کا ہاتھ اپنی گت پر

بالا خر وہ لوگ ایس ہو گئے اور تلاشی کا کام بند کر دیا گیا۔  
کیپٹن گورنر ایک بار پھر ایک پر اگڑا ہوا اور سارے سلاکتے ہوئے  
ہوا "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے جہاز پر کچھ نہیں ہے لیکن تم  
لوگوں نے میری بات کا مین نہیں کیا اور خواہ مخواہ وقت ضائع  
کیا۔ اس بار شاید کسی نے غلط فہمی کر دی ہے۔"  
"کچھ نہیں ملا تم لوگوں کو؟" میں نے بچی آواز میں ایک نیل  
سے پوچھا جو اس وقت ایک ہاتھ میں گن اور ایک میں سگتی  
سگریٹ لیے کھڑا تھا۔

"نہیں۔" اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا مگر دوستانہ لہجے  
میں بولا "میں نے تو مشینری کا بھی ہر کث کھلو کر دیکھا۔ مجھے  
امید تھی کہ اگر منشیات نہیں تو شاید افغانستان سے روسی اسلحہ ہی  
جار ہوا لیکن جہاز میں واقعی کچھ نہیں ہے" وہ گویا کسی سے بھی کوئی  
بات چپانے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ  
ٹرینل نیوی کے جو آدمی تھے وہ ان تمام چیزوں کو پہلے جیسی حالت  
میں لانے کی کوشش کر رہے تھے جنہیں انہوں نے کھول ڈالا تھا۔  
امریکی ان کی مدد کر رہے تھے لیکن جہاز کا کملہ ایک طرف کھڑا تھا۔  
وہ لوگ خواہ اپنے سامان کو ہاتھ نہیں لگا رہے تھے ان سب کے  
چروں پر ناگوار ہی تھی اور وہ گویا بے زبان خاموشی کر رہے تھے "تم  
لوگوں نے ہی ہر چیز کھولی ہے اب خود ہی بند کرو۔"

اسی پکر میں سپید فخر نمودار ہو گیا۔ اچھا خاصا اہل جہل چکا  
تو دور سے ایک لالچ جہازوں کی طرف آئی دکھائی دی۔ اس پر مڑی کا  
پرچم لہا رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو اندازہ ہوا کہ وہ ٹرینس کوٹ گارڈ  
کی لالچ تھی لیکن اس سے بھی ایک اور چیز عمر سفید قام شخص اتر کر  
در کی کھینچی میں سوار ہوا اور ہمارے جہاز کی طرف آئے لگا۔

کیپٹن اس وقت میرے قریب ہی ڈیک پر کھڑی تھی۔ اس  
نے ایک طویل سانس لی اور فکرت خورہ سے انداز میں میری  
طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ میرے پاپا ہیں۔ انہیں ہر بات کی خبر  
ہو جاتی ہے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس جہاز پر چھاپا بھی انہوں  
نے ہی نہ ڈال دیا ہو۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔  
"مجھے مود عارلے کے لیے" وہ کھنٹی سے بولی "معلوم نہیں  
کیوں انہیں وہم ہو گیا ہے کہ میں ڈرگزر کے دھندے میں لوث  
ہوں۔ یہ وہم تو اپنی جگہ ہے۔ ویسے بھی وہ مجھے اپنی مرضی کی زندگی  
گزارتے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ انہیں اپنی روایات اور نیک نامی  
اتنی عزیز ہے کہ میری اصلاح کی خاطر وہ مجھے جیل بھجوانے سے بھی  
گریز نہیں کریں گے۔"

اوپر مڑ کر چارلس جہاز پر آگیا۔ اس نے سب سے پہلے ایک  
نیل کو تلاش کر کے اسے ایک خطا دیا۔ وہ کوئی سرکاری خط معلوم  
ہو تھا کیونکہ اسے جتنے ہی ایک نیل کے نوٹے میں اس کے لیے  
ہے حد احترام آگیا۔ وہ خود اسے ساتھ لے کر اتر کر کیپٹن کے پاس

آیا اور گردن کو خم دیتے ہوئے بولا "اپنی بیٹی سے پوچھ لیجئے۔  
میں نے انہیں کوئی دھت نہیں ہونے دی۔ اور اگر آپ پہلے آجائے  
تو ہم ان کے سامان کی تلاشی بھی نہ لیجئے۔"

"بہت خوب!" میں نے دل ہی دل میں سوچا "میں تو  
واقعی ڈرگ مافیا کے لیے بے حد کار آمد ثابت ہو سکتی تھی جس کے  
باب کا دوسرے ملکوں میں بھی اعزاز و سرور تھا۔ منشیات کی  
دوگ قحام کے سلسلے میں امریکا کی پالیسی نہایت سخت تھی اس کے  
باوجود وہیں کے ڈرگ انفرمنٹ کے ادارے کا نامناکندہ اس سے  
کہ رہا تھا کہ اگر وہ پہلے آج پہنچتا تو اس کی بیٹی کے سامان کی تلاشی  
بھی نہ لی جاتی۔ کیپٹن تو اپنے باپ کے اس اثر و رسوخ سے نہ  
فائدہ اٹھا سکتی تھی لیکن گلن بھی تھا کہ فی الحال کیپٹن کو اس اثر  
و رسوخ کی ضرورت نہیں تھی یا پھر باپ بیٹی کے درمیان جذباتی پیچ  
اتنی وسیع تھی کہ وہ باپ کا کسی قسم کا احسان نہیں لیتا چاہتی تھی  
اور اتنا اس کی طرف سے غلط فہمیوں میں مبتلا تھی۔

چارلس بے تابی سے کیپٹن کی طرف بڑھا لیکن کیپٹن نے  
منہ پھیر لیا۔ چارلس نے اسے گلے لگا لیا تو اس نے چارلس ا  
ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ حیرانی اور رنجیدگی سے بولا "تم کیا کر رہی ہو  
کیپٹی! میں تو تمہاری خاطر اسٹبل سے بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ مجھے  
چلا تھا کہ اس جہاز کو راستے میں روک لیا گیا ہے۔ میں نے ڈرگ  
رات کو گورنر کو اٹھا کر اس سے سفارشی ڈالا اور یہاں بھی بیٹا  
پر پیغام بھجوایا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی جائے۔ اور  
الٹانچہ سے ناراض ہو رہی ہو۔"

"تم کو اس تردد کی کیا ضرورت تھی؟" کیپٹن بدستور غل  
سے بولی "مجھے ویسے بھی یہاں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکا تھا۔  
لے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن میرا خیال ہے آپ کے دل کا  
اطمینان نہیں ہو رہا ہو گا۔ یہ چھاپا بیٹھ آپ نے ہی ڈال دیا ہو گا۔"  
"حق دانی باتیں نہ کرو۔" چارلس تیزی سے بولا "میں  
اس جہاز کو تمہاری وجہ سے چھاپے سے بچانے کی کوشش کر رہا  
لیکن امریکی سفارت خانے کا دباؤ بہت زیادہ تھا بلکہ میں اپنی  
کوششوں کی وجہ سے ان کی نظر میں بھی مشکوک ہو رہا تھا۔ میں اپنی  
ٹیک نامی داؤ پر لگا رہا تھا۔ اس کا تم مجھے یہ صلہ دے رہی ہو۔"

"آپ کی خاندانی ساکھ عزت۔ ٹیک نامی۔ میں  
آگئی ہوں یہ الفاظ سننے سننے" کیپٹن بیٹھائی پر ہاتھ مار کر بولی "میں  
میرا اچھا بھلا ہوں نہیں دیتے کہ آپ کی ٹیک نامی پر کوئی دہ  
نہ آئے؟ آپ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

آزادی کی زندگی کیوں نہیں گزارتے ہو؟  
"تھو کی پناہ کیپٹی!" چارلس کی آنکھیں پھیل گئیں  
سال کی عمر کے بعد سے تم شاید بھی پورا ایک ہفتہ بھی گھر  
رہیں۔ جہاں تمہارا دل چاہتا ہے پھرتی ہو۔ جس سے اپنی  
دوستی کرتی ہو" مجھے چاہتی ہو چھوڑ دیتی ہو۔ جس کام کو دل چاہتا

### رومانی ناول

|       |                   |                  |
|-------|-------------------|------------------|
| 100/- | اسلم راہی ایم۔ اے | لڑکی اس گلی کی   |
| 100/- | اسلم راہی ایم۔ اے | اس جلتے جہاں میں |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | خدا اکہاں ہے     |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | جلتے بچتے لوگ    |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | سمیرا            |
| 75/-  | اسلم راہی ایم۔ اے | روتے کنول        |

کے دوسرے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے ایک نہایت چمکیلے پھل والا چاقو اٹھیا تھا جسے اس نے کیتھرن کے سر میں گنگے پر نکال دیا تھا۔ چاقو کی دھار کو محض دیکھنے پر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر کیتھرن نے ذرا پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تو اس کا سر میں گنگا نکال جائے گا۔ مگرتو کیتھرن نے دیکھ کر اس کی کوشش نہ کرے ورنہ یہ لڑکی ماری جائے گی۔" جنتی چننا پھر اس نے میک نیل کے ساتھ آئے ہوئے ٹرنش نیوی کے گاڑو کو مخاطب کیا۔ "کوئٹ گاڑو کی لاچ بے جو دو آدمی موجود ہیں انہیں بھی ہمیں بلوالو۔ وہ لاچ جس نے جاؤں گا۔ لڑکی میرے ساتھ جائے گی۔"

میک نیل بھی دم بخود ہو گیا تھا۔ اس کی گمن بھل میں دبی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے ٹھنڈی کا مظاہرہ کیا کہ اسے بعض سے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ جنتی کی نظر انہی لوگوں پر جمی جس کے پاس اسے اسلحہ نظر آ رہا تھا۔ وہ خود ایک محفوظ گوشے میں تھا اور کیتھرن کو ڈھال بنا کر اور بھی زیادہ محفوظ ہو گیا تھا۔ سب کے ہتھیار بیکار ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ کیتھرن کی زندگی کو شدید خطرہ تھا۔ "اسحق مت بے۔ تم لاچ لے کر نہیں جاسکو گے۔" میک نیل نے ہونٹوں کے گوشے سے سگریٹ نکالے بغیر غل سے کہا۔ "لڑکی کو جھوڑو۔"

"میں لڑکی کو بھی لے جاؤں گا۔ اس کے سامان کو بھی۔ اور لاچ کو بھی۔" جنتی دھشت کے عالم میں بولا۔ "مگرتو میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرے۔" اس پر کچھ خفیف سا جنون طاری تھا۔ مجھے وہ اب تک ایک بے ضرر سا آدمی لگا تھا لیکن یکدم ہی اس میں گویا کوئی شیطانی روح حلول کر گئی تھی۔

صرف میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے زائد کچھ ایسا تھا کہ میں جنتی کی کھینچی کا نشانہ بن سکتا تھا اور اس کی متحرک و مضطرب نظر میری طرف زیادہ گہری بھی نہیں تھی۔ اسے یقیناً یہ اطمینان تھا

کہ اس سے زیادہ کیا آزادی چاہتی ہو گی۔؟  
"میں چاہتی ہوں آپ میرا چچا چھوڑ دیں۔" کیتھرن پلا آئی۔  
"میری عمر کی اولادوں کے بارے میں والدین کو علم بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں لیکن آپ ہیں کہ میرے لئے میں جلتی ہوں کہ خبر رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے میں لوگوں کو فون کر کے کہتے رہتے ہیں کہ کیتھرن کا خیال رکھنا۔ لوگوں کو سائے کی طرح میرے پیچھے لگا دیتے ہیں۔"

چارلس کے چہرے پر اذیت کے آثار ابھر آئے۔ شاید اب اسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ دم نہ ہونے دیتا تھا۔ مشرق اور مغرب میں واقعی بہت فرق تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ مغربی معاشرے نے اپنی اولاد اپنی عزت کو اس کی من چاہی آزادی دے کر لیا ہوا تھا۔ ایک اندھا بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں بچے لوگ ان کی اس آزادی پر رشک کرتے ہیں اور ان کی تھیلہ کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر چارلس شکست خوردہ سے لمبے میں بولا۔ "ٹھیک ہے۔۔۔ صرف اس بات پر میرے ساتھ چلو۔ ہم پیش کر آؤں۔" کیتھرن نے بات کر دی۔ اس کے بعد تم جس طرح چاہو زندگی گزارنا۔ جس دگر پر چاہے چلنا۔ میں تمھارا کوئی روک ٹوک نہیں کروں گا۔ اگر تم یہاں چاہو گی کہ میں تم سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔ ہتھاری بالکل کوئی غیر خبر نہ ہوں تو میں ایسا ہی کروں گا۔ میں تمھاری طرف سے میری طرف سے جس کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ فی الحال تم میرے ساتھ چلو۔"

کیتھرن نے گویا پائل کا خواستہ اس کی دلچسپی قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سامان لینے اپنے کیمپ میں چلی گئی۔ کیتھرن نے گورنر کے محلے کے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ کیتھرن کے پیچھے پیچھے کیمپ میں چلا گیا۔ اور مریدی کے جنگلی جہاز کے قریب۔ کوئٹ گاڑو کی لاچ چارلس کے انتظار میں ادھر ادھر بھٹورے لے رہی تھی۔

چند منٹ بعد کیتھرن کیمپ سے برآمد ہوئی۔ محلے کا آدمی سامان اٹھائے اس کے پیچھے تھا۔ اسی دوران میں نے جہاز کے فرسٹ میٹ جنتی کو پلائی عرشے سے نیچے آتے دیکھا۔ وہ غالباً کیتھرن سے الوداعی ملاقات کے لیے آ رہا تھا۔ کیتھرن اسے دیکھ کر رگ گئی اور وہ قریب آیا تو مچھانے کے لیے اس کی طرف ہاتھ پھماتے ہوئے برقی "خدا حافظ جنتی! میں پاپا کے ساتھ جا رہی ہوں۔" ٹھیک افسوس ہے میں تمہارے۔"

وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کا جلد ادھر رہا گیا۔ جنتی نے اس کا مصافحہ کے لیے بیٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اچانک اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ مجھ سمیت شاید کسی کو بھی اس سے اس حرکت کی اور اتنی بھرتی دکھانے کی توقع نہیں تھی۔ اس نے یکدم ہی کیتھرن کو ایک بازو کے پٹے میں جکڑ لیا تھا اور اسے اپنی ڈھال بنالیا تھا۔ اس



آوی ہے۔ اس سے جو کام کوہ کرنا ضرور ہے مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی سزا فصل چوہدری اتم نے واقعی میری بیٹی کا خیال رکھا۔ کچھ معذرت میں اسے خطرے سے بچایا۔ میں اگر ترکی میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں نہ پھنسا ہوتا تو خود پاکستان آنکارہ کیسٹرن کے ساتھ سفر کرتا لیکن برسوں تک صورت حال ایسی تھی کہ میں ایک گھنٹے کے لیے بھی اسٹیشن سے نہیں نکل سکتا تھا۔

”کوئی بات نہیں“ میں نے ملائت سے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسک۔“ اسی بات پر ہے کہ سیدھے رمضان نے مجھے دھکے دے کر اس جہاز پر بھیجا تھا۔

اس دوران میک ٹیل آگے بڑھ کر جتے کے قریب پہنچا تھا اور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ غالباً یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کچھ نہیں گلیا اترنے کے باوجود اس میں کوئی سانس تو باقی نہیں۔

”یہ مرہکا ہے“ اس نے سر اٹھاتے ہوئے اعلان کیا۔ میں نے دل کی دہائی میں کہا ”یہ جانے کے لیے مجھے اس کا معائنہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ہمیں کھڑے کھڑے بتا سکتا تھا کہ یہ مرہکا ہے۔“ تاہم یہ بات میں نے منہ سے نہیں کی۔

میک ٹیل میرے قریب آکر گویا ایک نئے زاویے سے میرا سر آٹاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”تم نے یکدم ایک انتہائی قدم اٹھایا۔ لیکن میرا خیال ہے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس شخص نے ہم سب کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔“

اس کا اندازہ خود کافی کا ساتھ بھردہ ایک نظر جنرل لاش کی طرف دیکھ کر بولا ”اس کے مرنے سے ایک مسئلہ حل طلب ہو گیا۔ اب ہم یہ نہیں جان سکیں گے کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ کیسٹرن کو اس طرح مختبر کی نوک پر ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا؟“

”میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں؟“ میں نے امریکیوں کے انداز میں کندھے اچکائے ”میں باریکیوں میں جانے کا عادی نہیں ہوں اور یہ باریکیوں میں جانے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک خطرناک صورت حال دیکھی اور فوری طور پر مجھے اس کا جو حل نظر آیا تھا۔ اس پر عمل کر ڈالا۔“

”تم اس پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہو کیسٹرن؟“ اس نے کیسٹرن کی طرف مڑتے ہوئے کہہ اس طرح پوچھا ”جیسے وہ کیسٹرن کو برسوں سے جانتا تھا۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ کیسٹرن نے نیازی سے بولی ”مسلحہ کے دوران میرا رویہ اس سے خاصا دوستانہ رہا تھا۔ میں اسے مکمل ایک مذہب انسان سمجھ کر اچھی طرح پیش آری تھی۔ یہی اس سے ملاقات جہاز سے باہر پہنچی میں ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے۔ میرے اچھے دوست کی وجہ سے کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو اور اب مجھے جانتے دیکھ کر یکدم ہی اس کے ذہن نے چٹا کھایا ہو۔ مجھے لگنے لگے کہ اسے اس کے سوا کوئی طریقہ نظر نہ آیا ہو۔ ویسے مجھے

کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرا ہاتھ نہایت آہستہ سے رینگتا ہوا بلی کٹ کے نیچے جا رہا تھا۔ ”واشٹن آید بکار“ والا ٹھانڈا اس وقت مجھے بہت سی درست محسوس ہو رہا تھا۔ سائیکس رکا وہ ریپورڈ جو آصف بھٹی سے مجھ پر میں میرے ہاتھ لگا تھا اور جسے وہ بعد میں واپس لینا بھول گیا تھا اس وقت میری جلیٹ میں اڑسا ہوا تھا۔

”لاچ کے آدمیوں کو یہاں بلاؤ۔“ جتے چنچا ”ورنہ میں اس لڑکی کو مار دوں گا۔“ مجھے تو ویسے بھی مری جانا ہے۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خواہ پانچ دس آدمیوں کو مار کر مرادوں۔ جلدی کرو۔“

وہ اس سے آگے بھی شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میرے ریپورڈ نے اسے ملت نہ دی۔ ”ٹھک“ کی نہایت ہلکی سی آواز کے ساتھ ریپورڈ سے گولی نکل اور نہایت معافی سے اس کی کشتی میں اتر گئی۔ وہ دم سے زیریں عرشے پر گرا اور اس کے ساتھ ساتھ کیسٹرن بھی گرتے گرتے پئی۔ ایک لمحے کے لیے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا تھا اگر میں کچھ اور بھرتی کا مظاہرہ کرتا اور ریپورڈ کو دوبارہ چھپا لیتا تو شاید سب لوگوں کو یہ جاننے میں وقت پیش آتی کہ کوئی کس نے چلائی تھی لیکن میرے ریپورڈ جیب میں رکھنے سے پہلے میک ٹیل کی نظر مجھ پر پڑ گئی پھر کیسٹرن نے بھی اپنا گلا مسئلے ہوئے میری طرف دیکھا۔ وہ سخت دھشت زدہ نظر آری تھی۔ چند سیکنڈ کے اس تجربے نے اسے ماری چھ کڑی بھلاؤنی تھی۔ جس باپ پر وہ چند لمحے پہلے گنہ گار رہی تھی اب اسی کے بیٹے سے جا لگی۔ انسان کتنا ہی باغی کتنا ہی جاسکے کتنا ہی سرکش ہو جائے۔ جذباتی سادوں کی ضرورت باقی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی اسے اس کا احساس آخری سے ہوتا ہے۔

میک ٹیل نے کمری سانس لے کر میری طرف پُر خیال نظروں سے دیکھا لیکن فوری طور پر وہ کچھ نہ بولا بلکہ سگریٹ کا کش لینے لگا۔ چارلس کیسٹرن کو سنبھالتے ہوئے میرے قریب آکر بولا ”میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں پر فوراً اتم نے میری بیٹی کو بچانے کے لیے اپنے ہی ملے کے ایک ساتھی کو ہلاک کر دیا۔“

کیسٹرن باپ سے الگ ہوتے ہوئے بولی ”اس کا جہاز کے ملے سے کوئی تعلق نہیں ہے یا! یہ جلی سی مین ہے۔“

”تو پھر یہ کون ہے؟“ چارلس نے حیرت سے پوچھا۔ میرے جسم پر ہر حال اسی جہاز کے ہی مین کی وردی تھی۔

”آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ آپ کے دوست رمضان کا بھیا ہوا آدمی ہے۔ اس کا نام اصل چوہدری ہے۔ آپ کو میری بہت فکر تھی۔ یہ میرا خیال رکھنے کے لیے اس جہاز پر سوار ہوا تھا۔“ کیسٹرن کے لہجے میں اب بھی ہلکا سا ٹھکانا تھا۔

”اوہ۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔“ چارلس نے جو شے اعزاز میں مصانے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا ”رمضان بڑا لاجواب

ہے کہ اس کی کھوپڑی کا کوئی پڑھ ڈھیل ضرور تھا۔

سبک نیل پر خیال انداز میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ وہ اس امکان غور کرنے کے لیے قوتیار تھا لیکن میرا خیال تھا کہ بات اس کے لیے کو نہیں گئی تھی تاہم وہ خاموش رہا۔ میں نے ہنکار کر گھاساٹ کرتے ہوئے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ عدل کو بھی جتنے غیظ مل گیا تھا۔ اور آواز قل شاید چاقو سے مارا ہو" میں نے چلی فرش پر پڑے جھلس جھلس کرتے چاقو کی طرف اشارہ کیا "شاید اس کا کسی لیبارٹری وغیرہ میں تجربہ کرنے پر عدل کے خون کے ذرات مل جائیں۔"

میک ٹیل نے آگے بڑھ کر عدل کی دوسے چاقو اٹھالیا اور اسے رد مال ہی میں لپیٹ کر جب میں دالے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "تم تو کہہ رہے تھے کہ تم باریکوں میں جانے کے عادی نہیں۔ یہ تو خاصی باریک بات کی ہے تم نے۔"

"کوئی بھی شخص جس نے درجہ چار جاسوسی کمائیاں بڑھی ہوں۔ ایسی بات کر سکتا ہے یہ کچھ ایسی زیادہ باریک بات نہیں۔ البتہ آدمی کی عقل ہی کچھ زیادہ موٹی ہو تو بات دوسری ہے" میں نے ملالیت سے کہا۔

"کیپٹن گوز آگے آتے ہوئے بولا "جتنے جو حرکت کی ہے اس کے بعد تو مجھے بھی یقین ہو چلا ہے کہ عدل کو اسی نے قتل کیا تھا۔ ممکن ہے یہ کسی قسم کے جنون کا شکار ہو گیا ہو۔ جنون کے آثار کچھ نمایاں تو نہیں تھے لیکن اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ ایڈز کا شکار تھا۔ ممکن ہے اپنے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا ذہن کسی قسم کے غلبان کا شکار ہو گیا ہو۔"

"اگر یہ ایڈز کا شکار تھا تو پھر تمہاری بات درست ہو سکتی ہے" میک ٹیل نے اثبات میں سر ہلایا "بہر حال۔ ہمیں ان واقعات سے کوئی مطلب نہیں۔ بندرگاہ پر تم جس طرح چاقو ان واقعات کی رپورٹ کر سکتے ہو۔ ہمارا کام اب ختم ہو گیا" ہم چارے ہیں۔

چارلس بولا "میں بھی کیپٹن کو لے کر لاچا پڑی اسٹینل چاربا ہوں کیونکہ مجھ کو تو یوروم کی بندرگاہ پر۔ اور پھر اسٹینل پہنچنے پہنچتے بہت دقت لگ جائے گی۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے سسر چرچری؟ تم اب میرے صمان ہو۔ گوکہ میں خود کسی اور کام صمان ہوں۔"

"میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہیں ہے سسر چارلس" میں نے چٹپٹا کر اسے کہا۔ یہ بات اب چونکہ سبھی کو معلوم ہو چکی تھی اس لیے اب اسے چھپانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا" چارلس نے ہر دلی سے بولا "میں ایسے راستے سے جانا بھی نہیں ہے جہاں پاسپورٹ وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔ اسٹینل پہنچ کر میں تمہارے لیے پاسپورٹ وغیرہ کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ تم چلو تو سکی۔ تم میرے عین ہو لیکن تم سے بہت ہی نامناسب حالات میں

ملقات ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا تم میں سے کچھ اچھا ہو جاؤ۔"

میں نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ باپ کا اصرار اس کے لیے خوشی کا باعث تھا یا غم کی؟ بہر حال میرے لیے یہ ایک متعلق بننا حاصل کرنے کا عمدہ موقع تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ چارلس بین الاقوامی طور پر اثر و رسوخ رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر میرے بہت سے مسائل حل ہو سکتے تھے اس لیے میں نے تامل سے سر ہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے میں آپ کو کوئی زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔"

"بھئی ایک تو تمہاری کستانی لوگ وضع داری اور کھلف میں بہت پھنسے رہتے ہو" چارلس اپنی تمام تر محنت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "ہنس اب فضول باتیں چھوڑو اور ہمارے ساتھ چلو۔"

کیپٹن گوز مضمحلانہ انداز میں سگارا لگیوں میں چھاتے ہوئے بولا "اور اگر مجھے پولیس کو رپورٹ کرنے کے سلسلے میں مسٹر افضل چرچری کی گواہی کی یا بیان کی ضرورت پڑی تو؟"

"فحس پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم اسٹینل میں کہیں غائب نہیں ہو جائیں گے" چارلس بولا "میں وہاں برطانوی سفیر کا صمان ہوں اور اس کی سرکاری رہائش گاہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ اس کا کارڈ ہے۔ تم کسی بھی وقت کوئی بھی ضرورت پڑنے پر اس ایڈریس یا فون نمبر پر مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو" اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ کارڈ دیکھ کر کیپٹن گوز مطمئن نظر آنے لگا۔

چارلس اور کیپٹن رنگ کے اس حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں رستے کی میز پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ قدم بڑھایا تو کیپٹن گوز میری آتشیں پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا "ہماری یونٹ فارم تو آرتے جاؤ۔"

"اوہ" میں نے اپنے سر پر نظر ڈالی "میں تو بھول ہی گیا تھا۔" پھر میں نے چارلس سے کہا "آپ لوگ چلیں۔ میں کپڑے بدل کر لاچا پڑتا ہوں۔"

وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور میں پائلٹ روم کے اندرونی حصے میں جا پہنچا جہاں میں نے اپنا سفاری سوٹ چھوڑا تھا۔ میں لباس تبدیل کر کے باہر آیا اور اس جگہ سے گزرا جہاں چند منٹ پہلے خوب بیڑھاڑ تھی۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف جتنی لاش پڑی تھی۔ فی الحال اسے اٹھایا نہیں گیا تھا اور کسی نے اس کے پاس رکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

میں لاش کے پاس سے گزرنے لگا تو ایک تختے کے نیچے مجھے کچھ پڑا نظر آیا۔ میں نے جبکہ کر اسے اٹھایا۔ وہاں روشنی کم تھی لیکن میں نے دیکھ لیا یہ وہی عظیم کتاب تھی جو میں نے کئی بار

چیز میری تھی۔ حتیٰ کہ چارلس نے میرے لیے ایک تقریباً نئے سوہو کا بھی بندوبست کر دیا جو میرے جسم پر میرا اپنا ہی لگنے لگا۔ گھر پر موجود بٹر اور دیگر دو تین ملازمین چارلس کے اشارے پر ہر کام کر رہے تھے۔ سفیر سے ملاقات نہیں ہو سکی اور چارلس کو اس کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ سفیر اس وقت استیصال میں موجود ہی نہیں تھا وہ کہیں اور گیا ہوا تھا۔

شام ڈھلے چارلس مجھ سے معذرت کر کے کسی کام سے روانہ ہو گیا۔ کیتھرن کو اس کے جانے ہی کی ہنسی تھی۔ اس کے جانے ہی اس نے اپنے لیے ٹیکسی منگوائی اور وہ بھی کہیں روانہ ہو گئی۔ دونوں باپ بنی بنی مجھے ڈھکے ڈھکے ایک دوسرے کو بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ کہاں جا رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے میں لیٹ کر ان اور ان کا معاملہ کرنے لگا جو میں نے کیتھرن کی کتاب میں سے اٹھا رہے تھے۔ انہیں میں نے ابھی تک بہت چھپا چھپا کر بہت سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔

وہ واقعی کپیوٹر پر تیار شدہ ایک رپورٹ تھی۔ زیادہ طویل نہیں تھی، میں نے اسے دو مرتبہ پڑھا اور میرے رگ دے دیے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے خفیف سی سستی دوڑ گئی۔ اس میں لمبی لمبی کی طبی اصطلاحیں تھیں جو میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن جو بات سمجھنے کی تھی وہ ذہن پر ذرا زور دینے سے میری سمجھ میں آ گئی۔ کڑیاں مل گئیں اور میں دیر تک سوچوں میں کھوا رہا۔

بالآخر میں اپنے کمرے سے نکلا۔ میرے دائیں ہاتھ پر چارلس کا کمرہ تھا اور بائیں ہاتھ پر کیتھرن کا۔ میں نے ابھرنا دھڑکا۔ اس فلور پر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم تینوں کے سوا کسی کمرے میں کوئی مسمان ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔ میں نے کیتھرن کے کمرے میں پہنچ کر دو دروازے کی بائیں پر قسمت آزمائی کی۔ اس کا دروازہ مفلقل تھا۔ کھڑکی بھی اندر سے مضبوطی سے بند تھی۔

میں کھڑکی کو ذرا ٹھوک بجا کر دیکھ ہی رہا تھا اور اسے کھولنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کوئی عقب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں تیزی سے کھولا۔ دروازہ کھلے پر میزبجیوں کے قریب بٹور کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً سٹا رہا تھا کہ مسمانوں کے اس مسمان نے آتے ہی کیا حرکتیں شروع کر دی تھیں۔ وہ یقیناً ابھی میزبجیوں سے اوپر آیا تھا کیونکہ ایک لمبے پٹے تک وہاں موجود نہیں تھا۔

بٹر حرکت تھا لیکن عمر بڑی روانی سے بولا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں پاکستانی تھا۔ پاکستانیوں کا انجیل دینے والے دوسرے ملکوں میں کچھ اچھا نہیں۔ بے چارے ٹرک باشندے پاکستانیوں کو "برادر ملک" کے شری قزاقوں کے کہتے تھے۔ مت جت کا اظہار کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے چودوں جیسی حرکت کرتے دیکھ کر بٹر کے دل میں اگر پاکستانی برادر کے لیے کوئی تھوڑا

کیتھرن کے ہاتھوں میں دیکھی تھی مشرق وسطیٰ کے معاملات پر تیل کے اثرات کی گمان تھی۔

لیجے سے عنوان کی یہ کتاب شاید اس وقت بھی کیتھرن کے پاس تھی جب جنرل نے اچانک اسے دہلیج کر رہنما بنالیا تھا۔ غلط فہمی میں شاید کتاب بچے گئی تھی اور کیتھرن کو اس کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔ وہ دیکھ کر ایسی جگہ جا کر گئی تھی جہاں نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ میں اس ارادے سے اسے اٹھائے لے چلا کہ چاکر کیتھرن کو دوسرے دنوں کا۔

ذرا زیادہ دوشی میں انکریں نے یونی سرسری سے اعزاز میں اس کے دوش پٹے ڈھکائی چڑھائی نظریں منکلی۔ کتاب کے وسط میں کچھ اور ان مجھے اپنی کتاب سے کچھ مختلف محسوس ہوئے یوں تو یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ بہت سی کتابوں میں تصویروں یا اہم دستاویزات کے عکس وغیرہ پر مشتمل صفحات الگ سے بانڈ کئے جاتے ہیں اور وہ اپنی کتاب سے مختلف محسوس ہوتے ہیں لیکن ان صفحات پر سرسری نظر ڈالنے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا کتاب سے بالکل ہی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ کپیوٹر پر چھپی ہوئی کوئی رپورٹ تھی جس کے کاغذ نہایت صفائی سے تراش کر کتاب کے کچھ صفحات نکال کر ان کی جگہ ڈٹ کئے گئے تھے۔

میں وہاں کھڑے ہو کر ان کا عمل جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ صفحات کتاب سے اٹھا کر دیکر کر کے جب میں دیکھ لیا اور ذرا جھجے جا کر کتاب ایک ایسی جگہ سے جواز کے نیچے مجھے میں پیچیدگی دی جہاں مجھے کوئی یہ حرکت کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا پھر میں محسوس کر اس طرف اٹھیا جہاں دس کی سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ سیڑھی سے اتر کر میں لالچ میں پہنچا جہاں چارلس اور کیتھرن میرے منتظر تھے۔ چند منٹ بعد کوسٹ گارڈ کی لالچ میں لے کر استیصال کی طرف روانہ ہو گئی۔ کیتھرن کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کی کتاب کہیں گر چکی تھی۔

○☆☆○

استیصال میں چارلس واقعی برطانوی سفیر کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ درنہ مجھے نہ جانے کیوں وہاں پہنچنے تک اس معاملے میں کچھ شک تھا۔ وہ ایک طویل عرصے میں دوسرے بنگلہ تھا جس کی بالائی منزل مکمل طور پر مسمان خانہ تھی۔ اس میں کئی بڑے دو حوا زور ضرورت کی تمام چیزوں کے علاوہ ایک نہایت پر تعیش کچن بھی موجود تھا۔ جس علاقے میں بنگلہ واقع تھا اس میں اسلام آباد کی ہلک تھی۔ چارلس کے اندازہ و اطوار وہاں کچھ ایسے ہی تھے جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہو اور کسی حد تک یہ بات درست ہی تھی۔ وہ وہ تو غیر بہت "پہنچی ہوئی" شخصیت تھا لیکن زیادہ تر ملکوں کے عام باشندے بھی اپنے سفارت خانے اور اس سے متعلق چیزوں کو دبا غیر میں اپنے گھر کی طرح محسوس کرتے ہیں۔

مجھے وہاں الگ بڑے دل مل گیا۔ عمدہ کھانا اور ضرورت کی ہر

ٹوٹے ٹوٹے بھاگ۔ قیمت تھا کہ تالا فیا نہیں تھا۔ کافی گھسا ہوا تھا۔ میری دوسری کوشش کامیاب ہو گئی۔ جلدی سے اندر داخل ہو کر میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ اپنے عقب میں بند کیا اور اندر چلے میں گہری سانس لی۔

چند لمحوں بعد میری آنکھیں اندر چلے سے مانوس ہو گئیں۔ ویسے بھی راہِ ابراہیم میں روشنی ہونے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا مگر نہیں تھا۔ میں بقیال روشن کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بعد نہیں تھا کہ ہٹار ایک بار پھر اوپر آجاتا اور کیتھرن کے کمرے میں روشنی دیکھ کر پریشان ہو جاتا کہ آخر میں کس چکر میں تھا؟

کیتھرن کا سامان اب دروازوں میں محفل ہو چکا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کے سامان کی تلاشی لی۔ ڈرننگ ٹیبل کو کھینچا لیکن وہ چیز وہاں نہیں تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ چڑے کا وہ تھیلا جس میں 'میں' نے جنازے کے سفر کے دوران دماغی کیولوں کی شیشیاں دیکھی تھیں، خالی پڑا تھا۔

مجھے قدرے باہر سی ہوئی۔ شاید میں صحیح طور پر دیکھ نہیں سکتا تھا اور کیتھرن وہ شیشیاں آج ہی باہر لے گئی تھی تاہم ایک موہوم سی امید لمحوں میں ہاتھ روم میں جا پہنچا اور میڈ۔سن کینٹ کو کھول کر دیکھا۔ کینٹ کے ایک خانے میں وہ شیشیاں قریبے اور ترتیب سے بھی ہوئی تھیں۔ میں بے اختیار طمانیت کی گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے جلدی سے وہ شیشیاں نہایت حفاظت سے چڑے کے تھیلے میں بھر دیں اور باقی ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑ کر نہایت محتاط طریقے سے اپنے کمرے میں واپس جا پہنچا۔

میرے کمرے میں بھی کوئی ایسی محفوظ جگہ نہیں تھی جہاں میں ان شیشیوں کو چھپا کر مطمئن ہو جاتا۔ بہر حال میں نے اپنے ہاتھ روم میں جا کر قلعہ کی نیچلی کاپانی مبارک اور والرینڈ کے مزے پانی اندر جانے سے روک دیا پھر ایک بڑا اسکرپو کھول کر میں نے نیچلی کا ڈھکن کھولا اور شیشیاں نیچلی میں اوپر تلے رکھ دیں۔ فی الحال آسانی سے مجھے یہی ذرا محفوظ جگہ میسر تھی۔ نیچلی بند کر کے میں آرام سے کمرے میں آکر لیٹ گیا اور ہٹار کے دیسے ہوئے رسائل کی ورق گردانی کرنے لگا۔

رات کے کھانے پر بھی میں 'چارلس' اور کیتھرن کی کھانا ہو سکے میں نے کافی دیر ان کا انتظار کرنے کے بعد بالآخر کھانا کھالیا۔ میں ابھی کھانے کی میز سے اٹھا نہیں تھا کہ 'چارلس' آ پہنچا۔ لباس تبدیل کر کے وہ میرے ساتھ آ بیٹھا۔ رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ کیتھرن اب بھی واپس نہیں آئی تھی لیکن اب 'چارلس' کو گویا اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ اس کی تشویش شاید صرف اس وقت تک کے لیے تھی جب تک وہ جنازہ پر تھی۔

'چارلس' ایک بار بار میرا ٹھہرے اور کرتے دکا کے میں نے اس کی خاطر بڑی زحمت اٹھائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بیٹی اگر

میں محبت موجود بھی تھی تو اس کی بنیادیں خطرناک حد تک لرز گئی ہوں گی۔

میں نے پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے فحاش کا اظہار نہ ہونے پائے نہایت محنت سے چلتا ہوا میں اس تک پہنچا۔ خوشی ظنی سے مسکراتے ہوئے میں نے سرسری سے لمحوں میں کہا میری ایک کتاب کیتھرن کے پاس رہ گئی ہے۔ میں اب خاصا شیشیا پرور ہوا تھا۔ سوچا ذرا چڑھ لوں۔ لیکن اس کا کراہٹ منقل ہے۔ تمہارے پاس اس کی کاپی ہو گئی؟" میں نے یہ ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی کہ میرے دل میں چر نہیں تھا۔

اس نے فنی میں سہلایا اور بولا "تجربیاں دروازوں ہی میں لگی رہتی ہیں۔ اگر ڈیپکٹ ہوئی ہو گی بھی۔ تو ان کے بارے میں پاس کوئی کچھ پتا ہو گا۔"

"وہ۔۔۔" میں نے قدرے باہر سی سے کہا "تو پھر تم ہی مجھے کوئی انگریزی اخبار یا رسالہ وغیرہ دو۔ ترکی تو مجھے پڑھنی نہیں آتی۔" اس نے انہایت میں سہلایا اور نیچے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ کئی انگریزی رسائل لیے واپس آ گیا۔ میں نے چہرے سے خوشی کا اظہار کیا اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف واپس چل دیا۔ وہ کھٹکار کرکلا صاف کرتے ہوئے بولا "براہمیں یہ کہنے آیا تھا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو اتھر کام پر کہہ دیجئے گا۔"

"بہت بہتر" میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر کے گہری سانس لی۔

میں نے رسائل کو ایک طرف پھینکا اور کھڑکی کی جھری سے راہِ ابراہیم میں جھانکا۔ ہٹار واپس جا چکا تھا۔ تاہم میں نے دوبارہ باہر آنے میں ہلکت سے کام نہیں لیا۔ معلوم نہیں میں ہٹار کی نظر میں اپنی تھوڑی بہت عزت بحال کرانے میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ بہر حال چند منٹ بعد میں نے ہاتھ روم سے ایک بلڈ لیا اور دوبارہ کمرے سے نکل آیا۔

اس بار میں نے بیڑیوں سے نیچے دور تک جھانک لیا۔ گوست کما کی آمد کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں کیتھرن کے کمرے میں گھسنے کے سلسلے میں آخر اس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی واپس کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ میں ممکن تھا کہ وہ جلدی واپس آجائی۔ اس کام کو کل پر ڈالنے کی صورت میں یہ بھی امکان تھا کہ وہ چیز مجھے اس کے کمرے میں نہ ملتی جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس کے غائب ہونے کا اندیشہ تو اب بھی تھا لیکن مجھے کسی حد تک اطمینان اس لیے تھا کہ میں نے کیتھرن کو گھر سے تقریباً خالی ہاتھ ہی رخصت ہونے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں پرس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے دروازے کے نیچے پر جھک کر بلڈ کو کھڑے فرش سے اٹالے کی جھری میں داخل کیا اور اس کی مدد سے اٹالے کے لچ LATCH کو اندر گھسانے کی کوشش کی۔ پہلی کوشش میں تو بلڈ

انتظامات کر کے آئی ہو۔

حالانکہ میں نے اچھے کر بیٹھے کی کوشش نہیں کی تھی، صرف حیرت سے آنکھیں پٹ پٹانے پر اکتفا کیا تھا اس کے باوجود اس نے مجھے خبردار کرنا ضروری سمجھا، ”تم نے کی کوشش مت کرنا۔ شیشیاں کہاں ہیں؟“ اس کی آواز نامن کی پندرہاڑے مشابہ تھی۔

”شیسیاں۔۔۔ کون سی شیسیاں؟“ میں نے مصوم بننے کی  
 کوشش کی حالانکہ مجھے خود بھی معلوم تھا کہ میری یہ کوشش فغیر  
 تھی لیکن میں سوچنے کے لیے دو چار سیکنڈ کی مسلت حاصل کرنا  
 چاہتا تھا۔ اس کے آثار۔۔۔ خطرناک نظر آ رہے تھے۔ اچانک  
 کوئی حرکت کرنا میرے حق میں مسلک ثابت ہو سکتا تھا۔ ابھی میں  
 اس لڑکی کو پوری طرح نہیں جان سکا تھا۔

”میں تمہاری کچھ بڑی میں سوراخ کرنے کے بعد بھی شیشیاں  
 دھوڑ لوں گی لیکن میں تمہاری جان لیتا یا زیادہ رحمت اٹھائیں  
 لیا کرتی تھی ان دونوں کاہوں پر مجبور مت کرو۔“ اس کی آواز  
 اب بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی لیکن یہ سرگوشی گویا  
 صحت کو کھینچتی ہوئی گزر رہی تھی۔

”مجھے تو اس کسر سے میں کچھ شیشیاں ڈر لنگ نبیل پر اور کچھ تھوڑی دم میں میڈ۔ لیکن کینٹ میں رہی ہوئی ملی تھیں۔ ان کے سوا تو مجھے کسی شیشی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں“ میں نے مہارت و احتیاط سے اپنی معنوی مصیبت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں صرف تین تک گمنوں گی۔۔۔“ اس نے سفاک لمبے میں صرف اتنا کہا اور کشتی شروع کرنے سے پہلے ہی زنجیر پر اس کی انگلی اداؤں بڑھ گیا۔

”تمہارے پاپا تمہارے ہاتھوں میرے مرنے کا بہت برا  
 کام کیا ہے“ میں نے تیزی سے کہا۔

”جسم مرا گے پاپا!“ دغھے سے بولی۔

”ابھی تو نہیں گئے شاید مرنے کے بعد جائیں“ میں نے  
 صومیت سے کہا۔

”جگموت“ اس نے جھلا کر کہا اور متنی شہزاد کی ”ایکیمہ“  
 ”نصہو“ میں نے بظاہر گھبراتے ہوئے کہا ”آخر تو وہ کون سی  
 شیاں ہیں جن کے لیے تم میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ خدا کے لیے کچھ  
 تو تو کسی کوئی اشارہ دو۔ شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔“

ڈرگز کے دھندے میں لوٹ رہی تھی تو اب شاید اس سے کھل آئی تھی۔ اسے امید تھی کہ یورپ کے سفر کے بعد وہ اسے سمجھا بھجا کر اپنے ساتھ گھر لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں اس کی بات میں اس ملامت کیا۔ میں نے اس پر اپنی اس رائے کا اظہار نہیں کیا کہ ڈرگز کے دھندے میں ایک بار لوٹ ہونے کے بعد چاہے ہوئے بھی کسی کا اس سے کتنا تقریباً ممکن ہی تھا۔ میں چارلس کی امیدوں کو ناامید کیا اور دل شکستگی میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر وہ ایک باپ تھا۔ اپنی بیٹی کی تمام تر سرکشی کے باوجود اور اپنے مغربی معاشرے کی دعوایات کے برعکس وہ اب بھی بیٹی کی طرف سے اختلافی اور بے حس اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

وہ کھانا کھا چکا تو اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں بھڑکی جواز کی کوئی دکان کی بے اثری سے ملانی تھا کہ وہ اتنا اس لیے کچھ زیادہ ہی گرمی خند ہو گیا۔ مجھے بتائیں بلا کہ کیتھرن کس وقت واپس آئی تھی لیکن میری اس سے اسی بات اپنے ہی کمرے میں ملاقات ہو گئی لیکن اسوی کہ یہ کوئی بیت بھڑکی یا درمیان پر ملاقات نہیں تھی۔

وہ گنجت میری کھٹی پر پھول نکائے میرے بید کے پاس ہی  
 لڑی تھی۔ درحقیقت میری آنکھ کمرے کی لائٹ آن ہوئے اور  
 پوچھی پر پھول کی مال کے لمس سے ہی کھلی تھی۔ کیسٹرن کی بیوری  
 ہمیں اس وقت شعلے انگ رہی تھیں۔ اتنی شاکستہ، نرم خو،  
 دلرب اور خوش اطوار لڑکی کو اس قدر غصے میں دیکھنا میرے لیے  
 بے بسیب تجربہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دنیا وہ غصے میں تو کبھی آئی ہی  
 نہیں ہوگی۔ وہ ایک نہایت خوب صورت ناٹکی میں تھی اور اس  
 کے وجود سے سمور کچھ خوشبو پھوٹ رہی تھی لیکن افسوس کہ اس  
 نے اسے ناٹکی میں دیکھ کر بھی لطف اندوز نہیں ہوا جاسکتا تھا اور  
 اس کے وجود سے چھوٹی ہوئی خوشبو کو اپنے ہر شام جاں میں  
 رہنے کی کوشش بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے تاثرات کچھ  
 ہی خطرناک تھے۔

اس ایک لمحے میں مجھے یہ خیال بھی آیا کہ وہ اتنے بُرا امن اور  
بوش مارچنے سے میرے کمرے میں کیسے آن پہنچی تھی کہ میری  
میں ذرا بھی خلل نہیں پڑا تھا جبکہ میری ہمری نیند بھی کچھ زیادہ  
کی نہیں ہوتی تھی؟ پھر میں نے سوچا کہ جب میں ذرا سی بھی کھڑ  
کئے بغیر اس کے منتقل کمرے میں جا سکتا تھا تو وہ میرے کمرے  
کیوں نہیں آسکتی تھی۔ آخر وہ بھی تو نہ جانے کون کون سے  
بد امن میں میٹھے دنیا میں گھوم رہی تھی۔

مخبر کی جہاز پر سفر کے دوران جب میں نے اس کے سامان کی  
تفصیل دیکھی تو مجھے اس میں کوئی ہتھولہ دیکھ کر نظر نہیں آتا تھا۔ شاید  
وقت وہ بھی میری طرح اسے لباس کے اندر رکھیں ہر وقت اپنے  
سے چپکائے پھرتی ہو۔ یا پھر آج سے پھر سے وہ جس آواہ  
کیا میسر ہوئی ہوگی اس کے دوران بہت ہی جلدوار کے

اب اس کے باقوتی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی پھر اس نے ہدایت کی "نمایت آہستہ سے اٹھنا۔ ایک بار پھر خبردار کر رہی ہوں گوئی حیات نہ کرنا۔ تمہارے ساتھ اتنی زری صرف اس لیے کر رہی ہوں کہ تم نے جہاز پر میری جان بچائی تھی۔"

میں نے اتنا وقت بکواس میں اس لیے ضائع نہیں کیا تھا کہ اس کی ہدایت پر عمل کرنا۔ میں باتوں باتوں میں اس کے اعصاب کو ذرا مضمحل پر لانا چاہتا تھا۔ بیان زدہ انسان کسی بھی لمحے زندہ رہ سکتا ہے۔ اس لمحے میں دوسرے انسان کے اندازے غلط ہو سکتے ہیں لیکن جب انسان کے اعصاب اس کے قابو میں ہوں تو پھر دوسرے کو اس کے بارے میں اندازے لگانے میں آسانی رہتی ہے۔

میں نے بظاہر اٹھنے کے لیے بازوؤں کو خفیف سی حرکت دی۔ اس کے بعد یقیناً اس کی بھی سمجھ میں نہیں آیا وہ گاہ کہ کس طرح میرا ہاتھ اس کی کلائی تک پہنچا اور کس طرح میں نے اس کا ہتھول والا ہاتھ اٹھ کر دیا۔ اس نے زندہ رہنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔ اضطراب سے انداز میں زندہ رہا لیکن اس کا ہاتھ بہت اونچا ہو چکا تھا۔ گولی نے کانوس کے کچھ حصے کی کرسیاں بکھیر دیں جو میرے اوپر ہی آکر گر گئیں۔

دوسرے ہی لمحے میں کیتھرن کو بیڈ کی ایک طرف سے اٹھ کر دوسری طرف اچھال چکا تھا۔ اسٹارٹ لڑکیاں اس لحاظ سے بھی اچھی ہوتی ہیں کہ انہیں ایک بازو پر اٹھ کر پھینکنا آسان ہوتا ہے لیکن میرا اندازہ خود اس لحاظ سے ہو گیا۔ وہ دوسری طرف کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اچھی خاصی دھچک محسوس ہوئی۔

فلوری آواز زدہ بلند نہیں تھی لیکن اس دھچک سے میں ڈر گیا کہ کہیں اس کی کھوپڑی دھیرے دھیرے چٹکی ہو لیکن اس کی سخت جانی نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔ ہتھول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھپٹی لیکن اس وقت تک میں بستر پر لوٹ کر اس ہتھول پر گر چکا تھا۔

وہ میرے اوپر گر کر اور اس بد بخت نے فوراً ہی چپکاپ کر میری ناک چپانے کی کوشش کی۔ یہ ایک انتہائی غیر دوکانی۔ بلکہ غیر نسوانی اور تقریباً غیر انسانی حرکت تھی۔ میرے خیال میں اب وہ کرانے کے ایک آدھ جگے سے ہاتھ کی سختی ہو چکی تھی جو میں نے بلا تامل اس کی کپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو لڑھک گئی۔

میں ایک گرمی سانس لیتے ہوئے محنتوں کے بل اس پر جھک گیا اور بازو بڑھانے لگا کہ اس دنگل وجود میں کچھ ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی تھی۔ دفعتاً میں اپنے عقب میں ایک توشیہ زدہ آواز سن کر پلٹا۔ "یہ کیا رنگامہ ہے۔۔۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ چارلس تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا ایک ہاتھ نائٹ گاؤن کی جیب میں تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک ریو اور

"مجھے شروع ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک خطرناک آدمی ہو۔ مجھے تمہاری طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ زیادہ محتاط رہنا چاہیے تھا۔ تم یقیناً وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو" وہ ناگواری سے بولے۔

"آج کے دور کا الیہ کیا ہے کچھ ڈارنگ؟" میں نے غصہ سے سانس لے کر کہا "زیادہ تر لوگ وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں، تم بھی ان ہی میں شامل ہو۔"

اب میں اسے کیا بتا کہ شیشیوں کے راز سے آگاہ ہونے میں میری خطرناکی "کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اگر اتفاق سے کیتھرن کی وہ گری ہوئی کتاب مجھے نہ ملتی اور اس میں جڑے ہوئے وہ اوراق میری نظر میں نہ آتے تو شاید بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ میرا ذہن اتنی دیر تک نہیں جاسکتا تھا۔ پوری بات تو ان اوراق میں بھی نہیں تھی لیکن کچھ ایسی کڑیاں ضرور مل گئی تھیں جن کی مدد سے میں نے پوری بات سمجھ لی تھی۔ کیتھرن کو شاید ابھی تک کتاب کی گمشدگی کاظم نہیں تھا یا پھر وہ سمجھ رہی تھی کہ کتاب بھی میں نے ہی ہار لی ہوگی اور اس کے بعد ہی مجھے شیشیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا۔"

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "اگر تم نے ان شیشیوں کو گھر سے باہر کسین ختم کر دیا ہے تو تمہارے ساتھ ساتھ یہ میرے حق میں بھی بہت برا ہوگا۔ اس صورت میں ہمیں ہلاک کرنے کا بھی مجھے کوئی ناکارہ نہیں ہوگا۔"

"مجھے ہلاک کرنے کا تو تمہیں کسی بھی صورت میں کوئی ناکارہ نہیں ہوگا" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ اس ہمارے تم جان بچا سکو گے۔ اگر تم کو گھر کے کمرے کے شیشیاں کسین باہر ختم کوئی ہیں اور وہ ہمیں مارتے لے جائے بغیر میں مل سکتی تو میں نہیں ساتھ لے کر نہیں مل سکتی۔ میں شیشیوں کی طرف سے صبر کر لوں گی اور اپنا دل لٹھا کرانے کے لیے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گی لیکن اگر تم شیشیاں نہیں کسین گے برآمد کر کے میرے حوالے کر دو تو تمہاری جان بچا سکتی ہے۔" اس نے اب گویا اپنے منہ پر قابو پایا تھا۔

میں نے بظاہر ایک لمحے اس کی پیشکش پر غور کیا پھر سنجیدگی سے کہا "نہیں ہے۔ میں شیشیاں نہیں دیتا ہوں۔ مجھے اٹھنے دو۔ ہسپتال میری کچن سے ہٹاؤ۔"

"ہسپتال تمہاری کچن سے ہی لگا رہے گا۔ کوئی حیات نہ کرنا" وہ اب اس کیتھرن سے بہت مختلف لگ رہی تھی جسے میں نے جہاز پر دیکھا تھا۔

"تم بہت مشکل ہو۔ اردو کے کسی شاعر کی محبوبہ سے بھی زیادہ" میں نے غصہ سے سانس لے کر کہا۔ "میری مشکل کا کوئی نمونہ تو ابھی تم نے دیکھا ہی نہیں۔"



اسے کہنے دو۔"

"احباب! آپ کہتے ہیں تو میں مہر کر لیتا ہوں ورنہ میرے ہاتھ میں خاصی کھلی ہو رہی ہے" میں نے اپنے ہاتھ کا جائزہ لینے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں یہ کہنے لگا تھا کہ آپ کی بیٹی نے اپنے لیے ایک نیا سا بزنس بھی تلاش کر لیا ہے۔ مگر اگر اوپر ذکر ہونے لگے تو اس کا سلسلہ بھی شاید ابھی جاری ہو لیکن یہ سائنڈ بزنس شاید اس سے بھی زیادہ منافع بخش ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سائنڈ بزنس خالصتاً آپ کی بیٹی کا اپنا ہی ہے یا اس کے پیچھے بھی کوئی بینڈ کیٹ کام کر رہی ہے۔ کیونکہ آج کل دنیا کے جس دھندے میں بھی خوب دولت نظر آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی ناپا جلدی سے آکر اسے چھب لیتی ہے اور اس دھندے کو کنٹرول کر لیتی ہے۔ اسے خود چلانے لگتی ہے۔ ان دھندوں میں دور حاضر کی سیاست بھی شامل ہے۔ یعنی وہ دھندا جس میں دنیا کی سب سے زیادہ دولت لوٹ ہوتی ہے۔ اب اسے بھی مختلف قسم کی مافیائیں کنٹرول کرنے لگی ہیں اور دنیا کے سیدھے سادے بے خبر اور کم علم عوام کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس کے منہ پر کتنے ہولناک ٹکسوں کے مافیائیں کس کس پاس پہلے سیاسی طاقت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی حیثیت بحرال بحر مول کی رہتی تھی لیکن اب وہ یہ طاقت بھی حاصل کر رہی ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ دولت کے علاوہ ان کے لیے تحفہ اور ملاقاتی بھی ہے مگر میں شاید اپنے موضوع سے ہٹ کر دور گر گیا۔"

"میرا بھی بچی خیال ہے" چارلس خشک لہجے میں بولا۔

"مصل میں اس قسم کے سب موضوعات کی جڑیں کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "بحر حال میں آپ کی بیٹی کے سائنڈ بزنس کی بات کر رہا تھا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ کوئی الحال اس کے پیچھے کوئی بینڈ کیٹ یا مافیائیں کام نہیں کر رہی ہوگی کیونکہ میرا اندازہ ہے ابھی یہ بڑے پیمانے پر نہیں بچھلا۔ ابھی اس کا منافع آپ کی ہونٹاں لگا رہی اور باصلاحیت بیٹی کی جب میں ہی جا رہا ہو گا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ انڈیا کے کچھ سائنس دانوں نے جڑی بوٹیوں کی مدد سے ایف ڈی کا علاج دریافت کر لیا ہے۔ کم از کم ان کا دعویٰ یہی ہے۔ اور شاید ان کی تیار کردہ دوا کامیاب بھی جا رہی ہے کیونکہ کچھ خفیہ ایپروڈیٹرز نے ظاہر ہوئے ہیں کہ اس کی ڈیٹا رازدہ ہے۔ ورنہ یہی ہے۔"

چارلس ایک نگ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔ میں نے ایک نظر کبوتر کی طرف دیکھا۔ اب اس کی تیزی بندی اور سر کی دم توڑی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مڑتی چھانے لگی تھی۔ غالباً اب جا کر اسے یقین ہوا تھا کہ اس کا راز راز نہیں رہا تھا۔

خبر کے عین مطابق اس نے سب سے پہلے اپنے ہاتھوں کو حرکت لانے کی کوشش کی لیکن وہ بندھے ہوئے تھے۔ وہ مل کھا کر نہ لے سکا۔ شاید وہ مجھے لات ہی رسید کر رہی لیکن میں دور ہٹ چکا تھا۔ یہ شک وہ ایک حسین لات تھی لیکن اس وقت میں حسین لات کی بجائے اس کے ہونٹوں میں تھا۔

دفترا اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی اور اس نے ایک تپتی یا دہکتی چائے کا ارادہ کر لیا اور کھٹے کھٹے انداز میں نکلیں سے ہلکے لگائی۔

میں نے سائنڈ ٹیبل پر رکھی شیشیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہیں انہی کی تلاش بھی ہے؟"

اس نے اوپر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں صرف ایک لمحے کے لیے بھی چمک نمودار ہوئی اور معدوم ہو گئی۔ میں نے چارلس کو غائب کیا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ دماغی گولیاں نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیا یہ گولیوں کی شکل میں ہیروئن یا کوکین ہے؟" چارلس کے چہرے پر پھیلی ہوئی فکر مندی بڑھ گئی۔ اس کی حرکت میں زور ہی جھٹک رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ ہیروئن یا کوکین بھی نہیں ہے" میں نے جواب دیا "میں تم میں یہ ان سے بھی زیادہ منافع بخش چیز ہے اور اس پر وہ تو ایمین گئی لاگو نہیں ہوتے۔"

"پہلیاں مت بھڑاؤ۔ سیدھی طرح بتاؤ۔ یہ کیا پکڑ ہے؟" چارلس الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ میں نے کبوتر کی طرف دیکھا۔ وہ کمر کوڑھٹوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے دوبارہ چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "میں یہی طور پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ آپ کی بیٹی دیگر کسے دھندے میں لوٹ رہی ہے۔ اور شاید اب بھی ہو کیونکہ اس کے انداز و اطوار میں ایک "ڈارگ کیویر" کی تمام خصوصیات نظر آ رہی ہیں۔"

"زیادہ بیک اس مت کر۔ فیٹ۔۔۔ مرڈو۔" کبوتر نے میری بات کاٹنے کوئے غرائی "مجمیعہ سب سے ہوا اس طرح کی باتیں کر کے تم میرے باپ کی فخر میں ہیروئن باؤ گے یا وہ تمہیں کسی جاسوس کی اولاد سمجھنے لگیں گے۔"

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور چارلس ہی کو مخاطب کیا "میں خوب صورت خواتین پر زیادہ خفی کا قائل نہیں ہوں لیکن اگر آپ برائے منافع تو اس انداز دیکھو کہ آپ کی بیٹی کو ایک کدو ہاتھ اور رسید کدوں؟"

"نیکر۔۔۔ نہیں۔" چارلس بوکھلا کر جلدی سے بولا "میرا خیال ہے پہلے بھی تم نے اسے کوئی ہاتھ ہی رسید کیا تھا جس کی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ بے ہوش ہو۔ تم اسے بے ہوش میں رہتے دو اور بات جاری رکھو۔ یہ جو کچھ اس کہتی ہے



اس وقت بہت تاخیر ہو چکی ہوئی ہے۔

پھر میں نے چارلس کی طرف متوجہ ہونے کو کہا میں جنس انڈین سائنس دانوں کی تیار کردہ دوا کے بارے میں بتانا تھا۔ جنسین تو معلوم ہی ہو گا کہ دنیا بھر میں ایڈز کا علاج دیافت کرنے کے لیے زبردست کوششیں ہو رہی ہیں اگر انڈین سائنس دان یہ اعلان کر دیتے کہ انہوں نے اس مرض کے لیے دوا تیار کر لی ہے تو انہیں اس کو تجربات کے لیے عالمی لیبارٹریز میں پیش کرنا پڑے گا جس کے بعد رفتہ رفتہ یہ عام ہو جائی۔ اس صورت میں بھی انہیں اور ان کے ملک کو بہت فائدے پہنچنے لیکن انہوں نے ان فائدوں کو بعد کے لیے انتظار رکھا ہے فی الحال وہ اس کی بجائے مارکیٹ سے جو کچھ کماتے ہیں وہ کماتے ہیں۔ وٹامن کی گولیوں کی جو شیشیاں آپ سامنے رکھی دیکھ رہے ہیں یہ درحقیقت اسی دوا کی گولیاں ہیں۔ انہیں وٹامن کی گولیوں کا ”ہروپ“ دیا گیا ہے اور شیشیاں پر دی لیبل لگائے گئے ہیں۔“

چارلس گویا اب ایک نئے زاویہ نظر سے آنکھیں کھول رہا ہے کہ ان شیشیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ”انڈین سائنس دان اپنی دانست میں ان گولیوں کی معقول قیمت وصول کر رہے ہیں لیکن ان کے تصور میں بھی نہیں ہے کہ انہیں مارکیٹ کرنے والے آگے ان کی کیا قیمت وصول کر رہے ہیں۔ یورپ اور امریکا وغیرہ میں ایڈز کے ایسے ایسے دولت مند مریض موجود ہیں جو اس دوا کی ایک خوراک یعنی ایک گولی کے لیے دو سو سے لے کر تین سو ڈالر تک آسانی سے ادا کر دیں گے۔ ان میں سے ہر شیشی میں تقریباً اسی سو گولیاں موجود ہیں اور یہ بتانا شیشیاں ہیں۔ یعنی اس وقت تمہارے سامنے آٹھ دس لاکھ ڈالر کی رقم موجود ہے۔ دھندلا برا نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ انہیں مارکیٹ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔“

چارلس نے طبیی انداز میں سہلانے ہوئے دھڑ سے ٹھک لگائی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”کیترن اس لیے بڑی جواز سے سفر کر رہی تھی کہ اگر ایلزبتھ پر کسمو والے زیادہ بارک بٹا ہوئے ہیں تاہم اس میں بھی زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ اگر کیترن کا یہ چھوٹی سی کھپکھپانہ بھی قرار پاتی تب بھی زیادہ سے زیادہ لگنا ہو تا کہ یہ گولیاں وٹامن کی ثابت نہ ہوں۔ کسی نامعلوم دوا کی ثابت ہوتی۔ جس کے لیے کیترن پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی۔ شیشیوں پر اعتراض کی کسی نافرمانی کا لیبل ہے۔ شاید اس کا کہیں رجود نہ ہو۔ ان گولیاں میں جیلائی عام ہے۔ کیترن آرام سے کہہ سکتی تھی کہ اسے کسی نے وٹامن کی جلی گولیاں دے دی تھیں۔ کم از کم اس پر بیرونی یا کوئی کنٹرول اسٹنگ کا التزام تو نہیں آسکتا تھا لیکن ایک طبیی کھپکھپانہ سے جانے کا خطرہ ہر حال موجود تھا۔“

پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے مزید کہا ”بجائے ہسپتال میں

محالات میں نہیں خراب ہونے کا رُخ دینے بھی کچھ زیادہ ہی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انڈین سائنس دانوں نے اس دسویں کے مسئلے میں لیبارٹریز اور سماجی تو سرکاری استعمال کے ہوں لیکن دسویں انہوں نے اپنا ذاتی کام سمجھ کر کی ہو اور اب وہ اپنی اس دیافت سے خوب دولت کماتا چاہتے ہوں۔ انہوں نے سوچا ہو کہ اس فارمولے کے عام ہونے سے پہلے پہلے وہ جتنا کچھ سیٹھ سکتے ہوں سیٹھ لیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فارمولا کبھی عام نہ ہونے پائے کیونکہ غصہ رپورٹ سے کچھ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جڑی بوٹیاں صرف انڈیا میں پائی جاتی ہیں اور شاید صرف انہی سائنس دانوں کی ان تک رسائی ہے جنہوں نے دوا تیار کی ہے۔ ہر حال۔۔۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ان سائنس دانوں نے اپنی اس دیافت کو قطعی خفیہ رکھا ہے۔ وہ اس دیافت کو دنیا کے سامنے رکھ کر۔ اور اسے عام کر کے انسانیت کی خدمت کرنے یا سائنس کی دنیا میں اپنا نام امر کرنے کے چکر میں نہیں پڑے۔ انہوں نے کچھ رابطے تلاش کیے جن کے ذریعے ان کی تیار کردہ دوا کو خفیہ طور پر فروخت کیا جاسکے اس کے لیے ایک نہایت محدود یا بجائے مارکیٹ تیار کی جاسکے میرا خیال ہے انہوں نے ایسے لوگوں کو اپنے کام کے لیے موزوں سمجھا ہو گا جو کسی نہ کسی انداز میں ذرا اونچے پٹے پر منشاءات کے دھندلے میں ٹھوٹ رہے ہوں۔ انہوں نے دوا پر ہی ایسے لوگ تلاش کیے ہوں گے آپ کی ہونما رہی ان میں سے ایک ہے۔“

چارلس کے چہرے پر ذرا تکلیف کے آثار ابھرے شاید میرا طعنے لہجہ اسے فشر کی طرح چڑھ رہا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا پھر میں نے ذرا غماض سے کہا ”میں یہ بات مختص نظر نہیں کہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کیترن ایک نہایت باصلاحیت لڑکی ہے لیکن یہ انہی بد قسمت انسانوں میں سے ہے جن کی صلاحیتیں خفیہ کاموں میں استعمال ہونے لگتی ہیں۔ جو زندگی کے کسی موڑ پر ٹھک کر ایسے راستوں کی طرف جانتے ہیں جو انہیں بہت روشن بہت فائدہ مند نظر آتے ہیں لیکن ان پر چل کر یہ کسی منزل پر پہنچنے کے بجائے اندھروں میں کود جاتے ہیں اور زندگی کے سفر میں آخر کار بالکل تھک جاتے ہیں۔“

کیترن نے ہنسی سے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگی۔ ”انداز میں تجھے سے ٹھک لگائی پھر وہ بڑوانے کے سے انداز میں بولی ”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ زندگی کے کسی موڑ پر تمہارے وجود میں کوئی بورے ہی روح طویل کر گئی تھی۔“

”ہاں۔ لیکن اس بوڑھی مدد نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ فلا کیا ہے اور صحیح کیا۔ میں اپنی زندگی کو جھولی سرخس جھولی کامیابیوں اور جھولی شکستوں کے پیچھے بھاگنے میں ضائع نہیں کر رہا۔ تم جیسے لوگوں کو ایک نہ ایک دن ضرور احساس ہوتا ہے کہ زندگی وہ نہیں جی جی تو لوگوں نے دکھائی لیکن

”ہر جگہ بڑے عجیب عجیب کردار پائے جاتے ہیں اور میں  
بڑے بد کردار بھی“ میں نے فطری سانس لے کر کہا۔  
”کیا میں تمام رات بونٹی بڑھے ہاتھوں کے ساتھ بیٹھ  
رہوں گی؟“ کیہترین منٹائی۔  
”تو کم از کم پتھری پہن کر کسی پولیس اسٹیشن کے قریب  
کرے میں بیٹھنے سے تو ہتر ہے“ میں نے کہا۔  
”میں نے کیا کیا ہے جو پولیس مجھے پکڑنے کی جرأت کر لے؟  
خود بخود پولیس کی طرح غرائی کی طرح ہی اس کا بوجھ بدل گیا تھا۔  
”میرا بل کتا ہے کہ اگر تم کسی چکر میں پولیس کے ہتھے چڑ  
گئیں تو تمہارا ماضی تمہارے لیے مصیبت بن جائے گا“ میں نے  
کہی شجیرہ کی سے کہا ”میرا خیال ہے تمہاری شہرت اب اس قدر  
پر تھکی ہے کہ جس جہاز پر تم سفر کرو گی اس پر چھاپے پڑنے لگیں  
گے اور جلد ہی شاید وہ مقام بھی آجائے کہ تمہارے باپ کا  
الاقوامی اثر و رسوخ بھی تمہارے کسی کام نہ آسکے کیونکہ تمام فرما  
یا تو ممالک میں منشیات کے مسئلے میں پانچ سال درجہ درجہ سخت  
تخت ہوتی جا رہی ہیں۔ خصوصاً امریکا کا حال تو تمہیں معلوم ہی ہے  
کہ کس طرح وہ۔۔۔ دوسرے ملکوں میں چاہا کہ منشیات کے خلاف  
لڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے دل میں ان ملکوں کی  
عزت جو شہر دہانے لگی ہے بلکہ ظاہر ہے وجہ صرف یہی ہے کہ اس  
سیلاب نے اس کا اپنا برا حال کر دیا ہے۔ اس کے بانی ممالی سار  
توانی جگہ ہیں لیکن اس مسئلے نے اسے سب سے زیادہ حواس  
ہوا ہے۔ خیر میں بھی کتنا بے وقوف ہوں جو تمہیں یہ باتیں  
ہوں۔ یہ باتیں تو تم مجھ سے بہتر جانتی ہو گی لیکن میری کچھ بھی  
بات نہیں آتی کہ انسان ان سب باتوں کا علم رکھتے ہوئے بھی چال  
کے راستوں پر کیوں چل رہا ہے؟“  
چارلس بولا ”ہر انسان کو یہ امید رہتی ہے کہ باقی سب لوگ  
قانون کا وجہ سے پکڑے گئے لیکن میں نے چنگھٹاں کھان  
بندوبست کیا ہوا ہے اس لیے میں نہیں پکڑا جاؤں گا۔“  
کیہترین خاموش کچی میں نہیں سے نہیں کہ سکا خاکہ  
تمہاری باتیں سن میں بھی مری بھی یا نہیں۔ نصیحتوں میں سب سے بڑا  
غرائی یہی ہوتی ہے کہ انسان انہیں ہزاروں مرتبہ سن چکا ہو  
اگر نصیحتوں سے دنیا ٹھیک ہو سکتی تو آج ساری دنیا ٹھیک ہو  
کیونکہ نصیحتیں ہزاروں سال سے کی جا رہی ہیں۔ مسئلہ یہی ہے  
چٹ کھائے پھرے جنت کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا۔  
”سب تم اس مسئلے میں کیا کرنا چاہتے ہو؟“ چارلس نے  
پوچھا۔  
”میں تو کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا  
میں نے آپ کو بتا دیا۔ آپ کی بیٹی کی جو عمر میں کہ سکا تھا وہ  
کروڑی۔ جس قصداں سے اسے بچا سکا تھا“ بچارا۔ اب آپ  
جانیں اور آپ کی بیٹی“ میں نے بے نیازی سے کہا۔

فرسٹ بیٹ موجود تھا اسے بھی ان گولیوں کی جھک پڑ چکی تھی۔  
درحقیقت وہ ان کے چکر میں ایڑا کی حرکت لے کر بڑی سی جگہ پر  
تھا کیونکہ وہ بھی اپنے کار میٹھ تھا اور اپنی اپنی جگہ پر تھا۔ نہایت  
دل برداشتگی کے عالم میں وہ اس کا علاج تلاش کرنا پھر رہا تھا اور  
اسی دور کی محض اوٹنی اوٹنی خبریں کر اس نے ہی امیدیں باندھ  
لی تھیں لیکن لیبازری میں بیٹھے ہوئے کے ہر امرے فیروز کو دوا  
نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے خاص توہین کو کوکہ وہ  
گولیاں سستے داموں دے رہے تھے لیکن جتنی کہ قیمت بھی انور  
نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بد عادات کی بنا پر وہ ایک خاص توہی تھا۔  
اس میں بھرا نہ رکھنا تھا بھی موجود تھا۔ اسے یہ ضرور اندازہ ہو گیا  
کہ کیہترین اس دوا کی کیپ لے کر وہ اندر ہی چلی وہ اس کے  
پچھے لگ گیا۔ سفر کے دوران وہ بیٹھا کیہترین کے کہیں کی تلاش  
لے رہا تھا اور شاید اس نے گولیاں تلاش کر کے ابھی اندر نہیں  
لگایا تھا کہ کسی اس کی مطلوبہ دوا تھی اس دوران محلے کا ایک بنگالی  
توہی جہل اس کے سر پر چا پٹھا۔ اس نے شاید جتنی کہ رنگے  
ہاتھوں پکڑا لیا تھا۔ جہاز کے ایک آئینے کے لیے یہ بڑی مصیبت  
صورت حال تھی۔ جہز نے گھبراہٹ میں اسے قتل کر دیا۔ بند میں  
لاش خالی کہیں میں رکھ دی۔ اس کا ارادہ یہی ہوا کہ اسے موقع ملے پر  
لاش سمندر میں پھینک دے۔ لیکن میری وجہ سے لاش دریافت  
ہو گئی پھر جب چھاپے کے وقت اس نے دیکھا کہ کیہترین تو اس کے  
انداز سے پہلے ہی رخت ہو رہی ہے اور وہ انکرا اس کے ہاتھ  
سے جا رہی ہے تو اس نے جان پر کھل کر اسے پر لٹک بٹانے کی  
کوشش کی۔ اس نے شاید سوچ لیا تھا کہ اسے مرنا تو دینے بھی  
ہے لہذا دردناک موت مرنے کے بجائے ایک آخری کوشش  
کیلئے نہ کر کے دیکھ لی جائے۔ اس کوشش میں وہ میرے ہاتھوں مارا  
گیا۔ اگر وہ جہل کا قاتل نہ ہوتا تو شاید مجھے اس کے مرنے کا  
افسوس ہوتا اگر میں فوری قدم نہ اٹھاتا تو وہ کچھ بھی کر نہ پاتا۔  
چارلس جبر جبری ہی لے کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا ”میں  
تمہارا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گا۔ تم تمہارے لیے انجی تھے  
لیکن تم نے ظلم لے لیا اپنی جان خطرے میں ڈالی۔“  
”بات دراصل یہ تھی کہ جس نے آپ لوگوں کی سٹارش کی  
تھی وہ میرے لیے انجی نہیں تھا“ میں نے آواز دنگ بھلی کے اسٹیل  
پر بیٹھے ہوئے کہا۔  
”تمہارا مطلب ہے سیٹر و رضاں؟“ چارلس بولا۔  
”ہاں“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”وہ خاصا جہل اور تم  
مراہہ سا شخص ہے لیکن میری خاطر وہ بھی اپنی جان خطرے میں  
ڈال سکتا ہے۔ بلکہ کوئی بہتر نہیں“ زبان ہی نکلیں صورت حال  
میں وہ میرے لیے جان قربان بھی کر دے۔  
”مشرق میں بڑے عجیب عجیب کردار پائے جاتے ہیں“  
چارلس بولا۔

”جینی تم پولیس کو میرے بارے میں مطلع نہیں کرو گے؟“  
 جینے نے گویا تھک کر خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔  
 ”تمہارے بارے میں کیا کیا جائے یہ فیصلہ کرنا تمہارے  
 ہا کا کام ہے۔ میں ایک انجینیئر ملک میں ہوں۔ میں پرانے پٹھوں  
 کی ایک اڑان میں چاہتا۔ جی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس وقت  
 تمہارے باپ کی وجہ سے پولیس اور انٹیکشن ڈانل کے ہتھے  
 چڑنے سے بچا ہوا ہوں۔ زیادہ خدا کی فوجدار دنیا میں افواہ نہیں  
 کر سکتا۔“ میں نے صاف گوئی اور دیانت داری سے جواب دیا۔  
 ”تم میری اس گھپ پر بھی قہقہہ کرنے کی کوشش نہیں  
 کرو گے؟“ کیتھرین نے گردن اٹھا کر آنکھوں سے شیشیوں کی طرف  
 اشارہ کیا۔  
 ”مجھے کیا پڑی ہے ان پر قہقہہ کرنے کی؟“ میں نے قدرے  
 حیرت سے کہا۔ ”مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔“  
 کیتھرین نے کمری سانس لیا۔ اس کے چہرے پر طمانیت بکھل  
 گئی۔ اب مجھے اعانہ ہوا کہ وہ میرے بارے میں اتنی پھٹی ہوئی  
 کھل گئی۔ وہ میری طرف سے نہ جانے کیسے کیسے بے بنیاد اندیشوں  
 میں الجھی ہوئی تھی۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس نے ایسا  
 سرائی میں پرورش پائی تھی جہاں ماڈی کا مکہ سے ہی سب کچھ تھے  
 اس کے بورد نہ جانے کب سے وہ ان مٹھوں میں سرگرم تھی جہاں  
 مٹھیں خوش چیزیں دولت کے لیے ایک پل میں دوسرے کا لگا لگا  
 دیا جاتا تھا۔ جہاں کسی کے راز سے آگاہ ہونے کے بعد اسے پوری  
 طرح ملتی تھی جکڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس نے جب  
 گولیاں اپنے کمرے سے غائب پائی ہوں گی تو اسے بلا خیال ہی  
 آگاہ کیا کہ اس نے وہ ہرپ کرنے کی نیت سے بچرائی ہیں۔  
 ”تم میرے بارے میں پولیس کو بھی مطلع کرنا نہیں چاہتے  
 اور ان شیشیوں پر قہقہہ بھی نہیں کرنا چاہتے تو تم نے مجھے ہاتھ کر  
 کیوں بٹھایا ہوا ہے؟“ کیتھرین نے قدرے حیرت سے پوچھا۔  
 ”جو کچھ دشمن سے بچنے کے لیے“ میں نے سادگی سے جواب دیا  
 ”تمہارا ہر وہوش ٹوٹ پھوٹ، دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تو  
 بازار میں ٹوٹ پھوٹ سے بچایا تھا۔“  
 ”مگر مجھے پتا ہوا کہ تم نے صرف پایا کے سامنے شراباک ہو کر  
 بیٹے اور ڈرائے و صحت سے محروم ہو کر قہقہہ کرنے کے لیے شیشیاں  
 غائب کی ہیں تو میں ماروا جاؤں گی کوشش نہ کرتی اور سماعت منہ کی  
 سے اگر بچھ جاتی ہوں گے پایا کو بھی پہلے ہی بلاتی اور دست بستہ تم سے  
 اور غصہ کرتی کہ شیشیاں دانیس دے دو۔“ اب اس کے چہرے پر  
 دلچسپی سے وہی مسکراہٹ دانیس آ رہی تھی جو اسے مت دلکش  
 مانتی تھی۔  
 ”تمہارے چارلس کی طرف حوجہ ہوتے ہوئے کہا“ معذرت  
 کے ساتھ کہیں کہیں کہ آپ کی بیٹی سحر سے والی چیز نہیں ہے۔ آپ  
 اسے نرا سمجھانے کی کوشش میں وقت ضائع مت کیجئے گا۔ اب

آپ دونوں آرام سے جا کر سو جائیں۔ میں بھی چھ گھنٹے اس آرام  
 میں ستر بخند کے مزے لےنا چاہتا ہوں۔ بیانی باتیں کل ہوں گی۔“  
 چارلس ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے  
 کیتھرین کے ہاتھ کھول دیے۔ وہ کلایاں سلاتے ہوئے میری  
 طرف دیکھ کر ہر طور انداز میں مسکرائی اور باپ کی مسخوگی کی پروا  
 کے بغیر اٹھ کر میرا رخسار چھوتے ہوئے غور سے مجھے پس منظر  
 ”جو تو سونگٹ۔“ (YOU ARE SO CUTE)  
 پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ کیتھری سلاتے ہوئے پہلی ”لیکن تم  
 نے ہاتھ مت سخت مارا تھا۔ میں تمہیں صاف نہیں کر سکتی۔“  
 ”سخت مارا اور تو تمہاری گھوڑی پیچ چکی ہوئی اور اس وقت  
 تم یوں نہ چمک رہی ہو تھیں“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔  
 اس نے اپنی شیشیاں پیار بھرے انداز میں ایک ایک کر کے  
 نہایت احتیاط سے اٹھائیں اور ایک ٹیکے کا تلف انار کو دھرے  
 دھرے اس میں ڈالنے ہوئے چارلس کے آواز میں ایک ایک کر کے  
 دیکھ کر پہلی ”ایلیا! آپ نے کبھی اپنی بیٹی کی صلاحیتوں کی قدر نہیں  
 کی۔ کبھی میری کارکردگی پر خوش نہیں ہوئے۔ آپ کو کم از کم یہ سن  
 کر تو خوش ہونا چاہیے کہ اس وقت سو ٹھنڈے لینڈ میں ایک خیر  
 اکاؤنٹ میں میرے نوٹیں ڈال رہی ہیں۔ اچانک کے شرمندہ لباس  
 میری ذاتی ولا ہے۔ جس میں ذاتی اپارٹمنٹ ہے۔ اور میں کچھ  
 بھی نہیں کر سکتی۔ بس دنیا بھر میں گھومتی پھرتی ہوں۔ آپ بڑے ہی  
 ہانڈلر ہیں پایا! آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کی بیٹی نے اس  
 فوج دانی میں اتنی دولت کمائی ہے جو آپ اتنے بڑے فیلوٹ ہوتے  
 ہوئے پوری زندگی میں نہیں کمائے اور ابھی تو میرے سامنے نہ  
 جانے کتنی کمزوری ہے۔“  
 نوٹیں والے اچانک میں ولا اور جس میں اپارٹمنٹ کر سن کا  
 پیچھا چارلس کو بھٹکا تھا لیکن اس کے چہرے پر ناگوارمی برقرار  
 رہی۔ کیتھری بات جاری رکھتے ہوئے پہلی ”مگر آپ مجھ سے غرت  
 کرتے۔ مجھے ہر وقت نصیحتیں کرنا چھوڑیں تو آپ بھی اس دولت  
 سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔“  
 ”میں لطف بھیجتا ہوں ایسی گندی دولت پر۔ دارگ منی پر۔“  
 چارلس تیزی سے ہلا ”اور جہاں تک لطف اندوز ہونے کا سوال  
 ہے تو تم اس دولت سے کتنا لطف اندوز ہو رہی ہو؟ دولت تو بیٹوں  
 میں پڑی ہے۔ تم تو محض چھ کپڑے اٹھائے اور اسے دھرنا  
 بدوشوں کی طرح بھری ہو۔ یہ کام تو تم میرے دوسلوں سے بھی  
 کر سکتی تھیں۔ رہنے کے لیے بھی تمہارے پاس لندن میں طویل  
 و عرصہ حریفی نما آباؤی مکان موجود ہے۔“  
 کیتھری نے میری طرف دیکھ کر یوں حرم لیکن استہزائیہ سا  
 قہقہہ لگایا جیسے کہ وہی ہو ”اس فیملی بڑے کی کچھ میں میری بات  
 نہیں آئے گی۔“  
 چارلس ہلا ”یہی کسی سحر کے دوران تم کسی اپر پورٹ یا

بزرگوار زندہ کے بجائے مردہ حالت میں اتو کی اور تھماری ساری دولت خیر اکاؤنٹ میں پڑی رہ جائے گی۔

”یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں ایسی حیرت یا حیرت کی کیا بات ہے؟“ کیتھرن بولی۔

”فرق صرف یہ ہے کہ جائز ذرائع سے دولت کمانے والوں کا ضمیر اس وقت بھی مطمئن ہوتا ہے جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہوتے ہیں“ چارلس بولا۔

”جائز ذرائع؟“ ضمیر۔ ”ایک کیتھرن استنزائے انداز میں تھی۔“  
”ہاں! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آج کے دور میں یہ باتیں بے معنی ہو چکی ہیں۔“

”تم جیسے لوگوں کے لیے یہ باتیں ہر دور میں بے معنی رہی ہیں“ چارلس ٹھٹھ خورہ سے انداز میں گہری سانس لے کر بولا ”وہ لوگ ہی دوسرے ہوتے ہیں جن کے لیے یہ باتیں ہمیشہ سے بے معنی تھیں اور ہمیشہ بے معنی رہیں گی۔ چاہے آؤ اپنے اپنے کمرے میں چلیں۔ تمہارا ضمیر تو سوا ہے۔ اب تم بھی سوجاؤ۔“

کیتھرن نے بڑی ادا سے مسکرا کر تین انگلیاں ہلا کر مجھے گزٹ ٹاکٹ کا ادرا باپ کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے لائن بچائی اور دوسرے بستر پر گر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن میں بھی کسی نے کوئی سوچ آف کر دیا تھا۔ میں جلدی دنیا دانیہا سے بے خبر ہو گیا۔

دوسرے روز تقریباً دوپہر کو ہم تینوں ناشتے کے لیے میز پر بیٹھا ہوئے۔ اتفاق سے تینوں ہی تقریباً ایک ساتھ تیار ہو کر ڈائننگ روم میں پہنچے تھے۔ کیتھرن اب بالکل تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ وہ شوخ سرخ رنگ کے ایک عجیب سے لباس میں تھی اور پیرس کا کوئی ماڈل نظر آ رہی تھی۔ اس کا وجود غالباً فرانس ہی کی کسی بیش قیمت خوشبو میں نمایا ہوا تھا۔ اس خوشبو کے علاوہ اب دولت کی خوشبو بھی اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ اب واقعی اس پر نظر ڈالتے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی۔ اس نے تیاروں جیسے ملنے کوئی الحال خیر کیا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گویا اس کی حرکات و سکنات میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ واقعی بہت بدل بدل ہی لگ رہی تھی۔

میز پر بیٹھے ہوئے وہ کبھی مسل کر دھمے لہے میں بولی ”رات والی جوت خاصی تکلیف دینے لگی تھی۔ چپن بکر کھا کر آئی ہوں۔“  
”اگر میں نے اپنا دن قطع کرنے میں پھرتی نہ دکھائی ہوتی تو اس وقت میری مدح عالم بالا میں کہیں بھگ رہی ہوتی۔ اسے تو کوئی چپن بکر واپس بھی نہیں لاسکتا تھا۔ فی الحال تو بات چپن بکر پر ہی مسل تھی ہے۔ ڈیز بکر! میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ دھیرے سے انہی کر رہ گئی۔

ناشتہ کرتے ہی چارلس میز سے اٹھ گیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے اپنے کمرے میں گیا پھر ولف کیس اٹھائے کمرے سے نکلا اور کچھ

پائے بغیر تیزی سے رخصت ہو گیا۔ وہ کچھ پریشان معلوم ہوا تو اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ بوجھ اور پریشان کیتھرن کے علاوہ تھی۔

میں اور کیتھرن ابھی ناشتے کی میز پر ہی موجود تھے۔ میں انکی دونوں ہند نہایت عمدہ کافی میسر آنے پر دھیرے دھیرے چپکلنے لگے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا جبکہ کیتھرن نے سکرٹنگ سکرٹنگ لگا کر اس سے پہلے میں نے اسے سکرٹ پتے نہیں دیکھا تھا۔

دو ٹیوں کے لبروں کے حقب سے وہ نیم در آ نکھوں سے ملنے طرف دیکھ رہی تھی۔ بظاہر وہ بالکل پرسکون تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی پھجوری سی پک رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ لوگ تم سے زیادہ بے لطف ہوں گے یا زیادہ قریب ہوں گے۔ تمہیں اپنی کہہ کر پکارتے ہوں گے؟“

”ہاں“ میں نے جواب دیا ”لیکن تمہیں اچانک یہ پہچانے خیال کیوں آ گیا؟“

”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی تمہیں اپنی کہہ کر پکاروں؟“ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”اعتراض؟“ میں نے آنکھیں پٹ پٹائیں ”یہ تو میرا لیے ایک اعزاز ہوگا“ پھر میں نے خواب ناگ سے ملنے میں کہا ”کسی ختمین لڑکی کے منہ سے اپنی کے نام سے پکارے جانا کتنا بڑا لگا ہے۔“

”خواہ خواہ دل پیچیک نظر آنے کی کوشش مت کرو۔“  
برستور سنجیدگی سے بولی ”مجھے اندازہ ہے کہ تم دل پیچیک نہیں ہو۔“

”میرے بارے میں خواہ خواہ اندازے وغیرہ قائم کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں تو بہت ہی ”بے اندازہ“ قسم کا شخص ہوں۔ میرے بارے میں اکثر لوگوں کے اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا!۔“ اس نے بے یقینی سے آنکھیں پھپھائی ہیں  
دوسرے ہی لمحے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی ”تمہیں دیکھا جائے گا۔“

میں نے ذرا اس کی طرف جھٹکے ہوئے کہا ”لیکن تم اس قدر سنجیدہ اور تیز دار کیسے ہو گئیں کہ مجھے اپنی کے نام سے پکارنے کے لیے بھی تمہیں اجازت لینے کی ضرورت آن پڑی؟“

”میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟“ وہ بھی ذرا ہمیں ملنے کو جھٹکتے ہوئے چچی آواز میں بولی۔

”ضرور۔۔۔ ضرور“ میں نے گرم جوشی سے کہا۔  
”میں اب سیدھا جاتا ہوں لیکن میں جانا چاہتی ہوں کہ تم صحر کر مجھے کیا لے گا؟“

”مسکون“ میں نے پلا تاش جواب دیا۔  
”ہیں؟“ اس نے لاپرواہی سے پوچھا۔

”جی تو میں اور تمہارے پاپا جیسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے“ میں نے جلدی سے کہا۔

”جب میں سمجھنے لگی ہوں۔۔۔ جب میرے دل میں تمہاری قدر اور پاپا کی محبت بیدار ہوئی ہے تو تم کیوں دوڑ لگا رہے ہو؟ تم کیوں پیچھے ہٹ رہے ہو؟“ وہ میرا ہاتھ اپنے گداز ہاتھ میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولی ”میں اب سب کچھ چھوڑ چھاؤں کر تم سے شادی کر کے کسی سکون سے مقام پر گھر بسا کر بیٹھنا چاہتی ہوں۔

پاکستان۔ انگلینڈ۔ یا کوئی بھی اور ملک۔ جہاں تم کو وہاں کسی سکون اور خوب صورت سے شریں رہائش اختیار کر کے ہم اپنی جنت فقیر کرتے ہیں۔ زندگی کا ایک نیا دور شروع کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ اصل زندگی شروع کرتے ہیں۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ اب تک تو ہم نے خود کو بربادی کیا تھا۔ زندگی کو ضائع ہی کیا تھا۔“

”جی تو مسئلہ ہے“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا ”سکون ہی تو میری زندگی میں نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہ کر تو تمہاری زندگی میں اگر کوئی تھوڑا بہت سکون ہے بھی۔ تو وہ بھی برباد ہو جائے گا۔“

”کیوں۔۔۔ کیا تم بھی دولت کے پکر میں ہو؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”نہیں“ میں نے بلا تامل جواب دیا۔

”تو پھر تمہاری زندگی میں سکون کیوں نہیں ہے؟ تمہاری اب تک کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے صرف ناجائز دولت کے پکر میں رہنے والوں کی زندگی میں سکون نہیں ہوتا۔ باقی سب چھین کی بانسری بجا رہے ہوتے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے گھڑواتے ہوئے کہا ”آج کی زندگی میں ہر ایک کے لیے پریشانیوں اور مسائل تو ہوتے ہیں۔ لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ زیادہ تر مسائل ہمارے اپنے پیدا

کردہ ہوتے ہیں۔ ہماری خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہم خواہشات پالنا یا انہیں زیادہ پھیلانا چھوڑیں تو مسائل کافی کم ہو سکتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات خواہ خواہ بھی مسائل ہمیں آن چھننے ہیں۔ کسی بیماری کے وائرس کی طرح ہم پر حملہ آور

ہو جاتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ ان کی مثال کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کہ میں تو کبیل کو چھوڑتا ہوں لیکن کبیل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میری زندگی بھی کچھ ایسے ہی مسائل کا شکار ہے۔ میرے ساتھ رہ کر تم بھی پہلے سے زیادہ پریشان ہو جاؤ گی۔“

”اس کا مطلب ہے تمہارا اپلا گلف خفا تھا۔ پریشانیوں کسی بھی حال میں انسان کا مقدر ہو سکتی ہیں“ وہ جھکے لیے میں بولی۔

”بے شک“ میں نے تسلیم کر لینے میں ہی ممانعت سمجھی۔

”چلو۔۔۔ میں ایک وفا شعار بوی کی حیثیت سے ہر پریشانی میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔ نہیں کچھ اندازہ تو ہو گیا ہو گا۔ مزید اندازہ آگے چل کر ہو جائے گا۔ میں بہت باصلاحیت لڑکی ہوں۔

جگہ سکون کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں؟ لوگ تو اس کا خاطر اپنی ساری دولت کمانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں“ میں نے کہا۔

وہ منہ بنا کر بولی ”ہاں نہیں تم کسی دنیا کی بات کر رہے ہو۔ نہیں سکون عزیز ہوتا ہے وہ دولت کے پکر میں پڑنے ہی نہیں۔۔۔ جب ایک بار انسان دولت کے پکر میں پڑ جائے تو پھر دولت کے سوا اسے کوئی چیز عزیز نہیں رہتی۔ تم اگر مجھے مدد دے دو گے تو مجھے ہو تو سکون کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کا بھی لالچ دو۔ مجھے بتاؤ کہ سکون کے علاوہ مجھے کیا ملے گا؟“

”میں کیا جانتا ہوں۔“ میں نے درکار بڑا کر کہا ”تم ہی بتاؤ“

”میں جیسے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ۔۔۔ کیا تم مجھے مل سکتے ہو؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بلا ہچکچاہٹ بولی۔

مجھے خلیفہ سا جھکا لگا۔ میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے خاموش دیکھ کر اسیر اسیر انداز میں اپنی اور بولی ”بہی کیوں تم ہو گئی؟ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں حاصل کر سکوں؟“

میں نے تھوکر لگتے ہوئے کہا ”نہیں۔۔۔ تم تو اس سے کہیں زیادہ قابل ہو۔۔۔ دراصل میں ہی اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارا بن سکوں۔ میں تو بہت ہی معمولی بہت ہی ظالم سا آدمی ہوں۔ تمہیں کوئی ایسی ایک خفیہ نظر آئی؟“

اس نے بد مزگی سے منہ بنایا اور ہاتھ بڑھا کر میز پر ٹکا ہوا میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی ”یہ بلا وجہ کی انسانی سی کسر نفسی سے کام لیا چھوڑو۔ میرا تمہارا ساتھ ہے ایک بہت حقیر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی میں نے تمہاری اصل شخصیت کی محض ایک جھلک ہی دیکھی ہے لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کیا ہو۔“

میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا ”محنت افزائی کا بہت غریب۔ اگر تم مجھے کوئی ”چیز“ سمجھ رہی ہو تو یہ تمہارا حسین نظریہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تو خود کو بہت ہی معمولی بہت ہی گنہگار انسان سمجھتا ہوں۔“

”میرے الفاظ پر تو جہلے بغیر بولی“ میں بہت سمجیدہ ہوں۔ بلکہ میں کہوں کہ میں زندگی میں پہلی بار سمجیدہ ہونے لگی ہوں۔ مجھے احساس ہوا ہے کہ میں واقعی بہت جلد تھک گئی ہوں۔ میں نے دنیا کو کھلے سے ہر طرف سے سے ٹھیک کر دیکھ لیا ہے لیکن کسی کام میں کچھ نہیں رہا۔ انسان اپنی زندگی اپنی خواہشات کو جتنا بھی مصروف رہتا ہی اچھا ہے۔ وہ اتنی ہی مزے میں رہتا ہے اور زندگی کی لذت جتنے بڑے ہوتے جاتے ہیں اتنی ہی اس کی زندگی سے فزائیل رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ اسے کچھ بھی پالنے کی خوشی نہیں ملے گی۔“

مجھے تم کسی بھی قسم کے حالات میں خود پر بوجھ محسوس نہیں کرو گے میں تمہارے لیے ساری اسی ثابت ہوں گی بوجھ نہیں۔  
 ”مجھے اس میں کوئی شک نہیں کیسٹر“ میں نے دیکھے لیے  
 میں کہا۔ ”تم بلاشبہ بہت اچھی بہت باصلاحیت لڑکی ہو۔ اور  
 میں درحقیقت تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اپنی زندگی کا  
 ساتھی بنانے کے قابل سمجھا لیکن میرے حالات کچھ ایسے ہیں کہ  
 میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔“

”مگر انسان حالات میں الجھا رہے تو وہ زندگی بھر شادی نہیں  
 کر سکتا۔ کوئی نہ کوئی الجھن، کوئی نہ کوئی پریشانی، کوئی نہ کوئی  
 دشواری تو ہمیشہ ہی لاحق رہتی ہے۔ شادی تو آئی۔ ایسا کام ہے کہ  
 انسان جب سوچے کہ اسے کئی ہے تو بس کر گزرے۔“  
 ”میں ابھی خود کو اسی بات کا قائل نہیں کر پاتا“ میں نے  
 جلدی سے کہا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر اپنا کہ ازبا تھ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی  
 ”تم صرف جان پھرانے کے لیے اتنی لمبی بحث و تمحیص کا سارا  
 لے رہے ہو حالانکہ میں دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی نوجوان پر  
 اس طرح شادی کے لیے زور دیتی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔  
 خصوصاً جب میں کوئی شرٹ عائد نہ کرتی۔ میری طرف سے کسی قسم  
 کا کوئی مطالبہ نہ ہوا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ میں کتنی دولت  
 مند ہوں۔“

”مجھے اس میں ہرگز شک نہیں کہ کوئی بھی نوجوان اسے اپنی  
 خوش قسمتی سمجھتا کہ تم اسے اپنا شریک زندگی منتخب کر رہی“ میں  
 نے غلو سے کہا۔ ”یہ شخص میری بد قسمتی ہے کہ تم مجھے زندگی کے  
 غلط موڑ پر۔ یا پھر شاید غلط وقت پر ملی ہو۔ میں مجبور ہوں۔ تم سے  
 شادی نہیں کر سکتا۔“

وہ استغنائیہ سے انداز میں ہنسی ”میں نے تو سنا تھا کہ مشرق  
 میں صرف لڑکیاں مجبور ہوتی ہیں۔ آج بلی بار ایک لمبے خاکے  
 آزاد اور خود مختار نوجوان کو مجبور دیکھا ہے۔“

”مجبور تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مجبوریاں کی الگ الگ نوعیتیں  
 ہوتی ہیں“ میں نے جواب دیا۔

”میں انتظار بھی کر سکتی ہوں۔ میں نے سنا ہے مشرقی لڑکیاں  
 بڑی ایثار پسند اور صابر ہوتی ہیں۔ بعض لڑکیاں تو ساری عمر اپنے  
 خوابوں کے شہزادے کے انتظار میں گزار دیتی ہیں۔ میں ایک مغربی  
 لڑکی ہوتے ہوئے بھی تمہیں وفا شکاری اور ایثار کی مثال قائم  
 کر کے دکھا سکتی ہوں۔“

”وفا مشرقی یا مغرب کی میراث نہیں۔ وہ کہیں بھی پائی جاسکتی  
 ہے۔ کہیں کم، کہیں زیادہ“ میں نے مریدانہ لہجے میں کہا۔ ”اگر بے  
 وفا کی کو مغرب ہی کا تختہ سمجھا جائے تو اب تمہارے ہاں بھی تمہاری  
 سب برائیاں دھیرے دھیرے چلی آ رہی ہیں۔ مشرق اب وہ مشرق  
 نہیں رہا۔ وہ وفا شعار ہوں گے قصبے وہ ایثار رکھنا نہیں وہ عمر بھر انتظار

کی باتیں سب خواب و خیال ہوتی جا رہی ہیں۔ تو نہیں اور کسی  
 زمانہ ہے۔ آج شادی مکمل طلاق کا دور ہے۔ میں اپنی زندگی کے  
 بارے میں نہیں سے نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہو گا؟ معلوم نہیں کہ  
 میں زندہ بھی ہوں گا یا نہیں۔ میں خواہ مخواہ تمہیں اپنے انتظار میں  
 لٹکا کر تمہاری زندگی کے حسین اور سنہرے ماہر سال ضائع نہیں کرنا  
 چاہتا۔“

”ہوں تو کسی کی بھی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں“ وہ بولی ”میرنا  
 مجھ اور تم جیسے ہم پسندوں کی زندگی کا تو بالکل ہی کوئی بھروسہ نہیں  
 ہوتا لیکن اس اندیشے سے لوگ اپنے کام ترک نہیں کر سکتے  
 خواہشوں کو خیر باد نہیں کہہ دیتے۔ بلکہ اس طرف زندگی میں قوتوں  
 خواہشوں کی تکمیل میں حمزہ دیکھانے لگتے ہیں۔ ہر خوشی کو محبت  
 لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ نہ جانے کل موقع ملے یا نہیں۔ وہ  
 چلتے شادی کر لیتے ہیں۔“

”اور راہ ملتے ہی طلاق ہو جاتی ہے۔“ میں نے بے سارنگہ  
 ”میں اس قسم کی شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

”مجھ جیسی لڑکیوں کی جب کایا چلتی ہے تو وہ بڑی عجیب بیواں  
 ثابت ہوتی ہیں۔ شاید تمہارا کبھی مجھے چھوڑنے کو دل نہ جائے۔  
 اس لڑکی پر ٹیکہ یہ ہے عجیب ہی سک سوار ہوتی تھی۔ وہ گولانے  
 قائل کرنے پر تھی ہوتی تھی۔“

اور میرا یہ عالم تھا کہ میں اس سے شادی کے موقعوں پر  
 کر رہا تھا لیکن میرے ذہن میں ایسا راجحہ کی تصویر ابھرنی لگا۔  
 مجھ سے نہ جانے کس کس نے شادی کرنا چاہی تھی لیکن ایک ہی  
 تھا کہ اس بد بخت کی ”ہاں“ کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا  
 کہ وہ ایک بے عنوان سی عذراست اور خیالت کے تحت ”ہاں“  
 نہیں کرتی تھی۔ خود کو سزا دے رہے تھی۔ ورنہ وہ مجھے بھلا بھلا  
 چھوڑ کر رہی تھی۔ ”جان دے دے“ تھیں لفظوں کی حد تک نہ  
 آسان لگا ہے لیکن درحقیقت یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس انسان  
 جیلے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنا لوہا بوجھنے کے لیے  
 کام ہے لیکن مجھے معلوم تھا راجحہ یہ کام کر سکتی تھی۔ بلکہ وہ کام  
 چاہیے کہ کر رہی تھی۔

بائی توراہ گردیاں اپنی جگہ تھیں لیکن شادی کا مسئلہ میرے  
 خیال میں بڑا نازک تھا۔ میں راجحہ کی ”ہاں“ کا انتظار کر رہا تھا۔  
 مجھے معلوم تھا اس کی زندگی میں کوئی کمزور نہ ضرور تھی۔  
 جب وہ اپنی عذراست ”اپنی خیالت کو بھول جائے گی“ اپنی خواہشوں کو  
 عذر بازی ”انتظار اور بھروسے“ سے نکل آئے گی۔ اس کے اندر کلاں  
 کوئی ایسی ہو کہ ضرور اٹھے گی جب وہ اچانک ہاں کر دینے کی  
 اس لمحے کے انتظار میں تھا۔ یہ انتظار ہی ہر دوری جگہ میرے  
 سے انتظار ٹکوتا تھا۔

دنیا کی کسٹریں سنگیت اٹھنے سے میں سنبھلے ہوئے تھا  
 ہوتی اور کمری سنجیدی سے بولی ”میرے ساتھ آؤ۔ میں“

”حیرت ہے۔۔۔ جس میں اس وقت بھی باتیں کرنے کا ہوش ہے؟“ میں نے بدلی بدلی سی آواز میں کہا۔  
 ”ہاں بہت ضروری ہے“ وہ لفظ فرائی سی آواز میں بولی ”میں ایڈز کی مریض ہوں۔“

”کیا؟“ مجھے گھبراہٹ ہوئی ہزاروں باتوں کا جھکا لگا۔ جذبات کا سارا نغمہ ایک لحظہ اتر گیا۔ میں یوں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو۔ وہ ہنسنے ہنسنے ڈھری سی ہو گئی۔

”دیکھا۔۔۔ ایک لمحے میں کیسے ہوش میں آئے۔“ بالآخر وہ ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی حالانکہ وہ خود بھی اس طرح چانچر بند نظر آنے لگی تھی جیسے بے خودی اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ معلوم نہیں وہ پہلے اداکاری کر رہی تھی یا اب اپنے آپ پر ایک ہی لمحے میں قابو پالنے کا حیرت انگیز مظاہرہ کر رہی تھی۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسے بار بار دوسرے کے ذہن کو جھٹکانے کا فن خوب آتا تھا۔

”بات یہ ایسی ہے“ میں نے سنہلنے ہوئے کہا ”بہر حال میں تمہارا از حد شکر گزار ہوں کہ بروقت تم نے یہ بات مجھے بتا دی۔۔۔ ویسے۔۔۔ جس طرح تمہیں یہ مرض کسی سے لگا ہو گا ایسا ہی طرح تم نے بھی یہ تحفہ آگے کچھ لوگوں تک پہنچایا ہے؟ دانستہ یا نادانستہ طور پر؟“

”اس معاملے کو راز ہی رہنے دو۔“ وہ شرعی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی لیکن یہ اس سنسنی سے بہت مختلف تھی جو چند لمحے پہلے میرے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ میں گویا اپنی جھبک میں کسی بھیباک گڑھے سے مین کنارے پر پہنچ گیا تھا لیکن آخری لمحے پر کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔

میں نے ایک نئے زاویہ نگاہ سے اس کا سر تپا جائزہ لینے ہوئے کہا ”لیکن تم ایڈز کی مریض تھی تو نہیں؟“  
 ”ایڈز کے مریضوں کے کوئی سبب تو نہیں نکل آتے“ وہ بدستور شروع لمحے میں بولی ”حالت تو آخری اسٹیج پر جا کر پہنچی ہے۔ میں تو ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہوں۔“  
 ”تمہیں پتا کیسے چلا؟“

”مجھے شبہ ہوا تھا۔ میں نے ٹیسٹ کرایا۔ ٹیسٹ سے قطعی طور پر معلوم ہو گیا“ اس کا لہجہ بدستور شروع و گفتہ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی اس انسان کی سی ایسی دور ماندگی کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی جسے معلوم ہو کہ وہ ایک بھیباک ”لا علاج“ مرض میں مبتلا تھا اور دردناک موت دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اچانک میرا ذہن ایک امکان کی طرف گیا اور میری سمجھ میں آیا کہ اس کے اطمینان کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے چہنچہتے ہوئے کہا ”تمہارے پاس تو ایڈز کا علاج موجود ہے۔ کیا تم نے وہ گولیاں نہیں آزمائیں؟“

لانا چاہتی ہوں۔“  
 اور اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے دروازہ قفل کر دیا اور ابھی پرچہ پر چڑھ کر روشن ہو گئے۔ مجھے اچانک ہی پتا چلا کہ وہ مجھے در کچھ نہیں صرف اپنا آپ دکھانا چاہتی تھی۔ کیا وہ اپنی ضد کی نئی ہی بکلی کی یا پھر اس کے عوام کچھ اور تھے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں نے تھوک کھٹے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے تم اپنے آپ میں نہیں ہو۔ میں اپنے کمرے میں چلا ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں۔“ وہ سر سر ہانسیں میرے گلے میں حائل کرتے ہوئے بولی ”لیکن کیا تم واقعی اسے اس حق ہو کہ اس وقت اپنے کمرے میں جانا چاہتے ہو؟“

”وقت دراصل۔۔۔“ میں ہلکا کر دیا۔ میرا گلہ خشک ہونا تھا۔ نظریات کے تقاضے اپنی جگہ تھے۔ میں کوئی ناقص الفطرت انسان نہیں تھا کہ اس کی حرکتوں سے متاثر نہ ہوتا لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی اندیشہ سا ڈنک مار رہا تھا ”کیا وہ میرے ساتھ کسی قسم کا مکمل کیل رہی تھی؟ کیا وہ مجھے کسی طرح بیک سیل کرنے کا کوئی بندوبست کر رہی تھی؟ یا وہ واقعی خواہشوں کے جنگل میں اتنا آگے نکل گئی تھی کہ برقیات پر مجھے اپنا طلب گار بنالینا چاہتی تھی؟“

مجھے وہ دکان داری یاد آ رہے تھے جو آپ کے ہاتھ اپنی چٹون بچنے کے لیے بڑے اصرار سے کہتے ہیں ”جناب! وہ کونے میں از رنگ روم میں جا کر پین کر دیکھ لیجئے۔ بڑی لا جواب چیز ہے۔“ لیکن میرے خیال میں چٹون اور عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ایڈز ”سوالیات اور خیالات اپنی جگہ تھے“ جذبات اپنی بکس میں نے جو انداز رکھنے کی کوششیں ترک کر دیں اور پیش قدمی کا جواب پیش قدمی سے دیے لگا۔ تب وہ محوور سے انداز میں اٹھی اور بولی ”تم نے صحیح کہا تھا“ مغرب دھیرے دھیرے مشرق میں گزرتا کرتا جا رہا ہے۔ تم مشرق بھی نہکتنے بد معاش ہو گئے ہو۔ لاشی کا کوئی موقع ملے تو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن شادی کے نام پر جانے کھڑے کھڑے گتے ہو۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس وقت کسی اور فضا میں ہوا کر رہا تھا۔ میں خواب کے جزیروں کے سفر تھا اور وہاں آنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس کی بات سن کر اور اس کے لمحے کے طہر کو محسوس کرتے ہوئے مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ یکدم مجھے زور سے پس دھکیل دے گی اور بالکل بدلے ہوئے لمحے میں کے گی ”رفق ہو جائے یہاں سے۔ اور آئندہ میری طرف آنکھ اٹھا کے بھی مت دیکھا۔“

تاہم یہاں نہیں ہوا۔ اس نے صرف طہر کا ہلکا سا شہر چھوئے پر ہی اٹھنا کیا لیکن چند لمحے بعد وہ بولی ”میرا خیال ہے تمہیں ایک فرد کی بات بتا دوں تو بہتر ہو گا۔“

”تو میں یہ کہوں گا کہ یہ ایک نہایت ہی دایمات مذاق تھا۔ بہت ہی غلط وقت پر کیا گیا تھا۔ اس نے میرے دل میں دوہم کاغذ بولیا ہے جو کسی طرح بھی میرے دل سے نہیں نکل سکا“۔ ہمیں سنا عجیبی کے سے جواب دیا۔

تب وہ نہ جانے کیوں شہتہ شہتہ بستر پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ہوا دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ میری عجیبی دل کی دھڑک کر اسے زیادہ ہنسی آ رہی تھی۔ اس کی ہنسی ذرا بھی تو وہ ہانپنے کے سے انداز میں بولی ”چلو“۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تمہارے دل میں دوہم بیٹھ گیا۔ لیکن پھر بھی تم ذرا کچھ کرنا۔ کیونکہ میرا دل تم پر اٹایا ہے۔“

میں نے سر کھاتے ہوئے منہ پھیر کر کہا ”میں چلا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولتا دروازے پر دستک ہوئی۔ کیسٹرن نے اپنے لباس کی طرف لپکتے ہوئے بہ آواز بلند کہا ”کہوں ہے؟“

”میں ہوں۔ چارلس“ باہر سے آواز آئی۔ میں پہنچ گیا لیکن کیسٹرن کو کوئی تشویش نہ ہوئی۔ وہ غائب ہوا رہے میں بولی ”ایک منٹ پایا۔“

اب میرا دروازہ کھول کر باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ میں وہی جتنی الامکان دیر زائد انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کاناچ پر بیٹھا اور دیوار سے ٹوک لگائی۔ کیسٹرن نے صبح حالت میں آنے کی بڑی پھرتی دکھائی اور دروازہ کھول دیا۔ چارلس برف کسٹرن اٹھنا کمرے میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی عیاں تھی۔ کمرے میں میری موجودگی کو اس نے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی غالباً اسے یہ گمان گذرا کہ اس کی آمد سے پہلے کمرے میں کلا ڈرا جا رہی تھا بلکہ اللہ ہیبت ادا کر سر کھاتے ہوئے ذرا طمانین سے بولا ”خدا کا شکر ہے کہ تم دونوں گھر پر موجود ہو۔ میں اس وقت خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے ایک بار پھر باہر جانا تھا لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا مجھے کچھ ہی اہمیت نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا کیسٹرن باپ کے قریب پہنچ جیت سے اس کے گلے میں بائیں حاکم کرتے ہوئے بولی ”کیا ہے پایا؟ میں جب سے یہاں پہنچی ہوں آپ کو کچھ پریشان نہ رہی ہوں۔ لگتا ہے میرے علاوہ بھی کوئی آپ کے لیے پریشان باعث ہے۔ کم از کم میری طرف سے تو اب آپ پریشان ہوا چھوڑ دیجئے میرے علاوہ اگر آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہے بتائیے۔“

چارلس نے آنکھیں چاڑ کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ شاید یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسٹرن ہی تھی جو اس سے ایسے عجیب بات کر رہی تھی۔ وہ کہہ پھر نہ سکا۔ ”میرے کان بکس ہو چکا واقعی تمہارے لیے میں وہ اہمیت اور شہرت ہے جسے محسوس کرتا ہوں۔“

وہ ایک بار پھر شر سے انداز میں ہنسی اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی ”اب میں تمہیں صحیح بات بتاؤں۔ میں ایڈز میں مبتلا ضرور ہوئی تھی لیکن بہت جلد ہی مجھے پتا چل گیا۔ میں نے وہی کولیاں استعمال کی تھیں۔ میں بالکل صحت مند ہو گئی تھی۔ میں نے پچھلے دنوں اپنا اپنا آپ آئی وی ٹیسٹ کرایا تھا۔ رزلٹ نیگیو نکلا تھا۔ اب میرے خون میں ایڈز کا وائرس نہیں پایا جاتا۔“

”چلو یہ تو اچھا ہوا“ میں نے گہری سانس لی۔ ”اب تو میں تمہارے قریب آ سکتی ہوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک بار پھر میرے گلے میں بائیں حاکم کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے نرمی سے اسے روک دیا۔ ”دیکھو“۔ میں نے لٹاٹ سے کہا ”جہاں تک اعلا کی بیٹی ہوئی ان گولیوں کا مطلق ہے تو اپنے دل کو تسلی دینے یا ان کے ذریعے لاکھوں کمزوروں کا کاروبار کرنے کی حد تک تو وہ ٹھیک ہیں۔ یہی ممکن ہے ان سے علاج ہو بھی جاتا ہو۔ انسان کی جان بچ جاتی ہو اور وہ طبی عمر گزار لیتا ہو۔ لیکن میں محض ان کی بنیاد پر اپنے لیے رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔“

”اللہ میرے خدا ہے۔“ وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی ”انسان کو زندگی کتنی پیاری ہوتی ہے۔“

”بے شک۔ انسان کو جان سے زیادہ کچھ پیارا نہیں۔ لیکن میں جان کے معاملے میں اس طرح بزدلی نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے جان جانے کے تصور سے بھی اپنے آپ کو خوف زدہ محسوس نہیں کیا۔ اگر کسی دشمن سے لڑتے ہوئے۔ یا کسی اصول کی خاطر لڑتے ہوئے جان جانے کا معاملہ ہو تو میں ایک لمحے کے لیے بھی خوف زدہ نہیں ہوں گا لیکن میں طرح کی موت سے مجھے برا خوف آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ بڑے اطمینان سے کہیں چلے جا رہے ہوں کہ اچانک کوئی آواز ہو گئی اگر آپ کو لگ جائے اور آپ پھٹ سے گر کر توانہ کسے کی طرح مرجائیں۔ یہ ایک عجیب بے معارفی موت ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کسی گروہ کے قادی میں آجائیں اور وہ آپ کو یکدم مارنے کے بجائے آہستہ آہستہ دسے کر زیادہ سے زیادہ دیر میں ہلاک کرے۔ یہ بھی ایک عجیب بے بسی بے چارگی کی گناہ موت ہے۔ تیسرے یہ کہ آپ کسی ناقابل علاج اور غلیظ سی بیماری میں مبتلا ہو کر بستر پر اڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائیں۔ میں نے ہمیشہ خدا سے دعا کی ہے کہ وہ مجھے اس طرح کی موت سے بچائے جس طرح انسان خدا سے ڈھنگ کی زندگی کی دعا کرتا ہے اس طرح موت بھی ڈھنگ کی مانگی جاوے۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔“ میں نے گہری سانس لی۔

”واہ۔ واہ۔ بہت خوب!“ کیسٹرن نے تلی، سمائی پھر بیڈ کے کنارے پر چھٹی ہوئی بولی ”اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں تو تم سے مذاق کر رہی تھی۔ سرے سے ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔“



افضل چہدري کو بزرگ بتا رہی ہو۔ یہ تو ابھی ادیز عمر بھی نہیں ہے۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بزرگی کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا۔“  
 کیتھرن بولی۔ ”میرا حال میں نے اچانک ہی اپنے طور پر دیکھ لیا اور اپنی زندگی کا انداز بدلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن مجھے اس میں کافی دشواری پیش آئے گی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ڈارگری کی بیوی ہوں اور ساڑھ میں اپنا دھنڈا بھی کرتی رہی ہوں۔ کافی عرصے سے میں نے ان کے راستے اپنی فوری پچھائی کر لی ہیں۔ کافی عرصے سے میں نے ان کے لیے کام بہت کم کر دیا ہے لیکن مجھے ان کے پیغام ملتے رہے ہیں۔ اب میں ان میں مکمل طور پر چھوڑنے کا فیصلہ کر رہی ہوں لیکن قلم ہے وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ اور وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ بین الاقوامی طور پر خطرناک لوگ۔“ اس نے نہ جانے کیا تصور کرتے ہوئے جھرمجی سی لی۔

چارلس فوراً پُر غصہ ہو کر بولی ”تم ان کی فکر مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اپنا کتنی طاقتور ہے۔ انہوں نے تو اور گردی چھٹی حکومتوں کے سربراہوں تک کو اس دھندے میں ملوث کر لیا ہے۔ جوں جوں صافیوں اور ہر شعبہ زندگی کے انتہائی بارسوخ لوگوں تک کو قتل کر چکے ہیں۔ میں ان کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں اور ان کی تمام تر خوفناکی سے آگاہ ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصل اہمیت تمہارے اپنے ارادے کی تھی اگر تم نے ان کے پچھلے سے نکلنے کا ارادہ کر لیا ہے تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ تمہیں تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنا تمام تر اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔ ڈارگری والوں کے خلاف مزاحمت کے لیے تو مجھے ہر طرح کی مدد میسر ہے۔“

باقی معاملات میں خواہ میرا ہاتھ زیادہ دور تک نہ پڑا ہو۔ میں نے کھانا کرکھا صاف کرتے ہوئے کہا ”میں اگرچہ ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ اور خود تم سے بھی کچھ زیادہ خطرناک حالات کا شکار ہوں لیکن ایک اچھے مفقود کے لیے میں بھی تمہاری مدد کو حاضر ہوں۔ میں جس قاتل بھی ہوں، تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔“

”مجھے معلوم ہے تم اس سے کہیں زیادہ ”قاتل“ ہو جتنا نظر آتا ہو۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت تم نے اکسار کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔“ کیتھرن مسکراتے ہوئے بولی۔

”اکسار... اچھی چیز ہے۔ انسان اگر واقعی کسی قاتل ہو تب بھی اسے اکسار سے ہی کام لینا چاہیے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

چارلس بولا ”خدا کا شکر ہے کہ کیتھرن کی طرف سے میرے ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اب گرا گیا لیکن میرے ذہن پر ابھی ایک اور بوجھ برسرِ وجود ہے جس نے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ صرف اسی کی

کے لیے میں ترس رہا تھا؟“  
 ”دوست! چھوڑیں! اولاد اپنی خدا یا مہم پندگی میں کتنا ہی آگے نکل جائے والدین سے اس کا رشتہ ٹوٹ تو نہیں سکتا۔“ وہ کاؤچ پر ہی اپنے پیلا کی بائیں طرف ٹھک گئی۔ دائیں طرف میں تھا۔ چارلس بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا بھی میری طرف۔

کیتھرن نہایت سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”ماں کی محبت سے تو میں برسوں پہلے ہی محروم ہو چکی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے آپ جیسا محبت کرنے والا باپ میسر تھا ورنہ ہماری سوسائٹی میں تو اولاد کے جوان ہونے کے بعد اولاد کو ماں باپ کی اور ماں باپ کو اولاد کی پروا ہی نہیں ہوتی کہ وہ کہاں رہ رہے ہیں، کس حال میں ہیں۔ میں بد نصیب تھی جو آپ کی محبت سے استفادہ نہیں کر رہی تھی۔ مجھے اس کی قدر دینی نہیں تھی کہ یہ کسی انمول چیز ہے لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے۔ آپ سے لا تعلق ہو کر میں نے اپنی زندگی میں بہت برا غلط کیا تھا۔“

”خدا ایسا! میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں؟“ چارلس دونوں ہاتھ جھٹ کی طرف اٹھا کر خالصتاً کیتھرن کے ڈراموں والے انداز میں بولا پھر ایک بازو کے حلقے میں کیتھرن کو اپنے ساتھ چٹایا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کے ریشموٹ پر آنسو ٹپک رہے تھے۔ یہ کیفیت گورے دیے بہت بے حس سے لگتے ہیں، اپنے جذبات کے اظہار میں پتیلی سے لگتے ہیں لیکن جب جذبات کے اظہار پر آتے ہیں تو پھر گرد و پیش کی پروا نہیں کرتے، مکمل کر پڑتے ہیں، مکمل کر دیتے ہیں۔ ہر معاملے میں کھلے ڈنکے ہی نظر آتے ہیں۔ باپ بٹی کے جذباتی سین میں میں اپنے آپ کو قطعی فاضل اور کچھ کچھ جھڑسا محسوس کر رہا تھا۔

میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک چارلس کو جیسے کوئی خیال آیا۔ وہ کیتھرن کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے بولا ”یہ انقلاب آیا ہے؟“

کیتھرن کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ معلوم نہیں اب بھی ڈراما کر رہی تھی یا واقعی سنجیدہ تھی۔ وہ آنسوؤں سے پتیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”پاپا! بعض پرانی کمائیوں میں آپ نے چھپا ہوا کارڈ کسی جگہ سے پائے تھے۔ اس کی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کردار اور کرداروں کے انداز بدلے رہتے ہیں لیکن کمائیوں اکثر ڈوب کر جاتی ہیں پاپا! میری زندگی میں بھی ایک بزرگ ٹھکس آیا ہے۔ گناہ کی ہے کہ اس نے میری زندگی کا رخ یکسر بدل دیا ہے۔ اور اگر کوئی کسر نہ کرتی ہے تو اسے بھی وہ پوری کر دے گا۔“

”بزرگ؟ کون بزرگ؟“ چارلس نے حیرت سے پوچھا۔  
 کیتھرن نے میری طرف اشارہ کیا۔ چارلس بھی پتیلی پتیلی آنکھوں کے ساتھ دھیرے سے فہم ہوا۔ ”تم کہہ رہے جا رہے

وجہ سے میں ترکی میں پھنسا بیٹھا ہوں۔“

معلوم ہی ہو گا کہ تین دن بعد ہمارے پاس سے لیڈی ڈانکا ترکی آ رہی ہیں۔“

”نہیں! مجھے نہیں معلوم تھا“ میں نے اعتراف کیا ”میں نے ابھی تک کوئی ٹریش یا انگریزی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ ترکی تو پرستی ہی نہیں آتی تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا ”زبان پارسی ترکی دوسری ترکی نہ ہی دائم“ میرا ذہن تو ابھی اپنے معاملات میں ہی الجھا ہوا تھا۔ باقی کس کیس کیس میں پوری کوری تھی۔ اس نے اور بھی زیادہ الجھا لیا تھا۔ مجھے بھلا لیڈی ڈانکا وغیرہ کے بارے میں خبریں پڑنے اور پھر انہیں یاد رکھنے کاوش کہاں تھا۔

میں نے غم مندی کی سے پوچھا ”کیلی ہی آ رہی ہیں کیا؟ پر اس چارلس ساتھ نہیں آ رہے؟“

”نہیں“ چارلس نے لفظی سانس لے کر جواب دیا ”پر اس چارلس کی جگہ غلام چارلس آیا ہوا ہے۔“ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو خم دیا۔ ”لیڈی سرحال اب کیلی ہی آ رہی ہیں۔ ان کی کئی مصروفیات ہیں۔ رہ کر اس کے ایک سینیار میں مصالحت خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنی ہے۔ سالویشن آری کے ایک مرکز کا افتتاح کرنا ہے۔ خواتین کے عالمی دن سے متعلق ایک کانفرنس کی صدارت کرنی ہے۔ اس کے علاوہ جموں و نور پر ان کا یہ وہ خیر سگالی کا دور ہے کہ ان کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں لیکن انہیں محل سرکاری پروڈکٹ دیا جائے گا۔ ہمارے سفیر انہی انتظامات کے سلسلے میں مصروف ہیں اسی لیے وہ دن میں یہاں نظر نہیں آتے مسئلہ یہ کہ پڑا ہے کہ۔“ اس نے جملہ نامک چھوڑ کر گھڑی دیکھی۔

پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھتے ہوئے بولا ”مگر تم میرے ساتھ چلو دو بات خود بخود تمہاری کچھ میں آجائے گی۔ میں اس وقت اسی سلسلے میں ایک جگہ جا رہا ہوں۔“

میں نے صرف ایک لمحے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے لیے یہ ایک طرح کا شغل ہی تھا۔ وقت گزاری ہی وقت گزاری میں اگر میں چارلس کے کسی کام آجانا تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اسی لمحے کیسٹر بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی ”میں بھی چلوں گی بیبا!“

چارلس نے گھری نظر سے بنی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ گھبراہٹ میں رنگ پھر مانت سے بولا ”ہی! جان! جارہے ہیں وہ جگہ ایک لڑکی کے لیے۔ خصوصاً ایک سفید قام اور ماڈرن لڑکی کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔“

”بیبا! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں کہیں جانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ وہ جگہ ان کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ کیا آپ کو ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوا؟“

کیسٹر نے تدریجی سے ہنسی سے بولی ”میں اس شخص کی عمر میں دیکھ چکی ہوں۔“

چارلس نے گھری نظر سے بنی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ گھبراہٹ میں رنگ پھر مانت سے بولا ”ہی! جان! جارہے ہیں وہ جگہ ایک لڑکی کے لیے۔ خصوصاً ایک سفید قام اور ماڈرن لڑکی کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔“

”بیبا! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں کہیں جانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ وہ جگہ ان کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ کیا آپ کو ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوا؟“

کیسٹر نے تدریجی سے ہنسی سے بولی ”میں اس شخص کی عمر میں دیکھ چکی ہوں۔“

چارلس نے گھری نظر سے بنی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ گھبراہٹ میں رنگ پھر مانت سے بولا ”ہی! جان! جارہے ہیں وہ جگہ ایک لڑکی کے لیے۔ خصوصاً ایک سفید قام اور ماڈرن لڑکی کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔“

”بیبا! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں کہیں جانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ وہ جگہ ان کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ کیا آپ کو ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوا؟“

کیسٹر نے تدریجی سے ہنسی سے بولی ”میں اس شخص کی عمر میں دیکھ چکی ہوں۔“

چارلس نے گھری نظر سے بنی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ گھبراہٹ میں رنگ پھر مانت سے بولا ”ہی! جان! جارہے ہیں وہ جگہ ایک لڑکی کے لیے۔ خصوصاً ایک سفید قام اور ماڈرن لڑکی کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔“

پھر اس نے بطور خاص مجھے مخاطب کیا ”صرف اسی پریشانی کی وجہ سے میں کیسٹر کے پیچھے نہیں آتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ میرے نہ آنے کی وجہ سے اسے تمہاری رفاقت میں آگئی جس کی وجہ سے مجھے اس کی زندگی کا رخ تبدیل ہونا دکھائی دے رہا ہے۔ اب مجھے جو مسئلہ درپیش ہے۔ میرا دل کتا ہے کہ اس کے سلسلے میں بھی تم میری کوئی نہ کوئی مدد ضرور کر سکتے ہو۔“

معلوم ہوا تھا کہ چارلس چارلس پر میری کچھ زیادہ سی دھاک بیٹھ چکی تھی حالانکہ میں نے تو اس کے سامنے کوئی ایسا خاص کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا۔ وہ بڑی اپنائیت سے میرا گھٹنا چھو رہا تھا۔ ”تمہارے اندر طاقت اور ذہانت کا ایک عجیب اخراج موجود ہے۔“

”اچھا؟ مجھے نہیں معلوم تھا“ میں نے سادگی سے کہا۔

”آپ زیادہ بڑبڑاتے۔“ وہ کھنکھنے سے میرے کندھے پر آگیا اور اسے زیادہ جوش و خروش سے چھیڑتا ہوا بولا ”معلوم نہیں کیوں میں تمہارے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ اپنائیت محسوس کرنے لگا ہوں۔“

میں گہری سانس لے کر کہہ گیا۔ عجیب صورت حال تھی۔ صرف بنی ہی نہیں، باپ بھی میرے لیے اپنے دل میں اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا۔ میری کچھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے اس پر خوش ہونا چاہیے تھا یا غمر مند؟

چارلس بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں جیسے اس امید پر ایک اہم راز میں شریک کر رہا ہوں کہ تم میری مدد ضرور کرو گے۔“

”پہلے پتا تو ملے مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے کہا۔ مجھے اس کی مدد کرنے میں سرحال کوئی عذر نہیں تھا۔ فی الحال میرے پاس اپنے وقت کا کوئی اور مصرف نہیں تھا۔

”اس چھوٹے مسئلے نے ٹریش اور زرخش دونوں حکومتوں کی سیکرٹ سروس کو پریشان کر رکھا ہے۔“ چارلس کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا ”میں بے جا وہ آپ کو اس قابل نظر آتا ہوں کہ جس مسئلے نے ایسے ملک کی سیکرٹ سروس کو پریشان کر رکھا ہے، میں اس کے سلسلے میں کچھ کر سکتا ہوں؟“ مجھے واقعی چارلس کا یہ خیال عجیب سا دکھا۔

”ہاں؟“ وہ گہری مندی کی سے سہلاتے ہوئے بولا ”بعض اوقات بڑے بڑے ادارے اپنے رعایتی طور طریقوں اور گے بننے سے قارمولوں کی وجہ سے وہ کام نہیں کر پاتے جو کوئی ان کا شخص پرتی سے حرکت میں آتے ہوئے صورت حال کو صحیح طرح سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر بہت کم وقت میں کر گزرتا ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں اس کے بولنے کا فخر تھا۔ کیسٹر بھی اچھے تو کر رہی تھی۔ چارلس بولا ”جیسے شاید

”ہاں؟“ وہ گہری مندی کی سے سہلاتے ہوئے بولا ”بعض اوقات بڑے بڑے ادارے اپنے رعایتی طور طریقوں اور گے بننے سے قارمولوں کی وجہ سے وہ کام نہیں کر پاتے جو کوئی ان کا شخص پرتی سے حرکت میں آتے ہوئے صورت حال کو صحیح طرح سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر بہت کم وقت میں کر گزرتا ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں اس کے بولنے کا فخر تھا۔ کیسٹر بھی اچھے تو کر رہی تھی۔ چارلس بولا ”جیسے شاید

”ہاں؟“ وہ گہری مندی کی سے سہلاتے ہوئے بولا ”بعض اوقات بڑے بڑے ادارے اپنے رعایتی طور طریقوں اور گے بننے سے قارمولوں کی وجہ سے وہ کام نہیں کر پاتے جو کوئی ان کا شخص پرتی سے حرکت میں آتے ہوئے صورت حال کو صحیح طرح سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر بہت کم وقت میں کر گزرتا ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں اس کے بولنے کا فخر تھا۔ کیسٹر بھی اچھے تو کر رہی تھی۔ چارلس بولا ”جیسے شاید

”ہاں؟“ وہ گہری مندی کی سے سہلاتے ہوئے بولا ”بعض اوقات بڑے بڑے ادارے اپنے رعایتی طور طریقوں اور گے بننے سے قارمولوں کی وجہ سے وہ کام نہیں کر پاتے جو کوئی ان کا شخص پرتی سے حرکت میں آتے ہوئے صورت حال کو صحیح طرح سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر بہت کم وقت میں کر گزرتا ہے۔“

ایک سید حاسدہ سا اصول پرست انسان ہوں۔"

اس دوران میں دوبارہ گاؤں پر غصہ چکا تھا۔ چارلس نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "ایک مدت کے بعد آپ دونوں باپ بیٹی کے درمیان قائلے ختم ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے پھر قائلے پیدا ہو جائیں۔ جس ضروری کام کا آپ ذکر کر رہے ہیں، بھڑے اس کے لیے آپ دونوں ہی چلے جائیں۔ مجھے ساتھ نہ لے جائیں میں نہیں ٹھیک ہوں۔"

کیٹرین باپ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھ پر زور دے کر ہوتے ہوئے ہوئی "خفا ہو گئے؟ میں کوئی جج کی ضرورت نہیں اس طرف سے بدگمانی کا شکار تھوڑا ہی ہوں۔ میں تو پاپا سے اپنی بات منوانے کے لیے ذرا تساری آڑ لے رہی تھی۔" وہ شرارتاً میں مسکرا رہی تھی۔ "تم اگر میری طرف سے بدگمانی کا شکار بھی رہو تو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے کون سا تم سے کوئی سرٹیفیکٹ لینا ہے؟ میں نے نیپے نیاڑی سے کہا۔"

وہ میرا بازو پکڑ کر کہنے لگی "ہیلو! اب اٹھ بھی جاؤ۔ زیادہ ٹھہرے مت دکھاؤ۔ دو باتوں کی وجہ سے میں ذرا مری ہوئی ہوں ورنہ ابھی کرائے کا ایک ہاتھ رسید کرتی۔"

"وہ دو باتیں کیا ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔  
"ایک تو میں دل ہی دل میں تمہیں استاد تسلیم کر چکی ہوں۔ دوسرے مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔" وہ بدستور خوشی سے مسکراتے ہوئے ہوئی۔

"یہ تم نے برا چھنڈا نہ فیصلہ کیا ہے؟" چارلس بیٹی کی کرچھکنے ہوئے ہوا "فصل چھوڑی کی شاگرد بن کر شاید تم کسی قاتل ہو جاؤ۔ لیکن صرف دل ہی دل میں تسلیم کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں چاہیے کہ مشرقی اصولوں کے مطابق باقاعدہ کوئی رسم وغیرہ کا اہتمام کر کے اس کی شاگردی اختیار کرو۔"

"مجھے پائس پر چڑھا کر مروانہ دینا مسٹر چارلس" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا "میں تو ابھی خود قتل کتب ہوں۔"

"چچا اب اٹھ جاؤ۔ پہلے ہی باتوں میں بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔" چارلس ایک بار پھر گڑی دیکھتے ہوئے ہوا "مجھے اٹھنا ہی پڑا۔"

میں نے آئے تو وسیع ذرا تھوڑے میں تاریک فیشوں والی ایک سیاہ مرینڈر کو گھاسی سی پتھر تھی۔ ڈرائیو رنے میں دیکھتے ہی گاڑی کے دو دروازے کھولے اور ہمارے بیٹھے ہی گاڑی اشارت کردی۔ ڈرائیو ر ٹرک تھا اور چارلس نے ترکی میں ہی اس سے کچھ کہا تھا۔ اس نے سر کو خفیہ سی جنبش دی اور گاڑی ہنگلے سے باہر آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ استنبیل کی شاہراہوں پر فرارے بھر رہی تھی۔

میں چند ایسی مشہور اور تاریخی عمارات کے سامنے سے بھی گزرے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ جلد ہی گاڑی شر کے گھمان آباد علاقوں سے نکل آئی۔ میرے اندازے کے مطابق ہم شر کے ایک سرے سے "دوسرے سرے کی طرف جا رہے تھے لیکن پھر ہم شری

چارلس کو گولا جواب سا ہو گیا اور ایک لمحے کی الجھن آمیزی ناموشی کے بعد ہوا "مسٹر رازداری کا بھی ہے۔ کیا میں تم پر انداز کر سکتا ہوں؟"

کیٹرین کو اس سوال سے گولا کچھ معنوں میں جھٹکا لگا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہنے میں ہولی "آپ ایک اجنبی اور غیر ملکی پر احمق کر سکتے ہیں۔ اپنی بیٹی پر احمق نہیں کر سکتے؟"

"مجھے تمہارے ماضی۔ بلکہ تمہاری آج تک کی زندگی کی وجہ سے تم سے یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے؟" چارلس طاقت سے ہوا۔

"آپ کو اس شخص کے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" کیٹرین ایک بار پھر میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ہولی "آپ کو کچھ طور پر معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور کیوں ہم لوگوں کے ساتھ آئے ہیں؟"

"مجھے سینہ رمضان فون پر اس کے بارے میں بتا چکا ہے۔ اور سینہ رمضان میرا قابل احمق دوست ہے۔" چارلس نے جواب دیا۔

"لیکن بیٹی آپ کے لیے قابل احمق نہیں ہے؟" کیٹرین رخ کیے میں ہولی۔

"اگر تم زارگز کے دھندے میں لوث نہ رہی ہو تو میں تو میرے لیے دنیا میں تم سے زیادہ قابل احمق کوئی نہ ہوں گا۔ میں تو دنیا میں کوئی ایسی انسان کسی بھی خاص وجہ کے بغیر ہی بے اختیار ہو سکتا ہے لیکن ارزا کے دھندے سے وابستہ لوگوں کے ضمیر تو کچھ زیادہ ہی مٹھ ہو جاتے ہیں۔ ان پر مجبوراً نہیں کیا جاسکتا۔" چارلس صاف گوئی سے ہولا ملا کہ اگر یہ ہونے کی حیثیت سے وہ میری نظر میں ایک بنائی باپ تھا۔ انگریز۔ یا کسی اور سفید فام قوم میں اتنا بدبائی باپ مجھ سے آج تک نہیں دیکھا تھا لیکن جہاں احتیاط کی ضرورت نہ وہاں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نظر نہیں آتا تھا۔

"لیکن انسان کی ذات میں کبھی کبھی اچانک اٹھاب بھی تو آتا ہے؟" کیٹرین اپنی بات منوانے پر تلی ہوئی تھی۔

"میں اچانک اٹھابات پر کچھ زیادہ یقین نہیں رکھتا۔ لیکن پھر تمہارے معاملے میں یقین کر لیتا ہوں۔" بالآخر چارلس نے لٹھری سانس لے کر نہ جانے کیا سوچ کر یکدم ہی اختیار ڈال دیا۔

"دوبارہ! آپ عظیم ہیں۔" کیٹرین نے اپنی نکل بھول کر اس کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔

چارلس استہزائیہ انداز میں جس دبا "عظیم؟" جس۔۔۔ لیکن مجھے کھنکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کھنکھنے کے بغیر ہی میں نے تساری بات مان لی ہے۔ مجھے عظیم بنانے کی کوشش مت کرو۔ عظمت کے درجے بہت آگے سے شروع ہوتے ہیں۔ میں تو

ہم تینوں گاڑی سے اتر آئے چارلس نے ڈرائیور کو وہیں رہنے کی ہدایت کی اور ہم آگے چل دیے۔ پہاڑی کے گرد گھوم کر ہم دوسری طرف پہنچے تو ایک اور پہاڑی کے شیب میں ایک بہتی سی کے آثار دکھائی دیے۔ بہتی پہاڑی کے پہلو میں تھی۔ جہاں ہم چل رہے تھے وہاں سے اس کا صرف تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔

اس علاقے میں چلے ہوئے مجھے اپنے ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہمارے ان علاقوں میں سبزہ اور خوب صورتی نظر آتی ہے جبکہ یہ علاقہ کلائی حد تک بخری لگ رہا تھا۔ شیب میں کیسی کیسی تھوڑا بہت سبزہ درخت اور جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہیں بہت سے موسیٰ چر رہے تھے اور گویا اس سبزہ کو بھی قسم کرنے کی مقدور بھر کو شش کر رہے تھے۔ ان موسیوں کو چرانے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں کھاتے راستے پر چلے بااثر ہم بہتی کے قریب جا پہنچے یہاں کے مکانوں کی ساخت بھی ہمارے پہاڑی علاقوں کے مکانوں سے کافی مختلف تھی۔ زیادہ تر مکان گولائی کے تھے اور عجیب سی بات یہ تھی کہ تقریباً سبھی مکانوں میں باہر کی طرف سے تنگ سا ایک گول، بل کھانا زینہ اوپر ضرور جاما تھا۔ مکانوں کی ساخت جمہوریوں سے مشابہ تھی۔

”یہ ترکی کے ایک نہایت قدیم قبیلے کا گاؤں ہے“ چارلس نے چچی آواز میں مجھے اور کیتھرن کو بتایا۔

گاؤں میں بالکل درانی نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ ہمیں کچھ آگے جا کر معلوم ہوئی۔ گاؤں کے وسط میں ایک بڑا سا میدان تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کے تمام مرد عورتیں اور بچے اس میدان کے گرد جمع تھے۔ بہت بڑا جھوم نظر آ رہا تھا لیکن میدان میں کیا ہو رہا تھا یہ ہمیں فوری طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ جہاں تک ہم پہنچے تھے وہاں سے ہمیں پورا میدان نظر نہیں آ رہا تھا۔

جھوم میں زیادہ تر عورتوں نے سرخ اور سفید دھاریں والے لمبے لمبے لباس پہن رکھے تھے۔ مردوں پر وہ سفید اسکارف باندھے ہوئے تھیں۔ مرد زیادہ تر لمبے لمبے اور کونوں سے مشابہ پتوں میں تھے اور ان کے سروں پر فرکی وہ بڑی بڑی لمبی سی ٹوپی تھیں۔ تصویروں میں قدیم انگریز نوہیوں کے سروں پر نظر آتی ہیں۔ برطانوی شاہی کل پر قیادت رہنے اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ چلنے والا فنی رستہ اب بھی وہی دیکھی اور ٹوپی پہنا رہے اس ٹوپی کی وجہ سے کچھ ایسا تاثر پیدا ہو رہا تھا جیسے ہم کسی قبائل علاقے میں پہنچ گئے ہوں حالانکہ وہاں سردی کچھ ایسی خاص نہیں تھی۔ وہ لوگ نہایت انشاک سے کسی چیز کا ظہار کر رہے تھے۔ ہم لوگ کچھ اور آگے پہنچے تو جتنے جتنے شاہیوں کے درمیان سے بھاڑی بھر کر ہم عمارت سے جیسوں کی جھلک دکھائی دی جو ایک دوسرے سے بری طرح الجھ رہے تھے۔ تب مجھے انداز ہوا کہ

حدود کو عبور کر گئے۔ انجمن کی نہایت خفیف سی آواز کے ساتھ گاڑی بہ ستور قرانے بھرتی جا رہی تھی۔

ہم تینوں سفر کے آغاز سے لے کر اب تک خاموش تھے۔ میں تو اس خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن کیتھرن آخر کار خاموش نہ رہ سکی اور تاریک شیبے کے عقب سے چھیل میدان کا جائزہ لیتے ہوئے بولی ”ہم کہاں جا رہے ہیں پاپا؟“ دور دور تک کسی آبادی کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

”دیکھتی رہو“ چارلس نے اختصار سے جواب دیا۔ شاید وہ سپنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شاید خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم بالی دے سے ایک ساڑھ روڈ پر سڑک پہنچے تھے اور پھر درج بلندی کی طرف جا رہے تھے پھر ہم قدرے شیب میں چلے ہوئے ایک طویل جنگل کے قریب سے گزرے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم استیبل سے نکل آنے کے بعد تقریباً چالیس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ کیتھرن بے چینی سے پہلو بول رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ ششکھیں نظروں سے مجھے گھور کر رہ گئی۔

چند لمبے بعد گاڑی ایک پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ وہ راستہ کسی گدھا گاڑی کے بھی شان شان نہیں تھا جبکہ اس پر اتنی شاندار مسیڈیز آئی تھیں لیکن ایک لحاظ سے اچھا بھی تھا کہ ہم اس شاندار مسیڈیز میں سفر کر رہے تھے اگر کسی معمولی گدھا گاڑی میں ہوتے تو اس وقت ایک ایک فٹ اور اچھل رہے ہوتے۔ تمام تر سست رفتاری کے باوجود گاڑی اپنے عقب میں گرد و غبار کا ایک طوفان چھوڑتی جا رہی تھی۔

پاپا آخر کیتھرن خاموش نہ رہ سکی۔ منہ بنا کر بولی ”ایشیائی ممالک کے بعض حصے دیکھ کر تو میں محسوس ہوتا ہے جیسے زمانہ غار کے بعد سے وہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔“

اب چارلس نے بھی ذرا زبان کھولی اور کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا ”ہم جہاں جا رہے ہیں وہ بہت ہی جہیں زمانہ غار کے انسانوں ہی کی محسوس ہوگی۔“

”ہم وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں؟“ کیتھرن نے بے اختیار پوچھا۔

”یہ ہمیں وہیں چل کر معلوم ہوگا“ چارلس نے فوراً ہی زبان بند کر لی۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ اسی طرح جھکولے کھاتے ہوئے طے کرنے کے بعد گاڑی رک گئی۔ آگے سرک بالکل ہی اس قابل نہیں رہی تھی کہ گاڑی اس پر چل سکتی۔ پگڈنڈی یا سڑک وہ جو بھی تھی صرف دو ڈھالی فٹ چوڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ایک طرف شیب تھا اور دوسری طرف کچی پہاڑی کی بلندی۔

چارلس کسی سانس لے کر بولا ”اب ہمیں کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑے گا۔“

سے خون نکل رہا تھا۔ آہم میرے والے ستالے کی طرح یہ تاثر نہیں مل رہا تھا کہ اسے گھیر کر جمع کے سامنے ہلاک کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

ہم آگے بڑھے تو اس کے چند سینکڑوں بعد ہی کشتی غم ہو گئی۔ گورسے پتلوان نے گویا ازراہ کرم سانولے کو آخری بار زمین پر چٹا اور پھر نہیں اٹھایا۔ اس نے اسے بن وغیرہ کہنے کی دھمک نہیں کی بلکہ اس طرح اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا جسے کوئی شکاری شیر کو شکار کرنے کے بعد اس پر پاؤں رکھ کر تصویر کھینچا رہا ہو۔

وہ صرف بیٹے اور مٹی میں اٹھتا ہوا تھا۔ کہیں سے ڈبھی نہیں تھا۔ چہرے سے ہینٹ پچھ کر اس نے قاتلانہ انداز میں ادھر ادھر گردن گھما کر تماشاخوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خاصی درد کی تھی۔ سانولے پتلوان میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ لوگوں نے تائیاں بچانے کے بجائے اجتماعی طور پر گہری سانس لی جو شاید سب کے سینوں میں کئی لمحے سے قہقہہ تھی۔ یہ طمانیت کی سانس معلوم ہوئی تھی۔ شاید سب ہی کو مقابلہ ختم ہونے کے بعد کر اطمینان ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے انداز میں ایک خفیف سی ہانسی بھی شامل تھی۔ گورا پتلوان بھی کوکہ انہی میں سے ایک تھا لیکن شاید وہ اسے بچے دیکھنا چاہتے تھے مگر تنبیہ ان کی تو قاتل کے خلاف نکلا تھا۔

فاتح پتلوان کی نظر میں تماشاخوں پر سے ہوتی ہوئی ہم تینوں پر آنکھیں پھر چمکے اور چارلس کو تو اس نے کھٹا نظر انداز کر دیا لیکن کیتھرن پر اس کی نظر جم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشتانہ چمک ابھرتی۔ چارلس کی توجہ اس وقت کسی اور طرف تھی۔ میں پتلوان کی آنکھوں میں قہقہہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن شاید ایک میدان سے دوسرے میدان کی طرف چلا نکلا تھا۔

کیتھرن نے میری طرف کو ترہیلی ہوتے ہوئے سرگوشی کی "مجھے یہ شخص سخت محسوس لگ رہا ہے۔"

پتلوان نے چیخا محسوس کر لیا تھا کہ کیتھرن نے میرے کان میں اس کے بارے میں ہی کوئی بات کی تھی۔ اس کی وحشت کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ ریٹھ اٹھیں بجیکوڑوں کے انداز میں آسمان کی طرف منہ کر کے گھونٹوں سے اپنا سینہ پینٹے لگا۔ اس کا سینہ غیر معمولی طور پر چڑا تھا اور اس پر گوشت کی تھوں کے ابھار بھی غیر معمولی تھے۔ قد ذرا چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ جمجھکی طور پر کچھ زیادہ ہی چڑا چڑا لگ رہا تھا۔

اس نے مقلع سے ڈکرانے کی سی بے معنی آوازیں نکالیں پھر باڈی بلڈروں کے سے انداز میں پوز بنا کر اپنے جسم کی نمائش کرنے لگا حالانکہ وہ اس حد تک نمائش کے قابل نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ صرف کیتھرن کو دکھانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا اور اپنی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

یہ ان میں کسی قسم کی کشتی ہو رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ ان میں گمراہ سکوت چھایا ہوا تھا۔ تماشاخی کچھ عجیب غیر فطری سی اوشی سے مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ان میں بچے بھی شامل تھے۔ وہ بھی کوئی آواز نہیں نکال رہے تھے اور کشتی لڑنے والوں کی ہی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہم جھوم کے قریب پہنچے تو ہمیں ایک ایسی جگہ میسر آئی جہاں سے ہم ستالے کا نظارہ کر سکتے تھے۔ وہ واقعی کشتی تھی اور تقریباً زری اشاک کی تھی لیکن اس میں اتنی خوشخواری نہیں تھی جتنی ملتی مقابلوں میں ہی وی پر نظر آتی ہے۔ وہ دونوں ساڈی کی طرح لمبے ہوئے پتلوان تھے لیکن ان کے قد درمیان ہی تھے۔ دونوں کے کمرے البتہ غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ جسم ورزشی تھے لیکن بشرطی پتلوانوں کی طرح تو نہیں خاصی نکل ہوئی تھیں۔

وہ چڑے کی دھجلی ڈھالی سی پتلوانوں میں تھے ایک کا رنگ خاصا گورا تھا۔ دوسرے کی رنگت قدرے سانولی سی تھی۔ بھابھہ وہ دونوں ہم پلہ ہی معلوم ہوتے تھے لیکن گورا پتلوان مکمل طور پر سانولے پر حاوی معلوم ہوا تھا۔ سانولے کی حالت خاصی خراب تھی۔ گورا اسے اٹھا اٹھا کر رخ رہا تھا اور اس نے مقابلہ تقریباً ختم ہی کر دیا تھا مگر ان کے ہاں پتہ کرنے یا چت کرنے کا رواج تھا تو میرے خیال میں وہ اب ایسا کرنے ہی والا تھا۔ میرے خیال میں وہ اب کسی بھی لمحے اسے پتہ کر سکتا تھا لیکن اب شاید وہ محض لطف اندوز ہونے کے لیے اس کی بے رحمانہ طریقے سے پٹائی کر رہا تھا۔ گورا پتلوان شل سے کچھ اذیت پسند معلوم ہوتا تھا یا پھر شاید وہ مجھ کو محسوس کرنے کے لیے غیر ضروری مار پیٹ کر رہا تھا حالانکہ مجھ کے ہاتھ کی مار عرب نظر آ رہا تھا۔

ہماری آمد پر کئی عورتیں اور مردوں نے مرکز ہماری طرف دیکھا لیکن سینکڑوں میں گویا سب کو ہی پتا چل گیا کہ ان کے گاؤں میں ابھی ایسی آئے ہوئے تھے۔ سب نے ہی باری باری مرکز دیکھا۔ ان کی منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا اور وہ بادل کشتی کی طرف توجہ ہو گئے۔ مردوں نے البتہ کچھ زیادہ دیر تک کیتھرن کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری۔ انہوں نے گویا باہل ناخراستہ کیتھرن کی طرف سے نظر نہالی تھی۔

چارلس کو یقیناً کشتی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سٹلاشی سے انداز میں ادھر ادھر کود رہا تھا۔ ہمیں ایک طرف کچھ جگہ میسر آئی تھی اور ہم غیر ارادی سے انداز میں آگے بڑھ گئے تھے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر کئی مہرا میں ہوش سے اپنی کشتی یاد آگئی تھی اور میرے سرگ اپنے سینے خفیف سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک خوشی مقابلہ تھا۔ اس میں سب سے رنگ کے اندر ہی نہیں "رنگ کے باہر بھی میری ملکیت میں تھی۔"

پتال اس مقابلے میں بھی خون بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ سارے پتلوان کا چہرہ خن میں تر تھا۔ اس کی ناک منہ اور پیشانی

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ پولوان اسے ہسپتال سمیت اٹھا کر  
کیس اور صحرانہ پمپنگ دے۔ اس نے شفقت پر مبنی کے تحت  
جوش میں اگر خواہ خواہ ہی ہسپتال نکال کر سامنے آنے کی حفاظت کی  
تھی۔ اس کی عدوانیت کیتھرن کے لیے رحمت کا باعث بن سکتی تھی۔  
کیتھرن غالباً اس کی دھل اندازی کے بغیر اپنا دفاع بہتر طور  
پر کر سکتی تھی۔

میں عداوت نہیں بلکہ حقیقتاً اس معاملے میں ٹامک اڑا لے کے لے ٹامک کو حرکت دینے کی لگا تھا کہ جھوم میں سے کوئی بچتا کسی ناقابلِ فہم زبان میں اس نے نہ جانے کیا کیا تھا کہ پھولان کو گویا از سرِ نو بریک لگ گئے تھے۔ وہ یکدم سرِ دی کر گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے چھرے جسم کا ایک دراز قد شخص بھوم بھوم کر چیرتا ہوا آگے آیا۔ اس کا لباس بھی گاؤں والوں سے تقریباً ملتا جلتا ہی تھا لیکن اس پر بڑی وضو کا کچھ ایسا کام کیا گیا تھا کہ اس کا آواز شاہانہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی ٹوپی بھی ذرا مختلف تھی۔ اس پر بھی شاید سونے سے جڑاوت کی کچنی تھی جس کی وجہ سے وہ ناچ سے مشابہ نظر آرہی تھی۔

وہ گندی سی رحمت کا ایک عام سا شخص تھا لیکن اس میں ایک  
 نہیں تھا کہ اس کی شخصیت میں بھی ایک شانہ۔ ساجد جلال مور  
 تھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا چنگاریاں تلک رہی تھیں۔ اسی کی  
 چالیں کے قریب ہی ہوگی۔

قریب آکر اس نے ہارمی ہارمی ہم قیوں کو گھورا۔ کیسٹر کو کچھ زیادہ گھورا۔ چارلس نے پستول جیب میں رکھ لیا اور ذرا خوش خلقی سے انھیں پچھلائے ہوئے بولا "ہاشا سیو کیڈ۔"

تب مجھے معلوم ہوا کہ چند لمبے پیلے چارلس نے پہلوان کے سامنے اس شخص کا نام لیا تھا۔ وہ اسی نے مجھے یہاں آیا تھا لیکن "پاشا سیدک" نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی اور جیتے جیتے میں پہلوان نے بات کہنے لگا۔ زبان ترکی ہی معلوم ہوتی تھی لیکن اس میں فارسی کی بھی آمیزش تھی۔

جوانا پہلوان بھی تیری سے پوئے گا۔ اس کے بوجھ میں  
احزاق تو تھا لیکن کچھ سرکشی بھی تھک رہی تھی۔ جھوم بکھڑے  
کھٹک آیا تھا اور دائی پہلے سے ٹک ہو گیا تھا۔ سب لوگ سیدک  
اور پہلوان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے لیے خنہ چش  
معلوم ہوتے تھے جبکہ وہ گفتگو ہم تیریں میں سے غالباً کسی کی بھی سمجھ  
میں نہیں آ رہی تھی۔ چارلس نے ایک بار بھر ہڈیاں اور ہاتھ  
اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی "چٹا سیدک! ام تیر  
سے ملے آئے ہیں۔"

پاشا سب کو بے اپ بھی اسے لٹ نہیں دی اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ دیر یہ سہلان سے تھوڑے لمبے میں ٹھٹھک کر رہا۔ وہ ٹپٹپ سے چلتے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آواز سے قہقہہ کیا ہوا تھا۔ وہ دبا ہوا تھا۔

ہیں لیکن عورت کو مارنا ہم دونوں ہی کے معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اگر تمہارے پہلوان اعظم کو اپنی حرکت کے رد عمل پر اتنی ہی توہین محسوس ہوئی ہے تو کیسے تیرن کی جگہ میں مار لگاتا ہوں۔ تمہارے پہلوان کو تو صرف اپنا غصہ ہی ٹھنڈا کرنا ہے شاید وہ مجھے مار کر ہی ٹھنڈا ہو جائے۔

کیسے تیرن نے عجیب والہانہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے سپرو سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی "میں تمہیں استاد تسلیم کر چکی ہوں اور استاد کی باری بعد میں آتی ہے۔ پہلے اس پہلوان اعظم کو شاکر دے تو سنت لینے دو۔"

سیو بک کی آنکھوں میں حیرت سی نمودار ہوئی۔ کیسے تیرن اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی "میں مار کھانے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے اپنے دفاع کا اختیار تو ہو گا؟ آخر میں ایک گنہگار اور ناتواں سی عورت ہوں۔ مجھے کم از کم اتنا حق تو ملنا چاہیے کہ پہلوان اعظم کے سامنے اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکوں۔"

سیو بک نے ایک بار پھر اس کا سر تاپا جاتہ دیا اور پھر اپنے پہلوان اعظم کی طرف گھوم کر اسے اپنی زبان میں کیسے تیرن کی بات کا ترجمہ بتانے لگا۔ پہلوان اعظم نے اثبات میں سر ہلایا۔ غالباً موصوف نے سوچا تھا کہ ایک لات تو شاید اتفاقاً بڑھی تھی لیکن عورت آخر عورت تھی اور وہ پہلوان اعظم تھے۔ اس لیے عورت کو دفاع کا حق دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

سیو بک کیسے تیرن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "ہمارے قبیلے میں تو عورت کو دفاع وغیرہ کا حق نہیں ہوتا۔ اسے چھوٹی بد تمیزی پر گھر میں۔ اور بڑی بد تمیزی پر سب کے سامنے میدان میں کھڑے ہو کر مار کھانا پڑتی ہے لیکن تم چونکہ غیر ملکی ہو۔ تمہیں ہمارے رسم و رواج اور قوانین کا علم نہیں تھا اس لیے تمہیں دفاع کا حق دینے کی میں نے سفارش کی تھی جسے پہلوان اعظم نے مان لیا ہے۔ ہم پورے گاؤں کے سامنے پہلوان اعظم کا وقار بھجوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے اس لیے اب وہ جس طرح اور دقتی جا چیں گے، تمہیں مار لگا سیں گے، تم جس طرح جاؤ اور اپنا دفاع کر سکتی ہو۔ بلکہ پہلوان اعظم پر جو اپنی حملہ بھی کر سکتی ہو۔ تم زیادہ سے زیادہ جوش و خروش جانتی ہوگی لیکن عورت آخر عورت ہوتی ہے۔ جوش و خروش تمہیں نہیں بچا سکتے۔ تمہیں پہلوان اعظم کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

میں نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر دل انداز کی کوشش کی لیکن کیسے تیرن نے اس بار بھی میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دھکے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں کہہ چکی ہوں۔ پہلے شاکر دو تو موقع دو۔ استاد کی خدمات کسی زیادہ بڑے موقع کے لیے بچا کر رکھنی چاہئیں۔"

اس دوران سیو بک گردن گھما کر تماشا بینوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں ان کی زبان میں غالباً یہ بتانے لگا کہ ہم لوگوں کے درمیان کیا مکالمہ ہوا تھا۔ اس کی بات سن کر تقریباً تمام مرد کیسے تیرن

پاؤں خروہ چارلس کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت مجھے حیرت کا خلیفہ سا جھٹکا لگا جب میں نے اسے صاف شستہ اور رواں گھریزی میں بات کرتے سنا۔ وہ کیسے تیرن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا یہ درست ہے کہ تمہارے ساتھ آنے والی اس سفیر نام لڑکی نے ہمارے پہلوان اعظم کو لات رسید کی؟"

"باشا سیو بک! آپ کے پہلوان اعظم نے نہایت غیر مذہبانہ۔ بلکہ حدوت کے ساتھ میں تو یہ کیوں کا کہ نہایت بے ہودہ انداز میں میری بیٹی کا بازو کھینچتے ہوئے اسے اپنے ساتھ رقص پر مجبور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے میری بیٹی نے مجبوراً۔"

"اچھا۔ تو یہ تمہاری بیٹی ہے؟" سیو بک نے ایک بار پھر نگلی سی آنکھوں سے کیسے تیرن کی طرف دیکھتے ہوئے چارلس کی بات کاٹ دی۔

"جی ہاں باشا سیو بک! چارلس نے گواہی کسی جرم کا اعتراف کیا۔ سیو بک خاصی گرجن دار آواز میں بولا "پہلوان اعظم نے اگر تمہاری بیٹی کو اپنے ساتھ تاننے کی دعوت دی تھی تو یہ اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔ اسے تو اس اعزاز کو ٹھکرانے کی بھی جرأت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ چہ جائیکہ اس نے پہلوان اعظم کو لات رسید کر دی۔"

میں خاموش کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سیو بک اس قبیلے کا سردار مصلوم ہوا تھا۔ چارلس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ابھر آئے تھے۔ وہ نہ جانے کس سلسلے میں سیو بک سے ملے آیا تھا لیکن یہاں کچھ اور ہی پتھر چل پڑا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہمارے اوگرد موجود ہجوم میں سے کئی مردوں کے ہاتھوں میں جدید ترین مسافت کی آؤٹک گھسیں نظر آتے گی تھیں جن کا رخ ہماری طرف تھا اور ہم لوگ پہلے ہی سے ان کے گہرے میں تھے شاید اس وقت چارلس سوچ رہا تھا کہ اس نے کیسے تیرن کو ساتھ لاکر بڑی حماقت کی تھی۔

سیو بک گویا اپنے لیے بے غلغلہ غضب پر قابو پاتے ہوئے ایک لمبے کے زق کے بعد بولا "تم خواہ کوئی بھی ہو لیکن اس وقت ہمارے علاقے میں کھڑے ہو اس لیے تمہیں ہمارے علاقے کے قوانین کی پابندی کرنی پڑے گی۔ ہمارے قبیلے میں کوئی عورت کسی مرد یا ہتھ اٹھانا تو رکنار زبان سے بھی اس کی توہین نہیں کر سکتی۔ اب تمہاری بیٹی کو اپنی حرکت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اسے اس پہلوان میں اگر سب کے سامنے پہلوان اعظم سے مار کھانا پڑے گی۔"

اس موقع پر میں نے پہلی بار زبان کھول "ہم تمہارے مسلمان ہیں اور میرا خیال تھا کہ تمہارا بھروسہ قبائلی لوگوں میں مسلمان نوازی کی بجائے کچھ عہدہ داریات ضرور پائی جاتی ہیں۔"

"مسلمان نواز ہم بھی ہیں" سیو بک ایک بار بھر گرج اٹھا لیکن ہمارے قانون پہلے آتے ہیں۔"

ضمیمہ پاکستانی مسلمان ہوں اور یہ دونوں انگریز باپ بیٹی کر چن

نہیں لکھتا۔

”وہ فراہمی میں لکھا گیا تھا اور ہم ہر چاہتے ہیں۔ وہ تم نے ہی لکھا تھا“ چارلس ملاشت سے بولا ”تکارت کر۔ میں تم سے بہت ہی ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ تمہارا اس میں کوئی حرج نہیں۔ خدا کے لیے تم میرے چند ضروری سوالوں کا جواب دے لا اور اس احقانہ سلسلے کو بند کرو۔ چلو۔ کہیں چل کر بیٹھے ہیں۔ جہاں ہم اطمینان اور رازداری سے بات کر سکیں۔“

سیو بک چاروں طرف دیکھتے ہوئے بدستور پاٹ لیٹے ہیں اور ”میں جی میرانی ضرور ادا کروں گا لیکن مجھ سے پہیلیاں بھڑکانے کی کوشش مت کرو۔ مجھ سے ایسی باتوں کے بارے میں مت پوچھو جن کے سرچ کا مجھے علم نہیں۔ رہا یہ مقابلہ جسے تم احقانہ سلسلے کہہ رہے ہو یہ اب نہیں مل سکتا۔ پہلوان اعظم ہمارے قبیلے کی ایک اہم ہستی ہے۔ ہم اس کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے۔“

”میں خود بھی بہت اہم ہستی ہوں۔ میں بھی نہیں چاہتی یہ مقابلہ لے“ کیتھرن آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ چارلس کھڑا بے بسی سے ہاتھ مارتا رہا۔

سیو بک گویا اسے قتل دینے کے لیے نئی آواز میں بولا ”میں تمہاری تعقی کے لئے ایک دودھ کر سکا ہوں اگر تمہاری بیٹی نے اس مقابلے میں اپنی برتری ثابت کر دی تو میں تمہارے تمام سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ جس حد تک مجھے معلوم ہو اس حد تک ضروریات کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میدان کے وسط میں وہ کیتھرن اور پہلوان اعظم سے ذرا دور ریٹھی کے سے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پہلوان اعظم کے متحرم سے ہو تھوں پر اس وقت ایک شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔ کیتھرن ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ہم چو تک پہلوان اعظم کا دوسرے پہلوان کے ساتھ مقابلہ دیکھ نہیں سکے تھے اور اختتام پر پہنچے تھے اس لیے ہمیں اس کی طاقت اور لانے کے اسٹائل کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں خود بھی کیتھرن کے سلسلے میں ذرا تعریف کا شکار تھا۔

پہلوان اعظم نے اپنے ذیل ڈول کے برعکس کانی پھرنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچانک اچھل کر کیتھرن کو لانا ٹک بک رسید کرنے کی کوشش کی لیکن کیتھرن نہایت پرسکون انداز میں ایک طرف ہٹ گئی۔ پہلوان اعظم اپنی جھوک میں کھسکے کے مٹی دھب سے گرے۔ لانا ٹک بک مار کر بھی انسان زمین پر ہی گرنا ہے لیکن بگ خالی چل جائے تو جوت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

پہلوان اعظم کو انھیں میں ایک لمحے کی تاخیر ہوئی۔ کیتھرن نے اس کی پہیلیوں میں ٹھوکر رسید کی جس نے اس کے سینے چبھے بچنے کو بھی ایک فٹ اوپر اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آغاز دیکھ کر ہی میرے دل کو کچھ اطمینان ہوئے لگا۔ پہلوان اعظم میں جیتنے طاقت تو خاص ہوگی لیکن وہ احق تھا۔ اسے کیتھرن سے پہلی لٹ کھار کی اس کی پھرنی کا اندازہ کر لیا جا ہیے تھا۔ اگر وہ پھرنی میں کیتھرن

کی طرف استوائی نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہے لگانے لگے۔ غور میں البتہ بالکل خاموش تھیں۔ ان کی آنکھوں میں رنگ کے ساتھ ساتھ کچی اور جذبے کی بھی جھلک تھی۔ شاید وہ کیتھرن کی ذات سے کوئی امید وابستہ کر رہی تھیں۔

تمام مردوں کو قہقہے لگاتے دیکھ کر پہلوان اعظم بھی سینے کو گھونسلوں سے پیچتے ہوئے آسمان کی طرف متہ کر کے آواز دہنی سی آواز میں نکالنے لگا۔ وہ شاید یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ نہیں نہیں کرے حال ہوا جارہا تھا۔ اس کی ہنسی کسی پھاڑی پر ڈرم لڑھکنے کی آواز سے مشابہ تھی۔

کیتھرن پہلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیو بک سے مخاطب ہوئی۔ ”اس سے کو بیٹھنے کی طرح ڈکرانا بند کرے اور میدان کے بیچ میں چلے۔“

سیو بک ہانگوا دی سے بولا ”وہاں سبھاں کر بات کرو لڑکی! ہمارے باپ عورتوں کو مردوں کے بارے میں اس طرح بدتمیزی سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس پر تمہاری سزائیں اضافہ ہو سکتا ہے۔“

”میں انگریز ہوں۔ مجھ پر اپنے اصول مسلط مت کرو“ کیتھرن متہا کر بولی ”میں تمہاری عورتوں کی طرح نہیں ہوں جنہیں شاید تم نے بھیج کر بیوی کی طرح رکھا ہوا ہے۔“

”میں پتا چکا ہوں کہ اس وقت تم جہاں کھڑی ہو وہاں صرف ہمارے اصول اور ہمارے قوانین چلتے ہیں۔“ سیو بک غرایا ”تم انگریز ہو تو اپنی تہذیب اپنے پاس رکھو۔ جن عورتوں کو تم بھیج کر لوں مجھ رہی ہو وہ تم سے اور تمہارے ملک کی عورتوں سے بہتر حال میں ہیں۔“

چارلس کیتھرن کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچے ہوئے نچی لیکن منظرانہ آواز میں بولا ”مفتول بحث میں۔ اور اس مقابلے وغیرہ کے پکڑ میں مت پڑو۔ ہم یہاں اس قسم کی احقانہ حرکتوں کے لیے نہیں آئے ہیں۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ان لوگوں سے معافی مانگ لیتا ہوں۔“

سیو بک نے اس کی بات سن لی ”وہ کیتھرن کے جواب دینے سے پہلے بولا ”اب یہ مقابلہ ملتوی نہیں ہو سکتا۔ اب تمہیں معافی نہیں مل سکتی۔“

اس دوران تماشاہنوں اور پہلوان اعظم کے قہقہے ختم ہو چکے تھے۔ میدان میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ چارلس متعجبانہ لیٹے میں سیو بک سے مخاطب ہوا ”میں تو تم سے صرف اس خط کے بارے میں بات کرتے آیا تھا جو تم نے استیصال میں ہمارے سفارت خانے کو لکھا تھا۔ یہ یہاں کیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے اسے روکو۔“

سیو بک کی آنکھوں میں ایک لخت ہلا کی سرد مری در آئی۔ وہ چارلس کو گھورنے سے بولا ”لیکن سا خط! کیا خط؟ میں نے کسی برطانوی سفارت خانے کو کوئی خط نہیں لکھا۔ میں کبھی کسی کو خط



میں کوئی لک نہیں تھا کہ اگر کیتھن اپنے آپ کو اس وار  
پہلے میں کامیاب نہ ہوتی تو صرف یہی اس کے لیے خاصا  
ثابت ہوتا۔ پتلون نہ صرف جھونک میں ایک بار پھر لڑکھڑائی  
اسے کیتھن کا ایک اور تکلیف دہ وار سہارا۔ کیتھن نے  
پتھر اگڑاتے ہوئے اپنی پٹے کی طرح اس کی تونگی میں گھونپ  
اگر اس کے پیٹ پر چلی کی موٹی جھین نہ ہوتی تو پٹے کی  
والاد ہاتھ شاید اس کی پشت تک ہی دھنسن جاتا۔ تاہم اس  
جس طرح پیچ ماری اس سے اس کی تکلیف کا اندازہ کرنا  
نہیں تھا۔

اس نے اپنے جہازی سے ہاتھوں میں کیتھن کی سرسری  
صراحتی وار کردن روڑنے کی کوشش کی۔ ایک ٹانے کے لیے  
دل اچھل کر حلق میں اٹکیا جب میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کوشش  
کامیاب ہو گیا تھا۔ کیتھن کو پیچھے ہٹنے میں صرف ایک ٹانے  
آخر ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ اب تو یہ گردن ٹوٹ کر ہی ان جٹ  
ہاتھوں کی گرفت سے چھوٹنے کی لیکن کیتھن نے ایک جٹے کی  
سستی دکھائی تھی دوسرے ہی لمحے اس کی حلقی گدی ہوئی۔ اس  
پتلون کی دونوں کانٹیاں گرفت میں لیتے ہوئے اچھل کر اس  
پتے پر ٹھانک ٹھانک کے انداز میں گھٹنے رسید کیے اور اس کی گردن  
مضبوط ہونے سے پہلے صاف گل گئی۔

پتلون اعظم کا چہرہ جس پر دوسرے پتلون سے مقابلہ  
دوران خراش تک نہیں آئی تھی اب خون میں تھرا ہوا ہوا  
تھا حالانکہ کیتھن نے اس کے چہرے پر کوئی وار نہیں کیا تھا۔ شاید  
وہ منہ کے بل کچھ زیادہ سی زور سے گرا تھا۔ اس کی ٹکری بھی بڑا  
جھمی اور شاید چیشانی کی جلد ٹوٹ وغیرہ بھی چٹ گئے تھے۔  
مٹی اور خون میں تھرا جانے کی وجہ سے وہ مت خوفناک نظر آتا  
تھا لیکن ایک لحاظ سے اس کی یہ حالت قابل رحم بھی تھی۔ کیتھن  
گویا ایک چھٹاوا تھی جو اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔

اس نے گویا اپنی اپنی کچھ طاقت جمع کرتے ہوئے طاقت  
عمدی سے کیتھن پر چھلانگ لگائی۔ اس وقت اس سے اتنی پہل کی  
وقع تھی بھی نہیں تھی۔ کیتھن اس کی گرفت میں آئے سے بل  
بال پئی۔ اس بار پتلون اعظم کی گدی پر کرانے کا ہاتھ چڑھ  
خرب اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ وہ اوپر جا کر اڑ رہا  
نہیں تھا۔

کیتھن مستحی سے ذرا دور کھڑی اس کے اٹھنے کی خطر  
رہی۔ اس بار اس نے اس کے ڈھیر ہونے سے قانع اٹھانے کی  
کوشش نہیں کی اور اس حالت میں اس پر کوئی وار نہیں کیا۔  
کو شاید ابھی پتلون اعظم کے اٹھنے اور کوئی کرشہ دکھانے کی اپنے  
تھی لیکن بے چارے پتلون اعظم صاحب اوپر سے قاپے  
رہے۔ سانس کی آہورفت کے ساتھ پٹیلوں کے زبردست کے ماب  
ان کے جسم میں حرکت کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔  
بالآخر کیتھن کو اندازہ ہو گیا کہ پتلون اعظم اب نہیں

مقابلہ نہیں کر سکتا تھا تو پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے کیتھن کو  
چھینچھا تھا جبکہ وہ پہلے ہی ایک پتلون سے مقابلہ کر کے بقیہ کچھ نہ  
بچے تھا ہوا تھا۔

وہ اچھل کر اٹھنے میں کامیاب ہو گیا اور اب ذرا مختار انداز  
میں آگے بڑھا۔ وہ دونوں شیم دائرے میں ایک دوسرے کے سامنے  
پکرانے لگے۔ اب وہ بقیہ کیتھن کو روڑنے کی فکر میں تھا۔ چند  
سیکنڈ میں ہی اس کی موٹی عقل میں یہ بات ضرور چلی گئی کہ پٹری  
کے معاملے میں شاید وہ کیتھن کو شکست دے سکے۔

وہ خود بھی جوڑ کرانے سے واقف معلوم ہوا تھا۔ اس نے  
بھی کیتھن کے انداز میں اپنی کے بل گھوم کر کیتھن کے منہ پر  
”چاپ سوئی“ رسید کرنے کی کوشش کی لیکن کیتھن اتنی آسانی  
سے مار کھانے والی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ نہ صرف تیزی سے  
بھٹائی دے گئی بلکہ اسی دوران اس نے اس کی پٹیلوں میں ایک  
اور لات رسید کر دی۔

پتلون اعظم بے اختیار ڈر اٹھا۔ اس کے پیچھے پٹیلوں میں  
بقیہ خاصی اٹھل چھل ہوئی تھی۔ شمع کو اب بالکل ہی صاف سوکھ  
گیا تھا۔ سب دم سادھے کیتھن ہی کو دیکھ رہے تھے اور انہیں  
گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

آخر کار پتلون اعظم کی وہی کیفیت ہوئی جو اس قسم کی  
صورت حال میں اس قسم کے لوگوں کی عموماً ہوتی ہے یعنی اس میں  
اگر رتی دورتی شکل موجود تھی تو وہ بھی جلد ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی  
اور وہ اپنی طاقت کے وحشیانہ اظہار پر ہی اتر آیا۔ اس نے ایک بار  
پھر سینہ گولی کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں شاید یہ مخالف کو  
حروب کرنے کا کوئی بہت عمدہ حربہ تھا لیکن کیتھن نے حروب  
ہونے کے بجائے اس کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے  
ایک بار پھر اس کی کمر پر اس طرح گھوم کر لات رسید کی کہ وہ  
اوندھے منہ جا کر۔

کیتھن نے اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اس کی کمر پڑی پر پے  
روپے کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ مٹھنی سے انداز میں حرکت  
کر رہی تھی۔ اس کی حرکات میں جتنی پہل تھی، پتلون اعظم  
ایسی ست پر گیا۔ اس نے اٹھنے میں چند لمحے صرف کیے اور اس  
دوران اس کی پٹیلوں پر بھی دو ٹھوکریں پڑ گئیں۔

کیتھن نے اب تک محض ٹھوکوں سے ہی کام لیا تھا اور  
ٹھوکریں ماما کر ہی اسے بے حال کر دیا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا کہ  
شاید وہ کرانے کے خاص انداز میں ہلک اور ہلک کے علاوہ  
خاص انداز میں اس ٹھوکریں مارنے میں باہر تھی جو ہڈیاں چٹکارتی  
ہیں اور انسان کے تمام اندرونی احصا کو اٹھل چھل کر کے رکھ دیتی  
ہیں لیکن چند سیکنڈ بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کیتھن کی مہارت  
صرف یہیں تک محدود نہیں تھی۔

پتلون اعظم نے ایک ٹانے کے لیے کیتھن کو سامنے پا کر  
اس کی چیشانی پر کرانے کی چاپ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس

پتلوان اعظم پر اپنی برتری ثابت کر دی ہے۔

"ہاں۔ ہاں۔ میں ضرور جواب دوں گا" سید بک اس کی طرف گردن تھما کر ذرا برہمی سے بولا "تم دوسرے پورے کئے والے لوگ ہیں۔ وہ ایک بار پھر گوم کر اپنے کو میں کو کچھ دیا بات دینے لگا۔ اس دوران جوم حشر ہونے لگا تھا لیکن صرف عورتیں ہی نہیں، مرد بھی سڑھڑ کر کیتھریں کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے جا رہے تھے۔

اسی اثنا میں ایک گدھا گاڑی وہاں لائی گئی جس میں صاف سحر اگر اچھا ہوتا تھا۔ پتلوان اعظم کو اس میں لٹایا گیا اور گاڑی ایک طرف گودوانے ہو گئی۔ شاید وہ اس گاڑی کی "سپر نیس" تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔

میں نے بھی آواز میں کیتھریں سے کہا "تمہاری آج کی کارکردگی دیکھ کر تو جین نہیں آ رہا کہ تین روز پہلے تم بحری جہاز پر اتنی آسانی سے جتر کے قلاب میں آ گئی تھیں۔"

"اس کی کئی وجوہات تھیں" کیتھریں مسکراتے ہوئے بولی "اس نے واقعی بالکل غیر متوجہ طور پر پیچھے سے آکر میری شہ رگ پر ہتھ رکھ دیا تھا۔ ذرا سی بھی حرکت میرے لیے مسلک ثابت ہو سکتی تھی۔ دوسرے وہاں جگہ بہت تنگ تھی۔ تیسرے جہاز پر چھاپا ہوا تھا۔ میرے دل میں چر تھا۔ میں کسی کے سامنے زیادہ لگایا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ایک عام اور معمولی سی لڑکی سی بنی رہنا چاہتی تھی۔ اس طرح کی کئی وجوہات تھیں جن کی بنا پر میں چند سیکنڈ کے اس واقعے میں بالکل سناٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ ویسے اگر تم جنرل کو ہلاک کرنے میں بھرتی نہ دکھاتے تو پھر شاید میں ہی کچھ کر کر سکتی لیکن شاید میں بھی ذمہ دار ہوتی۔"

پتا تو سید بک ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تم لوگ میرے ساتھ چلو۔"

ہم تینوں اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ میدان عبور کے ایک ایسی جگہ سے گزرا جو عموماً گاؤں کے میں بازار کی حیثیت رکھتی تھی۔ مزید کچھ حاصل ہونے کے لئے اور دائیں بائیں مڑنے کے بعد مکانات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب ہمارے سامنے ایک پھاڑی تھی جسے اوپر سے زراش کر اس پر مکان بنایا گیا تھا۔ یہ مکان بھی چوٹی تھا لیکن نہایت شاندار نظر آ رہا تھا۔ پھاڑی کو زراش کر مکان تک جانے کے لیے بیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ جبل کی طرز پر مکان کے چاروں کونوں پر بیڑھیاں بنائی گئی تھیں جن میں ایک ایک شخص مشین کن "اسٹینڈ برٹ" کیے کھڑا تھا۔ چاروں کونوں کا رخ چاروں سمتوں میں تھا۔ مکان کیا تھا! اچھا بھلا چھوٹا سا چوٹی محل تھا۔

ہمارے اوپر پہنچنے ہی ایک خادم نے دھک سے پہلے ہی کٹری کا بڑا سا گیت کھل دیا۔ یہ شخص بھی مسلح نظر آ رہا تھا لیکن خود سید بک کے پاس کوئی حصار نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اس کے شانہ طرز کے ہماری بھر کم اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں کچھ فرق تھا۔ تاہم معلوم ہی ہوا تھا کہ اسے خود اپنی

جسے وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے کسی سانس لے کر ہوا تو اپنے ہاتھ سے چاہت ہوئی "چلو اب اپنے پتلوان اعظم کو اغوا کرو۔ اس کی باتیں، مرتبہ ہی وغیرہ کا انتظام کو اور ہونے کے تو اس پر غور کرو کہ آئندہ اس کا پتلوان اعظم کا اسلحہ پر قرار دینا چاہیے؟"

سید بک کے چہرے پر ہمیشہ جیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی بیکر کو تک رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً میدان آئیلوں کے شور سے گونج میں نے اب تک ایک وقت ہر طرف نظر رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا "آئیل" صرف عورتیں سجاری تھیں اور ان چہرے کی اندر بونی جوش سے شمارے تھے لیکن فروری ان مردوں نے خنوار نظروں سے انہیں گھورا اور ان کے آئیلوں نے ہوتے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ چوں سے مسکراہٹ غالب

آج کے لئے کے وقف سے کیتھریں بولی "یہ میری سکا تھا لیکن نے زیادہ مدد کر کے سے بچنے کے لیے کافی احتیاط برتی ہے اگر اسے بت دی تو میں آئندہ بھی کسی وقت اس سے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔"

سید بک اب بھی خاموش رہا۔ کیتھریں میری اور چارلس کی بات دیکھ رہی تھی۔ چارلس کے چہرے کا اظہار اس وقت دہشت انگین ہوا اپنی خوشی اور جوش و خروش کو ایک عجیبہ ذرا اور میں لیکن میں چھپانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ اس وقت اس کی کیفیت اس باپ جیسی ہی تھی جس کی لڑائی کے عظیم الشان قریب میں اس پر جرات انگیز صلاحیتوں اظہار کے کوئی بڑا انعام دینا ہو جبکہ باپ کو اس سے پہلے علم پتا نہ ہوا کہ اس کی اولاد میں ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی تھیں۔

کیتھریں کو زراش تک نہیں آئی تھی لیکن چارلس اس کا ہاتھ لگاتے ہوئے ہوتے بغیر نہ رہا۔ "تم ٹھیک تو ہو جی؟"

کیتھریں کوئی جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھ کر اظہار سے اس دی اور دواد طلب انداز میں بولی "میں نے شاکر کو آگے لے لیا نہیں؟"

میں نے غصے کی سانس لے کر کہا "خدا اتم جیسی بنی ہوئی شاکر کو اس کی دوسری مثال تو تم مجھے استاد نظر آ رہی تھیں۔ معلوم نہیں تم نے کس خود کو میری شاکر قرار دے دیا ہے۔ میں نے تو اس کا کمال سمجھا تھا۔" میں نے دیکھا کہ۔

میں نے غصے کی سانس لے کر کہا "خدا اتم جیسی بنی ہوئی شاکر کو اس کی دوسری مثال تو تم مجھے استاد نظر آ رہی تھیں۔ معلوم نہیں تم نے کس خود کو میری شاکر قرار دے دیا ہے۔ میں نے تو اس کا کمال سمجھا تھا۔"

سید بک اس دوران اپنی زبان میں اپنے آدمیوں کو دایات پتلوان کی طرف اشارہ کر کے ان کے اشارے کو جاننے۔ دوسرے اشارے سے سید بک کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "اب آئندہ سوائس کے جواب دہ کے؟ میری بیٹی نے تمہارے

رات سے زیادہ اپنے گھر اور اہل خانہ کی فکر تھی۔

سیوہک کی قید میں ہم اندر پہنچے تو سامنے ہی طویل و عریض صحن نظر آیا۔ اس صحن میں ایک نہایت خوب صورت عورت ڈھیلے ڈھالے لیکن شانہ سے لباس میں ایک بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ پہلی نظر میں وہ عورت مجھے سفید فام معلوم ہوئی کیونکہ اس کی رنگت سرخ و سفید، آنکھیں نیلی، بال سرے لیکن مشرقی اور قس کی طرح اچھے لیے تھے کہ کولہوں سے بھی بچے جا رہے تھے۔ ہرگز نہ سرخی اور بال کٹے ہی تھے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہو گیا کہ وہ عورت بہر حال مشرقی ہی تھی۔ سیوہک نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن وہ ہم انہیوں کو دیکھتے ہی تیزی سے مڑی اور اندر کہیں چلی گئی۔

سیوہک نے ہمیں دائیں ہاتھ پر واقع ایک طویل و عریض نشست گاہ میں بلا لیا۔ اس میں پیش قیمت دھڑ قالین، خوب صورت آرام دہ گاؤٹیکے وغیرہ موجود تھے لیکن جدید طرز کا نشست گاہاں وغیرہ نہیں تھا۔ دیواروں پر گھیس آویزاں تھیں۔ اس طرز کی نشست گاہیں ہمارے قبائلی علاقوں میں بھی ہوتی ہیں۔ سیوہک کسی غلام کو طلب کرنے کے بجائے ہمیں بٹھا کر باہر جاتے ہوئے بولا "میں سمندر اری کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ جا چکا تو میں نے بچہ آواز میں چارلس سے کہا "اتنا تو مجھے اعزاز دے دو گیا ہے کہ یہ اس قبیلے کا سردار ہے لیکن تم اس کے پاس کیوں آئے ہو؟"

"پہلے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ محض اس قبیلے کا سردار نہیں ہے اور اس کی زندگی صرف اس گاؤں تک محدود نہیں ہے۔" چارلس آرام سے، کھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اب وہ بالکل پُر سکون نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو خیر مجھے اعزاز دے۔۔۔ اس حیثیت کے لوگ قریبی شہروں تک بھی آتے جاتے رہتے ہیں" میں نے کہا۔

چارلس گویا میری بات سے محفوظ ہوتے ہوئے ہنسا "تم قریبی شہروں کی بات کر رہے ہو، وہ تو دور دراز ملکوں تک جاتا رہتا ہے۔" "کیا کوئی کاروبار وغیرہ کرتا ہے؟" میں نے کچھ حقیقی کچھ مصنوعی سادگی سے پوچھا۔

چارلس ایک بار ہنر دھیرے سے ہنسا اور میری طرف جھٹکتے ہوئے نہایت دبی آواز میں بولا "جیسے شاید تمہیں نہیں آئے گا۔۔۔ وہ بہت اونچے درجے کا جرتی قافلہ ہے۔"

کیتریں بھی ذرا باپ کی طرف جھک گئی تھی۔ اس نے ذرا چمک کر باپ کی طرف دیکھا۔ میں نے بغور چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کتنے اونچے درجے کا؟"

"سفیروں۔۔۔ وزیروں اور سربراہان مملکت کو قتل کرتا ہے۔ بہت بھاری معاوضہ لیتا ہے۔ سی آئی اے، انجمنی کے جی بی، ماسلا وغیرہ کے کسی گھاک اور تجربے کار ایجنٹ سے زیادہ

سردار ہے لیکن جب یہ یورپ، افریقہ یا مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں۔۔۔ یا بحر امریکا، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں نظر آتا ہے تو ان کی پر قبائلی ہونے کا شہ بھی نہیں کر سکتا۔ دنیا کی کئی زبانیں، مذاہب، یوں ہے اور دنیا کے کئی خاص شہروں میں اس کا بنگلا یا بازار موجود ہے جس میں اس کی کوئی نہ کوئی راشر رہتی ہے۔ دنیا کی کئی ہر قوم کی عورت اس کی داشاکوں میں شامل ہے یا شامل ہو چکی ہے۔"

"سٹر چارلس! ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مجھے کسی الف لیلو کردار کے بارے میں بتا رہے ہو" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چارلس ٹھٹھری سانس لے کر بولا "اب تو الف لیلو ہی ہے چیز ہو چکی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ایک ہی الف لیلو جاری ہے۔ ہر نظام حکومت کی غاصبوں یا مصلحتوں کی وجہ سے جبکہ الف لیلو کردار جنم لے چکے ہیں۔ جب ہم پہلی بار ان کے بارے میں جانتے ہیں، ان کے قریب جاتے ہیں تو ہمیں جرت ملتا ہے۔ ہم بے یقینی سے سوچتے ہیں "اچھا۔۔۔ کیا دنیا میں ایسے لوگ ہیں؟ کیا دنیا میں ایسا بھی ہو رہا ہے؟" لیکن ہمارے لیکن کیا یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ دنیا بہر حال الف لیلو کردار ہے بھری پڑی ہے۔"

"تم اس کے پاس کس لیے آئے ہو؟ کسی کو قتل کرانا ہے؟ میں نے پوچھا۔ وہ ایک شہر پاور کا نمائندہ تھا اور رسالت لے رہا تھا۔ وہ ان کی جگہ سے مقررے جاتے رہنا شہر پاور کا وظیفہ ہے۔"

"نہیں۔ قتل نہیں کرانا ہے۔۔۔ بلکہ کسی کو قتل ہونے چاہتا ہے" چارلس نے سرکشوں میں جواب دیا۔

"کسے؟" میں نے جانتا چاہا۔

"ہیلڈی ڈاکا کو" اس نے جواب دیا۔

میں چند لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کیا۔۔۔ بغیر نہ سکا "اس خوب صورت اور بے ضرر عورت کو کون قتل چاہتا ہے؟ وہ تو سردار و مملکت بھی نہیں ہے۔ سیاست سے ان کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ کون قتل کرنا چاہتا ہے؟ یہاں آنے کی ضرورت نہ پڑتی" چارلس گہری سانس لے کر "وہیے ڈاکا سردار و مملکت نہ سہی۔۔۔ سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہ سہی۔ لیکن وہ ایک اہم شخصیت ہے۔ ایسی شخصیت کے قتل خواہ کوئی عہد نہ ہو، لیکن اس کا خاتمہ اس کی حیثیت کے لحاظ سے ہے کہ اس کی زندگی یا موت دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہو چکی ہے۔"

"کیا ہیلڈی ڈاکا کو قتل کرنے کا سٹرکٹ سیوہک کو ملتا ہے؟ میں نے دریافت کیا لیکن اسی لمحے باہر آہٹ اٹھی۔

پسند کریں تو وہ تقریباً تیار ہے، ورنہ چپکے چپکے انگریزی کھائے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں۔

اس انداز میں بکرا مارے ہاں بھی قبائلی علاقوں میں دوٹ کیا جاتا تھا۔ میں نے اور چارلس نے اسی کے حق میں دوٹ دیا۔ کیٹرین نے کندھے اچکا کر ہماری تائید کر دی۔ اس کے خیال میں کھانا بیانا اہم مسئلہ نہیں تھا۔

سیوبک بولا "کھانے پینے کا سلسلہ چلا رہے گا۔ لیکن میرا خیال ہے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو جانی چاہئیں۔ مشر چارلس! آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھئے۔"

"چند دن پہلے اسٹینل میں برطانوی سفارت خانے کو ایک گھنٹہ موصول ہوا جو فرانسیسی میں لکھا گیا تھا۔ "چارلس نے کہا اور خاموش ہو کر یوں سیوبک کے چہرے کا جائزہ لینے لگا گویا اس پر کوئی رد عمل تلاش کر رہا ہو لیکن سیوبک کا چہرہ ہر تاثر سے عاری رہا۔

چارلس نے سلسلہ کا کام جوڑا۔ "اسکاٹ لینڈ مارڈ اور برطانوی سیکرٹ سروس اس خط کے بارے میں فوراً حرکت میں آئی۔ ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت تو موجود نہیں، لیکن باور کیا گیا ہے کہ وہ خط تم نے لکھا تھا۔"

"باور نہیں، تم لوگوں کو فرض کرنا چاہیے تھا۔ سیوبک نے جھجکی یا شاید مشورہ دیا۔ لہجہ نہایت نرم تھا۔

"چلو۔ فی الحال ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ خط تم نے لکھا تھا۔" چارلس نے بحث نہیں کی اور بات جاری رکھی "تم نے اس خط میں خبردار کیا تھا کہ لڈی زاناکا ترکی کا جو دورہ طے پا چکا ہے اور جس کا شیڈول بھی بن چکا ہے اس کے دوران انہیں قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تم نے یہ نہیں لکھا تھا کہ اس قسم کی شخصیت کو قتل کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اگر اس کی جنگی اطلاع موجود تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کسی جنونی کی حرکت بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ جنونی یا اس قسم کے لوگ جن کے دماغ میں کوئی خناس ہوتا ہے وہ اچانک ہی ایسی کسی شخصیت پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"درست ہے۔" سیوبک آہستہ سے بولا۔

"برطانوی سیکرٹ سروس اور دیگر کئی ماہرین نے اس خط پر بہت غور کیا۔" چارلس بات جاری رکھتے ہوئے بولا "بظاہر اس کے چند مقاصد ممکن نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جب کوئی بڑی شخصیت کسی ملک کا دورہ کرتی ہے اور اس دوران اسے کوئی گزند پہنچ جاتا ہے تو سب سے پہلے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ میزان ملک پر الزام آتا ہے کہ اس کے سیکرٹری کے انتظامات ناقص تھے۔ برطانیہ اور ترکی کے تعلقات اس وقت دیسے ہی ایک اہم دورے کے زمرے میں ہیں۔"

سیوبک خاموش رہا اور سوڑے کے گلاس کو انگلیوں میں جھما تارہا۔ وہ کسی جھیل کی طرح پرسکون تھا۔ بلکہ جھیل کی سطح بھی ہوا سے خفیف سی لہریں پیدا ہونے لگی ہیں۔ سیوبک کے

چارلس سرگوشی میں بولا "تم خاموشی سے سب کچھ دیکھتے ہو۔ سننے سے رو۔ بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔"

چند سیکنڈ بعد سیوبک کمرے میں داخل ہوا۔ دو گلاس اس کے ہاتھ لے اٹھائے آ رہے تھے۔ ان میں شراب، و مسکیز و فیروہ کی ٹھیں، سوڈا، برف سب کچھ تھا۔

"میرے ہاں ہر مہمان کی تواضع اس کی معاشرت کے مطابق لی جاتی ہے۔" سیوبک چلنے ہوئے بولا "پہلے مشروبات کا دور چلے گا۔"

چارلس نے اپنے لیے و مسکی کا ایک ہلکا چمک تیار کیا اور کیٹرین نے اپنے لیے شیری پسند کی۔ میں ساکت بیٹھا رہا تو سیوبک نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ کچھ نہیں لے رہے؟" اس نے انگریزی میں نہایت ٹائٹلی سے پوچھا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو میرے لیے شربت بنفشہ۔۔۔ سکینچین یا پھر لسی سٹکو وینجے۔ میں نے دیکھے لیجئے میں کہا۔

"دیکھا۔؟ شربت۔۔۔؟" سیوبک کے لیے شربت بنفشہ، سکینچین اور لسی جیسے الفاظ بڑا مشکل تھا۔ وہ ہلکا کر رہ گیا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے ہاں ہر مہمان کی تواضع اس کی معاشرت کے مطابق کی جاتی ہے۔" میں نے معصومیت سے کہا اور لوگوں کی طرف اشارہ کیا "میری معاشرت میں تو ان کی تنجائش نہیں ہے۔"

"اوہ۔۔۔ میں سمجھا۔۔۔" سیوبک سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ پتے نہیں ہیں۔ میں بھی نہیں جانتا ہوں۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ چارلس نے اس کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا تھا اس کے بعد یہ جانتا میرے لیے واقف بات حیرت تھا کہ وہ پتا نہیں تھا چہرہ میرے لیے ایک گلاس میں برف اور سوڈا ڈالتے ہوئے بولا "ٹھیں۔۔۔ آپ صرف یہی پانی لیں۔"

"آپ کہتے ہیں تو لی لیتا ہوں ویسے میری معاشرت میں تو یہ بھی شامل نہیں ہے۔" میں نے گلاس تھامتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اب سیوبک بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

چارلس نے سیوبک کو مخاطب کیا "تم مسٹر افضل چوہدری کی باتوں میں مت الجھو۔ یہ بہت سنجیدگی سے مذاق کرتے ہیں۔"

"میرے ساتھ ٹریڈی بھی رہی ہے۔" میں نے اپنے لیے کو ٹھانک مانتے ہوئے کہا "جب بھی میں نے سنجیدگی سے بات کرنے کی کوشش کی اسے مذاق سمجھ لیا گیا۔"

"تمہ۔۔۔" سیوبک نے کندھے اچکا تے ہوئے موضوع بدل دیا مشروبات کے دور کے بعد کھانے کا سلسلہ ہو گا۔ بات پھر دہی معاشرت کی آجاتی ہے۔ ہمارے ہاں سالم کمرے کے پیٹ میں لالہ بکر کر اسے خاص مسائل کے ساتھ دوست کیا جاتا ہے اور ساتھ ایک خاص طرح کی پھولی پھولی ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگ

چاچکا ہوتا۔ بلکہ شاید ضائع بھی کیا چاچکا ہو گا۔

”جو پھر تم کھل کر بات کیوں نہیں کر رہے؟“ چارلس بولا۔  
نے تو کہا تھا کہ تم میرے ہر سوال کا جواب دو گے۔ تم تو پہلے ہی سوال کا جواب نہیں دے رہے۔“

”کبھی کبھی سوال خود اپنا جواب ہوتے ہیں“ سیو بک نے یہ کہتے ہوئے گھاس ہوٹنوں سے لگا لیا۔

چارلس پلو بول کر بولا ”بہر حال۔۔۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کنٹرینک تمہارے پاس آیا ہو گا۔ اس کے بغیر تم اس راز سے آگاہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں اس سلسلے میں خبردار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے کنٹرینک واپس کر دیا ہے۔ سلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ تم نے کنٹرینک کیوں واپس کر دیا؟ اگر واپس کر دی واپس تو اس سلسلے میں ہمارے سفارت خانے کو کیوں خبردار کیا؟ یہ تو تم جیسے قاتلوں کی ”غلا قیات“ کے خلاف ہے۔“

سیو بک چند لمحوں گھاس کو انگلیوں میں چھاتے ہوئے پُر خیال انداز میں اسی کو گھورتا رہا۔ کیتھرین اب آنکھوں میں ایک نئی دلچسپی لے لے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہالا سیو بک نے شاید ذرا کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لی لیا۔ وہ چارلس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے نہایت ہی دھیمی آواز میں بولا ”یہ درست ہے کہ کنٹرینک میرے پاس آیا تھا اور یہ بھی درست ہے کہ میں نے واپس کر دیا تھا۔ تمہارے آدمیوں نے اندازے لگانے میں مہارت دکھائی ہے۔ مجھے تمہاری حکومت سے یہی امید تھی۔“

”لوگوں کنٹرینک لے کر آئے تھے؟“ چارلس نے پوچھا۔  
”پانچ آدمیوں کا ایک گروپ تھا۔ وہ ایک چارزڈ طیارے میں آئے تھے“ سیو بک نے جواب دیا۔

”میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کا تعلق کس ملک سے تھا؟“ چارلس ملا ٹنٹ سے بولا۔

”یہ میں نہیں جان سکا۔ اگر جان بھی لیتا تو ہمیں نہ بتانا۔ اب تم مجھ سے کاروباری ”غلا قیات“ کو اس حد تک بھی ترک کر دینے کی توقع مت رکھو“ سیو بک نہایت لمبے لمبے بولا۔

”انہوں نے ہمیں کتنا معاوضہ آفر کیا تھا۔ یہ تو بتا سکتے ہو؟“

”ہاں۔ ایک ملین پاؤنڈ۔“

”ایک ملین پاؤنڈ؟“ چارلس نے حیرت سے دہرایا۔

”یہ تو میں صرف نقد رقم کی بات بتا رہا ہوں جو وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ ایڈوانس تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد مزید ایک ملین پاؤنڈ میرے سونے اکاؤنٹ میں چھل ہوتا تھا۔“ سیو بک مسکراتے ہوئے بولا۔

چند لمحوں کے لیے کمرے میں سکوت چھا گیا!

چہرے پر ذرا بھی ارتعاش نہیں تھا۔

”دوسرا مقصد شاہی خاندان کو ایک بڑے بحران سے دوچار کرنا بھی ہو سکتا ہے“ چارلس سلسلہ حکام جوڑتے ہوئے بولا۔  
”کیونکہ آج کل ویسے ہی عالمی پریس اور میڈیا میں پریس چارلس اور لیڈی ڈاناکا کے درمیان اختلافات کی خبریں گرم ہیں اور طلاق تک نوٹ و پختی بتائی جا رہی ہے اس لیے یہ شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں شاہی خاندان نے خود ہی تو ڈاناکا کو نہ مردا یا ہو۔ شاہی خاندان کے دھار کو اس سے سخت دھچکا لگ سکتا ہے کیونکہ شاہی خاندان میں آج تک اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ شاہی خاندان آج کل ویسے بھی مختلف افواہوں کی کچھ زیادہ ہی زد و بند ہے جن کے پیچھے کچھ مخصوص لاپیاں کام کر رہی ہیں۔ بہر حال ڈاناکا عوامی سطح پر بھی خاصی مقبول شخصیت ہے۔ اس کے قتل پر برطانیہ میں خاصا شدید رد عمل بھی مرتب ہو سکتا ہے جو ملک کو اپنی جنگ کچھ نئے مسائل سے دوچار کر سکتا ہے۔“

چارلس نے ایک لمبے کے لیے غامض ہو کر مری سانس لی  
”چنانچہ لیڈی ڈاناکا پر قاتلانہ حملے کا امکان بڑھ گیا ہے۔ اس لیے ہم نے اس خط کو دوبارے کی بڑبجھ کر نظر انداز نہیں کیا لیکن حقیقتات کے بعد ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ تم نے وہ خط کیوں لکھا؟“

”تم نے کیوں فرض کر لیا کہ وہ خط میں نے لکھا تھا؟“ سیو بک نے پُر سکون لمبے میں پوچھا۔

چارلس ملا ٹنٹ سے بولا ”دیکھو۔۔۔ اگر ہم انجمن اور معصوم کہیں کر شکوک کریں گے تو بات آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم دنیا کے ایک نہایت مہنگے اور اونچے درجے کے اجرتی قاتل ہو۔ بہت سی خاص الخاص فنیسیوں کو قتل کرنا تمہاری دہڑ شہرت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری یہ شہرت صرف چند افراد تک محدود ہے۔ یہ بھی ایک الگ مسئلہ ہے کہ ایک تو ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے آج تک تمہارا کچھ نہیں لگا دیا جاسکا۔ دوسرے تم خود اپنی حفاظت کرنا بڑی جانتے ہو۔ کوئی نیکرٹ ایجنٹ یا ایسپی کو شش بھی کرے تو شاید تمہیں ہلاک نہ کر سکے۔“

اس موقع پر میں نے سیو بک کے بٹنے بٹنے سفاک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک رستی خود اور ہوتے محسوس کی۔

چارلس مریٹانے لمبے میں بولا ”اس لیے اب اس بات کو بھلا نا تو چھوڑ دو کہ وہ خط تم نے لکھا تھا۔ میری جیب میں کوئی تمہا سا نیپ ریکارڈز وغیرہ پوشیدہ نہیں ہے جس پر تمہارا یہ اعتراف جرم ریکارڈز ہو جائے گا۔“

”مجھے معلوم ہے کہ تمہاری جیب میں کوئی نیپ ریکارڈز وغیرہ نہیں ہے“ سیو بک اب ذرا مسکرایا ”مگر مجھے اس قسم کا کوئی شبہ ہوتا تو تم لوگوں کی غلاشی لے کر اب تک وہ نیپ ریکارڈز برآمد کیا

لازوال کمائیوں کے خالق  
انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے  
ایک نئی سوغات

## رقص ابلیس

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کمائی بن گئی۔  
ایک آشفستہ حال کی داستان عبرت جسے قانون نے مجرم بنا دیا  
قیمت - /150 روپے

ناشر - مکتبہ القریش سرگزرہ روڈ بازار لاہور 2

کمال حاصل کر لینے ہیں، کسی بڑے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، اسے صنعت کا درجہ دیتے ہیں، اس قابل ہو جاتے ہیں کہ آپ کے محض ایک اشارے پر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے تو پھر نہ جانے قاعدے قانون کمال چلے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ بعض اوقات خود آپ کو سارا دے کر اونچے سنگھاس پر بٹھاتے ہیں پھر نہایت ادب و احترام سے آپ سے مذاکرات کرتے ہیں۔ یہ تفاوت، یہ تضاد آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

لڑی ڈانکا کھلاک کرنے کے لیے سیوہک کو دو ملین پاؤنڈ کی چٹکس ہوئی تھی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم سات کروڑ سے اوپر تھی لیکن مجھے رقم پر حیرت نہیں تھی۔ ایک سپر اور کے شاہی خاندان کی ایک نہایت اہم اور ممتاز شخصیت کو قتل کرنے کا یہ معاوضہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں غریبوں کے دونوں سے منتخب ہونے والے کسی اسمبلی کے ممبر کو دوسرے ادھر لڑ چکے، کسی معاملے میں ”ہاں“ کرنے یا کسی معاملے میں ”نا“ کرنے کا اتنا معاوضہ مل جاتا ہے۔

حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس معاملے میں برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ بیٹا اس شخص سے نہایت دوستانہ ماحول

سیوہک بگور چارلس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چارلس کی بڑائی پر فکریں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر سوال کرنے کے لیے نہایت احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ احتیاط کے ساتھ سیوہک کو جواب دے رہا تھا۔ چارلس تو خیر ایک غیر رکی قسم کا ڈپلومیٹ اور غیر روایتی قسم کا معاملہ ساز تھا لیکن سیوہک بھی اس وقت اپنے انداز گفتگو سے کوئی ڈپلومیٹ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ جس سنجیدگی، سہانت اور ادب و احترام سے دونوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی اس سے یہ گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک نہایت اونچے درجے کا پیشہ در آجرتی قاتل تھا۔

اس دور کا المیہ یہی ہے کہ اس میں قتل و غارت اور دہشت گردی وغیرہ ایک بڑی صنعت یا شاید بہت بڑے فن کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ اگر آپ چھوٹے موٹے توہی ہیں اور غصے میں یا غلطی سے کسی نے کسی معقول وجہ کے تحت بھی کسی کو قتل کر دیتے ہیں تو آپ قاتل ہیں، پولیس آپ کو پکڑنے کے لیے حسب مقتدرہ کوشش کرے گی اور اگر آپ اس کے بچے چھ گئے تو امید کی جے کہ آپ کا مشر خاں صبرت تاک ہو گا لیکن اگر آپ اسی کام میں

میں بات چیت کر رہا تھا جو لیڈی ڈانکا کا قاتل بھی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس شخص کو بین الاقوامی قوانین کے تحت اپنے ہاں بلوانے یا اپنی کسی ایجنسی کے ذریعے اغوا کرانے اور اسکاٹ لینڈ وغیرہ میں اس سے تحقیق کرنے کے بجائے اس کے ویر دہشت پر حاضر ہو کر معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر یہ کوئی پاکستانی معاملہ ہو تا اور کوئی پاکستانی نمائندہ اس قسم کے ذراکرات کر رہا ہو تا تو مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوتی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس مہرے سانس لے کر بولا۔  
”تم نے دو لیڈین پاؤں کا یہ کنٹریکٹ منکروا؟“  
”ہاں۔“ سیو بک نے اختصار سے جواب دیا۔

”کیوں؟“ چارلس نے جانا چاہا۔  
”میری مرضی۔“ سیو بک کا جواب اب بھی مختصر تھا۔  
چارلس نفی میں سر ہلاتے ہوئے طاقت سے بولا۔ ”میرا خیال ہے اس کا جواب اتنا سادہ نہیں ہو سکتا۔“  
”شاید جواب مختصر ہونے کی وجہ سے تمہیں اتنا سادہ لگ رہا ہے۔“ سیو بک مسکرایا۔ ”مگر میں ذرا تفصیل سے جواب دوں گا تب بھی معلوم ہی ہو گا۔“

”پھر بھی۔“ میں چاہتا ہوں تم ذرا مکمل کر بات کرو۔“  
چارلس کے لیے میں مہذبانہ اصرار تھا۔  
”مکمل کرو میں نے آج تک اپنی پوری بات نہیں کی۔“  
”ہیو ہی سے تو خواہ تم بالکل ہی بات مت کرو۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔“ چارلس خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

سیو بک ایک لمحے کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ”ہیں۔۔۔ کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ ایک تو میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو قتل نہیں کیا۔ دوسرے مجھے اس عورت کی اب تک کی زندگی میں کوئی زیادہ بڑی خفاہ نظر نہیں آئی۔ کسی کی نجی زندگی سے میں کوئی مطلب نہیں رکھتا لیکن کسی بھی دوسرے زاویے سے یہ عورت کسی بھی اعتبار سے مجھے انسانیت کی مجرم نظر نہیں آتی۔“

”اوہ ہو۔۔۔“ چارلس استہزائیہ انداز میں دھیرے سے ہنسا۔ ”مگر آتم بہت نیک قسم کے قاتل ہو۔ صرف ان لوگوں کو قتل کرتے ہو جو تمہیں انسانیت کے مجرم نظر آتے ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ ایسا بھی بات نہیں ہے۔“ سیو بک ہلکی سی ناگواری سے بولا۔ ”تاہم میں چونکہ ہر امرے غیرے کو قتل کرتا نہیں پھر۔۔۔ میرا نشانہ بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے ماضی میں مجھے کچھ نہ کچھ گستاخانہ مل جاتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ یا یوں کہو کہ ان کی غلطیوں کے اثرات بہت بڑے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا ذرا سا غلط فیصلہ ہزاروں انسانوں کی زندگیاں برباد کر دیتا ہے۔ لاکھوں انسانوں کو ذمہ دار مقرر کر دیتا ہے یا انہیں اذیت ناک موت کی آغوش میں پھانسا دیتا ہے۔ کیا میں

جھوٹ کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں درست ہے۔“ چارلس نے تسلیم کیا۔

”تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ آج کی دنیا میں جنہیں بڑے لوگ کہا جاتا ہے وہ کچھ ایسی مثالی زندگی گزار کر بڑے نہیں بنے نہ جانے کیا کیا جوڑ توڑ کرتے ہیں۔ ان کا اعمال نامہ نہ جانے کئی کیسی خفاخوش سے بھرا ہوتا ہے۔ میں بے شک معاوضہ کے لئے قتل کرتا ہوں اور اپنا مطالبہ معاوضہ ملنے پر کسی کو بھی قتل کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی اپنے دل کے اطمینان کے لیے اس کے اعمال نامے میں سے کوئی نہ کوئی جواز چن لیتا ہوں کہ فلاں شخص اس وقت پہ شک ہوا نیک نام تھا۔ بڑے اوسٹے مقام پر فائز تھا۔ بے شمار لوگ اس کے نام کی مالا جب رہے تھے لیکن اپنی فلاں حرکت کی وجہ سے وہ موت کا مستحق تھا۔ وہ انسانیت کا مجرم تھا۔ اسے تو مت پہلے مرنا چاہیے تھا اور بڑی جبرناک موت مرنا چاہیے تھا۔“

”تمہیں خراب۔“ گویا تم بڑے ناخیر قسم کے قاتل ہو۔“ چارلس کا لہجہ اب بھی قدرے استہزائیہ ہی تھا اور میرا خیال تھا سیو بک یہ بات کچھ ناگوار گزر رہی تھی۔

”نہیں۔ مجھے ناخیر ہونے کا دعویٰ نہیں۔“ سیو بک دائیں سے بولا۔ ”میں اپنے آپ کو اس جواز سے صرف اس لیے مطمئن کرتا ہوں کہ رات کو آرام کی نیند سو سکوں۔ کوئی کنٹریکٹ ہوا کرنے کے بعد بھی میرے ذہن پر کوئی بوجہ نہ ہو ورنہ اس قسم کے کام انسان خواہ کتنا ہی بھاری معاوضہ لے کر کرے اور اس کے اعصاب خواہ کتنے ہی مضبوط ہوں لیکن کبھی نہ کبھی وہ اندر سے ضرور جھنجھٹے لگتا ہے جبکہ میں بالکل مطمئن اور سرور ہوں۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو مضطرب یا پریشان محسوس نہیں کیا۔“

”ہیڈی ڈانکا کو قتل کرنے کا تمہیں کوئی مضبوط جواز نہیں مل سکا؟“ چارلس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ میرے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ ”سیو بک نے جواب دیا۔ ”مجھ ہی طور پر بات صرف یہی ہے کہ میرا دل نہیں چاہا۔“

”چلو۔۔۔ مان لیا۔۔۔“ چارلس نے سر ہلایا۔ ”قصہ مختصر کہ تم نے کنٹریکٹ واپس کر دیا لیکن تمہیں پھر بھی یہ یقین ہے کہ لڈی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمہارا خیال ہے یہ بدگمان ملوث نہیں ہوا؟“

”خیال نہیں۔۔۔ بلکہ مجھے یقین ہے یہ بدگمان ملوث نہیں ہوا۔ اسی لیے تو میں نے تمہارے سفارت خانے کو تمام خط و کتابت ضبط دینے کی کوشش کی تھی ورنہ مجھے اس ذمت کی کیا ضرورت تھی؟“ سیو بک جیسے لمحے میں بولا۔

”تم نے یہ ذمت کیوں اٹھائی؟“ چارلس نے جانا چاہا۔  
”یوں نہیں۔ میں نے سوچا اس عورت کو قتل نہیں ہوا چاہیے۔“ سیو بک کندھے اچکا کر بولا۔ ”میں نے اس شخص کو

کی صورت میں لاحق ہوتا۔ ظاہر ہے جو لوگ اس قسم کے کنٹرول لے کر آتے ہیں وہ بھی معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے بھی کچھ طاقتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔

"تم اس کی پروا مت کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بچوے گا۔"

چارلس نے گویا اسے ٹھکرا دیا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی اعتبار کے ساتھ تو میں زندہ ہوں۔" وہ ایک خاص قسم کی بے نیازانہ خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔ مجھے اس کے انداز میں کسی حد تک ٹیکڑی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ "مجھے خیر وعافیت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے تمہاری حکومت کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

"میں تمہیں مدد کی پیشکش کر رہی نہیں رہا۔" چارلس نے فوراً گویا اس کی خوش فہمی دور کی۔ "میں تو ویسے ہی تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ ایک اندازہ ظاہر کر رہا تھا۔ اچھا۔۔۔ یہ تاؤ۔۔۔ تمہارے خیال میں کنٹرول اب حمان ہی کے پاس ہے؟"

"مجھے کچھ ایسی ہی خبریں ملی ہیں۔ اور میرا خیال ہے وہ درست ہیں۔" سیوہک نے جواب دیا۔ "اب وہی لیڈی ڈانکا کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں چار چھ کنٹرولنگ ہی کیے ہیں اور بتا ہے وہ کسی میں ناکام نہیں رہا۔"

"اگر وہ لیڈی ڈانکا کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ ہمارے لیے بڑی شرم کا مقام ہوگا۔" چارلس بولا۔ "تم اسے روکنے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں۔۔۔؟" سیوہک نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ "میں ایک اکیلا حقیر سا آدمی بھلا تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"زیادہ کمر فکس سے کام مت لو۔ ہمیں معلوم ہے تم کتنے حقیر ہو۔" چارلس بولا۔

"میری صلاحیتیں اور میری "فخربانی" اپنی جگہ سہی۔ لیکن فرد بہر حال فرد ہی ہوتا ہے اور خوش حال بہر حال خوش حال ہی ہوتی ہیں۔ تم ایک حکومت کے نمائندہ ہو۔ حکومت بھی معمولی نہیں۔۔۔ بلکہ ایسی حکومت جو کبھی تقریباً پوری دنیا پر قابض رہی ہے۔ جس کی حدود میں کبھی سورج ہی غروب نہیں ہوا تھا۔"

سیوہک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"پرانی باتیں مت کرو۔ آج کے دور میں وہ کربات کرو۔"

چارلس ملاٹھٹ سے بولا۔

"آج بھی تمہارے ملک کا شمار پہاڑوں میں ہے۔ تمہارے پاس پولیس ہے۔ فٹری انٹیلیجنس ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے۔۔۔ انجیل میکٹ سروس ہے۔ میرے عقائد کی تمہیں بھلا کیا ضرورت ہے؟"

"ہم اپنے سارے محکموں کو تو اٹھا کر یہاں نہیں لاسکتے۔ کسی

تمہارے سفارت خانے کو بپ دے کر اپنی زندگی اور اپنے کیریئر کے لیے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے کیونکہ جو لوگ میرے پاس کنٹرول لے کر آتے تھے وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ ان کا منصوبہ ناکام ہو۔۔۔ اور اگر منصوبہ ناکام ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان کا شک مجھ پر جائے گا کیونکہ میرا انکار سننے کے بعد میرے ہی سامنے غیر ارادی طور پر ان میں سے ایک کے منہ سے نکل گیا تھا کہ پھر جان سے بات کر لیتے ہیں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ انہیں اتنی بے مہربانی سے میرے سامنے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میں انجان سا بنا رہا تھا جیسے میں نے یہ بات سنی ہی نہیں تھی۔"

"تمہارے عقائد کے لیے میں واقعی پتہ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔" چارلس حقیقی ممنونیت سے بولا۔ "میں تم سے پوچھنے والا تھا کہ تمہارے بعد کنٹرولنگ کس کے پاس گیا ہوگا؟ میں ابھی اس سوال کے لیے مناسب الفاظ ہی تلاش کر رہا تھا۔ مجھے زیادہ اُمید نہیں تھی کہ یہ بات تمہیں معلوم ہوگی۔ اور اگر معلوم ہوگی تو تم مجھے بتانا پسند کرو گے یا نہیں؟ اچھا ہوا تم نے پوچھے بغیر ہی بتاؤ۔"

"جب میں نے تمہارے سفارت خانے کو خط لکھنے کی حماقت کرنی ڈالی اور تم لوگوں کو معلوم ہوئی گیا کہ خط میں نے لکھا تھا تو اب کوئی بھی بات چھپانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔" سیوہک فوراً بے پروائی سے بولا۔

"اب تم خاصی کچھ داری سے بات کر رہے ہو۔" چارلس کے لیے میں اب اچھی خاصی محبت جھلکے لگی تھی۔ "لیکن تم ہمارے سفارت خانے کو خط لکھنے کی حماقت مت قرار دو۔ میرے خیال میں تو تم نے زندگی میں پہلی بار ایک دھچک کا کام کیا ہے۔ تم ہماری حکومت کی گٹھ جوڑ میں آگئے ہو۔"

چارلس نے گویا سیوہک کو خوشخبری سنائی تھی لیکن وہ منہ غائب ہوئے بولا۔ "مجھے تمہاری حکومت کی گٹھ جوڑ میں آکر کیا ملے گا؟ میری حیثیت تو تبدیل نہیں ہو جائے گی۔ تمہارے ملک بہت جن ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے پاس میرا تھوڑا بہت ریکارڈ موجود ہے وہ تو جوں کا توں رہے گا۔ اس میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔"

"نٹائیہ۔" چارلس ہنس رہے تھے میں بولا۔ "لیکن ہم کم از کم یہ کوشش ضرور کریں گے کہ کنٹرولنگ واپس کرنے سے تمہارا جو نقصان ہوا ہے اس کی کچھ نہ کچھ ملانی ہو جائے۔"

چارلس کی دانست میں شاید یہ بھی سیوہک کے لیے ایک خوشخبری تھی لیکن سیوہک نے اس پر بھی کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ کم از کم کوشش تو ہرگز ظاہر نہیں کی۔ وہ منہ جاتے ہوئے بولا۔

میں نے کنٹرولنگ واپس کر کے اور تمہاری حکومت کو بپ آف کر کے اس سے زیادہ خطرہ مول لیا ہے جتنا مجھے کنٹرولنگ قبول کرنے



گزیر ہو جائے تو وہ اس کا کچھ توڑ کر سکیں۔

"کوئی گزیر نہیں ہوگی۔" چارلس نے ایک بار پھر اسے اطمینان دلایا۔ "جس طرح تمہاری نظر میں زبان اور دوسرے کی کوئی اہمیت ہے، اس طرح میری نظر میں بھی ہے۔ تمہارے علاوہ سب افسانہ چوہدری بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "دو اپنی انتظامات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم دونوں کو ساتھ لے کر میں ایک طرح سے بالکل غیر روایتی انتظام کر رہا ہوں۔ اب تم مجھے عمان کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میں نے خفیہ محکموں کی جو فائلیں دیکھی ہیں ان میں مجھے اس شخص کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملیں۔"

"میں گی بھی نہیں۔" سیو بک بولا۔ "وہ ایک افسانوی سا کردار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے ہم پیشہ لوگوں میں سے بھی کسی نے کبھی اسے دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں بہت سی باتیں ہمارے حلقوں میں مشہور ہیں۔ وہ شاید نسلاندہ دہلی ہے اور اسرائیلی فوج میں خدات انجام دے چکا ہے لیکن یہ بات تصدیق شدہ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کوئی طور پر جو باتیں معلوم ہیں وہ بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔" وہ ہلکے پلٹے ہوئے ایک لمبے لمبے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ "اس کے بارے میں ایک بات تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے شکار کو کسی دھماکا خیز چیز سے قتل کرتا ہے۔ موقع کی مناسبت سے کسی بھی قسم کا کوئی بم استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی ہزار ہا قسم کے بم ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ ان سب پر اضافی مطلب ہوتا ہے۔ ان ایجادات سے جتنا فائدہ اٹھاتا ہے اتنا شاید ہی کوئی اٹھاتا ہو۔"

وہ ایک بار پھر کسی سوچ میں اُلجھ گیا۔ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر پُر خیال انداز میں اپنی مونچھ کو لمبی دینے ہوئے بولا۔ "اس کے بارے میں دو سری اہم باتیں محسوس کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ بڑا زبردست حساسی کتابی آدمی ہے۔ اپنی واردات کی تفصیلات وہ بڑے سنجیدگی سے حساب کتاب سے لے کر اپنے گھر کے دروازے تک درج کرتا ہے۔ اس کی واردات کا انداز بتانا ہے کہ اگر اس کے شکار کو اس کے اندازے کے مطابق کسی خاص مقام پر پہنچنے میں تاخیر ہو جائے تو اس کی واردات ناکام بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی آمد اندازہ ہی کسی ایسی چیز کے بارے میں لگاتا ہے جس میں تاخیر امکان ہی نہیں ہوتا۔"

"تمہارا کوئی آٹا ہے؟" چارلس نے دریافت کیا۔ سیو بک مزید انداز میں مسکرایا۔ "وہ میری طرح جڑواں اور بنیادوں والا آدمی نہیں ہے۔ وہ تو محض ایک چلاؤ اور مارتا ہے۔"

"پھر بھی۔۔۔ آخر تک اس سے رابطہ تو کرتے ہوں گے۔" کتنی بھی اونچی چیز سی۔ لیکن پھر حال سے تو اُترتی چلی۔ "محض افسانوی کردار بن کر تو نہیں رہ سکتا۔ اسے سرکش کی

اہم شخصیت کے دورے کے موقع پر زیادہ سے زیادہ دو چار خاص خاص آدمی آجاتے ہیں۔ زیادہ تر تو میزبان ملک کے انتظامات پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہم شہر شرابا نہیں چاہتے۔ اس سے بدنامی ہوتی ہے۔ اسکیٹل بننے ہیں۔ پریس عجیب عجیب افسانے تراشے لگتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کسی کو کانوں کان خبریں نہ ہو اور خللہ بھی نہ لگ جائے۔ بس چند افراد اس معاملے سے آگاہ ہوں۔ اصل میں وہی اس معاملے کو سنبھالیں۔ باقی سب روایتی انتظامات معمول کے مطابق نظر آئیں۔ اس لیے میں تم سے مدد کی درخواست کر رہا ہوں۔"

"میں جو مدد کر سکتا تھا وہ میں نے کر دی ہے۔ یعنی تمہارے سفارت خانے کو خط لکھ کر خبردار کر دیا ہے۔" سیو بک بولا۔

"وہ مدد تو اپنی جگہ ہے اور اس کے لیے ہم تمہارے جتنے شکر گزار ہیں اس کا اندازہ تمہیں جلد ہی ہو جائے گا لیکن اس کے علاوہ بھی تم ہماری خاصی مدد کر سکتے ہو۔" چارلس نے اصرار کیا۔

"میں تمہارے ساتھ اسٹیبل میں جا سکتا۔" سیو بک بولا۔ "میں کبھی کسی ایسے پروگرام کے مطابق اس گاؤں سے باہر نہیں جاتا جس کا دوروں کو علم ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری احتیاط بندی میں ہی تمہاری جگہ ہے۔" ورنہ اب تک تمہارے جانچے ہوئے یا کسی حکومت کے چتے چڑھ چکے ہوتے لیکن اب اللال تمہارے لیے محفوظ ہو۔ یہ تو تمہارا اپنا گاؤں ہے اور تمہارے پیچھے ایک خطرناک جنگجو قبیلہ ہے۔ پتینا یہاں تم اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہو گے لیکن میرے ساتھ چلے وقت بھی تمہیں اندیشوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنی مدد کے لیے جس میں ساتھ لے جاؤں گا اور اس وعدے کے ساتھ لے جاؤں گا کہ کوئی حکومت تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ویسے بھی کسی حکومت کو تم پر ہاتھ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہارے خلاف کہیں بھی کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ورنہ شاید اب تک تم پر ہاتھ ڈالا جا چکا ہوتا۔"

سیو بک کسی سوچ میں غم دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد چارلس بولا۔ "کیسا سوچ رہے ہو؟ تمہیں میرے وعدے پر اعتبار کرنا چاہیے اور اپنے اس قلعے سے لگنا چاہیے۔" "اگر انگریزوں کے وعدے کا قطعی اعتبار ہوتے تو ایک زمانے میں وہ پوری دنیا پر قبضہ نہ کر پاتے۔" سیو بک مسکراتے ہوئے بولا۔ "مفتخر مزاج کو چھوڑ دینا۔ اگر تمہارا اب ایسی بے گوار قوم بھی نہیں ہے جسکی تم سمجھ رہے ہو۔ اس لمبی بحث میں مت الجھو۔ فی الحال کام کی بات کرو۔ تمہیں لیڈی ڈانکا کے دورے کے موقع پر اسٹیبل میں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"چھوڑا۔ ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گا لیکن مجھے قیلے میں کچھ خاص لوگوں کو اس سلسلے میں آگاہ کرنا ہوگا۔" سیو بک گویا یکدم ہی فیصلے پر پہنچے ہوئے بولا۔ "تاکہ اگر میرے ساتھ کوئی

اصرار رہا جب اس نے بیوی جی جھڑپ اٹھائی تو اسے کچھ زیادہ ہی ہنسی آئے گی۔ بکرا ہڈی سی ٹھنڈی میں ایک اسٹینڈ پر اس طرح رکھا تھا کہ اس کی چاروں اودھ کی انگلیں جھٹ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

”آخر تمہیں اتنی ہنسی کیوں آ رہی ہے؟“ سیدک ہمیں تنبیہ کی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے یہ سب کچھ قلمی مظلوم رہا ہے۔“ وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی ”مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم سب اداکار ہیں اور کسی نام نہاد شہسوار کی قلم کا سین ٹوٹ کر رہے ہیں۔ یہ سب بھراؤ بڑا سادہ سا عمل ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ اسے لے چوڑے پکڑوں میں کیوں پڑتے ہیں۔“

”میں تو زندگی گزار رہی ہوں سادہ سا عمل ہے قانون! سیدک مریانہ انداز میں بولا۔ ”لیکن دنیا کے خانوے لیسہ لوگ، بے شمار بکھیروں میں اٹھنے نظر آتے ہیں۔“

کیتھرن کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے چھری سے ٹکے کی ران سے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹانے لگی۔ سیدک بولا ”زندگی ایسی رنگارنگی کا نام ہے۔ جو جس طرح زندگی گزار رہا ہے گزارے دو۔ ہر ایک کا اپنا ایک لاکھ اشکال ہے اور اسی سے دنیا دلچسپ نظر آتی ہے۔ اگر دنیا میں سب سیدھے ساوے انداز میں زندگی گزارنے لگیں تو دنیا کیسی بے کبک نظر آنے لگے اسکول، خانقاہ یا مدرسہ نظر آتے لگے۔“

اس کے بعد ہم خاموشی سے کھانا کھاتے، لگے چارلس بدستور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے شاید سیدک اور کیتھرن کی گفتگو سے کھٹکنا بھی نہیں سنی تھی۔ وہ غصہ سے سیدک سے مخاطب ہوا۔ ”میں ان تمام اختلاعات کا جائزہ لے چکا ہوں جو لیڈی ڈانکا کے دربار سے ملے ہیں کیے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کے درمیان کہیں کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ لیڈی پر کوئی طاقتور حملہ ہو سکا ہے۔ سیدک مٹی کے سلسلے میں جو لوگ لیڈی کے قریب رہیں گے ان کا بھی قصور پکاراؤں میں سے دکھایا ہے سب پرانے لوگ ہیں۔ کوئی بچنے والا نہیں لگتا۔“

”اس دنیا میں کسی کے بچنے نہ بچنے کے بارے میں ہمیں کوئی بات وفاق سے نہیں کہنی چاہیے۔“ سیدک نے گویا اسے نصیحت کی۔ ”سربراہان مملکت کے خصوصی باڈی گارڈز تک پک جاتے ہیں جنہیں برسوں کی چھان بین کے بعد رکھا جاتا ہے۔“

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”ویسے تمہیں کہاں سے ملے گا اسکاٹن نظر آتا ہے؟“

”میرے خیال میں کوئٹہ اندر سے نہیں باہر سے ہو سکتی ہے۔“ چارلس بولا۔ ”یعنی لیڈی کے گرد جو حفاظتی حلقہ ہو گا اس میں کچھ نہیں ہو گا۔ باہر سے کچھ ہو گا۔ حمان کا جو نقشہ تم نے کھینچا ہے اس سے مجھے لگتا ہے کہ وہ لیڈی کی آمد کے وقت ہی کچھ کرنے

ضرورت تو پڑتی ہوگی اور کچھ طاقتوں کو اس کی خدمات کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ رابطے کا کوئی طریقہ تو ہونا ہو گا۔“

”یقیناً ہے۔ ایک ٹیلیفون نمبر کے بارے میں مٹا ہے کہ اس پر کچھ اشاریاتی سے انداز میں پیغام بھیجا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ”سٹراچ“ کے لیے ہے۔ یہ بھی مٹا ہے کہ اس ٹیلی فون نمبر کا تعلق ایک مسودنی تنظیم کے ریسائز سربراہ سے ہے۔ حمان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت کس ملک میں ہے لیکن پیغام ہر حال اس تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگ کسی انجمنی کے سے خیر انداز میں پیغام دینے والوں کے بارے میں تحقیقات کرتے ہیں کہ کیا وہ اپنے مقصد میں سنجیدہ ہیں۔ پھر بڑے ٹھکانے پھراؤ کے بعد حمان ان سے خود رابطہ کرتا ہے اور کہیں طاقت لے پاتی ہے۔ اس کام میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔

تھوڑے پاس اب ایک وقت نہیں ہے۔ اور اگر وقت ہو تو اب بھی شاید حمان تم سے نہ ملے۔ کنٹرول لے ہو جانے کے بعد تو وہ پیغام تم سے نہ ملے گا۔ یہ کہ اسے معلوم ہو جاتا تم ایک غیر روایتی قسم کے برطانوی لیڈی ہو۔ وہ سمجھ جاتا کہ تمہاری طاقت کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔“

سیدک یہ تفصیل سنا کر خاموش ہو گیا۔ چارلس بھی خاموش تھا اور کسی ہمراہی سوچ میں تھا۔ میں نے سیدک کی گفتگو کا ایک ایک لفظ لگاتار توجہ سے سنا تھا لیکن ظاہر میں اس کی طرف کچھ زیادہ متوجہ نہیں تھا البتہ کیتھرن پوری طرح اس کی طرف متوجہ نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی اس بات چیت میں پوری دلچسپی لے رہی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ سیدک اس کی شخصیت میں خاص دلچسپی لے رہا تھا۔ اسے سنجیدہ موضوع پر بات کرنے کے لیے بھی برابر اس کی نظریں کیتھرن کے سر پر آئے تھیں لگتی تھیں اور ان کی کمرالی میں گویا کچھ چنگاریاں ہی ملنے لگتی تھیں۔

اس دوران ہمارے سامنے قالین پر لہجہ واد سترخان بچا کر کھانا کھایا جانے لگا تھا۔ گوکہ ہمیں وہاں آنے کا دور ہو چکا تھی اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ اتنی دیر میں ہمکے کے ہوتے میں کامل بھرکرا سے روٹ نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس سے پہلے کی تمام باتیں بھی خاصا وقت لیتی تھیں مگر بکرا سترخان پر ہنکا تھا۔ شاید اس کی تیاریاں پہلے ہی سے جاری تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹرس میں بڑی بڑی چمکتی دکنی چھریاں بھی سجادی گئی تھیں۔ کھانے کے دیگر لوازمات بھی چلے آ رہے تھے تقریباً پورا کراہی مختلف اشیاء اور برتنوں وغیرہ سے بھر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہاں کم از کم پندرہ افراد کے اعزاز میں لمبیت پر مختلف ضیافت ہونے والی تھی۔

سیدک کے اصرار پر بالآخر ہم دونوں ہو کر کھانے کے لیے بیٹھے تو اس قدر اہتمام دیکھ کر کیتھرن کو ہنسی آنے جاری تھی کہ اسے کو تو پھر جانے کے لیے جاری نہیں تھی لیکن سیدک کے

پاکستانی، انڈین اور چائینز  
کھانوں پر مشتمل اپنے طرز  
کی واحد اور مکمل کتاب

پیش کن گائیڈ

قیمت: 76/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

کی کوشش کرے گا۔ ان پورٹ سے لے کر مہم ارقی عمل تک کے راستے میں کچھ کرنا کسی حد تک آسان ہوگا۔ اس سڑک پر ایک جگہ تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ سڑک کو کوشش کی جارہی ہے کہ لیڈی کے دورے سے پہلے پہلے وہاں کام مکمل کر لیا جائے اگر مکمل نہ ہو سکا تب بھی اس دن وہاں کام بند کر دیا جائے گا جس روز لیڈی ڈانٹا آ رہی ہوں گی۔ اس مقام پر بی الخال سڑک بھی ٹک ہے۔ وہ جگہ میری نظر میں ٹک رہی ہے لیکن میں نے سیکورٹی والوں کو وہاں خصوصی توجہ دینے کی ہدایت کر دی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" میں اس جگہ کا معائنہ کیے بغیر بھلا کیا رائے دے سکتا ہوں۔" سیو بک بولا۔ "میں تمہارے ساتھ اسٹینل چلوں گا اور ان تمام انتظامات کا جائزہ لوں گا۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا کہ کہاں کیا کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" چارلس بولا۔ "تم ہمارے ساتھ ہی اسٹینل چلتا۔"

اس کے بعد ہم خاموشی سے کھانا کھاتے تھے۔

○●○

سیو بک ہمارے ساتھ ہی اسٹینل آیا تھا اور برطانوی سفیر کے گھر میں ہی صبح صبح تھا۔ اسی کی موجودگی میں اس رات پہلی بار میری بھی برطانوی سفیر سے ملاقات ہوئی۔ چارلس نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سیو بک سے ملنے وقت برطانوی سفیر کے اندر میں کچھ زیادہ مگر تجویز نہیں تھی۔ شاید اسے یہ صورت حال کچھ پسند نہیں آتی تھی کہ ایک آجرتی قاتل کے متوقع حملے سے بچنے کے لیے دوسرے آجرتی قاتل کی خدمات حاصل کی جا رہی تھیں اور اسے اپنے تمام سیکورٹی کے انتظامات میں جھانکنے کا موقع مل رہا تھا۔ تمام سفیر نے اپنی ٹائپنگ کی کا واضح طور پر اہتمام نہیں ہونے دیا۔ اس کے دینے سے مجھے اندازہ ہوا کہ برطانوی حکومت کی نظر میں واقعی چارلس کی بڑی اہمیت تھی۔ چارلس کے کسی بھی ٹیبلے کے سامنے سفیر بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔

سیو بک ہمارے ساتھ اسٹینل پہنچا تو اس سیو بک سے قلعی مختلف نظر آ رہا تھا جسے ہم نے اس کے گاؤں میں دیکھا تھا۔ وہ جدید فیشن کے سیاہ سوٹ میں تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کا ہی فلیٹ ہیٹ تھا۔ ہاتھ میں برف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی مسزز بزنس مین یا کسی بڑی کمپنی کا انجینئر لگتا تھا۔ وہ رہتا لیکن اس کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ایسا بات ضرور تھی جو اسے ایک مشکوک انسان ظاہر کرتی تھی۔ شاید اعمال کے مطابق ہر انسان کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی تاثر ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن شاید ہر آنکھ اسے محسوس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور ظاہری روپ سے دھوکا کھا جاتی ہے۔

اس روز تو ہم آرام کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے کیونکہ رات

گئے وہاں پہنچے تھے۔ دوسرے دن چارلس نے ہم تینوں کو یعنی مجھے، سیو بک اور کیتھرین کو سیکورٹی کے انتظامات سے آگاہ کرنا شروع کیا پھر اہم افراد سے ملایا جو مختلف محکموں سے تعلق رکھتے تھے اور سیکورٹی کے انتظامات کو کنٹرول کر رہے تھے۔

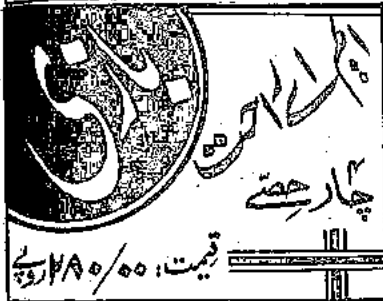
صرف سیو بک نے ان سے چند سوالات کیے۔ میں اور کیتھرین خاموش ہی رہے۔ ہمیں بات تو یہ تھی کہ میں صرف چارلس کے اصرار پر ساتھ کھنٹا پھر رہا تھا ورنہ میں اس معاملے میں خود کو قلعی غیر متعلق سمجھتا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی مجھے اس طرح کے کسی معاملے میں حصہ لینا پڑے گا۔ مجھے اس قسم کے معاملات کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ میں تو بس ایک خاموش تماشا کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں چارلس مجھے اہمیت دے رہا تھا اور اگر پہلوؤں پر مجھ سے رائے طلب کر رہا تھا۔ میں محض کامن سینس کی بنیاد پر مختصر جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمارے پاس جائزہ دینے والے کے لیے وہی ایک دن تھا۔ اس سے اگلے روز لیڈی ڈانٹا کو آنا تھا۔

آخر کار ہم ان پورٹ سے ایوان صدر تک جانے والی سڑک کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم اسی شاہ مریٹرڈ میں تھے جس میں سیو بک کے گاؤں گئے تھے۔ ہمارے پیچھے کرے نیلے رنگ کی ایک اور بڑی سی گاڑی میں اسٹینل کا پولیس گنسر اور ڈسٹن اٹلی جنس کا ایک آفیسر موجود تھا۔ وہ لوگ ضرورت پڑنے پر ہمیں سک رہا کے انتظامات کے بارے میں کچھ حیران کن معلومات دیتا



# پوٹھال

قمر اجلاوی قیمت: -/125



ہم تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ نقادوں نے پر نہایت خفیہ ی دستک ہوئی۔ کسی نے محض ایک اٹکل سے نہایت آہستگی سے دروازہ کھٹکنا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے محض احتیاطاً بجک آئی سے باہر جھانک کر دیکھ لیا۔ میرے خیال میں اس قسم کی رازدارانہ دیکھن زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتی تھی۔

بجک آئی سے جھانک کر میں کمری سانس لے کر رہ گیا۔ کیا تیرن تھی۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا اور نہایت مؤثرانہ انداز میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اس وقت پھر بڑے کمر فری قسم کے لباس میں تھی جو دیکھنے والوں کو انجی بجلی آواز میں ڈال سکتا تھا۔ اس کی اکھیں میں لہجے اور بجلی سی سکرٹ دہلی ہوئی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے وقت اس نے شر سے انداز میں میرے منہ پر گواہوں چھوڑا اور دوہم سے بیڑ پر جا کر رہ گیا۔ میں ہانک مہمانوں کی طرح ایک کمری پر بیڑ گیا۔

”تمہیں معلوم ہے سیوگ آج شام میرے ساتھ ٹھٹھ جانے کی فکر میں تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پیپا کے ساتھ دھکا دیا ہے۔“ اس نے گویا مجھے اطلاع دی۔

”تمہیں پتہ چلنا چاہیے تھا۔ اس میں کیا حرج تھا۔“ میں نے نہایت ملائمت سے کہا۔

”یہ تم کہہ رہے ہو؟“ اس نے مجھے گھورا۔

میں نے بوجھ اڑھ دیکھا اور سادگی سے کہا۔ ”ہاں۔“

خیال ہے میں ہی کہہ رہا ہوں۔ کمرے میں اور تو کوئی موجود نہیں ہے۔“

”تم بڑے ہی خبیث آدمی ہو۔“ وہ ٹھٹھ سانس لے کر رہا۔

”کاش تم میرے لیے رقابت میں مبتلا ہو سکتے!“

”تمہیں معلوم ہی ہے آج کل میرے حالات کچھ نہیں

کسی عمارت میں بلندی پر موجود رہنا چاہیے جہاں سے ہم چاروں طرف نظر رکھ سکیں بلکہ ہم میں سے دو افراد مرکز کے ایک طرف ہوں اور دو دوسری طرف ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے پاس دور مار رائفیں بھی ہوتی چاہئیں اور جدید واک ٹانگی بھی۔ جن پر ہمارا چاروں کا ایک وقت ایک دوسرے سے رابطہ رہ سکے اور ہم پولیس کو بھی ہدایات دے سکیں۔“

”کھجک ہے“ میں نے سب انتظامات کرادوں گا۔“ چارلس بلا ٹال ہوا۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھان کس سمت سے اور کس طرح حملہ کرے گا۔ وہ لاپتہ کر کے ذریعے راکٹ تو فائر کرنے سے رہا۔“

”اس سے یہ بھی بعید نہیں ہے۔“ سیوگ ہوا۔

”اس طرح تو وہ خود بھی بچ کر نہیں جاسکتا۔ کیا خلیفہ معاویہ کے لیے وہ جان بھی دے دے گا؟ اگر وہ زندہ ہی نہ رہا تو دولت اس کے کس کام کی؟“ چارلس ہوا۔

”اس بارے میں یقین سے کچھ مت کہو۔“ سیوگ نے گویا مشورہ دیا۔ ”وہ آج تک پکڑا نہیں جاسکتا۔ اب تک کارپکازڈ کی بتاتا ہے کہ اپنا کام وہ خود ذاتی طور پر کرتا ہے۔ کسی پر مجبور نہیں کرتا اور پیشہ جاتے واردات کے آس پاس ہی کہیں موجود ہونے کے باوجود کبھی نہیں پکڑا جاسکتا۔ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ تھان محض ایک سامنے کا نام ہے۔ فی الحال ہمیں بھی یہی فرض کر کے اپنا کام کرنا چاہیے۔“

”جیسے تم کو گئے ویسے انتظامات ہو جائیں گے۔“ چارلس نے اسے یقین دلایا۔ ”میں کوئی گریز نہیں ہوتی چاہیے اور ہمیں کو ان معاملات کی بھنگ نہیں ہونی چاہیے ورنہ دنیا بھر کے اخبارات و رسائل اور ٹی وی چینلز کو ایک نیا موضوع مل جائے گا۔ بات کا چنگیز بن جائے گا۔ اس میں سے بڑے پھولواٹش کر لیے جائیں گے۔ برطانوی حکومت اور شاہی خاندان کے لیے ایک نیا دوسر کھڑا ہو جائے گا۔“

”ہم سب مل کر کوشش کریں گے کہ ایسا نہ ہو۔“ سیوگ کے لیے میں غلوم تھا۔ ”ہم حال ہمیں اس کتنے کو نہیں بھولنا چاہیے کہ تھان بھوں کا اپنی شلٹ ہے۔ وہ اپنے شکار کو پیشہ کسی نہ کسی قسم کے بم پلاٹ کے ذریعے ہلاک کرتا ہے۔ اپنے گرد پیشہ پر نظر رکھتے وقت اس صورت حال کو ضرور ذہن میں رکھنا ہو گا۔“

سیوگ کی بتائی ہوئی بات پہلے ہی سے میرے ذہن میں تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے بتایا تھا تھان بڑا حساسی کتالی آدمی تھا۔ میں اس نقطہ نظر سے بھی ہرج کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گرد پیشہ کا تقبیل جائزہ لینے کے بعد آخر کار ہم لوٹ آئے۔

شام کو میں اپنے کمرے میں تھا اور تازہ دم ہونے کے بعد بازار سے خرید ہوا ایک نیا سوٹ زیب تن کئے ایک کمری پر بیٹھا سوچ

سیو بک لیزڈ ڈانکا والے معاملے میں ہماری مدد کر رہا ہے؟ کس وہ خواہ تو وہ ہماری توجہ دلاتا تو نہیں پھر رہا؟

”بھائی میں جائے سیو بک اور لیزڈ ڈانکا۔ مجھے ان دونوں سے

بلکہ ہمارے پورے رطانیہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”خدا کا پناہ! اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔“ اس طرح تو

مت کو کم از کم لیزڈ ڈانکا کے بارے میں قوت کو۔ وہ ہمارے

ملک کی ہونے والی ملکہ ہے۔“

”ہوگ۔“ میں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے ”میں تو

اس دن کا بھڑھڑا ہوا جب دنیا میں ہر لڑکی شہزادیوں کی طرح اہم

ہوئی اور ہر عورت کی اسی طرح حفاظت ہوگی جس طرح کسی ملکہ کی

ہوتی ہے یا پھر شہزادوں اور ملکہوں کی اسی طرح پھر کریں گی جس

طرح عام لڑکیوں اور عورتوں پر ملتی ہیں۔ تم خود ہی سوچو یہ کوئی

انصاف تو نہیں ہے ایک عورت کی حفاظت کے لیے زمین آسمان

ایک کیے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ پھول سی پتیاں ہوتی ہیں

جنہیں درندے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور سہانہ طریقے سے مسل کر

پھینک دیتے ہیں۔ مزید ظلم یہ کہ وہ بھی پکڑے بھی نہیں جاتے۔“

”وہ میرے خدا۔“ ”کیسے سب سے پیشانی پر ہاتھ مارا۔“ تم

بھی اس اعتقادے انتخاب کی آرزو میں گرفتار ہو۔ یہ جس کسی کا بھی

خواب ہے، بالکل غلط ہے اور کبھی پورا نہیں ہوگا۔ خدا نے سب

انسانوں کو برابر پیدا نہیں کیا لہذا کوئی اور انہیں کس طرح برابر

لا سکتا ہے۔ اس کو اس کو چھوڑو اور سیو بک کے بارے میں

سوچو۔“

”میں آج کل تم جیسی حسین اور صبران لڑکی کے بارے میں

فہم سوچ رہا ہوں۔ تم مجھے اس بد بخت کے بارے میں سوچنے کے لیے

کہہ رہی ہو۔ مجھ پر اتنا ظلم مت کرو۔“ میں نے گراہ کر کہا۔

”آج صبح تو تم لیزڈ ڈانکا کے دورے میں اور باقی سب باتوں

میں بڑی دلچسپی لیتے پھر رہے تھے۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”میں صرف پھر رہا تھا۔ دلچسپی لینا اور بات ہوتی ہے۔“ میں

نے ہجج کی۔ ”میں تو میں کل بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا اور مجھ

سے جو مدد ہو سکی وہ بھی کروں گا۔ لیزڈ ڈانکا پر کاٹنا نہ ملے گی اگر

واقعی کوئی کوشش ہوتی نظر آئی تو اسے بھی ناکام بنانے کی اپنی سی

کوشش کروں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس معاملے

سے واقعی کوئی دلچسپی ہے۔ یہ بس ایسے ہی ہے جیسے انسان چلنے چلنے

سہراہ کسی کو کر کے دیکھ کر اٹھنے کے لیے سارا دے دیتا ہے۔ میں

اس کا یہ مطلب پر گز نہیں ہوتا کہ اسے اس کے کرنے کے اسباب

سے اس وقت سے یا اس شخص کی ذات سے کوئی دلچسپی ہوتی

ہے۔“

”تم عجیب آدمی ہو۔“ ”کیسے سب سے پیشانی پر ہاتھ مارو۔“

”بے شک۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر تم غور سے دیکھو تو

ہمیں دنیا کا ہر انسان عجیب نظر آئے گا۔ زیادہ نہیں تو خود زراعت

پس۔ سب سے پہلے دیکھ کر شاید کبھی مشکل کے طور پر ہی رقابت میں

جٹا ہو جاؤں لیکن فی الحال مجھ غریب کو ان پکڑوں میں پھنسانے کی

کوشش مت کرو۔ پہلے پکڑی ختم نہیں ہو رہی۔“

وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نیم دا آنکھوں سے میری طرف

دیکھتی رہی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں ایک بار پھر کہا۔

”جس محترم سیو بک کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا۔ آخر وہ ایک

عظیم شخصیت ہے۔ اس میں خرابی بس یہی ہے کہ تھوڑا سا شادی

شہر واقع ہوا ہے لیکن ہمیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”پھر اس مت کرو۔ میں تم سے سنجیدگی سے بات کر رہی

ہوں۔“ وہ واقعی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”پاپا اپنی دانت میں

اس شخص کو چھپنے میں آنا کر ساتھ ساتھ لے پھر رہے ہیں لیکن نہ

جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ شخص ہمارے لیے بڑی پریشانی

کا باعث بنے گا۔ آخر وہ ہے تو اجرتی قاتل۔“

”اب کیا کیا جائے۔“ میں نے بے چارگی سے کہا۔ ”مجھے تو

لگ رہا ہے دنیا میں اجرتی قاتلوں کی تعداد بہت ہی تیزی سے بڑھ

رہا ہے۔ ان کے مقام، عمر بے اور واردات کے طریقے مختلف ہیں

لیکن بنیادی طور پر وہ سب اجرتی قاتل ہیں۔ لگتا ہے جلد ہی وہ وقت

آجائے گا جب انہیں مستقل دستیاب نہیں ہوں گے۔ پھر اجرتی

قاتل ایک دوسرے کو ہی قتل کریں گے۔“

”ختم ہوا نہیں مت کرو۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں یہ

کہہ رہی تھی۔ تم نے اس شخص کی طرف غور سے دیکھا ہے؟

اس کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں جیسی چمک ہے۔“

”مگر کہ یہ وہ سانپوں کے ساتھ آنکھ بھولی کیلٹا ہو۔“ میں نے

خیال ظاہر کیا۔ ”یا پھر سالم سانپوں کا سوپ چٹا رہا ہو۔“

”کیسے سب سے پیشانی پر ہاتھ مارو۔“

”پھر اسے اندر ہی بڑی خرابی ہے کہ جب ہمیں سنجیدہ ہونا

چاہیے اس وقت ہمیں کامیابی کا شوق چرانے لگتا ہے اور جب

ہمیں ہمتا کیلٹا چاہیے اس وقت کو تمہارے بن کر بیٹھ جاتے ہو۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو؟“ میں نے گراہ کر کہا۔ ”میں کوئی کامیاب

ہوں جو کامیابی کروں گا؟ میرے خیال میں تو ہر موقع ہی نہایت

سنجیدگی کا ہوتا ہے اور میں نہایت سنجیدہ و مدبر آدمی ہوں۔“

”واقعی۔“ اس نے محضی سانس کے اثرات میں سر ہلایا۔

”نہ تو چاہ رہا ہے اسی سنجیدگی سے تمہاری اس جھکی ٹانگ پر

کرانے کا ایک ہاتھ رسد کر کے اسے پیش کے لیے چھٹی کروں

جس کی ایک کروں ہمیں استاد تسلیم کر چکی ہوں اور استاد پر ہاتھ نہیں

اٹھاتا چاہئے۔“

”اور اگر میری طرف سے اجازت ہو؟“ میں نے کہا۔

”تب بھی مجھے اپنی جان عزیز رہے گی۔“ وہ مسکرائی پھر وہ

بڑی بڑی ہونٹیں ہونٹیں گود میں رکھ کر بولی۔ ”دیکھو۔ خدا

کے لیے سنجیدگی سے بات کرو۔ کیا ہمیں واقعی امید ہے کہ

عجب ضرور نظر آئے گا۔

”یہ خیال ہے سید بک تم سے بھی زیادہ عجیب انسان ہے۔“  
وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”لیکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔“ میں نے تسلیم کیا۔  
”اگر میں مدھرتے کا حرم نہ رکھتی ہوتی تو ضرور اس کی ذات  
میں اتنی ہی دلچسپی لینے کی کوشش کرتی جتنی وہ میری ذات میں لے  
رہا ہے۔“ وہ بولی۔

”کیا تم واقعی مدھرتے پر مبنی ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”جیسے ابھی اس میں شک ہے کیا؟“ اس نے مجھے گھورا۔  
”جیسے۔۔۔ ویسے ہی۔“ یقین سامنے آتا۔ اچانک ہی ہوا ہے تا  
یہ حادثہ۔“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔

”انسان کی زندگی میں ایسے اٹھکات اچانک ہی آتے ہیں۔“  
”اور اگر یہ اٹھکاپ نہ آتا ہو تو تم کیوں سید بک کی ذات میں  
دلچسپی لیتیں؟“ میں نے جانتا پوچھا۔

”وہ دلچسپی قطعی غیر مذہبی اور کاہنہ داری ہوتی۔“ کیتھن  
بولی۔ ”وہ میرے لیے اور ان سینڈی کیس کے لیے جن سے میرا  
تعلق بہت پرے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔“

”کوئی حیرت نہیں وہ پہلے ہی کسی سینڈیکٹ کا آدمی ہو اور وہ بھی  
تم میں اسی نقطہ نظر سے دلچسپی لے رہا ہو۔ یہ دنیا کھڑا خانہ کباب  
ہے یہاں بھی کبھی سانپ سانپ کو بھی کاٹ لیتا ہے۔“ میں نے  
ٹھٹکی سانس لے کر کہا۔

”اس میں تو خیر کوئی حرج نہیں۔ زہر کسی کو بھی نہیں چڑھا۔“  
وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میں محسوس کرتی ہوں سید بک کی  
دلچسپی دوسری قسم کی ہے۔ جیسے مظلوم ہے عورت ان باتوں کو  
اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ بلکہ میرا خیال ہے عورت انہی باتوں کو اچھی طرح  
محسوس کر سکتی ہے۔“ میں نے سہلے ہوئے کہا۔

کیتھن ایک لمبے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر  
باہر سے لٹھری سانس لے کر بولی۔ ”اس وقت تم حفاظت پر  
اُترے ہوئے ہو۔ کوئی بھی بات سید جی طرح نہیں کرے گا۔“ پھر وہ  
جائے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چھا“ سنجیدگی سے صرف یہ بتاؤ  
مجھ تو تمہارے ساتھ چلوں گا؟“

”ہاں وہ تو میں پہلے ہی کہ چکا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
”پاپا بے جا ہے تم پر ہمت کیے کر رہے ہیں۔ حالانکہ تم نے  
آج کے کپڑے سروے کے دوران کچھ زیادہ زبان نہیں کھولی۔“

”انسان کو زبان کے بجائے پاؤں زیادہ چلائے چاہئیں۔“  
میں نے غور سے انداز میں کہا۔

”یہ بات بھی تم صرف زبان سے ہی کہہ رہے ہو۔ تمہاری  
معملی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔“

”صحت لانا اندازہ لگا رہی ہو میرے بارے میں۔“ میں نے

مخبر سے لے کر میں کہا۔ ”کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ جب ہاتھ  
پاؤں چلانے کا موقع ہوتا ہے تو پھر مجھ سے بہتر کارکردگی دکھانے والا  
ذرا مشکل سے ہی ملتا ہے۔“

”بڑی خوش قسمتی ہے جس میں اپنے بارے میں؟“  
”اگر یہ خوش قسمتی ہے تو تم نے مجھے استاد کیوں مان لیا ہے؟“  
میں نے فوراً پوچھا۔

”مجھ میں؟“ حجت میں آکر۔ ”وہ کھدھے اُچکا کر بولی۔  
”میں ابھی تمہیں دو چار ہاتھ دکھا رہا ہوں جس کے بعد تم اپنی  
محبت واپس لینے پر مجبور ہو جاؤ گی۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”جیسے کسی۔“ وہ ہاتھ سے مجھے رکنے کا اشارہ کر کے  
دروازے کی طرف پڑتے ہوئے بولی۔ ”زناہ خوش میں آنے کی  
ضرورت نہیں۔“

میں نے واپس کر پی پڑھتے ہوئے کہا۔ ”ویسے یہ جو تمہارے  
مجھ پر کچھ کہنے کی بات کر رہی تھیں تو مجھے لگتا ہے تمہارے پاپا کو  
لوگوں پر کچھ کہنے کی خاصی عادت ہے۔ وہ تو سید بک پر بھی کئی  
کچھ کہہ رہے ہیں۔“

”اسی لیے تو جس زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت ہے۔ میں  
تم سے یہی تو کہنے آئی تھی۔ تمہارا حراؤ حرا کی بات تھی۔“ وہ لٹھری  
سانس لے کر بولی۔

”میں تو صرف تمہاری باتوں کے جواب دے رہا تھا۔ اپنی  
طرف سے تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔“ میں نے کہا۔

”بہر حال۔۔۔ کل ہوشیار رہنا۔“ وہ رخصت ہوتے ہوئے  
بولی۔

○●○

دوسرے روز ہم لوگ ان پورٹ سے آنے والی سڑک کے  
توبہ واقع ایک عمارت کی چھت پر موجود تھے۔ اس روز اتوار  
تھا۔ ترکی میں ہفتہ وار تفصیل اتوار کو ہوتی تھی۔ سڑک کے دونوں  
طرف بیشتر عمارات کاہنہ داری تھیں اور چھٹی ہونے کی وجہ سے  
خالی تھیں کیونکہ تمام روزاتر بند تھے۔ جن عمارات میں کچھ لوگ  
موجود بھی تھے ان سے بھی معذرت کر کے انہیں چار کھٹے کے لیے  
لٹال دیا گیا تھا۔ تمام عمارتوں کے دروازے بند کھدھے تھے۔

سڑک پر برائے نام ٹریفک تھا۔ کچھ دیر بعد یہ بھی رک جانا  
تھا۔ لڑی ڈانٹا کی کالٹ لیا۔ کچھ پتھنا تھی جبکہ ہم ان پورٹ سے  
چار میل کے قاصیہ پر تھے اور ہم صبح آٹھ بجے ہی اس جگہ پہنچ گئے  
تھے جہاں لٹال اور دیر تھیں ہو رہا تھا۔

ایک بار پھر نئے سرے سے اس جگہ کا تفصیل جائزہ لیا گیا  
تھا۔ کنسٹرکشن کھیتی دانوں نے اپنی تمام مشینری سڑک سے پیچھے  
دی تھی۔ دونوں طرف کی سڑکیں اچھی طرح صاف کر دی گئی  
تھیں۔ سڑک کے کنارے کنارے کئی دور تک پتھنی لے لے لے رہے تھے۔  
میں کی دیوار کھڑی کر دی تھی تاکہ کاغذ کا ڈیڑا زیادہ بکھرا ہوا دکھائی

ہم لوگ راتیں لے جھٹ پر گھات لگائے اس کا انتظار کر رہے تھے؟ مان بلی کا ہڑ کے ذریعے اور سے تو نہیں اسکا تھا۔ اگر اس وقت کسی پیشی اطلاع کے بغیر کوئی بلی کا ہڑ فضا میں نمودار ہوتا تو کوئی پوچھ مجھ کے بغیر ہا توڑا سے گرا دیا جاتا۔

میں رات نکل کی دور بین کے ذریعے لہجے دار میں کی چادریوں سے بنائی تھی اس دیوار کو دیکھ رہا تھا جس کے عقب میں لہجہ اور غیرائی مشینری وغیرہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس دیوار میں بین کی سب سے مکی چادر پر سفید بینٹ تھا جبکہ باقی چادریں بغیر بینٹ کی تھیں۔ اگر سفید بینٹ والی اس چادر میں لہجے نہ ہوتے تو وہ سنیما کی اسکرین معلوم ہوتی۔

کیترین مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ رات نکل کو دھیں رکے منڈیر کے ایک چوکور سوراخ سے جھانک رہی تھی۔ وہ گردن میری طرف کھاتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”تم اس وقت کیا محسوس کر رہے ہو؟“

”میں عجیب سی متضاد کیفیت کا شکار ہوں۔“ میں نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے سیو بک کی بات ٹھیک بھی محسوس ہوتی ہے کہ جو کہہ رہا ہے وہ نہیں کہیں ہو گا لیکن میں اس سکوت کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ اتنے انتظامات کی موجودگی میں کچھ اور اہمیت مشکل ہے مگر اس کے ساتھ ہی میری کوئی نامعلوم سی حس مجھے یہ احساس بھی دلا رہی ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ فضا میں جیسے کسی شیطانی سی چیز کی موجودگی کے اثرات پھیلے ہوئے ہیں۔“

سیو بک عمارت کے دوسرے کونے پر تھا۔ وہ ہماری بائیں نہیں سن سکتا تھا۔ ہمارے ہی منہ سے ہوا تھا کہ وہ دل و جان سے ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ میرے خیال میں تو حقیقت بھی یہی تھی۔ اس کا کیترین کے بارے میں زاویہ نظر کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن کم از کم اس معاملے میں وہ بھی چارلس جتنی ہی تشویش زدہ تھا۔

جھٹ پر دو پولیس والے بھی سادہ لباس میں موجود تھے۔ وہ احتیاطاً عمارت کے عقب میں دور تک نظر آنے والی دوسری عمارات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کانٹری کپ میں مجھے اور کیترین کو قہر بوس میں سے کافی لاکڑی۔ پھر وہ چارلس اور سیو بک کو کافی دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے منظر سے نظر ہٹائے بغیر دو گھنٹہ بھرے اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ کافی مجھے ابھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر دور بین آنکھوں سے لگائی۔ اس بار دور بین کا زاویہ ذرا اوپر تھا۔ تب میں نے دیکھا سرک سے کچھ دور ایک بہت ہی بڑی کمری تھی جو دور بین کے بغیر ہی بڑی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے کل بھی اسی طرح کھڑے دیکھا تھا۔

باغی کی سون کی طرح کریں کا یوم فضا میں بلند تھا اور دور تک

اس جیسے میں دونوں طرف ہر رفتار چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ کے نصب تھے۔ رکاوٹوں اور توڑ پھوڑ سے خبردار کرنے کے لیے دن ہی شرح بنیاں گھوم رہی تھیں۔

سرک کے کنارے موجود تمام مشینری کو پولیس اور اعلیٰ کے ماہرین نے ایک بار پھر چیک کیا تھا۔ کہیں کوئی مٹھوک چیز بھائی گئی تھی۔ اس روز سائٹ پر کہنی کا کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ اس سائٹ آفس میں بند تھا۔ ان کی جگہ چپے چپے پر پولیس اعلیٰ جس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔

میں نے پایا تھا کہ میں ”چارلس“ سیو بک اور کیترین ایک ہی رات کی جھٹ پر رہیں گے تاکہ ہمارے درمیان بہتر رابطہ رہ سکے۔ ضرورت پڑنے پر ہم فوری طور پر کوئی کارروائی کر سکیں۔ واکو ایڈیو پر ایک دوسرے کو پیغام دینے میں وقت ضائع نہ ہو ورنہ بہت دیر لگتا ہے ہوا تھا کہ ہم میں سے دو افراد سرک کے ایک بک کسی عمارت پر رہیں گے اور دو افراد دوسری طرف کی کسی رات پر۔ بعد میں ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں اپنی تمام تر توجہ پورٹ سے آنے والی سائٹ پر ہی مرکوز رکھنی چاہیے تھی۔ اس لیے ہم اپنا فوری دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ جدھر سے ٹریک اپریورٹ کی رہتا تھا کونکہ اس پر تو ٹریک بند ہو جانے سے ہی ہمارا دور رس ختم ہو جاتا تھا۔

ہم لوگ جھٹ کی چھوٹی سی منڈیر کے عقب میں چھپے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس ٹیلی اسکوپک سائٹ والی رات نکل تھی۔ تاہم اس کے پاس رات نکل کے بجائے صرف دور بین ہی تھی۔ اس کی فائبر آپٹک ڈسک داری ریڈیو پر اپریورٹ سے رابطہ رکھتا تھا جہاں سے ہمیں پل کی خبر مل رہی تھی۔ لیڈی ڈسکا کا خصوصی میڈیو اپریورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اس وقت وہ پولیس وغیرہ کے نمائندوں کے ہاتھ کر رہی تھی۔ ہر پورٹ پر اور کمرہ میں کو بڑی سخت چیکنگ لگوا کر ایک ایک کمرے اندر جانے دیا گیا تھا۔ فوٹو گرافوں اور ویڈیو والوں کے کمرے تک چیک کیے گئے تھے۔ غلیظ لائسنس تک لگائی گئی تھی کہ ان میں کوئی دھماکا خیز مادہ نہ پھنسا گیا ہو۔ چارلس اور دور بھرے ہوئے پولیس اور انٹیلیجنس کے اہلکار تھے۔ اسی ریڈیو پر فریکوئنسی بدل کر فوری طور پر رابطہ لگاتے تھے۔

میں دور بین کا ہول طرف کھاتے ہوئے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ احوال نہایت پرسکون تھا اور ہر چیز اس ماحول کا حصہ نظر آ رہی تھی۔ کسی چیز کو دیکھ کر کسی گڑبگ یا خطرے کی خبر نہ ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ تمام انتظامات ٹھیک لگ رہے تھے۔ جب ہر چیز چیک کی جا چکی تھی۔ کہیں کسی چیز کو کم از کم اس رات میں موجود نہیں تھی جو سرک سے لگائی گئی تھی۔ نقصان پہنچا سکتی سرک پر ٹریک بھی رک چکا تھا۔



میں کسی کو اس کے بارے میں بتا بھی نہ سکا۔

ویسے بھی جو بات میری سمجھ میں آئی تھی وہ چند سینکڑوں میں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر وہ غلط فہمی تھی تب بھی اپنا دھم دھم کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس کے لیے بجلی کی طرح حرکت میں آنے کی ضرورت تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ گاڑیوں کا قافلہ وہاں پہنچنے ہی والا تھا۔

وہ چار حشر عمارت تھی۔ اس میں لٹ نہیں تھی۔ بجلی کی ضرورت کے لیے ہم نے عمارت کی چھت سے ایک ریسیں لٹائی تھیں جو ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ ہم سب کے اہموں پر ٹانگوں کے خاص قسم کے دستانے تھے جو انہوں کو چھلنے سے بچا سکتے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ضرورت پڑنے پر نہایت تیزی سے ریسی کے ذریعے نیچے جا سکتا تھا۔ بیڑیوں سے جانے میں اسی کے مقابلے میں زیادہ وقت صرف ہوتا۔

میں نے رائے اٹھائی وہیں بہت پر جھنجکی اور لپک کر منظر کے اس حصے پر پہنچا جہاں سے ریسی نیچے جا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں پہنچ کر میں مندر پہلا لپک لپک چکا تھا اور تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ اوپر میں نے کیمرن کی بجلی کی کڑی سے دیکھی۔ شاید اس نے مجھے پکارا تھا لیکن اس کے سلسلے میں ہی آواز مل گئی۔

میں شاید دو تین سینکڑوں میں ہی پہنچ گیا تھا۔ ٹانگوں کے خاص قسم کے پارک جالی دار دستانوں نے میرے اہموں کو دھکی کر رکھ دیا۔ دوسرے منظر پر کھڑا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں سڑک کی طرف ہٹا جا رہا تھا۔ میں شاید کبھی اپنی جان بچانے کے لیے بھی اچھے تر نہیں دوڑا تھا۔

میں نے صرف ایک بار گردن ڈرا موز کو پیچھے دیکھا۔ کئی میرے پیچھے نہیں آتا تھا۔ دوسرے لوگوں کی شاید سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا تھا اس لیے انہوں نے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنا ہی بہتر سمجھا ہو گا۔ اس وقت سڑک قافلوں کے کنارے فاضل زمین کی پڑوائی اور سرسبز روڑوں کو دکھانے والے فاصلے بنا تھا۔ مجھے میلوں پر محیط محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بھی قیامت تھی کہ اس وقت ٹریفک دونوں طرف کی سڑکوں پر بالکل بند ہو چکا تھا۔ ورنہ میں بروقت انہیں پار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

میں گریا ہوا کے دوش پر دو سری سڑک کے کنارے پہنچا۔ اسی تیز رفتاری کا ایک قافلہ ہوا کہ میں آسانی سے زمین کی دیوار کو پہلا لپک لپا ورنہ شاید مجھے اس کو پار کرنے میں دشواری ہو جی۔ لیکن اس کے علاوہ انہوں اور سینٹ کی سلیپوں کو پہلا لپکا ہوا کہیں تک پہنچا۔

میں نے اس کے دو واڑے کو صرف ایک جھٹکا دے کر رکھ دیا۔ وہ منتظر تھا۔ اگر وہ منتظر نہ ہوتا تب بھی شاید مجھے کوئی خاص کام نہ ہوتا کیونکہ کرن اشارت کرنے کے لیے چلی تھی۔ اندر مڑا

ہوا تھا اور اس کا جو سرا ہوا میں بلند تھا اس پر بہت بڑا لپک لپکا ہوا تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑے سائز کی کرن تھی اور غالباً سینٹ کے بہت بڑے بڑے سلیپ اٹھانے میں زیادہ استعمال ہو رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا دیگر مشینری کے ساتھ کرن کو بھی چپک کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی کب بھئی وہ حصہ جس میں آہر غریب تھا خالی اور مقل تھی۔ میں دو زمین کو نہایت آہستگی سے حرکت دیتا رہا اور منظر کو دھیرے دھیرے میری آنکھوں کے سامنے بکھرے لیتا رہا۔ کرن کا ٹرم ورجن سڑک کے اوپر مقل تھا اور اس کا لپک بلندی پر تھا کہ سڑک کے درمیانی حصے کی زمین سیدھے میں تھا۔

مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ کل کرن کے ٹرم کا رخ کسی اور طرف تھا۔ آج حالانکہ کرن کو کچھ پیچھے ہٹا کر کھڑا کیا گیا تھا لیکن اس کے ٹرم کے معاملے میں کسی نے اتنا ہی پن کا ثبوت دیا تھا اور اسے سڑک کے اوپر ہی مقل رہنے دیا تھا۔ اس کی بلندی پر تھکے کافی زیادہ تھی شاید اس لیے کسی کا اس طرف خیال نہیں کیا تھا۔ اس میں ویسے کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ سر حال کرن تھی۔ کچھ دھماکے سے بندھی ہوئی کوئی چیز تو نہیں تھی جو مجھے سے گزرتے ہوئے ٹریفک پر گر پڑتی۔

اسی دوران پارکس نے ہمیں بتایا کہ لیڈی ڈانکا کی گاڑی دیگر گاڑیوں کے جلو میں ان پورٹ سے روانہ ہو چکی تھی گویا اس کے ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں چار یا پانچ منٹ کے گئے تھے۔ ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز ابھی تک بھی پہنچ رہی تھی لیکن الفاظ کچھ طور پر سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

میری توجہ اب بھی منظر کی طرف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر میری نظر زمین کی دیوار کے اس حصے پر جا رہی تھی جس پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ گڑا میری نظر میں لٹک رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ زمین کی یہ دیوار کل بھی تو مجھ سے زیادہ ہی ہوئی تھی لیکن کل اس کے کسی حصے پر سفید رنگ نہیں تھا۔ رنگ کرنے کا کوئی مقصد بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس دیوار کا مقصد تو صرف مشینری اور لپے کو آڑ میں پھانسا تھا اگر اس میں خوبصورتی پیدا کرنا ہی مقصد ہوتا تو پوری دیوار پر سفید رنگ کیا جاتا۔ صرف بجلی چادر پر کیوں کیا گیا تھا؟

پھر میری دو زمین دھیرے دھیرے گھومتی ہوئی کرن کے ٹرم پر آنکھ پڑی۔ اس وقت چار لپک لپکا رہا تھا۔ لیڈی کی گاڑی دو منٹ اور چند سینکڑوں میں یہاں پہنچنے والی ہے۔

میں دو زمین کے ذریعے ٹرم میں لپکے ہوئے بڑے سے ٹک کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ غلطی مجھے بے چین کیے ہوئے تھی وہ کسی ایسی بات کے بارے میں تھی جسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بات کچھ تاخیر سے۔ اور اسی سے پہلے۔ میری سمجھ میں آئی تھی لیکن وہ میری غلط فہمی پر مشتمل تھی۔ یہ وہ چیز تھی جسے میں نے پہلے سے سمجھا ہوا تھا۔

آپ کو خوشخبر اور نصیحت کا نشانہ بنوانے کا سامان کر رہا تھا یہ سوال ایک بار پھر بجلی کے کنبے کی طرح میرے ذہن میں چکا لیکن میں نے فوراً ہی اس کا گٹھا کھوٹ دیا۔ اپنا کتبہ دور کنبے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے کریں کے بڑے سے ٹپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب تو دیرے بھی میں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ میرا شب ٹھیک ہی معلوم ہوا تھا۔ عام حالات میں اس ٹپ کو ایک مضبوط اٹھیل پر بڑے بڑے نٹ بولکس وغیرہ کے ذریعے لٹکا ہوا چاہئے تھا کیونکہ اسی ٹپ میں لوہے کی رسیاں وغیرہ ڈال کر بڑی سے بڑی دونی چڑیاں اٹھائی جاتی تھیں۔ نٹ بولٹ اور اٹھیل وغیرہ اب بھی موجود تھے مگر اب وہ محض دکھانے کے لیے تھے۔

اب ٹپ در حقیقت ایک ٹاؤک کھانے میں اٹکا ہوا تھا جو شاید پلاسٹک کا تھا اور در حقیقت یہ وہ ٹپ ہی تھی جسے تھاجو کریں میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ اس ٹپ کی ایک کامیاب نقل تھی لیکن یہ سب کچھ دور سے دیکھنے پر محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی کریں کے اس آخری سرے تک اتنی باریکی سے دیکھنے کی ضرورت شاید کسی نے محسوس نہ کی ہو۔ میں بھی اگر دوڑتھن سے نہایت آہستگی سے ایک ایک چڑیا کا جائزہ نہ لے رہا ہوتا تو شاید مجھے بھی فرق کا احساس نہ ہوتا۔ میں نے کل اتفاق سے کریں کے ٹپ تک کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ مگرے سیاہ رنگ کا تھا اور اس کی بناوٹ میں ظاہر ہے بڑی منطقی تھی۔

آج دوڑتھن سے دیکھنے پر وہ مجھے بالکل سرسری رنگ کا دکھائی دیا تھا اور اس میں کبھی کبھی ناہمواری بھی تھی۔ اس کا بالائی حصہ تو لوہے کے گرؤڈ کی آڑ میں چھپا ہوا تھا اس لیے جب جب میں نے عمارت کی چھت پر سے اسے دیکھا تھا مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ اس وقت وہ نٹ بولکس کے ذریعے صحیح طور پر چسپا ہوا نہیں تھا۔ تاہم مجھے گڑبڑ کا شبہ ضرور ہو گیا تھا اور اب تصدیق ہو گئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میرے چہرے سے پیچہ میرے بازو تک؛ ٹپک رہا تھا۔ اس ٹپ کو ہاتھ لگانے کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے اس کے کھانے سے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں اسی وقت ایک گولی میری ٹپک کی ٹوک کو چھوٹی ہوئی کر گزری۔

میں بال بال بھاگتا تھا جین میری آنکھوں کے سامنے آنے سے ضرور بچ گئے۔ میں نے جھنڈی اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی پھرتی دکھادی تھی جو مجھے منگی پرستی تھی۔ اس جنگ میں ٹپک لٹکائیں پھرتی پر اٹکا ہوا ایک ساکت تھاکر تھا جس پر چاندل طرف سے کوئی بھی نشانے بازی کی مشق کر سکتا تھا۔ ہاں تو اس وقت میرے چاندل طرف بہت سے لوگ موجود تھے جنہیں اصولاً میری حفاظت کرنی چاہیے تھی لیکن مجھے امید تھی کہ ان میں سے کوئی مجھے کسی سمت سے آنے والی گولی

میں نہیں۔ اگر دو اذیت منقل نہ ہوتا اور چالی اندر موجود ہوتی تب تو

اپنا شاکیب میں بیٹھ کر اپنا کام کرنے کی کوشش کرتا۔ میں صرف ٹپ کو ٹھیک کر کسی اور طرف کر دیتا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ اس کے لیے زیادہ مہارت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ہوائی میں ایک تعمیراتی فرم میں کام کر رہا تھا۔ گوکہ میں وہاں ایک نام نہاد سا کاڈر شٹ تھا لیکن ہر کام دیکھنے کی پرانی عادت کے تحت ہر چیز میں دخل دینا رہتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں جو کریں موجود تھی وہ بھی میری "سوت برد" سے محفوظ نہیں رہی تھی تاہم وہ پائے ڈال کی ایک چھوٹی سی گھنٹا کر رہی تھی۔ اس وقت میرے سامنے چھ ڈال کی ایک بہت بڑی کریں موجود تھی۔

میں نے وہ ڈالے پر زور آزمائی میں وقت ضائع نہیں کیا اور کریں پر چڑھ گیا۔ وہاں موجود تمام پولیس والوں نے اپنی رائفلوں کا رخ میری طرف کر لیا تھا لیکن وہ یقیناً یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور نہ ہی جاننا ان کی یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ بہر حال مجھ پر قابض نہیں کر سکتے تھے کیونکہ صبح سے وہ مجھے پہلے خانقاہی انتظامات میں شریک دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کسی نہ کسی حیثیت میں ان لوگوں میں شامل تھا جو ان انتظامات کو کنٹرول کر رہے تھے۔ انہیں یقیناً حیرت ہو رہی ہوگی کہ دور ایک عمارت کی چھت پر بیٹھے بھانے اچانک مجھے کیا ہوا تھا جو میں کسی غاروش زدہ بندہ کی طرح اچھلتا کودتا کیوں کر رہا؟ آج تھا اور اب آسمان کی طرف اٹھے ہوئے اس کے بازو پر چڑھا جا رہا تھا۔ کریں کے اس حصے میں لوہے کے پچاسوں چوٹے بڑے گرؤڈ ایک دو سرے کو گراس کر رہے تھے۔ قینچاں سی بنی ہوئی تھیں۔ وہ میرے لیے اتنی بڑی کام دے رہی تھیں۔ ٹپ کے سرے پر کچھ کریں نے ایک گٹھے کے لیے بچھائے تھے اور ساؤفٹ محسوس ہوا۔ میں سڑک کے چین اور چین چار حوالہ عمارت جتنی پلہری پر ہوا میں منتقل تھا۔

میں نے فوراً نیچے کی طرف سے دھیان چھایا۔ کریں کا ٹپک اب میرے ہاتھ سے دو زمین فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے کانوں طرف بے پناہ سکوت کا احساس ہوا تھا لیکن اسی سکوت میں نظر اس سڑک کے ایک دور افتادہ حصے پر پڑی۔ کانوں کی ایک تھار بڑے ساڑے کے کھنڈوں کی طرح ریختی ہوئی دکھائی دی۔ لاشیما ان پورٹ سے آئی ہوئی کانوں کا قافلہ تھا جو بل کھائی سڑک کا پلہرہ رہتا دکھائی دے رہا تھا لیکن در حقیقت کاربن پائپر ڈھاری سے بلی آ رہی تھی۔ پھر مجھے سامنے کی مدھم سی آواز بھی سنائی دی۔ ٹپک ٹپک پولیس کی دو موٹر سائیکلیں جلوس سے کچھ آگے آ رہی تھیں۔ اب اس مقام سے زیادہ دور نہیں رہی تھیں۔ ایک ٹائپ سے کے لیے مجھے اپنے اصحاب میں تھر تھراہٹ سی لگس ہوئی۔ میں جو کہہ کر رہا تھا کیا وہ صحیح تھا یا میں مصل اپنے

تھا۔ وہ لوہے کے بجائے پلاسٹک کا بنا ہوا مطمئن ہوا تھا۔  
سائٹ پر موجود پولیس والے گروہ میں اٹھائے میری طرف سے رہے تھے۔ ان کے عقب میں کافی دور مجھے پانی کا ایک برتن ہوا  
ٹینک رکھا نظر آیا۔ وہ بال گاڑی کے ڈبے سے مشابہت رکھتا تھا۔  
ہمت پر انکسپر تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی غالباً کنسرٹین میں  
استعمال کے لیے وہاں رکھا گیا تھا۔

فاسلہ کافی تھا اور میں جس پوزیشن میں ٹکا ہوا تھا اس میں  
اس جگہ کو پانی کے اس ٹینکر تک پہنچنا بڑا مشکل کام تھا لیکن میں  
اسے مزید ایک سینکڑہ بھی ہاتھ میں رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکا  
تھا۔ میں ایک ہاتھ اور دونوں پیروں کی مدد سے گزڑے کے ساتھ چپک  
کر ایک ہاتھ سے وہ کام کر رہی گزرا۔ میں نے جگہ کو اندازاً پانی کے  
اس ٹینکر میں پھینکا لیکن منہ کے خیر حالت میں ہونے کی وجہ سے تھکا  
خطا ہو گیا۔

جگہ یوں تو ڈائریٹنگ کے اندر ہی گیا لیکن اندر کی طرف ہمار  
کے کونے سے ٹکرا گیا۔ بس میں اتنا ہی دیکھ سکا۔ اس کے ساتھ ہی  
زبردست دھماکے اور دھواں کے نمائندہ تیز جھماکے کی وجہ سے  
میری آنکھیں ایک ٹانے کے لیے غیر ارادی طور پر بند ہو گئیں۔  
میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو ڈائریٹنگ وہاں سے غائب  
ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے بکھرے ہوئے  
تھے اور دور دور تک پھچڑ سا بچھلا ہوا تھا اور ٹینک کی جگہ گڑھا سا بن گیا  
تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پانی کی وجہ سے اس دھماکے اور  
اس کی تباہی کی شدت بہت کم ہو گئی تھی۔ اگر جگہ کی سادگی کے  
اس ہم کو اس کی اصل جگہ پر گرجانے کا موقع مل جاتا تو نہ جانے  
کتنی تباہی پہنچتی۔

تمام پولیس والے زمین پر لیٹ چکے تھے اور انہوں نے اپنی  
اپنی گولیوں کے رخ اس طرف کر لیے تھے جہے دھماکا ہوا تھا لیکن  
ظاہر ہے اور کچھ ایسی ایسی چیزیں تھیں جس پر وہ ہندو تان کر کسی کو  
کوئی فائدہ پہنچاتے۔ اس وقت مجھے ان کی حالت اپنے سے بھی  
زیادہ مشکوک نظر آئی۔

یہ سب کچھ درحقیقت ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر اندر ہو گیا  
تھا۔ لمبے دار سڑک پر مجھے ٹینک والوں کی سوڑ سا بھینکس کافی  
قریب دکھائی دیں۔ ان کے سائزن تو صاف سنائی دینے لگے تھے  
اسی لئے کسی نے مجھے چکر میرا نام لے کر پکارا۔

میں نے گردن ہٹا کر دیکھا۔ چارلس کرین کے قریب کھڑا تھا۔  
میں تیزی سے بچے اُتر آیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری دھواں  
محیط ایک مبر آزاد چودہ سے گزر کر آ رہا تھا لیکن درحقیقت اس  
عمارت کی چھت سے اُترنے اور اب کرین سے اُترنے کے دوران  
بجھل ڈیڑھ منٹ کا وقفہ تھا جس کا اندازہ مجھے اپنی گڑھی دیکھ کر  
ہوا۔ جب ہم عمارت کی چھت پر تھے اور چارلس نے اعلان کیا تھا  
کہ کاروں کا قافلہ تقریباً ڈھائی منٹ بعد وہاں پہنچنے والا تھا اس

گولی سے بچا سکتا تھا کیونکہ فائر فیک سا ٹینکسنگی رائل سے ہوا  
تھا۔ جب تک ان لوگوں کو اندازہ ہوا کہ فائر کس سمت سے ہو  
رہا تھا اس وقت تک میرا کام تمام بھی ہو سکتا تھا بلکہ میں ممکن تھا  
کہ میں ہٹ سے بچے جا کر تا بھی ان لوگوں کو پتا چلا کہ مجھ پر کوئی  
فائر بھی ہوا تھا۔

میں فوراً ہی ٹیم کے گروڈر پر چپک کر لیٹ گیا۔ اس دوران  
ایک اور گولی آہنی گروڈر سے ٹکرائی تھی اور اس نے چنگاریاں  
پیدا کی تھیں۔ وہ گولی ایٹ کر بھی مجھے گلتی تو شاید ملک ثابت  
ہوتی لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ وہ شاید پیچھے کی طرف چلی گئی۔  
تیسری گولی میرے بالوں کو چھتی ہوئی گزری۔

یہ سب کچھ خوش قسمتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا  
کہ میں گروڈر کے اوپر لیٹا ہونے کے باوجود گولیوں سے محفوظ نہیں  
تھا۔ فوراً ہی میں نے گولٹ سی لی اور چوڑے گروڈر کی آڑ میں  
دوسری طرف دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے چپک گیا۔ اب  
میں مونے آہنی گروڈر کی آڑ میں تو ہو گیا تھا لیکن اگر میرے ہاتھ  
پیروں کی گرفت واصل نہ جاتی یا میں اپنا وزن نہ سنبھال پاتا تو میدان  
سڑک پر جا کر اور میری ہڈیاں پھیل گشت سب ایک دوسرے  
میں مدغم ہو جاتا۔

اس عالم میں بھی میں جگہ کی طرف ہاتھ بڑھانے سے باز نہ رہا  
کیونکہ جان کی بازی تو گت ہی چلی تھی۔ اب اصل مقصد بھی پورا  
ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ ساری بھلکد و فضول اور بے معنی ہو کر رہ  
جاتا۔ مطلقاً سب سے مزید کوئی گولی نہیں آئی کیونکہ عمارت کی  
چھت پر موجود میرے ساتھیوں کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ پر فائر  
ہوئے تھے اور انہوں نے فائرول کی سمت کا بھی اندازہ کر لیا تھا۔

انہوں نے شاید کچھ جوالی کارروائی کی تھی جس کی وجہ سے  
میری سمت میں مزید گولیاں نہیں آئی تھیں۔ میں نے دور کہیں شیشہ  
وغیرہ ٹوٹنے کی مدد سے ہی آوازیں سنیں تھیں۔ کیترن 'سیو بک'  
چارلس اور چھت پر موجود پولیس کے دو آدمی جنہیں اس وقت میں  
اپنے ساتھی شمار کر رہا تھا۔ ان سب کے پاس بھی سائیکس وائی  
راٹھیں تھیں۔ اس لیے مجھے جوالی فائرنگ کی پابعدہ آوازیں  
سنائی نہیں دی تھیں۔ مٹے میں پایا تھا کہ وہاں جو کچھ بھی ہوتا تھا  
نمائندہ خاص ہی سے ہوتا تھا۔

میرا ہاتھ اس دوران جگہ تک پہنچ چکا تھا۔ میں اس وقت بہت  
مشکل میں تھا۔ کچھ اسی طرح لوہے کے گروڈر سے چٹا ہوا تھا جس  
طرح بندر بعض اوقات کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر درخت کی شاخ  
سے چمٹ جاتا ہے لیکن ایک انسان کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی  
تسلان کام نہیں تھا، خصوصاً جبکہ اسے کچھ اور بھی کرنا تھا۔

تاہم میں کھانچے سے جگہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے  
اندیشہ تھا کہ جب کو میں جہاں کہیں بھی نکلوں گا، کچھ نہ کچھ جانی  
پھیلے گی۔ اب تو یقینی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اصل جگہ نہیں

وقت میں نے گھڑی دیکھی تھی۔

چارلس کا پیو کھلایا ہوا رنگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشین ہنسل تھا اور دوسرے میں ریڈیو۔ جس کا بیڈ فون اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کے عقب میں دو سیکورٹی آفیسر بھی دوڑے آ رہے تھے۔ وہ سب مشین گنیں اٹھائے ہوئے تھے اور ان کا دوڑ کر آنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے آ رہے ہوں لیکن شاید غیر ارادی طور پر انہوں نے غلطانہ میرا اور چارلس کا لپکا ہوا تھا۔

”یہ دھماکا کیا تھا؟“ چارلس وحشت زدہ لیجے میں ڈولا۔ ”کیا میں قافلے کو روک دوں؟“ وہ ریڈیو پر نہ کے قریب لانے لگا۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور بے ترتیبی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اب قافلے کو روکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ انہیں اب اسی مدانی سے گزر جانے دو۔۔۔ اب خطرہ ٹل چکا ہے۔“

میرے بات کرنے تک ٹریفک پولیس کی موٹر سائیکل اس مقام تک پہنچ چکی تھیں جہاں بورڈ لگا تھا۔ ”خود رفتار چاس کلوسٹر فی گھنٹہ۔“ یہ بورڈ تالپا مارضی طور پر لٹائی اور کی تعمیر کی وجہ سے لگا گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود ٹریفک پولیس والوں نے اس وقت لیڈی ڈانکا جیسی شخصیت کی گاڑی کو پائلٹ کرتے وقت بھی اس ہدایت کا خیال رکھا اور موٹر سائیکلوں کی رفتار کم کر لی ورنہ وہ کچھ تیز رفتاری سے آ رہے تھے۔ انہیں دھماکا کسی نہ کسی حد تک سنا لیا رہا ہوگا۔

انہوں نے چارلوں طرف دیکھا لیکن انہیں چو تک خطرے کا کوئی شعل نہیں ملا تھا اور نہ ہی ریڈیو پر کوئی پیغام ملا تھا اس لیے وہ گزرتے چلے گئے۔ اس کے بعد دوسری گاڑیاں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔ پولیس ’اسپیشل سیکورٹی‘ ملٹری اٹیلیجینس وغیرہ کی گاڑیاں گزریں۔ پھر تاریک شیشوں اور چھ دوڑاؤں والی سیاہ سرسبز گزری۔ اس میں یقیناً لیڈی ڈانکا اور ترک وڑ پر خارجہ موجود تھے۔

ہم لیے، مشینری اور ٹین کی دوجا کی آڑ میں ساکت کھڑے رہے اور گاڑیوں کا قافلہ ایک مخصوص رفتار سے ہمارے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ جتنے جیسے میں کنسٹرکشن جاری تھی اس سے نکلنے کے بعد گاڑیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ گویا ان گاڑیوں نے بھی خود رفتار کی پابندی کی تھی۔ میں گمراہی سانس لے کر رہ گیا۔ اپنے ملک سے کل گھر جگہ قانون کی پابندی نظر آتی تھی۔

یہ گاڑیوں میں گزرتے والے ان لوگوں کو میل ڈیڑھ میل کے فاصلے سے دھماکا بھی سنا ہی نہیں دیا ہوگا اور نہ ہی یہ کٹاں گزرا ہوگا کہ انہیں اس مقام سے حفاظت سے گزارنے کے لیے کتنے لوگوں کی جان پر بنی ہوئی کسی اور کس نے کس طرح بد وقت جان پر کھیل کر ایک عجیب و غریب موقع ملے گا یا کام بنایا تھا۔

چند لمبے ہم سب ساکت کھڑے رہے۔ قافلہ گزر جانے کے بعد نعاشیں ایک عجیب سا سکوت پھیل گیا تھا۔ اس دوران میرے اعصاب اور میری سانس معمول پر آئی۔ میں نے کھربے کھربے لیجے میں چارلس سے پوچھا۔ ”کیسے تھیں اور سیکورٹی کیا اسی عمارت کی پھت پر ہیں؟“

”نہیں۔۔۔“ چارلس کی آواز ابھی تک مرشش تھی۔ ”اس سے کافی پیچھے ایک اور عمارت تھی۔ وہاں سے تم پر فائرنگ ہوئی تھی۔۔۔ وہیں ایک کھڑکی میں کچھ حرکت نظر آئی۔ کیسے تھیں اس پر فائرنگ کی۔۔۔ اور اب وہ اس عمارت کی طرف بھاگے ہیں۔۔۔ پولیس والے بھی ان کے ساتھ ہیں لیکن تم بتاؤ۔۔۔ یہ کیا پکڑ تھا؟“

”پکڑ بعد میں سمجھتے رہتا، ہمیں ان کی مدد کے لیے جانا چاہیے۔“ میں نے تجزی سے کہا اور اپنے سامنے کھڑے سیکورٹی آفیسر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس سے کواپنی سب مشین گنیں بے دے۔“

چارلس نے سیکورٹی آفیسر کو اشارہ کیا۔ اس نے بائبل یاغراشتہ اپنی سب مشین گنیں مجھے بے دی اور میں اسی سمت میں واپس دوڑ پڑا جدھر سے آیا تھا۔ ٹین کی دیوار میں سے کسی نے ایک چادر گرا دی تھی اور اب اس کے درمیان سے آتے جانے کا راستہ بن گیا تھا۔ میں لمبے پر سے چھلانگ لگا کر اس راستے سے ہوتا ہوا سڑک پار کرنے لگا۔

دو فرقہ مزک عبور کرنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ چارلس گرتا رہتا میرے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ سیکورٹی آفیسر بھی تھا جس نے مجھے گمن دی تھی۔ وہ کچھ اس طرح میرے پیچھے آ رہا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں اس کی گمن لے کر بھاگ جاؤں گا۔

چارلس کی وجہ سے مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے کہا۔ ”تم مجھے اشارے سے بتاؤ وہ کس عمارت کی طرف گئے تھے۔“

اس نے اپنے ہونے براؤن رنگ کی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا جو دیگر عمارتوں سے ہٹ کر کافی پیچھے واقع تھی۔ اتنی دور ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ سخت سیکورٹی کے نقطہ نظر سے نگہبانی میں بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ میں نے چارلس کو اس کی طاقت کے مطابق دوڑنے کے لیے چھوڑا اور خود اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اس عمارت تک پہنچا۔

وہ ایک اپنی راتر عمارت تھی۔ گمیاہ بار منزل معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اوپر تک نظر دوڑائی تو دو منزلوں پر بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے نظر آئے۔ گمرے کے رنگ کے شیشے کے کچھ ٹکڑے مجھے نیچے بھی پڑے دکھائی دیے۔ عمارت کے گرد لہجہ کا جنگلا تھا اور اُدھر اُدھر دیکھتے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس عمارت کا رخ بظاہر مزک کی طرف تھا لیکن اس میں داخلے کا راستہ پیچھے کی طرف سے

تھا۔

میں دوڑتا ہوا اچھے بچپان تھا چلا اس طرف عمارت کا غامسا بڑا کپڑا تھا جو پارکنگ لائٹ کا کام بھی دیتا تھا۔ یہ عمارت بھی کادرباری مرکز معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس روز چھٹی کی وجہ سے پارکنگ لائٹ تقریباً خالی نظر آ رہی تھی۔

دفترا میری نظر بیڑیوں کی دہانے کے عقب میں مشکوک انداز میں ہتی ہوئی ایک ٹوپی پر پڑی۔ اچھا ہوا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس پر غور نہیں کر دیا۔ مجھے ہر وقت احساس ہو گیا تھا کہ وہ رنگ اور ساخت ٹرکس پولیس کی ٹوپی کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے دیوار کے عقب سے ایک سرسودار ہوا۔ یہ انہی پولیس والوں میں سے ایک تھا جو ہمارے ساتھ عمارت کی چھت پر تعینات تھے۔ وہ لپٹی گھنٹا اٹھائے ہوئے تھا اور اس کی آنکھیں چہرے خوف یا بھرکسی اور وجہ سے گول گول سی دکھائی دے رہی تھیں۔

”کیہ ترن وغیرہ کہاں ہیں؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ اس آوی کی تلاش میں گئے ہیں“ اس کا بیچھا کر رہے

ہیں۔ ”اس نے ٹوٹی پھٹی سی انگریزی میں جواب دیا۔

”کس آوی کا؟“ میں نے بے آلی سے پوچھا۔

”وہ اس عمارت میں چھپا ہوا تھا۔“ اس نے لابی کی طرف اشارہ کیا۔

”اور تم یہاں چھپے کیا کر رہے ہو؟“ میں نے بے آلی سے پوچھا۔ وہ مجھے اب کچھ ہونے سا لگ رہا تھا اور اس وقت کسی کا بھی ہونے کا میرے لیے ناقابل برداشت ہی تھا۔

”ہمارا ایک آدمی مر گیا ہے۔“ مجھے مس کیہ ترن نے یہیں رکھنے کے لیے کہا تھا۔ ”اس نے ہلکا تے ہوئے کہا اور لابی کے شیشے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ شیشے کے ٹکڑے ماربل کی بیڑیوں پر گھرے ہوئے تھے۔

میں نے بیڑیاں بڑھ کر خطا انداز میں دروازہ آہستگی سے کھولا جس کا صرف المونیم کا فریم ہی باقی رہ گیا تھا۔ میں نے لابی میں جھانکا۔ سامنے ہی ماربل کے جھللاتے فرش پر ایک باوردی پولیس والا اوندھا چڑا تھا۔ اس کا ایک رخسار تو فرش پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرا رخسار غائب تھا۔ اس کی شکل ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ میں نے اندازاً ہی اسے پہچانا۔ اس کے جسم میں اور بھی کی گولیاں بیوست تھیں۔ اس کے اوپر گرد خون پھیلا ہوا تھا۔ لابی میں دھم سی روشنی تھی۔ اس روشنی میں فرش بھی جھللا رہا تھا اور خون بھی۔

خون ابھی خشک ہونا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ عمارت میں بلا کا سکوت تھا۔ اندر جانا مقبول تھا۔ اب شاید وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر پولیس والے سے پوچھا۔ ”کیہ ترن اور سیو بک کس طرف گئے ہیں؟“

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خود نوشت

دہشت گرد  
سلیم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔

○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہو لہان ہو گئے تھے۔

○ ”سچی کہانیاں“ کا ایک مقبول ترین ایڈو سنر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خود نوشت

فون: 7224665

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "کیتھرن اس طرف مچی ہے۔" پھر دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سیوبک اس طرف گیا ہے۔"

دیکھا وہ دو آدمیوں کے تقاب میں کھڑے ہیں؟ "میں نے پوچھا۔  
"نہیں۔۔۔ آدمی تو شاید ایک ہی تھا۔۔۔ وہ بے یقینی سے بولا۔  
"مثلاً وہ اسے دو طرف سے گھیرنے کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ وہ شاید اس طرف بھاگا تھا۔۔۔ میں صحیح طور پر کچھ دیکھ نہیں سکا۔"  
اس نے ایک انگ اکر بتایا۔ اس کی ہر بات میں "شاید" شامل تھا۔  
اس دوران چارلس اور سیکورلی آفیسر بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ سیکورلی آفیسر کے ہاتھ میں اب ایک مثل نظر آ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو مختصر ترین الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا۔  
چارلس اپنے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے عمان اس عمارت میں اچھا ہوا تھا۔"

"میں بھی کچھ نہیں کما جاسکتا۔" میں نے حمزی سے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی تھا کیتھرن اور سیوبک اس کے تقاب میں کھڑے ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ زیادہ بھاگ دوڑ آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں اور یہ آفیسر جا کر ان کی مدد کی کوشش کرتے ہیں۔"  
چارلس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں نے سیکورلی آفیسر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں ہمیں سنبالے آگے روانہ ہوئے۔ دوڑتے ہوئے ہم اس عمارت تک پہنچے جس کی طرف پولیس والے نے اشارہ کیا تھا۔ مین روڈ کے آس پاس تو ہمیں دیرانی ہی نظر آئی تھی لیکن اب چونکہ ہم مین روڈ سے کچھ دور نکل آئے تھے شاید اس لیے ہمیں ایک جگہ کچھ لوگوں کی ٹھیکیں دکھائی دیں۔ وہ دو تین کی لڑیوں کی صورت میں کوسے کھدروں میں کھڑے تھے اور وحشت زدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید انہی عمارتوں میں رہتے تھے۔

سیکورلی آفیسر بھی میری طرح سادہ لباس میں تھا۔ ہمیں ہمیں اٹھائے بھاگتے دیکھ کر وہ لوگ کچھ اور پریشان ہو گئے۔ ادھر ادھر بھاگ کر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے بے آواز بلند حمزی سے انگریزی میں کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ہم سرکاری لوگ ہیں۔۔۔ آپ نے ایک مرد اور ایک عورت کو ادھر کس جاتے دیکھا ہے؟"

ان میں سے تین چار افراد انچاپاٹ آمیز انداز میں رک گئے۔ میں نے مختصر آؤٹس کیتھرن اور سیوبک کے ملنے پانے کی کوشش کی۔ سیکورلی آفیسر نے تڑکی میں انہیں میرا مطلب سمجھانے میں میری مدد کی۔ تب ان میں سے ایک شخص نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے آند میں طوفان کی طرح دو افراد کو ادھر جاتے تو دیکھا تھا۔ انہوں نے چند فاصلے بھی کیے تھے لیکن وہ کچھ نہیں سکے تھے کہ ان کے ملے کیا تھے اور ٹھیکیں کیسی تھیں۔

مین روڈ کے آس پاس تو زیادہ تر مکمل عمارتیں تھیں۔ سچ میں کچھ جگہیں خالی بھی تھیں اور کچھ ان عمارتوں کی پارکنگ لائن کی وجہ سے کشادگی نظر آ رہی تھی لیکن ان کے عقب میں جہاں تک ہم پہنچ چکے تھے وہاں سے کچھ آگے رہا کسی مکانات کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا اور وہ خاصی گنجان آبادی نظر آ رہی تھی۔ جس شخص نے ہماری رہنمائی کی کوشش کی تھی اس نے انہی گلیوں کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن وہ یقین سے نہیں جاسکتا تھا کہ ان میں سے کون کس گلی میں گیا تھا۔

مجھے سیوبک کے بارے میں تو نہیں البتہ کیتھرن کے بارے میں تشویش تھی۔ میرے خیال میں تو چارلس نے خواہ مخواہ ہی غریبہ جذبات سے مطلب ہو کر کیتھرن کو اس آپریشن میں شامل کر لیا تھا ورنہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ عمان بلاشبہ نہایت پھریتا اور سفاک قاتل تھا۔ اس کا اندازہ مجھے چند لمبے پہلے اس عمارت میں پولیس والے کی لاش پڑی دیکھ کر ہوا تھا۔

وہ ایک بلند عمارت تھی اور اس میں آمدرفت کا ایک ہی دروازہ تھا۔ جس وقت کیتھرن 'سیوبک اور دونوں پولیس والے اس عمارت تک پہنچے ہوں گے اس وقت تک عمان اندر ہی ہو گا۔ کیتھرن 'سیوبک اور پولیس والے اب ایسے کھڑے ہوئے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک پولیس والے کو چھپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا تقاب بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ممکن ہے کیتھرن کو آٹھنیں ہتھیاروں کے ساتھ مارواڑ کا خاصا تجربہ ہو۔ پھر بھی میرے خیال میں اسے یوں مٹا اٹھا کر عمان کے تقاب میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ ویسے ابھی تو یہ بھی یقین سے نہیں کما جاسکتا تھا کہ وہ عمان ہی تھا۔

ہمیں کیتھرن اور سیوبک کی تلاش میں زیادہ دور تک نہیں جانا پڑا۔ ابھی ہم فیصلہ کر ہی رہے تھے ہمیں کون سی گلیوں میں داخل ہونا چاہیے کہ کیتھرن اور سیوبک ہمیں ایک سی گلی کے موڑ پر ایک ساتھ نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ ان کی رائیوں کدھول پر تھیں اور منہ لٹکے ہوئے تھے انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہاوس واپس آ رہے تھے۔ سیوبک اپنے ہاتھ میں نیلے سے رنگ کے کچھ کپڑے اٹھائے ہوئے تھا۔ کیتھرن کی زینٹ کی جیکٹ کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ جینز مٹی میں تھڑکی ہوئی تھی۔ سیوبک کا حال کچھ زیادہ خراب نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ قریب کن پہنچے تب بھی میں نے کچھ نہ پوچھا۔ مختصر انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ بالآخر سیوبک بولا۔ "وہ نکل گیا۔"  
"کیا وہ عمان ہی تھا؟" میں نے دھمکے لہجے میں پوچھا۔  
"میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔۔۔ اور اگر دیکھ بھی لیتا تب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے بھی کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی لیکن اس کے بارے میں جو قصے سنے

نے ہی اس پر نازنگ کی تھی جس کے بعد یہاں سے نازنگ لوگ بھی  
بھی اور ہم بھاگ کر یہاں آئے تھے۔

ہم ٹوٹے ہوئے بیٹھوں کا دروازہ کھول کر اندر پہنچے۔ لابی میں  
پولیس والے کی لاش اسی طرح اوندھی پڑی تھی۔ ہم لفٹ کی  
طرف بڑھے تو بیڑیوں کی آڑ میں تھے ایک کھڑکی کی پڑی رکھائی  
دی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ وہ بھی ایک لاش تھی۔

وہ سادہ لباس میں ایک سیکورٹی آفیسر تھا جسے محض احتیاطاً  
اس عمارت کے دروازے پر تعینات کیا گیا تھا ورنہ اس عمارت کو تو  
ان عمارتوں میں شمار ہی نہیں کیا گیا تھا جہاں سے کسی کارروائی کا  
اندیشہ تھا۔ اس آفیسر کی گردن میں آٹے کا ایک پارک سار  
پیوست تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں حلقوں سے اُٹل آئی تھیں۔  
اس کی لاش کو یقیناً دروازے کے قریب سے کھینچ کر بیڑیوں کی آڑ  
میں ڈالا گیا تھا۔ اس آفیسر کے پاس غالباً صرف ایک ہائل موزون تھا  
جو اس وقت بھی اس کے قریب ہی پڑا تھا۔

البتہ باوردی پولیس والے کے قریب ایک اوزی گن پڑی  
تھی جو یقیناً اس کی نہیں تھی۔ وہاں موجود بچاؤ لوگوں میں سے  
کسی کے پاس اوزی نہیں تھی۔ وہ یقیناً حمان کی تھی جسے وہ فرار  
ہوتے وقت وہیں پیچک کیا تھا۔

حفاظت سی کینٹ میں ہم لوگ لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل  
پر پہنچے۔ ہمیں وہ کھڑکی تلاش نہیں کرنا پڑی جس کے پیچھے ہمارے  
اندازوں کے مطابق حمان موجود رہا ہو گا۔ وہ لفٹ سے نکلے ہی ہمیں  
وہ پڑی سی کھڑکی نظر آئی۔ اس کے تمام شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔  
وہ حقیقت راہداری کی کھڑکی تھی۔ اس وقت اس کے سامنے ہوا  
فرز اندر آ رہی تھی۔

مزید ثبوت ہمیں کھڑکی کے قریب پتھر کرل گیا۔ بیٹھوں کے  
گھڑوں کے قریب ہی ایک ٹیلی اسکوپک رائفل اور کیکک لیٹرے  
مشابہ تقریباً ایک بالٹ لہا اور چار انگل چوڑا ایک ڈبا سا ہوا تھا۔  
اسی ٹیلی اسکوپک رائفل سے حمان نے پھر پر قاتل کیے ہوں گے۔ یہ  
محض میری خوش قسمتی تھی کہ میں بال بال نکلا تھا۔

حمان کی دہری اور خود اعتمادی قابلِ رشک تھی کہ جس جڑی  
ضرورت جہاں ختم ہوئی نظر آئی تھی اسے وہیں پیچک کیا تھا۔ لہذا  
اسکو پک رائفل اس نے یہاں صرف دور کی نازنگ کے لیے رکھی  
ہوگی۔ یہاں سے بننے وقت وہ اسے ہمیں چھوڑ گیا تھا۔ پچھلے پولیس  
والے کو اوزی سے چھلنی کرنے کے بعد چونکہ اسے صرف کل  
بھاگنے سے دلچسپی نہ تھی اور وہ کسی سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا  
اس لیے اسے وہیں پیچک کیا تھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس  
لکڑاؤ مسل لوگوں سے تھا۔

ہمارے ہاتھوں پر چونکہ ابھی تک دستاں تھے اس لیے  
چارلس نے بلاتالی وہ کیکک لیٹرے ڈبا ڈھکیا اور اسے اُٹلے چلے  
ہوئے بولا۔ ”یہ کیکک لیٹرے یا مروت کینول؟“

ہیں اور جس طرح آج وہ نکلا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ  
وہ حمان ہی تھا۔“

”یہ کیا اٹھائے لارہے ہو؟“ میں نے اس کے ہاتھ میں موجود  
کپڑوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں وہ کچھ اس طرح لٹکائے ہوئے تھا  
جیسے دھلی کے ہاں لے جا رہا ہو۔

”یہ لفٹ ہوائے کی وردی ہے۔“ سیو بک نے بتایا۔ ”وہ اس  
وردی میں تھا۔ اسی کی وجہ سے ہم ایک لمبے کے لیے دھوکا کھا گئے  
اور اس کے لیے وہ ایک لمحہ ہی کافی تھا۔ وہ اس احقر پولیس والے  
کو آڑا کر رکھ گیا جس نے عمارت میں گھسنے میں کچھ زیادہ ہی غلط  
و کھالی تھی۔“

پھر وہ کچھ حسرت آمیزی نظروں سے یونیفارم کو دیکھتے ہوئے  
بولا۔ ”یہ مجھے ایک عمارت کی پھت پر پڑا ہوا ملا۔ بھی مجھے اندازہ  
ہوا کہ وہ کلن چکا ہے۔ اسی یونیفارم کے نیچے وہ یقیناً دوسرے  
کپڑے پہنے ہوئے ہو گا۔“

”تو اب انٹیلر اٹھائے کیوں چلے آ رہے ہو؟“ ان کی جیبوں میں  
یقیناً کچھ نہیں ہو گا لیکن تسلی کے لیے ہاتھ مار کر دیکھ لو اور ایک  
طرف پیچک دو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کپڑے اب ہمیں حمان کا پتا  
بتانے سے تو رہے۔“

سیو بک نے چلے چلے یونیفارم کی جیبیں کھنگالیں۔ حسبِ توقع  
ان میں کچھ نہیں تھا۔ وہ بیش کوٹ، ٹرپی اور چلون تین چیزیں  
پھینکے گا تھا لیکن سیکورٹی آفیسر کا ہتھیار دے دیا۔ ”یہ مجھے  
دے دیجئے۔ تفتیش میں کام آئیں گے۔“

سیو بک نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے  
اپنی ہزاری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”دے دو بھی!  
گتا ہے یہاں بھی سرکاری ٹھکوں کو سانپ نکل جانے کے بعد لکیر  
پینے کا شوق ہے۔“

ہم واپس وہاں پہنچے جہاں میں نے چارلس کو چھوڑا تھا۔ وہ  
دیوار کی آڑ میں پولیس والے کے پاس بیٹھا تھا اور ریڈیو پر مختلف  
لوگوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اب وہاں کچھ اور لوگ بھی نظر  
آنے لگے تھے جو مختلف کونے کھدوں سے سے سے انداز میں  
جھانک رہے تھے۔ کافی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں کوئی گمبزد  
تھی۔

”میں ذرا اندر سے اس عمارت کو ایک نظر دیکھنا چاہتا  
ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کو اندازہ ہے کہ حمان کون سی منزل پر  
موجود تھا؟“

”مجھے اندازہ ہے۔“ کیٹرین بولی۔ ”جب تم کہیں پر چڑھ کر  
نہ کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے اور ہمیں اندازہ ہوا کہ تم پر ناز  
اور سہ تھے تو ہم نے دور بین سے ادھر ادھر کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے  
اندازہ ہوا کہ اس عمارت کی ایک کھڑکی کے شیشے کے عقب میں  
کوئی موجود تھا۔ وہ پانچویں منزل کی کھڑکی تھی اور سب سے پہلے میں

اور سیو بک اپنی رائےوں پر بھی ہوئی دور بینوں کے ذریعے دیکھنے لگے۔ اب مرکز پر دونوں طرف ٹریفک بھی چل رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”۳۱ زوروت سے آنے والی ٹریفک کو اس دیوار کے سامنے سے گزرتا تھا اور ہر گاڑی سب سے پہلے اس سفید اسکرین کے سامنے سے ہی گزرتی۔ ٹریفک ہے“

”ہاں۔۔۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ چارلس دور بین آنکھوں سے ہٹائے بغیر بولا۔ ”یہ دیوار کبھی نے ضرور بتائی تھی لیکن اس ایک چادر پر یہ سفید رنگ انہوں نے بیٹھا نہیں کیا ہوگا۔ یہ حمان نے یا تو خود کل شام کے بعد کسی وقت کیا ہو گا یا کبھی کے کسی مزدور وغیرہ کو کچھ دے دلا کر کیا ہو گا۔ کہہ کر کل صبح جب ہم نے اس جگہ کا معائنہ کیا تو اس چادر پر سفید رنگ نہیں تھا۔“

چارلس نے آنکھوں سے دور بین ہٹا کر ابھرنے آئینہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”کسی نے بھی اس سفید کٹڑے کی طرف توجہ نہیں دی لیکن یہ صبح سے میری نظر میں لٹک رہا تھا۔ آہم میں بھی آخری وقت تک اس کا معرّف نہیں کچھ سنا لیکن میرے ذہن میں سیو بک کے وہ الفاظ مسلسل گونج رہے تھے کہ خان دھماکا خیز اشیا کا اسپیشلسٹ اور مت حسالی کتابی آدمی ہے شاید اسی جگہ سے میری رہنمائی کی۔“

”کس طرح؟“ سیو بک نے ایک نگ میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی کمرے چھپنے کی گاڑی اس سفید اسکرین کے سامنے سے گزرتی ہے تو ہمیں بھی نمایاں اور واضح نظر آتی ہے۔ عام طور پر نہایت اہم سرکاری ممانوں کو سیاہ رنگ کی چھ دروازوں والی سرسبز میں لایا جاتا ہے۔ لیڈی ڈائنا بھی ایسی ہی گاڑی میں تھیں۔ ٹین کی اس دیوار کے ایک سرے پر یہ سفید اسکرین تھی اور اس سے کچھ پہلے مرکز پر بورڈ لگا ہوا تھا۔ ”بٹر رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ“ حمان کو معلوم تھا کہ وہاں بیچ کر گاڑیوں کی رفتار اگر تین اس کے مطابق نہیں تو اس کے قریب قریب ضرور ہو جائے گی۔ دیوار کے دوسرے سرے پر ہلندی پر کرین کا ٹوم تھا جس میں سے اصل تک نکال دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک اور تک ایک خاص کھانچے میں لٹکایا گیا تھا جو درحقیقت تک نہیں بلکہ ذرا سی ٹھیس لگنے پر پھٹ پڑنے والا تانہ کیسہ تھا۔“

”میں سمجھ گئی۔“ کیسٹرن جلدی سے بولی۔ ”حمان نے اس دیوار کا فاصلہ ٹاپ لیا ہو گا۔ اس کے حساب سے مطابق ایک مخصوص رفتار سے آنی ہوئی گاڑی جب اس سفید اسکرین کے سامنے آتی تو وہ یہاں ریوٹ کنٹرول کا ٹین دیا جس سے وہ تک لیا ہم اس کھانچے سے نکل جاتا جو ریوٹ کنٹرول سے حرکت کر سکتا تھا۔ جس وقت تک لازم مجھے پانچا میں اس وقت سیاہ سرسبز اس کے نیچے پہنچ جاتی ہوئی۔ یعنی تک میں اس مخصوص گاڑی پر ہی گرا

”آپ کا دور سراسر اندازہ صحیح ہو گا۔ میرے حساب سے اسے ریوٹ کنٹرول ہونا چاہیے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”میں ٹوٹی ہوئی ٹرکی سے اس دور افتادہ منظر کا جائزہ لے رہا تھا جس کا چتر منٹ پہلے تک میں ایک حصہ تھا۔“

بغیر دور بین کے بھی وہاں کی چیزیں صاف ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ بس ذرا سراسر اصل سے چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ بین کی چادروں کی لمبی دیوار سب لہجہ۔ مشینری۔۔۔ دو دیوہ مرکز اور وہ کرین جس پر میرا چڑھنا اور اُڑنا گویا شخّص دار پر چڑھنے اور اترنے کے مترادف رہا تھا۔ دور بین کے ذریعے تو ان میں سے ہر چیز کو بہت صاف اور واضح دیکھا جاسکتا تھا۔

میں نے چارلس کیسٹرن اور سیو بک کو کھڑکی کے قریب آنے کا اشارہ کیا پھر بطور خاص چارلس کو مخاطب کیا ”آپ اس چکر کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے یہاں کٹڑے ہو کر سارا چکر زیادہ بہتر طور پر آپ کی سمجھ میں آسکے گا۔“

”کچھ کچھ تو میری سمجھ میں آ گیا ہے۔“ چارلس بولا۔ ”لیکن کچھ کڑیاں نہیں مل رہیں۔ دیے اس میں کوئی شک نہیں کہ حمان کا شاطر بھی ہے اور چھلاوے کی طرح چھڑتا بھی۔ اس میں کوئی المانہ طرازی شامل نہیں ہے۔ اس کا مجھے یقین آ گیا۔ اگر ہم اتنے افراد کی صلاحیتیں یکجا نہ ہوتیں تو وہ بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔“

”بے شک۔ ایک بار ایک سے کھینچنے کی وجہ سے تو میں بھی اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا ہوں لیکن نہ جانے کس مجھڑے کے تحت میری ذہانت اس حد تک بیدار ہو گئی کہ اچانک۔۔۔ میں وقت پر ہی اس کا چکر میری سمجھ میں آ گیا۔“

قریب سے ہی کیسٹرن نجی آواز میں بولی۔ ”میں نے حمیس خواہ مخواہی تو استاد تسلیم نہیں کیا ہے۔ تم خود بھی ایک غیر معمولی اہل آدمی ہو لیکن انکساری کی وجہ سے نہ تو اس کا اظہار کرتے ہو اور نہ اس بات کو تسلیم کرتے ہو۔ بہر حال۔۔۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔“

”میں اسی میں خوش ہوں کہ مجھے جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح میری سمجھ میں آ جاتا ہے اور کسی نہ کسی طرح حل بھی ہو جاتا ہے۔ بس اتنی ہی کافی ہے۔ اپنے تجربے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے کہا پھر بہت دور نظر آنے والی ٹین کی لمبی کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے دار میں کی چادروں سے بتائی گئی اس دیوار کو دیکھو نہ پہنچیں تو آپ لوگ؟“

سب نے اشارت میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ”ان میں سے پہلے کیسٹرن پر سفید رنگ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اسے دور بین سے دیکھیں تو کھال سے قطع نظر وہ کھڑا آپ کو سنیٹا کی اسکرین کی طرح دکھائی دے گا۔“

چارلس کے پاس اپنی دور بین ابھی تک موجود تھی۔ کیسٹرن



گا۔

”وہ تو محض رسمی کاروائیاں ہوں گی۔“ چارلس منہ ہانک رہا۔  
 ”وہ تو بس آج آج آتا تو آجاتا۔ اب اس کے بارے میں کوئی  
 نہیں کہا جاسکتا کہ کب دوبارہ اس کے بارے میں کوئی خبر سننے  
 کو ملے۔“

حمان کے نکل جانے کا مجھے بھی افسوس تھا۔ میں نے کڑی  
 سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں زیادہ ضروری کام پہلے نہ کرتا  
 اور کریں پر چڑھ کر اس بم کو بروقت دور نہ چھینکا تو شاید میں حمان  
 کے تعاقب میں جاسکتا۔“

کیترن بولی۔ ”لیکن اگر تم جاکر کریں پر نہ چڑھتے تو حمان کو تم  
 پر تازہ کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی اور ہم اس کی موجودگی سے  
 ہی آگاہ نہ ہو سکتے۔ تو اپنا کام کر کے خاموشی سے نکل جانا۔“  
 ”ہاں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن اگر کسی  
 بھی طرح اس کے تعاقب کے لیے میں بھی تم دونوں کے ساتھ  
 شریک ہو سکتا تو شاید وہ نکلنے نہ پاتا۔“

سیوبک جاکواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے جیسے جیسے لمبے میں  
 بولا۔ ”مسٹر چرچر دی! آپ ہم سب کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے  
 ہیں کہ میں اور کیترن حمان کا تعاقب کرنے کے اہل نہیں تھے  
 اور ہماری تلافی کی وجہ سے وہ نکل گیا۔“

”میں جیسے یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ دو سے تین  
 افراد ہر حال بہتر ہوتے ہیں۔“ میں نے لگاتار سے کہا۔  
 ”اب تو مجھے بھی افسوس ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں تھے  
 ہم بھی دیکھنے کے تم کیا تہہ چلاتے۔“ سیوبک کے لمبے میں پہلے سے  
 زیادہ ہلکا سا جھک گیا۔

”یہ کیا حماقت ہے؟“ چارلس نے بزرگانہ انداز میں دم  
 دونوں کو ڈانٹا۔ ”تم نے تو تجویز کی طرح آپس میں اٹھنا شروع کر  
 دیا۔ اس معاملے میں تم دونوں ہی کا کردار بے حد اہم رہا ہے۔ میں  
 تم دونوں ہی کا بے پناہ شکر گزار ہوں۔ حکومت برطانیہ کے  
 اہم افسدہ کی حیثیت سے میں پوری کوشش کروں گا کہ تم دونوں کا  
 فکریہ اوپر کرنے کے لیے مناسب ترین طریقہ اختیار کیا جاسکے۔“

سیوبک استہزائیہ سے انداز میں بولا۔ ”کیا ستم غریبی ہے؟  
 کبھی کبھی حکومتوں کو مجھ جیسے آدمیوں کی خدمات کی بھی ضرورت  
 پڑ جاتی ہے اور وہ ان پر شکر گزار کی کا اظہار بھی کرتی ہیں۔“  
 ”ہاں۔۔۔“ چارلس لھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”ڈاکے سے  
 بچنے کے لیے کسی ڈاکو کے مشورے ہی زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں  
 میں نے یہ بات بزرگوں سے سنی تھی اور یہ کافی حد تک درست ثابت  
 ثابت ہوئی۔“

اس کے بعد چارلس نے مختلف رسمی کارروائیاں پوری کیں۔  
 کچھ خاص خاص لوگوں کو ہدایات دیں۔ بیشتر لوگ دباؤ سے  
 رخصت ہو گئے اور چند منٹ بعد ماحول اس طرح معمول پر آ گیا۔

اور اس کے پرچے اڑا جاتے۔ ہانسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔  
 ”بے شک۔“ میں نے تائید کی۔ ”بلکہ اس بم نے پانی کے  
 ٹینک میں گرنے کے باوجود بجتی بجتی پھیلانی ہے اس سے مجھے  
 اندازہ ہوا ہے کہ اگر حمان کا اندازہ تصور ذراست غلط بھی ہو جاتا۔  
 جس کی اس نے جیشہ کھپائش رکھی ہوگی۔ تب بھی سیاہ سرسبز کو تو  
 ہر حال تباہ کر دیتا۔ لیکن اس چلتی ہوئی کم از کم تین گاڑیوں اس  
 کی تباہ کاری کی نوبت نہیں آتی تھی۔“

چارلس دم بخود کھڑا تھا۔ جی ہر حال باپ سے زیادہ ذہین  
 تھی۔ وہ باپ سے پہلے بات کو سمجھ گئی تھی۔ ایک لمحے کے توقف  
 سے میں نے کہا۔ ”یہ گاڑیاں حمان کے لیے زیادہ مشکل بھی ثابت  
 نہیں ہوئی ہوں گی۔ یہ ایک اوپن سائٹ تھی۔ اس نے اس سے  
 پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مجھے یقین ہے کہ کل شام وہ کریں پر پٹر کے  
 روپ میں سائٹ پر پہنچا ہوگا۔ کوئی پتہ نہیں ہے اس نے کریں  
 پر پٹر کو تعاقب بھی کر دیا ہو۔ بعد کی تحقیقات سے ایسی بہت سی  
 باتوں کا صحیح پتہ چلے گا۔ ہر حال اس روپ میں وہ اپنی گاڑیاں کر کے  
 چلا گیا ہوگا۔ گاڑیاں زیادہ لمبی چوڑی بھی نہیں تھیں۔ اس نے  
 اپنے کمرے ہونے کے لیے بھی اس جگہ سے بہت پیچھے ہٹ کر جگہ  
 منتخب کر لی تھی جہاں زیادہ سختی تھی اور زیادہ سیکورٹی والے پھیلے  
 ہوئے تھے۔“

چارلس جھرجھری سی لے کر بولا۔ ”اور اگر یہ بات بروقت  
 تمہاری سمجھ میں نہ آتی تو اس وقت فی دی اور ریڈیو کے بعض چیل  
 نہایت جوش و خروش سے ایک افسوسناک خبر نشر کر رہے ہوتے۔“  
 ”پوری بات تو فوری طور پر میری سمجھ میں بھی نہیں آتی  
 تھی۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے تو صرف سفید اسکرین میری نظر میں  
 نکلتی تھی۔ پھر میں نے دور میں سے کریں کا جائزہ لیتے ہوئے  
 محسوس کیا کہ اس کے جب کی سائٹ کچھ مختلف اور مشکوک سی  
 تھی۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن کی کسی کا دھیان جانا مشکل ہی تھا۔  
 ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے بھی لوگ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ سیکورٹی  
 والوں نے دھماکا خیز مادے کی تلاش کے لیے آج بھی آلات کی مدد  
 سے تمام مشینری کو چیک کیا تھا لیکن کریں کے جب تک جانے کا کسی  
 کو خیال نہیں آیا تھا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس بولا۔ ”حمان کی کوشش  
 کو ناکام بنانا ہی ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہمارا اصل مقصد تو  
 پورا ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی حمان کے نکل جانے کا بڑا افسوس  
 رہے گا۔ اس کی کسی واردات میں پہلی بار اس کی اپنی موجودگی کے  
 استے واضح آثار نظر آئے تھے۔“

ہمارے قریب ہی کھڑا سیکورٹی آفیسر بولا۔ ”بیکرٹ سروس  
 والوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ جس مکان کی چھت پر مسٹر  
 سیوبک کو گھٹ پوائے کا بیوقوف مہر ملا تھا اس سے آگے حمان کا  
 سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا تعاقب جاری رہے

ہیے وہاں کچھ ہوائی نہیں تھا۔

چارلس نے مجھے سیویک کو اور کیتھرن کو سیدھے گھر جانے کی ہدایت کی کہ اس نے زور دے کر خاص طور پر کہا کہ ہم اب دھڑ دھڑ نہیں اور جانے کی ہرگز کو شش نہ کریں۔ اسے خود نہ جانے کہاں شیر کے پاس پہنچنا تھا جس کی طرف سے اسے رہنے پر پیغام ملا تھا۔ وہی سرسبز ہمیں لے جانے کے لیے آگئی جس میں ہم سیویک کے گاؤں گئے تھے۔ گھر پہنچ کر میں لباس تبدیل کر کے اور آواز ہم ہو کر بیٹھائی تھا کہ کیتھرن ایک بار پھر رازدارانہ سے انداز میں میرے کمرے میں آگئی۔

دو روزہ بند کر کے اس نے غوری قفل کر دیا اور میرے قریب ہی ایک آرام کر رہی بہم دراز ہوتے ہوئے بغیر کسی تنہید کے بچی آواز میں بولی۔ ”تم ایک عجیب ہی آدمی ہو۔“ اسے معلوم نہیں کیوں مجھ سے آن کرے ہو۔“

”اب جو بات بھی میرے ذہن پر یوجہ بن رہی ہے وہ میں تمہیں بتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”اب اس میں میرا کیا قصور؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”میرا حال تمہارے آواز میں رنج و غم کی نوعیت کیا ہے؟“

”اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہی ہے۔“ وہ ترجمانی نظروں سے بھری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ویسے اب اس کا ذکر نہ کرنے کا کوئی خاص فائدہ تو نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں آگاہ کر دیا جائے شاید اس سے آگاہ رہنا آئندہ تمہارے لیے مفید ثابت ہو۔ جب تم کریں پر لکھ ہوئے تھے تو تم پر سا پائلٹر لگی را نقل سے ناز ہوا تھا اور خدا کا شکر ہے کوئی تمہیں نہیں ملی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم پر کوئی چلائی گئی ہے اور فوراً ہی میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کوئی کس عمارت کی کھڑکی سے چلائی گئی ہے۔ حالانکہ مجھے ان معاملات میں اپنے بارے میں فائدہ خوش قسمی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کوئی حام لڑکی نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے میں تمہاری یا سیویک کی برابری نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود سیویک نے اس وقت ہم سب کو جس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک اور عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ نازنگ وہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس نے خود بھی بلاوجہ اسی سمت میں نازنگ شروع کر دی تھی۔ اُپا اور سیکرٹری والے بھی اُدھر ہی متوجہ ہو گئے تھے۔ جتنی دیر میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اتنی دیر میں تمہارا کام تمام ہو سکتا تھا۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”یعنی صرف تم اپنی اصل عمارت کی طرف متوجہ رہی تھیں اور تم نے ہی اس کھڑکی پر نازنگ کر کے

مجھ پر ہونے والی نازنگ کو روکا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلاتے تو میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے میں جو اس وقت ذمہ سلامت بیٹھا نظر آ رہا ہوں خدا کے کرم کے علاوہ اس کا ایک سبب تم ہو؟“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میں تم پر احسان جتانے نہیں آئی ہوں۔ میں تو صرف اس حیرت کا اظہار کرنے آئی ہوں کہ آخر سیویک کی اس حرکت کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟“

”شاید وہ بے چارہ تمہارے معاملے میں مجھے اپنا رقیب سمجھ رہا ہو اور یہ اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا بہترین طریقہ سوچا ہو۔ اس طرح میرا کام بھی تمام ہو جاتا اور اس پر کوئی الزام بھی نہ آتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس نے چارے کو کیا معلوم کہ تم تو مجھ سے جان چمڑانے کا بہانہ تلاش کرتے پھر رہے ہو۔“ کیتھرن نے نہ ہنسا نہ ہر حال دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اس شخص کے قریب میں دوڑے تھے ہم جہان سمجھ رہے تھے تو سیویک اس گلی میں گھسا جس میں ہم نے اسے ٹاپ ہوتے دیکھا تھا اور مجھے اس نے عقبی گلی میں جانے کا حکم دیا کہ میں جہان اُدھر سے نہ نکل جائے۔ آگے سے وہ گلی بند تھی۔ اس لیے اس طرف سے اس کے فرار ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ میں نے وہ فزوں کی طرح جھپٹی گلی میں دوڑی پھرتی رہی۔ مجھے جہان کہیں سے فرار ہو نہ سکا کیونکہ میں نے پتہ لے لیا۔ بعد سیویک صاحب ایک مکان کی چست سے جھپٹی گلی میں کودے اور انہوں نے لٹ پڑے والا وہ بے غلام ہوا میں لڑا تھا۔ ہوئے مجھے مطلع کیا کہ محترم خان صاحب فرار ہو گئے ہیں اور محترم سیویک صاحب ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔“

”تم کتنا کیا جانتی ہو؟“

”کیا یہ بین ممکن نہیں کہ جس طرح اس نے جہان کو موقع دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس وقت تمہیں شوٹ کرنے میں کامیاب ہو جائے جب تم کریں پر لکھ ہوئے تھے۔ اسی طرح اس نے مجھے رُخا کر جہان کو نقل بھانسنے کا موقع بھی دے دیا ہو؟“

کیتھرن بولی۔

”اگر تمہارا یہ خیال درست ہو تو تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرو گی؟“

”میں کہ لڑی ڈانکا پر ملنے کی سازش میں وہ بھی شریک تھا لیکن ہماری نظر میں نیک نام بنے اور ہماری جانچوں کی خبر کھنے کے لیے ہمارے ساتھ آن ملا تھا۔“ وہ قدرے اچھا بھلا کے ساتھ بولی۔

میں خاموش رہا تو وہ زور دے کر بولی۔ ”اُپا نے سیویک پر اختیار کر لیا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایک ایتر فیصلہ قسم کے قابل کو ہم سے یا ہماری حکومت سے کوئی بد روی ہو سکتی ہے۔“

”پہلے شاید نہ رہی ہو۔“ جس میں دیکھنے کے بعد ہو گئی ہو۔“

نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سانپ شاید ابھی ہماری آستین میں ہی ہو۔ سیوہک ابھی ہمارے ساتھ ہی ہے۔ مجھے تو یہ بھی کسی سانپ سے کم نہیں لگتا۔

”کانی پنڈم سانپ ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ اس نے مجھے گھورا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”تمہیں اندیشہ ہے کہ سازش کی کوئی کڑی ابھی باقی ہے؟“

”ہاں۔“ وہ زور دے کر بولی۔ ”میں تم سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ ابھی تم بے فکر نہ ہو جانا۔ ہو شیار رہنا۔“

”آف خدا یا!“ میں نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔ ”میں کس کس کی طرف سے ہو شیار رہوں۔ اچھا۔ قرض کرو وہ اس سازش میں شریک بھی تھا تو اسے کیا ملا؟“

”ملا تو اس لیے نہیں کہ ان کی سازش ناکام ہو گئی۔ پھر بھی... کم از کم یہ فائدہ تو ہوا ہے کہ سیوہک ہماری گڈ بکس میں آگیا۔ ایک اجرتی قاتل ہوتے ہوئے بھی وہ میرے پاپا جیسے پارسوخ برطانوی کا دوست بن گیا۔ اگر سازش کا سیلاب ہو جاتی تب بھی وہ ہماری گڈ بکس میں ہی رہتا۔“

”تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں جنم لیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ان دو باتوں کی وجہ سے جو میں نے تمہیں بتائی ہیں۔ ایک تو سیوہک کا تمہیں حوالے کی کوشش کرنا۔ پھر ملٹوک انداز میں اگر ہمیں عمان کے فراہ کی خبر ملنا۔“

”کیترن پر احاطہ لے لیں۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں پھر بے وقت مذاق سوجھ رہا ہے۔ اس نے جس وقت ہمارے سفارت خانے کو اس سلسلے میں غلط لکھا تھا اس وقت تک شاید اس نے خواب میں بھی مجھے نہ دیکھا ہو۔“ وہ منہ ہٹا کر بولی۔

”خوابوں کی بات مت کرو۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس کے خوابوں میں کیا کچھ آتا ہو اور کون کون آتا ہو۔“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”خدا ایکے لیے تم غیر بخیر کی چھوڑو۔“ کیترن گویا عاجز آکر بولی۔ ”میں ایکہ گہری سازش کی ہو سو گئے وہی ہوں اور تم میری بات پر کان ہی نہیں دھر رہے۔“

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے نامست زدہ لمبے میں کہا۔ ”مجھے بجلی بے فکری سے گھوما کرتی تھیں۔ نہایت منافع بخش وعدے کیا کرتی تھیں۔ یکدم ہی گہری اور بین الاقوامی سازشوں کی پوسٹ گھنٹے کے چکر میں پڑ گئیں۔ خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔“

ادھر میرا یہ حال ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کی سازشوں وغیرہ سے... فی الحال کوئی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ کچھ سازشوں نے مجھے خود گھن چکر بنایا ہوا ہے لیکن فرض کرو میں بخیر ہو بھی جاتا ہوں تو اب اس سے کیا حاصل ہو گا؟ سانپ تو نکل چکا ہے اب لکیر پٹنے کا کیا فائدہ؟“

”ایک سانپ نکل چکا ہے۔“ اس نے گویا ہچک کی۔ ”دوسرا“

تم جیسی کسی لڑکی سے نہایت سنجیدگی سے عشق کرنے لگوں۔" میں نے مسکین کی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
 "تم مجھے باتوں میں بھلائے کی کوشش کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے اصل چکر کچھ اور ہے۔ شاید تم پہلے ہی سے کسی کے عشق میں گرفتار ہو اور خالص مشرقی انداز میں اس عشق کی "سلاج" رکھ رہے ہو۔ کوشش کر رہے ہو کہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔" پھر وہ رازدارانہ سے انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "سچ بتا دو۔ کیا وہ لڑکی بہت خوبصورت ہے جس سے تمہارے عہد دنیاں چل رہے ہیں؟"

"کون سی لڑکی؟ کیسے عہد دنیاں؟ کیوں دل کے زخموں کو چھینتی ہو۔ اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کسی خوبصورت لڑکی سے عہد دنیاں ہو۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔  
 "اپنی! اتم اول درجے کے بد معاش اور جھوٹے ہو۔" وہ مجھ سے بھی زیادہ لفظی سانس لے کر بولی۔  
 "تعریف کا شکر یہ۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے میں ابھی اس بلند مقام کو نہیں پہنچا۔" میں نے انکساری سے کہا۔

دخشا دروازے پر دستک ہوئی۔ کیتھرن نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ چارلس ریف کیس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ یہ حضرت بھی عجیب ہی بزرگوار تھے۔ موصوف جہاں کہیں بھی جاتے تھے غالباً انہیں احساس ہو جاتا تھا کہ ان کی بیٹی پر روانوی جذبات غالب پارہے ہیں اور وہ مجھ پر صراحت ہونے لگی ہے۔ وہ فوراً مجھے اس کے حسین "شر" سے بچانے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ میں سچ بتاؤں گا ان کا شکر گزار تھا۔  
 چارلس بیٹ آٹار کر ریف کیس ایک طرف رکھ کر دھم سے کاؤچ پر گرتے ہوئے بولا۔ "میں جب رابوادی میں داخل ہوا تو میں نے ایک سایہ اگلے کسی کمرے کی طرف غائب ہوتے دیکھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اس کمرے کے دروازے پر کی ہول پر جھکا ہوا تھا۔"

"وہ سید بیک کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا ہے۔" کیتھرن فوراً بولی۔ "اس ٹکڑ پر ہمارے علاوہ صرف وہی مقیم ہے لیکن یہاں آنے سے پہلے میں نے کی ہول کے ذریعے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اس وقت دوسرا تھا۔"  
 "ہو سکتا ہے اسے پہلے ہی معلوم ہو گیا ہو کہ کوئی اس کے کمرے میں جھانکتے والا ہے۔ اس کی تسلی کے لیے وہ جلدی سے اسٹیج سبارک سونے کا ڈراما کرنے لگا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ اس ٹکڑ پر سب ایک دوسرے کے کمروں میں جمائے پھر رہے ہیں۔ آخر پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

کیتھرن نے مجھے گھورا۔ چارلس کھٹک کر کھٹک صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں ویسے بھی ہم چاروں اب ایک دوسرے کے

اپنی قاتل کا بھائی ہوتا ہے۔ آج کل شرق میں انتشار پایا جاتا ہے اور قاتلوں میں بڑا اعتماد لینے میں آتا ہے۔ شاید انہیں معلوم لیا ہے کہ اتحاد میں ہی ان کی بھا ہے۔ ممکن ہے سید بیک اور عمان نے اس قسم کے سلسلے میں دو نظریے نہیں بنائی ہو۔"  
 "تم اس سلسلے میں میری رائے جاننا چاہتی ہو؟"  
 "نظا ہر قسم۔ اور میں کس لیے اتنی بیک بیک کر رہی ہوں؟"  
 "میری رائے یہ ہے کہ تمہاری رائے کچھ زیادہ صحیح نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آج کی دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان سے کیسی کتا پایا جاتا ہے۔" وہ منہ ہانک کر بولی۔

"تم نے میری رائے اگلی قسم میں نے دے دی۔" میں نے کہنے کا پتہ کر کہا۔ "میرا خیال ہے سید بیک ہمیں یہ اطلاع دینے میں تو قلعہ تھا کہ لڑکی ڈاکٹر کا علاج ملے والے ہے۔ اس کے بعد جب ہم لوگ اس کے کانوں گئے اور وہ ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہوا اس وقت تک بھی اس کی نیت میں کوئی خاص خرابی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ تمہاری شخصیت اور ملا جلتوں سے متاثر ہو کر تم پر عاشق ہو چکا تھا لیکن تم چرنگہ جو اس کی طرف التفات کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھیں چنانچہ اس نے فرض کر لیا کہ اس کی وجہ میں ہیں۔ جوں ہی اس نے موقع دیکھا کہ مجھے راستے سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس پر کوئی الزام بھی نہیں آسکتا تھا۔ میرے خیال میں تو معاملہ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

اس نے میری رائے سے کچھ زیادہ اتفاق نہیں کیا اور اصرار کرتی رہی کہ میں سید بیک کی طرف سے ہوشیار رہوں۔ آخر میں نے ہتھیار کر کہا۔ "میں اس قسم کے لوگوں کی طرف سے ہوشیار تو رہتا ہی ہوں لیکن اگر تمہاری صیحت اور آئندہ راسی طرح جاری رہی تو میں ابھی جا کر اس کی گردن توڑ دوں گا تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

"اس کی گردن توڑنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔" یہ مجھے معلوم ہے۔ "وہ منہ ہانک کر بولی۔

"تم خواد خواہ مجھے کسی شریف آدمی کے قتل پر مت اُکساؤ۔"  
 "شریف آدمی۔۔۔؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے گویا بڑا سناٹے ہوئے کہا۔ "اتنی شرافت اور شائستگی سے عشق کرنے والے میرے خیال میں شریف آدمی ہی ہوتے ہیں۔"

"تو پھر تم خود کیوں "شریف آدمی" بننے کی کوشش نہیں کرتے؟" وہ شرر نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 "میں ابھی شرافت کے اس درجہ کمال کو نہیں پہنچا کہ ایک لڑکی اور دنیا کے مختلف ممالک میں کئی رشتائیں رکھنے کے بعد بھی

آواز میں واقعی خودی کی جھلک نہیں تھی۔ اندر پہنچ کر چارلس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔

ہم تینوں بیٹھ چکے تو چارلس برف کیس گھنٹوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”سیو بک! میں بلا تہدید بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے نہ صرف میری حکومت کی طرف سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم نے نہ صرف میری خبردار کیا بلکہ لیزلی ڈانکا کے قتل کی سازش کو ناکام بنانے میں اعلیٰ طور پر ہمارے ساتھ شریک رہے۔ تم نے وہ طین پاؤنڈز کی رقم کو بھی محفوظ رکھا۔ یعنی مالی طور پر بھی ایک بڑا نقصان برداشت کیا۔ ہم سب کے طور پر تو تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے لیکن تمہارے نقصان کی کچھ نہ کچھ ٹھانی کی کوشش کر سکتے ہیں۔“

سیو بک کے بندے کے کنارے پر بیٹھا ایک نگاہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ذہنی ڈھال شرف کا گریبان نکلتا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نہایت مضبوط ورزشی جسم کا مالک تھا مگر خاصا ڈراما اور کچھ پھٹکا نظر آتا تھا۔

چارلس نے برف کیس کھولا اور میں ذرا چمکا۔ برف کیس پر ملائی کرکٹ توپوں سے بھرا ہوا تھا۔ چارلس برف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ ایک طین پاؤنڈز کی رقم تمہاری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔“

سیو بک کے سیاہ چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا اور نہ ہی اس نے برف کیس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے گہرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ چارلس برف کیس کچھ اور آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ لے لو نا۔۔۔۔۔“

سیو بک کچھ بدلے بدلے اور منہ بانہ لہجے میں بولا۔ ”مخبر چارلس! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے آپ واپس رکھ لیں۔ البتہ اس کے بجائے اگر آپ مجھے کچھ اور نہایت فراہمی تو میں آؤنگی آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

”وہ کیا؟“ چارلس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں میری کیتھریں صاف سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ ملوثانہ تھا اور وہ حد سے زیادہ عجیبہ نظر آ رہا تھا۔ چارلس گویا بھرتی کا سارہ گیا تھا اور ایک نگاہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا کھلا رہ گیا تھا۔ میں نے پورے پوری کوشش کی کہ کسی رد عمل کا اظہار نہ کروں اور دوسروں کے اثرات کا جائزہ لیتا رہوں۔ کیتھریں کے چہرے پر مجھے معمول سے کچھ زیادہ سرفی نمودار ہوئی دکھائی دی۔

آخر چارلس بولا۔ ”تم واقعی عجیبہ ہو یا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟ کوئی ڈراما وغیرہ بول رہے ہو؟“

”آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں؟“ سیو بک گویا کسی تکلیف محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”میں زندگی میں کبھی اس سے زیادہ عجیبہ نہیں ہوا۔ بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ زیادہ عجیبہ کی کیا علامت ہے؟“

ساتھی بن چکے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیے۔“

”آپ کی بیٹی کے خیالات سیو بک کے بارے میں بہت مختلف ہیں۔“ میں نے کیتھریں کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ مجھے گھور رہی تھی۔ ”اس کا خیال ہے کہ سیو بک بھی حمان کا ساتھی ہو سکتا ہے۔“

میں نے اسے وہ تمام گفتگو متاوی جو میرے اور کیتھریں کے درمیان ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں اپنی رائے بھی بے تکلفی سے ظاہر کر دی۔ چارلس نے اس کا قطعاً برا نہیں منایا بلکہ اثبات میں سرلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تمہاری رائے درست معلوم ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ کسی انکھی ہی عورتوں سے اس کا واسطہ کسی۔ لیکن بہر حال انسان ہے، مرد ہے۔۔۔ کیتھریں پر کوئی بھی مرد عاشق ہو سکتا ہے۔“

چارلس نہایت اطمینان سے بیٹی کے بارے میں اظہار خیال کر رہا تھا۔ اسے گویا اپنی بیٹی کی شخصیت کے اس کشش انگیز پہلو پر فخر تھا کہ اس پر کوئی بھی مرد عاشق ہو سکتا تھا۔ اس نے تو شاید مجھے بھی اپنی صاحبزادی کے عاشقوں میں شمار کر لیا تھا۔ بیانی الحال میں نے اس کی یہ غلط فہمی دور کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اس نے میرے بارے میں ابھی کوئی اظہار خیال نہیں کیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”بہر حال میں اس بات کو بڑا نہیں سمجھتا اور نہ ہی بیانی الحال اسے اہمیت دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ گاؤں واپس جائے گا یا کسی نئے ”کنٹریکٹ“ میں مصروف ہو جائے گا تو سب کچھ بھول جائے گا۔“ اس کے لہجے میں گویا تجربہ بول رہا تھا اور وہ اپنی جگہ نہایت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اس وقت سیو بک سے ہی بات کرنے جا رہا ہوں۔ عملی طور پر اس کا کچھ شکر ہی ادا کرنا ہے۔ میں اس لیے راستے میں رک گیا تھا کہ تم دونوں کو بھی ساتھ لے لوں۔“

میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں چارلس مجھے ساتھ لے جانے پر مٹھا ہوا تھا۔ کیتھریں بھی ساتھ جانے کی کچھ ایسی زیادہ خواہشمند معلوم ہوتی تھی لیکن ہم دونوں ہی کو جانا پڑا۔ ہم دم چٹوں کی طرح اس کے ساتھ تھوڑے لمبے

چارلس کی دستک کے جواب میں سیو بک نے آنکھیں ملنے ہوئے دروازہ کھولا گویا وہ سوئے سے اٹھا ہو۔ کیتھریں نے یوں میری طرف دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو۔ ”ڈراما کی تو۔۔۔ حیثیت کیسی ایکٹنگ کر رہا ہے!“

چارلس نے اس سے معذرت کی کہ وہ اس کے آواہ میں غفل ہو گیا تھا مگر میں داخل ہوتے ہوئے بولا ”لیکن میرے پاس وقت کم ہے اور کام بہت سے نشتا ہے۔ میں اس لیے نہیں چلا آیا۔“ ”کوئی بات نہیں۔“ سیو بک ذرا خشک لہجے میں بولا۔ اس کی

جملہ اور اورا چھوڑ کر اس نے اپنی دھلی ڈھالی قمیص اور چٹوٹوں کی قمیصیں ٹھیلیں اور بالآخر مرزا سائیک کاغذ نکال کر چارلس کی طرف بڑھا دیا۔ چارلس نے ہچکچاتے ہوئے کاغذ ہاتھ میں لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس پر کسی ایسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جو میرے لیے بھی ناقابل فہم تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ چارلس نے آنکھیں کھڑکھڑاتے ہوئے اسے لیے میں پرچا۔

”میری پہلی بیوی کی طرف سے شادی کا اجازت نامہ۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”اس نے مجھے لکھ کر دے رکھا ہے کہ میں جب چاہوں، جہاں چاہوں اور جتنی چاہوں شادیاں کر سکتا ہوں، اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”بہت خوب، بہت خوب۔“ چارلس ڈبیر لیے لیے میں بولا لیکن وہ کچھ ایسی نظروں سے سیو بک کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اب بھی امید تھی کہ سیو بک کسی بھی لمحے کہہ دے گا، وہ تو مذاق کر رہا تھا لیکن چارلس کی یہ امید پوری نہ ہو سکی۔ سیو بک نہایت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر اس کے جواب کا کھنکھارہ۔ آخر چارلس گہری سانس لے کر بولا۔ ”بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے اپنی پہلی بیوی سے آئندہ شادیوں کی دھلی ڈھالی اجازت لے رکھی ہے اور اس کی طرف سے ”میں اوس“ یہ وقت جب میں لیے پھرے ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم آئندہ جو شادی کرو گے اس بیوی کی طرف سے بھی اس قسم کا اجازت نامہ ہر وقت تمہاری جیب میں پڑا رہا کرے گا۔ یہ سلسلہ غالباً تمہارے مرے یا انتہائی ضعیف اور مریدہ ہو جانے تک چلتا رہے گا۔“

وہ بے پروائی سے کندھے اُپکاتے ہوئے بولا۔ ”اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ اگر حالات اجازت دیتے ہوں یا حالات کا تقاضا ہو اور انسان افورڈ بھی کر سکتا ہو تو اسے ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا ہے۔“

”لیکن تمہارے ہاں ایسا نہیں ہوتا سیو بک!“ چارلس زرا سخت لیے میں بولا۔ ”تمہارے ہاں نہ تو کوئی لڑکی پہلی بیوی کی موجودگی میں کسی مرد کی دوسری بیوی بننا پسند کرتی ہے اور نہ ہی قانون ایسا ہوتا ہے اس لیے تم اس اعتقاد بحث کو نہیں فہم کرو۔“

”تمہارے ہاں تو لڑکیاں بغیر شادی کے بھی مردوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ غالباً تمیں چالیس فیصد جوڑے اسی طرح رہ رہے ہیں۔“ سیو بک چہچہاتے ہوئے لیے میں بولا۔

”بات شادی کی ہو رہی ہے اس لیے صرف شادی کے قوانین کا ذکر کرو۔“ چارلس نے اسی لیے میں کہا جس میں چند لمحے پہلے سیو بک نے بات کی تھی۔

”اگر تم چاہو تو میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق بھی دے سکتا ہوں۔“ سیو بک کا غصہ تھا۔

”یہ اور بھی بڑی بات ہوگی۔“ چارلس بولا۔

”لیے خالص اپنے قبائلی انداز میں آپ سے درخواست کروں۔“ وہ ہنسنے سے باز آیا اور کچھ اس طرح ایک گھٹنے کے بل بیٹھ گیا جس طرح پڑانے دو من دیواری اپنے شیشہ کو سلام کرنے کے لیے بیٹھتے تھے۔ اس نے چارلس کے ہاتھوں سے ہریف کیس لے کر بند کر کے اسی کے پاس رکھ دیا اور نہایت احترام سے سر جھکانے ہوئے پہلے چارلس کے دونوں ہاتھ چومے۔ پھر اس کا ایک ہاتھ قلم کر دونوں آنکھوں سے لگا کر چھوڑا اور اسی ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر سر جھکانے ہوئے نہایت عاجزانہ لیے میں بولا۔ ”محترم چارلس! میں اپنی درخواست دہرانا ہوں اور تب سے وعدہ کرنا ہوں کہ آپ کی بیٹی کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اسے قلم نقشبندی اور آئینہ کشیں، ہیم پتھانے کے لیے جدوجہد کروں گا۔“

پھر وہ ذرا سیدھا ہوا تو بولے۔ ”تمہارے قبیلے میں بڑے سے بڑا آدمی اس طرح کسی کی بیٹی سے شادی کی درخواست کرتا ہے۔ میں نے اپنے قبیلے کی یہ ابتدا کی رسم ادا کر دی ہے۔ اب آپ مجھے کوئی وقت دے دیں تاکہ میں اپنے قبیلے کے دو عین بزرگوں کو لے کر آ جاؤں اور ایک باضابطہ طاقت میں شادی کی تاریخ طے پا جائے۔“

چارلس تھوک ٹھٹھے ہوئے بولا۔ ”مجھے تم سے اس سحرے پن کی توقع نہیں تھی سیو بک! اہم نہایت سنجیدہ ماحول میں نہایت سنجیدہ موضوع پر بات کر رہے تھے۔“

سیو بک کی آنکھیں چمک چمکیں۔ اسے گویا چارلس کے الفاظ نے ایک بار پھر سخت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ نہایت گھبرے گھبرے لیے میں بولا۔ ”مسٹر چارلس! اہم جب قبائلی انداز میں کوئی بات کرتے ہیں اور قبائلی انداز میں کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم بے حد سنجیدہ ہوتے ہیں۔ آپ اسے کوئی معمولی یا مذاق کی بات نہ سمجھیں کہ ایک قبیلے کا سردار۔ اور وہ بھی سیو بک جیسا سردار آپ کی بیٹی سے محض دوستی یا وقت گزارنے کا نہیں بلکہ شادی کا خواہشمند ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس ”اعزاز“ کے ذکر پر کیتھرس کے چہرے کی سرخی بڑھ گئی لیکن اس نے اب بھی گھٹنگ میں کوئی مداخلت نہ کی۔ شاید فی الحال باپ ہی اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا۔

چارلس اب گویا واقعی سیو بک کے لیے کئی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن تم تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہو اور کئی عرصے میں تمہاری داستانیں بھی موجود ہیں۔“

سیو بک کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کھنکھارہ سا آگیا اور وہ زرا سخت لیے میں بولا۔ ”داستانوں کی اس وقت کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ اس وقت صرف شادی کی بات ہو رہی ہے اس لیے تم صرف بیوی کا تذکرہ کر سکتے ہو۔“ قمیص میری پہلی بیوی کی موجودگی پر انکسائش میں ہونا چاہیے کیونکہ۔۔۔“

طرح بیجا ہمارے ساتھ باتیں کرتا نظر نہیں آئے گا۔ اس کی گفتگو  
و شنیدہ چارلس بالار بدحواس سے ہی ہوگی۔ "اس کا لہجہ نرم تھا مگر  
اس میں سختی بول رہا تھا۔"

چکر لوگوں پر گئے رحم آنے لگا تھا۔ پہلے تو میرا اسے کوئی بھی  
جواب دینے کو تھی نہ چاہا لیکن پھر جس کے بغیر نہ سکا۔ "یہ بات  
میں پہلے بھی کہی تھی لوگوں سے سن چکا ہوں۔ میں تو ہی دیکھا میں سمجھ  
ہوں لیکن ان کی شاید بڑیاں بھی کل جگلی ہوں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چارلس کی طرف دیکھ کر اٹھتے  
ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے ہماری گفتگو کی نتیجہ خیز ہو نہ پہنچی  
نظر نہیں آتی۔" اس کے ہاں خود میں کل اپنے ٹھیلے کے تین چار  
بزرگوں اور تین چار دوسرے لوگوں کے ساتھ۔۔۔ یہاں آؤں گا  
ہم ذرا مختلف ماحول میں بیٹھ کر بات کریں گے شاید تم یا کیتھرن  
خود اپنی رائے بدل لو۔

وہ اپنے کپڑے اور دو چار دوسری چیزیں زبردست جیک میں  
ڈالنے لگا۔ اس کے لیے میں ایک نہایت ہی ظالم سی دھکی پنڈال  
تھی لیکن چارلس شاید اس پر دھیان دے کر پھر دوستانہ ہی لہجے میں  
بولا۔ "کیا تم گاؤں والی چار ہے؟"

"ہاں۔" سید بیک نے سنا۔ "مجھے میں جواب دیا۔  
"میں جلدی بھی کیا ہے۔" چارلس بولا۔ "تمہارا آج جانتے  
کا پروگرام تو نہیں تھا۔"

"میں نے پروگرام بدل لیا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔  
"میرے یہاں بے کار بڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سر حال۔  
کل تم سے بھر ملاقات ہوگی۔"

"اگر کل بھی تم ہی باتیں کرنے کے لیے ملاقات کرنا چاہتے  
ہو تو میرے خیال میں تم خواہ مخواہ ہی ان نامعلوم بزرگوں اور دیگر  
لوگوں کو تکلیف دو گے۔ میرا جواب کل بھی یہی ہو گا۔" جس میں  
معلوم ہے ہم مغربی لوگوں کے ہاں ویسے بھی اولاد کے بالغ ہونے  
کے بعد والدین کو ان پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اگر کیتھرن راضی  
ہوتی تو میری ہاں یا نہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تم کو یہ سب  
باتیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی گوشہ تمہارے لیے  
انجمن نہیں ہے۔ ہر جگہ کے قوانین اور رسوم و رواج کے بارے  
میں تم جانتے ہو۔ "چارلس کا انداز اب بھی سمجھانے والا اور صاف  
جوا نہ تھا۔

"وہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ سب کچھ مجھے معلوم ہے لیکن  
میں ایک کام سمجھنے کی سے کرنا چاہتا ہوں۔ شادی عہد کا معاملہ  
ہمارے ہاں قبائلی طریقے سے ہی طے ہوتا ہے۔ سو میں اپنی رسی  
کا ردوائی پوری کر رہا ہوں۔" جس میں فہم کرنے کا اختیار دے دیا  
ہوں۔ ورنہ میں تو دنیا کے باقی معاملات ہم دنیا کے طور طریقوں کے  
مطابق کرتے ہی رہتے ہیں۔"

وہ گویا کچھ اس قسم کی بات کر رہا تھا کہ فی الحال تو وہ سیدھی

"تم اپنی بیٹی سے تو کچھ پوچھ ہی نہیں رہے۔ خودی گھٹو کیے  
چار ہے ہو۔" سید بیک کیتھرن کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"میں اس لیے خودی ساری گھٹو کیے جا رہا ہوں کہ کیتھرن  
سے جس میں کہیں اور زیادہ سخت و ڈانگوار جواب سننے کو نہ ملے۔ میں تو  
پھر بھی بڑی عمر کا ایک جوان عہد آدمی ہوں۔ جس مزاحیہ کا مظاہرہ  
کر سکتا ہوں لیکن کیتھرن۔۔۔" اس نے غصہ کی سانس لے کر حملہ  
ادھر اور اچھوڑ دیا۔

"پھر بھی۔۔۔" ہمیں محترمہ کیتھرن سے ان کی مرضی تو معلوم  
کر لینی چاہیے۔ "سید بیک ایک بار پھر بڑے مودبانہ لہجے میں بولا  
اور اپنی دیر میں اس نے پہلی مرتبہ کیتھرن کی طرف دیکھا۔ اس کی  
سچیگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ "آپ کیا کہتی ہیں محترمہ  
کیتھرن؟"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں جس زبان کے بھائے ہاتھ۔  
بلکہ لات سے جواب دوں۔" کیتھرن کمری سانس لے کر بولی۔  
"اگر تم پُرانا نہ ملاؤ تو میں تمہارے منہ پر ایک لات رسید کر دوں؟  
مجھے افسوس ہے یہ خاصا تسلی بخش جواب ثابت ہو گا۔"

سید بیک کی رنگت خضر ہو گئی۔ وہ گویا بڑی مشکل سے خود پر  
ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کو محض انداز میں بات کرنی چاہیے  
محترمہ کیتھرن میں فی الحال اپنے قبیلے کے رسوم و رواج کے مطابق  
آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

"بات تو میں احتیاط سے ہی کر رہی ہوں۔ البتہ لات کے  
استعمال میں شاید میں زیادہ احتیاط نہ کر دوں۔" کیتھرن اسے گھج  
معنی میں غار دلائے والے انداز میں بولی۔

اب سید بیک میری طرف دیکھتے ہوئے ٹانگی سے بولا۔ "کیا  
اس خاتون کے بارہانہ مدینے کی وجہ تم ہو؟ کیا اس کے ساتھ  
تمہارا کوئی معاملہ چل رہا ہے؟ کیا شادی وغیرہ کا وعدہ ہو چکا ہے؟"  
"اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کوئی حسین لڑکی ہم سے شادی یا  
وغیرہ وغیرہ کرے۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔ "ویسے یہ  
پہلا اور آخری موقع ہے کہ میں اپنی بیٹی زنی کے بارے میں کسی  
سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ وہ بھی محض اس لیے کہ جس میں کافی  
ذہیل ہوتے دیکھ کر مجھے ترس آ گیا ہے۔ براہ کرم آئندہ مجھ سے  
میرے نجی معاملات کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔"

میرے اہانت آمیز لہجے کے باوجود محض میری زبانی یہ سن کر  
سید بیک کے چہرے پر کچھ طرہائیت جھلک آئی کہ کیتھرن مجھ پر صبران  
نہیں تھی۔ کیتھرن ترم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے  
ہوئے بولی۔ "تم نے خواہ مخواہ ہی چارے افضل چودہری کو اپنا  
دعوت سمجھتے ہوئے سروانے کی کوشش کی تھی۔ تم پہلے ہی ہم سے  
پوچھ لیتے۔"

"مجھ میں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ زنی سے بولا۔ "اگر  
میں افضل چودہری کو اپنے سروانے کا ارادہ کر لوں گا تو پھر یہ اس

بیٹھے ہوئے ہوا۔ "بہسی کبھی حالات کی طرح انسان بھی اچانک ہی بدل جاتے ہیں۔"

پھر اس نے بخور اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور کسی تشویش زدہ فدا کی طرح بولا۔ "متم جیسی مدت ہی لڑکیوں تک اس کی رسائی ہے اور مزید بھی ہو سکتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے تم میں ایسی کیا خاص بات نظر آئی ہے جو وہ بچے جواز کر تمہارے بیچے پر گیا ہے۔"

میں اس موقع پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہ رہا۔ "میرے خیال میں جب سبک بے کیسٹرن کو اپنے بھلانے اعظم کی درگت ہٹا دیکھا اور پھر قح کے آپریشن میں حصہ لیتے دیکھا تو اس کے ذہن میں کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ اسے کیسٹرن کام کی لڑکی نظر آئی ہے۔ وہ شاید دل ہی دل میں کسی اور حساب سے پاننگ کر رہا ہے۔ ازدواجی زندگی اس کی نظر میں نہیں ہے۔" پھر میں نے معنوی سنجیدگی سے کیسٹرن کو مخاطب کیا۔ "اس کے بارہو جنہیں شکر کرنا چاہیے۔ ایسے عاشق ہر کسی کو کہاں میسر آتے ہیں۔ جنہیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اتنی ضد کر رہا ہے بے چارہ شادی کے لیے۔"

"اگر تم نے اسے میرا عاشق کہا تو میں پایا کا برف کیس تمہارے سر پرے اداوں گی۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔ "اور پایا اس سلسلے میں اپنی بیٹی کی مدد کریں گے۔" چارلس خوش دلی سے بولا۔

"آپ میری کھوپڑی کے بارے میں بڑے بڑے منصوبے بنانا چھوڑیں اور سبک بے کے بارے میں سوچیں۔" میں نے کہا۔ "وہ تو سنجیدگی سے اپنے فیصلے کے بازوؤں کو اپنے چلا گیا ہے۔ کل آج پچاپنا تو آپ کیا کریں گے؟" میں سیر کے گھر پر قاشانہ لگ جائے۔

"دیکھا جائے گا۔" چارلس کسی خاص تشویش کے بغیر بولا۔ "میں اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔ یہ لوگ جب چاہتے ہیں خالص قبا کی بن جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں جدت طرازی میں پیرس اور لاس اینجلس والوں کے کان کترنے لگتے ہیں۔ خیر۔۔۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ پہلے ہم ضروری باتیں کر لیں۔" اس نے برف کیس اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے مجھے کل رات کا بندوبست کرنا تھا لیکن سبک بے چو کہ یہ رقم چھوڑ گیا ہے اس لیے اب اسے تم رکھ لو۔"

"کس سلسلے میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اسے تم ایک طرح کا انعام سمجھ لو۔ سبک بے تمہاری تھوڑی سی مدد کی۔ ہم تو اسے بھی انعام سے نوازنا چاہ رہے تھے لیکن وہ کسی اور چکر میں پڑ گیا ہے۔ تم نے تو ہماری مدد کے سلسلے میں اپنی جان کو ہی خطرے میں ڈال لیا تھا۔ میں اپنی حکومت کی طرف سے تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ جب وہ سب لوگ ہماری اہم شخصیات یا شاہی خاندان کے افراد کو مروانے کے لیے پیشہ در

انکھوں سے بھی ٹٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چارلس اور کیسٹرن کی بھلائی اسی میں تھی کہ اسی دوران میں اس کی بات مان لی جاتی ورنہ پھر وہ کوئی اور طریقہ آزما لے گا۔ اگر کیسٹرن اس کے قبا کی یا "سجیدہ" طریقے کے مطابق شادی پر آمادہ نہ ہوئی، کسی اور طرح بھی اوجھر اوجھلے ہوئے اس کے "متم" میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی تو پھر نہ کوئی اور تدبیر کرے گا۔ کم از کم مجھے تو اس کا مضمون یہی محسوس ہوا۔

چارلس اگر اس کے اس مضمون کو پہنچ بھی گیا تھا تب بھی اس نے گھبراہٹ سے کوئی اہمیت نہ دی اور دوستانہ ہی لہجے میں بولا۔ "متم واقعی یہ رقم نہیں لے رہے؟" اس نے برف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے دولت کی خاطر زندگی میں بہت کچھ کیا ہے لیکن انسان کی زندگی میں بیشہ دولت ہی سب کچھ نہیں رہتی۔ کبھی کبھی وہ دولت سے بہت کچھ بھی سوچنے لگتا ہے اس کے دل میں کچھ اور تنہائیں بھی جاگ اٹھتی ہیں۔ اگر تم کیسٹرن کو مجھ سے شادی پر آمادہ کر سکو تو اس سے زیادہ رقم میں خود تمہاری یا کیسٹرن کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

"بہسی میں نے سنی کبھی کسی نے خود کو پتہ شروع نہیں کیا۔" میں نے چارلس کے لیے میں بولی بار تھی محسوس کی۔ "میرا خیال ہے تمہارا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ براہ کرم دوبارہ آنے یا کسی کو ماتھ لاسنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تمہارے پاس اگر غلطی کی تھی۔"

"اگر تم میرے پاس نہ آتے تو یہ تمہاری اور بھی زیادہ بڑی غلطی ہوتی۔" سبک بے کیسٹرن کی زب بزد کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ملک اور تمہاری حکومت پر اس وقت تک ایک ساتھ گرجنا ہوتا۔"

"تم نے صرف اس سانچے کی جنگی فٹاری کی لیکن اسے روکنے کا کوشش اب جنہیں نہیں جانتا۔ اس کے بارہو میں تمہارا شکر گزار تھا اور اس شکرگزاری کا اپنا سا اظہار بھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن۔۔۔" چارلس کندھے اچکا کر رہ گیا۔

انام اس مرحلے پر بھی وہ اپنی وضع کردہ ایک اظہار کے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ سبک بے کیسٹرن کے طرف بڑھتا چارلس بولا۔ "ایک منٹ غصہ میں انٹر کام پر ڈال دیتے کہہ دیتا ہوں۔ وہ جسک چھوڑ آئے گا۔"

"اس ٹھکاف کی ضرورت نہیں۔" سبک بے کیسٹرن نے بولا۔ "میں نے فون کر دیا تھا۔ میرے لیے گاڑی آگئی ہے۔ نیچے کھڑی ہے تمہارے خلاف بھی اس شرم میں میرے کچھ میان ہیں۔"

"چھوڑا۔۔۔ جیسے تمہاری مرضی۔" چارلس تھل سے بولا۔ سبک بے رخصت ہو گیا۔ چارلس اس کے ساتھ بیڑیوں تک لپک چڑھنے بعد وہ اہم کیا اور تھکے تھکے انداز میں گاڑی پر



لیجے اور ملک کی جڑیں کاٹنے کے لیے لوگوں سے بھرے بریف کیم  
دینے والوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور پھر بھی ٹیک نام بنے رہتے  
ہیں۔

"اے میں نے سوچا اس قسم کے لوگ تو مت پائے جاتے  
ہیں۔ ایک آدمہ ذرا کسی اور قسم کا بھی ہونا چاہیے۔" میں نے  
مسکراتے ہوئے کہا۔ "اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں اس قسم  
کی بے نمازی دکھانے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ میری طرح گناہم رہتے  
ہیں۔"

چارلس نے اُداس سی نظروں سے بریف کیم کو دیکھا اور  
اسے چھپتاتے ہوئے بولا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ  
ایک بڑی رقم کی اتنی بے قدری بھی ہو سکتی ہے۔"

کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اگر  
آپ کو اس رقم کے ٹھکرانے جانے کا اندازہ ہو رہا ہے تو انہیں  
مجھے دے دیں۔ میں اسے نہایت عزت و احترام سے اپنے موسس  
اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گی۔ آخر میں نے بھی تو آج کے آپریشن  
میں حصہ لیا ہے اور ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرے لیے تو کسی  
انعام کا ذکر ہی نہیں ہو رہا۔"

اس نے بریف کیم کی طرف ہاتھ بڑھا لیکن چارلس نے  
طرح سے اسے آٹھالیا اور بچھے تھے ہوئے بولا۔ "بے امانت ہے۔"

تاکوں کو بڑی بڑی رقیں دے سکتے ہیں تو کیا ہم ان لوگوں کی جان  
بچانے والوں کو قہوراً بہت انعام بھی نہیں دے سکتے۔"

"بچانے والا تو صرف وہ ہے۔" میں نے خالصتہ درویشانہ  
انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "میں نے تو یونہی معمولی سی  
کوشش کی تھی۔ میرے ذہن میں کسی انعام یا صلے کا تصور بھی نہیں  
تھا۔ میں تو یہ سب کچھ صرف فضل فضل میں کر رہا تھا۔ مجھے اس کا  
کوئی انعام یا معاوضہ نہیں چاہیے۔" میں نے بریف کیم کی  
طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"فضل فضل میں۔؟" چارلس نے حیرت اور کچھ بھینسی سے  
دہرایا۔ اسے سید بک کے رویے نے تو حیران کیا ہی تھا لیکن اب  
میرا رویہ شاید اس کے لیے اس سے بھی زیادہ حیرت کا باعث بن  
رہا تھا۔

میں نے اسے مزید تسلی دی۔ "بے فکر رہیں، میں آپ سے  
کسی اور صورت میں بھی اپنے تعاون کا صلہ طلب نہیں کروں  
گا۔"

"تم واقعی سچیدہ ہو؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"میں اس وقت سید بک سے بھی زیادہ سچیدہ ہوں۔ وہ آپ  
سے رقم کی جگہ کچھ اور مانگنے میں سچیدہ تھا۔ میں کچھ بھی نہ مانگنے

”تم کب بائگ رہے ہو۔ یہ رقم تو میں خود دے رہا ہوں۔ اپنی حکومت کے ایک خفیہ فنڈ سے میں نے اس کا بندوبست کرایا ہے۔ اگر سیویک آج یہ رقم لے جاتا تو کل مجھے تمہارے لئے بندوبست کرنا تھا لیکن اب تم یہی رکھ لو۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔“

”میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس موضوع کو ہمیں ختم کر دیں۔ مجھے دوسری حکومتوں کے ٹوکیا“ اپنی حکومت کے خفیہ فنڈز سے بھی اس انداز میں۔ اور اس طرح کی رقمیں لینے کا تصور ابھی اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ مجھے بس کاروبار کے ذریعے ہی آتی ہوئی رقمیں اچھی لگتی ہیں۔“ میں نے ملا ٹھٹ سے کہا۔

”عجیب آدمی ہو تم!“ اس نے برف سے کسی کاؤچ پر رکھ دیا۔  
 ”یہ دنیا عجیب آدمیوں سے بھری پڑی ہے۔ سیویک بھی عجیب آدمی تھا۔ وہ بھی رقم چھوڑ کر چلا گیا۔ حالانکہ وہ رقم کے لیے قتل کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ وہ تو یقیناً کسی اور طرح یہ کمر پوری کرنے کی فکر میں تھا لیکن تمہارا سلسلہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ چارلس سر جھٹک کر بولا۔ ”معدرت کے ساتھ کہوں گا کہ دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں میں عموماً۔ اور چند مشرقی ملکوں میں خصوصاً ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے بھائیوں کو اذیت کی موت مرنے کے لیے بے بنوا تم کرائے کے لیے ہتھی کو چوں میں آگ بھڑکانے کے

جہاں خرچ کرنے کے لیے لائی گئی تھی اگر وہاں خرچ نہیں ہو سکی تو واپس جائے گی۔ تمہارے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اب اگر یہ رقم تمہیں دینا ہوں تو یہ کیسے اقربا پروری بنی نہ ہو جائے۔ ویسے تم نے جو شکوک اٹھایا ہے وہ واقعی غور ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچوں گا اور خفیہ فنڈ کے ایک دو گروہوں سے بھی مشورہ کروں گا تاکہ کل کلاس کو مجھ پر کوئی الزام نہ آسکے۔ میرے خلاف کوئی اسکینڈل نہ بن سکے۔ میں بہت با اختیار ہوں لیکن اپنی نظر میں سرخ رو رہنا چاہتا ہوں۔“

”چھوڑیں یا پاپا! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں نے بھی افضل چوہدری کی طرح عقل عقل میں ہی اس آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت تو ہمیں مظلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا کوئی حلیہ یا انعام بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ جیسی نجی اور اثاثہ دار بیٹی کی وجہ سے آپ کی کچھ ٹیک ٹائی ہو جائے“ میرے لیے یہی بہت ہے۔“ کیسٹرن مسکراتے ہوئے بولی۔

”عجب ہے!“ چارلس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ ”تمہارے خیالات میں بھی افضل چوہدری جیسی دوسری آجی۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تمہاری کاپیالٹ چٹکی ہے۔“  
 ”یقین تو خود مجھے نہیں آ رہا ہے۔“ کیسٹرن لٹنڈی سانس لے کر بولی۔

”چلو خیر۔ دیکھتے ہیں تم پر یہ رنگ کچا چڑھا ہے یا پکا۔“ چارلس بولا۔ ”مجھے اندیشہ ہے تمہارا یہ روپ عارضی نہ ہو۔“

لے اور ملک کی چیزیں کاٹنے کے لیے لوگوں سے مجھے برف کیس دینے والوں کو ڈھونڈتے پھرے ہیں اور پھر بھی جنگ نام بنے رچے ہیں۔

"ہاں۔ میں نے سوچا اس قسم کے لوگ تو مت پائے جاتے ہیں۔ ایک آدمہ ذرا کسی اور قسم کا بھی ہونا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں اس قسم کی بے نمازی دکھانے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ میری طرح گناہ مرتبے ہیں۔"

چارلس نے اواس سی نظروں سے برف کیس کو دیکھا اور اسے ہتھیارتے ہوئے بولا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک بڑی رقم ایسی بے قدری بھی ہو سکتی ہے۔"

کیٹرین مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اگر آپ کو اس رقم کے ٹھکانے جانے کا اندازہ ہو رہا ہے تو انہیں مجھے دے دیں۔ میں اسے نہایت عزت و احترام سے اپنے سونے کا کؤنٹ میں جمع کرادوں گی۔ آخر میں نے بھی تو آج کے آپریشن میں حصہ لیا ہے اور ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرے لیے تو کسی انعام کا ذکر ہی نہیں ہو رہا۔"

اس نے برف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن چارلس نے جلدی سے اسے اکٹھا لیا اور پیچھے ہٹے ہوئے بولا۔ "یہ امانت ہے جہاں خرچ کرنے کے لیے لائی گئی تھی اگر وہاں خرچ نہیں ہو سکتا واپس جانے کی۔ تمہارے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اب اگر یہ رقم تمہیں دیا جائے تو یہ کیس اقرار دے گی؟" وہ جانتے ویسے تم نے جو شگفتہ اٹھایا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچوں گا اور خیرہ خد کے ایک دو ٹھکانوں سے بھی مشورہ کروں گا تاکہ کل کلاں کو کچھ بڑی الزام نہ آسکے۔ میرے خلاف کوئی اسکینڈل نہ بن سکے۔ میں بہت با اختیار ہوں لیکن اپنی تقریریں مگر خود رہنا چاہتا ہوں۔"

"چھوڑیں بابا! میں تو ذائقہ کر رہی تھی۔ میں نے بھی افضل چوہدری کی طرح فٹل فٹل میں ہی اس آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت تو میں مطمئن نہیں تھا کہ اس کا کوئی صلہ یا انعام بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ جیسی بچی اور ٹالاقہ بچی کی وجہ سے آپ کا کچھ ٹیک ٹائی ہو جائے۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔" کیٹرین مسکراتے ہوئے بولی۔

"بجب ہے! چارلس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ "تمہارے خیالات میں بھی افضل چوہدری جیسی دوسری بچی تھی۔ مجھے تو اب کیا یقین نہیں آ رہا کہ تمہاری گائیڈانٹ بچل ہے۔"

"یقین تو خود مجھے نہیں آ رہا ہے۔" کیٹرین لٹھری سانس لے کر بولی۔ "چلو خیر۔ دیکھتے ہیں تم پر یہ رنگ کیا چڑھا ہے یا نہ۔" چارلس بولا۔ "مجھے اندیشہ ہے تمہارا یہ روپ عارضی نہ ہو۔"

تاکوں کو بڑی بڑی رقبے دے سکتے ہیں تو کیا ہم ان لوگوں کی جان بچانے والا تو خود زہمت انعام بھی نہیں دے سکتے۔"

"میں نے والا تو صرف وہ ہے۔" میں نے خالصتہ مدد شانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "میں نے تو پوری محنت کی کوشش کی تھی۔ میرے ذہن میں کسی انعام کا صلہ کا تصور بھی نہیں تھا۔ میں تو یہ سب کچھ صرف فٹل فٹل میں کر رہا تھا۔ مجھے اس کا کوئی انعام یا معاوضہ نہیں چاہیے۔" میں نے برف کیس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"فٹل فٹل میں۔؟" چارلس نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔ "اسے سیو بک کے بجائے بے حیران کیا ہی تھا لیکن اب میرا مدیہ شاید اس کے لیے اس سے بھی زیادہ حیرت کا باعث بن رہا تھا۔"

میں نے اسے مزید تسلی دی۔ "بے فکر رہیں، میں آپ سے کسی اور صورت میں بھی اپنے تعاون کا صلہ طلب نہیں کروں گا۔"

"تم واقعی سچیدہ ہو؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"میں اس وقت سیو بک سے بھی زیادہ سچیدہ ہوں۔ وہ آپ سے رقم کی جگہ کچھ اور مانگتے ہیں سچیدہ تھا۔ میں کچھ بھی نہ مانگتے میں سچیدہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم کب مانگ رہے ہو۔ یہ رقم تو میں خود سے رہا ہوں۔ اپنی حکومت کے ایک خفیہ فڈ سے میں نے اس کا بیڑہ ڈالتے کر لیا ہے۔ اگر سیو بک آج یہ رقم لے جاتا تو کل مجھے تمہارے لیے بیڑہ ڈالتے کرنا تھا لیکن اب تم یہی رکھ لو۔ میں تم سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ اس موضوع کو ہمیں ختم کر دیں۔ مجھے دو دوسری حکومتوں کے ٹیکس اپنی حکومت کے خفیہ فڈ سے بھی اس انداز میں۔ اور اس طرح کی رقبے لینے کا تصور کبھی اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں کا دوبارہ آوی ہوں۔ مجھے بس کا دوبارہ کے ذریعے ہی آتی ہوئی رقبے اچھی لگتی ہیں۔" میں نے ملا نعت سے کہا۔

"عجب آوی ہو تم! اس نے برف کیس کا ڈیج پر رکھ دیا۔ "یہ دنیا عجیب آدمیوں سے بھری پڑی ہے۔ سیو بک بھی عجیب آدمی تھا۔ وہ بھی رقم چھوڑ کر چلا گیا۔ حالانکہ وہ رقم کے لیے قتل کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ وہ تو یقیناً کسی اور طرح یہ کمر پوری کرنے کی فکر میں تھا لیکن تمہارا سلسلہ کچھ میں نہیں آ رہا۔" چارلس سر جھٹک کر بولا۔ "معدرت کے ساتھ کبوں تاکہ دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں میں عموماً۔ اور چند مشرقی ملکوں میں خصوصاً ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے بھائیوں کو اذیت کی صحت مزوانے کے لیے بھارتی کرانے کے لیے ہتھی کرچوں میں آگ بھڑکانے کے

”میرے خیال میں تو میں بہت ہی سیدھا اور کھرا آدمی ہوں۔ اس لیے آج کے دور میں مسٹ نگر آتا ہوں۔ تاہم مجھے اس پر انوس فیض ہے۔ میری آپ سے دست بستہ بھی گزارش ہے کہ اپنی مصروفیات جاری رکھیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔“

کیٹرین نہ جانے کیوں نہ پراحتہ رکھ کر کہنے لگی۔ میں نے اسی مژدبانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب آپ کو لپڈی ڈانکا کے دورے کے مسائل سے فرصت مل جائے تو مجھے پاکستان واپس بھجوانے کا کوئی بندوبست کر دیجئے گا۔ آپ کی بچی بچی فراز ش ہوگی۔ میں اب واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”چلے جانا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”میرا حال تم ڈرنس میں چار ہے؟“

”نہیں۔ اس کے لیے تو میری معذرت ہی قبول فرمائیے۔“

میں نے بدستور اپنا مژدبانہ لہجہ برقرار رکھا۔ چارلس ایک لمحے گھوٹا رہا۔ بالآخر اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کیٹرین سے کہا۔ ”تمہارے پیانے تمہیں ڈرنس چلنے کے لیے نہیں کہا۔“

”تمہاری ایسا قسمت کہاں۔“ کیٹرین ٹھنڈی سانس لے کر بولی مردود سرے ہی لمحے اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”میری اس ٹھنڈی سانس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا مت ہو جانا۔ مجھے بھی اس خاتون سے اس قسم کی رسمی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر پیانے ڈرنس چلنے کے لیے کہتے تو میرا جواب بھی کم ریش دی ہوتا۔“

”جس سے تمہارے پیانے نتیجہ اٹھ کرتے کہ ہم دونوں کے درمیان زبردست ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور یہ تمہارے لیے زبردست خطرے کی علامت ہوئی۔“ شرارت سے مسکرائی۔

”ہم چند منٹ اسی طرح مپ شپ کرتے رہے پھر ہم نے چارلس کو تیار ہو کر دوبارہ رخصت ہوتے دیکھا۔ بریف کیس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔“

کیٹرین بولی۔ ”پاپا! آپ کچھ زیادہ ہی بے پروا نہیں ہوتے چارے؟ اب آپ اتنی رقم سے مجرا بریف کیس یونٹی ہاتھ میں لٹکائے گھومتے رہیں گے؟“

”مجھے تو لگتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رنگ اور گہرا ہو گا۔“ کیٹرین بولی۔ ”ملاچ اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک عجیب سی بے خوفی اور ایڈونچر پسندی کی زندگی گزارنے میں ایک الگ ہی لطف ہے جس سے میں اب تک نا آشنا تھی۔ ایڈونچر پسندی میری زندگی میں پہلے بھی تھی لیکن وہ حقیقی قسم کی تھی۔“

”کاش اپنے بارے میں تمہارا اپنا یہ اندازہ درست ثابت ہو۔“ چارلس ٹھنڈی سانس لے کر بولا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مگر بازار جا کر ایک اچھا سا ڈرنس خریدو اور اگر تیار ہو جاؤ۔“

”میں کو تمہیں میرے ساتھ ڈرنس پر چلنا ہے جہاں میں تمہیں ہرمانی نس سے ملواؤں گا۔“

”آپ کا مطلب ہے لپڈی ڈانکا ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔“ وہ کچھ اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے میں یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑوں گا۔

”مگر لپڈی ڈانکا میں گئے آپ مجھے ان سے؟“

وہ ایک لمحے کے لیے حیران سا نظر آیا پھر بولا۔ ”جس۔“

یہ کوئی خاص مقصد تو نہیں ہو گا ملاقات کا۔ فی الحال تو ہم ہرمانی نس کو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان پر قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی تھی جسے ناکام بنانے میں ہم نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ پریس کو اس بات کی بھگ چڑے۔ اس بات کو راز ہی رکھا جائے گا۔ خود ہرمانی نس زبان کے معاملے میں زیادہ محتاط نہیں ہیں۔“

”مجھے تو اس طرح جا کر بے مقصد ان سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”ایک آدھ منٹ کی اس قسم کی ملاقات کے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے جس میں آپ ان خاتون کو غالباً صرف یہ بتائیں گے۔ ان سے ملنے سے یہ مسٹر افضل چوہدری ہیں۔ یہ ایک پاکستانی پریس میں ہیں۔ وہ خاتون مصنوعی خوش طبعی سے مسکراتے ہوئے سر ہلا نہیں گی اور ایک آدھ رسمی سا جملہ بول کر آگے بڑھ جائیں گی۔ مجھے اس قسم کی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”ہرمانی نس اب تمہارے ساتھ ڈرنس پر جانے سے تو رہیں۔“ چارلس جل کر بولا۔

”میں کب ایسی فراخ کردہ ہوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ان سے کسی بھی قسم کی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

خصوصاً اس قسم کی ہر مختلف سرکاری و دیاری ملاقاتوں کے تصور سے ہی مجھے وحشت ہوتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا لوگ کیوں اس قسم کی ملاقاتوں کے لیے مرے جاتے ہیں۔“

”افضل چوہدری! تم بہت ہی ٹیرے آدمی ہو۔“ چارلس میری سانس لے کر گھٹت خوردہ سے لہجے میں بولا۔

میں تہذیبی چائی۔ ”ہمیں محترم چارلس کے علاوہ کسی سے بات نہیں کرتی ہے۔“

”میں ہی چارلس ہوں بھائی! مسئلہ کیا ہے؟“  
میں اس دوران پک اپ کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ بڑی کب اور پانچ سیٹوں والی مضبوط پک اپ تھی جو تاحوا اور پراڈی واسٹون پر بار برداری یا سفر کے لیے ابھی تکھی جاتی ہے۔ اس میں کوئی اور شخص بیٹھا نظر نہیں آ رہا تھا۔

اوچیز عمر قبائلی نے اپنے لیے سے پٹے میں ہاتھ ڈال کر مڑاڑا سا ایک پرچا نکالا اور چارلس کو چھوڑا۔ میں اور کیتھرن کچھ آگے بڑھ آئے۔ بال پوائنٹ سے غالباً خاصی گلیٹ میں انگریزی میں پیٹنام تحریر کیا گیا تھا۔ چارلس نیچی آواز میں پڑھنے لگا۔

محترم چارلس!  
مجھے افسوس ہے کہ میری آپ کے پاس سے روانگی کچھ زیادہ خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ میں حسب پروگرام تین بزرگوں کو ساتھ لے کر آپ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس طرح کے معاملات زبردستی طے نہیں کیے جاتے۔ میں شاید بزرگوں کے ساتھ راستے ہی سے واپس لوٹ جانا لیکن اسی سفر کے دوران ایک جگہ مجھے جان کی موجودگی کے شواہد ملے ہیں۔ کچھ خاص لوگوں کی زبانی آؤٹی سی خبریں بھی ملی ہیں کہ وہ جنگ میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں اس کی گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا ہوں۔ میرے خیال میں یہ معاملہ زیادہ اہم ہے۔ ہمیں اس کو ادھر رہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ میرے لیے انا کا سوال ہے۔ آپ کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ جان کی انا کو بھی نہیں پہنچی ہے۔ وہ آئندہ کسی بھی وقت ہم سب کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر موقع مل رہا ہو تو ہمیں گے ہاتھوں اس معاملے کو نشاے دینا چاہیے۔ میرے ساتھ کوئی خاص کام کا توئی نہیں ہے اور میرے آؤٹی اس قسم کے کاموں میں کچھ زیادہ ماہر بھی نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے جان کے ساتھ مجھے کچھ آؤٹی ہیں۔ اگر صرف آپ مسٹر جودری اور کیتھرن میری مدد کے لیے پہنچ جائیں تو کافی ہو گا۔ میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ جلدی پہنچنے کی کوشش کیجئے گا۔

سیو بک

تحریر سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ پیٹنام خاصی گلیٹ میں گھسیٹا گیا تھا لیکن کچھ ایسا مختصر نہیں تھا۔ بات آسانی سے سمجھ میں آئی تھی۔ چارلس نے ان لوگوں کو اندر بلائے کا کلف نہیں کیا اور ان سے کہا۔ ”تم ہمیں ٹھہرو ہم چند منٹ میں آکر تمہارے ساتھ بیٹھنے ہیں یا تمہیں کوئی جواب دینے ہیں۔“

وہ دونوں قبائلیوں کو حیران پریشان سا چھوڑ کر وہاں اندر آ گیا۔ گیت بند ہو گیا۔ چارلس نے ڈرائیو سے میں ہی ٹرک کو گویا کارنر میٹنگ منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ چال بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمیں جانا ضرور چاہیے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم ڈر کر کھجک کر بیٹھ

اے معمولی چور اچھے اور ٹیرے ان سے برف کیس چھین کر لے سکیں۔“

چارلس رخصت ہو چکا تو کیتھرن مگرمی سانس لے کر کندھے پکڑتے ہوئے بولی۔ ”مگرمی ہی جہیز ہیں پانچ پانچ!“  
”بے شک! میں نے بڑے غلوں سے سہارا لے ہوئے آئید لی۔“

○●○

دوسرے روز بھی چارلس کی مصروفیت کچھ کم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ لیزلی ڈانکا ابھی شہر میں موجود تھی اور شیڈول کے مطابق اس کی مصروفیات جاری تھیں۔ تاہم چارلس شام سے پہلے واپس گیا تھا اور ہمارے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ اب خاصا مطمئن اور فاسرگ فارغ سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اوپر کی منزل کے ڈائنگ روم میں ہی تھے۔ دفعتاً انٹرکام کا بزر بجا۔ مگر ہمیں موجود تھا۔ اس نے انٹرکام پر بات کی۔

چند لمبے بات کرنے کے بعد پھر چارلس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”سٹریٹ ڈاؤس سے سیکورٹی گاڑ بول رہا ہے۔ کہہ رہا ہے وہ قبائلی سے آؤٹی آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سیو بک کا کوئی ضروری پیغام لائے ہیں اور جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ سیکورٹی گاڑ پوچھ رہا ہے انہیں اندر آنے دیا جائے یا آپ گیت پر ہی جا کر ان سے بات کریں گے؟“

چارلس چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بلا ٹائل بولا۔ ”میں گیت پر ہی آکر ان سے بات کروں گا۔“

اس نے مجھے یا کیتھرن کو ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن ہم خود ہی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیے۔ نیچے کا بلند دھلا آؤٹی میں گیت الیکٹرانک سسٹم سے کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف چھوٹا سا گیت ڈاؤس بیٹھا ہوا تھا۔ باوردی سیکورٹی گاڑ اسی میں کھڑا تھا۔ چارلس کا اشارہ پا کر اس نے جیٹ دبا کر گیت کھولا۔ ہم باہر گیت ڈاؤس کی چھوٹی سی کمری سے جھانک کر بھی باہر دیکھ سکتے تھے لیکن چارلس نے اتنی احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

گیت کھلا تو سامنے ہی ایک نئی لیکن گرد و غبار میں بری طرح الٹی ہوئی ایک بڑی اور انڈر کنٹرولڈ ڈانک اپ کمری دکھائی دی۔ ٹوبی ہو دی قبائلی کمرے کچھ پریشان سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ دو بے بی لباس میں تھے جیسا میں نے سیو بک کے گاؤں میں اکثر لڑکوں کو پہنے دیکھا تھا۔ سروں پر وہی چھوٹی چھوٹی ہی ٹوپیاں تھیں۔ انہیں سے ایک اوچیز عمر اور ہماری ہم عمر تھا جبکہ دوسرا نوجوان اور ہم عمر سے جسم کا تھا۔ ان کے اثرات کچھ ایسے ہی تھے جیسے بے ہارے سیدھے سادے دھاتی شر اگر پریشانی آٹھاتے ہوئے کسی انڈین کو پہنچے ہوں۔

”آپ محترم چارلس ہیں؟“ اوچیز عمر نے ٹوٹی چھوٹی انگریزی

## طنز و مزاح

|       |                                        |           |
|-------|----------------------------------------|-----------|
| 100/- | منتخب مزاح پارے                        | ضیاء ساہد |
| 120/- | ممتاز ادیبوں کے منتخب خاکے             | ضیاء ساہد |
| 200/- | منتخب گفتہ شہ پارے                     | ضیاء ساہد |
| 100/- | سر جیکل وارڈ                           | ضیاء ساہد |
| 150/- | مزاح مزے کا                            | ضیاء ساہد |
| 90/-  | منتخب شاہکار محضی خاکے                 | ضیاء ساہد |
| 120/- | منتخب مزاحیہ مضامین                    | ضیاء ساہد |
|       | مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور نمبر 2 |           |

کئے۔

اس نے جواب طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
میں نے قدرے بے پروائی سے کہا۔ ”میں تیار ہوں مجھے تو ویسے  
بھی شاید خطرات مول لینے کا شہ ساہو تھا جا رہا ہے۔“  
”میں بھی چلتی ہوں۔“ کیترن بولی۔ ”شاید اس نے جو لکھا  
ہے وہ سچ ہی ہو۔ ویسے بھی اس نے ہمیں اپنے گاؤں نہیں بلایا  
ہے۔ اس کے گاؤں مانا ہمارے لیے زیادہ خطرناک ہوتا۔ جنگل میں  
اس نے پورے گاؤں کو تو لٹا کر نہیں بھالایا ہو گا۔ اصل جگہ کے  
قريب پہنچ کر ہم دیکھ بھال کر آگے بڑھیں گے۔ تھوڑے بہت  
قابلیوں سے تو ہم نشت ہی لیں گے۔ ویسے مجھے تو زیادہ امکان لگتا  
نظر آ رہا ہے کہ اس کا دماغ ٹھکانے آ گیا ہے اور اسے واقعی ہماری  
شد کی ضرورت ہے۔ آگے ہماری قسمت ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے  
گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“ چارلس طمانیت سے بولا۔ ”اس خط میں  
جس جنگل کا تذکرہ ہے وہ یقیناً وہی ہے جو سیوہک کے گاؤں کے  
راستے میں پڑتا ہے۔ میں احتیاطاً اس کے بارے میں پتہ خاص  
افراد کو بھی مطلع کر دیتا ہوں کہ ہم اس طرف جا رہے ہیں۔“  
”چھوڑیں۔۔۔ اب اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔  
سیوہک اور اس کے آدمی ایسے بھی نہیں ہیں کہ ہم ان سے نہ  
نشت لیں۔“ کیترن نے نیازی سے بولی۔

چارلس ہنور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اب یکدم ہی اتنی  
لوہنگی ہو اؤں میں آؤنا بھی مت شوج کر دو۔“  
اور آکر ہم لوگوں نے چند ہتھیار ساتھ لیے جو چارلس ہی نے  
ہمیں سنیا کر رکھے تھے۔ ہم باہر آئے تو چارلس بولا۔ ”تم لوگ نیچے  
چل کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں چند سیکنڈ میں آتا ہوں۔“  
”ہم اپنی گاڑی میں چلیں گے یا ان کے ساتھ انہی کی گاڑی  
میں بیٹھ جائیں؟“ میں نے پوچھا۔

چارلس نے ایک لمحے سوچا پھر کہا۔ ”انہی لوگوں کے ساتھ  
انہی کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ دیکھا جائے گا۔“

ہم نیچے آ گئے۔ وہ ناقابلِ باہر گاڑی کے پاس ہی کھڑے تھے۔  
ہمارے پاس ہتھیار دیکھ کر انہوں نے کسی مڑکل کا اظہار نہیں  
کیا۔ ان کے پاس بظاہر کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم گاڑی میں  
کیب کی پچھلی بڑی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے گاڑی میں بھی کوئی ہتھیار  
نظر نہ آیا۔ اتنا غیر مشکوک نظر آتا بھی مجھے کچھ مشکوک ہی لگ  
رہا تھا۔ تو جوان قبائلی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اوپر مزمر  
اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد چارلس بھی آگیا اور گاڑی پوزن  
لے کر تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی۔

راستے میں چارلس نے اوپر مزمر قبائلی سے پوچھا۔ ”سیوہک  
کیا جنگل میں آگیا ہے؟“  
”نہیں۔۔۔ دو آدمی اس کے ساتھ ہیں لیکن وہ کافی بوڑھے

ہیں۔“ اوپر مزمر نے ٹوٹی پھٹی انگریزی میں جواب دیا۔

”وہ جنگل میں کیا کر رہے ہیں؟“ چارلس نے پوچھا۔

”جنگل میں ایک جگہ ایک کنواں ہے۔۔۔ اس کے قریب ایک  
کھین بنا ہوا ہے۔ کافی پرانا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں کچھ لوگوں کی  
موجودگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔۔۔ سیوہک کو کسی کی جھک نظر  
آئی تھی۔ تب سے وہ اور دونوں بزرگ وڈیں پیچھے بیٹھے ہیں۔ انہوں  
نے مڑکل فون پر کسی سے بات بھی کی ہے۔ ہم لوگ اس علاقے  
کے پتے پتے سے واقف ہیں لیکن جنگل میں وہ کنواں اور کھین دیکھ  
کر ہمیں بھی حیرت ہوئی۔ ہم نے اس سے پیادہ دونوں چھین وہاں  
نہیں دیکھی تھیں حالانکہ وہ دہائی بھی نہیں ہیں۔ کنواں اور کھین  
دونوں برسوں پرانے معلوم ہوتے ہیں۔“ اوپر مزمر نے الگ الگ کر  
بیانیہ تان لیا۔

”سیوہک اور اس کے بزرگ ساتھیوں کے پاس کچھ اسلحہ  
وغیرہ موجود ہے؟“ چارلس نے دریافت کیا۔  
اوپر مزمر نے اثبات میں ہرلایا اور کہا۔ ”ماؤزر اور ٹی آئی ڈی  
ہمارے پاس بھی ہیں لیکن سوار نے ابھی تک ہمیں کچھ کئے  
نہیں دیے۔ انہیں شاید آپ کا انتظار ہے۔“  
شری حدود سے نکلنے کے بعد تو چھوٹے سے رگ سے شاید  
ایک اپ طرفانی رفتار سے دوڑنے لگی اور پھر تین کلون کا کھلا  
اس نے بہت سی کم دقت میں طے کر لیا۔ اس دوران میں نے کئی بار

اس پر لمبی سی ایک بوری لدی ہوئی تھی۔ کیتھرن نے اسے نشانے پر لے لیا تھا لیکن وہ گردن دینا سے بے نیاز نہ ہو کر نہ ایک میٹر می میڑھی چھڑی سے اپنے گدھے کو اپکا چلا کر آیا تھا۔  
وہ کوئی منلوک الحال ساترک نہ تان معلوم ہوا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر مختصری داڑھی تھی۔ چوپایے اور مٹی میں تھنزا ہوا تھا۔ سر پر مختصری چوڑی تھی۔ عروں جیسا اس کا ڈھلا ڈھلا لبادہ بھی ملا اور مٹی میں تھنزا ہوا تھا۔ بے جھم سے جوئے خاصی شکست حالت میں تھے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن کمر شاہ افلاس کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

وہ ہمارے دائیں طرف درختوں کے درمیان سے نمودار ہوا تھا اور کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے درختوں ہی کے درمیان ڈگڑک کے سے انداز میں اسی طرف جا رہا تھا جدھر ہم جا رہے تھے۔ اس نے صرف ایک بار تجسس سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے دوبارہ منہ پھیر کر اس طرح اپنے گدھے کے پیچھے نکلنا ہوا چلتے دکھائی دیے اسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ قدرے عجیب بات یہ تھی کہ اس کا گدھا آگے آگے چل رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے تھا۔ شاید گدھا اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ اس دنیا میں بہت سے گدھوں نے بے شمار انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ نبھایا ہوا ہے لیکن یہ گدھا چارناگنوں والا تھا۔ محسوس کی جاتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے آنے والے کو منزل تک پہنچای دے گا کیونکہ وہ راستے سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ وہ گردن جھکائے دانشورانہ خاموشی اور شجیرگی سے چلا جا رہا تھا۔ وہ دنیا سے بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔

ہماری رہنمائی کرنے والے قابیلیوں نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ ہم گدھے والے کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو چکے ہیں اور ابھمن سے اسی کی طرف دیکھے جا رہے ہیں۔ کیتھرن کے فضل کا رخ تو بدستور اسی کی طرف تھا۔ اگرچہ عمر باقاعلی چلتے چلتے ہماری طرف مڑتے ہوئے ہوا۔ اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک نیم پاگل سا آدمی ہے۔ جنگل میں ہی ایک جھونپڑی میں رہتا ہے۔ بالکل بے ضرر سا شخص ہے۔  
کیتھرن نے مٹھین ہٹل کا رخ زمین کی طرف کر لیا۔ لیکن ہم اب بھی چاروں طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہی ہماری قطعی تھی۔ ہم ہر طرف دیکھ رہے تھے سوائے اس طرف کے، جدھر دیکھنا ہمارے لیے سب سے زیادہ ضروری تھا۔ یعنی مجھے کی طرف۔

ہم درختوں کی گھنی شاخوں تک کا جائزہ لینے جا رہے تھے لیکن ہم نے زمین کی طرف دیکھنا زیادہ ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو راستے میں زیادہ تر ہمیں خشک پتے، ٹوٹی ہوئی چھوٹی موٹی ٹہنیاں اور گھاس پھوس ہی نظر آیا تھا۔ وہاں بھی ہمیں اپنے جوتوں تلے انہی چیزوں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جہاں ہم اچانک ہی

گردن جھکا کر پیچھے دیکھا۔ انا کا گناہاں نظر آئیں لیکن کسی پرچھے یہ شہ نہ ہو سکا کہ وہ ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔

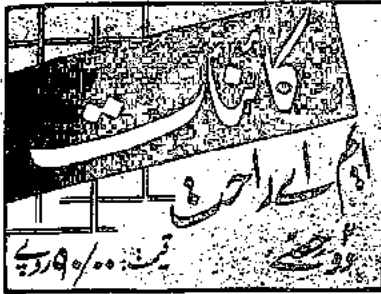
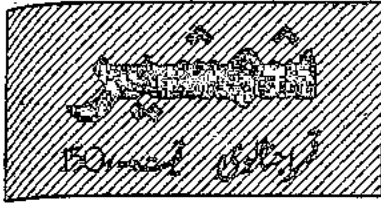
آخر کار وہ جنگل نظر آئی گیا جو ہم نے اس سے پہلے بھی سیدیک کے گاؤں جاتے وقت دور دور سے دیکھا تھا۔ جنگل بالی دے سے بہت ہٹ کر تھا۔ یک ایک کے میں اتر گئی اور ہمارا میدان ملائے میں پھولے کمانی جنگل کی طرف بڑھنے لگی۔ جس طرف سے ہم جنگل کے قریب پہنچے اس طرف درخت چھان میں تھے لیکن یک ایک اس طرف سے جنگل میں داخل نہیں ہوئی بلکہ درختوں کے قریب سے گردن ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ کافی طویل پکر کاٹ کر آخر ہم جنگل کے اس طرف آ پہنچے جدھر سے ہالی دے نظر نہیں آتا تھا۔

اس طرف سے یک ایک جنگل میں داخل ہوئی اور یہ مشکل ایک فرلانگ کا فاصلے کرنے کے بعد رک گئی کیونکہ آگے درخت بھی گھٹان تھے اور راستہ بھی نہایت ناموار تھا۔ وہ ہماڑی ماعلاقہ معلوم ہوتا تھا جسے جنگل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جبکہ جبکہ مٹی کے بڑے بڑے تودے نظر آ رہے تھے۔  
نوجوان نے انہیں کا سوچ آف کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے ہمیں پیدل آگے چلنا پڑے گا۔"

اس نے یک ایک درختوں کے جھنڈ میں ایک ایسے مقام پر روکی تھی جہاں وہ تقریباً گیرج ہی کی طرح محفوظ تھی۔ ہم گاڑی سے اتر آئے اور تینوں نے اپنے مٹھین ہٹل نکال لیے۔ نوجوان نے اپنی احتیاط سے گاڑی کے پیچھے چڑھا کر اسے مقفل کیا اور ہم ان دونوں کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگے۔

جنگل میں بلا کا نشانہ تھا۔ یہاں کے پرے بھی بڑے امن پسند معلوم ہوتے تھے۔ کہیں سے ان کی چوں چاں بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہمارے جوتوں تلے خشک پتے یا ٹوٹی ٹہنیاں چھڑائی تھیں تو ان کی آواز بھی بلند معلوم ہوتی تھی۔ گوکہ ہم بہت تیزی سے دائیں بائیں مڑتے جا رہے تھے لیکن میں راستہ زمین ٹھین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم ان دونوں قابیلیوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن تو نہیں تھے لیکن ہم کسی قسم کی دھوکے بازی یا اچانک کچھ ٹوکوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان دونوں کے بارے میں ہمیں ایک بات خاصی قلبی بخش لگی تھی کہ انہوں نے کسی بھی ہمارے سے ہمیں غیر مستعد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی ہمارے ہتھیاروں پر کوئی خاص توجہ دی تھی۔ خود انہوں نے ابھی تک کوئی گمن وغیرہ نہیں نکالی تھی۔ ان کے انداز و اطوار تو لاشعور والے ہی تھے۔ ہم تینوں ان کے پیچھے پیچھے شانہ بہ شانہ چل رہے تھے اور یک وقت چاروں طرف نظر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی دوران ایک طرف سے ایک شخص ایک محزے سے گدھے کو اپکا ہوا آتا دکھائی دیا۔ وہ گدھا کیا، تقریباً گواڑی تھا۔



اتنی نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گڑھے میں گرنے والوں کو اگر اب گڑھے کے دہانے پر کوئی گھوڑی نظر آئی تو وہ اس میں سے گلی بھی گزار سکتے تھے۔ غیر ارادی طور پر ہم تینوں بھی اس خشک کوئیں کی دیوار سے چپک گئے۔ کوئی اوپر سے ہم پر بھی گلیوں کی پھجڑا کر سکتا تھا اور ہم نہایت بے بسی کی موت مر سکتے تھے۔ وہ گرا کر اچھا ہم تینوں کی اجتماعی قبریں سکھا تھا۔

آہم ایسا نہیں ہوا۔ اوپر سے اویز عرقا کی کی آواز سنائی دی۔ وہ نہایت عجیب کی سے کہہ رہا تھا۔ "اوہو۔۔۔ برا افسوس ہوا۔ آپ لوگ گڑھے میں گر گئے۔ معلوم نہیں کس کینٹ نے یہاں یہ نہپ بٹایا ہوا تھا۔ ختم۔۔۔ آپ لوگ گھبراہٹ میں۔ ہم ابھی آپ کو کھانے کے لیے اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے کر آئے ہیں۔"

انہیں یقیناً یہ توقع نہیں تھی کہ ہم ان کی اس "مکارانہ معصومیت" پر یقین کر سکتے تھے لیکن وہ غالباً اس کی بروا کیے بغیر اپنا کردار ادا کیے جا رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے اوپر ٹھوٹ چھا گیا۔ شاید وہ لوگ واقعی کہیں چلے گئے تھے۔ معلوم نہیں ان کے منصوبے کا اگلا مرحلہ کیا تھا۔

مجھے اس گڑھے والے کے بارے میں سوچ بھی حیرت ہو رہی تھی۔ ہمیں گڑھے میں گرنے تو یقیناً اس نے بھی دیکھ لیا ہو گا لیکن کیا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا؟ کیا وہ اسی طرح دنیا جان سے بے نیاز اپنے راستے پر بڑھتا چلا گیا تھا؟ اس سے یہ بھی بعید تو نہیں تھا۔ وہ کچھ عجیب سی مخلوق لگ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے دونوں قبائلیوں نے ڈرا دھمکا کر بھاگا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں اس کے بارے میں خواہ مخواہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہوں

گویا غریب سے نیچے چلے گئے۔

ایک لمحے کے لیے تو میں بھی بدحواس سا ہو گیا اور فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا تھا۔ بہت ہی زوردار سا جھٹکا لگا تھا اور ہم یکدم ہی اندر سے ہی اتر گئے تھے۔ پھر مجھے اپنے اوپر کیتھرس کے لطیف وجود کا احساس ہوا لیکن اس وقت وہ بھی خاصی وزنی لگ رہی تھی۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے نیچے کوئی کراہ رہا تھا۔ وہ چارلس تھا جو میرے نیچے دب گیا تھا۔ میں نے اس پر سے ہٹنے کی کوشش کی۔ اس دوران کیتھرس کا وزن خود بخود مجھ پر سے ہٹ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہاں اتنا بھی اندر چرا نہیں تھا جتنا مجھے فوری طور پر محسوس ہوا تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ ہم ملتے ملتے اچانک ہی کوئیں سے مشابہ ایک گڑھے میں آن کرے تھے۔ وہ کافی کرا کر اچھا تھا لیکن اس کا نظریہ کولائی زیادہ نہیں تھی۔ اسے بھی یقیناً جھل کی بستر زمین کی طرح خشک چٹوں اور گھاس پھوس سے اٹھانپا گیا تھا۔ اگر ہم زمین کی طرف دیکھ رہے ہوتے تو شاید تب بھی سمجھ نہ پاتے کہ ہمارے پاؤں کسی گڑھے پر پڑنے والے تھے۔

یہ بڑی پرانی ٹیکنیک تھی۔ پرانے شکاریوں کا حربہ تھا جو وہ خطرناک درندوں کو شکار کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بعض پرانے حربے نئے دور میں قطعی غیر متوقع لگتے ہیں۔ شاید اسی لیے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے آگے آگے چلتے ہوئے دونوں قبائلی اس گڑھے میں نہیں گرے تھے لیکن ذرا سوچنے پر محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اس میں کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ یقیناً اس گڑھے کی موجودگی سے باخبر تھے اور اس سے بچ کر گڑھے سے راستہ نکال ہی تھا۔ ہم نے اگر انہیں خود زار بہت اندر دھکے دیے تو دیکھا بھی تھا تو اس سے یقیناً کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔

ہمارے حواس بحال ہوئے تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم تینوں کے کھڑے ہونے کے بعد گڑھے میں ہمارے ارد گرد جگہ کسی ہی پچی تھی۔ گڑھے کی دیواریں سبیل تھیں اور وہاں ایک عجیب سی بو محسوس ہو رہی تھی حالانکہ گڑھا خالی ہی تھا۔ اس میں ہمارے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ہی البتہ کچھ گھاس پھوس اور خشک پتے ضرور اندر گرے تھے۔

حواس ٹھکانے آتے ہی ہم تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے سے یہی پوچھا کہ کسی کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی۔ غنیمت تھا کہ تینوں کے ہاتھ پاؤں صحیح سلامت دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹی موٹی چوٹوں کی اس وقت ہمیں پروا نہیں تھی۔ ہتھیار ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گئے تھے جنہیں ہم نے فوراً اٹھایا اور گڑھے کے دہانے کی طرف دیکھا لیکن وہاں ہمیں کوئی سر دکھائی نہ دیا۔ کسی نے اندر بھاگنے کی ذمت نہیں کی تھی۔ وہ یقیناً اتنے



کے لیے اسے باہر پھینکا آسان ہو جائے تو نہیں کی دیوار بھی اور  
 تانہوار تھی۔ اس پر جب کہ پاؤں مضبوطی سے ٹکایا جاسکتا تھا۔  
 کیترن ایک بار پھر بندھائی کی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے  
 گڑھے سے نکل گئی اور اس کے بعد بھی خیریت ہی رہی۔ کوئی  
 دھماکا، کوئی جھجھکی یا کسی دی گھٹن جب کیترن نے گڑھے کے  
 کنارے لیٹ کر چارلس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ اس میں کاسیاب نہ  
 ہو سکی۔ اس کا ہاتھ چارلس کے ہاتھ تک نہیں پہنچ سکا تاہم اس  
 نے جلدی سے ایک ٹوٹی ہوئی شاخ تلاش کر کے گڑھے میں لٹکائی  
 اور درمیانی خلا پر ہو گیا۔ چارلس نے شاخ پکڑی اور لرزاؤں و  
 ترساں کسی طرح گڑھے سے نکل ہی گیا۔

اب صرف میرا مسئلہ باقی تھا اور میں کوئیں کی نہ میں تھا۔ ان  
 کے پاس کوئی ایسی دی و دیوہ نہیں تھی جسے وہ بچے لٹکاسکتے جس  
 کیترن کو بھٹا سارا مل گیا تھا۔ اتنی ہی کافی تھا۔ وہ میرا مقصد سمجھ  
 رہی تھی۔ اس کا ذہن اور جسم دونوں تیزی سے کام کر رہے تھے۔  
 وہ باپ کی مدد سے جلدی سے ایک درخت کی لمبی سی شاخ توڑ کر  
 لائی۔

ان دونوں نے کنارے پر لیٹ کر شاخ گڑھے میں لٹکائی۔  
 خوش قسمتی سے میرا ہاتھ اس تک پہنچ گیا۔ میرے لیے اتنی ہی سارا  
 کافی تھا۔ میں نے گڑھے کی دیوار پر پاؤں جمائے ہوئے اس طرح  
 چڑھنا شروع کیا کہ اپنا بیشتر وزن میں خود ہی سار سکوں اور ان  
 دونوں کو زیادہ دشواری نہ ہو۔ چند لمحوں میں بھی گڑھے سے باہر  
 تھا۔

اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور باہر آنے کے بعد گویا  
 یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحوں پہلے ہم خاص مشکل میں گرفتار  
 تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے حالات میں اگر ذرا آسانی  
 میرا آتی تھی تو وہ مجھے نازا از علت نہیں لگتی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہ قبائلی کسی کو پکڑ کر لانا ہی  
 چاہتے تھے تو وہ دونوں ہی کیوں چلے گئے تھے؟ ان میں سے ایک جاسکتا  
 تھا اور دوسرا گڑھے کے قریب گھرائی کے لیے موجود رہ سکتا تھا۔  
 مجھے شبہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی قریب ہی کہیں چھپا  
 ہماری تمام حرکات و سکنات کا جائزہ نہ لے رہا ہو اور یہ سوچ کر  
 لطف اندوز نہ ہو رہا ہو کہ کسی بھی لمحے ٹھیکہ دار کو وہ ہماری ساری  
 آچھل کود ہمیں روک دے گا، ہمیں پیشہ کے لیے ساکت کر دے  
 گا۔

ہم تینوں نے تین مختلف سمتوں میں منہ کر لیے اور کندھے سے  
 کندھا جوڑ دیا۔ اس طرح ہم تقریباً ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے  
 دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ جھلک جھلک سا سکوت برقرار رہا۔ کو  
 طرف سے کوئی گولی نہ آئی اور نہ ہی کسی نے ہمیں لٹکارا۔ وہ گولے  
 والا بھی ہمیں کہیں دکھائی نہ دیا۔ اگر وہ اپنے راستے پر ہی دوا  
 رہا تھا تو اب اس کے نظر آنے کی امید بھی نہیں تھی کیونکہ ہم ان

اب کیا کرنا چاہیے؟ کیترن سرگوشی میں بولی۔

”نہ تو اس گڑھے سے لٹکنا چاہیے۔ میرا خیال ہے وہ ہمیں  
 بڑھوں کی طرح کا بوجھ بن کر لٹکائی بندوبست کرنے کے لیے ہیں اور  
 ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ہمیں اس گڑھے سے لٹکنا چاہیے  
 لیکن کیسے؟“ کیترن بولی۔ گڑھا تقریباً چودہ پندرہ فٹ گہرا تھا۔  
 ”یہ کچھ اتنا زیادہ مشکل کام بھی نہیں۔ میں نے اکثر وہ پھٹے  
 ہوئے کہا۔“ مسٹر چارلس! آپ میرے کندھوں پر اکثر وہی حالت  
 میں بیٹھ جاتے تھے۔ جلدی کیجئے۔ شین ٹائل وغیرہ لباس میں ہی  
 چھپا کیجئے۔ آپ کو اتنے وقت دونوں ہاتھ کوئیں کی دیوار پر لٹکنا  
 پڑیں گے۔“

چارلس نے میری ہدایت پر عمل کرنے میں خاصی پھرتی دکھائی  
 اور میرے کندھوں پر چڑھ بیٹھا۔ تب میں نے کیترن سے کہا۔ ”تم  
 اب اپنے باپا کے کندھوں پر چڑھ جاؤ لیکن گڑھے سے سر نکالتے  
 وقت ذرا ہوشیار رہنا۔ کوئی گولی بھی تمہارا استقبال کر سکتی ہے۔“  
 کیترن کسی بندھائی کی پھرتی سے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ  
 بندھائی کی پھرتی سے باپ کے کندھوں پر چڑھ گئی۔ وہ سمجھ گئے تھے  
 کہ میں باز کیوں بیٹھا۔ طرفہ اختیار کرنا چاہتا تھا جس سے کم از کم  
 کسی سے اور دلا فرو کچھ کوشش کر کے نکل سکتا تھا۔ خصوصاً  
 کیترن کے لیے یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ عام سی لڑکی نہیں  
 تھی۔ اس کے لیے تو شاید گڑھے کے کناروں تک ہاتھ پہنچ جانا ہی  
 کافی ثابت ہوگا۔

ان دونوں باپ بچی کا بوجھ کندھوں پر لیے میں اپنی ٹانگوں کی  
 مضبوطی اور طاقت کو آزما رہے تھے دھیرے دھیرے اٹھا۔ یہ کام  
 میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میرے کندھے ہونے کے  
 بعد چارلس بھی بہت کم کے دیوار پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے اٹھ کھڑا  
 ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی ٹانگیں کاپ رہی تھیں۔ اس  
 کے لیے شاید اپنی سبک و دو دو بی کا وزن بھی کافی تھا۔ تاہم یہ قیمت  
 تھا کہ اس نے توازن خراب نہیں ہونے دیا۔

اس کے کندھوں پر کیترن تو خاصی پھرتی سے کھڑی ہو گئی اور  
 اس کے لیے نہ صرف ہاتھ گڑھے سے باہر لے جانا بلکہ سر بھی نکال  
 لینا آسان ثابت ہوا۔ تاہم اس نے میری ہدایت کے مطابق  
 نارت آہستہ سے سر نکال کر پہلے چاروں طرف دیکھا پھر دوسرے  
 ہونٹا کے ہوئے تیزی سرگوشی میں بولی۔ ”بہی الحال تو اس پاس کوئی  
 نظر نہیں آ رہا۔“

”اللہ کا نام لے کر نکل جاؤ اور گڑھے کے کنارے پر لیٹ کر  
 اپنے باپا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا پھر چارلس کو  
 کھجایا کہ اسے کیترن کا ہاتھ یا اس کی لٹکائی ہوئی کٹی چڑھام کو  
 کوئیں کی دیوار پر پاؤں ٹکاتے ہوئے اوپر چڑھنا تھا کہ کیترن

انت میں اسی طرف داییں پارے تھے جدھر سے آئے تھے۔  
جب کئی منٹ تک کچھ نہ ہوا تو ہمارے سنے ہوئے اصحاب  
چلے پڑے گئے آہم کتیریں کی حیرت اب بھی برقرار تھی کہ آخر وہ  
دو دن قبائلی کلن نائب ہو گئے تھے۔ یہ تقریباً سرگوشی میں ہوئی۔  
پہلی تو سمجھ میں نہیں آئی آخر یہی وجہ کا بیان کیا تھا وہ ہمیں کس  
میں کھڑا اور مرزا نے چاہتا تھا؟

”فی الحال جسم کو حرکت میں رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے اس پر زیادہ زور مت دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

وہ شاید میرے مشورے کے بارے میں کوئی اعلیٰ خیال کرنے لگی تھی کہ اچانک کوئی چیز ہمارے قریب ہی گر کر پھینک دھماکا ہوا نور و انوار میں غماغمین میں نے احتیاطاً میری سے زمین پر رہنے سے اس طرف تازگی کر ڈالا جو اسے میرے خیال میں چڑھ چکی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری چٹائی پہ لی گولی کسی کو لگی تھی یا نہیں لیکن مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ میں نے زمین پر گر کر گولی چلا دی۔ وہ گولی کہ گریڈ نہیں تھا جو ہمارے قریب پڑا تھا۔ وہ بے اثر کھینچنے والی کسی خفایت سی سرچل اور جس کا ٹیل تھا۔ اگر میں ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اس قسم کی کسی گیس کا ٹیل ہو گا تو ہم اس سے ابھر اور دھرم پانگ کر اس کے اثر سے بچنے کی بجائے کوشش کرتے تھے لیکن زمین پر گر کر ہم نے گولی فوراً ہی گیس کو سانس کے لیے جسم میں داخل کرنے کا بیڑا نہ کر لیا تھا۔

میں نے اور کئی عورتوں نے فوراً ہی انہیں گراہک طرف کو بھاگنے  
کا اشارہ کیا۔ اسے بھی تھپتھپاہٹا احساس ہے کہ گراہک کو کس کیس کیس حتی  
ہاں نہیں بھاگنے اور انہیں گراہک کی طرف سے کچھ بھی نہ ہونے چاہیے۔ جیسی حد اور میں  
سے بھگت رہا ہے۔ جیسی حد اور میں سے بھگت رہا ہے۔ جیسی حد اور میں  
سے بھگت رہا ہے۔ جیسی حد اور میں سے بھگت رہا ہے۔ جیسی حد اور میں

بکترن مجھ سے بھی پہلے کر پڑی۔ میں نے دلوں میں سے دھوئیں  
مردوں سے لٹکے کی کوشش کی جس میں ذہن اور جسم نے میرا  
خود راہ میں لاکڑا کر گرا پھر مجھے کچھ بھی نہ رہا۔

[illegible]

مگر مجھے احساس ہوا کہ وہ دودھ دیا تو مچھلی میرے تھیل کی طرف آ کر حقیقت مچھلی وہاں موجود نہیں تھا لیکن میں نے اس کو ہونے وقت آخری چیز دے دیا تھا وہاں ہی دیکھی تھی شاید اس کی بجائے وہی نظر آ رہا تھا۔ رشتہ رشتہ مچھلی غائب ہو گیا لیکن کس دور ملاح سے مجھے ایک چرو نمودار ہوا تو کھائی دیا۔

چونکہ کیا بچا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے مشعل ذہن پر  
 زور دیا تو اد کیا کہ وہ سب کا چہرہ تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے  
 عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میری آنکھوں کی دھندلاہٹ جگہ  
 اور کم ہو گئی تو احساس ہوا کہ وہ مسکرا نہیں رہا تھا بلکہ اس کے  
 ہونٹ اذیت زدہ انداز میں کھینچے ہوئے تھے اور وہیں ساکت ہو کر رہ  
 گئے تھے۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں زندگی کے نور سے خالی تھیں۔ میں نے آنکھیں ملتا چاہیں لیکن ہاتھوں کو حرکت نہ دے سکا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے آنکھوں کو نور سے پہنچ کر دوبارہ کھولا تو منظر مجھے بگم اور صاف دکھائی دیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میرے سامنے سیو بک کھلی حالت میں بیٹھا تھا۔

۱۰۔ صرف اس کا کتا ہوا سر تھا جو ٹکڑی کے ایک تخت پر رکھا  
 ۱۱۔ اس کا دروازہ نائب ٹولہ میں خود اس چلتی تخت کے قریب ہی  
 تھا۔ یہ بڑا تھا۔ کتیرے ادھر پارس بھی میرے قریب ہی پڑے تھے  
 کہ وہ ابھی اچھے ہوش میں تھے۔

نخت کے ایک طرف وہی مظلوم الخلیل رہتا تھا جسے  
 نے جگہ میں گھر سے کہا کرتے ہوئے جاتے دیکھا تھا لیکن اب وہ

عظیم مدبر عظیم قائد (زاہد حسین انجم) 150/-

(قائد اعظم محمد علی جناح کے حالات زندگی)

قائد ملت لیاقت علی خان (زاہد حسین و نجم) 150/-

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے حالات زندگی)

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

گزگاہ بخاری

۱۰۰/۰۰ فیصد

پھولوں کی سچ پر پروان چڑھنے  
والے ایک نواب زادے کی  
خودنوشت

## درخشاں

لازوال کمائیوں کے خالق انوار  
صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے  
ایک نئی سوغات تین دوستوں کا قصہ  
جن کے عزم و استقلال سے طوفان  
شکست کھا گئے تھے۔

دو حصوں میں مکمل

45/

45/

2

فون: 7224665

دیا مسکین اور غریبوں کو اس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے  
چہرے سے گویا کوئی کینچی سی لکڑی لگی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی  
ساتپ کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے جیروں میں دھلی  
ی بڑی بڑی تھی جو میں نے اسے گدھے پر لادے لے جاتے دیکھا  
تھا۔

اس وقت اس بوری کا منہ ٹکلا تھا۔ اس نے جبکہ کر بوری کے  
ایک کونے پر بائیں رکھ کر دونوں ہاتھ اندر ڈال کر کچھ کھینچا۔  
وہ سرے ہی کچھ ایک انسانی دھڑا ہر آگیا۔ میرے لیے اندازہ  
کر کے مشکل نہیں تھا کہ وہ سیدک کا دھڑ تھا۔ وہ تھان لے دھڑ بھی  
اٹھا کر تختہ ڈال دیا اور سیدک کا کھڑا ہو گیا۔ اب اس کی کمر میں  
کوئی خم و فریب نظر نہیں آ رہا تھا۔

”اے۔۔۔ اسے کس نے ہلاک کیا ہے؟“ میں نے نجف سی  
آواز میں پوچھا اور سیدک کی سر پر وہ لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کی حادثوں نے ہلاک کیا ہے۔“ تھان نے صاف  
ستھری انگریزی میں لکھ وار لیے میں جواب دیا۔

”تم کون ہو؟“ میں بڑی دشواری سے اپنی زبان کو حرکت  
دے رہا تھا۔

”مجھے تم اپنا غلام ہی سمجھو۔ زیادہ تر لوگ مجھے مان کے نام  
سے جانتے ہیں۔“ اس نے سٹاکا کا سی سٹاکا ہٹ کے ساتھ جواب  
دیا۔

میرے جسم میں جو قہوڑی ریت جاں آئی تھی وہ بھی گویا  
دوبان نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو اس امید  
سے بھلائے کی کہ شیش کی کوئی ڈراڈا خواب تھا جسے  
جلد یا دیر آخر کار ختم ہو جانا تھا لیکن دل بے ایمان اس بھلائے  
میں نہ آیا۔ اندر ہی اندر کوئی سرگوشی کر رہا تھا کہ حقیقت وہی تھی  
جو اس وقت میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔

اس شخص کو کم نے جنگل میں اپنے حوازی چلے دیکھا تھا اور  
اس وقت ہمیں گاہیں بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ مان تھا۔ اس کے  
گدھے پر جو کسی سی بوری لٹی ہوئی تھی اس میں سیدک کی سریدہ  
لاش تھی جس کی اب وہ گویا ناکل کر رہا تھا۔

سیدک خواہ کیسا ہی آدمی تھا اور گزشتہ روز اس کا مدینہ خواہ  
کیسا ہی رہا تھا اس کے باوجود اس وقت مجھے اس کا کتا ہوا سر کھڑی  
کے تحت پر دکھا دیکھ کر مددہ پہنچا تھا۔ وہ شخص جس نے نہ جانے  
کیسے کیسے مضبوط تھا قحقی حصوں میں رہنے والی ہتھیلوں کو راہ بردم  
دکھائی تھی خود کسی خاصوشی سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ مان  
پتہ چاہے اس کا استاد ثابت ہوا تھا۔ اس دنیا میں ہر سیر کے لیے سراسر  
موجود تھا۔

میں نے کمری نظر سے مان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک پست قامت  
شخص تھا اور عمر بزر معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کی عمر چالیس کے  
قریب ہو لیکن وہ یہ مشکل نہیں کا نظر آتا تھا۔ اس کی شخصیت میں

سے پر کا کی مشق کے ذریعے اپنی کھڑکی ہوئی توانائی بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیتھرن اور چارلس بھی ہوش میں آچکے تھے اور آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ کیتھرن کی حالت بر حال چارلس سے بہتر نظر آ رہی تھی لیکن ہتھک کی لاش دیکھ کر اسے بھی یقیناً زوردار جھٹکا لگا تھا حالانکہ گزشتہ روز سے تو وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار میں رہی تھی۔

”تھم، تمہارا جان ہو؟“ وہ پھنسی پھنسی ہی آواز میں بولی۔  
 بے لگ خاتون! آپ نے ٹھیک پہچانا۔ ”ممان نہایت مؤدبانہ انداز میں بیٹے پر ہاتھ رکھ کر راز اچھتے ہوئے بولا۔

”سیو بک تمہارے بچے کیسے چڑھ گیا؟“ یہ سوال گویا قطعی غیر ارادی طور پر یکدم کیتھرن کے ہونٹوں پر آگیا۔ اس کا لہجہ فی الحال کسی مریض کی کراہ سے مشابہ تھا۔ چارلس بھی مگر فکر چاروں طرف دیکھتے پر ہی اٹھ اٹھ گئے۔

”جان نے کچھ اس طرح بلا ساق قبضہ لگایا کہ آواز اس کے منہ میں ہی گھومتی محسوس ہوئی۔ وہ گویا اس سوال سے، یا پھر شاید اس صورت حال کو یاد کر کے لطف اندوز ہوا تھا جس میں سیو بک اس کے بچے چڑھا تھا۔

”سیو بک خود بخود میرے بچے میں چڑھا تھا خاتون!“ اس نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں جواب دیا ”اس کے لیے مجھے کچھ کوشش۔ نہایت تیزی سے کچھ منصوبہ بندی کرنا پڑی تھی۔ ہر کام کو کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی طریقہ کار گر ہو ہی جاتا ہے۔ سیو بک قبا کی کوئی تھا۔ میں نے اسے سزا دینے کے لیے بھی نہایت قدیم طریقہ ہی منتخب کیا۔ میں نے سوچا شاید اس طرح اس کی مدد کا نام بلا رہا تھا۔ مطمئن و مسرور رہے۔“

اس نے ہتھک گزشتہ ہزارا دیکھنے کی طرف پڑی ہوئی کوئی چیز اٹھائی۔ وہ چارلس سے مشابہ ”چوڑے چٹل کی نہایت ہماری بھر کم نکوار تھی۔ ایسی نکوار شاید پرانے وقتوں میں شاہی حلاہ بھروس کا سرگرم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس نکوار پر اب بھی خون لگا نظر آ رہا تھا جو خشک ہو چکا تھا۔

وہ نکوار کو چہرے کے قریب لا کر پھر اس کا ہاتھ لیتے ہوئے طرایت سے مسکرایا لیکن بھر متاسفانہ سے انداز میں سر ہلائے ہوئے بولا ”حکم از حکم سیو بک کو اپنے ایک ہم پیشہ کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”کیسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟“ کیتھرن نے غیر ارادی سے انداز میں پوچھا۔

”ممان نے مفہوم سے انداز میں سر ہلایا گویا اسے اس سوال سے صدمہ پہنچا ہو۔ پھر وہ نکوار دایہ کی تخت پر رکھتے ہوئے بولا ”جس کیتھرن! اس حد تک معنوی سادگی، معصومیت اور بوجھن اچھا نہیں ہوگا۔ آپ لوگوں سے مترکون جانتا ہے کہ سیو بک نے کیا کیا۔ میں اپنا کام کر رہا تھا۔ آپ لوگوں کا تو مجھے دیکھنے کی

اس کے سوا کوئی بھی قابل ذکر خصوصیت نہیں تھی کہ چہرے مرے اور آنکھوں سے وہ بے پناہ شاطر اور پُختہ نظر آ رہا تھا لیکن اپنی اس خصوصیت کو بھی شاید وہ ضرورت پڑنے پر نہایت کامیابی سے چھپا لیتا تھا کیونکہ جب ہم نے اسے جنگل میں کھانا پکاتے آئے تھے کیا تھا تو اس کے چہرے پر یا اس کی آنکھوں میں مکاری، خفاقت یا ہتھک کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ واقعی ایک ست اور مسکین جسم کا مزدور دکھائی دیا تھا۔ شاید اس کی بے ضرر اور نہایت عام سی نظر آنے والی شخصیت ہی اس کا سب سے بڑا سراپا تھی۔ وہ کیسے بھی عام آدمیوں کی بیخیز میں اس طرح کم ہو سکتا تھا کہ شاید کوئی اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری نظر ڈالنے کی رست نہ کرتا۔

کیتھرن اور چارلس بھی درجے درجے ہوش میں آ رہے تھے۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ اپنی جگہ سناٹ لیتا ہونے کے باوجود اپنی راگ و پے میں پھٹتی ہوئی جنگل کی کسی طرح دور کر سکوں۔ ممان بلاشبہ اونچا فنکار تھا۔ وہ مجھ جیسے ”مشاک پروف“ شخص کو بھی اچھا خاصا شاگ پھیلانے میں کامیاب رہا تھا۔

اس کی فریخت وادھی اور مونچھوں کے درمیان پتلے پتلے مشاک ہونٹوں پر گھمبائی ہوئی خفیف سی مسکراہٹ ہماری سبھی کو وہ خود بھی اس صورت حال سے خاصا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مجھے مختلف قوموں کے افراد کو چہرے مرے سے پہچاننے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ ویسے بھی بہت سی قوموں کے افراد کی عقلیں اور عین نفس آزمائی سے ایک دوسرے میں گھٹن ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے ممان کے چہرے میں ایک بے ہوشی کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی شکل و صورت کا مجموعی طور پر مجھ پر جو تاثر مرتب ہو رہا تھا اسے میں ”سہریت“ کے سوا کوئی نام نہیں دے سکتا۔

وہ دونوں قبا کی جنہیں ہم سیو بک کے گویا سمجھتے تھے ”اس وقت کرے کے دو مختلف گوشوں میں گڑی کی ٹوٹی ہوئی پٹیلیاں پر بیٹھے تھے۔ دونوں کی گود میں ٹھیں ٹھیں۔ وہ بالکل بے پروا اور صورت حال سے کچھ لافٹل سے نظر آ رہے تھے۔ ہم اس وقت جس کمرے میں موجود تھے وہ غالباً کسی سالن اور چوٹی کیمین کا حصہ تھا۔ اس کا فرش بھی گڑی کے ٹھٹھن کا تھا جو جگہ جگہ سے ٹپک رہے تھے۔ کیمین کا دروازہ ہم ٹھٹھن تھا لیکن ہر تھا۔ وہاں گرمی یا ٹھٹھن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید یہ میرے اندر چھپی ہوئی جنگل کی کمال تھا۔

”تم جیتنے افضل چودھری ہو۔ مجھے تم سے لے کا بڑا اشتیاق تھا۔“ وہ پہلے ہی کی طرح شہتہ انگریزی میں ٹھٹھن دار لہجے میں بولا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ہماری ملاقات کسی فانیہ اشارہ ہو گئی میں ڈنپر پر ہو رہی ہو اور وہ نہایت تہذیب و دانشمندی سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہو۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس وقت غیر محسوس طریقے

جہاں تھا کہ آخر تم کون ہو؟ دنیا کی کون سی خفیہ ایجنسی سے تمہارا تعلق ہے؟ پھر مجھے معلوم ہوا تم پاکستان کے ایک برٹس میں ہو تو میں اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ برٹس میں تم جیسے تو نہیں ہوتے مسٹر چودھری!

"شاہ میں غلطی سے برٹس میں بن گیا ہوں۔" میں نے آہٹ سے کہا "تمہیں کس نے میرے بارے میں بتایا؟"

"سیویک نے" اس نے اطمینان سے جواب دیا "وہ اور اس کے چند آدمی گاؤں سے آتے وقت میرے اور میرے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ میں اس کا حساب برابر کرنے کے لیے اس کی گھات میں تھا۔ میں حساب برابر کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ سیویک نے زندگی کے آخری لمحوں میں مجھ سے بڑا تعاون کیا۔ اس کے لیے میں اس بے چارے کا شکر گزار رہوں گا۔ میں نے جو کچھ اس سے پوچھا۔ اس نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ تم لوگوں کے بارے میں جو کچھ بھی اسے معلوم تھا مجھے بتا دیا۔"

"وہ رقبہ بھی اسی نے لکھا ہو گا جو ہمیں یہاں لانے کا سبب بنا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بے شک" حان نے طمانیت سے سر ہلایا "میں کوئی جھلساڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سیویک ہر طرح سے تعاون کر رہا تھا تو مجھے کوئی کچا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ زندگی کی آس بڑی بڑی میز پر ہوتی ہے مسٹر چودھری! جان بچ جانے کی آس پر انسان آخری لمحے تک ہر کام کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ سیویک کو بھی زندگی کے آخری لمحے تک آس رہی کہ شاید میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"تم نے اس کے آدمیوں کو بھی ہلاک کر دیا؟" میں نے پوچھا۔ "ظاہر ہے۔ میں انہیں خاطر قاضی کے لیے ساتھ تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ یونسی بے وقوف سے قبائلی تھے۔ میرے لیے دشواریاں پیدا کر سکتے تھے۔" اس نے بے پروائی سے کہا پھر اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ انہی کے لباس تو پہنے کڑے ہیں۔ کچھ لوگ باہر بھی شیش جوتوں کے لباس میں ہیں۔ سیویک کا لباس میں خود پہننا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے ایک چوہا ہاں گیا جس کے پاس ایک گرہا بھی تھا۔ مجھے اپنے کام کے لیے وہ زیادہ موزوں نظر آیا۔" "تم اونچے درجے کے قاتل کے بجائے نچلے درجے کے کوئی ڈراما باز معلوم ہوتے ہو۔" میں نے اندری اندر اپنے آپ کو پہلے کی طرح توان محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر قدرے تحریف کے آثار ابھر آئے "تم مجھے ڈراما باز ضرور کہو لیکن نچلے درجے کا مت کہو۔ میں اگر اعلیٰ درجے کا قاتل نہ ہوتا تو یقیناً اعلیٰ درجے کا دارا کارا بادشاہت کا ہوتا۔" میں نے لپٹے ہی لپٹے طویل وعروض کرے میں انکروڑ دانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "سیویک کے آدمیوں کی لاشیں کہاں ہیں؟"

کوشش کرنا سمجھ میں آتا ہے لیکن اس بد بخت سیویک کو آپ کے ساتھ کندھے سے کندھا جوڑ کر کفرے ہونے کی کیا پڑی تھی؟ مجھے یقین ہے کہ مسٹر چارلس یا کسی اور کو سیویک نے ہی خبردار کیا ہو گا کہ لیڈی ڈانکا کے قتل کا کنٹرول مجھے ملا ہے؟

اس نے تصدیق طلب نظروں سے چارلس کی طرف دیکھا لیکن چارلس بدستور آنکھیں پٹ پٹانا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر اس کے حواس صحیح طور پر کام کرنے لگے تھے تو وہ اس کا اعتماد نہیں کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے حان بولا "یہ اپنے پیشے سے غداری تھی۔ سیویک بے شک مجھے نہیں جانتا تھا، مگر مجھ سے نہیں ملا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا لیکن اسے میرے پیشے کے بارے میں معلوم تھا۔ یوں ہم ایک ہی عادیہ زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ اس قسم کے پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی آنکھ میں ایک دوسرے کے لیے شرم و لحاظ ہونا چاہیے۔ وہ اگر ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں تو کم از کم انہیں ایک دوسرے کی جزیں نہیں کاٹنی چاہئیں۔"

حان کا لہجہ اطلاعات کے کسی سیل کا سا ہو گیا تھا۔ میں بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کم بخت حیویر کا کوئی بہت بچھا ہوا اداکار معلوم ہوا تھا اور یہی کافی ستم ظریف بھی واضح ہوا تھا۔

پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "اس سے پہلے میرا کوئی منصوبہ بنایا نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے مجھے ہٹا کی کام نہ دیکھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ کبھی اس امکان کو ذہن میں رکھنے کا بھی خیال نہیں آیا کہ میرا منصوبہ بنایا ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس اہم کنٹرول میں بنایا رہنے کا مدد میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مسٹر افضل چودھری! میری سزا کا تہہ ہو گی۔ مستقبل تاریک ہو گیا۔ بہت سی بڑی رقم صرف کر کے میں نے حالی میں ایک نینٹ ورک قائم کیا تھا۔ بہت بڑی انوینٹ کی تھی۔ مجھے دنیا کے مختلف گوشوں میں کئی بہت سی اہم کنٹرول پلے کی امید تھی لیکن سب کچھ تباہ ہو گیا۔ سب کچھ ڈوب گیا۔ مسٹر چودھری!"

دنیا واقعی بڑی ترقی کر رہی تھی۔ قتل و غارت بھی ایک کاروبار! ایک انٹرنیٹ بن گیا تھا۔ اس کے بھی پھلے پھولے اور "سینٹر" ورک قائم کرنے کے تذکرے سنیوگی سے کیے جاتے تھے۔ اس میں "ساکھ" خراب ہونے کا انفرس کیا جا رہا تھا!

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ڈراما سے انداز میں سیویک کے کتے ہوئے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میری چاہی کا اصل ذمے دار تو میں شخص تھا۔" پھر اس کی انگلی ڈرامائی انداز میں ہی میری طرف گھوم گئی "لیکن اگر تم موجود نہ ہوتے تو سیویک کی ساری کوششیں دعویٰ کی دھڑی نہ جاتیں۔ تم نے میں آخری لمحوں میں اپنی جان پر کھیل کر میرے منصوبے کو ناکام بنادیا۔ تب سے میں

خصوصاً اپنے قابو میں آئے ہوئے افراد کو زیادہ اذیتیں دتا میرا مشغلہ نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں قتل کے طریقوں میں کچھ دریافت کی ہو، کچھ شروع ہو۔ مشکل یہ ہے کہ یہاں ہمیں زیادہ سہولیات اور زیادہ سازد سامان میسر نہیں ہے ورنہ تم لوگوں کو ٹھکانے لگانے کے کافی متنوع طریقے اختیار کیے جاسکتے تھے۔

میں اس وقت اپنے آپ کو پر سکون رکھنے اور رہائی کی کسی تدبیر کے سلسلے میں ذہن لڑانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا لیکن اس لمحے میرا بڑی شدت سے دل چاہا کہ کسی مجبور کے تحت میرے ہاتھ پاؤں بندھوں سے آزاد ہو جاؤں اور میں مناجات کی پودا کیے بغیر اس آلوکے پیچھے پر ٹوٹ پڑوں اور اگر مرنا مقدر میں ہو تب بھی مرے سے پہلے اس کی گردن توڑنے کی ایک بھر مار کوشش کر سکوں لیکن محض سوچنے اور خراہش کرنے سے بندھیں نہیں کھلتیں اور مجھ جیسے گناہ گار کو مجبور کی امید بھی کم ہی رکھنی چاہیے تھی۔

عنان بات جاری رکھتے ہوئے بولا جس نے ایک بار ایک دستاویزی قلم میں ایک شخص کو بجلی کی کرسی پر موت کی سزا پاتے دیکھا تھا۔ مجھے وہ منظر بہت دلچسپ لگا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں خود اپنے ہاتھوں سے کسی کو بجلی کی کرسی پر ہٹا کر موت کی سزا دوں لیکن۔۔۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "انسوس اس جنگل میں تو بیٹھنے کے لیے عام کرسی بھی دستیاب نہیں، بجلی کی کرسی تو بہت دور کی بات ہے۔ کاش میں تمہارے مضبوط اور درزشی جسم کو اور مس کیسٹرن چارلس کے غمر میں جیکر کو جتنی جھکوں کے ساتھ ٹیڑھا جھینڈا ہوتے اور نیلا پڑتے دیکھ سکتا۔ کبھی کبھی غمرت میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ نظام ہوتا۔"

اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اذیت پسند نہیں تھا لیکن اس کے الفاظ کے پیچھے یقیناً ایک اذیت پسند بول رہا تھا تاہم وہ ذرا مختلف قسم کا اذیت پسند تھا۔ وہ متاقلانہ سے انداز میں دونوں ہاتھ بچھلاتے ہوئے بولا "اب تم ہی بتاؤ اس جنگل میں اس بے سروسامانی کے عالم میں بھلا تم تینوں کو ہلاک کرنے کے سلسلے میں کیا اور کتنی پیدا کی جاسکتی ہے؟"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بے بسی کا احساس کچھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "تو یہ یہاں قریب ہی ایک کنواں موجود ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا تم تینوں کو رسی سے گولٹا لٹا کر باری باری کنوئیں میں اتار جائے لیکن کنواں کافی گہرا ہے۔ میں تم لوگوں کی کیفیت کچھ زیادہ صحیح طور پر نہیں دیکھ سکوں گا۔"

اس نے خاموشی ہو کر گویا میرے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن میرا اندازہ بھی تھا کہ میں اپنا چوہا پٹ رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ کیسٹرن نے بھی کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا البتہ چارلس کے چہرے سے تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا لیکن یہ

"وہ غیر اہم لاشیں تھیں۔ ہم نے انہیں جنگل میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ آخر دردوں اور پردوں وغیرہ کو بھی تو بیٹ بھرتا ہے۔ سید بیک کی لاش البتہ اہم تھی۔ اسے میں خود اٹھائے رہا تھا۔ کاش مجھے وہ اندھنوں کی طرح کھینچنے کیلئے کٹھن معلوم نہ آتا تو اس کی کھوپڑی کو جس کی یادگار کے طور پر اپنے پاس لگتا۔"

تمہارے بارے میں تمہارے ارادے کیا ہیں؟ میں نے پوچھا کہ مجھے امید نہیں تھی وہ اس سوال کا صحیح جواب دے گا لیکن اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ اس وقت اس کی خود اعتمادی بڑھ چکی ہوئی تھی۔ وہ صورت حال سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دوسری باتیں بھی کافی حد تک بچ رہی تھیں۔ میں ممکن تھا اس سوال کا بھی صحیح جواب دے دیتا اور ہماری کیفیت سے مزید لطف اندوز ہوتا۔

میرے ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی سختی سے بندھے ہوئے تھے اور میں خاصی تکلیف کی حالت میں ترجہاً ساغر شہر پر رہا تھا۔ ہاتھ پٹ پٹانے لگے تھے اور وہ میرے پیچھے ہی تقریباً پیچھے ہوئے تھے۔ کیسٹرن اور چارلس کی حالت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ چارلس کے چہرے سے تو تکلیف کے علاوہ مایوسی کا بھی اظہار ہوا تھا جبکہ کیسٹرن کا چہرہ پٹ پٹانے میں غیر محسوس طور پر زور ڈال کر رکھے دیکھ چکا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں کی بندھیں مٹانے کی ذمہ داری محسوس نہیں ہوئی تھی۔ زیادہ زور آزمائی کرنے پر شاید کوئی آواز پڑتا لیکن ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے میں پوری طرح زور آتا ہی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں سفاک سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ہرے دیر سے اس کے ہونٹوں تک آگئی۔ جواب دینے سے پہلے اس نے بطور خاص کیسٹرن کا گہری نظروں سے سرباگیا جائزہ لیا۔ وہ اس طرح آؤری ترجمی پڑی تھی کہ اس کے حسین غیب و فراز اور نور نمایاں ہو گئے تھے۔ اوپر سے اس کا سرخ بھرکا لباس بھی بڑے جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ حالات کی تنگی اپنی جگہ تھی اور اس کے سر پر ایک حشر خیزی اپنی جگہ۔ اس غفلت حالی میں بھی وہ کسی راست سے کم نہیں تھی۔ خصوصاً عیان کے لیے امید کہ وہ اس وقت اس طرف چھوڑ دیا تھا۔ سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہر بات سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور مزید ہو سکتا تھا۔

وہ ایک انگلی سے دھیرے دھیرے ہاک سٹلے ہوئے بولا "تم لوگوں کے پاس میں نے بڑی آنکھیں کھلی ہوئی۔ ابھی تک میں غور نہیں کر سکا کہ تمہیں کس طرح ہلاک کیا جائے۔ گولی مار دینا یا کھانسی لگاتے ہوئے۔ تمہارے گردن قلم کرنے کا تجربہ میں سید بیک کر چکا ہوں۔ مسئلہ یہ بھی نہیں ہے کہ میں تم لوگوں کو بہت زیادہ اذیت دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ذرا غور پر غور نہیں ہوں۔ بہت زیادہ اذیت پسند نہیں ہوں۔"

تکلیف بیٹھ جان کے الفاظ کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وہ بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ فرش پر پڑے پڑے زندگی سے بے زار ہو رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حنان بولا "چنانچہ فی الحال میں نے نہایت قدیم اور نہایت سیدھے سادے طریقے پر انکشاف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یعنی نہایت معمولی سی رسی کا چندا باری باری تم تیلوں کے گٹے میں ڈال کر تھیں درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے تم لوگوں کو اپنی سزائے موت کے اس طریقے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ ملاں سفیر جہاز کے بجائے زین سے جانے پر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ غیبت اپنی پوزیشن سے کچھ زیادہ سی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈانکا کو قتل کرنے کے سلسلے میں اس نے جس طرح زک اٹھائی تھی شاید اب اس کے جواب میں انسانی طور پر بھی جھکیں حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

ہم تھیں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ میں نے بھی اس کے بچکانہ اور احمقانہ سوال کے جواب میں کوئی اہانت آمیز بات کر کے اسے مزید چلانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید میری طرح اس وقت تکرین اور چارلس کے ذہن بھی کیس اور اٹکھے ہوئے تھے۔

جی بات یہ تھی کہ پہلے مجھ پر کچھ مایوسی اور اضمحلال سالاری ہوئے لگا تھا کہ اس سے قبل بھی زندگی میں بار بار ایسے مواقع آئے تھے جب مجھے زندگی سے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے مایوسی کو قرب نہیں پہنچنے دیا تھا اور کسی نہ کسی عجیبی امداد کے تعین سے خود کو سنبھالے رکھا تھا اور شاید اس تعین ہی کا کرشمہ تھا کہ کسی نہ کسی ہمارے صورت حال لیٹ جاتی تھی لیکن آج میں نے حقیقتاً اپنے آپ کو مجبور سا پایا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھائے کی کوشش بھی کی تھی کہ مایوس آدمی درحقیقت ڈھری موت مرنا ہے "اے گرامر سے پہلے ہی موت آجاتی ہے۔ یہ سب کچھ سوجنے کے باوجود میرے جسم میں خوش و خروش کی دھڑکنیں دوڑی تھیں جو بالاد کو اٹھ دینے میں میری مدد کرتی تھیں۔

مگر جب اس نے ہمیں رسی سے درخت میں لٹکا کر پھانسی دینے کی بات کی تو نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ مایوسی کی طرف کچھ بھٹکتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اندر جڑے میں کوئی کلن سی نظر آئے گی۔ یہ بھی کوئی حیرت انگیزی تجربہ تھا۔ اس نے ہمیں کوئی خوش خبری تو نہیں سنائی تھی۔

اس سے پہلے میں بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی بے بسی کے عالم میں ہماری کھوپڑیوں میں محسوس ایک ایک گولی آتا رہتا تھا۔ افسوس پاک کر کے کا لیکن بیشتر قاتل جو کچھ فطری طور پر اذیت پسند ہوتے ہیں، لے پھول میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی لے پھول میں پڑ گیا تھا۔

ہمیں اس طرح پھانسی دینے کے لیے انہیں یقیناً کچھ تردد کا پڑا۔ بے شک ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے لیکن ہم کوئی ٹخنے سے بے جان کھولنے بھی نہیں تھے جنہیں نہایت آسانی سے اٹھا کر درخت سے لٹکایا جاتا۔ اس حالت میں بھی خود اذیت قبول کر سکتے تھے۔ میں اگر مرنے سے پہلے حکمران کران میں سے کسی تکبیر بھی پھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو بڑی طمانیت کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوتا۔ میری خوشی کی وجہ محض اتنی سی تھی۔

اچانک باہر دوڑتے دوڑتے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ حنان کے تاثرات کدم ہی بدل گئے۔ ایک لمحہ پہلے تک وہ انتہائی مطمئن و مسرور نظر آ رہا تھا۔ اس کی خود امدادی کی کوئی انتہا نہیں تھی لیکن کدم ہی وہ ایک فکر مند چہرہ نظر آنے لگا۔

اس نے چیخ کر کسی کو پکارا اور کسی ناقابل فہم زبان میں کچھ پوچھا۔ ایک جہاز جھکاڑے چرے نے دوڑنے سے جھٹکا اور اسی زبان میں کوئی جواب دیا جو کم از کم میرے لیے ناقابل فہم تھی۔ کمرے میں حنان کے دو آدمی موجود تھے وہ بھی اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

جہاز جھکاڑے چرے کی بات سننے ہی وہ تھیں جیڑی سے کمرے سے نکل گئے۔ انہوں نے ہمارے پاس میں مزید کوئی احتیاطی تدبیر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ ہم تو پہلے ہی سر ہاپ "احتیاطی تدبیروں" میں ہی جکڑے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں میں جکڑے ہوں ان کے پاس میں مزید احتیاطی تدبیر کی کیا ضرورت تھی۔ حنان تو شاید ایک لمحے کے لیے ہمیں بھولی گیا تھا۔ وہ کچھ اس جیڑی سے کمرے سے نکلا تھا جیسے مکان سے تھیر نکلا ہو۔ اس کی چٹری پر میں قدرے حیران ہوئے لیکن نہیں رہ سکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے باہر سے قازمک کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے گہری سانس لے کر چارلس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی چمک تھی جیسی چوری چھپے دودھ پانی جانے کے بعد پانی کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ وہ عریض مجھ سے قاسم ڈانکا اور میں تیس سال کی ایک لڑکی کا باپ تھا لیکن اب میں اسے دوستانہ انداز میں ہی بات چیت کرنے لگا تھا۔ احرام اور عکالت کو میں نے بالائے طاقت رکھ دیا تھا۔

"کیا بات ہے آنے سے پہلے کچھ کام دکھا آئے تھے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" آتے آتے میں نے ایک خاص آدمی کو بتا دیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ آتے وقت تم لوگوں کو سفیر کے مکان سے باہر بھیجے کہ بعد میں اندر ایک فون کرنے گیا تھا۔ کام کا آدمی ہے۔ شاید وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہے اور اس نے طاراً سراخ بھی نکالیا ہے۔

"لیکن کیا اس نے آتے ہی اندر داخلہ قازمک بھی شوق

طنز و مزاح

|       |            |                    |
|-------|------------|--------------------|
| 125/- | مظفر بخاری | پچ در پچ           |
| 75/-  | مظفر بخاری | قصہ مختصر          |
| 90/-  | مظفر بخاری | ایک سوا ایک (کالم) |
| 100/- | مظفر بخاری | گستاخی معاف        |
| 100/- | مظفر بخاری | ایک سو نو (کالم)   |
| 200/- | مظفر بخاری | چمن کو چلے         |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور نمبر 2

”اس وقت جو کام تم نے دکھایا ہے اس میں تو اگر تمہارے ہاتھ کی کمال بھی اتر جاتی تو یہاں نہیں جی۔“ میں نے دے دے دیے جو ش سے کہا۔

”اےں، تمہیں بھلا کیوں پروا ہوئی۔ وہ تو میرے ہاتھ کی کمال ہوئی تھی۔“ وہ میری باتوں پر ہلکا سا گھونسا رسید کر کے کہنے لگا۔

”تمہارے لیے خوش خبری ہے کہ تمہارے ہاتھ پر کچھ زیادہ ہی چھید اور زیادہ ہی سخت قسم کی کڑی ہوئی ہیں۔ مجھ سے نہیں کھل رہیں۔ شاید وہ لوگ تم سے ہی سب سے زیادہ خوفزدہ تھے۔“

”نہیں نہیں معلوم تھا کہ اصل نتیجہ تم ہو۔“ میں نے کراہ کر کہا۔

”کما ۳۲ باتیں مت کیے جاؤ۔ تخت پر سے وہ بجواؤ اٹھاؤ اور دریاں کاٹ ڈالو۔“

تخت تک جانے کے لیے اسے گلے دے دیا اسے کے ساتھ سے گزرا کر آیا۔ اس نے پہلے سر زار سا آگے بڑھا کر دو آنے سے جھانکا پھر کھینچ کر ہاتھ تک پہنچا۔ اس نے شاید دھیرے دھیرے کر کے ہاتھ سے کھینچ کر اس نے اب بھی لپٹے ہوئے کی ہڈیوں کو کھینچ کر ہاتھ سے دھرتی نہیں کیا۔

تکوار تخت سے اٹھا کر وہ لپٹتی ہوئی دھرتی آئی اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

”واہ کیا شاعر تکوار ہے۔ اسے ہاتھ میں لے کر تو خواہ خواہ ہی کسی کی گردن گھم کر کے کوئی چاہتا ہے۔“

”واہ کتنی کم ظرف کے ہاتھ میں تمہارا خطرہ لگا ہوا ہے۔“

میں نے افسوس سے کہنے میں کہا۔

”میں دریاں کاٹنے کے بجائے میری نگاہیں نہ کاٹ دیتا۔“

”یہ ہے؟ اس طرح تو تمہارا وہ کام کا تو ہی ہمارا کام تمام بھی سکتا ہے۔“ میں نے فائزنگ کی آوازوں سے کچھ اندازے لگنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں وہ بہت تجربہ کار آدمی ہے۔ جو کچھ کرے گا سوچ کر کرے گا۔ مجھے ایسے پرہیزگاروں سے بچنا چاہیے۔“

”ہاں پریشان تھا اب ایک بیک سی اس کے لیے میں سب سے زیادہ بہت جھلکے لگی تھی۔“

”حضرات! کیا آپ دونوں براہِ مہربانی میری طرف کچھ توجہ نہیں لگائے؟“

”کیتریں کی دھمکی سی آواز سنائی دی۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اگر میں اس وقت فرش پر نہ جاتا تو پھر پھر سے اٹھ جاتا۔ وہ تقریباً اسی فوٹن میں پڑی تھی جس میں میں نے اسے چہرے پر پلے پلے لگا تھا۔

اب اب اس کا ایک بازو ہوا میں بند تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہاں وقت ہوا تھیں کسی کو دے کے لیے پکارنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یعنی اس نے اپنا ہاتھ بندھوں سے آزاد کرالیا تھا۔

”اب وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ جلدی سے میرے ہاتھ بھی کھلو۔“ میں نے گویا عجب کر کہا۔ ہاتھ گلیوں کی ترزا بہت تیز ہوتی جا رہی تھی۔

”کیتریں مسکراتے ہوئے پھر گئی سے اٹھ بیٹھی۔ ایک ہاتھ آزاد ہو جانے کی وجہ سے اس کے دوسرے ہاتھ پر ویسی دھیلے دھالے انداز میں بندھ گئی تھی۔ کیتریں نے اسے آگے بھینکا لیکن اس کے پاؤں اب بھی بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اسے کچھ جھک کر اور کچھ گھٹ کر میرے قریب آ رہا۔

اس نے مجھے ہانوں دوسرے پہلو کے بل لٹکا دیا جیسے قصائی بڑھے ہوئے جانوروں کو کھنکھرتے وقت بے پروائی سے اوپر اوپر لٹکا دیتے ہیں۔ وہ بھی بندھوں سے اٹھنے لگی تو میں نے پوچھا۔

”تمہارا ہاتھ کیسے آزاد ہو گیا؟“

”شاید یہ منصف نازک ہونے کا ایک اور نام تھا۔“

”ظفر گار لے میں پھول“ شاید میرے ہاتھ ایسی تھی سے ہاتھ سے بھی نہیں لگے تھے جس تھی سے تمہارے ہاتھ سے لگے ہیں۔ اس کے ظاہر ضرورت پڑنے پر خواہ جس قسم کی سخت جان ثابت ہوں لیکن میرے ہاتھ پھول میں، جو چپ اور نرمی ہے وہ تمہارے ہاتھ پھول میں نہیں ہو سکتی۔“

”گورنر نہ کرے“ میں نے جلدی سے کہا۔

”وہ گورنر میری بات ان کی کہنے کی تھی کہ تھکات تھکات میں بات ہانک رہے ہوئے پھول“ وہ منوس چھوٹی نسل کا بچا جب تم سے یک ایک میں الجھا ہوا تھا اس تمام وقت میں میں اپنے ہاتھ کو کیڑے کیڑے کر کے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش ہی کرتی رہی تھی۔ اس کو کھینچ کر میرا ہاتھ چھل کر رہ گیا ہے۔“



صرف جھک ہی دیکھ سکا تاہم مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ حمان تھا۔ میں نے تیزی سے نکواری بھاگائی۔ اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوا تو اس تیزی میں اندر آتے وقت اس غیر متوقع وارے سے نہیں بچ سکتا تھا لیکن حمان کی چوٹی نے مجھے بھی حیران کر دیا۔

اس نے جس تیزی سے گردن جھکائی اس سے یقیناً کوئی نہ کوئی ریکارڈ قائم ہوا ہو گا لیکن وار خالی نہیں گیا۔ حمان کے پیچھے کوئی اور بھی اندھا دھند بھاگا آ رہا تھا۔ حمان کی جگہ اس کی گردن اڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اس طرح کسی شخص کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ایک لمبے کے لمبے میں نے اپنے آپ کو بیسویں صدی کا کوئی جلاوطن نہیں کیا۔

اس شخص کی گردن کٹ کر دو داڑے کے قریب ہی گر گئی مگر اس کی سریدہ لاش کچھ آگے جا کر گری۔ کمرے میں کدم گیا کسی نے اسے بھرے مگیزین کے گات کھلی کر چھڑکاؤ سا کیا۔

اس دوران حمان جو اپنی جمبوک میں آگے کل چکا تھا میرا ایریوں کے بل گھوما۔ مجھے بروقت ہی اس کے ہاتھوں میں گمن کی جھک نظر آئی۔ میں نے بھی اسی کی طرح چوٹی کا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے خود کو فرش پر گرایا۔ دوند گولیوں کی بوچھاڑ نے شاید میرا بالائی اڑھڑ بھائی کر دیا ہو۔

حمان کمرے سے بھاگا تھا تو ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور ہم فرش پر پڑے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت کیبن کو گھیرے میں لیا جا چکا تھا۔ حمان کے ساتھی شاید مارے جا چکے تھے اور وہ کل بھاگنے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن جانے سے پہلے ہم تینوں کا کام تمام کرنے آیا تھا۔

تاہم اس کے اعصاب کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہوا تھا کہ کمرے میں ٹھٹھٹے ہی اس نے اپنے آپ کو نکواری کے قطعی غیر متوقع وارے سے بچایا تھا اور پھر کمرے میں بازی چلی ہوئی دیکھ کر حیران ہونے یا صورت حال کو سمجھنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا بلکہ فوراً ہی ایریوں کے بل محکم پر کچھ پرست مارنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی غاہری شخصیت اور جرأت سے وہ ایک معمولی آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن بلاشبہ وہ ایک چملاوا تھا۔

میں نے فوراً ہی دوسری طرف کو لٹک کر اس کے دوسرے متوقع برست سے بچنے کی کوشش کی گو کہ اس وقت مجھے زندگی کی آس ذرا کم ہی رہ گئی تھی لیکن حمان کی گمن کو دوپاؤ نہ کرنا نصیب نہیں ہو سکا۔ میرا دوسری طرف کو لٹھکنا بیکار رہا کیونکہ اسی لمحے میں نے دیکھا ایک گولا سا بڑی طاقت سے حمان کے منہ پر آکر لگا اور وہ بری طرح لٹکڑا گیا۔

گمن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے۔ میں فوراً گمن اٹھانے کے لیے بھینچا اور اسی لمحے میں نے اس گولے کو توڑ دیکھا جو حمان کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ سیوہک کی کھوپڑی تھی۔

میرا جملہ پورا ہونے تک وہ میری بندھنیں کاٹ چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے بیرونی کی بندھنیں کاٹ ڈالیں پھر وہ اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوئی جو یقیناً بے آبی سے اس کا ہتھکڑا ہاتھ اپنی جگہ نہیں لیکن اپنا کام کرنے میں کیتریں نے کوئی تاخیر نہیں کی تھی۔ چند سیکنڈ میں اس نے چارلس کو بھی بندھنوں سے نجات دلا دی تھی۔

میں اس دوران کھائیں کو رگڑ کر خون کی گردش صحیح طور پر بحال کر چکا تھا۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اڈا جلدی سے یہ نکواری مجھے دے دو۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اختیار نہیں ہے۔"

وہ نکواری مجھے دیتے ہوئے بولی "لو یہ اٹھو تا اختیار بھی تم رکھ لو۔ سچے موزیے ہی خود غرض ہوتے ہیں۔"

"تمہیں نکواری کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو نفروں کے تیر چلا کر ہی اپنا کام نکال سکتی ہو۔"

"نفروں کے تیر؟" اس نے حیرت سے دُہرایا۔ یہ خالص مشرقی اصطلاح شاید اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اب وضاحتوں کا وقت نہیں تھا۔ حرکت میں رہتے ہوئے ہم جتنی باتیں کیے جا رہے تھے وہی کافی تھیں۔

میں نکواری کے برابر کا جائزہ لینے کے لیے دروازے پر باہر جھانکنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ ابھی میں ایک ادھ کھلے پٹ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ایک تخت تھوڑے ہی فاصلے پر کسی سے دروازے پر پہنچی مٹین گمن کا برست پڑا۔ اسے پٹ کے پر پٹے آؤ گئے اور میں فوراً ہی فرش پر اوندھا کر پڑا۔

سب مٹین گمن اس کے بندھن بھی وقت و وقت سے کٹی باہر گئی۔ لیکن اب اس کا رخ شاید کسی اور طرف ہو گیا تھا۔ عقب سے کیتریں فرش پر رینگتی ہوئی میرے قریب آئی اور چچی آواز میں بولی "اوندھے کیوں کر گئے میرے شیر؟ نکواری نے کرگولیوں کی بوچھاڑ میں نکل جاؤ اور رشتوں کے پٹے لگا دو۔"

"خاموش رہو آستین کے سائب کی مادہ" میں نے نیچی آواز میں معمولی خشکی سے کہا "اگر تمہیں کچھ کو مروانے کا اتنا ہی شوق ہے تو ویسے ہی جی کر انہیں مطلع کر دو کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں۔"

"میں ایسا کر کر رہی لیکن اس صورت میں مجھے اور اپنا کو بھی تمہارے ساتھ مرنا پڑے گا۔ یہ منگاسودا ہے۔" وہ لٹھری سانس لے کر بولی۔

اس لمحے اچانک ہی نازنگ کا سلسلہ بند ہو گیا۔ پھر دوڑتے قدموں کی آواز دروازے کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ میں نکواری سنبھال کر اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں شکست دروازے کی اوٹ میں تھا اور کسی شخص کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی گردن اڑا دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔

ایک شخص گولے کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس کی

”تم ان حالات میں بھی نہیں کہتے ہو؟“ وہ غزالی ”تم بھی حمان اور سیو بک سے کچھ کم نہیں ہو۔“

”میں ایک شریف آدمی ہوں۔ مجھے ان کرائے کے قاتلوں سے کیوں مارا دی ہو۔“ میں نے گویا بڑا احاطے ہوئے کہا ”میں تو صرف تمہاری حالت دیکھ کر نفس رہا تھا۔ پوری ملک لگ رہی ہو بلکہ ملنگی کہنا چاہیے۔ سفید فاق ملنگی۔“

”یہ ملنگی کیا بہت برا آدمی ہوتا ہے؟“ اس نے پیشانی پر ہل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ہو نا نہیں“ ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لو جس طرح تمہارے پاس پیسے ہوا کرتے تھے اس سے کچھ کم ملتی جلتی چیزیں تمہارے پاس ملگ اور ملنگی کھلاتی ہیں۔“ میں نے حمان کی چھوڑی ہوئی گن اپنی طرف کھٹکاتے ہوئے کہا۔ وہ آؤدی تھی۔ اس نے پہلے بھی جب حمان اس مقام سے فرار ہوا تھا جہاں لیڈی ڈانکا کی کار کو دھماکے سے تباہ کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی تو ہمیں ایک عمارت میں حمان کی چھوڑی ہوئی ایسی ہی ایک اور اسرائیلی گن آؤدی ملی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ اس کی پسندیدہ گن تھی۔

میں دو بار کی طرف کھٹکے لگا تاکہ ذرا محفوظ کرے میں ہانک کھڑا ہو سکوں لیکن ”دوسرے ہی لمحے مجھے رک جانا پڑا۔“ میا فون پر کوئی آواز اُبھری تھی۔ کوئی انگریزی میں کہہ رہا تھا ”مسٹر چارلس! اگر آپ بحیرت ہیں تو کہیں سے باہر آجائیں۔ یا ہمیں یہ آواز بلند بتائیں آپ کس حال میں ہیں۔ ہم کہیں کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔“

چارلس کی آنکھوں میں فاقا نہ ہی چمک آئی اور وہ اپنی تمام دراندازی اور بد حالی کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میری طرف دیکھ کر باجھیں کھٹکاتے ہوئے بولا ”یہ مجبوروں کی آواز تھی۔“ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے مجبوروں میں کوئی بہت پرانا شاسا تھا جس میں بھلا بیٹھا تھا اور چارلس مجھے اس کی یاد دلانا رہا تھا۔

”یہ مجبوروں کون ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ایم آئی فائیو کا ایجنٹ ہے۔“ اس نے اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

”ایم آئی فائیو؟“ میں نے حیرت سے ڈہرایا ”یہ کیا ہے؟“

”ہر طائفہ کی ایک خفیہ ایجنسی۔“ اس نے دواؤں کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کچھ اس طرح باہر نکلا جیسے خوب تیار ہو کر بے داغ و بے شکن لباس زیب تن کر کے کسی تقریب میں شرکت کرنے جا رہا ہو۔ ابھی اس نے دواؤں سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ کسی طرف سے کوئی چل اور دوپٹ سے واپس کرے میں انکار۔ وہ چپکرا تھا اور وہیں ساکت ہو گیا تھا۔ میرے دل کو شدید دھچکا لگا۔

”اُنا! کتہہ؟“ چچا اور مزید کسی فائرنگ فوریہ کی پروا کے بغیر

کیٹرین نے کمال حاضر رہائی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے اور کچھ میں ملتا تھا تو اس نے سیو بک کی کھوپڑی ہی اٹھا کر حمان کے منہ پر پٹختی مادی تھی اور اس وقت اس نے واقعی توپ کے گولے سے زیادہ اہم کام کیا تھا۔

میرا ہاتھ گن تک پہنچای تھا کہ حمان نے اچانک کھڑکی سے باہر چلا نکل گیا۔ نہ جانے کیوں اس نے کمرے میں مزید رہنے اور اپنی حیرت انگیز پھرتی سے مزید کوئی کام لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ باہر کی صورت حال اس کے حق میں نہیں تھی جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

کھڑکی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن وہ گویا کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا اس سے نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے باہر ایک بار پھر کسی گن کی ترزاواٹ اُبھری اور میں سمجھا شاید اس کا کام تمام ہو گیا۔ کچھ دیر گولیوں کی ترزاواٹ کو بجتی رہی پھر سکوت چھا گیا۔

میرا ہاتھ حمان کی چھوڑی ہوئی گن پر تھا لیکن میں اپنی جگہ راکت ہو کر رہ گیا تھا۔ کھڑکی اور دروازے سے کئی توار اور گولیاں اندر آئیں اور اوپر اوپر دروازوں میں پوسٹ ہو گئیں۔ کچھ گولیاں باہر کی طرف سے بھی چوڑی دروازوں سے ٹکرانی گئیں جن کی وجہ سے کئی بار دوپٹیں پٹی ہوئی سی محسوس ہوئی تھیں لیکن یہ دوپٹیں بیٹھا کافی لمبی تھیں اس لیے گولیاں ان کے پار نہیں ہوئی تھیں لیکن کھڑکی اور دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے فی الحال کھڑے ہونے اور سک نہیں لیا جاسکتا تھا۔ کیٹرین اور چارلس بھی زمین سے چمک کر رہ گئے تھے۔

کمرے میں اب ایک کے بجائے دو سریرہ لائیں پڑی تھیں۔ حمان کے ساتھی کا خون تو چوڑی فرش پر کافی دور تک پھیل گیا تھا۔ میں نے جب حمان پر تکیہ سے وار کیا تھا تو حمان کے بجائے اس کے ساتھی کا سر قلم ہو گیا تھا تو اس وقت تکیہ اور دروازے میں کئی گز کر رہی تھی۔ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کو ٹالنے کی صلت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ اب بھی دروازے ہی میں پھنسی دھیرے دھیرے ٹھہر رہی تھی۔

کئی لمحے کے سکوت کے بعد کیٹرین مجھے مجھے سے لمبے میں بولی ”ابا! ہم زندگی بھر بھائی بھائی کی طرح زمین سے چنے لیے“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ہمیں جان بچ جانے کی خوشی میں دانس کرتے ہوئے باہر نکل جانا چاہیے؟“ میں نے لامنت سے پوچھا۔

اس نے خوف ناک سی نظروں سے مجھے گھورا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اور لباس بالکل جگہ سے ملٹی میں لٹھیرا ہوا تھا۔ حالت میری بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی لیکن اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے بھی آنکھ

ی کہا۔ اس بار کسی گولی نے اس کا استقبال نہیں کیا۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میگا فون پر وہی آواز ابھری "ہائی لوگ بھی براؤ کرہ کہیں سے باہر آجائیں۔"

میں نے آؤدی وہیں دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی کہ کہیں میرے ہاتھ میں گن دیکھ کر کسی کو غلط فہمی نہ ہو جائے معلوم نہیں وہ لوگ مجھے پہچانتے بھی تھے یا نہیں؟ میں اور کیتھرن بھی عطا انداز میں کہیں سے باہر آگئے کہیں رخ زمین سے تین چار فٹ کی بلندی پر تھا۔ تین چار بیڑیاں مختصر سے چلتے قارم کے آگے موجود تھیں۔ دائیں ہاتھ پر ایک کواں فطر آہا تھا جس پر بانی کچنے کے لیے چڑھی بھی موجود تھی۔

صرف اس کہیں کے ارد گرد کچھ دور تک زمین صاف تھی۔ اس سے آگے چاروں طرف گھا جھل تھا۔ کھلی جگہ میں مجھے کہیں کوئی لاش پڑی نظر نہ آئی۔ جنگل اتنا گھٹا تھا کہ کچھ دور سے کسی کی نقل و حرکت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ جراثیم پیشہ افراد کے لیے واقعی بڑی عمدہ پناہ گاہ تھی۔

کچھ دیر بعد جنگل کے مختلف حصوں سے کچھ لوگ برآمد ہوئے۔ کچھ لوگ کہیں کے عقب سے بھی آئے تھے ان میں سے صرف تین سفید قلم تھے۔ باقی ترکہ ی معلوم ہوتے تھے کہ کوکہ ان کی رنگت بھی سفید قلموں سے کچھ کم سرخ و سفید نہیں تھی۔ وہ مختلف قسم کی فطر ٹانگ آؤٹوگ تھیں اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک کے کندھے پر سب مشین گن بھی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کا مشکل نہیں تھا کہ وہ خاص تربیت یافتہ لوگ تھے اور انہوں نے کمانڈو ایکشن کے ذریعے حمان کے ساقیوں کو ہلاک کیا تھا۔

حمان کے ساتھی خود بھی یقیناً کمانڈو ہی تھے لیکن وہ شاید اس خوش فہمی میں مارے گئے تھے کہ کوئی انہیں یہاں آکر نہیں گھیر سکتا تھا۔

چاروں طرف سے جنگل سے برآمد ہونے والے لوگ ہمارے قریب آگئے مضبوط جسم کا ایک دروازہ "اؤٹو عر سفید قلم خاص ان کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس کی کمرے ایک میگا فون بھی بندھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہم نے یقیناً اسی کی آواز سنی تھی۔ قریب آئے پر اس کی تصدیق بھی ہوئی۔ چارلس نے صرف اسی سے میرا مختصر تعارف کرایا "تیرے بیوروٹس ہیں" اس کے علاوہ اس نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

"خدا کا شکر ہے ہم آپ کو زندہ ان لوگوں کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔" بیوروٹس سرور پہلے میں ہوا۔ ان کے بالوں میں دو تین پتے انکے نظر آ رہے تھے۔

"اس میں تمہارا کچھ ایسا کمال نہیں ہے۔" چارلس بولا "دو شکر ہے کسی طرح کیتھرن کا ایک ہاتھ رسیوں سے آزاد ہو گیا اور اس کی وجہ سے ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں مکمل گھسے ہوئے نہ رہ گئے۔"

اس پر جاگری اور اس کے سینے پر سر دھک کر دوڑنے لگی۔ میں ٹھنوں کے بل اس کی طرف بڑھا اور دوسرے ہی لمحے گری سانس لے کر رہ گیا۔ چارلس تو نہایت تیزی سے پھٹکیں جھپک رہا تھا۔

میں نے اس کا سر تاپا جائزہ لیا "کہیں کوئی ذہنی یا خون و غیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن کیتھرن صحیح طور پر اس کی طرف دھکے پھیرے اس کے سینے پر سر دھکے جاری تھی۔ میں نے اس کا کندھا چاڑھ کر ہلاتے ہوئے کہا "آہ وزاری کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاپا صحیح سلامت ہیں۔"

اس نے چوک کر سیدھا ہوتے ہوئے آنکھیں پونچھ کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ کیتھرن روٹا دھوتا بھول کر اس کا کندھا چلاتے ہوئے بولی "کیا ہوا پاپا؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"میری ٹانگ موجود ہے؟" چارلس کراہ کر بولا۔  
"ہاں" موجود ہے کہیں؟ "کیتھرن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی ٹانگ کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ چارلس نے خود بھی اپنی ٹانگ پر ہاتھ پھیر کر گھڑا اس کی موجودگی کی تصدیق کی اور طویل سانس لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے کمرے میں گرتے ہی باہر دوبارہ قازنگ شروع ہو گئی تھی اور ابھی جاری تھی۔

چارلس صدمت خواندہ سے لمبے میں بولا "میرا خیال ہے گولی میری ٹانگ کو چھوئی ہوئی گزری تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے چہرے پر لگی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ میرے خدا! پاپا! آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔" کیتھرن قدرے بگڑ کر بولی۔ اس کے رشتہ داروں پر لگی ہوئی مٹی کے درمیان آنسوؤں کی ٹکیریں نظر آ رہی تھیں۔

چارلس اطمینان سے بولا "جان بھٹکے کی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تم میرے لیے رو بھی سکتی ہو۔"

"یہ بات آپ مجھ سے دیے بھی پوچھ سکتے تھے۔ مجھے اتنا بڑا جھٹکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟" کیتھرن ٹھٹکی سے بولی۔

"میں تمہیں کوئی جھٹکا وغیرہ ہرگز نہیں دے رہا تھا۔" چارلس کراہ کر بولا "جھٹکا تو مجھے خود لگا تھا۔ مجھے واقعی یوں لگا تھا جیسے گولی میرے چہرے میں پوسٹ ہو گئی ہے۔ میں نے باقاعدہ اس کی تکلیف محسوس کی تھی۔"

ایک بار پھر میگا فون پر وہی آواز ابھری "مسٹر چارلس! کہیں کے قریب ایک شخص چھپا ہوا تھا۔ وہ بھی مارا جا چکا ہے۔ آپ کہیں سے باہر آجائیں اگر ہمیں اندازہ ہو سکے اندر کیا صورت حال ہے۔"

چارلس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور سر سلاتا ہوا ہواں اٹھ کر بار بار چل رہا جیسے کوئی زبردستی اسے کنوئیں میں دھکا دینے کے لیے پھینکے لیے جا رہا ہو۔ دروازے سے باہر قدم رکھتے

ہے مجھے معلوم نہیں وہ کون تھا۔ وہ میرے ہارنگ پر تھا لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں وقت پر میری سرنگ کا کلب خالی ہو گیا۔ مجھے کندھے سے دوسری لوڈنگ من اتار کر سیدھی گزے میں مشکل سے دو تین سیکنڈ لگے ہوں گے لیکن اس دوران وہ غائب ہو چکا تھا تاہم وہ چھ تک بھگتی میں اندر کی طرف بھاگا تھا اور خالی ہاتھ تھا اس لیے میرا خیال تھا کہ ہمارے کسی نہ کسی دوسرے ساتھی کے ہاتھوں ضرور مارا جائے گا۔

میرے دل میں نہ جانے کیوں اس انکشاف سے غلطی ہی پیش آئی کہ حمان جان بھاگ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن چارلس کو اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی پرست خوش تھا کہ ہم تینوں کی جان بچ گئی تھی، حمان کے تمام ساتھی ہمارے گئے تھے اور اسے نہ جانے کیسے کیسے عوام کا اٹھارہ گروے کرنے اچانک ڈوم ہارکھا گناہا تھا۔

میرجولسن بولا "اگر ان میں سے حمان بھاگنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو ہمیں اب بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ بے پروائی سے اِدھر اُدھر نہیں پھرتا چاہیے۔" وہ چونکا سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اپنے ساتھیوں کی نسبت وہ غلط آدمی معلوم ہوا تھا۔

چارلس بولا "اب تم ہوشیار رہو یا غافل لیکن ہمیں واپس بھجوانے کا بندوبست کرو۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ابھی میرا انان کے ساتھ یہیں موجود رہوں گا۔" اس نے ٹرکس آدمی کے کانڈروڈ میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو صورت ہی سے نہایت جنگجو معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نے بتایا "اپنی لوگ واپس چلے جائیں گے۔ ہم ان لاشوں کے بارے میں کچھ تحقیق کریں گے۔ اچھی طرح ان کا معائنہ کریں گے۔ حمان اگر زندہ بچ گیا ہے تو یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اس کا حلقہ جاری رہنا چاہیے۔ ابھی لڑی وانا کا مزید تین دن یہاں قیام رہے گا۔ وہ اس دوران کوئی اور کوشش نہ کر ڈالے۔ اس کے پاس دساکلی اور ساتھی موجود ہیں اور ہماری معلومات اس کے بارے میں بالکل ہیں۔"

اس نے اپنے ایک سفید فام ساتھی کو ہمارے بارے میں ہدایت دیں اور ہم اس کی رہنمائی میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ بیشتر افراد ہمارے ساتھ ہی چل دیے تھے۔ سفید فام شخص درحقیقت ایک ترک کانڈروڈی مدد سے ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ ہمیں جنگل میں کافی فاصلہ طے کرنا پڑا۔ جوں جوں ہم چلتے گئے درختوں کا سلسلہ چھوڑا ہو گیا اور نہ جہاں سے ہم چلے تھے وہاں تو سونچ کی روشنی بھی زمین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ترک کانڈروڈ جانے کے نشانہوں کے سارے آگے بڑھ رہا تھا۔

خامسے طویل سفر کے بعد بلاآخر ہم جنگل کے اس حصے میں آچکے جہاں درخت اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے درمیان سے چھوٹی موٹی گاڑیاں لڑاتی ہوئی گزر سکتی تھیں۔ یہاں دو بندہ بھیجے

کے لیے دو بارہ بھاگا بھاگا کیمپن میں آیا تھا۔ "پھر چارلس نے مختصر انہیں بتایا کہ ہم پر کیا گزری تھی۔ آخر میں وہ بولا "میرجولسن اپنا ہمارے آگے سے ہی چلا۔ ورنہ ہمارا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔"

"ہمیں بتادی کے لیے بہت کم وقت ملا۔ پھر بھی میرا خیال ہے ہماری کارکردگی مناسب ہی رہی۔" میرجولسن نے کہا پھر وہ اپنے ترک ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ٹرکس آدمی کے ان کانڈروڈ نے بھی بڑے اچھے طریقے سے ہمارا ساتھ دیا۔ درحقیقت یہی لوگ اس جنگل سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے قانون کے بغیر یہ آپریشن اتنے کم وقت میں اتنی کامیابی سے تکمیل تک پہنچا بہت مشکل تھا۔ قابل دو بات یہ ہے کہ ہمارے کسی آدمی کو ایک گولی بھی نہیں لگی۔"

مزید کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑے ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہے۔ میں اور کیمپن اس دوران بالکل خاموش رہے۔ بلاآخر چارلس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ سوال کر دی ڈالا جو کچھ دیر سے میری زبان پر چل رہا تھا "کیس کوئی لاش نظر نہیں آ رہی۔" "لاشیں جنگل میں ہیں اور ہمیں اندازہ ہے کہاں کہاں بکھری ہوئی ہیں۔" میرجولسن بولا "ہم ابھی ان کا جائزہ لیتے ہیں۔"

ہم ان کی رہنمائی میں جنگل میں بہت دور تک پہلے۔ ہمیں نصف مقامات پر کل پانچ لاشیں ملیں۔ ان میں دو افراد وہ بھی تھے جو ہمیں سفر کے گھر سے لے کر آئے تھے۔ کل تین افراد قبائلی لباس میں تھے جو انہوں نے تھینا سیوہک کے ساتھیوں کے جسموں سے اتارے تھے۔ باقی دو افراد جینز جیکٹوں میں تھے۔ ایک کیمپن میں میرے ہاتھوں تلواریں اُڑا دیا تھا۔

حمان کا ایک ساتھی تو عجیب سی انداز میں درخت میں اُٹا اُٹا ہوا تھا۔ اس کے پاس شاخوں میں کیسے کیسے پھنس گئے تھے۔ اس کی گن ابھی تک اس کے ہاتھوں میں ہی پھنسی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شخص اُٹا لنگ کر کسی کانڈروڈ کے رہا تھا لیکن اس کے سر کے مین بچے ڈانڈے میں پھیلا ہوا بہت سا خون کچھ اور کہانی سنار تھا۔ خون ابھی تک اس کے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ یہ خاصا جھرت انگیزہ سا منظر تھا۔

یہ تو ابھی صرف حمان کے ساتھیوں کی لاشیں تھیں۔ ان لوگوں نے سیوہک کے کم از کم تین ساتھیوں کو لٹکانے لگایا تھا۔ اس کا مطلب تھا جنگل میں کیسے اور ان کی لاشیں بھی موجود تھیں۔ کرائے کے ان قاتلوں سیوہک اور حمان نے خواہ خواہ ہی اتنے لوگوں کو مصیبت میں ڈالا تھا اور اتنی خون ریزی کرانی تھی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ہی نہیں خود کو بھی ہلاکت میں ڈالا تھا۔ لاشوں کو کسی نے نہیں چھیڑا۔ جب وہ لوگ اپنی بدولت عمل کچھ تو میں نے کہا "ان میں حمان کی لاش نہیں ہے۔"

ٹرکس آدمی کا ایک کانڈروڈ اکٹھی اکٹھی سی انگریزی میں بولا "مجھے کچھ شبہ تو ہے کہ ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہوا

میں پاکستانی دواہی چلے جاؤ اور کیتھرن تم اپنے پہلے پروگرام کے مطابق یورپ روانہ ہو جاؤ۔

"میں تو خود فوری طور پر پاکستان جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "میں تو خواہ مخواہ یہاں عجیب و غریب حالات میں الجھا جاتا ہوں۔"

کیتھرن باپ سے مخاطب ہوئی "پہلے تو میرے مقاصد کچھ اور تھے۔ اب میری ترجیحات بدل چکی ہیں اور آپ بھی ساتھ نہیں ہوں گے کیونکہ میں بھی اپنی کے ساتھ پاکستان چلی جاؤں گی۔"

وہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے اپنے باپ سے پوچھ رہی تھی کہ صرف وہی اسے میرے ساتھ جانے یا نہ جانے... کی اجازت دے سکتا تھا۔ اس میں میری اپنی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ پاکستان جائے۔ اس سے میرے لیے بہت سی دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر چارلس نے اسے پاکستان جانے کی اجازت دے دی تو میں منع کر دوں گا۔

اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب چارلس نے ایک لڑکے کے بعد کہہ دیا "نہیں" نہیں ہندوستان پاکستان جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں اگر اپنے مزید کچھ کام نمٹانے ہیں تو فرانس یا اٹلی کی طرف نکل جاؤ ورنہ دواہی لندن ہی چلی جاؤ اور اپنے باپ کے گھر کی طرف بھی تھوڑی سی توجہ دو جو تمہارے جانے کے بعد سے بالکل ہی اُپر کر رہا گیا ہے۔"

کیتھرن کا منہ ٹپک گیا لیکن وہ گویا خود پر جبر کرتے ہوئے بول "آپ کہتے ہیں تو چلی جاتی ہوں۔ مجھے اس وقت ذرا آپ کی فرمائشوں اور سعادت مند بنی بنے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے آپ کی بات ماننے پرے کی گورنہ میں ضرور پاکستان جاتی۔ بہر حال میں کبھی نہ کبھی جاؤں گی ضرور۔"

"ضرور جانا لیکن کسی مقبول وجہ کے تحت جانا۔ زندگی کو بچے بچے مفید اور دھڑکھڑکے پھر کر ضائع مت کرو۔" چارلس ہنسا ہوا انداز میں بولا "میرا اس وقت اطمینان کی گہری سانس لینے کوئی رہا تھا لیکن میں کیتھرن کو احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ فی الحالہ اس سے جان چھوٹے پر مجھے خوش ہوئی تھی۔ کسی کی اس حد تک بھی دل شکنی اچھی نہیں تھی۔"

"میں آج سینٹر رمضان کو گراچی فون کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرف سے گرین سٹریٹ می میں گراچی روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ میری جلد از حد اس سے بات کرادیں۔" میں نے چارلس سے درخواست کی۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔" چارلس دھیمے لہجے میں بولا "مگر آج گرین سٹریٹ کے خصوصی ٹیلی فون پر ابھی تمہاری سیٹھ رمضان بات کر رہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد جب نے ہمیں برطانوی سفیر کے چٹلے کے سامنے

درختوں کے درمیان آؤی ترجمی کھڑی تھیں۔ میں نے دھڑکھڑکے ہوئے کہا "اسی ہی کسی جگہ دوپک اپ بھی کھڑی تھی جس میں دو لوگ ہمیں لے کر آئے تھے۔"

سفیر قائم کا بندوبست پروائی سے بولا "وہ جگہ دیکھی جا چکی ہے" ایک آپ قبضے میں لی جا چکی ہے۔ ہمارے دو ساتھی وہاں بھی تعینات تھے۔ جنگل میں ہمیں اور بھی کسی کام کی چیزیں ملی ہیں بہت سا کام یہاں پولیس کو کرنا ہوگا۔"

ہم تینوں جس جیب میں بیٹھے اس کی ڈرائیونگ سیٹ ایک ترک نے سنبھال لی جبکہ دوسری گاڑی کو ڈرائیونگ کرنے کے لیے ایک سفید قائم بیٹھا اور ہم تیز رفتاری سے دواہی روانہ ہو گئے۔ اُلی بوسے وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

راستے میں چارلس میری طرف جھکتے ہوئے بولا "سیو بک کا مرنہ ہمارے حق میں بہت بُرا ثابت ہو گا۔" اس کے چہرے پر تحکرات کے سائے تھے۔

اس کا بار بار وہ مجھے بھی تھا لیکن میں نے وضاحت کی خاطر پوچھا "وہ کیوں؟"

"وہ اگر کا پٹھا اپنے قبیلے کے دو تین بزرگوں کو لے کر "ہاضابلہ" طور پر کیتھرن کا رشتہ لینے آ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس کے قبیلے کے خاص خاص لوگوں کو ظلم ہو گا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ اب اگر اس کی موت کی خبر سانسے آتی ہے تو اس کے قبیلے والے فوراً یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ اسے ہم نے مروا دیا ہے۔ اگر اس کی لاش غائب نہ کی گئی تہ تب بھی وہ یہی نتیجہ اخذ کریں گے۔" وہ شکرانہ سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

"تو چہرہ؟" کیتھرن نے باپ کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ "وہ ایک ہنگامہ برپا کر دیں گے۔ سوائے دماغ کے لوگ ہیں۔ کوئی بچہ نہیں کہ وہ ہمارے سفیر کی رہائش یا ہمارے سفارت خانے پر دھاوا بول دیں۔" بیٹھوئی موٹی جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اگر ترک حکومت نے سختی کی اور پتہ نہ ہوئی بھی مارے گئے تو شور مچا ہو جائے گا کہ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہی مغربی ملکوں کے اخباری اور ریوی اور رپورٹر کمرے انٹانٹھا کر بھاگے چلے آئیں گے اور دنیا کو بتائیں گے کہ کس طرح "مسموم" دے کر "قباکیوں کو پکلا جا رہا ہے۔" مجھے صورت حال بہت سی پیچیدہ ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔ میرے خیال میں اس کے اندر بیٹے بنیاد میں تھے۔

"میں آج رات اپنے سفیر، میجر دلسن اور ترک حکام کے ساتھ ایک میٹنگ رکھوں گا۔ اس میں فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" چارلس سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے تم دونوں کو اس سے پہلے ہی میں سفر میں طے جانا چاہیے۔" اس نے میری اور کیتھرن کی طرف دیکھا "یہاں صرف میں موجود رہوں گا۔ ضروری نظر آیا تو میں بھی کھٹک جاؤں گا۔ افضل! تم تو میرے خیال

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہارٹس کو سیڑھ پر مضامین کے ماضی اور حال کے چکروں کا کس حد تک علم تھا۔ میں نے گول مول سی بات کی“ وہ میری ہی وجہ سے اس کا اصرار کر رہا ہے۔“

آخرون کی محنت تھی۔ رہبر میں نے ہی اٹھایا۔ دوسری طرف میڈر رمضان ہی تھا۔ وہ پہلے کی نسبت ذرا پُر سکون لہجے میں بولا "پڑنے پڑانے غیروں کے بارے میں مجھے اطمینان نہیں ہے۔ مجھے صحیح طور پر معلوم تو نہیں ہے کہ وہ ٹیلی فون ٹیپ ہوتے ہیں یا نہیں لیکن کچھ عرصے میں میرے کئی راز لیک آؤٹ ہوئے ہیں۔ اور تھمارا معاملہ تو بہت ہی نازک معلوم ہوا ہے۔ اس لیے میں زیادہ احتیاط کر رہا ہوں۔"

”یہ نمبر محفوظ ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، یہ غیر فوٹ کرلو اور آئندہ جب بھی بات کرنی ہو صرف اس نمبر پر کرنا۔ یہ ایک عجیب و غریب نمبر ہے جس میں چھپس اس پر فوری طور پر نہیں ملوں گا۔ اس پر پیغام چھوڑ کر پانچ دس منٹ بعد چھپس روزانہ فون کرنا ہو گا۔“

اس نے غمیر بتایا پھر بے تابی سے بولا ”اچھا“ یہ ”ضروری  
 ہو اس“ تو ہو گئی۔ تم اپنا حال احوال سناؤ۔ خیریت سے پہنچ گئے؟  
 اب کہاں ہو، کس حال میں ہو؟“

”میری داستانِ غریب محض کا کافی لمبی ہے۔ اس کا خلاصہ بھی فون پر سنا مشکل ہے۔ فی الحال میں نے صرف یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ میں نے ایک کام تمہارے سر پر کیا تھا۔ تمہیں میرے کچھ ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا تھی۔ یہ بتاؤ اس میں کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، تمہارے ایک ساتھی سے رابطہ ہوا ہے“ وہ کچھ ہنچکا ہٹ آمیز لہجے میں بولا ”اس کا نام لیلمان ہے۔ وہ لاہور سے آیا ہوا ہے اور تمہاری تلاش میں ہے۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ میرا مطلب ہے اس کی اصل شکل میں بھی نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے پہچان لیا۔ اتفاقاً ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کسی قلمی کیرکڑ کی طرح حلیہ پرلے تمہارے ہی ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا اور ایسے جاسوسی اسٹائل سے بڑے خفیہ طریقے سے مجھ سے ملا کہ میری دوش فافا ہو گئی تھی۔ میں سمجھا تھا ذرہ ذرہ دیون مجھے کچھ بتائی گی۔ لیکن اس کا بچت سمجھ کر اغوا کرنے آیا ہے۔ اس میں صرف ایک کی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ ذرہ ذرہ دیون معلوم نہیں ہو رہا تھا۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”فضول باتیں کم کرو اور کام کی بات کرو۔“ میں نے بے تابی سے کہا ”مقصود یہ کہ تمہارا اس سے رابطہ ہو گیا؟“

”ہاں، تم نے جو فون نمبر دیئے تھے اور رابطے کے جو طریقے بتائے تھے ان میں سے کوئی کام نہیں آسکا بس یلیان سے اتفاقاً رابطہ ہو گیا۔“

اتار دیا۔ چارلس نے ایک ٹرکس آفسر سے کچھ دیر الگ کھڑے ہو کر باتیں کیں۔ شاید وہ آئندہ کو کوئی پروگرام طے کر رہے تھے۔ پھر دونوں گاڑیاں واپس روانہ ہو گئیں اور ہم اندر آ گئے۔

چارلس ہولہ "تم شاد رہے کر لباس تبدیل کر لو اور کچھ انسانی  
 طے میں آ جاؤ۔ میں بھی تب تک اپنی حالت درست کر کے کچھ  
 ضروری ملٹی فون کرتا ہوں پھر سینہ و مضام سے تمہاری بات کرتا  
 ہوں۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا لیکن سیدہ رمضان سے بات ہونے کی نوبت رات کے کھانے کے کافی دیر بعد ہی آئی تھی۔ اس دوران میں میری صاحبہ بھی گھر آگئی تھیں اور چارلس اس کے ساتھ اسٹڈی میں بیٹھ کر کتبہ دیر تک کچھ بات چیت کرنا تھا۔ اس دوران میں گھر کے ٹیلی فون بھی کافی مصروف رہے۔ پھر میری دواہ کہیں روانہ ہو گیا۔ گھر میں کچھ بچہ پڑھ رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ سیرنگ کے فیملی کے ردعمل کے سلسلے میں خاصے پریشان تھے۔

آخر کار چارلس نے مجھے اسٹڈی میں بلا بھیجا۔ وہاں تین رنگ کے ٹیلی فون رکھے تھے۔ سرخ، سبز اور نیلا۔ چارلس نے سبز فون پر بروڈ راست سینٹر رمضان کا نمبر لایا اور رمیور مجھے تھمادیا۔ اس نے خود سیٹھ رمضان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

”کون ہے یہ؟“ دو سری طرف سے سینئر رمضان قدرے بے ڈارمی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے لمبے می خفیف سی بے ڈارمی اکثر ہی بالی جاتی تھی اور یہ مصنوعی ہوتی تھی۔  
”یہ وہ افسر؟“ میں نے پوچھ کر کہا۔

”افضل! تم کہاں ہو؟“ اس نے خوراحیری سے پوچھا۔ اس کے لیے یہ بے وزنی یکدم غائب ہوئی اور میں نے چشمِ قصور سے دیکھا وہ گونا گونا گویا کر بیٹھ رہا تھا۔

”میں وہیں ہوں جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا۔“ میں نے آہ بھر کر کہا۔

”تم اپنا نمبر مجھے دو۔ کچھ دیر تک میں خود حمیس فون کرتا ہوں۔ میں اس نمبر پر بات نہیں کر سکتا۔“ سینہ زلفشان قدرے مضطربانہ آواز میں بولا۔

میں نے قبر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ٹیل فون سیٹ  
کھڑا قبر نہیں تھا۔ میں نے چارلس سے قبر پوچھا اور یہ بھی پوچھا  
کہ سیٹھ رمضان کو یہ قبر دینا مناسب تھا یا نہیں؟ اس نے سر  
الٹا سے اجازت دے دی اور قبر بتاوا۔ قبر لیتے ہی سیٹھ  
رمضان نے فون بند کر دیا اور ہم وہیں بیٹھ کر اس کی کال کا انتظا  
کرتے تھے۔

سینہ رمضان کو اس نمبر پر کال ملوانے میں کچھ دیر لگ گئی  
اس دوران چار نمبر ۱۲۳ سے گمان بھی نہیں ہو گا کہ اس وقت  
میں کچھ ترس رہا تھا۔

سینہ رمضان کو اس نمبر پر کال ملوانے میں کچھ دیر لگ گئی  
اس دوران چار نمبر ۱۲۳ سے گمان بھی نہیں ہو گا کہ اس وقت  
میں کچھ ترس رہا تھا۔

سینہ رمضان کو اس نمبر پر کال ملوانے میں کچھ دیر لگ گئی  
اس دوران چار نمبر ۱۲۳ سے گمان بھی نہیں ہو گا کہ اس وقت  
میں کچھ ترس رہا تھا۔

وہ زیادہ جیسیم نہیں تھا اور وہی بھی اس کے جسم پر فٹ نہیں تھی۔ کچھ ڈبیلی ڈھالی لگ رہی تھی لیکن حرکات و سکنات سے بہر حال اشارت لگ رہا تھا۔ اس کے سر پر ہیٹ بھی تھا جسے اس نے اتارنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا تاریک چشمہ اس کے چہرے کی مناسبت سے کچھ بڑا لگ رہا تھا۔ ہم اس کی آنکھیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن میرا اندازہ تھا کہ شاید ان آنکھوں میں خاصی رعوت پائی جاتی تھی۔ کم از کم اس کی چال تو یہی بتا رہی تھی۔

ڈرائیور گاڑی سے نہیں اترتا تھا تاہم اس نے ایئر کنڈیشنر آن ہونے کے باوجود کھڑکی کا شیشہ نیچے کر لیا تھا۔ ٹریفک سارجنٹ نے کھڑکی پر جھنجھٹے ہوئے ترکی میں حتی الامکان بارعب لہجے میں کچھ کہا۔ مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے گاڑی سے نیچے اترنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کا انداز بعض پاکستانی ٹریفک سارجنٹوں کا سا تھا۔ میں نے سوچا آخر ترکی ہمارا براہ راستی ملک ہے۔ شاید کچھ براہیم برادرانہ طور پر ادھر چلے گئے ہوں۔

ہمارا ڈرائیور بھی غالباً کوئی عام ڈرائیور نہیں تھا۔ اس نے ٹریفک سارجنٹ کے حکم پر عمل درآمد کے بجائے جھلا کر تیزی سے ترکی میں کچھ کہا۔ اس نے غالباً یہی جانا چاہا تھا کہ آخر سارجنٹ کیا چاہتا تھا۔ جہاں سارجنٹ نے بھی تیزی سے کچھ کہا۔ اس نے چونکہ اپنے ہیٹ کا اسٹریپ بھی نہیں کھولا تھا اور اس کی ٹھوڑی پر پلاسٹک کی فوٹی سے چڑھی ہوئی تھی اس لیے اس کی اس آواز کچھ اس طرح نکل رہی تھی جیسے دانت بچھ کر بول رہا ہو۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈرائیور سے کاغذات طلب کر رہا تھا اور ڈرائیور جانا چاہ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی کیا غلطی کی تھی جو سارجنٹ اس کے تعاقب میں چلا آیا تھا؟

جواب میں سارجنٹ نے پہلے سے فزادہ سخت اور اہانت آمیز لہجے میں کچھ کہا۔ شاید اس نے کسی معمولی بات کو فزادی اٹا کا مسئلہ بنالیا تھا جیسا کہ اس قسم کی صورت حال میں عموماً ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا چارلس کے چہرے پر سرخئی نمودار ہو چکی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سرخئی بڑھ چکی تھی کیونکہ اس کی رعیت دینے بھی سرخ ہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر اتر گیا اور برہمی سے بولا "کیا بات ہے؟ تم کیوں ہمارے ڈرائیور کو پریشان کر رہے ہو؟"

حالانکہ وہ ترکی سمجھتا تھا اور دوانی سے بول بھی سکتا تھا لیکن شاید جان بوجھ کر انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اپنے آپ کو معاملے سے ناظم بھی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا انداز ایک بارعب محض کا تھا لیکن ٹریفک سارجنٹ اس کے رعب میں آئے بغیر پہلے سے فزادہ غصے سے بولا "تمہارے ڈرائیور نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ہے اور میرے ساتھ بد تیزی بھی کی ہے۔ تم لوگوں کو پولیس اسٹیشن چٹا بنائے گا۔" اب وہ بھی انگریزی میں بات

"تاہم میں کبھی پاکستان ضرور آؤں گی۔"

"میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا۔" میں نے کہا اور وہ واپس اور جانے کے لیے سرگئی۔ میں اور چارلس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عام لباس میں ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی کوئی دوسری تھی۔ وہ سیاہ مرسیدز نہیں تھی جس میں ہم زیادہ تر سفر کرتے رہے تھے۔

چند لمبے بعد گاڑی سڑک پر فرمائے بحر رہی تھی۔ اس دوران پوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ چارلس گویا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر وہ اچانک میری طرف مڑتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میری بیٹی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا "تمہیں بہت دیر میں خیال آیا" اس کے بجائے میں نے کہا "یہ اس کا حسنِ نظر ہے ورنہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس جیسی لڑکی مجھے پسند کرے۔"

میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ میری وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو، کسی کی عزت نقصان نہ ہو۔ اچھا ہوا کہ چارلس نے اس موضوع پر مزید کچھ نہیں کہا۔ میری نظر عقب نما آئینے پر تھی پھر میں نے ڈرائیور کو دیکھا۔ ہمارے پیچھے کافی ٹریفک تھا لیکن میں نے چارلس سے کہا "ایک سفید گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

وہ اپنے خیالات سے چونکا اور گویا محفوظ ہوتے ہوئے بولا "تم اپنے گرد و پیش سے خوب باخبر رہنے والے آؤ ہو۔ بہر حال اس گاڑی کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ نرمنش ایشلی جنس کے لوگ ہیں۔ ہماری حفاظت کے لیے ہمارے ساتھ ہیں۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں نے اس گاڑی کی طرف سے توجہ ہٹائی اور چارلس کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھی اپنی احتیاط پسند کی سے مجبور ہو کر ایک بار پھر پیچھے دیکھا تو ٹریفک پولیس کی ایک موٹر سائیکل تیزی سے پیچھے آئی دیکھائی دی۔

اس سڑک پر ٹریفک کم ہی تھا۔ وہ چار گاڑیاں ہمارے پیچھے تھیں تاہم گتہ بھی تھا کہ وہ ٹریفک سارجنٹ ہمارے ہی پیچھے آ رہا تھا۔ جب اس کے اور ہمارے درمیان کوئی دوسری گاڑی حاصل نہ رہی تو اس نے ہوش بھی نبھایا۔ تب ہمارے ڈرائیور کی سمجھ میں آیا کہ وہ ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

اس نے رفتار کچھ کم کر لی لیکن وہ نہ کرتا تب بھی سارجنٹ اپنی ہماری ہمراہی کے طور پر موٹر سائیکل پر ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے گاڑی سڑک سے اتارنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کے پس میں آٹارلی اور ٹریفک سارجنٹ نے کسی قلمی بیرو کے سے انداز میں موٹر سائیکل لہرا کر گاڑی کے عین سامنے لا دو کی اور فوراً ہی

”تمہارا دماغ صحیح ہے؟“ چارلس نہایت تحمل مزاج شخص دتے ہوئے بھی برہمنی سے تقریباً بیچ اٹھا۔ ”یہ ذرا سیر نہیں سال سے اسٹینڈل کی سڑکوں پر گاڑی چلا رہا ہے“ تم اسے ذرا ٹیڈنگ کے قوانین سمجھانے لگے ہو؟“

”بیس سال یا چالیس سال گاڑی چلانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کبھی ٹریفک قوانین نہیں توڑ سکتا۔“ ٹریفک سارجنٹ فرمایا اور چارلس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ اگر اس کا قذر اور اونچا ہو تو شاید وہ اپنے ہیلمٹ کا چھچھا چارلس کی پیشانی سے ملا دیتا۔

”میں اس کے ساتھ سڑک رہا ہوں۔ میں بھی اسٹینڈل کے ٹریفک قوانین سے واقف ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا اس نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔“ چارلس نے اسے ڈانٹا ”تم خواہ مخواہ میں مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو۔“

”مرعوب تو تم مجھے کر رہے ہو۔ سرکاری کام میں مداخلت کر رہے ہو۔ تمہارے خلاف اس سلسلے میں بھی کارروائی ہوگی۔ تمہیں اب تو ضرور پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔“ پولیس سارجنٹ قلعی غیر متزلزل لہجے میں بولا۔

”تم تو واقعی کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے اس نوکری سے تمہارا دل بھر گیا ہے اور اب اسے لات مار کر تم جیل جانا چاہتے ہو۔“ چارلس کے لہجے میں ہلکی سی خود غامی آگئی ”میں نے پوری دنیا دیکھی ہے۔ ہر ملک میں سڑکیاں ہیں۔ لیکن تم بیسا خرواٹ پولیس والا آج تک نہیں دیکھا۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ میں ایک بہت سی اہم برطانوی ڈیپلیٹ ہوں اور نہایت اہم مشن پر مہل آیا ہوا ہوں۔ میرے ایک اشارے پر تم نہ صرف نوکری سے برخاست ہو سکتے ہو بلکہ جیل بھی جاسکتے ہو۔ اس وقت میں ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں اور مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

سارجنٹ نے استہزاء سے انداز میں ایک گھروڑا سا مقدمہ لگایا ”میں بھی کوئی عام پولیس والا نہیں ہوں۔ میرے عہدے پر نہ جانا۔ میں نے بڑے بڑے دفتریوں سفیروں کو عدالت میں کھینچا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میں جس پر بھی ہاتھ ڈالتا ہوں وہ کوئی اونگھی جی چیز نکلتا ہے۔“

چارلس نے غالباً انتہائی جنس والوں کی تلاش میں پیچھے نظر دوڑائی۔ ان کی گاڑی کا گیس دور دور تک ناموشان نہیں تھا البتہ دوسری آٹا کا کٹاؤں ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں۔ بعض کارٹین ہادی طرف دیکھتے ہوئے گزرے تھے لیکن کوئی ٹرک نہیں تھا جیسا عموماً پاکستان میں ہوتا ہے۔

انتہائی جنس والے اگر وہاں موجود ہوتے تو اب تک انہیں آگے آجاتا چاہے تھا اور چارلس کی حیثیت کی وجہ سے۔ چاہیے تھے لیکن میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ وہ ہمارے عقب میں موجود نہیں تھے۔ ان کی گاڑی اس دوران راستے میں کہیں غائب

ہو چکی تھی جب میری توجہ ان کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔

ان کی گاڑی غائب دیکھ کر چارلس کو قدرے حیرت ضرور ہوئی لیکن اس کی خود اعتمادی اور رعب میں کوئی فرق نہ آیا۔ تاہم اب وہ گویا اس کیل نما سارجنٹ سے جیچا چھڑانے کے لیے کچھ تحمل سے کام لیتے ہوئے ذرا سیر سے غائب ہوا ”سٹران! تم اسے کانڈنات اور اپنا سفارت خانے کا کارڈ دکھا دی دو۔ ہم سے ملنے ہوئی کہ ہم احتیاطاً اس وقت سفارت خانے کی نمبر لیٹ والی گاڑی لے کر نہیں نکلتے۔“

سارجنٹ ٹی میں سر ملاتے ہوئے بولا ”اب کانڈنات دکھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب تو جیس پولیس اسٹیشن چلنا ہی پڑے گا۔ تم نے بد تمیزی کی ہے۔ سرکاری کام میں مداخلت کی ہے اور مجھے اپنی حیثیت سے مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارے خلاف کارروائی ضرور ہوگی۔“

چارلس نے غالباً بڑی مشکل سے اس وقت اپنی نرم مزاجی اور تحمل کو آواز دی تھی لیکن سارجنٹ کی بات سن کر اس کا تحمل ایک بار پھر جواب دے گیا۔ میں نے پہلی بار اس کے منہ سے انگریزی کی ایک ہلکی پھٹکی سی گالی سنی پھر وہ غصے سے بولا ”تم جیسے آفیسر کو دسی سڑک پر کھڑے کھڑے شوٹ کر دیتا چاہیے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سارجنٹ کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ اس نے وہ سون فلموں کے کسی ٹائٹل کی سی تیزی سے اپنے ہوش سے رہا اور نکال لیا اور پھر لہجے میں بولا ”بہت خوب بہت خوب! اب تم ایک آفیسر کا ٹائٹل حملہ بھی کرنے لگے تھے۔ تم اپنے جرائم کی فرست کو لمبا کیے جا رہے ہو۔ پلویٹو گاڑی میں۔“

اس نے اپنے رہاورد کی ٹل چارلس کی پسلیوں پر ٹکادی اور اس کا رہاورد نہایت پھرتی سے اس کی جیب سے نکال لیا۔ میرا خیال ہے ایک لمحے کے لیے تو چارلس بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے یقیناً جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی کہ اچھا بھلا اپنے راستے پر جاتے جاتے یہ کیل کہاں سے آن چکا تھا۔ اب تو وہ اس جھنجھلاہٹ کا اظہار بھی نہیں کر رہا تھا۔

میں نہایت اطمینان سے بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی تھمبارہ وغیرہ نہیں تھا کیونکہ مجھے کچھ دیر بعد جنازہ پر سوار ہونا تھا۔ کوئی گمن وغیرہ لے کر چلے گا کوئی کاغذ نہیں تھا۔ اپنی پورٹ پر پینکٹ کے دوران وہ میرے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔

سارجنٹ نے رہاورد کی نوک سے چارلس کو گاڑی کی طرف دھکیلا۔ چارلس کا چہرہ کچھ دبا ہوا سی سرخ ہو گیا۔ شاید کسی ایسی ملک میں بھی اس کی پانٹی بے عزتی بھی نہیں ہوتی تھی لیکن اس نے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہاتھ پاؤں چلانے والا آدمی بھی نہیں تھا۔ جو کچھ کرنا تھا ممکن کے ذریعے کر رہا تھا اور اس



کھول دیا۔ چارلس نے اس وقت ٹارانتی میں دی کیا جو میں چاہ رہا تھا۔ یعنی وہ پہلے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی غیر ارادی طور پر سارنٹ بھی بیٹھ گیا۔ اسے غالباً اطمینان ہو گیا تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ اس نے ہاتھ اونچا کر کے ریو لوور کی ٹال بدستور میری پٹیلوں پر ٹکا رکھی تھی۔

میں ٹھکت خود سے انداز میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ ہم دونوں کے درمیان آیا تھا۔ شاید اس نے بھی اس طرح بیٹھنے کو بہتر سمجھا ہو کیونکہ اس کے اس طرح وہ بیک وقت ہم دونوں کی پٹیلوں پر ریو لوور رکھ سکتا تھا۔

”ڈرائیو ریسید سے ہی چلو۔“ اس نے ڈرائیو کو حکم دیا۔ ڈرائیو نے مرکز چارلس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ گویا اب بھی صرف چارلس ہی کے حکم کی قیید کرنا چاہتا تھا۔ سارنٹ نے اسے ڈانٹا ”اس کی طرف کیا دیکھ رہے ہو سڑا گاڑی چلاؤ۔“

ڈرائیو نے گردن ٹھکا کر شعلہ باز نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن چارلس اب قفل سے ہڑا ڈرائیو راہیہ نطفہ نا حقیقی جس طرح کہہ رہا ہے اسی طرح کہہ۔ اب ہمیں اس کا بغور دیکھ کر کے ہی اپنے کام کے لیے جانا ہو گا۔ اب بد بخت کو نوکری سے برخاست ہونے اور قفل جانے کی اتنی ہی جلدی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

ڈرائیو نے گاڑی آگے بڑھادی۔ سارنٹ نے چارلس کے الفاظ پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ ہمیں لے کر وہاں سے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ ڈرائیو اس کی سوز سائیکل کو بچاتے ہوئے گاڑی سڑک پر لایا۔ سارنٹ نے اپنی سوز سائیکل کو صحیح طرح کھڑی کرنے کی بھی دقت نہیں کی تھی۔

سارنٹ کی رہنمائی میں گاڑی چند منٹ میں ہی ایک ویران سڑک پر آ پہنچی۔ تب چارلس نے بیٹھائی پر ہل ڈالتے ہوئے پوچھا ”یہ تم ہمیں کون سے پولیس اسٹیشن لے جا رہے ہو؟“

”میں تم لوگوں کو ہائی وے پولیس کے ہیڈ کوارٹر لے جا رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس وقت اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے میری طرف سے ہٹ گئی تھی۔ شاید وہ میری طرف سے کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ مجھے وہ موقع اپنے لیے مناسب نظر آیا۔ میرے خیال میں اس کا ڈرائیو خاصا لمبا ہو چکا تھا۔ اب اسے کسی فیصلہ کن موڑ پر لانے کی کوشش کر رہی تھی جیسے چاہیے تھی۔

میں نے بیک وقت اس کی دونوں کلائیوں پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے خوب دیکھ بھال کر پنے تلے انداز میں ہاتھ ڈالا تھا۔ میری گرفت دیکھی ہی رہی تھی میں چاہتا تھا۔ میں نے یکدم اس کے دونوں ہاتھوں میں دبے ہوئے ریو لووروں کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔

وقت گھن اس کے پاس نہیں رہی تھی۔ ہیلٹ اور بڑے سے تاریک جھٹے کی وجہ سے سارنٹ کے چہرے کا بیشتر حصہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جتنا نظر آ رہا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ چارلس نے آرا بھی اس کی مرضی کے خلاف حرکت کی تو وہ اسے شوت کرنے میں دریغ نہیں کرے گا۔ چارلس نے بھی شاید یہ محسوس کر لیا تھا اس لیے قہر نہ رہی کے باوجود اس نے مزاحمت نہیں کی۔ تاہم اس نے مرکز ایک نظر میری طرف منبہ دیکھا۔ شاید اسے حیرت تھی کہ میں اس معاملے میں بالکل بد اخلاقت نہیں کر رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میرا ذہن اس وقت کسی اور زاویے سے اس مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔

چارلس گاڑی میں بیٹھنے لگا تو میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر جڑی سے باہر پھسل گیا۔ دراصل وہ جس طرح بیٹھنے کے تھے اس سے یہ ہوا کہ چارلس میرے اور سارنٹ کے درمیان پھنس جاتا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ سارنٹ میرے اور چارلس کے درمیان آجائے۔

سارنٹ نے اب تک گویا میری طرف توجہ نہیں دی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ میرے گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی اس کے دوسرے ریو لوور کا رخ میری طرف ہو چکا تھا جو اس نے چارلس کی جیب سے نکالا تھا۔ اس کے اپنے ریو لوور کی ٹال بدستور چارلس کی پٹیلوں پر رکھی تھی۔

”تم کہاں چل دیے سڑ؟“ وہ یہ آواز بلند بولا۔ ”اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرا تھماری لاش چری نظر آئے گی۔“

”میں بھاگ تو نہیں رہا۔“ میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے سادگی سے کہا۔ ”میں تو گاڑی سے اتر رہا تھا۔ مجھے آپ براؤ کر م نہیں چھوڑیں۔ میرا اس گاڑی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو صرف ان صاحب کا مسافر ہوں لیکن مجھے ایک کھتے بند فلاٹ پکڑنی ہے۔ اگر میں پولیس کے پکڑ میں پڑ گیا تو مجھے دیر ہو جائے گی۔ میری فلاٹ نکل جائے گی۔“

”فلاٹ کے نیچے چلو گاڑی میں بیٹھو۔ تم کون ہو اور اس گاڑی سے تھمرا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ پولیس اسٹیشن چل کر ہو گا۔“ سارنٹ چیخا ”تم سمجھ رہے ہو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا؟“

”تھماری بڑی مہربانی ہوگی آفسر! مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میں جیسی سے چلا جاؤں گا۔“ میں نے قدرے التجائیہ لہجے میں کہا ”اس کے عوض میں تمہاری مناسب ”خدمت“ بھی کر سکتا ہوں۔“ میں نے جیب کی طرف اشارہ کیا۔

”تم مجھے رشوت کی پیشکش کر رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں کچھ اور برہمی آگئی ”یک اور جرم! چلو بیٹھو گاڑی میں۔“ اس نے دوسرے ریو لوور کی ٹال میری پٹیلوں پر رکھ دی۔

میں نے اپنی صورت پر بے بسی طاری کرنی اور دروازہ کچھ اور

میں نے اس کے بارے میں دو اندازے لگائے تھے اور دونوں  
 بدست لگے۔ میرا ایک اندازہ تو یہ تھا کہ وہ زیادہ طاقتور آدمی  
 نہیں تھا۔ دوسرے وہ اسلحے کے استعمال میں ذرا بھی درخ کرنے  
 والا نہیں تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اس کی کلاں میری گرفت میں  
 آئیں تو میری مرضی کے خلاف بال برابر بھی نہیں ہل سکیں۔ لیکن  
 اس نے فائر کرنے میں ایک ٹائے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ میں چونکہ  
 اس کی کلاں پکڑنے ہی اوپر کرچکا تھا اس لیے دونوں ریو الوورڈ  
 سے نکلنے والی گولیاں گاڑی کی پھٹ میں پوسٹ ہوئیں۔

ڈرائیور بیک وقت دو فائرنگ کی آواز سن کر پچھڑا ہلکا گیا۔  
 اسٹیرنگک دھیل پر اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ہلک گیا اور گاڑی  
 ہلکا کر کے میں آگرمی۔ تاہم اس کی سمارت کام آئی۔ اس نے  
 گاڑی کو اڑتے نہیں دیا اور نہ ہی پورے گاڑی کو دوبارہ پکی سڑک پر  
 چڑھانے میں جلد بازی دکھائی۔

ہم تین سٹ کر ایک طرف کو ہو گئے۔ لیکن سارنٹ کی  
 کلاں یوں پر میری گرفت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے  
 میری گرفت اتنی سخت ہو چکی تھی کہ وہ دوسری حرکت نہ کر سکا۔  
 میں نے اسے اپنے اور چارلس کے درمیان اس طرح دبا دیا  
 تھا کہ وہ مزید کوئی حرکت بھی نہ کر سکا۔

میں نے اس کی کلاں پر اپنے ہاتھوں کے آہنی پھنجوں کا  
 دباؤ اتنا بڑھا دیا کہ اس کے ہاتھوں سے دونوں ریو الوورڈ خود بخود نکل کر  
 فرش پر گر پڑے۔ تب میں اس کے دونوں بازوؤں کو اس کی پشت  
 پر لے آیا۔

”یارے! اب اگر تم نے ذرا بھی اچھل کود کرنے کی کوشش  
 کی تو دونوں بازوؤں کے نکل جائیں گے۔“ میں نے نہایت  
 طاقت سے اسے خبردار کیا۔

چارلس نے دونوں ریو الوورڈ اٹھانے میں بھرتی دکھائی اور نہایت  
 چپک کر بولا ”مسئلہ یہ ہے کہ میں انگریز ہوں اور بڑا خاندانی قسم کا  
 آدمی ہوں۔ قانون کا لحاظ کسی بھی ملک کا ہو میں اسے مارنے کا  
 تصور نہیں کر سکتا۔ ورنہ دل تو تکیہ چاہ رہا ہے کہ اس بد بخت کو  
 دونوں ریو الوورڈ سے شٹ کر دوں۔“

”قانون کا لحاظ!“ میں نے بغیر نہ سکا لیکن میری ہنسی کراہ  
 سے مشابہ تھی ”سٹر چارلس! تم ابھی تک اسے قانون کا لحاظ ہی  
 سمجھ رہے ہو۔ اس جیسے لوگوں کی وجہ سے تو قانون کی حالت کچلی  
 رہتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ چارلس نے جبکہ کر صحیح طور پر اس کا چوہ  
 دیکھنے کی کوشش کی۔

”یہ ہمارا چارلے دوست جمان ہے۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ  
 اتنی جلدی اس سے دوبارہ ملاقات ہو جائے گی اور یہ شامی ہماری  
 بیل میں آئے تھے گا۔“ میں نے جمان کو قابو میں رکھتے ہوئے  
 جواب دیا۔

”جمان!“ چارلس نے اختیار چننا۔ اگر وہ اس وقت بری طرح  
 ایک طرف پھسنا نہ ہوتا تو شاید جنت کے مارے اچھل کر گاڑی کی  
 پھٹ سے جا کر مارتا۔

”ہاں! پچھلی حرکت ہم نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر فرح  
 کن دازمی اور سوچیں نہیں۔ اس وقت یہ کلین شیو ہے۔  
 ہیڈلٹ اور بڑے تاریک جتنے سے بھی چہرے کا کافی حصہ چھپا رکھا  
 ہے۔ شروع میں میں بھی دھوکا کھایا تھا۔ اسے اپنی آواز سن کر  
 اپنی چال وصال بدلنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ مجھے اس کی  
 صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔“

”لیکن یہ بد بخت ہماری صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کرے  
 گا۔ حالانکہ اسے چاہیے یہ اب ہمیں استاد مان لے۔“ چارلس  
 بولا۔

ڈرائیور اس وقت تک پیچھے مڑ کر یہ دیکھ کر مطمئن ہو چکا تھا کہ  
 وہ محض ہمارے قابو میں تھا۔ دوسرے فکروں میں مصروف حال  
 ہمارے قابو میں تھی۔ وہ گاڑی کی سڑک پر لے آیا تھا اور نہایت  
 سست رفتار سے یہ چلا رہا تھا۔ جمان کو یقین آ گیا تھا کہ اس نے ذرا  
 بھی زور آزمائی کی تو اس کے دونوں کندھوں کے جوڑا لگ ہو جائیں  
 گے۔ اس لیے وہ سادگت ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ سیٹ کے نیچے اس کی  
 دونوں ٹانگیں بھی میں نے ایک ٹانگ کے نیچے پھنسا لی تھیں۔

وہ ہر سکون لیے میں بولا ”لیٹر پڑھ کر! آج بھی کچھلی ملاقات  
 میں اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک طاقتور آدمی ہو لیکن میری غلطی یہ  
 تھی کہ میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ  
 آج کے دور میں جسمانی طاقت کی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف ہتھیار  
 اہم ہوتے ہیں لیکن آج مجھے احساس ہوا ہے کہ کبھی بھی جسمانی  
 طاقت بھی کام آجاتی ہے۔ میرے بازو دھل ہو چکے ہیں اور ہاتھ  
 ٹوٹے جا رہے ہیں۔ میرے بازو چھوڑ دو۔ میں تمہارے لیے کوئی  
 مسئلہ پیدا نہیں کروں گا۔ میں اپنی ٹکٹ تسلیم کرتا ہوں۔“

”سہرا! اب میں تمہاری اس محبت بھری درخواست پر عمل نہیں  
 کر سکتا۔ تم عوامیاد کے قبیلے سے معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری  
 درخواست پر عمل کر کے بچھڑانا نہیں چاہتا۔“

”تم بہت ہی غیر معیاری اور کینے قسم کے دشمن ہو۔“ وہ بھکی  
 سی کراہ کے ساتھ بولا ”تم نے مجھے کب پہچانا؟“

”میں نے تمہیں جلدی پہچان لیا تھا لیکن اس کا اظہار نہیں  
 ہونے دیا۔ میں چاہتا تھا کبھی پوری طرح کھڑکی کے جال میں آئے  
 سمجھنے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس لیے میں نے اپنا رویہ ایسا ہی  
 رکھا جیسے میں تمہیں پولیس سارنٹ ہی سمجھ رہا ہوں اور واقعی تم  
 سے جان چھڑانے کی فکر میں ہوں۔“

”انفوس کہ مجھے تمہارے اس رویے پر حقیقت کا احساس  
 مگر۔ میں تمہیں اپنے سے بڑا ایکٹر تسلیم کرتا ہوں۔ اب تو  
 میرے بازو چھوڑ دو۔“ وہ مگر برا۔

کر رہا تھا لیکن ان کی تعداد کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ باقی تمام کھڑکیوں کے شیشے چڑے ہوئے تھے اور وہ اسکرین سمیت تمام شیشے کمرے رنگ کے تھے۔

مجھے سامنے سے ایسی کسی گاڑی کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ میں صرف یہی دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ تاہم میں اس گاڑی کی آمد کا اندازہ دیکھتے ہی کھٹک گیا تھا اور مجھے بروقت احساس ہو گیا تھا کہ وہ جتان کے سائیکلوں کی گاڑی ہو سکتی تھی۔

میرا ذہن اس وقت کہیں نہ ٹکی طرح کام کر رہا تھا۔ چارلس کے ہاتھوں میں دو ریوڈر تھے لیکن اس لمحے کے حالات میں مجھے اس سے کوئی خاص امید نہیں تھی جب تکلی کی سی تیزی سے کچھ کر گزرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میرے لیے اس کے ہاتھ سے کم از کم ایک ریوڈر لے لینا ضروری تھا لیکن اس کے لیے مجھے جتان کے بازو چھوڑنا پڑتے۔

میں نے سوچا کہ بازو چھوڑنے سے پہلے اس کے کندھوں کے جوڑا الگ ہی کر دوں تاکہ واقعی طور پر کم از کم وہ تو معذور ہو جائے اور جو کچھ ہونے والا تھا اس میں کوئی خاص کردار نہ ادا کر سکے لیکن اس کا ذہن بھی یقیناً کمزور ہی کی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے تو یقیناً گاڑی کو دور سے دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ میں تو شاید اس کے دو تین سیکنڈ بعد گاڑی کی طرف سے خبردار ہو سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں جتان کے بازوؤں پر دباؤ بڑھاؤں اس نے گردن نیچے کر کے اس طرح میرے جڑے پر گھر سید کی کہ اس کے بازوؤں پر دباؤ بڑھنے نہیں پایا۔ اس کے سر پر ہیملٹ تھا اور اس نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ فکر کو کہ زوردار نہیں تھی لیکن اس سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا ایک بازو میری گرفت سے نکل گیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ہیملٹ سے دوسری گھر سید کی۔ اسی دوران اس گاڑی سے سب مشین گن کا برست پڑا۔ مجھے اس کا پہلے ہی خطرہ تھا۔ میں دونوں سیٹوں کی دو میانی جگہ میں کھس چکا تھا۔ میں نے جتان کو چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سب مشین گن سے برست صرف گاڑی کے تین تاڑا کاہ کرنے کے لیے ادا کیا تھا۔ ان کا اپنا سامی گاڑی میں موجود تھا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

میں نے دیکھا جتان چارلس کو دھکیلتا ہوا حیرت انگیز پھرتی سے دوڑا نہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دونوں ہی لڑھکتے ہوئے باہر جا کر۔ میں نے بھی تیزی سے گاڑی سے نکل کر ان دونوں کے اوپر جا کر ناچا لیکن میرے تھکائے کے لحاظ سے جگہ تک تھی۔ میں دونوں سیٹوں کے درمیان سے نکل کر دوسری طرف کے دوڑا نہ سے خاطر خواہ پھرتی سے باہر نہ پہنچ سکا۔ مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی لیکن یہ بھی درحقیقت قدرت نے میری مدد کی تھی۔ وہ ایک لمحے کی

”مجھے خود کو ایک جہلیم کرانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں۔ تم مجھے بازو چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ میں تو ابھی سسٹر چارلس سے تمہاری باتیں بھی بندھواؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”اگر یہ گزیر کرے تو میں کم از کم اس کی دونوں ٹانگوں میں تو گولی مار سکتا ہوں؟“ چارلس نے اجازت طلب انداز میں پوچھا۔

”نہیں نہیں اب یہ اس طرح ہاتھ اٹھایا ہے تو میری کوشش بھی ہوگی کہ ہم اس کے جسم پر خراش تک ڈالے بغیر اسے ترکی کی حکومت کے حوالے کریں اور اگر تم چاہو تو اسے اسکل کر کے برطانیہ بھی لے جاسکتے ہو۔ یہ تمہاری حکومت کا بھی مجرم ہے۔ وہاں اس کا جو مناسب سمجھو وہ مشرکوبنا۔ فی الحال میں اس کے ساتھ خون خرابا نہیں چاہتا۔ بشرطیکہ یہ مجھے اس پر مجبور نہ کرے۔“

”میرے بارے میں اسے لے پروگرام مت بناؤ۔“ جتان قدرے اطمینان سے بولا ”تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میں اس قسم کی صورت حال کا پیشگی بندوبست کر کے چلا تھا۔“

”کیسا بندوبست؟“ چارلس نے فوراً پوچھا۔

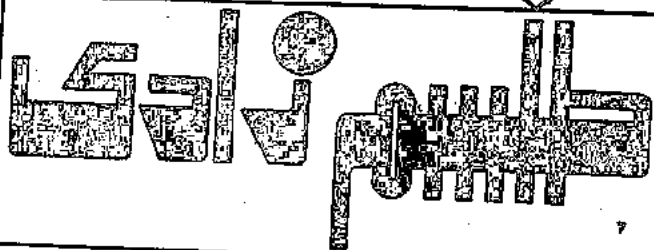
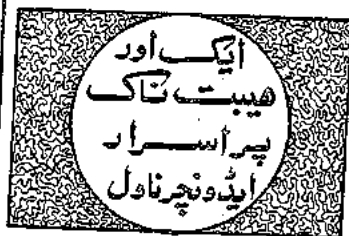
”یہ تو کچھ دیر تک تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ اس کا اطمینان مجھے کھٹک رہا تھا جس طرح شروع میں ہی اس کی دردی میری نظر میں نکلی تھی۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوا تھا کہ وہ اس شخص کی اپنی دردی نہیں تھی اور اسی احساس نے مجھے اس کی طرف بہت غور سے دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ معلوم نہیں کس بے چارے ٹریفک سارجنٹ کی شامت آئی ہوگی جس نے اس نے دردی اور موثر سائیکل دونوں سے محروم کیا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگا۔

میں نے بے پروائی سے کہا ”جس طرح ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے اس طرح تمہارے“ بندوبست“ کو بھی دیکھ لیں گے۔“ میں سڑ کر دیکھ چکا تھا۔ ہمارے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ پھر میں نے چارلس سے پوچھا ”کیا ہم ٹریفک سیزن کی طرف جا رہے ہیں؟“

”نہیں“ چارلس نے جواب دیا اور ڈرائیور کے ساتھ ”گاڑی واپس موڑو۔“

گاڑی صحیح طور پر واپس موڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ ڈرائیور ابھی پورا ٹرن نہیں کیے پایا تھا کہ سامنے سے کمرے بزرگ کی ایک گاڑی آخری طوفان کی طرح نمودار ہوئی۔ اس کے بریک چرچاے اور اس نے ترجمانی ہو کر ہماری گاڑی کا راستہ روک لیا۔ میں اس کی کھڑکی سے ایک گھنٹی کی ٹال باہر آتے دیکھ چکا تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ سب مشین گن کی ٹال تھی۔ اسی طرف کی کھڑکی میں مجھے ڈانٹنے والے ایک شخص کی جھلک نظر آئی۔ گاڑی میں غالباً صرف دو ہی افراد موجود تھے۔ دوسرا ڈرائیو

لا تعداد پر اسرار اور سنسی ٹھنیر داستانوں کے خالق



دوستی کی دنیا سے دور پر اسرار دنیا کی کسانوں جہاں مافوق الفطرت زندگی کا دور دورہ تھا، دو دشمنوں کی عجیب داستان جنہوں نے جب ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو ایک ناقابل یقین کسان نے جنم لیا۔  
ایم اے راحت کا وہ شاہکار ناول جسے شروع کرنے کے بعد مکمل کئے بغیر کرنا ناممکن ہو۔

جسٹاب آپنے قریبی ایک مثال کے طلب  
قرماتیں یا آواز کے لئے نام مکمل قیمت کا  
میں آئندہ ایک سال قمریہ  
جسٹاب آپ کو  
بند رہے۔



خط و کتابت کے لئے۔

مکتبہ القریشی سرگھر روڈ، اردو بازار، لاہور، فونٹ ۶۲۴۴۶۶۵

بھی نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں فوراً ہی دوبارہ گاڑی کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق جو ایسا بے مشین گمن کار برست آیا تھا۔ گاڑی کی حالت کچھ اور تازہ ہو گئی۔

میرے اب مزید کوئی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ دونوں ریوالتور خالی ہو چکے تھے۔ سفید گاڑی طوفانی رفتار سے ہمارے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اس کے ذرا نیورے وہاں رکنے کے بجائے کمرے ہنز رنگ کی گاڑی کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تیزی سے ہمارے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ میں نے اس کی ایک کھڑکی سے کسی کو سرنگالے ریوالتور سے نماز کرتے دیکھا۔

میں اس وقت ہنز گاڑی کو نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کافی دور جا چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہلکی مشین گمن کی ترزا بہت پھر گئی۔ ایک باز پھرنے کا دھماکا سنائی دیا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں چارلس اور رازا نیور کچھ زیادہ ہی سکا سٹ کر گاڑی کے عقب میں دیکھ رہے۔ چند لمحے بعد آخر میں نے ذرا سر نکال کر سڑک کی طرف دیکھا اور رازا یو سے ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تقریباً سو فیوڈ سڑک آگے سڑک کے دوسری طرف شیب میں وہ سفید گاڑی ٹھہرا کہ حد تک ترجمانی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے آگے ٹھہرنا سڑک ایک درخت تھا۔ شاید وہ اس درخت سے ٹکرا چکی تھی۔ تاہم امید افزا بات یہ تھی کہ گاڑی کے دروازے کھلے تھے اور چار افراد قریب کھڑے چاروں طرف سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہنز گاڑی کا دور در دور تک کہیں پتا نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری طبیعت میں بالکل اضطراب اٹھا۔ یہ تمام معرکہ آرائی صرف چند سیکنڈ میں ختم ہوئی تھی۔ سب کچھ اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے ہوا تھا جتنی تیزی سے کسی ایکشن فلم کے منظر میں ہوتا ہے۔ مجھے اس خیال سے ہلکی سی افسردگی کا احساس ہوا تھا کہ سب کچھ جب سے انداز میں شروع ہوا تھا اور جب سے انداز میں ہی ختم ہو گیا تھا۔

حمان کچھ عجیب بے وقوفانہ سے انداز میں ہی ہمارے قابو میں آ گیا تھا۔ سورت حال مکمل طور پر ہمارے حق میں تھی۔ شاید حمان کی دہری میں کوئی حساس آلہ پوشیدہ رہا ہو جس کے ذریعے اس کے ساتھی کہیں ہنز گاڑی میں بیٹھے ہماری ٹھنگوئیں رہے ہوں اور اسی لیے بروقت اس کی مدد کو آن پہنچے ہوں۔ بالآخر شاید سب کچھ کسی حد تک ان کی پلاننگ کے مطابق ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ہم حمان کو قابو میں رکھنے میں کامیاب رہے تھے اسی طرح وہ بھی ہمیں انوارا کر کے لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

شاید سفید گاڑی کی آمد کا اس حد تک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ حمان اور اس کے ساتھیوں نے فوری طور پر نکل جانے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ شاید وہ مزید رکتے اور اس مختصر سے معرکے کو فیصلہ کن

تایخ میرے لیے خوش قسمتی کا باعث رہی کیونکہ اس دوران چارلس نے بدحواس ہو کر حمان پر قوتارے کی ناکز کرا دی تھی۔ حمان کو کوئی گولی نہ لگی کیونکہ میں نے اسے اٹھ کر بھاگتے دیکھا تھا لیکن اگر میں اس دوران ان دونوں پر جاگرا ہوتا تو ایک آدھ گولی مجھے ضرور لگ جاتی۔ اسی دوران سب مشین گمن سے ایک اور برست مارا گیا لیکن مجھے گولیوں کے کسی چیز سے ٹکرانے یا کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ کی کوئی خبر سنائی نہیں دی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ٹھنڈا ہنس خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی ناکزنگ کی گئی تھی۔

میں اس وقت تک بہر حال گاڑی سے نکل چکا تھا لیکن گاڑی کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹنے کے بل لیت چکا تھا۔ ہم تینوں گاڑی کے ایک طرف کے دروازے سے نکلے تھے۔ حمان کی مدد کے لیے آئے والی گاڑی دوسری طرف تھی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ حمان دوڑ کر اس تک پہنچ چکا تھا حالانکہ چارلس نے اس پر ایک دو فائر مزید کیے تھے۔

اس بدحواسی میں بھی چارلس نے کم از کم یہ غلطی کی کہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا ورنہ شاید اس کی کھوپڑی آڑ میں لگی ہوتی۔ گاڑی پر تیسرا برست پڑا اور شیشے کی کڑیاں اڑنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں دل ہی دل میں ذرا نیور کچھ تھکنے لگا تھا لیکن میں نے دیکھا اسی لمحے وہ بھی ہماری طرف کے اگلے دروازے سے باہر لڑھک آیا تھا اور صحیح سلامت نظر آ رہا تھا۔ اس برست سے وہ یقیناً بال بال بچا تھا۔

اسی اثنا میں شرکی طرف سے سفید رنگ کی ایک گاڑی کچھ اسی انداز میں نمودار ہوئی جس طرح دوسری طرف سے کمرے رنگ کی گاڑی آئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس کے بارے میں چارلس نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں ٹرینڈر اٹھل جس کے لوگ تھے۔ بقول اس کے وہ ہماری "مخافت" پر مامور تھے۔ جتنے عرصہ طریتے سے انہوں نے ہماری "مخافت" کی تھی اس پر انہیں کوئی متغیر و فیرو ملنا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں اتنی دیر وہ راستے میں کہاں اٹکے رہے تھے اور اب کس طرح ہمارا سراں پا کر آ رہے تھے۔

میں نے چارلس سے دونوں ریوالتور چینیے۔ وہ اس دوران لڑھک کر میرے قریب آچکا تھا۔ میں نے ٹھنڈوں کے بل کھڑے ہو کر گاڑی کی آڑ سے ذرا سا سر نکال کر موزیشن لیتے ہوئے کمرے رنگ کی گاڑی کو دیکھنا چاہا تو باجلا کہ وہ وہاں جانے کے لیے ٹرن بھی لے چکی تھی۔ ٹانگوں کی چڑچڑاہٹ سنائی دی۔

اس کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ حمان آٹو ائمیر تھا اور آٹو ائمیر دروازے پر لٹکا ہوا تھا اور گاڑی کے ٹرن لینے کی وجہ سے جمول کر رہ گیا تھا۔ میں نے بیک وقت دونوں ریوالتوروں سے اس پر ناکز کیے مگر اس وقت تک وہ گاڑی میں ٹھنڈ چکا تھا اور دروازہ بند ہو چکا تھا۔ شاید گولیاں گاڑی پر کہیں لگی ہوں لیکن میں اس کے بعد کچھ

پانے کی کوشش کرتے ہیں ساتھ لے جانے یا وہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتے۔

میرے خیال میں اگر دو آدمی ایک سب مشین میں یا کچھ اور ہتھیاروں کے ساتھ حمان کی مدد کے لیے آن بھی پہنچے تو یہ کوئی زیادہ اہم بات نہیں تھی۔ تاہم میں آئے ہوئے شکار کو اس طرح ہمارے ہاتھ سے گھٹنا نہیں چاہیے تھا لیکن شاید میں غلط فہمی پر مبنی کہتا ہوں تھا۔ چونکہ میں سے صحیح طور پر نہیں نکلا تھا۔

پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو قلعہ کی قدرت پرست متاقد رکھنے والوں پر ہی مرمان نہیں رہتی۔ کبھی کبھی وہ بڑے لوگوں پر بھی مرمان ہوتی ہے۔ شاید قدرت نے اپنے اسی عمل کو "وہیل دینا" قرار دیا ہے۔ اس میں قدرت کی نہ جانے کتنی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ حمان میرے لیے اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ سب سے میرا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ مجھے اس میں اپنی ذہنی اور جسمانی توانائی صرف کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی میرے غمزہ ہونے کی کوئی تک تھی۔ مجھے تو اب صرف یہی فکر کرنی چاہیے تھی کہ جلد از جلد اور بیرون پاکستان روانہ ہو جاؤں۔

میں نے چارلس اور راجہ کو بتایا کہ انہیں گاڑی کے عقب سے نکل آنا چاہیے۔ ہم تین تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے سفید گاڑی تک پہنچے۔ اس کا ایک ٹائرسٹ ہو چکا تھا اور شاید اسی کی وجہ سے وہ لوگ خلیب میں آتی تھی۔ گاڑی کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ وہ اٹھتے اٹھتے چلی گئی تھی کیونکہ اس وقت اس کی رفتار بہت تیز تھی۔

وہ چاروں افراد گاڑی کے گرد کھڑے تھے ان کے چہروں پر خفیہ سی حالت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ہماری سرخس رہا اور تھا۔ باقی تینوں خالی ہاتھ نظر آ رہے تھے۔

"کہاں مر گئے تھے تم لوگ؟" چارلس نے رہاوردالے کو مخاطب کیا۔ شاید یہی سولت کے لیے وہ دن سے انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

"اس خبیث ٹریفک سارجنٹ نے ہماری گاڑی کو اور ٹیک کرتے وقت عین قریب سے گولی مار کر ہماری گاڑی کا ایک ٹائر برست کر دیا تھا۔" رہاوردالے نے بتایا "میں وہیل بدلنے کے لیے ٹیکڑا ہوا۔ اب یہ دو سرائٹس برست ہو گیا ہے۔"

"تم وہیل بدلنے کے بجائے کوئی چلتی گاڑی نہیں پکڑ سکتے تھے؟" چارلس نے اب ذرا کم ناگواری سے پوچھا۔

"جی کی جی گاڑی چھیننا یا اسے زبردستی ساتھ لے کر ہمارے خیال میں مناسب نہیں تھا۔" رہاوردالے نے جواب دیا۔

چارلس ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا "تم لوگوں

کے پاس کچھ اسلحہ وغیرہ بھی تھا یا نہیں؟" چارلس نے دو شخصوں کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن میں ان کے استعمال کا موقع نہیں ملا۔

"رہاوردالے کے لیے میں رکھائی آتی جا رہی تھی۔ چارلس غصہ منشی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بھرتے کو تو میرا بھی جی چاہ رہا تھا۔ زکس اشلی جنس کا حال بھی ہمارے ہاں کے خفیہ اداروں سے کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ایک بار پھر میں نے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر وہ ہمارا "برادر" اسلامی ملک تھا۔ وہ لوگ تو پھر بھی گاڑی کا تیار بدل کر کسی نہ کسی طرح ہمارے اور اس گاڑی کے قاتل میں آن پہنچے تھے جبکہ ہم نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے تھے۔ ہمارے ہاں کے کسی خفیہ ادارے سے تو شاید یہ امید رکھنا بھی مشکل ہو۔"

چارلس گڑی دیکھتے ہوئے بولا "اب ہم واپس کیسے جائیں گے؟ دونوں گاڑیاں بے کار ہو گئی ہیں۔ ہمارا اسپر وہیل بدلنے کا کام آچکا ہے۔" اس نے مضطرب انداز میں ابھر اُدھر دیکھا "مجھے سسر چورہی کو پکڑ لینا چاہیے تھا۔ ان کی ملاقات میں زیادہ وقت نہیں ہے اور انہیں اس سے پہلے بہت سی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک سنسان سڑک تھی۔ ابھی تک وہاں سے کوئی اور گاڑی گزرتی دکھائی نہیں دی تھی۔ ہماری گاڑی کے تین ٹائرسٹ ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے قدرے مایوسی کا احساس ہوا۔ شاید میرا آج پاکستان پہنچنا قدرت کو منحرف نہیں تھا۔ اچانک ہماری گاڑی کا ڈرائیور رولا "یہ دونوں گاڑیاں بے شک خلیب ہیں مگر کبھی ایک ہی ہے۔ ان کے جیلز کا سائز اور ساخت ایک ہی ہے۔ ہماری گاڑی کا جو ایک وہیل ملا ہے وہ کیا ہے میں اسے نکال لاتا ہوں تب تک تم لوگ یہ ٹاکہ وہیل آؤ۔ یہ گاڑی صحیح حالت میں ہے۔ ہم اپنی گاڑی کا وہیل اس میں لگا کر اسے لے جاتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے" جلدی کرو۔" چارلس بولا۔

ڈرائیور نے ڈنڈا ہوا واپس اپنی گاڑی تک گھبرا اور بڑی پھرتی سے وہیل نکال کر تیزی سے سڑک پر لڑکھانا ڈال دیا۔ اس دوران اشلی جنس والوں کی سفید کار کا وہیل نکالا جا چکا تھا۔ سفید گاڑی درست سے بھی گزرائی تھی لیکن یہ نہایت معمولی تھوڑی سی لیڈر تھوڑا سا ٹیڑھا ہونے کے سوا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

جلدی وہیل تبدیل ہو گیا اور سفید گاڑی ہمارے ڈرائیور نے سنبھال لی۔ حمان کی جگہ دو اشلی جنس والے ہمارے ساتھ ہو گئے۔ دو وہیں تباہ شدہ گاڑی کے پاس رک گئے۔ ہم نہایت تیز رفتاری سے واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

پکڑ لینا چاہیے تھا۔ ان کی ملاقات میں زیادہ وقت نہیں ہے اور انہیں اس سے پہلے بہت سی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔

پکڑ لینا چاہیے تھا۔ ان کی ملاقات میں زیادہ وقت نہیں ہے اور انہیں اس سے پہلے بہت سی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔

پکڑ لینا چاہیے تھا۔ ان کی ملاقات میں زیادہ وقت نہیں ہے اور انہیں اس سے پہلے بہت سی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔

جاننا تھا۔ پرانی ہونے کی وجہ سے اس میں اس شان و شکوہ کی جھلک بھی تھی جو شان و شوہر اور غم شانہ قسم کی عمارتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ پہلے شاید اس عمارت کا مصروف کچھ اور رہا ہو لیکن اب یہ پچھلے سینئر کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ اس کی چار دیواری میں ایک سرسبز اور طویل و عریض لان بھی موجود تھا جس پر ادھر ادھر مختلف معمول کے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں چارلس کی رہنمائی میں شانہ طرز کے ایک بہت بڑے ہال میں پہنچا جہاں بڑی گھما گھمی نظر آرہی تھی۔ چاروں طرف گھروں کے دروازے تھے جن سے لوگ ہال میں آ جا رہے تھے۔ ان میں عورتیں مرد بھی تھے۔ ان میں سے بعض عجیب سے لباس میں تھے۔ لیے لیے ہماری بھر کم گاؤں جن پر بچے کی طرف فری مین کی بھاریس لگی ہوئی تھیں۔ کچھ میں موٹی موٹی لالہاں اور سر پر ترکی ٹوپی بیروں میں کچھ اس قسم کے لیے لیے جوتے چپے عموماً برقائی ملاخوں میں رہنے والے پہنے تھے۔

ہال میں ایک طرف بہت سے بیک دنگ تھے۔ ایک طرف کچھ لوگ مختلف قسم کے چمڑے کے کبوتر اور کارٹونز وغیرہ میں موسیقی کے مختلف آلات بیک کر رہے تھے۔ شاید طائفے کی سڑکی تاریاں آخری مراحل میں تھیں لیکن وہاں غالباً اس طائفے کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی مصروفیات جاری تھیں۔

چارلس کے ساتھ میں اوپر کی منزل پر ایک آفس نما کمرے میں پہنچا۔ یہاں بھی کئی افراد موجود تھے اور بڑی سرگرمی نظر آرہی تھی۔ سامنے ہی بیٹے کے ایک کیمپن میں تراشیدہ بھورے بالوں والی ایک لڑکی سر جھکا کر تندی سے کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ چارلس نے ایک شخص سے کسی کے بارے میں کچھ پوچھا۔ اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کر دیا۔

سرخ و سپید سا وہ ٹیلا فوجوان سوٹ میں تھا اور کسی دوسرے کی جینز کوٹے میں ٹیل فون کان سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر بیٹے کے قطرے جھللا رہے تھے۔ وہ بڑے زور شور سے کسی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا اور بڑے قوتور سے ہاتھ بھی ملائے جا رہا تھا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم اس تک پہنچے تو اس نے ہلکے ختم کر کے رہیں اور رکھ دیا۔

وہ غالباً اندھ کر تیزی سے کہیں جانے ہی لگا تھا کہ چارلس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس کا گویا صرف تعارف کرنا ہی کافی تھا۔ اس نے کمر بوجھ سے چارلس سے معاف کیا اور فوراً ہی میرا سر تاپا بازوہ لیتے ہوئے بولا "غالباً یہ مسٹر افضل جو دھری ہیں؟" وہ فرانسیسی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

چارلس نے اہمیت میں سر ہلایا اور مجھے بتایا "یہ صاحبہ ترکی کے اس شائق طائفے کے فیچر ہیں جس میں ہمیں شامل ہو کر جانا ہے۔ ان کا نام کھان ہے۔"

کھان نشتر بیچے سے اپنے چہرے سے پینٹ پونچتے ہوئے بولا

"عجیب اتفاق ہے کہ ان صاحب کو فواد الخالص کی جگہ جانا ہے اور آج فواد واقعی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتا تھا۔ اسے بڑا شدید قسم کا کھو ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے کم از کم پانچ دن کے لیے بستر میں رہنے کی ہدایت کی ہے۔"

چارلس دھیرے سے ہنس دیا۔ کھان براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا "ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہماری پلاننگ ٹھوس سی غلط ہو گئی ہے جس کی وجہ سے بعض کام بڑے غلط وقت پر۔ یعنی آخری لمحوں میں ہو رہے ہیں۔ میں آپ کو اپنی ایک اسٹینٹ کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ آپ کو سفر کے لیے تیار کر دے گی۔ ہمیں کاسٹیوم میں ہی جانا ہے۔ توڑا سا میک اپ بھی ہو گا۔"

"اوہ میرے خدا! بے اختیار میرے منہ سے نکلا "کیا میک اپ کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟ یہ شو بزنس کے لوگوں والا میک اپ میں نے کبھی نہیں کیا۔"

"مسٹر جو دھری! جب آپ ہمارے طائفے میں شامل ہو کر جا رہے ہیں تو آپ کو طائفے کا ایک رکن ہی نظر آنا چاہیے۔ بلکہ آپ فواد الخالص کی جگہ جا رہے ہیں تو آپ کو فواد ہی نظر آنا چاہیے۔" کھان مضطرب لہجے میں بولا "ہم ٹھوس سی بے ایمانی کر رہے ہیں تو اسے سلیقے سے کریں گے۔ بے ایمانی دور سے ہی بے ایمانی نظر نہیں آتی چاہیے۔"

میں نے کندھے اچکا دیا۔ چارلس مجھے ہولے سے کہنی مار کر بولا "اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے دوست! مجھے تو پاکستان جانا ہے۔ میرا خیال ہے موجودہ حالات میں مجھے زیادہ غرے نہیں دکھانے چاہئیں۔ میں حاضر ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آئیے۔" کھان میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ چارلس بولا "میں اب چتا ہوں" اب یہاں میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔"

"مسٹر چارلس! ابیں تھکتا آپ کا تھوڑے سے ممنون ہوں۔" میں نے خجندی اور ادب سے کہا "آپ واقعی اس اجنبی ملک میں میرے بہت کام آئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اگر آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو میں اس وقت کہاں ہوتا؟"

"تم جہاں بھی ہوتے شاید اس سے زیادہ آرام سے ہوتے۔" چارلس مسکراتے ہوئے بولا "مجھے تو تم سے معذرت کرنا تھی اور تم میرا عجب ہی ادا کر رہے ہو۔ میری وجہ سے درحقیقت تمہیں بہت سی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ میرے مسائل شیئر کرنا پڑے۔"

پھر اس نے کندھے اچکائے اور میرے کندھے پر ہاتھ مارنے ہوئے بولا "بہر حال وقت گزر رہی جاتا ہے۔ یادیں رہ جاتی ہیں۔ ہمیں اتنی رہی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

"یقیناً" میں نے کمر بوجھ سے اس سے معاف کرتے ہوئے کہا

تھی کہ وہاں اتنی بھی ہلکے ڈنسیں تھیں جتنی بھار پھر آری تھی۔ رہائے ایک شاندار باجھ دم تک میری رہنمائی کی جو تمام لوازمات سے آراستہ تھا۔

فصل کے بعد رہائے مجھے ویسای لباس ملبا کیا جس میں وہاں کئی افراد پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہی لباس ہماری بھرم چٹایا گاؤں۔ پیچھے لیے کرتے سے مشابہ قمیص بھرم چڑے اور ترکی ٹوپی۔ گلے میں کالا ٹیکہ۔ اور نہ جانے کیا کچھ۔

میں نے اس لباس میں خود کو کارٹون محسوس کیا لیکن رعایا میرا جائزہ لیتے ہوئے طمانیت سے سرلا کر رہی تھی۔ ”جی رہے ہو خوادا کا نص سے زیادہ حق رہے ہو۔“

میں نے مجھے لیے میں کہا ”اگر میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہو تب بھی میں اس پر خوش ہوں۔“

اس کے پچھلے سے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ ابھری اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ایک طرف کو چل دی۔ اس بار ہم جس کمرے میں پہنچے وہ ایک خوبیل و عریض میک اپ دوم تھا۔ وہ غالباً ایک بہت بڑے خطیر میک اپ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس عمارت میں ایک بہت بڑا آؤٹریٹم بھی موجود تھا جہاں تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی ڈراما یا کلچرل شو فیروزہ دکھایا جاتا تھا۔ وہ خالص انداز کی قسم کی عمارت نہیں تھی۔ وہاں فن و شادیت کے شعبے سے متعلق تقریباً تمام ضروریات پوری کرنے کا انتظام تھا جی کہ دوسرے شعبوں سے یا دوسرے ملکوں سے آنے والے فنکاروں کو بھی اگر کسی وجہ سے ہوئی میں نہ ٹھہرا جاسکتا تو یہاں ٹھہرا جاسکتا تھا یہاں ان کے قیام و طعام کا مستقل انتظام تھا۔

مجھے دیوار گیر آئینوں میں سے ایک کے سامنے اٹھ کر بیٹھا دیکھا گیا اور رعایا کی ہدایت پر موٹی سی ایک خاتون نے مستعدی سے میرا میک اپ شروع کر دیا۔ چھوٹے قد کی وہ گول شکل سی عورت بہت جس کچھ معلوم ہوئی تھی لیکن اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ وہ رعایا سے صرف ترکی میں بات چیت کر رہی تھی۔ مجھے باقاعدہ پیشہ ورانہ کمروں کی طرح چھ کر میک اپ کرنا بہت عجیب لگ رہا تھا اور اس وقت تو میں بے اختیار گراہ کر رہ گیا جب میرے چہرے پر فوآنچر کٹ موچھوں کا اضافہ ہو گیا۔ پھر میک اپ دوسرے نے ترکی ٹوپی میرے سر پر رکھ کر ذرا پیچھے ہٹ کر فائدہ اندہ نظروں سے میرا جائزہ لیا۔

میں نے بے چارگی سے رعایا کی طرف دیکھے ہوئے کہا ”ترکی ٹوپی کی حد تک تو معاملہ قابل برداشت تھا لیکن کیا یہ ہفتی ہوئی سوچیں بھی ضروری ہیں؟“

”مجھووری ہے۔“ رعایا نے کندھے اچکائے ”خوادا کا نص کی سوچیں ہیں اور با سپورٹ برقی الحال اسی کی تصویر لگی ہے۔“

آپ جب بھی پاکستان آئیں مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا۔ سیٹھ رمضان سے کہہ دیجئے گا۔ میں جہاں بھی ہوا وہ آپ کا مجھ سے رابطہ کرادے گا۔“

میں نے دیکھا کھان مظہرانہ انداز میں گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں نے چارلس کو فوڈ سافٹ کیا اور کھان کے ساتھ ہم دونوں پیچھے آکر اپنے اپنے راستوں پر ہو گئے۔ چارلس باہر کی طرف چل دیا اور کھان مجھے ایک کمرے کے دروازے پر گھڑی ہوئی لڑکی کے پاس لے آیا۔

وہ ہم سے اوپر کی ایک دلی بلی لڑکی تھی۔ رعایاؤں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور بال نہایت مختصر تھے۔ وہ نیلے اور گلابی دو رنگے ایسکرت میں تھی۔ کھان نے اس سے میرا تعارف کرایا ”یہ وہی افضل چودھری ہیں جن کے بارے میں ہمیں ہدایات ملی تھیں۔“ پھر اس نے مجھے لڑکی کے بارے میں بتایا ”یہ رعایا ہے۔ یہ آپ کو جانے کے لیے تیار کرے گی۔ آپ کو اس کی ہدایات پر حرف حرف عمل کرنا ہے۔“

وہ صرف اتنا کہہ کر وہاں چل دیا اور ایک دروازہ کھول کر اس کے عقب میں غائب ہو گیا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ بظلوں میں دلیے، دروازے سے ٹیک لگائے کسی ناکام فلسفی کی طرح اداس اداس سی نظروں سے میرا سر تبا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ گویا فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے مشکوکا شرف بخشے یا نہیں؟

تاہم جب وہ بولی تو اس کی تواضع انتہائی ذہنی شیریں اور لہجہ نہایت دوستانہ تھا ”مسٹر چودھری! میرے خیال میں تمہیں سب سے پہلے فصل کی ضرورت ہے۔ گلہا ہے تم سوٹ پہن کر بھیجی باڈی کرتے رہے ہو۔“

تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں مٹی میں تھرا ہوا تھا۔ قسمت ہی کچھ عجیب تھی کہ چند میل کا سفر بھی سکون سے طے نہیں ہوا تھا۔ اب میں محترمہ رعایا کو کیا تاکہ میرا زندہ سلامت کچھل سیتز پہنچ جانا بھی اور واسے کی مہمانی ہی تھی ورنہ وہ مجھے جس فصل کا مشورہ دے رہی تھی وہ میرا فصل میت بھی ہو سکتا تھا۔

”کیا ہمارے پاس اتنا وقت ہے؟“ میں نے اپنی حالت پر ذرا بھی شرمندہ ہونے بغیر پوچھا ”مسٹر کھان تو بہت غلط میں معلوم ہوتے ہیں۔“

”وہ تو ہمیشہ اسی طرح غلط میں ہوتے ہیں اور اسی طرح گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے لیکن اگر آپ ذرا مستعدی سے کام کریں تو ہم ذرا آؤٹسک سے تیار ہو کر جاسکتے ہیں۔ دیکھیں بھی ہم کافی طاقتور لے کر جا رہے ہیں، سارجن کا قافلہ نہیں۔“ رعایا ٹھہرے ٹھہرے لیے مک لڑکی وہ ششہ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔



”بات کو مذاق میں مت ڈالو۔“ اس کی سنجیدگی برقرار رہی  
”میں یہ بات تم سے صرف اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہی ہوں۔  
ظاہر ہے میں جنہیں مدد تو نہیں سکتی۔“

”تمہیں واقعی اپنی معلومات میں افسانے کی کوشش کرنی  
چاہیے کیونکہ تمہاری معلومات بہت ہی ناقص ہیں۔ مجھ جیسا  
مسکین اور بے سوسامان آدمی جنہیں ڈرگ مانیا کا گیر پڑا ہے  
ہے۔ خیر تمہارا بھی قصور نہیں۔ ڈرگ مانیا نے واقعی دنیا میں اپنے  
پچھلے اتنے پیلا لے لیے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ چلے ہوئے شخص  
پر ڈرگ مانیا کے آدمی کا لاکھ ہوتا ہے لیکن تمہاری اطلاع کے لیے  
عرض ہے کہ ترکی سے پاکستان کی طرف پاؤڈر لے کر کوئی ایسا شخص  
ہی جاسکتا ہے جس کا ذہنی توازن درست نہ ہو۔ یہ پاؤڈر لے کر  
جانے کا نہیں بلکہ لے کر آئے کا روٹ ہے۔“ میں نے مانت  
سے اسے سمجھایا۔

”مجھے ان باتوں کا زیادہ علم نہیں ہے۔ میں نے تو احتیاطاً پوچھ  
لیا تھا۔“ وہ کندھے اچکا کر ہوتے ہوئے بولی۔

کچھ دیر بعد روایتی کا اعلان ہو گیا۔ بڑی سی ایک خوب صورت  
اور اترکندہ شہزادہ کوچ ہمیں لینے آئی تھی۔ کچھ مزدور ٹائپ لوگوں نے  
ہمارا سامان اس پر لاد دیا۔ کھانا، رہا اور ایک تیرے شخص نے  
فرود آمد سب کاموں سمجھنا کیا جیسے اسکول میں بچوں کی انپش  
ہوری ہو۔ پھر ہم قطار بنا کر کوچ میں سوار ہوئے۔ طائفے میں چار  
خوب صورت اور خوش اواز لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

کوچ روانہ ہوئی تو سب آپس میں ہنسی مذاق اور چہلچل  
کر رہے تھے لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا  
کہ ان سب کو معلوم تھا میں جہلی ذوالخالص تھا اور ترک نہیں  
تھا لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی  
کسی نے اس سلسلے میں مجھے کبھی لے کر کوشش کی تھی۔

راستے میں لڑکیوں نے ڈنٹ بجا بجا کر کچھ گانا شروع کر دیا۔ جو  
بھی ان کا ساتھ دینے لگے انہوں نے گویا راستے ہی میں اپنا ٹھکانا  
شو شروع کر دیا تھا۔ ان کی موسیقی میں جلی موسیقی کی جھلک تھی  
اور ان میں سے بیشتر کے نام بھی جلی ہی معلوم ہوتے تھے۔

گائے کے درمیان ان سب کے قہقہے بھی گونجنے لگتے تھے۔  
اترکندہ شہزادہ کوچ کے شیشے بند ہونے کی وجہ سے غالباً زیادہ شور مچا رہا  
نہیں جا رہا تھا۔ اس کے باوجود مکمل دنیو پر دوسری گاڑیوں کے  
لوگ ہماری گاڑی کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ  
ہمارے ہاں اکثر بڑیاں اسی طرح سفر کے دوران بسوں یا دیکھوں  
میں گاڑی بجاتی اپنی منزل کی طرف جاتی تھیں۔

آخر کار ہم لوگ ایئر پورٹ جا پہنچے اور سرسری انداز میں  
منابٹے کی کارروائیوں سے گزرنے کے بعد ٹرکس انڈا نئےز کے ایک  
جوجیٹ میں سوار ہو گئے۔ میرے خیال میں یہ ایک مشکل مرحلہ تھا  
لیکن میری توقعات سے کہیں زیادہ آسانی سے طے ہو گیا تھا۔

اور جسم دھلا چھوڑ دیا۔ ہم وہاں آگے سے آگے میں اپنا جائزہ لیتے  
ہوئے مجھے کچھ یوں لگا جیسے میرے سامنے کوئی ایسی بیٹھا ہو۔  
اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ سب کچھ تو میرے حق میں بہت سی  
اچھا ہوتا تھا۔ کوئی دوسرا تو مجھے کیا بچاؤ، محض چند چھوٹی چھوٹی  
تبدیلیوں سے میں خود اپنے لیے بھی ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔

میں خود کو شش کرنا تو شاید اس ایسی ملک میں مجھے اپنی شکل  
اور طبع تبدیل کرانے میں خاص دشواری پیش آتی لیکن میرا یہ کام  
کسی فرمائش کے بغیر خوب خود ہی ہو گیا تھا۔ میرا اصل شکل میں  
پاکستان جانا شاید بہتر نہ ہوتا۔ اس قسم کے سوپ میں جانا زیادہ بہتر  
تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی کے پٹے سے  
سر کا کر پرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

رہا نورانی میرا کندھا چلاتے ہوئے بولی ”اب اٹھ جاؤ۔ یہ  
میک اپ روم کی کرسی ہے کوئی کچھ ڈانٹیں جہاں لیٹ کر تم لوہی  
سننے کی تیاری کر رہے ہو۔ تمہارا کچھ دوسرے لوگوں کا میک  
اپ بھی کرنا ہے۔“

تب مجھے معلوم ہوا اس کوئی مثل نہیں کہ عورت کا نام تمہارا  
تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ”اصل  
میں میرے ساتھ معاملات کچھ آٹ پٹ سے ہو گئے ہیں۔ جب میں  
شیر خوار تھا تو لڑکیوں کے بھانے کا سیکل موسیقی بنا کر آتا تھا۔ اب  
لوہاں سننے کوئی چاہنے لگا ہے۔“

میں نے تمہارا گھر یہ لوا کیا اور ایک بار پھر رہا کے ساتھ  
ہو لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ رہا بھی اور بے پناہ  
ڈلی تھی۔ شاید حد سے زیادہ ڈانٹ کی باری ہوئی تھی جبکہ تمہارا  
پستہ قد اور ہر طرف سے گول منول تھی۔ رہا کی سنجیدگی تقریباً  
امردگی سے مشابہ تھی جبکہ تمہارا کے ہونٹوں سے ہی نہیں بلکہ  
چوڑے پھولے سرخ دھبہ گالوں سے بھی گویا کسی پھولی پڑتی تھی۔  
راستے میں رہا بولی ”تم اپنا سامان میرے حوالے کر دو۔“

”میرے پاس اس بریف کیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ میں  
نے اسے اپنا بریف کیس دکھایا جو کچھ زیادہ ہی ”بریف“ تھا۔  
”تم کچھ لے کر تو نہیں جا رہے ہو؟“ اس نے سرسری سے  
لیجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب؟“  
”مطلب یہ کہ تم بہت اونچی سفارش پر ہمارے طائفے میں کسی  
ادری کی جگہ شامل ہو کر جا رہے ہو۔ کہیں تم کو کوئی خاص قسم کے گیر پڑ  
دنیو تو نہیں ہو؟ ڈرگ مانیا کے آدمی تو نہیں ہو؟ براؤن شوگر دنیو  
تو لے کر نہیں جا رہے؟ میرا مطلب ہے یہی دنیو؟“ اس نے  
وضاحت کی۔

”اروہ“ میں گہری سانس لے کر رہ گیا ”آج کل میں واقعی خود کو  
گیر پڑ محسوس کر رہا ہوں لیکن وہ کب پڑ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ بلکہ  
کہ زیادہ سمجھتا ہوں کہ ان کے ہاتھ کا کچھ نہ“

میری نظر میں وہاں کسی شے کا صورت کو تلاش کر رہی تھی۔  
پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں سیکرٹری کے انتظامات تھے۔ غیر متعلق  
لوگوں کو ان کے لائسنس میں آئے تھے۔ روکنے کے لیے باہر پولیس  
دھیرہ موجود تھی۔ میں نے سوچا شاید باہر جاتے وقت میرا کوئی  
سامان نظر آئے۔

خدا خدا کر کے استقبال کے انتظامات ختم ہوئے اور ہم بیڑیاں  
دند کی رہائی میں باہر روانہ ہوئے۔ گاڑیوں کی طرف جاتے وقت  
میں نے راستے میں نظر آنے والے بھیم کی طرف بازو دکھایا لیکن  
مجھے کہیں کوئی شے اس کا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید  
چارلس، سیٹھ، رمضان کو میرے صحیح پروگرام سے مطلع نہیں کر سکا  
تھا اور سیٹھ رمضان آگے وہ اطلاعات میرے سامان ہی تھیں لیکن  
نہیں پہنچا سکا تھا ورنہ شاید سلطان خود یا میرا کوئی اور سامان مجھے  
یہاں دکھائی دے ہی جاتا۔

ہم ان پورٹ کی عمارت سے باہر پہنچ گئے اور میری منتظر  
نظر میں سامان کو نہ پاسکیں حتیٰ کہ ہم ان گاڑیوں کی قطار تک  
جانے پہنچے وہاں پہنچنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ یہاں کوئی ایک بڑی  
گاڑی نہیں تھی۔ کئی مریدین کار میں تھے۔ بیڑیاں اور مہمان  
سب ٹولہ میں تقسیم ہو کر ان گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ میں مختلف  
اندیشوں اور دوسروں میں مگر اس قافلے کے ساتھ اسلام آباد  
جو مل پہنچ گیا جہاں کچھ دیر کی خانہ پڑی کے بعد سب کو ان کے  
کمروں میں بھیج دیا گیا۔ میرے حق میں اچھا ہی تھا کہ مجھے مشکل  
بیڑیوں میں ملا تھا۔

کہا ہم ہمارے ہی کھانے تھے۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد میں  
دیر تک کچھ لوگوں کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا لیکن اس  
ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ میرے خاص ساتھیوں میں سے کسی کا  
یہاں ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا برنس آفس یہاں موجود تھا لیکن وہ اس  
وقت یقیناً بند تھا۔ اپنے ریڈیو فون ڈائریکٹر کے گھر کا فون نمبر بھی مجھے  
یاد تھا لیکن یہاں کے آفس والے بے ضرر سے لوگ تھے۔ انہیں  
کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کیوں غائب تھا اور لاہور میں جو  
غیر معمولی واقعات پیش آئے تھے ان کا پس منظر کیا تھا۔ میرے لیے  
یہاں کے ریڈیو فون ڈائریکٹر کو اپنی موجودگی کی اطلاع دینا فضول  
تھا۔ میں نے کسی کو بھی فون نہ کیا اور سوچا۔ میں نے کوئی بھی قدم  
اٹھانے کا فیصلہ صحیح نہ سمجھا۔

مجھے اس الجھن میں نہیں پڑتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔  
علی الصباح ٹیلا فون کی منتہی تھی۔ درحقیقت اس منتہی نے ہی مجھے  
بچایا۔ میں نے ریڈیو رٹاکر "ٹیلا" کہا تو دوسری طرف سے قصی  
قصی آواز میں صرف اتنا کہا "سرا باہر آجائے" میں آپ کا  
شکر ہوں۔

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منتقل ہو گیا۔ میں مری سامنے لے کر  
رہ گیا۔ اس انتہائی مختصر ٹیلا فون نے مجھے الجھن اور تذبذب

میرا سارے کے فضا میں بلند ہونے کے بعد جب اس کی پرواز  
ہوا تو ہو گئی تو میں نے پلٹ کر سٹ کے پٹے سے سر نہکایا اور  
آنکھیں بند کر کے سم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مجھے امید ہو چلی تھی کہ جس  
طرح اسٹیل کے ان پورٹ پر طائفے کے ہمراہ جہاز میں سوار ہونا  
کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا اسی طرح اسلام آباد ان پورٹ پر ان  
لوگوں کے ساتھ کسٹم اور ایگریکیشن وغیرہ سے لگنا کوئی مسئلہ نہیں  
ہو گا۔

طمانیت کے اس احساس کے ساتھ میرے اعصاب پر ایک  
مضبوط میٹھی لذت آمیز سی تھکن چھا گئی۔ ایک مدت گزرنے لگی  
تھی کہ میں ایک لافانی سے ہنگامہ خیز نہیں تھا۔ یہ سرگرمی ختم  
ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اس منہج کا سلسلہ کہیں فوجی نہیں  
تھا۔ ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی۔

اب میں وطن واپس جا رہا تھا تو یکدم ہی گویا میرے دل میں  
آرام کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ ایسا آرام جس میں اندیشے اور  
دوسے اعصاب میں سرسراہٹ پیدا نہ کریں۔ نیند کی حالت میں  
بھی خطرات کے احساس سے رگ و پے میں منتہی نہ دوڑتی ہو۔  
لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کہنے کو اب میں وطن واپس جا رہا  
تھا لیکن وہاں بھی نہ جانے کس طرح کے حالات میرے منتظر تھے۔  
یہ سوچتے سوچتے میرا ذہن غورنگی میں ڈوب گیا۔

○●○

غلام جب اسلام آباد ان پورٹ پر ان پورٹ کے نوچ رہے  
تھے۔ ان پورٹ پر بڑی رونق اور چل چل نظر آ رہی تھی۔ ہم کسی  
خصوصی ٹیلا رے میں نہیں آئے تھے۔ اس میں دوسرے عام مسافر  
بھی موجود تھے۔ پہلے انہیں نکل جانے کا موقع دیا گیا۔ بعد میں ہم  
ارٹیکل لائسنس میں آئے جہاں وزارت ثقافت کا سیکرٹری لیول کا  
کوئی بیورو کسٹ طائفے کو ریسیو کرنے آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ  
اسٹاف کے کچھ لوگ اور چند پریس فوٹو گرافر وغیرہ موجود تھے۔

بڑی ترتیب اور سلیقے سے پروڈکٹ کے مطابق تعارف وغیرہ  
کے مراحل طے ہونے لگے۔ مصالحوں ہونے لگے۔ دھڑا دھڑکائیں  
لائسنس کے جھماکے ہو رہے تھے۔ زیادہ تر کسٹروں کا رخ طائفے میں  
شمال لڑکیوں کی طرف تھا جو بڑی من موہنی مسکراہٹ کے ساتھ ہر  
ایک سے جھک جھک کر مل رہی تھیں اور سمجھ میں نہ آنے والے  
جملوں پر بھی ہوا دریا توں کے موٹی چٹا کر رہی تھیں۔

مجھے اس سارے سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن دل ہی  
دل میں حالات کی اس ستم خیز برہنہ ضرور آ رہی تھی۔ میرا نہ  
جانے اپنے ملک کی ثقافت سے بھی کوئی حقیقی تعلق تھا یا نہیں لیکن  
میں اس وقت ایک دوسرے ملک کے ثقافتی طائفے میں شامل تھا۔  
میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ کوئی بھی شخص مجھ سے کوئی سوال نہ  
کرنے پائے کیونکہ میں کسی میں جواب نہیں دے سکتا تھا جبکہ وہاں  
حجرت بھی موجود تھے۔

کرتے ہوئے بولا "وہ جا بجا اللہ کے نام پر۔ اللہ چمکے ہوویں کو لائے گا۔"

اس کی آواز گھنی گھنی سی تھی اور سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا لیکن وہ سلیمان نہیں ہو سکتا تھا۔ سلیمان خدا نہیں تھا۔

"تم نے مجھے بتا دیا کہ وہی ہے بابا! میں نے کہا "میرا دل چاہ رہا ہے تمہاری غیبت بیش کے لیے دور کروں۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے اسے ساتھ آئے کا اشتاء کیا اور ایک ٹیسی کی طرف بڑھا۔ وہ جلدی سے بولا "اس ٹیسی کو چھوڑیں۔ اس کا ڈرائیور بڑا بدعاش ہے۔ جو ٹیسی سب سے پیچھے کھڑی ہے اس میں بیٹھیں۔ اس کا ڈرائیور بہت اچھا آدمی ہے۔ میں ان سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"جس طرح تم کو مجھے میں اسی طرح کروں گا بابا! میں نے سعادت مندی سے کہا اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

فقیر نے آگے بڑھ کر خودی ٹیسی کا دروازہ کھولا اور پہلے مجھے بیٹھنے کا اشتاء کیا۔ اس ٹیسی کا ڈرائیور سویا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اونگھ رہا تھا۔ وہ مستندی سے اسٹیرنگ کو صلی سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ پارشل تھا اور پشیمان معلوم ہوا تھا۔ سر پر موٹی اونٹنی تھی اور وہ کمرے رنگ کی گرم شال پہنے ہوئے تھا۔

"مگر چنانا اے میب! ڈرائیور نے کھڑے لیے میں پوچھا۔

"کسی ایسے شاہجک امیر یا کی طرف چلو جہاں وہاں جلدی کھتی ہوں۔" میں نے کہا "ان بابائی کا ملیر تبدیل کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ صاف سترے کپڑے پہن کر نماز کو ایک معزز اور آسودہ حال آدمی نظر آئیں۔ یہ مجھے اس ملے میں ایسے نہیں لگ رہے۔"

"ڈرائیور نے ٹیسی اشارت کی اور ہوئی کے سامنے والی لائن سے نکال لایا پھر گردن گھمائے بغیر بولا "اس وقت تو مگر رہی دوکان کٹا نہیں ہوئے گا صیب! لیکن ان تم کو بازار چھوڑ دے گا۔"

"تو اس بندہ کو اور اپنی اصل آواز میں صحیح طریقے سے بات کرو۔" میں نے یکدم سی اسے ڈانٹ دیا۔

میں عقب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈرائیور چل پڑا اور یکدم بدلی ہوئی آواز میں بولا "میرا آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"ابھی میرے ہوش و حواس اتنے خراب بھی نہیں ہوئے کہ میں اپنے جاں نثار ساتھیوں کو بھی نہ پہچان سکوں۔" میں نے کہا۔

اس نے بڑی کامیابی سے دوپٹہ ہلا ہوا تھا لیکن میں نے ٹیسی میں بیٹھنے سے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ میرے خاص ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ اس کی اور آفتاب کی جوڑی ہوا کرتی تھی۔ آفتاب بھی میرا ایک خاص ساتھی تھا۔ دونوں دوست ہوا کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

سے نکال لیا۔ وہ سلیمان کی آواز تھی۔ اس کی کال کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری آمد اور ہوئی کے اس کمرے میں میری موجودگی سے واقف تھا۔

میرا ایک اپ عمدہ تھا۔ کئی گھنٹے کے سفر اور رات کو بہتر میں رہنے کے باوجود ذرا بھی خراب نہیں ہوا تھا۔ البتہ اب میں کافی طائفے والوں کے ملے میں باہر جانے اور اکیلا اوپر اوپر چڑھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرانے کا سبب بننا جبکہ مجھے لوگوں کی توجہ سے بچنا تھا۔

میں صرف کس میں عام سی ایک پینٹ شرٹ اپنی کپ اور تاریک چشمہ رکھ کر لایا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا ایک کپڑا بھی تھا۔ پینٹ شرٹ پہن کر اپنی کپ سر پر تاکر تاریک چشمہ لگا کر میں نے کپڑا گے میں نکالا اور تھکا تھکے نظروں سے ڈرنے کیلئے آہستہ میں اپنا جائزہ لیا۔۔۔۔۔ کوئی اچھا خاصا غور نہ دیکھنے کے بعد بھی مجھے کوئی ترک 'ارانی یا عرب تیلیج تو سمجھ سکتا تھا افضل چودھری نہیں سمجھ سکتا تھا۔

میں نے ہوئی کے کمرے کو الوداع کہا۔ صبح ممکن تھا کہ میں اب یہاں واپس نہ آتا۔ میری جگہ اصل فواد انکالیں کو بھیجا اب چارلس کا دور ہو رہا تھا۔ میں فٹ کے ذریعے نیچے آکر ہوئی کی لابی سے نکلا تو یہ دیکھ کر کہہ دے حیرت ہوئی کہ ابھی صبح کا اجالا صحیح طور پر نہیں پھیلا تھا۔

میں نے اوپر اوپر دیکھا تو ہوئی کے آس پاس کوئی نظرنہ آیا۔ سردی اس وقت بہت زیادہ تھی۔ اور گرد کھڑے درخت بھی سردی سے فطرتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دور فٹ پاتھ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے ایک فقیر کھڑا نظر آیا۔ اس سے پہلے بھی میں بار بار اسلام آباد ہوئی میں گھسنا تھا لیکن میں نے بھی اس کے آس پاس فقیر منزلانے نہیں دیکھا۔ خصوصاً سویرے سویرے جبکہ اسے کوئی بجیک دینے والا بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چند لمبیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے اندر لیتے سویرے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ میں چلوں کی جیروں میں پاتھ ڈالے شیشے کے سے انداز میں فٹ پاتھ پر چل دیا۔ عمر رسیدہ فقیر نظر آتا ہوا میرے قریب آگیا۔ اس کے جسم پر ایک بھنپاٹا اور دو کوٹ تھا۔ جیروں میں بیٹھے ہوئے جوتے تھے۔ لیے لیے اٹھے ہوئے سیاہ سفید بالوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور بے ترتیب ڈاڑھی مونچھوں میں مدغم ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے کا بہت کم حصہ نظر آ رہا تھا اور اسے بھی صحیح معنوں میں نظر نہ تھا کہ کہہ سکتے تھے کیونکہ اس پر بھی میل جا رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کے اور کوٹ کی ایک آستین ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھول رہی تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ڈنڈا تھا۔

کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ بلکہ بڑا ایک خاص قسم کے چیمبریز تھے جو ریڈ واٹ نے پالے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا ہر جاں نثار سامنے بہت عزیز تھا۔ آفتاب کی موت نے میرے دل میں بھی گماؤ ڈالا تھا لیکن آخر تو عمر سے تک سنبھل نہیں سکا تھا۔ تاہم اسی واقعے نے اس کے دل میں آتش انتقام بھی تیز کر دی تھی۔

پلیسی میں جینے کے بعد میں نے بھکاری کا بھی زیادہ قریب سے اور زیادہ غور سے جائزہ لیا تھا۔ وہ سلیمان ہی تھا لیکن اس کا میک اپ بہت عمدہ تھا حالانکہ احمد کی داؤدھی اصلی تھی جو یقیناً اس نے میری عدم موجودگی میں بدھائی تھی لیکن سلیمان کی معنوی داؤدھی اس سے بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے اس کے معنوی ہونے کا یقین صرف اس لیے ہو سکا تھا کہ اس میں سفیدی غالب تھی جبکہ سلیمان بشکل تین سال کا فوجیوں کا تھا۔

سلیمان اہم البت چند سیکنڈ کے لیے مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ "میں نے بھکاری کی طرف مڑنے ہوئے کہا "خصوصاً اس بازو کی وجہ سے۔ جس سے تم اپنے آپ کو خدا کا ظہر کر رہے ہو۔ یہ تم نے کیا ترکیب کی ہے؟ انسان اور دھوکے کی آہٹیں میں بھی بازو کو اس طرح تو ڈہرائیں کر سکتا کہ وہ خدا نظر آئے۔"

گاڑی میں ایک لمبے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ صرف انجی کی خفیف سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آخر کار سلیمان نے کھٹکار کر گھلا صاف کیا اور اپنی اصل آواز میں بولا "سرا یہ کوئی ترکیب وغیرہ نہیں ہے، میرا بازو واقعی کتا ہوا ہے۔ میں جی جی کا گنڈا ہوں۔"

اس کے لمبے میں قطعاً کوئی تاسف وغیرہ نہیں تھا۔ اس نے نہایت گفتگو جیسے میں مجھے یہ اطلاع دی تھی۔ میرے دل پر کھونسا لگا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری زبان چڑھی گئی۔ میری کچھ میں نے آیا کہ کیا کہوں۔

سلیمان اپنی جھانجھکاؤ داؤدھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پس کر بولا "سرا آپ تو اس ہو سکتے ہیں اس ادارے کی کیا بات ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"اتنی بے دردی سے اپنے بارے میں بات مت کرو۔ مجھے نیچر جی سے بتاؤ۔ یہ کس طرح ہوا؟" میں نے کوشش کی کہ میرے لمبے میں ارتعاش نہ پھیلے۔

"پھر میں سرا آپ اتنی سی بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟" وہ بے پروائی سے بولا "میرا باباں بازو ہی تو کتا ہے۔" وہاں تو اب بھی سلامت ہے۔ مجھے تو خوشی یہ ہے کہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح آپ کا دست و بازو ہوں۔ میں اب بھی ہر کام پہ سنبھلی کی طرح کر سکتا ہوں۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ تمہاری کارکردگی میں کوئی فرق تو نہیں پڑ گیا۔" میں نے قدرے تیزی سے کہا "میں نے جو پوچھا تھا

اس کا جواب دو۔ تمہارا بازو کیسے کٹ گیا؟ کس نے کاٹا؟" تب وہ غور جھکاتے ہوئے دیکھتے تھے میں بولا "سرا آپ کو یاد ہو گا۔ ریڈ واٹ کی ایک حلقوں آؤٹی ہوئی آئی تھی؟"

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں اتنے لمبے عمر سے غائب نہیں رہا ہوں کہ یہ سب باتیں بھول جاتا۔ اور نہ ہی میری یادداشت اتنی کمزور ہے۔ ریڈ واٹ کی تو ہر بات دلیے بھی مجھے قبر میں جانے تک یاد رہے گی۔ اب تو اس کے سوا کوئی بات اتنی ضروری محسوس ہی نہیں ہوتی کہ اسے یاد کر لیا جائے۔" میں تیزی سے یہ سب کچھ کہتا چلا گیا۔

"سرا وہ غلط خوراک جیسے لباس میں ہوتے تھے اور ان کی پشت پر ایک مختصر سا پس ہوا تھا۔ غالباً اسی میں وہ مشینری ہوتی تھی جس سے وہ آؤٹ تھے۔" سلیمان اب بھی مجھے گویا بھولی میری باتیں یاد دلانے جا رہا تھا "اس کے علاوہ ان کے سینے پر بھی ایک باکس بندھا ہوا تھا جس سے پھٹی چھوٹی چٹکی ٹشٹراں سی تیزی سے کھینچی اور آؤٹی ہوئی تھیں جو ہر چیز سے گزر جاتی تھیں۔"

"جیسا۔" میں نے ہماری سانس لے کر سیت کے پٹھے سے ٹیک لگایا "تو تمہارا بازو ان میں سے کسی ٹشٹری کے راتے میں آ گیا تھا۔"

"جی سرا" اس کے لمبے میں اب بھی ٹھٹھکی تھی "بازو بالکل اس طرح کٹ گیا تھا جیسے لپٹے سے صابن کا کوئی پکلا سا تار۔"

پھر اس کی انجی اب بھی منچوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ مسکرا رہا تھا "ہر بات کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو ہوتا ہے سرا۔ جو بعض اوقات ہمیں نظر نہیں آتا۔ اب یہی دیکھ لیتے کہ میرے معاملے میں بات صرف ایک بازو پر ٹھہری تھی۔ اس سے میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ ٹشٹری میرے سینے سے بھی گزر سکتی تھی۔ میرے دل کو وہ حوصلوں میں تقسیم کر لی ہوئی تھی کل سکتی تھی۔ میں کم از کم زندہ تو ہوں اور ایک بار پھر آپ سے مل رہا ہوں۔ میرے لیے یہی بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"ہیں سلیمان! اب میرا آگاہی دل رکھنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے دھیرے سے اس کا کاندھا تھپک کر کہا۔

اسی لمبے اس نے نہایت آہستگی سے سر کر دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا وہ اطمینان کر رہا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا؟ میں نے گردن گھما کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

اس نے مطمئن ہو کر اپنے مشکوٰۃ میں سے بکسوں کا ایک ٹرا خڑا سا ڈالا اور ایسی ہی ایک آدھ دو سری چیز ایک طرف کو کھٹکا لی۔ ان کے نیچے ایک موبائل فون موجود تھا۔ اس نے مشکوٰۃ گود میں رکھا ہوا تھا۔ موبائل فون اس میں سے نکالے بغیر اس نے نہر سچ کیا پھر فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

"سرا" وہ دوسری طرف سے کوئی آواز سن کر متوجہ نہ ہوئے

”اسی گھٹنے میں؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔  
 ”نہیں سر! وہ دھڑلے سے جہاں“ یہ طلیحہ جہاز میں بیٹھنے کے  
 لیے نہیں ہے مجھے پورے جہاز کے مسافروں کو اپنی طرف متوجہ  
 نہیں کرنا تھا۔ اس وقت ہمیں دوسروں کی توجہ سے بچنے کی ضرورت  
 ہے اس لیے ہم کل کچوں میں ریختے ہوئے کیزے بنے ہوئے ہیں  
 جن کی طرف دیکھتے ہوئے بھی لوگ نہیں دیکھتے۔ یہ اچھا ہی نوآباد  
 آپ کی فلاسفہ اسلام آباد کی تھی۔ درحقیقت ہم سب سناٹھی میں  
 جمع ہیں۔“

”کیوں؟ یہاں جمع ہونے کی کیا ضرورت آن پڑی؟“ میں نے دریافت کیا۔

دوسرا کل فون کو دوبارہ منکول میں چھپاتے ہوئے بولا "آپ  
کافی عرصے بعد واپس آئے ہیں سراسر اس دوران یہاں بہت کچھ  
ہو چکا ہے۔ بہت سے انقلابات آئے ہیں۔ بہت سے تعمیرات رونما  
ہوئے ہیں۔ آپ آہستہ آہستہ ہی ان کے بارے میں جان کیسے گے  
اور آپ کے لیے بہتر مقرر کیا ہے کہ مرطوب داران باتوں سے واقف  
ہوں۔"

”اور“ اس میں صرف اتنا ہی کہ سنا۔ کہنے کے پیشے پر مرد کی وجہ سے مہوئی ہو، دھندلا ہٹ پھیلی ہوئی تھی لیکن باہر اب صبح کا اچھلا نغمہ اُٹانے کا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف صبح کی دھوپ دھیرے دھیرے اپنا گنگنا دامن پھیلاتے لگی تھی۔ ماحول کی غوغا کچھ دور ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میرے اندر جیسے ایک بے عنوان یخ بگ بگاتی دھیرے دھیرے قدم بجا رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلیمان بولا ”ہر ایک ایک بڑی خبر البتہ میں آپ کو ابھی سنائوں تو بہتر ہو گا۔“ اس نے یہ کہہ کر دیا لیکن اس سے آگے بولنے کا کوا اس کا حوصلہ نہیں ڈالا۔

”کوکو! کوکو!“ میں نے سڑکانے کی کوشش کی ”مجھے معلوم ہے یہاں کچھ اچھی خبریں میری منتظر نہیں ہیں لیکن میں نے ہر خبر سننے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کر لیا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔ مڑھلوں وغیرہ کی روایت کو کہو۔“

”سرا! مفرد سر کا ہے۔ ہمیں افسوس ہے ہم اسے نہیں بچا سکتے۔“ سیلوان نے نہایت دھمے لگے ہیں کہا۔  
میرے اندر پھیلنے ہوئی رخ بنگلی کچھ بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں شاید پھر قوت گویا کی سے محروم ہو گیا تھا۔ خاموشی شاید گاڑی کے اندر ہی نہیں پھیلی تھی بلکہ میرے وجود میں بھی اتر گئی تھی۔

ریڈ ڈاٹ سے میری آخری معرکہ آرا کی لاہور میں دوزخ خانہ  
حفظ صاحب کے آبائی مکان سے شروع ہوئی تھی جس کے بعد میں  
نے فیصلہ کیا تھا کہ جان بچانے کے لیے میرا کسی طرف کو نکل جانا  
اور درویش ہو جانا ضروری ہو گیا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والوں کو کچھ دیکھ  
مٹا لے میں رکستے اور بس ٹائیڈ کرنے کے لیے میں نے مشورہ کو اپنا

ہوا "مس" "اے ون" بول رہا ہوں۔ چودھری صاحب پہنچ گئے  
 "ہر۔"

نوں پر دوسری طرف سے خفیف سی آواز مجھے بھی سنائی دے رہی تھی لیکن میں نے الفاظ سمجھنے کے لیے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ مجھ پر اس وقت خفیف سی بے زاری کا دورہ پڑا تھا اور ذہن پر اس وقت کی کچھ یادوں کی یلغار بھی تھی جب میں لاہور سے فرار ہوا تھا لیکن ان نوں پر غالباً کچھ بدایات دی جا رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی اس نے "میں سر" کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور احمد کی طرف متوجہ ہوا جو ایسی ڈرامائیور کے فرائض انجام دے رہا تھا یا پھر شاید تج کل اس نے مشتاق کی روپ دھار ہوا تھا۔ "تو اب تمہارے کوئی اور "سر" بھی ہو گئے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "یہ کون صاحب ہیں؟"

”سر! یہ ہمارے عارضی سر ہیں۔“ سلیمان نے جواب دیا۔  
 ”لیکن یہ کون؟“ میں نے ان کا سوال دہرایا۔

”یہ آپ کو جلد ہی اس سے ملنے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔“  
سیلان شہر سے مجھے میں بولا۔ وہ گویا سانس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے..... تمہیں اگر ماسٹر آف پنس بننے کے لیے یہی موقع مناسب لگ رہا ہے تو بین لو۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ احمر سے مخاطب ہوا ”بیڑہ کو ارڈر منجھنے کی جلدی نہیں ہے۔  
 سر نے کچھ فھر کر آنے کی ہدایت کی ہے۔ تم گاڑی اور بھی آہستہ  
 چلاؤ۔ بلکہ چاہو تو گاڑی واپس چھڑا کر ایک دو میل کا فاصلہ پکڑ کاٹ  
 لو۔“

اودھر اودھر گھومنے کے لیے چلے چکے کوئی اور راستہ نہیں تھا اس لیے احمد نے اس کی مدد پر عمل کرنے کی غرض سے گاڑی واپس سوڑی۔ اس سے پہلے میں نوٹ کر چکا تھا کہ گاڑی چکالہ انٹرپورٹ کی طرف جارہی تھی۔

ایک لمحے کی غاصوشی کے بعد میں نے کہا "میں نے استنبولی سے سینٹر و مضامین سے کراچی بات کی تھی۔ اس سے پتا چلا تھا کہ تم کراچی میں ہو۔" تم ایک میری آمد کا پروگرام معلوم ہونے کے بعد ہی یہاں پہنچے ہو؟"

”جی ہاں۔ میں اس وقت اشفاق سے کراچی میں تھا جب مجھے سینئر رمضان نظر آگیا اور میں اس سے مل بیٹھا۔ زر حقیقت اب ہم لوگ چٹا رہے تھے کہ آپ واپس آجائیں۔ ہم آپ کا سرائخ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اسی سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا۔ سینئر رمضان سے ملاقات، بہت فائدہ مند ہی رہی۔ وہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا۔ اس نے پرسوں کراچی میں مجھے آپ کے سارے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ میں کل ہی اسلام آباد پہنچا ہوں۔ آپ کے بروگرام کا چلنے کی سہولت ملے گی۔“

کی قابلِ رحم تصویریں تھیں۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ کروڑوں روپے مالیت کے ہر نقشِ عکسوں میں نامعلوم رہنے والا اور ہر وقت دولت کی چھین جھپٹ میں مصروف رہنے والا انسان کس کس حال میں زندہ رہتا ہے۔ سروائیو کر جاتا ہے۔

احمد گاڑی کو جمو پٹرول اور عیموں کے درمیان ہی نگ اور ٹیڑھے بیڑے راستوں سے گزارا آخر کار ایک جگہ جا رہا تھا جہاں سامنے ہی گاڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر چار پانچ مفلوک الحال افراد بیٹھے آتش پھیل رہے تھے۔ کسی کے تن پر مٹی اور پتھر نہ تو شور مچا تو قیس نہیں تھی کوئی مختصر مٹکائی اور واسکٹ میں تھا کسی کے تن پر ٹائلا کسی کی اتارن میں مٹی ہوئی تھیں بی بی پتلون تھی جس میں پلٹ کی جگہ ازار بند نظر آ رہا تھا۔ کوئی کھیلے وقت اپنے منہ سے کہاں اڑا رہا تھا اور کوئی لمبے لمبے اٹھے ہوئے بالوں سے بھرا سر کھرا رہا تھا۔

وہ ایک طرح کی بندگی تھی۔ اس میں ایک طرف گڑھے میں کندہ ایلی کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی کچھ پتلون کے جھلکے پڑے تھے جن پر چھایا بھجھک رہی تھیں۔ ایک عورت چلی اور لٹکا پٹنے پانی کا ایک گھنٹہ اٹھائے ایک نیچے میں جاری تھی۔

میں ابھی دکھ کی دھند سے نہیں اٹھا تھا۔ میں خدا کی اس بستی کا غور سے جائزہ تو لے رہا تھا لیکن ابھی تک میرے ذہن میں یہ سوال نہیں ابھرا تھا کہ احمد اور سلیمان مجھے یہاں کیوں لائے تھے۔ شاید میں ناشوری طور پر اس احساس سے مطمئن تھا کہ وہ یہاں آئے تھے تو کوئی مقصد تو ضرور رہا ہو گا۔

آتش کھیلے ہوئے موگر درختوں میں گھما کر فحاشی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سب ہی کی آنکھیں چند ہی چند ہی سی لگ رہی تھیں۔ میرے ذہن پر بھی افسروں کی دھند سے کچھ بھولے بسرے سے مناظر بھانک رہے تھے۔ یہ ماحول یہ نیچے یہ بستی یہ گرد و پیش مجھے کچھ جانا پچانا سا لگ رہا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں یہاں پہلے بھی آچکا تھا۔ ان لوگوں کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس ماحول سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ درحقیقت میں اس سے ملنے پہلے ماحول میں اپنی نوجوانی کے کچھ دن گزار چکا تھا۔ اسی طرح خانہ بدوشوں کی ایک بستی ہوا کرتی تھی جس سے کچھ دور پہلوی سی ایک کنسٹرکشن کمپنی نے ڈیرہ اڑالا ہوا تھا۔ وہ کمپنی ایک ٹیل قبیلہ کی تھی۔ میں اس کمپنی میں اکاؤنٹنٹ اور کسٹمر ہوا کرتا تھا۔ خانہ بدوشوں کی بستی میں لائی رہتی تھی جو کمپنی کے مزدوروں کے ساتھ چتر توڑی تھی اور بعد میں ملک کی نصف اولیٰ کی اداکارہ ستارہ بنی تھی اوس۔ اس کے ساتھ ہی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس میں دل کو گدگدانے والے لمحے بھی مقید تھے اور خون کے آنسو رلانے والے بھی۔ میں نے احساس کے جھمکے جھمکے احوال سے ناشور کا یہ درپچہ بند کر دیا۔ یہ ایسی یادوں میں اٹھنے کا وقت نہیں تھا اور نہ

بکے لینے کے لیے تیار کیا تھا۔ اس کے تھکا تھکا اور شکل صورت میں میری شبابت تھی۔ انفرادی ایک بت ایچے ایک اپ میں نے اس پر مزید محنت کر کے اسے بالکل میرا ہم شکل بنا دیا تھا۔ میں اسے اپنی جگہ چھوڑ کر ایک اپ میں کے گھر سے ہی ایک گوالے کے بسوہ میں نکل گیا تھا لیکن ریڈ واٹ کے لوگوں نے بہت دور تک میرا تعاقب کیا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میرا یہ بلف کامیاب نہیں رہا تھا۔ میرے خیالی میں اس صورت میں تو صندوق کو کوئی گزند نہیں پہنچی چاہیے تھی۔

سلیمان گھبرا میرے خیالات کو بڑھتے ہوئے بولا ”ریڈ واٹ والوں نے صرف چند لمحوں کے لیے دھوکا کھایا تھا کہ وہ آپ ہیں۔۔۔ اور وہ چند لمحوں کے لیے موت کا پیغام بن گئے۔ اس پر کسی ایسی گمن سے لڑا گیا تھا کہ اس کا پورا وجود گویا جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کی لاش کو پھینا لیکن جب تدفین کے لیے اسے فصل دیا جانے لگا تو لاش بالکل رت کے پت کے طرح بکھر گئی۔ بس یوں سمجھئے کہ ہم نے صندوق کی لاش کو نہیں بلکہ سیاہ رت کی ایک ڈھیری کو دفن کیا۔“

وہ الفاظ انہیں ”زہری کو بوندیں تھیں جو میرے لوم میں شامل ہو رہی تھیں اور نس میں ابھی تک سی لگ رہی تھی۔ سلیمان گویا اس زہری کی اذیت کو کچھ کم کرنے کی غرض سے بولا ”یہ مت سمجھئے گا کہ ہمارے پاس آپ کو کھانے کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اچھی خبر یہی ہے کہ ہماری قربانیاں ضائع نہیں گئیں۔“

احمد نے اس دوران ٹھیکس کو ایک بار پھر اسی موزلیا تھا۔ ہم دوبارہ چٹالہ از پورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر رواں تھے۔ جلد ہی ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سڑک سے کالی دور کے میں خانہ بدوشوں کی ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ اس سے کچھ اور نیچے خاصے فاصلے پر غالباً کسی قسم کا قبیلہ کی کام جاری تھا۔ بہت سے نیچے لگے نظر آ رہے تھے۔ کچھ عارضی سے کمرے بھی قبیلہ کے گھر تھے۔ بھاری مشینری بھی ادھر ادھر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ بلند دوز ”ڈھیر“ مکر اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ کہیں کہیں غالباً کھدائی ہو چکی تھی۔ مٹی کے بہت بڑے بڑے انبار نظر آ رہے تھے۔ پانی کے ٹنکر بھی کھڑے تھے۔ لگا ہی تھا کہ کسی بہت بڑے پرائیویٹ پر کام ہو رہا تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے عارضی سی ایک نیم پتہ سڑک بھی پائی تھی جو خانہ بدوشوں کی بستی کے قریب سے ہو کر گزر رہی تھی۔

احمد نے گاڑی اسی سڑک پر موزلی تھی۔ چند لمحوں بعد ہم خانہ بدوشوں کی بستی کے قریب پہنچے۔ وہ خانہ بدوشوں کی دیسی سی ایک بستی تھی جیسی عموماً شہروں کے گرد و نواح میں کہیں نظر آتی ہیں۔ بوسیدہ اور پتھر نہ تو کھڑوں کے نیچے ٹائٹ اور چٹائیوں کے بے بہم چھتر چھولی موٹی جمو پٹریاں ”غریبکہ“ رہائش کے لیے وہاں کی طرح کی تھیں موجود تھیں لیکن سب کی سب انسان کی غمت والا اس

یہ دل اس کے لیے آمادہ تھا۔  
گلہری کے تخت پر موجود افراد میں سے ایک نے اپنے بچے رکھ دیے اور تخت سے اتر آیا۔ وہ مختصر دھڑکی اور پھٹی ہوئی داسکت میں تھا۔ اس کا رنگ گندی تھا مگر اپنے دوسرے ساتھیوں میں وہ گورا لگ رہا تھا کیونکہ وہ سب سانولے تھے۔ وہ لہا اور دہلا تھا مگر اس کا جسم درزشی تھا۔ اس کی پٹلی ہوئی داسکت کے ٹہن گھٹے تھے۔ ڈبلے پتلے جسم میں بھی بچے بچے دکھائی دے رہے تھے۔

سلیمان ٹیکسی سے اتر کر میرے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اتر کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بہتی حیرت انگیز طور پر پرسکون معلوم ہو رہی تھی۔ چاروں طرف ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گندی رنگت والے ڈبلے پتلے اوجڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر خفیف مگر اصرار سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں اور ہر تاثر سے عاری دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے سر پر مختصر سی پکڑی تھی اور کان پر بڑی انگی ہوئی تھی۔ جس انداز سے وہ اٹھ کر آگے بڑھ کر مجھ سے مل رہا تھا اس سے میں بھی سمجھا کہ وہ اس بستی کا سردار یا اسی قسم کی کوئی اور معزز شخصیت ہوگی۔

احمد بھی ٹیکسی سے اتر کر میرے برابر قن کرکڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سرا! آپ ان لوگوں سے ملیں۔ بات چیت کریں" گاڑی کی ضرورت ہو تو ان میں سے کسی سے بھی کہہ دیجئے گا۔ گاڑی حاضر کر دی جائے گی۔ میں چلا ہوں۔ میری اسلام آباد ہوئی پڑھائی گئی ہوئی ہے۔

وہ بڑا بڑا ٹیکسی ڈرائیور معلوم ہو رہا تھا۔

"سرا! میں چند غیر ٹیکسیوں کی نگرانی کر رہا ہوں جو وہاں مقیم ہیں۔" احمد نے جواب دیا۔

"تمہیں اس ڈھونڈ پر کس نے لگایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سرا! آپ یہاں بیٹھیں گے، باتیں کریں گے تو آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ میں اب چلا ہوں۔" اس نے مجھے سلیٹ کیا اور گاڑی پر مشکل ریورس کر کے واپس روانہ ہو گیا۔

میرا ہاتھ ابھی تک اس سردار ناپ شخصیت کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے اس سے میرا تعارف نہیں کرایا تھا لیکن اس نے مجھے صحیح نام سے مخاطب کیا اور اس وقت مجھے حیرت کا خفیف سا محسوس ہوا کہ جب اس نے روانی سے انگریزی میں کہا "واپسی مبارک ہو مسٹر چودھری! آپ بڑے اچھے وقت پر آئے ہیں۔ ہم آپ کی آمد کے منتظر تھے۔"

"اچھا وقت...؟" میں نے اپنے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالنے ہوئے کہا "کیا یہ سب اچھے وقت کی نشانی ہیں مسٹر...؟"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ہاں مسٹر چودھری! اچھا وقت! اب مجھے

ماحول اور اچھی چیزوں کا نام نہیں۔ اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب حالات آپ کے حق میں اچھے ہوتے ہیں اور کسی کے آنے کا سب سے اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہوئی ہے۔"

وہ میرا ہاتھ تھامے مجھے ایک قریبی خیمے کی طرف لے چلا جو دوسرے خیموں کی نسبت بہتر حالت میں تھا اور بڑا بھی معلوم ہو رہا تھا۔ خیمے میں داخل ہونے سے پہلے وہ رک کر مسکراتے ہوئے بولا "یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا مسلحہ دھڑکی ابھی میری کامیابی کی ایک پھول سی دلیل ہے۔"

"میں اس وقت جبکہ آپ اس بات پر خوش ہو رہے ہیں میں نے آپ کو پہچان لیا نہیں صاحب! میں نے فہرے فہرے لیے میں کہا۔"

انہوں نے ایک اور ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت بہت خوش معلوم ہوتے تھے ورنہ وہ تو دھیما سا بھی قہقہہ لگانے والے آدمی نہیں تھے۔ نہیں صاحب ملک کی سب سے بڑی خیرہ انجینی کے سردار تھے۔ میں جب ریڈ ڈاٹ کی کمائی لے کر مجبوراً ان کے پاس گیا تھا تو ان کا تو عمل کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں نے انہیں کوئی فرضی اور تخریق اھل کمائی بتا کر ان کا قیمتی وقت ضائع کیا ہے۔ ایسی کمائی جو قطعی طور پر میرے تخیل کی پیداوار تھی۔

مجھے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ہکا بھٹی نگر نہیں تھی لیکن مجھے جب خود اصرار سے پتہ چلا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے ہمارے ملک کو کیا کیا خطرات لاحق تھے تو میرے دھڑکنے کوڑے ہو گئے تھے حالانکہ وہ معلومات مکمل نہیں تھیں، مگر جڑی تھیں۔ وہ پوری فلم نہیں صرف ٹریلر تھا لیکن اسے دیکھ کر ہی کم از کم ان لوگوں کی تو راتوں کی نیند اور دن کا چین خرام ہو سکتا تھا جنہیں ملک سے ذرا سی بھی دھڑکی اور محبت تھی۔

نہیں صاحب نے میری خوب دل شکنی کی تھی اور مجھے ہوس کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن میں نے بہت نہیں ہاری تھی اور انہیں ہاکل کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں۔ میں ان کے پاس کافی بڑی سفارش کے ساتھ گیا تھا۔ ان پر کچھ دباؤ بھی تھا۔ آخر کار انہوں نے ملک کی دوسری دو خیرہ انجینیوں کے سرداروں سمیت میرے ساتھ ایک میٹنگ رکھی تھی لیکن نتیجہ اس کا بھی ڈھاک کے تمہیدات والا ہی رہا تھا۔

آدم ری طور پر انہوں نے دوسری دو خیرہ انجینیوں کا بھی تعاون حاصل کر لیا تھا اور اس مقصد کے لیے جو ایک کمپنی سی بنائی گئی تھی اس کے وہ خود انچارج تھے۔ یعنی ری طور پر ریڈ ڈاٹ کے مسئلے میں اگر کچھ کیا جاتا تو اس قسم کی مداخلت کارروائی انہی کی نگرانی میں انہی کی منصوبہ بندی اور احکامات کے تحت ہوتی لیکن افسوس کی بات صرف یہ تھی کہ اس قسم کی کوئی کارروائی شروع ہونے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ میں اس جگہ جہاں وہ "خیرہ" میٹنگ

کیونکہ میں تمہارے لیے خانہ بدوش نہیں بنا ہوں۔" نہیں صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ان کا اس طرح مسکراہٹ اور خوش خلقی کے ساتھ مجھ سے بات کرنا بھی میرے لیے قدرے نیران کن تھا کیونکہ ان سے میری آخری ملاقات تک ان کے رویے میں سروسمی رکھائی اور بے اعتباری برقرار تھی لیکن اب کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے ظاہری طے میں ہی نہیں ان کے رویے میں بھی انقلاب آچکا تھا۔ مجھے کے اندر کوئی نہیں تھا لیکن وہ لوگ جو باہر سخت پریشان نہیں صاحب کے ساتھ آتش کھیل رہے تھے، اُنھ کے ہمارے پیچھے پیچھے اندر آچکے تھے۔ خیمے میں سازو سامان ایک "روسلو" کے خانہ بدوش سے بستر تھا۔ قدرے صاف بستر تقریباً صبح سالم چارپائیاں لٹکانا پکانے کے لیے مٹی کے تیل کا اسٹوڈ برتن اور پٹنے کے لیے موزے وغیرہ موجود تھے۔ سامان اتنا اچھا بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے ایک خانہ بدوش کے خیمے میں دیکھ کر کٹک میں پڑ جاتا اور انکار بھی نہیں تھا کہ اسے استعمال کرنا ایک معیبت ہوگی۔

نہیں صاحب نے مجھے ایک موزے پر بیٹھے کا اشارہ کیا اور خود میرے مقابل بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے آنے والے تین افراد بھی خاموشی سے ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ وہ اب ایک لگ بھگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ گویا میں ان کی نظر میں کسی اور تیار سے آنے والی مخلوق تھا۔

نہیں صاحب ان میں سے دو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "اگر تمہارا ذہن پر زور دو شاید ان دو حضرات کو بھی پہچان لو۔"

میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا "میں نے ذہن پر زور دے بغیر ہی پہچان لیا ہے۔ یہ باری صاحب اور شہرار صاحب ہیں۔"

یہ دونوں حضرات ملک کی باقی دو خیرہ ایجنسیوں کے سربراہ تھے لیکن ان کے پہلے بھی بلاشبہ اتنی عمر کی سے بدلے ہوئے تھے کہ ان کے قریبی جاننے والے بھی انہیں مشکل سے ہی پہچان سکتے تھے۔ مجھے یاد تھا ان میں سے شہرار صاحب نہایت عمدہ جسم کے رکھنے والے تھے لیکن اب اس وقت وہ ایک جڑنی کا راسخ میں رہائے کش لے رہے تھے اور بگلی بجا کر راکھ جھاڑ رہے تھے۔ ان کے جسم پر پٹا ہوا کوٹ اور وسیعہ ظلالہ تھی اور انہوں نے سر پر ایک سیلا پکٹ منظر بانڈہ دکھا تھا۔

میری بات سن کر ان دونوں حضرات نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ یوں انہماک سے سر ہلایا جیسے وہ اپنی دلی کسر کے سامنے موجود کوئی مسلمان تھے اور میں نے کپیر کے فرائض انجام دیتے ہوئے ان کا تعارف کر لیا تھا۔

میں نے ایک چارپائی سے نیک لگاتے ہوئے کہا "مجھے خانہ بدوشوں کی اس جہتی پر رشک آ رہا ہے جس میں اتنے بڑے بڑے

منشد ہو رہی تھی، ایک گاڑی دھماکے سے اڑی تھی اور ان کا ایک توڑی مارا گیا، اس کے باوجود انہیں میری باتوں پر نہیں کیا تھا اور وہ اپنے وسائل کو حرکت میں لاتے دکھائی نہیں دیے تھے۔ کم از کم اس وقت تک تو دکھائی نہیں دیے تھے جب تک میں اسلام آباد اور لاہور میں رہا تھا۔ اگر وہ میرا ساتھ دیتے تو شاید مجھے جان بچانے کے لیے دور دراز علاقوں کی طرف نہ بھجواتا۔

مجھے ان کو بچانے میں ذرا سی تاخیر اس لیے ہوئی تھی کہ ان میں واقعی سر سے پاؤں تک ان کی اصل شخصیت کی کوئی معمولی سی جھلک بھی موجود نہیں تھی۔ وہ سرخ و سپید آدمی تھے لیکن اس وقت گندی نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں مٹی جیسی لیکن اس وقت سیاہ نظر آ رہی تھیں۔ پہلے وہ کلین شیو ہوا کرتے تھے لیکن اس وقت ان کی واڈھی مچھلی خوب بچی ہوئی تھیں۔ چال ڈھال، حرکات و سکنات بھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صرف نام کی حد تک ہی نہیں بلکہ واقعی ہر لحاظ سے ایک نہیں آدمی منطوم ہوتے تھے لیکن اس وقت کچھ ایسی کمزوری اور کثرت شخصیت کے مالک نظر آ رہے تھے جیسے یہ اسی ایلیٹے اور اس ماحول میں ہوئے ہوں۔

میری بات تو یہ تھی کہ میں ایسے کسی مقام پر ان کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک ایسے اہم شخص تھے جو کبھی وہاں نہ رہتے ہوئے حکومتوں کو بناتے اور گرانے میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ وہ بے شک ایک خیرہ ایجنسی کے سربراہ تھے لیکن ان کی حیثیت ایک مدت سے اور نہایت طاقتور ہو کر کٹھن کی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس پر وہ کثرت ہو کر اور دفتر دونوں جگہ بے پناہ آرام و تسکین کی زندگی گزارنے کا عادی تھا خانہ بدوش کی بہت میں ایک خانہ بدوش ہی کے رویے میں موجود ہو سکتا تھا۔ میں یہاں ان کی موجودگی کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بھی مجھے ان کو بچانے میں ذرا دیر لگی تھی۔ پھر بھی ان کے انداز سے یہی ظاہر تھا کہ میں نے انہیں ان کی توقع سے پہلے پہچان لیا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں ان کے انگریزی بولنے کے باوجود انہیں نہیں پہچان سکتوں گا۔

"نہیں صاحب! آپ کا میک اپ بہت عمدہ ہے۔" میں نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے انہیں راہ دی۔

"میک اپ سے زیادہ اہم وہ مدتیہ ہوتا ہے جو آپ کی شخصیت میں دخل جانے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔" نہیں صاحب بولے "اگر آپ بولوں ڈھونڈنے والے مزدور بنے ہوں لیکن آپ کا مدتیہ پوریاں ڈھونڈنے والے مزدور جیسا نہ ہو تو میک اپ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا "اس صورت میں آپ کو میرے ساتھ انگریزی میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" "میرا جسمیں پسین میں چلا دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا



تھی اور ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے میرے لیے جتنی دشواریاں پیدا ہوئی تھیں ان کی کچھ نہ کچھ جتنی شاید میرے لیے میں جھلک آئی تھی لیکن اب تو نہیں صاحب کو میری جتنی سے بھی لطف اعمدہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر لگا سناقت لگایا۔

پھر وہ نہایت جمل اور تنبیہ کی سے بولے "میرا فضل چودھری! اس وقت کے اور آپ کے حالات میں بہت فرق ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں بہت اٹھکابات آچکے ہیں۔ اس وقت... جب تم ریڈ ڈاٹ کی کمائی لے کر ہمارے پاس آئے تھے اس وقت میرا اس سلسلے میں بے اعتنائی کا مظاہرہ کرنا اور بظاہر تمہاری بات پر یقین نہ کرنا بھی ہماری حکمت عملی کا ایک حصہ تھا۔"

"کیا؟" میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔  
"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" نہیں صاحب بدستور سنجیدہ تھے۔ اس دوران نہیں صاحب کے تیزے سانس نے "جو میرے لیے ابھی تھا" اسٹوپر چائے تیار کی تھی اور نہایت سستے لیکن صاف ستھرے گلوں میں لاکر ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ نہ جانے کیوں اس خیمے کے داخل میں ان گلوں سے اٹھتی ہوئی چائے کی مکھکھے بہت جلدی محسوس ہوئی حالانکہ میں چائے وغیرہ کا کچھ ایسا شوقین نہیں تھا۔

نہیں صاحب اپنا کمر اٹھا کر پر خیال انداز میں اس میں جھانکتے ہوئے بولے "تم جب ریڈ ڈاٹ کی کمائی لے کر ہمارے پاس آئے تو درحقیقت وہ ہمارے لیے نئی نہیں تھی۔"

یہ میرے لیے ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ وہ مجھے کچے ہمدردی کے حیرت گانے سے بڑھا دینے پر تامل ہوئے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "میں سرائی ل چکا تھا کہ بہت سے غیر ملکی، جن میں اکثریت سفید فاموں کی تھی، نہ جانے کس کس حیثیت کی آڑ میں ہمارے ملک میں کچھ عجیب و غریب اور پر اسرار قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھے جنہوں نے اسیاتی سرگرمیوں کو بھی پیچھے چھوڑنا تھا لیکن ہمارے پاس کوئی ٹھوس تفصیلات نہیں تھیں۔ پہلی بار ہمارے پاس کچھ تفصیلات تم لے کر آئے تھے۔"

"جنہیں آپ نے بظاہر تھا۔" میں نے کہا۔  
"ہم نے تمہاری ہی بھلائی کی خاطر ایسا کیا تھا۔" نہیں صاحب جمل سے بولے۔

"میری بھلائی کی خاطر؟" میں نے ایک بار پھر بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں تمہارے ساتھ میٹنگ سے پہلے ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کی باقاعدہ کوئی تنظیم ہے جس کا نام ریڈ ڈاٹ ہے اور جس نے دنیا کی تمام مافیاؤں کو پیچھے چھوڑا ہے۔ ان کے مقاصد اتنے اونچے ہیں اور وہ سائنسی طور پر اتنے زیادہ قریبی یافتہ ہیں۔ یہ باتیں ہمیں پہلی بار تم سے ہی معلوم ہوئی تھیں کیونکہ تم اتفاق سے اور ان کی نظر نہایت سے ان کے انتہائی خفیہ لوگوں کی سرگرمیوں کی طرف دیکھا۔"

لوگ ان تجلیوں میں موجود ہیں۔ میں تو اس قسم کی صورت حال کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

نہیں صاحب نے بھی اپنے کان پر سے جیری آٹار کر سٹائی اور سرگراں لے کر بولے "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ عام خانہ بدوش کی ہستی نہیں ہے۔ یہ ہستی ہم نے ہی بنائی ہے۔ ہم نے ہی اس میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے لیکن درحقیقت اس میں کوئی حقیقی خانہ بدوش موجود نہیں۔ یہاں موجود سب لوگ ہماری ایجنسیوں کے گوی ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے سر ہلایا۔ "آپ نے اپنی دانست میں بڑی کامیابی سے اس ہستی میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے۔ یہ شک اسے دیکھنے والا کوئی بھی شخص اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اب غور کر رہا ہوں تو مجھے ایک کی محسوس ہو رہی ہے۔"

نہیں صاحب نے جیری کا ٹکس لیتے ہوئے سوالیہ انداز میں تجھوس اچکا نہیں۔ میں نے اپنا تاریک چشمہ اتار کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا "مجھے اس ہستی میں عجیوبوں اور جھوٹوں کے سامنے نگہ دھڑنگ مفلوک الحال اپنے کیلئے نظر نہیں آتے جو شور مچاتے ہوئے ہماری جیبی کے پیچھے بھاگتے اور اس کے پیر وغیرہ ہٹنے کی کوشش کرتے۔"

نہیں صاحب نے ایک لمحے کے لیے ذرا ذور سے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ اپنے سیاہ کوشٹ لینز کی موجودگی کو محسوس کر رہے تھے۔ پھر وہ انہات میں سر ہلاتے ہوئے بولے "تمہارا مشاہدہ تیز ہے۔ ہستی میں کتنے ہی تم نے ایک خامی نوٹ کر لی ہے کوئی اور شاید ہی محسوس کر سکے۔ بہر حال ایسی بات نہیں ہے کہ اس ہستی میں بننے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہم نے چند بچوں کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ البتہ اس طرح بے حساب بننے نہیں ہیں جس طرح کسی خانہ بدوش ہستی میں ہونے چاہئیں کیونکہ خانہ بدوش... پلاننگ کے قائل نہیں ہوتے۔"

شرار صاحب کھٹکڑا کر گھا صاف کرتے ہوئے بولے "ویسے اس ہستی میں عورتیں بھی کم ہی ہیں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس دیرانے میں یہ ہستی بنانے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی؟" میں نے دل میں چلتے ہوئے سوال کو آخر کار زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

"یہ ضرورت ہمیں ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے پیش آئی ہے۔"

نہیں صاحب نے بلا آمل جو اب دیا۔  
"ریڈ ڈاٹ؟" میں نے معنوی حیرت سے کہا "آپ کے فرمان کے مطابق تو اس قسم کی کسی حکیم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ محض میرے تخیل کی پیداوار تھی۔ سائنس ٹکنس تھا۔ آپ اس کے لیے اتنے قریبی کیونکر بن گئے؟"

میں نے ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے جو تفلیس انتہائی خفیہ دو تہائی حکم جبر، دیگر، خفیہ، صاحب کے دوتے نے مجھے جو اذیت پہنچائی

نکار ہو گیا۔

آئے تھے لیکن افسوس کہ تم ان تک ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔

”اگر میں دوبارہ ان ٹھکانوں تک پہنچنے کے قابل ہوتا تو میں خود ہی اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان سے ٹھننے کی اپنی سی کوئی تدبیر کرتا۔“ میرے لہجے میں اب بھی غیر ارادی طور پر جھکی سی جلیبی تھی ”میں آپ کے پاس اسی لیے تو دوڑا دوڑا آیا تھا اور آپ تک ہی لیے اتنی بڑی سفارش کے ساتھ اپروچ کیا تھا کہ آپ اتنی بڑی طاقت کے مالک ہیں، آپ کے پاس اتنے وسائل ہیں آپ ان کا پتہ چلا سکتے ہیں اور ان سے ٹھننے کی کوئی تدبیر کریں۔ یہ ملک و قوم کی سلامتی اور تحفظ کا مسئلہ تھا۔“

”درست ہے، ہم تمہارے اس جذبے کے پیش قدمی قدر دان رہیں گے۔ تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان لوگوں کی ہدایات کی خلاف ورزی کی تھی اور ہم تم سے رابطہ کر لیا تھا حالانکہ انہوں نے تمہیں بت گئی تھی اس قسم کی کسی کوشش سے منع کیا تھا۔“ نفیس صاحب بولے۔

”میں بڑی افسوس سے لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔“ میرے لہجے میں اب بھی کرب تھا۔

”ہمیں خوب اچھی طرح اندازہ ہے۔“ نفیس صاحب نے نفیس انداز میں سہلایا۔ ”ہمیں یہ بھی اندازہ ہے کہ ہمارے مدینے سے تمہارے دل پر کیا گزری ہوگی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنی سی سبب الوہی کو کافی سمجھ کر اس قسم کی کوششوں سے ہاتھ کھینچ لیتا اور اپنی جان کی فکر کر لیتا یا ہاتھ باندھ کر دوبارہ ریڈ ڈاٹ کے سامنے حاضر ہو جاتا اور انہوں نے جو پیشکشیں کی تھیں، جو لالچ دیے تھے، انہیں قبول کر لیتا۔ لوگ اس سے کہیں کم قیمتوں پر ملک و دشمنوں کے ہاتھوں بک جاتے ہیں۔“

”اس کے باوجود آپ نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں ابھی تک آپ کی اس مصلحت کو نہیں سمجھ سکا۔“ میں نے کہا۔

”جس اسی طرف آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ انہوں نے چائے کی چمکی لی پھر گویا بڑی کسٹھ سے خوب لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے ”یہ مسئلہ بت لکھا ہوا تھا۔ ہم مسائل کو اس طرح نہیں دیکھ رہے تھے جس طرح تم دیکھ رہے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ ریڈ ڈاٹ والے خود تو بے حد مستحکم، طاقتور اور آنے والے زمانوں کی مانتی ایجادات سے یس تھے۔ لیکن ہمارے بھی نہ جانے کس کس جگہ میں کس کس شخص کو انہوں نے اس طرح خرید لیا تھا کہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے اور جو خدمات وہ انجام دے رہا ہے وہ اس ملک و قوم کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوں گی۔“

”درست ہے“ میں نے تسلیم کیا ”یہ دو چار افراد مختلف اتفاقات کے تحت مجھ سے بھی گرا گئے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ذمہ نہیں پہنچا کسی نہ کسی انداز میں وہ موت کا

”ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نہایت خاموشی اور رازداری جتنے ہم نے کچھ لوگوں پر ہاتھ ڈالا لیکن وہ سب کے سب چارہ سراز انداز میں مر گئے۔ بعض کے بارے میں تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ انہیں ہلاک کیا گیا تھا یا انہوں نے خود کشی کی تھی۔“ نفیس صاحب یہ کہتے ہوئے ایک لمحے کے لیے متاسف نظر آنے لگے ”ان میں ہمارے کئی بہت سی محترم بہت سی قابل اعتبار اور ہماری دانست میں نہایت بے دروغ ماضی رکھنے والے لوگ شامل تھے۔“

انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا پھر کرسی سانس لے کر بولے ”اس کے بعد ہمارے لیے یہ کتنا مشکل ہو گیا تھا کہ ہمارے دائیں یا بائیں ہاتھ پر جو شخص بیٹھا ہے وہ سوائفڈ اور خالصتاً ہمارا اور اس ملک کا وفادار ہے۔ بکا ہوا نہیں ہے۔ اس صورت حال نے ہمیں مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ ہم کوئی بھی قدم اٹھانے نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام کرتے وقت بھی ہمیں یقین نہیں ہوتا تھا کہ ہم اسے پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اسی لیے ہم نے بظاہر ہمسایہ بات پر بالکل یقین نہیں کیا اور تم سے کوئی وعدہ تک نہیں کیا کہ ہم اس مسئلے میں کوئی رسمی کارروائی بھی کریں گے۔ ہمیں انٹریڈ تھا کہ اگر یہ بات ذرا بھی ٹیک آؤٹ ہو گئی کہ تمہیں ہمارا تعاون حاصل ہو چکا ہے تو تمہیں فوراً ہلاک کر دیا جائے گا۔ ریڈ ڈاٹ اپنی ساری توجہ اسی بات پر مرکوز کر دے گی۔ ہم نے اپنی دانست میں تمہارے لیے خطرات کم کرنے کی کوشش کی تھی اور اندر ہی اندر اس صدمے کے سلسلے میں کام شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلا ضروری کام تو یہ تھا کہ ہم نے اپنے ان خاص خاص ساتھیوں کا انتخاب شروع کیا جنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنے اپنے جگہ اور اس ملک کے ساتھ اتنے مخلص ہیں کہ وقت پڑنے پر اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔“

”آپ کی اس عظیم الشان احتیاطی تدبیر کا مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مجھے تو پھر بھی ان کے قہر و غضب کا نشانہ بننا پڑا اور پھر جان بچانے کے لیے بڑی تدبیروں کے ساتھ یہاں سے بہت دور جانا پڑا۔“

”خیر ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ تم چاک اس طرح بھاگ نکلے اور غائب ہو جاؤ گے۔ ہم تمہاری حفاظت کے کچھ ایسے منصوبوں پر غور کر رہے تھے جن سے ہمارا یا حکومت کا کوئی تعلق نظر نہ آتا لیکن اسی دوران ریڈ ڈاٹ کل کر تم پر حملہ آور ہو گئی۔ اس کے کچھ ہر کارے کھل کر سامنے آ گئے۔ وزیر خارجہ حفظ صاحب کے آبائی مکان پر لاہور میں تمہارا ان لوگوں سے جو ”مرکز رہا اس میں تمہارا راج لکھنا ایک عجیبی تھا۔“

”یہ گناہی کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ شاید وہ میرے کام آگئی۔“ میں نے کہا ”ٹھانڈوں کے لیے ہر بے گناہ کو جو کسی شخص اپنی گھم بندگی کی بنا پر ہلاک کرنا اتنا آسان ہوتا تو آج

نکروا میں تمہارے صرف ایک ساتھی کو جان سے ہاتھ دھو رہے ہیں یہ ان لوگوں کے ہمارے ساتھ آئے سے پہلے کی بات ہے جب سے انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر کام شروع کیا ہے ان میں سے کسی کو کوئی خاص مرکز نہیں پہنچی البتہ مختلف خطرات کا برداشتوں میں ہمارے کی ادنیٰ کام آچکے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمہارے آدمیوں نے ہمارے آدمیوں سے زیادہ مصلحتی معاملہ فہم اور ذہین ہونے کا ثبوت دیا۔ خصوصاً اس لڑکی کی صلاحیتیں دیکھ کر تو یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی لڑکی ہے۔

”اب صورت حال کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”صورت حال اب بھی کچھ عجیب سی ہے۔“ نفیس صاحب لٹھری سانس لے کر بولے ”ریڈ ڈاٹ کچھ اس انداز میں ہمارے ملک میں بکھری ہوئی تھی اور اس کے ذریعہ لوگ کچھ اس طرح مختلف جگہوں میں سرایت کر چکے تھے کہ کسی ایک آہٹن کے ذریعے اس کا خاتمہ ممکن نہیں تھا۔ تعداد میں وہ ب لوگ مجموعی طور پر شاید چند ہزار سے زیادہ نہ ہوں لیکن ان کے پاس بھیجی ساتھی ایجادات موجود تھیں ان کو دیکھتے ہوئے اندیشہ تھا کہ کسی جہاز راست اور فیصلہ کن تصادم میں وہ لوگ چند منٹ میں ہزاروں ہمارے ملک کو کھڑکھڑا سکتے تھے۔“

”اس خطرے سے تو میں بھی آپ کو آگاہ کر چکا تھا۔“ میں نے یاد دلایا۔

”درست ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ ہمیں کچھ جیس ہاتھ آنے کے بعد ہوا۔“ نفیس صاحب بولے ”ان کے اصل اور بڑے ٹھکانے ہمارے تین شہروں میں تھے۔ کراچی، لاہور اور اسلام آباد۔۔۔۔۔ لاہور میں تو باقاعدہ ان کی ایک زیر زمین دنیا آباد تھی۔ ایک لاکھ لاکھوں اور طلسمائی دنیا۔ جس کی تم سیر کر چکے تھے۔“

”کیا آپ اس زیر زمین دنیا تک پہنچ گئے؟“ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے بے آلتی سے پوچھا۔

”ہاں“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا ”میں تو وہ سب سے بڑا کارنامہ تھا جو ہم تمہارے ساتھیوں اور خصوصاً اس لڑکی راجیلہ کی وجہ سے انجام دے سکے۔“ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا ”ہاں ایک اور لڑکی نے اس ضمن میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ انہی کے کپ کی لڑکی تھی لیکن اس نے گویا ان سے غداری کرتے ہوئے ہمارا ساتھ دیا۔ اگر وہ ہماری مدد نہ کرتی تو شاید ہمارا ریڈ ڈاٹ کی لاہور والی زیر زمین دنیا تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہوتا اور اس پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں تو بہت سی خون ریزی ہوتی۔ نہ جانے کتنی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس کی مدد اور راجیلہ کی کاغذ و کارروائیوں کی وجہ سے کام آسان ہوا اور زیادہ جانی نقصان نہیں ہونے پایا۔ ان واقعات کی تفصیل تمہیں راجیلہ سے معلوم ہو جائے گی۔“

وہ بھرپور سی لیتے ہوئے بولے ”اب سوچنا ہوں تو واقعی ایسا لگتا ہے جیسے وہ سائنس کائنات پر مبنی کوئی خواب تھا جس سے ہم سب گزر رہے تھے۔ ہر لمحے یہ محسوس ہوا تھا جیسے ابھی آگے نکل

دنیا کی آبادی بہت کم ہوتی اور قدم قدم پر ایک فرعون کا راج ہوتا۔“

”بے شک“ نفیس صاحب نے سر ہلایا ”بہر حال ہم وہاں کے حالات سے بے خبر نہیں تھے۔ لاہور میں جو کچھ ہوا اس کی رپورٹ ہمیں فوراً ملی اور ہمارے آدمی ذرا تاخیر سے سہی، لیکن حرکت میں آئے۔ ان واقعات کا ایک ناکہ ہوا کہ ہمیں پہلی بار صحیح معنوں میں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ کارآمد سراغ ملے اور ہم ان پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئے۔“

”کیا؟“ میں تقریباً اچھل پڑا ”آپ نے ریڈ ڈاٹ پر ہاتھ ڈال دیا؟“

”ہاں“ نفیس صاحب نے خاصی طمانیت سے اثبات میں سر ہلایا ”نہ صرف ہاتھ ڈال دیا بلکہ ہم نے ان کی کمر بھی توڑ دی ہے۔ اب وہ پہلے جیسی طاقتور تنظیم کے طور پر توانی نہیں رہی اور نہ ہی اس کے وہ بڑے بڑے منصوبے پائی رہے ہیں جن کے ذریعے وہ ہمارے ملک کو ایک تماشگاہ اور تجربہ گاہ بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس کا زیادہ تر کرڈٹ تمہارے ساتھیوں۔۔۔۔۔ خصوصاً اس لڑکی کو جانا ہے جس کا نام راجیلہ ہے۔“

راجیلہ! میرے دل میں ایک نفیس سی آہٹی۔ میں نے جب اسلام آباد آخر پیش از رپورٹ پر قدم رکھا تھا تب سے میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے ابھی تک کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا۔

نفیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے ”مجھے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ احمد، سلیمان، منیر، مسعود، مثنیٰ، شبیر، شیخ، منیف خان، شفیع شاہ اور سردار علی وغیرہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ وہ تمہارے کاروباری ساتھی ہیں لیکن عام سے کاروباری آدمی نہیں ہیں۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جاتے وقت تم راجیلہ کو انچارج دیتے تھے۔ اس نے سرداری کا حق ادا کر دیا۔ وہ بڑے ہی کمال کی چیز ہے۔“

”وہ ہے کہاں؟“ میں نے بظاہر ہر سکون لمحے میں پوچھا میں اپنے لمحے کے اضطراب کو چھپانے میں بے مشکل کامیاب ہوا تھا۔ ”تمہارے سب ساتھی ہمیں اسلام آباد میں موجود ہیں۔ کافی عرصے سے وہ ایک طرح سے ہمارے ہی جھگے کے آدمیوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہاں۔۔۔۔۔ اسی بستی میں خانہ بدوشوں کے روپ میں موجود ہیں اور کچھ مختلف مقامات پر مختلف سرورہوں میں، مختلف ڈپارٹمنٹس سرانجام دے رہے ہیں۔“

یہ سن کر میرے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ سلیمان کو ایک بازو سے محروم دیکھ کر اور مصدر کی موت کی خبر سن کر میرے دل پر جو کھاؤ سا بھارتا اس کی ازیت میں ڈرا کی ہوئی دہنہ مجھے تو اپنے بانی ساتھیوں کے بارے میں بھی تشویش ہو چلی تھی۔

نفیس صاحب بولے ”ریڈ ڈاٹ جیسی خطرناک طاقت سے

کی ہوتی ہے۔ سب کچھ ہمیں سے کنٹرول ہوتا تھا۔ اہم احکامات ہمیں سے جاری ہوتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید اب یہاں زیادہ افراد موجود نہ ہوں لیکن ان کے نیت و روک کو کنٹرول کرنے والے آلات... کوئی بہت بڑا کھینچ ٹرانز انڈکشن اور کچھ بہت چار کھنچ قسم کی سائنسی ایجادات ہمیں موجود ہیں جو محض کوئی ایک منٹ دبائے جانے کی خاطر ہیں جس کے بعد خوف ناک تاجی ہمارا مقدر ہو سکتی ہے۔"

ہائے گی اور سب کچھ غائب ہو جائے گا، جیسا ثابت ہو گا۔"  
"وہ لڑکی کون تھی جس نے ان کے کیمپ میں ہوتے ہوئے آپ کی مدد کی؟" میں نے پوچھا۔ "مجھے تو یہ ناممکن ہی بات لگ رہی ہے۔"  
"ایک لحاظ سے تم صحیح کہہ رہے ہو۔" نفیس صاحب نے تسلیم کیا۔ "ان کے کیمپ کا کوئی شخص تو نڈاری کا تصور نہیں کر سکتا لیکن وہ لڑکی دراصل بنیادی طور پر ان کی ساتھی نہیں تھی یعنی سفید فام نہیں تھی۔ وہ ہمیں کی تھی۔ تم اسے جانتے ہو۔ وہ بھی ہمیں بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ بلکہ شاید وہ تمہاری عقیدت مند ہے کسی زمانے میں وہ پرنس تھینہ کے نام سے انٹرکلائن میں وائس کیا کرتی تھی۔"

"اور وہ..." میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ درحقیقت اپنی کاؤکر کر رہے تھے جسے ریڈ ڈاٹ والوں نے برین واش کے ذریعے اپنے اشاروں پر پانچنے والی کھینچ بنایا ہوا تھا لیکن ان کے سائنسی تجربات کے دوران شاید اس کے ذہن کے کچھ غلٹے ان کی پسند کے سانچوں میں ڈھلنے سے بچ گئے تھے اس لیے اس نے پرنس تھینہ کے روپ میں بھی میری مدد کی تھی جس کی وجہ سے وہ ریڈ ڈاٹ کے ذریعہ قاتل بن گئی تھی اور انہوں نے اسے غائب کر دیا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کس طرح اس نے ریڈ ڈاٹ کے خلاف آپریشن میں نفیس صاحب کے اور میرے ساتھیوں کی مدد کر ڈالی تھی۔ خیر یہ تفصیلات تو میں بعد میں معلوم کر سکتا تھا۔ فی الحال تو میں مختصر سب کچھ جانا چاہتا تھا۔

"میں سمجھ گیا آپ کس کاؤکر کر رہے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ مہر حال آپ لاہور والی ذریعہ زمین دنیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے؟"

"ہاں" نفیس صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور وائس کی جیب سے ایک اور چیری نکال کر نکلتی "وہ ذریعہ زمین دنیا تباہ ہو چکی ہے۔ کچھ ہمارے ہاتھوں تباہ ہوئی کچھ انہوں نے خود تباہ کر دی تاکہ چیریں ہمارے ہاتھ نہ لگنے پائیں۔ اس کے باوجود بہت سی چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں۔ بہت کچھ معلوم ہوا۔ بہت سے افراد ان کے ہنگامے گئے۔ اس کے بعد ہی ہمیں پتا چلا کہ کراچی میں ان کی اس قسم کی کوئی ذریعہ زمین دنیا موجود نہیں ہے لیکن وہاں بہت سے اہم افراد موجود ہیں جو اوپر اوپر بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی ہم انہیں تلاش نہیں کر سکے۔ ان تک نہیں پہنچ سکے۔ ہمیں پہلے اسلام آباد کی طرف توجہ دینی پڑی کیونکہ یہاں ان کی دوسری ذریعہ زمین دنیا موجود ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ ایک بار مجھے اسلام آباد کے نواحی علاقے سے افغان کیا گیا تھا اور میری آنکھ ایک عجیب الف لیڈی اور ظلماتی سے انول میں مٹکی تھی۔

نفیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "درحقیقت ان کے یہاں والے ٹھکانے کی حیثیت وہی تھی جو انسانی جسم میں دماغ

انکا، اقبالہ، سونا گھاٹ کا پجاری

غلام روہیں، امیر تیل، درخشاں، خبیث

کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور

پراسرار ٹاول

برہم چاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب

کتابت و طباعت

قیمت - - 150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

برائی یا سیاسی مصلحتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے دو تین مغربی ملکوں کے لوگ یہاں مختلف مقاصد کے تحت سرورے وغیرہ کی آڑ میں بہت عرصہ ڈیرے ڈالے بیٹھے رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس دوران وہ کیا کرتے رہے ہوں۔

وہ خاموش ہوئے تو میں نے کہا ”اب آپ لوگ غالباً مزدوری وغیرہ کے بہانے دائرہ سلائی اسکیم پر کام کرتے ہوں گے اور فورسز کے آدمیوں کے ساتھ کام کی گہرائی کرتے ہوں گے۔ آپ لوگ اچانک پیش آنے والی کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار رہتے ہیں؟“

”ہاں“ اپنے دوسارے کے مطابق تو تیار رہتے ہیں۔“ نہیں صاحب نے جواب دیا۔

اچانک ساٹولا سائیک شخص اپنی بیوند زہر قیس کی آستین سے ناک پر ٹھٹھا ہوا نیچے میں داخل ہوا اور منوربانہ لہجے میں بولا ”سرازم آئی ہیں۔“

سب لوگ احزاناً اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک برقع پوش عورت خیمے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر پورا انتخاب تھا لیکن خیمے میں داخل ہوتے وقت اس نے نقاب الٹ دیا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا آدھا چہرہ بالکل سیاہ اور آدھا سرخ و سپید تھا۔ اور وہ بھی عبودی انداز میں۔ یعنی پیشانی کے درمیان سے لے کر نثرے کے درمیان تک۔

اگر اس کا چہرہ افقی انداز میں یعنی ایک کان کی لورے لے کر دوسرے کان کی لور تک سیاہ ہوتا تو اسے بڑی آسانی سے آٹے سے نقاب میں چھپایا جاسکتا تھا لیکن وہ اوپر سے نیچے تک سیاہ تھا اور رنگوں کی اس تقسیم میں اتنی صفائی تھی گویا کسی مسورے تصویر بنا کر باقاعدہ انکسلیں رکھ کر تصویر کے آٹے سے چہرے میں سیاہ رنگ بھر دیا ہو۔



نواب حیدر علی  
الماس ایم اے قیمت: 200/-

”اب آپ اس زیر زمین دنیا کی تلاش میں یہاں پرے ہیں؟“ میں نے تعجب سے چاہی۔ ”سچہ انتہائی جدید کیمپوں کے تیار کردہ نقشے نہیں لائے اور میں کچھ انتہائی جدید کیمپوں کے تیار کردہ نقشے اور دیگر تفصیلات وغیرہ کو بھی جن میں سے بیشتر ہمارے لیے ناقابل فہم تھیں۔ بہر حال ہمارے کئی شعبوں کے ماہرین نے ان پر سرکھیا کیا۔ کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی وہ زیر زمین دنیا اس علاقے میں آٹھ دس میل کے قطریں کہیں موجود ہے۔ ہم ان ایسے طریقوں سے... کہ کسی کو شک نہ ہونے پائے اس علاقے کو کھنگال چکے ہیں۔“ خاص حالات کے ذریعے کیمپوں کے ذریعے گاڑیوں کے ذریعے پہاڑوں اور بلی گاڑیوں کے ذریعے چنے چنے کا جائزہ لے چکے ہیں لیکن ہمیں کسی زیر زمین دنیا کا سراغ نہیں ملا لیکن جو چیزیں ہمیں ملی تھیں ان کی مدد سے بہر حال ایک سمت کا تعین کر کے ہم کام کر رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔“

”مجھے تو یہاں کوئی کام ہوتا نظر نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔ ”کام یہاں نہیں ہو رہا۔ تم نے شاید دیکھا ہو یہاں سے چند فرلانگ دور کنسٹرکشن کے لیے کیمپ لگے ہوئے ہیں۔ کھدائی وغیرہ ہو رہی ہے۔“ آج تو خیر پچھلی کا دن ہے۔ وہاں بھی ہمیں کام ہوتا نظر نہیں آ رہا ہو گا۔ ہوا اصل میں یہ ہے کہ ہماری خوش قسمتی سے یہاں کچھ عرصہ پہلے ایک بہت بڑی دائرہ سلائی اسکیم پر کام شروع ہوا تھا۔ قریب ہی ایک جھیل واقع ہے۔ ہم جب ریلوے ڈاک کے پکر میں اس طرف حوجہ ہوئے تو ہم نے ترکیب یہ کی کہ ریلوے رفته کنسٹرکشن کمپنی کے تمام ملازمین کو ایک ایک کر کے ایک اور جگہ بھجوا دیا گیا جہاں وہ ایک اور جگہ پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے تمام بورڈ مشینری وغیرہ اسی طرح یہاں سوخا دیا۔ راتوں رات نہایت خاموشی سے صرف افراد تبدیل ہوتے رہے۔ کمپنی کے آدمیوں کی جگہ فورسز کے آدمیوں نے لے لی اور اسی دوران ہم نے یہاں یہ خانہ بدوشوں والی بہت سی تحقیق کروائی۔ بظاہر ہم کہیں سے بلی گاڑیوں اور گدھوں پر سفر کرتے ہوئے یہاں آئے تھے اور یہ جگہ خالی دیکھ کر ساں ڈیرے ڈال لے گئے۔“

دو گھنٹے کے لیے کو ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے تو میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”تمہیں تو اچھی ہیں بشرطیکہ کامیاب ہوں۔“

”نہیں صاحب برے“ اب صورت حال یہ ہے کہ بظاہر وہاں دائرہ سلائی اسکیم کا کام جاری ہے لیکن ساتھ ہی مخالف سمت میں ایک بڑی سرنگ بھی کھودی جا رہی ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ شاید ریلوے ڈاک والوں نے اپنے زیر زمین قلعہ کو اوپر سے تیل کر دیا ہو۔

”چین پر بظاہر اس کی موجودگی کا کوئی نشان نہ ہو۔ ممکن ہے وہاں کوئی ذی مدح بھی موجود نہ ہو لیکن تباہ کن چیزیں موجود ہوں جنہیں کہیں اور سے کنٹرول کیا جاسکتا ہو۔ اس لیے ہم نہایت خاموشی اور رازداری سے وہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ زیر زمین قلعہ یہاں موجود ہو لیکن آدورفت کارا سے انہوں نے کسی اہمیت دور کھو ڈالا ہو کیونکہ ہماری حکومتوں کی ہے

## اے حمید کی ایدو خیر سیریز

### عاطفون

- ۱۔ اہرام مصر سے فرار 150/-
- ۲۔ اندلس کی آخری شمع 125/-
- ۳۔ ہڑپہ کی ناگن 125/-
- ۴۔ عاطفون موت کے دروازے پر 200/-

### شیو سینا کے دہشت گرد

- ۱۔ ٹاپ سیکرٹ مشن 150/-
- ۲۔ کشمیر کے غازی 150/-
- ۳۔ کھانڈوا کیش 200/-
- ۴۔ گو لکندہ کے مجاہد 200/-

- گنگا کے پجاری ناگ (اول) 150/-
- گنگا کے پجاری ناگ (دوئم) 200/-

### مکتبہ القریش

ازد و بازار، لاہور

فون : 7224665

میں بھی غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک کب اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اسے غائب کرنا چاہتا تھا کچھ کنا چاہتا تھا لیکن میری زبان جیسے تالوت چپک گئی تھی۔

وہ راجیلہ تھی! اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ بھی گویا اپنی جگہ بے ہن کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے نیچے کا ماحول گویا ساکت ہو کر رہ گیا۔ آخر کار راجیلہ نے ہی یہ سکوت توڑا "اپنی... تم!" تب میں نے تھوک نکلے ہوئے یہ مشکل کہا "یہ کیسا ہے وہ؟" تم کا میک اپ ہے۔ آدھا چوہا سیاہ وہ بھی اوپر سے نیچے کی طرف۔" نیچے میں دوبارہ سکوت بھاگ گیا۔ آخر راجیلہ نے کھٹک کر گھاٹ ماف کیا اور سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی "یہ میک اپ نہیں ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تو پھر یہ کیسا ہے؟" راجیلہ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بظاہر اس کے اوٹھلا ہوا منہ کھٹک رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خفیت ہی اُداسی نمودار تھی۔ وہ بے پروائی سے بولی "مثالیہ قسمت کا لکھا ہے۔" پھر شاید کچھ بھی نہیں ہے۔ تم اس کی فکر میں مت الجھو۔ اپنی خانہ؟ تم ٹھیک تو ہونا؟ تم اچانک ہی بھاگے تھے جس نے زیادہ مصائب کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟" "میرے مصائب کو کوئی مارد۔" میں نے تیزی سے کہا اور اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا "میں اپنے مصائب کو بھول چکا ہوں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم نے یہ اپنا چوہا سیاہ کون سا سیر کر رہا ہے؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟" "یہ میں نے نہیں کسی اور نے کیا ہے۔" وہ جیسے لمبے میں بولی۔

میں نے نہیں صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش رہے۔ ان کا چوہا سیاہ تھا۔ راجیلہ جلدی سے بولی "اس کی طرف مت دیکھو۔ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ میں بتا تو چکی ہوں کہ یہ میک اپ نہیں ہے۔" "تو پھر یہ کس کا کام ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جانکا۔

"بات ذرا لمبی ہے آرام سے بیٹھ کر کریں گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ تم اب دوبارہ بھاگنے کی تیار ہیں کر رہے؟" وہ اپنے لمبے میں پرانی فائنٹی لائے کی پوری کو شش کر رہی تھی۔ "نہیں۔ میں اب ہرگز نہیں بھاگوں گا۔ خواہ جان ہی جلی جائے۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر ہی فیصلہ کن ہو گیا "میرا خیال ہے میں نے پہلی مرتبہ ہی بھاگ کر غلطی کی تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

”نہیں۔ وہ بلکہ ڈس کیا گیا فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ اچھا ہوا تم پیش معتر سے ہٹ گئے ورنہ شاید حالات اور زیادہ خراب ہوتے۔ اب حالات بہت مختلف ہیں۔ اب تم آگے ہو یہ بہت اچھا ہوا ہے۔“

”خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے چہرے سے یہ سیاہی صاف کیوں نہیں کر دیتیں؟“ میں نے کہا۔  
”مگر کوئی تو ضرور کر دیتی۔“ وہ مسکرائی۔

”کیا مطلب؟“ میں نے بدستور ایک بے عنوان سا اضطراب محسوس کرتے ہوئے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی ”یہ بدنامی کی کالک سے بھی زیادہ بچی سیاہی ہے۔ بدنامی کی کالک بھی وقت کے ساتھ ساتھ دور ہو جاتی ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں اُتر سکتی۔“

وہ مسکرا کر گویا بات کی عینگی کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے دل میں شانا پھیلنا چلا گیا۔ میں ایک تک اس کی طرف دیکھا رہا۔ اس کا چہرہ جو ایک مغزو حسن کا حامل تھا، بد دیکھنے والوں کو ایک لمحے کے لیے مبہوت سا کر دیتا تھا۔ اس وقت شخص اس ایک تبدیلی سے نہایت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ دیکھنے والے کو شاید یہی گمان گزرے کہ وہ کسی قسم کا مذاق کر رہی تھی جس طرح بعض بچے یا بڑے دوسروں کو ڈرانے کے لیے چوہوں پر بھیاک ماسک لگا لیتے ہیں۔ یہ خیال کے آسکنا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ مذاق نہیں کر رہی تھی لہذا وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔

”تم مجھے بتاؤ تو کسی آخر یہ کس طرح ہوا ہے؟“ میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

”یہ سب کچھ صحیح طور پر فہمائے کے لیے خاما وقت چاہیے۔ دو چار جھلوں میں بات تمہاری کچھ میں نہیں آئے گی۔“ وہ یوں محسوس ہوئی گویا کسی لمحے پہنچے کو کسی شد سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”میں اتنا مصروف آدمی نہیں ہوں کہ تمہارے بارے میں کوئی اہم بات نہ سن سکوں۔ میں جب مصروف تھا تب بھی کم از کم تمہارے سامنے تو میری مصروفیات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ خوش دلا سے مسکرائی ”میں تو درحقیقت یہ چاہ رہی تھی کہ پہلے نہیں صاحب سے وہ ضروری بات کر لوں جس کے لیے میں یہاں آئی تھی۔ باقی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اس وقت ہمیں یہاں دیکھ کر مجھے زندگی کا ایک بڑا سربراہان ملا ہے۔“

”کیا تمہیں میری آمد کی اطلاع نہیں تھی؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے غمی میں سر ہلایا۔

”دوسرے ساتھیوں کو تھی۔“ میں نے اسے بتا دیا۔  
”مجھے کسی نے نہیں بتایا۔“ اس کے لیے میں ہلکے ہنسنے لگا تھا۔

”میں نے اسے بتا دیا۔“ اس کے لیے میں ہلکے ہنسنے لگا تھا۔

”حالات خواہ کچھ بھی ہوں یہ لوگ سچسپ ہیں اس کے لیے کوئی شش ماہ سے باز نہیں آتے۔“

پھر وہ نہیں صاحب کی طرف مڑی اور کسی سنجیدگی سے بولنا

”میرا میں آپ سے ابھی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔ کیا واقعی اسے امریکا یا کینیڈا لے جانا ممکن نہیں ہے؟ میں نے بارے میں اس نوعیت کا آپریشن ممکن ہے۔ شاید اس کی جان بچائی جاسکے۔ انسانی ہمدردی تو اپنی جگہ ہے لیکن میں سوچتی ہوں اگر اس کی جان بچ جائے اور اس کا ذہن مکمل طور پر بیدار ہو جائے تو شاید وہ ہمیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ اور بھی بتا سکے۔ میرے

ہوئے انسان کے بارے میں اس طرح خود غرضی سے سوچنا اچھا نہیں لگتا لیکن میں کچھ مجبوری کے سے عالم میں اس طرح سوچ رہی ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کے خاتمے کے لیے ہم نے اپنا سب کچھ سونپ کر اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی ہے اب اس آپریشن کو کسی نہ کسی طرح انتقام تک تو دیکھنا ہے۔“

اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں یہ سب کچھ کہا تھا۔ میرے لیے یہ اطلاع افسوس اور تشویش کا باعث تھی کہ ابھی تک زندگی اور موت کی کشمکش میں جھلا تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے بارے میں سبیا طور پر کچھ پیش گوئی کی تھی۔ استعمال کی جاسکتی تھی لیکن بعض لوگ نہ جانے کیوں بد قسمتی کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا ایسا نہیں زندگی بھر اچھے نہ رہتا ہے۔ وہ زندگی میں کئی بار بہت ہی نادر موصوف پر میرے کام آئی تھی۔ میں اس کے بارے میں مزید جانتا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں نے نہیں صاحب اور راجیلہ کی گفتگو میں مداخلت مناسب نہیں سمجھی۔

نہیں صاحب ایک لمحہ بڑھ چلا نظروں سے راجیلہ کی طرف دیکھنے رہے پھر اپنی پھنسی ہوئی شکل پھیل چلی مدنی دار و اسکت کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے ”وہی تو میں بھی پہلے ہی تمام ڈاکٹروں سے بات کر چکا ہوں لیکن تمہاری تسلی کے لیے ایک بار پھر مجھ کو کڑی

رحمان سے بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر وہ اجازت نہیں دے گا تو کئی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ کربل رحمان ہمارے ملک کے چند ایک قابل ترین نورو سرجنسٹریں سے ایک ہے۔“

نہیں صاحب کا ہاتھ دار و اسکت سے باہر آیا تو اس میں کچھ ہلکا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سکتی ہوئی جڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر لکھا۔ اپنی پھنسی پرانی دھول کو سنہلے وہ ایک چارہائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی کچھ اشارہ کیا۔ میں اور راجیلہ موصوفوں پر بیٹھ گئے۔ راجیلہ ان کی طرف ہر اسید بھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نہیں صاحب نے بازو عب لہجے میں کہا ”سرجن کربل رحمان سے بات کر اؤ۔“

اس کا ہاتھ دار و اسکت سے باہر آیا تو اس میں کچھ ہلکا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سکتی ہوئی جڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر لکھا۔ اپنی پھنسی پرانی دھول کو سنہلے وہ ایک چارہائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی کچھ اشارہ کیا۔ میں اور راجیلہ موصوفوں پر بیٹھ گئے۔ راجیلہ ان کی طرف ہر اسید بھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نہیں صاحب نے بازو عب لہجے میں کہا ”سرجن کربل رحمان سے بات کر اؤ۔“

اس کا ہاتھ دار و اسکت سے باہر آیا تو اس میں کچھ ہلکا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سکتی ہوئی جڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر لکھا۔ اپنی پھنسی پرانی دھول کو سنہلے وہ ایک چارہائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی کچھ اشارہ کیا۔ میں اور راجیلہ موصوفوں پر بیٹھ گئے۔ راجیلہ ان کی طرف ہر اسید بھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نہیں صاحب نے بازو عب لہجے میں کہا ”سرجن کربل رحمان سے بات کر اؤ۔“

اس کا ہاتھ دار و اسکت سے باہر آیا تو اس میں کچھ ہلکا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سکتی ہوئی جڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر لکھا۔ اپنی پھنسی پرانی دھول کو سنہلے وہ ایک چارہائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی کچھ اشارہ کیا۔ میں اور راجیلہ موصوفوں پر بیٹھ گئے۔ راجیلہ ان کی طرف ہر اسید بھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نہیں صاحب نے بازو عب لہجے میں کہا ”سرجن کربل رحمان سے بات کر اؤ۔“

اس کا ہاتھ دار و اسکت سے باہر آیا تو اس میں کچھ ہلکا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سکتی ہوئی جڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر لکھا۔ اپنی پھنسی پرانی دھول کو سنہلے وہ ایک چارہائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی کچھ اشارہ کیا۔ میں اور راجیلہ موصوفوں پر بیٹھ گئے۔ راجیلہ ان کی طرف ہر اسید بھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نہیں صاحب نے بازو عب لہجے میں کہا ”سرجن کربل رحمان سے بات کر اؤ۔“

اس کا ہاتھ دار و اسکت سے باہر آیا تو اس میں کچھ ہلکا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سکتی ہوئی جڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر لکھا۔ اپنی پھنسی پرانی دھول کو سنہلے وہ ایک چارہائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی کچھ اشارہ کیا۔ میں اور راجیلہ موصوفوں پر بیٹھ گئے۔ راجیلہ ان کی طرف ہر اسید بھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نہیں صاحب نے بازو عب لہجے میں کہا ”سرجن کربل رحمان سے بات کر اؤ۔“

ہیں۔ ممکن ہے ان کے زیر زمین قلعے کے گرد بھی کچھ ایسے انتظامات موجود ہوں۔ کوئی ایسا غیر مرئی ہالہ موجود ہو جس کی وجہ سے ہمارے حساس آلات بھی اس کی موجودگی کی نشاندہی نہ کر سکتے ہوں۔ ہمیں ان کے کیمپوں سے جو تعلق ہے اس سے ان میں اس مخصوص ٹکڑے کی ہر حال کوئی اہمیت ظاہر کی گئی تھی جس کا صحیح مطلب ہم نہیں سمجھ سکتے۔

راجیلہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "یہ بھی ممکن ہے کہ جب ہمارے لوگ کھدائی کرتے ہوئے واقعی اس زیر زمین قلعے تک پہنچ جائیں تو اچانک کوئی زیر دست چابی شروع ہو جائے۔ ان کے خفاقی انتظامات کچھ اس قسم کے ہوں کہ ہم یہ کارروائی کر کے پچھتانے پر مجبور نہ ہو جائیں؟"

"ہم تقریباً اٹھ م کی سی چابی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔" نفیس صاحب نے پلٹوہ لے ہوئے جواب دیا "تم سے اب کوئی بات چھپی ہوئی تو نہیں ہے۔ جسیں معلوم ہی ہے کہ کسٹرکشن مشینری کی آڑ میں وہاں کیا کچھ موجود ہے اور پھر قد رے اطمینان کی بات یہ ہے کہ یہاں چاروں طرف کالی دور دور تک دراندہ ہے۔ زیادہ جانی اور مالی نقصان کا امکان نہیں ہے۔"

راجیلہ خاموش رہی۔ ان کی گفتگو سے حالات کی تصویر بیری نظر میں بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک نفیس صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک گوشے میں چھپی ہوئی چٹائی کے پاس بیٹھ گئے۔ اس چٹائی پر چند گدڑیاں سی بھی لپٹی ہوئی رکھی تھیں۔ پڑاٹا سا ایک تختہ بھی رکھا تھا۔

انہوں نے وہ چیریں ایک طرف کو کھسکائیں اور چٹائی کا کونا اٹھا کر اس کے نیچے سے زور رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ نکالا۔ لفافہ راجیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولے "یہ وہی چند تصویریں ہیں جو ریڈ ڈاٹ کے کیمپوں سے ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ انہیں تم سیکرٹ سروس والوں کو بھجوا دینا۔ وہ انہیں اپنے خاص والٹ میں محفوظ کرادیں گے۔ پتا چلا ہے کہ یہ تصویریں کسی طرح بھی ہمارے ہاں پرنٹ نہیں ہو سکتیں۔ کسی بھی فوٹو گرافنگ جیبر ان کے پرنٹ نہیں نکل سکتے۔ یہ تصویریں کسی عجیب سی میزبل پر ہیں جو ان کے کیمپوں کے پرنٹرز میں استعمال ہوتا ہے۔"

راجیلہ پوچھنی سرسری سے انداز میں ان تصویروں کو لفافے سے نکال کر دیکھنے لگی۔ شاید وہ پہلے بھی انہیں دیکھ چکی تھی۔ وہ پلاسٹک کی ٹرانسپیرنٹ پلیٹ پر تھیں اور دونوں طرف سے دیکھی جاسکتی تھیں لیکن کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ نہ تو فیکرے کی تصویر تھیں نہ معلوم ہوتی تھیں اور نہ ہی ہاتھ کی بنی ہوئی نہ کسی عجیب سی مکینک میل کے ذریعے تیار شدہ لگتی تھیں۔

ساتویں وہ تقریباً عام کتاب کے برابر تھیں۔ راجیلہ انہیں تاش کے پتوں کی طرح ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہی تھی۔ وہ کچھ عرصہ اور مردوں کی تصویریں دیکھیں۔ وہ سب سفید

تھا جبکہ ان کا ٹیبلہ اور گرد و پیش کوئی اور سی تصویر پیش کر رہا تھا۔ اس فنکار سے لطف اندوز ہو سنا تھا بشرطیکہ اس وقت میرا کچھ غم نہ ہو۔ اس کے اطمینان سے میں نے اٹھ بھاگے۔

چند گھنٹے بعد نفیس صاحب کا راجیلہ ہرجن رحمان ہے ہو گیا۔ چند منٹ باقی کرتے رہے آخر کار فون بند کر کے دوبارہ اپنی کمر میں چھپاتے ہوئے بولے "ہرجن رحمان بھی جی کو کہیں قتل کرنے کے حق میں نہیں ہے کسی دوسرے ملک لے جانا تو ہمارا وہ اسے ایک ہسٹرے دوسرے ہسٹرے منتقل کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ وہ دینے بھی اس کی زندگی کے بارے میں پرامید نہیں ہے۔ اس کے خیال میں وہ ایک جھٹکا ہوا چارٹ ہے۔"

راجیلہ فون پر ان کی گفتگو کے دوران ہی یہ نتیجہ اخذ کر چکی تھی۔ اس کے آگے سیاہ، آگے سفید چہرے پر مایوسی کھیل چکی تھی۔ نفیس صاحب گویا اسے سمجھاتے ہوئے بولے "جو چیز ہمارے سامنے نہیں اس کے بارے میں ہمیں غور نہیں ہونا چاہیے۔" "ہمیں شاید غور نہیں۔ شکر ہوں سرا۔" راجیلہ خیمے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لیے میں بولی "کچھ اندازہ محسوس ہو رہا ہے کہ جس نقشے سے ہم نے فکری لی اگر جلد از جلد اس کا سرچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو وہ ہمیں دوبارہ ڈے گا۔"

نفیس صاحب ٹھوڑی سیلے ہوئے پرخیاں انداز میں اس کی طرف دیکھتے رہے۔ راجیلہ بولی "اس وقت ہمارے ارد گرد ایک کمرٹ سا طاری ہے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آ رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں گہرا ہے جیسے ساف ڈیو ہو کر مل میں گھس گیا ہے اور زیادہ خطرہ آ رہا ہے کہ لے اپنی توانائیاں جمع کر رہا ہے۔ یہ موت کسی خوفناک کا پیش خیمہ ہے۔"

"ہم اپنی سی کو خش کر رہے ہیں۔" نفیس صاحب بولے "ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے بہت بڑی منصوبہ بندی کی ہے اور بہت ماکس نمائیت خاموشی سے اس میں لگا رکھے ہیں۔ تم اس منصوبہ کی ایک کاپی چھو۔ مجھے امید ہے کہ وہاں چٹائی کی آڑ میں جو رنگ کھودی جا رہی ہے وہ ہمیں ریڈ ڈاٹ کے زیر زمین قلعے تک لے جائے گی۔"

"لیکن ہمارے انتخابی جدید اور انتخابی حساس آلات نے بھی نا علاقے میں کہیں زیر زمین کسی غیر معمولی چیز کی موجودگی کی نشاندہی نہیں کی ہے۔" راجیلہ بولی۔

"ہمیں اس سے پوچس نہیں ہوں۔" نفیس صاحب بولے "میں موضوع پر ایک مینٹگ میں ہم بات کر چکے ہیں۔ ہم سائنسی آلات میں ریڈ ڈاٹ کے مقابلے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جن کی فاصلوں نے یہ تنظیم بنائی ہے ان کے اپنے ٹکڑوں میں بھی وہ آلات مقرر عام پر موجود نہیں ہیں جن سے انہوں نے ریڈ ڈاٹ کو ٹھیک کر کے اس کے آگے بڑھنا اور ان کے جیسے



کات کر جوڑا گیا ہو۔

نام معلوم ہوتے تھے۔

”ان میں سے کچھ مرچے ہیں اور کچھ کی ہمیں تلاش ہے۔“  
راجیل نے گویا میری معلومات کے لیے سرسری سے انداز میں بتایا۔

اچانک ایک تصویر میرے سامنے آئی۔ وہ اسے ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے لگی تو میں نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا اور اجازت طلب نظروں سے نہیں صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر رازداری مانع نہ ہو تو میں اس تصویر کو ذرا غور سے دیکھ لوں؟“

نہیں صاحب دوسرے سے نہیں لیے ”بڑی دیر میں گفتگو کا خیال آیا نیز افضل چوہدری ابھی تک ہمارے سامنے جو باتیں ہوتی رہی ہیں وہ سب ہی انتہائی رازداری کی تھیں۔ غلط بدوش کی آڑ میں جکارا ہواں موجود ہونا ہی ایک اہم راز ہے۔ اب تم سے بھلا کون سی بات راز رہ گئی ہے۔ تمہیں تو خود اب بہت سے رازوں سے پردہ اٹھانے میں ہمارا ساتھ دینا ہے۔“

میں نے چٹکی میں پکڑ کر راجیل کے ہاتھ سے زانیئر نی لمبا وہ تصویر لے لی۔ شفاف پلاسٹک کی وہ شیٹ اس سیلونیٹ سے بھیجی گئی معلوم ہوتی تھی جو ہمارے ہاں پیکٹوں وغیرہ پر چسپی ہوتی ہے لیکن وہ فلم کے ٹیکسٹ کی طرح کراہی تھی۔

وہ ایک عورت کی تصویر تھی۔ میں ایک نکل اسے دیکھتا رہ گیا۔ تصویر میں گویا زندگی کے آثار موجود تھے اور وہ بھی جیسے ایک نکل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری رگ و پے میں خفیف سی حسنی دوڑ گئی۔ اس عورت کی اصل شخصیت میں ہی نہیں اس کی شفاف سی تصویر میں بھی کوئی ایسی بات تھی جس سے جسم میں سردی لہر دوڑ جاتی تھی۔

وہ اسی عورت کی تصویر تھی جس کی آنکھوں کا کوئی رنگ تھا خود سے لیکن مجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیا نام دیا جائے کوئی رنگ رکھتے ہوئے بھی وہ آنکھیں گویا بے رنگ تھیں اور آنکھی سی معلوم ہوتی تھیں۔

راجیل کی خفیف سی ہنسی من کر میں چڑھا۔ وہ گفتگو لمبے میں ہوئی ”گتا ہے تصویر نے ہی ہاتھ پاز کر دیا ہے۔ تصویر کو دیکھ کر ہی خود تصویر میں کر رہ گئے ہو۔ گتا ہے جب اصل میں اس عورت کو دیکھا ہو گا تو پتھر کے ہو کر رہ گئے ہو گے۔“

اس نے اندازہ لگایا تھا کہ میں اس عورت کو دیکھ چکا ہوں۔ میں نے نککار کر گھٹا صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا ”کون ہے یہ عورت؟“

”پہلے تم بتاؤ۔ تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟“ راجیل نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے آدھے سیاہ آدھے سفید چہرے پر مسکراہٹ بھی عجیب لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک چارٹرڈ مسٹر اور ایک چارٹرڈ لاءیر ہیں۔ آدھا آدھا

”میں جب لاہور سے بھاگا تھا تو ملک کے نہ جانے کون کن ایسے دور افتادہ علاقوں کی طرف نکل گیا تھا جو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ کچھ عرصے پہلے میں نے واپس آنے کی کوشش کی تھی اور کراچی پہنچا تھا۔ وہاں پولیسی رات میرے اپنے ہوٹل میں مجھ پر حملہ ہوا۔ اس وقت میں نے پہلی بار اس عورت کو دیکھا۔ وہیں میں دیکھا تھا۔“ میں نے مختصر بتایا۔

راجیل کے دوڑتے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اُتر آئی۔ نہیں صاحب بھی چارباکی پر کچھ آگے کو جب تک آئے۔

”پھر کیا ہوا؟“ راجیل نے نہایت نجی آواز میں پوچھا۔  
”میں نے کراچی میں کتنا بھر نہیں سمجھا۔ ساتھیوں میں سے بھی کسی سے رابطہ نہیں ہو سکا پھر صورتحال کچھ ایسی بنی کہ میں بحری جہاز کے ذریعے ترکی کی طرف نکل گیا۔ سفر کے ابتدائی دنوں میں اتفاقاً قی میں دوڑتے کے ذریعے سمندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ پرنکول کا شوقین ایک شخص مجھے پرہیز دیکھا رہا تھا کہ اچانک ایک اسٹیپر میں نے اس عورت کو دیکھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے مجھے ہی تلاش کر رہی تھی لیکن پھر وہ اسٹیپر غائب ہو گیا۔“

”اس کے بعد تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا؟“ نہیں صاحب نے دریافت کیا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”ترکی میں بھی یہ عورت کہیں نظر نہیں آئی؟“ نہیں صاحب نے جانتا جاہل۔ میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ نیسے میں گما سکت چکا تھا۔

”میرے سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ یہ عورت کون ہے؟“ میں نے اپنا سوال ڈرہرایا۔

”صحیح طور پر تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔“ نہیں صاحب گہرا سانس لے کر بولے ”لیکن ان کے کہیں ٹیوں سے ملنے والی معلومات کو ہم جس حد تک ڈی کوڈ کر سکتے ہیں اس سے بے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عورت کراچی میں ریڈ ڈاٹ کی گمراہ دھڑا تھی اور شاید اب بھی ہے۔ یہ ریڈ ڈاٹ کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حکیم میں اس کا نام حیثیت یا عہدہ کیا ہے۔ ہم نے اسے ”پاس فور“ فرض کر رکھا ہے پاس دن پاس نو اور پاس تحری ہمارے آپریشن کے دوران مارے جاسکے ہیں۔ وہ تینوں مرد تھے۔ کربابی میں ریڈ ڈاٹ کی تمام سرگرمیوں کو عالمی عورت کنٹرول کرتی ہے لیکن ہم اس کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکے ہیں۔“

”شاید کبھی دیکھ ہی لیں اور وہ آپ کی زندگی کا عجیب تجربہ ہو گا۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”بہر حال تمہاری بات سے ہمارے اندازوں کی کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔“ نہیں صاحب بولے۔ راجیل مزید تصویریں دیکھنے لگی



السلامی لکچر فیٹ 50/-

### طنز و مزاح

|       |             |                    |
|-------|-------------|--------------------|
| 100/- | اعتبار ساجد | انگور کھٹے ہیں     |
| 80/-  | اعتبار ساجد | غالب کی آبرو       |
| 80/-  | اعتبار ساجد | ایمر جنسی وارڈ     |
| 75/-  | اعتبار ساجد | مٹہ شکافیاں        |
| 75/-  | اعتبار ساجد | جائیل اسے مار      |
| 80/-  | اعتبار ساجد | اس طرح تو ہوتا ہے  |
| 100/- | اعتبار ساجد | غالب ہمیں بھی چھیڑ |

مکتبہ القریشی اردو بازار - لاہور 2

ن میں ایڈم عرف ایڈی کی تصویر بھی تھی جو لاہور میں سب سے پہلے ریڈ ڈاٹ سے میرے راجیلے کا زور دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر راجیلے کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا "اس شخص کے بارے میں کیا خبر ہے؟ زندہ ہے یا مر گیا؟"

"ہم نے اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے نہایت شرفاء انداز میں خود کشی کر لی کیونکہ وہ پکڑے جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔" راجیلے نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" میں پوچھنے بٹیر نہ رہ سکا۔

"کیونکہ وہ ہمارے ملک میں دہری زندگی گزار رہا تھا۔ ایک نہایت طاقتور مغربی ملک جس کی ہم پر "نوازشات" کچھ زیادہ ہی ہیں اور یسوں سے جس سے ہمارا ایک "تعلق خاص" چلا آ رہا ہے۔ ایڈی ہمارے ہاں اس کا قتل جزیل تھا لیکن اپنی شکل صورت میں تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ وہ ریڈ ڈاٹ کے خاص آدمی کا کردار بھی ادا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک پر آج نہیں آنے دی۔ زندہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔"

پھر راجیلے خود ہی طرے لیے میں بولی "حالانکہ وہ زندہ بھی ہمارے ہاتھ آجاتا تو ہم اس کا یا اس کے ملک کا کیا کیا کر لیتے؟ ہمیں ایک جزیل ہٹائی یا ایک دھمکی مٹی اور ہم فوراً دوبارہ رست میں سر ہٹا کر بیٹھ جاتے۔"

میں نے نہیں صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے نظریاتی اور اپنی جیب سے ایک اور بڑی نکال کر پُر خیال انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"شاید ایسے اور بھی کئی لوگ ہوں جو بظاہر اپنے ملکوں کے لیے یہاں سفارتی خدمات انجام دے رہے ہوں لیکن درحقیقت وہ ریڈ ڈاٹ کے ایجنٹ ہوں؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"بعض لوگوں کے بارے میں ہمیں یہی شبہ ہوا ہے لیکن وہ نہ تو زندہ حالت میں ہمارے ہاتھ لگ سکے اور نہ ہی ان کی لاشیں صحیح سلامت رہیں۔ وہ قطعی طور پر ناقابل شناخت ہو گئے تھے۔" راجیلے نے جواب دیا۔

"کیا ہمارے پاس کوئی طریقہ نہیں کہ ہم ان ملکوں سے احتجاج کر سکیں؟" میں نے دل کے کسی گوشے میں بے بسی کا درد محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں گئے کچھ نہ کچھ کریں گے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آپریشن کا قیہ حصہ کچھ ایسے انداز میں مکمل کر سکیں کہ ہمارے پاس سفید فام قوموں کے سامنے احتجاج کرنے کے لیے بنیاد تیار ہو سکے۔" نہیں صاحب نے گویا مجھے سنا ہی نہ تھا۔

"احتجاج کرنے سے پہلے ہمیں احتجاج کے خوف ہلک سا دھچکنے کے لیے بھی تیار کرنا ہو گا۔" راجیلے زہر لیے لیے میں بولی "ہرگز مضبوطی بھی کیا جا رہے۔" وہ مصطفیٰ سانس لے کر رہ گئی۔

نہیں صاحب گویا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے

بولے "تم یہ تصویریں لٹافے میں ڈال لو اور رست اعتقاد سے لے کر ہٹا۔" سیکرٹ سروس والے ان کی کامیاب کرنے کا کوئی طریقہ نکالیں گے اور وہ کامیاب کی شہرہ میں ہماری مختلف خفیہ ایجنسیوں کو بھیجی جائیں گی۔"

راجیلے نے تصویریں لٹافے میں ڈال لیں اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بڑا سا سیاہ چشمہ لگانے کے بعد نقاب اس طرح چہرے پر لپکا کہ چہرہ پورا چھپ کر رہ گیا۔ اب وہ رست سخت پردہ نشین قسم کی خاتون دکھائی دینے لگی تھی۔ بعض خاتونیں اسی طریقے میں ڈرائیو تک بھی کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ہر حال میں سختی سے پردے کی پابندی کرتی تھیں اور اس میں فرق نہیں آنے دیتی تھیں لیکن راجیلے کے بارے میں شاید کسی کو گمان بھی نہ گزرا کہ اس کے اس طرح نظر آنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

میں نے بھی اٹھتے ہوئے کہا "میں راجیلے کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے اس سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"



اس چاند چرے کو گرہن لگ گیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”بلکہ اب تو اس سکوت سے مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ ریڈ واٹ کی طرف سے یہ خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔ یہ سکون مجھے مشکوک لگنے لگے ہے۔“

میں خاموش رہا تو وہ بولی ”اے اچھے خاموش کیوں ہو؟ ناراض ہو گئے کیا؟ بھی تمہارا سوال اچھا تو نہیں تھا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میرے ساتھ جاتے وقت تم بالکل نہیں پوچھتے تھے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اہم بات صرف یہ ہوتی تھی کہ ہم ایک ساتھ جا رہے ہوتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے!“ اس نے بڑی کوشش سے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”تو اس مت کہو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی ”ناراض مت ہو۔ وہ کسی غمزدہ پہاڑی کمرے کی طرح نہ مت لگاؤ۔ چلو میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ اس وقت ہم ہنسی کے پاس جا رہے ہیں۔ آج کل میرا زیادہ وقت آوازی میں گزارا ہے۔ اسی لیے آج جب باہر نکلنے کا موقع ملا تھا اور پھر یہ خوشی بھی ملی تھی کہ تم سے ملاقات ہو گئی تو میں ذرا دل کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”ہنسی کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خود چل کر دیکھ لیتا۔“ وہ ملاحت سے بولی ”شاید یہ اس کی کسی خاموش دعا کا نتیجہ ہے کہ تمہیں اچانک غیر متوقع طور پر واپس آگئے ہو۔ ایک بار اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔“

ایک عجیب سے احساس سے میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس کے بارے میں بھی یقینہ کوئی اچھی خبر میری فکرت نہیں تھی۔ اس سے میرا کوئی ایسا خاص تعلق خاطر تو نہیں تھا کہ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے یاد کرتی۔ اس کے آئینہ دل میں تو کسی اور کی تصویر تھی۔ وہ کوئی الیکٹرانک انجینئر تھانے ریڈ واٹ نے ذہنی و جسمانی طور پر اس طرح اپنا غلام بنایا تھا کہ وہ ہنسی کو پہچاننا بھی نہیں تھا لیکن ہنسی کے دل میں اس امید کی شمع روشن تھی کہ ایک روز وہ اس کی طرف واپس آئے گا۔ اسے اپنا ماضی یاد آجائے گا۔

”ہنسی کے دل میں شاید میرے لیے عقیدت یا اس سے ملنا جانا کوئی جذبہ موجود ہے اور مجھے اس کی وجہ بھی معلوم نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔ صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“ راحیلہ بولی اور شاید وہ ہنس تقاب مسکراتی تھی ”اگر وہ تمہارے عشق میں بھی گرفتار ہوئی تب بھی مجھے نہ تو کوئی حیرت ہوتی اور نہ ہی کوئی شکایت۔ میرا تہم پر کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔“

”یہی تو زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے کہ تمہارا مجھ پر کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”کاش

ملائم تو میرے نام ہی تھا زیادہ جگہ چھوٹی والی مگر خوف ناک سی ایک گمن نے گھیر لی تھی۔ ایک خانے میں چھوٹا سا ایک بٹل بھی رکھا نظر آ رہا تھا۔ لہذا رکھتے ہی اس نے جلدی سے میز پر ٹیک بیک بند کر لیا۔

میں نے دوبارہ ذرا غور سے اس شخص کی طرف دیکھا تو وہ مجھے پہلے جیسا ہونے لگا تھا نہیں رہا۔ یوں لگا جیسے اس کے بارے میں میرا یہ اثر محض نظر کا دھوکا تھا۔ راحیلہ نے دو ٹیکن اشارت کی اور اسے سرک پر پوزن دے لیا۔ گاڑی کے شیشے ٹھنڈا تھے۔ باہر سے بہ آسانی اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کاش ہمیں معلوم ہوتا!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”اس دنیا میں ان گنت لوگ زندگی کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔“

میں نے اسے ٹھوہرا تو وہ معصومانہ نیسے مجھے بولی ”کیسا ڈانیا لگتا تھا؟ تم نے داد نہیں دی؟ کیا بالکل ہی بد وقت ہو کر دوپہر آئے ہو؟“ اس کے نیسے میں وہی پہلے والی راحیلہ بول رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ چہرے کی برادری سے اس کے مزاج میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ شگفتگی، وہ معصومیت کی دھم میں چھپا ہوا چلبلا پن برقرار تھا۔ جبکہ اسے دیکھنے کے بعد سے میرے پہلو میں خلش کا خنجر سا پوسٹ تھا۔

”میں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔“

”میں نے بھی کوئی مزاحیہ جواب تو نہیں دیا۔“ وہ ذرا ہونک پر آج مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ اب سرک پر خاصا رنگ نظر آنے لگا تھا۔ گاڑی میں ایک لمبے سکوت رہا۔ میں گردن کھما کر پیچھے دیکھنے لگا۔ مجھے یہی اندازہ ہوا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں نہیں تھی۔

راحیلہ اس وقت میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن پھر بھی گویا میری حرکات و سکنات پر اس کی نظر تھی اور وہ میرا مقصد بھی سمجھ رہی تھی۔ وہ اطمینان سے بولی ”میرا خیال ہے کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج کل ریڈ واٹ نے ہمیں ہر کام کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ نہ تعاقب نہ مار دھاڑ نہ کراؤ۔ آج کل کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ کوئی مشکوک یا شاسنا شکل بھی نظر نہیں آ رہی۔ زندگی بہت چمکی چمکی سی ہو گئی ہے۔“

وہ بظاہر بالکل بے پروائی سے اتنی بڑی گاڑی کو کھلونے کی طرح ہینڈل کر رہی تھی لیکن اس بے پروائی میں بھی ہلاکی مشافی تھی۔ مجھے برسوں پہلے کی وہ راحیلہ یاد آ رہی تھی جس سے کراچی میں میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جو اس وقت نیو یورک کی طالبہ تھی۔ جس کے ساتھ میں ایک پڑائی سی کشیدگی دیکھ میں ہلکے مٹانے پا سے گیا تھا۔ ان برسوں میں حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے لیکن اس کی شخصیت اس کالب و لوبہ آج بھی وہی تھا۔ صرف

”تمہارے ساتھ میں ہر طرح سے زندگی گزارا ہوں گا۔ میرے جذبے کو تقویٰ اور وعدوں کی سولی پر چڑھا چکا کرتا رہوں گا۔“ میں نے کرب کی ایک خفیف سی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا: ”اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو بے شک ابھی گاڑی کا شیش کسی نکاح خانوں کے گھر کی طرف موڑ لو۔ تم کیا سمجھتی ہو میں زندگی کے ان نازک معاملات میں مذاق کرتا ہوں؟“

”تم بہت ہی خدائی آدمی ہو۔“ اس نے بے آوازی ہنسی میں بات اڑانے کی کوشش کی ”مجھے زوجہ مت کیا کرو۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کی کتاب میں سے شادی کا ورق پھاڑ لیا ہے۔“

”اس بات پر میرا دل چاہتا ہے میں تمہارا سر چاٹ دوں۔“ میں نے دانت پیس کر کہا ”اب بھی وقت ہے۔ میری بات پر غور کرو اور گاڑی روک کر کسی راہ گیر سے پوچھ لو ”قریب ترین مسجد کہاں ہے۔ شاید اس کے امام صاحب نکاح رجسٹرار بھی ہوں۔“ اسی کے پاس ہم فوجیا جاسایا پیری کی حیثیت سے پہنچیں۔“

”یہ تو اس مت کرو۔ میرے برقعے کے اندر دو جھینس ہیں اور ان دونوں میں ٹی ٹی موجود ہیں۔ مجھے اتنا تک مت کرو کہ میں تمہاری اس بغیر جیسے والی کھوپڑی میں چند گولیاں اُتار دوں۔“ اس نے مجھے اڑانا۔

”چلو یہی کر گزرو۔“ میں نے ناگہم ہمارے ہوئے کہا ”کچھ تو کرو۔ بات کو کسی کنارے نہ لگاؤ۔ کمانی کو کسی انجام تک نہ پہنچاؤ۔“ آخر یہ بے ہشام کمانی کب تک اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہے گی۔“

”سو مت ہر کمانی کا انجام ہے۔ سو مت آئے گی تو خود بخود ساری کمانیاں ختم ہو جائیں گی اور ہماری زندگی کچھ ایسی ڈگر پر ہے جہاں قدم قدم پر موت کھڑی ہے۔“

”اسی لیے تو میں زیادہ اصرار کرتا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ آخر ہمیں ایسی کیا مجبوری ہے جو ہم یہ حسرت لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

”جبکہ میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں کہ ایسا زندگی میں کوئی حسرت پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”اے واقعی، کسی بھی بات کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ بس پاگل گھنے کی طرح زور دھرو اور دھڑکتے رہو۔ آخر کار ایک دن کسی کے ہاتھوں گولی کھا کر پٹ سے گر کر مر جاؤ۔ بس یہی کل زندگی ہے۔ یہ دنیا کے خانوے فیصد لوگ تو پاگل ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں مگر ہاتھ ہیں۔“

”اور پھر سر پہ ہاتھ رکھ کے روٹے ہیں۔“ راجیلہ نے کھوا لگایا پھر ایک لمحے کے توقف سے بولی ”ہاں۔۔۔ میری نظر میں“ ایسے لوگ نہیں جن کی تقلید کی جائے۔ ویسے میں تمہارے جوتے کی واقعی داور دیتی ہوں کہ تم ایک مضحکہ خیز چرے والی عورت سے

کوئی دعویٰ ہوتا۔ میں کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو تم میرے بال ٹوچنے کی دھمکی دیتی۔ کوئی لڑکی والہانہ انداز میں میرا ذکر کرتی تو تم اس کا منہ ٹوچنے کے بارے میں غور کرتیں۔ کاش اس قسم کی کوئی بات ہوتی۔ تمہاری یہ لاشعری میری زندگی کا سب سے بڑا دھوکہ ہے۔“

”لاشعری تو نہیں ہے۔“ وہ ہنچی آواز میں بولی ”تعلق تو بہت عمیق ہے۔“ اس کے اور میرے سر کے درمیان محض چند انچ کا فاصلہ تھا لیکن ان سروں میں لگی ہوئی سوچیں ایک لامتناہی شیش کے دو کناروں کی طرح تھیں جو کبھی آپس میں نہیں مل سکتے تھے۔ ”اس شاید تعلق تو بہت گہرا ہے لیکن اس کا کوئی عنوان نہیں ہے۔“ میں نے کچھ اور آہستگی سے کہا۔ دیکھن کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا شخص ہماری نگاہوں میں گم ہو گیا تھا۔

وہ مجھ سے بھی زیادہ دھچکے لمبے میں بولی ”وہ شعر مٹا ہے تم نے۔۔۔؟“

عشق کا ایک ہی عنوان ہو ضروری تو نہیں ہر کوئی چاک گریباں ہو ضروری تو نہیں میں نے سڑک کو گھورتے ہوئے کہا ”حاشا زندگی صرف شعروں سے بھل سکتی۔۔۔ بدل سکتی۔“

”تمہاری سوچ میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا؟“ اس نے قدرے حیرت سے پوچھا ”کیا اب بھی تم موقع ملتے ہی مجھ سے شادی کی فرمائش۔۔۔ اور پھر اس کی تکرار کرنے لگو؟“

”کھا رہے“ میں نے بلا تامل کہا ”اب ایسا کیا ہو گیا ہے جو میرے خیالات تبدیل ہو جاتے؟“

وہ گہرے دھڑکنے ہوئے کچھ اور مجھ سے لمبے میں بولی ”شاید تم بھول گئے ہو کہ قلاب اور سیاہ جینے کی آڑ میں چھپا ہوا ہے چہرہ آرد سیاہ ہے۔ یہ ایک مضحکہ خیز تصویر ہے۔ میں تو اب چٹا پھرتا ”بلیک اینڈ وائٹ“ قلاب ہوں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ چاند کو گرہن لگنے سے اس کی تدریجیت کم تو نہیں ہو جاتی۔“ میں نے کہا۔

”یہ ایسا گرہن ہے جو شاید کبھی دور نہ ہو سکے۔“ اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

”کوئی بات نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے بدستور بے پروائی سے کہا۔ تب اس نے ایک ٹاپے کے لیے گردن ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر کیا تاثرات تھے یا اس کی آنکھیں کیا کہہ رہی تھیں لیکن اگانہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد ایک لمحے تک وہ بالکل خاموش رہی۔

پھر انجمن کی سربراہت کے درمیان اس کی سرگوشی مجھ تک پہنچی ”کیا اس مضحکہ خیزی کے ساتھ تم زندگی گزار لو گے؟“ اس نے

تھا۔

اس کے باوجود راحیلہ نے اس کے قریب سے گزرنے وقت ایک سپیڈ نائز سا کارڈ نکال کر اسے دکھایا کیونکہ راحیلہ کا کلیہ ہی میرے خیال میں اسے مشکوک بناتا تھا۔ اس لمحے میں کوئی بھی عورت بلکہ ذرا کثرت کاٹھ کا کوئی مرد بھی وہاں داخل ہو سکتا تھا۔ یاد رہی شخص نے بڑے غور سے کارڈ چیک کیا حتیٰ کہ اس کے ابھرے ہوئے حروف پر تہہ جاتے کیوں انگلی بھی پھیر کر دیکھی پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر کارڈ واپس کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”یہ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے بھی زیادہ خاص آدمی ہیں۔“ راحیلہ بولی۔ یہ کہتے ہوئے شاید وہ بھی غائب سڑکائی بھی تھی پھر وہ مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیڑیاں چڑھتی چلی گئی۔

پہلی منزل پر شیشے کا ایک اور دروازہ ہماری راہ میں حائل تھا اس دروازے پر رکھی جھوٹے موٹے اٹھارے کے بجائے ایک مسلح آفیسر قیادت تھا۔ اس نے بھی راحیلہ کا کارڈ دیکھا۔ میرے بارے میں یہاں بھی راحیلہ نے وہی جملہ دہرایا جو وہ فچے بھی بول چکی تھی۔ آفیسر نے خاموشی سے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

اندرا بائیں ہاتھ پر جھوٹا سا ایک آئس فمافکرا تھا جس کی آدھی دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس میں ایک ڈاکٹر اور دو نرس نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک روشن اسکرین پر کوئی ایکس رے لگائے غور سے دیکھ رہے تھے۔

وایں ہاتھ پر راہداری میں شیشے کے تین کیمین سے نظر آ رہے تھے۔ ان تینوں میں مریض لیے نظر آ رہے تھے تینوں کے جسم سینے تک سفید چادر سے ڈھکے نظر آ رہے تھے۔ پاس رکھی مختلف مشینوں کی ٹالیاں ان کے جسموں سے منسلک تھیں۔

راحیلہ آخری کیمین کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں ہر طرف ڈاکٹروں پر انگریزی میں مختلف ہدایات آواز میں تھیں۔ جو کیے مست۔ شور مٹا دیتے۔ کسی چیز کو ہاتھ مت لگائیے وغیرہ وغیرہ۔ وہاں روشنی بھی کم ہی تھی۔

”کیا یہ قریظہ ہے؟“ میں نے شیشے کے کیمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“ راحیلہ نے نئی میں سر ہلایا ”یہ آئی یو کے عام کمرے ہیں۔“ اس کی نواز بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

اسی اثنا میں نہ جانے کس طرف سے ایک نرس لپک کر ہمارے قریب آئی لیکن اس نے ہمیں دیکھے یا ہدایات دینے کے بجائے موبائے انداز میں سلام کیا اور سرگوشی میں بولی ”مڈم! مریض کی حالت اب کچھ بہتر ہے۔ آپ اس سے بات کرنا چاہیں گی؟ اس وقت اس کا آئسکین مارک بھی آڑا ہوا ہے اور ٹریکولائزر کا اثر کم ہونے کے باوجود وہ زیادہ تکلیف میں نہیں

شادی کے لیے تیار ہو۔“

”مجھے تمہاری داد کی نہیں تمہاری“ ہاں“ کی ضرورت تھی۔“ میں نے آسف سے کہا۔

”وہ کبھی نہیں سن سکو گے میں تمہیں پہلے ہی مشورہ دے چکی ہوں۔ اپنے لیے کوئی وینک کی لڑکی تلاش کر دو اور اپنی زندگی کی یہ سبھی پوری کر لی ڈالو جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔“ پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی ”اس موضوع پر اب مزید بات نہیں ہوگی۔ ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔“

میں نے ایک طویل سانس لے کر سیٹ سے نکل نکلیا۔ تبدیلی اس کے چہرے میں آئی تھی۔ اس کے خیالات اور نظریات میں نہیں۔ بلکہ اس کی ضد شاید اپنی جگہ پھر ابھر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال شاید کچھ اور مضبوط ہو گیا تھا کہ اب میں تو کیا کوئی اور بھی اگر اس سے شادی کرے گا تو اس پر ترس کھا کر کرے گا اور یہ بات اس کی ادنیٰ اپنا کو منظور نہیں تھی۔ یہ خیال جب جسم سے انداز میں اس کے ذہن میں موجود تھا میں تب بھی اسے نہیں نکال سکا تھا۔ اب اگر یہ خیال اور بھی مضبوط ہو گیا تھا تو مجھے غالباً اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑنا چاہیے تھا۔

چند لمبے بعد گاڑی ایک ذیلی سڑک پر مڑی جس پر دونوں طرف پندرہ راپوڈوں سے آراستہ کھاریاں موجود تھیں۔ اس کے گیٹ پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک مخصوص سرکاری اسپتال تھا۔ اس کے اندر بھی سرسبز درخت، پھول اور سبز اس طرح بچھا ہوا تھا کہ مریض کی آدھی بیماری تو اس ماحول میں کچھ دیر سانس لینے سے ہی ختم ہو سکتی تھی۔

راحیلہ نے لیکن ایک مخصوص پارکنگ لٹ میں لے جاؤ گی اور اسے اشارت ہی چھوڑ کر اتر گئی۔ مجھے بھی اس نے اُترنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر کے سے چلے والا وہ شخص جو معلوم نہیں ڈاکٹر تھا یا نہیں آگے آکر ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راحیلہ اس سے غالب ہوئی ”تم گاڑی جلدی داپس لے آنا اور اس پارکنگ لٹ میں عین اسی جگہ پر چھوڑ دینا“ چائیاں اندر ہی چھوڑنا اور اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام نہ ہو تو پھر مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔“

اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اس کا چہرہ بدستور پتھرایا ہوا سا رہا۔ اپنا میڈیکل بیگ اس نے برابر کی سیٹ پر رکھ لیا تھا۔ وہ گاڑی رپورس کر کے نہ جانے کہاں روانہ ہو گیا۔ میں راحیلہ کی رہنمائی میں آگے چل دیا۔

عمارتوں کے کئی بلاکس سے گزرنے کے بعد ہم ایک بلاک میں داخل ہوئے۔ اس کی چشمانی پر چلی سرخ حروف میں انگریزی میں ”اسٹائیٹل عمارت کا کارڈ“ لکھا نظر آ رہا تھا۔ سامنے ہی بیڑیاں نظر آ رہی تھیں لیکن ان کے قریب ایک چاق و چوبند یاد دہی افکار گس لیے کھڑا تھا۔ راحیلہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ششاسانی کا تاثر ابھرا۔ غالباً اس کے مخصوص لمحے کی وجہ سے وہ استہجائے

ایک بار اسے پوچھ رہی تھی۔

ترت نہایت آہستہ سے جسم کے اس کھنڈر میں آنکھوں کے درمیان سے گھلے اور میرے دل پہ لگے ہوئے سنے چمکے کی اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ ان آنکھوں میں کوئی دیرانی سی ویرانی تھی، میں ایک بار پھر اس پر ٹھکا تو اس نے آہستہ سے دو تین مرتبہ پلکیں جھپکائیں۔ یہ خفیف سی حرکت زندگی کی علامت تھی پھر اس کی آنکھوں میں بھی زندگی کی روشنی نظر آئی۔ شاید اب اسے میرا چہرہ صاف نظر آیا تھا۔

اس کے ہونٹوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ اس نے مسکرائے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بید کے ایک طرف راحیلہ تھی۔ میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس کا رزنا ہوا استغاثی سا دوسرا ہاتھ چادر کے نیچے سے باہر نکل آیا۔ میں نے اسے تھام لیا۔ وہ گویا کسی ٹروے کا ہاتھ تھا کہ بعض ٹروے زندگی سے زیادہ زندگی کی علامت ہوتے ہیں اور بعض زندہ لوگ زندگی پر محض ایک تھمت ہی ہوتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہی ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندہ رہا اور اسے کس راہ میں موت آئی۔

اس کے ہونٹوں سے کچھ اس طرح آواز نکلی جیسے ان خزاں رسیدہ پتوں کے درمیان ہوا سرسراہی ہو جو ٹوٹ کر گرنے کے قریب ہوں۔ "فضل! اچھا ہوا۔۔۔ میرے مرنے سے پہلے تم آگئے۔ شاید اسی لیے سانس جسم میں ابھی ہوئی تھی؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ اے سا بولنا ہی گویا اس کے لیے ایک مشقت تھا۔ اس کی سانسیں کچھ تیز ہوتی محسوس ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر کچھ تکلیف کے سے آثار ابھر آئے۔ راحیلہ جلدی سے بولی "ڈاکٹر! زس کو بلاؤ؟" اس نے بید کے پاس لگے ہوئے سرخ بن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ہنی تھی میں سر نہیں ہلا سکتی کیونکہ اس کی گردن میں کار تھا۔ مظلوم نہیں اس کے لیے گردن ملانا نقصان دہ تھا یا محض احتیاطیہ کار پڑھنا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں سے آنکھوں میں گویا التجا کی کہ اس کے لیے کسی کو نہ بلایا جائے۔ ایک لمحے بعد وہ سرگوشی میں بولی "ان ڈاکٹروں اور نرسوں وغیرہ نے تو مجھے زندہ رکھنے کی کوشش میں میری بچی کچی زندگی اچھن کر دی ہے۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سفید معنوی بھت کو تک رہی تھیں۔ چند لمبے کے سکوت کے بعد میں نے آہستہ سے اس کے کان کے قریب کہا "ہنی! تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں؟ کوئی خاص بات کہنا چاہتی تھیں؟"

"میں کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔" اب اس کی سرگوشی آسانی سے سمجھ میں آ رہی تھی "میں بس یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے تمہارے دوستوں نے اور دوسرے بہت سے لوگوں نے ٹی کر تمہارا کام کافی آسان کر دیا ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی کمرٹ چکی ہے لیکن تم اس لئے جو چیز سے ضرور ختم کرنا ورنہ تم تو کیا اس ملک میں کوئی

ہے۔"

"یہ تو تم نے بڑی خوشی کی خبر سنائی مارا!" راحیلہ سرگوشی میں بولی "میری تو کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو کبھی کبھار اس کی دوچار سرگوشیاں سننے کا موقع ملتا رہتا ہے لیکن یہ صاحب جو میرے ساتھ آئے ہیں یہ اگر اس سے دوچار باتیں کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت اچھا ہو گا۔ اس کی دماغی حالت کیسی ہے؟"

"کسی حد تک ٹھیک ہی معلوم ہوئی ہے۔ کم از کم اسے یہ یاد ہے کہ وہ اسپتال میں ہے اور اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ آپ اس کے پاس نہیں ہیں۔ اس نے آپ کے پاس میں پرچھا تھا۔" نرس نے جواب دیا۔

راحیلہ نے طمانیت سے سہلایا۔ نرس نے نہایت آہستہ سے نکلے دار دروازہ کھولا۔ میں نے راحیلہ کی تھلم میں جوتے باہر ہی اُتار دیے اور نیچے پاؤں پیسے کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا فرش اتنا صاف تھا کہ اس پر بغیر جوتے کے بھی پاؤں رکھنا برا محسوس ہو رہا تھا۔

ہم دبے پاؤں سفید آہنی بیڈ کے قریب پہنچے۔ ہنی کا صرف چہرہ اور ایک ہاتھ سفید چادر سے باہر تھا۔ ہاتھ میں ڈرپ کی سولی لگی ہوئی تھی۔ اس ہاتھ اور چہرے کو دیکھ کر مجھے جبرجبری سی آہنی ہاتھ لگا تھا گویا کسی بڑے پرندے کا نیڑھا میزا سا جانتا تھا۔ جس میں چند ٹمڑی تری پڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چہرہ گویا کئی دن پرانی کسی لاش کا تھا جسے قبر سے نکال کر صاف کر کے پلنگ پر بٹایا گیا تھا۔

مجھے ہنی کی صورت اچھی طرح یاد تھی۔ وہ گوری جیٹی یا بہت زیادہ خوب صورت لڑکی تو نہیں تھی لیکن اس کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ اس کی رنگت گندمی اور نفوش دلکش تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ محض چند ابھری ہوئی پڑیوں کا مجموعہ نظر آ رہا تھا جس پر کھال کی جگہ نیلے سے رنگ کی ایک جھلی چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے جبکہ کمر بہت قریب سے اسے دیکھا اور بڑی مشکل سے پہچانا۔ اس کے وجود کے کھنڈر میں شاید کبھی ششمانی کے کچھ موتی دفن تھے میرے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا وہی ہنی تھی جسے میں جانتا تھا۔

راحیلہ اس کے قریب کاؤچ پر بیٹھ گئی اور نہایت آہستہ سے اس کے بالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی "ہنی! میری جان ڈرا آنکھیں تو کھولو اور کھو کھو کر دیکھو کیا ہے۔" اس کے لیے میں اس میں سی ملا نہت تھی جو اپنے برسوں کے پناہ چھوڑنے لگی ہو۔ ہنی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اگر اس کے جسم پر ڈھکی ہوئی چادر میں نہایت خفیف سا زبردہم نہ ہوتا تو یہ یقین کرنا بھی مشکل ہو تاکہ وہ زندہ تھی۔

ایک لمحے کے انتظار کے بعد راحیلہ آہستہ سے اس کا سر سلاتے ہوئے بولی "ہنی! ڈرا دیکھو تو افضل چہرہ دیا ہے۔ تم

بھی سکے سے نہیں رہ سکے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہے کسی کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ کیا خوف ناک فتنہ ہے۔ یہ فتنہ میری ماں کو کھا گیا۔ میرے مددگار کو کھا گیا۔ مجھے کھا گیا اور نہ جانے کس کس کو کھا گیا۔ ان لوگوں کی صحیح تعداد کسی کو بھی معلوم نہیں جنہیں یہ اثر دھا خاموشی سے کھا گیا۔ اس فتنے نے اس ملک کی بنیادوں میں بارود پھانپا دیا ہے۔ ہمیں اس بارود کو بھی مینا ہے اور اس فتنے کا عمل خاتمہ بھی کرنا ہے۔

”تم اب اس حالت میں ان فکر میں اپنے آپ کو اور اذیت مت دو۔“ میں نے اپنی اذیت کو چھپاتے ہوئے اسے اذیت سے بچنے کی تلقین کی ”تم یہ کام ہم پر چھوڑ دو۔“ ہمیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اس حالت میں تمہیں آرام کی تلقین کرنا پڑی مسئلہ خیر سی بات ہے پھر میں بھی یہی کہوں گا کہ تم اپنے ذہن کو کچھ آرام دینے کی کوشش کرو اور اس کا طریقہ یہاں ہے کہ تم کچھ مت سوچو۔“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے اور کیا مشورہ دوں کیا نصیحت کروں اس کے لیے کیا کروں! میرا دل چاہ رہا تھا اسے بازو دے کر اٹھا کر وہاں اس کو اتار دیا اور پلک جھپکنے میں کسی ایسی جگہ لے جاؤں جہاں مجھے روکنا ہوتے ہوں جہاں بتادوں کہ شفا ملتی ہو۔ مگر گوراناؤں کو نئی زندگی ملتی ہو لیکن اسے ایسی کسی جگہ لے جانا میرے بس میں نہیں تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں پھر کھلیا پڑی مشکلی سے انہیں کھولتے ہوئے بولی ”میں تو خیر ان سے غذا بری کی تھی۔ میرا دندان تو مکمل طور پر ان کا غلام بنا ہوا تھا۔ اسے انہوں نے صرف شک کی بنا پر میکینکٹون شعاؤں سے جلا کر ہلاک کر دیا۔ لہذا ہر اس کا کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ اسی طرح جیتا جاگتا دکھائی دے رہا تھا لیکن درحقیقت وہ کسی جانور کی طرح دوست ہو چکا تھا۔“

میں دندان کو نہیں جانتا تھا لیکن بتی نے ہی کافی عرصے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی لڑکپن کی محبت تھا۔ وہ بہت لائق الیکٹرانک انجینئر تھا۔ نہ جانے کب اور کس طرح ریڈ واٹ کے بننے چڑھ گیا تھا۔ وہاں وہ بتی کو بھی نہیں پہچانتا تھا نہ جانے اس پر کیا کڑی تھی لیکن بتی اس معاملے میں افسانوی سی لڑکی تھی۔ وہ خود ایسے ہی باہول میں رہی تھی اور زندگی میں کیسے ہی عجیب و غریب سے گزری تھی مگر اس شخص سے اس کا عشق ختم نہیں ہوا تھا۔ ناقابل یقین سی بات تھی کہ زندگی کا بیشتر حصہ خواہ مخواہ اجلا میں گزارنے کے باوجود وہ ایسا افسانوی عاشق کرنے کی اہل تھی۔ مجھے ان لوگوں پر رعب آتا تھا جن سے کوئی ایسا لا زوال عشق کرنا

تھا۔

میں نے اس کے سرواٹھ خالی ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے زندگی کی حرارت پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”بتی! امیری دوست۔ میری محسن! تم اطمینان رکھو۔ اب ان سے حساب ہو گا اور ہر چیز کا

حساب ہو گا۔“

”مجھے تمہاری زبان سے صرف یہی سننے کے لیے تمہارا انتظار تھا۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی۔“

اس نے طمانیت بھرے انداز میں آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کی طمانیت گویا راحیلہ کے لیے تشریش کا باعث تھی۔ وہ اس پر جھکتے ہوئے بے تابانہ سرگوشی میں بولی ”بتی! بتی!“ لیکن بتی نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی آنکھیں کھولیں۔ راحیلہ اس کی ہنسی دیکھنے لگی پھر اس نے پیشے کی دیواروں سے باہر کھڑی نرس کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اندر آئی۔ اس نے بتی کے جسم سے خشک رو تین مشینوں کے ڈاکٹر پر رزنی سویں کو دیکھا اور جلدی سے اس کے منہ پر آکسیجن کا ماسک لگا دیا پھر اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں راحیلہ کو اشارہ کیا۔ راحیلہ مجھے ساتھ لے کر پیشے کے کیمین سے باہر نکلی۔

پھر ہم آئی سی یو سے بھی باہر آ گئے اور ایک بالکل نئی میں جا کھڑے ہوئے۔ وہاں سے اسپتال کے ایک حصے کا سرسبز اور صاف ستھرا لان نظر آ رہا تھا۔ لان کے قریب ہی ایک وائرڈ کے دروازے پر ایک ایسپرینس کڑی تھی۔ چند لمحے کی بریکل سی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا ”بتی کا اس حالت کو پہنچنے کا اصل سبب کیا ہے؟“

”اس کے جسم میں چار گولیاں پیوست ہوئی تھیں۔“ وہ افسردگی سے بولی ”تین تو سرجری کے ذریعے نکال لی گئیں۔ چوتھی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہے۔ اس کی پوزیشن ایسی ہے کہ ماہر نیوروسرجنز کا خیال ہے اسے چھیننے کی صورت میں فوری طور پر بتی کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ باقی تینوں گولیاں نکالنے کے لیے بتی کے جو آپریشن ہوئے وہ بھی بہت ہی نازک قسم کے تھے انہوں نے بھی اسے موت کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ گولی کا زہر بھی اس کے جسم میں پھیل رہا ہے۔ کئی مرتبہ اس کا بلڈ ٹرانسفیوژن ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود انٹیکشن نہیں رک رہا۔ اس کا ذہن بھی کبھی کبھی بالکل جواب دے جاتا ہے۔ وہ بالکل ہی کوئی بات نہیں کر سکتی یا پھر خواب کے سے عالم میں کچھ بے دہیا سی باتیں کرتی ہے۔ اس کے ذہن اور جسم پر جو کچھ گزر چکا ہے اس کے بعد اس نے جتنی باتیں کر لی ہیں وہ بھی قیمت ہیں۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ فطری سانس لے کر بولی ”اصل الیہ یہ ہے کہ اسے ہماری ہی چلائی ہوئی گولیاں لگی ہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے بے یقینی سے کہا۔

وہ حسانہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”فریڈ واٹ والوں نے اسے اس کی غداری کی یہ سزا دی کہ جب ہم ان کے زیر زمین ٹھکانے تک پہنچے اور ان کے ساتھ ہمارا مسٹر کہ جاری تھا تو انہوں نے اسے گولیوں کی بارش میں دھکیل دیا۔ وہ بھی



خبر ریڈ واٹ والوں تک نہ پہنچے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ہائی کی تدفین کا ڈراما بھی رچایا۔ خدا ہمیں معاف کرے۔ اس کے علاوہ ہم نے اخباروں میں چھوٹی سی خبر بھی چھپوائی کہ عالمی شہرت یافتہ ڈاکٹر پرنس تینہ ہزار سال حالات میں انتقال کر گئیں۔ بظاہر ہمیں معلوم ہوا جیسے وہ خبر بیک آؤٹ ہو کر چھپی ہو۔ شاید ہماری یہ کوشش کامیاب رہی۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں محفوظ رہی اور وقتے وقتے سے ہمیں اس سے ریڈ واٹ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔

”اب اس کا تو یہاں پر آپریشن کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی اسے باہر لے جایا جاسکتا ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی۔ وہ اشیاء میں سر ملانے ہوئے بولی ”تم سب ہی چکے ہو۔ وہ کسی بھی قسم کی نقل و حرکت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خواہ اس میں کتنی ہی احتیاط برتی جائے۔ اب اس کے اسی حالت میں زیادہ سے زیادہ زہور رہنے کا امکان ہے۔ ہماری کوئی بھی اور کوشش اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“

اس وقت ہم ایک اور بارنگ ٹاٹ سے گزر رہے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر ٹھٹھکیاں کھینچتے ہوئے کہا ”بے شک یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث ہے کہ ریڈ واٹ کی ممرٹوٹ چکی ہے لیکن اس کے ساتھ جتنی بڑی خبریں سننے کو ملی ہیں۔ انہوں نے میرے بچے میں آگ سی دھکا دی ہے۔ سفر مہر کا ہے۔ سلیمان کا بازو کٹ گیا ہے۔ تمہارا آٹھا چہرہ سیاہ نظر آ رہا ہے۔ بتی کی حالت قابل رحم ہے۔ بھڑا میرا دل چاہ رہا ہے اس شرم کو آگ لگا دوں۔ شاید اس طرح میرے دل میں دھکی ہوئی آگ کچھ ٹھنڈی ہو۔“

وہ ایک جھٹکے سے رک گئی اور اس نے تیزی سے گردن جھکا کر میری طرف دیکھا ”یہ کیا احمقانہ بات کی ہے تم نے۔“ وہ تیز سی سرکوشی میں بولی ”اس میں شرم کا کیا قصور ہے جو اسے آگ لگادی جائے؟ دیکھو یہ بھی شروں کو آگ لگانے والے تو اس ملک میں بہت پڑے ہیں۔ ہم تو اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہمارے ان مرمان شروں بلکہ ہمارے اس پورے ملک کو اپیت میں لینے والی تھی جو ہماری پناہ گاہ ہے۔“

اس کی آواز سنی تھی لیکن وہ ایک استاد کی طرح مجھے واٹ رہی تھی ”مجھے حیرت ہوئی ہے تمہارے منہ سے یہ الفاظ سُن کر اتم نے تو پیشہ وردہشت گردوں کی سی بات کی ہے۔ ان پر اپنے اعمال کی بدولت بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ شروں کو آگ لگانے کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہم پر تو اگر تھوڑی بہت جانی تھی بھی ہے تو وہ اپنے اعمال کے باعث نہیں بلکہ ایک نیک مقصد کے لیے آئی ہے۔ ہمارے ساتھیوں سے کہیں زیادہ تمہیں صاحب کے آدمی مرے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یہ سودا مٹکا محسوس نہیں ہوا کیونکہ ہم ریڈ واٹ کی ممرٹوٹ تو دور کار اس کا بال بیکا کرنے کا بھی تصور نہیں کیا رہے تھے۔ یہ تو بس ایک مجرہ ساری ہو گیا۔“

اس عالم میں کہ ہم اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ یہ تو مجرہ ہی ہے کہ گولیوں کی ایک دو چھار میں یہ زندہ رہی گی۔“

”تم خواہ انصار سے ہی کسی لیکن مجھے سب کچھ بتاؤ۔ آخر یہ سب ہوا کس طرح؟“ میں نے انہیں سے کہا۔

”یہاں کھڑے کھڑے یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ آؤ گھر چلے ہیں۔“ وہ بولی۔

”گھر؟“ میں نے قدرے حیرت سے کہا ”کیا یہاں تمہارا کوئی گھر بھی ہے؟“

”انسان جہاں بھی کچھ عرصے کے لیے رکتا ہے وہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا تو بنانا پڑتا ہے۔ وہ انسان کا گھر ہی کھائے گا۔ میرے خیال میں تو جہاں سر پھپھانے کو جگہ مل جائے اسے گھر ہی سمجھا جاتا ہے۔“ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آئی سی یو سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دی۔

”تم بھی اچھی خاصی ظنی ہوئی جاری ہو۔“ میں نے اس کے ساتھ چلے ہوئے کہا۔

”تمہارے ہر عمل کی بنیاد کسی نہ کسی ظنی پر ہوتی ہے۔ اگر زندگی میں سے ظنی کو بالکل علی ٹھال دیا جائے تو یہ ایسی ہی رہ جائے گی جیسے رس کے بغیر گنا۔ بالکل پھوکنا۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے لیے میں بولی اور آٹھٹی سے میری ٹھٹھکیاں اترنے لگی۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا مگر سیاسی میں لپٹی ہوئی ایک گولی کی چیز کے سوا میرے سامنے کچھ نہیں تھا۔ کسی ایسے انسان سے بات کرنا ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے جو آپ کے سامنے موجود ہو مگر آپ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتے ہوں۔ صرف آواز آپ تک پہنچ رہی ہو۔

”اس وقت تم سے بات کرتے ہوئے مجھے ریڈ واٹ کے پاس دن اور باس نواد آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا ”ان کے کدھوں پر سر کی جگہ بڑا سا ایک سفید انڈر رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے آواز برآمد ہوتی تھی۔ کوئی چہرہ کوئی تاثر نظر نہیں آتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہارے کدھوں پر سفید کی جگہ سیاہ انڈر رکھا ہوا ہے اور یہ ساز میں اس سے کچھ چھوٹا ہے۔ نیز اس پر کوئی نمبر درج نہیں ہے اور یہ انڈر کے کی طرح ہموار نہیں ہے۔“

”تم نے خوب یاد دلایا۔ باس دن کی لاش بھی یہیں موجود ہے۔ اسے خاص طور پر کچھ لوگوں کے سامنے کے لیے اور غیر حینہ عرصے تک محفوظ رکھنے کے لیے یہاں لایا گیا تھا کیونکہ لاہور میں اس مقصد کے لیے زیادہ بہتر سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ تم دیکھنا پسند کرو گے؟“

”ضرور۔“ میں نے بلا تاویل کہا۔

وہ سڑکیاں آؤ کر آئی سی یو کے بیرونی دروازے سے نکلے کے بعد بائیں طرف مڑ گئی۔ راستے میں وہ بولی ”میں نے بتی کی بہت حفاظت کی ہے اور پوری کوشش کی ہے کہ اس کے زندہ رہ جانے کی

پھر وہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے قدرے طاقت سے بولی  
”ویسے بھی آگ لگتا بہت آسان کام ہے۔ آگ بجھانا بہت  
مشکل۔“

میں نے کھار کر گھا صاف کرتے ہوئے کہا ”شاید میں وہ نہیں  
کہہ پایا جو کچھ چاہ رہا تھا۔ دراصل ایک طویل عرصے سے میں ایک  
عجیب سی بے بسی کا شکار ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں کچھ کر  
گزر دوں۔ صورت حال فیصلہ کن ہو جائے۔ ہم اپنے معمولات کی  
دنیا میں لوٹ جائیں لیکن میرے وجود میں جو بھی کھڑی بہت طاقت  
ہے میرے دل میں جو لاوا اگل رہا ہے اسے کوئی صحیح سمت نہیں  
مل رہی۔ کوئی راستہ نہیں مل رہا۔“

”لے لے گا ضرور ملے گا۔“ وہ بڑے حمل اور وقار سے بولی  
”حالات اپنے منطقی انجام کی طرف جارہے ہیں۔ اس جوش  
جڑے اور طاقت کو بجھا کر رکھو۔ یہ وحشت کوئی کارنامہ سرانجام  
دینے میں بڑی کام آتی ہے۔ بشرطیکہ کسی منشی راستے پر نہ  
پر جائے۔“

”ویسے بانی واوے تم میں اتنی بزرگی کہاں سے آگئی؟“ میں  
نے کہا۔

”تم اگر غور کرو شاید تمہیں احساس ہو کہ مجھے لاکھوں سے  
ہی تمہارے مقابلے میں اپنے جذبات پر زیادہ قابو رہا ہے۔“ وہ  
پرستور پر سکون لہجے میں بولی۔ میں نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن دل  
کی دل میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

اس دوران ہم ایک ایسی مستقبل تجارت کے سامنے پہنچ گئے  
تھے جس کی پہچانی دیر سید مارلی کی تھی۔ دروازہ شیشے اور المونیم  
کا تھا۔ اس بلاک کی پیشانی پر کوئی دیوار وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ  
ہی کچھ لکھا تھا۔ اندر بھی اندر جیڑا دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے  
دروازے پر ایک کے بجائے دو مسلح محافظ موجود تھے۔

وہ یقیناً راحیلہ کو پہچانتے تھے مگر انہوں نے اس کے لیے راستہ  
نہیں چھوڑا۔ راحیلہ نے انہیں وہ کہیں بڑا گڑ دکھایا جس پر  
اس کی منجھی سی تصویر چسپاں تھی۔ تب ان میں سے ایک نے واکی  
ٹاکی نکالا اور کسی کو اطلاع دی ”میزم آئی ہیں۔“

چند سیکنڈ بعد ہی سفید یونیفارم میں ایک اوجڑ عمر اور عجیب سا  
مقبض قدرے ٹھنڈا ہوا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے  
مؤثرانہ انداز میں راحیلہ کو سلام کیا اور ایک خوب صورت تقرری  
ہالی سے منقل دروازہ کھولا۔ اندر قدم رکھنے کے بعد مجھے اندازہ  
ہوا کہ وہ مژدہ خانہ تھا۔ یہاں مژدے یقیناً ان گنت زندہ لوگوں سے  
لڑا وہ صاف ستھرے اور محفوظ ماحول میں رہ رہے تھے۔

مجھے نے لائش آن کوس اور دو دیوایاں روشنی ہر طرف  
پھیل گئی۔ اندر کی فضا میں بے بسی تھی۔ میرے جسم میں سردی لہر  
دوڑ گئی۔ ہمارے سامنے ایک دیواری کھڑی تھی جس میں لاکڑ کی  
طرح بڑے بڑے خانے نظر آ رہے تھے۔ ان پر نمبر لے ہوئے

تھے۔

”نمبر کیا؟“ راحیلہ نے اس دیوار کے قریب پہنچ کر کہا۔  
مجھے نے کہاں نمبر خانے کا پتلا پکڑ کر باہر کھینچا۔ لہذا ایک  
آبوت نما صندوق باہر آیا۔ اس میں اس طرح سفید غبارات اٹھ  
رہے تھے جیسے فریزر میں اٹھتے ہیں۔ درحقیقت وہ لمبوترے فریزر ہی  
تھے۔ ان میں لائشیں موجود تھیں۔

جو فریزر باہر آیا اس میں موجود لاش بلاسٹک کے خیلے میں لپی  
ہوئی تھی۔ صرف اس کا سر خیلے سے باہر تھا۔ وہ یقیناً سفید قلم تھا۔  
اس وقت بھی اس کا چہرہ سفید ہی نظر آ رہا تھا لیکن یہ سفیدی کچھ  
اور طرح کی تھی۔ اس کا چہلا سترف پیرس سے یاد دکھائی دے رہا  
تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس کی لاش کب سے فریزر میں تھی۔  
ممکن تھا اس کی یہ حالت فریزر میں رہنے ہی کی وجہ سے ہوئی ہو یا پھر  
شاید اس پر کچھ کیمیائی عمل بھی کیے گئے تھے۔

دوسری خاص بات اس کے چہرے میں بس یہی تھی کہ اس کی  
ناک ٹوٹنے کی چوچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ اس کا منہ کھرا کھلا  
ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے ٹوٹنے والے دانت بھاٹک رہے تھے اس  
کے باوجود نہ جانے کیوں اس کے چہرے کا اثر ڈر نکلا جیسا تھا۔  
اسے ذرا کمزوری نظر سے دیکھتے ہوئے یہی گمان گزرا تھا کہ ڈر نکلا  
حسب روایت دن میں میٹھی نیند سو رہا تھا اور رات ہوتے ہی وہ  
اٹھ کھڑا ہو گا اور خون پینے کے لیے شکار کی تلاش میں نکل جائے  
گا۔

میں نے کمزری سانس لے کر کہا ”اس کا مطلب ہے اس کے  
سر کی جگہ وہ جو برا سا انداز نظر آ رہا تھا وہ اس کی تھا۔ مجھے پلے ہی  
شبہ تھا۔“

”ہاں“ وہ ایک نہایت ہی عجیب اور پیچیدہ ساخت کا ماسک  
تھا۔ ”راحیلہ بولی“ اس کی بیرونی سطح اڑے کے جھلکے ہی کی طرح  
تھی مگر اس میں انسانی جلد کی طرح مسام تھے اور ہوا اندر جانے کا  
نظام موجود تھا۔ ہوا کے ساتھ ہی آواز کی لہریں بھی جمع ہو کر اندر  
پہنچتی تھیں۔ قلاب پوش کی ناک کے دونوں تختوں کے قریب  
ہوائی تالیاں اور کانوں کے قریب ایئر فون موجود رہتے تھے۔ اس  
کے علاوہ اس سفید خول پر سامنے ہی چلی انداز میں ”ایک“ ”نمبر سیاہ  
رنگ میں لکھا نظر آ رہا تھا۔ اسی نمبر کے درمیان تھا اس کا ایک عدد۔  
چھپا ہوا تھا۔ اس عدد سے کچھ دیر پہلے اس شخص کے سامنے پورا منظر  
دکھتا تھا۔ اس خول کے اندر نہایت پیچیدہ قسم کا الیکٹرانک نظام  
پھیل ہوا تھا۔ وہ ایک انوکھی اور انتہائی جدید چیز ضرور تھی لیکن  
کوئی طبعاتی قسم کی چیز بہر حال نہیں تھی۔“

”وہ ماسک اس وقت ہے کہاں؟“ میں نے دریافت کیا۔  
”مختلف لیبارٹریز میں معائنوں وغیرہ کے مراحل سے گزر رہا  
ہے۔“ راحیلہ نے بتایا۔

”اس کا مقصد میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا۔ وہ مقصد اس

کھول دیا تھا۔ اس میں ایک چیمینزی کی لاش تھی۔ ریڈ واٹ کے اس طرح کے چیمینزیوں سے مجھے بارہ واسطہ پہنچا تھا۔ انہوں نے میرا اور میرے دو غنیمت ساتھیوں کا خوب ناک میں دم کیا تھا۔ میرا ایک ساتھی آفتاب ایسے چیمینزی کے ہاتھوں مارا بھی گیا تھا۔ چیمینزی نے ایک خون خوار دروازے کی طرح اسے اوچڑ کر رکھ دیا تھا جبکہ عام حالات میں ان چیمینزیوں میں انسانوں کی سی ذہانت کے مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے۔ میں نے انہیں ہر کام انسانوں کی طرح کرتے دیکھا تھا۔ ریڈ واٹ والے انہیں بلیک بڑا کہتے تھے۔ ”ایسے کی چیمینزی ریڈ واٹ کے پاس موجود تھے۔“ راجیلہ نے بتایا ”ہمارے اور نفیس صاحب کے آدمیوں کے ہاتھوں پانچ تو مارے گئے تھے۔ شاید ابھی کچھ اور بھی باقی ہوں۔ ریڈ واٹ والے شاید کسی خاص مقصد کے تحت ایسے چیمینزیوں کی بھی ایک کھپ تیار کر رہے تھے۔ ان کے دماغ کا کوئی بہت ہی نازک آپریشن کیا گیا تھا اور ہر ایک کے دماغ میں کچھ ماٹریکڈ پیس ڈالے گئے تھے۔ ہمارے نیورو سرجنز ابھی تک اس آپریشن کی کوشش کو نہیں کئے۔“

”ان سلسلوں میں دماغ کچھ ایسا میرے خیال میں اتنا ضروری نہیں۔“ میں نے کہا ”اصل مسئلہ اس فتنے کا خاتمہ ہے۔ مجھے اپنی والدہ جی جہاں کچھ حد سے اٹھانے پڑے ہیں وہاں یہ بہت بڑی خوش خبری ملی ہے کہ ان کا ایک زیر زمین قلعہ تباہ ہو گیا اور اسے لوگ مارے گئے۔ میں نے تو اتنی کامیابی کا تصور نہیں کیا تھا۔ یہ! حوصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اب باقی کام بہت آسان محسوس ہونے لگا ہے۔ اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ ان کے چیمینزی اسے سمجھ اور کیوں تھے۔ ان کے آوی اڑتے کسی طرح تھے۔ وہ کول کول لڑتی چلیں برتنوں کو کس طرح چیرتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ یا ان کی دوسری بہت سی سائنسی شہدے ہاتھوں کے فارمولے کیا تھے۔ ان چیزوں کی جو تھوڑی بہت مرعوبیت تھی اب تو وہ بھی ذہن سے نکل گئی ہے۔ میرا یہ یقین کچھ اور بڑھ ہو گیا ہے کہ اگر ہم سچائی پر ہیں اور کسی اچھے مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں تو تاحیر کم مانگیں اور بے سرو سامانی کے باوجود آخری فتح ہماری ہوگی“ چاہے ان لوگوں کے پاس ان محنت سائنسی شہدے ہوں، تباہ کن چیزیں ہوں اور خواہہ کتنے ہی منظم و متنبیانت ہوں۔“

”میرے محسوسات بہت سارے ہیں۔ اسی لیے تو میں کبھی زیادہ پریشان اور فکر مند نہیں ہوتی۔ مجھے ایک عجیب سا اطمینان قلب حاصل ہے۔“ راجیلہ بولی۔

پھر اس نے انڈینٹ کو اشارہ کیا۔ اس نے فریئر بند کر دیا۔ راجیلہ بولی ”وہ غنیمت لائیں اور بھی یہاں موجود ہیں لیکن وہ زیادہ اہم لوگوں کی نہیں ہیں۔ انہیں صرف مشاہدے اور تجربے کے لیے یہاں محفوظ کیا گیا تھا کیونکہ ان میں سے بھی کسی کے دماغ پر اور کسی کے جسم پر کوئی حیرت انگیز اور ناقابل فہم سا آپریشن کیا گیا

مارک کے بغیر بھی تو مجھ سے بات چیت کر سکتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”شاید اس میں کوئی ایسی مصلحت بھی ہو جسے ہم ابھی سمجھ نہ سکے ہوں۔ لی الحال میرا اندازہ تو یہی ہے کہ اس قسم کی تمام ڈرامے ہاتھوں کا سب سے بڑا مقصد تو سامنے والے کو مرعوب کرنا اور نفسیاتی طور پر ایک طرح سے اپنے نرالی میں لانا ہوتا تھا۔ مرعوب انسان کو پناہ کار بنانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ صرف اس لیے بھی ان کے اکثر کاموں میں بہت زیادہ گھماؤ پھراؤ دیکھنے میں آتا تھا۔ سائنسی شعبہ ہاتھوں کی مدد سے وہ اپنے آپ کو ایک مافوق الفطرت سی طاقت بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ لا شعوری طور پر ان کے شکار کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ ناقابل شکست ہیں چنانچہ وہ اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے بھی بہت زیادہ ڈرامائی قسم کے طور طریقے اختیار کرتے تھے۔“

پھر راجیلہ مڑوہ خانے کے انڈینٹ کو فریئر بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی ”اس کے علاوہ کسی بھی تنظیم کے طور طریقوں کے پیچھے اس شخصیت کی نفسیات بہت کام آتی ہے جو اصل میں اس تنظیم کی سربراہ ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ساری پاور اور تمام اختیارات ہوتے ہیں۔ تنظیم کے طور طریقوں میں اس کا کس ضرور فکر آتا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اس تنظیم کے پیچھے جو بھی شخصیت نہروں سے بڑھ گیا تو خود سائنس دان ہے یا سائنس اس کی کمزوری ہے لیکن اس کی ذہانت مافیائی ہے۔ لی الحال تو پانچ چھ سفید فام قومیں لی کر اس تنظیم کو بورڈ آف گورنری کی طرح چلا رہی ہیں اور اس کے ذریعے دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہیں لیکن ممکن ہے بعد میں تنظیم کو چلانے والی شخصیت اتنی طاقتور ہو جائے کہ وہ اکیلی ان پانچوں قوموں کو بھی انگلیوں پر چھانے لگے۔ شاید یہی قدرت کا انتقام ہو۔ یہی مکانات مل ہو۔“

پھر وہ ذرا آگے بڑھتے ہوئے بولی ”ایک بات البتہ ہمیں تقریباً یقینی حد تک معلوم ہو چکی ہے اور وہ بڑی حیرت انگیز ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”وہ شخصیت عورت ہے۔“ راجیلہ میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ ”میں ممکن ہے وہ اس وقت یہی نقاب مسکراتی بھی ہو۔“

”عورت واقعی بڑی ترقی کر گئی ہے۔“ میں نے اس ٹھنڈے ماحول میں مزید ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”بعض لوگ کہتے ہیں عورت کو زندگی کے تمام معاملات میں مرد کے برابر شانہ جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے بعض معاملات میں تو وہ مرد کا شانہ توڑ کر آگے نکل گئی ہے۔“

”جیس ہو گئے؟“ راجیلہ نے لائٹ سے پوچھا۔

”بہت غلط سمجھ رہی ہو تم۔“ میں نے مفہوم انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”مجھ میں جیس ہونے کا... خصوصاً عورت سے جیس ہونے کا تو ماہی نہیں ہے۔“

اس دوران انڈینٹ نے راجیلہ کا اشارہ پا کر ایک اور فریئر

ہم نے جب پہلے سے کھلے کیم سے اندر قدم رکھا تھا مایا کر  
یقیناً اسی وقت ہماری آمد کا پتہ چل گیا تھا لیکن وہ پوری طرح گردن  
تھما کر ہماری طرف دیکھنے کے بجائے محض ذرا سا ترجہا ہو کر  
نا محسوس سے انداز میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بارش معلوم  
ہوا تھا۔ سر پر اے کپڑے کی مختصر سی پگڑی تھی۔ وہ غالباً نوجوان  
ہی تھا۔

راحیلہ اس کے بارے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی  
”ویسے یہ ہے بڑے کمال کا آدمی! جنات کے چیلے سے معلوم ہوتا  
ہے۔ رات بھر دو تین گھنٹوں سے سوخ ہو کر ہوا ہے۔ دن میں بھی  
جب دیکھو اور دوسرے کو کسی نہ کسی چیز میں ہاتھ مارا پھرتا رہتا ہے۔  
معلوم نہیں سوتا کس وقت ہے۔ میرا خیال ہے میں تمہیں اس سے  
ملوای دوں تو بہتر ہو گا۔“

اب چونکہ اس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے راحیلہ  
تقریباً آٹھ گھنٹوں تک چھا ہوا غلاب ہٹا چکی تھی۔ بڑے بڑے تاریک  
شیشوں والا چشمہ البتہ ابھی ناک پر لگا ہوا تھا۔ اب اس کے چہرے  
کا صرف ایک چوتھائی حصہ سرخ و سفید دکھائی دے رہا تھا۔ گویا  
اب محکمہ خیزی نے ایک اور ذریعہ اختیار کر لیا تھا۔

راحیلہ نے بارعب لمحے میں پکارا ”سے مائی! اور چر تو۔“  
وہ محض جو راحیلہ ہی کے بیان کے مطابق محض شعل کے طور  
پر مائی کے کام سے دل بسلا رہا تھا، کھڑی رک کر نہایت آہستہ سے  
اٹھ کر ہماری طرف گھوما۔ اس کی یہ آہستہ اس کی ست طبعی یا بے  
دلی کی نشاندہی نہیں کر رہی تھی، اتنا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کا  
انداز درحقیقت کچھ ایسا تھا جیسے اسے پیچھے سے کسی شخص نے گم  
کی زبرد لے رکھا ہو اور وہ نہایت احتیاط سے حرکت کر رہا ہو۔ پھر  
دوڑنے سے انداز میں قدم اٹھاتا قریب آیا۔

وہ تین میرے سامنے آں کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چند سیکنڈ ایک  
دوسرے کو بغور دیکھتے رہے پھر یکدم بازو پھیلا کر بڑھے اور ہٹلگیر  
ہو گئے۔ اس کی ڈھلی ڈھالی واسکت کی دونوں پیروں میں یقیناً پٹسل  
موجود تھے جن کی جبین میں نے اپنی پٹیلوں پر محسوس کی۔ راحیلہ  
بڑی خوش دلی سے ہنس رہی تھی۔

ہم جب پرجوش معافہ کر کے اور ایک دوسرے کی پٹیلیاں  
کڑا کر اکٹھے ہو چکے تب بھی چند لمحے تک ایک عجیب سی خوشی  
کے ساتھ ایک دوسرے کا سر تپا جا رہے تھے۔

راحیلہ بولی ”کیسا لگا تمہیں ہمارا یہ مائی؟“  
”تمہارے لیے بڑی خوشی اور فخر کا مقام ہے کہ تمہیں ایسے  
مائی کی خدمات حاصل ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مائی بھی ایسا جس کے لیے مائی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔“  
وہ مسکراتے ہوئے دھیسے لمحے میں بولا ”یعنی مجھے غریب کو تو تنخواہ تک  
دینے کا تکلف نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ ڈیوٹیاں بھی دو دیتا ہوں۔  
دن میں مائی رات میں کاروبار بلکہ کبھی کبھی تو مزدور کے فرائض بھی

ہے۔ مجھے ایک یہ بات بھی بہت عجیب سی لگی ہے کہ ریڈ ڈاٹ میں  
کئی بہت ہی کمال کے سرجن موجود تھے جو طلسمائی قسم کے آپریشن  
کر سکتے تھے۔ عظیم میں انہیں بہت اہم مقام حاصل تھا۔ یہ بھی گویا  
ان کی حکمت عملی کا کوئی خاص حصہ تھا۔ معلوم نہیں مستقبل میں  
ان کا ان سرجنوں سے کیا کیا کام لینے کا ارادہ تھا۔“

”ان کے عوام تو شاخ در شاخ پھیلے ہوئے جنگل کی طرح  
تھے۔ معلوم نہیں وہ کس کس نماز پر کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔ پھر میں  
نے گویا خود ہی اپنی خوش فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا ”ہم تو ان  
کے لیے اس طرح ”تھے“ کا سینہ استعمال کر رہے ہیں جیسے ان کا  
پوری طرح قطع ہو گیا ہے۔ ابھی تو یہ تھوڑا ہمارے سر پر لٹک  
رہی ہے۔ میرا خیال ہے اس سانپ نے ایک شدید چوٹ کھائے  
کے بعد بطن میں سر پھیلایا ہے۔“

”ہم کسی خوش فہمی میں جلا نہیں ہیں۔“ راحیلہ بولی ”میرا حال  
اب یہ امید ضرور ہے کہ جہاں اتنی کامیابی ہوئی ہے وہاں مزید  
کامیابی بھی حاصل ہو جائے گی۔“

”ہم دونوں مڑھ خانے کے سروا محل سے نکل آئے۔ فریروں  
سے باہر بھی دہاں اچھی خاصی لٹھ تھی۔ باہر آکر حرارت کا  
احساس ہوا۔ میں راحیلہ کی رہنمائی میں ایک معقول قسم کے کوارٹر  
تک پہنچا جسے قدرے حسین ظن کے ساتھ بنگلا بھی کہا جاسکتا تھا۔ یہ  
بنگلہ اسپتال کی حدود میں ہی تھا۔ اس میں چھتر سالان بھی تھا جس  
پر بڑے خوب صورت رنگارنگ پھول کھلے تھے۔

پورچ میں داخل ہوتے ہوئے راحیلہ بولی ”محل میں یہ بنگلہ  
اسپتال کے ایک ڈاکٹر کو ملا ہوا ہے۔ وہ آج کل ایک لمبے کورس  
کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے اور میں یہاں پناہ گزین  
ہوں۔“

لان کے ایک کونے میں ایک مائی بیٹھا کھڑی سے کباری  
درست کر رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے راحیلہ  
کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”لان کی حالت بتائی  
ہے کہ مائی بہت سختی ہے۔“

راحیلہ ہلے سے ہنس دی اور برآمدے میں رکتے ہوئے بولی  
”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ مائی نہیں ہے۔ یہ میرا باڈی  
گاؤڑ ہے لیکن اس کی ڈیوٹی اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب میں  
رات کو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ اس کے  
بعد یہ میرے کمرے سے نکلے تک گھر کے چاروں طرف بھوکے چنے کی  
طرح چکر لگاتا ہے۔ قطعاً اس کے پیچھے یہ ہے کہ جاگتے ہیں تو میں  
اپنی حفاظت خدا بھی طرح کر سکتی ہوں البتہ سوتا ہوا انسان کمرے  
برابر ہو چکے ہیں اسی لیے نہیں صاحب نے اس کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ یہ  
اس دوران میری حفاظت کرے جب میں کمرے برابر ہوتی ہوں۔  
حالانکہ میرا خیال ہے میں اس وقت بھی کمرے برابر ہرگز نہیں  
ہوتی۔“

انجام دینے پڑتے ہیں۔  
 ”چلو۔ بنگلے بعد میں ہوتے رہیں گے اب تم دونوں اندر چلو۔“ راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔  
 مانی جو در حقیقت لڑتی تھا اپنے منی میں تھڑے ہوئے ہاتھ واسٹ پر رگڑ کر صاف کرتے ہوئے ہمارے ساتھ چلی پڑا۔ راحیلہ اندر مٹی روانے کا کالا کھولنے لگی تو لڑتی ڈور میٹ پر گر کر انور جوٹے صاف کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔  
 ”چلیں آپ کی آمد کی خوشی میں آج ہمیں بھی میڈم راحیلہ کے گھر میں داخل ہونے اور ان کے ہاتھوں سے اپنی کچھ خاطر تواضع کرانے کا موقع مل جائے گا ورنہ ہماری دوڑ تو سرونٹ کو ارنڈ سے لان تک ہی رہتی ہے یا ہجرات کو امتحان کی طرح اس مکان کے گرد حواف کرتے رہتے ہیں۔“

”میرے ہاتھوں سے خاطر تواضع کرانے کی تم نے اچھی کہی۔“ راحیلہ دونوں ہاتھ مسل کران پر پھونک مارتے ہوئے بولی ”تم نے اگر اپنی اوقات بھولنے کی کوشش کی تو واقعی میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری ”خاطر تواضع“ کھوں گی۔“ اس نے کرائے کے اسٹائل میں اسے ہاتھ دکھایا۔  
 لڑتی میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”لگتا ہے آپ کی آمد سے بھی اپنی اوقات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔“  
 ”اس پر مجھے بھی شرمندگی ہے۔“ میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان شرمسارانہ بناتے ہوئے کہا ”مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میں اپنی عدم موجودگی میں اتنا ہی گریڈ ہو چکا ہوں۔“

ہم اندر پہنچ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ چکے تو راحیلہ نے برق آماہر کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب میں نے صبح طور پر اس کا جائزہ لیا۔ وہ یوں تو ٹھیک ٹھاک ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن محض آدھا چہرہ سیاہ ہونے سے اس کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ عجیب عجیب سی لگنے لگی تھی۔  
 وہ جوتے آمار کو در در پیچھتے ہوئے بولی ”اپنی! مذاق ایک طرف۔ اب تم سنجیدی سے بتاؤ تم بالکل ٹھیک ہو؟“ تمہیں زیادہ تکلیف تو اٹھانا نہیں پڑی؟ ہم سب ساتھی کو کہ یہاں بہت بڑی طرح اٹھے ہوئے تھے لیکن ہمارے ذہن تم میں ہی اٹھے ہوئے تھے ہم سب تمہاری طرف سے زیادہ فکر مند تھے۔ ہمیں اپنی باتوں کی اتنی فکر نہیں تھی۔“

”ہاں سر! میڈم راحیلہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم اب واقعی سنجیدی سے آپ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔“ منی مذاق تو ہوتا ہی رہا ہے۔ ”لڑتی واقعی سنجیدی سے بولا ”دیکھ آپ کو صبح سلامت اپنے سامنے دیکھ کر ہماری کھوئی ہوئی خوشیاں تو گھبرا دیاں آئی گئی ہیں۔“

”تم لوگ میری عدم موجودگی میں خاصے تیز و دار سے ہو گئے۔“ دیکھ رہا ہوں سب ساتھیوں کے لیے میں بڑا ادب احترام کر رہا ہوں۔ ”لیکن اس مت کرو۔“ راحیلہ نے اسے ڈانٹا پھر میری طرف دیکھ کر کشافیت سے لہجے میں بولی ”جب سے ہم بڑا رخت وقت پڑا ہے یہ کچھ زیادہ ہی شوق ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں اس کی جس مزاح کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئی ہے ورنہ یہ اچھا خاصا سنجیدہ نوجوان ہو کر آتا تھا۔“

”شکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسمان ہو گئیں۔“ لڑتی ٹھنڈی

آگیا ہے۔ راحیلہ کو سب ”میڈم یا میڈم راحیلہ“ کہہ کر پکارنے لگے ہیں۔ ”میں نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”سر! ہم تو کیا انہیں تو اچھے پہلے سرکاری لوگ بھی میڈم کہنے لگے ہیں۔“ لڑتی بولا ”انہوں نے کارٹاسے ہی ایسے انجام دیا ہے۔  
 ”میں تو یہاں باقاعدہ ایک طویل جنگ لڑتی رہی تھی اور میڈم نے اس میں ایک جہز کی سی شائق اور مہارت کا مظاہرہ کیا۔“  
 ”یہ مظاہرہ اس لحاظ سے تو اسے منگا پڑا ہے کہ ہر ایک نے اسے میڈم کہنا شروع کر دیا ہے۔“ میں نے شرارت سے راحیلہ کی طرف دیکھا ”نہ جانے کیوں میڈم کے انقلاب سے ذہن میں اچھی خاصی کچی عمر کی خواتین قسم کی عورت کا تصور ذہن میں آتا ہے۔“  
 ”سر! آپ مذاق میں مائلے کی کوشش نہ کریں۔“ ہمیں بتائیں آپ پر کیا کڑی! لڑتی بولا۔

”مجھ پر جو کڑی میں تم لوگوں کو دیکھ کر وہ سب بھول گیا ہوں۔ جس کے تم جیسے ساتھی موجود ہوں اسے دنیا میں ذرا بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ واپس آنے کے بعد میں تو یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے اس طرح منہ اٹھا کر بھانسنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حال میرا بھی تم لوگوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہا۔ جب سب دوست اکٹھے ہو کر میٹھیں گے تو پھر یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ ابھی تو کئی ساتھیوں سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ ”میر“ مسعود شفیق شاد شہیر ”خج“ سردار علی اور حنیف کہاں ہیں؟“ میں نے بھی ذرا اطمینان سے بیٹھے ہوئے کہا۔

راحیلہ بولی ”وہ سب مختلف مقامات پر مختلف بہروپوں میں ڈھونڈ رہے ہیں جو بظاہر مسکند خیر معلوم ہوتی ہیں لیکن ضروری ہیں۔“ میر اور مسعود تو وہیں خانہ بدوش کی کشتی میں رہتے ہیں جہاں سے تم آ رہے ہو لیکن اس وقت وہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ سلیمان بھی ٹنڈے فقیر کے روپ میں وہیں رہتا ہے۔ اسے جہاں جانے کا حکم ملتا ہے وہاں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بظاہر بھیک مانگتا رہتا ہے۔“

”اور اچھا خاصا دولت مند ہو چکا ہے۔“ لڑتی نے لقمہ دیا ”پچھلے دنوں اس کی ڈھولی سینٹرل بورڈ آف ریونیو کی غارت کے قریب لگی تھی لیکن وہ جلد ہی وہاں سے بھاگ آیا تھا کہ کس انداز سے کوئی بڑا انفراس سے انکم ٹیکس وصول کرنے نہ آجائے۔ وہ تو سنجیدی سے اس کام کو کئے پینے کے طور پر اختیار کرنے کی سوچ رہا ہے۔“

”لیکن اس مت کرو۔“ راحیلہ نے اسے ڈانٹا پھر میری طرف دیکھ کر کشافیت سے لہجے میں بولی ”جب سے ہم بڑا رخت وقت پڑا ہے یہ کچھ زیادہ ہی شوق ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں اس کی جس مزاح کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئی ہے ورنہ یہ اچھا خاصا سنجیدہ نوجوان ہو کر آتا تھا۔“

”شکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسمان ہو گئیں۔“ لڑتی ٹھنڈی

انہیں لے کر ہوا۔

راجیلہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی ”اگر ٹیکسی چلاتا

ہے۔“

”اس سے اور سلیمان سے تو میں مل چکا ہوں۔ مجھے ہوسٹل سے احمد علی اپنی ٹیکسی میں لے کر آیا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”وہ ٹیکسی لے کر زیادہ تر اسلام آباد ہوئی کے سامنے ہی کھڑا رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اسے صرف غیر ملکی مسافروں کو لانا ملے جاتا ہے۔“ راجیلہ نے بتایا ”سرور علی غریب بستیوں میں باکر بندر چھٹا ہے۔“

”کیا؟“ میں تقریباً اچھلی پڑا۔ سرور علی نام سے کسی لکنا تھا کہ وہ کوئی نہ ساقی سا شخص ہو گا لیکن وہ ایک نفیس ”ماڈرن اور خالص شہری“ نوجوان تھا۔ چہرے مہرے اور شخصیت سے کسی آسودہ حال گھرانے کا لڑکا لگتا تھا۔ اس کی شخصیت ٹوٹی اور شفیع شاہ سے کچھ ملتی جلتی ہی تھی لیکن وہ ذرا زیادہ چڑا چکا اور قدر سے بھاری جسم کا تھا۔ ٹوٹی اور شفیع شاہ کی طرح چھری سے جسم کا نہیں تھا۔ ہر حال میں اسے بندر بچانے والے کے روپ میں تو چشم بقصور سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

راجیلہ میری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”شاہی ریڈ ڈاٹ والوں کے باغیچہ وغیرت سے چھینسلز کو دیکھ کر نفیس صاحب کو خیال آیا کہ ان کی انجینی کے پاس بھی ایک تربیت یافتہ اور حیرت انگیز جسم کا بندر موجود ہے لیکن اس سے کام لینے کا ہتھیار صرف سرور علی نے قبول کیا اور اب وہ بندر بچانے والے کے روپ میں دن میں بھر غریب بستیوں میں گھومتا ہے اور رات کو وہ خانہ بدوشوں کی بستی میں آجاتا ہے۔“

”اکیس کوئی ہی سمجھ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی انجینی کو یہ خبر ملی تھی کہ سرحدی علاقے کی طرف سے آنے والا روسی اسلحہ اب غریب بستیوں میں پھیلایا جا رہا ہے۔ غیر ملکی طاقتوں نے ہمارے ہاں جو تحریک کار داخل کر رکھے ہیں یا جن جن مقامی لوگوں کو اپنا ایکٹ بنا رکھا ہے۔ انہوں نے اب بھی آباؤوں میں اسلحہ ذخیرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ فردخت اور تقسیم کا کام اب وہاں سے ہو رہا ہے لیکن یہ بستیوں اتنی زیادہ تعداد میں اتنے بے ہنگم طریقے سے پھیلی ہوئی ہیں کہ ان سب کی تلاش لینا ان کے سلسلے میں کوئی صحیح آپریشن کرنا بہت مشکل ہے۔ بے گناہ لوگوں کے زیادہ مارے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ دہشت گرد تو تربیت یافتہ ہوتے ہیں وہ بے گناہوں کو مروانے کا بندوبست کر کے صاف نکل جاتے ہیں۔ کارروائی کیسے والوں کی بعد میں شامت آتی رہتی ہے۔ ان پر خوب لعن طعن ہوتی ہے۔“

”سرور علی اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اسے ان بستیوں میں جس جگہ کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ وہاں اسلحہ ذخیرہ کیا جاتا ہے اس جگہ کا محل وقوع وہ بندر کو

”وہ بن نفیس“ کہہ رہا ہے بعد میں بندر موقع پا کر اکیلا وہاں گھٹتا ہے۔ جگہ اگر دشوار گزار بھی ہو تو وہ بندر ہونے کی وجہ سے آسانی سے وہاں پہنچ جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی ثبوت حاصل کر لیتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ کوئی ایسا ہتھیار یا ڈبا وغیرہ ہی اٹھاتا ہے جس سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں کوئی ذخیرہ موجود ہے پھر نفیس صاحب نہایت خاموشی سے وہاں چھاپا ڈالنے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اسلحے کے دو بڑے ذخیرے پکڑنے میں کامیابی ہو چکی ہے۔“

”کیا یہ بھی ریڈ ڈاٹ کا کام تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ اس کا ایک نہایت معمولی سا شعبہ تھا۔ وہ اس میں براہ راست کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ اس نے ہمارے قلی کوچوں میں خطرناک اسلحے کا سیلاب لانے کے لیے کچھ لوگوں کو خرید لیا تھا۔ بعد میں اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تھوڑے سے پیسے کے لیے ہماری قوم اپنی جڑیں خود کاٹنے میں خود کفیل ہے۔ ہر حال نفیس صاحب لگے ہاتھوں جس جس طرف توجہ دی جا سکتی ہے وہ رہے ہیں۔ جو کام نٹ سکتا ہے منٹائے جا رہے ہیں لیکن ہر کام درحقیقت بہت مشکل ہے۔ صرف یہ اسلحہ کا مسئلہ ہی حل ہونا نظر نہیں آتا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک اسلحہ پھیلایا گیا ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ پڑا ہی زور اثر زہر ہے جس سے قوموں کو کم سے کم وقت میں ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ قوم اسی اسلحے سے خود کشی کر لے گی۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راجیلہ بولی ”شفیع شاہ، شیریں شاہ اور حنیف قدرے معززانہ کام کر رہے ہیں۔ وہ کچھ غیر ملکیوں کی نگرانی کر رہے ہیں جو یہاں بہت ہی خشن اور اہم عیدوں پر کام کر رہے ہیں۔ نفیس صاحب ان کی نگرانی کے لیے سرکاری گاڑیوں کو لگاتا نہیں جانتے تھے۔“

”کیا تم سب لوگ آج کل نفیس صاحب کی ماقبلی میں کام کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں“ راجیلہ نے جواب دیا ”اپنے آدمیوں کی انچارج تو میں ہی ہوں لیکن میں نے نفیس صاحب کی ماقبلی میں کام کرنا قبول کر لیا تھا۔ جب ہمیں معلوم ہوا تھا کہ درحقیقت وہ صرف دکھاوے کے لیے تم سے بے اعتنائی برت رہے تھے لیکن اصل میں وہ ہمارے ہمدرد بھی تھے اور ہماری خدمات کے معزز بھی۔ تو میں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی پیشکش قبول کر لی تھی۔ وہ بہت بڑی طاقت ہیں۔ کم از کم ریڈ ڈاٹ کے معاملے میں ملک کی تین بڑی خفیہ ایجنسیوں کی سربراہی عارضی طور پر ان کے پاس ہے۔ اگر میں ان کا تعاون قبول نہ کرتی تو ریڈ ڈاٹ والے ہمیں چن چن کر مار ڈالتے۔“

”نفیس صاحب بلاشبہ بہت بڑی طاقت ہیں لیکن وہ جو سب سے بڑی طاقت اور موجود ہے اس کی خوشنودی کے بغیر کچھ ہونا

نامکن ہے۔" میں نے علامتی طور پر ہتھ کی طرف لیکن درحقیقت آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"وہی سب سے بڑی طاقت تو دراصل ہمیں دوسری چھوٹی چھوٹی طاقتیں کا تعاون مہیا کرتی ہے۔" راحیلہ مسکرا کر بولی "ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل کرنے کے لیے وہ ہمیں ظاہری دسائل تو مہیا کرتی ہے۔"

"شکر ہے کہ تم بھی بات کو سمجھتی ہو۔" میں نے طرہیت سے کہا "بہر حال نفیس صاحب نے ہمارے ساتھیوں کو عجیب سی کاموں پر لگا رکھا ہے۔"

"بظاہر یہ کام کچھ حقیر اور منہمکہ خیز ہیں لیکن درحقیقت بہت اہم ہیں۔" راحیلہ بولی "جب سے ہمارا ریڈ واٹ سے براہ راست کرنا شروع ہوا ہے اس کے بعد سے بہت سے لوگ غائب ہو گئے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ انہیں تلاش کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں صحیح طور پر سمجھنا پڑا نہیں چل رہا کہ کہاں کہاں ان کا کوئی کوئی موجود ہے اور وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھا کیا جال بن رہا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ جائز اور ناجائز طریقوں سے ہمارے ملک میں جو غیر ملکی چلے آ رہے ہیں ان میں سے کون کون بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے انجیل ہیں اور وہ کیا مقصد سے کر رہے ہیں۔ ہم اور نفیس صاحب کے ہزاروں افراد کو بڑے ملک میں پھیل کر اپنی راست میں ان معاملات پر نظر رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ کچھ ایسا ہی کام ہے جیسے سمندر کی تہ میں اتر کر چند مخصوص بھٹیوں کو تلاش کرنا۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ جتنی محنت لگیں اور جذبات کی شدت کے ساتھ ہم لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں اور ہم نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ضرور رنگ لائیں گی۔" میں نے دھڑکنے سے کہا پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے گویا اپنے آپ سے کہا "معلوم نہیں نفیس صاحب کو اب بھی میری ان قربانیوں کا احساس ہے یا نہیں؟"

"بہت اچھی طرح احساس ہے۔" راحیلہ بولی "انہیں معلوم ہے ہمیں کدوؤں کا تو بلی نقصان ہی پہنچ چکا ہے کامیاب رہا ہو رہا ہے۔ ہمارا عظیم الشان ہنگامہ اس کے آڑا کیا گیا۔ ہمارے گھنٹے بے دوستوں اور ہمدردوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ خود ہمیں جو نقصان اٹھانا پڑا ان کا کوئی شائبہ نہیں۔ نفیس صاحب کو ان سب کا احساس ہے۔ اس لیے تو اب ان کا رویہ اتنا بدلا ہوا ہے وہ ہمیں اپنے آدمیوں سے زیادہ عزت دیتے ہیں۔"

"مجھے راپس آکر یہی دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مجھے تو ان کا دل جیتنا ریڈ واٹ سے مقابلہ کرنے سے زیادہ مشکل محسوس ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں، دوسری سب سے قیمتی کامیابی امداد ہونے لگی ہے۔" راحیلہ نے کہا "میں نے اپنے ساتھیوں کو براہ راست اور غیر براہ راست اپنے ساتھ شامل کیا اور

اس کے لیے نظام بھی تیار کیا۔" باقاعدہ اپنی اپنی حد بندیوں مقرر کیں تو انہوں نے ہمیں سرکاری خزانے سے باقاعدہ تنخواہیں تمام الاؤنسز اور اخراجات وغیرہ بھی دوانے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا اور انہیں بتایا کہ ہم اس سے گئے گزرے نہیں کہ سرکاری خزانے پر بوجھ نہیں یا میکرت فنڈ وغیرہ اپنے اوپر خرچ کرنا نہیں بلکہ ہمارا ان کا ساتھ بھی عارضی ہے نہ جانے کب ہمارا کام ختم ہو جائے اور ہمارے راستے الگ الگ ہو جائیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "اپنی اپنی جگہ تلفظ ڈوبنا انہماک دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی کھانا اس مقام پر بھی جانا پڑتا ہے جہاں بظاہر وائز سلائی کا کام ہوتا ہے۔ اگر وہاں سرنگ کی کھدائی کامیاب ہو جاتی ہے اور کبھی ریڈ واٹ کا پوزیشن قلعہ نکل آتا ہے تو ہمیں اس کے دور عمل کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا۔ فی الحال تو ہم سب بظاہر مزدور و فیرو کی حیثیت سے وہاں جاتے ہیں اور کام کا جائزہ لے کر اپنی اپنی رائے دیتے ہیں حالانکہ ہم نہ انجینئرز ہیں نہ الیکٹریکس یا دوسرے علوم کے ماہر لیکن ہماری رائے کو بہر حال اہمیت دی جاتی ہے اور وہ دیکھنا پڑا کرتی ہے۔ اگر ہم کوئی مشورہ دیں تو اس پر عمل کیا جاتا ہے۔"

میں نے زار و زبانی سے اس کے ٹھکے ہوئے پوچھا "تم لوگ کس نتیجے پر پہنچے ہو۔ اس کھدائی کا کوئی نتیجہ نکلا نظر آ رہا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کھانا جا سکتا۔" راحیلہ بولی "بہت سی خاص قسم کے کھینچاؤ اور مواد کی بنیاد پر فورسز کے بڑے خاص خاص انجینئرز وغیرہ کے مشوروں کے بعد یہ کام شروع کیا گیا ہے۔ شاید کوئی نتیجہ نکل ہی آئے۔ ہم تو بس ان کی مدد کے لیے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔"

اس دوران انٹیلی کی ایک بڑی سی ٹرانی پر اسپتال کے میں سے کھانا اٹھایا، ٹوٹی باجر جا کر برتنوں میں کھانا لانے کے بعد بولا "ہاں ہم غریبوں کا خانہ بدوشوں کے لیے بہت اچھے انتظامات ہیں۔ بیٹھے بٹھائے کھانا مل جاتا ہے۔"

"جیسی اس کی طبیعت میں کچھ حرام خوردی سی آتی جا رہی ہے۔" راحیلہ کھانا میز پر لگائے ہوئے بولی۔

کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں اور مجھے حالات سے زیادہ سے زیادہ آگاہی ہوئی رہی۔ اس دوران راحیلہ سیاہ چشمہ بھی اُتار چکی تھی اور میں نے کئی بار غیر محسوس سے انداز میں ذرا قریب سے اس کے چہرے کے سیاہی کے جائزہ لیا تھا۔ اس کی جلد سفید تھی سی کی طرح ہموار تھی لیکن اس میں آکر کل کی سی چمک تھی۔

کھانے کے بعد راحیلہ برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے ٹوٹی سے مخاطب ہوئی "تمہاری دہریہ سے ہم لوگ باتیں کر رہے ہیں کھانا بھی کھالیا۔ بول بول کر دوبارہ گلا خشک ہو گیا لیکن ہمیں اپنی توفیق نہیں ہوئی کہ کچن میں جا کر کائی یا بنا لاؤ۔ باس کے لیے جان دینے کو تیار رہتے ہو۔ ان کی خاطر دیرارات کے لیے کافی بنانے کی

رحمت نہیں کر سکتے۔

”یہ شعبہ خواتین کا ہے۔“ ٹونی کاؤچ سے اتر کر مائیں والے انداز میں قائلین پر بیٹھنے ہوئے بولا۔

”جب تمہیں کوئی مقدمہوں کی مادی خاتون خانہ میرا جائے گی جب یہ بات کرنا۔ فی الحال تو جا کر کافی بلاؤ۔“ کیونکہ یہاں کوئی خاتون خانہ نہیں ہے اور ہم سب کمانڈو کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔“ راحیلہ بولی۔

ٹونی نے پھر بھی اٹھنے میں معنوی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو راحیلہ پہلے سے زیادہ بار صبر لیجے میں بولی ”میں تمہیں کمانڈرائس ٹی ایف ٹو کی حیثیت سے حکم دیتی ہوں کہ جا کر خود سمیت تینوں کے لیے کافی بلاؤ۔“

تب ٹونی کراہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور چھت کی طرف دیکھ کر فریادی انداز میں بولا ”اللہ میں واقعی عورت کو اختیارات مت دیتے گا۔ یہ تو معلوم نہیں مردوں کا کیا حال کرے گی۔ ذرا اندازہ لگائیے کافی بوائے کے لیے کمانڈرائس ٹی ایف ٹو کے اختیارات استعمال ہو رہے ہیں۔ اللہ اللہ!“

”چھوٹی موٹی حیثیت میں تم مرد لوگ بے چاری عورت کی بات پر کان ہی کھلا دھرتے ہو۔“ راحیلہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

ٹونی اپنی مختصر سی چوکی کے درمیان سے سر کھٹکاتا کہن میں چلا گیا۔ میں نے راحیلہ سے پوچھا ”یہ ایس ٹی ایف ٹو کیا بلا ہے جی؟“

”اسپیشل ٹاسک فورس نمبر دو۔“ راحیلہ بولی ”یعنی ہمارے راتھیوں کا گروپ جس کی کمانڈر میں ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کا قلع قوع کرنے کے لیے جو سرکاری مشنری حصہ لے رہی ہے وہ ایس ٹی ایف ون کمانڈو ہے۔ ہم لوگ ان کے سامنے اسی طرح ہیں جیسے پرازے کے سامنے چوہا لیکن فی الحال عارضی طور پر ہماری جگہ ایک سرکاری حیثیت ہے۔ اب تم آگے ہو تو شاید اپنے گروپ کے کمانڈر کے فرائض تمہیں سنبھالنے پڑیں۔“

”مجھے معاف ہی رکھو۔“ میں نے جلدی سے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا ”مجھے فی الحال حالات کے سریر کا صحیح طور پر پتا نہیں ہے۔ میں اس کمانڈر کی اہل نہیں ہوں۔ میں تو تمہارے ماتحت کے طور پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”زتے دار یوں سے جان چڑھانا تمہیں خوب آگتی ہے۔“ راحیلہ بولی۔

”فی الحال تو مجھے یہاں کوئی کام ہی نظر نہیں آ رہا۔ وہ جو ایک کمانڈر ہے تاکہ فلسفے اسے کہتے ہیں جو کسی تاریک کمرے میں وہ چہا تلاش کر رہا ہو تا ہے جو وہاں موجود نہیں ہوگا۔ مجھے اس وقت تم سب اسی قسم کے فلسفے لگ رہے ہو۔“ میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

”تم واقعی نے آئے ہوئے لگ رہے ہو۔ ابھی صورت حال ہماری سمجھ میں نہیں آسکی۔ ہم اتنے احمق نہیں ہیں کہ محض زور و اثر ہر ٹانگ ٹوئیاں مارنے کے لیے اتنا وقت اور انرژی ضائع کرتے پھر جس کام بہت مسئلہ میں بہت خاموشی سے ہوا ہے اور اس کے نتائج یکدم سامنے آئیں گے۔“

”پلے کا تو مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ احمق نہیں تھے اور تمہیں زور و اثر ہر ٹانگ ٹوئیاں مارنے کی عادت نہیں تھی لیکن میں نے سوچا شاید سرکاری تحویل میں آنے کے بعد ایسے ہو گئے ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”زیادہ طوفانے کی ضرورت نہیں ورنہ ایسا کونسا رسید کروں گی کہ یہ فوٹاچوٹ نقلی موٹھیں راتوں سمیت معدے میں پہنچ جائیں گی۔“ اس نے کونسا ہوا میں لہرایا۔

”بس بس ہمیں اتنی جلدی اپنی اوقات پر آنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”تو رات بھر مجھے یہ بتاؤ“ نفیس صاحب سے یہ سب معاملات کب اور کس طرح طے پائے؟“

”یکدم ہی۔ اور بڑے طوفانی سے انداز میں۔“ راحیلہ نے جواب دیا ”ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ نفیس صاحب ہماری عمرانی کر رہے تھے۔ ہمیں محکوک سمجھ کر نہیں۔ بلکہ ہمارے ذریعے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں خبردار رہنے کے لیے۔“

پھر وہ اپنے تراشیدہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر کمری سانس لے کر بولی ”جب وزیر خارجہ حفیظ صاحب کے آبائی مکان پر بلا ہو رہی ہمارا ریڈ ڈاٹ سے ٹکراؤ ہوا اور تم حسب پروگرام ردپوش ہونے کے لیے نکل گئے تھے تو تمہارے پیچھے نفیس صاحب کے آدمی ہماری مدد کے لیے آئے پہنچے تھے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کے بعد بالکل پاسا ہی پلٹ گیا تھا لیکن صورت حال بہت بدل ضرور تھی تھی۔ ایک جنگی جہلی کا پٹرک ہماری مدد کے لیے آئے پہنچا تھا لیکن وہ غلوں جو کمرہ کوئی مشینری وغیرہ باغی آؤٹی پھر رہی تھی ان میں سے ایک نے اس جہلی کا پٹرک بھی نقصان ہی دیا کہ اسے تباہ کر دیا۔ تب نفیس صاحب کو اندازہ ہوا کہ ان کا سامنا واقعی کچھ خطرناک لوگوں سے تھا۔ وہ اس وقت لاہور میں ہی ایک کنٹرول روم میں بیٹھنے تھے اور انہیں ایک ایک جہلی کی خبر مل رہی تھی لیکن ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ بہت سے کمانڈو وہاں پہنچ چکے تھے اور ہم حیران تھے کہ وہ کون لوگ تھے جو ہماری مدد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“

میں حیرت سے راحیلہ کی باتیں سن رہا تھا جو شاید ایک بار پھر اس وقت کے تصور میں کچھ کمی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی ”اس روز ریڈ ڈاٹ نے ہمارا جلد از جلد صفایا کرنے کے لیے وہ آڑے والے آدمی کافی تعداد میں میدان میں جھونک دیے تھے۔“

میں حیرت سے راحیلہ کی باتیں سن رہا تھا جو شاید ایک بار پھر اس وقت کے تصور میں کچھ کمی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی ”اس روز ریڈ ڈاٹ نے ہمارا جلد از جلد صفایا کرنے کے لیے وہ آڑے والے آدمی کافی تعداد میں میدان میں جھونک دیے تھے۔“





## رومانی ناول

|      |             |               |
|------|-------------|---------------|
| 75/- | عجمیدہ جبین | زیب           |
| 75/- | حمیدہ جبین  | شاخ بریدہ     |
| 75/- | حمیدہ جبین  | حنان اور پتھر |
| 75/- | حمیدہ جبین  | گیت یہ میرے   |

مکتبہ القرمیش اردو بازار لاہور 2

کے لیے مسائل کھڑے ہونے لگے۔ انجام خراب کرنے کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ عجیب عجیب سازشیں شروع ہو گئیں۔ ہمارا پورا حکومتی ڈھانچا لرزنے لگا۔ نفیس صاحب پر چاروں طرف سے زبردست دباؤ تھا۔

”اوہ۔ میرے خدا!“ میں بے اختیار لٹھری سانس لے کر رہ گیا۔ چھوٹے کمزور اور منتشر منتشر رہنے والے لڑکوں کی بے بسی کی یہ بڑی پرانی کہانی تھی۔ راحیلہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”ماہم نفیس صاحب نے ہوشیاری سے اپنا کام جاری رکھا۔ انہوں نے اس دباؤ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے لیکن غیر ضروری اڑاؤں کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ وہ بڑی ذلیلہ می سے چلتے رہے۔ اس دوران حالات نے ایک عجیب پلٹا کر دیا۔ ہمیں ایک ایسے طریقے سے دو میسر آئی جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔“

وہ ایک لمحے کے لیے پُر خیال انداز میں اپنے کافی کے گم کو دیکھتی رہی پھر بولی ”ہنی عرف پر نفس حیدہ کو تم ابھی بستر مرگ پر دیکھ کر آ رہے ہو۔ تم نے اسے تندرستی اور صحت مندی کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔“

”ہاں“ میں نے اپنے دل میں انفرادی کی ایک لڑھکھوس کر کے ہوئے کہا ”لوگ تاخیر اشارہ ہو گئی میں اس کا ڈانس دیکھ کر دیوانے ہو جاتا تھے۔“

”ہی ہنی ان دنوں ریڈ ڈاٹ کے پاس تھی اور کچھ دنوں کے لیے زیرِ غاب رہنے کے بعد کسی نہ کسی طرح اپنا اعتماد کالی حد تک بحال کر چکی تھی۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے اسے ہمارے ہاں کی ایک بہت بڑی اور معروف سیاسی شخصیت کے پیچھے لگایا تھا۔ وہ شخصیت کچھ عرصے کے لیے ایک بہت بڑے عہدے پر فائز رہی تھی۔ اس دوران ایک نہایت اہم فائل ان صاحب کے سامنے سے گزری تھی جسے تم ہمارا ایک بڑا قوی راز بھی کہہ سکتے ہو۔ ہنی کو اس کے صرف چند اہم نکات معلوم کرنے کے لیے اس شخصیت کے پیچھے

جس اور بخوبی انگلیاں مگ کے بڑے سے پینڈل پر تختی سے جی کی تھیں۔ وہ بلاشبہ فولادی اعصاب کی مالک تھی۔ مجھے فکر تھا کہ جیسی لڑکی میری ساتھی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”ایک مرتبہ کے دورِ وار۔ براہِ راست۔ ٹکرائو کے بعد صورت حال پھر پہلے ہی کی طرح ہو گئی تھی۔ نفیس صاحب کے ساتھ ہمارا باضابطہ طور پر تدارک ہو چکا تھا۔ تمام معاملات اور تفصیلات طے ہو گئی تھیں لیکن اس اتحاد کا کوئی ناکہ نہیں تھا۔“

”کونے والے جو لوگ ہاتھ لگے تھے اور جنہیں نفیس صاحب نے پشاور کے قریب کسی غیبی مقام پر بھجوا دیا تھا ان سے بھی کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں وہی بتانے لگی تھی۔“ راحیلہ بولی ”وہ بہت معمولی لوگ تھے اور ایک طرح سے قربانی کے کھڑوں کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ سب ہمارے ہم وطن تھے۔ بہر حال نفیس صاحب کے آدمیوں کے جو بھی تحقیقات وغیرہ کے طریقے ہوں گے وہ ان پر آزمائے جاتے رہے ہوں گے۔ کئی دن بعد آخر کار ان میں سے ایک نے زبان کھولی اور چند پیرامیٹروں کے نام بتائے جن کے توسط سے انہیں ہماری ہتھیاری رقبوں کی تفصیل اور رات رات انہیں مختلف کاموں کی تربیت دے کر ان میں الجھایا گیا تھا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس سارے سلسلے کے پس پردہ اصل طاقت کس کی تھی اور اصل تکمیل کیا چلی رہا تھا۔ وہ بس پکاؤ قسم کے عناصر تھے۔ معلوم نہیں کیا کچھ کر چکے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ گرفت میں آنے کے بعد وہ خود کو کشتی نہیں کر سکتے تھے۔ معلوم نہیں کس طرح وہ اس ”سولت“ سے محروم رہ گئے تھے۔“

”شاید ان کے پاس اہم معلومات نہیں تھیں اس لیے انہیں اس ”سولت“ سے ”مورستہ“ کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو یا پھر وہ اس لیے اس سولت سے محروم رہ گئے ہوں کہ انہیں ہنگامی طور پر تیار کیا ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”خیر وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو بہر حال وہ زندہ رہے۔ البتہ ”تحقیقات“ میں ان کی جو حالت ہوئی سو وہی۔ اس دوران احتیاطاً انہیں ایک جگہ سے دور کر کے نقل کیا جاتا رہا۔ شاید ان تمام قلعوں میں رکھا گیا جو تاریخ سے زیادہ تحقیقات کے سلسلے میں مشہور ہیں۔“

”جن غیر کلیوں کے نام ان میں سے کسی نے بتائے تھے ان کے سلسلے میں کیا کیا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب کے سب سفید نام تھے اور کسی نہ کسی بہرکاری یا نیم سرکاری حیثیت میں یہاں موجود تھے تاہم بڑی احتیاط سے ان پر ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن پتا چلا کہ ان میں سے بیشتر غائب ہو چکے تھے۔ صرف دو افراد ہاتھ آئے۔ انہیں پکڑنے پر بھی فوراً احتجاج شروع ہو گیا۔ سفارتی تعلقات خراب ہونے لگے، حکومت

لگایا گیا تھا۔ اسے کروڑوں روپے کی جیکٹس کے اختیارات بھی دیے گئے تھے۔  
 ”کیا بتائی اس مشن میں کامیاب ہو گئی تھی؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

راحیلہ نے ٹہنی میں سر ہلایا ”وہ ٹھنڈے دھماکے کی حد تک یہ کام کر رہی تھی۔ اس کی حقیقت وہی تھی اس میں نہیں تھی۔ دوسرے وہ شخصیت بھی کم از کم اس اہم قومی راز کے جیلے میں اس کے قابو میں نہیں آنے والی تھی۔ تاہم اس نے دھماکے کے لیے اس شخصیت تک رسائی حاصل کر لی تھی اور پھر اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اصل اہم بات یہ ہے کہ اس دوران اس نے ایک جگہ میری جھلک دیکھی۔ وہ مجھے تھماری قریب ترین ساتھی کی حیثیت سے پہچانتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کو جو نقصان پہنچا تھا اس میں میں نے خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ معلومات بھی اسے ریڈ ڈاٹ میں ہونے کی وجہ سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ ریڈ ڈاٹ والوں کو جن لوگوں کی تلاش تھی میں ان میں سرفہرست تھی۔ بتی کو بھی اس مسئلے میں میرے بارے میں فید کیا گیا تھا کہ وہ اپنی دیگر سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے میرے بارے میں بھی خبردار رہے اور اگر میرا کوئی سراغ ملے تو فوراً ریڈ ڈاٹ کو مطلع کرے۔“

”لیکن وہ ایسا کرنے کے بجائے تم سے مل بیٹھی؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں وہ جان کی بازی لگا کر ریڈ ڈاٹ کے خلاف ایک آخری وار کھیلنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے چند منٹ کے لیے مجھ سے ملاقات کی اور ان چند منٹوں میں اتنی ہمت سی معلومات میرے کانوں میں اُنڈیل دیں کہ میرے لیے ان کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔“ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔

”نئی ہوا میں کسی غیر ملکی چیز کو گھورتے ہوئے بولا“ یہ دور حقیقت ہمارے لیے بہت بڑی امداد تھی۔ وہاں سے صحیح معنوں میں ہمیں پہلا ”بریک تھرو“ ملا۔ ورنہ ہم تو کیا نہیں صاحب کی بھی ساری فوس نہ جانے کب تک ٹانگ ٹوٹیاں مارتی رہتی۔“

راحیلہ بولی ”میں نے مجھے بتایا کہ جہانگیر کے مقبرے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ریڈ ڈاٹ کا زیر زمین ٹھکانہ تھا۔ مختلف پوش علاقوں میں ان کے پاس کئی جگہ بھی تھے جو مختلف مواقعوں پر مختلف مقاصد سے استعمال ہوتے تھے لیکن اصل اہمیت اس زیر زمین ٹھکانے کی تھی۔ اس کے داخلے کا راستہ اور ہوا کا نظام وغیرہ اس سے بالکل الگ تھا۔ ایک کنڈر میں چائے انہوں نے اپنے سائنسی شعبوں سے اتنا زیادہ ”امیب زدہ“ بنایا ہوا تھا کہ کوئی اس کے قریب بھی نہیں چل سکتا تھا۔ اس کنڈر سے جو راستہ زیر زمین قلعے تک جاتا تھا اسے تلاش کرنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔“

لاہور میں جن دنوں میری ریڈ ڈاٹ سے مکلف جیل رہی تھی ان دنوں ہی ہمت سی باتوں کی وجہ سے مجھے اکثر شبہ ہوتا تھا کہ کہیں نہ کہیں ان کا کوئی بہت بڑا زیر زمین ٹھکانا ضرور موجود تھا لیکن پھر میں یہ سوچ کر خوشی اپنے خیال کی تردید کرتا تھا کہ جہاز باؤ کے تاروں اور عملی دنیا میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا۔ اس زمانے میں تو چھوٹی موٹی دہشت گرد تنظیمیں بھی اپنے اپنے زیر اثر لوگوں میں کوٹیاں بٹگلے حاصل کر کے عام آبادیوں میں ہی اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہتی تھیں۔ ان حالات میں ریڈ ڈاٹ بھی تنظیم کو... جو غالباً اپنی جڑ بنیاد اور اپنی سائنسی قوت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے طاقتور تنظیم تھی۔ اتنے کھراگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اب راحیلہ کی باتوں سے ثابت ہو رہا تھا کہ میرا شبہ درست ہی تھا۔

راحیلہ نے بات جاری رکھی ”کنڈر سے جو راستہ کنکریٹ کے اس قلعے تک جاتا تھا اس کے اختتام پر ایک کپڑا نرٹراؤ آہنی دروازہ تھا جس میں ایک کپڑا کارڈ ڈالا جاتا تھا تو چند سیکنڈ بعد اس کا قفل کھلتا تھا لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ کوئی بھی کسی طرح وہ کارڈ حاصل کر کے اس دروازے کی سلاخ میں ڈال دیتا کیونکہ اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان بھی ایک خاص جگہ پر ثبت کرنا ہوتا تھا جو انسان کو دیوے نظر نہیں آتا تھا“ اگر کپڑا ٹکڑے کا کارڈ میں انگوٹھے کا وہ نشان موجود ہوتا تھا تو دروازہ کھلتا تھا ورنہ نہیں۔“

”اگر کسی بھی انداز میں طاقت کے استعمال سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تو کیا ہوتا؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کا خود کار دفاعی نظام حرکت میں آ جاتا جو کسی چھوٹی موٹی فوج کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔“ راحیلہ نے جواب دیا ”میں نے یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ ایک بار دروازے ہی کے راستے اندر داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد جو بھی مناسب سمجھیں وہ کریں یا جیسے بھی حالات ہوں اس کے مطابق حکمت عملی اختیار کریں۔ اس نے مجھے کارڈ پلاسٹک میں ملفوف کر کے دیا تھا اور اس پر اس کے انگوٹھے کا نشان پہلے ہی ثبت تھا۔ ہمیں اس ناپید نشان کی حفاظت کرنا تھی تاکہ وہ نہ تو خراب ہونے پائے اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی انجینی کی انگلیوں کے نشانات گڑبڑ ہوں۔“

راحیلہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر لپٹا ہوا پھیلا کر گیا اپنی انگلیوں کے نشانات میں اٹھنے لگی۔ ہم کافی ختم کر چکے تھے۔ ٹوٹی ٹرے اٹھا کر کہیں کی طرف جاتے ہوئے بولا ”میں زبا ہر ہی جا رہا ہوں۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔“ اس کے چہرے پر اب گہری تنبیہ کی تھی۔ ٹرے کہیں میں رکھ کر وہ وہیں سے باہر چلا گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی ”میں نے اپنی بدولت ہمارے دو بڑے مسئلے قطعی غیر متوقع طور پر حل ہو گئے۔ یعنی ایک تو

”اوردہ“ میرے دل کو جیسے کسی نے منہ میں لے کر بھیج دیا تھا انہوں نے تمہیں مار چکا کیا؟“

”اگلی انہوں نے ہٹا دیا تھا آٹا دی کیا تھا۔ کرنت وغیرہ لگا دیا اور کچھ خاص قسم کی چیز پھاڑا کاراوردہ کر رہے تھے لیکن انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے میں نکلی۔ ان کے تو میرے بارے میں بہت لمبے پروگرام تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کے زیرِ ذمہ تھلے کے خلاف اسی رات آپریشن ہوئے والا تھا۔ وہ تو میری بریں اور شک و غیرہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”انہوں نے تم سے کیا پوچھ کر کہا؟“

”میں پوچھ کر کہہ کی بھی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ اپنی اہل طور پر وہ بھی جانتا چاہتے تھے کہ مجھے ریڈ وائٹ کے بارے میں کیا معلومات حاصل تھیں اور میں نے انہیں کہاں تک پہنچایا تھا۔ میں ہال میں ٹولی کرتی رہی۔ انہیں اگلے سیدھے جو آپریشن ہو رہا تھا۔ ستم خیزانہ تھی کہ اس دوران اپنی بھی وہاں موجود تھی۔ بظاہر وہ ستم خیزانہ کی طرح پرسکون تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کی دل کی کیفیت کیا ہوگی۔ اسے یقیناً خدشہ ہو گا کہ میں تشدد کی وجہ سے اس کا پول کھول دوں گی کہ اس نے ہمیں کچھ معلومات فراہم کی تھیں لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ تاہم یہ ہم دونوں ہی کی خوش قسمتی تھی کہ ریڈ وائٹ والوں کو ہماری ملاقات کا علم نہیں تھا۔ ہمیں ملنے ہوئے کچھ کیا گیا تھا البتہ انہیں یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی۔ اپنی بھی ان کی نظر میں ایک بار پھر مشکوک ہو چکی تھی لیکن وہ بظاہر انہماں بنے ہوئے تھے اور شاید ایک آدھ دن انتظار کر کے دیکھنا چاہتے تھے کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔“

”اس دوران تم پر تشدد کا سلسلہ جاری رہا؟“ میں نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”میں نے بتایا تا کہ انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسی دوران ایک شخص وہاں نمودار ہوا جہاں مجھے ایک عجیب و غریب سی کرسی پر باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ شخص کہیں باہر سے آیا تھا یا پہلے سے وہیں موجود تھا۔ وہ ایک ڈیڑھا لمبے سے قد کا سفید قام تھا۔ جوان تھا مگر اس کی کمر میں بڑھوں کی طرح خم تھا۔ فوکیلی سی ناک پر مونے مونے شیشوں کی عینک تھی ہوئی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام برنارڈ تھا اور وہ ایک سرجن تھا۔ ایک سرجن تو کر سچیں برنارڈ تھا جس نے تہذیبی قلب کا پہلا کامیاب آپریشن کر کے شہرت پائی تھی لیکن یہ کوئی اور برنارڈ تھا اور کچھ دوسری قسم کا سرجن تھا۔

”وہ لوگ کچھ دیر ایک کونے میں کڑے کسر پھر کرتے رہے پھر وہ سفید قام میرے قریب آیا جو اس وقت تک مجھ سے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہاں موجود باقی لوگ بھی گویا کسی مذاق سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مجھ سے پوچھ کر کہنے والا سفید قام بولا ”ہم تمہیں دوسری سزائیں

ان کے خیر نمکانے کا کل وقوع معلوم ہو گیا۔ دوسرے اس میں آسانی سے داخل ہونے کا ذریعہ ہاتھ اٹھایا۔ ہٹی نے کسی طرح اس ٹاروٹا کو ڈبکھٹ حاصل کیا تھا اور کوئی فیصلہ کن وار کھیلنے کے لیے سنبھال کر کھڑا ہوا تھا۔ اسے دراصل ہمارا انتظار تھا۔ تم سے ملاقات کی امید نظر میں آ رہی تھی۔ وقت بڑھنے سے گزرتا جا رہا تھا اور اس کی چھٹی جس اسے خبردار کر رہی تھی کہ وہ کسی بڑے انجام سے دوچار ہونے والی تھی۔ اس لیے وہ جلد کچھ کر گزرتا جا رہی تھی۔ اس نے مجھے تمہاری جائیں سمجھ کر تمام معلومات میری جھولی میں ڈال دیں۔“

راجیل کو جیسے یکدم کوئی خیال آیا۔ چونکے ہوئے بولی ”میں تمہیں نہایت اختصار سے سب کچھ بتا رہی ہوں۔ کسی بھی بات کی تفصیل میں نہیں جا رہی۔ اس کے باوجود اگر تم پر ہو رہے ہو تو مجھے بتا دو۔ یہ باتیں پھر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔“

”یکبار تمہیں مت کرو۔ جن پکڑوں نے ہماری زندگی خراب کر رکھی ہے ان کے بارے میں سننے ہوئے میں پور ہونے لگوں گا؟ یہ تو اشتیاق اور تجسس کی زیادتی کی وجہ سے اس وقت میں فلاسے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ بعد میں اگر آرام و سکون سے جیٹنا نصیب ہوا اور ذرا زیادہ فرصت میری تو میں ہر بات پر پوری تفصیل سے سنوں گا۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

تب وہ صوفے کے پٹے سے ٹپک لگاتے ہوئے بولی ”ہٹی سے میری ملاقات ہنگدڑ کی سی حالت میں ہوئی تھی۔ خوف سے اس کے حواس ٹھکانے نہیں تھے لیکن اس نے مختصر وقت میں جو کچھ مجھے بتایا وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ قابلِ خوشی اور یگانہ سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھاگی بھاگی نہیں صاحب کے پاس گئی۔ میرا خیال ہے اس دوران میں کچھ زیادہ غلط نہیں رہ سکی اور ریڈ وائٹ والوں کی نظر میں آ گئی۔“

”اوردہ! میں نہایت دیکھی تو ازیں کراہ کر رہ گیا۔“

”تاہم یہ اچھا ہوا کہ میں نے فوری طور پر وہ معلومات نہیں صاحب کو منتقل کر دی تھیں اور وہ کپیڈوٹا نڈا کر ڈاگڑی ان کے سپرد کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ بھی متعلق نہیں کیا اور فوری طور پر آپریشن کے انتظامات کیے۔ منصوبہ ان کا یہی تھا کہ اس زیرِ ذمہ نمکانے پر قبضے کی کوشش کی جائے اور جتنے بھی زیادہ سے زیادہ لوگ زندہ ہاتھ آئیں انہیں زندہ بچھا جائے لیکن اگر اس میں ذرا بھی دشواری پیش آئے یا ان لوگوں کی طرف سے خطرناک ردِ عمل ظاہر ہو تو پھر کسی بات کی پروا کیے بغیر سب کچھ تباہ کر دیا جائے لیکن سب تباہیاں کرنے کے بعد جب انہوں نے مجھے بریف کرنے کے لیے میرے نمکانے پر حلاش کیا تو میں غائب تھی۔“

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ میں نے جانتا چاہا۔

”مجھے ریڈ وائٹ والوں نے انوا کر لیا تھا۔“ اس نے طویل سانس لے کر کہا۔

میں نہایت حقیر محسوس ہو رہا ہے یہ سزا جو ہم نے فی الحال نہیں دی ہے اس وقت میں زیادہ تکلیف دہ محسوس نہیں ہوتی ہوگی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اس کی اذیت کا صحیح اندازہ ہو گا۔ اگر ہم نے اس میں چھوڑ دی اور اس وقت جسمانی طور پر تھماری حالت زیادہ بہتر نہ ہوگی تو اب بھی تمہارے لیے صرف یہی ایک سزا کافی ہوگی۔ ایک خوب صورت لڑکی کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ سزا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا چہرہ مسکھ کر خیر بادا جائے۔ وہ آسانی سے کہیں آجا بھی نہ سکے۔ لوگوں میں اچھے بچے نہ سکے۔ صحیح معنوں میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

”وہ سب اپنے اس مذاق پر بہت مفلوظ ہو رہے تھے۔ تم نے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا“ دنیا کا کوئی باہر ترین شخص بھی نہ قواب چرے کے اس حصے کی گرافنگ کر سکتا ہے اور نہ ہی چلد کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر اس کا رنگ تبدیل کر سکتا ہے اس کا علاج صرف اور صرف ڈاکٹر برنارڈ کے پاس ہے اور ڈاکٹر برنارڈ ہمارے پاس ہے۔“ راجیلہ میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں شکر ادا اور خاموش ہو گئی۔

”بھڑکیا ہوا؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔  
”کچھ بھی نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی ”تم میرے چرے کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ کمائی تو ہمیں قسم ہو گئی۔“

”کیا انہوں نے تمہیں راکھ کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں! وہ مجھ پر اتنے صراخ نہیں تھے۔“ راجیلہ مسکراتے ہوئے بولی ”ہوا یہ کہ اس رات جب تک میری تلاش میں ناکام رہنے کے بعد انہیں صاحب نے اپنے تیار کردہ پلان کے مطابق ریڈ واٹ کے زیر زمین قلعے پر حملہ کر دیا۔ انہیں یہ شبہ تو تھا کہ ریڈ واٹ نے مجھے اغوا کر لیا ہے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ میں اسی زیر زمین قلعے میں موجود بھی رہتا ہوں شاید وہ مجھے یہ حفاظت باذیاب کرانے کے لیے کوئی حکمت عملی تیار کرنے کی کوشش کرتے جو تقریباً ناممکن سا ہی کام تھا۔ یہ تو میں میری قسمت ہی اچھی تھی کہ میں اس قسم کی کسی حکمت عملی کے بغیر بھی زندہ بچ گئی۔ نہ صرف زندہ بچ گئی بلکہ میں نے ان کی قیدی کی ہوتے ہوئے بھی انہی کے خلاف آپریشن میں حصہ لیا۔“

”مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”امیدیں وغیرہ تو سب دھری رہ جاتیں۔ وہ تو میں قسمت کے ساتھ دے دیا۔“ راجیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”میں اس میری صلاحیتوں وغیرہ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں تو بدستور اس وکیل جیٹر نما خیر پر بندھی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں حتیٰ کہ گردن تک چڑنے کے باوجود شاید ٹائیلوں کے کسوں میں کھلی ہوئی تھی۔ جی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھ پر زندگی میں شاید پہلی بار ایسا ہی غلبہ پایا تھا۔ میں نہ صرف اپنی زندگی کی طرف سے ایسے ہو چکی تھی

بھی دیکھ کے لیکن زیادہ تر سزا میں ہمیں اس لیے پسند نہیں کہ ان کی تکلیف۔ ان کے نشاط اور ان کی اذیت باک یادیں وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹتی جاتی ہیں لیکن ہم میں فی الحال ایک ایسی سزا دینے کے لیے جس کی دشمنی ہمارے چہرے پر جیتے موجود رہے گی۔“

”پھر مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جو باقاعدہ ایک نہایت جدید قسم کا آپریشن ٹیبلر معلوم ہو رہا تھا۔ وہاں اس شخص نے میرے چہرے پر ایک عجیب قسم کے مارکسے سیدھی گھیر کھینچ کر گویا اسے دو حصوں میں تقسیم کیا پھر ہر شی کی مدد سے اس پر نہ جانے کس کس طرح کے طول پینٹ کیے جو اس وقت تک تو بے رنگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔

”پھر میرے چہرے پر فلا بازوں کے نامک جیسا ایک نامک چڑھا دیا گیا۔ اس کے ساتھ بہت سی تاریں خشک تھیں پھر کوئی سوچ آئی کیا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے چہرے کے اس آدھے حصے میں ہر جہاں بھڑکی ہوئی ہیں جس پر کئی طرح کے طول لگائے گئے تھے۔

”میں نے سنے گی لیکن انہوں نے زیادہ اذیت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ فوری طور پر مجھے ایک انجکشن لگا دیا گیا جس کے گتے لگتے ہی میں سو گئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں ایک بار پھر اسی ہال نما کمرے میں تھی جہاں مجھے ”آپریشن“ سے پہلے رکھا گیا تھا۔

میرے چہرے پر نامک وغیرہ کچھ نہیں تھا اور نہ ہی کچھ تکلیف تھی۔ میرے آس پاس چند افراد موجود تھے۔ ایک تو وہی ڈاکٹر برنارڈ تھا۔ اس مردود کے چہرے پر کچھ ایسی طمانیت بھری مسکراہٹ تھی جیسے ایک مصور کوئی شاہکار تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ وہ سفید قلم بھی بہت خوش نظر آ رہا تھا جو مجھ سے پوچھ کچھ کر رہا تھا اور جس نے اپنی عمرانی میں مجھ پر کچھ دیر نقد کر دیا تھا۔ وہاں موجود لوگ اسے مسرور کہہ کر پکار رہے تھے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ سب ان کے اصل نام نہیں تھے۔

بہر حال میری کرسی کو ایک دیوار کے قریب دھکیل دیا گیا جس میں بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں گردن سیدھی نہیں کر سکتی تھی۔ پہلی گردن میں بھی ٹائیلوں کا ایک اسٹریپ بندھا ہوا تھا تاہم میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ سکتی تھی جو ایسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا اس وقت کہم کر رہے ہو۔ میں نے جو کچھ بھی محسوس کیا وہ ایک الگ مسئلہ تھا تاہم مجھے یہ یقین ہرگز نہیں تھا کہ میرا چہرہ مستقل طور پر ایسا ہو چکا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ تو محسوس ہوا تھا کہ انہوں نے میرے آدھے چہرے کی جلد ہلا دی تھی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں یہ امید بھی بہر حال موجود تھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی حل کوئی نہ کوئی علاج موجود ہو گا۔

”تم نے دوسرے ہی لمحے یہ امید میرے دل سے نکال دی۔ وہ ختم ہوئے ہوا۔“ ہم تمہارے ساتھ مزید دو گھنٹہ بھی کرنا چاہتے ہیں وہ

دیواروں کے درمیان پھنس گئی اور خدا کی قدرت دیکھو کہ میں جس جگہ سے تھی اس طرف نہیں گئی تھی۔ یہ وہ ایک بابائیاں کی طرح تھیں جو کہیں کوئی بھی نہیں آسکتی۔ اس میں وہ اپنے گناہوں کی طرف سے ایک گناہ شروع ہو چکی تھی۔ پش اور فکرن سے میں تقریباً بے ہوش ہونے والی تھی۔

”دن کا کول کول سی آنکھوں والا ایک شخص اندر آیا۔ میں اسے پہلے بھی وہاں دیکھ چکی تھی اور کوئی ہوش قسم کی چیز بھی تھی لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوئی الیگزینڈر وڈرو کوئی نہایت جینیش قسم کی چیز تھا اور وہ کسی ہی تھا دراصل وہی ہی کا محبوب عدنان تھا جسے معلوم نہیں کیوں وہاں سڑے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ بھی کوئی نہیں پچانتا تھا اور نہ ہی اسے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یاد تھا۔ ممکن ہے کسی مصلحت کے تحت اس نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہو۔ وہ ہر وقت کچھ دھشت زدہ سا دکھائی دیتا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں کول کول سی معلوم ہوتی تھیں۔

”اس وقت وہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا۔ اس نے کرسی کے پیچھے لگے ہوئے کچھ مٹی دوائے اور میری بندشیں مکمل تھیں۔ اس کے پاس خوف ناک سی ایک گھنٹہ تھی جو اس نے مجھے دے دی اور صرف ایک جملہ کا ”اگر میراں سے جان بچا کر نکل سکتی ہو تو فوراً نکل جاؤ۔“

یہ کہہ کر وہ بیٹ سے گرا اور مڑ گیا۔ تب میں نے دیکھا ”اس کے سینے میں دو تین گولیاں ہوت تھیں“ زندگی کے آخری چند لمحے اس نے میری زندگی بچانے میں صرف کسے اور اس طرح میرے کام آئے کہ میں اس کا شکر بھی ادا نہ کر سکی۔ ”وہ حاسنات سے انداز میں خاموش ہو گئی۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ میرے دل کا ہر جمل پن بھی بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”پھر کیا ہوا؟“ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ ”بس... میں بندشوں سے آزاد ہوئی اور گھنٹہ میرے ہاتھ میں آئی تو گویا میرے جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا۔ وہ بلاشبہ ہمارے لیے قیامت کی سی رات تھی۔ نفیس صاحب کی کوشش تھی کہ وہاں سے کچھ لوگ زندہ بچا کر آجاتے لیکن انہوں نے مرے یا مار دینے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ ہر خون ریزی ہوئی۔ نفیس صاحب کے بھی بہت سے آدمی مار گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو قربانی کا کپڑا نہیں بنایا تھا۔ انہیں پیچھے بھٹکا تھا اور اسے کانٹہ زود کو آگے رکھا تھا۔ اس وقت تک ان کا خیال تھا کہ ان کے کانٹہ زود ہمارے ساتھیوں سے ”راکے تھے۔“

”کیا اب ان کی رائے بدل چکی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے وہی دل ہی دل میں تو بدل چکی ہے۔ زبان انہوں نے کبھی کسی واضح رائے کا اظہار نہیں کیا۔“ راحیل۔

بلکہ مجھے اپنا انجام بھی نہایت بھانپنا نظر آ رہا تھا۔ ”مجھے وہاں بے پناہ سڑی لگ رہی تھی اور کسی نے میرے اوپر کھینک نہیں ڈالا تھا۔ وہ حسبِ چاہے مجھے اس پڑنے سے کمرے میں چھوڑ کر بھول گئے تھے۔ میں اس وقت خدا سے یہ دعا مانگ رہی تھی کہ مجھے کسی لذت ناک انجام سے دوچار کرنے کے بجائے خاموشی سے موت دے دے۔

”چاکر کو قیامت ٹوٹ پڑی۔ بے تحاشہ فائرنگ ہونے لگی۔ دھماکے کو سنے گئے وہاں تک ہوا کی پہلائی کا جو نظام موجود تھا وہ بھی جیسے یکدم ہی جواب دے گیا۔ فکرن محسوس ہونے لگی اور ہر طرف بارود کی بو پھیلنے لگی۔ موت تو مجھے گویا سانپ ہی نظر آ رہی تھی لیکن میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ میں نے تو اللہ سے کچھ سکون موت کی دعا کی تھی یہ کس انداز میں موت آ رہی تھی؟

”مجھے بعد میں پتا چلا کہ نفیس صاحب خود اس کیمپ ٹر کارڈ کے ذریعے دروازہ کھول کر اس قلعے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قیادت خود کر رہے تھے۔ روایتی افسروں کی طرح کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر حکم نہیں چلا رہے تھے حالانکہ وہ انٹیلی جنس کے شعبے کے آدمی ہیں۔ میدان جنگ کے آدمی نہیں ہیں لیکن اس روز وہ سب مشین گن اٹھائے سب سے آگے تھے۔

”وہ ایک عجیب ساخت کا مکان تھا۔ اس کی دیواروں تک میں آلات نصب تھے اور وہاں کی ہر چیز کیمپ ٹر انڈر تھی۔ اس کی بعض دیواریں سینٹ اور اینٹوں وغیرہ کے بجائے پلاسٹک جیسے کسی میٹریل سے بنی ہوئی لگتی تھیں۔ جلد ہی وہ دیواریں ٹوٹنے لگیں اور ان میں سے دھواں نکلتا لگا۔

”اس دوران اپنی دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ وہ سخت دھشت زدہ تھی۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے ایک لفظ بھی بولنے کا موقع نہیں ملا۔ دو تین آدمی عجیب ساخت کی گھنٹیں لے کر آئے تھے۔ ان میں سے ایک چیخ کر بولا ”میراں غدار صرف یہی ہو سکتی ہے۔ اسی کی وجہ سے کارڈا بڑ گیا ہو گا۔ میں نے پاس سے پہنچ کر کہا تھا اس پر بھروسہ مت کرو۔“

”وہ سراجی کر بولا“ لیکن اسے اہمیت اسے ہم انہی لوگوں کے سامنے اچانک چھپائیں گے۔ اسے انہی کی گولیوں کا نشانہ بنے گا۔“

”وہ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچے ہوئے باہر لے گئے۔ میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں تو ویسے بھی بندھی پڑی تھی۔ انہوں نے اپنی دانست میں تو مجھے مرنے کے لیے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے ارد گرد قیامت کا شور جاری رہا۔ کہیں فلیش لائٹ کے سے جھماکے بھی ہو رہے تھے جس کی ننگاوں روشنی ایک ٹائٹل کے لیے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔ پھر بھی کسی چیز پر اہمیت کے ساتھ کسی شخص نے توجہ نہ دی۔ کمرے میں آن گری لیکن وہ تنہا کی طرح

لوگ صرف اس وقت ہوش میں آنے کے عادی ہیں جب باہر سے اونچا ہوا چکا ہوتا ہے۔ تو شکر کر رہی ہوں کہ اب بھی وہی واٹ کے بارے میں فیصلہ کن کارروائی ہوگئی ہو اور ابھی مزید کارروائی جاری ہے اگر اب بھی اس سلسلے میں کچھ نہ ہوتا تو ہم کیا کر لیتے؟

میں اس کی تائید میں سرسبزے بغیر نہ رہ سکتا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میرے لیے ایک لحاظ سے یہ آپریشن یابوس کن رہا کہ تھک میرا چہرہ ایسا کا ایسا ہی رہ گیا۔ وہاں جو لوگ مارے گئے ان میں ڈاکٹر برنارڈ کی لاش نہیں تھی اور نہ ہی وہ زندہ ہاتھ آیا۔ وہ غالباً میرے چہرے پر اپنی کارگری کا مظاہرہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔ چنانچہ اب میری زندگی کی جو دیگر مصروفیات تیل رہی ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں لیکن ان کے ساتھ ایک نئی اور اہم مصروفیت پیدا ہوگئی ہے کہ مجھے ڈاکٹر برنارڈ کو تلاش کرنا ہے ورنہ باقی زندگی میرا چہرہ ایسا ہی رہے گا۔"

پھر ذرا توقف سے وہ بولی "وہیے میں نے ایسے ہی چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر برنارڈ اگر یا تاہل میں بھی اکر گیا ہو گا تو میں تمہارے لیے اسے دھوختا نکالوں گا۔"

"یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں اسے ذہن پر سوار مت کرو۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"زیادہ بے نیاز بننے کی کوشش مت کرو۔" میرے لمحے میں غیر ارادی طور پر ہلکی سی اداسی... آہنی "میری وجہ سے پہلے ہی تمہارا بہت کچھ چھین چکا ہے اور اب چوہ بھی..." میری سانس بوجھل سی ہوگئی "وہ مردود ریڈ واٹ دالے لٹک چکے ہیں۔" میں نے ایک حسین لڑکی کے لیے اس کا چہرہ قدرت کا انعام بھی ہوتا ہے اور اس کا ایک اہم اثاثہ بھی۔ انہوں نے واقعی بڑی ستم گردانہ سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ پھر راجہ چوہ سیاہ ہو تو مشککہ خیزی کا پلو نہیں لگتا۔ ایسے چہرے کے ساتھ واقعی ایک لڑکی اس سوسائٹی میں کس طرح زندگی گزار سکتی ہے۔"

"میں گزار لوں گی۔ زندگی کچھ اتنی طویل بھی نہیں ہوتی جتنی محسوس ہوتی ہے۔" وہ بدستور بے پروائی سے بولی "اور خدا کے لیے تم میری خاطر اسے آپ کو مجرم مجرم محسوس کرنا چھوڑ دو۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ میری زندگی میں وہی کچھ ہو گا جو کاتبہ قدرت نے لکھ دیا ہو گا۔ تم کسی بھی چیز کے ذمے دار نہیں ہو گے۔"

"شکریہ" میرے ضمیر اور ذہن پر سے بوجھ کم کرنے کی اس غلط فہمی کو شش کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا "ہر حال ڈاکٹر برنارڈ کو

جواب دیا جس پر حال ان کی محنت عملی عمدہ تھی۔ جانی نقصان پھر بھی وقوع سے بچ گیا۔ ریڈ واٹ کے تو جیسے بھی لوگ وہاں موجود تھے سب مارے گئے۔ دراصل وہ حملہ ان کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی دواؤں کے کھول کر بھی اندر آسکا تھا، اگر کوئی دوا ریا دواؤں کے ڈاکٹر اندر گھسنے کی کوشش کرتا تو خود بخود ان کا دفاعی نظام حرکت میں آجاتا اور انہیں خود بھی سنبھلنے کا موقع مل جاتا۔ اس صورت میں ان کا اپنا جانی نقصان بہت کم ہوتا۔ ہمارے بہت آدمی مارے جاتے۔ انہیں اپنے سانس کی شہدوں کو استعمال کرنے کا بھی موقع نہیں ملا پھر بھی انہوں نے جو آتشیں ہتھیار استعمال کیے ہمارے ہتھیاروں کے مقابلے میں تو وہ بھی نہایت جدید اور خطرناک تھے۔"

"نگاہ دہ زیر زمین قلعہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں مکمل طور پر تو نہیں۔" راجہ بولی "وہاں سے بہت سی کام کی چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں۔ لوگ، ہر حال سب مارے گئے۔ انہوں نے پکڑے جانے پر... مر جاتے تو ترجیح دی۔ نہیں صاحب کی نظر میں یہ ایک کامیاب آپریشن رہا۔"

"اور تمہاری نظر میں؟" میں نے دریافت کیا۔ اس نے کندھے اٹکائے اور طویل سانس لے کر بولی "میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ایک لحاظ سے تو اچھا ہوا کہ ریڈ واٹ کا ہم پر جو بڑا سبوتاہ ہوا تھا اور ہمیں وہ کوئی ظلمانی کی چیز لگتی تھی وہ ضرور ٹوٹ گیا۔ ان کا نقصان اس طرح تباہ ہونے اور اتنے لوگوں کے مارے جانے سے ہمارے حوصلے بڑھے۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ بھی کاٹیں شکست ہیں ورنہ لاشوں سے انداز میں شاید ہم سب یہ سوچتے تھے کہ وہ کوئی ناقابل شکست طاقت ہیں۔ ایک بات ہر حال بڑے ہے اگر نہیں صاحب مکمل طور پر اس کے لیے کمر بستہ ہوتے تو یہ کام بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے بہت زیادہ وسائل اور بہت زیادہ بین پناہور چاہیے تھے جو ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم شاید ایک ایک کر کے ان سے ٹکرا کر مر رہے تھے تباہ ہوتے رہے۔ ہم ان پر اتنا بڑا حملہ نہیں کر سکتے تھے جتنے بڑے حملے کا انتظام نہیں صاحب نے کیا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے پاس اتنے بہت سے غیر ملکی آکر زیر زمین قلعے تک قہر کر لیتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رہ سکتی۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہمارا ملک تو ایک بہت سے انٹرنیشنل جیم خانہ بنا ہوا ہے۔ جتنی تعداد بھی غیر ملکی چاہیں یہاں آکر جو دل چاہے کرتے رہیں۔ سفید لام قوموں کا تو ویسے ہی آج تک ہم پر سنا ہے۔ انہیں تو جو کرنا ہوتا ہے دھونس سے کرتے ہیں۔ ویسے بھی وہ لوگ بہت مکار ہیں۔ کسی شخص کی اسٹڈی ٹور، آکر کیا تو کسی کی کسی مہمپناہاری ہی درخواست پر کیے گئے جیالو جیکل سوئے وغیرہ کی آڑ میں نہ جانے کیا کچھ کر کے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چل۔ ہم

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں فکرت ہوں؟“ وہ حیرت سے

حلاش کرنا صرف تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔“

”چھوٹے جیلوں میں رہنے کے لیے مجھے یہ سب کچھ دینا پڑا۔ میں نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔ تم فکرت نہیں ہو لیکن میں ضرور فکرت ہوں۔“  
یوں کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ میں خود کو دے رہا ہوں۔ ”میں نے کہا۔  
چند لمحوں کی بوجھ میں خاموشی کے بعد راحیلہ گہری سانس لے کر بولی ”بہر حال یہ فیصلہ میری داستانِ غم تمہاری عدم موجودگی میں جو چیک ہوا اب تم اس سے آگاہ ہو چکے ہو۔ اس کے بعد کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ اب تمہارا پروگرام کیا ہے؟“

”آج تو میں آرام کروں گا۔ میں ابھی بڑی زلت کے بعد وہاں سے گزرا کر آیا ہوں۔ نہ جانے کتنی راتیں ایسی گزری ہیں جب مجھے دو چار گھنٹے کے لیے بھی سوتا نہیں ہوا اور بے درجے مجھ پر غریب احقانہ قسم کے حالات سے واسطہ پڑا رہا۔ اگر تم اجازت دو گی تو ایک رات یہاں گزاروں گا۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس مکان میں میں بیٹہ نہ ہوں۔ ایک میں تم ذرا لگا لیتا جو بدکھی سوکھی میسر ہوگی کھالیا۔“ وہ کندھے اچکا کر بے نیازی سے بولی۔

”بہت شکریہ میڈم آپ نے اس خانہ بدوش کو پناہ عطا فرمائی۔“

”یوں کہو کہ ایک خانہ بدوش نے دوسرے خانہ بدوش کو پناہ عطا فرمائی ہے۔ راحیلہ نے ہنسی کی۔

میں نے اپنی واسن آئنا کر زور پھیل کر بیٹھے ہوئے کہا ”اگلے فیصلے صاحب کی خدمت میں حاضری دینی ہے۔ دیکھیں وہ میرے لیے کیا کام تجویز فرماتے ہیں۔ کہیں وہ مجھے ایک طوطا دے کر کسی فٹ پاتھ پر نال ٹکائے کے لیے نہ بھجوادیں۔“

”یہ تو تمہارے لیے بہت سی موزوں کام ہوگا۔ سب سے پہلے میری نال ٹکانا۔“ راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تمہاری نال طوطا نہیں، تو صحیح طریقے سے ٹکائے گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”چلو چرو کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔ یعنی تم خود ہی نکال لو گے۔“ وہ مجھ سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے خون خوار نظروں سے اسے گھورا پھر دھیمے دھیمے میں کہا ”نال وال ٹکوانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہارے حالات صرف ایک ہی صورت میں ٹھیک ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے ایک نیک بندے سے شادی کر لو جس کا نام محمد افضل چہدری ہے۔“

اب اس کی جیسے خونخوار نگاہوں سے گھورنے کی بادی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی ”اے تم اللہ کا نیک بندہ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں کیا بُرائی ہے اس میں؟“ میں نے معصومیت سے کہا۔

”کوئی ایک بُرائی تو تو تاراؤ۔“ وہ بڑا سادہ جاکر بولی ”اے“

سے تو اپنے حالات ہی نہیں سمجھتے۔ اس کے ساتھ شادی کر

”مجھے معلوم نہیں ہے۔“  
حلاش نے اسے حلاش کر رہی ہوں۔ تمام ساتھیوں نے بھی اس کام کو سرفہرست رکھا ہوا ہے۔ اب تم آگے ہو تو خراب ہے تم بھی اس مسئلے سے لا تعلق تو نہیں رہ سکتے۔ فیصلے صاحب اور ان کے آدمیوں نے بھی ڈاکٹر برنارڈ کی حلاش کے کام کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک ایک سفید قام غیر ملکی کو چیک کیا جا رہا ہے۔ اس کی شکل و شباهت سب کو ذہن نشین کرادی گئی ہے۔“

پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور بولی ”میں اپنے آپ کو اس لیے بھی اسی چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی ہوں کہ اگر ڈاکٹر برنارڈ مل بھی گیا اور وہ میرا چہرہ ٹھیک کرنے پر تیار نہ ہوا تو کیا ہوگا؟“

”اس کا تو آپ بھی تیار ہوگا۔“ میں نے بے ساختہ کہا ”اس کے قیام و آمد کو دھم بھی آکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑیں گی کہ اسے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ ضرور کرے۔“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیمے سے فہمی ”اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہلے صرف یہ دھا کر دو کہ برنارڈ مل جائے۔“

”مل جائے گا مل جائے گا۔“ میں نے گویا اسے نہیں بلکہ خود کو یقین دلایا پھر پوچھا ”لیکن اس سے پہلے کیا تم نے یہاں اپنی سی کوششیں کر کے نہیں دیکھیں؟ ہمارے ملک میں بھی تو چمچلے امراض کے بڑے بڑے ماہر رہے ہیں۔“

”بہت سی کوششیں کی جا چکی ہیں۔ میں لاہور اور کراچی بھی ہو آئی ہوں، چلنے کے بڑے ماہرین نے کچھ دوائیں آزمائیں جن سے کوئی فرق پڑنے کے بجائے الٹا تکلیف شروع ہوئی اور سیاہ چلد پر مزید بدلتی کے آثار پیدا ہونے لگے تو میں نے فوراً توبہ کر لی۔ کم از کم اس وقت کوئی تکلیف تو نہیں ہے اور جلد بھی بحال ہے۔“ وہ اپنے چہرے کے سیاہ حصے پر ہاتھ جھیرے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے مزید بتایا ”چلنے کے۔“

شار نیٹ بھی چند دنوں کے اندر اندر ہونچکے ہیں، چلنے کے کچھ ڈرے کھینچ کر باہر کی کسی لیبارٹری میں بھی نیٹ کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ وہاں سے بھی کوئی بہت افراتوا جو اب نہیں آیا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کسی حیرت انگیز طریقے سے الزوا وائریٹ شعاعیں اتنی طاقت کے ساتھ چلنے میں جذب کر دی گئی ہیں کہ چلنے کے ذرات میں مستقل تبدیلی آگئی ہے لیکن میرا خیال ہے جس طرح ڈاکٹر برنارڈ نے کچھ فارمولوں کے تحت تھوڑی سی دیر میں یہ کام کیا تھا اسی طرح اس کے پاس انہیں بے اثر کرنے کا بھی کوئی فارمولا ہوگا۔ اس کا کوئی توڑ ہوگا۔“

”یقیناً“ میں نے سر ہلایا ”یہ مسئلہ حل ہو جائے گا تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔“



میرے حالات کیا ٹھیک ہوں گے۔"

زندگی گزارتے ہیں تو سارا عشق ہوا ہوتا ہے۔ باقی صرف یک  
بیک رہ جاتی ہے۔ جو کچھ جس طرح ہے اسے بس اسی طرح رہنے  
دینا اس وقت خوبصورت تصویر کو خراب منہ کرنا۔  
اچانک باہر گئی کے بائیں کرنے کی توارسانی دئی۔ جو ان کوئی  
کچھ کہہ رہا تھا۔ راحیلہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی "میں دیکھتی  
ہوں۔"

اس نے کفری کا پردہ ذرا ہٹا کر باہر دیکھا پھر جلدی سے  
دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہ تو ہسپتال سے کوئی آیا  
ہے۔"

میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک پہنچا۔ لان پر  
کوئی یادوری نوجوان کھڑا ٹوٹی سے بات کر رہا تھا۔ وہ دروازے  
معلوم ہوا تھا۔ ٹوٹی بولا "میڈم! آپ فوراً ہسپتال چلیں۔ ہئی کی  
طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔"

راحیلہ جلدی سے اندر آئی اور ایک بار پھر اپنا چہرہ برق کی  
نقاب اور چشمہ وغیرہ کے عقب میں چھپانے کا اہتمام کرنے لگی۔  
اسی دوران فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ فون اٹکی یو سے تھا اور وہاں  
موجود ڈاکٹر راحیلہ کو ہئی کے بارے میں وہی اطلاع دے رہا تھا جو  
واڑو بوائے نے کر آیا تھا۔

ٹوٹی وہیں رہا۔ میں اور راحیلہ بھانجی بھانجی ہو چکی تھیں  
ہئی بالکل اسی طرح آنکھیں بند کیے سیدی لٹتی تھی جس طرح ہم  
اسے بہت دیر پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ اس کے قریب دو ڈاکٹر اور دو  
نرسیں افسردہ انداز میں سر جھکا کر کھڑی تھیں۔ اس کے جسم سے  
جو مٹھیں تانوں اور تالیوں کے ذریعے منسلک تھیں۔ ان کے  
ڈاکٹروں پر سویاں ساکت ہو چکی تھیں۔ اس کے پاس بیٹھی ہی سب  
سے پہلے میں نے ہی بات نوٹ کی تھی۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔  
ہمارے پیچھے پر ایک ڈاکٹر نے ٹھکے ٹھکے سے انداز میں سر  
اٹھایا اور راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میڈم! ہمیں افسوس  
ہے ہم اسے نہیں بچا سکتے۔"

"تمہارا کام صرف کو شش کرنا تھا سو تم کرتے رہے۔ بچانے  
والا تو کوئی اور تھا۔ اسے منظور ہوتا تو بچا لیتا۔" راحیلہ نہایت دھیمے  
لہجے میں بولی اور ہئی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے چاروڑا سی ہٹا کر  
ہئی کا استخوانی ہاتھ تھام لیا۔ اس ہاتھ میں بھی زورپ کی سولی  
بیست تھی۔

ڈاکٹر اور نرسیں کیمین سے باہر چلی گئیں۔ میں نے ہئی کے  
دوسری طرف بیٹھتے ہوئے اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ برف کی  
طرح سرد تھا اور تھلا چڑھا تھا۔ اس لمس کے ذریعے کڑوا موت کی فحش  
بے گلی میرے رگ و پے میں بھی رینگنے لگی۔ میرے دل میں، ہولناک  
سانسنا پھیل گیا۔ شدت غم سے میری یہی حالت دوتی تھی۔ آنسو  
پہنتے نہیں تھے "نارے بن کر اندر ہی اندر دہل کو جلاتے تھے میں  
تو دیکھا نہیں کرتا تھا شاید اسی لیے میرے اندر ایک ازیت ناک  
سانا پھیل باقی تھا۔"

"اصل میں اس کے اور تمہارے حالات ایک وقت اسی لیے  
تو خراب ہیں کہ تم دونوں کے ساتھ ایک الگ الگ سہولت بنایا جاتا  
پھر تمہیں یہ شادی ہو جائے گی تو ساتھ مل جائیں گے اور دونوں  
کا صحیح سمت میں سفر شروع ہو جائے گا" حالات بالکل ٹھیک ٹھاک  
ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے سٹلائی ٹھٹھکیوں سے اُدھر اُدھر دیکھا پھر لفظی سانس  
لے کر بولی "یہاں کوئی ایسا چیز بھی تو نہیں ہے جو اٹھا کر تمہارے سر  
پر مار سکوں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے تم حکم دو۔ وہاں کو وہاں اپنا سر  
خود سے مارو۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔  
وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتی رہی پھر ابھرنے لڑی  
لہجے میں تنجید گئی سے بولی "کیا مجھ سے شادی کا بھرت واقعی ابھی  
تک تمہارے سر سے نہیں اُترتا؟"

"یہ بڑا وصیت مندی اور مستقل مزاج قسم کا بھرت ہے۔ یہ  
بھی چیز سے سر سے نہیں اُترے گا۔ ایک نہ ایک روز میں تمہیں  
تاکل کر کے چھوڑوں گا۔" میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے" اس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا  
"کیا ان کے بعد بھی تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟"

"بالکل تیار ہوں اگر تمہیں کوئی شک ہے تو ابھی ٹوٹی کو بھیج کر  
کسی نکاح خواں کو بلاؤ۔ سچائی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا  
ہے؟ میں تو عملی آدمی ہوں، عملی بات کرتا ہوں۔ اب تو معاملہ اس  
حفاظ سے بہت اچھا ہے کہ لوگ میری بیگم کو دیکھیں گے تو کہیں گے  
واقعی اب میں اپنے گھر میں سیاہو سفید کا لٹک ہو گیا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر مجھے خاموشی سے گھورتے لگی۔ اس کی آنکھوں  
میں بے چینی تھی۔ آخر وہ لفظی سانس لے کر بولی "تمہارا واقعی  
کوئی پڑھ کر ہوا ہے۔"

"نہیں پڑھ نہیں کر رہے۔ یہ میڈیکل پر تک ثالث ہے۔" میں  
نے تنجید کی سے کہا "میرا حال بات خواہ کچھ بھی ہو لیکن تمہیں اب  
یہ یقین تو آجاتا چاہے کہ تمہیں مجھ جیسا مستقل مزاج عاشق دنیا  
میں کیس نہیں مل سکتا۔ میں شہر بھی ایسا ہی وفادار ثابت ہوں  
گا۔"

"مجھے عاشق کی ضرورت ہے نہ شوہر کی۔" وہ ایک ایک لفظ پر  
زور دیتے ہوئے بولی "آخر تم ہر قسم کے عرصے بعد یہ بے ہودہ  
موضوع کیوں لے کر دینے جاتے ہو؟"

"توبہ... توبہ۔" میں نے گال پیٹتے ہوئے کہا "اسنے  
ضروری اور اہم موضوع کو بے ہودہ کہتی ہو۔ اس دنیا میں اکثریت  
شادی شہرہ لوگوں کی ہے۔ تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ سب بے ہودہ  
زندگی گزار رہے ہیں؟"

"میں کیا کہہ رہی ہوں وہ خود اپنے بارے میں یہی کہتے ہیں۔"  
راحیلہ بڑا سانس بٹا کر بولی "سال در سال میاں پوری کی حیثیت سے

اُور اسی بال کو لے سو رہی تھی کچھ دیر پہلے میں راجیلہ سے ٹوک  
جھوٹک سے محفوظ ہو رہا تھا لیکن اب گویا یکدم ہی میرے اندر کا  
ہو بہم بدل گیا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے دل کی بات کہی۔  
راجیلہ کی حرکات و سکنات میں بھی اب تک جو مستحسنی نظر  
آ رہی تھی وہ اب مفقود تھی۔ وہ سر جھکائے کچھ اٹھیلے اُٹھالے سے  
انداز میں چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "حالا نکہ یہ خبر ہمارے  
لیے کئی دن سے متوقع تھی۔ یہ کوئی اچانک رونما ہونے والا واقعہ  
نہیں ہے بلکہ ہم نے جانے جانے کیوں دل کو برا دھچکا لگا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میرا اس وقت اپنے محسوسات کے اظہار کو  
بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "اب  
شاید میرے یہاں رہنے کی بھی ضرورت نہ رہے۔ میں صرف ہفتی کی  
وجہ سے اسپتال میں ٹھہری ہوئی تھی اور کوئی میری وجہ سے یہاں  
ڈوبی نہ دے رہا تھا۔"

"تو پھر اب ہم کہاں جائیں گے؟" میں نے حلق میں پھیلی کوئی  
کڑواہٹ سی ہنستے ہوئے پوچھا۔  
"کن کی رات تو ہمیں گزارنے ہیں، دیکھتے ہیں صبح ہمیں کیا  
ادکات ملتے ہیں۔" پھر راجیلہ ذرا وقف سے بولی "ہم ابھی تک  
تھیں صاحب کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے لیکن اب تم آگئے ہو۔  
تم چاہو تو ہم ان سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ لافلسف ہو سکتے  
ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے تیزی سے  
کہا "میری تو ابھی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔  
اگر ان جیسے وسائل اور اختیارات رکھنے والے آدمی کی سرپرستی  
میں کام کر کے ہم ریڈ واٹ کے قتلے سے شے میں کامیاب ہو جاتے  
ہیں تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ یہ بھی طے ہے کہ اس مسئلے سے شے  
بغیر ہم سکون سے زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ  
ہمیں تھیں صاحب کی نظر میں یہ مقام حاصل ہو گیا ہے۔ کوئی وقت  
تھا کہ میں نے انہیں اپنی بات کا یقین دلانے اور ان کا ذرا سا  
تعاون حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے تھے مگر مجھے ذرا بھی  
اندازہ ہو جاتا کہ اس وقت وہ ڈپٹی میس سے کام لے رہے تھے تو شاید  
مجھے فرار ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"دوست گھر سے آئی ہیں۔ ان کے بارے میں جین سے کچھ  
کہنا بہت مشکل ہے۔ اب بھی میں تھیں سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہم  
پر اتنے ہی نڈا ہیں جتنے ظاہر نظر آتے ہیں۔ میں خواہ مخواہ جذباتی  
ہو کر ان کے ساتھ رہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ البت میرے خیال  
میں مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان کے ساتھ رہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔

اس دوران ہم گھروا میں پہنچ گئے جہاں ٹونی بے ٹانی سے ہمارا  
تھکر تھا۔ آہم اس نے اپنے لمبے سے بے ٹالی کا اظہار نہیں ہونے  
دیا اور پرسکون انداز میں پوچھا "کیا بات تھی؟"

"جتنی مرگئی ہے۔" راجیلہ نے نہایت دھیمی آواز میں انتشار

راجیلہ نے ایک بات سے اپنا تاریک چشمہ ڈرا رکھا کیا اور ٹشو  
پپر سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر ہنسی کے چرے پر  
نظریں جمادیں۔ وہ چہرے بھی گویا ایک خوشے ہی کا چہرہ تھا۔ اب  
اس کی ٹرینی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ آٹاب تو اس  
چرے پر طمانیت سی چھیلی گئی تھی شاید ایک لحاظ سے موت اس  
کے لیے خوش آئند ہی تھی۔ اسے نہ جانے کس کس اذیت سے  
چھٹکارا مل گیا تھا۔

کئی منٹ تک انہیں میں سناٹا چھایا رہا۔ یہ موت کا سناٹا تھا پھر  
راجیلہ سر اٹھاتے ہوئے آنسوؤں سے بھیگی اور بھیگی پنہی سی آواز  
میں بولی "شاید تمہارے ہی اعتقاد میں اس کے سینے میں سانس ابھی  
ہوئی تھی۔ تم سے اس کے ہلنے کی خواہش یقیناً بڑی شدید تھی تبھی  
تم اچانک بالکل غیر متوقع طور پر چلے آئے شاید اسی کی کوئی  
خاموش دعا تھیں یہاں پہنچے اور ہی تھی۔"

"شاید" میں نے سر کو شے سے انداز میں کہا "لیکن افسوس  
کہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔"

"اس کا تو مجھے بھی زندگی بھر افسوس رہے گا۔ میں بھی اس  
کے لیے کچھ نہیں کر سکا حالانکہ صرف اسی کی وجہ سے ہمارے لیے  
ریڈ واٹ پر ہاتھ ڈالنا اور اتنی بڑی کارروائی کرنا ممکن ہو سکا۔ اس  
کے علاوہ اسی کے ماضی کے دوست عدنان کی وجہ سے میری جان بچی  
ورنہ شاید میں ریڈ واٹ کے اسی زیر زمین قتلے میں بے بسی سے ایک  
وکیل جیڑ کر بندھی آگ اور دھواں میں جل کر دم گھٹ کر مر جاتی  
اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ افسوس ہم اپنی اس غصہ کو پچھتاہیں  
سکتے۔"

"اس نے زندگی میں بہت سے اچھے اچھے کام کیے۔ کاش یہ  
ایک خوش انجام لڑکی ہوتی؟" میں نے اذیت سے کہا۔

"شاید وہ سری دنیا میں یہ ایک خوش انجام لڑکی ہو۔" راجیلہ  
سکھنے لینے کے سے انداز میں بولی پھر اس نے اپنے برقع کی کسی  
جیب سے مہاکل فون نکالا اور نمبر لکرات کرتے لگی۔ جلد ہی  
مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ تھیں صاحب سے بات کر رہی تھی۔ وہ انہیں  
ہفتی کی موت کی اطلاع دے رہی تھی۔ انہوں نے غالباً اظہار  
افسوس کیا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ آخر وہ فون بند کر کے اٹھ  
کھڑی ہوئی۔

"آؤ چلیے ہیں" وہ بو جھل لہجے میں بولی "اسپتال والے اور  
تھیں صاحب کے آدمی اس کی آنکھیں اور تھیں کا انتظام کر دیں  
گے۔ یہ کافی فتم ہو گئی ہم اب اسے کوئی اور انجام نہیں دے  
سکتے۔"

میں باہل خواہش اس کے ساتھ باہر آیا۔ اس نے ڈاکٹروں  
اور نرسوں کو کچھ ہدایات دیں۔ آخر کار ہم آئی یو سے نکل  
آئے۔ اس وقت شام کے سرمئی سامنے پہنچنے لگے تھے۔ اسپتال کا  
ماحول یوں بھی کچھ ایسا روح پرور نہیں ہوا تھا۔ اسپتال کشائی اعلیٰ  
درجے کا کھول رہا ہو لیکن اس وقت تو جیسے دھاتی دہل دروازہ پر

وہ شاید ہماری صورت دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ کر چکا تھا۔ وہ کچھ بولا نہیں۔ خاموشی سے جا کر لان کے ایک کونے میں بصر محاکا کر بیٹھ گیا۔ ہم میں ایک دوسرے سے رکھی جملے کہنے کی سکت نہیں تھی اور اس وقت ہم اپنے محسوسات بھی بیان کرنے کی اہلیت اپنے اندر نہیں پارہے تھے۔

وہ رات میں نے جوں توں وہاں گزار دی۔ صبح میں راحیلہ اور فونی تاشے کے بعد فیض صاحب کو فون کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ خود انہی کا فون آگیا۔ انہوں نے راحیلہ اور فونی کو ابھی وہیں رہنے کا حکم دیا اور مجھ سے بات کرتے ہوئے کہنے لگے "چند منٹ میں احمد جھپس لینے پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہیں ایک جگہ لے جائے گا۔ وہاں تمہارا دیک اپ وغیرہ ہوگا۔ تمہارا ٹیلیفون بالکل بدل جائے گا۔ اس کے بعد تم ٹکٹ لینے ہوئے یا کچھ بدل چلے ہوئے خانہ بدوشوں والی بستی تک پہنچنے کی کوشش کرنا کہ اس ٹکٹ میں تم ٹیکسی میں اتار لیا سڑ کرنے ہوئے اچھے نہیں لگے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اپنے قوی بھی تمہیں دیکھیں تو تمہاری کوئی بات ان کی نظر میں نہ کھلے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" میں نے آہستگی سے کہا پھر ایک لمبے کے وقفے پر چہا "بہنی کی مدفن کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟"

"وہ سب ملے ہو چکا ہے۔ اس کی مدفن خاموشی سے ہوگی۔ ہمارے خود سامنے آنے اور اس واقعے کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس کے جنازے میں شرکت نہ کر سکیں لیکن اس سے ہمارے دلوں میں اس کا احترام اور محبت کم نہیں ہوگی۔ وہ نہایت عظیم لڑکی تھی ہم سب کی عہدہ تھی۔" پھر وہ راحیلہ سے بات کرنے لگے۔ چند لمبے بعد انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد احمد اپنی ٹیکسی لیے آئے پچھا۔ اسے بھی بہنی کی موت کی خبر مل چکی تھی۔ وہ بھی افسردہ تھا۔ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر روانہ ہوتے ہوئے وہ بولا۔

"یہ نفوس ریڈ ڈاٹ بھی ہم پر خدا کا عذاب بن کر ہی نازل ہوئی ہے۔ اس نے ہمیں بڑے زخم لگائے ہیں" کاش کوئی ایسا طریقہ ہو تاکہ ہم اس سے قلعی دور ہو دے دیں رکنے والے ہر انسان فنا حیات کو ایک جگہ جمع کر سکتے اور ان پر کوئی انجیم کر سکتے۔"

"متم مطمئن رہو۔ ان پر قدرت کی تاراسل کا انجیم ہم ضرور کرے گا۔ تمہاری خواہش سے ذرا مختلف انداز میں سہی لیکن وہ اپنے انجام کو ضرور پہنچنے والے ہیں اور وہ یقیناً جبریت ناک انجام ہوگا۔" میں نے زور سے کہا۔

"خدا کرے آپ کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہو۔" وہ شاید خواہش کی تمام تر شرتوں کے ساتھ بولا۔

چند منٹ بعد ٹیکسی چھوڑنے سے ایک بجنے میں داخل ہوئی

جس پر وہ سیلا پیوٹی پارلر کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کے حصے میں شاید واقعی پیوٹی پارلر رہا ہو لیکن احمد مجھے اپنے ساتھ بچلے کے عقب میں لے گیا اور فونے و جھک ایک کمرے میں جا کھڑا۔ وہ ایک معمولی سی نشست گاہ معلوم ہوتی تھی۔ احمد نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پورے گئے ہوئے سوچ بورد پر ایک سوچ دیا۔ چند لمبے بعد کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور ایک لمبی ترنگی کوری جٹی بھاری بھر کم اوچیز عورت کھٹ کھٹ کرتی اندر آئی۔ وہ کسی فلمی قسم کی "میڈم" کے انداز میں لمبے سے ہولڈر میں سرکٹ لٹکائے لمبے لمبے کش لے کر ناک سے زخموں نکال رہی تھی۔ اگر وہ یہ حرکت نہ کر رہی ہوتی تو خاصی معقول عورت نظر آتی۔

احمد اس سے مخاطب ہوا "آپ کو اطلاع تو مل ہی گئی ہوگی میڈم؟"

"ہاں یہ آدی ہے؟" اس نے خم دیا آنکھوں سے میرا سر تپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کا جائزہ لینے کا انداز تپا تپا تھا کہ اس کی جوانی خاصی پُر پُر زری تھی بلکہ اب اوچیز عمری میں بھی اس کی زندگی کے راستے کچھ زیادہ سیدھے سادے نہیں تھے۔ میری درجہ کو بھی ہی جھرتھی لگتی۔

"جی ہاں یہی آدی ہے۔" احمد مسکراتے ہوئے بولا۔

تب وہ عورت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی "چلو اندر چلو۔" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو "اندر چلو۔ ذرا دیکھتی ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔"

تاہم اس کی پیشہ ورانہ سی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں اٹھا تو وہ آنکھیں سکیڑ کر ذرا قریب سے میرا جائزہ لینے ہوئے بولی "یہ تو پہلے ہی کیٹ ہیں ہے۔"

"جی ہاں تو وہ ہے لیکن یہ کیٹ آپ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" احمد حلا غمت سے بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ احمد وہیں بیٹھا رہا اور میں اس کے ساتھ ایک بہت بڑے کمرے میں پہنچ گیا جو کسی بہت بڑے فلم اسٹوڈیو کا میک اپ روم معلوم ہوتا تھا۔ تاہم وہاں کا ساڈو سامان فلم اسٹوڈیو کے میک اپ روم سے کہیں زیادہ بہتری اور معیار پر معلوم ہوتا تھا۔

غیبت ہی رہا کہ میڈم مجھے وہاں ایک کرسی پر بٹھا کر غائب ہو گئی اور جلد ہی وہ سامنے سے نوجوان کمرے میں آگئے۔ وہ آپس میں بھائی یا کم از کم فرسٹ کزن ضرور معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے بہت تیزی سے میرا ٹھیکہ بدلنے کا کام شروع کر دیا۔ ان کی قیامتہ پُجرتی کے باوجود کام مکمل ہونے میں ذریعہ دو گھنٹے لگے۔

کام ختم ہونے کے بعد ہی میڈم دوبارہ کمرے میں آئی اور اس نے تنقیدی نظر سے میرا سر تپا جائزہ لینے کے بعد مطمئن انداز میں سر ہلا کر گویا مجھے جانے کے لیے "میں اوسی" دے دیا۔

میں خود بھی قدر آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر تھوڑا سا

کر رہا لیکن چند گھنٹے بعد پتا چلا تھا کہ انہیں نہ صرف میری نقل و حرکت کا علم ہوا تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ میری کس سے کیا بات ہوئی۔

دراختلاف کے بعد میں نے کہا ”وہ بیٹے بھی حسب اسان کسی کی ماضی قبول کر لے تو پھر اسے اس کا ہر حکم ماننا چاہیے لیکن خیر چلو تھوڑی سی بے احتیاطی کر لیتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلا ہوں لیکن شر سے شکستے ہی تم مجھے آٹا روٹا پانی قاصلہ میں پیدل یا لفٹ لے کر لے کر لوں گا۔“

میں اگلی سیٹ پر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا اور احمد نے گاڑی اس پتھلے کے پورج سے نکالی، روانہ ہوتے وقت ہم دونوں نے ہی غیر محسوس طور پر درود درونک چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا اور احمد بھی اس سلسلے میں بدستور مطمئن تھا۔

ہم راستے میں اسلام آباد ہو گئے کے سامنے سے بھی گزرنے تب مجھے وہ ترک ٹھاقی طائفہ یاد آیا جس کے ساتھ میں استنبول سے یہاں پہنچا تھا۔ ایک لمبے کے لیے میرا بیٹا چلا کہ جا کر ذرا ان لوگوں سے مل کر آؤں لیکن بروقت ہی مجھے یاد آگیا میرا غلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں اس قسم کی غیر ضروری حرکتیں کرتا پھر اتنا۔

”معلوم نہیں وہ ترک ٹھاقی طائفہ اب بھی یہاں مقیم ہے یا نہیں؟“ میں نے مکرر ہو گئی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں لی حال تو وہ لوگ یقیناً ہیں۔“ احمد نے بتایا ”انہوں نے تو کچھ رات لراقت ہال میں شو بھی پیش کیا ہے۔ آج رات یا کل صبح شاید وہ لوگ لاہور اور پھر وہاں سے کراچی روانہ ہو جائیں۔“

”اے! کچھتوں نے میرے بغیر ہی ٹھاقی شو کر لیا۔“ میں نے کراہ کر کہا ”میں ترکی میں نہ سہی لیکن ترکی کے بارے میں کم از کم قاری میں تو ایک شعر کا کرنا سکتا تھا۔“

”وہی دالا“ زبان یا د سن ترکی دسن ترکی نمی داغم؟“ احمد نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”وہی وہی“ میں نے جلدی سے سر ہلایا۔

”حاضر میں کو پہلی بار کسی ترک کی زبانی یہ شعر سننے کو ملتا“ بڑے اڑے اور نماز پڑتے اس کے علاوہ ریڈ ڈاٹ والوں کو آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔“ احمد بگلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ میں نے ایک بار پھر مکرر دیکھتے ہوئے کہا ”ریڈ ڈاٹ والے تو گویا بالکل ہی کسی کی بل میں گھس کر بیٹھے گئے ہیں۔ یہ بات مجھے زیادہ تشویش میں مبتلا کر رہی ہے۔ یہ سکون کسی طوفان کا عیش خیر ہے۔“

”اب تو ہم خھر ہیں کہ جو طوفان آتا ہے آپکے معاملہ کسی کنارے تو گئے۔ روز روز کی اس بک بک سے نجات ملے۔“ احمد بے زاری سے بولا ”کیا آپ کے محسوسات اس سے کچھ مختلف ہیں؟“

جیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں اب کھنی داڑھی مونچھوں اور لمبے بالوں والا ایک چھان تھا۔ جس کے گال پر مونچھا سا تھا اور ناک کی ساخت بھی کچھ بدل چکی تھی۔ سر پر بگلی سی سفید ٹوپی اور جسم پر جیلا ڈھالا پراٹھا مشغولی شلوار قمیض تھا۔ بیڑوں میں پڑانے سے پٹا دوری پہنچل تھی۔ بس میرے کندھے پر ایک کدال کی کی تھی اور میں پوری طرح ایک سیدھا سادہ ان پڑھ اور جانش مزدور نظر آتا۔

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کمرے سے رخصت ہوتے وقت ایک کدال بھی میرے کندھے پر رکھ دی گئی اور یوں گویا یہ کی بھی پوری کڑی گئی۔ میں دوبارہ نکست گاہ میں پہنچا تو احمد مجھے دیکھ کر کہنے لگا پھر ذرا اجنبیدہ ہوتے ہوئے بولا ”سرا بے بڑی عجیب بات ہے کہ آپ تقریباً ہر گیت آپ میں فٹ جاتے ہیں جو بیٹے ہیں وہی گیت گتے گتے ہیں۔“

”کیا کادھ ایسے گیت آپ کا۔ جس میں تم نے مجھے پہچان لیا۔“ میں نے قدرے ماہوسی سے کہا۔

”سرا اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے اور نہ ہی یہ آپ کے گیت آپ کی خرابی ہے۔“ وہ جلدی سے بولا ”میں نے آپ کو اس لیے پہچان لیا کہ مجھے چند منٹ پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ آپ کس ٹھیلے میں آنے والے ہیں۔“

میں دم دوبارہ اس کمرے میں نہیں آئی اور میں احمد کے ساتھ باہر آگیا۔ احمد نے میرے لیے ٹیکسی کا دروازہ کھولا تو میں نے کہا ”ٹیکس صاحب نے ہدایت کی تھی کہ میں ٹیکسی میں نہ بیٹھوں۔ میرے موجودہ ٹھیلے کے ساتھ یہ عجیب لگے گا۔“

”اب آٹھ دس میل دور آپ پیدل تو جانے سے رہے۔ میں آپ کو شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چھوڑ دوں گا“ چند فریادگ پیدل چل کر آپ ہستی تک پہنچ جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا جسے آپ کا ٹیکسی میں سز کرنا عجیب لگے گا۔ ویسے بھی اس وقت ہم دونوں ”بھائی بند“ لگ رہے ہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور ایک مزدور۔ دونوں دوست بھی تو ہو سکتے ہیں اور دوست دوست کی ٹیکسی میں مفت سز کر سکتا ہے۔“

میں بدستور ہچکچاہٹ کا شکار رہا تو احمد بولا ”ٹیکس صاحب کی احتیاطیں بھی بعض اوقات میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ بھی اگر کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے تو یہ سارا تردد فضول ہے اور اگر کوئی آٹھ بیس دیکھ رہی ہے جس سے پہلا علم ہیں تو اس کے لیے تو ہم پہلے ہی مشکوک ہیں۔ بلکہ اسے تو شاید معلوم ہی ہو گا کہ ہم کون ہیں۔ اس صورت میں بھی سارا تردد فضول ہے۔“

”اصل میں ٹیکس صاحب بے چارے اپنی سی احتیاط کر رہے ہیں“ صحیح جواز دینوہ خود ان کی اپنی نظر میں بھی واضح نہیں ہیں۔ بہر حال وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ریڈ ڈاٹ کچھ میں نہ آنے والی چیز ہے۔ میں بھی جن دنوں لاہور میں تھا تو بعض اوقات برا مطنین ہوا تھا کہ کوئی میرا تعاقب یا مگرانی نہیں

”نہیں اب تو میں بھی کیا چاہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
اسی طرح باتیں کرتے ہم اس موڑ تک پہنچ گئے جہاں سے

سے لگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں صاحب کو چڑکھڑکھایا تھا۔“  
ہوتا چاہیے کہ میں نے ان کی بذاتِ کی خلاف ورزی کی ہے۔“

اتھ تھوڑے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”عہرا“  
آپ اتنے نالغ قرآن کب سے ہو گئے؟“

”آج تک کی شرم بھی کوئی چیز ہے یا آج کل وہ بے چارے ہم  
پر بہت مہربان ہیں۔ میں بھی ان کی دل شکنی نہیں کرتی چاہیے۔“  
میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

اتھ واپس جانے کے لیے گاڑی موڑنے لگا تو میں نے پوچھا  
”تھرا اب کیا پروگرام ہے؟“

”میری ڈیوٹی تو مستقل طور پر اسلام آباد ہوئی ہے  
وہاں آکر ٹھہرنے والے تمام غیر ملکیوں کے بارے میں نوڈل سے  
زیادہ معلومات حاصل کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میرے علاوہ بھی  
بسیں صاحب کا ایک آدمی دفتر کے طور پر اور ایک کسی اور ملازم  
کے روپ میں ہوئے ہیں کام کر رہا ہے۔“ اتھ نے بتایا اور واپس  
روانہ ہو گیا۔

میں نے کدال کدے پر رکھی اور آگے چل دیا۔ جلی خانہ  
بدوشوں کی بستی ابھی کم از کم تین میل دور تھی۔ ہر گاڑی کی آواز  
سن کر میں مرکز دیکھتا اور لٹ کے لیے ہاتھ دیتا۔ بیسیوں گاڑیاں  
مگر جنس لیکن کسی کے ڈرائیور نے گاڑی روکنے کی زحمت نہیں  
کی۔ گلی بھی تھا کہ اس علاقے میں لٹ دینے کا رواج ذرا کم ہی  
تھا۔ خصوصاً ایک خستہ حال مزدور کو۔

چند فلائنگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے لٹ کے لیے  
ہاتھ دینا ترک کر دیا۔ تاہم ہر گاڑی کی آواز سن کر کروں جھکا کر  
نکروں میں ایک خاموشی التجا کے لیے ڈرائیور کی طرف دیکھ کر ضرور  
لیتا تھا۔ اس سڑک سے گاڑیاں اٹکاؤنگھی گزرتی تھیں۔ آخر مجھے  
سلور فلر کی ایک خوب صورت گاڑی دست رفتاری سے عقب سے  
آتی دکھائی دی۔ میں نے اپنی ایکٹنگ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی  
کوشش جاری رکھی اور اس کے ڈرائیور کی طرف بھی لٹ طلب  
نظروں سے دیکھا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میری اس ایکٹنگ  
کو کون دیکھ رہا تھا لیکن احتیاطاً ہر حال بہتر تھی۔

سلور کار کی گاڑی کو کوئی فیشن ایبل سا بوڑھا چلا رہا تھا۔ وہ  
سفید قلم تو نہیں تھا لیکن غیر ملکی ہی معلوم ہوا تھا۔ اس کے سر اور  
داڑھی کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ وہ ذرا گہرے رنگ کے  
یشیوں کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ سیاہ کوٹ کے ساتھ اس نے  
بھڑکنے ہوئے سرخ رنگ کی شرٹ پر سفید ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ وہ  
مستلاشی نظروں سے اُدھر اُدھر جھٹکا جا رہا تھا۔ شاید علاقے کا جائزہ  
لے رہا تھا۔ یہ علاقہ ویران ہونے کے باوجود سرسبز اور خوب  
صورت تھا۔

پہلے تو وہ بھی آگے نکلا چلا گیا لیکن پھر شاید اس کا جذبہ قزم  
بیدار ہوا اور اس کی گاڑی رورس ہو کر آگے لگی۔ قریب پہنچ کر  
میں نے رونا دھونا جہاں رہتا تھا اسے دیکھ کر دیکھ کر پوچھا ”کدھر  
جاتا ہے؟“

میں غیر ارادی طور پر انگریزی میں اس کے سوال کا جواب  
دیتے ہی لگا تھا کہ بدقت مجھے اپنی زبان کو بریک لگانے کا خیال  
آ گیا۔ میں تو اس وقت ایک اُن پڑھ چھان مزدور تھا لیکن پریشانی کا  
مقام یہ تھا کہ مجھے ٹوٹے پھوٹے چند جملوں کے سوا ہشتوبوگنی بھی  
نہیں آتی تھی۔ میں نے استادوں کی جین الا قوامی زبان تک ہی  
محدود رہنا بہتر سمجھا اور سادگی سے آنکھیں پھیلانے ہوئے  
اشارے سے دریافت کیا کہ وہ کیا پوچھ رہا تھا۔

تب اس نے بھی اشارے سے پوچھا کہ میں کہاں جانا چاہتا  
تھا۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ میں اسی سڑک پر کچھ آگے  
مزدوری کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس نے مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا  
اشارہ کیا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ پچھلی سیٹ پر کتنی داڑھی موٹھوں اور لمبے  
لمبے بالوں والا ایک بوڑھا پتلا سن سہید نوجوان بیٹھا تھا۔ آنکھوں پر  
تار یک چشمہ تھا۔ وہ کچھ عجیب دھننے دھننے سے انداز میں بیٹھا تھا  
اور دوسری طرف کے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ  
اس میں جنس کا مادہ بھی بالکل نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر بھی  
میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ پوری دنیا  
سے تھا بیٹھا ہو۔ میں بھی سمجھا کہ شاید وہ بڑے میاں کا بیٹا تھا۔

میں نے گاڑی میں بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ نوجوان نے تب  
بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ بڑے میاں کو کہ جان بچکے تھے میں  
انگریزی نہیں سمجھتا تھا اس کے باوجود انہوں نے شاید غیر ارادی  
طور پر انگریزی میں وضاحت کی ”اس نوجوان کو بھی میں نے لٹ  
دی ہے۔ یہ سات میل آگے آئے گا۔“

میں انجان بنا بیٹھا رہا گیا اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ  
آیا ہو۔ تاہم میں دلی ہی دل میں نوجوان کے انداز پر حیران ہوئے  
بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ کچھ اس طرح بیٹھا تھا گیا اس نے بڑے میاں  
سے لٹ لے کر اس کی گزری ہوئی اور آگے والی سات پستوں اور  
سات نسلوں پر احسان کیا ہو۔

بڑے میاں نے مرکز میری طرف دیکھا۔ گہرے رنگ کے  
یشیوں کے عقب سے اس کی آنکھیں صاف دکھائی نہیں دے رہی  
تھیں لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے بہت غور سے میرا جائزہ لیا  
تھا۔ میری دھڑکن ذرا تیز ہو گئی لیکن میں ایک سادہ لوح اور انجان  
شخص کی طرح اپنے چہرے کو سپات رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے  
سکون سے بیٹھا رہا۔

بوڑھا بولا ”اس کدال کو تو نیچے رکھ دو۔“ پھر اس نے  
اشارے سے مجھے اپنا مطلب سمجھایا۔ اس کے لیے مجھے اس پر  
ایرانی ہونے کا شبہ ہوا۔

میں نے کدال کندھے سے اُتار لی لیکن نیچے پھر بھی نہیں رکھی۔ میں نے اپنے اسے بکھیر دیا۔ کدال آگے بڑھ گئی۔ تب ایک اچانک ہی میری نظر معلوم ہوئی جس نے اضطراب کا احساس دلانے لگا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ گاڑی کی رفتار اب بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، خلیب میں بھی زمین چھوڑے سبزے سے ڈھلکی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا گاڑی سے چھٹا کدال کاڑھنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا لیکن فوری طور پر میرا دل اس قسم کی بدحواسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوسکا۔

میں نے محسوس کیا کہ بوڑھا عقب نما آئیے میں میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں ایک سادہ لوح انسان کی طرح منونیت سے مسکراتے کی کو شش کر رہا تھا لیکن اس دوران میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی اضطراب کی لہریں کچھ تیز ہو چکی تھیں بوڑھے نے کار کی رفتار کچھ بڑھا دی۔

اچانک وہ غصے غصے لہجے میں بولا "یارے! اپنی ماں نے جس پر پچھتاوا نہیں لیکن مجھے کبھی شب ہو رہا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تمہارا ایک آپ زیادہ اچھا نہیں ہے مجھے دیکھو! میں نے اپنا ایک آپ خود کیا ہوا ہے لیکن دیکھو کتنا عمدہ ہے۔ اگر تم وہی ہو جو میں تمہیں سمجھ رہا ہوں تب بھی مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکتے ہو۔"

اچانک میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی یکدم ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی اضطراب کی لہریں گویا کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن ذرا تاخیر کے ساتھ۔

وہ عمان تھا!

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا! ایک لمحے کے لیے مجھے یہی گمان گزر رہا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ یہاں کی کھر کھر کیا تھا؟ اور اگر پہنچی گیا تھا تو کیا اس کا مجھ سے کرنا ضروری تھا؟

وہ انسان نہیں کوئی بد لوح معلوم ہوا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرا استیصال میں اس سے پہچان چھوٹ گیا تھا لیکن وہ یہاں بھی آں پہنچا تھا۔ کس طرح آں پہنچا تھا؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں عقب نما آئیے میں اس کی صورت دیکھنے میں شاید کچھ زیادہ ہی غور ہو گیا تھا کیونکہ اس دوران ایک سخت سی چیز میری پسیلوں پر آں لگی۔

وہ نوجوان جو مجھے روکھے روکھے انداز میں کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا نہ جانے کس وقت میرے قریب ٹھک آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک سی شکل کا ایک ہتھوڑا تھا جس کی نال سے ہی گویا وہ میری پسیلوں میں سوراخ کرنے کی فکر میں تھا۔ تاہم اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کا چہرہ دستور پتلا ہوا سا تھا لیکن اب اس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں پر تاریک جھٹے کے باوجود میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ آنکھ نہیں جھپک رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر کدال پر میری گرفت سخت ہو گئی لیکن نوجوان نے اسے بھی محسوس کر لیا اور ہتھوڑے کی نال پر دباؤ مزید بڑھا کر گویا مجھے اشارہ دیا کہ میں کدال کے ڈھتے سے ہاتھ ہٹاؤں۔ میں نے دھتے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ مجھے تو ڈرا سا اطمینان بھی تھا کہ شاید عمان بچ بول رہا تھا۔ ابھی وہ میرے بارے میں شک میں ہی تھا۔ اس نے پتلی طور پر مجھے نہیں پہچانا تھا۔

وہ بڑے اطمینان سے ذرا نیچے تک جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ میں نے عہد کیا تھا کہ چشم تک اس کا پہچان نہیں چھوڑوں گا۔ دو دن پہلے میرا اس سے آخری بار استیصال میں سامنا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے میرے بڑے بڑے کام بھی خراب ہوئے اور مجھے ذلت بھی بہت اٹھانی پڑی۔ میں خود اپنی تقریریں کر گیا۔"

میں نے عقب نما آئیے میں انھوں کی طرح اس کی طرف دیکھنا جاری رکھا جسے اس کی گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آ رہا ہو پھر میں نے یوں نوجوان کی طرف دیکھا جسے میرے خیال میں عمان اس سے بات کر رہا ہو لیکن اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ ساپ کی طرح پلک پلک چمکے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔

عمان نے بات جاری رکھی "مجھے اس شخص کا آخری سراغ یہ ملا تھا کہ میرے فرار ہونے کے بعد وہ استیصال کے سرکاری چکر میں شہر کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے مجھے کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترک فاشنی ملائے میں شامل ہو کر یہاں آیا ہے۔ میں اس ملائے کے پیچھے پیچھے یہاں پہنچا۔ سب دنیاؤں کو چمک گیا۔ وہ شخص ان میں نہیں ہے۔ میں اسی ہو گئی میں گھبرا ہوا ہوں اور کل شام سے کرائے کی اس کار میں اس کی تلاش میں مزدوروں کی خاک چھاتا پھرتا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے یہیں کس مل جائے گا۔"

مجھے ہتھوڑے جتنے بھی ٹوٹے پھوٹے پھلے آتے تھے میں نے ان سب کو گڈمڈ کر کے تیزی سے بول ڈالا۔ انداز کچھ ایسا تھا جسے میں قدمے سے پوچھ رہا ہوں کہ آخر یہ کیا مذاق تھا اور وہ لوگ کیا چاہتے تھے؟

عمان کے کان پر گویا ہوں تک نہیں رہیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہارا قد کاٹھ دی ہے، قد تو خال دی ہیں۔ جسمانی ساخت دی ہے۔ آنکھیں بھی وہی لگ رہی ہیں۔ میری نظر میں تو اس شخص کا سراپا نقش ہو گیا ہے اور اس وقت تک گفتگو رہے گا جب تک اس سے میرا حساب برابر نہیں ہو جاتا۔ اوپر سے تم میک اپ میں ہو۔ اس دیر میں اسے ایک شخص کا میک اپ کیے ہوئے پھرنا مجھے خالی از سلسلہ نظر نہیں آ رہا۔ میں ذرا کس مناسب مقام پر تمہیں میک اپ کے بغیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یا پھر جاؤ تو تم مجھے اس زحمت سے بچاؤ۔ سیدھی طرح بتا دو کہ تم انھیں چھوڑ دی ہو۔"

میں نے ایک بار پھر اپنی نالا سلا اور بے عمل ہتھوڑا مٹا دیا۔

زندہ رہتے ہیں۔ اگر مجھے ذرا بھی خللو نظر آیا تو میں اس سوچ کو دبانے سے بھی دو دفع بچیں کہوں گا کہ ہم تو مری جانیں گے لیکن ہمارے لیے زیادہ اہم اس بات پر ہے کہ ہم بھی جیسا کہ چاہتے ہیں۔

اب میں خاموش رہا۔ میں نے اپنے چہرے پر بے بسی طاری کر لی تھی۔ سڑک بہت دور رہ گئی تھی اور ہم ایک پھاڑی کے عقب میں پہنچ گئے تھے۔ سڑک سے آگاہ گاڑیوں میں گزرنے والے لوگوں کی فکر یہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور یہاں سے کوئی آواز بھی سڑک تک پہنچنا مشکل تھی۔ کوئی بوسا سم بھڑکتا پ شاید آواز وہاں تک پہنچتی۔

حمان نے ایک جگہ جمناڑیوں کے قریب گاڑی روک لی۔ تب میں نے پہلی بار اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز سنی۔ کسی بددع کی سی کھرکائی ہوئی آواز تھی جیسے کسی ذہک آلود لڑکے کو تیر و جار چمڑی سے کچا جا رہا ہو۔ ”جس طرح بیٹھے ہو اسی طرح آواز سنی سے کھٹک کر نیچے اتر جاؤ۔ کہ ال کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں گئی ہے گھر نہ دو۔“ اس نے حکم انگریزی میں دیا تھا۔

ایک لمبے کے لیے میں نے سوچا۔ اب بھی انہماں بارہوں جیسے اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس نے اشارے سے بھی اپنا معلوم واضح کر دیا پھر میں نے بھی کار سے اترنے کے مرنے کو نصیحت مانا۔ کھلی جگہ دیے بھی مجھے قسمت آزمائی کے لیے بہتر محسوس ہوتی تھی۔ بڑا کار ایک خاص خطرناک جگہ تھی۔ خصوصاً جبکہ ایک طرف سے پسیلوں پر پھنسل گیا ہوا تھا اور کوئی بھید نہیں تھا اس خبیث حمان کا دعوئی درست ہی رہا ہو کہ ڈر والا نہیں دبانے سے کار دھماکے سے اڑ سکتی تھی۔ ایسے بد بخت قسم کے لوگوں سے کوئی بھی بات بھید نہیں ہوتی۔ اس قسم کے لوگ عموماً اہل مارل ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی طرف کا دواڑہ کھولا اور باہر پھسل گیا۔ کہ ال دواڑے میں گر گئی۔ اس کا دستہ دواڑے سے باہر پھنسل ہو گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس دوران پستول کی ٹال ایک لمبے کے لیے بھی میری پسیلوں سے نہیں ہٹی تھی۔ حمان کا وہ چپلا گویا میرے ساتھ ہی پھنسل ہوا کار سے باہر آیا تھا۔ میں نے اسے کسی چیز کو پکڑنے یا سارے کے لیے کسی چیز پر ہاتھ رکھتے نہیں دیکھا۔

حمان مجھ سے پہلے ہی گاڑی سے اتر چکا تھا اور میں جب سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا تو میں نے اسے اپنے سامنے کھڑے پایا۔ وہ قدم میں بہ مشکل میرے پیچے تک پہنچا لیکن اس وقت اس کے ہاتھ میں کسی ہی ٹال کا ایک پستول تھا جس کی وجہ سے شاید وہ اپنے آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ بلند قامت محسوس کر رہا تھا۔

اس دوران اس کے چپلے کے پستول کی ٹال میری کمر پھنسل ہو چکی تھی۔ حمان نے پستول کی ٹال میرے پیچے پر رکھ دی۔ یعنی اس وقت میں بدست بیٹھے پڑھ ور قاتلوں اور ان کے نمائند

ہاتھ ہوئے ہاتھ نہایا۔ میں عموماً اپنے جوتوں کو آخری وقت تک بھانے کی کوشش کرتا تھا اس طرح مجھے سوچنے سمجھنے اور پہنچنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جہاں سے یوں طویل سانس لی جیسے کوئی چڑیا کسی بچے کی خد کے سامنے سے بس ہو گیا ہو۔

اس دوران مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ہم خانہ بدوشوں کی ہستی اور دواڑہ جالی اسلیم وغیرہ سے آگے نکل آئے تھے۔ بل کھائی سڑک پھاڑیوں کی طرف جاری تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ لیس صاحب وہاں نیچے میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں گمان بھی نہیں ہو گا کہ ان کے سامنے والی سڑک سے کوئی مجھے گاڑی میں اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔ ان کے میک اپ نے مجھے مردانہ لائق بنات باپ تھی کہ میں میک اپ میں نہ ہوں اور حمان سے میرا سامنا ہو جاتا ہے بھی کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ میں ممکن تھا وہ چلتی گاڑی سے مجھے کوئی اردو تہ۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس پر بچھٹانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا مجھے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ قسمت کے لکھے کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔

گاڑی اب پھاڑی کے گرد چکر کاٹ کر کے میں اتر رہی تھی۔ حمان بولا بھگوا تم یہ سامنے کے لیے تیار نہیں ہو کہ تم افضل چہ پوری ہو؟“

میں نے ایک بار پھر بری سے تھوڑی سی بک بک کی لیکن حسب سابق حمان نے میرے چہل احتجاج کو لٹ نہیں کرائی اور تیار ہوا راستے پر اعتبار سے ڈرائیو تک جاری رکھتے ہوئے بولا کہ تم افضل چہ پوری ہی ہو جس کا مجھے تو نے قصہ نہیں ہے تو میں تمہیں دو خطرات کے بارے میں خبردار کر دوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم بہت اونٹنی چیز ہو لیکن حمان سے اونٹنی نہیں۔ اس لیے اب کوئی کرتب دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ یہ نوجوان جو تمہارے برابر بیٹھا ہے دنیا کے آٹھ دس خفاک ترین قاتلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے سامنے قطعاً کوئی ہوشیاری مت دکھانا۔ یہ میرا ہوشیار ترین شاگرد ہے۔ دوسری بات یہ کہ میرا ہاتھ اس وقت کے بالکل قریب ہے جو ذرہ دینے کے کام آتا ہے۔“

گاڑی خفیہ سے ہچکے کھارہی تھی جس کے ساتھ میری پسیلوں پر پستول کی ٹال گر گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری ایک آدھ چپل پر سے تو کمال چھل چکی تھی، میں بالکل دواڑے سے چپک چکا تھا۔ مزید گھسنے کی جگہ نہیں تھی۔

حمان کہ رہا تھا ”تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ میں دھماکا خیز اشیا کا ماہر ہوں۔ میں نے کرائے کی اس کار میں بھی اپنا تھوڑا بہت کام دکھایا ہوا ہے۔ اگر میں ڈر دینے والا سوچ رہا ہوں تو یہ کار دھماکے سے اڑ جائے گی اور اس کے ساتھ ہم سب بھی۔“

میں گو کہ اب بھی ٹال ہاں کر کے نہ چلا ہوا تھا کہ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اس نے گویا فرض کر رکھا تھا کہ میں ہر بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے وضاحت کی ”ہم تو جان چھٹی پر ہی لے پھرتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم جیسے لوگ زیادہ عرصے

طرف کی یکن کرتے کرتے وہ تیسرا ناز بھی کر چکا تھا۔ گولی میرے کان کے قریب سے گزر کر غائب زمین میں ہوتی۔ اس وقت تک اس کی ترخو لٹروالی نکالی تیری گرفت میں آچکی تھی اور یہ وہ موقع تھا جہاں سے جسمانی طاقت کا کام شروع ہوتا تھا۔ اس نے پھول کا رخ میری طرف کر کے ناز کرنے کی کوشش میں پھول خالی کر لیا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اس دوران اس کا بازو مڑا چلا گیا۔

دوسرے ہاتھ سے میں نے اسے تباہ کیا ہوا تھا۔ وہ دھڑکا ہوا تھا۔ اس کے باوجود عام زونہاتوں کی نسبت طاقتور اور مضبوط تھا لیکن میرے لیے نہیں۔ اس کا پھول خالی ہونے کے باوجود اس میں اس کا بازو مڑا تباہی چلا گیا تھی کہ کراک کی آواز آئی اور اس کا بازو کبھی سے الگ ہو گیا لیکن میں زونہات کی قوت پر اشدت کی راد دے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ کھینے کھینے سے انداز میں وہ محض غرا کر رہ گیا۔

چند سیکنڈ کی اس کشاکش کے دوران بھی میں اس بات پر حیران ہونے بغیر نہیں رہا کہ اب تک مجھے حمان کی طرف سے گولی کیوں نہیں لگی تھی۔ اس وقت تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے اس کے اپنے ہی خیلے کی گولی لگ چکی تھی۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید میرا گھوڑا اس کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا اور وہ کہیں بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے خیلے کے لیے اتنی ہی سزا کو کافی سمجھا کہ اس کا بازو ٹوٹ چکا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس بدبخت کا بایاں ہاتھ تیزی سے کوٹ کی اندرونی جیب میں گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک اور گمن کی جھلک دیکھی۔ اس امکان کی طرف پیرا زہن گمایا، نہیں تھا کہ اس کے پاس دوسری گمن بھی ہو سکتی تھی۔

یہ اس کی بد نصیبی ہی تھی کہ اس نے دوسری گمن نکالنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ میں نے تو اپنی دانست میں خیلے سے کام لیا تھا اور اسے زندہ رہنے کا موقع دیا تھا لیکن بعض باتیں موت کے ہر کاروں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں اس وقت تک سیدھا کھڑا نہیں ہویا تھا جب میں نے اس کے ہاتھ میں کسی گمن کی جھلک دیکھی۔

ہم اس وقت گاڑی کے قریب ہی تھے اور وہ دروازہ کھلا تھا جس سے ہم باہر آتے تھے۔ کدال کا دست اس دروازے سے جھانک رہا تھا۔ پک جھپکنے میں کدال میرے ہاتھ میں آئی اور اپنے آپ کو اس کے متعلق ناز سے بچاتے ہوئے میں نے ایک ہی ہاتھ سے کدال اٹھائی۔

وہ شاید ایک بازو ٹوٹنے کی تکلیف کی وجہ سے دوسرے ہاتھ کو بھی صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکا۔ گولی نہ جانے کس طرف گئی۔ اس وقت تک کدال کا چل اس کی کھوپڑی میں ہوتی ہو چکا تھا۔ میں نے کدال کو نکالنے کی کوشش کی تو اس کا سر کدال کے ساتھ

جدید پتھروں کے درمیان سینڈ ریج بن چکا تھا۔ میں بہت گناہ کا راسا کوئی ہوں، یقین کی دولت بڑے خاص اور نیک بندوں کے پاس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں بیٹھ ایک عجیب سی طمانیت میرے ساتھ رہی تھی۔ موت کے منہ میں بھی میں نے بیٹھ ہی سوچا تھا کہ میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر رہا اس لیے کوئی نیبی طاقت ضرور میری حفاظت کرے گی۔

اس روز ایک لمحے کے لیے میرا یقین متزلزل سا ہو گیا۔ آخر کار میں ایک گناہ گار دنیا دار آدمی تھا۔ میری بنیاد تو عام سی ہی تھی۔ میری بنیاد میں روحانی طاقت کا سنگریٹ تو نہیں تھا۔ یقین کا سمارا ہمارا تو ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھا راسا آ گیا۔

خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھ پر یہ کمزوری صرف ایک لمحے کے لیے غالب آئی۔ وہ لمحہ آیا اور گزر گیا۔ ان دونوں کو توثیق پتا نہیں چلا ہو گا کہ اس ایک لمحے میں میری روح پر کیسی غفلانی سی آکر گزر گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میرے یقین کی طاقت پہلے سے زیادہ شدت سے نمودار آئی۔

شاید یہ وہ طاقت تھی جو صرف روح میں ہی نہیں، جسم میں بھی بنائیاں ہی میرے پر رکھتی تھی۔ حمان نے داسیں ہاتھ سے پھول میرے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ بایاں ہاتھ اس نے میری داڑھی موچھ نوچنے کے لیے پڑھایا۔

مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ میرے دونوں ہاتھ کس تیزی سے حرکت میں آئے۔ ایک ہاتھ حمان کی پھول والی نکالی پر پیچھے سے اوپر کی طرف اڑتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں اتنی قوت سے گھونسا رسید کیا کہ وہ نفسا میں کم از کم دو فٹ اُٹھ گیا۔

اس کے پھول سے ناز ہو چکا تھا لیکن گولی آسمان کی طرف گئی تھی اور اسی لمحے میں اپنے آپ کو زمین پر گر چکا تھا۔ وقت کے تقین کے لحاظ سے بگڑا ہی کھلا تھا۔ جان کی بازی لگائی تھی۔ اسی لمحے پیچھے سے ناز ہوا تھا لیکن میں زمین پر گر چکا تھا۔ یہ سب کچھ تقریباً ایک ساتھ ہی ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں یہ چٹری دکھانے میں کیونکر کامیاب ہوا تھا۔ یہ کام اتنے ہی وقفے میں ہوا تھا جتنا زبردست گھبراہٹ اور گولی چلنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔

قدرت نے عجیب ہی کام دکھایا۔ حمان کے خیلے نے جو گولی چلائی تھی، میں مجبوری سے انداز میں اس کے سامنے سے ہٹ چکا تھا اور وہ گولی حمان کو لگ چکی تھی جو اس لمحے میرا گھونسا لگا کر ہوا میں اچھلا تھا۔ ہم اس وقت تک مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ حمان کو خود اس کے خیلے ہی کی چٹائی ہوئی گولی لگ چکی تھی۔

مجھے اس وقت کچھ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ بس اتنا احساس ضرور تھا کہ حمان میرے انداز سے کچھ زیادہ ہی دور جا کر گرا تھا۔ حمان کا شاکر داس وقت تک دوسرا ناز بھی کر چکا تھا لیکن میں اس کی ٹانگ بچھنے لگا تھا۔ دوسری گولی تو نہ جانے کس



## اے حمید کی ایدو پھر سیر نی

### عاطفون

1. اہرام مصر سے فراق 150/-
2. اندلس کی آخری شمع 125/-
3. پڑپہ کی ناگن 125/-
4. عاطفون موت کے دروازے پر 200/-

### شیو سینا کے دہشت گرد

1. ٹاپ ٹیکر مشن 150/-
2. کشمیر کے غازی 150/-
3. کمانڈو ایکشن 200/-
4. گوگندہ کے بھادر 200/-

- گنگا کے پجاری ناگ (اول) 150/-
- گنگا کے پجاری ناگ (دوئم) 200/-

### مکتبہ القریش

اردو بازار، لاہور

فون : 7224665

ہی اور اٹھ آیا۔ میں نے کدال کو وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے جسم کو  
تنگی سے انداز میں دو تین جھٹکے گئے پھر وہیں ساکت ہو گیا  
کدال اس کے سر میں ہوا۔  
اب میں نے حان کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ  
لاٹک کر قدرے ٹھیب میں جا کر اٹھا اور ساکت رہا تھا۔ اس کے  
قرب پہنچ کر میں نے دیکھا اس کے سینے سے بھل بھل خون بہہ رہا  
تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شاید آخری سانس لے رہا  
تھا۔

میں اس کے قریب کھڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے  
اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بھی لورنگ  
تھیں۔ میں اس کی صورت دیکھنے میں کچھ ایسا حقا کہ اس کے  
نمات آہستہ سے بٹنے ہوئے ہاتھ کی طرف میرا دھیان ہی نہیں  
میا۔ شاید مجھے توقع نہیں تھی کہ آخری سانس لیتے ہوئے بھی  
کوئی اپنی زندگی کی بچی بچی رتی کو کاڑھ کرنے میں صرف کر سکتا تھا  
لیکن مجھے اس کی آنکھوں سے بھانپتی ہوئی نفرت سے اندازہ ہو جانا  
چاہیے تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نفرت نے ہی مجھے موت کر دیا  
تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مرتے وقت بھی کسی کی آنکھوں میں  
نفرت کی یہ شدت نظر آ سکتی تھی۔

میں اچانک ہی گویا کسی خواب سے چونکا۔ اس کا رزتا ہوا  
ہاتھ سیدھا ہونچا تھا اور اس میں ہتھول تھا۔ اگر میں نے بدوقت  
اپنے تب کو زمین پر نہ گرایا ہوتا تو شاید گولی میرے چہرے پر  
لگتی۔ اس کی یہ حرکت کچھ ایسی ہی تھی جیسے شمع بجھنے سے پہلے  
آخری بار بجھتی ہو۔

میں نے گرتے گرتے اس کے معنوی سفیدی سے بچے ہوئے  
بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر کچھ اوپر اٹھا کر زور سے زمین پر  
مارا اور وہ ساکت ہو گیا۔ اس کا ہتھول والا ہاتھ پہلے ہی زمین پر گر  
کر ساکت ہو چکا تھا۔ اس بار میں نے احتیاط برلی اور اٹھنے سے  
پہلے اس کے ہاتھ سے ہتھول نکال لیا لیکن اب وہ واقعی ساکت  
ہو چکا تھا۔ اس کی نفرت بھری آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

آخر کار میں نے ہتھول اس کی لاش پر ہی پھینک دیا۔ چند لمبے  
میں وہیں کھڑا مری مری سانس لیتا رہا۔ میرے ذہن میں چلی ہوئی  
آندھیاں عجم جی تھیں اور میرے ارد گرد بھی گہرا سکوت طاری  
تھا۔ شاید یہ موت کا سکوت تھا۔

میں چند منٹ وہیں کم کم کھڑا رہا پھر وہ بھل سے انداز میں قدم  
اٹھا اٹھا پاڑی کے دوسری طرف سے گھوم کر سڑک کی طرف چل  
دیا۔ کچھ دیر بعد میں اسی سڑک کے کنارے کنارے پیدل خانہ  
بدوش کی ہستی کی طرف جا رہا تھا جس سے آیا تھا۔ اب میں نے  
لفٹ لینے کے لیے کسی کو ہاتھ نہیں دیا اور نہ ہی کسی گاڑی والے  
نے میری طرف توجہ دی۔

مجھے

# طلسم زادی

☆ ----- ایم۔ اے راحت

روشنی کی دنیا سے دُور پُراسرار دنیا  
کی کہانی جہاں مافوق الفطرت زندگی کا  
دور دورہ تھا۔ دو دشمنوں کی عجیب  
داستان جنہوں نے جب ایک  
دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ  
بڑھایا۔ تو ایک ناقابل یقین کہانی نے  
جنم لیا۔

ایم۔ اے راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت: حصہ اول -/150

قیمت: حصہ دوم -/150

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

پھر وہی آتی ہے کہ قدرت جو کرتی ہے بہتر کرتی ہے اور میں قدرت  
کے کاموں پر حیران بھی بہت ہوں۔ شاید میں اشتیاق میں اس کام کو  
ادھورا چھوڑ آیا تھا جو قدرت کو مجھ سے یہاں عمل کرانا تھا۔"

ہو گا اور میرے خیال میں بہتر یہی ہو گا کہ اس واقعے سے تمہارا کوئی  
تعلق نظر نہ آئے اگر ایسی کوئی شہادت ہوئی تو ہمیں اس کو ختم  
کرنا ہو گا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے خود کلائی کے سے انداز میں بولتے  
چارہ تھے۔

"مجھے خود اس واقعے کا کریڈٹ لینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

میں نے بے پروائی سے کہا پھر انہیں تمام واقعہ سنایا۔

انہوں نے فوراً موبائل فون نکالا اور کچھ لوگوں کو ہدایت

وقت کی رفتار کا کوئی احساس نہ رہا البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ  
جب میں خانہ بدوشوں کی ہستی پہنچا تو پہلے میں شراور تھا۔ میں جس  
گلی سے ہستی میں داخل ہونے کا اس کے کونے پر دو مظلوم لہلال  
توہی زمین پر ٹپٹپٹے ہوئے چہ سرگمیل رہے تھے۔ انہوں نے سرگملا  
کر میری طرف دیکھا۔

ان کے ٹپٹے گو کہ بہت بدلے ہوئے تھے لیکن میں نے انہیں  
پہچان لیا۔ وہ میرا اور مسعود تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں  
ان کے قریب نہیں رکا اور جان بوجھ کر چہرے پر اجنبیت کیے گزرنا  
چلا گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا میرا کٹ اپ کتنا قابلِ بھروسہ تھا میرے  
ساتھی بھی مجھے پہچانتے تھے یا نہیں؟

میرا اٹھ کر تیزی سے میرے سامنے اٹھیا اور میرا راستہ تقریباً  
روکتے ہوئے بولا "کس سے ملنا ہے کس کے پاس جا رہے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "کسی  
طرح مجھے افضل چوہدری سے ملنا ہے۔ وہ تو کوئی آدم نہ جانے کہاں  
غائب ہو گیا ہے۔"

وہ ہلک جھپکاتے بغیر چند لمبے میری طرف دیکھا رہا پھر بے  
اختیارانہ سے انداز میں مجھ سے پتہ کیا "سر آپ مجھے پتا چلا تھا  
کہ آپ بیچ کچے ہیں اور کل یہاں بھی آئے تھے۔ افسوس کل  
آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ آپ کو دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے  
کہ بتا نہیں سکتا۔ ویسے جی بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو بالکل  
نہیں پہچانا تھا۔"

پھر اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے مسعود کو پکارا "اوی  
بیڑے! اور اگر دیکھ تو کسی کون آیا ہے۔"

تب مجھے معلوم ہوا کہ مسعود کا نام اس وقت بیڑا تھا۔ وہ بھی  
آکر مجھ سے ملا اور کچھ دیر ویسی ہی باتیں ہوئی رہیں جیسی عموماً ایک  
عرصے تک چھڑے رہنے کے بعد ملنے والے دوستوں میں ہوتی ہیں  
پھر میر کو جیسے یاد آیا۔ وہ چوتھے ہوئے بولا "آپ پہلے جلدی  
سے جا کر نفیس صاحب سے مل لیں۔ میرا خیال ہے وہ بہت دیر سے  
آپ کا انتظار کر رہے ہیں لیکن ہمیں نہیں معلوم تھا آپ اس ٹپٹے  
میں یہاں پہنچیں گے۔"

میں نفیس صاحب کے خیمے میں پہنچا تو وہ واقعی بے تابی سے  
میرے شہر تھے چھرتے ہی بولے "کہاں وہ گئے تھے؟ کب؟ میں تو  
تمہارے انتظار میں سوکھا گیا۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں یہاں پہنچ گیا۔ ورنہ شاید  
آپ زندگی بھر میرا انتظار کرتے رہتے۔" میں نے خیمے میں رکھی  
مراتی سے ایک بڑے سے گلاس میں پانی اٹھائے ہوئے کہا۔

"کیا وہ اخیر بہت تو تھکی؟" وہ کچھ چوٹے۔

"آپ کی عکسٹ عملی نے تو مجھے مروا دیا تھا۔" میں نے پانی

جیت میں اٹھانے کے بعد کہا "نہا کا شہر ہے کچھ کراہیا لیکن بات

دینے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے انداز سے واقعی لگ رہا تھا کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ انہوں نے کئی افراد سے بات کی اور کالی در میں غاص ہو گئے۔ میں اس دوران ان کی صورت دیکھتا رہا اور پورے آداب۔

آخر کار انہوں نے فون کی جان چھوڑی تو میں نے کہا ”میرا خیال ہے کہ وہ آپ نے مجھے کسی کام کے لیے ہی یہاں بلایا ہو گا لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ کام اب پیچ میں ہی رہ گیا ہے۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ کام تو ہونا ہی ہے تاہم وہ کام کچھ ایسا خاص بھی نہیں ہے۔ دراصل میں تمہیں وہ سرگرم رکھنا چاہتا تھا جو ہم اپنی داستان میں نہایت رازداری سے کھڑے رہے ہیں۔ میں اس کے بارے میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔“ نہیں صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”میں کوئی انجینئر وغیرہ تو ہوں نہیں۔ میں بھلا کیا رائے دے سکوں ہوں!“ میں نے حیرت سے کہا۔

”میں تم سے انجینئرنگ کے کتبہ نظر سے نہیں بلکہ کامن سینس کے کتبہ نظر سے رائے لینا چاہتا ہوں۔ انجینئر تو ہمارے پاس بہت ہیں اور وہ سب اس پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں لیکن وہ لوگ کلیئر کے فقیر ہوتے ہیں۔ وہ صرف ٹیکنیکل رائے دے سکتے ہیں۔ اس رائے کے پیچھے کچھ ضروری غوصات کام نہیں کر رہے ہوتے۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے ”کل شام رپورٹ آئی ہے کہ کچھ حساس آلات نشانہ بن کر رہے ہیں کہ جس سمت میں کھدائی جاری ہے اس سمت میں کچھ ہی آگے کوئی محسوس چیز موجود ہے۔ زمین کی ساخت سے مختلف کوئی چیز۔ میں نے کھدائی رکوا دی ہے۔ اب ہمیں ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر بہت احتیاط سے اٹھانا ہے۔ ہمیں ایسی ہی کسی خبر کا انتظار تھا۔“

”تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم پہلے میرے ساتھ چل کر سرنگ کا معائنہ تو کرو۔“ نہیں صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

ہم دونوں نیچے سے نکلے اور بہتی کی میزمری میزمری گلیوں سے ہوتے ہوئے اس سمت میں روانہ ہو گئے جہاں بڑا ہروائر پلانٹ اسٹیم پر کام ہو رہا تھا اور دیو بیکل مشینیں متحرک نظر آ رہی تھیں۔

”آخر ہوا کیا؟“ نہیں صاحب بیڑی مسکا کر میرے قریب آن بیٹھے۔

میرا ذہن اس وقت واقعی کیسے دور پہنچا ہوا تھا۔ مجھے ان کی تواضعی دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری نظریں ابھی تک حیران اور اس کے چلنے کی صورت کو محسوس ہی تھیں۔ میں نے دیکھے لیجے میں کہا ”تج مجھے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی صرف موت ہی انسان کا تعاقب نہیں کرتی“ انسان خود بھی موت کا تعاقب کرتا ہے۔ حیران سے میری خواہ مخواہ کی مکملش احتیال میں ختم ہو گئی تھی اور میں اسے زندہ سلامت چھوڑ کر آیا تھا۔ یہاں آکر میں گویا اس خدا نے کو بھول ہی گیا تھا۔ حقیقت میں تو میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن وہ بد بخت مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پیچھے پیچھے یہاں آن پہنچا۔ درحقیقت وہ اپنی موت کو ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی اس سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ حیران تمہارے ہاتھوں میں پکا ہے؟“ نہیں صاحب بے گمانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”صرف حیران ہی نہیں اس کا ایک چیلہ بھی۔ جس پر اسے بہت ناز تھا۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

”تو اٹھ مت کود بڑا!“ نہیں صاحب مجھے گھورتے ہوئے بولے ”میں عمر میں بھی تم سے کٹا ہوا ہوں اور ایک طرح سے کچھ عمر کے لیے تمہارا افسر ہوں۔“

”آپ اسے خزانہ کیوں سمجھ رہے ہیں؟“ میں نے انہیں گھورا ”میری تو اس وقت جس مزاح میں سوچ رہا ہے۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم اسے اطمینان سے منان کے مرنے کی بات کر رہے ہو۔ اس کو مارنے کے لیے کسی زمانے میں دنیا کی کئی مشہور خفیہ ایجنسیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا مگر وہ خطرناک ترین ایجنٹوں سے بچ کر لٹکا رہا تھا۔“

”اس وقت اس کی موت نہیں کبھی ہوگی۔ جب موت کبھی ہوتی ہے تو ہاتھی چوٹی کے ڈوبنے بھی ممکن ہے اور میں کچھ ایسی چیز تو بھی نہیں ہوں۔ البتہ آپ جیسے لوگوں کے لیے ہم جیسے لوگوں کا معاملہ گہری مرنی دال برابر“ والا ہوتا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”مجھے... مجھے اپنے کالوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ نہیں صاحب نیچے میں ٹپکنے لگے ”تم مجھے صحیح طرح بتاؤ۔ آخر یہ واقعہ کب کہاں اور کیسے پیش آیا؟“

”وہ تو میں بتا رہا ہوں لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ اپنے پریشان کیوں ہیں؟“ میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

”تم سمجھ نہیں رہے ہو اور حقیقت یہ بہت اہم واقعہ ہے۔ یان الا خواہی اہمیت کی خبر ہے۔ ہمیں ان کی لاشوں کو بھی قبضے میں کرنا

زندگی کے آخری لمحے پہنچنے والے تھے۔ ایک سرکش  
میں نے کہا کہ یہاں ہی بھاری کھانے کا وقت آتا  
آٹھویں بجتے مگر یہاں پہنچنے کے لیے۔

# سکس



محمود احمد مودی

اور اسے کسی خاص مقصد کے تحت پٹنے کی سی شکل دی جا رہی تھی۔ اس دوار کے قریب کئی بڑے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سنگریٹ کے بہت سے پلڑے کی قطار نظر آ رہی تھی۔ یہ پلڑے زیادہ اونچے نہیں تھے مگر موٹے بہت تھے۔ ان میں سے ایک پلڑے پر خاک ڈال کر لی اور نیلی لپا کیپ میں ایک شخص کھڑا تھا جس کی بڑی بڑی جیبوں میں کئی اوزار اور آلات لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کلپ بورڈ اور ایک نقشہ تھا۔ پلڑے سے نیچے کھڑے ہوئے تین افراد سر اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو خاصی پریشانی کے عالم میں سر جھانک رہا تھا۔ پلڑے پر چڑھا ہوا شخص سائٹ انجینئر یا سائٹ سپروائزر قسم کی چیز معلوم ہوا تھا۔

فیس صاحب کو دیکھ کر وہ پلڑے سے کودا اور ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے فیس صاحب کو مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ یہ ایک عاقبت تھی۔ سلام کرنا تو غیر اپنی جگہ ٹھیک تھا لیکن اے مودبانہ انداز اختیار کرنا بڑی بے وقوفی کی بات تھی کیونکہ فیس صاحب

وائز پلائی اسٹیم پر کام تو جاری تھا مگر اس میں کچھ خاص تیزی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مشینیں اور انسان دونوں ہی بہت زیادہ سی حرکت کر رہے تھے۔ پٹا ہر سال وائز پلائی ہی کی اسٹیم پر کام ہو رہا تھا اور اس کے تمام لوازمات موجود تھے۔ سرنگ کی کھدائی اسی کی آڑ میں جا رہی تھی۔

ایک طرف بہت بڑی جھیل موجود تھی۔ قریب ہی شاید ایک سائنس فیر کیا جا چکا تھا جس میں موٹے موٹے پائپوں اور والوز وغیرہ کا جال بھیل ہوا نظر آ رہا تھا۔ بہت سی دوسری تعمیرات بھی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ جو طے سے خانہ بدوش نظر آ رہے تھے وہاں مزدوروں کے طور پر کام کر رہے تھے۔ وہ غالباً فیس صاحب کی بسالی ہوئی بہت سی آئے تھے۔

ایک طرف مٹی کی ایک کائی اونچی دیوار دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی دریا کے کنارے سیلاب کے خطرے کے پیش نظر حفاظتی پٹیہ تعمیر کیا گیا ہو حالانکہ وہاں کوئی دیوار نہیں تھا۔ شاید یہ سرنگ اور دوسری چیزوں کی کھدائی سے نکل ہوئی مٹی تھی

تھا۔ یقیناً اسے بھی معلوم تھا کہ میں مزدور نہیں تھا۔

کمرے کی عقی دیوار کے ساتھ کھڑکی کے چند کارٹن تھے۔ ان پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن میرے لیے کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان میں اسطر تھا۔ میرے نہایت پرانی کا سیاہ رنگ کا ٹیلی فون سیٹ بھی موجود تھا۔ وہ جہاں اس کی شروع ہوئی۔

چند لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد ابصار نے ریمپر اٹھایا اور نام بتانے کے بعد کئی بار صرف "میں سرسبیس سر" کہا اور رکھ دیا پھر اس نے ایک کانڈ پر کچھ لکھا اور واپس صوفے بیٹھا۔

چند سیکنڈ کے بعد درمیانی دروازہ کھلا اور نہیں صاحب میں آگئے لیکن اب ان کا طعنے بدلا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں تو غوطہ خور دکھائی دیے۔ ان کے جسم پر جو رنگ سوٹ سے مشابہ رنگ کا لباس تھا اور سر پر ایک خاص قسم کا ہیلٹ تھا۔ آگے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی طرح ایک لائٹ لگی ہوئی اس ہیلٹ کے ساتھ بائک وغیرہ بھی منسلک تھا لیکن نہیں صاحب نے وہ چہرے سے ہٹایا ہوا تھا۔ ان کی کمر پر بچہ ایک ٹینک بھی بڑھا ہوا تھا جو غائب آنکھیں کا تھا۔

"کیا تم سنہرے رنگی میں جا رہے ہیں؟" میں نے حیرت پوچھا۔

"جی سمجھ لو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "اصل میں اس کے سبب زمین سے بٹنے ہی اس کے لیے خطرات شروع ہوئے ہیں۔ سبب زمین پر جو خطرات ہوتے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہوئے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے انہوں نے بتایا۔ "بھیلے سرنگ کی کھدائی کے دوران سرنگ کی چھت کا کچھ حصہ بیٹھ اور مزدور وغیرہ اندر بند ہو گئے تھے اس کے بعد ہم لوگ احتیاط کرنے لگے ہیں۔ برابر کے کمرے میں ہر چیز موجود ہے بھی جا کر اپنے سازگار کو کوئی حفاظتی سوٹ پہن لو اور ہیلٹ پہنا۔"

اسی دوران ابصار نے اٹھ کر وہ جٹ نہیں صاحب کو تو جس پر اس نے ٹیلی فون سننے کے بعد کوئی پیغام نوٹ کیا تھا۔ صاحب نے ایک نظر جٹ دیکھی اور سر ہلا کر اسے پڑے پر کر کے ایک طرف بھیجتے ہوئے بولے۔ "جی ٹی بی بی" ہے۔ "ان کے لیے میں صرف تباہی کی خفیف ہی لہر تھی۔ مجھے خفیف سا دھچکا لگا۔ میں نے دوسرے کمرے کی دیا جاتے جاتے رک کر کہا۔ "اس صوفے پر ہمیں موجود ہونا چاہیے۔"

میں جذباتیت کو برا نہیں سمجھتا۔ مناسب حدود میں والی جذباتیت کا قدر دان ہوں لیکن جی ٹی بی بی میں شریک کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ کام باعزت طریقے سے۔

اس وقت خانہ بدوشوں والے محلے میں تھے۔ یہ لوگ محلے تو بدل لیتے تھے تمام لوازمات پورے کر لیتے تھے اور لمبے چڑے کھڑاگ پھیلا لیتے تھے لیکن پھولی پھولی باتوں اور باریکیوں کا خیال رکھنا کسی کھار بھول جاتے تھے۔ ایک ساٹھ سو ڈالر یا ساٹھ انچینٹر کا ایک خانہ بدوش کے سامنے منسوب نظر آتا ایک عجیب سی مناشا تھا۔ اگر واقعی کوئی بھی آنکھ اس منظر کی عمرانی کر رہی ہو تو متحجب ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اس قسم کی خاموشی پر خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

"ابصار کہاں ہے؟ ہم ساٹھ نوڈ کھانا چاہتے ہیں۔" نہیں صاحب کے لیے میں متحکم تھا۔ ایک خانہ بدوش کو اس حکم سے بات کرنے کو کچھ کمرش مخطوط ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس شخص نے فوراً اپنی بیٹ میں اڑسا ہوا دای کی ٹاکا نکالا اور چند بلن دبانے کے بعد بولا۔ "ابصار! نہیں صاحب آئے ہیں۔ وہ ساٹھ نوڈ کھانا چاہتے ہیں۔"

"میں آ رہا ہوں۔" دای کی ٹاکا پر آواز ابھری۔ چند لمحے بعد جمیل کے دوسری طرف سے ایک جبب وصول آواز آئی دکھائی دی۔ سائنس کی چار دیواری کے گرد چکر کاٹی ہوئی وہ ہمارے قریب آئی اور ساٹھ سو ایک ایجو مرینڈم شخص آکر کمرہ کی طرف آگیا۔ اس کے سر پر بڑا سائفلٹ سیٹ اور آنکھوں پر تاریک چشمہ تھا۔ گلے میں دو ریش لگی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھ پڑوں کے انداز میں ہیٹ آتار کہ بہ زبان نموشی نہیں صاحب کو سلام کیا۔ نہیں صاحب نے بھی صرف سر ہلا کر جواب دیا۔ اس نے نہیں اشارہ کیا اور ہم خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑے۔

اوپر لپچی زمین پر اوچھری تعمیرات کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہم چند کمروں کی ایک قطار کے پاس پہنچے یہ کمرے غائب واپس عارضی طور پر تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کے سامنے سادہ لباس میں دو مسلح کارڈ تھیٹات تھے۔ انہوں نے آنکھیں سیکنڈ کر ہم تینوں کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ قیمت تھا کہ انہوں نے نہیں صاحب کو سیلوٹ وغیرہ کرنے کی ذمت نہیں کی۔

ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک اچھے بھلے آفس کی طرح کا کمرہ تھا جس میں ایک طرف نشست کے لیے کئی صوفے اور کرسیاں وغیرہ بھی پڑی تھیں۔ نہیں صاحب مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "تمہیں ذرا سا انتظار کرنا پڑے گا۔"

میں اور فیلٹ سیٹ والا شخص جس کا نام ابصار تھا صوفوں پر آئے سامنے بیٹھ گئے۔ درمیانی دیوار میں ایک دو دروازہ نظر آ رہا تھا۔ نہیں صاحب نہایت آہستگی اور احتیاط سے اسے کھول کر برابر والے کمرے میں چلے گئے۔ میں کمرے کا۔ اور پھر ابصار کا جائزہ لینے لگا۔ وہ انچینٹر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ہے کچھ اور بھی رہا ہو۔ مجھے اس کی کاؤڈرائے کی چٹوں کی دونوں پھولی پھولی چٹوں میں ہتھول کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے میرا جائزہ لے رہا

تدو رفت کے لیے ایک الگ رات بنایا ہے۔

پھر انہوں نے تاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ تاریں مختلف آلات اور کمپیوٹروں وغیرہ سے منسلک ہیں۔ ان سے ذرا بچ کر چلتا۔“

سرگ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ وہاں وہ مخصوص یا موجود تھی جو ہر زمین سیلن زدہ جہوں پر ہوتی ہے۔ میرے جتنے قد کا آدمی وہاں صحیح طور پر سیدھا ہو کر نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے گردن کو ذرا خم دے کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اس طرح چلتے چلتے جلد ہی مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک سیدھی سرگ تھی اور ہم اس میں چلے جا رہے تھے۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے وہاں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نفیس صاحب مجھے وہاں کیوں لائے تھے۔

وہاں روشنی کم از کم اتنی ضرور تھی کہ ہم آسانی سے چل سکتے تھے۔ اس کے باوجود نفیس صاحب نے اپنی ”ہیڈ لائٹ“ روشن کر لی تھی اور ان کی ہدایت پر میں نے بھی ہیڈ لٹ میں لگی ہوئی لائٹ کا بن دیا تھا۔ ہوا کی وہاں کچھ ایسی خاص کی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دو مقامات پر سرگب کا دہانہ کھلا تھا۔

جب ہمیں چلتے چلتے خاص در ہو گئی تو میں نے قدرے بے چاری سے پوچھا۔ ”نفیس صاحب! کیا یہ سرگب افق کے پار جا کر نکلے گی؟“ ”نہیں۔ اس سے ذرا پہلے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”بلکہ اس سرگب کے ذریعے ہم نکل گئے تو کہیں بھی نہیں سکیں گے۔ سرگب تو آگے سے بند ہے اور ابھی آدھا فاصلہ بھی طے نہیں ہوا۔“

”خدا کی پناہ! میں نے طویل سانس لی۔“ اتنی طویل سرگب کھودنے پر تو خاصی محنت ہوئی ہوگی۔ ”سرگب تیار کرنا تو زیادہ مشکل کام نہیں۔ آج کے دور میں مشینری وغیرہ نے یہ کام بہت آسان کر دیے ہیں۔ اصل مشکل راز داری سے کام کرنے کی تھی۔“

”مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ یہ سرگب کھودنے کا کوئی اور نام نہ ہو گا یا نہیں لیکن ایک فائدہ ضرور نظر آیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کیا؟“ ”نفیس صاحب! رگ کر میری طرف مڑتے ہوئے بڑی دلچسپی سے بولے۔

”مجھے یہ پتا چل گیا ہے کہ سرگب میں چلنا کتابور کام ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ہم دونوں کی لائٹ ایک دوسرے کے چہرے پر چڑی تھی اور ہم اس سرگب میں کھڑے تھے اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہے تھے۔ نفیس صاحب خشکیں نظروں سے مجھے گھور کر رہ گئے۔ منہ سے کچھ نہیں بولے اور گھوم کر ایک بار پھر ناک کی سیدھ میں چلے گئے۔ اس سرگب میں ناک کی سیدھ میں چلنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں

نی دروازہ داری سے ہو گیا۔ یہی بہتر ہے اس موقع پر زیادہ کا بچہ نہ ہو جانی بہتر تھا۔ ”نفیس صاحب نے میرا نہ انداز میں پایا۔“

میں خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور ہنی کے تصور ان سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ ایک مشکل کام تھا۔ رگ میں کسی پارسی نہ کسی عجیب موڈ پر ہی مجھ سے کمرائی تھی ہر بار یادوں کے عجیب ہی نقوش چھوڑتی تھی۔ اس کی تدفین ساتھ کرنا ایک بے ربط سی کہانی ختم ہو گئی تھی۔

دوسرا کمرہ عجیب سا تھا۔ اس میں ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان بیک کی طرح اسٹینڈز پر بہت سے بیگمیں تھیں اسی قسم کے تھے ہوئے تھے جیسا نفیس صاحب پہن کر گئے تھے۔ ایک ڈانٹنگ فیل جیسی بڑی سی میڈول پر ہیڈلٹ اور سیلنڈر وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ ٹیلیفون میں اقسام کی آؤٹ بیک تھیں کوڑو حالت میں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں اکڑ رکھنے کا کھلف نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں ایک سے ایک ناک گن موجود تھی۔ اس کمرے کا اصل دروازہ لوپے کا تھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔

یہاں میں نے بھی نفیس صاحب کی طرح اپنا خلیہ تبدیل کیا۔ واپس آفس نمائندہ میں آ گیا۔ نفیس صاحب نے میرا ہیڈلٹ روزانہ صحیح طریقے سے ایڈجسٹ کیا اور ہم اس کمرے سے نکل گئے۔ ایسا رن اپنا خلیہ نہیں بدلا تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ یہ اسے ہمارے ساتھ نہیں جانا تھا۔

ہم ایک اور چار دیواری تک پہنچے۔ یہ کوئی شیڈ سادہ کھائی دے تھا جس میں شاید کسی قسم کی مشینری نصب تھی۔ ایسا رن کے پاس بٹ کی چابی موجود تھی۔ اس نے نکلا کھولا اور اندر پہنچ کر میں نے لکھا ”وہاں کوئی خاص مشینری وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف پزل کا جال سا پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔“

ہم ایک پہلے چوڑے کے قریب پہنچے۔ یہاں سے بیڑھیاں بچے جا رہی تھیں۔ قریب ہی ایک الماری نما جیسے میں بہت سے بات اور کچھ وائی ٹاکی قسم کے سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ نفیس صاحب نے ان میں سے ایک وائی ٹاکی اٹھالیا۔ ایسا رن بولا۔ ”میں میں موجود ہوں گا۔ کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے بلا سکتے ہیں۔“

نفیس صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کا اشارہ پا کر میں نے ان کے پیچھے پیچھے بیڑھیاں اتر گیا۔ چند لمحوں بعد میں نے اپنے آپ کو ایک مچی سرگب میں کھڑے پایا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چند تاریں بھی آگے جا رہی تھیں۔ انہی تاروں کے درمیان موڑے ٹھوڑے فاصلے پر خاص ساخت کے کپڑوں کے ذریعے بلب دندلوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ یعنی سرگب میں روشنی کا انتظام تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے ایک اور راستہ کسی دوسری سمت میں جا رہا تھا۔ نفیس صاحب اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ”سرگب کا اصل دہانہ اس طرف ہے۔ یہ ہم نے اپنی

تھا۔

تھی۔

”ذیہ افضل چوہدری! جہیں شاید معلوم نہیں۔  
ذاتی زیادہ پسند نہیں کرتا۔ خصوصاً ان معاملات میں جو  
زیادہ سنجیدگی کا تقاضا کرتے ہیں۔“ وہ انگریزی میں بولے  
زیادہ سنجیدہ ہوتے تھے تو انگریزی بولنے لگتے تھے۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔  
ساتھ رہیں گے تو رفتہ رفتہ آپ ذاتی کو پسند کرنے لگیں  
آپ کا ذاتی۔ یعنی ذوق اس معاملے میں کافی بلند ہو۔  
جس مزاج ترقی کر جائے گی۔ میں زندگی آپ کے لیے پا  
ہو جائے گی۔“ میں نے جان بوجھ کر اردو میں جو  
پر مصحوبیت سے پوچھا۔ ”آپ کہیں خانہ بدوشوں والے  
بھی زیادہ سنجیدہ ہونے پر انگریزی بولنا تو شروع نہیں کر دیں  
وہ ایک لمحے مجھے گھورتے رہے پھر گویا اپنا دماغ ٹھنڈ  
کو شش کرتے ہوئے بولے۔ ”میں اسحق نہیں ہوں۔ سیکو  
عقلمند قسم کے سرور پر دھار چکا ہوں۔ تم مجھے ادھر ادھر کی  
الچائے کی کوشش چھوڑ دو اور اگر اس سرگ کے با  
تمہاری کوئی رائے ہے تو وہ بتاؤ۔“

”مجھ سے بہتر رائے تو آپ کے سپیڈر اور دوسرے  
ظاہر کر چکے ہیں۔ میں اس سرگ کو صرف دیکھنے کے  
رائے دے سکتا ہوں کہ یہ ایک سرگ ہے اور بس۔“  
سنجیدگی سے کہا۔

”ان معاملات میں ہم جیسے لوگوں کی چھٹی جس بعض  
کپیڈوں اور دوسرے آلات سے زیادہ کار آمد ثابت  
ہے۔“ نہیں صاحب بولے۔

”میری چھٹی جس کی رائے کا تو شاید آپ میری رائے  
زیادہ برا ماننا جائیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ تم بولو تو کسی۔“ انہوں نے گویا بہ  
بہائی۔

”میں صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری چھٹی  
ساتویں۔“ میں نے بہ سطور سنجیدگی سے کہا۔ ”بہر حال  
جس ہے جو مجھ سے کہہ رہی ہے کہ یہ سرگ بلاوجہ ہی  
ہے۔ خواہ مخواہ ہی امتیخت کی گئی ہے اور اسے دوسرا  
کہے ہیں۔“

اس بار نہیں صاحب نے غامضہ صبور قہقہے کا مظاہرہ  
کی افسرانہ شان جو ش میں نہیں آئی اور وہ ملائمت سے  
”یہ تو تم نہیں کہہ سکتے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سرگ کی  
بہت زیادہ محنت یا دوسرا نہیں ہوئے دائرہ چلاؤ  
میں ابن ہی رہی تھی۔ اس کی آؤں سرگ کھولنی گئی تھی  
کا کچھ نہ کچھ نتیجہ تو نکلا ہے۔ آلات نے نشانہ ہی کی ہے کہ  
زیادہ دو تین فٹ آگے کچھ موجود ہے۔“

”یہ بات شاید کسی اور طرح بھی معلوم ہو سکتی تھی۔“

اپنا ک نہیں صاحب بڑی طرح آچھل پڑے۔ ان کا سر بھی  
سرگ کی چھت سے ذرا ہی نیچے تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ انہیں  
کردن کو غم دے کر نہیں چلنا پڑا تھا۔ وہ قدمیں مجھ سے کچھ ہی  
چھوٹے تھے۔ وہ بڑی طرح آچھلے تو ان کا سر زور سے سرگ کی  
چھت سے ٹکرایا۔ قیمت تھا کہ سرگ کی چھت بھی سرگ کی باقی  
کولائی کی طرح کچی ہی تھی ورنہ نہیں صاحب کو دن میں تارے نظر  
آجاتے۔

انہوں نے فوراً اپنے مخصوص لباس کی جیب سے گن نکالی  
اور کسی باہر کاغذ کی طرح دوپارے گن کر ایک گھنٹے کے مل بیٹھے  
لگے۔ اس وقت تک وہ چیز چھد گئی ہوئی پیچھے جا چکی تھی جس نے  
انہیں ایکشن میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ ذرا کھیلنے سے ہو کر  
سیدھے ہو گئے اور گن جیب میں رکھ کر میری طرف دیکھ کر  
سکراتے ہوئے بولے۔ ”یہ کیفیت چہ ہے بھی ہر جگہ پہنچ جاتے  
ہیں۔“

”جی ہاں۔ یہ مخلوق تو بعض اوقات انسان کی قبر میں بھی  
سکر نکیر سے پہلے پہنچ جاتی ہے۔“ میں نے سہلے بولے۔

میں اس دور ان ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوا تھا کیونکہ میں نے  
پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ سرگ کی چھت سے مونا سا ایک چرا نہیں  
صاحب پر گرا تھا۔ وہ غالباً اسی دور سے آئے دیکھ کر راہ فرار کی  
تلاش میں کولائی میں پڑتا ہوا چھت پر پہنچ کر اٹھا ہو گیا تھا اور نرم  
مٹی میں پھول کی گرت پر قرار نہیں رکھ سکا تھا۔

اس کے علاوہ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا حتیٰ کہ سرگ کے  
انتظام تک پہنچ گئے۔ یہ گویا ایک بند گلی تھی۔ ہمارے سامنے مٹی  
کی دیوار آگئی تھی۔ وہ آریں جو سرگ کے دہانے سے پٹی آری  
ضمین یہاں ان کے سروں پر مختلف ساخت کے چھوٹے چھوٹے  
آلات شلک تھے اور ان سب کا کچھ نہ کچھ حصہ پگ کی طرح  
سامنے مٹی کی دیوار میں پست تھا۔

میں تمام راستے سرگ کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر بھی  
میں نے ہر کوئی کھد رہے کا غیر محسوس سے انداز میں جائزہ لے لیا  
تھا۔ نہیں صاحب متوقع ہی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے  
تھے۔

”کیا خیال ہے؟“ آخر انہوں نے پوچھا۔  
”بہت غور و خوض کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔“  
”کس نتیجے پر؟“ نہیں صاحب نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔  
”یہ کہ۔۔۔ یہ واقعی ایک سرگ ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے  
جواب دیا۔

نہیں صاحب کے تاثرات بدل گئے۔ انہوں نے کونٹیکٹ لینئر  
کے ذریعے اپنی نیلی آنکھوں کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ اگر اس وقت ان  
کی آنکھوں کا اصل رنگ نظر آتا ہوتا تو ان میں یقیناً زیادہ سرد  
مری نظر آتی۔ تاہم جب وہ بولے تو ان کے لیے میں کافی سرد مری



کہا۔

”ہم ہر طرف آزما چکے تھے۔ سب زمین سے کچھ چ نہیں مل رہا تھا۔“ ٹیس صاحب ملاحت سے بولے۔ ”جہاں ہم گھڑے ہیں اس کے آس پاس اوپر سے تو مت بڑے علاقے کو نکالتے وغیرہ سے چیک کیا گیا تھا۔ شاید نکالتے اس لیے بھی کوئی نشاندہی نہ کر سکے ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی موجود ہے وہ کافی گہرائی میں ہے۔ اس وقت ہم کافی گہرائی میں کھڑے ہیں۔ یہ سب کچھ ترجیحی ہوئی ہوئی کافی گہرائی میں آگئی ہے۔“

”اس کا مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہم دھیرے دھیرے دھلائی کی طرف جا رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنی گہرائی میں پانی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہاں پانی بہت زیادہ گہرائی میں ہے۔“ ٹیس صاحب نے بتایا۔ ”جن لوگوں نے یہاں زیر زمین کچھ بنایا ہو گا انہوں نے یہ سب چیزیں تو دیکھی ہوں گی۔ سوائل ٹیسٹ وغیرہ کیا ہو گا۔“

”آپ اسے پرامید کیوں ہیں کہ یہاں انہی لوگوں کا بنایا ہوا کچھ موجود ہو گا؟“ میں نے ٹیس صاحب سے کہا۔

”میں نے خیال ظاہر کیا۔“

”ہماری امیدوں پر اتنی بے دردی سے پانی پھرنے کی کوشش تو نہ کرو۔“ ٹیس صاحب کا لہجہ اب خوشگوار ہو چکا تھا۔ شاید میری پیش گوئی پوری ہو رہی تھی یا پھر صحبت کا اثر ہو رہا تھا کہ وہ نہایت برہمگشت حالات پر بھی خوش دل سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر وہ دو دروازے میں بیوست نکالتے ہوئے بولے۔ ”ہم تو یہاں تک پہنچنے کے بعد بڑے پرامید ہو چکے ہیں۔ کم از کم محل وقوع کا تعین تو ہو چکا ہے کہ یہاں کچھ موجود ہے۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسے پوری طرح نظروں کے سامنے لانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ آیا ہم اسی طرف سے کھدائی کا محیط بڑھائیں اور دیکھیں کہ ہمارے سامنے کیا آتا ہے۔ کوئی عقیقہ دیوار، مٹی دیوار، یا کوئی اور حصہ۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر یہ کوئی زیر زمین قلعہ ہے تو ہم اس میں داخلے کا اصل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس میں ہمیں پہلے ہی ناکامی ہو چکی ہے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اس حصے کو طاقتور بم بارش کے ذریعے اڑا دیا جائے لیکن اس پر ہم اس لیے عمل نہیں کر رہے کہ ہمیں یہ دیکھنے کا تجسس ہے کہ یہاں کیا کچھ موجود ہے۔ میں ممکن ہے یہاں سے بہت اہم معلومات حاصل ہوں یا کچھ اہم خبریں ہاتھ آئیں۔ کوئی بعید نہیں کہ اس مہ فون قلعے میں بھی کچھ زندہ انسان یا کوئی اور مخلوق موجود ہو۔“

میں ان کی امید بھری تقریر سننے کے بعد ایک لمحے خاموشی سے ان کی طرف دیکھا رہا مگر میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”ویسے تو میں دعاگو ہوں کہ آپ کی امیدیں برآئیں لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کے ساتھ ”محمود پناؤ نکلا چر“ والا معاملہ نہ

ہو۔ کھدائی کرتے کرتے آپ پہاڑ کے قریب آجائے ہوں اور چار پینگیں ہی نکل کر بھاگ گیا ہو۔ وہی چرچا جو ہم دونوں کی باتوں کے درمیان سے گھڑکتا ہوا بھاگا تھا۔“

وہ مجھے گھورنے لگے۔ میں نے گویا انہیں قتل دی۔ ”ویسے اطمینان کی بات یہ ہے کہ چرچا مر رہا ہو انہیں تھا۔ اچھا خاصا صحت مند اور چلچلا چرچا تھا۔ کم از کم ایک کلوڈون تو ضرور رہا ہو گا اس کا۔ کسی غریب گھرانے کی بیٹی کے برابر لگ رہا تھا۔ اگر پہاڑ کھودنے کے بعد چرچا بھی غمزدہ ہو تو میرے خیال میں مایوسی زیادہ ہوتی ہوگی؟“

وہ ایک لمحے خاموش رہے پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ”میں سوچ رہا ہوں یہاں سے واپسی پر کم از کم دو دو کلو کے کئی صحت مند چرچے فراہم کروا کے تمہارے معدے میں غصہ اداوں تاکہ تم اس محاذ پر سے صحیح طور پر مستفید ہو سکو۔“

”میری صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھے اتنے زیادہ لمبائی کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہن کھائے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔ ”آؤ واپس چلے جاتے ہیں۔“ وہ سگڑ سگڑ کر میرے قریب سے گزر کر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ ”واپسی کے سفر میں بھی دھجھ سے آگے چل رہے تھے۔ کچھ فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ انہیں بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔“

تب میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ تو آپ نے اوپر سب زمین پر اس جگہ کا تعین کر لیا ہو گا جہاں آپ کے خیال میں وہ چیز موجود ہو سکتی ہے؟“

جواب دینے سے پہلے انہوں نے سڑک کر ایک نظر میری طرف دیکھا گویا اطمینان کر رہے ہوں کہ میں ابھی تک غیر سنجیدہ تو نہیں ہوں۔ میری سنجیدگی سے شاید انہیں کچھ حوصلہ ہوا اور وہ نرم سے لہجے میں بولے۔ ”ہاں جگہ کا تعین تو ہو گیا ہے لیکن ہم نے احتیاطاً اس پر کوئی نشان نہ دیا۔ شاید انہیں لگا گیا۔ اندازاً اور کچھ نکالتے سے تلاش وغیرہ کے ذریعے ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں۔“

”اگر زحمت نہ ہو تو میں اس جگہ کو دیکھنا چاہوں گا۔“ میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

”اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔ ”مجھے اس معاملے میں دلچسپی لینے دیکھ کر گویا ان کے دل میں کوئی امید جاگی تھی اور ان کا موز خوشگوار ہو گیا تھا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ تقریباً شفقت سے بولے۔ ”تم زحمت کی بات کر رہے ہو۔ ہم اس معاملے میں جان کی بازی لگانے بیٹھے ہیں۔“

”برانہ سائیں تو ایک مشورہ دوں؟“

”ضرور ضرور۔“ وہ رک کر کمرہ تن گوش ہو گئے۔

”جان کی بازی ابھی بیٹھے بیٹھے ہی لگائی کریں۔ وہ جو بھل کام بھی ہلکے ہلکے محسوس ہوتے ہیں جو ہنسی ہنسی میں کیے جاتے ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

یہاں صرف سولہ مربع ایکڑ کے اندر اندر تقریباً ساٹھ فٹ گہرائی میں کہیں موجود ہے۔

میں نے جیب سے اتر کر دیکھا۔ وہ سخت اور نامواری زمین تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ برسوں سے وہاں کسی نے کدال تک نہیں چلائی تھی۔ اس جے میں تو بہت بڑی نہیں تھا، البتہ چار پانچ فرائٹک عید کے دائرے کو چھوڑ کر چاروں طرف چھدری خودو جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے جنگلات کا سلسلہ پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ان اطراف میں زمین اور بھی زیادہ نامواری تھی۔ کہیں کہیں تو نیلے سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایسی محسوس زمین کے نیچے کوئی قلعہ وغیرہ کیسے موجود ہو سکتا تھا جہاں زندہ سلامت انسان اور چھپتیزی نہایت آرام و سکون سے رہتے تھے، سانس لیتے تھے۔ اگر یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک بار مجھے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا تو وہ زمین پر موجود قبیرات سے بھی زیادہ آرام دہ تھی۔ وہاں انہوں نے جو الف لیولی ماحول تخلیق کیا ہوا تھا وہ تو یہی جگہ تھا لیکن مجھے وہاں کی فضا کی بڑی خوشگوار محسوس ہوئی تھی۔ اگر وہ لوگ اسے چھوڑ کر جا چکے تھے اور یہ جگہ حروک ہو چکی تھی تب بھی ان کے رخصت ہونے کے ہی کچھ شائبہ نظر آتے۔

میں بہت دیر تک کم کم چاروں طرف دیکھتا رہا پھر اچانک میں نے تیس صاحب سے کہا۔ ”آپ نے اس جگہ کا فضا کی سروے کیا ہے؟“

”ہاں۔“ وہ دروازہ کھٹکے کے بعد سنبھلے ہوئے ہوئے ”۳۰ درجہ کئی میل کے علاقے میں کوئی قابل ذکر یا مشکوک چیز موجود نہیں ہے۔“

”کیا میرے لیے بھی چند منٹ کے فضا کی سروے کا بندوبست ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

فیس صاحب نے جواب دینے سے پہلے میری سانس لی۔ ”تھا وہ کتنا چاہتے تھے۔“ ہم ہماری ہی ہوئی بات سے مطمئن کیوں نہیں ہوتے؟“ لیکن اس کے بجائے وہ نہایت حلق سے بولے۔ ”ہاں۔“

”کیوں نہیں۔“ یہ کون سا مشکل کام ہے۔“

ہم واپس جیب میں آپیچھے موبائل فون اس وقت بھی تھے صاحب کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے دو دو افراد سے بات کی مگر فون بند کرتے ہوئے بولے۔ ”مبلی کا پڑاؤ۔“ گھٹے تک پہنچ جائے گا۔ تب تک ہم کچھ کہیں۔“

ان کی تجویز مناسب تھی۔ ان کے منہ سے کھانے کا ذکر نہیں مجھے بھی جو کہ احساس ہوا اور یاد آیا کہ میں نے راحیلہ اسپتال دانی قیام گاہ پر ناشا بھی واپس ہی کیا تھا۔ ہم واپس ساتھ پر آگئے۔ وہاں کھانے کا انتظام تھا۔ باقاعدہ کینٹین موجود تھی۔ چند منٹ میں ہمارے لیے مستقل قسم کا کھانا لگایا اور چند منٹ میں ہی ہم نے اسے چٹ بھی کر ڈالا۔ ابصار کو اس دوران فیس صاحب نے پھٹی دے دی تھی اور وہ غائب ہو گیا تھا۔

وہ میری سانس لے کر پڑے۔ ”میرے اور تمہارے درمیان بہت سے فرق جاگتی ہیں۔ عمر کا فرق ہے۔ طرز زندگی کا فرق ہے۔ تم نے کسی اور پوزیشن میں۔ کسی اور طرح زندگی گزارا ہے۔ میں نے کسی اور پوزیشن میں۔ کچھ اور طرح سے روز و شب بتائے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ہر انسان اس دنیا میں اپنی ایک الگ فطرت لے کر آتا ہے۔ تم یہ توقع مت رکھو کہ میں تمہارے ساتھ رہوں گا تو تمہاری فطرت میں دخل چاہوں گا۔ اور وہ بھی محض چند تھکنوں، چند دھڑکنوں یا چند ہنسنوں میں۔“

”بالکل ٹھیک ہے سراسر“ میں نے تسلیم کیا۔ ”اس کا مطلب ہے میں بھی آپ کی فطرت میں نہیں دخل سکے۔“

”میں تو اس کی توقع ہی نہیں رکھتا۔ میں تو یہی محض معاملات میں تم سے تمہارا امت سنجیدہ ہونے کی درخواست کرتا ہوں۔“

”میں بھی آپ سے فطرت بدلنے کے لیے نہیں کہتا۔ یونہی بس تمہارا سا پلکا پلکا رہنے کی توقع کرتا ہوں۔ اگر آپ نہیں بد سکتے تو آپ کی مرضی میں اصرار نہیں کروں گا۔“

اچانک انہوں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ سرنگ میں یہ قہقہہ کچھ زیادہ ہی گونجیلا محسوس ہوا۔ کئی لمبے تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ وہ پلٹ کر میرے کندھے پر ہاتھ مارنے ہوئے پڑے۔ ”میرا خیال ہے، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں اور دونوں دراصل اپنے اپنے انداز میں ایک دوسرے کو سمجھتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہماری پیچیدہ جھاڑی تھی۔ ہم اپنی اپنی عمر، طرز زندگی اور دیگر چیزوں کے فرق کے باوجود اپنے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“

”یقیناً۔“ یہی محسوس کرنے کے بعد تو میں نے آپ سے پیچیدہ جھاڑی شروع کی تھی۔ میں ہر ایک سے پیچیدہ جھاڑی نہیں کرتا۔ میں نے کہا۔

باتوں باتوں میں ہم واپس سرنگ کے دبانے پر پہنچ گئے۔ ابصار ایک جھٹکے کی طرح وہاں استراہ تھا۔ فیس صاحب نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔ ”ہم وہ خاص اسپاٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔“

ابصار نے قہقہی انداز میں سر ہلایا اور ایک طرف کو چل دیا۔ ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ اپنی جیب کی طرف جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہم اس کے ساتھ جیب میں بیٹھے ایک طرف جا رہے تھے۔ وہاں کوئی حد بندی تو نہیں لیکن جلدی میں نے محسوس کیا کہ ہم اس سائٹ کی حدود سے نکل آئے تھے جو دائرہ پلائی اسکیم کے لیے مخصوص تھی۔

ابصار کی جیب میں کئی قسم کے کلات اور چھوٹی بڑی مشینیں وغیرہ موجود تھیں۔ اس چھیل میدان میں جگہ کے تعین میں وہ غالباً کچھ کلات سے مدد بھی لے رہا تھا۔ آخر کار ایک جگہ دھچکے سے جیب رک گئی۔

ابصار نے ہاتھ سے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ صرف آنکھوں کے اشارے سے بتایا۔ ”اگر ذہن زمین کوئی خاص چیز موجود ہے تو وہ

مجلس پانی بھر کر پھونکا اور اس کی طرف لے جا رہا تھا۔ حریفہ وی  
پڑا تھا یعنی ایک سوئے ڈالنے میں دو کھتر بندھے ہوئے تھے اور  
وہ اس کے کندھوں پر لگا ہوا تھا۔ مکان کے آس پاس کچھ اور بھی  
ایسے لوازمات موجود تھے جو ضرور ضرور وغیرہ رکھے والے درستیوں  
کے مکانوں میں پانکھوں کے آس پاس نظر آتے ہیں۔ وہ مکمل طور  
پر ایک دیگی مکان تھا۔ خاص بات صرف یہ تھی کہ وہ بہت بڑا تھا  
اور میلوں میں پھیلے ہوئے علاقے میں واحد مکان تھا۔

اس دوران بجلی کا پڑمت آگے نکل چکا تھا۔ میں نے پائلٹ  
کو واپس اسی طرف چلنے کی ہدایت کی۔ بجلی کا پڑ وائرز میں محوم  
گیا۔ نہیں صاحب کمری سانس لے کر بولے۔ ”مجھے معلوم تھا کہ  
اس دیرانے میں یہ مکان تسماری نظر میں ٹھکے گا لیکن ہم اسے چیک  
کر چکے ہیں۔ اس میں کرنی خاص بات نہیں ہے۔ یہ دو پاپ بیٹے  
ہیں جو برسوں سے اسی جگہ اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ موسیقی پلٹے  
چہ۔ ان کا دودھ نواحی بستیوں میں جا کر بچ آتے ہیں۔ کوئی گائے  
وغیرہ تیار ہو جائے تو اسے بھی نر کر کے بچ آتے ہیں۔“

یوڑھا اس دوران پانی کے کھتر اندر لے چکا تھا۔ بجلی بار  
اوپر سے بجلی کا پڑ گرنے پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن  
اب غالباً دوبارہ آواز سننے پر وہ باہر آیا اور ہاتھ سے آنکھوں پر بچھا  
مٹا کر اوپر دیکھنے لگا۔

میں نے پائلٹ سے کہا۔ ”میں پکارنے کی ضرورت نہیں۔  
کسی بھی طرف نکلے پلو لیکن قریب ہی کہیں درختوں کی آڑ میں کوئی  
ہموار جگہ دیکھ کر لینڈ کر دو۔ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرو کہ ہماری  
توجہ اس مکان کی طرف نہیں گئی اور ہے۔“

پائلٹ نے مڑ کر ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ میری بات  
سمجھ گیا تھا۔ میں ایک بار پھر کرنی کے نیچے بیٹھے پر دو زمین ٹکڑے  
کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”مکان بہت  
بڑا ہے۔!“

”بڑے سے مفت کی زمین اری ہوئی ہے اس لیے بے فکری  
سے لیے چوڑے رقبے میں اپنا کھڑا گ پھیلا رکھا ہے۔ سرکاری  
زمین ہے جب بھی یہاں کوئی کام شروع ہوا اسے اخلاط جاتے  
گاہ۔“ نہیں صاحب بولے۔

”ہمارے ہاں عام طور پر لوگ دیرانوں میں خاک بھرنا کرتا  
پسند نہیں کرتے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کوئی رہتا بھی ہے تو جلد ہی  
اس کی دیکھا دیکھی دوسرے گھر بھی آباد ہونے لگتے ہیں اور یوں  
دیکھتے ہی دیکھتے اچھی بجلی کی بستی تیار ہو جاتی ہے۔ آپ کہہ رہے  
ہیں کہ یہ برسوں سے یہاں رہا ہے۔ اس کے آس پاس کسی نے  
دوسرا گھر بنانا پسند نہیں کیا یا اس نے کسی کو گھر بنانے میں دیا ہے۔“

”یہ تو میں کما جاسک۔ میرا خیال ہے کسی نے بنا دیا ہے۔  
میں کیا ہوگا۔ یہ جگہ نواحی آبادیوں سے بھی کافی دور ہے۔ لوگ  
عموماً بجلی بستیوں میں شروع کے گھر ہی بناتے ہیں اس کے آس پاس بستیوں

کھانا ہم نے اسی آتش لگا کر سے میں کھایا تھا۔ وہ کھانا اس  
وقت بھی خالی تھا۔ نہ جانے اس میں کون بیٹھا تھا۔ میں نے نہیں  
صاحب سے پوچھا بھی ضروری نہ سمجھا۔ کھانے کے بعد ہم باہر  
آکھڑے ہوئے پھر لمبے بعد ہی فضا میں بجلی کی کڑکڑاہٹ ابھری  
اور ایک طرف سے سبز رنگ کا ایک بجلی کا پڑ نمودار ہوا تو دکھائی  
دیا۔

جلدی ہی وہ سائٹ پر پہنچا۔ سائٹ پر ایک طرف ایک اونچا  
پلٹہ چوڑا موجود تھا۔ شاید وہ کسی زیر زمین ٹینک کی چھت رہی ہو۔  
بہر حال اس وقت اس نے بجلی پڑ کا کام دیا اور بجلی کا پڑ اس پر آن  
اترا۔ میں نہیں صاحب کے ساتھ بجلی کا پڑ میں جا بیٹھا۔ اس میں  
صرف پائلٹ موجود تھا۔

میں اور نہیں صاحب پچھلی دو نشستوں پر تھے۔ ہم لائٹ  
والے ہیڈلٹ کو آگے چکے تھے لیکن بجلی کا پڑ میں ہمیں دوسرے  
ہیڈلٹ پھٹا رہے اور حلقی سیٹ بھی پائو ہٹا پڑی۔ نہیں  
صاحب نے پائلٹ کو ہدایات دیں کہ اسے کتنی بلندی پر لیکن حدود  
میں پرواز کرنا تھی۔

چند لمبے بعد بجلی کا پڑ فضا میں بلند ہوا اور غم وائرز میں محوم  
کر کافی بلندی پر آنے کے بعد ہمارے مطلوبے علاقے کی طرف پرواز  
کرنے لگا۔ ہم فضا میں بلندی پر نہیں تھے لیکن درخت اور جھاڑیاں  
کافی پھول نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کرنی کے قریب لگی ہوئی دور  
بین آنکھوں سے لگائی۔ دونوں کھڑکیوں کے چلی طرف اعلیٰ انداز  
میں بھی ایک لمبوتر سا شیشہ لگا ہوا تھا جس پر دور بین لگا کر ہم  
نمایات اچھے طریقے سے اس علاقے کا جائزہ لے سکتے تھے جس پر  
سے ہم گزر رہے تھے۔

میں جتنے علاقے کا جائزہ لینا چاہتا تھا اس کے لیے ہمیں  
وائرز میں سڑکنا تھا۔ وہ واقعی ایک غیر آباد علاقہ تھا اور اس میں  
کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ اونچی نیچی ناہموار زمین  
کہیں درختوں کے جھنڈ، کہیں جھاڑیاں اور کہیں برساتی پانی کے  
جو پڑ۔ بس یہی کچھ تھا۔

وائرز میں ہمارا سفر ختم ہونے سے پہلے ایک جگہ مجھے ایک  
صاف میدان سا نظر آیا۔ اس کے وسط میں ایک بہت بڑا جمو پڑا  
نما مکان موجود تھا۔ کسی نے بڑی سادگی اور فطری خوبصورتی کے  
ساتھ وہاں اپنے رہنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ بجلی ہی نظر میں جو  
بات مجھے زرا عجیب لگی۔ وہ یہ تھی کہ کرنی کی جلیں مشاخص گھاس  
پھوس اور گارے سے بنا ہوا یہ جمو پڑا بہت بڑا تھا۔ کسی ہائی وے  
وغیرہ کے کنارے بنے ہوئے پھیرے ستون اور بھی اتنے بڑے نہیں  
ہوتے تھے۔

قریب ہی درختوں کے نیچے کچھ سوئی بندھے ہوئے تھے۔  
بائیں ہاتھ پر ایک کنواں نظر آ رہا تھا جس پر چرخی اور ڈول بندھا ہوا  
تھا۔ اس کنویں سے ایک بارش اور عمود سیدھا مگر تندرست و توانا

جو اپنے چیلے سمیت آج ہی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا سامنا اس سے ہو والا ہے۔ اب تو میں ارادہ ایک جگہ کی طرف جارہا ہوں۔ آخر فرض ہے۔ جان پہلے بھی اوپر والے نے پجائی تھی۔ اب بھی اچھے لگے گا۔"

انہوں نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "جو کہ تم تو بہت عجیبہ معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ ہی تو مجھے عجیبہ بنائے پر نکلے ہوئے تھے۔ مجھے لگتا اب میں عجیبہ نظر آنے کی کوشش کروں گا تو آپ اس پر بھی خ نہیں ہوں گے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "بزرگوں نے کہا ہے۔ لوگ کسی حال میں خوش نہیں رہتے۔ اور نہ ہی کم رہتے دیتے ہیں۔"

ہم آپ درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ایک لمبے خاموشی کے بعد وہ بولے "میرا تو خیال ہے تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"زندگی میں بہت وقت ضائع کیا ہے۔ توڑا سا اور سنی میں نے بے نیازی سے جواب دیا پھر پوچھا۔ "اس جگہ کب۔۔۔ ان باپ بیٹے کو آپ نے خود آکر دیکھا تھا یا کسی اور نے آکر دیکھا تھا؟"

"کسی اور نے آکر دیکھا کیا تھا۔ مجھے رپورٹ ملی تھی۔ مگر دنوں بہت مصروف تھا۔ ہر جگہ خود نہیں جاسکتا تھا۔ اور حالات ایسے ہیں۔ زیادہ تر ہماری افرادی قوت اور دوسرے کام ہوئی ہے۔ بہت کم لوگ میرے ساتھ ہیں۔ تمہارے آدمیوں کی سے کچھ آسانی ہو گئی ہے۔ اب ہم اپنا ایجنسیوں کی تمام مشینز تو اسی مسئلے میں نہیں الجھا سکتے تھے۔ دوسرے مسائل بھی بہت ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ سب مسائل کی جڑ کسی ایک ہی جگہ ہے۔ میں نے مکرراتے ہوئے کہا۔ "بہر حال۔۔۔ اس جگہ کے بارے آپ نے رپورٹ پر تکیہ کیا تھا؟"

"وہ ایک معتبر رپورٹ تھی۔ محض خانہ پری کی چیز نہیں ہے۔ میرے ساتھ اس قسم میں جو لوگ ہیں وہ خانہ پری والی رپورٹ نہیں دیتے۔"

"خیر۔۔۔ اب موقع ملا ہے تو خود چیک کر لینے میں کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ اس دوران ہم درختوں کے سلسلے سے آئے تھے۔ وہ پھر نہایت اچھی بہت دور تھا۔

"میں جانتا ہوں ہم اس مکان کے عقب سے اس کے آگے نہیں۔" میں نے کہا۔ اس کے لیے ہمیں اس مختصر ریل میں توڑا سا پتھر کاٹ کر لپٹا سب بدلنا پڑی۔

"اگر تمہارے شہادت۔۔۔ جن کے بارے میں مجھے نہیں کہ وہ کیا ہیں۔ غلط لگتے تو میں تم پر جمانہ کروں گا۔"

کی کوشش کرتے ہیں۔ چشمہ در زمین چور ایسی ہتیاں آباد کراتے ہیں اور وہ دیر انوں کا نسخ نہیں کرتے۔ یہ باپ بیٹا تو ختمی پسند ہیں یا پھر انہوں نے حساب کتاب لگایا ہو گا کہ اسلام آباد میں یا اس کے آس پاس کیس بھی اتنی بڑی جگہ مفت میں یا سستے داموں نہیں باری جاسکتی۔" نہیں صاحب کے پاس ہر بات کی وضاحت موجود تھی۔ "شاید سردی میں چرنگ انہیں اپنے مویشی اندر ہی باندھنا پڑتے ہیں۔ اس لیے بھی انہوں نے اپنا یہ چھپرنا کھڑا بنایا ہے۔ اصل میں یہ صرف باپ بیٹے کا نہیں، ان کی گائے بھینسوں کا بھی گھر ہے۔"

"ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں۔" نہیں صاحب نے جواب دیا۔

"جوڑھے کا بیٹا بھی غلط نہیں آ رہا۔" میں نے کافی آگے نکل آنے کے باوجود دوڑتے ہوئے اس جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اندھ ہو گا یا گھوڑا گاڑی لے کر کسی نوادی بستی میں گیا ہو گا۔" نہیں صاحب نے جواب دیا۔ دوڑتے ان کے پاس بھی موجود تھی۔ اس دوران بوڑھا شاید بجلی کا پتھر کی طرف سے مطمئن ہو کر اندر جا چکا تھا۔

"یہاں کتوں بھی ہے اس کے برعکس جہاں آپ لوگوں نے سرنگ کھدوائی ہے وہاں سڑا سی فٹ کی گھرائی تک پانی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ جگہ وہاں سے بہت دور ہے۔" نہیں صاحب بولے۔ "اور قدرت کا نظام تو کچھ ایسا ہے کہ زیر زمین پانی کی سطح کیسے کچھ ہے اور اس سے جوڑے ہی قافلے پر کچھ اور ہے۔"

بالکل اس دوران بجلی کا پتھر کو گھما کر بڑی ہوشیاری سے ایک مناسب جگہ پر لینڈ کر چکا تھا۔ بالکل کو اب نہیں صاحب کے بجائے میں ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے اسے وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا۔ میں اور نہیں صاحب ہیلٹ آئندہ کچھ جھلک لگانے ہی گئے تھے کہ میں نے انہیں روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاس تو گھنٹہ موجود ہے لیکن میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میرے لیے بھی کسی گھنٹہ کا انتظام ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔" انہوں نے دواڑے کے قریب ہی دواڑے میں موجود ایک کپار ٹنٹ کھولا اور سیاہ رنگ کا چمکتا ہوا ایک لوڑو گاڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے جو گنگ سوٹ غائب اس کے اندر اڑس لیا۔ اس کا انبار نظر آ رہا تھا لیکن اس سلسلے میں اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم دونوں بجلی کا پتھر سے گودے اور درختوں کی طرف چل دیے۔ نہیں صاحب بولے۔ "ایک بوڑھے گوالے اور اس کے گاؤں کے بیٹے کے لیے تم سب بکر جا رہے ہو لیکن دنیا کے چند مشہور ترین اور سناٹا ترین علاقوں میں سے ایک ہے تمہارا واسطہ پڑا تو تمہارے پاس ان گھنٹہ نہیں تھی۔" ان کا اشارہ حنا کی طرف تھا

صاحب بولے۔

”میں آج کل بہت غریب ہوں۔ جان کا خزانہ دے سکتا ہوں۔ جرمانہ نہیں دے سکتا۔ ہمارے ملک میں غریب بے چارے ہر ایک کے لیے جان کا خزانہ دیتے رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”غیب اب اتنا بھی جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری جان تو ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اس کا خزانہ دینے کی ضرورت نہیں۔“ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ ”اب تو تم مجھے بھی اس مسئلے کو اہمیت دیتے پر مجبور کر رہے ہو۔ اگر بات کچھ اتنی ہی خاص ہے تو اور آدمی بلوا لیتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ میں ہنگامہ نہیں چاہتا۔“ میں نے کہا۔ ”مجموعی بات یہ ہے کہ مجھے خود بھی معلوم نہیں میں وہاں کیوں جا رہا ہوں۔ کوئی غلطی ہے جو اچانک پیدا ہوئی ہے اور مجھے اس جگہ کے بارے میں اطمینان کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جب یہ غلطی پیدا ہو جاتی ہے تو مجھے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتے۔“

ہم اس وقت مکمل میدان میں تھے اور مکان کے قطعی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مکان میں اس طرف بھی دیوار میں ایک کھڑکی تھی لیکن وہ اس وقت بند نظر آ رہی تھی۔ کچھ صحت مند مرطبات تانوں سے بنے ہوئے جنگل کے درمیان بھاگی پھر رہی تھیں۔ ایک مرنا اس پہلے کا سبب تھا جو کچھ خاص عرائم کے تحت اپنے حرم میں بے چینی پہلا رہا تھا۔

ہم حفاظ بھی تھے اور بظاہر بے پردہ نظر آنے کی بھی کوشش کر رہے تھے۔ ہم مکان تک جا پہنچے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ ہم ایک لمبے کے لیے رکے اور مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے سامنے کی طرف جانے لگے۔ مرنے کو شاید اپنے حرم کے قریب ہماری آمد پر اعتراض تھا۔ اس نے بہت کثرت اور اونچی آواز میں کٹ کٹ کر شروع کر دیا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے مرنے کا اس طرح ٹکٹا نا کوئی مستقل تھا کیونکہ فوراً ہی مکان کے کونے پر دو گراؤں میں گتے نمودار ہوئے۔ پہلی نظر میں تو وہ کتوں کے بجائے درمیان صحت کے گدے معلوم ہوئے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب میں پہلی بار میں درمیان سے اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا تو کم از کم کھلی جگہ میں مجھے کہیں کوئی گتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ شاید وہ مکان کے اندر رہے ہوں لیکن ان کا اس طرح اچانک نکل آنا عجیب سی بات تھی۔

دوسری عجیب بات یہ تھی کہ وہ بہت تیزی سے دوڑتے ہوئے یکدم ہی سامنے آئے تھے اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے بھرکنا تو درکنار، حلق سے غراہٹ تک کی آواز نہیں نکالی تھی۔ شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جو رستے ہیں وہ گزرتے نہیں۔

مکان کے گرد لکڑی کی بلوں کا جنگلا موجود تھا۔ دونوں نے نہایت ہی اتفاق اور یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک وقت

یکساں زندقہ بھر کر اسے پھلانگا اور سیدھے ہم پر آئے اتفاق اور ایک جہتی شاید اب کتوں میں اچھی تھی۔ انسانوں میں تو قسم ہوتی باری تھی۔

میں نے نہایت خوفناک ’نوسکے اور بڑے بڑے دانٹوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا جڑا اپنی گردن کی طرف پڑتے دکھا اور یکدم اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا۔ کتے نے گویا ہوا ہی میں اپنے آپ کو سکڑ اور سمیٹ لیا تھا۔ وہ میرے سینے پر گرا اور ایک لمبے کے لیے تو میری پھلانگ بل گئیں۔ یوں کہ مجھے کوئی چھوٹی موٹی چٹان میرے سینے پر آن گری تھی۔ وہ بہت سی جیمہ بلند ہاؤز تھا۔

اس نے میری گردن جڑے میں دوپٹے کے لیے سیدھی چلا گیا۔ لگی تھی۔ مجھے نہیں صاحب کا کچھ ہوش نہ رہا۔ میں ہر وقت مآذ زندقہ نکال سکا۔ تاہم میں دونوں یا دونوں پر کتے کو بہت دور تک اچھا۔ میں نے کامیاب ہو گیا۔ گتا فوراً پھلانگ میں گویا تڑپ کر وہاں سے بہت چکا تھا۔

اس دوران فائز کی آواز گونجی تھی۔ غالباً نہیں صاحب اپنا ہسپتال استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فوراً ہی دو سرا بھی فائز ہوا لیکن میں ان کی طرف نہیں دیکھ سکا۔ میں اپنا مآذ زندقہ نکالنے کی فکر میں تھا جو میرے بے ہودہ سوٹ میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس لمبے میں یہ سوٹ بغیر نہیں رہ سکا کہ آخر شخص سرنگ میں جانے کے لیے نہیں صاحب نے وہ وہاں سوٹ مجھے کیوں پہنایا تھا؟

کتے نے دوبارہ مجھ پر چلا گیا۔ لگی۔ اس وقت میں نے پہلی بار اس کے حلق سے خفیف سی غراہٹ سنی اور یہ غراہٹ رگوں میں لمبو سرور کرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے پوری قوت سے اسے لات رسید کی۔ وہ ہوا میں اچھلا اور دور جا کر لیکن ساتھ ہی میرا سوٹ اُدھڑا چلا گیا۔

اس کے خوفناک بچوں سے سوٹ کا اُدھڑنا میرے حق میں اچھا ثابت ہوا کیونکہ مآذ زندقہ میرے ہاتھ میں آ گیا اور جو کئی گتا دوبارہ مجھ پر بھجنا میں نے اس پر اندھا محاذ لڑنے کی گولیاں چلا دیں۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا کچھ دور جا کر گرا اور دو تین بار پھڑک کر وہیں ساکت ہو گیا۔

ایک طویل سانس لے کر میں نے نہیں صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ گمن ہاتھ میں لیے مستعد کھڑے تھے۔ وہ مجھ سے پہلے اپنے کتے سے ’قارغ‘ ہو گئے تھے لیکن میرے حصے میں آنے والے کتے پر غالباً انہوں نے اس لیے گولی نہیں چلائی تھی کہ اس کوشش میں مجھے بھی گولی گتے کا خطرہ تھا۔

میں نے دیکھا ’انہوں نے جس کتے کو دو گولیاں ماری تھیں وہ ابھی زندہ تھا۔ کبھی آنکھیں کھول رہا تھا، کبھی بند کر رہا تھا۔ ان آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔ وہ اٹھنے سے قاصر تھا لیکن پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں بل رہا تھا کہ اچھل کر ایک وقت ہم دونوں کی گردن جڑے میں دوپٹے لڑا۔



ہوئے بولا۔ ابھی شاید اس کے دل میں ہمارے لیے نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

”اب ہم اتنے بڑے لوگ بھی نہیں ہیں۔“ نفیس صاحب زری سے بولے۔ ”سڑک پر ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ ہم تو مدد کی تلاش میں اس طرف آ رہے تھے۔“

بوڑھے کی نظروں میں غرت اور بڑھ گئی۔ ”سڑک یہاں سے ڈھائی تین میل دور ہے۔ اگر تم دونوں سڑک پر ہی ڈھائی تین میل چل لیتے تو تمہیں دس جگہ مدد میر آ جاتی۔“ بلکہ چلنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ وہیں کھڑے رہتے تب بھی تمہیں ہر طرح کی مدد مل جاتی۔ تمہیں کیا المام ہوا تھا کہ تمہیں اسی سمت میں چلنا چاہیے۔۔۔ یہاں تمہیں ایک مکان مل جائے گا؟“

ہم دونوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ کچھ اور جارحانہ لہجے میں بولا۔ ”تم لوگ جھوٹے بھی ہو۔۔۔ اور جھوٹا ہونا انسان کے بڑا ہونے کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تم لوگ اس بلی کا پڑ میں آئے ہو جو تھوڑی دیر پہلے اوپر پھنگر لگا تھا۔“

میں اور نفیس صاحب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسی سانس لے کر رہ گئے۔ میں نے لامنت سے کہا۔ ”چلو۔۔۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارا بلی کا پڑ بھی تو خراب ہو سکتا ہے۔“

بوڑھا ہنسی سے بولا۔ ”مجھے تو لگتا ہے نہ تمہاری گاڑی خراب ہے اور نہ ہی بلی کا پڑ۔ صرف تمہاری نیت خراب ہے۔ تم کسی چکر میں یہاں آئے ہو۔ صاف صاف بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ ہم سے ذرا بھی خورہ نہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے اس کی یہ بے غولی کچھ مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ وہ ایک دیانتدار انسان کی سی بے غریبی کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو سوچتا ہے کہ اس نے کوئی نیک کام نہیں کیا تو اسے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں زیادہ تر شریف آدمی اس طرح نہیں سوچ پاتے۔ کچھ نہ کرنے والا زیادہ ڈرتا ہے۔

میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی جلدی بھی کیا ہے۔ چلو۔۔۔ اندر بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔“ اسے میرا غلطو ذرا بھی نہیں بھایا۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور رکھائی سے بولا۔ ”مجھے کیا پڑی ہے تم لوگوں کو اندر لے جانے کی۔۔۔ جو بات کرنی ہے میں کہوں۔“

اس نے جس طرح میرا ہاتھ جھٹکا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک طاقتور بوڑھا تھا۔ اس عمر کے کسی شخص میں اتنی طاقت و توانائی میں نے پہلے بار دیکھی تھی۔ صحت مندی پہلے ہی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اس کی سلیڈ واڈھی مصنوعی تو نہیں تھی؟ شاید وہ کوئی جوان آدمی ہو۔ ہم خواہ مخواہ ہی اسے بوڑھا سمجھ چکے ہیں لیکن اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھنے کے زمانے میں نے نہایت قریب سے اس کی

واڈھی کا بھی جائزہ لے لیا تھا۔ واڈھی اصل ہی تھی۔ میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ ”بزرگوار! آپ تو بہت ہی بد اخلاق انسان ہیں۔ اس عمر میں انسان کو اتنا بد اخلاق اور بد مزاج نہیں ہونا چاہیے۔“

”تم نے موتی اور کھن کے مارا ہے۔ میرا بس چلے تو میں لاٹھی مار کر تم دونوں کا پیچھا باہر نکال دوں۔ یہ تو میری مجبوری ہے کہ میں لاٹھی سے تمہارے سر توڑنے کے بجائے یہاں کھڑا تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ غریب آدمی ہوں نا۔۔۔ غریب آدمی کے بدن میں جتنی بھی طاقت ہو۔۔۔ وہ پھر بھی کمزور ہی ہوتا ہے۔ اور پھر تمہارے ہاتھوں میں تو ہتھیار بھی ہیں۔“ وہ کسی طرح ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”اب غصہ تھو کہ بھی دو بڑے میاں!“ نفیس صاحب بولے۔ ”ہم تمہیں موتی اور کھن کے بدلے دو بہت اعلیٰ نسل کے نئے دسے دیں گے۔“

”تمہارا خیال ہے تمہارے دیے ہوئے نئے موتی اور کھن کی جگہ لے لیں گے جنہیں میں نے اولاد کی طرح پالا تھا؟“ اس کے لہجے میں خود غماری کم نہیں ہوئی۔

نفیس صاحب غالباً اچانک ہی اس نیچے پر پہنچ گئے کہ بوڑھے کے ساتھ مغز مری فضول بھی اور شرارت و شائستگی کے مظاہرے سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے تاثرات ایک دم ہی بدل گئے۔ وہ ایک بالکل عطف انسان نظر آنے لگے۔ ہتھول کی ٹال انہوں نے بوڑھے کی پسیوں پر رکھ دی اور سانپ کی طرح پھنکارے۔ ”بھو اس بند کو اور خاموشی سے اندر چلو۔“

بوڑھے کے چہرے پر اور آنکھوں میں تو غرت کچھ گہری ہو گئی لیکن اس کی زبان بند ہو گئی۔ وہ حرا اور مکان کے سامنے والے حصے کی طرف چل دیا۔ اس دوران نفیس صاحب نے ایک تقریر میری طرف دیکھا۔ میرا لباس نیچے پر سے پٹ گیا تھا اور پٹنے پر خراشیں آگئی تھیں جن سے غراں رس رہا تھا۔ نفیس صاحب قدرے تشویش سے بولے۔ ”تمہیں کتنے نے کہیں کاٹا تو نہیں؟ کہیں چوہہ انجکشن لگوائے ہیں۔“

”میرا خیال ہے۔۔۔ نہیں کاٹا۔“ میں نے اپنا سر سرے سا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کاٹ بھی لیتا تو مجھے زیادہ لگرنہ ہوتی۔ انسان کے کاٹنے سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ مجھے زندگی میں کئی ایسے انسانوں سے واسطہ پڑا ہے کہ اگر وہ کسی کتے کو کاٹ لیتے تو کتے کو چالیں انجکشن لگوائے پڑتے۔“

بوڑھا اس موقع پر ایک بار پھر بولے بغیر نہ سکا۔ مگر وہ ذرا سی تھمتاے ہوئے بولا۔ ”مجھے تو تم لوگ بھی انہی میں سے ایک لگتے ہو۔“

نفیس صاحب نے ہتھول کی ٹال اس کی پسیوں میں بڑی طرح چھوئی اور اسے دھکیلتے ہوئے بولے۔ ”اگر اب تم نے زبان چلائی





معلوم کئے سے قاصر تھا مگر گویا اندھیرے میں اڑھرا دھڑھکا ہوا پس بار بار تھا۔

میں نے پینڈل پر کڑھن کا پسا گھمنا کی کو شش کی لیکن اس میں چھٹی ہی ایک سلاخ اڑی ہوئی تھی۔ یہ گویا مشین کو لاک کرنے کا ایک دیکھی طریقہ تھا تاکہ بے خبری میں کسی کا ہاتھ وغیرہ نہ کٹ جائے۔ میں نے وہ سلاخ نکال دی اور ایک بازو سے پکے کو گھمنا۔

اس مشین کو چلانے میں کافی زور لگتا ہے لیکن اس وقت مشین خالی تھی اور میں جسمانی طور پر عام آدمی بھی نہیں تھا اس کے باوجود مجھے کافی طاقت صرف کرنا پڑی لیکن اس کا نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ نہیں صاحب تو اچھل کر ایک طرف کو ہو گئے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی، تاہم اچھی بات یہ تھی کہ انہوں نے بوڑھے کی پسلیوں سے پتوں میں بنایا اور اس کی طرف سے بے خبری میں ہوئے۔

مشین کا پسا گھمنا کے ساتھ ساتھ کافی دور عقبی دیوار کے ساتھ سے درخت پر سے رکے ہوئے خشک چارے کا لہا چڑھا اور یوں ایک طرف کو کھینکے لگا تھا جیسے وہ کسی تختے پر رکھا ہوا تھا اور تختے کو کسی نے ایک طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے نیچے ایک شکاف نمودار ہونا شروع ہوا۔

میں بیٹے کو گھماتا چلا گیا۔ خشک چارے کا مستطیل ابار دیوار کے ساتھ ساتھ کھٹکا ہوا دوسرے کونچے میں جا لگا۔ تب کٹر کی مشین کا پسا گھماتے کھڑے رک گیا۔ میں نے زیادہ طاقت صرف کی مگر وہ مزید نہ گھوما۔ اس وقت تک عقبی دیوار کے قریب زمین میں بہت بڑا مستطیل شکاف نمودار ہو چکا تھا۔ وہ ایک پختہ طولوان راستہ تھا جو نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ اس کا دائرہ اتنا بڑا تھا کہ اگر گیت سے کوئی لپو چڑی گاڑی بھی مکان میں داخل ہوئی تو سیدھی اس دہانے میں داخل ہو کر طولوان راستے پر جا سکتی تھی۔

نہیں صاحب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ انہیں بوڑھے پر بھی نظر رکھنا تھی اور وہ نمودار ہونے والے اس راستے کو بھی صحیح طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ بوڑھے پر میں بھی نظر رکھے ہوئے تھا لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ یکدم ہی اس کی آنکھوں پر رخصت ہو گئی تھی جیسے کسی غبار سے ہوا نکل گئی ہو۔ زمین میں جب وہ شکاف نمودار ہوا اس وقت اس کے حلق سے عجیب سی آواز بھی نکلی تھی لیکن شاید وہ غلط تھا۔ اس نے ابھی تک مجھ پر یا نہیں صاحب پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب تو خیرو اس میں شاید دم نہ رہی نہیں رہا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! اتنے تر نہیں صاحب بول اٹھے۔“ یہ کیا ہے؟“

میں کستا چاہتا تھا کہ میرے خیال میں یہ وہیں جانے کا راستہ تھا

دی جان نہیں چھوڑ دے۔  
”بے شک“ میں نے اس کی تائید کی۔

میں بظاہر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے سوالات کرتا رہا لیکن میں نے گرد و پیش کا ذرا اور تفصیل سے جائزہ لینے کی بھی دی کو شش کی تھی اور غالباً نہیں صاحب بھی اسی کو شش میں روف تھے۔ یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ اس بوڑھے کی طرف بھی خیرباد دینا نہایت ضروری تھا۔ اس کے تپور اور اس کا بڑا سراپا بتاتا تھا کہ ذرا سا موقع پاتے ہی وہ حملہ کرنے سے نہیں کے گا۔

میں نے اپنے غیر محسوس جائزے کے دوران دیکھا کہ کٹر نے کی مشین بالکل ہی تھی۔ وہ ہاتھ سے چلانے والی دیکھی تھی۔ مشین جیسی درخت میں اکثر نظر آتی ہیں جن میں پینڈل بڑا سا آہنی پسپا اور بڑا سا پلینڈ لگا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس مشین سے ایک بار بھی کٹر نہیں کاٹا گیا تھا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نہیں صاحب کو بوڑھے پر وہ کڑی نظر رکھنے کا اشارہ کیا اور خود مشین کے پاس چلا گیا تاہم نے بھی اس دوران بوڑھے پر نظر رکھی۔ مشین کے نیچے دور چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں جو خشک چارے کے اباروں تک چلی تھیں۔

میں نے مشین پر ہاتھ پھیر کر بوڑھے کی طرف بخور دیکھتے لگا۔ ”بالکل ہی مشین ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ بوڑھے کے چہرے پر ایک رنگ اگر مگر تھا۔ وہ غیر متعین لہجے میں بولا۔ ”ہاں۔۔۔ میرا بیٹا کل ہی خرید کر ہے۔ پرانی بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہم نے اسے کباڑی کے چھوڑ دیا۔“

میرا نے مشین کے نیچے جیسی ہوئی چٹائیوں کو دیکھا۔ کئی زمین وہ کچھ اونچی نظر آ رہی تھیں جیسے ان کے نیچے زمین کی سطح اونچی

میں نے مشین کو ایک ہاتھ سے ہلانے کی کوشش کی۔ اس قسم نہیں خاصی ہماری ہوئی ہیں۔ ساری کی ساری لوہے سے بنی ہیں لیکن اتنی بھی ہماری نہیں ہوتیں کہ مجھ جیسا آدمی انہیں نہ سکے۔ میں نے محسوس کیا جیسے اس مشین کے پائے چٹائی پر نظر آ رہے تھے لیکن درحقیقت چٹائی کے نیچے سے کوئی چیز ان میں بہت تھی۔

بوڑھا تیزی سے بولا۔ ”تم کیوں اسے ہلانے پر تلے ہوئے ہو؟“

”اسے نیچے نیچے میں منت کر رکھا ہے۔“

میرے دگ دپے میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ میں نے دیکھا صاحب بھی تازہ کا شکار نظر آ رہے تھے۔ ان کی چھٹی حس نے ایسا نہیں کوئی احساس دلایا تھا لیکن شاید بات کا سربراہ ان کی

میں نہیں آ رہا تھا۔ بات کا سربراہ مجھے بھی نہیں معلوم تھا مگر

مظلوم جس کوئی سرگوشی کر رہی تھی۔ میں اس سرگوشی کا صحیح



راستے کو کھلا چھوڑ کر آئے ہیں۔ کبھی بچے سے کوئی آنہ جائے۔  
 نہیں صاحب تجزی سے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔  
 میں نے فوری طور پر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ایک بار  
 پھر جھک کر نوجوان کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے۔۔۔  
 اب یہاں کوئی نہیں۔۔۔ کوئی نہیں آئے گا۔“

نہیں صاحب جاتے جاتے پلٹ کر بولے ”کیوں؟“

”نہ جانے کیوں اب مجھے یہاں زمین کے نیچے۔۔۔ زمین کے  
 اوپر ہر طرف سکوت ہی سکوت محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے لٹھری  
 سانس لے کر کہا۔ ”اگر کوئی رد عمل ظاہر ہوتا تو شاید اب تک  
 ظاہر ہو چکا ہوتا۔ یہ بیٹا اپ اوپر سے جتنا دیا تو یہی نظر آ رہا ہے،  
 نیچے سے ایسا نہیں ہو گا۔ اس راستے کا دروازہ کھلتے ہی نیچے خیر  
 ہو جاتی ہوگی اور شاید کچھ حفاظتی انتظامات بھی موجود ہوں لیکن  
 ابھی تک چرنگہ کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے مجھے لگتا ہے کہ ریڈ واٹ یہ  
 ٹھکانا خالی کر گئی ہے۔“

میری چلائی ہوئی گولیاں نوجوان کے سینے اور چہرے پر لگی  
 تھیں۔ اس کے زخموں سے ابھی تک خون رستا محسوس ہو رہا تھا۔  
 نہیں صاحب بے تابی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔ ”پھر  
 بھی۔۔۔ چل کر اس راستے کو دیکھیں تو سہی۔“

میں نے اہستہ میں سر ہلایا لیکن جانے سے پہلے مردہ نوجوان  
 کی تلاش کی۔ میری توقع کے مطابق اس کی جیبوں میں کوئی ایسا چیز  
 نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی ”البتہ اس کی ایک  
 جیب میں بڑی مالیت کے بنت سے نئے پرائے بے ترتیب نوٹ  
 موجود تھے۔ خاصگی بڑی رقم تھی۔ وہ میں نے نہیں صاحب کے  
 حوالے کر دی۔“

نہیں صاحب احتیاط سے اسے ایک جیب میں رکھتے ہوئے  
 بولے۔ ”اے شہادت کے طور پر محفوظ کرنا پڑے گا۔“

نوجوان کی دھوئی کے نیچے بندلی کے ساتھ مجھے جہزے کی بنیام  
 بندھی دکھائی دی۔ اس میں سے خنجر کا دستہ جھانک رہا تھا۔ میں نے  
 فنگر پر قس و دغیو کی باریکیوں میں بڑے بغیر خنجر نام سے سمجھ لیا۔  
 اس طرح بھی میں بھی اپنے ساتھ مخصوص مسافت کا خنجر رکھتا تھا  
 لیکن آج تک وہ میرے پاس نہیں تھا۔

وہ دروازائی بانٹ لہا ایک جھلمل جھلمل کرتا خنجر تھا لیکن  
 خاص بات یہ تھی کہ اسے گوگردی جہیز پر رکھ کر صاف کیا گیا تھا اور  
 اسے بنیام میں بھی رکھ کر لگ بھگ تھی ”اس کے باوجود اس کے کناروں  
 پر تازہ خون کی ایک پتلی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ذرا  
 تشویش سے نہیں صاحب کی طرف دیکھا لیکن وہ کندھے اچکا کر وہ  
 گئے۔“

میں نے خنجر واپس مردہ نوجوان کی بنیام میں رکھ دیا اور نہیں  
 صاحب کے ساتھ دوبارہ مکان میں داخل ہوا۔ زمین میں نمودار  
 ہونے والا وہ بڑا سادہانہ گویا سکوت کے عالم میں عمارا انتظار

ہوا تھا۔ اپنی طرف کے کونے پر پہنچ کر میں نے جھانکا۔ اس طرف  
 اس شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی جس نے کھڑکی سے اپنی راست  
 میں فرشتہ اعلیٰ کو ہماری طرف روانہ کیا تھا۔ اس کی سب مشین  
 ممکن اس کے قریب ہی پڑی تھی۔

نہیں صاحب نے دوسری طرف جھانکنے کے بعد مڑ کر  
 اشارے سے مجھے بتایا کہ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ اس کے باوجود  
 ہم دونوں نے اسی طرح الگ الگ سمتوں میں آگے بڑھتے ہوئے  
 مکان کے گرد پکر کھل کر لیا۔ ہم دونوں اس لاش کے قریب بچھا  
 ہوئے جو کھڑکی کے پاس پڑی تھی۔

ظاہری طے سے وہ ایک رسائی نوجوان معلوم ہوتا تھا لیکن  
 میرے خیال میں وہ رسائی ہرگز نہیں تھا۔ میرے خیال میں تو وہ  
 یوزہا بھی رسائی نہیں تھا جو اندر مڑا پڑا تھا۔ یہ نوجوان بھی اس  
 یوزہ سے ہی کی طرح خوفزدہ تھا اور اس کا شہابی معلوم ہوتا تھا۔  
 معلوم نہیں اس دوران وہ کبھی پچھا رہا تھا یا کبھی سے آیا تھا اور  
 صورت حال کا اندازہ کرنے کے بعد اس نے نکات لگا لی تھی۔

نہیں صاحب بولے۔ ”یہ بہت ہی بڑا ہوا کہ دونوں باپ بیٹے  
 ہی مارے گئے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہ جاتا تو شاید ہمیں  
 کچھ معلومات حاصل ہو جاتیں۔“

”چلیں اب معلومات کی طرف سے تو صبر کر لیں۔ یہ شکر کریں  
 کہ ہماری منت را نگاہ نہیں گئی۔ یہاں کچھ نہ کچھ دریافت ہوا  
 ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر بے یقینی کے سے عالم میں چاروں طرف دیکھتے  
 ہوئے بولے۔ ”حیرت ہے! بڑے ہی عجیب طریقے سے یہاں گویا اتنا  
 لہا چڑواہیت لگایا گیا ہے اور صرف یہ دو آدمی اس سیٹ کی تحریکی  
 کر رہے تھے!“

”مجھے تو اس سیٹ میں۔۔۔ یا اس سیٹ اپ میں بڑی ذہانت کی  
 جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ وہ لوگ انسان کی نفسیات سے کھیلنے  
 ہیں۔ کوئی ایسا چیز تشکیل دیتے ہیں جو اس ماحول میں انجبی ہوتے  
 ہوئے بھی انجبی دکھائی نہ دے۔ لوگ ایک نظر اسے دیکھ کر بے  
 پرواہی سے گزرتے رہیں یا اس کی موجودگی کے جو اثر سے مطمئن ہو  
 جائیں۔ جس طرح آپ کے رپورٹ مرتب کرنے والے لوگ  
 ہو گئے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے خیال میں اندر اسی راستے کا دہانہ نمودار ہوا ہے  
 جس کی تلاش میں ہم پریشان رہے تھے؟“ نہیں صاحب نے تصدیق  
 پائی۔

”ہاں۔ میری نامعلوم حس تو یہی کہہ رہی ہے کہ ریڈ واٹ کے  
 اس ٹکٹے تک تمام نرسنگ میس سے جاتا ہو گا۔ شاید میں نے بھی بے  
 ہوشی کے عالم میں ایک بار اسی روٹ سے سڑکریا ہو۔“ میں نے  
 خیال ظاہر کیا۔

”تو پھر ہم اپنی بے پرواہی سے کیوں کھڑے ہیں۔ ہم اس

واپس آئیں گے۔

میں نے ان کے مشورے پر عمل کرنا بہتر سمجھا۔ گو کہ فوری طور پر آگے جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے سرنگ کے دبا سے باہر آتے وقت اسی سوچ کو دوبارہ چھوا۔ پوری سرنگ میں تاریکی پھیل گئی۔ اس راستے کو بند کرنا بالکل آسان ثابت ہوا۔ ہانے کی مشین کا پیمانیں لے لانا تھا۔ سرنگ کا دہانہ بند ہو گیا۔ میں نے مشین کے نیچے بھی بھٹی ہوئی چٹائیوں میں سے آ کو ذرا سا اٹھا کر دیکھا۔ اس کے نیچے پختہ فرش تھا جس کے غالباً کوئی میکانزم کام کر رہا تھا۔ ہال کے وسط میں زمین ٹھنڈی اور بوڑ کے لیے بکی چھوڑ دی گئی تھی۔ میں نے چٹائی چھوڑ دی اور بوڑ کی بیجوں کی تلاش کرنے لگا۔ اس کی بیجوں میں بھی رقم کے سوا نہیں تھا لیکن یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس کی شلوار کے

میں ایک بہترین قسم کا مشین پائلٹ آؤسا ہوا تھا۔ عجیب بات تھی اس نے تو ہمارے سامنے آنے سے پہلے گھات لگا کر ہم پر کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی بعد میں موقع پارکسنگ نکالنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس بے چارے کی مصلحت یا حکمت ۴ کچھ اور تھی لیکن ہو کچھ اور کیا تھا۔ میں نے نفیس صاحب پوچھ کر مشین پائلٹ اس کے بیٹے ہی میں آؤں دیا۔ ہم دو انسان اور دو کتوں کو غرورہ حالت میں وہیں چھوڑ کر واپس روانہ ہو گئے۔

جب ہم پیدل مرے کچھ دہاں پہنچے جہاں پہلی کا پڑ چھوڑا تو یہ دیکھ کر ہاتھ ٹھکا کہ پائلٹ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ صرف اس کا ہیلٹ سیٹ پر رکھا تھا۔ پہلے تو ہم یہی سمجھے کہ انتظار طویل لمحات میں نعمتاً انسان کو وہ جو ایک انسانی ضرورت پڑا آجاتی ہے جس کے تحت وہ ادھر ادھر آؤ تلاش کرتا پھر آتا ہے، پائلٹ بھی اسی ضرورت کے تحت کہیں درختوں کے جھنڈ میں جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا ہے۔

ہم چند منٹ پہلی کا پڑ کے پاس ہی کھڑے انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب اس کی واپسی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو نفیس صاحب نے دونوں ہاتھوں سے بھونپو سا بتا کر اسے آوازیں بھی دے کر کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ آخر ہم اسے تلاش کر کے مختصرے جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔

ہمیں اس کی تلاش میں زیادہ بھٹکانا نہیں پڑا۔ وہ ایک تیار درخت کی آڑ میں موجود تھا مگر اس عالم میں... کہ اس کی گردا آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی۔ کسی نے اسے نہایت مشاقی ہمارے اور صفائی سے کمروں کی طرح زین کر دیا تھا۔ بکری کی اگر چاروا ٹانگیں بندھی ہوں تب بھی اس کے زین ہونے کے بعد مزاحمت کچھ نشانیوں نظر آتی ہیں لیکن وہاں تو مزاحمت کی کوئی معمولی نشانی بھی نہیں تھی۔

حالت یہی بتا رہی تھی کہ وہ اپنی انسانی ضرورت کے تحت درخت کی اوٹ میں آیا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

کر رہا تھا۔ ہم تھیں سنبالے محاذ انداز میں اس کے قریب پہنچے سامنے کچھ ایسا دھوان فرش نظر آ رہا تھا جسے بے خانے میں کوئی گریز ہو۔ کچھ دور تک روشنی تھی۔ اس کے بعد کیا تھا یا راستہ کیسا تھا یہ بتانا مشکل تھا کیونکہ قدرتی روشنی زیادہ آگے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

نفیس صاحب یہ راستہ دریافت ہونے کے بعد سے بڑے پرجوش نظر آ رہے تھے لیکن میں دھوان فرش پر قدم رکھنے لگا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ ”میرا خیال ہے یہی الحال تم اس راستے کو بند کرو۔ ہم کچھ اور لوگوں کو لے کر ذرا پیادوں کے ساتھ آتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”فی الحال تو میں صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ شاید یہاں روشنی کا کوئی انتظام ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میں زیادہ آگے نہیں جا رہا۔“

میں نے ذرا آگے بڑھ کر دونوں طرف کی دیواروں پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ایک جگہ خود ہی میرا ہاتھ کسی چپنے سوچ سے ٹکرایا اور ٹھنڈی ہاتھ لگنے سے ہی ہمارے سامنے تاحہ نظر روشنی پھیل گئی۔ نفیس صاحب حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گئے۔

ہم ایک نہایت صاف ستھری اور نہ جانے کتنی طویل سرنگ کے دہانے پر کھڑے تھے اور یہ وہی کچی ٹانہوار قسم کی سرنگ نہیں تھی جیسی نفیس صاحب نے اپنی داستان میں بڑے وسائل صرف کر کے کھدوائی تھی۔ یہ تو کسی ترقی یافتہ ملک کا ٹیوب ٹرن کا راستہ معلوم ہو رہا تھا۔ چھت میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکر لائٹس نظر آرہی تھیں جنہوں نے پوری سرنگ میں دودھیا روشنی پھیلا دی تھی۔ ایک ہی جگہ سے وہ تمام لائٹس روشن ہو گئی تھیں لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ راستہ کتنا لمبا تھا۔

”اف... میرے خدا!“ نفیس صاحب سرسراتی سی آواز میں بولے۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دیرانے میں کوئی ایسا راستہ موجود ہوگا۔“

”اس میں سے تو بیک وقت دو کاریں آرام سے گزر سکتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ آپ کی ایجنسیاں حالات سے کس قدر باخبر رہتی ہیں۔“

وہ ایک نظریاتی طرف دیکھ کر رہ گئے کچھ بولے نہیں۔ میں نے سرنگ میں زیادہ سے زیادہ دور تک دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”اصل جگہ یقیناً زیر زمین ہے ویسے ہی کسی کا اس کی طرف دھیان جانا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اسے کسی کی نظر میں آنے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کا راستہ کتنی دور سے نکالا ہے۔ آپ کی کھدوائی ہوئی سرنگ دوسری سمت سے شاید اس جگہ تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سرنگ دوسری سمت سے جاری ہے۔“

”ہاں... یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔“ نفیس صاحب بولے۔ ”آؤ... اب چلتے ہیں۔ اس راستے کو بند کر دیتے ہیں۔ جلد دوبارہ

لیا۔ نفیس صاحب جب خانہ بدوشوں والے محلے میں نہیں تھے تو شاید یہ آفس انسی کے استعمال میں رہتا تھا اور وہ ٹیلیفون "ہاٹ لائن" قسم کی چیز تھی۔

انہوں نے فون پر صرف دو افراد سے بات کی اور انہیں دریافت ہوئے والے راستے کے بارے میں مطلع کیا۔ اس میں انہوں نے میرا نام بھی لیا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کون تھے اس کے بعد اپنے مطلب کے لوگ انہوں نے وہیں پہنچے جمع کر لیے۔ ان میں دو تھیں انجینئر تھے۔ چند کماؤ دھ۔ میرا بھی خانہ بدوشوں کی بستی میں موجود تھے انہیں بھی بلا لیا کہ لاٹھیاں اٹھوانے کے لیے بڑی ایئر لنس کا بھی انتظام کیا گیا تھا کے ساتھ اسٹاف بھی تھا۔

میرے ساتھیوں کو تو خاص طور پر اس لیے بھی ساتھ لیا کہ انہیں لاہور میں ریڈ ڈاٹ کے ایک زیر زمین قلعے پر حصار لینے کا تجربہ حاصل تھا۔ نفیس صاحب تو راجیلہ کو بھی بلا لے ہوئے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا اور سمجھا۔ "کوشش کی۔" میرے خیال میں تو ابھی اتنا ہجوم جمع کرنا ضرورت نہیں تھی۔ یہاں کے اور لاہور کے حالات میں فرق ابھی ہم صرف اس جگہ کا جائزہ لینے جارہے ہیں۔ میرا خیال بعد میں بھی یہاں کوئی ایکشن نہیں ہو گا۔ ہم بغیر کسی مزاحمت اس قلعے میں داخل ہو جائیں گے۔ میرا دل کتاب ہے کہ وہ لوگ جگہ کو خالی کر گئے ہیں۔"

نفیس صاحب ٹھوڑی سمجھاتے ہوئے ایک لمبے خاموشی میری طرف دیکھتے رہے پھر لٹھری سانس لے کر بولے "تمہارا نہیں بہت اہم باتیں بتاتا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے بلا نا مل کہا۔ "آپ کو اس میں کوئی ہے؟"

"میں مجھے اس پر رشک آتا ہے۔" وہ ایک اور لمحہ سانس لے کر بولے۔ "کاش میں بھی ایسے ہی دل کا مالک ہو تمہارا مطلب ہے کہ راجیلہ کو صرف اس وقت رخصت دی جا جب کسی ایکشن کا امکان ہو؟"

"زادہ مناسب بھی ہے۔" میں نے مختار لہجے میں کہا۔

وہ رہا لوگ چیز کے پٹے سے ٹک لگاتے ہوئے ہو۔ "محسوس تو میں بھی یہی کچھ کر رہا ہوں جو تم کہہ رہے ہو لیکن یہاں میں بے پناہ احتیاط پسند آدمی بھی ہوں۔ بے احتیاطی میں ہم بہت سے نقصانات اٹھا چکے ہیں۔ اس لیے میں کوئی بھی ذرا احتیاطی کا فیصلہ فاضل انتظامات کرتا ہوں۔"

"احتیاطی احتیاط میں آپ کا زرا کافی لہا ہو جاتا ہے میں نے زرا صاف کوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔" آپ نے زرا بہت سے کھڑا کچھ پھلائے جن کی میرے خیال میں کوئی غا ضرورت نہیں تھی۔ خصوصاً جبکہ ریڈ ڈاٹ پیش نظر ہے غا۔

پہلی کا پڑ کے قریب بھی اپنی اس معمولی سی حاجت سے فارغ ہو سکتا تھا۔ اس دیرانے میں بھلا کون اسے دیکھ رہا تھا کون اس پر معترض ہو سکتا تھا یا کون اسے شرمندہ کر سکتا تھا مگر جس طرح کتے کی فطرت ہے کہ اس کام کے لیے وہ کوئی کھبا یا درشت تلاش کرتا ہے اس طرح انسان۔ خصوصاً شرفاء اس مقدمہ کے لیے آؤ تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے پائلٹ بھی اتنا فاصلہ لے کر کے آیا تھا۔ یہاں کسی نے گھات لگا کر اسے ذبح کر دیا تھا۔

نفیس صاحب کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے اور وہ ٹھٹھیاں بھیج کر وہ گئے پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کھٹی کھٹی سی آواز میں بولے۔ "اس غریب نے کسی کا کیا بکاؤ تھا؟"

"اس وقت تک تو ہم نے بھی کسی کا کچھ نہیں بکاؤ تھا جب ہم پر سب دشمنی گمن سے برست مارا جا رہا تھا۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا۔ "آپ نے اس فوجان کے خنجر پر تازہ خون کا نشان دیکھا تھا؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "اس وقت شاید میری طرح تمہیں بھی گھل گھل نہیں مگر زرا ہو گا کہ وہ اس پائلٹ کا خون ہو سکتا تھا۔"

"مٹی ہاں۔" میں نے حلیم کیا۔ چند لمبے ہم افسردہ سے انداز میں پائلٹ کی لاش کے قریب کھڑے رہے پھر نفیس صاحب بولے۔ "آؤ۔ ہم واپس جا کر ان لاشوں کو اٹھوانے اور اس زیر زمین راستے کا جائزہ لینے کے انتظامات کرتے ہیں۔ پائلٹ کی لاش کو بھی ہم خود نہیں اٹھا سکیں گے۔ اسے بھی صحیح انتظامات کے ساتھ ہی اٹھایا جائے تو بہتر ہو گا۔"

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے کہا اور ان کے پیچھے پیچھے شکل سے باہر آیا۔

راستے میں میں نے کہا۔ "آپ موبائل فون پر رابطہ کر کے بھی تو مطلبہ افراد کو یہاں بلوا سکتے ہیں۔"

"شاید انہیں صحیح جگہ پر پہنچنے میں دشواری ہو اور وقت ضائع ہو۔ ہم خود ہی جا کر انہیں اپنی رہنمائی میں لاتے ہیں۔ مجھے نہیں ہے فحاشی عدم موجودگی میں یہاں کچھ نہیں ہو گا۔" نفیس صاحب بولے۔

میں نے اپنی تجویز پر زور نہیں دیا اور ان کے ساتھ چلا رہا۔ واپسی میں پہلی کا پڑ کے پائلٹ کے فرائض نفیس صاحب نے ہی انجام دیے۔ اب انہیں کچھ چپ کی گئی تھی لیکن محسوس کر رہا تھا کہ آج کی دریافت کے بعد وہ اندر ہی اندر ہیجان زدہ تھے۔

جلد ہی ہم دائر چلائی سائٹ پر جا آئے اور اس آفس میں چلے گئے جہاں صبح ہم نے اپنے محلے تبدیل کیے تھے وہاں اب میز پر ایک شخص موجود تھا لیکن نفیس صاحب کو دیکھ کر وہ سیٹوں کے کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا۔ وہ میز کے مقابل دو سری کرسی پر آ بیٹھا اور اصل کرسی پر بیٹھ کر نفیس صاحب سے میز پر رکھا ہوا فون سنبھال

جکی تھی۔

اس وقت کمرے میں صرف ہم دونوں ہی تھے۔ باقی لوگ انہوں نے کی تیاروں میں باہر مصروف تھے۔ اس لیے میں ذرا غفلت سے بات کر رہا تھا۔ وہ بڑے قتل سے میری تنبیہ اٹھ کرتے ہوئے بولے۔ ”یہ ڈاٹ اس لیے پیش منظر سے ہوتی ہے کہ اس پر کاری دار کرنے کے بعد ہم بھی پیش منظر پر غائب ہو چکے ہیں۔ انہیں یقیناً تشویش ہوگی کہ ہم کہاں ہیں کیا رہے ہیں۔ اگر ہم سامنے رہتے تو ہمیں ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنے میں زیادہ دشواری ہوتی۔ جانی نقصان زیادہ ہوتا۔ قدم قدم پر ہوشیار رہتے۔ میرے یہ اقدامات جنہیں تم ڈراما کی اور کھراگ کہہ رہے ہو ان کا فائدہ یقیناً ہوا ہے لیکن ہمیں اس کا اندازہ نہیں۔ ہمارا اپنا ایک نظام خاموشی سے کام کر رہا ہے۔ معلومات جمع ہو رہی ہیں۔ ست رفتاری سے سہی۔ لیکن اس پر عمل سامنے آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے جلد ہی وہ وقت بائے گا جب ہم مل جل کر یکدم ہی اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیں گے۔“

”آپ ہنگو بڑی امید افزا کرتے ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر خوش ہو جاتا ہے اور نئے جوش و خروش سے ناک کی سیدھ میں لڑنے کوئی چاہنے لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہی میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھی پیش پر امید رہیں۔“ وہ ہاتھ مار کر بولے۔

اس دوران تیاروں عمل ہو چکی تھیں۔ چند گاڑیوں پر مشتمل سہ ہاتھ کا قافلہ اس طرف روانہ ہو گیا جہاں سے ہم آئے تھے۔ ہاتھوں سے دہاں جانا کچھ اذیت تھی۔ بیکراں سمندر کی طرح لیے ہوئے دیرانے میں صرف سمنوں کے سارے دہاں پہنچنا ذرا فک مسئلہ تھا کہ اس دیرانے میں کچھ جگہ لیے چلتے سے جنگل، انڈیاں وغیرہ ہیں۔ بھٹکانے کے لیے موجود تھیں۔ تاہم یہ ہماری شہرستی تھی کہ میں اور نفیس صاحب آپس میں مشورہ کرتے سے کسی خاص دشواری کے بغیر دہاں پہنچ گئے۔ میں، نفیس صاحب، منیر اور مسعود سب سے آگے بیپ میں تھے۔ ایسے لینس ب سے پیچھے تھی۔ سچ میں مختلف گاڑیوں میں دوسرے لوگ تھے۔ مکان تک پہنچ کر ہم نے دیکھا۔ مظہر بالکل دیباہ تھا جیسا ہم دیکھتے تھے البتہ اب لاشوں پر کھیاں بھجھکاری تھیں۔ ہم نے لہ تینوں لاشیں اٹھوائیں۔ پالٹ کی لاش اٹھوانے کے لیے لہ ایک بار پھر جنگل کی طرف پانا چڑھا۔ اس وقت تک سورج اب ہونے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔

میں نے جلدی سے ایک بار پھر خنجر کانٹے والی مشین کے نیچے سرنگ کا ہانڈ کھولا۔ اس میں اب بھی کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ دو کمانڈوز کو ہم نے دہانے پر تعینات کیا اور انہیں مختصر جگہ پر کسی ہنگامی صورت حال میں انہیں کیا کرنا ہو گا۔ وہ دہاں

اسٹینڈر پر ایک مشین گن فٹ کر کے کھڑے ہو گئے۔ ایک کمانڈو ایسی ہی مشین گن کے ساتھ مکان کے دروازے پر تعینات تھا۔ میں، نفیس صاحب، منیر اور مسعود پہلے ہی کی طرح ایک بیپ میں سب سے آگے رہے اور چوٹ کھٹے ہوئے چوٹی کٹ سے گزر کر سرنگ میں داخل ہوئے۔ ابتدا میں راست کافی ڈھلوان تھا پھر تقریباً سیدھا ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت سرنگ تھی۔ نیوٹرین کی سرنگ تو تنگ و تاریک تھی ہوتی ہے لیکن ذریعہ زمین اسٹینڈر کشادہ اور روشن ہوتا ہے۔ یہ ان کے درمیان کی چیز تھی۔ تنگی اور تاریکی کا احساس بالکل نہیں تھا۔ دو کابین آسمانی سے ایک دوسرے کے قریب سے گزر سکتی تھیں۔

ہمارے پیچھے ایک گاڑی میں تین انجینئرز آ رہے تھے۔ دو کمانڈو ان کے ساتھ بھی تھے۔ ان کی اور ہماری گاڑی کے درمیان کافی فاصلہ تھا پھر مزید کچھ فاصلہ چھوڑ کر ایک گاڑی میں تین کمانڈو تھے۔ سب اسٹے سے لہے ہوئے تھے۔ ہم گویا واقعی کوئی قلعہ فتح کرنے جا رہے تھے۔ ہم نہایت مختار انداز میں ست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ تینوں گاڑیوں میں ہنگامی حالات میں کام آنے والا دو سرعت سارٹان بھی تھا۔ وائرس کے ذریعے ہم سب کا آپس میں اور اور موجود لوگوں سے رابطہ قائم تھا۔

آخر کار ایک مقام پر پہنچ کر راستہ مزید کشادہ ہو گیا۔ یہاں سے گاڑیاں وزن ہو گئیں تھیں۔ سامنے ایک بلند دیوار دیوار نظر آ رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہمارا سفر ختم ہو گیا۔ گاڑی نفیس صاحب ذرا نیچے کر رہے تھے۔ چند لمبے ہم گاڑی ہی میں بیٹھے رہے اور کسی غیر متعلق صورت حال سے بچنے کے لیے مستعد رہے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ یہ ایک عجیب بے شرم کا سپین تھا۔ تاہم اس جگہ کی ساخت اور عمل وقوع کچھ ایسا تھا کہ خواہ وہی اعصاب میں بار بار تباہ پیدا ہونے لگا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ یہاں کے سکوت میں بھی کچھ خباثت سی پناں تھی۔

آخر کار دوسری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے آن رکھیں۔ سب گاڑیوں سے آخر آگے نفیس صاحب کا اشارہ باکر انجینئرز نے سامنے موجود سیاہ دیوار کا معائنہ شروع کیا۔ باقی لوگ ہتھیار تھامے مستعد کھڑے رہے۔ مختلف آلات کی مدد سے اس کی چوڑی دیوار کا معائنہ بہت دیر تک جاری رہا۔ اس دوران بہت تیز لائنیں دیوار پر مرکوز گزری گئی تھیں جو ہم ساتھ لائے تھے۔

تینوں انجینئرز مختلف شبیروں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت دیر تک معائنہ کرنے کے بعد بہت دیر تک یہ وہ لوگ آپس میں بتاؤ لہ خیال کرتے رہے حتیٰ کہ ہتھیار سنبھال کر الٹ کھڑے ہوئے لوگوں کے جسم اڑ گئے اور انہیں جہاں آئے گئیں۔ ان لوگوں میں میں بھی شامل تھا۔ میں دیے بھی آج صبح ہی سے بہت خواہ کھانا

آخر کار انجینئرز حضرات نے گویا ہماری حالت پر رحم کھا کر

”دوسرا انجینئر کھار کر گھلا صاف کرتے ہوئے بولا۔“  
 جس سربراہان ملکیت کو جان کا غلو ہوتا ہے وہ اپنے لیے  
 بولتے ہیں۔ یہ اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر اور محفوظ جگہ  
 ہوتی ہے۔“

میرے خیال میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کیسی  
 لیلوی سی جگہ تھی۔ مجھے ایک بار اسلام آباد کے نواح میں  
 ہوش کر کے اغوا کیا گیا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں۔  
 آپ کو جس الف لیلوی سی جگہ پر پایا تھا، میرے خیال میں  
 اسی کے دروازے پر کھڑے تھے میں نے اس کا صرف ایک  
 سا حصہ ہی دیکھا تھا۔ میں تو شاید کچھ کچھ اندازہ کر بھی سکتا  
 کیسی جگہ تھی لیکن وہ لوگ محض اپنے علم کے سار۔  
 اندازے نہیں لگا سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ حیران تھے۔  
 نہیں صاحب ابھین زدہ کیسے میں بولے۔ ”مجھے یقین  
 کا نظام اس قسم کا ہوگا کہ اندر اگر کچھ لوگ موجود ہوتے  
 جاری آمد کی اطلاع ہو چکی ہوتی۔ اس صورت میں آپ  
 رد عمل ضرور سامنے آچکا ہوتا لیکن یہاں عمل سکوت۔  
 لگتا ہے اندر کوئی نہیں ہے۔“  
 اچانک وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولے۔ ”تمہارا  
 کہتا ہے فیضان؟“

”میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔“ میں نے دھجے لیے میر  
 دیا۔

”نقیس صاحب انجینئر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے  
 ”تمہارا اندازہ ہے کہ اندر کچھ رزکنولڈ سسٹم موجود ہے؟“  
 چونکہ ٹیلی فون لائن موجود نہیں ہے اس لیے موزیم۔  
 نہیں باہر سے تو اس نظام کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا۔  
 وقت وہ لوگ پیش کے لیے اسے بند کر گئے ہیں؟“

”ضروری نہیں ہے۔“ ایک انجینئر بولا۔ ”وہ لوگ  
 یافتہ معلوم ہوتے ہیں ان کے لیے ٹیلیفون نیٹ ورک۔  
 اپنے کچھ رزڈ کنٹرول کرنا مشکل نہیں۔ دوسرے یہ بھی  
 ہے کہ ایک آدھ فرد ابھی تک اندر موجود ہوئے اس لیے  
 ہو کہ وہ آخری دم تک اس جگہ کو بچانے کی کوشش کرے  
 مجھے اچانک ان پیجینزوں کا خیال آیا جنہیں وہ لوگ  
 کہتے تھے وہ افسانوں کی سی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ میں  
 انہوں نے ان پیجینزوں کو ایسے ہی مواقع پر استعمال کر  
 تیار کیا وہ جہاں قربانی کے کمپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔  
 کے بھانے ویسایہ کوئی پیجینز اس وقت بھی اندر موج  
 اس جگہ کا عمل کنٹرول سنبھالے ہوئے ہو۔ وہ لوگ ا  
 آدمی کو بھی قربانی کا کیکر بنانے والے تو معلوم نہیں ہوتے  
 نہیں صاحب میری طرف مڑ کر ٹھنڈی سانس  
 بولے۔ ”ان کے لاہور والے زیر زمین ٹھکانے میں

ہوئے سرگوشیوں میں جاری اپنا مذاکرہ ختم کیا ان میں سے ایک  
 سیاہ دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نقیس صاحب کو بتاتے لگا۔  
 ”کم از کم دو فٹ موٹی اسٹیل کی دیوار ہے اور اس کے نیچے  
 کنکریٹ کی موٹی فائبریشن ہے جس کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ کرنا  
 مشکل ہے۔ یہ دیوار شکر کا کام دیتی ہے اور غالباً کسی کیمپٹر کنٹرولڈ  
 سسٹم کے تحت کام کرتی ہے۔ اس نظام کا بٹن دلیا جاتا ہوگا تو یہ  
 کنکریٹ کی فائبریشن میں اثر پڑ جائی ہوگی اور راستہ کھل جاتا ہوگا۔  
 ممکن ہے اس سے آگے بھی کوئی دروازہ موجود ہو۔ اور بھی نہ  
 جانے کتنی موٹائی میں کنکریٹ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سے غالباً  
 لفٹ کے انداز میں لوہے کی رسیاں اس دیوار سے منسلک ہیں جن  
 کے ذریعے یہ فائبریشن میں اتار چڑھاؤ اٹھائی جاتی ہوگی۔“  
 نقیس صاحب کا منہ کچھ لٹک گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ اسے  
 کسی طریقے سے کھولا نہیں جاسکتا؟“ انہوں نے کسی امید کے  
 سارے پوچھا۔

”تین انجینئروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ان کی  
 ترجمانی کے فرائض انجام دینے والا ٹلی میں سرہلاتے ہوئے  
 بولا۔ ”کھانا تو در کی بات ہے اسے توڑنا بھی بہت مشکل ہے۔“  
 ”تو پھر اندر جانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟“ نقیس صاحب  
 نے جانتا چاہا۔

”میں دھماکا خیز اشیا کے ماہرین کے ساتھ مل کر اس کے لیے  
 لاکھ عمل طے کرنا پڑے گا۔ اسے ڈانکا میٹ سے اڑانے کے سوا  
 کوئی چارہ نہیں۔ بہت طاقتور بلاسٹ ہوگا اور چونکہ یہ ایک بند  
 جگہ ہے۔ ممکن ہے سرنگ بیٹھ جائے یہ بھی ممکن ہے کہ اوپر کی  
 طرف زمین پھٹ جائے۔“

”ہم سب لوگ جو قصد فتح کرنے آئے تھے ٹھنڈے پڑ گئے۔  
 معاملہ کچھ آگے جا رہا تھا۔ دیوار کے ایک کونے سے بہت موٹا سا  
 سیاہ پائپ نکلا ہوا نظر آ رہا تھا لیکن وہ ٹھنڈا ہوا تھا اور درحقیقت اس  
 کا صرف ٹھنڈا ہوا حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ زمین کے اندر ہی نیچے کی  
 طرف بہت تھوڑے فاصلے پر نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ نقیس صاحب نے غالباً کسی مہووم سی امید کے  
 سارے پوچھا۔

”یہ غالباً آرگنڈیشننگ کے نظام سے وابستہ ہے۔ اس کا سارا  
 ضرور کسی کھلی جگہ میں جاکر لٹکا ہوا گا لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ  
 کہاں؟ یہ رسی انفرسڈ دھات کا پائپ معلوم ہوتا ہے اگر اسے  
 کاٹنے میں کامیابی ہو بھی گئی تب بھی اس کے راستے تو مشکل سے  
 کوئی لمبی اندر جا سکتی ہے اور وہ بھی یقیناً آگے جا کر مٹینی گورکھ  
 ایک حیدرے میں پھنس جائے گی۔“

”کری۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”اس پائپ کے ٹیپر  
 سے اندازہ ہوتا ہے کہ آرگنڈیشننگ نظام ابھی تک کام کر رہا ہے۔  
 اندر جڑنڑ بھی ہوں گے۔“

معاملے میں اور رڈوز ہو چکا ہوں۔ میں اب تھوڑا بہت سکون سے سونے کی کوشش کروں تو میرے حق میں شاید بہتر ہو۔ ویسے بھی میرے خیال میں یہاں رہنا کچھ ایسا ضروری نہیں۔ بلکہ یہ بہت ہی کچھ ایسی ضروری نہیں۔ کم از کم اب ضروری نہیں رہی۔  
”کیوں؟“ نفیس صاحب نے ٹیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”جس ٹیکھی آنکھوں سے بچنے اور اپنی سرگرمیوں کو راز رکھنے کے لیے آپ اتنا تردد کر رہے تھے میرا خیال ہے آپ ان میں سے کسی کی نظر میں نہیں ہیں۔ اب تو ہم ان کے دو کارندوں کو ہلاک کر کے ان کے ٹھکانے تک ہو آئے ہیں۔ باقاعدہ جلوس کی شکل میں گئے تھے۔ اس کے باوجود کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحال ان کی توجہ ہم سب کی طرف سے اور اپنے اس ٹھکانے کی طرف سے بھی ہٹی ہوئی ہے۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔“ میں نے بلاتال اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔

نفیس صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ ”میں بھی یہ سب کچھ محسوس کر چکا ہوں لیکن میں نے کہا کہ میں بہت زیادہ احتیاط پسند آدمی ہوں۔ اب تو یہ کھڑا کچھ پھیل چکا ہے۔ اب اسے سینے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ ہم ریڈ ڈاٹ کے ذریعہ زمین قلعے میں داخل ہو چکیں۔ اس کے بعد میں یہ سارا سلسلہ سمیٹ لوں گا۔“  
”دروازہ بلاست کرانے کا پروگرام کب ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس سلسلے میں صبح متعلقہ لوگوں سے بات کروں گا۔ جتنی جلد بھی انتظام ہو سکا اتنی ہی بہتر ہے۔ میں بھی جلد از جلد اس کام کو نشتا چاہتا ہوں۔ ہمارا اس میں بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔“ نفیس صاحب بولے۔

”میرے اور آپ کے جو آدمی مختلف جگہوں اور مشکوک افراد کی نگرانی کر رہے ہیں انہیں مزید کچھ دنوں تک اس مقصد کے لیے تعینات رہنے دیجئے گا۔ شاید کوئی ناکہ ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

”میں نے یہی سوچا ہوا ہے۔“ نفیس صاحب نے جواب دیا۔  
”گویا میرے اور ان کے خیالات میں ایک بار پھر اتفاق پایا گیا۔“ اس وقت بھی کچھ نہ کچھ معلومات جمع ہو رہی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں تشویش ہے کہ وہ لوگ بالکل ہی غائب ہو گئے ہیں۔ کسی خاص آدمی کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ابھی چونکہ ریڈ ڈاٹ کے فتنے کا پوری طرح خاتمہ نہیں ہوا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں جو بھی بہم سے شراغ موجود ہیں ہمارے آدمی ان پر کام کرتے رہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اب چتا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
”جائے جاتے ایک مشورہ مفت آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“ نفیس صاحب نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔  
”آپ کے آدمی رات کو بہت دیر تک جاگتے رہتے ہیں اور

آسان ثابت ہوا تھا۔ ایک تو اس کا دروازہ مختلف تھا۔ دوسرے اس کا کپڑا کاڑھ لیا گیا تھا۔“

”یہ ممکن ہے کہ اندر دیکھا بھی ایک دروازہ موجود ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”یہ چونکہ ان کا ہیڈ آفس معلوم ہوتا ہے اس لیے یہاں زیادہ حفاظتی انتظامات موجود ہیں۔“

”اسی لیے تو میں اندر جانے کے لیے زیادہ بے تاب ہوں۔ لاہور والے ٹھکانے سے کافی کارآمد معلومات ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ شاید یہاں سے بھی بہت کچھ ہاتھ لگے۔“ نفیس صاحب بولے۔

”یہ محض آپ کی خوش گمانی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں آپ کا ”چھپاوا“ اچانک اور ان کے لیے قطعی غیر متوقع تھا اس لیے کچھ چیزیں آپ کو مل گئی تھیں۔ یہاں سے چونکہ وہ خبردار ہو کر غائب ہوئے ہیں اس لیے مجھے امید نہیں ہے کہ یہاں سے کچھ ہاتھ آئے گا۔“

”یہ تو مجھے بھی اندازہ ہے پھر بھی میں خوش گمان ہی رہنا چاہتا ہوں۔“ نفیس صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

”ٹیکس فی الحال تو اپنا جلوس لے کر واپس چلیں اور باہر سن کی مدد سے اس دروازے کو بلاست کرانے کا بندوبست کریں۔“ میں نے کہا۔ انہوں نے ایک لمحے کچھ سوچا۔ ان کے پاس میرے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ پورا قافلہ منہ لٹکائے واپس روانہ ہو گیا۔ باہر آکر اس راستے کا دروازہ بند کر دیا گیا لیکن مکان پر چار کانڈو تعینات کر دیے گئے۔ وہاں کافی سوئی ہوئی تھیں نفیس صاحب نے ایک شخص کو ان کا کچھ بندوبست کرنے کی ذمہ داری سونپی اور ہم واپس روانہ ہو گئے۔

ہم لوگ پہلا سائٹ پر آئے۔ سائٹ سے سب ادھر ادھر بکھر گئے۔ گاڑیاں بھی غائب ہو گئیں۔ ہم چار افراد خانہ بدوشوں والی بستی میں واپس آ گئے۔ یعنی میں ”سبز“ مسعود اور نفیس صاحب جو دوبارہ اپنے فرمانہ خلیوں میں آچکے تھے۔ بستی میں کہیں عیموں میں لائٹیں روشن تھیں اور کہیں بیڑا میکس بپ روشن تھے۔ رات کہیں تو بجلی تھی۔ اگر یہ اصل خانہ بدوشوں کی بستی ہوتی تو اس وقت اندھیرے میں ڈوب چکی ہوتی۔ اصل اور نقل میں باریک سے کچھ فرق تو نظر آتی جاتے ہیں۔

نفیس صاحب بولے۔ ”تم مجھے یہیں ٹھہرو گے؟ تمہارے لیے الگ ٹیپے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔“

”وہ کچھ اس طرح مجھے تسلی دے رہے تھے گویا کسی نایاب اشارہ ہوئی کا فیخبر اطمینان دلا رہا ہو کہ اس کے پرانے ٹیپے سا کو ہوٹل میں گلزدری سونٹ بھی مل سکتا ہے۔“

میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”مجھے تو جانے ہی دیتے ہیں میں وہیں اسپتال میں داخلہ والے مکان میں ٹھہر جاؤں گا۔ یہاں کی ماہ خورکی آٹھ چاکا اور میرا خیال ہے میں خورکی کے



کیٹ کی طرف بڑھتا تو وہ مجھے قریب بھی نہ پہنچنے دیتے۔ مجھے راجلہ کو اطلاع کرائی دینی اور اس نکلے میں یہ بھی ایک مشکل ہوگئی۔ شاید مجھے کسی مناسب مقام سے دوچار بنانے کا ہنری آئے۔

ڈرائیور مجھے مطلوبہ دروازے تک پہنچا کر فوراً ہی لوٹ کر میرے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھل گیا۔ ٹوٹی میرا استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے دوری سے مجھے پہچان لیا ورنہ اس کے ہاتھ میں گن ہوتی۔ ہم ساتھیوں کا اب تو دوسرے کو کسی بھی نکلے میں دیکھنا غیر متوقع نہیں ہوتا تھا اس نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ صرف کے تیار کے لیے بعد میں نے احتیاطاً چلا۔ "راجلہ تو سوئی ہوگی" ٹوٹی نے کرون گھما کر ایک کھڑکی کی طرف دیکھا۔ شیشے عقب میں موٹا پردہ پھیلا ہوا تھا مگر روشنی کا احساس ہو رہا تھا ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میڈم ابھی جاگ رہی ہیں۔ اگر تم رہنا نصیب ہو تب بھی وہ رات کو بہت دیر سے سوتی ہیں۔"

"کیوں؟ کیا کرنی رہتی ہیں تمہاری میڈم؟" میں نے اندھیرے میں اسے گھورا۔

"انہیں پڑھنے کی تیاری ہوگئی ہے۔ رات کو وہ کافی دیر نہ کریں تو انہیں نیند نہیں آتی۔" ٹوٹی نے جواب دیا۔ وہ صبح سے اس وقت راجلہ کے گاڑی کے فرائض انجام دے، مگر مکان کی حدود سے باہر نہ گئی۔

"اوہ... حیرت ہے کہ اس کی زندگی میں مطالعے کی کتنی موجود ہے۔" میں نے دروازے پر پہنچ کر کال تیل کے ٹن کی ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ٹوٹی مجھے زبانی اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کا تیل پیکار ہوگا۔ رات کے نو بجے کے بعد کوئی بھی تیل بجائے تو نہیں کھلے گا۔"

"اوہ... یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے سر گھما کر کہا۔ "میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ لگتا ہے اب مجھے تمہاری لائیو والی کو غر مونا پڑے گا۔ اس کا مطلب ہے آج مقدّر میں کوئی ڈھک

کوئی ڈھک کا بستر ہی نہیں تھا۔ میں نے خواہ مخواہ ہی ہمارا کی۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔ ابھی آپ نے میری پوری بات نہ سنی۔" ٹوٹی شر سے انداز میں مسکرایا۔ "میرا مطلب ہے کے بعد جو بھی آئے گا اسے پہلے مجھ سے بات کرنی پڑے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ کس مخصوص انداز میں تیل دی جائے گی دروازہ کھولیں گی۔"

"چلو بھئی۔ تم ہی کتنی بجاؤ۔ تمہارا احسان ہوگا۔" پیچھے پھرتے ہوئے کہا۔

ٹوٹی نے آگے بڑھ کر عجیب سی انداز میں کتنی بجاؤ

اپنے غیموں میں چراغوں کی رکھتے ہیں۔ خانہ بدوشوں کی بستیوں میں نہ تو لوگ اتنی دیر تک جاگتے ہیں اور نہ ہی ان کے ہاں اتنی لائینیں اور پڑوسیکس لپ وشن ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور تھیں انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "چھاپا ایکٹ ہے۔ میں ابھی سب کے لیے ہدایت جاری کرنا ہوں۔"

پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا اور مجھے خیمے سے باہر جانے دیکھ کر بولے۔ "تم شرمناک کیسے؟ اس وقت تو تمہیں سڑک پر کوئی گدھا بھی نہیں ملے گا جس پر بیٹھ کر جاؤ۔"

"اس مسئلے پر میں نے غور نہیں کیا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ میں پیدل ہی روانہ ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"تم زبے گھاڑو۔" ان کا موزاب کافی خوشگوار ہو چکا تھا۔ میں پہلی بار انہیں اس لیے میں بات کرتے رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ چھڑی شگلے لگے۔ جتنی دیر سے میں ان کے ساتھ تھا وہ میری ہی طرح مصروف تھے۔ کئی گھنٹے افراتفری اور آپشن میں ہی گزرے تھے۔ اس دوران میں نے انہیں ایک بار بھی چھڑی پتے نہیں دیکھا تھا لیکن خیمے میں آئی انہوں نے چھڑی شگلہ لگائی۔

ایک شخص لے کر وہ بولے۔ "میں سانس سے ایک گاڑی سڑک پر بھجوا دیتا ہوں۔ تم جیسی سے کھل کر سڑک پر پہنچو گے تو وہ تمہیں وہیں کھڑی ملے گی۔ اس قسم کی کسی بھی صورت حال کے لیے ہماری ایک گاڑی اسٹینڈ بائی رہتی ہے۔"

انہوں نے گدڑی کے نیچے سے ایک واکی ٹاک ٹکلا اور کسی کو حکم دیا کہ وہ گاڑی لے کر اسی جگہ پر پہنچ جائے جس کے بارے میں اسے علم تھا۔ واکی ٹاک بند کر کے وہ گدڑی کے نیچے کھینچتے ہوئے بولے۔ "اب تم ذرا آرام سے بیٹھو۔ سڑک تک چلے جاؤ۔"

میں ان تیلوں کو خدا حافظہ اور شب بخیر کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔ سڑک تک میں جان بوجھ کر ذرا مست رفتاری سے پہنچا۔ سامنے ہی سڑک کے کنارے ٹھیک اندھیرے میں ایک سفید وین کھڑی تھی۔ میں اسے سانس پر دیکھ چکا تھا۔ اس لیے قریب جا کر بے فکر سے دروازہ کھول کر اس میں جا بیٹھا۔

"کہاں جانا ہے سر؟" ڈرائیور نے میری تراسر مفلوک الحالی کے باوجود مجھے "سر" کہہ کر غالب کیا جس پر میں حیران ہوئے بغیر نہ نہ نکلا۔ میں نے اسے اسپتال کا نام بتایا اور اس نے آندھی طوفان کی سی رفتار سے گاڑی دوڑا دی۔ سنان سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم غلہ ہی اسپتال پہنچ گئے۔ اس اسپتال کا ایک ہی گیٹ تھا۔ اس کے عقب سے سڑکیں شاخوں کی طرح پھوٹی تھیں۔

بہت بڑا وہ گیٹ اس وقت بند تھا اور اس پر سسٹم کاروائی نہ تھی۔ ڈرائیور نے انہیں کوئی کارڈ دکھایا اور انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ میرا حلیہ اس قسم کا تھا کہ اگر میں اکیلا وہاں پہنچتا اور پیدل

کہا۔ "میں صاحب کے ساتھ کام کرنے سے تو بہتر ہے انسان کارپوریشن میں ملازمت کر لے۔"

"تو کن سی کارپوریشن؟" راحیل نے وضاحت چاہی۔  
 "وہی۔۔۔ اپنی سہیل کارپوریشن۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔ "انسان وہاں جہدار کے طور پر بھرتی ہو جائے اور کوشش کرے کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے پہلے ہیڈ جہدار کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو سکے۔"

"ہاں۔۔۔ اپنی اوقات کے مطابق تم نے صحیح سوچا ہے۔" راحیل ہنسی بخند کیے ہوئے۔

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے سہلاتے ہوئے کہا۔  
 "لیکن انیس سو رہے گا کہ تم مجھ سے پہلے ہیڈ جہدار کے عہدے پر فائز ہو سکتے۔"

"دیکھ۔۔۔ ذاتیات پر حملہ کرنے کی نہیں ہو رہی۔ ورنہ میں بھی تمہاری ذاتیات پر حملہ کر دیتی اور میں ذاتیات پر بھی گن سے حملہ کرتی ہوں۔" وہ گاؤں کی جیب سے دو بانہ کھن نکالے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری کمپنی میں سوراخ کر دوں گی اور میرے خیال میں کمپنی بھی ذاتیات میں شمار ہوتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ بکواس چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔  
 "کچھ نہیں۔ ایک ہاتھ پڑھ رہی تھی۔" اس نے دوسرے ہاتھ میں دایا ہوا ناول میری طرف اٹھال دیا۔ وہ انگریزی کا ایک ضخیم اور سنسنی خیز قسم کا ناول تھا۔

"اور۔۔۔ میں سمجھا کوئی سنجیدہ کتاب پڑھ رہی تھیں۔" میں نے بائیس سے کہا "شاید تھیں پتا نہ چلا ہو لیکن اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ سنجیدہ قسم کی کتابیں پڑھا کر۔"

"میں ذرا جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ تحریری سنسنی خیزی اور عملی سنسنی خیزی میں کیا فرق ہوتا ہے۔" وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے حیرت ہو رہی تھی یہ مصنف لوگ کتنے مزے سے "ایکشن" سے محروم "بڑا دل صفات لکھتے چلے جاتے ہیں اور لوگ بھی کیا مزے سے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ چند منٹ کے ایکشن میں حصہ لینے والوں کی کس طرح بے چین لگ جاتی ہیں اور تھوڑے بہت ایکشن کے ساتھ زندگی گزارنا بھی بڑے مضبوط اعصاب کے لوگوں کا کام ہے۔"

"اتنے سنجیدہ مشورعات پر اتنے رنجیدہ انداز میں غور ست کیا کرو۔" سنا ہے کہ میں تو پہلے ہی بے خوابی کی شکایت ہو چکی ہے۔ راتوں کو دور تک جاگتی رہتی ہوں۔ ہسپتال میں رہتی ہوں اور تمہیں اتنی توجہ نہیں ہوتی کہ کسی ڈاکٹر سے پوچھ پڑھ پاؤ خواب آور گولیاں لے کر چلاک بنیں۔"

"تمہیں اس دنیا میں میری موجودگی سے اتنی تکلیف ہے تو چلاک بنی ہوں۔" وہ کھن جیب میں رکھتے ہوئے بولی۔

جاننے کی دھن چھیر دی گئی ہو۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کمال ہو گیا بھئی! تم تو مجھے خامے سے موبیٹار ہو گئے ہو۔ کال بیل سے پالو کا کام لے لیتے ہو۔ جس میں تو اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔"

"یہ دنیا ایک اسٹیج ہی ہے سہنسہ اور میں اس پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔" وہ غصا لگے ہوئے بولی۔

"زیادہ ٹیکسیشن اسٹاکس اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ جذبات میں سوچ آجائے گی۔" میں نے کہا۔

اس لمحے برآمدے کی لائٹ آن ہو گئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ راحیل ٹائٹ گاؤں میں تھی مگر اس کے ہاتھ میں کھن اور دروازہ اس نے بڑی احتیاط سے کھولا تھا حالانکہ ٹوٹی نے "کھل جا سم سم" والی دھن بجائی تھی۔

راحیل نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا پھر کمری سنجیدگی سے بولی۔ "معاف کرنا بابا! یہ کوئی وقت ہے کسی شریف خاتون کا دروازہ کھٹکھٹانے کا؟"

اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی کچڑ میں تھری ہوئی بھاری بھر کم پٹاوری چپل دروازے میں پسنائی اور دروازے کے ہینڈل پر مضبوطی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مہم معاف کرنے والے فقیر نہیں ہیں بابا!۔۔۔ خصوصاً شریف خواتین کو۔"

ٹوٹی واپس مڑتے ہوئے بولی۔ "میں چل ہوں۔ میں اپنی ڈیوٹی پر موجود ہوں اور انھوں کی طرح مکان کے چکر کرا رہا ہوں۔" اس نے گویا راحیل کو مطلع کیا۔

"انھوں کی طرح کیوں لگا رہے ہو؟ انھوں کی طرح چکر لگاؤ۔" راحیل نے اسے چہایت کی۔ "وہی تم میری حفاظت کے فرائض کتنے عمدہ طریقے سے انجام دے رہے ہو۔ ایک شٹلڈانیر مردوا میرے گھر میں کھسا چلا آ رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو میں مکان کے گرد چکر کرا رہا ہوں۔ تم میری حفاظت کر رہے ہو یا مکان کی؟"

"اس "شٹلڈانے" کے آنے کے بعد آپ کی حفاظت خود بخود ہو جائے گی۔ میرے ذمے اب صرف مکان کی حفاظت رہ گئی ہے۔" ٹوٹی خفیف سی مسکراہٹ کے بعد بولا اور میز چایاں اتر کر لان کے اندر سے میں غائب ہو گیا۔

راحیل نے لفظی سانس لی اور دروازہ بند کرنے کی مصنوعی کوشش ترک کر دی۔ اس وقت اس کے چہرے پر غصہ سے دوپٹی پڑی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا چہرہ آدھا سیاہ اور آدھا سفید نہیں بلکہ اس پر شید پڑ رہا تھا کسی آئرش کے چین ورک سے بنائے ہوئے خوب صورت اسٹیج کی طرح۔

میں نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا اور خصوصی حفاظتی پولٹ بھی پڑھا دیا۔ پٹاوری چپل آواز کا ایک طرف پھینکتے ہوئے میں نے اندر میں ہی قاتلین پر گاؤ گئیے کے سارے شیم وراژ ہو کر

"نہیں سہنس وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ قاعدہ ضابطہ کے قوی ہیں۔ اپنے مخصوص دفتری سے انداز میں کام کرتے ہیں۔ خواہ خانہ بدوشوں کی ہستی میں رہ رہے ہوں۔ جب ملے ہو گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو ہر روز تمام حالات سے آگاہ رکھیں گے۔ تو بس۔ اس پر عمل ہو گا۔ ان کے لیے یہ بات قیام اہم نہیں تھی کہ تم یہاں آرہے تھے۔"

"تمہوں نے تمہیں مکمل اور مفصل رپورٹ دے دی؟"

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے۔ میرا خیال ہے۔ شاید کل برسوں ہی اس دروازے کو بلاسٹ کرنے کے اختتامات مکمل ہو جائیں گے۔ خیر۔ چھوڑو اس کو اس کو۔ یہ مسئلہ تو معلوم نہیں کب تک چلے رہیں گے۔ یہ تو بتانا۔ تم نے کچھ کھانا وغیرہ بھی کھا ہے یا نہیں؟" وہ اپنا ٹاول مجھ سے واپس لے کر ایک طرف رینگے ہوئے ہوئے۔

"کھانا؟" میں نے کراہ کر کہا۔ "خالم لڑکی! یہ تم نے کم خوابیدہ ذہنوں کو بیدار کر دیا۔ خانہ بدوشوں والی ہستی میں شیر صاحب نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی لیکن میں۔۔۔ ایک اپنا اسٹینڈرڈ کچھ اونچا کر لیا اور دل میں سوچا کہ میں کم ڈھنگ کی جگہ پر کسی ڈھنگ کی لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر ڈھنگ کا کھاؤں گا۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں آ گئے؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "یہ ایک اسپتال ہے۔ اس لحاظ سے اسے ڈھنگ کی جگہ نہیں کہا جاسکتا۔ نہ ہی یہاں کوئی ڈھنگ کی لڑکی موجود ہے اور۔۔۔ موجود ہے وہ ڈھنگ کا کھانا بھی نہیں بنا سکتی۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ میں اپنا اسٹینڈرڈ کچھ منجھے لے آ ہوں۔ جو کچھ بھی میرے آجائے گا۔ مگر شکر ہے کھاناں گا۔ آخر قاعدہ بھی کوئی چیز ہے۔" میں نے غلوں سے کہا۔ "میرے لیے یہی خوشی کافی ہے کہ تم نے اعتراف کر لیا کہ تم ڈھنگ کی لڑکی نہیں ہو۔ ڈھنگ کی لڑکی ہو تو اب تک مجھ جیسے کسی ڈھنگ کے آدمی کا کھر تیار کر چکی ہو تو اس اور رائفلوں یا کلاشنکوفوں وغیرہ کے بھانے چھوڑو اور کٹکڑیوں وغیرہ سے مکمل رہی ہو تب۔"

"شروع ہو گئی تمہاری بکواس۔" وہ اٹھتے ہوئے ہوئے بولی۔ "جہنم ہو گا کہ میں تمہارے منہ میں کچھ ٹھونس کر تمہاری زبان بند کر کے کی کوکشل کروں۔"

وہ کچن میں چل گئی اور میں ہاتھ دھو کر دم میں چلا گیا۔ اس گھر میں گزارے لائق کچھ مردانہ کپڑے موجود تھے۔ راجیلہ نے مجھے ایک صاف ستھری شلوار قمیض دے دی تھی۔ جب تک میں شاور لے کر اپنی حالت کچھ شرفناں اور معززانہ بنا کر ڈانٹنگ روم میں پہنچا تب تک راجیلہ نے کچھ ریڈی میڈ فٹنگ کا کھانا تیار کر کے میز پر سجایا تھا اور خود کافی پی رہی تھی۔

"نہیں۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ اس سے کم مقدار کا تم پر اثر ہونا ذرا مشکل تھا۔ سوائی کھوپڑی والوں کو ذرا چوری دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاؤں بڑھ پاؤں گولیاں کھاتے ہیں تب ایک آدھ گھنٹا سوتے ہیں اور ایک آدھ خواب۔۔۔ بلکہ خواب کی نظر آتا ہے۔" "ہیں تو اب ایک ہی گولی چین کی نیند سلائے گی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "وہ بے بدوق کی گولی۔"

"دل چھوٹا نہ کرو۔ وہ بھی نصیب ہو جائے گی۔"

"کئی بار نصیب ہوتے ہوئے رہ گئی ہے۔ تمہارا ساتھ میرا ہوا تو گولیاں بہت۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اب بکواس ہی کرتے رہو گے یا کوئی کام کی بات بھی کرو گے؟ میرا خیال ہے تمہیں ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ آفس تک رسائی کی کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی اور اُدھر کی ہانگے بارے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں تقریباً اچھل پڑا۔ "تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ آفس تک پہنچ گئے تھے؟"

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟" وہ اطمینان سے بولی۔ "حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام وقت نفیس صاحب تو میرے ساتھ تھے۔ میرے سامنے انہوں نے تمہیں فون نہیں کیا۔۔۔ تو پھر تمہیں کس نے اطلاع دی؟"

"میں ان کی دست راست ہوں۔ مجھے ہر بات کی رپورٹ تو لازماً ملنا ہوتی ہے۔" وہ گویا میری حیرت سے محفوظ ہوتے ہوئے شرارتا مسکرائی۔

"ابھی دست راست ہو جو گھر پر بیٹھی آرام کر رہی تھیں۔۔۔"

پھر میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ جو نفیس صاحب کا بابا یاں پاؤں ہے نہ ان کے ساتھ کھنسا پھر رہا تھا۔"

"ہم نے بہت خواہی اٹھائی ہے یہی اب تمہاری باری ہے۔" وہ اطمینان سے دہرائے ٹک لگاتے ہوئے بولی۔ "آخر تم واپس آئے ہو، تمہاری خاطر قاضی کا بھی بددوست ہونا چاہیے۔"

"خدا اچھا کرے۔ جی جی بتاؤ۔ تمہیں کس نے رپورٹ دی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نفیس صاحب نے ہی دی ہے۔۔۔ اور کون دے سکتا تھا؟ ان کے علاوہ کئی کو برا اختیار نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہوں نے کس وقت اطلاع دی؟"

"ابھی چند منٹ پہلے۔ جب تم یہاں آنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔"

"خدا ہو گئی ہوئی! میں نے جیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔" جب انہیں معلوم تھا کہ میں یہاں آ رہا ہوں تو رپورٹ دینا ضروری تھی؟ میں تو دل ہی دل میں نیچوں کی طرح خوش ہوا تھا کہ یہ خوشخبری خود تمہیں سنائیں گا۔ انہوں نے سارا سہنس ہی ختم کر دیا۔ بڑے ہی سہنس دشمن آوی ہیں۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ ”ایک تو جیسے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ اوپر سے رات گئے کالی پتی ہو۔ تمہارا دل بھگ ہے؟“

”جس گدھے نے تم سے کہہ دیا کہ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی؟“ اس نے لگ کے اوپر سے مجھے ٹھکودا۔

”وہ گدھا ہمارا لہان پر اس مکان کے ارد گرد گھاس چرتا پھر رہا ہے لیکن اتفاق سے وہ چار ٹانگوں والا گدھا نہیں ہے اور شاید زمانے کے صدات اٹھا اٹھا کر اس کی ذم بھی کھس گئی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس نے شاید خواہوا ہی تمہارے ذہن میں اگلے سیدھے خیالات ڈالنے کے لیے یہ شوشا مچا دیا ہے۔ میں کوئی قلمی بیرونی نہیں ہوں جو بیرو کے فراق میں راتوں کو جاگتی رہوں۔ میں اپنی مرضی سے جاگتی ہوں۔ ایک طویل مدت کے بعد آج کل پھر میرا کچھ نہ کچھ ہنسنے کوئی چاہئے لگا ہے اور رات کے شانے میں بڑھنے کا ذرا زیادہ لطف آتا ہے۔ جس قسم کی بے ہودہ زندگی ہم گزار رہے ہیں اس میں اگر اعصاب پر تناؤ ہوتا ہے تو رات کے مٹھانے سے میں بالکل تازہ دم اور ہلکی پھلکی ہو جاتی ہوں۔ جب چاہتی ہوں سو جاتی ہوں۔ بلکہ بعض اوقات تو رات کو کالی میرے لیے نرنگلا ناز کا کام دیتی ہے۔ اگر نیند میں بھی آرسی ہوئی تو کالی لپکا کر آ جاتی ہے۔“

”خیر۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔“ میں نے مستافانہ انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ”تم تو پیدائشی طور پر ہی آلت پلٹ قسم کی چیز ہو۔“

پھر میں نے دوسرے سینڈویچ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بھنگی طور پر بھی تم نے بڑے عمدہ سینڈویچ بنائے ہیں۔ اگر میں نے بھی لاہور میں ہوئی بنایا تو جیسے ضرور شیفت کے طور پر بھرتی کروں گا۔ مگر میں تو تم خانہ دار خاتون کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے تیار نہیں ہو لیکن اس معززانہ پوسٹ کے لیے تو ہائی بزنس کی ہے؟“

”بندی اس اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے لائق بھی نہیں ہے۔ میری طرف سے بیٹھی معذرت قبول فرمائیے محترم ٹائیگن صاحب! اسی نے کالی لگ لگ میرے رکھ رکھوں ہاتھ جوڑتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا۔

”دوسرے۔ بالی دادے۔۔۔ جیسے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھنے کا خیال کس طرح آیا تھا؟“

”میری شامت نے دعوت دی تھی۔“ وہ ہنسی سانس لے کر بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ نیکی کرنے کا انجام پڑا ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہہ دوں کہ مجھے ہزاروں بار کے تجربات یاد نہیں رہے تھے۔ مجھے تمہارے چہرے پر ہموک لکھی نظر نہ آئی تھی۔ اس لیے پوچھ لیا تھا۔“

”وہ محبت کی ہموک تھی یا دانا لڑکی! جیسے کبھی احساسات کی

زبان سمجھتا نہیں آئے گا۔“ میں نے دودھ بھرے لیمے میں کہا۔ ”میں اس کے لیے جلد ہی کوئی اچھی سی ”گٹ“ خرید کر لایا۔“

”اس نے کوشش کروں گی۔“ اس نے غلوں سے وعدہ کیا اور کالی لگ لگ ہونٹوں سے لگ لیا۔

میں اس وقت جو تھے سینڈویچ پر ہاتھ صاف کرنے میں مصروف تھا جب وہ کسی کھوں کی خاموشی کے بعد عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اُنی! ایک بات پوچھوں۔۔۔ ایمانداری سے بتاؤ گے؟“

”نہیں۔ میں تو پیدائشی بے ایمان ہوں۔ بات کا جواب دینے میں بھی ڈیڑی ماہوں گا۔“ میں نے خواب دیا۔

”اُنی! بچہ! میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی عجیبہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے دھیمے لیمے میں کہا۔ ”تم تو سنجیدہ سے زیادہ رنجیدہ نظر آ رہی ہو۔ خیر۔ پوچھو کیا پوچھتا ہے فریادی! بادولت پوری ایمانداری سے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔“

وہ میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا جیسے واقعی پہلے والی راحیلہ اور اب والی راحیلہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا؟ جیسے میرا چہرہ بالکل عجیب نہیں لگتا؟“

”جیسے میرے دلے میں کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟“ میں نے اٹھا اُسی سے سوال کر دیا۔

”بناویدہ ہمیشہ ایک جیسا رکھنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ یہ کام تو تم میرا دل دیکھنے کے لیے بھی کر سکتے ہو۔“ وہ بولی۔

”میں اتنا اچھا ایئر نہیں ہوں۔“ میں نے اپنے لیے کالی اٹھاپتے ہوئے کہا۔

”مجھے دل کی گمراہیوں کی بات بتاؤ۔ میرا چہرہ دیکھتے ہو تو کیا محسوس کرتے ہو؟“ اس کے لیے میں نے اصرار کیا۔

”کیا کہ چاند پر کوئی بدلی چمکی ہے۔۔۔ گزر جائے گی۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ چند لمبے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ تھرتھرائے لیکن آواز نہیں نکلی۔ پھر اس نے گویا وہ بات کہنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور سر جھٹک کر باہوں میں اٹھکھان پھیرتے ہوئے بولی۔ ”قارمٹ! بس! بس! پھر بھی کیا ذکر لے کر بیٹھ گئی۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”راحیلہ ڈیرا! اب تم مجھے ایک بات ایمانداری سے بتاؤ۔ تم اپنی ذات پر یہ جبر کیوں کرتی ہو۔۔۔ اور کب تک کرتی رہو گی؟“

”گوگوں سا بچہ؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

”تم کچھ کہنا چاہتی ہو مگر نہیں کہیں۔ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر نہیں کہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ شاید تمہارے کانوں کو بھلا لگتا ہے لیکن تم اس کا اقرار نہیں کرتیں۔“

دھوٹی کی سی خیر سے اس طرح اچانک جاننے کے باوجود میں بکرا  
ہی چڑھتا ہوا گیا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ جس آواز نے جگایا  
وہ مجھے ایسی زیادہ خطرے کی علامت نہیں تھی۔ دروازے پر کوئی  
نہایت آہستہ سے ایک انگلی سے دھک دے رہا تھا جبکہ دروازہ غیر  
متعلق ہی تھا۔

"اے! اے! یہ آواز سرگوشی کی طرح میرے کانوں تک  
پہنچی۔ وہ راحیلہ کی آواز تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔  
ہمارے کمرے کے درمیان کھڑی دیوار اب اور ہماری زندگیوں کے  
درمیان حائل غیر ملکی دیوار گر گئی تھی؟ کیا اس نے فیصلہ کر لیا  
کہ ہمیں ایک دوسرے کا ہونا چاہیے؟ ایک دوسرے کے دہر  
میں پناہ لینے کی بات ہے؟

"آج آج... دروازہ کھلا ہے۔" میں نے کہا۔ میرے حلق سے  
عجیب سی آواز نکلی تھی۔ اس میں غنودگی کا شمار بھی تھا اور امید  
کی لرزش بھی۔ ان محنت شکنہ آرزوؤں کی پکار بھی تھی اور اختلا  
و اشتیاق کی تھر تھراہٹ بھی۔

"نہیں۔۔۔ تم باہر آ جاؤ۔ بہت ضروری بات ہے۔" فیکر  
صاحب کا فون ہے۔" راحیلہ کی آواز اب مجھے زرا واضح سنائی د  
اور میرے تصورات کی عمارت خاموشی سے نشیب و نشیب ہو گئی۔  
"اللہ ان نفیس صاحب سے نیچے۔" میں نے زہر لب کہا اور  
کسیل پیچیک کر رہا تھا۔

لاؤنج میں آنکر مجھے پتا چلا کہ صبح ہو چکی تھی تاہم ابھی دھور  
نہیں چھلی تھی۔ وہ گواہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اور ہاتھ  
تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جھکن "احسان کشیدگی  
شب بیداری کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کے چہرے  
کے سیاہی مجھے پر تو مگر اب تاثرات بھی کہیں ماری میں کم ہو جا  
تھے۔ صرف سفید جھپٹ پر تاثرات کا صحیح طور پر پتا چلتا تھا۔  
ایک عجیب بات تھی۔

"نہیں صاحب پر صبح ہی صبح کیا مصیبت، آن پڑی؟" میں نے  
کاٹ کر کھانے والے لمبے میں پوچھا۔  
"مصیبت صبح نہیں رات میں پڑ تھی۔" وہ مسکرائے۔  
"شہر ہے پھر بھی شہریت ہی رہی۔" وہ قرب و ازان  
بات کر رہا۔ "اس نے موبائل فون مجھے تھما دیا۔ میں لاؤنج تک  
جا بیٹھا۔

نفیس صاحب نے مجھے راحیلہ سے یہ کہتے سن لیا تھا کہ نیہ  
صاحب پر صبح ہی صبح کیا مصیبت آن پڑی۔ وہ میرے "سیلو" کئے،  
بولے۔ "برخوردار! جو مصیبت ہم پر پڑے گی صبح دو اگر صحیح طر  
پڑ جائی تو اس وقت میں تم سے بات نہ کر رہا ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہو گئی حضرت؟ رات تو میں آپ لوگوں کو تھما  
ٹھا کہ اور یہ خود غایت چھوڑ کر آیا تھا۔" میں نے حیرت سے کہا  
تو کہ نفیس صاحب کا لہجہ خوشگوار تھا مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھ

"نہیں۔۔۔ ان باتوں کو میںیں قطع کر دو۔ میں اس قسم کے  
موضوعات پر بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے ایک مختصر سا سوال پوچھنا  
تھا۔ اس کا جواب مجھے مل گیا ہے۔ اب بات ختم۔" وہ مک میز پر  
رک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں سوئے جا رہی ہوں۔ شب بخیر۔"  
وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ میں نے جلدی سے یہ آواز  
بلند کیا۔ "مہیش! اپنے جذبات کا گھٹا گھٹا کھینچو اور میرے جذبات کو  
مجموع کرتی ہو۔ میں تمہیں بددعا دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ میں کوئی  
بے شر پھر رات بھر کاٹا رہے اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو۔"  
اس نے کمرے میں داخل ہو کر کھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور  
بولٹ چڑھایا۔ میں کافی غم کرنے کے بعد بھی دیر تک وہیں بیٹھا رہا  
جی کہ مجھے غنودگی آنے لگی۔ ممکن اس قدر تھی کہ کافی بھی اسے  
دور کرنے میں کامیاب رہی تھی اور غنودگی مجھ پر قلب پانے لگی تھی۔

راحیلہ کے کمرے کے دروازے کے نیچے دو دھڑکی کی باریک سی  
لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ یقیناً اب تک جاگ رہی تھی۔ معلوم  
نہیں وہ اب تک ناول ہی پڑھ رہی تھی یا مجھنے دل کا کوئی ایسا دوق  
پڑھ رہی تھی جس پر تھیں کے سود زیاں اور زندگی کی نا آسودہ  
سامانوں کا حساب درج تھا۔

آخر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کے برابر والے کمرے  
میں سونا تھا۔ میں جا کر بستر پر چڑھ گیا۔ میں نے دروازہ بند ضرور کر  
وا لیکن بولٹ چڑھانے کی زحمت نہیں کی۔ کمرے کی لائٹ آف  
تھی۔ میں نے اسے آف ہی رہنے دیا۔

میں ڈانٹک بچپن پر بیٹھا تھا تو چند سے آنکسین بو جھل تھیں۔  
لگتا تھا کسی بھی لمحے کمرے سے آنکھیں جاؤں گا۔ اب آرام وہ بستر  
آکر لینا تو تیز رفتور تھا جیسے آنکھیں صحت و صحت ہو گئی حالانکہ ایسے  
نہی کسی صاف۔ بخیر اور آرام وہ بستر کی آرزو میں نہیں خانہ  
پرو خوشی کی ہستی سے ٹھاکا تھا۔

راحیلہ کے کمرے میں شاید ابھی تک لائٹ جل رہی تھی؟  
شاید وہ روشنی میں جاگ رہی تھی اور میں اندر میرے میں جاگ رہا  
تھا۔ میرے اور اس کے کمرے کے درمیان صرف ایک دیوار  
تھی۔ میری اور اس کی زندگی۔ میری اور اس کی سوچ کے  
درمیان بھی ایک غیر ملکی دیوار تھی۔ میں اکثر سوچتا تھا معلوم نہیں  
یہ دیوار بھی کمرے کی کیا نہیں؟

بہت دیر تک جاگتے رہنے کے بعد جلی آنکھیں آخر کار جھک  
گئیں۔ غنودگی نے مجھ پر پلٹ کر حملہ کیا۔ میں نے گہری میں وقت  
دیکھنے کی زحمت تو نہیں کی لیکن میرا خیال ہے مجھے رات کے پچھلے  
چہرے یاد آئی تھی۔

سوئے والے کی اگر اچانک آنکھ کھلے تو اسے احساس نہیں  
ہو گا کہ وہ کتنی دیر سویا تھا۔ خصوصاً میری جو حالت تھی اس میں تو  
اندازہ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ چنانچہ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یہی  
لگا جیسے میں صرف چند منٹ سویا تھا۔ مجھے کسی آواز نے جگایا تھا اور

"کئی نقصان نہیں ہوا۔" نہیں صاحب! اطمینان سے بولے تب مجھے احساس ہوا کہ راحیلہ بھی اطمینان سے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ جتنا نہیں صاحب سے سب کچھ پہلے ہی پوچھ چکی تھی یا نہیں صاحب خود ہی اسے سب کچھ بتا چکے تھے۔

"تو پھر یہ کس قسم کی بیماری تھی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔  
"اصل میں وہ اپنے ٹارگٹ کو جٹ نہیں کر سکی لیکن ہمیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کا ٹارگٹ ہماری بستی ہی تھی۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ تم نے رات ہی اس بستی پر جان کم چلائے اور جلد بچائے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کے لیے ہدایت جاری کر دی تھی۔ چند منٹ بعد ہی بستی اندر سے میں ڈوب گئی تھی اور اس کے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد بیماری ہو گئی لیکن وہ اندر سے ہی کی وجہ سے صحیح ٹارگٹ پر ہم نہیں گرا سکے۔ انہوں نے روشنی کا کام چھیننے یا کسی اور طریقے سے علاقے پر روشنی پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ خود بھی روشنی کی زد میں آنے سے ڈر رہے تھے۔ انہوں نے غلط میں بس چند ہم گرائے اور غائب ہو گئے۔ ہم نے غیار سے کی صرف آواز ہی سنی تھی۔

"ہم کہاں گئے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سائٹ اور بستی کے درمیان۔" نہیں صاحب نے جواب دیا۔ "کافی اونچی جگہ تھی۔ زمین میں خاک سے بڑے اور گہرے گڑھے پڑے ہیں۔ سائٹ کو بھی کچھ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو یہی محسوس ہوا تھا جیسے ہم بستی پر ہی گئے ہیں۔ سبب وہاں سے ہو گئے تھے۔ اگر ان میں سے دو ہم بھی بستی پر گر جاتے تو ہمارا تو کام تمام ہو جاتا۔" انہوں نے لگنا سنا قطعہ لگایا پھر سنجیدگی سے بولے۔ "اب تو میں نہیں رہا ہوں لیکن اس وقت میں بھی حیران و پریشان ہو گیا تھا۔ ویسے خواہ ہم پر کتنے ہی دور شودر سے حملہ ہو جائے۔ مجھے اتنی حیرت نہ ہوئی لیکن غیار کے ذریعے ہم گرائے جلا سیر نہ کیے۔ یہی ناقابلِ یقین تھا۔"

پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ "سائٹ پر تو کبھی موجود ہے اور وہاں رات کو کچھ نہ کچھ لائٹیں چلتی رہتی ہیں لیکن ہماری قسمت اچھی تھی کہ اس وقت وہاں لائٹ گئی ہوئی تھی۔ کبھی کسی اس قسم کے بریک ڈاؤن ذمّت کے بجائے رحمت کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ وہاں بھی کافی آدمی موجود ہیں۔۔۔۔۔ شاید وہ فائیاں دیکھ کر غیار وہیں ہم کو رکھا۔ جہاں اونٹنوں، دونوں طرح کا نقصان ہوتا۔ بہر حال۔۔۔۔۔ تاثر تاریکی کے باوجود غیار نے اپنے ٹارگٹ کے کافی قریب ہم گرائے۔"

"اب آپ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اوپر اور کھٹ کھٹ ٹھکانوں پر بکھر گئے ہیں۔ بستی ہم نے فوراً خالی کر دی تھی۔ اپنی ضروری چیزیں وہاں سے ہٹا لی تھیں۔" انہوں نے بتایا۔

"اتنی جلدی؟" مجھے کچھ حیرت ہوئی۔

کچھ سنجیدہ تھا۔  
"معیشت کو آنے کوئی بندر لگتی ہے۔" تھیں۔ تو اکثر شہادت کٹ سے آتی ہیں۔ نہیں صاحب بولے بعد ہر دستہ ہر شوکار

تو آخر ہوا کیا؟ کچھ بتائیے تو سی۔ "میں نے زور دے کر کہا۔  
"اب تو انہوں نے ہونے لگی ہیں برادر! وہ لٹھڑی سائٹ لے کر بولے وہ مجھے کسی بھی القاب سے مخاطب کر لیتے تھے۔ کبھی رنڈو دار، کبھی برادر! کبھی بڑے کھلف سے مسٹر جی پوری، کبھی کہنے لگتے تھے اور کبھی بے کھلف دوستوں کی طرح اپنی یا افضل بھی کہہ لیتے تھے۔

"انہوں نے تو ہمارے ہاں ایک مدت سے ہو رہی ہیں۔ آپ تک اطلاع بہت دیر سے پہنچی ہے۔" میں نے ان سے بھی زیادہ غلطی سائٹ لے کر کہا۔ "بلکہ بعض اوقات تو پتہ بھی ہی نہیں۔" ہر میں نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ پل کہاں سے رہے ہیں؟ خانہ بدوشوں والی بستی ہے؟"

"اب وہاں کوئی خانہ بدوشوں والی بستی نہیں رہی۔" انہوں نے غمناک لہجے میں اطلاع دی۔

"تو آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔  
"رات بستی پر بیماری ہوئی تھی۔" انہوں نے شرمسارے لہجے میں بتایا۔

"کیا؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ "آپ کسی خطرناک سرحدی علاقے میں تو نہیں بیٹھے تھے۔ آپ پر کس کا جواز بیماری لڑ گیا؟"

"یہ تو جانتی نہیں چلا۔ رات کی تاریکی میں ایک نامعلوم غیار لایا اور چند ہم گرا کر غائب ہو گیا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں نے اپنے اندر جھپٹے ہوئے ایک بے عنوان سے مجھے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اب اس طرح می ہوا کرے گا کہ ایک نامعلوم غیار آئے اور ایک دار الحکومت کے نواحی علاقے میں بیماری کر کے چلا جائے؟ کسی کو اس کے رستے میں کچھ پتا نہ چلے۔ کوئی اس کے بارے میں ہدایت ہو سیکر ہو؟" اس نے کہاں سے سرحد عبور کی؟ ہمارا ریڈ اسسٹم کیا کر رہا تھا؟ کیا وہ کسی کی نظر میں نہیں آیا؟ اور اتنی ہی آسانی سے آئب بھی ہو گیا؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ تو بڑی خطرناک علامت ہے۔"

"ہمیں اس پر غم سے زیادہ تشویش ہے۔" نہیں صاحب بولے۔ "اس کی عملی تفتیش اور تحقیقات تو ہوگی۔ بلکہ یوں سمجھو کہ شہر ہو چکی ہے لیکن اب الحال تو دوسرے مسائل ہیں۔"

"یہ بتائیے نقصان کیا کیا ہوا؟" میری مراد جانی نقصان سے تھی۔ میرا دل ذرا تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہمارے بھی دو تین ماگھی وہاں تھے۔

میں نے ایک نظر راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
"سوچیں اگر میں نے آپ کو روشنیوں کے بارے میں خبردار نہ  
ہو تا تو کیا ہو گا؟"

"مجھے تو تم ہی محکوک گنتے تھے۔" نہیں صاحب کے  
میں چھپتی تھی۔ "میں تم دشمن کے ایجنٹ تو نہیں ہو گا؟ تم  
ڈانٹ کے ذریعہ زمین دانے کی تلاش میں اتنے دنوں سے ناک تھ  
مار رہے تھے۔ تم نے جانے کہاں کہاں سے پھٹتے پھٹتے  
عرے بعد آئے اور تم نے ایک دن میں ہی اس کا سرا ڈھونڈ لیا  
رات تم نے بظاہر ایک غلطی کی نشاندہی کی کہ خانہ بدوشوں  
بھٹیوں میں اتنی رات گئے تھے۔ اور اتنی تعداد میں بھیاں  
بھٹیں۔ اس کے چند گھنٹے بعد حملہ ہو گیا۔ ایسا لگا ہے کہ تم  
بات پہلے ہی سے معلوم ہوئی ہے۔ تم دشمن کے ایجنٹ معلوم ہو  
ہو۔ پھری کے لیے ہماری صفوں میں شامل ہوئے ہو۔ میں سوچ  
ہوں تمہیں گرفتار کر کے کسی دور دراز مقام پر بھجوا دوں۔"

"یہ تو بت ہی نیک خیال آیا ہے آپ کو۔" میں نے  
اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "آپ اگر مجھے کچھ زیادہ ہی دور  
بھجوا دیں تو میں آپ کا بہت ہی زیادہ ممنون ہوں گا۔ بلکہ بہت  
ہو گا کہ آپ مجھے کسی دوسرے تیارے پر ہی بھجوا دیں۔ اس  
سے تو میرا دل بھر گیا ہے مگر کسی ایسی تیارے پر بھجوائے گا  
مجھی اچھی۔ خوبصورت۔ پیاری پیاری لڑکیاں ہوں۔ را  
جیسی بلیک اینڈ وائٹ لڑکیاں نہ ہوں۔"

راجہ فون کے قریب مت لا کر زور سے بولے۔ "جی ہاں  
انہیں ایسے تیارے پر ضرور بھجوائے گا۔ مجھے یقین ہے وہ  
تیارے کی لڑکیوں نے ہماری دنیا کا ہنس نہیں دیکھا ہو گا۔  
ہمارے دیکھ لیں گی۔"

نہیں صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے۔ "بھئی یہ  
دوسرے کی کھچائی تم براہ راست کرتے رہنا۔ مجھے سچ میں  
کچھو۔"

"دیے میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں کہ میں واقعی دا  
ایجنٹ ہوں۔" میں نے نہیں صاحب سے کہا۔ "اگلی مرتہ  
آپ کو کوئی خبردار کرنے والی نہیں بلکہ مراد دینے والی اطلاع  
گا تاکہ "بھئی" کا حق تو ادا ہو سکے۔"

نہیں صاحب نے قہقہہ لگایا اور خداحافظ کہہ کر سلا  
کر دیا۔ میں نے فون بند کر کے راجہ کی طرف بڑھاتے ہو۔  
"بھاری سے تو نہیں صاحب کا موڈ کافی خوشوار ہو گیا ہے  
معلوم ہوا تو میں پہلے ہی کسی طرح ان کے آس پاس دو  
گردا گردا وہ تو قہقہے لگاتے تھے گی۔"

"میرا خیال ہے لا شعوری طور پر وہ خود بھی خانہ بد  
زندگی سے چھٹکارا پا کر خوش ہیں۔ ان کا یہ آئیڈیا کچھ زیادہ  
جانت نہیں ہوا تھا۔ مجھے تو شروع ہی سے اس آئیڈیا نے

"خانہ بدوشی کی زندگی میں یہی قزمزہ ہے۔ نہ گھبراتے دیر لگتی  
ہے اور نہ ہی انہمازیے ہوئے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔" وہ ہنس  
کر بولے۔ "مجھے تو اس تجربے میں اتنا لطف آیا ہے کہ سوچ رہا  
ہوں ہر سال ایک آدھ ماہ کی چھٹی لے کر خانہ بدوشی کی زندگی  
گزارا کروں۔"

"جی ہاں۔ بطور فضل تو آپ کو اس میں لطف آئے گا۔ اگر  
خدا خواستہ ایسی زندگی آپ کا مقدر ہوئی تو پھر آپ کے خیالات  
کافی مختلف ہوتے۔" میں نے ملاحت سے کہا پھر پچھا۔ "میرے  
سامنے منیر اور مسعود کہاں ہیں؟"

"ایک محفل کلیت میں محفل ہو گئے ہیں۔ باقی لوگ بھی اپنے  
اپنے ٹھکانوں پر موجود ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سب  
کا بوقت ضرورت ایک دوسرے سے رابطہ رہے گا۔" انہوں نے  
کہا مجھے تسلی دی پھر بولے۔ "کل ہی ہم نے بے احتیاطی کی اور  
علی الاطمان ان کے ذریعہ زمین ٹھکانے تک پہنچے آج اس کا رد عمل  
سامنے آیا۔ تم میری احتیاطوں کو کھڑا کر اور فضولیات کہہ رہے  
تھے۔ ایک ہی دن ہم نے اپنی ذرا سی بازی ترک کی۔ چند گھنٹے بعد  
نتیجہ سامنے آیا۔"

"چلیں۔ بات کسی کنارے تو لگی۔ اب جو بھی قدم اٹھانا  
ہو گا مکمل کر آٹھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اب تو یہی سوچا ہے۔" نہیں صاحب ٹھنڈی سانس  
لے کر بولے۔ "آج کل میں دروازہ بلاست کرانا ہے۔ اب یہ کام  
تیار تیار رہوں اور حفاظتی انتظامات کے ساتھ علی الاطمان دن میں  
کر آئیں گے۔ اب کم از کم یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ کوئی چیز سامنے تو  
ہے۔"

"اس مکان پر تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی جہاں اس ذریعہ زمین  
راستے کا بانڈ دریافت ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہاں سے کسی گڑبڑ کی خبر نہیں آئی۔ کمانڈروں  
تقدیمات ہیں۔" نہیں صاحب نے جواب دیا۔ "میں ملاست کے  
انتظامات کر رہا ہوں۔ جو بھی پروگرام ملے ہوا "میں اطلاع مل  
جائے گی۔ تم راجہ اور فونی تینوں کو آنا ہو گا۔ فی الحال اس  
بیماری والے واقعے کے بارے میں تحقیقات کے سلسلے میں بھی  
میرے رابطے جاری ہیں۔"

"یہ خاصا تشویش ناک واقعہ ہے نہیں صاحب! اس کا  
مطلب ہے کل کلاں کو کوئی نامعلوم ٹیپاہ دار حکومت میں داخل  
ہو کر کسی اور اہم مقام یا غارت پر بھی بمباری کر کے خراب ہو سکتا  
ہے۔"

"نہیں خیر۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ہر حال  
کئی شعبوں کو فوراً مزید الرٹ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ  
معلوم کرنا بھی ضروری ہو گا کہ اس مقصد کے لیے کس ملک کا ہوائی  
اڈا استعمال کیا گیا۔" نہیں صاحب پر خیال مجھے میں بولے۔

"تسلی کی بات پہ تم دو لٹیاں مارنے پہ تلی ہوئی ہو؟" مجھے گویا اپنے کانوں میں نہیں نہ آیا۔  
 "ہاں۔" اس نے پاؤں تلخ جواب دیا۔  
 "مجھے ایسا پریمی حیرت ہے کہ تم ڈسٹرب بھی ہوتی ہو۔"  
 "کیوں۔" کیا میں انسان نہیں ہوں؟" اس نے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ تم انسان کے روپ میں کوئی فیمل جن ہو۔" میں نے مصمومیت سے کہا۔

"میں ایک انسان ہوں اور خالعتا محرت ہوں۔ اگر تم نے مجھے اس مقام سے ہٹانے کی کوشش کی تو میں فرائنگ پین مار کر تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گی۔" وہ ایک ہار پھر مکن کی طرف پڑھتے ہوئے بولی۔ "میرے پیچھے مت آنا۔"

میں نے اس کی ایک نہ سنی اور پھر کچھ کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ گویا مجھے قطعی نظر انداز کرتے ہوئے ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ میں بظن میں ہاتھ دسے نہایت سعادت مندانہ انداز میں خاموشی سے کھڑا رہا۔ آخر وہ چپ نہ رہ سکی۔ میری طرف سڑتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کیا لڑکیوں کو بچن میں کام کرتے دیکھنے کا بہت شوق ہے؟"

"سب لڑکیوں کو نہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔  
 "بعض لڑکیاں تو پیدا ہی بچن میں کام کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ مجھے تو اس لڑکی کو دیکھنے کا شوق ہے جو خالی ہاتھ بھی ضرور کی ہڈیاں توڑ سکتی ہے۔ خطرناک آفتیں اسلحہ ہاتھ میں ہو تو کشتیوں کے پٹھے کاٹ سکتی ہے۔ اور بوقت ضرورت بچن میں گھس کر بہت اچھا کھانا بھی پکا سکتی ہے۔"

"تو اب کبھی لگانے کی ضرورت نہیں۔ اب مجھ تو اس قسم کی مہکا پاش کا شکار نہیں ہوتا۔" وہ ہنسنا کر بولی اور دوبارہ فرائنگ پین کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میں..... اور تمہیں کھن لگاؤں؟" میں نے اپنے لہجے میں حقارت لانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرا بس چلے تو میں تمہیں لوہے کے تاروں والے برش سے تار کول لگاؤں۔"

"جا اپنی مشقوں پر آسو بہا کے سو جا۔" وہ انداز توڑتے ہوئے بولی۔

"یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو یا اس چوڑے سے بڑے اس اندے سے لکنا نصیب نہ ہو سکا؟" میں نے پوچھا۔

"جہنم نے لے سکے والے چوڑے سے اگر مجھے کچھ کھنا ہوتا تو یہ کتنی حسرت ان خنجروں پہ جو جہنم کھلے مرجھا گئے۔"

"اب تو میں بھی خود کو ایسا ہی کوئی غنچہ محسوس کرنے لگا ہوں۔" میں نے غمزہ لہجے میں کہا۔  
 "تم غنچہ ہو؟" اس نے پلٹ کر مجھے گھورا۔ "تم تو پھول ہو۔"

اپنی نہیں کیا تھا لیکن میں ان کے عمدے اور بزرگی کے خیال سے چپ تھی۔" راحیلہ بولی۔  
 "مگر جس میرے کسی آئیے سے اتفاق نہ ہوتا تو تم نہ صرف آئیے کے بلکہ میرے بھی نیچے آؤ چڑھا لیتیں۔" میں نے توجہ پھر کر کہا۔  
 "کاش میرے سامنے بھی تم کسی خیال سے خاموش رہا کرتیں۔"

"جب تم ان کی عمر کو پہنچو گے تو میں تمہارے سامنے بھی خاموش رہا کر دوں گی۔ گو کہ تم ان جیسے کسی عمدے کے مالک نہیں ہو گے۔ اس وقت میں کم از کم اس خیال سے ہی خاموش رہا کر دوں گی کہ چلو۔۔۔ جانے دو۔۔۔ بے چارے بڑے میان کا ذہنی توازن ہی ٹھیک نہیں ہے۔ ان سے کیا بحث کرنا۔"

"دیکھو یہ تمہاری نگاہ تھی کہ ہے کہ میں اس وقت کسی بڑے عمدے پر فائز نہیں ہوں گا۔ میرے پاس اس وقت ایک بہت بڑا عمدہ ہو گا۔ جس میں اس کا خزام ضرور کرنا ہو گا۔" میں نے کمری شہید کی سے کہا۔

"کون سا عمدہ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔  
 "تمہارے شوہر نامہ دار کا عمدہ۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے کے سرخ و سفید مجھے پر فرشی زرا بڑھ گئی۔ اس نے ایک کشن اٹھا کر مجھ پر پھینکا لیکن میں جھکا کر دسے کچھ لگایا۔ وہ فخر و غرور سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "اس انتظار میں کہیں بخوانی نہ گزار دینا۔ میرا غلغلہ اور غلغلہ یعنی مفت مشورہ یہی ہے کہ جو خنی کوئی دھنک کی لڑکی ملے شادی کر کر دنا۔"

"لڑکیاں تو بہت ملتی ہیں۔ کوئی راحیلہ نہیں ملتی۔"

"میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔  
 "میں راحیلہ کی بات کر رہا تھا تم ناشتا لینے چل دیں۔ بھلا اٹھتے اور راحیلہ میں کیا قدر مشترک ہے؟" میں نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا۔

"قدر مشترک بس یہی ہے کہ یہ ناشتا راحیلہ بنانے جارہی ہے۔" وہ رگ رگ سڑتے ہوئے بولی۔ اور تم سے درخواست ہے کہ تم یہیں بیٹھے رہو۔۔۔ خودخواہ بچن میں آکر میرے سر پر کھڑے مت ہو جانا۔"

"میرا وعدہ ہے میں فرشی پر ہی کھڑا رہوں گا۔" میں نے کہا۔  
 "سر پر کھڑے ہونے کی مجھے پریکٹس نہیں ہے۔"

"دیکھو..... مذاق کی بات نہیں ہے۔ تم یہیں بیٹھے رہو ورنہ میں قلعہ لگا کر مار دوں گی۔"

"آخر ایسا کون سا خنی قسم کا ناشتا بنانے جارہی ہو کہ تمہیں برا بھلا میں کھڑے ہونا بھی گوارا نہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی میں۔ خودخواہ ڈسٹرب ہوتی ہوں۔ ناشتا ٹھیک سے نہیں بنے گا۔" وہ جھنجھاکا کر بولی۔



کر لو گے دیے بھی وہ جگت میں تھے۔ میں نے ہی ان سے بات کر لی۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہمیں چلنا ہے۔  
”کہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ میری غنودگی نو کافور ہو چکی تھی۔

”وہ جو محسوس دروازہ تم نے دریافت کیا ہے اسے بلا کرنے کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ نفیس صاحب نے کہیں قریب ہی کیپ لگایا ہے وہ چاہے ہیں کہ بلاسٹ کے ہم سب وہاں موجود ہوں۔ اگر راستہ مکمل کیا تو پھر ان کے سامنے ہی اندر جا سکیں گے۔ ان کے آدھی اس دورے علاقے کو مارنے کے بارے میں ہوں گے اور اگر باہر سے کوئی غلطو نظر آیا تو سے نہیں گے۔“ راجیل نے بتایا۔

”چلو بھی۔ اس کا خبر میں بھی حصہ لینا ہی پڑے گا۔“ نے غلطی سانس لے کر کہا۔ ”میں ذرا منہ پر پانی کے دروں۔“

”اس سے تم زیادہ حسین نہیں ہو جاؤ گے وہی بن جاؤ۔“

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ چہرے پر پانی کے دو چھپکے سے انسان حسین نہیں ہو جاتا۔ میں تو سستی اتارنے کے ذریعہ رہا ہوں۔“

”سستی اتارنے کا بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ مجھ سے آ ایک ڈنڈا اکھاؤ۔“ اس نے ایک لگائی۔ میں اس وقت تک دھم کے دواش میں پہنچ چکا تھا۔ منہ دھو کر اور جوتے پہ اس کے ساتھ ہو گیا۔

”وہی بڑی سی دھمک میں پر سرخ حریف میں ایک بڑے طبعی اواز سے کا نام ڈنڈا تھا۔ دروازے سے لگی کڑی مٹی نے ذرا تھک تک سیٹھی تھی۔ میں اس کے برابر بیٹھا اور ڈنڈا ہاری سیٹوں کے نیچے آؤں تک نہیں سوچا۔ دھمک سے روانہ ہو گئی۔

”راستے میں میں نے راجیل سے پوچھا۔ ”تمہارے کیا ہیں ڈنڈا کے اس ٹھکانے پر کوئی لے گا۔ یا جڑ کر لیا جائے آسکیں گی؟“

”تم نے جو راستہ دریافت کیا ہے میں اس کے دروازے کی طرف گئے تھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ اب ہمیں دھم کوئی آدھی لے گا اور نہ ہی کوئی کام کی جڑ لیا جائے گا۔“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ میں نے ”مجھے آپ دونوں کی بات میں ہاں ملاتے ہوئے خوب حق سے ٹوٹی ہوا۔“

”اس وقت سنجیدہ مذاکرہ ہو رہا ہے۔ تم اس میں کراسے لی دی گا نڈا کہہ بنائے گی کوئی شش ست کرو۔“

”اور وہ بھی کو بھی گا۔“ وہ وہاں کو گنگ سڑکی طرف گھوم گئی۔  
”اللہ بے قدر دہلی سے بھی کسی کا واسطہ نہ ڈالے۔“ میں نے آؤ بھر کر کہا۔

”بشمار تیار کر کے اس نے ٹوٹی کو بھی اندر بٹایا۔ اس کے آگے سے پہلے وہ بولی۔ ”بشمار تیار ہتھال کے سینے سے بھی آتا ہے لیکن اس میں ابھی دیر ہے۔ مجھے اگر ان کے مقرر اوقات سے پہلے بھوک لگتی ہے یا کسی چیز کی طلب ہوتی ہے تو میں ان کا انتظار نہیں کرتی۔“

”بہت اچھا کرتی ہو۔ ہر بے صبرے کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں بے صبری ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر مجھے گھورا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ”چھاپا۔ ٹھیک ہے۔ جانے جا کر ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھو اور آرام سے میں سے کھانا آئے کا انتظار کرو۔ یہ ناشائیں نے صرف اپنے لیے بتایا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے بے دردی سے کہا۔ ”میں تو صبرا کا اونٹ ہوں۔ کھانا پھر آجائے تو توٹ کر کھاتا ہوں۔ میرے آئے تو دو تین دن آرام سے کچھ کھائے بغیر گزار سکتا ہوں۔ میں سے ناشائیں آئے کا توڑی دیر انتظار کرنا میرے لیے کون سا مشکل کام ہے۔“

”وہ ڈانٹنگ ٹیبل پر آ بیٹھی اور اکیلی ناشائیں کرنے لگی۔ میں اس کے مقابل دونوں کنڈیاں میز پر ٹکا کر ایک تک اسے گھورنے لگا۔ نہایت سنجیدگی سے سر ہٹا کر اسے چند نواسے چائے۔ آخر سر اٹھا کر بولی۔ ”تم گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟“

”میں نہیں نظر لگا رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”نہیے کیسے کہہ سکتے ہو۔ کھانا۔ ٹھوس لو تم بھی۔“ وہ پٹیلیں میری طرف کھدکاتے ہوئے بولی۔ ”مگر نظر مت لگاؤ۔“

میں نے جلدی سے پٹیلیں ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ وہ دن تقریباً سب پر تک اسی طرح راجیل سے چمیر چھاؤ کرتے اور کچھ آرام کرتے گزارا۔ ایک مدت بعد اسے خوشگوار انداز میں وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وقت مجھ پر اتنا مہربان بھی ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ پھر کا کھانا کھا کر میں کچھ دیر سونے کے ارادے سے بھی لیٹ گیا۔ یہ ایک ایسی عیاشی تھی جس کا میں نے عمر سے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس بار مجھے راجیل نے ہی جگایا اور اس بار بھی اس کی دہ نفیس صاحب کا ہی فون تھا لیکن ان سے میری بات نہیں ہوئی۔ راجیل نے جب مجھے جگایا تو وہ اپنے مخصوص ”سیاہ پوش حینہ“ والے کتے میں تیار کڑی تھی۔

”نفس صاحب کا فون آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے تمہیں اس لیے نہیں جگایا کہ اس طرح تم چند منٹ اور آرام

تمہیں اس لیے نہیں جگایا کہ اس طرح تم چند منٹ اور آرام

مہارے ڈانٹا۔

فہر میں نے یہ رائے انتہائی عجیبہ کی سے دی تھی۔ "ٹونی" جتنی لمبے میں بولا۔

راجیل اس کی طرف توجہ دے بغیر بولی۔ "میرے خیال میں ریڈ ڈاٹ والوں کو بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم آخر کار کسی نہ کسی طرح ان کے ٹھکانے تک پہنچ جائیں گے۔ اور کچھ نہیں ڈنڈا بہت ہی ہمارا ساتھ دے دے۔ جس طرح ان کے لاہور آئے ٹھکانے کے معاملے میں قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ یہ سوچ کر انہوں نے اس ٹھکانے کو پہلے ہی مکمل طور پر خالی کر دیا ہوگا۔"

"اس کے علاوہ ایک اور علامت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی محسوس ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ یہ کہ ان کی طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ کوئی کارروائی دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہتر ہو رہا سمیٹ کر کہیں چلے گئے ہوں۔"

"یہ ضروری نہیں ہے۔" راجیل نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "ہو سکتا ہے ہم نفس صاحب کی سرپوش بازوں کی وجہ سے اب تک ان کی نظر سے بچے رہے ہوں۔ کل ہی انہیں کسی طرح پنا چلا ہو گا کہ خانہ بدوشوں کی ہستی یا دائرہ پلائی اسکیم کی سائنٹ سے کچھ لوگ ان کے ٹھکانے تک پہنچے تھے تو اسی رات اس کا رد عمل سامنے آیا۔ ان میں سے کسی ایک یا شاید دونوں ہی جیلوں پر بمباری کی کوشش کی گئی۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ یہ کوشش ناکام ہو گئی۔"

"انہیں پنا چلنے کا مسئلہ بھی عجیب ہے۔" میں نے کہا۔ "اس مکان پر جو دو آدمی موجود تھے۔ جو بظاہر باپ بیٹا معلوم ہوتے تھے۔ دونوں اپنی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں کسی کو کوئی پیغام دینے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اور نہ ہی وہاں دور دور تک ہمیں دیکھنے والا کوئی اور شخص موجود تھا۔ اس کے باوجود ریڈ ڈاٹ والوں کو کیسے اطلاع مل گئی؟"

"اس قسم کے کلمات تو پہلے ہی ہوتے رہے ہیں۔" راجیل بولی۔ "ہم اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ مختلف جیلوں پر کسی نہ کسی شکل میں غیر عادات موجود ہوتے تھے جن کی وجہ سے انہیں تمام باتوں اور نقل و حرکت کا پتا چلا رہتا تھا۔"

اس کی بات تقریباً درست ہی تھی۔ میرا ذہن ایک بار پھر اس سوال میں الجھ کر رہ گیا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے ہاتھ کہاں تک پہنچے ہوئے تھے۔ "بمباری کا واقعہ بھی کافی حیران کن ہے۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں اس کے لیے کون سے پردوسی ملک کا ہو انی اڈا استعمال کیا گیا ہوگا۔"

"کوئی بھی مخالف ملک ہمارے کسی بھی بدخواہ کو اس قسم کا تعاون فراہم کر سکتا ہے۔ ویسے بھی ان لوگوں کو سپر پارڈز کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ ان کے اثر و رسوخ اور دباؤ کے ذریعے کسی

بھی ملک سے کوئی کام لے سکتے ہیں۔ یہی سپر پارڈز ہر دوسروں سے ہمارے تعلقات فرخشاوار میں ہونے دیتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس کے لیے ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کو کوئی مشکل پیش آتی۔"

پھر راجیل غلطی سانس لے کر بولی۔ "ویسے بھی تمہارے ذہن کی سوئی صرف اس جگہ پر نہیں اٹکی چاہیے کہ اس کام کے لیے کسی پردوسی ملک ہی کا ہو انی اڈا استعمال کیا گیا ہوگا۔ جب ہمارے ہاں اسلئے کے ٹرک کے ٹرک آکر ٹھکانا آباد شہری علاقوں میں غائب ہو سکتے ہیں۔ پچاسوں خزیب کار اور بدشت گرد سرحدیں پار کر کے ملک میں غائب ہو سکتے ہیں اور داخلی جنسی ایجنسیاں ان کے بارے میں رپورٹیں نشر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتیں۔ بڑی طاقتوں کے ادارے دوسرے اور جیالوجیکل سروے یا مختلف ٹیموں کی آڈ میں یہاں زیر زمین قلعہ تعمیر کر کے چلے جاتے ہیں اور ہمیں کانٹوں کان خبر نہیں ہوتی تو پھر کوئی عید نہیں کہ یہاں کہیں کوئی خفیہ ہو انی اڈا بھی موجود ہو جو نہ جانے کب سے کن مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہو۔"

اس کے دیکھنے لمبے میں بے پناہ آفس جھٹک آیا۔ "یہ ایک انوس ناک حقیقت ہے لیکن ہر حال ہم اس سے نظر نہیں چرا سکتے۔ قدرت نے نہایت طویل و عریض خطہ عطا کیا جس میں ہر طرح کی زمین ہر طرح کا علاقہ ہر طرح کے موسم میں رہتے۔ بعض جگہیں تو بی بیائی جنت تھیں لیکن انوس کے ہم اسے مزید خوبصورت بنانا تو درکنار صحیح طور پر اس کی نگرانی اور دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتے۔ عین ہماری ناک کے نیچے نہ جانے کیا کچھ ہو رہا رہا ہے اور مختلف لوگ صرف اس وقت ہوش میں آتے ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔"

راجیل کی عجیبہ کی نے مجھے بھی عجیبہ کر دیا۔ ہم ان مسائل پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے خانہ بدوشوں کی ہستی تک جا پہنچے لیکن وہ ہستی اب ہستی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی جو زندہ بے ہوش جسمیں اور ٹوٹے پھوٹے چھپوڑوں پر مشتمل ہستی کوئی ہستی نہیں ہوتی لیکن انسانوں کے دم سے وہ بھی آباد لگتی ہے، بھلی لگتی ہے۔ اب انسان نہیں رہے تھے تو اجازت اور بد صورت لگ رہی تھی۔ دیرانی ایک مغرب کی طرح منہ کھولے کھڑی تھی۔ کچھ چھوٹے موٹے شیے جو شخص سمجھنے ہوئے کہڑوں اور ڈنڈوں سے بنائے گئے تھے، زمین پر بوس ہو چکے تھے۔ چیزیں گدیوں میں بکھری پڑی تھیں۔ چند گئے اُدھر اور مختلف چڑوں کو سونگتے پھر رہے تھے۔ کتے صرف آبادیوں ہی میں نہیں ہوتے، دیرانوں میں بھی نہ جانے کہاں سے بچے جاتے ہیں۔

ہستی کی حالت دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آگئی۔ میں نے راجیل سے کہا۔ "نفس صاحب اور ان کے آدمیوں نے اس طرح فرار ہو کر گویا ایسا بول خود کھول دیا ہے۔ انہوں نے گویا حلیم کر لیا کہ وہ جعلی خانہ بدوش تھے۔"

”بیماری ہوتا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا پرل تو کھلی ہی چکا تھا۔“ راحیلہ بولی۔ ”اب اپنے سروپ پر مغمور رہا ہے وقتی تھی۔“

”ہو سکتا ہے ابھی ریڈ ڈاٹ کو صرف لک ہی ہوا ہو لیکن ان لوگوں کے فرار سے ان کے بچے کی تہہ بقیہ کدی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”انتخاب بہتر تھی۔“ راحیلہ گاڑی کے کی طرف موڑتے ہوئے بولی۔ ”ویسے اگر یہاں اصلی خانہ بدوش ہوتے تو وہ بھی اتنے قریب بیماری ہونے پر بھاگ چکے ہوتے۔“

”لیکن اپنا آؤ گے سے زیادہ سامان چھوڑ کر نہ بھاگتے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”خیر۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ راستہ تو دریافت ہو ہی چکا ہے۔ اب تو مکمل کر سامنے آگاہی پڑے گی۔“ بعض اوقات تم خود ہی اپنی بات کی تردید کرنے لگتے ہو۔“ راحیلہ بولی۔

”میں اصل میں یہ آواز بلند ”سوچ“ رہا ہوتا ہوں۔“ مضامین کے خیالات بھی ذہن میں آتے ہیں۔ سوچ بچار سے انسان کسی صحیح نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”گویا تم ذہن تربیت ظنی ہو۔“ راحیلہ بولی۔

”نہیں۔ میں تو فارغ التحصیل فلسفی ہوں۔“ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ذہن تربیت اور فارغ التحصیل۔۔۔ دونوں قسم کے فلسفی ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس وقت ہم اس جگہ سے گزر رہے تھے جہاں ہم گرے تھے۔ زمین میں کالی کرے گڑے پڑے تھے اور وہاں سے زمین چٹکی ہوئی تھی۔ تمام ہم ایک سیدھ میں ہی گرے تھے۔ اب وہاں بہت سے سسل افراد نصیبات تھے۔ سہہ باردوری نہیں تھے۔ لیکن اپنی کی شخصیت بتا رہی تھی کہ وہ کون تھے۔ ہوں کے ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔“

”اب یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے گویا خود سے سوال کیا۔

”یہ شاید ان گڑھوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔“ راحیلہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ”یہ ہمارے ہاں کی پرانی روایت ہے۔ سامنے یا عاوتے کی پیش بندی کوئی نہیں کرتا لیکن جب سامنے رونما ہو جاتا ہے تو بعد میں وہاں بہت سے لوگ اسلحہ بارود لے کر ڈرا ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور اونچے رہتے ہیں۔“

”بعض اوقات اس لہجے بھی ایسا ہوتا ہے کہ وہاں سے شادی نہیں جمع کرنے کا کام ابھی باقی ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت کم ایسا ہوتا ہے۔“ راحیلہ بولی۔ ”۳۰ لاکھ اوقات تو کسی کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ ان لوگوں کو وہاں کیوں بٹھایا گیا ہے۔ بس یہ ایک روایت ہے جو آنکھیں بند کر کے بھائی جاتی ہے۔“

اس وقت ہم ٹانواور علاقے سے گزر رہے تھے۔ گاڑی

چٹکولے کھائی ہوئی باری تھی۔ میں نے راحیلہ سے پوچھا ”تمہیں اس جگہ کا اندازہ بھی ہے جہاں ہمیں پہنچنا ہے؟“

”ہاں۔“ صبح اندازہ کرنے کے لیے ہی تو میں خانہ بدوش رہتی تھیں۔ اب بھی وہاں سے سمت متعین کر کے چلی ہوں۔ بہت پہلے ہی کے کی طرف مڑ گئی ہوگی۔“

وہاں متعین افراد ہماری گاڑی دیکھ کر چونکا ہوئے تھے؟ ان میں سے کسی نے ہمیں رکنے کا اشارہ نہیں کیا۔ ویسے بھی کے اور ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ طاقتور لیکن والی کا اونچے نیچے راستوں پر غرائی چٹکولے کھائی پر مبنی تھی۔

اس قسم کے درانوں میں کسی سمت لڑا آئے کے بغیر یہ مشکل ہوتا ہے کہ آپ صحیح سمت میں جا رہے ہیں یا نہیں؟ لیکن اندازہ دیا ہوا تھا کہ راحیلہ اسی سمت میں باری تھی جدھر ہم مکان کے اندر راستہ دریافت کیا تھا۔

وہاں تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی ہمیں دیرانے میں بہت لوگ بکھرے ہوئے دکھائی دیے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ وہ لباسوں میں تھے لیکن سب کے سروں پر ہیڈلٹ تھے۔ کسی جنگجو متعین نہیں فٹ تھیں۔ مختلف مقامات پر کچھ ٹیبلر اور دو گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کسی سبز تیشیں بھی تھیں۔ دور تک خاص ترتیب سے جوان پوزیشنیں سنبھالے کھڑے تھے۔ تاہم زمین پر بہت دور تک خشک چرنے سے کچھ لکیریں بھی کھینچی آ رہی تھیں جیسے کچھ مخصوص جنگوں کی نشاندہی کی گئی ہو۔

بہت دور پس منظر میں وہ مکان بھی نظر آ رہا تھا جہاں ہم گز روز آئے تھے اور جس میں زیر زمین راستے کا باہر نہ وجود تھا۔ کے آس پاس دو ٹوکی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن کافی فاصلہ چھوڑ کر کسی افراد نے کھیرے میں لیا ہوا تھا۔ دو متعین تھیں وہاں بھی تھیں۔ لیکن وہاں مکان کے عقب میں کچھ اور لوگ یا مزید متعین موجود رہی ہوں۔

ہم ابھی اس مقام سے دور ہی تھے کہ اچانک ایک سبز چ اشارت ہوئی اور تیزی سے ہماری طرف آئے گی۔ اس بیماری گھس لے گا پرانہ موجود تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”نبہ صاحب نے تو یہاں پر ارمیڈان جنگ کا سنا قطعہ تحقیق کیا ہے۔“

”وہ ہر کام اسی طرح اجماع سے کرتے ہیں۔“ راحیلہ بولی۔

جیپ ڈرامائی انداز میں سامنے آرکی۔ اس نے وین کارا روک لیا۔ چاروں افراد جیپ سے کود پڑے اور انہوں نے دیگر گھیر لیا۔ راحیلہ نے گاڑی سے اترنے کی زحمت نہیں کی۔ صرا اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ اُٹار لیا۔ ایک نوجوان جو آفیسر تھا ہوا تھا لیکن سنبھالے کھڑکی کے قریب آیا اور بہت غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نیو آئیڈیشنیشی پلیر۔“

راجہ کے چہرے کا ذرا سا بھی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک کچھ نرا نڈا کاڑ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس پر جلہ کی تصویر موجود تھی لیکن آئینے نے تصویر اس کی شکل سے لے کر فرائض نہیں کی اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ راجہ نے خودی سے اشارے سے دوبارہ قریب بلایا اور پوچھا۔ "تیس صاحب

ہاں ہیں؟" اس نے بہت دور کھڑے ہوئے سرخ رنگ کے ایک ٹیلر کی طرف اشارہ کیا اور شاہکی سے بولا۔ "وہ آپ کو اس میں ملیں گے۔" راجہ وہ آپ کی امانت کر رہے ہیں۔

اس نے ہمارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ راجہ نے اڑی آگے بڑھا دی۔ سرخ ٹیلر مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم ساتھ بنائوں کی رفتار کے قریب سے گزرتے ہوئے سرخ ٹیلر تک پہنچے۔ راجہ نے گاڑی پارک کی تب تک ٹیلر کا دروازہ کھل چکا تھا اور تیس صاحب سامنے کھڑے نظر آ رہے تھے لیکن اب وہ ٹیکہ لگنے والے ہوئے انسان نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے خانہ بدوش والی کپڑی اتار دی تھی اور اپنے اصل روپ میں آ گئے تھے۔ اس وقت وہ گھر سے بڑے رنگ کے سفاری سوٹ میں تھے۔ دانتوں میں ان کا مخصوص شہابی نشان یعنی گارہا ہوا تھا۔ میں یہ تصویر انقلاب دیکھ کر مسکراتے بغیر نہ رہا۔

وہ ٹیلر مجھ سے خاص قسم کا تھا۔ ساتھ میں بہت بڑا تھا اور اس کے ساتھ جو اچھی شکل تھا وہ بھی کچھ خاص ہی قسم کا تھا۔ اس کی چھت پر اڑکھڑے ٹینگ سسٹم اور خانہ بدوش بھی نصب تھا۔ ٹیلر کی چھت پر ڈش لگی تھی اور آری تھی۔ اس کے پچھلے حصے میں کچلے دروازے کے پچھلے کئی موٹی اور باریک ٹائرس اس مکان کی طرف جارہی تھیں جس میں ڈیر تھیں راستے کا دبانہ تھا۔ ہم لوگ اوجھڑا دھڑکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ تیس صاحب بے تابی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ "بھئی تم لوگ جلدی سے آ جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کیا ہم لوگ تھانہ کی سیر کو چاہتے ہیں؟" میں نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"ہاں اگر باقی دوڑ چاند کی سیر کو جایا جاسکے تو ہم تمہیں اس کے لیے بھی لے چلیں گے۔" راجہ اور "تیس صاحب کا موٹو خوشوار معلوم ہوا تھا۔

ہم ٹیلر کے اندر پہنچ گئے اور تیس صاحب نے دروازہ بند کر دیا۔ ٹیلر اڑکھڑے تھا اور پی دی والوں کی ادبی دیوین سے مشابہ معلوم ہوتا تھا جس میں وہ لوگ آؤٹ اور براؤ کا شنگ یا ریکاڈنگ کے لیے جاتے تھے۔ اس کی ایک دیوار کے ساتھ تھانے کیسی کیسی مشینیں اور آلات نصب تھے۔ ایک کاڈ ٹریڈر میں کچھ نرے کے اینٹرو بھی نظر آ رہے تھے۔ دونوں طرف ٹیلر کی کئی دیواروں میں آئینہ گلاس کی مشینیں لگیں تھیں جن سے باہر

کاڈ ٹریڈر کی طرح دیکھا جاسکتا تھا۔ انہی ٹیلوں پر دو عدد دور نہیں بھی نصب تھیں جو مختلف زاویوں پر گھوم سکتی تھیں۔ راجہ نے بھی یہ ٹیلر خانہ بدوش کی طرح دیکھا تھا۔ وہ بھی بڑی دلچسپی سے جانچا طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔

"آپ نے تو بہت جلدی بہت لیے چڑے انتظامات کر ڈالے۔" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے کہا کیونکہ رات کے پچھلے پہر تو خانہ بدوش والی بستی اجڑی تھی۔ اس کے بعد سب لوگوں نے متبادل ٹیکوں پر بٹا ہوا تھا۔ تیس صاحب نے جن بھی بدلی تھی اور یہ سب کچھ بھی کیا تھا۔ دروازہ بلاٹ کرنے اور اس کے رد عمل سے نکلنے کے انتظامات کافی تسلی بخش نظر آ رہے تھے۔

پھر میں نے ٹیلر کے دروازہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تو آپ نے اچھا بلا سانس کش فیلروں والا سیٹ لگا رکھا ہے۔"

تیس صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "میں نے سوچا ریڈ ڈاٹ والے تو ہمیں اپنی سانس کی امدادات سے بہت مرعوب کر چکے ہیں۔ ہمارے پاس بھی غریبی دعوے کی جو دو چار چیزیں موجود ہیں انہیں ہم بھی کام میں لانے کی کوشش کریں۔"

ٹیلر میں تیس صاحب کے علاوہ بھی دو افراد موجود تھے۔ ایک تو دی انجینئر ایسا رہا جس سے میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ دوسرا ایک عمر رسیدہ شخص تھا جو کچھ زیادہ ہی خاموش طبع معلوم ہوا تھا۔ وہ اسٹول پر بیٹھا تھا اور اینٹرو کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے کھن ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ اسکرین کا جائزہ لینے لگا جن پر کچھ ہندسے اور کچھ ٹیکسی کی تصویریں ناچ رہی تھیں۔ تیس صاحب نے بھی اس سے ہمارا اتفاق کرانے کی ذمت نہیں لی۔

"بلاٹ کے انتظامات مکمل ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔ "ہاں۔" تیس صاحب نے جواب دیا۔ "دروازے پر ڈاٹا ہائٹ نصب کیے جا چکے ہیں۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ صرف سوچنے والے کی دیر ہے۔"

پھر تیس صاحب خاص طور پر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تمہارے سامنے شفیق شاہ، منیف اور سردار شیخ بھی آئے ہوئے ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "انہیں مکان کے عقب میں عینات کہا گیا ہے لیکن تمہیں ابھی ان سے ملنے اور جذباتی سین تخلیق کرنے کی ضرورت نہیں۔" تیس صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "ہم نے معائنے کرنے ایک دوسرے کی پہلیاں کرکڑانے اور خیر عافیت دریافت کرنے کے لیے بہت دقت پر اہے۔ پہلے تم پر وکرام شکر لو۔"

"کیا یہاں کوئی قریب دور ہے؟" میں نے پوچھا۔ "قریب نہیں۔ قریب کو۔" تیس صاحب نے جواب دیا۔ "میں نے کوئی قریب براہ راست نہیں دیکھا ہے۔"

حیرت سے کہا۔

کنٹرول چیتز بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ شخص نے مڑ کر جھپٹ کر دیکھا پھر عجیب سی نظروں سے انھیں صاحب کی طرف اسے نالایقہ انداز میں ناگوار گرد رہا تھا اور شاید اسے اس بات حیرت تھی کہ انھیں صاحب مذاق کس طرح برداشت کر رہے ہیں اس سے پہلے کہ راحیلہ کچھ کہتی، انھیں صاحب غلغلہ بولے۔ "افضل! اب مذاق بند کرو۔ یہ مذاق کا موقع نہیں۔" انھیں دبانے لگے ہیں۔ تم تیار ہو؟

ہم تینوں کے پاس انھیں اور فاضل کلپ وغیرہ موجود ٹرلر میں دوا کے سارے بھی کئی گھنٹیں کھڑی تھی۔ باہر ایک جیپ تیار کھڑی تھی۔ میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہوئے چپاسوں جو ان بھی مستعد نظر آ رہے تھے۔ میرے خدایا تیاران مل ہی نہیں۔

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی۔"

ہم سب اس وقت ایک صف میں کھڑے تھے اور شاید کے اعصاب پر تازہ تھا۔ انھیں صاحب نے اس عمر رسیدہ شخص کو اشارہ کیا کہ کنٹرول چیتز پر بیٹھا تھا۔ دوا میں لگی ایک مشین چھوڑا سا ایک پنڈل لگا ہوا تھا جیسا عموماً زیادہ طاقت کی برقی آئن آف کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

عمر رسیدہ شخص نے اس پنڈل پر ہاتھ رکھ دیا اور یہ تو بولا۔ "دن..... نف..... ٹھہری۔"

ٹھہری کتے ہی اس نے پنڈل کھینچ لیا۔ اس وقت میں نے ارادی طور پر سانس روک لی تھی۔ دوسرے ہی لمحے زمین اٹھی۔ زیر زمین پتھر زوردار دھماکا ہوا تھا لیکن اس کی گونج اتنا اندر دھب کر رہی تھی کہ دینے بھی اس وقت ہم بند ٹرلر میں کہ تھے ہم تک آواز کچھ اور بھی کم ہو کر پہنچی تھی لیکن ہم زمین ارتعاش سے دھماکے کی شدت کو محسوس کر سکتے تھے۔

میں شیشے کے بارڈر دھماکا کہ جن لوگوں نے وہی طرے کے لیے چوڑے مکان کو گھیرے میں لایا ہوا تھا وہ زیادہ مستعد ہو تھے۔ انھیں صاحب نے ہمیں جو ہرگز دہائی تھی اس کے ساتھ اب انتظار کا مرحلہ شروع ہو رہا تھا جس کے بعد ہمیں سرنگ داخل ہونے کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن اس کی نوبت نہیں آ سکا۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور دھماکا ہوا اور جو اس دھماکے کہیں زیادہ شدید تھا۔ میں تو شاید یہی سمجھتا کہ یہ دھماکا دوا کے ہی کو آواز کے سلسلے کی ایک کڑی تھا لیکن فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ انھیں صاحب "انجینئر ابصار اور تیسرے عمر رسیدہ شخص کو اس دھماکے کی توقع نہیں تھی کیونکہ وہ تینوں بیک دف

اچھل پڑے تھے۔ یہ دھماکا اتنا شدید تھا کہ ٹرلر لرز کر رہ گیا تھا۔ میں نے با

بعد ہم لوگ کچھ دیر انتظار کر رہے تھے کہ سرنگ سے گیس وغیرہ نکل جائے اور اگر اس دوران کوئی دھماکا سا آتا ہو تو چاہئے۔ اس کے بعد ہم چاروں یعنی میں، "تم" راحیلہ اور فانی ایک کھلی جیپ میں بیٹھ کر اسٹے کے ساتھ سرنگ میں داخل ہوں گے۔ ہمارے پیچھے دوسری جیپ میں شیخ شاہ، سردار شیخ، خلیف، منیر اور مسعود ہوں گے۔ ان کے پیچھے تیسری گاڑی میں خاص "تم" کا مگلا اپنے ضروری سامان سامان کے ساتھ ہوگا۔ اگر بلاست سے بہت زیادہ لمبہ گرا ہو گا یا اس مقام پر سرنگ بیٹھ گئی ہوگی تو وہ عملہ راستہ صاف کر دے گا۔ اس کے بعد ہماری دونوں گاڑیاں باری باری اندر داخل ہوں گی۔ باہر دوسرے لوگوں سے ہمارا راجلہ رہے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم فوری طور پر ملک طلب کر لیں گے۔

پھر انہوں نے شیشے کے پار ہمیں زمین پر چڑھنے سے کھینچی ہوئی گھیریں دکھاتے ہوئے کہا۔ "دو جو دو متوازی لکیریں مکان کی طرف سے آتی دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ اس زیر زمین راستے کی نشاندہی کرتی ہیں جو مکان سے اس آہنی دروازے تک جا رہا ہے اور وہ جو ایسی ہی دو لکیریں بہت دور سے آتی دکھائی دے رہی ہیں۔ وہ اس سرنگ کی نشاندہی کرتی ہیں جو ہم نے تیار کرائی تھیں اور ان دونوں کے سنگم پر جو ایک بہت بڑا مستطیل خانہ نظر آ رہا ہے یہ اس زیر زمین ٹھکانے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی لمبائی چوڑائی کا تعین کچھ آلات کی مدد سے اور کچھ اندازہ لگایا گیا ہے لیکن یہ اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف سے انھیں صاحب بولے۔ "تم کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو۔ کوئی تجویز پیش کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔"

"میں ایک ضروری سوال کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ہاتھ زرا اونچا کر کے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہاں۔ پوچھو۔" انھیں صاحب اشتیاق سے بولے۔ "ایک گھاس ٹھنڈا پانی لی جائے گا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ انھیں صاحب ایک لمحے کے لیے خاموشی سے مجھے گھورتے رہے پھر بولے۔ "ہاں۔ یہی تمہارا سوال ہے؟"

"نہیں سر! بہت ضروری سوال ہے۔" میں نے متوجہانہ لہجے میں کہا۔

انہوں نے ایک طویل سانس لی اور ایک کونے میں جا کر دوا میں لگی ہوئی ایک پمپوں کی کینٹ کو کھولا۔ وہ درحقیقت چھوٹا سا فریج تھا۔ اس میں سے پانی کی ایک بوتل اور دوسری کینٹ سے ایک گلاس نکال کر انہوں نے مجھے چھلوا۔

میں نے بوتل خالی کرنے کے بعد راحیلہ سے پوچھا۔ "تم بھی پی گئی؟"

"میں تمہارا خون پیوں گی۔" راحیلہ نے آواز میں بولی۔ "میں نے تو تھکا ہے وہ پانی پڑا ہے۔" فاضل سوچ ڈوبنے کے بعد شروع کرتی ہیں۔ تم نے دن دھاڑے ہی شروع کر دیا؟" میں نے

پھر یہ گڑھا کرا ہونے لگا۔ کناراں سے مٹی تیزی سے اسی آم میں گرنے لگی۔ یوں لگا تھا کہ کئی ایکڑ رقبے میں زمین تیزی دھنسی رہی تھی۔

فیس صاحب نے وائٹیس پر چی کر غالباً باہر تھینات کا پراہت کی کہ وہ تمام جوانوں کو پیچھے ہٹائے۔ ہر جگہ کھرا کھرا جاسے۔ زمین نہ جانے کہاں تک بیٹھ رہی تھی۔ زمین میں تیزی سے وسیع ہو رہا تھا اس میں سے دھوئیں اور گرد و غبار ابلبل بند ہو رہے تھے۔ دیکھ کر کامکان وہاں سے کافی دور رہا سرنگ کا دہانہ اس کے اندر تھا۔ اس مکان سے بھی دھوئیں سرخولے بند ہو رہے تھے۔ باہر تھینات تمام لوگ اپنا حصہ کر رہے تھے اور کالی تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے تھے۔  
”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ فیس صاحب تقریباً چلا اٹھے۔  
ریدہ فیس سے مخاطب تھے۔

”مم۔۔۔ میری۔۔۔ خود سمجھ نہیں آ رہا۔۔۔“ وہ فیس کا ”میرا خیال ہے وہ زیر زمین قلعہ تیار ہو گیا۔ سب کچھ تیار ہے۔ اسی لیے اب وہاں سے زمین دھنسی رہی ہے لیکن اس پکے دھماکے سے زمین میں شگاف ہوا۔۔۔ وہاں سے میرا کرا ہوا۔۔۔ اس کے بعد دھماکے سے وہ جگہ تیار ہوئی۔“

اس نے تھوک نکالا اور متوحش سی نظروں سے باری بار سب کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہمارا اس دواڑے کو بلاست کر زنگر بنانے کے مترادف ثابت ہوا۔۔۔ شاید یہ سب چیزیں وہ کے ذریعے پروگرام حالت میں چھوڑ گئے تھے کہ جو کئی دواڑا بلاست کر کے یا کسی اور طریقے سے کھولنے کی کوشش کی۔ پہلے جھٹ کی طرف دھماکے سے شگاف ہوا۔ وہاں سے میرا

تھینات جوانوں میں سے بعض کو گھنٹوں کے بل گرتے دیکھا۔ مطمئن نہیں وہ دھماکے کی شدت سے غیر ارادی طور پر گرے تھے یا کسی ناویدہ فطرے کے خلاف پوزیشن لے رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھنے کی سلت نہیں مل سکی کیونکہ اسی لمحے چرنے کی لکیوں سے بنے ہوئے مستطیل نشان کے درمیان زمین پست گئی تھی اور اس میں سے کوئی چیز تیزی سے نکل کر ایک طرف کو پرواز کرتی محسوس ہوئی اور چشم زدن میں غائب ہو گئی۔

ہم صرف اتنا ہی دیکھ سکے کہ اس کا رنگ قرمزی تھا اور وہ اپنے پیچھے ایک تاریخی سا شعلہ چھوڑ گئی تھی جو اس کے ساتھ ہی غائب ہو گیا تھا۔ عمر ریدہ فیس اور فیس صاحب ایک ایک طرف دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ انجینئر ابصار غیر ارادی طور پر اس طرح پیشے کی بنی سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے گردن آگے کرنے سے اسے کوئی چھپا ہوا منظر نظر آجائے گا۔

”یہ کیا تھا؟“ فیس صاحب نے سرموٹی آواز میں پوچھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کے لیے میں کوئی خوف نہاں تھا۔ شاید انہیں خود بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کیا چیز تھی لیکن وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ وہ کسی اور کے منہ سے اس کے بارے میں سنتا چاہتے تھے۔

میں نے پہلی مرتبہ عمر ریدہ فیس کی آواز سنی۔ وہ دہشت زدہ سے لیے میں بولا۔ ”یہ تو میرا کل تھا؟“

”میرا کل۔۔۔؟“ فیس صاحب کو کوا یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کے شبے کی تصدیق کی جا رہی تھی۔ میں راحیلہ اور نوٹی گئیں مضبوطی سے پکڑے کھڑے تھے لیکن وہاں کون تھا جس پر ہم حملہ کرتے؟

”تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ اس کا رخ کس طرف تھا؟“ فیس صاحب نے تھوک نکل کر پوچھا۔

عمر ریدہ فیس نے کھینچ کر ڈکی اسکرینوں کی طرف دیکھا پھر فنی میں سرلائے ہوئے بولا۔ ”نہیں۔۔۔ لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ شاید اس کا رخ دارا حکومت کی طرف تھا۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ خدا نہ کرے۔“ فیس صاحب بڑبڑاتے۔ اس وقت مجھے بھی اپنے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز محسوس ہو رہی تھیں۔ کھینچ کر ڈکی اسکرینوں پر اس وقت تیز می ترجمی لکھیں لہرے، مختلف چوڑ پتل پلڈ اور ہندو تیزی سے اچھل کود رہے تھے۔ ڈیکڑ میں لگے ہوئے وائٹیس پر تیزی سے کوئی کچھ پوچھ رہا تھا۔ شاید وہ باہر سائنٹ پر تھینات کسی افسر کی آواز تھی لیکن کسی کو اس کی بات کا جواب دینے کا ہوش نہیں تھا۔

اسی اثنا میں ایک اور زوردار دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا پچھلے دونوں دھماکوں سے زیادہ شدید تھا۔ اس بار تو ڈیکڑ کھڑکڑا کر رہ گیا جیسے کسی جتناں ہاتھ نے اسے دھکا دیا ہو۔ باہر چوکور خانے کے درمیان زمین میں جو شگاف پیدا ہوا تھا وہ اس دھماکے کے ساتھ کچھ اور بڑا ہو گیا

**برنجاری**  
انوار صدیقی  
قیمت: ۵۰/-

**کالی دنیا**  
ایم اے راحت قیمت: ۱۰۰/-



وہ عمر رسیدہ شخص کی طرف مڑے۔ ”نابالغ! تم یہیں رہو۔“  
 کچھ جوانوں کو بھی یہیں چھوڑ رہا ہوں۔ میری طرف سے آگیا  
 ہدایات ملنے تک تم ان لوگوں کے ساتھ اس جگہ کی گہرائی کرو  
 میں کچھ خاص خاص لوگوں کو لے کر چک لالہ جا رہا ہوں۔“

میں ”را حیلہ اور ٹونی ان کے پیچھے پیچھے ٹریلر سے نکلے اور قریب  
 کھڑی جیپ میں بیٹھنے انہوں نے بغور میری طرف دیکھا اور  
 ڈرائیو بگ سیٹ چھوڑتے ہوئے بولے۔ ”میرا خیال ہے اس وقت  
 تمہارے اعصاب مجھ سے زیادہ پرسکون ہیں۔ ڈرائیو بگ سیٹ تم کو۔“  
 میں نے کس سیٹ کے نیچے رکھ دی اور ڈرائیو بگ سیٹ  
 سنبھال لی۔ تیس صاحب را حیلہ کی طرف مڑے اور بولے۔ ”میر  
 خیال ہے تم اپنی وہی دیکھنا ساتھ لے لو۔ شاید وہ وہاں کام بھی  
 آجائے۔ اس میں سائزن اور فلیٹر بھی ہے۔ ٹونی کو تم اپنے ساتھ  
 بٹھالو۔ دیکھو تم ڈرائیو کرو۔ ہر حال میں ہمارے پیچھے رہنا۔“

را حیلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کس سنبھالے جیپ سے کوا  
 گئی۔ ٹونی اس کے پیچھے تھا۔ وہ دیکھن میں جا بیٹھ تو میں نے جیپ  
 تیزی سے آگے بڑھائی۔ تیس صاحب بولے۔ ”مکان کے پیچھے  
 سے فلیٹ شاہ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو ہمراہ لے لو۔“

ہم نے چلتی جیپ میں ہی ہدایات دیتے ہوئے ان ساتھیوں کو  
 جمع کیا۔ وہ بھی جیپوں ہی میں تھے۔ تیس صاحب نے دوسرے چند  
 جوانوں کو بھی ساتھ لیا اور چند منٹ کے اندر اندر ہی چھ گاڑیوں پر  
 مشتمل ہمارا قافلہ آندھمی طوفان کی طرح ہائی وے پر روانہ ہو گیا!

ہمیں چک لالہ کچنے سے پہلے ہی اندازہ ہونے لگا کہ کوئی  
 بڑی جانی ہماری پھر تھی۔ قاز بریگیڈ کی گاڑیاں اور ایمر نیس  
 اسلام آباد سے اس طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ مجھے کم از کم اس  
 موقع پر یہ مستحضر دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا۔ درندہ میرے علم میں کچھ  
 ایسے واقعات بھی آئے تھے جب کہیں کوئی ایمر جی جی آر سی  
 تھی اور متعلقہ حکام کی فیصلہ نہیں کیا ہے تھے کہ وہ جگہ مرکزی  
 حکومت کی حدود میں آئی تھی یا صوبائی حکومت کی حدود میں؟ یہ طے  
 ہونے کے بعد ہی فیصلہ ہو سکتا تھا کہ کون سے محکمے کو وہاں پہنچنا  
 چاہیے تھا۔

وہ گاڑیاں ہم سے آگے تھیں لیکن جلد ہی ہم نے انہیں پیچھے  
 چھوڑ دیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک  
 نہیں تھا۔ آرٹینس ڈپو تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں جانی کے آثار  
 نظر آنے لگے۔ پے درپے دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی  
 تھیں۔ بہت سی چیزیں فضا میں اُدھر اُدھر اڑتی دکھائی دے رہی  
 تھیں۔ کوئی اپنے مقصد میں شراہوں کا ایک فوارہ چھوڑتی جاری  
 تھی اور کسی کے ساتھ تاریخی شے کی ٹوک لگی ہوئی تھی۔

بظاہر یہ آتشبازی کا سالن تھا لیکن یہ شعلہ بدوش اور شر  
 فشاں چیزیں آتشبازی کے سالن کی طرح معمولی نہیں تھیں کہ فضا



وقتے وقتے سے جو آفتیں جن سے فضا میں بلند ہو رہی تھیں وہ تونہ جانے کہاں کہاں جا کر گر رہی تھیں اور کس کس کے لیے پتھام اجل لا رہی تھیں لیکن نہ جانے کیا کچھ اس طرح بھی ٹھٹھکا کر چند فرلانگ کے دائرے میں بھی بار بار آفتیں پھیل پھیل رہی تھیں اور اسی کی وجہ سے اسلحہ خانے کا ایک کے بعد دوسرا شعبہ لیٹ میں آنا پانا تھا۔

قائز ریگڈ کی گاڑیاں بھی سائزن بجائی وہاں پہنچنے لگی تھیں لیکن جو منظر ہمارے سامنے تھا اس کے مقابلے میں قائز ریگڈ کی گاڑیاں بہت سی حقیر نظر آ رہی تھیں۔ جنم کا دوا نہ کہ بہ لہجہ تخیل رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ قائز ریگڈ کی گاڑیوں سے اسے بچانے کی کوشش کرنا ایسے ہی ہوگا جیسے بھڑکتے ہوئے تندور میں ڈرا پر سے پانی کے چند قطرے پکنا۔

ہماری گاڑیاں آگے پیچھے کالی دوری رک گئی تھیں لیکن وہاں بھی ہم لوگ موت کی زد میں تھے کیونکہ ہمارے آس پاس بھی نہ جانے کس کس ساخت کے بم وغیرہ آکر گر رہے تھے اور جب کہ گڑھے ڈال رہے تھے ایک بار تو کسی ٹیل کے چند ٹکڑے اور کچھ پتھر ہماری جیب میں آکر گرے۔

قائز ریگڈ کی دو گاڑیاں کچھ آگے چلی گئی تھیں لیکن غالباً ان لوگوں کو بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آفتیں کیا کرنا چاہیے تھا۔ ان گاڑیوں سے چند فائزن ایلٹس، جیکبسن اور ماسک وغیرہ پنے اترے۔ جہاں ہم کھڑے تھے، چش وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ فائزن ہم سے بھی آگے تھے وہ یقیناً ہم سے بھی زیادہ پیش کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اس سے آگے جاتے تو شاید وہ بھلتے گتے۔

وہ گاڑیوں سے پائپ وغیرہ اُتارنے لگے۔ وہ اس مقام سے اب بھی بہت دور تھے جسے اس جنم کدے کا مرکز کہا جاسکتا تھا اور جہاں سے موت کے آفتیں ہر کارے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی دور سے وہ اس جنم کدے کو سرور کرنے کے سلسلے میں کیا کر سکتے تھے؟ گاڑیاں اگر کالی پریش سے بھی پانی پھینکتیں تو زیادہ سے زیادہ اس کی رسائی ملتی ہوئی گاڑیوں اور ان لاشوں تک ہو سکتی تھی جو کوئلہ بن چکی تھیں۔ بر حال وہ لوگ غالباً اپنی سی کوشش کرنا چاہتے تھے۔

اس دوران شام کا دھندلا پھیلنے لگا تھا لیکن ایک بہت بڑے جھم سے آتش و فضا کی وجہ سے یہ دھندلا اترنے نہیں پایا تھا۔ اس جھم میں تاریخی و دشمنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم لوگ وہاں پہنچ گئے تھے لیکن شاید ہم میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس اثنا میں وہاں دوسری گاڑیاں بھی پہنچنے لگی تھیں۔ راجیل اور ٹونی وغیرہ اپنی گاڑیوں سے اتر کر ہمارے قریب آن کھڑے ہوئے تھے۔ میں اور آفتیں صاحب ابھی تک کھلی جیب میں ہی بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھوں میں کچھ تکلیف سی ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ

میں چٹ کر معدوم ہو جائیں۔ ان کی اصل چاہ کاری زمین پر کرنے کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ وہ راکٹ اور پروجیکٹائل وغیرہ تھے جنہیں لائپر وغیرہ سے فائر نہیں کیا گیا تھا لیکن آنکھوں کی وجہ سے پیش پیدا ہونے پر وہ خود بخود ہی آگے سیدھے انداز میں مختلف سمتوں میں اُڑنے لگے تھے۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ ان میں میزائل بھی رہے ہوں۔ اتنی تیز رفتار چیزوں کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا بہ مشکل تھا۔ خصوصاً جبکہ خود بھی تیز رفتاری سے چومر رہے تھے۔

پڑی اور اسلام آباد کے درمیان اپنی دوسے کے دونوں طرف زیادہ تر علاقہ سرسبز تھا۔ اس علاقے میں کہیں کہیں دونوں شہروں کی اترتی بقیات اور گاؤں تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آسمان پر بجز اصل کے آفتیں پناہ براؤٹے پھر رہے تھے، کہاں کہاں باسٹ میں کر گر رہے تھے۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ ان میں سے کچھ سلام آباد اور پڑی کی حدود میں بھی جا کر گر رہے ہوں۔ ان کی کوئی سمت نہیں تھی۔ وہ چھریں ہر طرف جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی دعا کر رہا تھا کہ وہ سب کی سب اُدھر اُدھر کہیں دیر انوں میں آکر گریں۔ میری طرح شاید دوسرے لوگ بھی یہی دعا کر رہے ہوں۔

ہم ڈپ کے قریب منسوب علاقے میں داخل ہوئے تو بہت سی جلی گاڑیاں تیزی سے اُدھر اُدھر آتی جاتی دکھائی دیں۔ ڈپ کے گرد بہت بڑا علاقہ نکالی تھا اور ڈپ کو کچھ فاصلے پر لے کے اس کے باہر طرف غالباً جنگل لگا گیا تھا یا پھر جنگل پہلے سے موجود تھا۔ اس کے درمیان نکالی کے ڈپ کے لیے جبکہ نکالی جلی تھی لیکن اس وقت وہ سارا علاقہ ایک بہت بڑے آتش کدے سے بھرا ہوا تھا۔

دورخوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ڈپ اب خفیہ نہیں رہا تھا۔ اس کے مختلف حصے غالباً ہر کس کی شکل کے بنائے گئے تھے لیکن بیشتر ترکس کے دھماکوں سے پرچے اڑ چکے تھے۔ بعض مقامات سے فٹیلے اور شرابے آسمان تک جاتے محسوس ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ زمین میں بھی آگ لگی دکھائی دے رہی تھی۔

ڈپ کی طرف جانے والے راستے پر بہت سی گاڑیاں اور ترکس وغیرہ کھڑے تھے۔ ان سب میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بعض دھماکے سے ہمارے سامنے پھینک اور ان کے مختلف حصے اُدھر اُدھر بکھر گئے۔ ان حصوں سے بھی فٹیلے بلند ہو رہے تھے۔ اسی راستے پر اور اس کے اطراف میں بہت سی آفتیں بھی ٹھہری نظر آ رہی تھیں جن میں سے شاید ہی کوئی قابل شناخت رہی ہو۔ ان میں سے بعض کوئلہ ہو چکی تھیں، بعض بھٹکی ہوئی تھیں، بعض کے اعصاب غائب تھے۔ کہیں صرف دھڑکا تھا اور کہیں صرف سب۔ ان تمام لاشوں یا اشل کے ٹکڑوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ فضا میں بارود کی بو تو اقبالی برداشت تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ گوشت، کھڑکی اور جانے کیا کچھ پھیلنے کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

کے سے انداز میں پوچھا۔ ان کی آواز دھماکوں اور دنگ آواز کے درمیان بہ مشکل سنی جاسکتی تھی۔

بادرہی آفیسر بولا۔ ”سراہیاں کچھ کرنے کے لیے فاعر کے ایک پینٹ۔۔۔ خاص قسم کے ساز و سامان کی ضرورت ہے گاڑیاں اور ٹرک ضروری سامان اور تربیت یافتہ عملے کے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ سبھی کچھ کیا جاسکے گا۔ ہم کو خوش کریں کہ ڈپو کے کچھ حصوں کو بھلیا جاسکے۔ اس دوران اگر آپ کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس پاس کی نواحی آبادیوں میں سے کچھ ملے جائیں اور لوگوں کو دہاں سے نکالنے کی کوشش کریں۔ علاقے میں ان لوگوں اور راکٹوں کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔۔۔“

آفیسر نے ان آبادیوں کے نام بتائے اور بات جاری ہوئے تیزی سے بولا۔ ”ہمارے پاس ان علاقوں میں پیچھے فوری طور پر آدمی نہیں ہیں اور ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہاں قسم کے لوگ گھبراہٹ اور افراتفری میں زیادہ مارے جا رہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ کسی دشمن ملک نے ہم پر حملہ کر دیا ہے، اندر تک گھس آیا ہے۔ ہم وغیرہ ہندی اور اسلام آباد کی حد بھی جا کر گر رہے ہیں لیکن دہاں صورت حال کو سنبھالنے۔۔۔ کافی لوگ موجود ہیں۔ آپ جلدی سے اپنے آدمیوں سمیت قریبی بستی میں چلے جائیں۔ یہ کام آپ کے شاہان شان فر ہے لیکن یہ وقت بڑی آزمائش کا ہے۔“

”گوئی مارو میری شان کوم۔۔۔“ نفیس صاحب تیزی سے بولے۔ ”اس وقت کس کیفیت کو یاد رہ گیا ہے کہ کون سا کام شاہان شان ہے اور کون سا نہیں۔“

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ دھماکے تو دہاں جاری لیکن یہ دھماکا قریب ہی ہوا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ وقت ہم لوگ اپنی اپنی گاڑیوں سے اترے ہوئے تھے۔ وہ شدید تھا کہ ہم غیر ارادی طور پر منہ کے کل گر گئے اور یہ ہمارے اچھا ہوا کہ نہ اسی لمحے ہمارے اوپر سے لوہے کے بڑے ٹکڑے اترے ہوئے گزرے۔ اگر ہم کھڑے ہوتے تو ہمارے ہمارے بالائی دھڑ کو چیرتے ہوئے گزر جاتے۔ ایک نے ہماری جیب کی دھڑا اسکرین توڑ ڈالی۔

میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو مجھے جھرمجھری فائبر میڈ کی وہ گاڑی جو سب سے آگے چلی گئی تھی اور جو فائبر پالی سمجھنے کی تیاریاں کر رہے تھے اس کے پرچے تھے صرف ڈھانچا آواز تھا پڑا رہ گیا تھا۔ ٹائرنوں سے بلند ہونے لگے تھے۔ اس کے سڑے سڑے فریم پر عملے آدمی کا بالائی دھڑ اٹکا ہوا تھا جو ابھی بھڑک رہا تھا۔ اس نے جھلا تو اچھا حصہ غائب تھا۔ جو فائبر پالی گاڑی سے اترے تھے انہیں بھی اُدھر اُدھر پڑی تھیں۔ وہ بھی مکمل حالت

غیر ارادی طور پر میری گرفت نہ جانے کب سے جپ کے اسٹیزنگ وکیل پر بہت ہی سخت ہو چکی تھی جس پر گھروڑے پلاسٹک کی موٹی تہ چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے اسٹیزنگ وکیل چھوڑ کر نفیس صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ گویا بت بن گئے تھے۔ ان کی آنکھیں پتھری مچنی لگی تھیں۔ انہیں غالباً اسلحہ خانے میں موجود اسلحے کی تفصیلات کا علم تھا اس لیے وہ اس تباہی کا ہم سے بہتر اندازہ کر سکتے تھے اور تباہی ابھی وہی نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی تباہی تھی جسے روکنا شاید کسی کے بھی بس میں نہیں تھا۔ فی الحال تو جتنے لوگ دہاں پہنچے تھے ان میں سے بیشتر بے بسی سے کھڑے تماشائی دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ وہ دہاں کھڑے تھے کیونکہ ہم سمیت جتنے لوگ دہاں موجود تھے وہ سب بھی موت کی زد میں تھے۔ کسی لمحے بھی ہم پر کوئی راکٹ وغیرہ نہ گر سکتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ صرف کچھ لوگ تھے جو اُدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ جنم کو سے کہ قریب پہنچ کر اس تباہی کو مزید پھیلنے سے روکنے کی کوئی تدبیر کر رہے تھے۔

انہی چند لمحوں کے دوران ایک اور خیال نے میرے ذہن میں سر اُبھارا۔ اس قسم کی باتیں میں اکثر ہی سوجا کرتا تھا۔ دنیا کے ہر ملک میں بسنے والے ہر بے اختیار اور با اختیار شخص کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر سب قومیں جنگ و جدل ترک کر دیں اور اسلحے کے انبار لگا بند کر دیں تو دنیا میں کوئی غریب کوئی بے گھر کوئی بے علاج اور کوئی بھوکا نہ رہے۔ اس کے باوجود اس کہہ ارض پر گنتوں کی طرح لڑتے رہنا ہی انسان کی سب سے بڑی مصروفیت چلی آ رہی تھی۔ نئی نوج انسان کو یہی سب سے بڑا ناکلین لائق تھا اور پوری دنیا اس معاملے میں اب اتنی آگے جا چکی تھی کہ کوئی پیچھے ہٹنے میں ہیل کرنے پر تیار نہیں تھا۔

میں نے اس قسم کے خیالات سے ذہن ہٹانے کے لیے نفیس صاحب سے پوچھا۔ ”ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

وہ گویا کسی بھانک خواب سے جگھٹے ہوئے میری طرف حوجہ ہوئے۔ انہوں نے شاید فیذا سوال سنا ہی نہیں تھا لیکن مجھے اپنا سوال دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی لمحے وہ گاڑیاں ہمارے قریب آکر رکیں۔ ایک سبز جیب تھی اور دوسری سیاہ مر سڈیز۔

مر سڈیز کے دروازے بند رہے۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی چڑھے رہے۔ جپ سے ایک بادرہی آفیسر اتر کر ہماری طرف آیا۔ وہ یقیناً نفیس صاحب کو پہچانتا تھا۔ اس نے باقی لوگوں کی طرف توجہ نہیں دی اور مذہبانہ انداز میں نفیس صاحب کو سلام کرنے کے بعد بولا۔ ”سرا! آپ یہاں کھڑے ہو کر اپنی جان خطرے میں نہ ڈالیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی یہاں کچھ نہیں کر سکتے۔“

## طنز و مزاح

|       |            |                   |
|-------|------------|-------------------|
| 125/- | منظر بخاری | بیچ در بیچ        |
| 75/-  | منظر بخاری | قصہ مختصر         |
| 90/-  | منظر بخاری | ایک سوا یک (کالم) |
| 100/- | منظر بخاری | گستاخی معاف       |
| 100/- | منظر بخاری | ایک سو نو (کالم)  |
| 200/- | منظر بخاری | چمن کو چلے        |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور نمبر 2

لوگ قہے سے نکل بھی گئے تھے لیکن بد قسمتی سے وہ جس سمت میں پناہ کے لیے بھاگے وہاں بھی کوئی پرو بیکٹاکل آکر گرا۔ ان میں سے کچھ قہے کی طرف واپس بھاگے اور کچھ نے بلندی کی طرف پھیلے ہوئے جنگل کا رخ کیا حالانکہ جنگل سے پہلے ہی دھواں بلند ہو رہا تھا۔

اس علاقے میں چاروں طرف ہی وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ آکر گر رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قہے والوں کا ساتھ کچھ زیادہ ہی گردش میں تھا۔ کیونکہ قہے پر زیادہ پرو بیکٹاکل آکر گر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ دشمن کہیں بیٹھا آبادی کو نشانہ بنا رہا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ پرو بیکٹاکل وغیرہ تو محض حرارت پاکر فائر ہو رہے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق یا بد بختی تھی کہ ان میں سے بیشتر کا رخ آبادی کی طرف تھا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایسے مکانات کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا جن میں آگ لگ چکی تھی یا جن کا بیشتر حصہ مندھ ہو گیا تھا۔ ان میں نہ جانے کتنے لوگ مارے جا چکے تھے ہم سب خود بھی موت کی زد میں تھے یہ صرف قسمت کا سودا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس لیے موت کا کوئی آئینہ ہر گاہ ہم پر آکر گرا اور ہم میں سے کس کس کے پرچے اڑ جاتے۔

ہم نے طے کیا کہ ہم میں سے ہر فرد ایک ایک گلی میں داخل ہو گا اور ہم جتنے بھی زخمی یا مجبور اور معذور لوگوں کو لاکر گاڑیوں میں ڈال سکے واپس گے گاڑیاں ہرگز ہم انہیں ہنڈی لے جائیں گے کیونکہ یہاں تو دور دور تک کوئی محفوظ پناہ گاہ یا ایسی جگہ نظر نہیں

پادری آئینہ کنیوں کے بل اٹھتے ہوئے مرقش لمبے میں تیس صاحب سے مخاطب ہوا۔ ”سرا! آپ جلد از جلد یہاں سے چلے جائیے۔ یہاں بہت خطرہ ہے۔ جب تک حفاظتی ساز و سامان کے ساتھ لوگ یہاں نہیں پہنچ جاتے، آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ جلد از جلد قریبی آبادی میں پناہیں اور وہاں لوگوں کی جانیں بچانے کی کوشش کریں۔ یہاں تو جتنا جانی نقصان ہوتا تھا وہ ہو چکا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور رکاوٹ کی سی حالت میں دو ڈر سیارہ مرشدین تک پہنچا۔ اگلا دروازہ کھول کر اس نے سر اندر دھس کر کچھ کہا اور دوسرے ہی لمحے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ مرشدین کے بازو چڑھائے اور وہ شیم دائرے میں گھوم کر تیز رفتاری سے واپس اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئی۔ آئینہ چپ میں بیٹھا اور اسے موڑ کر درختوں کی طرف لے جانے لگا لیکن کچھ دور جا کر وہ گردن سمٹا کر تیس صاحب کو آئید کرنا نہیں بھولا۔

”سر۔ پلیز بری آپ۔ گاڑیاں پیچھے ہٹا لیں۔“  
ہم سے پہلے فائر گینڈ کی گاڑیاں پیچھے ہٹ گئیں۔ تیس صاحب نے ایک لمحے سوچنے کے بعد آئینہ کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور ہمیں گاڑیوں میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر ان کی رہنمائی میں ہماری گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔

اس بار ہنڈی کی ایک نواسی آبادی ہماری مشعل تھی۔ وہ ایک اچھا خاصا قصبہ تھا۔ ہائی وے سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ شیم پہاڑی تھا اور قصبہ چاروں طرف سے سبزہ زاروں میں گھرا ہوا تھا۔ عام حالات میں وہ یقیناً ایک بہت نظیر قصبہ رہا ہو گا لیکن اس وقت کسی حد تک جہم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

ہمت سے مکانات میں آگ لگی ہوئی تھی اور گلی کوچوں میں ایک افزائش برپا تھی۔ میرا خیال تھا کہ افزائش صرف بڑے شہروں کی خصوصیت تھی اور جنگلی حالات میں بڑے شہروں میں قیامت کا سماں نظر آتا تھا لیکن اس روز اندازہ ہوا کہ بد بختی اور افزائش ہمارا قوی شعار ہے۔ اس کے لیے چھوٹے بڑے شہریا گاؤں و ربات کی تفصیص نہیں۔

لیجے کی آبادی کچھ ایسی زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی اور راستے بھی ٹیڑھے پیڑھے یا تنگ نہیں تھے لیکن ہمارے لیے گاڑیاں لے کر گلیوں میں داخل ہونا مشکل ہو گیا کیونکہ گلیوں میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ سوئش بدشوں سے آزاد ہو کر اوپر اوپر دوڑ رہے تھے۔ انسان بھی مویشیوں ہی کے انداز میں اوپر اوپر دوڑ رہے تھے اور ان سے گھرا رہے تھے۔ انسانوں کو بھی گویا علم نہیں تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بھاگتے تھے، کبھی دوسری طرف۔ دو تین بوڑھے افراد کو شیم نے مویشیوں کے گھروں تلے کچلے جاتے دیکھا۔

ہم جب قہے کی طرف آ رہے تھے تو مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کچھ

آری حتی جہاں کسی کو لے جایا جاسکتا۔  
ہم نے مختلف گلیوں کا رخ کیا۔ میں جس گلی میں داخل ہوا

اس میں تین مکانوں کو الگ لگی ہوئی تھی۔ دو مکان مکمل طور پر  
زمن بوس نظر آ رہے تھے۔ گلی میں بھگدڑ دار کم تھی۔ یہاں سے  
شاید بیشتر لوگ نکل چکے تھے۔ گلی میں ایک گدھا گاڑی اور ایک  
بیل گاڑی ایک دوسرے میں بری طرح پھنسی کھڑی تھیں۔ گدھا  
اور بیل مخالف سمتوں میں زور لگا رہے تھے لیکن اس سے دونوں  
گاڑیاں ایک دوسرے میں اور بھی زیادہ سختی سے پھنسی جاری  
تھیں۔ شاید اسی لیے ان کے سوار انہیں جھڑک رہا تھا۔ بچے تھے۔  
ان میں کچھ سالان بھی پڑا نظر آ رہا تھا۔ ان گاڑیوں کی وجہ سے گلی  
بند ہو کر رہ گئی تھی۔

گلی میں جو چند لوگ مجھے بھاگتے دوڑتے دکھائی دیے ان کی  
طرف میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ صحیح سلامت تھے۔ اپنے ہماؤ  
کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں آگے  
بڑھا جو کسی مجبوری میں پھنسے ہوئے ہوں۔ راستے میں مجھے ٹالی کے  
قریب آٹھ دس سال کا ایک بچہ پڑا نظر آیا۔ وہ گویا کسی تکلیف سے  
ڈبڑا ہوا رہا تھا لیکن قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مر رہا تھا۔ اس  
کی کپٹن میں لوہے کا ایک ٹکڑا پیوست تھا اور سینک کی طرح اس کا  
کچھ حصہ باہر تھا۔

اس کی موت شاید لوہے کے اس ٹکڑے ہی کی وجہ سے واقع  
ہوئی ہو لیکن اسے یقیناً کئی انسان اور شاید ایک آٹھ نکل گاڑی یا  
گدھا گاڑی بھی کپٹن ہوئی گزری تھی۔ اس کے ناکہ منہ سے رستا  
ہوا خون ٹالی کے گندے پانی میں مل چکا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ  
پھٹ پڑے اور آنکھیں حلقوں سے اٹل آئی تھیں۔

وہ کسی قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر  
آگے بڑھ گیا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اندھرا کمرہ ہو چکا تھا۔ مجھے  
میں بجلی موجود تھی لیکن دوری سے ہمیں کئی جگہ بجلی کے کارٹوٹ  
کر ٹھٹھے دکھائی دیے تھے۔ یہ الگ اپنی جگہ موت کے پامیر تھے۔

ہم جب سڑکوں اور فنڈ پاتھوں پر چل رہے ہوتے ہیں تو ہمیں  
احساس تک نہیں ہوتا کہ موت ہمارے سروں پر سایہ فگن ہوئی  
ہے یعنی ہمارے سروں پر بجلی کے ٹھٹھے تارے ہوئے ہیں جن میں  
ہزاروں دولت بجلی دوڑ رہی ہوتی ہے۔ کوئی بھی تار کسی بھی وجہ سے  
لوٹ کر کسی بھی انسان یا انسانوں پر کر سکتا ہے اور چشم زدن میں  
اسے موت کے منہ میں پھینکا سکتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں ٹل و فیلو جیسے عظیم جرائم پر کسی شخص پر  
معدہ چلایا جاتا ہے۔ شہادتیں تلاش کی جاتی ہیں، ہزار طرح کے  
تدو کیے جاتے ہیں۔ پھر اسے بجلی کی کرسی پر بٹھائے گا "ہتھام" کیا  
جاتا ہے اور اب تو ہراس کا بھی مدافع نہیں ہوتا جا رہا ہے۔ درمیان  
صفت مجرموں کو بھی سزائے موت دینا وہاں "ٹھالانہ" سزا دکھائی  
ہے لیکن ہمارے ہاں راہ چلتے بے گناہ بے خبر اور بے تصور لوگوں کو

کری کے بغیر ہی بجلی سے سزائے موت دینے کا مستقل انتظام موجود  
ہے۔

مجھے میں بھی نہ جانے کہاں کہاں بجلی کی ٹوٹی ہوئی تاریں زمین  
تک پہنچ رہی ہوں اور نہ جانے ایسے کتنے لوگوں کی ہلاکت کا سبب  
بن چکی ہوں جو آسمان سے برستی ہوئی موت سے بچ چکے تھے  
بہر حال تاریں ٹوٹ جانے کی وجہ سے گلیوں میں اندھیرا تھا۔ کچھ  
مکانوں میں بجلی ہوئی تھی۔ اب اس اندھیرے کو دور کر رہی تھی۔

انہی شطوں کی روشنی میں میں آگے بڑھا تو مجھے گلی کے انڈیا  
کے فرش پر ایک عمر رسیدہ عورت پڑی کر ابھی نظر آئی۔ اس کا  
پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور کپڑے کچھ مٹی میں تھکے ہوئے  
تھے۔ اسے بھی یقیناً کچھ لوگ کچلتے ہوئے گزرے تھے۔ وہ دوڑا  
ہاتھ اندھوں کی طرح انڈیوں کے فرش پر راتے ہوئے اٹھنے کا  
کوشش کر رہی تھی۔

میں نے سارا دے کر اسے اٹھایا اور وہی سوال کیا جو عام طور  
پر ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ "اٹال۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟"

وہ بری طرح کرا رہے ہوئے، بری طرح جل کر رہی۔ "ہاں بیٹا  
میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ خوشی سے چلا نکلیں گے رہی ہوں۔۔۔  
سوخی ہی ایسا ہے۔۔۔ سب لوگ بالکل ٹھیک ہیں بڑے خوش ہیں  
خوشی کے مارے ہی تو ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہیں۔" آخر کا  
آواز اس کے گلے میں پھنسی گئی تب وہ خاموش ہوئی۔

میں نے کھینچا ہوا ہونے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں  
اٹال جی۔۔۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ ہاتھ آگے۔۔۔ میں نے جملہ ادھر  
چھوڑ دیا۔ سچی بات یہ تھی کہ مجھے معلوم نہیں تھا میں کیا پوچھا  
رہا تھا۔

اسی اثنا میں ایک بارش پڑھا کر آدھا کر تلاشی سے انداز  
میں ادھر ادھر دکھایا وہاں پہنچا۔ وہ غالباً آگے نکل گیا تھا اور پلٹ آ  
آیا تھا۔ وہ بھی زخمی حالت میں تھا اور کرا رہا ہوا آ رہا تھا۔ شاید  
قوت ارادی کے سارے بہ مشکل خود کو سنبھالے ہوئے تھا اور  
کسیں ڈھیر ہو گیا ہوگا۔ اس کی نظر عورت پر پڑی تو گرا آدھا کھینچا  
سے قریب آیا اور ذرا برہمی سے بولا۔ "موتراں کی مالہ۔ تو میرا  
پڑی ہے۔۔۔ مجھے تو آگے جا کر پڑ چلا کہ تو میرے ساتھ نہیں ہے۔  
وہ یقیناً اس عورت کا شوہر تھا۔

عورت زخمی ہونے کے باوجود کرا رہی آواز میں بولی۔ "مجھے  
میرے ہونے نہ ہونے کا ساری زندگی بتا نہیں چلا۔ اب بے خبر  
کیا تو کون ہی حیرت کی بات ہے۔"

بوڑھے کو بھی زخمی ہونے کے باوجود جلال آ گیا۔ اس  
بڑھیا کو موٹی سی گالی دی جسے سن کر ایک لمحے کے لیے تو میر  
کالوں کی ٹوئیں بھی تپ اٹھیں۔ اس گالی میں معافی و منہدم۔  
سلطے میں کچھ نئے تجربات کیے گئے تھے۔ بوڑھے کے جتنے دانش  
سلامت یا نیم سلامت تھے وہ انہیں پیتے ہوئے بولا۔ "تو قبر میں"

”دفعہ کو انہیں۔ مٹی والو اس بات پر۔ آؤ چل کر مغزاں کو دیکھ کر آتے ہیں۔ وہ زندہ بھی ہے یا۔۔۔“ بڑھیا نے ایک بار پھر سسکی سی کر بڑھے کا ہاتھ پکڑ کر واپس پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ ٹوٹ کر گر پڑی۔ بوڑھا بھی اسے اٹھانے کی کوشش میں گر پڑا۔ میں نے انہیں سارا دوسے کر دوبارہ اٹھایا اور ایک مکان کی دیوار تک لے گیا جو ابھی صبح سلامت تھی۔

میں نے انہیں دیوار کے سارے بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہیں بیٹھیں۔ میں مغزاں کو دیکھ کر آتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں آپ کا مکان کون سا ہے؟“

”اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹا! کسی طرح میری مٹی کو لے آؤ۔ میں تو زندگی بھر کے لیے اس سے آگے ملانے کے قابل نہیں رہی۔“ بڑھیا گڑگڑانے لگی پھر وہ مکانوں کی سانے والی قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس لائن میں کوئی نہ سب سے پہلا گھر ہمارا تھا۔ ہم جب نکل رہے تھے اُس وقت اُس پر ہم گرا ہے۔“

میں گلی کے سرے کی طرف دوڑا۔ اس طرف کئی مکان مندم ہو چکے تھے۔ عین چار مکانوں میں آگ لگی ہوئی تھی جو تیزی سے پھیلنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا قصبہ تباہی کی نذر ہوئے والا تھا۔ گلی میں اب بھاگ دوڑ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گلی خالی ہو چکی تھی۔ نہیں صاحب اور میرے ساتھ جن گلیوں میں گئے تھے ان کا نہ جانے کیا حال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہاں ایک قیامت برپا تھی جس میں اولاد والدین کو۔ اور والدین اولاد کو بھول گئے تھے۔

میں سانے والی قطار کے پہلے مکان تک پہنچا تو اس سے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیے۔ مکان تقریباً مندم ہو چکا تھا لیکن اس کا ایک تودہ کرا سلامت دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ بالائی منزل کا کرا تھا اور مکان کے ذمہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی نیچے گیا تھا مگر معمولی سی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ تو رچی حالت میں یوں بلے پر ٹکا ہوا تھا جیسے کسی نیبی ہاتھ نے اسے سنبھال لیا ہو لیکن اس کے ارد گرد بھی بہت سا ملبہ آن کر تھا۔ مندم مکان کے پچھلے حصے سے شعلے اور دھواں بلند ہو رہا تھا۔ مکان کا نی برا تھا لیکن نیم پتہ تھا۔ اب تو محض بلے کا بڑا سا ذمہ داری نظر آ رہا تھا لیکن اس کے بیشتر کھن شاید بروقت نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

میں نے بلے پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ بلے کے نیچے دبا ہوا مختلف سا زو سامان ادھر ادھر سے جھانک رہا تھا لیکن مجھے کہیں کسی انسانی جسم کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ میں اس کمرے کے قریب پہنچا جو زچہ ہو کر بلے میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کی ایک بند کڑی بند ہو کر چوٹ میں پھنس گئی تھی۔ میں اس میں جھانک نہیں سکا تھا۔ اس کا دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے بلے پر چڑھ کر اسے ہلانے

میرے ساتھ ٹوٹنے سے باز نہ آتا۔ یہ موقع ہے بھلا اس کمرے کا۔ چل۔۔۔ جلدی میرے ساتھ چل۔۔۔“ اس نے بڑھیا کو سارا دینے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش میں خود گر پڑا۔ میں نے دونوں کو سارا دے کر اٹھایا اور کہا۔ ”آپ دونوں میرے ساتھ چلیں۔“

”تم کون ہو؟“ بوڑھے نے کراچے اور کاپتے ہوئے میرا سر تاپا جائزہ لیا۔ وہ اس موقع پر بھی تھکن سے باز نہیں رہا تھا۔ ”ہم چند لوگ آپ کے قصبے والوں کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ قصبے سے باہر ہماری گاڑیاں کھڑی ہیں۔ چلنے میں آپ لوگوں کو وہاں لے جاتا ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

اسی لمحے قریب ہی کہیں ایک زوردار دھماکا ہوا اور زمین لرزتی محسوس ہوئی۔ ایک اور پور بیٹھا کئی میٹر اٹک گیا اور چڑھنے پر آکر گری گئی۔ شاید کہیں اور آگ لگی تھی۔ شاید کچھ اور مندم ہوا تھا۔ شاید موت کا عقاب کچھ اور دھواں کو اچک لے گیا تھا۔

اس تازہ دھماکے نے بوڑھے اور بڑھیا کی بددماغی یکدم دور کر دی۔ وہ قمر قرعہ کانپتے ہوئے بچوں کی طرح مجھ سے تقریباً چٹ گئے اور میں انہیں دونوں بازوؤں سے سنبھالے اس طرف لے چلا یہ دھڑکتے آیا تھا۔

اچانک بڑھیا میرے بازو کا سارا چھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے ہٹکی سی چٹ کے ساتھ بولی۔ ”اُسے مغزاں کے آبا۔ ہم مغزاں کو تو پھر چھوڑ آئے۔ ہائے میری مغزاں!“ بوڑھا بھی رک گیا۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے چڑھا سا گیا۔ وہ پڑانے کے سے انداز میں بولا۔ ”وہ کہاں بنی ہوگی۔ سارا مکان ٹوٹ کر گیا ہے۔“

”بھئی۔۔۔ ہمیں رکنا تو چاہیے تھا۔۔۔ اسے دیکھنا۔۔۔ تلاش کرنا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن ہم تو اسے بھول ہی گئے تھے۔ کیسے ماں آپ ہیں ہم!“ بڑھیا نے سسکی سی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو امنڈ کر اس کے زخمی چہرے پر پھل آئے تھے اور یقیناً اس کے زخموں میں آگ لگا رہے تھے۔

”مغزاں آپ کی بیٹی ہے؟“ میں نے ہمدردی سے پوچھا۔ بڑھیا نے کراچے ہوئے اہمیت میں سر ہلایا اور بولی۔ ”اے۔۔۔ ہمارا جوان بیٹی ہے۔ تم نے ایسے ماں باپ نہیں دیکھے ہوں گے غریبے وقت میں اپنی اولاد کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں۔“

”مگر کیا بات نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔“ میں نے نکل دینے والے انداز میں کہا۔

بوڑھا جلدی سے بڑھیا سے مخاطب ہوا۔ ”اور اسے یہ بھی تو یاد کرنا کہ ہمارے دو شادی شدہ بیٹے ہیں چھوڑ کر۔ اپنی بیویوں کو ساتھ لے کر بھاگ گئے ہیں۔ بھائے وقت انہوں نے ہمیں آواز تک نہیں دی۔“

کی کوشش کی لیکن وہ بھی چوکھٹ سمیت اپنے شکاف میں ہلکی طرح پھنسا ہوا تھا اور اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس پر کچھ زیادہ زور آزمائی نہیں کی۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کمرہ بھی درحقیقت ختم ہونے کو تھا لیکن عجیب و غریب انداز میں کسی خاص ذائقے پر اس کی دیواروں اور چھت کا توازن قائم تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کسی قسم کی زور آزمائی یا قریب ہی ہونے والے کسی زور دار و سما کے ارتعاش سے وہ کمرہ ریت کے گھروں کی طرح بٹھ سکتا تھا۔

میں محکوم کرکمرے کے دوسری طرف پہنچا۔ اس طرف بھی پھول سی ایک روشن دان تھا کڑکی بھی جو نہ صرف اس وقت کھلی تھی بلکہ اس سے ایک وحشت زدہ چو بھی جھانک رہا تھا۔ اس کڑکی کا مصروف نہ جانے کیا تھا۔ وہ محض اتنی بڑی تھی کہ اس سے صرف سر ہی باہر نکالا جاسکتا تھا۔

وہ بڑی بڑی حیران سی آنکھوں والا ایک گورا چٹا چو تھا لیکن اس وقت تنہا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر ہلکا سا چمک رہا تھا۔ رینگلی سیاہ بالوں کی ایک لٹ ایک رخسار سے چپکی ہوئی تھی اور دیکھتے تو بونٹوں کے عقب سے موتوں جیسے دانت جھانک رہے تھے۔ یقیناً یہی صفراء تھی۔ اس کا منہ چو اس لیے تنہا ہوا تھا کہ اس طرف مکان کے لمبے سے اچھے ہوئے شعلے کرکے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں خود اپنے جسم پر کچھ ایسی چٹن محسوس کر رہا تھا جیسے میں کسی تندور کے دہانے پر کھڑا تھا۔ چٹن لہو بہ لہو بڑھتی جا رہی تھی۔

لڑکی کی یوزیشن اس وقت چو ہے دان میں پھنے ہوئے چو ہے کی سی تھی۔ وہ کمرہ اس کے لیے نفس بن کر رہ گیا تھا۔ ورنہ اب تک وہ بھی یقیناً کل کر جا چکی ہوتی۔ والدین بے شک اسے ساتھ لے جاتا بھول گئے تھے لیکن وہ کوئی چھوٹی یا نا سمجھ بچی نہیں تھی کہ کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اسے تو یقیناً جوانی کی حدود میں داخل ہونے بھی مدت گزر چکی تھی۔ کسین یا نوخیز لڑکی نہیں تھی۔ اس کی عمر تیس اور پچیس کے درمیان کہیں تھی۔

وہ وحشت زدہ نظروں سے اس اذیت ناک موت کی طرف دیکھ رہی تھی جو رقص کرتے شعلوں کی صورت میں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں خشک ہو چکی تھیں۔ وہ شاید اب بھی روٹا جاتی تھی لیکن روشت کی زیادتی کے باعث آنسوؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”تم جلدی سے دوسری کڑکی کی طرف آؤ۔ میں اسے توڑ کر تمہیں نکالنے کی کوشش کر آؤں۔“ میں نے تجزی سے کہا۔

وہ بدستور وحشی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ میں نے احتیاطاً دھنچالی میں پیچ کر اپنی بات دہرائی لیکن اس کا سر بدستور اس چوکور کڑکی میں پھنسا رہا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

اس دوران ہوا کے ایک تھیزے کے ساتھ شعلوں ایک دم میری طرف کو ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے تندہ پھینک دیا ہو۔ میں اچھل کر اس کمرے کی دیوار سے چپک گم میں وہ لڑکی پھنسی ہوئی تھی۔ پھر میں نے گردن موڑ کر دیکھا کہ پیچھے سے میرے کپڑوں نے تو آگ نہیں پکڑ لی تھی۔

میرا اندیشہ غلط تھا۔ کپڑے محفوظ ہی تھے۔ اس دوران تھیزا بھی گزر گیا تھا۔ شعلے دوبارہ آسمان کی طرف لپکنے لگے یہ شعلے صرف ایک لمبے کے لیے میری طرف کو لپکے تھے او چٹن نہیں پائے تھے لیکن ان کی چٹن نے مجھے پریشان اور خواہاں تھا۔ میں سوچنے بٹھ نہیں رہا کہ اگر اس معمولی سی آگ آگ کا یہ عالم تھا تو جسم کی آگ کیا ہوگی؟

لڑکی کا چوہ چٹن سے عیاں سا ہو گیا تھا۔ میں نے چوہ سے کہا۔ ”بہری ہو کیا؟ تمہیں سنا ہی نہیں رہا؟ میں تمہاری و اپنی جان مصیبت میں ڈال رہا ہوں اور تم گائے کی طرح یہاں گردن نکالے کڑی ہو۔ اپنی جگہ سے ہلو تو سہی۔“ اس کے آنسوؤں کے سوتے یقیناً خشک ہو چکے تھے مگر لمبے لمبے سے اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو امانڈ پڑا اس نے منہ کھول کر ”آہ۔۔۔ آہ۔۔۔ آہ۔۔۔“ کی بے آواز سن نکالی۔

مجھے جھکا سا لگا اور یکدم گویا اس آتش زدہ ساحل میرے ذہن پر ریف کی بوچھاڑی ہو گئی۔ وہ صرف بہری؟ کوئی بھی تھی۔ اسی لمحے کس دور ایک اور دمکا ہوا۔ کوڑا سناکی دی اور میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ آ جانے کا خوف نہیں تھا۔ یہ اس بے زبان وحشت زدہ چو ہے کی طرح مارے جانے کا خوف تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس کہ اس کوڑا گڑا ہٹ کے ارتعاش سے وہ کمرہ بھی لمبے میں ہو جائے اور اس میں پھنسی ہوئی وہ مصوم صورت سی لڑکا زہ انداز میں دب کر نہ مر جائے۔

کمرہ زمین پر ہی ہوا تو میں خود بھی اس کی زو میں آسکا اس اندیشے سے مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ جسم ڈھیر ہونے کی آواز سنا لی نہ دی تو میں نے آنکھیں کھ کر آڑے ترے سے دو دو بار کو قدرت کے دست فیعی نے اسی طرح عجیب و غریب سے انداز میں قہا ہوا تھا۔

اب میں نے تجزی سے لڑکی کو ہاتھوں کے اشارہ سمجھایا کہ وہ بڑی کڑکی کی طرف آجائے۔ میں اسے آ کوشش کرتا ہوں۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے سر لیکن جلدی سے ہاتھ باہر نکالنے ہوئے مجھے اشارہ کیا کہ اندر کر کے کمرے کا جائزہ لے لوں۔

وہ خود ایک طرف کو کھٹک گئی۔ میں نے سر کرکے ایک لمبے کے لیے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اسی پھول سی

کچھ اور تھی۔

دانتوں پسند آنے والے عمارے کا صحیح معلوم مجھے اس روز معلوم ہوا۔ بالآخر لکڑی کے بے ہنگم دروازے کا ایک مرنٹ پٹ پیچھے کھٹکا شروع ہوا۔ ایک اندیشہ مجھے یہ بھی تھا کہ کہیں لڑکی کے جسم کا کوئی حصہ دروازے اور کاٹھ کباڑ کے درمیان دبنا نہ شروع ہو جائے لیکن اندر سے اس کی کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں نے دروازے پر قوت مرف کرنے کا عمل جاری رکھا۔

آخر کار دروازہ دباشت کے قریب مکمل ہی گیا۔ اس دوران مجھ پر چھت کی طرف سے مٹی بھرنے لگی تھی۔ کرا کسی بھی لمحے ڈھیر ہو سکتا تھا۔ لڑکی کا تو جو حشر ہوتا سو ہوتا ساٹھ میری بھی ہڈی پٹی ایک ہو سکتی تھی اور جان کے لالے بڑے پڑ سکتے تھے۔ ہر حال میں نے سانس روک کر جدوجہد جاری رکھی۔

دروازے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیا کچھ پیچھے کھٹکا تھا۔ آخر لڑکی نے دروازے سے سر نکالا لیکن وہ دروازے کے عقب میں کھڑی نہیں تھی بلکہ سازو سامان پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور آگے کھٹکے کا اشارہ کیا۔ اس کے بازو دروازے سے باہر آئے تو میں نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے اونچائی پر سے باہر کھینچ لیا جس کے دوران اس کی پیچیں نکل گئیں۔ اسے یقیناً کچھ پریشانی اور کچھ رگڑیں لگی تھیں۔ لباس بھی کھینچ کھینچ سے پھٹ گیا تھا لیکن کم از کم اسے بے بسی کے نفس سے نجات مل گئی تھی۔ وہ خود بھی زمین پر پاؤں ٹکٹے ہی اپنی تکلیف کو بھول گئی۔

اُس کا چہرہ کچل اٹھا اور اس نے شکر گزارانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ صرف نظروں ہی سے شکر یہ ادا کر سکتی تھی۔ عام حالات میں شاید یہ خاموش تفکر کسی کے عقلی شکریے سے زیادہ دلکش و شیریں محسوس ہوتا لیکن اس وقت ذہن منتشر تھا اور جو اس پر بڑا دباؤ تھا۔

میں نے اپنی گن اٹھائی اور اس کا ہاتھ بکڑ کر تیزی سے بھاگا۔ مجھے ایک مبہم سا اندیشہ محسوس ہوا تھا۔ میرا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ ابھی میں نے لمبے کی پلندی سے لڑکی سمیت لگی میں چلا گیا ہی لگائی تھی کہ وہ کرا بھی دھڑام سے پیٹھ گیا اور یوں پورا مکان ہی لمبے میں تبدیل ہو گیا۔

شاید قدرت کو صرف اس کو گئی بھری لڑکی کو بچانا ہی مقصود تھا۔ صرف اس کی خاطر وہ کرا اب تک کرنے سے بچا ہوا تھا۔ یہ قدرت کا بڑا فکر انگیز تماشا تھا لیکن یہ وقت غور و فکر کا نہیں تھا۔ گردوغبار کے ایک بادل نے ہمارا حلقاب کیا اور مٹی کی دھانس میرے ناک میں چڑھ گئی۔ فضا میں بارود کی بو پلے ہی پھیلی ہوئی تھی۔

لڑکی تھکراتی ہوئی میرے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ ہم چند قدم ہی دور گئے تھے کہ مجھے ایک اور نیم تپاہ شدہ مکان کی طرف متوجہ ہو کر رکتا پڑا۔ وہ مکان .... ہاں کہنے کے مکان کی باقیات شطلوں میں

ہم کی روشنی اس کمرے میں پہنچ سکتی تھی جس میں میں نے سر سمجھا ہوا تھا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے مجھے اندیشہ اٹھنا محسوس ہونے لگا اور کمرے کا منظر کافی حد تک دکھائی دینے لگا۔

وہ کمرہ شاید فاضل سازو سامان رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا اور لڑکی کو بھی شاید فاضل ہی سمجھ کر اس کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ چارپائیاں، لکڑی کے تخت، ٹیبل، پیٹیاں، ٹھونڈیاں اور نہ جانے کیا کچھ اس کمرے میں بھرا ہوا تھا۔ اتنے سازو سامان کے ساتھ وہ لڑکی نہ جانے کس طرح وہاں رہتی تھی۔

اس وقت مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ دروازہ اور کھڑکی ترجیحی ہو کر اپنی جگہ چھن کر رہ گئی تھی بلکہ کمرے کے اندر بھی سارا کاٹھ کباڑا الٹ پلٹ ہو کر ایک دوسرے میں چھن چکا تھا۔ دروازے اور کھڑکی کے پیچھے بھی سامان پھنسا ہوا تھا۔ یہی بڑی حیرت کی بات تھی کہ سامان کی اس الٹ پلٹ کے باوجود لڑکی صحیح سلامت دکھائی دے رہی تھی ورنہ اتنی مدت ہی بے ہنگم چڑچڑ کے درمیان تو اس کا کچھ مرنٹ مل سکتا تھا۔ شاید اسے کچھ جوں آئی ہوں۔ جس کا کافی الجھل مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور شاید فی الحال وہ قابل برواشت تھیں۔ وہ اشارے سے مجھے یہی دکھانا چاہتی تھی کہ ان سب چیزوں کی موجودگی میں وہ کس طرح دروازے یا دوسری کھڑکی تک پہنچ سکتی تھی؟ اس وقت بھی وہ ایک کمرنگڑی میں دونوں پاؤں پھنسائے کھڑی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ کھڑکی تک پہنچنے کی نسبت دروازے تک پہنچنا کچھ آسان تھا۔ میں نے اشاروں سے اسے سمجھایا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچنے کی کوشش کرے، میں کسی نہ کسی طرح دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں ایک بار پھر لمبے کو پھانٹا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازے کے اوپر دیوار میں چھت تک دروازہ نظر آ رہی تھی۔ دروازے کو پھینچنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن میں کوشش کیے بغیر وہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ ایک زندہ سلامت انسان کو دیکھنے کے بعد بے بسی کی موت مرنے کے لیے جھوڑ دینا میرے لیے بڑا مشکل کام تھا۔

لڑکی نے کم از کم اتنی عقلمندی ضروری کی کہ چند سیکنڈ بعد اندر سے دروازہ کھٹکا کر مجھے احساس دلایا کہ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ میرے کندھے پر اٹھیں گن بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اتار کر ایک طرف رکھا اور لمبے میں ایک مناسب جگہ پر پاؤں بجا کر دروازے پر زور آزمائی شروع کی۔

زندگی میں بہت کم موقعوں پر مجھے اپنی پوری قوت صرف کرنے کی ضرورت پڑی تھی لیکن اس وقت میں نے دروازے پر پوری قوت صرف کر دی۔ اگر اس کے پیچھے اتنا کاٹھ کباڑ مختلف زاویوں سے نہ پھنسا ہوتا تو شاید اس دروازے کو چوکھٹ سمیت اکھاڑنا بھی میرے لیے زیادہ مشکل نہ ہوتا لیکن اس وقت صورت حال یہی

ہوئی تھیں۔ اس کی صحت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن بیمار ہو اور اسی وجہ سے مکان میں پھنسا رہ گیا ہو۔ اس تندرست اہل خانہ اسے چھوڑ چھاڑ کر ہٹا گئے تھے۔

”گھبراؤ مت۔۔۔ میں تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے ہوں۔“ میں نے اسے یہ آواز بلند سہلی دینے کی کوشش کی۔

اُس کی چٹینیں یکدم رک گئیں۔ اس نے گویا سکون کی لی لیکن فوراً ہی پلٹ کر وہ اس چیز کو دوبارہ سمجھنے لگا جسے پہلے سمجھنے میں جتنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا وہ ٹانگوں پر کھڑا ہوا تو

نہایت میلا بیکلا سا گدا تھا جو ایک پرانی سی مسری پر بٹھا ہوا تو ہمت ٹوٹ کر مسری اور دوسری چیزوں پر گر گئی تھی۔

ٹوٹ گئی تھی اور گدا اُلے تلے دب کر حوصلہ ملی ملی اٹ کر گدا ہو گیا تھا۔ دونوں چیزیں آدمی سے زیادہ لمبے میں دلی

تھیں۔ اس لمبے کپیلے سے شخص کی خوش قسمتی تھی کہ اس پر وہ درد کے لیے نہ چب رہا ہو اور میں اس کے انجام سے بے

سے گزر رہا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے نظروں ہی میں تپ کرل کا کام کر لیا تھا۔ اس شخص کی جسامت یا د

زیادہ نہیں تھا۔

میں نے تیزی سے کہا۔ ”تم میری پیٹھ پر سوار ہو جا چاروں ہاتھ چیزوں سے مضبوطی سے جکے پکڑ لو۔ میں تم

دروازے سے واپس اسی طرح چلا نکالنے کی کوشش کر جاؤں گا۔“

یہ ایک مشکل کام تھا لیکن فی الوقت مجھے اس کے چارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر میں اس شخص کو اٹھا کر دروازہ

باہر پھینکا تو اندیشہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی حد تک بچائے نہیں کر سکے گا اور بڑی پہلی تڑاؤ پیٹھے گا۔ اس کے علاوہ

اسے زیادہ دور نہ پھینک سکا تو وہ سیدھا آگ میں جا کر دروازے کے سامنے بھی خاصی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ا

میں نے بہتر سمجھا کہ اسے پیٹھ پر لا کر چلا نکالنے کا ذمہ لے لوں۔ کرے میں حرارت ناقابل برداشت ہوئی جارہی تھی

میں اس شخص کو پیٹھ پر لا دینے کے لیے اس کی طرف کر کے چمک کر کھڑا ہو گیا لیکن جب مجھے اپنی پشت پر اس کے

کے کوئی آثار محسوس نہ ہوئے تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ دستور اس لمبے کپیلے کی طرح کے ساتھ زور آزمائی میں مصو

اس نے شاید میری بات سنی ہی نہیں تھی اور بدستور گدا تلے سے نکالنے کی کوشش میں پٹکان ہوا جا رہا تھا۔

ایک لمبے کے لیے تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا۔ آگ میں پھینک دوں یا اس کی کرپہ ایسی لات رسید کر کے دو ٹکڑے ہو جائیں لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ

گمراہی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان سے مجھے انسانی چھین شاکی دی تھیں۔ کوئی شخص مدد کے لیے نکلا رہا تھا۔

میں نے لڑکی کو اشارے سے سمجھایا کہ اس کے والدین اسی گلی میں آگے ایک جگہ بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے وہ ان کے

پاس چلی جائے اور تینوں ذرا دیر انتظار کریں میں ذرا اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو آگ میں گھرا ہوا تھا۔

لڑکی کو یقیناً اس شخص کی چھین تو شاکی نہیں دے رہی تھیں لیکن وہ میرا مطلب سمجھ گئی اور آگے روانہ ہو گئی۔ میں آگ سے

بچتے ہوئے اس مکان میں۔۔۔ اپوں کئے کہ اس لمبے میں داخل ہوا لیکن جس تباہ شدہ کمرے میں وہ شخص پھنسا ہوا تھا وہاں طرف

سے آگ میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے دروازے اور کمرے کیوں نے بھی آگ پکڑ لی تھی۔

اس کمرے کی آدمی سے زیادہ ہمت کر چکی تھی۔ ہمت کرنے کے وقت بھی شاید وہ شخص اسی گوشے میں تھا جہاں ہمت کا

کچھ حصہ محفوظ تھا۔ اسی لمبے وہ چمک گیا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں مجھے اندر کا ماحول کافی حد تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شخص درد

کے لیے چلا رہا تھا مگر ساتھ ہی لمبے میں دلی ہوئی بڑی سی کسی چیز کو سمجھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے ایک لمبے کے اندر اندر صورتحال کا جائزہ لیا اگر میں صحیح طریقے سے ذرا لمبی چلا نکالنے میں کامیاب ہو جاتا تو

شاید ٹوٹی ہوئی چیزوں سے ٹکرائے بغیر کوئی چوٹ کھائے بغیر اور شعلوں سے محفوظ رہتے ہوئے اس شخص تک پہنچ سکتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے مرنے کی گندھے سے اندر کر ایک طرف رکھنی پڑی اور مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں خواہ مخواہ کیوں اس بوجھ کو

گندھے پر لا کر لایا تھا۔ میں یہاں لوگوں کی مدد کرنے کے لیے آ رہا تھا۔ انہیں شوت کرنے کے لیے نہیں۔ لیکن شاید اس وقت

میرے لاشعور میں یہ خیال تھا کہ کبھی کبھی لوگوں کی مدد کے لیے جاتے وقت بھی ہمدردی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

میں نے جسم کو سیکھتے ہوئے دردوں کے سے انداز میں چلا نکالنے کی اور ”باب آؤں“ کے درمیان سے گزرتے ہوئے

عین اس شخص کے سامنے جا کوندے میں کامیاب ہو گیا۔ خوفزدہ تو وہ پہلے ہی بہت تھا لیکن میرے اس طرح کودنے سے کچھ اور خوفزدہ

ہو گیا۔ وہ کچھ بدلے ہوئے انداز میں پہلے سے زیادہ بری طرح چیخنے لگا جیسے میں اس کی مدد کے لیے نہیں بلکہ اسے قتل کرنے آیا تھا۔

وہ درد کے لیے جی رہا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ شاید مجھے مکان کی طرف آتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں یکدم اس کے سامنے

کودتا اس کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ اوسط قد کا ٹھکڑا ایک مظلوم الحال شخص تھا۔ اوچھڑا ہوا مگر اس کی کمر نہایت عمر رسیدہ لوگوں کی طرح کچھ جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گوشوں میں پیلا بچھڑ چمک رہا تھا۔ آنکھیں دھندلائی



اس پوچھی کے ساتھ زندہ جل مرو۔ میں جا رہا ہوں۔

اس کے حواس یک بہ یک ہی گویا بہت تیزی سے کام کرنے لگے۔ وہ بری طرح میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور آہ و زاری کرتے ہوئے بولا۔ ”نہیں... نہیں... خدا کے لیے مجھے یہاں سے ضرور نکالو۔ لیکن میں اپنے اس گمزدے کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتا۔ کسی طرح اسے بھی نکال دو۔“ پھر وہ مجھے اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام پیغمبروں کے واسطے دینے لگا۔

مجھے اس شخص سے کچن آ رہی تھی۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ میں اسے زندگی بھر کے کل اور کینٹینی کی سڑا لٹے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ممکن تھا جب آگ اس تک پہنچ جاتی، فسطے اس کے گمزدے وجود کو چاٹنے لگتے اور فضا میں اس کے ٹکڑے زندہ و جڑوں کی چرائیڑ پھیلنے لگتی تو میں گلی میں کھڑے ہو کر یہ فٹا دیکھتا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن نے پلٹا کھایا۔ ایک نیا زاویہ خیال میرے سامنے آیا۔

مجھے بھلا اس شخص کو سزا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے تو اللہ تعالیٰ خود سزا دے رہا تھا۔ اس کی زندگی ہی اس کے لیے سزا تھی۔ اس نے تو قدیم قدیم پر یہ سزا کائی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہتا اسے یہ سزا کاشی تھی۔ وہ اس روپے کے لیے جان دینے کو تیار تھا جسے وہ خرچ نہیں کر سکتا۔ وہ اس رقم کے لیے سزا بارہا قاضی کا مالک ہوتے ہوئے بھی وہ اسے اپنی کوئی حسرت پوری کرنے کے لیے خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں وہ نہ جانے کس چھٹی چھٹی ہی چیز کے لیے ترسنا تھا۔ رقم اس پر ہوتے ہوئے بھی! میں بھلا اسے اس سے بڑی کیا سزا دے سکتا تھا؟ موت تو اس کے لیے اس سزا سے نجات تھی۔

”صھو“ میں تھمارے اس گمزدے کو نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے ہور دانہ بچے میں کہا۔

میں سر سے پاؤں تک بیٹھنے میں تر تھا لیکن میں ہیرو مجھے آگ کی تپش سے بچا رہا تھا۔ قدرت کی ہر تخلیق اپنی جگہ واقعی ایک شاہکار ہے۔ ہر جسم کو پیش آنے والے مسئلے کا حل کالی حد تک اسی جسم میں موجود ہوتا ہے۔ جب تک میرے جسم میں ہیرو نہ جانے کے لیے کسی موجود تھی تب تک میں تپش کی لذت سے کالی حد تک بچا ہوا تھا۔

میں نے گمزدے میں اچھی طرح دونوں ہاتھ پھنسائے۔ گمزا واقعی روٹی کا تھا لیکن روٹی اس میں بہت زیادہ بھری ہوئی تھی۔ ایک بار بھر میں نے اپنی غیر معمولی طاقت کو استعمال کیا۔ سو گیا میرے چہرے اور بازوؤں میں سٹ آیا۔

گمزانہ جانے کتنا پرانا تھا؟ چررو کی آواز کے ساتھ اس کا کپڑا پھٹ گیا۔ کپڑا پھٹنے ہی روٹی کی تھیں بھی درمیان سے ٹوٹ گئیں۔ روٹی کی ان تھوں کے درمیان سے پرانے پھرنے والے ٹوٹوں کی تہ بھی ہوئی تھی۔ گمزا پھٹنے سے یکدم بہت سے ٹوٹ کرے میں بکھر

کہ جب انسان ہنگامی حالات میں دوسروں کی بددعا کے لیے نکلتا ہے تو اسے اپنا دماغ بہت ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ چاروں طرف آگ لگی ہو تب بھی اس کا وجہ شبہی ہونا چاہیے۔ خدمتِ خلق کا اصل مزہ شاید یہی آسکتا ہے۔

میں نے فوراً ہی اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ ”اے بھائی! اسے بزرگوار۔“ آخر تم اس کو روٹی کے پیچھے کیوں مرے جا رہے ہو؟ جان بچانے کی فکر کرو۔ میں تمہیں اس سے اچھا۔ نیا قوم کا گمزالے دوں گا۔ بلکہ پورا ایڈلے دوں گا۔ ذیل بیلے کے دوں گا۔ یہاں سے تو نکلو۔ کیوں روٹتے ہوئے پھٹے ہوئے ہو؟ اپنے ساتھ میرا بھی چرنا ہوا تو گے۔“

اس نے وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ بس گمزدے کو کھینچ رہا تھا۔ وہ شاید غریبی کی حالت میں تھیا پھر اس پر دیرانگی کی طاری تھی۔

میرے خیال میں اسے اس کیفیت سے چوگانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلایا اور چیخ کر کہا۔ ”او خدا کے بندے! اس گمزدے کا کچھ چھوڑ دے اور میری کمرے چٹ چا۔“

”کیسے چھوڑ دوں۔“ کیسے چھوڑ دوں اس گمزدے کو۔“ اور گویا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس میں میری ساری عمر کی جمع پونجی ہے۔ سلوم نہیں کیا کیا ہے ایمانیاں کر کے۔ کیا کیا جھوٹ بول کے۔ اپنا ہیٹ کٹ کے۔ نہ جانے کتنے برسوں میں میں نے یہ سب کچھ جمع کیا ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ جاؤں۔“ اس کی گمزدی آنکھوں سے آنسو اس کے میل زدہ رخساروں پر بہنے لگے۔

ایک لمحے کے لیے گویا سارا منظر میری نظر میں ساکت ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے فسطے بھی ساکت ہو گئے۔ میں اس گمزدے سے انسان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں آج تک یہی سنا تھا اور اس سے متعلق بھی تھا کہ جان سے زیادہ پیاری انسان کو کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس قہیے میں داخل ہونے کے بعد میں اس کا سب سے برا اثبات بھی دیکھ چکا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے اولاد والدین کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھی اور والدین اپنی کوئی بہری جوان بیٹی کو ساتھ لے کر بھول گئے تھے۔ لیکن اب میری آنکھیں ایک عجیب سی منظر دیکھ رہی تھیں۔

وہیہ انسان کو جان سے زیادہ پیارا بھی ہو سکتا تھا؟ اس کا عملی مظاہرہ میں آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کا طبع ہی بتا رہا تھا کہ وہ کبھی دھوکے کی نہایت کیماٹ مثالوں میں سے ایک زندہ مثال تھا۔

ان گنت خیالات صرف ایک ٹانے کے اندر اندر میرے ذہن میں گھل چاکر گزر گئے۔ فوراً ہی میں چونکا اور سر جھٹک کر میں نے پیچھے ہٹنے ہوئے برہمی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم اپنی عمر بھر کی

مجھے ایک بار پھر اس کو پکڑ کر جھنجھوڑا پڑا۔ ”تمہیں میرا ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟ میں تمہیں کسی محفوظ جگہ تک پہنچا دوں گا میرے پاس گاڑی ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

اس نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑا کر کے انداز میں بولا۔ ”تم نے مجھے آگ کے کھبرے میں سے نکال دیا۔ لیکن کافی ہے۔ اب میں خود ہی کہیں چلا جاؤں گا۔“ جلدی ہے تو تم جاؤ۔“

وہ شاید اپنے آخری نوٹ تک کو بچنے دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ بھی خود اپنی ہی کوئی قسم ہو۔ اس دوران ہمارے سرواڑے ایک آسمان پر کوئی شعلہ سالک لگا دکھائی دیا اور قریب ہی کہیں زوردار دھماکا سنائی دیا لیکن وہ محض بھرپوری سی لہر کے زور و خروش پر میرے ساتھ بچنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔

میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور واپس روانہ ہوا میں نے اس کے لیے ہتھکڑیاں لگائی تھیں۔ اگر وہ مزید اڑتا سہا چاہتا تھا تو اس کی مرضی۔ میں نے واپس جاتے وقت ادرہ تمام مکانوں میں جھانکا۔ کچھ تباہ شدہ تھے، کچھ نیم تباہ شدہ تھے، میں آگ لگی ہوئی تھی، کچھ کی طرف آگ بڑھ رہی تھی۔ مکان بہر حال سلامت تھے لیکن ان کے کینے بھی انہیں چھو بھاگ چکے تھے۔ اڑاؤ کے کچھ پرے تھے۔ بعض میں سامان جوں کا توں پڑا دکھائی دے رہا تھا۔

تباہ شدہ مکانوں کے لیے تلے اگر لوگ دب چکے تھے تو تلاش کرنا یا ان کے لیے کچھ کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ اس کے لیے ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ اس سے قطع نظر مجھے ر میں کہیں کوئی مدد کا طالب دکھائی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ میں اس میں پہنچا جہاں میں نے بڑے بڑے جوڑے کو چھوڑا تھا تو وہ بھی وہاں آئے میں نے ان کی بیٹی صغیرا کو ان کی طرف روانہ کیا تھا وہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اسے روانہ کر۔ صرف چند منٹ بعد ہی یہاں آگن پہنچا تھا لیکن بڑا حیرانہ تھا کے پہنچ جانے کے بعد میرا انتظار نہیں کر سکا تھا اور وہ تیز سے نکلنے کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

میرا یہاں آنے کا مقصد لوگوں کی مدد کرنا اور ان کی بچانے کی کوشش کرنا تھا لیکن میرا مشن کچھ عجیب ہی رہا تھا جس طرح خالی ہاتھ اور اکیلا آیا تھا اسی طرح واپس جا رہا تھا کچھ جہت انگیز تھائے ضرور دیکھ لیے تھے جن سے میری یادہ خزانے میں کچھ کار آمد اضافہ ہو گیا تھا۔

میں واپس قہقہے سے باہر اس جگہ پہنچا جہاں ہم نے م کھڑی کی تھی تو ایک اور عیرا انگیز تھا میرا جھڑپا تھا۔ یہ جن گاڑیوں کو ہم زخمیوں اور مصیبتوں کو محفوظ مقام تک کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے ان میں زخمیوں یا مصیبتوں کو زخمی جگہ ملی تھی یا نہیں لیکن ٹھیک ٹھاک بچے کے لوگ ا

تھے۔ وہ شخص دیوانوں کی طرح انہیں سمیٹنے لگا۔

غالباً بیشتر نوٹ ابھی مدنی کی تھوں کے درمیان ہی تھے۔ صرف چند مدنی کی رقم ادرہ اور بھری تھی۔ اس میں بڑے نوٹ کم ہی تھے تاہم میرا اندازہ تھا کہ گڈے میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔

اس دوران آگ مزید پھیل چکی تھی۔ کمرے کے اس بچے کچھ حصے میں غمرنا مزید دھواں ہو چکا تھا۔ ہوا تیز تھی اور اس کی وجہ سے آگ گویا ہر سمت میں تیزی سے پھیلی جا رہی تھی۔ جس طرف سے کمرہ اندھم ہو چکا تھا ادرہ سے بھی آگ اندر آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ دروازے کھلیں بھی بری طرح جل رہی تھیں۔ گویا اس جگہ سے نکلنے کا راستہ مسدود ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ شخص اپنے نوٹ اکٹھے کرنے میں لگا ہوا تھا اور اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ باپچوں سے قہقہے بہہ رہا تھا۔

میں نے اسے زور سے جھجھوڑ کر چاروں طرف پھیل ہوئی آگ دکھانے کی کوشش کی اور چیخ کر کہا۔ ”آگ تم نے ذرا بھی اور دیر کی تو ہم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے۔ تمہیں لگنا ہے تو نکلو ورنہ میں جا رہا ہوں۔“

اب وہ شعلوں کو دیکھ کر زہشت زدہ ہوا لیکن اس کی جان رقم میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ میری کمرہ سوار تو ہو گیا لیکن پارہا پارہے نوٹوں کی طرف دیکھنا جا رہا تھا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بھی نوٹ دبے ہوئے تھے جن کی وجہ سے وہ صحیح طور پر مجھے پکڑ نہیں پا رہا تھا۔

میں نے کسی جتنی سائز کے میزک کی طرح لمبی چلائنگ لگائی اور ہم شعلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باہر جا کر۔ چلائنگ کا خطرہ وہ حد تک لمبی رہی تھی اور ہم دروازے کے سامنے کچھ دور تک بڑھتے ہوئے شعلوں کو بھی چلائنگ گئے لیکن اس دوران اس کی مٹھلیوں سے کچھ نوٹ نکل کر اڑتے ہوئے آگ میں جا کر۔

میرے پاؤں زمین پر گئے تو جھینکے کی وجہ سے وہ شخص زمین پر جا کر۔ اسے چوتھیں ضرور آگئی ہوں گی لیکن کم از کم اس کی جان تو بچ گئی تھی۔ اسے چوٹوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے پلیٹ کر اپنی پوٹھی کی تباہی کا سفر دیکھنے لگا۔ نوٹ شعلوں کے درمیان پھرتے ہوئے زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی خاک ہوئے جا رہے تھے۔ ہوا کی وجہ سے کمرے میں بکھرے ہوئے نوٹ بھی اڑاؤ کر شعلوں کی لپیٹ میں آئے گئے تھے۔ چند لمحوں کی بات اور تھی۔ مدنی کے گڈے پر تو ایک چنگاری گرنے کی دیر تھی۔ اس کے بعد اس میں دبے ہوئے نوٹوں کو بھی آگ کی غازی ہونا تھا۔ صرف چند نوٹ اس شخص کی مٹھی میں دبے رہ گئے تھے۔ زندگی بھر اس نے اپنے آپ پر جو عظیم روار کھا ہو گا اس کا حاصل صرف یہ چند نوٹ تھے۔ وہ جتنی جتنی آنکھوں سے اپنی دولت کو نذر آتش ہوتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اسے نظر آ رہے تھے کہ وہ گاڑیوں کے بجائے شد کے  
سطح پر وہی نہیں۔

جیسے تو نظری نہیں آ رہی تھی۔ ان کے ہر حصے پر لوگ  
رہنے ان کا تو کوئی پتہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راجیلہ کی  
پیش دیکھ میں لوگ بیٹھ کر یوں کی طرح بیٹھنے ہوئے تھے اور  
اس سے زیادہ اس کی بھرت رلدے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ  
کے بچے اور بڑے بھی چڑھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

کچھ دھیمی اور ذلیل لوگ اور گردن میں پر آئے تھے پڑے  
رہے تھے۔ ان کا بھی نہیں صاحب راجیلہ اور ہمارے  
رہے ساتھی ان کے لڑے تھے لیکن ان میں گاڑیوں میں ڈالنے کی  
ی نہیں آ سکی تھی۔ غالباً ان کی آمد سے پہلے ہی گاڑیوں پر  
دھڑوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور وہ سب شور مچا رہے تھے کہ ان میں  
از جلد کسی محفوظ مقام کی طرف لے جایا جائے۔

نہیں صاحب ان کے ساتھی اور میرے ساتھی سب حیرت  
ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا  
ان میں کیا کرنا چاہیے۔ ایک لمبے کے لیے تو میں بھی دم بخود کھڑا  
سیاہ ہماری قوم کا آتش کچھ پتا نہیں چلتا۔ کبھی یہ اتنی آواز بلند  
آئی ہے کہ دوسروں کے لیے جان دے دیتی ہے اپنے منہ کا  
بھی نکال کر دوسرے کو کھلا دیتی ہے اور ہنگامی حالات میں اتنی  
م اتنی بے خوف نظر آتی ہے کہ دیکھنے والا رشک کرتے لیکن  
ہنگامی حالات کے دوران اتنی بد نظمی اتنی بڑبڑک اور اتنی  
مٹانے خود غرضی دیکھنے میں آتی ہے کہ دل اوبے اور دوبے لگا

اس جم غفیر کی بے وقوفی کا یہ عالم تھا کہ اس نے گاڑیوں کی  
یونٹ کی سیٹوں اور ایئر ٹرک و حیلر ٹرک پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ  
یونٹ کی سیٹ اور ایئر ٹرک و حیلر ٹرک میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان  
کا نہ جانے کتنے لوگ لڑے ہوئے تھے اور اس پر بھی ان کا  
تھا کہ ان میں جلد از جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچایا جائے۔ اسی  
ان آپس پاس پے در پے نین چار دھماکے سنائی دیے تو ان کی  
باہرہ کی گئی لیکن وہ لوگ گاڑیوں سے نہیں اترے۔ جو کئی  
کے اور گڑبڑا ہٹ معدوم ہوئی انہوں نے دوبارہ شور مچا  
دیا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے قریب پہنچ کر نہیں صاحب سے  
پوچھا۔

”کیا نہیں مسئلہ نظر نہیں آ رہا؟“ نہیں صاحب قدرے عقلی  
ہوئے۔ ان جیسا جانتا ہ وہ آدمی بھی اس وقت پریشان نظر آ رہا  
راجیلہ ان کے قریب ہی کھڑی تھی۔

”مسئلہ تو کچھ نظر آ رہا ہے۔ میں تو آپ لوگوں سے پوچھ رہا  
ہے کہ آپ سب لوگ یوں ہی اچھ باندھ کر کھڑے رہیں گے؟“  
میں نے ان کو آواز میں لیکن قدرے ناگواری سے کہا۔

”تو پھر ہم کیا کریں؟“ نہیں صاحب بولے۔

”کم از کم آپ جیسے آدمی کو تو یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔“  
آپ تو بڑی بڑی ہنسنے لگے۔ خیر صورت حال میں ہاں آف دی پھوٹیشن  
رہے ہوں گے۔“ میں نے کہا۔

”اس وقت میرا ذہن کچھ صحیح طرح کام نہیں کر رہا۔“ انہوں  
نے اعتراف کیا۔ ”بڑے بڑے وقت میں دیکھ کر غم چلا اور بات  
ہے خود اپنے سامنے کچھ ہوتے دیکھا اور بات ہے۔“

”آپ لوگ کم از کم اپنی محنت سیدھی کر لیں۔ بے ہتھم جھوم  
کو جو اس میں لائے کے لیے کبھی کبھی سختی ضروری ہوتی ہے۔ خواہ  
وہ سختی مصنوعی ہی ہو۔“ میں نے سچی آواز میں کہا۔

پھر میں نے جھوم کی طرف مڑتے ہوئے گرج کر کہا۔ ”یہ کیا  
ہنگامہ مچا رکھا ہے تم لوگوں نے؟ یہ گاڑیاں ڈھیلوں اور مضبوطی کی  
مدد کے لیے آئی ہیں۔ تم لوگ تو ویسے بھی بھاگ دوڑ کر کس پناہ  
حاصل کر سکتے ہو۔ ان گاڑیوں میں صرف ان لوگوں کو بیٹھنے دو جو  
چل نہیں سکتے۔“

ان کا شور تو بند ہو گیا لیکن گاڑی سے کوئی شخص اترنا دکھائی  
نہ دیا۔ میں نے پہلے سے زیادہ برسی سے چلا کر کہا۔ ”سب لوگ  
گاڑیوں سے اتر آئیں ورنہ ہم کوئی چلا دیں گے۔“

میں نے ایک ہوائی برست بھی مار دیا۔ میری تھیلہ میں نہیں  
صاحب اور دوسرے تین افراد نے بھی ہوائی برست مار دیے۔  
سب لوگ دھڑ دھڑ کر کے یوں گاڑیوں سے لڑھک پڑے گرا گئی  
نے آؤں کی پوریاں لڑھکادی ہو۔ راجیلہ کی اسٹیجنگ و دیکھن میں  
کئی عورتیں بھی گھسی ہوئی تھیں۔ ایک لمبے کے لیے میں نے سوچا  
کہ عورتوں کو گاڑی میں بیٹھا رہنے دیا جائے لیکن پھر خیال آیا کہ  
اس طرح وہ اپنے مردوں سے جھگڑ جائیں گی۔ اس سے قطع نظر بھی  
میں خرچ زخمیوں کی کو نہ چاہتا تھا۔ اس کے بعد اگر جگہ جگہ جاتی تو  
عورتوں کو بیٹھا جاسکتا تھا۔

لوگ خرچ ہو گئے تو ہم نے زخمیوں کو گاڑیوں میں ڈالنا شروع  
کیا۔ ان میں سے بعض بے ہوش تھے۔ وہ گاڑیوں میں زیادہ جگہ  
کھیر رہے تھے۔ بعض زخمیوں کو بھی سیٹوں پر بیٹھا نہیں جاسکتا تھا۔  
ان میں لٹائی ہی پر رہا تھا۔ اس طرح گاڑیوں میں کچھ زیادہ لوگ نہیں  
آ سکتے لیکن اس وقت تک کارٹر بیک کی دو گاڑیاں اور نئی لٹائی  
اداروں کی تین چار ایئر بیس دہاں آئیں۔ یوں مسئلہ کافی حد  
تک حل ہو گیا۔ زخمیوں کے لواحقین کو بھی گاڑیوں میں لفٹ مل  
گئی۔

اس دوران آسمان سے میزائلوں وغیرہ کی بارش کم ہو گئی  
تھی۔ اب دھقے دھقے سے کوئی دھماکا سنائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود  
ہم نے راستے میں کی جگہ یہ چیزیں کرتے دیکھیں۔ جگہ جگہ زمین  
میں گڑھے پڑ چکے تھے۔ بعض مقامات پر سڑک بھی بری طرح ٹوٹ  
پھوٹ گئی تھی۔ ہم لوگ ایئر بیسوں کے پیچھے ہی چل رہے تھے۔ یہ

انہیں حکمن کے علاوہ جیتنا بہت سے نظرات بھی لاحق وقت ہم انہیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے اس وقت سیکرٹریٹ کے سامنے اپنی جپ میں بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھ میں نہ جاسے کیا تک رہے تھے۔

میں راجیلہ کے ساتھ اسپتال والے پچھلے پرواہیں دونوں اس قدر تھکے ہوئے اور اس قدر دل گرفتہ تھے ایک دوسرے سے کوئی بات تک نہیں کی اور نہ ہی کچھ کہنے کی بات تھی ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں نیچے میں لیٹ گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مطلقاً خواب کا کیا حال تھا۔ کم از کم میرا تو یہ عالم تھا کہ گزشتہ روز کے تمام مناظر فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے مناظر بہت ہی رنجیدہ کو بیٹنے والے بہر حال اس تمام تر رنجیدگی والی شکل کی یادیں کس وقت مجھے نیند آگئی۔ میری آنکھ کھلی تو شام کا اندھیرا تھا۔ میں نے شاور لے کر لباس تبدیل کیا۔ اب میں آواز دہم محسوس کر رہا تھا۔ میں لاؤنج میں آیا تو راجیلہ وہاں موجود تھی۔ وہ بھی بظاہر میری طرح آواز دہم نظر آ رہی تھی نے محسوس کیا کہ ہمارے ذہنوں میں بدستور برف سی جی وہ بھی چپ چپ سی تھی۔ میرا بھی بولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے بنا لائی اور ہم چمکیاں لینے۔ اخبارات کھربے ہوئے تھے جن میں دو تین شام کے اہم شامل تھے۔ عام حالات میں یہاں کے شام کے اخبار پچھلے سے دکھائی دیتے تھے اور انہیں چھانے کا کوئی نہیں دیتا تھا لیکن آج انہیں چھانے کے لیے گویا بہت مواصلہ کیا گیا تھا۔ صبح کے اخبارات نے بھی جیسے شامل دی پر بھی خبروں میں سرسبزت دی اسلحہ ڈھم دلاوا تھا اور جزی تکپ والے سامنے کی یاد آواز کڑی تھی جب کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اخباری خبروں اور بدستور قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ ہر کوئی دور کی کوڑی مختلف سوالات اٹھائے جا رہے تھے۔ مختلف مقامات تھے۔

دھیرے دھیرے ہمارے ذہنوں سے برف کچھ کچھ دھکے لیے میں اس سامنے کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ اپنے کپ کو انگلیوں میں کھاتے ہوئے بولی۔ ہم نے تو ریڈ ڈاٹ کا صرف ٹائل اور پورٹن ہی کیا۔ ایک عمارت کو تباہ کیا۔ بلکہ اسے بھی ہم کیا۔ وہ خود ہی اس کے تباہ ہونے کا بدو بہت کہے ہم نے تو صرف اس سے چھڑ چھا کر کہنے کی غلطی کی اور نیچے میں ہمارے اتنے بہت سے بپتے بپتے کھراڑ گئے۔ خالص ہو گئیں۔ گویا اس بار بھی وہ ہمیں ہماری ہی نظر

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمارے قافلے میں سے کسی گاڑی پر کوئی میزائل وغیرہ نہیں گرا۔ ایک بار البتہ ہماری سب سے پچھلی گاڑی کے عین قریب کوئی چیز گر کر اچھے دھماکے سے پھٹی کہ میرے ہاتھ بھی اسٹینڈنگ وکیل پر لرز کر رہ گئے۔

وہ گاڑی ایک لمبے کے لیے دھول میں چھپ گئی۔ اس میں تھیں صاحب کے آدمی تھے۔ میں نے کھلی جپ میں گردن کھما کر دیکھا اور مجھے اندیشہ محسوس بھی ہوا کہ سب سے پچھلے والی جپ تباہ ہو چکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گردو غبار کے طوفان سے صبح سلامت برآمد ہوئی دکھائی دے گئی۔ جپ میں سوار افراد کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔

ذخیل کو راولپنڈی کے ایک سرکاری اسپتال میں چھوڑ کر ہم دوبارہ اس جیسے میں پہنچے لیکن اب وہاں ہماری مدد کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ مختلف سرکاری اور فلاحی ادارے کچھ تاخیر سے سہی۔ لیکن حرکت میں آچکے تھے۔ اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی اور متاثرہ علاقوں کی طرف مختلف گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ آسمان سے برستی ہوئی چیزوں کا سلسلہ بھی رک چکا تھا۔ پریس، ٹی وی کی ریڈیو کی گاڑیاں بھی مجھے حرکت میں نظر آئیں۔ بہر حال ہم اور تھیں صاحب وغیرہ بھی تمام رات ادھر ادھر پھرتے رہے اور جہاں بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑی، حسب مقتدرہ لوگوں کے کام آنے کی کوشش کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے بلاشبہ وہ قیامت کی رات تھی۔

صبح تک حالات قابو میں آچکے تھے لیکن بہت زیادہ جانی مالی نقصان ہو چکا تھا۔ کم و بیش دھماکی سوار افراد جاں بحق ہوئے تھے جن میں سے بہت سے تو اسلحے کے ڈبوں میں ہی موجود تھے۔ بعض کی لاشوں کے تو کھڑے ہی ملے تھے، بعض کو کھال ہو گئے تھے۔ مجموعی طور پر سات سو کے قریب افراد زخمی ہوئے تھے جن میں سے بعض کی حالت خراب تھی۔

مالی نقصانات کا ابھی کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکا تھا۔ شکر کا مقام ہے تھا کہ ڈپٹی اگ پر چند لمحوں بعد قابو پایا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے جان پر کھیل کر اس کے ایک بہت بڑے حصے کو بچایا تھا۔ اگر وہ حصہ بھی اگ پڑ لیتا تو تباہی اس سے کہیں زیادہ ہوتی۔

یہ تمام خبریں ہمیں ریڈیو اور کچھ ٹیلی فون کالز کے ذریعے ملیں۔ زیادہ صبح خبریں تھیں صاحب کے ذریعے مل رہی تھی۔ صبح کے اخبارات میں بھی رات کے کچھ تک کی خبریں شامل اشاعت تھیں لیکن ان میں سے بیشتر کو خبریں نہیں، محض قیاس آرائیاں ہی کہا جاسکتا تھا۔ حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

دن چڑھے جب ہم نے محسوس کیا کہ اب ہمارا تھیں صاحب کے ساتھ رہنا ضروری نہیں رہا تھا تو ہم نے انہیں خدا حافظ کہا اور اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہوئے۔ حکمن سے ہم سب کا برا حال تھا۔ تھیں صاحب کی حالت تو ہم سے بھی زیادہ خراب تھی۔

ہا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں

اس طرح آپ نے بھی تھوڑا بہت تماشاے اہل کرم کیا  
ہوں کہنے کہ تماشاے اہل کرم دیکھ لیا۔ لیکن یہ باتیں آپ کو  
اس وقت کیوں یاد آ رہی ہیں؟

”میں اصل بات کہنے سے پہلے حمیس یاد دلانا چاہتا ہوں کہ  
ریڑ ڈاٹ کے جگر میں پڑنے کے بعد سے میری کیا کیا درگت بنی  
ہے۔ میں نے..... یعنی تیس احمد خان نے بہ کس تیس کیا کیا  
میں تیس اور تیس اٹھائی ہیں۔“

”بے شک۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”مجھے وہ سب کچھ اچھی  
طرح یاد ہے سراسر آپ صرف نام کی مدد تک نہیں، عملی زندگی میں  
بھی ایک تیس آوی ہیں لیکن اس دوران آپ کی تمام تر خلافت  
دعویٰ کی دھری نہ گئی تھی۔“

پھر میں نے بڑے ادب سے انہیں یاد دلایا۔ ”مجھے یہ سب کچھ  
اس لیے بھی یاد ہے کہ خود میری اس سے بھی زیادہ ہی درگت بنی  
ہے۔“

”لیکن تم کم از کم اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ تم کوئی  
بڑے سرکاری افسر نہیں ہو۔ بڑے بڑے عظیم اور نازک  
محاطات میں کسی کو جواب دہ نہیں ہو۔“ وہ تیزی سے بولے۔

”تفسیر یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں کہ درحقیقت کون خوش  
قسمت ہے سراسر شخص اپنی طرف نہیں بلکہ کسی اور کی طرف  
دیکھ کر رشک کرتا ہے۔ بے شمار لوگ جو آپ کے جسارت کی طاقت  
اور اہمیت سے واقف ہیں وہ آپ پر رشک کرتے ہوں گے البتہ  
اتحاد ضرور ہے کہ۔“

جن کے رہتے ہیں بڑا اُن کی بڑا مشکل ہے  
”بات کیا ہے؟ آپ کو کیا مشکل آن پڑی ہے؟“

”میرے زخموں پر شعور دشمنی کا مزہ رکھنے کی کوشش مت  
کرو۔ اس وقت اشعار یا مصرع میرے زخموں پر مزہم کا نہیں  
نمک کا کام کر رہے ہیں۔“ تیس صاحب بدستور جھنجھلائے ہوئے  
سے انداز میں بولے۔ ”بھئی کبھی میں بھی اپنے آپ پر رشک کیا  
کرتا تھا لیکن آج کی بیشک کے دوران میرا احتیاطی رہنے کو دل  
چاہنے لگا تھا۔“

”کیوں سر؟ کیا بہت ڈانٹ پڑی ہے؟“ میں نے ہمدردی سے  
پوچھا۔

”ڈانٹ وغیرہ تو خیر میں نہیں پڑتی۔ لیکن کسی کا نظریں  
بدل لینا ہی ہمارے لیے ڈانٹ سے زیادہ سنگین ہوتا ہے۔“ وہ  
لٹھڑی سانس لے کر بولے۔ ”میرے پورے کیرئیر کے دوران  
مجھے میرے ساتھ ایسا بدعتی اختیار نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ اوڑنی کیمپ  
والے سانچے کے بعد بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ حلقہ کارکنوں کے پاس  
مناسب وضاحتیں موجود تھیں جنہیں قبول کر لیا گیا تھا۔“

”گولی بات نہیں۔“ میں نے دھمکے لہجے میں کہا۔ ”خون کا  
ماب تو سب کو نہ ہی پڑتا ہے۔ انہیں بھی دینا پڑے گا۔ ہم  
پادالے تو اپنا اپنا سیدھا نظام چلاتے ہی رہتے ہیں۔ اپنی  
فصل متل کے مطابق اپنے کام کرتے رہے ہیں۔ لیکن نہایت  
اموشی سے اس دنیا میں اوپر والے کا بھی ایک نظام کام کر رہا  
ہے۔ مجھے اس نظام پر زیادہ مجھو سا ہے۔“

راجیلہ نے اپنے تم آواز بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے  
تیب کی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مہیا کل خون اس کے  
چہرے ہی کا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”ذرا تیس صاحب کو فون تو کرو۔ معلوم کریں کہ تازہ ترین صورت  
مال کیا ہے۔“

راجیلہ نے خبر سچ کیا اور مختصر بات کہنے کے بعد فون بند  
کرتے ہوئے بولی۔

”وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں۔ میٹنگ اختتام پر ہی ہے۔  
بیشک ختم ہوتے ہی وہ خود ہمیں فون کریں گے۔“

میں نے وہ چند منٹ باتیں کہنے اور چائے پینے میں گزارے۔  
سب بدستور تیس صاحب کا فون لگیا۔ راجیلہ ان سے بات کرتے  
ہوئے بولی۔ ”میں نہیں..... دراصل افضل آپ سے کتنا چاہ رہے  
تھے۔“

اس نے فون میری طرف بڑھایا۔ تیس صاحب میری آواز  
سننے ہی کر اپنے کے سے انداز میں بولے۔ ”میرا افضل چودھری اتم  
نے مجھے موارا۔..... بالکل ہی موارا۔“

”کیوں سو؟“ میں نے کیا کیا ہے؟“ میں نے دھمکے لہجے میں  
پوچھا۔

”میں معلوم ہے چند منٹ پہلے میں جس میٹنگ میں تھا اس  
میں ملک کی اعلیٰ ترین مستدر و مشاں شریک تھیں۔“

میرے لیے یہ کوئی حیرت انگیز خبر نہیں تھی بلکہ یہ تو میرے لیے  
کوئی خبری نہیں تھی۔ اس قسم کی کوئی میٹنگ میرے لیے متوقع  
تھی۔ تیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”اگر حمیس یہ  
معلوم نہیں تو کم از کم یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ میرا شان اران لوگوں میں  
ہوتا ہے جنہیں ہمارے ہاں ”کنگ میکرز“ کہا جاتا ہے۔“

”کیا بالکل۔“ میں نے بات بھولا نہیں ہوں۔“ میں نے آہستگی  
سے کہا۔

”اس کے باوجود میں اس منحوس ریڑ ڈاٹ کے جگر میں خانہ  
بدستور اور نہ جانے کیا کچھ بنا۔ فقیروں کی طرح چمکتا رہا۔“ وہ  
بولے۔

”تو اس میں اس طرح بدعت کی کیا بات ہے سر؟“ میں  
نے طاقت سے کہا۔ ”یہ کام تو بہت سے بڑے بڑے لوگوں کو کرنا پڑ  
چکا ہے۔ بھی تو چچا غالب نے کہا تھا۔“



میں آجائیں گے لیکن فی الحال تو تم اپنے چہرے پر ایسی کی تاریکی مت بچھاؤ۔ اس پر جتنی تاریکی چھیل ہوئی ہے اتنی ہی کافی ہے۔ اس میں مزہ بھانسنی نہیں ہے۔

اس نے مجھے گھورا پھر سر جھٹک کر گویا اس موضوع سے بچھا چڑھتے ہوئے ہوئی۔ ”اُمی! تمہیں یاد ہے ہم نے کل دوسرے کھانا نہیں کھایا ہے۔ اور چائے پینے بیٹھ گئے۔“

”اف۔ ایہ تم نے کیا اولاد پلا دی! میں نے کراہ کر پیٹ پر ہاتھ رک لیا۔“ تم نے کھانے کا ذکر کیا اور فوراً بھوک لگنے لگی۔ درندہ اس صحرائی لوٹ کا کھانے کے بغیر بھی آرام سے گزارا ہو رہا تھا۔

”میری بھوک کو کہ اسروہی کی وجہ سے سرخلی ہے لیکن میں اب بھی کچھ کھانا چاہتی ہوں۔ میں سے کھانا آنے میں تو کچھ دیر ہے لیکن میں انہیں فون کر کے پہلے ہی منگاتی ہوں۔“

وہ گھر کے عام فون پر میں والوں کو فون کرنے لگی۔ اس دوران اس کے موبائل فون کا بڑبڑا اٹھا۔ فون میں نے اٹھالیا اور بٹن دبانے کے بعد ”ہیلو“ کہا تو دوسری طرف سے قدرے حیرت سے پوچھا گیا۔ ”میں کمال گئیں؟“

میں نے اچھر کی آواز پہچان کر غم ناک سے لمبے میں کہا۔ ”یارا تم لوگ تو میٹم سے بات کرنے کے بہت ہی عادی ہو گئے ہو۔ کبھی کبھی موبیو سے بھی بات کر لیا کرو۔ اس غربت اور بے سروسامانی کے باوجود موبائل فون موبیو کے پاس بھی ہے۔“

اچھر نے میری آواز پہچان کر ہلکا سا تھک لگایا اور بولا۔ ”سرا! آپ شاید اسے جھوٹ یا مذاق سمجھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں آپ سے ہی بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں موجود ہوں گے۔“

”میرا حال مجھے یقین ہے کہ تم تو مجھ سے جھوٹ بھل سکتے ہو اور نہ ہی مذاق کر سکتے ہو۔ کوسہ کیا کتنا چاہے ہو؟“

اس دوران راجیلا دوسرے فون پر میں والوں کو کھانے کا کہہ چکی تھی اور ریسیور رکھ کر تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اندازہ لگائے کی کوششیں کر رہی تھی کہ اس کے فون پر میں نے کس سے بات شروع کر دی تھی۔ میرا اپنا فون اس وقت کمرے ہی میں پڑا تھا۔

اچھر ذرا دبی آواز میں بولا۔ ”سرا! اصولاً تو مجھے اس کارروائی کی رپورٹ پہلے تھیں صاحب کو دینی چاہیے تھی لیکن نہ جانے میں نے مجھے خیال آیا کہ پہلے میں آپ کو اس مسئلے میں مطلع کر دوں۔ پھر آپ جو مشورہ دیں وہ کیا جائے۔“

”میرے آتے ہی بے اگمالی شروع ہو گئی۔ تم لوگوں کی نیت میں خور آگیا۔ تم نے تھیں صاحب کو بائی پاس کرنا شروع کر دیا۔“ میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں سرا! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو یونہی رہ سکتی

تو کہ بات کر رہا ہوں۔ آپ سمجھ لیجئے گا کہ آپ نے کوئی آؤٹی ہوئی سی بات بطور کی زبانی سنی ہوگی۔“ اس کے لمبے میں بھی ہلکی سنجیدگی تھی۔

”تھک گیا ہے؟“

”سرا! آپ کو معلوم ہے میں چند مشکوک غیر ملکیوں کی عمرانی کر رہا ہوں۔ تین غیر ملکی ہیں۔ تین سفید فام ہیں۔“ محمد تانے لگا۔ مجھے معلوم تھا وہ اسلام آباد ہوئی کے سامنے جیسی ڈرائیور کے روپ میں موجود رہتا تھا۔ سلیمان ٹڈے فقیر کے ہمیں میں اس کے آس پاس سی مدد کے لیے موجود رہتا تھا۔

اچھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تین غیر ملکی اسلام آباد ہوئی میں مقیم ہیں۔ آج ہوئی میں ایک اور سفید فام بچھا۔ ریٹ فائٹ کے لاہور والے آؤے سے ہمیں ان کے جن خاص خاص لوگوں کی کپیڈنٹراڈ تصویروں ملی تھیں ان میں اس شخص کی تصویر بھی شامل تھی۔ میں اسے ہوئی میں جانے دیکھ کر ہوئی کے دروازے سے سی چپک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ شخص کافی دیر اندر رہا۔ جب یہ اہلپن آیا تو ان سفید فاموں میں سے ایک اس کے ساتھ تھا جن کی ہم عمرانی کر رہے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے تم ان کو دہلی کی عمرانی ٹھیک سی کر رہے تھے۔“

”جی ہاں۔ اب تو یہ بات جتنی ہو گئی ہے کہ وہ واقعی مشکوک تھے۔ خیر۔ تو میں بتا رہا تھا کہ نوادر گورا اور پرانا گورا اسٹے باہر آئے۔ پرانا گورا نوادر گورے کو صرف باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ میں چلی سے جیسی دروازے کے سامنے لے آیا اور نوادر گورا خوش قسمتی سے میری جگہ میں بیٹھ گیا۔ میرا مطلب ہے یہ میری خوش قسمتی تھی۔ اس کی نہیں۔“

”وضاحت کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا ”کر یہ اس کی خوش قسمتی ہوئی تو شاید اس وقت تم مجھے فون نہ کر رہے ہو۔“

”آپ ٹھیک سمجھے سرا! اچھر جگہ سی جیسی کے ساتھ بولا۔ ”ہم ان لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر رہے تھے جن کی کپیڈنٹراڈ تصویروں ہمارے پاس تھیں۔ ان میں سے یہ پہلا شخص مجھے نظر آیا ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس وقت میری خوشی سے کیا حالت تھی جب یہ گورا میری جگہ میں بیٹھا۔“

”میں اندازہ کر سکتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جس میں میں محسوس ہو رہا ہو گا جیسے حسینہ عالم نے تم سے شادی کے لیے ہائی بھر لی ہے۔“

”نہیں سرا! حسینہ عالم اگر مجھ سے شادی کرنے پر متل جاتی تو میں تو سخت پریشان ہو جاتا۔ مجھ میں اس قسم کی عقیم خواہشیں سے شادی کا حوصلہ کہاں ہے سرا! اس نے لٹھری سافٹی۔“ میں تو بالکل اس طرح خوش ہوا تھا جس طرح سولہ ستر سال کی عمر میں اس وقت ہوا تھا جب میرے گاؤں کی ایک لڑکی نے بھت سے





”ظاہر ہے اس سے کچھ معلوم کرنے کے لیے اس پر کرنی پڑے گی۔“ خنی کریں گے تو امید ہے کہ وہ چی و پکارا گا۔ اس کا منہ بند بھی نہیں رکھا جائے گا کیونکہ وہ کسی زبان کھولنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم اس کی چی و پکار پر سناوے کے متحمل تو نہیں ہو سکتے۔ یہ آبادی کے بچوں کا تھا تو ہے ہمیں کہ لوگ چی و پکار سننے کے عادی ہوں اور کان پلٹ کر سوتے رہیں گے۔ ”ذرا تنگ دہم“ میں کو قہقہہ ہنسی ہوئی۔ ”میں نے کہا۔

”وہ سوتے ہوئے بولی۔“ یہ مکانات کافی بڑے ہیں دوسرے سے کچھ خاصے پر واقع ہیں۔ ویسے اس گھر میں ایک بڑا کرا ہے۔ وہ اصل میں اسٹڈی یا لائبریری ہے بجائے بچے بنائی گئی ہے۔ اس کا دروازہ وغیرہ بھی سا ہے۔“

”ہیں۔۔۔ پھر تو کام بن گیا۔۔۔ اور بھلا کیا چاہیے میں تو تحقیق کے عمرہ انتخابات موجود ہیں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میں اپنے دشمن پر بھی تصدیق نہیں کرنا اور پھر ذہن رکھنے والوں کے چھکڑے ہیں۔“ راجہ بنا کر بولی۔

”میں خود ان چھکڑوں کو پسند نہیں کرتا۔“ میر سے کہا۔ ”لیکن کبھی مجبوراً گھنیا لوگوں کے معاملے میں لینا پڑتا ہے۔ اس میں بھی میری کوشش یہی ہوتی کہ کچھ کرنے سے زیادہ ذرا دھماکا ہی کام چل جائے والوں کے خلاف میرے دل میں بڑی نفرت ہے۔ انہیں قابو میں آنے ہوئے کسی بے بس شکار پر غار کر دیا گا۔ ایسے لوگوں سے بھی میں تو درد و عقاب لیے جس میں ”ناوایا مر جاؤ والی صورت حال ہو۔“

”اس کا مطلب ہے تمہارے اندر قبائلی رو ہے۔“ راجہ بولی۔

”وہ تو سب کے اندر ہوتی ہے۔ کسی کی سوتی رہا ذرا عجیبی رہتی ہے۔ کسی کی قبائلی روح کو لیڈر کچھ کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں انسان قبیلوں ہی رہتا تھا۔ نفرت پر نہ جانے کب تک ان چیزوں کے ہیں۔“ میں نے نہایت مدبرانہ انداز میں کہا۔

اس دوران باہر سے ٹوٹی نے اطلاع دی کہ میر تھا۔ راجہ بولی۔ ”پارسل آنے سے پہلے کھانا کھا ہے۔“

کھانے کے دوران میں نے ٹوٹی کو بتایا کہ ایک تھا جس سے تحقیق کے سلسلے میں کچھ بحث درآ میرے ساتھ رہتا تھا پھر میں نے راجہ سے کہا۔

تمہاری فکر پر چل پڑے۔“ وہ فحشی سے بولی۔ ”اب یہ اتنا عجیبہ معاملہ تھا لیکن تم دونوں اس کے بارے میں مسخوں کی طرح باتیں کرنے میں لگے ہوئے تھے۔“

”دل بہت اداس تھا۔ ہم اس طرح باتیں کر کے خود کو بھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بھی خود فریبی کا ایک انداز تھا۔“ میں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

”مضبوط لوگوں کو خود فریبی کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ قدرے تھکنا سے لہجے میں بولی۔

”فون پر دوسری طرف سے احمد کی منگوائی ہوئی آواز ابھری۔“ ”میرا آپ نے مجھے بتایا کہ میں کہ میڈم ہماری تنگنویں رہی ہیں۔“

”آج پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کی باتوں سے میڈم کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوتا ہے۔ جب ان کا موڈ ہوتا ہے تو وہ بھی اسی قسم کی تنگنویں ہیں۔“ میں نے احمد کو تسلی دی۔

”لیکن میں موقع مل ضرور دیکھتی ہوں۔“ راجہ منہ بنا کر بولی۔

”چھا۔۔۔ خیر۔۔۔ یہ ڈانٹ ڈھپٹ چھوڑو اور بے چارے کو بتاؤ کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔“

راجہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولی۔ ”میرا خیال ہے اس شکار کو ہمیں ٹھکرا لیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال بھلا تمہارے خیال سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے۔ سوائے ایک معاملے کے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

راجہ فون میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے احمد! تم پارسل کو نہایت احتیاط سے پچھلے گیٹ سے میرے ہال لے آؤ۔“

”ٹھیک ہے میڈم! میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔“ احمد مؤذبانہ لہجے میں بولا۔ اب میں اپنا سر راجہ کے قریب لاکھ فون پر احمد کی آواز سن رہا تھا۔ احمد نے مزید کوئی بات نہیں کی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجہ بھی فون بند کر چکی تو میں نے کہا۔ ”غیر صاحب کو پتا تو ضرور چل جائے گا کہ ہم نے ہالا ہی ہالا کچھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا دفتر عمل کیا ہو گا؟“

”ان سے میں سنٹ لولہ کی۔“ راجہ نے پروائی سے بولی۔

”اس مکان میں کوئی نہ خانہ وغیرہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کیوں؟“ اس نے بھوسا چکا کر دیا۔

”وہ جو گورے صاحب قشریف لارہے ہیں وہ ہمارے عزیز دوست یا رشتے دار نہیں کہ ہم انہیں سامنے بٹھا کر چائے بھکت پیش کریں گے اور موصوف کو جو کچھ معلوم ہو گا وہ فر فر پاتا شریف کہیں گے۔“

”تھکرہ؟“ راجہ انجان بنے پر ٹٹی ہوئی تھی۔

قام کو سلیمان کی مدد سے اٹھا کر یہاں لے آیا کروں؟" احمد بڑے غصہ سے بولے۔

"میں یہاں گوروں کا اچار نہیں ڈالتا ہے۔" راجیل نے جواب دیا۔

"میں گورے کو اٹھا کر زہر زمین اسٹڈی میں لے کر آئے اور بے ہوش کے عالم میں ہی میں نے اسے گڑی کی ایک سیدھے چٹے والی کر سی پر بٹھا کر اچھی طرح پانچہ دیا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھکی رہی۔ احمد اور سلیمان واپس چلے گئے۔ میں نے اور ٹونی نے سفید قام کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ راجیل اور پٹی چلی۔

سفید قام کو جلدی ہوش آگیا۔ حواس ٹھکانے پر آئے ہی اس کی نگاہ پر ٹھکری اور سب سے سلاجل اس کے منہ سے یہ نکلا۔

"مرا مزادے! ام ابھی تک زندہ ہوں۔"

میں نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن میرا ہاتھ پھر بھی حرکت میں آئی گیا۔ اس نے میرے لیے ہاسٹل کا نقطہ استعمال کیا تھا اور اس کے نیچے میں میرے لیے بے پناہ غرت و حقارت تھی۔ میری کمزوری گھوم گئی۔ گھوٹا اس کے منہ پر پڑا۔ یہ گھوٹا میں نے پوری طاقت سے نہیں مارا تھا۔ مجھے کو بوقت کچھ نہ کچھ "بریک" لگ ہی گیا تھا لیکن وہ کر سی سمیت الٹ کر پیچھے جا کر۔

ٹونی نے کر سی سیدھی کی تو پتا چلا کہ وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کی زیادہ کوششیں ٹونی نے ہی کی تھیں۔ میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا گویا میرا گھوٹا سفید قام کو نہیں بلکہ ٹونی کو جالگا ہو۔

"معاذ کرتا یا داتا تھ ذرا بے اعتیاری گھوم گیا تھا۔"

"سرا میرا تو خیال تھا کہ آپ اس نقطہ تا تحقیق کی گردن توڑ ڈالیں گے۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ نے تو اسے جھٹس دیا۔"

"بڑی مشکل سے ریڈ ڈاٹ کا ایک آدمی ہاتھ آیا ہے۔ ہم بیڈائی ہو کر اسے خلع کرنا انورڈ میں کر سکتے۔ ویسے بھی۔۔۔ بڑھے ہوئے توی کو کیا مارتا۔ اگر اس سے معلومات نہ حاصل کرنی ہو تھیں تو میں اتنے صحبت میں نہ پڑتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ٹونی ایک بار پھر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر پر جو تھکے پٹے ہی چوٹ لگی ہوئی تھی اور اب بھی کر سی کرنے کی وجہ سے اس کا سر فرش سے جا لگایا تھا تا یہ اس لیے وہ اتنی جلدی دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

دوبارہ ہوش میں آنے پر بھی اس کی رعوت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ غرت و حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔"

منہ ٹھکانے بیٹھی تھیں۔ تم نے دیکھا۔۔۔ کبھی کبھی کس طرح آسمان سے اچانک کوئی اچھی خبر ٹپک پڑتی ہے۔"

"بے شک۔۔۔ اور کبھی کبھی پیٹھے بٹھائے اچانک آسمان سے جیڑا مل اور راکٹ بھی برسنے لگتے ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

کھانا کھا کر میں نے اور ٹونی نے راجیل کی رہنمائی میں ڈین تھا اسٹڈی میں جا کر کچھ پتاواں کییں اور دوبارہ اوپر آگئے۔ اس دوران احمد اور سلیمان آگن پیچھے ٹھیکسی وہ پچھلے گیٹ سے مکان کے اندر لے آئے تھے۔ اسپتال میں بھی وہ پچھلے گیٹ سے داخل ہوئے تھے۔

ہم نے پچھلے برآمدے کی لائن بھجادی اور احمد نے ڈکی کھول کر ہمیں پارسل کا ڈیڈا کر لیا۔ میں نے ٹھیکے اندر جے میں غیر ملکی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"ڈیڈا فقیر" سلیمان اپنا سٹیکول ہوا میں لراتے ہوئے بولا۔ "سرا کسی فقیر نے۔۔۔ اور وہ بھی کالے فقیر نے۔۔۔ پہلی بار کسی گورے کے سر سٹیکول مارا تھا۔ چوٹ کے علاوہ دلی صدمے کی وجہ سے بھی اس کی بے ہوشی بڑی ہو رہی ہوگی۔"

"جتنی زیادہ دیر بے ہوش رہے گا ہوش میں آنے پر اتنی ہی زیادہ کیٹکنی کا مظاہرہ کرے گا۔" احمد نے کہا۔

ہم اسے پوری کی طرح اٹھا کر اندر لے آئے۔ راجیل نے دشتی میں اس کا چہرہ دیکھا اور انہایت میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہالیت۔ اس شخص کی تصویر ان کیپٹن ٹرانزڈ تصویروں میں شامل تو کی۔"

"مجھے بھی یاد آگیا ہے۔" میں نے آئینہ کی وہ تصویریں تعداد صرف چھ تھیں اور میں نے انہیں صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔

"مجھ میں تھا کہ سامتا ہونے پر میں ان چہ کے چہ افراد کو پہچان سکتا ہوں۔" وہ اپنی اصل شکل میں ہوتے۔

"آپ کا کیا خیال تھا کہ ہم کسی غلط آدمی کو اٹھا لائیں گے؟"

گونا گونا گئے ہوئے بولا۔

"جب سے تم ٹھیکسی ڈرائیو رہے ہو میں تمہاری یادداشت پر زیادہ بھروسہ نہیں رہا۔ تم کچھ بھی اٹھا کر لے سکتے ہو۔" راجیل نے کہا۔

"واقعی آج کل ٹیکسی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" احمد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"پچھلا۔۔۔ چلو اب اسے تھکانے میں پہنچاؤ اور واپس جا کر سفید ڈیڈا ٹیکسیوں کی گھرائی کرو۔ اگر یہ شخص ان میں سے سے ملے کیا تھا تو پھر وہ بھی ہمارا مطلوبہ آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔"

میں نے اسے بھی اٹھا کر دیا۔ شاید اس سے بھی کوئی کام نہ ملے۔

مگر آپ حکم دی تو میں اپنی ٹھیکسی میں بیٹھنے والے ہر سفید

کو کہے کہ ریڈ ڈاٹ میں تمہاری حیثیت کیا ہے مسٹر ایکس؟  
 ”ریڈ ڈاٹ میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ سب نے  
 ڈنٹے کچھ کام ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنا اپنا کام کرتا ہے۔“  
 پڑسکون لیجے میں بولا۔

”تمہارے ڈنٹے کیا کام تھے مسٹر ایکس؟“ میں نے اس  
 آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بہت لمبی بات ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔“  
 ہم آتے بے سمجھ بھی نہیں ہیں۔ مسٹر ایکس!“

”سب دیکھتے ہیں اس تذکرے کا کوئی قلمرو نہیں۔ بات پر  
 ہو گئی ہے۔ فی الحال تو میرے ڈنٹے کوئی کام نہیں۔ اگر آج  
 تمہارے آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھا تو صبح تک ملک سے باہر  
 ہوتا۔“

”قتل اسے ہی کہتے ہیں مسٹر ایکس!“ میں نے طے لے  
 لیا۔ ”اس سے جس میں یقین ہو جانا چاہیے کہ ڈوہاں صرف  
 نہیں ہلاکتے۔ ایک ناوہہ طاقت بھی کچھ ڈوہاں ہلائی ہے اور  
 تک بات کے ہی یا پرانی ہونے کا متعلق ہے تو اس کی فکر میں  
 پڑو۔ جو پڑھا جا رہا ہے صرف اس کا جواب دو۔“

”میں تمہاری کسی بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں  
 فرمایا۔

”میں نے لٹھری سانس لے کر فونی کی طرف دیکھا اور کہ  
 اچکاتے ہوئے کہا۔ ”گورا آخر گورا ہوتا ہے۔ وہ کسی با  
 جواب دینے کا پابند نہیں ہوتا جب کہ ہم کالے ان کے حکم  
 فردوسی کے بھی پابند ہیں خواہ ہمارا خمیر اس کی اجازت نہ دے۔  
 کا کلام کتابت عجیب ہو گیا ہے فونی!“

”فونی آگئیں سیکڑ کر بنور میری طرف دیکھتے ہوئے  
 حیرت سے بولا۔ ”سرا آپ کالے تو نہیں ہیں۔ اچھے بھلے  
 سفید ہیں۔“

”سرخ و سفید تو تم بھی ہو لیکن افسوس کہ ہمارا شمار کا  
 ہی ہوتا ہے۔“ میں نے لٹھری سانس لے کر کہا۔ ”گورے  
 کا موڈ نہیں ہے کہ ہم کالوں کے سوالوں کا جواب دے۔“  
 مشورہ ہے؟“

”گورے صاحب کے مزاج میں ذرا سہمی ہے۔“  
 ہے صاحب کو ذرا گرمی پہنچائی جائے۔ فونی بولا۔

”مسٹر ایکس کے جوتے اور مونڈے ہم اس کی بے  
 دوران ہی اتار چکے تھے۔ میں نے ایک ٹھکے سے اس  
 ترجمی کی اور فونی نے لاسٹر جلا کر شطہ اس کے ٹکڑے  
 کر دیا۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھیجے لیے۔ اس کا چہرہ  
 جھجکا ہوا اور پھر زرد پڑ گیا۔ چند سیکنڈ میں ہی پینہ اس  
 سے پھسل کر گریبان میں جا لے گا۔ کمرے میں گوشت  
 پھیلے گی لیکن مسٹر ایکس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی

میں نے اپنا ذہن لٹھرا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
 ”سوال یہ نہیں ہے کہ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا  
 پیارے! سوال یہ ہے کہ تم نے اس ملک کے ساتھ کیا کیا۔ اور  
 مزید کیا کچھ کرنا چاہتے تھے۔“

”ہم سے اندازہ نہ کی لٹھی ہوئی۔ بھیاک غلطی۔“ وہ  
 خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ ”میں نہیں معلوم تھا کہ تم  
 جیسے مشکوک ماضی رکھنے والے شخص کے سر پر ملک سے محبت کا  
 بھوت سوار ہو جائے گا۔ جو کچھ ہم نہیں دنا چاہتے تھے۔ جو  
 کچھ تمہارے لیے کرنا چاہتے تھے اس کا پچاسواں حصہ حاصل  
 کرنے کے لیے بھی تمہارے ہاں کے وہ لوگ اپنا خمیر توڑی میں  
 ڈالنے پھرتے ہیں۔ جن کی جیت الوطنی و فیوض کے ترانے گلی گلی  
 گاتے جاتے ہیں اور جنہیں دیوانا کا درجہ دیا جاتا ہے۔“

”مجھے تمہارے اس دعوے سے اختلاف نہیں۔ لیکن میں  
 کیا کروں۔۔۔ میرا سب پر زور نہیں چلتا۔ میں سب کے دلوں  
 کی کاپیا نہیں پلٹ سکتا۔ میں صرف اپنے آپ کو ہی غداری اور خمیر  
 فروشی سے بچاؤ تو یہی بات ہوگی۔“ میں نے طاقت سے کہا۔  
 ”تک کی کان میں کب تک ٹنگ ہونے سے بچے گے؟“ وہ  
 کھڑے انداز میں مسکرایا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میرا خیال ہے فولاد کو ٹنگ بننے  
 میں مدد ہی ملتی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے فولاد کبھی بھی ٹنگ نہ  
 بنے۔“

”تیکمیل قارمولا مناسب ہو تو تمہارے ہاں کوئی بھی چیز کچھ بھی  
 بن سکتی ہے۔“ وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ اس کی نیلی آنکھوں  
 میں ہلا کی سرد مری تھی۔ میں اس کی خود اعتمادی پر دل ہی دل میں  
 حیران ہوتے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے پچان کر اس نے گویا ابتدا ہی  
 میں یہ اقرار کر لیا تھا کہ وہ ریڈ ڈاٹ کا آدمی تھا کہ میرے لیے اس  
 کی صورت اجنبی تھی۔ اس کا سکون راہطینان بے خوبی اور تخت  
 بنا رہی تھی کہ وہ کوئی اہم آدمی تھا۔ ریڈ ڈاٹ میں وہ کوئی خاص  
 مقام رکھتا تھا۔

”میں نے کسی سانس لے کر کہا۔ ”بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہم  
 دو مذہب اور بڑے آدمیوں کی طرح نہایت پڑسکون ماحول میں بیٹھے  
 نہایت وقار و محنت اور بردباری سے گفتگو کر رہے ہیں۔ لیکن  
 افسوس کہ مجھے ابھی تک تمہارا نام معلوم نہیں۔“

”تم مجھے مسٹر ایکس کہہ سکتے ہو۔“ وہ بات لیجے میں بولا۔  
 ”افسوس کہنا خواہدورت اور رہا فونی نام ہے!“ میں نے  
 رکھ بھرے لیجے میں کہا۔ ”اگر تم شادی شدہ ہو تو تمہاری سسر کا  
 نام بتیہ نوالی ہوگا۔“

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک دروازہ  
 شخص تھا۔ میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”خیر۔۔۔ نام سے کوئی فرق  
 نہیں پڑتا۔“ مسٹر ایکس سے بھی کام چل جائے گا۔ کیا تم اپنا پند

نے مجھے غلط سلاخوات دے کر نالے کا سوچا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گھبرے گھبرے لمبے میں کہا۔  
اس نے ایک لمبے کے لیے دانت بھیجے لیے گویا اپنے سونڈے پاؤں کی اذیت برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر استہزائیہ سے لمبے میں بولا۔ ”گھوڑا تم غیب داہن اور روشن خیر بھی ہو۔ دلوں کا حال جان لیتے ہو۔“

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ”اچھا۔۔۔ چلو۔۔۔ یہ بتا دو کہ تم ہوٹل میں جس شخص سے ملنے گئے تھے اس کی ریڈ ڈاٹ میں کیا حیثیت ہے؟“

”کوئی حیثیت نہیں۔ وہ تو ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ جانتا تک نہیں۔“ وہ تجزی سے بولا۔ ایک بار پھر اس کے لمبے میں جھوٹ تھا۔

میں نے ٹوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”گورے صاحب کے اندر کی برف پگھل نہیں ہے۔ انہیں تھوڑی سی حرارت اور پیچھا۔“

ٹوٹی نے اس کے دوسرے ٹکڑے کے پیچھے لا سٹروشن کر دیا۔ اس بار اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی لیکن اس نے جلد ہی اس کا گھٹا گھونٹ دیا اور ایک بار پھر حتیٰ سے دانت بھیجے لیے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ یوگا کے اصول پر اپنا ذہن کیس اور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس اذیت سے لائق ہو سکے۔ میں نے اس کے بال ملٹی میں جکڑتے ہوئے جھٹکا دیا۔ اسے آنکھیں کھولنا پڑیں اور اسی دنیا میں واپس آ کر پڑا جہاں وہ ”آتش زریا“ تھا۔

اُس کی آنکھیں لال انگارے جیسی تھیں۔ میں نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ ”اب بھی وقت ہے مسٹر ایکس! بولنا شروع کرو۔“

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ جیسے کیسے یقین دلادیں۔۔۔ کہ تم جو کچھ جانا چاہ رہے ہو وہ مجھے معلوم نہیں ہے۔“ اس کے حلق سے غجیب سی آواز نکلی۔ گوشت جلنے کی بو تیز ہو گئی۔

”ٹوٹی! میں نے سرو لمبے میں کہا۔ ”اس سٹرا کا شعلہ اس وقت تک گورے صاحب کے پاؤں تلے رکھنا جب تک آہ پار سوراخ نہ ہو جائے۔“

مسٹر ایکس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن ڈھیلی پڑ گئی۔ اپنی قوت برداشت کا امتحان لیتے لیتے وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ شاید یہ اس کے سر کی چوٹیوں کا بھی اثر تھا۔ میں نے ٹوٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے لا سٹراس کے پاؤں کے پیچھے سے ہٹا لیا۔ میں نے کرسی زمین پر ٹکا دی اور مسٹر ایکس کے بال چھوڑ دیے۔ اس کی گردن نہایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو دھٹک گئی۔

اسی دوران راحیلہ میز صوفیوں سے اتر کر نیچے آئی دکھائی دی۔ وہ ایک بار پھر لباس تبدیلی کر چکی تھی۔ اب وہ سیاہ پنٹ اور سفید

ایڑائی کی کوشش سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی نازک مزاج شخص نہیں تھا۔ پچھتاہے پناہ قوت برداشت کا مالک تھا۔

جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے ٹکڑے میں چھوٹا سا گھبراہٹ بڑھا ہوا تو میں نے ٹوٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے لا سٹراس کے پاؤں تلے سے ہٹا لیا۔ میں نے کرسی کے چاروں طرف فرش پر ٹکا دیے۔ مسٹر ایکس نے پاؤں پوری طرح فرش پر نہیں ٹکایا۔ صرف ایڑی نکال۔ اس کی سانسوں کی آواز اب خرخرات میں تبدیل ہو چکی تھی۔

”میں نے چاہا تھا بات چیت نہایت پرسکون اور محبت بھرے ماحول میں ہی ہو جاتی۔“ میں نے آسف سے کہا۔

پسند اس کی آنکھوں میں بھی جا رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر ہانپتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تمہارا انجام بدست ہجرت ناک ہو گا۔“ قسمت بدست انسان کا ساتھ نہیں دیتی۔ اگر تم اب تک زندہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم آنکھ بھی بچھاؤ گے۔“

”میں اگر ریڈ ڈاٹ کے ہاتھوں نہ مارا گیا تب بھی میں کسی نہ کسی دوزخ مر رہی جاؤں گا۔ میں اس دنیا میں پیشہ رہنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں۔“ میں نے طمانعت سے کہا۔

وہ ایک لمبے کے لیے دانت بھیج کر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ”لیکن موت موت میں فرق ہوتا ہے۔“

”بے شک۔۔۔ میں نے تسلیم کیا۔“ اسی لیے تو میں چاہتا

ہوں کہ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب دے دو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ شاید ہم دونوں طبعی موت مرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ حالانکہ میں اب ریڈ ڈاٹ سے حلق رکھنے والے کسی بھی شخص کو زندہ چھوڑنے کے حق میں نہیں ہوں لیکن کچھ کارآمد معلومات کے عوض میں تم سے تمہاری زندگی کا سودا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی وقت ہے۔ اپنے آپ کو اذیت میں مت ڈالو۔“

وہ گویا حق سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا نظام کچھ ایسا ہے کہ ہم میں سے کسی کے پاس کچھ زیادہ کارآمد معلومات نہیں ہوتیں۔ تم خواہ مخواہ مجھے ٹارچر کر کے اپنے گناہوں کی انصاف کرو رہے ہو۔ اپنے مستقبل کو زیادہ بھینٹنا چاہ رہے ہو۔“

”تم جیسے فرشتہ صفت لوگوں کے منہ سے اپنے گناہوں کا ذکر کن کہیں واقعی قہر قہر کاغذ پر لکھا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں خود بھی ٹارچر و میس کے سلسلے کو طویل دنا نہیں چاہتا۔“ اس نے آگے سے پیڑ پر بیٹھ کر بات چیت کرنے کا قائل ہوا۔ ”کالا“

”اُکی“ ہونے کے باوجود میں کالی منسوب ہوں۔ کیا تم جانا پسند کرو گے کہ ریڈ ڈاٹ کے باقی لوگ آج کل کہاں ہیں؟“

”سب تمہارے ملک سے بھاگ چکے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارا لہجہ تمہارے جھوٹ کی گواہی دے رہا ہے۔ اب تم

ہوش تھا۔ ہم نے جلدی سے اسے اٹھا کر ایک گاڑی میں لا کر اس خاص کمرے میں پہنچا دیا۔ جہاں ہمارے مختصر سے ڈرامہ تیار کیا گیا تھا۔

اس بار مسٹر ایکس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو آٹھیر میں پایا۔ اس کے جسم پر صرف ایک ڈیر تھا اور وہ آٹھیر نیل پر لپٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹائٹلوں کے قفسوں بندھے ہوئے تھے۔ میز کے عین اوپر چھت میں آئینہ تھا جسے مخصوص بڑی بڑی دو دیوایا لائٹس آن تھیں۔ تھوڑے سے فاصلے پر آٹھیر چھیر کے دیگر تمام لوازمات بھی موجود تھے۔

ہم تینوں مسٹر ایکس کی میز کے پاس موجود تھے لیکن اس پر سفید لباسوں میں تھے۔ سروں پر سفید ٹیپیاں اور چوڑے ٹائٹل تھے۔ ہمارے چوڑے پر ایک اضافی چیز بھی تھی جو سرخ چوڑے پر نہیں ہوتی یعنی ہم تینوں نے بڑے بڑے ٹائٹل چھیر لگائے ہوئے تھے۔ یوں ہمارے چہرے مکمل طور پر چھپ گئے لیکن ہم سرخوں کے بجائے انسانی روپ میں موت کے دکھائی دے رہے تھے۔

ہم نے وہ احتیاطی ٹیم کی تھیں جو آئینہ چھیر ہونے کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور ہم یہاں بہت سی ایسی بھی لے آئے تھے جو جرائم پیشہ لانے کا سبب بن سکتی تھیں۔ ہمارا کام ختم ہونے کے بعد آٹھیر چھیر کو جرائم سے پاک تھا۔ اسی لیے اسے استعمال کرنے کی خصوصی اجازت ملی تھی۔ آٹھیر نیل کے پاس بیٹوں والی ایک خاص میز ڈھک کر ڈھکی گئی اور جھانپاں کاٹنے کی ایک بڑی دو تین کھریاں دو تین ہتھوڑیاں چند بڑی کیلیں اور ایک دوسری چیزیں موجود تھیں جو مانی لولہ... یا بوجھ کے پیشے آسکتی تھیں مگر کسی آٹھیر میں ان کی موجودگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مسٹر ایکس جب گرہن تھا کہ چاروں طرف کا جائزہ لے اور اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کسی آٹھیر میں چھیر میں تھا تو اس نے اپنے آپ کو کھینچ کر لیکن پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ آٹھیر نیل کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف اور اہم کے ساتھ ساتھ بے عنوان سے خوف کی برچھائیاں ابھر آئیں۔ پھر اس نے بے خوفی نظر آنے کی کوشش جاری رکھی۔

فلوں اور ڈراموں میں کسی چیز کی جاو گئی تو غصے کے ساتھ جس قسم کی آواز دیکھا کی جاتی ہے وہی سی آواز کھودی اور کھوکھالی آواز میں راجیلہ بولی۔ ”تھوڑا سا کھوکھالی ہوش ابھی مسٹر ایکس! ہم تو تمہاری طرف سے تشویش جتا رہے تھے۔ پورے تین دن بعد ہوش آیا ہے تمہیں۔“

لے دیا اور پھر آٹھیر نیل کی طرف اشارہ کیا جس پر تین دن کی تائید ظاہر ہو گئی تھی۔

اسپورٹس شرت میں تھی۔ سر پر ہلی کپ تھی جس کا پتہ اس نے کافی جھکا رکھا تھا۔ گلے میں منظر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ چہرے کا کچھ حصہ چھپ گیا تھا۔ چٹائی ٹیپ کے چھیر کی وجہ سے چھپ گئی تھی۔ اس طرح اس نے شور کی پالا شعوری طور پر اپنے چہرے کا دور

رنگین چھپانے کی کوشش جاری رکھی تھی۔

”کمرے میں آکر اس نے گوشت پٹنے کی بو محسوس کرتے ہوئے منظر کا کچھ اور پر کیا۔ ”کیا خبر ہے؟“ وہ ناکواری سے بولی۔

”کوئی خبر نہیں۔ اس قسم کے معاملات میں اتنی آسانی سے خبریں نہیں مل سکتی۔“ میں نے کہا۔

”تم دونوں گھنٹہ وار جے کے گرد ہاؤسوں پر گرام پٹھ لوگوں اور دہشت گردوں کی طرح اس پر اپنے ہتھکنڈے آزار ہے ہو؟“

”بھی تو ایک ہی ہتھکنڈہ آزار ہے۔ اس دوران یہ دو مرتبہ بے ہوش ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں تو ایک بار پھر کسی کوئی کی تم فضول کوششوں میں لگے ہوئے ہو۔ اس سے دو ٹوک بات کرو۔ کچھ بتانا ہے تو ٹھیک ہے

ورنہ کوئی مار کر ایک طرف بھیجو۔“ وہ ناکواری سے بولی۔

”کوئی کوشش کر دیکھنے میں کیا صبر ہے۔“ میں نے کہا۔

ہم تینوں ایک میز کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں نہ جانے کیوں اندر کی سی بجلی ہوتی تھی۔ راجیلہ کسی کمری سوچے

میں تھی۔ دفعتاً وہ بولی۔ ”یہی! اگر تم اجازت دو تو تھوڑا سا ڈراما رچا کر دکھائیے۔“ ایک طرح کا نفسیاتی حربہ سمجھ لو۔ شاید کام بن جائے۔ تم دونوں کو ذرا اچھی طرح ایکٹنگ اور صداکاری کرنی

پڑے گی۔ باقی تمام انتظامات میں کراؤتی ہوں۔“

”تم جی بھی کرنا چاہو ضرور کرو۔ میری اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا نہیں چاہتا۔“ میں نے کہا۔

راجیلہ نے اسٹیم جیسے ہاتھ پائی۔ میں نے چند سیکنڈ اس پر غور کرنے کے بعد کہا۔ ”مسٹر ایکس کی فطرت کے بارے میں اب تک

مجھے جو اندازہ ہوا ہے اس کی روشنی میں مجھے اس قہر کے بارے میں بھی زیادہ خوش قسمتی تو نہیں ہے لیکن میں ایک بار پھر کسی کوئی کوشش کر دیکھنے میں کوئی فریب نہیں۔“

”تو پھر جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ مسٹر ایکس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہمیں تمام انتظامات کر لینے چاہئیں۔ ہمیں تمام

ضروری سامان اور جگہ تو مل جائے گی لیکن انتظامات ہمیں خودی کرنے ہوں گے۔“ راجیلہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ہم نے مسٹر ایکس کو وہیں کرسی پر بندھا رہنے دیا اور کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ دروازہ مغل کے ہم اوپر آگئے۔ راجیلہ نے فون پر اسپتال کے ڈاکٹر سے رابطہ کر کے ایک کمرے کو استعمال

کرنے کی اجازت لی اور ہم تینوں وہاں جا کر تمام ضروری انتظامات کر کے واپس آگئے۔

اسٹڈی میں جا کر ہم نے مسٹر ایکس کو دکھا۔ وہ ابھی تک بے

سسر ایکس نے قہقہہ لگلا۔ میں نے باقاعدہ ”ترج“ کی آواز سنی۔ وہ نروس سے انداز میں ہنسا۔ ”بہت ہی مجبور کر رہے ہو تم لوگ۔“ وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔ ذہنی طور پر تیار ہو۔ تم لوگوں کی جس مزاحیہ بحث ہی کو ہر حال میں مذاق بہت ہو چکا۔ اب مجھے ان بندشوں سے دلاؤ۔ میرے بیروں میں بہت تکلیف ہے۔“

”پہلے ہم تمہارے بیروں ہی کا تو آپریشن کریں گے۔ چیل کی طرح چمک۔“ تمہارے بیروں میں بری طرح افسوس ہے۔ کنگرین کا فخر ہے۔ تمہاری جان بچانے کے۔ تمہارے دونوں پاؤں کاٹنے نہیں گے۔“

”میرا خیال ہے آپریشن شروع کیا جائے۔“ میں کاٹنے کی دھمک آواز آئی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ چلایا۔

”آپریشن شروع کر رہا ہوں۔ تمہارے دونوں پاؤں فریضہ میرے تہہ ہے۔ میں پاؤں کاٹنے کا اسپیشلسٹ ہمارے ہاں اردو میں اسے ”پایا اسپیشلسٹ“ اور ”کھروڑا اسپیشلسٹ“ کہا جاتا ہے۔“ میں نے آری اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”اور میں کھوپڑی کا آپریشن کرتی ہوں۔“ را۔ ”تمہارے ہاں یہ آپریشن کرنے والے کو نیورو سرجن کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی پڑھا لکھا طبقہ تو ہمیں اسی نام سے پکارتا پڑے لکھے اور جاہل لوگ عموماً ہمیں ”کھوپڑی توڑ“ کہتے ہیں۔“

اس نے ایک زہور، جھینچ اور تھوڑی دغیرہ اٹھا کر کوہمائی۔ ”میں ان سے اپنا کام کرتی ہوں۔ یہ میرے آلات ہیں۔“

”اور میں ہیٹ وغیرہ۔ یعنی جسم کے درمیان سرخری کا ماہر ہوں۔“ ٹونی منٹیا۔ ”آتشیں“ اور بچپن کے گرد کے۔ غرضیکہ میں ہر چیز کی مرمت کر مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہاری یہ سب چیزیں مرمت ہونے نہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جا۔ ہیٹ میں صرف ایک بڑا سلاسل سوراخ کرنا ہوں راستے سب چیزیں نکال لیتا ہوں پھر اطمینان سے مرمت کرنا ہوں۔ دو تین دن میں سب چیزیں ٹھیک واپس ڈال دیتا ہوں اور مضبوط دھری سے سلاسل مریض کی کوئی تکلیف باقی نہیں رہتی۔“

پھر اس نے لمبا سا ایک زہور اور ذہنی سسر ایک ہونے کہا۔ ”اس زہور سے میں تمہارے ہیٹ کی تھو پکڑ کر اوپر اٹھاؤں گا پھر اس ذہنی سے اسے کاٹ۔ نہایت عمدہ قسم کا کول سوراخ تیار ہو جائے گا۔“

را حیلہ نہایت کامیابی سے اسی بدلی ہوئی آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”جسیں ہوش میں لانے کے لیے ہمیں بڑے جتن کرنے پڑے۔ پراگتا سگھٹا پڑا۔“ مجھنوں کے بازوؤں کا پراگتا گور سگھٹا پڑا۔ گندے بالوں کے پانی کے چھینٹے تمہارے منہ پر مارے پڑے۔“

سسر ایکس یقیناً محسوس کر سکتا تھا کہ اس وقت اس کا چہرہ گلیا تھا۔ وہ کھمکاتے ہوئے ذرا تشویش سے بولا۔ ”کیا یوں اس ہے۔“

تم لوگ کون ہو۔۔۔ اور یہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

را حیلہ نے گردن ذرا میری طرف گھمائی اور اسی کمر کھاتی آواز میں بولی۔ ”گلتا ہے مریض کے حواس ابھی ٹھکانے نہیں آئے ذرا تھوڑا سا جو آ اور سگھٹا۔“

میں نے سداوت مندی سے ایک پتھر پراگتا جو آ فرش سے اٹھا کر سسر

ایکس کی ٹانگ کے قریب کر دیا۔ اس نے چہرہ دور لے جانے کی حتی

الامکان کوشش کی لیکن اس حالت میں وہ گردن کو کمال تک موڑ

سکا تھا۔

”تم لوگ پاگل تو نہیں ہو؟“ بالا خروہ ہانپتے ہوئے پٹھا۔

”پاگل۔۔۔؟“ را حیلہ نے حیرت سے دہرایا۔ ”تم ہمیں پاگل

کہہ رہے ہو؟ گلتا ہے تین دن کی بے ہوشی کے دوران تمہارے

ذہن پر بڑے بڑے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ امتحان کیس کے! ہم

تینوں ملک کے معروف سرجن ہیں لیکن افسوس کہ آج کل ہماری

ڈیوٹی بھائی پھیرو کے اس اسپتال میں لگی ہوئی ہے۔“ ہمیں اسلام

آباد سے یہاں لایا گیا ہے۔ اسلام آباد کے کسی اسپتال میں

تمہارے لیے جگہ نہیں تھی اور تمہاری حالت لمحہ بہ لمحہ گہری جاری

تھی۔ تمہاری بے ہوشی طویل ہوتی جا رہی تھی۔۔۔“

”مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم لوگ خواہ مخواہ مجھے بے وقوف

بنانے کی کوشش مت کرو۔“ وہ پہلی پہلی سی آواز میں بولا۔

”تمہارے ساتھیوں نے صرف میرے پاؤں پلا سٹر سے جلا دیے

تھے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ سر پر چوٹ

لگی تھی۔۔۔ لیکن میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم لوگ اپنا یہ مذاق بند

کرلو۔“

”سر پر چوٹ لگی تھی۔۔۔!“ میں نے اسکی بات کاٹتے ہوئے

اثبات میں سر پٹایا اور اس کے سر پر الجھے ہوئے گومڑ کو بے

دردی سے دبایا۔ وہ بے پناہ قوت برداشت کا مالک ہونے کے باوجود

بے اختیار ہونے سے بچ اٹھا۔ میں نے دوبارہ اس کے گومڑ کو

دباتے ہوئے بدلی بدلی بھاری آواز میں اسے ڈانٹا۔ ”جوچہ مت۔ یہ

میں تمہارے دماغ کا ایک سرے لے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے اسی

چوٹ نے تمہارے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے۔ تم بجلی بجلی باتیں

کر رہے ہو۔ فی الحال تو ہم تمہارے دونوں بیروں کے آپریشن کی

تیاری کر رہے تھے لیکن میرا خیال ہے ساتھ ساتھ تمہارے دماغ کا

بھی آپریشن کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔“







# بنیادی انگلش اُردو ریڈر

☆ ---- عبدالرؤف انجم

انگلش زبان سیکھنے کے لئے

ایک مفید اور لاجواب کتاب

قیمت: 40/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

آئے یا نہ آئے یہ ہماری قسمت ہے۔ ہمیں صرف اے خیال رکھنا ہے کہ جو معلومات بھی ہمیں فراہم کر دے درست ہونی چاہئیں۔ اگر ہماری مثال ہوئی ہر بات درست لگی تو پھر خواہ ڈاکٹر برٹارڈ ہمارے ہاتھ آئے یا نہ آئے ہم جنہیں دیا کریں گے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہوگی کہ تم فوراً ٹیک چھوڑ دو۔

”مجھے منکھور ہے“ وہ جلدی سے بولا۔

”جب تک تمہاری فراہم کی ہوئی معلومات کی تصدیق نہیں ہو جاتی تب تک تم ہمارے پاس رہناں رہو گے“ میں نے کہا ”اس دوران میں جس کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”ٹیک ہے“ وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ”مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ کراچی کے قریب ایک جزیرہ ہے۔“ اس نے جزیرے کا نام بتایا۔

میں نے انہماک میں سہلاتے ہوئے کہا ”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نے وہ جزیرہ یاد رکھا ہوا ہے۔“

”اس جزیرے کی ایک بہت معروف شخصیت ہے قاسم بکلی۔“ قاتل بولا۔

یہ نام میرے لئے کچھ نیا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ”یہ شخص تو غالباً ایک بہت بڑا اسمگلر ہے۔ کئی بار مختلف شہادت کی بنا پر اس کے خلاف کارروائی شروع ہوئی لیکن ہر بار نہ جاننے کیوں اور کس طرح ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ تم اسی قاسم بکلی کا ذکر نہیں کر رہے؟“

”ہاں۔ تم ٹیک کیجئے۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟“ قاتل بولا۔

قاتل اس کا چہرہ کچھ کڑی طرح چمکاتا تھا۔ میرے خیال میں اس کا ذہن کچھ ایسا غیر متوجع نہیں تھا۔ راجیل کے چہرے پر ایک کسی کی بھی نظر پڑتی تو وہ اسی طرح چمکتا۔

میرے کان اس وقت گڑبے ہوئے جب میں نے قاتل کو نے ”نہا“ تم راجیل ہوتا...؟ افضل کی دوست؟“ وہ ایک ٹک جیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

راجیل کے بچائے میں نے جواب دیا ”ہاں۔ یہ راجیل ہے۔ کی دوست۔ تم اسے دیکھ کر کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو؟“

میں تابانہ طور پر اسے جانتا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں بہت سی فہمی۔ اس کا چہرہ ڈاکٹر برٹارڈ نے ایسا بنایا تھا؟“ وہ گویا تکالیف کو کچھ نہ تک۔ بھول گیا تھا۔

”ہاں۔ یہ اس مردود کی علمی قابلیت کا ایک نمونہ ہے“ میں غرت سے کہا۔

”کیا تم نہیں چاہو گے کہ اس لڑکی کا چہرہ ٹھیک ہو جائے؟“ دل تیزی سے بولا۔ اسے گویا امید کی کوئی کرن دکھائی دینے لگی۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ میں نے کہا ”کیا تم اس بات میں کچھ کر سکتے ہو؟“

”میں تو کچھ نہیں کر سکتا۔ بلکہ شاید دنیا میں کوئی بھی کچھ نہیں سکتا“ وہ ٹھوک ٹھگ کر بولا ”یہ چہرہ ڈاکٹر برٹارڈ نے بنا ڈیا ہے۔ رف دی اسے ٹھیک کر سکتا ہے۔ لیکن میں جسیں بنا سکتا ہوں۔ ڈاکٹر برٹارڈ کہاں مل سکتا ہے۔ میرے ساتھ سودا کر۔ میں میں برٹارڈ کے بارے میں جانتا ہوں۔ تم مجھے چھوڑ دو۔“

میں نے قہقہہ لگایا۔ راجیل بھی مسکرائی اور گفتہ لیے میں نے ”ڈاکٹر مسٹر قاتل! یہ مت فرض کرو کہ میں اپنے چہرے کا یہ نسخہ دہر کرانے کے لیے مری جا رہی ہوں یا افضل اسے کچھ حالت دل دیکھنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔“

”میں تم سے شک اس خواہش میں مرے نہیں جا رہا ہوں لیکن ڈاکٹر برٹارڈ ضرور ہے“ میں نے نرمی سے کہا ”تم ڈاکٹر برٹارڈ کو تلاش ضرور کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے تم سے سوئے بازی میں ہو سکتی۔ تم سوئے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ اس کے اوپر تم اس سلسلے میں زبان کھول کر قاتل کے میں رہو گے۔“

”کیا تاکہ ہو گا مجھے؟“ وہ کسماتے ہوئے بولا۔

”جس میں ان تکالیف سے نجات مل جائے گی جن میں تم اس وقت گرفتار ہو۔ جس قسم کے علاج کی ضرورت ہوگی وہ جس میں میرے آجائے گا۔ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے گا۔ اس وقت تک تم یہاں مسان کی سی حیثیت سے رہو گے۔ جب تک ڈاکٹر برٹارڈ ہمارے ہاتھ نہیں آجائے۔“

میں نے خود ہی اپنے مسئلے میں ترمیم کر لی ”بلکہ میں تمہارے لیے شرط کچھ اور نرم کر دیتا ہوں۔ ڈاکٹر برٹارڈ ہمارے ہاتھ

"نہیں۔ میں اسے نہیں جانتا۔ میں نے کبھی اسے دیکھا ہی نہیں۔ صرف اس کے تذکرے سنے ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے کتنی باتیں سچ ہوں گی اور کتنی غلط۔ ہر حال۔۔۔ لگتا یہی ہے کہ وہ اچھی شہرت کا مالک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"درست ہے" فادول بولا "کراچی کے کسی منگے اور پوش علاقوں و قبضے کا نقش اور لی ای سی ایچ انٹس وغیرہ میں اس کے پتے ہیں لیکن اس کا اصل گھر جزیرے پر ہی ہے۔ زیادہ تر وہ وہیں پایا جاتا ہے۔"

"جیس وہ کیوں یاد آگیا؟" میں نے جانتا چاہا۔

"ڈاکٹر برنارڈ آج کل اس کے مسمان کی حیثیت سے یا تو جزیرے والے مکان میں موجود ہو گا یا پھر ایک آٹھ دن میں وہاں پہنچنے والا ہو گا۔" فادول نے جواب دیا "پھر وہیں سے وہ قاسم بجلی ہی کی کسی لٹاچ کے ذریعے دینی وغیرہ ہوتا ہوا انگلینڈ یا امریکا کی طرف نکل جائے گا۔"

"ریڈ ڈاٹ کے ایک خاص آدمی کا ایک پیغام اسٹور سے کیا تعلق ہے؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن تمہارے ملک کے تمام بڑے اور خاص مشروں میں ہر قبیل کے چیدہ چیدہ لوگوں سے ہمارے مراسم رہے ہیں" فادول نے جواب دیا "مجھے جو معلوم تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔ ڈاکٹر برنارڈ تک پہنچنا اور اسے قابو میں کرنا اب تمہارا کام ہے۔"

"تم نے مجھے کچھ انجمن میں ڈال دیا۔" میں نے لوہے کے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا "قاسم بجلی جیسے لوگوں کے کمروں میں دوستانہ طور پر داخل ہونا ایک مشکل کام ہے۔ کسی سرکاری ادارے کے ذریعے میں اس کے ہاں چھپا پانے کے انداز میں کوئی کارروائی کرانا نہیں چاہتا۔ اس میں ناکامی کا زیادہ خطرہ ہے۔ اگر ڈاکٹر برنارڈ وہاں ابھی پہنچا نہیں ہو گا تو پھر وہ اس جگہ کے قریب بھی نہیں پہنچے گا۔"

فادول کچھ سوچتے ہوئے بولا "تم دوستانہ طور پر قاسم بجلی کے گھر میں داخل ہو سکتے ہو۔ تجویز میں پیش کر دیتا ہوں۔ اس کی کاپیالی یا ناکامی کا انحصار تم پر اور تمہاری قسمت پر ہے۔ یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ تمہارے ملک کے تمام خاص خاص مشروں میں ریڈ ڈاٹ کے ہمدرد موجود ہیں۔"

میں اس بات کا اہمیت منقہ سمجھ گیا تھا۔ انہوں نے ہر شخص میں ایسے بہت سے لوگوں کو بھر دیا اور آواز بکارت کھا تھا جن کے کردار مشکوک تھے ذرا تلخ آمدنی اور پیٹے مشکوک تھے اور جو اپنی اغراض کی خاطر ملک کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ایسے لوگوں کو خاص طور پر منتخب کیا جاتا ہو گا جو اپنی پوزیشن یا عہدے سے ریڈ ڈاٹ کو فائدہ پہنچا سکتے ہوں گے یا پھر جن کے پاس دولت و ماسک اور "بد معاشی" کی طاقت ہوتی ہوگی۔

فادول بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہمارے آدمیوں جب کوئی ایسے کسی آدمی کے پاس جاتا ہے اور اسے مدد کی ہوتی ہے تو وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ وہ "آر ایکس قمری" کے بعد وہ جو بھی مسئلہ بیان کرتا ہے وہ سراغ میں اسے حل پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ تم بھی چاہو تو قاسم بجلی کے کہے کہہ سکتے ہو کہ تم "آر ایکس قمری" ہو۔ تم اب ہمسان کے طور پر قیام کرنے کی فراغش کر سکتے ہو۔ اس سے اپنا کوئی مسئلہ بتا سکتے ہو اور مدد کی درخواست کر سکتے دو ران دیکھ لیا کہ ڈاکٹر برنارڈ اس کے ہاں موجود ہے یا نہیں اس سلسلے میں تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ میں تمہیں قاسم بجلی خاص ٹیلی فون نمبر دے دیتا ہوں جس پر اس سے براہ رار ہو جائے گا۔ اس کے کسی چھپے یا نیکہ پھری وغیرہ کی رگڑاؤ نہیں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم وہ نمبر تو مجھے دو۔ میں ذرا غور کروں" سلسلے میں کیا کرنا چاہیے "میں نے کہا۔

اس نے نمبر زبانی ہی مجھے بتا دیا جو میں نے نوٹ کر لیا ہے ہوئے بولا "اب تو مجھے یہاں سے نکالو اور میرے محتالے کی کچھ فکر کرو۔"

"ضرورت۔ ضرورت۔ اب تمہارے بارے میں میرا نہ میں ہی کروں گا۔ تم ہر گزرتے بے نیاز ہو جاؤ" میں نے ار دی اور اس کی بند ٹیٹیں کھول دیں۔ وہ بالکل بے حال نظر آ رہا تھا مضبوط شخص ثابت نہیں ہوا تھا۔ جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ راجیل نے ایک ڈاکٹر کو گلیا کر اس کے لیے مرمیم بنی انتظامات کرائے۔ ٹوٹی کو میں نے مسلح حالت میں ہر وقت طرح اس کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے منبر اور بھی اس کی نگرانی کے لیے طلب کر لیا۔ میں نے انہیں فادول کو ایک قیدی ہی کی حیثیت سے رکھنا ہے لیکن اسے تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اور اسے اس طرح رکھنا ہے کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آئے۔ اس کے علاوہ نہیں کو ہرگز معلوم نہیں ہوتا چاہیے کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی آدمی تحویل میں ہے۔

ان تمام انتظامات کے ساتھ فادول کو چنگل کے وہ خانہ پہنچانے کے بعد میں اور راجیل ایک بار پھر ڈانٹنگ وہ آہستہ۔ راجیل بغور میری طرف دیکھتے ہوئی بولی "کیا سونا ہو؟"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے فوری طور پر کراچی روانہ چاہیے۔ کہیں ڈاکٹر برنارڈ نکل نہ جائے" میں نے جواب دیا "انہی فیصلے سے کام کر رہا تھا۔"

"تم میری خاطر اس معاملے کو اتنی اہمیت مت دے دو۔ اس لیے کوئی خطرہ مول مت لو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں نے استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
تلف بہت ہی ہو۔ تمہاری خاطر غلط مول نہ لوں تو پھر کس کی  
طرفوں؟ کسی آواز گائے، ہمیش یا بکری وغیرہ کی خاطر لے  
”

”میں اس وقت بالکل سنجیدہ ہوں“ وہ بولی۔

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ شکل پر پورے بارہ بیچ ہوئے  
ایک تو انسان کی شکل دورگی ہو۔ اوپر سے اس پر بارہ بیچ  
نے ہوں۔ یہ تو بڑا ہی عجیب نظام ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی  
دو روئے چکا ہوں کہ اپنی شکل پر بارہ مت بچتے داکڑ۔ زیادہ سے  
دو چوئے بارہ تک بھی معاملہ قابلِ برداشت رہتا ہے۔“ میں نے

”میں اس کے چہرے کے دو رنگے پن کا خواہ کتنا بھی مذاق  
الیا لیکن اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار نہیں ہوتے  
۔ اُسے معلوم تھا کہ میں صرف اسے چھیڑنے اور چڑانے کے  
ایسا کرتا تھا۔ جیسے اس کا مذاق اڑانا مقصود نہیں ہوتا تھا۔  
دقت بھی اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں اُبھرے  
نہ اس کی سنجیدگی برقرار رہی۔

”اگر تمہارا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو کیا تم نہیں صاحب کو  
بارے کر نہیں جاسکتے؟“ وہ بولی۔

”مزدورقت ضائع ہو گا۔ وہ نہ جائے کس طرح اس معاملے کو  
مل کرنا چاہیں گے کہیں میرے اور ان کے درمیان اختلاف  
نے نہ پیدا ہو جائے۔ اس وقت ویسے بھی وہ سرکاری چھپے گیوں  
پہننے ہوئے ہیں۔ بلکہ مجھے تو ڈر ہے ان کی وجہ سے میں بھی  
نی سرکاری چھپے گی میں نہ چھٹی جاؤں اور میں بیضا نہ رہ  
بلکہ بڑی مشکل سے یہ بریک تھوڑا ہے۔“ میں نے تیزی سے

”وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ  
تھپاتے ہوئے کہا ”میں وہاں جا کر نہیں صاحب کو فون کر دوں گا  
مجھے برفس کی کوئی بہت بڑی ایمر جیسی آن پڑی ہے۔ دو چار دن  
مادامی آجاؤں گا۔ تم غلط مول لینے کی جو بات کر رہی ہو وہ  
غل اشتباہ ہے۔ ہماری زندگی میں فی الحال خطرات کے سوا ہے  
ایک؟ جن جن خطرات کے ساتھ ہم سرچھوڑ چکے ہیں۔ ان سے  
وہ کر اب ہمیں کون سے خطرات سے واسطہ پڑ سکتا ہے؟“  
”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی“ بلاخودہ بولی۔ مجھے یوں لگا  
”وہ شروع سے اصل میں یہی بات کرنا چاہتی تھی۔

”میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جلدی سے بولی  
”تاہم تم سوچ رہے ہو کہ میرا ساتھ جانا تمہارے لیے اچھن کا  
مٹ نہیگا۔ تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں  
گا۔ میں تمہارے ساتھ جڑے پر نہیں جاؤں گی بلکہ ہم دونوں  
لہرا رہے ہوئے جڑے پر چھپیں گے اور میں دوردور سے تم پر

اور قاسم بجلی کے مکان پر نظر رکھوں گی۔ میرا اپنے ساتھیوں سے  
رابطہ رہے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں فوراً انہیں طلب کرلوں گی یا  
پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں جڑے پر قدم ہی نہ رکھوں بلکہ  
سمندر میں تمہارے ٹھک کے جوڑا راجل رہے ہیں ان میں سے  
کسی ڈرائر پر رہتے ہوئے دوسرے جڑے پر نظر رکھوں اور موبائل  
فون یا ڈائریکٹس کے ذریعے تم سے رابطہ رکھوں۔“

”اس کام کے لیے میں نے شفیع شاہ کو ساتھ لے جانے کا سوچا  
ہے۔ وہ سمندر اور جڑیوں سے بہت بہتر طور پر واقف ہے۔ تم  
نہیں صاحب سے غٹنے کے لیے نہیں موجود ہو۔ شفیع شاہ چونکہ  
بریس کے سلسلے میں کراچی میں میرا ریڈینٹ ڈائریکٹر بھی ہے اس  
لئے اسے ساتھ لے جانے کا مقفل جواز بھی نظر آتا ہے۔ نہیں  
صاحب زیادہ چل چلا نہیں کریں گے اور ٹھک میں بھی نہیں پڑیں  
گے۔ تمہارا یہاں رہنا مجھے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں  
کے معاملات کو تم جتنا بہتر سنبھال سکتی ہو کوئی اور نہیں سنبھال  
سکتا۔ ویسے بھی نہیں صاحب نے نہیں یہاں ہماری ٹیم کا انچارج  
ہٹایا ہوا ہے۔ جیسے ساتھ ساتھ انچارج کا بھی قاتب ہو جانا ٹھیک  
نہیں ہے۔“

”میں نے یہ سب کچھ نہایت فحصرے فحصرے لیے میں سنجیدگی  
سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔  
ایک گہری سانس لے کر اس نے اچھا ڈالنے کے سے انداز میں  
کہا ”چاہے تمہاری مرضی۔“

”پوری گڈ“ میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا ”تم اسی طرح  
اچھی لگی بن کر رہا کرو۔ میں تمہیں ٹائیاں لاکر دیا کروں گا۔ اب تم  
فوراً موبائل فون پر۔ یا جس طریقے سے بھی ممکن ہو شفیع شاہ سے  
رابطہ کرو۔ اسے فوراً یہاں بلواؤ تاکہ وہ اپنا تحلیہ وغیرہ درست  
کر لے اور میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ پتا نہیں  
کہاں بندر چھپنا پھر رہا ہو گا۔ بلکہ کوئی جدید نہیں بندر اسے پھارے

### رومانی ٹائول

|       |            |                  |
|-------|------------|------------------|
| 75/-  | سلی ری عتا | دل کا آنگن       |
| 75/-  | سلی ری عتا | کالے کنول        |
| 100/- | سلی ری عتا | اور دیا جلتا رہا |
| 100/- | سلی ری عتا | موج گرداب        |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

کیونکہ ایک بار پہلے میرا بچہ ہی ہوٹل میں قیام کرتے گوار نہیں رہا تھا لیکن پھر میں نے سوچا اب حالات شاید اب ریڈ ڈانٹ والے میرے ہوٹل میں میری ہوں۔

شفیع شاہ نے ازپورٹ سے ہوٹل فون کر کے دو ہندو بست کر دیا تھا۔ ہمیں صرف چند گھنٹے آرام کا حق نکلی سے فون پر رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ راستے میں ہمیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ کراچی میں قیام کے ایک دو سرے سے لاشعقل نظر آتا تھا۔ شفیع شاہ نے فون کے تمام محلے کے لیے یہ ہدایت بھی جاری کرادی تھاکہ ہر گھر کی کوشش نہ کرے کہ وہ ہمیں پہچاننا ہے۔ صبح اٹھ کر ناشتا کرنے اور تیار ہونے کے بعد میرا نبیل کے آئیے میں اپنا تنہیدی جائزہ لیا۔ میری راکھ کٹنی بڑھی ہوئی تھیں اور میں نے ذرا فیشن ایبل سے کی تراش غراش کرائی تھی۔ آنکھوں پر تاریک مٹھے تھا۔ ہیرا سناٹا بھی بدلا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کمرسری طور پر جانے والے لوگ تو قریب سے دیکھ پہچان سکتے تھے۔

اپنے محلے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد نکلی سے فون پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ایک بارعب آواز سنائی دی۔ اس آواز میں کسی فلمی گروہ آواز جیسا معنوی پن نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں تصور کسی ایسی ہی شخصیت کا ابھرا۔ "قام نکلی؟" میں نے تھوڑی سی چاہی۔

وہ اسی بھاری اور بارعب آواز میں خلاف قوت تھری انگریزی میں بولا "ہوئے عرصے بعد اس نمبر پر کون رہا ہوں۔ کون ہو تمہارے اور کسی نے تمہیں یہ نمبر "آراکس تھری" میں نے تھمرے تھمرے لیے تھے۔ "نہہہہ" اس کی آواز تو کسی ہی بھاری اور گوراجہ یکدم بدل گیا۔ اب وہ لہجہ ایک دوست "ایک ہمارا تھا۔" نکلی اسلئے ہے؟

"فون پر نہیں بتا سکتا۔ ملنا چاہتا ہوں" میں نے کہا "نکلی مجھے خود آنا پڑے گا؟"

"بھروسہ کی ہے" میں نے جواب دیا۔

"کہاں ہے؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتایا تو وہ بولا "ملاقات سے ابھی شروع والے آفس میں موجود ہوں۔ آؤ مجھے کھنڈے ہا ٹھیک آؤ مجھے کھنڈے ہا ہا ہوٹل کے دروازے سے نکل کنارے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جاؤ اور مجھے اپنی کچھ نشتا میں نے ذرا تفصیل سے اپنا ٹھکانہ بتانا شروع کیا تو

ہوں۔ آج کل بندر بھی تو بہت ہو شیاء ہو گئے ہیں۔ شاید انیس معلوم ہو گیا ہے کہ ڈاؤن کے دعوے کے مطابق وہ ہمارے آباؤ اجداد ہیں۔"

وہ ذرا پیچھے ٹھک کر مہاگل فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کرنے لگی۔ میں نے دوسرے عام فون پر اپنے نرول ایجنٹ سے رابطہ کیا جو میری کاروباری مصروفیات کے دنوں میں میرے تمام سبزی مسائل حل کرتا تھا۔

میں نے اپنا تعارف کر دیا تو وہ حیران رہ گیا اور شکوہ آمیز سے انداز میں بولا "سرا آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ آپ نے تو ہمیں زحمت دینا پانگل ہی چھوڑ دیا۔ کیا کسی اور نرول ایجنٹ کی خدمات حاصل کر لی ہیں؟"

"نہیں بھائی! میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں نے ذرا رنج آمدورفت ہی ایسے اختیار کر لیے تھے جن کے لیے کسی نرول ایجنٹ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ مثلاً گدھا گاڑی۔ ٹیل گاڑی۔ سائیکل۔ اور زیادہ ہی جلدی میں ہوا تو موٹر سائیکل وغیرہ۔"

نرول ایجنٹ کے مالک نے ایک طویل اور گونجیلا تھوڑا لگا "سرا بات کو مذاق میں مانا کوئی آپ سے نکھے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ مذاق آپ سہرا کرتے ہیں۔"

"ہمس۔ بس۔ اپنا یہ کاروباری براہ کاشکھن کسی دوسرے کلاسٹ کے لیے سنبھال کر رکھو اور میرے لیے کراچی جانے والی کسی بھی انٹلانٹ کی پہلی پرواز میں دو سیٹوں کا بندوبست کرو۔"

"رٹش بہت ہے سہرا لیکن بندوبست ہو جائے گا۔ یہ تو معمولی کام ہے۔ ہمیں کوئی پروا کام بتایا کریں" وہ بے پروائی سے بولا۔

"پروا کام بھی بتائیں گے کبھی۔ اور دعا کریں گے کہ اس وقت تم منہ چھپاتے نہ پھو" میں نے کبھی سانس لے کر کہا "کئی افعال میں یہ بتاؤ کہ میں کھٹ لینے تمہارے دفتر بھی نہیں آسکتا اور کسی آدمی کو بھی نہیں بھیج سکتا۔"

"یہ بھی کوئی پرالم نہیں ہے" وہ بولا "آپ ازپورٹ پہنچ جائیں۔ ڈیپارچر لاؤنچ کے دروازے پر آپ کو ہمارا آدمی کھٹ لیے مل جائے گا۔ چند منٹ بعد میں آپ کو فون کر کے کلاسٹ کے بارے میں بتا سکوں گا۔ آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔"

میں نے اسے نمبر دے دیا اور فون بند کر دیا۔ اس وقت تک راجیلہ بھی شفیع شاہ سے بات کر چکی تھی۔

"شفیع کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے گا" راجیلہ نے بتایا۔

"میں اتنی دیر میں چند چیزیں برفے کس میں ڈال لوں؟" میں نے کہا۔

— اس طرح میں اور شفیع شاہ بڑی ہلکے ڈکے عالم میں کراچی روانہ ہو گئے ہم لوگ رات کے پچھلے پر کراچی پہنچے۔ شفیع میں شفیع شاہ کا بھکا موجود تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہیں قیام کیا جائے



”میں تمہارا نام نہیں پوچھوں گا۔ میرے لیے آراہیں تھی ہی کافی ہے۔“ وہ غصہ اور کچھ میں بولا۔ یہ درحقیقت نام جاننے کی ان ڈائریکٹ فرمائش تھی۔

”میرا نام عارف ہے“ میں نے کہا۔ شاید وہ بھڑکھا کہ میرے مزید بھی کچھ کون گا لیکن میں نے اس سے آگے نہ بڑھا۔

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق گاڑی اس دوران بے مقصد سڑکوں پر رواں تھی۔ قاسم بجلی نے سگڑ کا کراس لے کر مٹ پھیر کر دو سو طرف چھوڑا پھر دھیمی آواز میں بولا ”تو اپنا پینڈ کو کے کہ تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

”یقیناً“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”یہ بتائے بغیر تو چاہتی نہیں۔ میں چند دن تمہارے ہاں جزیروں پر صمان رہنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اگر ضروری ہو تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ مجھے کسی لالچ یا بھری جواز وغیرہ کے ذریعے کسی ٹیپو ملک کی طرف بھجوا دو۔ اور اگر غلطی ہو گیا تو میں تمہیں لوٹ آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”جن کے ریفرنس سے تم آئے ہو وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ وہ تو دو سروں کے مسئلے حل کرتے ہیں لیکن وقت و قوت کی بات ہے۔ آج کل وہ خود ذرا مشکل میں ہیں۔“

”میں تو مسئلہ ہے“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس نے مزید کچھ نہ پوچھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر وہیں بھی فون نصب تھا اور اس کے پاس ایک موبائل فون بھی موجود تھا۔ اس نے گاڑی میں گئے ہوئے فون پر کسی سے رابطہ قائم کیا اور بولا ”سو ٹریٹ کنارے پر لے آؤ۔ میرے ساتھ ایک صمان آ رہا ہے۔“ اب اس کا کعبہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ چھپیوں کے سے انداز میں بات کر رہا تھا۔

اس نے فون بند کر دیا اور گاڑی میں سکوت چھا گیا۔ انجن اور ایئر کنڈیشنر کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہم اس وقت کلکتہ کی طرف جانے والی سڑک پر تھے جس پر اس وقت ٹریفک براے نام تھا اس لیے بھی شور محسوس نہیں ہو رہا

لگتا ہاں مجھے کے بعد بولا ”ہیں۔ ہیں۔ اتنی کافی ہے۔ تو ڈرامہ ہمارے اندازے لگانے کے لیے بھی چھوڑ دو۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے شفیق شاہ کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا ”ہم بھی میرے رخصت ہوتے وقت ہوٹل سے باہر آ جانا اور ذرا قاسم بجلی وغیرہ کا جائزہ لے لیتا۔ ہمارا تعاقب کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ ہماری منزل بھر حال جزیرہ ہی ہو گا۔ تم وہیں پہنچ جانا اور دور دور سے حالات پر نظر رکھنا۔ کچھ ہتھیاروں کا بھی بندوبست رکھنا اور اپنے کچھ آدمیوں کو بھی اسٹینڈ بائی رکھنا۔ میں کوشش کروں گا کہ اگر کوئی ایمر جنسی ہوئی تو تمہیں موبائل فون پر اطلاع دے سکوں۔“

ٹھیک اتنیس منٹ بعد میں ہوٹل کے سامنے فٹ پا تھر پر کھڑا تھا۔ اس کے ٹھیک ایک منٹ بعد سیاہ رنگ کے نئے ماڈل کی ایک پام چم کرتی بھیرو میرے قریب آ کر ٹکی۔ اس کے پیشے تاریک تھے۔ اندر بیٹھے ہوئے افراد مجھے صرف پوچھوں کی طرح دکھائی دیے۔ ”خواری بچھا دو اور اندھ کھلا اور وی بھاری کو بجلی آواز سنائی دی ہو میں فون پر سن چکا تھا“ بیٹھ جاؤ۔“

میں بلا ٹائل کچھ سیٹ پر جا بیٹھا جس پر کھنسی واڑھی موچھوں والے دو مشہور جنیم اور سانولے کا شکوف ہر دار پہلے سے موجود تھے۔ قاسم بجلی خود آگے ڈرائیور کے برابر پمپر سیٹ پر موجود تھا۔ گاڑی میں کسی ٹیس سگڑ کے دھوکے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو کسی نہایت اعلیٰ درجے کی کون کی مک میں دھم بوری تھی۔

قاسم بجلی ایک بھاری بھر کم پلٹہ انٹر ٹیم مچھا ٹھنک تھا۔ نہایت ٹیس شلوار قمیض اور واسٹ میں تھا۔ اس کی موٹی موٹی سوجھیں چھوکی ریم کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کا نام سن کر کچھ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی ٹکی کو بے کار دہائی جسم کا مددگار یا بھو باؤنا دہشت گرد ہو گا لیکن اس کی شخصیت پر نظر پڑتے ہی اس کے بارے میں مجھے کچھ پوچھنے بغیر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت اونچی جڑ تھا۔ ظاہری شخصیت اور رک رکھاؤ سے وہ اسمگلر کے بجائے کوئی بہت بڑا جاگیردار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے دونوں مسلح محافظ ساتھ بھی گزر گئے۔ انکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

میرے بیٹھے ہی پمپر آگے روانہ ہو گئی تھی۔ چند لمبے تک قاسم بجلی مکہ بھی نہ بولا اور نہ ہی اس نے کبھی طور پر میری طرف دیکھنے کی زحمت کی۔ کچھ آگے جا کر گاڑی ایک سنگل پر ٹکی۔ تب قاسم بجلی نے پوری طرح گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں پر بھی سیاہ چشمے تھا لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں کی گراؤنگل میں جھانک سکتے تھے۔ اس وقت تک ایک مسلح محافظ قوسے پر تھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ پیچھے نظر رکھے ہوئے تھا کہ کوئی گاڑی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہی۔ میرا اندازہ تھا کہ قاسم بجلی کا ڈرائیور خود قاسم بجلی بھی مسلح تھا۔

تھارونہ کراچی کے ٹرنک کا شور تو اکثر کھینچنے اور ساؤنڈ ہونے کاڑیوں کے اندر بھی کانوں کے پردے چاڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ چند سینکڑے بعد ہی ڈرائیور نے گاڑی سونپ لی۔ ڈرائیور نے کچھ عجیب اور بڑا سراسر سادی تھا۔ قاسم جلی نے ابھی تک اس سے ایک تھوڑی سی نہیں کہا تھا لیکن اسے شاید ہدایات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ کس وقت گاڑی کا رخ کس طرف کرنا ہے۔

چند منٹ بعد ہم گھوم پھر گردبارہ ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے جہاں سے مجھے گاڑی میں بٹھایا گیا تھا۔ شفیع شاہ اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ یقیناً اپنا کام کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

گاڑی ہوٹل کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ جب ہم بی آئی ڈی سی ہاؤس سے آگے نکل آئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کبھی گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک لمبے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں قاتل نے مجھے "آر ایکس ٹری" کوڑے کے ذریعے مروانے کا تو بندوبست نہیں کیا تھا؟ کہیں میں آگھیں بند کر کے بھڑینے کی کچھار میں تو نہیں جا رہا تھا؟ میرے پاس اس وقت معمولی سا کوئی ہسٹول یا رو اور بھی نہیں تھا۔

پھر میں نے خود کو تسلی دی کہ یہ میری زندگی میں کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ میں اس طرح کا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اس وقت تو کم از کم یہی قیمت تھا کہ قاتل نے اگر مجھے یہاں بھیجا تھا تو وہ خود عنایت کے طور پر میرے ساتھیوں کی تحویل میں موجود تھا۔ اگر اس نے مجھے چھوڑنے کا بندوبست کیا تھا تو اس کا اپنا انجام بھی کچھ اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم کبھی گاڑی جا پہنچے۔ میں قاسم جلی کے ساتھ گاڑی سے اتر آیا۔ دونوں سیدھا ہمارے پیچھے تھے۔ کبھی گاڑی پر موجود لائین والے جو ہر گاڑی سے اترنے والوں کو گھیر لیتے تھے اور انہیں اپنی لائین میں سیر کرانے کے لیے کھینچا کرتی شروع کر دیتے تھے۔ وہ سب قاسم جلی کی گاڑی دیکھ کر ہی پیچھے ہٹ گئے تھے اور چند سینکڑے میں غائب ہو گئے تھے۔ کوئی ہمارے قریب بھی نہیں پہنکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیر کے لیے آئے ہوئے لوگ بھی احتیاطاً دوڑ کر ہٹ رہے تھے۔ گویا انہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ قاسم جلی اس قسم کی شخصیات میں سے تھا۔ جنہیں آتے دیکھ کر راستہ چھوڑ دینا چاہیے۔ جہاں بھی نظر آئی وہ بھی اتارے پہنچے سے پہلے ہی گاڑی کی طرف ہٹ گئی۔

ہم سمندر کے کنارے پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کرائے پر چلنے والی تمام کرائی والی لائینیں بہت دور ہٹ کر کھڑی تھیں۔ سڑکیوں کے قریب صرف ایک سفید رنگ کی نمائند خوب صورت اور جدید موٹر بوٹ موجود تھی جس کی بیٹھائی پر نیلے اور سرخ خروف میں "پرنس" لکھا نظر آ رہا تھا۔ یہ دو کمپن دانی تقریباً چالیس فٹ لمبی ایک پڑھیں موٹر بوٹ تھی۔ اس کے ڈیک پر بھی دو

کوئی کلا شکوف لیے کھڑے تھے۔ جس طرح اس وقت ساری بھاڑ پھنی ہوئی تھی اور وہ اکیلی موٹر بوٹ جس طرح سڑکیوں کے قریب غر سے "سراٹھائے" کھڑی تھی اس سے وہ واقعی شہ معلوم ہو رہی تھی۔

سڑکیوں پر سیاہ کانٹا اور لائینوں کے ڈریل کی پکھائی جو تھی۔ خاموشی سے سڑکیاں اتر کر ہم موٹر بوٹ میں کود گئے۔ میرے اندازوں سے زیادہ پڑھیں بوٹ تھی۔ اس میں داخل ہونے کے بعد ایک ایسا معلوم ہوا جیسے ہم کسی چھوٹے لیکن اعلیٰ درجہ اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے تھے۔ اس میں امریکن طرز کا کچن بھی قاسم جلی شو آف کرنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ام مجھے پوری بوٹ دکھانے یا آخر کا اعلان کرنے کی کوشش نہیں تھی۔ میں نے خود ہی گھوم پھر کر اس کا جائزہ لیا تھا۔

"اچھی بوٹ ہے" میں نے پوری بوٹ میں گھوم پھر کر کے بعد حسین آئیر لیمے میں کہا۔

"ٹانیا اور ٹانیا کو یہ سن کر خوشی ہوگی" قاسم جلی مسکرت ہوئے ہوا۔

"ٹانیا اور ٹانیا کون ہیں؟" میں نے بظاہر سرسری سے پوچھا۔

"میری بیٹیاں" اس کے لیے میں قدرے غر بھٹک آ در حقیقت انہی کی بوٹ ہے۔ کچلے پائوں میں تیز رفتاری سے چلانا اور اس کی ایک کرائی کا محبوب مشغلہ ہے۔

"بہت خوب۔ بہت خوب" میں سر ملاتے ہوئے صراحتی کہہ رہا تھا۔ یہ سن کر میری دھڑکن میں خفیف سا اضافہ ہوا۔ موصوف کی دو بیٹیاں تھیں اور وہ اس کی ایک بھی کٹی تھیں۔ یہ موقعوں پر میرے اندر کوئی نگہبانی سی آواز ابھرتی تھی وطن میں سب کچھ ہے بارے!"

بوٹ روانہ ہونے لگی تو میں نے کچھ آگے کھلے پانی میں فشنگ ڈالر کوست رفتاری سے چمڑے دکھائے۔ اس کی بہت دور میں لیے کھڑا تھا اور بظاہر منوہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی طرف سے منہ پھیرا۔ شفیع شاہ بہت مستعد نہ ہوا۔ اس نے آج صبح اچھے ہی فشنگ ہار پر پیغام بھجوایا تھا۔ چڑھے میرے ڈالر دونوں میں سے ایک خالی ہونا ایسا ہے اور کبھی کسی کے پاس موجود رہتا ہے۔

"پرنس" کبھی سے کھلنے کے بعد تیز رفتاری سے ج کی طرف روانہ ہو گئی اور چند منٹ بعد ہی ہم جزیرے پر جہاں قاسم جلی کا ذاتی بوٹ ہاؤس موجود تھا۔ بوٹ اتر کر سڑکیاں چڑھ کر جزیرے پر قدم رکھتے ہوئے قاسم جلی ہوا معقول میں یہ جزیرہ نہیں ہے۔ فشنگ سے ایک سڑک بھی ملے آتی ہے لیکن اس کے لیے بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ ویسے کے راستے آئے کا ایک انگلی نصف ہے۔"

دور جزیرے پر رہنے کا بھی ایک الگ ہی لطف ہے۔ میں نے کہا۔

”یہ ملک“ اس نے بغور میری طرف دیکھا ”شہر کے بہترین علاقوں میں میرے بچکے موجود ہیں لیکن میں اب بھی اس پرسانہ جزیرے پر رہنا پسند کرتا ہوں۔ یہ میری ایک الگ تھلک دنیا ہے جس میں کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری طاقت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“

ماصل پر اسے لینے کے لیے ایک دوسری پیروی آئی ہوئی تھی مالا۔ وہاں سے اس کے مکان کا ماصلہ یہ مشکل چند فرلانگ کا تھا۔ جزیرہ بے ملک پرسانہ تھا لیکن قاسم بجلی کا مکان کسی محل سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک الگ تھلک مصلح پر آڑی رہتا ہوا تھا اور اس کے تین اطراف سے سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ مکان کے ڈیزائن میں امریکا کے وائٹ ہاؤس کی جھلک تھی اور اس کا رنگ بھی سفید تھا۔ مین گیٹ سے ایک ڈھولان سڑک نیچے تک آ رہی تھی۔

اس مکان کی طرف آتے وقت راستے میں جہاں جہاں سے قاسم بجلی کی گاڑی گزرتی ”لوگ فوراً راست چھوڑ کر دیواروں سے لگ کر ٹھہر جینا کھڑے ہو گئے۔ کوئی کارکنہ گاڑی یا موٹر سائیکل پر تھا تو اس نے اپنی سواری ایک طرف کر کے دوک لی۔ یہ واقعی قاسم بجلی کی اپنی ہی الگ تھلک دنیا تھی۔

اس نے محسوس کر لیا کہ میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے مشاہدے میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مسکراتے ہوئے اس نے گویا وضاحت کی۔ ”ہمارا خاندان اس جزیرے پر کئی نسلوں سے آباد ہے۔ سرکاری طور پر ہماری یہاں کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی سرکاری طور پر ہم کوئی مقام حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن عملی طور پر ہم یہاں کے حکمران ہیں۔“

اسے یہ بات مجھے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یاد پڑتا تھا کہ جس زمانے میں میں نے یہاں خشک کے ژار خرید کر چھوڑے تھے اس وقت بھی میں نے قاسم بجلی کے تزکے کئے تھے۔ کوئی بعد نہیں تھا کہ ہمارے ژالوں میں سے کسی پر اس جزیرے کے بانی گیر بھی کام کرتے ہوں۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ شیخ شاہ دور سے اس جزیرے اور قاسم بجلی کے محل لیا مکان پر نظر رکھے کے لیے جو ژالے کر گیا تھا اس میں جزیرے کا کوئی آدمی نہ ہو پھر مجھے اس خیال سے اطمینان ہوا کہ شیخ شاہ اس قسم کی باریکیوں کا خیال رکھنے والا آدمی تھا۔

پیکر وچہ عالی چڑھ کر طویل و عریض ڈرائیو رے میں جا کر۔ مکان کے چاروں طرف جیسا لان پھیلا ہوا تھا ایسے خوب صورت لان میں بے مت کم گھروں میں دیکھے تھے۔ سبز گھاس کے ہموار اور نکلیں گھٹوں کے درمیان رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی

صاف تھری کیا مراں تھیں جنہیں خاص ٹھکیں دی گئی تھیں اور پھولوں سے ڈیزائن بنائے گئے تھے۔ پہلی نظر میں تو یوں لگتا تھا گویا کسی کیلنڈر میں چھپی ہوئی خوب صورت تصویر کو بے پناہ بڑا کر کے اس میں زندگی کی تپ و تاب اور تازگی بھری گئی تھی۔

فطرت کے اس نظارے کی دلکشی اپنی جگہ تھی لیکن وہ چیز بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھی جو اس لان کے ایک سایہ دار گوشے میں اچھل کود کر رہی تھی۔ رنگ برنگے چوک سمٹ اور جو کر ڈامیں چھپی ہوئی اس مختصر الوجود بستی کو پہلے میں لڑکا سمجھا تھا۔

چند قلابازیاں کھانے کے بعد اس نے ایک دم ڈک کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں ہاتھ کے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو کئی بار تیزی سے چٹو پھر سیدھے ہو کر اپنی کر کو دائیں بائیں پھنڈل دے چکے تھے کہ پہلے ہی تقریباً سب دم تھم گئے۔

جب اس کا چوا ایک لمے کے لیے ساکت ہوا اور جھکے لیے ہوئے مختصر تراشیدہ ریشمی بال ساکت ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی تھی۔ وہ لان کے درمیان سے گزرتی ہوئی ماربل کی ایک روش چر جو گنگ کرتی ہوئی قریب آئی۔ اب مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ لڑکی تھی۔ اسے دور سے دیکھ کر۔ اور متحرک حالت میں دیکھ کر ہی یقین تو ہو جانا چاہیے تھا لیکن دراصل اس میں لڑکی ہونے کی نشانیوں زرا کم ہی نمایاں تھیں۔

”اے ڈیٹس!“ وہ قریب آ کر بھی ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے جو گنگ کرتے ہوئے ہوئی۔ مخاطب وہ ڈیٹس سے تھی لیکن جائزہ میرا لے رہی تھی۔ سر تا پا تنہیدی جائزہ۔ اس کی منہ ہی ناک پر بیٹنے کی منہ منہ انداز میں خشم کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کا نازک

فکائیہ ادب میں منفرد اہمیت کے حامل

ادیب اعتبار ساجد کی نئی تصنیف

امیر جنسی وارڈ

قیمت: 80/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

تو غیر اور صبح چولان پر کھلے ہوئے بیض پھولوں سے ہی مشابہ تھا۔  
چرے پر مصویت تھی لیکن اس کی شرعی آنکھیں اس مصویت  
کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔  
”ہائے تالی! میری چاندی بنی کسی ہے؟“ قاسم بکلی اس کی  
چٹائی چرتے ہوئے بولا۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی  
تھی۔

”قائن ذیل! یہ طوفانی قسم کا اجنبی کون ہے؟“ اس نے اُٹھ کر  
کوہ کا پکا پکا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔ میں  
قدرے حیران ہوئے بغیر نہ سکا۔ معلوم نہیں اسے میری شخصیت  
میں کون سا طوفان نظر آیا تھا اور کس زاویے سے نظر آیا تھا۔  
”یہ عارف ہے تانی بیٹا! قاسم بکلی نے بڑے پیار سے بتایا  
”کون ہے۔ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن ہمارا دوست  
ہے۔“ پھر اس نے مجھے بتایا ”یہ میری بڑی بیٹی لگتا ہے۔“  
”اے۔۔۔ اذ ذریعہ؟“ اس نے اپنا مختصر سا ہاتھ معانے کے  
لیے بڑھایا۔ میں نے گویا ایک مٹلیں گلاب ہاتھ میں حمام لیا۔ فرق  
صرف یہ تھا کہ اس گلاب میں حرارت تھی۔  
”قائن!۔۔۔ شیک یو“ میں نے اپنے چرے پر ہمدردی طاری  
رکنے کی کوشش کی۔

”دیکھ۔۔۔“ اس نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور  
واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی لیکن  
جنوبی طور پر اس کی شخصیت میں دلکشی کی کمی تھی۔ صرف خوب  
صورت ہونا کسی کے پُرکشش ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔  
پاڑی پر بنے ہوئے اس طویل و عریض مکان کے اندر ایک  
طرف پارلر کے اوپر ایک اور چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔ اس کے  
نیچے پارلر کے درمیان فاصل کا ڈیڑھ کے لیے پارکنگ کی جگہ بنائی  
گئی تھی۔

قاسم بکلی اس مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”وہ  
ایکسی پیرا اصل گیسٹ ہاؤس ہے۔ اس میں کچھ غیر ملکی مسلمان  
ٹھہرتے ہوئے ہیں۔ کوکہ ابھی اس میں مزید آٹھ دس افراد کے قیام  
کی گنجائش ہے لیکن تم پھر بھی میرے اصل گھر میں۔ میری لیلیٰ کے  
ساتھ۔۔۔ کسی فاضل بیڑہ میں ٹھہرو گے ٹھیک ہے؟“  
”بہت شکریہ۔ یہ گویا میرے لئے ایک اعزاز ہے۔ اس کے  
لیے میں پیش تمہارا شکر گزار ہوں گا۔“ میں نے کہا۔

مکان کے اندر گرد اور گیسٹ کے آس پاس کئی مسلح محافظ کھڑے  
پہرتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اس کے ساتھ بیڑہ میں چڑھ کر  
ہال سے گزر کر اندر پہنچا۔ وہ کچھ ایک بڑے عظیم الشان  
ڈرائنگ روم میں۔۔۔ ”اے۔۔۔ اس کی ایک کونڑی سے بھی وہ ایٹمی  
دکائی دے رہی تھی۔“

قاسم بکلی نے جب اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ  
اس میں کچھ غیر ملکی مسلمان ٹھہرتے ہوئے تھے تو میری دھڑکنیں کچھ

تیز ہو گئی تھیں۔ کس وہ ریڈ ڈاٹ کے لوگ تو نہیں تھے؟ کبیر  
میں ڈاکٹر پر تیار بھی تو شامل نہیں تھا؟ کس ان میں سے کوئی  
پہچان تو نہیں تھا؟ کس ان میں سے کوئی اس وقت ایٹمی کی کا  
سے میری طرف دیکھ تو نہیں رہا تھا؟ میں نے غیر ارادی طور پر  
سمجھ لی لیکن مختصر اذنی موٹھوں پر ہاتھ پھیرا اور سیاہ چشمہ دور  
کیا اور قدرے اطمینان محسوس کیا۔

ہم شاندار صوفوں میں دھنس کر بیٹھ چکے تو قاسم بکلی بولا  
”ہاؤ تمہاری کیا خاطر قاضی کی جائے؟ تم کچھ چپے پڑاے  
شوٹیں ہو؟“

”ہاں۔۔۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”کیا پیو گے؟“ اس نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔  
”مختصر پانی۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک گوجر لیا آفتہ لگایا ”میں سمجھا تھا تم دنیا کی  
نمایات مٹکی اور کیاب شراب کا نام لینے والے ہو۔“  
”پانی دنیا کی سب سے اچھی شراب ہے لیکن اس کی قدر  
مصر اہل میں بھٹکتے ہوئے وہ مسافر ہی جان سکتے ہیں جن  
مشینرے غلام ہو چکے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں تو ہر چیز کی قدر دہی جانتا ہے جو اس سے بڑی طرح  
ہو۔ جو فحش انسان کی رسائی میں ہوئی ہیں ان کی قدر وہ  
جانتا“ قاسم بکلی کمری سنجیدی سے بولا ”لیکن یہ اس قسم کی بات  
کرنے کا وقت نہیں ہے۔“

ایک یاد دہی ملازم دروازے پر حاضر ہو چکا تھا۔ اس  
اسے چائے اور لوازمات وغیرہ پیش لگانے کا حکم دیا پھر میری طرف  
متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”میں سمجھ گیا ہوں۔ تمہاری خاطر ادا  
صرف اسی طرح کی چیزوں سے کی جاسکتی ہے۔ دیکھ۔۔۔ با  
داؤس۔ یہ پریر مار می ہے یا بیش سے چلا آ رہا ہے؟“

”عارضی ہے“ میں نے اسے ٹانے کے لیے جواب دیا۔ جو  
وہ مجھے کپڑے کا کچھ زیادہ ہی خواہش مند نظر نہیں آ رہا تھا۔  
کچھ دیر بعد جبکہ ہم اس کے طویل و عریض ڈرائنگ روم  
شاندار ڈرائنگ ٹیبل پر نمایت چڑھ گئے تھے اسے اسے لطف آ  
ہو رہے تھے ”تایا کرے میں داخل ہوئی۔ وہ لباس تبدیل کر چکی  
اور شاید شاید بھی لے چکی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اس کے دا  
ہوئے تھے اور لہجہ خوشبو پھیل گئی۔

وہ بڑی تیزی سے چلی آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھکی گئی پھر  
کی طرف دیکھ کر انگلیاں ہلاتے ہوئے بولی ”ہائے ڈیل! اچھے  
معلوم تھا آپ مسلمان کے ساتھ بیٹھے ہیں“ اس نے بڑی ادا  
کردن کو قلم دیتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا ”آپ کی تعریف  
وہ اب بھی انگریزی میں ہی بات کر رہی تھی۔

”تمہاری یادداشت بہت کمزور معلوم ہوتی ہے“ میں نے  
اختیار کرنا ”اس خوب آئی میں اتنی جلدی بھول جانے والی خاتون



ہے۔ اُمس پر حائی میں بہت زیادہ وقت گزارنا پڑتا ہے لیکن یہاں آنے کے بعد ہم قاصر ہونے کے باوجود کچھ نہیں کھاتے۔ عجیب مست اور بیزار انداز میں رات دن گزارتے ہیں۔ شہر چلے جاتے ہیں تو وقت ذرا اچھا کر جاتا ہے۔ وہ بالکل تانیا ہی کی طرح امریکی لہجے میں انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

قاسم کبھی محبت سے بولا "تینا! میں نے تم سے کہا تو ہے دن میں بے شک شہر میں رہا کرو لیکن رات کو یہاں اپنے گھر آجیلا کرو" پھر وہ سنی خیز انداز میں بولا "جلد ہی میں تم دونوں بہنوں کے لیے ایسی مصروفیت کا بندوبست کروں گا کہ تمہیں سر نہ کھانے کی فرصت نہیں ملے گی۔"

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے قہر انداز میں بولا "میری دونوں بیٹیاں اسٹینٹس سے بڑی اچھے خسرہاں میں ڈگری کے کرائی میں ہیں" پھر وہ زور دیتے ہوئے بولا "تینا! میں نے ذکر کیا" "بہت خوب" میں نے حسین آمیز لہجے میں کہا "میں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ اسٹینٹس سے اتنی اہم ڈگری ہے کہ کرائی ہوں گی۔ یہ تو سبک کی بچیاں لیتی ہیں۔"

قاسم کبھی نے ایک بار پھر بڑے سرد انداز میں قہقہہ لگایا "یہ دونوں بہنیں چینی اور جاپانی لڑکیوں کی طرح بڑی عمر جو رہیں۔" تانیا بالوں کو جھٹکتے ہوئے تڑپتی نظروں سے باپ کی طرف دیکھ کر کہی۔ "چینی اور جاپانی لڑکیوں کی طرح نہیں ڈیڈی۔ بلکہ آپ کی طرح تھیں۔ آپ خود کو بھی تو دیکھیں۔" آپ کھٹے عمر جو رہیں۔ آپ کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم دونوں بہنیں آپ کی دوسری بیوی کی اولاد ہیں۔ اور یہ کہ آپ کی پہلی بیوی سے ہم سے بھی بڑی عمر کی اولاد ہیں؟"

قاسم کبھی نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خوش معلوم ہوتا تھا۔ ایک سوچے کوئل دیتے ہوئے وہ بولا "تانی! میں نے ڈیڈی! تمہیں اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ تو ہمارا فیملی سیکرٹ ہے۔"

اسی اثنا میں تانیا بھی آن بجلی۔ وہ اب آؤسے آؤسے سے رنگ کی اسٹون واشڈریس جینز اور ہلکی پھلکی سفید شرٹ میں تھی۔ وہ بھی جائے نوشی میں شریک ہو گئی۔ ہلکی پھلکی کپ شپ پہنی رہی پھر قاسم گہری دیکھتے ہوئے بولا "مجھے اب واپس شہر جانا ہے۔ میں رات گئے واپس آؤں گا۔ تم سے شاید کل صبح ہی ملاقات ہو۔"

پھر وہ اپنی بیٹیوں سے خطاب ہوا "تم مسٹر عارف کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ اور اگر یہ تمہارے بس کی بات نہ ہو تو انہیں لو کروں گے سپرد کر دیتا لیکن پھر بھی گاہے گاہے ان کی خیر خواہیت معلوم کرنی رہنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ یہ انارے خاص مسلمان ہیں۔ تم خود ان کی خیر خیر کو کو تو راہ بہتر ہو گا۔ جو بیٹہ روم خالی پڑے ہیں ان میں سے جو مسٹر عارف کو پسند آئے وہ انہیں دے دینا۔"

نے پہلی بار دیکھی ہے۔" قاسم کبھی نے اپنے مخصوص انداز میں گونجیلا قہقہہ لگایا۔ تانیا انہیں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ قاسم کبھی میز پر ہاتھ مارنے ہوئے بولا۔ "مسٹر عارف! یہ تانیا نہیں تانیا ہے۔ آپ تو خیر پہلی بار مل رہے ہیں۔ ان سے کئی کئی بار ملنے والوں کو بھی اکثر یہی غلط فہمی ہوتی رہتی ہے۔ ابھی ایک منٹ پہلے تانیا سے کوئی بات کی۔ ایک منٹ بعد تانیا سامنے آئی تو اس سے اس بات کا جواب مانگتے تھے۔ یہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔"

"وہ خدا ایا۔" میں غریب سانس لے کر کہی "شکر ہے ان کے ناموں میں ایک نفلے کا فرق ہے۔ شکل میں تو ایک نفلے کا فرق بھی نہیں ہے۔"

"نہیں۔ شکل میں بھی ایک نفلے کا فرق ہے" تانیا تاک کے قریب رخسار پر انگلی رکھتے ہوئے مسکرا کر بولی "میرے یہاں مل ہے۔ تانیا کے نہیں ہے۔"

قاسم کبھی نے کبھی سی فمسی کے ساتھ قہر انداز میں کہا "میری بیٹیاں ذہانت میں کیساں ہیں۔"

"اور حساسیت میں بھی" میں نے کہا۔

"بے شک" وہ مسرور لہجے میں بولا "تم نے اتنی مشابہت مت کم جڑواں بہنوں یا بھائیوں میں دیکھی ہوگی۔"

"میں نے زندگی میں جڑواں بھائی بہنیں ہی کم دیکھی ہیں۔۔۔ بلکہ میرے خیال میں اس سے پہلے جتنے دیکھے ہیں ظلوں میں ہی دیکھے ہیں جن میں ایک ہی ایکٹریا ایکٹریا نہیں جڑواں بھائیوں یا بہنوں کا ملل ادا کرتی ہیں۔"

"حقیقی زندگی میں کبھی کبھی قہمی اور انسانی زندگی سے زیادہ حیرت انگیز اتفاقات رونما ہوتے ہیں" قاسم کبھی سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"بے شک" میں نے پُر زور انداز میں اس کی تائید کی "میں خود اس تجربے کا چلن پھر تاجوت ہوں۔"

"اوسے" تانیا نے اس طرح ادائے خاص سے آکھیں پہلا کہہ کر کہ گول کرل دکھائی دینے لگیں۔ وہ بلا جھجک میرے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی اور میرے تاریک چشمے کے پار میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہے" آپ نے ایک سو پچاس اور پچاسہ خیر زندگی گزارا ہے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے میری داستان حیات سننے کی خواہش کر لیتے۔"

کہ "اوسے" گئی پھر آئی "وہ عسٹری سانس لے کر بولی۔ تاہم وہ کسی قسم کی خواہش کی طرف نہیں آنی البتہ ایک نظریات کی طرف دیکھنے کے بعد بولی تھیں اور تانیا بھی جب اسٹینٹس میں تھیں تو کافی دلچسپ اور تکیان خیز زندگی گزار رہی تھیں حالانکہ ہم اسٹوڈنٹس تھیں اور وہاں اسٹوڈنٹس کی زندگی کافی خشک اور بے کیف ہوتی

ی بھر رخصت ہو گیا تھا۔  
 وہ میرے دائیں بائیں چمٹے گئے۔ دونوں کے وجود سے ایک  
 جیسی سبک اٹھ رہی تھی۔ کم بخت شاید کلن بھی ایک وقت  
 ایک ہی استحال کئی تھیں۔  
 ”مسٹر عارف! آپ کو اسکی ایک آنی ہے؟“ اچانک غانا  
 پوچھا۔

”آئی تو ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جو  
 میں باہر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

”ماہر تو اس میں انسان پرکیش سے ہی ہوتا ہے“ غانا بولی  
 مجھے گردن تھکا کر اس کی طرف دیکھتا ہوا۔ وہ بڑے بچے اور کچھ  
 سے انداز میں مسکراتی مہربان ہم آپ کو دو تین گریے تیار  
 کے کہ آپ چند منٹ میں ہی خود کو زندگی و موت ماہر محسوس کریں گے  
 آجے۔ بوٹ کی بیر اور اسکی ایک کے لیے چلتے ہیں۔ ہم دلدور  
 یہاں کئی دن سے اتنے پور ہو رہے ہیں کہ خود کئی کو مل پاتا  
 ہے۔“

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور اس نے اڑنا و اخلاق پڑ  
 ”آپ تنگے ہوئے تو نہیں ہیں؟“

”مجھے تنگے کی فرصت ہی نہیں ملتی“ میں نے لفظی سار  
 لے کر کہا۔

ہم آٹھ کر باہر آ گئے۔ مجھے اب تک باپ بیٹیوں کے علاوہ  
 کا کوئی فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہم ذرا نیوے میں آئے تو میری  
 ایک بار پھر انیسویں پڑی۔ اس کی کڑکیاں گویا چند جاتی آنکھوں  
 طرے دور سے مجھے گھور رہی تھیں۔

”قاسم صاحب بتا رہے تھے کہ انیسویں میں کچھ غیر ملکی سما  
 گھرے ہوئے ہیں۔ کون لوگ ہیں وہ؟“ میں نے بظاہر سرسری  
 لہجے میں پوچھا۔

”آغا اور غانا نے یوں انیسویں کی طرف دیکھا جیسے ابھی تک  
 اس کی موجودگی سے ہی بے خبر تھیں پھر آغا نے بتاتے ہوئے  
 ”ہم نے چند کوروں کو ڈیڑی کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ باہر آ  
 جاتے دیکھا ہے لیکن جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون ہیں؟  
 پچھ سال اسٹیشن میں گزار کر آئے ہیں۔ ہمیں کوروں سے کچھ نا  
 دلچسپی نہیں رہی۔ مولیٰ اور شافتم جیسی چمکی چمکی رکھتے دیکھ کر  
 بھر گیا ہے۔“

”اور پھر وہ بڑے بھی تو تھے۔“ غانا نے کھڑا لگایا۔

”ہاں۔“ آغا نے سر ہلایا ”ایک تو گورے۔ اور  
 بڑے۔ ہمیں بھلا ان کے بارے میں جاننے کی کیا ضرورت تھی

”بے فکر۔ بے فکر۔“ میں نے سر ہلایا۔  
 ”ہمیں تو کچھ مرے سے سب چیزیں ملنی اچھی لگتے لگی چڑ  
 لکی کھانے۔ لکی چڑیں۔ اور لکی بندے!“ غانا کہتا

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ”کچل جاتے ہوئے بولا“ لیکن اس  
 سے پہلے تم دونوں میرے ساتھ ذرا اسٹیشن میں چلو۔ ماربل کی  
 ٹیکڑی کے قفل محلات کے بارے میں جو قائلیں میں نے  
 تمہارے سپرد کی تھیں۔ تم نے ان کے بارے میں کیا سوچا؟ وہ ذرا  
 غور آجئے تیار اور قائلیں بھی داپس دے دو۔“

وہ محذرت خوابانہ لہجے میں مجھ سے قاطب ہوا ”میں تمہارے  
 سامنے کا دیوار کے خشک مسائل چمچ کر کہیں پور نہیں کرنا چاہتا۔  
 صرف چند منٹ کے لیے آنا اور غانا کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔  
 امید ہے تم آٹھ منٹیں مٹاؤ گے۔“  
 ”ہرگز نہیں۔“ میں نے غلوں سے کہا۔

میں مل ہی مل میں فاضل شرمن کا شکیبہ ادا کر رہا تھا جس نے  
 مجھے ”آرائیس ٹھری“ کی صورت میں گویا ”مکمل جاسم سم“ کی قسم  
 کا کوئی کوڑوڑا تانا تھا جس سے میرے لیے پڑھیں میرانی کے  
 رد و اذے کھاتے ہمارے تھے اور میرانی بھی وہ خوب صورت لڑکیوں  
 کے سپرد کی جارہی تھی۔ مانا کہ ان میں ”شوکت“ کی ذرا کئی تھی  
 لیکن بہر حال وہ لڑکیاں تھیں اور خوب صورت بھی تھیں۔ قدرت  
 میری زندگی میں بڑا توازن رکھتی تھی۔ جہاں میرا قدم قدم پر ایک  
 سے ایک بڑھ کر محسوس ”کروہ اور خطرناک مردے واسطہ پڑتا تھا“  
 وہاں خوش شکل ”خوش ادا“ اور کسی نہ کسی اعتبار سے منفرد خواتین  
 سے بھی میری رسم و رواج پیدا ہوتی رہتی تھی۔

ان باپ بیٹیوں کے جاتے ہی بنگر میرے سر آکر کھڑا ہو گیا  
 ”سرا آپ کو کچھ اور چاہیے؟“ وہ نہایت نبوتانہ انداز میں جھکتے  
 ہوئے بولا۔ ”مجھ سے چائے کے لیے اتنا تکلف کیا کیا تھا کہ طویل  
 و عریض ڈانٹنگ ٹیبل بھی پڑی تھی۔“

میں نے ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”مجھے تو یہ  
 سب کچھ بھی نہیں چاہیے۔ تم ”کچھ اور“ کی بات کر رہے ہو۔“  
 ”سرا آپ کوئی اور۔۔۔ سندھی۔ انگریزی۔ کل۔ غیر ملکی  
 اخبار یا رسالہ پڑھنا پسند کریں گے؟“

میں نے اسے گھورا لیکن اس کا چہرہ تاثر سے عاری تھا۔ وہ  
 چہرے سے موندے دماغ کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

”میں نے ایک لمحے کے وقف سے کہا ۳۳ وقت مجھ  
 پر حالت کا درد بڑا ہوا ہے۔ میں کچھ پڑھنا نہیں چاہتا۔“

”جیسے آپ کی مرض سرا“ اس نے کندھے اچکائے ”میں نے  
 سوچا شاید وقت گزارنے کے لیے۔“ اس نے جملہ احوال پچھوڑ دیا  
 اور وہیں کھڑا رہا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں تیار ہوں۔ یہ مجھے  
 تنہائی کا انجیل تھی۔ ان دونوں باتوں میں خامسا فرق تھا۔ نہ جانے  
 دونوں میں سے کون سی بات درست تھی۔

آغا اور آغا نے واپسی میں خاصی دیر لگادی لیکن جب وہ  
 واپس آئے تو خوش نظر آ رہی تھیں ”ڈیڑی چلے گئے۔“  
 انہوں نے گویا مجھے خوشخبری سنائی۔ ان کے کمرے میں قدم رکھتے

جاگر یوت کی رفتار بھی خطرناک حد تک بڑھادی لیکن میں نے اوسان نظام نہیں ہونے دیا۔

آخر جب میں یوت میں داخل ہوا تو وہ مجھے شاباش دیتے ہوئے بولیں "ہائی ہو۔ کمزیاہ نہیں۔"

اس وقت شام کاؤنڈ کا نمودار ہونے لگا تھا۔ میں تقریباً ایک گھنٹا پانی میں رہا تھا۔ اب مجھے خشکی اور صحت کا احساس ہونے لگا تھا۔ گزشتہ دو دن جیسے حالات میں گزرے تھے اور آرام کے لیے جتنا کم وقت مل رہا تھا اس کے اثرات کو میں اپنے جسم پر حاوی نہیں ہونے دے رہا تھا لیکن خود زہمت احساس ہونے لگا تھا۔

میں ایک پر آلیا۔ اس کے کچھ حصے پر کنڈی دھوپ باقی تھی۔ یوت اس وقت سے رفتار سے ایک بہت بڑے دائرے میں محوم رہی تھی۔ سمندر پر سکون تھا۔ آٹیا اور ٹانیا میرے دائیں بائیں آتے تھے۔ آٹیا کے ہاتھ میں لوٹن کی بوتل تھی۔

"تھک گئے ہو۔" وہ میری آنکھوں میں بھانکتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "اگر آسان کر دوں۔"

مجھ کو گار کو اس حسین و خلش سے بھلا کر اٹھا کر ہو سکتا تھا۔ وہ لوٹن میرے کندھوں اور کمر پر پھیلا کر کسی باہر اٹھنے کی طرح بالٹ کر کہنے لگی۔ ٹانیا اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی۔

میں نے دو ذریعہ نظروں سے اوجھڑا کر دیکھا۔ ایک طرف بہت دور وہ ٹرار کھلونے کی طرح نظر آ رہا تھا اور دوسری طرف اتنی ہی دور جزیرے کا مختصر ساحل دھند میں پناہ ہوا دکھائی دے رہا تھا جبکہ آس پاس کیس دھند نظر نہیں آ رہی تھی۔

کافی دیر بعد آخر کار میں نے بو جمل لیے میں کہا "کیوں ایک غروب پاکستانی کو موانے پر پہنچتی ہوئی ہو۔ یہ یورپ یا امریکا کا سمندر نہیں ہے۔ کوئی جہاز قریب سے گزرا تو ہمارے نظارے پر ٹکٹ لگ جائے گا۔ کوئی بہرہ نہیں کہیں دور سے کوئی زوم لینس لگا کر ہماری مودی بنا کر شوروں کر دے۔"

دونوں بیک وقت زور سے نہیں۔ اس وقت وہ خیرانی بلیاں لگ رہی تھیں۔ ان کے چہروں سے جو بچپنا سا جھٹکا تھا اب اس کا کہیں غام و نشان تک نہیں تھا۔ ٹانیا غار آلود سے لہجے میں بولی "ہالہ۔ چلو۔ آؤ نیچے کہیں میں چلتے ہیں۔"

ہم نیچے کہیں میں آگے جہاں فرش سے جڑا ہوا خوب صورت آرام دہ ڈبلی بیڈ موجود تھا۔

بہت دیر بعد ٹانیا نے کراٹ لیتے ہوئے سر اٹھا کر کمری سے باہر دیکھا اور بیاضات آئیز صحت سے بو جمل لیے میں بولی "غروب آفتاب کا نظارہ کتنا دلکش لگ رہا ہے۔"

ٹانیا نے بھی سر اٹھا کر کہی انجانے نشے سے بو جمل آنکھیں کھول کر کمری سے باہر دیکھا اور ہماری آواز میں بولی "واقعی۔ دنیا کتنی خوب صورت ہے۔"

ان سے سوال کر کے بھی میری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ صرف ان کے "قابلِ قدر" نظرات سے دھیرے دھیرے آہستہ حاصل ہو رہی تھی۔

ذرا سوچے میں اب وہ بیکر موجود نہیں تھی جس میں میں تھم نکلی کے ساتھ ساحل سے یہاں تک آیا تھا البتہ اس کی جگہ ایک میسجنگر کمری تھی۔ ٹانیا نے اس سیاہ میسجنگر کی ذرا نیچے تک سیٹ سجھائی اور ٹانیا پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ آ بیٹھی۔

ذرا سوچے میں کھڑے ہوئے دو مسلح گاڈز نے بھی خاموشی سے گاڑی میں ہمارے ساتھ بیٹھے کی کوشش کی لیکن ٹانیا نے انہیں ڈانٹ دیا "ہم ذرا سمندر کی سیر کر جا رہے ہیں۔ کیا ہمیں اب اپنا بدشاہی میں بھی گاڈز کی ضرورت ہوگی؟"

گاڈز میں بیٹے کریم بوٹ ہاؤس تک پہنچے وہاں "پرنس" اسی شان سے کمری تھی۔ دو مسلح محافظ بوٹ ہاؤس میں بھی موجود تھے۔ انہوں نے بھی ہمارے ساتھ "پرنس" میں سوار ہونے کی کوشش کی۔ انہیں بھی ٹانیا سے اسی طرح ڈانٹ سننا پڑی جس طرح کمرے موجود محافظوں نے کئی تھی۔

بوٹ کے ڈرائیو ہاؤس میں بوٹ کو چلانے والا اور دی نور جان موجود تھا مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ ٹانیا اسے بھی بوٹ سے ڈانڈے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے کشتی کی ناخدا آئی کی کے ہاتھ میں رہنے دی اور اسے کمرے پائیل کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

ذرا سی گلی جگہ میں پہنچ کر طاقتور بوٹ نے رفتار پکڑ لی تو سمندر میں جھانک کا ٹھکانا چھوڑتی ہوئی چند منٹ میں کہیں سے کہیں ایک ایک کر کے کی لائیں منوہ نامی جزیرہ وغیرہ سب پیچھے رہ گیا۔ بہت دور ایک ٹرار البتہ اب بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ گویا ہمارے توازن چل رہا تھا۔ فاصلہ اتنا تھا کہ وہ کسی حد تک کھلونے کی نظر رہا تھا لیکن میں اسے پہچان سکتا تھا۔

اس وقت تک ٹانیا اور ٹانیا کہیں میں جا کر لباس تبدیل کر آئی تھیں اور سو ٹھیک کاسٹیم میں تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی ایک سو ٹھیک ٹھیک دے دیا تھا۔ موٹر بوٹ میں انہوں نے نہ جانے کتنے کئی چڑوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ اسکی ایک کاسابان بھی موجود تھی۔

پہلے ان دونوں بہنوں نے باری باری اسکی ایک کی۔ پانی میں وہ کہیں کے کہیں سے ڈونٹن پھیلیاں مطوم ہو رہی تھیں۔ اسکی ایک روتھال میں وہ واقعی بے پناہ ماہر تھیں۔ پانی کی اس طرف سے تھیں اسکی ایک پر بیکر کر دیا۔

میں پرنس میں نہیں تھا۔ میرے انداز پر ایک آدھ مرتبہ سوال سے گتے بھی لگائے اور ایک بار ٹانیا نے خود چل دوام میں

# ہاگے بھون

اقلم علیم قیمت = 300/-

## اپلیس مصر

☆ ---- الماس ایم - اے

اسلامی کمانیوں کا بہترین استراٹج

واضح رہے کہ اس مجموعہ کی تین کمائیاں  
کو نہ صرف قرآن حکیم سے اخذ کیا  
ہے، بلکہ ان کے بیشتر مکالمے بہ  
قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں۔

قیمت: 100/- روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

کیا اس بیکراں سمندر میں ڈونا میرا مقدر تھا؟ یہ سوچ  
جیسا اندھیرا میرے حواس پر بھی چھانے لگا!

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔  
میرے مسئلے کا حل نہیں تھا۔ پانی میں دھیرے دھیرے اڑ  
ارہے ہوئے میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ ایک طرف  
دور جزیرے کی دو فٹیاں جھللا رہی تھیں۔ اندھیرے کی  
صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا کہ فاصلہ کتنا تھا۔

میرے سامنے ایک راستہ تو یہ تھا کہ جزیرے کی  
شروع کر دیتا۔ شاید وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی  
میری مغربی کا ایک کڑا امتحان ہوتا۔ اگر راستے میں میرا  
میرے بازو جواب دے جاتے تو میرا انجام حیرت انگیز  
تھا۔ اس میں حیرت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہوتا کہ میرے  
میں سے تو کوئی اس حقیقت سے آگاہ ہی نہ ہوا تاکہ وہ حقیقت  
انجام ہو اکیا تھا؟

میں نے بھی اورنگ ڈونچے سورج کو دیکھا۔ اس قسم کے  
مناظر صرف کیلاڑیوں پر نظر آتے ہیں۔ تانیا بولی ۳۰ سالہ دایس چلنا  
کا ہے۔

میں غروب آفتاب کا نظارہ کرتے ہوئے ہسوت سا تھا۔ تانیا  
مجھے کہتی رہتے ہوئے بولی "جانے سے پہلے تم ایک ڈبلی اور کیوں  
نہیں لگاتے؟ یہاں پانی کتنا صاف ہے۔"

"کیوں نہیں۔ میں خود کیا سوچ رہا تھا" میں نے چونکتے ہوئے  
کہا اور کابلی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باہر جا کر سمندر میں  
چلا گیا۔ لگاوی۔ اس فصل میں جو لطف تھا وہ اسپورڈ ٹانگوں اور  
جدید ترین ساز و سامان سے بچے ہوئے کسی پُر حش ہاتھ روم میں  
میر نہیں آسکتا تھا۔

یوت کا انجین بند کر دیا گیا تھا اور وہ بے آواز، قریب ہی  
ہنگور سے لے رہی تھی۔ میں کئی منٹ تک ٹھٹھ سے پانی سے لطف  
اندوز ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ سورج نے منہ چمپایا اور سبز آب پر ٹھکنا  
اندھیرا پھیل گیا۔

سورج نے تو صبح تک کے لیے غوطہ لگایا تھا۔ میں نے سوچا میں  
چند منٹ کے لیے غوطہ لگا لوں۔ میں نے سانس روکی اور زیر آب  
چلا گیا۔ زیر آب جانے سے انسان کے کان بند ہو جاتے ہیں تو ایک  
عجب سے سکون کا احساس ہوتا ہے۔ میں گویا مرا تے میں جا کر ان  
لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ تین گھنٹے پہلے میرا ان سے  
تعارف ہوا تھا۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں اور!  
میں نے دنیا دیکھی تھی۔ اونچے سے اونچے اور نیچے سے نیچے  
ٹھٹھ سے میرا واسطہ رہا تھا۔ بڑی بڑی آزاد خیال لڑکیوں سے بھی پالا  
را تھا لیکن پیش قدمی میں جیسی امریکی تیزی ان جزوں میں نہیں  
دیکھا تھی وہ میرے تجربات میں خامیاں یادگار اضافہ تھا۔ یہ محض  
حزبان کی آوارگی تھی یا اس کا کوئی خاص مقصد تھا؟ یا بھروسوں  
ہی باتیں تھیں؟

مجھے پانی میں خفیف سی ہچک چاہی کا احساس ہوا اور کمرائی میں  
ہونے کے باوجود ہلکی سی گھر گھر ہٹ سٹائی دی لیکن میں نے اسے  
اہمیت نہ دی اور اپنی گفتگو سوج و پچار میں مشغول رہا۔ آخر جب  
یو کا کی مشق بھی جواب دینے لگی تو میں سانس لینے کے لیے سرخ آب  
پر آیا تو سمندر کے سینے پر پھیلے ہوئے اندھیرے کے باوجود میرے  
سامنے چھوٹے روشن دھبے۔

یوت مجھے چمکوا کر روانہ ہو چکی تھی اور بہت دور پہنچ چکی  
تھی۔ اس کی جھللائی تو روشنی تھی کہ یہ لمحہ مزید دور ہوتی جا رہی تھی۔  
بہت دور اگر شفیق شاہ میرے زائر پر موجود بھی تھا تو وہ دور میں کی  
مدد سے بھی مجھے یہاں سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے نہیں دیکھ سکتا  
تھا۔ وہ یوت کو صرف اس کی مدد شیوں کی مدد سے دیکھ سکتا تھا۔  
اسے دایس جانتے دیکھ کر وہ یقیناً یہی سمجھا تھا کہ میں بھی اس میں  
جا رہا ہوں۔

اور گرد پانی میں بھونچال سا اٹھیا تھا جو مجھے بھی ادا کر ادا کر رہا تھا۔ سرچ لائٹ میرے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔ آخر کار میں ہاتھ پاؤں مار کر ڈالر کے قریب پہنچے میں ہو گیا۔ شیخ شاہ نے رتی کی میڑھی لٹکادی اور میں ڈالر پرچ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت میرا جسم سرد تھا۔ ہوا بھی تیز اور خشک تھی۔ میں سر جھکانے کھڑا اپنے جسم سے غور دیکھ رہا تھا جس کا دائرہ دیکر پریشان جا رہا تھا۔

میں نے سر اٹھایا تو شیخ شاہ ہونٹوں پر خفیف سی مس لے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اسے اپنے آپ کو زائد کار کا وہ انسان محسوس کر رہا تھا جس کا کمزور تھا اور وہ اپنے تاریک طرف جانے کے بجائے سمندر کیا تھا۔

”خدا کا شکر ہے آپ زخمی نہیں ہیں۔“ شیخ شاہ کہنے لے کر ہلا ”لیکن آپ کا اس طرح سمندر میں پلایا جانا میری میں نہیں آیا۔“

”تم نے وہ عمارت کتنا ہے ”چڑی اور دو؟“ میں پوچھتا ہوں۔

”میں اس کتنا تو ہے۔“ وہ ذرا حیرانی سے ہلا۔

”بس کبھی کبھی چڑی اور دو دکھانے والے کا بھی ا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”میں اس حال میں طور پر اس لئے تمہارے سامنے آیا ہوں کہ تم مجھے دیکھ کر جبریت پکڑ سکو۔“

”سراورہ مختصر الوجود سی لڑکیاں اتنی شہ دور تو نظر تھیں کہ آپ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک سکیں۔“ شیخ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پر قرار دی۔

”آؤ! میں نے کہا کہ کہا“ تمہیں ابھی تک انداز عورت کیسے کیسے شہ زردوں کو کہاں کہاں سے اٹھا کر پھینک سکتی ہے اور وہ بھی ہاتھ پلانے کی ذمت کئے بغیر۔“ اس دوران نیچے سے ایک شخص میرے لئے بڑا سا آیا۔ اسے لپٹ کر میں نے عرشے سے اترتے ہوئے کہا ”چلے ہیں۔“

وہ میرے پیچھے پیچھے بڑھیاں اترتے ہوئے ہلا ”

ہاتھ کا آپ بدستور ”پرنس“ پری ہیں۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں آپ کی اور ان دونوں لڑکیوں کی تمام نقل و

نظر کر کے ہوئے تھا۔“ شیخ شاہ ہلا۔

”تمام نقل و حرکت پر؟“ میں نے چونکے ہوئے اور

کات کر پوچھا۔

وہ ذرا جھینپ کر ہلا ”میرا مطلب ہے جب تک آپ

میں اس وقت تک میں نے آپ کو لوگوں کی نقل و حرکت

رکھی۔ اس کے بعد آپ تینوں نیچے چلے گئے۔ پھر مجھے

دوسری طرف وہ ڈالر تھامس پر شیخ شاہ موجود تھا۔ وہ جزیرے کی مخالف سمت میں تھا اور اس کی روشنیوں کی جھلکاہٹ سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی جزیرے سے کم فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے کپٹین نے شاید انجن بند کر رکھا تھا۔ وہ نہایت آہستہ سے پوٹھی ادا کر ادا کر رہا تھا۔

میں حیران تھا کہ اگر شیخ شاہ نے ”پرنس“ ٹائی بوٹ کی روٹیاں دور جاتے دیکھ لی تھیں تو ابھی تک اس کے تعاقب میں کیوں روانہ نہیں ہوا تھا؟ ضروری نہیں تھا کہ اس کے روانہ ہونے سے مجھے دو میرا آجاتی۔ ممکن تھا وہ اسی طرف سے گزرتا چدر میں بھٹکی ملی کی طرح تیر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھ سے بہت دور سے گزر جائے۔ سمندر کی دیکر اس وقت میں مست و فیوکی کسی خاص پابندی کے بغیر سفر کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ مجھ زرا سا گھبرائے کی وجہ سے وہ کسی مخصوص جگہ سے کتنے فاصلے پر رہتے ہوئے گزرتے چلے جائیں۔ تاہم میرے لئے امید کی کرن تیار ہو سکتی تھی۔

میں ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ ڈالر کی طرف تیرنا شروع کروں یا جزیرے کی طرف؟۔ وقتاً ڈالر کی روشنیوں نے ”جھرجھری“ سی ٹی اور تیزی سے میری طرف بڑھنے لگیں۔ شیخ شاہ نے قدمے آخر سے ”پرنس“ کے تعاقب میں روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور میری خوش قسمتی تھی کہ وہ اسی طرف کو آ رہا تھا جہاں میں دیر سے دیر سے تیر رہا تھا۔

میں نے ڈالر کی طرف تیرنا شروع کر دیا تاکہ کم سے کم وقت میں ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچ جائیں۔ ہمارے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہو آ گیا۔ مجھے اس کے انجن کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی پھر کچھ آسمان کے پس منظر میں مجھے ڈالر کے ڈیک پر شیخ شاہ کا چہرہ بھی دکھائی دے گیا۔ وہ اب بھی دور میں لئے کھڑا تھا۔ اگر یہ دور بین انفراریڈ ہوتی تو اچھا تھا۔ اس صورت میں شاید کچھ اور قریب آنے کے بعد وہ تاریکی کے باوجود مجھے دیکھ لیتا۔ فاصلہ زیادہ ہونے پر تو تاریکی میں انفراریڈ دور بین بھی کار آمد نہیں رہتی تھی۔ میں ڈالر کی پینڈ لائٹ کی سیدھ میں رہنے کا غلطو عمل نہیں لے سکتا تھا۔ میں ممکن تھا تیز رفتاری کے باعث ڈالر مجھ پر چڑھ دوڑتا۔

میں ابھی روشنی کی رسائی سے باہر ڈالر سے کافی دور ہی تھا کہ شیخ شاہ نے غالباً پانی میں میری موجودگی کو محسوس کر لیا۔ اچانک سی تیز روشنی مجھ پر پڑی۔ شیخ شاہ نے سرچ لائٹ روشن کی تھی۔ میری آنکھیں چند صایا گئیں لیکن میں نے سر پانی سے اوپر ہی رکھا تاکہ شیخ شاہ مجھے پہچان لے۔

میں نے یہ توازن بند اسے کچھ کہنے کنا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہ آسکے۔ شاید وہ کپٹین کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ ڈالر کا انجن بند ہو گیا لیکن وہ اپنے دور میں مجھ تک پہنچ گیا اور میرے گرد و نیم دائرے میں گھوم کر ہلکے سے چلنے لگا۔ اس کی آمد کی وجہ سے میرے

آپ کب پانی میں آئے۔ شاید آپ بوٹ کے دوسری طرف سے آئے تھے یا پھر آپ کو پھینکا گیا تھا؟

”میں نے رضا کارانہ طور پر چلا گیا تھا۔ ایک طرف لڑکی لگا کر سربانی سے نکالا تو وہ مجھے چموز کر ہماگ چکی تھیں۔ مجھے اس وقت شرم سے ذوب مرنے لگا تھا لیکن میں تھرا ہوا۔ تمہارے پاس آگیا۔ دھڑائی اسی کا نام ہے۔“

ہم چنے کہیں میں پہنچ چکے تھے۔ شفیع میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے بولا ”یہ محض چٹیل امیر زادیوں کی شرارت معلوم نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے یہ آپ کو ناپت مغالی سے نہایت غیر تشددانہ انداز میں قتل کرنے کی کوشش تھی۔“

”دلوں کے بچھڑا جاتا ہے۔“ میں نے درویشانہ انداز میں آہستان کی طرف اٹھ کر کہا ”میرا حال ابھی بات ختم تو نہیں ہوئی۔ جو سوال تمہارے ذہن میں ابھرا ہے یہ میرے ذہن میں بھی ڈبک رہا ہے۔ اس سوال کا جواب لینے کے لئے مجھے دوبارہ ان نوجوان معزز خواتین کے پاس جانا ہے۔“

میرے یہ کہنے سے پہلے ہی ژرار ”پرس“ کے تعاقب میں روانہ ہو چکا تھا جس کی روشنیاں جزیرے کی روشنیوں کے قریب پہنچ کر دکھائی دے رہی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد شفیع شاہ نے پوچھا ”بوٹ پر خطرے والی کوئی بات تو نہیں؟“

”ان چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے بڑا خطرہ اس بوٹ پر کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے ہمتا نقصان پہنچا سکتی تھیں، پہنچا چکی ہیں۔ اب ورا بارگاز سے دو دو باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”گلیا آپ جزیرے پر بھی دوبارہ جائیں گے؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں حالات دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔“ میں نے جواب دیا ”جانا تو پڑے گا۔ جزیرے پر میری آمد کا جو مقصد تھا ابھی تو اس کے پورے ہونے کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آئے۔“

”اگر جزیرے پر آپ اپنا کچھ کسی خطرے میں پھنس گئے تو میری کچھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کتاڑے پر چلے گئے کیا کریں گے؟ میرا خیال ہے ہم لوگوں کو قاسم بجلی کے مکان کے آس پاس ہی موجود رہنا چاہئے۔“ شفیع شاہ پُر خیال لہجے میں بولا۔

”تو یہ تو وہ مکان بھی اٹھا رہا ہے کہ دس بیس آدمی اندر قتل ہو جائیں تو ہزاروں کو کانوں کان جاسمیں ملے گا۔“ میں نے دہرائی اس کے پاس جزیرے کی روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اندرو تو جو کچھ ہو گا اس سے مجھے خود ہی غمنازی ہے گا اور جو بھی خطرہ درپیش ہو گا اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم لوگوں کو تو میں نے کسی بدل کی تسلی کے لئے بلایا ہوا ہے کہ اگر تم بدعت کچھ نہ کر سکو اور کچھ کچھ ہو جائے تو کم از کم بدعت میں توبہ لے سکو اور مجھ سے جو کام اور حراہ جائے اسے مکمل کر سکو۔“

”اگر آپ کو کچھ ہو گیا پھر تو سب کام بے معنی ہو جائیں گے۔“ شفیع شاہ دور اندیشی سے کسی نا معلوم چیز کو گورے ہوئے

”اسی کوئی بات نہیں ہے میرے دوست! میں نے ایک بارو سے اسے اپنے سینے سے لگا کر پیچھے ہونے کا ۱۳ انسان جن سے محبت کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ دنیا میں نہ رہے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا کائنات کی گردش ختم جائے گی اور نہ جانے کیا کچھ ہو جائے گا۔ لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں ہوگا۔ دنیا کا نظام یونسی پتھر رہتا ہے۔ کسی کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کسی گئے جنگل سے ایک پتھر ٹوٹ کر گر جائے سے جنگل کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مرنے سے نہ جانے کیا ہو جائے گا ان میں سے بدشرفی میں ہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔“

پھر میں نے اس کا مدعا چھینکے ہوئے کہا ”تم لوگ قاسم بجلی کے مکان کے قریب آنے کی کوشش مت کرنا۔ اس کی بہت سخت نگرانی ہوتی ہے۔ تم لوگ نظریں آجاؤ گے اور قاسم بجلی ہو شمار ہو جائے گا اگر اسے میرے بارے میں کچھ شک ہے تب بھی فی الحال میں اسے تذبذب میں ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی تو مجھے یہ دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا کہ اس کے ہاں کون کون مقیم ہے۔“

شفیع شاہ کچھ نہ بولا۔ وہ کسی کمری سوچ میں تھا۔ اب جزیرے کی روشنیوں واضح دکھائی دینے لگی تھیں اور بوٹ ہاؤس بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ ”پرس“ ابھی بوٹ ہاؤس میں ہی کھڑی تھی اور اس کی بتیاں روشن تھیں۔

”ایک منٹ کے لئے انجن بند کراؤ۔ میں یہیں آ رہا ہوں۔“ میں نے شفیع شاہ سے کہا ”باقی ناسطہ میں تیرے ہوئے ملے کرلوں گا۔ سمندر میں اس ژرار کی موجودگی کی طرف ان کا دھیان نہ دی جائے تو بہتر ہے۔“

کمپن کے پاس جا کر شفیع شاہ نے اسے انجن بند کرنے کا حکم دیا۔ ژرار کی رفتار یکدم کم ہو گئی۔ چند لمحے بعد میں نے شفیع شاہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے ایک بار پھر پانی میں چلا گیا لگادی اور بوٹ ہاؤس کی طرف تیرے لگا۔ ژرار نے اپنا منہ تھوڑا سا ہلایا۔

بوٹ ہاؤس کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا بوٹ کے صرف ایک پر ایک ہی روشن تھی باقی بوٹ میں تقریباً آدھ کی ہی نظر آ رہی تھی۔ بوٹ کو وہاں پہنچے کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی لیکن شاید آجنا اور غائب بوٹ سے آ کر جزیرے پر جا چکی تھیں۔ آہم میں نے بوٹ پر ہجما کر لینا بہتر سمجھا۔

میں نے پوری پوری کوشش کی کہ میرے تیرے سے شڑاب شڑپ کی آوازیں نہ اٹھیں۔ ہوں، تقریباً بے آواز طریقے سے تھرا ہوا میں بوٹ ہاؤس میں داخل ہوا اور بوٹ کے سطحی حصے سے کسی نہ کسی طرح اس پر چڑھ گیا۔ اس کی نظریں اٹھیں اس میں اس کہیں تک پہنچا جو بدعت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کہیں کی پھٹی ہی بیٹری کھڑکی میں مجھے دو جھنکی نظر آئی۔

نہایت محتاط انداز میں اس کھڑکی سے آنکھ لگا کر میں نے اندر جھانکا تو ایک لمحے کے لئے گھبرا دیا۔ گھوم گیا ”ایک انارو

دونوں نے کوئی جواب نہ دیا صرف غمور اور جھکے ہوئے انداز میں ہنس کر رہ گئیں۔ دونوں کی سرسری انگلیوں میں دے ہوئے تھے اور کہیں میں پکراتے ہوئے دُوحوں کی بو تھی کہ سکھٹ چرس کے بھرے ہوئے تھے۔ ہیروئن سے ہوتے تو میں بو سے اندازہ بھی نہ لگا پاتا۔ لڑکیاں سمجھدار جلدی مرنا نہیں چاہتی تھیں۔

وہ مجھے دیکھ کر ذرا بھی پریشان یا تشویش زدہ دکھائی نہیں رہی تھیں۔ انہیں گویا یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ مجھے مرنے۔ یہاں سے میلوں دور سمندر میں چھوڑ آئی تھیں۔ وہ ایک بار سر تاپا جائزہ لے رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں ایک ڈاگبر آئی تھی۔ ان کے کبھی مطمئن نہ ہو سکے والے قیامزدہوں میں شاید بھر کوئی خیال جنم لے رہا تھا۔ میں کانپ کر رہا۔ خدا یا۔ رحم!

”یہ کیا بد تیزی ہے!“ میں ایک بزم کھوردی اور گرم آواز میں کرچکا۔

میں نے گردن ذرا موڑ کر دیکھا۔ نوجوان کپٹن مجھ مخاطب تھا۔ وہ سمجھنے مان کر کسی نہ کسی طرح وردی الٹی سیدھی جسم پر ٹانگ چکا تھا اور خشکیوں نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ یقیناً کئی پہلوؤں سے اپنے جسم کی مضبوطی اور اپنے قد کاٹھ تھا۔

اس کے باوجود میں اس کی جرات پر حیران ہوئے بغیر نہ۔ آخر وہ کھن ایک نچی بوٹ کا کپٹن تھا۔ پھر مجھے احساس اسے اپنی اوقات بھولنے کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ جس پر

تیار“ والا عمارہ تو میں نے بار بار سنا تھا لیکن اس وقت اندر ایک انداز پر تیار“ والا معاملہ تھا۔

دو سب کچھ جو کچھ دیر پہلے مجھے پریت پگلی تھی اب اس موڑ بوٹ کے کپٹن پریت دی تھی۔ اس کی سفید وردی جس پر کہیں کہیں گرہیں کے دھبے تھے، ایک طرف پڑی تھی۔ وہ چھٹ سے بھی نکلتے ہوئے تھ کہ ایک ترمودر اور مضبوط نوجوان تھا۔ اس کی رعیت گرمی سافٹی تھی۔ اس وقت اس کا آئوئی جسم پیسے میں بیگ ہوا تھا۔

میں تانیا اور ٹانیا کی بھوک پر حیران تھا۔ وہ واقعی خوشخوار پٹیاں تھیں۔ اپنے آس پاس پائی جانے والی ہر چیز جٹ کر کھتی تھیں۔ معیار اور مرتبے کا خیال کے بغیر۔ انہیں اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ بوٹ اس وقت بوٹ ہاؤس میں ہی کھڑی تھی۔ چند قدم دور ساحل پر ان کے باپ کے غلام نما ہر کارے کھلتے رہتے تھے۔

یوں تو بوٹ کا کپٹن بھی ان کا ایک معمولی کارندہ ہی تھا۔ تانیا اور ٹانیا خود ہی مجھے بتا چکی تھیں کہ انہیں اسٹیشن سے آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اگر ان کی برق رفتاری کا یہی عالم تھا تو نہ جانے ان کے محل نما مکان کے اندر اور آس پاس گھرے رہنے والے کارندوں میں سے کون کون ان کی لامحدود محتایات سے فیض یاب ہو چکا تھا۔

میں نے کھڑکی سے نظر ہٹائی۔ بلا ضرورت کسی کی غفلت میں بھاگتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور نہایت مہربان سکون سے حالات ”معمول“ مرنے کا انتظار کرنے لگا۔ کہیں چاروں طرف سے بند تھا اس کے باوجود خفیف سی حیوانی آوازیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔

آخر آوازیں ختم گئیں اور گمراہ سکوت چھا گیا۔ میں نے مزید کچھ دیر انتظار کیا۔ سکوت برقرار رہا۔ صرف سمندر کی لہروں کا مخصوص شور ایک دو دم کے ساتھ سنائی دے رہا تھا۔ میں گھوم کر کہیں کے دروازے تک آیا۔ میں نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ دروازہ منسل تھا یا نہیں۔ میں نے اس پر ایک زوردار لٹ رسید کی۔ میرے لاشعور کے کسی گوشے میں جھنجھلاہٹ موجود تھی۔ دروازہ فوراً کھل گیا اور میں اندر جا پہنچا۔

وہ تینوں بندے کے بجائے فرش پر دراز تھے۔ مصری میاں کی طرح سیدھے سیدھے لیٹے ہوئے تھے لیکن زعمہ تھے اور توط شدہ نہیں تھے۔ نوجوان کپٹن ہڑوا کر اٹھا اور اپنی وردی کی طرف لگا۔ تانیا اور ٹانیا نے اس قسم کی کوئی زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ انہوں نے کاہلی آئینے سے انداز میں نیم آ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ دونوں واقعی اعلیٰ نسل کی کوئی ایسی بلیاں نظر آ رہی تھیں جو گھر کا سارا دودھ پی گئی تھیں۔

”تم نے ابھی تک اسے سمندر میں ڈکی لگائے نہیں بھیجا؟“ میں نے نوجوان کپٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تانیا اور ٹانیا کو مخاطب کیا۔

دو جلدیں  
قیمت: ۱۵۰/-  
تاریک وادی

منقول  
المناس ایم اے قیمت: 150/-

کچھن اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اب محض نظر آ رہا تھا۔ اس کی اکڑوں نکل گئی تھی۔ میرے بارے میں اس کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک شان بے نیازی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "میرا جاؤ تم دوکل روم میں جاؤ۔ عارف صاحب اب بھی ہمارے معزز صہان ہیں۔ تمہیں ان سے بھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اصغر اپنی گردن سسٹا کیبن سے رخصت ہو گیا۔ اچھا ہوا چائیا نے میرا نام لے لیا جو در حقیقت میرا نام نہیں تھا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ اس وقت میرا نام عارف تھا۔

دونوں ہمیں اٹھ کر میرے دائیں بائیں آنا کھڑی ہوئیں۔ دونوں نے میرا ایک ایک بازو قدام لیا۔ ان کے ہاتھ بری طرح چپ رہے تھے۔ ان کے قصور و جود میں واقعی کبھی سرو نہ ہونے والے آتش فشاں تھے۔

تانیائے مجھے بیڑ پر بٹنے کا اشارہ کیا۔ میں اس بجے کی طرح اکڑے اکڑے سے انداز میں بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا جو کسی بھی لمحے رتی خرا کر بھاگ جانے کے لئے تیار تھا۔ چائیا لٹیل سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے جیسے جیسے میں ہولی "سٹر مارف! آپ یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"اؤکر" میں نے مصوویت سے جواب دیا "میں وہاں گھرے پانی میں ڈوب رہا تھا اور مدد کے لئے چلا رہا تھا۔ اچانک ایک پری وہاں پہنچی۔ وہ تم دونوں سے ذرا زیادہ خوب صورت تھی لیکن کافی بیک وقت قسم کی پری تھی۔ سر سے پاؤں تک دھیلے ڈھالے لبادے میں تھی اور میرے زیادہ قریب بھی نہیں آئی۔ اسے مجھ پر حس کیا۔ اس کے پاس جاؤ کی چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی چھائی۔ میرے دونوں کندھوں پر نوچ نکل آئے اور میں اڑتا ہوا مریاں گیا۔" "ہیلو! ہیلو! وہاں این امیزنگ اسٹوری۔" دونوں ہنسونے لگیں۔ "تانیائیں بھائی! ان کے ہونٹوں پر اب بھی مخموری مسکراہٹ تھی۔"

"یہ کمالی نہیں، آپ جی ہے۔" میں نے گویا بڑا مانتے ہوئے کہا۔

"ہمارا مطلب وہی تھا۔ ہماری گرامر ذرا کمزور ہے۔" تانیائے گویا معذرت کی۔

شانیا میرے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ناپوسی سے ہولی "لیکن اس وقت تو آپ کے پر نہیں ہیں۔"

"اس بوٹ پر قدم رکھنے ہی میرے پر ٹوٹ کر سمندر میں گر گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "میری تو میرے دم بھی اگلانے پر تلی ہوئی تھی لیکن میں نے اسے مع کر دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ دم کے بغیر تو کام چل جاتا ہے۔"

"بے شک بے شک" تانیائے مدد انداز میں سر ہلایا۔

کی بیلیاں آخری حد تک صہان تھیں اس کی خودی تو بلند ہوئی ہی چاہے تھی۔

میں نے اس کا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے سر دینے میں کہا "دردی بہن کرکچ معزز نظر آنے لگے ہو مگر اتنے نہیں کہ مجھے تیز کھلانے لگے۔"

"تمہیں جرأت کیسے ہوئی بیبیوں کی اجازت کے بغیر اس وقت اس کیبن میں کھسنے کی؟" وہ چیخا۔ وہ تمہیں بچھنے میرے سر پر چھا رہا تھا۔ شاید وہ "بیبیوں" کے سامنے اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا۔ انہیں مزید بھی کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔

"جاؤ دوکل روم میں جا کر انجن کا تیل دفریو چیک کرو۔" میں نے اس کا کندھا چھوتے ہوئے ہمارے کہا "مجھے تمہاری "بیبیوں" سے کچھ پرائیویٹ بات چیت کرنی ہے۔"

"پرائیویٹ کا پچھ؟" اس نے کچھ اور بھڑکتے ہوئے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ دوسرے ہی لمحے میرا نہایت چمکا اور "بھڑپور" کھوٹا اس کے منہ پر پڑا۔ کیبن کشادہ تھا مگر میرا حال بوٹ کا کیبن تھا۔ زیادہ لسا چڑھا نہیں تھا۔ وہ اچھل کر ایک چوٹی دیوار سے جا کر گر آیا اور دوپٹے سے فرش پر گرا۔

اس کے ذرا بھی سنبھلنے سے پہلے میں نے بجلی کی سی غیری سے بڑھ کر اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ بڑی طرح ترپا چلا اپنی گردن سے میرا پاؤں ہٹانے کے لئے ڈبیرا ہو گیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ جتنا زور لگا تھا اتنی ہی اس کے زرخرے پر دباؤ بڑھتا گیا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے نکل آئیں۔ آخر کار اس نے میری ٹانگ چھوڑ دی اور بڑی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میرے خیال میں اس کے لئے اتنی ہی کافی تھا۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ طاقت کسے کتنے تھے میں نے اس کی گردن پر دباؤ ڈرا کم کر دیا کہ کس وہ مری نہ جاسکے۔

اس دوران وہ دونوں مرد خور بیلیاں اٹھ بیٹھی تھیں اور ازراہ کرم انہوں نے سوشلنگ کاسٹیوم کو شرف قبولیت بخشے ہوئے اپنے جھوس پر سجالا تھا۔ وہ اپنے بازو گھٹنوں کے گرد حاصل کئے گویا ساحل کی ریت پر بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے کوئی بدامی دلچسپ تماشا پیش کر رہا تھا۔ ان کی انگلیوں میں بدستور سگریٹ ٹنگ رہے تھے۔

آخر کار تانیائیں مسنائی "چھوڑ دو بے چارے کھس۔ مر جائے گا اس کی بوڑھی ماں بدنما میں دے گی۔"

"میں تو چھوڑ رہا ہوں۔" میں نے اس کی گردن سے پاؤں ہٹاتے ہوئے کہا "لیکن تم دونوں کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کی ہونے والی بیوی بدنما میں دے گی۔"

وہ دونوں ہم آہنگ ہو کر ہمیں۔ میں جب کیبن میں داخل ہوا تو ان کی آنکھیں دھندلائی ہوئی اور خواب زدہ سی تھیں لیکن اب ان میں کچھ بڑھتی جادری تھی۔



فہرہ رک تھا۔ اب آپ بیچ گئے ہیں تو دوسرے فہرہ تک بھی ہو گیا ہے۔

”تو کیا اب مجھے کوئی ایوارڈ وغیرہ ملے گا؟“ میں نے پوچھ دیا۔

”ہم دونوں کیا کسی ایوارڈ سے کم ہیں عارف صاحب؟“ نے اپنی اور تانیہ کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ دونوں ایوارڈ تو میں حاصل کر چکا ہوں۔“

”بعض ایوارڈ جتنی مرتبہ بھی ملیں ہم ہوتے ہیں۔ کیا آج بھی اس خیال سے شوق نہیں ہوئے عارف صاحب؟“ تانیہ نے

فہرہ کو اور ترمیمی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”ان ایوارڈز کی کیا وقعت ہو سکتی ہے جس سے گھر کے نوکر و

کھیلوں کی طرح کھیلے پھرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جلی مرتبہ میں نے دونوں ہینوں کے چپوں پر ایک عجیب

فہرہ آئے دیکھا پھر تانیہ کدے اچکا تے ہوئے بولی ”ہم دونوں بیچ

طبقاتی امتیاز کی ناکس نہیں ہیں۔ دل جس پر اگیا سو اگیا۔“

”یہ دل آتا نہیں کچھ اور ہے۔“

”چلے کچھ اور سہی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ تانیہ

بولی۔

”دراصل آپ دونوں عظمت کروار کی ان بلند یوں پر فائز

ہو چکی ہیں کہ اب آپ کے لئے کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا ”اگر آپ کے

والد صاحب کو پتا چل جائے کہ آپ کی بوٹ کا کینٹین آپ کے لفظ

دکرم اور عنایت سے کس حد تک مستفید ہو رہا ہے تو ان کا رد عمل

کیا ہو گا؟“

ایک لمحے عجیب سی خاموشی رہی پھر تانیہ کمری سانس لے کر

بولی ”مسٹر عارف! مذاق تو ہو چکا اور وہ ہمیں اچھا بھی لگا۔ لیکن اب

سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا کہ آپ یہاں تک کیسے پہنچے؟“

”کھارہے تھے کہ پچھتاہوں اور کس طرح بیچ سکا تھا؟“ میں

نے گویا جل کر جواب دیا ”یہاں سمندر میں تو دور دور تک کوئی کشتی

وغیرہ موجود نہیں تھی۔ میں بے بسی سے اپنے آپ کو ڈوبنے کے

لئے تو چھوڑ نہیں سکا تھا۔ میں نے تیرنا شروع کر دیا اور آخر کار

یہاں پہنچ ہی گیا۔“

وہ دونوں ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہیں جیسے

دل ہی دل میں میری بات کی سچائی کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہی

ہوں پھر تانیہ کمری سانس لے کر بولی ”مسٹر عارف! تو کتنی آ

دعز نقل میں۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ میں نے اٹھارہ... سے کام لے بغیر کہا

”اب مجھے بھی ایک سوال کا جواب چاہئے۔“

”ضرور۔ ضرور۔“ تانیہ بڑے غلو سے بولی۔

”تم دونوں نے مجھے ڈیڑھ گھنٹہ کے کوشش کیوں کی تھی؟ کیا

میں تمہاری بوٹ کے اس باغلو قسم کے کینٹین سے بھی کیا گزرا

تھا؟“ میں نے باری باری انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

”گھر نہیں عارف! ڈار لنگ!“ تانیہ بڑے پیار سے بولی ”تم تو

اصغر سے کہیں زیادہ شاندار آدمی ہو۔ تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ؟

وہ تو صرف آڑے وقت کا سہارا ہے۔“

”اور تم پر آڑا وقت غالباً بڑی جلدی آتا رہتا ہے؟“

دونوں ہینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر

کدے اچکا کر دیں۔ میں نے اپنے لمحے میں ذرا سو سوئی لائے

کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میرا سوال ابھی تک جواب کا شہر

ہے۔ تم دونوں نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟“

”دونوں ہینوں کی آنکھیں پھل گئیں۔ تانیہ حیرت سے بولی ”کیا

آپ واقعی سنجیدگی سے یہ سوال کر رہے ہیں؟ میں تو سمجھتی آپ

مذاق میں پوچھ رہے ہیں۔ ہمیں بھلا آپ کو ہلاک کرنے کی کیا

ضرورت تھی؟ آپ تو ہمارے معزز اور محترم سہان ہیں۔ خصوصاً

جس وقت ہم نے آپ کو یہاں میں چھوڑا اس وقت تک تو آپ ہمیں

بہت عزیز ہو چکے تھے۔“

”کیا آپ اپنی عزیز ہستیوں کو بیٹے شارق پھیلیدوں وغیرہ کے

پہرہ کروا کرتی ہیں؟“ میں نے ٹانٹ سے کہا۔

”لیکن کوئی بات نہیں ہے مسٹر عارف! آپ کو واقعی غلط فہمی

ہوتی ہے۔“ اس بار ترمیمی کے فرائض تانیہ نے سنبھال لئے ”ہم

نے آپ کو ڈوبنے کے لئے وہاں نہیں چھوڑا تھا۔ ہمیں معلوم تھا

آپ ڈوبنے والی چیز نہیں ہیں۔ ہم آپ کی مضبوطی کو آزمائنا چاہتے

تھے۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ آپ گھر کی یہاں تک پہنچ سکتے ہیں یا

نہیں؟ ہمیں تو یہ فہرہ نہیں تھا کہ آپ پہنچ سکتے ہیں۔ صرف دس

ان کی مرضی باتوں کے حلقے تک ہونے لگے۔ میں نے خود پر چھو رکھتے ہوئے ذرا سختی سے انہیں دھکیلے ہوئے کہا "تمہاری بوٹ کا کینٹن اصغر خاصا لبا ترنگا اور مضبوطا نو جوان ہے تم دیکھ چکی ہو اس کے لئے میرا ایک گھونسا ہی کافی ثابت ہوا تھا۔"

"بے شک۔۔۔ بے چارہ اصغر۔ تم نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔" "ٹانیا ترم آئیر لیجے میں بولی۔

"مگر وہی سی ایک ایک گھونسا تم دونوں کے منہ پر بھی پڑ گیا تو تمہارا کیا حشر ہو گا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"اڑہ فر" "ٹانیا ترمی سے بولی۔ دونوں کی آنکھیں پھیل گئی تھیں "میں آپ سے اس قدر بددلتی اور بے ہودگی کی توقع نہیں ہے۔"

"میں اس سے زیادہ بددلتی اور بے ہودہ انسان ہوں۔" میں نے کہا۔

"آخر بات کیا ہے؟ کیا بہت دیر تک سمندر میں رہنے کی وجہ سے لہند آپ کے دل پر چڑھ گئی ہے؟" "ٹانیا نے ملائمت سے پوچھا۔

"میں کوئی بات نہیں ہے۔ لہند تو ابھی کسی طرف سے میرے پاس بھی نہیں پہنچی ہے۔ بس ویسے ہی تم دونوں کی طرف سے دل بچھ کرنا سا ہو گیا ہے۔ یہ بات تقریباً صحیح تھی۔ دونوں بہنوں کو گویا دھچکا سا لگا۔

"ٹانیا دیکھے لیجے میں بولی "بہلی بار اپنی طرف سے اتنی جلدی کسی قابل کتا ہوتے نہ لکھا ہے۔"

"ٹانیا پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ میں کچھ عجیب سا آدمی ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"میرا خیال ہے ہم جو آپ کو سمندر میں چھوڑ کر بھاگ آئی تھیں۔ آپ اس بات کا کچھ زیادہ ہی برا ماننا لگے ہیں۔" "ٹانیا بولی۔

"ممکن ہے یہ بات بھی ہو۔ میں نہیں سے نہیں کہہ سکتا۔"

میں نے مجسم لیجے میں کہا "میرا حال انسان لا شعوری طور پر سوچنے پر مجبور تو ہو آ ہے کہ ایک بار وہ چڑی سے اترا تو کمرے پائیں میں آنکھ کھلی۔

"دوسری بار چڑی سے اترا تو کہیں قبر میں ہی نہ آنکھ کھلے۔ حشر کیر کر کے سامنے ہی کھڑے ہوں۔ میرے گناہوں کی فرست تو یہی ہے کافی لمبی ہے۔"

"میں سے زیادہ کسی شاید نہ ہو۔" "ٹانیا بھرا ہوا ایک نیا سگریٹ نکال کر دھو میں کا مرغولا میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے بولی۔

میں نے ہاتھ ہلا کر دھواں اپنے چہرے کے سامنے سے اڑاتے ہوئے کہا "میں ممکن ہے! میں گناہوں کی فرست کی طوالت کے سلسلے میں آپ جیسی عظیم خواتین سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔"

"ٹانیا لہندی سانس لے کر بولی میرا حال ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے آپ کی حیرانگی کی صلاحیتیں آزمائے کے شوق میں بایوں کیے کہ کسی حد تک مذاق ہی مذاق میں ایک شاندار آدمی کو ہاتھ سے

کے انکار و خیالات سے آگہی حاصل کر کے ہی خوش ہوا ہے۔"

میں نے مرگنا نہ انداز میں سر ہلایا۔ وہ دونوں کھی کھی کرتے لگیں۔

پھر ٹانیا بخیدہ ہوتے ہوئے بولی "ویسے عارف صاحب! آپ ہیں کچھ عجیب سے آدمی! میں آپ کو دانت آدمی سے چارہ ہی ہوں کہ آپ کے بارے میں کوئی بات میرے ذہن میں کلک رہی ہے لیکن میں اس کی نشاندہی نہیں کر سکتی کہ وہ کیا ہے۔ کاش آپ اپنی ذات کو پوری طرح ہم پر میاں کر سکتے! کاش ہم دونوں ہمیں آپ کو بہتر طور پر جان سکتیں۔"

"یہ ایک بہت بڑا "کاش" ہے۔" میں نے لہندی سانس لے کر کہا۔

"ٹانیا اپنے تراشیدہ بالوں کو خفیف سے جھٹکے سے چٹائی سے ہلاتے ہوئے بولی "خیر! میں اس پر کوئی نشوونما یا پریشانی نہیں ہے کہ ہم آپ کو پوری طرح نہیں جانتیں۔ کسی کو جانے بغیر بھی اگر انسان کا مقصد پورا ہوا تو رہے تو جانے دانے کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں رہتی۔"

"بے شک بے شک۔" میں نے رُجوش انداز میں تائید میں سر ہلایا "میں محسوس کر رہا ہوں کہ اگر مجھے چند دن آپ جیسی عظیم ہستیوں کی محبت میں رہنے کا موقع ملا تو میں بہت کچھ سیکھ سکوں گا۔"

"میں میں مٹھری کوئی بات نہیں ہے عارف صاحب! "ٹانیا بخیدگی سے بولی "انسان اس دنیا میں واقعی ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اچھے بُرے سب انسانوں سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔"

"ٹانیا بولی "میرا حال ایک بات طے ہے ہم خواہ ابھی تک آپ کو جان نہیں سکے لیکن ان ضرورتیں ہیں۔ آپ میرے یہاں تک پہنچ سکے آپ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ ہمیں آپ کے غیر معمولی ہونے کا اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے۔ اور ہم دونوں ہمیں غیر معمولی انسانوں کی زبردست قدر دہاں ہیں۔"

"چلیجے میں نے مان لیا۔ اب پروگرام کیا ہے؟ مگر واپس چلنا ہے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور چلنا ہے۔" "ٹانیا کچھ اور قریب کھینکے ہوئے بولی "لیکن کہیں نہ چلنے سے پہلے۔۔۔" وہ معنی خیز انداز میں کھی کھی کرنے لگی۔

"ٹانیا ابھی کچھ اور قریب کھینکے ہوئے اس کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔

حیرت سے واقعی میری کھوپڑی میں جھماکے سے ہونے لگے۔

میں نے باری باری ان دونوں کو گھورتے ہوئے کہا "تم دونوں واقعی غیر انسانی مخلوق ہو۔"

"میں بھی یہی لگتا ہے۔" "ٹانیا بولی پھر اس نے کندھے اٹکائے "لیکن کیا کریں کوئی میٹریکچرنگ فالت ہے۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں جیسا بننا تھا بنیں چکیں۔"

گتوا دیا۔

ٹانیا اسے کئی مار کر بولی "میرا نہ کو۔ ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ تم تو ابھی سے فلم کو "دی اینڈ" کا رہی ہو۔ ابھی تو عارف صاحب ہمارے صمان ہیں۔ ابھی نہ جانے ان کا کتنے دن کا قیام ہو۔ انسان کے خیالات بدلنے کی یاد رہتی ہے؟ ہمیں ممکن ہے آج رات میں ہی خیالات بدل جائیں۔ رات بڑی ظالم چیز ہوتی ہے کہیں میٹر عارف! اس نے نہایت مصوبیت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اسے گھورا تو وہ آنکھ مارتے ہوئے مسکرا دی پھر یکدم سنجیدہ ہو کر اٹھتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے اب واقعی چلنا چاہئے۔"

ٹانیا نے دیوار پر آویزاں الیکٹرانک کلاک کی طرف دیکھا "اب تک تو قیضہ ڈیڑی بجی واہیں آچکے ہوں گے۔"

کچھ دیر بعد ہم تینوں قدرے معززانہ گلیوں میں کہیں سے نکلے۔ امفر کی آواز اس پرچھ کی طرح رنگ کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے خرخرار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے قریب سے گزرتے وقت اس کا کندھا ٹھیک رہا "بس بس دل میں کیسے نہیں رکھتے۔ کیسے بڑی چیز ہے۔"

ٹانیا اور ٹانیا میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے چنی پل کی طرف لے گئیں۔ پل سے گزر کر ہم بوٹ ہاؤس سے نکلے اور کنارے پر آئے سیاہ مرسیڈیز وہیں کڑی تھی جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔ ساحل پر دوڑانی بجلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا زیرے پر رات کا آہل پہنچتے ہی لوگ گھروں کا رخ کرتے تھے پھر میری نظر کچھ دور ایک نیلے پرچی۔ ٹانیا میں مجھے اس پر ایک بھلا نظر آیا جو کس لئے کھڑا تھا۔ وہ غالباً بوٹ ہاؤس کی عمرانی پر مامور تھا۔

مرسیڈیز میں بیٹھ کر ہم ایک بار پھر اس محل نما مکان میں واہیں آئے۔ جب ٹانیا اور ٹانیا مجھے سمندر میں جھوڑ آتی تھیں تو مجھے یہ اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ میں دوبارہ اس گھر تک نہیں پہنچ سکوں گا لیکن اب میں اس فاصلے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو محسوس ہوا تھا کہ میرا تھر کر کنارے تک پہنچنا بھی کچھ ایسا ناممکن نہیں تھا۔ اگر شفیع شاہ ڈاکر لے کر میرے قریب نہ پہنچتا تب بھی شاید میں کسی نہ کسی طرح۔۔۔ نظم پشتم زیرے تک پہنچتی جاتا۔

قاسم بجلی والی گھر پہنچ چکا تھا کہ مجھے بوٹ ہاؤس میں کوئی دوسری بوٹ کڑی دکھائی نہیں دی تھی وہ ہمارا ہی بکھر تھا۔ غنیمت تھا کہ اس نے ہماری تلاش میں کوئی آوی بوٹ ہاؤس تک نہیں دوڑا تھا۔ مطمئن نہیں وہ ہمیں کس حال میں پاتا۔ شاید ٹانیا اور ٹانیا کے محلے میں قاسم بجلی ذرا علیحدہ قسم کے "توابر پڑی" سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اگر وہ کسی آوی کو بھیج بھی دیتا تو وہ نہ اٹھائے یکدم تو بوٹ کے کہیں تک آنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

"بھئی تم لوگوں نے بہت دیر لگادی۔" قاسم بجلی نے ہمارے انداز میں شکوہ کیا "میں نے اتنی لمبی تفریح کرنے کے لئے نہیں کہا تھا۔"

"کیا کریس ڈیڑی۔ واہیں آنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ٹانیا کا بلی امیز انداز میں اگڑا لٹی لپٹے ہوئے بولی۔

"کئی دن بعد سمندر کی میر کے لئے گئے تھے تا۔ ٹانیا نے کھو لگیا "بہت ہی لطف آیا۔ مسٹر عارف تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔" نے ان کی کھینچی کو بہت انجوائے کیا۔ کالی دنوں بعد طبیعت میں یہ تازگی آئی ہے۔"

"تم نے تو انجوائے کیا لیکن مسٹر عارف نے بھی انجوائے کیا نہیں؟" قاسم بجلی کھٹا خوشی سے سوال ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے ہی تو سب سے زیادہ انجوائے کیا۔" میں نے گھڑ سانس لے کر کہا "بڑا دلچسپ مسٹر تھا۔ حتیٰ کہ بوٹ کے کپٹن نے ہم انجوائے کیا۔"

ٹانیا اور ٹانیا کے چہروں پر قطعاً کوئی تھیر نہ آیا۔ قاسم بجلی م ہلاتے ہوئے بولا "اوہ امفر کی بات کر رہے ہو؟ بہت اچھا جواب ہے۔ سعادت مند بھی ہے۔ زندہ دل بھی ہے اور دلیر بھی۔"

"بے شک" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ میں اس کی تینوں خصوصیات کا عملی مظاہرہ دیکھ چکا تھا۔

"تم لوگوں کے انتظار میں میں بھی بھوکا بیٹھا ہوں۔" قاسم بجلی ڈانٹنگ دوم کی طرف پڑھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے گردن آواز میں بٹکر کھانا لگوانے کا حکم دیا۔

ہمارے دیکھنے ی دیکھنے ملازموں نے مشینی انداز میں طویل و عریض میز کو کھانوں سے بھر دیا۔ بہترین قسم کا سی فوڈ بھی نظر آتا تھا۔ تمام کھانوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کھانے والے صرف چاروں تھے جبکہ اہتمام ایک چھوٹی سونی برات کے کھانے کا تھا۔

میرے کچھ پوچھے بغیر ہی قاسم بجلی گویا وضاحت کرتے ہوئے بولا "یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ میری بجلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ میری دوسری بیوی یعنی ٹانیا اور ٹانیا کی ماں اپنے سوتیلے بیٹوں کے ساتھ یورپ گئی ہوئی ہے۔ اس لئے آج کل گھر میں ہم تینوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ صرف نوکر گھر کی روٹنی بڑھا رہے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ قاسم بجلی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے میری بیوی کے ذہن میں سوتیلے پند والی کوئی بات نہیں۔ بجلی بیوی سے میری جو اولاد ہے ان سب سے بھی میری دوسری بیوی کی خوب فتنی ہے۔ بلکہ یہی کہہ دو کہ گاڑی چھینتی ہے۔ سب فتنی کر رہے ہیں اور بہت خوش رہتے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے رسا کا "یہ باخول ہر ایک کو میسر نہیں ہوتا۔"

"خصوصاً جہاں دولت ہو وہاں گئے سوتیلے کے بھگڑے زیادہ

ہوتے ہیں۔" قاسم بکلی بولا "لیکن میرے ہاں ایسا نہیں ہے۔  
 دراصل میرے ہاں لوگ دولت کو اپنے لئے معیت اور سزا بٹانے  
 کی حالت میں جلتا نہیں ہے۔ میرے خاندان والوں میں پھر ٹا بڑا پیر  
 زور دولت کو انجوائے کرنے کے فتنے آگاہ ہے۔"  
 "بہت خوب" میں نے سر ہلایا۔ پھر سرسری سے لہجے میں کہا  
 "میں ان کمانے کا اع زیادہ اہتمام ہے۔ آپ نے اپنے انیکسی والے  
 سامان کو بیلا لایا ہوتا۔"

"میں نے بتایا کہ ان کے لئے انیکسی میں ہر چیز کا انگ  
 انتظام ہے۔ وہاں انگ لیکن ہے۔ انگ ملا نہیں ہیں۔ وہ لوگ  
 میرے فعلی فریڈ نہیں ہیں۔ صرف کا دہاری شکستہ ہیں۔ اس لئے  
 میں انہیں صرف وہیں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی بات  
 در ہے۔ جو شخص اگر انیکسی قمری کے حوالے سے میرے پاس  
 آئے وہ ایک طرح سے میرا فعلی فریڈ ہو جاتا ہے۔" قاسم بکلی نے  
 وضاحت سے جواب دیا۔ میرے لئے خاموش رہنے کے سوا کوئی  
 چارہ نہیں تھا۔ وہ بڑوں پر پانی نہیں بڑے دے رہا تھا۔ اس کے  
 سامان کا زیادہ زنا نہ قدم کی کسی شرتی دشمن کی روانگی سے بھی  
 زیادہ مشکل نظر آ رہا تھا۔

"میرے کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا "مگر  
 تک انہیں میری نظر سے بچاؤ گے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ اگر تم مجھے  
 ان سے نہیں ملاؤ گے تو میں انہیں دیکھ ہی نہیں سکوں گا؟ یہ شخص  
 نہایت خوش فہمی ہے۔"

"کمانے کے بعد کافی کا دور چل رہا تھا کہ بظلمت قاسم بکلی کے  
 قریب آکر جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اپنی دانست میں اس  
 نے رازداری برتنے کی کوشش کی تھی لیکن میں چونکہ اس کے  
 قریب بیٹھا تھا اور میرے کان بھی اسی کی طرف لگے ہوئے تھے اس  
 لئے کہ ازم کا اتنا تو ہی سہی لیا "میں فرحین آئی ہیں۔"

"میں نے محسوس کیا کہ قاسم بکلی کے چہرے پر یکدم ہی خاصا تغیر  
 آ گیا۔ اس سے پہلے وہ خواہ مصنوعی طور پر ہی کسی لیکن اپنے آپ  
 کو زندہ دل اور خوش مزاج ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا  
 تھا۔ اب یکدم ہی اس کے چہرے پر گہری جمید کی چھائی۔ اس نے  
 کافی کا بکلی فوراً ہی میرے رکھ دیا حالانکہ اس نے ابھی دو تین  
 ہنسیاں ہی کی تھیں۔"

"اس نے بہ قزاقانہ انداز کم از کم اتنا اعلان تو کر ہی دیا "میری ایک  
 سالان آئی ہے" مجھے کئی روز سے اس کا انتظار تھا۔ مجھے اس سے  
 بہت ضروری بات کرنی ہے۔ تم لوگ اطمینان سے کافی ہو۔ میں چند  
 منٹ میں حاضر ہوا۔" وہ تیزی سے ڈانٹنگ دروم سے روانہ ہو گیا۔  
 اس کے جا سنے ہی تینا چیتے ہوئے لہجے میں مجھ سے مخاطب  
 ہوئی "آپ نے ڈیڑی کو ہمارے اور اصغر کے بارے میں نہیں بتایا۔  
 یہ امکان بھی نکال لیتے۔ آپ کے دل میں ٹھنڈ بڑھاتی ہے۔"  
 "میرے دل میں ایسی کوئی آگ نہیں لگی ہوئی تھی جسے

بجھانے کے لئے مجھے جل ٹکڑ ٹکڑوں کی طرح تمہارے ڈیڑی سے  
 کوئی شکایت کرنا پڑتی۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور ان کے  
 سر ہاکی طرف اشارہ کیا "یہ وجود بھی تمہارا اپنا ہے۔ جذبات بھی  
 تمہارے اپنے ہیں۔ مرضی بھی تمہاری اپنی ہے۔ مجھ سمیت جسے  
 چاہو مستفید کر لی مجھو۔ یہ تمہارا اپنا حوصلہ ہے۔ میں اتنا کہد حائیس  
 ہوں کہ اس قسم کے معاملات میں دخل اندازی کرتا ہوں۔"  
 "پھر تم پوچھ کیوں رہے تھے کہ یہ بات اگر ہمارے ڈیڑی کو  
 معلوم ہو جائے تو ان کا رد عمل کیا ہو گا؟" ٹانیا نے جانا چاہا۔

"جنھں اپنی معلومات میں اضافے کے لئے پوچھ رہا تھا اور  
 اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہارا جواب درست تھا۔ تمہاری فعلی  
 یقیناً کافی ترقی یافتہ ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تم نے ڈیڑی کو اشارہ دینے کی کوشش تو کی تھی۔" ٹانیا ہلکی۔  
 "بے شک میں نے انہیں ٹٹولنے کی کوشش کی تھی کہ شیوں  
 کی مصروفیات کے بارے میں ان کے نظریات کیا ہیں۔" میں نے  
 تسلیم کیا "اس قسم اشارے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی  
 کافی "ہزارا اندازہ" ڈیڑی ہیں۔"

"تمہیں اس طرح کے ڈیڑیوں سے مل کر خوشی نہیں ہوتی؟"  
 ٹانیا مسکرائی۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" میں نے متذبذب لہجے میں  
 کہا "میں اس قسم کے معاملات میں متضاد کیفیات کا شکار رہتا  
 ہوں۔ شاید مجھے خوشی بھی ہوتی ہے اور شاید مجھے افسوس بھی ہوتا  
 ہے۔"

"اس کا مطلب ہے زندگی کے بارے میں ابھی تمہارا کوئی  
 واضح نظریہ نہیں ہے۔" ٹانیا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔  
 "شاید" میں نے ہنس لہجے میں کہا "مئی الحال میں کسی واضح  
 نظریے کے بغیر ہی زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے خیال میں کسی بے  
 ہودہ نظریے کے ساتھ زندگی گزارنے کی نسبت بغیر نظریے کے  
 زندگی گزارنا بہتر ہے۔"

"ٹانیا کافی کا کپ رکھ کر اٹھتے ہوئے ہوئی "بہر حال تم نظریے  
 کے ساتھ زندگی گزارنا ہی نظریے کے بغیر۔ تمہاری مرضی ہے لیکن  
 تم تفریح کے بغیر زندگی مت گزارنا۔ یہ ہمارا مشورہ ہے۔ اور تفریح  
 کے لئے جنہیں ہم دونوں بہنوں سے بہتر ساتھی مشکل سے ہی ملیں  
 گے۔"

"بے شک" میں نے ان کا دل رکھنے کے لئے کہا "تم دیکھ ہی  
 چکی ہو کہ میں کوئی زائد خشک یا پارسا بھی نہیں ہوں۔ میں نے تم  
 دونوں کی فائیاں دیکھ کر نہ نہیں پھیرا۔"

"اسی پر تو ہم حیران ہیں۔" ٹانیا بولی "اس وقت تو تم ہمیں  
 خالص اپنے مطلب کے قوی لگے تھے۔ بعد میں کچھ کسٹیفیڈ کرنے  
 لگے۔ بہر حال تم اپنی شخصیت کی تاحیر عجیب گھڑیوں کے ساتھ بھی  
 ہمیں قبول ہو۔ ہمارے دوست ہی رہنا ہمارے بزرگ بننے کی۔"

کو شش مت کرنا۔

”جست بہتر۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”ٹانیا“ آٹیا کی طرف مڑتے ہوئے بولی ”میں تو بات باتھ لینے جا رہی ہوں ورنہ سمندر کا منگ جسم پر کاٹا رہے گا۔“

”آٹیا بولی ”میں ذرا کافی ختم کر لوں۔ اس کے بعد میں عارف کو اس کا کراؤ دکھانے کی پھر مجھے بھی بات باتھ لینا ہے۔“

”اس سے پہلے میں ذرا قاسم صاحب سے ایک ضروری بات کر لوں۔“ میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ

کوئی مجھے روکنا میری تیزی سے ذرا تنگ دھم کی طرف بڑھ گیا۔ کسی کے مسمان کی موجودگی میں۔۔۔ خصوصاً ایک خاتون مسمان کی

موجودگی میں خواہ غواہ اور بلا اجازت ذرا تنگ دھم میں جاگھٹا کوئی معقول اور منطقی حرکت نہیں تھی لیکن میں یہاں عمل طور پر معقول اور منطقی انسان بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا تھا۔

مجھے دیکھنا تھا کہ قاسم بھائی کے ہاں کون کون عظیم تھا کون اس سے ملنے آیا تھا لیکن ابھی تک میں نہ تو کسی کو دیکھ سکا تھا اور نہ ہی

کچھ معلوم کر سکا تھا۔ مس فرحین نامی اس مظلوم لڑکی کی آمد کی اطلاع پلڑے قاسم بھائی کو خاصے رازدارانہ انداز میں دی تھی

حالانکہ بظاہر اس کی کوئی خاص ضرورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اس کا اندازہ مشکوک لگا تھا۔ ممکن تھا اس خاتون کو دیکھنے سے میری

معلومات میں کچھ اضافہ ہوگا۔ اگر اس وقت پلڑے سر سوار ہوتا تو یقیناً مجھے روکنے کی کوشش کرتا لیکن اس کی عدم موجودگی

سے ناکد اٹھاتے ہوئے میں سیدھا ذرا تنگ دھم میں جاگھٹا۔

”معاف کیجئے گا قاسم صاحب۔“ میں نے گویا اپنی دھن میں کہا ”مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔“

وہ اس وقت ایک خوب صورت خاتون کے عین قریب صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ دونوں تقریباً سر جوڑے شاید کسی اہم مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ میری اچانک آمد پر یکدم گزرا کر

رہ گئے۔

مجھے گویا یکدم احساس ہوا کہ میں غلط وقت پر آیا تھا اور یہ میری ایک ناشائستہ حرکت تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر خیالات کے آثار پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور واپسی کے لئے مڑتے

ہوئے معذرت خواہانہ لمبے میں کہا ”مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آپ اپنی مسمان سے ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے بعد میں بات کر لوں گا۔“

قاسم بھائی کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لئے ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ خلاف توقع وہ دوسرے ہی لمحے مسکرا دیا اور

خوشگوار لمبے میں بولا ”اتنا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں عارف صاحب! آپ تو اس طرح واپس بھاگے جا رہے ہیں جیسے آپ نے

میں قائل اعتراض حالت میں دیکھ لیا ہو۔ ہم تو گفتگو بھی قائل اعتراض نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں تو بہت مختصر اور شریفانہ سی بات

چیت کرنا تھی جو ختم ہو چکی ہے۔ اب آپ اطمینان سے ہا پاس تعریف رکھ سکتے ہیں۔“

میں بظاہر قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ ٹوک گیا۔ اس تک میں اس عورت کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔ وہ مجھ سے ایک

مرد قدر خوب صورت اور سرخ دہیز عورت تھی۔ پاکستان مظلوم ہوئی تھی لیکن اس کا لباس مغربی تھا۔ وہ گہرے نیلے

کے جھلمل جھلمل کرتے اسکرٹ میں تھی۔ ایک آپ اور اسٹائل نمائندہ عمدہ تھا۔ اس پر کسی اعلیٰ درجے کے اور ذرا بڑے

کے ماڈل کا کمان گزرا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ مجھے اس کی صورت شناسا لگ رہی تھی۔ یاد نہیں آ رہا تھا میں کب اور کہاں اس سے ملا تھا۔ مجھے

یادداشت پر بڑا ناخوشاں میرے لئے یہ بڑے شرم کی بات تھی کہ کوئی بات بھول جاتا۔۔۔ اور اگر میں اپنی خوب صورت لڑکی

مل کر بھول گیا تھا تو میرے لئے اور بھی زیادہ شرم کی بات تھی۔ صرف شرم کی بات ہی نہیں۔ پڑھتی کی بھی اشتیاق تھی۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ بھی بخور میری دیکھ رہی تھی گویا میرے بدلے ہوئے ملنے میں شناسائی کے

حفاظت کر رہی ہو۔ قاسم بھائی کی بات گویا اس نے مٹنی سی سبز تاہم قاسم بھائی کے انداز گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ

اس کی کتنی بے تکلفی تھی۔

قاسم بھائی خوش دلی سے بولا ”یہاں گتا ہے تم دونوں درمیان کوئی ”تیم نظر“ قسم کی چیز چل گئی ہے۔“

میں نے یہ کہنا بہتر نہیں سمجھا کہ مجھے اس کی مسمان کی یہ کچھ شناسا لگ رہی تھی۔ لڑکی نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔

بھائی کے رہنما کس کا گویا اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”مٹی آن مٹی کر رہی تھی۔ میں نے دیکھے لمبے میں کہا ”اس کی صورت خاتون کا انداز تو حق بتا ہے کہ اسے کم از کم چند سینکڑا

سے دیکھا جائے۔“

لڑکی کے یا تو قی اوٹوں پر دھنکس مسکراہٹ، نمودار ہوئی۔

”کھنکھی سی آواز میں بولی ”تعریف کا شعر۔“

اس سے مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ اردو بولتی اور سمجھتی غالباً پاکستانی ہی تھی۔ قاسم بھائی مجھے قریب آئے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ”آئیے میں اپنی مسمان سے آپ کا تعارف کراؤں۔ آپ جی بھر کے ان کے حسن کی تعریف کیجئے گا۔ مجھ سمیت ان

حسن کے قدرواں نہ جانے کہاں کہاں چلے ہوئے ہیں۔“

میں قریب چلا گیا۔ قاسم بھائی بولا ”یہ مس فرحین ہیں۔“

اس نے پورا نام نہیں بتایا اور ایک لمحے توقف کیا گویا

جنس سے لطف اندوز ہوا ہو۔ اس لمحے مجھے یہ احساس ہوا

نام بھی میرے لئے شناسا تھا لیکن یاد اب بھی نہ آ سکا کہ اس

پہلے کہاں سنا تھا۔ کس سلسلے میں سنا تھا۔ فرحین اب بھی

جہاں سے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کا چہرہ تقریباً سیاہ  
 سی تھا۔  
 قاسم بکلی بولا "بکلی میرے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے لیکن بکلی  
 کھانے کی اصل سختی میں فرمین ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ اپنے  
 کھن کی بجائیاں صرف امریکا میں گرائی ہیں۔"  
 "کیا مطلب؟" میں نے خاصی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے  
 پوچھا۔

"یہ امریکا کے بعض شہروں میں طور شو پیش کرتی ہیں۔ اور  
 ایسا پیش کرتی ہیں کہ امریکی بھی سرخ رسل کی طرح لٹنے لگتے  
 ہیں۔" قاسم بکلی نے غصہ کی سانسی لی۔

میرے دل کے کسی گوشے میں ایک ٹھنسی سی اٹھی۔ کیا اب  
 ہمارے ہاں ایسی باتوں پر غرغوس کرنے والے لوگ بھی واقعی  
 پائے جانے لگے تھے؟ تاہم میں نے کسی جذباتی رد عمل کا اظہار  
 نہیں کیا۔

قاسم بکلی نے مسکراتے ہوئے بات چاری رکھی "میں فرمین  
 وہاں صرف مس ایکس کے نام سے جانی جاتی ہیں۔"  
 "مناسب نام ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ایکس  
 نام کاہوں کے لئے "مس ایکس" نام بالکل ٹھیک ہے۔ اس سے  
 امریکیوں کو یہ پتا نہیں چلا ہو گا کہ آپ پاکستانی ہیں۔"

میں براہ راست فرمین سے مخاطب ہوا تھا لیکن جواب قاسم  
 نے دیا "میں تو سب سے زیادہ پتا ہے کہ مس ایکس پاکستانی ہے۔  
 لیکن تو اس کی وجہ شہرت ہے۔ ایک "مشرقی لڑکی" ہونے کی وجہ سے  
 وہ اس کی ذات میں زیادہ کشش محسوس کرتے ہیں۔ انہیں یقین  
 نہیں آتا کہ ایک مشرقی لڑکی وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو فرمین کرتی  
 ہے۔"

"واہ! پھر تو آپ وطن کا خوب نام روشن کر رہی ہیں۔" میں  
 نے ایک بار پھر براہ راست فرمین کو مخاطب کیا اور کوشش کی کہ  
 میرے لیے مس ظفر کا ہر زیادہ نہ شامل ہونے پائے۔

وہ میرے سامنے ہاتھ بائٹھتے ہوئے بیزار سی ہوئی  
 "عارف صاحب! خدا کے لئے اب مجھے یقین کرنے کی مت دیو  
 جانیے گا۔"

"ہرگز نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں نے اس کی  
 بات کاٹتے ہوئے غلوس سے کہا "میں زندگی میں کم از کم یہ تجربہ تو  
 حاصل کر چکی ہوں کہ نصیحت سے سب سے زیادہ وی بڑا ہے  
 نئے نصیحت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں نصیحت نہیں  
 کرتا۔ کبھی کبھار صرف اپنے محسوسات کا حقوڑا بہت اظہار کر جاتا  
 ہوں۔"

"عارف صاحب! فرمین ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے  
 نہایت فحشہ سے فحشہ کے لیے میں بولی تھی تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ  
 ہرگز اس کے پیچھے ایک کمانی ہوتی ہے۔ میرے پیچھے بھی ایک طویل

کمانی ہے۔ جس میں اس سوال کا جواب موجود ہے کہ میں طور  
 شو۔ یا اس کے علاوہ بھی جو کچھ کرتی ہوں وہ کیوں کرتی ہوں لیکن  
 میں آپ کو وہ کمانی سنا کر پور نہیں کروں گی۔ یہ تو خیر ہماری پہلی  
 ملاقات ہے۔ اگر وہ سو سو جنسوں ملاقات بھی ہوتی تب بھی میں آپ  
 کو وہ کمانی سنانے کی کوشش نہ کرتی۔ اب میں کمانی سنانے یا اپنے  
 آپ کو جنسی ناگزیر ثابت کرنے کی منزل سے بھی گزر چکی ہوں۔"  
 "بہت خوب" میں نے ہزرگانہ انداز میں سر ہلایا۔

"لیکن میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتانا چاہتی ہوں۔ میرے  
 شو میں اکثر اب بھی امریکیوں سے زیادہ تعداد پاکستانیوں کی ہوتی  
 ہے جن میں سے بیشتر ختے میں ہوتے ہیں۔ وہ پہلے نہایت دلچسپی  
 اٹھا کر اور جوش و خروش سے میرا شو دیکھتے ہیں۔ پھر مجھے نہایت پر  
 چلنے کی دعوت دیتے ہیں اور جب میں شہرے کے ساتھ انکار کر دیتی  
 ہوں تو پھر مجھے نصیحت کرتے ہیں کہ جو کچھ میں کرتی ہوں وہ بہت بُرا  
 ہے۔ اور مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں  
 کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ہیں یہی کہ وہ بے چارے بھی میری طرح کمزور قوت ارادی  
 کے مالک اور خواہشوں کے غلام ہوں گے۔ اچھا بننے کو ان کا جی  
 چاہتا ہو گا لیکن اچھا بننا ان کے بس کی بات نہیں ہوگی۔" میں نے  
 جواب دیا۔

"آپ اگر اتنے اطمینان سے اعتراف کر رہے ہیں کہ آپ  
 کمزور قوت ارادی کے مالک اور خواہشوں کے غلام ہیں تو شاید  
 حقیقت میں آپ ایسے نہ ہوں۔ آپ شاید ازراہ انکار کہہ دیا کہ  
 رہے ہوں لیکن میں جن لوگوں کا ذکر کر رہی ہوں وہ آپ سے بدتر  
 ہوتے ہیں۔ وہ صرف متعلق ہوتے ہیں۔"

میں خاموش رہا تو فرمین کسی سانس لے کر بولی "میں تو جو  
 ہوں سو ہوں۔ بہت گناہ گار ہوں۔ ناقابل اصلاح ہوں لیکن جو  
 لوگ میرا شو دیکھنے آتے ہیں کیا ان کے لئے کوئی نصیحت نہیں؟"  
 "حقیقتاً ہوگی لیکن مسئلہ وہی ہو گا کہ انہیں بھی نصیحت سے  
 نفرت ہوگی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

قاسم بکلی اس دوران سگار سلگانے میں مصروف تھا۔ ایک  
 طویل کش لے کر وہ بولا "جی یہ تم دونوں نے کیا کیا اس شروع  
 کر دی۔ میرے گھر میں اس قسم کی بے ہودہ گفتگو کا منہج ہے۔"  
 میں اور فرمین اس دیکھے۔ فرمین بولی "آپ کو جس گفتگو سے  
 دلچسپی تھی وہ تو ہو چکی۔"

قاسم بکلی مجھ سے مخاطب ہوا "میں جیسے ایک اہم بات  
 بتانے لگا تھا۔ تم نے سچ میں اپنا فلسفیانہ اور صوفیانہ مذاکرہ شروع  
 کر دیا۔"

میں حیران تھا کہ ہمارے ہاں بعض لوگ عیش و نشاط دولت  
 اور بد معاشرے کے علاوہ کسی موضوع پر بات کرنے اور سوچنے تک  
 کے لوازار نہیں تھے۔ تاہم میں نے ملا ٹٹ سے کہا "مجھے افسوس

ہے کہ میں نے وہ اہم بات سننے میں تاخیر کی۔

”وہ اہم بات یہ ہے کہ مس ایکس کچھ عرصے سے امریکا کے بجائے پاکستان میں بگلیاں گرا رہی ہیں۔“ قاسم بکلی نے سرور لیجے میں بٹایا۔ ”ظاہر ہے انہیں یہاں اتنے دولت کی بگلیاں گرانے کی تو اجازت نہیں جتنے دولت کی یہ امریکا میں گراتی تھیں پھر بھی میں نے اپنا خصوصی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے انہیں کافی آزادی دلائی ہے۔“

”آزادی مبارک مس ایکس! میں نے فرجین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی سنجیدگی برقرار رہی۔

قاسم بکلی کو اپنی دھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”گراچی میں ایک تھری اشارہ ہو گیا ہوا کرتا تھا۔ شاید جیس اس کے بارے میں معلومات ہوں۔“

اس نے تھری اشارہ ہوٹل کا نام بتایا۔ مجھے اس کے بارے میں تو حیرت ممت معلومات تھیں۔ اس کی شہرت ابھی نہیں تھی۔ کسی زمانے میں اس کی حیثیت ہوٹل سے زیادہ ایک ٹائٹ کلب کی تھی پھر وقت اور حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس پر زوال آگیا۔ بالیساں بدلیں تو اسے بھی اپنے انداز و اطوار بدلاتا پڑے۔ کسی نے کسی طرح چٹنا رہا۔ اسی دوران شہر میں کسی فوری اشارہ اور قافیہ اشارہ ہوٹلوں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ ہوٹل بالکل ہی نیندہ گیا تھا۔ اس کے بارے میں آخری خبریں نے یہی سنی تھی کہ اس کے مالکان اس کے کمروں و فیو کو دو قاف اور شونڈ میں تبدیل کسے ناہانہ کرائے کی بنیاد پر افغانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

قاسم بکلی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”مس ایکس آج کل اسی ہوٹل میں اپنا شو پیش کر رہی ہیں اور اس ہوٹل کو ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ وہ بالکل ڈوب چکا تھا لیکن اب سب سے اوپر جھلکا رہا ہے۔ تھری اشارہ ہو کر بھی اس نے آمدنی میں قافیہ اشارہ کو پیچھے چھوڑا ہوا ہے۔ حالانکہ فی الحال وہ تمام احتیاطاً مس ایکس کے شو کی پبلیٹی تقصاً نہیں کر رہے۔ ماذھ پبلیٹی پر ہی یہ حال ہے کہ گلت بلیک ہو رہے ہیں۔ ہوٹل میں قیام کرنے والوں کو بھی چونکہ کچھ خصوصی فوائد حاصل ہوتے ہیں اس لئے کمرے بھی بھرے رہتے ہیں اور مزید خواہش مندوں کی ایک لمبی وینگ لسٹ ہر وقت موجود رہتی ہے۔“

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے قاسم بکلی کی باجھیں کھلی جاری تھیں۔ میں پوچھنے بھرنے نہ سکا ”ان سب باتوں پر آپ کیوں اتنے خوش نظر آ رہے ہیں؟“

”میں اس لئے خوش ہوں کہ وہ ہوٹل دراصل میں نے خرید لیا ہے۔“ اس نے وجہ بتادی ”اسے غلاب حالت میں خرید کر دوبارہ کامیاب میں نے ہی بنایا ہے۔ اس مقصد کے لئے میں نے خاص طور پر مس ایکس کو امریکا سے بلایا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے اپنی آمد کا مقصد پورا کر دیا۔“ اس نے بڑی اچانکیت سے فرجین

کا کندھا چھیستایا۔ فرجین کے چہرے پر ایک لمبے کے لئے فخر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے مگر قاسم نہیں دیکھ سکا۔ ”اوہ۔۔۔ برا سسپنس پیدا کرنے کے بعد آپ نے یہ خبر بلا بہر حال۔ کامیابی مبارک ہو۔“ میں نے معنوی خوشی کا انداز کیا۔

”یہ میرا پہلا تجربہ نہیں ہے۔“ قاسم نے ذرا ترمیم میں آکر ”ڈوبے ہوئے اور تباہ شدہ پرائیویٹس کو خرید کر انہیں نئی زندگی میرا محبوب مشغلہ ہے۔“

”بہت اچھا اور قیصری مشغلہ ہے۔ دراصل آپ کے اس کے لئے بہت سے وسائل اور بہت سی کارگر ترکیبیں موجود ہیں۔“ میں نے سر ہلایا ”خصوصاً ایسی حسین ترکیبیں تو ہی کارگر رہتی ہیں۔“ میں نے فرجین کی طرف اشارہ کیا۔

قاسم بکلی بولا ”وہ دو مقولہ ہے نا۔ محبت اور جنگ میں۔“ میں نے اس میں تھوڑا سا اضافہ کر لیا ہے کہ محبت اور بددلی میں سب جائز ہے کیونکہ بددلی بھی میرے خیال میں اس طرح کی جنگ ہی ہے۔ یا پھر شاید ہر بددلی میں کا بددلی ہی اسی محبت ہوتا ہے۔“

میں تو اس مقولے سے ہی متعلق نہیں تھا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ دنیا کے کسی بھی کام میں سب کچھ جائز ہو سکتا۔ ہونا بھی نہیں چاہئے لیکن کیا کیا جائے۔ کچھ عداوت اور مقولے لوگوں نے اپنی ضرورت اور فطرت کے تحت بھی اپنا کر لئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ عورتوں کی دلالی کو ”بددلی“ سمجھتے تھے۔

میں خاموش رہا۔ فرجین اٹھتے ہوئے بولی ”قاسم صاحب! اب چلتی ہوں۔“ اس نے قاسم سے ہاتھ ملایا پھر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی ”آپ سے شاید پھر بھی ملاقات ہو۔“ وہ خوب صورت ضرور تھی مگر اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔

قاسم اٹھتے ہوئے بولا ”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ اگر عارفہ صاحبہ پاکستان میں رہے تو ہمارا شو ضرور دیکھنے آئیں گے۔“ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ”فرجین مسکرائی۔“

قاسم میری طرف دیکھ کر عذرت خواہانہ سے لیجے میں آیا ”میں ذرا فرجین کو گاڑی تک چھوڑ آؤں۔ اسے شہر واپس جا ہے۔“

میں سر ہلا کر دوسرے دروازے سے ڈائجنگ روم کی طرف بڑھا۔ اس دروازے سے ذرا آگے ہی مجھے آٹا کھڑی ملی۔ وہ کالا آئینہ سے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولی ”سڑکی ذرا بڑی عمر کی ہے لیکن خوب صورت ہے۔ شاید اسی لئے تم یہاں کھل ہو کر رہ گئے تھے۔“

”میں بھلا کبھی کیسے ہو سکتا تھا۔ وہاں جناب لائف لیمز ہمارے والد صاحب شریف رکھتے تھے۔“ میں نے اپنے لیے تیر

تمہیں ضرورت کے کچھ کپڑے۔ سلیپنگ سوٹ وغیرہ  
جانیں گے۔ جو مناسب نظر آئیں اور تمہیں فٹ آجائیں  
استعمال کرواؤں۔“

پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولی ”تمام کمزور  
بھی موجود ہے۔ میرا گھبراہٹ میں اس کرنے کے لیے راج  
کے برابر میں تانیا کا کمرہ ہے۔ لڑکی کی طرف سے کرا  
کسی سہانہ کو کمرہ دینے کی اجازت نہیں ہے ورنہ ہم  
تمہیں اپنا پرہیز دینے میں زیادہ خوش محسوس کر سکتے۔  
اب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انتظار کام پر میرے کمر  
سات اور تانیا کے کمرے کا آخر ہے۔ یاد رہے گا کہ  
”یہ ایسے کمزور کو بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔“  
میں نے لٹھری سانس لی۔

”اور کلی ایٹ بھی۔“ اس نے گویا یاد دلایا۔ وہ  
کسی بھی معاملے میں شاید ایک دوسرے کے بغیر خود  
محسوس کرتی تھیں۔

”یقیناً۔۔۔ یقیناً کلی ایٹ بھی۔“ میں نے سر ہلاتا۔  
”شب بخیر۔“ اس نے بوجھل آواز میں کہا اور وہ  
بغیر کا ایک قہقہہ ثبت کر کے رخصت ہو گئی۔ میں دوا  
ہوئے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان دونوں بھول کے ہوئے  
شب کا کچھ گزارنا کتنا میرا آسا کام تھا۔ ان کی موجودگی  
کے لیے یاد رکھنا بڑا مشکل ہوتا کہ وہ یہاں کس مشین  
کمرے میں منتقل ہوتے ہی سب سے پہلے ہاتھ دیا  
ہاتھ لیا، کپڑے بدلے اور آکر بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔  
سے میری آنکھیں بند ہوئی جاری تھیں لیکن سونے  
نے سانس نہیں پر رکھے ہوئے الیکٹرانک کلاک میں  
الارم لگایا۔ مجھے امید تھی کہ میں گھنٹے بعد قیام تک  
میں سناٹا محفلوں کے سوا سب سوچنے ہوں گے۔ مگر  
”سب بک سوئے ہم جاگیں“ جیسی کچھ کو خوش کرنا  
مجھے آمادوں سے نہیں ”کچھ جیتے جائے گا۔“ وہاں سے ہاتھ  
بڑھ کر میں ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ الارم  
کے بعد میں گھوڑے چل کر سو گیا۔ وہ گھوڑے جو میرا  
تھے!

عام حالات میں شاید اتنی تھکن اور گہری نیند  
بھی نہ چکاتا لیکن میں چونکہ ذہن میں ایک غرض  
اس لیے دھیمی اور مترنم آواز دالے اس الارم پر  
سب سے پہلے میں نے ہاتھ بلب کی مدد سے روشنی  
اطمینان محسوس کیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی بھی  
استعمال کر کے میرے کمرے میں نہیں گھسنا تھا۔ میرا  
بھی بندھے ہوئے نہیں تھے اور میں بالکل بے خبر و حالت  
میں نے دس قدموں دواؤں تک جا کر رہے

باہر کی کڑی کو شش کرتے ہوئے تھا۔  
”تانیہ غالباً میرے پیچھے پیچھے آکر ڈرائنگ روم میں جھانک چکی  
تھی اور شاید ہماری گفتگو بھی سنی رہی تھی۔“

”تم بڑے خبیث ہو۔“ تانیہ نے ترجمی نظروں سے میری  
طرف دیکھا پھر لٹھری سانس لے کر بولی ”بہر حال ہمارے مہمان  
ہو۔ آؤ میں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔“  
میں نے سعادت مندی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا  
”کیا یہ خوب صورت لڑکی اکثر تمہارے ڈیڑی سے ملنے آتی رہتی  
ہے؟“

”معلوم نہیں۔“ وہ عدم دلچسپی سے بولی ”ڈیڑی سے اس قبیل  
کی بہت سی لڑکیاں ملنے آتی اور جاتی رہتی ہیں۔“  
”تمہارے ڈیڑی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس طرح کے  
لوگوں سے میل ملاقات رکھنے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے  
زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔“

”تم ڈیڑی کے معاملات کو ڈیڑی کے ساتھ رہنے دو۔“ وہ میرا  
بازو تھامتے ہوئے بولی ”اور جب تک اس گھر میں ہو کم از کم جب  
تک تو صرف میرے اور تانیا کے بارے میں سوچا کرو۔ اخلاق بھی  
کوئی چیز ہے۔ ویسے بھی سہانہ پر میزبانوں کے کچھ حقوق ہوتے  
ہیں۔“ وہ میزبانوں کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرائی۔

”تمہیں اس غلط فہمی میں جلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ میں  
اس لڑکی پر عاشق ہو گیا ہوں۔ میں تو صرف اس لیے اس کے بارے  
میں جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی صورت مجھے کچھ شہ ساسی  
لگی تھی لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا تھا میں نے اسے کب اور کہاں  
دیکھا تھا۔ حالانکہ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔“

”اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ تمہیں اس کی  
صورت کچھ شہ ساسی لگی تھی لیکن شاید تم نے جس راہ چلتے ہی  
اسے دیکھا ہو اس لیے صحیح طور پر یاد نہ آ رہا ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی  
ایڈجسٹس قسم کی زندگی گزاری ہے، دوسرے ملکوں میں بھی گھومنے  
پھرنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے اور میرے ڈیڑی جیسے دولت مندوں میں  
آٹھنے پٹنے کے مواقع بھی ملتے رہے ہیں تو پھر اس قسم کی لڑکیوں سے  
نہ جانے کہاں کہاں تمہارا سامنا ہوتا رہا ہو۔ دنیا کے بڑے بڑے  
ہوٹلوں میں۔ بڑے بڑے آدمیوں کے بنگلوں پر۔ کسی کینینوں  
کسی ساحل پر۔ کسی فلاٹ پر۔ غرضیکہ کسی بھی ایسی جگہ پر جہاں  
غریب غرا کا گزر نہیں ہوتا۔“

”اوہ! میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔  
وہ اوپر کی منزل پر پہنچ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے  
بولی ”میرا خیال ہے تم اس بیلے روم میں ڈیرا ڈال لو۔“ اس نے  
لائٹ آن کر دی۔

وہ ایک طویل و عریض، آرام دہ و ہر است اور پختہ بیڈ روم  
تھا۔ تانیا ایک طرف اٹھانہ کرتے ہوئے بولی ”وارڈ روم میں



”اس وقت تم کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے انجمن بند کر رکھا تھا اور لبرس دھیرے دھیرے ہمیں کیمائز کی طرف لے جا رہی تھی لیکن آپ سے بات کرتے ہوئے میں نے آپ کی ہدایت ملتے ہی کیمائز کو اٹھا کر لیا تھا۔ انجمن اسٹارٹ ہو چکا ہے اور ہم جزیرے کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”ٹھیک ہے میں پانچ منٹ بعد اپنے کمرے سے نکلوں گا۔“  
”جسٹ آف لک“ شیخ شاہ بولا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر تک میں بستر پر ہی بیٹھا سکوت شب کی سرگوشیاں سناتا رہا۔ اس دوران میری نظر اتر کام پرجی رہی۔ میں نے تو سات اور آٹھ ٹیکسٹوں میں دیکھا تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ میں نے کمرے میں ہرگز نہ پہنچا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید تانیا اور تانیا تھک بار کر سونگئی تھیں۔

چند منٹ بعد میں دے قدموں کمرے سے نکلا۔ بیڑیوں کی طرف جانے کے بجائے میں کمرے کے گرد گھوم کر پچھلی طرف آیا۔ بیڑیوں سے بچے جانے کی صورت میں محافظوں سے یا کسی اور سے سامنا ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ میں جس طرف گیا تھا اور سے ایک فریج ڈور ٹیکس پر کھلا تھا۔

اس دروازے کے راستے میں ٹیکس پر آیا اور نہایت مختصر انداز میں ”میں نے ٹیکے اندھیرے میں بچے جھانک کر دیکھا۔ دیگر خالی بیڈوں کے علاوہ اس عظیم الشان مکان میں چاروں طرف ایک کشادہ کھلی سی موجود تھی جس کا فرش ماربل کا تھا۔ اس فرش پر کچھ ہی دور بے آواز قدموں سے ایک پہلا جانا دکھائی دیا۔ وہ میرے کمرے کے عتب سے گزر چکا تھا۔ اس کے کندھے پر کپڑے اور سر پر ٹوپی تھی۔ وہ یقیناً گاڑا تھا۔ وہ لوگ مکان کے صرف سامنے کے حصوں میں نہیں، عقبی حصوں میں بھی گشت کرتے تھے۔“

جو کسی وہ گاڑا لان کے کونے پر نظر سے اوچھل ہوا میں ٹیکس کی دیوار پر باہر کی طرف لٹک گیا۔ دیوار کے نیچے سے مجھے ایک ستون میسر آ گیا جس کے سارے پھسل گریں ماربل کی روش پر پہنچ گیا اور لان کے کنارے کنارے رکھ کر کسی سی حالت میں بے آواز قدموں سے دوڑتا ہوا اس کونے تک پہنچ گیا جہاں گاڑا میری نظر سے اوچھل ہوا تھا۔

یہاں سے انٹیکسی سامنے نظر آ رہی تھی لیکن سچ میں لان کا ایک بڑا حصہ تھا جس پر گھوٹوں کی دھندلی سی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کونے سے جھانک کر دیکھا۔ کالنی دور لان کے دوسرے سرے پر مجھے دو گاڑا کھڑے نظر آئے۔ وہ شاید بہت لمبی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔

میں چاہتا تھا ان کی توجہ دوسری طرف ہونے کا تاکہ انھانے ہوئے لان کے کنارے کنارے دوڑا جاو انٹیکسی تک پہنچ سکتا تھا

دروازہ کھول کر باہر راہداری میں جھانکا۔ جست کی فنی لائٹ سے راہداری میں مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں نوی طرف کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور سری طرف جا کر کھڑکی ذرا سی کھول کر عقبی ٹیکس پر جھانکا۔ ادھر ناکی نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ کوئی کی ٹانہ میں نہیں تھا۔

تب میں نے اطمینان سے بیچ پر بیٹھ کر اپنے موبائل فون پر شیخ شاہ کا نمبر لکھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ موبائل ہاتھ سے ملے تک کارڈ تھا وہ اسی دائرے میں کہیں موجود ہو۔ پہلی کراچی کے مرکز سے کافی دور تھے۔ اس وقت ایک لمحے کے لئے مجھے اکثر کام پر سات اور آٹھ ٹیکس دیکھنے کا بھی خیال آیا تھا۔ میں نے بہ مشکل خود کو باز رکھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کی ملت میسر تھی۔ میں خرافات میں وقت ضائع کرنے کا سچا ناہو ہو سکتا تھا۔ گوکہ خرافات میں کشش بہت تھی۔ تانیا اور تانیا کچھ کا تھا۔ رات، تنہائی اور شگافیت کا لم چیزیں تھیں لیکن اپنے آپ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مجھے جو کام پیش تھا وہ کمالی خواہشوں سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

چند سیکنڈ بعد بھربل گیا اور شیخ شاہ کی دھیمی آواز سنائی دی

”میں بول رہا ہوں۔“ میں نے نام بتائے بغیر تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”میں سر“ شیخ کے لیے میں مستعدی آنجی۔  
میں زبانی اسے قاسم بجلی کے کمر کا نقشہ جتنے بہتر طور پر سمجھا تھا سمجھانے لگا پھر میں نے اسے بتایا ”میں اب انٹیکسی میں ہوں دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ وہاں کون کون تم ہے۔ تم اور ان ٹیکس ٹراپل جزیرے کے قریب ہی لے آؤ۔ سمندر ہی میں ہے ہوتے تم جس حد تک اس مکان پر نظر رکھ سکو رکھنا۔ اگر کسی قسم کی گڑبگ ہو تو تم مکان میں ٹھننے کی کوشش بھی نہ کرو۔ لیکن اکیلے نہ ٹھننا اور بہت دیر نہ رہنا۔ یہاں کئی مسلح نااہل عمارت کے چاروں طرف گشت کرتے رہتے ہیں۔“

شیخ شاہ دھیرے سے ہنسنا چھوڑ دیا۔  
”مجھے معلوم ہے تم لوگ مسلح آدمیوں کو خاطر میں نہیں لے سکتے۔“ میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا ”لیکن میں جیسے مختصر چکی ہیئت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس باپ کی طرح مجھے معلوم ہے کہ اس کی اولاد وہاں ہو چکی ہے اور اپنا بڑا بھلا خوب جی ہے لیکن وہ انہیں سنبھال کر چلنے کی امید کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میں اب بھی نیسٹوں کو سننا بھلا گھٹا ہے سراسیمہ بھی آپ سے نہیں ہے۔ غلطی سے ہمیں تقریباً آپ کے برابر آگئے۔۔۔“  
شیخ شاہ خوشگوار لہجے میں بولا۔



مالت میں ساکت رہو۔ پھر کے بُت کی طرح! اور نہ مجھ سے اڑ جائیں گے۔

میں نے اس کے غم کی قہیل کرنے میں عافیت جانی دینے بھی جتنا شدید تھا۔ مجھے اس سے پہلے، کچھ سوچنے دیکھنے اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے چند سیکنڈز درکار تھے۔ میں نے انہیں سب سے پہلے دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے صرف ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔

عقب سے کوئی اور شخص میرے قریب آیا۔ اس نے ترجما رہے ہوئے نہایت مختار انداز میں میری تلاش کی۔ میں نے یکدم اسے پکار کر احوال پتے کے بارے میں سوچا لیکن یہ کام ذرا مشکل اور خطرناک نظر آیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا باقی مسلح افراد کس کس پوزیشن پر تھے۔ تلاش لینے والا بھی ان معاملات میں سمجھا ہوا معلوم ہوا تھا۔ اسے پتہ چلنے والی اندیشہ تھا کہ اسے احوال پتے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ بد کے بد کے سے انداز میں ذرا کاملہ رکھے ہوئے تلاش لے رہا تھا۔ میں ابھی تک صحیح طور پر اس کی کل نہیں دیکھ سکا تھا۔

اس نے ہر آواز بلند قاسم کی کل کو اطلاع دی "اس کے پاس کچھ نہیں ہے سر!"

"پھر تو بتاؤ پڑے گا کہ یہ ایک دلیر آدمی ہے۔" قاسم کی کل نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا "خال ہاتھ شیر کے پچھار میں گھستا ہر ایک کام نہیں ہے۔ جیسا خانا قادیانی پایا۔"

اس پہلے پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے میرے بارے میں "سرٹیفکٹ" کے بارے میں کہاں سے کچھ سن لیا تھا؟ قاسم کی کل نے مجھے مخاطب کیا "اب تم ہماری طرف گھوم سکتے لیکن نہایت آہستگی سے اور کوئی چالاکی دکھانے بغیر۔ اسی میں ادنیٰ بھلائی ہے۔ ہم ان احوال تمہاری ویسٹی اور پگڑی کا کوئی نمونہ بننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔"

میں نے ہاتھ بہ ستور بلند رکھے اور اس کی ہدایت کے مطابق علی سے گواہ صورت حال دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا ارادہ کیا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اس نتیجے میں میرا جسم چھلنی ہونے کے امکانات کا ہی "موشن" تھے۔ قاسم کی کل کے دائیں بائیں چار آدمی نازک اسکواڈ کے سے زمین سب مشین گنیں سنبھالے، "ٹرکیز پر اٹھائیں" دیکھے ہوں وہ کھڑے تھے گویا کسی بھی لمحے انہیں مجھ کو شوٹ کرنے کا شغل والا ہو لیکن ان کے چہرے اس طرح سیاہ اور تاثرات سے لیس تھے جس طرح عموماً نازک اسکواڈ کے ہوتے ہیں۔ ان چہلوں پر تو اس طرح خشونت اور خوفناکی تھی جیسے ان کی مجھ کو پانی اور آبی دشمنی چل آ رہی ہو۔

انکھ میں چند سیارہ تھے۔ چنانچہ وہ تھا جس نے میری ہاتھ بندھ کر رکھے۔

ان کے علاوہ خود قاسم کی کل بھی تھا جو ایک اُڑی سنبھالے، ٹانگیں چوڑی کئے ہیں ان کے درمیان فرش پر بھاگتا تھا جیسے کسی نامیدہ طوفان کے سامنے دوڑ رہے ہوں کی کوشش کر رہا ہو۔ اس وقت وہ بہت مختلف قسم کا قاسم کی کل نظر آ رہا تھا۔ جب سے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی میں پہلی بار اسے تاریک جھٹکے کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھیں بلاشبہ شیطان کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بڑی عمر کا شخص تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ مگر یہ صحت مندانہ چمک نہیں تھی۔ اس چمک کی وجہ سے ہی اس کی آنکھیں زیادہ شیطانی نظر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس تاثر میں کچھ دخل ان آنکھوں کی ساخت کا بھی تھا۔

اس کے ساتھ جو افراد تھے انہیں میں دن میں کارڈز کے طور پر مکان کے ارد گرد گھومتے دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت ان کے تاثرات جتنے بدلے ہوئے تھے ان کی وجہ سے ان کی ٹانگیں بھی کچھ مختلف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستعد بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ سب کچھ اس طرح مجھے کور کئے کھڑے تھے جیسے ان کے سامنے ایک فرد نہیں پوری باتیں موجود ہو۔

"تمہیں کس کی تلاش تھی افضل چوہدری؟" قاسم کی کل نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

یہ میرے لئے ایک نیا جھکا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے واقعی میرے پیروں تلے سے زمین کھینچنے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا تاہم میں نے بدحواس ہونے کے بجائے معصومیت کا مظاہرہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی "تمہیں کس نے بتایا کہ میرا نام افضل چوہدری ہے؟"

"اس قسم کی باتیں لوگ آکر ہمیں نہیں بتاتے پر خود ارادہ" وہ دھیسے لیکن زہریلے لہجے میں بولا "ہم خود ایسی باتوں کا علم رکھتے ہیں۔ کادبار کی ظالم دنیا میں میرے بھی اُن بگڑے روز و شب گزرے ہیں میرے چاہا اگر میں آگاہی دے گا ہوا تو آقا دولت مند نہ ہوتا۔ ایک ٹمپیرے کا بیٹا ہو کر آج اس مقام پر نہ ہوتا جہاں تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ میرے باپ کے پاس سر چھانے کے لئے جھوٹری بھی نہیں تھی۔ میں نے ایک ٹول پھونکی تھی جس میں جنم لیا تھا۔ مچھلیاں جھج کر کے پیچھے والا ٹھیکہ دار بھی میرے باپ کو گھسنے میں آکر لڑا رسید کر رہا تھا۔ آج میرے ایک ٹول فون پر بڑے بڑے وزیر سفیر اپنی خواب کا ہاں چھوڑ کر دوڑے چلے آتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اگر وہ اپنی "تعلیم الشان" کامیابیوں پر روشنی ڈال کر توڑی سی خوشی محسوس کرنا چاہتا تھا تو اسے اس کا موقع دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میرا ذہن اس دوران کسی اور ٹریک پر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ میں اپنے لئے کوئی حکمت عملی اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا کسی طرح میں ان سے

ہوتا ہے؟ تمہاری نظریں اہمیت تو صرف اس حوالے کی ہوتی جس کے ساتھ میں بیان آیا ہوں۔ کوڑوڑو آراکس تمہی سے بعد تو تمہیں اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں ہوتی چاہے کہ کون ہوں "میں نے اپنی دانست میں دلیل سے کام لینے کی کوشش کی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے گولا میری غلط فہمی پر "انسان کی اصل شخصیت کی اہمیت تو ہر حال میں رہتی ہے۔ اہم نکتہ شاید تمہیں معلوم نہیں تھا کہ "آراکس تمہی حوالے سے آنے والوں کو اپنی اصل شخصیت چھپانے کی کوشش نہیں رہتی خواہ وہ بیل تو ذکر بھاگ کر آئے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس کوڑوڑو کے ساتھ آنے والے کو چوروں کی طرح کے وقت میرے گھر میں جھانکتے پھرنے کی ضرورت نہیں اسے خواہ کوئی بھی کام ہو تا کسی کی بھی تلاش ہوتی وہ میرے گھر سے کہہ سکتا تھا۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر غلطی مارا "بہتر افضل چوہدری! بات صرف اتنی ہے کہ بات نہیں میں نے تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب میں نے تمہیں ہی ہوٹل کے سامنے سے گاڑی میں بٹھایا تھا اور میری کمر وقت گھوم گئی تھی۔ میں جکرا کر نہ گیا تھا کہ تم جیسی صاحب شہرت رکھنے والے بزنس میں کو اس ریفرنس سے میرے آپ کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ پھر میں نے اپنے آپ "پیارے قاسم بھائی! یہ دنیا ہے یہاں کچھ پتا نہیں کون کس ہے" میں تمہیں اپنے ساتھ تو لے آیا۔ نہایت اہمیت سے اپنے گھر میں بھی ٹھہرایا لیکن فوری طور پر اپنے کچھ غامض سے رابطہ کیا اور انہیں تمہارے بارے میں مطلع کیا کہ ریفرنس کے ساتھ میرے پاس آئے ہو کہیں کوئی گزرتو ضابطہ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ تم تو میرے دوستوں کو بہت سی غلطی مطلوب ہو۔ تمہارے ساتھ تو ان کا کوئی لہاسی پتہ ہے۔ نے خاص طور پر تمہیں ٹھہرانے کے لئے وہ بڑے روم دلایا تھا سے نظر رکھی جاسکتی ہے۔ پہلی ہی رات تم چوروں کی کی کرتے پکڑے گئے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ادھر ادھر کی باتیں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شاید قسمت سے وہ تھا۔ شاید میں اپنی خوش قسمتی پر غیور کرنے کا عادی ہوا اس لئے فی الحال وہ میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

میرے تاثرات میں شاید کوئی تبدیلی آئی تھی جسے کرتے ہوئے قاسم بھائی ذرا اطمینان سے مسکرایا اور پھر سوال کی اب کوئی اہمیت تو نہیں رہی پھر بھی کیا تمہاں کہ اس وقت تمہیں کس کی تلاش تھی؟ "تمہارے دوستوں کی۔" میں نے گویا اس کے ساتھ شہر کرتے ہوئے پھولنے کا فیصلہ کیا۔

یہ کام ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے پاس خطرناک محسوس تھی۔ ان کی تعداد چھ تھی اور کسی کی نظر ایک لمحے کے لئے مجھ پر سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے میں موت کا پلازمہ جاری نظر آ رہا تھا۔ میں ساکت رہا۔

قاسم بھائی ایک لمحے کے توقف سے بولا "میں نے ہر طرح کا بزنس کیا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی کام ہو جو میں نے نہ کیا ہو۔ شہر میں دو چھوٹے موٹے ہوٹل میرے بھی ہیں۔ میں اتنا بے خبر نہیں ہوں کہ ایک فانیو اشار ہوٹل کے مالک اور ٹھیک ٹھاک قسم کے بزنس میں کو نہ پچاؤں۔ مانا کہ میرے دونوں ہوٹل تمہارے ہوٹل کے مقابلے میں کمتر ہیں لیکن میرے پاس دوسرے ایسے بہت سے اٹھائے ہیں جن کی وجہ سے کامدار کی دنیا میں میری اہمیت کم سے کم نہیں زیادہ ہے۔ تم کراچی میں رہتے بھی بہت کم ہو۔ اس کے باوجود میں تمہارے وجود سے کبھی لاعلم نہیں رہا۔ تم نے شاید کبھی مجھے دیکھا بھی نہ ہو۔ دیکھا ہو تو شاید کبھی میرے بارے میں جانتے کی کوشش نہ کی ہو لیکن میں نے تمہیں دیکھا ہوا بھی تھا تمہارے بارے میں معلومات بھی رکھی تھیں اور تمہیں یاد بھی رکھا تھا۔ میں ایک باخبر بزنس میں ہوں لیکن افضل چوہدری!"

میرے خیال میں اسے جھٹلانے کی ایک آدھ کوشش اور کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ اسے ریڈ ڈاٹ کے کسی شخص نے میرے بارے میں مطلع کیا تھا اگر اس کا یہ دعویٰ درست تھا کہ اس نے خود ہی ایک بزنس میں کی حیثیت سے مجھے پہچان لیا تھا تو یہ میری بد قسمتی ضرور تھی لیکن میرے لئے اس میں ذرا سے اطمینان کا پہلو بھی تھا کہ شاید ابھی وہ میری آمد کے اصل مقصد سے آگاہ نہیں تھا۔

میں نے ٹھہرے ٹھہرے لمحے میں کہا "تمہاری تقریر بہت اچھی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا قاسم افضل چوہدری نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی فانیو اشار ہوٹل وغیرہ کا مالک ہوں۔ وہ ٹھیک میری لائن ہی نہیں ہے۔ میں تو وہ کام کرتا تھا جو تمہارے بزنس کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ یعنی ادھر کا مال ادھر کرنا۔ شاید میری شکل میں کسی افضل چوہدری کی شباهت موجود ہو لیکن میں اسے نہیں پانتا۔"

قاسم بھائی نے نہایت آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی لیکن اس کے احوال میں بدستور ساکت تھی۔ وہ چنان کی طرح اپنی جگہ بنا کھڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک بازرع شخصیت کا مالک اور دنگ آوی تھا۔ اس کی گھٹی مونچھوں کے نیچے خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تمہارے دوست نہ؟" وہ کسی حد تک شفقانہ سے لہجے میں بولا "میرے گھر میں پہلے ہی دو ہم شکل بڑاں ہمیشہ موجود ہیں۔ اب مجھے دو اور ہم شکل انسانوں کی کمائی سننے کی کوشش نہ کرو۔ ایک گھر اپنے زیادہ اتفاقات کا بوجھ نہیں لاوا کرتے۔"

”ان کے نام بتا پائے کو گے؟“

”ہام مجھے معلوم نہیں ہیں۔“

”بہت خوب“ اس نے سر ہلایا ”تمہیں میرے ”ہام معلوم“ دوستوں کی تلاش ہے، تمہیں کیسے معلوم تھا کہ ان سے میرے گھر میں ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”غیر ایجنسیوں کو کچھ سراغ ملا تھا۔ انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے کھنکھارے اچکائے ”مجھے معلوم ہے تم جیسے آدمی اس وقت تک کسی سے مرعوب نہیں ہوتے جب تک سوت ان کا کلا نہیں روچ لیتی۔“

”ان کے پاس آدمی ختم ہو گئے تھے کیا؟ جو انہوں نے تمہیں بھیج دیا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا پھر ایک لمحے کے وقف سے کہا ”ویسے مجھے ذاتی طور پر بھی ڈاکٹر برنامہ نامی ایک شخص کی تلاش تھی۔“

”ڈاکٹر برنامہ؟“ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں ”یہ نام کبھی سنا نہیں۔ اور نہ ہی اس نام کے کسی آدمی کا میں آنے کا پروگرام تھا۔“

”ہو سکتا ہے ابھی تم اسے نہ جانتے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے تم اسے کسی اور نام سے جانتے ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ گوکہ مجھے معلوم نہیں تھا وہ جہول رہا تھا یا محض یہاں تھا۔

”خیر یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ اس بدبخت کو نہیں معلوم تھا کہ میرے لئے یہ بات کتنی اہم تھی۔

اس کی نظریں صرف ایک دھنچکے کے لئے اپنے ساتھیوں کی طرف گئیں جو بیت بنے کھڑے تھے۔ وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا ”میں کھڑے کھڑے تم سے ہمت یا باتیں ہو گئیں۔ کچھ بچی کچھ بھولی۔ لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ہم یہیں کھڑے باتیں کرتے رہیں۔ اب تم پہلے ہی کی طرح نہایت آگے سے گھوم جاؤ اور اسی طرف نہ کرو جس طرف پہلے تھا۔“

اس کا مطلب تھا کہ ان کی طرف میری پشت ہو جاتی۔ میں نے حتی الامکان پر سکون لیچے میں کہا ”تم مجھے گولیاں مارنا چاہتے ہو تو جیتے ہی پرانے۔ میں پتھر پر گولی کھانا نہیں چاہتا۔“

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا ”کسی فکری ہیرو کی سی جگہ باتیں مت کرو اور نہ ہی عمارتوں کے پکر میں پرو۔ پتھر پر گولی کھانے والا ہر آدمی بزدل نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی بڑے بڑے سرداروں کو پتھر پر گولی لگ جاتی ہے اور کبھی کبھی بڑے بزدل بھی انھیں سے پتھر پر گولی کھا کر مر جاتے ہیں۔ بے ادبی اور بزدلی کے اس ٹکڑے کا صرف عاقر سے کی حد تک ہی رہنے دو۔“

پھر ایک لمحے کے وقف سے وہ بولا ”ویسے بھی ہمارا اس وقت

تک گولی چلانے کا ارادہ نہیں ہے جب تک تم میری ہدایات کی خلاف ورزی نہ کرو۔“

”تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“

”فرارہ دور نہیں۔“ قاسم بجلی نے جواب دیا ”میں تمہیں اپنے چند دوستوں سے ملانا چاہتا ہوں۔ خرگشاہ رماحل میں کچھ بات چیت ہوگی۔ کشتی کی سیر ہوگی۔ ویسے بھی تم نے کہا تھا کہ تم گلف کی کسی مڑا سٹ کی طرف لکھنا چاہتے ہو۔ شاید تمہیں گلف کی کسی ریاست کی طرف ہی بھیج دیا جائے۔“

”لیکن میرا پروگرام اب بدل گیا ہے۔“ میں نے مصیبت سے کہا ”میں اب مغرب کی طرف لکھنا چاہتا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں ہم تمہیں مغرب، مشرق، شمال، جنوب جس طرف چاہو گے بھجوا دیں گے لیکن اب مزید بکواس نہ کرو۔ کہیں میرا پروگرام نہ بدل جائے اور میں ساری تمہیں چھوڑ کر تمہیں عالم بالا کی طرف بھجوانے کا فیصلہ کر لوں۔“ وہ قدرے ناگوار سی

بولا۔

میں قاسم بجلی کو ہاتھ میں لگا کر جتنی سہلت حاصل کر سکا تھا کر دینا تھا لیکن اس دوران مجھے کچھ کر گزرنے کے لئے کوئی لمحہ مناسب نظر نہیں آیا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ کسی نے کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں کسی کی طرف سے ذرا سی غلط حرکت کا شکر دیتا تھا جو عموماً میرے لئے صورت حال کو اگٹ دینے کا سبب بن جاتی تھی لیکن اس وقت تو کچھ ایسا معلوم ہوا تھا کہ سب سے بڑی حماقت مجھ سے ہی سرزد ہو چکی تھی۔ کوئی اور ذرا سی بھی غلطی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جس سے میں خود راہست نام نہان تھا۔

”شفیع شاہ اگر کہیں ساحل کے آس پاس موجود تھا تو نہ جانے اسے اندازہ ہو رہا تھا یا نہیں کہ مکان میں کچھ گڑباز تھی؟ محل نما مکانوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات پڑوسیوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کسی کے حق میں یہ بات بہت اچھی ہوتی ہے کسی کے حق میں بہت بُری۔“

میں آگے سے گھوم گیا تو قاسم کی آواز سنائی دی ”اب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے تاکہ کی سیدھ میں چل پڑو۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ میرے عقب میں کبھی سی سرسراہٹ ہوئی۔ کوئی میرے قریب آگیا تھا۔ میری وحزن کن ذرا تیز ہو گئی۔ نہ جانے وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے لیکن اس نے صرف میری کمر

گن کی ٹال ٹکانے پر ہاتھ رکھا۔

”چلتے رہو چلتے رہو۔“ قاسم بجلی کی آواز آئی۔

میرے تھے ہوئے اعصاب نہ صرف کچھ ڈھیلے پڑ گئے بلکہ میرے دل میں خوشی کی ایک نہایت خفیف سی لہر بھی دوڑ گئی۔ مجھے اُمید کی ایک مدھم مدھم کن نظر آئی تھی۔ شاید یہی وہ حماقت تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔ ان کے اور میرے درمیان اگر خود راہ

سے

میرے

میرے

میرے

میرے

میرے

میرے

میرے

میرے

لازوال  
کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی  
کے

شاہکار ناول

حبیب (۵ حصے) ۲۰۰/-

برہم چاری ۱۵۰/-

درخشاں (۲ حصے) ۹۰/-

رقص ابلیس ۱۵۰/-

آسیبِ ندہ ۱۱۰/-

دستک ۱۰۰/-



مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

فون ۴۲۲۳۶۶۵

فاصلہ برقرار رہتا تو میرے لئے زیادہ مطلوب تھا لیکن شاید ان سب کو مجھ سے ذرا دور رہتے ہوئے کچھ اطمینان نہیں تھا اور قاسم بجلی نے اپنے ایک آدمی کو میرے عین قریب بھیج دیا تھا۔ نفسیاتی طور پر اس طرح شاید انسان زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہے کہ اس کی کن کن نال اس کے شکار کی پشت پر لگی ہو۔

دو میرے دھیرے چلا ہوا میں انٹیکس کے کونے تک پہنچ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب قاسم بجلی مجھے دائیں طرف مڑنے کے لئے کہے گا۔ میں وہ کہہ تھا جب میں جان کا جھلجھل مولا لیتے ہوئے تھوڑی بہت امید کے سارے ایک کوشش کر سکتا تھا۔ اگر میں اختالی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محسوس کر اس شخص سے من چھین سکتا جس نے نال میری پشت پر ٹھکا ہوا ہوئی تھی تو شاید میں اس کو لے کر آؤ لیٹے میں کامیاب ہو جاتا۔ یہ کتنا چہلے کے لئے میرا سوچا ثابت ہو سکتا تھا اور اس دوران میں بھاگنے اور کسی جگہ سے چار دیواری چھلانگ کی کوشش کر سکتا تھا۔

اس کوشش میں بھی خطرات ہی خطرات تھے لیکن خطرات اب میرے لئے ویسے بھی کم نہیں تھے چنانچہ میں نے یہ جوا کھیل ڈالا۔ میں اچانک ہی بیٹھ گیا۔ اس قسم کی صورت حال کے لئے یہ ایک بڑا کارآمد داؤ تھا۔ من کی نال نہ صرف میری کمر سے ہٹ گئی بلکہ میرے پیچھے آنے والا شخص میرے اوپر گرتے گرتے بھاگ۔

اس کی وجہ سے دوسرے لوگ فوری طور پر فائر نہ کر سکتے تھے اس کی من چھین کر اور اسے باقی لوگوں کی طرف اچھالتے ہوئے کونے کی آڑ میں۔ پہنچ گیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی لیکن مجھے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوسکا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا اس کو لے کر آؤ میں پہلے ہی کوئی چھپا ہوا تھا۔ عقب سے کوئی ٹھوس چیز میری کھوپڑی پر پڑی اور میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے ٹپک گئے۔ دوسرے ہی لمحے سارا منظر میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ صرف تاریکی رہ گئی۔

اس تاریکی میں بڑی راحت تھی۔ جب ذہن پر دباؤ حد سے زیادہ بڑھ جائے تو دنیا بھائیسا سے بے خبر ہو جاتا ہی نیست لگتا ہے لیکن اس کے لئے کھوپڑی پر ہتھوڑا نہ پڑے تو یہ عمل زیادہ راحت بخش ہو۔

میں جب نامعلوم مدت تک گروپش سے بے خبر رہنے کے بعد آگئی کی دنیا میں واپس آنے لگا تو مجھے کچھ یوں لگا جیسے یہ عمل کسی ٹھوس دیوار سے سرگراں کے حوازیں تھا۔ میرے سر میں کچھ ایسی ہی دھک ہو رہی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ دھک کم ہوئی اور میں نے آنکھیں کھولیں تو اندازہ ہوا کہ میرا سر کسی چیز سے نہیں گرا رہا تھا۔ میں تو شاید کسی آرام کر رہی پر نیم دراز تھا۔ میرا ذہن گویا نہایت ہی آہستہ سے کسی تاریک دہلیز سے باہر آ رہا تھا۔

کافی دیر بعد مجھے صحیح طور پر معلوم ہوا کہ میں کہاں تھا اور کس حال میں تھا۔ میں "پرنس" نامی نوٹروٹ کے پچھلے حصے میں تھا۔

مسئلہ جس کے اختیار میں تھا وہی اس سلسلے میں کچھ کر سکتا تھا۔ اور میں اس کی رہنمائی میں رہتا تھا۔

یوزہا کو کیا کسی سوچ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا "کتنی عجیب بات ہے کہ جب ہم جنہیں ہلاک کرنا چاہتے تھے تو تم بچ کر نکل گئے۔ ہم جنہیں احمق و ذلیل قرار دیتے تھے اب جبکہ ہم نے تمہارا خیال چھوڑ دیا تھا اور ہمزبوریا سمیٹ کر جا رہے تھے تو تم خود بخود ہمارے پاس چلے آئے اور وہ بھی ایک ایسی جگہ جہاں ہم تمہاری آمد کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ میں نہیں آ رہا اس حسین اتفاق کو ہم کیا نام دیں!"

میں نے کہا "چاہا" جو تمہارے لئے حسین اتفاق ہے وہ میرے لئے قسمت کی خرابی ہے۔" میں یہ بات کہہ نہ سکا۔ میں نے یوزہا کو اپنا احساس ہوا کہ میری زبان بھی کچھ مولیٰ بھاری اور مفلوج سی ہو گئی تھی۔ میں کو شش کرنا تو شاید بول سکتا تھا لیکن نہ جانے کیسی آواز نکلتی، کیسا غلط ہوتا۔

میں نے بولنے کا ارادہ ہٹا دیا اور سانس روک لی۔ میں یوگا کی مشقوں کو کام میں لانا چاہتا تھا۔ اس وقت انجمن کے اثر یا سر کی چوٹ کی وجہ سے میری جو کیفیت تھی اسے ٹھیک کرنے میں یوگا کی مشقیں میری توفیق دیتی رہتیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ ان لوگوں میں موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ کا جو حلیہ مجھے بتایا گیا تھا وہ ذرا الگ ہی قسم کا تھا اور میرے دل پر نقش تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ دس بیس آدمیوں میں تو الگ ہی نظر آتا ہوگا۔ میں ان سے پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کہاں تھا؟ میں ان سے صحیح جواب ملنے کی توقع تو رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اس دوران مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ ہم ابھی بوٹ ہاؤس میں ہی موجود تھے۔ قاسم بجلی کھنکار کر کھانا صاف کرتے ہوئے بوڑھے سے مخاطب ہوا "مسز بی ایس نے ایک قیمتی تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ ان چکروں میں پڑ کر میں تو ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوسکتا۔"

"اب آپ اطمینان سے خواہ ایک ہفتے تک سوتے رہئے مسٹر بجلی! آپ نے ہمارے لئے جتنا بڑا کام کیا ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور آپ کو شاید اس کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو۔" عمر رسیدہ سفید فام بولا "ہم زندگی بھر آپ کے شکر گزار رہیں گے اور آپ کے اس تعاون کا بھی آپ کو معقول صلہ ملے گا۔"

"مجھ پر آپ کی نوازشات پہلے ہی کیا کم ہیں۔" قاسم بجلی نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی باجیس کبلی جاری تھیں۔

عمر رسیدہ سفید فام نے ہاتھ ہلا کر گویا اسے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ بوٹ کے اگلے حصے کی طرف ہٹل دیا۔ میری نظریں اس کے نقاب میں تھیں۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ بوٹ کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ راکٹ لانچر

تھیں۔ کھلا تھا اور اس کے نیچے ایک پریش ایک آرام کرسی پر ہم دراز تھا۔ مجھ پر تیز روشنی پڑی تھی۔ میرے سامنے نشیب میں حزیب سے رکھی ہوئی کچھ کرسیوں پر چند سفید فام افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے دلچسپی عیاں تھی۔ انداز کچھ ایسا تھا گویا وہ اپنے سامنے اسٹیج پر پیش کیا جانے والا کوئی دلچسپ تماشا دیکھ رہے ہوں اور وہ "تماشا" میں تھا!

ان سفید فاموں کے پیچھے قاسم بجلی کھڑا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں دو مسلح افراد تھے۔ اس وقت قاسم بجلی کے آثار ت کچھ زیادہ خوف ناک نہیں تھے۔ وہ ایک منڈب اور خوش مزاج شخص کی طرح مکر رہا تھا۔

میں نے کئی بار چلکیں جھپکائیں تو مجھے کچھ اور صاف نظر آنا شروع ہوا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے سامنے ذرا نشیب میں کرسیوں پر جو سات سفید فام بیٹھے تھے ان سب کا تعلق ریڈ ڈاٹ سے تھا۔ ان کی کپڑاؤں اور تصویریں میں دیکھ چکا تھا۔

اُن میں سے ایک خاصا عمر رسیدہ تھا۔ اس سے تو ایک بار میری ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ اسلام آباد کے نواح میں ایک بار مجھے اغوا کر کے ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا۔ اس وقت "پاس ٹو" نے مجھ سے بہت اہم قسم کے "مذاکرات" کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت یہ یوزہا اور تقریباً اسی کی ایک ہم عمر عورت پاس ٹو کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ تمام کشمکش پاس ٹو نے ہی حل کی لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ یوزہا جو ڈاٹ ریڈ ڈاٹ میں بہت اہم حیثیت کا مالک تھا۔ اب یوزہا اکیلا نظر آ رہا تھا۔ شاید بڑھیا اس سے بچ رہی تھی۔

میں نے آرام کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ میرے لئے حرکت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ فوراً مجھے گمان گزرا کہ شاید میں ریتوں کے ذریعے آرام کرسی سے بندھا ہوا تھا لیکن جب میں نے اپنے سر پر اپر نظر ڈالی تو مجھے کہیں کوئی بندش نظر نہ آئی۔ میں یہی سمجھا کہ شاید سر کی چوٹ نے میرے اعصاب پر کچھ ایسا اثر ڈالا تھا کہ جسم بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کے باوجود میں نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن میں بالکل اسی طرح کھسکا کر رہ گیا جیسے کچھ ٹاویہ بندشوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مجھے بے بسی سے کھسکاتے دیکھ کر سفید فام یوزہا کو میرے خیالات پر پتہ ہوئے بولا "شاید تم کچھ دے ہو کہ سر کی چوٹ کی وجہ سے تمہارا یہ حال ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ ہم نے جنہیں ایک انجمن لگایا ہے جس سے تمہاری طاقت سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ سے زور آزمائی کرنے کے لئے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرنا۔ تم سے اس طرح ہلا نہیں جائے گا۔"

پھر ٹھیک تم صحیح تک زندہ رہے۔" دوسرے سفید فام نے تقریباً

نے فوراً ہی اس طرف سے اپنا ذہن ہٹا لیا۔ زندگی اور موت کا

مہربانوں سے بیٹھے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ میں مستقل مزاجی پر حیران تھا۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی پور ہر قرار تھی جیسے جلدی میں ان کی تفریح طبع کے لئے کسی اور میں تبدیل ہونے والا تھا۔

آخر کار میں پوچھنے بغیر نہ رہ سکا "تم لوگ کس چیز کا کر رہے ہو؟"

مجھے خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ میری گویا شک مدلی کی ہو کر رہ گئی تھی اور تالو سے چپکی جابری تھی سفید قام بڑھا کچھ آگے جھٹکتے ہوئے بولا "خودا دور سے تمہاری آواز سنا لی تھیں دے رہی۔"

میرے دوبارہ بولنے سے پہلے ایک نوجوان سفید قام بولا "عبرت کا مقام ہے۔ سنا ہے یہ شخص بتاتی سی طاقت کا مالک گزلیں کی بوجھاڑ میں بھی بچ کر نکل جاتا تھا۔ دس دس گویا قابو میں نہیں آتا تھا۔ توج کیا مژدہ چوبے کی طرح پڑا ہے؟" لہجہ تم آہن بھی تھا اور استہزائیہ بھی۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ اس میں بھلا ان کے کون سے کمال کا تھا؟ حکام کی اور دھوکے سے تو وہ کسی رستم زباں قسم کی شخصیت بھی بے ہوش کر کے اسے کسی دوا کا انجکشن لگا کر بے بسی کرتے، مطلق نہایت تھے بلکہ اسی پر کیا موقوف تھا بے ہوشی میں تو وہ اسے ذرا سے زہر کا انجکشن لگا کر بغیر کسی زحمت کے دنیا سے ہی رخصت کر سکتے تھے۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں تھا جس خوش ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے یہ بات ان سے نہیں کہی۔ وقت میں وہ توانائی بھی ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہی بولنے میں صرف ہوئی تھی۔

تاہم میں نے اپنا سوال اپنی دانست میں چھ کر ڈھرایا "تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو۔ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟" میری کو ذرا استہزائیہ تھی۔

بوڑھے نے طمانیت سے سر ہلایا اور کہا "ہاں، اب تم آواز آسانی سے ہم تک پہنچ رہی ہے۔ ہم تمہارے بولنے انتظار کر رہے تھے۔ اب تم نے یوں شروع کر دیا ہے کہ مطلب ہے تمہارا جسم تو اب بھی بے جان ہی ہو گا لیکن تم حیات کچھ کام کرنے لگی ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ مجھ سے کسی جواب کی توقع کر لیکن میں خاموش رہا۔ میں نے شاید پہلے ہی بول کر غلطی کی اسے صحیح اندازہ نہیں ہوتا چاہئے تھا کہ کس وقت میری کیا کیا تھی۔ شاید انہیں مطالعے میں رکھنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔

سفید قام بوڑھے سسرالی نے سلسلہ کلام جوڑا "اگر تم حیات کچھ کام کرنے لگی ہیں تو ہمیں بھی اپنا کام شروع کرنا چاہئے۔ ہم چاہتے تھے کہ جو کچھ ہم کریں، تم اس کی تکلیف محسوس کر سکو۔ ہم تمہیں قسطوں میں سمندر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے ہم تمہارا ایک ہاتھ کالٹ کر سمندر میں پھینکیں گے۔

فٹ تھے۔ یعنی انہوں نے بوٹ کو کسی ممکنہ حملے سے بچانے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ کیا ان راکٹ لانچر کی موجودگی میں شیع شاہ اپنا زائر بوٹ کے قریب لانے کی حماقت کر سکتا تھا؟ اگر وہ بے خبری اور نادانستی میں قریب آ بھی جاتا تو اس کا انجام کیا ہو سکتا تھا؟ ان سوالوں نے میری تشویش بڑھا دی۔

مجھے قاسم بجلی کی بد قسم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ جاتے جاتے بوٹ کے کپٹین اصغر کو کچھ ہدایات دے رہا تھا پھر میں نے چربی پھل پر ان کے ہماری قدموں کی آوازیں دور جاتے سنی۔ تمام سفید قام بدستور نہایت احتیاط سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ معلوم نہیں انہیں ایک شخص کو بے بسی سے اپنے سامنے پڑا دیکھنے میں کیا لطف محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے چہروں پر اس قدر دلچسپی کے آثار تھے، شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا یا پھر یہ ان کے کسی دیرینہ خواب کی تعبیر تھی۔

میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی تک میں نے اپنے آپ کو اس سوال سے بھی باز رکھا تھا۔ یہ بھی میری زندگی کا ایک عجیب سی تجربہ تھا کہ میں بالکل آزاد تھا، میرے ہاتھ پاؤں کچھ دھماکے سے بھی بندھے ہوئے نہیں تھے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے چہرے پر مجھناٹے والے پھر بھی نہیں بنا سکتا تھا۔

ایسی بے بسی میں نے کبھی بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ہاتھ پاؤں اگر بندھے ہوئے تھے تب بھی یہ احساس تو رہتا تھا کہ میری جسمانی طاقت جو مجھے اپنا سب سے بڑا سرمایہ محسوس ہوتی تھی، میرے ساتھ تھی۔ طاقت بدستور میں جکڑی ہو تب بھی پامشا اطمینان محسوس ہوتی ہے لیکن قانع زدہ جسم آزاد بھی ہو تو بوجھ ہوتا ہے۔

بہر حال میری سانسوں کی مشق غیر محسوس طور پر جاری تھی اور میں اندر ہی اندر اپنی حالت کچھ بہتر ہوتی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمبے بعد بوٹ کا انجن اشارت ہوا اور وہ حرکت میں آگئی۔ بوٹ پاؤں سے نکل کر تاریکی میں "ہر نس" ایک سمت میں روانہ ہو گئی۔ میں سمندر میں دونوں طرف جہاں تک دیکھ سکتا تھا وہاں تک مجھے کوئی روشنی متحرک نظر نہ آئی۔ نہ جانے شیع شاہ کہاں تھا؟ میں اسی امید سے دل کو سنبھالے ہوئے تھا کہ شاید وہ جہاں بچھا کر کسی سمت سے ہمارے قاقب میں آ رہا تھا۔ میں تو اس وقت اچھی خاصی روشنی میں تھا اگر وہ کہیں دور سے دور بین کے ذریعے "ہر نس" کا جائزہ لین تو شاید کسی زاویے سے مجھے بھی دیکھ لیتا لیکن مجھے آرام کری پر خیمہ زار دیکھ کر شاید وہ کی بھٹکتا کہ میں بڑے مزے میں ہوں اور کسی تفریحی سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ معلوم نہیں اسے حالات کا اندازہ تھا یا نہیں؟ نہ جانے وہ سفید قاموں کو دیکھ پالا تھا یا نہیں؟

میرے ذہن میں ان سوالات کی کچھڑی پکتی رہی اور بوٹ کمرے پانچوں کی طرف بڑھتی رہی۔ تمام سفید قام بدستور نہایت



میری حالت کچھ بہتر ہوئی تھی۔ میں اب چاہتا تو شاید ہاتھ بچوں کو تھوڑی بہت حرکت دے سکتا تھا لیکن میں نے ایسی کوشش نہیں کی۔ میں قبل از وقت انہیں ہوشیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مسز ڈی نے ایک نوجوان سفید فام کو اشارہ کیا اور وہ اندر کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک بڑا سا چمکتا ہوا چاچا تھا۔ وہ ایک دروازہ اور دو نوجوان تھا۔ اس کے گرفت اور کمرے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جیسے وہ میرے کمرے کرنے کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس کی شفاف نیلی آنکھوں میں ہلکی سی سفائی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اسٹیل چاچے پر چڑھ کر میرے قریب آئے ایک بہت قد سفید فام ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے چلا اٹھا "وہ کیا ہے؟"

سب نے بیک وقت گردنیں ہٹا کر اس طرف دیکھا۔ چہرے قد نے اشارہ کیا تھا۔ مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی کہ شاید شیخ شاہ نزار لے کر آ رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ لائسنس و دیو آٹن رکھتے ہوئے اس بوٹ کے قریب آنے کی کوشش کرے؟ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کسی ذمہ یا لاعلمی میں بھی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ یہ دہریہ منگی پرستی تھی۔ بوٹ کے ایک حصے میں دونوں طرف دو راکٹ لائسنس تو مجھے نظر آ رہے تھے۔ دوسرے حصے میں کیا کچھ انفلاما تھے، ان کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ شیخ شاہ اور اس کے ساتھی اگر صحیح طور پر سمجھتے نہ ہوتے اور پھر پورا انداز میں "پرنس" پر حملہ آور نہ ہوتے تو نزار کو غرق کرنے کے لئے دو راکٹ لائسنس ہی کافی تھے۔

سفید فاموں کی توجہ میری طرف سے اٹنی تو میں نے بھی گردن ہٹا کر اس طرف دیکھا جس طرف بہت قد نے اشارہ کیا تھا۔ تیز روشنیوں کے ساتھ کوئی چیز تیزی سے بوٹ کے عقب میں آ رہی تھی۔ بیولے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی جہاز تھا۔ اس کے عرشے پر سرخ لائسنس نصب تھیں اور ایک طاقتور بیٹری لائٹ فلش کے انداز میں گردش کر رہی تھی۔

تمام سفید فام خطرناک انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے مسز ڈی نے کہنے سے انداز میں چیخا "یہ تو کوئٹ گارڈ کا جہاز ہے!" ایک اور سفید فام چیخا "کیا ہمارے بارے میں خبری ہو گئی ہے؟"

کسی کے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ مسز ڈی نے ایک سفید فام کو حکم دیا "کیٹچن سے کمو کہ تمام لائسنس بچھاوے اور بوٹ کی رفتار جتنی بڑھا سکتا ہے بڑھا دو۔"

وہ سفید فام دوڑتا ہوا کیٹچن کے گرد گھوم کر وہیل روم کی طرف چلا گیا۔ ایک اوجڑا عمر سفید فام نے مسز ڈی کو مخاطب کیا "ہمیں راکٹ تاز کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

ڈی ایک لمحے سوچ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ہمیں کوئٹ گارڈ سے تصادم مول نہیں لینا چاہئے۔ یہاں سے چند میل

پر بعد دو سڑا ہاتھ کٹ کر پھینکیں گے۔ یوں وقت و وقت سے ہم نہیں سمندر میں پھینک کر پھیلوں کے لئے تھوڑی بہت خوراک کا بندوبست کریں گے اور دیکھیں گے کہ کس سرے تک تمہارے بچے کچھ ہو جو میں زندگی کی رشت باقی رہتی ہے۔ سب سے آخر میں تم تمہارا سر سمندر میں پھینکیں گے اور یوں تمہیں اللہ وار کیس کے اس شغل میں ہمارا سطر بھی ایسے طریقے سے کٹ جائے گا۔ ازار سطر کا بدگرام تو طے ہی تھا لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ پائے جاتے تم ہمارے ہاتھ آجائو گے اور یوں ہمارے سفر کا لطف بالا ہو جائے گا۔"

مسز ڈی خاموش ہو کر گویا میرے چہرے پر کوئی رد عمل تلاش لے لگ۔ میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے سے کوئی رد عمل ابر نہ ہونے پائے شاید اس وقت میں کوئی رد عمل ظاہر کرنے کا قابل بھی نہیں تھا۔ میرے ذہن پر ابھی تک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

"تم لوگ بوٹ کے ذریعے کیوں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ میں نے مجھے کانٹے پیٹنے کی جرات کی تھی میں نے گویا اسے قطعاً لائسنس نہیں دی تھی۔

میرے اس رد عمل سے مسز ڈی کے چہرے پر ایک لمحے کے ناچنے کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر وہ مسکرا دیا اور بولا۔ "لاصوب پر بھی تمہاری تجسس پسند طبیعت کو چین نہیں ہے۔ تم بٹ سے باز نہیں آ رہے۔ اگر سوال کرنا ہی ہے تو اپنی زندگی بٹ کے بارے میں کرو۔"

"میری زندگی کو تو اگر تم نے اپنی دانست میں موت میں تبدیل نہ کیا فیصلہ کر لی لیا ہے تو اب سوالات کرنے کا کیا فائدہ؟" میں نے

پوچھا سوال تم نے کیا ہے "فائدہ تو اس کا بھی کچھ نہیں ہے۔" "مسز ڈی نے کدھے اچکائے "تمہاری قتل کے لئے عرصہ تمہاری خفیہ ایجنسیاں تمام بکری اور ہوائی اڈوں کی نگرانی کر رہی ہیں۔ ہم چاہتے تو اپنے اپنے ملکوں کا اثر و رسوخ نا کر کے اس طرح واپس جاسکتے تھے کہ تمہارے اعلیٰ حکام اور خدمت کرنے والی اڈوں تک آتے لیکن ہمیں ہدایات کہ ہم بیشک کی طرح گناہ اور بد پوش ہی دیں۔ اس طرح ہمارے یہاں سے غائب ہو جائیں کہ کسی کو کانوں کان پتا نہ آ سکے گا چاہے تمہارے ہاں کے عام آدمی کو ہمارے بارے میں معلوم ہونے پائے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی باتیں ہیں۔"

از خاموش رہا۔ اس دوران میری سانس کی مشقیں جاری رہیں۔ صحیح طور پر استفادہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ بالکل حاصل ہوئی۔ میں مراقبے کی کیفیت میں چلا جاتا تھا مسز ڈی سے باتیں بھی کئے جا رہا تھا اور میری توجہ بھی بالکل طرف تھی۔ اس کے بازوؤں میں نے محسوس کیا کہ

حکومت مجھے اوپر لانے کے لئے تو کیا، ایک مقام پر رکھنے کے لئے؟  
ناگانی تھی۔ میں بدستور کسی محسوس مجسمے کی طرح بیٹھے ہی بیٹھے پا  
تھا۔

جسم تو تاریک سمندر کی گہرائیوں میں اتاری رہا تھا، میر  
ذہن پر بھی مایوسی کی دھند چھانے لگی۔ مجھے اپنا سانس دینے کے  
بھی کچھ دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ جس دو اکا نکشن مجھے  
کیا تھا وہ یقیناً خاصی خطرناک تھی۔

میں اس تاریکی میں کہیں موت کی آہٹ سن رہا تھا۔  
طرح طرح مجھ سے پہلے بھڑکی ہے، اس طرح مجھے بھی یکبارگی  
سا آیا۔ مجھ میں تو ناگانی کی جو روشنی موجود تھی میں نے اسے  
میں لانے کی کوشش کی اور ایک عزم نوکے ساتھ ہاتھ پاؤں پکڑ  
کی کوشش کی کہ کسی طرح نیچے جانے کے بجائے اوپر جا سکوں۔  
میری اس جدوجہد کا اٹھنا فائدہ ضرور ہوا کہ پانی میں  
اپنے پیدا ہوئی اور میری نیچے جانے کی رفتار جو پہلے ہی تندی  
کچھ کم ہو چکی تھی، مزید کم ہو گئی۔ چند لمبے بعد میں ایک جگہ  
سا ہو گیا۔ میں اپنے جسم پر کچھ چیزیں کالس محسوس کر رہا تھا۔  
وہ پھلیاں اور دوسری آبی مخلوقات تھیں جو مجھ سے ٹکرائی  
یا پھر شاید فی الحال صرف سوکھ رہی تھیں کہ اگر اس غلیظ  
مزاحمت نہ کی تو رات کے کھانے کے لئے مناسب رہے گی یا  
انہیں معلوم ہو جائے کہ مجھ میں مزاحمت کی جان نہیں تھی تو  
ذکر کا پروگرام کچھ جلدی ہی بنائیتھی۔

جب میرا نیچے جانے کا عمل رک گیا تو مجھے مگن مگر راک  
اب سمندر مجھے دوبارہ سطح کی طرف اچھال دے گا لیکن ایسا  
ہوا۔ سمندر کو بھی شاید میرے مرنے کا انتظار تھا۔ جب  
اور معدے و فیروہ میں پانی اچھی طرح بھر جاتا ہے، روح نفس  
سے پرواز کر جاتی ہے اور لاش پھول سی جاتی ہے سمندر بھی  
دھرتی کے اس بوجھ کو ٹوٹا ہے۔

میرے لئے سانس کو روکنا کچھ اور دشوار ہو رہا تھا۔  
ذرا اور بھرنے۔ میں نے ایک بار پھر ہاتھ پاؤں چلائے اس  
ہاتھ بیروں کو زیادہ تیزی سے حرکت دینے میں کامیاب ہو گیا  
شاید یہ میری جدوجہد نہیں تھی بلکہ دایم مرگ میں پھنسا ہوا  
بے بسی سے بھر کر رہا تھا۔

اچانک میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ مجھے یوں لگا جیسے  
انسانی بازو تھا۔ اس لئے میرا اپنے آپ پر ہنسنے کوئی چلا  
خیال تھا کہ صرف صحرائی انسان کو سراب میں جلا کر آج  
سے مرتے ہوئے انسان کو لالچ دیتا ہے کہ کچھ آگے پانی  
لیکن اب معلوم ہوا کہ سراب سمندروں میں بھی ہوتے  
ڈوبتے ہوئے انسان کو گمان گزرتا ہے کہ اس کے قریب کچھ  
بازو حرکت کر رہا ہے۔ شاید ہر ڈوبتے ہوئے انسان کو  
پہلے یہی دھوکا ہوتا ہو۔

دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ شاید وہ دھوکا

دور ایگر سائر کے لئے نکلے ہوئے نیوی کے جہاز نظر انداز ہیں۔ اگر  
سمندر میں ہنگامہ ہوا تو ہمارا سفر خطرے میں چڑ جائے گا۔ ہمیں  
خاموشی سے فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کوسٹ گارڈ کے  
جہاز پر دیسے بھی تباہ کن گھیس موجود ہوں گی۔

اس دوران تمام لامائیس آف ہو گئیں اور بوٹ نے جھر جھری  
سی لے کر گویا ایک غنی طاقت کے ساتھ سفر شروع کیا۔ اس کی رفتار  
چند سیکنڈ میں ہی تقریباً دو گنی ہو گئی۔

بوٹ کے پچھلے حصے میں بھی گویا اندھیرا ہو گیا تھا لیکن میں ان  
لوگوں کو بیروں کی کسی صورت میں دیکھ سکتا تھا۔ اس اندھیرے میں  
انجن کی خفیف سی گھر گھر ہٹ کے دوران مسزوی کی آواز ابھری۔  
"البرٹ! اب ہم افضل چوہدری کے ٹکڑے کسے کے متحمل تو  
نہیں ہو سکتے۔ تم صرف اس کی گردن تن سے جدا کر کے اسے  
سمندر میں پیسک دو۔ کوشش کرنا کہ بوٹ میں زیادہ خون نہ پھیلنے  
پائے۔ پتلا پھیلے" اسے بھی فوراً صاف کر دیا۔ بوٹ میں اس شخص  
کی موجودگی کی کوئی نشانی باقی نہیں رہی تھی۔

دراز قدرتوں پر جان چارے لے اچھل کر اسٹیج نما حصے پر چڑھ آیا۔  
میں نے ٹکڑے اندھیرے میں بھی چارہ کی جھلکناٹ محسوس کی لیکن  
اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب پہنچتا، میں لڑھک کر بوٹ کی بظنی  
دیوار تک پہنچا اور دونوں باتوں سے دیوار کو تمام کر اس کے اوپر  
سے ہوتا ہوا سمندر میں جا کر۔

وہ فاصلہ بہ مشکل دو فٹ تھا جو میں نے لڑھک کر طے کیا تھا  
اور اسٹیج نما حصے سے وہ دیوار تقریباً ایک فٹ اونچی تھی جسے میں نے  
بند جانے کس طرح پھلانگ دیا تھا۔ میں اس کام میں خاطر خواہ پھرتی  
دکھانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور چارہ والا نوجوان مجھے دوک نہیں  
سکتا تھا۔

اتنی دیر میں میرے جسم میں بس اتنی ہی جان آسکی تھی کہ میں  
یہ کام کر گزرا تھا۔ پانی میں کرتے ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں  
مزید کچھ کرنے کی سکت نہیں تھی۔ حیرتا میرے بس کی بات نہیں  
تھی۔ مجھے پہلے بھی اینڈیشہ تو تھا کہ شاید میں لڑھک کر پانی میں گرے  
کے بعد ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکوں لیکن ایک موبوم سی امید کے  
سارے میں نے وہاں بڑے بڑے چارے سے گردن کٹوانے کی نسبت  
سمندر میں کرنا بھر سمجھا تھا خواہ ڈوب جانا ہی میرا مقدر ہو۔

پانی میں ہاتھ پاؤں ہلا کر کچھ اور مشکل ہوتا ہے۔ میں نے بوٹ  
سے گرنے کے بعد فوری طور پر ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش بھی نہیں  
کی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سطح آب سے کالی نیچے چلا جاؤں  
تاکہ اگر بوٹ سے مجھ پر فائدہ وغیرہ کیا جائے تو مجھے کوئی نکلے کام سے  
کم امکان ہو۔

بحر میں نے محسوس کیا کہ میں تو کچھ زیادہ ہی نیچے جا رہا تھا۔  
مجھے امید تھی کہ اس دوران بوٹ اپنی تیز رفتاری کے باعث کافی  
آگے نکل چکی ہوگی اس لئے میں نے ہاتھ پاؤں مار کر را اور آنے  
کی کوشش کی۔ میرے ہاتھ بیروں نے معمولی سی حرکت کی لیکن یہ

آسانی ہوگی اور میں ذرا تیزی سے اوپر جاؤں گا۔

میں نے جس وقت سطح آب سے سر اٹھایا، مجھے یوں لگا کہ اگر میں مزید چند سینکڑ پانی میں رہتا اور سانس روکے رکھتا تو میرے پھیپھڑے پھٹ جاتے۔ سطح آب پر کیا آیا تھا گویا پانی کی ایک گرمی قبر سے برآمد ہوا تھا اور مجھے ایک نئی زندگی ملی تھی۔

چند سینکڑ تک تو مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پہلے ہی کی طرح آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہا۔ صرف یہ احساس ہوا کہ میرا سر پانی سے باہر نکلا تھا۔ میرے جسم کا تمام خون گویا کینٹین میں جمع ہو گیا تھا اور میرے ارد گرد آدھ جہاں سی چل رہی تھیں۔ کچھ دیر تک میں دیوالی گھوڑے کی طرح شول شول کرتا رہا اور ٹانگ منہ سے پانی کے پھینکے اڑاتا رہا۔

مجھے اوپر لانے والے نے اب ذرا بہتر طور پر مجھے سسارایا ہوا تھا۔ ٹنگے اندھیرے میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شفیع شاہ ہی تھا۔ میں خود بھی کوشش کر رہا تھا کہ سطح آب پر شفیع شاہ کا سہارا لے کر تھرا رہوں۔ اس دوران انجی کی گھر گھبراہٹ قریب آنے لگی۔ پھر ایک بڑا سایہ ہلا ہمارے قریب آیا۔ وہ ہمارا ڈالر تھا لیکن اس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

کسی نے رتی کی میڑھی اور ایک فاضل رتی نیچے پھینکی۔ شفیع شاہ نے رتی کا پھندا میرے سینے کے گرد بانڈوں کے نیچے بٹھایا۔ ایک اور شخص ڈالر سے اتر آیا۔ ان دونوں نے سہارا دے کر مجھے ڈالر پر چڑھایا۔ ڈالر کی ساخت عام موزوں سے کچھ مختلف ہوئی ہے۔ میں صرف چند لمحوں کے ساتھ بڑبڑ پر چت لیٹا رہا اور گرمی گرمی سانسیں لیتا رہا۔

شفیع شاہ اس دوران میرے ہاتھ پاؤں سسلا رہا اور بچی آواز میں پوچھا رہا "سرا آپ ٹھیک تو ہیں۔ سرا آپ ٹھیک تو ہیں؟"

وہ خود بھی ہانپ رہا تھا اور اس کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ میں خاموش چت لیٹا آسمان کو دیکھتا رہا جس پر کہیں کہیں کوئی آرا جھلکا رہا تھا۔ شاید یہ امید کے تارے تھے جو کچھ دیر پہلے میری نظر سے اوجھل ہو گئے تھے۔ دنیا کو دوبارہ دیکھنا کتاب ہلا لگ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں فکر کے آنسو آگئے۔ زندگی کی قدر تو مجھے پہلے بھی تھی۔ قدم قدم پر میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ زندگی قدرت کا ایک انمول عظیمہ تھی لیکن جس وقت انسان موت کو چھو کر واپس آتا ہے یا موت انسان کو چھو کر لپٹ جاتی ہے تب زندگی کی قدر و قیمت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اگر شفیع شاہ کچھ دیر اور مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہتا تو شاید تاریک سمندر کی نہ میں میری زندگی کی شام ہو جاتی۔

"سرا آپ ٹھیک تو ہیں؟" شفیع شاہ نے ایک بار پھر ایک مشتق ہاں کی طرح آہستگی سے مجھے ہلاتے بولتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ایک عزم نو کے ساتھ جواب دیا اور اس لمحے میں نے واقعی خود کو موت بہتر محسوس کیا۔ یہی بس سانسوں کے ساتھ تازہ ہوا گویا زندگی کی یا بہرہ ور کر

کیونکہ جو نئی میرا ہاتھ اس بازو سے کھرایا وہ تیزی سے لہرایا جیسے اس تیل اندھیرے میں مجھے تلاش کر رہا ہو۔ پھر میرا ہاتھ اس ہاتھ سے کھرایا اور اس نے یکدم میرے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

جب مجھے احساس ہوا کہ وہ تیل اور سفاک اندھیرا جو مجھے نکل جانے کے لئے بے تاب تھا، میں اس میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے قریب ہی ایک اور انسانی جسم بھی موجود تھا جس نے گویا مجھے "دربافت" کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ پھلکی کی طرح پڑک اٹھا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا اس نے مجھے گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ صرف میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر لے جانے لگا۔ ڈوبے انسان کو بچانے والے کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ ڈوبتا ہوا شخص اسے بری طرح چٹ جاتا ہے اور یوں بعض اوقات اپنے ساتھ اسے بھی لے اڑتا ہے۔ لیکن میں اس وقت فیرا راوی طور پر بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھ میں اتنی سکت ہی نہیں تھی اگر مجھ میں سکت ہوتی تو میں ڈوب نہ رہا ہوتا۔

میرے دھندلاتے ہوئے ذہن میں ایک لمحے کے لئے اس اندیشے نے بھی سر اٹھایا کہ میرا ہاتھ تمام کرکھے اوپر لے جانے کی کوشش کرنے والا نہیں کوئی سفید نام ہی تو نہیں تھا جس نے مجھے سمندر میں لڑھکتے دیکھ کر میرے قنائب میں جھلنا تک لگا دی تھی؟ وہ لوگ جس طرح میرے خون کے پاس تھے اور جس طرح مجھے عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کے جنون میں مبتلا تھے، اس دھکے پڑنے نظر تو یہ بھی کچھ بعد نہیں تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ گوشت کارڈ کے جہاز کو دیکھنے کے بعد وہ کچھ نہ کچھ بد احساس ضرور ہو گئے تھے۔ انہوں نے بوٹ کی رفتار بھی حتی الامکان بڑھوائی تھی اور لائنیں بھی آف کرا دی تھیں۔ وہ ہر حال کی جہاز کو ڈانچ دے کر نکل جانے کی فکر میں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی میرے چکر میں الجھ کر وہیں سمندر میں غوطہ کھاتے رہنے کا عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دیئے بھی انہیں یہ تو یقین ہو گا کہ سمندر کی لڑھکتے کے بعد بھی مجھ میں جان بچانے کی سکت تو نہیں تھی؟ دینے کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت میں انہیں یہی طرف سے سہرا جانا چاہئے تھا۔ مقصد تو مجھے ہلاک کرنا ہی ہے۔

اس کا مطلب تھا کہ میری تلاش میں سمندر کی گہرائیوں میں کھنڈیاں ماسنے والا وہ شخص میرا دشمن نہیں دوست تھا۔ شاید شفیع شاہ آخر کار میری مدد کو آن پہنچا تھا۔ آخر کو کہ بہت ہو چکی تھی ان قیمت تھا کہ وہ آدھ تو کیا تھا۔

شاید اسے محسوس میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر لے جانے میں دقت نہ آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے خود بھی غور سے بہت تو پاؤں مارنے چاہئے تھے۔ بڑی کوشش سے میں ناموں کو کچھ دے دینے میں کامیاب ہوا۔ اس سے مجھے اوپر کھینچنے والے کو کچھ

میرے پیچڑوں میں داخل ہو رہی تھی اور میرے رگ و پے میں توانائی کی لہریں دوڑا رہی تھیں۔ میں جس میر آزما سرطے سے گزرا تھا شاید اس کا مجھے یہ فائدہ بھی ہوا تھا کہ میرے جسم سے کافی تیزی سے دوا کے اثرات ختم ہو رہے تھے۔

اس دوران میں نے محسوس کیا کہ زرارہ کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ میں شفیع شاہ کا سارا لے کر اٹھ بیٹھا۔ وہ زرب کچھ بڑا رہا تھا۔ میں نے ذرا توجہ سے سنا تو یہاں تک کہ وہ نہایت خشک و خضوع سے خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں شفیع شاہ؟“ میں نے تاریکی میں غفر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”سراہم ”سر نس“ کے تعاقب میں جا رہے ہیں لیکن ہم آپ کو ڈھونڈنے میں لگ گئے تھے۔ اس لئے اس سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ ہم اسے پکڑ سکیں گے۔ زرارہ ویسے بھی خیر قدری میں اس قسم کی موثر ٹولس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ شفیع شاہ نے جواب دیا۔

”کوئٹہ گاؤں کا ایک جہاز بھی تو آتا دکھائی دیا تھا۔۔۔ اس کا کیا پایا؟“ میں نے تھابت ذہن سے پوچھا۔

میں غلط سمت میں دیکھ رہا تھا۔ شفیع شاہ نے آہستگی سے مجھے دوسری طرف گھمایا۔ ادھر بہت دور کچھ روشنیاں جھلکتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”وہ کوئٹہ گاؤں کا جہاز ہے۔“ شفیع شاہ بولا ”وہ بھی ”سر نس“ کا تعاقب کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن مجھے نہیں ہے وہ بھی رفتار میں اس طاقتور فینسی اور ہلکی پھلکی موثر ٹولس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرا اندازہ ہے کہ موثر بوٹ اسے جیل دے کر نکل چکی ہے۔“

”لیکن۔۔۔ یہ کوئٹہ گاؤں کا جہاز اچانک اس طرف کیسے آ نکلا تھا۔ اور اسے کیسے معلوم ہوا کہ سمندر کے اس حصے میں حالات کچھ مشکوک ہیں؟“ میں نے انہیں سے پوچھا۔

”یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا سر“ شفیع شاہ بولا۔

میں ایک طرف مل سانس لے کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا ”تم کہاں رہ گئے تھے؟ بڑی آخر سے میری مدد کے لئے پہنچے؟“

”ہم جب زرارہ میں قاسم بجلی کے گھر کے عین قریب منزلہ رہے تھے تو اچانک ہی ایک دوسری موثر بوٹ اور دو چھوٹی لالچوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ ان میں قاسم بجلی کے مسلح آدمی تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نازک کے ساتھ سے ہٹاؤں گا اور مزید لوگ ادھر آجائیں۔ بس وہ چند لمحے کی ہچکچاہٹ ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ انہوں نے ہمیں قابو میں کر لیا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں اب بے تاب محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری حالت مزید بہتر ہو رہی تھی۔

”اسی دوران ہم نے کچھ گاڑیاں قاسم بجلی کے گھر سے نکلتے

اور بوٹ ہاؤس کی طرف جاتے دیکھیں۔ بہت دیر سے آپ کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی یہ پتا چل رہا تھا کہ اس گھر کے اندر کیا ہو رہا تھا۔ ہمیں پریشانی ہانپنے والے ہمیں کسی اور جزیرے کی طرف لے جانے کی گھر میں تھے۔ بہر حال وہ تھے قاسم بجلی کے آدمی۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کے ساتھ کچھ گزرا ہو چکا تھی۔ ہم نے سوا قریب پاتے ہی سبالت الٹ دی۔ ان میں سے دو تین آدمی مارے گئے اور باقی بھاگ گئے۔ ہم بوٹ ہاؤس کی طرف آئے تو ”سر نس“ وہاں سے غائب تھی۔ ہم اس کی تلاش میں ابھر اُدھر بھاگے۔ ہم اس وقت اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے جس وقت دوسری طرف سے کوئٹہ گاؤں کا جہاز بھی نمودار ہو چکا تھا۔ پھر ”سر نس“ پر لائنس آف ہو گئیں۔ جب ہم اس کے اور قریب پہنچے تو مجھے احساس ہوا کہ بوٹ پر سے کسی کو سمندر میں پھینکا گیا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ وہ آپ تھے۔“

”تمہارے دل نے ٹھیک کہا تھا لیکن مجھے پینکا نہیں کیا تھا۔ میں خود گمراہ تھا۔“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”بہر حال۔۔۔ سمندر کی وسعتوں اور اس انداز سے میں کسی بھی بات کا صحیح پتا تو چل نہیں رہا تھا۔ یہ ساری بھاگ دوڑ اور مہم آرائی اندازوں پر ہو رہی تھی۔ ہم نے بھی اپنی لائنس بجھائی ہوئی تھیں۔ بہر حال میں آپ کی تلاش میں کوڑ بڑا۔ اس انداز سے میں آپ کو تلاش کرنا سمندر میں پھینکا جانے والا کوئی سکہ تلاش کرنے کے حراف تھا چونکہ آپ کے ذرا بھی ہاتھ پاؤں مارنے کے آثار دکھائی نہیں دیئے تھے اس لئے طرح طرح کے دوسرے میرے دل میں آرہے تھے۔“

”میں ہاتھ پاؤں مارنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ انہوں نے میری بے ہوشی کے دوران مجھے کسی دوا کا انکشن لگایا تھا جس نے مجھے ابھی تک ناکارہ بنا رکھا ہے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

”اوہ۔۔۔!“ شفیع شاہ کمری سانس لے کر رہ گیا ”میں سمجھ رہا تھا کہ اگر سمندر میں گرنے والے آپ ہی ہیں تو آپ یقیناً کم از کم بے ہوش یا ضرور ہیں یا پھر شاید آپ کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں یا پھنسے۔“

”یا پھر مجھے ہلاک کرنے کے بعد سمندر میں پھینکا گیا ہے۔“ میں نے جملہ مکمل کیا۔ وہ خاموش رہا تو میں نے کہا ”اس میں بس بال برابر کمرہ لگی تھی ورنہ ہمیں یہاں دھڑکیں اور ”سرکس اور تلاش کرنا پڑتا۔ شاید دونوں ہی چیزیں نہیں نہ تھیں۔“

”اکیس بد فال منہ سے نہ نکلیں۔“ شفیع شاہ دور جھلکتی متحرک روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ٹھیک ہوا ہمارے پیچھے جھوسوں میں پھریراں دوڑائی گزری تھیں۔ ہوائی شاخیں شاخیں اور انہیں کی گھر گھر اہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد شفیع شاہ بولا ”لگتا ہے کوئٹہ گاؤں کا جہاز ”سر نس“ کا سراغ کچھ بیٹھا ہے اور انداز ہے میں ادھر ادھر تک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ جبکہ ہم تو اس سے بھی بہت پیچھے

اُڑا دیا؟" میں نے کمری سانس لے کر کہا۔  
 "آپ دیکھ رہے تھے سرکہ اس کے سوا کوئی چاہ نہیں تھا  
 شفیع شاہ جیسے بچے میں بولا۔

"میرا خیال ہے بوٹ کے ساتھ ان سب لوگوں کے بھی پر  
 اُڑ گئے ہوں گے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں، آزادہ اسکان تو کیسی ہے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا:  
 کچھ ٹیکنیکل اصطلاحیں استعمال کرنے کے بعد بولا "یہ آریہ  
 اوسط درجے کے ایک بحری جہاز کے پرچے اڑا دینے کے لئے کا  
 تھا۔ آریہ زو عام طور پر صرف بحری جہازوں کے چہرے میں سورا  
 کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں لیکن یہ بہت مختلف قسم  
 آریہ زو تھا۔"

"تم لوگ اب مجھ سے بالا ہی بالا کام کرنے لگے ہو۔ باقی  
 ہوئے جارہے ہو۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا "کچھ کچھ  
 دہشت گرد بھی معلوم ہونے لگے ہو۔"

شفیع شاہ نے لگا سا قہقہہ لگایا "سرا! ان لوگوں سے دوسرے  
 طریقوں سے کہاں نشتا جاسکتا ہے۔ پھر اس نے سنجیدگی سے پوچھا  
 "سرا آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

"تم ہمارا سنگی کی بات کر رہے ہو شفیع شاہ! میں نے آہ بھر  
 کر کہا "مجھے تو افسوس ہوا ہے کہ یہ نیک کام میں اپنے ہاتھ سے  
 کیوں نہیں کر سکتا۔ یہ تو ہمارے فیرنگل دشمن تھے خود ہمارے  
 اپنے بہت سے ہم وطن ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا دل چاہتا

ہے کہ انہیں کسی بہت بڑے بحری جہاز میں بھر کر سمندر میں کہیں  
 بہت دور لے جا کر اس جہاز کو اسی طرح کسی بہت طاقتور آرمیڈ  
 سے آزادوں اور اوپر سے احتیاط کسی ایسی دوا کا اسپرے بھی  
 کراؤں جس سے ان کے جراثیم دوبارہ ہمارے ملک تک نہ پہنچ

سکیں۔ لیکن کیا کروں ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم  
 لگے۔ تم نے جو کچھ کیا "اچھا کیا۔ کسی حد تک ترقی پاگ ہوا۔"  
 دور جھللاتی روشنیوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوئٹہ گارڈ

جہاز اب تک "پرنس" کے نقاب میں غلط سمت میں سفر کر رہا  
 تھا۔ اب جہاز پر موجود لوگوں نے شاید بہتر طور پر دھماکا سن لیا تھا  
 اور بوٹ کے پرچے اُڑنے کا منظر بھی دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ ہماری

نسبت بھر بھی اس مقام سے زیادہ قریب تھے۔ اب جہاز کا رخ اسی  
 طرف ہو گیا تھا جہاں پانی کی سطح پر کچھ شعلے رقصاں دکھائی دے  
 رہے تھے۔ یہ پانی کے سینے پر ٹک کا رقص تھا۔ ہمارا نثار بھی حتی

الاسکان تھوڑا فاصلے سے اس سمت میں رواں تھا۔  
 "میں یہ کوئٹہ گارڈ کا جہاز بھی تمہاری ہی وجہ سے تو نہیں  
 آیا ہے؟" میں نے اب ذرا سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے شفیع شاہ کو  
 اندھیرے میں کھوہا۔ اب میں اپنے آپ کو اس قابل محسوس کر رہا

تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔  
 "نہیں سرا! اس جہاز پر آپ کو کچھ ایسے لوگ ملیں گے جنہیں  
 دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔"

جی۔  
 "اس کا مطلب ہے وہ لوگ نکل جائیں گے! میرے حلق  
 سے بے اختیار گرا دی نکل گئی۔

"سرا آپ چاہتے ہیں وہ بھاگنے نہ پائیں؟" شفیع شاہ نے گویا  
 تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے" اس کے علاوہ میں کیا چاہوں گا؟ ساری تکلیف  
 اس لئے تو نہیں اٹھائی تھی کہ آخر میں یہ لوگ اطمینان سے  
 رخصت ہو جائیں۔ مجھے اپنی بے بسی پر جھنجھلاہٹ محسوس ہو رہی  
 تھی۔

"سرا وہ لوگ اب زندہ تو ابھ نہیں آسکتے۔ آپ اجازت دیں  
 تو انہیں اگلے جہاں پہنچایا جاسکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"  
 "سرا میں نے ایک کام آپ کی اجازت کے بغیر ہی کر ڈالا تھا۔  
 آپ سے اجازت لینے یا مشورہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ آپ  
 صرف یہ بتائیں کیا ان کے بھاگ جانے کی نسبت ان کا مر جانا بہتر  
 نہیں ہے؟"

"یقیناً بہتر ہے۔"  
 "نہیں تو پھر ٹھیک ہے۔" شفیع شاہ نے چوٹی نشست کے نیچے  
 سے سیاہ رنگ کا ایک ریڈیو سا نکالا۔ اس کے ایک کونے سے اس  
 نے کھینچ کر ابریل نکالا اور اسے ہوا میں بلند کرتے ہوئے ایک من  
 دباریا۔

بہت دور کہیں سے دھماکے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ دھماکا  
 یقیناً زوردار ہوا ہو گا لیکن ہم تک اس کی آواز بہت ہلکی پہنچی تھی۔  
 فاصلہ بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے تاریکی میں چاندوں طرف  
 نظر دوڑائی۔ ایک جگہ مجھے کچھ جھلجھلائی سی چمکتی دکھائی دیں۔ پھر  
 نیچے نیچے شعلوں کے بالائی سرے لہراتے دکھائی دیے۔

بچپن میں جنراٹھے میں زمین گول ہونے کے کچھ ثبوت پڑے  
 تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سمندر میں دور کی چیزوں کے  
 صرف بالائی حصے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت شاید یہی ہو رہا تھا۔  
 ہمیں منظر پر ادھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے شفیع شاہ کی طرف دیکھے  
 ہوئے پوچھا "کیا تم نے "پرنس" کے کسی حصے میں ریڈیو کنٹرولڈ  
 آریہ زوٹ کر دیا تھا؟"

"جی ہاں" شفیع شاہ نے آہستگی سے جواب دیا "مجھے ایک  
 مناسب موقع نظر آیا تھا۔ یہ قاسم علی کے آرمیوں کے ہتھے چڑھنے  
 سے کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ میں نے سوچا فقط مقدمے کے طور

پر کچھ کر دینا چاہئے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ بوٹ کسی ایسے کام میں  
 استعمال ہوگی جسے ہم ہوتے دیکھنا نہیں چاہیں گے لیکن شاید ہم  
 اسے روکنے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ میرا  
 اندیشہ درست ہی تھا۔"

"چنانچہ تم نے موثر بوٹ کو اس ریڈیو کنٹرولڈ آریہ زو سے

”مثلاً؟“

مول لے بغیر جگت اور خاموشی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا اور نہ جس طرح مجھے موقع پر پہنچنے میں تاخیر ہوگئی تھی، اگر وہ بھی نہ نمودار ہوتے تو ریڈ ڈاٹ والے تو آپ کی چٹائی کو چیتے۔“

”لیکن اب بھی ریڈ ڈاٹ والوں کا مسئلہ تسماری ہی کو ششوں اور پیش بندی سے ہوا۔ اگر تم نے ”پرنس“ کے ساتھ شخص اسیٹاٹا مارینڈوٹ نہ کیا ہوتا تو ہم سب ان کی تلاش میں ٹانگ لڑیاں مار رہے رہتے اور وہ صاف نکل جاتے۔“ میں نے کہا۔

”چلیں اسی طرح کام ہو جاتا ہے۔ کچھ فائدہ ہمیں نفیس صاحب کی طرف سے پہنچ جاتا ہے۔ کچھ کام ہم خود کر لیتے ہیں۔ اب تو مجھے حوصلہ ہونے لگا ہے کہ ہمارا یہ چھوٹا سا دوستوں اور خیر خواہوں کا گروپ ”دی سرکل“ بہت بڑے بڑے کام سر انجام دے سکتا ہے۔“ شفیع شاہ بولا۔

”لگتا ہے تم لوگوں کی وجہ سے مجھے بھی نفیس صاحب کو برداشت کرنا پڑا کرے گا۔ میرے ساتھیوں میں ان کی لابی مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔“ میں نے غم ٹانگ لیجے میں کہا۔

شفیع شاہ بگلی سی ہنسی کے ساتھ بولا ”سرا یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان جیسے آدمی کے ساتھ ہمارے ایسے تعلقات ہو گئے ہیں کہ وہ ہر مسئلے پر خود ہمارے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کے لئے چلے آتے ہیں ورنہ ان کے تو محض ایک ٹیلی فون پر بند جانے کیاتے کیا ہو جاتا ہے۔ اور ان کی صرف ایک نظر کرم کے لئے نہ جانے کیسے کیسے لوگ کیا کیا جتن کرتے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ مجھے ان کا جغرافیہ مت بتاؤ۔ کسی زمانے میں میں نے ان کے ساتھ بہت مغز ماری کی ہے۔ جب تک وہ ہم پر مہربان ہوئے تب تک ہمارا لمبیہ عن گہاپ۔“ میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

شفیع شاہ مجھے سہارا دیتے ہوئے بولا ”آپ آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟“

”کئی ماہ کا تیار۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن پھر بھی پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ جب میں ”پرنس“ پر تھا اس وقت تو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا انتقال پڑا ل ہو چکا ہے لیکن کسی ماسٹروم وجہ کے تحت ذہن کسی حد تک کام کے جا رہا ہے۔“

”اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اندر لے چلوں۔ آپ آرام سے لیٹ جائیے۔“

”یہ لیٹنے کا وقت نہیں ہے بارے!“ میں نے صحیح طور پر کھڑا ہوتے ہوئے کہا ”یہ خوش کن نظارہ دیکھنے کے لئے تو شاید میں بہتر مرگ سے بھی اٹھ کھڑا ہوتا کہ یک وقت ریڈ ڈاٹ کے سات خاص آدمی جنم رسید ہو گئے ہیں۔“

”کیا ان لوگوں میں ڈاکٹر برنارڈ بھی شامل تھا؟“ شفیع نے پوچھا۔

”نہیں“ میں نے جواب دیا ”قدرت شاید ہماری مزید مدد کرنا چاہتی ہو۔ شاید وہ ابھی ملک میں ہی موجود ہو۔ اگر وہ بھی اس بوٹ

”آفس! اب مجھے ذہان کھولنا ہی پڑے گی۔“ شفیع شاہ کراہ کر بولا۔

”آپ سے بالا بالا تصور اساکام راجیلہ نے بھی کیا ہے سرا وہ آج صبح کراچی پہنچ چکی تھی۔“

”اور!“ میں نے گویا تکلیف کے عالم میں کہا ”تم سب اب باقی ہوتے جا رہے ہو۔ میں ”دی سرکل“ کو توڑ دوں گا۔ جس کے جو دل میں آئے کرتے پھرتا۔“

شفیع شاہ میری مصنوعی فحش سے متاثر ہونے کے بجائے بگلی سی ہنسی کے ساتھ بولا ”سرا اپنا پنجوٹ موٹ کا غصہ ذرا بچا کر رکھیے۔ ابھی تو میں آپ کو ایک اور ”سوسے پر ساگا“ قسم کی خبر سنائے والا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے گویا سہم کر پوچھا۔

”اس کے ساتھ نفیس صاحب بھی ہیں۔ راجیلہ اکیلی نہیں آئی ہے۔“

”سرا بولا۔“ میں کراہ کر دوبارہ سانس پر بیڑہ کیا گویا میری ہانکوں سے جان نکل گئی ہو۔ میں صرف ایک ٹنگ ہی نہیں کر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس اطلاع سے مجھے حیرت کا ہنسا لگا تھا۔

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”کوسٹ گارڈ کے جہاز پر کوسٹ گارڈز والوں کے ساتھ ورامل راجیلہ اور نفیس صاحب ہی موجود ہیں۔ ممکن ہے نفیس صاحب کے ساتھ ان کے اپنے بھی کچھ آدمی موجود ہوں۔“

”راجیلہ کو تم نے بلوایا ہے؟“ میں نے شفیع شاہ کو گھورا۔

”نہیں سرا مجھے تو اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ خود ہی آئی ہے۔ اسے تو معلوم ہی تھا کہ آپ اس جزیرے پر قاسم بگلی کے ہاں آ رہے ہیں۔“

”اور وہ یہ بات نفیس صاحب کو بتائے بغیر نہیں رہ سکی۔“ میں نے مصنوعی آفس سے کہا ”حالا ملک میں اپنی دانست میں نفیس صاحب سے چھپ کر اور بمانہ بنا کر یہاں آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے راجیلہ اب کوئی بات ان حضرت کو بتائے بغیر نہ ہی نہیں سکتی۔“

”چلیں کوئی حرج نہیں سرا ان سے ہمیں کوئی مدد ہی ملتی ہے۔ ہماری طاقت ہی بڑھتی ہے۔“ شفیع شاہ نے غرض دل سے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نفیس صاحب کے پاس کچھ زیادہ ہی پاور ہے بارے! ہم جیسے چھوٹے سوسے لوگوں کو تو ان سے مدد نہ بھی مانگا پڑتا ہے۔ ہم لوگ خاموشی سے اپنا کام کر گزرنے کے عادی ہیں۔ وہ دھرم دھڑکے سے آتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو۔ کوسٹ گارڈ کا جہاز لے چلے آ رہے ہیں۔ شکر ہے پورا بحری بیڑا لے کر نہیں آ گئے۔“

”ان کی آمد سے فائدہ تو ہوا ہے سرا۔“ شفیع شاہ مجھے قائل کرنے پر مٹا ہوا تھا ”انہی کی وجہ سے تو ریڈ ڈاٹ والوں نے تصادم

میں ہوا اور اس کے بھی پر پہنچے اور جانے تو شاید مجھے زندگی بھر  
 چھٹا اور ہوتا۔ اب ایک آس رہے گی کہ وہ بھی نہ بھی ہاتھ لگ سکتا  
 ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اس پراسرار سی لڑکی کے بارے میں بھی  
 تجسس رہے گا جس کی آنکھیں آنکھیں کی ہیں۔ مظلوم نہیں وہ  
 کون ہے اور کہاں غائب ہے۔ ریڈ ڈاٹ کے جن لوگوں کے بارے  
 میں ہمیں علم تھا، ان میں سے اب صرف یہ وہی باقی رہ گئے ہیں جو  
 ابھی ہمارے ہتھے نہیں چڑھے۔ اگر یہ دونوں بھی اپنے انجام کو پہنچ  
 جائیں تو شاید ہم یہ کہہ سکیں کہ ریڈ ڈاٹ کا قتل قح ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر  
 برنارڈ کو انجام تک پہنچانے سے پہلے اس سے راجیلہ کا چہرہ بھی  
 ٹھیک کرانا ہو گا۔

اس دوران ہم اس مقام کے قریب پہنچ چکے تھے جہاں  
 ”پرنس“ دھماکے سے تباہ ہوئی تھی۔ وہاں ابھی تک سمندر کے  
 پتے پر شعلوں کا رقص جاری تھا۔ وہ براہی عجیب سا تھا۔ واقعی  
 ایسا مظلوم ہو رہا تھا کہ سمندر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پانی سے شعلے  
 اٹھ رہے تھے۔

دراصل پانی کی سطح پر بہت سا تیل پھیل گیا تھا جس نے آگ  
 پکڑ لی تھی۔ اس کے علاوہ بوٹ کے بعض ٹکڑوں میں بھی آگ لگی  
 ہوئی تھی جو ابھی تک زور و اثر سے تیر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے  
 ساتھ شاید انسانی گوشت کے ٹکڑے بھی چپکے ہوئے تھے جو کولر  
 ہو چکے تھے اور فضا میں گوشت پلنے کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

کوئٹہ گاڑ کا جہاز اب بھی بڑا نہیں تھا۔ اس کے عرشے پر مشین  
 گنیں فٹ تھیں۔ جہاز اور ہمارا زائر ایک دوسرے سے کافی دور  
 رہتے ہوئے نیم دائرے میں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں  
 چارے تھے۔ یوں دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے دائرے میں  
 گھوم سکتے تھے۔ اب انجن اسٹارٹ کر لئے گئے تھے تاکہ پانی کا مبادو  
 انہیں زور دے دے لے جائے۔ میں نے دیکھا جہاز کی رفتار کے  
 عقب میں کئی افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو ہماری طرف دیکھ کر  
 ہاتھ ہلا رہے تھے۔

وہ راجیلہ اور نہیں صاحب تھے۔ اب ہمارے زائر پر بھی  
 لائنیں آن ہو چکی تھیں۔ راجیلہ اپنے مخصوص طے میں تھی یعنی  
 اس کا پورا چہرہ اور سر رقع کی سیاہ نقاب اور گہرے رنگ کے گلاسز  
 میں چھپا ہوا تھا۔ اب شاید اسے رات میں بھی ڈارک گلاسز کے  
 ساتھ کوئی سم انجام دینے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ وہ زور  
 جدید کی کوئی خاتون۔ خری توان مظلوم ہو رہی تھی۔ میں نے بھی جھٹکے  
 جھٹکے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس نے جھج کر کچھ کہا جو فاصلے اور  
 انجنوں کی گھر گھر ہٹ کی وجہ سے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

تب نہیں صاحب گویا کچھ اٹھانے کے لئے جھٹکے۔ جب وہ  
 دوبارہ سیدھے ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک میکانی فون تھا۔ وہ  
 میکانی فون پر بولے ”اب یہاں کچھ نہیں رکھا۔ قاسم بجلی کی گھڑی  
 طرف واپس چلو۔ وہیں بات کریں گے۔“

شفیع شاہ نے اسے کمپین کو اس ہدایت پر عمل کرنے کا حکم دیا  
 اور زائر مزید تھوڑا سا گھوم کر واپس روانہ ہو گیا۔ کوئٹہ گاڑ کا  
 جہاز اب ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

اس دوران ہم اس مقام کے قریب پہنچ چکے تھے جہاں  
 ”پرنس“ دھماکے سے تباہ ہوئی تھی۔ وہاں ابھی تک سمندر کے  
 پتے پر شعلوں کا رقص جاری تھا۔ وہ براہی عجیب سا تھا۔ واقعی  
 ایسا مظلوم ہو رہا تھا کہ سمندر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پانی سے شعلے  
 اٹھ رہے تھے۔

دراصل پانی کی سطح پر بہت سا تیل پھیل گیا تھا جس نے آگ  
 پکڑ لی تھی۔ اس کے علاوہ بوٹ کے بعض ٹکڑوں میں بھی آگ لگی  
 ہوئی تھی جو ابھی تک زور و اثر سے تیر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے  
 ساتھ شاید انسانی گوشت کے ٹکڑے بھی چپکے ہوئے تھے جو کولر  
 ہو چکے تھے اور فضا میں گوشت پلنے کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

کوئٹہ گاڑ کا جہاز اب بھی بڑا نہیں تھا۔ اس کے عرشے پر مشین  
 گنیں فٹ تھیں۔ جہاز اور ہمارا زائر ایک دوسرے سے کافی دور  
 رہتے ہوئے نیم دائرے میں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں  
 چارے تھے۔ یوں دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے دائرے میں  
 گھوم سکتے تھے۔ اب انجن اسٹارٹ کر لئے گئے تھے تاکہ پانی کا مبادو  
 انہیں زور دے دے لے جائے۔ میں نے دیکھا جہاز کی رفتار کے  
 عقب میں کئی افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو ہماری طرف دیکھ کر  
 ہاتھ ہلا رہے تھے۔

وہ راجیلہ اور نہیں صاحب تھے۔ اب ہمارے زائر پر بھی  
 لائنیں آن ہو چکی تھیں۔ راجیلہ اپنے مخصوص طے میں تھی یعنی  
 اس کا پورا چہرہ اور سر رقع کی سیاہ نقاب اور گہرے رنگ کے گلاسز  
 میں چھپا ہوا تھا۔ اب شاید اسے رات میں بھی ڈارک گلاسز کے  
 ساتھ کوئی سم انجام دینے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ وہ زور  
 جدید کی کوئی خاتون۔ خری توان مظلوم ہو رہی تھی۔ میں نے بھی جھٹکے  
 جھٹکے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس نے جھج کر کچھ کہا جو فاصلے اور  
 انجنوں کی گھر گھر ہٹ کی وجہ سے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

تب نہیں صاحب گویا کچھ اٹھانے کے لئے جھٹکے۔ جب وہ  
 دوبارہ سیدھے ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک میکانی فون تھا۔ وہ  
 میکانی فون پر بولے ”اب یہاں کچھ نہیں رکھا۔ قاسم بجلی کی گھڑی  
 طرف واپس چلو۔ وہیں بات کریں گے۔“

شفیع شاہ نے اسے کمپین کو اس ہدایت پر عمل کرنے کا حکم دیا  
 اور زائر مزید تھوڑا سا گھوم کر واپس روانہ ہو گیا۔ کوئٹہ گاڑ کا  
 جہاز اب ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

ایک حصہ کسی کھاڑی کی طرح نکرا تھا۔ جس کا ہمارا اثر بھی کنارے تک جاسکتا تھا جبکہ زیادہ تر موٹر لوٹس توڑاڑ سے بھی پھول اور ہلکی ہوتی تھیں۔ ان کے لئے تو یہاں بھی آسانی سے پوت ہاؤس بن سکتا تھا۔

کوئٹہ گارڈ کا جہاز الہت کنارے تک نہیں آسکا۔ اسے کچھ اور کمرے پانی میں ہی نظر انداز ہونا پڑا۔ اس وقت سپیدہ عمر نمودار ہوا تھا۔ راجیلہ، نفیس صاحبہ اور کوئٹہ گارڈ کے دس جوان تین چھٹی کشتیوں میں بیٹھ کر کنارے تک آئے وہ سب کے سب مسلح تھے اور کانٹو معلوم ہو رہے تھے۔

قاسم علی کا چاٹاڑی پر استاذہ قلعہ نما مکان قلعے اندر جرنے میں لپٹا ہوا تھا۔ مکان کی طرف جانے والے راستے اور گیٹ پر بھی کوئی لائٹ آن نظر نہیں آ رہی تھی۔

راجیلہ اور نفیس صاحبہ نے پہلے میری اور شفیع شاہ کی خبر و عاقبت دریافت کی۔ نفیس صاحبہ کا موزو خٹکواڑی معلوم ہوتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے "تم تو مجھے گولی دے کر آگے تھے لیکن راجیلہ نے مجھے حالات سے آگاہ کرنا بھڑکھا۔"

"یہ لوگ آپ مجھ سے زیادہ آپ کے ساتھی ہوتے جارہے ہیں۔" میں نے غصہ لہجے میں کہا "گلتا ہے یہ لوگ بھی کوئی کریڈٹیشن مگر کوئی ٹی اے ڈی اے اور دیگر مراعات وغیرہ حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ اپنا بڑھاپا سنوار رہے ہیں۔"

"پہلے جو جانی تو سنور جائے۔ بڑھاپا تو بعد کی بات ہے۔" راجیلہ گویا دانت میں کرچی آواز میں بولی۔

"جو جانی تو تمہاری اپنی زندگی کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ درنہ میں تو جو جانی سنوارنے کی عمدہ تجاویز پیش کر چکا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ راجیلہ کوئی دندان شکن جواب دیتی، نفیس صاحبہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے "ہمت اچھا موقع نکلا ہے تم دونوں نے اس قسم کی بیکاراس کرنے کا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "میں نے پوچھا تھا اب تمہاری حالت کیسی ہے؟"

میں مختصراً ان لوگوں کو حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ان کے سوال کے جواب میں "میں نے کراہتے ہوئے کہا "اس وقت میری حالت اتنی سالہ بوڑھے کی سی ہے۔ میں آپ کے ساتھ تو چل سکتا ہوں لیکن مجھ سے کوئی توقع مت رکھیے گا۔ میں کبھی بھی نہیں مار سکتا۔"

"حالا کہ ساری عمر کھیاں ہی ماری ہیں۔" راجیلہ نے لقمہ دیا۔

"مگر یہ ایک عجیب اقلیت کبھی میرے ہاتھ سے بچ گئی۔" میں نے راجیلہ کی طرف اشارہ کیا۔

نفیس صاحبہ نے حیرت سے ایک نظر میری طرف پھر راجیلہ کی طرف دیکھا اور بے یقینی سے بولے "تم تو لوگوں کو ایسے موقعوں پر بھی مذاق سوچتا ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے سہرا" میں نے کراہ کر کہا "یہ ظلم زندگی کی

چند لمحے کی خاموشی کے بعد شفیع شاہ بولا "مجھے تو کچھ یوں لگ رہا ہے کہ ریڈ وائٹ والا باب بند ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کا ایک وقت مارے جانا اس عظیم کٹ رگ کٹ جانے کے حروف ہے۔ پھر لوگ پہلے ہی مارے جا چکے ہیں۔ ان کے اڈے بھی تباہ ہو چکے ہیں۔"

"جھپٹا ہر تو یہی لگ رہا ہے کہ ریڈ وائٹ والا باب بند ہو گیا ہے لیکن میں اس سلسلے میں زیادہ یقین نہیں ہوں۔ ملک کارپوں کا زبردست علاج کرنے کے بعد لگتا تو یہی ہے کہ مکمل علاج ہو گیا ہے لیکن اس بیماری کے چند جراثیم بھی باقی رہ جائیں تو بیماری کسی وقت بھی عود کر آسکتی ہے۔ یہی معاملہ اس طرح کی بہت بڑی بہت طاقتور اور بین الاقوامی سازشی یا دہشت گرد تنظیموں کا ہونا ہے۔ ان کے قہوڑے سے براہیم باقی رہ جائیں اور جب تک ان کی اصل جڑ ختم نہ ہو تب تک ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں ان سے نجات مل گئی ہے۔"

شفیع شاہ پر خیال انداز میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "میرا حال ہمارے لئے تو یہی بڑا اعزاز ہے کہ ہم نے ان سے گولی اور اس حد تک ان کا خاتمہ کر دیا۔ یہ سب صرف تم لوگوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ مجھے تو کچھ کرنا نہیں پڑا۔ یہ بلاشبہ تم لوگوں کا بہت بڑا کام ہے۔"

"ہم آپ سے الگ تو نہیں ہیں سہرا" شفیع شاہ فوراً بولا "ہم نے جو کچھ کیا یہ صرف آپ ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اور پھر اس سلسلے میں سب سے زیادہ مصائب اور نقصانات بھی آپ ہی نے اٹھائے۔ اگر آپ ثابت قدم نہ رہتے اور آپ کی وجہ سے ہمیں اتنے دماغی اور تربیت وغیرہ حاصل نہ ہوتی تو ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میرے گرد تم جیسے لوگوں کا حلقہ بن گیا ہے۔ ریڈ وائٹ درحقیقت تمام ترقی یافتہ ملکوں کا پروردہ قہر ہے۔ پروردہ ہمارے خلاف جو دوسری سازشیں بد معاشیاں دھوکس دھالی اور اقتصادی جکڑنڈیاں کرتی رہتی ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں لیکن یہ انہوں نے ہم جیسی قوموں کو تباہ کرنے کا الگ ایک خفیہ جال بچھا تھا جس سے بظاہر وہ تمام ممالک لاقطع نظر آتے رہیں گے مگر پروردہ ریڈ وائٹ کو ان کی ہر طرح کی مدد حاصل رہے گی۔ انہوں نے شاید سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پسماندہ قوم میں ہم جیسے چند سہمے ان کے لئے دیرسربین جائیں گے۔ ریڈ وائٹ صرف ہمارے ہی بل ہی سرگرم نہیں تھی، انہوں نے اور بھی کئی ملکوں میں جڑیں پکائی ہوئی ہیں اور ان سب جھکوں پر حالات بہت اتر چکے۔"

اسی طرح باتیں کرتے ہم لوگ قاسم علی کے مکان کے قریب پہنچے۔ اس کا مکان ساحل سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن پوت ہاؤس اس نے نہ جانے کس مصلحت کے تحت مکان کے قریب بسکھایا تھا حالانکہ اس طرف بھی کنارے کی طرف سمندر کا



نہ آگے بڑھتے ہوئے نفیس صاحب سے مخاطب ہوا "تو  
بجلی گھر نہیں ہے۔"  
"اس کے باوجود میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔" نفیس  
صاحب نے بارعرب لیے میں کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گندے اچکے اور  
خاموشی سے گھوم کر ہمارے آگے آگے چل دیے۔ ان کی رہنما  
میں ہم پاڑی سے راستے پر چڑھ کر عظیم الشان مکان کے بلندی  
میں تک پہنچے جس کے عقب میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ  
صرف اتنی ہی تھی جتنی افق سے نمودار ہو رہی تھی۔ مکان میں  
کوئی جی روشن نہیں تھی۔ کوسٹ گاڑ کے کوئی کسی ہدایت کے  
بی مکان کے چاروں کونوں پر پوزیشن سنبھالنے کے لئے چل دی  
تھے۔

کال بیل کا بٹن دیا گیا۔ کال بیل گیت کے عقب میں  
چھوٹے سے گیت باؤس میں تھی۔ چند لمبے بعد بلی گیت کا  
چھوٹا سا چور کور حصہ نکلا اور اس میں سے ایک خوشخوار سا چور  
ہوا۔

"کیا ہے؟" اس نے درشت لیے میں پوچھا۔  
اس لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ آنے والے  
ملک کی نہایت اونچی اقدار شخص کے نہایت با اختیار لہجے سے  
بلکہ پیش در بیکاری تھے اور ہم کسی بہت بڑے اسمگلر کے نمبر  
کسی بادشاہ سلامت کے محل سرا کے دروازے پر آئے  
ہوئے تھے۔

ہمارے ساتھ آنے والوں میں سے جو شخص ذرا پہلے  
معلوم ہوا تھا اس نے اندر سے جھانکنے والے کو صورت کا  
آگاہ کیا۔ اندر سے جھانکنے والے کے چہرے پر خوشخواری  
کھی ہوئی لیکن وہ پہلے ہی جیسے درشت لیے میں ہوا "مالک"  
نہیں ہیں۔ وہ رات نہیں چلے گئے ہیں۔"  
"کہاں چلے گئے ہیں؟" نفیس صاحب نے غفلت کا  
ملاحظہ سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم" بے رخی سے جواب ملا۔  
"بلیٹ کھولو۔ ہم کم کر کے تلاش کر لینا چاہتے ہیں۔" نفیس صاحب  
نے بدستور ملاحظہ سے کہا۔

"تلاش کا وارنٹ ہے آپ کے پاس؟" خوشخوار چہرے  
بارحانہ لیے میں پوچھا۔

آخر کار نفیس صاحب کو حلال آئی گیا جس کا مجھے انتظار  
انہوں نے میری توقع سے زیادہ جلد اور بیکاری کا مظاہرہ کیا  
اُن کا ہاتھ نہایت تیزی سے گھوما اور چور کو رکشاک سے  
ہوئے چہرے پر تجسس نہیں بلکہ ان کی گمن کا بٹ پر۔ ضرب  
تھی کہ چوہا بکس رکشاک میں غائب ہو گیا۔ فوراً ہی دوسرا چور  
ہوا لیکن اس پر خوشخواری نہیں، خوشواری ہی کمر بٹ تھی۔  
نفیس صاحب گرجے "تو کہ بھلا مجھے سے وارنٹ کا نام

نہایت عجیبہ جھپٹیں ہیں۔" خیر آپ بتائیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"  
"اس وقت میں سب سے پہلے تو قاسم بلی کو گرفتار کرنا ہے۔  
ریڈ ڈاٹ سے اس کا قریبی تعلق ثابت ہو گیا ہے۔ اس شخص پر  
ہاتھ ڈالنا بہت ضروری ہے۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔  
"تو پھر چلے۔ ہاتھ ڈالے۔" میں نے آگے بڑھنے کا اشارہ  
کرتے ہوئے کہا "خیال رکھیے گا ہاتھ پر کاٹ نہ لے۔"

ابھی ہم دس بارہ قدم ہی چلے تھے کہ خاموش فضا میں اچانک  
گولیوں کی ترزا ڈھٹ گونج اُٹھی۔ ہم سب بیک وقت سینے کے بل  
گر پڑے۔ وہاں کچھ چھوٹے بوئے ٹپلے موجود تھے۔ زمین بھی کانپ  
ٹا ہو رہی تھی۔ ہر ایک نے کھٹک کر ذرا آڑ میں ہونے کی کوشش  
کی۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ چند گز آگے موجود درختوں کے  
جھنڈے سے برست مارا گیا تھا لیکن ہمیں نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ ہوائی  
فائرنگ کی گئی تھی۔ فی الحال فائرنگ کا مقصد ہمیں خبردار کرنا یا پھر  
ہماری پیش قدمی روکنا تھا۔ فضا میں گویا ابھی تک گولیوں کی گونج باقی  
تھی۔

چند لمبے کے سکوت کے بعد نفیس صاحب نے میگافون پر کہا۔  
"مگر کسی نے مزید ایک گولی بھی چلائی تو اس کی زندگی کی ضمانت  
نہیں دی جاسکے گی اور جو زندہ بچا اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔"  
اس دوران دوسرے افراد نے سینے کے بل ٹھیکے ہوئے غم  
دائے میں جھپک کر درختوں کے جھنڈ کو گھیرے میں لینے کے لئے  
پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ نفیس صاحب کی آواز بارعرب اور ناٹرا گلیز  
تھی۔ دوسری طرف چند لمبے سکوت ہی رہا پھر کسی نے کھردری  
کرت اور بلند آواز میں پوچھا "تم لوگ کون ہو اور کس لئے آئے  
ہو؟"

نفیس صاحب نے اپنا تعارف تو نہیں کرایا لیکن یہ بتا دیا کہ ہم  
لوگ خفیہ ایجنسیوں اور کوسٹ گاڑ کے آدمی ہیں۔ دوسری طرف  
ایک بار پھر چند لمبے کے سکوت چھایا پھر پوچھا گیا "تم نے یہ  
نہیں بتایا کہ تم کس لئے آئے ہو؟"

"ہمیں قاسم بلی سے ملنا ہے۔" نفیس صاحب نے جواب  
دیا۔

"صرف ملنا ہے یا اسے گرفتار کرنا ہے؟" یہ آواز بلند جرح  
جاری تھی۔

"اس کا فیصلہ اس سے ملاقات کے بعد ہی کیا جائے گا۔"  
نفیس صاحب نے ذلیلانہ جواب دیا۔

چند لمبے بعد درختوں کے جھنڈے سے چار افراد نکل آئے۔  
انہوں نے اپنی گھنٹیں کندھوں پر لٹکائی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ بھی محتاط  
انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں تقریباً گھیرے میں لے لیا۔  
وہ چاروں مقامی تھے۔ چاروں کھنٹی داڑھی سو پھول والے تھے  
ڈھکی ڈھالی شٹوار قمیصوں میں تھے۔ سولہ پر بڑی بڑی پگڑیاں  
تھیں۔ ان میں سے ایک زرا زحاکہا معلوم ہوا تھا۔

اپنے مردود امیں خود اتنا بڑا وارنٹ ہوں۔ چھ فٹ دو انچ کا وارنٹ۔ یہ تو اس غیبت کی خوش قسمتی ہے کہ میں خود اسے گرفتار کرنے اس کے دروازے تک آیا ہوں۔ اگر مجھے اس کے بارے میں پتا ہو تو میں کب کا اسے اٹھوا کر اپنے دفتر منگوا چکا ہوتا۔“

پھر وہ گیت پر لڑا تار کر پیلے سے زیادہ جلال سے پیچھے ہٹ کر کہو۔“

ہماری رہنمائی کرنے والوں کا لیڈر چیچ چیچ کر اندر والوں کو صورت حال سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئٹہ کا رڈو فیروہ کے آدھی گئیں سنبھالے الٹ کھڑے تھے شفیع شاہ اور راجیلہ بھی گئیں سنبھالے گویا کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے شفیع شاہ کے ساتھ ڈرائر سے بھی تین آدمی آئے تھے وہ کچھ پیچھے درختوں کے عقب میں گئیں سنبھالے کھڑے تھے میرے علاوہ باقی سب مسلح اور الٹ تھے۔ میں گمن کے بغیر کھڑا تھا۔ یہی کیفیت تھا۔ صحیح معنوں میں تو میں اس وقت اس قسم کی صورت حال میں ٹانگ اڑانے کے قابل ہی نہیں تھا۔

فحاشی زبردست تیار تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مکان کے بلند حصوں سے شاید کچھ آنکھیں ہماری جانب نگراں تھیں اور شاید کونے کھدکوں سے کچھ گھنسی بھی جھانک رہی تھیں۔ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن یہ احساس شاید سب کو تھا کہ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہم گویا بادلوں کے جھیر پر کھڑے تھے۔

تمام فریٹ ہی رہی۔ چند لمحے کی بعد کوئٹہ کے بعد گیت کھول دیا گیا۔ ٹائیس آن ہو گئیں۔ سب لوگ مکان میں ٹھس آئے۔ چار افراد نے اس طرح چاروں کونوں میں پوزیشن سنبھال لی کہ کوئی مکان سے بھاگنے کی کوشش کرے تو نظر میں آئے۔ گیت کو اندر کی طرف سے مقلل کر دیا گیا۔

کوئٹہ کا رڈو ایک اعلیٰ آفیسر بھی ہمارے ساتھ تھا لیکن کارروائی نہیں صاحب ہی کی ہدایات کے مطابق ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ اینٹینسی کی طرف چلے گئے۔ اتنے بڑے مکان کی خلاشی لینا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔

میں جب نفیس صاحب شفیع شاہ اور راجیلہ وغیرہ کے ساتھ اندر پہنچا تو سب سے پہلے ہمارا سامنا تانیا اور تانیا سے ہوا۔ وہ بیوی ہال کے ایک ٹیبلر نما حصے پر کھڑی تھیں اور یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ وہ شب خرابی کے لباس میں نہیں بلکہ نیلے رنگ کی ایک جھسی چیز اور جیکٹ میں تھیں۔ وہ دونوں ایک تک صرف مجھے گھور رہی تھیں اور باقی لوگوں کی موجودگی سے گویا بالکل بے خبر تھیں۔

میں نے ان کے سامنے پہنچ کر کھڑا کر رکھا صاف کرتے ہوئے زرا بو کھلائے ہوئے سے انداز میں کہا ”صاف کرنا میں ذرا اگلے سیدھے پکڑوں میں پر گیا تھا۔ انٹرکام پر سات اور آٹھ نمبر کا شی نہیں دیا سکا۔ اگر اجازت ہو تو اب آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟“

”کیوں نہیں۔“ تانیا بلا تامل اپنے کمرے کی طرف کرتے ہوئے بولی ”اب بھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ ہر وقت یا مکان سے نکلا ہوا تیر تو زرا ہی ہیں جو پھر اتار کر چہرہ مارو دشمن دل بامشاہ۔“

میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ ایک تو تانیا کا جواب غلاب تو فتح تھا۔ دوسرے اس وقت وہ امریکی سبے میں اکر بولنے کے بجائے باقاعدہ اردو بول رہی تھی۔ میں نے سر ہونے ذرا کھسکا ہٹ سے نفیس صاحب اور راجیلہ کی طرف نفیس صاحب گویا ہماری باتوں پر وہ بیان دینے کے بجائے اردو کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے تھے اور راجیلہ کا جو اس کی چٹھا ہوا تھا کہ اس کے اثرات کے بارے میں کچھ کتنا مشکل تھا تانیا استنزا اپنے سے سبے میں بولی ”بیس مسٹر افضل چور آپ تو ہیں بٹ من کر رہ گئے۔ اتنی ہی ہمت تھی؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل اس وقت میرے بزرگ ساتھ میں نے نفیس صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا بو کھلائے ایکٹنگ کی اور حقوگ لگلا۔ دیے اس ایکٹنگ میں کچھ حیرت تھی۔ اس کہنت نے مجھے میرے اصل نام سے مخاطب واقعی تو زرا سا بو کھلا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باپ نے بھی میری اصل شخصیت سے انکار کر دیا تھا یا پھر باپ بھیاں شروع ہی سے مجھے پہچان گئے تھے لیکن وہ بڑے فکار تھے۔ نے آخر تک مجھے جکڑ دیے رکھا۔“

تانیا لغزنی سانس لے کر بیٹھ کر دوبارہ ہاتھ نکاتے ہوئے ”اچھا ہی ہوا کہ آپ ہمارے ساتھ کمرے میں چلے گئے تھے نہیں ہوئے مسٹر جہد ری! آپ آمادہ بھی ہوئے تو شاید کسی کی وجہ سے ہوئے۔ ہم آپ کو اس خیال سے نہیں بلا رہے جس خیال سے پہلے دعوت دی تھی۔ اب تو ہم آپ کو اس لے جانا چاہتے تھے کہ آپ کا قبضہ بنا کر اپنے نکوں کو کھلا سکیں مقصد کے لئے ہمیں آپ جیسے کسی صحت مند گدھے کی ضرورت تھی۔“

”آپ کے نکتے گدھوں کا قبضہ کہا جاتا ہے؟“ میرا مصوحیت اور حیرت سے کہا ”جب خریدتے ہیں۔“

تانیا خشک پر جھٹکے ہوئے بولی ”مسٹر جہد ری! ہمیں پہلے تھا کہ آپ ایک بڑے بزنس من ہونے کے ساتھ ساتھ سرکاری دیواری قسم کی چیز ہیں۔ کوئی بہت اعلیٰ اور اونچے درجہ کی قسم کی طرف سے۔ آپ کی چیزیں کہیں نہ کہیں جا کر کی گئی مزی چیزوں کے ساتھ لگژری ہو رہی ہیں۔ اسی لئے ہم فرصت میں آپ کو سمندر میں غرق کرنے کی کوشش کی آپ ہی ذمیت چیز ہیں۔ پیچھے پیچھے چلے آئے۔“

میں نے سوچا وہ امریکا کی ٹیلیویشن اگر اچھی خاصی باقاعدہ اردو بولے اور سمجھنے پر تلی ہوئی تھیں تو انہیں تو زرا ترمیم کے ساتھ چچا غالب کا ایک شعر سنائے میں کوئی ح

”دعویٰ تو قاسم بھلی کا کیا ہے۔“ میں نے سادگی سے جواب

دیا۔

”نفس صاحب براہِ راست ان سے مخاطب ہوئے“ (سکر)!

”تمہارا باپ کہاں ہے؟“

”وہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھیں۔ تانیا نے نڈائی سے کندھے اچکا کر بولی ”مقامِ اذکم یہاں تو نہیں ہیں جہاں آپ انھیں تلاش کر رہے ہیں۔“

”تو پھر کہاں ہے؟“ ”نفس صاحب نے عمل سے پوچھا۔ ان کی نیلی آنکھیں اس وقت سلتی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ انھیں یقیناً قدم قدم پر اہانت کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ حتی الامکان تحمل اور درگزر سے کام لے رہے تھے۔

”ہم بے چارے بھلا کیا کر سکتے ہیں۔“ اس بار تانیا نے جواب دیا ”وہ مرضی کے مالک ہیں۔ ان کا جب اور جہاں دل چاہے چلے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت کراچی میں ہوں۔ ہو سکتا ہے انگینڈہ، فرانس یا انٹیش روانہ ہو چکے ہوں۔“

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ قاسم بھلی ہمیں گھر پر نہیں بلے گا۔ اس کی افکار میں سوس پینچ خفیہ ایجنسیوں سے بھی زیادہ عجیب تھی۔ اسے بروقت اطلاع مل چکی تھی کہ سندھ میں گڑبڑ ہوئی تھی اور ”پرس“ دھماکے سے اڑ چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سید الٹ چکا تھا۔ اس کے پاس صرف دساک ہی نہیں تھے، وہ بلاشبہ ایک خوش قسمت انسان بھی تھا۔ اس کی پہلی خوش قسمتی تو یہی تھی کہ وہ خود اس وقت ”پرس“ پر موجود نہیں تھا جب وہ دھماکے سے بچا ہوا۔

نفس صاحب اپنی جیکٹ کی بڑی سی جیب سے سوا کل فون نکالتے ہوئے بولے ”سکر! تمہارا باپ اس جزیرے پر ہو سکتا ہے۔ کراچی میں ہو سکتا ہے۔ لیکن اتنی جلدی وہ انگینڈہ، فرانس یا انٹیش روانہ نہیں ہو سکتا۔“

انہوں نے فون پر کوئی خبر پوچھا اور سلسلہ ملتے پڑے ہوئے ”نفس“ اسپیکرنگ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہے۔ ابھی تلاشی عمل نہیں ہوئی، ہر حال تم جزیرے سے کراچی کی طرف جانے والے خشکی کے راستے کی نگرانی کرو۔ کراچی سے باہر جانے والے راستوں کی نگرانی کرو اور ایئر پورٹ کو کھانا۔ اگر ابھی وہ کسی جہاز میں نہ بیٹھا ہو لیکن ایئر پورٹ پر موجود ہو تو اسے فوراً گرفتار کرلو۔ وہ ملک سے تو کیا شہر سے باہر بھی نہ جانے پائے۔

”کچھ؟“

انہوں نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ تانیا اور تانیا نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر اب بھی تشویش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ تانیا ہوا میں لیے ہوئی بولی ”اس سے پہلے بھی کئی بار ایڈی کو ملک سے باہر جانے سے روکنے کی کوششیں ہوئی ہیں۔ بڑی بھاگ دوڑ ہوئی ہے۔ نیلی فونوں پر بڑے احکامات

ملنے پہلے سے زیادہ غم ناک لہجے میں کہا۔

”ہوئے“ ”ہاں“ سر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ فرق دیا

”نہیں جتناہ افق“ نہ کہیں مزار ہوگا

”شعور و ذلت سے کر گیا ہے لیکن حال کے عین مطابق ہے۔“

”جہان تو آپ کا اب بھی نہیں اٹھے گا اور نہ ہی کہیں مزار ہوگا۔“

”تاپ کی تو یونیاں ہوا میں اڑیں گی اور جیل

کے انھیں کما میں گئے۔“

”مجھ سے شاید وہ جڑواں بلیوں کے حصے میں آئیں۔“ میں

نے آدھر کر کہا۔

نفس صاحب اس دوران حیرانی سے کبھی میری طرف اور کبھی

لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر کار ان کی قوتِ برداشت

جواب دے گئی۔ وہ بائیں سر پر چلا اٹھے ”افضل! یہ کیا کہو اس سے۔“

تم تو ہر جگہ بے شک اپنے جتنے جاتے ہو۔ مد ہو گئی اب شعر بھی

پڑھے جا رہے ہیں۔“

نفس صاحب بے فکر ڈبلے پتلے توڑی تھے لیکن ان کی

ضعیفیت میں ایک خاص قسم کا رعب تھا۔ خصوصاً جب وہ کسی بات

پر برم ہو کر بحث اٹھتے تھے تو کم از کم ایک لمحے کے لئے تو بڑی بڑی

قوتِ جبریں خاموش ہو جاتی تھیں۔ میں نے بظاہر دراسم کر تانیا

اور تانیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”دیکھا میں نے کما تھا کہ بزرگ

ساتھ ہیں اور یہ بگلی بگلی خرافات کا بھی پڑا ساتھ ہے۔“

دوسری طرف سے راجیلہ مجھے کہنی مار کر کھنٹی کھنٹی سی آواز

میں بولی ”کھانا شوق ہے تمہیں ایسی لٹھی قسم کی لڑکیوں سے بے عزتی

کرانے کا۔“

میں اس کی مزاح شامی۔ یا پھر کہنے کے لڑکی شامی پر حیران

ہوئے اندیشہ نہ سکا۔ اس نے پہلی نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ لڑکیاں

لٹھی نہیں۔ تانیا جھگڑے پڑا دیکھتے ہوئے فوراً راجیلہ کی طرف دیکھ کر

بولی ”یہ نقاب پوش حیثیت کون ہے؟“

”حیثیت یہ پہلے تھی اب صرف نقاب پوش ہے۔“ میں نے

جلدی سے کہا۔

راجیلہ کی گردن میری طرف محکوم تھی۔ اس کی آنکھوں پر

نادر یک چشم تھا لیکن میں ان آنکھوں میں ہانپتی ہوئی غیظ و غضب

کی پرچا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ اگر اس وقت نفس صاحب ساتھ نہ

ہوتے تو شاید وہ اپنی گن کاٹتے تو مجھے رسید کر ہی دیتی۔ اسے غصہ

دلا کر مجھے برا تلف آتا تھا۔

فتحی شاہ اور دوسرے افراد اس دوران گھر کی تلاشی لینے کے

لئے اصرار و محرم کھر پکے تھے۔ صرف میں ”راجیلہ“ اور نفس صاحب

بالدش کھڑے تھے مکان کے اصل رہائشی حصے سے باہر جانے کا

کوئی راستہ بھی ہی تھا۔

نفس صاحب نے دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

مجھے لہجے میں مٹھ سے پوچھا ”یہ دونوں قاسم بھلی کی بیٹیاں ہیں؟“

جاری ہوئے ہیں لیکن ڈیڈی اگر ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہ ضرور نکل جاتے ہیں۔ شاید وہ کسی کی نظر میں نہیں آتے۔ ان کے پاس الدین کا چراغ ہے۔"

نقیس صاحب دھیمے لیے بیٹھیں "اگر بڑی میں بولے" مجھے معلوم ہے۔ الدین کے اس چراغ کا دور سراسر نام دولت "اثر و سرخ اور صبح بیکوں پر رابطہ ہے لیکن میں تمہیں نہیں دلاتا ہوں کہ اس بار یہ چراغ اس کے کام نہیں آئے گا کیونکہ معاملہ اسمگلنگ وغیرہ سے نہیں نکلیں گے۔"

"اسمگلنگ وغیرہ؟" دونوں لڑکیوں نے پتی پتی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر حیرت کی نہایت عمدہ اداکاری کی۔ "سیر سیر کیا آپ یہ لفظ ہمارے ڈیڈی کے لئے استعمال کر رہے ہیں؟" ٹانیا نے سوال کیا۔

"نہیں۔ اپنے ڈیڈی کے لئے۔ جن کے انتقال کو تیرہ برس گزر چکے ہیں۔" نقیس صاحب ہل کر بولے۔

"پتلیں بھر تو ٹھیک ہے۔" ٹانیا طرہایت سے سر ہلاتے ہوئے بولی "لیکن اگر آپ یہ لفظ میرے ڈیڈی کے بارے میں استعمال کرتے تو ہم دونوں ہمیشہ بہت زیادہ برا مانیں گے۔ ہمارے ڈیڈی ایک بہت بڑے اور بہت معزز برنس تھے ہیں۔"

"اس ملک کی حالت جن لوگوں کی وجہ سے دن بہ دن بدلتی ہوئی جاری ہے ان میں ایک خولا تمہارے ڈیڈی جیسے "بڑے" اور "معزز" کا دوبارہ لوگوں کا بھی ہے۔" نقیس صاحب گہری سانس لے کر بولے "بہر حال یہی نہ کہی ہر قسم کے برے لوگوں پر بھی کوئی نہ کوئی برا دقت آتی ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ڈیڈی کا بھی بڑا دقت آگیا ہے۔ ہم انہیں نہیں کہیں سے دھونڈ نکالیں گے۔"

"یہ تو دن چڑھے پتا چلے گا کہ بڑا دقت کس پر آیا ہے۔ جب وکیلوں کا ایک مثل اعلیٰ عدالت میں قانونی چارہ جوئی شروع کرے گا اور کئی ٹکڑوں میں چند بڑے وزیروں کے ٹیلی فون موصول ہونا شروع ہوں گے۔" ٹانیا بولی۔

نقیس صاحب تکلیف کے سے عالم میں بہنے لگے پھر بولے۔ "ہمارے ہاں اکثر بڑے خلیفوں کے بچے ٹپکے گا کار مولائی ہے لیکن کاش۔۔۔ میں کسی طرح تمہیں یقین دلا سکتا کہ اس مرتبہ یہ فارمولا نہیں چلے گا۔"

"نکھنا جائے گا۔" ٹانیا نے بے پروائی سے کہہ کر اچکا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ نقیس صاحب کون تھے۔ ان کا مقام کیا تھا اور اختیارات کیا تھے۔ انہوں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور غالباً فرض کر لیا تھا کہ وہ کوئٹہ گاؤں "سنٹر یا سی آئی ڈی" جیسے کسی جگہ کے کوئی افسر ہوں گے اور وہ بھی دوسرے درجے کے۔

نقیس صاحب راجہ سے مخاطب ہوئے "تم ان دونوں لڑکیوں پر نظر رکھو۔ ہو سکتا ہے انہیں بھی کشیش میں شامل کرنا

پڑے۔ میں اور افضل ٹاشی لینے والوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں جلدی فارغ ہو سکیں۔"

راجہ نے انہماک میں سر ہلایا اور نقیس صاحب بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "چلو کچھ رہنمائی کرو۔" گھر دیکھا ہوا ہو گا۔"

"میرا زیادہ وقت گھر کے بجائے گھر والوں کو دیکھنے ہوا ہے۔" میں نے کہا "بہر حال آپ گھر کو بھی دیکھ لیتے ہیں ہم نے راجہ اور دونوں لڑکیوں کو وہیں چھوڑا اور

کہے۔ ہم ٹاشی لینے والوں کے ساتھ جا رہے۔ جن کمرہوں کا چابکا تھا انہیں بھی ہم نے دوبارہ دیکھ ڈالا۔ ایک ایک ہاتھ اس میں موجود بنگ ٹک کو کھٹکالا۔ بیڈز کے نیچے جھانکا۔ الماریوں میں ہاتھ مارے۔ سونٹ کو ارنرز کو چیک کیا۔

اس دوران لائن حاضر کیا چابکا تھا۔ اس دوران انٹیکس بھی مکمل ہو گئی۔ آخر کار سب لوگ خد لکائے واپس آگئے میں یہ خانہ بھی موجود تھا۔ اسے بھی اچھی طرح کھٹکا لایا۔ قاسم بھٹی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

"بڑ بخت نکل گیا۔" آخر کار نقیس صاحب کو حلیم

"خواہ مخواہ ہی یہاں رسوا ہوا بولا گیا۔" میں نے تسکین سے "اگر ڈاکٹر برارڈ کو کچھ آخر سے یہاں پہنچنا تھا تو اب وہ پتہ نہ لگے۔ معلوم نہیں اب وہ ہمارے ہاتھ آئے گا بھی یا نہیں۔"

"اگر قاسم بھٹی ہاتھ آگیا تو شاید ڈاکٹر برارڈ بھی ہاتھ آئے۔ بلکہ شاید ریڈ ڈاٹ کے کچھ اور بچے کچھ لوگ بھی ہاتھ آجائے۔ نقیس صاحب نے گویا میری امید بڑھائی پھر انہوں نے

"ہم نے اسلام آباد ہوٹل سے تین غیر ملکیوں کو بھی پکڑا۔ ان کا ریڈ ڈاٹ سے کوئی کمرہ تعلق ثابت نہیں ہو رہا۔ وہ طرح کے "کنسلٹنٹ" تھے۔ ہماری معاونہ رونا تو نا کچھ

انہماک دیا کرتے تھے لیکن انہیں ریڈ ڈاٹ کے اصل سینہ اس کے مقاصد وغیرہ کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ خیال میں یہ بھی شاید سی آئی اے یا آئی جی کے جی بی وغیرہ کوئی خفیہ ایجنسی تھی۔"

ہم واپس ہال میں آئے تو دیکھا وہاں راجہ اکیلی کھڑا ٹانیا اور ٹانیا کیس نظر نہیں آ رہی تھیں۔ نقیس صاحب ڈراگ بولے "تو کیا کہاں ہیں؟"

"میں نے انہیں اس کمرے میں بلایا ہے۔" راجہ ہاتھ سے ایک بند دوواڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اور نقیس صاحب نے جلدی سے جا کر اس کمرہ

جھانکا۔ ٹانیا اور ٹانیا واقعی ایک بیڈ پر پاس پاس جٹ لیا تھیں اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ نقیس صاحب ٹپکنا ہٹا۔ انداز میں ان کے قریب جاتے ہوئے ذرا حیرت سے بولے "واقعی سو گئیں؟"

”جس طرح انسانوں کی شکلیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں اسی طرح سوچیں اور کردار بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ہر حال یہ دیا ہے اور دنیا میں ہر رنگ ہر رنگ کا انسان موجود ہے۔“ نفیس صاحب مسکرائے۔

میں نے ایک نظر تانیا، غایا کی طرف اور ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا: ”ان میں ذرا اور طرح کا میوٹیشن ہو چکا ہے۔ تم میں ذرا اور طرح کا میوٹیشن ہو چکا ہے۔“

”تم اپنی چونچ بند رکھو ورنہ کوہڑی توڑ دوں گی۔“ راحیلہ مگن اونچی کرتے ہوئے بولی ”تم بر تو مجھے سب سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ کاش میں مونا سا ایک اعزائے کتھاری ہڈی بل ایک کر سکتی۔“ ”خدا دیا۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس وقت اکیلا نہیں ہوں۔“ میں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا ”ورنہ میں تو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ میں تو اس وقت صرف اتنی جان ہے کہ چل بھر رہا ہوں۔“

”موقع بہتر ہوتا تو میں تم میں اتنی جان بھی نہ چھوڑتی۔ پچھتے دس دن کے لئے تو جیسے بستر پر ہی لٹا ہوتی۔“ راحیلہ دانت کچکپاکر بولی۔

میں نے نفیس صاحب کی طرف دیکھ کر غصڑی سانس لیتے ہوئے پوچھا ”آپ نے اس سے پہلے اتنی جلائی لڑی دیکھی تھی؟“ نفیس صاحب دیوار کے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے ”تم دونوں اپنی کواں بند کر اور میرے ساتھ آؤ۔“

ہم نے تانیا اور غایا کو اسی کمرے میں لیے چھوڑ دیا۔ ہمیں امید تھی کہ نوکر انہیں سنبھال لیں گے۔ انہیں کوئی خاص گزیر نہیں پہنچی تھی۔

ہم باہر آگئے۔ ہمارے ساتھی لان پر جمع تھے۔ قاسم بجلی کے مسلح مٹافہ دھبہ دھبہ دیوار کے قریب کھڑے تھے اور کینہ توڑ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

نفیس صاحب آگے بڑھ کر ان سے مخاطب ہوئے ”گٹا بھی ہے کہ قاسم بجلی کم از کم یہاں سے تو فرار ہو گیا ہے لیکن کوسٹ گارڈ کے آدمی ہر حال اس مکان کی عمرانی کریں گے۔ دن میں کسی وقت میرے گھر کے آدمی آکر ان کی جگہ لے لیں گے۔ ہم جب تک مناسب سمجھیں گے مکان کو احقر آہریشن رکھیں گے۔ تم میں سے کوئی بد معاشی دکھانے کی کوشش نہ کرے ورنہ نتائج کاڑتے دار وہ خود ہو گا۔“

نفیس صاحب نے ایک لمحے توقف کیا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ نفیس صاحب نے کوسٹ گارڈ کے آدمیوں کو ہدایات دیں پھر فون کر کے اپنے لئے گاڑی طلب کی اور ہم باہر آگئے۔ ہم سب گاڑی کے انتظار میں کھڑے تھے تو نفیس صاحب نے مجھ سے پوچھا ”تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”میں اب تک جتنی کواں کر رہا ہوں اور دیکھنے کی کوشش

”ان کا سونے کا پروگرام تو نہیں تھا۔ ملانا پڑا ہے۔“ راحیلہ بے نیازی سے بولی ”میں نے انہیں تھوڑی سی خواب آور دوا دی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ نفیس صاحب نے پلٹ کر اسے گھورا لیکن میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ ہماری عدم موجودگی میں کوئی نہ کوئی گزیر ضرور ہوگی۔

”میں نے ان دونوں کی کچن پر کرائے کا ایک ایک لاکھ پچلا ہاتھ رسید کیا ہے۔“ راحیلہ نے نہایت اطمینان سے بتایا ”کیونکہ ان کی زبان کسی طرح رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ آپ کی موجودگی میں تو یہ پھر بھی کچھ مقبول قسم کی گفتگو کر رہی تھیں۔ آپ کے جانے کے بعد تو انہوں نے بہت سی بے ہودہ قسم کی باتیں شروع کر دی تھیں۔“

”اشک...؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

راحیلہ میری طرف گھولی۔ اس کا چہرہ اب بھی بحال طور پر چھپا ہوا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کی آنکھیں شیطے برساتی تھیں۔ وہ گویا دانت پیس کر بولی ”تمہارے ہی بارے میں سب سے زیادہ کواں کر رہی تھیں اور مجھ سے بھی تمہارے بارے میں کچھ ایسے سوالات شروع کر دیے تھے جنہیں میں سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ تم کو کہ ان کے باپ کو پکڑا نے آئے ہو۔ اس کے باوجود تمہاری طرف سے ان کا دل ملا نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ ہم ہی تمہیں بہت پسند کرنے لگی ہیں۔ لیکن ان کی پسندیدگی کے پکڑنے زرا مختلف قسم کے ہیں۔“

میں نفیس صاحب کی طرف دیکھ کر سر سمجھانے لگا۔ نفیس صاحب ذرا احتجاج نہ کر تانیا اور غایا پر جب کہ ان کی ہنس دیکھتے ہوئے بولے ”پھر بھی جنہیں ان لڑکیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا یہ بڑی فسادی قسم کی لڑکیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی ہی لڑکیاں تو بات کا جتنی بات ہی ہیں اور اچھے بھلے ٹھکوں کی ایک ٹاپ ہی بھی حرف آجاتا ہے۔“

”میں آپ لڑکیاں کہہ رہے ہیں؟“ راحیلہ جارحانہ لہجے میں بولی ”میرے خیال میں تو یہ گندے کے دو ڈھیر ہیں۔ ایک خاص قسم کی جنونی گتھی ہیں۔ انہیں علاج کے لئے کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل کرانا چاہئے۔“

”جس قسم کے ماحول میں اور جس قسم کی دولت سے انہوں نے پرورش پائی ہے اس میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔“ نفیس صاحب بڑے قریب سے پہنچے ہوئے بولے ”اصل بتانا تھا ان کا زیادہ وقت اسٹیشن میں گزرتا ہے۔“

”اسٹیشن میں تو میں بھی رہ کر نکلتی تھی۔ میں اور میرا بھائی بچپن میں ہی وہاں طے گئے تھے۔ عمر کا سوواں سال مجھے اسٹیشن ہی میں لگا تھا۔ عمر کے چند ابتدائی خطرناک سال میں نے وہاں گزارے تھے جس کی ایسی باتوں کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔“

ری تھی۔ بڑھ نکاس والی کمری سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور کئی  
تینکوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

میں چند لمے راحیلہ کی طرف دیکھا ہوا اور آنکھیں  
رہا۔ اس نے مجھے بیدار ہوتے دیکھ لیا تھا لیکن فوری طور  
نہیں بولی اور رسالے کے ورق پلٹی رہی۔ جب میں کمر  
گھورتا ہوا تو آخر اسے رسالہ بند کرنا ہی رہا۔ اسے فوراً  
بٹختے ہوئے وہ بولی "یہ لوگوں کی طرح کیا دیکھے جارہے ہو؟"  
"میں تمہیں نہیں ڈرپ کو دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا  
"را" اس وقت ڈرپ تم سے زیادہ حسین لگ رہی ہے۔"  
راحیلہ زخم آمیز انداز میں کمری سانس لے کر کہہ  
نے لگی "تمہارے حیرت سے کہا "یہ ڈرپ ابھی تک ختم نہیں  
ہوئی؟"

"حق کہیں کے! یہ پانچویں ڈرپ ہے۔" راحیلہ  
جس میں ایک سی ڈرپ لگی ہوئی تو اب تک ختم ہو چکا ہے  
ہوئے۔"  
"میں کتنی دیر بوتا رہا ہوں؟"

"پورے چوبیس گھنٹے۔" راحیلہ نے جواب دیا پھر پھر  
تمہاری حالت پہلے سے بہتر ہے یا دھکا اشارت سی ہو؟"  
"نہیں" اب میں سیلف اشارت ہو گیا ہوں۔" میں  
ایسا بازو دوڑوش کے انداز میں ہلاتے ہوئے کہا۔ دوسرے  
ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے وقف سے میں نے پوچھا "ان چوبیس  
کے دوران قلم کلی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی؟"  
"اس کے بارے میں تو اطلاع کل دوپہر ہی مل گئی۔"  
راحیلہ بولی "اس کی کوئی مثال ہوئی کہ پچھلے میں داخل  
میں۔" شمس صاحب اس کے لئے معلوم نہیں کہاں کہاں کے  
بند کر رہے پھر رہے تھے جبکہ وہ اس دوران جزیرے پر سی  
تھا۔" دیکھا ذاتی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا "کہاں سے او  
طرح پکڑا گیا؟"

"وہ جزیرے کے ایک چھپرے ستوران کے عقب میں آ  
تھیں وہیں بالکل تنہا موجود تھا۔ ایک کارڈ بھی اس کے ساتھ  
تھا۔" راحیلہ نے بتایا۔

"اس نے گرفتاری دینے میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں  
میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ وہ مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں ہی  
کیونکہ اس کی کھوپڑی میں ایک گولی پوسٹ تھی اور اسے  
ہونے کی گھنٹے گزر چکے تھے۔" راحیلہ نے اطمینان سے بتایا۔

میں گردن نیچے رکھے راحیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے  
نہیں آتا تھا کہ قلم کلی مرکا تھا۔ وہ ایک طاقتور قوی

کر رہا ہوں اس سے آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔" میں  
نے قدرے سنجیدگی سے کہا "میری حالت اس وقت تباہ ہے۔ میں  
بڑی شدت سے آرام کی اور ایک عدد ڈاکٹر کی ضرورت محسوس  
کر رہا ہوں۔ مجھے اور شفیع شاہ کو میرے ہوٹل پھانچا دینے کی  
بھر کے آرام کروں گا۔ ایک دو دن تک تو میں کچھ سوچتا بھی نہیں  
چاہتا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" جس میں ایسا ہی کرنا چاہئے۔" شمس  
صاحب نے سر ہٹایا "ایک دو دن تک تو میں خود بھی کراچی میں ہوں  
لیکن میں تمہارے ہوٹل میں نہیں ٹھہروں گا۔ کیسی اور ٹھہروں گا  
تاسم کلی کا معاملہ کچھ دوسرے لوگوں کے سپرد کر کے میں اسلام آباد  
واپس چلا جاؤں گا۔ بہر حال میرا تم سے رابطہ قائم رہے گا۔"

پھر وہ راحیلہ کی طرف متوجہ ہوئے "تمہارا کیا پروگرام ہے؟"  
وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میں بھی افضل کے ہوٹل میں ہی  
ٹھہر رہا ہوں۔ شاید اس کے قریب رہ کر مجھے تبادلہ داری کے بہانے  
اسے دھرم دینے کا موقع مل جائے۔"

شمس صاحب مسکرائے اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولے "ٹھیک  
ہے۔ پھر ہم لوگ ایک دو دن بعد ہی ایک دوسرے سے بات کر کے  
آئندہ کا کوئی مشترکہ پروگرام طے کریں گے۔"

کچھ دیر بعد ایک جیب ہمیں پیلے آجپٹی اور ہم فنگلی کے  
راستے کراچی پہنچے۔ یہ راستہ زیادہ طویل تھا۔ جس وقت شمس  
صاحب نے مجھے راحیلہ کو اور شفیع شاہ کو میرے ہوٹل کے سامنے  
اتارا اس وقت دھوپ چڑھ چکی تھی۔ راحیلہ اور شفیع نے سہارا  
دے کر مجھے میرے سوٹ میں پچھلایا۔

میں اب تک گویا حرف تو تبادلہ کے سارے خود کو چھپنے  
پھر رہا تھا۔ پوچش کرے میں انتہائی آرام دہ بیٹھ رہنے ہی جیسے مینر  
میں چلا ہوا انجی یکدم غائب ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو بالکل  
بے دم محسوس کیا۔ چند منٹ میں ہی ایک ڈاکٹر کون پچھلایا جس نے  
میرا چیک اپ دیکھ کر کہنے کے بعد ایک ڈرپ میں نہ جانے کون  
کون سے انجکشن ملا کر ڈرپ مجھے گاڑی۔ شاید اس میں کسی خواب  
تورہ کا انجکشن بھی شامل تھا۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو میں خود کو بہت بہتر اور تازہ دم محسوس کر رہا  
تھا۔ میرے ذہن پر غور کی کا شمار ضرور ہائی تھا لیکن اس میں ایک  
خصوصی خوشگوار شامل تھی۔ وہ جو ایک پرمجمل پن کی دھند  
سی چھائی ہوئی تھی وہ ہٹ گئی تھی لیکن ڈرپ مجھے بدستور لگی ہوئی  
تھی۔ اس کا اینڈ قریب ہی کھڑا تھا۔

راحیلہ میرے بیڈ کے قریب ہی ایک ہونے پر بیٹھی کوئی  
رسالہ پڑھ رہی تھی۔ وہ اب "مفتاب پوش حسینہ" والے صفحے میں  
نہیں تھی اور اپنے آگے سیاہ آگے سفید چہرے کے باوجود  
نہایت تازہ دم کھلی کھلی اور بے تشنگ نظر آ رہی تھی۔ کمرے میں  
ایک دھڑکتے ہوئے بجلی ہوئی تھی جو شاید اسی کے وجود سے پھوٹ

## تاریخی ناول

|                      |           |      |
|----------------------|-----------|------|
| دنیا کے نامور فاتحین | قمر تسکین | 0/-  |
| شیر مصر              | قمر تسکین | 0/-  |
| ششیر اسلام           | قمر تسکین | 10/- |
| ترک مرد میدان        | قمر تسکین | 10/- |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

”اپنی کھوپڑی نوٹ مٹی تو کسی دوسرے کی کھوپڑی سے چلائے گئے۔“ میں نے کچھ اور جمل کر کہا ”ماشاء اللہ ایسا صورت قلعہ حیات ہے راحیلہ مائی فیروز اگر تمہارا مائی حال بہت جلد تم احقوں کی سرواز کے عودے پر فائز ہو جاؤ گی۔“

”نہیں۔۔۔ میرا جیس اس عودے سے ہٹانے کا کوئی ار نہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تمہارے ارشادات عالیہ باتوں کی حد تک تو اچھے ہیں پر عمل ذرا مشکل ہوتا ہے یہ کوئی کامیاب قلعہ حیات ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں تو کہتی ہوں قلعہ حیات کو بھی گولی مارو۔ ایک ق حیات ناکام ہو تو انسان کو فوراً دوسرا قلعہ حیات اختیار کرنا چاہئے۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”یہ تم ترجیحی باتیں کر رہی ہو؟“ میں نے حیرت سے اس طرف دیکھا۔ ”مجھے تو تم سے خوف آنے لگا ہے۔ باتوں سے کچھ لگتا ہے جیسے تم سیانداں ہو گئی ہو۔“

”چلو خیر یہی قیمت ہے کہ ہمیں کسی سے خوف نہ آتا۔“ جتنے ہوئے بولی۔

”اگلے سے تو انسان کو خوف ذرا ہی رہتا چاہئے۔ کیا جا دقت کیا کر کر رہیں۔“ میں نے کہا ”خیر۔ یہ بیکار باتیں چھوڑو ڈاکٹر اگر کہیں اس پاس دستیاب ہے تو اسے لگا کر مجھے اس دار سے نجات دلاؤ۔ میں یوں مریضوں کی طرح لیٹنا نہیں چاہتا۔“

”جو تجربہ تم کس طرح لیٹنا چاہے ہو؟“ راحیلہ نے حیرت پوچھا ”تم اس دقت مریض ہی ہو۔“

”مجھے خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرو۔“ میں نے گویا براہ راست ہونے کہا ”میں مریض وغیرہ نہیں ہوں۔ یہ دُرپ ہواؤں میں ہمیں ابھی چھٹا نہیں گا۔“

ظاہر سے میری مراد جسمانی طور پر طاقتور ہونا نہیں ہے۔ وہ ایک طرح سے اپنے جزیرے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وہاں کے رہنے والے ابھی تک ہم قبائلی طرز زندگی کے عادی تھے اور قاسم کلی گویا ان کا غیر رسمی سا سردار تھا۔

اس حیثیت سے قطع نظر بھی اس کے پاس کی طرح کی طاقت تھی۔ دولت کی طاقت تھی، اثر و رسوخ کی طاقت تھی۔ ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کا قانون اسے حاصل تھا۔ ان کے علاوہ بھی نہ جانے کیسے کیسے لوگوں کے ساتھ اس کے رابطے رہے ہوں گے۔ مسلح محافظوں کی ایک ذخیرہ اسے ہر وقت اپنے ہتھ میں رکھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ یوں خاموشی سے جزیرے پر بیٹھا رہا گیا تھا کہ ہمیں وہاں ہوتے ہوئے بھی کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہ بڑا حیرت کا مقام تھا پھر مجھے خیال آیا کہ اس قسم کے کی حیرت انگیز موڑ میری زندگی میں پہلے بھی آچکے تھے۔

”یہ تو بہت بڑا ہوا۔“ میں نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا۔

”یعنی ایک بڑا آدمی اپنے انجام کو پہنچ گیا تو یہ تمہارے خیال میں بہت بڑا ہوا؟“ راحیلہ پوچھتے ہوئے لمبے میں بولی۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا ”مجھے تو خود اپنے ہاتھوں سے اس بڑے آدمی کی گردن موڑنے کی تمنا تھی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اکثر بڑے لوگ ہمیں کوئی خاص کام کی بات بتاتے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔“

”کیا پوچھنا تھا جس میں اس سے؟“ راحیلہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

”کیا کہ جانہ پر کدوؤں کی کاشت ہو سکتی ہے یا نہیں؟“ یہی کہ لیکسٹونس آج کل ٹانوں کا کیا ہوا جمل رہا ہے۔ ”میں نے کہا۔

”لگے بے پر کی بات ہے۔“ راحیلہ نے آنکھیں نکالیں۔

”ظاہر ہے احتیاج سوالات کے جو اب بات بھی احتیاج ہی ہو سکتے ہیں۔ بے وقوف لڑکی کیا کہیں اندازہ نہیں کہ قاسم کلی کتنا اہم آدمی تھا اور اس سے کیا کچھ معلوم ہونے کی توقع رکھی جاسکتی تھی؟“ میں نے ذرا جمل کر کہا۔

”میں نے تو کسی بھی واقعے سے کسی بھی فرد سے۔۔۔ کسی بھی قسم کی توقعات ہی رکھنی چھوڑ دی ہیں۔“ وہ کہہ کر اچانک اطمینان سے بولی ”میں نے مجھے کسی بھی قسم کے نتائج پر کوئی غامض اندیشہ نہیں ہوتی۔ انسان کو میں اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔ کسی نہ کسی زاویے سے سوچتے رہنا چاہئے۔ کسی نہ کسی راستے پر سفر چاہی رکھنا چاہئے۔ ایک راستے پر رکاوٹ آگئی تو دوسرے راستے پر چل دیے۔ امید کی ایک کلن معدوم ہوئی تو دوسری کلن کی تلاش میں نظر دوڑانے لگے۔ ایک دور اندیش ہو تو دوسرے کی تلاش شروع کر دی۔“

”جس تمہاری فکر میں ہوں۔ اب اٹھ بیٹھے ہو تو خودی آؤر  
دے دو۔“ وہ بے نیازی سے کرسی پر بیٹھ کر دو بارہ رسالہ دیکھنے لگی۔  
”ہاں بھئی۔“ تم نے تو مجھے ڈرپ لگائی اور اناری ہے۔ تم تو  
اب کو الٹا نڈ ڈاکڑ ہو گئی ہو۔ تم بھلا اس قسم کے معمولی کام کیوں  
کرتے لگیں۔“ میں نے غمزہ انداز میں سہلاتے ہوئے کہا اور خود  
نی ہوم سروس کو فون کر کے ہاتھ کا آؤر دیا۔

ہاتھ کے انتظار کے دوران میں نے ایک ٹک راجیلہ کو گھورتا  
شرع کر دیا۔ وہ بڑی بے نیاز بن کر بظاہر رسالے کے مطالعے میں  
مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جلدی اسے اس سے  
توجہ ہٹاتی رہی۔

”کسی کو ٹھک کرنے کا بہترین طریقہ شاید یہی ہے کہ اسے  
ایک ٹک گھورتا شرع کرو۔“ آخر کار وہ سر اٹھا کر ہوئے بولی  
”آخر کیا تکلیف ہے جیسے؟ کسی ناراض نسل کے ٹوکوی طرح  
کیوں گھورے جارہے ہو؟“

”میں تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور تم رسالے کر  
بیٹھ گئی ہو۔ یہ ایسے فضول فیشن میگزین پڑھنے کا وقت ہے؟ اس  
کے علاوہ میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ یہ میرا کرا ہے یا  
لاہیری؟“ میں نے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

”اوہو۔۔۔ اس کی آنکھیں بڑی طرح جھل جھل گئیں ”پاس  
بننے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”داخل دلا۔۔۔“ میں نے ہاتھ پر ہاتھ مارا ”پاس بننے کا شوق  
کس کبوت کو ہے۔ میں تو کچھ اور بننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن خیر  
چھوڑ دو۔ تم ایک کوڑھ مغز لڑکی ہو۔ تمہاری سمجھ میں یہ باتیں کہاں  
آئیں گی۔“ اب اس کے مجھے گھورنے کی پابندی تھی لیکن میں نے  
اس کی پروا کے بغیر سنجیدگی سے کہا ”میں تم سے ایک بات پوچھنا  
چاہتا تھا تمہارے خیال میں کام چلی کو کس نے قتل کیا ہو گا؟“

”کاش یہ ٹیک کام میں سے کیا ہوتا؟“ وہ لفظی سانس لے کر  
بول۔ ”دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں نکالیں ”یہ سوال جیسے مجھ  
سے کرنا چاہئے تھا؟“

”تم سے اس قسم کا سوال کرنا کسی نے خلاف ضابطہ قرار دے  
دیا ہے کیا؟“

وہ بخلا ہونٹ دانتوں میں دباے خاموشی سے مجھے گھورتی رہی  
تو میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ”ناراض کیوں ہو؟ میں  
جا کر یہ سوال ہاتھ دھم کی ٹوٹی سے پوچھ لیتا ہوں۔ شاید وہ بہتر  
جواب دے سکے۔“

”بیوقوف“ اس نے تائید میں سر ہلایا ”لیکن سوال کرنے سے  
پہلے دو مرتبہ دور دور سے ٹوٹی پر سوار ہونا بلکہ ہو سکے تو تین چار مرتبہ  
مارنا۔۔۔ جتنی زیادہ مرتبہ سر ٹوٹی سے گراؤ گے اتنا ہی بہتر جواب  
ملے گا۔“

پھر وہ قدرے سنجیدگی سے بولی ”حق انسان! میں ایک کھینے  
سے بھی کم وقت اس جڑے پر رہی ہوں۔ مجھے اس جڑے کے

رکنا سکا ہوں۔“  
”وہ تو خیر مجھے تعین ہے کہ تم چلا گئیں گا کر دکھا سکتے ہو۔ اس  
کے لئے تو شاید ڈرپ ہونا بھی ضروری نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ  
تم ڈرپ سمیت ہی چلا گک گانا نہ شروع کرو۔“ آخر ایک بن مانس  
سے اور توجہ میں کیا رہی جاسکتی ہے؟ ”وہ کمری سنجیدگی سے بولی۔

”اب اگر تم نے کیواس بند نہ کی تو میں ڈرپ اسٹینڈ پر سے  
منہ کر تمہارے سر پر دے مارتوں گا۔“ میں نے اسے گھورا  
”تمہارے حق میں بہتر کی ہے کہ ڈاکڑ کو گولا لو۔“

”ہاں تم واقعی مزید ڈرپ لگوانا نہیں چاہتے؟“ راجیلہ نے  
نبھکی سے پوچھا۔

”بھئی مجھے ڈرپ کی کیا ضرورت ہے؟ میں خود کو بھلا چکا  
میں کر رہا ہوں اور پھر اس ڈرپ سے میرا بے کا بھی کیا؟ اسے  
آزار ایک طرف سمجھو اور میرے لئے گھڑا سا ہشتا منگواؤ۔“ میں  
نے گھمٹاتے ہوئے کہا۔

وہ ڈاکڑ گولہ لانے کے بجائے خودی اٹھ کر میری کھالی سے نیپ  
اٹانے لگی تاکہ سولی قس سے نکال سکے۔

”کیا تم خود ڈرپ ہٹاؤ گی؟“ میں نے پریشانی کا اظہار کرنے کی  
کوشش کی ”ڈاکڑ کو قتل نہ لڑاؤ گی؟“

”میں تو میں پریشان ہو رہے ہو جیسے یہ کوئی بھڑا پڑیشن ہے۔“  
اس نے مجھے گھورا ”یہ کون سا مشکل کام ہے۔“

اس نے سولی میری قس سے کھینچ کر اسپرٹ کا چھاپا رکھتے ہوئے  
میرا ہاتھ سوز دیا۔ میں نے خواہ خواہ کراچے ہوئے کہا ”کیا معلوم تھا  
کہ مجھے طبی معاملات میں بھی تمہارے سامنے تختہ مشق بننا پڑے  
گا۔“

”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جیسے ڈرپ لگائی بھی  
ملنے سے ہی تھی۔“ وہ ایک نرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی  
”ڈاکڑ صاحب تمام دوا میں وغیرہ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے  
مجھے فون پر چالاکت دے دی تھی۔ یہ آخری ڈرپ میں نے ہی  
لگائی تھی۔ میں نے اس سے پہلے بھی زندگی میں کئی بار کئی لوگوں کو  
ڈرپ لگائی ہے۔“

”وہ خدا ایا! میرے حال پر رحم کرنا۔“ میں نے ہمت کی طرف  
دیکھ کر ہونٹ ہاتھ جوڑ دیے اور کراچے ہوئے اٹھ بیٹھا ”چھا ہوا  
ملنے سے جلدی یہ ڈرپ آؤرادی۔ معلوم نہیں تم نے اس میں کیا  
ڈال دیا؟“

”میری ایسی قسمت کہاں کہ مجھے اس میں کچھ ملانے کا موقع  
ملے۔“ وہ لفظی سانس لے کر بولی ”ڈاکڑ صاحب اگر دواؤں کے  
ساتھ غمزدہ سا پادھ شیم سا کانا بڑ بھی چھوڑ جائے تو ضرور ڈرپ میں  
لارنگ۔“

”تم سے کیا امید ہے۔“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا  
”میں نے تم کو دست جس کے دشمن اس کا آسان کیوں ہو۔ بہر حال  
اس دشمن جیل باؤ خوشی اپنی جگہ کم از کم ہاتھ کا آؤر تو دے دو۔“



”دو تو کیا چاہتے ہیں۔“ راحیلہ بولی ”لیکن میرا ان کے ساتھ جانا بہت ضروری ہے۔“ میں اسی سلسلے میں مٹھوں کر کے لے کر تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔“

”مجھے معلوم ہوا تو میں ابھی خنزیرہ وغیرہ دس دن پہلے ہوش میں آئی۔“

وہ اچھے اٹھاتے ہوئے تیزی سے ہولی "بسم" میں اس پر  
سے اُترنے کی کوشش مت کرنا۔ بڑی مشکل سے عجمی کی سے  
شروع ہوئی ہے تو اب ذرا عجمی کی سے ہی چلاؤ۔ مجھے کیا  
جانے؟

”اب تم مجھ سے مشورہ کرنے لگی ہو؟“ میں نے ذرا حیران سے کہا ”میرا تو خیال تھا کہ اب تم نے فیض صاحب کے مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھانا چھوڑا ہے اور کوئی بات تم فیض صاحب سے بغیر نہیں کہہ سکتیں۔ میں نہیں جانتا کہ تم فیض صاحب کے جیسے جیسے چاہو۔ تم فیض صاحب کو ساتھ لئے میرے پیچھے چل آؤ گے۔“

”اس بات پر تو حسین خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے تاہم انسان اتم کا شکر کرے ہوا“ وہ غصیلے لیے میں ہولی کھڑا ہو گیا نہ کہنے تو یہ ذات والے تمہاری کھابولی کر کے چھٹلا ڈونر کھلا کے ہوتے۔“

”تمہارے بچنے سے میری جان بچنے میں کون سی مدد ملی جائے گی؟“  
 نے آنکھیں نکالیں ”مجھے خود ہی قہر بہ نقد ہو کر موٹو ٹوٹا ہوا  
 سمندر میں تھوٹکا ہوا اور جب میں نے جان ہی حالت میں ڈوب  
 قافو شفیع شاہ نے آکر مجھے نکالا جو اتفاقاً ہی مجھے تلاش کرنے  
 کا سبب ہو گیا تھا۔ اس میں تم لوگوں کا کیا کمال ہوا؟ اس میں  
 شاعر کا خیالی کا سراسر شفیع شاہ کے سر ہے۔“

”چلو تم اسی کے سر سہرا بانہ لو۔ مندی کی رسم کرلو۔ ابا  
کالو لیکن مجھ سے یوں سوئوں کی طرح مت لڑو۔ ہم سے غلطی ہو  
وہم تمہاری ٹھہر میں بھاگے چلے آئے۔ آنکھ وہم کسی گڑھے میں  
رہے ہو گے تو میں بچنے سے اگر ایک لات رینڈ کروا کی اور تمہا  
نام آسان کروا دی گا۔“

”کلات ٹوٹ جائے گی۔“ میں نے خبردار کیا۔

۳۱ چھاب بکواس ہی کئے جاؤ گے یا میرے اصل سوال  
 جواب بھی دو گے؟ کیا میں تیرے صاحب کے ساتھ چل جاؤں؟

”مجھ نے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے بظاہر علی:

ام انہی سے پوچھ کر انہی کی مرضی کے مطابق کیا کرو۔“

اب اس کے بزرگوں کو جی رقیب بھٹا شروع کر دیا۔  
نے حیرت سے کہا۔

”وہ اتنے بزرگ بھی نہیں ہیں۔ ابھی تو ان کی سزاؤں مکمل ہوئی تھیں چار سال باقی ہیں جبکہ میں نے تو بعض بزرگوں کو سزاؤں سے

لے بعد بھی دوسری تیسری یا چوتھی شاوی کرتے دیکھا ہے۔“

بارے میں۔۔۔ اور کام بخلی کے اور گرد پائے جانے والے لوگوں کے بارے میں قطعاً کوئی معلومات نہیں ہیں۔ میں بھلا کیسے کوئی اندازہ ظاہر کر سکتی ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا ہو گا؟“

”تم کچھ کر رہی ہو۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس سوال کا تم سے بجز جواب تو ہاتھ دوں کہ کوئی دے سکتی ہے۔“ پھر میں نے ذرا آنکھیں نکالیں۔ ”کوئی رقم! میں تو اس لئے پہنچ رہا تھا کہ شاید میری بے ہوشی کے دوران کوئی نئی بات سامنے آئی ہو۔“

”میں صاحب خفیہ اورادوں کے کچھ لوگوں کو وہاں چھوڑ کر آئے تھے۔ شاید ان کا طرف سے کوئی رپورٹ آئی ہو جس کی روشنی میں کوئی اندازہ قائم کیا جاسکے گا؟“

اس نے غصہ ڈی سانس لی "ہمارے غصہ ادارے اتنی جلدی کوئی کام کی بات معلوم کرنے کے قابل ہو تو پھر بات یہ کیا تھی! پھر ہمارا یہ درگت تو شرعی تھی جواب بن رہی ہے۔"

”یہ بھی تم سمجھ کہہ رہی ہو۔“ مجھے اس کی تائید میں سر ہلانا پڑا۔  
پھر مجھے قاسم علی کی جلیبوں کا خیال آیا اور میں نے دوا چڑھتے ہوئے  
کہا ”تائیا اور تائیا کا تو بہت بُرا حال ہو گا باپ کی موت کی خبر سن  
کر“

”بہت فکر ہے جس میں ان دونوں کی؟“ اس نے ترجیحی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”مجھے تو تمہاری بھی بہت فکر ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ فکر ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جواب دیتی تھیں نے ہمدردی سے کہا ”آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ باپ خواہ کیسا ہی قمار اور دھوکا کھائے بھی خواہ کیسی ہی ہیں لیکن انہیں باپ کی اس طرح چاٹنا کہ موت سے دھکا توڑ روست لگا ہوگا۔“

”مثلاً“ اس نے بے پروائی سے کہہ مے اچکائے ”مجھے اس صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں ویسے میرا خیال ہے کہ وہ دھکے وغیرہ محسوس کرنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ان کی جذباتیت کچھ اور طرح کی ہوتی ہوگی۔“

اس دوران ناشتا آیا۔ راجہ نے اپنے لئے صرف کافی تیار کیا۔ وہ ناشتا کر چکی تھی۔ ناشتے کے دوران میں نے اس سے پوچھا: شمس صاحب سے رابطہ کیا؟“

”کئی بار“ اس نے جواب دیا۔

”وہ کیا کر رہے ہیں؟“

تجربہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ”وہ لٹری سائنس کے کربولی

نے کچھ دوسرے لوگوں کی ڈیوٹیاں لگائی ہیں جو ریڈ ڈاٹ کے خاص

دوڑیں اور کام میں کی سوت سے بھلے پیدا ہونے والے حالات پر  
ملزم رکھیں گے اور بچے کھینچے لوگوں کی تلاش کا کام جاری رکھیں

۱۳۰۱ میں کراہ کر رہ گیا ”تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم نصیحتیں

احب کے ساتھ اسلام آباد جاؤ گی؟“

ایک آدھ ٹشو بھی سر جری کے بعد باقی رہ جائے تو وہ بیماری لوٹ کر آسکتی ہے۔ اسی طرح مجھے اندیشہ ہے کہ ریڈ ڈاٹ کا ایک آدھ شیطان بھی یہاں رہ گیا تو ریڈ ڈاٹ دوبارہ جنم لے سکتی ہے۔ یہ کینسر خود کر آسکتا ہے۔

راجیلہ خاموش رہی۔ میں نے کالی کا ایک گھونٹ بھر کربات جاری رکھی۔ سب سے زیادہ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ ہاتھ نہیں آیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہوگا؟

”میں کہہ چکی ہوں کہ جیسے میری وجہ سے ڈاکٹر برنارڈ کی فکر میں جلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو اب اس چرے کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہوئی جا رہی ہوں۔“ راجیلہ بے پروائی سے بولی۔

”تمہارا کیا ہے تم تو کہہ دو گی کہ میں بغیر چرے کے بھی گزارا کر سکتی ہوں۔ جس طرح کھوپڑی میں پیسے کے بغیر گزارا کر رہی ہو لیکن دیکھو۔۔۔ انہیں کی کھوپڑی میں بھیجانا ہو تو یہ بات کم از کم اس وقت تک تو چھپی ہی رہتی ہے جب تک وہ زبان نہیں کھولتا یا کوئی حرکت نہیں کرتا۔“

”لیکن بعض لوگ تو خاموش رہتے ہیں تب بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی کھوپڑی میں بھیجا نہیں ہے۔ تم اس کی ایک روشنی اور آئینہ مثال ہو۔“ وہ بظاہر گہری سنجیدگی سے بولی۔

”بھروسہ اس شروع ہو گی۔“ میں نے آنکھیں نکالیں۔  
”اس کی ابتدا تم کرتے ہو۔“ اس نے بھی جواباً آنکھیں نکالیں۔

”اچھا۔۔۔ سیرنا۔۔۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا تھا کہ رہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کے علاوہ بھی مجھے ایک شخصیت کی فکر ہے۔“  
”وہ کون؟“

”وہی آئینی آنکھوں والی لڑکی جس کی کسپید ٹرانزڈ تصویر تم لوگوں کے پاس موجود تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”لوہڑی کی فکر تو جیسے بیشی سی لائق ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ آئینی آنکھوں والی ہی کیوں نہ ہو۔“ راجیلہ منہ بنا کر بولی۔

”دیکھو ٹریک سے بٹنے کی کوشش مت کرو۔“ میں نے خیر وار کیا۔ ”اس میں میری دلچسپی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بھی ریڈ ڈاٹ میں خاصی اہمیت کی مالک معلوم ہوئی ہے۔ اسے بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔“

”ممکن ہے یہ دونوں شخصیات اب ملک میں موجود نہ ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کے کالی لوگ فرار بھی تو ہوئے ہیں۔ بلکہ چند ایسی عمارتی اپنی ملکی شخصیات بھی غائب ہوئی ہیں جو مختلف سرکاری عہدوں پر فائز تھیں مگر ریڈ ڈاٹ کی آواز کا رتی ہوئی تھیں۔“ راجیلہ بولی۔

”بہر حال میں انہیں تلاش کرنے کی ایک کوشش اور کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں ان کے پائے جانے کا زیادہ امکان ہے۔ میں ابھی کچھ دن اور یہاں رہوں گا۔ قاسم بجلی کے جڑے گا بھی ایک

اس نے حلائی نظروں سے ادراد مرد کھا۔ ”کالی! اب میں واقعی کچھ اٹھا کر تمہاری کھوپڑی پر دے گا۔ ان کی اور خواہ مخواہ وہ مارا جو سا کرے میں بھر جائے گا جو اس کھوپڑی میں بھرا ہوا ہے۔“ وہ لڑائی میں مائل لے کر بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”راجیلہ میری زبان اس وقت تمہارے ساتھ ہو اس بازی میں مصروف تھی لیکن میرا ذہن کسی اور ٹریک پر چل رہا تھا۔ میں یہی فیصلہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جیسے کیا مشورہ دیا جائے۔“

راجیلہ تو مجھے معلوم ہے کہ جب تمہاری زبان فنیجی کی طرح چل رہی ہوتی ہے تو تمہارا ذہن کسی اور ٹریک پر لڑھک رہا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی تم بڑی عجیب و غریب لوگ کر سکتی ہو۔ میرا میں چلتا تو جیسے زندہ ہی تھوڑا کر کے کسی غائب گھر میں رکھوا دیتی۔“

”میں اب بھی غائب گھر میں ہی ہوں۔“ میں نے ناشتے کا منایا جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ دنیا کیا کسی غائب گھر سے کم ہے؟ یہ بجائے خود ایک بیکراں گھر کا غائب گھر ہے۔ اس سے پہلے کہ میں قفسے کے ٹریک پر زیادہ روک لڑھک جاؤں، جیسے اپنے گراں قدر مشورے سے نوازا دیا جائے تو بہتر ہے۔“

”دوسرے ہی لمحے میں نے کہا ارادہ بدل دیا اور کہا۔ ”لیکن سوال یہ ہے کہ تم میرے مشورے پر چلنے کے بجائے خود اپنی مرضی سے ہی کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر رہی؟“

”میں نے تو تمہیں اپنی ہی مرضی سے کہوں گی۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”وہ تو میں یونہی تمہارا اور نہیں صاحب جیسے تو میوں کا دل رکھنے کے لئے مشورہ دے لیتی ہوں۔“

”اب تم ہڑی سے آ رہی ہو۔“ میں نے ناشتے کی رے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اور کالی کے برعکس کی طرف ہاتھ بدھاتے ہوئے کہا۔

”وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”دراصل ریڈ ڈاٹ کا تو میرے خیال میں قریباً خاتمہ ہو چکا ہے اس لئے میں اب نہیں صاحب کے ساتھ زیادہ کھینچنے پھینچنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“

”میرا خیال ہے فی الحال تو تم نہیں صاحب کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤ۔ وہاں اگر کچھ معاملات باقی ہیں تو انہیں ختم کر آئے۔“ راجیلہ کو ان کے ٹھکانوں سے واپس بلا کر، ”نہیں صاحب کو مطلع کر کے لاؤر پہنچ جاؤ۔ میں بھی چند دنوں تک وہیں آ جاؤں گا۔ مجھے اپنے گھبراہٹ کو بھی دیکھنا ہے اور کسی اچھی سی جگہ کو اپنے گھر کی سٹے کرے سے تعمیر کا ٹھیکہ بھی دینا ہے۔ اسی طرح دوبارہ کب تک بھول گا؟“

”تم اتنے دن یہاں کیا کوئے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے خیال میں ابھی ریڈ ڈاٹ کا کچھ معنوں میں خاتمہ نہیں ہوا۔ وہ جو ایک عمارت ہے تاکہ باقی کل گیا مگر ڈوم جیسے کچھ کے خیال میں کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ اچھی سرگیا ہے مگر اس کی ڈوم زندہ ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں کسی ملک چیز کا

پکر اور لگاؤں گا۔

”اس زمانے ان لڑکیوں کی دلجوئی بھی ہو جائے گی۔“ راحیلہ نے لقمہ دیا۔

میں نے کافی کے گک کے اوپر سے اسے گھورتے ہوئے کہا ”میرا خیال تھا کہ تم رقابت میں جھلا نہیں ہوئیں۔“

”میں رقابت کے نہیں۔ شرافت کے تحفظ و نظر سے بات کر رہی ہوں۔ شرفا بڑے وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ دلجوئی کرتے ہیں۔ جنہیں ضرورت ان شریف لڑکیوں کے معزز باپ کے نامانی نقل پر ان کی دلجوئی کرنی چاہئے۔“ وہ بظاہر بے پروائی سے بولی۔

”جنہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس قسم کی لڑکیوں میں اگر میں دلچسپی لیتا بھی ہوں تو وہ دلچسپی بالکل عارضی نوعیت کی ہوتی ہے۔“ میں نے گویا مسکائی پیش کی۔

”مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ میری طرف سے تو خواہ تم ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی ذات میں دلچسپی لیتے رہنا۔ ان کا رزار تیار کروا کے خود گاؤں میں کرینے جانا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”دام۔ دام۔!“ میں نے کافی کا گک رکھ کر تالی بجاتی ”جیک وقت بے نیازی دکھانا اور جل جل کر کباب ہونا تو کوئی تم سے سیکھے۔“

”کباب ہونا ہے میرا جوکر۔“ اس نے پاؤں ذرا اونچا کر کے جوکر مجھے دکھایا ”ویسے ایک بات ذرا سنجیدگی سے بتا دوں۔ ان لڑکیوں کے دوستیلے بھائی بھی آج کل میں یورپ سے واپس جیتنے والے ہیں۔ یہ چاروں بہن بھائی غالباً تمہیں اپنے باپ کی موت کا ڈنکے دار سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے ذرا احتیاط رہنا۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ میں واقعی جنہیں خبردار کر رہی ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ کافی کا گک خالی کر کے تپاکی پر رکھتے ہوئے بولی ”تمہیں واقعی نہیں صاحب کے ساتھ اسلام آباد چل جاؤں؟“

”ہاں“ میں نے سوچتے ہوئے کہا ”لیکن بس دو چار دن میں معاملات و انتظام اپ کر کے لاہور پہنچ جاؤ۔ ریڈ زون کے سلیٹے میں اگر کوئی کام پائی بھی ہو تو وہ نہیں صاحب ہی کے سپرد کرو۔ وہ جانیں اور ان کے آدمی۔ اتنے طاقتور ادارے ان کے احکامات پر چل رہے ہیں۔ اتنی میں پاور ہے ان کے ساتھ۔۔۔ اب انہیں ہی یہ معاملے سنبھالنے دو۔ ویسے بھی کام تو تقریباً ختم ہی ہو چکا ہے۔ ہماری اب ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔“

راحیلہ خاموش رہی اور بغور میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے نہ کلام جوڑا نہ شفیق شاہ بیس میرے ساتھ رہے گا۔ اگر میں جلد کتبہ کا تب بھی تم لاہور پہنچتی ہی سب سے پہلے تو ذرا برائے ہو۔۔۔ جس تک تمہاری ”ماتقص“ متعل ساتھ

دست۔ وہاں تک اس سے کام لینے کی کوشش کرنا اور دیکھنا کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے بڑے زیادہ بڑے حال میں تو نہیں؟ میرا فون پر تم سے رابطہ رہے گا۔“

پھر میں نے اسے لاہور کے ایک بہت بڑے آرکیٹیکٹ کا نام بتاتے ہوئے کہا ”اگر مجھے کچھ زیادہ دن لگ جائیں تو تم وہاں سے آرکیٹیکٹ صاحب سے بات کر کے مکان کے نئے نقشے کی بنیاد بھی شروع کرانا۔ انہیں سائٹ دکھانا اور لمبہ وہاں سے اٹھوانے کا بھی بندوبست کرنا۔ میرے آنے تک تمام چیز نوکوں سے تمہیں ہی کام لینا ہوگا۔ اب ہمیں اپنی نارمل زندگی کی طرف واپس آنے کے لئے بخیر سے کام شروع کرنا ہوگا۔“

”نارمل زندگی۔!“ راحیلہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگی۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”ہم۔ اور نارمل زندگی۔۔۔!“ وہ ہنسنے ہنسنے یکدم عجیب و غریب لٹھڑی سانس لینے ہوئے بولی ”تمہاری اس بات پر بھی اپنی حق مجھے نہیں لگا کہ نارمل زندگی ہمارے نصیب میں نہ گئی ہے۔“

”کیوں۔ ہم نے کیا قصور کیا ہے جو ہم نارمل زندگی نہیں گزار سکتے؟“ میں نے نکلی سے پوچھا۔

”نارمل زندگی تو آج کل نارمل انسانوں کو نصیب نہیں ہو رہی۔ ہم تو نارمل انسان ہی نہیں ہیں۔ ہم بھلا نارمل زندگی گزارنے کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں؟“ اس نے طویل سانس لی۔ ”ہم جیسے بھی ہیں، ٹھیک ہی ہیں۔“ میں نے سر جھک کر کہا ”دل خراب کرنے والی باتیں زیادہ مت کیا کرو۔ دل خوش کرنے والی باتیں کیا کرو۔ آج شام تم نہیں صاحب کے ساتھ جا رہی ہو۔“

”اگر یہ تمہارے لئے دل خوش کرنے والی بات ہے تو چل جاتی ہوں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”میں لٹھڑی سے دونوں ہاتھ ایک سانس میں کر بیٹھا۔ یہ سوال الگ تھا، اب خواہ خواہ زبان پھڑکنے کی کوشش مت کرو۔“

میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔

”تمہاری زبان بھلا کون پکڑ سکتا ہے۔“ وہ حسرت سے ہلکا جھیر حال میں آج شام جاری ہوں اور تمہاری ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔“

”شکر ہے تمہاری زبان سے یہ تو نکلا کہ تم کسی کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کرو گی ورنہ تم پر تو اکثر مجھے ”بائی گورلی“ کہا گیا۔ گمان گزرتا ہے۔“

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی ”نہیں صاحب کا فون اب تک آنا چاہئے تھا۔ مجھے ان کو بتانا پڑے گا کہ میں ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔“

”خوش ہو جائیں گے بے چارے۔“ میں نے جھپٹتے ہوئے راحیلہ کے ایک بار پھر خوشخوار نظروں سے مجھے گھورا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس کے موبائل فون کی ٹھنکی بج اٹھی۔

آ رہا ہے۔" راجیلہ نے اطمینان سے جواب دیا "اس کے بعد آئندہ کاروبار گرام طے کر لیں گے۔ جیسی بھی صورت حال ہوگی اس کے مطابق چلے کر لیں گے۔ اس دوران آپ اس سے رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنے ہوش میں ہی قیام کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میری اس بات کراؤ۔" نفیس صاحب نے کہا۔

راجیلہ نے سر جھپکے بنا کر پہلے نفیس صاحب کی نظروں سے مجھے گھورا پھر فون مجھے تھمادیا۔ میں نے فون کان سے لگایا تو راجیلہ نے آہستگی سے سر میرے سر سے جوڑ لیا۔

نفیس صاحب میری خیر خواہی و دریافت کرنے اور رسی جملوں کے تبادلے کے بعد بولے "قاسم بھلی کی موت ابھی تک تو معافی نہیں ہوئی ہے۔ ہر حال میں نے اس کی تحقیق ہی آگئی اے کے سپرد کر دی ہے۔ ہمارے آدمی ان سے رابطہ رکھیں گے اور اگر کوئی نئی بات سامنے آئی تو اس کی روشنی میں ضروری اقدامات کریں گے۔ ہمارے آدمی قاسم بھلی کے مکان اور اس کے اہل خانہ پر بھی نظر رکھیں گے۔"

"تاکہ کوئی ان کے ہاں آنے والا بھی ہو تو وہ ان کے قریب نہ پھٹے اور کسی کی نظر میں نہ آئے۔" میں نے ملا ٹٹ سے کہا۔

وہ میرا مطلب سمجھ کر بھلی سی ہنسی کے ساتھ بولے "نہیں نہیں یہ رسی گھرائی نہیں ہوگی۔ قاسم بھلی کے آدمیوں اور اس کی فیملی کو پتا نہیں چلے گا کہ ان کی گھرائی ہو رہی ہے۔ ان کے ٹیلی فون بھی چُپ ہوں گے۔"

"اچھا ہوا آپ نے بتایا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میرا تو ان "عظیم" لڑکیوں یعنی تانیا اور ٹانیا سے فون پر کچھ "دوستانہ" گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔ آپ خواہ مخواہ بعد میں شپٹا کر شرمندہ کرتے رہتے۔"

"کیا تمہاری دوستانہ گفتگو بھی شرمسار کرنے والی ہوتی ہے؟" نفیس صاحب نے مصممانہ لہجے میں پوچھا۔

"بڑھ بڑھ کچھ پتا نہیں ہو آ زبان سے کیا نکل جائے زبان دیے بھی پھسلنے والی چیز ہے۔"

"بے شک" نفیس صاحب نے تائید کی "خصوصاً جب بات حیات تانیا اور ٹانیا جیسی "عظیم" خواتین سے ہو رہی ہو تو زبان کے پیچھے پیچھے پورا انسان بھی پھسلتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں تک جاسکتا ہے۔"

"واقعی یہ کی ہے آپ نے تجربہ کار انسانوں والی بات۔ اساتذہ آخر اساتذہ ہی ہوتے ہیں۔" میں نے تھیں آئیز لہجے میں کہا۔

"نیکو اس بند کو اور کام کی بات سنو۔" وہ شاید کچھ جھنجھک بولے "مجھے کچھ شے ہے کہ بڑی کا ہتھکڑا ہمانہ ہے۔ تم یہاں اپنے طور پر ریڈ ذات کی باقیات کے سلسلے میں ضرور ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرو گے۔ خصوصاً قمیص ڈاکٹر براؤز کی تلاش

میں فوراً کیا ہو ابھی تم نے یاد ہی کیا تھا کہ ان کا فون چلے گا۔" وہ کہنے میں دل کو مل سے راہ ہوا۔

"جی ہاں آپ! وہ فون اٹھاتے ہوئے بولی "اسے وقت کی بڑی کتنے ہیں۔ انہوں نے اسی وقت فون کرنے کے لئے کہا۔"

اس نے فون کاٹھن دبا دیا اور اسے کان سے لگایا۔ میں نے بھی دیکھنے سے آگے نہ بڑھا۔ اس کے سر سے تقریباً سر جوڑ لیا تاکہ گفتگو ہاسکوں اور اسے ہانے اس کے دھوکے کی بجائے جیسی خوشبو سے پڑ جائے۔ دوسری طرف واقعی نفیس صاحب تھے۔ جلد ہی آواز سننے ہی انہوں نے سب سے پہلے میرے بارے میں پچھا "فصل کو ہوش آگیا؟"

"ہوش؟" راجیلہ دانت چس کر میرے بال کھینچ کر مجھے دور لے کر ہانک کر کہنے ہوئے بولی "وہ بے ہوش ہی کب تھا؟ تو اپنی میٹوں کی نیند کی کمی پوری کر رہا تھا۔ مسلسل چوبیس گھنٹے نے کی عیاشی اس نے شاید آج تک نہیں کی تھی۔ سوچ قیمت و کراس نے اپنی حسرت نکالی ہے۔"

"یعنی اب وہ جگ رہا ہے۔ ٹھیک تھا کہ ہے؟" نفیس صاحب کے ذہن کا بوجھ گویا کچھ کم ہو گیا۔ ان کے لیے میں گفتگو نہ

"وہ تو ٹھیک تھا کہ ہے لیکن اب آپ میری فکر کیجئے۔ میرے نے کسی نفسیاتی اسپتال میں بستر کا انتظام کیجئے۔ اسے ہوش میں لے مشکل سے آدھا بٹھاتا ہوا ہے اور اس نے میرے دماغ کی لیٹا کر کرکھو دی ہیں۔" راجیلہ بولی۔

"گولی بات نہیں۔ دماغ کی چوبیس تو دوبارہ کسی جاسکتی ہیں۔ خوش ہے کہ فاضل کی حالت ٹھیک تھا کہ ہے۔ مجھے اس کے سے میں تشویش تھی۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

"آپ اس کے بارے میں برطانیہ نہ ہوا کریں۔ بڑی ذہین ہے۔ آپ کو ابھی تک اندازہ نہیں ہوا؟" راجیلہ بولی۔

"نفیس صاحب بھلی سی ہنسی کے ساتھ بولے "گلتا ہے وہ قریب نہیں بیٹھا تمہاری گفتگو سن رہا ہے۔"

"کیا اہل سامنے ہی بیٹھ کر بیٹھا کسی اور اس کو بھینچنے کی طرح مجھے اور رہا ہے۔" راجیلہ نے جواب دیا حالانکہ میں اب بھی اس کے سے کڑوڑے ہوئے تھا۔

"تم نے اس سے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بات کی؟" نفیس صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن وہ ابھی نہیں

"نہیں؟" نفیس صاحب نے ملا ٹٹ سے پوچھا۔

"ٹھیک تو وہ انکو اپنے آپ کو مکمل تندرست محسوس نہیں ہے۔ دوسرے یہاں واقعی اس کے بڑی کے بعض معاملات سے آگاہ ہوئے ہیں۔ اس کا چند دن یہاں قیام کچھ ضروری نظر

ہوگی۔

”اے تو ذرا سنبھال لوں۔ میں چار بجے سے پہلے ہی جا رہا ہوں۔ تم بھی اس دوران شاور لے کر کچھ انا والے طبقے میں آنے کی کوشش کرو۔ گوکہ تمہارے لئے بہت مشکل کام۔ کہ تم انسان نھر آؤ لیکن کوشش کرنا یہ انسان کا فرض ہے۔“

پھر وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پہلی عین میں نے غور کو تمہارے لئے کچھ مہموں کا انتظام کرنے کے لئے کہا تھا۔ نے کسی کو بازار بھیجا تھا۔ وہ آتا ہی ہوگا۔ کوئی ڈھنگ کا روٹ پن کر بیٹھو۔ اس وقت تمہارا جو گلیہ ہے اس میں ہوئی کسی سوپر کے سامنے بھی آگئے تو وہ تمہیں چوراہا کر دھکے دے کر باہر ٹھانے کی کوشش کرے گا اور اگر تم نے یہ بتایا کہ تم اس ہوٹل کے مالک ہو تو وہ تمہیں پاگل خانے یا کی کوشش کرے گا۔“

میں نے اپنا جائزہ لیا۔ واقعی اس وقت میں کسی گھبراہٹ کا دورہ نہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنے کروڑوں کے پڑا کر باہر پھونکا رہا تھا اور یہی سہی سرسراہٹ میں کھنکھناتے پیچھے لگ کر پوری گوی تھی۔ میرا وجود واقعی اس ڈی گھبراہٹ میں ابھی لگ رہا تھا لیکن میں اس فضا سے محفوظ ہونے لگا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”عجب اتفاق ہے۔ میں اور پہلے بھی یہاں ایک مظلوم الحال رسائی کے طبقے میں قائم ہوں۔ اس وقت کسی نے مجھے پہچانای نہیں تھا اور کلرک نے بھی دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ قیمت یہ تھا کہ ان لوگوں پر مارنے کے لئے میری جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں موجود تھیں۔ راجلہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں شاور لینے کے باجھ دوم میں کھنکھنایا۔ جب تک میں صاف ستھرا ہو کر اور اوپر کھلون وغیرہ کا چھڑکاؤ کر کے باہر برآمد ہوا تب تک وارڈ بکس بھی کچھ آباد ہو چکی تھی۔ میں نے ایک عرصہ تک منتخب کر کے پڑا کر بیٹھی میڈ ہوئے کے باوجود مجھے بالکل فتن یہ غالباً راجلہ کا کمال تھا۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔

دروازہ کھلائی تھا۔ چند لمبے بود راجلہ ونگ کے کمرے تو میں سوٹ کے ڈرائنگ دوم میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ ٹھنڈے کی آواز کرتے ہوئے انگریز میں بولی ”صاف کیجئے گا سرائیاں نہایت مظلوم الحال سامنے گذر اسات پینڈو سا۔ بے ہودہ ملنا لینا ہوا تھا۔ اس کا نام افضل چوہدری تھا۔ آپ نے اسے دیکھا ہے؟“

”ہیں سیم!“ میں نے بڑے شائستہ انداز میں گردن کو گھماتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا ”کبھی اس دنیا میں صرف وہ دوست تھا لیکن اب میں اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔“

بھی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس سے ملاقات ہو جاتی

میں غاموش رہا۔ حضرت سرحال پہنچی ہوئی چیز تھی۔ ان کی بات کی تردید کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے ”یونس کے مسائل اگر تمہیں درپیش بھی ہوئے تو وہ تمہارے لئے ثانوی چیز ہوں گے۔ سرحال میری ایک دو نصیحتیں یاد رکھنا۔ ایک تو اکیلا اکیلا۔ اپنے طور پر کوئی بڑی مصیبت مول لینے کی کوشش مت کرنا۔ کوئی خاص بات سامنے آئے تو مجھے ضرور مطلع کرونا۔ اس کے علاوہ کراچی کے دو عین فون نمبر لکھ لو۔ یہ ایک ہی صاحب کے ہیں۔ انہیں تم صرف چشمی صاحب کے نام سے جان سکو گے اگر کبھی کسی مشکل میں پھنس جاؤ اور مجھ سے بھی بروقت رابطہ نہ ہو سکے تو ان سے ضرور رابطہ کر لیا۔ یہ میرے خاص مانتوں میں سے ایک ہیں اور بڑے کام کے آدمی ہیں۔“

”ضرور ضرور ایسے آدمی کا نمبر تو میں کسی نوٹ بک یا کاتھ پر لکھنے کے بجائے دل پر لکھ لوں گا۔ فی الحال کاتھ پر ہی لکھ لیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور ان کے بتائے ہوئے تینوں نمبر نوٹ کر لئے۔

”نقیس صاحب بولے۔“ میں نے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ میں انہیں ہدایات بھی دے چکا ہوں گا۔“

”بہت شریف نقیس صاحب! میں خواہ مخواہ کالی دونوں تک آپ کو مت برا آدمی سمجھتا رہا۔ آپ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”اب میں جواباً تمہاری تعریف نہیں کروں گا۔ راجلہ سے کہنا تیار رہے شام چار بجے کے بعد کسی وقت بھی اس کا بلادوا آسکتا ہے۔“ نقیس صاحب بولے پھر انہوں نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منتقل کر دیا۔

مجھے راجلہ کو ان کا پیغام دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سن ہی رہی تھی۔ اس نے سر پیچھے ہٹایا تو میں نے سوچنے کے انداز میں گہری سانس لے کر کہا ”کاش نقیس صاحب ابھی کچھ دیر اور گفتگو جاری رکھتے۔“

”کچھ اور جو انہیں میرے سر میں منتقل ہو جائیں۔“ وہ بالوں میں انگلیاں پیچھرتے ہوئے بولے۔

”میں نے آج تک کسی جوں کے سر میں جو نہیں چلتی نہیں دیکھیں۔“ میں نے کہا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے تشریف زور انداز میں کہا ”تھراؤں ہو گئیں کیا؟“

”مجھے تھراؤں ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تمہیں ترکی بہ ترکی اردو بہ اردو دست بہ دست لکھوٹا بہ لکھوٹا ڈنڈا بہ ڈنڈا جواب دے سکتی ہوں۔ میں منہ بسور کر بیٹھنے والی یا روٹا ہونے والی ترکی نہیں ہوں۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ ڈھیٹ چیز ہو لیکن کہاں جا رہی ہو؟“

”میں غائب ہونے کے پاس زیادہ سامان تو نہیں ہوتا لیکن جتنا

”نہیں“ یہ تو بڑا دلوں و دجوات میں سے ایک وجہ ہے۔ وہ بدشور مسکرائی رہی۔

”انسان جب کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تو اس کے لئے بڑا دل و دجوات مگر لیتا ہے اور جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی بڑا دل و دجوات جوڑ کر لیتا ہے۔ چاہے کام اچھا ہو یا بُرا۔ ساری بات بس انسان کے دل کی ہے۔ دل ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے انگلیوں پر گھسنے کے انداز میں تیار ہو کر پوچھتے ہوئے کہا ”تو مجھ پر فرض کرو تم کوئی امتحان دے رہی ہو۔“ یہی میں تم سے سوال کیا گیا ہے کہ افضل چودری سے شادی نہ کرنے کی صرف دس مہینوں دجوات لکھیں۔ تو تم کیا لکھو گی؟“

”ایک تو تم کو تم بھر کر اپنے اس پسندیدہ موضوع پر ضرور آجاتے ہو۔“ وہ معنوی ناگواری سے پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی ”چلو ٹھیک ہے۔ مان لیا۔ میرے پاس ایک بھی مہینہ وجہ نہیں ہے لیکن اگر کسی کا شادی کرنے کو ہی دل نہیں چاہتا تو کیا اسے مجبور کرنا ضروری ہے؟“

”میں مجبور تو ہوا ہی کر رہا ہوں۔ میں جنہیں منانا ہوں۔“ میں نے سادگی سے کہا ”اس لئے کوئی شادی کے لئے راضی کرنے کا عمل کیتے ہیں۔“

”میں نہیں مانوں گی۔ تم میرا دل چاہنا چھو دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”بعض لوگ زندگی بھر صرف ”میں نہ مانوں“ کی گردان کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”بہر حال میں تو اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ ابھی تمہارے جانے میں خاصا دقت ہے۔ کیوں نہ میں واقعی اپنے بڑوس کے تھوڑے سے محاطات دیکھ لوں۔ کم از کم اس ہوٹل کا ہی تو ہوا بہت حال چال پوچھ لوں۔ اب میں نے سوٹ بوت پہن لیا ہے تو خواہ مخواہ ہی آئیں میں جا کر بیٹھنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ تو نیچے ہوٹل کے آئیں میں چلتے ہیں۔ میں ہوٹل کی حالت کا سرسری سا جائزہ ہی لے لوں۔“

”یعنی تم اب آئیں میں بیٹھ کر فائیں دیکھو گے اور میں احتیوں کی طرح تمہاری شکل دیکھوں گی؟“

”نہیں تم احتیوں کی طرح نہیں بلکہ پیار سے میری شکل دیکھنا۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”اُئی“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی ”میں اب واقعی کوئی چیز اٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گی۔“

”بھی تم آخر کس قسم کی لڑی ہو؟ نہ تم شادی کے لئے ای بھرتی ہو اور نہ ہی میں تمہاری بیٹھ کر تم سے رویتھک سکتا کر سکتا ہوں۔ حتیٰ کہ جنہیں پیار سے میری طرف دیکھنا بھی گوارا

عام دیا ہوتی ہے۔ وہ اپنی راہ چل رہا ہے اور میں اپنی راہ بولتا ہوں۔ ابھی ابھی مجھ سے مل کر رخصت ہوا ہے۔“

”تمت خوب پڑانے دو سٹیوں سے ملے رہتا چاہئے۔“ راجیلہ نے بیچری سے سر ہلایا ”آپ کی تعریف؟“

”خفاں سے میرا نام بھی افضل چودری ہے۔“ میں نے ہانسی سے جواب دیا۔

”بڑا۔ بڑا۔“ راجیلہ نے تالی بجائی ”اکاڑی بھی اچھی اسی کہتے ہو۔“

”تم نے بھی تو حیرت کی بہت عمدہ اداکاری کی تھی۔“ میں نے

”حیرت تو مجھے واقعی ہوئی تھی۔ تم کچھ دیر پہلے واسطے افضل چودری تو قطعاً نہیں لگ رہے تھے۔“ راجیلہ بولی۔

”اس میں میرا کوئی کمال نہیں راجیلہ ڈیرا یہ صرف پیسے کا مال ہے۔ پیرا واقعی انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے اور غرت

نہ ملے انسان کو بھی ناقابل شناخت بنا دیتی ہے۔ تم نے بھی کوڑا لے والے بچوں کو دکھا ہے؟ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی

کی دیکھتا۔ وہ گندگی اور مٹی بچل میں اتھرتے ہوتے ہیں۔ ان کے کپڑے غلط بدوار لباس ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض بچے اتنے

ب صورت ہوتے ہیں کہ اگر وہ صاف شہرے ہو کر ”شاندھار لہ پن کر سائے آئیں تو ان کے چہرے پر نظر نہ ٹھہرے۔“ میں

”میں صرف ہی ملی“ ”اس شاک غرت اور انتہائی مظلوم اعلیٰ بڑی لکڑ ہے اچھے بھلے انسان کی بڑا کر دکھ دیتی ہے۔ اس کے

کس صاف شہرے“ فیشن ایبل لباس میں“ دس میں لاکھ کی ٹائش بیٹھا ہوا شیخ و طرار اور پراستہ بچے انتہائی کم رو بھی ہو تو

بلا بلا خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔“

”سکراتے ہوئے گہری نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی

”میں نے کہا اور گہری اور ابتدائی تاثر کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور گہری دیکھی ”ابھی تو تمہارے جانے میں

”نہیں میری سوجھ بوجھ سے پریشانی ہے تو ابھی چلی جاتی

”لوں بد بخت یہ چاہتا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا

”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں جنہیں زندگی بھر کے لئے

”میں نے کہا“ ”ابھی میں نہیں کرتی۔“

”میں نے کہا“ ”ابھی میں نہیں کرتی۔“

نہیں۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر اگر میں کادربار کی طرف ڈرائی توجہ دینے کی بات کرتا ہوں تو اس سے بھی تم بور ہوئی ہو۔ تاؤ آخر میں کیا کروں؟

”پہلو!۔۔۔ تم آفس ہی چلو۔“ راجیلہ ہاتھ جوڑ کر بول۔

سوٹ سے نکل کر لفٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے اس سے کہا ”ویسے تم بزنس میں اپنی دلچسپی بے پناہ کی کوشش کرو تاکہ اگر کبھی مجھے ادھر ادھر ہونا پڑے تو تم میرا بزنس سنبھال سکو۔ مجھے معلوم ہے تم بزنس سنبھال سکتی ہو۔“

”سنبھال سکتا اور بات ہے“ دلچسپی لینا اور بات۔ ”وہ بولی ”میں بزنس سنبھال سکتی ہوں لیکن اس میں دلچسپی نہیں لے سکتی۔ لاہور میں تمہاری عدم موجودگی میں چند دن کے لئے جب ریڈ زائ والا عذاب لفظ اتفاقاً تو میں نے تمہارے بزنس کی دیکھ بھال کی تھی۔ ایک اخلاقی یا دفتری فریضہ سمجھ کر میں سارے کام تو کر سکتی ہوں لیکن درحقیقت مجھے روپے پیسے کے جکڑوں اور کادربار کے خبیث و نرا سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

میں نے لفٹ میں ٹھس کر رہن دواتے ہوئے کہا ”شادی سے تمہیں دلچسپی نہیں۔ کادربار سے تمہیں دلچسپی نہیں۔ مجھ سے تمہیں دلچسپی نہیں۔ آخر تمہیں کس چیز سے دلچسپی ہے؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے تم سے دلچسپی نہیں۔“ وہ مسکراتی ”دلچسپی تو بہت ہے“ ویسے بھی تم بہت دلچسپ چیز ہو۔ میں تمہارا مشاہدہ اور مطالعہ کرتی رہتی ہوں لیکن ضروری تو نہیں کہ انسان جس چیز میں دلچسپی لے اس سے شادی بھی کر لے۔ دلچسپی تو انسان تڑپا کر کے کسی بندہ میں بھی لیتا ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ اس سے وہ شادی بھی کر لے۔“

”تم مجھ میں دلچسپی مت لو“ حرف شادی کرلو۔ دلچسپی تم چڑیا گھر کے کسی بندہ میں ہی لیتی رہنا۔“ میں نے مشورہ دیا۔

اس نے لٹھڑی سانس لے کر لفٹ کی چمٹ کی طرف دیکھا اور گویا بے بسی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔ وہ مزید کچھ نہ بولی حتیٰ کہ ہم آفس میں جا پہنچے۔ ایک خاص تراش تراش کاغذیں قسم کا بروج تو اس نے اوپر سے روانہ ہوتے وقت ہی لے لیا تھا۔ اب اس نے اپنے مخصوص انداز میں نقاب لپیٹ کر سیاہ چشمہ بھی لگا لیا تھا۔

ہوٹل میں ایک آفس میرے لئے مخصوص تھا لیکن آج تک یہ زیادہ تر بندی رہا تھا۔ میرے اس آفس میں پہنچنے سے ہوٹل کے اسٹاف میں کچھ کھلبلی مچ گئی۔ میں نے جنرل منیجر اور اکاؤنٹس منیجر وغیرہ کو بلا کر حسابات کی ناقص رپورٹس اور آؤٹ رپورٹس وغیرہ دیکھیں۔ ان سے تمام ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس دوران شفیع شاہ بھی آگیا اور یہ ایک طرح کی غیر رسمی کادربار بن گئی ہو گئی۔

ہوٹل بہت اچھا بزنس تو نہیں کر رہا تھا لیکن حالت ملاپس کن بھی نہیں تھی۔ میں نے شفیع شاہ سے کنسرکشن کے بزنس کے

بارے میں معلومات کیں۔ اس کی حالت بھی تقریباً ہوٹل تھی۔ شر کے حالات کی وجہ سے کنسرکشن کا بزنس بھی لیکن زیادہ بڑی حالت نہیں تھی۔ اس کام میں تو سچا قریبے بھی شامل تھے۔ او ایگزیو کی صورت حال بھی خیر ہم کادرباروں میں شامل نہیں تھے۔

کلنی در تک ان مسائل میں سرکھانے کے ہونے سے دوبارہ کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں نے شفیع ”جیرے پر قائم بجلی کا مکان اور اس کے اہل خانہ“ کی مگرانی میں رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اپنے لوگوں پر نظر رکھو اور اگر تمہیں کوئی کام کی بات معلوم فوری طور پر مجھے اطلاع دو۔ امید تو نہیں ہے کہ اب اس گھر کے قریب پہنچنے کی کوشش کرے گا لیکن تم خاص کی تلاش کے سلسلے میں آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کرنا۔ راجیلہ نہایت سنجیدگی سے شفیع شاہ کی طرف دیکھتے

”عام حالات میں کیا تمہاری آنکھیں بند رہتی ہیں؟“

شفیع شاہ مسکرایا۔ میں نے راجیلہ کو ٹھکی سے گھور کر کہا ”ہم اس وقت ذرا جاسوسانہ زبان میں بات کر رہے اپنی چوچ بند رکھو یا اسے کھانا کھانے کے لئے استعمال میں نے دوبارہ شفیع شاہ کو مخاطب کیا ”کراچی میں۔۔۔“ بلکہ کسی بھی جگہ ڈاکٹر رنڈا کی جھلک بھی نظر آجائے تو“ کھیل کر بھی اسے قابو میں کرنا ہے۔“

”مفضل بے چارے کو میرے چہرے کی بہت راجیلہ نے شفیع شاہ کو بتایا۔“

”خفا رہے۔“ میں نے کہا ”تمہارے بارے میں یہ کہنی پڑتی ہے۔ تمہیں تو کارٹون بن کر چمڑے ہونے نہیں ہوتی لیکن مجھے تم کو دیکھ دیکھ کر اچھن ہوئی ہے پوش سینہ کے روپ میں گھومتی ہو تو بعض جکڑوں پر لا مڑ کر دیکھتے ہیں اگر کھلا چہرے لے کر گھومو گی تب اور بھی مڑ کر اور رک رک کر دیکھیں گے۔“

”جوگ تو اس وقت بھی مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ میرا چہرہ ٹھیک تھا۔ تمہیں اس وقت پریشانی نہیں؟“ راجیلہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت ہم تینوں میرے سوٹ میں داہیں تو وہیں کھانا منگو کر کھا رہے تھے۔

میں نے منہ بنا کر کہا ”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ لوگ مڑ مڑ کر تمہاری طرف دیکھتے تھے البتہ جب ساتھ ہوتا تھا تو کچھ خواتین ضرور مڑ مڑ کر دیکھ کر دراصل میری طرف دیکھتی تھیں۔“

”۔۔۔ اور حیرت سے سوچتی تھیں کہ یہ پہلوئے کمال چلا جا رہا ہے۔“ راجیلہ نے غلغلہ لگایا۔

اللہ رے خوش تھی! میں نے ٹھنڈی سانس لے کر  
مٹا سفانہ انداز میں سر ہلایا۔ شفیق شہر جھکائے، مسکراتے ہوئے  
خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔

ہم ابھی خوش کہیں اور کھانے میں ہی اُلجھے ہوئے تھے کہ  
راجیلہ کے لئے شیس صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے پروگرام سے  
کچھ پہلے ہی پانچ بجے والی فلاٹ پکڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ  
راجیلہ کو تھوڑی دیر تک ان پورٹ کے لئے روانہ ہونا چاہئے  
تھا گاڑی اسے لینے کے لئے آنے والی تھی۔ شیس صاحب نے  
مجھے اور شفیق شاہ کو ان پورٹ آنے سے منع کیا تھا۔

راجیلہ فون بند کر کے ایک طرف دکھ کر اطمینان سے دوپٹا  
کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی ”کیسا! اس لئے میں نے  
وقت سے بہت پہلے ہی جانے کی تیاری کر لی تھی۔ شیس صاحب کا  
کچھ بتائیں ہو۔ عام طور پر ان کے پروگراموں پر وقت سے پہلے  
ی عمل در آمد شروع ہو جاتا ہے۔“

ہم نے کھانا تو کھالیا لیکن چائے یا کافی پینے کی فورت نہیں  
آئی۔ نیچے استیالیہ سے فون پر اطلاع آگئی کہ راجیلہ کو گاڑی لینے  
آگئی تھی۔ بیل ہوائے اس کے کمرے سے اس کا چھوٹا سا بیگ اور  
بریف کیس اٹھا کر نیچے چل رہا اور وہ یوں ہاتھ ہلا کر تیزی سے روانہ  
ہو گئی جیسے بوس میں کیس جاری ہو۔ ہم اسے سی آف کرنے نیچے  
بھی نہیں گئے۔ اس نے خود ہی اس کلف سے منع کر دیا۔

اس کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی شفیق شاہ بولا ”سرا! میں بھی  
چلتا ہوں۔ جزیرے پر جا کر صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں۔ ہمارا  
زار تو جزیرے کے قریب ہی موجود ہے لیکن سحرانی کے لئے مجھے  
صحیح طور پر انتظامات کرنے ہوں گے۔“

میں نے سر ہلا کر اسے اجازت دے دی۔ جاتے جاتے وہ ڈرک  
کر پڑے ہوئے بولا ”سرا! آپ نے مجھ سے رائے مانگی تو نہیں۔  
لیکن میں خود ہی اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں  
قاسم بجلی کو اس کے اپنے ہی کسی آؤٹی نے گل کیا ہے۔ شاید اسے  
اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ موقع بہت مناسب تھا۔ اس قسم کے لوگوں پر  
جب کوئی بڑا وقت آنے لگتا ہے تو انہیں سب سے زیادہ خطرہ اپنے  
ہی آدمیوں کی طرف سے ہوتا ہے۔“

”تمہیں یہ خیال کیہ کر آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی لاش کے ساتھ کسی بھی گارڈ کا زہریلا مرنہ نہ پایا جاتا  
مجھے حیرت میں مبتلا کر رہا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ کسی گارڈ کو  
ساتھ لئے بغیر فرار ہونے کے لئے روانہ ہوا ہوگا۔“

”دیکھتے ہیں سرکاری اداوں کی تحقیقات سے کیا نتیجہ نکلتا  
ہے۔ اس کے بعد شاید ہم کوئی صحیح اندازہ لگانے کی پوزیشن میں  
ہوں۔“ میں نے کہا اور وہ سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔

راجیلہ اور شفیق شاہ کے جانے کے بعد یکدم گویا میرے سونٹ  
میں ہی شیس، میرے وجود کے اندر بھی گمراہا سنا چکا گیا۔ میں نے

اچانک ہی اپنے آپ کو بہت خفا خالی خالی اور گراں محسوس کیا  
اتنے ہنگاموں سے گزرنے کے بعد یکدم ہی گمراہا مجھے دنیا میں کیا  
مصروفیت نہیں رہی تھی۔ میں بہت دیر تک آنکھیں بند کر کے  
پر بیٹھا اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔  
ایک طویل عرصے کی بیگانہ تیزی اور جاں کھل مصروفیت کے  
مجھے منتشر کر کے رکھ رہا تھا۔ اب میں چند دن مناعت سکون اور  
روی سے گزارنا چاہتا تھا۔ مجھے جو مصروفیات درپیش تھیں انہیں  
غیر متوجہ طور پر سر اٹھا سکتی تھیں، انہیں بھی میں مناعت دیکھ کر  
اور مصروف سکون سے نشانہ چاہتا تھا۔

کافی دیر تک یہی مراتب کی سی حالت میں بیٹھے رہنے لگا  
میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو نہ جانے کیوں بہت اہم  
محسوس کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مزید تاخیر نہ ہونے کے لئے  
کافی بارش جا کر کافی جینی چاہئے۔

میں ایک بار پھر لٹ کے ذریعے نیچے آیا اور کافی بارش کی طرف  
چل رہا۔ کافی بار کا باقاعدہ کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ  
ایک طوائف جھلکا ہوا تھا جس کے عقب میں معنوی پورٹ کا  
طوائف گئے تھے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان اندر جانے کے لئے  
کچھ جگہ خالی تھی۔ درمیانی راستے پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔  
میں اسی راستے پر گزرا اپنے لئے کوئی بیز خفہ کر رہا تھا  
اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی بیڑی طرف دیکھ رہا ہے۔ کلنی پورٹ  
اس وقت ڈسٹریبٹرز خالی تھیں۔ میں نے منابت سے آگے سے گزرا  
موز کرکے کی ایک بیڑی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی کم تھی۔  
کے باوجود میری آنکھیں گمراہ نہ ہو گئیں۔

بھلل کرتے شرعاً بلاوے میں وہ وہاں بڑی حکمت سے  
ہر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی حرمیں غولی اٹھیں اور  
سگریٹ دہلی ہوئی تھی جس سے دھوئیں کی گھیر پڑ رہی تھی۔  
مسکرا رہی تھی اور خطرہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔  
میں سیدھا حاسی کی میز پر پہنچ گیا۔ وہ جو بھی تھی، تھی جی  
بہر حال ایک خوب صورت عورت تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا ”ہر خود را  
چوہ در آگر وہ اتنے اشتیاق سے تمہاری آمد کی منتظر ہے تو  
میز پر جانا تمہارا“ غلطی“ فرض ہے۔“

وہ فرض عجب حس ایسی تھی جس سے میری ملاقات  
بجلی کے ہاں ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت کی ایک خاص  
جگہ تھی لیکن اس سے تو جھج جھج کے تحت بھی ملاقات  
میں نے جب اسے قاسم بجلی کے ہاں دیکھا تھا تو مجھے اس کی  
کچھ مانوس سی محسوس ہوئی تھی اور مجھے ابھی تک یاد نہیں  
کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اب بھی اسے دیکھ کر  
ذہن میں بہت سے سوالات ابھرے تھے اس لئے



مردوں کی اسی دنیا میں گزارنی ہے اور مرد ایک عورت کی ضرورت ہے زندگی میں شامل ہے۔ اس لئے میں یہ بھی نہیں کہتی کہ میں تو مرد کے قریب پہنچنے بھی نہیں دیتی۔ تاہم میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میں اپنی آسانی سے رسائی میں آنے والی عورت بھی نہیں ہوں جیسی جمنا میری لائن کی عورتیں ہوتی ہیں۔“

”اور تمہاری لائن کیا ہے فریمن؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

وہ ایک بار بھر دھیرے سے ہنسی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کی ہنسی معنوی نہیں تھی۔ وہ کرسی کے کھسکاتے ہوئے پہلی ٹانجیں قلم بکلی لے بتایا تو تھا۔“

”وہ“ میں نے تکیبی انداز میں سہلایا ”یعنی وہ تمہارا درست تعارف تھا۔ اس میں کوئی کمی نہ تھی۔“

”کئی پیشی اگر ہو بھی سکتی ہے تو ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔“ اس نے بے نیازی سے اپنے سڈول کندھے اچکائے ”اگر تم سے میل ملاقات رہی تو ممکن ہے تم مجھے اچھے لگے لگے۔ تب ہم دونوں ہی اپنے اپنے تعارف میں کات چھانٹ یا ترمیم اور اضافے وغیرہ پر غور کر سکیں گے۔“

”لیکن یہ سوال تو شاید میں اس وقت بھی کر سکتا ہوں کہ تم مجھے کس طرح جانتی ہو اور کس حد تک جانتی ہو؟“ میں نے کہا۔

”میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تم لاہور کے ایک بڑے بزنس میں ہو۔ تمہارے کئی بزنس ہیں۔“ میں بھی اور کراچی میں بھی اور یہ ہوئی بھی تمہارا ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میں کبھی سانس لے کر نہ کیا پھر میں نے اچانک پوچھا ”کافی پیو کی؟“

اس نے ایک لمحے سوچا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولی ”چٹوٹی لالال کافی سی پی لیتے ہیں۔“ وہ کبھی انگریزی اور کبھی اردو میں بات کر رہی تھی۔

”میں نے وینر کو کافی کا آرڈر دیا اور اس کے جانے کے بعد کہا ”مجھے تو اس ہوٹل کے دیگر بھی نہیں پہچاننے کہ میں اس کا مالک ہوں لیکن تم نے مجھے پہچان لیا تو مجھے لگ رہا ہے کہ میں کافی جانی پہچانی شخصیت ہوں جا رہا ہوں۔“ مجھے اس پر تشویش ہے۔“

”کیوں کیا تمہیں گناہ مہنا زادہ اچھا لگتا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”میں نے اثبات میں سرلاتے ہوئے کہا ”تمہیں قلم بکلی نے میرے بارے میں بتایا تھا؟“

”نہیں“ اس نے نفی میں سرلایا اور اس کے شد کی سی رنگت کے روشنی بال بالکوں سے لے کر کہنے ”قلم بکلی سے تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ تم تو اچانک ہی ڈرائنگ روم میں آئے تھے۔ اس کے بعد جو بھی منہگو ہوئی تمہارے سامنے ہی ہوئی تھی اور پھر تمہارے سامنے ہی میں رخصت ہو گئی تھی۔ میں تمہیں اس سے پہلے سے پہچانتی تھی۔“

اپنی دانست میں ایک کونے میں تقریباً چھٹی بیٹھی تھی۔ ہاتھوں کی جھجکات بھی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن کافی بار کی ہول بڑھتے بھی مرد تھے مگر میں موزوں کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے شاید صرف وہی اپنی گردنوں کو ہاتھوں سے پھینے تھے جن کی ہڈیاں ان کے ساتھ تھیں۔

میں نے ہاتھوں پر نہایت ہتھاراندہ اور بڑا اشتیاق مسکراہٹ جالے کی کوشش کی اور اس کے قریب جا پہنچا۔ اس نے اٹھ کر براہِ استقبال کیا اور گر جو کچھ سے مصافحہ کیا۔ وہ جب بیٹھی تھی تب ہی قیامت سی تھی اور اس کا اٹھنا بھی قیامت سے کم نہیں تھا۔

”آپ سے دوبارہ مل کر خوش ہوئی مس ایکس!“ میں نے ہاتھ ملے کہا۔

”میرا نام فریمن ہے۔ آپ مجھے اسی نام سے مخاطب کیجئے۔“ اس ایکس میرا کاہنہ باری نام ہے۔“ وہ دھجے لیکن ٹھنک وار لہجے میں بولی۔ اس کی توازن بھی دل کو کھل گوانے والی تھی ”اور ہم ابھی سے ایک دوسرے کو ”تم“ کہہ کر مخاطب کریں تو ہتھکڑیوں پر جمل بن نہیں رہے۔“ غریب رکھے۔“ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں بیٹھ چکا تو اس نے انتہائی شیریں لہجے میں پوچھا ”کیسے ہو افضل چہرہ؟“

انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں اس کا بڑا سولہ انا اور قریبی دوست تھا۔ میری کوچہ جی ہنک سے اڑ گئی۔ اس نے مجھے میرے اصل نام سے مخاطب کیا تھا جبکہ مجھے اس کی نظر میں عارف ہونا چاہئے تھا۔ قلم بکلی نے اپنے کمرے اس سے میرا تعارف عارف کے نام سے کرا تھا۔

”سب بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا اور اپنی پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے بھی حیرت ظاہر نہ ہوئے۔ لیکن اس نے بیٹھا محسوس کر لیا تھا کہ اندر ہی اندر مجھے حیرت کا ہلکا سا تھا۔

ایک طویل کش لے کر ٹاک سے مڑو اس نکالتے ہوئے وہ گویا مولا کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے مترنم انداز میں ہنسی اور دھیمی توازن بولی ”جی حیرت کو چھپانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟“

”میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک تک اس کی طرف دیکھا رہا۔ تب اندازاً آگے کو جھٹکے ہوئے غمور سر کو کچی کے سے انداز میں بولی ”مجھے ہے تم جلد سے اٹھ کر جانے والے مرد نہیں ہو افضل“

”کیا تمہیں جلد سے اٹھنے ہونے والے مرد اچھے لگتے ہیں؟“ میں نے آریکہ عیشوں کا پھر آثار کر میز پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”مگر تمہارا اندازانہ جواب مانجے ہو تو میں کہوں گی کہ مجھے تو کہہ کہہ کر مرد اچھے نہیں لگتے لیکن کیا کروں۔ زندگی تو

”ڈوبوئی کا شکر ہے۔“ میں نے گردن کو خم دیا اور ایک خاموشی کے بعد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: ”معلوم ہے قاسم کبلی مرچکا ہے؟“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”تم پر اس کی موت کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔“ میں غماز کر گیا۔

”اگر قاسم کے بجائے اسی طرح کسی میں ماری جا چکا قاسم پر بھی اس کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔“ میں نے کہا جیسے لوگ ایک سفاک دنیا میں رہ رہتے ہیں۔ ”وہ“ میں بولی۔

میں نے اپناٹ میں سر لایا ”میرا خیال ہے آج کل سفاک دنیا میں رہ رہتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تم یہاں کس طبقے آ رہی ہو؟ میرا مطلب ہے اس ہوٹل میں؟“

”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں یہیں عیم اس نے ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

”وہ“ میں نے آنکھیں پھیلائی ”مجھے نہیں معلوم کل میرے ہوٹل پر خوش قسمتی اس حد تک سایہ فگن ہے۔“

”تم تو کراچی میں رہتے ہی کم ہو اور اگر مجھے جی تو نہ کہڑے ہوتا یا بلکہ کارجنز دیکھنا ایک مالک کے شامیان ہوتا۔ اگر تم بھی چند دن یہ تکلف اٹھاؤ تو تمہیں معلوم ہوگا قسمتی کیسے کیسے حسین روپ میں تمہارے ہاں قیام کر لی اور ہوتی رہتی ہے۔“

”یقیناً تم یہاں میں ہی رہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔“ ٹھنڈی سانس لی اور اچانک ہی پوچھا ”تم تو قاسم کبلی کی سوا روشنی ڈال سکتی ہو؟“

”یہ اندرجوں کی باتیں ہیں“ انہیں اندھیرے میں ہوا ان پر روشنی ڈال کر تمہیں کیا دل جائے گا؟ بد صورتیاں ہی آئیں گی۔ ویسے بھی میں ایک معمولی عورت ہوں۔ مجھ حشیت کمال کہ اتنے بڑے بڑے معاملات پر اعتبار خیال کر اس نے سگرت اٹھانے میں مسئلہ دی۔

”اب اتنی بھی انکساری اچھی نہیں۔ میرے خیال میں بھی عورت معمولی نہیں ہوتی اور تم تو معمولی ہوئی نہیں سیکھ اگر کسی شاہراہ کے پل پر بیٹھی بیک بائک دی ہو تمہیں معمولی نہ ہو تم۔“

”بس بس“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی ”معمولی باتوں۔ دل خوش کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں ان حزلوں سے محروم ہوں۔ میں اب ایسی باتوں سے خوش نہیں ہوتی۔“

”تم نے میری باتوں کو جھوٹ سمجھ کر میرا دل توڑ دیا۔“ میں نے مضمون لیے میں کہا۔ ”اس دنیا میں بے فک ان ایک جیسی باتیں کہتے ہوں لیکن ان میں سے ایک تو

جی بات تو یہ ہے کہ جب قاسم کبلی نے عارف کے نام سے تمہارا تعارف کرایا تو مجھے حیرت کا زور وار جھٹکا لگا تھا۔“

”لیکن تم نہایت معافی سے اپنی حیرت کو چھپا سکتی تھیں۔“

”ہاں بالکل اسی طرح جس طرح چند لمبے پہلے تم نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔“ اس نے جواب دیا ”بلکہ میں نے تو شکر کیا تھا کہ میں اس سے پہلے ہی تمہیں تمہارے اصل نام سے مخاطب نہیں کر چکی تھی۔“

”تم نے اپنی حیرت کو چھپا سکتی تھیں۔“

”میں نے سوچا تم ایک بڑے بزنس میں ہو اور قاسم کبلی جیسے بدنام آدمی کے گھر میں فرضی نام سے موجود ہو۔ معلوم نہیں اس میں تمہاری کیا مصلحت ہوگی۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہاری اس مصلحت کو نقصان پہنچاؤں۔ آج کل بزنس اور بد محاشیاں گڈ نہ ہو رہی ہیں، کچھ پتا نہیں چلا کون خالص بزنس میں ہے اور کون اس کی آڑ میں دوسرے وعدے کر رہا ہے۔ میں نے سوچا شاید تمہارا بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ ہو۔ مجھے اس میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ میں پہلے ہی خاص خطرناک دنیا میں رہتی ہوں۔ غیر ضروری طور پر زبان کھول کر اپنے لئے مزید خطرات مول نہیں لیتی۔“

”بہت خوب۔ لیکن کیا تمہاری وہ رائے ابھی قائم ہے؟“

”کون سی رائے؟“ اس کی نیچی تلی ہویں کمان میں لگیں۔

”وہی کہ شاید بزنس کی آڑ میں میرے بھی کچھ ایسے ویسے وعدے ہوں؟“

”نہیں بہت جلد میرے رائے بدل چکی ہے۔ میں نے یہاں واپس پہنچنے ہی تجسس سے مجبور ہو کر تمہارے بارے میں اپنے کچھ ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یہ جان کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمہاری شہرت بہت اچھی ہے۔ بہت کم لوگ تمہیں جانتے ہیں لیکن جتنے بھی جانتے ہیں وہ تمہارے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ تمہارے بارے میں کوئی مٹھوک بات سننے میں نہیں آئی۔ تمہیں ایک شریف آدمی سمجھا جاتا ہے۔“

”بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”کیس میں شرافت کی اس منزل کو نہ پہنچ جاؤں کہ رات چلنے خوب صورت خواتین مجھے دیکھ کر سروں پر دوپٹے درست کر لیا کریں اور جب میں قریب پہنچوں تو نظریں ادب سے جھکا کر کہا کریں ”بھائی جان! السلام علیکم!“ تم نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔“

”وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی بھریا نازک بلوری بالوں میں تھرتھرتے برف کے کیوبس کنادوں سے ٹکرائے ہوں اور بہت ہی دھیمے جلتی رنگ بچاؤں۔“

”نہی صحتی تو وہ بولی ”دو دو مت تم پر وہ وقت آتا دکھائی نہیں دیتا۔“

اور اس میں سے ایک شرافت مند نکال کر میری طرف بولا "یہ ایک سو اتنی لپنی کاڑ ہے اس پر وہ افراد آسکتے ہیں لیکن اگر تم اکیلے ہی آؤ تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔"

"میں ضرور آؤں گا۔" میں نے یکدم ہی فیصلے پر پہنچے ہوئے کما مکرہ بات سن کر میں ہی وہ مگر کہ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟ اور میں تم سے ہی پوچھتا چاہتا ہوں کہ کیا میں بھی تمہیں جانتا ہوں؟ پہلی ملاقات پر ہی مجھے تمہاری صورت پر کچھ شناسائی لگی تھی۔"

"آج بھی قیمت ہے۔" وہ دھڑکتے سے کہی "دو روپے مجھے تو اُمید نہیں تھی کہ تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں میری کوئی پرچھائیں موجود ہوگی۔"

"میں کا مطلب ہے ہم پہلے مل چکے ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یقیناً" اس نے جواب دیا "میری نظر میں تم بڑے آدمی تھے۔ میرے لئے وہ ملاقات اہم تھی۔ میں نے اسے یاد رکھا۔ تمہارے لئے اہم نہیں تھی تم نے یاد نہیں رکھا۔ اس موقع پر ایک افسوس ناک واقعہ بھی پیش آیا تھا۔"

"تک کی بات کر رہی ہو؟" میں نے ذہن پر زور دیا "میری زندگی میں تو بے شمار افسوس ناک واقعات پیش آئے ہیں۔"

"ہمت مرے پلے کی بات ہے۔ لاہور میں فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر سعید احمد سعید صاحب کے ہاں زبردست پارٹی تھی۔ میں نے وہاں گانا گایا تھا۔ میں ان دنوں بھی اسٹیشن سے آئی ہوئی تھی۔"

میرے ذہن میں چھٹا کا سا ہول ساری باتیں یکدم ہی مجھے یاد آ گئیں۔ اسی تقریب میں ایک خوب صورت فلمی ایکٹر کرل نشا کی لاش سو ٹھک پول سے برآمد ہوئی تھی جسے میری ایک محسن بہی نے مدد طلب کرنے کے لئے میرے پاس بھیجا تھا۔ وہ ایک الگ ہی کہانی تھی۔ بہر حال مجھے یاد آ گیا اس تقریب میں فرخین نے گانا سنایا تھا اور بعد میں میرا اس سے تعارف بھی ہوا تھا۔

بلاشبہ اس کی آواز خوب صورت تھی اور وہ خود بھی اس وقت اب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ عمر کے تین چار برسوں نے ہی اسے خاصا پال لیا تھا۔ سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں وہ ایک نوجوان، اچھوتی اور گفت و شنید و شادابی قسم کی چیز نظر آ رہی تھی۔ اب وہ اس گھر کے کی طرح کچھ پڑھ رہی تھی جو اس کے سرانے پڑا شب رتن کی نشانی معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ نوجوانی میں ہی بہ حد خوب صورت ہے حد بھر رہی تھی اس لئے اب بھی اپنی ہم عمر خیراواں خواتین سے کہیں بہتر اور کہیں تازہ دم معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے نقیب و فرخاں میں اگر کوئی جھکی تھی تو وہ دور ہو چکی تھی اور اب وہ چمکتا ہوا جام تھی۔

اس وقت مجھے فلم اشار ستارہ مرحوم نے بتایا تھا کہ وہ ایک نہایت معزز گھرانے کی لڑکی تھی جو برسوں سے امریکا میں سیٹل تھا۔

آپ جو باتیں سچے دل سے کر رہا ہوتا ہے۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے پہلی "قاسم بھائی" سے کہنے لگی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے ہی اسے انجام کو پہنچا دیا۔ تمہارے اشارے پر یہ کام ہوا ہو؟ کیا یہ محب افغانی ہے کہ جس رات میں نے تمہیں اس کے گھر میں دیکھا "قاسم بھائی" اس رات کی صبح مجھے کتنی نصیب نہیں ہوئی۔"

"یہ افغانی ضرور ہے مگر بہت زیادہ عجیب نہیں۔" میں نے بیان سے جواب دیا "یہ نیک کام میرے ہاتھوں انجام نہیں دیا۔ یہ سچی سچی بڑے آدمی کے حلقے میں آئی ہے۔ میں تو ابھی مگر اس کو صحیح طور پر جان ہی نہیں سکا تھا کہ اس کے بارے میں کئی اہم فیصلے کرتا۔ میں تو کچھ اور لوگوں کے چکر میں اس کے ہاں پھنسا ہوا تھا۔"

"تو کب ہے مجھے تمہاری بات کا اعتبار دینا۔" وہ مطمئن لہجے میں بولا۔

"عجیب صورت ہو گئی بات کا اعتبار کرتی ہو کسی کا نہیں کرتی۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا پھر پوچھا "قاسم بھائی نے جو اہوا ہو کل خرید اٹھا اور جسے وہ تمہارے شریفیہ کے سارے اہل گاہب بچا چکا تھا۔ کیا اس میں تمہارا شواہب بھی جاری رہے؟"

"یقیناً" اس نے جواب دیا "میرا انگریز منٹ قاسم بھائی کے تو نہیں، اس کی کھیتی کے ساتھ ہے اور تمہیں معلوم ہے خیال کے کام تو ان کے بیجنگ ڈائریکٹرز یا ڈائریکٹرز و فیرو کے ال کے بعد بھی چلتے رہتے ہیں۔ ابھی مزید ایک ماہ کا انگریز منٹ ہے جس کے بعد میری مرضی ہوگی کہ اسے ری نیو کروں یا نہ کروں اس انگریز منٹ میں ہی مجھے قادیان اشار ہو گئی میں تمہارے شریفیہ کی مثال تھی جس کے نتیجے میں میں یہاں نظر آ رہی ہوں نہ شاید اسی ہو گئی میں ہوتی جہاں اپنا شو پیش کر رہی ہوں۔" پھر مڑا دیکھتے ہوئے پہلی "مجھے تو آج بھی اپنا شو پیش کرنا ہے۔" "مگر ازم قاسم بھائی کے سوگ میں ہی ایک آدھ دن کے لئے لٹکی ہو جانا چاہئے تھا۔" میں نے کہا۔

"اب میں کیا کر سکتی ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے "یہ تو میں کا کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ قاسم بھائی کی موت کی خبر لگائیں گے۔ ابھی تک یہ خبر کسی اخبار میں بھی نہیں آئی۔"

اس دوران کافی آہنی تھی اور وہ کافی تیار کرنے لگی تھی۔ چند نام خاصوں سے کافی کی چکیاں لیتے رہے پھر وہ کپ رکھتے پہلی "تم آج میرا شو دیکھنے آؤ نا۔" میں نے فوری طور پر جواب دیا تو وہ پہلی "شاید تمہیں ان خرافات سے دلچسپی نہ ملے۔" میں نے ملاقات کا بہانہ ہی سمجھا۔

اس وقت تقریب میں دو سر کی کرسی پر رکھا ہوا اپنا بیڈ بیک اٹھایا

وہاں میں یہاں آنے کے چند دن بعد ہی کلشن میں ایک انارٹسٹ خرید چکی تھی جس کے لئے بیشتر رقم قاسم چکی۔ کلشن کے ہمارے قریب ایک مہرے پر گرام تھے معلوم نہیں اس میں سے کس پر کلشن ہو سکے گا اور کس پر نہیں۔ بہر حال اس انارٹسٹ میں کلشن ہو رہی ہوں، لگتا ہے کہ کلشن ہو رہی ہیں۔ چند کلشنوں کے لئے تو میں وہاں گئی یا جا چکی ہوں خاصوش رہا تو وہ مسکراتے ہوئے خودی بولی "ایڈریس لیں گے؟"

"میں خاصا صابر آدمی ہوں۔" میں نے جواب دیا سوال کرنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرتا ہوں اور سوالوں کے سلسلے میں سوچتا ہوں کہ وہ پوچھنے کی نہ پس تو؟ خود یہ خود ان کے جواب مل جاتیں۔

"وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی بہت دلچسپ و افضل، احم سے بولی ملاقات بہت مختصر ہوئی تھی اور وہاں بہت قسبی سے المناکی صورت اختیار کر گئی تھی لیکن اب بھی میں نے تمہارے بارے میں سوچا تھا کہ تم ایسے ہو گے۔"

"کیسے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ایسے ہی جیسے تم ثابت ہو رہے ہو۔"

"اگر وہ شکر ہے میں ویسا ثابت نہیں ہوں۔" میں نے کی سانس لی۔

"کیسا؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ایسا دیا" میں نے جواب دیا۔

اس کی ہنسی کا سلسلہ کچھ دراز ہو گیا۔ ہنسی ضعیف الفاظوں کا دہرائی پن بھی نہیں آتا ہے۔

"میں اب میں اتنا قائل بھی نہیں وہ تو ہنسی بھی اس سے بات نکل آتی ہے۔" میں نے کہا پھر اضافہ کیا "میں انکساری کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"ایڈریس لیں میں نہیں اس وقت ہی بتاؤں گی جب دیکھنے آؤ گے۔" پھر وہ گہری دیکھتے ہوئے بولی "مگر تم اپنا میں کمرے میں جا کر شو کے لئے جانے کی تیاری کر لوں؟ لینے کے لئے آنے والی ہوگی۔"

"ضرور۔ ضرور" میں تک رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سنانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اس بار اس کا ہاتھ پہلے کی نہیں تھا۔ وہ میزوں کے درمیان مگر گاہ کے سرخ قالین، گالی سے باہر چلی گئی۔ حضرت خوش نے رقص کو امضا کیا تھا اس عورت کی چال میں اعضا کی شاعری تھی۔ تھا کہ اس راستے کے آس پاس میزوں پر جو مواد موجود ہے دلوں کی دھڑکن چند لمحوں کے لئے ضرور تیز ہوئی ہوگی نہیں تھا عورتوں کے دلوں کی دھڑکن بھی تیز ہوئی ہوگی۔

میں کے بغیر نہ تھا۔" میں مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس قریب میں تم سے تعارف سے پہلے ہی کسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک مسخرو گھرانے کی لڑکی ہو۔"

"تھیک ہی بتایا تھا جس نے بھی بتایا تھا۔" وہ خود استہزائی کے ساتھ انرازم میں ہنسی "وہ مسخرو گھرانہ اب کا قلم ہو چکا ہے۔ اب تو میں نہیں ہوں اور یہی رسوائیاں!"

قاسم چکی کے ہاں بھی اس کی ہتھکڑی مجھے چکی کی آمیزش سمجھوس ہوئی تھی۔ میں خاموش اور منتظر رہا کہ شاید وہ اپنے بارے میں کچھ اور بتائے مگر وہ ایک ہی سکریت لگا کر میرے منہ پر زحوال چھوڑتے ہوئے بولی "تو پھر تم میرے شمس آ رہے ہو؟"

"مجھے پتا" میں نے جواب دیا پھر ایک لمحوں کے توقف سے کہا "شیرت مجھے واقعی کوئی غامض دلچسپی نہیں لیکن تم سے مل کر کچھ پورا محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی ہے۔ اس لئے بقول تمہارے مزید میل ملاقات کا سامنا کھینچے ہوئے آ جاؤں گا۔ یہاں تمہارا کراہیہ کیا ہے؟ شاید میں تمہارے لئے کچھ بہتر خدمات کا بندوبست کر سکوں۔"

"آپ کوئی فائدہ نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ شام تمہارے ہوش میں میری آخری شام ہے۔ میرا سامان جا چکا ہے اور آج رات جب میں شو کے لئے تھری اسٹار ہوئی جاؤں گی تو واپس یہاں نہیں آؤں گی۔"

"کیا مجھ سے ملاقات اتنی ہی ناخوشگوار ثابت ہوئی ہے کہ تم نے میرا ہوش ہی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا؟" میں نے افسوس زدہ جیسے ٹپکا پوچھا۔

"پھر گز نہیں" وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی "تم سے ملاقات تو بہت ہی بروقت اور بہت ہی خوش آئند محسوس ہو رہی ہے۔ تم سے مل بیٹھنے سے پہلے میں اپنے آپ کو بہت تھا تھا سی محسوس کر رہی تھی۔ اب مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے سر راہ چلے چلے کوئی بہت بُرا بنا اور مخلص دوست بالکل غیر متوقع طور پر مل گیا ہے۔"

"کمال ہے!" میں نے نیم استہزائیہ لہجے میں کہا "ایک ایسی عورت جس کے ہر رات اس شہر میں کیڑوں نے چاہئے والے پیدا ہو رہے ہوں گے وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی!"

"میں ہی عورتیں تو زیادہ تنہا ہوتی ہیں جن کے گرد زیادہ جھوم ہوتا ہے۔" اس کے بچے میں ایک عجیب بے ساختگی تھی۔

تمہارا ناٹا غیبت لگتا ہے۔ بھلا محسوس ہوا ہے۔"

"اس کے باوجود جارحی ہو؟"

"وہ پروگرام پہلے سے طے تھا۔"

"کیا اب وہیں تھری اسٹار ہوئی میں ہی سمجھو گی۔ جہاں پروگرام کر لیا ہو؟"

"میں وہاں تو میرا ٹھکانہ بالکل ٹھیک نہیں۔" اس نے جواب

سے

فرجین نے مجھے جو کارڈ ڈیا تھا میں نے وہ لفافے سے نکال کر دیکھا۔ اس میں شرویع ہونے کا وقت رات نو بجے کا تھا۔ ابھی میرے پاس خاما وقت تھا۔ میں نے گرم گرم کالی کا ایک اور مکھڑے میں آثار کے ایک بار پھر اور کی راہ لی۔ اپنے سرشت میں پہنچ کر میں نے ٹیلی فون سنبھال لیا۔ مجھے بہت سے لوگوں سے رابطے بحال کرنے تھے لیکن اہل فون پر اس کام کی ابتداء کی جاسکتی تھی۔

○●○

میں فرجین کے شرمیں ذرا آخر سے پہنچا۔ قہری استاد ہوٹل میں اس قسم کے شوڈ اور ڈانس پارٹوں وغیرہ کے لئے ایک ہال کو خاص طور پر "ڈسکو ٹنک" کی شکل دی گئی تھی اور وہ واقعی کسی ملٹی ملک کا ڈسکو ٹنک معلوم ہوا تھا۔ ایک عظیم الشان قسم کا اسٹیج اس میں ایک انسانی چیز تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو ہال کچھ بھرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ میں جب نمبر کے ذریعے اپنی درگاہ کی سیٹ تلاش کرنے میں کامیاب ہوا تو پتا چلا کہ اس پر بھی ایک صاحب تشریف فرما تھے اور باقاعدہ جموم رہے تھے۔ ہال میں سینکڑوں تک رہنمائی کرنے کے لئے تو کوئی صاحب موجود نہیں تھے لیکن شاید میری خوش قسمتی تھی کہ اگلی قطار میں میری سیٹ نسبتاً ایک پر سکون سے گوشے میں دوار کے قریب تھی اور اس کے ساتھ ہی پھولے سے کاؤتھر گئے سے ایک صاحب موجود تھے جو قور غیر معلوم ہوتے تھے۔ ہال کے مسائل کے مسئلے میں ان سے رجوع کیا جاسکتا تھا۔

میں نے ان سے رجوع کیا تو انہوں نے میری سیٹ فوراً ہی خالی کرادی۔ اطمینان سے بیٹھے کے بعد میں نے اسٹیج کا جائزہ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک غروردار سی حیرت ہوئی کہ فرجین عرف مس ایکس گانا سناری تھی گانے کے ساتھ ساتھ اس کا جسم شاخ مکمل کی طرح ایک خاص ردم سے مل کھارہا تھا۔ تاہم وہ بے ہودگی نہیں پھیلا رہی تھی۔

اس کے جسم پر ایک نہایت خوب صورت، نفیس اور باریک لباس کچھ ایسی اپنائیت سے لپٹا ہوا تھا جیسے بارش میں بیجا ہوا ہو۔ پاکستانی اور انڈین فٹوں میں بعض اوقات کسی نہ کسی طرح موقع نکال کر بہرہ دہن کو بارش میں بیجا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرجین اس وقت کسی حد تک ویسی ہی نظر آ رہی تھی مگر اس کی شخصیت میں زیادہ خوب صورتی، زیادہ لوچ، زیادہ گرہیں اور زیادہ شاعرانہ پن تھا۔ وہ خواہ کچھ بھی تھی اور کسی بھی حال کو پہنچ چکی تھی لیکن اس میں ایک "پتہ آف کلاس" اب بھی موجود تھا۔ وہ اب بھی ہمارے ہاں کی فلمی ہیروئنوں سے درجہ بالا تھی۔

گانا وہ انگریزی میں گارہی تھی لیکن اس کی آواز میں شرقی وائل کا سا سوز تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہال میں موجود لوگ اس کا گانا بھی شوق اور اشتہاک سے سن رہے تھے۔ اسٹیج پر وہ

کچھ اور بھی دروازہ لگ رہی تھی۔ موسیقی کا ڈیروم اس کا سوز اور اس کے وجود کا شاعرانہ لہر آئے۔ یہ ایک عجیب سا تھا اور یقیناً لوگوں کو مسحور کر رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس سے زبردست کچھ آسانی کا شکار تھے دھیرے دھیرے گویا اس نے دزد میں آئے تھے۔

میری نشست خاصی اہلی تھی۔ قور نمبر جو کالی تھا قور عمر کا نہیں تھا تقریباً میرے دائیں کندھے پر جھکا ہوا تھا۔ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس ہونٹ نیم داتے اور وہ ایک تنگ اسٹیج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں تقریباً یہی کامی عالم تھا۔ کوئی ایک دو سرے سے بات کر رہا تھا۔ سب اپنے اپنے تصور میں نہ جانے کہاں کچھ پرواز اور اچانک ایک جھٹکے سے گویا سازوں نے دم توڑ دیا اور پر لرائی ہوئی خواب ناگ سی روٹیاں غائب ہو گئیں۔ اسٹیج میں ڈوب گیا۔ ایک لمحے کی آخر سے حاضری کو امانت دہرا ختم ہو چکا تھا۔ تب ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

میں سمجھا جس بی بی کل شہانہ یہ تو کچھ ایسی چیز نہیں تھی کا کام بنی نے نقش کھینچا تھا اور نہ ہی یہ شر کے پیش کوئی چیز میں دھوم پھانے والی کوئی چیز تھی لیکن میری غلط فہمی طبعی ہو گئی۔ میرے غلط فہمی میں جھٹکا ہونے کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے کارڈ تفصیل سے نہیں پڑھا تھا۔

اسی اثنا میں دو لڑکیاں تقریباً رقصاں سے انداز میں اچھلتا ہوا بیڑ لے کر اسٹیج سے گزریں جس پر جلی حریف میں کہ مس ایکس چند منٹ بعد اپنے شو کا دوسرا آکٹیم پیش کریں گے وہ لڑکیاں اور بیڑا پاٹ لائیں کہ دائرہ میں تھا۔ وہ اسٹیج دائیں دھک سے اسٹیج پر آکر دھیرے دھیرے بائیں دھک کی باغائب ہو گئیں۔ ہال میں دو خفیاں تیز ہو گئیں۔ وغیرہ بھی آگے مشروبات وغیرہ کا دھڑ پلٹے لگے۔ میں نے دو تین ایسے صاحبان کو دیکھا جن کے ہونٹوں میں سکرشیں لگی ہوئی تھیں مگر وہ انہیں بھولے ہوئے تھے۔ اب انہوں نے اپنی سکرشیں نکال لیں۔

میں نے اپنے لئے کوئلہ ڈرنک کا آرڈر دیا اور سر اٹھا کر گانہ سننے لگا۔ قور نمبر کچھ اس طرح داد طلب نظروں سے میری طرف رہا تھا جیسے چند لمحے پہلے وہی اسٹیج پر گانا گا کر نیچے آیا ہو۔ اور چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی نیم پلیٹ کے مطابق اس کا نام اور داد کی مستحق کو کہ فرجین تھی لیکن فی الحال اس کا دل دھکنے لئے مجھے کسا ہوا "واہ ایسا خوب صورت آواز تھی۔"

میں نے آواز کی تعریف کی تھی لیکن وہ اپنی جیستی چننا ہوا پھیرتے ہوئے بولا "واقعی صاحب! بڑی زبردست عورت ہے۔" کے ایک شرمیں جاہر آکٹیم ہوتے ہیں اور وہ ہر رات دو شو میں ہے یعنی میں روزانہ اس کے جہازوں آکٹیم دو مرتبہ دیکھا ہوں۔ میں نے دیکھ رہا ہوں لیکن ابھی تک میرا دل نہیں بھرا۔

ایک میں درجہ بدرجہ آگے بڑھتی گئی۔ آخری رقص واقعی خاصا  
”میر آزا“ قسم کا تھا۔ اس ”شاعلی رقص“ سے گہرا کھمبے کئی بار  
پیشانی سے پیٹتے ہوئے چمکا ہوا۔

آخر کار پہلا شو ختم ہو گیا اور ایک کھنکھ کا وقفہ آیا۔ اس شو  
کے تمام شائق رخصت ہونے لگے۔ تاہم طور خیر اور نے تکیا کے سیرا  
وی آئی پی کارڈ دونوں شو کے لئے کارآمد تھا۔ تاہم ہر ادہاں مزید  
ٹھہرنے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ میری سینیٹر رمضان سے ملاقات ملے  
تھی۔ وہ میرا بزرگ دوست تھا اور مجھ سے ملنے کے لئے بے قرار  
تھا۔ کافی دلوں سے ہم ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ نہیں  
کر سکے تھے۔ میں فون پر اس سے پوچھا کہ تم نے کچھ عاکہ رات کا  
کھانا ذرا تاخیر سے ہم آئیے اس کے گھر پر کھاؤ گے۔

فرحین یقیناً اس سچ سے مجھے دیکھ چکی تھی لیکن اس نے ابھی  
تک مجھے نہیں بتایا تھا۔ میں بہن بگائے جا کر اس کے سر سوار ہونا  
نہیں چاہتا تھا۔ اس قسم کے شو وغیرہ پیش کرنے والوں کی اس سچ کے  
پیچھے عجیب سی حالت اور عجیب سی مصروفیات ہوتی ہیں۔ ان کی  
مرضی کے بغیر ان کے پاس جانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ عموماً  
وہ ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ فرحین کو ابھی دو سراسر بھی پیش کرنا تھا۔  
لیکن تھا کہ ایک کھنکھ کے وقفے میں وہ آرام کرتی ہو۔

یہ سب کچھ سوچ کر میں اٹھی کی تھا کہ سرنگوت اور سیاہو  
والا ایک شخص میرے قریب آکر رہا۔ وہ ہیڈ وینٹر معلوم ہوا تھا۔  
اس نے جب کہ تقریباً سرگوشی میں پوچھا ”آپ مسٹر افضل چوہدری  
ہیں؟“

”ہاں“ میں نے غیر محسوس طور پر اس کا سر ہاتھ جاترہ لیتے  
ہوئے جواب دیا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ اس کے ہونٹوں کے کون  
تے ہلکی ہو لسنر چھپا ہوا تھا۔

”براؤ کم میرے پیچھے آئیے“ اس نے کھوروی سی انگریزی  
میں کہا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھ لیا، ہنر سمجھا۔

اس نے مجھ کو اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے  
اس سوال کی توقع نہیں تھی اور محض اس سوال کی وجہ سے وہ مجھے  
ایک بے وقوف انسان سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تاہم اس نے کہا  
ازراہ صوریان مجھے بتایا ”کوئی آپ کو بلاتا ہے۔“

فرحین کا نام اس نے اب بھی نہیں لیا تھا۔ ہر حال میں اٹھ  
کر اس کے پیچھے چل دیا۔ ہم بظنی راستے سے گھوم کر اس سچ کے  
عقب میں پہنچے۔ ہال کی خوب صوریان اور شان و شوکت کا اس جتنے  
سے گہرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہاں ایک لمبی سی راہداری تھی جس  
کے ایک طرف کمروں کی قطاریں تھیں۔ کمروں کے دروازوں پر  
سیل پکھیل کے درجے تھے اور راہداری میں سجھا ہوا قالین قابلِ رحم  
حالت میں تھا۔ مجھے پئے اس گرد و خاک قالین میں جا بجا سکرٹوں کے  
چلنے کے سوراخ تھے لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس بے ہودہ

”بھروسے کا بھی نہیں۔“ میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا  
”میں کچھ دیکھنے سے دل کہاں بھرتا ہے۔“

اس کے چلنے سے کچھ ایسی آواز نکلتی جیسے وہ غراوت کر رہا ہو۔  
اسے ہنسی آتی تھی لیکن وہ اس ہنسی کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔  
میں نے ایک بار پھر ہال کا جائزہ لیا اور پوچھا ”کیا روزانہ ہال پر ہنسی  
کچھ سمجھ رہا ہوتا ہے؟“

”جی سر!“ اس نے سرور سے میں جواب دیا ”شو روم سے اسی  
فری اڈس نکل جا رہا ہے۔ اب تو چند ہند ہندوں کی ایڈوانس بنگلہ  
واقعی ہے۔ لوگ دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو کر پروگرام دیکھنے کے  
لئے چار رہے ہیں لیکن ہم اس کی اجازت نہیں دیتے۔“

”جیت خوب“ میں نے اس ”تربانی“ پر اسے داد دی۔  
وہ میری طرف کو جبکہ ریات جاری رکھتے ہوئے بولا ”یہ سب  
اوپر طبقے کے لوگ ہیں۔ میرا ایک ایک رات میں ہزاروں روپے  
خرچنے والے۔“

”بے شک“ میں نے اس کے دعوے کو درست حلیم کرنے  
اور ثابت میں سر ہلایا۔

اس دوران ایک کامیڈین اس سچ پر آکر حاضرین کو مٹھوٹا کرنے  
کی کوشش کرنے لگا۔ وہ مجھے بے لیلیئے ٹھنڈا تھا لیکن خود ہی مختلف  
کراہوں کی آوازیں نکال کر ان لٹینوں کو دلچسپ بنانے کی کوشش  
کر رہا تھا۔ صرف چند افراد اس کی طرف متوجہ تھے اور ان لٹینوں پر  
فٹ رہے تھے۔ باقی سب شاید صرف مس ایکس کی وجہ سے آئے  
ہوئے تھے اور صاف طور پر اپنی دلچسپی صرف اسی کی ذات تک  
محدود رکھنے کا عہدہ کئے ہوئے تھے۔ آخر کار کامیڈین ایک مشہور  
گلوکار کی آواز کی نقل اُتارتے ہوئے ایک گانا گانا کر رخصت  
ہو گیا۔

ہال کی مدفیناں ایک بار پھر دم ہو گئیں اور اس سچ پر خواب  
ناگ مدفیناں نمودار ہونے لگیں۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں  
اُگھرنے لگیں۔ موسیقی تیز ہوتی گئی۔ آخر ایک چھانکے کے ساتھ  
ایک سمت سے اچانک فرحین اس سچ پر کودی۔ اب اس کا نظریہ ڈیڑھ  
انچ کی سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ اب وہ خود نہیں جا رہی تھی۔ ایک  
انگریزی گانے پر رقص کر رہی تھی اور اپنے پیچھے آئٹم سے وہ قدم  
لگے لگے چلی گئی تھی۔

رفتہ رفتہ اس کے رقص میں تیزی آتی گئی اور شاید اس کے  
ساتھ ساتھ لوگوں کا دورانِ خون بھی تیز ہو گیا۔ جن میں میں بھی  
شامل تھا۔ تاہم کچھ سمیت سب دم سادھے بیٹھے رہے۔ آخر کار چند  
من کا یہ ظلم ٹوٹ گیا۔

ایک بار پھر سچ میں چھوٹا سا ایک ”دون مین شو“ آیا۔ اس بار  
ایک صاحب چاند کے کلاٹ دکھانے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ  
اس ایکس کے پروگرام کا اندازہ دورانِ شو والا تھا۔ اسی طرح تھوڑا  
قریب وقت دے کر اس نے اپنے چار مختلف رقص پیش کئے اور ہر

تم بھی ہو لیکن تم ذرا مختلف قسم کے ہوے آوی ہو اور اس کے

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی الجھن میں تھی۔ اس کا جواب تو دینا ہی تھا لیکن اس کا چواہیک پر سکون تھا۔ اس قسم کی غور تھی وہ حقیقت ایک بیانِ فخرِ حمید کی گزارتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ بتاؤں گزرتا ہے غلط کی عادی ہو جاتی ہیں۔ انہیں ظاہری طور پر ایک جھیل کی پُر سکون نظر آتے ہیں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

وہ گویا اس قدر میرا سہارا بن گئے تھے کہ وہی غمی اور اندر ہی اندر کسی بات سے مطمئن ہو گئی، کسی چیز سے محبت ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پتائی سے ایک لڑکی سرگھٹ کر ایک سرگھٹ نکالی اور بائیں میری طرف بڑھایا۔

”میں نے آج شام ہوئی میں جس میں بتایا تھا کہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر سرگھٹ جوازہ لیا۔

”وہ میں بھول گئی تھی۔“

اس سے پہلے کہ وہ بائیں واپس رکھتی تھی۔ میں نے ہاتھ ایک سرگھٹ نکالتے ہوئے کہا ”لیکن جب کوئی خوب عورت سرگھٹ کی آفر کے تو انکار کرنا امتحانِ بددلتی کی ہوتی ہے۔ آج ایک ہی دن میں دو مرتبہ تمہارے ہاتھ نہ لیتا میری برداشت سے باہر ہے۔ میں یہ سرگھٹ لیا کر خواہ یہ میرے تابوت میں پہلی مکمل ثابت ہو۔“

”یہ سرگھٹوں سرگھٹ مل کر بھی تمہارا کچھ بگاڑ سکتے۔“ اس نے لائٹ سے میری سرگھٹ کو شط کو دکھایا۔ شط کے اوپر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھیں نیلی آنکھیں بھی سفید فاسوں کی طرح ہی شفاف تھیں۔ ان کے شط کے عکس کر رہا تھا۔ ان آنکھوں کی دھند میں شاید ایک بعد ایک بے حواسانہ گرجی ہوئی لڑکی تھی۔

”کیوں مجھ غریب کو خوش غمی میں جلا کر کے مرنے ہوئی ہو۔“ میں نے سرگھٹ کا ہلکا سا سٹس لے کر کہا۔

”نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہیں اطمینان اور یہی رہی ہوں کہ تم کم از کم سرگھٹ سے نہیں مرے گے۔“ چلو تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔“

ایک لمحے ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ پھر وہ اچانک ہی بولی ”فضل چوہدری تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلانے لگیں۔ ”جب کوئی خوب صورت عورت اتنی محبت سے مجھ سے گفتگو کرنے کے لئے بکاتی ہے تو عام طور پر اسے مدد کی ضرورت

رہا داری میں بہت اچھی فریب ہوئی تھی جو کئی قسم کی خوشبوؤں کا کچھڑا معلوم ہوئی تھی۔

وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد شخص جو معلوم نہیں ہیڈ وین تھا یا کچھ اور۔ آخری دو دنوں کے سامنے بار۔ اس دو دنوں اور دوسرے دو دنوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں تھا کہ اس پر شہری رنگ کا ایک پتلا سا ستارہ چسپاں تھا۔ میرے رہنے والے دو دنوں پر دھبہ دی اور ساتھ ہی بلند آواز میں اطلاع دی ”کس ایکس بائی میں ہوں جیل!“

”آپنا نہیں شرطانہ طے میں ہوں۔“ فرحین کی آواز سنائی دی۔

”یہ تو بڑی مایوس کن خبر ہے کہ تم شرطانہ طے میں ہو۔“ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور اس نے ایک کھٹکتا ہوا قہقہہ لگایا۔

وہ اس وقت ایک بہت ہی گدیے قسم کے صوفے پر نیم دراز تھی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بہت بڑی ڈرننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ ایک بڑا اخبارات اور رسائل سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں زیادہ تر شہریوں سے متعلق معلوم ہوتے تھے کیونکہ ہر طرف سے بڑی بڑی رنگیں تصویریں جھانک رہی تھیں۔ اس کی ڈرننگ ٹیبل بھی حلقہ سازو سامان سے کچھ بچ بھری ہوئی تھی۔ آئینے کے فریم میں بھی کچھ غیر ملکی اداکاروں اور گلوکاروں کی تصویریں آویسی ہوئی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ کمرہ پچاس سال پہلے کی انگریزی ظہور میں دکھائی جانے والی پرانے کی کسی اداکارہ کا ڈرننگ روم معلوم ہو رہا تھا۔

فرحین اس وقت سیاہ رنگ کے ایک لمبے سے گاؤں میں تھی جس نے اس کی سفید فاسوں کی شخصیت کو اور نمایاں کر دیا تھا تاہم اس کے چہرے پر اسٹیج کا ایک اپ اسٹے قریب سے دیکھنے پر بھلا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک البتہ اس کے ہونٹوں پر اچھی لگی رہی تھی۔ یہاں سے وہ ہونٹ آنکھیں دکھائی دے رہے تھے۔

”تمہارا بہت شہری جیل!“ اس نے مجھے ساتھ لائے والے شخص کی طرف دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے مؤبدانہ انداز میں گردن کو ہٹا کر اور رخصت ہو گیا۔

فرحین نے آٹھ کر کے کا دو روزہ قتل کیا اور میرا ہاتھ تمام کر صوفے کی طرف پڑھتے ہوئے بولی ”یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم مجھ جیسی عورت کے بچانے پر چلے آئے۔“

”تم جیسی عورتوں کے بچانے پر تو بڑے بڑے لوگ چلے آتے ہیں۔“ میں نے صوفے میں دھنسنے ہوئے کہا۔

”بڑے بڑے لوگ تو چلے آتے ہیں لیکن مجھے تمہارے آئے کی اہمیت نہیں تھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”حالانکہ بڑے آوی

تہاڑی مدد کی ضرورت ہے کہ تم مجھے مصیبت میں چھیننے سے بچاؤ۔

اس نے فیرنگی سکرٹ کا شل لے کر حواں میرے منہ پر چھڑا۔ میں خود اپنی سکرٹ کم لی رہا تھلاہ اپنی سکرٹ اس طرح مجھے زیادہ پلا رہی تھی اس کے نیم دا آٹھیں ہونٹوں سے دھواں ہوا میں دم مچھکا تو وہ بولی "تمہیں یہاں میرے پاس آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"مجھے اسٹیج کے بتلے کی طرف مڑنے ہوئے تو کسی افزا نے دیکھا ہوگا لیکن تمہارے کمرے تک میرے آنے کا شاید صرف اسی شخص کو علم ہو جو مجھے بلا کر لایا تھا۔"

"جیل؟ اس کی کوئی بات نہیں۔ میرا ماننا آوی ہے۔ تم نے آنے وقت ہال میں خاص طور پر تو کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ نہیں پایا تھا؟"

"میں نے توجہ نہیں دی۔" میں نے دوا نڈاری سے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کپڑا اسرار معاملے کی طرف جا رہا تھا ورنہ ضرور توجہ دیتا۔"

وہ اٹھ کر دوا نڈے تک پہنچی۔ تاب کا ٹکڑا ہا کر اس نے دوا نڈے کو غیر منتقل کیا اور نہایت محتاط انداز میں آنکلی و خاموشی سے دوا نڈہ تھوڑا سا کھول کر باہر راداری میں بھانکا پھر شاید کچھ مطمئن ہو کر دوبارہ دوا نڈہ منتقل کر کے واپس صوفے پر آن بیٹھی۔ وہ یقیناً کسی خوف کے سائے میں دقت گزار رہی تھی۔ اس کے باوجود اتنی خوش اور ذمہ دل نظر آ رہی تھی یہ بڑی بات تھی۔

"مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن یہ جگہ اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "دو بجے میرا دوسرا شو ختم ہو جائے گا۔ کیا تمہیں بیگم میرے پارٹنر پر آگئے ہو؟"

"آ جاؤں گا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کر تم رت چکا کرانے پر تلی ہوئی ہو تو کر لیتے ہیں لیکن افسوس کہ بات وہ نہیں نکل جو میں سمجھ رہا تھا۔"

"یعنی؟" اس نے ترمیمی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ تم مجھ پر عاشق ہو گئی ہو لیکن یہاں تو کام نکل آیا۔" میں نے پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لی۔

"میں تو یہی محسوس کر رہی ہوں کہ میں تم پر چاروں ہاتھ پاؤں سے عاشق ہوں لیکن بے چارہ مجھ جیسی عورت کے عشق کی تمہاری نظر میں کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟" اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی صرف ایک لہری آنکھ گزر گئی۔

"یہ تم باہر اترتے ترم آمیز انداز میں۔ اور اتنی عمارت سے اچھا تو کہ "مجھ جیسی عورت۔" مجھ جیسی عورت "کہ کر مت لے۔" اس نے بڑی گڑبڑ سے مت کے جائز۔ اگر تم جلد جان سے اس پر دیش میں گیا۔"

ہم نے سادگی سے کہا۔

"یہ بات کہ۔" وہ گہرا غریب کر بولی "تم چند ہو اور نہ ہی میں نے تمہیں محض غرض کے تحت بلایا ہے۔ مجھے ایک طاقتور آدمی کی مدد کی ضرورت ہے اور طاقت سے میری مراد جسمانی طاقت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسا شخص جس کا معاشرے میں کوئی مقام ہو۔ جو کسی سے ڈر نہ ہو جو بہت بار سوچ ہو اور جس کے پیسے میں دل بھی نہ ڈر نہ عام طور پر ایسے انسانوں کے سینوں میں دل کی جگہ چکر کا ایک گھڑا رکھا ہوتا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ منہ پلانے سے انداز میں بولی "میں بہت گناہ گار ہوں۔ خطا کار ہوں لیکن مجھے معلوم ہے تمہارا موزہ ہو تو تم گناہ گاروں اور خطا کاروں کے بھی کام آتے ہو۔ سعد صاحب کے ہاں پائل میں جو لڑکی سوئٹنگ بول میں ٹرہ پائی تھی وہ بھی تم سے مدد طلب کرنے کے لئے پہنچی تھی وہاں کے ہاتھ میں تمہارے نام ایک سفارشی نوٹ دیا ہوا تھا۔ وہ دو مہینے آنے سے پہلے ہی قتل کر دی تھی تھی لیکن مجھے معلوم ہے تم نے اس کے قاتل کو تلاش کیا تھا اور اپنے طور پر اسے انجام تک پہنچا دیا تھا۔ اتنی زحمت صرف کوئی صاحب دلی ہی کر سکتا تھا۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟" میں نے اپنے آپ کو چنگے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"مجھے معلوم ہے یہ تمہارا راز ہے لیکن تمہیں میری طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو خود تمہاری مدد کی طالب ہوں۔ ایک سوالی ہوں۔ میں چاہوں بھی تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ تم نے بہت "مہیاں" خرما کام کیا تھا۔ تم نے معروف فلمی مصنف نصیر نواز کو خودکشی کرادی تھی۔ بعض راز کراہیں جوڑنے سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ میں نے جب اخبار میں نصیر نواز کی خودکشی کی خبر پڑھی تھی اور انٹرویو میں اس کے بارے میں انڈی انڈی باتیں سنی تھیں تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا قاتل وہی تھا اور اسے تم نے انجام تک پہنچایا تھا۔ خیر۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ گرتے مگرتے اکھاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو صرف اپنی بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے گہری دیکھی۔

میں نے اس کی بات کی تائید یا تردید نہیں کی تاہم یہ محسوس کے بغیر نہیں رہا کہ وہ خطرات کا حد تک ڈھین لڑکی تھی۔ اس نے سلسلہ کلام چڑھا "میرا تم سے دوستی اور ہمدردی کا کوئی رشتہ نہیں۔ اس کے باوجود میں نے نہ جانے کیوں تمہیں دوست اور ہمدرد سمجھنے ہوئے تکلیف دی ہے۔ مجھ جیسی عورتوں کے دوست اور ہمدرد بہت کم ہوتے ہیں بلکہ شاید نہ ہی نہیں۔" وہ عجیب سے انداز میں منکرا لئی۔

"تم کسی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہو؟" میں نے پوچھا۔  
"نی الحال تو نہیں" اس نے جواب دیا "لیکن پھنس سکتی ہوں اور بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتی ہوں۔ مجھے اسی سلسلے میں



ہوا تمہیں۔ تم ایک اچھی عورت ہو۔

”دل رکھنے کو یہ باتیں اچھی ہیں۔“ وہ اندر کی سے مسکرائی  
”لیکن مجھے معلوم ہے مملی زندگی میں یہ کچھ زیادہ وزن نہیں  
درکھتے ہیں۔ تم مجھ سے ملحق نہیں کر سکتے اور میں تم سے ملحق کروں تو  
اس کی تمہاری فکر میں کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔“

”ملحق کسی سے پوچھ کچھ کرنے اور اس کے بارے میں  
تحقیقات کرنے کے بعد نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کہا۔

”دوست ہے۔ لیکن بعض اوقات کسی کے بارے میں پوچھ کچھ  
اور تحقیقات کرنے کے بعد ملحق لکھنا ضرور پڑ جاتا ہے۔ بجائے  
اس کے کہ بعد میں کسی وقت تم مجھے جبری اوقات یا دولاؤ۔ میں خود  
ی اپنی اوقات میں رہنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں خوش فہمیوں  
میں رہنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں اپنا آپ تمہاری خدمت  
میں پیش کر دوں۔ تمہارے قدموں میں گر دوں تب بھی میرے  
خیال میں یہ کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ مجھے معلوم ہے تم چاہو تو ہر  
رات مجھ جیسی ایک نئی عورت تک تمہاری رسائی ہو سکتی ہے۔“

”وہ پلڑے مجھے اتنا اونچا اڑانے کی کوشش مت کرو۔“ میں نے  
درخواست کی ”میں نہ تو ایسا لگتا ہوں اور نہ ہی ایسا پیش کوش۔  
یہ بھی مت بھولو کہ میں یورپ یا امریکا وغیرہ میں نہیں رہتا۔“

”اب یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔“ وہ اپنے خوب صورت  
بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی ”جہاں دولت ہو وہاں یورپ  
اور امریکا خود چل کر آجاتے ہیں۔ اچھا جان فصول باتوں کو چھوڑو۔ یہ  
بتاؤ تم میری مدد کرو گے؟“

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے۔ سچی قومیں کوئی صحیح جواب  
دے سکیں گے۔ کم از کم مسئلے کی نوعیت ہی کا اندازہ ہو جائے تاکہ تم  
سے دوبارہ ملاقات تک میں اس کے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔“

ایک لمبے کے لئے اس نے پُر خیال انداز میں خپلا ہونٹ  
واپس میں دھالیا لیکن پھر نفی میں سہلاتے ہوئے بولی ”میں تمہیں  
پوری بات بتاتا چاہتی ہوں اور پوری بات کہنے بغیر میرا موقف  
تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تمہاری ہمدردیاں میرے ساتھ  
نہیں ہوں گی اور پوری بات سنانے کے لئے نہ تو ابھی میرے پاس  
وقت ہے اور نہ ہی یہ جگہ مناسب ہے۔ مجھے یہاں کی دیواروں پر  
بھی اعتبار نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے کندھے اچکائے۔  
”تمیں سے چار بجے کے درمیان میرے اپارٹمنٹ پر آجاؤ۔“  
اس نے ایک بار پھر فراموش کی۔

”وہ تو میں آ جاؤں گا۔ سر کے بل آ جاؤں گا لیکن بد قسمتی سے  
مجھے ابھی تک معلوم نہیں کہ تمہارا اپارٹمنٹ ہے کہاں؟“

”ناہرو ٹاورز کلفٹن“ اس نے چند ثانیوں کی مدد سے مجھے اس  
کا کل وقوع سمجھایا جو نہایت آسانی سے میری سمجھ میں آیا۔

”یہ بہت چھوٹا ساپراپارٹمنٹ ہے۔“ وہ بولی ”بہت قہر  
لیکن بڑے بڑے اور پُر تعلیم اپارٹمنٹس پر مشتمل ہے۔ نہایت  
بڑے سکون۔ بلکہ تقریباً ویران سا علاقہ ہے۔ میرے فلیٹ کا نمبر  
تقریباً ہے۔ تمہیں اس تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے  
گی کوئی تھکس نہیں روکے گا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ جب  
تم اس عمارت کے قریب پہنچو تو کوئی تمہارا تعاقب نہ کر رہا ہو۔“

پھر اس نے ڈرائیونگ ٹیبل کی دروازہ میں سے اپنا پرس نکالا اور  
اس میں سے ایک خوب صورت سی چابی نکال کر میری ہاتھ  
رکھتے ہوئے بولی ”یہ میرے اپارٹمنٹ کی چابی ہے اگر اتفاقاً  
میں موجود نہ ہوں۔ کسی وجہ سے مجھے وہاں پہنچنے میں دیر ہو جائے  
تم اطمینان سے دروازہ کھول کر اندر چلے سکتے ہو۔ میرا انتظار کر سکتے  
ہو۔ اگر بلا تک کا مین کیٹ بند ہو اور کوئی چرکیڈر یا غیر موجود ہو  
ٹوٹ کا ٹالا بھی تم اسی چابی سے کھول سکتے ہو۔“

میں نے ایک نظر چابی کو دیکھا اور اسے کوٹ کی اندر دلی چپ  
میں رکھتے ہوئے کہا ”تم چاہو تو میں تمیں چار بجے تک یہیں ٹوک  
سکتا ہوں۔ میرا ایک دوست کے ساتھ کھانے پر اپنا ٹینٹ ہے لیکن  
میں اسے کینسل کر سکتا ہوں۔“

”نہیں تم اپنا اپنا ٹینٹ ہرگز کینسل مت کرو۔ بلکہ اگر  
تمہاری کوئی مصروفیت نہیں ہے تب بھی تم اپنا یہ وقت یہاں سے  
کسیں دور رہ کر گزارو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میرے ساتھ دیکھے جاؤ  
یا اس کرے میں دیر تک موجود رہو۔“

”اوہ اوہ ڈرائیونگ انداز میں جانے کے لئے کہہ رہی ہو؟“ میں  
سنبھل کر چیخ گیا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ اس نے یکدم ایک بازو میرے گلے  
میں حائل کر کے مجھے اٹھنے سے روک دیا ”میرے ساتھ دیکھے  
جانے میں تمہارے اپنے لئے بھی خطرہ ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ  
خطرات تمہارے لئے کوئی معافی نہیں رکھتے۔ اسی لئے میں نے تم  
سے مدد بھی طلب کی ہے لیکن پھر بھی جتنی حد تک ممکن ہو احتیاط  
برت لی جائے تو بہتر ہے۔ دو چار دن میں شاید بات کسی کنارے لگ  
جائے پھر اپنی احتیاط کی ضرورت نہیں رہے گی۔“

”تم تو افریقہ پر چاک کی شاگرد معلوم ہوئی ہو۔ کالی سپینس پر  
کہا ہے تم نے۔“ میں نے ایک طویل دھکے کے بعد سرگٹ کاٹا  
ساکش لینے ہوئے کہا ”یہ بتاؤ تم خیریت سے کمر تو بیچ جاؤ گی؟“  
”اس کا خیال رکھنا بھی تمہاری ہی فہم داری ہوگی۔“ وہ شرے  
سے انداز میں مسکرائی۔

”وہ کس طرح؟“ میں نے جانتا چاہا ”تم سے دور رہ کر کیا میں  
کسی ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعے تمہاری حفاظت کا فیصلہ انجام  
دوں گا؟“

”کی سمجھ لو۔“ وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے ایک بار پھر  
کر ڈرائیونگ ٹیبل تک پہنچی۔ وہ مختصر سا فاصلہ بھی دلفریب انداز میں

ایک اپ میں کو مت سمجھو۔ میں خودی تیار ہو جاؤ گی ٹیک اپ میں مجھے تیار کرانے میں زیادہ دیر لگتا ہے۔ میں خود جلدی تیار ہو جاتی ہوں۔ ہاں میرا ایک اپ کرتے وقت وہ بے چارہ خوابوں خیالوں میں نہ جانے کہاں پہنچا رہتا ہے کیا؟ نہیں ابھی میرا معیار اتنا نہیں گرا۔" اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

ایک بار پھر اس نے دروازہ کھولی کہ باہر راہداری میں جھانکا اور میری طرف مڑے ہوئے سر کو شی میں بولی "اب تم جاسکتے ہو۔" میں باہر آگیا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ اس پر مجھے اطمینان کے بجائے کچھ تشویش ہی محسوس ہوئی کہ وہ یہ جتنہ پہنچ سے کافی دور تھا۔ پھر بھی میرے خیال میں یہاں انچی ویرانی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ یہاں کے انچے پر خاصا گرم گرم بدکردارم پیش کیا جاتا تھا اور اس بدکردارم کی اشارتیں موجود تھیں۔ یہاں کھانسی نہ سنی، کچھ لوگوں کی آمد و رفت تو نظر آتی چاہئے تھی۔ پھر میں نے سوچا شاید فریجین نے ہی لوگوں کو اوھر آنے سے باز رکھنے کا کوئی بندوبست کر رکھا ہو۔

میں ہال میں پہنچا تو دیکھا وہاں سنے لوگوں کی آمد شروع ہو چکی تھی شاید کچھ پرانے چہرے بھی ہال میں موجود تھے جنہیں میں پہلے شے کے دوران دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے غالباً دونوں شوز کے لئے بنگ کرائی ہوئی تھی۔ وہ "فن" کے بچے قدر دان معلوم ہوتے تھے۔ غور فیچر از سر نو مصروف ہو چکا تھا۔ میں دوسری طرف سے گزرتا چلا گیا کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔

واپسی پر میں لفٹ میں اکیلا تھا۔ اس وقت شاید صرف آنے والوں ہی کی لائن لگی ہوئی تھی۔ جانے والا کوئی نہیں تھا۔ پیچھے بچے کر ہوئی کے بند دروازوں سے نکل کر میں نے بڑی ذہنت محسوس کی۔ ہوئی میں حرارت، مسکریں کا ڈھول، کلنگز کی بڑھل خوشبو اور محض تھی۔ باہر خشکی، آؤ کی اور خوشگوار ہوا تھی۔

میں کچھ دیر ایک طرف کو کھڑا رہا اور غیر محسوس طور پر گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی صورتحال نظر نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ رش تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ہوئی کی اصل پارکنگ لائٹ کو کہ عقب میں تھی لیکن چار دیواری کے اندر اس کے بجلی جتنے اور ذرا نیوے میں بھی گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب گاڑی ٹکالنے میں خاصی وقت ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب مجھے گاڑی ٹکالنے کی ذہنت ہی نہیں کرنی پڑے گی۔

میں محکم کر ہوئی کی پچھلی طرف پہنچا۔ یہاں پوری پارکنگ لائٹ میں صرف ایک مرل سے بلب کی ناکافی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ابھی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک سٹون کے عقب سے اچانک ہی ایک شخص نے نمودار ہو کر نہایت پھرتی سے میری کمرہ کسی گرن کی بال رکھ دی۔

مکوئی الٹی سیدھی حرکت مت کیجئے گا چوہری صاحب! میری

لے کرتی تھی۔ اس کی حال رفص سے کم نہیں تھی گو کہ اس میں قہقہہ اداوے کا دھل معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس بار اس نے ذرا رنگ بھل کی ایک متقل دراز کھلی۔ اس میں سے چٹا اور لیوڑا سا ایک پکٹ نکلا جس پر سفید سا وہ کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک معمولی سا پارسل معلوم ہوتا تھا جو ایٹو ریس لکھے جانے کا انتظار تھا۔

پکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی "جب تک یہ پکٹ تمہارے پاس محفوظ رہے گا میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک طرح سے میری سلامتی کی ضمانت ہے۔ میری انشورنس پالیسی ہے۔"

میں نے پکٹ کو گائٹ پلٹ کر دیکھا تاہم پوری کو خوش کی کہ میرے چہرے پر جیس کی علامات نمودار نہ ہونے پائیں۔ پھر میں نے اسے کوئی بڑی جیب میں ڈال لیا۔

"تم نے کوئی سوال نہیں کیا۔" وہ مسکرائی۔

"اب میں اتنا بھی کوڑھ مغز نہیں ہوں۔ تمہاری اتنی دیر کی گفتگو سے کم از کم یہ تو میری سمجھ میں آئی گیا ہے کہ اصل موضوع یہاں گفتگو نہیں ہوگی۔ اب میں سوال اس وقت ہی کروں گا جب تم چاہو گی۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ میرے سامنے کھڑی دھیرے دھیرے اپنے ریشمی بالوں میں اٹھایاں پیچھرتے ہوئے پر خیال انداز میں میری طرف دیکھتی رہی۔ مسکرائی وہی پھر بولی "بالکل صحیح فیصلہ کیا تم نے۔ ہر سوال صحیح وقت پر۔ اور مجھ پر کچھ پر اچھا لگتا ہے۔ جواب کے لئے انتظار کرنا بھی جتنی نہیں آتا ہے۔"

"میں بڑا صابر قسم کا آدمی ہوں۔ میرے والدین کو ابتدا میں اندازہ نہیں ہو سکا ورنہ شاید وہ میرا نام ہی افضل چوہری کے بجائے صاحب چوہری رکھ دیتے۔"

وہ اب ذرا طمانیت سے مسکرائی۔ آگے بڑھ کر بیٹوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے بازو میرے گلے میں حائل کر دیے اور ایک خوشگوار گمز جانے کے بعد بولی "میرے گھر آؤ گے نا؟"

اس نے گویا کوئی باقاعدہ معاہدہ کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے بازوؤں کے پھٹنے میں لپٹا ہوا توہ پھل کی طرح پھسل کر دوڑی چلی گئی۔

"آؤ گے نا؟" اس نے اپنا سوال دہرایا "صرف میں کہنے کی تو بات ہے۔"

میں ضرور آؤں گا۔ خواہ مجھے وہ میل چہرہ ہی آتا پڑے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں سر ہٹا کر انتظار رہوں گی۔" اس نے کہا۔ اس لمحے پائی پر کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسپونڈ اٹھایا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دوبارہ میرے کھاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہاں مجھے یاد ہے کہ مجھے دو سراسر شو پیش کرنا ہے۔ ابھی خاصا وقت بڑا ہے۔ نہیں

انگل کو نگر دبانے کی بہت جلدی رہتی ہے۔ ”وہ طرح سے لمبے میں بولا۔

میں نے کمری سانس لی۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں ابھی اس کا چوبیسویں سال نہیں دیکھ سکا تھا لیکن میرا خیال یہی تھا کہ وہ میرے لئے ابھی تھا۔ معاملہ صرف اسی تک محدود نہیں رہا تھا۔ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک تصویر کی اوٹ سے ایک اور شخص نمودار ہو چکا تھا اور اس نے دوسری طرف سے گمن میری پلیٹوں پر رکھ دی تھی۔

”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے دھمکے لمبے میں پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس ذرا میرے لئے چلتے ہیں۔ میرے لئے موسم بہت اچھا ہے۔“ پہلے والے نے جواب دیا۔ اسی دوران دوسرے نے میری پیٹوں وغیرہ پر ہاتھ مارنا شروع کر دیا تھا۔ میری پیٹوں میں ہلن اور نیارپس موجود تھا۔ دونوں چیزیں اس نے نکال لیں۔ کافی عرصے سے میں نے پرس میں رقم کے علاوہ کچھ رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آج کل تو میرے پاس دیسے ہی کچھ نہیں تھا۔ ان چیزوں کا بندوبست بھی شیخ شاہ اور راجہ لے گیا تھا تاکہ میں ذرا باعزت طور پر ادھر ادھر گھوم گھوم پھر سکوں۔ گاڑی بھی شیخ شاہ نے میرے مقامی آفس سے منگوا کر دی تھی لیکن شاید ان دو غیبت سے اجنبیل کو میرا باعزت انداز میں گھومنا پھرنا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے پہلے ہی کی طرح غمی دست کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ دائیں طرف والے نے میرے ہاتھ سے موبائل فون بھی لے لیا تھا۔

ایک اعتباراً البتہ میرے کام ابھی تھی۔ فریجن کا دوا پیکٹ میں نے لٹٹ میں بچے آئے کے دوران جیب سے نکال کر پھلون کی ٹیٹ میں چھپے کی طرف ڈال دیا تھا۔ میں اس وقت کمرے میں اس کی جھین مسمس کر رہا تھا لیکن میری ملاشی لینے والے کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچا تھا۔

میرے دائیں طرف والا کچھ آگے آگیا تھا۔ میں کن انھیں سے اس کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ درمیانے قد کا تھا لیکن اس کے کندھے غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔ اس کے بال پیشانی سے کافی اوپر جا کر شروع ہوتے تھے۔ سر کا انکا حصہ جو بالوں سے محروم تھا اس کی جلد سفید سفیدی تھی اور بدھم روشنی میں بھی چمک رہی تھی۔ نہ ہالے کیوں اس مجھے کو دیکھ کر گھمن ہی آ رہی تھی۔

تادم اس کے بال لمبے اور سیاہ تھے۔ بڑی طرح سر سے چپکے ہوئے تھے جیسے اس نے انھیں استری کر رکھا ہو۔ ان میں تل ہا شاید کسی اسپرے کی چمک تھی۔ اس نے سر کو خفیف سی حرکت دی تو مجھے معلوم ہوا کہ موصوف نے لمبے بالوں کی پونی بھی بائیں ہونے لگی تھی۔ اس کی ناک ٹوٹنے کی طرح جھگی ہوئی تھی۔ پلے پلے نیم دا ہونٹ بھی سفید سے دکھائی دے رہے تھے اور ان سے بے پناہ شگافی مٹاں تھیں۔ اس کی رگت ہاتھوں کی سی تھی لیکن اس کی حرکات و سکنات اور جسمانی حالت تماموں والی ہرگز نہیں تھی۔

اگر اسے کوئی بیماری تھی تو شاید وہ اس کے ذہن میں تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی میرے ذہن میں ڈاکٹر برٹاڈ کا قصہ مجھے میں نے دیکھا نہیں تھا لیکن نہایت تفصیل سے اس کا قصہ کے بعد اس کی ایک تصوراتی سی شکل میرے ذہن میں گھس گئی لیکن یہ شخص نہ تو سفید خام تھا اور نہ ہی ڈاکٹر برٹاڈ کی طرح پتلا اور لمبا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر برٹاڈ کی طرح اس کی کمری کے آثار تک نہیں تھے۔ اس کا سینہ تو باڈی بلڈن کی طرح ہوا تھا اور کندھے بھی انہی کی طرح چوڑے تھے۔ اس کی ہڈیاں ناک اور ہونٹوں کی ساخت ڈاکٹر برٹاڈ جیسی تھی اس لئے اس کی شکل میں مجھے اپنے تصوراتی خاکے کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

لے اسے دل ہی دل میں فوراً ”ٹوٹے“ کا نام دے رہا۔ دوسرا شخص تیسرا دراز قد تھا۔ مجھے سے ذرا ہی نیچا تھا۔ خاصا مضبوط معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی توہ خاسی نمایاں تھی۔ کی شہید بڑھی ہوئی تھی۔ وہ قطعی عام اور غیر نمایاں سی شکل اور کاماک تھا لیکن اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی وحشت و خفاہ جو نہایت سی کردہ اور اذیت پرستانہ فطرت رکھنے والے جرائم لوگوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس کا ”توند“ رکھ دیا۔

ٹوٹے نے بھی گمن کی ہل اب میری پلیٹوں پر رکھ دی تھی وہ اس پر دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا ”ٹوٹو دوا زے کی طرف چلو“ اس کا اشارہ بارنگ لٹ کے عقبی دوا زے کی طرف میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ”یہ کیا سلسلہ ہے پارے؟“

”ہم ذرا ایک پارٹی میں جا رہے ہیں۔“ ٹوٹے نے جواب اس کے ہونٹ بدستور نیم داتھے شاید یہ اس کی مسکراہٹ لیکن اس کی آنکھیں مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ سفاک لوگوں کی مسکراہٹ عموماً اسی قسم کی ہوتی ہے۔

میں نے آنکھوں سے اس کی گمن... کی طرف اشارہ کر کے ہونے پر سکون لہجے میں کہا ”تمہارا دعوت نامہ ایسا ہے کہ اس سائے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن...“ میں نے اپنے سر ہاپاڑ ڈالی ”کیا سیرامیل پارٹی میں جانے کے لئے مناسب ہے؟“

”نہیں سو تو چن رکھا ہے۔ اور کیا شای لباس میں جاؤں؟“

ٹوٹا غریبا ”ویسے بھی یہ کچھ زیادہ سہز لوگوں کی پارٹی نہیں ہے جس جیلے میں بیٹھا کھڑا لینا ہوا سی جیلے میں آسکتا ہے۔“

اس نے گمن کی ہل سے ٹوکا اور میں دوا زے کی ہل چل دیا۔ میری گاڑی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ میں حیرت نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھتا چلا گیا ہم عقبی گلی میں آئے جہ وقت مشان ہڑی تھی۔ گلی کے کونے پر ایک سیاہ کار کھڑی غیبت تھا کہ انکے پاس مزید کوئی ”سیاہ کار“ نہیں ”کھڑا“ تھا۔

ٹوٹے نے توند کو ذرا نیچے سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا خود بھلا دوا زہ کھولنے ہوئے مجھے دوا زہ سے دھکیلے ہوئے

اس نے کچھ دانت پیسے کچھ میری پسیلیوں کو چسپا بھر لٹھری سانس لے کر بولا "کافی دن پہلے میں نے کسی سے سنا تھا کہ تم بہت شرح آوی ہو چموری! لیکن یہ تمہاری شوخیوں کی آخری رات بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں تو ہر رات یہی سمجھ کر گزارتا ہوں۔" میں نے بدستور پرسکون لہجے میں کہا۔

گازٹی کے پیشے بند تھے اور وہ خاصی تیز رفتاری سے چاری تھی۔ راستے میں دو ایک جگہ پولیس کی محنتی گاڑیاں بھی نظر آئیں لیکن کسی نے اس سیاہ کار کو روکنے کا اشارہ تک نہیں دیا۔ شاید وہ لوگ گاڑیوں کو ابھی طرح پہچانتے تھے۔ اگر اس میں صرف شرقا موجود ہوتے تو شاید انہیں روک لیا جاتا۔

طوٹا شاید کسی معلمت کے تحت اپنی رہی رہی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نسبتاً پرسکون اور ہموار لہجے میں بولا "تمہاری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں؟"

"عجیب سوال ہے!" میں نے حیرت سے کہا "شاید مجھے اس لئے بھی تمہارے سوالات عجیب لگ رہے ہیں کہ ان کا کوئی خاص پس منظر ہے جو مجھے معلوم نہیں ہے۔ تم پہلے مجھے حالات سے آگاہ کیوں نہیں کرتے؟ پھر شاید میں تمہارے سوالوں کا کوئی صحیح جواب دے سکوں۔"

"مجھے الوہا کر مجھ سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ غریبا "تمہیں یقیناً پہلے ہی بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ اسی لئے میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں؟"

"ہر تو بڑا سیاسی سا سوال ہے ایسے سوالوں کے ڈیڑھ ٹک جواب دینا ابھی میرے لیے مشکل نہیں سا۔ اگر میں یہ کہوں گا کہ میری ہمدردیاں اس ملک کے غریب عوام کے ساتھ ہیں۔ جو غریب ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح بھی ہیں تو تم سمجھو گے میں سیاسی لیڈر بننے کی کوشش کر رہا ہوں حالانکہ سیاسی لیڈر کبھی عوام کو سادہ لوح اور بے وقوف نہیں کہتے کیونکہ اسی سادہ لوحی اور بے وقوفی پر ان کا سارا کاروبار چل رہا ہے۔ وہ انہیں ذہین و انتہر اور بدبخت سمجھ کر ہتھیار دے دیتا ہے۔" میں نے کہا "میرا ہونا کہ میری ہمدردیاں خوب بدورت لڑکیوں کے ساتھ ہیں۔"

"خوب صورت لڑکیوں کو تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔" وہ غریبا "ہمدردی کرنی ہے تو بد صورت لڑکیوں سے کرو۔" "میں نے آج تک کسی لڑکی کو اپنے ہارے میں کتے نہیں سنا کہ وہ بد صورت ہے۔"

"چھاپا تادم مس ایکس کے پاس کیوں گئے تھے؟"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دولت مند لوگ عموماً اس قسم کی

پہلی سے میرے ساتھ چھٹی سیٹ پر آن بیٹھا۔ اب جبکہ توڑ بنے ہیں کسی بیٹ میں رکھ لی تھی اور اسٹیرنگ و میل سنبھال لیا تھا میرے قریب صرف ایک ہی آدمی فور ایک ہی ریو اور وہ گیا تھا۔ میں ہلکا ہوتا ہوں حرکت میں آسکتا تھا اور تھوڑی بہت پہل شروع کر سکتا تھا لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ پکڑ کیا تھا اور وہ لوگ درحقیقت کون تھے؟ اس لئے میں کافی حد تک سداوت مندی سے بیٹھا ہوا رہا۔ میں نے انہیں اپنے انگوٹھ کے منصوبے پر کامیابی سے غور کیا اور چاروی رکھنے کا موقع ملا۔

"موتی کے جسم کا کیا تپا ہے؟" طوٹے نے پوچھا۔ وہ اب بھی بے ضرورت تھی۔ کی نال میری پسیلیوں میں چھوٹے جا رہا تھا۔ اس کے لئے مجھے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے شخص سوال برائے سوال کیا تھا ورنہ اسے جواب کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

"لڑکی؟ کون سی لڑکی؟" میں نے حیرت سے کہا "میں تو رات دو گئی کسی لڑکی سے بات کرنے کو بل کر رہا ہے۔"

"چموری لیڈر زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔" طوٹا زہر پلے لہجے میں بولا "میں اتنے دولت مند آدمی ہوں۔ تمہاری زندگی میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے؟"

دیا لگا تھا کہ اس کے لہجے میں کوئی ذاتی مذاق بھی بول رہا تھا۔ لیڈر، بڑا غم خیز لوگوں کی نظر صرف دولت مندوں کی دولت پر ہوتی ہے۔ اور بعض ان کی دولت چھیننے کے ساتھ ساتھ انہیں سزا دیتی ہے۔ یہ بھی غلط فہمی ہے۔ ان میں سے بعض کے ذہن میں اپنے گدیائی کے خیر سے غم خیز پن کی وجہ سے کچھ ایسا اٹھ رہا ہوتا ہے اور بعض کے ذہن میں کوئی اور خوفانہ سراٹھاتا رہتا ہے۔

وہ رات چاروی رکھتے ہوئے بولا "وہی فی الحال میں مس ایکس کی بات کر رہا ہوں۔"

"گورنر؟" میں نے باغی سے کہا "وہ لڑکی کہاں ہے۔ وہ تو انگریز تھی۔ شاید بد صورت ہے۔ سمورو گرم پوشیدہ ہے۔"

"ہوسکتے ہوئے الفاظ بد صورت بول رہے سوال کا جواب دو۔"

طوٹا غریبا "سوال کیا تھا تمہارا؟ میں بھول گیا۔" میں نے بے سادگی سے کہہ دیا۔

اس نے ایک بار پھر مس کی نال میری پسیلیوں پر دھڑکی۔ اس بدبخت سے زمانا چھین چھا کر کچھ منگی پڑی تھی۔ دو تین سیٹ گویا عموماً پسیلیوں کی کمال آواز کے درپے تھا تاہم اس نے دانت پیٹتے ہوئے اپنا سوال دوبارہ پوچھ رہا تھا اس عورت نے تمہیں کیا کچھ بتایا ہے؟"

"مورخیں کب کسی کو کچھ بتاتی ہیں۔ وہ سب کچھ اپنے دل میں ہی رکھتی ہیں۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا۔ اس دوران گاڑی ٹوک کر گاڑی کی چھارہ ہٹ پیداکر کے موڑ کاٹ کر ایک طرف اشارہ ہو چکی تھی۔

فریادوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ میں نے اسے بھی سوال ہی میں اُٹھائے کی کوشش کی۔ اس کے سوال پر مجھے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی تھی۔ فرحین بے چاری بھی کبھی وہی تھی کہ مجھے اس کے پاس جاتے اور پھر وہاں سے نکلنے کی نہیں دیکھا تھا لیکن یہاں مجھ سے اس کے بارے میں سوال جواب ہو رہے تھے۔

طوطے کو خاموش دیکھ کر میں نے جلدی سے مزید کہا "میں تو اس کے پاس خاصا لہا پروگرام لے کر گیا تھا لیکن اس نے مجھے فی الحال صرف چند خوب صورت مسکراہٹوں پر نال دیا۔ لگتا ہے امیدواروں کی لائن کافی لمبی ہے۔"

میں اس دوران کار کے اندر میرے میں نہایت آہستگی سے ہاتھ پیچھے لے جا کر پیکٹ ٹیٹ سے نکال چکا تھا اور اسے سیٹ میں اس جگہ ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں بیٹہ اور ننلا حصہ لیتے ہیں۔ عام حالات میں یہ ایک معمولی سا کام تھا لیکن اس وقت اسے انجام دینے میں مجھے محاورہ "آدا انگوں بیچہ" لگتا تھا اور عملی طور پر میرا پورا دھور پیسے میں بیگ چکا تھا۔ میں اپنی پیشانی سے پیسے کے قطرے آنکھوں کی طرف پھلتے محسوس کر رہا تھا۔

طوطا اچانک ہی اچھل کر ذرا پرے ٹھک گیا لیکن اس کے گمن کی نال میری پسیلوں پر ہی رہی۔ وہ شاید کچھ حرکت محسوس کر کے ہڑی طرح چونکا تھا۔

"یہ تم کسٹا کیوں رہے ہو؟" وہ برہمی سے بولا۔

"ایک شریف اور معزز آدمی کو تم گمن کے زور پر اغوا کر کے لے جا رہے ہو اور تم چاہتے ہو کہ وہ کسٹا بھی نہیں؟" میں نے دردناک لہجے میں کہا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ میں پیکٹ سیٹ میں اُڑس چکا تھا جہاں وہ کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندیشہ تھا کہ شاید ایک بار پھر میری تفصیلی حاشی لی جائے گی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کی طرف لائٹ آن کر دی۔ میں اس وقت دونوں ہاتھ گود میں رکھے حتی الامکان معصوم سی شکل بنائے بیٹھا تھا۔ میں نے طوطے کو تسلی دینے کی کوشش کی "تم خواہ خواہ وحشت زدہ ہو رہے ہو۔ میں نے تو ذرا جب سے سگریٹ نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میرے پاس تو سگریٹ ختم ہو چکی۔ اگر پیکٹ ہوتا بھی۔ تو شاید تم لوگ نکال چکے ہوتے۔"

"یقیناً" طوطے نے اپنے مخصوص زہریلے انداز میں جواب دیا "میں تمہاری جیبوں میں تو کیا تمہارے تن پر بھی کچھ نہیں چھوڑا ہوں۔"

میرا اندیشہ کچھ درست ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "میں اسوکر تو معلوم نہیں ہوتے۔"

"باقاعدہ اسوکر تو نہیں ہوں۔ کبھی کبھار لیٹا ہوں۔ خاص طور پر جب نروس ہوتا ہوں تو سگریٹ کی طلب شدت سے محسوس

ہوئے گئی ہے۔" میں حتی الامکان ایک عام آدمی نظر نہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو اس وقت تم نروس ہو؟" طوطے نے استغنائے لہجے میں پوچھا۔

"نکلا رہے ہر شریف آدمی اس طرح اغوا ہونے وقت نروس تو ہوگا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا تم مجھے اتنی گدھا سمجھتے ہو؟" اس نے نہایت گھبرے لہجے میں سوال کیا۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں نہ جیسے اُنکو سمجھتا ہوں اور نہ گدھا۔ مجھے تو تم صرف طوطے نظر آ رہے ہو۔ تاہم میں نے اپنی سادگی پر قناعت رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں ہر حال میں گدھا کیوں سمجھنے لگا؟" یہی تک تم نے مجھے دو لونی رسید نہیں کہ "نروس لوگوں کی زبان یوں فنی کی طرح نہیں چلتی۔" طویل سانس لے کر بولا "میرا حال میں تمہیں سگریٹ پلا دیتا ہوں۔ کسی بھی قسم کے نشے کے لئے ترستے ہوئے لوگوں پر مجھے ترس آتا ہے۔"

اس نے میری پسیلوں سے گن ہٹائے بغیر اپنے غالی ہاتھ سے اپنی جیب نکال کر ایک سگریٹ نکالی۔ پیکٹ جیب سے نکالے بغیر اس نے سگریٹ نکال لی تھی۔ سگریٹ اس نے میرے ہونٹوں میں پھنسا دی اور اسی ہاتھ سے اسٹرنگ نکال کر اسے شعلہ دکھایا۔

"شکریہ" میں نے بادل خواستہ ایک سس لیتے ہوئے کہا "خدا ہی میں نے اپنی شامت کو دعوت دی تھی۔ ایک کھٹے سے کچا کم وقت میں یہ دوسری سگریٹ چٹا پڑ رہی تھی۔"

میں نے اپنی پیشانی سے پھیند پوچھا۔ طوطا بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ انجھن میں نظر آ رہا تھا۔ وہ گویا اپنی رائے پر نظر ثانی کرتے ہوئے بولا "تم تو واقعی نروس نظر آ رہے ہو۔ میں نے تو سنا تھا تم بڑی ہیرو قسم کی چیز ہو۔"

"کہاں سے سُن لیا تم نے؟" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا "میں تو یہاں کافی گناہم آدمی ہوں۔ تم تک میری شہرت کیے پہنچ گئی؟" اور وہ بھی غلط مسلط قسم کی شہرت؟

"جس جاہلے کچھ ذرائع ہیں۔" اس نے اپنی ساپ بھی آنکھوں میں پراسرار سے لانے کی کوشش کی۔

"بہت ہی بے ہودہ ذرائع ہیں۔ ان پر محروم سات کرنا۔" میں نے مشورہ دیا۔

اس دوران گاڑی مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی میٹروپول کے پاس سے گزر کر کلکتہ کی طرف مڑ چکی تھی۔ ابھی وہ کسی اور طرف ہی مڑ سکتی تھی لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب وہ کلکتہ کی طرف ہی جا رہے تھے یہاں سڑک پر روشنی کافی تھی۔ طوطے نے خلاف لائٹ بجھا دی۔ "توہ" نہایت افسانہک سے ڈرائیو تک کر رہا تھا اور اپنے گرد پیش سے گویا بالکل لا قنطن تھا۔

”ہمارے ذرائع بالکل ٹھیک ہیں۔ بے ہودہ اصل میں تم ہو۔“  
”طوطا بولا۔“

”تمہارے ہاتھ میں کون ہے۔ میں تمہاری بات کی تردید نہیں کر سکتا۔“ میں نے بے چارگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔  
”ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا ”کیونکہ کیا ہے؟“  
”طوطا کو کسی صورت سے محفوظ ہوتے ہوئے کھانے کے سے انداز میں ہونے سے ہنسا ”تمہیں توڑی سی تیراکی کرانے کا پروگرام ہے لیکن تمہیں پتا نہیں چلے گا کہ تم تیرے ہوا ڈوب رہے ہو؟“

”اوہ میرے خدا!“ میں نے آنکھیں پھیلائیں ”تم لوگ مجھے سمجھ دینا چاہتے ہو؟“  
”نہیں ہم تمہیں خیر گالی مٹھ پر سمجھ رہے ہیں کہ کی طرف روانہ کرنا چاہتے ہیں۔ تم یہاں سے ہمیں رپارٹ بھیجا کرنا کہ سمندر میں تمہارے علاوہ کس کس مخلوق کا اضافہ ہوا ہے اور پھیلیا کیا فیشن اپنا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔  
”تو نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا ”توڑی“ اتم نے کاربائوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس سے معلوم کرنے کی کوشش کرنا توڑی نے اسے کیا بتایا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔“ طوطا غرایا ”میں اس کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تم فی الحال خاموشی سے وہی کام کرو جو تمہارے سپرد ہے۔ اپنے منہ سے وہی کڑوا دھرا الجھانے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہم جس شخص کو خوش قسمتی سے قلابوں کے لئے جا رہے ہیں یہ چھٹی نہیں بلکہ چہرہ ہے۔ یہ ہمیں کچھ نہیں بتائے گا۔ چنانچہ اس کے ساتھ منتر خوری سے بہتر ہے کچھ وقت بلی جھکی باتوں میں ہی گزار لیا جائے۔ آخر میں اسے سمندر میں پھینکنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اس شخص کی سی اداکاری کرنے کی کوشش کی جو اندر سے خوف زدہ ہو لیکن بے خوف نظر آنے کی کوشش کر رہا ہو ”مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ توڑی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اگر بتایا ہوتا تو میں اسے چھپانے کے لئے جان پر نہیں کھیل سکتا تھا۔ میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میری اس سے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں تو اس سے صرف توڑی سی دل خوش کرنے والی باتیں کر کے والپس آگیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات مجھے اتنی مہنگی پڑے گی ورنہ میں تو اس کے قریب بھی نہیں چٹکتا۔ اس شرمیں ٹھیکوں کی کمی ہے کیا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے چارے!“ طوطا بولا ”لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ تم اس کے پاس نہیں گئے تھے۔ اس نے اپنے ایک خاص چمچے جیل کو تمہارے پاس بھیج کر تمہیں بلایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا ہے کہ اس کا کوئی خاص مقصد تھا اور اس وقت اس کا ایک ہی

خاص مقصد ہو سکتا تھا۔ اگر تم خود اس کے پاس گئے ہوتے تو شاید ہم یقین کر لیتے کہ تم صرف ٹھیک جھاڑو کھائیں آگے ہو گے۔“  
”بلکہ پھر بھی یقین کرنا مشکل ہوتا۔“ تو نے غور کیا۔ ”کالی عام سینہ نہیں ہے۔“

”طوطے نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”تم لوگ واقعی اتنے غیر اہم سے کسی پکڑیں مجھے ایک بے وقت انسان کی طرح کوئی مار کر سمندر میں پھینک دے گے؟“  
”تم نے اس نے کہہ دیا کہ یہ کوئی خبر اہم پکڑ ہے؟“

”غرایا۔“  
”ظاہر ہے جب مجھے اصل بات ہی معلوم نہیں تھی تو میں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتا ہوں؟ مجھے یہ سوال یہ کہنا اہم معاملہ نہیں لگ رہا کہ اس کے لئے تم مجھ جیسے اہم آدمی کو کوئی مار کر سمندر میں پھینک دو۔ کیا تمہیں میرے عوض کوئی بھائی یا بھائی اور وغیرہ بھی وصول کرنے کا خیال نہیں آیا؟ تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک دولت مند آدمی ہوں۔“

”میں لالچ دینے کی کوشش مت کرو۔“ طوطے نے غصہ سے کہا ”ہمارے پاس لمبے پکڑوں میں اچھٹے کے لئے وقت نہیں ہے۔ تم چاہتے ہو ہم ایسے پکڑوں میں پڑ جائیں جن میں ہمیں لینے کے بجائے بھی پڑ سکتے ہیں۔“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ سیدھے سادے انداز میں تمہیں نہیں لاکھوے سکتا ہوں۔“ ”توڑی“ نے دو منٹ میں ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر رقم منگو اور بتا دی۔ ”جیسے بھائے تمہیں اتنی رقم مل جائے گی مجھے چھوڑنے میں کیا مزہ ہے۔“  
”اس قسم کی کوئی ذیل نہیں ہو رہی۔“ طوطا مضبوطی سے کہتا ہوا۔

”توڑی!“ تو نے کھار کر ہنگامہ آویز لہجے میں بولا۔ ”توڑی! طوطے کی عورت تھی۔ اس کا اصل نام نہ جانے کیا رہا ہو گا۔ تو نے اسے صرف مخاطب کیا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کر چاہتا تھا۔ وہ غالباً اپنے ساتھی کو بخورہ دینا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے نہیں لاکھ۔ بلکہ شاید اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے بھانے لگا سکتے تھے۔“

”طوطا بھی یقیناً اس کے لئے بغیر ہی اس کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن وہ شاید اپنے کا معلوم پاس کا بہت ہی وفادار اور اپنی طرف سے کی سیدھ میں بیٹنے والا آدمی تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے صرف احکامات پر عمل کرتا تھا۔ ”مسا بڑ بڑنس“ میں کرتا تھا۔ اپنے طوطے پر کسی پکڑ بازی میں نہیں پڑا تھا۔ بہت ہی ”دانت دار“ و سناٹا معلوم ہوتا تھا۔“

”ظاہر ہے میرا مقصد بھی ان سے کوئی سودے بازی نہیں ہو گا۔ ہرگز نہیں تھا۔ میں تو اتنی دیر سے محض اس لئے آئیں ہوں کہ

کر ڈرا آگے جا کر پیٹک آتے ہیں تو عام طور پر لاش دریافت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی غلطی کہ آخر تم ایک بڑے آدمی ہو۔ تمہارے لئے توڑا بہت اہتمام تو ہونا چاہئے تھا۔" طوطے نے وضاحت کی۔

"درست کہہ رہے ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازہ کھل کر اترنے لگا۔

طوطا کن لے میرے پیچھے تھا۔ اب وہ لوگ بیان زدہ نہیں رہے تھے جس کا قاعدہ یہ ہوا کہ لاشوری طور پر انہوں نے مجھے آسمان شکار کچھ لیا تھا حالانکہ وہ میرے بارے میں توڑے بہت خبردار بھی تھے۔ اب ان کی توڑی بہت لاشوری بے پروائی اس بات سے ظاہر تھی کہ توڑا ڈرائیو تک سیٹ سے اتر چکا تھا لیکن اس نے میری طرف کے دروازے پر آنے اور مجھے گن سے گور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ صرف طوطے کے ہاتھ میں گن تھی اور وہ میرے پیچھے پیچھے اس دروازے سے اترنے کے لئے جھک کر آگے ٹھک رہا تھا جس سے میں اتر رہا تھا۔

میں اتنی دور تک اتنی سعادت مندی سے اس لئے چلا آیا تھا کہ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کسی کے سامنے پیش کرنے کے لئے جا رہے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس طرح بات کچھ سمجھ میں آئے گی۔ اس میں سے گاؤں کی بڑا ہاتھ آئے گا لیکن وہ تو میرا بیانی صاف کرنے پر قائل تھے اور مجھے اس کی وجہ تک معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ گاؤں سے اترتے وقت میں نے جوا کھلا۔ میں نے مڑ کر تو نہیں دیکھا کیونکہ اس سے طوطا چوکتا ہو سکتا تھا۔ اندازاً ہی میں نے گاؤں سے اترنے کے بعد لیکن اس وقت زور سے دروازہ بند کر دیا جب میرے خیال میں طوطا سر ہٹا کر باہر آگے لگا تھا۔

میں نے دھب سے دروازہ زور سے اس کے سر سے ٹکرائے اور اس کے بے ساختہ چچ اٹھنے کی آواز ایک وقت سنی۔ اس وقت تک میں دوڑ رہا تھا۔ ریت پر دوڑنا بھی آسمان کام نہیں تھا۔ ہر قدم پر زمین گویا پاؤں پکڑ لیتی تھی۔ ریت دہاں نرم تھی اور پاؤں اس میں دھنسے جا رہے تھے۔ توڑے ہی قاصلے پر مجھے نابریل کے چند درختوں اور جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا ملنے اندھیرے میں نظر آیا تھا۔

میں اُنکی کی طرف دوڑا تھا۔ وہاں پہنچے تک میری زندگی یا موت کا فیصلہ بھی ہو سکتا تھا تو چونکہ گاؤں سے باہر تھا وہ فوری طور پر گن نکال کر تازہ کر سکتا تھا۔ لیکن اندھیرے میں وہ میرا بھلا تو دیکھ ہی سکتا تھا لیکن شاید وہ طوطے کی گھر میں رہتا تھا کیونکہ فوری طور پر کوئی کوئی میرے مقابلے میں نہیں آئی تاہم میں ریت میں پاؤں دھسنے کے باوجود دگ دیک ہو کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ کسی بھی لمحے کو لیاں شروع تھیں۔

میرے جھنڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی گولیوں کی روتھ اڑاوت شروع ہو گئی۔ گولیاں سنسنائی ہوئی میرے اچھے قریب سے گزریں کہ میں

فخاکہ ان کے اعصاب پر بیان اور تباہی کی وجہ سے پڑنے والا آدمی سے کم ہو جائے۔ بیان اور تباہی کی کیفیت میں واقعی لاشوں کی انگلیاں بہت جلدی ٹرنگر داتی ہیں۔ ان کے اعصاب بالکل ان کی حالت میں ہوں تو وہ ٹرنگر داتے وقت ایک آدمی کے لئے لپکتے جاتے ہیں۔ ایک آدمی کیلئے کے لئے ان کا ذہن اپنے لئے بچنے کے بارے میں سوچ لیتا ہے۔ میرے لئے وہ ایک آدمی کے لئے اہم ہوا تھا۔

لڑی نے پہلے سے زیادہ روشنی سے توند کو بھاڑا۔ میں نے تم سے کامے خاموشی سے ڈرائیو کرو۔ اس کے چکر میں مت آؤ۔ تم دیکھ کر کہے ہو یہ کوئی عام سیٹھ نہیں ہے۔ سیٹھ تو عام بھی ہو تو تلے پن گراس سے ہاتھ تلایا کرو۔ کوئی ہیڈ نہیں کہ مصالحوں سے ہوئے یہ وہ تمہاری کھال کھینچنے کے اور اس پر چار پیسے تلے اسے تم نہیں نہیں چکاس لاکھ کے خواب مت دیکھو۔ صرف ایک ہر غم کو۔

تو خاموش ہو گیا۔ اس نے یقیناً تصویریں توئوں کی لڑیوں کو ادا کر کے دیا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم ل بہت ہی بے وقوف ہو۔ میں معقول اور طلوس سے جو بھی کے جا رہا ہوں تم سے روکے جا رہے ہو۔"

"ابا ہم لوگ ایسے ہی ہیں۔" طوطا بے پروائی سے بولا "معتدل اور طلوس نہ تو نہیں جھو کر گزرا ہے اور نہ ہی ہمیں اس اندر ہے۔ بعض اوقات تو کوئی زیادہ ہی معقول اور زیادہ ہی میں نے کی کوشش کرے تو ہم اسے زیادہ ہی جلدی ٹھکانے دیتے ہیں۔"

اس دوران گاؤں کھنڈن پہنچ چکی تھی اور کیسینو کی طرف مڑ رہا تھا۔ میں نے آگے چلی جا رہی تھی۔ کیسینو جیسے تقریبی مقام پر لاشیں وقت ساٹا تھا۔ اس سے بہت آگے جا کر جہاں گاؤں کے پتے سے اترتی وہاں تو ہو کا عالم طاری تھا۔ گاؤں سمندر کے چین بہا رہی۔

لڑی یا طوطے نے مجھے گن کی نال سے شو کاوا "پلو آؤ۔" "گن کی کش اترنے سے انتظار کروں؟"

"گن میں سے ناگوار فیصلہ گاؤں کے اندر ہی انجام دینا چاہئے۔" طوطے نے جواب دیا "یہ مت سمجھا کہ ہمیں گاؤں کی گندی بات کی گھر ہوگی کیونکہ یہ گاؤں ہماری نہیں ہے۔" "تم نے محض اس سے کام لے لئے اتنی دور آئے کی راحت پہنچنے کے بعد جتنا ڈرا حیرت سے کہا "تم راستے میں کسی دیر ان باتوں کی میرا قصہ پاک کر سکتے تھے۔"

میں نے اسے اس پتہ لوگ ہیں۔ گھروں میں سوئے ہوئے ہیں۔ یہ غراب نہیں کرتے کسی کو مضرب نہیں کرتے۔ لاشوں کی گندی نہیں پہچانتے کیونکہ وہاں پہلے ہی کافی گندی ہوتی ہے۔ میں گولی مارنے کے بعد لاش کے ساتھ کوئی ہماری چیز باندھ

تھے بچنے کی کوشش کی تھی جس کی اسے حسرت ہی رہ گئی۔ اس کا گن والا بازو موڑ کر اس کی پشت پر لگا تھا اور اسے ڈھال بنا چکا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے جھوٹ کرکس کر چکا تھا۔ دفعتاً جھاڑیوں میں شعلہ لگا اور میری گرفت میں توڑ کر سالکا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈھیل پڑ گیا۔ اسی دوران ایک گولی گردن کے پاس سے گزر گئی۔ میں نے توڑ کو چھوڑ دیا اور اس ساتھ ہی میں خود بھی زمین پر گر گیا۔ میں زمین پر اُدھر اُدھر تھا اس کی کن تلاش کرنے لگا۔

گن تو مجھے مل گئی لیکن اس وقت تک طوفان ابھار تھا اور خاصی دور نکل گیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے اپنا ہسپاں اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اس سے یہ توقع نہیں تھی کہ اس نے مجھے اس کا تعاقب شروع کرنے میں کچھ دیر ہوگی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ہاتھوں اس کا اپنا ہی سامعہ گیا تھا اور اس کا ہسپتال میرے ہاتھ اُٹھ گیا ہوگا۔

میں نے اس پر اندھا دھند دو تین فائر کئے لیکن ابھی اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ میں اس کے تعاقب میں دوڑا۔ مجھے کار کا اچھی اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک کے ساتھ کار کا ہیولا حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے اسے لے کر ریت اُڑائی ہوئی آندھی طوفان کی طرح سڑک کی با روایت ہو گئی۔ میں نے اضطرابی انداز میں گولیاں برسائیں۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کار تباہی میں غائب ہو گئی اور بے وقوفوں کی طرح وہیں کھڑا گیا۔

وہ بات جو میں اس جھگڑے اور زندگی موت کی محفل میں چکا تھا اچانک ہی مجھے یاد آئی اور ایک لمحے کے لئے ہنسی سے جان نکل گئی۔ وہ بیکٹ جو فرمین نے برسے مان سے مجھے جس کے بارے میں غالباً اس نے سوچا تھا کہ میں اس کی خا سے بہت طور پر کر سکوں گا وہ اس گاڑی میں ہی نہ لایا تھا۔ نے کہا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی منات تھا اس کی انٹرنل حروف تھا۔ اس کے خیال میں جب تک بیکٹ محفوظ رہتا زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہاڑ میں چھپا ہوا بیکٹ کب تک کسی کی نظر سے محفوظ رہے گا۔ میں چند لمحے وہیں گم صدم کھڑا رہا۔ آخر بیکٹ کو روکے واپس آیا جو جھانکوں خانے چٹ پڑا تھا۔ میں نے جب کر دے قریب سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کی توڑ، جس کی وجہ سے اس کی دل میں اس کا نام توڑ رکھا تھا اب کافی نیچے چل گیا اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ وہ چٹ پڑا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس توڑ میں ایک گولی بیست ہو چکی تھی جس کے دم ابھی تک بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

دوسری گولی اس کے سینے میں اتری تھی۔ شاید چند لمحوں ہی اتری تھی اور اسی نے اس کا کام تمام کیا تھا۔ اگر وہ چٹ

نے زگ زگ ہوا بھی چھوڑ دیا اور اسے آپ کو ریت پر گرانا۔ اس سے انہیں یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی کہ مجھے کوئی لگ چکی ہے۔ جھنڈے طرف چند قدم کے فاصلے پر پہنچا تھا۔ میں لڑھکا ہوا درختوں تک جا پہنچا اور چاروں ہاتھوں بیروں کے بل چلی کر تیزی سے ان کی اوٹ میں ہو گیا۔ کچھ گولیاں درختوں کے چنوں کو بھی اُڑائی ہوئی لے گئیں۔ وہ جس طرح اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے اس سے لگتا تھا کہ انہوں نے انسانی چہرے سے اپنے ہتھیاروں کو... دوبارہ لڑا بھی کر لیا تھا۔

اب وہ فائر کرنے میں محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے غوطے کے پینے چلانے کی آوازیں سنیں۔ وہ توڑ پر برس رہا تھا اور اسے احکامات دے رہا تھا۔ میں ایک لمحے ساکت رہا پھر درختوں کے عقب سے سرزرا سا نکال کر دیکھا۔ نوزی اور توڑ دونوں جھنڈ کی طرف چلے آ رہے تھے۔ تلخ اندھے میں وہ محض دھندلی پرتھائیاں دکھائی دے رہے تھے۔ تیرہواں میں ان کے کپڑے پڑ پڑا رہے تھے۔ میں کچھ اور پیچھے ہٹ گیا۔

وہ دونوں جھنڈ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ نوزی بولا "تم اس طرف سے گھوم کر جاؤ۔ میں اس طرف سے جاتا ہوں۔ دیکھتے ہی کوئی مارے گا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔" "اگر وہ بچ کر نکل گیا تو اس ہماری بچاؤی کرادے گا نوزی!" توڑ نے بظاہر صرف ہانپتے ہوئے یہ بات کہی تھی لیکن مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ اندری اندر دو رہا تھا۔

"ادھار کر نہیں جاسکتا۔" نوزی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ توڑ کے ساتھ ساتھ وہ گویا خود کو بھی قہقہے دلا رہا تھا۔ میں پتوں اور شاخوں کی کھڑکڑاہٹ سن رہا تھا۔ وہ جھاڑیاں بنا بنا کر دیکھ رہے تھے گویا کسی مغرور خرگوش کو تلاش کر رہے ہوں۔ میں نے درختوں کے درمیان سے نہایت محتاط انداز میں بھاگا اور اندازہ لگایا کہ توڑ جلد میرے قریب پہنچے والا تھا۔ میں تھک کر ایک اور درخت کی اوٹ میں ہو گیا جہاں میں بہت طور پر اس کا استقبال کر سکتا تھا۔ اب میں اپنی جگہ ساکت تھا اور کسی درخت سے کی طرح اس کا منتظر تھا۔ میں نے درخت کی اوٹ سے نکلتے ہی کوشش میں کی کہ اب وہ بھی میرا سر دیکھ سکتا تھا۔ میں سانسوں روکے اس کا منتظر تھا لیکن وہ میرے انداز سے بہت پہلے اچانک ہی میرے سامنے آیا۔ گو کہ اس کی نظر مجھ پر سہا پڑی تھی لیکن وہ میری طرف گھومنے ہی لگا تھا۔ مجھے فوراً اس پر چلاٹک لگا پڑی۔ میں نے کوشش کی کہ تیزی سے اس کی گردن بازو کے قہقہے میں لے کر اسے پیچنے سے باز رکھوں لیکن مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ توڑ کے حلق سے چیخ نکل ہی گئی۔

میں نے اس کی گردن گھٹنے میں تو بھجائی اور اس کا گن والا ہاتھ بھی قابو میں کر لیا لیکن اس کا سامعہ بہت حال خراب ہو چکا تھا۔ توڑ خود بھی غماصا جاندار تھا۔ اس نے مجھے اپنی کمر سے اُچھال کر



اشان کیا "اب میں ان لوگوں کو تمہاری حیثیت کے بارے میں کچھ بتاؤں گا تو یہ بعد میں کسی کوئے میں منہ چھپا کر کھی کھی کرتے رہیں گے سمجھیں گے سیدھا مذاق کر رہا تھا۔"

پھر اس نے آنکھیں سنبھڑ کر کہا ہر کھڑے فیکسی ڈرائیور کو دکھا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تمہاری جیب میں پشیا کرایہ دینے کے لئے بھی پیسے نہیں ہوں گے؟"

"بالکل صحیح اندازہ لگایا تم نے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دوست شنای ای کو کہتے ہیں۔"

اس نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر فیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا "نل تو چاہ رہا ہے جس میں اسی فیکسی میں ڈال کر واپس بھجوا دوں اور اس ڈرائیور سے درخواست کروں کہ راستے میں جس میں کسی گندے ٹاپے میں پیسہ بندھے۔"

"یہ خاصا مشکل کام ہے۔ سو روپے میں تو نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے گھورتا ہوا اندر جانے کے لئے مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر غصے لہجے میں بولا "یہ تمہارا آنے کا وقت ہے؟"

"نہیں یہ تو میرا جانے کا وقت تھا۔ عالم بالا کی طرف جانے کا وقت۔۔۔ چائیں کیسے میری آنٹی ہوئی ٹل گئی۔" میں نے کپڑے بھاڑتے ہوئے کہا۔ "جی بات یہ تھی کہ آنٹی تک مجھے اپنے کپڑے بھاڑنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔"

"تمہارے خیال میں تمہاری آنٹی ہوئی کب تک ٹٹتی رہے گی؟" سیٹھ رمضان نے ہوار لہجے میں پوچھا گویا کسی کمپنی کے شیئرز کے بارے میں معلومات کر رہا ہو۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے ابھی تو مجھے یونی دھوکا ہو رہا ہے۔ جب سچ اوجھل سے ملادیا ہو گا اس وقت موت کا فرش بالکل نہیں ٹٹے گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس وقت تک ہم اس کے ڈانٹنگ دوم میں پہنچ چکے تھے۔ شاندار ڈانٹنگ ٹیبل پر برتن سجے ہوئے تھے۔ سیٹھ رمضان وائل کلاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا خیال ہے۔ رات کا کھانا اور ناشتا اکتھای منگوایا جائے؟"

"ہمیں امید پائی جاتی ہے کہ ناشتا میں ایک حینہ کے ساتھ کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"امید ہے زندگی کا آخری کھانا بھی تم کسی حینہ کے ساتھ ہی کھاؤ گے۔" اس نے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے مجھے گھورا۔

"تمہارے منہ میں کھجی شکر۔" میں نے فوراً کہا۔

"اس حینہ نے ہی کھانے میں زہر ملایا ہو گا۔" اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

"گوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "حینہ صبح معذن میں حینہ ہو تو اس کے ہاتھوں سے زہر کھانے سے کس

ہو گیا طرے کی گمن بڑے کیلیبر کی ہوئی تو یہ گولیاں میرے جسم میں جکڑت ہوئیں۔ میں نے توند کی نبض دیکھی۔ نبض ساکت ہو چکی تھی۔

میں چہرے دہیں کھڑا سوچا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، دور دور تک وہاں کسی ذی مدد کا نام و نشان نہیں تھا اور سمندر کے شور کے سوا کوئی آواز نہ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آخر میں نے.... اس کی گن دھال سے صاف کر کے اسے توند کے مودہ ہاتھ میں پھنسا دیا۔ وہ اس کی امانت تھی۔ میں نے اسے لوٹادی اور یہ زبان خوشی اسے خدا حافظ کہہ کر سڑک کی طرف چل دیا۔

میں تقریباً آدھا گھنٹا پیدل چل کر کلفٹن کے پلے لینڈ وغیرہ تک پہنچا۔ ان دنوں تفریح کا ہوں وغیرہ پر بھی پرانے معمولات کی نسبت بہت جلد سناٹا چھا جاتا تھا۔ شہر پر بد قسمتی سایہ لگن تھی۔ پلے لینڈ کے سامنے بھی دریا فی تھی۔ صرف ایک کھنار اسی فیکسی ایک طرف کڑی تھی اور اس کا ڈرائیور نہ جانے کس امید کے سارے اگلی دونوں سیٹوں پر لیٹا اپنے سینے پر چھوٹا سا ایک ٹیپ ریکارڈر رکھے عطا اللہ بیٹنی نیلی کے گیتوں میں کھویا ہوا تھا۔ شاید ان گیتوں میں کھویا ہوئے کی وجہ سے ہی اسے پتہ نہیں چلا تھا کہ اس کے چاروں طرف کب سے سناٹا چھا چکا تھا۔

میری ٹرانس پر اس نے ازراہ کرم سوز ساز کی دنیا سے باہر آنے اور مجھے دھنسنے لے ملنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور میں اس کھنارے میں بیٹھ کر سیٹھ رمضان کے گھر جا چکا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ عالم یہ تھا کہ میری جیب میں فیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں تھے اور سیٹھ رمضان کے گھر پر تعینات تھے گاڑے مجھے اندر جانے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اجازت دینا تو دور کی بات تھی وہ میری آمد کی اطلاع اندر پہنچانے کے رد اور ان میں تھے میری فیکسی ٹکٹے دیکھ کر ہی انہوں نے اپنی کاشمیر ٹیگٹ زیادہ مستعدی سے تھام لی تھیں۔

آخر کار مجھے ان کو قہور سی ہی بھاڑ پانا پڑی۔ تب انہوں نے گیت ہاؤس کے انٹرکام سے چپکے چپکے غالباً سیٹھ رمضان کو یہی اطلاع دی کہ ایک مشکوک سی فیکسی میں ایک مشکوک سا آدمی آیا ہے جو اپنے آپ کو افضل چودری بتا رہا ہے۔ جواباً سیٹھ رمضان فوراً گیت پر چلا آیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ اس وقت گاؤں میں تھا ورنہ گھر پر انکڑوہ صحتی زبان میں فخر ادا تھا۔

وہ دوری سے چلے بیٹھے لہجے میں بولا "مجھے معلوم تھا کہ جو آدمی مشکوک سے چلنے میں مشکوک ہی فیکسی میں آئے گا جس کے ہال اور کپڑے مٹی میں بکھرے ہوئے ہوں گے وہ افضل چودری ہی ہو گا۔"

قریباً آگروہ بولا "یارا تم بھی میرے گھر صاف بھرے اور معززانہ چلنے میں نہیں آجکتے تاکہ میں اپنے اسٹاف کو یقین دلا سکوں کہ تم واقعی ایک بڑے سیٹھ ہو۔" اس نے مسلح کارڈ کی طرف

کبھت کو انکار ہو سکتا ہے۔

”واہ! وہ طویل سانس لے کر بولا ”تم نے تو غصہ سمجھ کر رکھا۔ تم نے تو مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں بھی کل ہی اگلے ایک بجے کے لئے اس کے شو کی بگ کرالوں۔ تم تو اس غارتوں کے لئے میرے اچھے بگ ایکٹ ثابت ہو سکتے ہو۔“

”زیادہ بکواس کی تو ایک ہی جھگڑے میں گردن ٹوٹ جائے گی۔ میں نے کھیا کر کیا اور پتا تھا اس کی گردن کی طرف بدھایا۔

”بس بس“ وہ پیچھے ہٹے ہوئے گردن بچا کر بولا ”زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں کا دھاری آدی ہوں۔ سب سے پہلے ذہن ہرجرج کے کا دھاری پہنکو کی طرف جاتا ہے۔ ویسے میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ ایک آدھ دن میں اس کا شو دیکھنے کی بجائی پرے گا۔“

”کلک نہیں مل رہا ہے۔ کئی کئی دن کی ایڈوانس بگ مل رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور دیر تک ہنساتی رہا پھر بولا ”کالی بڑے ہو گئے مگر ابھی تک پیچھے نہیں گیا۔ اتنے عرصے کی یاری ہے اپنی۔ میری رنگ رنگ سے تم واقف ہو۔ میرے بارے میں ہر بات جانتے ہو۔ پھر بھی شاید کبھی کبھی بھول جاتے ہو کہ تمہارے اس بزرگ دوست کا شرم میں تمہارا دست اُتردو سوخ ہے۔ اگر تمہیں اس قسم کی لٹو لٹو دوستی میں وہی آتی پائی کا ڈاؤس ملتی ہیں تو ہمارے دوسرے ذرا دلچسپ ہیں۔ کو تو اس کا پورا شا اپنے اس غریب خانے پر سٹکوا لیں۔ دو چار دن اس ٹٹ پونچھا ہو کل میں شوی نہ ہوئے دیں۔ اب تو قاسم بجلی بھی ٹھکانے لگ چکا ہے۔ اس سے ٹکر لینے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سینئر رمضان ایک بار سوخ مگر عجیب آدی تھا۔ کبھی وہ بے پناہ لڑ اور کبھی بے حد نرم و گھٹ نظر آتا تھا۔ اپنے وسائل اور افرور سوخ کو استعمال کرتا بھی بھول جاتا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ”اچھا خبر تو تمہارا دل چاہے کرتے رہتا۔ سن! ایس کے علاوہ میں خواہ دو چار حسیناؤں کو کچھ کر کے بھرا دیکھتے رہتا۔“

وہ میری بات کانٹے ہوئے بولا ”اب میں اتنا بھی لالچی نہیں ہوں۔ میں اپنی بی بی چھی جوانی اس قسم کے بے ہودہ مشاغل میں بھلا کر نہیں جاتا۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ فی الحال تم میرے لئے کچھ رقم کا بندوبست کرو اور اپنی کوئی چھوٹی موٹی گاڑی مجھے دے دو۔ میری گاڑی اسی بے ہودہ ہو کل میں مدد کی ہے۔“

”تمہیں ان چیزوں کی اس وقت کیا ضرورت آن پڑی؟ کیا تم کہیں جا رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم نے دیکھا نہیں کہ میں اپنا ٹھنڈ کا کتنا خیال رکھنے والا آدی ہوں۔ جب میں تم جیسے بے ہودہ اور اوجیز عمر مر رہا ہوں۔ وعدہ نبھانے کے لئے گولیوں کی بوچھاڑ میں لاش پھلا سکتا۔“

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے گھورتے رہنے کے بعد یکدم بچت پڑنے والے انداز میں بولا ”ابے گدھے! میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آخر تم نے رات کے کھانے پر پیچھے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ میرا بلٹرو رنگ تمہارے اختصار میں سوکھ کر چھو ہارا بن گئے ہیں۔ میں خود بھی وہاں شاعر مشرقی بیوی کی طرح بھوکا پیٹھا انتظار کرتا رہا۔ تمہارے ہوٹل فون کر کے تھک گیا۔“ میں نے اسے موبائل فون کا نمبر نہیں دیا تھا۔

”یہ بات تم سیدھے سادے انداز میں بھی پوچھ سکتے تھے۔ تم نے تو مجھے دیکھتے ہی لڑنا شروع کر دیا۔ مجھے تو وہاں شاعر مشرقی بیوی کے بجائے زبان دراز اور لڑاکا مغربی بیوی لگ رہے ہو اور وہ بھی عمر سیدہ قسم کی۔“

”اس سے پہلے کہ میں زبان دراز لڑاکا اور عمر سیدہ مغربی بیوی کی طرح کوئی پلٹ وغیرہ تمہارا کھسار کھوپڑی پر دے ماروں۔ تم نہایت اختصار سے مجھے بتا دو کہ تم پر کون سی نئی افاد پڑی۔ یا یہ کسی پرانی افادہ کی تازہ قسط تھی؟“

”پہلے کھانا کھلاؤ۔ پھر باتیں ہوں گی۔ کم از کم اس بات کی داد دو کہ میں ہر حال میں تمہارے ہاں پہنچ گیا ہوں۔ ایک لاش بھلا تک کر تمہارے ہاں کھانا کھانے پہنچا ہوں۔ اپنے اپنا ٹھنڈ کا اتنا خیال رکھنے والا آدی تم نے آج تک نہیں دیکھا ہو گا۔“

وہ ایک بار پھر مجھے گھورتے لگا۔ میں نے پیار سے کہا ”بس بس زیادہ بازعب نظر آنے کی کوشش مت کرو۔ آنکھوں میں دھوا ہو جائے گا۔“

اس نے نظر اڑتے لگ کر کھانا گانے کا حکم دیا۔ پُر کٹھ کھانے اور کالی وغیرہ کے بعد سینئر رمضان مجھے اپنی اسٹڈی میں لے گیا اور ذرا کچھل کر بیٹھے ہوئے بولا ”اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ کوئے اور نقل اسٹاپ وغیرہ کے بغیر مجھے اپنی نئی داستان غم سنا ڈالو۔“

آخر میں نے کچھ اختصار سے اسے اپنی داستان غم سنائی ڈالی۔ وہ غصہ کی سانس لے کر اپنی آرام دہ کرسی کے پٹے سے ٹپک لگاتے ہوئے بولا ”معلوم نہیں ابھی کچھل جیتوں کا سلسلہ ختم ہوا ہے یا نہیں کہ تم نے یہ نیا سلسلہ شروع کر لیا۔“ پھر وہ آنکھ مار کر میری طرف جھٹکتے ہوئے ذرا بچی کواڑ میں بولا ”ویسے حسینہ اس فائنل بھی ہے یا نہیں کہ اس کے لئے اتنی مصیبت قبول کی جائے۔“

”ابھی اس کی ”قابلیت“ کا بیج اندازہ تو نہیں ہوا۔ ہر حال دیکھنے میں ٹھیک خفاک ہے۔ مگر اچھی خاص ہے۔ تیس پینتیس کے درمیان ہوئی اور اس کی عمر کا کافی حصہ آوارگیوں میں گزارا ہے مگر دیکھنے سے یہی لگتا ہے کہ اپنا دست خیال رکھا ہے اس نے پاکستانی ہے مگر اعزیز لگتی ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بستر ہے کہ اس میں انگریزوں والا پیکا پین نہیں ہے۔“

بھر کچھ انگوٹوں سے بالا پڑ گیا اور میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت نہ کی تو جھنگ تک بھی گزارا ہوا ہوا مشکل ہے۔" میں نے رقم جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"سڑی تو اپنی نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔  
 "نہیں نہیں اس کا مسئلہ روپے پیسے کا نہیں ہے میرا مطلب ہے وہ کم از کم مجھے موٹی آسانی مجھ کو مال توڑنے کے لئے مجھ سے نہیں لے لے۔ اسے کسی اور قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔"  
 "جس کے لئے اس نے تمہیں رات کے تین بجے بلایا ہے۔" سینہ رمضان نے تعجبی انداز میں سر ہلایا۔

"اے نہیں یار!" میں نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے خالص عوامی انداز میں کہا "اسے کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت ہے اور میں نے اسے بلا تحفظ نہ دیا ہے کہ اس کا اسٹارٹ ہوا پکٹ کھوا دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ میرے پاس زیادہ محفوظ رہے گا۔ مظلوم نہیں اس میں کیا تھا؟ اس نے اسے اپنی زندگی کی ضمانت قرار دیا تھا۔"

"مگر یہ کشتن روزِ اول" سینہ رمضان نے حسانت سے کہا "تم نے اچھا کیا جو پہلے ہی دن اسے سبق سکھادیا۔ آئندہ وہ تمہیں اس قسم کے فضول کاموں کی زحمت نہیں دے گی اور زندگی کے رو سینک پلوں کی طرف زیادہ توجہ دے گی۔ میرا تو تمہارے لئے شہری مشورہ ہے کہ ہر لڑکی بڑی بلی ملاقات میں ہی واضح کر دیا کہ کہ عشق لانے اور عیش و نشاط سے کچھ وقت گزارنے کے علاوہ باقی ہر کام کے لئے تم سخت نااہل آدمی ہو۔ ورنہ ان لڑکیوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ آدمی کو کس کس کام پر لگا دیں۔ میں نے ایک اچھے بھلے معزز آدمی کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو دودھ اور دو سرا سوا سلف لاکر دیا کرتا تھا۔ اس کے بھانجے بیٹیوں کے نمکین ہلا کرتا تھا اور انھوں کی بات یہ ہے کہ وہ اس کی محبوبہ بھی نہیں تھی۔ صرف "مستحقہ عجوہ" تھی۔"

"اچھا مزید بکواس پھر بھی کہتے رہتا۔ میں نے تمہیں ایک اور کام بھی بتایا تھا۔" میں نے اچھے ہوئے کہا۔

وہ میز کی درازوں میں ہاتھ مار کر ایک کی رنگ نکال کر اس کا محاسبہ کرنے کے بعد میرے سامنے پھینکتے ہوئے بولا "میں تمہیں ایک برائی نوٹ یاد دے رہا ہوں۔ فی الحال کوئی قیمتی کار نہیں دوں گا۔ تمہارا کوئی بھروسہ نہیں ہے کہیں پیچیدہ چابک کر آجائو گے۔"

"میرے لئے اس وقت یہ بھی رو کر اس سے کم نہیں۔ اس وقت تو میرا کام گدھا گاڑی سے بھی چل جانا شرطیکہ وہ کچھ تیز چلتی۔ جن دن چکے ہیں اب میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ ڈرائیو کے ایک کونے میں ایک برائی نوٹ یاد دلائی تھی۔ یہ قیمت تھا کہ اس کی بیٹی ڈاؤن نہیں تھی اور گاڑی بھی کچھ ایسی تھی گڑبڑ نہیں تھی۔ میں سینہ رمضان کو شب بخیر کہہ کر آدھی طوفان کی طرح کلفٹن کی

پیدل۔ بھی چلتی میں نے۔ گمراہ نہ تاج مسکا ہوں تو پھر ایک خوب صورت خاتون سے کیا ہوا وعدہ نبھانے سے کیسے باز رہ سکتا ہوں؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر خدا خواست میری فاکٹ نوٹ جی تپ جی میں ضرور آؤں گا خواہ مجھے کچھ مل جائے یا نہ ملے۔  
 "وہ خدا یا!" رمضان سینہ نے ایک لمحے کے لئے سر تھام لیا "تمہارے جذبات کا یہ عالم مجھ سے دیکھ! نہیں چارہ۔ مجھے تمہاری غلامی ہو جی ہے افضل بیارے! تمہارا کیا ہے؟"  
 "میرا مقبرہ بننے کا اور تم اس کے حرمان ہو گے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں عجیب کی سے بات کر رہا ہوں۔ تم کچھ بولے ہو اسے نہیں ہو گے ہو؟"

"دیکھیں بھیر الزام لگا رہے ہو یار!" میں نے مصنوعی غلغلے کا "میں تو یہ سنی بھی کبھی کبھی لگا دیکھ کر ہاتھ دھو لیتا ہوں۔ ویسے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی اس قسم کی چیزیں ہوں۔" کو پسند کرنا ہوں۔"

پھر میں نے ذرا عجیب کی سے کہا "بھی بھئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کسی عورت کو کچھ بتا دیتے ہیں لیکن وہ دل کی بہت اچھی ہوتی ہے۔ جو عورتیں دل کی بہت اچھی ہوتی ہیں ان کے ساتھ میں بھی بہت اچھی طرح پیش آنے کی کوشش کرتا ہوں خواہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں اور اس وقت وہ کسی بھی ذکر پر جاری ہوں۔ ایسی عورتوں کے ساتھ بھی تھوڑی دیر دوستوں کی طرح رہنے میں کیا حرج ہے؟"

"مگر تو کچھ نہیں۔" وہ لہجہ سانس لے کر بولی "میں کبھی کبھار کوئی ایسی عورت زیادہ ہی ایسی۔ یا پھر زیادہ ہی دیکھ کر آتی ہے اور آدمی کی گردن کا منگنا ٹوٹ جاتا ہے اور تو کچھ نہیں ہوتا۔" "نکا" سمجھتے ہوئے؟

"بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ کئی بچے توڑے بھی ہیں اور منکوں کی اس فہرست میں تمہارا منکا بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اب بکواس بند کر دو اور اٹھ کر اپنی کسی ایسی تجوری کا منہ کھولو جس میں تمہاری ہلک مٹی چھپاتے ہو۔ اس میں سے ایک آدھ گڈی نکال کر میرے حوالے کر۔ صبح کے تین بجے انسان بالکل خالی جیب کسی حینہ سے ملے جائے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں دل انجانے اندیشوں سے نہ دھڑکتا رہے۔ اب اٹھ جاؤ۔"

"دل دھڑکتا ہی رہے تو اچھا ہے۔ اگر دل نہ دھڑکتا ہی بند کر دیا تو پھر کسی حینہ سے ملے جائے گا کیا فائدہ؟" سینہ رمضان اٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے اسٹری میں ہی موجود ایک چھوٹی سی تجوری کا خفیہ وعدہ کھولا اور کچھ رقم نکال کر میرے سامنے لا دی۔ "میں تمہیں بزار ہیں۔ کچھ ناکارہ تو ہو جائے گا؟"  
 "گزارا ہوئے پر کیا تو مینے بھرا بھی ہو سکتا ہے اگر راستے میں

طرف روان ہو گیا۔

نشانوں کی مدد سے مجھے ماہرہ نادر کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بنگلوں اور لٹیوں کے زیادہ گنجان آباد علاقوں سے ایک تنہا گھر کی تعمیر شدہ عمارت تھی۔ شاید اس کے تمام لٹیت انہی آباد گھر میں ہوتے تھے وہاں چونکہ اراک موجودگی کے آثار تو تھے لیکن وہ اس وقت نہ جانے کہاں تھا۔

میں متعلق تھا لیکن فرحین کی دی ہوئی چالی جو خوش قسمتی سے بچ گئی تھی اور ابھی تک جب کے ایک کونے میں پڑی تھی گیت کا تھکا کھوٹے میں کام آئی۔ وہ ایک خوب صورت اور سلیقے سے تعمیر شدہ عمارت تھی۔ نمبروں اور روشنیوں وغیرہ کے ذریعے پر جلدی اور دیگر جگہوں کی طرف رہنمائی کا انتظام تھا۔ تحریر ذی نیسی مندرجہ ذیل تھا۔

میں نے لٹیت پر پہنچ کر تیل دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس کا مطلب تھا فرحین ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ انتظار کرتا میرے لئے ایک مشکل کام تھا لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر فرحین کی دی ہوئی چالی استعمال کی اور اندر جا پہنچا۔

وال ٹو وال کا بیٹ کے ساتھ وہ بہترین طریقے سے آراستہ ایک بڑا پارٹمنٹ تھا۔ میرا ارادہ ڈرا رنگ دم میں بیٹھ کر فرحین کا انتظار کرنے کا تھا لیکن میں نے سوچا اس سے پہلے پورے پارٹمنٹ کو ایک نظر دیکھ کر لینا چاہئے۔ میں ڈرا رنگ دم میں جھانکا ہوا لاؤنچ سے گزر کر پہلے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا۔ پارٹمنٹ پوری طرح فرشتہ تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر جھانکا تو وہاں بیڈ پر سرخ کپڑے پہنے فرحین لیٹی نظر آئی۔ مجھے اس کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ فرحین تھی حالانکہ اس کا چہرہ کبھی میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے بیروں سے پہچانا۔ اس کے سفید مرمری پاؤں کپڑے سے نکلے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خوب صورت پاؤں فرحین ہی کے تھے۔ قریب ہی بیڈ ہیڈ بوش تھا۔ فرحین کا ایک ہاتھ بھی کپڑے سے لٹکا ہوا تھا۔

شاید وہ صبح باری آکر بیڈ پر گرتے ہی سو گئی تھی۔ کال تیل اتنی بدم اور حرم تھی کہ گمری بند سوجا ہوا انسان اس کی آواز پر مشکل سے ہی بیدار ہو سکتا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ مجھے اس کے انتظار میں احمقوں کی طرح تھا اس پارٹمنٹ میں بیٹھنا نہیں پڑا تھا۔

میں نے اپنی دانت میں شرارت کے طور پر چالی کی نوک آہستگی سے اس کے کپڑوں پر بھرائی۔ میں نے تین چار مرتبہ یہ عمل دہرایا اگر وہ گمری بند تھی تب بھی اسے تھوڑا بہت کھانا چاہئے تھا مگر اس کے وجود میں تو ذرا سی جنبش بھی نہیں ہوئی تھی۔ اچانک میرے جسم میں سوئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے آگے بڑھ

کر آہستگی سے اس کے چہرے سے کپڑے کھینچے۔ ایک خوب صورت چہرے کے نیچے ایک ہنستا ہوا بدم صورت زخم میرا منہ تھا۔ میں اسے ہنستا ہوا زخم ہی کہہ سکتا تھا۔ فرحین کا کلا ایک کان سے دوسرے کان تک کٹا ہوا تھا اور زخم کپڑے کے ہونے سے دامن کی طرح کھلا ہوا تھا۔

میں ایک ہاتھ سے اسی طرح کپڑے ہانپنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اس کے پاؤں کپڑوں کے نیچے سے نکلتے ہوئے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کے پاؤں کپڑوں کے نیچے سے نکلتے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی سفید نظر آ رہا تھا۔ اب درحقیقت اسے خوب صورت بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈراؤنے انداز میں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ہونٹ نیم دائرے اب نہ تو ان پر لب اسٹک تھی اور نہ ہی زخمی کا قطر۔ دراصل اب ان ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے دانت بھی بھانک معلوم ہو رہے تھے۔

زخمی اس کے وجود سے رخصت ہوئی تھی تو شاید ساری خوب صورتی بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ زخمی ہی درحقیقت خوب صورتی ہے اور خون زخمی کی علامت ہے۔ بشرطیکہ رگوں کے اندر ہی مقید رہے۔ ہنا خون تو موت کے سوا کچھ نہیں۔ اور اس کا خون اس بیٹے زخمی سے نکل نکل کر دھیرے دھیرے میں جذب ہو چکا تھا۔ خون کی ایک موٹی۔ ابھی بستر کی چادر پر موجود تھی۔ ساڑھ پانچ کی روشنی میں خون کی یہ موٹی سی سرخ پینٹ کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کے خوب صورت بال کچھ اس طرح اٹکے ہوئے تھے جیسے کسی نے انہیں بڑی طرح سٹکی میں جکڑا تھا اور اس کا ایک ہاتھ اکڑی ہوئی سی حالت میں سینے پر ٹکا ہوا تھا۔

اور اسی کی ایک عجیب سی لڑکھائی میری آنکھوں کے راستے دماغ میں اتر گئی۔ میں نے کپڑے سے دبا دھاس کے چہرے کو دھانپ دیا۔ شاید اس لئے کہ یہ منظر میرے لاشعور میں نہ بیٹھ جائے یا پھر شاید اس لئے کہ میں اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا حالانکہ اس کی آنکھیں زندگی سے خالی تھیں۔

میں اس کے قریب ہی ایک کاؤچ پر بیٹھ گیا اور دوبارہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا ذہن شل ہوا جا رہا تھا لیکن میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ بہت سے سوالات مجھے دماغ میں گھومتے تھے۔ کیا میں ہی اس کی موت کا ذمے دار تھا؟ کیا وہ صرف اس لئے ماری گئی تھی کہ میں اس کا کا ہوا پکٹ کھو چکا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ وہ پکٹ اس کی زندگی کی ضمانت تھا۔ جب تک پکٹ میرے پاس محفوظ تھا اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس کی موت کی وجہ شخص یہ نہیں ہو سکتی تھی کہ پکٹ میرے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ ابھی تک تو شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ پکٹ میرے پاس تھا۔ اگر یہ معلوم بھی ہوتا تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ پکٹ

کرتے یہ کوئی عین معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی لمبا پکر ہی نکل آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی چھوٹا پکر ہو لیکن کسی دوسرے بڑے پکر میں گنڈ ہو۔

”ٹھیک ہے آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے کو صحیح طرح پینڈل کیا جائے گا۔“ وہ کسی خاص جوش و خروش یا تشویش کے بغیر بولے ”اس معاملے کا اگر قاسم بجلی کے معاملات سے گہرا تعلق نکل آیا تو پھر مجھے خود بھی اس میں دلچسپی لینی پڑے گی کیونکہ قاسم بجلی کے بارے میں اب فیڈرل گورنمنٹ بڑی سنجیدگی سے چھان بین کر رہی ہے۔ میں علاقے کے ایس بی کو فون کر دیتا ہوں۔ اگر وہ خود جائے وقوعہ پر آیا تب مجھ اور اگر اس نے دونوں کے مطابق کسی کو بھیجا تب بھی آپ کو کوئی ذمت نہیں ہوگی۔ بس آپ تمام تفصیلات بالکل سچ سچ اسے بتا دیجئے گا۔“

”جتنی صاحب! میں تو ہر وقت سچ بولنے کے لئے تیار رہتا ہوں بشرطیکہ سچ کا کوئی قدر دان ملے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”آپ کو باو سی نہیں ہوگی۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولے ”مجھے اس جگہ کا فون نمبر اور ایڈریس بتا دیجئے جہاں سے آپ بول رہے ہیں۔“

میں نے ایڈریس اور فون نمبر انہیں بتا دیا۔ انہوں نے شب بخیر کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریسور رکھنے کے بعد کچھ دیر میں ساکت بیٹھا اس سرخ کمر کھڑا رہا جس کے نیچے ایک زندگی موت کی آغوش میں سوچتی تھی۔ میں فرمیں کو اپنی آنکھوں سے ٹھوہر دیکھ چکا تھا اس کے بارے میں جتنی صاحب سے بات کر چکا تھا لیکن اب بھی جیسے مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہنسنا سنا کر آٹا کباب سا پکڑ موت کے بد صورت بے رحم اور مہاک نچوں میں سلا جا چکا تھا۔

میں گویا اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے ایک بار پھر کمر کھڑا کرنا تھا کہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ بے نور آنکھیں میری آنکھ میں تانیرہ گویا مجھے الزام دے رہی تھیں اور میری ہی جانب ٹھکراں تھیں۔ میں نے آنکھوں سے آنکھوں سے انہیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح بند نہ ہوئیں۔ نیم دار ہیں۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سرد تھا۔ وہی چہرہ جس کی حرارتوں اور نزاکتوں کو آن ہی کی شب میں نے بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ آج کی شب جو ابھی جیتی نہیں تھی۔ جسے ابھی سورج کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

کمر کھڑے مجھے بہت دزدی اور اپنا ہاتھ بہت گزور محسوس ہونے لگا۔ میں نے کمر کھڑا اور ایک بار پھر تھکے تھکے انداز میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ فرمیں کی اور بستر کی حالت بتاتی تھی کہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی تھی۔ شاید زندگی کے آخری لمحوں میں بھی اسے یقین نہیں تھا کہ اسے قتل کیا جا رہا تھا۔

اس کے جسم پر پانٹ گاؤں تھا۔ یعنی گھرتے کے بعد وہ لباس

میرے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ میں نے وہ پکٹ کسی کے حوالے نہیں کیا تھا۔ کسی نے مجھ سے چھینا نہیں تھا۔ میں نے وہ کار کی سیٹ میں چھپا دیا تھا۔ کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا اور کسی نے مجھ سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

میرے سامنے ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کم از کم اس واقعے کی اطلاع تو پولیس کو دے ہی دینی چاہئے تھی۔ اگر میں عام اور بے وسیلہ شہری ہوتا تو زیادہ امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے ہی فرمیں کے قتل کے شبے میں دھکیلی لیکن میں اپنے ساتھ آیا نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ لاہور میں ہی نہیں کراچی میں بھی وہ ہمارے اچھے اور اعلیٰ پولیس آفیسر میرے شناسا تھے۔ پھر سینٹر رمضان کے بہت سے کارآمد رابطے تھے۔ فلیش شاہ نے بھی یہاں مختلف شعبوں میں کام کے لوگوں تک رسائی رکھی تھی اور پھر اب تو میں صاحب مجھے جتنی صاحب کے فون نمبر دے کر گئے تھے جن کے بارے میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بہت اچھے اور بہت کام کے آدمی تھے۔

میں کچھ دیر سوچا کہ ان میں سے کسے تکلیف دی جائے اور شڑا کے آرام کا وقت تھا۔ پہلے تو میں نے فیصلہ کیا کہ خود کو ہی تکلیف دی جائے اور اپنے ہی ذرائع کو استعمال کیا جائے لیکن پھر میں نے خود ہی اپنا فیصلہ بدل دیا اور سوچا کہ جتنی صاحب کو تکلیف دے کر دیکھنا چاہئے کہ وہ کس حد تک کام کے آدمی تھے۔

ایئر سٹنٹ میں ملی فون موجود تھا۔ اس وقت ایسے کسی آدمی کو فون کرنا خاصی بے ہودگی کی بات تھی لیکن ایسے ہی اوقات میں مجھ اندازہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس قسم کی کسی شخصیت پر ہمارا کس حد تک اثر اور سوجھ بوجھ تھا۔ چند لمحوں کی ہچکچاہٹ کے بعد آخر کار میں نے ان کا نمبر کھائی دیا۔

وہ جتنی صاحب کا پرائیویٹ نمبر تھا۔ حیرت انگیز طور پر لاہور کی طرف دو گھنٹیوں کے بعد ہی فون اٹھالیا گیا۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز ہماری اور کو بجلی ضرور تھی لیکن فون کی آواز ہرگز نہیں تھی۔ وہ خود جتنی صاحب ہی تھے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو کسی حد تک گرجبوشی سے بولے ”اے ٹھیک صاحب نے آپ کا نام نہ تعارف کرایا تھا۔“

میں نے بے وقت ذمت دینے کی معذرت کی تو بولے ”میں سو نہیں سکتا تھا حالات کچھ ایسے ہیں کہ اکثر سونے کا موقع دن میں ہی ملتا ہے۔ آپ فرمائیے مسئلہ کیا ہے؟“

وہ کچھ گئے تھے کہ رات کے پچھلے پھر میں نے کسی مسئلے ہی کے مسئلے میں فون کیا ہو گا۔ میں نے اقتدار سے انہیں صورت حال کھائی اور کہا ”گزارش صرف اتنی ہے کہ یہاں جو بھی پولیس آفیسر آئے وہ فرمیں کے قتل کے شبے میں مجھ پر ہی ہاتھ ڈالنے اور لکھا لکھا کر دینے کی کوشش نہ کرے بلکہ سمجھداری سے تفتیش

میرے سامنے ایک دروازہ، اساتر، فوجیوں اور دیگر پولیس آفیسر کھڑا تھا۔ ہماری پولیس میں ایسے آفیسر بھی دیکھے جاتے تھے۔ عدسے کے لحاظ سے وہ صرف انسپکٹر تھے لیکن ان کی شخصیت میں خود اعتمادی کسی بہت بڑے پولیس آفیسر سے بھی زیادہ تھی۔

ہم دونوں چند لمبے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے پھر اس کی بارعب مونچھوں کے نیچے دھڑکے دھڑکے منکراہٹ طلوع ہوئی اور وہ معاملے کے لئے ہاتھ بڑھانے ہوئے بولا "میرا خیال ہے ہمیں ایک دوسرے سے اپنا تعارف کراپنے کی ضرورت نہیں ہے مسز افضل چوہدری!"

"بے شک" میں نے اس کے مضبوط ہاتھ کو اپنی نظیر گرفت میں لیتے ہوئے کہا "تمہارا خیال ٹھیک ہے اسکاؤڈم کل!"

یہ درست تھا کہ ہم دونوں ہی کو ایک دوسرے کو پہلے دیکھ کر خاصا زوردار جھکاؤ تھا لیکن دونوں ہی اپنی اپنی حیرت بھرا ہوا حسہ اندر آتے ہوئے انگریزی میں بولا "دنیا جتنی جلدی ہے اس جلد انسانوں کا ایک دوسرے سے کہیں نہ کہیں دوبارہ ملنا ہوا ہے"

انگریزی بولنا کوئی فخر کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اپنے بولنے والے کو اتنی صاف تھری انگریزی بولتے دیکھ کر کم از کم مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔

اس کے چھپے چھپے ایک ایسے آئی، ایک اے ایس آئی، ہیڈ کانسٹیبل، دو کانسٹیبل غرضیکہ تقریباً پورا خاندان ہی چلا آیا۔ ملاکہ رحیم گل سب سے آگے تھا کہ وہ کچھ اس طرح بے پروائی سے اندر چلا آیا تھا چھپے کسی دوست سے ملنے اس کے گھر آیا ہو لیکن اس کے ماتحت اس طرح رائفلیں سنبھالنے چادوں طرف دیکھتے آہستہ تھے جیسے انہیں فلیٹ میں چھپتے ہی گھسٹان کارن پرانے کی توقع رہتی ہو۔

رحیم گل بظاہر بے پروائی سے چلا آیا تھا لیکن اس کی نظائری نظریں بڑی مہارت سے چادوں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سناٹے اس کی رہنمائی نہیں کی لیکن وہ خود ہی ادھر ادھر محاکمات پر اسی بندہ دم میں جار کا جہاں لاش پڑی تھی۔ اس کے آدھوں نے چادوں طرف یوں پوزیشنیں سنبھالیں جیسے میں یا کوئی اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا حتیٰ کہ ایک سپاہی یا کونسل میں جا جا کھڑا ہوا کہ کہیں کوئی وہاں سے تین منٹ نیچے چلا گیا نہ لگا دے۔

رحیم گل نے لاش کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی تماشہ توجہ اس وقت شاید میری طرف تھی۔ وہ ایک بار پھر گویا سناٹے کی نظر سے میرا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "عجب بات ہے مسز افضل چوہدری! میری جب بھی آپ سے ملاقات ہوتی ہے مجھے

تبدیل کر چکی تھی۔ اپارٹمنٹ میں ذرا دیر کسی کے داخل ہونے کے آثار نہیں تھے۔ اس کے قاتل نے جب اسے موت کی نیند ملانے کا فیصلہ کیا اس وقت وہ غالباً بیڈ پر ہی دراز تھی۔ ان باتوں سے کچھ ایسا لگتا تھا کہ قاتل اس کا جانے والا ہی تھا اور شاید وہ اس سے کوئی خاص خفیہ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ شاید کوئی دوست ہی دشمن جاں ثابت ہوا تھا۔

مجھے اب بھی پولیس کا انتظار کرنا تھا۔ یعنی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے سوچا اس وقت کو استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ پولیس تو تحقیق کرتی ہی رہے گی لیکن مجھے بھی اپنے طور پر ایک بار غور سے ہر چیز کا جائزہ لے لینا چاہئے شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ میں نے سرائی کی جو انگریزی اور اردو لکھنا دیکھنا یاں نوجوانی میں پڑھی تھیں شاید میرے کسی کام آسکیں۔

چنانچہ میں نے ایک ہاتھ پر دو الپٹ کر نہایت احتیاط سے ایک دوسرے سے اپارٹمنٹ کی تلاش کی لینا شروع کی اور ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا لیکن شاید میں اتنا خوش قسمت نہیں تھا جتنے کہانیوں کے سرائیوں ہوتے تھے۔ مجھے وہاں کوئی سرائی نہیں ملا یا پھر شاید کوئی سرائی وہاں موجود رہا ہو لیکن میں اسے سمجھنے سے قاصر رہا ہوں۔

اپارٹمنٹ فرشتہ ضرور تھا اور اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی لیکن آثار بتا رہے تھے کہ فرسین واقعی اس میں آج ہی ختم ہوئی تھی۔ اس نے اپنے تین سوٹ کیسوں اور دو بڑے بڑے بیگوں میں سے صرف ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ کھولا تھا۔ ان میں سے بھی پورے بلوساٹ اور دو سری چیزیں اس نے وارڈروپ اور ڈرنگ روم پر ختم کر دی تھیں۔

میں نے اپنے کچھ پڑائے "مظنون" کو کام میں لاتے ہوئے اس کے قاتل سوٹ کیسوں کو بھی کھول کر دیکھا لیکن مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے میں سرائی کہہ سکتا۔ تھک ہار کر میں نے اپنی کوششیں ترک کر دیں۔ ایک اندیشہ مجھے یہ بھی تھا کہ میری ان عظیم سرائیوں کے وارڈروپوں کے دوران ہی پولیس میرے سر پر آن پہنچے تھے پہلے ہی اپنے آپ کو غیر مشکوک ثابت کرنے کے لئے سفارشوں کی ضرورت پڑی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تقریباً سرمد لاش کے سر ہاتے میری موجودگی کے ساتھ ساتھ میرا اس طرح ہر چیز کو کھنگالتے پھرنا پولیس کے لئے ناقابل برداشت ہی ہو جائے اور میری تمام تر زوردار سفارش کے باوجود وہ مجھے شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

یہ سوچ کر میں ہر چیز کو پہلی ہی حالت میں چھوڑ کر واپس کاؤچ پر جا بیٹھا اور اگلے چند لمحوں نے ثابت کر دیا کہ میں نے یہ فیصلہ بروقت ہی کیا تھا کہ کچھ لمبے بعد ہی کال تھل بن گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر اپنا دروازہ میں جا کر دوبارہ کھولا۔

برخاش کے تحت نہیں بلکہ ایک دیانتدار اور کھرے آفیسر کی حیثیت سے خود کو مطمئن کرنے کے لئے کر رہا تھا۔ وہ بھی فطرت اور اصلیت کو اچھی طرح جان چکا تھا۔ ہم دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے عزت اور قدر تھی لیکن دونوں ہی اپنی اعتراف نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کے سامنے ذرا "کڑک" رہتے تھے۔

وہ خاموش رہا تو میں نے ذرا اطمینان سے کہا "تمہارا بیان تو آج بھی تو خاصا عجیب انگیز ہے۔ تم ذرا تاج مگر کے آس پاس انہوں سندھ کے کسی علاقے میں ہوا کرتے تھے۔ یہاں کیسے گئے؟ تم پر کیا کڑی؟"

میرے دوستانہ لہجے سے اس کے چہرے پر سردمی اور وہ قدرے کم ہوئی اور وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میں خود اپنا تاج لہاں کر لیا ہے۔ میں نے سوچا کہ باتوں کی تو خوش خاک چھانک لی۔ اب ذرا بڑے شہر کے پوش اور فیشن اسٹیل علاقے کی چمک دمک بھی دیکھ لی جائے۔"

"مگر میں نے تمہارے بارے میں ادھر ادھر سے جو باتیں سنی ہیں ان سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمہیں ملکی زندگی پیار ہے اور تم وہاں کے سادہ لوح مفلوک الحال لوگوں کو ڈاکوؤں بدخلیت و ڈیروں اور فرعون صفت پولیس افسروں وغیرہ کے چمکانے کی کوششوں میں ادھر ادھر بارے پھرتے رہتے تھے۔ اس کی مسکراہٹ ذرا واضح ہو گئی "میرے سامنے رہا سے اور دہشت کی مٹی سے میرا وہ لگاؤ وہ عشق برقرار ہے۔ تو نہیں ہوا۔ زندگی کے راستے عارضی طور پر بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں۔۔۔ کبھی وہاں۔۔۔ دہشت سے میرا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔ میں کسی بھی وقت وہاں جا سکتا ہوں۔"

"تو پھر تمہارے یہاں آنے کی وجہ اتنی سرسری نہیں ہو جتنی تم بیان کر رہے ہو۔" میں نے ذوق سے کہا "لیکن میرا تعلق ایسا نہیں ہے کہ میں اصل وجہ جاننے پر اصرار کر سکوں۔ اس کی خفیف سی مسکراہٹ ایک لمحے کے لئے گویا اس ہونٹوں پر جمہ ہو گئی۔ اسے شاید کچھ سے ایسی بات کی تھی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہنسنے لگے بولا "تمہیں تو پھر آفیسر ہونا چاہئے تھا۔"

"شکر ہے میں نہیں ہوں۔" میں نے فوراً کہا "یہ مجھے میں بھی اچھا ہوا اور میرے حق میں بھی۔"

"میرا حال مناسب وقت آنے پر میں تمہیں اصل وجہ بتا دوں گا۔" وہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"یہ تو خاصا سیاسی بیان ہوا۔" میں نے کہا "عام طور پر لیڈر ارشاد فرمایا کرتے ہیں کہ مناسب وقت آنے پر میں تمام قوم کے سامنے رکھ دوں گا۔ یہ فیصلہ بھی ان کو خود ہی کرنا ہوتا ہے کہ مناسب وقت کون سا ہو گا۔ خیر یہ باتیں تو پھر بھی ہوتی ہیں۔"

پراسرار سے حالات میں ہوئی ہے۔ ایک بار آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ یہاں سے ٹیکوں میل دور ایک نہایت خوب صورت اور ساحر صفت جاگیر دہلی کی زمینوں پر گھوڑے سدا جانے والے ایک معمولی کارندے تھے آج آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو مجھے بہت "ادب" سے بتایا گیا ہے کہ آپ بہت بڑے بزنس مین۔ بہت بڑے سینئر ہیں۔"

وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ شاید کوئی جھوٹ تلاش کر رہا تھا۔ میں نے نہایت سادگی اور انکساری سے کہا "میں اللہ کی دین ہے۔ کبھی کبھی انسان یونہی بیٹھے بٹھائے اچانک تنہی کر جاتا ہے۔"

اس کی نظر میرے چہرے پر گڑی رہی اور اس کے چہرے پر وہی سردمی سی طاری رہی "یہ مذاق کا موقع نہیں ہے چوہدری صاحب! ہمیں ایک لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر مذاق نہیں کرنا چاہئے۔"

"لاشیں دیکھنا آپ کے تو معمولات میں شامل ہو گا انسپکٹر رحیم ٹکل! آپ تو محض رہنما جمیڈی اختیار کرتے ہوں گے لیکن اس لاش نے میرے دل پر اس سے بھی بڑا زخم لگایا ہے جتنا اس کے اپنے گلے پر موجود ہے۔ آپ جس بات کو مذاق کہہ رہے ہیں وہ میں نے مذاق کے طور پر نہیں، جل کر کہی ہے کیونکہ آپ نے آتے ہی فیز حلقہ باتیں شروع کر دی ہیں جو شاید آپ کی عادت ہے یا پھر شاید آپ مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں بھلا آپ پر رعب کیسے ڈال سکتا ہوں۔" وہ جتنی سے مسکرایا "مجھے تو بہت ادب ہے۔ بطور خاص ہدایات ملی ہیں کہ میں آپ پر رعب ڈالنے کی کوشش نہ کروں اپنے حدود میں رہوں۔ جو کچھ آپ ارشاد فرمائیں اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں۔"

"ایمانداری سے بتائیے انسپکٹر صاحب! میں نے ملائمت سے کہا "کیا ہر دیانتدار شریف اور سچ بولنے والے شہری کے سامنے ہر پولیس آفیسر کو ایسا ہی نہیں کرنا چاہئے؟"

"پولیس آفیسر کے لئے پہلے یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ اس کے سامنے ایک دیانتدار شریف اور سچ بولنے والا شہری موجود ہے۔" وہ ڈھانچا بولا۔

"مگر آپ کو بہت "ادب" سے میرے بارے میں کچھ ہدایات ملی ہیں تو آپ کو یقین کر لینا چاہئے کہ ان کا کوئی پس منظر تو ضرور ہو گا۔ ان کو میرے بارے میں کوئی اطمینان تو ہو گا۔" میں نے کہا "یہاں تو کسی چھوٹے سے افسر کو کسی بات پر قائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر بہت ادب اور والے کسی کی دیانتداری شرافت اور سچائی کے قائل ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ میں بے چارے نے بہت سی زیادہ قربانیاں دی ہوں گی۔"

وہ گویا میری دلیل سے لاجواب ہو کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ یہ سب باتیں کسی دلی

”اسی کوئی تعلق استوار ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔“ میں نے تأسف سے کہا اور جو کچھ بھی مجھے معلوم تھا وہ اسے بتا دیا۔

”بہت خوب“ اس نے سر ہلایا ”یہ تو اچھی خاصی جاسوسی کمائی ہے۔ میرا خیال ہے تم جہاں بھی جاتے ہو وہاں کچھ نہ کچھ عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔“

”عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ تو پوری دنیا میں ہر جگہ ہر وقت چلتا ہی رہتا ہے۔ میری بد قسمتی یہ ہے کہ میں ان میں سے بعض مقامات پر جا پہنچتا ہوں اور ان واقعات میں لوٹ ہو جاتا ہوں۔ چین سے نکال کر منہ چھپا کر اپنے گھر میں نہیں بیٹھتا۔ بیٹھ بھی نہیں سکتا کیونکہ آج کل تو میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ جب گھر قنابل بھی میرا زیادہ وقت آوارہ گردی میں ہی گزارتا تھا۔ میں شاید قنابل آوارہ گرد واقع ہوا ہوں۔“

”اس سارے سلسلے میں اس پیکٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ اور وہ تم اس گاڑی میں رکھ کر ہاتھ سے سونپ چکے ہو۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”میں تم سے اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا ”مجھے اس پیکٹ کے ہاتھ آنے کی اشد ہے۔ وہ گاڑی چوری کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر اسے تمہیں نہ کہیں چھوڑ دیں گے خوش قسمتی سے مجھے اس کا نمبر یاد ہے۔ اس کا نمبر ایک اور ماڈل دنیو بھی میں نے توجہ سے دیکھا تھا۔ تم اس کے بارے میں ریڈیو پر پیغام نشر کرو۔ جو نی اس کے بارے میں کوئی اطلاع آئے“ میں اور تم خود جا کر یا بھروسے کے کسی ایماندار آدمی کو بھیج کر سیٹ کے اسی مخصوص حصے میں پیکٹ کو تلاش کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اگر ہماری قسمت اچھی ہوگی تو شاید وہ ابھی تک وہیں محفوظ ہو۔“

اس نے ایک لمبے کچھ سوچا پھر اہانت میں سر ہلاتے ہوئے ایک اسے دیس آئی کو بلیا۔ میں نے گاڑی کے بارے میں اسے تفصیلات بتائیں اور وہ انہیں ایک کانٹہ پر نوٹ کر کے اپنی گاڑی کے ریڈیو پر پیغام نشر کرانے کے لئے نیچے چلا گیا۔

رجیم گل بولا ”میں یہاں بنا ہوں لیکن خوش قسمتی سے مجھے اپنے حقانے میں ایک بڑا تجربہ کار ماتحت مل گیا ہے اور میری اس سے بھی زیادہ خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ مجھے پسند بھی کرتا ہے ورنہ پولیس کے گلے میں ایک بڑی دشواری ہی بھی ہے کہ عموماً زیادہ دبانڈار اور روٹ کر کام کرنے والے پولیس آفیسروں کے اپنے ماتحت بھی زیادہ پسند نہیں کرتے۔ میرا وہ سینئر ماتحت اکثر معاملات میں بڑی مدد کرتا ہے۔ کراچی کے شرفاؤں اور جرائم پیشہ۔ دونوں ہی قسم کے طبقات کے بارے میں اس کی بڑی معلومات ہیں۔ میں اسے بجاتا ہوں۔ تم اسے ان دونوں آدمیوں کے نیچے اور دوسری تفصیلات بتاؤ۔ شاید وہ ان کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکے۔“

”تم جیسے آدمیوں کو بھی ہر جگہ اپنے مطلب کا کوئی نہ کوئی

ذرا لال تم اس کام پر دھیان دو جس کے لئے آئے ہو۔“ اس نے کیل اٹھا کر آہستگی سے ایک طرف دکھ دیا اور خاموشی سے لاش کا سر ہٹا کر معائنہ کیا۔ چند سیکنڈ میں ہی اس نے حاکم کو لیا اور اپنی دائری میں کچھ نوٹ کرتے ہوئے خود کلائی کے لئے اندر میں بولا ”بھرانہ گلے۔“ نقد دیا زیادہ مزاحمت کی کوئی گائی نہیں بلکہ جھگڑا ہے قاتل مقتول کا جاننے والا تھا۔“

میں خاموش رہا۔ یہ امکان میرے ذہن میں بھی آچکا تھا۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا ”جب تم یہاں پہنچے تو لاش اسی حالت میں تھی۔ یہ سوال سے زیادہ محض ایک بیان تھا۔ میں نے اثبات ہی سر ہلایا۔“

”تم ایک سمجھدار آدمی ہو۔ تم نے یقیناً کسی چیز کو ہاتھ نہیں لایا ہو گا۔“ اس نے تصدیق چاہی۔

”جو کچھ میں نے تمہارا سامنا جھوٹ بولا۔“

”جس یقیناً ذرا بھی اندازہ نہیں ہو گا کہ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟“ اس نے گویا صرف رسمی کارروائی پوری کرنے کے لئے کہا۔

”مجھے اندازہ ہے۔“ اس نے تھمبی انداز میں سر ہلایا ”کہ اگر میں معلوم ہوتا ہے کل کس نے کیا ہے تو تم خود جا کر قاتل کا سرتن سے ہوا کر دیتے تم میں کیا بڑی خرابی ہے کہ تم قانون ہاتھ میں لینے اور اپنا ہی ایک چھوٹا سا نظام انصاف قائم کرنے کی کوشش کرتے ہو۔“

”مگر تمہارے گلے میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ معاملہ زاکو درست کرنا قانون کو ہاتھ میں لئے رہیں تو تم کچھ بھی کر سکتے لیکن ایک شریف آدمی کسی ایک مقصد کے لئے بھی قتل کو ہاتھ میں لینے لگے تو تم لوگ فوراً جا کر بڑی مضبوطی سے لہجہ کرنا چاہتے ہو۔“ میں نے کہا۔

میں اٹھا اور کمزور آدمی ہوں۔ پولیس کا محکمہ بہت بڑا ہے۔ لڑائے گلے کے اعمال کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ ہر حال ان قانون کی عمرانی کے لئے لڑنا رہوں گا۔ خواہ کوئی مجھے پاگل کہے۔“ وہ مضبوط نیچے میں بولا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا ”خود انہوں نے اپنے طریقہ کار کے مطابق تیزی سے اپنا اپنا کام ختم کر لیا۔ اس کے ساتھ فکر پرش لینے والے دو آدمی بھی غم ہارے بارگشت کی تلاش اور فکر پرش وغیرہ لینے کا کام لے گا۔“

”میرا رجیم گل میری طرف حوجہ ہوتے ہوئے بولا ”مجھے فون ملے گا۔“ حالات بتائے گئے ہیں لیکن تم جو کچھ جانتے ہو وہ تمہارے گلے تھا۔ اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق تھا؟“



آدی مل ہی جاتا ہے۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔  
 اس نے انگریزی کا ایک محاورہ استعمال کیا جس کا معلوم تھا  
 کہ جہاں خواہش موجود ہو وہاں کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے۔  
 پھر اس نے ایک کالمپیل کو حکم دیا "اکرم صاحب کو بلاؤ۔"  
 میں اور رجیم کل اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ باقی  
 لوگ دوسرے کمروں میں مصروف تھے۔ چند لمحوں بعد سافولا سا  
 سیانہ قامت اور اوجیز عمر ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی  
 ہانک پر نظری ٹینک کئی اوکی تھی۔ چہرے سے کمری بخیدگی میاں  
 تھی۔ اگر وہ پولیس کی وردی میں نہ ہوتا تو ہر گز پولیس کا آدمی معلوم  
 نہ ہوتا۔ کسی نجی دفتر کا شریف اور عظیم الطبع قسم کا کلرک معلوم  
 ہوتا۔ یہ سب الیکٹرک اکرم صاحب ہیں۔" رجیم کل نے مجھ سے  
 اس کا تعارف کرایا۔ اس نے اپنے ماتحت کے نام کے ساتھ  
 "صاحب" کا اضافہ کر کے اس کی عزت بڑھائی تھی۔ اس سے اس  
 کی اپنی عزت میرے دل میں کچھ اور بڑھ گئی تھی۔  
 میں نے اکرم کو "طوطے" اور "توند" کا ٹیبلہ اور ان کی  
 حرکات و سکنات، انداز گفتگو وغیرہ کے بارے میں ہر بات تفصیل  
 سے بتائی اور یہ بھی بتایا کہ توند نے طوطے کو کئی بار "نوزی" کہہ کر  
 مخاطب کیا تھا۔  
 اکرم نے نہایت توجہ اور اشتہاک سے میری بات مٹنی پھر  
 اثبات میں سرلاتے ہوئے بولا "توند والے کے بارے میں تو میر  
 کچھ نہیں کہہ سکتا جی۔۔۔ سر حال اب تک اس کی لاش اٹھائی جا چکا  
 ہوگی۔ اس کے بارے میں تحقیقات ہو جائیں گی البتہ دوسرے۔  
 بارے میں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ نادر تھا جو اپنے ساتھیوں اور  
 جرائم پیشہ حلقوں میں نوزی کے نام سے مشہور ہے۔"  
 "اس نوزی کا کچھ حدود اور بعد۔۔۔؟" رجیم کل نے پوچھا۔  
 "کسی زمانے میں ایک بہت بڑے چور کا خاص ملازم تھا  
 بددیانتی کے اقرا میں نکالا گیا تھا۔ اس کے بعد تیزی سے ترقی  
 چلا گیا۔" اکرم نے بتایا۔  
 "بہت سے بددیانتوں نے ہمارے ہاں بڑی ترقی کی ہے۔"  
 نے اثبات میں سرلاتے ہوئے لہجہ دیا۔  
 "جی ہاں آپ کی بات بھی صحیح ہے لیکن اس وقت میری  
 دوسری قسم کی ترقی سے ہے۔" اکرم بولا "نوزی، بہت بڑا بد معا  
 واکو اور بدہشت گرد بن چکا ہے۔"  
 "اس کے باوجود آزاد پھر رہا ہے؟" میں نے حیرت اور تا  
 سے کہا۔

"جی ہاں" اکرم نے ٹینک کے عقب سے کمری نظر سے  
 طرف دیکھا "اور اس سلسلے میں صرف پولیس کو کوئی بہت  
 پائیے گا۔ پولیس بھی قصور وار ہے لیکن اس سوسائٹی کے ہا  
 کچھ دتے داریاں خود سوسائٹی پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ ہر  
 بد معاش اور بدہشت گرد نے کسی نہ کسی پارٹی میں پناہ لے لی

ہیں ہمارے عوام بڑے جوش و خروش اور محبت سے دوث دے کر اسٹیبلوں میں بیٹھے ہیں جہاں وہ اچھل کر اسٹین تان کر دوسرے کو فوج کھسٹ کر تاتے رہتے ہیں کہ انہیں عوام کا اوجا ملے۔ اس "مٹاؤ" کو ڈھال بنا کر وہ ملک کی ہر جگہ کا تار کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ ہم جان بھلی ہو کر خون پسینہ ایک کر کے خطرناک مجرموں کو عدالت میں پیش کر دیں تو اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ عدالتیں گولہ مالتی ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے قتل و غارت ہوتے، ڈاکے چستے ہوتے ہیں۔ مجرموں کو پچھاتے ہیں مگر کون ان کے خلاف عدالت باز کر دیتی ہے؟

تپ بھی اپنی جگہ صحیح کہہ رہے ہیں بھائی اور عوام بھی اپنی سمجھ میں۔ انہیں معلوم ہے انہوں نے کراہی دی تو ان کا کیا حشر لائیں حفظ رہنے والا بھی تو کوئی نہیں ہے۔ عوام کو آج تک اپنی طرف سے احساس حفظ نہیں ملا۔ بد معاش سب سے ناممکن ہیں۔ شرنا سب سے زیادہ غیر منظم ہیں۔ "میں نے اپنی سائنس کی تحریروں پر تو لمبی بحث ہے۔ آپ نادر عرف نوزی کے بارے میں بتا رہے تھے کیا وہ بھی پکڑا گیا؟"

"نہی جرح" اکرم نے بتایا "ہر بار عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو جاتا ہے۔ دیکھو ان کے کندھے سے کندھا جو ذکر سگراٹا عدالت سے دھست ہو گیا۔ ہم پیسے پولیس والے تو آج کل کی بنا پر ہیں کیا برا؟ قیمت ہے چودہری صاحب! ہم لوگ تو طالعیت ہیں۔ اپنے آپ سے شرمندہ ہیں۔ آج کل صرف بے دھرم کے منہ ہیں۔"

یہی خاموش رہا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سوسائٹی کے بادل اور انہوں میں کسی کی صحیح بات بھی نہیں سنتے بلکہ اکثر ایسا ہے کہ ہم دوسرے کی سنتے ہی نہیں۔ صرف اپنی بات لگتے ہیں۔ اگر دوسرے کی کسی طرح سن بھی لیتے ہیں تو مانتے نہیں۔ رحیم چودہری طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اکرم سے پوچھا "آپ کو نادر عرف نہیں کہ نادر عرف نوزی کہاں مل سکتا ہے۔ کیا کہاں سے لے کر لائے گئے؟"

"میں نے اکرم نے ہاوی سے نفی میں سر ہلایا "مختلف قانونوں اور لوگوں کے کاغذات کے انبار میں اس کے پیسیوں بے درج ہوں گے۔ سب غلط اور فرضی ہوں گے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ کسی واردات کے دوران اچانک ہی

پکڑا گیا ہو۔ کیا کہ نادر نوزی اپنی نادر ترین واردات کے وقت کبھی پوائنٹ پر اغوا کر کے لے جاتے ہوئے دو

محبوب پولیس کی محنت کا ڈیول کے سامنے سے گزرا لیکن اس وقت تو وہ اتفاقاً بھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا۔ رحیم گل اور اکرم اس کے جواب میں کہہ سکتے تھے کہ گرفت کے دوران پولیس کے سامنے سے تو ہزاروں گاڑیاں گزرتی ہیں۔ پولیس ہر گاڑی میں تو بھانک کر نہیں دیکھ سکتی کہ اس میں کیا ہو رہا ہے کیا لے جایا جا رہا ہے۔ پولیس میں ایسے لوگوں کی تعداد شاید نہ ہونے کے برابر تھی جو کسی گاڑی کو دور سے دیکھ کر ہی کسی نامعلوم جس کی مدد سے فیصلہ کر سکتے تھے کہ اسے ملکوک سمجھا جائے یا غیر مشکوک؟

ابھی ہم تینوں خاموش ہی ہوئے تھے کہ ایک کانشیل ایک دروازہ قد اور خوش پوش شخص کو ساتھ لے اندر آیا۔ وہ تقریباً پینتیس کی عمر کا ایک خوش شکل شخص تھا۔ سوٹ میں تھا اور مع لوازمات کے تھائیٹن سرفٹ بیٹ تک موجود تھا۔ لگتا تھا کہ وہ رات کے اس پیر بڑے اہتمام سے گھر سے نکلا تھا۔ وہ تجسس انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ انپکٹر رحیم گل کی طرف دیکھ کر بولا "خیریت تو ہے یہاں کیا ہوا ہے؟"

"جہاں پولیس موجود ہو وہاں خیریت ذرا کم ہی ہوتی ہے۔" رحیم گل بولا "آپ کی تعریف؟"

"آپ۔ آپ مجھے نہیں جانتے؟" نادر نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے اسے رحیم گل کے سوال سے دلی مدد پہنچا ہو۔

"مگر میں آپ کو جانتا ہوں تو مجھے آپ سے یہ سوال کہنے کی ضرورت ہرگز پیش نہ آئی کہ آپ کون ہیں۔" انپکٹر رحیم گل ہنستے ہوئے لمحے میں بولا۔

"مجھے اس لئے ذرا حیرت ہو رہی ہے کہ اس شہر کے اکثر پولیس افسران مجھے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ خوش پوش ایسی قدرے شاطراں کیسے میں بولا۔

"کیوں کیا آپ اشتہار مجرم ہیں؟" رحیم گل نے ملاحت سے پوچھا۔

نادر دوا گیا زندگی بڑا لیکن اس کی فہمی تقریباً بے توازی تھی جیسے سائنس دان کے کہنے میں رہا ہو۔ پھر وہ اپنا فلیٹ ہیٹ درست کرتے ہوئے گہری نظر سے رحیم گل کی طرف دیکھ کر بولا "مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ۔ ورنہ پولیس والوں میں بھلا جس مزاح کہاں ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے آپ یہاں لے آئے ہیں ورنہ میں چاہے آپ سے واقف ہوتا یا نہ ہوتا لیکن آپ مجھ سے ضرور واقف ہوتے۔"

"دوا! یہ تو آپ نے اور بھی سہنس پیدا کر دیا۔" رحیم گل ہلکے جھپکائے بغیر بولا "لگتا ہے آج کی رات سہنس میں ہی گزرے گی۔"

"مجھے مشتاق مڑ سکتے ہیں۔" ابھی معافی کے لئے ہاتھ بیٹھاتے ہوئے بولا۔

رجیم گل اس کے بڑے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "اوہ آپ کو تو بہت بڑا کھلاڑی ہوتا چاہئے آپ کے نام میں تو ہمارے دو بڑے کرکٹرز کے نام یکجا ہو گئے ہیں۔"

مشاق مدثر شاید اپنی کھسیا ہٹ چھپانے کے لئے اپنے بڑے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ اپنے فیلٹ بیٹ کی طرف لے گیا اور خواہ مخواہ ایک بار پھر اسے درست کرنے لگا "کھلاڑی تو شاید میں نہیں ہوں انٹینر صاحب لیکن کچھ کما بھی نہیں جاسکتا۔ کھلاڑیوں کی بھی تو قسمیں ہوتی ہیں نا۔" پھر اس نے اپنے منہم کو گویا تھوڑا سا پکڑ دیا "ہم تو لفظوں کے کھلاڑی ہیں جناب! ہائپ رائٹر سامنے رکھ کر لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ میں دانا نا۔ "مون" کا شیرازس اور کلچرل

ریپورٹر ہوں۔ ہمارا اخبار انگریزی میں شام کا سب سے بڑا اخبار ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلک آیا۔

"بہت خوب۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" رجیم گل نے اب بھی اس سے ہاتھ ملائے بغیر کہا "یہاں آپ کی آمد شیرازس کے سلسلے میں ہوئی ہے یا کلچر کے سلسلے میں؟"

"کچھ بھی سمجھ لیجئے۔" وہ بے پروائی سے بولا "مس فرحین شیرازس کی نمائندگی بھی کرتی ہیں اور کلچر کی بھی۔"

"کون سے کلچر کی؟" رجیم گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملامت سے پوچھا۔

"آف کورس۔" مشقی کلچر کی۔ لیکن یہ کوئی ایسی معیوب بات نہیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ امریکا میں گزرا ہے۔ اس لئے اگر وہ وہاں کی موجودہ معاشرت کی نمائندگی کرتی ہیں تو ہمیں اس پر زیادہ شرمندہ یا جریز نہیں ہونا چاہئے۔" پھر ذرا توقف سے وہ بولا "ہمیں اردو ٹھیک ٹھاک بولی رہا ہوں نا؟" بچپن ہی سے انگریزی میں لکھتے پڑھتے اور زیادہ تر انگریزی میں ہی بولنے کے باوجود مجھے اردو پر بھی اچھا خاصا عبور رہا ہے۔"

"یہ کچھ اتنی زیادہ حیرانی کی بات نہیں مسٹر مشاق مدثر! اب رجیم گل صاف ستھری اور درست انگریزی میں بولا "ہمارے ہاں انگریزی کے بہت سے بڑے صحافی اردو میں بھی اتنا ہی اچھا لکھتے اور بولتے ہیں جتنا انگریزی میں۔"

"بے شک بے شک" مشاق مدثر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اچھا تو آپ مس فرحین سے ملنے آئے تھے؟" رجیم گل گویا اسے دوبارہ اصل موضوع پر لاتے ہوئے بولا۔

"میں یونہی ملنے نہیں آیا تھا۔ مس فرحین نے مجھے انٹرویو کے لئے وقت دیا تھا۔ ہماری ملاقات باقاعدہ طے مہی بلکہ مجھے انٹرویو ہے کہ میں کچھ لیت ہو گیا۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

"کچھ نہیں آپ بہت بہت۔" مسٹر مشاق مدثر۔

"مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔ یہاں آپ لوگوں کی موجودگی کو آجماٹکون نہیں ہے۔ یہاں کوئی جبری تو نہیں ہوگئی۔ ڈاکا تو نہیں

رحیم گل دونوں ہنوار اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ میں نے پہلی بار اسے مخاطب کیا "مجھے یاد ہے میں نے آج رات تمہیں ہمیں اشارہ ہوئی میں فرحین کے شو میں دیکھا تھا۔"

مشاق مدثر کے پتلے پتلے بوٹوں پر دوح سے خالی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ گویا پہلی بار میری موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے بولا "ہاں میں تو تقریباً ہر رات ہی ایسی کسی نہ کسی جگہ پر موجود ہوتا ہوں۔ یہ میرے پیشے کا حصہ ہے اور خامداد لچپ جسد ہے۔ لیکن فرحین وہاں مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

پھر اس نے سر تپا میرا جائزہ لیا اور پُر تجسس لہجے میں پوچھا "آپ کی تعریف؟"

"مجھے افضل چوہدری کہتے ہیں۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"چوہدری گروپ آف کینیز کے مالک افضل چوہدری تو نہیں؟" اس نے آنکھیں پکڑ کر میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ شاید اسے کسی اسکینڈل کی بو محسوس ہوئی تھی۔

آہم میں نے اسے اثبات میں جواب دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا اور سر ملاتے ہوئے کہا "کاروباری میدان میں میں بھی آپ کی معلومات کافی وسیع معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے کراچی میں ایک بزنس من کی حیثیت سے۔۔۔ بلکہ شاید کسی بھی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

"معلومات رکنا بعض لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔" وہ اپنی اسی بے دوح مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

رحیم گل دلچسپی آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ فرما رہے تھے کہ شہر کے بیشتر بلیس آفیسر آپ کو پہچانتے ہیں۔ کیا ان سے بھی آپ کی اکثر مشتملات رہتی ہے؟"

"بے شک" وہ ہلکا سا ہلکا بولا۔

"کیا پولیس بھی آپ کے نزدیک شہر بزنس کا حصہ ہوتی ہے؟"

رحیم گل نے ماتم سے پوچھا لیکن اس کے اس ماتم لہجے میں ایک خاص قسم کا طعنے ہوتا تھا۔

"جی ہاں" مشاق نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور ایک بار پھر فلسفیانہ سے لہجے میں بولا "ہم سب اس سوسائٹی میں رہتے ہیں اور ہم سب ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ کس نے کس ہمارے گھانٹے ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو ہم سب صرف اس وقت تک آرام سے رہتے ہیں جب تک ہم سب ایک دوسرے کی بھلائی کا خیال رکھتے ہیں۔ جو نئی ہم کسی دوسرے کی جڑیں کاٹنا شروع کرتے ہیں فوراً ہی ہمارے لئے بھی مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "یہ تو آپ کے سوال کا

پہلا؟" مشاق نے تدریس سے تشویش سے پوچھا "آج کل اس علاقے میں چوری دیکھتی کی وارداتیں بہت ہو رہی ہیں بلکہ اس علاقے میں کیا بڑے علاقے میں ہی ہو رہی ہیں۔" اس کا ذہن شاید اب بھی محل کے امکان کی طرف نہیں گیا تھا۔

"وہ تو آپ جان ہی لیں گے کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ کیا مس فرحین نے آپ کو انٹرویو کے لئے صبح تین چار بجے کا وقت دیا ہوا تھا؟" رحیم گل نے وہ سوال کیا جو میرے ذہن میں بھی کل رہا تھا۔

"اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے انشپل رحیم گل صاحب؟" اس نے رحیم گل کے سینے پر گئے ہوئے بیچ سے اس کا ہاتھ لیا تھا "یہ شہر بزنس کی دنیا ہے اس میں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوئے ہیں۔ خاص طور پر مس فرحین کی تو مصروفیات ہی ایسی تھیں کہ ان سے ایسا ہی کوئی وقت ملنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ دن میں تو ان سے وقت مل ہی نہیں سکتا تھا اور میں چونکہ ایک عرصے سے شہر بزنس کی صحافت میں ہوں اس لئے میں نے شہر بزنس کے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا سیکھ لیا ہے۔ کوئی مجھے انٹرویو کے لئے خواہ کوئی بھی وقت دے کسی بھی جگہ بلائے میں ضرور پہنچ جاتا ہوں اور اس انٹرویو کے لئے پہنچے گا تو مجھے بڑا ہی تجسس تھا کیونکہ مس فرحین نے کہا تھا وہ اپنے انٹرویو میں کچھ اہم افکشافات بھی کریں گی۔ میں تو قصوری تصور میں دیکھتا تھا کہ ہمارا اخبار اگر پری ہونے کے باوجود مس فرحین کے دھماکے دار انٹرویو کی وجہ سے دھڑا دھڑک رہا ہے۔"

"مگر خیم کے افکشافات؟ فرحین نے کچھ بتایا نہیں تھا؟"

رحیم گل نے پوچھا۔

"مگر نہیں۔ انہوں نے اگر کچھ اشارے ہی دے دیے ہوتے تو میں یہاں آنے سے پہلے ہی کوئی پھوٹی موٹی اسٹوری تو بنا کر آتا۔" دیکھی کچھ پلٹنی ہو جاتی۔ باقی تفصیلات انٹرویو میں آجائیں گی۔ لیکن وہ بول میں یا کہیں اور کوئی بات کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ قصور بزنس من ان کی ہوا پکے تھے۔ بڑی ہوش رہا قسم کی تصویر بن گیا۔ ان میں سے صرف چند ایک ہی چھپنے کی نوبت آئے تھے۔ اس کے لہجے میں حسرت تھی لیکن پھر گویا اس نے اپنے آپ کو قائل کر لیا "لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے امید ہے ان کا انٹرویو کسی کچھ کم دھماکا خیز نہیں ہوگا۔ اس قسم کی خواتین سے بڑی متاثرہ اور حیران کن باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ عام طور پر ان کے انٹرویو پر بڑا ہنگامہ مکڑا ہوتا ہے اور اگر کوئی ایسا اسکینڈل ہاتھ آجائے تو اخبار کی اشاعت کس سے کس جگہ پہنچتی ہے۔ اس لئے میں بڑے اندیشہ سے مس فرحین کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ انٹرویو کے لئے رضامند ہوئی تھیں۔" وہ بڑے ادب و احترام سے فرحین کا ذکر کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے کمرے میں بو جھل سکوت چھا گیا۔ میں اور

تلفیانہ جواب تھا اور اس کا طعنے جواب یہ ہے کہ پولیس کا ٹکڑا اب واقعی شوریس ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی بس دکھاوا ہی دکھاوا۔ اگر نقلی اعتبار سے بھی غور کریں تو اس میں شوریس دونوں نظر آتے ہیں۔ شوریہ صرف بڑے بڑے سرکاری لوگوں کی بڑھاتا رہتا ہے اور اپنے لئے اکثر برنس میں مصروف رہتا ہے۔

رجیم کل کمری سانس لے کر بولا "ہم آپ کی لگائی سے مت متاثر ہوئے ہیں۔ مشتاق مدثر صاحب آپ نے میرے مختصر سے سوال کے بڑے تفصیلی اور پھلدار جواب دے دیے۔ کاش آپ اصلی اور سچا جواب بھی دے دیتے۔ مجھے اصل میں یہ سن کر خاصی حیرت ہوئی ہے کہ شمر کے تقریباً کسی پولیس آفیسر آپ کو جانتے ہیں۔ یہ دعویٰ تو شاید کوئی کرائم رپورٹر بھی نہ کر سکتے تھے روزانہ پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ تو شوریس اور کلچر کے رپورٹر ہیں۔"

"اصل اور سچا جواب یہ ہے انپکڑ صاحب۔ کہ میں ہر شعبہ زندگی میں کام کے لوگوں سے سلام دعا رکھتا ہوں۔ خود جا کر ان سے مل کر رسم و راہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا مظلوم انسان کو کس وقت کس سے کام لینا چاہئے۔ لوگ پولیس والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔ لیکن میرے خیال میں تو ان سے دوستی اچھی اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ میری توجہ ان سے بھی دوستی رہی ہے۔ پیشہ میرے بڑے کام آئے ہیں۔ میرے لئے تو آپ کی صورت بھی شمسار ہے۔ آپ نے بھی مجھے دیکھا ہوا ہے لیکن شاید بھول گئے۔ یا پھر آپ نے مجھے اہمیت نہیں دی ہوگی۔ میں نے آپ کو آپ کے علاقے کے ڈی ایس پی قادیق صاحب کے آفس میں دو تین مرتبہ دیکھا ہے۔ میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔"

"لیکن میں نے آپ سے مجھے دیکھا ہو لیکن میں نے آپ کی طرف توجہ نہیں دی ہوگی۔ اگر میں آپ کی طرف توجہ سے دیکھتا تو آپ کی صورت ضرور میرے ذہن میں رہتی لیکن میں جب ڈی ایس پی صاحب کے پاس کسی کام سے جاتا ہوں تو میری توجہ صرف اسی کام کی طرف رہتی ہے۔" رجیم گل نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔

"چلیے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اگر پہلے شناسائی نہیں تھی تو اب ہو گئی ہے اور امید ہے آئندہ یہ شناسائی دوستی میں بدل جائے گی۔" اس نے گویا وصیت بن کر ایک بار پھر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"سنئے وثوق سے یہ بات مت کہیے۔" رجیم گل انگریزی میں بولا "آہم اس بار اس نے مشتاق مدثر کا مصافحے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ تمام لیا لیکن انداز کچھ ایسا تھا جیسے مصافحے کے لئے پہلے وہ دستاویز بننے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔

مشتاق مدثر نے میری طرف بھی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ "آپ سے مل کر بھی بہت خوشی ہوئی افضل چور دہری صاحب امیں عاتقان طور پر آپ سے معمولی سا واقف تھا۔ ملنے کی آرزو تھی لیکن سچی بات ہے میرے ذہن میں آپ کا جو خاکہ تھا آپ اس سے بہت مختلف نکلے ہیں۔ انپکڑ رجیم گل صاحب کی شخصیت اور انداز گفتار بھی ہمارے روایتی پولیس افسروں سے بہت مختلف ہے۔ مجھے کہہ دوں ہی سے مل کر بہت خوشی اور ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی ہے۔"

اس کا لہجہ خوشامد نہیں تھا لیکن میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس انداز گفتار پر خوش ہو سکتا تھا۔ انپکڑ رجیم گل بھی خوشامد اس سے ملنے جلتی گفتگو سے متاثر ہوئے والا آدمی مظلوم نہیں ہوتا تھا۔

مشتاق مدثر سے مصافحہ کر کے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک مضبوط اور طاقتور آدمی تھا۔ یہ تو میں پہلی نظر میں ہی دیکھ چکا تھا کہ وہ دراز قد اور کمرتی جسم کا مالک تھا۔ پھر بھی مجھے اس کے اتنا مضبوط ہونے کی توقع نہیں تھی جتنا وہ مصافحے کے بعد محسوس ہوا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنا مضبوط اور فٹ صحابی دیکھا تھا۔ وہ ایک بار پھر رجیم گل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "ادھر ادھر کی باتیں تو مت ہو گئیں۔ کیا اب میں جان سکتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" جس فریجن بھی خاتون کے گھر میں راستہ کے پچھلے پور کئی پولیس والوں اور ایک بڑے برنس مین کا بیٹا جانا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ جس فریجن کہاں ہیں؟"

رجیم گل نے گہری دیکھی پھر دوواڑے پر کھڑے ہوئے اسے ایس آئی کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے کہا "۳۳ وقت اس کی لاش ایمرنس میں رکھ کر سرکاری اسپتال کے عمرہ خانے میں لے جایا جا رہی ہے۔ راستے میں ہوگی۔"

مشتاق مدثر اپنا فلیٹ ہیٹ سر سے اُتار کر ہاتھ میں خانے ہوئے تھا۔ یہ سن کر ہیٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور آٹھیں پھیل گئیں۔ اس نے اضطراب سے انداز میں ہیٹ کو اٹھایا اسے جھانکا اور مرتضیٰ آواز میں کہا "لاش؟" جس فریجن کی لاش؟ تم مذاق تو نہیں کر رہے انپکڑ؟"

"میری ابھی آپ سے اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی ہے کہ مذاق کرنے لگوں۔" رجیم گل رکھائی سے بولا۔

"نہیں کس نے قتل کیا؟" ایک لمبے کی خاموشی کے بعد مشتاق نے سچ میں ڈوبے لمبے میں پوچھا۔

"تپ کو کیسے مظلوم ہوا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے؟ میں نے تو ابھی یہ نہیں کہا۔" رجیم گل نے کمری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو انپکڑ۔ تمہاری یہاں موجودگی اور تمہارے آدمیوں کی اتنی زیادہ سرگرمی تمہاری ہے کہ فریجن

اور ابتدائی تفتیش مکمل کر لی تھی۔ وہ رخصت ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس گاڑی کے بارے میں کوئی اطلاع آنے تک رجم محل کے ساتھ ہی رہوں۔ جس میں پکٹ رہ گیا تھا۔ رجم محل کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلوں۔ فلیٹ کے دروازے پر ایک مسک کا نشان لٹا ہوا تھا اور میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پولیس کی گاڑیوں کے پیچھے پیچھے پولیس اسٹیشن جا پہنچا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

وہاں پہنچے ہی رجم محل کے لئے گویا مصروفیات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نئی وارداتوں کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ پڑانے سلسلوں میں کچھ نوکروں کو پکارا یا جا رہا تھا۔ وہ بھی تھے جو کسی نئے یا پڑانے سلسلے میں اتفاقاً جتے چڑھ گئے تھے۔ غرضیکہ خانے میں بہت سی گھما گھمی تھی، ابھی صبح سوئوں میں دن نہیں چڑھا تھا اور یہ ایک پوش علاقے کا تھا۔ جب یہاں "دوق" اور "گھما گھمی" کا یہ عالم تھا تو باقی علاقوں میں نہ جانے کیا صورت حال چل رہی ہوگی۔

رجم محل خود تو اور دھڑلے سے مصروف ہو گیا لیکن اس نے اذراؤ کرم مجھے اپنے کمرے میں بٹھایا اور کچھ دیر بعد میرے لئے خاصا معتدل قسم کا ناشتا بھی بھجوا دیا۔ اس جیسے آدمی کی طرف سے یہ سلوک بھی غیبت تھا۔ اس دوران سب انسپلز اکرم کچھ دیر کے لئے میرے پاس بیٹھا جس کے بارے میں رجم محل نے بتایا تھا کہ وہ ایک دیانت دار اور مخلصی آدمی تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "آپ لوگوں کے پاس فوڈی کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے؟ اسے کھانا کھانے کے لئے شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

"میں خود چلا پھرتا ریکارڈ دوم ہوں سرا" وہ بتانے لگا۔

"..... اس کے بارے میں موٹی موٹی باتیں تو میں نے آپ کو بتا دی ہیں مزید بھی جو کچھ پوچھا ہو مجھ سے پوچھ لیجئے مجھے معلوم ہوا تو ضرور بتاؤں گا۔ ویسے شاید کسی ٹوٹے پھوٹے کمرے میں گرد و غبار اور پرانی فالتوں کے انبار تھے وہی اس کے بارے میں بھی کوئی تفتیشی فائل پڑی ہو تو اسے نکالنا کاردار ہو گا اور اس سے شاید ہی آپ کو کوئی مدد مل سکے۔ اب ہمارے ہاں وہ کچھ مزاحزہ نظام تو ہے نہیں کہ جن دہلیا اور مجرم کی حقیر، مسڑی شیٹ نکل آئی۔ جن دہلیا اس کی انگلیوں کے نشان تھک نکل آئے۔ جن دہلیا اور دیگر تمام ضروری معلومات سامنے آچکیں۔ یہاں تو میں جس طرح گزارا چلا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ ویسے آپ اس کے بارے میں کیا جانتا چلا رہے ہیں؟"

"کوئی بھی ایسی بات جس سے اس تک پہنچنے میں کوئی مدد مل سکے" میں نے جواب دیا "آپ لوگ ایسے کسی مجرم تک پہنچنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟"

یہی سوت نہیں آئی ہوگی۔ "مشاق دثر ناگوار سی سے بولا "میرا ہاتھ پہلے ہی شکا تھا لیکن میں سمجھا تھا شاید کوئی چوری دیکھتی کا مسئلہ ہو گا۔ کس نے قتل کیا ہے انہیں؟ اس بار پوچھنے کا انداز سمجھایا تھا جیسے قاتل کا نام معلوم ہوتے ہی وہ خود ظہور ہاتھ میں لے کر نکل کھڑا ہو گا اور اس کا سر قلم کر دے گا۔ سوال کرتے وقت اس نے ایک لمحے کے لئے شک زدہ سی نظروں سے میری طرف بھی دیکھا۔

رجم محل نہایت سنجیدگی سے بولا "نی الحال ہمیں تقریباً ایک لاکھ افراد پر فرجن کے قتل کا شبہ ہے۔ صبح تک شاید یہ تعداد کچھ کم ہو جائے۔"

مشاق دثر ایک لمحے اسے گھورتا رہا۔ رجم محل نے پلک نہیں جھپکی۔ آخر مشاق اپنا فلیٹ بیٹ سر پر رکھتے ہوئے بولا "اب میں چلا ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں کوئی دھمک کی بات معلوم ہونے کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔"

"مجھ سے رابطہ رکھیے گا۔ مجھے کچھ معلوم ہو سکا تو ضرور آپ کو بتا دوں گا۔ آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ ان میں سے کون سی بات دھمک کی ہے۔" رجم محل نہایت شیریں لہجے میں بولا۔

"میں تم سے نہیں، تمہارے افسران اعلیٰ سے رابطہ رکھوں گا۔" مشاق جانے کے لئے مڑتے ہوئے بولا۔

"یہ تو اور بھی ہنر ہو گا۔ وہ آپ کو زیادہ اعلیٰ قسم کی خبریں فراہم کر سکیں گے۔ ہم اپنی آدمیوں سے تو اپنی خبریں ہی مل سکتی ہیں۔" رجم محل خوشگوار لہجے میں بولا۔

مشاق دثر کے جانے کے بعد میں نے رجم محل سے کہا "پولیس والوں کو تو صحافیوں سے بنا کر رکھنی چاہئے۔"

جہاں تو سبھی کو ایک دوسرے سے بنا کر رکھنی چاہئے لیکن کسی خوف کے تحت نہیں بلکہ صرف انسان دوستی کے جذبے کے تحت۔ انکو لوگ صرف اپنے اعمال پر پردہ ڈالنے رکھنے کی غرض سے صحافیوں سے بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے زندگی کا اصول بنا رکھا ہے کہ کوئی غلط کام مت کرو اور کسی سے مت ڈرو۔ میں خوف کے تحت کسی کے ساتھ خوش خلقی سے پیش نہیں آسکتا۔ انانیت کے ناتے سے پیش آسکتا ہوں۔ وہ بھی اس شرط پر کہ دوسرا مجھ سے خوش خلقی سے پیش آ رہا ہو۔ مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش نہ کر رہا ہو اور ٹھیک آدمی ہو۔ ٹھیک آدمی کا مطلب مجھے ہیں یا آپ؟"

محبت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ ہر حال تمہاری شرائط بہت لمبی ہیں پھر اسے رجم محل! میں نے ہنسی سانس لے کر کہا "تمہاری پیشہ لوگوں سے بی بی بی بی بی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں اس کے لئے تیار ہوں بلکہ اب تو عادی ہو جا رہا ہوں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

اس دوران پولیس والوں نے وہاں اپنی ضابطے کی کارروائیاں

## شیوہ ناک کے رہشت گرد

سے حمید قیمت 600/-

|                      |                         |
|----------------------|-------------------------|
| امریکہ رے امریکہ     | طارق اسٹیل ساگر - 150/- |
| صومیت اور عالم اسلام | طارق اسٹیل ساگر - 125/- |
| کورٹ مارشل           | طارق اسٹیل ساگر - 200/- |
| آخری گناہ کی سہلت    | طارق اسٹیل ساگر - 150/- |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

ہوئی سراغ موجود ہو تو ہم اس کے سارے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ اللہ پر توکل کر کے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اچانک ہی وہ ہاتھ آجاتا ہے۔ جب اس کی تقدیر باری ہوئی ہے تو وہ کسی نہ کسی چکر میں کسی بیٹے ہمارے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ بات وہی ہے کہ اوپر والے کا بھی اپنا ایک نظام کام کر رہا ہے اس کے تحت ہر بڑا آدمی بہر حال ایک بار گرفت میں ضرور آتا ہے۔

”آپ کا مطلب ہے کہ اب ہم سب کو اطمینان سے بیٹھ کر اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے جب کہیں سے اچانک اس کے پکڑے جانے کی خبر آئے۔ خواہ اس میں دو چار سال لگ جائیں؟“

میں نے ہوا رعبے میں پوچھا۔  
”نہیں ہم اپنی سی کوشش تو کریں گے۔“ اس نے کیا مجھے اطمینان دلایا۔ ”میرا سانس لینے کا موقع تو ملے۔ نوزی کا وہ ساتھی جو کلشن کے ساحل پر اس کے اپنے ہی ہاتھوں ہلاک ہوا ہے اس کی شناخت ہو جائے تو شاید اس سے بھی کچھ مدد ملے۔“  
”بھرا ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”آپ شاید اس لئے نوزی تک جلد از جلد پہنچنا چاہتے ہیں کہ وہ فرحین کا قاتل ہو سکا ہے لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ جو واقعات آپ نے انکپٹر صاحب کو سنائے ہیں اور فرحین کی موت کے وقت کے بارے میں میرا جو اندازہ ہے“ اس صاحب سے تو جب فرحین کو قتل کیا جا رہا تھا اس وقت نوزی اور اس کا ساتھی کلشن کے ساحل پر آپ سے اٹھے ہوئے تھے۔“

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بات اس نے کامیابی کی قسمی۔ یعنی وہ اتنا کانسیس تھا جتنا عموماً ہم اپنے پولیس والوں کو سمجھتے ہیں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”نہیں میں اسے صرف فرحین کا قاتل سمجھ کر اس کی تلاش کے لئے بے چین نہیں ہوں۔ مجھے دینی ہے اس پر خارا آ رہی ہے کاش آپ لوگوں کے پاس اس کا کوئی آنا چاہتا ہو۔“

”آخری بار وہ ایک کچی بستی کے ایک مکان میں پایا گیا تھا۔ جہاں اس نے اپنی کین گاہ بنائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اس کے کسی مستقل ٹھکانے کا پتا نہیں چلا۔ اس وقت وہ ایک معمولی سا بد معاش ہوا کرتا تھا۔ مار پیٹ، چوری چکاری، میرا پھیری اور جھوٹے سونے ناجائز دھندوں تک ہی اس کی پہنچ تھی لیکن پھر بہت مختصر عرصے میں وہ بہت بڑا بد معاش، قاتل اور دہشت گرد بن گیا۔“

سب انکپٹر اکرم نے مجھے لمحے میں بتایا۔  
”یہ انقلاب کیونکر رونما ہوا؟“ میں نے جنس سے پوچھا۔  
”اس سے منظم اور طاقتور لوگوں کی پشت پناہی میری تھی۔ بد معاش صرف پشت پناہی کی وجہ سے بڑے ہیں ورنہ بد معاش بڑا شو خود کچھ بھی نہیں ہوتے۔ وہ بہت بوڑھے اور بہت معمولی لوگ ہوتے ہیں۔ صرف پشت پناہی انہیں دلہاتی ہے۔ اگر بد معاش کی

پشت پناہی کرنے والے منظم طبقوں کا خوف نہ ہو تو کوئی بھی شریف آدمی کسی بد معاش کا بھرکس نکال سکتا ہے۔“ اکرم میرے ساتھ ناشتا کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ مجھے اپنے خیالات و تجربات سے مستفید کر رہا تھا۔

اسی طرح باتیں ہوتی رہیں کرے میں لوگ آتے اور جاتے رہے۔ خود اکرم بھی کئی بار بار گر گیا اور لوٹ آیا۔ رحیم گل البتہ کالی طویل وقت کے بعد ہمیا رہے کے قریب واپس آیا۔ اب وہ مجھ جیسا بازو دم اور گھٹنے مزاج نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر گتلیں تھیں جو اس کے داہنی تاؤ کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ وہ اکرم سے باتیں کرنے لگا اور ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے بہت سے معاملات درپیش تھے جو اس کی نظر میں فرحین کے قتل کے معاملے سے زیادہ اہم تھے۔

آخر اسے میرا پریشنا نصیب ہوا اور وہ میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا۔ ”کڑوشت رات سے اب تک مجھے سر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ پھر بھی آپ لوگ کہتے ہیں ہماری پولیس کام نہیں کرتی۔“

”صحیح معنوں میں کام کرنے والے آئے میں تک کے برابر ہیں نا۔ باقی سب تو کئی بھرا رہے ہیں۔ وقت پورا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا، پھر پوچھا ”اس کار کے بارے میں کوئی خبر آئی؟“

لگادی۔ اس دوران اکرم لوٹ آیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور اس کے چہرے پر بھی کوئی ایسے تاثرات نہیں تھے جیسے کوئی اہم چیزانے کے بعد ہوتے ہیں۔ میرا دل کچھ ڈوب سا گیا لیکن میز کے قریب آکر اکرم نے اپنی سرسئی حسی کے گہبان میں ہاتھ ڈالا اور بغل کی طرف سے سفید کاغذ میں لپٹا ہوا دی پکٹ نکال لیا جو میرے لئے جانا بچانا تھا۔ اب وہ کچھ میلا میلا سا نظر آتا تھا۔

”کیسی ہے نا افضل صاحب؟“ اس نے پکٹ میز پر رکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”ہاں کیسی معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے قدرے بے تالی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

”اس سے چیمیز چھاؤ صاحب کے آنے کے بعد ہی ہوگی جناب۔“ اس کے لہجے میں قطعاً موت نہیں تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا اور اپنے تجسس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ تجوڑی دیر کے لئے میں نے اپنے آپ کو اس ماحول سے اور تمام واقعات سے لاقطع کر لیا۔

نیمت رہا کہ اس کے بعد رحیم گل جلدی لوٹ آیا۔ اس کے چہرے سے بڑھتی عیاں تھی۔ اس نے ٹوٹی آنار کر زور سے میز پر جتنی اور کرسی پر تقریباً دھیر ہوتے ہوئے بولا ہمیں سمجھا تھا کہ ایک دیا اندر آپریٹس آفسر کے لئے رومات میں کام کرنا بہت دشوار ہے لیکن اب اندازہ ہوا کہ شرمیں اس سے زیادہ مشکل ہے۔

”خیریت تو ہے؟ بات کیا ہے۔ بہت غصے میں نظر آ رہے ہیں انیکلر صاحب؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ابھی ابھی مجھے رشوت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔“ وہ برہم لہجے میں بولا۔

”تو اس میں اتنے غصے کی کیا بات ہے؟ کہنے والے نے تو روٹوں کا ایک کام کہنے کی کوشش کی ہوگی۔“ پھر میں نے اسے چھیڑا ”کیسی وہ معاملہ تو نہیں تھا کہ رشوت؟ اور وہ بھی اتنی تجوڑی؟“

”جی نہیں“ وہ دوشے ہوئے بچے کی طرح غلج سے مجھے گھورتے ہوئے بولا ”بڑے فنون سے بھرا ہوا بریف کیس تھا۔ آپ جیسا دولت میں کھیلنے والا بڑا سیٹھ بھی دیکھ لیتا تو ایک بار نہ میں پانی آجاتا۔“

”اور میں ایک طرف کوند کر کے اس ہائی کی گلی کرتا۔“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہنا آسان اور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے افضل صاحب!“

”کوئی بڑا ہی معاملہ ہوگا؟“ میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا

”توہوں سے بھرے ہوئے بریف کیس بڑے ہی معاملات میں چلتے ہیں جن میں سیاسی لوگوں کی خرید و فروخت کا معاملہ بھی شامل ہے لیکن آپ بہر حال سیاسی آدمی نہیں ہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی لمحے اس کی میز پر رکھے ہوئے فن کی گھنٹی بجی۔ اس نے چند لمحے بات کی پھر ریسیور رکھ کر مٹراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا ”مگر آپ پہلے کار کے بارے میں پوچھ لیتے تو شاید وہ پہلے ہی مل جاتی۔ وہ شمر کی ایک معروف سڑک کے کنارے کھڑی مل گئی ہے۔“

اکرم بولا ”مجھے معلوم تھا وہ جلدی مل لی جائے گی اور کسی بارانی یا مچھان آباد اور ٹنگ و آریک گلیوں والے علاقے کے قریب کھڑی ملے گی۔ نوزی چوہی کی گاڑی زیادہ دیر استعمال میں نہیں رہ سکتا۔ اس کی احتیاطی تدبیریں اس کے بڑا کام آتی ہیں اور وہ ٹیبا دوتنی یا مچھان علاقوں میں ہی عائب ہوتا ہے۔“

رحیم گل اس سے مخاطب ہوا ”اس سے پہلے کہ وہ کا دھارے دے شے کے قبضے میں چلی جائے تم جا کر اس کی پچھلی سیٹ کے کمانچے میں سے وہ پکٹ نکال لاؤ جس کا افضل صاحب نے ذکر کیا تھا۔ اس دوران میں اور افضل صاحب یہاں بیٹھ کر دعا کریں گے کہ وہ پکٹ ابھی تک وہیں موجود ہو۔“

”میں اکرم صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

رحیم گل نے مجھے چمچے کا اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے بولا ”اب اطمینان سے بیٹھ رہیں افضل صاحب! پریشان نہ ہوں۔ اپنی آپریٹس پر اعتبار کرنا سیکھیں۔“

”بات اعتبار یا بے اعتباری کی نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”مگر دراصل تجسس سے بے چین ہو رہا تھا۔“

”پکٹ تو بہر حال یہاں۔ میرے سامنے آنے کے بعد ہی کھلے گا۔“ رحیم گل نے فیصلہ سنایا۔

”اچھا۔“ جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔“ میں نے کندھے اٹکائے اور دوبارہ بیٹھ گیا۔ اکرم مستعدی سے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ رحیم گل نے اپنے اور میرے لئے بلیک کافی منگوائی پھر گویا ”یہاں مجھے کھلی دیتے ہوئے بولا“ میں نے پکٹ لینے کے لئے ہاتھ لگائے تو وہی کو بھیجا ہے۔“

”مجھے یقین ہے۔“ میں نے مختصر کہا۔

رحیم گل کو کافی بھی سکون سے چٹا نصیب نہیں ہوئی۔ منٹ منٹ بعد اس کے فن کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کے قریب ہی کالنگ کیسٹ پر ایک وارنریس بھی رکھا تھا۔ اس پر بھی تجوڑی تجوڑی رہ رہ کر بیانات آرہے تھے۔ کافی ختم کرتے کرتے آخر اسے اٹھانی کر دیا۔

وہ ایک بار پھر ٹوٹی سر پر رکھ کر دودی درست کرتے ہوئے بولا ”میں پندرہ میں منٹ میں حاضر ہوتا ہوں افضل صاحب! قریب ہی ایک بینک پر جا رہا ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر انتظار کی کوفت اٹھانے لگا۔ اس نے واپس آنے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ دیر



مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ معاملہ مجھے بتائے گا۔ میں نے یونہی بات برائے بات کی تھی لیکن وہ بتانے لگا "ایک بہت بڑے سیٹھ نے ایک بہت بڑی سمانی شخصیت کو اس علاقے میں اپنا ایک بڑا سا پیش قیمت بنگلا دیا ہوا تھا کہ وہ اس میں اپنے مشہور قلاتی ٹرسٹ کی شاخ کھول لے لیکن گورنام جو بچنے کے نہ خانے میں قہار وہ سیٹھ صاحب نے اپنے پاس رکھا۔ بڑی سمانی شخصیت بہر حال پھر بھی بڑی خوش تھی اور اس نے بچنے میں بڑی سی راج کھول لی تھی۔ اور قلاتی کام ہوتے رہے اور نہ خانے میں ایک سپورٹ کے مال کے کمرے میں بیرونی پیک ہوئی رہی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش تھے گلشن کا کامدادار بھی خوش چل رہا تھا کہ سچ میں مجھ جیسا نامراد دیکھا جسے مسیتیں راہ چلے آواز دے لیتی ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے آنکھیں مسلیں پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ایسے ہی ایک اتفاق کے تحت۔ جس طرح آج آپ سے ملاقات ہوئی ہے اسی طرح وہ معاملہ میرے علم میں آگیا۔ میں نے سیٹھ صاحب کے اثر و رسوخ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اور اپنے افسروں کو ناراض کرتے ہوئے اس معاملے کو اوجھڑا دیا۔ سب کچھ ٹھپ ہو گیا۔ سیٹھ صاحب فی الحال باہر بھاگے ہوئے ہیں، مجھ پر ہر طرف سے بڑا دباؤ پڑے ہوئے سمانی شخصیت مجھ پر اپنا سمانی دباؤ ڈال رہی ہے کہ اس معاملے میں خواہ مخواہ ان کا نام لوٹ ہوگا اور بات نہ جانے کس طرح پلک تک پہنچے ان کی نیک نای پر حرف آئے گا۔ سیٹھ صاحب کے نمائندے نے آج بڑی رقم کا بریف کیس مجھے تھمانے کی کوشش کی۔ میں چھوٹا سا افسر۔ کتنی بڑی بڑی مشکلوں میں گھرا ہوا ہوں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے افضل صاحب؟"

"بہت اچھی طرح اندازہ ہے لیکن فی الحال اس چھوٹی سی مشکل کو دیکھ لیجئے جو آپ کی میز پر رکھی ہوئی ہے۔" میں نے پکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ابھی تک اسے دو زور اختیار ہی نہیں سمجھا تھا۔

وہ کرسی پر کچھ آگے کو جھک آیا۔ آنکھیں میڑھتے ہوئے اس نے پکٹ کو چھری سے چھوا اور قدرے حیرت سے بولا "یہ ہے وہ پکٹ؟"

اس کی حیرت بجا تھی۔ بظاہر وہ پکٹ بہت حقیر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو رحیم گل نے اکرم کو اشارہ کیا "اکرم صاحب! احتیاط سے اسے کھولیں۔ میں اور افضل صاحب مل کر دیکھتے ہیں کہ یہ دھماکے سے نہ پھٹے یا اس میں سے زہریلی گیس خارج نہ ہو۔"

اکرم ہچکچاہٹ آمیز انداز میں پکٹ اٹھا کر گویا اپنے آپ کو یقین دلاتے ہوئے بولا "اس میں ایسی کوئی چیز تو نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس کے لئے قتل و عداوت ہو رہی ہے۔ گولیاں چل رہی ہیں۔"

اس نے نہایت احتیاط سے ہاتھوں سے پکٹ کا کھانا اندر سے نکلنے کا ایک مضبوط ڈبا نکل آیا۔ اس ڈبے کو کھول کر چوڑے کی ایک مستطیل تھیلی برآمد ہوئی جس میں بڑی جھلس ہوئی تھی۔ اکرم نے زپ کھول کر اس میں جھانکا۔ ٹیکے کے نام میں اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے تھیلی رحیم گل کی آٹ دی۔ ہلکی سی کڑکڑاہٹ کے ساتھ مختلف سازو سامان کے ہیرے میز کے پیشے پر بکھر گئے۔ کبھی ہیرے اچھے خاصے ہوتے تھے اور غالباً پوری تھیلی ہیروں سے بھری ہوئی تھی۔

"اوہ!" رحیم گل کے منہ سے بے اختیار نکلا اور نظر پڑا جم کر رہ گئی لیکن ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کر لی کہ ان آنکھوں میں لالچ نہیں، خیرت تھی۔ میرے اندازے کے خلاف گری سے گری حالت میں بھی وہ ہیرے ایک کرڈے سے کم کے نہیں تھے اور شاید یہ قدرت کا ایک عجیب قماش تھاکر ساری مار دھاڑان کے لئے ہو رہی تھی تب بھی وہ مار دھاڑان والوں کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ اگر نوٹی کو معلوم ہو جائے کہ کی جس کار کو وہ سڑک کے کنارے چھوڑ چلا گیا تھا۔ اسی کی کے کھانچے میں یہ ہیرے موجود تھے تو شاید وہ افسوس کے مار خود کشی کر لیتا۔

چند لمحے کے سکوت کے بعد رحیم گل کمری سانس لے کر "عجب بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ نوٹی کی زبان میں یہ ہے۔" چوکرز کے ہاں ملازم تھا۔ بد عنوانی کے الزام میں نکالا گیا تھا اب وہ جس پکٹ کے لئے مار دھاڑ کر رہا تھا اس میں بہت سے ہیرے تھے۔ اب کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ نوٹی تصور میں کہاں فٹ بیٹھا ہے۔"

"میرے خیال میں یہ اتنی بڑی کمائی نہیں ہو سکتی۔" میں بھی ذرا اپنے ذہن کے کل پر زوں کو ہلاتے ہوئے کہا "وہ چوکرز کے ہاں کام کرتا تھا اگر وہاں سے اتنے ہیرے نکلے تو وہ محض اسے نکالنے پر اکتفا نہ کرتے۔ وہ تو اس کی گردن دیتے۔ اسے ہاتھ ملک بھی نہ چھوڑتے۔ خصوصاً جبکہ اس وقت اتنا برا بدعاش بھی نہیں بنا تھا۔ یہ تو کوئی جی کمائی معلوم ہوتی جس میں کیس فرمیں بھی فٹ ہوتی ہے۔"

رحیم گل پُر خیال انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ قہر توقف کے بعد میں نے کہا "فی الحال تو یہ بھی یقین سے بتا جاسکتا کہ نوٹی اس پکٹ ہی کے پکڑ میں تھا کیونکہ اس نے مجھے کسی پکٹ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھ پر پوچھا تھا کہ فرصت نے مجھے کوئی چیز دی تھی یا نہیں؟" جانا چاہتا تھا کہ فرصت نے مجھ سے کیا کیا تھا۔ مجھے کیا بتانا؟ نوٹی نے ایک عجیب سا سوال یہ بھی کیا تھا کہ میری ہمدردی کے ساتھ ہیں؟ اس سوال کا مقصد تو میری سمجھ میں بالکل ہی آیا تھا۔ یہ سب باتیں میں آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں۔"

نہیں۔

میں کندھے اچکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اب معلوم ہو چکا تھا کہ پیکٹ میں کیا تھا۔ میرا تجسس اب ختم ہو چکا تھا۔ میں نے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ اب آپ کے پاس ہی رہے گا؟"

"خاطر ہے یہ میں آپ کو تو نہیں دے سکتا۔" رجم گل نے جواب دیا۔

"میں نے کب مانگا ہے۔ مجھے ایسی چیزیں اپنے پاس رکھنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ جن سے میرا کوئی تعلق نہ ہو۔" میں نے ناگواری سے کہا "میں تو صرف یہ جانتا چاہ رہا تھا کہ کہیں آپ اسے مال خانے وغیرہ میں تو جمع نہیں کرادیں گے؟" میں نے ذرا ناگواری سے کہا۔

وہ میری ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے ذرا معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "میرا مقصد آپ پر بے اعتمادی کا اظہار کرنا نہیں تھا۔ میں تو دیکھ رہی تھی کہ ہا تھا۔ میرا اسے مال خانے میں بھی جمع کرائے گا کوئی اور اور نہیں کیونکہ پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔ میرے اور اکرم کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں جانے کے بعد ان کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہو گا خواہ کتنی ہی قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے اس لئے جب تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہو جاتا کہ ان پر دراصل کس کا حق بنتا ہے تب تک یہ میرے پاس ہی محفوظ رہیں گے۔"

اس نے اٹھ کر پیکٹ لوہے کی ایک الماری میں رکھ کر اس دروازہ کو قفل کر دیا۔ میں نے دیکھ لیا کہ میں "خیال رکھیے گا۔ فی الحال اس کی حیثیت متحولہ فرمیں کی امانت کی ہے۔ اس نے یہ کہہ کر پیکٹ میری حفاظت میں دیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی ضمانت ہوگا۔ اس کی مراد غالباً یہی تھی کہ جب تک کوئی نامعلوم شخص یا اشخاص اس سے یہ پیکٹ حاصل نہیں کر لیں گے تب تک اسے قفل نہیں کریں گے لیکن افسوس کہ اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ میں فی الحال یہ میرے اسی کی امانت سمجھ کر رکھ رہا ہوں اور اگر یہ واقعی اس کی ملکیت ثابت ہوئے تو میں اس سے حلق رکھنے والی کسی ایسی ہستی کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کروں گا جو فرمیں کے بعد ان ہیروں کی مستحق نظر آتی ہو۔ میں یہ امانت ضرور اس تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

میں مطمئن ہو کر تھانے سے نکل آیا اور سینہ رمضان کی دی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل کی طرف واپس روانہ ہو گیا۔ تمام راستے میں چاروں طرف کا جائزہ لیتا آیا کہ شاید کہیں فوڈی کسی گاڑی میں جاتا نظر آجائے شاید وہ میرا خائب کر دیا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔

ہوٹل میں داخل ہو کر میں نے دیکھا لابی میں خلاف معمول

جا رہے ہوئے آپ لوگوں کو کسی ٹیبل پر بیٹھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میں نے مشورہ تو دے دیا لیکن ایک لمبے کے لئے مجھے اندیشہ ہوا کہ رجم گل بڑی ہی نہ متا چائے۔ سرکاری کرسیوں پر بیٹھنے والے لوگ عموماً خود کو مفضل ٹھہرتے ہیں۔ انہیں ان کے کام کے ٹیبلے میں مشورہ دیا جائے تو وہ اسے کام میں مداخلت تصور لے لیں۔ رجم گل تو دیکھتے ہی پولیس والا تھا تاہم یہ دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار نہیں ہوتے۔ وہ بڑا خیال انداز میں ہنکارا بھر کر نکلا۔ اسی لمحے سب ٹیکس اکرم نے اپنا منہ بند کر لیا جو میرے دیکھنے کے بعد سے اب تک لگا ہوا تھا۔ وہ گاڑی سے پیکٹ نکال کر لے رہا ہوا تو شاید اس نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اس میں ایک کوڑے کے پیرے موجود تھے شاید وہ اسے بیرونی دنیا اسی حکم کی کسی دوسری چیز کا پیکٹ سمجھ لے۔

رجم گل نے خود پیرے سمیٹ کر دوبارہ چھلی میں ڈالے اور ان کو تقریباً پہلے جیسی حالت پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "آپ کو یقین ہے نا کہ فرمیں نے آپ کو جو پیکٹ عطا کر دیا تھا؟"

"خاطر ہے ورنہ یہ میری بتائی ہوئی جگہ سے کیسے مل سکتا تھا۔"

میں نے جواب دیا۔

رجم گل نے سر ہلایا۔ ایک لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا "تقریباً ہر گز میں جب آپ شو کے بعد فرمیں سے ملنے گئے تو آپ کو تاہم کہہ کر اسے اس کے ہاتھ سے آپ کا خائب نہیں کیا تھا؟"

میں نے اس کا خیال رکھا تھا۔ میرا اندازہ تو یہ تھا کہ کسی غیر خائب نہیں کیا تھا۔ راجداری کافی لمبی تھی اگر کوئی میری بات کو سمجھنے ضرور احساس ہو جاتا۔ میں نے جواب دیا۔

"اس کے باوجود جب فوڈی اور اس کے ساتھی نے نیچے گھسٹ میں آپ کو اغوا کیا تو انہیں معلوم تھا کہ آپ فرمیں والے کو آ رہے ہیں؟" رجم گل بولا۔

"ہاں" میں نے تسلیم کیا۔

میں کا مطلب ہے نیل ٹائی جو شخص فرمیں کی طرف سے ہلاک کرنے کے لئے آیا تھا اور آپ کو اس کے پاس لے گیا تھا وہ ہلاک ہے۔" رجم گل بولا۔

میں اس مسئلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ "میں نے بہت سے فرمیں نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اس کے بھروسے کا خائب ہے۔"

مجھ سے تو ہی تو بعض اوقات سوا دیتے ہیں افضل رجم گل کسی کسی سانس لے کر بولا "ہو سکتا ہے اسی نے ہلاک کر دیا کہ اس کی ہو۔ میرا خیال ہے میں آج کسی وقت اسے ہلاک کروں گا۔ اس سے فوڈی بہت پوچھ گچھ کرنے میں کوئی حرج

میں نے لٹاف جاک کیا تو اس میں سے ہمارے ہی ہوئے  
ایک چٹ برآمد ہوئی لیکن وہ سادہ تھی۔ میں نے اسے اٹھ لیا  
دیکھا۔ اس پر دونوں طرف کچھ نہیں لکھا تھا۔ صرف ہوئی لکھا  
اور مونو گرام چھپا ہوا تھا۔

میں نے کلرک کے سامنے ہی لٹاف کھولا تھا اور وہ مجھ پر  
تھا کہ چٹ سادہ تھی۔ وہ کچھ پریشان اور غمازست زہ سادہ نظر  
لگا۔ صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا "سرا میں نے اس  
اس میز پر جا کر کچھ لکھتے تو دیکھا تھا۔" اس نے دور کوٹے میں  
ہوئی میز کی طرف اشارہ کیا۔

"شاید آخری وقت میں اسے اپنے پیغام پر شرم آئی ہو  
اس نے اس کی جگہ یہ سادہ چٹ رکھ دی ہو۔" میں نے سکا  
ہوئے کہا "یا پھر شاید اسے ابھی تک بیچن کے مشغلہ ہونے  
اس نے غائب ہونے والی روشنائی سے پیغام لکھا ہو۔ میں نے گریے  
جا کر اسے بلب سے حرارت پسپا کر دیکھوں گا شاید پیغام نمودار  
ہو جائے۔"

مجھے مطمئن انداز میں مسکراتے دیکھ کر شاید کلرک  
تکبر باہت کچھ کم ہوئی۔ تب میں نے اس سے پوچھا "کلیہ کیا تھا  
فحص کا؟"

اس نے ایک ایک کر کے بتانے کی کوشش کی اور کئی  
بدر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نوزی کا کلیہ بیان کر رہا تھا۔ میرے  
گویا جھرمجھری کے لریدار ہو گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا  
لٹاف دینے کے بعد وہ فحص کہاں گیا؟

"سرا یہ تو میں نہیں دیکھ سکا۔ میں مصروف ہو گیا تھا لیکن  
خیال ہے وہ وہاں ہی چلا گیا تھا۔" کلرک کے لیے میں ایکسا  
تکبر باہت جھٹک آئی۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔" میں نے اسے  
"آئندہ اگر کوئی میرے بارے میں پوچھے آئے اور تمہیں وہ  
ذرا بھی مشکوک لگے تو کم از کم نذیر چوہدری کو ضرور اطلاع دے دو  
کر دیا کرو۔"

نذیر چوہدری ہوٹل کا سکیورٹی انچارج تھا۔ کلرک نے اس  
میں سر ملایا اور میں لٹف کی طرف چل دیا لیکن اب میں جا  
اور گردن تھماتے بغیر میری نظر چاروں طرف تھی۔ میں تمام  
جس فحص کی تلاش میں نظر دوڑا آیا تھا وہ خبریاں میری  
میں آیا تھا۔ وہ نہ صرف مجھے جانتا تھا بلکہ اسے یہ بھی معلوم  
میں آج کل اپنے ہی ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس کی دیدہ دلزدگی  
قابلِ دانش۔ یا پھر شاید قابلِ غور تھی۔ وہ نہ جانے کتنے قانون  
کن وارداتوں میں مطلوب تھا لیکن وہ نہ جانے شہر کے کون کون  
باردق مقامات پر دندناتا پھرتا تھا جتنی کہ ایک فانیہ اشارہ ہو  
بھی درشن دے گیا تھا۔ بلاشبہ ہم گلابات کے دور میں داخل  
تھے۔

کافی روایتی نظر آ رہی تھی۔ چند غیر ملکی دنیا جہان سے بے نیاز ادھر  
ادھر صوفوں پر بیٹھے اخباروں کے مطالعے میں غرق تھے۔ ایک سفید  
قام پختہ عمر شخص کافی دور بیٹھی ایک سفید قام شہرے پاؤں والی  
نوجوان لڑکی کی طرف بڑی بیٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا  
تھا مگر وہ اسے قطعاً لٹ نہیں کر رہی تھی۔ لڑکی چست نئی جینز  
اور ہوشیار قسم کی شیش جرسی میں تھی۔ وہ کسی اور خیال میں ڈوبی  
ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہی عمر کے اس مرد نے اگر قریب جا کر  
بھی اس سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی تو نہ کی کھائے گا۔  
اپنے جیسے۔ یعنی وہی لوگوں کی بھی روایتی ٹولیاں ادھر ادھر  
موجود تھیں۔ کچھ نئے صمان بھی آئے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر ان کے  
تاسوں وغیرہ کا اندراج ہو رہا تھا۔ کارڈ پڑھتے جا رہے تھے۔ میں یہ  
تمام سر کر میاں دیکھتا ہوا لٹف کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ ایک کلرک  
کی نظر مجھ پر پڑی جو شاید اذرا مہربانی مجھے ہوٹل کے مالک کی  
حیثیت سے پہچاننے لگا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے سلام کیا اور  
ساتھ ہی رکنے کا اشارہ بھی کیا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ایک طرف کو ہوتے ہوئے نیچی  
آواز میں بولا "سرا ایک صاحب آپ کا پوچھتے ہوئے آئے تھے۔  
آپ کا کرا نمبر معلوم کر رہے تھے۔"

پلے مجھے گماں گزرا کہ کہیں سیٹھ رمضان نہ آیا ہو لیکن پھر  
مجھے یاد آیا کہ اسے تو میرا کرا نمبر وغیرہ سب معلوم تھا اور ہوٹل کا  
بیشتر عملہ اسے مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کے لئے شاید کلرک  
"ایک صاحب" کے الفاظ استعمال نہ کرتا۔ سیدھی طرح سیٹھ  
رمضان کہتا۔

میں نے فوراً پوچھا "تم نے بتا تو نہیں دیا؟"  
"نہیں سرا" اس نے جلدی سے نفی میں سر ملایا۔ گو کہ میں  
ہوٹل کے عملے کو اس سلسلے میں خاص طور پر کوئی ہدایت کرنا معمول  
کیا تھا لیکن کلرک ٹھنڈی ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے قدرے اطمینان کی سانس لے کر کہا "کون صاحب  
تھے؟ انہوں نے اپنا کچھ نام بتایا نہیں بتایا؟"

"جی نہیں۔ مجھے تو نہیں بتایا لیکن وہ آپ کے لئے پیغام چھوڑ  
گئے ہیں۔ شاید اس میں لکھا ہو۔" وہ اس وقت تک عجبیہ دوار کی  
طرف مڑ چکا تھا جس میں چوٹی خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے پر  
نمبر موجود تھا۔ جس خانے پر میرا سوئٹ نمبر نظر آ رہا تھا اس سے  
کلرک نے ایک لٹاف نکال کر میری طرف بڑھایا۔ وہ ہمارے ہی  
ہوٹل کا لٹاف تھا۔ اس پر بڑی جگت میں میرا نام لکھیا گیا تھا۔ یہ  
کوئی تشویش کی بات نہیں تھی کہ وہ ہمارے ہی ہوٹل کا لٹاف تھا۔  
لالی میں ایک کونے میں چھوٹی ہی ایک خوب صورت میز کرسی لگی  
ہوئی تھی جس پر مختلف خانوں میں ہوٹل کی ایشیٹری موجود تھی۔  
کوئی فحص ہوٹل میں مقیم صمان کے نام کوئی پیغام چھوڑنا چاہتا تو  
اس سہولت کو استعمال کر سکتا تھا۔

میرے جسم میں خفیف سی جھرجھری آگئی۔ دروازہ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے عقب میں بند کر دیا۔  
گرا خاصا سی اجڑی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ڈرامک نیل وغیرہ کی درازیں کھلی پڑی تھیں۔ بیڈ کی میٹریں اٹکیے اور صوفوں کے نقش وغیرہ کسی تیز دھار چڑے سے کاٹ دیے گئے تھے اور ان کا فوم گویا کسی جنونی ہندو نے ادھر ادھر کھیر کر رکھ دیا تھا۔

میں نے تجسس ہو کر ہاتھ روم میں جھانکا۔ وہاں بھی کچھ ایسی سی اجڑی نظر آئی۔ کینٹ کھلی پڑی تھی۔ چپڑیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ توپے بھی شافت سے اٹھا کر نیچے پھینک دیے گئے تھے حتیٰ کہ فٹس کی کنگی بھی کھلی ہوئی تھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کسی کو نہایت ہی شدت سے کسی چیز کی تلاش تھی جو یقیناً اسے یہاں نہیں ملی تھی۔

میں واپس بیڈ روم میں آکر چند لمبے جمیل کا جائزہ لیتا ہوا۔ اس کا کلا اسی صوفے پر بیٹھے بیٹھے کاٹا گیا تھا اور اگر وہ تھوڑا بہت نرپا تھا تو اس دوران اسے قابو میں رکھا گیا تھا کیونکہ خون صوفے پر زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا۔ زیادہ خون اس کے گردن میں سے ہوتا ہوا تھوڑا بہت نیچے پھیلا تھا۔ معلوم نہیں جمیل نے کسی کو ذلیل کر اس کیا تھا یا نہیں۔۔۔ سرحال میرے دل میں اس کے لئے تأسف کی لہر ابھری تھی۔ ابھی میرے ذہن کے بعض گوشوں سے دی افسردگی محو نہیں ہوئی تھی جو فرہین کی لاش دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ مزید افسردگی میرے حواس کو کند کر سکتی تھی جبکہ میرا واسطہ یقیناً بڑے شگاف آدمی یا آدمیوں سے تھا۔ میرے لئے بالکل چاق و چوبند اور تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ مستعد رہنا ضروری تھا۔ ذرا حواس کے شل ہونے یا ذہن کے مضطرب ہونے کے نتیجے میں میرے گلے پر بھی ہشتاد و ختم نمودار ہو سکتا تھا۔

میں نے افسردگی کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے ٹیلی فون اٹھایا اور سب سے پہلے رحیم گل سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے قہانے ہی میں مل گیا۔ اپنا نام بتا کر میں نے بلا تہدید پوچھا ”تم نے جمیل کو گولوانے کے لئے اپنے آدمیوں کو تو نہیں بھیجا؟“

”ابھی کوئی آدمی فارغ ہی نہیں ہے لیکن گھنٹے آدھ گھنٹے تک میرا بھیجے گا ارادہ تھا۔“ رحیم گل نے جواب دیا پھر پوچھا ”کیوں۔ کیا بات ہے؟“

”اب یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے ہوش مند۔ میرے کمرے میں موجود ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا ”مجھے کسی کو بھیجنے اور اسے تلاش کرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اسے وہیں روکے رکھیے گا۔ مجھے جلد ہی کچھ فرصت میرے آنے والی ہے۔ میں سیدھا آپ کی طرف آؤں گا۔ وہیں اس سے کچھ سوال جواب کر لوں گا۔ ضروری ہوا تو اسے قہانے لے آؤں گا۔ ورنہ وہیں سے وہیں اس کی جان چھوڑ دوں گا۔ میرے آنے

بجائی منزل پر پہنچ کر میں نے لٹ سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ راپارڈی ویران نظر آ رہی تھی۔ دیوار کالین پر بھی میں نہایت جلد انداز میں قدم رکھتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا تاکہ ذرا سی بھی آہستہ پیدا نہ ہو۔ دروازے سے کان لگا کر میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا کوئی آواز سنائی نہ دی۔

پھر میں نے تاب کا معائنہ کیا کہ آٹے سے چھینر چھار تو نہیں کی گئی۔ آٹا نہایت عمدہ قسم کا تھا اور اس پر چھینر چھار کا کوئی نشان و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا ”ساتھ کرام“ کے لئے آٹے پر کوئی نشان چھوڑے بغیر اسے کھلی کر اندر داخل ہو جانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

میں نے اپنی چال سے آٹا کھولا اور دروازے کو یکدم اندر دھکیل کر خود باہر ہی دھڑ سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ شاید اندر کوئی ”سمران“ میرے استقبال کے لئے موجود تھا لیکن کسی سیکنڈ تک انتظار کرنے کے بعد بھی کوئی رزق ظاہر نہ ہوا۔

آخر کار میں نے سر دھرا سا آگے کھسکا کر کمرے میں جھانکا۔ جو حد درجہ تنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ذرا غصہ مول لیتے ہوئے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ ٹیلی کی طرح بے آواز قدموں سے چپوں کے بل چلتے ہوئے میں نے ڈرائنگ روم عبور کیا۔

بجروں کی دنیا میں فوڈی یقیناً بہت بڑا بد معاش اور بدبخت گرد ہو گا لیکن میں اس طرح کے بد معاشوں سے منہنے کے لئے ہوش کے تکیوں کی اسلاف کی مدد لیتا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا یہ اعتماد اپنی نظر میں برقرار رکھنا چاہتا تھا کہ اس طرح کے بد معاشوں سے منہنے کے لئے میں اکیلا ہی کافی تھا۔ اس وقت میں غالی ہاتھ تھا لیکن اس سے بھی میری خود اعتمادی میں کمی نہیں آئی تھی۔ درحقیقت مجھے اس کو خود اعتمادی کا نام نہیں دینا چاہئے تھا۔ میرا یہ اعتماد اصل میں کسی اور پر تھا جس نے میری تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا تھا وہ اٹل تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے درمیان موجود محرابی سے دروازے کی آڑ لے کر بیڈ روم میں جھانکا۔ میرے بیڈ کے قریب پہنچتے ہوئے ایک صوفے پر جمیل بیٹھا تھا۔ وہی جمیل جو کبھی استاد ہوئی میں فرہین کے شو کے اختتام پر مجھے بلا کر فرہین کے پاس لے گیا تھا اور جو بقتل فرہین اس کے بھروسے کا آدمی تھا۔

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار تھی یا پھر شاید اس کے ہونٹ اس طرح کھینچ کر رہ گئے تھے۔ اس کی نظر دروازے پر جمی ہوئی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار رہا ہو لیکن اس کی آنکھیں سب سے نور تھیں۔ اس کا لگا نہایت سنائی سے ایک کان سے ”کمرے کان تک کٹا ہوا تھا۔ ایک اور ہشتاد و ختم میرا منہ کھڑ تھا۔ مل بوقت ضرورت بے حد سنجیدگی بھی ہو سکتا تھا لیکن اس لئے

تک اسے کہیں جانے نہیں دیتے گا۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔“

میں نے گردن ٹھٹھا کر جمیل کی طرف دیکھا اور کہا ”مجھے یقین ہے کہ وہ بھاگنے یا کہیں جانے کی کوشش ہرگز نہیں کرے گا اگر وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلے تو اس کی گردن پیچھے کو ٹنگ جائے گی۔“

رحیم گل ایک لمحے کے لئے خاموش رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا ”وہ مر چکا ہے؟“

”مکمل طور پر۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ مائی گاڈ!“ وہ ہماری سانس لے کر رہ گیا ”میں آ رہا ہوں۔“

”تم کیا آ کر اسے زندہ کر دے؟“ میں نے بے اختیار کہا۔

”یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ افضل صاحب!“ وہ گویا برا مانتے ہوئے بولا ”یہ میرا کیس ہے اور مجھے اس کے سلسلے میں ہر موقع پر پہنچنا پڑے گا۔ اس علاقے کا ایس ایچ او بھی میرے ساتھ ہو گا جس میں آپ کا ہوٹل واقع ہے۔“

”خدا کے لئے زیادہ بھیڑ بھاڑ لے کر مت آنا۔“ میں نے جلدی سے کہا ”آج کل ویسے ہی میرے ستارے گردش میں ہیں۔ اب مشکوک قسم کے لوگوں نے میرے صاف ستھرے ہوٹل میں آکر بھی مرنا شروع کر دیا ہے۔ کہیں اس کا بزنس بھی چوہٹ نہ ہو جائے اس سے پہلے یہاں اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جس سے اس کی شہرت ذرا بھی داغدار ہوئی۔“

”میں کوشش کروں گا کہ اب بھی آپ کے پیارے ہوٹل کی شہرت پر حرف نہ آئے۔ میں حتی الامکان رازدارانہ انداز میں وہاں پہنچنے اور تمام کارروائیاں رازدارانہ انداز میں ہی انجام دینے کی کوشش کروں گا لیکن فی الحال میرے اور دوسرے ایس ایچ او کے لئے سادہ لباسوں میں پہنچنا ممکن نہیں ہو گا۔“ وہ بولا۔

”چلو خیر تم جتنی احتیاط کر سکو گے میرے لئے اتنی ہی قیمت ہوگی اور میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں گا۔“ میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

”یہ آپ کی کسر نفسی ہے افضل صاحب!“ وہ شکر گزاری سے

بولتا تھا کہ آپ ہم جیسے چھوٹے افسروں سے اتنے اعزاز سے پیش آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ درند میرے اندازے کے مطابق جہاں تک آپ کی چیزیں پہنچی ہوئی ہیں وہاں تک رسائی رکھنے والے تو ہم جیسے افسروں کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔“

”ڈانڈا رازداریوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے فیروز رحیم گل! وہ چھوٹے بھی ہوں تو مجھے بہت بڑے لگتے ہیں۔ آج کے دور میں اگر کوئی ڈانڈا رازی اور اونچے اصولوں پر قائم ہے تو وہ بلاشبہ جہاد کر رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کس طرح خراج تحسین پیش کروں۔“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

”بس بس افضل صاحب! مجھے زیادہ باتس پر نہ چڑھائیں۔ میں

میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

اس نے یہ انتظار نہیں کیا کہ میں اسے پیٹنے کا اشارہ کروں۔ وہ ایک صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ پھر شاید اسے خیال آیا کہ ابھی بے غلطی میں کچھ کی تھی۔ اس نے جوتے، موزے آثار کر ایک طرف اٹھالے اور پاؤں بھی صوفے پر رکھ لئے۔ وہ آج تھری پین سوٹ میں تھا۔ کارپر گلاب بھی لگایا ہوا تھا کہ شیو بڑھا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

یہ سینہ رمضان کا اسٹائل تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قوی کو پر ٹیکٹ نہیں نظر آتا چاہئے کچھ نہ کچھ کی ضرورت چھوڑنی چاہئے۔ اگر اس کا شیوہنا ہوتا، بال سلیف سے سنورے ہوتے، جسم پر اسی طرح عمدہ سوٹ ہوتا تو عین ممکن تھا وہ بیروں میں قبول پس کر چلا آتا۔ اس کے ساتھ دو سراخ گاڑ بھی تھے جو لابی میں عیادروازے سے خامے فاصلے پر بڑک گئے تھے۔

جوتے اتارنے کے بعد سینہ رمضان گیا سکون کی سانس لے کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نے اپنے گلے کی حفاظت کا بھی کوئی بندوبست کیا ہوا ہے یا نہیں؟"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"بھئی تمہارے جانے والوں کے گلے اتنی تیزی سے کٹ رہے ہیں پہلے اس حینہ کا کھانکنا جس کا شو دیکھنے کی ہمیں حسرت رہ گئی۔ پھر ایک اور آدمی کا کھانکنا کیا جو بے چارہ غلطی سے صرف ایک مرتبہ تم سے ملا تھا۔ لگتا ہے اب تو تم سے ملتے وقت اپنے گلے کی فکر کرنا پڑے گی۔ میں تو اسی لئے گاڑا ساتھ لایا ہوں۔ میں تو گلے پر لوہے کا خول بھی پہن کر آئے گا تھا۔ پھر میں نے سوچا گردن اور دھڑکڑھما کر خوب صورت خواتین کو دیکھنے میں دقت ہوگی۔ اس لئے تمہارا سارمک لے لیا۔ بہر حال... انسان کو اپنے گلے کی حفاظت کرنی چاہئے لوگ ایسے قوی کو دوست بنانا پسند نہیں کرتے جس کا کھانکنا ہو۔ کیا خیال ہے؟"

"آج اتنا چمک کیوں رہے ہو؟" میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو بتانا ہوں۔ پہلے کچھ کھانے پینے کو مگاد۔" وہ صوفے پر آلتی بائیں مار کر بیٹھے ہوئے بولا "قسم سے تمہارے ہوٹل میں مجھے بالکل اپنے گھر جیسا آرام محسوس ہوا ہے، کبھی بھی قوی میں سوچا ہوں کہ خواہ مخواہ اتنے بڑے جنگلے میں ڈھالی ٹیلی کمبرز اور پندرہ نو کمر کے ساتھ پڑا ہوا ہوں کیوں نہ اور حری آجاؤں۔"

"تو آزاد۔ کس نے منع کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"لیکن پار جب تم یہاں نہیں ہوتے ہو تو پھر میرا یہاں بالکل دل نہیں لگتا۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔

میں نے فون پر اس کے لئے کھانے پیٹنے کا کچھ بندوبست کیا اور رہیور رکھتے ہوئے کہا "دیکھو یہ ہوٹل اب بھی تمہارا ہی ہے۔ کبھی تمہارا اس میں تقریباً چالیس فیصد حصہ تھا۔ تم نے خود ہی اپنا

صرف فرض ادا کر رہا ہوں۔"

"جی تو ایک کام ہے جو یہاں بہت کم لوگ کر رہے ہیں۔" میں نے توجہ کرکما "بیشتر لوگ یہاں صرف فرض ادا نہیں کر رہے۔ بالکل سب کچھ کر رہے ہیں۔"

اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔



محالہ میری توقع سے کہیں زیادہ خاموشی سے منٹ گیا لیکن یہ مزہ رحیم کل کے تعاون کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ میرے ساتھ اس کا روپ اب کافی حد تک دوستانہ تھا اور اس کی بڑی وجہ شاید مزہ یہ تھی کہ اب اسے یقین آ گیا تھا کہ میں کوئی غلط آدمی نہیں تھا۔

اسی رات میں ایک دوسرے مشکل بیڈ کمرے میں منتقل ہو گیا۔ ٹیبل کی موت کے سلسلے میں کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ قہر کرے سے کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ بس یہ اندازہ ہوتا تھا کہ (زین اور جمل کا قاتل ایک ہی تھا۔ طریقہ واردات بالکل یکساں اور نہایت ماہرانہ تھا۔

رحیم کل اپنے حساب سے تفتیش میں مصروف تھا لیکن میں نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ جب تک کوئی نئی بات سامنے نہ آئے میں اپنی اپنے پرنس کی طرف تھوڑی سی توجہ دے لوں۔ اسی لئے دس روز میں نے اپنے کراچی آفس کا بھی ایک پکر لگایا اور کئی گئے وہاں گزارے۔ بہت سے معاملات کو دیکھا۔ بہت سے مسائل ٹھنکے۔ اس کے بعد میں نے پورٹل والے آفس میں ڈیرا ڈالا۔ اسی دوران سینہ رمضان بھی ملاقات کے لئے آسپکا۔ اسے مل فون پر تمام حالات سے آگاہ کر چکا تھا اور اس نے مجھے خوب بتا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھ پر مصیبتیں آتی نہیں تھیں۔ لیکن خود وہ ڈوڈر مصیبتوں کا چھوٹا تھا اور ہاتھ باندھ کر ان کا منت کرنا تھا کہ وہ میرے گلے پڑ جائیں۔ میں نے اس کے خیال کا تردید نہیں کی تھی ورنہ وہ مجھے اور ڈانٹا۔

اس نے مجھے آفس میں فائلوں اور کاغذات کے انبار کے قریب میں بیٹھے دیکھا تو اس کی باچھیں کل گئیں۔ خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا "بھرا ایک مدت کے بعد پرنس میں کے روپ میں آگیا۔ دیکھو یہ ہو تو روح کو تازگی ملی ہے ورنہ تم نے تو بالکل ہی لشکروں، لشکروں والی زندگی اپنا لی تھی۔ یہاں خون خرابا، یہاں مار دھانسا، یہاں اغوا، یہاں دھماکے۔ ابے میں ایک بار پھر جیسے جیسے ہلکے دمیت کرے گی کہ شش کر رہا ہوں کہ تم اٹھل چھل کر دیو۔ دوسرے بننے کی کوشش مت کرو کیا سمجھے؟"

میں اس سے کتنا چاہتا تھا کہ مجھے رہیور بیٹے کا قتلہ کوئی شوق ملے تھا۔ میں کب بننا تھا۔ حالات بتا رہے تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ رمضان میرے اس موقف کو تسلیم نہیں کرے گا اس لئے

سانس لے کر کہا ”مجھے جیسے معزز آدمی سے دوستی رکھنی ہے تو میرا  
ذرا معزز بننے کی کوشش کرو۔“

”کیا کتنے تمہاری عزت داری کے!“ وہ سینڈویچ نے کہا  
”نوالے کو کافی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اُتارنے کے بعد  
”تمہارے معزز ہونے کا ثبوت تو میں اپنی جیب میں لے کر  
ہوں۔“ اس نے اپنے کوٹ کی بڑی سی جیب کو ہاتھ میں لے کر  
رہے تھے تاکہ آج میں اتنا چمک کیوں رہا ہوں۔ اس کی دھڑکن  
میں تھی کہ تمہاری عزت داری کا جو ثبوت میں جیب میں لے کر  
پھر رہا ہوں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر محفوظ ہو رہا تھا۔  
”کسی نے تمہاری خوب ہی نہیں ہے۔“

”کیا کتنا چاہ رہے ہو؟ کیا چھپا لائے ہو اپنی اس خفیہ گنجائش  
میں؟“ میں نے ایک بار پھر سخت لگا ہوں سے اسے گھورا۔  
”لگتا ہے تم نے نہیں پرہیز کیا ہے ورنہ اتنے مطمئن بیٹھے نظر  
آتے تو وہ بہت ہل ضرور ہوجا رہے ہوتے۔ ورنہ کم از کم  
سانس ہی تیز چل رہی ہوتی۔“ وہ گویا کسی تصور سے محظوظ  
ہوتے ہوئے بولا۔

”تم کچھ زیادہ ہی سہنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔  
اس کوشش میں کہیں مریض نہ بن جاؤ۔ دل تمہارا دینے ہی ضرور  
ہے۔“ میں نے کہا ”جیب میں جو کچھ ہے خاموشی سے نکال دو۔  
ورنہ میں آفس کے ڈسٹن اور اپنی تمام تر بچیدگی کو ہالے ہالے  
رکھتے ہوئے تمہاری اس بے ہنگم گردن پر کرانے کا ایک کدھ اٹھ  
رسید کر دوں گا۔ تم جیسے آدمی کو اس جہانِ فانی سے کوچ کرانے کے  
لے ایک آدھ ہاتھ ہی کافی ہو گا۔“

”ہاتھ پائی کی نیس ہو رہی ہے۔“ وہ جلدی سے ہاتھ  
اٹھاتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے جیب سے ایک ترشیدہ اخبار نکال  
کر میری میز پر پھینک دیا اور ایک دوسری پلیٹ سے انڈین  
سینڈویچ اٹھاتے ہوئے نکلتا ”خبر اس پریش دوش کا اور پھر کیا  
اپنا۔“

میں نے اخبار کی تھیں کھولیں۔ وہ انگریزی کے روزنامہ  
”مون“ کا رنگین ایڈیشن تھا۔ مجھے فوراً مشتاق مدثر یاد آیا۔ جو ان  
اخبار کے شو بزنس اور کلچرل رپورٹر کی حیثیت سے فرجن کے  
اپارٹمنٹ پر ملا تھا۔ اخبار کا پہلا ری رنگین صفحہ فرجن کی خوب  
صورت تصویروں سے سجا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک ۳۳  
رپورٹ ”پہیں ہوئی تھی۔ رپورٹ ”مسٹر ایم ایم“ کی تھی جو ظاہر  
ہے مشتاق مدثر کے سوا کوئی نہیں تھا۔

میں نے آہستگی اور اطمینان سے رپورٹ پڑھنا شروع کیا  
اس کی ابتدائی سطروں میں ہی واضح کر دیا گیا تھا کہ فرجن کی وہ خوب  
صورت تصویریں اس کے ایک خصوصی انڈرویو کے لئے لی گئی تھیں  
تھیں جو لیا نہیں جاسکا تھا کیونکہ حسن اور زندگی سے محروم ہو کر  
جو دو دن پہلے ایک ذوقِ تماشا رکھنے والوں کے دلوں کو گرا رہا تھا

پیرس واپس لیا لیکن میری نظر میں تم اب بھی اس کے مالک ہو اور وہ  
بھی چالیس فیصد کے نہیں بلکہ پورے پورے مالک ہو۔ بولو تو ابھی  
یہ کری چھوڑ کر اٹھ جاؤ؟“

”میں نہیں خدا کے لئے کری چھوڑ کر مت اُٹھنا۔“ اس  
نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے ”کری بڑی خراب چیز ہے۔ میں  
اس کے قریب بھی نہیں چھٹکا چاہتا۔ اسی لئے میں زیادہ تر صوفے  
پر ہی بیٹھا پسند کرتا ہوں۔ میں تو اپنے آفس میں بھی زیادہ تر کام  
صوفے پر بیٹھ کر۔ بلکہ یوں کہو کہ صوفے پر لیٹ کر انجام دیتا  
ہوں۔“

”اس کی اصل وجہ مجھے معلوم ہے۔“ میں نے سر ہلاتے  
ہوئے کہا ”میں نے تمہاری ٹیکہ بٹری کو دیکھا ہوا ہے تم نے خوب  
چھانٹ کر رکھی ہے تمہارے مطلب کی چیز ہے۔“

”اسے کہتے ہیں۔ گھر کا بھیدی لٹکا ڈھانے۔“ وہ ہنسنی سانس  
لے کر بولا لیکن اس نے مجھے پکڑی بدلنے سے باز رکھا ”تمہاری  
جذباتی پینکشن کا شکر۔ لیکن مجھے ہوکل کا بزنس کچھ زیادہ پسند نہیں  
آتا تھا۔ اسی لئے میں نے اپنا پیسہ نکال لیا تھا۔“

”مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہی پیرس تم نے یہاں سے بہت دور کسی  
نئے مصطفی علاقے میں کسی انڈسٹری میں لگایا تھا۔ وہ انڈسٹری کیسی  
جاری ہے؟ کیا اس میں ہوکل سے زیادہ منافع ہے؟“ میں نے  
پوچھا۔

”بہت زیادہ۔“ وہ بڑے مسرور لہجے میں بولا۔  
”کیا بار ہے ہو؟“

”انگلینڈ کی ایک واشنگ مشین بنا رہا ہوں۔ وہی نام۔ وہی  
سب کچھ اور زوروں سے پہنچی کرتا ہوں۔ انگلینڈ کی کہہ کر چھ رہا  
ہوں۔ خوب بکتی ہے ہم کو اس طرح کے تیز دھندوں میں مزہ آتا  
ہے۔ ہوکل کا دھندا تو بہت ٹھنڈا ہے۔“

”زندگی میں کبھی کوئی ڈھنگ کا کام بھی کر لیا کرو۔ اپنا کوئی  
بزنس تو ایمانداری سے چلاؤ۔“ میں نے کہا۔

”پاکستان میں بزنس اور ایمانداری ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے  
میرے چاہئے۔“ وہ ملاحت سے بولا۔

”جو اس مت کرو۔“ میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ اس دوران  
ایک ویئر نے لے کر آیا۔ میں نے سیٹھ رمضان کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا ”اس حرام خور کے سامنے رکھ دو۔“

ویئر چلا گیا تو سیٹھ رمضان مظلومانہ سے مجھے میں بولا ”یابہ کہ  
سے کم وینوں کے سامنے تو بے عزتی نہ کرو۔“

”تو کیا دیروں کے سامنے کیا کروں؟“ میں نے پوچھا۔  
”اے تو کیا بے عزتی کرنا ضروری ہے؟“ وہ جھلا کر بولا

”دوست! دوستوں کی عزت بڑھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ بے عزتی  
کرنے کے لئے نہیں۔“

”تم عزت بڑھانے والا کوئی کام بھی تو کرو۔“ میں نے ٹھنڈی

اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اسے سفاکی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ رپورٹ کا انداز اخباری سے زیادہ انشائی تھا۔ اس میں گویا بڑی کوشش سے لفظی کی کمی تھی اور کہیں کہیں اس کا انداز ایک ذلتی غم ناک تاثر کا سا ہو گیا تھا۔ مسٹر ایم ایم نے نہایت تفصیل سے بتایا تھا کہ جب وہ حسب وعدہ فرمین کے دیئے ہوئے وقت پر اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچے تو انہیں وہاں فرمین کی لاش کس حالت میں لی، وہاں کون کون موجود تھا، پولیس کس طرح تفتیش کر رہی تھی۔

حالاںکہ مجھے یاد تھا کہ جب مشتاق مدثر وہاں پہنچا تھا تو فرمین کی لاش ایمرپنس میں رکھ کر روانہ کی جا چکی تھی۔ ہر حال اس نے چونکہ آگے ذکر کر دیا تھا کہ وہ سرکاری اسپتال کے مرنہ خانے بھی گیا تھا اس لئے فرض کیا جاسکتا تھا کہ لاش کی حالت درحقیقت اس نے وہاں دیکھی ہوگی۔

ہر حال اس رپورٹ میں میرے لئے سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اپارٹمنٹ میں میری موجودگی کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی اور یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ میرے ساتھ پولیس کا رویہ نہایت منہ بان تھا۔ تفتیشی افسر مجھے تفتیش میں شامل کرنے کے بجائے مجھ سے مشورے کر رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی رپورٹ میں ذریعہ دو سال پڑانے ایک اور واقعے کا حوالہ دیا گیا تھا۔ جب اسی طرح ایک خوب صورت اور نوجوان ماہل لڑکی کو سفاکی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کا قاتل اتفاق سے پکڑا گیا تھا اور وہ شہر کا ایک بڑا سینہ تھا۔ درحقیقت مشتاق مدثر نے رپورٹ میں یہ اشارہ دینے کی پوری پوری کوشش کی تھی کہ فرمین کا قاتل میں ہی ہو سکتا تھا لیکن پولیس میرے اثر و رسوخ یا کسی اور وجہ سے نہ صرف مجھے نظر انداز کر رہی تھی بلکہ میری ہی دوسرے تحقیقات کا رخ کسی اور طرف موڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مشتاق نے ”پتچ“ نسل میں ڈھنڈورا شرمیں کے مضموم والے دو ایک خادروں سے بھی استعمال کئے تھے لیکن یہ سارا کام اس نے پتچ چاکر کا قیامین کچھ اس طرح کی زبان و بیان استعمال کی تھی کہ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی تھی اور اگر کی جاتی تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ ایک خاص مزاج رکھنے والے گھماک اور شاطر قسم کے صحافیوں کا یہی طریقہ ”واہرات“ ہو رہا تھا۔

میں نے پوری توجہ اور انہماک سے رپورٹ پڑھنے کے بعد اظہارِ مزید ایک طرف رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے سینہ رمضان کی طرف منہ کیا۔ وہ ذرا ہلکا کر دیا ”تم مسکرا رہے ہو؟“

”تمہارے خیال میں کیا مجھے دماغ مار مار کر دیا چاہئے؟“

میں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”یہ آدمی جنہیں اس معاملے میں جاننے کی پوری پوری

کوشش کر رہا ہے۔ تم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر دے گے؟“ اس نے

گویا مجھے خبردار کرتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے اٹنا اس سے سوال کیا۔

”میرا اندازہ ہے کہ ابھی یہ شخص اس سلسلے کو اور بھی آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ تمہیں سیدھے یا ٹیڑھے کسی بھی طریقے سے اسے روکنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ مجھے کوئی ہلکے سیدھے قسم کا صحافی معلوم ہوتا ہے اس قسم کے لوگ کبھی بھی ہم جیسے کارروائیوں کو لوگوں کے لئے بڑا مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔“

”کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ تم اطمینان رکھو۔“

مجھ پریشانیوں کا رشتہ تھا۔ ”میں نے کہا“ میں بھی ایسے کسی جرم

کے سلسلے میں پریشان نہیں ہوا جو میں نے نہیں کیا تھا۔“

”میں نے تو اکثر بے گناہوں کو بھی بڑی پریشانیاں اٹھاتے دیکھا

ہے۔“ سینہ رمضان پہلو بہتے ہوئے بولا۔

”وہ پریشانیاں عارضی ہوتی ہیں یا پھر شاید وہ کسی اور غلط عمل

کی سزا ہوتی ہے جو انسان ماضی میں کبھی دانستہ یا نادانستہ کر چکا ہوتا

ہے اور بحول چکا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا بھائی! جیسے تمہاری مرضی۔ تم تو بہت ہی ٹیڑھی چیز

ہو۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”وہ ہنسنی سانس لے کر گویا مجھے میرے حال پر چھوڑتے

ہوئے بولا۔

”زمانے میں یہی تو اٹ بھیر ہو گیا ہے میرے ادیزہ چاند!

سیدھے لوگ دوسروں کو ٹیڑھے لگتے ہیں اور ٹیڑھے لوگ آسانی

سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں تو اس لئے تم سے اس موضوع پر تبادلہ خیال کرنے

دوڑا دوڑا آیا تھا کہ اگر تم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرنا چاہتے یا

تمہارے پاس ان پھنڈوں میں الجھنے کا وقت نہیں ہے تو مجھے علم

کر۔ میں کچھ بددوست کر رہا ہوں۔ مجھے سیدھے ٹیڑھے ’تربجے

اور دوسرے کئی طریقوں سے اس قسم کے مسائل حل کرنے کا کافی

تجربہ ہے۔“ سینہ رمضان نے پیشکش کی۔

”نہیں نہیں۔ خدا کے لئے تم اس سلسلے میں کچھ مت کرنا۔“

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے ”کہیں تم ایک مسئلہ حل

دکرتے کرتے میرے لئے کوئی دوسرا مسئلہ کھڑا کر دو۔“

”جنگ میری نظر میں تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جسے تم مسئلہ سمجھ رہے ہو۔ تم اس

معاملے کو جوں کا توں رہنے دو۔ یہ خود ہی اپنے کسی منطقی انجام کو

پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے بابا۔ ٹھیک ہے۔“ وہ ایک اور سینڈویچ کی طرف

ہاتھ بڑھاتے ہوئے بے پروائی سے بولا ”تمہارے ہاں سینڈویچ اب

کچھ ڈھنگ کے بننے لگے ہیں ورنہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بس

ڈرامے بازی ہوتی ہے۔ مولے مولے انگریزی۔۔۔ فرائیسی اور

اطالوی نام۔۔۔ اندر کچھ نہیں۔ ہنسنی بد مزہ! باہی جیسے لیکن جنہیں

اسلاف اچھا ملا ہوا ہے۔ ہو کل کو اچھے طریقے سے چلا رہا ہے۔ تم

واقعی ہو بڑے کلی آدمی۔“



”کس بات کی؟“ میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اس طرح آپ کے آفس میں مجھے چلے آئے کی۔“ مرتضیٰ نے بولی ”لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں آپ کو فون کر کے ملاقات کا وقت طے کر کے آئی۔“ اس نے خوف زدہ سی نظروں سے شیشے کے دروازے سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی سانس اب بھی تیز تھل رہی تھی۔

”کیا تمہارے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے؟“ میں نے نرمی سے پوچھا۔

”بھلا ہر کوئی میرے پیچھے نہیں لگا ہوا ہے۔“ وہ ذرا سنبھل کر بولی ”لیکن مجھے محسوس کی اور ہمارے۔۔۔ پیچھے کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ شاید موت میرے تعاقب میں ہے۔“

”موت بھی اکثر کسی نہ کسی روپ میں آتی ہے۔ تم نے اپنے تعاقب میں کسی کو نہیں دیکھا؟“ میں نے ایک بار بھر تھک جاتی تھی۔ اس نے ٹی ٹی میں سر ملاتے ہوئے ہونٹوں پر زبان چھری اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی ”ایک گھاس پانی مل جائے گا؟“

”پہلے تم بیٹھ جاؤ۔“ میں نے ایک آرام دہ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس گدلی کی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ شاید میں نے بدوقت ہی اسے بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں شاید مزید اپنا وزن سارنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

میں نے گاڑی کو اشارہ کیا۔ اس نے کونے میں شلیف میں رکھے ہوئے چھوٹے سے فرنیچر سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر ایک گھاس اسے دیا۔ میں نے گاڑی سے کہا ”اب تم جا سکتے ہو لیکن ذرا ہوشیار رہنا اور میرے آفس کے آس پاس ہی رہنا۔ کسی اور کو اس طرح اندر مت آنے دینا۔ خواہ وہ کوئی خاتون ہی ہو۔“

اس نے اٹھتے میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ میں دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تو وہ گھاس خالی کر چکی تھی اور بوتل سے اپنے لئے مزید پانی اٹھ کر رہی تھی۔ وہ مزید پانی پی چکی اور چند گہری سانسیں لے کر کافی حد تک پرسکون نظر آنے لگی تو میں نے کہا ”تم نے مجھے نام سے مخاطب کیا تھا لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ میں پہلے کبھی تم سے ملا ہوں؟“

”اے اے تو شاید یاد آجائے۔ آپ نے تو شاید اس سے پہلے مجھے دیکھا بھی نہیں۔ البتہ میں نے آپ کو دو دن پہلے ذرا قافلے سے دیکھا تھا اور میں جمیل کی وجہ سے آپ سے عجائبانہ طور پر واقف ہوئی تھی۔“ اس کی آواز میں ابھی تک معمولی سی لرزش تھی۔

”جمیل؟“ میرے کان کھڑے ہوئے ”کون جمیل؟“

”ہاں اس میں کیا فک ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مزید کچھ کھانے اور تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد بیٹھ رمضان رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر اخبار اٹھایا اور بنور فرحین کی تصویریں اور رپورٹ دیکھنے لگا۔ مشتاق درڑنے مجھے ٹھہرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ میری تو اس سے وہ پہلی ملاقات تھی۔ اسے میری اور فرحین کی شناسائی یا عدم شناسائی کے بارے میں غالباً کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ کیوں ایک نادیدہ پسند اخلاش کر کے اسے میری گردن میں فٹ کرنے کا خواہاں تھا؟ یہ خواہش اس کی تحریر سے جھلک رہی تھی۔

میں چند لمبے سوچتا رہا۔ آخر میں نے اخبار دوبارہ میز پر ایک طرف رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں شاید اپنے کام میں کچھ زیادہ ہی متنبہ ہو گیا تھا اس لئے مجھے باہر کسی گزردہ کا احساس نہیں ہوا۔ میں اس وقت چٹا چٹا جب دروازہ اچانک کھٹاک سے کھلا۔ میرا ہاتھ فوراً کوٹ کی اندر دھکی جب کی طرف بڑھا جس میں اس وقت ایک مٹھین پھنسل موجود تھا لیکن میں نے اسے جیب سے نہیں نکالا۔ صرف میرا ہاتھ اس کے دستے پر جم کر رہ گیا۔

میں نے پھنسل نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اندر آنے والی شخص ایک حواس باختہ لڑکی تھی اور اس کے پیچھے آنے والا ہوٹل ہی کا ایک سکیورٹی گارڈ تھا۔ لڑکی سیدھی میری میز کے قریب آگئی۔ سکیورٹی گارڈ نے اس کا بازو پکڑ لیا اور میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں بولا ”سراسر میں نے اسے روکنے کی ہمت کو شش کی لیکن اس نے صرف آپ کے بارے میں پوچھا۔ اور پھر اپنے لڑکی ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے دھکا دے کر سیدھی یہاں گئی۔“

لڑکی بظاہر غیر مستحکم تھی اس لئے میں نے ہاتھ جیب سے نکال لیا اور گاڑی کو بھی اشارہ کیا ”پھر دو اسے۔“

وہ متوسط طبع کی ایک معقول لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ خوش شکل تھی۔ بال تراشیدہ تھے تاہم اس وقت ذرا منتشر تھے۔ وہ جدید تراش خراش کی شوارٹس قمیص میں تھی۔ نیوی بلو کالر کی ایک عمدہ جری بھی پہنے ہوئے تھی جس کی زپ کھلی ہوئی تھی گلے میں مختصر سا دوپٹا جھول رہا تھا۔ خدوخال دلکش تھے، عمر چالیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ تھکا ہوا تھا جیسے اس نے کچھ فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا ہو۔

وہ سخت خوف زدہ معلوم ہوتی تھی۔ میز کے قریب ٹوک کر اس نے گہری سانس لے کر اپنی عمر میں اور غزوطی انگلیاں بالوں میں بھیریں تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔ تاہم وہ خود پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ تموک نکل کر وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی ”میں معافی چاہتی ہوں افضل صاحب!“

بیچے کہیں متید تھے اور سر ٹپنے کے لئے کوئی باندھ دھونڈ رہے تھے۔ وہ سر جھکتے ہوئے دھبے لیے میں بولی "شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہم جیسے پشتر بدل گئے۔ بلکہ لوڑ بدل گئے۔ اس لئے مسائل حل کرنے کے لئے اپنا معیار زندگی پشتر بنانے کے لئے بعض اوقات اپنی ادھوری خواہشوں کی تکمیل کے لئے اپنی نوکری کا کاروبار کے علاوہ بھی اور دوسرا ہاتھ پاؤں مارے رہے ہیں ناقص آمدنی کا کوئی ذریعہ ڈھونڈتے رہے ہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ ایک تعمیری جذبہ ہے محنت کرنے والے میری نظر میں قابل قدر لوگ ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"درست ہے لیکن کبھی کبھی اس محنت کا رخ ذرا غلط ہو جاتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو بعض اوقات اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ بظاہر کام بے ضرر سے نظر آتے ہیں اور ہم یہ سمجھ پاتے کہ آگے چل کر بات بہت سنگین بھی ہو سکتی ہے۔" دھربے نمبر لیے میں بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ نیکی کی طرح برائی بھی ایک چھوٹا سے جج سے پھوٹی ہے۔ پھلتی پھوٹی ہے لیکن ابتدا میں بہت معمولی اور حیرت نظر آتی ہے۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے اندازہ شکوے سے اسے حملہ آئے اور وہ کھل کر شکوہ کر سکے۔"

"ہاں شاید کچھ ایسی ہی بات ہے اور پھر ہم دونوں تو بچہ اپنے اچھے ماحول میں کام بھی نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے ہوٹل کا مالک..... یعنی قاسم بھلی بھی کچھ ایسا اچھا نیک آدمی نہیں تھا وہاں آنے والوں میں سے بھی پشتر کچھ ایسے مسز یا بے داری کر کے مالک نہیں ہوتے تھے۔ بے داری کر دار کے مالک تو اب خود بھی ہماری سوسائٹی میں شاید آنے میں شک سے بھی کھائے جا رہے ہیں۔ بہر حال ہمارے ہوٹل میں تو مشکوک اور بد رفتاری پکڑ میں رہنے والے لوگوں کا کچھ زیادہ ہی جگہ شمار ہے۔" دیکھ کر وہ بولی "کچھ ایسے لوگوں کے لئے کام کرنے لگے تھے؟"

نے دریافت کیا۔ "میں سمجھ لیجئے لیکن ہمارے خیال میں ہمارا کام نہ تو بڑا ایمانی اور بددیانتی کا تھا اور نہ ہی ہم اس میں خطرناک حد تک تھے۔ معاوضہ اچھا مل جاتا تھا۔ ہمارے حالات کچھ بہتر ہوئے تھے۔ ہم جلدی شادی کرنے والے تھے۔" وہ ایک بار پھر سسکی لے کر خاموش ہو گئی۔

"مجھے اپنے کام کی نوعیت اور دوسری باتیں جس حد تک تفصیل سے بتا سکتی ہو بتاؤ۔ تاکہ بات آسانی سے سمجھ میں آئے اس کے بعد یہ بھی بتا دو کہ مجھ سے تم کیا چاہتی ہو۔"

"میں سب کچھ بتا دوں گی۔ جو کچھ بھی مجھے معلوم ہے۔ بتا دوں گی لیکن خدا کے لئے مجھے مرنے سے بچنا ہے۔"

جھکایا۔ وہ شاید پہلے بھی روٹی رہی تھی اور اب بھی روٹا چاہتی تھی مگر کسی نہ کسی طرح اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ وہ ذرا سی سنبھل پائی تھی کہ پھر زلزلے والا موضوع چھڑ گیا تھا۔

مجھے فی الحال اس پر حیرت بھی تھی کہ اسے جیل کی سوت کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ جیل کے قتل کی خبر ابھی کسی اخبار میں نہیں آئی تھی۔ قریب کے قتل کی خبر البتہ کافی نمایاں انداز میں تقریباً تمام اخبارات میں آچکی تھی۔ لڑکی خوب صورت تھی شہریت سے اس کا تھوڑا بہت تعلق تھا۔ اخبارات نے اپنا اپنا صفحہ چھاننے کے لئے بھی اس کی اچھی سی تصویر کے ساتھ اس کے قتل کی خبر چھاپی تھی لیکن سب کا مضمون کم و بیش وہی تھا جو پولیس کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ کسی کو اپنے طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور نہ ہی کسی نے قیاس آرائی کی کوشش کی تھی کسی اخبار میں اس سلسلے میں میرا نام نہیں آیا تھا۔ صرف مشتاق مدثر کو یہ "امراز" حاصل تھا کہ وہ موضوع واردات پر پتہ پتا تھا اور اس نے مجھے ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک خاص زاویے سے اسٹوری بنائی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ جیل مرہکا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کچھ دیر پہلے ہی اس کی لاش پوسٹ مارٹم سے قاش ہو کر گھر پہنچی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اسے اور مس انیس کو ایک ہی انداز میں قتل کیا گیا ہے ان دونوں کے بعد اب میری باری ہے۔ میں اس وقت جیل ہی کے گھر پر۔۔۔ اسی کے گھر والوں کے ساتھ تھی جب اس کی لاش گھر پہنچی۔ اس کے قتل کی تھوڑی بہت تفصیل معلوم ہوتے ہی میں وہاں سے نکل بھاگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میری باری آنے والی ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اس وقت بھی کوئی میرے تعاقب میں ہو۔"

"اگر تم ڈرا رہا اور ترتیب سے بات کرو تو شاید ہم دونوں کے حق میں بہتر ثابت ہو۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "مجھے ابھی تک بھی معلوم نہیں کہ تمہارا نام کیا ہے۔ تم کون ہو اور جیل سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟"

"ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں صحیح طرح بات نہیں کر پاری ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں اور ایک لمبے خاموش رہنے کے بعد تھوک نکل کر بولی "میرا نام امیر ہے۔ میں تھری اسٹار ہوٹل میں استقبالیہ کلرک ہوں یاں سمجھ لیں کہ میں ایک طرح سے جیل کی فیوریری سنگیٹر۔ اس کی راز دار۔۔۔ اور کسی حد تک اس کی شریک کار بھی تھی۔"

"شریک کار؟" میں نے ڈھرایا "کیا تم ہیڈوینٹر کے فرائض ادا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نوشہ ہے آنکھیں پونچھیں جن میں بظاہر کوئی آنسو نہیں تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ آنسو بچوں کے

سے اس نے ایک ایسا دھندا شروع کیا تھا جس کے بارے میں یہاں شاید کبھی کسی نے سنا بھی نہ ہو۔ آپ کو شاید معلوم ہی ہوگا کہ مشہور ممالک میں چوری، نقب زنی، لُکچئی اور لوٹ مار کی شرح بہت زیادہ ہے۔

میں اس کی بات میں دخل دینے بغیر نہ سکا۔ اب تو ہم بھی کم از کم ان معاملات میں کافی "متقی یافتہ" ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھے کاموں میں نہ سہی لیکن ان کاموں میں ہم ان کے ہم پلہ ہونے کی پوری چوری کو شش کر رہے ہیں۔

"جی ہاں" اس نے تسلیم کیا۔ "بلکہ اس قسم کے کاموں میں تو ہمارے "فکار" ان کے بھی کان کھرنے کی کو شش کرتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں ایک ترقی ہوئی ہے کہ قاضی ڈاکو لیرے سب کسی نہ کسی پارٹی میں گھس گئے ہیں۔ یوں یہ "مقیم" ہستیاں ہمارے ہاں سیاسی قوت بن گئی ہیں۔ انہیں سیاست کی چھتری میسر آگئی ہے۔ یوں ان کی طاقت کئی گنا بڑھ گئی ہے اور یہ زیادہ محفوظ ہوگئی ہیں جبکہ دیگر ممالک میں اگر بد معاشی منظم بھی ہیں تو وہ اپنی الگ مشہور یکیش کی صورت میں ہیں۔ انہیں بہر حال بزم ہی سمجھا جاتا ہے اور قانون بیٹھ ان کے قاتل میں مبتلا ہے۔ کم از کم سیاسی پارٹیوں میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور سیاست ان کی ذوال نہیں بنتی۔ لیڈر ہاں بھی تو انہیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتے اس طرح ان کا اپنا سیاسی کیڑا خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہاں حساب اس کے بالکل الٹ ہے۔"

"جی ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

"لیکن میں نے شاید تمہیں موضوع سے ہٹا دیا۔" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ جو کچھ میں بتانے والی تھی، ان سب باتوں کا ایک طرح سے اس سے گرا تعلق بنتا ہے۔" وہ جلدی سے بولی "میں یہ کہنے لگی تھی کہ وہاں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چوری کی چیزیں کھپانے کے لئے بڑی مارکیٹ موجود ہے۔ زیر زمین دنیا کے لوگ ہی یہ دھندے کرتے ہیں۔ چھوٹی موٹی چیزیں تو پان شاہیں PAWN SHOPS پر ہی کھپ جاتی ہیں جو بظاہر پرانی چیزوں کی خرید و فروخت اور انہیں رہن رکھنے کا کامدار کرتی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کا اصلی دھندا چوری کی چیزوں کا ہی ہوتا ہے۔ بعض ایسے ایسے دکاندار یا ایجنٹ بھی موجود ہوتے ہیں جو لاکھوں کا مال ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی وہاں زیادہ منگنی چیزوں کو چوری کرنے کے بعد بڑے پیمانے پر ادھر ادھر کھپانے میں زیادہ دشواریاں پیش آنے لگی تھیں۔ اس سلسلے میں انٹرنیشنل کمپنیوں کی طرف سے پولیس اور دیگر تحکموں پر دباؤ بہت بڑھ رہا تھا کیونکہ انٹرنیشنل کمپنیوں کو بہروں اور بیش قیمت زیورات کی چوریوں کے سلسلے میں خاص طور پر بہت نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا اور یہ نقصان دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر خوف زدہ نظر آنے لگی۔  
"مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ میرا انجام بھی مس ایکس اور جیل بن گیا ہوگا۔ جیل مجھے بتا کر آپ سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ وہ بھی آپ سے مدد طلب کرنا چاہتا تھا لیکن شاید اسے آپ سے ملنا قیسمتی نہیں ہوا۔"

"اں۔ میں نے اسے ٹھوہری پایا تھا۔" میں نے جواب دیا۔  
"اگر میں کچھ پہلے پہنچ جاتا تو شاید ایسا نہ ہوتا۔"  
"لیکن میں تو اب آپ کے سامنے۔ آپ کی بناء میں پہنچ گئی ہوں۔ مجھے اس طرح مت مرنے دیجئے گا۔" اس کے لمبے میں بڑا دلچسپ لہجہ تھا۔

"میں اپنی یا کسی کی بھی زندگی اور موت کے بارے میں کسی سے کوئی وعدہ نہ کرتا تو اچھا نہیں سمجھتا لیکن اتنے ضرور کہوں گا کہ میرے پاس بیٹھ کر تم موت کا خوف اپنے دل سے نکال دو اور اطمینان سے بات کرو۔"

"قائم بکلی خواہ کیا بھی آوی تھا لیکن وہ بطور پاس بہت اچھا تھا۔ اس کی زندگی میں ہمیں اپنی حفاظت کے سلسلے میں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کی اچانک موت سے سب کو روم بزم ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم کس کام کے سلسلے میں کس سے رجوع کریں اور کچھ پتا نہیں چل رہا کہ کون اب قائم بکلی کا وادارہ کر گیا ہے اور کون اندری اندر غدار بن چکا ہے میں اور جیل آپ کو زیادہ اچھی طرح نہیں جانتے تھے لیکن ہم نے محسوس کیا تھا کہ مس ایکس نے آپ پر آنکھیں بند کر کے بڑا سا کیا تھا۔" اس لئے ہم نے سوچا ہم بھی آپ سے مدد طلب کریں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے مدد طلب کرنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوا۔" میں نے حقیقتاً عزامت سے کہا "فرہین نے مجھ سے مدد طلب کی اور ماری گئی۔ اب تم نے بتایا ہے کہ جیل بھی مجھ سے مدد طلب کرنے کے ارادے سے آیا تھا لیکن مجھ سے ملاقات سے پہلے ہی وہ بھی ایک دردناک انجام سے دوچار ہوا۔ اس کے بدلہ میں میرے پاس آئیں۔ میں تمہاری بہت کی وادارہ ہوں۔"  
"مجھے یقین ہے اگر میں آپ کے پاس نہ آئی تب بھی انجام تو بگڑا ہی ہوتا تھا۔ میں نے سوچا ایک کو شش کر کے دیکھ لیوں۔" شاید جان بچائی جائے۔ انسان کو جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ وہ دھکے کھینچے ہوئے۔

"یہ تو درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا "بہر حال اصل قصہ

اصل موضوع پر آتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لئے پھر غماز کا شکار ہوگئی۔ تمام قدرے توقف کے بعد اس نے بتانا کہ وہ کس بکلی کے بیسیوں قسم کے دھندے تھے۔ کچھ کا شاید کہ کوئلہ ہو، کچھ کے بارے میں آپ کو اندازہ ہوگا لیکن چند سال

اتفاقات کے تحت دنیا کے مختلف گوشوں میں بھرتا بھی رہتا تھا۔ خیال تھا کہ میں برٹش کے علاوہ بھی دنیا کے معاملات سے واقف تھا۔ اس کے باوجود بعض باتیں میرے لئے بھی انکشاف ورجہ رکھتی تھیں اور مجھے بھی حیران کر دیتی تھیں۔ امیر کی باتوں سے بھی اس وقت مجھے غماز حیران کیا تھا۔ تاہم ذہن میں کچھ کراں لے لے لگی تھیں۔

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کمی سانس لے کر کہا۔ میری بیروں کی اس تجارت میں کسی سینڈ کیٹ کا ہول سیل لڑنا ہو گا؟“

”جی ہاں“ امیر نے سر ہلایا۔  
 ”اور فرجین اس کے لئے دیگر خدمات انجام دینے کے ساتھ میری کی کہیں کا کام بھی کر رہی ہوگی؟“  
 ”جی ہاں“ اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”تم اور جمیل اس میں کہاں فٹ ہوتے تھے؟“ میں۔  
 پوچھا۔

”ہم اونچے طبقے کے لوگوں میں بیروں کے ٹاپک تلاش کرتے۔ ہوٹل میں رہتے ہوئے جائزہ لیتے تھے کہ کون رعایتی دکانیں ہیرے خریدنے میں دلچسپی لے سکتا ہے اگر ہماری رجسٹریشن کے خرید و فروخت ہوتی تھی تو ہمیں اس پر خود اسٹاکیشن ملتا تھا ہم جیسے کم خواہ پانے والے چھوٹے ملازمین کے لئے یہ ایسا آمدنی بھی کافی تھی۔ یہ ایک مستقل قسم کا پارٹ ٹائم کام تھا۔ ہمارے خیال میں بہت زیادہ خطرناک بھی نہیں تھا۔“

”تو پھر اس میں قتل و غارت اور خوں ریزی کہاں سے آگے گزریں کیوں کافی جانے لگیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ قاسم علی کی موت ہے زندہ تھا تو ہرجے کنٹرول میں تھی۔ سارا نظام صحیح طریقے سے کر رہا تھا۔ ایک مشینری تھی جس میں ہرگز وہ اپنا اپنا کام انجام دیتا تھا۔ اس کے سرے ہی گریا لوٹ مار شروع ہو گئی ہے۔ میں ہاتھ میں جو کچھ عادی اسے ہتھم کر جانے کی فکر میں ہے اور یہ معلوم ہے جب پیسے کی لوٹ مار شروع ہوئی ہے تو پھر قتل و غارت بھی شروع ہوئی ہے لیکن اس میں جمیل جیسا چھوٹا اور بے کار کن یقیناً کسی غلط فہمی کی بنا پر مارا گیا ہے یا پھر اسے اس کی گستاخی کی سزا دی گئی ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر میرا بھی گنا ہو سکتا ہے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ موت میرے نقاب ہے اور میری کچھ میں نہیں آتا“ میں پتاہ کے لئے کہاں جاؤں خاموش ہو گئی۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے کہا ”پتاہ کا لڑکچہ مسئلہ نہیں ہے۔ تم خوف اپنے دل سے نکال دو۔ اگر تمہارے والے پریشان نہ ہوں تو تم اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں جاؤ۔ میں تمہاری حفاظت کا بندوبست بھی کر دوں گا۔“

”اب وہاں اس سلسلے میں بہت سے اقدامات کئے جا رہے تھے۔ دوسرے ان چیزوں کے زیادہ خریدار ملنا بھی دن بہ دن مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ چنانچہ سٹریٹیکٹس نے اس کا دوبارہ کونے سرے سے ترک کر دیا۔ انے انتظامات کئے اور بیش قیمت جو اہرات کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ جلاش کر لیں۔ یہ مارکیٹیں کچھ ترقی پزیر ممالک ہیں۔ جو رکی کے یہ بیزنس اور دیگر جو اہرات اگر اصل ایلٹ سے آج بھی قیمت پر بھی بک جاتے ہیں تب بھی ان میں سٹریٹیکٹس کو بہت منافع ہوتا ہے۔ ان کے اپنے ملکوں میں ڈیلر یا ایجنٹ قسم کے وکانڈار جنیں FENCE کہا جاتا ہے ان چیزوں کی اتنی بھی قیمت نہیں دیتے تھے۔ دن بہ دن ان میں رسک بڑھتا جا رہا تھا اور ان کی قیمت فروخت گھٹتی جا رہی تھی لیکن سٹریٹیکٹس نے نہایت عمدگی سے متبادل انتظامات کر لئے اور ان کا منافع بھی بڑھ گیا۔ انہوں نے چھوٹے موٹے چوروں اور بھی کھاراکا ڈکالادرات کرنے والوں سے بھی مال لے کر اپنے پاس جمع کرنا اور اپنی ہول سیل یعنی تحو کی تجارت میں شامل کرنا شروع کر دیا۔“

”افضل صاحب! آپ ایک بڑے برٹش میں ہونے کے باوجود شاید تصور نہ کر سکیں کہ یہ کتنی بڑی تجارت ہے۔ اس کا ٹرن اور کرڈوں اور اربوں میں ہے۔ ہر سینڈ کیٹ نے جس ملک کو اپنی مارکیٹ بنایا اس میں ایک دو بڑے اسمگلرز کو پکڑا اور انہیں ایک طرح سے اپنا ہول سیل ایجنٹ بنالیا۔ اسمگلرز کو بھی یہ گویا ایک نیا شعبہ مل گیا۔ ان کے پاس دولت بھی تھی اور دوسرے وسائل بھی۔ وہ مرفوقہ بیروں کی ایک پوری لاٹ خرید لیتے ہیں۔ پھر ان کے کچھ پیسے جو عام طور پر خوب صورت اور زرا جان بچان رکھنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں اس بڑی لاٹ کو کئی چھوٹی چھوٹی کمپنیوں میں تقسیم کر کے کسی ترقی پزیر ملک میں لے آتی ہیں جسے انہوں نے اپنا گڑھ بنانا ہوتا ہے یا وہ پہلے ہی سے ان کا گڑھ ہوتا ہے۔“

”پہاں ان کے لئے کئی طرح کی مارکیٹ موجود ہوتی ہے۔ کئی بڑے جہاز کوز ہوتے ہیں جو زیادہ تعداد میں یہ میرے خرید لیتے ہیں۔ بعض شریفین دولت مند بھی ہوتے ہیں جو ایک آدھ یا دو چار خرید لیتے ہیں۔ ان دولت مندوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ عام برٹش میں بھی۔ بلیک مارکیٹیں بھی۔ نو دو تلیے بھی اور شور برٹش کے لوگ بھی۔ ان سب لوگوں کو یہ جو اہرات اور بین مارکیٹ کی نسبت بہر حال کافی سے پڑتے ہیں اور سستی چیز خریدنا ہمارے ہاں کے لوگوں کی کمزوری ہے خواہ وہ کیسے سے بھی آ رہی ہو کسی بھی ذریعے سے مل رہی ہو اور خریدنے والے کے پاس خواہ کتنی ہی دولت موجود ہو۔“

وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر بانی پینے کے لئے رک۔ شاید اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں دم بخود بیٹھا تھا۔ میں ایک ٹھیک ٹھاک برٹش میں تھا۔ عام برٹش میں کی نسبت میرے سامنے زندگی کے زیادہ پہلو بے نقاب رہتے تھے۔ میں مختلف کاموں کے سلسلے میں یا

میں صرف اپنی والدہ اور ایک بڑی بہن کے ساتھ رہتی ہوں جس کی ذہنی حالت صحیح نہیں ہے۔ میرے والد کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اس نے بتایا۔

”میں اطلاع کرادیا کہ تم چند دن کے لئے گھر سے باہر ہو گی۔ اگر تم ان کے لئے کوئی خطبہ محسوس کرو تو ان کی حفاظت کے لئے بھی میں ایک دو آدمی بھجوا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا ”جب تک یہ کردینے نہیں جاتی اور کوئی واضح صورت سامنے نہیں آتی تب تک میں تمہارے لئے ضروری حفاظتی انتظامات کر سکتا ہوں۔“

”میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“ وہ بے پناہ ممنونیت سے بولی۔

”جو باتیں تم نے مجھے بتائی ہیں۔ ان میں کئی پہلو تشنہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس ذخیرہ کی کئی کڑیاں غائب معلوم ہوتی ہیں۔ جس میں اس سلسلے میں کچھ اور بھی معلوم ہے؟“

”جی ہاں میں آپ کو وہی بتانے لگی تھی لیکن اس کے بعد بھی آپ کو شاید اس ذخیرہ کی کوئی کڑی غائب محسوس ہو۔“ امبر بولی ”قاسم علی خود تو چونکہ کبھی یہاں کبھی کسی اور شہر۔ کبھی کسی اور ملک میں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ خود بیرون کی کھپت کے مجتہد میں نہیں رہ سکتا تھا اس لئے اس نے ایک شخص کو یہاں تمام معاملات کا اچھا نگر اور نگران بنایا ہوا تھا۔ قاسم علی تو بس باہر سے لاث فریڈ کر فٹوں میں یہاں بھجوا رہا تھا۔ ہر قسط اس شخصیت کے پاس پہنچ جاتی تھی اور گویا خزانے میں جمع ہو جاتی تھی۔ وہ شخصیت خود بھی بہت بڑے پیمانے پر میرے کھپاتی تھی اور ہم جیسے چھوٹے موٹے کارندوں کو بھی اگر کسی موقع کا ہک کو میرے دکھانے۔ پسند کرانے ہوتے تھے تو ہم اسی شخصیت کو پیغام بھجواتے تھے۔ میرے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتے تھے۔ جو میرے ہک نہیں پاتے تھے وہ یہ حفاظت اسی شخصیت کے پاس واپس پہنچ جاتے تھے لیکن یہ سارا نظام کچھ ایسا تھا جیسا اکثر ناچار و دھندوں کے سلسلے میں بعض باہمی یا جرم و سزا کی کمائوں میں بیان کیا جاتا ہے یعنی وہ شخصیت عمل طور پر بدو سے رہتی تھی۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہ شخصیت کون تھی۔ وہ شخص یا پھر شاید اس کا کوئی کارندہ خود ہی دوسرے میرے روز ہمیں فون کر کے معلوم کرتا رہتا تھا کہ کوئی آواز ہے یا نہیں۔“

”تم نے دلچسپ بات بتائی ہے۔ کیا فرحین کو بھی اس شخصیت کا علم نہیں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شاید اسے علم رہا ہو لیکن اس نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ جانتی تھی۔ بہر حال وہ قاسم علی کی اہم ترین کارندہ تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا کچھ جانتی ہو۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے ایک خط لکھا تھا۔ وہ خط اس نے جمیل کے سپرد کیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ جس آل میں وہ شوش پیش کرتا ہے اس کی سیٹ نمبر

تھو کے نیچے آؤں دے۔ فرحین، جمیل پر بہت بھروسہ کرتی تھی اور مالی طور پر بھی اسے نوازی رہتی تھی لیکن ان دونوں جمیل کے ذہن میں بھی معلوم نہیں کیا بھگوری پک رہی تھی۔ وہ کچھ فکر مند بھی نظر آتا تھا لیکن اصل بات اس نے مجھے بھی نہیں بتائی تھی۔ مجھ سے وہ یہی کہتا تھا کہ چند دن گھر جاؤ، پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔ معلوم نہیں کیا سوچ کر اس نے وہ خط سیٹ نمبر تھو کے نیچے نہیں اڑا سکا کہ اپنے پاس ہی رکھ لیا اور دوسرے دن میرے سپرد کر دیا کہ میں اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھ لوں۔“

”کیا وہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”جی ہاں وہ میں ابھی آپ کو بتاتی ہوں۔“ وہ اپنا شوٹلر بیگ کھولتے ہوئے بولی ”میں نے اسے پڑھا ہے لیکن اس سے بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کس کے نام ہے۔ شاید آپ کو اس سے کچھ جانتے میں مدد مل سکے۔“ اس نے بیگ سے خط نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے خط پڑھنے سے پہلے پوچھا ”جمیل نے یہ تو دیکھا ہو گا کہ تھو نمبر سیٹ پر کون آکر بیٹھا تھا۔ کیا اس نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ بتایا؟“

”جی ہاں اس نے دو راتوں کے دوران اس سیٹ پر نظر رکھی تھی۔ دونوں راتوں میں دو مختلف افراد آکر اس سیٹ پر بیٹھے اور وہ دونوں جمیل کے لئے ابھری تھے۔ جمیل ان کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا کہ وہ کون تھے اور نہ ہی جمیل یہ دیکھ سکا کہ ان میں سے کسی نے سیٹ کے نیچے خط تلاش کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں۔“

میں نے خط کو ہل کر دکھا۔ وہ انگریزی میں تھا۔ لکھا تھا۔

”نہتر۔!“

مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کون ہو۔ اپنی بے وقوفی پر حیرت بھی ہو رہی ہے۔ ہم ایک عرصے سے فون پر تمہاری آواز سن رہے ہیں اور ایک دوسری حیثیت سے تم سے مل رہے ہیں لیکن ہمیں گمان تک نہ گذر کہ دو فون شخصیتیں اصل میں ایک ہیں۔

مجھے اب معلوم ہے کہ میں فون پر تم سے کہاں رابطہ قائم کر سکتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر رہی ہوں۔ میں دہی پڑانا طریقہ اختیار کر رہی ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ اگر کبھی ہنگامی طور پر تم تک کوئی پیغام پہنچانا مقصود ہو تو یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

میں ہنگامی طور پر تمہیں یہی بتانا چاہتی ہوں کہ قاسم علی کی موت سے سب کچھ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ اس قسم کے کاموں کا کوئی باضابطہ ریکارڈ یا کھت پڑحت تو ہوئی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہے کہ اشاراتی اور مبہم سی زبان میں کئی ڈائریز میں اندراجات کر لئے جاتے ہیں۔ اس لئے میں تمہارے سامنے کوئی ٹھوس اور واضح قسم کا تحریری ثبوت تو پیش نہیں کر سکتی لیکن میں پہلے بھی تمہیں یقین دلانے کی کوشش کر چکی ہوں اور اب پھر

کے آدمیوں سے کوئی گمراہ تعلق نہیں تھا۔

میں نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے کہا ”فرصین کا قتل ہو چکا  
کچھ میں آتا ہے۔ اس کے پاس کوئی کیپ تھی جو یقیناً ہیروں کی  
تھی اور وہ اسے اس پراسرار باس کے حوالے کرنا نہیں چاہتی  
تھی۔ لیکن بے چارہ جیل کیوں مارا گیا؟“

”فرصین اس پرست مجوسا کتنی تھی شاید کسی سمجھا گیا ہو کہ  
اسے ہیروں کے بارے میں کچھ معلوم ہو گا۔ شاید اسے بھی پراسرار  
باس کی شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا ہو۔“ امبرولی۔

”لیکن اس نے ہمیں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی  
تھیں خود کوئی اعتراف؟“ میں نے تھوڑی سی چاہی۔

اس نے لٹی میں سر ملایا اور بولی ”ابست مجھے اتنا اندازہ ہو گا  
ہے کہ ہیروں کی وہ کیپ ابھی پراسرار باس کے ہاتھ میں آگئی  
ورنہ شاید جیل کے قتل کی نوبت نہ آتی۔ اسی نے اب مجھے اپنی  
بھی جان کا خطرہ ہے۔ پراسرار باس کو معلوم ہو گا کہ میں جیل کی  
ہونے والی بیوی تھی۔ ہیروں کے دھندے میں ہم دونوں کسی نہ کسی  
انداز میں ملوث تھے اس لیے اس کا انکار کھار میں ہوں گی۔ وہ نہیں  
ہیروں کی تلاش اور اپنی شخصیت کو راز رکھنے کے لیے یقیناً جان  
ہو رہا ہے۔“

”دولت کی ہو۔ انسان کو یہی دنیا کھتی ہے اور جب  
بات یہ ہے کہ دولت کے لالچ میں وہ لوگ عموماً زیادہ دیوانے ہوتے  
ہیں جن کے پاس پہلے ہی کافی دولت موجود ہوتی ہے۔“ میں نے  
تھوڑی سی سانس لے کر کہا ”تم نے اچھا کیا کہ مجھے نہ جانے ہوئے بھی  
مجھ پر مجروسا کرنے کا جو اکھیل لیا اور میرے پاس چلی آئیں ورنہ  
شاید ابھی بات بگڑتی ہی چلی جاتی۔ اب اس انجی ہوئی ڈور کے  
کھینچنے کی کچھ امید پیدا ہو چکی ہے۔“

پھر میں نے اسے نوزی کے ہاتھوں اپنے اغوا کا واقعہ بتایا اور  
نوزی کا کلیہ تفصیل سے بتانے کے بعد پوچھا ”تم اس شخص کے  
بارے میں مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟“

میں نے اسے نوزی کا نام یا عرفیت نہیں بتائی تھی لیکن وہ خود  
ہی بولی ”یہ تو آپ شاید نوزی کی بات کر رہے ہیں؟“ اس کے چہرے  
پر ایک پھر خوف جھلک آیا جو گزشتہ چند لمحوں کے دوران کالی  
ہو گیا تھا۔

”ہاں کچھ خاص حلقوں میں وہ اسی نام سے جانا جاتا ہے۔“

میں نے تسلیم کیا۔

”اس کے بارے میں مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ وہ قاسم کل  
کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے اور بہت بڑا بدعاش ہے۔  
ہیروں کے دھندے میں بھی اس کا کردار کافی اہم تھا۔ شاید ہیرو  
نوادہ بڑے پانے پر کھانے کا شہبہ اسی کے سپرد تھا۔ زیادہ تر  
میں میرے تو بڑے نیوکرزی خرید سکتے تھے۔ شاید وہ ان سے  
مداخلت کرتا تھا۔ تو کو یا پھر نہ۔ دونوں طرفوں پر یہ

کرہی ہوں کہ وہ چھوٹی کیپ قاسم کل کے لیے مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا۔  
جس میں معلوم کہ میں نے اس کے لئے کیا کیا خدمات انجام دی  
ہیں اور اس کے لیے کیسے بڑے کام نکلوائے ہیں۔ جو دھڑا دھڑ  
انگے ہوئے تھے۔ اس کی طرف میرا مت اُٹھا رہا تھا۔ حساب  
بے باق کرنے کے لئے اس نے وہ چھوٹی کیپ میرے نام کر دی  
تھی۔ میں اب اسے اپنے پاس ہی رکھوں گی۔ قاسم کی موت سے  
ناگوار اٹھاتے ہوئے تم خواہ خواہ اس پر بھینچنے کی کوشش مت کرو۔  
میں اتنی کمزور عورت نہیں ہوں دیکھو یہ بھی۔ اب جبکہ تساری  
شخصیت ہم پر بے نقاب ہو چکی ہے تو یوں سمجھو کہ تم بھی خامے  
کمزور ہو چکے ہو۔

میں وہ کیپ ہمیں ہرگز نہیں دوں گی۔ وہ میرے لئے اس  
لفاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ میں اس پر بہت انحصار کر رہی تھی۔  
میرا ارادہ تھا کہ اب جو بھی میرے پاس ایک مشیت بڑی رقم آئے گی  
میں اسے کہیں انویسٹ کر کے پُر سکون اور شرفانہ زندگی بسر کروں  
گی۔ میں ان تھوڑا سا اور بے ہودہ کاموں سے بچ آچکی ہوں۔  
خود اپنی نظر میں میری کوئی عزت نہیں رہی ہے لیکن میں بحال  
ایک پُر عیش زندگی گزارنے کی عادی ہوں اس لئے مجھے شرفانہ  
زندگی گزارنے کے لئے بھی وسائل چاہئیں۔ اپارٹمنٹ میں خرید  
چکی ہوں۔ مزید رقم کا بندوبست ہو جائے تو اسے میں کہیں انویسٹ  
کر دوں گی جس سے میرے لئے ایک معقول قسم کی مستقل آمدنی کا  
ذریعہ پیدا ہو جائے گا۔ ممکن ہے خود کو مصروف رکھنے کے لئے میں  
کوئی بزنس بھی کر لوں۔ یہ ایک اچھا اور تعمیری مقصد ہے۔ تم اس  
میں رکاوٹ نہ بنو۔ تم پہلے ہی کافی کمایا ہے۔ آخر اتنی دولت کا تم  
کیا کر دو گے؟ اس کے علاوہ اگر تم فی فیکم نہیں کر دو گے۔ بے ایمانی  
کر دو گے تو قاسم کل کے آدمی بھی ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔ ان  
میں سے بھی کسی نہ کسی کو یقیناً سارے حساب کتاب کا پتا ہو گا۔  
لہذا میں ہمیں خبردار کر رہی ہوں کہ وہ کیپ زبردستی مجھ سے  
حاصل کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تم نقصان میں رہو گے اور  
تساری شخصیت پر سے نقاب بھی اُتر جائے گا۔ (اکیس)

فلظ ختم کرنے کے بعد بھی میں کسی کیسے تک اسی پر نظر جمائے  
بیٹھا رہا۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آئے لگی تھی۔ آخر میں نے خدا سے  
کرتے ہوئے پوچھا ”کیا اسے میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟“

”یہ میں آپ ہی کو دینے کے لئے لائی تھی۔“ وہ بولی ”مجھے  
اس کا کیا کرنا ہے۔ مجھے تو اس وقت صرف حفظ کی ضرورت ہے  
اور کچھ میں پولیس کے پاس جانے کی ہمت نہیں۔ میں قاسم کل کے  
کسی آدمی سے بھی مدد طلب کرنا نہیں چاہتی۔ میں اور جیل سمجھ  
معنوں میں قاسم کل کے ساتھی نہیں تھے۔ ہم تو اس ہوٹل میں پہلے  
سے ملازمت کر رہے تھے۔ قاسم کل نے ہوٹل خریدا تو ہم اس کے  
ملازموں میں شامل ہو گئے۔ پھر کسی کے توسط سے ہیروں کے اس  
دھندے میں معمولی سا کام کرنے لگے۔ مگر نہ ہمارا قاسم کل یا اس

کے لئے عرض ہوئی لیکن وہ گویا نور علی اپنے آپ پر کاہلیاں کرتا جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ لڑکی کا طرہ و احوال معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے، غلط بھی ہو سکتی ہے۔ میرا زیادہ وقت کچھ زیادہ اچھے لوگوں کے درمیان نہیں گزرنا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں بڑے لوگوں کے بارے میں بہت زیادہ جان مٹی ہوں۔ کون نہیں سے کہہ سکتا ہے کہ کس کی شخصیت کے تحت پہلو ہوں۔" وہ اپنی رائے کا اظہار احتیاط سے کرتا چلا آتی تھی۔

بہر حال اس کی مثال مولیٰ بشترا میں توجہ طلب تھیں۔  
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے  
کہ نوزی ایک "نگرہر ہیکس" پر معاش ہے، نوزی کو چلا جاتا ہے لیکن  
ضروری نہیں ہو تاکہ اس قسم کے "پنپے ہوئے" پر معاش ہر قتل  
گولی مار کر ہی کرے اور پھر نوزی کے بارے میں تو میں نے سنا ہے وہ  
عام بد معاش نہیں، ایک بدبخت گرد بھی ہے۔ اس قسم کے لوگ  
کسی بھی موقع پر ضرورت کے مطابق کوئی بھی طریقہ واردات  
اختیار کر سکتے ہیں۔ فرہین اور جمیل کو میرے خیال میں اس لئے گلا  
کٹ کر قتل کیا گیا کہ اس پاس کوئی فائرنگی آواز نہ کر متوجہ نہ  
ہو سکے کہ وہ دونوں ہی جگہیں ایسی تھیں جہاں قابل تارکے لیا جاتا  
اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ فخریا  
کسی اور تیرہ وار تارے سے قتل کر اس کا اسٹائل ہی ہو۔"

”آپ ان محاطات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر محاط لکھے میں بولی۔

”لیکن اس وقت زیادہ رہنمائی مجھے تم سے ملی ہے۔“ میں نے کہا ”میں تمہاری رائے سے کافی حد تک متفق ہوں۔ نو ذی قحطین اور جہیل کا قاتل ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ اگر وہ قاتل نہیں ہے تو پھر ہمارے سامنے سب سے اہم کام اس پڑا سرا پر اس کو تلاش کرنا ہے جاتا ہے۔ باقی سوالوں کا جواب تو تمہاری آمد سے مل گیا ہے۔ تمہاری آمد سے پہلے میں زیادہ اندھیرے میں تھا۔“

ہے اس کے بارے میں آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ اس نے اچانک ہی پوچھا۔

میں نے اس کی بڑی بڑی۔ خوب صورت مگر وحشت زدہ سی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں سادگی تھی۔ اس نے غالباً یہ سوال سادہ سے جنس کے تحت ہی کیا تھا۔ مجھے یوں گرمی نظر سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے کہہ کر خود ہی ہوجئی۔ اپنی عمر میں انگلیاں مضطربانہ سے اعزاز میں بالوں میں پھیرے ہوئے بولی "میں نے یہ سوال کر کے شاید خود کو حاکم کہلاتا ہے؟"

”تمہیں“ میں نے گہری سانس لے کر کہا ”تمہارا یہ سوال کافی حد تک فطری تھا۔ تم نے شاید یہ اندازہ لگایا ہے کہ فریمن نے وہ کیپ پیچھے دے دی ہوگی اور وہ اس وقت میرے پاس ہوگی؟“ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

سہر حال کسی خاص نکتہ پر مت یا قانونی کارروائی کے بغیر ہی ہوتا تھا۔ اس لئے اگر کسی کسی فریق کی نیت خراب ہو جاتی تھی، کوئی ہاں میں ہاں پیڑھیری کرنے یا اور ایسی چیزیں گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتا تھا تو فوری ہی اسے سیدھا کرتا تھا لیکن یہ باتیں میں نے زیادہ تر جیل سے سنی تھیں۔ مجھے خود شبی طور پر کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نے فوری کو صرف ایک بار قاسم بجلی کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہوا تھا۔"

”جو آدمی اپنے صرف ایک ساتھی کے ہمراہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے اس سے ایک عام لڑکی کو تو خوف آتا ہی جائے تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”مہر حال تمہاری آمد میرے لئے بڑی کار آمد ثابت ہوئی ہے۔ بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔“

پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”تمہارے خیال میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ فرحین اور جمیل کو نوڑی نے ہی قتل کیا ہو؟ جو شخص ہماری نظر میں پُر اسرار لباس ہے وہ درحقیقت نوڑی ہی ہو؟ اس نے قاسم بجلی کی بجلی میں رہتے ہوئے ہی دو سو پونے دو سو روپے کے

امیو ایک لمبے کے لئے سوچ میں پڑ گئی پھر ہچکچاتے ہوئے پولی  
"مکن تو ہے لیکن یہ بات کچھ زیادہ دل کو نہیں گنتی۔ میں نے نوزی  
کے بارے میں جو باتیں سنی ہیں اور ذاتی طور پر میرا اس کے بارے  
میں جو اندازہ ہے۔ اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ  
"جاسوسی" قسم کے چکرلوں میں پڑنے والا شخص نہیں ہے۔ وہ تو  
دھڑلے سے بد معاشی کرتا ہے۔ قاسم بجلی کے علاوہ بھی اسے نہ  
جانے کس کس کی پشت پناہی حاصل ہو۔ کئی مرتبہ پکڑا چکا ہے  
لیکن ثبوت اور گواہیاں نہ ہونے کی وجہ سے ہر بار رہا ہو جاتا ہے۔  
اس لئے بھی اس کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ مٹنا ہے پولیس  
اگر اسے پکڑتی بھی ہے تو بادل غماشت پکڑتی ہے کیونکہ اسے گرفتار  
کرنے والے پولیس آفیسر کی جان خطرے میں ہوتی ہے۔ جس  
حوالہ میں اس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے اس کے ججوں کو دھمکیاں  
لئے لگتی ہیں۔ ایک آدھ بار اگر کسی گواہ نے اس کے خلاف پیش  
ہونے کی کوشش کی تو وہ ایسا قاتل ہوا کہ اس کی لاش تک نہیں  
لا۔ ایسے آدمی عموماً جو کچھ بھی کرتے ہیں دھڑلے سے کرتے ہیں۔  
جیسے پر خائب ڈال کر بد معاشی دکھانے کا، انیسویں لطف نہیں آتا۔  
ان کی نفسیات ہی شاید کچھ اس قسم کی بن جاتی ہے۔"

میں بغور امریکی طرف سے کچھ رہا تھا۔ لڑکی ذہین معلوم ہوتی تھی۔  
خوف کے ان لمحات میں بھی اس کا ذہن مدھکی سے کام کر رہا تھا۔ وہ  
بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

ہو اس کے علاوہ وہ ممکن کے استعمال کا بہت شوقین مطمئن ہوتا ہے۔ سنا ہے فاز کرنے میں وہ ذرا دریغ نہیں کرتا۔ فرہین اور بیبل دونوں کو گلا کاٹ کر ہلاک کیا گیا۔ اس کی توازن ایک لمحے

موت کا دکھ تو تمہارے دل سے نہیں نکال سکا لیکن تمہارے غم اور اندیشوں کا بار بار اندر سے نکلتا ہوں۔ یہ کہ کہش نے سیکرٹری خیر چوہدری کو بلایا اور اس کے مشورے سے امیر کو باپ کو ہوش کے بجھل طرف ایک سنگل کمرے میں بھجوا دیا اور غریبی پر ہدایت کردی کہ وہ اس کی حفاظت کا خصوصی بندوبست کرے۔

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر فرمین کا خط نکال کر بیٹھ گیا اور پہلے سے زیادہ غور سے اسے پڑھنے لگا۔ اس کے الفاظ میں بدلے تھے لیکن میں ان کے عقب میں گویا کوئی نیا منہم تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شاید مجھے وہم سا ہو رہا تھا کہ اس خط کی مدد سے میں کوئی بات سمجھ سکا تھا مگر کچھ نہیں سکا تھا۔ خط پڑھ کر میں یہ کہہ کر کہ جب میں رکھ رہا تھا کہ ہوش کے ایک ملازم نے ایک وزٹنگ کارڈ لا کر میرے سامنے رکھ دیا اور کہا "گارڈ پوچھ رہا ہے اسے اندر بھیجوں یا نہیں؟"

گارڈ پر نظر پڑے ہی میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اتفاقات بعض اوقات بڑے جملے لگتے ہیں۔ وہ مشتاق ڈر کا کارڈ تھا۔ کارڈ بلاشبہ بہت خوب صورت اور سٹار کن تھا۔ اس کی خصوصیت کی طرح! صرف اس کا اخبار سٹار کن نہیں تھا۔ وہ شام کے انہی اخباروں میں سے ایک معلوم ہوا تھا جو رقیق، سستی خیزی، چٹیل پن اور مزاح سالے کے سارے بکتے ہیں مگر پھر بھی زیادہ عجیب و غریب صرف اس بات سے کوئی چاہتا تو مرعوب ہو سکا تھا کہ انگریزی میں تھا۔

میں نے ملازم سے کہا "اے صاحب کو فوراً عزت و احترام سے اندر لے آؤ۔"

ملازم میری ہدایت کے مطابق اسے گارڈ اور اس لڑکی سے "ہیپا" کر اندر لے آیا جو عارضی طور پر میری سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ملازم خود اس کے لئے میرے آفس کا دو ٹوٹا کھول کر کھڑا ہوا۔ میں پہلے ہی اس کے استقبال کے لئے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ قدرے رعوت سے گردن اگرائے اندر گیا تھا لیکن شاید اسے اتنے مؤدبانہ استقبال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے حتی الامکان عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا۔

اس کی رعوت کچھ کم ہو گئی۔ گردن ذرا ڈھیل پڑی دکھائی دی۔ شاید اندر ہی اندر وہ کچھ پزل بھی ہوا تھا لیکن اس نے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں نے گرجوشتی سے اس سے مصافحہ کیا اور ایک بار پھر دل میں اس کے دست و بازو کی مضبوطی پر حیران ہونے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بائپ رائٹر نہیں بلکہ دست ڈائل اور پینٹنگ بک وغیرہ پر طبع آزمائی کرنے والا کوئی معلوم ہوا تھا۔

اس کی پہل میں ایک اخبار دیا ہوا تھا۔ وہ پیچ اس کے اپنے اخبار کا نامزد تھا۔ اخبار میں اس نے فرمین کے قتل کے سلسلے میں

"لیکن ایسا نہیں ہے۔" میں نے کہا "میرے میرے پاس نہیں ہیں لیکن میری شدید خواہش ہے کہ بیرون کی تلاش میں کوئی تم تک یا مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرنے۔ میں فرمین اور جیل کے قاتل کو جھوٹوں کا نہیں۔ فرمین نے بڑے مان سے مجھ سے مدد طلب کی تھی اور تم ہماری ہو کہ جیل بھی کچھ ایسے ہی ارادے سے میرے پاس پہنچا تھا۔ میں ان دونوں کی روحوں سے شرمندہ ہوں۔ یہ دونوں مجھے ایک عجیب سا بچہ بنا دے گئے ہیں۔"

وہ مسکرائے ہوئے منہم سے لمبے میں بولی "مجھے بھی بڑی خوشی ہوگی اگر میں جیل کے قاتل کو انجام تک پہنچنے دیکھ لوں۔ اس کے بعد موت بھی آجائے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔"

"جیل نہ جانے کس طرح میرے کمرے تک پہنچ گیا تھا۔"

میں نے ایک لمبے کی بوجھل خاموشی کے بعد کہا "میرا اسٹاف کسی اجنبی کو میرا کمرہ نہیں جاسکتا تھا اور نہ ہی اندر بیٹھنے کے لئے چاہی دے سکتا تھا۔"

"وہ ہوش کی لائق کا آدمی تھا۔ یہ اس کے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔" وہ مجھے لمبے میں بولی۔

شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میرا حال مجھے اپنے ایک انتہائی کلرک سے یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص نے میرا کمرہ جاننے کی کوشش کی تھی لیکن کلرک نے اس کا جو ٹھیکہ بتایا ہے وہ نوزی کا ہے۔ اسی لئے میرا شبہ نوزی کی طرف جارہا ہے کہ شاید قاتل اور پراسرار اس دی ہو۔ وہ پیچھے کسی نہ کسی اور ذریعے سے میرا کمرہ معلوم کر کے جیل سے پہلے یا جیل کے بعد وہاں پہنچا تھا۔"

"میں ممکن ہے۔" اس کے لمبے میں اضمحلال جھٹک آیا۔ "بائیں بہت ہو گئیں۔ مجھے انہوں سے کہ میں اس دوران نہیں کچھ کھانے پینے کے لئے پوچھنا بھول ہی گیا۔" میں نے محضرت خواتان سے ملے میں کہا۔

"کھانے پینے کا کسے ہوش ہے۔" وہ جھپکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "کل شام میں نے جیل کے گھر پھیل کی لاش دیکھی تھی۔ اس وقت سے میں نے نہ تو کچھ کھایا ہے اور نہ ہی میں سو سکی ہوں۔"

اس کی آنکھوں کے گرد خفیف سے ملتے اس کی بات کی تائید کر رہے تھے۔ اس کا ایک آپ سے عاری چوکرے میں داخل ہونے وقت ہلکے ڈور گھبراہٹ کی وجہ سے ضرور تھم رہا تھا لیکن آپ اس کے چہرے پر زیدی، جھن اور اضمحلال غالب تھا۔

"میرا حال اب بلا تھک بتاؤ کہ تم کیا کھانا پینا پند کرو گی؟"

"پہلے مجھے کسی کمرے میں بھجوا دیجئے۔ اگر میرا دل چاہا تو میں وہیں کچھ منگوا لوں گی۔ میں اب تک نہ جانے کس طرح صحت کے پھر رہی تھی لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں ڈیر ہونے ہوں۔"

"اب تم تمام تفکرات کو ذہن سے جھٹک دو۔ میں جیل کی



کے ساتھ اسے بھی لڑا رہے ہوتے ہیں۔ اپنی خوب صورت پر تنگ اور سنسنی خیز سریشوں کی وجہ سے یہ فوراً نظروں میں کھب جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بے یقینی سی ابھری لیکن وہ اپنی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے بولا "سرکولیشن والے مجھے بتاتے تو ہیں کہ اب ہماری اشاعت تین لاکھ پونے دو لاکھ ہے اور تین لاکھ اخبار چھپنے کا مطلب ہے کہ اسے کم از کم پندرہ لاکھ افراد پڑھتے ہیں لیکن میں ان سے یہی کہتا ہوں کہ تین لاکھ اشاعت بھی بھلا کوئی اشاعت ہے؟ کاش ہمارے ہاں تعلیم کی شرح کچھ زیادہ ہوتی اور لوگوں میں قوت خرید بھی زیادہ ہوتی تو ہم اس کی اشاعت کو نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاسکتے تھے۔"

میں دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ سکا۔ یہ شاید اس کی سالانہ اشاعت تھی جسے وہ پونے پانچ لاکھ تین لاکھ میں بظاہر مرغوبیت کا ڈراما جاری رکھتے ہوئے کہا "جی ہاں تو یہ ہے کہ میں آپ کا اخبار واقعی نہیں دیکھتا تھا یونہی ایک توہ مرتبہ نظر سے گزرا تھا لیکن اس کی زبردست مقبولیت کا اندازہ تو مجھے آج ہوا جب اس میں میرا ذکر چھپا اور اخبار مارکیٹ میں آنے کے بعد سے اب تک مجھے بیسیوں عزیزوں، رشتے داروں اور جاننے والوں کے ملٹی فون آچکے ہیں کہ یہ کیا چکر ہے۔ میرا ذکر کیوں اس انداز میں اس رپورٹ میں آیا ہے؟ کیا میں واقعی فرمین کے قتل میں ملوث ہوں؟ میں نے انہیں قتل دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے شاید مشتاق صاحب کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے" جب ملاقات ہوئی تو بس غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

پھر میں نے میز پر ذرا جھکتے ہوئے نہایت دوستانہ لہجے میں کہا "کیوں؟ میں نے ٹھیک کہا تا کہ جب ملاقات ہوگی تو سب غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی؟"

وہ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد انگریزی میں بولا "اس کا انحصار کیا باتوں پر ہے۔"

"اے صاحب! باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ سب باتیں ملے ہو جاتی ہیں لیکن آپ نے تو کوئی بات کرنے سے پہلے ہی ہمیں رکڑ ڈالا۔ آپ نے ہم سے بات تو کی ہوئی۔" میں نے خوشامدہ سے انداز میں ہی شکوہ کیا "ہم کاروباری لوگ ہیں۔"

"چلیے ابھی تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اب بات کر لیتے ہیں۔" وہ شاعرانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "لیکن آپ کچھ اور صبر سے سمجھئے گا۔ میں بلک میلر قسم کا صحافی نہیں ہوں جو خود اذیت خذرانہ لے کر مل جاتے ہیں۔"

"اے صاحب! تو یہ سمجھتے ہیں نے تو ایسا سوچا نہیں تھا۔"

میں نے آہستگی سے گالوں پر ہاتھ دارتے ہوئے کہا۔ "میرا مسئلہ خذرانہ نہیں ہے۔ میں حقیقت جانتا چاہتا ہوں۔" وہ زور دے کر بولا۔

مخصوص رپورٹ مچالی تھی۔ بلک میلر قسم کے صحافیوں کا یہ مخصوص "طریقہ وارادت" تھا۔ اگر ان کا اخبار زیادہ مقبول نہیں ہوتا تھا اور انہوں نے بطور خاص کسی کو متوقع شکار سمجھتے ہوئے نکال دیا تو اس پر کوئی تیر چلایا ہوتا تھا یعنی اس کے بارے میں کچھ چھاپا ہوتا تھا لیکن انہیں یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ چیز ان کے شکاری نظر سے گزری ہوگی تو وہ خود وہ شمارے کے شکار کے پاس پہنچ جاتے تھے یا بذریعہ ڈاک بھجوا دیتے تھے اور پھر فون پر یا خود نازل ہو کر درمحل معلوم کرتے تھے۔

"بے نصیب۔۔۔ بے نصیب" میں نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے خوشامدہ سے لہجے میں کہا "جو میرے لئے ایک ناما مشکل کام تھا۔ مجھے یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ یہ شخص اداکاری نمی جو میں بھجوا کر رہا تھا وہ نہ دلی طور پر میں اس سے ہرگز خوش نہیں تھا۔ فطری طور پر مجھے اس وقت کچھ ایسا ہی کرار ادا کرنا تھا۔ اسی سے مشتاق ڈاکو کو فحش مندی کا احساس ہو سکتا تھا۔ اگر میں اپنے آپ کو کچھ خوش و خرم ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تو میرا رویہ غیر فطری محسوس ہوتا۔"

"مشتاق صاحب! اس وقت میں خدا سے کچھ اور مانگ لیتا تو شاید وہ مجھے بھی مل جاتا۔" میں نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں اس وقت آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آپ کو فون کروں یا خود آپ کی خدمت میں حاضری دوں۔"

وہ ہنس کر اور اسی دوران اس کی نظر میری میز پر پڑے ہوئے اپنے اخبار پر پڑی وہ صفحہ اوپر ہی تھا جس پر اس کی رپورٹ چھپی ہوئی تھی۔ اب اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھری اور وہ سر ملاتے ہوئے بولا "ہماری کارگزاری تو پہلے ہی یہاں پہنچی ہوئی ہے۔"

"کارگزاری نہیں صاحب! کارنامہ کیسے کارنامہ۔" میں نے اسے چاروں طرف سے محض کا رویہ اپنائے رکھنے کی کوشش کی جو غلغلے میں دل میں چلا ہوا تھا مگر مجبوراً خوش ظنی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" وہ سر ملاتے ہوئے بولا "آج کے درمیان بچ لکھنا کسی کارنامے سے کم نہیں۔ میں تو سمجھا تھا میرا بچ آپ تک نہیں پہنچا ہو گا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمارا اخبار کوئی امت بڑا اخبار نہیں ہے اور نہ ہی عوامی سطح پر چھپا جاسکتا ہے کیونکہ انگریزی میں ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس کی کم اشاعت نہاوجہ سے شاید اس کی رسائی آپ تک نہ ہوتی ہو اس لئے میں جتنا ایک کالی ساتھ لے آیا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ یہ تو آپ کی میز پر پہلے سے موجود ہے۔"

"اے صاحب! کون کتا ہے آپ کے اخبار کی اشاعت کم ہے۔" میں نے ہاتھیں پھیلاتے ہوئے کہا "ہر ایک انسان پر تو نظر آئے اور دھڑ دھڑک رہا ہوتا ہے۔ ہر مسئلہ پر یا کردیگر اخباروں

”کیسی حقیقت؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔  
 ”یہی کہ آپ فرمیں کے اپارٹمنٹ میں کیوں موجود تھے؟“ وہ میری آنکھوں میں بھانکتے ہوئے بولا۔

”کمال ہے مشتاق صاحب!“ میں نے حیرت سے کہا ”آپ شہرِ قس کے اتنے زبردست جرمن ہیں۔ کیا آپ کو بھی یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس قسم کی لڑکیوں کے پاس ہم جیسے لوگ کیوں جاتے ہیں؟ مجھے اس نے وقت ملا تھا۔ میں برا خوش خوش وہاں پہنچا لیکن وہ اپنے بیرونی لباس میں مڑھ پڑی تھی۔“

”آپ کی جگہ کوئی اور سینہ ہوتا تو خاموشی سے وہاں سے نکلتے کی کوشش کرتا لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے خود پولیس کو اطلاع دے کر وہاں بلایا تھا۔“ وہ پلک بھپکائے بغیر بولا۔

”میں آپ کو دانتہ اداری سے تیار ہوں۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا لیکن پھر میرے دل میں سو طرح کے سو سے آئے میں نے سوچا شاید فرمیں نے کسی سے میرے آنے کا ذکر کر رکھا ہو۔ ممکن ہے کسی نے مجھے اس کے ہاں جاتے دیکھ لیا ہو اگر بعد میں پولیس کو کسی بھی درجے سے مطلع ہوا کہ میں اس کے ہاں گیا تھا تو میں ان کی نظریں زیادہ مشکوک ہو جاؤں گا۔ پھر میرے لئے جان چھڑانا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مجھے یاد آیا کہ اس علاقے کا ایسی ایچ او تو تیرا جاننے والا تھا۔ وہ دیدار ملا والا آدمی ہے۔ اسے معلوم ہے میں ایک بے ضرر کاروباری آدمی ہوں۔ قتل وغیرہ جیسے چکرلوں میں نہیں پڑتا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے اسے بلالیا تھی برسرِ سمجھا۔“

مشتاق میرے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ بے اطمینانی اس کی آنکھوں سے بھاگ رہی تھی۔ اس نے زبان سے بھی اس کا انکار کر دیا ”مجھے بات کچھ اور لگتی ہے۔“

”کچھ اور؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں ”مثلاً کیا؟“

”شاید فرمیں سے آپ کی شہسائی زیادہ پرانی ہو۔ شاید اس نے کسی کام میں آپ سے مدد طلب کی ہو۔ شاید وہ آپ کی کسی وفات سے ماری گئی ہو۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں مشتاق صاحب! پبلیاں نہ بچھو اپنے کھل کر بات کیجئے۔“

”تمہاری اشار ہوئی قاسم بھائی کی ملکیت ہے اور فرمیں وہاں کام کر رہی تھی بلکہ یوں کہیے کہ وہ ایک ملاپ ہوئی تھا۔ قاسم بھائی کی ملکیت میں آنے کے بعد وہ فرمیں ہی کی وجہ سے چلا۔ وہ وہاں جس قسم کے پروگرام پیش کر رہی تھی آپ کو معلوم ہی ہے۔ قاسم بھائی ایک بدنام آدمی تھا۔ اس کے نہ جانے کیا کیا وعدے تھے۔ کوئی عہد نہیں کہ فرمیں اس کے کسی اور وعدے میں بھی شریک رہی ہو۔ اس کی ذمہ داری کا بیشتر حصہ باہر گزارا تھا اور اب بھی وہ باہر یوں آئی جاتی رہتی تھی جیسے ہم لوگ پروسی کے گھر آتے جاتے

ہیں۔ آپ بھی ایک ہوئی کے مالک ہیں۔ فرمیں سے آپ کا تعلق بھی خالی از طاعت نہیں لگتا۔“

”میرے بھائی!“ میں نے گویا قتل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں قتل پیدا ہی کہاں ہوا تھا؟ ابھی تو قتل استوار کرنے کے لئے پہلا قدم ہی اٹھایا گیا تھا۔ سر منڈانے ہی اگلے بڑھکے۔ فرض کرنے کا کیا ہے؟ فرض تو آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اپنے مفروضوں کو اخبار میں بھی لکھنا شروع کریں۔“ میں نے ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رکھا تھا کہ مجھے اس کے لکھے کی بہت پردا تھی ”میں اسے بہت اہمیت دے رہا تھا اور اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے نہایت ملامت سے کہا ”میں تو آپ سے اسی لئے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا کہ اگر آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے تو اسے دور کر سکو۔ اس کے علاوہ میں ہر طرح سے آپ کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔ آپ بلا تکلف مجھے کوئی حکم دیجئے۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے اپنے الفاظ کے رد عمل کا انتظار کیا لیکن وہ خاموش بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا شاید ابھی اس کے خیال میں پوری طرح کھلنے کے لئے موقع مناسب نہیں تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام بڑھتے ہوئے کہا ”میں کاروباری توئی ہوں مشتاق صاحب! میں انکیترو لوں میں ٹھہرنے کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ میرا تو ہر طرح سے آپ کی خدمت کے علاوہ آپ کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں بھی آپ کی کچھ دگر کرنے کا ارادہ تھا۔“

”وہ کس طرح؟“ اس نے آنکھیں سیکڑ کر میری طرف دیکھا۔ ”آپ صحافیوں کے تو ہر جگہ تعلقات ہوتے ہی ہیں لیکن تھوڑے بہت تعلقات ہم کاروباری لوگوں کے بھی ہوتے ہیں۔“

میں نے روبرو ایک چیز کے پیشے سے بچ کر لگتے ہوئے کہا ”آپ کو گفتگوئی قاتل کے ایس ایچ او اور جیم کل کے بارے میں تو اتنا اذہار ہی چکا ہے کہ وہ اپنا مرید ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بڑے افراد سے بھی اپنے بہت اچھے مراسم ہیں۔ اگر آپ ہمیں اپنے دوستوں میں شمار رکھتے تو شاید ہم آپ کو بھی کچھ بڑے کام کی گمانیاں بہت اندر کی خبریں دیا کرتے۔ بہت سے کرائم رپورٹرز جو ہمیں گفتگوئی رپورٹنگ کرنے کے بعد بھی معلوم نہیں کیا ہے وہ ہم آپ کو گھر بیٹھے بتا دیا کرتے۔ آغا کے طور پر شاید آپ کا یہ خادم آپ کو فرمیں کے قتل کے سلسلے میں ہی کوئی کام کی بات بتا دیتا۔“

”مثلاً؟“ اس کی آنکھیں بدستور سکڑی ہوئی تھیں اور وہ بیٹھا پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے لیے سے دلچسپی نہ جھٹکنے پائے۔ ”میں نے عرض کیا یا مشتاق صاحب! میں کاروباری آدمی ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ نے اپنے اخبار میں مجھے رگڑا دیا ہے۔ اب میں جو اب ایک ایس ایم ٹی ہوں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ دنیا میں زیادہ تر معاملات کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر چلتے ہیں۔ مثلاً

آپ کو زیادہ فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں لیکن تمہارا سا فائدہ مجھے بھی پہنچانا چاہیے۔  
 ”کیا؟“ وہ مجھ کو رہا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً ایک شکاری کی طرح چمکنا تھا۔

”میں آپ کی مالی خدمت بھی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کیس کے سلسلے میں بھی آپ کو ایک اہم شہدوں کا اور آئندہ بھی اگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تو آپ کو ضرور مطلع کرتا رہوں گا۔ اس کے عوض مجھے صرف اتنا فائدہ ہونا چاہیے کہ آپ آئندہ کبھی مجھے اسکیٹلائز کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کیس میں تو خیر دینے بھی آپ نے مجھے ذرا سستی چھیننے کی کوشش کی ہے لیکن بہر حال میں بندہ بشر ہوں۔ کبھی کسی معاملے میں میرا ہاتھ میلا ہو بھی سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان ایک شرطنامہ سا معاہدہ برقرار رہے“ آپ مجھے نظر انداز کریں۔“

میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھے ایک عام سائبرول سا کاروباری آدمی سمجھے جو اس جیسی صحافت کرنے والوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتا تھا اور پہلی بار ہی کسی اسکیٹل کی زد میں آنے پر سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ یہ کاروباری آدمی ہر قیمت پر آئندہ گئے لئے تحفظ تلاش کر رہا تھا۔

وہ چند لمبے خاموش پر کھڑا نہایت بے باکی سے بولا ”آپ مجھے کتنی رقم دے سکتے ہیں؟“  
 ”جتنی آپ معقول حدود میں رہتے ہوئے طلب کریں۔“ میں نے بلا تاثر جواب دیا۔

”تھیک ہے فی الحال صرف دس ہزار دے دیجئے۔“  
 ”آپ کا مطالبہ مناسب ہے۔“ میں نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”معاہدہ جتنا سنگین تھا اس کے مقابلے میں تو رقم بہت کم ہے لیکن میں نے اس لئے کم رقم کا مطالبہ کیا ہے کہ آپ مجھے کوئی اہم شہد دینے والے ہیں۔“

”بے شک۔ بے شک۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔“ میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور اہم کام پر اپنی عارضی سیکرٹری کو گمراہ کیشنر سے گودس ہزار روپے لٹائے میں رکھ کر فوراً مجھے بگوا دے۔“

ریپورر رکھ کر میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اہمیت کے اظہار کے لئے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ ہمارے درمیان باہر کی نہیں ہوئی۔“

میں نے اتنی دیر میں پہلی بار اسے کرسی پر کسمپاسے دیکھا۔ وہ پلو بدل کر بولا ”رقم تو اتنی رہے گی۔ آپ بے تباہی نہ کیا ہے؟“  
 اندرونی طور پر وہ یقیناً بے چین اور مضطرب تھا لیکن بظاہر اپنے اوپر قابو رکھے ہوئے تھا۔

میں نے اس کی طرف جھٹکے ہوئے ذرا رازدارانہ سے انداز

میں کہا ”آپ کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے میری فون پر رحیم گل سے بات ہو رہی تھی۔“ میں نے جملہ اذہورا چمکڑایا۔ یکدم ہی گویا میں نے کوئی اعتراف محسوس کرتے ہوئے کہا ”آپ کو اس سلسلے میں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا کہ آپ رحیم گل کو کچھ نہیں بتائیں گے اور نہ ہی اس سے کچھ پوچھیں گے۔ اگر آپ نے اس موضوع پر اس سے ایک لفظ بھی کہا تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ میرے پیٹ میں بات نہیں رہی بلکہ اس نے فوراً ایک پولیس سیکرٹ ایک آؤٹ کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ایک تواریخی دوستی میں فرق آئے گا۔ وہ دوسرے وہ آئندہ کے لئے خطا ہو جائے گا اور کبھی مجھے کوئی بات نہیں بتائے گا جو آپ جیسے لوگوں کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی ہو۔“

”میرا آپ سے وعدہ ہے میں اس سلسلے میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گا لیکن آپ اب اتنا سوسن پیدا مت کریں اور کام کی بات کریں۔“ وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

”رحیم گل کو آج کسی لڑکی نے فون کیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ معلوم ہوئی تھی۔“ میں نے اپنی آواز کچھ اور نیچی کرتے ہوئے کہا۔ وہ صحیح طور پر سننے کے لئے بے اختیار سیز پر کچھ آگے کو جھک آیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”وہ فرجن اور جمیل کے قتل کے سلسلے میں پولیس کو کچھ بتانا چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ان دونوں کی موت کے بعد اس کی جان کو بھی شدید خطرہ لاحق تھا اس لئے وہ کیس چھپی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کبھی پولیس کی تحویل میں دینا چاہتی تھی لیکن پولیس سے بھی سخت خوف زدہ تھی۔ آپ کو اپنے ہاں کی پولیس کی ریپوٹیشن کا تو پتا ہی ہے۔ رحیم گل کافی پرہیزگار اور باکراور پولیس آفیسر ہے۔ اس نے لڑکی کو بہت تسلیاں دیں کہ اگر وہ اس کی تحویل میں آجائے تو اس کی عزت اور جان کو قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہو گا لیکن فی الحال لڑکی رضامند نہیں ہوئی۔ تاہم اس نے کہا ہے کہ شاید ایک آدھ دن میں وہ دوبارہ رابطہ کرے۔ رحیم گل کہہ رہا تھا کہ اگر دوبارہ اس لڑکی کا فون آیا تو وہ مجھے بتائے گا۔ کبھی بات تو یہ ہے کہ میں نے ہی اس سے فرمائش کی تھی کہ وہ مجھے ضرور بتائے۔ میں جتنی سے بے چین ہو گیا تھا۔“

”مگر کی بات کیا؟“ وہ مکر کرائی سی آواز میں بولا۔ میں نے یکدم ہی اس کے لیے میں عجیب سی تہذیبی محسوس کی جس پر شاید وہ قابو نہیں رکھ سکا تھا۔  
 ”کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہی تھی کہ یہ کوئی عام قتل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی لمبا چکر ہے۔ لڑکی تو اسے پوری جاسوسی کمائی بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی اس میں کسی پراسرار شخصیت کا بھی ہاتھ ہے جو یہی پروہ رہتی ہے۔ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس فرجن کا کوئی اہم خط ہے۔ بہر حال رحیم گل کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ لڑکی کی باتیں قطعی بے ربط تھیں اور وہ بڑے خوف کے عالم میں بات کر رہی تھی۔ سلسلہ

بھی اس نے یکدم ہی منتقل کر دیا تھا لیکن اتفاقاً ضرور کہہ چکی تھی کہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ دوبارہ فون کرے گی۔ رحیم گل کو اب بے تابی سے اس کے فون کا انتظار ہے اور مجھے رحیم گل کے فون کا انتظار ہے۔

میں خاموش ہو گیا اور مسکراتے ہوئے قدموں سے داخلہ طلب سے انداز میں مشتاق کی طرف دیکھنے لگا۔ میری مسکراہٹ اس وقت یقیناً اسے خاصی احتیاط لگ رہی ہوگی۔ اس نے ہنگامہ بھرتے ہوئے کرسی کے پٹے سے نچک لگایا۔ وہ ایک بار پھر سکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے یقیناً بڑی تیزی سے اپنے اعصاب پر قابو پایا تھا اور اپنے اندر رہا ہونے والی پھل کو دبایا تھا۔ اب وہ آنکھوں کی آنکھوں میں ایک بار پھر مجھے تول رہا تھا۔ میں مطمئن تھا۔ مجھے اعتماد تھا کہ میں نے خاصی عمر کی سے اپنا کردار ادا کیا تھا۔

اس دوران کیشٹر خود ایک لفافہ لئے آفس میں داخل ہوا۔ لفافہ اور ایک وادچر اس نے خاموشی سے میرے سامنے رکھ دیا۔ وادچر پر ایک خانہ ہوتا ہے جس میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ رقم کد میں ادا کی گئی۔ میں نے اس میں لکھ دیا "دفتری خرچہ اور خاطر تواضع" حالانکہ یہ دفتری خرچہ تھا اور نہ ہی میں مشتاق مدثر کی خاطر تواضع کر رہا تھا۔ میں تو اس کی "خاطر تواضع" کسی اور ہی طرح کرنا چاہتا تھا لیکن بہرحال اگم ٹیکس، سٹریٹس اور آؤٹ ... دالوں کے لئے کاغذات کا بیٹ تو بھرنا ہی پڑتا ہے ورنہ وائنداری کا قحط تو یہ تھا کہ میں وادچر پر لکھتا "پارادرائز شکار"۔

میں نے وادچر پر ساکس کر کے کیشٹر کو واپس کر دیا اور وہ نمونہ انداز میں سر جھکا کر خاموشی سے لوٹ گیا۔ میں نے لفافہ مشتاق کی طرف بڑھاتے ہوئے لکھا "قرض منقولہ"۔ بلکہ اسے نو پلری گھنٹے دینا کے خوب صورت محبت ناموں میں سے ایک۔ خلاف توقع اس نے فوری طور پر لفافہ لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا اور ملائمت سے بولا "افضل صاحب! آپ چاہیں تو اسے واپس رکھ سکتے ہیں۔ آپ نے مجھے بہت اہم بات بتائی ہے۔ اب رقم کی زیادہ اہمیت نہیں رہی۔"

"آپ نہایت غیر کاروباری بات کر رہے ہیں مشتاق صاحب! رقم ہمیشہ اہم رہتی ہے۔ اس کی مقدار یا موقع محل کے لحاظ سے اس کی اہمیت کتنی بڑھتی رہتی ہے لیکن میرے خیال میں جب اس کی اہمیت کم ہوتی ہے تب بھی دوسری بہت سی چیزوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے اور پھر میں یہ رقم مل پر پھر دیکھ کر نہیں بلکہ اپنی خوشی سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر اتنی حقیر سی رقم کے سارے میں آپ کے دوستوں میں شمار ہو سکتا ہوں تو میرے لئے یہ سودا بہت سستا ہے۔"

اس نے لفافہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور وہ صفائی سے اس کی جیب میں چھپ گیا۔ وہ ٹائی کی گروہ درست کرتے ہوئے بولا "افضل صاحب! آپ کا مددگار آدمی ہیں اور میں اخباری آدمی ہوں۔ آپ

سے میری دوستی اس حقیر رقم کے سارے نہیں، خبر کے سارے استوار ہوگی۔ آپ رحیم گل سے رابطہ رکھیں گے اور جو بھی اس سلسلے میں مزید کوئی خبر ملے گی، آپ ایک لمحہ ضائع کے بغیر مجھے مطلع کریں گے۔"

اس نے میرے سامنے رکھے ہوئے اپنے وزٹنگ کارڈ کی طرف اشارہ کیا "اس پر میرے موبائل فون کا نمبر بھی موجود ہے۔ آپ کو مجھ سے فوری رابطہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ کیا میں تعاون کی امید رکھوں؟"

"امید؟ ارے صاحب! آپ یقین رکھیں۔" میں نے تودرنے کر کہا۔

وہ یکدم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ اس بار اس کا مصافحے کا انداز دوستانہ تھا ورنہ جب وہ آیا تھا تو اس کے مصافحے کے انداز میں بھی گویا ایک دم کی چٹائی ہوئی تھی۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسے رخصت کرنے پر ہر تک آیا۔ دروازے سے ذرا آگے اس کی ہنڈا اکڑا کر لی تھی۔ میں نے اس کے وزٹنگ کارڈ پر اس کے کمر کا پتہ لکھا تھا۔ کمر کا پتہ ایش کا تھا۔ وہ ہنڈا اکڑا کر میں گھومتا تھا، دھنسن میں رہتا تھا اور موبائل فون بھی رکھتا تھا۔ اس کے پیشے کو دیکھتے ہوئے یہ قابل غور باتیں تھیں۔

میں نے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا "بڑے ٹھات چیں آپ کے لگتا ہے صحافت پر بہت اچھا وقت آیا ہے۔ آپ کا اخبار آپ کو یقیناً بہت اچھی تنخواہ اور بہت سی مراعات دیتا ہوگا؟"

وہ گاڑی میں بیٹھنے بیٹھتے رک گیا اور استہزائی سے انداز میں ہنسا "دفتر سے مجھے جو تنخواہ ملتی ہے اس سے میرا پیڑل کا خرچہ بھی پورا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر ہزاروں کا سلسلہ بہت بھلا ہوا ہوگا؟" میں نے سادگی سے اظہار خیال کیا۔

"ہزاروں کا سلسلہ معقول ہے لیکن بہت زیادہ بھی نہیں ہے۔ ان سے ٹھات بات قائم رکھنے میں مدد ضرور مل رہی ہے مگر یہ سلسلہ بھی میرے ٹھات بات کی بنیاد نہیں ہے۔" وہ کمری عجیب کی سے بولا۔

"تو پھر اصل بنیاد کیا ہے؟ کچھ نہیں بھی بتائیے نا۔" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے دوستانہ اور رازدارانہ سے انداز میں کہا "ہم کا مددگار لوگوں کو تو ایسے نسخوں کی تلاش رہتی ہے۔" اس کی عجیب کی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے اصل بات آپ کو بتا ہی دوں۔ کس آپ کما

ظلمتی میں جلا نہ ہو جائیں۔ بات یہ ہے افضل صاحب! کما ایک زمیندار گھرانے کی آخری نسلانی ہوں۔ صحافت میرا شوق اور مشغلہ ہے۔ ذریعہ معاش نہیں۔ میرے پاس اپنے فالو وقت کا کوئی

وقت دوسری مجلسوں پر مصوب ہیں۔ اس لئے ہمیں تکلیف دے رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ تم سے دوستی کے بعد دینے بھی انسان کے مقدر میں تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ بولو یہی تکلیف کیا ہے؟“ وہ لفظی سانس لے کر بولا۔

”ایک تو تم جیسے جہلا کو مذہب انسانوں والی زبان بھی پاس نہیں آتی۔“ میں نے معنوی بے زاری سے کہا ”وہ جو تم ایک لے ہو وہ سارا اخبار میرے منہ پر مار گئے تھے جس میں ایک بے ہودہ سی رپورٹ بھیجی ہوئی تھی۔“

”ہاں وہ ایک بے ہودہ آدمی کی دوسرے بے ہودہ آدمی کے بارے میں رائے زنی تھی۔“ وہ بات کانٹے ہوئے بولا۔

”تم مشتاقی و شکر کو جانتے ہو؟“

”ہمت سرسری طور پر۔“ وہ بولا ”دو تین تقریبات میں ملاقات ہوئی ہے۔ آخر تم نے اس کے بارے میں حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لی لیا؟ مجھے معلوم تھا تمہارا ذہن اکوہ دماغ ذرا دیر میں حرکت میں آئے گا۔“

”جو اس مت کو اور کام کی بات سنو۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلومات چاہئیں۔ اس کے پس منظر کے بارے میں جتنا بھی زیادہ سے زیادہ معلوم ہو سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ تمہارے پاس کوئی آدمی ہے جو اس کے بارے میں کم سے کم دقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکے؟“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سیٹھ رمضان بولا ”میرے اپنے آدمیوں میں سے تو شاید کوئی اتنے کم وقت میں معلومات حاصل نہ کر سکے لیکن ایک انگریزی اخبار میں میرا ایک دوست ہے۔ بہت چرانا سمجانی ہے۔ انگریزی صحافت کے ہر قابل ذکر شخص کو جانا ہے۔ یوں کہو کہ مخالفین کی چلتی پھرتی دائرہ کشی ہے۔ میں اس سے معلوم کرتا ہوں۔ شاید اسے معلومات حاصل کرنے میں بھی دقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ اس کے پاس پہلے ہی سے تمام ضروری معلومات موجود ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہو تم مجھے جلد از جلد اس کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرو۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟ کچھ کرنے سے پہلے ہم بزرگوں سے مشورہ لے لیتا۔“

”تم تھلا کچھ رہے ہو یا راجا؟“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا ”تمہارا خیال ہے کہ اس نے اپنی رپورٹ میں فرجین کے قتل میں مجھے ملوث کرنے کی جو کوشش کی ہے اس سے مجھے ذاتی طور پر صدمہ پہنچا ہے اور اب میں تم سے اسے کوئی سبق سکھانا چاہتا ہوں؟“

صرف نہیں تھا۔ کھینے کا مجھے شوق تھا۔ صحافت کے جراثیم مجھ میں موجود تھے۔ پہلے میں نے اپنے چھوٹے سے گاؤں سے بڑے بڑے انگریزی اخباروں کو مرا لے بیچنے شروع کئے تھے۔ آخر کار خوں مالاں مالاں اور صحافت کے میدان میں کود پڑا۔ امید ہے اب بات آپ کی سمجھ میں آجی ہوگی۔“

”بے شک“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”مہربانیت کچھ میں آجی بلکہ آپ کی قدر بھی میرے دل میں کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ آپ نے صحافت کے میدان میں چلا ننگ لگائی بھی تو بہت خوب لگائی۔ بڑے رنگین شعبے میں مقام بنایا آپ نے اپنا۔ مجھے تو آپ پر شک آئے لگا ہے۔“

وہ دھیرے سے چٹا ”جس بس افضل صاحب! اب زیادہ کھن نہ لگائیں۔ میں سر حال آپ کا دوست بن چکا ہوں لیکن یہ دوستی زیادہ مضبوط اس وقت ہوگی جب آپ مجھے رحیم گل سے مزید معلومات حاصل کر کے دیں گے۔“

”اگر رحیم گل کو اس لڑکی کا فون آیا تو یقین رکھیے آپ کو ضرور معلوم ہو جائے گا اور مزید جو بھی باتیں وہ کہے گی وہ بھی آپ کے علم میں آجائیں گی لیکن اس سلسلے میں کبھی۔ کبھی جگہ میرا نام نہیں آتا چاہئے۔“

وہ میرے کندھے پر ہاتھ دارتے ہوئے بولا ”آپ اطمینان رکھیں افضل صاحب! اچھے صحافی کبھی اپنا سوس آف اخبار پیش خاطر نہیں کرتے۔ اس طرح تو ان کا دھند ابلدی ہی چھوٹ ہو جائے۔ لوگ انہیں کوئی بات بتاتے ہوئے ڈرنے لگیں۔“

میں نے اپنے چہرے سے طمانیت ظاہر کرنے کی کوشش کی اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ اس کی گاڑی فطرے اور جمل ہوتے ہی میں آفس میں داخل کیا اور موبائل فون پر سیٹھ رمضان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی قدورے حیرت سے بولا ”یہ اتنی جلدی دو بارہ میری یاد کیسے آجی؟“ بھی تو تمہارے ہوش کے ملازموں نے وہ دہلیزیں بھی نہیں دھکی لی ہوں گی جن میں میں نے بیٹھو چو خرو کا صفایا کیا تھا۔“

”جو اس چور زور اور یہ بتاؤ اس وقت کیا کر رہے ہو اور کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بھئی میں اپنے آفس میں ہوں اور یہ بتانا خاصا معیوب ہو گا کہ اس وقت کیا کر رہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میری پڑائی ساتھی کی بکری لڑی آئی ہوئی ہے۔ ہم دونوں بیٹھ کر لڑائی یادیں نازہ کر رہے ہیں لیکن ہمیں یہ ہے کہ وہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش کرتی؟“

”میرا سوال ہے ہونہ نہیں۔ تم آدمی ہی بے ہوش ہو۔ مجھے تم سے ایک کام آں پڑا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کو کام بولو۔“ فضول سوال جواب کیوں کر ہے ہو؟“

”میرے خاص کوئی جو اس قسم کے کاموں میں ماہر ہیں اس

”کیا اس کے علاوہ کوئی بات ہے؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔  
 ”کیا تم مجھے اتنی سلی آوی سمجھتے ہو گھاسڑ کیس کے؟“ میں نے مصنوعی شکل سے پوچھا۔  
 ”جیس۔ میں تو نہیں اس سے زیادہ سلی سمجھتا ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔  
 ”کیوں مت کہہ۔ میں سمجیدہ ہوں تو تم پڑی سے اترنے لگتے ہو۔“

وہ میری بات کانٹے ہوئے بولا ”میں تو پیشہ ہی پڑی سے اُترا ہوا ہوں۔ خیر تم بتاؤ کیا بڑا سلی جھانٹا ہے؟“  
 ”میرے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ وہ مزید بھی کچھ چاہتا تو لکھتا رہتا۔ میرے لئے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بات صرف جیس تک ہوتی تو یہ میری فہمیں ایک غیر اہم معاملہ ہوتا لیکن اس کی اس حرکت نے میرے سامنے تو کچھ اور ہی دروازے کھول دیے ہیں۔“  
 ”تم ان دروازوں میں کس کس دہرے نکل جانا میرے چاند؟“ وہ میری بات کانٹے ہوئے بڑے پیار سے بولا۔

”میں نے تم سے کہا تھا اپنی بد نما چوچ بند رکھو۔“ میں نے اسے ڈانٹا ”اس وقت میں بڑے خوش میں ہوں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی جلدی کچھ اتفاقات پیش آئیں گے اور خالق کے کچھ سراغ ملتے چلے جائیں گے شاید قدرت جلدی اس خون ناحق کا صاف صاف کرنا چاہتی ہے۔ اور تم وہ اخبار مجھے پہنچا کر گئے اور ایک اور شخصیت آن پہنچی۔ اس نے بات کچھ صاف کی۔ پھر مشتاق درخورد آن پہنچا۔“

”وہ کیسے تم سے ملے آیا تھا؟“ سینہ درمضان ایک بار پھر میری بات کانٹے ہوئے حیرت سے تقریباً چلا اٹھا پھر فوراً ہی ترمیم آمیز انداز میں بولا ”وہ ہے چارہ جیس جانا نہیں ہے تم نے اس کے ساتھ زیادہ برا سلوک تو نہیں کیا؟“

”نہیں نہیں میں نے تو اس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کے سلسلے میں سارے دیکھاؤ توڑ دیے ہیں کیونکہ اسی کے سارے تو مجھے زیادہ اہم حقیقت کی تک پہنچنا ہے۔ اب تو دور کا سراپا تھا آیا ہے اور دور بکھٹا شروع ہوئی ہے۔ میں اتفاق نہیں ہوں کہ اسے دوبارہ الجھا دیتا۔ اس سے ملاقات بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ مجھے کچھ اور اندازے لگانے میں مدد ملی ہے۔ اب اگر اس کے پس منظر کے بارے میں بھی تھوڑی سی معلومات حاصل ہو جائیں تو میرا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔“

”چھپا میں تمہارا کام آسان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ لٹھڑی سانس لے کر بولا ”گو کہ تم نے اس وقت میرا کام خراب کرنے میں کوئی کردار نہیں ادا کیا ہے۔ میرے فون کا انتظار کرنا۔“ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور چند لمحے سوچنے کے بعد ان کیلکٹر

رجیم گل کا نمبر شیخ کیا۔ پتا چلا کہ وہ گھر چکا تھا۔ اس کی سہیلی بھی لکھنؤ ہی میں تھی۔ میرے پاس اس کے گھر کا نمبر بھی تھا۔ مسئلہ سے اس کے ملازم نے اس سے میری بات کرائی کہ یہ نمبر شب بیداری اور دن بھر کی خواری کے بعد کچھ دیر سوئے کے ارادے سے بیدار ہوں میں گھسا تھا۔ ملازم کو اس نے بدامنی کی غی کہ خواہ کسی کا بھی فون ہو اسے نہ بنگایا جائے۔

وہ غنودگی زدہ اور شکوہ آمیز لمحے میں بولا ”افضل صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی بات نہ کہے۔“  
 ”آپ قانون کے لحاظ ہیں رجیم گل صاحب! آپ کو ہر وقت جانتے رہنا چاہئے تاکہ قوم آرام کی نیند سو سکے۔“ میں نے اسے بھیڑا۔

”ہاں صاحب! آپ ہمیں بنگائے رہے ہیں اور ہوتے کھاتے رہے۔“ وہ لٹھڑی سانس لے کر بولا ”کیا کوئی بہت ضروری بات تھی جس کے لئے آپ چند گھنٹے انتظار نہیں کر سکتے؟“  
 ”بظاہر ہے رجیم گل صاحب! بات بہت ضروری ہی تھی مگر میں تو اپنے چوکیدار کو بھی نیند سے بنگانا پسند نہیں کرتا۔ خواہ وہ بولی کے دوران ہی سو گیا ہو۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”اچھا؟ تو پھر بتائیے کیا مسئلہ آج پڑا ہے؟“ اس نے گہرا جھانی کا گھٹا گھونٹنے ہوئے کہا۔

”آپ فرحین اور جمیل کے قتل کے ساتھ ساتھ ان بیرونی دلائل سے معاملہ کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے افضل صاحب! یہ تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے ایک ہفتے کے بھوکے شیر سے پوچھا جائے کہ کیا وہ ہلا کے شکار میں دلچسپی رکھتا ہے۔“ اس کی آواز سے غنودگی قاب ہو گئی۔

”تو پوچھ لیا پھر بھی بہتر ہوتا ہے رجیم گل صاحب! ہر مسئلہ کے شیر ڈانٹنگ کر رہا ہو اور صرف سلاہ پر گزارا کر رہا ہو۔ ہر حال اگر آپ میری اور میں آپ کی تھوڑی سی مدد کریں تو یہ معاملہ ہو سکتا ہے اور آپ کی ساتھ مزید بہتر ہو سکتی ہے کیونکہ میں اس سلسلہ میں کوئی کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کروں گا۔“  
 ”الاجل نہ دیں افضل صاحب! میں ابھی آکر آپ کے گھر سے ہو جاؤں گا۔“

”آپ کو یہ ذمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ سر تو میں آپ کے سوار ہونا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں کچھ دیر بعد بات ڈرا کر اور جتنی ہو جائے اس سے پہلے میں ذرا آپ کی مرضی چاہتا ہوں تھا۔“

”پہلیاں مت بگھڑائیے۔ آپ کرنا کیا چاہتے ہیں آپ کی باتوں سے کہیے پڑا سرارت۔“ جھک رہی ہے؟“  
 ”جی میں نہ تو جیس باغ ہوں اور نہ ہی شراک ہوں۔ افاق سے کچھ باتیں آپ کے بجائے میرے علم میں آگئی ہیں۔ میں نے

سوچا انہیں صبح آوی یک کھل کر دوں۔

لیکن آپ نے ابھی تک مجھے بات تو ایک بھی نہیں بتائی۔  
اس نے شکوہ کیا۔

معلوم ہو جائے گا۔ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ میں نے  
گویا اسے قتل دی جس آپ کو زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر سب کچھ  
بتاؤں گا لیکن ذرا مجھے سہن تو پیدا کر لینے دیں۔ ایک پوکس آفیسر  
کو سہن میں جلا کرنے کا لطف یہ کچھ اور ہے۔ میں تقریباً ایک  
گھنٹے بعد آپ کے گھر آ رہا ہوں۔ اس وقت تک آپ چاہیں تو  
جوڑی سی خیر لے لیں لیکن ایک گھنٹے بعد مجھے تیار لے گا۔ پوکس  
کی دودھ میں نہیں۔ سادہ لباس میں۔ ہم اسٹے ذرا ایک جگہ تک  
چاہیں گے۔

رجیم گل نے گہری سانس لی اور ایک لمبے کے وقف سے بولا  
ہم فضل صاحب! آپ غلط کہہ رہے ہیں کہ آپ شرکاء ہو رہے ہیں  
کی کوشش نہیں کر رہے۔ میرا خیال ہے آپ پوری پوری کوشش  
کر رہے ہیں۔

”میرے نہیں بھائی! مجھ میں اتنی ذہانت کمال۔ میں نے بھی  
سی نہیں کے ساتھ کیا“ میں تو خامسے موئے داغ کا پینڈو سا آوی  
ہوں۔ میں نے کہا تاکہ بس کچھ اتفاقات پیش آ گئے ہیں جو اس  
معاملے کو انجام تک پہنچانے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے  
بعد ملاقات ہوئی۔ میں آنے سے پہلے ایک بار پھر فون کر دوں گا۔  
”چما چٹا۔ ایسے آپ کی مرضی۔“ وہ لٹھری سانس لے کر  
بولا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے احتیاطاً رجیم گل کے ساتھ ایک گھنٹے بعد کا وقت طے  
کیا تھا لیکن سیٹھ رمضان کا فون میرے اندازے سے پہلے آ گیا۔  
میرا خیال تھا وہ خبیث جب تک اپنی سابق سیکرٹری کے ساتھ اپنی  
پرائیویٹوں کو ابھی طرح تازہ نہیں کر لے گا تب تک میرے کام کی  
طرف دھیان نہیں دے گا۔

وہ بلا تھید بولا ”باب وہ تھمارا مشتاق و شوقیو پچھ جڑ معلوم  
ہوتا ہے میرے پڑا نے۔ بلکہ بچے پڑا نے دوست نے مجھے بتایا  
ہے کہ مشتاق اس قسم کے معاملوں میں سے ہے جن سے خود صفائی  
بڑے تک ہوتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ جن کا خود خود معاملوں کے  
لئے شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ معاملوں کے درمیان کافی بیخیز  
ہے۔ بلکہ بیخیز تو جھوٹی ہوتی ہے اسے تو کالا اوٹ کھنا چاہئے میں  
نے دو تین آدمیوں سے اس کے بارے میں بات کی اور کسی کے منہ  
سے اس کی تعریف نہیں سنی۔“

”خیر اب اسے کوئے دینے مت شروع کر دے۔ کوئی کام کی  
بات بتاؤ؟“ میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔

”صحت آوی یا یہ سب کام کی باتیں ہیں۔ انہی سے کسی کی  
خصوصیت اور کردار کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے اپنے  
ہم پیش اس کا نام سن کر استغفار پڑھنے لگتے ہیں۔ اس سے اندازہ  
ہو جاتا چاہئے کہ وہ کیا چیز ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب وہ صفات

میں قدم چمکا ہے۔ اب کوئی اسے نکال تو نہیں سکتا۔ میں تو ان  
نے اپنے بارے میں بہت سی جھوٹی باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔  
سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ اس کا تعلق کسی زمیندار خاندان  
سے ہے۔ اس کے باپ دادا کا تعلق زمیندار خاندان سے ضرور  
ہے لیکن مزارعوں کی حیثیت سے۔ یعنی اس کے باپ دادا ایک  
مشہور زمیندار خاندان کے داری ہو کر گئے تھے لیکن اس نے زمین  
کو سابق زمیندار مشہور کر رکھا ہے۔ اس کے غائب ہونے کے  
بیشتر لوگوں کو یقین بھی آ جاتا ہے کیونکہ محض بلیک میلنگ کے  
سارے بھی اس غائب ہونے سے رہتا لیکن نہیں۔  
”میں اصل تصدیق اسی بات کی کرنا چاہتا تھا۔“ میں نے  
ظہانیت کی سانس لے کر کہا۔

”اور تصدیق کے بعد تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ ہم گئے اور داد  
لوگوں کو بھی کچھ بتاؤ۔“ سیٹھ رمضان بولا۔

”مجھے قسمیں بتانے کا کوئی تاہم نہیں۔ ہو سکتا ہے میرے  
اندازے غلط ہوں۔ میں کوئی پیشہ ور سراسر افسانہ نہیں ہوں۔  
ذرا اس معاملے میں ٹانگ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔  
کو کہ یہ معاملہ خودی اگر میری ٹانگ میں اڑ گیا ہے۔ کوئی  
سامنے آ جائے تبھی بتاؤں گا تاکہ اگر اندازہ غلط نکلتا تو  
ختم کر دوں۔ بعد میں خواہ مخواہ کہیا نہ ہونا پڑے۔“ میں نے  
جواب دیا۔

”زادہ ہلاک بننے کی کوشش نہ کرو۔“ سیٹھ رمضان  
مرحمانہ لہجے میں بولا ”تو کسی مشکل میں پھنس گئے تو پھر میں  
کرتے ہم پر گروں گی پاس دوڑے آؤ گے۔“

”ظاہر ہے تم جیسے بزرگ دوست میں نے اور کس  
رکھے ہیں؟ ضرورت کے وقت دوست کو تکلیف نہ ملے  
اخلاقی فرض ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم جیسے دوستوں کی پیشہ پر ایک ذمہ داریاں دیکھ کر  
دوستوں کا اخلاقی فرض ہے۔“ سیٹھ رمضان نے کہا پھر  
سانس لے کر بولا ”لیکن افسوس کہ مجھ جیسے دوست یہ اخلاقی  
ادائیں کیا ہے۔“

”کیونکہ انہیں معلوم ہے اس فرض کی ادائیگی میں ان  
ٹانگ نوٹ کتنی ہے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد میں نے جنرل غیر کو کھانا اور قاتلوں کے  
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میں نے جتنا کام کر لیا  
ہے۔ اب باقی سب کچھ تم خودی سنبھالو۔ یہ تمہارا ہی  
میری تو ذرا کچھ دوسری قسم کی مصروفیت شروع ہو رہی ہے۔  
”آپ چھوڑ دیں سراسر“ وہ سکرانے ہوئے بولا ”میں  
رہتا ہے۔ آپ کا پھر بھی جب موز ہو یا وقت میرے ہونے کا  
دیکھ لیجئے گا۔“

میں آفس سے نکل کر ہوٹل کے بظنی حصے کی طرف چلا  
حتے شاپنگ آرکیڈ تھا۔ یہاں آٹھ دس شاندار قسم کی گاڑیاں

تکلف و زبردت کر سکتی ہو۔" میں نے کہا اور وہ شکر یہ ادا کر کے رخصت ہو گئی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ رجم کل کو فون کیے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کا نمبر لایا۔ اس بار اس نے خود ہی فون کر لیا۔ اس کی آواز میں غصہ کی نہیں تھی۔

"تم نے کچھ دیر آرام نہیں کیا؟ فید نہیں آئی تھیں؟" میں نے "آپ جناب والا۔" تکلف ترک کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"بھائی! میں کوئی رپوٹ نہیں ہوں کہ میں دبا یا اور سو گیا۔ میں دبا یا اور جاگ گیا۔ تم نے ایک گھنٹہ بعد دوبارہ فون کر کے میرے سر پر کھار لگادی۔ میں نے سونے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔" اس کا لہجہ بھی دوستانہ تھا مگر اس میں ہلکی سی خفگی کی جھلک بھی جو جھینپا مصنوعی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔ تم تیار رہنا۔ لیکن وردی میں نہیں۔ سادہ لباس میں۔" میں نے کہا۔

"بس یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے؟"

"مہذب لوگ اسی طرح کہیں جانے سے پہلے دو سرے کو مطلع کرتے ہیں۔" میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ "اب ذرا مجھے کچھ نشانیوں و نشوونما کی مدد سے اپنے گھر کا اندر دیکھیں اس طرح سمجھا دو کہ مجھے کسی اور سے پوچھنا یا پھنکانا پڑے۔"

اس نے ایڈریس مجھے سمجھا دیا اور میں چند منٹ بعد دو تین دوسری چیزوں کا بندوبست کرنے کے بعد وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ رجم کل کا گھنٹا دو گھنٹے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ساحل کے قریب ایک دس منزلہ عمارت کے ٹاپ فلور پر رہا تھا۔ اس منزل پر وہ ایک سی ایئر لائن تھا اس لیے جیٹ ہاؤس کھلا تھا مگر مجھے وہاں تک جانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ رجم کل نے گیٹ پر ہی ملنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ حسب وعدہ وہیں مل گیا۔ سادہ لباس میں بھی وہ اسٹارٹ ہی لگ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کسی وردی میں زیادہ اسٹارٹ لگتے ہیں یا سادہ لباس میں؟

وہ مجھے دیکھ کر گاڑی کے قریب آ گیا۔ اس نے مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اس بلڈنگ کے اپارٹمنٹس میں انٹرکام ہیں؟"

"ہاں۔ ہیں تو کسی۔ لیکن میں تو چپے موجود ہوں۔ انٹرکام کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"دراصل مجھے ابھی ابھی ایک بات یاد آئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ جسیں لفٹ میں دوبارہ دس منزل اور جانا پڑے۔ تم گیٹ ہاؤس سے ہی انٹرکام پر اپنے ملازم سے کہہ دو کہ تمہارے لیے کوئی فون آئے تو وہ بھی جواب دے کہ تم بڑی طرح تنگ ہار کر سو رہے ہو اور تم نے بہت سختی سے منع کیا ہے کہ جسیں بنگلیا نہ جائے۔ تمہارا ملازم یہ ہرگز نہ کہے کہ تم کہیں باہر گئے ہوئے ہو۔" میں نے

بنی کاغذ میں نوڈ کی طرف تھا۔ ان میں اعلیٰ درجے کی ایک گفت بات بھی تھی۔ میں اس دکان میں چلا گیا۔ تھوڑی سی مغز ماری کے بعد مجھے اس دکان سے اچھی مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔

میں وہ چیزیں لے کر اپنی عارضی سکرپٹری کے پاس پہنچا۔ وہ ایک نہایت خوش خلقی پارسی لڑکی تھی لیکن خوش خلقی کا مظاہرہ بالخصوص نہیں کرتی تھی۔ درحقیقت وہ ہوئی کی گیسٹ ریلیشنز مینجمنٹ آفسر مسٹراوری تھی لیکن جب کبھی میں تموزا بہت وقت بھر کھانے پر ہوئی والوں کے سر پر سوار ہو جاتا تھا تو وہ عارضی طور پر میری سکرپٹری کے فرائض بھی انجام دینے لگتی تھی۔ اس کا نام کس پر کیا تھا۔ خوب صورت اور اسٹارٹ تھی۔ کئی زبانیں بول سکتی تھی اور کئی ملکوں کے تہذیبی طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھی۔

میں نے گفت شاپ سے لی ہوئی چیزیں اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا "مس شام! اگر آپ مجھے چھوٹا سا ایک پکٹ تیار کریں تو میں آپ کا ازاد ممنون ہوں گا۔" پھر میں نے اسے تفصیل سے سمجھایا کہ مجھے کس قسم کا پکٹ درکار تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھنے ہی کچھ حیران حیران سی دکھائی دیتی تھیں۔ میری بات سن کر ان میں کچھ اور حیرت سمٹ آئی۔

"مسٹر جہادی! یہ کس قسم کا گفت ہے؟" وہ پوچھتے بغیر نہ رہ سکے۔

"یہ سراسر اتر ہے مس شام! میں نے جواب دیا۔" اگر آپ اسے اسی طرح بیک کریں گی جس طرح میں نے بتایا ہے تو امید ہے کہ میں کسی کو حیران کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"دلی۔ جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکاے اور دوسرے کام چھوڑ کر اس کام میں لگ گئی۔ میں اپنے آنس میں آ گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد میری شام میری مرضی کے عین مطابق پکٹ تیار کر کے لے آئی۔ میں نے اسے شاباشی دی اور کہا۔ "مس شام! آپ نے میرا مطلب سمجھتے ہوئے یہ پکٹ بالکل دیکھا تیار کیا ہے جیسا میں چاہتا تھا۔ ایسا شاید میں خود بھی تیار نہ کر سکتا۔" انعام کے طور پر آپ اس پینے میں کسی بھی نوڈ سیال اپنی کسی گول لٹریا ہوائے فریڈ کے ساتھ میرے حساب میں اپنی مرضی کا ڈنر کر سکتی ہیں۔"

"میرا کوئی بوائے فریڈ نہیں ہے سراسر! اس نے کچھ میری غلط فہمی دور کی۔

"اوس! امیری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس پر اظہار افسوس کھلایا آپ کو ایک مرتبہ اور شاباش دوں۔" میں نے کہا۔

"مسرا! آپ کچھ بھی نہ کریں۔ آپ صرف دعا کریں کہ بوائے فریڈ نہ ملے پھر میری شادی ہو جائے۔" وہ مسکراتے ہوئے دعا مانگنے کے قریب پہنچ کر بول۔

"مہر حال۔ انعام برقرار ہے۔ تم کسی کو بھی اپنے ساتھ پڑ



کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گیت سے واپس اندر چلا گیا۔ گیت ہاؤس میں چوکیدار موجود تھا۔ وہاں سے اس نے اتر کام پر اپنے ملازم سے بات کی اور چند لمحے کے بعد واپس آگیا۔ میں نے اسے گاڑی میں اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ ایک طویل سانس لے کر نشست میں دھنستے ہوئے بولا۔ ”مسٹر افضل چوہدری! کیا اب تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ یہ تم کس قسم کا ڈراما کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”بڑے انوس کی بات ہے نئیر انکسپرا“ میں نے مجروح سے لمبے میں کہا۔ ”میں کوشش کر رہا ہوں کہ ایک بڑا مجرم کے ہوئے چل کی طرح تمہاری بھولی میں آؤں گے اور تم میری اس کوشش کو ڈراما کر رہے ہو۔ واقعی توجہ کل نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔“

”نیکی کا تو خیر کی زبان ہے۔۔۔ آج کل کے زمانے کو نیکیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔“ وہ سنبھل کر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”لیکن تم سے مجھے خطرہ لگتا رہتا ہے کہ کس قسم کا قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرو۔ تم میں اس بیماری کے کافی برا اشیہ پائے جاتے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ میں نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ”تم اپنے قانون کو اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں ساتھ لیا ہے ورنہ اکیلا ہی نہ چل رہا۔“

”آخر تم نے مجھے سادہ لباس میں آنے کے لیے کیوں کہا؟ ردی پہننے سے کیوں منع کیا؟“ اس نے جاننا چاہا۔

”یابو! زندگی میں کچھ کام ”سادگی“ سے کرنا بھی سیکھ لو۔ ردی پہن کر گھونپہ پر یہ اعلان کرتے ہوئے جانا ضروری تو نہیں ہے کہ خواتین و حضرات! توجہ فرمائیے۔ ادھر دیکھیے۔ یہ پولیس والا ایک ضروری مہم پر جا رہا ہے۔ مجرم حضرت! آپ بھی ہوشیار ہو جائیے اور اپنے اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیتے ورنہ بعد میں شاید کھانا کھا کر اپنے آپ کو بھڑکے ہوئے دیکھیں۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے گھور رہا تھا لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے ڈرائیو تک جاری رکھی۔ آخر وہ لٹری سانس لے کر بولا۔ ”خدا اس لیوی کو عمارت کسے۔“

”یہ یکدم ہی تم نے لیوی کو کیوں کوستا شروع کر دیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”لیوی واقعی بڑا طاقتور میڈیا ہے۔۔۔ اسے گویا اس بات پر انوس تھا۔“

”صحت دیر سے پتا چلا تمہیں۔“ میں نے لقمہ دیا۔

وہ گویا میری بات پر دھیان دے کر بولے۔ ”کوئی مخصوص اصطلاح یا نیکے کلام لیوی پر دوچار مرتبہ ڈھرایا جاتا ہے اور وہ بچے کی طرح زبان پر آ جاتا ہے۔ یہ کھانا کی اصطلاح بھی لیوی کا تھن ہے۔ مجھے جیسے لوہے، رونا، کو، اور، بڑی، کھانا، ہو، آ، سے

جنسوں نے زندگی میں کبھی کبھار مکا نہیں کیا۔“

”تمہیں اس پر کھانا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اصطلاح تم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن مجھ پر پولیس آفیسر ہونے کا ٹھپا تو لگا ہوا ہے۔“ لٹری سانس لے کر بولا۔

”صبر کرو اور اپنے مجھے کو نیک نام بنانے کی جدوجہد جاری رکھو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”میری زندگی میں تو اس میں میں کامیابی کی امید نظر نہیں آتی۔“ اس کے لمبے میں باؤسی تھی۔

”ہم تم جیسے لوگوں کا کام اپنے اصولوں کے لیے جدوجہد کرتے رہتا ہے۔ کامیابی کا نامی کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دو۔“

”یہی تو میں کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا پھر وہ بوجھ بڑھانے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے ہم فرمین کے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہے ہیں۔“

”تم ٹھیک سمجھے ہو۔“ میں نے تائید کی۔

”کیا وہاں کوئی ایسا سراغ ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہے جو ہم پولیس والوں کی نظر میں نہیں آسکا؟“ اس نے قدرے طنز کے ساتھ پوچھا۔

”سراغ دیکھو وہاں کچھ نہیں ہے۔ ہم تو اپنی سی ایک کوشش کرنے جا رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”دیکھو۔۔۔ تمہیں ذہن نہ کروا رہا۔ مجھے اپنی عزت اور نیک نامی کا بڑا خیال رہتا ہے۔“ اس کے ذہن میں جیتنا اندیشہ بڑھنے لگا تھا۔

”ذلت اگر تقدیر میں ہوئی تو ضرور اٹھانی پڑے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے بارے میں یہ اندازہ مجھے ہو چکا ہے کہ تم سپیکس کی حد تک اپنی عزت دیک بٹائی کی نظر میں رہتے ہو۔“

وہ گہری سانس لے کر سیٹ کے پٹے سے نکل نکلتے ہوئے بولا۔ ”مظلوم نہیں کیوں میں نے تم سے دوستانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ میں غیر ارادی طور پر تمہارے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔“

حالا تک میں ایسا چاہتا نہیں ہوں۔“

”مابودت کی ذات میں کشش ہی کچھ ایسی ہے۔“ میں نے گاڑی ایک دیر اور ان سڑک پر موڑتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

”چند لمحے بعد ہم اس سڑک پر پہنچ گئے۔ جس کے انتظام مالبروٹ اور زنانی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے گاڑی ایک اور عمارت کے عقب میں روک دی۔ وہاں سے ہم پیل ایلو بلور تک پہنچے۔“

فرمین کے اپارٹمنٹ کے سامنے ایک کاشییل کرای پر بیٹھا اور گھبراہٹا تھا۔ اس کی رائفل اس سے دو فٹ دور پروا کے ساتھ کھینچ لی تھی۔ اسے ہماری آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے اسے اسے دیکھ کر جیم گل سے کہا۔ ”مجان کاشییلوں کی حالت قابلِ مذموم ہو رہی ہے جن کی اس قسم کی آزمائش لگ جاتی ہے اسے یہاں شکار

دی تھی۔ ہر چیز پر گرد کی ایک ہلکی سی۔ جی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ بعض دیران مقامات پر واقع بلند عمارتوں کے ایسے کمروں میں بھی گرد کہاں سے پہنچ جاتی تھی جن کی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند ہوتے تھے۔ رحیم کل نے دروازہ اپنے عقب میں قفل کر دیا۔

ہم سیدھے فریمن کے بیڈ روم میں پہنچے۔ رحیم کل نے یہاں بھی ہر چیز جوں کی توں رہنے دی تھی۔ حتیٰ کہ خون آلود بستر بھی اسی طرح بچھا ہوا تھا۔ رحیم کل نے جو بھی غصیش کرنا تھی، وہیں کھلی تھی۔ اس کے خیال میں کوئی بھی چیز اٹھوا کر لے جانے کا کوئی تاوانہ نہیں تھا۔ اس سے معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم دونوں چند لمبے خاموش کھڑے پورے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ ہمیں گویا انتظار تھا کہ وہاں موجود کوئی چیز ہل اٹھے گی اور ہمیں کوئی ان کی کمانی سنائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آخر رحیم کل نے کھٹکار دیکھا سانپ کیا اور میری طرف دیکھ کر ہلا۔

”اب بتاؤ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اسی کے لیے مناسب جگہ تلاش کر رہا ہوں۔“ میں نے بدستور ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور اپنی جیب سے وہی پیکٹ نکال لیا جو مجھے مس شام نے تیار کر کے دیا تھا۔

رحیم کل پیکٹ دیکھ کر اچھل پڑا۔ ”یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ کیا تم نے میرے آفس میں؟“

”خاموش رہو چند! یہ وہ پیکٹ نہیں ہے۔ ابھی میں نے تھانوں میں قبضہ زنی شروع نہیں کی۔“ میں نے اسے ہلکی سی زانت پلائی۔ ”یہ پیکٹ تمہارے اس پیکٹ کی نقل ہے۔“

”اورہ!“ اس نے گویا اٹھیمان کی سانس لی۔ ”نقل مطابق اصل ہے۔ حتیٰ کہ یہ پیکٹ اصل کے مطابق توڑا سا میلا بھی نظر آ رہا ہے۔“

”نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے نا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے خواہ مخواہ ہی اپنی عادت سے مجبور ہو کر جزئیات کا اتنا خیال رکھا ہے ورنہ ان کی اپنی ضرورت نہیں تھی۔“

اس دوران مجھے اپنے مقصد کے لیے ایک مناسب جگہ نظر آئی۔ میں احتیاطاً اپنے ساتھ چھوٹے سے ایک بیگ میں چند اوزار لے کر چلا تھا جو میں نے ہوٹل میں کام کرنے والے ایک لمبر سے مستعار منگوائے تھے۔ فریمن کے بیڈ کے سرانے کا تختہ بڑے خوبصورت ڈیزائن کا بنا ہوا تھا اور اس کے چاروں کونوں پر چار بڑے اسکرپو اس طرح لگے ہوئے تھے کہ وہ ڈیزائن ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے اس تختے کو اٹھلی سے ٹھوک بجا کر دیکھا۔ وہ کھوکھلا ہی معلوم ہوا تھا۔ میں نے اپنے قبیلے سے ایک بڑا اسکرپو ڈرائیور نکالا اور چاروں اسکرپو کھول ڈالے۔ میری توقع کے عین مطابق تختہ نہایت مضامی سے علیحدہ ہو گیا۔ کھوکھلے حصے میں داخل جگہ موجود تھی۔ میں نے پیکٹ اس میں

کاٹاؤ کیا ہے؟ یہ بے چارہ تو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔ اپارٹمنٹ کی گھرائی کیا کرے گا۔ کوئی معمولی درجے کا بد معاش بھی ہا ہے تو اسے ہلاک کر کے اس کی راتقل بھی لے کر آرام سے گزار ہو سکتا ہے۔“

”یہ بے چارے بھی کیا کریں!“ رحیم کل ترحم آمیز لہجے میں ہولا۔ ”کسی خالی مکان کے سامنے ایک دیران رہا داری میں مسلسل بارہ گھنٹے کرسی پر بیٹھے رہتا ہوں مگر آنا کام ہے۔ یہ بہت سی بے ہودہ قسم کی ڈیوٹی ہے۔“

رہا داری میں چونکہ تائین بچھا ہوا تھا اس لیے کانشیل کو ہاوی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی کہ ہم اس کے سر پر جا پہنچے۔ رحیم کل کھٹکار تو کانشیل نے آنکھیں کھولیں اور ہڑوا کر اپنی راتقل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وہ اس کے ہاتھ میں آنے کے بجائے تائین پر گر گئی اور وہ اسی بوکھلاہٹ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو کرسی اٹ گئی اور وہ اس طرح اوپر سے گر گیا کہ کرسی اس کے اوپر تھی۔ میں اور رحیم کل ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کئی سانس لے کر رہ گئے۔

جتنی دیر میں وہ راتقل اٹھا کر کرسی کو دھکیلی کر سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا اتنی دیر میں وہ کم از کم تین مرتبہ قتل ہو سکتا تھا اور اب بھی وہ اس عالم میں کھڑا ہوا تھا کہ اس کے سر پر ڈیوٹی نہیں تھی۔ وہ نیچے گر چکی تھی۔ اس نے نہایت عالی جتنی کوشش کی تھی دیتے ہوئے مجھ پر اور رحیم کل پر راتقل آنے کی کوشش کی تھی لیکن اسی دوران اس نے رحیم کل کو بچان لیا اور بوکھلاہٹ میں راتقل دوبارہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرتے گرتے جکی کیونکہ اس نے راتقل کو بھول کر فوراً رحیم کل کو سیٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔

”سب آپ۔۔۔ یہاں!۔۔۔“ وہ ہٹ گیا۔

”ہاں۔۔۔ میں یہاں۔“ رحیم کل نے زری سے کہا۔ ”اب تم یہاں مت رہو۔ ایسا کہہ کر اپنی کرسی اٹھا کر جھٹ پر پٹے جاؤ اور اگر کچھ دیر بعد تمہیں یہاں توڑی بہت گڑبگڑ کا احساس ہو تب بھی اگر کسی معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ ہم خود ہی نمٹ لیں گے۔ سمجھ گئے؟“

”جی سرا سمجھ گیا۔“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور فزک جیڑ اٹھانے لگا۔

”اپارٹمنٹ کی چابی مجھے دے دو۔“ رحیم کل نے کہا۔ کانشیل نے چابی اسے دے دی۔ میں نیچے سے اوپر آتے وقت رحیم کل کو سمجھا چکا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ وہ اسی کے مطابق کانشیل کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس طور پر صرف ایک اپارٹمنٹ اور قابض کے بارے میں ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ابھی قاتل تھا۔

میں اور رحیم کل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ اپارٹمنٹ میں سب کچھ جوں کا توں تھا۔ صرف فریمن نہیں تھی اور انکی کا احساس نہیں تھا۔ دروازے سے موت کی سوگوار کی ٹپک

”آپ کون صاحب؟“

”افضل چوہدری۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے لہجے  
کے دم اشتیاق ٹھٹھک آیا۔  
”کیا حال ہیں چوہدری صاحب؟ کیا کوئی خاص خبر سنانے کے  
لیے فون کیا ہے؟“

”معلوم نہیں خبر خاص ہے یا نہیں مشتاق صاحب! اس پر  
فیصلہ تو آپ خود ہی کرتے رہتے گا۔“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔  
”میں نے تو آپ سے وعدہ کیا تھا کہ رحیم گل سے کوئی بات معلوم  
ہوئی تو آپ کو خبر کروں گا۔ میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ آپ  
معلوم نہیں ہماری ان کوششوں کا آپ کی نظر میں کوئی مقام ہو گا  
نہیں۔“

”اے۔۔۔ کیسی باتیں کرتے ہیں چوہدری صاحب! آپ اب  
ہمارے لیے کوئی کوشش کریں یا نہ کریں لیکن آپ کی جگہ ہمارے  
دل میں بن چکا ہے۔“ اس کے لہجے میں شیرینی سمٹ آئی۔ ”اب  
آپ کی رحیم گل سے کوئی بات ہوئی؟“

”ہاں۔۔۔ ہوئی تو ہے۔۔۔ وہ تو کچھ عجیب سی قصہ سنانا ہے۔ مجھے  
گناہ سے لڑی اس سے مذاق کر رہی ہے۔۔۔ ایک سنجیدہ سناٹے کو  
بنیاد بنا کر دل لگی کر رہی ہے۔ وہ اگر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے  
نہیں کر رہی۔۔۔ بس ٹیلی فون ہی کیے جا رہی ہے اور تھیلوں میں  
عجیب عجیب باتیں سنانے جا رہی ہے۔“

”آپ وہ باتیں بتائیں۔۔۔ مطلب میں خود ہی افہام کر لوں گا۔  
میرا مطلب ہے اسٹوری میں خود ہی تیار کر لوں گا۔ وہ لڑی رحیم گل  
سے کیا کہتی ہے؟“ وہ اپنے لہجے کی بے تابی نہ چھپا سکا۔

”یہی بات اس نے فون پر جو باتیں کیں وہ تو میں آپ کو بتا چکا  
ہوں۔ اس نے ذکر کیا تھا کہ اس کے پاس فرحین کا کوئی خط ہے۔  
اب اس نے فون پر اس خط کا مضمون بھی سنا دیا ہے۔ وہ ابھی تک  
پولیس کی تحویل میں آنے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ لڑی اس  
خوفزدہ ہے۔“

”کیا بتایا ہے اس نے؟ خط میں کیا لکھا ہے؟“ مشتاق نے بات  
کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔۔۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔ بقول اس  
کے۔۔۔ فرحین کے خط میں لکھا ہے کہ کہیں اس کے بیٹے روم  
چوپائے کے سر میں رکھی ہے۔۔۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی؟ معلوم نہیں  
فرحین نے واقعی ایسا لکھا ہے یا یہ لڑکی رحیم گل کو کوئی چکر دے  
رہی ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ فون پر انجن کی سرسراہٹ وغیرہ بھی سنائی  
نہیں دے رہی تھی۔ شاید اس نے گاڑی کیس سڑک کے کنارے  
رکھ لی تھی۔ کئی سیکنڈ تک اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں  
دوبارہ دہرایا تو وہ گویا کسی خیال سے چوکا اور بولا۔ ”آپ کو  
طرح یاد ہے رحیم گل نے یہی الفاظ کہے تھے؟“

”ہاں۔۔۔ ابھی دو منٹ پہلے ہی میری اس سے بات ہوئی۔“

رکھ دیا اور سمجھ پہلے ہی کی طرح اسکرین کی مدد سے کس دیا۔ کچھ  
پچھے ہٹ کر میں نے اپنی کار کوئی کا تنہیدی نظر سے جائزہ لیا۔  
وہاں کسی تازہ کارروائی کے نشانات نظر نہیں آ رہے تھے۔ بیٹے جوں  
کا توں تھا۔ رحیم گل دونوں ہاتھ چٹون کی بیسون میں ڈالے یوں غور  
سے میری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے مجھ سے کسی شے کے  
توقع تھے۔

میں نے ہاتھ جماڑتے ہوئے طمانیت سے کہا۔ ”جگہ تو عمدہ  
مل گئی۔“

رحیم گل کچھ نہ بولا۔ وہ بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔  
اس کمرے کا ایک دروازہ بالکونی میں بھی کھلتا تھا۔ اگر ہم باہر جا کر  
بالکونی میں چھپ جاتے اور یہ دروازہ بند کر لیتے تب بھی ہم ایک  
کھڑکی میں تھوڑی سی جھری رکھ کر کمرے کا منظر دیکھ سکتے تھے لیکن  
بالکونی میں رہنے میں یہ خطرہ تھا کہ عمارت کے باہر سے ہی کوئی  
ہماری موجودگی کو محسوس کر سکتا تھا کیونکہ بالکونی کی دیوار زیادہ اونچی  
نہیں تھی۔ میں اپنی ترکیب ناکام ہو جانے کا ذرا سا بھی خطرہ مول  
لیا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے بالکونی میں چھپنے کا ارادہ ترک  
کر دیا۔

مجھے فوراً ہی ایک تباہل جگہ مل گئی۔ وہ چھوٹا سا ایک ڈرننگ  
روم تھا جو ہاتھ روم سے جڑا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بھی کمرے ہی  
میں کھلتا تھا اور اس کے دروازے میں چھوٹا سا ایک مستطیل شیشہ  
بھی لگا ہوا تھا۔ یہ شیشہ گلاس تھا اور اس رخ سے لگا ہوا تھا کہ  
ڈرننگ روم سے بیٹے روم میں تو دیکھا جاسکتا تھا لیکن بیٹے روم سے  
ڈرننگ روم میں نہیں جھانکا جاسکتا تھا۔

میں نے رحیم گل سے کہا۔ ”ہم دونوں کو بیک وقت یہاں  
چھپنے اور بیک وقت کمرے کے منظر پر نظر رکھنے میں ذرا دشواری تو ہوگی  
لیکن یہ جگہ آئیزل ہے۔“

”اگر اس ساری جدوجہد کا کوئی نتیجہ نظر کی توقع ہو تو میں کمر  
میں چھپنے کے لیے بھی تیار ہوں۔“ رحیم گل بولا۔

”نتیجہ تو کچھ نہ کچھ ضرور نکلے گا البتہ وہ مرضی کے مطابق نہ  
ہوا تو صبر کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

میں بیٹے روم میں ایک کونج پر جا بیٹھا۔ رحیم گل میرے ساتھ  
ساتھ تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی۔ ”احتیاط سے بچنا۔ یہ  
احساس ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ فرحین کی لاش دریافت ہونے  
کے بعد سے کوئی اس کمرے میں داخل ہوا ہے۔“

میری ہدایت سن کر وہ کچھ اس احتیاط سے کاؤچ پر بیٹھا گویا  
انڈوں کی نوکری پر بیٹھنے لگا ہو۔ میں نے اپنا سوا کس فون اور مشتاق  
مٹر کا دیا ہوا وزنگنگ کارڈ نکالا۔ میں نے اس کے موبائل کا نمبر  
ڈائل کیا تو سلسلہ طے ہو مجھے دو سری طرف سے گاڑی کے انجن کی  
خفیف کی گھر گھر اسٹائٹ دی۔ شاید وہ کیس چھو سرف تھا۔

”بیلو۔۔۔ مشتاق صاحب؟“ میں نے قہقہہ میں چاہی۔

”جی۔۔۔ ہاں، ہاں، ہاں۔“ مشتاق مٹر کی آواز ابھری۔

کہہ رہی تھی کہ وہ کل تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرے گی۔ شاید کل اس میں اتنی جرات پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کی تحویل میں دے دے۔ رحیم کل نے اسے بڑی حد تک اپنی شرافت کا یقین تو دلا دیا ہے اور اس کی بہت بدعاشی ہے۔ وہ یہ بھی مان رہی تھی کہ جہاں وہ چھپی ہوئی ہے وہاں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس نہیں کر رہی۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ”فی الحال تو یہی کچھ معلوم ہو سکا ہے۔ کیا خیال ہے۔ کچھ اسٹوری تھی ہے یا نہیں؟“

”ہاں۔ کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گی۔“ اس کے لہجے سے بے دھیانی عیاں تھی۔

”لیکن اسٹوری سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا چاہے کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ میں تھا۔“ میں نے اپنے لہجے سے تشویش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”آپ مناسب سمجھیں تو یہ اشارہ دے سکتے ہیں کہ لڑکی نے آپ کو بھی فون کیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں سب سے اچھا طریقہ تو یہی ہو گا کہ اپنے سوریس آف انفارمیشن کے بارے میں کئی طرح کے اشارے دے دیں۔ کنفیوژن پیدا کر دیں۔“

مشاق قدرے بیزاری سے بولا۔ ”بھئی یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اپنے کام کو بستر سمجھتا ہوں۔ آپ نے میری مدد کی ہے۔ میں آپ کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہونے دوں گا۔ بلکہ اب تو میں بھی جو آپ کی کچھ خدمت کروں گا۔ چند دن ٹھہر جائیے۔ میں کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر کے اپنے اخبار میں آپ کا اچھا سا انٹرویو شائع کروں گا۔“

”ارے نہیں بھئی۔ ہم بھلا اس قابل کماں۔“ میں نے گویا انکساری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”آپ اس قابل ہو چکے ہیں۔ یہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ اس موضوع پر پھر بات ہوگی۔ خدا حافظ“ اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

رحیم کل میرے قریب بیٹھا ایک تک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری اور فون بند کر دیا۔ وہ کمری سانس لے کر بولا۔ ”تو تمہارے خیال میں فرحین اور جمیل کا قاتل مشتاق مدر ہے؟“

”صرف ان دونوں کا قاتل ہی نہیں۔ وہ بیروں کی اسٹینک کے بہت بڑے دھندے میں بھی بہت اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ پہلے تو مجھے صرف شبہ ہوا تھا لیکن اب اس سے فون پر بات کرنے کے بعد تو یقین ہو گیا ہے۔ اور اگر کچھ دیر بعد وہ ان بیروں کی تلاش میں یہاں آئے پتہ چلے گا کہ میں تمہاری الماری میں پڑے ہوئے ہیں۔ تو پھر تمہیں بھی میری بات کا یقین آجانا چاہیے۔“

”تمہارا خیال ہے کہ تم نے اس کے لیے جو جال بچھایا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا آئے گا اور اس میں جکس جائے گا؟“ رحیم کل ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

”جی۔ کوئی لبا عرصہ تو ہوا ہی گزرا ہے جو میرے بھول جانے کا خطرو پیدا ہوا۔ مجھے اس لیے بھی یہ الفاظ اچھی طرح یاد ہیں کہ میں نے اس سے دوبارہ پوچھا تھا اور اس نے یہ الفاظ دہرائے تھے۔ لڑکی بھی اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ رحیم کل کی سمجھ میں بھی نہیں آیا اور میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ کیا یہ کوئی بیرونی دھیمو کی کھپ کا ذکر ہے جو فرحین کے بیڈ روم میں رکھے ہوئے کسی چپائے کے بجائے دھیمو کے سر میں چھپائی گئی ہے؟“ میں نے اس عام آدمی کی طرح پوچھا جو اپنی سمجھ سے بڑا کوئی معاملہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”فرحین کے بیڈ روم میں کسی چپائے کا مجسمہ نہیں ہے۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ میں چاہتا تھا اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اسے یہ بات کیونکر معلوم ہوئی؟ کیونکہ وہ تو میرے اور رحیم کل کے سامنے فرحین کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا اور بقول اس کے وہ فرحین کا انٹرویو لینے آیا تھا۔ اس نے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس وقت پہلی مرتبہ فرحین کے ہاں آیا تھا اور اسے فرحین کے بیڈ روم میں جانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا کیونکہ اس وقت فرحین کی لاش وہاں سے اٹھائی جا چکی تھی اور پولیس والے کمرے میں اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔

تاہم میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ اس کے لیے میں ایک عام پیش پرست سیٹھ تھا جسے صرف دولت کمانے کا ہنر آتا تھا اور جو دولت کے بل پر ہر چیز خریدنے کی ٹھہر میں رہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کے سامنے اپنا یہ ایجنڈا بیان کیا تھا۔ اب میں نواہد باریک بینی کا مظاہرہ کر کے اور ذہانت پر مبنی سوال کر کے اسے چمکا نہیں سکتا تھا۔ اسے خود بھی احساس ہو گیا کہ اس کی زبان غیر ضروری طور پر پھسل گئی تھی۔ جلدی سے بولا۔ ”اس روز اس کے اپارٹمنٹ سے واپس آتے وقت میں نے بیڈ روم میں جھانکا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ مجھے تو وہاں کسی بھی قسم کا کوئی مجسمہ نظر نہیں آیا تھا۔“

پھر اس نے گویا اس پنلو سے میرا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ ”خیر۔ چھوڑیے اس بات کو۔ یہ بتائیے رحیم کل اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ فی الحال تو وہ زندگی سے بیزار معلوم ہو رہا تھا۔ سخت تنہا ہوا تھا اور سونے جا رہا تھا۔ اول تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سلسلے میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہر حال۔ اگر وہ کچھ کرے گا بھی۔ تو صبح کرے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ صبح جا کر سٹے کمرے سے فرحین کے بیڈ روم کا جائزہ لے گا۔ شاید کوئی بات سمجھ میں آجائے۔“

”تو اس نے کیا کیا؟“ مشتاق نے دریافت کیا۔

”تو اس نے کوئی بھی سمجھانے کی کوشش کرنا رہا کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کی حفاظت میں دے دے تو اس کے حق میں بستر ہو گا۔ یا کم از کم ٹھکانا دے کہ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے۔ لیکن۔ نہیں مانی۔

”یقیناً۔“ میں نے وقتوں سے جواب دیا۔

سرکھلاتے ہوئے بولا ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ مشتاق مدثر مصافحت کی دنیا کا آدمی ہے۔۔۔ لوح و قلم اور الفاظ سے اس کا رشتہ ہے۔ وہ اتنا خطرناک آدمی کیسے ہو سکتا ہے!“

”وہ لوح و قلم کا آدمی نہیں ہے۔ اس کے لیے اتنی دماغی دھیمی اصطلاحیں استعمال مت کرو۔ مصافحت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کو بچے میں تو اس نے پناہ لی ہوئی ہے۔ وہ بھیڑی کی گھل میں کریموں کے گلے میں شامل ہو جانے والا بھیڑیا ہے۔ اپنے مقاصد کے لیے اس نے تھوڑا بہت لفظوں کا امٹ پھیر سیکر لیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ اس قبیلے کا آدمی نہیں ہے لیکن وہ اس پیشگی طاقت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اس طاقت کو اپنے لیے استعمال کر رہا تھا“ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کام میں لا رہا تھا۔

رحیم گل خاموش رہا۔ اب میرے موقف کے خلاف اس کی مزاحمت کر رہی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”وہ جس طرف سے۔۔۔ اور جس طرح بھی دولت سمیٹ سکتا تھا سمیٹ رہا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ سب سے زیادہ مدد یہ بیرونی کو اودھڑا کر کھا کر کھا رہا تھا۔ قاسم بجلی کو ایک طرح سے ہول سیل ڈیڑھ تھا۔ اس کا کام فرمیں کے ذریعے بیرونی کو پاکستان پہنچانا تھا۔ یہاں ان کی کھیت کے سلسلے میں میری معلومات اور اندازے کے مطابق تین افراد کام کر رہے تھے۔ جمیل، امیر اور مشتاق مدثر۔ ان میں سے جمیل اور امیر کی حیثیت معمولی درجے کے سکرٹین کی تھی لیکن مشتاق مدثر ایک طرح سے مارکیٹنگ منیجر تھا۔ وہ زیادہ بڑے پیمانے پر بیرونی کھانا تھا۔ مصافحت کے ذریعے اس نے دولت مندوں اور خصوصاً شہریوں کے لوگوں میں جو شناسائی پیدا کر رکھی تھی وہ اس کے سائڈ بزنس کے لیے بہت کارآمد تھی۔ وہ ”سائڈ بزنس“ جو اسے اس کے اصل بزنس سے زیادہ منافع دے رہا تھا۔ ان لوگوں کو سستے داموں بیرونی دکانوں کے لیے اس نے کوئی معززانہ طریقہ سوچ رکھا ہوگا۔“

میں اب بہت بچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ رحیم گل نہایت انصاف سے سن رہا تھا۔ اس کا انصاف دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”قاسم بجلی کی اپنا کھیت موت کی وجہ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا۔ ایک کھپ اس وقت فرمیں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بعض وجوہات کی بنا پر اس پر اپنا حق سمجھتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر اسے پراسرار باس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھی جو نئی فون پر اسے وہ کھپ کیس پہنچانے کے احکامات دے رہا ہوگا۔ مشتاق مدثر نہایت کامیابی سے فرمیں، جمیل اور امیر کی فہم میں ”پراسرار باس“ بن کر۔۔۔ اپنا دھندلا چلا رہا تھا لیکن فرمیں کو اس دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ پراسرار باس کون تھا۔ اس لیے وہ اور بھی شرمیلی تھی۔ وہ مشتاق کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کے لیے تیار نہیں تھی بلکہ اٹاناس کو بلیک میل کرنے کی کار میں تھی لیکن اس نے چاری کو اندازہ نہیں تھا کہ مشتاق مدثر کتنا خطرناک آدمی تھا اور کتنی تیزی سے کوئی فیصلہ

اس نے ترمیم تیزی فہموں سے میری طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ مزیدانہ لہجے میں بولا۔ ”مائی ڈیئر افضل چوہدری! آج کل چرچے بھی اتنے چالاک ہو گئے ہیں کہ کھانا سے بدھ ہونے والے پرائی طرز کے چرچے دان میں پھیرا رہی کا کھانا پھیرا کر کھو تو وہ اس کے قریب ہی نہیں پہنچتے۔ اور تھرا خیال ہے کہ مشتاق مدثر اتنا شاطر آدمی ہوتے ہوئے اتنی آسانی سے تمہارے اس سادہ سے جال میں آن پہنچے گا؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بزرگوں نے بلاوجہ سادگی کی اتنی تعریفیں نہیں کی ہیں۔ بہت زیادہ چالاک دیکھار لوگوں کو گھیرنے کے لیے بعض اوقات میں بالکل سادہ سے طریقے اختیار کرتا ہوں اور ان کے سامنے خود بھی بڑا سادہ سا بن جاتا ہوں۔ یہ طریقہ ایسے لوگوں کے معاملے میں پرتفع اور عیارانہ طریقوں سے زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چالاک سے چالاک کا انسان بھی اکثر لالچ کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ یہ سادہ سا بلکہ اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے کہ۔۔۔ لالچ بڑی طاقت ہے۔ بلا انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اس کی ساری چالاکي دوسری رہ جاتی ہے۔ مشتاق مدثر پر بھی خون سوار ہے۔ بیرونی کی اس کھپ کو حاصل کرنے کے لیے وہ دو قتل کر چکا ہے لیکن کھپ اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ اب اس کی طلب ہوئی اور وحشت بہت بڑھ چکی ہے۔ جس انداز میں اس نے فون بند کیا ہے اس سے مجھے لگتا ہے کہ وہ فوری طور پر اس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو چکا ہوگا۔ کیس وہ کسی قریبی جگہ سے ہی نہ آ رہا ہو۔ ہمیں اب ڈزرننگ روم میں پھنپ جانا چاہیے۔ ویسے ہمارا انتظار طویل بھی ہو سکتا ہے۔“

”اگر مقصد پورا ہونے کی اُمید ہو تو میں پورا ایک ہفتہ اس دکان لٹا ڈزرننگ روم میں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں“ رحیم گل بولا۔

”لیکن مجھے کچھ اُمید نظر نہیں آ رہی۔“

”تمہیں اُمید نظر نہیں آ رہی۔ اور مجھے یقین ہے کہ مشتاق مدثر اس طرف روانہ ہو چکا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جس وقت میں نے اسے فون کیا اس وقت وہ امیر کو ڈھونڈنا پھیر رہا تھا۔ اگر وہ اسے مل جاتی تو اس کے ہاتھوں تیسرا قتل بھی ہو چکا ہوتا لیکن امیر اس وقت ایک محفوظ مقام پر ہے۔ مشتاق کو ہرگز اُمید نہیں ہو سکتی کہ امیر نے وہاں پناہ لی ہوگی۔“

”یہ امیر کون ہے؟“ رحیم گل نے دریافت کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ امیر کون تھی اور اس سے مجھے کیا کچھ معلوم ہوا تھا۔ پس منظر اس کی سمجھ میں آ گیا۔

وہ سرکھلاتے ہوئے بولا ”۔۔۔ تو میں کوننا افضل ڈیڑھ کہ تم مجھ سے بالا بلا ہی جرم و سزا کی دنیا کے چوہدری بنے پھر رہے ہو۔ تمہیں پہلے ہی اتنا کچھ معلوم ہو چکا ہے بھی اتنے پراسرار نظر آ رہے ہیں۔“

ایک لمحے کے لیے اس نے ہونٹ سمجھنے لیے پھر نفی میں

ہوگا۔ ویسے اس قسم کی امید رخصتی تو نہیں چاہیے۔ پولیس والوں کا دماغ ذرا سونامی ہونا ہے۔

”تھو اس کی ضرورت نہیں“ وہ منہ ہانک بولا ”میرے لئے کے بعد چکر تو کافی حد تک میری سمجھ میں آئے لگا تھا لیکن تم ذرا کٹی آؤی ہو۔ تمہیں اس ذخیرہ کی گندہ کڑیاں ملنی چلی گئیں۔ میرے حق میں یہ اچھا ہوا کہ مجھے تمہارا کندھا میرا گلیا جس پر اب میں بغور رکھ کر چلا سکتا ہوں۔ کوئی غلطی ہوگی تو مجھ سے زیادہ تم نے دار ہو گئے۔“

”میرا خیال ہے باتیں بہت ہو چکی ہیں۔ اب ہمیں ڈرنیک روم میں بچھپ جانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ پرہ فبیہ سے کیا ظہور میں آتا ہے۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ”اب تک تو شاید مشتاق تمہارے گھر سے تھرتھرتی بھی کر چکا ہو گا کہ تم واقعی سو رہے ہو۔ کوئی عہد نہیں کہ وہ اس وقت عمارت میں داخل ہو چکا ہو۔“

ہم نے ڈرنیک روم میں کھس کر دواخانہ اندر سے منتقل کر لیا۔ ہم دونوں کے لیے ایک وقت چھوٹے سے میز پر گلاس سے پانی بھر جھانکا ذرا مشکل تھا لیکن فی الحال اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لیے ہم صوبو سکون سے دونوں طرف دیوڑوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

”میں اپنے اندازوں سے زیادہ دیر تک انتظار کرنا چاہا۔ شاید مشتاق کہیں دور سے آ رہا تھا یا پھر شاید اس نے آئے سے پہلے کافی وقت سوچ بچار میں صرف کیا تھا۔ بہر حال ہمیں باہر کے آگے میں چابی گھومتے کی خلیف سی آواز سنائی دی اور ہم جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

”میں نے سرگوشی میں کہا ”بد بخت کے پاس چابی بھی موجود ہے۔“ معلوم نہیں کہاں سے۔ اور کس طرح حاصل کی ہوگی۔ یا بڑائی ہوگی۔“

چند لمحوں بعد ہم نے دواخانہ چھوٹے اور پھر نہایت آہستگی سے بند ہونے کی خفیف سی ”ٹھٹھ“ سنائی لیکن اس کے بعد کئی منٹ تک مشتاق بیڑہ روم میں نہیں پہنچا۔ وہ شاید چھوٹک چھوٹک کر قدم رکھ رہا تھا یا پھر کسی ایک ہی جگہ ٹوک کر فضا کو سمو گئے۔ ہا تھا۔ میں اور رحیم گل گردن میں ٹیڑھی کیے اور سر ایک دوسرے سے جوڑے ایک ایک آنکھ کھینچنے سے لگے کھڑے تھے۔

خدا خدا کر کے ہمارا انتظار ختم ہوا اور بیڑہ روم کا دواخانہ آہستگی سے کھلا۔ اندر جمائے والا مشتاق مدثری تھا۔ وہ کچھ اس انداز میں اندر آ رہا تھا جیسے شیر کی بچھار میں داخل ہو رہا ہو لیکن کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اندر آ کر اس نے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا شروع کیا پھر اس نے بیڈ کے نیچے جھانکا۔

وہ میرے انداز سے زیادہ جلدی تجیر پر پہنچ گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے سیدھے کمرے ہو کر آ سر نوکرے کا جائزہ لیا اور اس کی نظر بیڈ کے چاروں پاؤں سے ہوئی ہوئی آخر کار سرہانے کے تختے پر آکر ٹوک گئی۔ بیڈ کے چاروں پاؤں شیر کی ٹانگوں کی سی

کمرے اس پر عمل کر گزرتا تھا۔ فرحین کو اپنی سرگوشی کی قیمت اپنی جان دے کر چکا ہونے میں جس رات فرحین سے ملنے پہنچا، مشتاق اس رات شاید ہوش سے ہی فرحین کے ساتھ آیا تھا۔

اس رات شاید فرحین نے اس پر ظاہر کر دیا کہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔ پراسرار لباس وہی تھا۔ اس نے غالباً یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ میرے کسی قیمت پر اسے نہیں دے گی۔ وہ میرے میرے سپرد کئے ہوئے تھی اور غالباً اسے اطمینان تھا کہ مشتاق میرے حاصل کئے بغیر اسے نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔ وہ شاید سمجھ نہیں سکی کہ مشتاق کے لیے یہ صورت حال کتنی خطرناک تھی۔ اس نے فرحین کا کام تمام کر دیا۔ اسے غالباً اطمینان تھا کہ میرے اسے فرحین کے اپارٹمنٹ میں ہی کہیں مل جائیں گے لیکن اس کی یہ امید پوری نہیں ہو سکی۔ اسی چکر میں اس کے ہاتھوں جیل گنل ہوا۔ ان بیروں پر قبضہ جمانے کے لیے وہ بھی دیوانہ ہو رہا تھا۔ ”اور نوزی اس سارے چکر میں کہاں فٹ ہوتا ہے؟“ رحیم گل نے دریافت کیا۔

”نوزی خاصاً قاسم بجلی کا آدمی ہے۔ یا یوں کہو وہ اس کا نگار کی کتاب ہے۔ اسے بھی معلوم ہے کہ بیروں کی ایک کلیپ آہم فرحین کی قفسے میں بھی جس کے لیے قاسم بجلی کو نہیں پہنچے تھے۔ اس قسم کے بد معاش اور بدبخت گرو عموماً اپنے کسی نہ کسی آقا کے بڑے دنا دار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسی دنا داری کے تحت وہ کلیپ واپس حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قاسم بجلی کی موت کے بعد اس کی بھی نیت خراب ہو گئی ہو اور وہ میرے اپنے لیے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یوں وہ اس سلسلے میں تیسرا امیدوار بن گیا ہو۔ اس کا تو کچھ ایسا کردار سمجھ میں آتا ہے۔“

”اب تم نے مشتاق مدثر کے لیے چارہ پھینکا ہے کہ میرے اسی اپارٹمنٹ میں فرحین کے بیڈ روم میں موجود ہیں۔ تمہارا خیال ہے وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے دوڑا آئے گا؟“ رحیم گل نے تعجب سے پوچھا۔

”جس چیز کے لیے اس نے دو قتل کروئے اور تیسرا قتل کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے لیے اسے دوڑنے تو آنا چاہیے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور یہ تم نے فرحین کے بیڈ روم میں چوپائے کا ذکر کیا ہے کیا؟“ رحیم گل نے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ اپنی بات کو ذرا متاثر نہ کرنے کے لیے۔ اب اتنی بھی سادگی ابھی نہیں تھی کہ میں آرام سے اس سے کہہ دیتا کہ جا کر فرحین کے بیڈ کے سرہانے سے میرے نکال لو“ میں نے کہا ”اس بیڈ کے چارپائے ہیں جو صاف دکھائی دے رہے ہیں اور اس کمرے میں کوئی چوپایا موجود نہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ذرا توجہ سے کمرے کا جائزہ لے گا اور ذرا ذہن پر زور دے گا تو اس کی سمجھ میں آجائے گی۔ امید ہے اب یہ سارا پتھر تمہاری سمجھ میں بھی آجائے گا۔“

بہت ہی کر رہا تھا۔ اس لیے مجھے اس کی حالت قابل رحم دکھائی دے گی۔  
پھر ایک دم ہی وہ یوں چوٹا چپے سے اسے گرٹ لگا ہوا۔ وہ یکدم حرکت  
میں آیا اور کڑکیوں پر آویزاں پردوں کی طرف دیکھنے لگا جو فرش  
تک پہنچ رہے تھے۔ اچانک ہی وہ کسی درندے کی طرح چوٹا دکھائی  
دینے لگا تھا۔ اس نے یقیناً خطرہ محسوس کر لیا تھا کہ شاید اس کے  
ساتھ مذاق کیا گیا تھا۔ اور اگر یہ مذاق قاتلانہ کرنے والا قریب  
بھی ہو سکتا تھا۔

اسے غالباً شبہ ہوا تھا کہ کوئی پردوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ان  
کی طرف گھومنے کی وجہ سے اس کی پشت ہماری طرف ہو گئی تھی۔  
میرے خیال میں یہ باہر آنے کے لیے مناسب وقت تھا۔ میں نے  
رجیم گل کو کبھی ماری۔ ہم نے بے تواؤ طریقے سے ڈسٹیک دوم کا  
دوازہ کھولا اور باہر آگے رجیم گل کے ہاتھ میں ریوالبور تھا۔  
مشاق کو ہر حال کمرے سکوت میں ہماری نقل و حرکت کی خفیت ہی  
سرسراہٹ بھی سنائی دے گئی۔ وہ کسی درندے ہی کی طرح تجزی  
سے گھبرا۔

مجھیرے نہ پا کر شاید ہمیں بہت ہی مایوسی ہوئی ہے مشاق  
ذیڑا میں نے پرسکون لمبے میں کہا اور ہاتھ بوساکر لائٹ آن  
کری۔ سوچ بول قریب ہی تھا۔ اس کے چہرے پر جو دھشت  
و خوفناوری تھی اس نے اسے درندے سے بھی بدتر کوئی چیز بنایا  
تھا۔

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک گلا  
استرا تھا۔ وہ عام سائز کے استروں سے کافی بڑا تھا اور روشنی میں  
اس کا چوڑا پھل جھلکا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے جسم میں سر  
سی لرزہ دگئی۔ اس کے ہاتھ میں وہ استرا کسی دودھاری شجرے  
زیادہ خطرناک محسوس ہو رہا تھا۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ذیڑ مشاق!“ رجیم گل  
سردہ لمبے میں بولا۔ اس نے بڑی طاقت سے پوچھا ”کیا فرمین اور  
جیل کو تم نے ہی استرے سے ذرا کیا تھا؟“

مشاق کے حلق سے کسی درندے کی سی خراہٹ ابھری۔  
اس نے ایک نفردواڑتے کی طرف دیکھا لیکن ہم دونوں اس کا  
راستہ روکے ہوئے تھے۔ اچانک اس نے رجیم گل کی بدانت اور  
اس کے ریوالبور کی پروا کے بغیر اس پر چلاٹک لگائی۔ میں نے  
استرے کا پھل بجلی کی طرح ایک ٹانے کے لیے نفا میں گھٹنے  
دکھا۔ فوراً ہی فائر کا دھماکا گونجا مگر مشاق بدتر کے بجائے رجیم گل  
ذیڑ ہو گیا۔ میں نے رجیم گل کی بجلی سی چیخ مٹی۔

مشاق واقعی پیٹنے کی طرح پھرتا اور طاقتور تھا۔ اس کی لات  
کسی شہتیر کی طرح میرے سینے سے ٹکرائی۔ میں ٹوکڑا اور وہ  
جکولے کی طرح میرے قریب سے گزر کر دواڑے سے ڈھ پلا۔  
میں فوراً ہی سنبھل گیا لیکن ایک ٹانے کے لیے میرے  
ساتھ بہت بڑی الجھن آن گئی ہوئی اور وہ یہ کہ میں رجیم گل کا  
طرف توجہ دوں جو ایک طرف لڑاک چکا تھا۔ یا مشاق بدتر کے

ساتھ کے تھے اور سہانے کی طرف بحرانی قسم کا ڈیرائن سا ہوا  
تھا۔ مشاق کو اسی ڈیرائن میں چپے ہوئے ہاتھوں اسکو بھی نظر  
آگئے اور وہ جبکہ کران کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے ان پر انگلی پھیر کر  
بھی دیکھا۔ چند لمبے بعد وہ دبے قدموں واپس چلا گیا۔

”یہ کہاں گیا ہوگا؟“ رجیم گل نے مجھ سے پوچھا ”اسکو  
ڈرا پھرتے؟“

”ظاہر ہے“ میں نے جواب دیا ”کاش ہم اپنے اوزار اس کی  
خدمت میں چل سکتے۔ بے چارے کا کافی وقت بچ جائے۔“

کچھ دیر بعد وہ اپنی کار کی ٹول کٹ اٹھائے واپس آیا۔ اس  
نے مناسب سائز کا ایک اسکو ڈرا پھرتی منتخب کیا اور پھرلی سے  
اسکو کھول ڈالے۔ وہ آسانی سے کھلنے والے اسکو تھے۔ مشاق  
نے بے تالی سے بیڑ کا تختہ ہٹا کر ایک طرف رکھا۔ اسے پکٹ  
ساتھ ہی رکھا نظر آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ دیا پکٹ پہلے  
بھی دیکھ چکا تھا یا نہیں۔ ہر حال میں نے احتیاطاً اصل پکٹ کی  
نقل ہٹا کر رکھی تھی۔

اس نے جیٹ کر پکٹ اٹھالیا۔ کمرے میں روشنی زیادہ نہیں  
تھی اور مشاق نے غالباً اوزار اختیار لائٹ آن نہیں کی تھی لیکن  
ہم اس کے تاثرات دیکھ سکتے تھے۔ وہ گویا ریشہ پھٹی ہوا جا رہا تھا۔  
چند لمبے تک تو وہ پکٹ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے عجیب سے انداز  
میں ہٹکا رہا۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ گرد  
چوٹی کی اور کسی چیز کی طرف گویا اس کا دھیان نہیں رہا تھا۔

پھر یکدم اس نے تیزی سے پکٹ کھولنا شروع کر دیا۔ بیڑ کے  
قریب کمرے کمرے اس نے اوپر کا کافٹہ پھاڑ ڈالا پھر گئے کی پینٹنگ  
کھولنے لگا جو خاصی مضبوط تھی۔ جلدی جلدی تمام کتبہ ہڈا کر اس  
نے ادھر ادھر پھینک دیا۔ جوں جوں پکٹ کی جھین کھلتی جاتی  
تھیں ”اس کی بے تالی بدتر جاتی تھی۔ میں دولت کی ہوس کے  
اس قسم کے مظاہرے دیکھ کر اکثر ہی تیران ہوتا تھا۔ مشاق بدتر کو  
اس وقت چونکہ یہ احساس بھی تھا کہ کمرے میں وہ تھا تھا اس لیے  
اپنے تاثرات کی شاید اسے کچھ زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔“

گئے کی پینٹنگ میں سے بالآخر جی جھلی نظر آئی تو مشاق کی  
حالت اور بھی عجیب ہو گئی۔ ایک لمبے کے لیے وہ اسے بھی دونوں  
ہاتھوں میں تھامے دونوں کی طرح ہٹکا رہا پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ  
بے آواز طریقے سے ہنس رہا تھا۔ آخر اس نے برف کیس لٹا اس  
جھلی کی ڈپ بھی کھول ڈالی اور نہایت احتیاط سے ایک ہاتھ پر  
مہیرے سے کٹائے لگا۔

ہیرا بھی مصل ایک پتھر ہی ہوتا ہے اور اس کی جھلی پر جمع  
ہونے والے بھی پتھر ہی تھے فرق صرف یہ تھا کہ ان میں ہلک  
دک نہیں تھی۔ وہ ماربل کے ٹکڑے تھے جو آرائشی ٹکڑوں وغیرہ  
میں ڈالے یا فرش وغیرہ بنانے میں کام آتے تھے۔

مشاق نے ساری جھلی اپنے پیڑے سے ہاتھ پر خالی کر لی۔ کچھ  
پتھر نیچے بھی کر گئے۔ جھلی عالی ہوئی تو اسے کٹا سکتا سا ہو گیا۔ وہ

تاقب میں ہماروں جو کولے کی طرح کمرے سے نکل رہا تھا۔  
 ظاہر ہے ایسے معاملات میں سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں  
 کیا جاسکتا۔ میں نے ایک لمبے میں فیصلہ کیا اور رحیم گل کو اس کے  
 مال پر چھوڑ کر مشاق مدثر کے تاقب میں بھاگا۔

مکان یا قلیف وغیرہ کا کشادہ ہونا ایک بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی  
 ہے لیکن اس وقت مجھے فرمین کے اپارٹمنٹ کا کشادہ ہونا بہت  
 گراں گزرا۔ ایک لمبے کے لئے میں سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلا آپسی  
 لڑائی کو اچھا برا اپارٹمنٹ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر بد قسمتی یہ کہ  
 بے چاری کو اس اپارٹمنٹ میں رہنا نصیب بھی نہیں ہوا تھا۔

دوسرے ہی لمبے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اچھے اور بڑے گھر  
 میں رہنا شاید زیادہ تر انسانوں کی لاشوری خواہش ہوتی ہے۔ میں  
 بھی اکیلا ہی تھا لیکن دولت آتے ہی میں نے ایک طویل و عریض  
 قلم لیا گھر بنوایا تھا۔ مجھے بھی اس میں زیادہ عرصہ رہنا نصیب نہیں  
 ہوا تھا۔ چند لمحوں میں وہ دھماکوں کے ساتھ زلزلہ بوس ہو گیا تھا اور  
 کچھ ہی دیر بعد اس کی جگہ لمبے اور کونوں کا بازار رہ گیا تھا۔ برسوں  
 میں بننے والی چیزیں چند لمحوں میں کتنی بے وقت ہو جاتی ہیں۔

یہ خیالات ذہن میں آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے کافی  
 بڑے لائونج اور رہا رہاؤں وغیرہ سے گزر کر پہلی دروازے تک  
 پہنچنا پڑا اور اس میں چند قیمتی سیکنڈ صرف ہو گئے۔ مجھے کچھ یوں لگا  
 جیسے مشاق مدثر اس اپارٹمنٹ کی مسافت اور فرنیچر کی ترتیب وغیرہ  
 سے مجھ سے کہیں بہتر طور پر واقف تھا کیونکہ وہ کسی چیز سے گرائے  
 بغیر گویا بھاگتا ہوا نہیں بلکہ تقریباً اڑتا ہوا اپارٹمنٹ سے نکل گیا  
 تھا۔

میں پہلی دروازے پر پہنچا تو وہ میز میوں تک پہنچ چکا تھا۔ میرا  
 خیال تھا کہ آدھی میز میاں تو وہ ایک ہی چھالک میں پھلاک  
 جائے گا۔ اس کی پکڑتی حیران کن تھی لیکن اسی لمبے اس سے بھی  
 زیادہ حیران کن نظارہ میری آنکھوں نے دیکھا۔ میز میوں کے  
 کنارے تقریباً ایک فٹ چوڑی ایک آرائشی دیوار بنی ہوئی تھی۔  
 اس دیوار کی اوٹ سے 'خاک پتوں میں چھپی ہوئی ایک ٹاک  
 اچانک ہی برآمد ہوئی اور مشاق مدثر اس ٹاک میں اُلجھ کر میری نظر  
 سے غائب ہو گیا۔ ہر آٹھ دس میز میوں کے بعد لینڈنگ تھی۔  
 آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑھکھا ہوا لینڈنگ تک پہنچ گیا  
 تھا۔

اسی لمبے پہلی پہلی ہی آواز گونجی "خبردار... ٹوک جاؤ۔" اس  
 کے ساتھ ہی آرائشی دیوار کی اوٹ سے وہ کانسٹیبل نکل آیا جسے ہم  
 نے جہت پر بھیجا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رائل تھی اور اس کا  
 لڑنے لینڈنگ کی طرف تھا۔ اس نے بڑا کمال دکھایا تھا کہ نہایت  
 جگہ وقت پر ٹاک اڑا کر مشاق مدثر کو میز میوں سے لڑھکایا تھا اور  
 اب اسے رستے کا حکم دے رہا تھا۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ

لازوال کمائیوں کے خالق

انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے

ایک نئی سوغات

## رقص ابلیس

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی

ایک حقیقت جو کمائی بن گئی۔

ایک آشفستہ حال کی داستان عبرت جسے

قانون نے مجرم بنادیا

قیمت - 150 روپے

ناشر۔ مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور 2

کبھی کبھی کوئی چیز بھی کام آجاتا ہے۔ اس وقت میرا اس کانسٹیبل  
 پر تھان جانے کو دل چاہا۔

میں میز میوں تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا مشاق مدثر اس  
 دوران لینڈنگ سے اُلجھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کرنے کی



جس طرح کی آوازیں مٹی جیسی ان سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید وہ بے ہوش ہو گیا ہو اور کوئی بید نہیں کہ گردن ہی تڑوا بیٹھا ہو لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ اس میں اتفاق کے علاوہ اس کی سخت جاتی کو بھی دخل تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ اس کے حواس کچھ ختم سے ہو چکے تھے۔ وہ دیوار کا سارے کر اٹھ رہا تھا۔

اس نے کانٹیل کی لٹکار پر قطعاً کان نہیں دھرا تھا اور اگلی بیڑیوں کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ کانٹیل نے چاہہ تذبذب میں تھا۔ راکھ اس کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ گولی نہیں چلا رہا تھا۔ شاید اس میں افسر کے حکم کے بغیر گولی چلانے کی ہمت نہیں تھی۔ اور افسر اس وقت اس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔

بیر حال اس نے جو کام کر رہا تھا، میرے لئے وہی ہمت تھا۔ اس نے مجھے اتنی ملت مہیا کر دی تھی کہ میں مشتاق کے سر پر جا بیٹھا تھا۔ وہ عین ممکن تھا کہ وہ نکل جاتا۔ مجھے اس کا تعاقب شروع کرنے میں دو تین سیکنڈ کی تاخیر ہو گئی تھی اور وہ میرے اندازے سے زیادہ پکڑتا ثابت ہوا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ مجھے خود کچھ زیادہ اُمید نہیں تھی کہ میں اسے پکڑ سکوں گا لیکن کانٹیل کا اس وقت ہمت کے بجائے یہاں موجود ہونا اور بروقت ٹانگ اُڑا کر میرے لئے اندراجی ثابت ہوا تھا۔

میں نے لینڈنگ پر جھلاٹ لگا کر مشتاق نے صحیح طور پر حواس میں نہ ہونے کے باوجود پلٹ کر نہایت تیزی سے ہاتھ بٹھمایا۔ غیبت یہ تھا کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں اسٹرا نہیں تھا۔ وہ میرے لئے اپنی گردن بچانا مشکل ہو جاتا۔ اسٹری سے لڑنے اور وار کرنے کی ایک الگ ہی ٹیکنک ہوتی ہے اور وہ اس میں ہمت ماہر معلوم ہوا تھا لیکن اس کی بد قسمتی اور میری خوش قسمتی یہ تھی کہ اسٹرا اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔

اس کا ہاتھ میری گردن پر پڑا تھا اور ایک لمحے کے لئے میرا پورا وجود جھنجھٹا کر رہ گیا تھا لیکن اس جھنجھٹاوت کو برداشت کرتے ہوئے میں نے اس کی گردن پر اس سے کہیں زیادہ دباؤ ڈالا اور پھر پورے ہاتھ دسید کیا۔ اس وقت چونکہ اس کا ایک ہاتھ لینڈنگ پر اور دوسرا بیڑی پر تھا اس لئے اس کا توازن پہلے ہی کچھ صحیح نہیں تھا۔ گردن پر ہاتھ پڑنے ہی وہ اہل کی بیڑیوں سے لڑھکا ہوا سیدھا دو سری لینڈنگ پر جا بیٹھا۔ کرنے سے پہلے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس بار وہ نہیں اٹھ سکا۔

میں نے نیچے ہینچ کر اسے کالر سے پکڑ کر اُٹھایا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بول بول کر ہرجا بھول رہا تھا جیسے اسے چکر آ رہے ہوں۔ تاہم وہ بے ہوش نہیں تھا اور آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس عالم میں بھی اس نے بازو لہرا کر مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ شاید اب بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں اسٹرا موجود تھا۔ اپنی دانست میں اس نے میرا گلا کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کے

دو ٹوں بازو مرد زکشت پر لے جا کر قابو میں کر لئے۔ اب اس میں کوئی خاص مزاحمت باقی نہیں تھی۔ وہ مرتبہ بیڑیوں سے لڑھکا کر اس کے کس بل نکل گئے تھے لیکن اس کی سخت جاتی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ جس انداز میں وہ کرا تھا، اس کی جگہ کوئی اور ہوتا شاید بے ہوش ہو چکا ہوتا۔

بازو مروڑے جانے پر وہ کراہا اور لڑکھائی آواز میں بولا "تم بہت مردود اور غیبت آدمی ہو۔"

"تم سے کہہ" میں نے اسے دایں اوپر کی بیڑیوں کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میں نے زندگی کی۔۔۔ سب سے بڑی۔۔۔ غلطی کی۔ میں نے جیسی بہت انداز ایسی میٹ کیا۔۔۔" وہ میرے دھکیلتے ہوئے بیڑیاں چڑھتا جا رہا تھا اور بڑھانے کے سے انداز میں بولتا جا رہا تھا۔

"اس میں تمہاری کوئی غلطی یا میرا کوئی کمال نہیں تھا میری جان!" میں نے لڑکتے سے کہا "یہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ انسانی جانوں سے کھلونوں کی طرح کھینچے والوں کو کسی نہ کسی طرح۔۔۔ کسی نہ کسی ہاتھ سے آخر کار اپنے انجام کو پہنچا ہوتا ہے۔ قدرت نے تمہیں سنہیلے کے لئے بیٹھا کافی ملت دی ہوگی۔ تم نہیں سنہیلے۔۔۔ ملت ختم ہو گئی۔"

"کچ کبہ معاش! مولوی بننے کی کوشش مت کہہ۔" وہ شاید دانت پیس کر بولا۔ دل تو چاہا کہ اسے ایک اور زوردار ہاتھ دسید کر اس کی اس طرح تک کو جھنجھٹا دے لیکن بعد کوشش میں نے اپنی کھوپڑی ٹھنڈی رکھی۔ وہ بے دم تھا اور میرے قابو میں تھا۔ قابو میں آئے ہوئے انسان کو کیا مارنا۔

کانٹیل اوپر کھڑا تھا۔ وہ مستعدی سے مگن سنہالے ہوئے تھا۔ اس کی بیٹ میں جھنجھٹا بھی موجود تھی۔ میں نے مشتاق کو اس کے سامنے دھکیلتے ہوئے کہا کہ "اسے جھنجھٹا لگا دو۔"

"جھنجھٹا۔۔۔؟" اس نے ذرا بڑبڑا کر پیلے جھنجھٹ کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا "میں جھنجھٹ کیسے لگا سکتا ہوں سر؟ جب تک افسر کا حکم نہ ہو۔"

"خدا کی پناہ!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ اس لئے میرا سر پیٹے کو دل چاہا "فلا کام تو تم لوگ اپنی مرضی سے ہی کر لینے ہو۔ کوئی صحیح کام کرنے کے لئے افسروں کے حکم کا انتظار شروع کر دینے ہو خواہ اتنی دیر میں خون کی ندیاں بہہ جائیں۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اس کی بیٹ سے جھنجھٹ نکال کر خودی مشتاق کو پستانوں اور یوں "قاتل دست اندازی پولیس" جرم کا مرتکب ہو جاؤں لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی لئے مجھے ایک خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں نے دیکھا کہ جیم گل فلیٹ سے باہر آ رہا تھا۔

اس کے بازو پر سفید کپڑا لپٹا ہوا تھا جس پر سُرنی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اس بازو کو تھامے ہوئے تھا۔ اس کی رنگت کچھ زردی دکھائی دے رہی تھی۔



میں آئے مشتاق کی ہتھکڑی میں نے ایک کھڑکی کی گرل میں قفل کھدی تھی اور درجیم گل نے کاشٹیل کو اس کی عمرانی پر مامور کرتے ہوئے حتیٰ سے ہدایت کی کہ اگر وہ بھاگنے کی ذرا بھی کوشش کرے تو وہ پالا تامل اسے گولی مار دے۔

امیر آکر میں نے کچھ چیزیں احوطاً احاطہ کر ڈرا بہتر طور پر اس کے بازو پر کس کر دیتی تھی ہانڈ میچر تاکہ اسپتال پہنچنے تک خون کا بہاؤ نہ کاربہ پھر میں نے اپنا خون دھیرہ ڈھلایا۔ فرخین کے بیڑوم میں جہاں درجیم گل کرا تھا وہاں اس کا بہت سا خون پھیلا ہوا تھا۔ اسی کمرے میں ابھی تک فرخین کے بیڑ پر اس کا خون جذب تھا۔ یہ خاصا خون آتھام سا کرا تھا۔

واپس باہر آکر ہم نے غلیٹ کو دوبارہ آلا لگا دیا اور کاشٹیل کو ایک بار پھر وہیں ڈیوٹی پر بٹھا کر مشتاق مدثر کی ہتھکڑی کی گرل سے کھول کر نیچے ہل دیے۔ اب کوئی جگت نہیں تھی اس لئے ہم لٹ کے ذریعے پارچے تھے مشتاق اب خاموش اور ست فہر آ رہا تھا۔ اس کی خوشخبری اور دروندگی اب گویا رخصت ہو چکی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کمری سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا ذہن کسی اور چیز میں تھا اس لئے وہ دھیمے پر گیا تھا۔ درجیم گل اپنے بازو کو بدستور گرفت میں لے لے اور ذرا اونچا کئے ہوئے تھا تاکہ خون کا بہاؤ روکے رکھنے میں مدد ملے اس وقت اس کی جگہ میں ہی پولیس آفیسر کے فرائض انجام دے رہا تھا اور مشتاق مدثر کی ہتھکڑی مضبوطی سے پکڑے پل رہا تھا اور دل ہی دل میں یہ تیرہ بھی کئے ہوئے تھا کہ اگر اس نے بھاگنے کی معمولی سی بھی کوشش کی تو اس کی ذرا ٹھیک ٹھاک قسم کی ٹھکانی کروں گا۔ اگر وہ اب بھی بھاگنے کی کوشش کرنا تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ اس کی ٹھکانی میں کمرہ کئی تھی اور وہ کمرہ پوری ہو جانی چاہئے تھی۔

ہم عمارت کی چار دیواری سے باہر آگئے مشتاق نے بھاگنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس قسم کی کوشش فاضل تھی۔ آتے وقت ہم نے گاڑی احتیاطاً عمارت سے کافی دور چھوڑی تھی۔ مشتاق مدثر کی گاڑی بھی آس پاس کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس نے بھی کسی وجہ سے ایسی ہی احتیاط کی تھی۔

”شکر ہے تم زندہ ہو۔“ میں نے اطمینان کی کمری سانس لے کر کہا ”میں تو زار رہا تھا۔“ میں نے جملہ ادھر دھا پھوڑا۔  
”ہم میرا کام تمام ہو گیا۔“ وہ بیچکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”میں بھی یہی سمجھا تھا۔ اسرا پائل میں میری گردن کے قریب جھلایا تھا۔ معلوم نہیں کب غیر ارادی طور پر میرا بازو سامنے آ گیا تھا اور وہ بھی تقریباً نک کر کرتے کرتے بچا ہے۔ کافی کراؤ تم آتا ہے۔“ وہ ایک ہاتھ سے حتیٰ سے پکڑے کو دبائے ہوئے تھا اور یوں خون کا بہاؤ روکے ہوئے تھا۔

پھر وہ قبر آلود نظروں سے مشتاق مدثر کو گھورتے ہوئے بولا ”کسی بدکردار انجام کی ناجائز اولاد۔“ اٹوٹے یہ اسٹری سے قفل کرنا کمال سے سیکھا؟“ ساتھ ہی اس نے گویا دانت ٹیس کر مشتاق کو لات رسید کی۔ مشتاق ہلکا کر رہ گیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا وہ میری گرفت میں ایک لمحے کے لئے چل کر پہلے سے زیادہ ڈھیلا ہو گیا۔

”تم نے تو یہیں تفتیش شروع کدی۔“ میں نے درجیم گل کو مخاطب کیا ”تفتیش کا یہ انداز تمہارے لئے فی الحال ٹھیک نہیں۔ کہیں جھٹکا لگنے کی وجہ سے ذمہ سے خون نہ بنے لگے۔“ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی گرفت کے باوجود سفید کپڑے پر سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کہہ کہ بہت سے کام لے رہا تھا لیکن اس کا ذمہ خطرناک ہی معلوم ہوا تھا۔

میں نے مشتاق کو ایک طرف کو دھکیلتے ہوئے کہا ”اپنے کاشٹیل سے کو اسے ہتھکڑی تو لگائے تمہارے حکم کے بغیر اس معزز قافلہ کو ہتھکڑی لگانے کے لئے بھی تیار نہیں ہے۔ شکر ہے جب یہ حیثیت بھاگ رہا تھا تو تمہارے کاشٹیل نے اس کے راستے میں ٹانگ اڑائے کے لئے تمہارے حکم کا انتظار نہیں کیا ورنہ یہ تو گل گیا تھا۔ اس چھوٹی سی بہادری اور قتل مندی پر تمہارا ٹھکے اس کاشٹیل کو انجام دے یا نہ دے میں ضرور دوں گا۔“

درجیم گل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاشٹیل کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر مشتاق کو ہتھکڑی لگادی۔ مشتاق مضطرب نظر آیا لیکن اس کی سرکشی و خیانت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ ظہور رنگ آنکھوں سے درجیم گل کو گھورتے ہوئے بیٹھی بیٹھی آواز مل رہی بولا ”ہتھکڑی لگا نا اور بات ہے‘ جرم ثابت کرنا اور بات۔ تم میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکو گے۔“

”شباباش میرے شیر!“ میں نے اس کی پیٹ پر چھکی دی ”میں تمہارے ہاتھ جوصلے کی داد دیتا ہوں۔ تمہارے ہاں اب قاتلوں‘ ڈاکوؤں‘ ناجائز دھندے کرنے والوں اور دہشت گردوں کے جوصلے کی داد دے رہے ہیں۔“

درجیم گل اسے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا ”اگر میں تم جیسے آدمی کو بھی سزا نہ دلوں گا تو پھر میں پولیس کی طاقت میں ہی چھوڑ دوں گا۔“

ہم دونوں مشتاق کو کاشٹیل کی عمرانی میں چھوڑ کر واپس غلیٹ

رحیم گل اپنے زخمی بازو کو سنبھالتے ہوئے اٹھ بٹھا اور مشتاق دھڑ پر جبک گر اس کا بازو لینے کے بعد کراہ کر ہلاک ہو گیا۔  
 چوہدری انہ نے مجھے مروا دیا۔  
 ”مجھے تو تم اتنے خاصے زندہ نظر آ رہے ہو۔ مرقا مشتاق دھڑ ہے۔“ میں نے گویا اس کی لفظ فہمی دور کی۔  
 ”اس سے تو بہتر تھا کہ میں ہی مر جاتا۔“ وہ پہلے سے زیادہ دردناک لہجے میں بولا۔

”ایک بد فال منہ سے مت نکلو یا رہ۔ تم جیسے آفیسر تو ایسے ہی ہمارے ہاں کیا با۔۔۔ بلکہ نایاب ہیں۔“ پھر میں نے مشتاق دھڑ کی طرف اشارہ کیا ”اس جیسے شخص کو کیا ہے تو وہ زہر آہوٹے اور مرتے رہے ہیں۔“

”لیکن یہ حیثیت مر کر میرے گلے پر کیا ہے۔ تم بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ میری تحویل میں مارا گیا ہے۔ میں سادہ لباس میں ہوں۔ بلڈ نمک کا چمکیدار اور دوسرے دو چار لوگ ٹیبلوں کی کھڑکیوں سے جھانک رہے ہیں۔ وہ اصل منظر تو دیکھ نہیں سکے اور نہ ہی اصل بات سمجھ سکیں گے۔ پس والوں میں اگر کچھ مشتاق دھڑ کے حافی نکل آئے تو وہ بڑی آسانی سے بات کا شمع بول دیں گے کہ پولیس والے بعض لوگوں کو اسی طرح مار کر اسے پولیس مقابلہ یا کسی دوسرے کی کارروائی قرار دے دیتے ہیں۔ بلکہ پولیس میں خواہ مشتاق دھڑ کے حافی ہوں یا نہ ہوں۔“ انہیں چھاپنے کے لئے اس طرح کی چٹکارے دار اور شناہدہ کہانیوں کی تلاش رہتی ہے۔ چھوٹے اخبار والوں کو تو مرضی کا مواد نہ ملے تو خود ہی لگا پھرنے لگا لیتے ہیں۔ بہر حال تم نے بیٹھے بٹھائے یہ خواہ خواہ کی مصیبت میرے گلے ڈالادی ہے۔“

”میری جان از زندگی میں ایک اصول بتاؤ۔“ میں نے مشتاق لہجے میں مشورہ دیا ”اگر تم نے کوئی لفظ کام نہیں کیا تو بالکل مت ڈرو۔ خواہ ہمارا معاشرہ کتنا ہی اگٹ پٹ ہے۔ خواہ یہاں تک لوگ سختی ہی کیسے تھرا د میں پائے جاتے ہیں اور خواہ ہمارا نظام ہی خراب ہے۔ اگر تم ٹھیک ہو تو کوئی بھی قوت تصدیق طاقت کرے گی۔ اگر تم پر مشکلات آئیں گی بھی۔ تو وہ عارضی ہو گی۔“

”مجھے کیا سمجھا رہے ہو۔“ وہ لہجہ بڑی سادگی سے بولا۔  
 ”اصل میں یہ ہے اور مجھے زندگی میں تجربات بھی پیش آئی ہیں۔“  
 ”پھر تو تمہیں اس طرح کی بات ہی نہیں کرنی چاہئے۔“

”بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ بظاہر تو ہمیں مام اور بد انسان ہی نظر آتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔  
 ”یہ بد معاشرہ تو تم۔“ میں نے لہجہ بڑی سادگی سے کہا۔  
 ”مشتاق کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔“ اس کا کیا کر

ہم نے مشتاق دھڑ سے اس کی گاڑی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا اور خاموشی سے اس طرف چل دیے جہاں ایک ذریعہ قنیر عمارت کے عقب میں ہماری گاڑی موجود تھی۔ ہم ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ ہلکی سی سنسنیات اور ٹھٹھکی کی سی آواز سنائی دی اور مشتاق دھڑ کچھ ریشمی زین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میرے ہاتھ میں موجود پھنگلی کی وجہ سے مجھے بھی جھٹکا لگا لیکن میں اس جھٹکے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے مشتاق ہی کے انداز میں گر پڑا کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مشتاق کے گرنے کی وجہ کیا تھی۔

رحیم گل نے بھی معاملے کو سمجھنے میں سستی نہیں دکھائی اور اپنے بازو کو پچاتے ہوئے پہلو کے بل ڈھیر ہو گیا۔ گویا ہم تینوں تقریباً ایک وقت ہی ڈھیر ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ مشتاق دھڑ اپنی مرضی سے یا احتیاطاً منہ کے بل نہیں گرا تھا۔

عمارت سرنگ سے ہٹ کر تھی اور اس کے گرد ساحلی زمین کافی دور تک پکٹی اور ریشمی تھی۔ میں اور رحیم گل کئی لمبے تک ساکت رہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن اس کے بعد سنسنیات کی سی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ اس کے بجائے کہیں دور کسی کار کے انجن کی غراہٹ اور ٹائروں کی چرچاہٹ سنائی دی۔ میں نے ذرا سراوٹا کر کے آواز کی سمت میں دیکھا لیکن اس طرف مجھے کوئی کار دکھائی نہیں دی۔ اس طرف بھی ایک اور جوری عمارت موجود تھی اور کار کی آواز اسی کے عقب سے ابھری تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر آواز معدوم ہو گئی۔

”وہ جو بھی تھا۔۔۔ نکل گیا۔“ رحیم گل کراہ کر بولا۔  
 ”اگر تم یہاں صورت حال کو سنبھال لو تو میں اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا ”معلوم نہیں وہ ہاتھ آئے یا نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم میرے ساتھ رہو۔ میں اس بازو کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوں کہ کسی ایمر جنسی سے منٹ سکوں۔“  
 میں نے فرار ہونے والے آن دیکھے شخص کے تعاقب میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ رحیم گل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کے زخمی بازو اور ایک عدد دلاش کے ساتھ تنہا چھوڑ کر میرا جانا ٹھیک نہیں تھا۔ مشتاق دھڑ کے بارے میں مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اب زندہ نہیں رہا تھا۔ لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ تاہم تصدیق کے لئے میں نے اسے سیدھا کیا۔

اس کی پیشانی زخمی اور خون آلود تو پہلے ہی تھی لیکن اب تو منی اور خون میں کچھ زیادہ ہی تصریح تھی۔ میں نے اس کا سر ذرا اونچا کیا تو خون باقی چہرے پر بھی پھیل آیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ بائیں آنکھ سے ذرا اور گولی کا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ گولی یقیناً سائینٹر گولی یا نکل سے چلائی گئی تھی۔ یہیں شاید کسی مصیبت کی وجہ سے پیش دیا گیا تھا یا پھر شاید فوری طور پر اوندھے منہ گرنے کی وجہ سے ہم ٹھٹھانے پر نہیں آئے تھے۔

۳۳ اصل میں میرا سراغری کا گھوڑا جہاں تک دوڑ سکتا تھا دوڑ چکا۔ میں نے اعتراف کیا ۳۴ اب بعض سوالوں کے جوابات کے لئے تو مجھے بھی انتظار کرنا پڑے گا۔ تم بھی کرو۔ میرا تجربہ ہے کہ وقت اکثر سوالوں کے جواب دے دیتا ہے۔ بشرطیکہ ہم مصروف عمل سے انتظار کریں۔

۳۵ چھاپڑ کو رام! میں مصروف عمل سے انتظار کرتا ہوں۔ ۳۶

محضی سائنس کے کربلا۔

میں اسے سرکاری اسپتال میں لے گیا جہاں اس نے اپنے  
خوابوں اور قاعدوں کے مطابق مشاق و عثر کی لاش میٹھی کر لی  
آفسر کے حوالے کی۔ اس دوران اس کے بازو پر بھی ٹانگے لگا کر  
بیڈ پر لیٹا دیا گیا۔ اسپتال والے اسے دو چار دن کے لئے  
ایمٹ ہونے کا مشورہ دے رہے تھے لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ  
گھر پر ہی کسی اچھے ڈاکٹر کی نگرانی میں رہے گا۔

تمام کاروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد میں ایک بار پھر رجم کھل کو ساتھ لے کر روانہ ہوا۔ اب مجھے اس کے مگر چھوڑنا تھا۔ اسے اپنے بازو کی لکر میں تھپی۔ جس پر کئی ٹانگے آئے تھے۔ وہ اب بھی مشتاقانہ دھڑکی کے بارے میں سوچ کر کمر مند تھا۔ راستے میں پورا اس واقعے کے برلے میں آنے کی دیر ہے۔ سب بچے حجاز کر میرے پیچھے دھانسیں گئے۔

”مجھے اُمید ہے ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔  
 ”میں نے اس کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں اس سے تو  
 بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے چھٹکارا پا کر اس کی اپنی برادری بھی  
 سکون کا سانس لے لے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی دعا کرو کہ یہ معاملہ  
 بریس میں نمایاں ہونے سے پہلے ہی مشتاق کا اصل قاتل سامنے  
 آجائے اور ہمارے ہتھے چڑھ جائے تاکہ تم اپنا مؤقف ثبوت کے  
 ساتھ سب کے سامنے پیش کر سکو۔“

”یہ تو تقریباً مجموعی ہو گا۔۔۔ اور مغزے ہم جیسے گناہ گاروں کے لئے دلہنا نہیں ہوا کرتے۔“

”بھئی بھئی ہو بھی جاتے ہیں۔ میں اس کا مورال بلند رکھنے کی سرزد کو شش کر رہا تھا۔“

اسی طرح باغی کرتے ہم اس کے گھر جانے پہنچے وہ بیوہ پرلیٹ گیا۔ اب وہ انا گھر مند اور معطل نظر میں رہا تھا۔ انا حاکم میری باتوں اور رفاقت سے اسے کچھ سہارا ملا تھا اس کے علاوہ ہم نے کچھ دیر اس سے اعتماد بہرہ روی اور اعتماد قبولی کرنے کے بعد میرے لئے کافی اور اس کے لئے گھوکوڑ بنایا۔ کافی پیے اور مزہ کچھ دیر کب شب کرنے کے بعد میں نے اس سے اجازت چاہی۔

جو کسی نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا کسی نے مجھے واپس اندر دھکیل دیا۔ میں اس وقت بے خبر وارے پر ہوا تھا۔ لڑکھڑاکر رانڈاوی کی دیوار سے جا کر آیا۔ دروازہ کھلتے جتے جاہر کسی کی موجودگی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میرے خیال میں وہ ایک محفوظ

ہاں مردوں کے احرام کی تلقین نہ کی گئی ہوتی تو میں اس کی تلقین کے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہ کرتا لیکن فی الحال ہم اسے لٹا کر اسپتال لے چلتے ہیں۔ یہی کارروائیاں اور پوسٹ مارٹم فرم ہو جائے تو بہتر ہے۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا "اے تمہاری گاڑی میں ڈالنا دے گا۔ گاڑی ذرا لمبی ہوگی۔ امید ہے تم بڑا فیصلہ سناؤ گے۔"

میں تو برا نہیں منادوں گا۔ کہیں گاڑی نہ بجا جاسکے  
 گاڑی پر میری نہیں، میرے ایک دوست سینٹر رمضان کی گاڑی  
 ہے جسے اس نے گویا کوڑے میں پھینکا ہوا ہے لیکن مجھے یقین ہے  
 کہ یہ گاڑی کبھی ایسے گندے خون میں نہیں تسخیر ہوگی۔" میں

لاش مجھے ہی اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا پڑی۔ رحیم گل اپنے بازو کو کٹاے ہوئے تھا۔ اچانک کرنے کی وجہ سے شاید اس کے بازو سے پھر خون برسنے لگا تھا۔ بازو پر باندھے ہوئے نئے کپڑے پر بھی سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے ہی گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

”تمہارے خیال میں مشتاق کو کس نے اتنے ماہرانہ انداز میں کھلا ماری ہے؟“ راستے میں رحیم گل نے پوچھا۔

”گراچی میں ایسے لوگوں کی تعداد چاروں میں تو ضرور ہوگی جو کسی کو اتنے مہربانہ انداز میں کوئی ناکرہا پرانہ ہی انداز میں غائب ہو سکتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”بلکہ اب تو کوئی مارنے کے لئے عمارت بھی ضروری نہیں رہی۔ کوئی بھی اگر مجمع عام پر اپنے حادہ خدہ بازیوں کے اطمینان سے رخصت ہو سکتا ہے۔ کوئی اس کا راستہ لے کر کسی کو کشتن نہیں کرے گا۔“

”میں ان سب کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ رحیم کھلے  
 زار سے بولا ”میں کسی ایسے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے  
 خاص طور پر مشاق مدثر کو تاک کر گولی مارنے کی ضرورت محسوس  
 ہوئی ہے۔“

”مشتاق عرض کر جس قسم کا آدمی تھا اور جس قسم کے دھندلوں میں لوٹتا تھا ان کے پیش نظر تو وہ بھی کافی لوگوں کا دُف ہو سکتا تھا۔ مشتاق جیسے لوگ زیادہ تھکا ہوا یا خفا سے دوچار ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ایک اہم بات یہ ہے کہ پولیس والے تم ہو، میں نہیں۔ اس قسم کے سوالات مجھے تم سے کہنے چاہئیں۔ اگلا تم نے مجھ سے شروع کر لیے۔ آج کل دنیا میں ہر کام ہی اُلٹ ہو رہا ہے۔“

”سہانی چاہتا ہوں بابا!“ وہ فحش سی سانس لے کر ہوا ”میں نے تو اس لئے پرچے کی جراثیم کھلی تھی کہ کچھ دیر پہلے تک تم اچھے غامی شہلاک ہو مگر مظلوم ہو رہے تھے اب اچانک ہی تم نے اپنی رازگزارانہ صلاحیتوں کی نگاہ کھینچ لی ہے۔“

اگر اس کے وجود کو اس کے اعمال کی خباثت اور بے باک  
نفرت نے مسخ نہ کیا ہوتا تو وہ ایک خونخوار مجرم ہو نہ بلکہ  
ترک اور مضبوط نظر آتا تھا شکل مسرت بھی اچھی تھی۔

نادر عرف نوزی چونکہ اب ایک مجنا ہوا اور چلا ہوا  
بد معاشر تھا۔ وہ اپنی نفرت اور خباثت کو اپنے اندر ہی مقید رکھنے  
کے ہنر سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ بھی کچھ کم زور بلا سانپ نہیں تھا  
لیکن زہر اس کے وجود سے چھٹکا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ایک  
پرسکون شیطان معلوم ہو رہا تھا۔

کبکنت پہلے ہی کی طرح خوش لباس بھی نظر آتا تھا۔ بڑے  
تراش فراش کے نیلے کوٹ کے ساتھ شرح عالی لگائے ہوئے تھے۔  
پہلے ہی کی طرح بالوں کی پونی ٹیل بھی بنی ہوئی تھی اور شاید ان  
اچھے بھی کیا ہوا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ حیثیت کی جب میں ایک  
گلاب کی کٹی بھی تھی ہوئی تھی مگر وہ شاید کسی دیوار سے رگڑ لگا کر  
کچلی گئی تھی۔ اس کے نیلے کوٹ پر دیوار سے رگڑ کا سفید نشان نظر  
آتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پہلے میں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں  
آتی تھی۔

میں نے صرف ایک لمحے میں ان دونوں کا جائزہ لیا اور ان  
ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ نوزی طور پر کوئی حرکت کیا  
میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ نوزی کا نوجوان ساتھی بڑے  
زادہ شعلہ جوالا نظر آتا تھا مجھے اس سے اتنا خوف محسوس نہیں  
ہو رہا تھا جتنا نوزی سے محسوس ہو رہا تھا جو بلا بالکل پرسکون تھا۔  
نوزی نے گمن سے اشارہ کیا اور میں نے خاموشی سے اپنے  
اٹھادیے۔ وہ پرسکون لمبے میں بولا "نادر چلو۔ ذرا تمہارے ابا  
پولیس والے ہیرو سے بھی ملاقات کر لیں۔ اور خیال رکھنا تم  
ہیرو بننے کی کوشش مت کرنا۔ قسمت ہر بار آدمی کا ساتھ دیتی  
ہے۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ہم راہداری سے نکلے تو  
اچانک ہی ہاں میں ایک طرف سے رجم کل کا نوکر نمودار ہو گیا۔  
اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا "نوزی کے ساتھی نوجوان نے اس  
کے سر پر ماؤزر کا دست رسید کیا اور وہ جی ڈھیر ہو گیا۔  
"اس طرح مار دھاڑ مت کرو۔" میں نے گردن جھکنے  
ہوئے نوجوان کو نہایت ملالت سے مشورہ دیا "جب تمہارے حکم  
کی تعمیل ہو رہی ہے تو کسی بے حضور پر تشدد کی کیا ضرورت ہے؟"  
"جب کہ بے مولوی مدن کے بچہ" نوجوان بھکارا "ٹانہوٹا  
سے آگے چل۔"

نوزی نے گمن کے اشارے سے ہی گویا اسے ذرا اچھلے سے  
لپٹے کا مشورہ دیا اور مجھے دوسرے ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ  
کیا۔

رجیم کل کا بیڈروم سامنے ہی تھا اور اس کا دروازہ کھلا تھا۔  
میں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے گویا اسے خوش

معارف تھی۔ دیئے بھی اس وقت میں ایک پولیس آفیسر کے کمرے  
نکل رہا تھا لیکن اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کسی بھی جگہ کو محفوظ  
سمجھنا اور ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو جانا سماعت تھی۔ کوئی باہر  
گھبات لگائے بیٹھا تھا اور دروازہ کھلے کا کھٹک رہا تھا۔

آگے پیچھے دو آدمی نہایت چمکتی سے اندر آگئے۔ پیچھے والے  
نے پیچھے دیکھے بغیر اسی چمکتی سے دروازہ قفل بھی کر دیا اور رولٹ  
بھی چلا دیا۔ دروازہ قفل کرنے کے لئے اسے تاب میں موجود  
صرف ایک ٹی بی دیا ہوا تھا۔ میں اس وقت تک سنبھل چکا تھا  
لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ان دونوں کے ہاتھوں میں  
خوف ناک سی ساخت کے ماؤزر تھے۔

ان دونوں میں سے جو شخص آگے تھا اور جس نے مجھے اندر  
دھکیلا تھا اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا خف سا چھٹکا لگا۔ وہ نادر عرف  
نوزی تھا جس کی مجھے بھی تلاش تھی اور رجیم کل کو بھی۔ نئے دور  
کے بھروسوں اور بدشت گردوں کی دیدہ دلیری میرے لئے واقعی دن بہ  
دن زیادہ سے زیادہ تشویش کا باعث بنتی جا رہی تھی لیکن شاید یہ  
صرف مجھ جیسے ہی لوگوں کے لئے باعث تشویش تھی جو اس ملک  
کے شرما کے مستقبل کے بارے میں سوچتے تھے۔

نوزی کا یہ ساتھی اس سے کہیں زیادہ خطرناک بد معاشر معلوم  
ہو رہا تھا جسے میں نے "تورم" کا نام دیا تھا اور جو نوزی سے پچھلی مرتبہ  
میرے ٹکراؤ کے دوران اتفاق سے نوزی ہی کی فائرنگ کی ذیلی ٹکر  
ہلاک ہو گیا تھا یا یوں کہنے کے لئے میں نے نوزی کی فائرنگ کے  
دوران دھماکے کے طور پر استعمال کر لیا تھا۔

اس بار نوزی کے ساتھ جو نوجوان تھا اس کی عمر میں بائیس  
سے زیادہ معلوم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مختصر سی سیاہ  
چمکی داڑھی تھی۔ اس کے اعمال نے اس کے چہرے سے نوجوانی  
کی نرمی اور کشش چھین لی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شیطانی قسم  
کی کرختگی تھی۔ آنکھوں میں خون کی بائیس تھی۔ وہ انسان کم درجہ  
زیادہ نظر آتا تھا۔ بلکہ شاید اس قسم کے انسانوں کو ہم درجہ دل سے  
تشبیہ ظلم دیتے ہیں۔ درندوں کی آنکھوں میں تو صرف درندگی ہوتی  
ہے ایسی نفرت نہیں جو اس قسم کے انسانوں کی آنکھوں میں نظر آتی  
ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ نفرت ان لوگوں کے لئے بھی ہوتی  
ہے جو ان کے دشمن نہیں ہوتے۔ یہ خود ہی انہیں اپنا دشمن فرض  
کر لیتے ہیں اور انتقام کی کبھی سزا نہ ہونے والی آگ میں جلتے جھلتے  
وجود لئے لوگوں کی طرح اُدھر سے اُدھر بھرتے رہتے ہیں۔

اس وقت یہ نوجوان بھی مجھے کچھ ایسی طرح مگھور رہا تھا حالانکہ  
اس سے پہلے زندگی میں کبھی اس سے میرا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں  
نے اس کا کچھ نہیں دیکھا تھا کہ اس کا پس نہیں چل رہا تھا کہ  
نظروں ہی نظروں سے مجھے خاستہ کر رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے حیرت بھی  
ہوتی تھی کہ اس قسم کے لوگ اپنے وجود میں ایسی بے جواز نفرتیں  
کماں سے سمیٹ لاتے تھے۔

”میں نے دیکھا کہ میں تمہاری پرانی تصویریں دیکھی ہیں۔ تم میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں لیکن اب بھی سر حال ان تصویروں کی مدد سے پہچانے جاسکتے ہو۔“ رحیم کل سرہانے ہوئے مستانہ جیسے میں بولا ”اس کے باوجود تم آزاد پھر رہے ہو۔ مجھے اپنے گلے کی باہلی کا اعتراف ہے۔“

”بھولے بادشاہ ایک میں ہی کیا مجھ جیسے ہزاروں آزاد پھر رہے ہیں اور دل و جان سے تمہارے گلے کو دعا میں دیتے ہیں۔“ نوزی استہزائیہ لہجے میں بولا ”کاش دوسرے ملکوں کی پولیس بھی ایسی ہو جائے تو رفتہ رفتہ مجھ جیسے لوگ وہاں بھی جرائم پیشہ اور دہشت گرد کمانے کے بجائے سیاسی قوت بن جائیں۔“

رحیم کل کا ذہن اس وقت گویا کہیں اور تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ وقت اکثر سوالوں کے جلدیا بدر خود ہی جواب دے دیتا ہے۔ مجھے اس وقت نوزی کو دیکھ کر اچانک ہی اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔“

”وہی سوال کہ مشتاق و شکر کو کس نے قتل کیا تھا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

”ہاں۔ ہم خواہ مخواہ انہیں میں پرے ہوئے تھے۔ قاتل خود ہی چل کر ہمارے گھر آگیا ہے۔“ رحیم کل نے نوزی کی طرف دیکھا۔

”اور خودی رخصت بھی ہو جائے گا۔“ نوزی نے کہا اسے

بتائی ”میں تمہارے لئے ایک اور مصیبت لے آیا ہوں۔“ میرا ہواؤ کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں اس سے پہلے ہی اس کی بات میں کوئی غیب صورت خندہ پیش کر چکا تھا اور اب اس کے ذہن ایک حسین خندہ لے کر آیا تھا۔ میں اسے ذرا چڑانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔

”یہ بڑا گڑبگڑ کے سارے بیٹھا تھا اور ایک تک نوزی کو رہا تھا۔ اسے گویا اپنی آنکھوں پر پتھر نہیں آ رہا تھا۔ نوزی نے اس کے پیٹ کے قریب کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ میں نے اس کا حکم ہی قبول کیا۔ نوزی اندر آچکا تھا لیکن اس کا ساتھی بازو پر ہی جم کر کھڑا ہو گیا تھا اور مطلب انداز میں دوسرے کچا تھا۔ شاید اسے انتظار تھا کہ اپارٹمنٹ میں کوئی اور ہونوہ بھی سامنے آجائے۔

”تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا نوزی۔“ رحیم کل ٹھہرے دیکھے میں بولا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اس صورت میں بھی خوف زدہ یا پریشان نہیں تھا۔

”نہیں مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہوتا ہے، میں ان کی خدمت در پہنچ جاتا ہوں۔“ نوزی نے گردن کو خم دیتے ہوئے بڑی آہستہ کہا ”بڑی خوشی کی بات ہے کہ میری شہرت تم جیسے لوگوں تک بھی پہنچ گئی ہے اور وہ بھی مجھے صورت دیکھتے ہی لگے ہیں۔“

## اسلم راہی ایم اے کے ولولہ انگیز تاریخی ناول

|       |                  |       |                 |
|-------|------------------|-------|-----------------|
| ۱۵۰/- | سنہری غول        | ۲۰۰/- | نہروں کے ساربان |
| ۱۵۰/- | صلیب و حرم       | ۲۵۰/- | نادیک رزم گاہ   |
| ۱۵۰/- | نیشاپور کا شاہین | ۱۵۰/- | مقلیہ کا مجاہد  |
| ۱۵۰/- | بابل کا بت شکن   | ۱۵۰/- | نقاب            |
| ۱۴۵/- | طلسم کردہ        | ۱۵۰/- | محراں آگ        |
| ۱۵۰/- | تم تشکر نشان     | ۱۵۰/- | نہروں کے مسلم   |
| ۲۰۰/- | آخری حصار        | ۱۴۵/- | ریت کے مسافر    |
| ۱۵۰/- | بنت نیل          | ۱۵۰/- | رب کا ابلیس     |

کتبہ القریش اُندو بازار لاہور فون: ۴۲۲۴۶۶۵

ساقی کے ہمراہ دھننا، گھنٹیں لہراتا داخل ہوا اور اسی طرز پر چلا جائے۔

”تو بھر تیار کیا پر درگم ہے؟ اس زخمی باز اور غالی پانی کے ساتھ ہمیں روکو گے؟ افضل چوہدری پر زیادہ کچھ مت کہو بھی غالی ہاتھ ہے اور انسان کو بہت جلدی جلدی بیوی بچے کے مواقع میسر نہیں آتے۔“ وہ بے فکر بہت پر سکون اور سہ زل آوی تھا لیکن اب کچھ مضطرب ہونے لگا تھا۔ اس کے بڑے بڑے عضلات ہلچلے گئے تھے اور اس نے اپنا وزن بھی ایک اور کمر دوسرے پاؤں پر منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ میرے لئے ایک خوش آئند علامت تھی۔

اس کا ساقی تو ویسے ہی ہے جیسا میں نے دیکھا تھا۔ وہ گردن ٹھاکرے میں جمائیتے ہوئے تھیلے میں فوڑی سے مخاطب ہوا ”فوڑی! تم نے کیا لہجے پر چڑے مذاکرات شروع کر دیے۔ گولہ مارا قصہ ختم کرو۔ میرے ہم خودی دھوئے لیں گے۔ جیسی کہیں ہو گے۔“

فوڑی نے ہم پر سے نظر مٹانے کا فغورسل نہیں کیا اور نہ اس وقت وہ اسے غور کیا۔ وہ مخصوص انداز میں کھٹک کر رہا کھٹکائے کے اس انداز میں متنبہ ہو شیدہ محبت تو بھلا۔ سیدھے ہو کر دوبارہ پوزیشن سنبھال لے۔

فوڑی، رحیم گل سے مخاطب ہوا ”تم نے دیکھ لیا یا سارا کتا بے چین ہے۔ میرے پاس بھی اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے میرے خوالے کرو۔ میرے بے فکر بہت جیسی ہے لیکن اتنے جیسی نہیں کہ ان کے لئے جان دے دی جائے۔“ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ رحیم گل کو غور سے دیکھا ”میریوں کے لئے بھلا کیا جان رہا۔ مجھے اگر جان دینی ہے؟ اصولوں کے لئے دوں گا۔ میرے اگر میرے پاس سوچو ہوئے تو ضرور تمہاری خدمت میں پیش کر دیتا۔ بشرطیکہ وہ غار ہوتے۔ لیکن اس کے بعد بھی میں تمہیں جانے کی اجازت دے سکتا تھا کیونکہ تم ایک مفور غم ہو۔ سیکڑوں سیکڑوں ڈراؤ پولیس کو مطلوب ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم میرے سامنے آؤ میں تمہیں روکنے کی کوشش نہ کروں۔ میرا ایک پولیس سپر اور پولیس آفیسر ہر وقت ڈوٹی پر ہوتا ہے۔“

فوڑی نے لپکا سا قہقہہ لگایا۔ لگتا تھا کہ وہ رحیم گل کی بات بہت محفوظ ہوا تھا مجھ کو رحم آئیر سے انداز میں بولا ”میں تم سرکاری لوگ صرف اخباری بیانات وغیرہ میں ایسا مزاح کرتے ہو لیکن آج چا چلا کہ دو دو بھی ایسا باتیں کر موجود ہیں۔ اخباروں میں اس قسم کے بیان بھی شہرندوں کو گڑبڑ کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ دہشت خون ریزی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ دھمک دھمک کر پوچھ چکے ہیں کہ کیا یہ لوگ اس قسم کے کام سرکارت

اطمینان دلایا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ انجان بننے ہوئے مصیبت سے بولا ”ویسے، ہائی واکس۔ یہ مشتاق بڑوں ہے؟ ضروری نہیں ہوتا کہ ہمیں اپنے ہاتھوں ہلاک ہونے والے ہر شخص کا نام معلوم ہو۔“

”وہ دور مارا نقل کہاں ہے جس سے تم نے مشتاق بڑوں کو شرت کیا تھا؟“ رحیم گل نے اس کا سوال ان منہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سوال تم نہیں۔ میں کروں گا۔“ ”فوڑی نے اگلی سے باری باری ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا ”میریوں کا ایک تم دونوں میں سے کس کے پاس ہے؟“

”میرے خدا! یہ میرے کتنے لوگوں کی جان لیں گے! بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”بھئی چپڑیں جب تک اصل مالک کے پاس نہ پہنچیں، جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔“ ”فوڑی اطمینان سے بولا۔

”اصل مالک تو مرچکا ہے بلکہ اسے بھی اصل مالک کہنا درست نہیں۔ اصل مالک تو دنیا کے نہ جانے کن کن کوئے کھدروں میں بیٹھے اپنے نقصان پر کھپ افسوس مل رہے ہوں گے۔“ ”میں نے کہا۔

فوڑی نے مجھے گھورا ”مگر جس نظر سے آگاہ ہو ہی چکے ہو تب بھی زیادہ بھڑا بننے کی کوشش مت کرو۔ اصل مالک قاسم علی ہی تھا۔ اور اس کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کا کامداری نظام کام کر رہا ہے۔ جو چیز اس کی ملکیت ہے۔ وہ اس کے حساب میں جمع ہوتی جائے۔“

میں کمری سانس لے کر رہ گیا۔ میروں کی اس سبکدوشی میں فوڑی کا کردار میرے اندازے کے عین مطابق ہی نکلا تھا۔ رحیم گل کا یہ اندازہ بھی یقیناً درست تھا کہ مشتاق بڑوں کو فوڑی نے ہی قتل کیا تھا اور ہمیں اس وقت شاید اس نے اس لئے گولی نہیں ماری تھی کہ وہ یہاں اطمینان سے ہم سے مذاکرات کرے کہ میرے حاصل کرنا چاہتا تھا جن کے لئے ہماری خون ریزی ہو رہی تھی۔ اگر اسے ہم سے میرے مل جاتے تب بھی شاید وہ ہمیں گولی مارنے ہی کی کوشش کرتا۔ ایک پولیس آفیسر اور ایک بڑے پرنسپل میں کو ہلاک کرنا بھی اس کے لئے یقیناً کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ وہ اونچے درجے کا بد معاش تھا۔

ایک لمحے کے انتظار کے بعد وہ قدرے مضطربانہ انداز میں گن کو حرکت دیتے ہوئے بولا ”میرے تم دونوں میں سے جس کے پاس ہیں۔ میرے خوالے کرو تاکہ میں پر سکون اور شرفانہ انداز میں واپس چلا جاؤں۔ میرے تم دونوں میں سے کوئی بھی ہتھم نہیں کر سکتا اور نہ ہی تم ان کی بندر باند کر سکتے ہو۔“

”میرے ہتھم کرنے کا تو ہمیں قطعاً کوئی شوق نہیں۔“ رحیم گل بولا ”لیکن یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ تم جیسا قاتل‘ اشاریہ مجرم اور دہشت گرد مجھے جیسے پولیس آفیسر کے گھر میں اپنے

سائل۔

”تمہاری کالی بیٹیوں کے سر پر تو ہمارا سارا نظام چل رہا ہے، ہمارے لئے وہ سفید بیٹیس ہیں۔ ہم ان کی بڑی قدر کرتے ہیں۔“ نوزی بولا۔ ”میرے جہاں کہیں بھی ہیں، مجھے ابھی اور اسی وقت یہاں چاہئیں۔“

”ورنہ؟“ رحیم گل نے جانتا جا۔

”ورنہ مجھے یہاں بھی دولا شیں چھوڑ کر جانا پڑیں گی۔“ نوزی نے بلا تامل جواب دیا ”مجھے تو شاید اس کا حقوار امت افسوس بھی ہو لیکن وہ جو باہر میرا دوست کھڑا ہے اسے تو انسان کے مارنے کا اتنا بھی افسوس نہیں ہو تا جتنا کسی کو کبھی مارنے کا ہو سکتا ہے۔“

”اگر میرے قصیں مل جاتے ہیں تب بھی۔ اور اگر نہیں ملتے تب بھی۔“ جیسے ہم دونوں کو مارنے سے کیا حاصل ہو گا؟“ رحیم گل نے پوچھا۔

”ہم اتنی بار کیوں میں نہیں جاتے۔ ہم نے اپنی شرافت کے ساتھ تم سے بات چیت میں اتنا وقت ضائع کیا ہے اس کے بعد بھی میرے ہمیں نہ ملیں تو کم از کم اتنا تو ہمارا حق بنتا ہے کہ جھٹلاہٹ میں تمہارے جسموں میں چند گولیاں آتا رہیں۔“ پھر اچانک ہی نوزی میری طرف متوجہ ہوا ”میرا خیال ہے میرے تمہارے قبضے میں ہیں۔ مجھے لگتا ہے تم دونوں میں کچھ کچھ جوڑ سا ہو گیا ہے۔ تم نے اپنی اپنی حیثیت سے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کا کوئی لہجہ پروگرام بنایا ہو گا۔“

میں فحس دیا جس پر وہ کچھ چرما گیا۔ مجھے گھورتے ہوئے بولا ”میرے دوستانہ رویے سے شاید تمہیں کوئی خوش فہمی ہو گئی ہے۔“

”میرے لئے تمہاری بات مذاق سے کم نہیں۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”کاش میرے میرے پاس ہوتے۔ میں کب کا انہیں تمہارے خوف سے کرچکا ہوتا۔ میں کوڑوڑھ کوڑکی چنے کے لئے باقی نہیں دے سکتا۔“

”باہر کڑے نوجوان نے ایک بار پھر کمرے میں جھانکا۔ اس کے مہر کا تاج نہ لبر ہو چکا تھا بلکہ شاید جھگ ہی دا تھا۔ اس نے گمن کا رخ بھی اندر کی طرف کر لیا تھا۔ وہ انتہائی ناگوار سی نوزی سے مخاطب ہوا ”نوزی! تم نے تو اس کام کو بھی سیاسی فداکرات بنادیا ہے۔ قصہ ختم کرو بھی۔ یہاں خدو می اٹھیں سے کھی لکھا دکھائی نہیں دیتا۔ تم ان کا پتا تو صاف کرو۔ میرے بعد میں ہمیں ملے ہوں گے تو مل جائیں گے ورنہ وہ ہاتھ سے تو جاسی چکے ہیں۔“

”لیکن اس سوال کا آج تک کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ اگر ان بیانات سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آئندہ شہریندوں نہ کروں اور دیگر مجرموں و فیسروں کی سرگرمیوں سے روکنے و ختم کرنے کی بات ہے تو یہ بھی گویا یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ اس پہلے ایسی کوششیں نہیں ہو رہی تھیں۔“

نوزی نے زیادہ محاش نہیں تھا۔ بات کرنا بھی جانتا تھا۔ استہزائیہ میں میرا بولا ”اس کے علاوہ آہنی ہاتھوں سے منٹنے کی باتیں بھی جانی ہیں۔ تم لوگوں کے ہاتھ صرف ان بے بس اور مجبور لوگوں کے آہنی ہوتے ہیں جو تمہارے قابو میں آئے ہوتے ہیں۔“

رحیم گل کچھ نہ بولا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نوزی بولا ”ایسی ہی بات تم نے بھی کی ہے کہ تم مجھے جانے کی اجازت دے کر گویا تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے اجازت لے کر آیا ہوں۔ تم سے اجازت لئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ یہاں ہاتھ دکر تمہارے سامنے کھڑا رہوں گا؟“

رحیم گل اب بھی خاموش رہا۔ نوزی اس کے ذہنی بازو کی اشارہ کرتے ہوئے بولا ”خدا کے لئے مجھے اس آہنی ہاتھ روکنے کی کوشش مت کرنا۔ لاؤ۔ اب میرے نکال دو۔ میں نے لینے کیا ہوں اور لئے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

اس نے اپنا خالی ہاتھ یوں پھیلا دیا۔ جیسے اسے توقع تھی کہ اگلے میرے اپنے گانے کے نیچے رکھے بیٹھا تھا اور اس کی ٹانہ فوراً نکال کر اسے دے سکتا تھا۔

”میرے میرے پاس تو نہیں ہیں۔ وہ تو سرکاری مال خانے میں دپکے ہیں۔“ رحیم گل ملا تکت سے بولا۔

نوزی استہزائیہ انداز میں ہنسا ”مجھے لطیفوں سے بھلانے کی ٹل مت کرو۔ اس طرح کے پولیس افسروں کا ذکر اب صرف انہی ملتا ہے جو کوڑوڑھ کوڑکے میرے پاس اس طرح کی کوئی ڈال خانے میں جمع کر سکتے تھے۔“

”تم مجھے لوگوں کا کام سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ ان کا تمام نقد و مال پر سے ایمان اٹھ چکا ہوتا ہے۔“ رحیم گل غصہ منی دے کر بولا ”کاش میں تمہیں یقین دلا سکتا کہ دنیا میں اچھے مال کی تعداد کم ضرور ہوتی جا رہی ہے لیکن وہ ختم نہیں ہوئے۔ میرے مجھے میں شاید وائز اور لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک برابر ہو لیکن بہر حال وہ موجود ضرور ہیں۔ تمہیں ان کے وجود انکار نہیں کرنا چاہئے۔“

”بحث کو چھوڑ دو اور میرے نکالو۔“ نوزی کا لہجہ یکدم بدل گیا اور سامنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ مال خانے میں جمع لیں۔ اگر تم نے انہیں مال خانے میں جمع کر لیا ہوتا تو مجھے شک اس کی اطلاع ہو چکی ہوتی۔ کس قہانے میں کیا ہو رہا ہے؟“

”گتہ ہماری کالی بیٹیس۔“ رحیم گل نے ایک اور غصہ منی



سے جھانک رہا تھا۔

مجھے یہ تشویش بھی محسوس ہوئی کہ بیڑے گھرے میں اس نے کس اپنے زخمی بازو کو مزید نقصان تو نہیں پہنچایا تھا؟ پھر وہ کھڑکی سے دیکھنے لگا۔ وہاں اس کی تصدیق کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے اٹھتے اٹھتے نوزی کا مآذّر اُٹھایا تھا۔ میں دیوار کی آڑ میں رہ چکا ہوں۔ ٹھنڈوں کے بل نہایت محتاط انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے سے جھانکنے پر مجھے ایک عجیب سی منظر دکھائی دیا۔ نوزی کا سامنے ہال کے فرش پر چاروں خانے چت پڑا تھا جس کے جسم کو گویا نزع کے سے عالم میں جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کے سینے پر سیاہ رنگ کا ایک جسم کتا سوار تھا۔ اسے بھی کچھ جھٹکے لگ رہے تھے لیکن نوجوان کی گردن، سر ہال اس کے جھڑوں میں تھی۔

میں جہاں تھا وہاں سے نوجوان کی گردن کچھ طور پر نہیں دکھ سکا تھا۔ ہال کا منظر سر ہال کی تاربا تھا کہ اب وہاں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نوزی کیس نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں احتیاطاً چند لمحے دیوار کی اوٹ میں کمرے میں ہی رہا۔ مآذّر نوزی اس اپارٹمنٹ کے کسی دوسرے کمرے یا کچن میں پھنس گیا اور اس کے پاس کوئی اور ہتھیار موجود ہو۔

ایسی دوران رجیم کل بھی اُنہ کر میرے قریب آ گیا۔ وہ زخمی بازو کو کچھ اس طرح موڑے ہوئے تھا جیسے عملاً لوگ چلا چڑھانے کے بعد جھولے میں لٹکانے رکھتے ہیں۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے سرکوشی میں پوچھا "متم نے۔"

زخمی بازو کو مزید نقصان تو نہیں پہنچایا؟

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے بازو کو چھانے اور دروازے کی طرف سے اسباب ہو گیا ہوں۔"

"سہارک ہو۔" میں نے کہا۔ وہ بھی میرے قریب آ کر مجھے کے بل جھک کر ہال میں جھانکنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے۔ ایک لمحے کے لئے تو میں لگا کہ اسے کوئی خوشی ملی تھی مگر دوسرے ہی لمحے گویا کسی نے اس کے

میں خنجر گھونپ دیا۔

وہ گویا سب کچھ بھول گیا۔ اسے کسی خطرے کی پروا نہ تھی۔ اس نے اپنے صبح بازو کی کھٹی سے مجھے ٹوکا۔ وہ مجھے باہر اشارہ کر رہا تھا۔ میں مآذّر سنبھالے ٹھنڈوں ہی کے بل کمرے نکلا۔ کسی دروازے کی طرف سے گولی نہیں آئی۔ کوئی دھماکا نہیں پڑا۔

مآذّر اور نوجوان دونوں ہی کے جھولوں کو نزع کے سے جھٹکے لگا بند ہو چکے تھے۔ نوجوان بھی ساکت پڑا تھا اور وہاں کے سینے پر دھلے دھالے انداز میں سوار تھا لیکن اس کی ہاتھیں فرش پر پھسل آئی تھیں۔

ہوا تھا جیسے جھپٹک آنے کی وجہ سے اس کے بازو میں شدید تکلیف ہوئی تھی۔

اسی لمحے کمرے سے باہر ہال میں کسی گھٹنے کے بھونکنے کی خوف ناک آواز گونجی اور میں نے نوزی کے سامنے نوجوان کو بڑی طرح ٹوکرا کر دروازے کے سامنے ڈبیر ہوتے دیکھا۔ مجھے ایک بڑے سے سیاہ گھٹنے کی بھی جھٹک نظر آئی جس نے اس پر چلا گیا تھا لیکن میں نے اس طرف مزید توجہ نہیں دی کیونکہ ایک لمحے کے لئے نوزی جیسے گھاگ آدی کی توجہ بھی ہم پر سے ہٹ گئی تھی۔ ایسے ہی لمحے فیصلہ کن ہوا کرتے ہیں۔

میں نوزی کی طور پر قائلین پر گھر پڑا۔ میرے اور نوزی کے درمیان آخر دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے اس پر چلا گیا۔ لگائے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس کی توجہ غالباً صرف ایک لمحے کے لئے ہی تھی۔ میرے چلا لگ لگائے تک وہ دربان سی طرف متوجہ ہوئے ہوئے فائر کر سکتا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں گر کر لڑھکتے ہوئے اور اس کے متوقع فائر سے بچتے ہوئے اس کی ہاتھوں سے ٹکرا کر اسے گراؤں گا اور اسے قابو میں کرنے کی کوشش کروں گا مگر اس ایک لمحے کی سہمت سے مجھ سے زیادہ رجیم کل نے فائدہ اُٹھایا۔ اس کا ہاتھ بجلی کی تیزی سے گاڑنے کے نیچے گیا۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا ریموڈر گاڑنے کے نیچے تھا۔

تقریباً ایک ساتھ کمرے میں اور باہر ہال میں فائر کی آواز گونجی۔ باہر تو بے درپے تین فائر ہوئے لیکن اندر کمرے میں ایک ہی فائر ہوا اور میں گر کر ایک لمحے میں لڑھک کر وہاں تک پہنچ گیا تھا جہاں نوزی کھڑا تھا لیکن نوزی وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

میں نے لڑھکتے وقت کمرے سے ایک بجلا سا باہر جاتے تو دیکھا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ نوزی ہو سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرا ہاتھ دھات کی کسی چیز سے ٹکرایا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ نوزی کیوں گولے کی طرح فرار ہوا تھا۔ وہ اس کا مآذّر قہار قائلین پر پڑا تھا پھر جھٹ پر مجھے خون کا بڑا سا دھبہ بھی نظر آیا۔

رجیم کل کی چلائی ہوئی گولی غالباً نوزی کے ہاتھ یا بازو پر لگی تھی۔ مآذّر اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ بھی یقیناً پلک جھپکتے میں فیصلہ کرنے والا آدی تھا۔ ایک ٹانے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ باڑی پلٹ چکی تھی۔ اس نے کمرے میں وہ خطرہ مول نہیں لیا۔ حتیٰ کہ جھٹک کر مآذّر بھی اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

مکمل دروازے سے اب اس کا سامنے بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہال سے بڑی خوف ناک غرابٹ اور خرخراہٹ کی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے محتاط انداز میں اُٹھتے اُٹھتے بیڑ کی طرف دیکھا۔ رجیم کل بیڑ پر نہیں تھا۔ وہ خود کو بیڑے سے نیچے گر چکا تھا اور اسی کی آڑ لے چکا تھا۔ اس کا ریموڈر بیڑ کی اوٹ

کر لیتا چاہئے تھا۔

”اب نوزی کو مزید باتوں میں لگائے رکھنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا ”گر یہ سنا اپنی جان پر کھیل کر نہ اخلت نہ کرنا تو ہمارے لئے ان سے نمٹنا بہت مشکل ہوتا۔ نوزی نہایت شاطر اور چھٹا ہوا بدمعاش لگا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لئے بھی اسے قابو میں کرنا کچھ آسان معلوم نہیں ہوتا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ مجھ سے ٹکرانے کے بعد بھی نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔“ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ نوزی کے نکل بھاگنے کے بعد بھی ہم نے ازراہ احتیاط کچھ دیر اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اتنا وقت اس کے غائب ہونے کے لئے کافی تھا۔

ایئر سٹ کا مین دروازہ بند تھا۔ رحیم کل نے مجھے اس کی طرف دیکھتے پایا تو گویا میری غلط فہمی دور کرتے ہوئے بولا ”وہ ادھر سے نہیں بھاگا ہے۔“

اس نے ہجک کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ فرش پر خون کی چند یونٹیں نظر آرہی تھیں جو ہجک کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ رحیم کل بولا ”وہ ہجک کے عقبی دروازے سے ایئر بٹنی یہ زخموں کے راستے بھاگا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے ایئر سٹ کے نقشے سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔“

”تم نے بازو زخمی ہونے کے باوجود خود کو بچاتے ہوئے“ ہجک جھپٹنے میں اس کے بازو والے ہاتھ کو نشانہ بنا کر بلاشبہ مہارت کا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔“ میں نے اسے داد دی۔

”میں جاہلوں تو خاموش رہ کر یہ داد دوں تحسین سمیٹ سکتا ہوں لیکن اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ میری سماعت پر تو وہ الفاظ بھی بوجھ بن جاتے ہیں جن کا میں مستحق نہیں ہوتا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے اس کے ہاتھ پر گولی نہیں ماری تھی۔ میں نے تو اپنی دانست میں اس کے پیٹ میں گولی ماری تھی۔ یہ حمل ایک عجیب و غریب اتفاق ہے کہ گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور بازو اس کے ہاتھ سے گر گیا ورنہ مجھے تو بازو سے زیادہ نوزی کو گرانے کی فکر تھی۔“ اس نے میری غلط فہمی دور کر دی۔

”خفیہ قدرت نے جو کیا بہتر کیا۔ اگر گولی اس کے پیٹ میں لگتی تب بھی شاید وہ گرتے گرتے ہم پر چند خانہ تو گری دیتا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن قرار تو نہ ہوتا۔“ رحیم کل نے لفظی سانس ل۔

”اگر ہم سب یک وقت ہی مر جاتے تو یہ کوئی خوب صورت پھوٹن نہ ہوتی۔“ میں نے کہا ”میرے حال اب تم موکل پولیس کو نوزی کے بارے میں اطلاع دے کر تو دیکھو۔ شاید وہ کسی کسی کے ہتھے چڑھ ہی جائے۔“

”یہ امید مت رکھو۔“ وہ مایوسی سے بولا ”نوزی جیسا آدمی

قویہ پنج کر میری سمجھ میں آیا کہ ماجرا کیا تھا۔ جسم اور سیاہ زلف ناک ہلاک نے کسی طرف سے اچانک ہی نکل کر نوجوان پر ہلاک لگائی تھی اور اس کی گردن دھججلی تھی۔ نوجوان نے کھابٹ میں تین گولیاں چلائی تھیں جن میں سے دو گتے کے جسم سے گزر گئی تھیں لیکن اس نے گردن نہیں چھوڑی تھی اور مرتے رہے بھی آدمی سے زیادہ گردن چپا ڈالی تھی۔ اب گردن اس کے زلف ناک اور خون آنسو جڑے سے نکل چکی تھی لیکن کئی پہلی گولی اور زخروں ایک بھیاں بکھڑ پیش کر رہا تھا۔ گردن سے ابھی ان سے رہا تھا اور گتے کے جسم سے بھی خون بہتا نہ نہیں ہوا تھا لیکن وہ دونوں بہر حال مر چکے تھے۔

میں اور رحیم کل چند لمحوں ساکت کھڑے انہیں دیکھتے رہے حتیٰ ان کے جسموں سے خون بہتا نہ ہو گیا۔ ان کے آس پاس خون لاکھ جڑ سا بن گیا تھا۔ گتے اور انسان کا خون ایک دوسرے میں لڈھو گیا تھا۔

رحیم کل آسف زوہ لہجے میں بولا ”یہ سنا اس قسم کے انسانوں سے بہتر تھا۔ مجھے اس کی موت کا بڑا افسوس رہے گا۔“

”کیا یہ تمہارا آقا تھا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ کسی اور کا کتا تو اس طرح اگر گتے میں نہیں کوہ سکتا۔“

”یہ اچانک کہاں سے آن پکا؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے چہرے سے ایک کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا ”اس کا کرا تھا۔ یہ نہایت چھپی اور تربیت یافتہ تھا۔ اسی قسم کا صورت حال میں کام آنے کے لئے رکھا گیا تھا۔“

میں نے قدرے بے چینی سے پوچھا ”جی دیر تک یہ چھپای

”میں نے کہا تھا کہ یہ ایک نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ کتا تھا۔ اس قسم کے معاملات میں تقریباً انسان جتنا ہی سمجھدار تھا۔ اس کی طبیعت کی طرح اس سے بھی اندازے کی کوئی غلطی ہو گئی ہوگی۔ شاید یہ ابھی نہ مرنا اور آئندہ بھی زندگی میں نہ جانے کون کون سا ناک موقعوں پر کام آئے۔ طاقت میں یہ تقریباً شیر کا مقابلہ کرنا اس کا لہجہ تھا تاہم اس کا اسے اپنے گتے کی موت کا واضح ہے۔“

”تم نے غالباً زبردستی جینک مارنے کے ساتھ کچھ عجیب سی شکل دیا تھا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں لیکن کاش میں نے شکل نہ دیا ہوتا۔ شاید وہ موقع اب نہیں تھا۔ مناسب موقع کے لئے مجھے کچھ دیر اور انتظار

لڑکی سے بھی ملنا چاہتا تھا جسے میں نے اپنے ہوٹل میں پناہ دی تھی۔  
میں اسے یہ خبر سنانا چاہتا تھا کہ اس کا اور اس کے متعلق میگزین  
”پراسرار برائیاں“ جو ہیرا کی فروخت میں انہیں استعمال کرتا تھا  
صرف بے نقاب ہو چکا تھا بلکہ اپنے انجام کو بھی پہنچ چکا تھا اس کا  
نام مشتاق بد شرف تھا۔

میں صبح کے اخبارات دیکھ چکا تھا۔ ابھی مشتاق کے قتل کی خبر  
اخبارات میں نہیں آئی تھی۔ میں ان سب کے بارے میں سوچ رہا  
تھا لیکن میرے ذہن کے کسی تارک کوئی بھی در حقیقت کی  
اور یہ بات چہرہ رہی تھی۔ ایک عجیب غلط سی ٹھیک سی ان کی  
نوعیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

کافی بڑے وقت مجھے اچانک ہی معلوم ہو گیا کہ وہ کیا خیال تھا  
مہم اور خیر باد واضح انداز میں میرے ذہن کے کسی گوشے میں رنگ  
رہا تھا۔ دراصل مجھے احساس ہو رہا تھا کہ نوڑی سیٹھ قاسم جی کا  
خاص آدمی تھا۔ قاسم جی کے زیر پر بھی اس کے پائے پائے  
امکان ہو سکتا تھا۔ زیر پر پر شفیع شاہ موجود تھا۔ مجھے اعتقاد  
نوڑی کا خلیہ وغیرہ بتا کر بدایت کو دلی چاہے تھی کہ اگر آپا کی  
محض نظر آئے تو اسے فوراً قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔

یہ خیال جو کئی ذہن میں واضح ہوا میں نے کافی پیچھے  
مواہل فون اٹھایا اور شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔ پہلے میں نے اس  
سے زیر پر کے تازہ ترین حالات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے

بتایا کہ قاسم جی کے بیٹے بیرون ملک سے آچکے تھے اور چڑچڑ  
ہی اپنے کل نما گھر میں تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے ملنے  
ملاقات کی تھی تاہم ان کی کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

دوسرے دو آدمیوں کے آدمی بھی اس گھر پر نظر کر کے  
تھے شفیع شاہ اور میرے دوسرے آدمی بھی ٹرائل پر چلے گئے  
اور بھی زیر پر پر آجاتے تھے۔ وہ گرد و پیش پر نظر کرتے  
وقت گزار رہے تھے لیکن کوئی خاص بات ان کے علم میں  
آچکی تھی۔

مجھے اتنی جلدی کوئی کام کی بات معلوم ہونے کی توقع بھی  
تھی اس لئے میں نے کہا ”تم دو چار دن اور وہاں گزار کر آؤ۔ اگر  
دوران میں ڈاکٹر برنارڈ کی کہیں کوئی جھلک دکھائی نہ دی اور  
کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تو تم لوگ واپس آ جاؤ۔ وہاں  
وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اگر قسمت میں ہو تو شاید کہیں  
برنارڈ سے سامنا ہو جائے ورنہ مجھے راجہ کی بیگ لپٹا  
صورت پر صبر کرنا پڑے گا۔“

”آپ جب نہیں گے میں واپس آ جاؤں گا سر“

”یہاں اس وقت میں نے ایک اور کام کے سلسلے میں  
فون کیا ہے“ میں نے کہا اور نوڑی کا خلیہ خاص  
ڈیرا ”یہ قاسم جی کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے۔“

فرار ہونے ہوئے ہماری محنتی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے۔ یہ کچھ  
شیخ چیلانہ سی سوتا ہے۔ محض رسی کارروائی کرنے کا کیا نفع؟  
اس نے میرے مشورے کو اہمیت نہیں دی تاہم اپنے قاتلے فون  
کے بانی کارروائیوں کے لئے آدمی طلب کرنے لگا۔

ایک بار پھر مجھے اس کے ساتھ کافی دیر تک رہنا پڑا۔ حتیٰ کہ  
اس کے پاس سے انسان اور کتے کی لاش اٹھائی گئی۔ ضابطے کی  
کارروائی ختم ہو گئی۔ رستمیرا بیان وغیرہ بھی ہو گیا تب میں نے اس  
سے اجازت چاہی۔ اس نے دروازے پر دو پولیس والے بٹھائے  
تھے۔

”اگر نوڑی لوٹ آیا تو کیا تمہارے یہ پولیس والے اسے  
روک لیں گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔  
”مضمینہ تو ہے۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”ورنہ مجھے ہی کچھ  
کرنا پڑے گا۔ کاش میرا بازو دشمن نہ ہوتا۔“

”مجھے یوں لگتا ہے کہ تمہیں اپنے فرائض کی ادائیگی کے  
سلسلے میں کافی مار کھائی پڑتی ہے۔ تم جیسے دیانت دار اور مخلص  
پولیس آفسر کا یہ مشر ہوتے دیکھنا خاصا صبر تباہ لگتا ہے۔“ میں  
نے کہا۔ مجھے یاد تھا کہ ایک مرتبہ دربان گھر کے قریب بھی میں نے  
اسے جوہر سے قریب المرگ حالت میں نکالا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس  
وقت اس کا یہ مشر کیا تھا۔

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ وہ مسکرایا  
”پولیس کی نوکری قبول کرتے وقت ان باتوں کے لئے تو تیار رہنا  
چاہئے۔ یہاں مار کھاؤں گا تو شاید اوپر والے کی مار سے بچ  
جاؤں۔“ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ایک لمحے کے وقف سے وہ بولا ”عجیب بات یہ ہے کہ میرا  
مشر خواہ کچھ بھی ہو لیکن انجام کار مجھے ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔  
جراثیم پیشہ لوگ خواہ فون کی شکل میں ہوں مجھ اکیلے سے دل ہی  
دل میں ڈرتے ہیں اور آخر کار وہ میرے ہاتھوں مرتے ہیں۔۔۔  
پکڑے جاتے ہیں یا کسی اور طرح ایسے انجام کو پہنچتے ہیں جس کے  
وہ سستی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی عجیب  
طاقت میری مدد کرتی ہے۔“

”یقیناً کرتی ہوگی۔ مسئلہ یہی ہے کہ لوگوں کا اس عجیب طاقت پر  
سے ایمان اٹھ گیا ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے اپارٹمنٹ سے  
کل آیا۔ لفٹ کے ذریعے نیچے آئے وقت بھی میں اس کے بارے  
میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس کے گلے میں آوے لوگ بھی اس جیسے  
ہوتے تو شاید ہماری سوسائٹی کا خلیہ اس بڑی طرح نہ بگڑا ہوتا۔  
ہوٹل پہنچ کر میں نے شاہد لیا اور کھانا کھاتے ہی سو گیا۔

دوسرے روز میں دن چڑھے سو کر اٹھا۔ تیار ہونے کے بعد میں نے  
کمرے ہی میں ناشتا طلب کیا۔ میرے ذہن میں ایسے لوگوں کی ایک  
لمبی فہرست کھلبلا رہی تھی جنہیں میں فون کرنا چاہتا تھا۔ ہر ایک سے  
کہہ کر کہہ کر بات کرنا ہوتا۔ اس کے علاوہ میں امیرنا ہی اس

کر رہا ہے۔ "شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"اسے فوراً مہاکش پر نوزی کا ٹکڑا تیار کروا کر کہہ دے یہ شخص اگر اس راستے سے آنا چاہتا نظر آئے تو اسے گھیرتا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا پھر پوچھا "تم خود اس وقت کہاں ہو؟"

"میں زرارہ پر واپس پہنچ چکا ہوں۔ ہم لوگ زرارہ کو ادھر ادھر لٹلا رہے ہیں۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ کچھ کے علاوہ چار ہیں۔"

"تم صرف کچھ کچھ کو اپنے ساتھ رکھو۔ باقی چاروں کو کسی خاص حکمت عملی کے ساتھ جزیرے پر پھیلا دو۔ اگر یہ شخص ابھی تک جزیرے پر ہی موجود ہوا تو شاید اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہ ہو۔ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"زیادہ بڑا تو نہیں۔ لیکن کافی گنجان آباد ہے اور یہاں ایک آدمہ تو کیا دس بیس افراد کے بیک وقت غائب ہونے کے لئے بھی کافی سارا گہرا داخل موجود ہے۔" شفیع شاہ بولا۔

"بہر حال۔۔۔ اس شخص سے تمہارا سامنا ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔ قسمت آزمائی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ شاید مل ہی جائے۔ اس ہوٹل کا جائزہ لینے اور تھوڑی بہت پوچھ گچھ کرنے کے لئے میں خود آ رہا ہوں۔"

"آپ اسے بہت اہمیت دے رہے ہیں سراسیمہ یہ واقعی ایک اہم ہے؟" شفیع شاہ نے غماص لہجے میں دریافت کیا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔" میں نے کہا "کئی احوال تو مجھے صرف اس لئے اہم لگ رہا ہے کہ جن مرتبہ مجھے اور ایک طانت دار پولیس آفیسر کو رک بچا کر صاف بچ کر نکل گیا ہے اور اس سے پہلے بھی بچا سون سٹھین جرائم قتل اور خون ریزی کا مرتکب ہونے کے باوجود زندہ بچ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے سراسیمہ اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" بعد خان کے ہوٹل اگر آپ خود آ رہے ہیں تو ایک بات اور آپ کو بتا دوں۔ اس عوامی دستوران میں سافٹی سی ایک عورت چولی اور لنگا پہنے اور اوپر پھرتی رہتی ہے، کبھی کبھی میں پہلی جاتی ہے۔ کبھی کاؤنٹر والے کے پاس بھی جا بیٹھتی ہے اور اگر کوئی وغیرہ اور دوسرا ہو جائے تو گاؤں کی میز پر کھانا پانی وغیرہ بھی لا کر رکھ دیتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ عورت کون ہے لیکن میرا خیال ہے اس کے اور نوزی کے درمیان کوئی شناسائی موجود ہے۔ ان کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے تھے۔"

"یہ تو اچھی بات بتائی تم نے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں وہاں پہنچ رہا ہوں تم بھی حرکت میں آ جاؤ۔"

چند لمبے بعد میں جزیرے کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ جزیرے کی حدود جہاں سے شروع ہوئی تھی وہاں سڑک انگریزی کے حرف "سی" کی شکل میں خم کھاتی تھی۔ اس موڑ پر ایک آرائشی کیت سائینا

فلرناک بد معاش اور دہشت گرد ہے۔ دو مرتبہ مجھ سے ٹکرا کر بچ کر نکل گیا ہے۔ میں نے سوچا احتیاطاً تمہیں مطلع کر دوں۔ اگر یہ چیزے پر تمہیں نظر آئے تو قایم رہیں کہنے کی کوشش نہ کرو۔ ہاتھ سے نظر نہ آئے تو کوئی بھی مار سکتے ہو۔ تاہم اس کے سامنے بہت محتاط رہنا۔ ذرا سی غلطی خود تمہارے لئے بھی ملک ثابت ہو سکتی ہے۔ فی الحال شاید اس کا دایاں ہاتھ زخمی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کچھ کم فلرناک ثابت ہو۔"

"دوسری طرف سے شفیع شاہ کچھ نہ بولا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "گیمیا بات ہے تم چپ کیوں ہو گئے؟ کیا یہ نام نہیں کچھ شناسا لگ رہا ہے؟"

"جی نہیں" وہ گویا کچھ چرکتے ہوئے بولا "میں تو قسمت کی ستم گردی پر غور کر رہا ہوں۔ کاش آپ نے مجھے آدھا گھٹنے پہلے فون کیا ہوتا۔"

"کیوں۔۔۔ آدھا گھٹنا پہلے کیا تھا؟" میں نے ذرا چرکتے ہوئے پوچھا۔

"آدھا گھٹنا پہلے یہ شخص میرے سامنے بیٹھا تھا۔ کھانا اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ شاید اس لئے بھی مجھے یاد رہ گیا۔" وہ تاسف سے بولا۔

"تمہارے سامنے۔۔۔؟" میں چرکتا۔

"سرا یہاں جزیرے پر بعد خان کا ہوٹل ہے۔ یہ تین چار منزلہ مکان سا ہے جس کے اوپر کے کمرے ہوٹل کی طرح کرائے پر لگائے جاتے ہیں اور پورے گراؤنڈ فلور پر عوامی انداز کا دستوران ہے۔ بڑی مشہور جگہ ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے بازار سے گزرتے وقت یہ ہوٹل دیکھا تھا۔" مجھے یاد آیا۔

"راج مینج ٹانٹا ہم وہاں کر رہے تھے۔ یہ شخص عین میرے سامنے والی بیچ بیٹھا تھا۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"پھر کہاں گیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا "قاسم بجلی کے مکان میں تو نہیں گیا؟"

"میں سرا قاسم بجلی کا مکان تو اس ہوٹل سے بھی نظر آتا ہے۔ میں نے اسے اور حیران نہیں دیکھا۔ وہ ایک پرائیویٹ جیب میں تھا۔ اسی میں بیٹھ کر دوسری طرف گیا تھا۔ میری نظر میں وہ شخص کھانا کھا تھا۔ میری جھپٹی جس کمرے میں تھی کہ وہ کوئی بد معاش تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہمیں بھی مطلوب ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی۔"

"تو۔۔۔؟" اس اطلاع سے مجھے واقعی افسوس ہوا تھا "یہ شخص بھی قسمت کا مدمن معلوم ہوتا ہے۔ اب تو معلوم نہیں کہاں کھانا کھا ہوگا۔ جزیرے سے شہر آنے کے لئے ٹنگی کا تو ایک ہی راستہ ہے۔ تم نے اس پر اپنا کوئی آدمی بھیج رکھا ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں ہمارا ایک آدمی شروع ہی سے اس سڑک کی نگرانی

اس کی عمر چالیس سے کم نہیں تھی لیکن خذ و خال میں اس پر کشش تھی وہ شاید جوانی میں نہ رہی ہو۔ وہ بہت معمولی سے ٹیبل میں تھی اور معمولی سے کام انجام دے رہی تھی لیکن معمولی عورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی چال ڈھال اور حرکات و سکنات کا کلیہ دیدہ تھیں۔ ہماری نظروں میں بعض نامعلوم قبیلوں کی لڑکیوں کا کچھ ایسی طرح کے خلیوں میں دکھایا جاتا ہے۔ اس کے بیروں میں چاندی کی پازیب بھی تھی جس کی چمن چمن میں ایک خاص طرح کا تھا۔ اس کی چال کے ساتھ یہ دھن ہم آہنگ تھی شاید اس ڈھول کے ذریعہ وہ وہاں موجود لوگوں کے دل و فحل چھل کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو رہا تھا۔

شاید وہ وہاں کے ماحول کا ایک حصہ تھی اور دستور ان میں مستقل آنے جانے والے اس کی موجودگی کے عادی ہو چکے تھے۔ شاید وہ کسی خاص ہی موقع پر کسی خاص ہی درجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے لیکن وہ عورت مجھ پر نظر پڑنے ہی میری طرف پوری طرح متوجہ ہو چکی تھی۔

شاید اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں وہاں کے ماحول میں الگ ہی نظر آ رہا تھا۔ میں جلدی میں کوئی ایسا بندہ دیکھ کر نہیں آتا تھا کہ اس ماحول میں مکمل جا جائے۔ مجھے اس میں کوئی دقت نہیں آتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت میں نہیں سوٹ رہا تھا۔ اتنی بھی نگار تھی تھی اور سینہ رمضان کی پرائی گاڑی میں بیٹھنے چھوڑ دی تھی۔ میں اس وقت اپنی سرسبز رہیں آیا تھا۔

عورت بیٹھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے میرے لئے یہ جاننا مشکل نہیں رہا تھا کہ وہ کس قبیلہ کی عورت تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نوڑی سے اس کی پٹلی سے ٹٹا سائی ہونا ضروری نہیں تھا۔ شفیع شاہ نے مجھے رپورٹ دی تھی کہ نوڑی اور اس عورت کے درمیان آنکھوں آنکھوں میں کچھ بات ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ عین پہلی بار آنکھیں چار ہوئے پر ان کے درمیان آنکھوں آنکھوں میں بات شروع ہوئی ہو۔

عورت کاؤنٹر پر جا بیٹھی تھی۔ کاؤنٹر کے عقب میں محو موٹھیوں والا ایک نوجوان موجود تھا۔ اس کے سر پہ سیاہ کپڑا تھی۔ وہ کاؤنٹر سنبھالے ہوئے تھا اور عورت کی طرف کھنکھاتا نہیں تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کس زمانے عورت کے قریب جاؤں اور کس انداز میں اس سے بات شروع کروں کہ وہ مجھے نوڑی کا دھڑ نہیں دوست سمجھے اور مجھے اس کے بارے میں کوئی کام کی بات بتا دے۔ میری مشکل عورت نے ہی حل کر دی۔ مجھے کوئی زبان تراشنا نہیں پڑا۔ کچھ دیر بعد عورت کو بال بال دل میں کس فیصلے کا پتہ چلی اور اٹھ کر خود ہی میری میز کی طرف آنے لگی۔ میں بظاہر ارجحان بنا کر سر جھکا کر شخص دکھانے کے لئے

ہوا تھا اور سرگرمی کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ یہ ایک بار دہائی کی جگہ تھی۔

یہاں پھولوں کی ایک دکان پر مجھے اپنا آدمی کھڑا نظر آیا۔ وہ تمام سواروں اور آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے بھی دیکھ لیا بظاہر انجان ہی بنا رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس راستے کی گمرانی ہو رہی تھی۔ اس سرگرمی پر نریٹک میں گدھا گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ میں اسی سے رفتار نریٹک میں شامل ہو کر جمعہ خان کے ہوٹل جا پہنچا۔ دینے تو میں اس ہوٹل کے سامنے سے پہلے بھی گزر چکا تھا لیکن توجہ نہیں دی تھی۔ اب میں نے ایک نئے زاویہ نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

شاید یہ جزیرے کی سب سے بار دہائی جگہ تھی۔ گراؤنڈ طور پر پھیلا ہوا عوامی سارے دستور ان پٹینٹ کافی چٹا تھا۔ چولہوں پر بڑے بڑے دیگچوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ اصل عمارت کے سامنے بھی انہوں نے کافی رقبہ گھیرا ہوا تھا۔ یہاں سے ساحل بھی نظر آتا تھا۔ پہلے میں دستور ان کا جائزہ لیتے ہوئے وہاں سے گزرتا چلا گیا۔ مجھے اس عورت کی بھی جھلک نظر آئی جس کا شفیع شاہ نے ذکر کیا تھا۔ وہ بڑا سا ایک دیگچا اٹھائے مجھے دستور ان کے عقبی حصے میں ایک طرف کو باقی نظر آئی۔

میں نے ساحل کا اور قاسم بھٹی کے گھر کا ایک پکر لگایا۔ اپنا گزارہ بھی مجھے سپنڈر میں "ٹھٹھا" نظر آیا۔ میں ممکن تھا کہ شفیع شاہ اس کے کسی حصے سے دوڑیں سے مجھے بھی دیکھ رہا ہو۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کچھ اور لوگ بھی مختلف مقامات سے بظاہر غیر محسوس سے انداز میں اس محل نما مکان کی گمرانی کر رہے تھے۔

میں واپس جمعہ خان کے ہوٹل آ گیا اور گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے اندر ایک کونے میں چھوٹی سی گندی میز پر جا بیٹھا۔ ایک پیڑے کے کندھے پر سے نہایت گندہ لپٹا آئنا کر مستعدی سے بیڑ صاف کی۔ کم از کم اپنی دانست میں تو اس نے صاف ہی کی تھی لیکن طبعی اصولوں کے مطابق شاید مزید گندی کر دی تھی کیونکہ وہ کپڑا اس کپڑے سے بھی زیادہ گندہ تھا جس سے نچلے درجے کے گھروں میں پوچھا جاتا ہے پھر اس نے نمک سے میرے سامنے المونیم کا بگ اور گلاس لا کر رکھا۔ بگ سے پانی چھٹک پڑا۔

"کیا کھائے گا صاحب؟" اس نے ایک ادائے خاص سے گردن تڑپھی کر کے پوچھا۔ مجھے کسی چیز کی طلب نہیں تھی لیکن انی وہاں موجودگی کو باہر ازیانے کے لئے مجھے ہانسنے کا آرزو نہ پڑا کہ کوکے ہانسنے کا وقت گزر چکا تھا۔

جلد ہی مجھے وہ عورت بھی نظر آئی جس کی کچھ دیر پہلے میں نے صرف جھلک دیکھی تھی۔ اب وہ چھوٹا سا ایک کنٹر اٹھائے ایک پچیل کوٹھری سے نکل کر کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ وہ تو اچھی خاص پچیل پچیل ہی عورت تھی۔

”میں ظلم و انکساف نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن تو سے دوستی ہو گئی تو شاید تمہاری خاطر میں جاؤں۔“  
اس بات پر خوش ہونے کے بجائے وہ کچھ متحید ہو گئی اور لٹھڑی سانس لے کر بولی ”پختی چڑی باتیں کرتا تو کوئی تم کو بدل سے کھیلے۔“

”میں ابھی وہی عورتوں اور مردوں کی بحث۔۔۔“ میں نے اس سے بھی زیادہ لٹھڑی سانس لے کر کہا ”مردوں میں تو یہی بحث چھڑی رہتی ہے کہ عورتیں یوں ہیں اور مرد یوں ہیں۔ جہاں خیال تو ایسی جگہوں پر ایسی باتیں نہیں ہوتی ہوں۔“ میں نے گردو چٹکی کر طرف اشارہ کیا۔

”عورت اور مرد جہاں بھی موجود ہوں گے وہاں ایسی باتیں ہوں گی۔“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی ”میرا حال۔۔۔ اگر تم میرا سال پلے میری خاطر ظلم و انکساف نہ کیا کرتے تو میں زمین کو کھجے کھجے معلوم ہے اب وہی ہو جی کہ ہے اور اب میں پہلے جیسی نظر بھی نہیں رہی۔ بہت کچھ سُن لیا اور بہت کچھ دیکھ لیا ہے میں نے اس دنیا میں۔۔۔!“

”میری بد قسمتی یہی ہے۔“ میں نے انسوس سے کہا ”جب کو کسی اچھی شخصیت سے ملاقات ہوتی ہے وہ دنیا میں بہت کچھ دیکھ چکی ہوتی ہے۔ اس کی مصیبت رخصت ہو چکی ہوتی ہے اور مصیبت کے ساتھ ہی انسان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں رخصت ہو جاتی ہیں“ چالاک ہو جانا بڑے انسوس کا مقام ہے۔ چالاکی انسان کو بڑے دکھ پہنچاتی ہے۔“

”ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ وہ سر ملاتے ہوئے بولی ”چالاکی واقعی انسان کو بڑے دکھ پہنچاتی ہے۔ مصیبت میں بڑی راحت ہے۔ اب تم بھی چالاکی چھوڑو اور یہ بتا دیاں کس پتھر میں آئے ہو؟“

مجھے اتنی جلدی اس سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”تمہیں کیا پتہ یہ خیال آیا کہ میں کس پتھر میں یہاں آیا ہوں؟“

”تمہاری رہائش اس جزیرے پر نہیں ہے۔ جن کی رہائش اس جزیرے پر نہیں ہوتی اور جو ایک نظر دیکھنے میں ہی لوگوں کے لوگ نظر آتے ہیں وہ عام طور پر کسی نہ کسی پتھر میں عیاں ہوتے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے بھلا کسی دولت مند آدمی کو اس گدے اوپر بد حال سے جزیرے پر آنے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ سچی سچی بولی۔

”مجھے تو یہ گندا اور بد حال جزیرہ نہیں لگتا۔ مجھے تو یہاں دولت کی خوشبو آتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”حیرت ہے۔۔۔!“ وہ دیر سے ”نہی“ نے آئے والے اکثر ناک سیکڑ کر یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ یہاں ہر جگہ پھلی کی آلی ہے۔“

سے پر اٹھا اور آلیٹ وغیرہ چبانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ ایک اداے خاص سے بازید پھنکاتی میری طرف بدھ رہی تھی۔ جب وہ میری ہیر کے عین قریب آ پہنچی تو میں نے چرنگے کی اداکاری کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

اس کے سامنے چہرے پر بدستور مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی ہڈی بڑی سیاہ آنکھوں میں نشانچہاں سا تھا۔ اس کے غانہ پردوشوں جیسے اور قدرے پلے کپڑوں سے کسی پرانے قسم کے عطری خوشبو آ رہی تھی۔ چند لمحوے قطعی خاموشی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتی رہی۔ میں نے کچھ یوں ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ میں گرا ناٹھا کتا بھی بھول گیا تھا۔

”کیا بیٹھے کو بھی نہیں کوئے؟“ وہ صاف ستھری اردو میں نہایت منہمانہ لہجے میں بولی جس پر مجھے حیرت کا خفیف سا متکا لگا۔ ”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“ میں نے جلدی سے سامنے والی چھوٹی سی تنگی کی طرف اشارہ کیا۔

”لگتا ہے پہلی بار اس جزیرے پر آئے ہو۔“ وہ لنگا نہال کر سامنے بیٹھے ہوئے بولی۔ غمور آنکھوں سے بدستور مسکراہٹ پھوٹی پڑی تھی۔

”نہیں۔۔۔ جزیرے پر تو کئی بار آ چکا ہوں۔ اس کوئل میں پہلی بار آیا ہوں۔“ میں نے گویا نہٹھٹے ہوئے جواب دیا۔

”تھوڑے صاحب!“ وہ بڑی ادا سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی ”جب ہم سے ہی نہ ملے تو اس جزیرے پر اتنا نہ اتنا برا بری ہوا نا!“ ”ہاں یہ بات تو ہے۔“ اب میں نے بھی ادا سر تو کمری نظر سے اس کا جائزہ لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ نوجوانی میں وہ یقیناً ایک ساتھی قیامت رہی ہوگی۔ اس نے چلی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کانٹہ میں لپٹے ہوئے دو بان نکالے۔ ایک اس نے خود کھلے میں دبایا۔ دوسرا میری طرف بڑھایا۔

میں نے تھی میں سر ملاتے ہوئے کہا ”تم جیسا غاؤں کے ہاتھ سے کوئی چیز لے تو انکار کرنا بڑی ہی بد قسمتی لگتی ہے۔ لیکن مجبوراً انکار کر رہا ہوں۔ پانچ مجھ سے کوشش کے باوجود نہیں کھایا جاتا۔“ ”کسی زمانے میں ہم سے بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔ جب کھانے لگے تو پھر پھڑپھڑائے نہیں پھڑپھڑا۔“ پھر ذرا توقف سے وہ بولی ”ہم سے دوستی ہو گئی تو کھانے لگو گئے۔“

میں نے ناٹھا چھوڑ کر ذرا میز پر جھکتے ہوئے کہا ”تمہیں کیا نظروں میں کام کرنے کا شوق ہے؟“

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولی ”تم کیا ظلم و انکساف ہو؟“ اس کے لہجے سے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ اردو اس کی مادری زبان نہیں تھی لیکن انداز گفتگو سے وہ پختی آن پڑھ یا ایڈمنسٹریٹر نہیں لگتی تھی۔ اس پر مجھے دل ہی دل میں ایک خوشگوار سی حیرت محسوس ہوئی تھی۔

”شاید پھلی کی اس بو میں ہی دولت کی خوشبو لپٹی ہوئی ہے۔“  
 وہ ایک بار پھر دھڑے سے ہنسی ”بہت تیز ناک ہے تمہاری۔“  
 ایسی ناک والے خطرناک ہوتے ہیں۔“  
 ”میں تو بالکل بے ضرر آدمی ہوں۔“

”ہاں سچی تم نہایت مفاتی سے میرے سوال کا جواب مول کر گئے۔ میں نے تو چھپا تھا تم یہاں کس جگہ میں آئے ہو؟“ وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی ”شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“  
 ”اگر یہ امید دلا رہی ہو تو پھر تم سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“ پھر میں نے اس کی طرف جھٹکے ہوئے ذرا دراز دارانہ انداز میں کہا ”میرا ایک دوست ہے نادر عرف نوزی۔ میرا اس سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے اور مجھے پتا چلا ہے اس کا ہاتھ بھی کسی طرح ڈھکی ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی تلاش ہے۔ مجھے ذرا دیر سے پتا چلا کہ وہ یہاں آیا تھا۔ ورنہ شاید میری اس سے ملاقات ہو جاتی۔ یقین ممکن ہے کہ وہ بھی مجھے تلاش کر رہا ہو لیکن اسے مجھ سے رابطے کا طریقہ معلوم نہیں ہے۔ اگر تم مجھے اس کے بارے میں کچھ بتا سکو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اس کے عوض میں تمہاری ہر خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

وہ ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”خدمت بتائی تو تم بھاگ جاؤ گے۔ خدمت کی بات تو چھوڑو۔ یہ بتاؤ یہ نادر عرف نوزی کون ہے؟“

یہ کتنا مشکل تھا کہ وہ اداکاری کر رہی تھی یا واقعی اسے معلوم نہیں تھا کہ میں کس کی بات کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حقیقی الجھن کی پرچھائیاں تھیں۔

”تم نادر عرف نوزی کو نہیں جانتی؟ قاسم مشہور آدمی ہے۔ قاسم بکلی کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔“

”قاسم بکلی کے زیادہ تر آدمیوں کو تو میں جانتی ہوں لیکن قاسم بکلی کے آدمیوں کا بھلا کیا شائبہ؟ پتا نہیں کہاں کہاں اس کے کس کس طرح کے آدمی موجود ہیں۔ تم جس آدمی کا ذکر کر رہے ہو شاید اسے میں کسی دوسرے نام سے جانتی ہوں گی۔ تم اس کا خطبہ بتاؤ۔ تمہاری مدد کر کے مجھے خوش ہو گی۔“

میں نے نادر عرف نوزی کا خطبہ بیان کیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولی ”اوہ۔ تم مجھے نئی بات کر رہے ہو۔ ہم اسے نادر عرف نوزی کے نام سے نہیں ”پچھتے“ کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ تو جگہ یہاں آیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں اس کے بعد کہاں گیا۔ اس سے میری بات نہیں ہوئی۔ وہ بہت جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔“

لگتا تھا کہ وہ دانت داری سے بات کر رہی تھی اور میری مدد کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس کے جواب سے مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے جلدی سے پوچھا ”کوئی اور بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا؟“

”وہ قاسم بکلی کا آدمی ہے تو اسی کے گھر گیا ہو گا۔“ وہ بولی۔

”میں وہ اس کے گھر نہیں گیا۔ میں نے معلوم کر لیا ہے۔“  
 ”ہاں قاسم بکلی کے مرنے کے بعد اس کے آدمی آج کل اس کے گھر سے ذرا دور دوری رہتے ہیں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے اور کچھ سوچتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے میرا شوہر تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکتا ہے۔“

”اچھا۔ تو تمہارا کوئی شوہر بھی ہے؟“ میں نے اپنی حیرت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

”کیوں کیا میں تمہیں اس قاتل نہیں لگتی کہ میرا کوئی شوہر ہوتا؟“ اس نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”اب اگر شوہر موجود ہی ہے تو کوئی حرج نہیں۔ سوچو نہ ہوتا تب بھی ٹھیک ہی تھا۔“ میں نے سر ہلایا ”دوپے۔۔۔ عجیب بات ہے۔ ہم اتنی باتیں کر چکے ہیں لیکن ابھی تک مجھے تمہارا نام معلوم نہیں۔“

”نام تو میرا کچھ اور تھا لیکن وہ اب ایک بھولی بھری کمائی بن چکا ہے۔ اب اس جزیرے پر لوگ مجھے صرف چھپیلی کے نام سے جانتے ہیں۔“

”اوہ!۔۔۔ میں یہ کہنے کہنے رہ گیا کہ میں نے زندگی میں پہلی بار سافلی چھپیلی دیکھی تھی۔“

ایک لمحے کے وقف سے وہ بولی ”اگر تمہیں کوئی خوف لاحق نہ ہو تو تم مجھے اپنا نام بتا سکتے ہو۔“

”مجھے افضل کہتے ہیں۔“ میں نے اپنا صحیح نام بتا دیا۔ ستر سمجھا۔ ہم نچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ نام میں نے اپنا نام بتاتے وقت غیر محسوس طور پر نکھیلوں سے اڑھو اڑھو کیا۔ کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا اور یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی۔ چھپیلی وہاں موجود اکلوتی عورت تھی۔ خواہ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی اور چاہے وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت نہیں مگر بہر حال عورت تھی اور ایک مخصوص دلکشی کی دولت سے مالا مال تھی۔

اس قسم کے عوامی رستوران میں تو رنگا رنگ اور پھولدار کپڑوں میں اگر مرد بھی بیٹھا ہو تو لوگ گرد میں تھما تھما کر اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ چھپیلی تو پھر بھی خاصی دلچاسم کی عورت تھی۔ رستوران میں گاؤں کی تعداد بھی کچھ ایسی کم نہیں تھی۔ تقریباً تمام بیڑیں بھری ہوئی تھیں۔ گپ شپ ”شور شراب“ اور کھانا بیٹا اسی طرح جاری تھا جس طرح عموماً ایسی جگہوں پر ہوتا ہے۔ چھپیلی جب آٹھ کر میری طرف آئی تھی صرف اس وقت چند لوگوں نے نکھیلوں سے اڑھو دیکھا تھا۔ گاؤں پر بیٹھے ہوئے گاؤں والے نوجوان نے بھی سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا تھا لیکن اس کی نظروں میں تجسس یا اشتیاق سے زیادہ بے زاری تھی۔ بعد میں اس کی توجہ بھی ہماری طرف سے ہٹ گئی تھی۔

دفعتاً ایک ٹھنڈی ہوائی جاکٹ اور گھاس اٹھا لے کر قریب

سے گزرا۔ وہ بانس کی طرح لمبا اور سوکھا ہوا تھا۔ وہ دعوتی واسکٹ میں تھا اور کالا بھنگ تھا۔ اس کی کمر میں قم تھا اور وہ پول بے زاری سے پاؤں تھیکٹ کر چل رہا تھا جیسے زندگی اس کے لئے ایک بوجھ ہو۔ اس کے پیروں میں فوٹی چمپلی اور سر پر رٹانے سے کپڑے کی مختصر مڈی تھی۔ اس کی ناک طوطے کی چوچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔

میں اسے دیکھ کر ذرا چٹکا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی شخصیت میں صرف یہی ایک نشانی نوزی والی تھی۔ وہ میک اپ میں ہو آج بھی نوزی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نوزی اتنا لمبا نہیں تھا اور نہ ہی ایسا سوکھا ہوا تھا۔ وہ باای بلڈ ریٹائپ تھا۔

ایک گاہک نے اس شخص کو ہیرا سمجھ کر میز پیشہ کاری اور اشارے سے ملانا چاہا لیکن وہ سر جھکائے رستوران کی عقبی کونٹریں کی طرف چلا گیا۔ چمپلی نے محسوس کر لیا تھا کہ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے گویا وضاحت کی "بے چارہ کو نگاہ برا ہے۔ اس لئے اس نے گاہک کی تواضع نہیں کی۔"

"تو ہمارے ہوٹل میں کیوں رکھا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔  
"وہ ہمارا ہے۔ ہیرا نہیں۔" چمپلی مسکراتے ہوئے بولی "میں یونہی ہوٹل کے کسی کو نہ کھدے میں پڑا رہتا ہے" اشاروں سے سمجھاوا جائے تو چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔ مالک نے خدا ترسی کے جذبے سے رکھا ہوا ہے۔"

وہ شخص ایک کونٹری میں داخل ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ میں نے ادھر سے نظر ہٹا کر دوبارہ چمپلی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "خیر۔ وضع کو اسے۔۔۔ میں نوزی کی بات کر رہا تھا۔ تم بتا رہی تھیں کہ تمہارا شو پر شاید اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ تمہارے شو پر سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے چٹکایا ہٹ آئیر سے لمبے میں گویا ضروری سمجھ کر تے ہوئے بولی "وہ درحقیقت میرا شو پر نہیں ہے لیکن ہم جیسی عورتوں کی بھی سرحال کوئی عزت ہوتی ہے اس لئے میں اسے اپنا شو پر ہی مانتی ہوں۔ حالانکہ وہ اس بات کا برا منانا ہے کیونکہ اس کی اصل بیوی موجود ہے۔"

"پھر تم اس کی کون ہو؟" میں نے انجان بنے ہوئے پوچھا۔  
"راشتہ" اس نے آہستگی سے جواب دیا "بلکہ ایک عرصے سے تو وہ بھی نہیں ہوں۔ میں ایک پالتو جانور کی طرح ویسے ہی یہاں پڑی ہوں۔ میں اس وقت اٹھارہ سال کی تھی جب اس نے مجھے راشتہ بنایا تھا۔ وہ خود اس وقت پچاس سال کا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً پانچ سال کا ہے اور کئی سال سے ایک جاوے میں مسطور ہو کر بستہ پڑا ہے۔ اس نے مجھے کئی سال پہلے چھٹی دے دی تھی کہ میں جہاں جاؤں جا سکتی ہوں لیکن میں کہیں بھی نہیں جاتی۔ میں پڑی ہوں میں بڑی وفادار راشتہ ہوں۔ بیوی سے بھی زیادہ وفادار۔۔۔ وہ خود استہزائی کے سے انداز میں دھیرے سے کہی۔

اس کی ہنسی میں بڑی جذبات خیز ٹھٹھکی تھی۔  
"تمہارا شو پر۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ شخص کون ہے؟" میں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"اس ہوٹل کا مالک۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "وہ اس جزیرے کے بہت پرانے مقامیوں میں سے ایک ہے۔ اس کا یہ ہوٹل دیکھنے میں معمری لگتا ہے مگر وہ کافی پیسے والا آدمی ہے۔ ٹھیک ٹھاکہ اڈر سوخ بھی رکھتا ہے۔" پھر اس نے شوخی نظروں سے کاؤنٹر پر بیٹھے نوجوان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی "یہ اس کا بیٹا ہے اگر اس شخص سے میری شادی ہوئی ہوتی تو یہ میرا سوتیلا بیٹا ہوتا۔"

"اب تم اسے کیا سمجھتی ہو؟"  
"اب بھی تقریباً بیٹا ہی سمجھتی ہوں لیکن تمہارے اس سوال سے کچھ بد معاشی کی کیوں جھٹک رہی ہے؟" اس نے ٹھیک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تمہی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "تمہارے شو پر سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"  
"میں۔۔۔ اسی ہوٹل کے خانے میں۔" چمپلی نے جواب دیا "اب وہ کسی مذہبی چیز کی طرح خانے میں پڑا رہتا ہے۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ صرف میں ہی کبھی کبھار جا کر اس کا حال احوال پوچھ لیتی ہوں۔ کوئی اور اس کی زیادہ خبر گیری نہیں کر سکتا۔"  
"اس ہوٹل کے نیچے بھی کچھ بنا ہوا ہے؟" میں نے گردو پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ عمارت تو انگریزوں کے زمانے کی ہے۔ اس کے نیچے بہت کچھ بنا ہوا تھا۔ حالانکہ نیچے زمین چٹری تھی پھر بھی بڑا احیاء خانہ وغیرہ بنایا گیا تھا۔ اب تو کمروں کا ناس لگ چکا ہے۔ ان کمروں نے اسے گودام بنایا ہوا ہے۔ ایک کمرے میں میرا شو پر پڑا رہتا ہے۔" اس نے بتایا۔

"مجھے اس سے ملنا دو۔" میں نے فرمائش کی۔  
"پہلے مجھے اس سے پوچھ کر آنا پڑے گا۔ وہ اب بہت چڑچڑا سا ہو گیا ہے۔ خوش مزاج تو وہ پہلے بھی نہیں تھا لیکن عمر بڑھنے اور ایک عرصے سے بستہ پڑا رہنے کی وجہ سے تو ایسا ہو گیا ہے کہ بات بات پر کانٹے کو دوڑاتا ہے۔ اس لئے بھی اس کا اپنا کمرہ اس سے بے زار ہے اور انہوں نے اسے نیچے پیچک رکھا ہے۔" پھر وہ ایک فکر کاؤنٹر کی طرف دیکھ کر بولی "تم یہیں ٹھہرو۔ میں پوچھ کر آتی ہوں۔"

وہ اٹھی اور بازیب چٹکائی رستوران کے عقبی حصے کی طرف چلی گئی۔ میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ کاؤنٹر پر بیٹا نوجوان کا کھانا سے پیسے لینے بیروں کو دریا ہٹ دینے اور انہیں ملکی پیکلی ڈانٹ پلانے میں مصروف تھا۔ اسے گویا ان معاملات کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔



ہوئے گما۔

”آج کل اسمگلر بھی تو سیٹھ ہی کھاتے ہیں۔ انہیں اسمگلر کون کتا ہے؟ ہم جزیرے والوں کے لئے تو وہ زیادہ بڑے سیٹھ ہیں۔“ وہ اپنی مخصوص سرواں مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ اس کی ناک میں ہیرے کا لونگ جھلما رہا تھا جو اس کی سائول رکت پر مت بھلا لگ رہا تھا۔

ہم جس کوٹھری میں داخل ہوئے تھے اس میں اگر کزور سا ایک بلب روشن نہ ہوتا تو دروازہ بند کرنے کے بعد اس میں گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ اس کوٹھری میں خالی کھنڈ اور ہوٹل کا دو سرا کاٹھ کبابڑا تھا۔ فرش اور دیواروں پر چٹائی اور میل چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس لیے سوکے اور کھرخیدہ کالے بھنگ ٹھنڈے کو اسی کوٹھری میں آتے دیکھا تھا لیکن اب وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ راستہ کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید اوسرے ہی لوگوں کی آلود رفت راتی تھی۔ میں چٹیلی کی رینائی میں اس راستے سے ایک اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ایک اور کوٹھری تھی جو نسبتاً صاف تھی۔ اس میں فرش پر دو گدے بچھے ہوئے تھے کچھ دو سری چیزیں بھی موجود تھیں۔ لگتا تھا کہ اس میں ہوٹل کے ملازموں کی رہائش تھی۔ ایک طرف سے چھری پڑھیاں نیچے جاری تھیں۔

میں بظاہر سکون انداز میں چٹیلی کے پیچھے چلا جا رہا تھا لیکن میرے اعصاب تڑپ رہے تھے۔ میرا ہاتھ کٹ کی جیب میں گن کے دستے رہتا ہوا تھا لیکن ابھی تک مجھے کہیں کوئی سسٹیا غیر مسلح ٹھنڈے نظر نہیں آیا تھا۔ رستوران کا شور یکدم ہی جیسے کہیں بجے رہ گیا تھا۔ سینکڑہ کوٹھریوں کی اس زردی روشنی میں چٹیلی کی پازیب کی چمن چمن میرے حواس سے کچھ دلفریب سی سرگوشیاں گزری تھیں لیکن میں ان پر دھیان دے بغیر چلا جا رہا تھا۔ چٹیلی بار بار گردن کھٹکا کر میری طرف دیکھتی تھی اور سرواں انداز میں مسکراتی تھی لیکن میں اس وقت بھڑا رہا ہوا تھا۔

پڑھیوں کے اختتام پر لوہے کا ایک مضبوط گیٹ تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اس معمولی سی جگہ پر اتنا مضبوط اور شاندار گیٹ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ اس سے گزرنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن کوئی اس گیٹ کو بند کرنے نہیں آیا اور نہ ہی وہ خود بہ خود بند ہوا۔ وہ بدستور کھلا رہا۔ میں نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔

خانے میں داخل ہوتے ہی ہم گویا ایک بالکل ہی مختلف جگہ پر آ گئے تھے۔ یہاں فرش اور دیواریں ماربل کی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چند بوہیاں اور خیلے رکھے تھے۔ وہ آئے اور تک وغیرہ کی بوہیاں اور خیلے معلوم ہوتے تھے۔ شاید یہ ہوٹل میں استعمال ہونے لگے لیکن ان کے ارد گرد بھی فرش بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ ان بوہیوں اور خیلوں کے باوجود وہاں کی حالت دیکھی نہیں تھی جیسی عام طور پر گوداموں وغیرہ میں ہوتی ہے۔

میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چٹیلی کی باتوں میں کتنا چار اور کتنا جھوٹ ہو سکتا تھا؟ فی الحال یقین سے کچھ کتا مشکل تھا۔ بہر حال میں معصوم بن کر اس کے ساتھ کافی آگے تک جانے کے لئے تیار تھا۔ اگر اس میں کوئی غلطی بھی پوشیدہ تھا تو مجھے بہر حال اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ غلطی مول لئے بغیر کوئی بات جتنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس ہوٹل سے مجھے کچھ پراسرار بات کی بو آ رہی تھی۔

میں نے نظر بچا کر جب سے وہاں کی فون نکالا اور شفیع شاہ کا نمبر رخ کے نمائندہ مختار انداز میں اسے کان سے لگاتے ہوئے نیچی آواز میں مختصر اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ بظاہر میں ناشتے ہی میں مصروف تھا لیکن درحقیقت میں کچھ نہیں کھا رہا تھا۔ صرف چند سیکنڈ بات کر کے میں نے فون جیب میں ڈال لیا۔

کچھ دیر بعد چٹیلی چمن چمن کرتی واپس آئی تو میں بے دلی سے گاڑی اور لٹری چائے کی چکیاں لے رہا تھا۔ وہ قریب آ کر بولی ”ٹھنڈے میرے ساتھ آؤ۔ جانو میر بخر تم سے ملنے کے لئے راضی ہو گیا ہے۔“

”یہ جانو میر بخر کون ہے؟“ میں نے کپ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”دبی جس کی میں رکھیل تھی۔ رکھیل کھتے ہو یا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”اگر پہلے نہیں سمجھتا تھا تب بھی تمہاری زبان سے سننے کے بعد تو سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”اس کا نام جانو میر بخر ہے؟“

”ہاں وہ اس ہوٹل کے بانی جمعہ خان مرحوم کا بیٹا ہے۔ میں نے اسے بنایا کہ شرے کوئی بڑا سیٹھ اس سے ملے آیا ہے تو اس کی تھکی ہوئی بدن میں ذرا دلچسپی کی لہر دو گئی۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ وہ ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ورنہ وہ تو کن کل مجھ سے بھی لپا پند نہیں کرتا۔“

”تم سے مل کر تو بے چارے کا دل بھر گیا ہو گا“ اور پھر اب ملنے کا کام بھی کیا۔“ میں نے اس کی رینائی میں ہوٹل کے عینے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس نے تھکی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا ”تو بے تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں شرے سے آیا ہوا کوئی بڑا سیٹھ ہوں؟“

”اللہ نے مجھے بھی دو آنکھیں دی ہیں۔ بے شک میری زندگی کا زیادہ حصہ اسی جزیرے پر گزرا ہے لیکن میں اتنی کوٹھ مغزو نہیں رہا۔ میں رہتے ہوئے بھی میں کہہ سکتی ہوں کہ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ کیا میں کسی کا خلیہ گاڑی اور رکھ رکھاؤ دیکھ کر یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکتی کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”وہ تو ٹھیک ہے ذہین تو خیر تم شاید شہر میں رہنے والی عورتوں سے زیادہ لیکن میرا مطلب ہے میں کوئی اسمگلر وغیرہ بھی تو ہو سکتا ہوں۔“ میں نے اس کے ساتھ ایک کوٹھری میں داخل ہوتے

کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”میں تمہارا پرانا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ پھر بے درودوار کے درمیان اس کی بھاری گونجی آواز کچھ اور بھی باریع محسوس ہو رہی تھی۔

”افضل چہ درہی۔“ میں نے اب ذرا مکمل جانے کا فیصلہ کیا۔ اگر بوڑھا میری آمد کے مقصد سے واقف تھا تو میں اس کا رد مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔

”اس نام کا ایک آدمی کراچی میں فائبر اسٹار ہوٹل کا مالک ہے۔“ وہ پلک جھپکائے بغیر بولا۔

”میں دہی ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سچائی کے ٹریک پر میری گاڑی کہاں تک جا سکتی تھی اور اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ یہ بوڑھا میری توقعات سے بہت مختلف تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے سامنے غیر ضروری جھوٹ نہیں بولنا چاہئے تھا۔

”تو پھر نادر عرف نوزی تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک ڈاکو، بد معاش اور دہشت گرد ہے۔“ جانو میر، مگر ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں بولا۔

”دوست ہو بھی ہو سکتا ہے۔ کاروباری لوگوں کو کئی طرح کے لوگوں سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔ ”بنا کر رکھنا اور بات ہے دوستی اور چہز ہوتی ہے۔ بنا کر رکھنا درحقیقت مجبوری اور غرت کا رشتہ ہے۔ دوستی محبت کا رشتہ ہے۔ تم مکمل کربات کرو اور سچ بولو۔ تمہارا اس سے کون سا رشتہ ہے؟“ ”ابھی یہ واضح نہیں ہو سکا۔“ آخر کار میں نے جواب دیا۔

”کیا تم اسے مارنے آئے ہو؟“ وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”ابھی میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے اب جھوٹ کا سارا ایلان بستر سمجھا۔

”تو پھر اپنی جیب میں موجود گن کے دستے بہتے ہاتھ ہٹاؤ۔ تم ایک دوست کے سامنے بیٹھے ہو۔ دشمن کے سامنے نہیں۔“ بوڑھے کی گونجی آواز میں غضب کا گھبراہٹ تھا۔ اس کی آنکھیں کھنڈلائی ہوئی تھیں مگر انکس دے مٹین سے کم نہیں تھیں۔ اسے میری جیب میں گن کی موجودگی کا پتا چل گیا تھا۔ میں نے گمی سانس لے کر ریب سے ہاتھ نکال لیا۔

”ہاں اب ٹھیک ہے۔ اب ہم شرابی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔“ وہ طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”کیا اب ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی سے پوچھ سکتا ہے کہ نادر عرف نوزی کہاں ہے؟“ میں نے پرسکون لمبے میں کہا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے لیکن میں یہ پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ وہ جلد جہیں مل جائے گا۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم

اس کمرے میں بوڑھوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ہم ایک اور دروازہ تک پہنچے۔ اس میں بھی لوہے کا ایک مضبوط اور شاندار گیٹ لگا ہوا تھا۔ یہ بھی کھلا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ نہ خانہ ہونے کے باوجود یہاں قہقہوں کا احساس قطعاً نہیں تھا جبکہ ہوا کی آمدورفت کا کوئی ذریعہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”دوسرے کمرے میں بیٹھے ہی مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں کسی اسپتال کے راول میں آ گیا تھا۔ یہاں غرض اور دیوالوں پر لگی ہوئی مارٹل کی گلیں بھی سفید تھیں اور زیادہ تر سازد سامان بھی سفید تھا۔ اسپتالوں جیسا ہی لوہے کا ایک پلنگ تھا جس پر ایک بوڑھا شخص گاؤ کیلئے کے سارے ٹھم دراز تھا۔ اس کا بستر بھی سفید تھا اور وہ سینے تک ایک سفید ہی چادری میں بچھا ہوا تھا۔

وہ بوڑھا ضرور تھا مگر ایسا کھڑا معلوم نہیں ہوتا تھا جیسا چنبلی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا۔ اس کے قریب سارے بال سفید تھے اور آنکھیں کھنڈلائی ہوئی تھیں مگر اس کے چہرے پر صحت مندی کی تمام علامتیں موجود تھیں۔ اس کی رنگت گندمی تھی مگر اس میں صحت مندانہ شرفی کی جھلک تھی۔ اس کے پوٹے بھاری تھے۔ شاید اس کی وجہ کثرت شراب نوشی رہی ہو، تاہم وہ مریض معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس کے بازو اور گردن سے ذرا نیچے تک کا حصہ چادر سے باہر تھا لیکن اسے محض اس حد تک دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک مضبوط اور قوی ابلش آدمی تھا۔ جوانی میں قیقا کلاسیک روحانی داستانوں کے کسی تصور یا ہیرو سے مشابہ رہا ہو گا۔

اس کے برابر میرے دروہائی اور ضرورت کا دوسرا سامان پڑا تھا۔ سرانے کھنڈی بھی لگی ہوئی تھی۔ بڑے سیاں ایٹھے بھلے ٹھاٹ سے وہ رہے تھے ورنہ چنبلی کی باتوں سے تو میرے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ ابھرا تھا کہ کوئی قریب المرگ بوڑھا خانے کی کسی گندی سی کوٹھری میں گندے حال میں پڑا کھائے رہا ہو گا، خون خوک رہا ہو گا اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہو گا۔ بید کے پاس تین چار دھندلے قسم کی کرسیاں بھی پڑی تھیں۔

میں قریب پہنچا تو وہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھاری گونجی آواز میں بولا ”جانو میر، مگر خوش آمدید کتا ہے۔“

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے زمانہ قدیم میں کوئی بادشاہ کسی مہمان کو شرب ملاقات بخش رہا ہو۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا تو احساس ہوا کہ وہ بستر پر بٹے ہوئے کسی بوڑھے کا ہاتھ نہیں تھا۔ ایک لمبے کے لئے تو مجھے شبہ ہوا کہ اس نے کہیں سفید بالوں کی دگ تو نہیں لگا رکھی تھی؟ لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر یقین ہو گیا کہ اس کے بال اصلی ہی تھے۔

اس نے مجھے پیٹنے کا اشارہ کیا۔ چنبلی کو اس نے یوں نظر انداز کیا ہوا تھا جیسے وہ کمرے میں موجود ہی نہیں تھی۔ اس کی نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ میں بیضا تو چنبلی بھی میرے برابر

وہیں کے بست کیے ہو۔ جس کام کا بند کر لیتے ہو اسے پورا کر کے چھوڑتے ہو۔ جسے تلاش کرنے کا عزم کر لیتے ہو اسے پامال سے بھی اوجھڑا لیتے ہو۔

”شاید ایسا ہی ہو۔“ میں نے ہنس لیے میں جواب دیا۔  
 ”لیکن میری باتوں سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اسے میں نے پناہ دے رکھی ہوگی۔ میں ایسے فساد کی آدمیوں کو پناہ نہیں دیتا۔“ اس نے گویا وضاحت کی۔  
 ”جیلے میں آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کہاں لے سکا ہے؟“

”لے جائے گا۔ لے جائے گا۔ ہمیں کہیں جزیرے پر ہی ہوگا۔ آج صبح وہ اوپر ہوئی میں آیا تھا لیکن مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہے میں اسے پسند نہیں کرتا۔“ جانو میرا کچھ انداز گھٹو کچھ شاہانہ سا تھا ”مجھے پتا چلا ہے کہ وہ شہر میں پھر کوئی عین وارادات کر کے بھاگا ہے۔ شاید اس نے کسی اخباری آدمی کو قتل کر دیا ہے اور ایک پولیس آفیسر کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مشتاق مدثر کے قتل کی خبر ابھی کسی اخبار میں نہیں چھپی تھی۔ شاید کسی میں چھپی بھی ہو تو کم از کم یہ تو ابھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اسے نوڑی نے قتل کیا تھا۔ خود نوڑی اور اس کے ایک آدمہ حواری کے علاوہ شاید یہ بات صرف

مجھے اور رحیم محل کو معلوم تھی۔ بلکہ ہمیں بھی معلوم کیا تھی، ہم نے اندازہ لگایا تھا۔

”آپ بہت باخبر آدمی ہیں جانو میرا صاحب!“ میں نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہ خانے میں رہتا ہوں۔ قبر میں تو نہیں رہتا۔“ اس کے ہونٹوں پر خلیفہ سی مسکراہٹ ابھری لیکن اس کے چہرے سے اس کے دل کا حال جاننا ناممکن تھا۔ وہ بہت گہرا آدمی تھا۔ چنبیلی۔ جو بھی اس کا نام تھا میرے برابر بالکل خاموش اور منسوب بیٹھی تھی۔

”پھر بھی آپ کی معلومات ناقابلِ داد ہیں۔ ہمارے ہاں یہ خانوں میں تو کیا، واپج ٹاورز میں رہنے والوں کو آپے اندر گرد کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا جن کا کام ہی معلومات رکھنا ہے جنہیں باخبر رہنے کی تنخواہ ملتی ہے انہیں خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔“ میں نے کہا۔

وہ میرے سے ہنس ”شاید وہ اس نظریے کے قائل ہوتے ہیں کہ آگلی ایک عذاب ہے۔ لاطمی اور بے خبری میں بڑی راحت ہے لیکن میرا نظریہ مختلف ہے۔ میرے خیال میں باخبر رہنے میں عافیت ہے۔ بہر حال۔ اگر نوڑی نے واقعی کچھ آزدہ وارداتیں کی ہیں تو اس کی تلاش میں پولیس کو اتنا پابند تھا۔ تم کیوں آئے ہو؟“

”آپ خواہ خواہ فرض کئے جارہے ہیں کہ میں اس سلسلے میں

انکا، اقبالہ، سونا گھاٹ کا پجاری، غلام روہیں، امبر بیل، درخشاں، خبیث کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور پراسرار ناول

## برہمچاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم

خوبصورت سرورق، دیدہ زیب کتبت و طباعت

قیمت = -/150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

نوزی کے پیچھے آیا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی اور غرض ہے۔" میں نے کہا "اگر کوئی اس تک پہنچنے میں میری مدد کرے تو میں اس کی معقول خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

"لوہے پیسے کی بات کر رہے ہو؟" اس کی خوشامی پر ٹٹلیں نمودار ہو گئیں۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔  
 "کتنا دے سکتے ہو؟"

"پانچ لاکھ۔ دس لاکھ۔ پندرہ لاکھ۔" میں نے خاموش ہو کر جائزہ لیا کہ شاید اس کی آنکھوں میں کوئی تغیر رونما ہوا ہو لیکن ان میں مجھے اب بھی وہ منہ لا ہٹ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

وہ پہلی بار تیاروں کے سے انداز میں ہٹکارا بھر کر بولا "ذیتر افضل چوہدری بلانا کہ تم فانیہ اسرار ہوئی کے مالک ہو۔ تمہارے ہوئی کے ساتھ میرا یہ ہوئی ایسا ہی ہے جیسے محل کے سامنے جھونپڑی۔ لیکن تم اس ہوئی کی حالت پر نہ جانا۔ وہ یہ میں نے بھی زندگی میں مت کھایا ہے اور بہت گویا ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے ملا ٹٹ سے کہا "میں آپ کو لالچ نہیں دے رہا لیکن دولت کی ضرورت کس کو نہیں ہوتی۔ بلکہ دولت مندوں کو شاید دولت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔"

"میں نے زندگی میں کبھی خبر کار اور ادا نہیں کیا۔" وہ ہاتھ ہلا کر گویا اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے بولا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ نوزی اس وقت کہاں ہے تو میں تمہیں منت میں ہی تار دیتا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم کیوں اس کے چکر میں ہو۔ خیر۔ فی الحال ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بے ہودہ باتیں تو زندگی بھر چلتی ہی رہیں گی میں ان میں الجھ کر آپ میری جیانی بھی بھول گیا۔"

اس نے ٹٹلی کو اشارہ کیا۔ وہ بڑے مستند انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی "آپ کیا پتا پسند کریں گے؟"

جانو نے گویا وضاحت کی "اس دعویش کے ذریعے پر دنیا کی بہترین شرابیں دستیاب ہیں۔"

"لیکن یہ دعویش شراب نہیں پیتا۔" میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جو پھر افضل صاحب کو چاہئے پلاؤ۔" جانو نے ٹٹلی کو حکم دیا۔

"نہیں نہیں۔ میں چاہئے بھی نہیں بیوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا "میں ادھر ہوئی میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔ چاہئے بھی اپنی چکا ہوں۔"

"چھوڑو ہوئی کی چاہئے کہ۔" جانو ہاتھ ہلا کر بولا "وہ کوئی چاہئے تو نہیں ہوتی۔ مختلف عمریوں کی سیل پیکل کا مخلوط ہوتا ہے۔ اپنے ہوئی کی چاہئے وغیرہ تو میں خود نہیں پیتا اور نہ ہی وہاں کا کھانا کھاتا ہوں۔"

"وہ صرف پبلک کے لئے ہے؟" میں نے ملا ٹٹ سے پوچھا۔  
 "کیا کریں گا دوبارہ کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ تم پبلک کے غم میں جھگڑا مت ہو اور عہدہ قسم کی چاہئے بیو۔ سری لنکا سے براہ راست آئی ہے میرے پاس۔ یہ قسم بازار میں فروخت کے لئے پیش نہیں کی جاتی۔" اس نے ٹٹلی کو اشارہ کیا۔ وہ سائز نیل پر رکے ایک خوب صورت بڑے قمر موس سے نہایت صاف سحرے پیش قیمت اور نفیس کپ میں چاہئے ڈالنے لگی۔ وہ درحقیقت ایک ویکسوم بگ تھا اور بین ڈبانے پر اس کی ٹوٹی سے چاہئے کپ میں خلل ہونے لگی تھی۔ چاہئے سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور اس کی سنووی منک کمرے میں پھیل گئی تھی۔ مجھے چاہئے کافی وغیرہ کا درحقیقت کوئی شوق نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کوئی خاص طلبہ ہوتی تھی۔ میں اچھی سے اچھی اور بڑی سے بڑی چاہئے صلی شکل کے طور پر لی لیتا تھا۔

ٹٹلی نے ایک کپ بھر کر میری طرف بڑھایا پھر اسی ویکسوم بگ میں سے دسیاے دو سرا کپ بھر کر جانو کو پیش کیا۔ کپ دینے سے پہلے اس نے جانو کو سہارا دے کر زور اور کیا تاکہ وہ گاؤ ٹکیوں کے سادے بیٹھے لیکن وہ صحیح طور پر بگ لگا کر بیٹھے کے قابل بھی نہیں تھا تاہم کسی حد تک اس پوزیشن میں آگیا کہ چاہئے لی سکے۔

ٹٹلی نے ایک ڈبے سے بکٹ بھی ایک پلیٹ میں نکال کر تپائی پر میرے سامنے رکھ دیے اور جانو میرے مچرنے میری مطوعات میں اضافہ کیا "یہ ہالینڈ کے بکٹ ہیں۔ تم نے بے شک دنیا بھر کی ہوئی شاید ہالینڈ بھی کئے ہو گے لیکن یہ بکٹ تمہیں ہالینڈ میں بھی نہیں ملے ہوں گے۔"

میں اسے ہانا چاہتا تھا کہ میں اتنا فارغ البال بھی نہیں تھا کہ ہالینڈ جانا تو وہاں کسی مخصوص رانڈ کے بکٹ تلاش کرنا پڑتا لیکن اغلا تا مجھے ایسی کوئی بات کرنے کے بجائے تو نوزی ہی مرغوبیت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ مروت بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید جانو میرے مچرنے کی انہی لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی ہر چیز کے بارے میں یہ بتانے کا پکیلیکس ہوتا ہے کہ یہ فلاں بگ کی ہے۔ یہ فلاں بگ سے آئی ہے۔ یہ خاص طور پر ان کے لئے بنائی گئی ہے بلکہ بعض لوگ تو اپنے تن پر موجود کپڑے کے بارے میں بھی سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ یہ اتنے دھپے کڑ کا ہے انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ ان کے وجود پر خراج دے گا یا نہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ کپڑا منگا ہے تو وہ ضرور اس میں خوب صورت نظر آ رہے ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسے لوگوں کا دل رکھنے کی خاطر مرغوب نظر آتا ہے۔

میں نے اس وقت تک کپ ہونٹوں سے نہیں لگایا جب تک جانو کوئی چسکیاں لیتے نہیں دیکھ لیا۔ وہ اطمینان سے چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے انداز سے کسی قسم کی استیلا پسندی ظاہر نہیں

# بازی

ایم اے راحت

کے ایڈووکیٹ قلم

ایک شاہکار ناول

چار حصوں میں

مکمل سیٹ -/280 روپے

اردو بازار لاہور

ہوری تھی اس لئے میں نے بھی دیر سے دیر سے چائے بنا شروع کر دی۔ چائے ابھی معلوم ہوئی تھی لیکن میں چونکہ چائے نوشی کا کوئی خاص ذوق نہیں رکھتا تھا اس لئے اس کی کوئی خاص ترقیف نہیں کر سکا۔ ویسے بھی میں یہاں چائے نوشی کے لئے نہیں آیا تھا۔ میرا ذہن فوری میں اٹکا ہوا تھا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بوز صاف مجھے فوری کا آنا چاہتا تھا تھا لیکن میں فوری سے اس کے قتل کی فوجیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسی لئے میں یہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھا کہ اس سے فوری کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کچھ کاغذ میں استعمال کر کے دیکھ چکا تھا۔ اس کا مجھے کوئی اثر نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے ابتدا میں اپنے آپ کو فوری کا دوست ظاہر کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ تو بالکل ہی ناکام رہی تھی لیکن یہ اب فوری کے کوئی خاص بہرہ بھی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ورنہ شاید ان کا رویہ مجھ سے اتنا اچھا نہ ہوتا۔ وہ مجھے اس کا دشمن سمجھ کر کھٹک جاتے۔ یا پھر شاید وہ بھی ابھی اُنہیں میں تھے۔ فیصلہ یہ کیا ہے تھے کہ میں فوری کا دوست تھا یا دشمن؟

میں نے چنبیلی کی طرف دیکھا ”تم چائے نہیں پی رہی؟“

”میں چائے بالکل نہیں پیتی۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اب اس کے چہرے پر اس شرمیلی اور نظروں میں اس آواز کی کا ن تک نہیں تھا جو میں نے رستوران میں موجودگی کے دوران ہی سنی تھی۔

بالو اپنا کپ تقریباً ایک چوتھائی خالی کرنے کے بعد مگ کپ سے انداز میں بولا ”افضل صاحب! میں نے سنا ہے کہ آپ کے راجی چلے ہیں۔“

”میں بالکل چلے تو ہیں۔“ میں نے اس کی تردید کرنا مناسب سمجھا۔ کہنت اگر تھ خالے میں بیٹھ کر اتنا پختہ ہو سکتا تھا تو کمر ٹکل کر نہ جائے کیا غضب اُٹھاتا۔

”میرے فیملی کے اصل لائن بھی مایہ گیری تھی۔“ اس نے جھنجھکی میری اولاد کے زمانے میں ہمارے خاندان سے یہ کام لیا ہے۔“ چہرہ مجھے بتانے لگا کہ زرار کے ذریعے خشک میں باسنا کیل پڑا ہوا پتہ تھے۔ مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا یہ کوئی خاندانی کام نہیں تھا اور نہ ہی میں اس کی عمرانی تھا۔ میں تو بس اس میں ایک طرح کا ناخوش تھا۔ میری یہ ذیلی ایسے حسابات میں کچھ منافع جمع کر رہی تھی۔ اور میں بس اُنہیں جانے کیلئے کچھ کتابا۔ میرا دھیان اب اس کی باتوں سے بٹھا تھا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میں نے یہاں اگر نہ منافع کیا تھا۔ خواہ تو وہ اپنے آپ کو ابھارنا تھا۔ میں نے سکے ذرا بڑے گھونٹ میرے شروع کئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ جلد از جلد اس بوز سے جان بچانے کی کوشش کرنی

دو گنا میں چٹکا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا ”افضل صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے زرار صرف خشک میں ہی استعمال ہو رہے ہیں کسی اور کام میں نہیں؟“

”ہاں مجھے یقین ہے۔ لیکن آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”غیر حاضر بالکل کے زرار بعض اوقات دوسرے کاموں میں بھی استعمال ہوتے دیکھتے ہیں۔ بالکل کو پتا بھی نہیں ہوتا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کا اصل بزنس اور ہیڈ آفس لاہور میں ہے۔ آپ خود بھی زیادہ تر وہیں رہتے ہیں۔ اس صورت میں آپ کو اپنے زراروں کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ بشرطیکہ آپ خود دوسرے کاموں میں دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔“

”میں نہیں میں کسی دوسرے کام میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ میں خشک میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ وہ تو بس کچھ وقت ایسا تھا کہ میں نے اس شے میں انٹرنسٹ کر لی تھی۔ میری حیثیت اب بھی تقریباً انویسٹر کی ہے لیکن مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ میرے کون سے بزنس میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا جو ریزرو فنڈ ڈائریکٹر یہاں میرے تمام بزنس کو دیکھتا ہے اس کے ہوتے ہوئے میرے کسی شے میں کوئی کمزوری نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مجھے خود دوسرے کاموں کا کوئی شوق ہے۔ میرے پاس سو بڑے راستوں سے جو کچھ آ رہا ہے وہی میری ضروریات سے نہیں زیادہ ہے۔ میں اسے سنبھال نہیں پاتا۔ مجھے نیز سے راستوں کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟“

میرے قابو میں نہیں تھے۔ میں نے جب سے گمن نکال کر ہاتھ اوجھا  
کیا تو احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کچھ تھی اور معمولی وزن کا  
پہلے مجھے مشین گمن سے زیادہ وزنی محسوس ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں جانور کا نشانہ لے پانا، چینیلی نے چھٹی  
کلائی پر ہاتھ مارا۔ اس کا نشانہ میرے شل ہوتے ہوئے ذہن کو  
بھی حیران کرنے کے لئے کافی تھا۔ اُن پرانہ اور خاندان بدوش سی نظر  
آنے والی وہ عورت یقیناً کرائے کی ماہر تھی۔

مشین پہلے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ماربل کے فرش پر گرا  
اور پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔ چینیلی مجھ پر دو سرا وار کرنے کے لئے  
ایک خاص پوز میں کھڑی تھی جس طرح جوڑو کرائے کے کلائی  
نمائندگی متاوازن کے دوران کرتے ہوتے ہیں۔ میرا بازو میرے پلو  
میں جھول گیا تھا۔ مجھے اپنی کلائی میں صرف ہلکی سی جھنجھٹاہٹ  
محسوس ہوئی تھی۔ ذہن کے ساتھ ساتھ گویا جسم بھی تیزی سے چل  
ہو رہا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے حواس پر قابو پانے اور اندازے کو  
ذہن سے دور رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔ اپنی تمام تر قوت  
ارادی کو کسی ایک ناہیدہ نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے  
میں اپنی دانست میں خاصی تیزی سے اٹھا۔ مجھے صحیح طور پر کچھ نظر  
نہیں آ رہا تھا لیکن یہ احساس تھا کہ چینیلی مجھے اٹھنے دیکھ کر کرائے  
کا دو سرا وار کرے گی۔

میں نے اس کا ہاتھ حرکت میں آتے دیکھا تو جھکا کر دینے  
ہوئے اسے کرائے کا جوابی ہاتھ رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں  
خاطر خواہ انداز میں وار نہیں کر سکا اور نہ ہی اس وقت مجھے اپنے  
جسم میں وہ قوت محسوس ہو رہی تھی جو مجھے طاقتور ترین انسانوں کے  
ساتھ بے خوفی سے بجڑ جانے کا حوصلہ دیتی تھی تاہم یہی اس  
کوشش کا ایک ناقہ ضرور ہوا کہ میں چینیلی کے وار سے بچا گیا اور وہ  
میرا چپتا ہوا سا ہاتھ پڑنے پر بھی دور جا گری۔

میں کرسی کا سارا لیٹے ہوئے اٹھا اور جانور میرے جری طرف  
گھوما۔ مجھے اس کی شل وحشی اور زری طرح کی نظر آئی لیکن اس  
کے ہاتھ میں موجود بد صورت سی گمن صاف دکھائی دی جس کا لہجہ  
میری طرف تھا۔ میں اُچھل کر اس پر گرا جا رہا تھا لیکن میں نے  
اپنے آپ کو باز رکھا۔

میں جب چینیلی کی رہنمائی میں اس ہوٹل کے - غارے میں  
آنے کے لئے روانہ ہوا تو باغ و بس آؤمیں سے حوا متاقل  
کرتے کے لئے بھی تیار تھا لیکن اس طرح کی صورت حال کی مجھے  
وقع نہیں تھی۔ میں نے ڈوبے ذہن سے فیصلہ کیا کہ مجھے چینیلی اور  
جانور سے اچھے کے بجائے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے  
تھی۔

میرے جسم سے توانائی یوں ختم ہو رہی تھی جیسے وہ بیحد تیزی  
سے ڈاکٹان ہونے پر کوئی لب بچ رہا ہو۔ میں آنکھیں چاڑھا کر آیا

”کپ پہلے آؤں ہیں جو اپنی دولت کو اپنے لئے کافی قرار دے  
رہے ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں تو مجھے دولت کا چمکا لگ جائے اسے  
قانون کے شرعے بھی مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔“  
جانور مسکرایا۔

”یہ ایک بنیادی ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں۔ خدا کا شکر  
ہے میں اس بنیادی میں جھلا نہیں ہوں۔“ میں نے کپ تالی کر کے  
رکھتے ہوئے کہا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ میں کچھ ست ہڑا ہوا تھا۔ شاید صورت کی  
وجہ سے ایسا ہو رہا تھا۔ میں یہاں اپنی مشکوک کرنے نہیں آیا تھا۔  
مجھی جانور میرے بحر کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر نوڑی کے تصور سے  
اپنا لوگوں کے کی کوشش کی۔ میرے ہاتھ اس شخص کی گردن تک  
پہنچنے کے لئے بے چین تھے۔

میں نے ایک بار پھر جانور کو اس موضوع پر لانے کی کوشش کی  
لیکن آپ میری قوی دست بھی رہنمائی نہیں کر سکتے کہ نوڑی کہاں  
مل سکتا ہے؟ میرا خیال ہے وہ اس جزیرے پر ہی کہیں موجود  
ہے۔“

”مگر وہ جزیرے پر ہی موجود ہے تو جلد یا بدیر اس کے بارے  
میں کوئی نہ کوئی اطلاع آنے لگے گی لیکن میں محسوس ہے وہ خود آجائے۔  
ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آپ جیسے لوگ ہم جیسے گنہگار اور معمولی  
لوگوں کے پاس دو روز تو نہیں آتے۔ کپ شب ہو رہی ہے۔ لطف  
آ رہا ہے۔“

لطف شاید اسے آ رہا تھا۔ مجھے ہرگز نہیں آ رہا تھا۔ میرا سونے  
کوئی چاہ رہا تھا جو میرے لئے بھی حیرت کی بات تھی۔ میں تو خاص  
حالات میں دو تین دن اور راتیں سوئے بغیر آسانی سے گزار سکتا  
تھا۔ یہ اچانک اتنی نیند کہاں سے آئی تھی؟ ہاتھ بیروں میں ایک  
جھپ سی سنسنی محسوس ہو رہی تھی لیکن میرا ذہن یہ ماننے کے  
لئے تیار نہیں تھا کہ مجھے چائے میں کچھ ملا کر دیا گیا تھا۔

میں نے چینیلی پر نظر رکھی تھی کہ وہ ہاتھ کی صفائی نہ دکھانے  
پائے اور آس نے کوئی مشکوک حرکت بھی نہیں کی تھی۔ چائے پنی  
پانی تھی اور وہ یکدم بگ ایک ہی تھا۔ اسی میں سے جانور میرے  
چائے پی تھی اور مجھ سے بھی پہلے ختم کی تھی لیکن وہ اسی طرح  
مستعد بیٹھا تھا جبکہ وہ عمر رسیدہ اور مرعش تھا۔

اچانک ہی مجھے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا اور آنکھوں کے  
سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہوا  
ضرور تھا۔ کس طرح ہوا تھا؟ احوال یہ سوال زیادہ اہم نہیں تھا۔  
پہلے اپنا بچاؤ کرنا زیادہ ضروری تھا۔ جانور نے وہ حقیقت اب تک  
مجھے باتوں میں لگا ہوا تھا۔

میں نے تیزی سے جب میں ہاتھ ڈالا لیکن مجھے خود بھی  
احساس ہوا کہ میں جسے تیزی سمجھ رہا تھا وہ درحقیقت سلوموشن  
تھا۔ میری پھرئی کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے اپنے ہاتھ پاؤں گویا

# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                  |
|-------|------------------|
| 125/- | صلیب و حرم       |
| 150/- | نیشاپور کا شاہین |
| 150/- | باہل کابٹ شکن    |
| 175/- | طلسم کدہ         |
| 150/- | آتش فشال         |
| 200/- | آخری حصار        |
| 125/- | بنت نیل          |
| 150/- | سامیرا کا طوفان  |
| 150/- | آتش و آہن        |
| 150/- | ظلمات            |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ہزاروں اڑے کی طرف لپکا۔ کسی بھی لمحے مجھے اپنے عقب میں قاز  
کا دھماکا سنائی دینے کی توقع تھی لیکن میں نے اس معاملے میں اپنے  
آپ کو تسلیہ نہ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں غیر ارادی طور  
پر اڑھراؤ میں مبتلا رہا تھا شاید اس لئے کوئی سے بچ جاؤں۔

میں کمرے کے دروازے سے نکلے میں کامیاب ہو گیا اور کوئی  
گولی میرے جسم میں پڑت نہیں ہوئی۔ قاز کے دھماکے کے  
بجائے میرے عقب میں جانو کا قہقہہ گونجا۔ مارٹل کی دیواروں کے  
درمیان اس طرح اس قسم کی بازگشت سنائی دی جس طرح کنوئیں  
میں سنائی دیتی ہے۔

”واہیں آجائز افضل فیض آباد ایس آجائز۔ تمہیں کچھ نہیں کما  
جائے گا۔“ جانو کی آواز گویا مجھے مدت دور سے سنائی دی۔

میں اندھوں کی طرح کرتا بڑا گیت کی طرف بڑھا چلا گیا۔  
حالانکہ مجھے احساس تھا کہ جانو کسی بھی لمحے مجھے روکنے کے لیے  
گولی چلا سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے گولی کی فضا پروا  
نہیں تھی۔ جانو نے گولی نہیں چلائی اور جب میں گیت تک پہنچا تو  
مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔

گیت بند تھا۔ اور یہ بات یقیناً جانو کو معلوم تھی اسی لیے وہ  
اپنے بستر پر اپنے اطہمینان سے بیٹھا تھا۔ شاید اس سے آگے  
وہ سرگیت بھی بند ہو چکا ہو۔ جب میں جانو اور چینی کی کپاس بیٹھا  
تھا تو گیت بند ہونے کی کوئی تواڑ سنائی نہیں دی تھی۔

میں نے اپنے نیم ٹرہہ احوال سے گیت کو دھکیلنے کی کوشش کی  
لیکن اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ میری ٹانگوں میں اب  
میرا وزن اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ٹانگیں خود بخود ہری  
ہوئی چلی گئیں۔ میرے ہاتھ گیت پر پھسلے ہوئے بیٹھے آگئے۔

چند سیکنڈ بعد میں نے اپنے آپ کو کھنکھوں کے بل بیٹھے پایا۔  
میرا وزن اس وقت گویا ایک برف پوش چٹان بن چکا تھا جس پر  
ٹھکی سے مزید برف جمی جا رہی تھی۔ میں نے بہت سرجھٹکا اپنی  
فست ارادی کو کام میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن ایسی کوئی  
کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ ذہن بدستور شل رہا اور اندھیرے میں  
بٹھا چلا گیا۔ میں گیت کا سارا لے کر بھی نہ اٹھ سکا۔ میری گردن  
تو بخود جھکتی چلی جا رہی تھی حتیٰ کہ میری ٹھوڑی تقریباً سینے سے  
بالگ۔ مجھے گویا کسی خیز آہی تھی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے دونوں بازو پکڑ کر مجھے اٹھایا  
ابا تھا۔ میرے پٹوں کے ساتھ گویا کسی نے بہت بھاری وزن  
لٹھ کر لٹکا دیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے آنکھیں ذرا کھول کر اور  
وڑرا اور اٹھا کر کھینچنے کی کوشش کی۔

چینی اور جانو میرے دائیں بائیں موجود تھے۔ وہ میری مٹھوں  
ساتھ دے کر مجھے اٹھا رہے تھے۔ جانو بالکل صحیح طریقے سے  
پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا تھا۔ وہی جانو جو چند لمحے پہلے بستر پر دراز  
اور جس کے بارے میں چینی نے مجھے بتایا تھا کہ برسوں پہلے وہ

مادے میں مخدور ہو کر صاحب فراش تھا۔ مجھے اس کا چومت  
مُحند لا کھائی دے رہا تھا پھر بھی میں اس کے ہونٹوں پر شکر اہٹ  
دیکھ سکتا تھا۔

پھر مجھے خفیف سا احساس ہوا کہ کوئی میرے چہرے پر ہاتھ  
پھیر رہا تھا۔ چو گویا میں ہو چکا تھا۔ مجھے نہایت مہملی سا لمس  
محسوس ہوا تھا۔ میں نے گردن ذرا اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ چینی  
تھی جو میرے چہرے پر مشتعل انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ  
رہی تھی ”کھان جا رہے ہو میرے چاند! چو اندر چلو۔ تم جیسے  
لوگ یہاں روز روز تو نہیں آتے۔ ہم نے تو تمہارا قہقہہ تم بے شہ  
ذور ہو۔ بڑے ہو شیاہ۔ بڑے پکڑتے ہو۔ آؤی بھی بہت ہیں  
تمہارے پاس۔“ تمہیں قہقہہ کا شیر کو قابو میں کرنے کے برابر

ہے۔ لیکن تم تو جوانی کی طرح ہمارے ہاتھ آگئے۔

اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ مشکل سنائی دے رہی تھی۔ میرا ناکارہ ذہن اس وقت بھی صرف ایک ہی سوال میں پھنسا ہوا تھا۔ میں وہ سوال اس سے کرنا چاہتا تھا مگر میری زبان گھبرا کر کھڑکی کی ہو گئی تھی۔ میں نے یہ مشکل اسے حرکت دی۔ ”تم نے۔ چاہے میں جو کچھ ملایا۔ وہ کیسے ملایا؟“ مجھے چنبیلی کی یہی بہت دور کی بازگشت کی طرح سنائی دی۔ وہ شاید جانو سے غائب ہوئی ۳۳ اس حالت میں بھی اس شخص کو سوال کرنے کی سوجھ رہی ہے۔

جانو شاید مجھے اس کی مدد میں آواز سنائی دی۔ یہ ایک طاقتور ذہن کی نشانی ہے۔

چنبیلی نے شاید مجھ پر رحم کھاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دے دیا ۳۳ اس طرح کے شہدے ہماری جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ میں نے چاہے میں کچھ نہیں ملایا تھا۔ پہلے ہی سے ملایا ہوا تھا۔ قہر محسوس میں دوڑتی تھی۔ اندر سے وہ حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک ٹھنڈے دبانے سے ایک حصے سے چاہے تھپی ہے۔ دوسرا ٹھنڈے دبانے سے دوسرے حصے سے۔ دونوں ٹھنڈے ساتھ ساتھ ہیں۔ لیکن میں نے محسوس اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اب کہیں پوچھ رہے ہو؟ کیا ناکارہ؟

میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور نہ ہی کوئی جواب دینے کے قابل تھا۔ اس کی آواز بھی گم ہے۔ لمحہ دور ہوئی جا رہی تھی۔ آخری احساس مجھے بس یہ ہوا کہ وہ مجھے گھسیٹ کر واپس لے جا رہے تھے۔ اس کے بعد میرے ذہن کا قطعہ مدھم پڑنے پڑنے پلاٹا خرچ ہو گیا اور میرے حواس پر مکمل تاریکی چھا گئی۔

مطمون نہیں کتنی دیر میں دنیا باہینا سے بے خبر رہا پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے پونے حرکت کر رہے تھے اور مجھے ان کو حرکت دینے میں کوئی خاص دشواری بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کئی بار آنکھیں بند کیں اور کھولیں لیکن میرے ارد گرد چھائی ہوئی تاریکی دور نہ ہوئی۔

پہلے تو اس اندیشے سے میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ شاید میری چھائی چلی گئی تھی۔ میں نے بے اختیار آنکھیں کھلنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دی اور اس احساس سے مجھے کچھ خوشی ہوئی کہ ہاتھ آزاد بھی تھے اور حرکت بھی کر رہے تھے۔ گوکہ ذہن اور جسم پر کچھ ایسا بوجھل پن ضرور طاری تھا جیسے بہت زیادہ لی پلا کے سونے کے بعد بیدار ہوتے وقت محسوس ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت اس کیفیت سے تو لاکھ درجے بہتر تھی جو بے ہوش ہونے سے پہلے تھی۔

میں نے ہاتھوں کو حرکت دی تو انہیں بھی آزاد پایا۔ اب تو میرے دل میں باقاعدہ گدگدائی ہوئی تھی۔ کیا واقعی قدرت مجھ پر اتنی مہربان تھی یا میں عالم بے ہوشی میں ہی کوئی خواب دیکھ رہا

تھا؟ اس دور ان میں آنکھیں مل چکا تھا اور مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے ارد گرد چنبیلی ہوئی تاریکی اتنی گہری بھی نہیں تھی جتنی پہلے محسوس ہوئی تھی۔ وہ گھبراہٹ جیسا تھا اور ایک طرف کچھ بھڑکائی سے روشنی کی باریک سی ٹیکرس اندر آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میری نظر کام کر رہی تھی لیکن میں کہیں تاریکی میں پڑا تھا۔

میں نے ہاتھ پیروں کو ڈرا اور ابھی طرح ہلا جلا کر دکھائے۔ اپنے آپ کو تقریباً ٹھیک محسوس کر رہا تھا جس پر مجھے حیرت تھی۔ کیا دوڑا کے اثرات اتنی جلدی دور ہو گئے تھے؟ مجھے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا تاہم یہ کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ ہوش میں آنے یا بیدار ہونے پر کوئی بھی صحیح طور پر نہیں چٹا سکتا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش یا سو رہا۔ میں نے گھڑی دیکھ کر اندازہ کرنا چاہا تو اپنی قیمتی گھڑی کھائی سے غائب پائی۔

میں اس کی سے اٹھ بیٹھا۔ اندر میرے میں آنکھیں مجازاً بھاڑ کر میں نے اوپر اوپر دیکھنے کی کوشش کی۔ اب میں کلائی بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک ٹنگ سی کوٹھری تھی۔ یہ خانہ ٹائپ ہی معلوم ہوئی تھی لیکن یہ جگہ ویسی صاف تھی کہ میں محسوس نہیں تھا جیسا جانو کے ہونگے خانہ تھا۔ یہاں سیلن اور عرسے سے جی رہنے والی مٹی کی بو سوجھ رہی تھی۔

شاید میں خود بھی مٹی میں لتھڑکا تھا۔ میرے ارد گرد دیواروں کے ساتھ کچھ ایسے پھیلے اوپر تلے رکھے تھے جیسے آٹے کے ہونے ہیں لیکن وہ بیٹھا آٹے کے نہیں تھے۔ کچھ کاربن اور کھڑکی کی پینیاں بھی تھیں۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ وہاں پٹرول کے کچھ جہل بھی موجود تھے۔ نہ جانے وہ وہاں کس مقصد کے لیے رکھے گئے تھے!

مجھے بھی شاید کسی بوری یا پھیلے کی طرح کہیں گھسیٹا گیا تھا اور پھر یہاں لاکر پینچا گیا تھا۔ کئی جگہ سے میری ہڈیاں دکھ دیا تھیں۔ کہیں کہیں سے جسم چلا چلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی قناعت دور کرنے کے لیے پہلے سانس کی مشقوں کے ذریعے اپنی توانائی بحال کی پھر اٹھ کر کوٹھری کے دو دروازے پر جانے کا ارادہ کیا کہ ہاتھوں کو ٹھیک کر رہا گیا۔

باہر کچھ ایسی آواز سنائی دی تھی جیسے کسی نے دیا سنائی دوش کی ہو۔ میں ایک لمبے کے لیے اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔ باہر جب مزید کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں دسے قدموں دو دروازے تک پہنچا اور ایک جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔

دو دروازے کے عین سامنے ٹنگ سی ایک سیدھی گلی تھی جس کے اختتام پر بیڑیاں اوپر جالی دکھائی دے رہی تھیں۔ ریلواری ٹھاس گلی کی چمٹ میں پڑا سا ایک بلب لٹکا ہوا تھا جو کدو اور زرد روشنی دے رہا تھا۔ اس گلی میں دو دروازے سے زراعتی اسٹول پر ایک شخص دیوار سے ٹنگ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے اوٹوں میں سرگت دہلی ہوئی تھی۔ ایک لمبے بیٹھے اس نے



ماجس کی تل جلا کر سرگٹ لٹکائی تھی۔ اس کے کندھے پر  
کا شتوف موجود تھی۔ یہ بھی اچھائی ہوا تھا کہ میں نے ہوش میں  
آنے کے بعد تارا لٹکی میں کوئی آواز نہیں لگائی تھی اور نہ ہی کسی  
چیز کو چھو کر گھڑی کی تھی ورنہ اسے یقیناً علم ہو جاتا کہ میں ہوش میں  
آچکا تھا۔ قدرت نے مجھے بھٹکنے کا جو موقع فراہم کیا تھا وہ میرے  
ہاتھ سے نکل جاتا۔

میں نے جھری سے حتی الامکان صحیح طور پر اس شخص کا جائزہ  
لینے کی کوشش کی۔ وہ مضبوط اور دراز قد نوجوان تھا۔ سیاہ شلوار  
قیس میں تھا۔ میں اس کا چوہ صرف ایک سائز سے دیکھ سکتا تھا  
لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے ہی کسی خیال میں مگن جیسا تھا اور  
بڑے سرور انداز میں سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

میں ابھی یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا تھا یا پر  
سے کھڑکی تالا وغیرہ لگا ہوا ہے۔ میں دروازے کو زیادہ ہلا جلا کر بھی  
نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر نوجوان ذرا سا بھی لٹکا من لیتا تو فوراً ہوشیار  
ہو سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا ل جائے تو اسے قاپو میں  
کر لے کی کوئی تدبیر کی جائے۔

میں ابھی اسی پکرش میں تھا کہ بیڑھیوں پر کسی کے دونی قدموں  
کی آواز سنائی دی۔ کوئی دھم دھم کرنا لگے آ رہا تھا۔ میں نے  
دروازے کو بے آواز طریقے سے ہلانے چلانے کی کوششیں ترک  
کر دیں اور اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

بیڑھیوں سے ایک ہماری بھرم شخص آتا دکھائی دیا۔ اس  
کے کندھے پر بھی کا شتوف بھول رہی تھی۔ وہ نیم نیم مرد تھا  
لیکن جھل قفل کرتے جسم کا نہیں تھا۔ گینڈے کی طرح مضبوط نظر  
آ رہا تھا۔ وہ بھی گمرے رنگ کی شلوار قیس میں تھا۔ گلے میں منظر  
تھا۔ وہ دروازے کی عمر کا تھا۔

اس نے دوسری سے اُکڑے اُکڑے لیے میں نوجوان سے  
پوچھا ”اڑے۔ تو نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تھے؟“

”میں کیسے باندھا؟ میرے پاس رتی نہیں تھی“ نوجوان نے  
دوسرے بے زبانی سے جواب دیا۔ اسے نہ جانے کن خیالات کی  
جائے باہر آتا رہا تھا۔ اس پر خوش نہیں تھا۔  
نیم نیم شخص نے اسے ایک موٹی سی گالی دی اور غصیلے لیے  
لو لولا ”اڑے۔ رتی نہیں تھی تو کسی کو بول دیتا۔“ منکوا لیتا۔  
صرف رتی نہ ہونے کی وجہ سے تو نے اس کو دیسے ہی چھوڑ رکھا  
ہے۔

”میں کس کو بولتا؟ سب تو اوپر چلے گئے تھے“ نوجوان نے  
اب دیا۔

”اے تو خود اوپر آ جاتا“ نیم نیم شخص فرمایا۔  
”مجھے جاننے علم رہا تھا کہ میں اوپر سے نہ ہوں“ نوجوان  
نوجوان پیش کیا۔

موٹے لے جانو کہ بھی اس کی عدم موجودگی میں ایک موٹی سی

**سلسلہ اِمام**  
جائزہ فی حق  
ماقبلین کی پُرکشم اداس

موت کے سوداگر کے خالق  
اقلیم علیم کے پراسرار قلم سے لکھی گئی  
ایک سلسلہ وار پراسرار اور ایڈونچر کہانی جس  
نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کیے۔  
کہانی شکل میں شائع ہو گئی ہے۔

ناشر:  
مکتبہ القریش  
جلد اول: ۵۰ روپے  
جلد دوم: ۵۰ روپے  
اردو بازار لاہور  
فون: ۷۲۲۳۷۶۱۵

وہ نوجوان کی طرف اُچھال دیا اور واپس کے لیے مڑے ہوئے بولا  
 ”ذرا اچھی طرح یاد رکھنا۔ سنا ہے آدمی خطرناک ہے۔“  
 ”تم بھی ذرا میرے ساتھ آجنا۔“ نوجوان اٹھتے ہوئے بولا  
 ”ایک سے دو بھلے رہیں گے کام بھی اچھا ہو جائے گا۔“  
 ”تمہارے خیال میں مجھے اور کوئی کام نہیں ہے؟“ موٹا ڈرا کر  
 کر بولا۔

”اس میں کون سی دیر لگے گی یا را“ نوجوان ذرا صحت سے  
 بولا۔ کینٹ میرے کام کو مشکل بناتا تھا۔ آخر موٹا گویا باہل  
 تاخراست اس کے ساتھ کوٹھری کی طرف بڑھا۔

میں نے جلدی سے لڑوہر اوپر نظر دوڑائی۔ یوں تو مجھے بھروسا  
 تھا کہ نوجوان کی کوٹھری پر میرا کرائے کا ایک بھروسہ دار بھی کارگر  
 ثابت ہو سکتا تھا لیکن میں ذرا سبھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا  
 اور خطرہ بہر حال بڑھ چکا تھا کیونکہ وہ ایک سے دو ہو چکے تھے۔  
 ہماری بھرم فتن نوجوان کے مقابلے میں زیادہ خطرناک معلوم  
 ہوتا تھا۔

مجھے ایک کونے میں شراب کی دو تین خالی بوتلیں بڑی نظر  
 آئیں۔ دو آڑے تھے۔ ایک پوری بوتل تھی۔ میں نے پکڑ لی تھی۔ وہ  
 اٹھالی اور دروازے کے ساتھ ہی دو آڑے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ  
 دونوں آگے پیچھے آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پہلے نوجوان  
 ہی کو ٹھری میں داخل ہو گا۔

جو کسی باہر سے دروازے کا پوٹ ہٹا دیا اور ایک ہونے لے  
 کوٹھری میں قدم رکھا۔ میں نے اس کے سر پر پوری قوت سے پوٹ  
 رسید کی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس ضرب کے بعد اس کے ذمہ رہنے  
 کا امکان بہت کم تھا لیکن میں نے اس وار کا نتیجہ دیکھنے میں ایک  
 لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اس کے پیچھے آتے ہوئے نیم خیم فتن  
 کے پیٹ پر ایک زوردار لٹا رسید کی۔

میرا خیال تھا کہ وہ اٹ کر پیچھے جا کرے گا لیکن وہ کسی  
 گینڈے سے کم نہیں تھا۔ جھٹ لکڑا کر رو گیا۔ تاہم میرے لیے اتنا  
 بھی کافی تھا۔ میں نے اس پر چلا ٹک لگائی۔ ہم دونوں کو ٹھری کے  
 دروازے سے باہر نکال دیں۔

گرتے کرتے اس نے کلا مشکوف کندھے سے اُٹارنا چاہی تھی  
 لیکن وہ اس کے اپنے وزنی وجوہ کے نیچے دب کر رہ گئی۔ اس نے  
 مجھے اُچھال کر اپنے اوپر سے چھیننے کی کوشش کی لیکن میں اب اپنا  
 زخموں بھی نہیں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ  
 اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلے پائے کیونکہ ابھی مجھے یہ علم  
 نہیں تھا کہ کتنے فاصلے پر کتنے لوگ موجود تھے۔ اگر اس پاس کہیں  
 کچھ لوگ موجود تھے اور انہیں اندازہ ہو جاتا کہ مجھے کچھ گڑبڑ  
 میری یہ جدوجہد بے کام مل جاتی۔

میں نے مونے پر چلا ٹک لگاتے ہی اس کی گردن کھنکے  
 نیچے دبا لی تھی۔ نوجوان کو بھی بے ہوش ہونے یا مرنے سے پہلے

کالی سے نوازا اور برہمی سے بولا ”تم لوگوں میں عقل تمام کی کوئی چیز  
 تو ہے ہی نہیں۔“

نوجوان ناگوار سے بولا ”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات  
 ہے۔ جانوئے کما تھا! ابھی وہ دیر تک ہوش میں نہیں آئے گا۔“

”ہاں۔ جانو کو تو غیب کی باتوں کا بھی پتا ہوتا ہے۔“ موٹا  
 بدستور غصے سے بولا ”اُسے پاگل کے بیٹے! احتیاط بھی کوئی چیز ہوتی  
 ہے۔ میں رتی لے کر آتا ہوں۔“ وہ واپس کے لیے مڑا۔

نوجوان چپکپاتے ہوئے بولا ”اب اتنی تکلیف اٹھانے کی کیا  
 ضرورت ہے؟ دو چار منٹ بعد تو اس کو اٹھا کر اوپر لے کر چلنا ہے۔“  
 پھر تو اس کو پچھلے لے ہی کھانا ہے۔“

”جھانکنا۔ تو تمہارے خیال میں اب اس کے ہاتھ پاؤں  
 باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی؟ تم چاہتے ہو کہ جب ہم اس کو  
 سمندر میں پھینکیں تو اسے ہوش آجائے اور وہ آرام سے ہاتھ پاؤں  
 باہر کر اوپر آجائے اور تیرتا ہو اس کی کتابے پہنچ کر مھر چلا جائے؟“  
 ”کوہ کا کہیں کیا۔“

”سنا میں تو کہہ رہے تھے اس دفعہ نیا طریقہ اختیار کریں گے۔  
 اس کو سینٹ کے پائپ میں ڈالیں گے۔ پائپ کو دونوں طرف سے  
 بند کریں گے پھر سمندر میں پھینکیں گے۔“ نوجوان کو جیسے یاد آیا  
 ”وہ چاہتے ہیں کافی عرصے تک کسی کو اس کی ہڈی بھی نہ مل سکے۔  
 میرا خیال ہے۔ ایسی پینک کے بعد تو اسے پچھلیاں بھی نہیں  
 کھا سکیں گی۔“

”ہاتھ پاؤں باندھنے تو پھر بھی ضروری ہیں نا۔ پائپ ٹوٹ بھی  
 سکتا ہے۔ اس کا نہ کل بھی سکتا ہے۔ تم تو زندگی بھر کدھے کے  
 کدھے ہی رہو گے۔ جیسے کبھی عقل نہیں آئے گی۔ پتا نہیں کون  
 جھیں اس طرح کے اہم کاموں میں ملتا ہے۔ جھیں تو ابھی صبح  
 طرح سے جھینے پکڑنے بھی نہیں آئے۔“ وہ واپس میز صوفیوں کی  
 طرف چلا گیا۔

نوجوان ناگوار سے سر جھٹک کر دوبارہ اسٹول پر بیٹھ گیا۔  
 ظاہر تھا یہ بحث مجھ بندہ ناچنے کے بارے میں ہو رہی تھی جو دروازے  
 کے پیچھے کھڑا نہ صرف یہ سارا پروگرام سن رہا تھا بلکہ ان دونوں کو  
 دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ دونوں جب باتوں میں اُٹھے ہوئے تھے تو میں نے  
 دروازے کو بے آواز طریقے سے ذرا ہلا جلا کر اندازہ بھی کر لیا تھا  
 کہ باہر سے اس کا پوٹ چڑھا ہوا تھا۔

دیکھ تو دروازہ پر اتنی ساخت کا اور کمزوری معلوم ہوتا تھا  
 لیکن میں فی الحال اسے اپنے کندھے کی ایک یا دو کندھوں سے  
 توڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ نوجوان کے کندھے پر  
 کلا مشکوف موجود تھی۔ میرے دروازہ توڑ کر نکلنے اور اس تک پہنچنے  
 سے پہلے ہی میرا کام تمام ہو سکتا تھا۔

میں بہرہ سکون سے انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی موٹا لوٹ  
 آیا۔ اس کے ہاتھ میں رتی کا پٹھا تھا۔ دو قدم دور سے ہی اس نے

اوپر بیڑیاں بندرج تارکی میں غم ہو رہی تھیں۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہ بیڑیاں کہاں جا رہی تھیں لیکن مجھے ہر حال ان بھول بھلیوں سے لگنے کی کوشش تو کرنا ہی تھی اس لیے میں اللہ کا نام لے کر دو بے قدموں بیڑیاں چڑھنے لگا۔ کلا شکوف میرے ہاتھ میں تھی اور میں سر اٹھائے مسلسل اوپر دیکھتے ہوئے آہستگی سے ایک ایک بیڑی چڑھ رہا تھا کہ کہیں اوپر سے مجھ پر بھی اسی طرح کوئی قیامت نہ ٹوٹ پڑے جس طرح میں ان دونوں پر ٹوٹ پڑا تھا جو بے ہارے مجھے رسی سے باندھنے آرہے تھے۔

جوں جوں میں اوپر جا رہا تھا اندر میرا گرا ہوتا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ مجھے بیڑیوں کی دیوار میں بلب بھی لگا نظر آیا لیکن میں نے اس کا سوچ غلط کر کے کی کوشش نہیں کی۔ میرے حق میں اندر میرا ہی بچہ تھا جس حد تک دیکھا جا سکا تھا اتنا مجھے اس اندر میرے میں بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے کچھ لوگ رہا تھا جیسے میں کسی بیڑا کی بیڑیاں چڑھ رہا تھا لیکن اس بیڑا میں کہیں سے روشنی نہیں آ رہی تھی۔

بیڑیوں کا اختتام ایک راہداری میں ہوا لیکن ذرا غور سے دیکھتے پر اندازہ ہو تو وہ راہداری نہیں پکڑوں کی ایک بہت بڑی الماری تھی۔ اس وارڈ روم میں دو تین دروازے اور جیم انسان آسانی سے چل پھر سکتے تھے۔ اس میں ایک پائپ پر پچاسوں ڈنگر لگے ہوئے تھے مگر کسی ڈنگر پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ایک طرف جوتوں کے ریک تھے۔ وہ بھی خالی تھے۔ مستطیل کمرے سے مشابہ اس وارڈ روم میں لائٹس بھی موجود تھیں۔ لیکن میں نے انہیں آن نہیں کیا۔

مجھے الماری کا دروازہ بھی جلدی نظر آیا لیکن میں نے اسے بھی ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ جین اسی وقت مجھے کسی کے ہاتھ کر کے کی آواز سنائی دی تھی۔ ہند الماری میں آواز کچھ اسی طرح سنائی دے رہی تھی جیسے بہت دور سے آ رہی ہو لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز دور کی نہیں تھی۔ اس کے بعد بیک وقت کئی افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں جن میں ایک نسوانی آواز بھی شامل تھی جو میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اس پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز یہاں کی مگر سنائی دے رہی تھی پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس میں جرت کی بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ ابھی تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کہاں کھڑا ہوں؟

دارو روم کے دروازے میں کی ہول موجود تھا۔ میں نے اس سے آنکھ لگائی تو الماری کے سامنے دبیز روشنی پر دے جھولنے نظر آئے جو غالباً محبت سے لے کر فرش تک آ رہا تھا۔ تمام یہ پردے الماری کے دروازے کے سامنے شے تھے۔ ان کے درمیان زیادہ روش کا قائلہ نظر آ رہا تھا۔ میرے دیکھنے کے لیے اتنا قائلہ بھی کافی تھا کیونکہ پردے دروازے کے قریب ہی تھے اس لیے اس

شاید یہی محسوس ہوا ہو کہ کوٹھری کا دروازہ کھلتے ہی کوئی بچا ان پر ٹوٹ پڑی تھی اور مومے کو بھی یقیناً کچھ ایسا ہی لگا ہو گا۔ مجھے اسی چیز کا سب سے زیادہ فائدہ پہنچا تھا کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دروازہ کھلتے ہی ان پر کوئی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

مومے کو سمجھنے کا ذرا بھی موقع مل جاتا تو وہ میرے لیے ایک مشکل شکار ثابت ہو سکتا تھا لیکن بے چارہ بے خبری میں مارا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی طرح میرے نیچے سے نکل پاتا میں نے اسی بول سے اس کی کھوپڑی پر بھی وار کیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا۔ بول مضبوط بھی آپ بھی ٹوٹی نہیں تھی۔ میں نے احتیاطاً ایک وار اور کیا۔ مومے کی کھوپڑی لپٹے کے گولے کی طرح مضبوط معلوم ہوئی تھی لیکن وہ یقیناً پھلنے ہی وار میں مڑی طرح پھٹ چکی تھی مگر شاید اس وقت مجھ پر کچھ سفاکی طاری تھی جس نے ایک وار کو کافی نہیں سمجھا تھا۔

کئی سیکنڈ تک جب اس نے جنبش نہ کی تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹھری میں واپس آکر میں نے نوجوان کا جائزہ لیا۔ وہ اندر جا پڑا تھا۔ کوٹھری میں سوچ بورت موجود تھا۔ میں نے سوچ دیا تو ایک سر مل سا پلہ روشن ہو گیا۔ میں نے دیکھا نوجوان کی ناک سے خون کی تیلی کی ٹیگر ہر کر فرش پر پھیل رہی تھی اور کھوپڑی پر جہاں بول لگی تھی وہاں سے بھی خون بہا رہا تھا۔ اس کے آگے سے زیادہ بال خون میں تر ہو چکے تھے۔ اتنی سی دیر میں ہی اس کی آنکھوں کا پتلا حصہ نیلا ہونے لگا تھا۔

میں نے یہ دیکھنے کی دھمت نہیں کی کہ وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ میں مومے کو بھی گھسیٹ کر کوٹھری میں لے آیا۔ میں نے ان دونوں کی تلاش کی کہ شاید ان کے پاس کلا شکوف سے چھوٹی کوئی گن موجود ہو لیکن دونوں کے پاس کلا شکوفوں کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجھوڑا جیسے ایک کلا شکوف ہی اٹھان پڑی گو کہ مجھے معلوم تھا بعض حالات۔ مجھ جیسے آدمی کے لیے کلا شکوف جیسا ہتھیار فائدہ مند ثابت ہونے کے بجائے بوجھ بن جاتا تھا۔

ان دونوں کو کوٹھری میں چھوڑ کر بولٹ چڑھانے کے بعد میں نے گرد پوچھ کا جائزہ لیا۔ کوٹھری کے ایک کونے پر مجھے سیاہ دیوار نظر آئی۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا وہ لوہے کا سیاہ اور پائٹ گیت تھا جو دوسری طرف سے منقل تھا۔ میں نے اسے ہلانے چلانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن تھا دوسری طرف کہیں کسی کو احساس ہو جائے کہ اُدھر کچھ گڑبڑ تھی۔

جس نوجوان اور بچی ہر کے افراد کو میں نے کوٹھری میں چھوڑا تھا۔ ان کی جیبوں سے مجھے کوئی چابی وغیرہ نہیں ملی تھی۔ گویا اب میرے پاس انتخاب کا موقع نہیں تھا۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ نظر آ رہا تھا اور وہ بیڑیاں تھیں۔

میں دیوار سے لگ کر نہایت محتاط انداز میں بیڑیوں تک پہنچا۔ روشنی کی رسائی صرف پچاس بیڑیوں تک تھی۔ اس سے

تھا۔ سوکھا لبا اور کرشیدہ سادہ سیاہ قام شخص جس کی ناک طویل کی چونچ جیسی تھی۔ وہ اب بھی واسکٹ اور دھولے میں تھا اور اس کے بالوں میں آنے کے ذرات نظر آ رہے تھے۔

میرے لیے اس کی موجودگی حیرت کا باعث نہیں تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سیاہ قام کو گناہ اس وقت روانی سے امریکی لمبے میں انگریزی بول رہا تھا اور وہی صدر مجلس معلوم ہو رہا تھا۔ اسی لیے میرے ذہن میں چھٹا کا سا ہوا اور یک لخت مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیا محنت ہوئی تھی۔

مجلس معمولی سی ظاہری تبدیلیوں کی وجہ سے میں نے اس شخص کو پہلی نظر میں نہیں پہچانا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرا ذہن اس وقت نوزی میں پھنسا ہوا تھا ورنہ اتنی سیدھی سی بات میرے ذہن میں آ جانی چاہیے تھی۔

وہ درحقیقت ڈاکٹر برنارڈ تھا۔ جسے وہ اس لیے گناہ بھرا ہوا تھا کہ اسے عالم آباد ہونی نہیں آتی تھی۔ اپنے آپ کو سیاہ قام بنانا اس کے لیے مشکل نہیں رہا ہو گا۔ اس نے کسی رنگ یا کیمیکل کا سہارا لیا ہو گا۔ آگےوں کا رنگ بھی غالباً کنٹیکٹ لینز کی مدد سے بدلا ہوا تھا اور سوپ بھی ایسا دھارنا ہوا تھا کہ اس پر سفید قام ہونے کا تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر افسوس تھا کہ میں نے چند واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ بطور خاص کسی سے خطاب نہیں تھا بلکہ کبھی اس طرح بات کر رہا تھا جیسے کسی بینک سے خطاب کر رہا ہو۔ ہم نے جتنی بھی تکنیکیں اٹھائیں اور ہمیں جتنی بھی برادری کا سامنا کرنا پڑا اس کی سب سے بڑی وجہ یہی شخص ہے۔

پھر اس کا روئے خن غالباً راجیل، شرنیل، تانیا اور ٹانیا کی طرف ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے باپ کو بھی اسی نے قتل کیا تھا۔

یہ یقیناً میرا ہی ذکر خیر ہو رہا تھا۔ دل چاہا آگے بڑھ کر غالب کا مصرع پڑھوں۔

ڈاکٹر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس مصل میں ہے میں نے اپنے آپ کو اس حرکت سے باز رکھا۔ بغیر سوچے سمجھے کرے میں کس کرشمے کا خیر چاہا غالب کے پاس بھی جتنی سنا تھا اس لیے میں نے وہیں رہے ہوئے اور کا شکوک کو زیادہ مضبوطی سے تھامے ہوئے ڈاکٹر برنارڈ کے ارشادات پر توجہ مرکوز رکھی۔

وہ کہہ رہا تھا "میں بہت پہلے یہاں سے نکل گیا ہوتا لیکن میں صرف اس شخص کو محبت ناک انعام سے دوچار ہونے دیکھنے کے لیے یہاں آ رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہو رہا ہے۔ تم سب کی پریشانیوں کی جڑ بھی یہی شخص ہے اگرچہ وہ زندہ رہا تو تم لوگ بھی بھی ہیں سے زندگی بسر نہیں کر سکو گے۔"

دو مہینے لپکاتے بھی اس طویل و عریض کمرے کا بیشتر حصہ نظر آ رہا تھا جو اس وقت میرے سامنے تھا۔

کمرے کا سطر دوہ کی بات تھی۔ پہلے تو اس کمرے کو دیکھنا میرے لیے بڑی حیرت کا باعث تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی اسے پہچان لیا۔ وہ قاسم بجلی کے محل نامکان کا ڈرائنگ روم تھا جہاں میری بہت دیر اس کے ساتھ لٹ رہی تھی۔ اسی کمرے میں میری فرہین کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی جب وہ قاسم بجلی سے ملنے آئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک عجیب و غریب اور چڑا سرور سے راستے سے اوپر آنے کے بعد قاسم بجلی کے ڈرائنگ روم میں کھڑا تھا۔

کمرے کا سطر بھی خاصا جڑان کن تھا۔ وہاں ایک بینک کا سا سالن تھا اور کافی تعداد میں "سٹوریز" وہاں جمع تھے جن میں سرفہرست نادر عرف نوزی تھا جس کے پیش میں ڈکریں آتا خوار ہو رہا تھا۔ وہ لکڑی کی ایک کینٹ سے ٹک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس وقت بھی سفید ہڈی کے جھولے میں تھا اور ہاتھ پر بھی ڈیٹاں پہنی ہوئی تھیں۔

کمرے میں "مستور" جانو بھی موجود تھا۔ وہ ہاتھ میں گلاس لیے "پنہ بیرون" پر ٹٹل رہا تھا۔ گلاس کا معلوم ہوا تھا۔ سامنے ہی صوفے پر قاسم بجلی کی جڑاں ڈیٹاں تانیا اور ٹانیا موجود تھیں۔ میں نے جو کسوٹی آواز سنی تھی وہ انہی میں سے کسی ایک کی تھی۔

دوسرے صوفے پر تھنی داڑھی موٹھوں والے دوچار صوب اور وجہ نوجوان موجود تھے۔ وہ کچھ ایسے نوجوان بھی نہیں تھے۔ ان کی عرس پینٹیں اوڑ چالیں کے درمیان رہی ہوں گی۔ وہ مجھے صرف کندھوں تک دکھائی دے رہے تھے لیکن انہیں محض اس حد تک دیکھ کر بھی ان کی شخصیت کی خراب صورتی اور وجاہت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

مجھے اور دیکھ رکھا تو وہ کسی بڑے قبائلی سردار کے بیٹے معلوم ہوتے تھے۔ وہ تانیا اور ٹانیا کی طرح ہم شکل تو نہیں تھے لیکن دونوں کی شکل میں قاسم بجلی کا عکس ہلک رہا تھا اور میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ قاسم بجلی کے بیٹے تھے جو اس کی پہلی بیوی کے بہن سے تھے یعنی تانیا اور ٹانیا کے سوتیلے بھائی۔ لیکن میری معلومات کے مطابق ان چاروں بہن بھائیوں میں کم از کم فی الحال تو کئے سوتیلے والے اختیارات اور تقبالت موجود نہیں تھے۔ قاسم بجلی کی موت کے وقت یہ دونوں بھائی ملک سے باہر تھے۔ شہنشاہ نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے نام راجیل اور شرنیل تھے۔

سب سے زیادہ حیرت مجھے اس میرا شخصیت کو دیکھ کر ہوئی تھی میں نے جانو کے رستوران میں دیکھا تھا اور جس کے بارے میں شرنیل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ درحقیقت میرا نہیں، میرا اور گونا

میں اس کے لیے احرام تھا۔  
ان لوگوں کے پاس بھی تعلق اور پکڑوں کو سمجھنا مشکل تھا۔ ریڈ  
ڈاٹ 'قاسم بھٹی' اس کی اولاد میں 'نوزی' جانو ان سب کا ایک  
دوسرے سے کیا تعلق تھا؟ یہ کس شطرنج کے مربے تھے، کس کی کیا  
حیثیت تھی؟ یہ سب بڑے تفتیش طلب معاملات تھے۔  
"تو پھر آخر تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟" ڈاکٹر برنارڈ نے ہزاری  
سے پوچھا۔

شریبل بولا "میرا خیال تھا کہ اسے مار کر ہمیں کہیں پتیل میں  
بی دفن کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت جگہ ہے۔ وہ خائے ہیں۔  
اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو مار کر اسی پتیل کی حدود میں اور دھڑ  
دفن کیا گیا ہے۔ حالات نے ان کی لاشیں باہر لے جانے کی  
اجازت نہیں دی تھی۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا کہ آخر وہ کہاں  
گئے۔ اب تو ان کی ہڈیاں بھی محل سڑک چلی ہوئی ہیں۔"

وہ انسانوں کو مار کر دفن کر دینے کا ذکر کچھ اسی طرح کر رہا تھا  
جیسے چوہیوں کو مسل کر پیسک دینے کی بات کر رہا ہو۔ ان کی محل  
سرا کی بنیادوں میں انسانوں کا خون رچا ہوا تھا، انسانی ہڈیاں دفن  
تھیں اور وہ نہایت اطمینان سے اس محل سرا میں رہتے تھے سکون  
کی نیند سو رہے تھے۔ جس نے زندگی میں بہت سے ایسے انسان دیکھے  
تھے جن کی انتہائی نجی مجلسوں کی تشکیل کن کر تھیں ہونے لگا تھا کہ  
انسان سے بڑا دندہ روئے زمین پر نہیں پایا جاتا۔

ڈاکٹر برنارڈ طعنے لگے میں بولا "یہ طریقہ اختیار کرنے میں  
تمہیں کوئی اندیشہ محسوس نہیں ہوا؟ جو لوگ افضل چوہدری کو جسد  
خان کے رستوران میں داخل ہوتے دیکھ چکے ہیں وہ اب کئی گھنٹے  
بعد بھی اسے برآمد ہوتے نہیں دیکھیں گے تو یقیناً رستوران کی  
بنیادیں تک کھود ڈالیں گے۔ بلکہ شاید اس وقت وہ اسی کام کی  
تیاری کر رہے ہوں گے۔ میں ممکن ہے وہ وہ خانہ۔ خفیہ راستہ  
سب کچھ دریافت کر لیں۔۔۔ پھر یہاں تمہارے پتیل میں آڑہ گھدی  
ہوئی زمین۔۔۔ اور اس میں دفن شدہ افضل چوہدری کی آڑہ لاش  
بھی دریافت کرنی جائے گی۔ اس صورت میں تم کہاں ہو گے؟"  
"پتیل بہت بڑا ہے اور پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کے نیچے بڑی  
عجیب عجیب جگہیں ہیں۔" شریبل بولا "یہاں ایک لاش کا ڈھونڈنا  
بہت مشکل ہو گا۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔۔۔ بلکہ شاید خوش فہمی ہو۔" ڈاکٹر برنارڈ  
منہ بنا کر بولا "مجھے خفیہ اداروں کے لوگوں سے زیادہ افضل چوہدری  
کے اپنے قومیوں سے خفیہ ہے۔ وہ اگر ڈھونڈنے پر آمیں تو اس  
پتیل میں اپنی مطلوبہ سوئی بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"  
"نن سے ہمارے آدمی نمٹ لیں گے۔" یہ امید رائل نے  
ظاہر کی تھی۔

ڈاکٹر برنارڈ ہزاری سے بولا "تمہارے آدمی اگر اس قابل  
ہوتے تو حالات اتنے خراب ہی کیوں ہوتے۔ وہ سب مرنے والے

"تو تو ٹھیک ہے۔" رائل یا شریبل دونوں بھائیوں میں سے  
کسی ایک نے ٹھکانا کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "لیکن اسے فی  
الحال سینٹ کے پائپ میں پیک کر کے سمندر میں پھینکانے کا  
انتظام ذرا مشکل ہے۔ ہمارے گھر کی۔۔۔ اور ہم سب کی نقل  
و حرکت کی عمرانی تو پہلے ہی سے ہو رہی تھی لیکن میرا خیال ہے جسد  
خان کے ہوٹل میں اس کے آنے کے پروگرام کا بھی خفیہ اداروں  
کو پتا تھا۔ اس وقت ہوٹل کی بھی کڑی عمرانی ہو رہی ہے۔ میرا  
خیال ہے ہم اسے پائپ میں پیک کر کے کسی گاڑی میں نہیں کھل  
سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ اب اس گھر سے جو گاڑی نکلے گی اس کی  
بھی تلاشی لی جائے گی اور اگر ہوٹل کی طرف سے کوئی چیز کسی  
گاڑی میں لادی گئی تو اسے بھی چیک کیا جائے گا۔ اگر ہمارے آدمی  
رہنے والے ہوں پکڑے گئے تو ہمارے خلاف کیس اور مضبوط ہو جائے  
گا۔ تمہیں معلوم ہے "آخر وہ خانے میں بال بھی موجود ہے۔"

ڈاکٹر برنارڈ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔  
"تم لوگ اس علاقے کے بادشاہ ہو لیکن اتنے سے کام سے  
تمہارے ہوٹل اڈر ہے۔ اس سے پہلے بھی یہاں لوگوں کو مارا  
جاتا رہا ہے۔ لاشیں سمندر میں بھیگی گئی ہیں۔ لوگوں کو غائب کیا گیا  
ہے۔ تمہارے باپ کو تو بھی کسی کام میں گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ تم  
لوگ نوجوان ہو کر بھی ڈرتے ہو؟"

"ہم ڈر نہیں رہے۔" دوسرا نوجوان "برنارڈ سے بھی زیادہ  
ناگواری سے بولا "یہ وقت دقت کی بات ہے اور آدمی آدمی میں  
فرق ہوتا ہے۔ آج اگر بابا زعمہ ہوتے تو وہ بھی احتیاط کرتے۔ اس  
وقت ہم ذرا غمناک ہیں۔ ہمارے گھر گھبراہٹ ہو رہا ہے۔ اور پھر  
افضل چوہدری کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ خفیہ اداروں کے علاوہ بھی  
اسے معلوم نہیں کن کن لوگوں کی مدد حاصل ہے، شاید اس کے  
اپنے آدمی بھی ہیں جو اور دھڑ اور محرک نظر آ رہے ہیں۔"

پہلا نوجوان گویا اس کی تائید میں بولا "اور ہمارے حالات یہ  
ہیں کہ جن وزیروں سفیروں سے ہماری جان بچان تھی وہ ہمارا خون  
تک نہیں سن رہے ہیں۔ ہمارے کئی آدمیوں کو باہر سے باہر کچھ  
لوگ پکڑ کر لے گئے ہیں اور ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کہاں  
ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے کس کس نے کیا کچھ بک دیا ہو گا۔ کیا  
کیا راز کھول دیے ہوں گے۔ ہمیں اب ہر قدم بہت احتیاط سے  
اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم چاروں سب بھائی جیل جانے یا  
خفیہ اداروں کے ہتھے چڑھنے سے بچیں تو اچھا ہے۔ شاید ہم  
مل جل کر کچھ عرصے میں حالات کو سنبھالنے میں کامیاب  
ہو جائیں۔"

"شریبل ٹھیک کہہ رہا ہے سب! " ٹائٹا منوبانہ نے میں بولی  
جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ شریبل کون تھا اور رائل کون ہو سکتا  
تھا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ اس چٹا لال چوکرزی میں ڈاکٹر برنارڈ کی  
حیثیت مدبر مجلس ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ ہائی لوگوں کے رویے

دغضب کچھ زیادہ ہی بڑھ کر رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے تن پر تیس کی موجودگی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بقول میں سیاہ رنگ کی "میرلی ٹائٹ" تھی۔ اس گمن کے بغیر بھی وہ کچھ کم خوفناک نظر نہیں آتا ہوگا۔

شریٹل "نوزی سے مخاطب ہوا" قلندر بخش نے اسے باندھ داندھ تو رہا ہوگا۔ میرا خیال ہے تم اس کا قصہ بھی سن رہی ہو۔" نوزی کا دایاں ہاتھ زخمی تھا۔ اس کے بازو و دو ایک ادا نے بے غازی سے بولا "کیا کرتا ہے اس کا؟ گولیاں ماروں یا ذبح کروں؟"

اس نے بائیں ہاتھ سے جیب سے ایک ٹی ٹی نکال لیا تھا۔ جس انداز سے اس نے ہاتھ پکڑا ہوا تھا اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے بھی گمن استعمال کرنے میں ماہر تھا۔

اس نے گمن کا جائزہ لینے ہوئے نہایت سرسری سے لمحے میں دو بار پوچھا "سے گولیاں مارنی ہیں یا ذبح کرنا ہے؟"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی خانہ سالانہ گمن میں جانے سے پہلے بالک سے پوچھ رہا ہو کہ وہ مرغ سالمی تیار کر کے لائے یا اس کے ٹکے بنا لے۔ ہم میں سے بعض لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہم میں سے ہی بعض لوگوں کے لیے انسانی جان کس قدر حقیر اور اڑاں ہو جاتی ہے۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے ارد گرد چلے پھرتے بظاہر عام سے نظر آنے والے لوگوں میں بعض کتنے سفاک اور درد مند مفت ہوتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں کیا ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنے مخصوص اڈوں پر اپنے قابو میں آتے ہوئے انسانوں سے کیا سلوک کرتے ہیں؟

شریٹل بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا "جو تمہارا دل چاہے" کو لیکن نہایت معافی سے کہو اور جلد از جلد اس کی لاش قائب کر دو۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جلد ہمارے خلاف کوئی ایکشن شروع ہونے والا ہے۔"

نوزی نہایت مستعدی سے اسی وارڈ و ب کی طرف بڑھا جس میں "میں دوا زانے کے پیچھے کھڑا اپنے بارے میں ان معجزین کے عقیم مشورے اور ارشادات عالیہ سن رہا تھا۔ وہ بہت جیزی سے الماری کی طرف بڑھا تھا۔ میرے لیے اب فوری طور پر باہر آنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں الماری میں سوچ رہا ہوتا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے باہر آنے میں کچھ تاخیر بھی کر دی تھی۔ مجھے ڈاکٹر برنارڈ کو بھی کمرے سے باہر جانے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا اور اس وقت میں سامنے آ جانا چاہیے تھا۔ وہ کمرے میں موجود تھا۔ یوں میں ایک وقت میں اس پوری پڑاؤل چوڑی سے غصے کی کوئی تدبیر کر سکتا تھا لیکن ان کی زیادہ سے زیادہ باتیں سننے کے انتظار میں" میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔

جیسی تیزی سے نوزی وارڈ و ب کی طرف بڑھا تھا اس سے زیادہ تیزی سے میں نے باہر نکل کر اس کے منہ پر کلا شکوف رسید

کے آدی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے تم لوگوں کا حکم مانتے ہیں اور غلاموں سے زیادہ تم لوگوں کے وفادار ہیں۔ عقل نام کی کوئی چیز ان میں نہیں ہے۔"

"حکم کی تعمیل کرنے والوں میں عقل ہونی بھی نہیں چاہیے" یہ فلسفہ آتنا بے بیان کیا "اگر ان میں عقل ہوگی تو بعض احکامات پر وہ سوچ میں پڑ جائیں گے۔ فتنہ نقصان کا حساب کرنے لگیں گے۔ پتا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ ہم جیسے لوگوں کو یہ باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔"

ڈاکٹر برنارڈ اب غما سبزار نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک لمبے کے لیے پڑ خیال انداز میں خاموش رہنے کے بعد ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "اچھا۔" جس میں جو بھی فیصلہ کرتا ہے جلدی کر لو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں زرا چند منٹ کے لیے انکسٹی میں جا رہا ہوں" میں کسی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم اس دوران اس کا کام تو تمام کر لو پھر جو بھی کرنا ہو گا کر لیتا۔ میں اب کئی بات پر زور نہیں دہوں گا۔"

اس نے اپنی ہتھیلی کی پل داسکت کی جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ ممکن ہے وہ موبائل فون کے بجائے کوئی اور چیز رہی ہو کیونکہ وہ ہمارے ہاں دستیاب موبائل ٹیلی فونوں سے کافی مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے ایک اندر دینی دوا زانے کی طرف چل دیا۔

شریٹل "نوزی سے مخاطب ہوا" قلندر بخش رتی لے کر پیچھے گیا تھا۔ وہ تو واپس ہی نہیں آیا۔ پتا نہیں کس دھندے میں لگ گیا۔"

نوزی سیدھا ہوتے ہوئے بولا "میں جا کر دیکھتا ہوں۔" میری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ جو ٹیم ختم شخص میرے لیے رتی لے کر پیچھے چلا تھا اس کا نام قلندر بخش تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جلد خان یا جانو کے ہوٹل اور اس پبلک نما مکان کے درمیان نیچے ہی چلے کوئی راستہ موجود تھا جو ان میں ایک دوسرے سے ملتا تھا۔ دونوں جگہوں پر پڑ خانے بھی موجود تھے۔ ان دو خانوں اور زپر زمین راستوں کے پیچھے کچھ "معلیٰ" قسم کے مصروف بھی رہے ہوں گے۔ گوروکھ دھندے کا پیچھے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کہ نوزی اپنی جگہ سے چلا، شریٹل نے کسی کو اشارہ کیا۔ وہ شخص غالباً ابھی تک ایک کونے میں موجود تھا۔ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ شریٹل کا اشارہ پا کر وہ آگے نکلا اور نوزی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ وہ قلندر بخش سے بھی زیادہ خوفناک قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ صورت سے ہی جلد معلوم ہوتا تھا۔ معنی وارڈ میں موٹھوں کے ساتھ اس کے سر کے بال بھی کندھوں تک لمبے تھے اور آنکھیں انگادوں کی طرح دیک رہی تھیں۔ وہ سیاہ شلوار کے اوپر صرف بنیان پہنے ہوئے تھا۔ شاید اس کے وجود میں آٹھ فیڈ

لیکن میں نے اسے اسٹائل مارنے یا مکن استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے ٹریگر دبانے کی سہولت نہیں ملے۔ کلا خشک کا برٹ اس کے سینے پر پڑا اور وہ آگ کر پیچھے جا کر اس کے جسم سے خون کے فوارے نکل پڑے۔

تایا اور ٹانیا کا ٹرنگ سے بچنے کے لیے ہونے سے فرش پر اونچے کی گئی تھیں۔ رائل پر بدستوریت بنا بیٹھا تھا۔ شریٹل نے اس لیے عجیب حرکت کی۔ وہ اچانک ہی ہونے سے اٹھ کر باہر کو بھاگا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کا کمرے سے باہر جانا میرے لیے مسئلہ کھڑا کر سکا تھا۔ میں نے گن بجھاتے ہوئے اس کے پیروں پر ناز کیا۔ وہ اونچے سے گر گیا۔

ٹانیا نے اسے کرتے دیکھ لیا۔ وہ احتیاط اور خوف، سب کچھ بھول کر یک دم چیخ ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ غالباً جھوٹ کرانے جانتی تھی۔ یہی ممکن تھا دونوں بیٹیں ہی مارشل آئرس سے واقف رہی ہوں۔ تاہم اس ذلت صرف ٹانیا چیخ ہوئی تھی پر جینی ہوٹل یا تم نے میرے بھائی کو بھی مار دیا۔

اس نے لات تھما کر اس طرح میری کلائی پر مارنے کی کوشش کی کہ کلا خشک میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے لیکن اگر اس قسم کے دواؤں پر مجھ پر چلے گئے تو یہ میرے لیے خاصا شرم کا مقام ہوگا۔ اس سے پہلے کہ اس کی لات میری کلائی پر پڑتی تھی اس نے اس کی ران کے نیچے سے پرٹھو کر سید کی جس سے گوشت پھٹ جاتا تھا۔ وہ قلابازی کھا کر دور جا کر گری۔ اس کے حلق سے کرب تک چیخ نکلی۔

میں نے نہایت لائٹ اور شائع سے کہا ”آئی ایم سوری“ ایک لڑکی اب اس قسم جیسی نازک اندام اور نہیں لڑکیوں کے ساتھ بات چاہی اپنا ہنس کر لایا اس وقت رعایت کا موقع نہیں ہے۔ میں مارشل کے ایک ستون کی آؤ میں ہو گیا۔ وہ بہت جلد کراٹھا اور اس میں چاروں سمتوں میں دوڑاؤں سے ڈاکٹر پر ماراؤں میں نے خود کمرے سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ وہ بھی واپس آسکا تھا اور غصہ تک بھی ثابت ہو سکا تھا۔ میں اس کے اور اس کی ملامتوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن بہر حال ایڈلٹ کا کوئی تھا۔ میرا اس کی طرف سے ہوشیار رہنا ہی بہتر تھا۔

اس کے علاوہ مجھے معلوم تھا کہ اس مکان پر برٹ سے مسلح افراد قیادت رہتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ٹرنگ کی آواز میں کراؤں تک روم کی طرف دوڑ پڑے ہوں گے۔ بلکہ میرے حساب سے تو انہیں اب تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اگر انہیں وہاں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی تو شاید یہ میری خوش قسمتی تھی۔ میں کسی ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں تھا جہاں میں کمرے میں موجود افراد کو کلا خشک کی زور پر رکھتے ہوئے دوسرے لوگوں سے بھی اپنا دفاع کر سکوں۔ وہ قیقیش بھی کسی لیے کمرے پر دھارا پونے والے تھے۔ اگر رائل، شریٹل، تایا اور ٹانیا وغیرہ میری گن کی زور پر رہتے تو

کی وہ آگ کر کمرے کے دسٹ میں جا کر لیکن بلاشبہ وہ بیانی سخت جان آدمی تھا۔ اس کا ہاتھ پہلے ہی ڈھکی تھا اور میری یہ ضرب بھی اسے لٹاؤنے کے لیے کافی تھی مگر وہ بد بخت مشق گڈے کی طرح اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹی ٹی ہٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں تھا لیکن شاید اس لیے اسے صحیح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ہٹل ہٹل کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری سمت میں اندھا عند ہٹل خالی کمرے گا۔ میں اسے ذمہ چکنا چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ موت کے علاوہ شاید کوئی چیز اسے روک ہی نہیں سکتی تھی۔ اس ایک ہٹل میں مجھے اپنی یا اس کی زندگی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

میں نے کلا خشک کا برٹ مارا۔ اس کا آدھا سر اور چہرے کا کچھ حصہ اڑ گیا۔ کچھ گولیاں سینے میں بھی پڑیں۔ اس کے کمرے سے پہلے ہی میں نے کلا خشک سے باقی لوگوں کو کور کر لیا۔ وہ سب دم بخود بیٹھے تھے انہیں شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ رائل اور شریٹل کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس قسم کے لوگ ہتھیار اپنے پاس رکھنے کی ذمت نہیں کرتے کیونکہ وہ زیادہ تر ہتھیار پروادوں کے حفاظتی کیمبرے میں رکھتے ہیں۔ انہیں بارود ساڑ کے کاموں میں اپنے ہاتھ گڈے کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی ایک جہش ابرو پر یہ سارے کام ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ میں نے رائل اور شریٹل کی زیادہ فکر نہیں کی تھی۔ میں نے اس غیبت صورت غصہ پر نظر رکھی تھی جو بنیان اور شلوار میں تھا۔ حالانکہ اس کے ہاتھ میں ایم پی ٹائی موجود تھی لیکن جراتی کی شدت کے باعث شاید وہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ میں نے جب فوری کو کلا خشک مار کر گرایا اور پھر جب اس پر برٹ مارا اس دوران وہ غیبت صورت چاہتا تو ایم پی ٹائی سے مجھے چھٹی کرنے کی کوشش کر سکا تھا۔ گوکہ میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا لیکن اس نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔

وہ ایم پی ٹائی کو ایک بیکار چیز کی طرح دونوں ہاتھوں سے تھامے ساکت کھڑا رہا۔ پلک جھپکنے میں اس کے سامنے جو کچھ ہو گیا تھا شاید وہ اسے فکر کا دھوکا نہ دے رہا تھا لیکن جب میری کلا خشک کا رخ اس کی طرف ہو چکا تھا شاید اس کا سوا داغ حرکت میں آیا پھر اس نے کلا خشک کی بھی پروا نہیں کی۔ ہونے والے لوگوں کے ساتھ بعض اوقات یہی مشکل ہوتی ہے۔ وہ صحیح وقت پر خطرے کا احساس نہیں کر پاتے۔ انہیں ایک آدھ لمبے کی تاخیر ہو جاتی ہے اور کبھی وہ صحیح وقت سے ایک آدھ لمبے پہلے کچھ کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس نے اپنی دانست میں بڑے اسٹائل سے پوزیشن لینے ہوئے ایک گھٹنے کے بل کھڑے ہوتے ہوئے ایم پی ٹائی میری گن کی



- ایک ایسی کہانی جس کو مکمل کئے بغیر
- رکن ناممکن ہے۔
- چار حصوں میں شائع ہو گئی ہے۔
- کتابیں پیپر بیک پر خوبصورت شرفی
- کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

قیمت فی حصہ: ۶۰/۰۰ روپے

مکمل سیٹ: ۲۸۰/۰۰ روپے

مکتبہ الفکر

۱۰۰ روپے لاہور

میں انہیں اپنی احوال کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ انہیں گزرتے سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے حافظہ فوری طور پر مجھ پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ یوزین لینے کے لیے مجھے کمرے میں ماربل کے اس ستون کے علاوہ کوئی آڈیو نہیں تھی۔

راجیل کے حواس شاید ٹھکانے آچکے تھے۔ اس نے ایک نظر اپنے بھائی شریل کی طرف دیکھا۔ فرسٹ پر اٹھ بیٹھا تھا مگر اپنی دونوں ہاتھیں پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا اور نہیں شلوار کے پائینے سرخ ہو چکے تھے۔

راجیل دانت پیس کر بولا "تم نے جو کچھ کیا ہے اس پر تمہاری آنے والی سلیس بھی بچتا نہیں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے ان کے بچھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا" میں نے بے پروائی سے کہا "مٹی افعال تو ان کے آنے کے ہی کوئی آثار نہیں ہیں۔"

میں ان سب کے علاوہ دنیاؤں پر بھی نظر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرا یہ اندیشہ غلطی ثابت ہوا کہ راجیل، شریل کے مسلح حافظہ کمرے پر دھاوا بولیں گے۔ اس کے بجائے باہر سے میچ فون پر کسی کی تحمید آواز سنائی دی "میں کمرے میں جو بھی مسلح افراد موجود ہیں وہ ہتھیار ڈال دیں۔ یہ پورا مکان قانون نافذ کرنے والے اداروں کے تحریک میں ہے۔"

پھر ایک لمبے کے وقفے سے کسی نے پوچھا "مسٹر افضل ایسا آپ خیریت سے ہیں؟" یہ آواز بھی میرے لیے انجینی تھی۔

"جی ہاں۔ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کمرے سے نیک چاہتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

باہر گرا سکوت چھا گیا۔ شاید انہیں میرا جواب پسند نہیں آیا تھا۔ ایک لمبے کے وقفے سے میں نے کہا "آپ لوگ تشریف لے آئیں۔ اب ان تلفات کی ضرورت نہیں ہے۔"

چند لمبے بعد باہر کے دروازوں سے کچھ چوڑے عظام انداز میں کمرے میں جھانکا صورت حال کا جائزہ لیا مگر کچھ لوگ گھسیں لیے اندر آئے۔ انہیں سب سلامہ لباسوں میں تھے اور سب میرے لیے ابھی ٹھنڈے اینولہ نے سب کی تلاش لی۔ صرف جانو کی جیب سے فیملی نکلا۔

مضبوط کاغذی کا ایک اوجیزہ اور بارب ساغص آئے اگر صاف کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے ہنسی کہتے ہیں۔ آپ بیٹے مسٹر افضل ہیں؟"

میں شون کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ میں نے کا خوف بھل گیا۔ ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ لیٹر اچھا پندر کریں گے باکرہ؟"

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری جس مزاح کے اس نے ہنسنے لگا ہرے پر مجھے سخت لہجے میں کوئی ہیبت کرے یا اس سے محفوظ



ہو۔ اس نے جالباً غاموش رہا اور کوئی رد عمل ظاہر نہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔

میں نے کمری چنبیدی کی سے مزید کہا ”بے شک گھر اور ذرا تنگ دودھ دو سروں کا ہے لیکن آواپ بیڑائی کا خیال رکھنے میں کیا حرج ہے؟“

چشتی صاحب میری بات کا جواب دینے کے بجائے کمرے میں اُدھر اُدھر دیکھنے لگے پھر انہوں نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دینا شروع کیں۔ ہتھیار قبضے میں لیے جارہے تھے۔ لاشوں کو ڈھانپنا چاہا تھا اور دشمنی شریٹل کے لیے فطی امداد کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔

و نفقائے اس وارڈ روپ کا ورنہ ایک بار پھر وہاں جس سے نہیں اس کمرے میں وارد ہوا تھا۔ اس ورنہ اسے سے چنبیدی برآمد ہوئی اور یوں لڑکھرائی ہوئی تیزی سے آگے اٹھی جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے شفیق شاہ اور دوسرے دو افراد تھیں اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔

”بڑی دیر کی مہراں آتے آتے“ میں نے بے آواز بلند شفیق شاہ کو مخاطب کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی اسی وارڈ روپ کے راستے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پاس جدید ماسک کی گھنٹیں تھیں۔ کمرانہایت طویل و مریض ہونے کے باوجود بھرا بھرا نظر آنے لگا۔

شفیق شاہ قدرے شرمندگی سے بولا ”سراہم تو کب کے پہنچ گئے ہوتے لیکن ان سرکاری لوگوں نے سچ میں ہانک اڑادی۔ ان کے پاس کچھ اطلاعات جمع ہو گئی تھیں جن کی روشنی میں فوری طور پر کارروائی کرنا ضروری تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ہمیں تقریباً حکم دیا کہ کارروائی کو زیادہ نتیجہ خیز بنانے کے لیے ہم مل کر کام کریں۔“

”اگر مجھے بدولت ہوش نہ آتا تو تم لوگوں کی کارروائی بہت سی زیادہ نتیجہ خیز ہو جاتی یعنی میرا قصہ پاک ہو چکا ہوتا“ میں نے کہا۔ چشتی صاحب میرے قریب آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں انگریزی میں بولے ”مجھے مقاصد کے حصول کے لیے خود اہمیت دے رکھ تو لیا پڑا ہے افضل صاحب!“

”تھک ہے سراہم“ میں نے معذرت مندی سے سر ہلایا ”آئندہ بھی قریانی کے کمرے کی ضرورت ہو تو اس غلام کو یاد فرمائیے گا۔“ ”نہیں جناب! اس کی قطعاً ضرورت نہیں پڑے گی۔“ چشتی صاحب نے مجھے یقین دلایا ”تپ کو شاید اندازہ نہیں کہ تھوڑے سے مجبور تھل اور آپ کے ساتھیوں کے تعاون کی وجہ سے کتنی بڑی کام سر ہو گئی ہے۔ قاسم بجلی ایک عرصے سے ہماری دواج لسٹ پر تھا۔ وہ کبھی لیے عرصے کے لیے پکڑا نہیں جاسکتا تھی کہ مارا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے تمام دھندے اسی طرح چل رہے تھے۔ اس وقت ہم نے آپ کے ساتھیوں کے تعاون سے دو طرف

سے دھوا دھولا۔ یعنی ہم نے مکان کو بھی گھیرے میں لیا اور تمام مسلح فاضلوں کو قابو میں کیا اور دھندے خان کے ہوٹل کا رخ خانہ اور وہ خفیہ راستہ بھی آپ کی وجہ سے دریافت ہو گیا جو ہوٹل کو اور اس مکان کو آپس میں ملاتا ہے۔ ہمیں ان دونوں جگہوں کے درمیان ایسے کسی راستے کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔“

”آپ کو تو ابھی نہ جانے کس کس بات کا علم نہیں ہے سراہم! تو ایک بڑا مسئلہ ہے کہ آپ جیسے لوگوں کا علم بہت محدود ہے سراہم! میں ایسے لوگوں پر بھروسہ کرنے کا کوئی سوچ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا حالانکہ مجھے وہی دل میں اعتراف بھی تھا کہ تھیں صاحب! چشتی صاحب اور اس فیل کے دو سب سے افسروں کا دم تو پھر بھی غنیمت تھا۔ یہ لوگ تو بڑے بڑے جرائم کے خاتمے کے لیے پھر بھی سرگرم نظر آ رہے تھے۔ جان بھی خطرے میں ڈالتے تھے۔ خود ہر جگہ کھینچتے تھے۔ باقی بہت سے ٹھکانوں کے سربراہ اور دیگر اعلیٰ افسر تو نہ جانے کیا کرتے تھے! کہاں بد ہوش پڑے رہتے تھے۔ ان کے بیچ اور دھندے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔“

چشتی صاحب کے چہرے پر ناگوارگی کی لہر ابھری لیکن فوراً ہی غائب ہو گئی۔ شاید تھیں صاحب کی طرح ان میں بھی محل اورد ہرداری موجود تھی۔ وہ سنی ان سنی کر کے بات جاری رکھتے ہوئے بولے ”قاسم بجلی ڈرگ ہافا کے ان خاص آدمیوں میں سے ایک تھا جو پاکستان میں موجود ہیں لیکن ہمیں یہ بات آج معلوم ہوئی کہ اس کی اصل ڈھیرو گاہ جمع خان کا ہوٹل تھا۔ اس کے نہ غائبے اور بجلی کو غروں میں آئے دال اور تنک وغیرہ کی جو ہوریاں اور خلیے موجود رہتے تھے انہی کے سچ میں ڈرگزی خلیاں بیک ہوئی تھیں۔ سب کچھ ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔ ہمارے حق میں یہ اچھا ہوا ہے کہ آپ ان کی قید میں موجود تھے۔ قاسم بجلی نہ سنی! اس کی اولاد میں گمراہ رنگے ہاتھوں بکڑی گئی ہیں۔“

میں نے راضی اور شریٹل کی طرف اشارہ کیا ”کیا یہ دونوں نوجوان اپنے باپ کے دھندوں میں ملوث تھے؟“ ”یہی طرح“ چشتی صاحب نے وقت سے جواب دیا ”یہ اس کی زندگی میں بھی مختلف مقامات پر ڈرگزی کے آپریشن کو کنٹرول کرتے تھے۔ پاکستان میں اور بیرونی ممالک میں بھانگ دوڑ میں مصروف رہتے تھے۔ باپ کے قتل کے بعد تو پورا ”کامدھار“ تھا انہوں نے سنبھال لیا تھا لیکن فی الحال انہیں دھارماں پیش آ رہا ہے۔ ابھی ان کے قدم باپ کی طرح مضبوطی سے پچھے نہیں پائے تھے۔“

”آپ نے قدم بالکل ہی اٹکا ڈیئے“ میں نے کہا۔ ”یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ یہ کام ہمارے ہاتھوں انجام پائے اور نہ ہمارے ہاں ایک کے بجائے دو قاسم بجلی ہو جاتے۔“ چشتی صاحب نے دونوں نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا یہ دونوں لڑکیاں بھی ان دھندوں میں ملوث تھیں؟“ میں

کچھ حد تو یہی تھا، یہاں سے میں ہوش میں آنے کے بعد اُڑا ہوا تھا اور وارڈ دہلیپ کے رشتہ تھلا تھا۔ اس سے پیچھے وہ راستہ مزید دو تین فرلانگ لیا تھا اور اس میں کسی گیت اور کو ٹھکراں تھی۔

اس وقت مجھے ان بھول، بھلیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی مجھے اس خیال سے کوئی سستی محسوس ہو رہی تھی کہ یہ خانوں وغیرہ سے کیا کچھ برآمد ہوا تھا۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس تصور سے ہی میرا دل دہلیپ رہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کسی طرح اس آپریشن کے دوران نکل گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب راجیل کو اس کارروائی کی تفصیلات کا پتا چلے گا اور یہ علم ہو گا کہ ڈاکٹر برنارڈ میرے سامنے آنے اور ایک ذریعہ خاصہ مکان میں موجود ہونے کے باوجود نکل گیا تھا تو وہ دل میں کیا سوچے گی؟

راجیل کے آگے سیاہ چہرے کو درست کرنے کے لیے جس

طبی شعبے کی ضرورت تھی وہ صرف ڈاکٹر برنارڈ کے پاس تھا۔ جب سے ریڈ ڈاٹ کا حادثہ ہوا تھا، میرے دل میں صرف یہی پھانسل رہی تھی کہ کسی طرح ڈاکٹر برنارڈ ہاتھ آجائے۔ راجیل بظاہر توجہ پروردہ اور بے نیاز بنی ہوئی تھی کہ اسے اپنے آگے سیاہ آگے سفید چہرے کی کوئی پڑا نہیں تھی اور وہ اسی کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہوئی جیسا کہ میں اس کی بات پر پوری طرح یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بھلا کوئی لڑکی اس شہت کڑائی کے ساتھ زندگی کیہ کر گزار سکتی تھی؟ اور لڑکی بھی وہ جو ہلکا جین رہی ہو۔ مجھے تو یوں لگا تھا کہ وہ محض میرا دل رکھنے کو بے نیاز بنی تھی۔ ایک بد صورت حقیقت کے سامنے دیکر نظر آنے کی کوشش کرتی تھی کہ کہیں میں کسی قسم کے احساسِ جرم میں مبتلا نہ ہو جاؤں کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ روزِ وہ تو کراچی میں آرام سے ایک محدود اور پرسکون سی زندگی گزار رہی تھی۔

کچھ بھی تھا، ڈاکٹر برنارڈ کا نکل جانا میرے لیے ہر حال ایک دھچکا تھا۔ اگر میں نے اسے دکھایا نہ ہوتا، پچھانے نہ ہوتا تو اور بات تھی۔ لائسنس بعض اوقات بڑی راحت کا باعث ہوتی ہے۔ میں بھی اس کی موجودگی سے لاعلم رہتا تو بڑے سکھ میں رہتا۔ میرے دل کو بچھتا وہ نہ ہوتا۔

میری ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ جان بچ جانے کی بھی کوئی خاص خوشی نہیں رہی تھی۔ میں نے چشتی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے فاضل آدمیوں کو جڑ سے پرہیزاویں تاکہ ڈاکٹر برنارڈ اپنے اصل محلے یا بھوپ میں کہیں نظر نہ آجائے تو قابو میں کرنے کی کوشش کریں۔ میرے آدمی شفیع شاہ سمیت صرف پانچ تھے۔ میں نے انہیں سمندر کی راستے کی نگرانی کرنے کا حکم دیا۔ وہ سب فوری طور پر روانہ ہو گئے لیکن نہ جانے کیوں میں ان

نے آتیا اور تانیا کی طرف اشارہ کیا جو اب صوفے پر بیٹھی تھیں اور کچھ مضمحل نظر آ رہی تھیں۔ ان کی مخصوص سرکشی اور تیزی و طراری اس وقت مفقود نظر آ رہی تھی۔

”کسی حد تک“ چشتی صاحب نے جواب دیا ”مافی الحال انہیں بھی حراست میں لیا جا رہا ہے۔ تفتیش کے بعد شاید مزید کچھ حقائق سامنے آئیں۔“

دو آدمی تھیں لیے دونوں لڑکیوں کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں لیکن اب ان کی نظروں میں میرے لیے فیلڈ فٹب بھی نہیں تھا جس پر مجھے حیرت تھی۔

چشتی صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے ”آپ کی وجہ سے ہمارا کام بہت آسان ہو گیا۔ آپ نے نہ صرف خود اپنی حفاظت چھوڑنے سے کی بلکہ ہماری مدد کے بغیر ان دو بڑے بد معاشرلوں کا بھی قصہ پاک کر دیا جو اس کمرے میں خوریزی کا سبب بن سکتے تھے۔“

وفاً مجھے احساس ہوا کہ اس ہڑنگ میں ایک شخص کا خیال تو میرے ذہن سے نکل ہی گیا تھا جو میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر چشتی صاحب سے پوچھا ”آپ نے مکمل طور پر مکان کا محاصرہ کیا تھا؟“

”جی ہاں۔ کیوں؟“ انہوں نے کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہوئے پلٹ کر پوچھا۔

”آپ کے آدمی باہر بھی موجود ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ لیکن آپ کو اچانک کیا یاد آیا ہے؟“

”یہاں ریڈ ڈاٹ کا بھی ایک آدمی موجود تھا۔ وہ یہاں ہنگامہ شروع ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے باہر گیا تھا۔ ذرا اپنے آدمیوں سے معلوم کیجئے وہ بھی ہاتھ آیا یا نہیں؟“ میں نے بے تابی سے کہا۔

”ریڈ ڈاٹ کا آدمی؟ کیا آپ کو اس کا نام معلوم ہے؟“

چشتی صاحب کی چٹائی پر ٹھکیں ابھر آئیں۔

”ڈاکٹر برنارڈ ہے اس کا نام؟“ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دووانے کی طرف لے جانے کو کہا ”لیکن وہ خلیہ بدلے ہوئے ہے۔ تقریباً سیاہ نام ہوا ہے۔ دعویٰ واسط میں ہے۔ اس کا ہاتھ آنا بہت ضروری ہے۔“

”اگر وہ اس مکان میں یا ہوش کے خاتمے میں موجود تھا تو ضرور پکڑا گیا ہو گا“ چشتی صاحب بولے۔

ان کا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا۔ مکان کے مختلف حصوں سے جتنے بھی آدمی حراست میں لیے گئے تھے ان میں ڈاکٹر برنارڈ شامل نہیں تھا۔ اہلی اور خاندان تک مافی الحال ایک طرف بٹھالے گئے تھے لیکن ڈاکٹر برنارڈ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں خود مکان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑا پھرا۔ انیسویں میں بھی گیا۔ شفیع شاہ کے ساتھ میں نے اس ذریعہ راستے کا بھی سڑک لیا جو اس مکان سے جھوٹے خان کے ہوٹل تک جاتا تھا۔ اس کا

کی کامیابی کے سلسلے میں کچھ زیادہ پر امید نہیں تھا جو شخص اسے  
زبردست چھاپے کے دوران سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر  
اٹک گیا تھا اس کا اب اسے بڑے جزیرے پر ہاتھ آنا مشکل ہی لگتا  
تھا جس کے تین طرف سمندر اور ایک طرف خشکی کا راستہ بھی  
موجود تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں قدرے بائیں واسطہ کی طرف عالم میں  
جزیرے سے لوٹ آیا۔ اپنے ہوش پہنچ کر میں نے شاور لیا۔ لباس  
بدلیا کیا اور ذرا تازہ دم ہو کر کھانا ڈانٹنگ ہال میں کھانے کے  
ارادے سے نیچے آگیا۔

استقبالیہ کے قریب سے گزرتے وقت میں نے دیکھا، شرج  
اسپورٹس شرٹ اور بلو جینز میں ایک لڑکی کاؤنٹر کھڑی ہوئی میں  
ایک آن ہونے کے لیے کارڈ کی خانہ پری کر رہی تھی۔ ہوش کے  
اوپر اس کا سامان لاکھڑی الحال اس کے قریب رکھ رہے تھے۔

وہ بکھرے بھرے جسم کی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ خدوخال  
بے حشر تھے۔ اس کے ریشمی بھورے بال کندھوں پر پھیلے  
ہوئے تھے۔ لابی میں جو ایک دلچسپ سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی وہ  
بیچ اسی کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔

گزرتے ہوئے مجھے ساڑھے اس کا صرف ایک رخسار دکھائی  
لا۔ یہ شخص ایک جھلک ہی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے کچھ شناسا  
لگتی ہوئی۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم سست پڑ گئے۔ میں بوجھ  
اپنے کمرے کی چابی کاؤنٹر کلرک کو دینے کے بجائے لوٹ آیا۔ تب  
ایک لڑکی کاؤنٹر پر دستخط کر کے سیدھی کھڑی ہو چکی تھی اور بالوں میں  
الٹیاں پھیرنے لگی تھی۔ میں نے کلرک کو مخاطب کیا تو لڑکی نے  
گواہی تو اذیتن کر کر دینا میری طرف دیکھا اور ایک لمبے  
کے لیے میری سانس گویا جیسے میں ایک گئی۔  
وہ زرتاج تھی!

میں ایک لمبے اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ اُس زرتاج سے  
تھوڑے فاصلے پر آ رہی تھی جس نے پہلی بار اس کی ذمہ داری پر  
لیا تھا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر "میری" خُش کا شاہکار تھی۔  
ایک دوامی داستانوں کا کوئی کردار تھی۔ اس وقت وہ کوئی ایسی لڑکی  
نہ تھی جو یورپ "سرنیکا" انگلینڈ سے تازہ تازہ وارد  
ہوئی ہو لیکن اس کے دونوں روپ ہلاکے و نکش اور حسین تھے۔ ہر  
لاپ کی اپنی ایک انفرادیت اور الگ طرح کی کشش تھی۔ پہلی بار

کی اسے زرتاج تھیں دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا اور آج  
اسے اپنے نائیو اشار ہوش کی جھلک جھلک کرتی لابی میں گھڑے  
لیج کر بھی میں دم بخود سا رہ گیا تھا۔

دویرے دویرے اس کے سلسلے یا قوتی ہونٹوں پر مسکراہٹ  
طرا ہوئی اور وہ گویا کسی آن کسی آن سنی بات سے محظوظ ہوتے  
ہوئے پہلی "کیا بات ہے..... اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا  
کہہ رہے ہو" کیا میرے سر پر سیکنگ ٹکڑے آتے ہیں؟

ہمارے لئے دی آگلی پی۔۔۔ بلکہ دی دی آگلی پی ہیں۔“

”میں سر!“ کلرک نے سعادت مندی سے کہا اور اس کے کارڈ میں نمبر دے لے گا۔ ذرا نئے کانے احتجاج کیا لیکن میں اس کی ایک نہ چلنے دی تاہم میں نے اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے کے ہوئے میرا تھا۔ میں نے غیرادب سے اس کا نام اس سے لے کر دے کی کوشش کی تھی کہ میں بھی مخلص ایک عام بزنس میں آجیٹ سے اس ہوٹل میں مقیم تھا۔ بس میری ذرا ہوٹل کے لئے ہر اچھی شاسانی تھی اور میں اضافی خرچ اپنے لئے لے رہا۔ اسے مشکل روم کے بجائے وی آئی لمبا سوٹ میں مقرر تھا۔ اس کے کارڈ میں نمبر وغیرہ تبدیل ہو چکا تو میں نے پوچھا۔ اس وقت اتر پورٹ سے آ رہی ہو؟“

”ہاں“ اس نے جواب دیا ”میری گاڑی آج شام نکلی۔“  
 روڈ پہنچ جائے گی۔“

”کٹاؤ کی تم نظر نہ کرو۔ گائیاں بہت ہیں۔ بلکہ اب تم نے بھی چیز کی فکر مت کرو۔ تمہاری اوقات اپنے اس خادم سے مل رہے ہیں جو تمہارے گھوڑے سے مدد کر رہا ہے۔ یہ خادم تمہارے لئے چیز میا کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ تم اگر یہاں پیچیدہ دریا میڈج کے کنارے کسی اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سفر کرنا پسند کرو تو وہ بھی میا کیا جاسکتا ہے۔“

”میں ہدایت پسند ضرور ہوں لیکن مجھے کارٹون بننے کا شوق نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”جیسا اب تم اپنے سوئٹ میں جاؤ، زور افریقہ ہو جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد تم سے ملاقات ہوگی پھر باتیں ہوں گی۔“ میں نے کہا اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بیل برائے کر رہنمائی میں آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ٹھکرک کو بدایت کی کہ اس آرام دہ آسائش اور ضروریات کا خاص خیال رکھنا جائے مثلاً غسل کو میں نے بتادیا کہ وہ میری محنت تھی لیکن ساتھ ہی اشیاء بدایت کی کہ ذرا کچ کو احساس نہ ہونے دیا جائے کہ میں اس پر کام لاک تھا۔

کھانا کھانے اور ہندو ضروری فون کرنے میں میرا ایک مہنگا کر گیا۔ ایک بار پھر میں لٹ سے اور آیا اور ذرا بج کے سو گیا۔ پانچ کروڑ تک دی۔ اس نے دواؤں کو کھانا اور تاؤ کی بخشش کی ایک ملک نے میرے ہر مسام جال کو معطر کر دیا۔ وہ شاور کے کلاب جنرل کی بجلی تھی اور اس فوٹو گیسٹ پھول کی طرح ملک دی تھی۔ شب رنڈ کی تمام خوب صورتیاں سینے کے بعد اس میں ناپا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گری نظریے اس کا جائزہ لیا تو وہ فہرے لپے میں بولی مشورہ پس آنے کے بعد تھماری نظروں سے کچھ بد معاشی ہی لگتی ہے۔“

”شہر کی فضا ہی ان دونوں کچھ بد معاشی سی ہو گئی ہے۔“  
 ”فہنڈی ہاؤس لے کر کہا ”یہ کن میرے بارے میں“

”تمہارے سر پر بیگ نکل آتے تب بھی شاید تمہارے حسن میں کوئی خاص کمی نہ آئی۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

اس کے گلاب سے رخساروں پر سُرخئی نمودار ہوئی۔ وہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر نرمی سانس لیتے ہوئے مسکرا کر بولی "تم اس وقت اس افضل سے کتنے مختلف نظر آ رہے ہو جو میرے ہاں گھوڑے بدھ جانے پر ملازم تھا۔"

"یہ سب وقت وقت کی باتیں ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آخر ہمیں وہ بہروپ بھرنے کی کیا ضرورت آتا پڑی تھی؟“  
وہ اب بھی میری طرف دیکھتے ہوئے گویا کسی پُرانے تصور سے لطف  
اندوز ہو رہی تھی۔

”میں نے تمہیں اس کی وجہ بتا دی تھی۔ آخری دنوں میں تو میں نے تمہیں اپنی سازی دھم کھائی تھی۔“ میں نے اسے یاد دلائی۔

”لیکن اپنی ذات کے بہت سے گوشے پنہاں رہنے دیے تھے۔“ اس نے گویا شکوہ کیا۔

”کچھ باتیں کسی اور وقت کے لئے بھی اٹھا رکھنی چاہئیں۔“

”میں نے سوچا شاید وہ وقت آن پہنچا ہو۔“ اس کی منگواہٹ  
 پہلے سے زیادہ روشن پہلے سے زیادہ دل نشیں تھی۔

”تم محض اس لئے تو یہاں نہیں آئی ہو گی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”تم بہت جلد باز ہو گئے ہو۔ لگتا ہے زور تاج نگر سے واپس آنے کے بعد تم میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں یا پھر شاید تم پہلی سی سے ایسے تھے اور زور تاج نگر میں تم نے بیس بدلنے کے ساتھ ساتھ عادتیں بھی بدل رکھی تھیں۔“

”تمہیں میری کس بات سے مجھ پر جلد باز ہونے کا لگاں مگڑا ہے؟“ میں نے خانا چاہا۔

”تم نے ہمیں کھڑے کھڑے یہ جاننے کی کوشش شروع کر دی کہ میں یہاں کس لئے آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اورہ واقعی کبھی کبھی میں بالکل بھول جاتا ہوں کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور موقع کمال کیا ہے۔“ میں نے قدرے شرمندگی سے تسلیم کیا ”آج صبح تیراوتر نے کمر لے لیا؟“

”ہاں“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”کیسا کراہا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں اسکی آنکھوں میں سہل بخیر لیا ہے۔ میرے لئے کافی ہے۔“

”کافی تو ہو گا لیکن اب مجھے یہ ظاہر کرنے کا موقع دو کہ مجھے حق میں بڑائی ادا کرنے کی کافی فکر ہے۔“ میں نے کہا پھر ٹھکرک کو مخاطب کیا ”اس کے مشکل بیڑ کو وہی آبی سوئٹ سے بدل دو۔ یہ

صرف ایک فون نمبر دے کر آگئے تھے اور وہ بھی اب بدل چکا تھا۔ اپنے بارے میں تم نے صرف یہ بتایا تھا کہ تم چھوٹے سے ایک بزنس میں ہو۔ مجھے یہ جان کر کچھ عجیب سا محسوس ہوا کہ اس کے لیے میں شکوہ تھا۔

”میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا تھا۔ میں واقعی ایک چھوٹا سا بزنس میں ہوں۔ فون نمبر میرے وہاں ہے آنے کے بعد بلائے۔ اس لئے تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ میں نے جہاں بوجھ کر تمہیں غلط نمبر دیا تھا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”میں نے صرف اس لئے تمہیں اپنے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل سے نہیں بتایا تھا کہ زندگی میں دوبارہ تم سے ملاقات کی کوئی امید نہیں تھی اور یہ تو مجھے قطعاً توقع نہیں تھی کہ اگر تم کبھی حسن اتفاق سے لاہور آجی گئیں تو مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کرو گی۔“

”کیا میں تمہیں اتنی ہی بے مروت لگتی ہوں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم تو شاید بے مروت نہیں ہو لیکن مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم لاہور بھی آئی تھیں اور وہاں تم نے مجھے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگر مجھے ایک فیصد بھی امید ہوتی کہ ایسا ہو گا تو میں تمہیں اپنا تفصیلی آڈیاپا سارے ایڈریس سارے ٹیلی فون نمبر۔ بلکہ اپنا انٹرنیٹ نمبر دے کر آتا جو کچھ زیادہ قابل فخر نہیں ہے۔“

”معلوم نہیں تم نے مجھ سے دوبارہ ملاقات کو ایسی انسوئی کیوں سمجھ لیا تھا۔“ وہ بدستور خواب ناک سے انداز میں مسکراتی تھی ”میں نہ صرف لاہور آئی بلکہ میں نے اس ایک ٹھکانے میں فون نمبر کی مدد سے تمہارا صحیح فون نمبر بھی تلاش کر لیا پھر تمہارے دفتر پر مشکل بلڈنگ بھی جا کر دیکھی۔ تمہارا وہ مکان بھی دیکھا جو حقیقتاً کبھی بہت عالی شان رہا ہو گا مگر اب اس کا بلڈنگ اٹھایا جا رہا تھا۔“

”کیا واقعی تم نے میرے بارے میں معلومات کرنے کے لئے اتنی زحمت کی؟“ مجھے گویا یقین نہیں آ رہا تھا۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ میں نے تو تمہارے کراچی ٹیک کے ٹھکانے معلوم کر لئے حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت میں جس ہوٹل میں مقیم ہوں یہ بھی تمہارا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”اور۔۔۔ مرادو! میں کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اپنی وائٹ میں فی الحال اس حقیقت کو اس سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”تم تو واقعی بہت چھوٹے سے بزنس میں ہو۔ چوتھی پتہ چھوٹے۔“ اس کا لہجہ استعزائیہ تھا۔

”اس ٹیکراں کائنات میں میری حیثیت واقعی ایک چھوٹی سے زیادہ نہیں۔“ میں نے ردِ بیانہ لمبے لمبے کہا۔

”ہم۔۔۔ بس اتنی انکساری مت ظاہر کرو جو جھوٹ معلوم ہونے لگے۔“ وہ بولی ”ابھی تو حقیقتاً تمہارے اور میری کادربارہ میں

ہے جسے تم بد معاشری سمجھ رہی ہو درحقیقت وہ سائنس ہے۔“ وہ ایک طرف ہٹ گئی اور میں اندر جا بیٹھا۔ اس کے کہنے سے ہی میں ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے مقابل لیٹے کھانا کھالیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جانا پر عی جیسا تھا سارا کھالیا تھا۔“ اس نے جواب دیا ”پھر کافی کا دور چلنا چاہئے۔“ میں نے کہا اور فون پر درام کو کافی کا آرڈر دیا۔

میرے ریسیور رکھنے کے بعد کمرے میں گھرا سکوت چھا گیا۔ ہم باہمی خاموش تھے اور مگر مگر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے۔ آخر کار وہ دھیرے سے ہنسی اور دھیمی آواز میں بولی ”بعض ت بے وقوفوں کی طرح دو افراد کا ایک دوسرے کو شکنا دونوں لانا ہوتا ہے۔“

”شکر ہے تم نے“ ”دونوں“ ہی کی بات کی ہے۔“ میں نے کہا۔ اسی اثنا میں کافی آگئی۔ دھڑ بھٹکا اور زور آج کافی بنا کر مجھے ہاتھوں میں صوفے کے پتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ”ہاں تو اب تم مجھے بتاؤ کہ تم کراچی کیوں آئی

گیوں کیا میرے کراچی آنے پر پابندی ہے؟“ اس نے کچھ انگلیوں سے میری طرف دیکھا۔

اور اسے پابندی کی بات مت کرو۔ یہاں نہ جانے کتنے ایسے رہائے پھر رہے ہیں جن کے اس دنیا میں آنے پر پابندی ہوتی تھی مگر وہ نہ صرف آپ کے ہیں بلکہ کسی طرح جانے کا نام بھی ہے۔ تم تو اس دنیا میں بہت بڑا اضافہ ہو لیکن میرے سوال پر گول کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں جب کوئی سوال کر ل تو پھر اپنی آسانی سے اسے نہیں بھولتا۔ تم کراچی کیوں

آئی؟ ایک گھنٹہ پھر کرو۔ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستگی سے اس کی تلاش میں آئی ہوں۔“

”ہاں ہے وہ؟“ میں نے اس کی آنکھوں کے راستے اس کے حاشیے کی کوشش کی۔

میں ابھی نہیں جاسکتی۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

پھر کب بتاؤ گی؟“

اب وقت آنے پر۔“ اس نے جواب دیا ”ویسے تلاش تو میں بھی کیا تھا۔“

مارکٹ کے لئے ایسی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں مانتے کہا۔

راجی دل رکھنے کی کیا بات ہے۔ میں بچ کر رہی ہوں۔ تم انظر میں کام رہنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ مجھے

کے جن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں ہو سکا ہوگا۔

”تم نے جو کچھ معلوم کر لیا وہ بھی کم نہیں ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک بدلے ہوئے فون نمبر کے سارے کوئی میرے بارے میں اتنا کچھ معلوم کر سکتا ہے۔ مجھے تو تم سے خوف آنے لگا ہے۔ تم تو شرلاک ہو مڑکی جتنی معلوم ہوتی ہو۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تم نے اپنی ذمت کیوں کی؟“

”کیا وجہ بتانا ضروری ہے؟“

”اگر تم نے وجہ نہ بتائی تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہوں کہ تمہیں میری ذات سے دلچسپی تھی۔“

”دلچسپی تو تھی۔“ وہ کچھ سوچنے کے بعد غلط سے لمبے میں بولی ”میں تمہارے بارے میں تجسّس میں مبتلا تھی۔ پہلے دن جب تم نے ذرائع گھر میں میرے ہاں گھوڑے سدا خانے کی ذمہ داری قبول کی، مجھے اسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ تم وہ نہیں تھے جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہے تھے پھر جب تم نے ذرائع گھر چھوڑنے سے کچھ پہلے اپنی کمانڈیشنل تب بھی مجھے یہ احساس رہا کہ تم بہت کچھ چھپا رہے تھے۔ چنانچہ جب اتفاق سے میرا لاہور آنا ہوا تو میں نے سوچا تمہارے بارے میں بھی لگے ہاتھوں کچھ ”تفتیش“ کر لی جائے۔“

”اس کے بعد تمہارا کراچی آنا ہوا؟“

”ہاں۔۔۔ کچھ تھکے جس کی مجھے تلاش تھی اس کے بارے میں پتا چلا کہ شاید وہ کراچی میں موجود ہو۔“ اس نے جواب دیا۔  
”ظہور اگر تم یہ نہیں بتانا چاہتیں کہ تمہیں کس کی تلاش ہے تو کم از کم یہی بتا دو کہ تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟“ میں نے اسے گریہ نے کر لیا ایک اور کوشش کی۔

”فی الحال میں یہ بھی نہیں بتا سکتی۔“

”دل کا معاملہ ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہو بھی سکتا ہے۔“ اس نے ہنس لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ ساٹا نظر آنے لگا تھا اور اس کی آنکھوں سے بھی میں اس کے دل کا بھید پانے سے قاصر تھا۔

چند لمبے ہم دونوں خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔ آخر کار میں نے گہری سانس لے کر کہا ”کسی عورت کے دل کا بھید پانا کتنا مشکل کام ہے۔“

”اس دنیا میں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں پانا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔“ وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے کہا ”بے شک“  
”تمہیں معلوم ہے رحیم کل بھی آج کل کراچی میں ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ایک بار پھر مجھے انکافی ہوئی۔

”مکون رحیم کل؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔ اس کی چیخ پر شکستیں تھیں گویا وہ ذہن پر زور دے رہی ہو۔  
”وہی انسپکٹر جو ذرائع گھر میں مجھے ڈاکو سمجھ کر گرفتار کر لیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ وہ!“ اسے یاد آیا ”وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟“  
”اس نے بڑی کوشش سے اپنا چادر لے کر لیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”وہ اپنی زندگی میں تبدیلی لاتا چاہتا تھا۔ اپنی ملا بیٹیں شری ماحول میں بدنے کا رونا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں کچھ نیا ہی تبدیلی آگئی۔ ابھی اسے آئے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن اڈا خانے سنگین معاملات میں الجھ گیا ہے۔ بازو بھی شدید زخمی کر دیا ہے۔ آج کل اپنے گھر میں بست رہا ہے۔ آرام کر رہا ہے۔“  
”اوہ۔۔۔!“ ذرائع نے کھٹکنا کہا۔ اس نے اس سلسلہ کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”اتفاق سے اس کے اور میرے معاملات پھر ایک دوسرے میں الجھ گئے ہیں۔“ میں نے کہا ”آج بھی میرا اس سے ملنے بہت ضروری ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد اس کی طرف جاؤں گا۔ تمہیں کوئی مصروفیت نہ ہو اور تم مناسب سمجھو تو تم بھی میرا ساتھ چلو۔“

اس نے ایک لمحے سوچا پھر کندھے اُچکاتے ہوئے بولی ”ہو ہے چلے چلوں گی۔“ اس کے لمبے میں کسی خاص دلچسپی یا ڈر نہ خودی کی جھلک نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ہم نیچے آئے۔ پارکنگ لائن میں میری گاڑی لے لے جگہ مخصوص تھی۔ میں نے اس کے لئے گاڑی کا دروازہ اور وہ نہایت پُر وقار انداز میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے اور خوب صورت ساخت کا دھوپ کا پتھر لگایا تھا جو اس کے چہرے پر بہت سی چیزیں بتا رہا تھا۔

چند لمبے بعد جب گاڑی سڑک پر ٹھہرے لے رہی تھی، نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا ”یار زندہ۔۔۔ صحبت باقی محاورہ کتنا سچا ہے۔ انسان زندہ رہے تو واقعی کسی نہ کسی ملاقات ہونے کا امکان باقی رہتا ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں کبھی ہم دونوں ایک ہی گاڑی میں اس شہر کی سڑکوں پر ٹھہرے۔“

وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ کسی حرکت میں تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”میں اپنا طرز زندگی یکسر بدل لینے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“ اس نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔  
”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔  
”میں نے کراچی شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

سنگتراش

اقدیم عظیم قیمت 300/-



ہو جائے۔ ان کی جمولیاں جتنی بھرتی ہیں آج ہی بھر جائیں۔ ان کے مشن کوئی تغیری مشن تو ہوتے نہیں۔ کہ وہ میرا سکون سے کام کریں اور اگر کام اچھرا رہ جائے تو اپنے بعد والوں کے لئے چھوڑ جائیں۔ ان کا مسئلہ تو کوٹ مار اور چھینا چھینا کا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں بہت جلدی ہوتی ہے۔ تمہارا معاملہ تو بہت مختلف ہے۔ تمہیں کاہے کی جلدی ہے؟

”مجھے جلدی نہیں۔“ وہ قہقہے سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”میں ٹھک گئی ہوں۔ میری بہت جواب دے گئی ہے۔ اتنے بڑے علاقے کا نظام مجھ سے اکیلے نہیں سنبھالا جاتا اور پھر جس طرح میں اپنے علاقے کا نظام چلانا چاہتی ہوں اس سے میرا کام اور مشکل ہو جاتا ہے۔“

”تم شادی کرلو۔“ میں نے کمری سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ ”کس سے؟“ اس نے مجھ سے بھی زیادہ سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ہالہ۔ یہ مسئلہ ذرا غور طلب ہے۔“ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹرنگ سنبھالنے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سر کھپایا ”تم جیسی غیر معمولی لڑکیوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے لئے مزہ بھی غیر معمولی ہونا چاہئے اور غیر معمولی مزد دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔“

”یوں تو دنیا میں غیر معمولی لڑکیاں بھی بہت کم پائی جاتی ہیں۔“ وہ مسکرائی ”لیکن شاید ان غیر معمولی لڑکیوں کی ان غیر معمولی مردوں سے ملاقات نہیں ہوتی۔ یا اگر خیر اتفاق سے ملاقات ہو بھی جاتی ہے تو ان کی زندگی کے راستے جدا جدا ہوتے ہیں۔ یوں وہ بے چاریاں معمولی مردوں کے پتے چڑھ جاتی ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔ ایسا تو ہوتا ہے۔“ مجھے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ تسلیم کرنا پڑا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ”آج کل تو حالات یہ ہیں کہ جن کی جڑ بنیاد گاؤں میں تھی وہ اپنے گاؤں کو واپس جا رہے ہیں اور جو کسی دوسرے شہر منتقل ہونا انورڈ کر سکتا تھا وہ منتقل ہو رہا ہے۔ یہاں بیشتر لوگ صرف وہی رہ گئے ہیں جو یہاں رہنے پر مجبور ہیں۔ ان کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں۔ ان حالات میں تم اپنی جڑ بنیاد۔۔۔ اپنی خوب صورت بہن۔۔۔ اپنا مائل گاؤں چھوڑ کر یہاں آنے کی بات کر رہی ہو۔ کوئی اور نئے گاؤں کی بجائے کاکہ تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔“

”ہاں۔۔۔ ذہنی توازن تو میرا واقعی درست نہیں ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے تسلیم کیا۔

”نہیہ۔ میرے لئے یہ کوئی نئی خبر نہیں۔“ میں نے کہا ”تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو اور اس دنیا میں جتنے بھی غیر معمولی لوگ پائے جاتے ہیں ان کا ذہنی توازن کسی نہ کسی حد تک ضرور بگڑا ہوتا ہے۔ غیر معمولی لوگ نارمل نہیں ابھار مل ہوتے ہیں۔“

”نہیہ۔ مجھے بڑے بڑے لفظوں سے بھلانے کی کوشش مت کرلو۔ پاگل پن، سر حال، پاگل پن، ہی ہوتا ہے۔ خواہ کسی بھی قسم کا ہو۔ میں برسوں سے زرنج ٹھکر کو ایک مثالی بہن بننے کے لئے کوشاں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کی ہر خوشی اس مقصد کے لئے تنج کی تھی۔ میں اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک طرح کا پاگل پن ہی تھا۔“

”تو کیا وہاں کوئی گزیر رہا ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”نہیں۔ گزیر تو نہیں ہوئی۔ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح اچھوڑ کر آئے تھے لیکن میرا یہ احساس شدید تر ہو گیا ہے کہ میری نخل بہت دور ہے اور میں ٹھک گئی ہوں۔ میرا دل کتا ہے کہ میں نا اس منزل تک نہیں پہنچ سکوں گی۔“ تمہیں واقعی اس کے لیے لڑ بول رہی تھی۔

”یہ کوئی ایسی تشویش کی بات تو نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ضروری تو نہیں ہوگا کہ بڑے بڑے مقاصد انسان کی زندگی لڑ ہی پورے ہو جائیں۔ جو لوگ اپنے نصب العین سے مختص رہتے ہیں وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ ان کی منزل انہیں اپنی زندگی میں ملتی ہے یا نہیں۔ وہ بس کام کے جاتے ہیں اگر ان کا کن ادھر رہا بھی رہ جائے تو وہ اسے اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔“

”بعد میں آنے والے۔۔۔!“ وہ استغناء سے انداز میں ہنسی میرے بعد کون آئے گا؟ میں کسی عظیم یا سیاسی پارٹی کی سربراہ تو نہیں ہوں کہ میرے بعد منتخب یا نامزد ہونے والے لوگ میرا کام لے کر چلیں گے۔“

”سربراہوں کو تو ہمارے ہاں زیادہ گھر ہوتی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہاں کی زندگی میں ہی ہو جائے بلکہ ان سے تو زندگی بھر بھی انتظار لیا جاتا ہے۔ ان کی تو کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے آج ہی

اچانک اس کا مریض ہاتھ اسٹیرنگ پر آن نکا اور اس نے مریض کو خفیف سا لہرایا تب مجھے احساس ہوا کہ ہمارے آگے ایک گاڑی نے اچانک بڑیک لگا دی تھی۔ زرنج بھی کو کہ میری طرف دیکھ رہی تھی اس کے باوجود اسے سامنے گاڑی ٹکے کا احساس ہو گیا تھا اور اس نے بروقت اسٹیرنگ وکیل کو خفیف سی حرکت دے کر دونوں گاڑیوں کو حادثے سے بچالیا تھا ورنہ شاید میری جنازی سائیکل مریض پر اس ننھی سی سوزوکی پر چڑھ دوڑی ہوتی۔

”ہاں بچے خوش ہوگی۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔  
اس نے زندگی سے بھرپور فائدہ لگایا اور بولی ”اس سوال کا جواب دینے کے لئے تمہیں شریک سے بے نیاز ہونے کی ضرورت نہیں تھی ورنہ میں ممکن تھا کہ جو سوال تم سے یہاں کیا گیا تھا اس کا جواب تم عالم بالا پر پہنچ کر دیتے۔“  
”کی احوال ہم عالم بالا پر تو نہیں البتہ رحیم گل کے گھر پہنچ گئے ہیں۔ ویسے اس کا اپنا شغل بھی تقریباً عالم بالا پر ہی واقع ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ تجسّس نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔ گاڑی سے اتر کر اس نے سر اٹھا کر عمارت کے باب غور کی طرف دیکھا اور بولی ”میری طرح اس رحیم گل کا بھی کوئی پڑھ کر ہوا ہے۔ یہ بھی آئیڈیلسٹ معلوم ہوتا ہے۔ جب گاؤں میں تھا تو عجیب عجیب باتیں کرتا تھا۔ عجیب عجیب خواب دیکھتا تھا۔ شاید اس کے بھی خواب ٹوٹ گئے ہیں اس لئے شرمچلا آیا۔“

”نہیں“ وہ اب بھی خوابوں کی دنیا کا آدمی ہے۔ البتہ مجھے اندیشہ ہے کہ گاؤں میں اگر اس کے کچھ خواب ٹوٹنے سے بچ گئے تھے تو وہ شرم آکر ٹوٹ جاتیں گے۔“ میں نے عمارت کی لابی کی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا ”لیکن اس میں تشویش یا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں.... تم رحیم گل.... اور میرے چند ساتھی.... ہم سب خوابوں کی دنیا کے آدمی ہیں اگر ہمارے خواب ٹوٹ بھی جائیں تب بھی ہمیں زیادہ ٹھکرتے دل نہیں ہوتا چاہئے اور ان خوابوں کی کہانیاں جو ذکر زندگی کا سفر جاری رکھنا چاہئے اگر ہم چھ لوگ بہت ہمارے پیچھے رہے تو باقی لوگوں کے لئے زندگی اور بھی زیادہ دشوار ہو جائے گی جبکہ ان کی زندگی پہلے ہی کچھ کم دشوار نہیں ہے۔“

وہ خیر خیال انداز میں خاموش رہی اور ہم لفٹ کے ذریعے اوپر آن پہنچے میں نے اس سے کہا ”تم ہمیں راہداری میں روک۔ میں رحیم گل کو سر اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“  
وہ کچھ اس طرح مزیدانہ انداز میں مسکراتی چہرے کوئی بزرگ کسی بچے کا دل رکھنے کے لئے اس کی بات مان رہا ہو۔ وہ دیر اور سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میری کال بیل کے جواب میں ملازم نے دروازہ کھولا تو میں اندر چلا گیا۔

”میں نہیں چاہتی کہ میرے ساتھ ایسا ہو۔“ وہ آنکلی سے بولی۔  
”پھر بھی تمہیں اپنا کوئی وارث چھوڑنے کے لئے شادی تو کرنا ہی پڑے گی۔“ میں نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔  
”حق آدمی! ہمارے ہاں نسل عورت سے نہیں، مرد سے چلتی ہے۔ میں نے اگر شادی کر بھی لی تو میرے بچے میرے نہیں میرے شوہر کے وارث ہوں گے۔“ وہ بولی۔  
”اے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ میں نے ایک بار بھر سر کھکھایا۔

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا میری اتنی بڑی جاگیر کو خلی دولت اور دوسرے اثاثوں کا مصروف کیا ہو گا۔ میں اکثر یہی سوچتی ہوں کہ مرنے سے پہلے کوئی ٹرسٹ قائم کر جائوں گی جو وصایتوں کی تلاش و بہود کے لئے کام کرے۔ وصایتوں میں زیادہ تر لوگ بڑی قابل رحم زندگی گزار رہے ہیں۔“  
”غریب اور نادار ہر جگہ ہی بڑی قابل رحم زندگی گزار رہے ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”بہر حال تم نے شرمینکل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”اے میرے پیچھے یہاں دشمنیں میں ایک بیٹھے کا بیعتانہ بھی دے دیا ہے۔ میں اب دراصل اسی ذیل کو فاضل کرنے آئی ہوں۔ کراچی مجھے اپنی زمینوں سے قریب پڑتا ہے اس لئے میں یہاں رہنے کو ترجیح دوں گی لیکن یہ بھی ممکن ہے میں ایک کوٹھی لاہور میں لے لوں۔ ہو سکتا ہے تمہاری ہی طرح میرا قیام بھی کراچی اور کبھی لاہور میں ہوا کرے۔“ اس نے بتایا۔

”گویا تم وصایتی زندگی کو خیرباد کہہ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”خیرباد تو نہیں کہہ رہی۔“ وہ بولی ”میں وصایتی زندگی سے اپنا تعلق محدود کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے آئیڈیلز بھی محدود کر رہی ہوں۔ آئیڈیلسٹ انسان زندگی میں بڑے دکھ اٹھاتا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں دنیا کو جس طرح دیکھتا چاہتی ہوں، دنیا اس طرح نہیں ہو سکتی۔ میں اب اپنی زندگی کو اپنے لئے ذرا آسان بنانا چاہتی ہوں۔“

”یہ کتنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے کہ انسان کون سے عمل سے اپنی زندگی کو آسان بنا رہا ہے اور کون سے عمل سے مشکل.... بہر حال زندگی تمہاری اپنی ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں فیصلوں کا اختیار ہے۔ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے کہ تم کراچی اور لاہور دونوں شہروں میں پانی چاؤ گی۔ اس طرح تم از کم مجھے تو تم سے میل ملاقات بڑھانے کا موقع ملے گا۔“

”کیا تمہیں واقعی اس سے خوشی ہوگی؟“ اس نے گردن جھکا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ تاریک بیٹشوں کے عصب سے اس کی نظریں میری آنکھوں کی گہرائیوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے میرا دھیان شریک سے ہٹ گیا۔



”ایسا نہیں ہو گا بھئی!“ میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا  
”تم تو بالکل ہی بدذوق آدمی ہو۔ کم از کم اپنی باری مان لو اور کچھ  
جرمان اپنے اوپر ڈال لو۔ جس طرح میں نے تمہارے بیٹے پر دس  
ہزار کا انعام رکھا تھا۔“

”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے اس کے لئے میں تیار ہوں۔ میں اپنی بار  
مانتا ہوں تم مجھے پرچہ چرانے والا جاہر ڈال دو۔“ وہ نہایت آسانی  
سے مان گیا۔

”چونکہ تم نے آسانی سے امان لی ہے اس لئے میں تم پر ہاتھ  
بلا کر رکھتے ہوئے جرمانہ ڈال رہا ہوں۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں  
صرف ایک شاندار ساؤنڈز۔“ میں نے کہا۔

”اچھا سا ہوٹل تو شہر میں تمہارا ہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا  
تم کس طرح لوگوں کو گھیر گھیر کر وہاں لے جاتے ہو۔“ بہت دیر بعد  
اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”واقعی“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”اگر میں اس طرح  
نہ کروں تو ہوٹل کس طرح چلے۔“ پھر میں دروازے پر واپس آیا  
اور باہر جھانک کر ذرا تاج کو پکارا ”آجائو ذرا نکلا ہو گیا ہے۔“

ذرا تاج پڑو قادر انداز میں قدم اٹھاتی اندر آئی۔ جب وہ رحیم  
مٹھی کے کمرے میں پہنچی تب بھی اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر  
نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ رحیم گل اسے دیکھ کر گویا دم بخود  
رہ گیا تھا۔ وہ ایک ننگ اسے دیکھ کر جا رہا تھا۔ اسے شاید اپنی  
آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ذرا تاج مسکرا رہی تھی مگر اس کے  
انداز پر کسی قدر مضطرب بھی نظر آ رہی تھی۔

آخر ذرا تاج نے ہی سکوت توڑا ”کیا بات ہے۔ میرا شہر تاتا  
سب کے لئے ہی بڑی حیرت کا باعث بن رہا ہے دیکھتے ہی ہر ایک  
کی سنی گم ہو جاتی ہے۔ کوئی پوچھنے کو بھی نہیں پوچھتا۔“

”نہیں... نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ رحیم گل گویا کسی اور سی  
دنیا سے واپس آتے ہوئے چونک کر بولا ”آپ تشریف رکھیے۔ پلیز  
تشریف رکھیے۔“

ذرا تاج اپنے مخصوص شاہانہ انداز میں بیٹھ چکی تو رحیم گل بولا  
”دراصل مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتفاقات  
بعض اوقات اتنے حسین ہوتے ہیں کہ انسان کو وہ اپنی نظر کا دھوکا  
لگتے ہیں۔ پہلے افضل سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی ایک خوب صورت  
اتفاق تھا لیکن یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسی افضل کے  
ساتھ ایک روز آپ بھی میرے گھر میں تشریف لاری ہوں گی۔“

”بھئی اتنے بڑے ٹکٹف انداز میں گفتگو مت کرو۔ تم تو پولیس  
آفیسر کے بجائے کسی مشاعرے کے منتظم معلوم ہو رہے ہو۔ اتنے  
ٹکٹف پر تو میں اپنے آپ کو کسی بھاری بوختے دبا محسوس کر رہی  
ہوں۔“ ذرا تاج مسکراتے ہوئے بولی۔

”آہ...!“ رحیم گل نے ایک طویل اور ٹھنڈی سانس لی  
”میری بد قسمتی ہے جو آپ بھی اسی تاثر کا شکار ہیں کہ کوئی پولیس

رحیم گل بالکل اسی طرح بیڑہ دروازہ تھا جس طرح میں اسے  
چھوڑ کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے میرے جانے کے  
بعد اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کی تھی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ  
اس کا لباس بدلا ہوا تھا اور وہ پہلے کی نسبت زیادہ صاف ستھرا اور  
تازہ دم نظر آ رہا تھا۔

”کوئی خاص خبر لائے ہو؟“ وہ بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔  
”خبر تو نہیں... میں ایک جتے جاگتے انسان کو ساتھ لایا ہوں  
اگر تم بوجھ لو کہ وہ کون ہے تو میں تمہیں دس ہزار روپے انعام دوں  
گا۔“ میں نے اس کے بیڈ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر تجسس یا اشتیاق کی کوئی علامت نمودار  
نہیں ہوئی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”ہم جیسوں کے گھر تو اب  
زیادہ تر بھرم، بدعاشی اور بدہشت گرد ہی آتے ہیں۔ کہیں تم کسی  
کا شکوک برادر کو تو یا ہر گھڑا کے نہیں آتے ہو؟“

”جب میں اندر آیا کم از کم اس وقت تو اس کے ہاتھوں میں  
کا شکوک نہیں تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں تو پھر بچوں کی طرح یہ بلیاں مت بھجواؤ اور است اندر  
لے آؤ۔ اس وقت اس قسم کے خصل میلے مجھے اچھے نہیں لگ  
رہے۔ ہانویں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر تکر  
نکشن لگا کر گیا ہے۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے یا صرف ایک ہانو زخمی ہونے  
سے تمہاری تو زندہ دلی یہ رخصت ہو گئی۔ شیر بنو... شیر“ آخر تم ایک  
پلیس آفیسر ہو۔ اور وہ بھی دیانت دار، فرض شناس قسم کے پولیس  
آفیسر ابھی تو ہمیں نہ جانے کتنی تکلیفیں اور اٹھانی پڑیں۔“

”میرا ہانو کھنڈ زخمی نہیں ہوا۔ الگ ہوتے ہوئے بچا  
ہے۔“ وہ بیڈوں میں لیٹے ہانو کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بولا ”میری جگہ  
لی اور ہوتا تو اس وقت اسپتال میں لیٹا ہوتا۔ اگر میں تکلیفیں  
خانے کے لئے تیار نہ ہوتا تو پولیس میں کیوں آتا؟ زمینداری  
رنگ ہم خاندانی زمیندار ہیں۔ یا پھر اب ہی نسل نے تھوڑا بہت  
کس شروع کیا ہے، جہاں تک زندہ دلی رخصت ہونے کا سوال ہے  
میں پہلے بھی کچھ زیادہ زندہ دل آدمی نہیں تھا۔ میں ایک سنجیدہ  
آدمی ہوں۔“ اس نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں تمام باتوں کا  
اب دیا۔

”اچھا... بھائی سنجیدہ صاحب! آپ سنجیدگی سے بھی میرے  
ال کا جواب دے سکتے ہیں میرا دل رکھنے کے لئے بھی تھکتے ہیں  
باہر کون آیا ہے۔“ میں نے اصرار کیا۔

”بھئی میں اس وقت کوئی کوئی کھیلنے کے موڈ میں نہیں  
ہے۔ وہ اپنے انکار پر قائم تھا پھر وہ بستر سے اٹھنے کی کوشش  
سے ہوئے بولا ”میں خودی جا کر دیکھ لیتا ہوں کہ کون آیا ہے  
مکے“ ”اعزاز“ میں تم اتنا سہنس پیدا کر۔ نہ کی کوشش کر رہے

والا مذہب نہ اور شرفانہ انداز میں گفتگو ہی نہیں کر سکتا۔  
 ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ ذراتج دیکھتے لیجے میں بولی ”خیر  
 ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم کراچی کیسے پہنچ گئے؟“  
 ”سچ جانتا چاہتی ہیں؟“ رحیم گل نے کمری نظر سے اس کی  
 طرف دیکھا۔

”ظاہر ہے مجھے جھوٹ سننے کا توانا شوق نہیں ہے۔“ ذراتج  
 نے جواب دیا۔  
 ”میں کسی کی وجہ سے کراچی آیا ہوں۔“ رحیم گل نے گویا  
 سینے پر رکھا ہوا کوئی بھاری بوجھ اُتارتے ہوئے کہا۔

اس موقع پر میں نے بے اختیار ایک لٹھڑی سانس لی اور  
 بولے بغیر نہ رہ سکا ”تم بھی کسی کے لئے کراچی آئے ہو۔“ ذراتج  
 بھی کسی کے لئے آئی ہیں۔ ایک میں ہی انوکھا چرغا ہوں جو یہاں کسی  
 کے لئے نہیں آیا۔ معلوم نہیں میں کیوں یہاں آ گیا ہوں۔ مجھے تو  
 رہاں ملے جانا چاہئے۔“

وہ دونوں اسے عجیبہ تھے کہ انہوں نے شاید میری بات سنی ہی  
 نہیں۔ وہ بغیر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور شاید دل  
 ہی دل میں ایک دوسرے کی پہلی بونیت کی کوشش کر رہے تھے۔  
 کمرے میں بوجھل سکوت چھا گیا تھا۔

رحیم گل نے یہ سکوت توڑا اور بدستور ذراتج کی طرف دیکھتے  
 ہوئے کچھ بے یقینی سے کہا ”کیا واقعی آپ بھی کسی کے لئے آئی  
 ہیں؟“

ذراتج نے جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھا۔ اس  
 کی نظروں میں ایک خاموش شگہ تھا کہ میں نے یہ بات رحیم گل  
 کے سامنے کیوں کی تھی؟ وہ اپنی ذاتیات کو دوسروں کے سامنے  
 موضوع گفتگو بنانے کی عادی نہیں تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے معذرت کی اور شور  
 چانے کے سے انداز میں موضوع بدلنے کی کوشش کی ”رحیم گل!  
 زیادہ دیر اس بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہارے گہرا انا ہم  
 سمان لے کر آیا ہوں اور تم غافلہ ارات کا بھی کوئی بندہ دست  
 نہیں کر رہے۔“

”دراصل میں ذراتج صاحبہ کو دیکھ کر اتنا بولکھا گیا ہوں کہ  
 میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ رحیم گل نے  
 اعتراف کیا۔

”تم اور کچھ کرو یا نہ کرو لیکن تمہیں حق میزبانی ضرور ادا کرنا  
 چاہئے۔“ میں نے کہا۔

رحیم گل ذراتج سے مخاطب ہوا ”یہ بڑی پیٹھ آدمی ہے۔ ہر  
 وقت کھانے پینے کی فکر میں رہتا ہے لیکن اس لحاظ سے یہ بہت  
 کیما ب پیٹھوں میں سے ہے کہ اس کی فوند نہیں ہے۔“  
 ”مجھے پیٹھ کہہ کر ایک خوب صورت خاتون کے سامنے میرا  
 ایجنہ خراب کرنے کی کوشش مت کرو۔“ ہمیں شاید معلوم نہیں ہے

میں صحرائی اونٹ کی طرح کچھ کھائے پئے بغیر بھی دو تین دن گزار  
 سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
 ”مجھے معلوم ہے تم بڑی پیچیدہ قسم کی چیز ہو۔“ رحیم گل نے  
 سر ہلایا اور اپنے ملازم کو آواز دی جو خانہ سالن کے فرائض بھی  
 انجام دیتا تھا۔ ذراتج اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس  
 نے ملازم کو کچھ اہتمام کرنے کی ہدایات دے ہی دیں۔

پھر اصرار وصر کی باتیں ہونے لگیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ  
 رحیم گل ابھی تک ذراتج کی آمد پر حیرتہ سا تھا انا ہم وہ ذراتج  
 سے اس کے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں مسلسل سوالات  
 کرتا رہا۔ آخر کار ذراتج نے اسے بتا ہی دیا کہ وہ کراچی شفٹ  
 ہونے کا پروگرام بنا رہی ہے اور اس کے فیصلے ڈیٹس میں ایک  
 ہفتے کا بیٹھ جائے دے دیا ہے۔

رحیم گل جیسے ہی سننا چاہا رہا تھا۔ اس خبر سے گویا اسے قرار  
 سا آگیا۔ میں اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے اندر  
 ضرور کوئی تھکڑی پک رہی تھی۔ اب وہ اپنے بازو کی تکلیف بھی  
 بھولا ہوا تھا۔

ملازم نے جانے اور لوازمات وغیرہ کا انتظام کر لیا تو ہم اُنٹھ کر  
 ڈینگ دوم میں آ بیٹھے۔ تب میں نے رحیم گل سے کہا ”اگر تم  
 دلچسپی محسوس کرو تو میں تمہیں تینس ٹیڈر عرف نوزی کے بارے میں بھی  
 کچھ بتا دوں؟“

اس کے تاثرات یکدم بدل گئے اور وہ مجھے گھورتے ہوئے  
 سر ہلے میں بولا ”کیا وہ غیبی پھر کچھ کر گیا؟“

”اس بار اس نے ایک نہایت ہی نیک کام کیا۔“ میں نے  
 کہا۔

”نیک کام؟“ اس کی آنکھیں مسکرتھیں ”وہ کیا؟“  
 ”یہی کہ وہ میرے ہاتھوں کا شکوفہ کار بست کھا کر مر گیا۔“

میں نے جواب دیا۔  
 رحیم گل کو حیرت کا شدید جھکا لگا۔ بے خیالی میں اس نے

ایک وقت دونوں بازوؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی اور کراہ کر  
 گپا ”کیا واقعی نوزی مر گیا ہے؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا ”ا  
 تمہیں کہاں لگا؟“

”قاسم علی کے جزیرے پر۔“ میں نے جواب دیا ”وہاں ظام  
 زوردار مگر رہا۔“

میں نے اسے وہ تمام واقعہ سنایا جو جزیرے پر میرے ساتھ  
 پیش آیا تھا۔ وہ بڑے اٹھاک سے سننا رہا۔ ذراتج کو سیاق و سباق  
 کا علم نہیں تھا لیکن وہ بھی توجہ سے سب کچھ سنتی رہی۔

میں خاموش ہوا تو رحیم گل افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا  
 ”یہ بہت بڑا ہوا۔“

”یعنی میں ذمہ دار کر آگیا۔ یہ بہت بڑا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ رحیم گل کا سر ایک بار

ہمت دیر تک کپ شپ باری رہی۔ چائے وغیرہ کا دور چلتا رہا۔ گاؤں کی باتیں اور ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ تاہم ذرتاج کے ہنسی مذاق میں بھی ایک قسم کی ستانت تھی۔ جس نے محسوس کیا کہ رحیم گل کے سامنے وہ زیادہ مکمل نہیں رہی تھی۔ رحیم گل خوب چپک رہا تھا۔ وہ اپنے بازو کی تکلیف اپنے مسائل کے لئے فرائض کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات وغیرہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

آخر ہم نے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم جائیں۔ مسکین سی شکل بنا کر بولا "کچھ دیر تو اور بیٹھو اور بات کا کھانا کھا کر چلے جانا۔ میں زخمی ہوں، تیار ہوں۔ کچھ دیر میری عیادت تو کرو۔"

"اب تک ہم اور کیا کر رہے تھے؟" میں نے اسے گھورا "ہمیں دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"تم اپنے ساتھ ذرتاج کو کیوں شامل کر رہے ہو؟ تمہیں بہت سے کام ہوتے ہوں گے لیکن ضروری نہیں کہ ذرتاج کو بھی اتنی مصروفیت ہو۔" رحیم گل نے پرامیدی نظروں سے ذرتاج کی طرف دیکھا۔

"میں تو افضل سے بھی زیادہ مصروف ہوں۔" ذرتاج اپنے مخصوص دھنکے انداز میں مسکراتی "میں یہاں منتقل ہو رہی ہوں۔ ایک ایسی جگہ سے منتقل ہو رہی ہوں جہاں میری جڑیں تھیں۔ جہاں میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ اب مجھے یہاں اپنی رہائش کے تمام انتظامات کرنے ہیں۔ تم شاید میری مصروفیات کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"جب انسان کے پاس دولت موجود ہو تو رہائش کی منتقلی بھلا کون سا مشکل کام ہے۔" رحیم گل بے پروائی سے بولا "اور پھر یہاں میں اور افضل موجود ہیں۔ ہمیں حکم کریں ہم تمام انتظامات کر دیتے ہیں۔ گویا آپ کو ہاتھ بھی نہیں ملتا ہے؟ گا اور سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ آکر آرام دہ ویراستہ پٹنگے میں بیٹھ جائے گا۔"

"بہت شکریہ۔ اگر ضرورت پڑی تو میں آپ لوگوں کو زحمت دوں گی۔" ذرتاج بولی "ویسے انسان کے رہنے کے لئے مسئلہ صرف آرام دہ ویراستہ پٹنگے ہی کا نہیں ہوتا اور بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔"

"میرے گھنے کا مقصد یہی ہے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ کسی بھی قسم کا مسئلہ ہو ہمیں حکم کریں اور یہ بد معاش افضل چھوڑی تو مجھ سے بھی زیادہ کالم کا آدمی ہے۔" اس نے مصروفی و رقابت سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے معلوم ہو چکا ہے۔" ذرتاج بدستور مسکراتی تھی۔ یہ مشکل رحیم گل نے ہماری جان چھوڑی۔ ہم جب نیچے آکر گاؤں میں بیٹھ کر اس عمارت سے نکل چکے تو ذرتاج نے سیٹ کے پٹے سے ٹپک ٹپک کر ایک طویل سانس لی گویا اس کے سر سے کوئی ہماری بوجھ اتر گیا ہو۔

الغرض زندہ سے انداز میں بیٹھے گا "میں تو یہ کھانا چاہ رہا تھا کہ نوزی زندہ ہمارے ہاتھ آتا تو بہتر تھا۔"

"اگر میں اسے زندہ چڑھنے کی کوشش کرتا تو شاید میں غرور حالت میں بھی تمہارے "ہاتھ" نہ آتا۔" میں نے کہا "ویسے بڑے دادے۔۔۔ تمہیں اس کی زندگی کیوں عزیز ہو گئی؟ تمہیں امید تھی کہ وہ "سنٹی خیر انگشتاں" کرے گا اور تمہیں کسی میڈل وغیرہ سے نوازا جائے گا؟"

"میڈل وغیرہ کی کسی کیفیت کو فکر ہے۔" وہ جل کر بولا "تمہیں شاید یاد نہیں ہے کہ مشتاق مدثر کی۔ یعنی ایک صحافی کی موت میرے گلے چڑی ہوئی ہے۔ وہ میری تحویل میں مارا گیا تھا۔ نوزی نے اسے قتل کیا تھا۔ اب اگر وہ زندہ ہاتھ آتا تو میں اسے پرنس کے سامنے پیش کر سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا "نیچے حضرات! یہ ہے مشتاق مدثر کا قاتل" لیکن اب کون میری بات کا یقین کرے گا؟ ایک غرور شخص کو میں کیسے مشتاق کا قاتل ثابت کروں گا؟ ایک تو میرے گلے کی شہرت اتنی خراب ہے کہ ہم گلا بھار بھار کراچ بھی بولتے رہیں تب بھی کوئی یقین نہیں کرتا۔ لوگ تو ویسے ہی کہتے رہتے ہیں کہ ہم پولیس مقابلوں میں سرنے والوں پر جو الزام چاہیں ڈال دیتے ہیں۔ جو کس بھی ہم سے مل نہیں سکتا وہ ان کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اول تو پولیس مقابلوں ہی کو کوئی درست تسلیم نہیں کرتا۔ یہ تو ویسے بھی ایک صحافی کا معاملہ ہے۔" "جڑیے پر جو کچھ ہوا یہ پولیس مقابلہ قسم کی چیز نہیں تھی۔ نوزی میرے ہاتھوں مر رہا ہے۔ میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خفیہ اداروں کے لوگ وہاں موجود تھے اور میرا خیال ہے یہ واقعہ پولیس میں رپورٹ نہیں ہو گا کیونکہ اس کی جڑیں ڈرگ افایا کے ساتھ جا کر لٹی ہیں اور ڈرگ افایا کے سلسلے میں جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، حکومت زیادہ تر اسے خفیہ ہی رکھ رہی ہے۔" میں نے بتایا۔

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ویسے بھی مشتاق مدثر کی موت پر پولیس کا بدو عمل میری توقع کے میں مطابق ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے پولیس والوں نے تو خود اس سے جان چھوٹنے پر خدا کا شکر ادا کیا ہے۔ خود اس کے اپنے اخبار نے کچھ زیادہ شور نہیں مچایا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس اخبار کا اپنا دامن بھی شاید کچھ زیادہ صاف نہ ہو۔ جو اخبار مشتاق مدثر جیسے لوگوں کا اہم پرسوں پر لکھتے ہیں وہ خود بھی کچھ ایسا صاف ستھرا ریکارڈ نہیں رکھتے۔ اس کے اخبار نے شاید اسی لئے زیادہ شور نہ مچایا ہو کہ کیس خود اس کے اپنے بارے میں کچھ حقائق سامنے نہ آجائیں۔ ہر حال تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

رحیم گل ایک طویل سانس لے کر بولا "تم کہتے ہو تو میں بے لہو ہوتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر ذرتاج کی طرف متوجہ ہو گیا اور ل کی آنکھیں ایک بار پھر خواب ناک سی ہونے لگیں۔

"بہر حال آج اس کا رویہ... اس کا اندازہ... اس کے تاثرات میرے لئے حیران کن... بلکہ کسی حد تک پریشان کن تھے۔" وہ بولی۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے سست رفتاری سے ڈرائیوگ جباری رکھتے ہوئے کہا "گلتا ہے قدرت نے میرے مشورے پر عمل درآمد کا فوری بندوبست کر دیا ہے۔ میں ہوش میں تھیں کہ یہی تو کہہ رہا تھا کہ شادی کر لو۔ اور تم پوچھ رہی تھیں کہ اس سے؟ یوں سمجھو غیب سے تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ بھڑی امیدوار حاضر ہے۔ رحیم گل خورو نو جوان ہے۔ عمدہ زیادہ پرانہ سہی لیکن کام کے ٹکے میں ہے اور اس کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ اپنی وادعائیں اور خدائی پیمانے کے باوجود اس ٹکے میں بھی ترقی کر جائے گا۔ فیملی بیک گراؤ نہ بھی پہنچا ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے یہ رشتہ تمہارے لئے آسمان سے اترا ہے۔"

"تم نے کیا کوئی شادی دفتر کھول لیا ہے؟" اس نے مجھے گھورا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی "بہن کی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا کسی کو منزل کا راستہ دکھاؤ تو وہ بے عزتی کرنے لگتا ہے۔"

"تم نے کس نے کہہ دیا کہ رحیم گل جیسے کسی نو جوان سے شادی کرنا میری منزل ہے؟"

"آخر اس میں حرج بھی کیا ہے؟" میں نے کہا "تم مجھے چند دواہیات بتا دو جن کی بنا پر رحیم گل سے شادی نہیں کی جا سکتی۔"

"اس کے لئے ایک ہی وجہ کافی ہے۔" وہ کہتی سنجیدگی سے بولی "اور وہ یہ کہ مجھے رحیم گل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"ضروری نہیں ہے کہ جس سے دلچسپی ہو؟" اس نے شادی کی بات کی۔ یا جس سے شادی کی جائے اس میں دلچسپی بھی لی جائے شادی ایک الگ مسئلہ ہے۔ سماجی ضرورت ہے۔ ممکن ہے تمہیں شادی کے بعد رحیم گل سے دلچسپی ہو جائے۔" میں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن اس مت کرو اور زیادہ بھڑا بننے کی کوشش بھی مت کرو۔" اس نے مجھے ڈانٹ پائی۔ اس کا انداز اب قطعی دوستانہ ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے زندگی میں شاید ہی کسی سے اس طرح دوستانہ انداز میں بات کی ہو۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو لڑکیوں سے بھی اس حد تک بے تکلف نہیں ہوتیں۔ میں اس میں کچھ تبدیلی محسوس کر رہا تھا جو میرے لئے خوشگوار بھی تھی اور حیرت کا باعث بھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "تم نے میرے انداز فکر کا پورا نہیں منانا؟"

"نہیں۔" مجھے خوشی ہوئی ہے۔ اب تم سے گفتگو میں سہولت رہے گی۔" میں نے کہا۔

مزید ایک لمحے تک وہ خاموش ہی رہی تو میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا "اس طویل سانس کے پیچھے کچھ الفاظ کا گھٹا گھٹ کر رہ گیا ہے۔ تم شاید کچھ کہنا چاہتی تھیں۔"

وہ بے ساختہ نہیں۔ یہ نہیں اُس نہیں سے بہت مختلف تھی جو میں نے رحیم گل کے بارے میں سنی تھی۔ یہی تھی تو وہ بولی "تم بہت نصیحت ہو۔"

"عزیز کا شکریہ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "لیکن اصل بات ٹول کر کہنے کی کوشش مت کرو۔"

"وہ تو اصل..." وہ قدرے ہچکاہٹ کے ساتھ بولی "میں نے محسوس کیا ہے کہ رحیم گل میری ذات میں دلچسپی لینے لگا ہے۔" "دلچسپی؟" اب میرے ہنسنے کی باری تھی "اتنی انکساری کی کیا ضرورت ہے۔ یوں کہو کہ وہ جاہلوں ہاتھ پیر سے تم پر عاشق ہو چکا ہے۔"

"تم اس سے بھی زیادہ غیث ہو جتنا میں سمجھتی تھی۔" وہ درمیانے طبقے کی نو عمر اسکول گرل کی طرح جینپ سی کی اور مجھے اس کے رخساروں کی سرخی بڑھتے دیکھنا بہت ہی عجیب لگا۔ یہ بظاہر بڑا سرسری بڑا معمولی لیکن دل کو تھکوانے والا تجربہ تھا۔

پھر وہ گویا خود پر قابو پاتے ہوئے بولی "یہ اچانک عشق کہاں سے برآمد ہو گیا؟ زور ناگ کر میں اس سے دور چلا جاؤں تو یہی لیکن وہاں تو یہ بڑا مذہب ہو کر آتا تھا۔ میں بھی بیٹھ اس کے سامنے رہ کر رہی رہی۔ میں نے کبھی اپنے رویے سے اس کی معمولی سی بھی بہت انفرائی نہیں کی۔"

"منطقی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے لمانت سے کہا "بہت انفرائی کی بھی ہوتی تو یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ زندگی تمہاری اپنی ہے اور زندگی کے کچھ تھائے ہیں۔"

"میں منطقی پیش نہیں کر رہی۔ تم میرے بزرگ نہیں ہو کہ میں منطقی پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتی۔" وہ تیزی سے بولی "بلکہ بزرگ ہوتے تب بھی شاید میں منطقی پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ میرے مزاج میں سرکشی کی حد تک خود مختاری ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر تمہیں ایسی بات کرنی ہی نہیں چاہئے تھی۔" اس کے لیے میں اب بھی خلیفہ کی رہی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے سوجھا شاید... "میں نے بات اور صوری چھوڑ دی۔"

"میں تو صرف حیرت کا اظہار کر رہی ہوں۔ آخر رحیم گل کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ وہی چہرے ہوئے بولی "عشق یوں اچانک تو نہیں ہو جاتا؟"

"ہو سکتا ہے عشق پہلے سے سوجھ رہا ہو لیکن اس کا اظہار آج اچانک ہوا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔



رکنا ضرور۔ اس لئے تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ میں ذرہ دوستی تمہارے لئے باب نکال رہا ہوں۔ شاید اسی لئے تمہیں میری صاف گوئی بھی بُری نہیں لگے گی کہ تم اپنی اہل حال میرے مطلوبہ مہیا پر پوری نہیں آتی ہو لیکن تم ہر حال ایک اہل لڑکی ہو۔ مجھے اُمید ہے تم بہت جلدی پک کر لو گی بہت کم وقت میں سب کچھ سیکھ جاؤ گی۔

”میں کو شش کردوں گی سر!“ اس کا لہجہ نشانہ دہی کر رہا تھا کہ وہ ایک اچھی سیکرٹری ثابت ہو گی۔

میں نے اشارے سے بتایا ”یہ جو سامنے... میرے آفتاب کے ساتھ ہی چھوٹا سا کرا ہے اس میں بیٹھنے کے اختتام موجود ہیں۔ تم جاؤ تو کل سے بیٹنا شروع کر سکتی ہو۔ جہاں زیادہ مصروفیت انہی دنوں میں ہو گی جب میں کراچی میں ہوں گا۔ میری عدم موجودگی میں کام بہت کم ہو گا۔ کل پر سون چھبیس پر سون بجے سے لپٹا ٹنٹ لیٹرل جائے گا جس میں کھڑا ہو کر وہی تھیںات ہوں گی۔ کسی بات پر اعتراض ہو تو مجھ سے ڈسکس کر لیا۔“

”اعراض...؟“ وہ خرد استہزائی کے سے انداز میں ہنسی ”سرا کسی کو احسان کے بوجھ سے انعام دیا نہیں کہ اس بے چارے کا دم ہی ٹھٹ جائے۔ میرا یہاں اپنی ملازمت کی شرائط پر اعتراض کرنا اپنی خوش قسمتی کو لات مارنے کے مترادف ہو گا۔“

”دراصل میں نہیں چاہتا کہ تم کسی معاملے میں اپنے آپ کو مجبور محسوس کرتے ہوئے یہاں ملازمت شروع کرو۔“ میں نے واضح کیا۔

”مجھے اندازہ ہو گیا ہے سرا آپ نہیں چاہتے کہ میری عزت نفس کو کوئی ٹھیس پہنچے۔ مجھے تو یقین نہیں تھا کہ آپ کے ہفتے میں مجھ جیسے لوگوں کے محسوسات تک کا خیال رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔“ وہ واقعی بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں کسی اور سیارے سے آئی ہوئی مخلوق تھا۔

”ہر طبقے میں تمہیں ہر طرح کے لوگ ملیں گے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اتنے اور آئیڈیل قسم کے لوگ اب ہر طبقے میں بہت کم رہ گئے ہیں سر!“ وہ بولی۔

”اچھی چیزیں... اتنے انسان تو غیر عادی ہی کم تعداد میں رہے ہیں لیکن تم ٹھیک کہہ رہی ہو اب خطرناک حد تک کم ہو گئے ہیں۔“ میں نے تسلیم کیا ”مگر تم مجھے اتنے اور آئیڈیل قسم کے انسانوں میں مت شمار کرو۔ میں کوئی ایسا اچھا اور آئیڈیل قسم کا انسان نہیں ہوں۔ اب تم باسکتی ہو۔ اپنے معاملات نمنہ کر کل یا پرسوں سے اپنی فی ملازمت پر آنا شروع کرو۔“

”سرا میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس طرح آپ کا شکر ادا کروں۔“ اس کے لہجے میں اتنی منونیت تھی کہ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔

”جو کام سمجھ میں نہ آئے وہ کرنا ہی نہیں چاہئے۔“ میں نے

لپٹ چکا ہے تاکہ تم اپنے اعصاب پر بوجھ لئے وقت نہ گزارو۔“

”آپ نے میری جتنی مدد کی ہے یہ احسان میں بھی فراموش نہیں کر سکتوں گی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو کسی غرض کے بغیر یوں اپنے کام آتے دیکھا ہے۔ میں اب چلتی ہوں مجھے معلوم ہے آپ کا وقت جتنی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اشارہ کیا ”میرا خیال ہے میں تمہیں اس ہوٹل میں ایڈیٹ کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم اپنا لائف اسٹائل بدلنے کے لئے اپنے آپ کو تیار محسوس کرو۔ یہاں کوئی ایسا دنیا دھندلا نہیں ہو تا۔ تمہیں کوئی ایسا ویسا سا بڑا برس پارٹ ٹائم کام میر نہیں آئے گا البتہ اگر یہاں دیپٹی فٹم کرنے کے بعد تمہارے پاس ٹائم بچے اور تم یہاں کی عذرا کو اپنی ضروریات کے لئے کافی سمجھو تو کسی اور دفتر اور اسے میں شرفانہ قسم کی پارٹ ٹائم نوکری کر سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

وہ کچھ اس طرح بیٹھ گئی جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ یکدم ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ”آپ ذرہ دوستی میری خاطر چاہتے نہ نکالیں۔ آپ لائف اسٹائل بدلنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں تو خود ہی لائف اسٹائل بدلنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ اسی لئے تو میں تمہری اشارہ ہو کر واپس نہیں جا رہی ہوں لیکن مجھ جیسے لوگ جب اپنی اصلاح کا عزم کرتے ہیں تو ان میں ایک اور بڑی خرابی پیدا ہو جاتی ہے یعنی ان کی خود داری بیدار ہو جاتی ہے۔ میری خود داری اب یہ گوارا نہیں کرتی کہ میرے حالات سے متاثر ہو کر آپ ذرہ دوستی میرے لئے جگہ نکالیں اور مجھے نوکری دیں۔“

”تم سے کس نے کہا کہ میں ذرہ دوستی تمہارے لئے جگہ نکال رہا ہوں؟“ میں نے تیزی سے کہا ”یہ درست ہے کہ میں لوگوں کے کام آنے کی کو شش کرتا ہوں اور اس سلسلے میں کبھی کبھی بڑے بڑے خطرات بھی مول لے لیتا ہوں لیکن میں ہر حال ایک برس میں بھی ہوں۔ ایک برس میں خواہ مخواہ کا مستقل بوجھ کبھی نہیں پاتا خواہ بوجھ اس کے لئے تنگ کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔“

وہ خاموش رہی اور آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس کے آنسو ختم نہ ہوئے لیکن آنکھیں نمی رہیں پھر نہ جانے کیوں وہ افسردہ سے انداز ل کر اوی۔ یہ سٹراٹج آفسوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔

بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں وہ بولی ”چلے میں آپ کی بات کا یقین لیتی ہوں۔ آپ مجھے کس کام کے لئے رکھنا چاہتے ہیں؟“

”میرا خیال ہے میں جن پیکڈوں میں پڑنا ہو رہا تھا ان سے لڑی جان چھوٹ رہی ہے۔“ میں نے وہی الونگ پیچر کے پیشے سے سناگتے ہوئے کہا ”اب مجھے کچھ فرصت میرا آنے کی۔ اب میں اپنے کاروبار کی طرف توجہ دینا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں اب لی کراچی آمد وقت بھی زیادہ رہے گی۔ یہاں اس ہوٹل میں لی کوئی مشکل سیکرٹری موجود نہیں ہے۔ مجھے اس پوسٹ کے لئے کسی نہ کسی کو رکھنا ہی تھا۔ اب نہ سنی ایک ماہ بعد رکھنا لیکن

”برصاورد۔“

”حمید کچھ اور لمبی ہو گئی ہے۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”ہوئے درد۔ کوئی بات نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں نے تمہیں اپنا بھائی یا بھائی سمجھ لیا ہے۔ اب ہر معاملے میں تم میرے رازدراں ہو گے اور تمہیں بھی پورے غلو میں دل سے میرے ساتھ جی دوستی بنانا ہو گا۔“

”نی اللال تم ایک طرف ٹرنک چلائے جاؤ۔ ابھی میں اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ دیئے اس قسم کی باتیں کافی جرم سے پہلے اپنی اسکول کے لڑکے لڑکیوں میں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان میں بھی نہیں ہو جیں۔ زمانہ بہت فاسٹ ہو گیا ہے۔“

”میں ابھی گھر سے دقتوں کی معصوم اور خوب صورت قدروں اور روایتوں کے ساتھ چل رہا ہوں۔“ وہ بولا ”مجھے تو میرا یہ عالم ہے کہ ذرا تاج کو فون کرنے کے بجائے تمہیں کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے یا افضل..... وہ دو میں نے تمہارے اور ذرا تاج کے سامنے کہا تھا تا کہ میں کسی کے لئے کراچی گیا ہوں تو اس سے میری مراد دراصل ذرا تاج ہی تھی۔ میں درحقیقت اس کی وجہ سے کراچی شفٹ ہوا ہوں ورنہ مجھے شہری زندگی اور میاں کے محل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔“

”اور.....!“ میں ایک طویل سانس لے کر کہہ گیا لیکن پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے کہا ”لیکن تم تو ذرا تاج سے پہلے میاں آچکے تھے۔ ذرا تاج تو اب آئی ہے۔“

”مجھے پہلے ہی بتا چل گیا تھا کہ وہ شفٹ ہونے کا پروگرام بنائیں گی۔“ اس نے بتایا۔

”تمہیں کیسے بتا چل گیا تھا؟ اس نے تو تمہیں نہیں بتایا ہو گا۔“

”نہیں اس نے تو یقیناً نہیں بتایا تھا لیکن میں آخر پولیس والا ہوں۔“ وہ بولا ”اس وقت میرے ایک جاننے والے سوبائی حکومت میں ایسے عہدے پر موجود تھے میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان سے کہہ کر وہاں جا کر بھی کر لیا کہ بعد میں کہیں تبادلہ مشکل نہ ہو جائے۔“

میں شخص بنگارا بھر کر گیا۔ ایک لمحے کے لئے کچھ بھی نہ بول سکا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں گھرا سا جھگڑا چھلکا حالانکہ یہ میرے لئے اتنا نیا انکشاف نہیں تھا۔ مجھے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ تو ذرا تاج کے ساتھ اس کے گھر جا کر ہی ہو گیا تھا پھر بھی اس کے مت سے یہ سب کچھ نمٹتا نہ جاتے کیوں مجھے عجیب سا دکھا۔

”تم خاموش کیوں ہو گئے؟“ اس کی آواز نے مجھے جھجھکا دیا۔ ”میرے بزرگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تم کسی کو محبت میں جلا دیکھا کرو تو دوست کے لئے تعزیری انداز میں خاموشی اختیار کر لیا کرو۔“ میں نے سنبھلے ہوئے کہا۔

”کما“ جب تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ کس طرح میرا شکریہ ادا کرو۔ تو اس کا بہترین حل یہ ہے کہ تم شکریہ ادا ہی مت کرو۔“ اس کے رخصت ہونے کے بعد میں شفیع شاہ کو فون کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آپہنچنے مجھے رحیم گل کے فون کی اطلاع دی۔ مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ تھوڑی ہی دیر پہلے میں اور ذرا تاج اس کے ہاں سے آئے تھے۔ اتنی ہی دیر بعد ہی اسے فون کرنے کی نہ جانے کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔

”میں نے کال ریسیو کی تو اس نے خود اسی وضاحت سے بات شروع کی ”تم حیران ہو رہے ہو گے کہ اتنی دیر تو تم سے کپ شپ دئی ہے اب میں نے کیوں فون کیا ہے؟“

”اب تم نے خود ہی سوال اٹھایا ہے تو خود ہی وضاحت بھی کرو۔“ میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔

”دراصل میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا تھا جو ذرا تاج کے سامنے بتانے کی میری بہت نہیں پڑی تھی۔“ میں اس کے لیے پ

حیران ہوئے بغیر نہ سکا۔ ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا اس کے لیے۔

”ہاں رعب ہے بھی تم پر لڑکیوں کا!“ میں نے حیرت سے کہا ”کاش ہمارا بھی تم پر اتنا ہی رعب ہوتا۔“

”سب لڑکیوں کا نہیں۔ صرف ذرا تاج کا۔“ اس نے گھبراہٹ سے کہا۔

”پلو اتنا بھی کافی ہے اور یہ ذرا تاج کی خوش قسمتی ہے۔“ میں نے اس کے لیے پھر غور کرتے ہوئے کہا ”اب بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے؟“

”بات یہ ہے افضل ذرا تاج اس شہر میں میرا کوئی دوست نہیں ہے بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ میرا کہیں بھی کوئی دوست نہیں ہے۔“ ”ہو بھی کیسے سکتا ہے۔“ میں نے قہر دیا ”آخر تم پولیس والے ہو اور پڑانے دقتوں کے کسی کام رانٹور نے یہ معاہدہ ایجاد کر کے پبلک کو بھارا رکھا ہے کہ پولیس والوں کی نہ دوستی انہی نہ دشمنی انہی۔ شاید اسی لئے لوگ تم سے دوستی یا دشمنی کچھ بھی نہیں رکھتے ہوں گے۔“

”ایک تو تم بات میں سے بات بہت نکالتے ہو۔“

”بھئی جب تم ایک بات بتانے کے لئے باقاعدہ حمید باغیہ رہے ہو تو کیا میں بات سے بات بھی نہیں نکال سکتا۔“ میں نے کہا۔

”بات ہی کچھ ایسی ہے کہ اس کی حمید باغیہ ضروری ہے۔ میں یکدم بات کہہ کر تمہارے سر پر غم اتار نہیں چاہتا۔ بنیادی طور پر تم بھی ”پینڈو“ ہو اور میں بھی۔ ہم جیسے لوگ عام طور پر بات لگھ مارنے کے انداز میں ہی کہہ گزرتے ہیں لیکن میں یہ بات بڑے قہر اور دھچکے پن سے کہنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی سے قہر اور دھچکے پن سے منسوب پھر اسی قہر اور دھچکے پن سے اسے آگے

”اس سادگی پر کون نہ حیرات اے خدا!“ میرا منہ رات میں کرکنا لیکن پھر میں نے بڑی کوشش سے اپنا لہجہ نہایت ملائم بنالیا ”یار رحیم گل! آج ذرا رنج کی موجودگی میں تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ کچھ شبہ ہو رہا تھا کہ تم جھوٹے سونے گدھے ہو لیکن اب تمہاری باتیں سن کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم درحقیقت کتنے بڑے اور بے مثال گدھے ہو۔“

”کیوں... میں نے گدھوں والی کیا بات کی ہے؟“ وہ ہلکی سی فحش سے بولا۔

”کیسا جبرت کا مقام ہے کہ ایک گدھا چار چار ہاے اس نے گدھوں والی کیا بات کی ہے۔“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا ”بھائی! رحیم گل! تم ذرا رنج کے دیوانے ہو اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ بڑی اچھی بات ہے لیکن شادی کا پیغام بھجوانے کے لئے تمہاری نگاہ انتخاب مجھ پر ہی کیوں پڑی ہے؟ میں کیا تمہیں بڑے زمانے کی باتیں... یا ”خسین خالہ“ قسم کی چیز نظر آتا ہوں جو گھر گھر رشتوں کے پیغام لے کر جایا کرتی تھیں؟! یا پھر تمہارے خیال میں ”میں نے اس جدید دور میں کوئی میرج یو دو کھولا ہوا ہے جس میں ذرا رنج نے ویننگ لسٹ میں نام لکھوایا ہوا ہے؟“

”ہیں... اتنی سی بات کا بڑا مٹا گئے ہو؟ میں تو بڑی گھبراہٹ سے بول رہا تھا کہ نہ جانے کیوں اتنے خفا ہو گئے ہو۔“ وہ گویا اطمینان کی سانس لے کر بولا ”یار اے شک میں نے شہروں میں تعلیم پائی ہے، ہو مٹلوں میں رہا ہوں۔ ملک سے باہر بھی رہا ہوں لیکن بنیادی طور پر میں دسالی آدمی ہوں۔ میرے طور طریقے اب بھی دسالی ہیں۔ مجھ میں جرات اظہار کی کمی ہے۔ میں نے تمہیں دوست سمجھا۔ تم سے دل کی بات کہہ دی اور تم سے مدد مانگ لی۔ میرے خیال میں تو اس میں کوئی بُرائی نہیں تھی۔“

اس کے سادہ سے لہجے میں ایک عجیب سی تاثیر تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر نرم ہاتھ پڑے ہوئے کہا ”بنیادی طور پر تو میں بھی دسالی آدمی ہوں لیکن میں اگر کسی سے مدد طلب کرتا ہوں تو کسی ڈھنگ کے کام میں کرتا ہوں۔ یہ بھلا کوئی کام ہے جو تم مجھے بتا رہے ہو؟“

”میرے لئے تو یہ بہت اہم کام ہے۔ زندگی موت کا مسئلہ ہے۔“

”حق آدمی! اس میں اتنا گڑبڑاؤ اور دو دروں کے کان کھانے کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے اس بار است ذرا نرمی سے ڈانٹ پلائی ”اچھی بجلی تمہاری عمر ہے۔ اب تم میرے نکلے کوئی نو عمر لونڈے سے لپاؤ نہیں، داور نہ ہی میں نرمی کا پتہ ہوں جسے تم مالی وغیرہ کالا بچے دے کر گلی میں رہنے والی، بالی اسکول کی کسی لڑکی کو رخصت کرنا چاہتے ہو۔ اپنا خزانہ تم خودی بیان کر چکے ہو کہ تعلیم یافتہ معقول عہدے پر فائز اور خوش حال آدمی ہو۔ خاندانی پس منظر بھی اچھا ہے۔ ذرا رنج بھی اب کوئی نو عمر لڑکی نہیں ہے۔ ایک

وہ بے ساختگی سے تھا۔ اس کی انہی میں زندگی کی گرجوٹھی تھی۔ انسان جب نوکر قرار محبت ہوتا ہے تو اس کے لفظوں، اس کے لہجے سے بھی ایک عجیب سا سرور پھوٹتا ہے۔

”خداق مت کرو۔“ وہ بولا ”میں نے محبت کی نہیں، محبت کی بات کی ہے۔“

”ایک سی بات ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہارے نظریے کے مطابق محبت ایک محبت ہے لیکن مجھے معلوم ہے یہ بات کرنے والے درحقیقت خود بڑی شدت سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن خود محبت کے انداز میں محبت کرتے ہیں۔“

مجھے حیرت کا خلیفہ سا جھٹکا لگا۔ اس کیفیت کے لہجے میں اتنا تجربہ کہاں سے بول رہا تھا؟ میں نے اپنے لہجے میں غصے کی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”تم میرا تجربہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمہاری اصل تکلیف کیا ہے جس کے لیے تم اتنی بے قراری سے فون کیا ہے؟“

”میری اصل تکلیف یہ ہے کہ جب تک وہ سانس نہیں تھی تب تک مجھے مہر تھا، قرار تھا لیکن اسے یہاں دیکھنے کے بعد میرے لئے مہر کرنا محال ہو گیا ہے۔“

”تو کیا تم اسے ہوش سے اٹھا کر لے جانا چاہتے ہو۔ جس طرح فلزوں میں دل کی کسی مزارع کی بیجی کو اٹھا کر لے جاتا ہے؟“

میں نے سادگی سے پوچھا۔

”نیکو اس مت کرو یا راج میں کوئی تھوڑی سی قسم کا بد معاش تو نہیں ہوں۔“ وہ شاید جینپ کر بولا۔

”میں میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم تھوڑی سی قسم کے بد معاش ہو۔ تم تو فرسٹ ریٹ قسم کے بد معاش ہو۔“ میں نے کہا ”لیکن میری اب بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں اسے میری بے آزاری دل کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ تم خواہ میرا کتنا بھی مذاق اڑاؤ لیکن میں تمہیں پوری بات بتا کر رہوں گا۔ یقین کرو یہ کوئی وقت گزاری یا دل بھلا دے کا سلسلہ نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کے بارے میں حد سے زیادہ مجید ہوں اور نہایت سیدھے سادے انداز میں اس معاملہ دل کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ یعنی اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم یہ بات اسے بتا دو۔“

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد وہ بولا ”تم چپ کیوں ہو گئے؟“

”تمہارے خیال میں کیا تمہاری بات سننے کے بعد مجھے راک ٹار کاٹنا چاہیے تھا؟ اے گدھے! میں اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”کیوں؟“ اس نے نہایت سادگی سے پوچھا۔



تھا اب میرے اندر اتنی ہی گمراہی تھی جتنی تھا۔  
میں ابھی اپنی بے عنوان سوچوں میں ہی الجھا ہوا تھا کہ  
دروازے پر بجلی کی دھچک ہوئی۔

"ہیس... کم ان" میں نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے کہا۔  
دوسرے ہی لمحے دروازہ جھوٹا ہوا کے جھوٹے کی طرح اندر  
آگئی۔ خوشبو کا ایک ہال اس کے ہم قدم تھا۔ وہ آفس کا جائزہ لینے  
گئی۔

"جیس سیکریٹری والوں نے نہیں روکا؟" میں نے پوچھا۔  
"تمہارا سیکریٹری گاڑو مجھے خود یہاں تک چھوڑ کر گیا ہے  
ورنہ مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ تمہارا آفس اس کوٹے میں ہے۔  
انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ آتے جاتے دیکھ لیا تھا۔ انہیں  
اندازہ ہو گیا ہے کہ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔" پھر ایک لمحے  
کے توقف سے وہ بولی "وہیے بھی کیا میں شکل سے خطرناک لگتی ہوں  
کہ سیکریٹری والے مجھے روکیں؟"

"یقیناً تم ایک خطرناک لڑکی ہو۔ ہر خوب صورت لڑکی  
خطرناک ہوتی ہے۔" میں نے اسے ہنسنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
"فصل بائیس مت کرو۔" وہ ہنسنے ہوئے بولی "میں کافی دیر  
سے تم سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آریٹر  
مسلل بھی بتا رہا تھا کہ تمہاری کسی سے بات ہو رہی ہے۔ کس  
حیثیت سے اتنی لمبی بات ہو رہی تھی؟"

"میں ان سے لمبی باتیں کرنا ہمارے مقصد میں کہاں؟" میں  
نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تو ایک نمائندہ بے ہودہ قسم کے  
مرد سے بات کر رہا تھا جو گمازہ تو تھا ہی... ادھر سے پوچھیں والا بھی  
ہے۔"

"اور اگرچہ کل پھر تمہارے کان کھارہا تھا؟" اس کی آنکھیں  
حیرت سے کچھ کھیل گئیں "آج ہی تو ہم اس کے ساتھ اتنی لمبی  
فصلت کر کے آئے تھے۔ مجھے تو لگا ہے کہ تم نے اس کے جتنے کچھ  
ڈنٹے داریاں بھی اپنے سر لے لی ہیں۔ نہ جانے کن بد معاشوں  
کا ذکر ہو رہا تھا۔ کبھی کسی اردو حاکم یا تیس ہو رہی تھیں۔"

"وہ اس پر بھی ہنس نہیں کر رہا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے  
کر کہا "وہ میری ٹانگ کھینچ کر اپنی نئی زندگی میں بھی پھنسا چاہتا  
ہے۔"

"تم نے اپنی ٹانگ کو اتار دیا بھی تو چھوڑا ہوا ہے۔ لوگ اسے  
لاوارث سمجھ کر ہر چیز میں آڑا لے کر کوشش کرتے ہیں۔" وہ بولی۔  
"ہاں" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے تم سے  
اتفاق ہے لیکن اب میں اپنی ٹانگ کی سرگرمیاں محدود کرنے پر غور  
کر رہا ہوں۔ کبھی زیادہ ادھر ادھر آڑے آڑے ٹانگ ٹوٹ ہی نہ  
جائے۔"

"شکر ہے جنہیں اپنے بڑے بھلے کے بارے میں سوچنے کی بھی  
ضرورت محسوس ہوئی۔" وہ بولی۔

میرے سے خود بخود ہی زندگی گزار رہی ہے۔ آکسفورڈ کی پڑھی  
ہوئی ہے۔ تم خود جا کر اسے پروپوز کر سکتے ہو۔"

"آف میرے خدا! اگرچہ کل نے شاید اپنی بیٹھائی پر ہاتھ مارا  
تھا "میں شاید اتنی دیر سے نہیں کے آگے ہیں بھارہا تھا۔ یعنی!  
میں تو اصل رہتا ہے۔ اگرچہ میں اتنی بہت ہوئی تو تمہارے سامنے  
ایسا لبا چڑھاؤ ڈکھڑاؤ دینے کی کیا ضرورت تھی؟ ذرا تاج کے سامنے  
کچھ کھینے کی مجھ میں جرات نہیں ہے اور میرا دل رکھنے کے لئے تم  
میری نظر میں مجھے کتنا ہی طرہ خاں بنانے کی کوشش کرو لیکن  
حقیقت یہی ہے کہ ذرا تاج کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں  
ہے۔"

"اگر جیس حیثیت کی اتنی ہی فکر تھی تو پھر عشق بھی سوچ  
سمجھ کر کرنا چاہئے تھا۔" میں نے مشورہ دیا۔

"عشق پر تو انسان کا کوئی زور نہیں پاتا۔ یہ تو چٹا غالب بھی  
فرما چکا ہے۔"

"حیثیت پر بھی انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے ورنہ اس دنیا  
میں کوئی کم حیثیت ہی نہ ہوتا۔"

"مستفید یہ کہ تم میری کوئی مدد نہیں کرو گے؟" اس نے  
قد سے باوڑی سے پوچھا۔

"میں تمہاری مدد کر رہا ہوں نا۔ یعنی جنہیں مشورہ دے رہا  
ہوں۔ تمہاری بہت بڑا رہا ہوں کہ اگر عشق ہو گیا ہے تو اب  
حیثیت وغیرہ کے پکڑ میں نہ پڑو۔ ذرا تاج سے مرعوب مت رہو۔  
دنیا کی پروا مت کرو اور اپنی نواز لے کر سیدھے اس کے حضور  
میں پہنچ جاؤ۔ اگر اس سے اسی طرح ڈرتے رہو گے تو شادی کیا  
خاک کرو گے۔ کسی طرح کھینچ تان کر شادی ہو بھی گئی تو اس کے  
شرہے کے بجائے خانہاں معلوم ہو گے۔ تم خود سوچو کہ آخر تم کس  
انجام سے دوچار ہونا چاہتے ہو۔"

"میں نے کیا سوچ کر جنہیں فون کیا تھا۔ تم نے تو میری طبیعت  
ہی صاف کر دی۔" وہ ٹوہ سے لہجے میں بولا۔

"خیر تم دل چھوٹا نہ کرو۔" میں نے گویا اس پر ترس کھاتے  
ہوئے کہا "میں تمہاری بات آگے بڑھانے کی کوشش تو کروں گا  
لیکن اصل کام جنہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ یہ تمہارے عشق کا  
معالجہ ہے۔ بات تمہارے ہی من سے انہی لگے گی۔ میں ذرا تاج کو  
ٹٹولنے کی کوشش کروں گا۔ میرا مطلب ہے عمارت ٹٹولنے کی  
کوشش کروں گا کہ اس کی تمہارے بارے میں کیا رائے ہے۔"

"تم اتنا بھی کرو گے تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔" وہ منونیت  
سے بولا "جو بھی نتیجہ نکلے مجھے فون کر کے بتانا۔ میں بھی اس دوران  
اپنی جرات جمیٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

پھر اس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ متعلق کر دیا۔ میں دبیور  
رکھنے کے بعد دیر تک غم غم بیٹھا رہا۔ میرے ذہن پر سوچوں کی  
بیخار تھی۔ میں فون پر رجیم کل سے بات کرتے وقت جتنا چمک رہا

# گنگا کے بھاری ناک

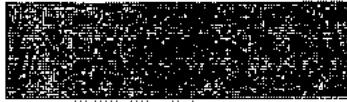
ایک عید ۰ قیمت ۰/۰۰ ۲۵ روپے

ماہنامہ ”جی کہانیں“ کا  
ایک مقبول ترین ایڈو سخر سلسلہ

## دہشت گرد

سلیم فاروقی کے ایڈو سخر قلم سے

پیار حسن میں



اردو بازار لاہور

اصل خرابی تو لاہور میں ہی رہنے کی تھی۔

”پھر تم نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنی زمینوں سے بہت سی زور ہو پاؤں گی۔ وہاں نہ کر میرے لئے زمینوں کا نظام چلانا بہت مشکل ہو جاتا۔ کراچی میں رہتے ہوئے میرے لئے زمینوں کا نظام چلانا پھر بھی کچھ آسان ہے اور کراچی سے لاہور آتے جاتے رہنا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ فی الحال زمینیں بیچ دینے کا بھی مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ دیسے میں اتنے بڑا قدم بھی اٹھانا کتنی تھی لیکن اس کے لئے مجھے کوئی ٹھوس بنیاد چاہئے تھی۔ جو شاید ابھی موجود نہیں ہے۔“ آخری لفظ ادا کرتے وقت نہ جانے کیا اس نے مجھے میں خفیہ سی لرزش آئی۔

”ٹھوس بنیاد؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں بھانٹا۔ وہ دیوار پر آویزاں پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔

”خیر اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔“ میں نے جلدی

میں نے ایک لمبے سوچا پھر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر میں جنہیں یہ باتیں کہ فون پر رجم کل سے تمہارے ہی بارے میں بات ہو رہی تھی تو تمہارا رد عمل کیا ہو گا؟“

”میرے بارے میں؟“ وہ جیسے کسی انجیل سے ڈر گئی۔ ”ابن تمہاری عمر شیطان کی طرح لمبی ہے۔ ابھی تمہارا ذکر ہی ہو رہا تھا کہ تم آگئیں۔“ میں نے کہا۔

”میرا تو اصل میں ایک اپا فنٹ کینسل ہو گیا۔ میں فارغ ہونے پر ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ڈرا دیجوں اگر تم مصروف نہیں ہو تو ایک بار پھر تمہارے کان کھائے جائیں۔ اگر تم رجم کل سے اتنی لمبی گفتگو کر رہے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ زیادہ مصروف نہیں ہو اور میں اپنے خیمہ کوئی بوجھ محسوس کئے بغیر تمہارے کان کھا سکتی ہوں۔“

”رجم کل سے گفتگو صرف اس لئے طویل ہو گئی کہ وہ تمہارے بارے میں تھی۔“ میں نے کہا ”تم جانتا نہیں چاہتے کہ گفتگو کیا تھی؟“

”نہیں“ اس نے ہلا آمل جواب دیا۔ اس نے محض جنس کے تحت بھی کوئی سوال نہیں کیا۔

”لیکن میں جنہیں تباہ بنیاد نہیں آؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”میرا اندازہ درست ثابت ہوا ہے۔ وہ شخص واقعی چاروں ہاتھ دیر سے تم پر عاشق ہو گیا ہے۔ وہ بہت عجیبہ ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

وہ نیکم بے حد عجیبہ نظر آنے لگی اور ٹھہرے ٹھہرے لمبے میں بولی ”وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے چاہئے۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے اسے سوچتے۔ وہ تم کیوں اس کی وکالت پر کل گئے ہو؟“

”مشق میں کسی کی بڑی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی پھر جب آوی یا دوست بھی ہو۔ اس کے کوئی اٹلے سیدھے عزائم بھی نہ ہوں۔ سیدھے سادے شرفانہ طریقے سے شادی کرنا چاہتا ہو تو فواہ کواہی اس کی سفارش کرنے کو بھی چاہئے لگتا ہے۔“

”تم اپنی سفارش اپنے پاس ہی رکھو اور اس موضوع کو پیچیدہ نہ کر دو۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ معلوم نہیں کیوں وہ اس سلسلے میں کاکی ہونے کے لئے تیار نہیں تھی۔

”اچھی طرح سوچو۔ اور فیصلہ جلدی ہو کر سوچو۔ اس طرح کے مستقل رشتے دو روز نہیں چلتے خصوصاً اتنی چاہ کے ساتھ۔“ میں نے اپنا لہجہ بدستور نگہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”وہ بے چارہ تو تمہاری وجہ سے کراچی دوڑا آیا ہے۔ اسے تو پہلی ہی خبر مل گئی تھی کہ تم نے کراچی شہر ہونے کا پروگرام بنالیا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنا تھلا کراچی کر لیا۔“

”اسے غلط اطلاع ملی تھی۔“ وہ بدستور پُر سکون لہجے میں بولی ”میرا ارادہ تو پہلے لاہور شہر ہونے کا تھا۔ میں نے لاہور میں چند دن رہنے کے بعد کراچی میں ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ میری

دیا جائے؟“ زرتاج نے دریافت کیا۔

”ہاں شاید خود ہی اس کا کوئی بہتر حل نکال آئے۔ اب ہمیں اسے نرم انداز میں نہانے کا کوئی طریقہ سوچوں گا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”ویسے کیا ہی بہتر ہو گا کہ تم اس کا پورا ہوا ہاتھ تمام لے لیں۔“

”میں نے شادی کو محبت سے مشروط کر رکھا ہے۔“ وہ سر جھکا کر ہوتے ہوئی ”میں نے سوچ رکھا ہے کہ شادی صرف اس شخص سے کروں گی جس سے مجھے محبت ہوگی۔ میں نے اس فلسفے کی قائل ہونے کی بہت کوشش کی کہ شادی اور محبت دو علیحدہ مسئلے ہیں۔ محبت ایک حادثاتی سی چیز ہے اور شادی ایک دائمی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ دیرہ و دیرہ لیکن میں اس قسم کے فلسفوں کی قائل نہیں ہو سکی۔ اسی لئے میں شادی بھی نہیں کر سکی کیونکہ اب تک مجھے کسی سے محبت ہی نہیں ہو سکی تھی۔“

مجھے اس کے آخری جملے کا آخری لفظ یعنی ”حق“ بہت اہم محسوس ہوا۔ شاید اس نے اس پر زور بھی دیا تھا۔ میں نے باخبر کا بوجھل پن کم کرنے کے لئے بھی یہ موقع غنیمت سمجھا اور جلدی سے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے ذرا شرر انداز میں کہا ”میں ہو سکتی تھی؟ یعنی زور کس پر ہوا؟“ ”حق“ پر۔ اس کا مطلب ہے اب یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ کوئی خوش نصیب پہلے ہی تمہاری نظر کو بھاگایا ہے اس لئے بے چارے زرتاج کل کی رات میں گھر رہی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں وہ خوش نصیب کون ہے؟“

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے جھجھری سی آئی۔ جس سوال پر اس کی آنکھوں میں اشتیاق اور کربوشتی کی جھلکیاں چھوٹی چاہیے تھیں اس پر اس کی آنکھوں میں ہلاکی ویرانی پھیل گئی تھی۔ ایسی شیطانی لڑائی کی آنکھیں ایک ٹائٹل میں کھنڈر ہو گئی تھیں۔ یہ میرے لئے ایک انوکھا مگر کچھ خوف زدہ سا رویہ والا اظہار تھا۔

”شاید وہ ایک سراپ ہے۔“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ غیر ارادی طور پر میری آواز بھی مدغم ہو گئی ”تم کوئی عام لڑکی نہیں۔“ تم ایک بہت ہی خاص لڑکی ہو۔ دنیا جہاں کی سمجھ بوجھ رکھتی ہو۔ تم کسی ”اب“ سے کیے مگر محبت کر سکتی ہو؟“

”مجھ جیسی لڑکیاں ہی تو عام طور پر سراپوں سے محبت کرتی ہیں شاید اسی لئے زندگی بھر غالی ہاتھ دیتی ہیں۔“ وہ خود استہزائی کے سے انداز میں سرکاری ”لیکن خیر۔ ضروری نہیں کہ میں بے سراپ کہ رہی ہوں وہ میرے لئے سراپ ہی ثابت ہو۔ میں قسمت پر یقین رکھتی ہوں۔ قسمت میں ہوا تو شاید وہ سراپ بھی میرے لئے حقیقت بن جائے۔“

”اس باغیچہ سراپ کا کوئی نام بھی ہو گا؟“

”نہ کہ“ ”نی الحال زرتاج مجھ کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ پہلے اسے کسی کنارے لگ جانا چاہئے۔“

”وہ بات تو کنارے لگ چکی ہے۔ میں نے کہا تو ہے کہ اس موضوع کو ہمیں غم کرو۔ مجھے اس شخص سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آخر مجھے تم کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کیا کرنا پڑے گا؟“ وہ گویا قفل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”بات مجھے نہیں بلکہ اس غریب کو یقین دلانے کی ہے۔“ میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا ”میں تم سے بات کرنے سے پہلے ہی اس کی کافی دل چاہی کر چکا ہوں۔ اسے بڑے اصرار سے بتا چکا ہوں کہ میں اس موضوع پر تم سے بات کرنا قطعی مناسب نہیں سمجھتا اور یہ میرے شایان شان بھی نہیں ہے۔ اب جب میں اسے بتاؤں گا کہ اس پر تم سے کمانے ہوئے ہیں تم سے بات تو کی تھی اپنی ہی بھرپور سفارش بھی کی تھی لیکن تم اس سے من نہیں ہو سکی تو آئے بیٹھنے نہیں آتے گا۔ وہ سمجھے گا میں اسے زخماں ہوں کیونکہ میں اس موضوع پر درحقیقت بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔“

”میں خود اسے بتا دیتی ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی ”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں بیٹھ کے لئے اس سلسلے میں اس کا منہ بند کر دوں گی۔ وہ آئندہ کبھی تم سے اس معاملے میں سفارش کے لئے نہیں آئے گا۔ بلکہ تم ابازت دو تو میں ابھی طرح اس کی طبیعت صاف کر دوں گی۔“

”تم تو واقعی بہت خطرناک لڑکی ہو۔“ میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا ”میں تو سمجھا تھا تم چونکہ ایک روایت پرست لڑکی ہو اس لئے اندر سے شرمیلی بھی ہوگی۔“

”تم غلط نہیں سمجھتے تھے۔“ وہ بولی ”میں اندر سے شرمیلی ہی ہوں لیکن صرف ان معاملات میں جن میں ایک لڑکی کو واقعی شرمیلی ہونا چاہئے۔ سچ بولنے کے معاملے میں میں شرمیلی نہیں ہوں۔ خصوصاً ایسا جج جو انسان کو آئندہ زندگی میں بہت سی الجھنوں سے بچائے۔ یہاں اس کے کہ میں اپنی جگہ بیٹھ کر کوئی کام کروں اور زرتاج مجھ کی غلط توقعات پاتا رہے کیا ہے۔ بہتر نہیں کہ میں ابھی اس کی غلط فہمی دور کر دوں؟ اسے دھوکا ضرور لگے گا لیکن کچھ عرصے تک وہ اس دھچکے سے سنبھل جائے گا۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہو گا۔“

”میں نے نہیں نی الحال ایسا مت کرو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ زرتاج مجھ کے جس طرح اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تھی اس کے بعد زرتاج کی طرف سے انکا سا جواب ملے پر اس کا تو جہ حال ہوتا سوہرگا۔ خود میرے لئے یہ تصور بڑا تکلیف دہ تھا۔ منافقت یا لالچی خود مجھے بھی پسند نہیں تھی۔ میں بھی صاف صاف بات کرنا ہی پسند کرتا تھا لیکن یہ دل کا معاملہ تھا۔ میں اسے اتنی بے رحمی سے پینڈل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ فی الحال اس مسئلے کو برومی معلق رہنے

# گالی دنیا

ایم اے راحت قیمت :- 100/-

## ناگے بھون

اقلم علیم قیمت :- 300/-

”یہی تو اصل مشکل ہے کہ وہ شخص نہیں... اسی کرے میں موجود ہے۔ آخر تم نے مجھے مجبور کر دی دیا یہ بات کرنے پر۔ تم بیٹیا میرے من سے سُنا چاہتے تھے۔ دن نہ تم اتنے کم قسم تو نہیں ہو سکتے تھے کہ بات تمہاری سمجھ میں ہی نہ آئی۔ میرے من سے تم کو شاید تمہاری انا کو زیادہ تسکین ملی ہوگی۔“ اس کی آواز میں ہی نہیں اس کے پورے وجود میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ میں عقب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے میں اپنی ریلوے گنگ چیز پر ساکت رہ گیا۔ میں فوری طور پر کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس نے خوات کی قسمی وہ خیال کسی داسے کی طرح میرے ذہن کے کسی آراک کوٹے میں سرسرا رہا تھا لیکن میں اسے ذہن سے ہٹانے کی کوشش کئے جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے من سے یہ بات سن کر اپنی انا کو تسکین پہنچا چاہتا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کے من سے یہ بات سن کر میرے اعصاب پر برف کی پوچھاڑی ہو گئی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پہلے سے زیادہ سرکش آواز میں بولی ”پلو میں اعتراف کر لیتی ہوں کہ تمہاری خاطر میں نے زندگی چھوڑ کر شہر آئے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں کسی ایسی جگہ رہنا چاہتی تھی جہاں آسانی سے تم سے رابطہ رہ سکے۔ ایک لڑکی ہوتے ہوئے مجھے یہ سب کچھ کتنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن میں نے کہہ ڈالا ہے۔ کاش اس قسم کی کوئی بات میں نے تمہارے من سے سنی ہوئی!“ وہ اب بھی میری طرف سے منہ پھیرے کھڑی تھی۔

مجھے اس وقت واقعی خوش ہونا چاہئے تھا۔ میرے دگ رہے میں جلی دوڑ جانی چاہئے تھی۔ میرے لہو کو آتش سیال بن جانا چاہئے تھا۔ مجھے سر آپا بھان و اشتیاق بن جانا چاہئے تھا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اُٹا کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے قسمت مجھے کسی خضر ناک دورا رہے کی طرف دھکیلنے کی کوشش

”وقت آنے پر نام بھی معلوم ہو جائے گا۔“ وہ بولی۔  
”یہ تو نالے والی بات ہوئی۔“ میں نے کہا ”جب انسان کوئی بات بتانا نہیں چاہتا تو کہہ دیتا ہے کہ وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔“

”نہیں میرا معاملہ ایسا نہیں ہے بتانا تو مجھے پڑے گا لیکن میں کچھ دن انتظار کرنا چاہتی تھی کہ شاید اس کا نام تم خود دریافت کر لو۔“

”میں بلا ضرورت بچھاریس پوچھنے کے پکر میں نہیں پڑتا۔ جب تم سامنے موجود ہو تو تم خود ہی کیوں نہیں بتا دیتیں۔“ میں نے اصرار کیا ”بالکل اسی طرح... جیسے رحیم گل نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ کس کی خاطر یہاں آیا ہے۔ تم اور رحیم گل... دونوں میرے دوست ہو۔ دونوں کے راز میرے لئے اسی طرح خفیہ ہیں جس طرح میرے اپنے راز۔ اور میں ان کی اسی طرح حفاظت کروں گا جس طرح اپنے رازوں کی کرتا ہوں۔“

”بہت خوب!“ وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرائی پھر اچانک ہی اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جس پر بلا اندوہ پھیلے ہوئے تھے۔ باہر کچھ نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ اس نے آنکھوں سے ڈوری کھینچ کر بلا اندوہ ہانپے سامنے صرف خالی راہداری تھی اس کی پشت میری طرف تھی لیکن اس کے انداز سے مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی نظرس خالی راہداری میں کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

ایک طویل لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی آواز دوبا کیسی دور سے آئی ”اس میں راز والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس شخص کا نام تم سے اس لئے نہیں چھپا رہی کہ میں اسے کوئی راز سمجھتی ہوں۔ کم از کم تم سے تو میں اسے راز نہیں رکھ سکتی لیکن تمہارے ہی سامنے اس کا نام لیتا بھی میرے لئے سب سے زیادہ مشکل ہے کچھ اچھا نہیں لگے گا کہ میں ایک لڑکی ہوتے ہوئے خود تمہارے سامنے اس پہیلی کا جواب دوں۔ کیا ہی اچھا ہو گا کہ وہ شخص خود ہی اس پہیلی کا جواب دیتا۔ رحیم گل مرد تھا۔ اس نے آسانی سے جیسے بتا دیا کہ وہ کس کی خاطر کراچی آیا ہے۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ میری تم کو یہ بتانے کی بہت نہیں پڑی کہ میں نے کس کی خاطر اپنا طرز زندگی بدل لینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”کمال ہے!“ میں نے حیرتینہ زرا حیرت سے کہا ”میں تو تمہیں اتنے تمہارا پھر او کے ساتھ بات کرنے والی لڑکی نہیں سمجھتا تھا۔“

”تمہارا پھر او بیض اوقات خود بخود آتا چلا جاتا ہے۔ صورت حال ہی کچھ ایسی ہو جاتی ہے۔“ اس کے لہجے میں خفیف سی بے بسی تھی۔

”وہ شخص چونکہ یہاں موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہاں کوئی بھی تیرا فرد موجود نہیں ہے۔“ میں اس پہیلی کو پوچھنے میں کسی سے مدد نہیں مانگ سکتا۔ اسی لئے تمہارے کان کھارہا ہوں تم ہی سے اس شخص کا نام معلوم کرنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

کر رہی ہے۔

میری آواز جیسے کہیں کھو گئی تھی اور میرے ذہن میں آندھیاں ہی چل رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میرے حواس کچھ کام کرنے لگے اور میں نے اپنے آپ کو بولنے کے قابل پایا "زر آج! میری دوست... میری محسن...! اُمّ کچھ دیر ہو کہ میں تمہارے منہ سے یہ بات نہ کر لیتی! تو تھیں پہنچا چاہتا تھا۔ بخدا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کہاں کی اتنا اور کہاں کی تھیں...! میں تو اندر سے بڑا ہی دودھن... بڑا ہی اکھڑا پسند انسان ہوں۔ تم نے جو کچھ کہا۔ میری توقعات میرے اندازوں سے بہت زیادہ ہے۔ میرے لئے یہ کسی قابل نہیں خواب کی باتیں ہیں۔ تمہاری محبت تو کیا... میں اپنے آپ کو تمہاری بددستی کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔ تم نے مجھ پر اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا ہے مجھے اٹھانا شاید میرے بس کی بات نہیں۔ میری سانس لینے میں آگے لگی ہے۔"

تب شاید اس کے اعصاب سے کھینچا کچھ کم ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے وجود میں ارتعاش ختم ہو گیا تھا۔ وہ میرے دھیرے میری طرف گھومی اور اسی طرح نہایت آہستہ سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "محبت تمہارے لئے ایک بوجھ ہے؟"

"چھوٹے آدمی سے تو بڑے لوگوں کی عزائیں بھی سنبھالی نہیں جاتیں۔" میں نے تم کو لگتے ہوئے کہا۔

"مجھے زیادہ خوش قسمتی میں جتنا کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بولی "میں نے بھی اپنے آپ کو "بڑے لوگوں" میں شمار نہیں کیا۔ تمہارے ملک میں ویسے بھی "بڑے لوگوں" کا مینہ ان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو اندر سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔"

"تمہیں اتنی تو اُمید رکھنی چاہئے کہ میرے کسی کو بڑا سمجھنے کے پانے مختلف ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"اپنی شاید..." اس نے بہم لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لئے گھوم کر کھڑکی کے بلائینڈ ڈوبادوبہ بند کر دیے۔ اس کے چہرے پر اب بے پناہ غماضیت تھی اور مجھے اس غماضیت سے خوف آرہا تھا۔ میں ابھی اسے بچہ اور بھی بتانا چاہتا تھا۔

میں نے ہلکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "یہ... یہ تمہارے دل میں میرے لئے محبت کے جنم لینے کا حادثہ کب پیش آیا؟"

اس کی سرخ و سفید رنگت ایک لمحے کے لئے متحیر ہو گئی۔

اس نے غصا ہونٹ و انٹوں میں دیا کر سر ہٹا لیا اور کچھ سوچ کر بولی "میں تمہیں صحیح تاریخ اور صحیح وقت تو نہیں بتا سکتی لیکن میرا خیال ہے ذرا آج گرھیں تمہارے قیام کے دوران ہی کسی وقت یہ کوئل بولی تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں چند ہی دنوں میں یہ کوئل ایک تارودور درخت بن گئی۔ ورنہ لوگ تو کہتے ہیں کہ آنکھ اور جمل پہاڑ اور جمل... محرمیرے ساتھ آٹا ہی معاملہ رہا۔ تم کیا لگے گویا زندگی کا سارا خوشی چلا گیا۔"

"جب میں وہاں سے روانہ ہوا" مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے اس وقت تو ایسی کوئی علامت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔" میں نے کہا۔

"شاید تمہیں کسی کے دل میں جھانک کر دیکھنا نہیں آتا اور شاید میں خود بھی اس وقت اپنے جذبے کی شدت سے آنکھ نہیں کھلی۔" وہ دہراورے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

کمرے میں کمراسکوت چھا گیا تھا۔ میں خود اپنی دھڑکنوں کی آواز بڑی آسانی سے سُن سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی مگر شاید کسی جواب کی منتظر تھی۔ زندگی میں شاید پہلی بار مجھے ایک ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا جس میں "میں اپنے آپ کو کوئی جواب دینے کے قابل نہیں پارہا تھا۔"

پھر نہ جانے کیوں میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا حالانکہ میں اپنے اندر اُٹھنے کی ہمت بھی نہیں پارہا تھا۔ غامضوں سے گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ مجھے دراصل ایک عجیب 'بے عنوانی' کی خدمت کا سامنا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس سرے سے کیسے گزروں۔

میں گویا ایک طویل غلا میں تیرتا ہوا اس تک پہنچا اور غیر ارادی طور پر میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دئے شاید میرا مقصد اس کی قوت کو محسوس کرنا نہیں بلکہ کوئی سارا تلاش کرنا تھا۔ میں اس وقت سارے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میں "جو اپنے آپ کو چٹان کی طرح مضبوط محسوس کیا کرتا تھا اس وقت نہ جانے کیوں ایک برگِ خزاں رسیدہ کی طرح اپنے آپ کو ہوا کے دوش پہ اُڑتا محسوس کر رہا تھا جبکہ کمرے میں ہوا اس وقت ساکت تھی۔"

زر آج کا سر پہکھ اور جھک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ غصیت کے اعتبار سے وہ بھی ایک نہایت ہی مضبوط لڑکی تھی لیکن ہم دونوں ہی شاید اس قسم کے لوگوں میں سے تھے جن کے لئے خود اپنے ہی جذبات کے سیلاب کے سامنے ٹھہرا کبھی کبھی بہت و شواہر ہو جاتا تھا۔ شاید اس وقت وہ بھی کسی سارے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے لئے ہاتھ اٹھانا بھی دشوار تھا۔

"زر آج! محبت میں ریانت داری کسی چیز ہے؟" میں نے نہایت دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"بہت اچھی چیز ہے۔ ریانت داری ہر شعبہ زندگی میں ہی بہت اچھی چیز ہے۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "بشرطیکہ انسان میں اس پر قائم رہنے کا حوصلہ ملے ہو۔"

"میں تمہیں ریانت داری سے سب کچھ بتانے اور پھر اس ریانت داری پر قائم رہنے کی بھی کوشش کروں گا۔" میں نے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا "میں جب ایک نو عمر لڑکا تھا، جوانی میرے وجود پر دھتک دے رہی تھی... جب ہر مسام جان سے شرارے سے

میرے لئے ایک مشکل مرحلہ تھا۔  
 تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح سلسلہ کلام جوڑا "پھر زندگی کی  
 ڈگر کچھ بدل گئی۔ مفلسی کے سامنے کچھ ایسے گھرے نہ رہے۔ عموماً  
 بڑھی۔ غربت کچھ گھٹی۔ میں خاصاً آسودہ حال ہو گیا۔ میرا کاروبار  
 آگیا ہوا۔ یہاں ایک دولت مند فیملی رہتی تھی جو اتفاقاً ہی میرے ذریعہ  
 احسان آگئی تھی گو کہ میں اس احسان کو احسان نہیں سمجھتا تھا۔  
 میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تفصیلات سے جنہیں کوئی دلچسپی  
 نہیں ہوگی اور یہ تفصیلات میں جانے کا موقع بھی نہیں ہے مختصراً  
 قصہ بس اتنا ہے کہ اس فیملی میں ایک لڑکی سے میری ملاقات  
 ہوئی۔۔۔۔۔"

لفظ "لڑکی" مٹنے ہی اس کے چہرے کی رحمت حفری ہو گئی۔  
 اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف جھلک آیا۔ سب پر راتی ہی  
 آواز میں دوپٹی اور اس لڑکی سے جنہیں عشق ہو گیا ہو گا؟  
 "عشق شاید بے سبب نہیں ہوا تھا۔" میں نے کہا "میں جس  
 آئینہ دل کے بحر میں گرفتار تھا وہ بڑی حد تک اس کا عکس تھی۔ وہ تم  
 جیسی نہیں تھی لیکن تمہاری بہت سی خصوصیات اس میں پائی جاتی  
 تھیں۔ وہ میرا نوجوانی کا دور تھا۔ مجھے دی اپنا آئینہ دل لگی اور  
 میرے دل میں اسی کی تصویر نقش ہو گئی۔ ذہن اور داس پر وہی چھا  
 گئی اور کچھ اس طرح چھائی کہ پھر بھی اس کا تصور ذہن سے نکلا  
 ہی نہیں۔۔۔ حالانکہ اس کے بعد زندگی میں کئی سوڑا ایسے آئے جب  
 مجھے اس کو بھول جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کی  
 شادی بھی دوسری جگہ ہو گئی۔ اس نے کسی کو یہ بھی بتایا کہ وہ تو  
 دراصل مجھ سے دل لگی کر رہی تھی، اسے مجھ سے عشق و محبت کچھ  
 نہیں تھا پھر اس فیملی پر زوال آگیا۔ لڑکی کو شادی کے کچھ عرصے بعد  
 ہی طلاق ہو گئی۔ ایک طویل عرصے بعد ایک چھوٹے سے ٹلیٹ میں  
 اس سے ملاقات ہوئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کے پاس  
 آ رہا تھا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہ میری تصویر دیکھنے سے لگائے ہوئے

پکڑے تھے۔ اور میں بے حد غریب تھا۔ گاؤں کی کچی گلیوں میں اپنی  
 مفلسی کے گلے میں پائیس ڈالے تو اوردہ پھرتا تھا تو تم جیسی کوئی لڑکی  
 میرا آئینہ دل ہوا کرتی تھی۔"

میں خود ہی اپنے اسی بھولے برے تصور پر استہزائیہ انداز  
 میں ہنس دیا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی خزاں  
 آنکھیں دھیرے دھیرے گویا دیکھنے لگی تھیں۔

"مجھ جیسی لڑکی۔۔۔؟" اس نے سر کو شیشی میں تصدیق چاہی۔

"ہاں تم جیسی لڑکی۔ جو بے حد امیر ہو۔ جاگیردارانی ہو۔ اپنی  
 جگہ ایک پھولی سی جگہ ہو۔ بے حد حسین ہو۔ اس کی شخصیت ایک  
 شعلہ جلا ہوا جسے محض نظریے چھوئے پر بھی انسان اپنے آپ کو

خاستر ہوتا محسوس کرے۔ وہ کسی بھی لحاظ سے کوئی عام لڑکی نہ ہو۔

زندگی کے میدان میں میرے شانہ بہ شانہ نکلے تو بڑے سے بڑے  
 خطرناک دشمن سے بھی ٹکرا سکے۔ گھر کی چار دیواری میں ہو تو اس

کے دم سے گھر کے دروازے پر جھنگٹاتے ہوں۔ اس کی ہتھیاریوں پر

رنگین حائل نظر آتا ہو۔ اس کے رخساروں پر جیاتی شفق پھرتی ہو۔"

"تم تو نہیں شاعری کر رہے ہو۔" وہ خفیف سا مسکرائی۔

"نوجوانی میں ہر انسان اپنے اندر خاموشی کی زبان میں شاعری

کرتا ہے۔ یہ میرے اُس زمانے کے محسوسات ہیں۔" میں نے

دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ ایک عجیب قسم کے

شمار کا۔ بالکل پن کا دور ہوتا ہے۔ انسان بڑے قانونی الطولت سے

آئینہ دل تراشتا ہے اور پھر تین بھی رکھتا ہے کہ وہ اسے زندگی کے

کسی موڑ پر مل جائیں گے۔ مجھ میں پھر بھی کسی حد تک حقیقت

پسندی کے جراثیم موجود تھے۔ مجھ پر یہ بالکل سوچیں صرف ایک

دورے کی ہی صورت میں حملہ آور ہوئی تھیں لیکن میں جلد ہی ان

کے اثر سے نکل آتا تھا اور اپنے آپ پر ہنستا تھا۔ اپنا مسخہ اُڑاتا

تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا اور دل ہی دل میں اپنے آپ

سے کہا کرتا تھا "مگر تھے کہیں؟" اپنی شکل دیکھیں ہے؟ اپنی

اوقات یاد ہے؟ اُمی لڑکیاں اقل تو دنیا میں ہوتی نہیں ہیں اور اگر

ہوتی بھی ہوں تو کیا وہ تجھ جیسے ہوتی، مفلس اور بے حیثیت و رسائی

کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی؟ اپنی فنی جھپٹیں۔ اپنی کھسی پٹی خلواریں

تھیں۔ اپنے بالوں پر جی خاک۔ آوارگی۔ اپنے چہرے سے جھلکتی

مفلسی کی جھلک دیکھیں ہے؟ جس قسم کی لڑکی کا بیکر تو اپنے خیالوں

میں تراشتا ہے کیا وہ تجھ جیسے کسی چھد کی راہ دیکھتی ہوگی؟ میں یہ

سوچتا اور میری اُمیدوں کے تمام بُت چھین چھین کر کے بکھر

جاتے۔"

میرا لٹکا شک ہوا جا رہا تھا۔ میرے سینے میں آگ سی لگی ہوئی

تھی۔ میں تھوک نکلے کو ایک لمبے کے لئے خاموش ہوا۔ وہ سر

اٹھائے بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں اسے کوئی نئی

الف لیلہ سنا رہا تھا۔ اب میرے سامنے اپنی داستان حیات کا وہ

حصہ تھا جسے زندگی کے غم میں لانا اور اس کا صحیح مفہوم سمجھنا

|       |         |                     |
|-------|---------|---------------------|
| 80/-  | اے حمید | صحرا کا چاند        |
| 250/- | اے حمید | پہلی محبت کے آنسو   |
| 100/- | اے حمید | اُداس جنگل کی خوشبو |
| 200/- | اے حمید | چاند چہرے           |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

جو ایک لڑکی میرا آئینہ بن گیا تھا، وہ شاید تم ہی تھیں لیکن جب تم نہیں ملیں اور تم سے ملنے چلتے اوصاف رکھنے والی ایک لڑکی سامنے آئی تو دل نے اسی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ ویسے بھی اس وقت تک یہ بات عقل میں آجکی تھی کہ آئینہ اپنی مکمل شکل میں نہیں ملتا کرتے۔ اب میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میرے دل کا اس لڑکی سے کوئی وعدہ ہے۔ میری اس سے کوئی گفت منت ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا انتظار کرنے پر مجبور ہاں ہوں۔

”خواہ یہ انتظار انتظار ہی رہے؟“ اس نے پوچھا۔  
”ہاں... خواہ یہ انتظار انتظار ہی رہے۔“ میں نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا۔

”نفل چو پوری اتہم واقعی خوابوں کی دنیا کے قوی ہو۔“ وہ بولیں سانس لے کر تھکے تھکے لہجے میں بولی ”یقین نہیں آتا کہ میں کلی آنکھوں سے جھیں دیکھ رہی ہوں اور آج کے دور میں تم سے بات کر رہی ہوں لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گی کہ جب تم نہایت مفلوک الحالی میں بولی بار میرے سامنے آئے تھے اور تم نے گھوڑے سدھانے کا کام سنبھالا تھا مجھے تب ہی احساس ہو گیا تھا کہ تم خوابوں کی دنیا کے قوی ہو اور مجھے شاید خوابوں ہی کی دنیا کے کسی شخص کی تلاش تھی جس کی وجہ سے آج میں یہاں تک آئی ہوں۔“

وہ ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتے ہوئے مسکرائی ”یہی عجیب بات ہے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پا بھی لیا مگر اس خوش قسمتی کے باوجود ہم ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ بیچ میں ایک لامعاصل عشق آکر کھڑا ہوا ہے لیکن خیر... کوئی بات نہیں۔ تم اگر مرد ہو کر نامعلوم مدت تک انتظار کر سکتے ہو تو میں عورت ہو کر انتظار کیوں نہیں کر سکتی۔ عورت تو ویسے بھی شاید انتظار ہی کا دوسرا نام ہے۔ تم اس لڑکی کی ”ہاں“ کا انتظار کرو۔ میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ دیکھتے ہیں کس کو کس کی رفاقت نصیب ہوتی ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک ایسے غم کی جھلک تھی جس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔

میں نے ہڑبڑا کر ایک بار پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اب اس کے وجود میں پہلے کی طرح ارتعاش نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک مضبوط چٹان کا وہ پہرہ دار رہی تھی۔  
”دیکھو... میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم اپنی زندگی خراب کرو۔ اسے بھربھاتا اس کی خوب صورتیوں اور لذتوں سے محروم رہو۔ میں اپنے آپ کو تمہارا مجرم محسوس کروں گا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”تمہارے پاس اس کا کیا حل ہے؟“ اس نے مہمی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اب اس کا لہجہ سرد مہمی کی حد تک ٹھنک چکا تھا۔  
”وہ... رحم کل...“ میں نے تھوک نکالا ”وہ شاید تمہارے لئے زندگی بچا دے گا۔ تمہارے انتظار میں برباد ہو جائے گا۔“

ری تھی۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ دھوکا اس نے مجھے نہیں اپنے آپ کو دیا تھا۔ وہ حقیقت وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔  
میں مہمی سانس لے کر ذرا خاموش ہوا تو وہ ہینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”خاصی انسانوی داستان ہے۔“  
”افسانہ تو مفت میں بدنام ہے۔ انسان کی زندگی پر درد میں انسانے سے زیادہ افسانوی رہی ہے۔“ میں نے کہا ”بہر حال اب یہ کمافی ایک عجیب و غریب ہے۔ وہ لڑکی خود لڑکی میں مبتلا ہے۔ اپنے آپ کو سزا دے رہی ہے۔ میں نے اسے معاف کر دیا ہے لیکن وہ خود کو معاف نہیں کرتی۔ وہ مجھ سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی اور نہ ہی خود کسی اور سے شادی کرتی ہے۔ شادی کرنا تو دور کی بات۔ وہ کسی اور مرد کی طرف دلچسپی کی نظر سے دیکھتی تک نہیں۔ میرا پہلو ہے کہ میرے ذہن پر جو نقش بن چکا ہے وہ متاثر نہیں۔ میں اس کی طلب سے آزار نہیں ہوتا۔“

اس نے میرے ہاتھ نہایت آہستگی سے اپنے کندھوں سے ہٹا دیے اور اسی طرح خواب کے عالم میں نہایت آہستگی سے چلتی ہوئی ایک کرنی تک پہنچی۔ وہ کچھ اسی طرح کر رہی پر پتہ نہیں چل گیا اب اس کی باتوں میں بھی اپنا وزن سارے کی طاقت نہ رہی ہو۔ اس کا سر ہمواری سے جھکا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب ہی جا کھڑا ہوا۔ میری آنکھیں ٹپک رہی تھیں۔

ایک طویل لمحے کے بعد اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہنسی ہنسی تو آواز میں بولی ”اب تم زندگی پر مبنی کراؤ گے؟“  
”مجھے معلوم نہیں“ میں نے بے بسی سے کہا ”کل کیا ہوا...“  
”کون کیا کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں ایک سوہمی امید کا قیدی ہوں جسے شاید امید کتنا بھی غلط ہے۔ ایک لامعاصل انتظار میں مبتلا ہوں جو شاید کسی کی نظر میں انتظار بھی نہیں، کھس ایک حماقت ہو۔“

”اس کا مطلب ہے میں نے ایک سراب کا تعاقب کیا تھا؟“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

”میں اس کے قریب بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس کا ہاتھ تمام کراپی جگہ آنکھوں سے لگا چاہتا تھا لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں صرف ایک مجرم کی طرح اس کے قریب کھڑا ہوا پھر میں نے آہستگی سے کہا ”بعض نہایت سادہ سے شعر کہتے پڑاؤں کہتے باسٹی اور کیسے حسب حال گتے ہیں۔“ میں نے خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی ”یہ بات میں کہ رہا ہوں حالانکہ میں شعرو ادب کا کوئی خاص ذوق رکھنے والا شخص نہیں ہوں۔“

”شاید؟“ اس نے پلکیں جھپکاتے بغیر پوچھا۔  
”شاید کہ...“  
زندگی سے یہی کہ ہے مجھے  
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے  
میرے حال کی خبر تمہارے سے بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ وہ

# رقص ابلیس

انوار صدیقی قیمت :-/150

## گنگا کے بجا رہی گ

ایک عہدہ ۰ قیمت ۲۵۰/۰۰ روپے

بے وہ تھا غلط نہیں تھا۔

میں اس لئے جب راجیلہ کا نام میری زبان پر نکلا ہوا تھا اور میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ ذرا آج کے سامنے وہ نام میری زبان سے پھسل نہ جائے، دروازہ نہایت آتشی سے کھلا اور ایک سیاہ پوش نے اندر قدم رکھا۔

دوراجیلہ تھی!

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ میں اسی لمحے اس کا پہنچنا کس طرح ممکن تھا؟ اسے اس وقت اسلام آباد یا لاہور میں ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنی آدمی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ میں ایک ٹکٹ اس کی طرف دیکھ کر بارہا تھا۔ کوئی احساس تھا کہ میں اس وقت کرسی پر بیٹھی ذرا آج کے قریب کھڑا تھا اور میرا ہاتھ اس کے کندھے پر تھا لیکن میں اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کر سکا۔ اپنا ہاتھ بھی اس کے کندھے سے نہ ہٹا سکا۔

راجیلہ اپنے مخصوص ٹیبلے میں تھی۔ یعنی ایک نہیں قسم کا سیاہ برقع، آنکھوں پر بڑا سا ایک دو چشمہ.... اور چہرے کا بانی ہتھ بھی سیاہ نقاب میں لپٹا ہوا۔

وہ میری سیر کے سامنے پہنچ کر ایک لمحے کے لئے کھڑی رہی۔ میں اسے پہننے کے لئے بھی نہ کہہ سکا۔ میں ابھی تک بے یقینی کی دھند سے باہر نہیں آ سکا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ میرا خیال میرے ساتھ شراعت کر رہا تھا۔ میں نے ابھی راجیلہ کے بارے میں سوچا تھا اور بہت شدت سے سوچا تھا۔ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا تھا، شدت سے ہی سوچتا تھا۔ شاید یہ سوچ کی شدت ہی کی کوئی کرشمہ سازی تھی کہ میں راجیلہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ یہ محض میری نظر کا دھوکا تھا!

آخر کار نقاب کے نیچے سے راجیلہ کی دم آواز ابھری۔ میں

”ہم سب کو ایک دوسرے کے انتظار میں بہا رہے ہو جانے۔ وہ ہماری طرح عشق کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔“ وہ خود استہزائی کے انداز میں ہنس کر بولی ”میں بھلا اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟“

”میں کہہ تو چکا ہوں۔ تم اس سے شادی کرو۔“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”بے ہودہ بات مت کرو۔ تم نے دیوانوں والا عشق کیا ہے۔ مجھ جیسے تجربے سے گزر چکے ہو۔ کم از کم تم تو مجھے ایسا مشورہ مت دو۔ ہم جیسے لوگ محض شادی برائے شادی نہیں کر سکتے۔ ہمارے نزدیک یہ بھی دل کا معاملہ ہے اور دل کا معاملہ بجلی کے تاروں کی طرح تو نہیں ہے تاکہ اس سارکٹ میں کرنٹ نہیں ہے تو دوسرے سارکٹ میں پلگ لگا دو۔ دل کی تاروں تو اسی سارکٹ سے باہر نہیں گئی جو خاص طور پر اسی کے لئے بنا ہے اور وہیں سے اس کو زندگی کا کرنٹ ملے گا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”رجیم محل ایک عام آدمی ہے لیکن اسے بھی انتظار کی آگ میں جلتے دو۔ اگر وہ ثابت قدم رہا تو شاید وہ بھی خاص آدمی بن جائے۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں آجائے کہ عشق درحقیقت کیا ہوتا ہے۔ شاید اسے بھی معلوم ہو جائے کہ خود سوختگی کی لذت کیا ہوتی ہے۔“

میں خاموش رہا۔ اس نے سر کو خفیف سا جھکا دیا پھر اپنے رہنشی چمکیلے بالوں میں انگلیاں بھیرتے ہوئے بولی ”اچھا چھوڑو۔ ان بڑی بڑی اور گہری باتوں کو تو رہنے دو۔ تم مجھے ایک چھوٹی اور سطحی سی بات بتا دو۔ میں شاید اس لمحے خود کو ایک اسکول گرل محسوس کر رہی ہوں اور تم سے ویسا ہی ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں جو کوئی پندرہ سولہ سال کی اسکول گرل جو پوری چوری اپنی طرف دیکھنے والے کسی لڑکے سے لے کر پوچھ سکتی ہے۔“

”کیسا سوال؟“

”میں... کہ کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟“

”اس سوال کا جواب شاید کوئی نوجوان لڑکا نہایت آسانی سے دے جاتا لیکن میرے پاس اس کا جواب دینے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ہیں کیونکہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تم مجھے کتنی اچھی لگتی ہو۔“ میں نے خود میری نظر میں اپنی قدر و قیمت نہ جانے کتنی بڑھ چکی ہے کہ تم جیسی لڑکی مجھے محبت کے قابل سمجھ سکتی ہے۔“

”بس۔ اب اٹھو! چھوڑو۔“ وہ اپنے سر میں ہاتھ کو خفیف سا جھکا دے کر بولی ”اب تم مجھے صرف اس لڑکی کا نام بتا دو جس کے انتظار کی سولی پر تم مصلوب ہو؟“

”اس کا نام....“ مجھے یکدم ہی کمرے میں ٹھن محسوس ہونے لگی۔ میں نے ٹال کی گرہ ڈھیلی کر لی۔ میں کتنا چاہتا تھا کہ میں اس لڑکی کا نام اسے نہیں بتا سکتا لیکن یہ کہنے کی بہت میں اپنے اندر نہیں پارہا تھا۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ وہ جو کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ زندگی افسانے سے زیادہ انسانی چیز



میرے پاس دیکھ کر احساس کمتری یا حسد و رقابت کا فکار نہیں تھی۔ حالانکہ اسے یہ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے ایک نظر زراحت کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک ہی خدا کی بندی تھی۔ راحیلہ کا عجیب و غریب چہرہ دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر حیرت کا خفیف سا اثر بھی نہیں ابھرا تھا۔ وہ بس کمری نظر سے اس کا چہرہ لے جا رہی تھی۔ اس کی نظر مشاہداتی تھی لیکن اس کا ذہن شاید راحیلہ کے چہرے سے زیادہ اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ وہ کون تھی۔ اس کے اور میرے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے خیال میں شاید راحیلہ کے چہرے کے بارے میں جاننے سے زیادہ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنا اہم تھا۔

”یہ تم اچانک کیسے نازل ہو گئیں؟ کیا تمہیں ٹیلی فنی کے ذریعے کوئی اشارہ موصول ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ میں بہت سخت جذباتی لکھنوی سے مگر راحیلہ اور ابھی مکمل طور پر اس سے آزاد نہیں ہوا تھا لیکن میں ماحول کے پوچھنے پر کون کون کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔

”مجھے اپنے اچانک نازل ہونے پر بہت افسوس ہے۔“ راحیلہ کمری سنجیدگی سے بولی ”لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ نفیس صاحب نے اچانک مجھے حکم دیا۔ ٹیلی فون کرنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ مجھے آنا پڑا۔ ایک فلائٹ تیار تھی۔ یوں سمجھو کہ مجھے گرتے پڑتے وہ پکڑنی پڑی۔“

”اچھا دماغ میں کرنے اور اپنے اچانک آنے پر اتنی مفاتیح چٹن کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو کیا ایک بہت ہی منہب نظر آنے لگی ہو۔ کیا کمزوری تنہا ہے؟ تمہارا کوئی تعلق نکل آیا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تنہا تو شاید مجھے کسی بھی علاقے کی چمک کر نہیں مگر ذرا لیکن میں بہ حال انسان ہوں اور ابھی میں زمانہ غارتگیاں دہلی نہیں پہنچی۔ اس لئے کچھ باتوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔“ راحیلہ شائستگی سے بولی۔

زراحت شاید اب تک صرف تجسس سے مجبور ہو کر وہاں بیٹھی رہی تھی ورنہ یوں چند لمحے تک بھی دو افراد کا اسے نظرباندہ کر کے بائیں کے جانا یقیناً اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتا۔ اب شاید اس نے تجسس کو بھی ذہن سے جھٹک دیا اور اچانک ہی اٹھ کمری ہوئی۔

”اچھا افضل...! میں اب چلتی ہوں۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

”نہیں تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ میں نے بارع لہجے میں کہا۔ زراحت نے میرا من رکھ لیا۔ وہ مریدانہ سے انداز میں مسکرائی اور دوبارہ بیٹھ گئی۔

میں نے راحیلہ کو مخاطب کیا ”میں جب ریڈ وائٹ سے نہ پچھا کر یوں کو کہ خواہ خوارم یا نہ افکار دھر دھر دوا پھر رہا تھا اور

شاید غلط وقت پر پہنچی۔ مجھے اطلاع دے کر آنا چاہئے تھا۔ معافی چاہتی ہوں۔ میں پھر کسی وقت آ جاؤں گی۔“

اس کا لہجہ پُر وقار تھا اور پُر وقار انداز میں ہی وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔ تب مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا اور نہ ہی وہ میرے تخیل کی کرشمہ سازی تھی۔

”رنگ جاؤ راحیلہ!“ میں نے زراحت کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر اپنی کمری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”تمہارے آنے کا اس سے زیادہ صحیح وقت شاید کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تمام اس وقت تمہاری آمد میرے لئے حیران کن ضرور رہی ہے۔“

میں اپنی کمری پر تقریباً ڈیرہ ہو گیا۔ زراحت اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ایک ہلکے سا جھلک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راحیلہ نہایت آہستگی سے نکھوی۔ تارکک چمنے کی وجہ سے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کا رخ میری طرف تھا۔ زراحت کو اس نے گویا بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ زراحت بالکل پُرسکون بیٹھی تھی۔ اس نے کسی قسم کی کھیا بابت تمکیر یا اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

”کیا میں واقعی رنگ جاؤں؟“ راحیلہ کی دھیمی نواز ابھری۔

”ہاں۔ اس میں اتنے پراسرار لہجے میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟“ میں اب جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ میں نے اسے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا جبکہ زراحت میرے دائیں ہاتھ پر تھی۔

”کیا میں واقعی بیٹھ جاؤں؟“ راحیلہ کے لہجے میں خطرہ مگر نہیں تھا۔ وہ بڑے شیریں لہجے میں بولی تھی مگر خطرے اظہار کے لئے یہ الفاظ ہی کافی تھے۔

”ہاں بیٹھ جاؤ۔“ میں نے لکڑا کر رکھا صاف کرتے ہوئے کہا ”اور اگر تمہیں بیٹھنے کی عادت نہیں ہے تو چوگرد کی طرح پھٹ میں اُلٹی لٹک جاؤ۔“

یہ وہ اصل لہجہ تھا جس میں ہم اکثر ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ غامدی تھے۔ خلاف توقع اس نے مجھے کوئی نہ تو زراحت دینے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ عام حالات میں وہ کسی کی موجودگی میں اپنے چہرے سے غائب نہیں ہلاتی تھی۔ خصوصاً کسی اجنبی کی موجودگی میں تو وہ بہت سی غلط رفتاری تھی کہ وہ اس کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ پائے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھی بلکہ وہ محض اس لئے یہ احتیاط کرتی تھی کہ کوئی اس کا چہرہ دیکھ کر حیرت میں مبتلا نہ ہو جائے اور اگلے سیدھے سوالات نہ کرنے لگے لیکن اس وقت اس نے نہایت اطمینان سے نہ صرف غائب پورے چہرے سے ہٹا دیا بلکہ تارکک چشمہ بھی اتار کر میز پر رکھ دیا اور کمری کے پچھے سے ٹیک لگا کر میری طرف..... دیکھتے ہوئے مسکرائے لگی۔ شاید وہ مجھے بتانا چاہتی تھی کہ وہ ایک غیر معمولی طور پر خوب صورت لڑکی کو بھی

|                        |              |
|------------------------|--------------|
| اسلام کے نامور مجاہدین | قرتسکین -/50 |
| اسلام کی نامور خواتین  | قرتسکین -/40 |
| سومستمان مشائیر        | قرتسکین -/75 |
| حک ملک کی عورتیں       | قرتسکین -/35 |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

نہ جانے کہاں کہاں جا پہنچا تھا۔ اس دوران میری ملاقات ایک زمیندار خاتون سے ہوئی تھی۔ میں نے تم سے ان کا تذکرہ کیا تھا۔

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ راحیلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے ذرتاج کی طرف دیکھا، ”میں سمجھ گئی۔ یہ بیٹیا ذرتاج عمر کی ذرتاج ہیں۔“ اس نے ذرا آگے جبکہ کمریز کے اوپر سے مصافحے کے لئے ذرتاج کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ذرتاج نے کمری پر ذرا آگے کمک کر اس کا ہاتھ تو تمام لیا لیکن میری طرف دیکھ کر بھوس اُٹکاتے ہوئے بولی ”کاش میں بھی کسی اشارے کی مدد سے ان خاتون کو پہچان سکتی۔“

”تم انہیں کسی اشارے کی مدد سے بھی نہیں پہچان سکتی تھیں کیونکہ تمہارے سامنے کبھی ان کا ذکر نہیں ہوا۔“ میں نے کہا ”یہ میری تم سے بھی بڑی محنت اور مہیاں ہیں۔ ان دوستوں میں سے ایک ہیں جو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ میں اپنی دولت کو کوئی قابل ذکر چیز نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں نے زندگی میں کیا کیا تو میں یہی کہوں گا کہ میں نے چند دوست کمائے ہیں۔ دولت تو دنیا میں بہت سے لوگ کما تے ہیں لیکن جو کچھ زیادہ دولت کما تا ہے عام طور پر وہ اتنا ہی غنا ہوتا ہے۔ اس کے گرد لوگوں کا ایک جھوم ہوتا ہے مگر وہ سب اس کے ساتھ کسی نہ کسی غرض کی ذور سے بندھے ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ جو لوگ ہیں وہ کسی غرض کی ذور سے نہیں بندھے ہیں۔“

راحیلہ کا ہاتھ بدستور ذرتاج کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں خواتین ہلکا ہر ریشم۔ مگر درحقیقت فولاد تھیں۔ اس وقت گویا فولاد فولاد کی گرفت میں تھا۔

ذرتاج میری طرف دیکھتے ہوئے اور عجیب مشفقانہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ”تم نے اتنی لمبی تقریر کر دی لیکن خاتون کا نام نہیں بتلایا۔ ویسے میں سن چکی ہوں۔ تم نے انہیں راحیلہ کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ درست ہے نا؟“

”ہاں ان کا نام راحیلہ ہی ہے۔“ پھر میں نے راحیلہ کو پھینچنے کے لئے کہا ”بڑا دیکھاڑی سا نام ہے اور یہ خود بھی اس وقت تمہیں دیکھاڑی ہی لگ رہی ہوں گی۔“

”نہیں“ ذرتاج کی نظر راحیلہ کے چہرے پر کڑھ گئی ”میں ظاہری چیزوں سے دھوکا کھانے والی نہیں ہوں۔“ وہ راحیلہ کا چہرہ دیکھ کر نہ تو چوڑی تھی نہ حیرت زدہ نظر آتی تھی اور نہ ہی اس نے اس سلسلے میں کوئی سوال کیا تھا۔ تاہم اس نے آہستگی سے راحیلہ کا ہاتھ چمکڑایا تھا۔

راحیلہ گویا ذرتاج کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے بولی ”آپ افضل کی باتوں پر مت جائیے گا۔ یہ خوش قسم انسان ہے۔ ہر چیز کے بارے میں خوش فہمی میں رہتا ہے۔ ہم کچھ لوگ اس کے دوست ضرور ہیں مگر کچھ ایسے زیادہ جاں نثار بھی نہیں ہیں۔ ہم بھی

اس کے ساتھ کسی نہ کسی غرض کی ذور سے بندھے ہوئے ہیں نہ ہم اسے مروانے کی بھی مسبب توفیق کو بخش کرتے رہتے ہیں مگر یہ بڑا خوش قسمت ہے جو راجی جا تا ہے۔“

ذرتاج ایک بار پھر اسی مریانہ انداز میں دھیرے سے ہنس دی گویا کسی بچے نے اس سے مذاق کیا ہو اور وہ اس مذاق کی حقیقت کو خوب سمجھتی ہو۔ تاہم اس نے اس پر کوئی تبہ نہیں کیا۔ راحیلہ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ذرتاج ایک بار پھر اُٹھتے ہوئے بولی ”بھئی اب تو میں واقعی جارہی ہوں۔ مجھے کچھ ٹیلی فون کالز کرنی ہیں۔ تم بھی اطمینان سے بات چیت کرو۔ فارغ وقت میں پھر ملاقات رہے گی۔ بلکہ ہو سکے تو تم اور راحیلہ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ ہو کل تمہارا سہی لیکن میرا کافی کاموقع مجھے دے دو۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، راحیلہ بولی ”میں آپ کی اس محبت اور نوازش کے لئے بے حد شکر گزار ہوں لیکن اس لئے معذرت چاہوں گی کہ میں بہت کم وقت کے لئے کراچی آئی ہوں اور مجھے بہت سے کام نٹانے ہیں۔ دیکھی انداز میں اطمینان سے بیٹھ کر کھانا کھانے کا موقع مجھے شاید ہی مل سکے۔ مجھے آج رات ہی باہر بے گئی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔“

”اوہ“ ذرتاج نے کسی خاص افسوس کے بغیر کہا ”غیر زندگی رہی تو پھر مجھ کی ملاقات ہوگی۔ تب شاید آپ کے پاس وقت بھی ہو پھر ضرور ساتھ بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے۔“

”ضرور۔۔۔ ضرور“ راحیلہ نے سر ہلایا۔ اس بار اس کا انداز بزرگانہ تھا۔ دونوں نے ایک بار پھر مسخروخی سے مصافحہ کیا اور ذرتاج رخصت ہو گئی۔

راحیلہ ہوتنوں پر خفیف سی مسکراہٹ لئے چند لمبے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سنجیدگی سے بولی ”مجھے واقعی بڑا افسوس ہے، تم نہ جانے کتنی محنت سے لڑی پر ذور سے ڈال رہے

"نہیں صاحب نے مجھے تمہاری وجہ سے یہاں بھیجا ہے۔"  
اس نے میرے سوال کا جواب کچھ اس طرح دیا کہ میرے لئے اور  
بہت سے سوالات کا دروازہ کھل گیا۔

"میری وجہ سے؟" میں نے حیرت سے کہا "میں نے کیا کیا  
ہے؟"

"تم کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہتے ہو۔ اگر ارادہ نہیں کرتے تو  
تم سے سرزد ہو جاتا ہے۔" وہ مسکرائی "اب تمہاری وجہ سے یہاں  
جزیرے پر قاسم بجلی کے دونوں بیٹے اور منشیات کا بہت بڑا اسٹاک  
پکڑا گیا ہے۔ قاسم بجلی ڈرگ ٹافیا کے اُن خاص مقامی آدمیوں میں  
سے ایک تھا جن پر مرکزی حکومت ایک عرصے سے ہاتھ ڈالنا چاہتی  
تھی لیکن جب بھی اس پر ہاتھ ڈالا گیا ہمارے بے ہودہ سرکاری  
طریقہ کار اور کرپٹ افسروں کی وجہ سے وہ کبھی مضبوط گرفت میں  
نہیں آسکا۔ اس پر پیش کیا ہوا تھا ہی بڑا اور وہ چھٹی بھٹی کی طرح  
پھسل کر نکل گیا حالانکہ مارکوئٹس پروڈکٹ ایک خاص فہرست میں  
اس کا نام شامل تھا۔ اس کے مرنے پر شاید کئی ملکوں کے کئی  
افسروں نے سکھ کی سانس لی تھی گو کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ  
قاسم بجلی کے مرنے سے ڈرگ انفا کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا  
کیونکہ اس کے دونوں بیٹے اس کے جانشین تھے اور اس کی زندگی  
میں بھی بیشتر کاروبار وہی چلا رہے تھے لیکن وہ زیادہ تر ملک سے باہر  
رہتے تھے۔ کچھ دانت دار لیکن کام چور افسروں کو امید تھی کہ  
باپ کی موت کے بعد وہ دونوں پاکستان آنے کی زحمت ہی نہیں  
کریں گے لیکن وہ نہ صرف آئے بلکہ تمہاری وجہ سے پکڑے بھی  
گئے۔ اس قسم کی ایسی بڑی پھیلوں کو حکومت اہل غلامت پکڑتی رہی  
ہے لیکن اس کی حالت یہی رہتی ہے گویا کوئی ناگمانی مصیبت اس  
کے گلے پڑ گئی ہو۔ آئندہ پالیسی یہ رہے گی کہ اس طرح کے بیشتر  
لوگوں کو امریکا کے سپرد کر کے جان چمڑانے کی کوشش کی جائے گی۔  
اس قسم کے معاملات کو وفاقی حکومت خود چنڈل کر رہی ہے اس لئے  
راہیل اور شریل کو بھی فوری طور پر ایک خصوصی حیارے کے  
ذریعے اسلام آباد لایا گیا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی پھر پہلو بہ لٹے ہوئے بولی  
"اُن سے تحقیق سے اندازہ ہوا ہے اور کچھ دوسرے ذرائع سے  
بھی خبر ملی ہے کہ ڈرگ انفا جزیرے پر گنڈہ کرانے کی کوشش کرے  
گی۔ جزیرے کی صورت حال کو خراب کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔  
قتوتیش کی بات یہ ہے کہ جزیرے کے آس پاس کچھ اہم دفاعی  
تخصیصات بھی موجود ہیں۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"میں اب بھی نہیں سمجھ سکا کہ تم اس سلسلے میں کیا کرو گی؟"  
"کچھ بھی نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی "میں بھلا اس سلسلے  
میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تو اس وقت صرف کو رہتی۔ یعنی قاصدا  
پامبر کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔"

اس نے میز پر رہنے والے اپنے خوب صورت چرمی بریفنگ

کیج میں نے تاج میں آکر رنگ میں بھگ ڈال دیا۔  
"افغانوں والی منگھو مت کرو۔ میں نے آج تک کسی لڑکی پر  
ذورے نہیں ڈالے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" راجیلہ گویا صبح کرتے ہوئے بولی "تمہیں ذورے  
ڈالنے کی ضرورت ہی کہاں پڑتی ہے۔ لڑکیاں بے چاری خود ہی بچی  
ذورے بندھی، کھینچی چلی آئی ہیں۔"

"اب میں ایسا بندہ ہی نہیں ہوں۔ تم کیوں ہر وقت مجھے پلے  
جوائے بنانے پر کئی رہتی ہو؟" میں نے لالحت سے پوچھا۔

"مجھے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو بے بنائے ہو۔ بلکہ تم تو  
بہرہ اور پلے جوائے سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہو۔" وہ کندھے اچکا کر  
بولی۔

اب میں بھٹکی ہانپنے لگا۔ "تمہاری سوچی اسی دیکھاؤ پر  
لڑکی پکڑا گیا ہے جو میں ذرائع پر ذورے نہیں ڈال رہا تھا بلکہ ایک  
بہت اچھی بھولی ذورہ کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذورے ڈالنے  
سے زیادہ مشکل کام ہے۔ دیکھو بھی ذرائع اتنی معمولی لڑکی نہیں  
ہے کہ اس پر ذورے ڈالنے میں عیاذ نہ حرکت کی جا سکے۔"

"وہ تو خیر میں نے دیکھ لیا ہے۔ خاصی "ملکہ عالم" قسم کی چیز  
ہے لیکن ذورے تو بحال ملک پر بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔ فرق  
صرف یہ ہے کہ اس کے معاملے میں ذرا سلیقہ درکار ہوتا ہے اور  
اپنی اوقات بھی دیکھنی ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے اس وقت تمہاری بکواس کرنے کی صلاحیت  
کچھ زیادہ ہی بیدار ہے اس لئے اس موضوع کو ہمیں چھوڑتے  
ہیں۔ ضرورت پڑی تو اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال یہ بتاؤ  
کہ نفیس صاحب نے تمہیں اچانک کیوں یہاں بھیجا ہے اور کیا  
واقعی تم اتنی افرا تفری میں یہاں آئی ہو کہ مجھے اطلاع تک نہیں  
دے سکتی تھیں؟"

"نہیں... کچھ ایسی افرا تفری بھی نہیں تھی۔" وہ اطمینان سے  
بولی "میں چاہتی تھا اطلاع دے بھی سکتی تھی۔ اسلام آباد سے نہ دیتی  
تو پٹنیاں پہنچ کر اطلاع دے سکتی تھی لیکن میں تمہیں سربراہان  
چاہتی تھی۔"

"سربراہان تو واقعی تم نے دیا... اور بہت زبردست دیا۔" میں  
نے سر ہلایا۔

"اچھا؟" اس نے مصوبیت سے آنکھیں پھا لیں "میرے  
خیال میں تو مجھے یہاں پہنچ کر سربراہان ملے۔" پھر وہ سر جھٹک کر  
بولی "خبر ان باتوں سے قطع نظر۔ لڑکی اچھی ہے۔ میری باتو تو اب  
نیکو ہو جاؤ اور اگر وہ رضامند ہے تو شادی کر ڈالو۔"

"ہاں اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن اس سلسلے میں مجھے  
تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے کم از کم یہ کام تو میں  
تمہارے مشورے کے بغیر کسی روز اچانک کر کر دوں گا۔ میں نے تم  
سے سوال کچھ اور کیا تھا۔"

کس کی طرف اشارہ کیا جو کچھ زیادہ سی بریف تھا اور سرسری نظر میں بریف کس کے بجائے سیڈیز پر ہی معلوم ہوتا تھا "اس میں کچھ افسروں کے لئے کچھ ضروری ہدایات ہیں اور کچھ افسروں کے فوری تبادلے کے احکامات ہیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" میں نے جانا چاہا۔

"یہ تو فیض صاحب ہی بترا جانتے ہوں گے۔" وہ کندھے اٹکا کر بولی "بہر حال میرے خیال میں اس سے جزیرے کی صورت حال کو کنٹرول میں رکھنے اور دفاعی تنصیبات کو کسی حتمی خطرے سے بچانے میں مدد ملے گی۔"

"فیض صاحب کو اس کام کے لئے کوئی اور آدمی نہیں ملا تھا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا "یادہ کسی اور آدمی سے یہ کائنات نہیں بچوا سکتے تھے؟"

"بچوا تو سکتے ہوں گے" آدمیوں کی ان کے پاس کیا کمی ہے اور طریقے بھی بہت سے ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے مجھے سمجھنے میں ہی مصلحت سمجھی ہوگی۔ ہم انی الحال ان کے چلے بنے ہوئے ہیں۔ میں اس قسم کے چھوٹے موٹے کاموں سے افکار بھی نہیں کر سکتی۔ دینے بھی خیر یہ ملکی مفادات کے سلسلے کی ایک خدمت تھی۔ ہمیں اس قسم کے کاموں سے افکار کرنا بھی نہیں چاہئے۔" رابطہ بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ جب ان لوگوں کو کوئی مجبور لاحق ہو تب تو ان کے کام آئے۔ میں کوئی حرج نہیں۔ فیض صاحب واقعی ایچھے آدمی ہیں۔ وہ خود۔۔۔ اور ان کے ارد گرد جو آدمی موجود ہیں وہ دیانت دار ہیں کہہ نہیں ہیں۔ ملکی مفادات کے لئے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بے لوث طریقے سے کام کر رہے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اب میں ان لوگوں سے تعلق داری میں محتاط ہونا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں انہیں بھی تقریباً انہی لوگوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی نہ دوستی، ابھی نہ دشمنی اچھی۔"

میں نے ایک لمبے وقفہ کیا۔ رابطہ خاموش رہی تو میں نے سلسلہ کلام جو "ریڈ ڈاٹ والا مسئلہ تقریباً حل ہو چکا ہے صرف ڈاکٹر پرناڈ اور آجی آجی آنکھوں والی اس عورت کی تلاش جاری ہے۔ اگر ہمارے خفیہ ادارے انہیں ملک سے نکل جانے سے روکنے میں کامیاب رہے تو امید ہے وہ بھی نہ کبھی نہ کبھی ہمارے ہتھے چڑھ ہی جائیں گے۔ بہر حال اب ہمیں فیض صاحب کے حلقہ اثر سے باہر کتبے کی کوششیں شروع کر دینی چاہئیں۔ ہمیں آئندہ زیادہ مخفیہ معاملات میں ایچھے سے بھی جتنا چاہئے۔ ریڈ ڈاٹ والا تجربہ ہمارے لئے خاصا سبق آموز تھا۔ بشرطیکہ ہم اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

رابطہ دھڑکے سے ہنسی اور ذرا استہزاء سے میرے میں بولی "لگتا ہے تمہارا جوش و خروش خاصا ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ وہ ملک و قوم کی خاطر سب کچھ لٹا دینے اور ہر تکلیف اٹھانے کی باتیں... ذاتی

مفادات سے بالاتر ہو کر ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ۔ شاید وہ سب کچھ تم بھولے گئے ہو۔ شاید تم زیادہ عقل مند زیادہ خالاک ہو گئے ہو۔ شاید تمہیں صرف اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچنا آیا ہے۔ شاید تم بھی ملک کی کان میں پڑنے پڑے آخر شک ہو گئے ہو۔ یا پھر شاید کسی کی صحبت نے تمہیں سو روپایاں کا حساب کرنا سکھا دیا ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ میں بھی وہی ہوں اور میرے نظریات بھی وہی ہیں۔ میں اب صرف محتاط ہونا چاہتا ہوں اور محتاط ہونا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ ہر معاملے کو جنگجو رویوں کی طرح شک کی نظر سے دیکھنا چھوڑ دو۔"

"چھا" تم کہتے ہو تو یقین کرتی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "وہیے فیض صاحب سے شاید ہمارا تعلق بہت غوثی غوثی کم ہوتا جائے گا۔ اسلام آباد میں ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ اب تو ان لوگوں کو ہمیں لاہور جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میں ان کے یہ کاغذات متعلقہ لوگوں کو بچھا کر آج رات لاہور ہی واپس جاؤں گی۔ کل سے میں تمہارے مکان کی دوبارہ تعمیر کے سلسلے میں کام شروع کر دی گئی۔" وہ ایک بار پھر طرے سے انداز میں مسکرائی "اگر وہ خوب صورت خاتون شادی کے لئے آتا رہے تو تب تو تمہیں جلد ہی گھر کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایک معزز اور جاگیردار بیوی کے ساتھ آدمی ہوٹل میں رہتا ہوا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ خواہ وہ اس ہوٹل کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔"

## اے حمید کے ایڈوینچر قلم سے شیو سبنا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ = 700 روپے

ناشر: مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

کی کرشمش کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور فون پر آپ بڑی آواز سننے کے بعد اس سے کہا کہ وہ پر سول فیکس سے کہہ کر ایک گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کرائے۔

فون رینگنے کے بعد میں نے راجیلہ سے کہا "دو چار منٹ لگ جائیں گے۔ تم ابھی بیٹھو۔ میں اپنی گاڑی تمہیں اس لئے نہیں دے رہا ہوں کہ مجھے خود کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے، میں ابھی تیس سکون سے بیٹھا نظر آ رہا ہوں لیکن کسی بھی لئے مجھے اٹھ کر بھاگنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔"

"مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ سے بہتر یہ باتیں کون جانتا ہے۔" وہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولی "یہ بتاؤ لاہور کب آنے کا پروگرام ہے؟"

"میں کل بھی آسکتا ہوں اور ایک مینا بھی لگ سکتا ہے۔ میرے یہاں رہنے کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ میں ڈاکٹر برنارڈ کے بارے میں کسی اطلاع کا شکر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"جڑے پر جو کچھ ہو اس کی ریکی اور سرکاری رپورٹ مجھ تک بھی پہنچ چکی ہے۔" راجیلہ بولی "لیکن مختصر تم بتاؤ تو بہتر ہو گا۔"

میں نے مختصر بتایا اور یوں انتظار کے دو چار منٹ گزر گئے۔ ڈرائیور آن پہنچا تو وہ آہستہ ہوئے بولی "اگر مجھے واپس جانے سے پہلے وقت ملا تو اس سلسلے میں پھر بات کریں گے ورنہ فون پر رابطہ رہے گا۔"

"میرا موبائل کا نمبر کچھ محفوظ ہے۔ خاص معاملات کے بارے میں صرف اس پر بات کرنا۔" میں نے ہدایت کی۔ اب ہم بالکل سنجیدگی سے بات کر رہے تھے اور اسی سنجیدگی کے عالم میں وہ رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر تک دوبارہ کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ میں اس اجاگ اور غیر متوقع ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف ذرا تاج تھی۔ وہ گفتگو کیجے میں بولی "مجھے پتا چلا ہے وہ سیاہ پوش حبیبت تمہارے آفس سے رخصت ہو چکی ہے۔" میں حیرت کے باعث ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی راجیلہ کے بارے میں باخبر رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاں راجیلہ جا چکی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ میری زندگی کے حیرت انگیز ترس اتفاقات میں سے ایک اتفاق تھا کہ جس وقت میں اس لڑکی کو دیکھنے کی بڑی شہرت سے خواہش مند تھی میں اسی وقت وہ آن پہنچی۔" ذرا تاج بولی۔ "کیا مطلب؟" میں نے گزرا کر کہا۔

"اب خواہ مخواہ مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھانے کی

میں نے صرف اسے گھورتے پر اکتفا کیا۔ میں اسے نہیں بتا سکا کہ مسئلہ خاتون کے آمادہ ہونے کا نہیں بلکہ اس کے بالکل اُلٹ تھا اور اس کی وجہ صرف راجیلہ تھی۔ اس پر یقین کرنا شاید خود راجیلہ کے لئے بھی مشکل ہوتا۔

"اس طرح گھورتے ہوئے خاصے بارعب لگ رہے ہو لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں "رعب پر دف" ہوں۔" وہ اپنا تاریک چشم اٹھا کر ناک پر جماتے ہوئے بولی پھر اس نے نقاب بھی اپنے مخصوص انداز میں چہرے اور پیشانی پر لپیٹ لیا۔ وہ ایک بار پھر مکمل سیاہ پوش نظر آنے لگی۔ اپنا بریف کیس اٹھ کر وہ گود میں رکھتے ہوئے بولی "مجھے کوئی گاڑی اور ڈرائیور مل جائے گا؟ میں بہت تنگی ہوئی ہوں۔ خود ڈرائیور کرنا نہیں چاہتی۔"

"تم گھبراہٹ سے جیسا کہیں کیسے پہنچی تھیں؟" میں نے پوچھا۔ "ایک عام سے مسافر کی طرح۔" ٹھیکسی میں۔ "اس نے جواب دیا۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم عام مسافر لگ رہی ہو گی۔" میں نے کہا "ایک تو تم اپنے طے کی وجہ سے عام مسافر نہیں لگ سکتیں۔ دوسرے یہ کہ عام مسافر کے پاس تو ڈراہٹ سالان ضرور ہوتا ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرے پاس بھی مختصر ما

ایک سوٹ کیس مزدود ہے اور مزید اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اس وقت تمہارے ہوٹل میں مقیم ہوں۔ تمہارے آفس میں گھسنے سے پہلے میں یہاں کمرالے چکی تھی۔ سوٹ کیس میں نے وہاں رکھا۔ شاید لیا بکاس تبدیل کیا پھر تمہارے پاس آئی تھی۔" "بڑی غیبت ہو تم۔" میں نے حیرت سے کہا "میں تم نے آکر ہوٹل میں قیام بھی کر لیا اور مجھے اطلاع ہی نہیں۔"

"میں نے اسٹاف کو منع کیا تھا کہ کوئی تمہیں میری آمد کے بارے میں نہ بتائے۔" وہ بولی۔

"اسٹاف میرا ہے اور کہتا تمہارا ہوتا ہے۔" میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا "پھر بھی غور نہیں کرتی ہیں کہ وہ عورت ہو کر نقصان میں ہیں۔"

"اچھا تم یہ بتاؤ گاڑی دے رہے ہو یا نہیں؟" وہ آہستہ ہوئے بولی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم گاڑی کا انتظام کرنے کے لئے کو اور گاڑی نہ ملے۔ تم حکم کو تو ریل گاڑی کا انتظام ہو سکتا ہے اور ڈرائیور کے فرائض میں خود انجام دے سکتا ہوں۔" میں نے ٹپائی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ریل کا انجن چلانے والے کو ڈرائیور نہیں" انجینئر کہتے ہیں۔" راجیلہ نے صدمہ کی۔

"مجھے معلوم ہے پروفیسر صاحب! لیکن میں عام فہم زبان بولنے

# جاہ بابل

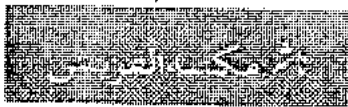
دیو تاؤں کے شہر بابل کی کہانی

جسے مصنف نے 35 سال کی رسرچ کے بعد

قلب بند کیا۔

فٹ 400

800 صفحات



اردو بازار لاہور

کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو فائلوں میں الجھانے لگا۔

○●○

مجھے کراچی میں مزید دو ہفتے گزر گئے۔ اس دوران کئے کو تو کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا لیکن میرے اندر کا طوفان بدستور مجھے منتشر کر رہا تھا۔

ذرتاج ابھی کراچی میں ہی تھی اور میرے ہوسٹل میں ہی مقیم تھی۔ گو کہ اس نے ڈینس میں بگڑا خرید لیا تھا اور خاصی جھلٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ادا لگی بھی کروی تھی لیکن ابھی اس میں شفقت نہیں ہوئی تھی۔ ابھی اسے اس کے "شایان شان" بیٹا تیار تھا۔ انٹریزیکوریشن کی ایک فرم اس کی تزئین و آرائش اور ڈیزائننگ کا کام کر رہی تھی۔

کبھی کبھی ذرتاج خود بھی جانکر کام کی گرانٹی کرتی تھی اور سامان وغیرہ منتخب کرتی تھی۔ میری اس سے دن میں دو تین مرتبہ ملاقات رہتی تھی لیکن پہلے دن کے بعد سے ہم کبھی جذبات کے خار زاموں میں نہیں اٹھے تھے۔ ہم صرف اپنے دوستوں کی طرح ملتے تھے اور دل کے معاملے کے سوا دنیا کے ہر موضوع پر بات کرتے تھے۔ اصل موضوع کے حلقے میں ہمارے درمیان گویا ایک چنے عنوان سا لکھتے "ایک بسم سا حجاب" لایا تھا۔ صرف پہلے دن کھل جانے کے بعد ذرتاج کو اپنی انا کے ذہن میں بند ہو گئی تھی لیکن اس کا کراچی منتقل ہونے کا بدگرام نہیں بدلتا تھا۔

اس دوران راجیل کا ذکر بھی صرف ایک ہی مرتبہ آیا تھا۔ وہ

کوشش نہ کر رہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے یہی وہ لڑکی ہے جس کے لامحالہ انتظار نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

میں ابھی اس بات کا اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن فوری طور پر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے ذرتاج سے راجیل کا تعارف کراتے وقت اسے صرف اپنے بہترین دوستوں میں سے ایک قرار دیا تھا لیکن اُن کی باتوں کو محسوس کرنے کے معاملے میں ذرتاج بھی کچھ کم نہیں تھی۔

ذرتاج نے بات جاری رکھی "لڑکی کا چہرہ اس وقت مضحکہ خیز ہے۔ اس کے باوجود بڑے غضب کی چیز ہے۔ تمہارا اس پر عاشق ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اپنی تمام تر مضحکہ خیزی کے باوجود وہ تم سے شادی پر آمادہ نہیں ہے۔"

میرے خیال میں اب ذرتاج کو جھٹلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے دیکھے لہجے میں کہا "میں نے جھٹلایا تاکہ اس کے پیچھے اس کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔"

"افسوس! اس نے ٹھنڈی سائنس لی "ایک تو ٹکڑے لوٹے فلسفوں نے انسانوں کو بہت تباہ کیا ہے۔ ہر حال تم اس فلسفے کی ہیئت چہرہ کر اپنے حق میں کچھ اچھا نہیں کر رہے۔ مجھے صرف اتنا ہی کہنا تھا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

ریپورر رکھ کر میں کئی لمبے تک تم صم بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ میں زندگی کے ایک موڑ پر ذرتاج کو پیچھے چھوڑ گیا تھا اور اسے

ایک دن میرے لئے قصہ پارہ بن جاتا تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ تو پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ اندر ہی طوفان کی طرح میری زندگی میں دوڑا آئی تھی۔ میں اپنے اس خیال پر تو قائم تھا کہ میں راجیل کے سوا کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنے دل کی حدالت میں مجھے یہ اعتراف بھی تھا کہ میں ذرتاج میں بھی ایک انوکھی اور ناقابل بیان کشش محسوس کر رہا تھا۔

میں ایک فیصلے پر قائم ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو یکسو محسوس نہیں کر رہا تھا۔ شاید میری کوئی بشری کمزوری اس کی وجہ تھی۔ میں لوہے کے اس ٹکڑے کی طرح ہو کر رہ گیا تھا جسے بیک وقت دو مخالف قوتیں اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ ذرتاج نے ابھی تک یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ راجیل کا چہرہ مضحکہ خیز کیونکر ہوا تھا۔ اسے یہ اندازہ تو یقیناً ہو گیا تھا کہ اس کا چہرہ بدآہنی طور پر ایسا نہیں تھا۔ بدآہنی طور پر کسی کا چہرہ اتنی منفی سے مکمل طور پر بدحواسی میں منتہم نظر آتا ہے کہ خیال میں تو تقریباً نامکمل ہی تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں بیک وقت ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا تو میرا ذہن شل ہو جائے گا اور میں اپنا کوئی بھی کاروباری کام نہیں شناسکوں گا چنانچہ میں نے دونوں ہی کے قصور

بھی اس طرح کہ ذرتاج چشمن سے مجبور ہو کر آخر کار اس کے چہرے کے بارے میں سوال کری بیٹھی تھی۔ میں نے اسے ساری بات بتادی تھی۔ اس نے اسس کا اظہار کیا تھا جو مجھے کسی حد تک رنجی ہی محسوس ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر بھی رابطہ کے بارے میں بات نہیں ہوئی تھی۔

رابطہ سے میرا فون پر رابطہ رہتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس نے بھی کراچی سے ہانے کے بعد ذرتاج کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ بھی مذاق میں بھی اس کا تذکرہ انگلی میں نہیں لاتی تھی۔ اس نے میرے مکان کی تعمیر شروع کرا دی تھی۔ میری بذات پر اس نے کنسٹرکشن کہتی ہے کہ کمرت زیادہ آوی ٹکوا کر کام شروع کرا رکھا تھا کیونکہ میں مکان جلد مکمل کرانا چاہتا تھا۔ میرے چہرے پر سنا تھی اہتمام آباد میں تھے وہ بھی رابطہ کے ساتھ ہی لاہور پہنچ چکے تھے اور رابطہ انہی کی مدد سے بزنس بھی سنبھالے ہوئے تھی۔

میں نے شفیع شاہ وغیرہ کو بھی جزیرے سے واپس بلوایا تھا کیونکہ انہیں جزیرے پر رہنے کا اب کوئی ناکہ نہیں تھا۔ میں نے انہیں ڈاکٹر برنارڈ کی وجہ سے جزیرے پر چھوڑا تھا لیکن ان کی باتوں سے تصدیق ہو چکی تھی کہ وہ جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان تمام راستوں اور ذرائع آمد و رفت کی فکری نگرانی دوسری تھی جن کے ذریعے وہ بیرون ملک فرار ہو سکتا تھا۔ ابھی تک کوئی ایسی شہادت نہیں ملنی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے بیرون ملک فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

زیادہ امکان یہی تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کراچی میں موجود تھا لیکن کراچی بنائے خود ایک سندر تھا۔ اس میں ڈاکٹر برنارڈ جیسے فنکار کو تلاش کرنا کارے وارد تھا۔ اس معاملے میں تو قسمت کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتی تھی کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا۔ بہر حال ہم اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ میرا چشمی صاحب سے بھی رابطہ رہتا تھا۔ اگر چہ اپنے آدمیوں کو ڈاکٹر برنارڈ کے حلقے میں کوئی کامیابی ہوتی تو مجھے چھوڑ دیا جاتا۔

امبر تقریباً دو ہفتے سے میری سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی اور اس حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود وہ بہت اچھی سیکرٹری ثابت ہوئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو بہت ہی احسان مند محسوس کر رہی تھی اور اب اسے نئے سرے سے ایک اچھے باعزت انداز میں زندگی شروع کرنے کا موقع ملا تھا تو وہ اس سے پر اپرا پر قائمہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کوئی بڑی بے راہبوز لڑکی نہیں تھی لیکن ماضی میں اس نے ملازمت کی جگہ وہاں کے ماحول اور قریبی ساتھیوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط نہیں کی تھی جس پر اسے پکارتا تھا اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اندر سے وہ بہر حال ایک اچھی لڑکی تھی۔ میں نے

اسے جو بھی دتے داریاں سونپی تھیں وہ اپنے آپ کو ان کا اہل ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی بلکہ وہ ان کا بانیہ قسم کے ملازمین میں سے ایک ثابت ہو رہی تھی جو ہر ذرتاج کے اپنے سر لینے کے لئے تیار رہتے ہیں اور ان کی پوسٹ خواہ کچھ بھی ہو لیکن وہ نہایت خوش و خروش سے ہر کام کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ اپنی مستند قسم کی کبھی کبھی اس کی مستندی دیکھ کر کھینچے شرمندگی ہونے لگتی تھی۔

چنانچہ اس روز جب وہ منظرانہ انداز میں اچھا ملتی ہوئی میرے آفس میں داخل ہوئی تو میں بھی سمجھا کہ وہ فرائض کرے گی "سرا مجھے کوئی اور کام بتائیے۔ سیکرٹری کی مصروفیات تو کوئی مصروفیات ہی نہیں ہیں۔ یہ تو حق ایک نمائندگی کی جاب ہے۔" بعض دفاتر میں واقعی سیکرٹری کی جاب نمائندگی ہی ہوتی ہے لیکن میرے دفتر میں کام بہت زیادہ تھا کیونکہ میں اپنے دوسرے بزنس کو بھی انی حال ہو کر والے آفس سے ہی ہینڈل کر رہا تھا۔ اس میں مجھے سہولت رہتی تھی۔ میری مصروفیات بڑھتی تھیں تو اس سے زیادہ امبر کی مصروفیت بڑھ جاتی تھی۔ اس کے باوجود اسے کام کی کٹھنہ رہتا تھا۔

میں سمجھنے لگا کہ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے لئے کوئی کام سوچنے کا جس میں اسے مصروف رکھا جائے۔ میں فوری طور پر اس کے لئے کوئی کام نہ سوچ سکا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری نظر اس کے سراپا میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ مجھے صحیح معنوں میں آج پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ ایک اسٹارٹ اور خوش لباس لڑکی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے گھر کی حالات کیا تھے لیکن یہ تو بہر حال طے تھا کہ اس کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا لیکن قدرے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ شخصیت کے اعتبار سے نچلے متوسط طبقے کی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ اس کے سراپا سے اس کے وضع قطع اور پہناوے میں ایک "پنج آف کلاس" موجود تھا۔ یہ گویا اس کی ایک اضافی ذلت تھی۔ جس جگہ... جس ماحول میں... اور جس حیثیت سے وہ کام کر رہی تھی اس میں "پنج آف کلاس" ضرور تھا۔

وہ سرورہ کتاب الا اعضاء اور خوش شکل تھی۔ چلتی تھی تو ماحول میں ایک خوشگوار سا ارتعاش پیدا ہوتا تھا۔ شاید ذرتاج نے ایک بار اسے دیکھ کر خاص انداز میں مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا تھا "سیکرٹری بھی تم نے خوب چھانت کر رکھی ہے۔"

لفظ "بھی" پر اس نے اس طرح زور دیا تھا جسے اس سے پہلے بھی میں مختلف کاموں کے لئے بہت سی خواتین کو چھانت کر رکھ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں نے امبر کو ہرگز چھانت کر نہیں رکھا تھا۔ وہ تو قسمت کی مادی خودی "بھٹی چھائی" میرے پاس آن پہنچی تھی۔ اس کی مجھ سے ملاقات حادثاتی تھی اور کچھ حادثاتی سے ہی انداز میں اسے ملازمت پر رکھ لیا گیا تھا لیکن ذرتاج کو شاید

# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                       |
|-------|-----------------------|
| 500/- | سراج منیر (اول و دوم) |
| 200/- | طارق بن زیاد          |
| 175/- | مقدس دیو داسی         |
| 200/- | سرابوں کے صحرا        |
| 300/- | رقص درویش             |
| 250/- | دشت کے بھیڑیے         |
| 300/- | غریب کا چوپان         |
| 300/- | شیر شاہ سوری          |
| 250/- | سندھ کا سورما         |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ایک نئی کتاب تھی۔ یہاں آنے کے بعد تو رفتہ رفتہ ان سے رابطہ  
لوہا گیا تھا۔ ایک عرصے بعد اس گھر کی ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی  
ہے جو میری سہیلی ہو اگئی تھی۔ اب وہ وہاں بچہ ہے۔ اس کی  
چھوٹی بہن کچھ عرصہ پہلے ملازمت کے سلسلے میں کراچی آئی تھی  
لیکن وہ انسانوں کے اس جنگل میں کھو گئی ہے۔ اسے تلاش کرنے  
کی ہر کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ میری سہیلی خود بھی اسے تلاش  
کرتے تھک چکی ہے۔ ان کے والد تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔  
میری سہیلی ہی گویا اپنی بہن کی سرپرست تھی۔ وہ بہت پریشان ہے  
سرا اسے آپ جیسے کسی شخص کی مدد کی ضرورت ہے۔  
”تمہاری اس سہیلی کا نام کیا ہے؟“

اس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ امیر نے  
جب سے میرے ہاں کام شروع کیا تھا وہ بہ دن گھر کی باری تھی۔  
وہ بچوں میں ہی اس امیر اور اس امیر میں زمین آسمان کا فرق نظر  
قے لگا تھا جو سخت دہشت کے عالم میں اپنی باپتی میرے پاس مدد  
کی درخواست لے کر آئی تھی۔

”سرا میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔“  
میں امیر کی آواز میں کراہنے خیالات سے چونکا۔ میں نے محسوس کیا  
کہ آج امیر کا لہجہ مختلف تھا۔ وہ بہت ہچکچاہتی تھی شاید وہ مزید کام  
کی فراہم کرنے نہیں بلکہ کچھ اور کہنے آئی تھی۔  
میں نے ایک طویل سانس لے کر مائی کی گروہ درست کرتے  
ہوئے سرسری سے کہنے میں پوچھا ”کوئی مالی مسئلہ ہے؟“

”میں سر نہیں۔“ وہ گویا قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے جلدی  
سے انگریزی میں بولی ”میرے مالی حالات اتنے بُرے نہیں ہیں اور  
پہلے ایک ہفتے بھی بے روزگار نہیں رہا ہوں۔“  
”تو پھر کیا مسئلہ ہے؟“ میں کچھ اور سنہل کر پوچھ گیا۔

”سرا میری آپ سے کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔“ وہ ہاتھ ملتے  
ہوئے بولی ”مسئلہ قطعی ذاتی سا ہے اور ہے بھی کسی اور کا لیکن  
آپ اسے میرا ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے جذبات میں آکر کسی سے وعدہ  
ڈال دیا ہے کہ میں آپ سے اس کی مدد کی درخواست کروں گی لیکن  
اب مجھے خیال آ رہا ہے آپ یقیناً سوچیں گے کہ ابھی تو آپ نے  
میرے لئے اتنا درد سہا ہوا تھا۔۔۔ میری اتنی مدد کی تھی اب  
لی دوسروں کی سفارش بھی لے کر آنے لگی۔ کہیں آپ یہ نہ  
دیکھیں کہ میں آپ کی قربان طبیعت سے قائمہ اٹھانے کی کوشش  
لہری ہوں یا کہیں میں آپ کے لئے مستقل درد سہی نہ بن  
اؤں۔“ اس کی آواز گلے میں اٹکنے لگی ”لیکن یہ ہوائی کسی

بیت زدہ کا معاملہ ہے میں اسے اُمید دلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔“  
”بھئی تم نے تو بہت سہجی پیدا کر دیا ہے۔ پہلے معلوم تو ہو کہ  
تلا کیا ہے۔ سبھی تو میں کوئی جواب دے سکتا ہوں۔“

”آپ چاہیں تو اس سلسلے میں ضرور کچھ کر سکتے ہیں سراج لیکن  
نہ احساس ہے کہ آپ ایک مصروف آدمی ہیں۔ بڑے آدمی ہیں  
لی لیکن کائنات کی ضرورت تو بڑے آدمیوں کو بھی پڑتی ہے سرا۔“  
”بھئی تم رہی باتیں چھوڑو اور اصل بات کرو۔“ میں نے  
نصرت سے کہا۔

”سرا میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں کراچی آئے ہوئے کافی  
نہ ہو گیا ہے لیکن اصل میں ہماری فیملی سکھر کی رہنے والی تھی۔“  
بلدی سے بولی۔

”ہاں مجھے یاد پڑتا ہے تم نے ایسی کوئی بات کی تھی۔“ میں نے  
”سرا وہاں ملنے میں رہنے والی ایک فیملی سے ہمارے بہت



چھپا کر باقاعدہ روئے تھی۔

میں چند لمے خاموش بیٹھا رہا۔ ایک اجنبی عورت کا رونا انسان کو بڑی الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ اچانک میں نے درشت لہجے میں کہا ”کیا کیا ہو اس ہے۔ بند کرو یہ رونا دھونا۔“

اسے یکدم زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے نشوونما سے آنکھیں صاف کیں اور بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی پچھلی پچھلی آنکھیں کچھ اور پھیل گئی تھیں جس طرح اچانک اس کے آنسو برسا شروع ہوئے تھے ”اسی طرح اچانک ختم بھی گئے۔“

میں نے فوراً اپنے اثرات بدل لے اور محبت سے مسکراتے ہوئے کہا ”ہاں اب ٹھیک ہے۔ دراصل مجھے تمہارے آنسو روکنے کا کوئی اور کارگر طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ تمہارے آنسو روکنا اس لئے ضروری تھا کہ آنسو بہانے سے تمہارے مسئلے کے حل میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ہاں تو۔ مسئلہ کیا ہے؟ تمہاری بہن تم ہو گی ہے؟“

”ہاں“ اس نے پینڈ بیگ میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے پچھلے پچھلے سفید سے چہرے پر ابلیسی سرخنی نمودار ہو چکی تھی۔ گویا اس کی شخصیت میں بھی کچھ رنگ آ گیا تھا۔ پورا چہرہ نشوونما سے پوچھنے کے بعد وہ عرض لہجے میں ہوئی ”آپ نے تو مجھے ذرا ہی دیا تھا۔“

چند لمے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے آپ پر گلاب پالا اور کافی حد تک پُر سکون لہجے میں ہوئی ”میری بہن کا نام یہ نہ کہ ہے۔ مگر میں ہم اسے پیار سے سونا کہتے ہیں۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹی ہے۔“

میں اب بھی نہ پوچھ سکا کہ اس کی اپنی عمر کیا تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے ہوئی ”مجھ سے سونا کا کچھ پتا نہیں ہے۔ پہلے وہ مجھے اور اسی کو ہر پختہ خط لکھتی تھی لیکن پھر سرے سے اس کے خط آنے بند ہو گئے۔ جب چھ ماہ تک اس کا کوئی خط نہ آیا تو میں اس کا آنا پکارنے یہاں آئی۔ اس کے خفوں سے ہمیں یہ علم تھا کہ یہاں وہ کسی بڑے خاتون کے ہاں رہتی تھی جنہوں نے اپنے مکان کو ہوشیاری کی سی شکل دے رکھی تھی۔ وہ صرف تنہا اور ملازمت پیش لڑکیوں کو کمرے کرائے پر دیتی تھیں۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ بیٹک اٹھا کر اس نے دوبارہ ناک پر نکال دیا۔ بیٹک کے ساتھ اس کی شخصیت کچھ بستر لگتی تھی۔ ایک لمے کی خاموشی کے بعد وہ سر اٹھاتے ہوئے ہوئی ”میں اس ایڈریس پر پہنچی تو نہ جانے کیوں مجھے دھچکا سا لگا۔ میرے ذہن میں اس جگہ کا ایک الگ سی نقشہ تھا لیکن وہ مجھے اپنے قصور سے قطعی مختلف لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی صاف ستھرے علاقے میں صاف ستھرا سا مکان ہو گا جس میں چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے بستر سے کمرے ہوں گے۔ اس کی بائیں ایک بیٹک دل اور بعد وہ قسم کی خاتون ہوں گی جنہیں اندازہ ہو گا کہ بڑے

”تم اسے اندر بھیج دو۔ میں اس سے بات کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”بہتر سہرا“ وہ یکدم پُرانیہ نظر آنے لگی اور تیزی سے گھوم کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کی کمر میں شاخ کل کی سی چمک تھی جو آج میں نے پہلی بار محسوس کی تھی۔ وہ جاچکی تو میں اپنے سامنے موجود ناٹکس بند کرنے لگا اور کچھ کھڑے ہوئے کاغذات سینہ لگا۔

چند لمے بعد جو لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا لپکا سا جھٹکا لگا۔ شاید نا شعوری طور پر میں نے فرض کر لیا تھا کہ امیر کی دوست بھی کچھ اسی جتنی ہو گی لیکن وہ میرے انداز سے بہت مختلف تھی۔

وہ ایک دلی چلی بسی سی لڑکی تھی جس کے دہود میں ہڈیاں سی لہجائی نمایاں تھیں۔ چہرے پر بھی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ناک کی ہڈی بہت نکلی اور نمایاں تھی اور اس بڑی پرناؤک فریم کا چشمہ لٹکا ہوا تھا۔

اس کی عمر تیس سال بھی ہو سکتی تھی اور چالیس سال بھی۔ اس سلسلے میں میں سے کچھ کمنا بہت مشکل تھا۔ وہ معنی مگر صاف ستھری شگوار فیص اور دوپٹے میں تھی۔ وہ اجازت پا کر اندر آئی تو اس کے ساتھ سستی سی خوشبو کا ایک جھونکا بھی اندر آیا۔ بے شک اس کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی لیکن وہ بے حد گوری تھی اور اسے دیکھ کر صاف ستھرے پن کا احساس سا ہوتا تھا اور کسی استانی ہی کا قصور ذہن میں ابھرتا تھا کہ وہ چھوٹے اور پسماندہ شہروں کی تو کیا؟ اچھے پھلے بڑے شہروں کی پیشتر استانیوں اور استادوں کی شخصیت بد قسمتی سے پہلی پہلی نظر آتی تھی۔

وہ سلام کرنے کے بعد میرا اشارہ پا کر بچھکاتے ہوئے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً ندوس تھی کیونکہ وہ اپنا پینڈ بیگ گود میں رکھنے کے بعد اس کا ٹھکانا کبھی کبھل رہی تھی اور تھی بند کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ اس کے بازو اور اس کے ہونٹ بھرے بھرے اور خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی پوری شخصیت میں قابل ذکر چیز شاید اس کے ہونٹ ہی تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ بے کیف سے بے کیف شخصیت میں بھی کوئی نہ کوئی خوبصورتی موجود ہوتی تھی، لیکن اوقات یہ خوب صورتی تلاش کرنے سے ملتی تھی۔ عذرا کہ خوب صورت ہونٹ اس وقت تھر تھرا رہے تھے۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے ملالت سے پوچھا۔  
بیٹک کے شیشوں کے عقب میں اس کی پچھلی پچھلی سی آنکھوں میں یکدم ہی آنسو جھلک آئے۔ اس نے جلدی سے چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور تالبا زوال کی تلاش میں ”کاپتے ہاتھوں سے جلدی سے اپنا پینڈ بیگ کھولنے لگی۔ میں نے نشوونما کا ڈھانچہ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے بیٹک وقت دو تین نشوونما نکالے اور ان میں منہ



شہروں میں آکر ملازمت یا کوئی چھوٹا سونا کام کرنے والی خواتین کے کیا مسائل ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنا مکان اس قسم کی خواتین کے لئے مخصوص کر دیا ہوگا۔ وہ خود شاید ایک کونے میں تخت پر مضبوطی سے نماز وغیرہ میں مصروف رہتی ہوں گی۔ اس کی آواز میں ہوتے ہوئے معدوم ہو گئی۔ اس نے دہکا کھینچ کر اپنے شانوں پر پھینکا لیا۔

مجھے اس کی کمائی میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اپنی مصروفیات بھول گیا تھا۔ وہ ایک نئے خاموش رسی تو میں نے کہا ”وہاں پہنچ کر تھارے قصورات کو کچھ زیادہ ہی شدید دیکھو گا؟“

”جی ہاں“ وہ ہنچا کرتے ہوئے بولی ”وہ ایک بہت سی داہیات سے ملاتے ہیں داہیات سا مکان تھا۔ مکان تو تین چار منزلہ تھا لیکن اس کے کمرے و زبوں کی طرح تھے۔ وہ پوری گلی ہی داہیات ہی تھی۔ مکان داہکن بھی داہیات ہی عورت تھی۔ سوئی۔ جینس جیسی۔ کرفت اور بد مزاج۔ کسی بات کا سیدھے منہ جواب ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ سونا اس کے ہاں سے کرا چھوڑ کر جا چکی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کہاں گئی تھی تو اس نے برہنہ سے جواب دیا کہ اسے کچھ پائیں تھا اور زندگی وہ جانے والیوں کا اتنا چار کھتی تھی۔ اس کے اصل الفاظ یہ تھے ”میں ان کے ہاپ کی ٹوکر نہیں ہوں کہ ان کے جانے کے بعد بھی ان کے پیچھے پیچھے بچوں اور ان کے بارے میں مطبوعات رکھوں۔ وہ چلی گئی سوچتی گئی۔ میری طرف سے وہ ہماڑ میں جائے“ میں نے پھر بھی بہت کر کے اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ سونا کون گئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا تھا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے مجھے ممکن سے دھکیل کر باہر نکالا اور دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ عجیب عورت تھی میں تو اس کی بد اخلاقی پر حیران رہ گئی۔“

پھر اس کا لہجہ اچھا نہیں ہو گیا ”آپ کو میری مدد کرنا ہوگی افضل صاحب! میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا میں کس طرح اتنی کے پاس واپس جاؤں۔ وہ تو یہ سب کچھ سن کر پریشان ہو جائیں گی۔“

”اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ اسیں اتنی جلدی تو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے بڑی حساس سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ ذرا چونک کر بولی۔

”مطلب یہ کہ ابھی تو سونا کے خطوط کا سلسلہ منقطع ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں۔ ابھی سے تمہاری ماں کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ماں کو اتنی جلدی تو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔“ میں نے ملا خمت سے کہا۔

وہ میرے طہر کو سمجھتے ہوئے مرتعش لیجے میں بولی ”میں آپ کو کیا بتاؤں افضل صاحب۔! اہم ماں جی وہاں کس حال میں زندگی گزار رہی ہیں۔ ہمارے اپنے کچھ مسائل ہیں۔ اتنی مستقل مرہنہ ہیں۔ بعض اوقات وہ اتنی تکلیف میں ہوتی ہیں کہ اپنی اولاد تک کے بارے میں سوچنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ میرے لئے بھی ان

کی وجہ سے گھر سے نکلا مشکل تھا اور پھر میرے اپنے ملازمت کے بھی کچھ مسائل ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ ہم سونا کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اس کا ہمیں ذیل لکھنا بہتر کہنے کی بجائے عرصے تک ہمارے لئے حیرت یا تشویش کا باعث نہیں بن سکا تھا۔ سونا دراصل نہایت موڈی اور لا امانی قسم کی لڑکی ہے۔ وہ خط لکھتے پر آئے تو ہنسنے میں کیا! روزانہ بھی کسی کو خط لکھ سکتی ہے اور لکھتا چھوڑ دے تو میوں کسی کو ایک سطر بھی لکھ کر نہ بھیجے۔ صرف خطوں میں ہی نہیں زندگی کے تقریباً سبھی معاملات میں اس کا یہی حال ہے۔ اس لئے ہم اس کی طرف سے زیادہ پریشان نہیں ہوتے تھے۔“

میں ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ اس خاموشی میں ابھی ہی معذرت خواہی کا تاثر تھا پھر میں نے کہا ”اگر تم مجھے کسی حد تک اپنے پس منظر سے بھی آگاہ کرو تو بہتر ہوگا۔ کچھ اپنے بارے میں۔ گھر کے بارے میں۔ والدین کے بارے میں بتاؤ اور اگر سونا کے بارے میں بھی مزید کچھ بتا سکو تو بہتر ہوگا۔“

اس نے اپنے خوب صورت ہونٹوں پر زبان پھیری۔ شاید اس کا نہ خشک ہونا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے تھوڑا بہت آداب میزبانی کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا۔ امیر اور غریب جیسی لڑکیاں تو اس ہوسل میں بیٹھ کر اپنی جیب سے کچھ کھانے پینے کا قصور بھی مشکل سے ہی کر سکتی تھیں۔ میں نے آخر کام پر امیری کو اس کے لئے کوئلہ رکھ دیا اور کچھ اینٹیکس وغیرہ کا انتظام کرنے کی ہدایت کی۔

رہی انکار کے بعد وہ سلسلہ کام جوڑتے ہوئے بولی ”ہمارے والد کا تکی سال پہلے کینسر کے مرض میں انتقال ہو گیا تھا۔ ہمارا کوئی بھائی وغیرہ نہیں ہے۔ والدہ نے مختلف کام کاج کر کے گھر چلایا اور کوشش کی کہ ہم دونوں ہمیشہ تعلیم جاری رکھیں۔ میں نے اتر کے بعد بھی تعلیم جاری رکھی۔ بی اے کیا۔ بی ایڈ کیا لیکن سونا انٹر بھی نہیں کر سکی۔ اسے تعلیم سے پہلے ہی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ابا کے انتقال کے بعد تو اس کا بالکل ہی دل اچانک بد گیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی ہم جیسے گھرانوں کی لڑکیوں کو زیادہ تعلیم حاصل کرنے

کے بعد بھی چوہا سی جھونکا ہوا ہے اس لئے پڑھنے کا کیا فائدہ؟ لیکن یہ شاید محض ایک راہ گزار تھی۔ اصل میں وہ ایک بے چین مدح ہے۔ وہ کوئی لمبی اُڑان اُڑنا چاہتی تھی۔ ہمیشہ سے اس کے خواب اونچے تھے۔

”اورہ!“ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ایسے کئی ایسے میرے علم میں تھے جب غریب گھرانے کی لڑکیوں نے اونچی اُڑان کے شوق میں بال و پر گھنوا رکھے۔ اونچی اُڑان کا شوق بُرا نہیں تھا لیکن اس کے لئے بہت سی چیزیں دیکھنا پڑتی تھیں۔ خصوصاً لڑکیوں کو زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ محض خواہش پرواز رکھنا اور آنکھیں بند کر کے اُڑ لینا کافی نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہیں ایسا ہی کوئی کہانی تو میری ہتھک نہیں تھی؟ میں ایسا کوئی قصہ دیکھنے سے بچنا چاہتا تھا۔

”غیر بات باری دیکھتے ہوئے بولی“ آخر کار مونا ہمارے رشتے کے ایک بچا غنیمت صاحب کے پاس حیدر آباد چلی گئی۔ غنیمت چچا ایک طرح کے بگت چچا تھے۔ سبھی انہیں انکل غنیمت کہتے تھے۔ اچھی بھلی عمر کے لوگ بھی انہیں اسی طرح پکارتے تھے حالانکہ وہ خود کوئی ایسے عمر رسیدہ نہیں تھے۔ وہ دھڑلے اور لالچہ تھے۔ انہوں نے دو سری شادی نہیں کی تھی۔ وہ ابھی خاصے دولت مند آدمی تھے۔ مونا درحقیقت اسی پکڑ میں ان کے پاس گئی تھی کہ ان کی تھوڑی بہت خدمت کرے گی۔ شاید وہ اپنی ساری باکم از کم آدمی ہوئی دولت تو اس کے نام کر دیں حالانکہ خاندان کے دو تین لڑکے بھی پہلے اسی پکڑ میں انکل غنیمت کے پاس جا چکے تھے اور تھوڑا تھوڑا عرصہ وہ کر سکتی تھیں کہ ان کو واپس آچکے تھے۔ انکل غنیمت بھی ایک سی گھاگ اور کایاں آدمی تھے۔ وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے اپنی دولت کے بارے میں کیا سوچا ہوا تھا۔ ویسے بھی ابھی تو وہ بچے تھے۔ تھوڑا کر دیا کر رہے تھے دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے۔ مونا کو اُمید تھی کہ ایک لڑکی ہونے کے ناتے وہ ان کی زیادہ خدمت کر سکے گی اور صحیح سنوں میں ان کے دل میں گھر کر سکے گی۔ وہ کہتے تھے کہ یہاں ان کے ہاں رہنے لگی تھی۔

اس نے خاموش ہو کر نظر ڈکالی۔ شاید وہ کسی سوچ میں الجھ گئی تھی۔ میں نے سکھیلیوں سے گھڑی دیکھی تاہم کچھ کے بغیر اس کے بولنے کا خہر رہا۔ ایک لمحے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا ”تقریباً پندرہ سال انکل غنیمت کے ہاں گزار کر وہ واپس آگئی۔ یہ سب سے طویل عرصہ تھا جو کسی قریبی رشتے دار نے انکل غنیمت کے ہاں گزارا تھا۔ مونا بہت خاموش واپس آئی تھی۔ اس نے کھل کر تو یہ بھی کچھ نہیں بتایا لیکن لگتا ہی تھا کہ اس کی توقعات پوری نہیں ہوئی تھیں اور وہ انکل غنیمت کو ناراض کر کے آئی تھی کیونکہ اس کے بعد بھی ہمارے ہاں انکل غنیمت کا کوئی خط و خطبہ نہیں آیا۔ خط تو پہلے بھی ان کا شاندار دوری آتا تھا لیکن مونا کے ان کے

ہاں قیام کے دوران چند خطوط آئے تھے۔ مونا کچھ عرصہ گھر پر ہی رہی اس نے اتنی کی تمام تر مخالفت کے باوجود کراچی کے لئے رخصت سفر باندھ لیا۔ وہ اپنی زندگی بٹا کر دکھانے اور کچھ کر گزرنے کے لئے لڑکوں کی طرح بے چین تھی اور حوصلہ اس میں لڑکوں سے بھی زیادہ تھا۔ وہ میرے اور راتی کے منع کرنے کے باوجود کراچی آگئی۔

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”تقریباً پندرہ سال پہلے کی۔“ غڈا نے جواب دیا۔  
”پھر کیا ہوا؟“

”مونا ہمیں خط لکھتی رہی۔ لگتا ہی تھا کہ اسے اس بڑے اور اجنبی شہر میں سیٹل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے خطوط سے زور دہلی جھلکتی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے ایک خرم میں تو کسی لمبی گلی تھی لیکن خرم کا نام وغیرہ نہیں لکھا پھر وہ تھوڑے سے مہینے بھی بھیجے گی۔ میں بھی کافی عرصے سے منجر کے طور پر جاب کرنے لگی تھی۔ شاید گھر کے حالات کچھ بہتر ہو جاتے لیکن اس دوران اتنی کافی بیمار رہنے لگی تھی۔ ان کے علاج معالجے کا کافی خرچ تھا اور مسائل بھی درپیش رہتے تھے لیکن زندگی کی گاڑی بہر حال کسی نہ کسی طرح گھس رہی تھی۔

اس دوران مونا نے لکھا کہ وہ ماؤنگ میں بھی کچھ مقام بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ہمیں ایک رسالہ بھی بھیجا جو ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں اس کی رنگین تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ اتنی وہ تصویریں دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے روٹی دہیں کر دیو کہ انہوں نے اس قسم کے کاموں کو کبھی پسند نہیں کیا تھا لیکن جس طرح بیس گھروں کے لڑکے والدین کے قابو میں نہیں رہتے سرکش ہو جاتے ہیں ماں باپ کا کتا نہیں مانتے اس طرح مونا بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور پھر ہمارا تپا بپ بھی نہیں تھا۔ ہم نے رسالہ بھاڑ کر پھینک دیا۔ ہم نے مونا کو تقریباً اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بہر حال رشتے ختم نہیں ہو جاتے۔ ہم اسے یوں تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس سے لائق تو نہیں ہو سکتے۔ چہ باہ سے اس کا کوئی خط نہیں آیا تو آخر پریشان ہو کر مجھے کراچی تپا پڑا۔“

”اس کے خط آنا یکدم ہی بند ہو گئے“ ایسا نہیں ہوا کہ رشتہ رشتہ خطوں کے درمیان وقفہ ہوتا گیا اور آخر کار سلسلہ منقطع ہو گیا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوا۔ خطوط آتے یکدم ہی بند ہو گئے۔“ غڈا نے سر ذرا اونچا کر کے بولے کہ ”آخر کار مجھے یہاں تپا پڑا لیکن یہاں آکر بھی اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔“

”اس کا آنا پتا کرنے کے لئے تم نے پورے چھ ماہ انتظار کیا۔“ میرے لیے میں غیر اداوی طور پر بگڑی گئی آگئی۔  
”میں نے بتایا کہ ہماری کچھ عجیبوایاں تھیں۔“ اس کی آواز ایک بار پھر رنڈ مٹنے لگی۔

# کائنات

ایم اے راحت قیمت :- 100/-

کرتی ہوگی۔ میں تو پہلے ہی سوچ کر آئی تھی کہ اگر مجھے مونا کو تلاش کرنے میں کسی کی مدد بھی لینا پڑی تو پولیس کی مدد پر کر نہیں لوں گی۔ کسی اور کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کروں گی خواہ اس میں مجھے رقم بھی خرچ کرنی پڑے۔ یہ دیکھیے میں تو رقم کا بھی بندرست کر کے آئی تھی۔

اس نے ہینڈ بیگ سے پڑا تین توڑوں کی تین گولیاں نکال کر مجھے دکھائیں جن پر ریویونڈ چڑھے ہوئے تھے۔ وہ نکالنا چہترہ بیس ہزار نوپے کی رقم تھی۔ گولیاں اس کے سرسری استخوانی ہاتھوں میں لرز رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چارگی تھی۔ مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں ٹھنک سی محسوس ہوئی۔ اس لئے مجھے اس پر برا ترس آیا۔ میرے لئے اعوانہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان ماں بیٹی نے یہ رقم جمع کرنے کے لئے کیا جتن کئے ہوں گے۔

اس نے خود بھی میرے اندازے کی تصدیق کردی اور جی آواز میں بولی "میرا خیال ہے مجھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اعوانہ ہزار کی یہ رقم انٹری کرنے کے لئے ہمیں کیا کچھ بچانا پڑا اور کن ضروریات کا گھما گھوٹنا پڑا۔ اس کے باوجود میں آنکھیں بند کر کے یہ رقم کسی بھی ایسے شخص کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے تیار تھی جو مونا کی تلاش کے سلسلے میں واقعی میری کوئی مدد کر سکتا لیکن آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ سے تو میں اس طرح کی بھی کوئی بات نہیں کر سکتی۔"

میں مسکرایا۔ اس نے رقم واپس ہینڈ بیگ میں رکھ لی۔ میں نے ملا ٹٹ سے کہا "غذرا! میں تم سے مفرت چاہوں گا۔ میں ایک مصروف آدمی ہوں اور آج کل خود مجھے کچھ ایسی آگاہیاں درپیش ہیں جن کا میں کوئی حل تلاش نہیں کر پا رہا۔ ان میں کچھ نجی آگاہیاں بھی شامل ہیں۔"

اس کے چہرے پر مایوسی کی تاریکی پھیلنے لگی کر میں نے جلدی سے کہا "لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے اپنے کچھ خاص آدمی ہیں جو اس کام میں تمہاری پوری مدد کر سکتے ہیں اور بے لوث طریقے سے تمہارے لئے ہر کوشش کر سکتے ہیں۔ تم چاہو تو یہ کام پولیس کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے۔ پولیس میں بھی میرا کم از کم اتنا اثر و رسوخ ضرور ہے کہ یہ کام اس طرح نہیں ہو گا جس طرح تم سوچ رہی ہو۔ تمہیں پولیس کے دو ایجنٹوں پر طریقوں سے جو اندیشے ہیں وہ حقیقت کا دوپ نہیں دھاریں گے مجھے دینے بھی

میں نے جلدی سے کہا "خیر کوئی بات نہیں۔ یہ تباہی۔ جب تم اس جگہ نہیں جانا مونا تمہیں کسی اور جس سے پتہ نہ آئے خط لکھتی تھیں تو وہ جگہ تمہیں صرف وادیاں ہی ملے گی یا تمہیں اس پر کسی قسم کا شک بھی ہو؟"

"میں مجھے وہ جگہ کچھ ٹھیک نہیں لگی افضل صاحب! وہ کچھ بے بسی سے بولی "میں کچھ صحیح طرح اپنا تازیانہ نہیں کر سکتی۔ میں نے بہت محدود اور محدود سادے سے انداز میں زندگی گزار لی ہے۔ کسی بڑے شہر میں قیام کرنے اور اوپر اوپر مارے مارے پھرنے کا مجھے پہلی بار اتفاق ہوا ہے۔"

"تم ٹھہری کہاں ہو؟" میں نے دریافت کیا۔  
"میرے پاس۔" اس نے جواب دیا "میں تو یہاں ہمارے کئی جاننے والے موجود ہیں لیکن میں نے صرف امیر کو تکلیف دی۔ وہ سمجھا رہا ہے اور ذرا تیزو طرار بھی۔ اس کی سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ وہ مجھے جیسے شاساؤں اور چرائے تعلق واردوں کا کام کرنے کی پوری پوری کوشش کرتی ہے۔ چرائے جانے والوں سے کبھی منہ نہیں پھیرتی۔ اس نے آپ کا ذکر کیا۔ بڑی تعریفیں کیں کہ آپ بڑی بالکل شخصیت ہیں۔ آپ کی رسائی بھی بہت اور تیک ہے اور آپ سینے میں ایک درد مند دل بھی رکھتے ہیں۔ اس کا کتنا تھا کہ اگر آپ نے چاہا تو پچھلے بجائے ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور مونا کا پتا چل جائے گا۔"

"خیر۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔ امیر نے شاید مجھے تمہارے سامنے کچھ زیادہ ہی معزاتی قسم کی شخصیت بنا کر پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شرانوں کا ایک جنگل ہے۔ دو چار نہیں بلکہ ان گنت بھول بھلیوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں اگر کوئی چھپنا چاہے اور وہ اوپر سے کچھ چالاک یا شاطر بھی ہو تو پھر شاید قسمت ہی آپ کو ذراہ اس سے ملوائے میں اور مجھ پیسے نہ جانے کتنے دوسرے لوگ جو کسی کا شران لگانے میں خاص طور پر ماہر ہیں۔ خود کی دن اسے ایک شخص کو تلاش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس لئے تم مجھ سے کسی معجزے کی توقع مت رکھنا۔"

ابھی نے گویا اس کی خوش قسمی دور کرنے کی کوشش کی "میرے خیال میں تو میری قیادت کا تم پولیس سے رجوع کر تیں۔ تم پولیس کے پاس کیوں نہیں گئیں؟"

"پولیس؟" اس نے حقوٹھکل کر یوں بھڑک سی نظروں سے بڑی طرف دیکھا گویا اس سوال سے اسے کافی صدمہ پہنچا ہو "یہ کسی کا معاملہ ہے افضل صاحب اور ہم عزت دار لوگ ہیں معلوم نہیں اندر سے کیا کہانی نکل آئے یا پولیس کا ہاتھ چ میں آجائے نہ بعد نہ جانے کیا کہانی بن جائے۔" اس نے جھرمھری سی لی مجھے مونا کے بارے میں بھی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں جو باتیں میں کہی جا سکتی ہیں۔ افضل صاحب! میں اس کے پاس جانے کا رسک نہیں لے سکتی۔ آپ کو کسی میری مدد



# سکس



محمود احمد مودی

ہوئے اسی دھیمے گیسے میں بولے۔ اس کے چہرے پر نہایت حریف سا جو گلابی رنگ چمک آیا تھا وہ ابھی برقرار تھا۔  
اس نے ذرا مستطابانہ انداز میں بولو دیا، پھر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ ایک بار پھر اسے کھول کر اس میں جھانکتے ہوئے، دوسرا دھڑکتا ہوا کارڈ اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ اس کی پتلی پتلی سفید اکھیں میں اب بھی ہلکا سا ارتعاش تھا جو نہ جانے کیوں اس کی شخصیت کے ساتھ جھلا تلک رہا تھا۔

”یہ وہ ایڈریس ہے جس پر میں مونا کو تلاش کرنے لگی تھی اور جس پر ہم اسے خط لکھتے رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔  
میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر شخص سرسری سی نظر ڈال کر پیچہ وٹ کے پیچے رکھ دیا۔ وہ اندرونِ شہر کے ایک پرانے علاقے کا ایڈریس تھا۔

”تو پھر آپ میری بہن کو تلاش کریں گے نا؟“ اس نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔  
”نہیں“ میں نے دے ٹوک لہجے میں جواب دیا۔ اس کی پچیل ہوئی سی آنکھیں کچھ اور پچیل گئیں۔ ایک بار پھر ان میں آنسو چھلکنے لگے۔

”کیوں؟“ اس نے زبردستی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔  
”اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں ہے۔“ میں نے ملا نکت سے جواب دیا ”یہ ذمہ کدو آبادی کا شہر ہے۔ اس کے گلی کوچوں میں نت نئے عذاب پل رہے ہیں۔ میں کہاں تسماری بہن کو ڈھونڈ پھروں گا۔ یہاں ہندو میں ہزار افراد پر مشتمل پولیس فورس تعینات ہے ان کے پاس وسائل اور اختیارات موجود ہیں انہیں اسی قسم کے کاموں کے لئے رکھا گیا ہے۔ تمہیں پولیس پاس جانا چاہئے۔“

”ہاں۔ جس طرح پولیس نے آج تک اپنے حقے کے دوسرے کام انجام دیے ہیں اسی طرح وہ میری بہن کو بھی تلاش کر دے گی۔“ وہ زبردستی لہجے میں بولے۔ آٹھ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے دھواں ہو گئے چشمہ آٹا کر اس نے بیڑہ رکھ دیا اور ایک بار پھر شوشہ زکاسا رالیا۔

”میں نے کہا نا کہ مجھے تسماری دہ کرنے سے انکار نہیں ہے۔ میں پولیس کو اوپر سے ٹیلی فون کرا دوں گا۔ وہ دو بجائے انداز میں تسماری بہن کو تلاش نہیں کرے گی اور نہ ہی کوئی انسپکٹر ملنے دے گی۔ اگر اس معاملے کو کریڈٹ سے کوئی انسپکٹر مل بھی گیا تو وہ اسے دبا دے گی۔ میں خود اس بات کا خیال رکھوں گا۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”بہن! جس آپ کی بہت مہربانی آپ اتنی بھی زحمت مت کیجئے“ وہ یکدم ہی گویا پٹ پڑی ”میں نے خواہ مخواہ ہی آپ کے

دراصل وہ تصویر اتنی خوب صورت تھی کہ اس پر سے فوری طور پر نظر ہٹانا ذرا مشکل کام تھا۔ عذرا کہہ چکی تھی کہ وہ تصویر اس کی بہن کی شخصیت کی کچھ عکاسی کرتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بعض تصویر ہی خوب صورت نہیں تھیں بلکہ اس کی بہن مونا کچھ ایک خوب صورت لڑکی تھی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے اپنی خوب صورتیوں کو نمایاں کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کی تھی۔ لہذا پوز کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھنے کے بعد دھڑکنے کا تصور ابست تیز ہوتا بھی لازمی تھا۔ اندازاً آٹھ لڑکیوں کو تصویر کھینچوانے کا شوق بھی کافی تھا۔

اس کے خوب صورت مجسمے مجسمے بال اس کے چہرے کے گرد ایک دلکش بالہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بخوبی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید یہ توڑی سی ایکٹنگ کا نتیجہ تھا۔ مجھے مجھے ہونٹ نیم دا تھے۔ صرف اس کے ہونٹوں میں عذرا کی مشابہت نظر آ رہی تھی اور کسی بھی چیز میں نہیں آ رہے تھے اس کی تصویر کو دیکھ کر ہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنی اڑان کی خواہش رکھنے والا پردہ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جن کے دل میں اگر کچھ ہو تو اس کی پچیل کے لئے وہ کچھ بھی کر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

سر سے پاؤں تک وہ دلکش خشب و فراز کا مجموعہ تھی اور اس میں ابنا کر کرنے کے معاملے میں اس کا انداز ایک شوگرل کا تھا۔ عذرا نے اپنا جو کمرہ لیں مقرر بتایا تھا اسے ذہن میں رکھتے ہوئے مونا کا تصویر کھینچوانے کا یہ انداز میرے لئے ذرا دلچسپ بھی تھا اور کچھ حیرت انگیز بھی۔ نچلے متوسط گھرانوں میں بھی بعض اوقات کیا کیا انقلابات جنم لیتے ہیں۔ وہ اس کی ٹائٹ نیلی جینز اور کچھ ایسے ہی پیلے بلاؤز میں تھی۔ جینز گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے تک تھی اور بلاؤز بھی اختصار کے معاملے میں اس سے پیچھے نہیں تھا۔

چہرے تک تصویر کو ایک ٹک دیکھتے رہنے کے بعد میں نے سر اٹھا کر گویا ایک نئے زاویے نظر سے عذرا کی طرف دیکھا اور بے اختیار چمک گیا یہ تسماری ہی بہن ہے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔ تھی بہن ہے؟

اس نے اسرہ رہی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹک لیا گویا یہ سوال اس کے لئے متوقع تھا۔ اس بار وہ بولی تو اس کے سبب میں کچھ ایسا غر کا حاضر حال نہیں تھا۔

”مجھے اور اسے دیکھنے کے بعد تقریباً ہر شخص کی سوال کرتا ہے۔“ وہ وہی گواہی بولی۔

”تعب تو میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں کیونکہ مجھے ایسے سوالات کرنا زیادہ پسند نہیں جو ہر شخص کرتا ہو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”مہربانی اس کا جواب اہمیت میں ہے۔“ وہ سر اٹھاتے

پاس آکر اپنا اور آپ کا وقت ضائع کیا۔  
 وہ یوں جھٹکے سے کرسی سے اٹھی کہ کرسی اٹ گئی۔ اس کے  
 انداز سے جہنمہ طاقت اور توانائی کی موجودگی کا اظہار ہوا تھا۔  
 مجھے توقع نہیں تھی کہ ایسی ڈھانچا سی لڑکی میں اتنی توانائی ہوگی لیکن  
 اس دنیا میں کسی کے بارے میں اس وقت تک یقین سے کچھ کہنا  
 بہت مشکل ہوتا ہے جب تک اسے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع  
 نہ ملے۔

آئو اس کی آنکھوں سے اب بھی دواں تھے لیکن اس نے  
 اب انہیں پوچھنے کی کوشش نہیں کی اور بیک کندھے پر لٹکا کر  
 جانے کے لئے تیزی سے مہم گئی۔

”سٹو“ میں نے غصہ سے اسے پکارا۔ وہ ایک جھٹکے سے ٹوک  
 گئی گویا کسی غیبی قوت نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہو۔

میں اٹھ کر میز کے گرد گھوم کر اس کے قریب پہنچا۔ اس نے  
 پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی  
 جھلکلاہٹ کے ساتھ اُمید کی چمک ابھری۔ میں نے اس کا چہرہ  
 اس کی طرف دیکھا تو ہونے کا یہی تم بہل بھولے ماری ہو۔

اس کی آنکھوں میں اُمید کی چمک فوراً ہی دم توڑ گئی۔ ایک  
 جھٹکے سے اس نے چہرہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور بیٹھی بیٹھی لیکن  
 غضب ناک سی آواز میں بولی ”امبر نے خزاہ خزاہ ہی آپ کی رُم  
 دلی اور چہرہ ہمدردی کے طوار بنا دے تھے مجھے پہلے ہی سمجھ جانا  
 چاہئے تھا جو آوی اتنا دولت مند ہو اس کے دل میں بھلا اتنا رحم اور  
 ہمدردی کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ کسی غریب عورت کی بیٹی۔ کسی غریب  
 اسکول ٹیچر کی بہن کو تلاش کرنے چل دے۔ امبر کے ساتھ اگر  
 آپ نے سہائی کا سلوک کیا ہو گا تو اس کی وجہ کچھ اور ہوگی۔“

وہ ہاتھ پٹختی کمرے سے نکل گئی۔ اس کا آخری جملہ مجھے  
 ناگوار لگتا تھا لیکن میں نے معافی پیش کرنے یا اس سے کوئی سخت  
 بات کہنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا اس وقت وہ جذباتیت  
 کا شکار تھی۔ غرت بجائے خود ایک معیت ہے لیکن غرت میں  
 اگر مزید کوئی معیت سرے آئے پڑے۔ خصوصاً جبکہ اس معیت کا  
 تعلق خونی اور جذباتی رشتوں سے ہو تو انسان بارود کی طرح ہلکا ہوتا  
 ہے۔ میں نے اسے دل کا غبار ڈالنے کا موقع ملا تھا۔ خود کچھ کہ کر  
 اسے مزید ہلنے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ شاید کوئی بحث چھڑماتی۔

حقیقت یہ تھی کہ میں اس کے کام آجاتا تھا لیکن میرے حالات  
 اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ریڈ زائٹ اور قاسم بجلی کے  
 سہانے نے مجھے کافی طویل عرصے تک الجھائے رکھا تھا۔ ابھی مجھے  
 اپنے ہی حالات کو درست کرنے کے لئے بڑا وقت درکار تھا۔ وہ  
 میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی اور میں جس حد تک اس کی  
 مدد کر سکتا تھا، اس نے غصے میں اسے بھی قبول نہیں کیا تھا۔

جذباتیت میں انسان اپنا طبع نقصان نہیں سوجاتا۔  
 میں لٹری سانس لے کر وہاں میز پر بیٹھا اور چند لمحوں تک  
 اس کرسی کو دیکھا رہا جسے وہ اُٹ گئی تھی۔ سہائی تصویر اور اس کے

ایڈریس کی جٹ بھی وہ میز پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ میں نے ان دونوں  
 چیزوں کو پھاڑ کر روٹی کی ٹوکری میں پھینکے کا ارادہ کیا مگر یہ سوچ کر  
 ایک دراز میں ڈال دیا کہ شاید وہاں اسے چاہئے اور یہ جان کر  
 اس کے جذبات کچھ اور ہلکا کر اُٹھیں کہ میں نے انہیں پھاڑ کر  
 روٹی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ اسے تو شاید وہ اپنے جذبات کی  
 دانستہ توہین سمجھتی۔

کالی در تک میں دوبارہ کام بھی شروع نہ کر سکا۔ بس یونہی بیٹھا  
 اس ٹوکری سے باہر دیکھتا رہا جس کے سامنے بندھ گئی تھیں ایک  
 راہداری تھی۔ یہ راہداری در حقیقت بالکل بند نہیں تھی۔ اس  
 میں ایک دروازہ تھا جو انٹرکنٹینٹل پلانٹ کی طرف کھلتا تھا لیکن  
 وہ دروازہ اسی کے رنگ کا تھا اور دروازہ کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔

مجھے اُمید تھی کہ امبر جلد ہی کمرے میں آئے گی اور شاید وہ  
 مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور کرے گی لیکن وہ کافی  
 دیر بعد آئی اور وہ بھی محض چند قائلین لیٹے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا  
 اور چہرے پر کمری سنجیدگی تھی۔ جذرا کی آمد سے پہلے میں نے اس  
 کے چہرے پر جو گفتگو دیکھی تھی وہ غالب ہو چکی تھی۔ ایسا معلوم  
 ہوتا تھا کہ وہ دوتے دوتے نہ رہ گئی تھی۔

قائلین جزل نمبر نے منگوائی تھیں۔ وہ انہیں اُٹھا کر خاموشی  
 سے واپس جانے لگی تو میں نے وہی آواز میں پوچھا ”جذرا چلی  
 گئی؟“

”جی سر!“ اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔  
 ”بہت غصے میں ہوگی؟“ میں نے اسے پوچھا۔  
 ”غصے میں تو نہیں تھی سر!“ وہ ابھٹکی سے بولی ”اُداس“ مایوس  
 اور دل گرفتہ ضرور تھی۔

”میں نے اسے پولیس کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں  
 اس کا مسئلہ پولیس کے ذریعے حل کر سکتا ہوں۔ اس میں خود میرا  
 ٹانگ اڑانا زیادہ ضروری نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے سر۔“ اس نے بتایا تھا۔ ”وہ پہلے ہی کی  
 طرح جینی بیٹی سی آواز میں بولی ”لیکن وہ اسے بہتر نہیں سمجھتی  
 ہوگی۔ اس کی اپنی کچھ مصیبتیں ہوں گی۔“

”تم مجھ سے تھا ہو؟“ میری نظر اس کے چہرے پر جمی ہوئی  
 تھی۔  
 ”نہیں سر!“ وہ گویا غرپ کر بولی۔ اس نے بے چارگی سے  
 میری طرف دیکھا میں بھلا آپ سے کیسے تھا ہو سکتی ہوں؟ مجھے کیا  
 حق ہے؟“

”نہیں“ تم چاہو تو تھا ہو سکتی ہو۔ تمہیں میری مجبوریوں اور  
 مصروفیات کا شاید صحیح اندازہ نہ ہو حالانکہ تم میری سیکڑی ہو۔ تم  
 میرے کراچی والے بزنس کے سوا شاید میرے بارے میں زیادہ  
 نہیں جانتیں۔“

”بے شک میں نہیں جانتی لیکن مجھے آپ کی مصروفیات اور  
 مجبوریوں کا اندازہ ہے سر! ہر انسان کی اپنی LIMITATIONS



سیکورٹی کارڈ تعینات تھا۔ معلوم نہیں اس بے چارے کا کیا بنا تھا۔ ان دوائی کارڈز کا تو واقعی کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ تربیت یافتہ قسم کے دہشت گرد تو انہیں مار کر ان کے ہتھیار بھی لے جاتے تھے مسئلہ یہ تھا کہ میرے خاص آدمی ہر جگہ ہڑتے داری نہیں سنبھال سکتے تھے۔

امبر کو جس شخص نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ کسی گوریلے سے کم نہیں تھا لیکن وہ دراصل صف سترا قسم کا گوریلا تھا۔ اس کے بال لمبے اور داڑھی سو لمبیں تھیں۔ سینئر جیکٹ میں تھا اور تھپے ہوئے جسم کا تھا۔ دیکھنے میں ہی کافی محظوظ اور سخت جان معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بھی داغیں ہاتھ میں گمن تھیں۔ صرف بائیں ہاتھ سے اس نے امبر کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔

میرے دائیں بائیں کھڑے ہونے والوں میں ایک تو بالکل نو عمر لڑکا تھا۔ وہ ان معاملات میں زیادہ گھاگ تو نہیں ہو سکتا تھا لیکن بہت پُر تنگنا معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں سٹاکا پیشہ در قاتلوں کی دلی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گمن تھاے ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جنہیں "زیگر" کہتے ہیں۔ کہا جاتا تھا۔ جو کوئی چلانے کا بہانہ دھونڈتے ہیں۔ کئی گروں میں نوجوانوں کے ہتھے کے ہتھے اسی حلقوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ تیسرا بالکل عجیب تھا اور یوں اس نے اپنے آپ کو زیادہ بد نما بنالیا تھا کیونکہ اس کا سر کچھ زیادہ ہی لیوڑا تھا۔ وہ بھی خاصا خوشخوار معلوم ہوتا تھا اور کسوتی جسم کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں۔ وہ کچھ ایسا کم عمر نہیں تھا۔

میں نے ان پر محض ایک نظر ڈال کر ان کا مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ وہ میری بے خبری کے لمحے میں اس تیزی سے کمرے میں وارد ہوئے تھے کہ میں میری ایک خاص درواز تک بھی ہاتھ نہیں لے جاسکا تھا جس میں میری گمن موجود تھی۔ جس وقت میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تھا اس وقت تک تاخیر ہو چکی تھی۔ اگر میں اس وقت گمن نکالنے کی کوشش کرتا تو وہ میرے لئے قاتل کے بجائے نقصان کا باعث ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے دوسرے ہی لمحے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

امبر کے حلق سے ٹھٹھکیا ہوا کئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے سہلے میں کہا "لڑکی کو چھوڑ دو۔ جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔"

گوریلا نما شخص جس نے امبر کو بالوں سے پکڑ کر قابو میں کیا ہوا تھا ان میں سینئر معلوم ہوتا تھا اور کان یقیناً اسی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا "دولت مند ہونے میں ایک یہ بھی بڑی خرابی ہے۔ انسان کو حکم چلانے کی بڑی عادت پڑ جاتی ہے۔" اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ یہ بات اس نے اپنے ساتھیوں سے کہی تھی لیکن ان کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ ان تینوں کی نظر مجھ

ہوئی ہیں اور پھر کام آپ کے شایان شان بھی نہیں ہے۔" میں "شایان شان" وغیرہ کے پکڑ میں بھی نہیں پڑا۔ میں نے اسی مقام و مرتبے کے ساتھ ایسا رد بھی دیکھا ہے کہ شاید ہمارے ہوش کے فٹ پاتھ پر بھاڑ دینے والے کو بھی میری حالت قابلِ رحم لگتی۔ میں نے لیدی ڈانکا کے ساتھ بیٹھ کر بھی ڈنر کھایا ہے اور میں کسی بھی ہستی کے زور کے گلے میں بائیں ڈال کر اس کی کچی کے بندھو پر بھی کھانا کھانے جاسکتا ہوں۔"

وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے۔ میں نے رولنگ چیز کے پٹے سے ٹپک ٹپک کر ایک طویل سانس لے کر مسئلہ کام جو "بات یہ ہے امبر فریڈ کہ مجھے اس معاملے میں کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ یہ شخص ایک لڑکی کی کشدگی کا معاملہ نہیں ہے۔"

چوتھریں ۱۹۹۰ امبر کی آنکھیں جرت سے ذرا کھیل گئیں۔ لیکن ہے اس کے سرے کیوں اور جا کر ملتے ہوں۔ کوئی راستان دور داستان کل آئے اور میں نے احوال خود کو زیادہ اگھاتا نہیں چاہتا۔

"منہمک ہے سراجے آپ مناسب سمجھیں۔" وہ مجھے مجھے سے انداز میں بولی اور قائلوں کے کر رخصت ہو گئی۔ میں کام میں مصروف ہو گیا۔ عذرا اور مرنے کے تصور کو میں نے ذہن سے جھٹکتے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ امبر کو جلد ہی دوبارہ میرے کمرے میں آنا پڑا۔ یا یوں کہتے کہ اسے لایا گیا!

میں شاید کام میں کچھ زیادہ ہی منہمک ہو گیا تھا اس لئے اپنے دو دروازے کے باہر ہر وقت کوئی گڑبڑ محسوس نہیں کر سکا۔ اگر کڑھٹھ اور ساؤنڈ پروف کمرے کے تے سے قاتلے سے کسی۔ لیکن مجھ جیسے شخص کے لئے ایک نقصان یہ تھا کہ بعض اوقات کوئی "ضروری" آواز ہر وقت آپ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

دو دروازہ یکدم ہی جھٹکے سے کھلا اور امبر گویا ایک سی دھتکے میں کمرے کے وسط میں پہنچ گئی گروہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے بال ایک شخص کی نظموں میں بکڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں کچھ دہشت سے۔ اور کچھ بال بچنے کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر کچھ نشانات بھی نظر آ رہے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے منہ پر گھونٹنے یا پھینچنے کی مارے گئے تھے۔

اس کے ساتھ صرف ایک شخص ہی امبر نہیں آیا تھا "دو اور بھی تھے۔ وہ بھی امبر کے تقریباً ساتھ ہی آئے جو طوفان کی طرح کمرے میں گئے تھے اور انہوں نے حمایت پڑھتی سے میری میز کے دائیں بائیں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی تھکنیں تھیں جنہیں وہ یقیناً اپنے لباسوں میں ہی چھپا کر امبر کے کمرے تک پہنچے ہوں گے میرے کمرے میں آنے کے لئے امبر کے کمرے سے گزرنا پڑا تھا۔ چھوٹی دو دروازے پر ایک دوائی قسم کا

انجامے میں دو ہندوں کے ساتھ بڑے سخت الفاظ بول جاتے ہیں۔ ہم سخت لفظوں کا سختی سے ہی حساب کتاب لیتے ہیں۔ وہ بہت عرصہ گھر کر۔ ایک ایک لفظ پر زور دے کر پھنکارنے کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ لاشعوری طور پر وہ ہمسایہ ملک کی نظروں سے کافی متاثر تھا۔

بہر حال وہ محض قلمی وطن نہیں تھا۔ ہمارے ہاں کے نئے، مجبور یا شریف لوگوں پر "ہاتھ صاف" کرنے کے بعد اس قسم کے لوگ بھی کافی خطرناک بد معاش بن جاتے ہیں۔ ہر طرح کا خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ وہ دیکھ کر صرف میری طرف رہا تھا لیکن کمرے کی دو سری چیزوں پر بھی اس کی نظر پڑی۔ اس نے کم عمر نوجوان کو اشارہ کیا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ اس کڑکی کے قریب تھا جس کے بلائینڈر اس وقت بٹے ہوئے تھے۔ اس کی نظر بدستور بچہ پر رہی اور اس کی گن کاٹھ بھی میری طرف رہا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈوری کھینچ کر بلائینڈر بند کر دیے۔ کافی حد تک روایتی بد معاش ہونے کے باوجود وہ بہر حال شاطر و چالاک تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ایک لمحے کے لئے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے کسی طرف ہاتھ بڑھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بڑی ہی سیز کے عقب میں رہا لوگ جیسے پڑیٹھا آدوی دیے بھی کچھ اچھی پوزیشن میں نہیں ہوا۔

گوریلانہ بد معاش بولا "بہت سی دولت کمانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ بہت عقل مند بہت چالاک بہت ہوشیار ہے۔ تم بھی یقیناً اپنے آپ کو بڑی خوب چیز سمجھتے ہو گے لیکن ہم نہیں جانتے آتے ہیں کہ تم اکیلے درجے کے گھامڑے بے وقوف اور اٹو کے پتھے ہو۔"

مجھے اپنی کنیاں جتنی عروس ہوئیں لیکن میں نے اپنی کھڑی ٹھنڈی رکھنے کی کوشش کی۔ ایسی بھجوریاں مجھ پر اکثر آتی رہتی تھیں جب چھوٹے لوگوں کو بڑی بڑی باتیں کہنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ "یہ اطلاع تم مجھے فون پر بھی دے سکتے تھے۔ میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا۔" میں نے پراسکون لیے میں کہا "مجھے تو اپنے بارے میں کسی کوئی دعویٰ ہی نہیں رہا۔"

"نہیں بابا۔ اہل فون پر مشکل باتیں کہاں سمجھ میں آتی ہیں۔ ہم خود تمہیں سمجھا کر جائیں گے اور بہت اچھی طرح سمجھا کر جائیں گے۔ ہمارا سمجھا ہوا سبق تم جلدی نہیں بھولو گے لیکن تم نے پوچھا نہیں کہ ہم تمہیں گھامڑے بے وقوف اور اٹو کا چٹا کیوں سمجھتے ہیں۔"

"یہ تم ہی خود ہی بتا دو تو تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔" میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ "تم اس لئے گھامڑے بے وقوف اور اٹو کے پتھے ہو کہ تم نے دھڑوا کر بین کو کلاش کرنے کی ہائی محرمی کی ہے۔" اس نے گرا گرا کر راز کی بات آخر تک مجھے بتائی دی۔

پر مرکوز تھی اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی میری طرف سے نظر نہیں ہٹا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ مجھے قزوالا نہیں سمجھ رہے تھے۔ پوری طرح خبردار اور چرکنا تھے۔

میں نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کے بغیر ایک بار پھر پہلے سے زیادہ سوجھ بوجھ میں کہا میں کہ رہا ہوں لڑکی کو چھوڑ دو۔ گھٹیا ترین بد معاش بھی عورتوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرتے۔ "چلو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔" گوریلانہ شخص کسی گوریلے ہی کے انداز میں مسکرایا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے امیر کو بڑی طرح دور وکیل دیا۔ امیر زوردار آواز کے ساتھ دیوار سے جا لگائی۔ دیوار پر آواز اس ایک مشہور مقصور کی پیشکش کیجے اچھی اور اس کے ساتھ ہی امیر بھی۔

وہ بہت زور سے دیوار سے کرائی تھی اور اس کے ساتھ رگڑ کھاتی ہوئی نیچے گر پڑی تھی۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ اسے یقیناً کافی چوٹ آئی ہوگی لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ وہ دیوار سے ہی ٹک لگائے دونوں ہاتھوں میں منہ چپا کر سسکیاں لینے لگی۔ گوریلانہ شخص نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس نے گویا پھرے کی پوری دور پھینک دی تھی۔

وہ اندازہ کیوں نہ کر والے نے کمرے میں ٹھٹھے ہی اپنے عقب میں بند کرتے وقت ہی منتقل کر دیا تھا۔ اس کے لئے صرف ایک کھٹکائی دبانے کا تھا اور اس کی ہلکی سی آواز میں کچا تھا۔

چند لمحے کے لئے کمرے کا منظر گویا ساکت ہو گیا۔ میں اور گوریلانہ شخص ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی پلک نہیں جھپکی۔ آخر میں نے ہی یہ سکوت توڑا اور ملاحت سے پوچھا "اب تم میں سے کوئی یہ بتانے کی تکلیف کرے گا کہ تم لوگ کیوں یہاں آئے ہو؟"

"ہم تو شاید نہ آتے۔ لیکن ہم کو آنا پڑا۔" گوریلانہ شخص الفاظ کو چپاتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف گھڑبھڑکی سی مسکراہٹ مستقل طور پر موجود تھی۔ یہ مسکراہٹ عام طور پر ان لوگوں کے چہروں پر موجود رہتی تھی جنہیں اپنے سامنے موجود ہر چیز بہت بڑی لگتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں یہ اثر موجود تھا جیسے اس کے دونوں سائیروں کی آنکھیں کچھ ایسا ہی پیغام دے رہی تھیں۔

"میں تو میں جانا چاہتا ہوں کہ کیوں آنا پڑا؟ کون سی تکلیف نہیں یہاں لائی ہے؟" میں نے اب بھی ملاحت سے پوچھا۔ "ہمارے ساتھ اس طرح بات مت کرو۔ پلارے سیٹھ صاحب! گوریلانہ شخص کی آنکھوں میں مسکائی بڑھ گئی "ہمارے سامنے بولا ہوا ایک ایک لفظ آدھی کو بہت متنازعہ آتا ہے۔ ابھی تم نے صرف دو پہلے ہیے کا حساب کتاب کرنا سیکھا ہوگا۔ لفظوں کا حساب کرنا کچھ مشکل ہے۔ آنا ہوا ہے۔ تمہارے لئے لوگ جانے لگے۔"

بندوبست لگا ہے۔ کوئی ہمارے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ کسی طرف سے کوئی خلغہ نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کم عمر نوجوان نے اپنا وزن ایک باؤں سے دوسرے پر منتقل کیا۔ وہ یقیناً اب بھی مضطرب تھا۔ ٹائیگر کی باتوں سے اسے یقیناً اطمینان نہیں ہوا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔ شاید احترام کا خفا تھا۔ ٹائیگر نے آنکھوں سے اس کی طرف خفیف سا اشار کیا اور

مجھے بتانے لگا "یہ بڑی بے چین مدح ہے۔ اسے ہر کام کی بڑی جلدی رہتی ہے۔ یہ ہر چیز تک شارٹ کٹ سے پہنچنا چاہتا ہے۔ بڑا آدمی بننے کے لئے بھی یہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ کچھوے کی رفتار سے نہیں چل سکتا تھا۔ اسی لئے آج یہ کالج یا کسی دفتر میں نظر آنے کے بجائے ہمارے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ اس کی جلد بازی کا یہ عالم ہے کہ اس کم عمری میں ہی سولہ گن کر چکا ہے۔ اس کی رفتار یکساں رہی تو ہماری عمر کو چھٹے تک پلاٹینم ہوئی کر چکا ہوگا۔"

وہ یقیناً مجھے مرعوب کرنے کے لئے یہ سب کچھ بتا رہا تھا۔ مرعوب تو خیر میں کیا ہوتا۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ مجھے سینئر بر معاش سے زیادہ اس جو تیز بر معاش کی طرف سے غلط رہنے کی ضرورت تھی۔ اس قسم کے اعصاب زدہ بر معاش جن کی انگلی ٹیگر پر کانپ رہی تھی اور جو اپنے سارے سے بھی خوف زدہ ہو کر گولی چلا دیتے تھے "اس لحاظ سے زیادہ خطرناک ہوتے تھے کہ بعض اوقات انہیں صحیح معنوں میں معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کو مار رہے ہیں تو کیوں مار رہے ہیں اور اس سے درحقیقت انہیں کیا فائدہ ہوگا؟ ان کے ہاتھ میں کون ہوتا ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کسی بندو کے ہاتھ میں گن ہوتا۔

بہر حال مجھے ان کی لاف زنی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک سوال پڑھ رہا تھا وہ میں اس سے پوچھتے بغیر نہ رہ سکا "تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے ہڈرا کی بہن کو تلاش کرنے کی ہائی بھری ہے؟"

"خود طے رائے۔" ٹائیگر نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں چونکا "کیا وہ تم کو لوں کے قبضے میں ہے؟" میرے دل میں اس لڑکی کے لئے ہوروں کی کچھ عجیب سی لہر اُبھری۔

"ہمیں اس چوبیا کو قبضے میں رکھ کر کیا کرنا تھا۔" ٹائیگر حقارت سے بولا "ہم نے اسے راستے سے اٹھایا تھا۔ جب وہ میاں سے واپس جا رہی تھی۔ ہم نے اس سے صرف اپنے مطلب کی بات معلوم کی اور اسے چھوڑ دیا پھر ہمیں اس آگے۔ اگر ہم اسے قبضے میں رکھتے تو اب تک شاید وہ صرف دہشت سے ہی مر چکی ہوتی۔"

معلوم نہیں ہڈرا نے کس بنا پر ان سے کہہ دیا تھا کہ میں نے مرنا کو تلاش کرنے کی ہائی بھری تھی؟ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس کے منہ سے خوف کے دالم میں غیر ارادی طور پر یہ نکل گیا ہو۔ یہ بھی

"دوسرا" اب مجھے سنہل کر بیٹھا ہوا۔ معلوم نہیں وہ کس بنا پر یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ہڈرا کی بہن کو تلاش کرنے کی ہائی بھری تھی۔ میں نے تو اس کام سے انکار کیا تھا لیکن فی الحال میں نے اس کا اعتراف ضروری نہ سمجھا اور طویل سانس لے کر کہا "تو تمہیں اس بات سے تکلیف پہنچی ہے؟" اس کی مسکراہٹ ڈراگمیری "ہمیں کیا تکلیف پہنچی تھی۔" اس کی ہنس تو صرف یہ ہوئی "ہم تو تکلیف پہنچانے والوں میں سے ہیں۔ ہم تو صرف یہ بتانے آئے ہیں کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"مجھ کو اب مجھے کسی بھی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تم سے پوچھ کر کرنا پڑے گا؟"

"ہاں" اس نے بڑے اختصار سے فیصلہ منایا۔ "کیوں؟" میں نے زری سے پوچھا۔ "کیونکہ تمہیں اس شہر میں رہنا ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "شہر کو کہہ دو بھی تو تمہیں اس شہر میں رہنے اور میاں سے اتنی دولت کمانے کا خراج ادا نہیں کرنا پڑا۔" میں "میں تمام قسم کے ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے تمام ٹیکسوں اور ان کی وصولی کرنے والوں کو ہی نہیں بلکہ ان کی ادا بھی کرنے والوں کو بھی چند موٹی موٹی گالیوں سے نوازا اور بولا "تمہیں ٹیکسوں کی نہیں خراج کی بات کرنا ہوں۔ تم تو مجھ سے زیادہ بڑے کھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کیا تمہیں ٹیکس اور خراج میں فرق معلوم نہیں؟"

کم عمر نوجوان اچانک ہی بولی اٹھا۔ وہ گورٹا نما شخص سے مخاطب تھا "ٹائیگر! یہ تم نے کس قسم کی باتیں شروع کر دیں۔ کیا پورا دن تمہیں گزرنے کا پروگرام ہے؟ اپنا کام کرو اور چلو۔"

نوجوان ان تینوں میں جو تیز تھا۔ میرا خیال تھا اسے کسی بھی معاملے میں ہولنے کی جرأت نہیں ہوتی ہوگی لیکن وہ نہ صرف بولا تھا بلکہ بہت سی واضح قسم کی بے زاری کے ساتھ بولا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود گن میں خفیف سا ارتعاش تھا لیکن اس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ خوف زدہ تو یقیناً نہیں تھا لیکن جلد از جلد کچھ کر کرنے کے لئے بے تاب ضرور تھا۔

اس کے بولنے سے مجھے معلوم ہوا کہ گورٹا نما شخص کو ٹائیگر کہہ کر گایا جاتا تھا۔ یہ اس کا نام تو نہیں ہو سکتا تھا۔ عزت ہی رہی ہوگی۔ بد معاشر میں اس قسم کی عریضی کالی مقبول تھی۔

ٹائیگر نے جو تیز نوجوان کی مداخلت کا بُرا نہیں منایا اور اس کی طرف دیکھ کر بغیر زری سے بولا "کام بھی ہو جائے گا چند اہم آئے ہیں تو کام کر کے ہی جائیں گے لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ سیٹھ صاحب سے دو بار باتیں کر لیٹے میں کیا حرج ہے۔ ایسے خدا ترس سیکھوں سے مدد روز ملاقات تو ہوا ہی ہوتی ہے۔ ہم اپنا کام اطمینان سے کر کے جائیں گے تمہیں تو معلوم ہی ہے باہر

مکن تھا کہ اس میں اس کی کوئی مصلحت رہی ہو۔

معلوم نہیں کیوں میں یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ میں نے سونا کو تلاش کرنے کی ہائی نہیں بھری تھی۔ مجھے یہ کہہ لیا محسوس ہوا جیسے میرا یہ کہنا ان بد معاشوں کے سامنے معافی پیش کرنے اور ان سے رحم طلب کرنے کے حروف ہو گا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

ٹائیکر نے قابل دلی دل میں فیصلہ کیا کہ باقی کافی ہو چکی تھی۔ اب کچھ ایکشن بھی ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اور قریب آ گئے۔ انہوں نے دائیں بائیں دونوں طرف سے میری کپڑیوں پر تھیں رکھ دیں۔

جو تیز بد معاش کے اعصاب کا ارتعاش میں گن کی ہال کے ذریعے بھی اپنی کپڑیوں پر محسوس کر سکتا تھا۔ صورت حال کچھ اور خراب ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے قریب آ جانے کی وجہ سے میں گویا میز کے عقب میں کچھ اور جھپ کر رہ گیا تھا۔

ٹائیکر نے اپنی گن پلٹ میں کچھ اس طرح اڑس لی کہ وقت ضرورت وہ پلک جھپکتے میں نکالی جاسکے۔ اس کے بعد اس نے میز سے سامان اٹھا کر نیچے پھینکا شروع کر دیا۔ ٹھیکریپ اس نے تالین پر زور سے چلا۔ اس کا دودھ جلا بلب بلب سے دھماکے سے پھٹ گیا۔

ایسی شہری کی جو چترس زیادہ ٹوس اور مضبوط نہیں تھیں انہیں اس نے ٹھکی میں لے لے کر پچکا دیا۔ بعض چترس ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اس دوران اس کی نظر کچھ پری بھی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف سے ہوشیار رہنے کے ساتھ ساتھ گویا مجھے اپنی طاقت کے مظاہرے سے بھی مرعوب کر رہا تھا۔

تینوں ٹھکی فون میٹ اس نے کیے بعد دیکرے جھٹکے سے کھینچ لئے اور ان کی ٹامرس توڑ ڈالیں۔ میٹ اس نے تالین پر پڑا ہے۔ دو ایک تالین بھی گھسا کر اس نے درمیان سے چھڑا کر دو دھڑکڑوں میں تقسیم کر کے ایک طرف پھینک دیں۔ میز اس نے بالکل خالی کر دی۔

اس دوران امبری سکیاں رنگ چکی تھیں اور وہ منہ پر ہاتھ رکھے خوف زدہ نظروں سے یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ ٹائیکر نے ایک بار پھر بولا شروع کر دیا تھا "اس چوہا کی گن اگر غائب ہو گئی تھی تو اسے اس پر مبر کر لیا جاتے تھا۔ اس شر میں بد زانہ کوئی نہ کوئی کم ہو آتی رہتا ہے۔ وہ الٹی پچی اس کی تلاش میں کچھ زیادہ ہی بھر آؤھر پھرتی رہی۔ پوری جاسوس بننے کی کوشش کر رہی تھی پھر تھمے پاس بھی چلی آئی اور تھماری بے وقوفی دیکھو کہ تم نے بھی اسے تلاش کرنے کی ہائی بھری۔ تم نے اتنی دولت کمانی ہے جتنی تیر اور شاطر آدمی ہو سکے دینا کے۔ ملک کے۔ اور خصوصاً اس شر کے حالات کا تھیں اچھی طرح پتا ہو گا کیا ان حالات میں پرانے حالات میں تاکہ اڑا ان کی شکل مٹی ہے؟"

جیسے لگا تھا۔ فون میری کپڑیوں میں گویا جمع ہو رہا تھا لیکن انہی کپڑیوں پر دو گھنٹیں بھی گئی ہوئی تھیں۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی تھی کہ بالقرض میں نے سونا کو تلاش کرنے کی ہائی بھی بھری تھی تو اس پر کس کو اتنی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟ یہ بد معاش یقیناً اپنے طور پر تو یہ کارروائی نہیں کر رہے تھے۔ یہ ضرور کسی کے حکم کے پابند تھے۔

ٹائیکر نے میز خالی کرنے کے بعد فائلنگ کیسٹ کا رخ کیا۔ حالانکہ اس کے لئے اسے زاویہ بد لانا پڑا پھر بھی وہ مجھ پر نظر رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا اور اس کے دونوں ساتھیوں کی قدرت بھری نظروں کا مرکز تو میں ہی تھا۔ انہیں نہ جانے کیا چیز یاد رکھے ہوئے تھی ورنہ شاید وہ دونوں اپنی اپنی تھیں میری کھوپڑی پر خالی کر دیتے ہوتے۔

ٹائیکر نے باری باری فائلنگ کیسٹ کے تمام خانے باہر نکال کر تالین برائٹ دیے اور ان میں موجود تمام فائلوں اور کٹاگ کارڈز وغیرہ کو ٹھکر کر مار کر جوتوں تلے پھیل کر اور سونو توڑ کر پھینکا خراب کر سکتا تھا گویا۔ بعض چیزوں کو اس نے چھڑا بھی دیا۔ تاہم وہ اتنا ہوشیار ضرور تھا کہ زیادہ چننا ہی ہو کر اس کام میں زیادہ نہیں اُلجھ رہا تھا۔ متنبہ نہیں ہو رہا تھا۔ صورت شاید ان کا مقصد مجھے صرف خوف زدہ مرعوب اور ڈیل کرنا تھا۔ یہ احساس دلانا تھا کہ وہ میرے ساتھ جو سلوک چاہتے کر سکتے تھے اور میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔

خوف زدہ اور مرعوب تو خیر میں نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس وقت اچھی خاصی ذلت ضرور محسوس کر رہا تھا۔ کچھ کر گزرنے کی کئی تدبیریں میرے ذہن میں آچکی تھیں لیکن میں انہیں مسترد کر چکا تھا۔ رسک بہت زیادہ تھا۔ جب تک بالکل ہی جان پر نہ بن آتی تب تک میں زیادہ رسک لیتا نہیں چاہتا تھا۔ امبری کی موجودگی نے بھی مجھے کچھ مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کرے میں گولیاں پھینکا شروع ہوئیں تو وہ ہو ٹھاکا بہت ہی نہ باری جائے۔

مجھے اب تک تو یہی تجربہ ہوا تھا کہ اس قسم کی صورت حال میں کم از کم کوئی ایک لمحہ ایسا ضرور آتا تھا جس سے فائدہ اٹھایا جائے تو بازی پلٹ بھی سکتی تھی لیکن آج کی چھٹیوں میں ایسا کوئی لمحہ ابھی تک نہیں آیا تھا حالانکہ میں سراپا آگہ بنا ہوا تھا۔ پتا ہر میری نظر ٹائیکر پر بھی ہوئی تھی اور میں گویا بے بسی اپنی جگہ بیٹھا جمل گڑھ رہا تھا لیکن دراصل میں غیر محسوس طور پر ہر فرد اور ہر ذریعے کو نظر میں رکھے ہوئے تھا۔

اتنا ضرور تھا کہ میرا ہاتھ اس دراز کے کالی قریب پہنچ چکا تھا۔ جس میں میری گن رکھی تھی۔ پتا ہر میرا ہاتھ پھٹنے پر نکلا ہوا تھا۔ ہاتھ دراز کے قریب پہنچ جانا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ دراز کا ٹھکانا اور گن کا میرے ہاتھ میں آنا گویا ایک طویل عمل تھا حالانکہ یہ دراز نیچے کی طرف سے کھینے کا ذرا سا ہلکا ڈالنے پر سامنے کی طرف

جانا تو پھر تاب کو ذرا سادہ کر بھی کھولا جا سکتا تھا۔  
ٹائگر نے پہلے تو اس کی تاب پکڑ کر کھینچی۔ جب وہ نہیں کھلی تو  
وہ غرا "اس کی جالی کہاں ہے؟"

"اس میں آلا نہیں ہے۔ دیسے ہی پھنس گئی ہوگی۔ اس میں  
کوئی ایسا چیز نہیں ہے جسے تاج کر کے تم اپنا شوق پورا کر سکو۔" اس  
نے اسے ہانپنے کی کوشش کی لیکن وہ لٹنے والا نہیں تھا۔

اس نے آنکھیں سکیڑ کر دروازہ کا جائزہ لیا۔ اس میں واقعی  
کبھی جالی کا سوراخ نہیں تھا لیکن وہ اس کا بیچھا چھوڑنے کے  
بجائے شاطراتانہ انداز میں مسکرایا "اوه۔۔۔ یہ تو خاص دروازہ ہے۔  
اس میں کوئی خاص چیز ہی ہوگی۔"

اس نے ہلکی سی ہتھپتھاپ کے ساتھ تاب پر ہتھیلی ماری اور  
دروازہ کھٹ سے باہر آگئی۔ اس میں میری سیاہ مگن رکھی یوں چمک  
رہی تھی جیسے چھوٹا سا کوئی سانپ کھنڈی مارے بیٹھا ہو۔

اس نے مگن آٹھالی اور محض ایک نظر اسے دیکھ کر اپنے  
مخصوص خیانت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "واہ۔۔۔!  
بہت عمدہ چیز ہے لیکن تم جیسے لوگوں کے پاس ایسی چیزوں کا کیا  
کام؟"

اس نے مگن اپنی جیب میں رکھ لی۔ میرا خون کھول رہا تھا لیکن  
بے بسی کا احساس بھی برقرار تھا۔ وہ تینوں میرے بہت ہی قریب تھے  
اور تینوں کی اگلیاں تریکروں پر تھیں۔ جبکہ ابھی کشادہ نہیں تھی۔  
میں میز کے صوب میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے صرف ایک لمحے کا انتظار  
تھا۔ کوئی ایک لمحہ جب ان کی توجہ مجھ پر سے ہٹ جائی۔ اوه۔۔۔  
ان کے اور میرے لئے فیصلہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔

ٹائگر میرے قریب سے ہٹ کر دوبارہ میز کے سامنے چلا گیا۔  
میرا خیال تھا کہ اب وہ جانے کے لئے پر تزلزلہ تھے۔ ان کا مقصد  
شاید صرف مجھے دھمکیاں دینا اور ذلت دینے کی کا احساس دلانا  
تھا۔ ٹائگر سامنے سے میز پر میری طرف جھپٹتے ہوئے سانپ کی طرح  
پھسکارا "میرا خیال ہے اب بھی تمہاری کچھ میں نہیں آیا ہو گا کہ  
یہ سب کس سلسلے میں تھا۔ کیونکہ تم ایک احمق انسان ہو۔ میرا  
خیال ہے تمہاری کچھ میں بات آسانی سے نہیں آئی ہوگی۔ اس  
لئے تمہیں اچھی طرح بتانا ہوں۔ تمہیں فرض کر لیتا چاہئے کہ تم  
اس چوبیس سے کبھی نہیں ملے جس کا نام ہڈرا ہے۔ تم نے اس کی  
جمن کتنی۔۔۔ بلکہ مونا نام کی بھی کبھی لڑکی کو تلاش کرنے کی ہالی نہیں  
بھری ہے۔ تمہیں اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کے بارے میں  
سوچنا چاہی نہیں ہے۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا کیا میرے آثارات کا جائزہ لے  
رہا ہو۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اسے میرے آثارات سے میری  
اندرونی کیفیت کا اندازہ نہ ہونے دے۔ اسے شاید میرے آثارات  
سے۔۔۔ یا پھر اپنی "کھار کوئی" سے کچھ تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے  
گویا کوئی "فائل پن" دینے کے لئے اپنا کبک بائیں ہاتھ سے میرا

سے کھینکے سے کھل جاتی تھی لیکن میرا مزید حرکت کرنا خطرے سے  
خالی نہیں تھا پھر کھٹکا ہوا اور میرا گن نکلا ایک الگ مرحلہ تھا۔  
اس دوران میرے دائیں بائیں کھڑے ہوئے موت کے فرشتوں کو  
صرف ٹیکر دبانے کی مصلحت درکار تھی۔ چنانچہ میں ساکت رہا۔  
آہم میرا انتظار ختم نہیں ہوا تھا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک کسی بھی طرف سے  
مداخلت کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ اگر باہر والے  
سیکرٹی گاڑو کو انہوں نے بے ہوش ہلاک یا قابو میں کر لیا تھا تب  
بھی کیا کسی اور کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا  
تھا؟ بے شک یہ آفس ایک طرف کو ہٹ کر ہوئی کہ ایک کونے  
میں تھا لیکن اس طرف بھی سر حال لوگوں کی آمدورفت تو رہتی تھی  
اور جب سے میں یہاں تھا تب سے تو میں نے اپنے سیکرٹری  
انجیلے داؤد چوہدری کو خاص طور پر مستعد رہنے کے لئے کہا ہوا تھا  
لیکن ایسا سلووم ہوا تھا کہ ان احتیاطوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

فائنک کینٹ میں موجود تمام چیزوں کی ایسی چھٹی کرنے کے  
بعد ٹائگر مسافروں والی کرسیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے جیب  
سے کھینکے وارہاؤ نکالا اور ان مسیحی قسم کی ٹیس کرسیوں کے کشن  
انتہائی پکڑتی سے پکڑی طرح چر کر رکھ دیے۔ صرف ایک نہیں "اس  
نے انہیں اُدھر اُدھر اکٹ بھی دیا۔

کمرے کا ایک حصہ چھوڑنے سے ڈرائنگ روم سے مشابہ تھا۔  
اس نے وہاں پہنچ کر پیش قیامت مصروف کا بھی کی حشر کیا۔ اس نے  
ان کے گونپے صفے چھڑچھاڑ ڈالے پھر اس نے وہاں سے  
مصروف مصروف کی پیش قیامت پیٹنگ آثار کر تالین پر اس طرح  
پٹھیں کہ ان کے پیش قیامت گئے پھر اس نے انہیں جوتوں سے اس  
طرح روند ڈالا کہ وہ سب ناکام ہو گئیں۔ میں ساکت بیٹھا یہ سب  
دیکھا رہا اور خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ یہ سارا حساب میرے دل میں  
جج ہو رہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اپنے مالی نقصان کی بہت پروا  
تھی بلکہ اس لئے کہ خود میرے ذہن میں میری ذلت کا احساس بڑھتا  
جا رہا تھا۔

ذرا ہی دیر میں میرا شاندار آفس کچہ ایسا منظر پیش کرنے لگا تھا  
جیسے وہاں کسی باگل یا جوتی کو خوب اچھی طرح اپنے دل کی حشر میں  
ٹکالنے کا موقع ملا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر ٹائگر میری میز کے گرد گھوم کر میرے  
قریب آگیا۔ مجھے نے ذرا پیچھے ہٹ کر اسے جگہ دی لیکن اس کی  
گن کی نال پر ستور میری کینٹی پر رکھی رہی۔ ٹائگر نے میری میز کی  
درازیں بھی تالین پر آٹ دیں اور ان کا سامان ٹھوکروں سے اُدھر  
اُدھر بکھیر دیا۔

پھر اس کی نظر خاص دروازہ پر پڑ گئی۔ وہ عام طریقے سے۔۔  
یعنی تاب پکڑ کھینچنے سے تو نہیں کھنکی تھی لیکن اسے کھولنا کچھ ایسا  
زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ اگر اسے نیچے سے دباؤ ڈال کر نہ کھولا



آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جنہیں اس نے ایک ایک گولی سے لٹا دیا تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ابھی مجھے جتیس میں جھار کھینے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے بھی سر ہست اصرار نہیں کیا۔ مجھے امیر کا خیال ہی تھا۔ کوئی مجھے معلوم تھا وہ گولیوں کی زد میں نہیں آئی تھی لیکن احتیاطاً اس کی خبر خیر لے لی جا چاہئے تھی۔ میں اس کی طرف مڑا تو دیکھا اس نے کم از کم یہ ٹھنڈی کی کمی کہ دیوار کی جڑیں دیوار سے چپک کر سیدھی لٹ گئی تھی اور ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔

میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ قرقر کا پ رہی تھی۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بھی گویا کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند سیکنڈ میں باڑی پلٹ چکی تھی۔ میں اسے نکل دیتے تھا۔

اچانک کلک کی جھلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میں نے احتیاطاً گھٹنوں کے مل کر تے ہوئے اس گمن کی طرف ہاتھ بڑھایا جو کم عرصہ جو ان کے ہاتھ سے گری تھی لیکن مجھے اس کو اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ اس وقت تک ایک چو دروازے کے عقب سے نمودار ہو چکا تھا۔ محتاط انداز میں کمرے میں جمائے والا وہ شخص ہوئی کاسیکورٹی اچھا سچ واؤڈ چوہدری تھا۔

اس کا مطلب تھا باہر کی صورت حال بھی قابو میں تھی۔ میں اُنکھ کھڑا ہوا۔ مگر وہ جو ان کی گمن اٹھانے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ کمرے کا سفر دیکھ کر واؤڈ چوہدری گویا مطمئن ہو کر اندر آئیں۔ اس کے ہاتھوں میں سیاہ ایم پی ٹی تھی۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد اور توانا کارڈ تھا لیکن وہ دروازے پر ہی جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی گمن تھی۔ اس پر سائینسٹ لگا ہوا تھا۔

وہ میرے سامنے پہنچ کر بڑی شرمندگی سے سر جھکا تے ہوئے بولا "آئی ایم سوری سر اچھے نتیجے میں پہنچے دیے ہو گئے۔ دراصل مجھے ذرا تاخیر سے اطلاع ملی کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ ان لوگوں نے باہر کمرے سے پکڑ لی گاڑ کو نہایت خاموشی سے خنجر مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کی جگہ اپنا آوی کھڑا کر دیا تھا۔"

"باہر والا گاڑ مر چکا ہے؟" میں نے اسٹاف کے ساتھ تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔" واؤڈ کے لیے میں بھی اسٹاف تھا اور اس کی جگہ ان پر محاشوں نے اپنے جس آدمی کو کھڑا کیا تھا وہ ہمارے ہاتھوں مر چکا ہے۔ دونوں کی لاشیں باہر پڑی ہیں۔"

"اگہ دانی گاڑ؟" میں نے اپنی براؤ لوک جینز پر ڈھیر ہوتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سر تقام لیا "پانچ ستائیس والے ہو گئے ہیں پانچ لاشیں۔" واؤڈ چوہدری نے یہ ہو کر خاک چلنے لگا۔ اس کا توجہ اترنے ہو جائے گا۔ جب یہ لاشیں یہاں سے اٹھیں گی اور کئی یا برسوں

تھا۔ مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ گولیاں کس طرف سے آئی تھیں۔ محکم کر اس طرف دیکھتے ہوئے میری دھڑکنیں بگڑے اور تیر ہو گئی تھیں۔

میں آہستہ سے گھوما تھا۔ آخر میری نظر اس کھڑکی پر جا پھری جس کے بلائینڈ چند لمبے پیلے کم عرصہ جو ان کے کرائے تھے اور باہر وہ جہاں اس طرف سے بے فکر ہو گئے تھے انہوں نے شاید صرف دیکھا تھا کہ یہ کھڑکی ایک بڑی گلی میں کھلی تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ آگے ان کے پیشنگ پلانٹ کی طرف سے ایک دروازہ اس گلی میں کھلا تھا۔

اس کے علاوہ یہ تو صرف دو تین افراد کو ہی معلوم تھا کہ یہ کھڑکی باہر سے ایک خاص ترکیب سے بلائینڈ سمیت دروازے کی طرح اندر کی طرف بھی کھل جاتی تھی۔ مجھے اب تک باہر یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی احتیاطی مجھ جیسے قوی کے بہت کام آتی تھی۔

کھڑکی دراز کی کھلی ہوئی تھی۔ اس سے ایک گمن اور سائینسٹ کی سیاہ ٹال جھانک رہی تھی۔ اس سے ذرا اوپر یا قوی ہو توں ستوں ناک اور غزالی آنکھوں کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔ جھانکتے والی کو پچھاننے کے لئے اس کا چہرے کا صرف اتنا سا حصہ پتلی سی ایک پتلی کی صورت میں نظر آتا ہی تھا لیکن اس کا وہاں سے جھانکنا میری سمجھ سے باہر تھا۔

وہ راج تھی۔

وہ ہو گئی میں سمجھتا تھا۔ چند دن پہلے ہی آئی تھی۔ بے شک وہ تمام اسٹاف سے خائف ہو چکی تھی اور بے اسے میری خاص دست کی حیثیت سے جان چکے تھے لیکن کم از کم میری معلومات کے مطابق وہ اس قسم کے رازداری سے تو ابھی واقف نہیں ہو سکی تھی کہ اگر کئی پیشنگ پلانٹ کا ایک دروازہ کس کھلا تھا اور میرے آگے کی کھڑکی کا پت اندر سے بند ہونے کے بعد وہ کس ترکیب سے بے تواتر طریقے سے اندر کی طرف کھلا تھا۔ میں کھڑکی میں کم از کم اس کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"مگر آج آج ہوا۔" میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

اس نے کھڑکی کا پت پورا کھولا اور کسی سبک انداز میں پتلی کی طرح کو کر اندر آ گئی۔ وہ اس وقت کوئلن ٹراؤڈر اور خاص گمن ڈسٹری ڈھال ہی موانہ شرت میں تھی جس پر بڑی بڑی کئی جیسے نظر آ رہی تھیں۔

"تم یہاں کہاں سے پہنچ گئے؟" فیئر ارادی طور پر میرے حلق سے جیسی جیسی سی آواز نکل رہی تھی۔

"مگر تم کوئی دوسری گمن کو پہنچ جایا کرتے ہیں۔" اس نے ہلکی سی مگر اسٹ کے ساتھ بے نیازی سے جواب دیا چہرہ اٹھانے گمن کے سائینسٹ پر چونک مارنے لگی۔ اس نے ان دو افراد کی طرف

کے اخباروں میں سرخیاں لگیں گی تو ہمارے مہمان کربہ چھوڑ  
چھوڑ کر بھاگتے لگیں گے۔ پرسوں تک یہ ہوئی تھی۔ ایک  
خوب صورت چمکا دکھنا تو منزلہ ماڈرن قبرستان نظر آنے لگے گا۔  
اس کے بارے میں تم نے کچھ سوچا؟

”ہیں سر“ اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا ”یہ چیز تو ہماری  
شریک میں شامل تھی کہ ہوئی کی سیکورٹی کا اس طرح خیال رکھا  
جائے کہ اس کے بزنس پر اثر نہ پڑے۔ اسی لئے تو ہم باہر سے  
نمائت خاموشی سے حملہ آور ہوئے۔ آفس سے نکلنے کے یہ دعویٰ  
راتے تھے۔ ہم نے دونوں کو رکھ لیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے  
پاس سائیکسٹر کی صرف دو ہی گنیں تھیں۔ اوپر سے ہمیں ذرا تاج  
محبہ مل گئیں۔ ہمیں جھگڑا نہیں دیکھ کر یہ بھی ہمارے ساتھ  
ہوئیں۔ میں نے جلدی جلدی انہیں بتایا کہ آپ کے آفس میں گزرو  
تھی۔ کچھ بدعاش گھس آئے تھے۔ یہ ضد کرنے لگیں کہ سائیکسٹر  
والی ایک گن انہیں دے دی جائے۔ مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔  
میں نے انہیں حق پر راستے سے ہٹا دیا اور خود سامنے سے آیا۔ ان کی  
طرف سے مجھے کچھ زیادہ اُمید نہیں تھی لیکن گتا ہے انہوں نے  
بھی ٹھیک ٹھاک کام دکھایا دیا۔ میں نے اندازاً انہیں چوبیس  
سجھادی تھی اور تمام ضروری باتیں بھی بتادی تھیں۔“

پھر اس نے طمانیت کی گہری سانس لی ”خدا کا شکر ہے سر  
آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ امیر صاحب بھی کافی حد تک ٹھیک سی  
نظر آ رہی ہیں۔“ امیر اس وقت میز کا سارا لے کھڑی تھی۔ اسے  
چھینا بہت سی چٹنیں مل گئیں لیکن شاید فی الحال اسے ان کا  
احساس نہیں تھا۔ اس کے ذہن پر سب سے زیادہ خوف کا قالب تھا  
مگر اس کا ہاتھ تھا کہ وہ دھیرے دھیرے سنبھل رہی تھی۔  
”وہ سب تو ٹھیک ہے دادو چوہدری۔ لیکن ہوئی کی سرچشمن  
کا کیا ہو گا؟“ میں نے تشویش سے کہا۔

”میرے خیال میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“ دادو  
چوہدری نے مجھے تسلی دی ”یہ آفس خاماچی بہت کرا ایک کوٹے  
میں ہے۔ آپ کا کمر ساؤنڈ پروف ہے۔ صرف ریجسٹر کے چند  
فائلوں کی آواز گونجی تھی۔ وہ بھی خود مجھے بہت ہلکی سناٹی دی تھی  
حالانکہ میں اس وقت آفس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ ہوئی میں اس  
وقت کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ صرف ہمیں اور چند دوسرے سیکورٹی  
گارڈز کو ہی پتا ہے کہ یہاں کچھ گزرا ہے۔ وہ اس وقت ہوئی کے  
چابوٹوں کو نوں پر اٹھ کھڑے ہیں لیکن گراچی میں اب قدم قدم پر  
کارڈز کا اٹھ کھڑے نظر آنا کوئی حیرت کی بات نہیں رہی۔“

”لیکن باجی لائیں“ میں کراہ کر رہ گیا۔  
”میں ہم رازداری سے انھوں کو سب کے سب اس سلسلے میں  
آپ کا اثر سوخ بھی کام آئے گا۔“ دادو چوہدری اطمینان سے  
بولے۔

زور تاج میرے قریب آگئی اور دو سروں کی موجودگی کی پروا کئے

بغیر کرسی کے بہتے پر بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے  
شفقت امیر حیرت سے بولی ”مفضل! تم تو واقعی بزنس میں ہو۔  
تمہیں اپنی اور اس لوڑ کی جان بچنے کی خوشی نہیں ہے بلکہ ہوئی  
کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ میں تو تمہیں ذرا مختلف قسم کا بزنس میں سمجھی  
تھی لیکن تمہیں تو کا دیوار اسی طرح جان سے زیادہ عزیز ہے جس  
طرح زیادہ تر کا دیواری لوگوں کو ہوتا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے پہلے سے زیادہ تکلیف کے عالم  
میں کراہ کر کہا ”تم۔ اور شاید بہت سے دوسرے لوگ بھی اس  
معاملے میں میرے مؤقف کو نہیں سمجھ سکیں گے مجھے ہوئی کی  
فکر اس کے منافع کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ اگر مجھے ایک پیسہ بھی  
منافع نہ دے تب بھی میں اسے چلا آ رہوں گا بشرطیکہ اس کی  
دقتیں۔ شان و شوکت اور لوگوں کی یہاں آمدورفت اسی طرح  
برقرار رہے۔ سوال دوپے پیسے کا نہیں ایسی بھروسے اور اعتماد کا  
ہے جو لوگ اس ہوئی اور اس کے نام پر کرتے ہیں۔ یہاں تمہارا  
کسمی اور دقتی دیکھ کر مجھے ایک عجیب طرح کی خوشی ہوتی ہے۔  
یہاں آنے والے لوگ معمولی بھی نہیں ہوتے۔ کسی نہ کسی اعتبار  
سے وہ اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہوتے ہیں اور میں ہوئی کا مالک  
ہونے کے ناتے سے لا شعوری طور پر اپنے آپ کو ان کے اعتماد اور  
بھروسے کا امین سمجھتا ہوں۔ اسی لئے میں نے یہاں بہت سے ایسے  
انتظامات کئے ہوئے ہیں جو بہت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یا محض  
نہیں ہوتے۔ میں اور میرے ساتھی اسے ایک ہوئی۔ یا محض  
ایک کاروباری راجیکٹ سمجھ کر نہیں چلاتے۔ بلکہ یہ گویا ہماری  
اتنا کا مسئلہ ہے۔ اگر یہاں اس قسم کے واقعات رونما ہونے لگیں تو  
لوگ کہنے پھوڑ پھوڑ کر بھاگتے لگیں اور آئندہ کے لئے ادھر کا  
رُخ کرنے سے قویہ کر لیں تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہو گا جیسے میں نے  
اپنے آپ کو ان کے احکام کا اعلیٰ ثابت نہیں کیا۔ بس یہ احساس  
میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ بات نفق نقصان کی نہیں ہے۔“

”اد۔ تو یہ بات ہے۔“ زور تاج ہونٹ سیڑھتے ہوئے بولی اور  
کرسی کے بہتے سے اٹھ کھڑی ہوئی ”میں تو میں سوچ رہی تھی کہ  
تمہارے بارے میں میرا اندازہ غلط کیسے ہو سکتا ہے۔“

میں ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اسے دادو چوہدری کی  
طرف پھیلانے لگی لیکن میں نے اس کے ہاتھ سے وہ لے لی اور کہا  
”تم یہ سمجھنا کہ تم یہاں آئی ہو نہیں تھیں۔ تم نے کچھ نہیں  
دیکھا۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ ہم خود ہی اس معاملے سے نمٹ  
لیں گے۔ میں تمہیں اس میں اگلا نہیں چاہتا۔“

وہ دنگل مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”میں تو تم رکھ لو لیکن  
تمہیں اس معاملے میں زیادہ تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔  
میں بھی اتنی مٹی گزری نہیں ہوں کہ اس قسم کے دو چار غیظوں کو  
نہانے کے بعد ان کے ساتھ میں سرسبز ہوں یا پولیس والوں سے نہ  
نمٹ سکوں۔ میرے لئے بھی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“



جواب دیا "لیکن کبھی کبھی میں دو سروں کی بھلائی کی خاطر مصلحت پسند بھی ہو جاتا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ ان بہنوں کو اس معاملے میں نہ کھیلنا جائے؟" میرا ہاتھ ریسور پر تھا لیکن ابھی میں نے اسے اٹھایا نہیں تھا۔

امبر نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اس طرح شاید اس کے سر میں دھک ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر قمام لیا اور ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند رکھنے کے بعد بولی "سرا مجھے ان دونوں بہنوں کی زندگی ویسے بھی تباہ ہوتی ہی دکھائی دے رہی ہے لیکن اگر ہم اسے تباہی سے بچانے کے لئے توڑی بہت کوشش کر سکتے ہیں تو ہمیں ضرور کر سکیں گے۔ اگر انہیں اس معاملے میں ملوث کئے بغیر کام چل سکتا ہے تو ہم ضرور کوشش کیجئے۔" اس کے لیے میں اپنی جگہ جی جی کی بنیاد پر غصہ غلوں پر تھی اور غلوں میں ہر حال ایک قابل قدر چیز تھی۔ وہ بھی پرائی تدبیر کی امین معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس سے اس کی سمجھ کی دوستی تھی تو وہ اسے ہر نقصان سے بچانے اور اس کی مدد کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کر رہی تھی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں کوشش کروں گا کہ اس معاملے میں ان کا نام نہ آئے اور اگر آئے بھی تو کوئی رسوائی ان کے حصے میں نہ آئے۔"

"جست شرک ہے سرا" امبر کی آواز جیسے حلق میں جھنسنے لگی۔ زرتاج مجھ ہی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے رحیم گل کے گھر کا نمبر لیا۔ اس کا بازو کافی حد تک ٹھیک ہو چکا تھا۔ وہ آرام سے چلنے پھرنے لگا تھا۔ گھر سے باہر بھی آنے جانے لگا تھا لیکن اس نے ذہنی جراثیم نہیں کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک پولیس آفیسر کو مکمل فٹ حالت میں ڈیوٹی پر بھجوا جائے۔ ایک نظر لگایا ہوا یا کر رہتا ہوا پولیس آفیسر غریبوں سے نیم نمٹ سکتا۔ اس پر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا "ہمارے ہاں تو اکثر اوقات ایک ڈکراتا ہوا جانا کتا پولیس آفیسر بھی مجرموں سے نہیں نمٹ پاتا۔ البتہ عام شہریوں سے خوب نمٹ لیتا ہے بلکہ ان کے لئے تو اس کا مکمل فٹ بھجنا کافی ہوتا ضروری نہیں۔"

اس پر رحیم گل مجھے صرف کھور کر رہ گیا تھا۔ دوسری طرف کھٹی جی تو ریسور رحیم گل نے ہی اٹھایا۔ حقہ دہی جٹوں کے ہاتھوں کے بعد میں نے کہا "تمہارے راج میں؟" غریبوں کے ساتھ یہ ہوا ہے کہ دن دواڑے چار چار بد معاش خرد ناک تمہیں لے کر قافیہ اٹار ہو جس میں میرے آنکس میں گھسے چا آ رہے ہیں۔ ساز و سامان توڑ پھوڑ کر پیچیدہ رہے ہیں۔ مجھ سب کو ڈکس کر رہے ہیں۔ لڑکیوں کو دھواؤں سے کھرا رہے ہیں ہمارے سیکرٹری گاڑو کو قتل کر رہے ہیں۔ اور تم آرام سے گھر بیٹھے ہو۔ کیا کافور ہے؟ ہمیں تمہاری دوستی؟"

اس نے جب "ہیلو" کہا تھا تو اس کے لیے سے چھٹکن عمار

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تم نے جتنا کھوایا وہی کافی ہے۔ اب ہمارا بھی کچھ اخلاقی فرض بننا ہے۔ یہ دوسرا سرم ہمارے لئے رہنے دو۔"

پھر میں نے امبر کے قریب پہنچ کر اس کا کندھا تھپتھپتے ہوئے کہا "تم آرام سے کاؤچ پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لئے ڈاکٹر کالواتا ہوں۔"

وہ اپنی کفنان اور پیشانی وغیرہ سلا رہی تھی۔ میری بات سن کر اس نے اٹھیں سلاتا بند کر دیا اور دیکھ کر انہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اس کی ضرورت نہیں سراج نہیں ہیں۔ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں کوئی بین کمرڈیو کھاناں کی۔"

"ایک تو تمہارے ہاں لوگوں کو اپنا علاج خود کرنے کا برا شوق ہے۔" میں نے زرتاج کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بعض لوگ اپنا علاج ڈاکٹروں سے بغیر خود کر لیتے ہیں۔" زرتاج بولی۔

امبر حوک نکل کر بولی "سرا مجھے اپنی چوڑوں یا اپنی تکلیف کی اپنی فکر نہیں ہے۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ یہ کیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ تو کوئی لمبا ہی چکر لگا ہے۔ انٹی وید وہ لری سے یہ لوگ آپ کے آنکس میں گھس آئے۔"

"شاید اس کی وجہ ان کی کم علمی بھی ہو۔" زرتاج اس کی بات سننے ہوئے ملا نمت سے بولی "شاید یہ بے چارے اھل کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتے ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

امبر جھرمجی سی لے کر بولی "مہر حال۔۔۔ یہ بات طے ہے مس زرتاج۔۔۔ کہ اس شر میں اب کوئی بھی کسی بھی جگہ محفوظ نہیں۔"

"جہاں بیک وقت اتنی بہت سی باتیں کام کر رہی ہوں۔ سرکاری اہل کا دوا میں سے اکثر کو مال بنانے کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور عام آدمی کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ وہاں تو حالات ایسے ہی ہوں گے ڈیر امبر! زرتاج کمری سانس لے کر بولی۔

"میری رنجیدہ اور دل چکن گفتگو سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" میں نے جلدی سے کہا "نی اللال ہمیں ان لاشوں کو اٹھوانے کی فکر کرنی چاہئے۔ میں ذرا رحیم گل کو فون کر کے دیکھتا ہوں۔ شاید وہ ان لاشوں کو رازدادی سے اٹھوانے میں ہماری کچھ مدد کر سکے ورنہ پھر مجھے ذرا اور بات کرنا پڑے گی۔"

"سرا" امبر ہٹکپاتے ہوئے بولی "کیا آپ رحیم گل صاحب کو یہ بھی بتائیں گے کہ یہ سب کچھ موتا کی گمشدگی کی وجہ سے ہوا؟ کیا اس میں عذرا کا ذکر بھی آئے گا؟" اس کے لیے میں ایک انجانا سا خوف تھا۔

"اصولاً تو مجھے ساری بات صحیح بتانی چاہئے۔" میں نے

تھی۔ شاید وہ "آرام" کرتے تھک گیا تھا لیکن میری بات سننے کے بعد شاید حکم اس کی محسن اور کالی کا نور ہو گئی۔ وہ تیزی سے بولا "تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟"

"میں سادگی پر کون نہ مرنے والے اے خدا!" میں نے لہجہ میں سانس لی "تم تو اس طرح بے یقینی سے پوچھ رہے ہو جیسے زندگی میں پہلی بار تمہیں اس قسم کے واقعے کی اطلاع مل رہی ہے۔ حالانکہ تمہیں انہی طرح مطمئن ہے ایک عرصے سے شر کے عمل کو جو میں بھی سمجھ رہا تھا۔"

میں شر کے حالات اور پولیس کی کارکردگی کے بارے میں آج کل اس پر جو بھی فکر کرتا تھا وہ زیادہ تر اسے نظر انداز کر جاتا تھا۔ مگر ان سنی کہتا تھا کہ یہ سنی کے خیال میں یہ بھی اکثر موضوعات کی طرح بحث طلب موضوع تھا اور بحث ایک لا حاصل کام تھا کیونکہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی دانست میں "پراسن پائے باسی" کا راستہ اختیار کیا تھا یعنی بحث سے پرہیز کرنا شروع کر دیا تھا۔

"تم مجھے فون کر رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے تم نے ان بد معاشوں پر قابو پایا ہے۔" اس نے خیال ظاہر کیا پھر ذرا تشویش سے پوچھا "ان کی حالت کیسی ہے؟"

"تم پولیس والوں کو بد معاشوں کی حالت کی کتنی فکر رہتی ہے۔ کبھی تم شر کا کی حالت کی بھی فکر کر لیا کر۔" میں نے کہا۔ میں اسے چھیننے کے کا کوئی موقع تھا سے جانے نہیں دیتا تھا۔

"ایک تو جیسوں جب بھی بڑا حق سوچتا ہے، بے موقع ہی سوچتا ہے۔" وہ جھلا کر بولا "میں صحیح طور پر صورت حال جانتا چاہتا ہوں۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ان کی حالت کیسی ہے؟"

"حالت ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ بس ذرا مرگئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد میں نے کہا "گلتا ہے تمہیں بہت حد تک پہنچا ہے کہ شر کا تصور اس کا صاف ہو گیا؟"

"وہ ایک بار پھر سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا "کیا چاہوں مر گئے ہیں؟"

"ہاں۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ چاہوں مر گئے ہیں۔ یہ تمہارے لئے کام ہے جو تم لوگوں کو کرنا چاہتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان شخصوں کے ہاتھوں تمہارا ایک سیکورٹی گارڈ مارا گیا۔ ایک شریف آدمی جو لوگوں کی جان و مال کی حفاظت پر اصرار تھا۔ ان خبیث مجرموں کے ہاتھوں مارا گیا جو نہ جانے کن کچھادوں سے اتنی تعداد میں نکل آئے ہیں۔" غیر ازادی طور پر میرے لیے میں تیزی آگئی۔

"سب تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے بات لیے میں پوچھا۔ "اگر میں لوگوں میں بڑی ہیں۔ تم ایک برس میں کن مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہو۔" شر ہے یہاں زیادہ ہنگامہ بنائیں ہو ورنہ اس

وقت ہو گئی خالی ہونا شروع ہو چکا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں جتنی خاموشی سے یہ مسئلہ نمٹ گیا۔ اتنی ہی خاموشی سے لاشیں اٹھائی جائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کمال ہے! اگر معاملہ اتنی ہی خاموشی سے نمٹ گیا ہے تو تمہیں لاشیں غائب کرانے یا اٹھوا کر کہیں اور بیٹھکانے کا خیال نہیں آیا؟" وہ پتھیرے لہجے میں بولا۔

"میں ایسا بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے یہ بہتر نہیں سمجھا۔"

میں نے صاف کوئی سے جواب دیا "میں چاہتا ہوں ان بد معاشوں کے سرسختوں کو بھی پتا چلے کہ میں نے خود ہی اس معاملے سے نمٹنے کے بعد اسے اندر ہی اندر دبائے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں کیا تو مکمل سامنے آتا ہے۔"

وہ خاموش رہا۔ شاید میری مصلحت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا توقف کے بعد میں نے کہا "اور کوئی تو مکمل سامنے آنے سے پہلے ہی اگر تم یہ پتا کر کے مجھے بتا سکو کہ ان بد معاشوں کے سرسخت کون ہیں۔ تو میں تمہارا مزید ممنون ہوگا۔ شاید اس سلسلے میں لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہ پڑے۔ تمہارے پاس وہ جو ایک ایس آئی ہے کیا نام ہے اس کا۔ وہ جو جرم پیشہ لوگوں کا انٹیلیجنڈا مطمئن ہوتا ہے؟"

"اکرم" اس نے اختصار سے جواب دیا۔

"ہاں شاید اکرم ہی ان کے حدود اور بعد سے واقف ہو ورنہ تم پولیس کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے مجھے بتاؤ۔ تمہاری بڑی نوازش ہوگی۔"

"پھر تم کیا کرنا گے؟" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں دریافت کیا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو یہی جزیل مانج کے لئے پوچھ رہا ہوں۔"

"میں تمہاری "جزیل مانج" سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جیسے مجرموں سے اپنے طور پر نمٹنے کا بدلا شوق ہے۔ اس وقت بھی یہی شوق تمہارے دل میں کھل رہا ہوگا۔"

"مجھے میں بھلا اتنی جرأت کہاں۔" میں نے عاجزی سے کہا "تم خواہ مخواہ میرے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ تمہارا حکم اتنی محبت سے اس قسم کے بد معاشوں اور دہشت گردوں کے لئے ماحول سازگار بناتا ہے۔ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے انہیں من مانیان کرنے کے مواقع دیتا ہے۔ میں بھلا ان کی راہوں میں روڑے اٹھانے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں؟"

"پھر دی جلی کئی باتیں شروع کر دیں۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"کیا کر دیں۔ تم دل کے زخموں کو چھین دیتے ہو۔" "جلی کئی باتیں کرتے وقت تم معصوم بننے کی اداکاری بھی کچھ

زیادہ ہی کرتے ہو۔ اتنی اوور ایکٹنگ مت کیا کرو۔" اس نے مشورہ دیا۔

ابھی تبیس فونز پر بھی میری اوور ایکٹنگ نظر آ رہی ہے؟ شاید میری لائسنس میں ہمارے فون ڈیوٹ فونز میں تبدیلی ہو گئے ہیں۔ چلو مبارک ہو۔ ہم نے ترقی کی طرف ایک اور قدم اٹھایا ہے۔"

"اچھا۔" فضول باتیں چھوڑو۔ تمہارے پاس لائسنس پڑی ہوں۔ تب بھی تم تک بک کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ بتاؤ تم نے اپنے بطور پر ان لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی؟"

رجیم کل بولا۔  
"اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ اس مقدمہ کے لئے میں نے اپنے وسائل استعمال کئے ہوں گے یا اپنے آدمیوں کو حرکت میں لا چکا ہوں گا۔ تو شاید تم بھول رہے ہو کہ یہ واقعہ چند منٹ پہلے کا ہے۔ ابھی مجھے اپنی "مشینری" کو حرکت میں لانے کا موقع نہیں ملا۔ ویسے بھی پہلے میں تمہارے گلے سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری طرف سے کوئی کارآمد اطلاع نہ مل سکی تو پھر اپنی مشینری کو بھی استعمال کر کے دیکھ لوں گا۔ اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ میں نے لائسنس کی تلاش کی ہے یا نہیں۔؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے ایسی جرات نہیں کی۔ میں نے جرم و سزا کی کانپوں دیکھو میں پڑھا ہے کہ پولیس کے آنے تک لائسنس کو نہیں چھیڑنا چاہئے۔ شہادتیں ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری اس مصیبت اور سعادت مندی پر قربان جانے کو جی چاہ رہا ہے اور وہ عمارت بھی یاد آ رہا ہے۔ فوسنوجے کے کھانے کی بج کو مل۔ معلوم نہیں کتنی لاشیں تم نے کہاں کہاں۔ کس کس حال میں چھوڑی ہوں گی۔ کس کس لاش کو کس طرح الٹ پلٹ کیا ہو گا اور اب ایسے مصیبت بن رہے ہو جیسے لائسنس سے واسطہ ہی نہ ملے گی۔ میں کوئی بار پڑا ہے اور وہ بھی شاید آسمان سے ٹپک پڑی ہیں۔"

"ایک تو تم پولیس والوں کا سب سے بڑا مشغلہ شرکا پر الزام لگانا ہے۔ تم مجھے کیوں ہلاکو خان ثابت کرنے پر تھے ہوئے ہو۔ میرے ہاتھوں زندگی میں اگر مرا بھی ہو گا تو کوئی درندہ ہی مرا ہو گا۔ انسان نہیں مرا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"چلو۔ خیر۔ میں تسلیم کر لیتا ہوں تمہارے تو پاؤں تلے آکر کوئی بیڑی نہ بھی نہیں مری ہوگی۔" وہ جلدی سے بولا۔ میں نے فی الحال یہ کٹا چاہ رہا تھا کہ تم کسی کے آنے سے پہلے ان لاشوں کی تلاش تو لے کر دیکھو۔ شاید کوئی ایسی چیز نکل آئے جس سے ان کی شناخت میں مدد ملے۔"

"تم اجازت دے رہے ہو تو میں ایسا کر لیتا ہوں۔ ورنہ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" میں نے آؤ تھوڑے ہیں پر ہاتھ رکھے بغیر واؤڈ چھوڑی سے کہا۔ "رجیم کل صاحب کہہ رہے ہیں لائسنس کی تلاشی لو۔"

واؤڈ چھوڑی ابھی تک کمن سنبھالے کچھ اس طرح مستعد کھڑا

تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی لاش اٹھ کھڑی ہوگی۔ میری بات سن کر اس نے کمن میز کے سارے کھڑکی کی اور کمرے میں پڑی تین لاشوں کے علاوہ ساڑھے کی راہ اوری میں میرے کمرے سے باہر پڑی لاش کی بھی نہایت مہارت سے تلاش کی۔ اس نے اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

چاروں بدمعاشوں کی جیبوں سے پھولی ہوئی علف چھریں بہن میں کھٹکے دار چاقو اور فاضل سیکڑیں بھی شامل تھے۔ برآمد ہوئے لیکن کوئی معمولی سی بھی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جس سے ان کی شناخت کی طرف کوئی اشارہ ہی مل سکا۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ ان کی جیبوں میں بڑے فونوں کی کئی گڈیاں بھی موجود تھیں۔ نوٹ پڑانے تھے اور گڈیاں پورے سو سو فونوں کی معلوم ہوتی تھیں۔ کیونکہ ان میں پیش بھی لگی ہوئی تھیں لیکن کسی بھی گڈی پر بینک کا رسید نہیں تھا۔ عین ممکن تھا ان پر سے رسید چاڑ کر بینک دینے گئے ہوں یا پھر یہ گڈیاں اس وقت براہ راست بینک سے نہ آ رہی ہوں۔ معلوم نہیں وہ ان لوگوں کی اپنی ملکیت تھیں یا بیارے میں "لگے ہاتھوں" وہ ایک آدھ ڈاکے سے بھی فاسق ہوتے آئے تھے۔ ان کی جیبوں میں مجموعی طور پر کم از کم پانچ لاکھ کی رقم تھی۔ اصلی زحالی بیکنوں چٹوٹوں وغیرہ کا صحیح معنوں میں قانہ انہوں نے ہی اٹھایا تھا۔ خوب لڈے پھندے تھے اور مہارت یہ تھی کہ اپنے بارے میں کوئی سُرائے نہ کر نہیں چلے تھے۔ مرنے کے بعد بھی کم از کم فی الحال تو بے نام و نشان ہی تھے۔

واؤڈ چھوڑی نے تمام چیزیں میز پر رکھ دیں تو میں نے فون پر رجیم کل سے کہا۔ "مبارک ہو ان کی جیبوں سے شناخت کی تو کوئی چیز نہیں نکلی لیکن تم پولیس والوں کی دلچسپی کی ایک خاص پڑی چیز نکلی ہے۔"

"کیا؟" اس نے بے اختیار جلدی سے پوچھا۔  
"تقریباً پانچ لاکھ کی رقم۔" میں نے جواب دیا۔ "جلدی سے بھاگ کر آ جاؤ۔ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے۔"

"اگر تم نے جلد بکواس کی تو میں تمہارے اثر رسوخ کی بنا کے بغیر پولیس پائلے کے آؤں گا اور تمہیں ان چاروں قاتلوں افراد کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لوں گا۔" وہ ٹھٹھے سے بولا۔  
"پولیس والوں سے دوستی کر کے بھلا انسان اور کیا امید رکھ سکتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم اس بات کی پروا نہیں کرو گے کہ یہ علاقہ تمہارے تھانے کی حدود میں آتا ہے۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب میں دوسرے قاتلے کا ہا تمہاری مدد کے لئے آسکتا ہوں تو اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" بولا۔

"بے شک بے شک۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ لیکن تو تمہارے قانہ کے کی بات کر رہا تھا۔ پانچ لاکھ روپے بہر حال

رقم ہے۔" مجھے معلوم تھا چند ہی دن پہلے اس نے اپنی تحویل میں آئے ہوئے ایک کونڈا لیت کے میرے نہ صرف سرکاری مالی خانے میں جمع کرائے تھے بلکہ ان کے لئے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالا تھا۔ وہ ان ٹالیاب قسم کے دانت دار پولیس افسروں میں سے تھا جو حقے کمانیوں کے کردار ادا کرتے ہیں لیکن اسے چھیننے میں لطف آتا تھا۔

”تم جیسے بڑے آدمی کے لئے یہ بڑی رقم ہوگی لیکن مجھ جیسے چھوٹے آدمی کے لئے یہ بہت چھوٹی رقم ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ اسے بھی پتا ہوتا تھا کہ میں کب اسے چھیڑ رہا ہوں لیکن شاید وہ اس پھینچ چھڑاؤ کو ”مُڑاڑا“ بنانے کے لئے جان بوجھ کر تنبیہ کی سے جواب دیتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی مصنوعی سنجیدگی میں بڑی عمدہ بات کی تھی۔ واقعی بعض زیادہ دولت مند لوگ جس رقم کی خاطر مرے جا رہے ہوتے ہیں، کسی فائدہ مست درویش کی نظر میں وہ بے وقت ہوتی ہے۔

ایڈیٹر ظاہر کیا۔  
 ”میں اسے ہضم نہیں کرنے دوں گا۔“ وہ اطمینان سے بولا  
 ”ہم سب چیزیں دایس ان کی جیبوں میں ڈال دو۔ میں متعلقہ لوگوں  
 ”مرا جب میں حالات کو نہایت سازگار سمجھ کر آرام سکون  
 سے بیٹھا ہوا ہوں تو اچانک کوئی مصیبت ٹپک پڑتی ہے۔“ واڈو  
 سر کھاتے ہوئے بولا۔

”ہاں... پچھی جب بے لگری سے اپنے آپ کو ذیلا چھوڑ کر رانا دکھانے لگتا ہے تبھی میاد کے جال میں پھنستا ہے۔“ میں نے آگے بڑھ کر خود زان کے لئے دواواڑہ کھولتے ہوئے کہا ”بہر حال تم لوگوں نے فکر بہت عمدہ طریقے سے صورت حال پر قابو پایا۔ یہ کارنامہ اگر کسی کانپز ایکشن سے بھی بہتر نہیں کہہ سکتا۔“

”اب الکی جی کیا جلدی ہے۔“ میں نے کہا ”وہ اُوڑ کر یں  
میں پہنچ رہا۔ اسے کچھ دقت لگے گا اور اگر اس بے چارے کو

معلوم ہو گیا کہ تم اس کا نام سن کر ہی اٹھ کر چل رہی ہو تو صدمہ کی شدت سے شاید وہ خود کشی کر لے۔

”ابن علی کوئی کسی کی وجہ سے خود کشی نہیں کرتا، افضل فیہ!“ ہم امیر کے کمرے کے سامنے والی راہداری میں پہنچے اس راہداری کے سرے پر شیشے کا دروازہ تھا۔ گاڑا اس دروازے سے باہر گری پر بیٹھا تھا لیکن اس وقت اس کی لاش راہداری میں دوڑ کر آئی۔ ہم نے اس کی طرف دھاوا کیا۔ اس نے ہاتھ اٹھائے اور کہا: ”کوئی، چھوٹ کام نہیں ہے۔“

وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے گویا کوئی خیال آیا۔ خود ہی دڑکے ہوئے پوٹی میں بلا تکلف پچھڑ رہی ہوں۔ میرا رگڑنا ضروری تو نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے اس نکل و دھارت کے سلسلے میں۔ اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تجربہ چاہو تو میں یہاں رک کر یہاں دے سکتی ہوں کہ بدیع معاش میرے باوجود اسے گھٹے میں دے دے۔“

”نیکوئی نہیں۔ اس معاملے کی وجہ سے ہمیں یہاں روکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے میں خود بخود نمٹ لوں گا۔ یہ اتنا زیادہ دیر تک خفیہ رکھنے کے لئے لاش کو اندر لاکر عین اس کے کمرے کے دروازے پر ڈالا تھا۔ گاڑ کے چائے کے برتن بھی اس کے قریب ہی لاکر پھینک دیے گئے تھے۔ اس کی گمن نہ جانے کہاں

تھی۔

آنے والے دوسرے سیکورٹی گارڈ نے نہ جانے کس طرح اس کی نظر میں آنے بغیر اسے خاموشی سے سائیڈتھرگی گن سے شوٹ کیا تھا۔ یہ ان کا چھوٹا سا کارنامہ تھا۔ بد معاشی جہاں خائے جیت پڑا تھا۔ گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھی لیکن اسے شاید اس سے کوئی چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک گولی اس کی گردن سے پار نکل گئی تھی۔ دوسری پیشانی میں بوسٹ ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ عجیب کر رہ گیا تھا اور اس پر اس سے بھی زیادہ خیانت نظر آنے لگی تھی جتنی شاید اس کی زندگی میں نظر آتی ہوگی۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ امبر کے چہرے اور پیشانی پر چونوں کے نشان نیلے پڑنے لگے تھے میں نے اس سے کہا ”تم اب چھٹی کرلو تو بہتر ہے گھر جا کر آرام کرو۔ جاتے جاتے رہتے میں ہوس کے ڈاکٹر سے ملتی جانا۔ جب طبیعت بہتر محسوس کرو تب آؤ آؤ۔“

”سہ! میں پولیس کے آنے تک رُک جاتی ہوں۔ شاید میری ضرورت پڑے۔“ وہ کمزوری آواز میں بول۔  
بات اس کی معقول تھی۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر ”جہاں تم اپنے اندر اتنی مت محسوس کر رہی ہو کہ پولیس کے آنے تک رُک سکو؟“

”کیوں نہیں سراسر میں تو اس سے بھی زیادہ دیر تک رُک سکتی ہوں۔“ وہ پہلے سے زیادہ ہمت و جرأت سے مسکرائی ”آپ مجھے اتنی کمزور لڑکی نہ سمجھیں سراسر میں نے زندگی میں خاصی مشکلات اور سختیاں برداشت کی ہیں۔“

”اچھا تو پھر دواؤں دہم میں جا کر ذرا فریض ہونے کی کوشش ہی کرو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”معذرت چاہتی ہوں سراسر میں یہ بھی نہیں کھوں گی۔ میں پولیس کے سامنے اسی حالت میں پیش ہوں گی۔ اسے لیا پوٹی کے ذریعے بہتر نہیں بنائوں گی۔ یہ زیادہ بہتر نہیں رہے گا سر؟“

”ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قسم کے حالات میں میں جن ”خصوصی“ انتظامات کے تحت پولیس کو بلواتا ہوں۔“

ان کا صرف ایک ہی قواعد ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ میں سب کچھ جاکجا بتاتا ہوں اور پولیس کو اس پر یقین کرنا ہوتا ہے۔ میں اپنے اثر و رسوخ سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا۔ میں تو پولیس کو صرف اس کے اپنے مطلب کی کوئی کمائی کھڑنے سے روکتا ہوں۔ آج کل انسان کو حقیقت کو صرف حقیقت کے طور پر پیش کرنے کے لئے بھی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے۔ تم اپنا ٹیلیفون کچھ ٹھیک کرلو تو

بھی کوئی حرج نہیں۔ بتااؤ۔ یہ جو کچھ ہوا ہے۔ جو تم محسوس کر رہے ہو اور جو تم پر ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے براہیچے آپ کی مرضی۔“ وہ اٹھ کر دواؤں دہم طرف جانے لگی۔

”سنو“ میں نے بیرارادی سے انداز میں اچانک ہی کہا۔

”میں صرف اس لمحے سے ڈر رہا تھا۔“ میں نے لاش کی طرف سے نظر اُٹاتے ہوئے کہا ”کسی بگناہ اور بے قصور کی لاش دیکھنا میرے لئے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ بڑی کٹھن آزمائش۔ میں جو اتنی دیر سے چمک رہا تھا۔ اب اس کر رہا تھا۔ درحقیقت میں اسی حقیقت کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر اس بے چارے کی لاش پڑی ہے۔“

میں نے اس کی لاش پر سے کڑی ہٹا کر امبر کے کمرے میں لے جا رکھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ذرا تاج اور داؤد چوہدری بھی لاش کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

”یہ غالباً کوئی عام سائیڈتھرگی گارڈ ہوگا؟“ میں نے داؤد چوہدری سے دریافت کیا۔

”میں سمجھتا ہوں! کسی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے۔“ داؤد ہنپکاتے ہوئے بولا ”یہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو کچھ خاص قسم کے محکموں میں سے جلدی رنڈا منٹ لے لیتے ہیں اور بعد میں گارڈ کے طور پر بھرتی ہو جاتے ہیں۔ اسلئے کے استعمال وغیرہ کے معاملے میں تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ رمانت دار ہوتے ہیں۔ اس شخص کا تو ریکارڈ بھی اچھا تھا۔ اس سے پہلے سیکورٹی کی کمپنیوں میں ملازم رہ چکا تھا۔ دو مرتبہ اس نے مقابلہ کر کے دو ڈاکوؤں کو چڑا۔ ایک مرتبہ مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہوا۔ کمپنیوں کی طرف سے اپنی خدمات کا خاطر خواہ صلہ ملنے پر دل برداشتہ ہو کر تارے پاس آ گیا تھا۔“

”قریبیت یافتہ دہشت گردوں اور چھپ کر حملہ کرنے والوں کے معاملے میں بہر حال یہ لوگ مار کھا جاتے ہیں۔ اور اس وقت تو ویسے ہی بے چارہ بیٹھا شاید چائے پی رہا تھا۔“ میرا دل واقعی تاسف سے دو چل گیا تھا ”ہم اس کے لواحقین کے لئے اسے واپس تو نہیں لایکتے لیکن تم ان کے لئے جو کچھ بھی ہو سکے ضرور کرنا۔ تم جو کچھ بھی تجویز کرو گے وہ مجھے لکھ کر دے دے“ میں اس پر آنکھیں بند کر کے ساٹن کر دھول گا۔

”اور اس وقت مجھے بھی یاد کر لینا۔“ زرتاج بولی ”میرے لاش بھی جو خدمت وہ بتاؤ۔ مجھے خوش ہوگی۔“

”بہت شکر ہے۔ بہت شکر ہے۔“ داؤد ہاتھ ملنے ہوئے بولا۔

زرتاج بیوی دواؤں کے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی ”تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ یہ چکر کیا تھا؟“

”الطیفینا سے ڈینہ کرتا دس گا۔“ میں نے کہا۔

”اوکے۔“ میں نے ہاتھ ملایا اور دواؤں سے نکل کر ہوٹل کی عمارت کے پہلو میں چلتی ہوئی آگے جا کر ڈرائیو کے کی طرف مڑ گئی۔ میں واپس ہوں۔ واپس میں ”میں نے اس بد معاش کی لاش کا جائزہ لیا جسے سیکورٹی گارڈ کو ٹھکانے لگانے کے بعد میرے کمرے کے دواؤں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ داؤد اور اس کے ساتھ

ذرا توقف سے بولی ”میں آنکر عذرا سے نوں پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور یہ خوش خبری اسے سنائی ہوگی۔ اگر رابطہ نہ ہو سکا تو پھر میں گھر جا کر اس سے بات کروں گی اور کل اسے ساتھ بھی لے آؤں گی۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

○☆☆○

مرنے والے بد معاشوں کے بارے میں فوری طور پر مجھے پولیس سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ رحیم گل کا ماتحت سب انسپکٹر اکرم بھی یعنی انداز میں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا البتہ اس نے یہ خیال ضرور ظاہر کیا کہ ان کا تعلق کسی خطرناک گروہ سے معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اگر وہ چاروں مارے گئے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ بات ختم ہو گئی تھی۔ ان کے پیچھے بھی شاید کچھ لوگ ہوں گے اور اگر وہ کوئی باقاعدہ منظم گروہ تھا تو پھر ان کا کوئی سردار بھی ہوگا اور وہ سردار نہ جانے کس قسم کی شخصیت ہو۔ آج کل کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کیسے کیسے لوگ کن کن گروہوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔

رحیم گل کے خیال میں ان لوگوں کی طرف سے کوئی رد عمل بھی سامنے آسکتا تھا اور اسی سے ان کا کوئی ٹرگر بھی مل سکتا تھا۔ رحیم گل نے مجھے پولیس کا تحفظ فراہم کرنے کی بھی پیشکش کی لیکن میں نے شک کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس کا غلصہ اپنی جگہ تھا لیکن میں دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ پولیس سے تو ایسی حفاظت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بھلا دو سروں کی حفاظت کیا کر سکتی تھی؟ البتہ ہر دور میں صاحبان اقتدار کی حفاظت کا فریضہ خاصی مستعدی سے انجام دیتی آئی تھی۔

داؤد چوہدری کو البتہ میں نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ سیکورٹی گارڈز کو پوری طرح الارٹ کر دے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے چار خاص آدمیوں کو بھی ہوشیار ہی میں تعینات کر دیا تھا۔ وہ ظاہر ہوئے ہی میں مقیم عام مسلمانوں کی طرح زور اور پھر پھرتے نظر آنے لگے تھے لیکن درحقیقت انہوں نے ہوش کے برعکس کی گہرائی شروع کر دی تھی۔

شام کو میں نے شفیع شاہ کو ساتھ لیا اور اس ایڈریس کے بارے میں ذرا تحقیقات ”کرنے کے ارادے سے“ خطا جھوڑا رانے مجھے دیا تھا اور بتایا تھا کہ مونا اس عمارت میں کرائے پر کرائے کر رہتی تھی اور اسی پتے پر گھر والوں سے اس کی خط و کتابت رہی تھی۔

وہ شر کے ایک پڑانے اور منجانب آباد علاقے کا ایڈریس تھا لیکن جب ہم اپنا پتہ کرتے ہوئے مشکل سے اس عمارت تک پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہ کچھ ایسی منجانب جگہ پر واقع نہیں تھی۔ سڑک نسبتاً کشادہ تھی اور اس کے ارد گرد واقع دو سری عمارتیں رہائشی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ وہ چھوٹے موٹے کارخانے معلوم ہوتے تھے اس عمارت کے بالکل ساتھ والی عمارت میں شاید برف کا

ٹرک گئی۔ ”یہ ذرا کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرے ہی پاس ٹھہری ہوئی تھی لیکن معلوم نہیں واپس مگر پہنچی ہوگی یا نہیں۔“ اس کی آواز میں خفیف سی لرزش آگئی ”یہ لوگ کمزور تھے تاکہ انہوں نے راستے میں اسے اٹھالیا تھا۔“ وہ اٹھالیا تھا لیکن چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اُمید ہے وہ مگر پہنچ گئی ہوگی یا پہنچنے والی ہوگی۔ تم دانش ور ام سے واپس آکر اپنے گھر نوں کے دیکھ لیٹا۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں سر؟“ امبر کے لیے میں ہلکا سا خوف تھا۔ جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خود ہی بولی ”آپ اس سے ناراض ہیں نا؟ آپ اس سے پوچھیں گے کہ اس نے بد معاشوں سے یہ کیوں کہا کہ آپ اس کی بسن کو تلاش کرنے کی ہائی بھرچکے ہیں جبکہ حقیقت میں آپ انکار کر چکے تھے؟ آپ کا فتنہ بھابھے سرا اس کا ذرا سا جھوٹ ہی اس ساری نقل و حرکت کی وجہ بنا ہے۔“ ”تم خود ہی سب کچھ مت فرض کئے باز۔“ میں نے ملامت سے کہا ”میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ میں تو اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے پہلے اس کی بسن کو تلاش کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب میں ضرور اسے تلاش کروں گا۔ میں چاہتا ہوں تم یہ بات اسے تادد اور کل اسے ساتھ لے کر آؤ۔ میں اس سے مزید کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

امبر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے کہتا چاہتی ہو ”سرا آپ واقعی عجیب آدمی ہیں۔ شاید آپ کچھ فیملی ہیں۔“ لیکن زبان سے اس نے یہ نہیں کہا۔ اس کا چہلا ہونٹ متورم ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر یقیناً دو تین گھونٹے مارے گئے تھے اور اسے جینے سے روکنے کے لئے شاید اس کی گردن گرفت میں رکھی گئی تھی۔ اس کی سرسری گردن پر انگلیوں کے نشانات نمودار ہو چکے تھے۔ صرف یہی نہیں اسے دیوار کے ساتھ بھی شیخ مارا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ بہت والی لڑکی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔

”اس طرح میری طرف مت دیکھو۔“ میں نے نرمی سے کہا ”میں خفیہ نہیں ہوں۔ پہلے میں نے اسے کوئی عام سامانہ سمجھ کر مونا کو تلاش کرنے سے انکار کیا تھا۔ میرے پاس لوگوں کے انتہائی نجی مسائل حل کرنے کے لئے واقعی وقت نہیں ہے لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کوئی خاص معاملہ ہے۔ لگتا ہے ان بہنوں کو کچھ مسئلوں میں ہد کی اشد ضرورت ہے۔ اس لئے میں مونا کو تلاش کرنے کی ہائی بھر رہا ہوں۔ میں اس معاملے میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا تھا لیکن میری ٹانگ پکڑ کر زبردستی اس معاملے میں آزادی گئی ہے۔ اب تو مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے سرا۔“ امبر نے سنبھل کر کہہ دیا ”اُنکائے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گئی۔ بائیں کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ

کارخانہ تھا۔

معلوم ہوتی تھیں۔

”کیا ہے؟“ اس نے کات کھانے والے لمبے میں پوچھا۔ وہ ہمارے معززانہ ٹھیلوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی آواز میں بھی غماری کی جگہ ی لڑکھٹا ہٹ تھی۔

”ہمیں میڈم بلیس سے ملنا ہے۔“ میں نے استعفیٰ شائستگی سے کہا۔ عذر دے کر مجھے بتایا تھا کہ مرثیٰ مکان مانکن کا نام بلیس تھا۔ میڈم کا افسانہ میں نے خود کر لیا تھا کہ عذر دے اس کا جس قسم کا نقشہ کھینچا تھا اس کے بعد اسے میڈم کہنے کے لئے مجھے دل پر کچھ جبر کرنا پڑا تھا لیکن مصلحت کی خاطر یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

”کیا تمہیں پتا نہیں ہے وہ آج کل کسی سے نہیں ملتیں؟“ اس نے غشی سی نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے کھورے لمبے میں کہا۔

”میں مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں بہت عرصے بعد آیا ہوں۔“ میں نے بدستور ملاحت سے کہا۔

”اس سے پہلے کب آئے تھے؟ میں نے تو تمہیں پہلے بھی نہیں دیکھا۔“ اس کا لہجہ کچھ استہزائیہ سا ہو گیا۔

شاید وہ طویل عرصے سے وہاں تھا اور نئے پڑانے بھی آئے جانے والوں کو انہی طرح پہچانتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے ساتھ کھس بات چیت سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے اچانک ہی دروازے پر کندھے سے ایک زبردوار گھر رسید کی۔

مجھے معلوم تھا عام سی خانہ نشینی کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہوتی تھیں۔ میری فکر سے نہ صرف زنجیر ٹوٹی بلکہ دروازہ بھی بہت زور سے اس شخص سے ٹکرایا۔ ادھر وہ پیچھے کیس غائب ہوا اور میں اور شفیع شاہ اندر پہنچ گئے۔

دروازہ میں نے اسی پھرتی سے اپنے عتبہ میں بند کر دیا۔ وہ کمرائیں، عمارت کا ایک زور دھمی فٹا ہوا تھا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا وہ دروازے کی ٹکر سے ایک دیوار کے قریب جا کر اٹھا لیکن وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔

دوسری دیوار کے قریب ایک کونے میں ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ایک کلا شگوف تھا۔ ہونے تھا جس کا رخ ہماری طرف تھا۔ اگر وہ فوری طور پر رست مار دیتا تو شاید ہم اپنی تمام تر ہوشیاری، پھرتی اور عمارت کے بارود گولیوں کی دھماکا آجاتے کیونکہ وہ ایک تنگ زور دھمی تھی۔ وہاں ادھر ادھر ہونے کے لئے زیادہ جگہ نہیں تھی۔

معلوم نہیں یہ اس کی غلطی تھی یا ہماری خوش قسمتی کہ اس نے فوری طور پر ٹکر نہیں دیا بلکہ چلا کے ہمیں خبردار کرنے کی کوشش کی ”معلوم۔ دروست۔“ آواز سے وہ کچھ دُور معلوم ہونا تھا۔

”ورنہ“ سے آگے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ شفیع

راستے میں کئی جگہ مجھے دوکانوں یا مکانوں کے باہر ”نظروں“ پر کچھ لڑکے بیٹھے نظر آئے تھے۔ انہوں نے بڑی عجیب سی نظروں سے ہماری گاڑی کا جائزہ لیا تھا۔ زانہ اور ماحول واقعی بڑی تیزی سے تبدیل ہوا تھا۔ پہلے بھی اس قسم کے علاقوں میں کوئی شاہکار گاڑی داخل ہوتی تھی تو اسے رکھ، تجسس یا زیادہ سے زیادہ ایک مبہم سے تجسس کے ساتھ دیکھا جاتا تھا کہ ایسی گاڑی علاقے میں کیوں آئی ہے؟ اب نظرس ایسی گاڑی کی طرف اٹھتی تھیں تو ان میں واضح طور پر ایک فرت، ایک دھمکی، ایک عجیب سی ہموک اور حسد ہوتا تھا۔ ان نظروں کے پیچھے پھلا خیال شاید ہی کھلا رہا ہوتا تھا کہ کیوں نہ اس گاڑی کو چھن لیا جائے۔

میں نے گاڑی ایک محفوظ سے گوشے میں ٹھکانی اور اترنے سے پہلے ہم نے اس عمارت کا جائزہ لیا۔ تین حوالہ و عمارت زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی اور کچھ عرصہ پہلے تک پچھٹا کافی پیسہ دہی ہوئی لیکن کافی لاگت کے ساتھ اس کی مرمت وغیرہ کر کے اسے کافی حد تک بہتر بنایا گیا تھا اور شاید شکل بھی خاصی تبدیل کر لی گئی تھی۔ اس کا دروازہ ٹکڑی کا تھا اور کافی مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ عمارت کچھ دیر ان دیر ان سی نظر آ رہی تھی لیکن وہ چونکہ چاروں طرف سے کچھ بند بند ہی تھی اس لئے اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔

آخر میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں گاڑی سے اتر آئے شفیع شاہ اپنے لمبے اور ڈھیلے ڈھالے ذلل کوٹ کی آڑ میں ایک لمبی کئی چھپائے ہوئے تھا۔ میں بھی مسلح تھا لیکن میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ اور گرد کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس عمارت کے سامنے ایک غار ش زدہ کتا اور کچھ اسی قبیل کی ایک کتا کندھے سے کتہا جاڑے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں نے پہلی بار کسی کتے کو کتا کو اتنے قریب ہونے کے باوجود اتنے امن و سکون سے بیٹھ دیکھا تھا۔ شاید انہیں ساتھ رہنے کا کافی عرصہ ہو گیا تھا یا پھر اس وقت انہوں نے اپنے آریک مستقبل پر غور و فکر کرنے کے لئے کچھ سلت نکالی تھی۔

ہمیں قریب آتے دیکھ کر وہ دونوں اٹھ کر کاپلی آئیز سے انداز میں ایک طرف کو چل دیے۔ انہوں نے ہموکتے کا بھی تکلف نہیں کیا۔ بہت کم کو معلوم ہوتے تھے میں نے آگے بڑھ کر کال بیل بجائی۔ شفیع شاہ ذرا اس طرح ترجہا ہو کر کھڑا ہو گیا کہ اندر سے جھانکنے والے کو اس کے پاس گھن کی موجودگی کا شبہ نہ ہو۔

دوسری سمت میں بیل بجانے پر دروازہ کھولا سا بھلا۔ اس کے پیچھے خانہ نشینی زنجیر لگی ہوئی تھی۔ دروازے کے عتبہ سے جھانکنے والا چہرہ خاصا خوشخوار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی رنگت تانے کی سی تھی۔ اس چہرے پر باقاعدہ داڑھی موچیں نہیں تھیں لیکن شیڈ کی دونوں کی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں کچھ چمکی چمکی سی تھیں۔ غور

شاہ کی لات تیزی سے ہوا میں گھومی تھی۔ لات شاید اس کی کپٹی پر پڑی تھی۔ میں سمجھ کر طور پر اس کا نتیجہ نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں اس دوران دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہو چکا تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔

وہ فرش سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے نیچے سے ٹٹی نکال چکا تھا لیکن اسے میں نے فائر کرنے کی سہولت نہیں دی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھکر کر سید کی ٹٹی پر شاید وہ ابھی صحیح طور پر گرفت بھی مضبوط نہیں کر پایا تھا اس لئے وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے کہاں جاگرا۔ دروازے اور دیوار سے ٹکرانے کے باعث شاید اس کے حواس بھی خراب تھے۔ وہ کچھ اس طرح اٹھ رہا تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔

تاہم وہ کافی محظوظ دکھائی دے رہا تھا اس لئے میں نے اسے سنبھالنے کا موقع دیے بغیر اس کی کپٹی پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ گھونسا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی زوردار ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر اچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور دیواریں ڈھیر ہو گئیں۔

وہ بدادب نہیں اٹھا۔ مجھے اس کے اتنی جلدی ڈھیر ہونے کی امید نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا غمور ہونا بھی تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو شیخ شاہ گھن لئے کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ خنجر تھا کہ کسی طرف سے کوئی اور نمودار ہو تو وہ اس کا بھی بعددست کر دے۔

اس کی لات جس شخص کی کپٹی پر پڑی تھی وہ اوپر سے منہ پر ہوا تھا۔ اس کی کلاخونف پانی کی موڑ کے پاس پڑی تھی۔ اس کے لیے شاید ایک لگ بھگ کافی ثابت ہوئی تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ "تمہیں نے تو بے ہوش ہوئے میں کافی بھڑکتی دکھائی۔" میں نے قدرے مایوسی سے کہا "ان سے تو اب کچھ ہو چکا بھی نہیں جا سکتا۔"

"میںاں بیٹیاں اور لوگ بھی موجود ہوں گے سرائے شیخ شاہ کی بے چھن نظریں ہر کونے کھدوے کا جائزہ لے رہی تھیں "خاصی بی بی عمارت ہے۔"

امدوسے وہ پرائی طرز کے مکان جیسی ہی تھی۔ ڈیوڑھی سے چھری میز میاں اوپر جاری تھیں۔ میز میوں کے نیچے پانی کی موڑ اور میزوں کے نیچے ہوتے تھے۔ ڈیوڑھی سے آگے دونوں طرف دروازے کھولنے کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ وہ چاروں دروازے بند تھے عمارت میں تاریکی اور سلیمن تھی۔ دن میں بھی ڈیوڑھی اور راپاڑی میں بلب بٹے ہوئے تھے۔

تھوڑی بہت اٹھا پٹ تو ہوئی تھی لیکن نیچے کہیں سے کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی لیکن اسی لمحے میں اوپر سے ایک گھب سی آواز سنائی دی "کیا ہو رہا ہے۔ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ کون ہے؟ حاضر خانہ۔" کوئی آیا ہے؟" تو آواز سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ بولنے والا مولا تھا یا عورت؟

اس آواز میں بیک وقت کئی مختار خصوصیات تھیں۔ کراختی بھی تھی اور شگفتہ بھی۔ خوف بھی تھا اور رعب بھی۔ اس کے علاوہ وہ آواز خسار سے بھی بوجھل تھی۔

"حاضر خان! کون آیا ہے؟" اس بار آواز گویا دوزخ سے آئی۔ وہ گویا کسی نپ ریکاڈ سے ابھرنے والی اور ہوا کے دوش پر آنے والی آواز تھی۔ کبھی ہر دم ہو جاتی تھی "کبھی تیز۔ وہ اپنا سوال دہرائے جاری تھی جیسے نپ ریکاڈ میں نپ پھنس گئی ہو۔

بے ہوش ہونے والے دونوں افراد میں سے نہ جانے کون حاضر خان تھا۔ فی الحال تو دونوں ہی "غائب" خان بنے ہوئے تھے اور جو اب رہنے سے قاصر تھے۔ میں اور شیخ شاہ مستعد کھڑے رہے کہ شاید کوئی دریاخت حال کے لئے آئے۔ میں بھی گھن نکال چکا تھا۔ میرا رخ ٹیلی منزل کے کمروں کی طرف تھا۔ جبکہ شیخ شاہ گھن کا رخ میز میوں کی طرف تھے "دیواری اوٹ میں کھڑا تھا۔

نیچے یا اوپر؟ کہیں سے بھی کوئی آواز دکھائی نہیں دی۔ نیچے والے کمروں میں سے کسی کا دروازہ بھی نہیں کھلا۔ یہ رد عمل ہمارے لئے ذرا حیرت کا باعث تھا۔ سوال کرنے والی آواز بھی آخر کار خاموش ہو گئی۔ ہم خنجر رہے کہ شاید وہ سوال کرنے والا آیا والی خود آواز کر نیچے آئے لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔

آخر میں نے شیخ شاہ کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی جگہ ہی جم جائے اور میز میوں پر ہی نظر رکھے جبکہ میں خود ڈیوڑھی عبور کر کے راپاڑی میں چلا گیا۔ دیوار سے چپک کر اور گھن ہاتھ میں سیدھی رکھتے ہوئے میں نے انتہائی محتاط انداز میں نیچے دروازے کا پتھل سمجھایا۔ وہ غیر منتظر تھا۔ میں نے دروازہ یکدم کھول دیا۔ کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔

میں نے کمرے میں جھانکا۔ کمر خالی تھا۔ وہ کچھ ایسا ہی کمر تھا جیسا کسی ستے سے ہوئی کا ہو سکتا تھا۔ معمولی اور مختصر سے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہر چیز نہایت سستی قسم کی تھی اور کافی پرانی تھی۔ دروازے سے بھی کبھی میاں نہیں تھی۔

کمرے سے ملحقہ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ ہاتھ روم بھی خالی نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسی طرح یکے بعد دیگرے چاروں کمروں میں جھانکا۔ سب کمرے تقریباً ایک جیسے تھے اور سب خالی تھے۔ راپاڑی میں ایک کونے میں کھلی جگہ میں ہی چند شامٹ وغیرہ لگا کر ایک کچن بنایا گیا تھا جو شاید کمروں میں رہنے والوں کے مشترکہ استعمال کے لئے تھا لیکن کمروں میں رہنے والے اس وقت نہ جانے کہاں تھے۔ کمروں میں کسی کا سامان بھی نظر نہیں آیا تھا۔ کمروں کی حالت بتاتی تھی کہ وہ کافی دنوں سے خالی تھے۔ لیکن شاید اب بھی کسی کے استعمال میں تھا مگر اس کی حالت عبرت ناک تھی۔ ہر چیز پر چمک جما ہوا تھا۔ سنے ہوئے برتن اور دھڑلے ہوئے تھے۔ نیچے درحقیقت ان دونوں محافظ نما شخصیتوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ اسی لئے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی اور نہ ہی



کوئی اور سامنے کیا تھا۔

میں نے ایک کمرے کے بستری چادر پھاڑ کر ان دونوں کے ہاتھ ان کی پشت پر باندھے جو راہداری میں بے ہوش پڑے تھے۔ ہم نے انہیں وہیں پڑا رہنے دیا۔ البتہ ان کی ٹخنیں ایک ہاتھ دوم میں پچھادیں۔ اس کے بعد ہم حلقہ انداز میں میزبیاں چھنے لگے۔

اس قسم کی صورت حال میں میزبیاں بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ کوئی نہایت آسانی سے آپ کو اوپر سے نشانہ بناسکتا ہے اس لئے ہم دونوں ایک خاص حکمت عملی کے ساتھ دو الگ الگ کونوں میں رچے ہوئے پکڑے کی رفتار سے اوپر جا رہے تھے لیکن اوپر کی منزل پر پہنچ کر احساس ہوا کہ ہماری یہ تمام احتیاط وغیرہ بے کار تھی۔ اوپر کوئی گمن کے ساتھ تو کیا بغیر گمن کے بھی ہمارا خطر نہیں تھا۔

اوپر کی منزل کچھ کٹاوا معلوم ہوتی تھی لیکن میزمرے میزمرے سے انداز میں اوپر اوپر کو کمرے پہنچے ہوئے تھے۔ شاید یہ اس قسم کی کوئی پرانی عمارت تھی جو ایک ایک کمروں کے قطبوں پر مشتمل ہو کر بنی تھی۔ میزبیاں کے پیچھے چھوٹے سے ایک صحن ٹھانے کے ساتھ ایک کمرے کا دروازہ کھلا نظر آ رہا تھا لیکن اس پر دھڑک رہا تھا۔ کمرے میں روشنی تھی۔

اس کمرے سے دسی آواز ایک بار پھر سنائی دی جو ہم پہلے بھی کئی مرتبہ سن چکے تھے۔ اب ہمیں پتا چلا کہ آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ شاید وہ حاضرخان کی طرف سے تو باتیں ہو چکی تھی۔ اب وہ دوسرے کو پکار رہی تھی ”پیکلے تو کہاں مر گیا۔ تو سی پول پٹ حرام خور کیس کے!“

یہ ”پیکلے“ یا بیٹھا بھی غالباً انہی میں سے ایک تھا جو نیچے بے ہوش پڑے تھے اس لئے اس مرتبہ بھی کئی بار پکارے جانے کے بعد بھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا لیکن ہم نے احتیاطاً چند لمحوں کے لئے دیوار سے چپک کر انتظار کر لیا کہ شاید یہ کوئی اور شخص ہو اور کسی طرف سے نمودار ہو ہی جائے۔

جب کسی طرف سے کوئی آتا دکھائی نہیں دیا تو میں نے دوسرے کمروں میں جھانکا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی خالی ہی تھی۔ اس فکرو پر دسی ایک کمرہ روشن اور ”آباد“ نظر آ رہا تھا۔ جس میں کوئی حاضرخان اور پیکلے کو پکار رہا تھا مگر دروازے تک آنے کی زحمت نہیں کر رہا تھا۔

میں نے شفیع شاہ کو چاندوں طرف نظر رکھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر پردہ ذرا سا ہٹا کر اندر جھانکا۔ سامنے ایک نہایت شاندار اور شاہانہ طرز کی آرام کرسی پر ایک خاصی عجیب و غریب قسم کی حلقوں میں دروازہ نظر آئی۔

جس طرح اس کی آواز کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ عورت کی تھی یا مرد کی۔ اسی طرح اس کی شخصیت دیکھ کر

بھی فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے کس جنس میں شمار کیا جائے۔ ذرا گہری نظر سے دیکھنے پر مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ اس میں نسوانیت پڑا بھاری تھا اور خاصا بھاری تھا۔ گو کہ اس کے بدلے لاپلائی ہونے پر مونچھوں جیسا لکڑا سا رواں بھی موجود تھا۔

وہ ایک بھاری بھر کم بے ڈول بے ہتھم اور بد شکل عورت تھی لیکن کچھ اس طرح آرام کرسی پر ٹھہر کر دروازہ تھی جیسے کوئی کم اپنے تختہ شای پر جلوہ افروز ہو اور اس بات پر پردہ زور و شور اس کے تالی جھانے پر غلام خدام وغیرہ حاضریاں نہیں اٹھاتا۔

اس کا کمرہ شاید اس عمارت کا واحد کمرہ تھا جس کی آ شاندار تھی۔ اس میں منہج فرنیچر موجود تھا۔ شاید ارقاعے عاتقے بچے ہوئے تھے۔ خوب صورت پردے تو یہاں تھے۔ کالی دی ”فرخ“ اور ضرورت کی وہ سرسب چیزیں اسی پر پردہ کمرے میں موجود تھیں۔ ڈبل بیڈ خوب صورت اور جدید سا تھا۔

عورت کا چہرہ تیار تھا کہ وہ پچاس سے اوپر کی تھی یا سیادہ چٹیلے تھے۔ یقیناً رنگے ہوئے تھی۔ انہیں رنگے میں خدای محنت کی کئی تھی لیکن ظاہر ہے وہ اس کے چہرے سے ٹل کر مار رہے تھے۔ عورت کی رحمت سافلی بیڑے بھاری بیڑے ہوئے اور ہونٹ موٹے موٹے تھے۔

مجھے جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ لگی وہ کہ عورت کے قریب بیٹھے کی ایک ڈرائیو، دھکی کی بولی، سگریٹ کا پیکٹ کا نذر اور نہ چلانے کے پکے لوازمات موجود گلاس اوپر بھرا نظر آ رہا تھا اور کمرے میں دھکی کی بولی بول رہی تھی۔ گویا موصوف پڑانے خواندہ اور عادی شریاں کے اندر شغل فرما رہی تھیں۔

دوسری دلچسپ بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے دلچسپے ہاتھ میں جام نہیں چھوٹا سا ایک پستول دیا ہوا تھا اور رخ میری طرف تھا۔ میں نے اپنی دانست میں نہایت احتیاط پردے کے درمیان بھری بنا کر صرف ایک آنکھ سے کبھی جھانکا تھا لیکن اس نے میری اس اکیلی آنکھ کو بھی چھوڑنا کے درمیان دیکھ لیا تھا اور شاید اسی کا نشانہ لے لیا تھا۔ اسی طور پر کچھ نہیں بولی اور میرے دل نے کہا کہ وہ فوری طور پر نہیں دباؤ گی اس لئے میں نے اس کی شخصیت کے ساتھ کمرے کا جائزہ بھی مکمل کر لیا کہ گو کہ اس میں تین چار بچے زیادہ وقت نہیں لگا ہوگا۔

اسی لئے عورت کے موٹے موٹے ہونٹوں میں حزن اور وہ اسی عجیب مگر کمراتی سی آواز میں بولی ”چندرا! اندر آ جا۔ تمہارے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہے اسے باہر ہی چھینک دو۔“ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی لہجہ کسی بچے کو کلاس

آئے کا حکم دے رہا ہوں اور پتہ اپنے ہاتھ میں اٹلی یا کوئی چڑیا ہوا  
چل دینا اور پچائے کھڑے ہو۔ اس احمق عورت کو یہ اندازہ نہیں تھا  
کہ اگر میرے ہاتھ میں کوئی گن وغیرہ موجود تھی اور وہ پردے کی  
اوٹ میں تھی تو میں اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے وہیں  
سے اسے شوٹ بھی کر سکتا تھا۔

تاہم میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کافی حد تک سعادت  
مندی کا مظاہرہ کیا اور پردے کی اوٹ میں ہی رہتے ہوئے اپنی گن  
کوٹ کی اندرونی جیب میں دھکی لی۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے میں نے  
اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود کوئی چیز  
چھپائی ہے۔ میں نے وردازے پر کئی بار کڑی سی دھکم پیر کی اور  
پردہ ہٹا کر غالی ہاتھ اندر چلا گیا۔

میں شاید عین اس کے پہلو میں جا کر کڑی لیکن ابھی میں اس  
سے سات آٹھ فٹ دور ہی تھا کہ وہ خطرناک انداز میں ہسٹل ہلاتے  
ہوئے چلی ”رنگ جاؤ۔ وہیں رُک جاؤ۔“

میں کسی ردوٹ کی طرح ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ وہ کسی  
تاراض رچھہ کی طرح سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی  
تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ خوف زدہ تھی۔ اس کا پھولا  
پھولا سا ہاتھ جس میں ہسٹل دبا ہوا تھا ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

وہ آرام کر سی پر سیدھی ہو کر بیٹھنے لگی تو بے اختیار اس کا خالی  
ہاتھ کمر پر چلا گیا اور وہ بڑی طرح کرا دیا تھی۔ اس کا چہرہ بکا کر رہ گیا۔  
نہایت تیزی سے اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار  
ہو گئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی کمر میں کوئی تکلیف تھی جس کی  
وجہ سے وہ آسانی سے چلنے پھرنے سے معذور تھی اور اسی لئے اپنی  
جگہ لیٹے لیٹے حاضر خان وغیرہ کو آواز دیتی رہی تھی۔

اسے گویا اندازہ ہو گیا کہ میں کیا سوچ رہا تھا اور اس نے  
وضاحت ضروری سمجھی ”یہ مت سمجھنا کہ میں مستقل معذور ہوں۔  
یہ تو کبھی کبھی میری کمر میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ اس کے باوجود  
میں تم جیسے اچکوں سے خوب نمٹ سکتی ہوں۔“

میں نے اس کی خوش فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی اور  
مسکین سی شکل بنائے کھڑا رہا۔ مگر کی تکلیف اور وزن کی زیادتی  
سے وہ آرام کر سی پر ڈھیر تھی چلنے پھرنے سے معذور تھی مگر اپنے  
ہاتھوں اپنی ہلاکت کا عمل جاری تھا۔ یعنی کھاتے پینے میں کوئی کمی  
نہیں تھی اور یہ ”کھانا پینا“ عام قسم کا کھانا پینا نہیں تھا جو شخص  
بیٹھ بھرے کے لئے ہوتا ہے۔

میری خاموشی سے وہ کچھ حوصلہ پا کر ڈراؤنٹ کر لی ”کون ہو  
تم؟“

”افضل“ میں نے فوراً اپنا نام بتایا۔

”کون افضل؟“ اس نے آنکھیں سیڑھیں۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ میں کون افضل ہوں۔ بس افضل  
ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا؟“ وہ بولی۔  
”میں کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن میرے خیال میں  
سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے میں کبھی یہاں نہیں  
آیا۔“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔

”تمہارے ساتھ کون ہے؟“ وہ شاید میرے الفاظ پر دھیما  
ویسے بغیر اپنے خوف کو پچائے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔  
میں نے دائیں بائیں دیکھا اور مصیبت سے نفی میں سر ہلا  
”میرے ساتھ تو کوئی نہیں ہے۔“

اسے یقیناً احساس تھا کہ میں قطعی غیر مخفیگی سے اس کے  
سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے کم  
سوال پر فخر نہیں دیا اور نہ ہی اسے ڈر لایا۔ فوراً ہی اس نے اگلا  
سوال کر ڈالا ”حاضر خان اور پچھلے کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ حاضر خان اور پچھلے کون ہے۔ بہر حال  
مجھے نیچے دو آدمی ملے تھے۔ میں نے تو ان سے صرف مصافحہ  
معاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے ہی تو مجھے اوپر بھیجا ہے۔“ میں نے  
مصیبت کی اداکاری جاری رکھی۔

وہ دیر دیر سے پہلے ہی ہاتھ دسی تھی۔ اب شاید اس کی  
قوت برداشت بالکل ہی جواب دے گئی۔ یکدم چیخ کر لی ”کیا اس  
مت کو بچ چکے تھو؟“ تم نے حاضر خان اور پچھلے کے ساتھ کیا کیا  
ہے۔ اور تمہارے ساتھ کون ہے اگر تم نے اب بھی بچ نہ دیا تو  
میں کوئی چلا دوں گی۔“

وہ بڑی طرح ہانپنے لگی کہ چند سیکنڈ میں اس نے بہت طویل  
فاصلہ دوڑ کر طے کر لیا ہو۔ چوتھے میں بھگ گیا۔ پسینے کے دو ٹپ  
قطرے تو اس کی چہرے پر نمودار ہوئے۔ جب بھی بڑے ہسٹل کے  
زنگ پر اس کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ میرے خیال  
میں اب فضول باتوں کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ مولیٰ عورت اب  
خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے اپنی تیزی سے جھکا کر دیتے ہوئے اس کی کلائی پر ہاتھ  
ڈالا کہ اس کی نمودار آنکھیں شاید صحیح طور پر یہ حرکت دیکھ بھی نہ  
سکتی ہوں۔ اس نے کوئی چلانے میں تامل نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن تھا  
کہ کوئی خود ہی چل گئی ہو۔ بہر حال اسے دوسرے کوئی چلانے کا  
موقع نہیں ملا کیونکہ اس وقت تک میری آنکھیاں اس کی پہلی کلائی  
میں گڑبگڑ تھیں۔ میں نے اس کا بازو اونچا کر دیا تھا۔ ہسٹل سے جو  
کوئی ملے وہ شاید ہمت میں کہیں ہوست ہو گی۔

میری طرف یہ کہ سخت تر ہوئی ہوئی گرفت کے باعث دو دروازے  
چلی۔ درد صرف اس کی کلائی میں ہی نہیں تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ  
کمر پر چلا گیا تھا اور بگڑا ہوا چہرہ کچھ اور بگاڑ رہا تھا۔ اس عالم میں  
وہ ابھی خاصی صیانت دیکھائی دے رہی تھی لیکن تمام تر تکلیف  
کے باوجود بھی اس نے مجھے لات رسید کرنے کی کوشش کی جس سے  
میں نہایت آسانی سے بچ گیا۔ دواہر ٹانگ کو زحمت دینے کی اس

”یہاں سے کونسا؟“ اس نے کی بات چندی رہی۔ ”یہاں سے۔“  
جواب دیا ”تیرے کمرے سے۔“ نڈائی ہے۔ یہ بھی بے ہوش ہو گئی  
ہے۔ بد بخت نے ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔  
شفیع شاہ کی طرح بے آواز قدموں سے اندر آگیا۔ اس کی  
عقابی نظروں نے چادروں طرف کا جائزہ لیا اور آخراں کی نظر میر  
آگئی۔ میر پر آگس باکس اور پانی وغیرہ بھی موجود تھا۔ شفیع شاہ نے  
مگن ایک طرف رکھی اور آگس باکس میں سے پکھلی ہوئی برف کا  
پانی نچوڑ کر ایک خالی گلاس میں نکالا۔ اس پانی سے اس نے موٹی  
عورت کا چہرہ تر کر دیا۔

عورت نے جھرجھری سی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ شفیع شاہ  
نے ایک اور غسل مندی کی۔ اس نے عورت کا چہرہ زار ہوا دیکھ کر  
اُدھ بھرا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک ہی سانس  
میں گلاس خالی کر دیا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بڑی پکھلی  
معلوم ہوئی تھی۔

ذرا کہ اس کے حلق سے اتنی تو اس کا شمار ہونے کے بجائے  
اس کی آنکھوں سے کچھ زیادہ ہوش مندی ظاہر ہونے لگی۔  
”توڑی سی اور دے دو۔ خدا کے لئے۔“ اس نے منت کی۔  
اب اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

شفیع شاہ نے گلاس میں کچھ اور دھکی اور پانی اور برف  
ملائی لیکن جب وہ گلاس اس کے ہونٹوں کے قریب لے جانے لگا تو  
میں نے ہاتھ بڑھا کر روک دیا اور عورت کی طرف جھٹکے ہوئے کہا  
”پہلے میرے سوال کا جواب دو پھر یہ گلاس تمہیں ملے گا۔“

”کون سا سوال؟“ اس کے ذہن سے گویا سب کچھ نکل گیا  
تھا۔  
”موٹا کہاں ہے؟ یہاں سے وہ کہاں گئی؟“ میں نے غل سے  
کہا۔

”سوال؟“ یہ نام سننے ہی اسے گویا پھر غصہ آگیا ”مجھے کیا  
معلوم موٹا کہاں ہے۔ پہلے وہ ایک چوبیس سیڑھی اس کا پتا کرنے  
آگئی تھی۔ خچے بھانڈا کر میرے پیچھے چلتی تھی۔ اس سے جان  
چھڑائی تو اب تم مذاق کی طرح میرے سر پر سوار ہو گئے ہو۔ میں  
لڑکیوں کو کمرے کرائے پر دیتی ہوں۔ زندگی عمران کی خبر سننے کا  
ٹھیکہ تو نہیں لیتا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ اس کی نظر گلاس پر جمی ہوئی تھی  
جو میں نے شفیع شاہ کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

”چلو تم نے یہ تو مانا کہ وہ تمہاری کرائے دار تھی۔“ میں نے  
کہا۔

”ہاں اس روز میری قسمت نے دھکا دیا تھا۔ مجھے پاگل سمجھتے  
تھے کہ اس کا تاجس روز میں نے اسے کرائے دار رکھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ  
میں اتنی بڑی مصیبت مول لے رہی تھی۔“ وہ اذیت پس کر رہی۔  
”یہ مصیبت اتنی تم پر؟“ میں نے

میں بہت نہیں پڑی۔ اس سے بچنے اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔  
اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ پستول  
اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر خچے آگراں میں نے اسے ٹھوکر سے بلے  
کے نیچے پھینکا۔ اس نے مجھے اندازہ ہوا کہ تکلیف زدہ آوازوں  
کے درمیان بھی وہ مجھے گندی گندی گالیاں دے رہی تھی۔ بڑی  
غیبت چڑ معلوم ہوتی تھی۔

میں نے اس کے منہ پر اٹے کا ایک تھپڑ رسید کیا۔ میں  
نے ہاتھ ہٹا کر رکھا تھا لیکن اس کے لئے یہ بھی کافی تھا۔ اس کی  
زبان تو بند ہو گئی لیکن اس کے ناک منہ سے خرخرات کی کچھ ایسی  
آوازیں نکلنے لگیں جیسے اس پر کوئی دو دن پرانے والا ہو۔

اس سے پہلے کہ اس پر کچھ کوئی دودھ پڑا یا وہ اس کی آنکھیں  
شروع کر لیں میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا جو بے جان انداز میں اس  
کی گود میں آگراں میں نے اس کے رگڑے ہوئے بال منہ میں جکڑ  
لئے اور تیزی سرگوشی میں کہا ”میں موٹا کے بارے میں معلوم  
کرنے آیا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟“

بال کھینچنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یوں چل  
کچھ اور انداز سے جکڑ گئی۔ گویا اس کی شکل ہر لمحہ بدل رہی تھی  
اور بد سے بدتر انداز میں بدل رہی تھی۔ وہ خوف زدہ ضرور تھی  
لیکن بد زبانی شاید اس کی نفرت میں شامل تھی اس لئے موٹا کو بھی  
ایک گندی سی گال دے کر ہانپتے ہوئے بولی ”یہ موٹا ہے کون؟“

”وہ تو اب تم انجان بھی ہو گئی۔“ میں نے لفظی سانس  
لے کر کہا ”بات کو طول مت دو۔ اس کے بارے میں جو کچھ بھی  
معلوم ہے، مجھے بتا دو ورنہ تمہارا مشراں سے کیسی زیادہ خراب  
ہو سکتا ہے۔ بتانا نظر آ رہا ہے۔“ میں نے اس کے بالوں کو جھونکا۔  
”وہ نکلی مگر اتنی ہی جگہ کے ساتھ بولی ”مجھے نہیں معلوم تم کس  
موٹا کی بات کر رہے ہو۔“

میں نے دوسرے ہاتھ سے جب سے تصویر نکال کر اس کے  
سامنے لگائی ”میں اس موٹا کی بات کر رہا ہوں جو یہاں رہتی تھی۔“  
”میں نے تو یہ شکل اس سے پہلے بھی نہیں دیکھی۔“ وہ اب  
بھی دھناتی پر قائم تھی۔

اب میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے اسے  
دوسرا ہاتھ رسید کیا۔ وہ کچھ زور دار پرکھا۔ اس کی آنکھیں بند  
ہو گئیں اور گردن دھکیا پڑ گئی۔ سر ایک طرف کو دھٹکتا محسوس  
ہوا۔ میں نے بال چھوڑے تو دھپ سے آرام کر رہی پڑھیر ہو گئی۔

میں نے مسافانہ سی سانس لے کر بے بسی سے دوسرا دھچک  
دیکھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کی مدد اس بیماری  
بہر کم قسٹ ضروری سے ہوا تو نہیں کر گئی تھی مگر پھر میں نے دیکھا  
اس کا ہاتھ جیسا دودھ پھول چک رہا تھا۔ یعنی سانسوں کی  
تعمیرت جاری تھی۔

اسی لمحے شفیع شاہ نے کمرے میں بھانڈا ”کیا ہوا سر؟“

موتی نے واضح کیا۔ اس بات کا مجھے اس کے تانے سے پہلے اندازہ ہو چکا تھا۔

”تمسارا نام کیا ہے؟“ دفعتاً میں نے پوچھا۔

”نور افشاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”بہت خوب... بہت خوب۔“ میں نے سر ہلایا۔ اس شخصیت کی نور افشاںی تو میں بہت دور سے دیکھ رہا تھا۔ نور افشاں بیگم آپہ تو تباہ کر اس وقت تسماری بلڈنگ میں گھرے غالی کھڑے آ رہے ہیں؟ لڑکیاں کہاں ہیں؟“

”میں نے یہ بلڈنگ بیچ دی ہے۔ میں ڈینٹس شفٹ ہو رہی ہوں۔ میری کمرائے وار لڑکیاں بھی وہیں شفٹ ہو گئی ہیں۔“ اس نے جواب دیا ”تم دو تین روز زبرد آتے تو میں بھی شفٹ ہو چکی ہوں لیکن میری قسمت خراب تھی۔ میرے مقدر میں تم سے پہلے لکھا تھا۔ سو پھر ڈریں ہوں۔“

حالانکہ سرد ہے ہودہ عورت نہیں بلکہ میں پھوڑا رہا تھا۔ میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ خوب ڈینٹس چاری ہو اس کا مطلب ہے ترقی کر گئی ہو۔ وہ اچھا جا رہا ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ باگواہی سے مجھے گھورتی رہی۔ یکدم اس کے تاثرات بدل گئے اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ فلم انداز میں بولی ”ایک گھونٹ ہی پلا دو۔“ وہ ہونٹوں پر زبان بھی لگی۔ میں نے اس جتنی عمارت اس جیسی حالت کی کسی عورت پہننے کی اتنی عادی نہیں دیکھا تھا۔

”بات ختم ہو جائے تو آرام سے چینی پیتی رہنا۔ ہم جی جان چھوڑ دیں گے۔“ میں نے زری سے کہا۔

”کب ختم ہوگی تسماری بات؟ میرے پاس تمہیں پتہ لے کر کچھ نہیں ہے۔“ وہ ہنسنے لگا اور تسماری باتیں شروع کر دیں۔ ”تم مجھے موٹا کا تھوڑا بہت شراغ دے دو۔ میں تمہارا چھوڑ دوں گا۔“ میں نے ایک بار پھر وعدہ کیا۔

”کاش وہ حرافہ میری رسائی میں ہوتی تو میں اس کی کر کر تمہارے ہاتھ میں دے دیتی۔“

”تمہیں اس کے غائب ہونے پر تشویش نہیں ہوتی ہے پوچھا۔“

”میں اگر اس طرح تشویش میں مبتلا ہوں تو کلوں تو پھر کاروبار چلا چکی۔“ وہ اپنے بڑے سے منہ کو مزید بڑھاتا۔

”یہ میرا اس کی طرف کوئی حساب نہیں لگا تھا۔ اتنا ایڈوائس کی کچھ رقم میرے پاس پڑی تھی۔ اس لئے میں کے بارے میں سوچا کچھ نہیں۔ اس کا سامان بھی صرف سوٹ کیس میں تھا۔ میں فزفٹ کر کے دیتی ہوں۔ اپنا سامان ساتھ لے گئی تھی۔ میرے آدمیوں کو اس نے یہی تاثر دیا ہے کہ وہ والوں سے ملے جا رہی تھی۔“

”ایک مصیبت تو تم ہی ہو جس نے مجھے بچوں میں دلیا ہوا ہے۔“ وہ کراہ کر بولی ”تم سے بڑی مصیبت اور کیا ہوگی۔“

”میرے علاوہ...؟“ میں نے اصرار کیا۔

”تمہارے علاوہ اس کی وہ ٹینک والی چڑیا سی بس بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ بھی میری جان کو اچھی تھی۔ اس سے بھی حاضر خان اور چھپکے سے میری جان چھڑائی تھی۔“

”یہ تو کوئی مصیبت نہ ہوئی۔“ میں نے سر ہلایا ”کوئی لڑکی تم ہوگی تو کچھ لوگ اسے پوچھنے تو ضرور آئیں گے۔“

”اس سے میں نے تو کم نہیں کیا۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”جو پھر کس نے تم کیا ہے؟“

”مجھے کیا معلوم۔“ وہ تقریباً چلا اٹھی ”وہ خود بھی کسی مصیبت سے کم نہیں تھی۔“

”وہ یہاں سے کب گئی تھی۔ یا کب غائب ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے یہ کھاس مجھے دے دو پھر میں تمہارے سوالوں کے جواب دوں گی۔“ اس نے مورے بازی کی کوشش کی۔

”نہیں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”پہلے سوالوں کے جواب دو۔ پھر میں تمہیں کھاس کیا پوری بوش دے دوں گا۔ بلکہ اگر کوئی تو تمہارے لئے پراکٹسٹ منگوا دوں گا۔ اس پر بھی تسماری طبیعت سیر نہ ہو کر تمہارے لئے شراب کا سونٹنگ پول بنا دوں گا۔ اس میں بڑی غلطی کماٹی رہنا۔“

وہ کھانے والی نظروں سے مجھے گھورتی رہی اور ہانچ رہی پھر شاید اس نے جواب دینے میں ہی غایت سمجھی ”وہ تھوڑا پہلے یہاں سے چلی گئی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ اسے ”پلے جانا“ کہا جائے یا ”غائب ہونا“ سمجھا جائے۔ بہر حال اس نے مجھے اپنے

جاننے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ کئی دن تک تو مجھے اس کے جانے کا پتا ہی نہیں چلا کہ یہاں کئی لڑکیوں کی اپنی اپنی الگ الگ دنیا ہے۔ اپنے معمولات ہیں۔ ہر لڑکی اپنی مرضی کی زندگی گزارتی ہے۔

میری طرف سے کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مرنے والے بھی یہاں آسکتے تھے۔ یہ ایک ایسی سولت تھی جو کوئی مالک مکان نہیں دے سکتا۔ شاید اسی لئے میرے ہاں کرائے کی ان

خواہش مند لڑکیوں کی لاٹھن لگی رہتی تھی جو یہ سولت چاہتی تھیں۔ میرے ہاں تو لڑکیوں کو کراہشکل سے ملتا تھا۔ بعض تو یہاں کراہنے پر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی تھیں۔“

”یقیناً... یقیناً سمجھتی ہوں گی۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

عمارت جس علاقے میں واقع تھی اور کمرہ کی جو حالت تھی اس کے باوجود اگر کوئی لڑکی یہاں کرایہ سے آئے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھی تو اس کے مزاج کا اندازہ لگا جاسکتا تھا اور یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ کتنی قابل کی لڑکی رہی ہوگی۔

”حالا...“ وہ کراہنے لگی اور اٹھ اٹھ کر بھی ٹھٹھا لہتی تھی۔

اس نے ہوتل پر زبان پھیری "سائنس درست کرنے کی کوشش کی پھر بولی "مجھے پہلے ہی معلوم تھا وہ چڑا ایک روز میرے گھونٹے سے اڑ جائے گی۔ وہ بہت اونچا اڑتا جانتی تھی۔ لوہا اڑنے کی خوشی چڑیاں زیادہ دن گھونٹے میں نہیں کھتی۔" اس کی کم از کم اس بات سے مجھے اتفاق تھا لیکن کبھی قطعی طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ مونا کے بارے میں اس کی یہ بات صحیح تھی یا غلط۔

"یہی مونا کا کرا کر اڑنے پر اٹھ چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔  
"کرا کر اڑنے پر اٹھنے کے بعد خالی بھی ہو چکا ہے۔ ان دونوں اس میں جو لڑکی تھی وہ دو سری لڑکیوں کے ساتھ وینس جا چکی ہے۔ اس نے بتایا۔"

"اس کے باوجود میں اسے دیکھنا چاہوں گا۔ کون سا ہے وہ کرا؟"

"اوپر کی منزل پر ہے۔ اس کے دو اوزارے پر چاک سے تھو نمبر لکھا ہوا گا۔" اس نے جواب دیا۔

"تھو؟" میں نے دہرایا۔ مغربی لوگ نام طور پر تھو کے ہندو کے مٹوس خیال کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں مونا جب تک اس کمرے میں رہی تھی تب تک تو وہ کسی خاص قسمت کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

"مونا سے یہاں کوئی ملے آتا تھا؟" میں نے پوچھا۔  
"کئی قوی آتے تھے لیکن اب اگر تم پوچھو گے کہ وہ کون تھے تو میں جیسے پہلے ہی بتا دوں کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" وہ تیزی سے بولی۔

"تم مجھے اتنی بے نیاز رہنے والی چیز تو نہیں لگتی۔" میں نے اسے گھورا۔

"میں نے کب کہا کہ میں مونا کے ملاقاتیوں کی طرف سے بے نیاز تھی؟ میں نے ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن مونا نے کبھی جاننے کا موقع ہی نہیں دیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ مجھے بھی لے کر آتی تھی وہ امریکی چیز معلوم ہوتا تھا۔ مونا بوری کوشش کرتی تھی کہ میں ان کے قریب نہ پہنچنے پاؤں۔ وہ خود بھی بہت محتاط معلوم ہوتے تھے۔"

ایک گہری سانس لے کر اس نے سلسلہ کلام جو "اویسے بھی ان میں سے کوئی ایک توہ مرجہ سے زیادہ یہاں نہیں آیا۔ وہ بھی شاید صرف اس لئے کہ ایک مرتبہ مونا کا ٹھکانا کچھ لپا جائے اور نہ شاید زیادہ تر وہ خودی ان سے باہر ہی باہر کھینٹ لی جاتی تھی۔"

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ مستانہ انداز میں پہلی "جن لوگوں سے اسے میں نے ملا چاہا وہ اسے کچھ زیادہ پسند نہیں آئے وہ ان سے بھی لڑی لیکن جلد ہی ان کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے کہا کہ وہ بہت اونچا اڑتا چاہ رہی تھی۔ میں اس سے خوش نہیں ہوں۔ صرف اس لئے میرا اس کے بارے میں بات

کرنے کوئی نہیں چاہتا لیکن تم معلوم نہیں کیا سمجھ رہے ہو۔ میں متعلق نہیں ہوں۔ میں اپنے تاثرات نہیں چھپاؤں گی۔ اگر وہ کہیں غائب ہو گئی ہے تو مجھے اس کی خوشی ہے لیکن یقین کو اسے غائب کرانے میں میرا قطعاً ہاتھ نہیں۔ میں اس سے ناراض ضرور ہوں۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ میں نے اس کے ساتھ بڑی بھلائی کی۔ میری اس پرست سی مریاں وہیں لیکن اس کی طرف سے مجھے ان کا کوئی مسئلہ نہیں ملا۔ وہ بڑی بے دید لڑکی تھی۔"

جس طرح کی مریاں اس نے مونا پر کی ہوں گی اور جس طرح کا صلہ وہ چاہتی ہوگی اس کا اندازہ کرنا میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ ان راستوں پر چلنے والی۔ یا یوں کہئے کہ ان راستوں پر چلا دی جانے والی لڑکیاں اگر نور افشاں بنکر جیسی عورت کی نظر میں بے دید ہی ہو جائیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی چاہے کبھی بلکہ ان راستوں پر چلنے کے لئے بے دید ہونا شاید مکمل ضرورت تھی۔ آنکھ میں موت، شرم، حیا رکھنے والوں کا تو سیدھے سچے راستوں پر چلنا دشوار ہوتا ہے۔ بڑے بڑے اور نامور راستوں کا تو ذکر ہی کیا۔

"اگر تم پہلے ہی اس موٹوں بات کر لیتیں تو ہم اور تم کافی پریشانی سے بچ جاتے۔" میں نے کہا۔

"دراصل مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ تم کوئی غیبت چیز ہو۔" اس نے نہایت صاف گوئی سے اعتراف کیا "سوٹ بوت سے تو کوئی معزز، شریف آدمی نکلے ہوتے ہیں کبھی بھی تم مونا کے عاشقوں میں سے کوئی ایک ہو۔ میرا خیال تھا میں تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کر، چیخ و پکار کر کے اور رعب دکھا کے ہٹاؤں گا میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ میں مونا کے بارے میں بالکل بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں بڑی کینہ پرور عورت ہوں۔"

"پھر تو میں ممکن ہے تم نے ہی مونا کو غائب کرا دیا ہوا؟" میں نے اس کی سرخ اور دھندلی آغلیوں میں جھانکنا۔ ان میں کئی جھللا رہی تھی۔

"اس نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس بڑے شرمیں آکر وہ بڑی چالاک چیز بن چکی تھی۔ اگر مجھے موقع مل بھی جاتا تب بھی شاید میں ایسا نہ کرتی۔ میں اس جسم کے لیے پکڑوں میں پڑنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں تو سیدھے سادے "دو اور دو چار" والے کام کرتی ہوں۔ میری اپنی ایک لائن ہے۔ چار پیسے کا قاعدہ اٹھانے کے سوا میں کبھی پکڑیں نہیں پڑتی۔"

لگتا تھا وہ سچ و گریہ پر آمکھی تھی اور سیدھے صاف انداز میں بات کر رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کا کوئی کبہ نہیں تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کی صحت کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی لمحے وہ اچانک اس جہان فانی سے رخصت ہو سکتی تھی مگر "چار پیسے" کے قاعدے کی ہوس سے اسے بھی چھوڑنا نہیں تھا۔ کمرے کرائے پر چڑھا کر بھی غائب ہات سے اس کی گرد مر ہو سکتی تھی مگر کروں

کے ساتھ ساتھ وہ یقیناً لڑکیاں بھی کرائے پر چلا رہی تھیں "مثنیٰ" کر کے بغیر بھی جاری تھی۔ گویا ابھی مزید "چار پیسے" کمانے کی انگ انگ کر رہی نہیں پڑی تھی۔ یہ "چار پیسے" کی کشش بھی عجیب پڑا سرا چیز تھی۔

میں نے اپنے جانِ حیرت سے باہر آتے ہوئے کہا "فی الحال میں تمہاری باتوں پر اعتبار کر لیتا ہوں لیکن اگر ان میں سے کوئی غلط ثابت ہوئی تو مجھے واپس آنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکے گی اور جب میں واپس آتا ہوں تو پہلے سے زیادہ غصیٹ ثابت ہوتا ہوں۔"

میں نے گلاس اس کی زالی پر رکھ دیا اور زالی اس کے قریب کھسکا دی۔ اس نے غصہ دل کی طرح گلاس اٹھالیا۔ میں اور شفیع شاہ کمرے سے نکل آئے اور ہم نے تیسری منزل کا رخ کیا۔ دفعتاً پیچھے سے آواز آئی "اے... سنو..." یہ لورائش ہی کی کھر کھرائی اور عجیب سی آواز تھی۔

میں نے واپس جا کر کمرے میں جھانکا تو وہ بولی "مجھے یاد آیا۔ اوپر ایک کمرے میں ابھی ایک لڑکی موجود ہے۔ وہ ابھی شفٹ نہیں ہوئی ہے۔ اسے میں نے ہی مزید دو ایک رات کے لئے یہاں روکا ہوا ہے۔ خدا کے لئے اسے کچھ مت کہنا۔ وہ بہت سعادت مند بن چکی ہے۔ میں اس کی بڑی قدر دان ہوں۔ تم اس سے بالکل مت اٹھنا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے بچ بچ ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے غیر واضح سے انداز میں سر ہلایا اور پلٹ آیا۔ یہ میرے لئے ابھی خبر تھی کہ اوپر کوئی لڑکی موجود تھی۔ شاید اس سے مونا کے بارے میں کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔ میں نے شفیع شاہ کو گمن چھپا لینے کی ہدایت کی۔ ہم اوپر پہنچے تو اس لڑکی نے اپنی موجودگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی لیکن دروازہ بند تھا۔

کڑکی بھی بند تھی اور اس میں موٹی موٹی سلاخیں نظر آرہی تھیں۔ وہ کڑکی کا پتہ ڈر سا کھولے اور کمرے رنگ کا پردہ کڑکی پر پھیلائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ہراس میں دکھائی دے رہا تھا۔ نام یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ غزالی آنکھوں "ستواں ناک" بھرے بھرے ہونٹوں والی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی رنگت گندمی اور بال بھورے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔ اسے یقیناً معلوم تھا کہ شیچے گزرتی تھیں لیکن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی اس کی آنکھیں دو سروں کو قیدی بنانے کی صلاحیت رکھتی تھیں لیکن اس وقت سلاخوں والی کڑکی کے پیچھے وہ خود قیدی معلوم ہو رہی تھی۔

میں دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ گئی اور اس نے کٹ سے کڑکی کا شیشہ بند کر لیا تاہم دیر پردے کے باوجود مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کڑکی کے پیچھے سی موجود تھی۔ میں نے انتہائی شائستگی اور نرمی

سے کہا "اچھی لڑکی! ہم سے ڈرو مت۔ ہم کوئی ڈاکو یا بد معاش نہیں، معزز اور شریف لوگ ہیں۔ شیچے والوں کے ساتھ توڑی سی ہاتھ پائی اس لئے کرنی پڑی کہ وہ ہمارے ساتھ صحیح طرح پیش نہیں کرے تھے اور کسی بھی بات کا شرافت سے جواب نہیں دے رہے تھے۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ کڑکی کے عقب میں سکوت تھا۔ لڑکی بہ حال میری بات مڑ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے سلسلہ کلام جوڑا "ہم صرف مونا کے بارے میں معلومات کرنے آئے ہیں۔ تمہیں اگر اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہے تو بتاؤ۔ ہم تمہیں انگلی بھی نہیں لگائیں گے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم مونا کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس میں ہماری کوئی غرض شامل نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم اس کی بس کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اس کی تلاش میں یہاں آئی تھی اور ناکام واپس چلی گئی تھی۔"

کڑکی کے پیچھے خاموشی رہی۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد میں نے کہا "ہم چاہیں تو دروازہ توڑ کر بھی اندر ٹھس سکتے ہیں۔ یہ کڑا ایسا مضبوط دروازہ نہیں ہے لیکن اگر تم خود دروازہ کھول کر ہمیں اندر آنے کی اجازت دو گی تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔"

میری تقریر دل پذیر کا آخر اس پر اثر ہو گیا۔ اس نے دروازے کا پلٹ کر اسی دروازے کی صورت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ قدم اٹھانے کے لئے اسے بڑی کشش سے گزرتا ہوا تھا اپنی تمام تر جرات جمع کرنی پڑی تھی۔ میں نے کرا نمبر تھوڑا جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا اور پہلے اس سے بات کر لیا۔

وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اور کمرے کے وسط میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے فیصلے کی آزمائش سے گزر کر دروازہ تو کھول دیا لیکن شاید اسے ابھی پورا یقین نہیں تھا کہ ہم اپنے وعدے کا پابن کریں گے۔ میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ اس نے دخل کوٹ آڑ سے گن نکال کر دروازے کے قریب کھڑی کر دی اور یوں اس سے دور ہٹ گیا جیسے اس کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لڑکی نے رنگ کی خوف ناک سی گن کو دیکھ کر تھوکر لگایا۔

بڑے سے بلب کی تیز روشنی اب بڑا راستہ اس کے چہرے پر پڑی تھی اور اس کی رنگت میں بھی سی صلاحیت اب بہت آشکار رہی تھی۔ وہ شاید مجھ ہی دیر پہلے نما کر نکلی تھی۔ اس کے دھڑکنے پر بھرے ہوئے بالوں میں ابھی نمی تھی۔ توبہ بند پر تھا۔ کمرے میں اس کے وجود کی بجائے جیسی اور ناؤ کی آہری سی چیل ہوئی تھی۔ وہ گد راتے جسم کی گول مٹول سی لڑکی تھی مگر قد نہیں تھی۔

"بندہ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ خوف زدہ یا پریشان ہونا ضرورت نہیں۔" میں نے انتہائی نرمی سے کہا۔

ایک کے پیچھے ایک مختلف کمائی ہے۔ اس کے باوجود ہم سب یہاں گویا ایک ٹیبلے یا پھر شاید ایک دیوڑی طرح ہیں۔ کہ کو سب لڑکیاں یہاں موجود نہیں ہیں لیکن آپ کو اندازہ ہو ہی چکا ہو گا کہ وہ کس قسم کی لڑکیاں رہی ہوں گی۔

”نہیں مجھے اندازہ نہیں ہوا۔“ میں نے انجان بننے ہوئے کہا۔ میں اس کے منہ سے لہٹکا چاہتا تھا۔

”اب آپ اتنے انجان نہ بنیں۔“ وہ میری اداکاری سے متاثر ہوئے بغیر لپکا سا سس لے کر بولی ”ابھی تو میں ایک نمونہ... یا یوں کہنے کے ان لڑکیوں کی ایک نمائندہ آپ کے سامنے موجود ہوں۔ اگر میں نہ ہوتی تب بھی آپ میزیم سے مل کر... یہاں کے ماحول کو دیکھ کر تسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ یہاں کس قسم کی لڑکیاں رہتی ہوں گی۔ آپ جیسے بہت سے شرفاء تو دیسے ہی اس جگہ سے واقف ہیں۔“

”میری جہل جان ڈرا کمزور ہے۔“ میں نے بخجیدگی سے کہا۔ وہ گویا میری تسلی کے لئے وضاحت پر آمادہ ہوئے ہوئے بولی

”زیادہ تر وہی لڑکیاں ادھر کا رخ کرتی ہیں جو کچھ ایسی زیادہ پارسا نہیں ہوتیں۔ جن پر سے اپنے گھر لے کر اور خاندانی شرافت کا رنگ اتر چکا ہو تا ہے۔ بعض کے خاندانی پس منظر میں یہ رنگ شامل ہی نہیں ہوتا۔ وہ خاندانی طور پر ہی کچھ چلتی پھرتی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں لیکن بعض شرف خاندانوں کی بھی ہوتی ہیں اور وہ خود بھی شرافت کی زندگی گزارتا چاہتی ہیں لیکن حالات، مجبوراں، بے در پے ہلاکیاں یا لوگوں کے مسلسل دھوکے اور قریب انہیں اس منزل پر لے آتے ہیں کہ وہ شرافت کی زندگی کا خیال چھوڑ دیتی ہیں۔ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتی ہیں۔ اپنے گئے توڑی بہت آسانیاں، توڑی بہت آسانئیں تلاش کر لیتی ہیں۔ میزیم نور جیسی عورتوں کی سرپرستی اور گھرائی میں کسی اور ہی انداز، کسی اور ہی فلسفے کے ساتھ اپنی زندگی کو بھر جانے کی جدوجہد شروع کر دیتی ہیں۔ راتوں کو آسودہ حال لوگوں کے عشرت کدوں کی روشنی بڑھانے لگتی ہیں۔ ان کے آئینہ بیلر بدل جاتے ہیں۔ وہ کسی کلرک، پروفیسر، کاندار یا الیکٹریشن کی بیوی بن کر ”عزت“ سے زندگی گزارنے کے بجائے کسی بڑے قومی کی داشتہ بن کر ”میش“ سے زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا تو یہ خواب بھی پورا نہیں ہوتا۔ سب کچھ گر گرنے کے بعد بھی زیادہ تر تو ایسے ہی تنگ دہار یک مکانوں میں مختلف مسائل یا مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتی ہیں۔ یہ قصے برس برس سے چل رہے ہیں۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ توڑے بہت انداز تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔“

وہ نظریں جھانکے خاموشی سے سکرین کو اٹھیں میں مٹھانے لگی۔ اس کی کھینچی پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں تک پہنچ رہا تھا۔ نقادہ سر اٹھا کر ذرا اٹھکے لیے میں بولی ”اب اگر آپ یہ کہیں

بیٹے اس کے قریب تھا۔ وہ بیڈ کی پتی پر ہی تک مگی اور بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں بولی ”آپ بھی بیٹھے نا۔“

کمرے میں دبی کر گیاں تھیں۔ ہم دونوں ان پر بیٹھ گئے۔ میں نے نہایت شائستگی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا ”نام کیا ہے تمہارا؟“

”جیسا“ اس نے اب ذرا بہت سے جواب دیا۔ ”پیارا نام ہے۔“ میں نے ماحول کے تناؤ کو مزید کم کرنے کے لئے کہا ”یوے شخصیت کے اعتبار سے تمہارا نام ٹھیک ہونا چاہئے تھا۔“

وہ کچھ نہ بولی تاہم مجھے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رشتی دکھائی دی۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً ہی پوچھ لیا ”موتا کے بارے میں تم ہمیں کچھ بتا سکتی ہو؟“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مونڈنا انداز میں پوچھا ”میں سکرین پٹی سکتی ہوں؟“ یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ مائڈ ٹیبل کی طرف بڑھ چکا تھا۔ جس پر سکرین کا پیکٹ اور اس کی بی بی تھی۔

”اگر تم سکرین چتی ہو تو ضرور پیو۔ جب وزارت صحت کی سفید قمیص نہیں روک سکتی تو میں کیسے روک سکتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے سکرین سٹاکائی اور ہار نہ انداز میں ہوا میں دھوئیں سے چھلایا۔ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن ل کا ذہن شاید کہیں اور تھا۔ دھوئیں سے کئی پھلے اس نے بے مانی میں ہی بنا ڈالے۔

”میزیم نور نے آپ کو موتا کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“ اس نے پھر خیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے لینڈ لیری نور افشاں نے...؟“ میں نے مدتی چٹائی اور بچے کی طرف اشارہ کیا۔

”کی ہا۔ ہم انہیں مختصر میزیم نور کہتے ہیں۔“ اس نے سب دیا۔ مجھے جو کچھ اس عورت سے معلوم ہو سکا تھا وہ میں نے بتا دیا۔

”ہاں مجھے اس سے کچھ زیادہ معلوم ہے۔“ وہ اثبات میں سر تے ہوئے بولی۔ اب اس کا لہجہ بالکل پُر سکون تھا ”میزیم نور نے ایسا ہی بولا ہے۔ انہیں اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو گا۔ مجھے صرف اس لئے معلوم ہے کہ موتا مجھ سے توڑی سی بے ہو گی تھی۔ وہ میرے برابر دالے کمرے میں ہی رہتی تھی۔“ اس نے اٹھنے سے دھار کی طرف اشارہ کیا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”وہ کسی اور سے ذرا بھی بے نہیں تھی حالانکہ ہم سب گویا ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم میں سے بعض کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ بعض دوسرے سے آئی ہیں۔ ہمارا بولی میں... خاندانوں میں فرق ہے۔ ہر

جس کا دل چاہے میڈم کا کھانا مان کر خود بھی کھائے اور میڈم کو بھی حصہ دے۔

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی پھر اصل موضوع پر آئے ہوئے بولی ”مونا یہاں پریشانی کے عالم آتی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ ایک عورت کی کراے دار تھی جو شادی دفتر چلاتی تھی۔ اسی قسم کا شادی دفتر۔ جن کے اشتہار چیتے ہیں کہ ایک کروڑ پتی حسین دوشیزا کے لئے رشتہ درکار ہے جو اپنے باپ کے اچانک انتقال کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ کروڑوں کا بزنس اس سے سنبھالا نہیں جا رہا ہے۔ کوئی ٹیکہ دل اور خدا ترس شخص آکر اس دکھیاڑی کا سارا بچہ۔ اس کا کروڑوں کا بزنس سنبھالے اور اسے بچے، کلچر، جیون ساتھی کا چارہ دے۔ کنوارا، رنڈوا، شادی شدہ، سب قبول ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان اشتہاروں میں دوسری بیوی کو الگ گھر بنا کر دینے اور پہلے بچوں کا تمام خرچ اٹھانے کا بھی وعدہ کیا جاتا ہے۔ وہ کروڑ پتی دوشیزہ اتنی مجبور اور بھی کسی سارے کی ایسی محتاج ہوتی ہے کہ نہ جانے کتنے لوگوں کے دل تڑپ اٹھتے ہیں اور وہ جو تو درجوں اس کا سارا بچنے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔“

”مونا وہ ”کروڑ پتی دوشیزہ“ تھی؟“ میں نے دریافت کیا۔  
”جی ہاں“ کہیں نے ان بات میں سر ہلایا ”اس حرافے نے مونا کی وجہ سے خوب کھایا۔ اس کا ایک بد معاش قسم کا بار لڑ بھی تھا۔ پولیس کو بھی حقت جاتا تھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا سر پر شاکت لے کر پولیس کے پاس پہنچ جائے تو اس کی شہادت نہ ہو۔“  
”کیا یہ فراز؟“ میں نے بھی تکیا جا رہا ہے؟ کیا ایسی تکہ کو عقل نہیں آتی؟“ میں نے بھی تجسس سے پوچھا۔

”بے وقوف بننے والے اس دنیا میں ازل سے موجود ہیں۔ اب تک موجود رہیں گے۔ ان کے دم سے سیاسی، ملاتی، اقتصادی، شیطانیوں کا کاروبار چل رہا ہے۔ دیے اب یہ وحدا لٹھلٹھ کر گیا ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ اختراعات آتی رہتی ہیں۔ شکاری نے جان لائے رہتے ہیں۔ سالہا سال سے اسی طرح ہو رہا ہے۔ بس انداز ذرا بدل جاتے ہیں۔ الفاظ آ جاتے ہیں۔ ذرا دینے سے تلاش کرنے جاتے ہیں۔“

”کیا مونا کروڑ پتی دوشیزہ کا کردار ادا کرتے کرتے کسی میں پھنس گئی تھی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ وہ سلسلہ تو ٹھیک ہی چل رہا تھا لیکن شادی واقعہ سے اس کا کچھ بھگڑا ہوا تھا۔ اس نے مونا کو پولیس کے میں پھنسانے کی دھمکی دی۔ بات خاصا بڑھ گئی تھی۔ مونا بالکل بھاگ نکلی۔ کسی کے ریفرنس سے یہاں پہنچی۔ شاید کسی لڑکی اس کی رہنمائی کی تھی۔ میڈم نے اسے پناہ بھی دی اور انہر ممکن مدد بھی کی۔“

”اور پھر اپنی لائیں پر بھی چلایا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”آپ ان باتوں سے بالکل ہی لاعلم ہیں تو میں اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کچھ ایسے کسمن دکھائی نہیں دیتے اور نہ ہی ایسے مفلس و تلاش نظر آ رہے ہیں کہ آپ کو گھر سے باہر بھاگنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔ آپ نے یقیناً کسی نہ کسی حد تک تو دنیا ضرور دیکھی ہوگی۔“

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ملا نعت سے پوچھا ”مونا بھی اسی قبیل کی لڑکی تھی؟“

”ظاہر ہے۔ اسی طرح کی لڑکیاں میڈم کی۔ اور اس ٹھکانے کی شہرت سن کر کسی کی نہ کسی سے اس کا تذکرہ سن کر یہاں پہنچی ہیں۔ تاہم میں اتنا ضرور کہوں گی کہ ہماری طرح کی بیشتر لڑکیاں ذہنی طور پر آوارہ نہیں ہوتیں۔ وہ یا تو بھگی ہوئی ہوتی ہیں اور ان کے لئے واپسی کے راستے بند ہو چکے ہوتے ہیں یا پھر وہ حالات کا شکار ہوتی ہیں۔ بہت کم ہوتی ہیں جن کی اپنی آوارگی انہیں اس طرف لاتی ہے۔“

وہ ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی گویا مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہو ”مونا کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بہت خوب صورت تھی اور اس کی خوب صورتی نے اسے بے چین کیا ہوا تھا۔ میں اس کے لئے ”جی“ کا صنف اس لئے استعمال کر رہی ہوں کہ اسے یہاں سے مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔“

اس وضاحت کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا ”وہ اپنی خوب صورتی کے بل پر جلد از جلد زیادہ سے زیادہ شہرت اور دولت سمیٹنا چاہتی تھی۔ بعض ایسی لڑکیاں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ بعض کو یہ سوچ راس نہیں آتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مونا کا معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ جب سے وہ یہاں سے گئی۔ یہ میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا اور اس کی کامیابی کا کوئی ثبوت بھی انہی الحال میری نظر سے نہیں گزرا۔“

”اسے اس ماحول سے الگ جہت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی؟“ میں نے کرد و پیش کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں“ کہیں نے جواب دیا ”بعض لڑکیاں یہاں پریشانی کے عالم میں پہنچتی ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ جگہ ان کے لئے پناہ گاہ بھی ثابت ہوتی تھی۔ میڈم نور کیسی بھی عورت سی لیکن ایک ذہنی بہر حال اس میں موجود ہے کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرتی۔ کسی کو بیک میل نہیں کرتی اور نہ ہی اس نے کبھی کسی پاراسم کی لڑکی کو اس لائن پر لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک گرفت ”بدمزاج اور بد لحاظ عورت ضرور ہے لیکن کبھی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاتی۔“

”میں عجیب سے انداز میں مسکرائی ”یہاں تو خوشی کا سودا ہے۔ جس کا دل چاہے رہے۔ جس کا دل چاہے چل جائے۔ جس کا دل چاہے صرف میڈم کا مطلوبہ کرایہ اور اخراجات وغیرہ ادا



اپنا مطلب نکالنے کے بعد اسے دعوں پر غرور ہے جسے یا پھر شاید وہ صحیح معنوں میں کام کے آدمی نہیں تھے۔ میں خود کبھی بھارا سبج پر چھوٹے موٹے مول کرتی ہوں۔ مجھے بھی کئی لوگ خالی میں لٹے ہیں جو لی وی پر چھوٹی سوتی نوکریاں کرتے ہیں لیکن مجھے بڑی بڑی سیریز میں ہیرن کے مول دلانے کی باتیں کرتے ہیں۔

میں ایک کان سے سنتی ہوں دوسرے سے نکال دیتی ہوں حالانکہ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی کی بات پر اظہار کر کے دیکھ لیا جائے۔ زندگی میں جہاں انسان اتنے دھوکے کھاتا ہے وہاں ایک آدھ دھوکا اور سنی لیکن نہ جانے کیوں دل کے اس مشورے پر عمل نہیں کر سکتی۔ میں سوچتی ہوں اس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت ضائع کرنا فضول ہے۔

مونا بھی اس قسم کے لوگوں کے پتھر میں آنے والی نہیں لگتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان سلسلوں میں باہر بہت وقت ضائع کر رہی تھی۔ اس موضوع پر کبھی اس سے تفصیلی بات نہیں ہوتی تھی حالانکہ دیکھتے دیکھتے اس کی زندگی کا کوئی راز مجھ سے چھپا ہوا بھی نہیں تھا۔ میں بھی اس موضوع پر اسے کچھ زیادہ بولنے پر مجبور نہیں کرتی تھی اسے کیدنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ مجھے احساس تھا، ناگاہکوں کے بارے میں بات کرنا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ شاید وہ بھی منتظر تھی اور میں بھی چاہتی تھی کہ کسی روز اسے کوئی بڑی کامیابی نصیب ہو اور وہ اچانک آکر دھماکا خیز انداز میں یہ خبر مجھے سنائے۔

اس نے ایک گھنٹی سانس لی "لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ حتیٰ کہ ایک مزدور کچھ بتائے بغیر غائب ہو گئی۔ اس نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔" اسے گویا اس پر حیرت بھی تھی اور مدد بھی۔ "حالانکہ وہ تم سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مجھے ہر بات ہی بتا دیتی تھی۔" سیمیں قدرے ہچکچاہٹ سے بولی "تاہم اتنا ضرور تھا کہ مجھے اس کی زندگی کے کئی اہم واقعات کا علم تھا۔ اب اگر اس کی زندگی میں کوئی اہم موڑ آ رہا تھا یا آچکا تھا تو اس نے اس کے بارے میں مجھے نہیں بتایا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے مجھے یہ تک بتا دیا تھا کہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد کون تھا۔"

"کون تھا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"اس کا رشتہ کا ایک بچا۔ جس کے پاس رہنے کے لئے وہ خیر آباد گئی تھی۔" سیمیں نے بلاتامل جواب دیا "مونا کا۔" اور شاید اس کے گھر والوں کا بھی خیال تھا کہ وہ اس کے لئے باب کا ٹیم الہدیل ثابت ہو گا لیکن اس نے ایک خاص حکمت عملی کے تحت اس کے روز و شب کے کچھ خاص اور سرکش لمحات سے کام لیا۔ اٹھاتے ہوئے اسے ایک نئے ہی راستے پر ڈال دیا۔ اس کی بے چین زندگی پر فطری شرم دیا کہ جو کمزور سا بندہ موجود تھا اس نے

مجھے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اس قبیل کی بعض لڑکیوں میں حیا کی رت پائی ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر خلیفہ سی آوازی کا پرتو بھی تھا۔ بچے اور انداز نگہ سے وہ درجی کبھی اور کچھ بہتر ذوق کی مالک لگتی تھی۔ یہ جگہ اس کے لئے کچھ ناموزوں لگ رہی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ ڈینس کے ماحول میں شاید وہ کچھ زیادہ ہنسنے لگے۔

وہ دھیمے لمبے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میڈم کے کہنے پر وہ کچھ لوگوں کے ہاں جاتی رہی لیکن جن لوگوں تک میڈم کی رسائی ہے وہ مونا کو زیادہ پسند نہیں تھے اور جتنے جڑے ہوئے کے بعد اس میں جس حد تک مالی فائدہ تھا مونا اس سے بھی مطمئن نہیں تھی حالانکہ وہ خوب صورت تھی، نوجوان تھی۔ اس کی "ہنگ" سب سے زیادہ تھی۔ اسے رت بھی سب سے زیادہ ملتا تھا مگر اس نے جلد ہی میڈم کا ٹھم مانا چھوڑ دیا۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ بہت جلدی میں معلوم ہوئی تھی۔ وہ اپنی خوب صورتی اور جوانی سے جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دولت اور شہرت سیٹھے کے معاملے میں اندری اور ایک قسم کے جنون میں مبتلا تھی لیکن یہ جنون ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک خاموش مگر بڑی ضدی لڑکی بیٹھی تھی۔ اپنی کم عمری اور نا تجربہ کاری کے باوجود ایک بات وہ جانتی تھی کہ اسی نوجوانی اور اُنھیں کے زمانے میں اس کا کوئی صحیح ہاتھ پڑتا تو یہ گمراہ نہ پھرتا۔ کوئی نہیں پرہیز کرتا۔"

میں نے مونا کی تلاش کو محض اتنا کامسکہ بنا کر اس سلسلے میں ہائی پری تھی لیکن اب وہ مجھے ایک دلچسپ کردار محسوس ہونے لگی تھی۔ مجھے جب کوئی کردار دلچسپ محسوس ہوتا تھا تو پھر اس کے لئے کوئی زحمت اٹھانا پڑا نہیں لگتا تھا۔ وہ نہ ہی اس میں کوئی بوریٹ ہوتی تھی۔ اس طرح بھی اپنے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ کرنا مجھے ایک دلچسپ مشغلہ محسوس ہوتا تھا اور اگر اس میں کسی کا بھلا یا ہونا یا نہ ہونا تھا تو اب "وہ لا محالہ تھا۔"

مونا تو ویسے بھی لڑکی تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ لڑکی کے معاملے میں لاشعوری طور پر مرد کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ خواہ اس کے عوام کچھ بھی نہ ہوں۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو سلیٹینا ز اور غیر معمولی ظاہر کرنے کے لئے اس کا اعتراف نہ کریں تو بات اور ہے۔ مجھے تو خاص طور پر مونا اور سیمیں ٹائپ کی لڑکیاں اس لئے بھی زیادہ دلچسپ محسوس ہوتی تھیں کہ یہ کم عمری میں ہی بڑی کمزوری چٹائیاں اور بڑی سفاک حیثیتیں اپنے دامن میں چھپائے پھرتی تھیں جو عام لوگوں کی نظروں سے اکثر اوجھل ہی رہتی تھیں۔

سیمیں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "مونا اس دوران شہر نس کی طرف بھی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اس نے دو تین چھوٹے لیکن سافٹ کے لئے ہانڈ بگ بھی لی۔ لی دی کے پتھر بھی لگائے تھے۔ شاید بات سن میں رہی تھی۔ حالانکہ مونا اتنی معمولی بھی نہیں تھی۔ کالی کھاک ہو چکی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ اسے لٹنے والے

اسے تو دیا۔ اس کے بعد شاید مونا کی جھجک کھل گئی۔

میں دم بخود سا بیٹھا رہ گیا۔ غدار نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بہن رشتے کے ایک چچا کے پاس اس خیال سے رہنے کے لئے گئی تھی کہ وہ اس کی کچھ مدد کرے گا۔ اسے آگے بڑھنے کے لئے کوئی سارا میا کرے گا۔ اس کے لئے اپنا اثر رسوخ استعمال کرے گا۔ اس نے کیا خوب اثر رسوخ استعمال کیا تھا۔ وہ خواہ رشتے ہی کا چچا ہی۔ بہر حال اس سے قطعاً تو بزرگی کا ہی تھا۔

دینا واقعی بڑی عجیب جگہ تھی!

”ان کی عمروں میں تو خاصا فرق رہا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔  
مجھے اپنی آواز گٹھے میں پھنسی محسوس ہوئی۔

”ہاں۔ مونا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس وقت پنجاس سے اوپر کا تھا اور مونا کی عمر میں سے بھی کم تھی۔ اسی لئے تو مونا کی ماں اور بہن نے بھیج دیا تھا کہ ”بچی“ وہاں ایک ”بزرگ“ کے زیر سایہ رہے گی۔ وہ اتنا ہی خود غرض، شاطر اور مکار تھا۔ مونا کو اس سے فائدہ تو کیا پہنچتا تھا؟ اسے کتنا اس سے جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ وہ اس کی نو نوزی اور نوجوانی کے لئے ہر ترسہ پائین کیا۔ جب تک اس میں دم غم رہتا شاید وہ مونا کو اپنے گھٹے سے نہ نکلے دیتا لیکن وہ بہر حال اپنی تمام تر کم عمری اور نا تجربہ کاری کے باوجود چھٹی شریک اور بے خوف تو تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑا کر گئی۔ پہلے وہ گھر کی چکر لگاتی رہی۔“

دفترا سمیں کو جیسے کچھ خیال آیا۔ اس نے ملتجیانہ سی نظر سے میری طرف دیکھا ”آپ میرے لئے اب بھی ہیں لیکن میں نہ جانے کس مدد میں یہ بات آپ کو بتا رہی ہوں حالانکہ یہ اس نے اپنے گھر والوں تک کو نہیں بتائی۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ دونوں حضرات اسے اپنی ذات تک محدود رکھیں گے؟“

”یقیناً“ میں نے جواب دیا۔ شفیع شاہ نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”تم سے اتنی دیر کی گفتگو کے بعد بھی بات درحقیقت وہیں کی وہیں رہی۔ مونا کے بارے میں ہماری معلومات میں تو خاصا اضافہ ہوا لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جس سے اسے تلاش کرنے میں مدد مل سکے۔“

سمیں نے بے جی کے اظہار میں کندھے اٹکائے اور کچھ سوچتے ہوئے بولی ”میں جو کچھ بتا سکتی تھی“ میں نے بتا دیا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ غالب ہونے سے پہلے وہ کچھ خوف زدہ اور غائب دماغ ہی رہنے لگی تھی۔ ویسے تو وہ ان دنوں یہاں رہتی ہی کم تھی لیکن چھٹی دیر رہتی تھی ”اس دوران بھی اس کا ذہن کوہا نہیں اور رہتا تھا۔“

”کوئی ایسا جنس جس سے ان دنوں اس کا میل جول ہو رہا ہو۔ یا کوئی ایسا جگہ جہاں اس کی آمدورفت زیادہ رہی ہو؟“ میں

اردو کے شاہکار سفرنامے ضیاء ساجد -/200  
منتخب مشہور سفرنامے ضیاء ساجد -/250  
منتخب مشہور افسانے ضیاء ساجد -/150  
منتخب اعلیٰ افسانے ضیاء ساجد -/125

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

نے پوچھا۔

وہ چند سیکنڈ سوچتی رہی پھر بولی ”ان دنوں اس نے گویا خود کو اپنی ذات کے خول میں بند کر لیا تھا۔ کچھ بولتی نہیں تھی۔ کچھ بتاتی نہیں تھی لیکن ہاں ان دنوں ایک قصص دو تین مرتبہ اس کے ساتھ یہاں تک آیا۔ وہ کوئی فوٹو گرافر تھا۔ اسٹیل فوٹو گرافی بھی کرتا تھا اور ویڈیو وغیرہ بھی بناتا تھا۔ مونا کا کہنا تھا کہ وہ اسے بہت اونچے درجے کی ماڈل کے طور پر متعارف کرانے کے لئے کام کر رہا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے باقاعدہ طور پر کوئی حکمت عملی بھی تیار کی تھی۔“

اس نے چند لمحے کے لئے خاموش ہو کر نئی سکرٹ سلائی۔ مجھے امید کی ایک موہوم سی کن دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک طویل کش لے کر وہ بولی ”اس فوٹو گرافر نے مجھے بھی اپنے اسٹوڈیو میں آنے کی دعوت دی تھی لیکن مجھے نہ جانے کیوں وہ آدمی کچھ خطرناک سا لگا۔ ظاہر ہے ہم جیسی لوگوں کی ملاقاتیں صبح شام ایسے لوگوں سے تو نہیں ہوتیں جنہیں سولیفڈ شریف کہا جاسکے لیکن چلیں ”غیر شریف“ ہوتا ہمارے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں مگر وہ جو ایک خاص قسم کے لوگ ہوتے ہیں نا۔ جنہیں دیکھ کر کسی عجیب اور ناقابل وضاحت سے خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے قریب جاتے ہوئے کم از کم میں بہت ڈرتی ہوں۔ میرا دل بے امان ہوتا ہوا۔ ایک مرتبہ میں نے اس کے اسٹوڈیو جانے کا ارادہ بھی کیا لیکن بس۔ جانتیں سکر۔ حالانکہ مجھے بھی ایک اونچے درجے کی ماڈل کے طور پر متعارف ہونے کا لالچ بھی آ رہا تھا اور لگا بھی تھا کہ وہ اپنے پیسے بٹانے پر کام کرنے والا آدمی تھا۔ وہ ہنڈ ا کارڈ میں آ تھا۔ شاید اس قسم کے سٹ میں ہوتا تھا اور اس کا اسٹوڈیو پشیمور میں کسی بیلنگ میں تھا۔ وہ خود بھی بڑا چنڈ سم اور خیر آدمی تھا۔ کہ بیرو سے کم نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ بھی دیا تھا۔“

وہ اٹھ کر ڈرننگ ٹیبل وغیرہ کی دروازوں میں کامزدار تلاش کرتا لگی۔ میں ایک امیدوار کے ساتھ اس کی حرکت و سکتا دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کارڈ مل جائے۔

خبری یا دھوشی کی آغوش میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے گویا کسی کا انتظار تھا۔ شاید وہ ہمارے دہلیز جانے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ میں نے کمرے میں جھانکا تو اس نے یوں آنکھیں پٹ پٹا میں جیسے مجھے پچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے بات آواز بلند کیا۔ ”آئی ایم سوری میڈم نور افشاں! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ماضی کی ایک بڑی فنکارہ ہیں۔ میرے دل میں فنکاروں کے لیے بڑا احترام ہے۔۔۔ خواہ وہ لائن بدل ہی کیوں نہ چکے ہوں۔“

”دع ہو جائے۔“ وہ اپنی پچھلی پچھلی عجیب سی آواز میں چنکی۔ ہمارے اس آواز کو عجیب ترین اور تھا۔ وہ ابھی تک مجھ سے تھا تھی اور میری معذرت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے زالی سے گلاس اٹھا کر مجھ پر کھینچا۔ میں ایک طرف کو ہٹ گیا لیکن میری یہ زحمت فضیل ہی تھی۔ اس کے بازو میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ گلاس مجھ تک پہنچ سکے۔ وہ راستے میں ہی قابض پر آگیا۔ میڈم نور چند لمبے آگے پیچھے جھومتی رہی پھر دھپ سے آرام وہ کر سی پر شرم دراز ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ غالباً بے ہوشی نے اسے اپنی بے پناہ میں لے لیا تھا۔ میں نے اندر جانے کی زحمت نہیں کی اور شفیع شاہ کے ساتھ نیچے آگیا۔ ڈیوڑھی میں وہ دونوں افراد اب بھی بے ہوش بڑے تھے جن کے نام غالباً حاضر خان اور پیکا تھے۔ ہم نے انہیں بھی اسی حال میں چھوڑا اور باہر آ گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم روانہ ہوئے تو چند منٹ بعد ہی مجھے شہ ہوا کہ سفید رنگ کی ایک چھوٹی سی کار ہمارے نقاب میں تھی لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ واقعی ہمارے نقاب میں تھی کیونکہ علاقہ نمجان تھا اور ٹریفک اس سڑک پر تقریباً رنگ رہا تھا۔ بیسیوں گاڑیاں ہمارے پیچھے تھیں جن میں گدھا گاڑیاں اور اونٹ گاڑیاں بھی شامل تھیں۔

آخر ہم اس علاقے سے نکل آئے اور ایک کھلی سڑک پر پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ شفیع شاہ قد سے تھجا ہو کر بیٹھا تھا اور اس گاڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ چند سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑانے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ چھوٹی سی سفید گاڑی ہمارے نقاب میں تھی۔

اس وقت ہم ایک پوش علاقے سے گزر رہے تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ کچھ ہی آگے اس پوش علاقے کے عین پہلوں پر ایک کچی بستی بھی تھی۔

میں نے شفیع شاہ سے کہا۔ ”میں گاڑی کچی بستی میں لے جاتا ہوں۔ کسی گلی میں گاڑی روک کر ہم اس گاڑی والوں کو مجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سر! شفیع شاہ نے سہلایا۔ اس کی مرن سینوں کے نیچے تھی۔ میں عقب نما آئیے میں دیکھ چکا تھا اور شفیع شاہ نے بھی

تھی۔ عزت اور دولت مندی کی زندگی بھی شاید انہیں مطمئن نہیں کر سکی یا اس میں آئی۔ انہوں نے اپنی کونجی کے مالی سے تعلقات استوار کر لیے جو ساڑھے چھ لکھ ایک ہجڑہ سال جات تھا۔ دیکھنے میں نیکر لگا تھا۔ میڈم نور نے نواب صاحب کے اعتماد میں نوبت لگا کر گویا اپنی خوش قسمتی کو لات مار دی۔ نواب صاحب نے ان دونوں کو غلط میں دیکھ لیا لیکن فوری طور پر انہوں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ نہایت غصے دل کے ساتھ انہوں نے پہلے ان سے اپنی تمام دولت و جائیداد واپس لی۔۔۔ پھر انہیں چکر دے کر پینڈور کھایا۔ جہاں ان کو علاج کے لیے بھیجا گیا وہاں بھی انہیں دوا کے بجائے سینڈ وڈ وغیرہ ہی کھایا جاتا رہا حتیٰ کہ ان کی آواز بچنے کے لیے تیار ہو گئی۔ انہیں بالکل حسی داماں کر کے نواب صاحب نے نکال باہر کیا۔ صرف گھر سے ہی نہیں۔ انہوں نے میڈم نور کو اس شہر سے بھی نکال دیا۔ یہ لایا ہو کر کی بات ہے۔ اس مالی کا بھی کچھ پتا نہیں چلا کہ کہاں غائب ہو گیا۔ نواب صاحب کی پہلی بیوی موجود تھی۔ وہ اس کی طرف لوٹ گئے اب تو وہ مرحوم ہو چکے ہیں اور ان کی اولاد میں جائیداد وغیرہ کچھ کر لک سے باہر کہیں پیش ہو چکی ہیں۔“

”یہ تو خاصی عبرت ناک سی کہانی ہے۔“ میں نے تصویر کے قریب سے بٹے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا؟“

”نور میڈم نور نے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”وہ جب خاص سہوڈس ہوتی ہیں تو خاص سی قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ ساری دنیا کو۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خود اپنے آپ کو بھی خوب گالیاں دیتی ہیں۔ انہیں اتنی خامیاں کا پتا ہے لیکن وہ آج تک اپنی کسی خافی کی اصلاح نہیں کر سکیں۔ ویسے وہ اتنی بڑی عورت نہیں ہیں۔ جتنی نظر آتی ہیں۔“

”ایک بار پھر تھراوا شہر سے سیمیں امیرا یہ وڈ کاٹی حد تک ہے ہووہ اور مار دھاڑے آکھوہ تھا لیکن تم نے اسے خوشگوار بنا دیا۔ اب میں ایک نظر مونا کے کمرے میں بھی جھانک لوں گو کہ مجھے وہاں کوئی سرائے ملنے کی امید نہیں ہے۔“ میں نے دروازے کی طرف ہرستے ہوئے کہا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ مونا کے کمرے کو کھانقاں فضول ہی رہا۔ اس میں جو در چار چھوٹی سوئی تھیں جو موجود تھیں وہ مونا نہیں اس کے بعد آئے والی کرائے دار لڑکی کی تھیں۔

میں نے اور شفیع شاہ نے وہاں سے رخصت ہو لینا ہی بہتر سمجھا۔ ہم وہاں بڑے اطمینان سے کافی وقت گزار چکے تھے۔ یہی نصرت تھا کہ اس دوران کسی طرف سے مداخلت نہیں ہوئی تھی۔

چلے چلے میں نے ایک بار پھر بڑی لڑکی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ کمرے پیچھے مونا سا کٹن رکھے آرام کر رہی تھی۔ یہی خفی زالی پر رکھی ہوئی خالی ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں مزید شرح ہو چکی تھیں مگر وہ شاید انہیں یہ مشکل کھلی رکھے ہوئے تھی۔ شاید وہ بے



"پینٹنگ..." سیمیں نے میری نظروں کے تعاقب میں دیوار کی طرف دیکھا۔ "اودھ... یہ پینٹنگ نہیں ہے۔ یہ ایک کالی پُرانا اور وحید سا فوٹو گراف تھا جس میں کسی ماہر فن نے اپنے ہاتھ سے رنگ بھر کر اسے یادگار کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل بنادیا۔"

"فوتو گراف..." اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ "کیا منسل شزاؤں کے دور میں بھی کیرے سے تصویریں کھینچنے کا رواج تھا؟ کیا منسلوں کے دور میں کیرا ایجاد ہو چکا تھا؟" وہ میرے سے ہنسی۔ "اس تصویر پر اکثر لوگوں کو پینٹنگ سی کا گمان گزرتا ہے اور جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ فوٹو گراف ہے تو پھر انہیں یہی حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں فوٹو گرافی کہاں سے آئی۔"

"کیا کسی فلم یا اسٹیج ڈرامے وغیرہ کا سین ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس کے بلج چرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اب اس کے اعصاب یقیناً پوری طرح پُرسکون تھے اور وہ مجھے جتنی دیکھ کر محفوظ ہو رہی تھی۔

ایک لمبے کے توقف سے وہ بولی۔ "یہ حقیقی زندگی کا ایک لمحہ ہے جسے بڑے اہتمام کے ساتھ کیرے کی آنکھ میں محفوظ کرایا گیا تھا۔ ہوں... سمجھیے یہ ایک کمائی کا سرورق ہے۔ اس کمائی کے ایک کردار سے... یعنی اس عورت سے آپ مل بھی پکے ہیں..." اس نے تصویر میں موجود عورت پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس سے مل چکا ہوں..." میں نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔ "کب اور کہاں؟" "کچھ دیر پہلے..." مجھے... اسی بلڈنگ میں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا...؟ تمہارا مطلب ہے میڈم نور افشاں؟" میں واقعی حیرت زدہ ہو کر تصویر کے قریب چلا گیا اور اس طرح درحقیقت سیمیں کے قریب جا پہنچا۔ اس کے وجود سے چھوٹی ہوئی آوازی آتے ہوئے ایک لمحے کے لیے میرا دھیان تصویر کی طرف سے ہٹا دیا لیکن میں فوراً ہی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تصویر میں اور میڈم نور افشاں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ کھلی جوانی اور بڑھاپے کا فرق نہیں تھا۔ میں نے جس نور افشاں کو دیکھا تھا وہ اس تصویر سے بالکل ہی مختلف عورت تھی تاہم میرا دل کہہ رہا تھا کہ سیمیں غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ بعض لوگوں کو وقت بہت سی بڑی طرح بدل کر... یا پھر شاید بالکل ہی کھنڈ کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن ہے میڈم نور کی شکل پر اس کے انحال کا بہت اثر پڑا ہو۔

سیمیں نہایت دھیمی آواز میں بولی۔ "یہ قیام پاکستان کے بعد کی تصویر ہے۔ بہت زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ وہ میڈم نور افشاں کی جوانی کا دور تھا۔ ان کے نہیں کھل کر الگ الگ کر کے دیکھا جائے

کارڈ اسے اپنی الماری کے ایک خانے میں رکھا ہوا ملا۔ میری جان میں جان آئی۔ کارڈ اس سے لے کر میں نے بغور دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت نہیں اور سٹار شکن کارڈ تھا۔ اسٹوڈیو کا نام "فیش رن" تھا اور پردہ انٹر کے طور پر ظفر جمال کا نام چھپا ہوا تھا۔ ایڈریس دیکھیں گا تھا۔

میں نے کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کچھ کار آمد شراغ معلوم ہو رہا ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ سیمیں! بعض اوقات بڑی بے ہوشیوں پر بڑے شاندار لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن ہے مونا ستم رسیدہ ہو اور واقعی ہماری امدادی دودھ کی مستحق ہو۔ تم نے میرے سوالوں کے جواب دے کر درحقیقت میری نہیں اس کی مدد کی ہے لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ اگر میرے لائق بھی کوئی کام ہو تو ضرور یاد کر لیتا۔"

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے وہ جھکی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ آکھوں میں لے دیتا ہے ہوسے اس بلڈنگ میں کھس آنے والے آدمی اتنے مذہب بھی ہو سکتے تھے کہ خاصی دیر سے دست بستہ سے انداز میں اس کی گفتگو کر رہے تھے اور اب ان میں سے ایک شخص اسے اپنا وزنگ کارڈ بھی پیش کر رہا تھا۔

بہر حال اس نے کارڈ لے لیا اور نہایت احتیاط سے دیکھنے کے لیے رکھ لیا۔ اس لمحے میری نظر اس پینٹنگ پر پڑی جو اس کے سرانے دیوار پر آویزاں تھی۔ پینٹنگ زیادہ بڑی نہیں تھی اور اس میں تجرید و تیرہ کی قطعاً کوئی جھلک نہیں تھی۔

اس پینٹنگ میں ایک نواہر یااد یا شہزادہ قسم کی شخصیت کو شاندار منظر لیاں میں ایک تخت نما چیز پر ارجان دکھایا گیا تھا۔ وہ ایک وجہ شخص تھا۔ اس کے سامنے قائلین پر ایک لڑکی سوار لیے بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ستار پر اور دوسرا اوامیں بلند تھا۔ شاید اسے کچھ گاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

لڑکی کا رخ سامنے کی طرف نہیں تھا اس لیے اس کا چہرہ پورا نہیں دکھ سکا۔ لیکن سامنے پوز یا پوزاں سے بہر حال زیادہ خطر آ رہا تھا اور اس کی خوبصورتی پوری طرح نمایاں تھی۔ وہ شاید بالکل حسن کا نمونہ تھی۔ بڑی بڑی سیاہ اور دلکش آنکھیں... سیاہ لمبے بال... بھرے بھرے ہونٹ... پینٹنگ میں بھی اس کی رنگت کا مائولا بین اور اس کی آنکھوں میں بولتا جاؤ نمایاں تھا جس کے صرف تذکرے پر چہرہ کھیرے ذہن میں ایک تصور قائم تھا کہ غالی عورت کی آنکھوں میں جاؤ ہوتا ہے۔ درنہ حقیقی زندگی میں تو اسے گھروں میں کام کرنے والی جو چند رنگی عورتیں دیکھی تھیں۔ سیاہ کام کو بھی سری اور نہایت کم رو تھیں۔ مجھے ان کی آنکھوں کا چاند کے بجائے افلاس اور مصائب کے سامنے نظر آئے تھے۔

حال یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہر عورت تو خوبصورت نہیں آتی تھی۔ بہت عمدہ پینٹنگ ہے۔" میں نے بغیر نہ سکا۔

بیشہ دلچسپی رہی تھی۔

”تھہ مختصری ہے انسان اور قومیں جن تباہیوں سے دو ہوتی ہیں وہ برا طوائف عمل گناہ ہے۔ اس میں برس ہا برس گزار جا ہیں لیکن بعد میں ان کے بارے میں باتیں کرنے والے چاہیں تو جملوں میں یہ تذکرے سمیٹ سکتے ہیں۔“ وہ ڈرامہ نگار جمل اسٹول پر بیٹھے ہوئے بولی۔ اس کا منہ اب بھی ہماری طرف ہی ”ہم نور انشاں کے عروج کے زمانے میں ایک نوابزادہ صاحب کی شخصیت اور آواز دونوں ہی پر مری طرح عاشق ہو گئے تھے۔“ یہی صاحب جو تصویر میں نظر آ رہے ہیں؟“ میں نے اذ کیا۔

”جی ہاں۔ یہ بڑے روایت پرست سے نوابزادے کا تقسیم کے بعد ان کے پاس زیادہ لمبی چوڑی جاگیریں تو نہیں تھیں پھر بھی بہت بڑی آسماں تھہ خاص خاص موقوفوں پر مخصوص روایتی انداز میں محفلیں سجاتے تھہ وہ میڈم نور اذ کے اس حد تک سچ عاشق تھے کہ شادی کے وقت انہوں نے سب کچھ ان کے نام کر دیا تھا جس کی کل مالیت اس سستے دور بھی شاید ایک کروڑ سے اوپر تھی۔ شخصیت کے اعتبار سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ نواب صاحب ایک وجہ انسان تھہ نور نے شاید دو یا تین سال ان کے ساتھ کسی خوشی زندگی پر لیکن موصوفہ کی طبیعت میں ایک عجیب اور بے جواز قسم کی آہ

تو شاید وہ خوبصورت نہ تھیں لیکن مجموعی طور پر ان کی شخصیت کشی پرکشش تھی یہ اس تصویر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔“

اس نے تائید طلب سی نظریے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ بولی۔“ آپ کو تو شاید ان کا نام بھی مانوس محسوس نہیں ہوا ہوگا؟“

”نہیں۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ اپنے زمانے کی ایک معروف کلاسیکل گلوکارہ ہیں۔“ سیمین نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”ان کی آواز تو اتنی بھیا تک ہے کہ انگریزی یا پاپ کانوں کے لیے بھی موزوں نہیں ہے۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ کلاسیکل گلوکارہ تھیں۔“

”میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ ریڈیو کی تاریخ میں ان کا نام اور کام محفوظ ہے۔ تاہم ان کی شہرت کا دور مختصری تھا۔ آپ شاید اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے ہوں یا شاید دودھ پیتے بچے ہوں جب ان کے نئے ریڈیو سے چلتے تھے اور نجی محفلوں میں ان کی شرکت لوگوں کے لیے باعث فخر ہوا کرتی تھی۔ ان کی آواز تباہ ہو چکی ہے۔ بلکہ شاید ان کی پوری زندگی ہی تباہ ہو چکی ہے۔ وہ لالچ اور ہوس کا ایک مصنوعی دنیا میں زندہ ہیں۔“

”یہ کیا تھہ ہے؟ تم مختصر یا تباہ کر دی؟“ میں نے قدرے تجسس سے کہا۔ ”کروڑوں کی حیرت انگیز شکستہ درخت سے مجھے

## ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خودنوشت

### دہشت گرد

سلیم فاروقی

- وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
- وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لو لہان ہو گئے تھے۔
- ”جی کہانیاں“ کا ایک مقبول ترین ایڈوینچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

ہے۔ ایک ہاتھ روم کی فرش کی فرش بھی بالکل ناکارہ اور تنگ پڑی تھی۔ مزدوروں نے اسے دیوار سے الگ کرنے کے لیے کھولا تو اس میں سے یہ دو ڈیڑھ فوٹ کیٹ نکلیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ کیسی کیٹ ہیں۔ میں ابھی اندر سے لے کر آیا ہوں۔ ظفر جمال نے اس گھر میں روتی اخباروں کے انبار۔ مٹی کوڑا۔ پھٹے ہوئے بچہ رز اور نوٹسے ہوئے کپڑوں کے علاوہ بس یہ دو کیٹ ہی چھوڑی ہیں۔  
”یہ آپ ہمیں دے دیجئے۔“ میں نے اچانک ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیوں دے دوں؟“ وہ یکدم جیسے گڑبڑا گیا اور ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ شفیع شاہ فوراً اس کے کندھے سے لگ کر کھڑا ہو گیا کہ وہ اوجھڑا دھرنے ہو سکے۔

”جہاں آپ نے لاکھوں کا نقصان برداشت کیا ہے وہاں ان حقیر سی کیٹ کا نقصان بھی برداشت کر لیجئے۔ شاید ان کے ذریعے ہمیں ظفر جمال کا کوئی سراغ مل سکے اور ہم آپ کا نقصان پورا کرانے میں آپ کی کوئی مدد کر سکیں۔“ میں نے تحمل سے کہا۔  
وہ کچھ نرم پڑ گیا لیکن کیٹ دینے سے ابھی تنگ کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ شاید وہ ایک تجویس شخص رہا ہو۔ بعض کتبوں کو بھی ظفر جمال جیسے لوگ کھرا جاتے ہیں۔

آخر میں نے ہاتھ بڑھا کر کیٹ اس کے ہاتھ سے تقرباً چھین لی۔ اس نے احتجاج کے سے انداز میں منہ کھولا لیکن میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ محض تھوک نکل کر رہ گیا۔ میں اور شفیع شاہ گاڑی کی طرف چل دیے۔ اصغر خاموش ہی رہا۔ حتیٰ کہ ہم گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

اوٹل پہنچ کر ہم دونوں نے ذرا تازہ دم ہونے کے بعد اوٹل کے دینے کو کنٹرول روم سے ایک دی سی آر منگوا لیا اور میرے کمرے میں بیٹھ کر ان میں سے ایک کیٹ لگا لی اور ذرا آرام سے نیم دراز ہو کر دیکھنے بیٹھ گئے۔

کمرے میں دھیمی دھیمی موسیقی بکھرنے لگی۔ چند لمبے بعد جو چوٹی دی کی اسکرین پر ابھرا اسے دیکھ کر ہم دونوں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ مزید چند سیکنڈ بعد جو منظر اسکرین پر شروع ہوا اسے دیکھ کر پہلے تو ہم ذرا اچھلے پھر ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

صرف ان چیزوں کے بل ہی لاکھوں میں ہیں۔ آخر کار مجھے اس شخص سے منہ کے لیے خود میرا آنا پڑا۔ اسے میری آمد کا پہلے سے علم ہو گیا۔ وہ اپنا ساز و سامان اٹھا کر نائب ہو گیا۔ بنگلے کو آلا لگا دیا۔ مجھے کل کورٹ سے آڈر لے کر بیلنٹ کی موجودگی میں آلا تو ذکر بنگلے کا قبضہ لینا پڑا۔ ”اس کا شاید روئے کوئی چاہ رہا تھا۔“  
”بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔“ میں نے ہمدردی سے کہا۔ ”آپ نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”کیوں نہیں کی؟۔“ وہ سنبھل کر بولا۔ ”لیکن وہ کیس نہیں مل سکا۔ اس کا نشانہ حتیٰ کارڈ اور اس پر دست پانچ بھی جعلی نکلا۔ میں نے تو اس کے خلاف جھلسازی اور فراڈ وغیرہ کی رپورٹ بھی درج کرادی ہے۔“

مجھے اس کی داستان غم سن کر افسوس تو واقعی ہوا تھا لیکن زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ جس سراغ کی امید پر ہم یہاں آئے تھے وہ بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اصغر بولا۔ ”اس وقت صورتحال یہ ہے کہ یہاں کا ہر کنکشن کٹا ہوا ہے۔ بنگلے کی حالت تباہ ہے۔ اس پر لاکھوں کے واجبات ہیں۔ کرائے سمیت مجھے کئی لاکھ کی چوٹ پڑی ہے۔“

”آپ کے ساتھ واقعی بڑی زیادتی ہوئی۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اندر سے کھڑکھڑکی تو آڑیں آ رہی تھیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مکان کی مرمت شروع کرانی ہے جناب! میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے جلد ہی واپس جانا ہے۔ میں چاہ رہا ہوں جلد از جلد مکان کی حالت ٹھیک ہو جائے اور کنکشن وغیرہ بحال ہو جائیں۔“  
اس نے جواب دیا۔

”کیا پھر کرائے پر دیں گے؟“ میں نے دریافت کیا۔

اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”موتیہ جناب!۔۔۔ میرے باپ کی بھی توبہ۔ جو میں اب بھی اپنی کوئی پراپرٹی کرائے پر دوں۔ میں اسے ٹھیک کرائے کے بیچ دوں گا۔ یہ رقم میں کیس انویسٹ کروں گا۔ کرائے سے زیادہ منافع کمایں گا۔ بی بیج سے بھی بچوں گا۔“

ظفر جمال جیسے کرائے والوں کی وجہ سے نہ جانے کتنے مالک مکان آئے دن اسی طرح اپنی جائیداد کرائے پر دینے سے توبہ کرتے ہوں گے اور کرائے والوں کے لیے مشکلات بڑھتی ہوں گی۔

قدرے ایسی کے عالم میں میری نظر اصغر کے ہاتھ میں موجود پیاسے ٹیکٹ پر پڑی۔ وہ درحقیقت دو عدد ڈیڑھ فوٹ کیٹ تھیں جن پر سب لپٹی ہوئی تھیں۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے یونہی ازراہ تجسس پوچھ لیا۔

اصغر کو جیسے یاد آیا کہ اس کے ہاتھ میں کچھ موجود تھا۔ اس نے ہاتھ اونچا کر کے دیکھا اور بولا۔ ”معلوم نہیں ظفر جمال اس کان کو کس طرح استعمال کرتا رہا ہے کہ اس کی ہر چیز ناکارہ ہو چکی

فرنچ اردو ریڈر

پروفیسر محمد اشرف قیمت: 90/-

دراصل لی دی کی اسکرین پر ایک لڑکی بڑی جذبات خیز موسیقی کی دھن پر رقص کر رہی تھی۔ اس کا رقص اس موسیقی سے کہیں زیادہ جذبات خیز تھا۔ لہجہ بہ لہجہ رقص زیادہ جذبات خیز ہوتا گیا۔ مختصر سے لباس کی صورت میں اس میں جو حدود و ثبوت داخل تھے وہ بھی دور کردی گئیں۔

میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں گھوما تھا۔ کئی ایسے ملکوں میں بھی خاصی آواز گرو کی تھی جو اپنی بارہ پیر آزادی کے خواہے سے مشہور تھے۔ مجھے چونکہ کبھی بارہ سائی کا کوئی دعوتی نہیں رہا اس لئے میں بہت سی ایسی جگہوں پر بھی گیا تھا جہاں جانا شرفا کی نظر میں خاصا معیوب تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ موقع ملنے ہی وہ شرفا خود وہاں پائے جاتے تھے۔

بعض جگہوں کے توانسے ایسے مشہور تھے کہ میں ازراہ تجسس ہی وہاں چلا گیا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان جگہوں پر جا کر میں محظوظ ہونے کے بجائے کوفت ہی کا شکار ہوا تھا۔ وہ جگہیں انسانی زندگی کے ایک خوب صورت اور سنسنی خیز پہلو کو گماڑا اور مشکینی بنادینے کے اڑے تھے۔

ہنگ کانگ میں ایسے ہی ایک صیغہ نما آڑے پرش نے اپنے لی دی کی ایک خاتون آرٹسٹ کو بھی دکھا تھا۔ اسے اپنے قریب ہی تماشاخیوں کی قطار میں بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت کا خاصا زور وار ہونکا لگا تھا۔ ترستے پھرتے ہوئے وہ پاکستانیوں کا قطار در قطار ایسے ٹھکانوں پر جانا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن ایک خاتون وہاں اپنی ہی ایک تمام جس کا تماشاخیوں دیکھنے آئی تھی یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ زیادہ حیرت مجھے اس بات پر بھی تھی کہ وہ لی دی آرٹسٹ کچھ ایسی نوجوان بھی نہیں تھی۔ خاصی عمر کی تھی۔ انسان کا شعبہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس عمر میں عموماً زندگی کے بارے میں انسان کے رویے بدلنے لگتے ہیں۔ مجھے مزید حیرت اس وقت ہوئی جب مجھے احساس ہوا کہ وہ خاتون صیغہ مال میں تنہا لی ہوئی تھی۔ کوئی مرد اس کے ساتھ نہیں تھا۔

کوئی مرد اس کے ساتھ ہوتا تب شاید اس کی موجودگی زیادہ حیرت کا باعث نہ ہوتی۔ بعض مرد اپنی سامنے عورتوں کو جو پہلے ہی خاصی منجھی ہوئی ہوتی تھیں مزید تنجھا ہوا بنانے کے لئے ایسی جگہوں پر ساتھ لے آتے تھے ان کے دائرہ نظر اور ان کے ذہن کو مزید وسیع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک بار اس وقت ایک نوخیز لڑکی عجیب و غریب حرکات کے ذریعے اپنی داستان میں حاضرین اور ناظرین کے جذبات میں غلط فہمی برپا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابھی اس کی عمر کم تھی اور غریب صورتی کے جدید سیارات کے مطابق وہ کچھ سوکھی سڑی بھی تھی۔ اس کے جسم میں خوب صورتیاں کچھ ایسی نمایاں نہیں تھیں لیکن وہ انہیں نمایاں کرنے کے لئے ایڑی چرلی کا زور لگا رہی تھی اور مزید عجیب تر حرکتیں کر رہی تھی۔

تماشاخیوں میں کئی ایسے مسلمان ملکوں کے معززین اور مخصوص لباسوں میں موجود تھے جو ہمارے قلم و کلمہ ہیں۔ ان سے بعض کافی عمر رسیدہ تھے لیکن ان کے پہلو میں کم عمر و فراریتان شب موجود تھیں۔

میں اس عجیب و غریب ماحول میں بار بار گردن سمٹا کر اس لی دی آرٹسٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں بہت کم لی دی دیکھتا تھا۔ یہ نہیں ملتا تھا لیکن یہ شاید اتفاق تھا کہ میں اس خاتون آرٹسٹ پہچانتا تھا۔

انڈول ہوا تو میری حیرت کو ایک نیا رخ ملا۔ میں نے دیکھا لی دی آرٹسٹ کے رخساروں پر آنسو بہ رہے تھے۔ وہ زار و قطار رہی تھی۔ دوشنی ہوتے ہی اس نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھ کر میرا تجسس بڑھ گیا اور میں اس کے قریب جا کر اپنا تعارف کرانے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے اسے باہر کینے لیرا میں کافی پینے کی دعوت دی جو اس نے قبول کرلی۔ وہ بالکل خاموش اور کھولی کھولی ہی تھی۔ قدر کمائوں میں کوئی کردار، شہزادی سے پوچھتا تھا کہ وہ پہلے تم کیوں اور پھر روئی کیوں؟

میرے سامنے بیٹھی ہوئی عورت شہزادی نہیں لی دی آرٹسٹ تھی اور وہ فنی بھی نہیں تھی۔ صرف روئی تھی تاہم میں اس نے دوسرے کاسب پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کیا تم یقین کر دے کہ میں یہ صرف تجسس کے تحت آئی تھی؟"

"اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟" میں نے فوراً کہا۔ وہ عورت تھی، تنہا آئی تھی۔ ایک عورت ہی کا تھنا دیکھنے میں اس کے لئے بھلا لطف اندوزی کا کون سا پہلو ہو سکتا تھا اس لئے اس کی یہ بات زیادہ قابل یقین تھی کہ وہ تجسس کے تحت آئی تھی۔ البتہ میں یہ بات کرنا تو قابل یقین ہوئی کیونکہ میں ایک مرد تھا حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ میں بھی وہاں تجسس ہی کے تحت آیا تھا لیکن میں نے اس سے یہ بات نہیں کہی۔ شاید وہ سمجھتی کہ میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "تجسس کے تحت آؤ تو کچھ میں آتا ہے لیکن یہ زار و قطار روئی کیوں؟"

"چھاتم نے دیکھ لیا؟" وہ افسردہ سی مسکرائی "میں شاید گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہو گئی تھی۔ میں شاید سمجھ رہی تھی کہ مجھے وہاں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ یا پھر شاید میں وہاں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو قطعی غیر ارادی طرز پر بہنے لگے تھے۔ دراصل اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے بار بار اپنی بی بی کا خیال آ رہا۔ وہ بالکل اسی عمر کی ہے۔ میں نے اسے شہر بس کی دنیا سے بالکل دور رکھا ہے۔ ایسے اداؤں میں تعلیم دلائی ہے اور اسی کی خاطر اپنے گھر میں شہر بس کے لوگوں کی آمد و رفت تک نہیں ہونے



جئے جئے ہوئے تھے۔

”برخوردار اتم سارا دن ہمیں کام کرتے ہو؟“ میں نے پوچھا  
اسے دابہں دیتے ہوئے پوچھی پوچھا۔

”میں سراسیمہ اسکول جاتا ہوں۔ میں بچے یہاں آجاتا  
ہوں۔“ اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

”گزر بسر ٹھیک ہو جاتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں سراسیمہ اودھان کام کرتا ہوں۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی  
ہے۔ وہ سارا دن کام کرتا ہے۔ ایک گھنٹہ میں میرے ملازم ہے۔  
ڈسٹنگ پیٹنگ کرتا ہے۔ ہاں گھر پر لٹائے ہائی ہے۔ اللہ کا شکر  
ہے سراسیمہ اچھی گزر بسر ہوتی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا ذاتی مکان  
ہے۔“

”وری گڈ! اور باپ کیا کرتا ہے؟“

”باپ نہیں ہے سراسیمہ چھوٹا سا تھا جب ان کا انتقال  
ہو گیا۔“ ایک لمحے کے لیے اس کا سراسیمہ رویہ بے چارہ گیا۔

میں نے اسے ہزار کاؤنٹ دیا اور کہا۔ ”باقی پیسے تم رکھ لینا۔“  
وہ جلدی سے نوٹ دابہں میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھتا ہوں آپ کا بہت شکریہ۔ لیکن میں اس طرح پیسے نہیں  
لےتا۔“ تھوڑی بہت نپ کی بات اور ہوتی ہے۔ لیکن اتنے پیسے.....  
آپ جیٹھا ترس کھا کر دے رہے ہیں۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا  
کہ کوئی مجھ پر ترس کھا کر پیسے دے۔“ اس کے انداز گفتگو سے اس  
کی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ اور ہنسی نکلتی تھی۔

”یہ میں تم پر ترس کھا کر نہیں..... انعام اور تحفے کے طور پر  
دے رہا ہوں۔ تم جیسے باہت نیچے میری گزروں میں ہیں۔ اتنے خراب  
زمانے میں بھی تم سر جھکاؤ اتنی کم عمری میں اتنے اطمینان سے میر  
شکر اور محنت کے راستے پر چل رہے ہو۔ یہ رکھ لو۔“ میں نے نوٹ  
اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔

”سراسیمہ اس کے بدلے کوئی ایسا دیا کام نہیں کروں گا۔“  
اس نے گہرا مجھے خبردار کیا۔

”کیسا کام؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”سمجھو“ وہ چپکاتے ہوئے بولا۔ ”بعض لوگ زیادہ پیسے دے  
کر لیتے ہیں یہ بچہ اسکول کے بیگ میں دابہں بچپنا آکسے یا دابہں سے  
لگا لگا چڑا اٹھا لٹا۔ میں ان بچوں میں نہیں پڑتا۔“

”جہت اچھا کرتے ہو۔ اس سمجھ اور کی وجہ سے تو میں  
جس انعام دے رہا ہوں۔ میں تمہیں کوئی کام نہیں بتاؤں گا۔  
بلکہ شاید آئندہ زندگی میں کبھی تم سے ملاقات بھی نہ ہو۔  
البتہ.....“ میں نے جیب سے دس ڈسٹنگ کاؤنٹ نکال کر اس کی طرف  
بڑھایا۔ ”اگر خدا انعام سے تمہیں زندگی میں کبھی کوئی پریشانی لاحق ہو  
تو مجھ سے ضرور مل لینا۔“

”بہت شکریہ سمجھو!“ وہ کاؤ کو بے چینی سے دیکھنے لگا۔ میں  
نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سراسیمہ آج تو آپ بڑی فزاعلیٰ  
سے اپنے کاؤزارا بننے پھر رہے ہیں۔“

”صرف دو ہی تو دیکھے ہیں۔ اور میرا خیال ہے مناسب  
جگہوں پر ہی دیکھے ہیں۔ خاص طور پر یہ بچہ مجھے میرا لگا ہے شفیع شاہ!  
ممکن ہے کل کو یہ بھی شاید ارگانی میں محسوس رہا ہو۔ اور اگر نہیں  
محسوس رہا ہو گا تب بھی شاید یہ ہم جیسوں سے کہیں بہتر انسان ہو گا۔  
بشرطیکہ اس سے پہلے کسی نے اس کے کان میں یہ فلسفہ نہ پھونک دیا  
کہ اس کے ساتھ بے شمار زیادتیاں ہو رہی ہیں..... اور یہ جو اس  
کے ارد گرد اوبھی اوبھی عالی شان عمارتیں نظر آ رہی ہیں یہ اسی کے  
خون پیسے سے بنی ہیں کسی اور کی محنت ان میں شامل نہیں ہے.....  
چنانچہ اسے اٹھ گھنٹے ہونا چاہیے۔ اور سب کچھ جھین لینا  
چاہیے۔ چھیننے کے چکر میں یہ بے چارہ بھی گنوا بیٹھے گا جو اس  
کے پاس ہے۔ کسی اور کی آگ کا ایجنہ بن جائے گا۔“

پھر میں نے خود ہی اپنے اندیشے کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔  
”مجھے امید ہے کہ ایسا نہیں ہو گا کیونکہ اسے جیٹھا ایک عقیم ماں کی  
سرپرستی حاصل ہے جس نے اسے شکر کرنا سکھایا ہے۔ تم نے اس  
بچے کے الفاظ پر توجہ دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے سراسیمہ اچھی گزر بسر  
ہوتی ہے۔ میں نے اس بچے کو..... اور اس عمر کے کسی بچے کو آج  
کل کے حالات میں اتنی اطمینان کے ساتھ خدا کا شکر ادا کرتے  
نہیں سنا۔ اس قسم کے کرداروں سے مل کر دھوکہ دہی تو بڑی لذت لیتی  
ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سراسیمہ شفیع شاہ گہری منہجی سے  
بولا۔ ”آج کاؤنٹ تو بڑا ناٹھکی کا دور ہے۔ ایسے کردار بہت کم ملتے  
ہیں۔ آج کل تو سب کچھ میسر ہوتے ہوئے ہی ہر وقت عموں کا  
دونا دوتے رہنا اور دوسروں کو گالیاں دیتے رہنا ہمارا کلچر بن گیا  
ہے۔“

ہم اس دوران ڈیٹس کی حد دوسروں داخل ہو چکے تھے۔ ہم نے  
مطلوبہ بغیر میں پہنچ کر ظفر جمال کا اسٹوڈیو تلاش کرنا شروع کیا تو یہ  
ایک مہر آؤا مہم ثابت ہوئی۔ یوں تو ڈیٹس کی بیشتر گلیاں ستان  
ہی نظر آتی تھیں مگر وہ جگہ تو ایک ڈور افائن اور کچھ زیادہ ہی دران  
گلی میں واقع تھا۔ گلی میں ابھی مکانوں کی تعداد بھی کم تھی۔ گلی  
چلاٹ خالی تھی۔

آخر کار جب ہم مطلوبہ نمبر تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تو  
اس پر اسٹوڈیو کا کوئی بورڈ وغیرہ آؤریاں نظر نہیں آیا۔ گیت کھلا  
تھا۔ ڈرائیوے میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اپنی ظاہری حالت سے  
جگہ لاوارث نظر آ رہا تھا۔ جگہ اچھا خاصا تھانہ بڑی حالت میں  
تھا۔

ڈرائیوے کا بیڑا تھا۔ میں گاڑی اندر ہی لے گیا۔ لان پر  
میں ایک اوپر سر معزز سا شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ اخبار پھل میں  
دباے، ایک ہاتھ میں سیاہ پیکٹ لیے کھڑا تھا۔ چرے سے کچھ

|                      |                |
|----------------------|----------------|
| الماس ایم۔ اے -/ 100 | ایلیس مصر      |
| الماس ایم۔ اے -/ 125 | حسن بن صباح    |
| الماس ایم۔ اے -/ 150 | را بھکاری      |
| الماس ایم۔ اے -/ 250 | نور الدین زنگی |
| الماس ایم۔ اے -/ 150 | سلطان عادل     |

مکتبہ القریش اُردو بازار۔ لاہور 2

ہے۔ لیکن جس شخص کو ظفر جمال جیسا کرانے وار مل جائے وہ بد نصیب ہوتا ہے۔

”اچھا۔ تو ظفر جمال آپ کا کرانے وار ہے؟“ میں نے کہا۔  
 ”جی نہیں صاحب۔ اُٹھا۔“ اس نے کراہنے سے انداز میں صبح کی۔ ”دو سال پہلے میں نے اسے ایک نہایت معزز آدمی اور ایک ایڈورٹائنگ ایجنسی کا مالک سمجھ کر یہ بھلا کرانے پھرا تھا۔ حالانکہ میں خود ایک کاروباری آدمی ہوں مگر اس نے مجھے عجیب و غریب طریقے سے ٹرانس میں لے لیا تھا۔ میں اس سے متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب ہو گیا تھا۔ اس قسم کے بعض لوگوں کے پاس یہ بڑا آرٹ ہوتا ہے۔ اسی کے بل پر وہ بڑے بڑے فراڈ کرتے پھرتے ہیں۔ مجھ جیسے گھماک کاروباری آدمیوں کو بھی بے وقوف بنا جاتے ہیں۔“

میں اور شفیع شاہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ذرا وقف کے بعد بولا۔ ”میں ملک سے باہر ہوا ہوں۔ اسٹیشن میں رہتا ہوں۔ گرین کارڈ ہولڈر ہوں۔ ظفر جمال کو بھلا کرانے پر وہ کرمیں واپس چلا گیا اور ایسا لکھا کہ پھر دو سال تک نہیں آسکا۔ ظفر جمال سے میں نے صرف چھ ماہ کا کرایہ بطور ڈپازٹ لیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک مجھے تو کیا۔۔۔ کچل گیس اور ٹیل فون کے ٹکے والوں کو بھی اس سے ایک پسا لینا نصیب نہیں ہو سکا۔ بھلا ایک عزمہ میں دینیس میں ہی رہتی ہیں۔ میں انہیں اختیار دے گیا تھا کہ وہ ظفر جمال سے کرایہ لیتی رہا کریں۔ وہ بھی ایک جاناغہ خاتون ہیں مگر صاحب! ظفر جمال تو کوئی بہت بڑا فنکار تھا۔ وہ انہیں کرایہ دینا تو درکنار ان کے بیٹوں کو کوئی پرمٹ لاسٹنس دلانے کا چکر دے کر اٹا ساتھ سرخزاران سے لے گیا۔۔۔ شدتِ غم سے گویا اس کی آواز مٹ چکی۔

ایک لمحے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”میں نے زیادہ حیرت تو مجھے کچل گیس اور فون کے ٹکوں پر ہے۔ ہم لوگ دو تین مہینے بلے دین تو وہ لوگ کنکشن کاٹنے آجاتے ہیں مگر وہ حاشا نہ جانے تھے عرصے تک بلے دینے پر یہ چیزیں استعمال کرنا رہا۔

پریشانی میں تھی۔  
 ”میرا خیال ہے کہ ساتھ لینے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے سرگوشی میں شفیع شاہ سے کہا۔ ”مجموعی آباد۔“  
 ہم گاڑی سے آخر کر نہایت مذہبانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے۔ ہمارے انداز میں ذرا سا بھی جارحانہ پن نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس شخص کے چہرے پر پریشانی کے علاوہ ہلکا سا خوف بھی چھلک آیا۔ وہ کوئی عام ”شریف“ کاروباری ما آدمی مظلوم ہوتا تھا۔ ظفر جمال یقیناً نہیں تھا۔ ہمیں نے ظفر جمال کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ اس سے کافی مختلف تھا۔ عربی زیادہ تھی۔  
 اس کے قریب پہنچ کر ہم نے سلام کر کے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے گویا ڈرتے ڈرتے ہم سے مصافحہ کیا۔ نظریک عینک کے عصب میں اس کی قدرے پھیل پھیلی سی آنکھوں میں تشویش تھی۔

”ہمیں ظفر جمال سے ملنا تھا۔“ میں نے شائستہ اور ملائم لہجے میں کہا۔

”کس سلسلے میں؟“ اس کے منہ سے گویا بے اختیار نکلا۔  
 ”فی الحال تو صرف ملنا ہی ہے۔ سلسلہ ان سے ملنے کے بعد طے کر لیں گے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”کیا وہ اندر موجود ہیں؟“  
 ”کاش وہ موجود ہوتے!“ وہ شخص ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔  
 ”مجھے تو خود ان سے ملنے کی حسرت رہ گئی۔“

”کیا مطلب؟“ کیا وہ خدا خواستہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”کاش ایسا ہوتا۔! اب بھی مجھے مبرا آجاتا۔“ اس شخص نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔

”براہر عزیز! آپ کچھ پیلیاں سی بھجوا رہے ہیں۔“ میں نے حد درجہ شائستگی سے کہا۔ ”براہر کم کل کر بات کیجئے۔ کچھ اپنے بارے میں۔ کچھ ظفر جمال کے بارے میں بتائیے۔“  
 ”پہلے تو آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔ ظفر جمال کی طرف آپ کا کوئی حساب وغیرہ تو نہیں لگتا؟“ وہ اب کچھ حوصلے سے بات کر رہا تھا۔

”ہمارا سلسلہ دراصل کچھ عجیب ہے۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ دراصل پہلے ہمارا ظفر جمال سے ملنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے اس کی طرف ہمارا کچھ حساب نکل ہی آئے۔“

”اب پیلیاں آپ بھجوا رہے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”برحال میں آپ کو جو کچھ بتا سکا ہوں بتا دیتا ہوں۔ میرا نام امیر ہے۔ میں اس جتنے کا بد نصیب ہوں۔“

”کمال ہے!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دینیس میں اتنے بڑے جتنے کا مالک ہو کر آپ خود کو بد نصیب کہہ رہے ہیں۔“  
 ”بھلا تو میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ وہ اس سے اچھا

ایک جاب ہوتا ہے۔ ہمارا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ دراصل اس میں شفیع شاہ کی طرف سے ایک بے عنوان سا احترام شامل تھا۔ میری طرح شفیع شاہ کو بھی پارسا ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں رہا تھا۔ پھر بھی وہ اس دور کے ان مکت نام نادر شریف نوجوانوں سے بہتر تھا۔ انسانی قدوں کا اس کے دل میں بہر حال ایک احترام تھا جو نام نادر شرافت سے بہتر تھا تاہم میں ممکن ہے کہ تنہائی میں یا کسی اور کے ساتھ بیٹھ کر آرام سے اس فلم کو دیکھ لیتا اور لطف اُردو یا مستفید بھی ہو لیتا لیکن مجھے احساس تھا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہوئے وہ خاصی تکلیف اور بے چینی کا شکار تھا کہ بظاہر آرام سے ہی بیٹھا ہو تھا۔

آخر کار وہ فلم ختم ہونے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی چند لمبے ہی مزید بیٹھ سا۔ فلم کے اثرات تو اپنی جگہ تھے ہی۔ رگ دپے میں ایک اضطراب برپا تھا لیکن میرے ذہن میں بھی ایک عجیب سی گھڑی پک رہی تھی۔ بہت سی باتیں ذہن میں گزرتی ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں کچھ واضح خطوط پر صبح اور صاف انداز میں نہیں سوچ پا رہا تھا۔

آخر میں نے سکوت کا بن دبا کر لی وی اور دی سی آر بند کر دیا۔ ان چیزوں کو اسی طرح چھوڑ کر میں بھی کمرے سے نکل آیا۔ مجھے شفیع شاہ کو تلاش نہیں کرنا پڑا۔ وہ راجداری کے ایک سرے پر مینڈ گلاس کی ایک دیوار کے قریب کھڑا تھا جہاں سے پارکنگ لائن اور پمپنگ سڑک نظر آتی تھی۔

میں بھی اس کے قریب جا کر کھڑا ہوا۔ چند لمبے ہم دونوں خاموشی سے نیچے پارکنگ لائن میں آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتے رہے۔ آخر میں نے سی سکوت توڑا اور دھیسے لہجے میں کہا ”شفیع شاہ! ہم نے برسوں میں جا کر تھوڑی سی عزت بنائی ہے۔ اب ہم معاشرے میں دو معزز کا درباری شخصیتوں کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ہم پر رشک بھی کرتے ہیں کہ ہم نے جوانی میں ہی اتنی کامیابیاں حاصل کر لیں۔ خالی ہاتھ اپنی جدوجہد شروع کرنے والے بعض لوگ تو اس مقام تک پہنچنے کی حسرت ہی لئے مرکب جاتے ہیں۔“

”تیس سر!“ شفیع شاہ دور فضا میں کسی غیر ملکی چیز کو گھورتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ”ہم خود اپنی نظر میں اپنی جو عزت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اس عزت سے زیادہ اہم ہے جو ہم نے سوسائٹی میں حاصل کی ہے۔“ میں نے مزید کہا۔

”جی ہاں“ وہ حسب عادت اختصار سے بولا۔ ”تمہیں حیرت نہیں ہو رہی کہ یہ میں نے کس قسم کی باتیں شروع کر دیں؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”میں سر!“ اس کے پتلے پتلے رخسار پر خفیف سی

میں نے محسوس کیا کہ اس فلم میں کم از کم کیراٹین اور لائٹنگ کرنے والے کا ایک مخصوص اسٹائل ضرور تھا تاہم یہ ضروری نہیں تھا کہ یہ اسٹائل انہوں نے اس قسم کی فلمیں بنا کر مستحکم کیا ہو۔ میں ممکن تھا کہ وہ شرفانہ فہمیں بنانے والوں کی کوئی لم ری ہو جس کی خدمات ایسی فلم کے لئے حاصل کی گئی ہوں اور وہ زیادہ معاوضے کے لالچ میں یا کسی اور وجہ سے لادھڑ پھسل گئے ہوں۔

ایک اور خاص بات جو میں نے نوٹ کی، اس کی طرف شاید ایسی فلم دیکھتے وقت کسی اور کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ وہ بات یہ تھی کہ فلم کے کئی شٹل میں دیوار پر ایک پینٹنگ آویزاں نظر آتی تھی۔ کیراٹین نے ایک باہر بھی اسے بطور خاص ایک پوز نہیں کیا تھا۔ وہ دیے ہی فلم میں آگئی تھی۔ وہ آئے بغیر وہ ہی نہیں سکتی تھی۔ خاصی بڑی پینٹنگ تھی اور ایک دیوار کے عین وسط میں توڑا لگائی تھی۔

وہ ایک بہت بڑے اور معروف آرٹسٹ کی پینٹنگ تھی۔ بات پھر وہی اسٹائل کی آجاتی تھی۔ اس دستور کا بھی اپنا ایک اسٹائل تھا۔ وہی اس کی انفرادیت بھی تھی۔ اس اسٹائل کی وجہ سے اس کی پینٹنگز دور سے پہچانی جاتی تھیں اور بڑی اونچی قیمتوں پر بیچی جاتیں۔ ظاہر ہے اونچا قیمت ہی انہیں خریدنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ دیکھنے والے کے بعض لوگوں کو دستور سے دلچسپی ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ کو باذوق اور فن کا قدر دان ظاہر کرنے کے لئے بھی نامور دستوروں کی پینٹنگز منگے واسوں خرید لیتے ہیں۔ چھوٹے اور گمنام دستوروں پر وہ یہ کرم فرمائی نہیں کرتے خواہ وہ فن کا کتنا ہی بہترین نمونہ پیش کریں۔ کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہوتا تھا کہ شاید دستور ہی شہرت کی کوئی شاخ ہوئی جا رہی تھی جس میں نام چل تھا۔ تاہم اس میں شک نہیں تھا کہ فی الحال ہمارے ہاں بڑے نام والے بیشتر آرٹسٹ واقعی فن میں بھی بڑے تھے۔ اکثر نے بڑی طویل محنت سے کام بنایا تھا۔

اس آرٹسٹ کی پینٹنگ بھی اس کے مخصوص اسٹائل کی وجہ سے صاف پہچانی جا رہی تھی پھر ایک گلوزاب میں پینٹنگ کا ایک کونہ ایک لمبے کے لئے اس طرح صاف طور پر گہرے کی زد میں آیا کہ آرٹسٹ کا پارک سا نام بھی نظر آ گیا اور میرے اعزاز کے کی خدمت ہو گئی۔ اگر میں صرف فلم میں کھویا رہتا تو ان پارکیوں کو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ فلم بنانے والوں نے بہر حال پوری کوشش کی تھی کہ دیکھنے والا اس میں بڑی طرح کھوجائے۔ اس کے پیچھے قیثا ایک اچھے ڈائریکٹر کا ذہن بھی کام کر رہا تھا۔

شفیع شاہ کی اور میری معمول میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اور ہمارے دو میان بیشتر معاملات میں کافی بے تکلفی بھی تھی لیکن جوئے رشتے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ ان میں بے تکلفی ہوتے ہوئے بھی ایک لطف ہوتا ہے۔ کوئی جاب نہ ہوتے ہوئے بھی

مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انزکے فطر ہو گئی اس کی چٹائی پر بیٹھے کی منہ منہ جو غریب ہلک رہی تھیں۔ یہ بوجھوں فلم دیکھتے وقت نمودار ہوئی تھیں اور ابھی تک معدوم نہیں ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "مجھے اندازہ ہے آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں سراسر اس لئے آپ نے جہاں سے بات شروع کی ہے" مجھے اس پر حیرت نہیں ہے۔

لڑکی اور شفیع شاہ صلاحتوں کے اعتبار سے تو انمول نوجوان تھے۔ لیکن وہ اس لئے بھی میرے قریبی ترین ساتھی تھے کہ وہ میرے ذہن میں بھانک سکتے تھے۔ اکثر ان کی باتیں بھی سمجھ سکتے تھے۔

"شفیع شاہ! ہم نے مونہ کو تلاش کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اور ہم جان دے کر بھی وعدہ نبھانے کا نظریہ رکھنے والے لوگ ہیں لیکن میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیسے ہم ایک حادثہ اور فضول فلم کی لڑکی کی تلاش میں تو اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کر رہے؟ ہماری جو تھوڑی بہت عزت ہے، کیسے اس پکر میں اس عزت پر حرف تو نہیں آجائے گا؟" فلم دیکھنے کے بعد میں بڑی آنکھوں میں پر گیا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم نہیں اٹھانا چاہئے؟

میں تو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی بات کر رہا تھا، شفیع شاہ تو بات کا جواب بھی بہت سوچ سمجھ کر دیتا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ وہ بہت کم وقت میں بہت گہری سوچ بچار کرنے والا نوجوان تھا۔ کچھ دیر بیٹھا اس کے ذہن میں بھی کچھ رہی تھی لیکن اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانا ہمیشہ بہت مشکل ہوا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ پرسکون اور دھیمے لہجے میں بولا "سراسر سوچ سمجھ کر تو ہر سلسلے میں ہی قدم اٹھانا چاہئے۔ ہم نے کم سوچ بچار کے ساتھ بھی جو کام کئے ان میں ہماری نیت نیک تھی۔ ہم نے بھی کسی غلط مقصد یا صرف ذاتی مفاد کے لئے جدوجہد نہیں کی۔ اب آپ نے اس لڑکی کو تلاش کرنے کی ہاپی بھری ہے۔ اس میں بھی ہمارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ بلکہ شاید اس پکر میں ہمیں کوئی نقصان ہی اٹھانا پڑے لیکن ہم نے ان کام کا ارادہ کر لیا ہے تو اب اسے پورا کر کے ہی چھوڑنا چاہئے۔ کسی کی مدد وغیرہ کا سوال تو اپنی جگہ ہے لیکن ہمیں اپنے تجسس کی تسکین کے لئے بھی ایسا کرنا چاہئے۔"

"فلم دیکھنے کے بعد بھی تمہاری یہی رائے ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"فلم دیکھنے کے بعد ہی تو میری یہ رائے زیادہ پختہ ہو گئی ہے سراسر! اس نے جواب دیا "آپ نے اس فلم کو دیکھ کر کوئی خاص بات محسوس نہیں کی؟ میری مراد فلم کے بے ہودہ اثرات سے نہیں ہے۔"

گھونکی بات ہے جو میرے ذہن میں کھلک رہی ہے جس میں اب تک میں اسے سمجھ نہیں پایا۔ شاید کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اسے سمجھ سکوں۔" میں نے دیانت داری سے جواب دیا۔ "آپ اسے ایک بار پھر دیکھیے سراسر! آپ ضرور اس چیز کو جانیں گے جس کا تعلق صرف احساس سے ہے اکثر باتوں کو محسوس کرنے میں آپ مجھ سے بہتر رہے ہیں سراسر! آپ نے یہی رائے سے پہلے کی نہ کسی معاملے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ آپ کو کہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی معاملے کی حیثیت کیا ہے۔ بظاہر کیا دیکھ دے رہا ہے اور اس کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔"

"شاید میری حیات کچھ کند ہوئی جا رہی ہیں۔ شاید میں معاملے میں تم لوگوں کی رہنمائی کرنے کے قابل نہیں رہا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ اپنی بے عنوان سی افسردگی کے باوجود دھیرے سے چہرہ بات نہیں ہے سراسر! آپ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ فلم دیکھ کر وقت آپ کا ذہن شاید دوسرے نکتوں میں الجھا ہوا تھا۔ آپ دوبارہ دیکھیں۔ آپ بھی اس بات کو ضرور محسوس کر لیں گے جو نے محسوس کی ہے۔ آپ کی حیات کو کچھ نہیں ہوا۔ آپ کی حیات تو شاید وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اور تیز ہوں گی۔ یہ صرف یکسوئی کی ہے۔"

"یار! کہیں مجھے مروانے پر تلے ہوئے ہو۔" میں نے کراہ کر کہا "میں ایک باریق اس فلم کو دیکھ کر مدد سے سننے لے رہا ہوں۔ تم مجھے دوبارہ دکھانے پر تلے ہوئے ہو۔ جبکہ خود باہر آ کر کھڑے ہو گئے ہو۔"

"اصل میں پھر ہم اس موضوع پر بہتر انداز میں بات چل کر سکتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ اس کے بعد بھی آپ یہاں رائے سے مشتعل ہی ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے میری رائے غلط ہو۔" وہ غصا طے لے بیٹھا۔

"بھائی! تم کیوں مجھے لمبے پکر میں ڈال رہے ہو۔ مجھے وہاں فلم دیکھنے پر مجبور کرنا کہہ دو اور سیدھی طرح خود ہی بتا دو کہ تم نے محسوس کیا ہے۔ شاید میں دوبارہ فلم دیکھ کر بغیر ہی تم سے متاثر ہو جاؤں۔" میں نے درخواست کی۔

"سراسر! آپ نے شاید فلم میں اس لڑکی کے تاثرات پر زیادہ تو نہیں دی۔ اس کی آنکھوں میں نہیں بھانکا۔ پرنت بہت صاف ہے۔ شاید ماسٹر پرنت ہے۔ ہزنیات بہت نمایاں ہیں۔ کم از کم تو کی تو آنکھوں میں بھی جھانک کر بہت کچھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے لڑکی کے تاثرات زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ میں ٹیکنیکل باتوں میں زیادہ پسند تھا کہ وہ میں نے فلم کے اصل اور بے ہودہ اثرات سے بچتے پوری چوری کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود بھلا ایسی فلموں

دی۔ یہ ایک مشکل کام ہے کہ آپ خود ہی پر کام کریں اور لی  
دی کے لوگوں کو اپنے کمر کرنے جانے سے باز رکھیں مگر میں نے ایسا  
کیا ہے میں کم عمری میں ہی ایک نہایت معزز گھرانے میں اس کی  
شادی کر دی ہوں۔

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر عمری سانس لی  
"لیکن یہ سب کچھ صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ میرے حالات  
موافق تھے مجھے شوہر بھی اچھا ملا اور میں مالی طور پر بھی آسودہ حال  
ری۔ اس وقت میں درحقیقت اپنی بچی کے جینز کی خریداری کے  
لئے ہی ایک کالک آئی ہوں۔ بچہ میں خواہ خواہ دو سری چیزوں کے  
بارے میں تجسس میں پڑ گئی۔"

کالک کالک بیزر رکھتے ہوئے وہ عمری نظروں سے میری طرف  
دیکھتے ہوئے سکرانی لیکن یہ سکرانیت دلچ سے خالی تھی۔ اس  
سے بہتر انداز میں وہ لی دی اسکرین پر سکرانیت بھی تھی۔ اس کی وجہ  
شاید یہ تھی کہ اس وقت وہ اندر سے آسودہ تھی۔ اس کا گندی چہرہ  
میک اپ سے عاری تھا اور اس پر کہیں کہیں سینے کی کوئی ننھی سی  
بوہ کیٹے لپٹا کی رنگین روشنیوں میں میرے کیٹے کی طرح چمک  
رہی تھی۔ لی دی اسکرین پر وہ بھی کھنسی کھنسی تھی۔ اس وقت اس سے  
بہتر لگ رہی تھی۔

نہایت دھبی آواز میں وہ بولی "شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ  
میں موضوع سے ہٹ چک رہی ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں تجھیں اس  
لئے اپنی بچی کے بارے میں بتا رہی ہوں کہ تم اس سے میری دانستگی  
کا اندازہ کر سکو اور یہ محسوس کر سکو کہ میں نے اسے کس ماحول میں  
پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے لیکن جب میں اندر ہال میں پہنچی  
اچانچ پر اس لڑکی کی عجیب و غریب... ناقابل بیان... بلکہ یوں کہو کہ  
لڑہ خیر نکات دیکھ رہی تھی تو مجھے بار بار اپنی بچی کا خیال آئے  
جارہ تھا۔ اپنی بچی کا قصور میرے ذہن سے نکالے نہیں نکل رہا تھا۔

میں یہی سوال میرے ذہن کوڑے جارہا تھا کہ آخر یہ بھی تو کسی کی  
بچی ہوگی۔ یہ بن مال باپ کے تو پیدا نہیں ہوگی اور جب یہ پیدا  
ہوئی ہوگی تو کیا اس کے والدین نے چشم قصور سے دیکھا ہو گا کہ بڑی  
بزرگ ان کی بچی اس بدنام مھیرال میں "دنیا بھر سے آئے ہوئے  
بیباہل کے سامنے یہ کچھ کر دی ہوگی؟"

مھیرال سے ملتی اس کیٹے میرا کا ماحول جس زندہ قاحلیں  
میری رگ دے میں برف زاموں کی سی ٹھنڈک اتر آئی۔ بعض  
لوگ کسی کو زندگی کے راستے پر اپنا ٹک ملتے ہیں اور کسی غیر متوقع  
سوال سے اسے لاجواب کر دیتے ہیں۔ اس کے حواس پر شب خون  
سلا دیتے ہیں۔ میں کچھ بھی نہ بول سکا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں کوئی سچی رہنا قسم  
کی شخصیت نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے عقیم سازی دیکھو کا شوق  
ہے میں معزز خواتین کے اجتماعات منعقد کر کے ان کے سامنے  
اس قسم کی تقریریں جھلانا نہیں چاہتی کہ یہ جو بچی بچی کی تدلیں

ہو رہی ہے۔ یہ تو ان لوگوں کی مشرق کماں ہیں۔ مجھے تو بس اپنے اسی  
ایک سوال کے جواب کی تلاش ہے جس کی اذیت مجھے ہے جین  
کے ہونے ہے۔"

چند لمحے کی بوجھل اور تکلیف دہ خاموشی کے بعد وہ بولی "یہ  
اس قسم کی بچی جگہ نہیں ہے جہاں میں آئی ہوں۔ میں اس طرح کی  
بست سی جگہوں پر گئی ہوں۔ تجھیں اندازہ ہو ہی جانا چاہئے کہ  
میرے یہ دورے خلاصہ مطالعاتی اور مشاہداتی تھے۔ نہ دیکھنے کھڑے  
کر دینے والے بست سے حقائق اس دوران میرے علم میں آئے۔  
تجھیں یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ جسم فروشی اور اس قسم کے شرمناک  
مظاہرے یہاں کی ایک باقاعدہ صنعت ہیں اور ذرا مبالغہ کمانے کا  
بڑا ذریعہ ہیں لیکن تجھیں شاید یہ معلوم نہ ہو کہ مقامی لوگوں کی یہ  
لڑکیاں جو ثقافت کی اس دلدل میں سرگڑا کر رکھ رہا ہے کی عمر کو پہنچنے  
سے پہلے ہی مر جاتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر رہن رکھی ہوئی  
ہیں۔"

"نہیں مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔  
"خیر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہاں آنے والے بیشتر لوگ  
اس قسم کی باتیں جانتے کے لئے یہاں نہیں آتے۔" وہ ادھر ادھر  
دیکھتے ہوئے بولی "میرا حال ان میں سے بیشتر لڑکیاں یہ سب کچھ کرنے  
کے بعد بھی خاصی غریبانہ زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ ان کے  
والدین نے غربت کے قابضوں کی غور ہو کر یا بعض چھوٹے چھوٹے  
قرضوں کی وجہ سے انہیں کم عمری میں ہی رہن رکھ دیا ہوتا ہے۔  
تجھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ بعض قرضے تو دو سو بائگ کالک ڈالر  
سے بھی کم ہوتے ہیں مگر سود در سود نظام، اپنے عجیب و غریب  
اخراجات اور بہت سی کنڈیوں کی وجہ سے ایک لڑکی بعض اوقات  
اپنی مختصر سی جوانی اس دلدل کی نذر کرنے کے باوجود اپنے مال باپ  
کا وہ قرضہ بے باقی نہیں کر پاتی۔"

"حیرت ہے!" میں نے تھوک نکل کر کہا۔  
"آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ باتیں عجیب نہیں لگتیں؟" اس  
نے میری آنکھوں میں چھانکا "انسان نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ یہ ترقی  
یافتہ ملک، معیشت جن کی اکلیں پر پناہ جاتی ہے اپنی چمک، مکے سے  
ہماری آنکھیں خیرہ کر دیتے ہیں۔ ہم سر اٹھا اٹھا کر مرعوبیت سے ان  
کی عمارتوں اور روشنیوں کو دیکھتے ہیں۔ اسی چیز سے کہ کچھ لوہ  
کیسی چکا چند اور شان و شوکت ہے۔ صاف ستھری سڑکیں ہیں۔  
جھل جھل کرتی عمارتیں ہیں۔ ادھر سے ادھر فراتے بھرتی لگتی  
گاڑیاں ہیں لیکن عورت کو اسی قدیم میسوس سے بھی زیادہ تکلیف دہ  
انداز میں، مجمع میں کھڑے ہو کر اپنا آپ بچھا پڑ رہا ہے۔ شاید بے  
حیث مرد کا ہیٹ بھرنے کے لئے۔ شاید اس کی پشت پہلو بوس کی  
تسکین کے لئے۔ شاید اس سے دور کا آواں ادا کرنے کے  
لئے!" وہ ایک بوجھل سی سانس لے کر... ش ہو گئی۔  
اس کا سر گھبرا گیا کسی انجانے بوجھ سے جھک گیا تھا۔ ایک لمحے

دو تین ”واقعات“ میں ہی بیڑوم ہر ذائقے سے نظر آتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا اور غیر معمولی طور پر شاندار اور پریشانی بیڑوم تھا۔ وہاں اتنی جگہ تھی کہ میدان جنگ کے سوا کسی بھی قسم کا سہل سیٹ لگا کر نکلیا جاسکتا تھا لیکن جو کچھ وہاں نکلیا جا رہا تھا اس کے لئے سیٹ نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ حقیقی لکیشن تھی۔ جی جی کا ایک عظیم الشان بیڑوم تھا۔

ہم خاموش اور ساکت بیٹھے بیٹھے دو تین ”واقعات“ دیکھ گئے۔ ان میں موبدل گئے تھے لیکن لڑکی مونا ہی رہی تھی۔ موبدل کے معاملے میں صاف نظر آ رہا تھا کہ میک اپ وغیرہ کی مدد سے ان کی شکلیں بدلنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن مونا اپنی اصل شکل میں کام کر رہی تھی۔

میرا چونکہ فلم لائن سے تھوڑا بہت تعلق تھا اس لئے میں بعض پیلوؤں کو فلساڑی کے تکرار نظر سے بھی دیکھ رہا تھا۔ لاہور میں میرا فلساڑی کا ایک ادارہ بھی کام کر رہا تھا۔ گوکہ میں اس کا سلیپنگ پارٹنر کی طرح کام کرتا تھا اور اس کے معاملات میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے باوجود محض کبھی کبھار کاموں کی حسیلیں دیکھ کر اور کچھ ذاتی معلومات و مشاہدے کی بنا پر مجھے بہت سی باریکیوں کا علم تھا اس لئے میں ان باریکیوں کو نوٹ کر رہا تھا اور پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ مجھ پر فلم کے اصل اثرات کم پڑیں۔ یہ کوشش خاصی صبر آزما تھی۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ فرشتہ ہونے کا مجھے دعویٰ نہیں تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ فلم بنانے والے پیشہ ور تھے۔ فلم میں کام کرنے والے بے شک اس میدان کے پرائے کلاڑی نہیں تھے۔ دیئے تو یہ میدان ہی ہمارے ہاں کچھ ایسا پڑا نہیں تھا کیونکہ میں نے اس طرح مکمل اہتمام سے بنائی گئی اس قسم کی پاکستانی فلموں کا کبھی تذکرہ بھی نہیں سنا تھا اور یہ یقیناً ہم پر اوپر والے کا کرم ہی تھا کہ ابھی ہم ”ترقی“ کی اس منزل پر نہیں پہنچے تھے۔

بہر حال اس فلم میں لائننگ کیرٹین کا کام اور ایڈیٹنگ وغیرہ بنیادی تھی کہ وہ انڈیوں کا کام نہیں تھا۔ اس کے پیچھے مجھے ہوئے پیشہ ور ہاتھ کام کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے اپنے ہنر کے ذریعے مرکزی کرداروں کے انداز ہی کو چھپانے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہے تھے۔ لیکن منظر کی موسیقی اور طرح طرح کی آوازوں کا استعمال نہایت خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ ڈنگ بہت عمدہ تھی۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ محض دو چار آدمیوں کا کام نہیں تھا جنہوں نے کسی کوئے کھد رہے میں کیرٹین کر کے کسی کی مرضی سے اور کسی کی مرضی کے بغیر الٹی سیدھی سی فلم بنا ڈالی تھی۔ کام بڑے منظم انداز میں کیا گیا تھا۔ میرے خیال میں ہر شے ذرا کی ذرا کوئی بھی کام کرنے والے کا اپنا ایک اسٹائل ہوتا ہے۔ جس کا شاید بعض اوقات اسے خود بھی علم نہیں ہوتا۔

بعد اس نے سراٹھایا اور ذرا ہموار لمبے میں بولی نکلیا گا کہ وہ اس ترقی کا؟

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ ترقی، معیشت، اچھائی، برائی، نیکی بدی وغیرہ کے حوالوں سے خود میرے ذہن میں ان گنت سوالات ایسے تھے جن کا مجھے کبھی جواب نہیں مل سکا تھا۔

فی دی آرٹسٹ سے پردیس کی اس طاقت میں اور بھی بہت سی باتیں ہوئی تھیں لیکن شاید وہ بھی دلچسپ کم اور تکلیف دہ زیادہ تھیں۔ اس وقت فی دی پر یہ وڈیو چلتی دیکھ کر وہ ساری باتیں یکدم ہی میرے ذہن میں نازد ہو گئی تھیں۔ وہ طاقت اچانک ہی ذہن میں ابھر آئی تھی۔ ایک اور ہی تیز رفتار سی فلم چند سیکنڈ میں ذہن میں چلی اور ختم ہو گئی۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ فی دی کی اسکرین پر جو رقص جاری تھا وہ ہانگ کانگ، بنگاک، یا اسکیڈے سے یورپ ملکوں کی ٹانٹ لائف میں دکھائے جانے والے انہی کھیل تماشوں سے ملتی جلتی کوئی چیز تھا جو تمام تر بشری کرداروں کے باوجود ان لوگوں پر گراں گزرتے ہیں جو ہر معاملے میں ایک ذوق سلیم یا مزاج میں نفاست رکھتے ہیں۔

نہیں جس چیز نے سیدھے ہو کر بیٹھنے پر مجبور کیا تھا وہ رقص نہیں، رقص کرنے والی تھی۔ وہ پاکستانی تھی۔ غیر ملکی لڑکیوں کی تو اس قسم کی فلیس عام تھیں۔ مگر اعلیٰ کرانے پر ملتی تھیں۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ کسی پاکستانی لڑکی پر بھی اس قسم کا رقص نکلیا گیا ہو گا۔

ہم اسے کسی اور ایشیائی ملک کی لڑکی سمجھ کر اپنی لاشعوری غامت کو کم کرنے کی کوشش کر سکتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ وہ مونا تھی۔ ہماری حیرت کی اصل اور سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ ہم نے اسے پہچان لیا تھا۔

میں اور شفیع شاہ قدرے کھیاہٹ کے سے عالم میں بیٹھے رہے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ آخر کار رقص ختم ہو گیا لیکن اس کے بعد جو کچھ شروع ہوا وہ رقص سے بھی زیادہ شرمناک تھا۔ وہی سب کچھ جو اس طرح کی خطرناک ترین مغربی فلموں میں ہوتا ہے وہ سب کچھ اس میں موجود تھا۔ عورت کا مقام بس یہ تھا کہ اس کا مرکزی کردار بھی مونا ہی تھی۔ میں نے جب مونا کی تصویر دیکھی تھی تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کیرے کے سامنے وہ سب کچھ کرنے کی اہل ہوگی جو میں اسے کرتے دیکھ رہا تھا۔

گوکہ اس کی حرکات و سکنات اور تاثرات میں کوئی بات تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی لیکن فی الحال میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ کوئی مختصر فلم نہیں تھی۔ اس طرح کی مغربی فلموں کے انداز میں اس میں چھوٹے چھوٹے واقعات نکلائے گئے تھے۔ واقعات الگ الگ تھے لیکن انہیں کسی ایک ہی بیڑوم میں نکلیا گیا تھا اور ان کا مرکزی کردار مونا ہی تھی۔

میں نے گاڑی سے اتر کر ان کے قریب پہنچ کر پوچھا "امیر صاحب کہاں ہیں؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا آنکھوں میں آنکھوں میں مشورہ کر رہے ہوں کہ اس سوال کا جواب دیا جائے یا نہیں۔ آخر ان میں سے ایک بولا "امیر صاحب تو اسپتال میں ہیں جناب۔"

"اسپتال میں؟" میں نے حیرت سے کہا "میری دو تین گھنٹے پہلے ہم آئے تھے تو وہ یہیں لان پر ٹھیک خاک کھڑے تھے اور صحت مند نظر آ رہے تھے۔ اچانک اسپتال کیوں پہنچ گئے؟ طبیعت خراب ہو گئی یا کوئی دوا وغیرہ؟"

"نہیں جی۔ طبیعت تو بالکل ٹھیک تھی۔ دوا بھی نہیں دیا۔" اس شخص نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "تین چار آدمی کلا شکوہ نہیں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے پہلے اندر آکر سب طرف دیکھا۔ ہم سے پوچھا کہ ہمیں اندر کیس سے دی سی آر کی دوائیں تو نہیں ملی تھیں۔ ہم نے سچ بولا کہ کسی جلی تو تھیں، ہم نے امیر صاحب کو دے دیں۔ وہ امیر صاحب سے مانگتے گئے۔ امیر صاحب نے قسمیں کھا کر انہیں بتایا کہ فلیس صرف چند منٹ ان کے پاس رہیں۔ وہ انہیں ہاتھ میں لئے لان پر کھڑے تھے کہ دو آدمی آئے اور ان سے وہ فلیس چھین کر لئے گئے مگر کلا شکوفہ والوں نے ان کی بات کا اعتبار نہیں کیا اور انہیں ہٹوں سے مارنے لگے۔ بد معاشوں نے انہیں لولہاں کر دیا جی وہ تو ہم لوگوں نے جان کا خطرہ مول لیا اور بیچ میں پڑ کر انہیں چھڑا دیا وہ تو شاید جان سے ہی ابر ڈالتے۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے تسکون ٹھکا ہوا بھرا "بڑی مشکل سے انہوں نے امیر صاحب کو چھوڑا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے اسی وقت امیر صاحب کے ایک رشتے دار آگئے۔ انہوں نے امیر صاحب کو گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گئے۔"

"اوہ یہ تو بہت بُرا ہوا۔" میں نے حقیقتاً افسوس سے کہا۔ اس شریف آدمی کی خواہ مخواہ کچھ زیادہ سی درگت بن گئی تھی۔ قیمت تھا کہ جب ہم نے امیر سے کیسٹ لیں اس وقت مزدور وغیرہ اندر تھے۔ انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسٹ لے جانے والے ہم ہی تھے جس کی وجہ سے بے چارے امیر کی شامت آئی تھی۔

"اب پولیس آئے گی اور خواہ مخواہ ہم غریبوں کی معیت آئے گی۔" مزدور بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم صرف بچ پولا۔ جو ہوا ہے وہ بتا دیتا۔ تم مزدور ہو تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"تعلق ہو یا نہ ہو۔ ہم جیسے لوگوں کی جان پولیس آسانی سے

آخر میں نے سکوت توڑا اور اس سے پوچھا "کچھ سمجھ میں آیا؟"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہاں میں آندھیاں سی چل رہی ہیں۔" شفیق شاہ بے بسی سے بولا "میں تو یہی سوچے جا رہا ہوں کہ یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"برسوں سے یہ ہمارے اخباروں رسالوں میں اداریوں کا عنوان چلا آ رہا ہے "ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس کے باوجود لوگوں کو آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور اس بات کی پروا کئے بغیر یہ وہ چلے جا رہے ہیں۔" میں نے ٹھنڈے پانی کا ایک اور گھونٹ بھر کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "در جس کو جہاں جانا ہے وہ وہیں جا رہا ہے کسی کے روکے سے رُک نہیں رہا ہے، خواہ اندھے کنوئیں میں جا رہا ہے۔ لی الحال ہمیں صرف اس مسئلے کے بارے میں غور کرنا چاہئے جو ہمارے سامنے ہے۔" "آپ نے کیا سوچا ہے؟" شفیق شاہ نے پسو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمیں اس مکان کا ایک اور چکر لگانا پڑے گا جس میں ظفر جمال رہتا تھا۔" میں نے جواب دیا "مجھے شبہ ہے کہ یہ فلیس۔ بلکہ شاید اس جیسی کچھ اور بھی فلیس وہیں بنائی گئی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا گیسٹ روم ظفر جمال ہی رہا ہو۔ شاید وہاں اس کا کوئی سراغ مل ہی جائے۔ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ ہم نے وہاں سے آنے میں جلدی کی۔ ہم مالک مکان سے فلیس تقریباً چھیننے ہی چل پڑے۔ ہمیں اندر کا بھی جائزہ لینا چاہئے تھا۔"

"مالک مکان بتا تو رہا تھا کہ ظفر جمال نے وہاں روٹی اخباروں ایک جڑی ٹوٹے ہوئے جگر گز اور کوڑے کباڑے کا سوا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔" شفیق شاہ نے مجھے یاد دلایا۔

"وہ تو ایک مالک مکان کا نکتہ نظر تھا۔ شاید ہمارے لئے کوئی ایسی چیز کارآمد ثابت ہو جائے جو اس کی نظر میں بے کار ہو۔ مثلاً یہ دو فلیس ہی اگر اس کے پاس رہیں تو وہ انہیں محض خوش فلیس سمجھ کر دیکھیں۔ کیس چھپا کر رکھتا شاید کسی کو دے دیتا لیکن ہمارے لئے ان کی کچھ اہمیت ہے۔"

شفیق شاہ نے کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے سراویچ لیتے ہیں۔ وہ مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

ہم دوبارہ اس مکان پر پہنچے تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لان پر چار پانچ مزدور منہ لٹکائے اداسی کے سے عالم میں بیٹھے تھے گویا انہیں ہمت خشک ہونے کے بعد تو کیا خون خشک ہونے کے بعد بھی مزدور نہ ملے ہو۔ مالک مکان کی گاڑی زرا تیر وے میں موجود تھی لیکن وہ خود کوئیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مزدوروں نے کچھ خوف زدہ سی نظروں سے ہماری گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ گویا چونکنا سے ہو کر بیٹھ گئے تھے ان کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔

جب کوئی عام قلم ریش نہیں لیتی تھی تو وہ سچ میں اس قسم کا کوئی "ٹوٹا" چلا دیتے تھے۔ ایک مزاحیہ اداکار جو اس دوران کافی مقبول ہو چکا تھا اس کا ایک پُرانا "ٹوٹا" تو اتنی مزاحیہ ایک مینیما میں چلا کر پولیس اس کے گھر چھاپے مارے گی۔ وہ بے جاہر اور محروم چہرچہا بھرنے لگا۔ مجھے یہ قہقہے اس لئے یاد ہے کہ اس کی جان پولیس سے میں نے ہی چھڑائی تھی۔ پولیس کا مقصد صرف اداکار کو تھوڑا سا خوار کر کے لفٹ لینا اور کچھ مال بیٹانا تھا ورنہ انہیں ان معاملات کے اخلاقی پہلوؤں سے جتنی دلچسپی ہے وہ تو ہمیں معلوم ہی ہے۔

اس سے بہت پہلے بلکہ ایگزٹو ہائٹ فلموں کے زمانے کی ایک ہیروئن کا اسکیٹل بھی کافی مشہور ہوا تھا۔ وہ تو اخباروں میں بھی آگیا تھا۔ وہ اداکارہ ایک عرصے تک وضاحتیں کرتی رہی تھی کہ وہ تو آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران جھاڑیوں کے پیچھے لباس تبدیل کرنے گئی تھی۔ اس دوران کسی نے زوم لینس لگا کر اس اہلی کا "ٹوٹا" قلمایا تھا۔ ایک طویل عرصے تک وہ پریشان رہی۔ آخر کار قلم ایگزٹو ہی چھوڑ گئی۔

شفیع شاہ نے بڑے تحمل اور قہجہ سے میری طویل وضاحت سنی۔ ایک طویل سانس لے کر میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "اس لئے سونا کا خوف ذرا ہوتا تو مجھ میں آتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔ غرووں نے تو اپنے ملے بھی بدلے ہوئے تھے؟"

"جی نکتہ تو قابل غور ہے سرا" شفیع شاہ بولا "غرووں نے تو اپنے ملے بدلے ہوئے تھے لیکن لڑکی اپنی اصل شکل میں تھی۔ اس نے لوگ تک نہیں لگائی ہوئی تھی۔ اگر اسے صرف پہچانے جانے کا خوف ہوتا تو وہ بھی اپنا جلد بدلنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ وہ شاید جلد بدلنے پر قادر ہی نہیں تھی۔ اسے اس کی اجازت ہی نہیں تھی۔ پہچانے جانے کا خوف تو اپنی جگہ تھا ہی لیکن اسے شاید کوئی اور خوف بھی لاحق تھا۔ میں نہیں سے کہہ سکتا ہوں کہ اس قلم کی تیاری میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک احتجاجی سراسر"

اس نے ایک طویل وقفے میں پہلی بار گردن ٹھہا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شگ رسی تھیں تاہم اس کا لہجہ پُر سکون ہی تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ظاہر ہے اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اس قلم کو کون کون دیکھے گا اور کس کے ہنڈیا ہات کیا ہوں گے لیکن اس نے انہی نامعلوم قماشائیوں میں سے کسی کو یہ زبان خوشی... آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ شاید کسی سوہو می امید کے سارے۔ یا پھر شاید غیر ارادی طور پر اس نے ایسا کیا ہے"

"اور وہ نامعلوم قماشائی تم ہو۔" میں نے اس کی سٹنگی آنکھوں میں جھانکا۔

یہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی سلت کون نکال سکتا ہے۔ خصوصاً یہ انسان کا ذہن پہلے ہی سے مت الجھا ہوا ہو۔

میں نے یہی بات شفیع شاہ کو سمجھائی پھر کہا "تم کلکوں میں ت مت کرو۔ پوری بات کرو۔ بلکہ ممکن ہو تو اس کی وضاحت بھی کرو۔ کچھ دیر کے لئے اپنی کم کوئی کو بالائے طاق رکھ دو۔ شاید ہم دونوں لی کر صحیح نتیجے پر پہنچے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"سرا اس قلم کے پیچھے ہتھینے کسی ہدایت کار کی ہدایات بھی کام لوری تھیں اور اس نے لڑکی کے چہرے پر لفٹ اندوزی کے اثرات پیدا کرنے کی ہر پر کوشش کی تھی۔ شاید وہ کافی حد تک بے مقصد میں کامیاب بھی ہو لیکن یہ بات صرف سطحی لوگوں کے لئے ہے۔ ان اثرات کے پیچھے درحقیقت ایک عیساک خوف تھا۔ یہ شاید سطحی لوگ محسوس نہ کر سکیں۔" شفیع شاہ بولا۔

"جی۔۔۔ اس طرح کے کاموں میں ٹوٹ بھی لوگوں کے ان میں ایک خوف تو موجود رہتا ہے نا۔" میں نے ایک لمحے کی خیال خاموشی کے بعد کہا "ہمارے ہاں یہ دھنچا پڑا نہیں ہے راہی شاید کچھ ایسا باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوا۔ اس کے وہ یہ صرف اخلاقی ہی نہیں قانونی طور پر بھی جرم ہے۔ یوں تو اسے ہاں دوسرے تمام جرائم بھی لوگ بے حد متحرک کرتے ہیں۔ ان اس میں شاید اس لئے بھی تھوڑا بہت خوف رہتا ہو کہ اس کا ویری بوجہ موجود رہتا ہے۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ شفیع شاہ بغور میری بات رہا تھا۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑا "خصوصاً جو لوگ کمرے کے لئے ایک پوز ہو رہے ہوتے ہیں ان کے ذہنوں میں تو ایک خوف وجود رہتا لازمی ہے۔ مجھے یاد ہے لاہور میں ایک بار قلم اسٹوڈیو میرے سامنے ایگزٹو سٹری کے بعض اہم لوگ اسی موضوع پر بات رہے تھے۔ بعض اداکار یا اداکارائیں جو آج کافی مشہور ہیں یہ وہ قسمت آزمائی کے لئے نئی نئی قلم ایگزٹو سٹری میں پہنچیں لی تو ان میں سے بھی بعض کی کچھ معیوب سی فلمیں تیار ہو گئی تھیں۔ وہ اس درجے کی معیوب تو نہیں تھیں لیکن بہر حال کچھ نہ نہ معیوب تھیں۔ ان میں سے ہر قلم کی تیاری کا پس منظر مختلف تھا۔ کس کسی اداکارہ کی لاعلمی میں وہ مناظر قلم لئے گئے۔ کس کسی نے دھوکا دیا گیا۔ کس اداکارہ کی نا تجربہ کاری اور انارزی پن نا فائدہ ڈھلایا گیا۔ کس اداکاروں سے گویا یہ ایک عاقبت سرزد تھا۔ کس کو کسی ناخوشی آگئے۔

میں نے تو یہاں تک سنا کہ ایک ٹولے نے فلموں میں کام کرنے کی شوقین ایک خوب صورت مگر کم عقل اور کم علم لڑکی کو کہہ کر بھی اس کی قلم بنائی کہ یہ سینے نکل کی تعلیم کے لئے ال کی جائے گی۔

بہر حال یہ یہ قصوری بے ثبوت ذہنوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ عرصہ پہلے تو یہ بھی ہوا تھا کہ بعض بدنام قسم کے سینما گس میں

"وہ آپ بھی ہو سکتے ہیں سرا کوئی بھی ہو سکتا ہے جو خوف ذرا آنکھوں کی زبان سمجھ سکتا ہو۔ وہ بھی ایسے لمحوں کے درمیان جب



ہم نے کافی صبر سکون سے بیٹھ کر وہ قلمیں دیکھیں۔  
 قلم تو کچھ زیادہ بانی نہیں تھی۔ اس کے صرف دو ٹکڑے اور  
 وہ بھی اسی بیڑم میں قلمائے گئے تھے۔ آخری ٹکڑا کافی  
 تھا۔ اسے مغربی قلموں سے بھی زیادہ تباہ کن بنانے کی کوشش  
 تھی۔ بہر حال اس میں ہمیں مزید کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی  
 ”سراغ“ کہہ سکتے۔

مونا دانی قلم دیکھنے کے بعد ہم نے پھر ”ٹنڈول“ کیا  
 ڈرکس وغیرہ پینے کے بعد ہم نے دل مضبوط کر کے دوسری  
 سی آر میں لگا لی۔

وہ بھی تقریباً اسی قسم کی۔ لیکن اس سے کچھ بہتر قسم  
 پر زیادہ محنت کی گئی تھی۔ اس میں بھی چھوٹی چھوٹی کمانیاں  
 ان میں بھی ایک ہی لڑکی مرکزی کردار ادا کر رہی تھی اور  
 نہیں تھی۔ وہ مونا سے بھی زیادہ خوب صورت تھی اور مونا  
 بہتر ”فنکار“ معلوم ہوتی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ پہلی بار  
 کا حسین اور معصوم چہرہ کھڑا پ میں کمرے کے سامنے آتا  
 ہی گمان کزرا کہ وہ وہی قلم نہیں ہوگی جیسی مونا کی تھی  
 دیر بعد وہی طے شروع ہو گئے۔

دو سرا فرق یہ تھا کہ یہ قلم اس بیڑم میں نہیں قلمانی  
 جو ہم نے مونا دانی قلم میں دیکھا تھا۔ بیڑم تو بہر حال اس  
 بھی ”بر“ ”کوئے“ میں آیا تھا لیکن وہ مجھے کسی ہوٹل کا کار  
 ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کمانیوں کے بے ضرر تھے آؤٹ ڈوٹ  
 بھی قلمائے گئے تھے گویا ایک قدم اور آگے بڑھانے کی  
 گئی تھی لیکن فنکاری یہ دکھائی گئی تھی کہ ان جگہوں کے  
 بہت سی مختصر لے گئے تھے اور کچھ اس طرح لے گئے تھے  
 جگہوں کی کوئی انفرادیت کوئی شناخت نہیں رہی تھی۔ کچھ  
 جاسکتا تھا کہ وہ کون سی بگنیس تھیں۔ ان میں کہیں کہیں  
 متعلق لوگ بھی آتے جاتے نظر آتے۔ وہ بے چارے  
 سمجھ رہے ہوں کہ وہاں کسی ٹی وی ڈرامے یا فلم کی شوٹنگ  
 ہوگی کیونکہ ان شائش کا تعلق کمانیوں کے بے ضرر  
 تھا۔

کمانیوں کے اصل کردار وہی معلوم ہوتے تھے  
 مونا دانی قلم میں بھی کام کیا تھا۔ اس میں بھی وہ انہی  
 جگہوں میں اپنے آپ کو ناقابل شناخت بناتے ہوئے  
 ایک توغاب ہی پن کر آیا تھا جس میں سے اس کی صرف  
 اور ہونٹ ہی باہر تھے۔ اس چھوٹی سی کمانی میں اس کا کار  
 تھا۔

اس قلم کی تیاری بھی مکمل طور پر اسی ٹیم کا کار  
 ہوتی تھی۔ قلم ختم ہوئی تو میں نے بیڑم فرنگ سے ٹھٹھ  
 بوتل نکالی۔ میں اور شفیع شاہ دیر تک بیٹھے ٹھنڈے پانی  
 بہرتے رہے اور سوچتے رہے۔

وہ آنکھیں بھرا ہوا لطف اندوزی کی لواکاری کر رہی ہوں۔ ”شفیع  
 شاہ ایک بار پھر بیٹھے کے پار دیکھنے لگا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن سے کوئی  
 بوجھ اُتر گیا تھا۔ میں نے ایک کمری سانس لے کر اس کے کندھے پر  
 ہاتھ رکھ رکھا اور ایک عجیب سا طمینان محسوس کرتے ہوئے کہا ”تم  
 سے تباہ ذہن خیال بہت مفید رہا ہے۔ میرے ذہن میں ایک غلطی  
 تھی۔ میں اسی لئے تم سے اتنی تفصیل سے بات کر رہا تھا کہ ہر پہلو  
 زیر بحث آجائے۔ قلم دوبارہ دیکھنے بغیر ہی مجھ میں تم سے بات کر کے  
 میرے ذہن کی وہ غلطی دور ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب سرا؟“ اس نے تجویز اُچکا نہیں۔  
 ”مطلب یہ کہ میں جس آنکھوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا وہ یہی تھی  
 جس کی تم نے وضاحت کر دی ہے۔ میرا ذہن چونکہ کچھ ٹیکنیکل  
 باتوں میں پھنس گیا تھا اس لئے میں بعض قلموں کے دوران مونا کے  
 چہرے اور آنکھوں کے تاثرات زیادہ گہری نظر سے نہیں دیکھ سکا  
 لیکن ان کی طرف میری توجہ ضرور گئی تھی اور وہ محض ایک آنکھوں  
 کی صورت میں میرے لا شعور میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ اب تم نے  
 بات کی تو گویا بات صاف ہو گئی۔“

”اور یہ بھی طے ہو گیا کہ ہم مونا کو تلاش کرنے کی کوشش  
 جاری رکھیں گے۔“ شفیع شاہ کے لہجے میں طمانیت تھی۔  
 ”یقیناً“ میں نے اس کی تائید کی ”میں یہ نہیں سمجھتا کہ  
 ہمارے اندازے سو فیصد درست ہیں۔ ہم جو کچھ سمجھ رہے ہیں وہ  
 محض ہماری خوش گمانی بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمارے دلوں کو اس حد  
 تک اطمینان ضرور ہو گیا ہے کہ اب ہم ذرا دلچسپی سے یہ کام کریں  
 گے۔“

”اب ہم کہاں سے کام کا آغاز کریں؟“ شفیع شاہ نے دریافت  
 کیا ”ہمارے سامنے مونا کا کوئی سراغ نہیں ہے۔“  
 ”تلاش کرنے سے کوئی نہ کوئی سراغ بھی مل ہی جائے گا۔“  
 میں نے ایک بے عنوان امید کے سارے کامیاب سے پہلے تو  
 ہمیں اس قلم کو مکمل دیکھنا چاہئے تھے ہم ادھوری چھوڑ آئے ہیں۔  
 اس کے بعد دوسری قلم کو بھی دیکھ ڈالنا چاہئے۔ یہ اس ضمن میں  
 پہلا ضروری کام ہے۔“

”جو میرے لئے بہت مشکل ہے۔“ شفیع شاہ گویا کراہ کر بولا۔  
 ”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا ”میرے لئے بھی یہ ایک  
 آزمائش سے کم نہیں لیکن ہم دو محققین کی طرح بیٹھ کر کسی اور محقق  
 نظر سے ان قلموں کو دیکھیں گے۔ اس طرح نہیں جس طرح عام  
 طور پر لوگ ایسی قلمیں دیکھتے ہیں۔“

”محققین کی طرح بھی ان قلموں کو دیکھنا آسان کام نہیں۔“  
 وہ بولا ”آپ کو معلوم ہے میں ان خرافات سے دور رہا ہوں۔  
 بہر حال۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کدھر اُچکا کر دیا ہم  
 دونوں واپس کمرے کی طرف چل دیے۔

”ہم امغر سے ملے اسپتال چلیں؟ شاید اس سے حملہ تو روں  
کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔“ شفیع شاہ بولا۔  
”مجھے اس کی امید نہیں ہے۔ اس قسم کے بد معاش آج کل  
کلی کلی بکھرے ہوئے ہیں جو کلا شکوفے کے کر آئے اور کسی کو  
مار پیٹ کر یا برست مار کر ہلاک کر کے چلے گئے۔ امغر بے چارہ ان  
کے بارے میں کیا بتاے گا۔“ پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر  
ایک نظر شفیع شاہ کی طرف دیکھ کر کہا ”اس کے علاوہ مجھ میں اخلاقی  
طور پر بھی امغر کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہے۔ ایک طرح  
سے ہم بھی اس کی پریشانی میں اضافے کا سبب ہی بنے ہیں۔ پہلے وہ  
صرف مالی چوٹ ہی کھائے بیٹھا تھا۔ ہماری وجہ سے اس نے جسمانی  
چوٹیں بھی کھالیں۔ اگر ہم اس سے قلمیں چھین کر نہ لے گئے  
ہوتے تو یقیناً وہ بے چارہ قلمیں ان کے حوالے کر کے جان  
چھڑا لیتا۔“

”تمی ہاں یہ بات تو ہے۔“ شفیع شاہ دیکھے لمحے میں بولا پھر ایک  
لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا ”آپ کو یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا  
ہو گا کہ قلمیں اسی پنگلے میں تیار ہوتی تھیں یا نہیں کیونکہ وہ تو اب  
بالکل خالی اور شکستہ حال پڑا ہے۔“

”اس کے باوجود مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ دونوں قلموں میں  
کوئی بھی حصہ اس گھر میں نہیں قلمایا گیا۔“ میں نے جواب دیا۔  
”وہ کس طرح سر؟“

”سو ناوالی پوری قلم میں بند رہا ایک ہی نظر آیا۔ دو تین جگہ  
اس کا دروازہ بھی نظر آیا تھا جو میرے ذہن میں رہ گیا۔“

”میں سمجھ گیا سر!“ شفیع شاہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا ”مجھے  
بھی یاد آ گیا ہے۔ وہ دو کنورین اسٹائل دروازہ تھا جبکہ اس پورے گھر  
میں کوئی دروازہ دو کنورین اسٹائل نہیں تھا۔“

”بالکل ٹھیک مجھے تہ۔“ میں نے کہا ”وہ کسی بہت ہی عالی شان  
پنگلے کا بند رہا تھا۔ مجھے نہیں ہے کہ ظفر جمال دالا بنگلا تو جب ٹھیک  
حالت میں ہو گا تب بھی اس کا پاسک نہیں ہو گا۔ یہ تو ایک عام سا  
بنگا تھا اور اس کے کمرے کچھ ایسے طویل و عریض بھی نہیں تھے۔“  
شفیع شاہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”سرا آپ کی نظر  
تو ایک سرافراز مکان کی سی ہوتی جا رہی ہے اور آپ جزییات پر اسی  
طرح غور کرنے لگے ہیں۔“

”میری نظریات سے ایسی ہی ہے اور میں اسی طرح جزییات پر  
غور کرتا آیا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کل تم سے چاروں خیال  
کرنے کا اتفاق زیادہ ہو رہا ہے۔ ویسے ہم سب کو ہی حالات کے  
مطابق اپنی ذہنی و جسمانی ملا جلتوں سے کام لینا پڑتا ہے اور  
ضرورت کے مطابق کسی کو دار میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی ہے  
کہ تم سمیت میرے تقریباً سبھی ساتھی ایسا کر لیتے ہیں۔“

”ہم تو قلمی گزارا کرتے ہیں سرا!“ وہ انکساری سے بولا۔  
”یہ گزارا ہی میرے لئے کافی ہے۔“ میں نے کہا ”آپ جنہیں

کہاں چھوڑتی ہے۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔  
میں اور شفیع شاہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھے تو وہ گویا  
چرنا اور ہچکچاتے ہوئے بولا ”آپ کون ہیں جی؟“  
”ہماری امغر صاحب سے اس پنگلے کو خریدنے کے سلسلے میں  
کچھ بات چیت ہوئی تھی۔ اس کی حالت ذرا ٹھیک ٹھاک ہو جائے  
پھر بات آگے بڑھائیں گے۔ ہم نے سوچا کہ فی الحال مرمت وغیرہ  
ہونے سے پہلے ہی ایک نظرا سے دیکھ لیں۔“ میں نے سرسری سے  
لمحے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ مزید کچھ نہ بولا۔

مکان ٹھکڑی پڑا تھا اور اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ تمام پکرا مٹی  
اور ٹٹی پھوٹی بے کار شیا ہزاروں نے باہر ڈرا دیوے کے ایک  
حصے میں دھیر کردی تھیں۔ ہم نے تمام کمروں کا جائزہ لیا پھر اس دھیر  
کو بھی دیکھا لیکن ہمیں کوئی قابل توجہ چیز نظر نہیں آئی۔

اندیشہ تھا کہ کوئی ایسا شخص وہاں نہ آئے ہوئے جو ہمیں مشکوک  
سمجھ کر کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کرے اس لئے ہم جلدی  
وہاں سے واپس چل دیے۔ راستے میں شفیع شاہ بولا ”بے چارے  
امغر کے ساتھ تو بہت ہی بڑی ہوئی۔“

”واقعی اس کا مجھے بھی افسوس ہے۔“ میں نے کہا ”اور ساتھ  
ہی اس عجیب و غریب اتفاق پر حیرت ہے کہ صرف چند منٹ پہلے ہم  
اس کے پاس پہنچے تھے۔ اس لئے وہ کیسٹ ہمارے ہاتھ آگئیں ورنہ  
شاید ہمیں پتا بھی نہ چلا کہ وہاں سے وہ کیسٹ بھی برآمد ہوئی  
تھیں۔ بس طرح آسانی سے ہم انہیں امغر سے لے آئے تھے۔  
اسی طرح وہ نامعلوم لوگ لے جاتے اور امغر سے ہماری ہتھکڑی  
دوران شاید ان کا ذکر بھی نہ آتا۔“

”جنس طرح ان لوگوں نے امغر کو مارا بیٹا ہے اس سے ظاہر  
ہوتا ہے کہ ان قلموں کی کوئی خاص اہمیت ہے۔“ شفیع شاہ کچھ  
سوچتے ہوئے بولا ”محض ان کا نقش ہونا اہم نہیں ہے۔“

”یہ تو میں پہلے ہی محسوس کر رہا ہوں۔ ظفر جمال نے محض ان  
کے نقش ہونے کی وجہ سے انہیں قلم کی نگارہ نگلی میں نہیں چھپایا  
تھا۔ اس نے یا تو پنگلی طور پر انہیں وہاں چھپایا تھا اور بعد میں  
ساتھ لے جانا بھول گیا یا پھر وہ یہاں سے جاتے وقت انہیں ساتھ  
لے جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ پھر کسی  
وقت یہاں سے نکال لے جائے گا۔ اسے تو قلع نہیں رہی ہوگی کہ  
امغر اپنی جلدی مکان کی مرمت شروع کر دے گا۔“ میں نے خیال  
ظاہر کیا۔

”تو پھر آپ کے خیال میں کچھ دیر پہلے جو لوگ قلموں کے  
بارے میں پوچھتے آئے تھے اور امغر کو ذمگی گھر کے مجھے ہیں وہ ظفر  
جمال کے آدمی تھے؟“ شفیع شاہ نے دریافت کیا۔

”یہ بھی ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی دوسری پاداشی  
رہی ہو جس کے خوف سے ظفر جمال نے قلمیں چھپائی ہوں۔“ میں  
نے جواب دیا ”مسئلہ سمجھنے کے بجائے مزید اچھتا جا رہا ہے۔“

ہے کہ یہ شعبہ میں تمہارے سپرد کر دیا ہوں۔ اب تمہیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ یہ معلومات کس طرح حاصل کی جائیں۔ اس مقصد کے لئے کچھ لوگوں کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہیں جو کہ وہی فرج ہوتا ہو تو کہو۔ جتنی بھی رقم خرچ ہو، پروا مت کرو۔ جب ہم نے ایک کام کے لئے کس کس کی مدد ہے تو پھر اسے کر کے چھوڑیں گے اب قطع نقصان کی پروا نہیں ہے۔ تمہیں خود زیادہ سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک جگہ بیٹھ کر ڈیڑھ بجے بلا سکتے ہو لیکن کام ذرا جتنی سے کرنا ہے۔ تم باقی سب کچھ چھوڑ دو۔ بس یہ معلومات حاصل کرنے میں لگ جاؤ۔

”میں سمجھ گیا سراجو کچھ بھی ممکن ہو اور ضرور ہو جائے گا۔“

اس کے سبب میں وہی پڑانا اتحاد لوٹ آیا تھا۔

”اسی عرصہ میں تمہیں ایک کام اور کرنا ہے یا کسی سے عمل کروانا ہے۔ وہ معیوب نہیں ہے۔ مجھے یاد آیا ”مونا والی“ قسم میں ہم نے مشہور آرٹسٹ ہادی کی ایک پینٹنگ دیوار پر آویزاں رکھی تھی۔ اس کا باقاعدہ ایک عنوان بھی تھا ”شام اور سویرا“۔ وہ ایک بڑے آرٹسٹ کی بڑی پینٹنگ تھی۔ اس قسم کی پینٹنگ بڑے اہتمام سے رکھی ہیں۔ وہ اگر کسی نمائش وغیرہ کے بعد کسی گیلری کے قریب سے گئی ہوگی تب بھی اس کا کوئی نہ کوئی ریکارڈ موجود ہو گا اور اگر کسی نے آرٹسٹ سے براہ راست خریدی ہوگی تب بھی آرٹسٹ کی یاد ہوگا۔ شرمیں چند ہی آرٹ گیلریز یا ایسی جگہیں ہیں جہاں بیٹنگ کی نمائش ہوتی ہے۔ تم ان سے اور آرٹسٹ ہادی سے براہ راست رابطہ کر کے صرف یہ معلوم کرو کہ پینٹنگ ”شام اور سویرا“ کس نے خریدی تھی۔“

”یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہ تو میں معلوم کر لوں گا۔“

شفیع شاہ بے پروائی سے بولا۔

”میرا خیال ہے اگر ہم نے سلیتے سے اپنے ذہن اور ہاتھ پیروں کو استعمال کیا تو ہم ان فلموں کے سارے چکر کی تفصیلات بھی معلوم کر لیں گے اور مونا کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“ میں نے پڑا اپنے لہجے میں کہا۔

”سراجو میں بھی اپنے آپ کو کچھ جرجوش اور تیزان ذہن محسوس کر رہا ہوں جیسے یہ کوئی اہم کام ہے۔ پہلے میں تمہیں کوئی چھوٹا سا اخلاقی فریضہ سمجھ کر بس پونہ بیس روپیہ سے انجام دینے کی سوچا تھا۔“ شفیع شاہ بولا۔

اس دوران ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے شفیع شاہ میرے ساتھ رہا۔ ہم آفس پہنچے تو دیکھا امیر اور غدار میرے ہی کمرے میں بیٹھ گئے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ میری ہی فکریات میں کسی آکھیں کچھ جھلی جھلی سی نظر آ رہی تھیں۔ وہ مجھے کچھ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق تھا تاہم ان نے نہ صرف بڑے ہی ادب و احترام سے مجھے سلام کیا بلکہ دیکھتے ہی ہڑا کر اٹھ بھی کھڑی ہوئی۔

بھی ذرا ایک سراسر غماں کے سے انداز میں حرکت میں آتا ہے اور جلد از جلد کچھ باتیں معلوم کرنی ہیں۔“

”وہ کیا سر؟“ اس نے دریافت کیا۔ اس وقت ڈرائیو تک پہنچی وہی کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ دھکیل رہا تھا اور ایک کبھی بے پروائی سے کھڑکی میں لگی ہوئی تھی۔ موڑ کاتے وقت بھی وہ دوسرے ہاتھ کو کم ہی زحمت دیتا تھا۔ اس کا انداز بیٹھ ایسا ہی مشائشانہ ہوتا تھا۔ گاڑی جتنی زیادہ بڑی اور جتنی زیادہ شاندار ہوتی تھی وہ اتنی ہی زیادہ بے پروائی سے ڈرائیو کرتا تھا۔ اس کا گناہ تھا کہ شاندار گاڑی کا یہی تو سب سے بڑا فائدہ تھا کہ وہ اشارے پر چلتی تھی۔

”سب سے پہلے تو تم یہ معلوم کرو کہ یہ فلمیں مارکیٹ میں تو نہیں چل رہی ہیں۔“ میں نے کہا ”تمہارے ہاں ہر قسم کے دیوے فلموں کا کافی پرائیوٹ ورک موجود ہے۔ کافی بڑی مارکیٹ کام کر رہی ہے۔ اس میں ایک بڑا حصہ خوش فلموں کا بھی ہے۔ اس سرکل کے بڑے کرکوں کو پکڑنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ فلمیں اوپن مارکیٹ میں نہیں چل رہی ہیں تب بھی ان بڑے کرکوں سے دوستانہ انداز میں ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے۔ شاید اس طرف بھی کوئی واضح اشارہ مل جائے کہ ان فلموں کی تیاری میں کس لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ہر فیڈ کے لوگ اپنے اپنے شعبے کے ٹیکنیکل لوگوں کو جانتے ہیں اور ان کے کام کو پہچانتے ہیں۔ شاید کچھ ”ہیرن“ ان فلموں کو دیکھ کر ان کے بارے میں بھی کچھ رہنمائی کر سکیں۔“

”یہ تو کافی مشکل کام ہے سراجو“ شفیع شاہ تشویش آمیز انداز میں سر ہچکاتے ہوئے بولا۔

”میں خوب سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہلکا سا ٹکونا مارے ہوئے کہا ”تم نے آج تک کسی کام کو مشکل نہیں کہا۔ یہ کام دراصل تمہیں مشکل نہیں بلکہ معیوب لگ رہا ہے۔ تمہیں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ایسے حلقوں میں جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا کیونکہ یہ تمہاری نظر میں ایک گھٹیا کام ہے۔ مجھے اس پر خوشی بھی ہے کہ آج کے دور کا نوجوان ہونے ہوئے بھی تمہارے رجحانات آج کے دور کے نوجوانوں جیسے نہیں ہیں لیکن کام کو تو بحال کام سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے پچھلے دنوں ریڈ ڈاٹ کے خلاف جدوجہد کے دوران ہم میں سے کوئی تقریباً ہوا تھا کوئی ڈرائیو کر رہا تھا اور دیکھا رہا تھا تو کوئی غائب ہو کر رہ گیا ہوا تھا۔ یہ سب سوچ عارضی تھی۔ ایک اچھے متعدد کے حصول کے لئے نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تم چند دن کے لئے ہموں جانا کہ تم شفیع شاہ ہو۔“

”اوکے سراجو“ اس نے فوراً ہی سعادت مندی سے کہا۔

”یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ ساری پوچھ گچھ تم خودی کرو اور ہر جگہ خود ہی جاؤ۔“ میں نے اسے تسلی دی ”میرا مقصد صرف یہ

کی کوشش کرتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "مفضل صاحب! سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ آپ نے مونہ کو تلاش کرنے کی ہائی بھلی ہے۔ امیر نے جب مجھے یہ بتایا تو مجھے اپنے کانوں پر تعین نہیں آیا کیونکہ آپ کا انکار مننے کے بعد میں بڑی ہی دل شکستگی کے عالم میں یہاں سے رخصت ہوئی تھی۔ میرا خود کشی کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے مگر میں اندر ہی اندر رو رہی تھی۔

میں باہر فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ میرے چاروں طرف بلند دیوار، صاف ستھری عمارتیں تھیں۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی نہ ٹوٹنے والی قطاریں تھیں۔ پیدل آنے جانے والے بھی کچھ کم تھے لیکن میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میں اپنے آپ کو کتنا تھا محسوس کر رہی تھی۔ ہم جیسے کم مایہ اور معمولی لوگ دیسے بھی بڑے تنہا ہوتے ہیں سڑا کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوتا۔ ہم جیسے مسائل میں گھرے ہوئے لوگوں سے دوسرے لوگ ویسے ہی دور بھاگتے ہیں کہ کہیں ہم کوئی سوال نہ کر دیں کوئی مدد نہ مانگ لیں۔

آپ تو پھر بھی اتنے بڑے۔ اتنے مصروف آ رہی ہیں۔ آپ سے ہماری کوئی شناسائی، کوئی واقفیت بھی نہیں تھی۔ آپ پر ہمارا کوئی حق بھی نہیں بنتا تھا۔ آپ نے انکار کیا تھا تو ٹھیک ہی کیا تھا۔ میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن دل تھا کہ بدستور رنجیدہ تھا۔ مجھے جو دکھ، جو بے چاری ہوئی تھی وہ تو اپنی جگہ تھی لیکن مجھے ایک عجیب طرح کا توہین کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ شاید میں امیر کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی مان سے آپ کے پاس آئی تھی اور آپ نے وہ مان تو ڈرا تھا۔ میں... میں... جھوٹ نہیں بولوں گی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت میں آپ سے نفرت محسوس کر رہی تھی۔ "اس کی زبان لاکڑا گئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ اس کے ہونٹ نیم داغ تھے۔ وہ گویا ایک جھکے ہوئے پردے کی طرح ہانپ رہی تھی۔

میں اس کی صاف گوئی پر بے ساختہ مسکرایا۔ اس کا لہجہ دھیمہ اور انداز بیان دل نشیں تھا۔ وہ اپنے محسوسات کو عمدگی سے بیان کر سکتی تھی۔ میں، امیر اور شفیع شاہ تینوں ایک تک اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کلاس روم میں بھی شاید وہ اسی طرح سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہوگی۔

میں نے اپنی زندگی میں یہ پہلی کلاس میجر دیکھی تھی جو اتنے دھیمے لہجے میں بات کرتی تھی ورنہ کلاس روم میں بچوں کو بڑھانے والوں کو عموماً جھج کر اور کشت لہجے میں بات کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ عام زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے وہ بات نہیں کر رہے بلکہ کلاس کو ذانت لٹ رہے ہیں۔ شاید عذر دینے کا کلاس روم اور عام زندگی کے انداز مختلف ہے درمیان ایک حد کا صل قائم رکھی تھی۔

میں نے اسے پہنچنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اپنی کرسی منہاں اور امیر سے پچھا "تم ابھی تک گھر نہیں گئیں؟ رات ہو چکی ہے۔ کیا آج کچھ زیادہ تھا؟"

"نہیں سراسر میں تو شام کو پہلی گئی تھی۔ گھر جا کر دوبارہ آئی ہوں۔ مجھے یہ ذہن سستی لائی ہے۔" اس نے عذر دہانی کی طرف اشارہ کیا "یہ آپ سے آج ہی دوبارہ ملاقات کرنے پر چلی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں نے گھر سے فون کر کے معلوم کر لیا تھا کہ آپ ہوسٹل میں موجود نہیں ہیں اور آپ کا کچھ پتا بھی نہیں ہے کہ آپ کہاں گئے ہیں۔ آپ کے سوا ہوسٹل فون پر بھی کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔"

شاید اس کا فون اس وقت آیا ہو جب ہم میڈم نور کے پاس گئے ہوئے تھے۔ اس وقت میں فون باہر گاڑی میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ ہر حال میں خاموش رہا۔

امیر بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ عذر دہانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "لیکن یہ بھڑک رہی کہ ہمیں ضرور آپ سے ملنا چاہئے خواہ کتنی ہی دور انتظار کرنا پڑے۔ مجبوراً مجھے اتنا پڑا۔ ویسے ہمیں یہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"

اس نے ایک نظر میرے اور شفیع شاہ کے منجیدہ چہروں کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "مرا! اگر آپ زیادہ مصروف ہیں تو اس عذر دہانی کی بجائی کو ذرا سمجھا دیجئے کہ یہ پھر کسی وقت آجائے۔"

"نہیں ایسی کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے۔" میں نے عذر دہانی کی طرف دیکھا "اور جو مصروفیت ہے وہ بھی انہی کی بخشی ہوئی ہے۔" میں نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا تھا اور خود اسے مسکراتے کی بھی کوشش کی تھی جس سے شاید عذر دہانی کو کچھ حوصلہ ہوا۔

اس کا استخوانی سا چہرہ دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے گھر سے، گھرے حوالی ہوٹلوں پر۔ جو اس کے چہرے کا واحد خوب صورت ترن حصہ تھا۔ قدرے نرم و انداز میں زبان بھیر رہی تھی۔ سونے کی ٹیشوں والی عینک کے عینک میں آنکھیں بدستور پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی رنگت بھی اُبلجی تھی اور اس کا دہنا بھی سفید برف سا تھا۔ اس عالم میں وہ اپنی پسند نوری کے باوجود نہایت مصروف اور پاکیزہ ہی لگی۔ اس کی شخصیت میں ہلکا سا تقدس ضرور تھا اور پھر وہ ایک نیچر بھی!

میں غیر ارادی طور پر ایک تک اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔ دراصل میرے ذہن میں سونا والی قسم کے کچھ مناظر گھوم رہے تھے اور میں اس تضاد پر غور کر رہا تھا۔ بڑی، مین کی تھی اور کس دنیا میں رہ رہی تھی۔ چھوٹی، مین نہ بنائے کس دنیا میں پہنچی ہوئی تھی اور کیا کچھ کر سکتی تھی؟ کیا کچھ کر رہی تھی؟ یہ تضاد حیران کن اور حیرت انگیز تھا۔

مجھے یوں خود اپنی طرف دیکھتے ہوئے عذر دہانی کی سفید سی رنگت میں نہایت بھی سی شرمندہ ہوئی تاہم وہ اپنے اضطراب کو چھپانے

”آپ نے میری بات کا بڑا اثر نہیں مانتا سر؟“ اس نے ملتجیانہ سے لہجے میں پوچھا۔ شاید میری مسکراہٹ سے بھی اسے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ اسے یہ بھی شہ تھا کہ شاید میرے دل میں غصہ ہو حالانکہ میرے دل میں پہلے بھی اس کے لئے غصہ نہیں تھا اور اب تو میرے دل میں اس کے لئے صرف ہمدردی ہی ہمدردی تھی۔ وہ ایک چوٹی کی طرح نہایت مستقل مزاجی سے نہایت لگن سے اپنی مومن عین اپنی حزل کی طرف ستر کھٹنے والی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ وہ خواہ کتنی ہی معمولی لڑکی تھی اور اس کی حزل بھی خواہ کتنی ہی معمولی رہی ہو لیکن اس کے مزاج کے دیکھنے پر اور اس کی استقامت میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔

”میں اب تمہاری کسی بھی بات کا بڑا مانتا ہوں تو اس کے لئے مجھے کافی کوشش کرنا پڑے گی۔“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے یہ بتاؤ کہ جب وہ شکستہ دل لڑکی اونی عمارتوں اور نیچے انسانوں کے اس جنگل میں فٹ پاتھ پر تھاپلی جا رہی تھی تو کیا ہوا؟ کیا کوئی گاڑی بسکول کی چرچہ اسٹ کے ساتھ اس کے قریب آکر رکھی؟“

”جی ہاں“ اس کی پتلی پتلی سفید انگلیاں میز پر رکھے ایک پیپر پٹ پر تختی سے جم گئیں۔ ”وہ ایک بڑی سی سفید گاڑی تھی۔ انہوں نے مجھے اتنی بھرتی سے اندر کھینچا کہ میں گاڑی کے درجے کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھ سکی۔ میرے منہ پر ایک ہاتھ تختی سے جم چکا تھا۔ میں جیج بھی نہیں سنی اور یہ ایک بھری پڑی سڑک پر ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے یہ سب کچھ دیکھا ہو گا لیکن کسی نے بھی کچھ نہیں کیا۔ لوگوں اور گاڑیوں کا جلاپ اسی طرح رواں رہا۔ کسی طرف سے کوئی چیخ کوئی بلند آواز تک سنائی نہیں دی۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ ناسف تھا۔

”شہروں پر اب اسی آسیب کا تو سایہ ہوتا جا رہا ہے۔“ میں نے کرسی کے پتے سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اب ہر اس سانچے سے نظر خرا کر دیکھا ہے جس کا تعلق ہماری ذات سے نہ ہو۔ بلکہ اگر کسی ایسے پر قیامت گزرے جس سے ہمارا زبان عقیدے، مسلک یا سیاست کا اختلاف ہو تو ہم دوشی سے مجلس بھی بناتے ہیں۔ خیر تو پھر کیا ہوا؟“

وہ ٹھہر جھری سی لے کر بولی ”انہوں نے جلد ہی گاڑی ایک بنگلی گلی میں موڑ لی پھر اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں گھماتے ہوئے میرے دونوں پہلوؤں میں نہیں بچھوتے ہوئے وہ پوچھنے لگے کہ میں آپ کے پاس کس طبلے میں گئی تھی۔ میں نے بتا دیا۔ بالکل سچ سچ بتا دیا کہ میں آپ کے پاس کیوں گئی تھی۔ انہیں پہلے ہی اندازہ تھا۔ اور یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی۔ ہر حال پھر وہ پوچھنے لگے کہ آپ نے کیا جواب دیا۔ میرے منہ سے قطعی غیر ارادی طور پر نکلا کہ آپ نے مونا کو تلاش کرنے کی ہائی بھری تھی۔ معلوم نہیں یہ میری ناشعوری خواہش تھی یا میں انہیں بھی آپ کے انکار کے

بارے میں بتاتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ انہوں نے مجھے ”آپ کو مونا کو کچھ گندی گندی گالیاں دیں پھر آپ کے بارے میں کہنے لگے کہ آپ سے تو وہ خودی منٹ لیں گے۔“

”میرے بارے میں ان کی طرف سے حکم صادر ہوا کہ میر فوراً اپنی نخوس شکل لے کر دفن ہو جاؤں اور دوبارہ کراچی میں نظر نہ آؤں ورنہ میرا جو حشر ہو گا اس پر آسمان بھی آنسو بہائے گا پھر انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ میرا خوب صورت اور پُرکشش نہ ہونے میری خوش قسمت تھی ورنہ اس وقت جس طرح انہوں نے مجھے اٹھانے کی ذمت کئی تھی وہ مجھے ساتھ ہی لے جاتے۔ انہوں نے ایک سٹیشن ہی گلی میں مجھے لات مار کر گاڑی سے نیچے بھیج دیا۔ محاورہ ”آپ نہیں۔“ انہوں نے حقیقتاً میری کمرہ لات ماری تھی۔ ”آپ بے اختیار کمرہ ہاتھ رکھ کر کراچی کو وہ لمحہ یاد آئے پر تکیف عود کر آئی ہو۔“

”انسان کبھی دوسروں کے انجام سے سبق نہیں لیتا۔ فرعونیت اگر ایک بار اس کے دماغ میں گھس جائے تو پھر آسمانی سے بچھا نہیں چھوڑتی۔“ میں نے کہا ”جو لوگ تمہارے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے کچھ دیر بعد ان کی لاشیں یہاں بکھری پڑی تھیں۔“ میں نے چادروں طرف اشارہ کیا۔ آفس کی صفائی دیکھ کر کے ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک کر دی گئی تھی۔ اب اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے وہاں لاشیں پڑی تھیں اور وہ چیز اٹ پٹ تھی۔

”جی سر۔ امیر نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں تو کافی خون خرابا ہوا۔ خود آپ کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔“ وہ بڑی تعجب سے بولی۔ ”شہزادے تو زندگی کے ساتھ ہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”جو اپنی دانست میں خطرات منول نہیں لے رہے ہوتے ان کی زندگی کو بھی نہ جانے کون کون سے خطرات لاحق رہتے ہیں۔“ اب میں اسے کیا بتانا کہ میری جان کتنی مرتبہ خطرے میں پڑ چکی تھی۔ وہ شاید اسے ایک انسان سمجھتی۔ نہ جانے کب تک زندگی اسی طرح گزرتی تھی اور نہ جانے کس موڑ پر زندگی کا سورج غروب ہو جاتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا ”جب ہمیں گاڑی سے نیچے بھیج دیا گیا تو پھر تم نے کیا کیا؟“

”ہم بھی لڑکیاں اس قسم کے معاملات میں ڈوبنے کے سوا کیا کر سکتی ہیں سر؟“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”تاہم میں نے دوڑنے سے پہلے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان اور عزت سچ گئی تھی۔ توڑی کی توہین اور معمولی چوڑوں پر یہ بات ٹل گئی تھی۔ کلی چونکہ سٹیشن تھی اس لئے پھر میں نے پلٹے پلٹے تھوڑے سے آنسو بھی بہا لیے جس سے کسی حد تک دل کا غبار نکل گیا۔ کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد مجھے ایک رکشال ٹپا اور میں گھر ٹپکی گئی۔ میرا مطلب ہے امیر کے گھر۔“ اس نے امیر کی طرف اشارہ کیا ”وہاں میں نے اپنا علیہ

میں تائب شدہ الفاظ کا مغموم کچھ یہ تھا کہ مونا جب اس کے پاس رہنے کے ارادے سے آئی تھی تو اس نے مونا کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا جس کا اسے بہت بعد میں احساس ہوا تھا۔

پھر اس پر دل کا دودھ بڑا اور اس نے گویا موت کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ صاحب فرماں تھا تو مونا کے سلسلے میں اس کا بچپن سارا شدید تر ہو گیا۔ اس کی زندگی کا کوئی بخروا نہیں تھا۔ وہ لاولد تھا۔ اسے اپنے سلوک کی غلطی کا سب سے بہتر طریقہ ہی نظر آیا تھا کہ وہ اپنی تمام دولت و جائیداد مونا کے نام کر جائے اس کی موت کے بعد وہ اس کی وارث ہو۔

”ہائے اس زور پشیمان کا پشیمان ہونا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے خط شفیق شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بھی دونوں چیزیں پڑھیں۔ اس دوران کمرے میں گہرا سکوت رہا۔ امیر اور عذرا کبھی میری طرف اور کبھی شفیق شاہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

خط اور وصیت نامہ پڑھ کر شفیق شاہ نے میری طرف دیکھا اور ہم دونوں گہری سانس لے کر رہ گئے۔ صرف ہم دونوں کو معلوم تھا کہ مونا کے رشتے کے چچا نے جو یہ لکھا تھا کہ اس نے مونا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا تو اس سے درحقیقت اس کی کیا مراد تھی۔ میڈم نور کے بڑے تنگ ہاؤس میں ملنے والی لڑکی تھیں نے اگر ہمیں اصل بات نہ بتائی ہوتی تو ہم بھی اسے ایک عام سی بات ہی سمجھتے۔ ہمیں حالات کی اس قسم طرفی نے بھی چند لمحے کے لئے افسوس زدہ سے انداز میں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ایک لڑکی کو قسمت نے عجیب و غریب انداز میں سزا دی تھی لاکھ کے ٹکٹوں کا مالک بنا دیا تھا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں تھی۔

عذرا میری اس سوچ کو الفاظ کی صورت میں زبان پر لاتے ہوئے حسرت آمیز لہجے میں بولی ”اب جب ہمارے دن پھرنے کا وقت آیا تو وہ سزا کی غیروار لڑکی نہ جانے کہاں غائب ہے۔“ یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں غائب تھی لیکن ظلم کی صورت میں ہم اس کی جو سرگرمی دیکھ چکے تھے اس کے بارے میں بھی عذرا یا امیر کو کچھ نہیں پتا سکتے تھے میں خاموشی سے عذرا کی طرف دیکھا اور مونا کے بارے میں سوچا رہا۔

عذرا چلو بولنے ہوئے بولی ”فضل صاحب! اس وصیت کے سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”فی الحال تو آپ دو مکمل صاحب کو لکھ دیں کہ مونا کیس جی ہوئی ہے جہاں اس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ جو کئی دو ماہ اس آئے گی اسے حیدر آباد بھیج دیا جائے گا۔ تب تک جائیداد اور دیگر ٹکٹوں کو ”جہاں ہے اور جیسا ہے“ کی بنیاد پر رکنا جائے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت بہتر۔“ عذرا معذرت مندی سے بولی ”آپ سے مشورہ کہ کے میرے دل کو سکون مل گیا ہے۔“ پھر اس نے پراسید لہجے میں پوچھا ”مونا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ میری۔ من ل

ٹھیک کیا، کینزے بدلے اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس واقعے کے بارے میں سوچ سوچ کر در تک کا پتہ پڑی۔ امیر کے گھر میں میں نے کسی کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ مجھے امیر کا انتظار تھا۔ امیر آئی تو اس کی حالت مجھ سے زیادہ غراب تھی۔ تاہم یہ اپنے آپ کو بہت جرات سے سنبھالے ہوئے تھی۔ تنہائی میں بیٹھ کر ہم نے ایک دوسرے کو اپنی داستان غم سنائی۔“

پھر وہ سر جھکا کر ہونے بولی ”سرا! آپ نے خواہ غصہ میں آکر یا کسی اور وجہ سے مونا کو تلاش کرنے کی ہائی بھری ہے۔ لیکن میرے لئے اتنی ہی کافی ہے کہ آپ نے ہائی بھری ہے۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔ میں یہاں سے جتنا شک و شبہ دل لے کر گئی تھی اب میں اتنی ہی خوش ہوں حالانکہ ابھی مونا ملی نہیں ہے۔“

پھر اس نے سر اٹھایا۔ اس کے تراشیدہ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن۔ افضل صاحب! اس وقت درحقیقت میں یہ سب باتیں کہنے نہیں۔ بلکہ کچھ اور بتانے آئی تھی۔“ اس نے امیر کی طرف دیکھا ”تو راہ خط نکالو اور افضل صاحب کو دکھاؤ۔“

امیر نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے پنڈ بیگ میں سے ایک خاک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی ”یہ خط اصل میں عذرا کی والدہ کو موصول ہوا تھا۔ انہوں نے میرے بچے پر عذرا کے لئے بھیج دیا ہے۔“

لغاف لگھا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے خط نکالا۔ وہ کسی دیکل کے لیٹر ہیڈ پر تائب شدہ خط تھا جو اس نے حیدر آباد سے مونا کے نام لکھا تھا۔ انگریزی میں اس خط میں رکی اور قانونی زبان میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ حیدر آباد میں اس کے رشتے کے چچا کا انتقال ہو گیا تھا۔ انہیں دل کا دودھ پڑا تھا جس کے بعد وہ چند دن صاحب فرماں رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی وصیت مرتب کرائی۔ چند دن بعد انہیں اسپتال میں ہی دو سرا دودھ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔

وہ لاولد مرے تھے اور وصیت کے مطابق انہوں نے اپنی تمام جائیداد اور نقد پیسہ وغیرہ مونا کے نام چھوڑا تھا۔ لطیف آباد میں ایک بڑی کوٹھی تھی۔ ایک ٹکڑی مل تھی۔ کچھ دیگر اثاثے تھے۔ نقد رقم تھی۔ سب ملا جلا کر تقریباً سترائی لاکھ مالیت کا ترکہ تھا جس کی قانونی وارث مونا بن چکی تھی۔

خط میں اس سے درخواست کی گئی کہ مونا حیدر آباد آکر یہ تمام چیزیں اپنے نام منتقل کرانے کی کارروائیاں مکمل کرائے اور ان کا نظام سنبھال لے۔ اس کے بعد وہ مرضی کی مالک ہوگی کہ جائیداد غیر ہوائی طرح رکھے یا اسے فروخت کر دے۔

دیکل نے وصیت نامے کی فوٹو اسٹیٹ بھی ہمراہ شملک کی لی۔ میں نے اس پر نظر دوڑائی۔ اس میں مونا کے چچا کے انگریزی

جانے گی؟

”مہم تو ہے۔“ میں نے کہا ”یہ بہتر یہی ہے کہ مجھ سے مت پوچھو۔ بس اوپر والے کے نام عرض بھیج دو اور اسی کے آکرے پر بیٹھ جاؤ۔“

”اسی کے آکرے پر تو میں اور اتنی پہلے ہی بیٹھی ہوئی ہیں۔“ عذرا بلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”اسی نے تو آپ کو ہمارے لئے وسیلہ بنایا ہے۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی ”اب میں چلتی ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو اب تک جو تکلیف اٹھانا پڑی اس کے لئے میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔“ اس نے بچ بچ نہایت شجیدگی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

مجھے بھی آگئی۔ میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ”بس بس۔ اس طرح معافیاں مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

امبر بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور مسکراتے ہوئے عذرا کا ہاتھ تھام کر بولی ”سرا میری یہ دوست بڑی سادہ لوح اور جذباتی ہے۔ اس کے ہر جذبے میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ کسی سے خفا ہو تو زندگی بھر کے لئے خفا ہو جاتی ہے۔ کسی کی شکر گزار ہو تو زندگی بھر شکر گزار رہتی ہے اور بڑی شدت سے رہتی ہے۔ کسی سے محبت کرے تو بڑی شدت سے کرتی ہے۔ نفرت کرنے تو بڑی شدت سے کرتی ہے۔ آپ اس کی شخصیت پر نہ جائیے گا۔ بظاہر یہ جتنی کمزور اور سادہ مزاج نظر آتی ہے اس کی سوچیں اتنی ہی طاقتور اور مزاج میں اتنی ہی آتش نشانی ہے۔“

”چچہ۔ مگر کمزور لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایک بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ اپنے کسی بھی جذبے کو چھپا نہیں سکتی۔“ امبر ذرا محبت سے اسے ایک بازو کے سلسلے میں لیے ہوئے بولی ”یہ آپ کے پاس جتنے مان سے آتی تھیں لیکن آپ نے جس طرح مونا کی تلاش میں مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کے بعد یہ آپ سے اتنی ناراض ہو کر گئی تھی کہ شاید زندگی بھر آپ کو کوستی رہتی۔ شاید کبھی آپ کے ہر عمل کے سامنے والے فٹ پاتھ سے بھی نہ گزرتی۔ وہ تو یہاں اچھی بجلی خون ریزی ہو گئی اور آپ نے بد معاشرہ کے سامنے مثالی پیش کرنے والے انداز میں یہ نہیں کہا کہ آپ تو مونا کی تلاش کے سلسلے میں انکار کر چکے تھے۔ بس آپ کی اس ادا سے اس کا دل موم ہو گیا اور یہ آپ پر واری صدف ہوئے آگئی۔ اب آپ مونا کی تلاش کے سلسلے میں جتنی زیادہ زحمت اٹھائیں گے۔ یہ اتنی ہی زیادہ شکرگزار کے ساتھ زندگی بھر آپ کے قدموں میں لپکتی رہے گی۔“

عذرا کے رُف سے سفید ریشاردوں پر بھی سی سُرخ نمودار ہوئی اور وہ دانت چس کر امبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”اگر تم مجھے جانتی ہی ہو تو کم از کم افضل صاحب کے سامنے میری شخصیت کا اس طرح پوسٹ مارٹم تو نہ کرو۔“

”بے فکر ہو۔ اس سے افضل صاحب کی نظر میں تمہاری عزت کم نہیں ہوگی بلکہ شاید کچھ بڑھ ہی جائے گی۔“ امبر نے کہا اسے تسلی دی۔

پھر وہ دونوں رخصت ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اور شفیع شاہ درہم تک خاموش بیٹھے فکر فکر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے۔ آخر میں نے دیکھ لکھ میں کہا ”شفیع شاہ! میں نے اچھا کیا جو عذرا یا امبر کو مونا کی اس قلم کے بارے میں نہیں بتایا؟“

”کپ نے بہت ہی اچھا کیا سرا۔“ شفیع شاہ ایک ایک لفظ زور دیتے ہوئے بلا تامل بولا ”میرے خیال میں تو ان دونوں کو بات بتانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

”میں نے بھی یہی محسوس کیا۔ اسی لئے اس سلسلے میں میرا زبان بند رہی۔“ میں نے کہا ”بلکہ میرا خیال ہے ہم مونا کے بارے میں اب تک معلوم ہونے والی یا آئندہ معلوم ہونے والی کوئی کام معیوب بات عذرا کو نہیں بتا سکتے۔ اسے اور اس کی ماں کی خواہ گمانی کو جو دھوکا پہنچے گا اسے شاید وہ دونوں برداشت نہ کر سکیں۔“

”بے شک۔“ شفیع شاہ نے تائید کی پھر اٹھتے ہوئے بولا ”میں بھی چلا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ کام اسی وقت شروع کرے جائیں جو آپ نے میرے سپرد کیے ہیں۔“

اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک سر ہٹکاتے بیٹھا رہا حالات پر از سر نو غور کرتا رہا۔ اسی دوران میں وہ آزاد نہایت آگے سے کھلا اور ذرا تاج اندر آگئی۔ وہ نہایت نہیں قسم کی سیاہ چٹ اور ڈھلی ڈھالی بجلی مرادہ قمیص میں تھی۔ سر پر ایک خوب صورت سی بی بی کپ تھی۔ آج کل اس کا زور مغربی لباسوں پر تھا۔ وہ انگلیوں سے بی بی کپ کے نیچے کو چمکوتے ہوئے دو خوش

لکھے میں بولی ”ہیلو باس! کیا خبریں ہیں؟“

”ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھیجیں۔“ میں نے ہمہ اور ہر اچھوڑ دیا اور کمری نظر سے اس کے کھلے کھلے گلے سرا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”میں تمہارا باس کب سے ہو گیا؟“

”بہت دنوں سے ہو۔ تمہیں اطلاع دے رہے تھی۔“

”بے پروائی سے جواب دیا اور میرے مقابل آئینہ میں اس کی

نے کرے کو مٹا دیا تھا۔

میں خاموش رہا تو وہ اپنی کرسی کو دھیرے دھیرے چھو

ہوئے بغور میری طرف دیکھ کر بولی ”کیا بات ہے۔ منے اتنا کچھ

ہوا ہے؟ کیا مجھ پر دلنوا زیادہ آ رہی ہے؟“

”کون سی عجیبے دلنوا؟“ میں نے اسے گھورا۔

”کیا تمہاری ایک سے زیادہ عجیبیاں ہیں؟“ اس نے

دیکھنے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو میں پھر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں اسی بلکہ

وہاں آئندہ آؤں گا۔“ اس نے سید چرے والی لڑکی کی بات

میں معلوم ہوتی تھی۔ ایک عرصے سے میں نے اسے اس لیے میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔

”نی الحال تو تم سے بات ہو رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
”اس سے پہلے کس سے بات ہو رہی تھی؟“ اس نے چمپڑے والے انداز میں پوچھا۔

”تمہیں کیا الام ہوا ہے کہ میری کسی سے بات ہو رہی تھی؟“

”اوہ۔۔۔ اتنے خفا کیوں ہو رہے ہو؟ میں تو یہی بات برائے بات کر رہی تھی۔ خوش غلطی بھی کوئی چیز ہے۔“ وہ بدستور چمک رہی تھی۔

”تمہارا خوش غلطی سے کیا تعلق؟ تمہیں تو کتنا چاہئے کہ آخر بد غلطی بھی کوئی چیز ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہائے۔ ہائے!“ اس نے معنوی آہ بھری، ”کوئی زمانہ خاتم بات کرتے تھے تو سنہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اب بات کرتے ہو تو منہ سے لٹکے جھڑتے ہیں۔“

”سنہ سے لٹکے جھڑا نہیں۔ لٹکے چاہا عاودہ ہے۔“

”میں کب کہہ رہی ہوں میں نے عاودہ بولا ہے میں نے تو اپنا معلوم بیان کیا ہے۔ ویسے اللہ رحم کرے۔ کیا تم اب لسانیات میں بھی دخل دو گے؟ آخر تم کس کس چیز میں دخل دو گے؟“

”میں ہر اس چیز میں دخل دوں گا جو مجھے نہیں آتی ہوگی۔ میں نے گویا عزم ظاہر کیا“ تم یہ بتاؤ کہ تم نے کیا اس وقت رات کو صرف اسی قسم کی باتوں سے فون کیا ہے؟“

”آف۔۔۔ اتنی بد مزاجی!“ وہ ترم آہیز سے لہجے میں بولی ”لگتا ہے زرتاج کی کبھی بھی تمہیں خوش مزاج نہیں بنا سکی۔“

زرتاج اس وقت گہری تنہید کی سے ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بیٹھا سمجھ چکی تھی کہ فون کس کا تھا۔ میں نے کرسی کے پتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ”آخر تمہاری اصل تکلیف زبان پر آئی گی جس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اور تمہارا دعویٰ بھی یہی تھا کہ تمہیں یہ تکلیف نہیں ہے۔“

”خدا نہ کرے کہ مجھے اس قسم کی کوئی گھٹیا تکلیف لاحق ہو۔“ وہ براہ منانے بغیر بدستور خوشگوار لہجے میں بولی ”تکلیف تو اصل میں تمہارے آرکیٹیکٹ کو ہے اور میں نے اسی سلسلے میں تمہیں فون کیا ہے۔“ اس نے فوراً زرتاج کا ذکر چھوڑ دیا اور اصل موضوع پر آگئی۔

”کیا تکلیف ہے آرکیٹیکٹ کو؟“ اب میں نے ملامت سے پوچھا۔

”تم نے ہو ہو اسی پرائے نقشے اور ایلیمنٹن کی کاپیاں نکالنے کو کہا تھا۔ تم تو یہی چاہتے تھے کہ تمہارا وہی پرانا مکان سر اٹھا کر کھڑا ہو جائے لیکن اس نے مجھ سے یا تم سے پوچھنے کی زحمت کئے بغیر یا نقشہ تیار کر لیا ہے اور اس میں کئی تبدیلیاں بھی کر دی ہیں۔“

ہوں۔“ زرتاج بولی۔  
”زرتاج پلیز“ میں نے تکلیف زدہ لہجے میں کہا ”اس کا ذکر کہ ایسے استہزائیہ انداز میں مت کرو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”آئی ایم سوری“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”میں نے اپنی انٹ میں تو انتہائی سرسری لہجے میں بات کی تھی۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں اتنے چھوٹے ذہن کی لڑکی تو نہیں ہوں کہ رفاقت میں جھلا جو کرسی کی ایسی کنزرویوں کا مضحکہ اُڑانے لگوں جن پر اس کا کوئی اختیار نہ ہو۔ کیا تمہیں میرا لہجہ استہزائیہ لگا؟“

”مثالیہ تمہارا لہجہ نہیں، تمہارے الفاظ استہزائیہ رہے ہوں۔“ میں نے بے یقینی سے کہا ”بہر حال استہزائیہ الفاظ بھی تمہارے شایان شان نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں تمہارا جو مقام ہے اس سے کوئی بھی معمولی اور عاقلانہ چیز میل نہیں کھاتی۔“

”دل رکھنے کا شکریہ۔“ وہ مسکرائی ”ویسے میں نے تم جیسا صدق دل اور دیانت داری سے عشق کرنے والا آج تک نہیں دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ ایسے کردار صرف داستانوں میں زندہ ہو گئے ہیں۔“

”جو کردار داستانوں میں پائے جاتے ہیں وہ انہیں میں کے فرق کے ساتھ دنیا میں بھی کیس نہ کیس ضرور پائے جاتے ہیں تاہم یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان سب سے ہمارا سامنا بھی ہو۔“

”بہر حال عشق کے معاملے میں تمہاری اس ثابت قدمی اور دیانت داری کی وجہ سے میرے دل میں تمہاری قدر اور بڑھ گئی ہے حالانکہ تمہاری ان باتوں پر مجھے تم سے چڑھونی چاہئے تھی۔“ اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ برقرار تھی۔

”دراصل یہ بچپن کے سلسلے بڑے عجیب اور پراسرار ہوتے ہیں۔“

”کبھی کبھی تم بڑی دانشوروں جیسی باتیں کرتے ہو۔“ وہ گویا ٹھوٹکا ہوتے ہوئے بولی۔

”مثالیہ میری اس کمپوزیٹ میں کوئی کنزروی سادہ انشور بھی مقید ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کو صرف زندگی اور اس کی آسائشوں سے دلچسپی ہے زندگی کے فلسفے سے نہیں تو وہ بے چارہ سکرسٹ کر ذہن کے کسی تاریک گوشے میں جا سوتا ہے۔ کسی دن اسی طرح دل فلنگس کے عالم میں بے چارے کا انتقال ہو جائے گا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ٹیلی فون کی ہتھکنج اُٹھی۔ زرتاج نے بولنے کا ارادہ ہٹو کر دیا۔ ہتھکنج میرے ڈائریکٹ لائن کے فون کی تھی۔ اس کا مطلب تھا میرے خاص اور قریبی لوگوں میں سے کسی کا فون تھا۔ میں نے ریموٹر اٹھایا تو وہ سرری طرف سے راحیلہ کی کواڑ کُن کر مجھے حیرت کا جھکا لگا۔ کیا اس کا فون اس وقت ہی آتا تھا؟

”میرا لینی ڈیئر لیا ہو رہا ہے؟“ وہ چکی۔ بڑے خوش گوار موڈ



وہ نہیں سکی حالانکہ بات کوئی خاص بھی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں وہ صبح بھی فون کر سکتی تھی یا آرکیٹیکٹ خود مجھ سے بات کر سکتا لیکن عین اس وقت۔۔۔ میں نے جملہ اوصرا چھوڑ دیا۔

”اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔“ زور تاج کو سنجیدگی سے بولی ”دل کے معاملے بڑے عجیب ہیں۔ تعلق خاص انسان کو بڑے عجیب عجیب تماشے دکھاتا ہے۔ بظاہر وہ بھی بڑی نیاز خیزی ہے۔ تمہیں یہ بتانے کی کوشش کرتی ہے کہ تمہارے بھی عمل سے اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن دلی تعلق ہر کمرے اس کا اندازہ شاید تم بھی نہ کر سکو۔“

”بڑی عجیب صورت حال ہے۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سر تھام لیا ”تم دونوں غیر معمولی لڑکیاں ہو۔۔۔ دونوں اپنی اپنی کسی چٹان سے کم نہیں ہو۔ مجھے لگتا ہے میں ان دونوں چٹانوں درمیان پس کرنا ہو جاؤں گا۔“

”مجھے تو آثار کچھ اور ہی لگتے ہیں۔“ وہ بدستور کمری سنجی سے بولی ”مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ تمہارے چکر میں ہم دونوں لڑکیاں اپنی اپنی زندگی برباد کر لیں گی۔“

”میں تو ایسا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں کسی کو کوئی دھوکا دے ہوں۔ کسی سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ کسی سے کوئی غلط وعدہ کر رہا۔ کسی کو اندر صبر میں نہیں رکھ رہا۔ میری زندگی تو خود بخود عقلی کا شکار ہے۔ میں تو خود کسی غلط پر نہیں پہنچ رہا۔ مجھ پر تو الزام نہیں آنا چاہئے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”گون کہہ رہا ہے کہ تم پر کوئی الزام آئے گا؟“ وہ خواب نا سے انداز میں مسکرائی ”یہ سب تو نصیبوں کی باتیں ہیں۔“ وہ اچانک ہی جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ”اصل بات تک ہونے نہیں پائی۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آئی تھی کہ تین دن تک میرے مکان میں کام ختم ہو جائے گا اور میں اس شغف ہو جاؤں گی۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔ تمہیں ایک اور کمرہ مار کر لیکن تم یوں اچانک کیوں اٹھ کھڑی ہو گئیں؟ نہ کچھ کھانے پانے کا در چاہا۔ نہ کوئی کپ شپ ہوئی۔ بس دل کو اس کر دینے والا باتیں اور نشست ختم! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“ میں نے اٹختے کہا۔

”تفکات کی ضرورت نہیں۔“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے میرے لیے میں بولی ”یہ سلسلہ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت میں دیکھ زیادہ دیر بیٹھنے کے لئے نہیں آئی تھی۔ آج مجھے جلدی سونا۔ صبح شاید میں ایک آدھ دن کے لئے زمینوں پر بھی جاؤں۔“

”ہاؤس دار رنگ پائی کب دے رہی ہو؟“ میں نے مانہ خوش گوازیانے کے لئے خوشگوار موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ میں بھی ہلکی سی افسردہ

اس کا کہنا ہے کہ وہ نقشہ اور وہ ایڈیٹیشن چند سال پہلے کے حساب سے تھی۔ اب آج کے دور کے حساب سے اس میں کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہو گئی ہیں۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”بھئی وہ ملک کے چند بڑے آرکیٹیکٹس میں سے ایک ہے۔ اپنی لائن کا جینس سمجھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ہم جیسا اس کے کام میں دخل نہ دیں اور اسی کی چلنے دیں تو بہتر ہے۔“

”صوبہ لود۔۔۔ بعد میں جیس جیس مت کرتا۔ وہ جینس اپنی جگہ ہے لیکن وہ یہ تمہارا فریج ہو رہا ہے۔ اگر تم اپنی ہینڈ نا پینڈ کو نظر انداز کرنے کے قائل ہو سکتے ہو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ بولی۔

”بھئی مجھے چرچہ کہ آرکیٹیکٹ کا کام نہیں آتا۔ اس لئے دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ اس میں بھی ٹانگ اڑاؤں لیکن کیا کروں۔ مصروفیت زیادہ ہے۔ اس لئے جو وہ کر رہا ہے اسے کرنے دو۔ بڑا آدمی ہے۔ اُمید ہے وہ بھی مارے گا تو سلیف سے مارے گا۔ اس کے کام میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ جس مکان کو میں بوس کر دیا گیا تھا وہ سکتا ہے اب اس سے بھی بہتر مکان زمین کے سینے سے سر اٹھا کر کھڑا ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ وہ کمری سانفس لے کر بولی ”بہر حال میں آرکیٹیکٹ سے کہہ چکی ہوں۔ صبح وہ نقشے کی کاپیاں چھوٹی کر کے تمہیں فیکس سے بھجوائے گا۔ ایک نظر انہیں دیکھ ضرور لے۔“

”اب تم نے کہہ دیا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“ میں نے کہا۔

”کیا بات ہے؟ یہ سبجے میں اتنی درویشی کیوں آ رہی ہے؟ لگتا ہے کوئی نہیں کوئی معمولی سی جمو پڑی بخار ہے ہو۔“ وہ بولی۔

”جب اس قسم کی شاید ار غار میں جاہ ہوتی ہیں تو جمو پڑی جیسی ہی حیرت انگیز ہیں۔ اب اگر مجھے اس کمرے میں رہنا نصیب..... ہوا تو میں اسے جمو پڑی ہی سمجھ کر رہوں گا۔“

”اللہ۔۔۔ اللہ! تم اور تمہاری جمو پڑی! راجیلہ نے غصٹی سا نسلی ”اچھا خدا حافظ۔“ اس نے سلسلہ متعلق کر دیا۔

میں نے ریسپور د رکھا اور زور تاج کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ”مجھے سخت حیرت ہے۔“

”ہر اس وقت راجیلہ کا فون آ گیا۔“ زور تاج نے جملہ عمل کیا۔

”ہاں۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کا مجھ سے یا تم سے ٹیلی فنی کے ذریعے رابطہ ہے۔“ میں نے کہا ”کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اور تم جب بھی ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہو تو اسے خبر ہو جاتی ہے۔ مانا کہ ایسے ہر موقع پر تو اس کا فون نہیں آتا لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اسے پتا ہوتا ہے۔ اس وقت شاید وہ فون کے بغیر

میں معلومات حاصل ہوئیں۔ انہیں مکران میں سے فی الحال کوئی نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ ان چار کے مرنے کے بعد گروہ میں پانچ سات آدمی رہ گئے تھے لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ دوپوش تو وہ پہلے ہی رہتے تھے لیکن اب تو بالکل ہی غائب ہو گئے تھے۔

پہلے وہ کس طرح دوپوش رہتے ہوں گے اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اکثر یہ معاشوں کے گروہ پولیس کے سامنے دہناتے پھرتے رہتے ہیں۔ وارداتیں کرتے ہیں مکران کی اصطلاح اور ان کے کاغذات میں وہ دوپوش ہوتے ہیں۔ اپنے چار ساتھیوں کی ہلاکت کے بعد شاید وہ احتیاطاً پانچ دوپوش ہو گئے ہوں۔ رجم گل نے مجھے بتایا کہ وہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی طرف سے کوئی بڑا عمل حوالہ تھا۔ میں نے اسے چلانے کے لئے یہی کہا تھا کہ میں تو اپنی دانت میں ہوشیار رہتا ہوں لیکن پولیس بھی اگر کچھ ہوشیار رہا کرتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس پر اس نے مجھے دو چار جلی کٹی سنائی تھیں اور خون بند کر دیا تھا۔

آخر پانچویں دن شیخ شاہ مسکراتا ہوا نمودار ہوا لیکن اس کی مسکراہٹ کچھ معذرت خواہانہ ہی تھی۔ میں اس وقت آفس میں ہی تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے کام چھوڑا اور پوچھا "کیا خبر لائے ہو؟"

"سراخیز شاید اتنی امید افزا نہیں ہیں جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ میں اپنی ہانگ دوڑ کے دوران کافی پرجوش اور پرامید تھا لیکن میں جو کچھ معلوم کر کے آیا ہوں وہ شاید آپ کا اتنا اہم محسوس نہ ہو۔"

"تمہید کو چھوڑو۔ اصل بات کرو۔" میں نے کہا۔

"سرا بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ معلوم کرنے جاتا ہے وہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کچھ اور ہی معلوم ہو جاتا ہے مگر وہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہوتی ہے اور اصل موضوع سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔" اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یار اٹھک ہے۔ اگر تم کوئی کام کی بات معلوم نہیں کر سکتے تو اس میں اتنا شربانے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "جو معلوم ہوا ہے وہی بتا دو۔"

"سرا سب سے پہلے تو میں نے اس پینٹنگ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پتا یہ چلا کہ پینٹنگ آرٹسٹ صاحب نے براہ راست خود فروخت کی تھی اور وہ اس وقت اپنی غرضوں کے سلسلے میں غیر ممالک کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ ان کے اسٹوڈیو میں کئی لاکھ اور لاکھیاں شاگرد کے طور پر کام کر رہی ہیں لیکن مذکورہ پینٹنگ کے بارے میں انہیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہر حال مجھے ان کے غیر ممالک کے جو نمبر مل سکے ان پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ یہ کوشش ابھی جاری رہے گی لیکن لگتا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے گا۔ ہمارے آرٹسٹ باہر جا کر ٹھہرتے ہیں۔ یہاں ہمیں لگتا

تھا کہ وہ بھی تمہارا ہی ایک گھر ہے۔ میں کیا پاؤں دار منگ پائی دوں گی۔ مجھ سے تو بس چیک ساکن کر لو۔ خود ہی بددوست ٹرمز۔ خود ہی جن لوگوں کو مناسب سمجھو انہیں مدعو کر لیتا۔ خود ہی میزبان بن کر ان کی مہمانداری کرتا۔ میں تو بس تمہارے پیچھے پیچھے رہوں گی۔ اس بارے میں شاید مجھ دستان کا بھی کچھ معززین شہر سے خائف ہو جائے۔"

"تمہید" میں نے گراہ کر کہا "تم نے تو اکساری میں مجھے بھی ات کر دیا۔"

"میں میں اکساری ہرگز نہیں برت رہی اور نہ ہی یہ محض رہی ہاتھ ہیں۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا۔" وہ دروازے کی طرف ہڑتے ہوئے بولی۔



شیخ شاہ سے تین چار دن تک میری ملاقات نہیں ہوئی تاہم اس کا فون بدوازہ ضرور آتا رہا۔ ہر بار اس نے گویا مجھے تسلی دی "میں میں معلومات جمع کر رہا ہوں۔ کچھ ہر بات کو آنا دکھائی دے رہا ہے۔"

مجھے اس نے کہا "سرا کہیں روپیہ نہیں دیکھ سکتے۔ دیکھ کر کام دکھا رہی ہے۔ بات سے بات نکل رہی ہے۔ یہ تو ایک الگ ہی دنیا ہے جس کی آپ نے مجھے سمجھ دیا ہے۔"

مجھے اس نے بتایا "آج ایک بڑے کام کے آدمی سے ملاقات دی گئی ہے۔ اسے روپے کا لالچ بھی ہے اور ضرورت بھی لیکن ساتھ ساتھ کچھ خوف زدہ بھی ہے۔ روپیہ تو اس کے سامنے پھینک دیا ہے اب ذرا اس کا خوف دور کرنا ہے۔ میں خود اس معاملے میں زیادہ مانتے نہیں آ رہا۔ میں نے کچھ لوگوں کو ابھر دیا ہے۔"

وہ اسی طرح اطلاعات دے چلا تھا لیکن جب بھی میں نے پتہ سے مجبور ہو کر اس سے تفصیل پوچھی تو اس نے یہی کہا "نوں پر یہ باتیں نہیں ہوسکتیں۔ میں خود حاضر ہو کر تفصیل رپورٹ دل گا۔"

میں بہر حال مطمئن تھا اور اس کی رپورٹ کا منتظر تھا۔ اس دوران رجم گل نے اپنے گلے اور دیگر ذرائع سے ان بد معاشوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو میرے فیس میں مانے گئے تھے۔ میں نے بھی اس سلسلے میں اپنے کچھ ذرائع استعمال کئے تھے۔ پتا یہی چلا تھا کہ ان کا تعلق بد معاشوں کے ایک چھوٹے مگر خطرناک گروہ سے تھا تاہم وہ خاص طور پر کسی ایک شخص کے لئے کام نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے طور پر بھی وارداتیں کرتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر معاوضہ اچھا مل جاتا تھا تو کسی دسکے کے بھی خطرناک سے خطرناک واردات کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ میرے ہاں ان کی کارروائی کی ذاتی سلسلے میں کچھ ایسا کام کے لئے کسی نے ان کی خدمات اصل کی تھیں۔ اس گروہ کا کوئی اور آدمی ہاتھ آتا تو اس سلسلے

ہے وہ اتنے معروف ہیں۔ باہر ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر دو تو پتا چلے گا انہیں کوئی جانتا ہی نہیں۔“

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا ”جیہا یہ قسمی تاکائی نمبر ایک۔ تاکائی نمبر دو کیا ہے؟“

”وہ کامیابی آئینہ تاکائی ہے سرا“ وہ ذرا جھنجھپ کر بولا ”اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ ان فلموں کا کیرا مین ظفر جمال تھا بلکہ ایک اور آدمی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ یقینی طور پر ان فلموں کا کیرا مین رہا ہوگا۔ اس کا نام روشن ہے مگر اس کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اس سے لگتا ہے کہ وہ خاصا تاریک آدمی ہے۔ وہ عمر رسیدہ آدمی ہے۔ اشتہاری فلموں کا کیرا مین تھا اور اپنے کام میں براہ راست آدمی سمجھا جاتا تھا گراہی غیر زینے داری اور بے تمنا شرب نوشی کے وجہ سے تباہ ہو گیا۔ اسے کام ملنا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ لگتا ہے کچھ لوگوں نے اس قسم کی فلموں کے لئے اس کی خدمات حاصل کیں۔ وہ یکدم بہت خوش حال نظر آنے لگا۔ ذرا تیز رفتاری گاڑی میں گھومنے لگا لیکن پھر یکدم غائب ہو گیا۔ اس کی بیوی بچے کیلئے دیوہو نہیں تھی سنا ہے دینی کی طرف نکل گیا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ خوش حالی آجانے کے بعد وہ ملک سے کیوں چلا گیا اور وہ بھی دینی وغیرہ کی طرف۔ جہاں اسے اس قسم کے کام ملنے کا اسکوپ بھی نہیں۔“

”یعنی اس آدمی کے بارے میں پتا تو چلا کر وہ بھی ہاتھ نہیں آسکا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کاموں کے لئے چار پانچ دن کا وقت کم تھا۔ یہ وقت تو معلومات حاصل کرنے میں ہی صرف ہو گیا۔ اب اگر کوئی ملک سے باہر ہے تو اس تک پہنچنے کے لئے تو تیز رفتاری درکار ہوگا۔ بہر حال اس دوران ایک بڑی دلچسپ اور کارآمد بات معلوم ہوئی ہے۔“

”خدا کے لئے اب تو وہ جتنی دور دورہ میں مایوسی اور مدد کے بارے کر سی سے گریزوں کا۔“ میں نے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا ”سرا کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہاں ایک ایسا عقلمند ٹینگ کام کر رہا ہے جو شو بزنس کا شوق رکھنے والی آزاد خیالی لڑکیوں کو کسی طرح ٹریپ کر کے ان کی اس قسم کی فلمیں تیار کرتا ہے لیکن یہ فلمیں مارکیٹ میں ریلیز کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ انہوں نے نہایت خاص اور جدیدہ جدیدہ لوگوں پر مشتمل اپنی ایک الگ ہی چھوٹی سی مارکیٹ بنائی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”شہر کے ایک پوش علاقے میں ایک بڑی کوچھی میں ایک باقاعدہ پروڈکشن ڈوم بنا ہوا ہے۔ اس میں بکواس نشستیں ہیں۔ سب کی سب الگ الگ باکس کی صورت میں ہیں۔ چند باکس ڈبل سیٹوں والے بھی ہیں۔ اس سنی سینما ہال میں بیٹنے میں صرف ایک شو چلے گا لیکن اس شہر کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ وقت کی

اطلاع آخری لمحوں میں سینما ملک کے ممبروں کو دی جاتی ہے۔ ”سینما ملک؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”اس سنی سینما ہال میں اگر فلم دیکھنے والے شائقین کے کاؤڈورڈ میں نام ”سینما ملک“ ہے لیکن یہ سب باتیں زبانیاں ہیں۔ تحریری شکل میں کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ سینما ملک ممبران مقررہ وقت پر نیم تاریک ہال میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہر ایک اس کے الگ باکس میں بیٹھا رہتا ہے۔ اگر وہ ایک دوسرے ٹوڈ میں نہ رہیں تو انہیں ایک دوسرے کے بارے میں علم بھی ہو جائے کہ وہاں کون کون آیا۔ وہاں انہی خوب صورت دیکھی میں سے کسی ایک کی کوئی بھی طرف ایک فلم چلائی جاتی۔ صرف ایک کھٹے کا شو ہوتا ہے اور ایک فرد کے لئے ایک کلکت دس ہزار روپے کا ہوتا ہے۔“

”دس ہزار؟“ میں نے حیرت سے کہا ”میں نے تو سنا ہے علاقوں میں مخصوص آڈیوں پر دی سی آر کے ذریعے لوگ ڈی روپے میں اس قسم کے شو دیکھتے ہیں۔“

”شفیع شاہ عجیب سے انداز میں مسکرایا ”سرا غریب اور آدمی کے رہن سہن پہناوے کھانے پینے میں فرق ہوتا ہے۔ ہے ان کی تقریحات میں بھی فرق ہوگا۔ غریب آدمی دو تھپا میں نان بکڑے لے کر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بیٹ بھرتا ہے۔ سے کہیں کم بھوک رکھنے والا سینہ اس فانیہ انار میں کئی ارار کر کے اٹھتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے تمام معاملوں میں فرق ہے۔ اس خاص تفریح میں بھی دونوں کے مقابلے متبادل میں بڑا فرق ہے۔ فرسٹریشن یا ذہنی کج روی کا کچھ غریب شخص کسی گنجان گلی کے کسی بدنام اڑے پر جا کر جم کرے یا ٹوٹے جھونپڑے میں بیٹھ کر خراب فی وی اور کھانا سی آر کے ذریعے دس روپے میں ایک گھما چارنٹ دیکھتا۔ اس سے پہلے نہ جانے کتنے لوگ دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ سے تو دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہوتے ہیں۔“

دوسری طرف ایک سینہ نہایت رازدارانہ انداز میں شاندار گاڑی میں بیٹھ کر ایک پوش علاقے کی عمدہ کوچھی ہے۔ اوزکنڈ سنہ ہال میں بیٹھا ہے جہاں اسے ڈرگس سوا ہیں۔ باہر سٹار گاڑی پرادے رہا ہوتا ہے۔ وہاں غیر ملکی طوائفیں خوب صورت دیکھی لڑکی کی فلم چلتی ہے جس کے بارے میں اثر ہے کہ وہ خاص طور پر صرف چند لوگوں کی تفریح کے لئے تیار کی گئی ہے۔ تو اس میں نمایاں فرق تو ہوا سرا اس فرا ماری قیمت ہوتی ہے۔“

”درست ہے۔“ میں نے حلیم کیا۔

”ایک اور سب سے بڑا فرق ہے میرا جو ابھی میں نے بتایا ہی نہیں۔“ شفیع شاہ گرمی سانس لے کر بولا ”شاہ وہ ہے اہم ہوا اور اسی میں سب سے زیادہ کشش ہو۔“

خود بھی کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اس کے پاس بھی ایک شخص اطلاع لے کر آتا ہے اور اس کے پاس جمع شدہ فراٹھیں لے کر بٹا ہے۔ پھر ٹیلی فون پر اس شخص کے پاس اطلاعات آتی ہیں جو کوٹھی پر تعینات ہے۔ وہ ٹیلی فون ہی کے ذریعے انہیں مجبوروں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے اپنے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مقررہ وقت پر اسے قسم لے جاتی ہے لڑکیوں کی بلنگ کی فراٹھیں آتی ہے تو وہ اس آدمی کو دے دیتا ہے جو اس کے پاس آتا ہے۔ لڑکی طے شدہ وقت پر خود طلب گار کے پاس پہنچ جاتی ہے یا پھر اگر اسے اسی کو بھی پرہلایا گیا ہو تو وہ وہیں آجاتی ہے۔ طلب گار بھی وہیں پہنچ جاتا ہے۔

”کیا یہ خاصا منافع بخش دھندا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”جی ہاں آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے سراسر اقلیم کے ایک شومیں تقریباً تیس چالیس مجبور موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات پورے پچاس بھی ہو جاتے ہیں۔ یعنی پانچ گناں قتل بھی جاتا ہے۔ دس ہزار روپے کی عکٹ کے حساب سے تخمینہ لگا لیجئے۔ قتلوں کی تعداد ابھی زیادہ نہیں ہے۔ ان کے پاس تقریباً تیس قلمیں تیار ہوتی ہیں لیکن اس میدان میں کام جاری ہے۔ خوب صورت۔ اور اس مطلب کی لڑکیاں تلاش کرنے۔ انہیں مطلوبہ سانچے میں ڈھالنے یا ٹرپ کرنے کے لئے کچھ لوگ سرگرم ہیں جو لڑکیاں اس وقت تک قتلوں میں کام کر چکی ہیں اور مکمل طور پر ان کے قابو میں ہیں ان میں سے تین چار روزانہ جک رہتی ہیں۔ چھتیس ہزار روپے کی لڑکی کے حساب سے روزانہ کی اس آمدنی کا اندازہ کر لیجئے۔ دیگر اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔“

میں ہنکارا بھر کر کہہ گیا۔  
”شفیع شاہ نے سلسلہ کلام کو ذرا ”نی احوال یہ“ تلمیں صرف سولہ ایم ایم کے بروڈیکس پر چلائی جا رہی ہیں۔ بعض قتلوں کو ڈرا کر بھی کام چلایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے جب انہیں اس طرح خوب کیش کر لیا جائے تو پھر ان کے ویڈیو پر پش تیار کر کے منگے داموں دولت مند شائقین کو دے دیے جائیں کہ وہ اپنے پاس ہی رکھ لیں اور یو تھ ضرورت جہاں چاہیں وہیں ان سے مستفید ہو لیں پھر شاید وہ مرحلہ آئے جب ان قتلوں کی ویڈیو تقریباً ختم ہو جائے نی احوال تو ان کے مقامی ہونے کی وجہ سے ان میں ایک کشش ہے اور پھر اس سارے سلسلے کو ختم رکھ کر اس کی ویڈیو، منشی فیزی اور اسٹینڈرڈ مزید بیچا دیا گیا ہے۔ جب یہ اچھی طرح استعمال ہو چکیں اور سیٹھوں سے ان کے ویڈیو پر پش کی بھی اچھی خاص قیمت وصول ہو جائے تو پھر عین ممکن ہے انہیں ویڈیو شاہیں کے لئے بھی ریلیز کر دیا جائے اس میں بھی ایک مدت کافی رقم کمانی جائے گی۔ تاہم اس کے بعد یہ پرجن کا سودا ہو جائے گا۔ پرجن فروش اس میں کمائیں گے۔ دس دس روپے میں یہ قتل بھی بیچ جائیں گی۔ یہ فوٹ آئے میں شاید کافی عرصہ لگ جائے اس وقت تک لڑکیوں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہو جائے گی۔ وہ بھی کسی حد تک اسی منزل کو پہنچ

”یہ کیا ہے؟ وہ بھی بتاؤ۔“  
”جس لڑکی کی قسم چلتی ہے، جس سیٹھ صاحبان کو وہ اور اس کی پرکار میں بند آئے وہ اسے چھتیس ہزار روپے کی رات کے حساب سے دیک بھی کر سکتے ہیں۔ وہاں شہ کے تمام انتظامات کرنے والا اور قلم چلانے والا صرف ایک شخص ہوتا ہے۔ سیٹھ صاحبان صرف ایک جٹ لکھ کر اسے دے دیتے ہیں کہ انہیں قتل لڑکی چاہئے۔ بعد میں انہیں فون کر کے مطلع کر دیا جاتا ہے کہ قتل قتل نامیخ پر وہ لڑکی دستیاب ہو سکتی ہے وہ اپنی پسند کی نامیخ نوٹ کر دیتے ہیں اور نقد رقم لے کر واپس بھجوا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر انہیں جگہ کا پراہم ہو تو جگہ بھی فراہم کر دی جاتی ہے۔ اسی کو بھی میں اوپر اس مقصد کے لئے چند پڑھیں بیڈروم موجود ہیں۔ ان کا کاریہ ہمارے اس فائبر اشارہ ہو مل کے کمران سے زیادہ ہے۔ تمام اخراجات ہی زیادہ ہیں لیکن یہ مت بھولے کہ یہ تمام انتظامات شہر کے صرف چیدہ چیدہ دولت مند اور اس قسم کی تقریحات سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے ہیں۔ بعض لوگ دولت مند ہونے کے باوجود اس قسم کے معاملات میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ انہیں اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔“

”جیسے میں“ میں نے کہا۔  
”جی ہاں۔ جیسے آپ۔“ شفیع شاہ بولا ”ویسے بھی آپ تو خیر ہاں ہوتے ہی نہیں تھے۔ آپ کا یہاں قیام تو پہلی بار اتنا طویل ہوا ہے۔“

پھر ایک لمحے کے توقف سے شفیع شاہ بولا ”میر شپ آسانی سے نہیں ملتی۔ یہ دھندا چلانے والوں نے شروع میں شاید کچھ دلوں کو کسی طرح خود کا بک بنایا ہو لیکن بعد میں لگا ہوتا جا رہا ہے کہ جس طرح نیکی سے نیکی کا چراغ جلا ہے اسی طرح بدی کے ایک شعلے سے ”دسرا شط پدا“ ہوتا جا رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایک مجبور کسی دوسرے شخص کو مجبور بنانے کی سفارش کر سکتا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ تحقیقات کی جاتی ہیں جس کا اسے پتا نہیں چلا پھر کہیں اوپر سے منگوری آتی ہے تو اسے مجبور بنایا جاتا ہے۔ اس کو بھی پس۔ جہاں شہ چلتے ہیں۔ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا بورڈ لگا ہوا ہے لیکن اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی۔ پروجیکشن ہال بھی بظاہر اسی مقصد کے لئے بنایا گیا ہے کہ وہاں اشتہاری تلمیں چلا کر کوئی بھی چاہیں۔ وہاں چند اشتہاری قتلوں کے ڈسٹے بھی پڑے رہتے ہیں مگر وہ دسروں کی ہائی ہوئی تلمیں ہیں۔“

تمام آپریشن نہایت صاف ستھرا ہے اور اس میں کم سے کم دس لاکھ ہیں۔ کوٹھی پر تعینات مسلح گارڈ کو کچھ پتا نہیں ہے کہ ہاں کیا ہو رہا ہے اور اسے جگہ کا مصروف کیا ہے۔ صرف ایک شخص وہاں موجود ہوتا ہے۔ وہی سب کچھ کرتا ہے۔ وہ تمام سیٹھوں سے رابطہ کرتا ہے۔ انہیں شہ کے انتظام کی اطلاع دیتا ہے لیکن اسے

لگ جائے گا۔ میں نے سوچا اس دوران پہلے آپ کو ایک اور رپورٹ تو دے دوں اور مشورہ کرلوں کہ کیا طریقہ کار اختیار چاہئے۔ "شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"جیسے تم نے اُلھویا تھا اس کا کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔  
 "اسے میں نے زیادہ دیر نہیں رکھا۔ اس کے ٹھکانے بھجوا دیا اور زبان سختی سے بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ "شفیع شاہ نے بتایا "وہ چمک چوہیں کھنے اسی کو بھی پرہتا ہے۔ میں نہیں کہ اس کے زیادہ دیر غائب رہنے سے کسی کو کوئی شبہ نہ سارے سیٹ آپ میں جو لوگ ملوث ہیں ابھی ان میں سے بھی خزاں ہونے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ جب تک کوئی عملی نہ ملے ہو جائے جب تک ہمیں ان لوگوں میں پہلے کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔ کم از کم میری توہین رائے ہے جیسے آپ حکم دیں دیے کر لیتے ہیں۔"

"تمہاری رائے ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا "میں تم نے چھوڑا ہے" اس کے بارے میں ہمیں امید ہے کہ بند رکھے گا؟

"امید نہیں سہ۔ یقین ہے۔" شفیع شاہ نے اعتراف دیا۔ "میں نے اسے پوچھی نہیں چھوڑ دیا۔ ایک ظالم اطمینان محسوس کرنے کے بعد ہی چھوڑا تھا۔"

"یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کوئی کس کی ہے؟" میں نے "اتفاق سے اس کو بھی کاٹا گیا" شفیع شاہ نے جواب دیا "کسی نے کرائے پر لی ہوئی ہے لیکن ابھی اس کے بارے میں میں جملہ سکا کہ وہ کون ہے کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ سہلت ملی تو شاید میں معلوم کر لوں۔" شفیع شاہ نے جواب دیا "ایک لمحے خاموش رہ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا "اے بات البتہ اور معلوم ہوئی ہے۔ شاید اس سے آپ کوئی

نکلیں۔ آپ کے دوست سیوہ رمضان بھی "سینا گلب" ہیں۔"

"کیا؟" میں تقریباً چل پڑا "یہ تمہارا کدو ہے ہو؟" میں آپ کو بالکل صحیح اطلاع دے رہا ہوں۔ "وہ نے اس کی زندگی کی ہر قاطبہ ذکر کیا۔ نہ مجھے پتا ہے بات کا اس بد بخت نے بھی ذکر ہی نہیں کیا۔" میں۔ افسوس سے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "میں اب اس سے بات کرتا ہوں۔"

پھر میں خود ہی ڈک گیا "خیر ایسی جلدی بھی کیا ہے آرام سے ہی اس چند سے بات کر دوں گا۔ اچھا۔ بتاؤ۔ کبھی نہ کبھی اس قسم کے دھندوں میں اندر ہی کا کوئی قسم کی کوئی شخصیت یا پھر کوئی مہر و غیرہ کسی نہ کسی وجہ پھوڑتا ہے۔ اس دھندے میں کبھی کسی نے کوئی نہیں کی؟"

جائیں گی۔" لیکن اگر اس میدان میں کام جاری ہے تو اس دوران ہی کھپ اتی رہے گی اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔" میں نے خیال کا ہر کیا۔

"جی ہاں" شفیع شاہ بولا "جب تک کوئی اس سلسلے کو نہیں روکے گا تب تک تو چلتا ہی رہے گا البتہ یہ ممکن ہے کہ کافی عرصے بعد اس کی کشش کم ہو جائے اور ہر مرتلے پر ریش گر جائیں۔" "تمہیں یہ سب معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمت سے لوگوں سے ہوتا ہوا میں نہایت مبہم سراغوں کے ذریعے اس شخص تک پہنچا جو کوئی میں اس سارے سلسلے کو آہستہ کرتا ہے۔" شفیع شاہ نے بتایا "میں نے اسے نہایت خاموشی سے اُلھویا۔ ہماری پالیسی یہ تھی کہ کسی گناہ گار کو بھی خارج کرنے سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے چنانچہ میں نے اس کے سامنے ایک طرف ایک بڑی رقم رکھ دی اور دوسری طرف خارج کے کچھ نکات۔ اس کے علاوہ میں نے ماحول بھی کچھ ڈراؤنا سا تخلیق کیا۔ میں نے اسے اختیار دے دیا کہ وہ چاہے تو بڑی رقم اٹھا سکا ہے اور چاہے تو اپنا حشر خراب کر سکا ہے۔ مجھے ہر صورت میں معلومات چاہئیں۔ آوی اپنے ٹاویہ مالک کا بہت وفادار تھا۔ اسے دس ہزار روپے امانت عطا ہوئی ہے جبکہ دیگر نوادہ اور عیاشیاں اپنی جگہ ہیں۔ یعنی درگت کڈیٹر ابھی ہیں۔ تاہم اس نے تھکنڈی سے کام لیا۔ اپنی جان کو خدا آپ میں نہیں ڈالا۔ جو کچھ معلوم تھا بتا دیا۔ اس کی معلومات محدود تھیں۔ کئی زاویوں سے جانچنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھے پکڑ نہیں دے رہا تھا۔ اسے اتنا کچھ ہی معلوم تھا۔

میں نے اسے رقم اٹھانے کی اجازت دے دی جس پر وہ حیران بھی ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے شخص دانہ والا جا رہا تھا۔ اسے اگر اس سے زیادہ معلوم ہوتا تو ضرور بتا دیتا لیکن اس سارے سلسلے کے پیچھے بیٹھا کوئی بہت شاطر ذہن کام کر رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو پس پردہ رکھنے کا فنل پروف بندوبست کیا ہوا ہے۔ کوشش کرنے پر مشینری کے بہت سے پڑے تو سامنے آسکتے ہیں لیکن وہ سب صرف اپنے اپنے کام سے واقف ہیں۔ اپنی ڈنٹے واریوں کے سوا انہیں کچھ پتا نہیں ہو گا۔ انہیں یہ پتا نہیں ہو گا کہ مشینری کو چلا کون رہا ہے۔"

"وہ آوی تمہارے ہاتھ نہیں آیا جو قلمیں لے کر آتا ہے اور اس شخص کے پاس جمع شدہ بیانات وغیرہ لے کر جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی مجھے اس پر ہاتھ ڈالنے کا وقت نہیں ملا لیکن میرا خیال ہے اس پر ہاتھ ڈال کر بھی بات صرف تھوڑی سی آگے بڑھے گی۔ اس طرح اصل گرد گھٹاں تک پہنچنے میں مرحلہ بہ مرحلہ بہت وقت

لے رہا تھا۔

"ہاں یار معاف کرنا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "تمہارا بھلا شرم و حیا سے کیا واسطہ۔ میں نے زندگی میں تمہاری جتنی عمر کے کسی آدمی کو تم جتنا خبیث نہیں دیکھا۔"

"تم نے ابھی زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے میرے چاہنے والا؟ وہ شفقانہ لہجے میں بولا۔

"چھابکواس چھوڑو اور سنجیدگی سے بتاؤ، تم اس وقت کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے صحیح بتایا ہے میں اس وقت ایک عمارت کی بیسویں منزل پر ہوں۔ دور کا منظر یہاں سے دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اصل میں وہ اس سے بھی چھوٹے ہوں۔" وہ رنگ کنشری کے سے انداز میں بولا "مزید وضاحت کچھ یوں ہے کہ یہ اصل میں میرے ایک دوست کا دفتر ہے۔ کبھی کبھی پانچ دس منٹ کی فرصت ملتی ہے تو میں یہاں آجاتا ہوں کیونکہ اس کی سیکرٹری بڑی خوب صورت ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں ایسی سیکرٹری مجھے بھی ڈھونڈنا، خواہ دو ہزار زیادہ دے دوں گا۔ کبھی میری درخواست پر کان ہی نہیں دھرتا۔ بڑی قبضہ پسندی طبیعت پائی ہے اس نے۔ حالانکہ کسی قبضہ گرد پ سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"اس وقت وہ سیکرٹری کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سانسے ہی بیٹھی ہے۔ ہم اسی کے خوب صورت ہاتھوں کی بنی ہوئی کالی پائی رہے ہیں۔ کیا بتاؤ۔ کیا عمدہ کالی ہے واہ!"

"اس کی جو پتیاں بھی بڑی عمدہ ہوں گی۔ جس دن کھوپڑی پر دو چادر رسید کرے گی اس دن ان کے بارے میں بھی رائے دیا۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ جو تیروں وغیرہ کے سلسلے کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ بڑی مہذب اور خلق لڑکی ہے۔ اس وقت بھی مسکرا رہی ہے۔ میں نے تو ایسی سیکرٹری کی تلاش میں انگریزی اخبار میں اشتہار بھی دیا تھا مگر انفرسب نیوز میگزین کی لڑکیاں ہی آئیں۔"

اس نے ایک لٹری سانس لی "خوب صورت ہوئی تو خیر تھوڑی بہت کوشش کرنے سے مل سکتی ہے لیکن خوب صورت سیکرٹری کسی کو قسمت سے ہی ملتی ہے۔" پھر اسے گویا کچھ خیال آیا "خیر تم بتاؤ۔ کیسے فون کیا؟"

"شکر ہے تمہارا ذہیل ذہن کسی کی خوب صورت سیکرٹری سے تو رہا۔"

"ذہن کہاں مٹا ہے۔ ذہن تو وہیں اٹکا ہوا ہے لیکن آخر اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے۔" وہ بات کانٹے ہوئے بولا "اب اخلاقیات مجھے تمہاری بات بھی تو سننی پڑے گی۔"

"یہ دھند زیادہ پڑانا نہیں ہے اور زیادہ پھیلا ہوا بھی نہیں۔" تنقید اور پینہ چیدہ لوگوں تک محدود ہے۔ شاید اس لئے ایسی بات آنے کے زیادہ امکانات پیدا نہیں ہوئے۔ تاہم ایک بار ایک شخص نے ایسا کوشش کی تھی۔ اسے دن داڑے قل گویا کیا تھا۔ لہذا وہ تک نہیں پکڑے گئے۔ اس کے بعد کسی کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا ہو۔ "شفیق شاہ نے بتایا۔"

میں چند لمحوں میں الجھا رہا۔ شفیق شاہ نے پوچھا "میرے باب کیا حکم ہے؟"

"ختم مزید معلومات حاصل کرنے کی کوششیں جاری رکھو لیکن یہ بھی رکھو کہ اس چکر کے پیچھے جو اصل لوگ ہیں وہ وقت سے ہوشیار نہ ہوتے پائیں۔ جب تک ان پر ہاتھ ڈالنے کا بہت نہ ہو جائے تب تک انہیں یہ پتا نہیں چلنا چاہئے کہ کوئی کی ٹوہ میں لگا ہوا ہے ورنہ ممکن ہے وہ سب غائب ہو جائیں اور بے ہاتھ شرمندگی کے سوا کچھ نہ آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس وقت ہوشیار ہو جائیں تو اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیں۔"

ناعت دانیں گل چائے۔

"امید تو ہے کہ ایسا نہیں ہوگا سراسر!"

"ہوئے تو اس دورے آدمی پر اسی طرح نہایت خاموشی سے ڈالنے کی کوشش کرو جو ظلمیں دیکھو لے کر آتا ہے اور آرڈر لے رہا ہے۔" میں نے ایک لمحہ سوچ کر کہا "میں اس دوران رمضان کو بلا کر بات کرتا ہوں۔ شاید اس سے کوئی کام کی بات ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے سراسر!" اس نے سر ہلایا اور پوچھا "تو پھر میں اب؟"

"ہاں تم اب جاؤ۔ تمہارے سامنے سیلہ رمضان مکمل کر بات لے گا۔" میں نے کہا اور شفیق شاہ رخصت ہو گیا۔

میں نے سینٹر رمضان کے گھر فون کیا تو وہ گھر پر نہیں ملا لیکن رافون پر اس سے رابطہ ہو گیا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک عمارت کی بیسویں منزل پر۔" اس نے جواب دیا۔ "مگر تم میں ذرا بھی حیا اور غیرت ہوتی تو تم وہاں سے چلا نکلتے۔" میں نے کہا۔

"نیکلا۔ میں نے ایسا کون سا کام کیا ہے؟" وہ خوشگوار لہجے میں۔

"اگر تم اپنی اب تک کی زندگی پر نظر ڈالو تو تمہیں بہت سے اہم نظر آئیں گے جس کے بعد تمہیں ڈوب مرنے چاہئے تھا یا کسی چودہ میں حزلہ عمارت سے چلا نکلتا دینی چاہئے۔" میں نے عجب کی سے کہا۔

"تم سے کسی نے کہہ دیا کہ میں اتنا باشرم اور باحیا انسان ہوں نے اطمینان سے پوچھا۔ وہ شاید کسی چیز کی چسکیاں

وہ دھیلے دھالے حکم آؤ سوٹ میں تھا۔ ہونٹوں میں لہا دبا ہوا تھا حالانکہ وہ تھکا کو نوش کا عادی نہیں تھا لیکن وہ اس میں سے تھاجن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کون سا خصل شروع کر دیا اور کب کون سا خصل ترک کر وہ ایک مونے پر دھیر ہوتے ہوئے چراغ کے جہی انداز میں بولا "کیا حکم ہے میرے آقا؟"

میں نے کام چھوڑ کر دیوالیگ چتر کھٹا کر اس کی طرف ہوتے ہوئے کہا "رمضان سینہ! تمہیں شرم نہیں آئے؟ میں ایسا حرکتیں کرتے ہو۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ تم آج بدعاش ہو لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس درجہ کمال کو ہو۔"

"مجھ سے کیا خطا ہوئی میرے آقا؟" وہ ہاتھ جوڑ کر ہوا "تم سینا کلب کے ممبر بنے ہوئے ہو اور تم نے مجھ ذکر تک نہیں کیا۔"

"سینا کلب؟" اس نے حیرت سے دہرایا پھر جیسے "اوہ! اچھا۔ دوسرے نام سے کوئی اچھا بھلا معزز انسان ہوتا ہے۔ اس لئے میں تو چکر اڑا گیا تھا۔" پھر وہ مسکرا بولا "تم سے اس لئے ذکر نہیں کیا تھا کہ تم اس لائن کے نہیں ہو۔ تمہیں اس قسم کی کرائے کی عیاشیوں سے نہیں ہے۔ تمہارے آس پاس تو ایسے ہی کوئی نہ کوئی ایسا اور صاف ستھری قسم کی حینہ موجود رہتی ہے۔ تمہیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ بہر حال اگر تمہارا البیل اس صاف ستھری قسم کی حیناؤں سے مل جائے گا تو تم ذرا بے ہودہ قسم کی چراگاہوں میں منہ مارتا چاہتے ہو تو ممبر بنو دیتے ہیں۔ یہ کون سا ایسا مشکل کام ہے۔"

وہ اس معاملے کو بالکل پکے پھلے انداز میں لے جس جتنے کی طرف اسے حوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اس طرف جا ہی نہیں رہا تھا۔ میں اس سے یہ شکوہ کر رہا تھا کہ اگر فیچ مکر منظم کاروبار کے بارے میں مجھے بتایا تک نہیں رہا تھا شاید مجھے خود اس قسم کی عیاشیوں سے دلچسپی تھی۔

میں نے لٹھری سانس لے کر قہقہے سے کہا "اے گدھے! اپنی عمر دکھاؤ ذرا اپنی باتوں پر غور کرو۔ میں دلانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم مجھے ممبر شپ دلانے کر رہے ہو۔ میں تو پہلے تمہیں یہ احساس دلانا چاہ رہا تھا کہ میں تمہیں اس قسم کے پھولوں میں پڑنے سے شرم ہوتی؟"

وہ ابھر کر بولا "اے مر میں تو ایسے پھولوں کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ بچی بچی جوانی کی عمر ابھی تیزی سے مٹتی ہے پھلتی جا رہی ہے۔ ابھی تو بچھا

میں منظر سے مردانہ اور زنانہ فہمی کی نہایت مدھم آواز سنائی دی تھی جو یقیناً رمضان کے دوست اور اس کی سیکرٹری کی تھی۔ معلوم نہیں بے چارے اخلاقیاتیں رہے تھے یا زندہ دلی سے اس مذاق میں شریک تھے۔

"تم اپنی بکواس بند کرو اور فوراً میرے ہوٹل والے آفس آجاؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اب ان شرکا کا بچھا چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

"شرقا؟" اس نے لپکا سا قہقہہ لگایا "خیر اب تمہیں ان دیکھے لوگوں کے بارے میں اتنی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ بہر حال۔ میں آ رہا ہوں۔ یہاں سے تمہارا ہوٹل زیادہ دور نہیں ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" پھر ذرا توقف کے بعد وہ بولا "سیکرٹری تو خیر اب تم نے بھی خاصی ٹھیک ٹھاک رکھ لی ہے لیکن یہاں والی بات نہیں ہے۔"

"نیکو اس بند کرو۔ اگر تم نے اس پر آنکھ رکھی تو میں تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو کچھ اسی قسم کی بات ہو گئی کہ ماہوں گھٹنا پھوٹے آنکھ بھلا آنکھ رکھنے کی صورت میں ٹانگ توڑنے کی کیا شک ہے؟"

"نیک تو جیسا سمجھ میں آئے گی جب ٹانگ ٹوٹے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"ویسے تمہیں اپنی سیکرٹری کے بارے میں اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ پہلے کہاں کام کرتی رہی ہے اور کیا کیا کام کرتی رہی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"وہ ماضی میں کیا کرتی رہی ہے اور کہاں کام کرتی رہی ہے؟" اسے بھول جاؤ۔ "میں نے سو لہجے میں کہا میں نے اسے ایک نئی زندگی گزارنے کا موقع دیا ہے۔ اب اگر تم جیسے لوگوں نے اس کا بچھا چھوڑ دیا تو شاید وہ اپنی زندگی کو خوش انجام بنانے میں کامیاب ہو جائے۔"

"یہاں تم تو میری زندہ دلی کی وجہ سے خواہ خواہی مجھے عجیب غلط قسم کے آویں میں شمار کرنے لگے۔ میں تو بڑے ضرر ساز آدمی ہوں۔ میں تو کسی کی رضامندی کے بغیر اس کے ساتھ مذاق تک نہیں کرتا۔ اگر کوئی مسکرا کر میری طرف نہ دیکھے تو میں دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے میں کوئی زیادہ بڑا آدمی تو نہیں ہوں۔"

اس کا اپنا ایک فلسفہ تھا۔ اس کی دوسری واقعہ کچھ ایسا بڑا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے قدرے بے زاری سے کہا "اچھا۔ اے نیک" شریف اور شائستہ انسان! جلدی سے میرے دفتر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سینہ رمضان حسب وعدہ دس منٹ بعد میرے آفس پہنچ گیا۔

وجود کی چادر دھوئی پر قدم بنانے شروع کئے ہیں جب اندر بھی قدم بنانے کا تو ذہن میں غصہ ہی آہوں کے سوا کیا رہ جائے گا۔ اسی لئے اپنا یہ عالم ہے باہر میں کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ کیونکہ اب تو اس چادر کی چاندنی ہے پھر اندر ہی رات ہے۔

میں اپنی جگہ بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”بھی کچھ ہی عرصے پہلے میں ایک ایکٹور نے نیو یارک کے ایک سینما میں بیٹھا تھا۔ جہاں اسی قسم کی فلمیں چلتی تھیں۔ اٹریل میں میں نے جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ وہاں موجود خانوے بند تماشائی تقریباً میری ہی عمر کے تھے جو اگلا کوا تو جوان تھے بھی۔ وہ اپنے اوپر کمرے ہی۔ ایٹیا کی معلوم ہوتے تھے وہاں بڑی لڑکی ایک میڈ ستائی کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس سینما میں تو جوان کیوں نظر نہیں آ رہے؟ میڈ بولی ”انہیں بھلا ماں اگر محض غناشا دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو خود اس وقت لیس پر ٹیکٹل میں مصروف ہوں گے تو چند اہم ایجنٹوں کو انہیں ہم آہنگ لوگوں کے محسوسات کو نہیں سمجھ سکتے جو بڑھاپے کی حدود پر قدم رک چکے ہیں۔“

”تم سینما گھب کے ذریعے لڑکیاں بھی حاصل کرتے رہے ہو؟“

میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”بھی کبھار“ اس نے سکار کا کسل لے کر بے پروائی سے بوا پھر دیا انکو ٹھانٹھوڑی کے نیچے رکھ کر چہرہ آگے کرتے ہوئے ”اب ظاہر ہے اس چوکے کے ساتھ اس عمر میں تمہارے اس مہ پر جوان اور حسین لڑکیاں عاشق تو ہونے سے رہیں۔“ اور اپنی سنت ابھی دونا داری سے نکلتی نہیں ہے۔ اس لئے بس اسی طرح چلتا ہے۔“

”تمہیں ان میں سے کسی لڑکی کا کوئی پتا ٹھکانا یا رابطے کا کوئی معلوم ہے؟“ میں نے ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔

”رابطے کا ذریعہ؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”رابطے کا ذریعہ وہی جگہ ہے جہاں فلمیں چلتی ہیں۔ فلم شو میں صرف ممبر جاسکتے اور ممبر ذرا خاصا مشکل کام ہے لیکن تمہیں اپنے اس خادم کے تے ہوئے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کھل کر بات کرو۔ تمہیں سب مل جائے گی۔“

”کیا اس بڑے کرو۔“ میں نے اسے ڈانٹا ”میں لعلت بھیجتا ہوں سے اس قسم کے شوق اور تمہاری ممبر شپ پر۔ میں تم سے یہ دبا ہوں کہ تم نے بھی اس ذریعے سے آنے والی کسی لڑکی سے اصل پتا ٹھکانا پوچھنے کی کوشش نہیں کی؟“

”بھئی۔ تمہیں معلوم ہے میں آدمی ہوں ذرا اور تم کا۔“ وہ ی جہاں سے کر بولا ”میں آم کھا۔“ سے غرض رکھتا ہوں پیڑ سے ٹسک۔ اس کے باوجود میں ایک تودہ مرتبہ تجس کی میں جھلا ہوا اور میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو اس معاملے میں بہت ہی ہوشیار چڑس تھیں۔ پر دل پر

پانی ہی نہیں پڑے دیتی تھیں۔ انہوں نے اپنا پتا ٹھکانا بتا کر نہیں دیا حالانکہ میں نے انہیں خاصا جکر بھی دیا اور روپے پیسے کا لالچ بھی دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس معاملے میں وہ خوف زدہ تھیں۔ اپنے بارے میں وہ کسی قسم کی معلومات کسی کے ہاتھ نہیں گئے دیتی تھیں۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھیں اور کیا چاہتی تھیں کہ دوسرا بھی اپنے کام سے کام رکھے لیکن خیر۔ اتنی خشک اور میکینیکل بھی نہیں ہوتیں۔ ویسے تو دنیا بھر کے موضوعات پر خوب صورت اور شاندار گفتگو کرتی ہیں آدمی کا دل لگائے رکھتی ہیں۔ اچھی کھنی حیات ہوتی ہیں۔ بس واحد قسم نے ان کی ذاتیات کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور پھر ان کا سوچ آف ہوا۔“

”اس کے باوجود تمہیں کبھی تشویش نہیں ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”کیسی تشویش؟“ اس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”یہی کہ سوسائٹی میں پہلے ہی کئی طرح کے کنسر داخل ہو چکے ہیں۔ یہ ایک اور نئی طرح کا کنسر داخل ہو رہا ہے۔ میں نے کہا۔

”جو کنسر پہلے داخل ہو چکے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے پلاک کی طرف لے جانے والے ہیں۔“ وہ سکار کو انگلیوں میں کھاتے ہوئے بولا ”اور پھر یہ کوئی یا کنسر تو نہیں ہے۔“

”حسن فروشی۔ جسم فروشی تو ہزاروں سال سے ہو رہی ہے۔ ہماری سوسائٹی سمجھ نہ جانے کب سے اس کی پلیٹ میں ہے۔“

”میں اس کی بات نہیں کر رہا۔ اس سلسلے میں ایک نیا سلسلہ شامل ہوا ہے۔ تم نے ان فلموں کو شاید کسی خاص زاویہ نظر سے نہیں دیکھا۔ تم نے ان کے بارے میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔“ میں نے کرسی پر پل بولنے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی ”حسن فروشی ہماری سوسائٹی میں پرانی بیماری سی۔ لیکن یہ فلمیں بولنے والی اسٹیج اب بھی نہیں آتی تھی۔ کوئی انتہائی اخلاق باز نہ لڑکی بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی۔ تمہیں کچھ گریڈ محسوس نہیں ہوئی کہ اتنی خوب صورت لڑکیوں کو شاید کسی طرح اس کام کے لئے مجبور کیا گیا ہو؟ انہیں کسی بہت مضبوط جکے میں جکڑا گیا ہو؟ کچھ لوگوں نے نہایت منظم انداز میں فی الحال تو اونچے پٹے پر یہ کا دیار سیٹ کیا ہو؟ اور اس امکان کی طرف بھی تمہارا ذہن نہیں گیا کہ جب یہ وحدا پٹے سے علی سطح پر آئے گا تو کئی گلی کیا ہو گا؟“

اس نے ایک لمحے سوچا پھر اپنے ہماری بھر کم شانے اچکاتے ہوئے اعتراف کیا ”میں میں نے اتنی بہت سی۔ اور گری باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ جب کوئی چیز دوسرے ممالک سے کسی بھی جائز یا ناجائز راستے سے ملک میں آتا شروع ہوتی ہے۔ وہ چیز اچھی ہو یا بُری۔ کوئی نہ کوئی نہ انسان ایسا ضرور آتا ہے جب وہ ”موکل میڈ“ بھی دستیاب ہونے لگتی ہے۔ میں تو



”تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ بظاہر یہ معمولی اور معمولی  
وہذا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کے ذریعے ایک ایسا  
بجلی بڑی اندر سڑی جتنا ناجائز رہتا ہے کھینچا جا رہا ہے جو نہ جانے  
کتنے برس آدمی کی جب میں جا رہا ہو گا۔ بلکہ شاید بیاد آ رہی ہو  
راست بازی سے تو چلائی جانے والی کوئی اندر سڑی بھی اتنی آواز  
دے سکتی ہو۔ پہلے ہی اس ملک میں ناجائز آمدنیوں نے جو انداز  
پھیلایا ہوا ہے اور جس طرح لوگوں کی زندگی ابھرنے کی ہوئی ہے اس  
نہیں اندازہ ہونا چاہئے۔ ان کے علاوہ جو اس دھندے کے  
بھیاں اثرات مرتب ہوں گے وہ الگ ہیں۔“

سیٹھ رمضان نے استہزائی سی نظروں سے میری طرف دیکھا  
ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر کھینچی کی۔ میں اس دوران  
گھور آ رہا۔ وہ عجیبہ ہوتے ہوئے بولا ”اسم کی کیس فزائی  
مت جاؤ۔ بہر حال یہ ایک چھوٹا اور گھٹیا دھندا ہے۔ ہم بڑے  
ہیں ہمیں اتنے چھوٹے چھوٹے اور گھٹیا معاملات میں ٹانگہ  
ازدانی چاہئے۔ کیس ٹانگہ گندی نہ ہو جائے معاشرہ تو بے  
جانے کس کس چکر میں پھنسا ہوا ہے تم اسے کس کس چکر  
میں؟ اکیلا چٹا کیا بھڑا چھوڑے گا۔“

”ہماری یہی سوچ تو ہمیں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ ہم میں  
جتنا بھی کر سکتا ہے اسے اتنا تو کرنا چاہئے۔ اگر کوئی ایک ذرا  
برائی کو بھی مٹانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ بھی اس کی  
کامیابی ہے۔ ذرا ذرا کر کے ہی پار بننا ہے اور ذرا ذرا الگ  
پاروں کو ختم بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ ایسا  
بھی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ سڑ، کچھ سوگ، کچھ  
دالے بھی ہیں۔ باش کا ایک کرم خوردہ دانہ تم بھی ہو۔ ہم  
دست و پا بھی نہیں ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ ہم کچھ کر سکتے  
تو کسی بھی طرح۔ کسی کی بھی مدد سے بڑے بڑے کام کر سکتے  
ہمارے اپنے اپنے کام اور زندگی کے دوسرے چکر تو چلتے  
گئے موقع ملے تو سائنڈ میں بھی ہمیں ایسا بھی کوئی کام  
رہنا چاہئے۔“

”تمہیں اس چکر کا کیا کہیے چلا اور تم کس طرح اس  
متوجہ ہو گئے؟“ سیٹھ رمضان نے پوچھا ”تمہاری اس میں  
دیکھی کیا ہے؟“

عام حالات میں سیٹھ رمضان ایک بالکل بے پروا  
بے وقوف اور قدرے ایدگوار سا آدمی نظر آتا تھا لیکن  
اس کی اصل شخصیت اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگتی  
ہمت مختلف تھی۔ اس وقت وہ ایسی ہی نظروں سے میری  
رہا تھا جن کی وجہ سے وہ ایک بالکل مختلف سیٹھ رمضان  
لگتا تھا۔

”میں ایک لڑکی کی وجہ سے اس چکر کی طرف  
ہوں۔“

اسے اسی طرح کا عمل سمجھا تھا۔ تمہاری پیدائش سے پہلے... اور  
پارٹیشن سے بھی پہلے۔ بلکہ شاید میری پیدائش سے بھی پہلے جب  
انگلیڈیا امریکا سے عام فلمیں آنا شروع ہوئی تھیں۔ سنیما گھر بننا  
شروع ہوئے تھے تو فلم کے لئے تماشائی دستیاب نہیں تھے۔ انہیں  
فلم کی طرف راغب کرنا تھا۔ ہماری بہت پرانی موسیقی میں فلم  
دیکھنے جانا ایک مقبوضہ کام تھا۔ شرفا کے بچوں کو اس پر مار پڑتی  
تھی۔ آج ہم خود فلساڑی میں کتنا آگے ہیں اور کس کس ملکوں کی  
فلمیں ہمارے گھروں میں فیکل کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی جاتی ہیں جو  
خاصی ضرورتیں ہیں۔“

”پھر بھی وہ کچھ اور بات ہے۔ یہ کچھ اور بات ہے۔“  
”ہاں“ وہ میری بات کانٹے ہوئے بولا ”یہ فلمیں زیادہ  
خطرناک ہیں اور زمانہ خواہ کتنا ہی آگے چلا جائے بہر حال یہ چھپ  
چھپ کر ہی دیکھی جاتی رہیں گی لیکن ان پر بھی فارن میڈ سے لوکل  
میڈ کا زمانہ تو آتا ہی تھا۔“  
”وہ زمانہ ابھی نہیں آیا۔“ میں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے  
کہا ”اور خدا نہ کرے کہ وہ زمانہ کبھی آئے۔ اس زمانے کو زبردستی  
لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہمیں مل کر اس کو روکنا ہے۔“  
”تم پر کچھ خدا کی فوج داری کا دورہ پڑا ہے؟“ اب اس نے مجھے  
گھورا۔

”وہ تو مجھ پر اکثر پڑتا ہی رہتا ہے۔ اس بیماری کے جراثیم بھی  
کبھی تھوڑی بہت تعداد میں تمہاری خود غرض اور بے پروا  
کھوپڑی میں بھی داخل کرتا رہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
”ہاں۔ ہاں۔“ وہ جیسے کچھ چوتکتے ہوئے بولا ”تم کبھی بکھار  
مجھ سے کوئی اچھا کام کرا ہی لیتے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“  
”تمہیں خود کبھی خیال نہیں آیا کہ اس دھندے کے پیچھے نہ  
جانے کیا کمائی ہو۔ کتنے منظم انداز میں کام کیا جا رہا ہو اور مستقبل  
کے لئے ان لوگوں کے نہ جانے کیا عزائم ہوں؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں۔ میں اتنی کمری سوچوں میں نہیں پڑتا۔“ اس نے  
اطمینان سے جواب دیا۔ مجھے اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی  
پھر اس نے آنکھیں سکڑ کر مجھے گھورتے ہوئے ذرا تشویش سے  
پوچھا ”تم اس چکر کے بارے میں اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو؟  
تمہارے ارادے کیا ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے کو روکا جائے خصوصاً ان  
لوگوں کو اگر کسی طرح مجبور اور خوف زدہ کر کے ان سے کام لیا  
جا رہا ہے۔ یا ان کی کچھ عجیبہ عجیبہ مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے  
انہیں کسی نادرہ جال میں پھنسا دیا جا رہا ہے۔“

”اس قسم کے سلسلے معاشرے میں عام ہیں لیکن ان پر پردہ پڑا  
رہتا ہے۔ اس لئے وہ کبھی ہماری تمہاری عقلوں میں زیر بحث نہیں  
آتے لیکن یہ ذرا تمہارے علم میں آیا ہے اس لئے تم اتنے پریشان  
ہو رہے ہو۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

قلم دیکھی تھی یا کسی! ہے بک کیا تھا؟

وہ تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہی بولا "ہاں اس کی قلم تو میں نے دیکھی تھی اور اسے بک کرنے کی فرمائش بھی کی تھی لیکن وہ فرمائش پوری نہیں ہو سکی تھی جس پر مجھے اس وقت حیرت بھی ہوئی تھی لیکن پھر اس سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں میرے آنے لگی تھیں اس لئے میں اسے بھول بھال گیا تھا۔"

"تم دوبارہ اس کی فرمائش نہیں کر سکتے؟" میں نے پوچھا۔  
"کر تو سکتا ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن تم کتنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جب یہ تمہارے پاس آئے یا تم اس کے پاس جاؤ تو تم خون کر کے مجھے مطلع کرو۔" میں نے کہا۔  
"اور تم اس لڑکی کو قاتل کرو؟" وہ لٹھڑی سانس لے کر بولا۔

"تم کہہ سکتے ہو کہ کچھ ماسٹوم لوگ اسے انوا کر کے لے گئے، ہم ذرا عے میں پوری طرح حقیقت کا رنگ بھی بھروسے کے۔" میں نے کہا۔

"اس میں سب سے نمایاں لہو کا رنگ ہو گا اور وہ لہو میرا ہو گا۔" وہ صوفے کے پیشے سے نیک لگا کر راجے ہوئے بولا "یارا تم کیوں مجھ غریب کو اس پکڑ میں مردانے پر گتے ہوئے ہو؟ ایک سینٹھ نے ایک لڑکی کے معاملے میں اس سے بھی معمولی درجے کی کوئی گڑبگڑ کی تھی وہ قتل ہو گیا تھا۔ آج تک اس کے قاتلوں کا قاتل کا پتا نہیں چلا۔"

"میری جان... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں... لیکن تم اطمینان رکھو میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوں

"وہ میرے خدا!۔" سینٹھ رمضان نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا اور دونوں باتوں سے سر قدام لیا "مجھے یہاں ہی بچھ جانا چاہیے تھا کہ تم کسی لڑکی کی وجہ سے اس طرف متوجہ ہوئے ہو گے تم کسی بھی معاملے کی طرف لڑکی کی وجہ سے متوجہ ہوتے ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تم ایسے پارسا بن کر مجھے اٹھائے ڈپٹے نہیں کیوں گے ہوئے تھے؟"

"ایک تو یہ بار بار تمہارا جو کہ حاپن عود کر آتا ہے اس کی وجہ سے بات چیت میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔" میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا "پہلے پوری بات سن لو اور اپنے کھانا داغ سے اتنی جلدی نہ کیا کہہ کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس لڑکی سے کوئی دلچسپی ہے۔"

"ہاں مجھی تم یہ کہنا بھی انور ڈر سکتے ہو۔" وہ ایک بار پھر میری بات کاٹتے ہوئے حسرت آمیز انداز میں بولا "کیونکہ تم جوان اور ہنرمند ہو۔ تمہارے پاس تو ہر وقت کوئی نہ کوئی حسین اور اونچی قسم کی چیز موجود رہتی ہے تمہارے پاس پورا کس ہوتا ہے کہ فلاں میں دلچسپی لو فلاں میں مت لوب مصیبت تو تم جیسے بڑی عمر اور معمولی کچنے والوں کی ہے جنہیں دولت مند ہونے کے باوجود کسی کی نظر کرم حاصل کرنے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔"

میں نے چند لمبے خاموشی سے اسے گھورتے رہنے کے بعد ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "اگر تم اب سچ میں بولے تو میں وہ بات اٹھا کر تمہارے منہ پر کھینچ ماروں گا جس کے بعد تمہارا یہ معمولی پرکھنا غیر معمولی طور پر مرمت طلب ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ایک شریف فیملی کی لڑکی ہے ایک ایسی فیملی جو ہماری ہمدردیوں کی مستحق ہے شاید بتاتے ہیں کہ وہ کسی پکڑ میں پھنس گئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ بلکہ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں ہے۔"

اب سینٹھ رمضان کچھ سنجیدہ نظر آیا اور اس نے تیزی سے ٹپکیں جھپکے تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر وہ لڑکی اپنی مرضی کے خلاف کسی پکڑ میں جا پھنسے تو اس سے نکل آئے اور اگر اس کے دل میں شرفانہ زندگی گزارنے کی خواہش کسی کوئے کھد رے میں موجود ہے تو وہ اپنی فیملی میں لوٹ جائے۔"

"میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھے ہوئے سکار کو دوبارہ سگائے کے بعد پڑ سکون لہجے میں پوچھا۔

"کاش یہ سمجھ ارا نہ سوال تمہاری ہے بورد زبان پر سنا گیا ہوتا۔" میں نے تیزی کے دروازے سے موٹائی تصویر نکالتے ہوئے کہا پھر میں نے تصویر اس کی طرف پڑھائی "سب سے پہلے تو اس تصویر کو غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ کیا تم نے اس مخصوص اڈے پر اس کی کوئی



اشرف کتب خانہ القصیر پش

اردو بازار لاہور

بہر حال اب شیخا کلیپ کے ممبر کی حیثیت سے سیٹھ صاحب کا اس شخص سے رابطہ کرنا کچھ اور معافی نہ رکھتا تھا۔ اس نے ملایا اور رابطہ ہونے پر گودرڈز کے سے انداز میں دو تین بار سفر کے جملے بولنے کے بعد نیچے آوازیں بات کرنے لگا۔ اس کے کہنے کا انداز گول مول سا تھا۔ وہاں قلموں کے غالب اثر مل رہے تھے اور ابی نمبر کے حوالے سے اس قلم والی لڑکی کو جانتا تھا۔

میں نے رمضان کو وہ سیریل نہیں یاد تھا۔ ہم نے جو پرنٹ دیکھا تھا اس میں ایسا کوئی نمبر نہیں تھا۔ شاید وہ سیریل پرومیکٹر سے قلم دیکھنے والوں کو ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے چٹ لکھ کر رمضان کی طرف بڑھائی۔ چٹ پر جس نے لکھا تھا کام مرنے کا تم اس نام سے اس کے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔ وہ قلم کی کچھ نشانیاں تھیں تاکہ لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

اس نے چٹ پڑھ کر انگلی ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ ایسا کر سکے۔ اس نے بات جاری رکھی تاہم بات جلد ہی ختم ہو گئی۔ اس نے فون بند کر دیا اور کراہنے کے سے انداز میں بولا "ستم" اور بھی مروانے کا بندوبست کر رہے تھے کہ میں فونی کا اصل سٹے لے کر اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دوں۔ وہ تو پہلے ہی میرے بارے میں غلگ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے جو نہیں اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اٹناچھ سے سوال جواب شروع کر دینے کے بجائے اس کا خیال کیسے جھپٹا؟ مجھے تو اس سے جان چڑھا رہا تھا۔ ہوتی تھی۔ میں اگر یہ بھی ظاہر کر دیتا کہ مجھے لڑکی کا نام بھی معلوم تھا پھر تو اسے یقین ہو جاتا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اگر اس کا لڑکی کہنے کا ارادہ ہو تا تب بھی انکار کر دیتا۔"

سیٹھ رمضان آتا کہ وہاں نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ اس عقل کی بات کی تھی۔ اس کے دماغ کے کل پرزے ٹھیک ٹھاک کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا ”اس شخص نے جواب کیا دیا؟“ ”دی جس کی جتنے توقع تھیں۔“ سیٹھ رمضان نے لفظ سانس لے کر جواب دیا ”اس کی جو کئی سمجھ میں آیا کہ میں کم لڑکی کا ذکر کر رہا تھا، اس نے فوراً انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ لڑکی سے ان کا نہ تو کانفرنس ہوا ہے اور نہ ہی کا فیصلہ ہوا ہے۔ ان کے ”پرنس“ کے دائرے سے نکل چکی ہے۔“

میرے دل میں مایوسی کی ایک لہر ابھری۔ میں نے محض ایک  
موجودہ ہی امید کے سارے سینے رمضان کو آگے بڑھا دیا تھا۔  
کوئی شش ماہ کا کام ہی تھی لگائی تھا مجھے کسی طرف سے مدد  
آنے کا امکان کم ہی تھا۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی کرنا تھا وہ  
اور میرے ساتھ ہی کرنا تھا۔

دوں گا۔ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو، کوئی عام سیٹھ نہیں ہو کہ کوئی تمہیں اتنی آسانی سے قتل کر کے چلا جائے۔"

”بیٹہ عام ہوا غافل۔ چھوٹا ہوا بڑا۔ اس کے لئے ایک آدھ گولی ہی کافی ہوتی ہے اور سیرے مرنے کے بعد اگر تم نے قاتلوں کی نسل بھی ختم کر دی تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں تو عالم بالا سے ان کا انجام دیکھنے کے لئے واپس نہیں آسکوں گا اور نہ ہی اپنے گھر کے سامنے ٹیٹ لکوا کر شہر لے جاؤں گا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”یار! وہ جو لوگ بھی ہیں کافی خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔“

”ہم سے زیادہ خطرناک تو نہیں ہوں گے۔ بد معاشیوں کے لئے ہم خود سے خطرناک ہیں۔ ایسے خطرناک طاقت ہوتے ہیں اس کا شاید جس سے ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا۔ میں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے دوں گا۔“

”یار! تم اندازوں اندازوں میں ہی مجھے مردادو گئے“

”رمضان ڈیڑھا بجے یہ تو معلوم تھا کہ بزدلی تمہارے خیر میں کافی قسب بخشنے قدر ایش شامل ہے مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ کسی معاملے میں پوری طرح میری رفاقت میسر ہوتے ہوئے بھی تم بزدل کے بزدل ہی رہو گے۔ دیئے کبھی کبھی تم بغیر کسی سہارے کے ہی کافی بامادر بھی ہو جاتے ہو۔“

”وہہ بس۔۔۔ ویسے ہی کبھی کبھی پر دلیری کا دورہ پڑتا ہے۔“ وہ گویا ذرا شہرا کر بولا ”لیکن دورے کا کوئی وقت تو نہیں ہوتا۔“

”کاش کوئی دیکھتے ہو تو جس اس وقت چاہے اسکو اتر کر پر دلیری کا دورہ پڑ جائے!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اچانک وہ جھرجھی سی لے کر گویا کسی خول سے باہر آتے ہوئے بولا "اچھا! بس! اب تم اتنی غصہ کر رہے ہو تو کچھ کرتا ہی پڑے گا۔"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ درحقیقت کچھ ایسا خوف زدہ نہیں تھا۔ وہ صرف مجھے تنگ کر رہا تھا۔ وہ میرا کل فون جیب سے نکالنے ہوئے بولا "فرمائش تو میں ابھی کر کے دیکھ لیتا ہوں لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ فرمائش پوری ہوگی۔ اگر پوری ہونا ہوتی تو اسی وقت ہوجاتی۔"

”تم کہاں فون کرنے لگے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اسی کو ٹھنی کہہ۔۔۔ جہاں شریلائے جاتے ہیں۔ رابطے کا ذریعہ۔  
 صرف وہی ایک شخص ہے جو وہاں موجود رہتا ہے۔“ اس نے  
 جواب دیا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ اس شخص کو ہم اٹھوا چکے  
 تھے اور اس سے ہمیں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ تم  
 ذمہ لڑکی کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا البتہ ان کے  
 حندے اور طریقہ کار کی تفصیل اسی سے معلوم ہوئی تھی۔ اسی  
 سے چند مہینوں کے نام معلوم ہوئے تھے جن میں سینئر رہنما کا  
 نام بھی شامل تھا۔

تمہیں ذرا احتیاط رہنے کی تاکید کر رہا ہوں۔ تمہیں قرشاید اندازہ بھی نہ ہو کہ کرم بخار بیک اور اس کا گروہ کتنا خطرناک ہے۔  
 میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تاسم بکلی اور اس کا گروہ بھی بہت خطرناک تھا۔ بلکہ میرے اندازے کے مطابق کرم بخار بیک کے گروہ سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ اس کی توہیں بہت بڑی امیر موجود تھی اور اس کی ہنت پر پورا ایک قبیلہ تھا کرم تاسم بکلی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“  
 ”قسمت بیش یکساں انداز میں انسان کا ساتھ نہیں دیتی۔“ وہ ذرا چڑ کر بولا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ خلف انداز میں تو ساتھ دیتی ہوگی۔“  
 میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا ”اہم بات بس یہی ہے کہ قسمت انسان کا ساتھ دیتی رہے۔ اندازہ کچھ بھی ہو۔ خوش قسمتی انسان کی زندگی میں بہت اہم فیکٹر ہے۔“

”بہت اہم نہیں۔ سب سے اہم فیکٹر ہے میری جان!“ سیٹھ رمضان سرہلاتے ہوئے بولا ”انسان خوش قسمت ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ اسے اور کیا چاہئے لیکن اپنے آپ کو خوش قسمت کا بھی ہر انسان کا اپنا ایک تلف معیار ہوتا ہے۔ بعض لوگ کرائے کے دو کمرے کے مکان میں اپنی سیدھی سادی دفا شعار بیوی اور عام سے بچے کے ساتھ رہ کر کسی دفتر میں کھڑکی کے کچھ خود کو خوش قسمت سمجھتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ بعض لوگ کسی حال میں خوش نہیں رہتے۔ ہر وقت دوتے ہیں۔ ہر وقت انہیں دنیا سے تنقید سے سب سے گھر رہتا ہے۔ بعض لوگوں کو تو میں نے تم بھی حیثیت میں بھی خوش نہیں دیکھا۔ ہر حال۔ بات کرم بخار بیک کی ہو رہی تھی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی خوش قسمتی پر زیادہ مت اترا تا اور اس سے مت الگنا۔ خواہ تو اہ کسی معمولی بات کے پیچھے اپنے لئے کوئی بڑی مصیبت مول مت لیتا۔ وہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ آدمی کو گولی پہلے مارتے ہیں نام بعد میں معلوم کرتے ہیں۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ کرم بخار بیک ملک سے فرار ہو چکا ہے۔“  
 میں نے اس سے بحث میں الجھے بغیر کہا ”کیا اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کے وعدے اسی طرح جاری ہیں؟“

”جب انسان کے پاس بے حساب دولت اور زمین پاور دونوں موجود ہوں تو اس کے ایک جگہ موجود ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بے قویہ بھی مداخلات کا زائد ہے۔ آپ کہیں بھی بیٹھ کر ہزاروں میل دور اپنے سفارت کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ بس وہاں آپ کے حکم کے غلام موجود ہونے چاہئیں۔ تم خود اتنے بڑے پرنس ہیں ہو۔ مجھ سے بے ذوقوں کی طرح کیوں ایسے سوالات کر رہے ہو۔ تم ان حالات سے گزر چکے ہو۔ ریڈ ڈاٹ سے تکفیش کے دوران تم اتنا عرصہ قایم رہے۔ تمہارا تو اپنے ساتھیوں سے رابطہ بھی نہیں رہا تھا لیکن کام تو چلتے رہے۔“

”معلوم ہونے میں دیر اس لئے ہو رہی ہے کہ کوئی مالک کہیں یا رہے۔ تمہیں اگر اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے تو بتاؤ۔“  
 ”دیکھ نہیں۔ یہ بات تو تم پہلے ہی مجھ سے پوچھ لیتے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔  
 ”ابے ہوئی! اگر مجھے پوچھتے میں دیر ہو گئی تھی تو تم خود ہی بتا دیتے۔“ میں نے دانستہ چپ کر کہا ”کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ اہم بات ہے؟“

”یار امیری فکر میں تو یہ سارا پکڑ ہی اہم نہیں۔“ وہ اعترافاً لے کر بولا ”چاہے تم پر کیا وہ پڑا ہے جو تم اسے اتنی اہمیت دینے جا رہے ہو۔ تم پر ہر قوموں دن بعد اسی قسم کا کوئی نہ کوئی دورہ پڑتا ہے۔ اسی لئے تم دنیا کے سارے گوشہ گوشہ میں ہونے کے باوجود اکثر خود کو مصیبت میں ڈالے رکھتے ہو۔ ہر حال اگر میرے بتانے سے تمہاری تکلیف میں کمی ہو سکتی ہے تو بتانا ہوں۔ وہ کوئی کرم بخار بیک نے لے لیا۔ اگر گنڈ پر کرائے پڑی ہوئی ہے۔ یہ بات مجھے کتنی طور پر معلوم ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا پتا ہوگا۔“

”کرم بخار بیک؟“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے دہرایا۔  
 ”یہ نام تو کچھ ناشائستہ محسوس ہوتا ہے۔“

”ایک تو تمہیں جن موضوعات سے دلچسپی نہیں رہی۔ ان کے بارے میں تم نے کچھ بھی یاد رکھنا چھوڑ دیا ہے۔“ سیٹھ رمضان نے ٹھوکر مارا۔

”اس کے باوجود یاد رکھنے کو اتنی باتیں ہوتی ہیں کہ ذہن ہر وقت لاپرواہ رہتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کرم بخار بیک ڈرگ مانیہ کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے اور ان دونوں ملک سے مشہور ہے۔“ سیٹھ رمضان نے بتایا۔  
 ”اوہ ہاں مجھے یاد آیا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”جیسے ممکن تھا حکومت اسے پکڑ کر ایک ملک کے سپرد کر دی۔ وہ احتیاطاً کسی اور ملک کی طرف نکل گیا۔ برا احتیاط پسند آدمی ہے۔“ سیٹھ رمضان سرہلاتے ہوئے بولا ”تم اس کی احتیاط پسندی کا اندازہ اس سے لگا لو کہ وہ اپنا ”کلڈ وار“ پاکستان سے چلا تا تھا مگر اس نے پاکستان میں کوئی پراپٹی نہیں بنائی تھی۔ کرائے کی جگہوں سے کام چلاتا تھا۔ پچھلے دنوں جب حکومت نے ڈرگ مانیہ کے لوگوں کی جانبداری خریدی فروخت دیکھنے اور ان کی چھان بین کرنے کا پروگرام بنایا تو پتا چلا بیشتر پہلے ہی اپنی پراپٹی ٹھکانے لگا چکے تھے اور ان میں سب سے ہوشیار کرم بخار بیک تھا جس کی یہاں کوئی پراپٹی ہی نہیں تھی۔“

”اس کا مطلب ہے یہ وعدہ کرم بخار بیک ہی کا ہو سکتا ہے؟“ میں نے ذرا امید صاف کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”ہاں میں ممکن ہے۔“ سیٹھ رمضان بولا ”اسی لئے تو میں

”میرے تو جائز کاروبار تھے۔“ میں نے فرق نہانا چاہا۔

سیٹھ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”اے بیٹے، مولے مت، بنو پار! تمہیں معلوم ہے زمانہ کچھ الٹ پلٹ سا ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو الٹا حساب ہو گیا ہے۔ ناجائز دھندے کرنے والوں اور بد معاشرلوں میں سروائیو کرنے کی طاقت برحق جارتی ہے۔ جائز برٹس کرنے والوں اور شریف لوگوں میں گھٹ رہی ہے۔ جائز برٹس کرنے والوں کے لئے چندوں میں ہی اپنے حالات پیدا کئے جاسکتے ہیں کہ وہ بستر بوریا کر کے بھاگ جائیں۔ ناجائز دھندے کرنے والا بد معاشری پھیلانے والا تمام انسدادی کارروائیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے برسوں سروائیو کر جاتا ہے اور بعض اوقات تو پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔“

”اے!۔۔۔“ کسی حد تک تھمادی بات درست ہے لیکن میں اس یقین اور فکریے کے ساتھ زندہ ہوں کہ آخری فتح اچھائی اور سچائی کی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن آخری فتح کی نوبت آنے تک انسان کا نکل نکل جانا ہے۔“ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔  
 ”اچھا۔۔۔ تم یہ بتاؤ تمہیں کرم عماریک کے باہر کے ٹھکانے کا کچھ علم ہے؟“ میں نے پوچھا ”یا کم از کم یہ معلوم ہے کہ وہ کس ملک میں ہے؟“

سیٹھ رمضان نے نفی میں سر ہلایا ”فی الحال تو یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ جب معاملہ ذرا اٹھنا اڑ جائے گا اور حالات کرم کے حق میں کچھ بہتر ہو جائیں گے تو وہ خود ہی اپنی کین گاہ سے باہر آجائے گا۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں بلا کر بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ کوئی مدد نہیں ملی۔ معلومات میں تشکا کوئی اضافہ نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔

”بڑے ناشر کے انسان ہو۔“ سیٹھ رمضان بولا ”میں نے تمہیں کرم عماریک کے بارے میں بتایا کہ وہ کون سی اس نے کرائے پر لی ہوئی ہے۔ یہ تمہاری معلومات میں اضافہ نہیں تھا؟“

”اپنے پاس ہی رکھو اپنا یہ اضافہ۔“ میں نے اسے چڑایا ”فی الحال یہ تو کفر میں نہیں ہے کہ یہ واقعی کرم کا اپنا ہی دھندہ ہے کوئی بید نہیں، کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی بڑا کارندہ کام دکھا رہا ہو۔ اس نے اپنا کاروبار شروع کر لیا ہو۔“

”اگر تمہیں یہ پتا چل جائے کہ کرم کس ملک میں موجود ہے تو تم کیا رہاں اس پر اچھ والے کی کوشش کرتے یا براہ راست اسی سے تصدیق کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ دھندہ اسی کا ہے یا کسی اور کا؟“ سیٹھ رمضان نے ذرا بے چینی سے پوچھا۔

”ہاں یہ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ کون سا ایسا نامکن کام ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سیٹھ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر نکلا پھر گویا اس موضوع

کو ختم کرتے ہوئے بولا ”اجنی دیر سے خود بھی بکواس کے چارے، اور مجھ سے بھی بکواس کرائے جارہے ہو مگر اجنی تھکن نہیں ہوتی کچھ کھانے پینے کو ہی منگوالو۔“

”میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم وہ گدھے ہو جو دو ٹائلوں پر چلے ہو اور بدقت چرتا رہتا ہے۔“ میں نے فون کی طرف اشارہ پڑھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن دیکھ لو۔ کھانے پینے کا اتنا شوقین ہونے کا یہ وجود ابھی تک مونا نہیں ہوں۔ میرا جسم قتل عمل نہیں کرتا اور یہ خیال ہے میں اس شر کا واحد سیٹھ ہوں جو اس عمر میں بھی کچھ پھٹسی سموتے تک کھاتا ہوں بلکہ اکثر کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا ہوں اس کے باوجود مجھے شوکر، بلڈ پریشر، دل کی کوئی بھی بیماری نہیں ہے۔“ وہ فخر سے بولا۔

وہ اپنے منہ میں مٹھو نہیں بن رہا تھا۔ وہ ایک لمبا ترنکا اور قدرے چوڑا چکلا سا آدمی تھا۔ اس کی شخصیت ذرا گنوار دم خرم تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس کی جسمانی ساخت سے مولانا جملہ جھلکا تھا بلکہ وہ ورزش وغیرہ کے شغلات میں بھی نہیں پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین آتا تھا کہ صحت واقعی ایک خدا داد چیز تھی اور بعض لوگوں کو تو صحت اسی طرح عطا ہوتی تھی کہ انہیں اس کا حفاظت بھی نہیں کرنا پڑتی تھی۔

پیٹ پوجا کرنے کے بعد سیٹھ رمضان رخصت ہو چکا تو میں نے شفیق شاہ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ یہ معلوم کرنے کے لیے میں دقت شائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون سی کس کس کرائے پر لی ہوئی تھی یہ بات سیٹھ رمضان سے معلوم ہو گئی تھی۔

اس کے بعد ہم ایک بار پھر بندگی میں کھڑے تھے۔ آگ بڑھنے کے لئے ہمارے پاس کوئی سراغ نہیں تھا۔ امیر جتنی بڑے بھی ٹائلیں کاغذات و دیگرے کے میرے پاس آئی تھی، پڑا ہوا نظروں سے میری طرف دیکھتی تھی کہ شاید میں اس سلسلے میں ات کوئی خبر سناؤں گا۔ بخدا ابھی ایک مرتبہ چٹکایا ہٹ امیر اداؤں فون کر چکی تھی۔ میرے پاس انہیں منانے کے لئے کوئی خبر نہیں تھی۔ جو کچھ معلوم ہوا اتفاقہ میں انہیں نہیں بتا سکتا تھا۔

میں ابھی اسی سوچ بچار میں تھا کہ امیر کرے میں آئی اور بچہ پڑجوش سے لیٹے میں بولی ”سرا! ایک بڑی وی آئی پنا شخصیت تم سے ملے آئی ہے۔“

عام طور پر امیر کسی کی آمد کی اطلاع مجھے فون پر ہی دیتی تھی لیکن وہ خدا اچھ کر دوڑی دوڑی آئی تھی تو اس کا مطلب یہ شخصیت واقعی وی آئی تھی۔ تاہم میں نے کسی خاص دلچسپی اظہار کے بغیر پوچھا ”ایسا کون وی آئی پی ہوا یا نہیں۔ جس۔“ تمہیں اتنا ہو کھلایا ہے؟“

”میں ہو کھلائی تو تمہیں ہوں سرا“ وہ سنہلے ہوئے ذرا کھپا ہوا ہو کر بولی ”دراصل مجھے حیرت، دیر ہی ہے کہ یہ شخص آپ سے

”اب! میں نے قدرے دلچسپی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس شخصیت کا نام تو بتاؤ۔“  
 ”ہیر دانش شاہ“ امبر نے جواب دیا ”آپ یقیناً انہیں جانتے  
 ہیں گے“

”انسوی... مجھے ان صاحب سے شناسائی کا شرف حاصل نہیں ہے۔“ میں نے معذرت خواہانہ سے لبے میں کہا۔

”نہیں سر! میرا مطلب ہے آپ غائبانہ طور پر تو اُمیدیں جانتے ہیں۔“

”غائبانہ طور پر.....؟“ فیس نے دہرایا ”اس کے لئے بھی مجھے اپنے زور و دھڑکے کا۔“

مجھے واقعی ذہن پر زور دینا پڑا اور اس قدر قی کبھی نہیں نہ جانے کسی کوڑے کے تحت پڑی ہوگی کچھ معلومات انجمن جو زیادہ تر اخبارات میں دیا تھا تو میری نظر پر گزری تھیں۔ میرا دل شاہ واقعی شہر کی نہایت نمایاں شخصیات میں سے ایک تھا۔ کسی دور حکومت میں وزیر بھی رہا تھا۔ اس کا شمار ملک کی دولت مند ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ کا دیواری طعنوں میں ہمیں نے سنا تھا کہ اس کی آمدنی کی نہ جانے کتنے دراز رہا تھے اور اپنی دولت کا شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

اس کی کوئی سیاسی پائلٹی نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی پائلٹی میں شامل تھا۔ اس کے باوجود ایک بار وزیرِ زہ چکا تھا اور میں نے سنا تھا ہر دور میں وزارتوں کے امیدوار اس کے درِ دولت پر حاضری دیتے تھے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس ہر بڑے سے بڑا کام کرنے کا کوئی جاوہ تھا۔ وہ ملک کے انتہائی بارشورخ آدمیوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔

پہری سردی اس کا خاندانی سلسلہ نہیں تھا۔ خود ہی اپنی کوثرانی کے نور میں ہی پیر کے طور پر مشہور ہوا تھا۔ تعویذ کندے دیتا تھا لیکن لوگ غیر معمولی طور پر اس کے عقیدت مند ہوتے چلے گئے۔ اچھے بھلے بڑے لکھے لوگ اس کے بارے میں کہتے پائے جاتے تھے کہ اس کے قبضے میں جہنم تھی۔

وہ سائل سے کہتا تھا کہ وہ اپنی پسند کی کسی کھانے کی چیز کی خواہش کرے۔ سائل خواہش کرنا تھا اور پھر صاحب ہاتھ ہوا میں بلند کرتے تھے۔ وہ چیز ان کے ہاتھ میں آجاتی تھی۔ اس طرح کے پھرنے موئے کمالات دکھاتے تھے اس کا معقول تھا جس کی وجہ سے اس کے متعلقہ کی کن فعد او غولانی رفتار سے بڑھتی رہی اور وہ بلا اکتاف بلا غرور اکسار ہماری نذرانے لیتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پاس بے پناہ دولت جمع ہوتی چلی گئی۔  
دولت ویسے بھی دولت کو کماٹی ہے لیکن اسے شاید دولت سے  
دولت کمانے کا ہر کچھ زیادہ ہی آتا تھا یا پھر شاید اس میں بھی اس

کے کسی ”رومانی“ کمال کا دخل تھا کہ اس کی دولت میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دولت بذات خود اپنی جگہ ایک طاقت ہے۔ دولت آجائے تو اثرِ سونخ میں اضافہ ہو آئی چلا جاتا ہے لیکن پیر دانش شاہ اس معاملے میں بھی شاید غیر معمولی طور پر ذہین اور ہوشیار تھا۔ اس کے اثرِ سونخ میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے اضافہ ہوا۔ مختصر یہ کہ اپنی جدوجہد کے آغاز کے چندہ نہیں برس بعد ہی وہ ملک کی نہایت اہم شخصیات میں شمار ہونے لگا تھا۔ ایک ایسا شخص جسے وراثت میں یہ چیزیں نہیں ملی تھیں اس کے لئے لاشعریہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

شناختا کلمات دکھانے اور لوگوں کے مسائل حل کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن اب وہ بہت خاص لوگوں تک محدود ہو چکا تھا اور اس کی فہم اتنی ہو چکی تھی کہ عام آدمی اس تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عام آدمی سے اب ویسے بھی پیر دانش شاہ کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

مجھے یہ معلومات مختلف اوقات میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں حاصل ہوئی تھیں اور ذہن کے تاریک کونے کھدروں میں محفوظ پڑی تھیں لیکن میں نے انہیں کبھی اہم نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے فوری طور پر کچھ یاد نہیں آسکا تھا۔ اب ذہن پر زور دینے سے یہ باتیں یاد آئیں تو یہ بھی احساس ہوا کہ زندگی رہے تو کچھ پتا نہیں ہوا کہسے سو ڈپر، کسی شخص سے اچانک آپ کی ملاقات ہو جائے۔ امیر کہہ رہی تھی ”سربلکھ یاد آنا۔“ میں اب کو بتاؤں؟“

”نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے خیالات کی دنیا سے باہر آتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا ”ہمت کچھ مجھے یاد آگیا ہے بعد میں تم سے بھی پوچھ لوں گا۔ شاید تم میری معلومات میں کچھ اضافہ کر سکو۔ کچھ ہی عرصہ پہلے تک اہم اور دولت مند شخصیات کے بارے میں معلومات رکھنا تمہارے کام کا ایک حصہ رہا ہے۔ یہ ضرورت پڑنے پر تمہاری معلومات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تاؤوہہ کہیں؟ کیا تم نے اسے اٹھ کرے میں بٹھایا ہوا ہے؟“

”نہیں سراسیمہ ہو میرے کمرے تک پہنچے ہی کہاں ہیں۔“  
 امیر قدرے مضطربانہ انداز میں ہاتھ تلے ہوئے بولی ”ابھی تو وہ لائی  
 میں ہی کمرے ہیں۔ ان کی جاننے والی چند بڑی بڑی غفصیات نے  
 انہیں وہیں گھیر لیا ہے۔ وہ خود بھی ایک جہلوس سے کم نہیں ہیں۔  
 جہاں جاتے ہیں، کم از کم چھ سو سٹیل گاڑاؤں کے ساتھ ہوتے ہیں۔  
 بعض اوقات دو سرے دو چار خاص افراد بھی ان کے ہمراہ ہوتے  
 ہیں۔“

”چلے جائے... کچھ دیکھو؟“ میں نے تعجباً ہی جاسی۔  
 ”یہ کچھ لیجئے“ وہ چٹکا ہٹ آئینہ انداز میں بولی۔ وہ شاید  
 میری فحش نگاہوں کا نشانہ بن رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو  
 پکڑ لیا۔ ”وہ جب کسی سے ملاقات کے لئے روانہ  
 ہوتے ہیں تو کم از کم دو کڑیاں ان کی گاڑی کے آگے پیچھے ہوتی

پہلے

تشریف لائے ہیں۔“

پرانے زمانے میں ایک ملک میں ایک بادشاہ ہوا تھا۔ اس  
 عموماً ہر ملک میں چھوٹے چھوٹے بہت سے بادشاہ بکھرے ہوتے  
 ہیں۔ ان سب کے درمیان بے چارے عوام کی کدو رعایا کی کھچیا  
 آئی ہوتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی گویا خٹارچی نے ایسے ہی ایک  
 بادشاہ سلامت کی آمد کا اعلان کیا تھا۔

میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے عقب سے نکل آیا۔ پیر دانش شاہ کو دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھکا کا مگر میں نے اذرا ہمت نہ ہارنے دیا۔

مجھے یاد پڑتا تھا کہ میں نے ایک آدھ مرتبہ اخباروں میں اس کی تصویر دیکھی تھی مگر اس میں وہ ایک مختلف انسان نظر آتا تھا۔ مگر کہ شکل صورت یہی تھی جو اس وقت میرے سامنے تھی لیکن تصویر یقیناً دس بارہ سال پرانی تھی اور صرف چہرے تک کا تھا کہ چھائی ہوئی تھی۔ تصویر میں اور اصل شخصیت میں دیے ہی بڑا فرق ہوتا ہے اور اگر کسی کی تصویر آپ نے صرف چہرے تک دیکھی ہو تو پوری شخصیت آپ کے اندازوں سے بہت مختلف بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے تصور میں جس چرواہے کو دیکھا تھا اس کے لیے سیاہ بال پیچھے کو سیدھے منگھکی گئے تھے اور ہستی ہوا رانڈاؤ میں اس کے سر سے چپکے ہوئے تھے چہرے پر نہایت بارعب محسوس واڑھی سو نہیں تھیں۔ آنکھیں تاریک شیشوں کی بینک کے عقب میں چھپی ہوئی تھیں۔

اس کا چہرہ اب بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عمر کے دس بارہ سال کے انسانے کی وجہ سے وہ چہرہ زیادہ چروڑا چکا۔ زیادہ پھولا پھولا ساد کھائی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اصلی رنگت کا پتا چلا تھا جو گرمی سازنی تھی۔ اس کے سر پر کسی شانی آج کی سی ساخت کی تقریباً ایک فٹ اونچی ٹوپی تھی۔ جس میں اس کا سر تو چھپ گیا تھا لیکن ٹوپی کے کناروں سے بہر حال اس کے لیے بال شانون تک پہنچے ہوئے تھے اور ان میں سفیدی نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔

تاج نما کدھار ٹولی کا حقد غالباً صرف اپنی شخصیت کے  
 "تیرا نہ" تاثر کا اظہار کرتا ہی نہیں بلکہ اپنا قد بڑھانے کا تاثر دیتا  
 بھی تھا کیونکہ اس کا اصل قد شاید پانچ فٹ سے بھی کم تھا۔ اس کے  
 ساتھ اس کی جسارت بھی مشککہ خیز تھی۔ وہ جتنا لہجہ تقریر کرتا ہی  
 چوڑا معلوم ہوتا تھا۔

کلون کی بعض موٹی اور بھاری عہد کم سی شیخیاں تقریباً چو کوڑ  
ہوتی ہیں۔ اس کی جسمانی ساخت تقریباً ویسی ہی تھی۔ اس کا چوڑا  
اور ٹوٹی کھپا اس شیخیا کا منہ اور ذمکن تھی۔ اس کے لباس کی ٹوٹی  
سے کوئی مناسبت نہیں تھی کیونکہ وہ نہایت عمدہ اور جدید تراش  
خراش کے سوٹ میں تھا۔ اس کی مشککہ خیز جسمانی ساخت کی وجہ  
سے خواہ سوٹ اس پر نہیں بچ رہا تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”سراپہ صاحب نے یہ تو واضح کر دیا ہے کہ وہ آپ سے ملنے آئے ہیں لیکن شاید وہ توقع کر رہے ہیں کہ آپ لابی میں جا کر ان کا استقبال کریں۔ ہمارے گیٹ ریسیشنز پر تو وہاں پہنچ چکے ہیں۔ میں بھی جا کر سلام کر آئی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ بھی وہیں جا کر ان کا استقبال کر لیں اور انہیں اپنے ساتھ اپنے کمرے تک لے آئیں۔“

میں نے ایک لمحے سوچا۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ میں بہر حال ایک بڑے میں تھا۔ اس شہر میں میرا وہ کل اور دوسرے بڑے تھے۔ اس قسم کے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ ایسے تعلقات رکھنا میرے بڑے کے لئے زیادہ سے زیادہ اچھا تھا اور شاید خود میرے حق میں بھی بہتر تھا۔ مجھے اکساؤ۔۔۔ بڑے اور دوسروں کے سامنے خود کو کترہ کر پیش کرنے کی اچھی یا بری عادت بھی لاحق تھی۔ اس وقت تو ویسے بھی بیرواٹل شاہ خود چل کر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرا اٹھ کر اس کے استقبال کے لئے لابی میں چلے جانا قطعاً کوئی معیوب بات نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں میں اپنی کرسی سے حرکت نہیں کر سکا۔

”اے یہیں آنے دو امیر!“ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا ”صرف تم اس کا استقبال کر لو... یہی کافی ہے۔“

”ٹھیک ہے سہرا مجھے آپ مناسب سمجھیں۔“ اس نے جلدی سے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔

اُس کے جاتے ہی میں نے فون پر اپنے سیکریٹری چیفٹ واؤڈ سے رابطہ کیا اور اسے ویرائنٹل شاہ کی آمد کے بارے میں بتایا۔ وہ فوراً بولا ”مجھے معلوم ہے سرب“

”تکنا تو یہی ہے کہ وہ دوستانہ ماحول میں ملاقات کے لئے آیا ہے۔“ میں نے کہا ”لیکن اس کی آمد میرے لئے غیر متوقع ہے۔ کوئی اور سلسلہ بھی ہو سکتا ہے تم الارث رہنا۔“

”ہم پہلے ہی الارث ہیں سراسر آپ کے آفس کی عمرانی ہو رہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے خون بند کر دیا اور اپنی مخصوص دروازہ کھولی کر چدید ترین ساخت کا سیاہ پیپر نکال کر گھٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ دروازہ بند کر کے میں سر ہٹکا کر بظاہر کام میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی مجھے اس طرح کی ذرا کاری کرنا پڑتی تھی۔

میرا کمر اساتذہ پر فہم تھا۔ اس کے باوجود چند منٹ بعد مجھے کچھ لوگوں کی آمد کا احساس ہوا۔ امیر کے کمرے کے سامنے شاید کچھ غفلت سا رہا تھا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور یکدم جیسے شور کا ریا سا اندر آگیا۔

امیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نہایت مؤدبانہ انداز میں اعلان کیا "سر! جناب پیر دانش شاہ آپ سے ملنے کے لئے

خدمت نے۔ اور ماں کی دعا نے ہمیں لوگوں کی نظر میں شاید کچھ بڑا آدمی بنادیا ہے ورنہ ہم تو مرتبے میں کیا۔ قد میں بھی بہت چھوٹے آدمی ہیں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔“ اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا اور ایک بار پھر کھج کھج کر ہوا اقتصد لگایا۔

”اے نہیں میر صاحب“ میں نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ”میں اتنے بے خبر آدمی نہیں ہوں۔ مجھے آپ کے مقام اور مرتبے کا پتا ہے۔ آپ نے یہاں شریف لاکر واقعی میری عزت افزائی کی ہے۔“

میں نے اسے کمرے کے اس حصے کی طرف ملنے کا اشارہ کیا جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ تحلیل صوفے میں دھنس چکا تو میں نے پوچھا ”آپ کیا کھانا چاہتے ہیں؟“

”اے جھوڑو بابا!“ وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ”دفتر میں کیا کھانا چاہتا۔ دفتر تو بڑی تکلف والی جگہ ہوتی ہے۔ آپ کبھی ہمارے گھر شریف لائیں پھر ہم آپ کو کچھ کھلائیں پلائیں گے۔ جو کچھ ہم آپ کو کھلائیں پلائیں گے اس کے بعد امید ہے آپ بڑی مدت تک ہم کو یاد رکھیں گے۔“

”آپ جیسی ہستی سے ملاقات ہوگئی۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔ میں تو دیکھ ہی نہیں سکتا کہ آپ کو مدت تک یاد رکھوں گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آئندہ ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔ ملاقات تو ہوتی رہتی چاہئے۔“ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اچھا ہوا وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کسی پر تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ بازوؤں والی کرسی میں وہ سہاٹی نہیں سکتا تھا۔ میں نے چھوٹے قد کے توہمت سے لوگ دیکھے تھے لیکن چھوٹے قد کا اتنا چڑا شخص زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ بھی یقیناً نظروں ہی نظروں میں مجھے قول رہا تھا۔ بظاہر ہم بات کر رہے تھے لیکن درحقیقت ہم دونوں ہی کا ذہن ایک دوسرے کی شخصیت کے ناہیدہ گوشے دریافت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ملاقات تو اب ہوئی رہے گی۔ ہم نے آپ کو اپنے دوستوں میں شمار کر لیا ہے۔ دوستوں میں ملاقات تو ہوتی ہی ہے۔“ ایک فٹ اونچی ٹوپی کی وجہ سے اس کا سر ملانا ایک عجیب سا عمل محسوس ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا بیٹا کرکٹ آگے پیچھے بھولتا ہوا قمار خیرت ہوتی تھی کہ وہ گر کیوں نہیں رہا تھا۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ نے مجھ حقیر کو اپنے دوستوں میں شمار کیا۔“ میں نے اپنے لیے میں ایک سناٹا ہی عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں شاید مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے لیے میں سڑھری پر تیار رہی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”آپ نے مجھے دوستوں میں تو شمار کر لیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح آپ کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کروں۔ آپ کچھ کھانا چاہتے ہیں؟“

سوٹ اپنی جگہ نہایت نفیس تھا۔ کوٹ کے چوڑے کالر پر کسی سفید دھات کا پہل چکر رہا تھا۔ جس میں تین تیرے جھلکار رہے تھے۔ مانی ہن کا رواج اب بہت کم ہوا تھا۔ قمار کردہ مانی ہن لگائے ہوئے تھا اور اس میں بھی ننھے ننھے بیروں کی ایک قطار بنگلہ کاری تھی۔

یہ دانش شاہ کے پیچھے پیچھے واقعی ایک چھوٹا سا جلیوس کمرے میں آیا۔ چھ سچ کا رڈز نے اسے یوں شہم دائرے میں لیا ہوا تھا اور وہ یوں اپنی کاشٹو فیس وغیرہ تھامے ہوئے تھے جیسے کسی کی منہ ان کے چہرے پر قاتلانہ حملہ ہونے والا ہو۔ تین افراد بغیر گلوں کے بھی تھے۔ وہ ہاتھ باندھے سر جھکائے نہایت مؤدبانہ انداز میں سب کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے چروں پر گھیر شجید کی کھی گویا وہ دل ہی دل میں کوئی عمل بڑھ رہے ہوں۔

آفس کا کمرہ خاصا طویل و عریض تھا لیکن اتنے افراد کے اس طرح پھیل کر کمرے ہوئے۔ اور پہلے ہی سے موجود بیماری بھر کم فرنیچر کی وجہ سے بھر سا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر مصانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اور گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے خوش خلقی سے کہا ”خوش آمدید میر صاحب! آپ نے شریف لاکر کچھ خریدا ہوگا۔“

اور میرے اس چھوٹے سے ہوش کو بڑا اعزاز بخشا ہے۔ اس نے کھج کھج کی آواز کے ساتھ ہاتھ لگا سناقتد لگاتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ کیا تھا گویا ایک اینٹ تھی جو اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ ہاتھ بھی تقریباً چوکور تھا اور پھر کی طرح سخت تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا اس کا پورا وجود ہی شاید پھٹی سی ایک چلتی پھرتی چٹان تھا۔

مصافحہ کرتے ہی اس نے اپنے سب آدمیوں کو اشارہ کیا ”بابا! تم سب لوگ باہر جاؤ۔ ہمیں افضل صاحب سے ختمی میں ملاقات در بات حیت کرنی ہے۔“

میں نے امیر کو اشارہ کیا ”ان تمام حضرات کو اپنے کمرے میں بٹھاؤ اور پوری طرح ان کی خاطر مدارت کرو۔“

سب لوگ سر جھکا کر امیر کے پیچھے پیچھے کمرے سے رخصت ہو گئے۔ یہ دانش شاہ گویا مجھے صرف ان کی جھک دکھانے کے لئے اندر لایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رخصت صفت شخص ہو گا لیکن اپنے آدمیوں کے جانتے ہی اس نے عاجزی و انکسار کا مظاہرہ کر کے مجھے حیران کر دیا۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے حاجت آمیز سے لیے میں بولا۔ ”بابا! تو آپ کی انکساری ہے جو آپ خود کو غریب اور اس ہوش کو چھوٹا کر رہے ہیں۔ سر آپ کے بڑے بن کی نشانی ہے۔ جو گویا اندر سے بڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی انکرا بات نہیں کرتا۔ ہمیں آپ میں بڑے بن کی نشانی نظر آتی ہے۔ ہمیں یہی امید تھی اور اسی امید کے سہارے ہم چل کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہم بھی اپنے آپ کو بہت چھوٹا آدمی سمجھتے ہیں بابا! عقل کے غلام ہیں۔ لوگوں کی



خدمت بتائیں۔"

"ہماری خدمت تو آپ پہلے ہی شروع کر چکے ہیں۔ اسی لئے تو ہم یہاں نظر آ رہے ہیں۔" وہ مسکرایا اور داڑھی سے اوپر اس کے رخساروں کے گول مثل اجمار کچھ اور نمایاں ہو گئے۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"میں آپ کی خدمت کر رہا ہوں اور مجھے اس کا پتا بھی نہیں؟" "ہاں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ آدمی کسی کی خدمت کر رہا ہوتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں ہوتا کہ وہ وہ حقیقت کس کی خدمت کر رہا ہے۔" وہ گویا اپنے مزاج سے خود ہی محفوظ ہونے ہوئے نہا۔ ایک بار پھر کمرے میں کچھ کچھ کی سی آواز ابھرے گی۔

پھر یکدم ہی اس کی ہنسی کو بریک لگی اور وہ مد سے نیا وہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ وہ میری طرف کو جھٹکے ہوئے نہایت دمی آواز میں بولا "آپ مونا کو تلاش کر رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ہماری ہی خدمت ہے۔"

چند لمحے کے لئے کمرے میں گمراہ سکوت چھا گیا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی پلک نہیں جھپک رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ بات نہ کہ مجھے حیران کیا تھا لیکن فوری طور پر میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ جب وہ از خود کسی وضاحت کی طرف نہیں آیا تو میں نے گہری سانس لے کر کہا "معافی چاہتا ہوں ہر صاحب! میں ایک کم عقل سا آدمی ہوں۔ آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔"

ایک بار پھر اس کی داڑھی سوچوں کی حرکت اور رخساروں کے اجمار سے اندازہ ہوا کہ وہ مسکرایا تھا۔ اس کے ہونٹ تو کبھی داڑھی سوچوں میں تقریباً چپے ہوئے تھے۔ عجیب سرسراہٹ سی آواز میں وہ بولا "مفضل صاحب! آپ بھی بڑے آدمی ہونے کے باوجود ہماری طرح انکسار پسند ہیں۔ انکسار پسندی اچھی چیز ہے لیکن اب ہمارے سامنے آپ کو انکساری برتنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اور آپ اب دوست ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ میں نے کچھ کنا چا لیکن وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں وضاحت کر دیتا ہوں۔ یہی بات دراصل یہ ہے کہ آپ سے پہلے ہمیں مونا کی تلاش تھی لیکن ہم اس میں ناکام رہے تھے۔ ہمارے آدھوں نے پورا شرمجہان ارا۔ شرمیں ہمارا کچھ اثر و رسوخ بھی ہے۔ ہم نے وہ بھی استعمال کیا مگر دوسرے ذرائع سے بھی اس کو تلاش کر لیا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ وہ اس شرمیں سے بلکہ شاید اس ملک میں ہی نہیں ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اب پہلے اس کی بات سن لیتا ہی ہر تھا۔ ذرا توقف کے بعد وہ گہری سانس لے کر بولا "پھر ہمیں پتا چلا کہ آپ بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ایک سے دو بھلے۔ ہمیں اس معاملے میں ناکامی ہوئی لیکن شاید آپ کی قسمت اس معاملے میں ہم سے اچھی ہو یا آپ

کے آدمی اس طرح کے کاموں میں ہمارے آدمیوں سے بہتر ہوں۔"

"آپ مونا کو کیسے جانتے ہیں۔ کس حیثیت سے جانتے ہیں۔ اور آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟" میں نے نہایت گھبرائے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

اس کی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں گویا کچھ اور سڑک گئیں۔ ان میں ایک عجیب سی اداسی اثر آئی جس پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ آدھ کے چشمہ جو اس نے اتار کر میز پر رکھ دیا تھا اٹھا کر دوبارہ لگا لیا اس کی شخصیت میں مانیائی سرداروں کی سی پراسراریت اور سٹائی لینڈ آئی۔

وہ گہری سانس لے کر بولا "ہمیں معلوم تھا ہم یہاں آ رہے ہیں تو ہمیں اس قسم کے سوالوں کے جواب بھی دینے ہوں گے۔ ان سوالوں میں ہمارے لئے نہایت کامیاب ہے لیکن مونا کی تلاش کے سلسلے میں ہم ہر نہایت اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کونٹ کی سامنے والی جیب سے اس نے نیپولین میں بیک شدہ ایک نہایت مونا غیر ملکی سنگار نکال کر اس کی بیکنگ چاک کی اور ایک طلائی لائسنس سے اسے سلگنے کے بعد گہرا کش لیا۔ کمرے میں ایک خاص خوشبودار ٹینگلوں و جوال بکرا لے لگا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا "مفضل صاحب! ہم نے آپ کو دوست کہا ہے اور آپ ایک بڑے آدمی ہیں۔ بڑے آدمی کے لئے دوستی کا پاس رکھنا بھی ضروری ہے کیا؟" "یقیناً رکھیں کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو اس کمرے کے ٹکڑے ٹکڑے سمجھو رہے گی۔ یہاں سے باہر نہیں جائے گی؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے ہاتھ تال جواب دیا۔ "دراصل ہم یہی شخصیتوں کے خلاف ایکشنل بڑی چلاؤ جتے ہیں۔" وہ بولا پھر جیسے اسے خود ہی ہتھی کا خیال آیا "اوپے ہمارے خلاف ایکشنل بنانا کوئی آسان کام ہی نہیں ہے۔ اخبارات و میڈیا کی سطح تک تو کوئی مانی کالال ہی کسی مستی کی جرات کر سکتا ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ذریعہ بھی سرگوشیاں یا کانٹا پھوسی کرے۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ اس سب سے بڑے بڑے راز و مخفی ہیں۔" میں نے اسے قہری دینے کی کوشش کی۔

"آپ کے سوالوں کے جواب دینے سے پہلے ہم آپ سے ایک سوال کرنا چاہیں۔" وہ بولا "آپ مونا کو کس لئے تلاش کرتے ہیں؟"

"مختص انسانی ہمدردی کے نائن۔" میں نے جواب دیا "کوئی مجھ سے درخواست کی۔ میں نے انکار کر دیا لیکن پھر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ میں نے ہائی بھی اور یہ میری انکا مسئلہ بن گیا۔" "ٹھیک... بالکل ٹھیک۔" اس نے نہایت سے سر ہلایا

”ہیں کچھ اسی قسم کے جواب کی توقع تھی کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق آپ کا مونا سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ آپ تو شاید کبھی اس سے ملے بھی نہیں؟“

”جی ہاں آپ کا خیال درست ہے اور آپ کی معلومات قابلِ رشک ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”میں اپنے سوالوں میں ایک اور سوال کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے مونا کی تلاش ہے؟“

”آپ میڈم نور کے آؤسے پر گئے تھے اور آپ نے وہاں اس کے بارے میں پوچھ کچھ کی تھی۔ ہمیں یہ تو بعد میں پتا چلا کہ آپ نے وہاں مونا کے بارے میں پوچھ کچھ کی تھی۔ ہمارے آدمی پہلے ہی وہاں سے مونا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن انہیں مونا کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ بہر حال وہ میری برائت پر یوٹی ایک سوہوم سی امید کے سارے اس آؤسے کی عمرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو وہاں جانے دیکھا۔ واپسی پر انہوں نے یوٹی جنس کے تحت آپ کا تعاقب کیا۔ آپ خبردار ہو گئے۔ آپ نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے آپ کا بیچا چھوڑ دیا مگر سمجھا۔ یہ واقعی ان کی ٹھنڈی تھی۔ وہ آپ کو پکوان چکے تھے اور آپ نے یقیناً اپنے ہونٹ یا کسی اور ایسے ہی ٹھکانے پر جانا تھا۔ اس لئے آپ کا تعاقب کر کے ان کی معلومات میں اضافہ ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اچھا ہی ہوا وہ آپ سے لگراؤ سے بچ گئے ورنہ دو دیکس اور قیدی متقد رکھنے والے نزیروں میں سے کسی ایک کو۔ یا شاید دونوں ہی کو بلاوجہ نقصان پہنچ سکتا تھا۔ انہوں نے بعد میں میڈم نور کے آؤسے سے معلوم کر لیا تھا کہ آپ وہاں کس لئے گئے تھے۔“

”جھانسا تو وہ آپ کے آدمی تھے؟“ میں نے گہری سانس لے کر کہا ”چلیں یہ جس تو قسم ہوا۔ میں برا حیران تھا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے تعاقب شروع کیا اور پھر اتنی آسانی سے بیچا چھوڑ دیا۔“

”مجھے جب معلوم ہوا کہ آپ بھی مونا کی تلاش میں ہیں تو میرا حوصلہ بڑھا۔ مجھے خوشی ہوئی کیونکہ میں نے قاتلانہ طور پر آپ کو جانا ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ ایک شریف آدمی ہیں۔ مونا سے آپ کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے امید تھی کہ آپ کسی کی درخواست پر اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میرا کام آسان ہوئے والا تھا۔ اسی لئے میں نے سوچا آپ سے ملاقات بھی کر لی جائے۔“ وہ اب ”ہم“ کا مینڈ چھوڑ کر ”میں“ کے پیشہ میں بات کرنے لگا تھا۔ شاید غیر ارادی طور پر بلندی سے کچھ نیچے اتر آیا تھا۔

ازراؤف کے بعد وہ بولا ”اب ہم آپ کے سوالات کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے پوچھا ہے کہ میں مونا کو کیسے جانتا ہوں؟“ صاحب! یہ تو یقیناً تقدیر کا فیصلہ تھا کہ میں اسے جانتا

لگوں۔ آپ ایک ماڈرن آدمی ہیں افضل صاحب! آپ سے مکمل کربات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں بھی ایک ماڈرن آدمی ہوں۔ میری فقیر کی اپنی جگہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے آج کی دنیا میں ہم جیسے لوگوں کے سلسلے عام دنیا دار لوگوں سے بھی کچھ زیادہ پیٹلے ہوئے ہیں۔ ہر طرح کی عورتوں سے ہمارا رابطہ رہتا ہے اور ہر طرح کی محفلیں، منسی ہیں۔ معتقدین کے سامنے ہماری ایک الگ زندگی ہے۔ ہماری پرائیویٹ زندگی اس سے کافی مختلف ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہو گا۔ آپ تنہے دنیا دیکھی ہے۔“ وہ قدرے کھیاٹے پن سے جیسا حالانکہ میرے خیال میں وہ ان باتوں پر کچھ ایسا شرمندہ نہیں تھا۔

”جی ہاں جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ سب فطری باتیں ہیں۔ فطرت سے لاکر زندگی گزارنے والوں کا زائد اب کہاں رہا ہے۔“ میں نے گویا اسے اخلاقی حمایت مہیا کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد بات کو آگے بڑھائے اور حالات کی کوئی بھی یا جھوٹی تصویر میرے سامنے آ سکے۔

وہ پھر خیال سے انداز میں سوچنے کو بل دیتے ہوئے بولا ”مونا کو ایک رات میری خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ نوجوان تھی۔ ترو تازہ تھی لیکن یہ خیال اب میرے لئے کچھ زیادہ اہم نہیں رہیں۔ مجھ جیسے لوگوں کی زندگی میں اس قسم کی لڑکیاں رات کو آتی ہیں اور صبح ہم انہیں بھول جاتے ہیں۔ میری اس بات سے آپ کو اپنے اس سوال کا جواب بھی مل رہا ہے کہ میں اسے کس حیثیت سے جانتا ہوں۔ ٹھیک ہے؟“ اس نے سگار کا طویل کش لیتے ہوئے بطور میری طرف دیکھا۔ میں تاریک شیٹوں کے عقب میں بھی اس کی آنکھوں کو کافی حد تک واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

”جی ہاں اور اب سب سے اہم سوال یہ جانا ہے آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں بدستور اداسی کی پرچھائیاں تیر تھیں۔

”افضل صاحب! اس رات مونا سے ملاقات کیا ہوئی۔ بس دل کے ساتھ کچھ عجیب سی حادثہ ہوا!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”وہ اس قبیل کی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ رات کے پچھلے پھر یوٹی خودی سے اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا وہ جیسے جیسے دوری تھی پھر اس سے باتیں ہونے لگیں اور ہوئی ہی چلی گئیں۔ شاید ہم دونوں ہی کو وقت گزرنے کا احساس نہ رہا۔ دن چڑھ گیا اور ہم باتیں ہی کرتے رہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہم تو بالکل ہی غلط پس منظر میں ملے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت پہلے۔“ یہی لڑکیوں میں مجھے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی اور وہ خواہش اب بھی لا شعور میں کہیں بڑی مضبوطی سے پچھ کاڑے بیٹھی تھی۔ میرا ظاہری سراپا شاید اسے پسند نہ رہا ہو لیکن میرے اندر اسے بھی اپنا مطلب محض

وہ اب اس پیر دانش شاد سے بہت مختلف لگ رہا تھا جسے میں نے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے گویا اپنے اوپر سے ایک خول اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور بڑی جرات سے کام لیتے ہوئے اپنی اصل شخصیت میرے سامنے رکھ دی تھی۔ میں اب اس کے بارے میں ابھن میں رہ گیا تھا کہ کیا وہ واقعی قابلِ عزت تھا۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں محسوس کیا تھا؟ یا میرے مشاہدے نے اس وقت مجھے دھوکا دیا تھا اور اصل پیر دانش شاد اب میرے سامنے آ رہا تھا؟

وہ کہہ رہا تھا "آپ میرا سراپا دیکھ رہے ہیں؟ ہر انسان کو آپ خوب صورت ہی لگتا ہے اگر وہ اچھا خاصا مشکل خیز ہو۔" بھی کم از کم اپنے آپ کو قابلِ قبول حد تک ٹھیک تھا کہ تو بھلائی ہے لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں میں خوش خیم ہرگز نہیں ہوں۔ مجھے شاید میری بیویاں بھی پسند نہ کرتی ہوں۔ میں ان کی ساری ضرورت ہوں۔ باقی رہیں وہ عورتیں جنہیں ان کے جھوٹے لفظوں اور جھوٹے جذباتوں کے ساتھ رات دو رات یا پختہ دو پختہ کے لئے خرید جاتا ہے ان کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ وہ تو شاید میرے پاس سے جانے کے بعد میرا تصور بھی ذہن میں لانا پسند نہیں کرتی ہوں گی۔" میں نے اس پر کوئی تبصرا نہیں کیا۔ وہ ذرا سی خاموشی کے بعد مسمی سانس لے کر بولا "لیکن جب اس لڑکی سے باہمی ہو میں اور اس نے اپنا دل گویا جیر کر میرے سامنے رکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میں نے اس لڑکی کو اپنی بہانہ میں لے لیا تو وہ زندگی بھر مجھ سے اتنی محبت کرے گی کہ میری روح سرشار ہو جائے گی۔ یہ ایک عجیب احساس تھا۔ میں اس احساس کی شدت، طاقت اور مستثنیٰ خیزی پر حیران ہو گیا۔"

وہ خاموش ہو کر اپنے سار کو گھورتے لگا۔ میں نے پلوہ لے لئے ہوئے کہا "تھو محض یہ کہ آپ نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا؟" "ہاں لیکن میں نے اسی وقت اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی حماقت بھی کی۔ جو اسی وقت مجھے بہت بڑی چھلندی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے یہ تو بتا دیا کہ میں اس سے شادی کرنے کے لئے فوری طور پر تیار تھا لیکن ہر حال یہ کام کچھ وقت لیتے ہیں خاص طور پر کچھ بھی شخصیت کے لئے تو ایسا فیصلہ کرتے وقت نہ جانے کتنے مسائل کو حل کرنا ضروری ہوتا ہے چنانچہ میں نے اس سے بڑے کیا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد ہم دوبارہ ملیں گے اور شادی کی تاریخ طے کریں گے لیکن اس دوران وہ میری امانت بن کر رہے گی کوئی مرد اسے چھوئے گا نہیں نہ پائے۔ اس نے بہت بڑی قسم کھا کر وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اس دوران ہم بالکل نہیں ملیں گے۔ آتش شوق جتنی بھڑکے اتنی ہی بستر ہوگا۔ دراصل میں اپنے خیال میں ہر پہلو سے برا بھلا کر رہا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ شخص کوئی واقعی بھلائی لہرت تو اس، جس تک گزر جائے گی۔ میرے فیصلے میں جو بھی غلطی ہوگی میں جذبات سے بچنے

بچھا دکھائی دیا۔ وہ میرے لئے کچھ میں کھلا ہوا پھول تھی اور میں اس کے لئے گونے کی کان میں رہا ہوا میرا۔ ہم دونوں میں ایک دوسرے کو پانے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ گو کہ اس وقت بھی ہم ایک دوسرے کو باہمی چمکے تھے لیکن وہ پانا کچھ اور تھا۔۔۔"

"وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر استہزائیہ سے انداز میں ہنسا "آپ یقیناً دل ہی دل میں میری باتوں پر غصے رہے ہوں گے؟" "اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے جھجکی سے کہا۔ "انسان کامل بڑی عجیب چیز ہے۔ کسی وقت بھی کوئی تماشا دکھا سکتا ہے۔"

وہ گویا میری بات سے حوصلہ پا کر بولا "افضل صاحب! میں آپ کو یہ بتانا چاہوں کہ میری تین بیویاں ہیں اور تینوں نہایت خوب صورت ہیں اگر آپ کو کچھ جیسے آدمی کے لاف اشاکل کا ذرا بھی اندازہ ہے تو شاید آپ یہ اندازہ بھی کر سکیں کہ کتنی عورتیں میری زندگی میں آکر ملی گئی ہوں گی۔"

"کیسے شاید اندازہ نہ ہوتا لیکن آپ کی باتوں سے اندازہ ہو گیا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہم۔ تو پھر آپ کو اس بات پر حیران ہونا چاہئے کہ اس وقت میری حالت ایک نو عمر لڑکے کی سی ہو گئی۔ میرے دل میں گویا ایک نئے سرے سے ہی زندگی کا آغاز کرنے کی خواہش جاگ اٹھی جس میں موت کو میرا ہم سفر ہونا چاہئے تھا۔ اس کی حیثیت میرے لئے شرمناک ہونی چاہئے تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں اس کا باہمی اس سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں اگر اس سے شادی کر لیتا اور بھی اس کا باہمی ایک طعنہ بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوتا تو میرے لئے بڑی مشکل صورت حال پیدا ہو سکتی تھی لیکن میرے ذہن سے گویا یہ تمام اندیشے نکل گئے تھے۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ اب تک میں ایک بھونٹی اور جھلی سی زندگی گزار رہا تھا۔ مجھے اس کا بھی کچھ کٹھنہ ادا کرنا چاہئے تھا۔ اگر مجھے موت بھی لڑکی سے شادی کر کے کوئی شرمندگی اٹھانا بھی پڑتی تو میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔"

اس نے نگار کا ایک اور طویل سس لے کر کمرے میں ہوا کی کشائش میں اضافہ کیا پھر سلسلہ کام جوڑا "وہ بھی بڑی خوشی سے مجھ سے شادی کے لئے تیار تھی۔ اسے ایک مضبوط سارے کی شدت ضرورت تھی۔ میں اپنی شخصیت کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں افضل صاحب! مجھے معلوم ہے میں اپنی تمام تر دولت کے باوجود کسی عورت کا آئینہ نہیں ہو سکتا اور شاید یہی میری عقلی ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان چاہتا ہے کہ اسے چاہا جائے۔ یہ جو میں نے تین شادیاں کیں۔۔۔ اتنی عورتوں کی قوت حاصل کی۔ یہ شاید ہوس نہیں تھی افضل صاحب! یہ چاہے جائے کی خواہش تھی۔ اپنے لاشعور میں یہ عقلی لے انسان بدن کے صحرا میں بھٹکا رہتا ہے۔ اس صحرا میں بھلا اس عقلی کا فائدہ کمال؟"

بھی کہا جاسکتا تھا۔ اپنی ہی کو ششیں تو کی جاسکتی تھیں لیکن محض کو ششوں کی بنا پر یقین سے کچھ کرنا مشکل تھا۔

پیر رائٹ شاہ کہہ رہا تھا جس نے اپنا اثر سرخ بھی استعمال کیا ہے۔ پولیس سے بھی کہا ہے۔ اپنے کچھ خاص دوستوں سے بھی مدد کی درخواست کی ہے لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ آپ کو بھی دوست ہی سمجھ کر آپ کے پاس آگیا ہوں۔ جوں ہی مجھے بتا چلا کہ آپ مونا کی تلاش میں دلچسپی لے رہے ہیں، مجھے امید کی ایک موہوم سی کرن نظر آئی کہ اس معاملے میں میری قسمت نے تو یاد دہانی نہیں کی لیکن شاید آپ کو ہی کوئی سراغ مل جائے آپ کو ہی اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ میرا مسئلہ تو اس صورت میں بھی حل ہو جائے گا۔

بہرہ وہ صوفی کے پیشے سے ٹک لگاتے ہوئے بولا "افضل صاحب! میں نے تو آپ کو ساری بات بتادی ہے۔ اب آپ سچ سچ بتائیں، آپ کو مونا کی تلاش کے سلسلے میں کوئی کامیابی ہوئی یا نہیں؟"

"میں نے تو ابھی تلاش شروع ہی کی ہے پیر صاحب! میں نے دیکھے لیجئے میں کہا "آپ تو اتنے طویل عرصے سے تلاش کر رہے ہیں جبکہ آپ کے وسائل بھی شاید مجھ سے زیادہ ہوں۔ اس کے باوجود آپ کو کامیابی نہیں ہوئی تو مجھے اتنی جلدی کامیابی کیسے ہو سکتی تھی۔"

"اوہ! اس کے کمرے سانولے چہرے پر ایسی ہنسی تھی۔

دے اسے ٹھیک کر دوں گا۔" اس نے چشمہ اتارا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن وہ نہیں دیر دیر دیر لے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے چشمہ دوبارہ ہاتھ لایا اور نکلتے سے لیجئے میں بولا "ٹیک ماہ بعد میرا فیصلہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو چکا تھا۔ میرا دواؤں دواؤں گواہی دینے لگا تھا کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ پہلے سے زیادہ بے تاب تھا۔ یہ میرے لئے بلاشبہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ جو لڑکی پیسے ہی ہر وقت۔ ہر طرح سے آپ کی رسائی میں ہو۔ اس سے بادی کرنے کے لئے مزاحم بے تاب کہاں ہوتا ہے؟ اور وہ بھی برے بیچارہ۔ جس نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا تھا۔"

وہ خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرایا "میں نے اس پرے مینے کے دوران اسے فون تک نہیں کیا تھا ورنہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ماہ بعد میں خود رڈا دوڑا اس کے ٹھکانے پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ غائب ہو چکی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں لیکن وہ نہیں ہے۔"

اس نے طویل سانس لی "کافی مضحکہ خیز کہانی ہے؟" "مضحکہ خیز نہیں پیر صاحب! یہ ایک دردناک کہانی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا "لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ مونا کو غائب ہوئے چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ کم از کم میڈم نور کے اڑنے پر تو وہ چھ ماہ سے نہیں ہے۔"

"میں چھ ماہ سے ہی اس کی تلاش میں ہوں۔" وہ فوراً بولا۔ اور میں ابھی تک باپس نہیں ہوا۔ میری حالت اس انسان کی سی ہے جسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی محض ایک جھلک دکھانا اور غائب ہو گئی ہو۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ میری امید کمزور پڑنے کے بجائے قوی تر ہو رہی ہے۔ برسوں میں اس لڑکی کو پانے کی خواہش شدید تر ہوئی جا رہی ہے۔ وہ ساتھ ہی یہ احساس بھی شدت اختیار کر رہا ہے کہ وہ جہاں بھی ہے اسے میری مدد کی اشد ضرورت ہے۔ میں راتوں کو سوتے سے نہ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے کیا کہیں سے اس کی پکار سنائی دیتی ہے۔"

"آپ کو کہیں سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں" وہ کمری افسردگی سے بولا "اور اس پر مجھے شدید نیرت ہے۔ اس لئے کہ میں کوئی ایسا کام گزارا تو ہی نہیں ہوں جو اس شہر میں ایک انسان کو تلاش نہ کر دے۔"

میں دل ہی دل میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ محض اس کی غلط فہمی یا خوش فہمی تھی۔ انسانوں کے اس جنگل میں کھوجانے یا پھونکنے پر جانے والے ایک تو کیا، سیکڑوں انسانوں کو تلاش کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ کوئی اتفاق ہی سے مل جاتا تو مل جاتا۔ اسے یہی مدد

اے حمید کے ایڈوینچر قلم سے

شیو سینا کے

دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ = 700 روپے



اردو بازار لاہور

ہوش کے دروازے تک آیا۔

ان کی تینوں گائیاں روانہ ہو چکیں تو میں آفس میں واپس بیٹھا اور دیر تک اس کے بارے میں سوچا رہا۔ اس کی کد بلاشبہ سمورت حال کو ایک نیا رخ دے دے گا۔ امیر اس دور میں کام سے آفس میں آئی۔ وہ قبیضہ مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ دانش کس سلسلے میں آیا تھا لیکن شاید اس کی ہمت نہیں چڑھی۔ میں نے بھی از خود کچھ نہیں کہا اور کام کی مصروفیت میں تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اس وقت جبکہ میں آفس سے اٹھنے کا ارادہ کر رہا میرے ڈائریکٹ ٹیلی فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریموٹر اٹھا کر کہا تو دوسری طرف سے ایک بہت ہی دھیمی آواز نے پوچھا: "افضل صاحب بی بول رہے ہیں نا؟" آواز نسواری تھی اور سرگ سے ذرا ہی بلند تھی۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "آپ کون ہیں؟" "آپ دی افضل صاحب ہیں نا، جو اس ہوش کے آگے ہیں؟" بولنے والی نے تصدیق چاہی۔ اس کی آواز سے خوف تھا اور وہ گویا میرے تعارف کی تصدیق کے بغیر کوئی بات نہیں چاہتی تھی۔

"ہاں میں دی افضل ہوں۔" میں نے ملاکت سے کہا: "کون ہیں؟ آپ کو جو بھی بات کرنی ہے بلا خوف و خطر کہجئے۔"

"بلا خوف و خطر؟" وہ استہزائیہ انداز میں کہی۔ یہ فنی کراہ سے مشابہ تھی "ہاں آپ یہ بات کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس وقت اپنے محفوظ اور انوکھ خط آفس میں آرام سے بیٹھے تھے۔" اس کی آواز اب بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "آپ کون بول رہی ہیں؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

غیر ارادی طور پر میری آواز بھی نیچی ہو گئی۔ "میں مونا بول رہی ہوں۔" اس کی آواز اب بالکل سرگوشی میں داخل گئی لیکن میں نے اسے صاف سن لیا تھا۔ "مزنا؟" میں نے بے یقینی سے دہرایا اور بڑا کد مبدعہ

بیٹھ گیا۔

میرے ذہن میں ایک مکمل سی پیا تھی۔ میں اسے مونا والی قلم کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اسے اس قلم کے بارے میں کچھ معلوم تھا؟ وہ مونا سے اس کی ملاقات سے پہلے کی بنی ہوئی تھی یا اس کی گمشدگی کے دوران وجود میں آئی تھی؟ اس سلسلے میں اگر اسے کچھ معلوم ہو تو شاید اس سے کچھ باتوں کا تعین کرنے میں مدد ملتی لیکن نہ جانے کیوں میں یہ بات زبان پر ہی نہیں لاسکا۔ کسی بھی قوت نے گویا مجھے اس موضوع پر بات کرنے سے باز رکھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس موضوع پر اگر مجھے پیر دانش سے بات کرنی بھی ہوئی تو دو چار دن بعد کروں گا۔ بہترین قلم کا ابھی اسے کچھ اور کچھ لیا جاتا۔ اس کے بارے میں کچھ اور اندازے لگائے جاتے، کچھ اور معلومات حاصل کر لی جاتی۔ میں ممکن تھا اس کے بارے میں کوئی نئی بات سامنے آجاتی۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے قلم کے بارے میں زبان بند کر رکھی۔ پیر دانش کی گفتگو سے مجھے اس طرف کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔

"کیا واقعی آپ کو مونا کا کچھ پتا نہیں چلا؟" پیر دانش کے لیے میں ہلکا سا شک جھلک آیا۔

"میں کیا آپ سے جھوٹ بولوں گا پیر صاحب؟" میں نے اپنے لیے سے ہلکی سی خفگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "مجھے آپ سے ایسا امید ہرگز نہیں ہے۔ میں تو اصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کہیں آپ کسی بات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کر رہے ہوں۔ آپ کو اس کے بارے میں کوئی معمولی سی معمولی بات بھی معلوم ہوئی ہو تو مجھے ضرور بتادیں شاید وہ میرے لئے کافی اہم ثابت ہو۔"

"ابھی تو کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا پیر صاحب! لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ جتنی کچھ معلوم ہوا سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا۔ آپ اتنے نیک مقصد کے لئے اسے تلاش کر رہے ہیں آپ سے تعاون کرنا تو اب میرے لئے سب سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔" "دویری گڈ! اس نے قدرے طہایت سے سر ملایا "میں آپ سے یہی وعدہ لیتا چاہتا تھا۔ اگر مجھے کچھ پتا چلا تو میں بھی آپ کو بتا دوں گا۔ ہم دونوں دوستوں کو اب مل جل کر یہ کام کرنا ہے۔ اب میں چتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ تو کوئی ملاقات نہ ہوئی پیر صاحب! آپ نے ہمیں کسی خدمت کا... خاطر قاضی کا موقع ہی نہیں دیا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے افضل صاحب! اصل مسئلہ حل ہو جائے تو پھر دونوں دوست جینے کر جشن منائیں گے جشن! وہ مجھ سے بے شک ہو گیا۔ میں اسے اور اس کے توہمیں کو رخصت کرنے



لیکن اس نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ مجھے دھوکہ دے ہوئے میڈم نور کے بورڈنگ ہاؤس تک آئے تھے۔ پہلے تو میں ڈر گئی کہ شاید آپ کے روپ میں بھی درحقیقت مجھے موت ہی دھوکہ دے ہے لیکن سیکس نے مجھے بتا دیا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ اسے نہیں تھا کہ آپ جیسا ہی کوئی آدمی میری مدد کر سکتا ہے۔ " شاید اس کا خیال ٹھیک ہی ہو لیکن میں بھی تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں جب مجھے معلوم ہو کہ تم کہاں ہو، کس مصیبت میں گرفتار ہو۔ "

"اس وقت تو میں برقعے میں لپیٹی... کارڈ والے ایک فون سے آپ سے بات کر رہی ہوں۔ میرا چوتھا نقاب میں چھپا ہوا ہے۔ دوسرے سب خوف تو اپنی جگہ ہیں لیکن ایک دھڑکا یہ بھی لگا ہوا ہے کہ اگر کوئی اور فون کرنے آیا تو میں آپ سے بات نہیں کر سکیں گی؟ "

"تو پھر ضروری بات کرو اور بات۔ " مجھے اس کی حد سے زیادہ احتیاط پسندی پر غصہ آ رہا تھا لیکن خود پر ضبط کرتے ہوئے میں بدستور نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ زندگی میں جہاں جہاں اس لڑکی کو احتیاط کی ضرورت رہی ہو وہاں اس نے قطعاً احتیاط نہ کی ہو لیکن جہاں اسے کسی پر بھروسہ کر کے جلد از جلد اصل بات کرنی چاہئے تھی وہاں اس کی احتیاط پسندی آڑے آ رہی تھی۔

وہ خاموش رہی تو میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "تمہیں معلوم ہے میں درحقیقت کیا جانا چاہ رہا ہوں۔ میرے لئے یہ بات اہم نہیں ہے کہ تم کہاں سے اور کس طے میں فون کر رہی ہو۔ یہ بتاؤ کہ میں تمہاری مدد کے لئے کہاں پہنچوں؟ اگر تم میرے پاس آ سکتی ہو تو آجیاز۔ میں کوئی گارنٹی دیتا تو پسند نہیں کرتا لیکن تمہیں امید ضرور دلا سکتا ہوں کہ میری پناہ میں تم محفوظ رہو گی۔ گو کہ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ تمہیں کس سے خطرہ لاحق ہے۔ " وہ اب بھی خاموش تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ سلسلہ متقطع نہیں ہوا تھا۔ میں نے طویل سانس لے کر کہا "کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہیں کس سے خطرہ لاحق ہے؟ "

"معلوم ہے۔ " وہ نہایت کمزوری آواز میں بولی۔ "مجھے صرف اس کا نام بتاؤ۔ " میں نے کہا۔ "میں فون پر کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ " فتنا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی سسکیاں نہایت مدہم تھیں لیکن اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نہایت اذیت کے عالم میں مدد ہی اور اپنی آواز کو بڑے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ "تو پھر فون کس لئے کیا ہے؟ " میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ "شاید کسی نامعلوم امید کے سارے۔ " اس نے سسکیوں کے درمیان جواب دیا۔

"جی ہاں۔ میں سہاوی بول رہی ہوں۔ " اس نے گویا میرا ہاتھ پکڑ کر محسوس کرتے ہوئے زور دے کر کہا۔ ایک لمحے کے لئے میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سہاوی بول رہی تھی۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ جس مونا کی تلاش میں ہم اتنے باہر تل رہے تھے اور پیشہ ور سرائیوں کی طرح جس کا سرائی لگانے کی کوشش کر رہے تھے وہ خود مجھے فون کر رہی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو میرا فون اس کے بارے میں اتنی تشکک رہی تھی۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے افضل صاحب! میں نے تو سنا ہے آپ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ " وہ چپچپے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ "ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔ " میں نے سنبھل کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں واقعی تمہیں تلاش کر رہا تھا لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں تمہیں تلاش کر رہا تھا؟ "

"میں نے میڈم نور کے بورڈنگ ہاؤس میں سیکس کو فون کیا تھا۔ " وہ بدستور چپچی آواز میں بولی "اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا اور آپ کا ایڈریس فون نمبر دیا۔ " "میں نے پوچھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟ " "میں نے پوچھا۔

"چند منٹ پہلے کی۔ " اس نے جواب دیا "یہ چند منٹ مجھے فیصلہ کرنے میں لگ گئے کہ میں آپ کو فون کروں یا نہ کروں۔ سیکس کا اصرار تھا کہ میں آپ کو ضرور فون کروں۔ " "اس کے باوجود تم نے فون کرنے میں اتنی دیر لگا دی؟ " میں نے کہا۔

"کیا یہ شکوہ ہے؟ " اس نے دریافت کیا۔ "میں کچھ کہہ رہی تھی۔ " میں نے کہا۔

"آپ یہ شکوہ کر سکتے ہیں افضل صاحب! کیونکہ آپ کو اس صورت حال کا اندازہ نہیں جس میں میں گرفتار ہوں۔ میں اس وقت اپنے سامنے پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتی۔ " اس کے لیے میں اب بھی خوف نمایاں تھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟ " میں نے پوچھا۔ "میں ابھی یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکی کہ آپ کو یہ بات بتا دوں یا نہیں۔ " وہ چپچاپٹ سے بولی۔

"تو پھر مجھے فون کیوں کیا ہے؟ " میں نے ملاحت سے پوچھا۔ "سیکس کا اصرار تھا کہ میں آپ کو ضرور فون کروں۔ " اس نے دوبارہ بتایا۔ "دراصل میں نے سیکس کو فون کر کے بتایا تھا کہ میری جان کو شدید خطرہ لاحق ہے، کیا وہ میری کچھ مدد کر سکتی ہے؟ مالا مال مجھے معلوم تھا وہ میری کوئی خاص مدد نہیں کر سکتی لیکن ذرا دیر کے لئے اس سارا ہوا ہے مجھے کوئی اور ایسا نظر نہیں آ رہا تھا جس سے میں بات کر سکتی۔ سیکس کو میں نے فون دے دیا لیکن مجھے ابھی اس احساس تھا کہ اس جیسی لڑکیاں تو بے چاری خود کسی نہ کسی انداز میں مدد کی تلاش ہوتی ہیں۔ وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی

”آپ کب آئیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”آج۔ ابھی۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ وہ بھی ہنس کر  
 صورت میں میرے لئے مسیحتوں سے نجات کا پیغام آتا۔  
 ”میں بھی جیسے مجھے گھر سے لے جاتی ہیں۔“

”مجھے امید ہے کہ میرا تم تک پہنچنا تمہارے لئے مصیبت  
 خاتمے کی نوید ثابت ہوگا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

وہ جلدی سے ہوئی ”اے میرے“ سے مت کھٹکے گا کہ میں آ  
 ہر دریاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں یا کروں گی۔  
 کی ہمدردی کی سختی نہیں ہوں۔ میں اپنے مصائب کی خورد  
 ہوں۔“

”جو لوگ یہ اعتراف کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے مصائب  
 زبے دار ہیں، وہ بھی ہمدردی کے شوق ہو جاتے ہیں۔“  
 اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔

”آپ سے بات کر کے حوصلہ ملا ہے۔ آپ سے مل کر  
 زندگی مل جائے۔ قدرت نے مجھے جو ایک خوب صورت  
 تھی اس کا تو میں نے بڑا غرق کر لیا ہے۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ شاید اب بھی تاخیر نہ ہوئی ہو۔“  
 کہا۔

”بہت شکریہ۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ خدا حافظ  
 نے محسوس کیا کہ اس کے لمحے میں زندگی کی انگ لٹ آئی  
 میں نے ریسور رکھ دیا اور صرف ایک لمحے کے لئے  
 بیٹھا رہا۔ اس ایک لمحے میں اُن گت خیالات میرے ذہن  
 آمدی کی طرح ابھرے اور گزر گئے۔ میرے رگ دپے  
 سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا تھا  
 موت سے بات ہوئی تھی اور اس کا ایڈریس مجھے مل چکا تھا۔  
 پہلے تک میں ہندو کلی میں کھڑا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا  
 موت کی تلاش میں کدھر کا رخ کیا جائے۔ میں نے ایک بار  
 کاغذ اٹھا کر بنوڑ دیکھا جس پر میں نے موت کا بتایا ہوا ایڈریس  
 نشانیاں نوٹ کی تھیں پھر میں نے شفیق شاہ کے موبائل کل ڈیو  
 سے رابطہ کیا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ میں نے اس کی آواز سن کر  
 ”میرا اس وقت میں اپنے کچن والے آفس میں ہوں۔“  
 شخص کی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے اسے اس کو  
 عمرانی پر مقرر کیا تھا جہاں منیما کلب والوں کے لئے قلاب  
 ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس شخص کو قابو میں کیا  
 قلابیں لے کر آتا ہے۔ آپ نے بھی ہدایت کی تھی لیکن  
 اس کو ٹی پر بالکل دیرانی چھائی ہوئی ہے۔ لگا ہے وہ  
 سرگرمیاں منظر ہیں۔“

”تم اس کو بھی اور وہاں ہونے والی سرگرمیوں پر غور

”کبھی کبھی کسی پر مجھوسا کر لینے سے امیدیں حقیقت کا روپ  
 دھار لیتی ہیں۔“ میں نے کہا ”تمہیں شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ میں  
 نے تمہیں کتنے غلوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ مجھے  
 بھلا اس قسم کے کاموں کی فرصت کہاں۔“

اس کی سسکیاں رک گئیں اور اس نے آنسوؤں سے بھیگی  
 سر کوٹھی میں پوچھا ”آپ نے کس کے کتنے پر مجھے تلاش کرنا شروع  
 کیا تھا؟“

”پہلے تمہاری بہن کے کتنے پر۔ اور پھر اپنے اندر ابھرنے  
 والی کسی بھی آواز کے کتنے پر۔“ میں نے جواب دیا ”یہ شاید میرے  
 غلوں ہی کا تجربہ ہے کہ مجھے تم کو زیادہ تلاش نہیں کرنا پڑا اور تم  
 نے خود ہی مجھے فون کر لیا۔ اب ایسا کرو کہ تم جہاں کیس بھی ہو کسی  
 بھی سوا میں میں بیٹھ کر اس ہوٹل تک پہنچ جاؤ۔“

مجھے کچھ یوں لگا جیسے اس بات پر وہ گراہ انجلی تھی۔ ایک لمحے  
 کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”میرے لئے اس وقت ایک قدم اٹھانا  
 بھی آگ کا دریا پار کرنے کے برابر ہے افضل صاحب! معلوم نہیں  
 کس موڑ پر موت میرے انتظار میں کھڑی ہو۔“ پچھلے پندرہ دن میں  
 نے جس طرح گزارے ہیں اس طرح شاید مل میں پیچھے رہنے والے  
 کسی چوہے نے بھی نہ گزارے ہوں۔ میں صرف ایک آخری  
 کوشش سمجھ کر کہیں کو فون کرنے کے ارادے سے نکلی تھی۔ میں  
 نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں سے مجھے آپ کے بارے میں پتا  
 چلے گا اور میں آپ سے بات کرنے کی بہت بھی کروں گی۔ میں کسی  
 اُن دن کی شخص سے رابطہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے  
 اپنے بارے میں کچھ بتانا تو دور کی بات تھی۔“

”اب اتنا بتا دیا ہے تو یہ بھی بتا دو کہ میں تمہیں کہاں لینے  
 آسکتا ہوں۔ حالات اگر ایسے ہی ہیں جیسے تم بتا رہی ہو تو پھر یہ بھی  
 سمجھ لو کہ شاید یہ تمہارے لئے جان بچانے اور مدد کے لئے کسی کا  
 مشہور ہاتھ تھامنے کا آخری موقع ہو۔“

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی ”ٹھیک ہے میں آپ پر  
 مجھوسا کرنے کا جوا کھیل پلٹی ہوں۔ ایک ایڈریس لکھئے۔“ اس  
 نے مجھے ایک پتہ لکھوایا پھر بولی ”یہ جگہ آپ کے عالی شان ہوٹل  
 سے بہت دور ہے۔ شہر کے مضافات میں نہایت غریبانہ سی جگہ بستی  
 ہے۔ یہ اس کا ایک مکان ہے۔ نشانوں کے بغیر آپ اسے تلاش  
 نہیں کر سکیں گے۔“

اس نے چند نشانیاں مجھے سمجھائیں پھر بولی ”راستے میں یا اس  
 پاس کہیں سے میرے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش مت کیجئے  
 گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس مکان میں کوئی لڑکی موجود ہے۔  
 دیکھو یہ شخص میری خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ کسی کو میری  
 موجودگی کا علم نہیں ہے۔“

”ممنہ۔ کچھ بھی ہو۔ تمہیں اب تمہارے لئے کی ضرورت نہیں۔“  
 میں نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔

تبدیل ہو جائیں۔“

ان کے سوا مجھے دور دور تک کوئی انسان تو کیا ہوتا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مونا نے ہمیں کسی سے کچھ پوچھنے سے منع کیا تھا لیکن یہاں کوئی نظری نہیں آ رہا تھا جس سے ہم کچھ پوچھتے ہیں۔

نشانوں کی مدد سے نہایت سست رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ شفیع شاہ الرٹ بیٹھا تھا۔ وہ کوٹ کے نیچے چھپی گن کو چھپکتے ہوئے بولا ”یہ علاقہ پکا ہر جہ اور ایران اور خاموش ساد کھائی دے رہا ہے درحقیقت اسی خطرناک ہے۔ یہ اوسط درجے کے بحر میں کی بناوٹ کا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا وہ لڑکی یہاں تک کیسے پہنچی اور کیا وہ واقعی اس مکان میں اکیلی ہوئی جس کا اس نے ہمیں ایڈریس دیا ہے؟“

”یہ میں اس سے پوچھنا بھول گیا۔“ میں نے تسلیم کیا ”لیکن اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہاں اکیلی گھری ہوئی ہے۔“

”حیرت ہے! شفیع شاہ بڑا کر رہ گیا۔“

”وہاں میں عجیب عجیب تماشے ہو رہے ہیں شفیع شاہ! لگتا ہے اب ہمیں کسی بھی بات پر حیران ہونا چھوڑنا پڑے گا۔“ میں نے احتیاط سے کار کو ایک نیلے پر سے گزارتے ہوئے کہا جس کے ایک طرف چوڑا اور دوسری طرف جھاڑیاں تھیں۔

اس کے چند سیکنڈ بعد قدرے غیر متوقع طور پر کافی آسانی سے ہم اپنے مطلوب مکان تک پہنچ گئے۔ اس کی جھولی نیم شکستہ دیوار پر چاک سے جلی انداز میں اس کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ نہ شاید ہم نشانوں کے باوجود اس کے بارے میں شک میں ہی رہتے۔ کوئی عیب نہیں تھا کہ مونا نے فون پر مجھ سے بات کرنے کے بعد واپس آ کر یہی نمبر لکھا ہو۔ تاہم یہی لکھا ہوا لگتا تھا۔ یہاں کا قریب ترین بازار جس سے ہم گزر کر آئے تھے وہ بھی یہاں سے کافی دور تھا جہاں بے کارڈ فون کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ معلوم نہیں مونا وہاں پیدل گئی اور آئی تھی یا اس نے کوئی سوادری استعمال کی تھی۔ لگتا تو یہی تھا جیسے یہاں بس رکشا گیسوی وغیرہ کی آمد و رفت نہیں تھی۔

میں نے مکان دیکھ لینے کے باوجود گاڑی اس کے سامنے نہیں روکی بلکہ آگے نکال لے گیا۔ کسی کسی مکان کی پیشانی پر یا صحن میں کوئی مرل سابلنگ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے علاقے میں زیادہ تارکی نہیں تھی لیکن مکانوں کے اندر تارکی ہی تھی۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے بعض نامعلوم گوشوں سے کچھ ناویدہ آنکھیں ہماری گاڑی کو گھور رہی تھیں۔

میں نے کافی آگے جانے کے بعد گاڑی ایک دوسرے راستے سے لاکر اس مکان کے عقب میں روکی۔ یہاں تارکی تھی اور گاڑی جھاڑیوں میں تقریباً چھپ کر رہ گئی تھی۔ اترنے سے پہلے ہم نے اچھی طرح گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ اتنی

میں تسماری طرف آ رہا ہوں کیونکہ تم اس وقت میرے راستے میں ہو۔ میں نہیں وہاں سے پک کر لوں گا۔ ہم گھاس پھوس کے انبار میں جو سبکی تلاش کر رہے تھے انہوں سمجھو کہ وہ ٹل گئی ہے۔“ میں نے ایک انگریزی محاورے کا مضموم اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی۔

”سرا آپ کا مطلب ہے متبادل گئی ہے؟“ شفیع شاہ تیزی سے بولا۔

”مونا تو ابھی نہیں ٹل لیکن اس کا ایڈریس ٹل گیا ہے۔“

”یہی مضموم اطلاق ہے؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”مضموم ہی بتاؤ پڑے کیونکہ اطلاق اس نے خود ہی ہے۔“

میں نے جواب دیا ”میں تسماری طرف آ رہا ہوں۔ ہمیں اس کو لینے چاہیے۔“

”خود سرا! میں تیار بیٹھا ہوں۔“ اس نے مضموم سے جواب دیا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نہایت اطمینان سے ہونٹوں سے روانہ ہوا۔ میں نے آمدنی طوفان کی طرح ڈرائیو تک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے خیال میں اس معاملے میں زیادہ جلد بازی کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے یہ شبہ بھی میرے ذہن میں ابھرا کہ کیس یہ کوئی چال تو نہیں تھی؟ پھر میں نے خود ہی اس شبہ کو مسترد کر دیا۔

میں نے شفیع شاہ کو اپنے کپڑے کھینچ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ خاصا خوش تھا۔ میں نے راستے میں اسے مونا سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ قدرے حیرت سے بولا ”سرا! یہ تو پیشے کے نمائندے ہی مسئلہ حل ہو گیا۔“

”اں! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔“ میں نے طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ڈرائیو تک میں ہی کر رہا تھا۔ سفر خاصا طویل تھا۔ ایک مقام پر آ گیا جس سے آگے کا راستہ میرا دکھا ہوا نہیں تھا۔ تب میں نے شفیع شاہ سے گائیڈ کا کام لیا۔ آخر ہم ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جو آباد ہوتے ہوئے بھی ویران تھا۔ یعنی وہاں خال خال مکان نظر آ رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے ان میں کوئی رہتا نہیں تھا۔ جگہ جگہ نیلے اور جھاڑیاں تھیں۔ کوئی مکان پلندری پر تھا کوئی نشیب تھا۔ کبھی گھنٹے پانی کا جوہر تھا تو کبھی کوڑے کے ڈھیر۔ مکانات بھی نہایت معمولی اور اجڑے اجڑے تھے۔ وہاں کی گلیوں میں گاڑی کے بھائے کہ حاکم گاڑی زیادہ تیز رفتار سے چل سکتی تھی۔

ایک جگہ جوہر کے قریب دو آدمی اوڑھے سیدھے بڑے نظر آئے۔ میں نے شفیع شاہ سے پوچھا ”میں کیا کسی نے قتل کر کے پھینک دیا ہے؟“

شفیع شاہ غور و فکر سے ہار دیکھتے ہوئے بولا ”میں سرا! بیرونی ہیں۔ بے سوادہ پڑے ہیں۔ کوئی عیب نہیں سمجھ تک لاشوں میں ہی



دروانی کا تاثر دینے والی ایسی چھدری چھدری سی آبادی میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

وہ مکان زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ ساخت بھی غریبانہ قسم کی تھی۔ اس کی مٹی دیوار میں بھی چھوٹا سا ایک گیت سوزہ تھا لیکن میں نے غور سے دیکھا تو اس پر کالا لٹکا دکھائی دیا۔ اندر بھی تاریکی تھی۔

”ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں تو کوئی رہتا ہی نہیں۔“ شفیع شاہ نے سر کوئی کیا۔

”یہی تاثر تو مونا کی زندگی کی ضمانت ہو گا۔“ میں نے کہا۔

چند سیڑھیاں بعد ہم دونوں گلیں لئے گاڑی سے اتر آئے۔ شفیع شاہ نے احتیاطاً گاڑی سے ناسمجھ بھی نکال کر تھپ تھپ ڈال دی تھی۔ مکان کی مٹی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کے بغیر ہی اسے چلا کر گئے اور لمبی کی طرح بے آواز قدموں سے تنگ گلی نما جس میں کوہ گئے لیکن دائیں بائیں کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جس سے ہم گھوم کر مکان کے سامنے والے دروازے پر پہنچ سکتے۔ اندر جانے کے لئے اب مٹی دیوار سے داخل ہونا ہی ضروری تھا۔

وہ دروازہ چھوٹا اور نہایت معمولی سا تھا۔ اس میں کوئی فلٹس لاک وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ سے زور دیا تو ڈالا تو بجلی سی چڑھا ہٹ کے ساتھ وہ کھل گیا۔ اندر کی طرف سے اس کا کوئی بولٹ وغیرہ بھی چڑھا ہوا نہیں تھا۔ چڑھا ہٹ کی آواز ابھرتی ہی میں اور شفیع شاہ دروازے کے دونوں طرف دیوار سے چپک گئے۔

اندر پچھلا ہوا گھپ اندر میرا گویا ہمارا شکر تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس اندر میرے میں کیا چھپا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا آہٹکی سے موتا کو آواز دے کر دیکھوں۔ شاید وہ خود دروازے تک آجائے۔ شاید اس نے میرے ہی انتظار میں دروازہ کھلا رکھا تھا۔ تاہم میں نے آواز دینے کا ارادہ ہٹای کر دیا۔ اسی اثنا میں درپے تیز ہوا کے دو تین جھونکے آئے اور تنگ دروازے میں کچھ ایسی سرسراہٹ سی ابھری جیسے تیز ہوا کسی غار میں گھس رہی ہو۔ سیڑھیاں سی بجتے میں کچھ سی کمرہ گئی تھی۔

میرے ذہن میں ایک شبہ نے سراپا ہمارا۔ تیز ہوا تو پہلے بھی چلتی رہی ہوگی۔ اگر دروازے کا بولٹ اندر سے چڑھا ہوا نہیں تھا تو اسے پہلے ہی کھل جانا چاہئے تھا۔ ہمیں تو وہ کھلا ہوا ہی ملنا چاہئے تھا۔ کیا کسی نے ہمیں آتے دیکھنے کے بعد اندر سے دروازے کا بولٹ ہٹایا تھا؟ اگر وہ موتا ہی تھی تو اب تک اسے بول پڑنا چاہئے تھا پھر میں نے سوچا شاید وہ بھی ہماری طرح احتیاط برت رہی ہو۔ وہ ہمیں پہنچاتی تو نہیں تھی۔ اگر وہ ہم سے شاسا ہوتی تب بھی اس کیلئے اندر میرے میں اس کے لئے ہمیں پہچانا مشکل ہو گا۔ چہ جائیکہ اس نے ہمیں دیکھا ہوا ہی نہیں تھا۔

آخر میں نے سہنس فٹنکر کے کافیلہ کرتے ہوئے شفیع شاہ کو

اشارہ کیا اور ہم رکروں کی سی حالت میں اچانک کمرے میں داخل ہو گئے۔ چند لمبے ہم اندر کی طرف دیوار سے چپکے رہے۔ دوران میری آنکھیں آسانی سے اس اندر میرے میں دیکھنے کے ہو گئیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ میری یہ احتیاط فضول تھی۔ کم از کم اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ شفیع شاہ نے تاسف سے ہنسنے لگا۔ اس کمرے میں صرف ایک چٹائی اور اس پر ایک سیلاب تھیکہ پڑا تھا۔ وہ ایک عجیب وحشت انگیز سا کمرہ تھا۔ کوئی کدھر میں چالے گئے ہوئے تھے۔ روشنی ہوتی ہی ایک کونے سے اچھا چھپ کر کھانا جو شاید ہماری آمد سے پہلے وہاں بیٹھا ہو گا تھا۔

میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ اس نے تاسف بھرا ہوا نہایت کار آمد تاسع تھی۔ ایک ٹپن دبانے پر اس کا روشنی تاسع کی طرح محدود رہتی تھی۔ دوسرا ٹپن دبانے پر یہ ایک تاسع کی طرح روشنی دیتی تھی۔ تیسرا ٹپن دبانے پر یہ ایک خاص طاقتور سرج لائٹ کا کام دیتی تھی اور چوتھا ٹپن دبانے کی روشنی سرخ ہو جاتی تھی۔ اس طرح یہ خاص شکل میں استعمال ہو سکتی تھی۔

مکان بدستور سکوت میں ڈوبا رہا۔ کسی طرف سے کوئی آواز ظاہر نہ ہوا۔ ہم دونوں ہمیں سنبھالے، چوبک چوبک کر قدم ہوتے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے میں مجھے ہیرا ہوا میں معلق نظر آیا اور مجھے اندر میرے ہی میں احساس کہ وہاں کوئی بہت بڑی خبر ہماری منتظر تھی۔

میں نے خطرے کے احساس کو ہلانے طاق رکھتے ہوئے شاہ کے ہاتھ سے تاسع کی اور تیز روشنی ڈالا ٹپن دیا۔ کمرہ میں پہلے کمرے سے بھی زیادہ وحشت انگیز دکھائی دیا۔ حالانکہ وہ ایک فرنیچر سے مکان کا عام سا کمرہ ہی تھا۔ اس کی دیوار پلستر لکڑیا ہوا تھا۔ اس میں تھوڑا بہت سا زرد سامان بھی موجود تھا۔ قاتل ذکر بات صرف یہ تھی کہ اس کمرے کے وسط میں ری کا پھندا پڑا ہوا تھا اور اس پھندے میں ایک لاش ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ تاسع بندھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے اٹل آتی تھیں۔ چھوٹا دیکھا تھا۔ مجھے ہوتے چرے کے ساتھ بھی اسے ہمارے لئے مشکل نہیں تھا۔

وہ پھینکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر عمدہ اور فیشن ایبل کپڑا اور فٹن آئو لباس تھا جو کہیں کہیں سے پھٹ بھی تھا۔ شاید زندگی کے آخری لمحوں میں اس نے کسی کے محتاجت کی تھی۔ اس کی جوتیاں ایک طرف بڑے سلیفے ہوئی تھیں۔ اسی طرف ایک بیڈ پر اس کا برقع پڑا تھا۔ ہم دونوں چند لمبے ساکت کھڑے رہے۔ میرے دل میں اور اطرد کی کی ایک لہر ابھری جو طوفان مٹا جاتی تھی

دشمنوں کے زرنے میں سے بھی صحیح سلامت نکل جاتا ہے۔ قسمت مخالف ہو جائے تو کسی دیرانے میں بھی دشمن سے سامنا ہو جاتا ہے۔

شفیع شاہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس وقت ڈرائیو نگ وہی کر رہا تھا۔ کہنی کا آفس راستے میں پڑا تھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ میری اجازت پا کر وہاں اتر گیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر جانے کے لئے ڈینس کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اپنی گاڑی میں ہو کر واپس آ گیا۔

واپس آتے ہی میں نے رحیم گل سے رابطہ کیا۔ پولیس سے متعلق معاملات نٹانے کے لئے فی الحال رحیم گل ہی کافی ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے زیادہ اونچی سطح سے کچھ کھولانے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ گو کہ اس کا تعلق صرف ایک علاقے کے تھانے سے تھا لیکن وہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھنے والا مسئلہ حل کر دیتا تھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ اس کے ساتھ جچ بولا جاتا اور اسے بالکل صحیح معلومات فراہم کی جاتی تھیں تاکہ بعد میں اس پر کوئی الزام آنے کا امکان نہ رہتا اور اس کے نظریات یا دوا تہداری کو کوئی دھچکا پہنچنے کا خطرہ پیدا نہ ہوتا۔

میں نے مختصر اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا: ”اب میں یہ کیس تمہارے۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارے جگے کے سپور کر رہا ہوں۔“

”بہت اچھا کر رہے ہو۔“ وہ میری بات کاٹ کر ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”کیونکہ تم نے اس کا جو بیڑا غرق کرنا تھا کر لیا اور اپنا سا زور لگا کر دیکھ لیا۔ اب تمہارے لئے اس سے جان چھڑا لیا۔ بستر ہے۔“

”یاد رہے اس کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے ڈانٹ پلائی ”اگر یہ کیس شروع سے پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا ہو تو اب تک وہ نہ پانے نہ کتنے بے گناہوں کو اس کی پیٹ میں اگلے کران کی کھال سمیٹ کر کشتالہ ہو چکی ہوتی۔“

”جوگوں کو پولیس کے بارے میں اس کے سوا شاید کوئی بات کرنی ہی نہیں آتی۔“ وہ ناگوار سی بولا ”میں بیٹھ میں نہیں پڑوں گا۔ ایک اور بات البتہ میرے خیال میں قابلِ توجہ ہے۔ یہ دو سرا موقع ہے کہ تم مجھے کسی جگہ ایک لڑکی کی لاش کی موجودگی کی اطلاع دے رہے ہو۔ میری نظر میں تو تم خود خامسے مشکوک ہوتے جا رہے ہو۔“

”جی اور دیکھتے جاؤ بیٹا! ابھی تو تمہارے شکوک و شبہات اور بڑھیں گے تمہیں راتوں کو نیند نہیں آیا کہے گی۔ تم بے چینی سے بستر پر کوئی بلا کر کے لیکن افسوس کہ تم کچھ کر نہیں سکو گے۔ اب اپنے ناکارہ کان کھول کر ایک بات سن لو۔ میں چاہتا ہوں مونا کے قتل کی خبر بے شک اخبارات میں تھانے لیکن اس معاملے کا کوئی اسکینڈل نہ ہے ایک خاندان کی عزت کا سوال تو ہے۔ لیکن ویسے بھی اس قسم کی باتیں ہماری سوسائٹی کے لئے

نے اس کو دبائے رکھنے کی کوشش کی۔ فی الحال میں کبھی کیا سکتا تھا؟ میں اور شفیع شاہ شاید یکساں محسوسات کے ساتھ ایک وقت چینی کی طرح چلے اور احتیاطوں کو فراموش کرتے ہوئے گولے کی طرح بوسے مکان میں محکم گئے۔ مکان پر انہیں تھا۔ چند سیکنڈ میں ہم نے اس کا پتہ چھپ دیا۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

میں اس کمرے میں نہیں گیا جس میں مونا کو چھائی دی گئی تھی۔ میں اس کی لاش سے شرمندہ تھا۔ ہم دونوں ہندو تھے مختصر سے صحن میں کھڑے رہے۔ شفیع شاہ یو جھل کبے میں بولا ”ہمیں دیر ہو گئی سرائے“

”مونا ہم بازی ہار گئے۔“ میں نے مہری سانس لے کر کہا ”اب یہاں رکھنے کا کوئی ناکہ نہیں۔ آؤ چلتے ہیں۔“

”سرا مکان کی تلاش لیتے ہیں۔ شاید کوئی سراغ۔“

”جگہ سے اور گرد و نواح کا کچھ کھانڈا کو کھانڈا لے گا کوئی ناکہ نہیں شفیع شاہ جو لوگ اس قسم کے کام کر رہے ہیں وہ سراغ چھوڑ کر جانے والے نہیں گئے۔“

”میں آپس پاس کے مکانوں سے پوچھ کچھ کرنے کی کوشش کرنا ہوں۔“ شفیع شاہ بے جاہ اپنی سی کوشش کرنا چاہتا تھا کچھ ہاتھ پاؤں مارنا چاہتا تھا۔

”دو اپنی قسم کی تحقیق پولیس کے لئے چھوڑ دو۔“ میں نے ہدایت کی ”جو کچھ معلوم کر پائیں گے اس کی رپورٹ ہمیں مل جائے گی۔ ہمیں اس میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہمارے کہنے کا جو کام تھا وہ ہم سے نہیں ہوسکا۔ اب ان باتوں کا کیا ناکہ؟ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے دل کی افسردگی میرے لیے نہ نہ جھلکے پائے۔

شفیع شاہ مجھے لیے میں بولا ”احرام انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم کم از کم لاش کو پھندے سے نکال کر نیچے تو لٹا دیں۔“

”اگر یہ تم ٹھیک کر رہے ہو۔“ میں نے اس کی جانتی کی۔ ہم

دونوں اس کمرے میں واپس آئے۔ ہم نے لاش کو پھندے سے نکال کر احتیاط سے میلے کیلے بستر پر لٹایا اور وہاں موجود ایک پرانی

ٹی چادر اس پر پھیلا دی۔ اس کے بعد ہم جس راستے سے آئے تھے اسی سے واپس روانہ ہو گئے۔ کسی سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔

کسی نے ہمیں مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے دل پر جھل ہو چکے تھے۔

”میرا خیال ہے مونا فون کرنے نکل تو واپس میں اسے دیکھ لیا

کیا۔“ میں نے راستے میں اظہار خیال کیا۔

”جی بالکل محسوس تو کیا ہوتا ہے۔“ شفیع شاہ مجھے لیے میں

بولا ”لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کیا اس کی تلاش میں اتنے دور

اور اڑاؤ تھا تو تک لوگ پھیلے ہوئے تھے؟“

”کچھ پتہ نہیں ہے۔“ میں نے مہری سانس لے کر کہا ”ویسے

سارا مکمل قسمت کا ہے۔ قسمت ہی ہار جائے تو عجیب عجیب

اتفاقات رونما ہوتے ہیں۔ قسمت ساتھ دے رہی ہو تو انسان



شرمناک ہیں۔ ان کے نہ جانے کیا کیا اثرات مرتب ہوں۔  
 ”میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا مولوی صاحب!“ وہ رکھائی سے  
 بولا۔ مجھے معلوم تھا نہ وہ خواہ کچھ بھی کہتا لیکن دل ہی دل میں  
 وہ ان باتوں کا مجھ سے زیادہ قائل تھا اور عملی طور پر بھی جہاں تک  
 اس کا بس چلتا تھا خیال رکھتا تھا۔ زبانی طور پر ہم ایک دوسرے کو  
 چرانے کے لئے بہت کچھ کہتے رہتے تھے۔  
 ”اگر تم نے اس بات کا خیال نہ رکھا تو پھر میں تمہاری نوکری  
 کا بھی خیال میں رکھ سکوں گا بر خود را زمینوں پر واپسی کے لئے  
 بستر تہہ کر رکھتا۔“ میں نے کہا۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز میں مستحکم  
 تھی۔ ایسی مستحکم جو کسی خوش خبری کے انتظار میں نہ تھی بلکہ  
 بلکہ جیسے سفید کائنات کے لباس میں اس کا استخوانی وجود بھی گویا بہت  
 ہی بار میں سینے ہوئے تھا۔ وہ کوئی بہت اچھا کلون لگائے ہوئے  
 تھی۔ کمر اس کی موجودگی سے محکم رہا تھا۔ وہ اس عذر سے کٹتی  
 تھی۔ دکھائی دے رہی تھی جسے میں نے پہلے دوا نہ دیا تھا۔ میرے  
 دل میں آسف کی طرح قوی رہو گئی۔

”وہ تو رکھائی رہتا ہے اور میری جیب میں استغنیٰ بھی پڑا رہتا  
 ہے لیکن تم جیسے چہرے قاپیوں کی وجہ سے اس کے استعمال کی فہم  
 نہیں آسکتی۔“  
 ”یہ تو وقت آنے پر پتا چل جائے گا۔“ میں نے مہمانانہ  
 لہجے میں کہا مہر حال اب گویا اس بند کو اور حرکت میں آجاء۔ اگر  
 کسی مرتبے پر تمہیں دشواری پیش آنے لگے کوئی متعلقہ آفیسر  
 تمہاری بات نہ مانے یا کام لگانے لگے تو مجھے ضرور فون کر لیتا۔“  
 میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا لیکن میں خود اس کے متعلق  
 بیٹھنے کی بہت نہ کر سکا۔ میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اس کھڑکی سے  
 آفس کی عقی بند کھلی دکھائی دیتی تھی۔ میں اس وقت تصفوں کی بنا  
 گئی میں ہی کھڑا تھا۔ کئی لمبے تک کمرے میں کمراسکت رہا پھر کمر  
 عذر سے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے کہا ”میرا اقامت  
 لے مجھے بلایا تھا۔“

رجیم گل کے ساتھ نوک جھونک سے بھی میری مدد کی  
 افسردہ کی کچھ کم نہ ہو سکی۔ اس رات مجھے بہت کم خبر آئی۔ دوسری  
 صبح میں جلد ہی ابر ہو گیا۔ ناشتے سے پہلے میں نے امبر کو فون کر دیا کہ  
 وہ جب آفس آئے تو عذر کو ساتھ لیتی آئے۔

”ہاں“ میں نے دیکھے لہجے میں کہا اور دل میں سوچا کہ کام  
 میں نے اسے نہ بلایا ہوا فون پر ہی یہ خبر سنائی ہوئی۔ کسی کام  
 کے بغیر فون پر کسی کو کوئی ہی خبر سناتا پھر بھی کچھ آسان ہو آئے  
 ”میرا خیال ہے مونا کا پتا چل گیا ہے۔“ وہ پرامید  
 میں بولی۔

ناشتے کے بعد میں نے رجیم گل سے فون پر صورت حال معلوم  
 کی۔ متعلقہ علاقے کی پولیس نے مونا کی لاش اٹھائی تھی۔ دوسری  
 پوسٹ مارٹم کے بعد اسے شافٹ کے لئے اسپتال کے مرنہ خانے  
 میں رکھ دیا جاتا تھا۔ تفتیش شروع ہو چکی تھی۔

”ہاں“ میں نے ایک بار پھر دیکھے لہجے میں یہی لفظ دہرایا  
 اس وقت نہ جانے کیوں خود کو اس کا مجرم محسوس کر رہا تھا۔ میں  
 کھانا کھا کر صاف کرتے ہوئے کہا ”عذر! جب تم مونا کی طرف  
 یہاں آئیں تو کیا تم اس کے بارے میں کوئی بری خبر سننے کے لئے  
 تھیں؟“

اب مجھے عذر کا سامنا کرنے اور اسے یہ خبر سنانے کا مشکل مرحلہ  
 درپیش تھا۔ یہ کام میرے لئے بہت سے مصائب، مشکلات اور  
 خطرات کا سامنا کرنے سے زیادہ دشوار تھا۔ میں آفس میں داخل  
 ہوا تو امبر اپنے کمرے میں موجود تھی لیکن عذر میرے کمرے میں  
 تفتیش میرا انتظار کر رہی تھی۔

”اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ میں گو کہ اس  
 طرف دیکھنے کی ہر بات محسوس نہیں کر رہا تھا لیکن شاید غیر  
 سے انداز میں میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اسی  
 آنکھوں میں ستارے دم توڑ گئے تھے اور اس کے شکستہ وجود  
 گویا خزاں کا جھونکا گر کر گیا تھا۔ میرے سوال نے ہی شاید  
 بہت کچھ بتا دیا تھا۔“

ستم غریبی نے تھی کہ آج وہ کچھ کھلی کھلی دکھائی دے رہی تھی۔  
 اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ دیسے بھی  
 اس کے چہرے کا خوب صورت ترین حصہ تھے۔ آج وہ ہونٹ تو  
 یا قوت کی طرح دکھائی دے رہے تھے لیکن مجموعی طور پر پورا چہرہ ہی بھلا  
 لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ مونے کی شیشوں کی عینک کے عقب میں اس کی  
 آنکھیں بھی گویا ستاروں کی طرح جھللا رہی تھیں۔ وہ یقیناً بہت  
 خوش تھی۔ اور تب میں سمجھا کہ میرے اس طرح غیر متوقع طور پر  
 بلانے سے وہ کبھی تھی کہ شاید میرے پاس اسے سنانے کے لئے  
 کوئی خوش خبری موجود تھی۔ میں اندر ہی اندر کراہ کر رہ گیا۔ نہ  
 جانے کیوں اس نے یہ فرض کر لیا تھا۔

وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے باقوی  
 نہایت آہستگی سے بے ”تی“ میں لیکن آپ سے ملنے کے  
 جانے کیوں دل کو ڈھارس کی تھی کہ شاید ہمارے مقدر کی

کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ دونوں کی طرح اپنی آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں میرے ہاتھ پر رکھنے لگی۔

پھر اچانک اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہت سے شوپہرے کر اس نے اپنا چہرہ پونچھا اور میز سے ٹیک اٹھاتے ہوئے بولی "میں اب چلتی ہوں۔ مجھے بتادیتے مونا کی لاش مجھے کہاں سے ملے گی؟"

اس کے رویے کی بے ساختگی اور اس کے جذلوں کی شدت نے مجھے قدرے حیران کر دیا تھا۔ میں نے سمجھتے ہوئے پوچھا "تم کھر والیں جانا چاہتی ہو؟ میرا مطلب ہے کھر؟"

"جی ہاں" وہ میری طرف دیکھ کر بغیر اثبات میں سر ملاتے ہوئے بولی "مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کر لیا۔ آپ سے جو کچھ ہو سکا آپ نے کر لیا لیکن ہم میں سے کوئی بھی قسمت کے کھٹے کو نہیں مٹا سکتا۔ میں اب اس بے رحم شہر میں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ لوگ کہتے ہیں یہ بڑا غریب پروردھر ہے۔ شاید کبھی رہا ہو۔ اب تو یہ غریبوں کی سب سے بڑی ٹھکانہ گاہ ہے۔ میں اپنی بہن کی لاش لے کر جس قدر جلد ممکن ہو سکے وہاں سے چلے جانا چاہتی ہوں۔"

"جہیں اس سلسلے میں کوئی تردد کرنے یا کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا "تم اپنا ایڈریس وغیرہ چھوڑ جاؤ۔ میٹ تھراپے گھر پہنچ جانے کی اور وہاں ایک بات میں اور کٹنا چاہتا ہوں۔ خواہ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو یا نہ پڑا ہو۔ خواہ اس سے جہیں کوئی دلچسپی ہو یا نہ ہو۔"

اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں گلابی زورے تھم رہے تھے۔ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لیے میں کہا "میں مونا کو تو موت سے نہیں بچا سکا لیکن میرا تم سے وعدہ ہے کہ اس کے قاتل یا قاتلوں کو بھی موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

"شاید اس سے دل کا زخم مندمل ہونے میں کوئی مدد ملے۔" اس نے بیچمی بیچمی آواز میں کہا "میرا ایڈریس اور رابطہ کا فون نمبر وغیرہ امیر کے پاس ہے۔ خدا حافظ۔ مجھ سے جو بھی گستاخیاں سرزد ہوں انہیں ایک دیوانی کی کرتیسی سمجھ کر صاف کر دیتے گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔" وہ تجزی سے گوی اور ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر نکل گئی۔

میں دم سے اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ یک لخت مجھ پر ایک عجیب سی محسوس کا حملہ ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا ہذا را بھی امیر کے کمرے میں رکھی ہوئی اور اسے سب کچھ بتا کر مزید آنسو بباری ہوگی۔



دوسرے روز جبکہ مونا کی میٹ اس کے گھر روانہ کی جا چکی تھی اور اخبارات میں اس کی موت کی خبر چھپ چکی تھی میں آنس میں اگر بیٹھا ہی تھا کہ امیر نے اصرار کام پر بتایا "سرا میرا دانش صاحب کا فون ہے۔" پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "وہ بیچکان لے کر

بھی کسی اچھی خبر میں تبدیل ہو جائے۔" وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"ہذا را۔ اچھے انسو ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا۔" میں نے کہا۔

"آپ نے اسے احوال تو کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں لیکن شاید اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔" میں نے جواب دیا "مجھے تو بیٹھے بیٹھے ہی اس کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے خود ہی مجھے فون کیا تھا لیکن شاید اس نے اس کام میں تاخیر کر دی۔ میں نے تو اس تک پہنچنے میں کھٹا تاخیر نہیں کی۔ فون پر اس سے بات ہوئی ہے میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کے پتے ہوئے چلے پوچھا لیکن۔" میں نے ایک ایک کر کے اسے بتایا کہ کس طرح مجھے مونا کا فون موصول ہوا تھا۔ کس طرح میں اور فلیچ شاد اس مکان تک پہنچے تھے اور وہاں ہمیں کیا دیکھنے کو ملا تھا۔ وہ چلے گئے ساکت بیٹھی ایک تک میری طرف دیکھتی رہی۔

اسے گویا سکھ ہو گیا تھا پھر ٹیک کے عقب سے دو آنسو اس کے چہرے پر رشادوں پر پھیل آئے۔ آہم اس کی خاموشی پر قرار دی۔ آنسو گویا کسی جہنم کی آنکھوں سے نکلے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اسے واقعی سکھ تو نہیں ہو گیا تھا لیکن اسی اثنا میں اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ لڑائی ہوئی سپید سپید استخوانی سی انگلیوں سے اس نے نہایت آہستہ سے ٹیک اتاری پھر میرے سر پر رکھ کر پھٹ کر روئے لگی۔

میں نے اسے تسلی دینے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن تمام الفاظ مجھے کھوکھلے بے معنی اور بے اثر سے محسوس ہوئے۔ میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ دل کا غماز لگن جانا اس کے تن میں بہر تھا۔ کئی منٹ تک اس کی سسکیاں کمرے میں ابھرتی رہیں اور اس کا زور سا وجود خرواں رسیدہ ہونے کی طرح کرسی پر لڑا رہا۔

آخر میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے سر اٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے یوں مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا گویا کسی ڈوہڑے ہوئے انسان کو اچانک سارا امیر آگیا ہو۔ اس کے ہاتھ گویا غماز میں تپ رہے تھے اور اس کی حرارت استخوانی انگلیاں گویا میرے ہاتھوں میں لڑی جاری تھیں۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس برف سے وجود میں اتنی حرارت بھی ہو سکتی تھی اور وہ پٹے پٹے سے ہاتھ اتنی طاقت رکھتے تھے۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں ہذا را۔ ایسی تھراپے نے کچھ نہیں کر سکا۔" میں نے حیرت منانہ شرمندگی سے کہا۔

"آپ کیوں شرمندہ ہوتے ہیں سرا؟" وہ آنسوؤں سے بھیگی بھی میں کو کہتی تھی۔ میں نے تو میرے لئے جتنا کچھ کیا میں اس کا تصور نہ کر سکتی تھی۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ جیسا کہ وہی میری اتنی مدد کرے گا۔ آپ بہت اچھے ہیں سرا میں آپ کو

دور پہن سرا۔

”وہ میرے خدا!“ میں نے زہر لب کا مہر حال بات کراؤ۔“

اس نے لائن ملائی۔ پیر دانش واقعی بچوں کی طرح دو ہاتھ افضل صاحب! یہ کیا ہو گیا۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔“ وہ بچیاں لینے ہوئے بولا۔

”آپ کون سے ظلم کی بات کر رہے ہیں پیر صاحب؟ اس ضر میں تو بہت سے ظلم ہو رہے ہیں۔“ میں نے علامت سے کہا۔

”افضل صاحب! ہمیں تو بس ایک ہی ہستی سے غرض قہمی اور اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے اس شر کو الگ لگا دوں۔“

”شر کو تو پہلے ہی الگ لگی ہوئی ہے پیر صاحب! ہر شخص جس کی ذات یا انا کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ سوچتا ہے شر کو الگ لگا دوں۔ شر بے چارے کا نہ جانے کیا تصور ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ بات تو تائیں۔ ہوا کیا ہے؟“

”آپ نے اخبارات نہیں دیکھے کیا؟“ اس نے بدستور بچیاں لینے ہوئے پوچھا۔ پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر بولا ”دیکھے بھی ہوں تو شاید آپ کی نظر سے وہ خبر نہ گزری ہو۔ انا بڑا ظلم اور اتنی چھوٹی سی خبر۔ کونوں کھدووں میں چھپی ہوئی ہے۔ اخبارات نے اسے اہمیت ہی نہیں دی۔ بڑے افسوس کا مقام ہے۔“ وہ ہلک ہلک کر روئے لگا۔

”اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔“ میں نے جلدی سے کہا ”آپ مونا کے قتل کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے خبر دیکھ لی ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے خود کر لیا لیکن آپ اس مدے کو اس طرح دل پر مت لیں۔“

”کیسے دل پر نہ لیں افضل صاحب! ہم نے زندگی میں پہلی بار تو کسی سے محبت کی تھی۔“ وہ کچھ اور بھی زور زور سے بچیاں لینے لگا۔ ”آپ نے شاید کبھی کسی سے محبت نہیں کی افضل صاحب! اس لئے آپ کو کسی کے درد کا اندازہ نہیں۔“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”مجھے اچھی طرح اندازہ ہے پیر صاحب! لیکن کیا کیا جائے۔ جو ہو چکا ہے اسے اب بدلائیں جاسکتا۔ میرے الفاظ خواہ آپ کو کتنے بھی کھسے پنے لگیں لیکن اس کے سوا کچھ کہا بھی تو نہیں جاسکتا کہ آپ مبرا کریں۔“

”ہماری والدہ محترمہ بھی یہی کہہ رہی تھیں اوزیم نے زندگی میں کبھی ان کا حکم نہیں ملا لیکن اس معاملے میں ہم ان کا حکم بھی نہیں مان سکتے۔ ہم مبرا کس طرح کریں؟ یہ کوئی ہمارے اختیار کی بات تو ہوا ہی ہے۔ اب تو بس یہی بچتا ہوا دل کو سانپ کی طرح ڈسے جا رہا ہے کہ ہم نے اسے جانے ہی کیوں دیا تھا۔ ہم اتنی ہی غلطی نہ کرتے تو آج وہ ذات کی سوت مرنے کے بجائے ایک منگہ کی طرح اس شرم میں رہ رہی ہوتی۔ نہ جانے کتنی عورتیں اس کے

مقدور پر رشک کرتیں۔ ایک رات میں وہ کچھ کے پھول سے ر تاج بن جاتی۔ وہ خود بھی اپنے آپ پر رشک کرتی۔ افسوس۔ سب کچھ نہ ہو سکا۔ یہ مدد ہم سے بڑا شت نہیں ہو رہا۔ خدا افضل صاحب! کچھ دیر کے لئے ہمارے پاس آجائیں اور ہمیں قر دیر۔ مدت کے بعد ہمیں آپ کی صورت میں ایک معتقل تو رکھائی رہا ہے۔ آپ کی بات ہمارے دل پر اثر کرتی ہے۔ خدا! لئے چند منٹ ضرور ہمارے لئے نکالیں۔ ذرا سی دیر کے لئے غریب خانے پر آجائیں۔“ اس کے لہجے میں اُن گت التجائی تھیں ایک بار پھر وہ بچوں کی طرح روئے لگا۔

بلانشہ وہ ایک عجیب و غریب کردار تھا۔ میں نے ایک لئے غاموشی کے بعد تجزی سے کہا ”خدا کے لئے پیر صاحب! آپ کے کو سمجھائیے۔ یوں بچوں کی طرح مونا آپ کو زہم نہیں دیتا۔ چند منٹ میں آپ کے دولت کو دے پر حاضر ہوا ہوں۔ میں خدمت کے لئے حاضر ہوں پیر صاحب! آپ اپنا ایڈریس بتا کر آئیں۔“ میں نے اچانک ہی فیصلہ کیا تھا کہ موقع اچھا تھا۔ بہتر اس شخص کا گھر دیکھ لیا جاتا۔

”میں نے اپنا کارڈ آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔“ وہ ششوں کرتے ہوئے بولا ”میرا حال زبانی بھی بتا رہا ہوں۔“ اس مختصر کالغزب کے ایک ہلاک کا ایڈریس بتایا اور بولا ”مگر ذرا دقت پیش آئے تو اس ہلاک میں پہنچنے کے بعد کسی سے بھی پوچھ لیجئے گا۔ وہ آپ کو اس خادم کے غریب خانے تک چھوڑ کر جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فوراً بند کر دیا۔

میں کچھ دیر ساکت بیٹھا اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا پہلی ملاقات پر میں نے دل ہی دل میں اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ اسے خود تو اسٹائل ہی چاہئے تھا کہ آخر یہ کیا چیز تھا؟

میں نے شیخ شاہ کو فون کر کے اپنے پاس بلالیا اور اسی توسط سے اپنے دو آدمیوں کو بھی مطلع کر دیا کہ ہم پیر دانش سے جا رہے تھے۔ انہیں ایڈریس بتا دیا گیا اور ہدایت کر دی گئی کہ وہ وقت تک دور دور سے اس مکان پر نظر رکھیں جب تک ہم ان سے مل کر یہ خیر عایت واپس نہ آجائیں۔ سنے لوگوں سے وقت کچھ احتیاط کر لیتا ہی بہتر تھا۔ خصوصاً ایسے لوگ جن کی ذرا بھی برا سرائت کے پوسے میں لپٹا ہوئی تھی یا جو کسی اعتبار سے طاقتور تھے۔

شیخ شاہ کے ساتھ میں پیر دانش سے ملنے کے لئے روانہ ہوا راستے میں میں نے اس سے پوچھا ”تم اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”جی نہیں کہ شر کا بہت اہم۔ بہت طاقتور۔ بہت دولت مند اور بہت بامعروف شخص ہے۔“ شیخ شاہ بولا ”لیکن سنا ہے ان

کے لئے کہا پھر اس سے بھی زیادہ معذرت کے ساتھ ایک منظر ڈیٹیکٹر ہمارے جسموں پر پھیر کر دیکھا۔ وحاشا کی نشاندہی کرنے والے اس آلے نے ہمارے پاس ایسی کسی چیز کی موجودگی کا اشارہ نہیں دیا۔

تب اس نے ایک ملازم کو اشارہ کیا جو سامنے کی آہنی گرل ہڈ کر خود ہی ہماری گاڑی طویل و عریض ڈرائیو سے میں ایک طرف کھڑی کر آیا۔ ہمیں اسی ملازم کی رہنمائی میں اندر پہنچ دیا گیا۔ ماربل کی پتھر کمر گاہ کے دو دروازوں طرف نہایت خوب صورت لان تھا جس میں خود کار فوارے پانی کی پھوار پر سارے تھے۔ دقتے دقتے سے وہ بند ہو جاتے تھے۔

عالیشان مکان کی اصل عمارت کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں سامنے پہلی منزل کی طویل و عریض ٹیرس نظر آئی جس کے سامنے کی پتھی کی دیوار یقیناً سپورٹنگ کولن سے آراستہ تھی۔ اس ٹیرس پر ایک جسم عورت بظاہر میں ہاتھ دے کھڑی تھی۔ اس کے کندھوں تک ٹیرس کی دیوار تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک دروازہ عورت تھی۔ اس کی رنگت ساقی تھی۔ عمر ساٹھ سے کم نہیں رہی ہوگی لیکن وہ کسی ساڈنی کی طرح مضبوط دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چوڑے چکلے اور بے کشش چہرے پر بالائی سفالی تھی۔

اس کے دائیں بائیں دو عوامی ٹاپ لڑکیاں ہاتھ بانہ سے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ وہ یقیناً پردائش کی ”والدہ محترمہ“ تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنی دروازہ عورت کا بیٹا اتنا پستہ قد تھا۔ شاید اس کا شہر پرستہ تھا ہو۔ وہ کچھ اس طرح ٹیرس سے نیچے کا جائزہ لے رہی تھی جیسے زمانہ قدیم کی کوئی مطلق العنان ملکہ اپنے محل کے کسی منابر پر کھڑے ہو کر اپنی سلطنت کے کسی حصے کا معائنہ کر رہی ہو اور جو کچھ اس نے دیکھا ہو وہ اسے پسند نہ آیا ہو۔

ہمارے آگے چلے ہوئے ملازم نے گو کہ سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن اسے یقیناً اس کی موجودگی کا علم تھا۔ ٹیرس کے عین سامنے پہنچ کر وہ پرانے شاہی غلاموں کی طرح جھکا اور دیر تک جھکای رہا۔ میں اس دوران اس کے پیچھے کھڑا خود کو چند محسوس کر رہا تھا۔ شاید شفیق شاہ کے محسوسات بھی مجھ سے مختلف نہ رہے ہوں۔

عورت کو شاید توقع رہی ہو کہ میں اور شفیق شاہ بھی اس کے احترام میں روک روک کر ہی حالت میں چلے جائیں گے لیکن ہم نے اس قسم کی کوئی زحمت نہیں کی اور سادس کی طرح گردنیں اٹھائے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ ہم سے چند فٹ کی ادنیٰ جالی پر کھڑی تھی۔ دفعتاً اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور وہ اپنی موٹی سی آنکھیں شہادت سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں بولی ”تم یقیناً افضل ہو۔“

یہ سوال نہیں بیان تھا۔ شفیق شاہ کی طرف اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ میں نے بالکی کی خوش خلق مسکراہٹ کے

خصوصیت کے پیچھے اصل میں اس کی ہاں ہے۔ یہ اپنی ہاں کی کھٹکتی ہے اس کے جسم کے پیچھے یہ انگلی بھی نہیں ہلاتا اور اس کا کوئی معاملہ ہاں سے پوشیدہ نہیں۔

”کیا اس کی دانشمندی تک کے معاملات اس کی ہاں کے علم میں ہوں گے؟“ ہم نے قدرے حیرت سے کہا۔

”شاید“ شفیق شاہ کہہ کر اچکا کر جسم لمبے میں بولا۔ مجھے یاد تھا کچھ دیر پہلے مجھ سے فون پر بات کرتے وقت بھی پردائش نے بتایا تھا کہ اس کی والدہ محترمہ نے اسے ممبر کسٹن کی تلقین کی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ پردائش کے ”ختم وادعوہ“ کی وجہ سے بھی واقف تھی۔

میں پردائش کا مکان نہ تو تلاش کر سکا تھا اور نہ ہی کسی سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ شفیق شاہ نے کم از کم باہر سے اس کا گھر دیکھا ہوا تھا۔ میں اس کی دولت مندی کے تذکرے تو سن چکا تھا اس کے باوجود اس کا مکان دیکھ کر مجھے خفیف سی حیرت ہوئی۔ اس عجیبے علاقے میں واقع اس کا مکان کسی قلعے سے کم نہیں تھا۔ اس کی بیرونی ساخت میں آثار بھی قلعے والا ہی پڑا گیا تھا تھا۔ بلند پوٹی دیوار کالی موٹی معلوم ہوتی تھی اور قلعے کے اسٹائل میں ذرا ترچھی تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر میں زرد پتھر اور ماربل استعمال کیا گیا تھا۔ ادنیٰ سیاء آہنی گیٹ اور اس دیوار نے مکان کی اصل عمارت کو تقریباً چھپا کر رکھا تھا۔

میں نے ہارن دیا ٹویٹ میں ایک چوکور شگاف نمودار ہوا۔ مٹی داڑھی منجھول والی ایک جتنا ہی قسم کی شخصیت نے باہر جھانکا پھر گیٹ کا صرف ایک ہٹ کھل گیا اور میں گاڑی اندر لے گیا لیکن میں زیادہ آگے نہیں جاسکتا تھا۔ آگے تین طرفہ آہنی گرل نے راستہ روکا ہوا تھا۔

گاڑی کے دونوں طرف باوردی اور مسلح محافظ آگن کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں ہی دیو زادہ تھے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس نے باہر جھانکا تھا۔ اسی اثنا میں عام سے قد کاٹھ کا ایک شائستہ صورت سا شخص گیٹ ہاؤس سے نکل کر ہماری گاڑی کی طرف آیا۔ وہ ہمیں قسم کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے بڑے خلق لمبے میں انگریزی میں میرا نام پوچھا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی افسر مسانداری قسم کی چیز تھا۔

میں نے نام بتایا تو وہ نہایت عاجزی سے بولا ”سر! آپ کی آمد کی اطلاع ہے۔ میر صاحب آپ کا انتظار فرما رہے ہیں لیکن ایک ذرا سی زحمت آپ کو ضرور کرنا پڑے گی۔ اسے یہ نیزی مت سمجھئے کہ یہ اس گھر کا اصول ہے۔ کوئی ملاقاتی کسی قسم کا ہتھیار لے کر گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے پاس ایسی کوئی چیز ہے تو براہ مہربانی امانتاً مجھے دے دیجئے یا گاڑی میں ہی چھوڑ دیجئے۔“

میں نے اور شفیق شاہ نے کوٹ کے نیچے سے ہمیں نکال کر گاڑی کے ڈرائیو پر روک کر دیں لیکن اس کے لئے کوئی صرف اتنی ہی کافی نہیں تھا۔ اس نے معذرت کے ساتھ ہمیں گاڑی سے اترنے

باجھ ملاشت سے کہا "میں مازام!"

بے حال ہو گیا۔ "وہ مجھ سے بھگت ہو گیا۔"

وہ گینڈا نما شخص میری منزل میں منہ دیکھ کر شول شول کر رہا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسے شول دینا ہے۔ نے اس کی چوڑی چٹکی کمر چھپتے ہوئے ایک ایک کر کے چڑھ کر آئینے پہلے بولے اور اسی دوران میں وہ دم کا بازو دیا۔ وہ ایک طرف عریض اور انسانی جسم کا بیڑہ تھا۔

ہینڈ کی سائڈ پینل پر تین مختلف رنگوں کے ٹیلی فون سیٹ (موبائل فون) اور ایک انٹرکام سیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ بیکٹر القاص کا ایک جدید انٹرکام سیٹ تھا۔ اختتام انٹرکام کی سٹریم ٹکنالوجی اور اس کے پینل پر سرخ لائٹ بھی چلنے بجھنے لگی۔

میں نے کچھ سکون کی سانس لی کیونکہ یہ ٹکنالوجی سن کر مجھ سے الگ ہو گیا اور ٹشو پیپر کے ایک پرے سے گولے سے چرو پونچھے ہوئے سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ انٹرکام کا بیڈ سیٹ کر اس نے چو لکھے کسی کی بات سنی پھر نہایت سعادت مندی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "جیسا آپ کا حکم ماما جانی! آپ کا حکم جی ہاں۔ بہت بہتر۔"

وہ ریپور دینے کے بعد بھی کچھ دیر وہیں کھڑا شول شول کر پھر ہماری طرف مڑے ہوئے بولا "مادرے آپ ابھی تک کہہ کیوں ہیں بیٹے نا۔"

ہم کمر کیوں کے قریب موجود شاندار مسروفل میں دھنسنے والے ہمارے ستا بل آہٹا۔ چند سیکنڈ میں ہی اس کی حالت سنبھل گئی۔ وہ آنسوؤں سے بھیلی اپنی داڑھی کو ٹشو پیر سے مالتا خشک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "ماما کا فون تھا۔ ان تھا کہ مجھے سمانوں کے سامنے دے دھوئے سے پرہیز کرنا تھا اس کے علاوہ انہوں نے حکم دیا ہے کہ سمانوں کی قوا مشعل کرنے اثر اٹھا کر جائے۔"

اس دوران میں نے دیکھا کہ اس کے ہینڈ کی دوسری ٹیبل پر مونا کی بڑی سی فریم شدہ تصویر رکھی گئی۔ وہ ایک کلوز اپ تھا جس میں وہ مجھے سائڈ ہنسی دکھائی دے رہی بلاشبہ وہ ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی جس کی فکر سے بھر پور تھی۔ اس تصویر کو کچھ کرگمان تک نہیں گزرنا اس لڑکی کا اصل کردار کیا تھا اور وہ کن کن خبیث و فراز۔ چکی تھی۔ وہ کالج سے حال ہی میں نکلنے والی کسی ہنسی بھلا خوب صورت اور پُرانگ لڑکی کا فرائش چو تھا۔

اس تصویر نے ایک لمحے کے لئے مجھے الجھایا تھا۔ انداز بتاتا تھا کہ وہ مازانگ کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ میرے اصل میں ایک قضا بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ میں نے اس ایک دور افتادہ "عشرت زہ" اور ہراسر سے مکان میں پسند سے میں نکلے دیکھا تھا۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ وہ پھل اس وقت کیسا نظر آ رہا تھا۔

"آپ کی ماما کو آپ کے دکھ کی وجہ معلوم ہے؟"

اس نے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ ایدہوں کے بل گھومی اور اسے کہنے کے انداز میں قدم اٹھاتی ٹیرس پر پیچھے کیس غائب ہو گئی۔ خاموشی بھی تیزی سے گہم کر مشقی انداز میں اس کے پیچھے چلے گئی تھیں۔ اس کے نظروں سے او بھل ہونے کے چند سیکنڈ بعد تک بھی مجھے کچھ یوں لگا جیسے ٹیرس پر اس کے قدموں کی دھمک گونج رہی ہو۔

مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ صرف میری شکل دیکھنے کے لئے وہاں کھڑی تھی۔ وہ یقیناً معمولی شکل صورت کی ایک غیر معمولی عورت تھی۔ ایک پیر دانش ہی نہیں اور بھی نہ جانے کتنے لوگ اس کے اشاروں پر مارتے ہوں۔ ہم نے گاؤ فادر اور اس سے ملتی جلتی شخصیتوں کے قہرے توڑے تھے قلمیں بھی دیکھی تھیں۔ یہ عورت کچھ "ہاؤڈر" قسم کی چیز معلوم ہوتی تھی۔

ہم اپنے سروں کو صحیح پوزیشن میں لے آئے۔ ہمارے سامنے رکوع کی سی حالت میں گیا ہوا ملازم کچھ اس طرح کمری سانس لے کر سیدھا ہو گیا جیسے اس کی کمر سے چمڑی کوئی ہماری سل بنائی گئی ہو۔ ہم اس کی رہنمائی میں اب مکان کی اصل عمارت میں داخل ہوئے جس کا رابطہ کار فرما یوں جھللا رہا تھا جیسے اس پر تازہ تازہ پالش کی گئی ہو۔ ٹھوس ٹکڑی کے ہماری بھر کم متشدد دروازے نہایت خوب صورت تھے۔

ایک آرامت و پیرات ہال اور راپارڈی سے گزر کر ہم جس کمرے کے دروازے پر رے وہاں ایک اور مسلح محافظ ایک کمرے پر بیت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ ہمیں قریب آتے دیکھ کر وہ مشقی گڈے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا لیکن ملازم نے اشارے سے اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ پیر دانش کے حفاظتی انتظامات گھر کے اندر کمروں کے دروازوں تک پہنچے ہوئے تھے نہ جانے اسے کس سے اتنا خطرہ تھا۔ میرے خیال میں کسی بڑھم کی شخصیت کو اپنی حفاظت کی اتنی فکر تو نہیں ہوتی چاہئے تھی۔

ملازم سرگوشی میں بولا "یہ پیر صاحب کا بیڑہم ہے۔ وہ آپ کے خطہ ہیں۔ آپ اندر جا سکتے ہیں۔ میرا اندر جا کر اطلاع دینا ضروری نہیں ہے۔"

میں نے اعتقاد میرے سے دروازے پر دھک دی۔ وہ گویا کسی نیبی آنکھ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اندر سے اس کی مدد مگر کمر کمرائی سی آواز سنائی دی "آجائیں۔ آجائیں افضل صاحب!"

میں اور شعیب شاہ پہنچے سے ہماری بھر کم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو وہ گنبد نما جالی میں کمرے ہوئے اپنے عظیم الشان بیڈ سے اتر رہا تھا۔ علیہرہن کر وہ دونوں بازو پھیلائے میری طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور چمڑی چمڑی آکھیں ہوئی کی طرح سرخ تھیں۔

"آپ منہ بہ منہ دیکھ دی افضل صاحب۔ میں تو روتے روتے

کی بات کانٹے ہوئے اور تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”جی ہاں“ اس نے اطمینان سے جواب دیا ”ہمارے تو میری  
 شاہی سی کوئی بات چھپی ہو۔ چھپی رہی نہیں سکتی۔ جس طرح ایک  
 شیرخوار بچہ کی ہر بات ماں کے سامنے عیاں ہوتی ہے بالکل اسی  
 طرح میں بھی اپنی ماں کے سامنے بالکل بے پردہ ہوں۔ اپنی ماں کے  
 لئے میں اب بھی ایک شیرخوار بچہ ہوں اور ان کی نظریں میرا ہر  
 کام نظر آتے ہیں۔“

وہ ذرا ہماری طرف کو جھکتے ہوئے زیر مونچھ مسکرایا ”آپ یہ  
 مت سمجھئے گا کہ میں اتنا بڑا ہونے کے بعد اس طرح اپنی ماں کی نظریں  
 میں رکھتی رہی ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ کبھی کبھی میں بڑا  
 بے چین ہوتا ہوں۔ مجھ میں بغاوت کی خواہش ابھرتی ہے۔ میں  
 اپنی ہی چھٹی موٹی آزادانہ حرکتیں کرتا ہوں۔ اپنے سامنے اپنی  
 خود مختاری کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ایسے کاموں میں  
 مجھے پیشہ نقصان یا پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ جس کام میں ماں کی  
 سرپرستی شامل نہ ہو وہ میرے لئے مبارک ہی ثابت نہیں ہوتا۔ ماں  
 جانی کے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔“

پھر وہ گویا بحرِ عقیدت کی گہرائیوں سے باہر آتے ہوئے  
 سر جھٹک کر بولا ”خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ بتائیے میں آپ کی  
 کیا خاطر دلاتی کہوں؟ میرا خیال ہے پہلے ڈرگس کا دور چلنا  
 چاہیے۔ دنیا کی بہترین ڈرگس۔ اور یہی قسم کی بہترین دوا منتر میرے  
 منہ خانے میں موجود ہیں۔ آپ جو حکم کریں گے حاضر ہو جائے گا۔  
 اس کے بعد کھانے کا دور چلے گا۔ میرا خیال ہے آپ میرے ہاں  
 کے باہر کی کوئی سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔ میرے لان کے ایک  
 بہت بڑے درخت پر پائیل کیو کا انتظام ہے۔ چوستان کے تیز کوئٹہ کے  
 بکول کی رائیں، شمشیر کی مہربانیاں، ہمالیہ کے خرگوش۔ جو آپ  
 کہیں دوست کو دالیا جائے؟“ وہ متوقع نظروں سے ہماری طرف  
 دیکھنے لگا۔

میں اور شفیع شاہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس  
 کی آنکھیں بدستور سرخ تھیں لیکن آنسو خشک ہو چکے تھے۔ میں  
 نے ہلکی سی غمی کے ساتھ کہا ”خیر صاحب! ہم دونوں اس قدر  
 اہتمام کے ساتھ کھانے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ ہم تو مزدور قسم  
 کے لوگ ہیں۔ جب اور جیسا میرا کھانا۔ اس وقت تو کچھ  
 کھانے پینے کی خواہش ہی نہیں ہے۔ ہم تو صرف آپ کی دلجوئی  
 کے لئے حاضر ہوئے تھے۔“

”آف کورس! افساری۔“ اس نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ  
 ملے ”بابا! میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ افساری اچھی چیز ہے۔ میں خود  
 اپنے لئے والوں اور عقیدت مندوں کو اس کی تلقین کرتا ہوں لیکن  
 بڑے آدمیوں، کبھی کبھی بڑا آدمی بھی نظر آتا ہے۔ کلف  
 پھر نہیں باری! آپ صرف لے آئے بس میری دلجوئی ہوگئی۔ ماں نے  
 بھی کوئی سی ڈانٹ پلائی ہے۔ اب میں واقعی طور پر اس سلسلے کو  
 بھول گیا ہوں۔“

گویا اوپر کی منزل سے اس کی ماں جانی کا فون بھی بروقت ہی آیا  
 تھا۔ ورنہ وہ نہ جانے کب تک اپنا شیو جیسا سر میری پہن میں  
 گھسیڑے شول شول کرتا رہتا۔ مجھے اس کی حقیقی کے لئے الفاظ  
 تلاش کرنا پڑے۔ جب تک کوئی جذبہ دل سے نہ چھوٹے اس کے  
 لئے الفاظ تلاش کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور اس میں اتنی تاثیر بھی  
 نہیں ہوتی کہ بغیر نظروں کے اس کا اظہار ہو جائے۔

بہت دیر تک اس کا اصرار اور ہمارا اظہار جاری رہا۔ آخر کار  
 ہمیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور تقریباً بہت کھانا پانا رہا لیکن اس طرح  
 نہیں جس طرح وہ چاہ رہا تھا۔ ہم نے ہنسنے کو لڑوا کر دیکھا اور کھانے  
 پینے کی چند ہلکی چھٹکی چیزوں پر اکتفا کیا کیونکہ ہمیں ہشتا کے زیادہ  
 دیر نہیں گزری تھی اور وہ ہر کے کھانے کا ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔  
 کھانے کے دوران بھی ڈانٹنگ ہال میں دو مرتبہ اس کی ”ماں جانی“  
 نے اصرار کام پر دو مرتبہ کال کیا اور کچھ ہدایات دیں۔ وہ واقعی ایک  
 گاڈ گر کی طرح اور پٹیلی اپنی راجہ عالی کو کنٹرول کرتی تھی اور ہل  
 پل کی خبر رکھتی تھی۔

جکے جکے کھانے سے فارغ ہو کر میری فرمائش پر کافی کا دور  
 چلا۔ اس نے ہمیں برازیل کی کافی پلائی۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ ہم اس  
 کی فرمائش پر اس کے ہاں چلے آئے تھے۔ میں اس کا گہرا روبرو  
 سمجھ دوستانہ ماحول میں ”قرب“ سے دیکھتا چاہتا تھا۔ میں اپنے مقصد  
 میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ مجھے بہت سی چیزوں کو دیکھنے کا  
 موقع ملا تھا۔

کافی نوشی کے دوران پیروائس سارنگا کر ایک گہرا غصہ لینے  
 کے بعد نیم دا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے  
 لہجے میں بولا ”میں اس ناروا اور تکلیف دہ تھے کہ وہاں چھپتا تو  
 نہیں چاہتا لیکن کیا کیا جائے بات کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔  
 اخبارات میں تو موٹی لاش ملنے کی خبر نہایت مختصر چھپی ہے۔ آپ  
 کو اس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟“

”نہیں۔ بس یہی معلوم ہو سکا ہے کہ پولیس نے کسی گناہ  
 اطلاع پر لاش برآمد کی ہے۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی نے  
 رسی کے پھندے میں لٹکا دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہیں۔ ہیں۔“ پیروائس ہاتھ اٹھا کر میری بات کانٹے ہوئے  
 بولا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے تھے ”موٹا کے  
 ساتھ جو ظلم ہوا اس کا تذکرہ مت کیجئے میرے دل میں طوفان  
 اٹھنے لگتے ہیں۔ مجھے ذرا سا اشارہ بھی مل جائے کہ یہ کون لوگوں  
 کا کام ہے تو میں انہیں نیست و نابود کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس  
 کے چہرے سے غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا۔

پھر وہ گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا ”آپ کی معلومات تو مجھ  
 سے بھی کم ہیں۔ میں نے پوسٹ آفیس میں رپورٹ معلوم کر لی ہے۔  
 یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ وہ مکان کس کا تھا جس میں موٹی لاش  
 پائی گئی۔“

”کیسے معلوم کر لیا؟“ میں نے پھر اس کی طرف دیکھا۔



سکراتے ہوئے کہا ”جس کی قسمت میں جو کچھ ہوا وہ اسے  
جائے گا۔ یا یوں کہنے کے کسی کے دامن میں اگر واقعی کچھ ہوا  
دوسرے کو دے دے گا۔“

ہم جتنی دیر اس کے پاس بیٹھے رہے مسلسل ملاقاتوں کی  
کی اطلاع آتی رہی۔ ان میں سے بعض لوگوں کے ساتھ تو کام  
کا وقت طے تھا لیکن وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر نہیں گیا۔  
لوگوں کو اس کے سیکرٹری نے اس کی ہدایت پر رخصت کر دیا  
ملاقاتیں اس نے مشغول کر دیں اور بعض کو انتظار کے  
دورانگہ روم میں بٹھوایا۔ یہ سب کامیابیوں اور انتظار کام  
چلتے رہے۔ اس کے علاوہ اس نے تیار کیا شام چار سے کچھ  
تک اس کا ”دربار عام“ بھی لگا تھا۔ اس میں لوگ ملاقات  
وقت طے کے بغیر بھی آ سکتے تھے۔ اس کے بارہوہ وہ تمام مصروف  
مشغول کر کے ہمارے ساتھ بیٹھے رہنے پر مصر تھا لیکن میں  
شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کچھ دیر بعد اجازت طلب کی۔  
مشکل سے اس نے ہمیں جانے کی اجازت دی اور مکان  
اندرون ہی دروازے تک ننگے پاؤں ہمیں چھوڑنے آیا۔

اس کے بعد ایک ملازم ہمیں گیت تک چھوڑنے آیا۔  
گاڑی گیت پر لائی گئی اور بڑے ادب و احترام سے ہمیں روانہ  
کیا گیا۔ ہماری قمیص اسی طرح ڈش بورڈ پر رکھی ہوئی تھی  
ہم نے ان کا کوٹ کے نیچے چھپا لیا۔

راستے میں ہم نے شفیع شاہ سے کہا ”تمہاری کچھ  
آیا کہ آخر اس ملاقات کا مقصد کیا تھا؟“

”میری تو سمجھ میں صرف ایک ہی مقصد آیا ہے۔“  
متذبذب لہجے میں بولا ”وہ ہمیں بالکل صحیح طور پر جانا چاہتا  
”تمہارا خیال درست ہے۔ کم از کم میری رائے کے  
درست ہے۔“ میں نے سہلے ہوئے کہا ”اس سے بھی زیادہ  
سوال یہ ہے کہ وہ ہمیں کیوں بہتر طور پر جانا چاہتا ہے؟“  
”اس کی تو بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں سر۔“ شفیع  
”کسی ایک وجہ کا تئیں کرنا مشکل ہے۔“

”میرا خیال ہے وقت کے ساتھ ساتھ اصل وجہ  
آجائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہمیں ضرورت  
امیت دے رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”پہلیں اس ہمارے اس عجیب و غریب کردار کو قوت  
دیکھنے کا موقع تو ملا۔“ شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا ”میں  
سوشل طبقوں میں یہ بہت بڑا نام ہے۔ اس کے اور اس  
جانی“ کے بڑے تذکرے رہتے ہیں۔ بڑے احترام سے  
لیا جاتا ہے حالانکہ میرا خیال ہے اپنی خدائی میں یہ اول  
بد معاش عورت رہی ہوگی۔“

میں نے لگا سا مقصد لگایا ”تم خدائی کی بات کر رہے  
اب بھی کچھ کہہ بد معاش نہیں تھکی۔“

”افضل صاحب! ہم اتنے بڑے شہر میں اتنا نام کمانے کے بعد  
یہاں بیٹھے جبکہ تو نہیں مار رہے ہیں۔“ وہ گویا میری کم مٹلی پر  
افسردگی سے مسکرایا ”جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں لوگوں  
تک ہماری رسائی ہے وہاں پولیس میں بھی بہت سے لوگ ہمیں  
سلام کرنے والے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید آپ کے مجھ سے  
زنا، ابلے ہوں گے۔ کہ ابھی بڑے آدمی ہیں۔ اور ذرا مختلف  
نے بڑے آدمی ہیں۔“

”میں کمار! بڑا آدمی ہوں پیر صاحب!“ میں نے انکساری  
کہا ”کاہلدار بن چار پیسے لینے سے آدمی تو تھوڑا ہی بن جاتا  
بہ کار آمد طبقوں میں رسائی رکھنا اور بات ہے۔ بعض لوگ  
دولت مند نہ ہونے کے باوجود اس کام میں ماہر ہوتے ہیں۔ میں تو  
پہلے ہی آپ پر واضح کر چکا ہوں کہ میں زیادہ اثر رسوخ والا آدمی  
نہیں ہوں۔“

”بات یہ نہیں ہے افضل صاحب!“ وہ ہمارے دھوکے کے  
عقب سے ہم کو آٹھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”بات یہ  
ہے کہ آپ کو موت کی ذات سے دھکی دو چھی نہیں تھی جیسی ہمیں  
تھی۔ شاید اس لئے آپ نے اس کے بارے میں معلومات کرنے  
میں اتنی بھلت کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی جتنی ہم نے محسوس  
کی۔ آپ نے شاید یہ بھی سوچا ہو کہ آپ تو وہ مرچکی ہے۔ اب اس  
کے بارے میں تک وہود کرنے کا فائدہ بھی کیا؟ لیکن میری دو چھی اس  
کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوئی۔ میں اس وقت تک جہنم سے  
نہیں بیچوں گا جب تک اس کے قاتل یا قاتلوں کو جہنم تک انجام  
سے دو چار نہیں کروں گا۔“

پھر ایک کمری سانس لے کر وہ بولا ”میرے اور آپ کے  
رہنمائی میں فرق کی ایک وجہ تو یہ ہوگی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے  
افضل صاحب! کہ آپ دراصل ہمارے سامنے مکمل نہیں رہے۔  
آپ کی ذات پر کچھ پردے پڑے ہوئے ہیں اور آپ انہیں اٹھانا  
نہیں چاہتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم انتظار کریں گے۔ کبھی نہ کبھی  
تو ہمارے اور آپ کے درمیان پردے اٹھ جائیں گے۔ ہم بڑے  
مہربان والے آدمی ہیں۔ انتظار کرنا جانتے ہیں۔“

میں نے لگا سا مقصد لگایا ”آپ کو آنا ہی اپنا کوئی آپ سے  
دیکھ پیر صاحب! میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں اتنا بڑا آدمی  
نہیں ہوں جتنا آپ مجھے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔  
میں اپنی شخصیت کو پردوں میں چھپانے کا اہل بھی نہیں ہوں۔ کاش  
میں واقعی اتنا ”قابل“ ہو سکوں جتنا آپ نے مجھے تصور کر لیا ہے۔  
میں نے تو آپ کی نہ مت میں حاضر ہونا ہی لئے شروع کیا ہے کہ  
شاید آپ کی قسمت سے فیض پا کر میں ایسی کوئی چیز بن سکوں۔“

وہ گویا اپنے غم کو بھول کر جھڑپ سے ہنسا ”عجب بات ہے!  
ہم دنیا کے لئے جی رہے ہیں لیکن ہم آپ کی شخصیت سے کچھ فیض پانے  
کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”جیسا ہم اپنی اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں۔“ میں نے

کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔

چند لمے گاڑی میں خاموشی رہی۔ میری طرح شاید شفیع شاہ بھی ابھی تک آج کی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے تو ہیرا دانش کو کوئی کام کی بات نہیں بتائی تھی لیکن اس سے بھی مجھے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

اس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ اس نے مونا کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی معلوم کر لی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ جس مکان میں اس کی لاش پائی گئی تھی وہ کس کا تھا؟ لیکن جب بعد میں میں نے کپ شپ کے دوران اس سے اس سلسلے میں سوالات کئے تو دونوں ہی باتیں بے کار محسوس ہوئیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں صرف موت کی وجہ بیان کی گئی تھی۔ وجہ وہی تھی جو ظاہری طور پر نظر آ رہی تھی یعنی گلے میں پھندا ڈالے جانے کی وجہ سے دم گھٹا۔ یہ کوئی انکشاف نہیں تھا۔ اس مکان کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کبھی کچھ منشیات فروشوں کے پھلے درپے کے کارندوں کے قبضے میں تھا جن میں سے کچھ گرفتار اور کچھ مفروز تھے۔ آج کل وہ لاوارث رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ مونا وہاں کس طرح پہنچی تھی؟ یہ بھی کوئی کام کی بات نہیں تھی۔ اگر پولیس کی تحقیقات کا اب تک صرف یہی نتیجہ نکلا تھا تو مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو محسوس کرتا تھا

اور زیادہ اندر کی اطلاعات کی تلاش میں رہتا تھا۔

اچانک شفیع شاہ کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ ذرا چونک کر بولا "سرا ہم اور احرار کوھر کے چکروں میں کچھ زیادہ ہی الجھ گئے ہیں۔ کاروبار کے بارے میں بات کرنا یاد ہی نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے انگلینڈ سے مسٹر جن ڈی برائن آ رہے ہیں؟"

"ہاں۔ مجھے کل لندن سے ان کی سیکرٹری کا فون آیا تھا۔" مجھے یاد آیا۔ مسٹر جن ڈی برائن انگلینڈ میں ہمارے ایک سپورٹ کے بال کے ایک بڑے خریدار تھے۔ وہ لیدر گارمنٹس کا کاروبار کرنے والی ایک بڑی کمپنی کے مندر تھے۔ وہ خاص طور پر ہم سے کچھ نئے معاملات ملے کرنے کے لئے آ رہے تھے۔

شفیع شاہ بولا "سرا یہ بھی اچھا ہے کہ آپ اتفاق سے کراچی میں ہی موجود ہیں۔ مسٹر برائن بھی اپنی کمپنی کے سربراہ ہیں۔ پروٹوکول کا تقاضا ہے کہ آج شام آپ انہیں لینے انزپورٹ چلیں۔ وہ دو تین روزہ یہاں ٹھہریں گے۔ انہیں کچھ اور لوگوں سے بھی ملاقاتیں کرنی ہیں۔ پھر ہم انہیں لاہور روانہ کر دیں گے۔ ہم سے ان کے اصل معاملات لاہور میں ہی ملے پائے ہیں۔ وہاں راجیلہ ٹوٹی اور ہمارے ایک سپورٹ شیجران سے بات چیت کر لیں گے۔ یہاں صرف آپ تھوڑی دیر کے لئے ان کی میزبانی کر لیں۔ گورا خوش ہو جائے گا۔ ہمارا اہم ہمارے ہے۔"

امبر نے آج صبح اس کا گلیس بھی میرے سامنے اہم کاغذات کی فائل میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک لمے سوچنے کے بعد گری

اد شفیع شاہ ہنڈی سانس لے کر بولا "۳ نکلات ہیں فنانس ٹیکنالوجی ہاؤس نے ان دیکھتے ہی دیکھتے کیسے کیسے لوگ معزز و محترم ہو جاتے ہیں۔ لوگ کس طرح ان پر عقیدوں کے پھول۔ بلکہ جانیں تک بچاؤ کر کے لگتے ہیں۔ میں نے سنا ہے ہیرا دانش کسی فنانس میں باقاعدہ شعبے باز تھا۔ اسی قسم کا شعبہ بے باک جو نوکری میں سے کیڑا اور کان کے پیچھے سے ہانی وغیرہ نکال کر دکھاتے ہیں۔ نہ جانے کب اور کیسے اسے اپنی شعبے بازی کی صلاحیتوں کو چھپی نظیر میں استعمال کرنے کا خیال آیا اور وہ ڈرامی پردہ کار کسی مشافاتی ملائے میں بیٹھ گیا۔ تجربہ کا سیلاب رہا۔ اس نے اپنے شعبوں سے لوگوں کو جرات کرنا شروع کر دیا۔ لوگ انہیں اس کی روحانی طاقت کا کمال سمجھتے تھے۔ ہمارے ہاں اچھے بھلے پڑے لکھے لوگ بہت چھوٹے ذہن کے مالک اور ضعیف الا عقائد ہوتے ہیں۔ شاید کسی کو بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ اسی قسم کے شعبے وہ ملیں ٹیلیں میں یا کئی کچھوں میں دیکھتے تھے۔ جب کوئی شخص ایک خاص روپ دھار کر ایک مخصوص ماحول تخلیق کر کے وہی شعبہ دکھاتا ہے تو وہ "روحانی طاقت کے کرشمے" بن جاتے ہیں۔"

"پھر بھی، ہیرا دانش جتنی ترقی کم ہی لوگ کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آوی یقیناً بہت تیز تھا۔ ایک بار سرا ہاتھ آجائے کے بعد اس نے بہت تیزی سے زور لینا شروع کر دی اور دولت سے دولت کمانے کے معاملے میں بھی یہ بہت شاطر رہا۔ اس نے ہر کام میں ٹانگ اڑائی ہوئی ہے۔ جائز اور ناجائز نہ جانے کیا کیا دھندے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے اثر و رسوخ بڑھانے پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اوپر سے وہ گاؤں دار۔ اس کی ماما جانی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ میں نے اس کے بڑے قہرے سنے تھے۔ دیکھئے کا اتفاق آج ہوا ہے۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"میرے مجھے امید تو یہی تھی کہ اس شخص کا یہی منظر کچھ اسی قسم کا ہوگا۔" میں نے کہا "لیکن اس شخص کا ہماری طرف اتنی محبت سے توجہ ہونا مجھے کچھ غالی از غلط نہیں لگ رہا۔" "کوئی بات نہیں سرا۔" شفیع شاہ گاڑی زرا توجہ کرتے ہوئے ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکرایا "جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہمیں ۳۳ عقائد کو اور دیکھو" کی پالیسی اپنانا ہوگی۔ اس کا مقصد سامنے آ ہی جائے گا۔"

"ہاں۔ فی الحال تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" میں نے ہنڈی سانس لے کر کہا "ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ اس کی گھرائی شروع کرانی جائے۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔"

"کام کی باتیں تو اس کا کوئی اندر کا آدمی ہی جاسکتا ہے۔" شفیع شاہ بولا۔

"مندر کے کسی آدمی کا بھی پتا چلانے اور اس پر ہاتھ ڈالنے کی

بارے میں جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس سے خدا  
تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اس کا قطعہ لیا مگر بھی تمہاری  
بلذائقہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔

میں نے جو سنی اسے پیر دانش کے بارے میں بتا دیا  
چونکہ کریمہ بات کانٹے ہوئے بولا "اچھا۔ اچھا تم اس  
کر رہے ہو۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اسے میں قاتلانہ طر  
ہوں۔ وہ کار بائیجھے کھانے پر مدعو کر چکا ہے۔ حتیٰ کہ ایک  
نہایت خوب صورت لڑکی جو اپنے آپ کو اس کی نیکہ نظر  
تھی اس کا پیغام لے کر آئی تھی۔"  
"تم پر بھی نہیں گئے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔  
"نہیں۔"

"آؤ کریم کل اچھے تمہارا انجام اچھا نظر نہیں آتا  
لے کراہ کر کہا "قدر ناشای تم میں کوئی کوئی کریمہ کی  
دل چاہ رہا ہے جس سے بہت بہت کر تمہارے اندر سے  
ناشای نکال دوں۔ بدوق زبان! حسین قاصد اس لئے  
بیجے جاتے کہ انسان دعوت قبول نہ کرے۔"

"میں فوراً ہی اس کی طرف سے شکوک و شبہات  
ہو گیا تھا۔ ایسے لوگوں کی طرف سے ذرا غلطی رہنا چاہئے  
طرح بطور خاص اپنے علاقے کے پولیس آفیسر سے تو  
برصائے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر میں دوسری مصروفیات  
جانے کی وجہ سے اس کی طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔  
نے بھی گوارا نہ دینے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔  
اس کے بعد بھی اس کا کوئی پیغام نہیں ملا۔ پھر مجھے یہ یگانہ  
اس کے توجہ سے کہیں اور بھی ملے۔ پر تعلقات ہیں۔ اس  
جائے کیا سوچ کر کچھ "معمولی" انٹیکلر پر نظر کر کے کار  
تھا۔"

"بہر حال اس میں شک نہیں کہ تم بہت ہی ناخوش  
باقدر انسان ہو۔ مجھے تو ابھی تک تمہاری اس بے ہودگی  
نہیں آ رہا کہ "حسین لڑکی پیغام لے کر آئی اور تم پھر بھی  
گئے۔ چہ۔۔۔" میں نے غصہ سے سانس لی "میں  
نے صحیح چیز لایا۔ پر بیچ دی۔ مجھے بھی قدر شناس کے پاس  
میں سر کے بل جاتا۔ ہم تو کھن فون پر اس فزوز کے بچے کے  
بارے پر دوڑے دوڑے چلے گئے تھے۔"

"اچھا اب اپنے آپ کو ذرا دل پیچک ثابت کر  
کوشش نہ کرو اور یہ تباہ کر تم اس کے پاس کیا لینے چلے  
تھے؟" کریم کل نے پوچھا۔  
"کاش کچھ لینے گئے ہوتے۔" میں نے ایک اور غلطی  
لے کر کہا "ہم تو صرف اس کی کچھ بے ہودہ کراس۔ کچھ  
بھولے۔ کچھ شوشن سننے گئے تھے۔ وہ سن کر آ گئے۔"  
"پھر بھی اس ملاقات کا کچھ پس منظر تو ہو گا؟" کریم کل

سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے شفیع فیہ راقم کہتے ہو تو میں گورے کو  
خوش کرنے کے لئے تمہارے ساتھ از پورٹ پٹ چلوں گا۔"  
شفیع شاہ نے تباہ کیا کہ ملاقات رات کو آٹھ بجے پہنچی تھی۔ سسر  
برائے کو ہمارے ہوٹل میں ہی ٹھہرا تھا۔ شفیع شاہ نے اپنے طور پر  
پلے ہی پروگرام بنایا ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی داخل کرے گا۔  
مجھے آفس چھوڑ کر شفیع شاہ رخصت ہو گیا۔ میں نے کریم کل  
سے رابطہ کیا اور اس سے معلومات کہیں کہ موتا کے قتل کے سلسلے  
میں کیا پیش رفت ہوئی تھی۔ اس کا "تخلیق پولیس" والوں سے رابطہ  
تھا۔ اس نے مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور جانے واردات کے  
بارے میں وہی کچھ بتایا جو پیر دانش بتا چکا تھا۔

"یہ تو کوئی خاص باتیں نہیں ہیں۔ یہ تو لوگوں کو بھی معلوم  
ہو چکی ہیں۔" میں نے اپنے لیے سے قدرے مایوسی کا اظہار کیا۔  
"لوگوں کو کس؟" وہ چونکا "کن لوگوں کو؟"

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے  
سے کہا "پولیس کی بھلا کون سی بات راز نہ سکتی ہے؟ صرف  
پولیس کے رازوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ باقی تو سب کو پولیس کی ہر  
بات معلوم ہوتی ہے۔ جانے نہ جانے کھلی نہ جا۔" "باب" تو سارا  
جانے ہے۔"

"کبھی کبھی تو تم مجھے کسی فنکاروں کے شاعر کی بدمدح معلوم  
ہونے لگتے ہو۔" کریم کل جل کر بولا "تمہاری اطلاع کے لئے  
عرض ہے کہ یہ کوئی ایسی خاص راز کی باتیں نہیں ہیں جنہیں چھپا کر  
رکھنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر یہ کسی کو معلوم ہو چکی تھی تو اس  
میں کوئی ایسا حیرت کی بات نہیں ہے لیکن تمہارے دل کی تسلی کے  
لئے میں پوچھتا چاہوں گا کہ یہ کسے معلوم ہو گئی ہیں؟"

"پیر دانش کو" میں نے جواب دیا۔  
"پیر دانش؟ وہ کون ہے؟" کریم کل نے پوچھا۔  
"اس سادگی پر کون نہ مر جائے؟ خدا!" میں نے پھر ایک  
مصروع داغ دیا "تم اتنے پیر دانش اور مغز پولیس آفیسر ہوتے ہوئے پیر  
دانش کو نہیں جانتے؟ وہ تو دیتا بھی تمہارے علاقے میں ہے۔"  
"میرے علاقے میں تو کی لاکھ افراد رہتے ہیں۔ میں ان سب  
سے تو واقف نہیں ہو سکتا جبکہ مجھے یہاں آئے بھی زیادہ عرصہ نہیں  
گزرا۔" اس نے جواب دیا۔

"بے شک تمہارے علاقے میں لاکھوں افراد رہتے ہیں لیکن  
پیر دانش لاکھوں میں ایک ہے پیارے! میرا تو خیال تھا کہ تم اس  
کے دربار میں حاضری دے چکے ہو گے۔ وہ تو شکر کی بڑی مشور اور  
صاحب کرامت" کیفیت ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا جیس اب تک پانچس چلا کر میں درباروں میں حاضری  
دینے والا پولیس آفیسر نہیں ہوں؟" وہ ذرا غصے سے بولا۔  
"پتا تو چل گیا ہے لیکن تین اب تک نہیں آتا۔" میں نے  
غصہ سے سانس لے کر کہا "بہر حال میں جیس اب تک اس عظیم ہستی کے

اب اس معاملے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔  
 ابھی منظر غماسا لیا چڑا ہے۔ یہ ایک دردناک اور افسوس  
 ناک کہانی ہے۔ میں نے جواب دیا "کسی وقت فرصت میں بیٹھ کر  
 سنائی گا۔"

"اور اس حیران کن کو مونا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ وغیرہ سے  
 کیوں دلچسپی ہو گئی؟" رحیم گل نے جانتا تھا۔  
 "میں کا تعلق بھی اسی لیے چڑے اور افسوس ناک پس منظر  
 سے ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے اس پس منظر سے آگاہ رکھنے کی کوشش کرنا۔" اس نے  
 کہا مجھے خبردار کیا "شاید یہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ خودی خدا کی  
 فوجہ رہنے کی کوشش مت کرنا۔"

اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے درحقیقت اسے خبردار رکھنے کے  
 لیے ہی یہ ذکر چھیلا تھا۔ میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا "تمہیں  
 اطلاع دینے بغیر بھلا میں کب کوئی قدم اٹھاتا ہوں؟" اچھا اپنے کزور  
 اور نٹھے سے ذہن پر زور دے کر یہ بتاؤ کہ مونا کے قتل کے سلسلے  
 میں کوئی اور بات مت معلوم نہیں ہوں؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "پولیس کی تفتیش کے  
 دوران یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اس مکان میں اکیلی نہیں رہ رہی  
 تھی۔ کوئی مرد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس مکان کی خفیہ نگرانی کی  
 جاری ہے لیکن ابھی تک کوئی مرد لوٹ کر اس کی طرف نہیں آیا۔  
 وہ جو کوئی بھی تھا، میں مکن ہے وہی مونا کا قاتل رہا ہو لیکن اس کا  
 کوئی واضح سراغ نہیں مل رہا۔"

"اواہ! میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ حیران کن کو کم از کم یہ بات  
 معلوم نہیں ہو سکتی تھی اور اگر معلوم ہوئی تھی تو اس نے شاید کسی  
 مصلحت کے تحت مجھے نہیں بتائی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا  
 کر کے فون بند کر دیا۔"

اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ جب مونا نے مجھے فون کیا تھا،  
 کاش میں نے اس سے پوچھ لیا ہو تاکہ جس مکان کا ایڈریس وہ مجھے  
 دے رہی تھی وہ کس کا تھا۔ یا وہ وہاں کس کے ساتھ رہ رہی تھی؟  
 لیکن شاید ایک تو ایک اور قطعی غیر متوقع طور پر اس کا فون آنے  
 سے میں ابھی بے پروا نہ ہو گیا تھا۔ دوسرے مجھے اس سے کچھ پوچھنے  
 سے زیادہ اس سے ملنا ضروری محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے فون کو  
 میں نے ملاقات تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔ وہ دیر بے بھی پبلک فون  
 سے بول رہی تھی اور سخت خوف زدہ تھی۔ جتنی باتیں اس نے کہی  
 تھیں وہی کافی تھیں۔ گفتگو کو مزید طویل نہیں دیا جاسکتا تھا۔

میں نے اس معاملے میں مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا کہ شاید  
 پولیس کی تفتیش سے کوئی ایسی کام کی بات معلوم ہو جائے جس کی  
 بنیاد پر ہم خود آگے کچھ کر سکیں۔ فی الحال کوئی اور نکتہ ایسا نظر نہیں  
 آتا تھا جس کے سارے ہم آگے بڑھ سکتے۔  
 رات کو ہم مسٹر جون ڈی برائن کو لینے ان پورٹ چل دیے۔

ہم دو گاڑیوں میں روانہ ہوئے تھے۔ ایک گاڑی میں صرف میں اور  
 شفیع شاہ تھے۔ دوسری گاڑی میں ہمارا جنرل فیروز اور دو مسلح گارڈ  
 تھے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ مسٹر برائن کے ساتھ ان کی بیٹی بھی  
 آ رہی تھی۔ اس پر مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں تو  
 اب غیر ملکی مزد بھی آتے ہوئے گھبرانے لگے تھے جبکہ مسٹر برائن  
 اپنے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی لا رہے تھے میری مراد صرف شریف اور  
 معزز غیر ملکیوں سے ہے جو کراچی آتے ہوئے گھبرانے لگے تھے ورنہ  
 غیر قانونی تارکین وطن اور سازشی قسم کے غیر ملکیوں کا تو اتنا بندھا  
 ہوا تھا۔

میں نے مسٹر برائن کی قتل کے لئے دو گارڈز ساتھ لے  
 لئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ مسٹر برائن اور ان کی بیٹی میری گاڑی میں  
 میرے اور شفیع شاہ کے ساتھ بیٹھ جائیں گے جبکہ جنرل فیروز دونوں  
 گارڈز کے ساتھ ہماری گاڑی کے بالکل قریب رہتے ہوئے پیچھے  
 بیچھے آئیں گے۔

مسٹر برائن برٹش انڈیائی پرواز سے آرہے تھے۔ ہم میں سے  
 کوئی بھی انہیں نہیں پہچانتا تھا اس لئے انہیں جتنے کرنے کی غرض  
 سے ہمارا ایک گارڈ ہاتھ میں ان کے نام کا بورڈ لے کر آتا تھا۔  
 فلائٹ وقت پر آگئی اور مسٹر برائن کو کسم وغیرہ میں بھی کوئی دیر  
 نہیں لگی۔ ان کے اپنے فزڈ کسٹر کے علاوہ اس میں میرے  
 اثر سونگ کو بھی قہر ڈالت دھل تھا۔

ارائیل ڈلائو میں مسافروں کے جھوم کے درمیان جب ایک  
 بڑی عمر کا سفید فام اور ایک نوجوان لڑکی اوجھر اوجھر دیکھنے کے بعد  
 ہمارے گارڈ کے ہاتھ میں بورڈ کو غور سے دیکھ کر اسی طرف بڑھے تو  
 ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ برائن اور اس کی بیٹی تھیں۔

دونوں باپ بیٹی میرے تصور سے کافی مختلف تھے۔ برائن  
 چلی داڑھی والا ایک مختصر الوجود سا شخص تھا۔ اس کی ناک پر  
 مونے مونے گول شیشوں کی عینک لگی ہوئی تھی۔ سر پر بھگے دار  
 اولی ٹوپی تھی۔ لباس کی طرف سے وہ سخت بے پروا معلوم ہوتا تھا  
 حالانکہ اس کے کاڈ بار کا ایک شعبہ لمبوسات کا بھی تھا۔ شاید اسی  
 لئے چرائے تھے انداز تھا۔

وہ نفسی، پروفیسر اسرار معلوم ہوتا تھا۔ بزنس میں ہرگز  
 دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی بیٹی سرد کامت، نازک اندام اور خوب  
 صورت تھی مگر اس کی عمر اٹھارہ بیس سال سے زیادہ نہیں تھی جبکہ  
 برائن کم از کم پینتیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اس عمر میں مغرب کے لوگ  
 عام طور پر بزنس سے بھی ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ وہاں ریٹائر ہونے کا  
 تصور صرف سرکاری نوکریوں سے ہی وابستہ نہیں۔ برائن کی بیٹی تو  
 اس کی تقریباً آخری اولاد تھی اور اگر اگلی ہی توفیقہ کافی تاخیر  
 سے پیدا ہوئی تھی۔

دونوں باپ بیٹی بہت گرجوٹی اور غلوں سے ہم سے ملے۔  
 تعارف اور مصافحوں وغیرہ میں کافی دیر لگ گئی۔ برائن کی بیٹی کا نام

میں تھی۔ ایک عرصے سے اس کی کہنی سے کوئی برقی بجلی  
تھا۔ کوئی خط، کوئی فون بھی نہیں آیا تھا۔ شاید عمر بھر کے  
سلطے میں مایوس ہونے کے بعد کاروباری تعلق بھی دھیرے  
دور توڑ گیا تھا۔ مجھے بھی زندگی کے ہنگاموں نے اس سے رام  
کی ملت نہیں دی تھی۔

مسٹر برائن اس سے پہلے بھی دو مرتبہ پاکستان آچکے  
کچھ دوسری کمپنیوں سے بھی ان کا برنس رہا تھا۔ ہمارے  
خریدار اپنے انہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پاکستان کے  
کاروبار کرنے کے معاملے میں ان کے تجربات کچھ زیادہ  
نہیں تھے۔ میں نے دھیرے دھیرے انہیں یقین دلانے کی کوشش  
کی کہ ہمیں وہ دوسروں سے مختلف پائیں گے۔ میں کاروبار  
لیجی چوڑی باتوں کے بجائے مل کا قائل تھا اس لئے میں  
کچھ نہیں کہا اور ہم خاموشی سے ماربل کی میز چھوٹوں سے  
لگے۔

ارائیل لاونج کے دوسری طرف ڈیپارچ لاونج تھا۔  
میڈیوں پر بھی بہت سے لوگ چڑھتے اترتے دکھائی دیتے  
تھے۔ کچھ خود مسافر تھے اور کچھ مسافروں کو الوداع کہنے  
انہی کے درمیان میں نے ایک سروقامت لڑکی کو غایت  
انداز میں میڈیاں اترتے دکھا۔

اس کی طرف میری توجہ مبذول ہونے کی وجہ شاید یہ  
کہ اس کے دائیں بائیں دونوں طرف دو سب اور باوردی  
چل رہے تھے حالانکہ ان دنوں شہر میں مسلح کاروبار بدیہہ  
گارڈز نظر آتا کوئی قابل توجہ بات نہیں رہی تھی۔ قدم قدم  
دکانوں، دفینوں کے سامنے، گارڈز میں، افراد کے آگے  
گارڈز ہی گارڈز نظر آتے تھے۔ درجنوں پرائیویٹ سیکرٹ  
کھل چکی تھیں اور آثار کچھ ایسے لگتے تھے کہ کچھ عرصے بعد  
عام شہری کم ہوں گے اور گارڈز زیادہ۔

اس کے باوجود خواتین کے ساتھ گارڈز ذرا کم ہی دیکھ  
آتے تھے۔ شاید اس لئے میری توجہ اس لڑکی کی طرف چلی  
لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ لڑکی ویسے بھی قابل توجہ  
عنائی رنگ کے ایک میکسی ٹائٹس لبادے میں تھی جس نے  
تقریباً گردن سے نچنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے  
خند و خال کی حشر خیزی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر قدم پر گلیا  
قیامت ڈھاتی چلی رہی تھی۔

ریٹیم کی طرح چلتے بالوں کا خوب صورتی سے جوڑا ہوا  
وہ چند زیورات بھی پہنے ہوئے تھی جو دور ہی سے جس  
جھللاتے دکھائی دے رہے تھے اس سے اندازہ کرنا مشکل  
کہ وہ ڈائمنڈز کے تھے۔ یہ بھی قدرے حیرت کی بات تھی کہ  
میں تو عورتوں نے تقریبات میں ڈائمنڈز کے زیورات پہنے  
دے تھے۔ وہ پبلک مقام پر پہنے پھر رہی تھی۔ شاید اسے

سلویا تھا۔ سلویا برائن کو جب معلوم ہوا کہ میں ایک بڑے گروپ  
آف کمپنیز کا مالک تھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے خاصی پھیل  
گئیں۔

اس نے بتایا "میں اپنے باپا کے دفتر میں ان کی سیکرٹری کے  
طور پر کام کرتی ہوں۔ آپ کی کہنی سے زیادہ تر خط و کتابت میں ہی  
کرتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کم از کم میرے پاپائی کی عمر کے  
ہوں گے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا  
جس پر باپ بٹی خوش رہی۔

"دراصل میں اب ڈیڑھ سال بعد اپنی ریٹائرمنٹ کی منصوبہ  
بندی کر رہا ہوں۔" انہں نے بتایا "سلویا میری انکوٹی اولاد ہے۔  
میں اسے برنس سکھا رہا ہوں۔ اسی لئے یہ میرے آفس میں بھی کام  
کر رہی ہے اور میں اکثر دونوں پر بھی اسے ساتھ لے کر چلنے لگا  
ہوں۔ اسے برنس سے دلچسپی بھی ہے۔ یہ اتنی کم عمر اور نوجوان  
ہونے کے باوجود لڑکوں کے ساتھ کھیلوں میں اپنے اچھلنے کودنے اور  
شیش پینے یا کوک سونگھنے میں اپنی زندگی بھر نہیں کر رہی۔"  
"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" میں نے سلویا سے کہا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" سلویا بولی "شاید میں  
اس مختصر قیام کے دوران آپ سے بھی کچھ سیکھ سکوں۔" اس کے  
الفاظ رسمی ضرور تھے مگر لہجہ رسمی نہیں تھا۔ وہ گہری نظر سے میرا  
سر آپا جائزہ لے رہی تھی۔

ان کا سامنا تھا تھا۔ ہم میڈیوں کی طرف بڑھے تو سلویا  
نے پوچھا "آپ کو بھی کیا اپنی برنس اپنا زور لٹے میں ملی تھی جس  
طرح مجھے ملے گی؟"

"ورٹھ میں؟" میں تقریباً کراہ اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں  
نے خوش رہی سے مسکراتے کی کوشش کی "ورٹھ میں تو مجھے فلسفی  
فانے اور دھکے ملے تھے۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" وہ بولی۔  
"کبھی کبھی مجھے بھی نہیں آتا۔" میں نے بدستور مسکراتے  
ہوئے کہا "لیکن ایک چیز ہوئی ہے قسمت! ہم ایشیائی اس پر بہت  
یقین رکھتے ہیں۔"

وہ گردن کو خفیف سا جھکا دے کر رہ گئی۔ اسے دیکھ کر مجھے  
جوڑی خوشی آگئی تھی۔ وہ بھی لندن کی ایک خاص بڑی کہنی کی  
مالک تھی۔ اسے بھی کاروبار ورٹھ میں ملا تھا لیکن جب اس سے  
میری پہلی ملاقات ہوئی تو اسے کہنی کی مالک بننے کی سہا مگر رہے  
تھے۔ وہ سلویا کے مقابلے میں خاصی بڑی عمر کی ایک جھانڈی لڑکی  
تھی۔

اس کے ساتھ میرا بہت اچھا وقت گزرا تھا اور اس کی بڑی  
خواہش تھی کہ وہ دوستی زندگی بھر کی رفاقت میں بدل پاتی لیکن میں  
اس کی بہت نہیں کر سکا تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں تھی، کس حال

میں نے جرحمیری کے لئے اس جھگڑے سے شہلے کی کوشش کی جو اس لڑکی کو پہچان کر مجھے لگا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی زمین میں سخت ٹھکڑا شروع ہو گئی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔ میں اس وقت عجیب ہی صورت حال میں پھنسا ہوا تھا۔ اگر میں اپنے فیرنگی مسالوں کو چھوڑ کر بھاگتا تو وہ میرے بارے میں... بلکہ پورے پاکستانی معاشرے کے بارے میں ہی نہ جانے کیا سوچتے۔

شاید ان باپ بیٹی نے محسوس بھی کر لیا تھا کہ میں اس لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ سلوائے تو اس میں اپنی توجہ بھی محسوس کی ہو کہ میں اس جیسی خوشخیز اور سفید فام لڑکی کی موجودگی میں کسی اور طرف متوجہ تھا لیکن اس کی وجہ ان کے دہم گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

شفیع شاہ نے میرے اضطراب کو محسوس کر لیا تھا لیکن وہ اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس نے بھی لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک لمحے کے لئے ڈرے کے آثار ابھرنے تھے تاہم بظاہر وہ بھی میری ہی طرح ہنس مکھ نظر آ رہا تھا۔

مونا اور ایک دوسری لڑکی کی بے ہودہ فلم ہم دونوں نے اسٹھے بیٹھ کر دیکھی تھی۔ وہی دوسری لڑکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی لیکن اس کی شان و شوکت اس کا پرتوخت انداز نہیں ابھرنے میں جھلا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس قسم کے کام کرنے والی لڑکی کی یہ شان و شوکت تو نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس نے اس فلم میں خواہ مجبوراً کام کیا تھا اپنی خوشی سے... دونوں ہی صورتوں میں اس کا یہ دکھ رکھاؤ ہمارے لئے حیران کن تھا۔ فلم دیکھ کر نہ جانے کیوں ہمارے ذہن میں یہ امکان نہیں ابھرا تھا کہ وہ اس طبقے کی لڑکی بھی ہو سکتی تھی جس طبقے کی اس وقت نظر آرہی تھی۔

وہ فلم میری نظریں ایک چپ قلم کی چیز تھی اور اسی اعتبار سے مجھے وہ لڑکی بھی چپ دکھائی دی تھی مگر اس وقت تو اس کا روپ اس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کی اصل شخصیت باہر سے نہیں ہوتی ہے لیکن فلم میں وہ پُرکشش دکھائی دیتے ہیں۔ اس لڑکی کا معاملہ الٹ تھا۔ فلم میں وہ اپنی ماتر شہر خیز رکوتوں اور جلوہ نمائی کے باوجود ایسی سادہ رنگ و دکھائی نہیں دی تھی جیسی اس وقت معززانہ لباس میں... بیش قیمت زوہرات میں... اور اپنے پرتوخت انداز کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں گویا کسی طلسمی ہاتھ نے ایک نئی آب و تاب بھر دی تھی۔ بے شک دولت کی بھی اپنی ایک آب و تاب ہوتی ہے لیکن شخصیت میں بھی کوئی بات ضرور ہونی چاہئے ورنہ بعض اوقات دولت بھی کچھ نہیں کر پاتی۔

ہم لوگ پارک لائٹ میں جا پہنچے تھے جہاں بہت سی کاریں موجود تھیں۔ وہ لڑکی گاؤڑ کے ساتھ سرخ رنگ کی ایک شاندار چمچ کر رہی تھی بیش قیمت مرہینہ کے پاس بیٹھ کر رک بچھ رہی تھی۔ اس

گاؤڑ پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا یا پھر شاید وہ شہر کے حالات سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اس کے ساتھ گاؤڑ کی موجودگی تو یہی ظاہر کرتی تھی کہ اسے شہر کے حالات سے ناواقف تھی۔

وہ فیرنگی بھی ہو سکتی تھی۔ شاید کسی ایسے ایشیائی ملک کی باشندہ ہو جس کے باشندوں کی رنگت میں سفید فاموں جیسا گورا پن بھی ہو آئے اور ایشیائیوں والی حالت بھی۔ جس کی وجہ سے وہ سفید فاموں سے زیادہ پُرکشش لگتے ہیں۔ تاہم وہ پاکستانی بھی ہو سکتی تھی۔

وہ ڈیپارٹ لائونج سے واپس آرہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی سالان نہیں تھا۔ امکان یہی تھا کہ وہ کسی کو ہی آف کر کے آرہی تھی۔ ہم پرائیویٹ پارک لائٹ کی طرف جا رہے تھے اور اسے بھی ٹالیا اور حری جانا تھا اس لئے اس کا اور اس کے گاؤڑ کا رخ ہماری ہی طرف ہو گیا تھا۔

میں گردن موڑ موڑ کر توجہی نظریں غیر محسوس انداز میں اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اس کے چہرے میرے اور شخصیت میں شناسائی کی کچھ جھلک محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا 'افضل پیارے! حسن سے تو تمہارا طلب کا رشتہ پرانا ہے شاید اس لئے تمہیں ہر حسین صورت شناسائی لگتی ہے؟'

اس دوران وہ لوگ ذرا قریب آ گئے۔ ان کے راستے میں ایک جگہ دائرے میں اونچے کھجوروں پر تیز تاریکی سی روشنی دینے والی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے نیچے سے گزرتے تو تیز روشنی ان کے چہروں پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کچھ اداکار اپنا شٹ دینے کے لئے تیز روشنی میں کمرے کے سامنے آئے ہوں۔

گاؤڑ کے چہروں سے تو ظاہر ہے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف لڑکی کی طرف متوجہ تھا اور اس ایک لمحے میں اس کا ہر شخص اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ غمازاں ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے کسی نے بجلی کا ٹکڑا میرے جسم سے مس کر دیا تھا جس میں کئی ہزار دولت بجلی دوڑ رہی تھی۔

یہ احساس تو صرف ایک لمحے کا تھا لیکن اس کے بعد بھی میرے اعصاب میں جھنجھٹا ہٹ جاری رہی۔ میں گویا بالکل بھول گیا کہ میں کسی کے ساتھ تھا لیکن جا رہا تھا اور میری آمد کا مقصد کیا تھا۔ ایک آندھی سی تھی جو ساری سوچیں اڑا کر لے گئی تھی۔

لڑکی اور اس کے دونوں گاؤڑ اب کچھ اور قریب آ گئے تھے۔ وہ ٹھکڑے کی دوسری دوش پر ہمارے تقریباً متوازی چلنے لگے تھے۔ لڑکی اسی طرح ایک شان بے نیازی اور نخوت سے سر اٹھائے گاؤڑ کے درمیان چل رہی تھی۔ وہ تینوں بھی یقیناً پارک لائٹ کی طرف جا رہے تھے۔

گاڑی کے ٹیشے جگے رہ گئے تھے تاہم اتنا اندازہ ہوا تھا کہ گاڑی میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ ایک گاڑی چالی سے اٹکا دواڑہ کھولنے لگا تھا۔

ہم بھی اپنی گاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں گردن ذرا موڑ کر اس لڑکی کی طرف دیکھنے پر مجبور تھا۔ میرے خیال میں یہ فیصلے کا لمحہ تھا اگر میں گاڑی میں بیٹھ کر اپنے معزز مسافروں کے ساتھ چل دیتا تو ہمیں ممکن تھا کہ باقی تمام زندگی کے دوران کبھی مجھے اس کی جھلک بھی نظر نہ آتی۔ بہت بڑے اور بے ہنگم طریقے سے پھیلے ہوئے شہر کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی اچانک اور اتفاقاً کسی کوئی ایسی ہستی کھرا جاتی ہے جس کے بارے میں آپ نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ وہ سربراہ مل جائے گی اور کبھی تلاشی بیزار کے باوجود انسانوں کے اس جنگل یا جھوسوں کے اس سمندر میں آپ کا مطلوبہ انسان نہیں ملتا۔

یہ شخص میری خوش قسمتی تھی کہ وہ زندہ سلامت پہنچا پھر تا سراغ اچانک ہی میرے سامنے آ گیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ دوبارہ بھی ایسا ہوتا۔ لڑکی کو بھی یقیناً احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کی طرف متوجہ تھا لیکن شاید یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

قدم قدم پر نہ جانے کتنے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوں گے۔ وہ چیز ہی ایسی تھی اور مردوں کی اس توجہ کے جواب میں وہ شان بے نیازی دکھانے میں بھی یقیناً ماہر تھی۔ ظاہر اس نے ایک طائرانہ نظر بھی ہماری سمت میں نہیں ڈالی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ بظاہر نہ دیکھنا۔ لیکن پھر بھی آپ کو دیکھ لیا بعض عورتوں کی ادائے خاص ہوتی ہے۔

وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ ایک گاڑی نے ذرا نیچے سیٹ سنبھالی تھی۔ دوسرا اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔ لڑکی پچھلی سیٹ پر اٹھ چکی تھی۔ گاڑی نے اس کے لئے دواڑہ کھولا اور بند کیا تھا۔ گاڑی اب ریلوے ہو رہی تھی۔ ہمارے اور اس کے درمیان چند گاڑیوں کا فاصلہ تھا۔

آخر میں نے نکلتش کے ان چند لمحوں کے بعد فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے شہنشاہ سے کہا ”ہم سب لوگوں کو لے کر ہوٹل پہنچو۔ مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آیا ہے جسے کرنا میں بھول گیا تھا۔ میں اپنی گاڑی لے جا رہا ہوں۔ ضرورت پڑے تو یہاں سے کرائے کی گاڑی یا ٹیکسی لے لیتا۔ میں کچھ دیر میں پہنچ جاؤں گا یا فون کروں گا۔“

مرسٹریز نے ان پریشان نظروں سے دیکھا شاید دل ہی دل میں انہوں نے پاکستانی طرز حیات کی بد نظمی پر افسوس بھی کیا ہو گا کہ جس میں ایک بڑا بڑا شخص میں اپنے ضروری کام کرنا بھی بھول جاتا تھا۔ شاید اس کے پاس اپنے کام فریضے اور ترتیب سے انجام دینے کا کوئی نظام ہی نہیں تھا۔

میں نے ان سے بے پناہ معذرت کی۔ وہ معذرت کے بارے میں کبھی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ”کی گردن کسے نے سلوا سکرانے ہوئے لیکن ذرا پیچھے ہوئے سے لمبے میں لانا افضل! میرا خیال ہے اس قسم کے کام آپ کو کسی طرح ادا آتے ہوں گے؟“

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کر دیا۔ میں اس وقت باتوں کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار تھا۔ میں نے علامت ”نہیں۔ ایسا کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیشہ اس طرح میں ہوتا ہوں۔“

شہنشاہ جو اصل بات سمجھ رہا تھا، ہماری بیچہ کی ”میں آپ کے ساتھ چلا ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ تم مسافروں کے ساتھ جاؤ۔ میں نے فیصلہ کن لمبے میں کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مسافر سلوا برا محسوس کر جائے۔ اگر بڑے کا اصل مالک نہیں تو کم از کم غیر نو آری تو ان کے ساتھ جا رہا تھا۔

اس وقت تک سرخ مرسیڈیز پارکنگ لاٹ کی حدود سے باہر چلی تھی اور چھوٹی سڑک کی طرف مڑ رہی تھی۔ جلد ہی وہ نظر اور بھل ہو سکتی تھی۔ میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا چاہتا تھا کہ اوقات ایسے محسوس ہوں کہ قسمت مذاق بھی کر جاتی ہے۔

میں سب کے تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی مرسیڈیز میں بیٹھا اور میں نے گاڑی بہت تیزی سے ریلوے گاہ کے لئے چھوٹی۔ اس کے باوجود جب میں چھوٹی سڑک پر پہنچا تو اب تک سرخ مرسیڈیز کم روشنی اور زیادہ گاڑیوں میں میری نظر اور بھل ہو چکی تھی۔ تاہم مجھے اطمینان تھا کہ ابھی وہ میں نے نہیں پہچانی ہوگی۔ مجھے اس کو میں روڈ پر پہنچنے سے پہلے تلاش کرنا در نہ مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ دائیں طرف مڑی تھی یا بائیں طرف؟

مجھے اس پڑسکون سی سڑک پر کافی تیز رفتار کی کامیاب ہو کر جس پر یقیناً دوسری گاڑیوں والوں نے مجھے برا بھلا بھی کہا ہو گا جلد ہی مجھے سرخ مرسیڈیز نظر آئی جو بھروسے لیکن ہوئی تھی۔ مزید چکی تھی۔

مرسیڈیز کی رفتار اچھی خاصی تیز ہو تب بھی تیز محسوس نہ ہوتی۔ اس وقت مرسیڈیز مرسیڈیز کا تعاقب کر رہی تھی اور دونوں کی رفتار خاصی تیز تھی۔ تاہم میں نے درمیان میں مناسب فاصلہ رکھا تھا۔ شائع فیصل پر پہنچنے کے بعد تعاقب آسان ہو گیا۔ کیونکہ وہاں ٹریفک زیادہ تھا اور اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کوئی گاڑی کسی دوسری گاڑی کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس سڑک پر جب مرسیڈیز کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔ گورا قبرستان پہنچ کر وہ گاڑی گورنگی روڈ پر مڑی تھی اندازہ ہو گیا کہ وہ واپس جائے گی۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ سن سیٹ بلجی اور اسے پہلے گاڑی واپس کی طرف مڑ گئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اس وقت وہ

مرسیڈیز نے ان پریشان نظروں سے دیکھا شاید دل ہی دل میں انہوں نے پاکستانی طرز حیات کی بد نظمی پر افسوس بھی کیا ہو گا کہ جس میں ایک بڑا بڑا شخص میں اپنے ضروری کام کرنا بھی بھول جاتا تھا۔ شاید اس کے پاس اپنے کام فریضے اور ترتیب سے انجام دینے کا کوئی نظام ہی نہیں تھا۔

میں نے ان سے بے پناہ معذرت کی۔ وہ معذرت کے بارے میں کبھی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ”کی گردن کسے نے سلوا سکرانے ہوئے لیکن ذرا پیچھے ہوئے سے لمبے میں لانا افضل! میرا خیال ہے اس قسم کے کام آپ کو کسی طرح ادا آتے ہوں گے؟“

”مرد اور ذرا یہ ایڈرمین تو دیکھنا۔ کیا اسی گھر کا ہے۔“ میں نے انٹرکام کے قریب منے جاکر نہایت ملاحت اور شائستگی سے کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری آواز اندر کہیں نہیں سنی جا رہی تھی۔ اس گھر کے کینوں نے ملاقاتیوں سے سوال جواب کرنے کا دور سر نہیں پالا تھا۔ ان کے بارے میں گیت پر ہی ساری ”فقیشت“ مکمل ہو جاتی ہوگی اور غیر ضروری طور پر آنے والوں کی چھائی میں گیت کی پیمانی پر نصب ایک بڑی سی لائٹ آن ہو گئی۔ میں اور میری گاڑی دو روشنی میں نہ گئی۔ پھر گیت میں ایک جو کہ شگاف نمودار ہوا۔ صرف اتنا کہ اس میں ایک انسان کا چہرہ آسکا تھا۔ اسی شگاف میں جو چہرہ نمودار ہوا وہ ان دونوں گاڑیوں سے ایک کا تھا جنہیں میں نے انرپورٹ پر دیکھا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ان دونوں گاڑیوں نے مجھے انرپورٹ پر نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ تاک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے مارچ کرنے کے سے انداز میں چل رہے تھے۔ میں نے گاڑیوں اور انچا کرتے ہوئے کہا ”یار میں ذرا یہ ایڈرمین تلاش کر رہا تھا۔ بہت دیر سے خوابور رہا ہوں۔ کوئی بتانے والا بھی نہیں ہے اور کوئی گیت بھی نہیں کھول رہا۔“

مجھے معلوم تھا وہ باریک حریف میں انگریزی میں چھپا ہوا گاڑی اس شگاف میں سے جھانک کر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اول تو وہ مجھے انگریزی پڑھنے کا اہل ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے دوستانہ لہجے سے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی دو شگلی ذرا کم ہوئی۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بھی کھلا چھوڑا تھا کہ اندر سے جھانکنے والا کوئی بھی شخص یہ دیکھ سکے کہ میں تنہا ہی تھا۔ گاڑی میں کوئی اور نہیں تھا۔

گاڑی نے جب دوستانہ اور مہذبانہ لہجے میں بات کرنے والے ایک سوئڈیز بولڈ اور تھنا شخص کو دیکھا پیچھے اس کی پیش تیت گاڑی بھی کھڑی دیکھی تو انہیں اس کے ذہن سے محو ہو گئے اور اس نے بلی گیت کھول دیا۔ مجھے یہی امید تھی۔

اگر میری یہ کوشش ناکام ہو جاتی تو پھر میرا ارادہ تھا کہ محوم کر بچنے کے عقب میں جاؤں گا اور چہروں کی طرح دیوار چھاننے کی کوشش کروں گا۔ اس میں خطرہ ذرا زیادہ تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ انسان دیوار پر چڑھے تو اس پر تہ کرتی ہوئی خاردار تاروں میں کرنٹ دوڑ رہا ہو یا دیوار سے کوئی تہ انسان کی ٹانگ زمین پر گرنے کے بجائے سیدھی کسی خاموش طبع گھر آدم خود قسم کے گرنے کے جزے میں چلی جائے۔ آج کل حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان گویا مقابلہ جاری تھا مگر دیوار میں نہیں کہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

گاڑی نے باہر جھانکا۔ اس کا ایک ہاتھ کندھے پر تھکی گھن کے دیتے پر تھا۔ میں کارڈ لے اس کے قریب چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے

چہرے میں کہیں مدہنی بھی بہت کم تھی۔ بڑے بڑے مکانوں کے پتھر سے امریکی پیس ڈوبے ہوئے تھے۔ چاروں طرف سانے کا رائج تھا۔ کہیں کہیں گلی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جو بھوک کر زندگی کا حاس دلا۔ تلخ اندھے میں مکانوں اور درختوں وغیرہ کے پیسے کچھ عجیب پر اسرار سا منظر پیش کر رہے تھے۔

ان گلیوں میں سرخ سرسبز دیواروں کو احساس ہو سکتا تھا کہ کوئی گاڑی مسلسل ان کے پیچھے آ رہی تھی اس لئے میں نے ریائی فاصلہ بڑھا دیا۔ سرخ گاڑی کی رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ اتفاقاً ایک دیوہکل پرندے کی طرح دوسرے دوسرے ہلکے سے لپٹی ایک بلی گلی میں مڑی جو دوسری گلیوں سے بھی کچھ زیادہ تاریک تھا کہ دے رہی تھی۔

میری کسی نا معلوم جس نے مجھے اس گلی میں مڑنے سے باز رکھا وہ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ جب میں اس گلی کے سامنے سے گزرنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ آگے سے بند تھی۔ سرخ سرسبز باریک بلند پلا گیت کے سامنے رک چکی تھی اور اسے ذرا تیر کرنے والا گاڑی ہارن بجا رہا تھا۔ اگر میں ان کے پیچھے پیچھے گلی میں مڑ جاتا تو نہیں احساس ہو جاتا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ اور میں بالائی ان میں یہ احساس دلا نہیں جاتا تھا۔

میں آگے نکلتا چلا گیا۔ نہایت سست رفتاری سے کچھ فاصلہ طے کر کے میں ایک چھوٹے سے راونڈ ایازٹ تک پہنچا۔ اس دراپے پر آگ کا گازیال آئی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں ایازٹ ایازٹ کے گرد گھوم کر واپس روانہ ہوا اور اسی گلی میں جا پہنچا۔

گاڑی اب غائب ہو چکی تھی۔ گلی میں نیم تاریکی اور سناٹا تھا۔ اس مکان کی بیرونی دیوار اور گیت بہت اونچا تھا۔ اس کے باوجود غاروہ ہوا تھا کہ وہ ایک شاہدار مکان تھا۔ اس پر کوئی نمبر کوئی نیم بیٹ وغیرہ نہیں تھی۔ سیاہ گیت سرخ سرسبز کوٹنگ کے بعد بڑوں ہاک کھڑا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی جہانی مخلوق اپنے شکار کو رہ کرنے کے بعد دوسرے کے انتظار میں گھات لگائے کھڑی ہو۔

میں گاڑی میں گیت کے سامنے روک کر اتر آیا۔ ایک ہی نظر اس میں نے گرد و پیش کا جائزہ لے لیا۔ مکان کی دیوار سے بھولوں سے لندی بلیں جھانک رہی تھیں۔ گیت کے پلیمیں کال بیل کاٹھن در انٹرکام وغیرہ موجود تھا۔ میں نے ایک لمحے سوچا اور انٹرکام کے سے چلتا ہوا کال بیل کاٹھن دیا۔ مجھے جب میں کسی ملاقاتی کا رنگ کارڈ پڑا لیا تھا۔ وہ میں نے ہاتھ میں تمام لیا۔

کال بیل اندر کہیں دور نہیں بلکہ گیت کے عقب میں ہی غالباً گیت باؤس میں تھی۔ ملک کی آواز کے ساتھ انٹرکام آن دیا۔ اس کے اسٹیک پر سرخ جی جلی اور کسی نے کھوڑے لہجے اور بلی ہوئی اردو میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“ یہ سوال بھی غالباً گیت کے سے گھر کے گلی تھا۔



غالب کھانا کھاتے کھاتے ہی اٹھ کر باہر آیا تھا۔

ستم غرق یہ ہوئی کہ جس وقت میں نے اندر جھانکا میری وقت گاؤں نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا وہ بیٹھا ساتھی کی واپسی کا منتظر تھا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا مگر کمر بند ستور اس کندھے پر لگی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ ڈیوٹی کے معائنہ خاصے مستعد تھے۔ بے پروا نہیں تھے۔

گاؤں بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کھٹے ہلکی پھلکی میز کرائے اور وہ الٹ گئی۔ اس کا ہاتھ فوراً گن کی طرف گیا۔ اس گن دیکھا کہ خیر اور کرنے یا کوئی حکم دینے کی گنجائش نہیں تھی لئے میں نے اسی لمحے اس پر چلا تک لگادی۔ میں اسے گولی بھی نہیں چاہتا تھا ورنہ مجھے چلا تک لگانے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گن کندھے سے اتارنے سے پہلے ہی ذخیرہ ہو سکا تھا میں اسے لیتے ہوئے چارپائی پر گرا اور اس کے ساتھ میرے مشین پمپل کا دستہ اس کی کچلی پر پڑا۔ وہ ایک ہلکی سی کے ساتھ وہیں ساکت ہو گیا۔ میں اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی انگلیں چارپائی سے نیچے جھول رہی تھیں ورنہ یہی معلوم ہوتا کہ وہ آرام سے سویا ہوا تھا۔ اس کا ردائی میں بھی ہلکی سی میز لٹنے آواز کے سوا کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ڈاؤن بس پلٹ کر گیت ڈاؤن کے زونڈاؤں سے با جھانکا۔ باہر کا منظر چند لمحے پہلے جیسا ہی تھا۔ میں دے قدموں یا اٹھیا۔ میں نے گیت کے پاس پڑے ہوئے گاؤں کو بھی اٹھا کر گے ڈاؤن کے اندر ہی لاکر چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کی ٹیٹ میں چارپوں ایک چھوٹا موجود تھا۔ وہ میں نے نکال لیا۔

وہاں موجود ٹیلی فون اور انٹر کام سیٹ وغیرہ پلگ والے تھے میں نے ان کے پلگ نکال کر سیٹ کرے سے باہر رکھ دیے اور کمرے کو باہر سے قفل کر دیا۔ اس آواز کی چالی گھٹے میں سوئے تھی۔ باقی چابیوں اگر اندر کے کابین کی تھیں تو ان کی گاؤں ڈاؤن پاس موجود بی باعث حیرت تھی۔ چابیوں پاس ہونے کا مطلب تھا وہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی وقت مکان کے کسی بھی حصے میں جاسکتے تھے بلکہ شاید وہ ضرورت پڑے بغیر بھی جاسکتے تھے۔ گویا وہ خاصہ با اختیار اور با اختیار قسم کے گاؤں ڈاؤن معلوم ہوتے تھے۔

میں اندر پہنچ گیا تھا اور گاؤں ڈاؤن پر قابو پانا بھی کوئی مشکل مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ اب دیکھنا تھا کہ آگے کیا کچھ میرا منتظر تھا۔ سرگشتہ کی اس پختہ روش پر آگے بڑھا جو ڈرائیو دے کا کام دیتا تھی۔ اس پر وہی سرخ سرسبز اور ایک چھوٹی سی سفید سوزو کی کھڑی تھی جو اس شاندار کار کے سامنے نہایت معمولی دکھائی دے رہی تھی۔

مکان کی اصل غارت و برباد میں تھی۔ لگتا ہی تھا کہ اس کے چاروں طرف لان تھا جس میں چلنے پھرنے کے لئے سارے کی سلیوڈ سے راستے بنے ہوئے تھے۔ اصل غارت زیادہ لمبی چوڑی نہیں

تھی۔ اس کی گردن پر تھا اور میں نے اسے گیت سے باہر گھسیٹ لیا تھا۔ اس کی گردن میرے ہاتھ کے آگے کھینچے میں تھی۔ وہ کوئی آواز نہ نکال سکا لیکن بہت بری طرح زخاں اس نے بیک وقت کئی کام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے گردن بھی چڑانے کی کوشش کی، مجھے لات بھی رسید کرنا چاہی اور کندھے سے گن بھی اتارنا چاہی لیکن وہ ان میں سے کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے گاؤں جیب میں ڈال کر اس کی گردن چھوڑے بغیر اس کی پیشانی پر بیاں ہاتھ کھانسی کے پھل کی طرح رسید کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈھیلا ڈھالا ہو کر میرے ہاتھ میں جھول گیا۔ اس کام میں یہ مشکل چند سیکنڈ لگے ہوں گے اور اس دوران اس کی ہلکی سی خرابی کے سوا کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

میں اسے دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر اپنی ڈھال بنا کر نقلی گیت سے اندر داخل ہو گیا۔ ایک لمحے میں میں نے چاروں طرف کا جائزہ لے لیا۔ گیت ڈاؤن لان اور ڈرائیو دے میں روشنی تھی لیکن کہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیت ڈاؤن اس لمحے پھٹے کمرے کے برابر تھا۔ اس کا وہ زونڈاؤں اور کھڑکی کھلی تھی۔

میں نے گاؤں چوڑی سے سرگشتہ کی روش پر زونڈاؤں اور گیت اپنے عقب میں بند کر دیا۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ وہ قفل ہو گیا۔ گیت ڈاؤن کے اندر سے آواز آئی ہو گئی تھا زمان؟ چلا گیا کیا؟ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص کھاتے کھاتے بول رہا تھا۔

میں دے قدموں گیت ڈاؤن کے دوڑے تک پہنچا اور دروازے سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ میں روشنی میں تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کسی طرف سے کوئی ٹھٹھا ہوا نہ آئے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کمرے میں آواز اور جگہ تھی۔ میں نے جس گاؤں کو گیت کے قریب لٹایا تھا اس کی گن کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ کلا شیف تھی اور اس وقت میں ہماری گن اٹھانے سے بچنا چاہتا تھا۔ جب مجھے نہایت خاموشی اور بھرتی سے کچھ کرنا ہوتا تھا تو میں ایک ہاتھ سے نہایت آسانی سے استعمال ہونے والی کسی ہلکی پھلکی گن کو ترجیح دیتا تھا۔ اس لئے اس وقت میں نے اپنا مشین پمپل نکال لیا تھا۔

میں نے غلط انداز میں کمرے میں جھانکا لیکن اس احتیاط کا کوئی ناکہ نہ ہوا۔ کمرے میں دو دروازے کے سامنے میز کر سی اور اس پر ٹیلی فون، انٹر کام سیٹ وغیرہ تھے۔ اندر کی طرف لوہے کی ایک چارپائی اور تپائی پڑی تھی۔ لوہے کی چارپائی پر دو سرا گاؤں ڈاؤن تھا۔ اس کے سامنے تپائی پر بوسٹ اور کھانے پینے کی کچھ دوسری چیزیں بھی ہوئی تھیں۔ قریب ہی فرش پر کچھ خالی ڈبے اور کاندہ وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔

یہ دو سرا گاؤں ڈاؤن وہی تھا جسے میں نے لڑکی کے ساتھ انٹرویو پر دیکھا تھا۔ شاید اہل خانہ کے ساتھ باہر آنے جانے کے علاوہ کمرے پر بھی وہی ڈیوٹی دیتے تھے۔ گاؤں کھانا کھا رہا تھا۔ دو سرا گاؤں ڈاؤن بھی

اندھیرے میں اگر کہیں کسی چیز کی اوٹ میں کوئی موجود بھی تھا تو اس کے پاس گھس نہیں سکتی ورنہ وہ اب تک اسے استعمال کر چکا ہوتا۔ مجھے لگا کر چکا ہوتا۔

میں سو ٹنگ پول کے کنارے جا پہنچا۔ ٹانگوں کے فرش پر کھڑے ہو کر میں نے استخوان کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پول میں بھی جھانکا کہ کہیں کوئی سانس روک کر اس کی نہ نہیں تو نہیں بیٹھا ہوا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ نیلی ٹانگوں والے فرش پر شفاف پانی میں کوئی نظر نہ آیا۔

اچانک میرے عقب سے بلندی سے آواز آئی "جھیں شاید میری تلاش ہے۔" آواز نسوانی اور نہایت غماز آور سی تھی۔

میں کی بھی قسم کی صورت حال میں اپنے اعصاب کو تالاب میں رکھنے میں اکثر کامیاب رہتا تھا لیکن اس وقت اعصاب شاید کچھ زیادہ ہی کشیدہ تھے۔ اس آواز نے میرے اعصاب پر کچھ ایسا ہی اثر کیا جیسے دھانسن کے تھے ہوئے ٹانگوں پر اچانک کسی نے ہاتھ مار دیا ہو۔

میں اچھل کر مڑا اور سو ٹنگ پول کے کنارے کی چکنی ٹانگوں سے پھسل کر پانی میں گرے پڑا۔ میرے اس انداز پر حرم غم بھی ابھری۔ غمی کیا تھی گویا کسی نے چاندی کی چٹتری میں موتی لڑکا دیے تھے۔ اسی حرف حرم غم ہی نہیں تھی "اس میں ایک خاص قسم کی جذباتی خیزی بھی تھی۔"

گردن کھاتے ہی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ڈائوٹنگ بورڈ کے سرے پر ایک بیڑے کی طرح کھڑی تھی۔ مجھے اس کی وجہ بھی فوراً ہی معلوم ہو گئی کہ میں چند لمحے پہلے اسے کیوں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً ڈائوٹنگ بورڈ پر اوڑھ لی ہوئی ہوگی۔ بلکہ شاید اس سے چپکی ہوئی تھی۔ اس لئے میں نیچے سے اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ شاید وہ جان بوجھ کر اس طرح لیٹی ہوئی تھی اور مجھے چوروں کی طرح چھوٹک چھوٹک کر قدم رکھتے دیکھ کر محفوظ ہو رہی تھی۔ کم از کم اس کی ہنسی تو یہی بتا رہی تھی۔

میرے ہنسل کا رخ غیر ارادی طور پر اس کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے پول "حق! گولی نہ چلا دیا۔" میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ کم از کم اس کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ تیراکی کے لباس میں تھی۔ میں نے گرمی سانس لی اور ہنسل نیچے کر لیا۔

شیڈ والی لائٹس کا رخ نیچے کی طرف ہونے کی وجہ سے میں اسے صاف طور پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں نے ملاٹ سے کہا "تم نیچے تھاپنا بند کرو گی؟"

"کیوں نہیں۔" وہ بلا تامل بولی۔

میرا خیال تھا کہ وہ ڈائوٹنگ بورڈ کی سیڑھی کے راستے نیچے آئے گی مگر اس نے ہاتھ کچھ اوڑھ کر ڈائوٹنگ بورڈ کو ہلکا سا

خمی۔ اس کے ارد گرد بہت زیادہ جگہ کھلی چھوڑی گئی تھی۔ اصل عمارت تارکی میں ڈوبی ہوئی تھی جبکہ چاروں طرف دریا جھگڑا اور فنیس لائٹس وغیرہ کی وجہ سے کافی روشنی بھیلی ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کے سورج کہاں تھے ورنہ میں انہیں آف کر دیتا کیونکہ ان کی وجہ سے کافی حد تک روشنی میں ہی رہے ہوئے اصل عمارت کی طرف۔ یہاں پر ہوا تھا۔ کوئی ابھید نہیں تھا کہ تاریک مکان کی کھلی کھڑکی! دروازے کے عقب سے کوئی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو۔ اس رات میں اصل دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی کوئی گنا میرا۔ لی کر سکتی تھی۔

میں چار دیواری کے قریب۔ اب اس طرف روشنی کم تھی۔ چار دیواری کے اوپر خاردار تار کی موجود تھی اس کا مطلب تھا بچنے میں پچھلی طرف۔ داخل ہونا بھی میرے لئے کافی مشکل ہوگا۔ میرے پاس اب چابیاں تو موجود تھیں لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اصل عمارت کے چاروں طرف ایک بیکرنگلوں۔

دائیں طرف لان نہیں صرف بائیں گئی تھی۔ میں مٹھین ہنسل ہاتھ میں لئے نہایت محتاط انداز میں دیوار کے قریب رہے ہوئے اس گلی سے گزر کر کوئے تک پہنچا۔ کوئے پر چھوٹا سا ایک الگ پورٹن تھا۔ یہ یقیناً سروٹ کو ادر تھا مگر اس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن تھوہ گاڑیساں رہے ہوں یا یہ کچھ اور ملازموں کی رہائش ہو مگر وہ اس وقت کہیں گئے ہوئے ہوں۔

سروٹ کو ادر کی اوٹ سے میں نے مزید آگے جھانکا تو عقبی ان نظر آیا۔ یہ لائن سامنے والے لان سے زیادہ بڑا تھا اور اس کے وسط میں ایک مستطیل سو ٹنگ پول تھا۔ سو ٹنگ پول زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن نہایت اعلیٰ سا دوسرا سامان سے مزین تھا اور بہت خوب صورت تھا۔ گوکہ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی مگر پھر بھی ہر چیز کی خوب صورتی اور معیار نمایاں تھا۔

دھیمی روشنی میں پول کا پانی جھللا رہا تھا۔ مدھم مدھم کے صوٹے اس میں صرف معمولی سا ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ پول کے قریب بلندی پر لہسا ایک ایسا ڈائوٹنگ بورڈ بھی موجود تھا لیکن اس وقت جولاٹس آن تھیں ان کا رخ چونکہ نیچے کی طرف تھا اس لئے بورڈ تقریباً اندھیرے میں تھا۔

میں ہنسل ہاتھ میں لئے آہستگی سے ماربل کی دوش پر آگے بڑھا۔ میری نظر کس لان پر لگاتے ہوئے بریڈ سے اور بھی دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر دوش کا جائزہ لے رہی تھیں جو دھیمی ہوا میں میرے دھیرے چلتے ہوؤں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ نہ اسے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی موجود تھا جو شاید سانس سے میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری آنکھیں تلاش کرنے میں ناکام تھیں جبکہ میں روشنی میں تھا۔ یوں میں لامبٹ بڑا غلط معمول لے رہا تھا لیکن خطرے کے احساس کو ذہن سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے فرض کر لیا تھا کہ چلیے

بنادیتے ہیں۔ میں تمہیں اپنے بارے میں اچھی اچھی بات  
پیارے باتیں بتاتا۔ تم مجھ سے متاثر ہو جاتیں۔ مجھ پر  
ہو جاتیں اور پھر راوی بیس بیس لگتا۔

”میں اب بھی تم پر مرانا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور  
”کچھ...؟“ میں نے پچھانا خوشی سے پوچھا۔

اچانک وہ پانی سے نکل آئی اور کنارے پر عین میرے  
آن کھڑی ہوئی۔ وہ ایک سروتھ لڑکی تھی۔ وہ پانی سے نکل کر  
مجھے کچھ یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں اس کے وجود کی پیش محسوس کر سکا تھا  
جسٹم میں نمایا ہوا شعلہ تھی۔ اس کے بالوں سے پانی کی گہرے  
کے صحت مند سرخ و سفید جسم پر پھسل رہی تھیں۔ پانی کے قطر  
جسٹم کی طرح اس کی لمبی لمبی پلکیں پر بھی اٹکے ہوئے تھے۔  
آنکھیں نہیں جھپک رہی تھیں۔

اب وہ بالکل سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ وہ پانی تو اس کی  
سرکوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی ”تم میری بات کو مذاق سمجھ  
ہو؟“

”مگر نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”مجھے تو سرفیہ  
تھا کہ تم کس قسم کسی اور کے دھوکے میں تو مجھ سے خطاب نہیں  
تھیں میرا نام معلوم ہے؟“

”سرفیہ...!“ اس کے گلابی ہونٹوں پر طعنے  
سکراہٹ ابھری ”تم ابھی نام ہی اٹھے ہوئے ہو۔“  
تمہاری عادات اور پسند ناپسند تک کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

”کس نے بتایا ہے اور کیوں؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔  
”مجھے تم کو بہت کچھ بتانا ہے۔ اور تمہیں مجھ سے بہت  
سوالات کرنے پڑیں گے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ نہیں کہنے کو  
ہوگا؟“ اس نے خنک ہوا میں بھر جھری سی اور گویا حرارت

پناہ کی تلاش میں آگے بڑھ کر مجھ سے جڑ کر کھڑی ہو گئی۔  
سائیں سینے میں اٹکے لگی۔ اس نے میرا خالی ہاتھ اپنے ہاتھ  
تھام لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ میرے شین ہٹل پر آن لگا۔

میں نے ہٹل کے دستے پر گرفت ڈال لی۔ میں دیکھا  
تھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اس نے ہٹل میرے ہاتھ سے نکال  
نہایت آہستگی سے میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا  
اظہینان کی ایک خفیف سی لہر میرے اعصاب سے گزری۔

اب بھی چڑکھ رہی تھی۔  
میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو کیا ایک سی نہایت  
ناک سی دکھائی دیتے لگی تھیں۔ اس کی ہانسیوں کا ماحول میرے  
تک پہنچا تھا اور ہونٹ دھیرے دھیرے قہر قرار پاتے تھے۔

”آؤ۔ اندر چلتے ہیں۔“ وہ اسی طرح مجھے مکان کے  
دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔  
”مجھے اندر سے جا کر کس کے ہاتھوں مروانا چاہی ہے؟“

”میں نے تم سے پوچھا۔“

جھلکا دے کر کسی ڈولفن کی طرح سر کے بل غراپ سے پانی میں  
چھلانگ لگادی۔ کچھ پانی اچھل کر میرے سوت پر بھی گرا۔ سوت  
کافی حد تک گیلیا ہو گیا۔

اس نے پانی سے سر اٹھا دیا تو میں نے اسے گھورا۔ شاید وہ  
میرے تاثرات دیکھ کر ایک بار پھر نہیں۔ اس کے بالوں کا جو زائید  
بڑے اہتمام سے بندھا ہوا تھا کچھ نکدہ سر کے بال پانی میں چھلانگ  
لگانے کے باوجود اسی طرح قائم تھا جس طرح میں نے ان پورٹ پر  
دیکھا تھا۔

وہ تقریباً پوری کی پوری سلخ آپ پر ابھر آئی اور کسی پھٹی کی  
سی مثالی سے دھیرے دھیرے دائرے میں تیرنے لگی۔ میں نے کمری  
نظر سے اس کا سر تپا جائزہ لیا اور ذرا ابھی تو ازم میں کہا ”کون کتا  
ہے تمہارے پاس بھیا نہیں ہے۔ تم تو سرایا اسلحہ خانہ ہو۔“

وہ غوطہ مار کر نیچے چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ ابھر کر اس نے  
گردن تیزی سے اُدھر اُدھر گھما کر پانی جھٹکا اور پستل سے زیادہ بھرپور  
انداز میں فیس کروٹی ”تمہاری آنکھیں بڑی بد معاش ہیں۔“

”وہ تو لازمی ہے تمہاری۔“ میں نے گردن کو خم دیتے ہوئے  
کہا ”ویسے یہ خادم صرف آنکھوں کی حد تک بد معاش نہیں  
ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ شون سکراہٹ کے ساتھ بولی۔  
دو شیاں سو ٹھنک پول پر مرکوز تھیں۔ میں اب اسے کچھ زیادہ سی  
اچھی طرح دیکھ سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں اپنے جسم میں حسنی  
محسوس کر سکتا تھا۔ تاہم میں اپنے گرد پیش سے اب بھی بے خبر  
نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے عقب میں مکان کا پچھلا  
دروازہ تھا۔ مجھے اس کی بھی فکر تھی کہ کیس کوئی اس طرف سے  
برآمد نہ ہو جائے۔

تاہم میں نے بظاہر اسی کی طرف متوجہ رہے ہوئے پوچھا۔  
”تمہیں میرے بارے میں یہ اہم بات کس طرح معلوم ہے؟“

”کون سی اہم بات؟“ اس نے پانی میں دھیرے دھیرے میرے  
قرب سے گزرتے ہوئے آنکھیں پھیلائی۔

”کیا کہ تمہارا یہ خادم صرف آنکھوں کی حد تک بد معاش  
نہیں ہے؟“ میں نے کہا۔

”تمہارے خیال میں یہ اہم بات ہے؟“ وہ شرر انداز میں  
سکرائی۔

”یقیناً“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا ”بلکہ میرے خیال میں  
تو یہ میری زندگی کا اہم راز تھا۔ حیرت ہے تم سے ملاقات سے پہلے  
ہی میرا یہ راز تم تک کیسے پہنچ گیا۔“

وہ ایک بار پھر زندگی سے بھرپور انداز میں نہیں ”مجھے تمہارے  
بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔“

”اور یہ تو بہت برا ہوا۔“ میں نے ابھی سے کہا ”میں خود  
آکر بتانا تو چاہتا ہوں۔ دوسرے لوگ نہ جانے کیا کیا جھوٹ بچھا کر

اب بھی اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی چھپا ہوا تو نہیں تھا۔ وہ ایک لمحے کے توقف سے بولی "تمہیں پسند آیا میرا قید خانہ؟"

"قید خانہ؟" میں نے دہرایا۔

"ہاں" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر عظیم الشان ذیل بند کی طرف لے جاتے ہوئے بولی "میں سوچتی ہوں وہ پرانی کمائیاں جو پچاس سال تک بڑی بوڑھیاں تھیں جن کو بھلانے کے لئے بنائی رہی ہیں، انہوں نے یقیناً کسی بچ کی کوکھ سے جنم لیا ہو گا اور وہ ہر دور میں دہرائی جاتی رہی ہیں۔ اگر تم اپنے کردہ پیش پر نظر والو اور بعض دور دراز گوشوں تک تمہاری رسائی ہو سکے تو تم دیکھ گے کہ چننا چڑے کی کمائیاں..... پورے اور شراوی کی کمائیاں..... اور دوسری بے شمار کمائیاں کہیں نہ کہیں دہرائی جا رہی ہوں گی۔"

"تم کس کمائی کا کردار ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم کوٹ اور تائی اتار کر اطمینان سے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" وہ خود میرا کوٹ اتارتے ہوئے بولی "میں تمہیں بتاتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو شراوی تو نہیں کہہ سکتی۔ میں تو بہت معمولی اور بہت وابہات سی لڑکی ہوں۔ اپنی زندگی کو مزید وابہات تر بنانے میں کچھ میرا اپنا بھی ہاتھ ہے لیکن بہر حال میں اس شراوی کی طرح ہوں جسے ایک دیوے نے کسی کل میں قید کر رکھا تھا جہاں وہ سوئی رہتی تھی جب دیو اتھا تھا اسے جگا لیتا تھا۔ میں بھی ایک دیو کی قیدی ہوں۔ وہ دونوں مسلح گارڈز میری نگرانی پر مامور ہیں۔ انہیں ساتھ لئے بغیر میں کہیں نہیں جا سکتی۔ انہیں مطلع کئے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی۔" "تم مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا موقع دے رہی ہو کہ میں وہ شراوی ہوں جو اگر اس شراوی کو قید سے نجات دلاتا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" تمہیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی "میں نے کب کہا کہ میں اس قید سے آزاد ہونا چاہتی ہوں؟ یہ قید میں نے خود اپنے لئے منتخب کی ہے۔ کو کہ اب یہ مجھے بہت گراں گزرتی ہے لیکن پھر بھی مجھے اس سے فرار ہونے کے لئے کسی شراوے کی مدد نہیں چاہئے۔ میں ابھی کچھ اور عرصہ اس قید میں گزارنا چاہتی ہوں۔ پھر مجھے کسی شراوے کی مدد کے بغیر خود ہی اس قید سے رہائی مل جائے گی۔ میں نہایت صبور سکون اور تحمل سے اس وقت کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"کیا نام ہے اس دیو کا۔ جس نے تمہیں قید کر رکھا ہے؟" میں نے بظاہر سرسری سے بے لگے میں پوچھا لیکن میری دھڑکن تجسس کے باعث ذرا تیز ہو گئی تھی۔

وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لپیٹے ہوئے محور سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لو گے کیا؟ پہلے یہ بتاؤ تم کیا چاہتا ہو کہ؟ مجھے اچانک احساس ہوا ہے کہ تو اب میرا بانی بھی کوئی چیز ہیں۔" وہ بڑی صفا کی سے میرے سوال کا جواب گول کر گئی۔

بھگدھے! میں تمہیں مردانے کے لئے نہیں۔ تمہاری زندگی کا سامان کرنے کے لئے تمہیں اندر لے جا رہی ہوں۔" وہ ذرا غفلت سے بولی لیکن آواز اب بھی پوچھل تھی۔

"انداز کون ہے؟" میں نے اب بھی اپنی جگہ سے ہلے بغیر پوچھا۔

"انداز کوئی ہوتا تو میں تمہارے اتنے قریب آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔" وہ میرے کوٹ کے کنارے دھیرے دھیرے رخسار دگڑتے ہوئے بدستور سرکوشی میں بولی "البتہ گا۔ کے بارے میں مجھے بتاؤ۔ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ انہیں مار دیا ہے؟" اس نے کچھ یوں پوچھا تھا جیسے اسے رزق کے مرے کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی بلکہ اس کے نزدیک شاید یہ کچھ بہتری ہو تاکہ وہ مرتا ہے۔

"نہیں۔ میں اشد مجبوری کے بغیر کسی کو نہیں مارتا۔ اگر بے ہوش کرنے سے ہی کام چل جائے اور بے ہوش کرنے کا موقع بھی مل جائے تو پھر اسی سے گزارہ کرتا ہوں۔ وہ دونوں گیٹ ہاؤس میں بند ہیں اور بے ہوش ہیں۔" میں نے بتایا۔

"جلدی ہوش میں تو نہیں آجائیں گے؟"

"خوش ہو دیکھنے سے پہلے تو ہوش میں نہیں آتے۔"

"چلو اتنا بھی کافی ہے۔ دیے اگر ساری رات ہوش میں نہ آتے تو اچھا ہوتا۔ ساری رات ہماری اپنی ہوتی۔ مجھے تم سے ڈھیر ساری باتیں کہنی ہیں۔ ویسے بھی ایک عرصے بعد کسی بیڑم اور نہیں کوئی کی قوت نصیب ہوتی ہے۔ ایک عرصے سے میں بدصورتی اور غلاطی کے سولنگ پول میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔"

وہ مجھے لئے آگے بڑھی اور عجمی دواؤں کے کھل کر اندر جا پہنچی۔ راستے میں اس نے ایک ہاتھ پوچھا کہ کہیں کہیں لائٹ آؤں کی اور مجھے میری نامعلوم حس نے بتایا کہ مکان کا واقعی خالی ہے۔ اندر کوئی اور نہیں تھا۔ دو دیو اور ایک عجیب سے سکوت میں ڈوبے گویا تجسس سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

مکان کافی بڑا پُر فیش اور شاندار تھا۔ اس کی ہر چیز اعلیٰ اور بیش قیمت تھی۔ وہ جس کمرے میں جا کر رکی وہ نہایت خوب صورت بندھن تھا۔ اس کی آرائش انسانی جسم کی تھی۔ اس نے دواؤں بند کر کے مقل کر دیا اور گھوم کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"تم اس گھر میں تنہا رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تنہا ہی سمجھو۔" وہ ہنس لہجے میں بولی "میرے علاوہ یہاں دو ملازمین ہوتی ہیں لیکن ان دونوں وہ دونوں اپنے گاؤں گئی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ دو گارڈ ہوتے ہیں جن سے بہت کرم یہاں تک پہنچ سکے ہوں۔"

میں ادھر ادھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید لا شعوری طور پر مجھے

ملا بیڑک دروازہ کھولنے لگی۔ دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا وہ ایک چھوٹی سی دیوار گیر بار تھی۔ اپنے لئے ڈرک تیار کر کے وہ وہاں بیڑہ آئی تھی۔ میں پہلے ہی بیڑہ چکا تھا۔ وہ سرکشٹ کے گیلے لباس کی جگہ اب شب خوابی کے لباس سے میں تھی جو سرکشٹ کے لباس سے زیادہ مشرف تھا۔

پہلے ہی اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔ چند چسکیاں لے کر گھوما یہ خمار اور بڑھ گیا۔ وہ اپنی خوب صورت آنکھوں میں گلابی ڈورے لئے میری طرف ایک نگہ دیکھتے ہوئے دھیمی گواہ میں بولی "تم مجھے کس حد تک جانتے ہو؟"

"خطرناک حد تک۔" میں نے جواب دیا "لیکن ویسے مجھے تمہارا نام بھی معلوم نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس کی ہوا پریشانی پر چلتی ابرو آئیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں نے اس کی جو ہوش رہا قلم دیکھی تھی اس میں وہ کوئی اونگے درجے کی لڑکی ہرگز دکھائی نہیں دی تھی۔ قلم میں جو کچھ درجہ کر رہی تھی اس کی شخصیت بھی اس سے میل کھاری تھی یعنی اس کی ہر حرکت سے سستا بن اور طواغیت عیاں تھی لیکن اب جبکہ میں اسے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا تو وہ ایک قطعی مختلف چیز تھی۔ فطری مددِ جز کی بات اور تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ قلم میں مجھے صحیح معنوں میں اس کی ذات میں کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اسے سامنے اور قریب دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ وہ تو سر بایا کشش تھی۔ وہ ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت تھی۔ اس کی

شخصیت اس کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کا اعلیٰ بن گیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس قسم اور اس کی موجودہ شخصیت کے درمیان کتنا فاصلہ حائل تھا جس میں یہ انقلاب رونما ہوا تھا۔ ورنہ بعض لوگوں کے ساتھ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ معمولی اور بے کشش شخصیت کے مالک ہوتے ہیں مگر قلم وغیرہ میں کھم کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں وہ خوب صورتی اور اعلیٰ بن نظر آتے لگتا ہے جو در حقیقت ان میں موجود نہیں ہوتا۔

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسی فرق کے تجربے میں کھپا ہوا تھا جب اس نے سرگوشی میں اپنا سوال دہرایا "تم نے بتایا نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ تم مجھے خطرناک حد تک جانتے ہو اور جس میں میرا نام بھی معلوم نہیں؟"

میں نے اسے اصل بات بتا کر اس کا رد عمل دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ "بات یہ ہے۔" میں نے کمری سانس لے کر کہا "مجھے حقیرانہ مجھے انسان کو تھمائی ایک عقیم انسان قلم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں تم زانا غار کے۔ بلکہ اس سے بھی بہت پہلے کے لباس میں تھیں اور میدان کارزار میں بڑی عمدہ جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس لحاظ سے گویا میں نے جس بہت قریب سے جان لیا لیکن تمہارا نام مجھے واقعی معلوم نہیں۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا اگر گزر گیا۔ ایک طویل لمحے

پھر مجھے چپ دیکھ کر وہ بولی "خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جس سب کچھ بتا دوں گی۔ لیکن ذرا صبر سکون سے۔ مرحلہ وار۔ اپنے موڈ کے مطابق بتاؤں گی اسے بے تاب مت ہو۔ بے تابی کسی بھی کام میں اچھی نہیں ہوتی۔ مجھے بھی یہ سن کر اطمینان ہو گیا ہے کہ گاؤں ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے۔ اگر وہ ہوش میں آکر اس کمرے میں کچھ شور شرابا کرنے لگیں تو تم جا کر ان کی کچھ پڑوں پر ایک ایک ڈنڈا رسید کر کے انہیں مزید کچھ دیو کے لئے بے ہوش کر آنا۔ تمہارے لئے یقیناً یہ کام مشکل نہیں ہو گا۔"

میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ اس تہذیبی کو محسوس کرتے ہوئے بولی "ہاں یوں ٹھیک ہے۔ بالکل ریلیکس ہو کر بیٹھو اور اب بتاؤ تم کیا ہو؟ ہمیں۔۔۔ شیر کی لاشیں؟" میرے پاس اس وقت صرف یہ تین ڈرکس ہیں۔ "وہ اندھ کڑی ہوئی۔"

"میرے مطلب کی ان میں کوئی ڈرک نہیں۔" میں نے سر ہلایا۔

"تم تباہ و صحری چٹاپند کرو گے؟ وہ بھی مل جائے گی۔ اس کے لئے مجھے بھی تک جانا پڑے گا۔" وہ بولی۔

"نہیں۔ اس کے لئے جسیں فریخ تک جانا پڑے گا۔" میں نے بیڑہ فریخ کی طرف اشارہ کیا "میری محبوب ترین ڈرک کا نام سادہ اور مختصر اپانی ہے میں صرف اسی کو پی کر ریلیکس ہوتا ہوں۔"

"واقعی؟ تم ہی بولی رہے ہو یا محض احتیاطاً نہیں لیا رہے؟" اس نے حیرت اور بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

"میں جی بولی رہا ہوں۔"

"اگر محض احتیاط کر رہے ہو تو اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے گویا مجھے سمجھا ہوا مگر سمجھا "میں نے پہلی ہی ملاقات میں جس میں اپنا دوست۔۔۔ اپنی خلوت کا ساتھی بنالیا ہے۔ اب کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔" جس پر احتیاط کو بھول جانا چاہئے۔

"احتیاطوں کو تو میں اس وقت ہی بھول گیا تھا جب میں نے جسیں سو رنگ پزل میں تھرتے دیکھا تھا۔ میں پانی احتیاطاً نہیں مانگ رہا۔ مجھے تو پانی کا نشہ ہے۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔" میں خود ہی اٹھ کر فریخ تک جا پہنچا اور بوتل نکال کر پانی گلاس میں انڈیل کر اس طرح چسکیاں لینے لگا جیسے وہ پانی نہیں "کچھ اور تھا۔ وہ ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "مجھے تمہارے بارے میں بتانا تو کیا حکمت رکھتے ہیں؟ لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا۔"

"جسیں واقعی یقین نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں تو چاہوں۔ خود ہی دیکھ لو۔ اس وقت بھی لی رہا ہوں۔" میں نے پانی کا گلاس ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے اسے دکھایا۔

وہ عجیب سے اعجاز میں مسکرائی اور گھوم کر الماری کا

تک وہ ایک تک میری طرف دیکھتی رہی پھر گلاس سے چسکی لینے کے بجائے ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر گھری سانس لے کر بولی "ہمت خوب آ تو تم نے وہ قلم دیکھی ہوئی ہے۔۔۔ جبکہ تم سینا کلب کے ممبر بھی نہیں ہو۔"

"ہاں مجھے یہ اعزاز حاصل نہیں ہے" میں نے تسلیم کیا۔ اس کی صورت میں صرف ایک لمحے کے لئے کوئی تفسیر یا ذکر ضرور کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش گفتگو اور قدرے محمود دکھائی دینے لگی تھی۔ مجھے یہ جان کر ٹھوڑی سی حیرت ہوئی تھی کہ اسے یہ بھی معلوم تھا "میں سینا کلب کا ممبر نہیں ہوں۔"

"تمہیں میرے بارے میں اور کیا کیا بتایا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنا زیادہ نہیں کہ تم پریشان ہونے لگو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "ہمت کچھ شاید مجھے خود بھی معلوم کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور بائیں میرے گلے میں حاصل کر دی۔

گفتگو میں ایک طویل وقفہ آیا۔ آخر کار ہم دونوں دوبارہ "جوان سے انسان کی جون میں آئے تو اس نے اٹھ کر ڈرنک ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال سینے اور اپنے لئے ایک اور ڈرنک تیار کی۔ چند لمحے وہ خاموشی سے چسکیاں لیتی رہی پھر خود ہی بولی "مجھے تمہارے بارے میں تمہارا ہمت بتایا گیا تھا اور تمہاری تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔ "پھنسی سی ایک مہم میرے ذمے لگائی گئی تھی۔ مجھے تمہارے قریب ہونا تھا۔ تمہیں گھیر کھار کر ایک خاص جگہ پر لے جانا تھا۔ پھر یہی کچھ ہونا تھا جو اب ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہوا کہ خفیہ کیمروں سے اس کی فلم تیار ہو جاتی اور تمہیں پتا بھی نہ چلا۔" وہ ہانک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے غصہ بھر کر بولی۔

میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بیڑے سے اترتے ہوئے کہا "اس وقت شاید اسی منصوبے پر عمل در آمد ہو رہا تھا۔"

میں نے تیزی سے چھت اور دو در دیوار کا جائزہ لیا۔ چھت میں فانوس تو ہواں تھے اور فیشی لائٹس نصب تھیں۔ دیواروں اور سائڈ ٹیبل پر بھی کئی ایسی چیزیں موجود تھیں جن میں خفیہ کیمروں کے لینز ٹھٹھ ہو سکتے تھے۔ میں ہلکا سا ہونے انداز میں ایک ایک چیز کو چیک کرنے لگا۔ میرے لئے یہ تصویر بڑا تکلیف دہ تھا کہ کہیں کچھ لوگ بیٹھ کر میری اس قسم کی فلم دیکھیں۔

وہ غمور رہی کے ساتھ بولی "بڑا حساس بندر کی طرح ادھر ادھر بھاگنا بند کرو اور واپس یہاں میرے پاس آکر اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ یہاں کسی چیز میں کوئی خفیہ کیمرہ پوشیدہ نہیں ہے اس وقت

تمہارے بارے میں کوئی بلیک میلنگ اسٹف تیار نہیں ہو رہا ہے۔ کام چپ ہونا تھا تب بھی یہاں نہیں ہونا تھا۔ کہیں اور ہونا تھا۔ ابھی تو اس کی تیاریاں ہی نہیں ہو سکی ہیں۔ ابھی تو مجھے تم سے دوستی بڑھانا تھی۔ پھر نہ جانے کتنے دن بعد یہ نوبت آنا تھی۔"

میں نے رک کر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ غمور رہا تھا۔ دیکھتے ہوئے اس کے گوشوں سے ہنسی پھوٹ رہی تھی۔ غمور آنکھوں میں ستارے سے جھلکا رہے تھے۔ وہ گویا میری حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کے وقف سے وہ بولی "یہ تو محض اتفاق ہے کہ مجھے اس مہم پر نہیں لکنا پڑا۔ اس سے پہلے ہی تم مجھے نظر آ گئے اور بجائے اس کے کہ میں تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوئی تدبیر کرتی "تم خود ہی میرے پیچھے پیچھے چلے آئے۔"

میں آہستہ سے چلا ہوا واپس اس کے قریب آ بیٹھا۔ وہ میرے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی "میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ جب مجھے تمہاری تصویر دکھائی گئی تو تم مجھے قصور میں ہی اچھے لگے۔ پھر ان پورٹ پر تمہیں اصل میں دیکھا تو تصویر سے بھی بہتر لگے میں نے اس وقت ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ مہم کئی جنم میں۔۔۔ میری تم سے نجی دوستی ضرور ہوگی۔"

اس نے ایک گھری سانس لی پھر پلکا سا گھونٹ بھر کر بولی "چنانچہ یہ میری تم سے خالصتاً ایک نجی ملاقات ہے۔ میری محبت اور پسندیدگی کے اظہار کا ایک انداز ہے۔ یہاں کسی قسم کی بلیک میلنگ کی تیاریاں نہیں ہو رہیں۔ یہ اچانک اور غیر متوقع ملاقات صرف اس لئے ممکن ہو گئی کہ تم نے گھر میں گھس کر۔۔۔ گارڈز کو قابو میں کر لیا ورنہ شاید ابھی یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔" اس نے ایک بار پھر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

"ہمت تیرا رفاہ محبت ہے تمہاری۔" میں نے گھڑی سانس لی لے کر کہا "ایک ہی وقت میں الف سے بے تک جا بیٹھی۔"

"جن راستوں سے میں گزر رہی ہوں اور جہاں پہنچ چکی ہوں وہاں یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ پہلے میں تمہیں خوشبو میں بھا ایک خط لکھا بیٹھے میں ڈال کر کتاب میں رکھ کر دیتی جس میں چند نمونے بھرنے کے بعد تمہارا پیرا کر بتایا گیا ہوا کہ تم میرے خوابوں کے شہزادے ہو۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں سال و پڑھ سال نظرسں جھکائے تمہارے سامنے سے گزرتی رہتی اور تمہاری طرف سے اس قسم کے کسی خط کا انتظار کرتی رہتی۔ جو یقیناً تم نے بھی نہیں لکھا تھا۔"

"ٹھیک کہہ تم نے۔" میں نے اپنے لئے گلاس میں پانی اندر پلٹے ہوئے کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ میرے خلاف بلیک میلنگ اسٹف کی ضرورت کے اور کیوں تن پڑی تھی؟"

"شبہ پایا جاتا ہے کہ تمہارے پاس دو خاص غلوں کی کیکس موجود ہیں۔ ایک تو اس بات کو یقینی بناتا جانا تھا کہ تم انہیں کہیں

بارے میں کچھ بتانے لگی تھی۔

”دوسری فلم بھی اسی قسم کی خرافات پر مبنی تھی۔ وہ ایک اور لڑکی کی تھی۔ اس کا نام مونا تھا۔ وہ فلم بھی غالباً تیسرا ہی پاس ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”نام یاد آیا۔ تم نے ابھی تک اپنا نام مجھے نہیں بتایا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سوال سے پہلو بچاتے ہوئے کہا۔

وہ استغنائیہ سے انداز میں مسکرائی پھر کندھے اچکا کر بولی۔ ”میرا نام فرح ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا ”اب یہ مت کہنا کہ یہ بڑا خوب صورت نام ہے۔ اس طرح کا کوئی جھوٹ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”میرا اس قسم کا جھوٹ بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“ میں نے گویا اسے تسلی دی ”یہ ایک عام سا نام ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ ایک نہایت خاص لڑکی کا نہایت عام سا نام ہے۔“

”تھینک یو۔“ وہ میرے بازو پر سر ٹکاتے ہوئے بولی۔ ”فرح!“ میں نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا ”اب ہم اس ام سوال کی طرف آتے ہیں جو اب تک چھٹی پچھلی کی طرح پھسل کر کبھی اُدھر کو لڑھک رہا ہے اور کبھی اُدھر کو۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں فلموں کی ضرورت کبے آن پڑی ہے؟“

”پیر دانش کو۔“ اس کی سرگوشی اتنی ادھم تھی کہ اگر ہم جڑے نہ بیٹھے ہوتے تو شاید میں نہ سن سکتا۔

ایک لمحے کے لیے میں بالکل خاموش رہا۔ میں حیرت کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ میرے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ میں اس کے مجھے کا کھنکھاتا تھا۔ شاید میرے لاشعور کے کسی گوشے میں یہ توقع موجود تھی کہ مجھے پیر دانش کا نام سننے کو ملے گا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے حیرت کا شدید ہتھکا لگا تھا۔ میں اسے برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اپنا چہرہ پات رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی ”تمہیں حیرت ہوئی ہے؟“

”ہاں“ میں نے یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا ”ایسی عظیم سماجی شخصیت۔ اور اسے کن چیزوں کی ضرورت کن پڑی ہے؟“

”عظیم سماجی شخصیت۔“ وہ استغنائیہ انداز میں ہنسی ”تم اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی ہو۔ سب سے پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟“

”میں اس کی داشت ہو۔“ اس نے پات لہجے میں جواب دیا۔ ”دوست!“ میں نے بے اختیار سنی تباہی ”بڑا ہی سنسنی خیز

مسک بھی سلیے میں استعمال نہ کرنے پاؤ۔ ان کے جواب میں لڑائی بھی کیٹت چلا ہو جس کی بنیاد پر سووے بازی کی جائے۔ آخر مرد کی بھی اپنی ایک عزت ہوتی ہے۔ خصوصاً تم جیسے سرکردہ اور ممتاز فہمی کی۔“ وہ شرر انداز میں مسکرائی۔

”ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ میری کہیں اس قسم کی کوئی کہٹ یا تصویر پائی جائے۔ اس کے لئے قتل و غارت ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر اس قسم کی حرکتیں مت کیا کر دے۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”میں کہاں کرتا ہوں۔“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا ”تم جیسی معزز اور ہنرمند خواتین مجھے مجبور کر دیتی ہیں۔ آخر میں انسان ہوں فرشتہ نہیں۔“

”اچھا ہی ہے تم انسان ہو۔ فرشتہ ہونا بڑی اُن انجیل سی بات ہوتی اور مجھے اس پر بڑی مایوسی ہوتی۔“ اس نے گلاس ہونٹوں سے لکھایا۔

”وہ دو فلمیں کون سی ہیں جن کے بارے میں شبہ پایا جا رہا ہے کہ لا میرے پاس ہیں؟“

”ان میں سے ایک تو میری ہی ہے جس کے بارے میں تم اعتراف کر چکے ہو کہ وہ تم دیکھ چکے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے ہی پاس ہوگی کیونکہ وہ سینما کلب میں نہیں چلی ہے اور اس کا صرف ایک ہی دوپٹ پر منٹ بنا تھا جو کسی کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔“

”ضروری تو نہیں ہے کہ وہ فلم میرے ہی پاس موجود ہو۔ ممکن ہے میں نے کسی اور کے پاس دیکھی ہو۔“ میں نے کہا۔

”تمہیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی تم سے کوئی جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔“ وہ قدرے بیزارگی سے بولی ”مجھے اس فلم سے یا اسے واپس حاصل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ خواہ سینما ہالوں میں چلے گئے۔ میری بلا سے۔ میری محنت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں دے دے بھی کچھ لوںے تک اس ملک سے نکل جاؤں گی۔“

”ہمت خوب۔ بڑی بے خوف لڑکی ہو۔“

”حالات نے بنا دیا ہے۔“

”دوسری فلم کون سی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ لٹھڑی سانس لے کر بولی ”تم معصوم بن بن کر سوال کرتے رہو۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دیتی رہوں گی۔ تم کسی سوال کا جواب مت دینا اور کوئی بات مت بتانا۔“

”پلے تھماری زبان سے تو کچھ تمہیں سلیجے جائیں۔ پھر میں بھی سب کچھ بتا دوں گا جو مجھے معلوم ہو گا۔ دے دیے۔ میرا خیال ہے مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔“ میں نے پُر خیال لہجے میں کہا ”مجھے تو حقیقت سبھی کچھ تم سے معلوم کرنا ہے۔ تم دوسری فلم کے

رشتہ ہے۔ پھر میں نے گویا از سر نو کردہ پیش کا جائزہ لینے ہوئے کہا۔  
”ویسے میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہیردانش بڑا دل والا اور باوقوف آدمی  
ہے۔ داشتہ کو کس ثباتِ باث اور شان و شوکت سے رکھا ہوا  
ہے۔“

”تمہیں شاید اس کی دولت کا اندازہ نہیں ہے اس لئے  
تمہیں اس کی داشتہ کے رنن سنن پر حیرت ہو رہی ہے۔ ویسے  
خوبہ تمہیں تو کیا۔ شاید اسے خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں  
ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دولت کو کہاں خرچ کرے۔ اور  
دولت ہے کہ بدعتی ہی جاری ہے۔“

ایک لمحے کے لئے خاموش ہونے کے بعد وہ بولی ”ویسے  
میرے علاوہ بھی اس کی دو داشتائیں ہیں۔ یا پھر یوں کہنا چاہئے کہ  
کم از کم دو ایسی ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ وہ بھی اسی ثباتِ باث اور  
شان و شوکت سے رہتی ہیں لیکن منسلک محافظوں کا ہر ان پر بھی  
ہے۔ گاؤز کے بغیر وہ بھی کس قدر نہیں نکال سکتیں۔ ان میں سے  
ایک کی عمر تو پندرہ سال ہے۔ اس کے علاوہ چھتے دو  
چھتے۔ مینے دو مینے کے لئے جو عورتیں ہیردانش کی زندگی میں آئی  
رہتی ہیں وہ الگ ہیں۔“

”اور اس کی تین بیویاں بھی ہیں۔“ میں نے گویا یاد دلایا۔

”ہاں۔ تین بیویاں بھی ہیں۔“ اس نے سر ہلا کر تائید کی۔

”غصیت کیس کا! بڑی ہی جھنجھ پند سی طبیعت پائی ہے اس  
نے۔“ میں نے گویا جمل کر کہا ”ہم چھتے تانت پندوں کا احتمال  
کر رہا ہے۔ پرانے بادشاہوں کی طرح پورا حرم آباد کر رکھا ہے۔ وہ  
جو ایک انگریزی فلم آئی تھی جس کے نام کا اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا  
”ہوس کا پجاری“ وہ کیسی اسی کے بارے میں تو نہیں جانتی؟“

وہ فائیس بستر پر پھیلائے ہوئے کراہنے کے سے انداز میں  
ہنسی اور بولی ”اس وقت تنجید کی سے بات ہو رہی ہے۔ خواہ مخواہ  
میں نکلوے مت لگاؤ۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ  
کبھی کبھی وہ اپنی داشتائیں کے پاس مینہ مینہ نہیں آتا۔ بیویوں  
سے چارویں کا تو نہ جانے کیا حال ہو گا کیونکہ بیویاں تو پھر بیویاں ہی  
ہوتی ہیں! زیادہ ہوس اسے صرف اس بات کی ہے کہ جو لڑکی اسے  
بہت زیادہ بھا جائے وہ بس ہر وقت اس کی رسائی میں رہے۔ وہ جب  
چاہے اس کے پاس جاسکے۔ اس مقصد کے لئے وہ بہت دولت  
خرچ کرتا ہے۔“

”اس نے تمہیں میرے بارے میں بلیک میلنگ اسٹن تیار  
کرنے کی مہم پر لگا دیا تھا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”بھی اس کی جباریاں نہیں  
ہوتی تھیں۔ ابھی صرف بات چیت ہوتی تھی۔ مجھے تمہارے بارے  
میں بتایا گیا تھا کہ تم مستقبل قریب میں ہیردانش کی ذات اور اس  
کے کچھ کا دوبادل کے لئے خفیہ ہیں سکتے تھے۔ اطلاعات بتاتی تھیں  
کہ تم میں اس سے کمرانے کی طاقت بھی موجود تھی۔ یہ اطلاعات

ہیردانش کے لئے بہت تشویش ناک تھیں۔ تمہیں قادیوں کی  
تمہارے پرکات کر رکھنا اس کے خیال میں ضروری ہو گیا۔  
ضرورت پڑنے پر تمہارا پتا بھی صاف کیا جاسکتا تھا۔ ہیردانش اور  
محفوظ قلعوں کے ارد گرد کسی کو منڈلاتے نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ  
ایک طرف وہ تم سے دوستی کا نکتہ کر تمہارے گھر میں کھس بیٹھے  
کو خش کر رہا تھا اور دوسری طرف تمہیں تباہ و برباد کرنے کا  
ضرورت پڑنے پر قتل کرانے کے لئے ایسا جال پھیلا رہا تھا کہ اس  
پر کوئی الزام نہ آسکے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تم بہت باوقوف  
آدمی ہو۔ تمہارا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہو گا۔ اس کی بد  
اندیشی بتانے پر تمہیں ہوگی۔“

”بھئی واہ افضل میاں!“ میں نے مسکراتے ہوئے خود  
کندھے پر چھکی دے کر کہا ”شکر میں تمہارا کافی رعب ہے۔ یہ  
بڑے لوگ بھی تمہیں گاجر مولیٰ کی طرح کٹوا کر پیچھنے کی ہمت نہ  
رکھتے۔“

”میں بس زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ بولی ”یہ تو  
تمہیں خبردار کر رہی ہوں اس لئے تم اپنے بچاؤ کا بندوبست کر  
میں کامیاب ہو جاؤ گے ورنہ وہ ہر حال تمہارا پتا صاف کر دیں  
وہ بڑی مکار چر ہے۔ پکا اٹھیں ہے۔ شیطانی چالیں چلے اور شیطانی  
منصوبے بنائے میں اس کا جواب نہیں۔“

”وہ تمہاری لور مونا کی وڈیو کیسٹ کیوں حاصل کرنا چاہتا  
ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔ یہ سوال کچھ دیر سے میرے ذہن میں  
چھب رہا تھا۔

”اس کا جواب دینے سے پہلے میں تم سے پوچھنا چاہوں گی کہ  
کیا تم سینما کلب تک پہنچ گئے ہو؟“ اس نے میری آنکھوں میں  
جھانکا۔

”ہاں“ میں نے اقرار کر لیا تا ہی ہنر سمجھا۔ میں سوچ رہا تھا۔  
مجھے بھی خود تو اتھوڑا کھل ہی جانا چاہئے تھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی ”ہیردانش کو یہی اندیشہ تھا۔  
بھی ہاں لو کہ میری اور مونا کی وڈیو کیسٹ بھی تمہارے پاس ہیں  
”چلو یہ بھی مان لیتا ہوں۔“ میں نے ذرا توقف سے کہا۔

”ہیردانش کو یہ بھی اندیشہ تھا۔“ وہ بولی ”اس کا مطلب  
اس کا شیطانی ذہن صحیح انداز سے لگانے میں بھی ماہر ہے۔“  
انداز خود کافی کا تھا۔

”اصل میں اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں مونا کو تلاش  
تھا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا ”اس کے بعد اس کے آدمی میرے  
بیچے لگ گئے ہوں گے اور انہوں نے تیزی سے میرے بارے  
معلومات جمع کر ڈالی ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس میں انجام  
دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟“

”اس لئے کہ سینما کلب کا واحد اس کا ہے۔“ فرج  
نمائت دھیمے سے میری بولی گویا اسے اندیشہ تھا کہ تجھے میں



اور۔۔۔

کالے دھندے کرنے والوں کے طریقہ کار عموماً ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے حالات میں بھی اپنے بچاؤ کا بندوبست رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہر مختلف جگہ کی کالی بمیڑوں ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ ہر خطرے سے منٹے کا بندوبست رکھتے ہیں لیکن اگر کبھی ان کے خلاف کوئی خاص ہی قسم چل پڑے تب بھی ان پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔

فرح بات جاری رکھتے ہوئے بولی "دوسری طرف محرم بخار بیک کے کچھ دھندوں میں بیروانی کچھ پرسنٹ کا پارٹنر ہے۔ اسی طرح ملی بھگت سے یہ بڑے بڑے گمراہ ایک دوسرے کو مضبوط سے مضبوط تر بن رہے ہیں۔"

یہ ایک عبرت ناک اور مدح فرما حقیقت تھی کہ معاشرے میں لوگ کن کن دھندوں کی کمالی کھارے تھے، کن کن ذرائع سے اپنی دولت کے انبادوں میں اضافہ کر رہے تھے اور لوگ انہیں بند کر کے انہیں پوچھ رہے تھے۔

فرح نے سلسلہ کلام جو ڈا محترم بخار بیک بے شک یہاں نہیں ہے لیکن اس کے جو لوگ موجود ہیں ان کے ذریعے اور دوسرے نامعلوم ذرائع سے دونوں خطرناک افراد کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل رہتا ہے۔ یوں معاملہ گوا دو آتش ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "لوگوں کی اس قسم کی ظلموں کی دوزخ کیسٹ کی شکل میں صرف ایک ایک کالی تیار کی جاتی ہے جو صرف بیروانی کے اپنے بیہوشی کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے پاس ان ظلموں کی چھوٹی سی ایک لائبریری موجود ہے۔ سینما کلب والوں کے لئے ان ظلموں کے سرف پروجیکٹر چلنے والے پرنٹ تیار کئے جاتے ہیں۔"

"میری قلم کا مسئلہ یہ ہوا کہ قلم تیار ہو کر جب بیروانی صاحب کے ملاحقے کے لئے ان کی خدمت میں پہنچی تو موصوف کو میں پسند آگئی۔ انہوں نے مجھے اپنے عشرت کدے میں بلوایا۔ بلکہ ہوں کہو کہ منگوایا۔ اس رات میں موصوف کو اور بھی زیادہ پسند آگئی۔ اس نے فوراً مجھے اپنی داشتہ کے مقام پر فائز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"برسبیل تذکرہ بتاتی چلوں کہ میں اس کی سب سے چینی داشتہ ہوں۔ مجھے اس کے قبضے میں ایک سال ہو گیا ہے جو اس کی داشتہ کی تاریخ میں کافی طویل عرصہ سمجھا جاتا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ ابھی وہ مجھے مزید کافی عرصہ رکھے گا حالانکہ اس کی موجودہ داشتہ اس میں ایک لڑکی اٹھان سال کی بھی ہے۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ بھی بہت خوب صورت ہے لیکن میں نے سنا ہے اسے وہ جلد ہی فارغ کرنے والا ہے۔ مجھ پر وہ بہت مہربان ہے۔"

"جو ہر شاس ہے۔" میں نے سنا ہے کہ وہ ستر اٹھتے ہوئے کہا۔

جاری بات سن سکتا تھا۔ پھر شاید اسے وہ کاروبار یاد آ رہا تھا کہ داروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

میں سناٹے میں آیا۔ ایک بار پھر مجھے چند سیکنڈ کے لئے چپ لگ گئی۔ حالانکہ میں نے زندگی میں اتنی حیرتیں سہیلی نہیں کیں کہ میں سوچا تھا اب کسی بھی بات پر حیران ہونا چھوڑ دوں لیکن ہر حال میں بندہ شرفاء حیرت کبھی کبھی چھ پر حملہ آور ہو جاتی تھی اور غلبہ پا جاتا تھا۔

اس زمانے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کسی شخصیت کے پیچھے سے کیا ڈراما برآمد ہو جائے۔ پھر دانش کے بارے میں ابتدائی سے مجھے کچھ اچھی توقعات نہیں تھیں لیکن میں نے اس حد تک بھی نہیں سوچا تھا کہ۔۔۔

فرح کی سرگوشی سن کر میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی "سینما کلب کے لئے کسی فلمیں تیار کر سنبھال انہیں چلانے اور لڑکیاں چلائی کرنے کا دھندا اصل میں بیروانی ہی کا ہے۔ اس قسم کی لڑکیاں جو شو بزنس میں آنے کا جنون کی حد تک شوق رکھتی ہیں اس کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار رہتی ہیں۔ پہلے ہی سے کالی آزاد خیالی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو لڑکیاں کالی خوب صورت ہوتی ہیں انہیں گھیر گھار کر قابو میں کرنے کے لئے بیروانی کا ایک منظم گروہ کام کر رہا ہے جس میں ایک دو ٹانگہ ٹاپ عورتیں بھی شامل ہیں۔ جو لڑکیاں اس گروہ کے چال میں پھنس جاتی ہیں وہ اس سے نکل نہیں سکتیں۔ ان منتخب لڑکیوں میں سے بھی جو غیر معمولی طور پر خوب صورت ہوتی ہیں اور بیروانی کو پسند آ جاتی ہے" اسے وہ کچھ عرصے کے لئے اپنی داشتہ بنا کر رکھتا ہے۔ اسے ہر وہ چیز فراہم کرتا ہے جس کے اس نے کبھی خواب دیکھے ہوتے ہیں لیکن اس کی یہ دنیا غرضی ہوتی ہے۔ بہت جلد بیروانی کا اس سے دل بھر جاتا ہے اور وہ اسے دودھ کی کھسی کی طرح نکال پھینکتا ہے۔ تاہم اتنی مہربانی ضرور کرتا ہے کہ اپنے حرم سے نکالنے وقت اس کی جھولی میں کچھ دولت ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ بیروانی ہی کے زیر سایہ رہتے ہوئے اسی قسم کے میوہ دھندوں میں استعمال ہوتی رہتی ہے۔"

"مجھے پتا چلا تھا کہ جس کو خفی میں سینما کلب والوں کے لئے شرطیں ہیں اور لڑکیوں کی بلنگ ہوتی ہے وہ ایک بہت بڑے اور خطرناک اسٹور محرم بخار بیک کی ہے جو کراچی کل کیس بیرون ملک لادویش ہے۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ شاید یہ دھندے اسی کے ہوں۔" میں نے کہا۔

"محرم بخار بیک ان دھندوں میں بیروانی کا کچھ پرسنٹ کا پارٹنر ہے۔" فرح نے بتایا "اس کی کو خفی اور کچھ آدمی استعمال ہو رہے ہیں۔ کو خفی تو خیر اس کی اپنی بھی نہیں ہے۔ اس نے بھی کرائے پر لی ہوئی ہے۔ اس طرح معاملہ کچھ اور محفوظ ہو جاتا ہے یہی جگہ کہ مالک کوئی ادب کرائے دار کوئی ادب کرتا دھرتا کوئی

نہیں۔“

وہ دوسرے سے نہیں اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”میں اس کی آنا کا مسئلہ بن چکی تو اس نے حکم دے دیا کہ میری قلم سینا کلب والوں کے لئے ”رٹلیئر“ نہ کی جائے اور نہ ہی اب اسے مزید کوئی شخص دیکھنے پائے۔ ڈیو کیسٹ کی شکل میں اس کی ایک ہی ماسٹر کاپی تیار ہوئی تھی لیکن وہ غائب ہو گئی۔ یا یوں سمجھو کہ اس دوران کچھ دانش کا اپنا ایک نہایت خاص آدمی اسے دبا کر بیٹھ گیا۔“

”اس کا نام تالیا ظفر جمال تھا؟“ میں نے اندازہ ظاہر کیا۔  
”جی ہاں تم اس کے بارے میں جان چکے ہو؟“ اس نے سر ہلایا  
”ہاں اس کا نام ظفر جمال تھا۔ وہ شو بیز کا بہت اعلیٰ درجے کا ڈانٹر گرافر تھا لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح شارٹ کٹ سے دولت کمانے اور کم سے کم وقت میں دنیا کی ہر عیش و عشرت سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کے لئے پیر دانش کا آلہ کار بن گیا تھا۔ ڈینس میں بنگالے کر اس نے پروا ٹھٹا دار اسٹوڈیو بنایا ہوا تھا۔ خود بھی بڑے ٹھٹا باٹ سے رہتا تھا لیکن اس کے زیادہ تر ٹھٹا باٹ پیر دانش کی وجہ سے تھے۔ اس کے کام کی وجہ سے نہیں۔ خالص محنت اور دیانت داری سے دولت کمانے میں ذرا زیادہ وقت لگتا ہے۔“

”میرا خیال ہے مطلوبہ معیار کی لڑکیاں تلاش کرنے اور انہیں گھیر گھار کر ایک خاص منزل تک لانے میں ظفر جمال کا کردار بھی بہت اہم رہا ہو گا؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”بے شک“ فرح نے جواب دیا ”وہ اس سارے ریکٹ کا اہم ستون تھا۔“ پھر وہ گہری سانس لے کر بولی ”تمام ناجائز و ہندے دولت کے لئے ہوتے ہیں اور یہ ہندے کرنے والوں میں آہلی میں اکثر لڑائیاں دولت ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔“

میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ اس نے بے بڑی تجربے کی بات کی تھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولی ”مجھے کچھ زیادہ راتیاں طور پر معلوم نہیں کہ بالکل صحیح بات کیا ہے۔ میں پیر دانش کو اس قسم کے معاملات میں زیادہ کرید تو نہیں سکتی لیکن مختلف باتوں سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو پیر دانش نے ظفر جمال کو کوئی بہت بڑا رقم دینے کا کوئی وعدہ کیا ہو تھا جس سے وہ کر گیا۔ یا پھر شاید ظفر جمال کا دعویٰ تھا کہ حساب کتاب کے مطابق اس کی کوئی بہت بڑا رقم رتن رتن پیر دانش پر ڈیو ہو چکی تھی جبکہ پیر دانش اس حساب کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔“

”میرا حال دونوں کے درمیان اختلاف ہو گیا۔“ میں نے کہا۔  
”بہت عجیب اختلاف۔“ فرح نے سر ہلایا ”ظفر جمال شاید ہی دانش سے عجیب ترین اختلافات کے باوجود اس کے سامنے سزا اٹھانے کی جرأت نہ کرنا لیکن اس دوران ایک اور عجیب انقلاب یہ رونما ہوا کہ موتا اور ظفر جمال ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ بہت ہی افسانوی قسم کی محبت میں۔“ وہ کچھ عجیب سے

ہوا ہے۔“

”آج بھی کہیں اس بلا کے نازل ہونے کی رات تو نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے نازل ہونے کی کوئی مقررہ راتیں نہیں ہیں لیکن تمہارے خیال میں میں تمہیں کیوں اتنی مطمئن نظر آ رہی ہوں؟“  
”اس نے تمہیں یقینی طور پر بتادیا ہو گا کہ وہ آج نہیں آئے گا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”وہ ایسی کوئی بات کرے بھی تو میں اسے ڈرانا بھیجتی ہوں۔ وہ اگر فون پر یہ کہہ دے کہ وہ آج رات شہر سے باہر جا رہا ہے تب مجھ میں یہ فرض نہیں کرتی کہ اس رات اس کے نازل ہونے کا امکان نہیں۔ یہ کہنے کے بعد بھی میں ممکن ہوتا ہے کہ وہ آج رات کو آجائے اور کبھی کبھی یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ وہ آنے کی اطلاع دے اور اس کے بعد چند روز تک نہ آئے۔“

اس نے ایک طویل سانس لی ”اسے خواہ آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ لیکن اگر وہ گھر میں موجود ہو تو اس کا خیال ایک آسیب کی طرح ذہن سے چٹا رہتا ہے۔ اس وقت میرے بے فکر نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ وہ دعویٰ کیا ہے۔ میں ان رپورٹ پر اسے ہی تو چھوڑنے کی کوشش کرتی۔“

میں چونکا ”کیس کمزم مختار بیک دینی تھی میں تو دپوش نہیں ہے؟“ میں نے پیر دانش اسی سے تولنے نہیں کیا؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ اس نے اپنے خوب صورت کندھے اچکائے ”میرا حال وہ ہنگامی طور پر روانہ ہوا ہے اور جلد ہی واپس آجائے گا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے سر جھٹ کر کہا ”غیر۔۔۔ وہ تمہاری کیسٹ کی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔“

”ہاں“ میں نے تیار ہی تھی کہ میری قلم سینا کلب والوں کے لئے رٹلیئر نہیں ہو پائی تھی کہ پیر دانش نے مجھے اپنے اوپر اور کھمبے ہوئے حرم میں شامل کر لیا۔ پیر دانش میں ایک بات بڑی عجیب ہے جب تک کوئی لڑکی اس کی داشتہ رہتی ہے وہ اسے بیوی کی طرح اپنی آنا کا مسئلہ سمجھتا ہے۔ اسے باہر کی ہوا نہیں لگے دیتا۔ یہ برداشت نہیں کرنا کہ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ اس کے گاؤں کو یہ پدایت ملی ہوئی ہے کہ اس کی کوئی بھی داشتہ جب ان کے ساتھ کسی کام سے باہر نکلے اور راستے میں کہیں کوئی ادبائش نوجوان وغیرہ اس پر کوئی آواز نہ کہیں یا کسی قسم کی بد تمیزی کریں تو وہ ان کی اچھی طرح ہنگامی کریں اور اگر ضرورت محسوس کریں تو بے دھڑک انہیں شوٹ کر دیں۔ گاؤں کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بعد کے حالات سے پیر دانش خود ہٹ لے گا۔“

”بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔“ میں نے سر ہلایا ”کیا شان ہے۔ بے چارے عام آدمی کی تو شریف بیوی کو بھی یہ تحفظ حاصل

آلا لگ آیا تھا۔ اس کمرے میں ایک ہی کھڑکی ہے اور اس میں سلاخیں ہیں۔ وہ باہر تو نہیں آسکتے لیکن ہوش میں آنے کے بعد کہیں شور شرابا شروع نہ کریں۔ میں ان کے منہ میں کچھ نہیں ٹھونس سکا تھا۔

ہم دونوں نے کان لگا کر سنا لیکن اس کھٹکے کے بعد مزید کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ کھولا اور ہٹل ہاتھ میں لے کر باہر کھٹک کر دروازے تک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے لاش آٹن نہیں کی لیکن میں دیکھ سکا تھا کہ ہال میں کوئی نہیں تھا۔

فرح نے ایک کمرے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مجھے کچھ کپڑا وغیرہ دیا جسے میں گاڑو کے منہ پر باندھنے اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں استعمال کر سکا تھا۔ میں اسی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہال سے باہر آیا۔ برآمدے سے لے کر گیٹ ہاؤس تک بدستور روشنی بچھلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں کہیں کوئی ذی روح حرکت کرتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گیٹ ہاؤس بھی بدستور سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔

اتہم میں محتاط انداز میں ہی گیٹ ہاؤس تک پہنچا۔ میری نظر چاروں طرف تھی اور میں کسی بھی اچانک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ فرح اپنے بیڈ روم میں ہی دروازہ منقل کر کے بیٹھ گئی تھی۔

میں نے گیٹ ہاؤس کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ گاڑو دہن "جو استراحت" تھے جہاں میں نے انہیں چھوڑا تھا۔ لگتا تھا وہ کھٹکا کسی غیبی قوت نے ٹھن میری اور فرح کی تنگدستی میں غلط ڈالنے اور ان خوب صورت لمحات کو بد مزہ کرنے کے لئے کیا تھا۔

میں نے نہایت آہستگی سے گیٹ ہاؤس کا آلا کھولا اور ہٹل کا رخ گاڑو کی طرف رکھتے ہوئے ان کے قریب پہنچا۔ میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا کہ کہیں وہ ہوش میں آنے کے باوجود بے ہوش رہنے کی چال نہ چل رہے ہوں۔ میں خود زندگی میں دو تین مرتبہ یہ واقعہ استعمال کر چکا تھا۔ ہر بار یہ واقعہ کارگر رہا تھا۔

گاڑو کے معاملے میں میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ میں نے ایک ہاتھ میں ہٹل سیدھی رکھتے ہوئے دوسرے سے انہیں کلاٹ دلا دی۔ ان کے جسموں کی کیفیت نے مجھے بتا دیا وہ حقیقت میں ابھی تک بے ہوش تھے تب میں نے ہٹل دانتوں میں دبا کر پھرتی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا۔ ان کی تنگیں میں نے پہلے ہی باہر لان پر ایک بازو کی آڑ میں چھپا دی تھیں۔ اب کارروائی مکمل ہو گئی تھی۔

مطلوبین ہو کر میں مکان کے اندر لوٹ آیا۔ بیڈ روم کے دروازے پر ایک اٹلی سے دستک دے کر اوڑ سرگوشی میں اپنا نام بتا کر میں نے فرح سے دروازہ کھلوا دیا۔ مجھے ٹھیک ٹھاک دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور وہ دوبارہ دروازہ منقل کرتے ہوئے بولی

اور ازمیں نہیں۔  
اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے اس بات پر یقین سنا نہیں آتا۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "گاہر ہے مرنابہ ظفر جمال سے متعارف ہوئی ہوگی تب بھی کوئی ایسا سیدھی سادی اور معصوم دوشیزہ نہیں رہی ہوگی۔ ظفر جمال نے خود اسے مزید غلامتوں میں دھکیلا تھا۔ ظفر جمال خود بھی سے گماں شکاری تھا۔ اس قسم کے مرد اور اسی قسم کی لڑکیاں فزائی میچوں کے پکڑ میں کماں پڑتے ہیں۔ ان کا تو ان قدروں پر سے ایمان ہی اٹھ چکا ہو تا ہے اور دل پتھر ہو چکے ہوتے ہیں۔ خاص اور جب سامنے بہت سنگین قسم کے خطرات اور مصیبتیں ہی پیش نظر آ رہی ہوں پھر کہاں محبت کا حوصلہ پڑتا ہے۔"

"اس کے باوجود لوگ محبتیں کرتے آئے ہیں اور بڑی عجیب پیسہ کاٹنے والی عین داستانیں ختم کی رہی ہیں۔ بڑی بڑی گھاگ برگرگ پاراں دیدہ... قسم کی طوائفیں کسی کی محبت میں گرفتار کر لیں گی تو پھار میں اپنے محبوب کے ساتھ فرار ہوتی رہی ہیں۔ محبت کے راستوں میں انہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں۔ میں تم کی گوی؟"

"ہاں۔ ایسا ہوتا ہے۔" اس نے پچکپاتے ہوئے تسلیم کیا۔ لیکن مجھے پھر بھی اس قسم کے واقعات افسانوی سے ہی محسوس سے رہے ہیں۔ میرا حال... بات ظفر جمال اور مونا کی ہو رہی ہے۔ انہوں نے ایک رات کہیں ساتھ گزار دی اور دوسری صبح وہ فانی انداز میں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ "معمومہ معمومہ" میں نے جلدی سے اسے خاموش ہونے اشارہ کیا "یہ قصہ تو مجھے پیرافٹل نے سنایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ مادھو اس کے ساتھ گزرا تھا۔"

"پیرافٹل۔ اور سونا سے محبت؟" فرح استہزائیہ انداز میں نا اور دیر تک ہنستی رہی۔ میں مہرہ جھل سے اس کی طرف دیکھتا۔

انہاںک دور کہیں سے کوئی خفیف سا کھٹکا سنائی دیا اور اس کی مار بیک لگ گیا۔

"یہ کھٹکا کیا تھا؟" اس نے خوف زدہ سے انداز میں سرگوشی

"معمومہ مجھے دیواروں کے پار نظر نہیں آتا۔" میں نے ڈیڑھ سا کھٹکے کے بیڈ سے اتر کر اپنے کٹ کی جیب سے ہٹل لے کر دے گا۔

"کہیں گاڑو کو ہوش تو نہیں آ گیا؟" وہ اپنے خوب صورت لکڑی سے بچے نکاتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔  
"میرے تو نہیں ہے۔ ویسے میں احتیاطاً جا کر دیکھ آتا ہوں۔" مائے شرم ہنسنے ہوئے کہا "میں انہیں گیٹ ہاؤس میں بند کر کے

”کیا پکڑ تھا؟“

”پھر تو بے فکری ہی بے فکری ہے۔“ اس کے لیے  
منور طمانیت جھلک آئی۔

انٹول کافی طویل ہو گیا۔ آخر کار وہ جھکے جھکے  
آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی ”مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”تم سو جاؤ۔ میں احمقوں کی طرح بیٹھ کر تمہارا  
گاہ۔“ پھر میں نے ذرا اٹھنے کے لیے انداز میں کہا ”تمہارے

میں میں اس لئے یہاں آیا ہوں؟“  
وہ آنکھیں کھولتے ہوئے نیچے انداز میں مسکرائی۔

آنکھوں میں گھائی دور سے اب بھی تیر رہے تھے۔ اچانک  
کی سی پھرتی سے چلا تک لگا کر اٹھ بیٹھی اور بیٹھ سے اتر

ہوئی ”میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“

میں دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے چپت لیٹا دوڑی  
گھور آیا اور ذرا زعمی کے نشیب و فراز کے بارے میں خود

پیرا دلش کے بارے میں سوچنا رہا۔ وہ ایک دستاورد اور  
تھا۔ چاروں کے چنگلوں کی طرح اس پر سے تھیں اور یہی

فرح بیک کافی کے دو گ بنا لائی۔ ان سے بھاب  
تھی۔ کمرے میں کافی کی مہک پھیل گئی۔ پاس پاس بیٹھ

چسکیاں لے چکے تو میں نے کہا ”سلسلہ وہیں سے جوڑنے  
سے ٹوٹا تھا۔ کیا بات ہو رہی تھی؟“

”تم پیرا دلش کے سونا کی محبت میں گرفتار ہوئے  
کر رہے تھے۔“

”اور تم اس پر استہزائیہ انداز میں ہنس رہی تھیں۔“  
”ہاں ہی ہنسنے کی تھی۔ پیرا دلش اگر مونا جیسی لڑکی

میں گرفتار ہونے لگے تو پھر وہ پیرا دلش نہیں رہے گا۔  
”دراصل اس نے مونا اور ظفر جمال کی افسانوی سی محبت

میں سے ظفر جمال کا نام نکال کر اس کی جگہ اپنا نام فٹ کر  
کھائی تھیں سنار۔“

”کیوں؟“ میں نے وضاحت چاہی۔  
”ظاہر ہے وہ اپنی داستان میں تھیں۔ بے وقوف بنا

تہ رویاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اگر تم  
بارے میں کچھ معلوم کرے میں یا اسے تلاش کرنے میں

ہو چکے ہو تو اسے بتا دو۔ اسے بڑی شدت سے سونا کی تلاش  
اس وقت تک شرم میں پھیلے ہوئے اس کے آری مراد کو دکھانا

میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔“  
”اسے سونا کی تلاش کیوں تھی؟“ میں نے دریافت کیا

”ظاہر ہے وہ سونا کی محبت میں تو بے حال نہیں ہوا  
شہم استہزائیہ سے لہجے میں بولی ”محبت تو اسے دنیا میں

دولت کے سوا کسی چیز سے نہیں ہے۔ دونوں میں بیاد  
غریب قسم کے کردار ہیں اور ذرا الگ الگ قسم کے جنونی

”کوئی پکڑ نہیں تھا۔ یونہی کسی آواز نے ہمیں غلط فہمی میں  
جلا لیا تھا۔ دراصل کوئی بھی طاقت ہماری گفتگو میں انٹرول کرنا

چاہتی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔  
وہ مسکادی لیکن دوسرے ہی لمحے خوف زدہ سے انداز میں

اچھل پڑی کیونکہ کمرے میں فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی جبکہ اس کے  
کمرے میں فون نہیں تھا۔ خود میری سمجھ میں بھی ذرا تاخیر سے آیا

کہ وہ میرا مہیا کل فون تھا جو میرے کوٹ کی جیب میں تھا۔ اس کی  
گھنٹی بج رہی تھی۔

”سوری!“ میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف  
دیکھا ”یہ میرا بد تعبیر فون ہے۔ اسے اسی طرح موقع مل دیکھے بغیر

اٹھنے کی عادت ہے۔“  
میں نے بیڈ پر بیٹھ کر کوٹ کی باہر کی جیب سے فون نکالا اور

بالکل اندرونی جیب میں ڈالتے ہوئے فرح کی طرف دیکھ کر کہا  
”کوٹ کیا ہے۔ یوں سمجھو کہ ایک الماری پن کر پھرتا ہوں۔

شاندار سوٹ کی فنگ کا تو بالکل خیال نہیں رکھ سکتا۔ نہ جانے  
کمال کہاں سے پھولا پھولا دکھائی دیتا ہے۔“

”اس کے باوجود خوش لباس اور پنڈم دکھائی دیتے ہو۔  
تمہیں تشویش میں جلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”دل رکھنے کا شکر ہے۔“ میں نے فون کا ٹائمر دیا اور ”ہیلو“  
کہا۔ دوسری طرف اطمینان کی سانس لی گئی۔ وہ شفیع شاہ تھا جو

صرف ”ہیلو“ سن کر میری آواز پہچان لیتا تھا۔  
”سرا مجھے آپ کے بارے میں تشویش تھی۔“ وہ بولا ”آپ

بالکل اچانک روانہ ہوئے تھے۔ اور اب تک آپ کی واپسی نہیں  
ہوئی۔ کوئی اطلاع بھی نہیں آئی۔ اس لئے میں نے سوچا ذرا رابطہ

کرنے کی کوشش کروں۔ آپ کہاں ہیں؟“  
”یہ مت پوچھو نیر!“ میں نے فضا کی سانس لے کر کہا ”بہت

ہی اچھی جگہ پر ہوں۔ دل چاہ رہا ہے میں وہ جاؤں۔“ میں نے  
فرح کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے ہنسی پھوٹی

پڑ رہی تھی۔  
دوسری طرف شفیع شاہ ہولے سے ہنسا اور بولا ”بس سرا مجھے

یہی معلوم کرنا تھا۔ میرے لئے کوئی حکم؟“  
”بس۔۔۔ دعا کرنا کہ میرا یہاں قیام کافی طویل ہو۔“ میں نے

کہا۔  
شفیع شاہ نے ہلکا سا تھقہ لگایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون بند کر دیا اور فرح کی طرف دیکھ کر کہا ”انٹول  
کافی طویل ہو گیا۔“

”کیوں نہ اسے مزید طویل کر دیا جائے۔“ اس نے ہاتھ پکڑ کر  
مجھے اپنی طرف کھینچا۔

”ہاں۔۔۔ کیا تو چاہ سکتا ہے۔ اب تو میں کارڈ کا بھی پکا بندہ دست



چاہے تو تو ہو لیکن میں بھونکتی رہوں گی۔ تمہارے ذہن بھی سوال ہو تم اس کا جواب مجھ سے لے سکتے ہو۔

”تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”بہت سی باتیں تو پیر دانش نے خود بتائی ہیں۔“  
جواب دیا ”کہ وہ بہت احتیاط پسند آدمی ہے۔ دشمنوں کا بھی اپنی کسی بیوی کو بھی اپنے معلومات سے آگاہ نہیں کرتا۔ میرے بارے میں اسے کم از کم ایک بات کا یقین ہے کہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس لئے وہ بہت سی باتیں کہتا ہے۔ کچھ باتیں مجھے اصرار اور اسے معلوم ہوئی ہیں اور بارے میں میں نے اندازہ لگائے ہیں۔“

”اسے صرف تمہارے بارے میں یقین ہے کہ تم نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور تم ہی اسے نقصان پہنچا رہی ہو۔ اسے یہ عقلمند قدرت کہتے ہیں۔ شیطان صفت لوگ تمہارے کے ہمیدوں کی وجہ سے ہی مارے جاتے ہیں۔“ میں نے عالمانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”تم سے کسی نے اسے نقصان پہنچا رہی ہو؟ میں تو تمہیں تھوڑا سا ڈرا رہی ہوں۔ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔“

”بہت خوب“ میں نے محفوظ ہوتے ہوئے کہا ”یہ تو ہے۔ بھی تم مجھے اس کے رازوں سے آگاہ کر رہی ہو۔ نقصان پہنچانے کے حراوف نہیں ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے لٹی میں سر ملایا ”یہ باتیں تمہیں معلوم ہو ہی جانی نہیں۔ میں نے اپنے پاس سے ثبوت نہیں دیا۔ میرے پاس درحقیقت کوئی ثبوت ہے۔ میں نے صرف باتیں کی ہیں۔ باتوں کا کیا ہے؟ ان سے انکار کر سکتا ہے کہ وہ میں نے نہیں کہیں۔ پیر دانش کو یہ ہے کہ تم اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر چکے ہو۔ وہ تمہیں گھبرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ تمہیں بہت ڈراؤں لٹکانے لگاؤں کی کوشش کرے گا جس سے اس کی زبان شہ تک نہیں جائے گا۔ میں نے تو تمہیں صرف اس آگاہ کر کے ایک ٹکی کمانے اور ایک اچھا دوست بنانے کی ہے۔ تم یہ سب کچھ معلوم ہو جانے کے باوجود یہ نہیں بگاڑ سکو گے اس لئے میں کہہ رہی ہوں کہ میں نقصان نہیں پہنچا رہی۔ صرف تمہیں تھوڑا سا ڈرا رہی ہوں۔“

”یعنی تم عملی طور پر میرا کوئی ساتھ نہیں دے رہی پوچھا۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ دلتا تامل بولی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ میں تم سے کسی بلکہ یوں کو کتنا ہی

اس موقع کی تصویریں بھی اخبارات میں چھپ چکی تھیں۔ یہ بات کہیں کو یاد آجائی تو نظم کا تعلق پیر دانش سے جڑ سکتا تھا۔“

مجھے خود وہ پیشنگ ایک اہم سراغ محسوس ہوئی تھی اور میں نے شفیع شاہ کو اس کے بارے میں معلومات کے لئے کہا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ ابھی اس کے مالک کا نام معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن جلد یا بدیر ہر حال یہ بات معلوم ہو ہی جاتی۔ پیر دانش نے صحیح خطرو محسوس کیا تھا۔

فرح بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”اس سے پہلے پیر دانش بڑی کامیابی سے اپنے آپ کو اس کا رد بارے الگ تھلک رکھے ہوئے تھا۔ اس دھندے سے اس کے تعلق کا کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں تھا جس تک کسی کی رسائی ہوئی لیکن اس کیسٹ کی صورت میں گویا ایک ثبوت محفوظ ہو گیا تھا۔ اس لئے پیر دانش کی نظر میں فوراً وہ کیسٹ اہم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بیڑوم کا فرنیچر بھی بدل دیا تھا۔“

مجھے یاد تھا جب میں پیر دانش کی دعوت پر اس کے گھر گیا تھا تو اس نے مجھے بیڑوم میں بلوایا تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ شاید وہ بیڑوم ہی وہ سرا تھا یا پھر وہ بیڑوم بدل چکا تھا۔ اس نے شاید یہی سوچا تھا کہ اگر کسی طرح وہ فلم میری نظر سے گزر چکی تھی تو بیڑوم دیکھنے کے بعد اگر میرے ذہن میں کوئی شک موجود بھی ہو تو وہ نکل جائے۔ وہ واقعی بڑی چٹنی ہوئی چیز تھا۔

فرح بولی ”پیر دانش کو وہ کیسٹ خطرہ محسوس ہونے لگی تھی اسی لئے اس نے اس کا رد و جھکڑ والا پرنٹ بھی واپس منگو لیا تھا۔ نظریہ خیال اس کی اہمیت کے پیش نظر ہی اس کیسٹ کو بھی دیا کر بیٹھ گیا تھا لیکن اس کی بد قسمتی دیکھو کہ اسے کچھ ایسے حالات میں اپنے اسٹوڈیو والے پینٹلے سے رخصت ہونا پڑا کہ وہ دونوں کیسٹ ساتھ نہیں لے جاسکا۔ وہ شاید انہیں وہیں نہیں چھپا گیا تھا کہ حالات ذرا مناسب ہونے پر اور موقع ملنے پر وہ دوبارہ انہیں لے جائے گا لیکن اس بے چارے کو وہ موقع نہیں مل سکا اور اس دوران وہ کیسٹ کسی اور کے ہتھے چڑھ گئیں۔ شاید وہ تم ہو۔“ اس نے شوخی آمیز سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔

میں ان کیسٹوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیسٹ اس حد تک اہم ہوں گی۔ وہ میرے ہونٹوں کے کمرے میں یونہی بڑی تھیں۔ میں انہیں بے پروائی سے چھوڑ آیا تھا۔ میرے ہونٹوں کا کراہ کچھ زیادہ محفوظ جگہ بھی نہیں تھی۔ شاید پیر دانش کو وہاں ان کی موجودگی کا امکان نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے دلی دلی دعا کی کہ میری عدم موجودگی میں کسی نے ان پر ہاتھ صاف نہ کر دیا ہو۔

فرح نے جواب کے لئے اصرار نہیں کیا اور مجھے خاموش پا کر کندھے اچکاتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے تم اب بھی محتاط رہنا

چاہتی۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر میں تمہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کرنے کا وعدہ کروں؟"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"میں اب رتبہ لینے کے دور سے گزر رہی ہوں۔"

"تمہیں ایک داشتہ کی زندگی پسند ہے؟"

"مجھے داشتہ کی زندگی پسند نہیں۔ لیکن وہ سب کچھ پسند ہے جو داشتہ بن کر مجھے حاصل ہوا۔ یہ تحفظ۔ یہ ثبات۔ اس نے چاروں طرف اٹھادیا۔" بعض لڑکیاں سب کچھ لٹا کر شو بزنس میں آئے اور اچھی پھلی اشار بن جانے کے بعد بھی یہ کچھ حاصل نہیں کر سکیں جو میرے پاس ہے۔"

"لیکن ان کے پاس شہرت کی کشش ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"شہرت کی طرف سے میں نے صبر کر لیا ہے۔ شہرت عملی طور پر فائدے کی نہیں، نقصان کی چیز ہے۔ شہرت بھی درحقیقت لوگ انہی آسائشوں کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ شہرت کا خود اپنا تو کوئی مصروف نہیں ہے۔ انسان کی ننانوے فیصد جدوجہد کا محور مرکز دولت ہے۔"

"مثلاً تم ٹھیک کر رہی ہو۔ اسی لئے دنیا کا یہ حال ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بلکہ میں اس میں اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ننانوے فیصد انسانوں کی ننانوے فیصد جدوجہد کا محور مرکز دولت ہے۔"

"ہاں، یوں بات زیادہ صحیح ہوگئی ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "بہر حال... داشتہ کے طور پر میری "سزا" جلد ختم ہو جائے گی۔ میرا دانش کو مجھ سے کتنا ہی خصوصی لگاؤ بھی لیکن سال دو سال بعد یقیناً اس کا دل مجھ سے ہجرت جائے گا۔ میں اس فکر میں ہوں کہ اس دوران اس سے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لیوں۔ اس کے بعد وہ یہ بھی میں یہ ملک چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

"واہ... تمہاری سوچ تو کسی رشوت خوردہ پرور کوٹ سے ملتی ہے۔"

"دراصل مجھے اندیشہ ہے کہ میرا دانش نے مجھے آزاد کر دیا تب بھی میں صحیح معنوں میں آزاد تو نہیں ہوں گی۔ میری حیثیت اس چوڑی ہوئی ہڈی کی سی ہوگی جسے اپنے دست و خزان سے اٹھا کر گتے بابوں کے سامنے پیسٹک دیا جاتا ہے۔ میں وہ ہڈی بنائیں چاہتی۔ معلوم نہیں زندگی کس طرح گزرے۔ آخر عمر میں کیا حشر ہو۔ میں چپے سے باہر نکل جاؤں گی اور کیس سیل ہو جاؤں گی۔ اس قید خانے سے نکلنے کے بعد میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ قید نما آزادی کا دور اور درد شروع نہیں کرنا چاہتی۔"

"اگر میں میرا دانش کو تباہوں کہ تم نے مجھے یہ سب باتیں بتائی ہیں تو۔۔۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے اس موقع پر تمہیں دوست نہیں بنایا کہ تم اتنے گھٹیا آدمی بھی ثابت ہو سکتے ہو۔" وہ بولی "بہر حال... یہ دیا ہے۔ یہاں

کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تب بھی مجھے امید ہے کہ میں میرا دانش کو یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں گی کہ تم مجھ پر رول رہے ہو۔"

میں نے اس کا کدھا تھپکتے ہوئے کہا "میں مذاق کر رہا تھا۔ تم نے جس طرح آنکھیں بند کر کے میری طرف دیکھا وہ سب کچھ بڑا ہے۔ میں اس کا اتنا گھٹیا جواب واقعی نہیں دے سکتا۔ اچھا۔ یہ سب تمہیں ظفر جمال کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ وہ کہاں ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

"اس کے بارے میں جب میرا دانش کو کچھ معلوم نہیں تو مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔" وہ بولی "بہر حال وہ بڑا مضبوط انسان ثابت ہوا۔ اس نے ایک بار سر اٹھایا تو پھر بٹھا گیا۔ وہ اب تک بڑا پوش رہنے میں کامیاب ہے اور میرا دانش حقیقتاً اس کی طرف سے خوف زدہ ہے۔ وہ گھر کا بھیدی ہے۔ لڑکا جاسکتا ہے۔" اس صورت میں تو میرا دانش کو محض رقم کے لئے اس سے اتنا اختلاف نہیں برپا ہوتا ہے۔ جب اور معاملات میں وہ میرا پانی کی طرح بہتا ہے تو اسے بھی رقم دے کر اس کا منہ بند کرنا چاہئے تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں... جب بات بگڑتی ہے تو شاید یو ٹی وی بگڑتی چلی جاتی ہے کوئی پھول سی تلخ آہنی بڑی ہو جاتی ہے کہ پھر کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ دونوں طرف سے اُن کی دیوار کچھ زیادہ ہی بلند ہوگئی۔" بول۔ اس کی بات میں بڑی گہرائی تھی "میرا دانش سے تو خیر... روسیہ کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن جرت مجھے ظفر جمال پر ہے۔ اس نے بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اپنا سب کچھ واؤ پر لگا دیا۔ وہ اس لڑکی کو بھی کھو بیٹھا جس کی وجہ سے درحقیقت اس کے دل میں بے گناہی لے آئی مضبوطی سے جڑ پکڑی تھی۔ معلوم نہیں اب کہاں ہے اور کیا کرنا پھر رہا ہے۔"

میں نے اپنے لئے سکوت برقرار رکھا۔ ہم کافی ختم کر چکے تھے۔ بہت رگ و پے میں ایک خفیف سی سنسناہٹ تھی۔ حقائق کی وہ گتیا ہوئی تو خیر جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا اس کی تمام کڑواہٹیں تھیں۔ ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اب اصل سوال یہ تھا کہ میں اس مسئلے میں کیا کر سکتا تھا۔ یا مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟ اس سوال پر میں کسی شرط نامہ ماحول میں تنہا بیٹھ کر کسی سے غور کر سکتا تھا۔ اس کا فرادہ حیدر کے پہلو میں بیٹھ کر دیکھتا تھا۔ سیدہ عمر نمودار ہو رہا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔" میں نے کہا۔ "تم تو فون پر کسی سے کہہ رہے تھے کہ وہ دھاک دے گا۔ یہاں قیام زیادہ سے زیادہ طویل ہو۔" وہ شرر مسکراہٹ کے

بولی۔ "دل تو میرا بیک چاہ رہا ہے کہ میںیں چاروں لیکن کہاں

علاوہ یہ عین ممکن ہے کہ کسی بھی وقت پیر دانش یہاں موجود ہو۔ اور جب وہ یہاں ہوتا ہے تو فون دی اٹھاتا ہے۔ ہمیں جب بھی آنا ہو گا بغیر اطلاع ہی آنا ہو گا البتہ ہم ایک سنگل مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی گیت کے قریب کہنے میں دیوار پر بند ہی پر ایک بیلا گلوب لگا ہوا ہے۔ اگر وہ گلوب روشن ہو تو تم سمجھا کر کہ لاؤں گلوب ہے۔ اگر گلوب بجھا ہو تو پھر اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں وہ گیت اور گلوب ابھی تمہیں یاد کھا دوں گی۔

میں غصہ نہ کیا۔ وہ تو چہی نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی "نہیں کیوں رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں نے کسی کو بلانا چاہا ہے تو بندہ قلعہ میں بھی راستہ نکال لیتی ہے۔ نہ بلانا چاہا ہے تو کھلے میدان میں بھی راستہ نہیں دیتی۔"

"کھاگ مردوں والی باتیں مت کرو۔" وہ ہلکی سی تنبیہ کے انداز میں بولی "اور ہاں چاہیوں کیا ہے کچھا گھر میں ہی چھوڑ جانا۔ میں گارڈز کو بھی بتاؤں گی کہ یہ مجھے راستے میں پڑا ملا تھا۔ معلوم نہیں کیوں نامعلوم شخص اسے بیس پیچیک کیا۔ امید ہے چھوٹی چالی کی کسی کو کوئی محسوس نہیں کرے گا کیونکہ وہ بھی استعمال نہیں ہوتی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کوئی گارڈ یہ پوچھنے کی جرأت تو نہیں کرے گا کہ اس نامعلوم شخص نے تمہارے بیڑہ دم کا تالا کھول کر اندر گھسنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"میرے بیڑہ دم کی چابی اس گھبے میں نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "میرے بیڑہ دم کی چابی صرف پیر دانش کے پاس ہے۔"

"تمہارے پاس اس گھر کی کوئی چابی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے خود استہزائی کے سے انداز میں مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلادیا۔ پھر سر جھکاتے ہوئے بولی "میں نے بتایا تھا۔ میں دیوار کے محل میں قید شہزادی ہوں۔ اس کی عدم موجودگی میں سوئی رہتی ہوں۔ وہ آتا ہے تو جگا لیتا ہے۔"

"لیکن اس وقت تو تم کچھ زیادہ ہی بیدار اور ہوشیار ہو۔ بلکہ اپنے ساتھ تم نے مجھے بھی جگا رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"آج کی بات اور ہے۔ آج کی رات میری زندگی کی دلچسپ اور سنسنی خیز راتوں میں سے ایک ہے۔ تم نے ذرا مائی انداز میں اندر آکر اس سنسنی کو اور بڑھا دیا۔ برسوں بعد میں نے اپنی زندگی میں یہ ذرا مائی اور سنسنی محسوس کی ہے۔" اس کی آواز میں شکایت تھی۔

"اس سے پہلے کہ یہ سنسنی مجھے پھر اپنی لپیٹ میں لے لے۔ میں چلا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور بھی غم نہیں نہانے میں محبت کے سوا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن خبردار رہو۔ میں پھر آؤں گا۔ چور نے اب گھر دیکھ لیا ہے۔"

"اب روز روز تو یہ طریقہ کار کر نہیں رہے گا جس طرح آج آئے ہو۔" وہ بولی "ظاہر ہے تم گارڈز کو ہلاک کر کے تو نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں نے تائید کی۔ "اس صورت میں وہ آئندہ زیادہ محتاط رہیں گے۔ وہ اس واقعے کی پیر دانش کو رپورٹ بھی دیں گے گو کہ اس سے انہیں پیر کے خلاف غضب کا نشانہ بننے کا بھی اندیشہ ہو گا کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی گھر میں کھس گیا۔ شاید وہ تمہارا حلیہ بھی بیان کریں اور پیر دانش سمجھ جائے کہ وہ تم تھے۔"

"تم کیا کامیابی ستاؤ گی؟" میں نے جانا چاہا۔

"میں تو یہی کہوں گی کہ کوئی گھر میں کھسا تو تھا لیکن مجھ تک نہیں پہنچا سکا۔ میں ذیل دروازے متقل کر کے اس کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں کہاں پھر کر اور کیا کچھ کر کے چلا گیا۔" وہ بولی۔ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا "گارڈز سے بھی میں یہی کہوں گی اور میں ہی جا کر انہیں گیت ہاؤس سے نکالوں گی۔ کیوں نہ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں کہ اس واقعے میں چمکے کسی کا کچھ نہیں بکرا اس لئے بہتر ہے پیر دانش سے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ مجھے یقین ہے وہ خوشی سے مان جائیں گے کیونکہ دل میں تو وہ بھی جگا رہے ہوں گے۔"

"ہاں تجربہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "نی اللہ یہ بات پیر دانش تک نہ پہنچے تو اچھا ہے۔"

"آئندہ اندر آنے کی ترکیب بھی میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔" وہ ڈرنک ٹینک سے چاہیوں کا گچھا اٹھاتے ہوئے بولی جس میں ایک گارڈ کی بیٹ سے نکال کر لایا تھا۔ اس نے اس میں سے تلاش کر کے ایک چھوٹی سی چابی نکال لی۔

وہ چابی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "چنگے کی پچھلی دیوار میں درختوں کی اوٹ میں بالکل چھوٹا سا ایک ٹھیک ہے جو بھی استعمال نہیں ہوتا۔ ایک عرصے سے اسے کسی نے نہیں کھولا۔ اس میں لٹکے لاک لگا ہوا ہے۔ یہ اس کی چابی ہے۔ سنبھال کر رکھو۔ رات کو کسی وقت تم چنگے سے دو گیت کھول کر اندر آ سکتے ہو۔"

میں نے پہلے میں فون کر کے اطلاع دے دیا کروں گا تاکہ تم میرے ساتھ ہو۔ پھر ہی بلایا کرو۔" میں نے بڑی خوشی سے کہا۔

"یہ محنت مت کرنا۔" اس نے یہ کہہ کر میری خوشی پر پانی پھیر دیا "میرا خیال ہے کہ میرا ٹیلی فون ٹیپ ہوتا ہے۔ اس کے



مل بیٹھوں گا اور یوں اسنے رازوں سے پردے اٹھتے چلے جائے گے۔

میں جب اس بندگی سے نکلا تو صبح کا اجالا پوری طرح بھلا تھا۔ فضا سرسبز تھی اور دھنسیں کی گھنوں میں رات سے زارہ سنا تھا۔ میری گاڑی پر اس جی ہوئی تھی۔ غیبت تھا کہ میں لکڑی ہونے کے باوجود کسی نے گاڑی پر ہاتھ صاف کرکے کوشش نہیں کی تھی۔ اگر کوشش کی بھی ہوگی تو یقیناً کام نہ ہوگا۔ کیونکہ اس گاڑی میں کچھ خاص، مہی خفاقی انتظامات موجود تھے میں ہوئی پہنچاوت بھی میرے ذہن میں سمجھڑی کی ایک تھی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اس کھد پر قابو پا کر لگی تار سو گیا۔ دوسرے کو میری آنکھ کھلی۔ میں نے شادوئے کر بلا عا لباس پہنی شلوار لٹیں پہنا اور بیچے جانے کے ارادے سے گھر سے نکلے لگا۔ میرا ناشا گول ہو گیا تھا اور گزشتہ رات بھی میٹر کھانا نہیں کھایا تھا۔ فرح نے خود کھانا کھانے یا اس سطلے سے کچھ پوچھنے کا کلف بھی نہیں کیا تھا۔ اس وقت کھانے کا کبھت کو ہوش تھا۔ اب دوسرے کھانے کا وقت تھا اور زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں کھانے کے ارادے سے جانے لگا تھا لیکن پھر میں نے سوچا پہلے شیع شاہ سے فون پر بات جائے۔

مجھے نہیں معلوم تھا، وہ اس وقت کہاں تھا اس لیے میٹر اس سے مباحث فون پر رابطہ کیا اور اس سے پوچھا ”تم ان کہاں ہو؟“

”سر! میں محاورہ آؤں وقت عین آپ کی ناک کے نیچے اس نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”سر! میں آپ کے آفس میں ہوں اور کہنی کے مصلص مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں“ اس نے جواب دیا۔

چلا تھا کہ آپ علی الصبح ہوئی پہنچے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ نکلے ہوئے ہوں گے۔ آرام کر رہے ہوں گے۔ اس لیے میٹر آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا۔“

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا ”تھکا ہوا تو میں ابھی نہیں تھا۔ یونہی ذرا رستہ سو گیا تھا۔ اور اس وقت میں آپ کو جتنا تازہ دم محسوس کر رہا ہوں“ اس کا تم اندازہ کر سکتے۔“

”میں اندازہ کر سکتا ہوں سر!“ وہ کھنکھتے لیے میں بولا۔

”اگر اس وقت سولوا تمہارے پاس موجود ہے تو تم کچھ نہ کچھ تازہ دم تو ہونا چاہیے۔ خوب صورت لڑکی ہے۔“

”لیکن اس نے ساتھ اس کے دائرہ رقص کے والد کا بھی تو ہیں سر!“ وہ کراہ کر بولا ”میں تازہ دم ہونے کے علاوہ

فرح نے مجھے اس چہرے سے عقی گیت کے راستے ہی رخصت کیا جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ اس نے مجھے وہ نکلا گلوب بھی دکھا دیا جسے ہم نے سکل مقرر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا اگر میں اس گلوب کو مدشن دیکھوں بھی چہرے گیت کا آلا کھول کر اندر آؤں ورنہ اندر آنے کی کوشش نہ کروں۔

مجھے چھٹی کئی سے گھوم کر اٹھتی کئی میں آنا پڑا کیونکہ میری گاڑی وہاں لکڑی تھی۔ میں نے اسے پتکے کے اندر لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں جب گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوا تو شب رشتہ کا شمار جلدی میرے ذہن سے اتر گیا اور ان گت اٹھے اٹھے خیالات نے ذہن پر پلٹنا کر دی۔

فرح بہت ہی حقیقت پسند اور سفاکی کی حد تک عملی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بیروانش کا ہر راز اس کے دل کی ہر بات۔ اور اپنے بھی دل کی ہر بات مجھے بتادی تھی لیکن بیروانش کے خلاف استعمال ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا والدانہ پن اس کا خوش و فروش اور میرے لیے اس کے جذبات اپنی جگہ تھے لیکن وہ کوئی خطرہ مول لینے اور اپنی پریش زندگی کو ڈسٹرب کرنے کے لیے تیار نہیں تھی حالانکہ میں نے اسے انہی تمام آسانسوں کی بھی پیکٹس کی تھی جو اسے بیروانش نے میا کی ہوئی تھیں لیکن وہ اس لالچ میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس کا کتنا تھا کہ میں اسے سچ میں لانے بغیر اور اسے کسی خطرے سے دوچار کیے بغیر بیروانش کے خلاف خواہ کچھ بھی کرنا رہوں اسے کوئی پروا نہیں ہو گی۔

بہر حال اس سے ملاقات بہت قلمہ مند رہی تھی۔ یہ رات صرف اسی کے لیے نہیں میرے لیے بھی سنسنی خیز اور ڈرامائی تھی۔ بھرپور تھی۔ ایک مدت بعد فرح بھی لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی جو نہیں ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا مختلف بھی تھی۔ اپنے دامن میں زندگی سے بھرپور، ان گت وحشی جذبے پہنچائے ہوئے تھی۔ وہ دوسرے کی رگ رگ میں بھی زندگی بھر دینے کا ہنر جانتی تھی۔ میرے نزدیک بڑے انوس کا مقام تھا کہ اتنی شاندار لڑکی بیروانش جیسے بے ہودہ آدمی کے بچے میں تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ رات کو اس سے پھر ملے آؤں گا۔ گوکہ اس سے ملاقات چھٹی نہیں تھی لیکن قسمت آزمائی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بیروانش باہر گیا ہوا تھا۔ لگہ و گاہ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ ٹل ایسٹ ہی گیا تھا لیکن امید تھی کہ اس کی واپسی میں کم از کم دو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔ فرح سے ملاقات نے دل و جان کو جو راحت بخشی تھی وہ تو اپنی جگہ تھی لیکن معلومات میں بھی بہت اضافہ ہوا تھا۔ حالات پر چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی تھی۔ بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ بہت سے مسئلے حل ہو گئے تھے۔ میں نے جب اسے اچانک ان پورٹ پر دکھا تھا تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ شخص اس کا نقاب کر کے میں اس طرح اس سے

آرٹسٹ سے میرا رابطہ ہو گیا اور اس نے بلا تامل مجھے بتادیا کہ اس کی وہ پیشنگ کسی نے خریدی تھی۔ سزا آپ اس شخصیت کا نام سن کر حیران رہ جائیں گے۔

”نہیں شفیق زہرا! میں اس کا نام سن کر ہرگز حیران نہیں ہوں گا“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا ”کیونکہ مجھے اس کا نام معلوم ہو چکا ہے۔ اس کا نام پروانش ہے۔ تم مجھے کیا بتانا چاہتے تھے؟“

”میں سزا“ وہ قدرے باپری سے بولا۔

”اب اس..... معاملے میں سرکھپانے کی ضرورت نہیں“ میں نے کہا ”اس سارے حقدے کی تفصیلات سامنے آگئی ہیں۔ تمام گتھیاں سلجھ گئی ہیں۔ اس سارے ریکٹ کی تہ میں پروانش ہی نکلا۔“

”لگتا ہے آپ کی رات بڑی مطلوبات افزا جگہ پر گزری ہے“ شفیق شاہ بالکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ اس کا مواظبت بہت ہی خوش گو اور تھا۔ میں نے فون پر شاؤن اور سی اس کی ہنسی سنی تھی۔ لگتا تھا سلوا کی صحبت غیر محسوس طور پر اپنے اثرات دکھا رہی تھی۔

”ہاں شفیق شاہ!“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا ”وہ واقعی بڑی مطلوبات افزا جگہ تھی۔ تم تصور نہیں کر سکتے میرے علم میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔“

”پروانش بھی آخر پروانہ تو ت یا پھر قسمہ پاشم کی چیز ہی نکلا“ شفیق شاہ بولا۔

”اے سن سے بھی زیادہ گھٹیا اور زیادہ خطرناک“ میں نے جواب دیا ”مسئلہ یہ ہے کہ اب اس کے ملے میں کیا کیا جائے؟ ہونا کو قتل بھی اسی نے کرایا ہے لیکن اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی محسوس اور واضح ثبوت نہیں۔ کوئی ایسا ثبوت جو اس کے کڑوت کے مطابق ایسی سزا دلوائے جس کا وہ مستحق ہے۔“

”تو پھر اسے ذاتی عدالت سے سزا دلوانی ہے۔ اس کا پتا صاف کر دیتے ہیں“ شفیق شاہ جی آواز میں بولا۔

”میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ میں نے اس امکان پر غور کیا تھا“ میں نے کہا ”اس سے ہمارے لیے اُلجھنیں کھڑی ہو سکتی ہیں اور میں فی الحال اُلجھنیں مول نہیں لینا چاہتا۔ خدا خدا کر کے ہمیں ذرا سکون کی سانس لینا نصیب ہوا ہے۔“

”ویسے..... اتفاق سے ہی ایک پارکک سا جوت میرے پاس محفوظ ہو گیا ہے۔ اگر وہ کسی کام آئے.....“ شفیق شاہ گویا کچھ سوچنے ہوئے بولا ”اس آرٹسٹ سے جب میرا رابطہ ہوا اس وقت میں یونسی اعتباراً آفس والے اس فون پر بات کر رہا تھا جس پر بات چیت ٹپ کی جاسکتی ہے۔ آرٹسٹ کی اپنی آواز میں یہ بات ریکارڈ ہو چکی ہے کہ اس نے وہ پیشنگ پروانش کے ہاتھ فروخت کی تھی۔ وہی پیشنگ اس بے ہودہ فلم میں دیکھی گئی تھی۔“

”یہ واقعی بہت پارکک سا جوت ہے۔ اس کی بنا پر عدالت میں

بہت دور ہوں۔ ابھی تو میں صرف مغزوری کے مراحل میں ہوں“ بات چیت چوتھ اردو میں ہو رہی تھی اس لیے شفیق شاہ نے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مسٹر رائی اور سلوا اردو ذرا بھی نہیں جانتے تھے۔

”میں چھوٹا نہ کروں خود دار لڑکی اکثر بڑے آدھ دم ہونے کے مراحل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ صرف تمہارے فرمائش کرنے کی دیر ہے۔ لڑکی کے والد اگر مایوس نہ ہوں گے کہ صاحب زادی ساتھ ڈنٹ پر جاتے دیکھ کر خوش ہوں گے کہ صاحب زادی پاکستان میں بھی فوراً مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

”لیکن سب وہ تو بار بار آپ کے بارے میں پوچھے جا رہی تھی۔“

”اس سے یہ مطلب ہرگز مت لینا کہ وہ مجھ پر عاشق ہو گئی ہوگی“ میں نے گویا اسے تسلی دی۔

”بہر حال..... وہ آپ کے بارے میں تشویش اور جھنجھس میں ضرور مبتلا ہے۔ شاید اس نے اس میں اپنی توہین بھی محسوس کی ہو کہ آپ اس جیسی خوب صورت اور سفید فام لڑکی کے ہونے ہوئے ایک دلی لڑکی کے پیچھے بھاگ لیے“ شفیق شاہ بولا۔

”اور!“ میں نے کراہ کر کہا ”کیا انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میں لڑکی کے پیچھے بھاگ ہوں۔“

”ظاہر ہے سزا اب وہ یہ تو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آپ بڑی بڑی منجھول والے ان کارڈز کے پیچھے بھاگے ہوں گے لیکن سب..... ایسے بے چارے ہیں بڑے وضع دار لوگ..... بظاہر انہوں نے آپ ہی کی بات پر اعتبار کیا ہوا ہے اور بار بار آفیس کے ساتھ یہی کے جا رہے تھے کہ بے چارے افضل صاحب کو اچانک ضروری کام یاد آنے کی وجہ سے بھاگنا پڑا۔“

”ان کی اس وضع داری پر میں ان کا شکر گزار ہوں“ میں نے کہا۔

شفیق شاہ کو جیسے کچھ یاد آیا ”سزا! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں فی الحال آپ کو ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہوں۔ آپ نے مجھے ایک مشہور آرٹسٹ سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی جس کی ایک مشہور پیشنگ ہم نے اس بیڈ روم میں آویزاں دیکھی تھی جو موتا کی اس بے ہودہ فلم میں دکھایا گیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ آرٹسٹ اپنی پیشنگوں کی نمائشوں کے ملے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے اور میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس کے لیے میں ہلکا سا جوش و خروش جھلک آیا تھا۔

”ہاں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ کوئی اتنی پُرانی بات تو نہیں جو تم مجھے اس طرح یاد دلار ہے۔“ میں نے کہا۔

”سزا! سابق دہائی کے ساتھ بات کرنا پھر بھی بہتر رہتا ہے“ شفیق شاہ عائدہ لے کر بولا ”میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس

خود بخود نکل آتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سہرا جیسے آپ چاہیں گے ہم سب وائٹس پر اسی طرح ہاتھ ڈالیں گے۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کس سے پالا بڑھا تھا۔ اس نے خود آگے بڑھ کر اپنی شامت کو آواز دی ہے۔ معلوم نہیں اسے کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ وہ اگر آپ سے ملے۔“

”اپنی داستان میں تو وہ ہمیں گھیر رہا ہے۔ وہ ہم سے کچھ معلوم کرے اور ہمیں کسی معاملے میں الجھانے کی فکر میں ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”یوے بھی وہ ہمارے معاشرے میں پلے ہوئے فرعونوں میں سے ایک ہے۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں ہوگا کہ اس کا بھی کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ سب اس مسئلے کو تو اب بعد میں دیکنا ہوگا۔ فی الحال جو مسئلہ درپیش ہے اس پر تھوڑی سی توجہ دیجئے۔“ شفیع شاہ بولا۔

”منی الحال کیا مسئلہ درپیش ہے ہمیں؟“ میرے کان کھڑے ہوئے۔

”یہ جو آپ کے سمان آئے ہوئے ہیں انہیں بھی تھوڑا سا وقت دیجئے۔ حالانکہ کاروباری معاملات میں ان سے ملے کرنا جاہل ہوں پھر بھی نہ جانے کیوں انہیں آپ سے ملنے، آپ سے باتیں کرنے اور آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا اشتیاق ہے۔ ان کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔“

”یہ تمہاری ہی کوئی کارستانی ہوگی۔ گناہ ہے تم مجھے انگریزوں میں پاپولر کرانے کے مشن پر لگے ہوئے ہو۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا سہرا۔“ شفیع شاہ خوشگوار لہجے میں بولا ”میں نے تو ان سے آپ کے بارے میں کوئی خاص بات بھی نہیں کی۔ بڑے میاں آج کے دور کے بزنس مین ہیں، پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان کے کسی گوشے میں کسی ایسے ہی روایت پسند بڑے انگریز کی روح چھپی ہوئی ہے جو مشرق کو ”پراسرار مشرق“ کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور جنہیں ہر ایشیائی کے وجود سے پراسراریت کی بو آتی تھی۔ آپ تو انہیں کچھ زیادہ ہی پراسرار محسوس ہوئے ہیں۔“

”اوہ۔۔۔ میرے خدا! میں کر رہا! اللہ میرے حال پر رحم کرے۔ تم نے انہیں سمجھایا نہیں کہ میں ایک سیدھا سادہ بزنس مین ہوں۔“

”مجھے ان کو کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ براہِ راست آپ کے بارے میں زیادہ بات نہیں ہوئی۔ یہ تو میں آپ کو ان کے وہ محسوسات بتانے کی کوشش کر رہا ہوں جنہیں ابھی زبان نہیں ملی۔“

”اوہ۔۔۔ شفیع شاہ! تم نے تو اب لوگوں کے دلوں میں بھی جواگتا شروع کر دیا۔“ میں نے گویا پریشان ہو کر کہا ”دیکھو۔۔۔ مجھے

کوئی بڑا فیصلہ ہونا بہت مشکل ہے۔ پیروائش جیسے لوگ اپنے بچاؤ کے لیے شاطر و کیوں کی ایک پوری فوج لاکر عدالت میں گھڑی کر سکتے ہیں جو اس ثبوت کو جھٹلانے کے لیے نہ جانے کون کون سی کمائیاں گھڑیں۔ بہرحال تم اس ثبوت کو بھی سنبھال کر رکھو۔ بعض اوقات کوئی معمولی سی چیز بھی بڑا کام دے جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کیا واقعی اس غیبت کو قانون اور عدالتوں وغیرہ کے پتھر میں گھیرنا چاہتے ہیں؟“ شفیع شاہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں شفیع شاہ! میں نے جواب دیا ”میں چاہتا ہوں اس مسئلے میں زیادہ سے زیادہ تحقیقات منظرِ عام پر بھی آئیں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ وہ کیسی کیسی شخصیات کو دیوانہ بنا کر پھرتے رہتے ہیں۔“ میں ابھی تحقیقات تو آپ سے سنوں گا۔ لیکن مجھے اعزاز ہے کہ اس کے گرگوں کا بہت بڑا نیٹ ورک ہوگا۔ جب آپ اس غیبت کو قانون کے طبقے میں پھنسانے گے تو ہمیں ان بد معاشرلوں کے زیادہ غریب و غصب اور خو غراوی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ شفیع شاہ نے احساس دلایا۔

”اس کی ہمیں زیادہ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس قسم کے بد معاشر ہمارے لیے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟“ میں نے کہا ”اس غیبت و غصب کے مقابلے میں ہمیں فائدہ بہت بڑا حاصل ہوگا۔ اس قسم کی شخصیات کا محروم ہونا چاہیے۔ آخر لوگ کب تک بے وقوف بننے رہیں گے؟“

”قیامت تک سہرا۔“ شفیع شاہ نے اطمینان سے جواب دیا ”لوگوں میں۔۔۔ خصوصاً ہمارے لوگوں میں بے وقوف بننے کی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ بس کوئی بے وقوف بنانے والا ہونا چاہیے۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ اچھے بھلے لوگ جنہیں ہم پڑے ٹھکروں۔ بلکہ بعض اوقات دانشوروں میں شمار کرتے ہیں، عجیب عجیب حقائق میں جھٹا ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر حیرت ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے ”حسین“ افکار و نظریات پر روشنی ڈالتے ہیں تو تاریکی کو شرم آنے لگتی ہے اور جب وہ اپنی زبان سے ہمیں حاشا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو جہالت منہ چھپا کر کسی طرف کو نکل جاتی ہے۔ ان حالات میں ایک پیروائش کے بے نقاب ہونے سے کیا فرق پڑے گا؟“

”کچھ نہ کچھ فرق پڑے گا شفیع شاہ! میں نے ملائمت سے کہا ”موسمائی کی شکل بگڑتی بہت تیزی سے ہے۔ سنو رتی ذرا آہستہ آہستہ ہے۔“

”ٹھیک ہے سہرا! تو آپ کی بات سامنے والوں اور آپ کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں۔“ شفیع شاہ بولا ”آپ نے اسے گھبرانے کا کیا طریقہ سوچا ہے؟“

”منی الحال تو میرے ذہن میں کوئی طریقہ نہیں۔“ میں نے اعتراف کیا ”لیکن مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی طریقہ نکل ہی آئے گا۔ انسان ایک بار کسی ایسے کام کا ارادہ تو کر کے دیکھے۔ اسباب

سادگی اور مصوصیت تھی۔ وہ اگر کچھ جانتا بھی جانتی تھی تو شاید تجسس اور اشتیاق کے تحت جانتا چاہتی تھی۔ اس کے انداز میں طرز ہرگز شامل نہیں تھا لیکن میرے اس طرز دیکھنے سے وہ کچھ گزرا گئی اور جلدی سے مہذرت خواہانہ سے انداز میں بولی "اگر میرا یہ سوال ذاتی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے بھول جائیے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے مسکراتے ہوئے اسے قلبی دی "میرا کام عملی بخش طریقے سے ہو گیا تھا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا" اس نے سر ہلایا اور جلدی سے موضوع بدل دیا۔ انگریز موسم کی بات کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے چند لمبے موسم پر اظہار خیال کیا پھر میری شلوار قمیص کے بارے میں رائے کا اظہار کرنے لگے کہ یہ بڑا آرام دہ لباس تھا اور اب انگلینڈ میں انگریز بھی اس سے روشتاس ہوتے جا رہے تھے۔ اگاد کا انگریز اسے پہنے ہوئے بھی پائے جاتے تھے۔

"مجھے جا کر ذاتی طور پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے ہمارے لباس پر نظر عنایت کی" میں نے انکساری سے کہا "دور نہ ہم بے چارے تو ہم تک آپ کے لباس کو ہی اعلیٰ اور افضل سمجھ کر زیب تن کرتے ہیں اور اگر کہتے پھرتے ہیں۔"

برائے خوش مزاجی سے بولا "ہم اس کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر عزت اور غیرت کے سوال اٹھتے ہیں اور نہ ہی لباسوں کو سرحدوں میں متفیہ کرنا چاہیے۔ میرے ذاتی خیال میں تو لباس کو کسی قوم کی میراث نہیں ہونا چاہیے۔ جس کو جو اچھا لگے اسے وہ پہن لینا چاہیے۔"

"اور اگر کسی کو کچھ بھی اچھا نہ لگے تو بے شک وہ کچھ بھی نہ پہنے۔ اس کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے جیسا کہ آج کل زیادہ تر امریکا اور یورپ وغیرہ میں ہوا ہے" میں نے تصدیق دیا۔

برائے اور سلویا خوش خلقی سے پہنے۔ انہوں نے اس ریمارک کا بڑا نہیں منایا۔ برائے اپنا پیچیدہ اظہار خیال جاری رکھتے ہوئے بولا "اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے۔ ہمیں تو پوری دنیا کے انسانوں کو کچھ مشترکہ اقدار تہذیب کی زنجیر میں بوندے کی باتیں کرنی چاہئیں۔ چنانچہ ہم لباس زبان اور اس قسم کی پھولی پھولی باتوں کے فرق پر ایک دوسرے سے دور ہوتے رہیں۔"

میں خاموش رہا۔ میں اسے کیا بتانا کہ ہمارے ہاں اکیسویں صدی اس قسم کی زیادہ بڑی بڑی غلطیوں سے کر آ رہی تھی اور ان غلطیوں کو وسیع تر کرنے میں بہت سے ترقی یافتہ ممالک حسب توفیق ہاتھ بٹا رہے تھے مسئلہ یہ تھا کہ سب سے زیادہ خراب خود ہم میں تھی۔ ہم کسی اور کو کس منہ سے دوش دے سکتے تھے؟

سلویا نے شاید غلط محسوس کر لیا تھا کہ کہیں کوئی پیچیدہ سیاسی بحث نہ شروع ہو جائے۔ اس نے جلدی سے ہاپ کو ٹوک دیا "اب کچھ بڑس کی بات بھی ہو جائے۔"

اس پر تو اعتراض نہیں ہے کہ تم سلویا کے دل میں جھانکنے کی کوشش کرو۔ لیکن جنہیں کم از کم اس سرسیدہ فلسفی نما برنس میں کے دل میں جھانکنے سے تو پرہیز کرنا چاہیے۔ اس سے تمہاری ذہنی حالت پر بڑے عجیب اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔"

"میرا آپ بات کو ماننے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ انہیں غور و ملاحظہ دے دیں تو میں کچھ دوسرے کاروباری معاملات نہایت جگہ کافی پہلے سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔" شفیع شاہ مجید کی سے بولا "میرا مدبر کا کھانا آج ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت بڑے افسر کے ساتھ جم خانہ میں ملے ہے۔ آپ دوسرے کا کھانا ان باپ بیٹی کے ساتھ کھائیں تو کام بہت جلدی ہو گا اور یہ لوگ خوش بھی ہو جائیں گے۔"

"شفیع شاہ! اگر تم ناشرے پن پر تلے ہو تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے گویا اس کے فیصلے پر اظہار افسوس کیا "تم ایک خوب صورت نوجوان غیر ملکی لڑکی کو چھوڑ کر کسی دہی کھانے کے ساتھ برنس لے کر جانا چاہتے ہو تو میں تمہاری حالت پر افسوس ہی کر سکتا ہوں۔ میں تو خیر ویسے بھی انہی باپ بیٹی کے پاس آنے والا تھا۔ لیکن کیا تمہارا جاکہ بہت ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے" سر اسٹوڈ کے لیے مزید کچھ آسانیاں پیدا کرنے کا مسئلہ ہے۔" شفیع شاہ جیسے لمبے میں بولا۔

"تمک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔ تم بے جا مانا۔ لیکن جانے سے پہلے ڈانٹک ہال میں ایک پُرکلف انگریز کیلوز لے جا کا اہتمام کراتے جاؤ" میں نے کہا۔

"وہ سب ہدایات میں پہلے ہی دے چکا ہوں سراسر اب آپ جلدی سے آجائیے۔"

میں نے فون بند کیا اور شلوار قمیص میں ہی اٹھ کر نیچے چاہا۔ وہ تینوں آفس میں موجود تھے۔ باپ بیٹی کے ہاتھوں میں ڈرکس تھیں۔ شفیع شاہ چائے پی رہا تھا۔ سلویا سرخ رنگ کے ہاف ٹراؤز اور سیاہ رنگ کی مختصری بلاؤز نما قمیص میں مٹی جیسے غالباً اس کے لیے ڈانٹک ہال جاتا تھا کہ اس میں آگے کی طرف کپڑے ہی سے ایک گریڈ پینڈا سا بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس ڈانٹک کا مقصد یقیناً اس مختصری قمیص کو کچھ اور مختصر بنانا ہی ہو سکتا تھا۔

روایت پسند انگریز زیادہ گرم جوشی کے قائل نہیں ہوتے لیکن وہ باپ بیٹی واقعی کچھ اس طرح لے جیسے میں ان کے خاندان کا کوئی نعمت انہم نمکدہوں سے چھڑا ہوا فرد تھا۔ فرد بھی ایسا جس سے انہیں کوئی بہت بڑا فائدہ پہنچنے کی امید تھی۔

جب سب دوبارہ سکون سے بیٹھ چکے اور رسمی جملوں کا تبادلہ ہو چکا تو سلویا نے ٹھٹھکی ہوئی آواز میں پوچھا "میرا افضل! آپ کو اچانک جو ضروری کام یاد آیا تھا وہ ہو گیا تھا؟"

میں نے ٹوٹے والی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا کہ کہیں موصوفہ طرز تو نہیں فراموش تھیں لیکن اس کے چہرے پر

۳۴ ہاں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں؟ براؤن نے چونک کر گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے کہا۔ شفیق شاہ نے کچھ فائنل میں سے سامنے رکھتے ہوئے بھی بتایا کہ کون کون سے معاملات پر وہ بات چیت کر چکا تھا؟ کون کون سے معاملات مجھے فائنل کرنے تھے اور آئندہ کے لیے ہمیں کن کن معاملات کی ایک دوسرے کے سامنے وضاحت کرنی چاہیے تھی۔

یہ ایک طرح کی غیر رسمی میٹنگ تھی جس میں اب شفیق شاہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت ہو گیا۔ ہمارے درمیان باتیں چلتی رہیں۔ کاغذات کے تباہ لے ہوتے رہے اور بہت سے کاغذات پر دھخ بھی ہوئے۔ براؤن ہماری لیدر کا وہ نوعات تیار کرنے والی ایک فیکٹری کا قاضی دودھ بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ فیکٹری ہم نے لاہور میں لگائی تھی۔ براؤن اپنی ضرورت کے مطابق وہاں کارکنوں کو زبانی خود کچھ ہدایات دینا چاہتا تھا جنہیں تحریری طور پر ایک دوسرے کو سمجھانے میں ذرا دشواریاں پیش آتی تھیں۔ براؤن کو اپنے دیگر کاموں کے سلسلے میں لاہور جانا ہی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہاں راجیلہ اسے فیکٹری دکھاوے گی۔ وہ وہاں میری قائم مقام کے طور پر کام کر رہی تھی۔

اس پر سلویا نے ذرا آنکھیں کھائیں مگر کچھ بولی نہیں۔ غصے اُمید تھی کہ جب وہ بیڑہ آفس میں ایک سیاہ پوش لڑکی کو میری جلد سنبالے دیکھے گی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگے گا۔ خصوصاً جب وہ گوشے کے بارہو زرا جلد کے چرے کی جھلک تک نہیں دیکھ سکے گی۔

آخر کار ہماری غیر رسمی میٹنگ ختم ہو گئی۔ ہم نے ہاتھ ہاتھ میں تھپتھپ سے باضابطہ طور پر کوئی پروگرام طے کیے بغیر تقریباً تمام معاملات نمٹا دیے تھے۔ جس پر اب براؤن اور سلویا کو خود بھی حیرت ہو رہی تھی کیونکہ وہ لوگ باقاعدہ وقت طے کر کے بڑی سنجیدگی سے بریف کیس اُٹھا کر باضابطہ قسم کی میٹنگوں میں ضروری معاملات طے کرنے کے عادی تھے۔ یہاں ہنس مذاق میں سب کچھ ہو گیا تھا اور انہیں احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ دوسرے کے کھانے کا وقت بھی گزر گیا تھا اور انہیں کھانا بھی یاد نہیں آیا تھا۔ بیڑہ ویرنے نے کراہیوں کا کہہ کر انہیں کھانا کھانا چاہیے تھے۔ میں براؤن اور سلویا کو ساتھ لے ڈانٹا۔ ہاں میں آگیا۔ ایک وی آئی پی میز ہمارے لیے مخصوص کی گئی تھی۔

ہاں میں بہت کم لوگ تھے۔ صحیح وقت پر کھانا کھانے والے بیشتر لوگ کھا کر جا چکے تھے۔ ہم لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے تک ہاں میں لوگوں کی تعداد کچھ اور کم ہو گئی۔ جو موجود تھے ان میں سے بھی بیشتر کن آنکھوں سے سلویا کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں چند سفید فام غیر ملکی بھی شامل تھے۔

ان دنوں میری عادت سی بی سی تھی کہ جہاں بھی سفید فام غیر ملکیوں کو دیکھتا تھا، ایک آدھ مرتبہ غیر محسوس طور پر اچھی طرح ان

کا جائزہ ضرور لیتا تھا کہ کہیں ان میں مجھے کی جگہ تہذیبوں کے ساتھ ڈاکٹر برنارڈ تو شامل نہیں تھا۔ میں نے ان غیر ملکیوں کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا تھا حالانکہ اپنے ہی ہوسٹل میں اس کی موجودگی کی توقع رکھنا محض حماقت تھی۔ دوسرے ڈاکٹر برنارڈ تو سفید فام سے سیاہ فام اور ایشیائی بننے پر بھی قادر تھا۔ اسے سفید فام وکر اپنے لیے خطرات بردھانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے اپنے کچھ آدمی اور خفیہ محکموں کے کچھ نوک بھی بدستور اس کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن ابھی تک کسی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

ہم لوگ کھانے کے بعد کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ خوش گپیاں بھی جاری تھیں۔ سلویا کافی کی چسکی لینے کے بعد ہزار اہنا چودھو دونوں ہاتھوں کے ملتے میں نکالیتی تھی اور یوں گرمی نظر سے میرا جائزہ لینے لگتی تھی گویا میں کوئی پیچیدہ قسم کی مشین تھا جسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شہرے بالوں کی ایک لٹ برابر اس کی پیشانی پر ڈھلک آئی تھی جسے وہ سرسری آنکھوں سے ہٹا دیتی تھی۔ آج وہ کل سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے سرخ مرطوب ہونٹ اکثر نیم دار رہتے تھے اور ان کے عقب سے موتیوں جیسے دانت جھلکتے رہتے تھے۔ خوب صورتی کے علاوہ اس کا پورا وجود گویا صحت مند سی سے بھی دھلکا تھا۔ اس کی سرخ و سفید بے داغ جلد میں گویا ہمیں جھک کا احساس ہوتا تھا۔ اس کی شفاف ٹیلی آنکھوں میں سنجیدگی بھی گم نہ جانے کیوں احساس ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں کھیں اور پہنی ہوئی تھیں۔

دفتر کا نہایت دھیمی اور سنگٹاتی سی آواز میں بولی "سسر افضل! نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا ہے کہ آپ کا دھیان اس وقت گفتگو میں ہے۔"

"کیا؟" میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ یہ بات تو میں اس سے کرنا چاہتا تھا، افلا تا میں کہہ رہا تھا۔ انا اس نے مجھ سے کہہ دی تھی۔

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تو اس وقت جاہلوں بھی... تو اب دھیان کسی اور طرف نہیں لے جا سکتا۔ کیا ہال میں اس وقت تم سے زیادہ خوب صورت کوئی لڑکی موجود ہے جس کی طرف میں دھیان دوں گا؟"

سلویا جب میری کی چسکیاں لے رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں غماز کی جھلک نظر نہیں آتی تھی لیکن اب اس کی آنکھوں میں نشہ سا جھلک آیا۔ سسر براؤن بھی خوشی اور فخر سے مسکراتے گئے۔ انگریزوں کے ساتھ بیٹھنے میں یہ فائدہ تھا۔ آپ باپ کے سامنے بیٹا کر دل کھول کر بیٹی کی تقریبات کر سکتے تھے۔ اس کے حسن کے قصیدے پڑھ سکتے تھے۔ والد صاحب آپ کی اس قدروانی اور جوہر شایاں آپ کے شکر گزار ہو سکتے تھے۔ بڑا نہیں مٹا سکتے تھے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مزید کہا "بلکہ یہاں تو کوئی لڑکی مرے سے سوجھ رہی نہیں ہے۔ میں کوئی پاگل ہوں جو ان حالات میں میرا دھیان کسی اور طرف ہو گا؟"

میں ہر بات کو کسی اور طرف ٹھکانے کی کوشش نہ کریں مسٹر "آپ بات کو بولی "میری مراد یہ تھی کہ آپ جیسے تو افضل "وہ ہنسنے لگے۔ باتیں بھی ہمارے ساتھ کر رہے ہیں لیکن ایسا عموماً ہو رہا ہے۔ آپ سوچ کچھ اور رہے ہیں۔"

"کچھ عمر نہ تھی مگر نادان ہرگز نہیں تھی۔ بہت گہری باتوں پر اس کی نظر تھی۔ یقیناً وہ ان چیزوں کو بھی محسوس کرتی تھی جن کی طرف سلی لوگوں کی نظر نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ میری بہت پرانی بیماری ہے اور تقریباً علاج ہے۔ میں پتھر ٹھیک فارم ہے۔ اللہ نے صورت ہی کچھ ایسی بنائی ہے کہ لوگوں کو مجھ سے بات کرتے وقت شبہ ہوتا ہے شاید میں کچھ اور سوچ رہا ہوں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ میں اس وقت صرف تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے اپنا حسین چہرہ دونوں ہاتھوں کے پالے میں نکالتے ہوئے غمور مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "جی کہ تمہارے ڈیڈی نے بہت صحیح فیصلہ کیا کہ کاروبار اب تمہارے پر چھوڑنا چاہیے۔ مجھے امید ہے تم کاروبار اپنے والد سے سہرا چلاؤ گی۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر خفیف سی ہلکی سی چھائی۔ شاید وہ اس وقت کاروبار کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی تھی۔ بہت دیر وہ کاروبار میں مگڑھا کھانچا کھی۔ شاید اس سے زیادہ دیر کے لیے کاروبار میں آگئے رہنے کی ابھی اس کے ذہن میں گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا باب خوش ہونے ہونے بولا "تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا مسٹر افضل بالکل ٹھیک۔"

درحقیقت اس وقت خود سلویا کا ذہن کیسے اور تھا۔ شاید وہ کبھی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ کچھ اور سرخ نظر آنے لگے تھے کہ وہ اس نے کھانا میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی لب اسٹک بھی نہیں تھی۔ کوئی اندرونی پیش تھی جو اس کے وجود کو دکھا رہی تھی۔ اس کی طرف مسلسل دیکھتے ہوئے میں خود بھی اپنے آپ کو کچھ کم عمر محسوس کرنے لگا تھا۔

میں اس کے بارے میں کھانا کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا اس کی شفیق شاہ سے دوستی ہو جاتی تو اچھا تھا لیکن انسان کی طبیعت پر اس کے ماحول اور ارد گرد کی بے جان چیزوں تک کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ تو پھر بھی ایک زندہ سلامتی لڑکی تھی جس کی پرورش پورے زندگی کا ارتقا پیش پھوٹ رہا تھا۔ میں خواہ خواہ ہی اپنے آپ کو ہواؤں میں بکھوڑے لیتا محسوس کر رہا تھا حالانکہ میں نے ذرا بھی نہیں پی تھی۔

مگر ان تمام خوب صورت محسوسات کے درمیان کہیں کوئی پھنسی سی بد مزگی تھی، کوئی غلط تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی جیسے بہت خوب صورتی سے چپے ہوئے کسی نہایت عمدہ دسترخوان پر کوئی کبھی بھنجانا رہی ہو۔

جلد ہی مجھے اس کی وجہ معلوم ہو گئی۔ وجہ بہت دور گونے کی ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک سفید قام نوجوان تھا۔ خاصا نکمرا اور دراز قد تھا۔ سر پر اسی طرح بے مال بنا ہوا تھا جس طرح آج کل زیادہ تر لفظ کے اور گردہ باز قسم کے نوجوان باندھے پھرتے ہیں۔ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں مگر بیان نکلتا تھا۔ بڑے بڑے رنگ برنگ پھولوں والی شرٹ چست چست اور لمبے جوتوں میں تھا۔ ہونٹوں میں مسکرت جھول رہی تھی۔ تاریک چشمہ اتار کر اس نے میز پر رکھا ہوا تھا۔ شاید یہ واضح کرنے کے لیے۔ کہ وہ ایک تک سلویا کو گھور رہا تھا۔ شاید وہ یہی چاہتا تھا کہ سلویا اور دوسرے لوگ محسوس کر لیں کہ وہ سلویا میں دیکھی لے رہا تھا۔

وہ اپنی میز پر تھا تھا اور بہت دیر سے سلویا کو گھور رہا تھا۔ میں نے ذرا تاخیر سے اسے محسوس کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں سلویا کی شخصیت کی متناہیست اور اپنے کچھ خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ سلویا کو شاید اب بھی اس کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ سلویا اس وقت اپنے گرد پیش اور ماحول سے بالکل ہی لاطعلق تھی۔ اس کا ذہن تو مجھ سے بھی آگے نہ جانے کہاں پہنچا ہوا تھا۔ وہ نہ فطری طور پر اسے اس بات کو مجھ سے بہت پہلے محسوس کر لیتا تھا جیسے تھا۔ لڑکی کو تو بہت دور سے۔ بیٹھی بیٹھی نظروں سے بھی کوئی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ پتا چل جاتا ہے۔ یہ نوجوان تو اپنی نظروں سے اس کی طرح سلویا کے وجود میں آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سلویا شاید ایسی نظروں کی عادی ہو چکی تھی اب یہ نظروں اس کے محسوسات میں چھپن پیدا نہیں کرتی تھیں اور وہ اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی۔

میں حیران ہوئے بغیر وہ سنا کہ میرے ہونٹوں میں اس قسم کی مخلوق کہاں سے کھس آئی تھی؟ لیکن ہونٹوں میں حال ہونٹوں ہوتا ہے۔ جس کی جیب میں بھی بیل ادا کرنے کے پیسے ہوں۔ بلکہ بعض اوقات تو خواہ پیسے بھی نہ ہوں۔ وہ دھنڈا کھانا کر آسکتا ہے۔ یہ نوجوان تو پیسے بھی سفید نام تھا۔ سفید نام سے مرعوبیت تو ہمارے خون میں شامل ہو چکی تھی۔ سفید ناموں کے بارے میں ایک تجربہ مجھے اور ہوا تھا۔ اپنے ملک میں بھی۔ اور دوسرے ممالک میں کھوٹے پھرتے ہوئے بھی میں نے خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے بارے میں بھی محسوس کیا تھا کہ ان کے پیچھے سے ان کی حیثیت اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگانا چاہیے تھا۔ پہلی ہوئی چیز "سلی شرٹ اور بیدار جوتوں والا لڑکا کسی کروڑ پتی کارخانے دار یا ڈاکو کا بیٹا بھی ہو سکتا تھا۔ کانوں میں ہنڈے پٹنے، میک اپ کے "لال ہری پینٹ شرٹ پٹنے اور دست رنگے کھڑے

بالوں والا کوئی لڑکا کسی پادری کا ناجائز بیٹا یا جائز بیٹا بھی ہو سکتا تھا۔ بہت عمدہ قسم کے استری شدہ سوٹ اور پالش شدہ جوتوں والا کوئی صاف ستھرا نوجوان جس کے بال بڑے سیلتے سے بنے ہوں، مجھ کوئی آفس بوائے بھی ہو سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں اس نوجوان کی حیثیت کا تعین کرنے کی تو کوشش نہیں کی لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ موصوف کو بد معاش بننے کا کافی شوق تھا اور جس انداز سے اس نے کلائی میز پر کھائی ہوئی مٹی سے مضمون ہوتا تھا کہ اسے اپنے رگ پیچے پر بھی کافی ناز تھا۔ اس کے ایک کان میں بڑا سا بلا جھول ہاتھ تھا۔

میں نے چند لمحے کے لیے اسے ایک تک گھورا لیکن اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ بالکل اسی طرح جیسے سلویا نے ابھی تک اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی لیکن میری نظروں کے تعاقب میں اس کی نظریں اس نوجوان تک جاتی تھیں۔

”کسے اس طرح گھور رہے ہو؟“ وہ انہماں بنے ہوئے شرعے لمحے میں بول۔

”تمہارے ایک قدردان کو“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا ”بد بخت خواہ خواہ اور قیہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

سلویا نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور میری مگر ٹھنکتی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”اُسے چھوڑو اسے۔۔۔ اس قسم کے لٹھکے تو مجھے انگلیشن میں بھی قدم قدم پر ملتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی ایک نظر اُٹھایا تو کیا ہوا۔۔۔ میں نے بھی ان کی پروا نہیں کی۔“

”اس قسم کے لٹھکے انگلیشن میں نظر آتے رہتے تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ یہاں بھی“ آتے ہی ختمیں اس قسم کی مخلوق سے واسطہ پڑ گیا۔ ”میں نے لٹھڑی سانس لی“ اگر ختمیں یہاں بھی کسی لٹھکے سے واسطہ پڑتا تھا تو کم از کم لٹھکا مختلف قسم کا تو ہونا چاہیے تھا۔“

”مختلف قسم کے بھی مل جائیں گے“ وہ ایک بار بھر دھیرے سے افس کر بولی ”اگر یہاں یا لاہور میں“ میں فانیہ اشارہ ہو غلوں کے ماحول سے نکلتے۔ گلیوں بازاروں میں گئی تو دوسری قسم کے بھی مل جائیں گے۔ ”مقامی طور پر تیار شدہ نمونے“ بھی مل جائیں گے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج تک کوئی مجھے زیادہ تک کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔“

اس نے اب بھی گردن جھکا کر اس نوجوان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ تجسس کے تحت بھی نہیں دیکھا تھا لیکن محسوس کہ ایسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ اسے کسی عجیبی آنکھ سے اچھی طرح دیکھ رہی تھی۔ لڑکیوں میں ایک یہ بھی خوبی ہوتی ہے جب چاہیں نہ دیکھتے ہوئے بھی کسی کو اچھی طرح دیکھ لیں اور جب چاہیں کسی کو اچھی طرح دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ قریب تک کوئی بھی اسے زیادہ تک کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا

کہ وہ نوجوان سلویا کا یہ ریڈیو خراب کرنے پر مگلا ہوا تھا۔ عین اسی وقت وہ آنکھ کر ہماری سڑک کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ کچھ اس طرح چلتا ہوا ہماری سڑک پر پہنچا جیسے قدم دھمک سے زمین کو ہلا دیتا چاہتا ہو۔ اس کی نظر صرف سلویا کی طرف تھی اور مسٹر براؤن تو شاید اس کی نظریں وجود ہی نہیں رکھتے۔ ہم پر تو اس نے ایک نگاہ انداز بھی ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔

”ہائے بے بی۔۔۔“ وہ ہماری اور محسوس آواز میں بولا۔ ”میرے آجائو۔ میں تمہارے لیے ڈریک منگوا تا ہوں۔“ وہ پہلی ہی میں معلوم ہوتا تھا اور اس کے نزدیک کسی لڑکی کے لیے ڈریک منگوانا گھرا حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کے مترادف تھا۔

سلویا کا مہربوسکون اور تحمل قابلِ داد تھا۔ اس نے اب بھی اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا اور بدستور مسکراتے ہوئے طرح میری طرف دیکھتی رہی جیسے کہ ہمارے درمیان گفتگو تھی ”اس میں کوئی غلط نہیں پڑا تھا“ اس نے نہ تو نوجوان کی سنی تھی اور نہ ہی اس کی قوم سے باخبر ہوئی تھی۔ میرے خیال کسی کو شک لگنے اور اسے اس کی اوقات یاد دلانے کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ میں دل ہی دل میں سلویا کو داد دے رہا تھا۔ براؤن بے چینی سے اپنی نشست پر پلو پلو لے لگا تھا۔

میں نے نوجوان کو گھورا لیکن اس نے اب بھی میری بات تو نہیں دی۔ سلویا اس کے ساتھ جو سلوک کر رہی تھی بدلتا بدلتا وہ مجھ سے لے رہا تھا۔

سلویا کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دہرا دیکھنے لگا۔ ”آئی بے نیازی نہ دکھاؤ بے بی! مانا کہ تم خوب صورت ہو اس خشک ملک میں تمہیں مجھ سے اچھا دوست نہیں ملے گا۔ کچھ دیر کے لیے کہیں چل کر مزے کرتے ہیں۔“ قہر نہ جھٹکتی۔ تم اور میں۔“

وہ چونک کر دبا جھکا ہوا تھا اس لیے اس کی سانپوں کے برآمد ہونے والے دھبے کے بھیکوں سے میں اور براؤن مسخ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

میں نے نہایت نرم لہجے اور شائستہ انگریزی میں کہا ”دوست! اگر تم جہاز نہ منادو تو تمہارے لیے میرا ایک قہر سام ہے۔ تم باہر جا کر تازہ ہوا میں کچھ دیر چل کر دیکھو کہ کیا ہوگی کوئی کمپوزیٹ کچھ ٹھکانے پر آجائے۔“

اس نے نہایت افسانے سے سر جھکا کر حکایت سے میری طرف دیکھا اور غماخوں کی جگہ گویا الفاظ میرے منہ پر مارے ہوئے۔ ”تم اپنے کام سے کام کرکو جاہل پاکستانی!“

”میرے بارے میں تعلیم یافتہ انگریز!“ میں نے نہایت نرم سے کہا ”جاہل پاکستانی اس وقت اپنے کام سے کام لے رہی ہوئے تھے لیکن تم نے اگر کسی اعلیٰ نسل کے گھر سے کی گئی“

MANNER سے بہت اچھی طرح واقف ہوں اُنکے! میں نے اب ذرا بدلے ہوئے لباس میں کہا۔ لیکن جب لڑکی تمہارے ساتھ جانا نہیں چاہ رہی تو تم کیوں اسے تنگ کر رہے ہو؟  
”یہ میرا اور لڑکی کا معاملہ ہے۔ تم اپنا منہ بند رکھو“ وہ پہلے سے زیادہ غور غواری سے بولا۔

برائے برائے نظر آنے لگا تھا جبکہ سلویا بدستور پُر سکون تھی۔ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لباس میں سلویا سے پوچھا ”کیا تم اس لفظ کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟“

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر گویا اُڑاتے ہوئے بولی ”کیا میں جسے اتنی گری پڑی لڑکی نظر آتی ہوں۔“

میں نے سفید قام نوجوان کی طرف دیکھا اور سرد لباس میں کہا ”اب چلے پھرتے نظر آؤ اُنکے اور نہ یہ شکل اس قابل نہیں رہے گی کہ اسے لے کر اپنے ملک پاسکو۔“

ڈانٹک ہال میں اس وقت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ جو موجود تھے ان کی تعداد بھی بڑی تیزی سے مزید کم ہو گئی تھی حالانکہ میں نے اپنی آواز بچی رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی تاکہ معززین میں یہ گہرا ہٹ نہ پھیلے کہ وہاں کوئی جھگڑا ہونے والا تھا۔ آواز اس نوجوان کی بھی کچھ ایسی بلند نہیں تھی لیکن لباس کی غرابٹ اور چہرے کے تاثرات بہر حال اصل کمائی سنانے کے لیے کافی تھے۔

میرا خیال تھا کہ سلویا کا جواب سننے کے بعد اسے کچھ شرم آجائے گی اور وہ واپس چلا جائے گا لیکن وہ یقیناً اُٹھائی کا کوئی بہت بڑا ایوارڈ جیتنے کا تہیہ کرے ہوئے تھا۔ اس نے اچانک ہاتھ بدھا کر سلویا کی خوب صورت کلائی چکلی۔ سلویا دونوں کندیاں میز پر ٹکائے بیٹھی تھی۔

نوجوان نے ایک جھٹکے سے اسے اس کی جگہ سے اٹھانے کی کوشش کی۔ سلویا دیکھنے میں ایک نہایت نازک اندام اور نفیس لڑکی تھی۔ اس کی شخصیت سے پھولوں کی سی نزاکت کا احساس ہوتا تھا لیکن اس وقت اس نے کم از کم اتنی مضبوطی ضرور دکھائی کہ وہ اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔

نوجوان کو اپنی طاقت پر یقیناً بہت ٹھنڈا تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو عموماً ٹھنڈا ہوتا ہے شاید اس لیے وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ نوجوان کا اندازہ شاید یہی تھا کہ وہ ایسی ہلکی جھٹکی اور نازک اندام دکھائی دینے والی لڑکی کی کلائی پکڑ کر کھینچے گا تو وہ ایک جھٹکے سے اس کے سینے سے آگے گی۔ اس کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکی۔ جس پر یقیناً اسے حیرت کا خفیف سے جھٹکا تھا۔

اس کی یہ حرکت میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس نے اب تک جس جرات رندانہ کا مظاہرہ کیا تھا میں تو اسی پر حیران تھا لیکن وہ مجھے اس سے کہیں زیادہ حیرا کر رہا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے تحقیر آمیز الفاظ پر اگر کوئی رد عمل ظاہر کرے گا

میں اُنکے آزادی ہے۔ اس کے دانت بیٹھنے کی طرح ہونٹوں کے عقب سے جھانکنے لگے اور آواز گویا جھنگریں ڈھل گئی۔ وہ گویا اب سلویا کو بول گیا اور میری طرف جھٹکے ہوئے بولا ”اپنی زبان کو قابو میں رکھو گندے کتائی!“

حالانکہ میں اس وقت اس سے زیادہ صاف ستھرے لباس میں تھا۔ بہت اعلیٰ قسم کا کلوں بھی لگائے ہوئے تھا۔ میرے جسم سے اس کی طرح پیسے کی بدبو اور منہ سے شراب کے پھپھکے بھی نہیں اُٹھ رہے تھے پھر بھی اس متعصب لنگور کو میں گندہ کتائی نظر آ رہا تھا۔ میں نے اب بھی اپنی کمر بڑی پر قابو رکھا۔ میں اپنے ہی ہوش میں تو پھر زیادہ غلغلہ بول نہیں لے سکتا تھا۔ یہاں کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بڑا آدمی کی تھی اور میری نظر میں اس قسم کے کسی لفظ کی کمر بڑی سے ایک کوکل ایسٹریٹ بھی زیادہ جیتی تھی۔ تو پھر ’لڑائی بھگڑنے اور بنگارے میں مالی نقصان سے زیادہ رہنے پر تین اہمیت رکھتی تھی۔

مالی نقصان تو پورا بھی کیا پاسکتا تھا۔ ساکھ ایک بار خراب ہونے کے بعد دوبارہ بدانی بہت مشکل ہوتی تھی۔ قایمہ انصار ہوش میں معاملات سے نسبتاً زیادہ مشکل ہوتا ہے اور وہ شاید اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے پر خطا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی دیشیا تھو کا پیچھے رہ ستروان نہیں تھا جس دو لفظ لپٹاؤ کی ہو جاتے، لکڑی کی بے ہنگم کریاں اور الموشم کے ٹیڑھے میزے جگ ایک دوسرے پر چلائے جاتے جن کا اس جنگ وجدل میں کچھ نہ بگڑتا۔ جھگڑا ختم ہوتے ہی۔۔۔ اور ذہنیوں کے اسپتال یا کمریاتے ہی سب چیزیں اٹھا کر واپس اپنی اپنی جگہ رکھ دی جاتیں اور دوبارہ گلشن کا کاروبار شروع ہو جاتا۔

جتنی اونچی جگہ تھی اتنے ہی اونچے خدیب کے تھانے تھے۔ میں ہوش کا مالک تھا میں اپنے آپ کو زیادہ مجبور محسوس کر رہا تھا حالانکہ میں اس کے تمام تر کسرتی جسم کے باوجود ایک جھٹکے میں اس کی گردن توڑ سکتا تھا۔

مجھے اس کی جرات رندانہ پر خاصی حیرت بھی تھی۔ ایک ایسی ملک میں اس طرح اچانک اُٹھ کر تین ایجنٹیوں کی میز پر چلے جانا اور یوں بد معاشی دکھانا بڑے حوصلے کی بات تھی۔ میں ابھی نہیں تھا کہ میں اس کے پیچھے کوئی سازش تو کام نہیں کر رہی تھی؟

وہ ایسی زہریلے لباس میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اگر تمہیں زبان کو قابو میں رکھنا نہیں آتا تو میں جس میں اس طرح تمہاراں کا کہ زندگی بھر نہیں بھولوں گے اب میں سچ میں تمہاری تمہیں آواز نہ سنوں۔ وہ ایک سفید قام لڑکی ہے اور میں اسے ٹیٹ پر چلنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ ہمارے ہاں اسی طرح ہوتا ہے تمہیں اس پر تھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں تمہاری تہذیب اور تمہارے میسرانزم ISM



نوجوان کو چمکانے کے لیے میرے بازوؤں پر نہ لگ جائے  
 کچھ دیر اور یہ منظر اسی طرح برقرار رہا۔ آخر مجھے اندازہ  
 کہ کہیں نوجوان بے ہوش نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اسے لم  
 دیا۔ وہ آگے بچھے جھولنے لگا۔ بالآخر ایک کرسی کا سہارا لے کر  
 نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

میں نے اس کے قریب ہو کر پچی آواز میں کہا: "محب بھیڑ  
 ہے۔ یہاں سے چلے جائیگا پھر تم اسٹیج پر جانا چاہتے ہو؟"  
 اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے حواس ٹھکانے پر  
 تھے۔ اس کے بازو کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ ایک بازو کر رہا  
 پٹنے پر لگا تھا تو دوسرا پھسل جاتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنا اور انجمن  
 پٹ پٹا رہا۔ بالآخر یوں بڑے سے دائرے میں گھوم کر لوڑکھائی  
 دروازے کی طرف چل دیا جیسے کوئی پُرانا شرابی نشے میں دھ  
 ہوئے کے بعد سے خانے سے رخصت ہو رہا ہو۔

اُسے راستے میں پہنچ کر شاید اس کے اوسان کچھ عا  
 ہوئے اور وہ رک کر مدہوش شرابیوں کی انداز میں ایک بار  
 گھوما اور گھومنا اترانے کی کوشش کرتے ہوئے تھکاتہ ڈھ  
 انداز میں بولا "تم یہ مت سمجھا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔  
 تمہیں سبق ضرور سکھاؤں گا۔"

میں نے اسے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور سلیو کی طر  
 متوجہ ہو گیا جواب بھی منکرا دی تھی۔ برائے نے گویا اس فو  
 کو جاتے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی تھی لیکن اب بھی وہ  
 انگلیوں سے اس کی طرف دیکھ جا رہا تھا۔

"اے! تو میں کیا کہ رہا تھا؟" میں نے یوں بات شروع  
 جیسے صرف ایک لمحے کے لیے میں کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا  
 اس سے پہلے کہ سلیو کوئی جواب دیتی ہوگی کے  
 دروازے کی طرف سے دو سیکورٹی گارڈ لیے لیے ڈنگ بھرتے ہو  
 آئے اور انہوں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا۔ شاید کسی وٹرنل  
 ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تیسرا گارڈ جلدی سے مجھ سے ملے  
 "سر! کیا مسئلہ ہے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں تھا بے وقوف! اسے فوراً چھوڑ دو" میں  
 حکم دیا "ہوئی میں قماش لگانے سے ہی تو میں چمکا جاتا تھا اور  
 لوگ قماش لگانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہاں کچھ نہیں ہوا۔  
 اس انگور کے بیجے کو جانے دو۔ اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔"  
 گارڈ نے لٹکا کر واپس چلا گیا۔ اس نے جا کر دونوں گارڈ  
 کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔ انہوں نے نوجوان کو چھوڑ دیا اور وہ  
 ایک بار پھر مجھ پر قہر آلودی نظر ڈال کر رخصت ہو گیا لیکن  
 خیال میں یہ امکان شاید اب بھی اس کے ذہن میں نہیں تھا  
 میں ہوئی کا مالک بھی ہو سکتا تھا۔ گارڈ بھی باہر سے باہر ہی  
 چلے گئے۔

برائے گہری سانس لے کر بولا "انسان کو کسی بھی دفت

توجہ کوئی اس کا نشانہ بنانے کا لیکن اس نے سلیو پر ہاتھ ڈال  
 دیا تھا۔ اس قسم کی حرکتیں تو سفید فام لوگ اپنے ملک میں بھی اس  
 وقت کرتے تھے جب کہیں کوئی انجیلی دیکلی لڑکی نظر آجاتی تھی اور  
 نوجوان ٹینک کی شکل میں ہوتے تھے۔ یہ تو انجیلی کمال دکھانے پر  
 مٹا ہوا تھا۔

آخر کار مجھے اٹھنا ہی پڑا لیکن اب بھی احتیاط مجھ پر غالب  
 رہی۔ میں نے زیادہ شدید دھڑکنے کا اظہار نہیں کیا جس کے نتیجے  
 میں بارہواؤں کا توجہ شروع ہو جاتی۔ تاہم میں اتنی گہری  
 سے اٹھا کہ شاید وہ اسے اپنی نظر کا دھوکا ہی سمجھا ہو۔ ویسے بھی  
 شاید وہ سلیو کو اس کی نشست سے اٹھانے میں ناکام رہنے کی وجہ  
 سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

انسان کی گردن اور کندھوں کے درمیان دونوں طرف کچھ  
 مسلہ ہوتے ہیں جنہیں اگر صحیح انداز میں پکڑ لیا جائے اور کافی قوت  
 سے دیا جائے تو اس سے ادوی دھڑکنے کی طور پر مطلوب سا ہو جاتا  
 ہے۔ میرے دونوں ہاتھ سیدھے انہی مسلہ پر پہنچے تھے۔ نوجوان کو  
 اتنی مسلت بھی نہیں مل سکی کہ وہ اپنے آپ کو چمکانے کی کوشش  
 ہی کر لیتا۔

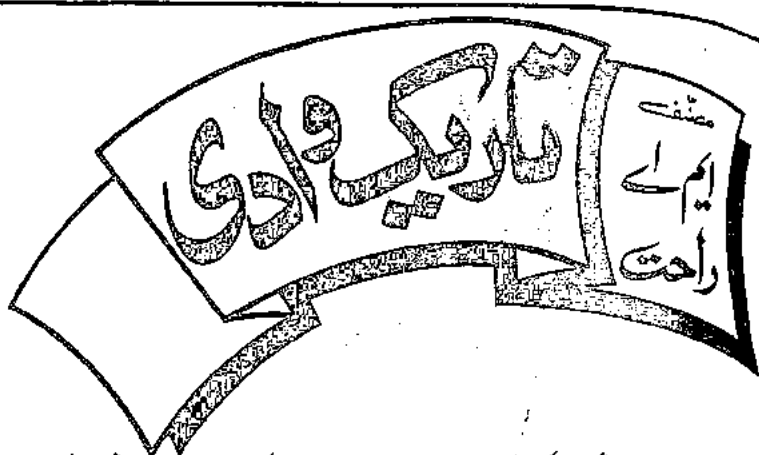
اس کے حلق سے کراہنے کی سی آواز برآمد ہوئی اور اس کے  
 بازو دھیلے ہو گئے۔ سلیو کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس  
 کا چہرہ پہلے سرخ اور پھر نیلا پڑنے لگا۔ اس کے بازو پلوں میں  
 جھول رہے تھے اگر وہ کوشش کرنا تو شاید لات چلانے میں تو  
 کامیاب ہو ہی جاتا۔ اور میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ لیکن وہ  
 اتنا بد حواس ہوا کہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

چند سیکنڈ میں ہی وہ بار بار اس طرح آنکھیں پھاڑنے لگا جیسے  
 اس کی بینائی زائل ہو رہی ہو۔ ساتھ ہی وہ بار بار اس انگور کی طرح  
 منہ پھاڑ پھاڑ کر سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا جس کے پھپھونوں میں  
 آکسیجن کی شدید کمی پیدا ہو گئی ہو۔

برائے میری منت کر رہا تھا۔ "مسٹر افضل! اسے چھوڑ دیجئے۔  
 جانے دیں۔ دفع کریں۔ اس قسم کے آدمیوں کے منہ نہیں لگنا  
 چاہیے۔"

"مسٹر برائے! میں تو اسے کچھ بھی نہیں کہہ رہا" میں نے  
 پُرسکون لیتے ہوئے کہا "میں تو یہی ذرا دوستی میں اس کے کندھوں پر  
 ہاتھ رکھ کر خوبصورتی دے رہا ہوں۔"

سلیو اب اطمینان سے ایک ہاتھ پر ٹھوڑی ٹھکانے یوں  
 نوجوان کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا رہی تھی جیسے وہ اس کے سامنے  
 کوئی مزاحیہ خاکہ پیش کر رہا ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ  
 اس قسم کی صورت حال میں پُرسکون رہنے والی لڑکی تھی۔ برائے  
 بوکھلاہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن سلیو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر  
 اسے دوبارہ اس کی نشست پر بٹھایا۔ میں نے دل ہی دل میں سلیو  
 کا شکریہ ادا کیا ورنہ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں برائے اس



سرزمین افریقہ کے پراسرار گوشوں کی داستان ہے جہاں آج بھی تہذیب کے قدم نہیں پہنچے، اور علم کی روشنی نہیں پھیلی۔ اسی وجہ سے وہاں تو بہت، جادو اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اور ہزاروں سال سے وہ لوگ اپنے عقائد کے سہارے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بھی سرزمین افریقہ کے پراسرار گوشوں کی داستان ہے جس میں روٹے کھڑے کر دینے والے واقعات اور عجالیہ کے دامن میں بکھری ہوئی لادائوں کی داستان اس کہانی میں ایک خوبصورت اضافہ کرتی ہے۔

نحو بصورت سرورق © بہترین کتابت و طباعت

جسٹاب اپنے قریبی ایک سال کے طلب  
قرآن میں یا آداب کے نام پر قیامت کا  
میں آؤں گا۔ سال قمری ۱۴۰۰  
جسٹاب آپ کو  
بذریعہ پختہ آؤں گا۔ سال قمری ۱۴۰۰

دو جلدوں میں مکمل  
جلد اول : ۱۵۰ روپے  
جلد دوم : ۱۵۰ روپے  
مکمل سیٹ : ۳۰۰ روپے

خط و کتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرگرم روڈ، اردو بازار، لاہور، فون ۶۲۲۴۹۹۵

بھی جگہ گفتگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

”بے شک“ میں نے تائید کی ”ایک دوویس ہی آج کل تقریباً ہر ملک گفتگوں کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ اوپر سے دوسرے ملکوں کے بھی پلے آتے ہیں۔“

برائے کوئی قدرے شرمندگی اور افسوس سے بولا ”انگریزی معلوم ہوتا تھا۔“

”محض ممکن ہے امریکن رہا ہو“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں۔ یہ بھی ممکن ہے“ برائے نے اتفاق کیا۔

”چھوڑیں۔ دفع کریں اس منحوس کو“ سلویا ہاتھ جھٹک کر

بولی ”ہمیں اس کے بارے میں باتیں کر کے وقت ضائع نہیں کرنا

چاہیے۔ ہمیں اپنی باتیں کرنی چاہئیں۔ مسٹر افضل! آپ بتائیں

آپ مجھے کراچی کے مشہور مقامات کب دکھارے ہیں؟ آپ کو

معلوم ہے میں پہلی بار پاکستان آئی ہوں“ وہ ایک لگ میری طرف

دیکھ رہی تھی۔ اس کی رودشن آنکھوں میں بہا رہیں رقصاں تھیں۔

”مشہور مقامات۔“ میں نے سر کھپایا۔ ”جی بات تو یہ تھی کہ

میں نے خواب تک مشہور مقامات دوڑتے بھاگتے ہی دیکھے تھے۔

وہ بھی کسی اور ہی چکر میں۔ بطور خاص کوئی جگہ دیکھنے کے لیے مجھے

آج تک مہربوسکون سے کہیں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک

خوب صورت جوان اور مہربان سفید قام لڑکی کو ابھر کر دھر کھاتے

پھرے کا قصور خاصا خوش کن تھا لیکن میں بھی اپنی مصروفیات کے

بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

آج رات بھی میں فرح سے ملنے کے سلسلے میں قسمت آزمائی

کرنا چاہتا تھا۔ اس سے ملنے کی کشش تو اپنی جگہ تھی لیکن دراصل

میرے دل میں یہ امید بھی بکھلا رہی تھی کہ شاید میں کسی طرح اسے

بیروائش کے خلاف اپنا ساتھ دینے کے لیے آمادہ کرنے میں

کامیاب ہو جاؤں۔ گنے والے کل بھی مجھے بہت سی مصروفیات

درپیش تھیں۔ آہم سلویا کو صاف جواب دینا بھی اس کی تسوایت

کی توہین تھی۔ عام حالات میں اور ”مشغلی“ کے دغوں میں شاید اس

سے دو تہی استوار ہونا خود میرے لیے بڑی سنسنی کا باعث ہوتا لیکن

ان دغوں ذہن نہ جانے کیوں کئی سمتوں میں الجھا ہوا تھا۔

آہم میں نے اس کی دلدادہی کے لیے گرم جوش مسکراہٹ

کے ساتھ کہا ”میں نہیں۔ کیوں نہیں۔ میں ذرا اپنی مصروفیات

کا جائزہ لے کر جلد ہی اس سلسلے میں کوئی پروگرام بناتا ہوں۔“

”جلدی نہ؟“ وہ بابو سی سے بولی ”میرے پاس تو صرف کل کا

دن ہے۔ پرسوں تو ہم لوگ لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ بزنس کے

معاملات بھی ملے ہو چکے ہیں۔ پاپا بھی کل کچھ دوسرے کاموں میں

مصروف ہوں گے۔“

صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ پاپا کا پٹا کانٹے پر ٹکی ہوئی تھی۔ انہیں

زبردستی کل ”کچھ دوسرے“ کاموں میں مصروف کر رہی تھی۔ وہ

اکہل میرے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ ویسے بھی اس قسم کی ترقی یافتہ

قوموں میں لڑکیوں کے والدین بڑے ”مشاہدہ دل“ تصور ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ عام طور پر خود ہی غم کرتے تھے۔ یہ ان کی تہذیب کا تقاضا تھا۔

سلویا بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”میری کچھ

میں اس دوران ایک اجنبی ملک۔ اجنبی شہر میں

بورت سے میرا قدم گھٹ جائے گا۔“

”تا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں“ میں نے

ہوئے اسے تسلی دی۔ ”ہم پاکستانی اتنے ہوشیار

ناتدرے نہیں کہ تم جیسی لڑکی کا بورت سے دم

دیں۔ کچھ نہ کچھ کریں گے۔ میں صبح جیسے پورا

کا۔“

”ویسے تو میں آج شام بھی فاسٹ ہوں۔“ سلویا

لیجے میں کل دعویت تھی۔

”لیکن آج شام مجھے ایک جگہ جانا ہے۔“ میں

کہا۔

”وہ؟“ وہ گہری سانس لے کر بولی اور مجھے

ہوا کہ وہ لوگ شام کی ملاقاتوں کا عموماً ایک ہی مطلب

میں نے جلدی سے وضاحت کی ”ایک کاروبار

ہے۔“

سلویا کے چہرے پر کچھ رنگ سے لوٹ آئے

بڑے اطمینان سے پاپ کے کس لے رہا تھا۔ ہم کچھ

کی باتیں کرتے رہے۔ بالآخر ہم نے اٹھے اور ایک

خدا حافظ گئے کا ارادہ کیا۔

دھنڈا ایک دغیر میرے قریب آیا اور بازو دارانہ

ایک شدہ کاغذ میری طرف پڑھاتے ہوئے بولا ”

پر کوئی اس غلطی کے لیے دے گیا تھا لیکن میں

دے دوں تو بہتر ہے۔“

اس نے نہ تو نام لیا تھا اور نہ ہی اشارہ کیا تھا؟

سمجھتا مشکل نہیں تھا کہ اس کی مراد سلویا سے تھی

بھی اردو میں کی تھی۔ میں نے کاغذ کھولا۔ کر دیکھا۔

میں انگریزی میں جو پیغام لکھنا تھا اس کا مفہوم

ایسا تھا کہ میری دعوت قبول نہ کر کے اپنے

ہے۔ تم میرے ساتھ چند گھنٹے گزاریں تو اس خیم

فراموش نہ کیا تیں۔ میرے پاس تمہارے لیے بہت

تھیں۔ میں حیران ہوں کہ تم جیسی خوب صورت

لڑکی کے ساتھ بیٹھی کیوں وقت ضائع کر رہی

نہیں تھوڑا۔ باہر آ جاؤ“ میں اس ہوش کی پیچھے والی

انتظار کر رہا ہوں۔ ہم ایک ایسی جگہ چلیں گے جہاں

ہوں گے تمہارا۔ آ رہا۔

میں نے رقتہ پڑھ کر اسے دوبارہ نہ کر لیا۔ سلو

میں زیادہ سے زیادہ بے خفی کا اظہار کر کے اسے زیادہ سے زیادہ چڑانا چاہتا تھا۔

ایک چڑانے پر گد کے قریب کھڑی ہوئی جیلی گری کار کی ایک پیچر کے عقب سے وہ اچانک نکل کر مجھ پر حملہ آور ہوئے جو سفید قام نوجوان فساد کی جڑ تھا اس سمیت وہ تعداد میں چار تھے شاید اس بد بخت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک آدمی کو ہرا لے جانے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں ایک ایشیائی بھی تھا۔ وہ پاکستانی ہی ہو سکتا تھا اور ملایا ایرانی وغیرہ بھی۔

ان میں سے ایک کے ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چین تھی۔ ایک کے ہاتھ میں پائپ کا ٹکڑا ایک کے ہاتھ میں چاقو اور ایک کے ہاتھ میں لوہے کی عام لیگن موٹی اور زونی ڈنچہ۔ میں اس وقت ہوٹل سے کافی دور نکل آیا تھا اور پیچروں کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا جب وہ گردہ شیا میں کی طرح اچانک پیچروں کے عقب سے برآمد ہوئے مجھے دو ایک دوسری جیکوں پر ان کی موجودگی کا زیادہ امکان محسوس ہوا تھا۔ موٹر سائیکل کی چین والے نے حملہ کرنے میں پہل کی اور بڑی پھرتی دکھائی۔

میں اپنا اندازہ تو فوراً سا کھلا ہوا جانے کے باوجود پھرتی سے ایک طرف کو ہٹنے ہوئے بیٹھا گیا۔ چھین پیچروں کے ہونٹ پر بڑی اور اس طرح پڑی کہ اس کا خوب صورت رنگ اتر گیا حالانکہ ان گاڑیوں کے اس قسم کے رنگ آسانی سے نہیں اُترتے۔ اگر وہ چھین میرے جسم پر پڑی ہوتی تو رنگ کی جگہ میری کھال اُترتی۔

قیمت یہ تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی گن وغیرہ نہیں تھی۔ میں اس وقت شلوار قمیض میں تھا اور میرے پاس بھی ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ شاید وہ لوگ نہایت خاموشی سے میرا طرہ بانے کے ارادے سے آئے تھے اور اس قسم کے کاموں میں ماہر معلوم ہوتے تھے۔ تین سفید قام تو خاص طور پر اسٹریٹ فائر قسم کی چیز معلوم ہوتے تھے۔ ان کے چہروں پر ہلاکی خشونت اور سفاکی تھی۔ میرے لیے یہ بڑا صدمہ کا مقام تھا۔ ہم تو کئی کچوں میں بیٹھے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت کچھ کرنے والوں کے معاملے میں خود کفیل ہو چکے تھے ہم سے تو وہی سنبھالے نہیں سنبھال رہے تھے۔ اوپر سے یہ غیر ملکی بھی چلے آ رہے تھے اور اس کار خیزت میں نہایت دھمائی سے حسب توفیق اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔

کسی آتشیں ہتھیار کے بغیر بھی وہ کچھ کم خطرناک نہیں تھے۔ اور پھر تعداد میں چار تھے۔ میں نے دل عیاں میں اپنے آپ سے کہا "اپنی پیارے آج تم کچھ زیادہ ہی ڈم میں آگئے۔ تم نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب جھٹکو۔"

وہ حملہ کرنے کے لیے اپنی اپنی باری کا تو ظاہر ہے، انتظار نہیں کر رہے تھے۔ پہلا ڈنچہ ہونٹ پر پڑنے لگا۔ دوسری جلیبھی تیزی سے

پہلی میں پانچا ہوا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم میرے ایک دوست کا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم میرے ایک دوست کا ہے۔"

اب اپنے سر کے میں چلو۔ تم سے چھڑا قات رہے گی۔" سراسر اگے سے چکا کر کھڑے کھڑے ہوئے۔ برائے نام اس کی تقلید میں ڈانٹ ال کے دو دروازے تھے ان کے ساتھ گیا۔ وہاں میں نے انہیں خدا حافظہ کہا اور اس سڑک کی طرف چل دیا جو گلی میں لگتا تھا۔ ہوٹل کی اپنی یادداشتوں میں موجود نقلی گلی سے رکش چلی گئی تھی۔ اسے پچھلی گلی میں پہنچ سکتا تھا۔

پہلی پچھلی گلی میں تھی۔ ذرا میں بھی کبھی انسان کو دھڑکی اور دھڑکیوں سے واسطہ پڑا ہے جو آپ کی تمام تر برداشت کے باوجود آپ کے ہر صدمہ میں آپ کی نگاہ رکھ رہی ہیں۔ وہ ایک فنی اور کراہیت انگیز کھسی کی طرح آپ کی گرجا رہے ہیں۔ ناک سے آواز تو کان پر ہے۔ کان سے آواز تو کان پر ہے۔ اور وہاں سے پھر کان پر ہے۔ حتیٰ کہ آپ کا خوشی کرنے کا اپنے گلے ہے۔ یہ غیبت بھی کچھ اسی قسم کی چیز معلوم ہونا ہے۔ ذرا زیادہ سخت قسم کا سبق سکھانے کی ضرورت تھی۔ سڑک پر جانے کے بجائے وہ جلد سنبھل گیا تھا۔

اس نے کسی کو ساتھ لینے کی بھی زحمت نہیں کی۔ میرا اندازہ اسطرح قائم شاید اپنے ایک آدمی دوست کو ساتھ لے کر آیا اس وقت اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ بڑا طرہ خاں سمجھ رہا ہے یہ تو اندازہ ہو گا کہ ہوٹل کے اندر سے اس کے رخصتے میں لڑکی کے بجائے میں ہی نکلوں گا۔ وہ غالباً یہی چاہتا ہے۔ لے لے لے لے کے سامنے جس طرح اپنی توہین محسوس کی ہوگی جواب میں وہ مجھے سبق سکھانے کے لیے تڑپ رہا ہو گا۔ ساتھ ہی جیسے مزید ایک آدمی لنگور کا ہونا میرے لیے کسی اہمیت نہیں تھا۔

دھڑکی کی تھکی گئی کافی طویل تھی اور اس میں سامنے کی طرف نہیں گلیاں نکلتی تھیں۔ اس گلی میں بہت سے چڑانے اور سٹے سٹے خوں والے درخت بھی تھے جن کی وجہ سے گلی وقت مایہ رتا تھا اور سر شام ہی اندھیرا نظر آنے لگا تھا۔ پانچ تھی اور درخت گویا پختہ فرش کے درمیان سے ہی لے کر گزرتے تھے۔ اس طرف لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھا۔ گاڑیاں کسی نظر آنی تھیں۔ درختوں پر موجود پرندے انہیں پر ہٹ کر گلیاں پر گرتے رہتے تھے۔

میں جب اس گلی میں پہنچا تو وہاں ایک چڑا مظر میرا خطر تھا۔ چڑا غریب معلوم نہ کھائی نہیں دے رہی تھی اور وہ بد بخت بھی نہ تھا۔ اندازہ تھا کہ اس نے ان ڈانٹ کی محبت نامہ بھیج کر مجھے کسی بھی شیا کو کھڑی کے پیچھے پچھا میرا جائزہ لے کر کھانا کھا رہا تھا۔ کچھ زیادہ ہی ترسک میں آ گیا۔ میں ہاتھ پٹتے ہوئے کھانا کھا رہا تھا۔

اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھاکر ان تینوں نوجوانوں پر پھینک دیئے۔ ایک اٹھ چکے تھے لیکن سنبھل نہیں پائے تھے۔

وہ چاروں ایک بار پھر ایک دوسرے پر ڈھیر ہو کر دوران مجھے اپنے عقب میں کسی گاڑی کی تھوڑا سا دھڑکائی۔ میرے پاس پلٹ کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میری نظر اس کے لیے بھی ان چاروں پر سے ہٹا میرے حق میں لگا ہو سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں ان کے سروں پر تھا۔

ان میں سے دو کافی پھرتے تھے تو ربا اٹھ چکے تھے انہیں گردن سے پکڑتے ہوئے ان کی کھوپڑیاں ہٹا کر اس کے ذمہ کی خاصی زوردار آواز بلند ہوئی جس نے دل کو کچھ راحت ملی لیکن اسی دوران پیچھے سے گھبراہٹ

کھڑی آواز سنائی دی "اوتے۔ اوتے۔ کھوتے۔ کھوتے۔ کر رہا ہے۔"

بھاری قدموں کی آوازیں بھی سنائی دیں لیکن ان نیچے والے دونوں نوجوان بھی اٹھنے میں کامیاب ہو کر زنجیریں ابھی ان کے ہاتھوں میں ہی تھیں۔ اس لیے ان پیچھے دیکھنے کے بجائے زنجیروں پر ہاتھ ڈالنا زیادہ ضروری لگتا تھا۔ ان کے دونوں زنجیریں بیک وقت جھٹکے سے ان کے ہاتھوں میں۔ لیکن میں اسی وقت جب میں ذرا پیچھے ہٹ کر ان سے ان پر وار کرنے لگا تھا، عقب سے میری کمر باندھ کر زوردار ضرب لگی۔

ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اوج میں سنبھلے ہوئے ایڑیوں کے تل گویا۔ مجھے کچھ دھندلے سے سامنے نظر آئے ایک سایہ تو میں میرے سامنے غالباً مجھ پر دوسرا وار کرنے کے لیے کوئی چیز ہوا میں نے زنجیروں سے وار کرنے میں شاید مجھے تاخیر ہو جانی۔ زنجیریں ان ہاتھوں سے چھوڑتے ہوئے ایک بھرپور گھونٹا پر رسید کیا۔

وہ گھٹ کر سڑک پر جا کر اور اس کے ہاتھ تلے وہ چھوٹ گئی۔ اسی لمحے اچانک میری آنکھوں کی دھندل ہوئی اور میں نے دیکھا وہ دراصل کوئی یادوری ہوا تھا اس کے ہاتھ سے جو چیز چھوٹ کر گری تھی وہ گولہ تھی۔

میرے گھونٹنے نے اس کا منہ بگاڑ دیا تھا۔ اسی لمحے سڑک پر تھوکا۔ وہ تھوک نہیں، خون تھا۔ سفید چیزوں کی جھلک بھی نظر آئی جو یقیناً اس کے پیچھے اچھی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے کسی کی طرف سے

میری طرف لپکے تھے۔ لوہے کی عام زنجیروں نے بھی وار کیا تھا۔ میں جھکا کر دے کر اس سے بھی بچ گیا تھا اور بھاری زنجیریں پھینک دیں۔ اسکرین پر پڑی تھی۔ دھڑا اسکرین میں مرکزی کا نہایت ہی جھلک قسم کا جلا پھیل گیا۔ دھڑا اسکرین ناکام ہو گئی۔ نہ جانے کس پر نصیب کی گاڑی تھی لیکن میری کھوپڑی نوٹنے کے مقابلے میں یہ نقصان بھر حال کوئی معافی نہیں دے سکتا تھا۔

چاقو اس سفید نام نوجوان کے ہاتھ میں تھا جس نے ہوٹل میں اچانک چاروں ہاتھ پاؤں سے نہایت بھونچے انداز میں سلویا پر عاتق ہو کر یہ سارا فساد کھڑا کیا تھا۔ وہ شاید مجھ سے بھی زیادہ ترنگ میں آ گیا تھا۔ وہ پھیر دی گھٹ پر چڑھ چکا تھا۔ میری نظر اس وقت باقی تینوں نوجوانوں پر تھی لیکن میں اس کی طرف سے بھی بے خبر نہیں تھا۔

اس نے خالص فلمی انداز میں مجھ پر چلا ٹک لگائی۔ اس قسم کے متاثر فلموں میں عموماً سلوموشن میں دکھائے جاتے ہیں۔ وہ غالباً اس عالم میں مجھے ساتھ لے کر بچنے کرنا چاہتا تھا کہ اس کا چاقو میری گردن میں بیوست ہو۔ میں اسی لمحے دونوں زنجیروں والے نوجوانوں نے مجھ پر زنجیر سے وار کیا۔ پاپ والے کو شاید "بھڑکھاڑ" کی وجہ سے موقع نہیں مل سکا ورنہ وہ بھی حسب توقع ہاتھ بٹاتا۔ وہ پھیر کر گردن کو کم کر رکھا کہ آ رہا تھا تاکہ اپنے ساتھیوں کے درمیان میلے کے لیے جگہ تلاش کر سکے۔

وہ میں نے بچوں کے بل تقریباً بیٹھ کر جس پھرتی سے اپنے آپ کو بچایا وہ شاید ان کے لیے ناقابلِ یقین اور ناقابلِ قسم رہی ہو۔ اسی حالت میں میں زنجیروں کے درمیان سے اس طرح نکلا کہ ان کے گھٹنوں پر کرائے کے وار کرتے ہوئے میں نے انہیں اوندھے منہ گرا دیا لیکن اس وقت تک ان میں سے ایک کی پٹین چاقو والے پر پڑ چکی تھی اور وہ زوردار کراؤ کے ساتھ گر چکا تھا۔ دوسرے کی عام زنجیر میری کمر کھینچتی ہوئی گزری تھی لیکن فی الحال میں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔

وہ تینوں ایک دوسرے پر ڈھیر ہو چکے تھے چاقو والے کا چاقو خود اپنے ایک ساتھی کی گردن میں بیوست ہوتے ہوئے رہ گیا تھا۔ شاید ابھی اس کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے میں ان تینوں کے زرنے سے تو نکل گیا لیکن اس دوران پاپ والا عین میرے سامنے آچکا تھا اور اس نے پاپ گھمرا دیا تھا۔ اس سے تو میں بہ مشکل اور ہال ہال ہی بچا۔ پاپ بلی ہی شائیں کی آواز کے ساتھ میرے سر پر سے گزر گیا۔

اگر وہ میری کھوپڑی پر پڑا ہوتا تو شاید کوار سے زیادہ کا درجہ رہتا۔ اس وار کے خالی جانے اور کچھ بولکھا ہٹ کی وجہ سے پاپ والا لڑکھار گیا۔ میں نے اس کی پٹیلوں میں اس قوت سے گھونٹا رسید کیا کہ شاید اس کی آنتیں اچھل کر حلق میں پہنچ گئی ہوں۔

میں نے سرور اساد پر اُٹھایا تو سر میں گویا پائے سے چلے گئے لیکن میں نے اس تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے سر کے پچھلے حصے کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہاں ایک بڑا سا گومڑ موجود تھا۔ یہی گومڑ گویا ساری تکلیفوں کا مرکز و منبع تھا۔ گومڑ کی تھاکا درد کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جہاں بڑے پائے پر درد کی پرڈکشن عمل میں آ رہی تھی اور وہاں سے درد پورے جسم کو پھیلانی ہو رہا تھا۔

میں اس گومڑ کے نیچے ہاتھ ٹکا کر مزید دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ تکلیف کچھ کم ہو گئی۔ اس سے پہلے سخت قرش پر بھی ہوئی تھی۔ اس گومڑ میں چھ رہی تھی جس کی وجہ سے لیٹے لیٹے سہلانا دشوار تھا۔ درد کچھ کم ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں۔ میں نے اپنی قوت ارادی کو بھی کام میں لانے کی کوشش کی اور اٹھ بیٹھا۔

تب میں نے دیکھا وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کا دروازہ سلاخوں کا تھا۔ کوٹھری کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کون سی جگہ تھی۔ وہ یقیناً حالات کی کوٹھری تھی۔ اس پاس سے بھانت بھانت کی دہلی دی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ارد گرد غالباً اور بھی کوٹھریاں تھیں اور ان میں بھی حوالاتی موجود تھے لیکن میں انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میری کوٹھری کے سامنے بھی کوئی کوٹھری نہیں تھی لیکن جب میں نے دائیں بائیں دیکھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری اپنی زباناں کوٹھری میں مزید دو قیدی موجود تھے۔ دونوں نوجوان تھے اور الگ الگ کوٹھوں میں بالکل ایک جیسے انداز میں اکڑیں بیٹھے تھے مگر فکر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو اتنی بھی توجہ نہیں ہوئی تھی کہ جب میں گراہ رہا تھا اور اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو ان میں سے کوئی ذرا آگے کھٹک کر مجھے سارا ہی دے دیتا۔ وہ دیکھ اس طرح میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی اور تیارے کی مخلوق تھا۔

”گو کہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا“ میں حوالات میں تھا لیکن شاید میرے لیے اس پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا اس لیے میں ان نوجوانوں کی طرف دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔ ”میں حالات میں ہوں؟“ مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میرا سوال احمقانہ تھا لیکن ہر حال۔ الفاظ زبان سے پھسل چکے تھے۔ وہ چاہتے تو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس کائنات میں سیدھا سا جواب بھی دے سکتے تھے لیکن پہلے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے پھر ان میں سے ایک استہزاء سے لہجے میں بولا ”ظاہر ہے۔ یہ پرستان تو نہیں ہو سکتا۔“

اس دندانِ حسن جواب کے بعد مجھے ان سے مزید کوئی بات کرنے کی جرات نہیں ہوئی اور میں سلاخ دار دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں کس طرح بے ہوش ہوا تھا۔ بے ہوش ہوتے ہوئے میں نے جو آخری جملہ سنا تھا وہ بھی

اس نے صوب سے انکر سب کو لٹا کر ”خیرباد کر کے یا چوڑا“ آپ دیکھ کر اُن کے بجائے میری کمر غالباً اپنی گن کا دست رسید کرنا تھا۔ دوسرے بڑے بھی اب مجھے صاف نظر آ گئے تھے۔ وہ بھی باروری پولیس والے ہی تھے جو ہمیں اُٹھائے چاروں طرف سے مجھ پر یلغار کرنے۔ لیے لپک رہے تھے۔ قیمت تھا کہ انہوں نے قازم نہیں شروع دی تھی ورنہ میں بعد میں ”پولیس“ مٹانے میں ہلاک ہوتا۔ ابھی قزاق ہاسکتا تھا۔

باروری کا احترام غالب آ گیا۔ اور یہ احترام مجھے کافی رہا۔ میں نے نہ تو اپنے دفاع کی کوئی کوشش کی اور نہ ہی مزید کسی پولیس والے پر۔ ار کیا مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھ سے جو قلعی مزدور ہو چکی تھی وہ اتنی تھی۔ ایک پولیس آفسر کے دو دانت باہر آ چکے تھے، یہی کافی تھا۔ مجھے مزید ڈر چھوڑے گریز کرنا چاہیے تھا۔ دیے بھی وہ چ سات تھے اور سب کے پاس گتھیں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے صرف گھیرنے اور ہاتھ اٹھانے کا حکم دینے پر اکتا کر س گئے۔

مجھے اپنے اس خیال پر افسوس کرنے کی مصلحت بھی نہیں مل سکی۔ دوری کا جو احترام مجھ پر غالب آیا تھا اس نے مجھے بروقت ہاتھ لانے کا موقع نہیں دیا اور پولیس والوں نے مجھے ہاتھ اٹھانے کا حکم دینے کا تکلف نہیں کیا۔ وہ اپنی گنوں کو لاکھڑیوں کی طرح استعمال کرتے ہوئے مجھ پر تل پڑے۔

بائی ضربات کا تو مجھے کچھ خاص پتا نہیں چلا لیکن ایک گن کا وزن میری کھوپڑی پر ”غٹ“ بیٹھ گیا اور میری آنکھوں کے سامنے نیلے نیلے تارے تاج گئے۔ میں گر پڑا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ میری پمیلیوں وغیرہ پر دو چار ٹھنڈے بھی رسید کیے گئے تھے پھر میں نے گویا بہت دور سے آتی ہوئی ایک آواز سنی ”اٹھو اس آٹو کے پتے کو۔“ موبائل میں ڈالو۔“ اس کے بعد میرا ذہن عمل تاریکی میں ڈوب گیا۔



میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر ایک روشن دھبے پر پڑی مگر اس روشن دھبے میں وہندلاہٹ بھی تھی جیسے کسی موٹے اور وہندلے شیشے کے پیچھے کوئی چراغ روشن ہو۔ دھبے دھبے وہندلاہٹ صاف ہو گئی اور مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک بلب تھا جو لوہی بہت میں قلعی تار کے سرے پر چمک رہا تھا۔

کلن دیر تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میں کہاں تھا۔ اور کیا تھا؟ وہ جو بھی جگہ تھی ”میں کس طرح وہاں پہنچا تھا؟ دھبے دھبے مجھے احساس ہوا کہ میں ایک چٹائی پر چٹ پڑا تھا تاہم مجھے ہاتھ پاؤں آزاد تھے اور چند لمحوں بعد میں انہیں ہلانے پڑے میں بھی کامیاب ہو گیا لیکن جب میں نے اپنا سر اٹھایا تو مجھے محسوس ہوا کہ کوشش کی تو سر کے پچھلے حصے میں یوں تکلیف ہوئی جیسے کھانکھل کر بڑا سا چھوڑا موجود تھا۔

دولت مند آدمی تھا تو حالات میں پڑا تھا جبکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ میں تو اس وقت اپنا دفاع کر رہا تھا جب پولیس پہنچی تھی اور اگر میں بارہوا کا کاربند نہ ہوتا تو پولیس کو وہاں پر بھانے میرا ملید ہی ملتا۔

میری چونکہ ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کیا تھا تھا اس لیے ان احوال میں دل ہی دل میں پولیس کو مزید کوس کرنا آپ کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاید میرے حالات میں کافی دور رس قسم کے اثرات پڑ جاتے تھے کیونکہ اسی دوران باہر بھاری قدموں کی توناز اور سلاخوں کے پار وہی پولیس والا نمودار ہوا جس نے ا سے عین منبر پر ایک عدد گھونٹے سے نواز دیا تھا۔ میرے لیے پچانا مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کے چہرے پر اس گھونٹے نشانیوں موجود تھیں۔ اور یہ نشانیوں جلد ہی معدوم ہونے نہیں تھیں۔

گھونٹا بننے سے پہلے بھی وہ کوئی حسین یا وجہ شخص نہ ہو گا لیکن گھونٹے نے تو اس کی شخصیت پر کچھ زیادہ ہی حیرت اثرات مرتب کیے تھے۔ اس کے ہونٹ بڑی طرح ٹوٹے تھے جن کی وجہ سے شکل ہی عجیب ہو کر رہ گئی تھی۔ انسانوں بھانے کسی کارٹون فلم کا کردار نظر آ رہا تھا۔

وہ میری کونھری کے سامنے آ کر اور میری طرف دیکھ کر خیال انداز میں مسکرانے لگا۔ یہ بلاشبہ بڑے دل گروے کا تھا۔ جب انسان کے چہرے کا یہ مشر ہو چکا ہو تو مسکرانے کے برا حسلہ درکار ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کے دو اذانت نامہ یعنی منہ میں چھوٹی سی ایک تاریک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ منہ گوا وہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز دکھائی دینے لگا تھا جتنا ہندو کے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دراز قد اور ذرا بھاری بھر کم تھا۔ میں نے اسے اپنی طاقت پر ناز بھی رہا ہو۔

میں اٹھ کر کونھری کے دروازے پر جا پہنچا۔ غیر ارادی میں نے دو سلاخیں تمام لیں۔ قیدی عموماً ہی کرتے ہیں۔ میں بھی جو اٹھ مسکراتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا "تم نے وہ" دانت نکل تو نہیں لیے تھے؟ پیٹ میں جھپٹ گئے۔ میں ٹھوکتی آہیں کرتے لگیں۔ دانتوں کو تو اپنا کام کرنے کی عادت ہوئی تھی۔

"چمک لو میری جان! ابھی طرح چمک لو" وہ سہلا کر آواز میں بولا "یہ تمہارا چمکنے کا آخری دن ہے۔ کل کے بعد تم کے قابل نہیں رہو گے؟"

"کیوں۔۔۔ کل کیا مجھے تمہارے سرہانے بیٹھ کر بتانا تھا؟" میں نے مصیبت سے پوچھا۔

"میں میرے چاند اگل تمہارے لہو آجین کو تمہارے منہ چمک کر آؤں، ذرا کرنا بڑے گمراہ۔ وہ لڑکتی ہوئی لہجہ میں بولا۔

مجھے یاد آ گیا تھا اس سے اٹھا کر مہا کل میں ڈالنے۔ کچھ اسی قسم کی بات کی گئی تھی اور شاید دو چار انقلابات سے بھی نوازا گیا تھا۔ مہا کل میں ڈالے جانے کے بعد اگلی منزل حوالات ہی ہو سکتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اس سفید خام لنگور کو کوسا جس نے عاشق ہونے کے لیے سلوا کا انتخاب کیا تھا اور وہ بھی میرے ہو گئی تھی۔ میری موجودگی میں! پھر میں نے اپنے آپ کو کوسا۔ آخر مجھے کیا پڑی تھی جو میں اس مردود کا رقدہ لٹے پر اسے سبق سکھانے چل دیا تھا۔ رقدہ بھی وہ جو میرے نام نہیں تھا۔ اگر وہ میرے ہاتھ میں پہنچی ہو گیا تھا تو جو ان کے لیے اس کا بہترین جواب یہ ہوا کہ میں اس رقدے کو پھاڑ کر جین ایش ٹرے میں ڈال کر تلخ دکھاتا اور باپ بٹی سے اسی طرح مشککہ جاری رکھتا جیسے کچھ ہو اسی نہیں تھا۔ پھر میں نے پولیس کو کوسا جسے میں نے کبھی ایسے موقعوں پر فوری طور پر پہنچتے نہیں دیکھا تھا جہاں اس کی ضرورت ہوتی تھی لیکن ان فوجیوں کے ساتھ میری بارہوا کے دوران اچانک نہ جانے وہ لوگ کہاں سے آن پہنچے تھے۔ اور نہ صرف آن پہنچے تھے بلکہ انہوں نے اپنی روایت کے بالکل برعکس فوری طور پر اس معاملے میں بڑی مستعدی سے ٹانگ بھی اڑادی تھی۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کونھری میں لب روشن تھا لیکن اس سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ حوالات کی کونھری میں توں میں بھی اندھیرا ہو سکتا تھا اور لب بھانے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ میں نے پٹی کلائی کو ٹٹولا۔ اس پر کھڑکی موجود نہیں تھی۔ جیب بھی خالی تھی۔ اپنا مہا کل فون میں ہو گئی میں ہی میز پر چھوڑ آیا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ وہ کل میں سے کسی نے میرا آنا جانے یا جانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میں کہاں گیا تھا؟ پھر مجھے یاد آیا کہ میں کون سا کسی کو بتا کر آیا تھا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ میرا یوں اٹھ کر چلے جانا اور غائب ہو جانا کسی کے لیے بھی تشویش کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کسی کے لیے بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں یونہی کسی بھی وقت اٹھ کر غیر معینہ مدت کے لیے غائب ہو سکتا تھا۔ گویا یہ لائف اسٹائل کبھی کبھی نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا۔ ناگمانی کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا تھا؟ بے اختیار میں نے ایک اتنی لمبائی سانس لی کہ شاید اس سلیٹن زدہ کونھری کی فضا مزید سلیٹن زدہ ہو گئی ہو۔ مجھ سے زندگی میں بڑی بڑی باتیں ہوئی تھیں بڑے بڑے خطرناک حالات سے واسطہ پڑا تھا۔ بہت سی ایسی حرکتیں سرزد ہوئی تھیں جن کے نتیجے میں میں جیل پہنچ سکتا تھا اور وہاں میرا قیام و طعام خاصا خوب ہو سکتا تھا لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ میں حوالات جانے سے بھی بچا رہا تھا۔

میں نے فائدہ سستی کے زمانے میں بھی حوالات کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اب جبکہ میری نہایت معزز نہایت مایوس اور کاٹا

خصوصاً جب اسے اختیارات بھی حاصل ہوں۔

میں نے ملائمت سے کہا ”میرے خادم حسین! مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری غلط فہمی اور کم علمی صورت حال کو پیچیدہ نہ بنا دے۔ تم نے کیا سمجھ کر مجھے حرولت میں بند کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟“

”مجھے معلوم ہے کہ تم شہنشاہ اکبر کے بڑے پوتے یا بڑا نواسہ ہو“ وہ استہزاء سے لہجے میں بولا ”ہم جسے بھی پکارتے ہیں وہ شہنشاہوں اور نوابوں کی اولاد ہوتا ہے۔ کشن زنی کشن کے بھانجے بھتیجے سے کم تر کوئی ہوتا ہی نہیں۔“

مسئلہ واقعی ٹیڑھا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے دماغ گھڑا رکھتے ہوئے بدستور ملائمت سے کہا ”تم یہاں ایسے اچھے آدمی ہو؟“

”ہاں۔“ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ وہ چھڑی دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا۔

”تمیں۔“ تم ہی تو ایسی ہی ہو تے تب بھی مجھے تو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ چلو۔ میں تو اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کر رہا۔ میں سنجیدگی سے۔ تم سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ تم مجھے کیا سمجھ کر پکڑ کر لائے ہو۔ ذرا سنجیدگی سے بتاؤ۔ تمہاری بڑی موصافی ہوگی“ میں نے بہت سی ملائمت سے کہا۔

”جو تم ہو وہی سمجھ کر پکڑ کر لایا ہوں۔ سنسان گلی کوچوں میں لوٹ مار کرنے والا کوئی بد معاش۔ جو ابھی تک ہمارے بچے چڑھنے سے بچا ہوا تھا۔ اور جو خاص طور پر غیر فیکٹوں کو نشانہ بناتا ہو گا۔ انہیں لوٹ کر مار پیٹ کر کے پھینک جاتا ہو گا۔ پچھلے مہینے میں میرے علاقے میں دو تین ایسی وارداتیں ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ تمہارے ہی کارنامے ہوں گے۔ آج رات تمہارے ساتھ ”فتیش“ ہوگی۔ سب بچ چل جائے گا۔ فی الحال تم چمک لو۔ جتنا چمکتا ہے“ اس نے سر ہلایا۔

”تمہیں کس نے بتایا کہ میں ان لوگوں کو مار پیٹ کر لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا؟“

”خود انہوں نے ہی بتایا تھا“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”انہوں نے تمہیں بتایا کہ میں اکیلا ان چاروں کو مار پیٹ کر لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ ان کے پاس ایک عام زنجیر ایک موٹر سائیکل کی چین، ایک باپ اور ایک چاقو بھی موجود تھا۔ اور تم نے ان کی بات کا یقین کر لیا؟“ میں نے بے یقینی اور حیرت سے پوچھا۔

”وہ اختیار ان کے نہیں تمہارے تھے“ وہ سخت لہجے میں بولا۔

”یارے خادم حسین! میں انسان ہوں کالی دیوی نہیں جس کے بت سے ہاتھ ہوتے ہیں۔ وہ چاروں اختیار ان چاروں کے تھے۔“

میں نے بددانت توڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔! اس نے مجھے دو تین اونچی قسم کی گالیوں سے نوازا۔

”دورا قریب آؤ خادم حسین! میں تمہارے باقی وادانت بھی نکال دیتا ہوں۔ میں اس غیر معمولی دانے کو اور بھی غیر معمولی بنا دیتا ہوں۔ شاید آئندہ میں اس کا اندراج ہو جائے“ میں نے کہا۔

”آئندہ میں نہیں۔“ اس کا اندراج خفرائے میں ہو گا جن کھان! وہ ایک بار پھر ملائمت سے بولا ”کیونکہ اس کا تعلق تمہارے خفرائے سے ہے۔ کل تک تمہارا خفرائے بالکل بدل جائے گا۔ کل وقوع بھی بدل جائے گا۔ معلوم نہیں تم کہاں پائے جاؤ؟ اس کا لہجہ گو کہ خطرناک حد تک نرم و شیریں تھا لیکن اس کے مقل میں کوئی درد نہ بول رہا تھا۔ بولے ہوئے غرا رہا تھا۔

”کیونکہ۔“ میرے خادم حسین! تمہارا نام بھی خادم حسین ہے اور دیے بھی تمہیں عوام کا خادم ہی ہونا چاہیے لیکن تم تو بادشاہوں کی طرح بات کر رہے ہو۔“

اس نے اپنے نام کو بھی دوچار صلاواتیں سنائیں اور میری انگلیوں پر چھڑی رسید کی۔ میں نے فوراً سلاخوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ چھڑی انہوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ ”میں خادم بننے کو تیار ہوں لیکن شریف اور پھلے مانس لوگوں کا۔ تم جیسے خنزروں بد معاشوں اور دوا گیروں کا نہیں۔“

”تمیں؟“ میں غصہ بد معاش اور دوا گیر۔“ میں نے اپنی طرف اشارہ کیا اور میری آواز حلق میں اٹک گئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات پر فہم یا دعوں۔

میں نے اپنی ان انگلیوں کو سسٹایا جن پر اس نے چھڑی رسید کی تھی پھر میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”معاذ کچھ سیکس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں اس پر سنجیدگی سے بات کرنا پڑے گی۔“

”تم تمہارے خیال میں اب تک میں ہنجریاں کر رہا تھا؟“ وہ یکدم ذرا ہلچل کر بولا۔ اس نے خالی سلاخ پر ہی چھڑی مار کر اپنے شے کو ذرا تسکین پہنچائی پھر اپنی زخمی انگلی پر مزید دوچار موٹی موٹی گالیوں کا مزہم رکھتے ہوئے بولا ”تمہارے جیسے بد معاشوں کا تو میں جانی دشمن ہوں جو کچھ کا نام بدنام کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت بنا پھرتے خان سمجھتے ہیں۔ غیر فیکٹوں کو بھی نہیں بخشے۔ ان کے ساتھ بھی خفا کر دی کرتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ اپنے ملک جا کر ہمارے ملک کے بارے میں کیا کیا قہقہے سنائیں گے۔“

میں نے اختیار سر کھانے لگا پھر میں نے اپنے کوڑ کو سسٹایا اور دوبارہ غور سے خادم حسین کا جائزہ لیا۔ بہت سے پولیس والوں کی طرح وہ کچھ ایذا اور کچھ موٹے دماغ کا ہوسکتا تھا لیکن اس کے لہجے میں کچھ درد مندی بول رہی تھی۔ وہ یقیناً میری طرح کسی غلط فہمی کا شکار تھا یا پھر یہاں بوجھ کر اپنی آنکھ کا درد انہوں کے لیے جو آواز گڑ رہا تھا۔ کم مشکل آدمی دونوں صورتوں میں خطرناک ثابت ہوتا ہے



اس کا چہرہ غصے سے گزرا تو کچھ اور مضحکہ خیز ہو گیا لیکن وہ کہنا ہی مشکل سے اپنے غصے کا رعبا بول پاتے ہوئے یوں چپک لے۔ چپک لے۔ رات تک چپک لے کھڑے کئے تھے۔ اگلے سے تم خود اپنی آواز نہیں بھانوں گے۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ وہ توجہ ہو گا دیکھا جائے گا۔۔۔ ہمیں نیچے لے جا اپنے شیعے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”لیکن خدا کے لیے تم میرے سوال کا جواب ضرور دے دو۔ یہ سوال تمہارے لیے بھی بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ چاروں کہاں چلے گئے؟“ وہ چند سیکنڈ تک خوفناک نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر غرائز کے سے انداز میں بولا ”ظاہر ہے اپنے ہوٹل چلے گئے جہاں“ نصیر نے ہونے ہیں۔“

”تم نے ہوٹل کے نام اور کمرے نمبر وغیرہ نوٹ کیے ہیں؟“  
میں نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ کیے ہیں آئی جی صاحب!“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔  
”کہو تو راجے پچھلے عقدہ ہوں کی نا۔ نکلیں بھی تمہاری خدمت میں چڑ  
کر دوں؟“

میں نے اس کے ظہور دھیان نہ دیتے ہوئے کہا ”مرعوبیت واقعی انسان کو گمراہ بنا دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے انہوں نے جس ہوٹل کا نام لکھوایا ہو گا اوّل تو وہ اس میں مقیم ہی نہیں ہوں گے اور اگر ہوں گے بھی۔۔۔ تو اب تک وہاں سے رخصت ہو چکے ہوں گے کون سے ہوٹل کا نام لکھوایا ہے انہوں نے؟“

اس نے مجھے میرے ہی ہوٹل کا نام بتایا۔ میں نے سوچا اب اس سے اپنا تعارف کراؤں گا جیسے تھا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اس ہوٹل کا مالک ہوں۔۔۔ بلکہ صرف اس ہوٹل ہی کا نہیں۔۔۔" اے۔ی گروپ آف کمپنیز "کا بھی مالک ہوں۔۔۔" مجھے اس کو غری سے نکال ہی لو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

وہ اپنا غیظ و غضب بھول کر بہت زور سے ہنسا گویا میرے اس بیان سے بہت ہی محظوظ ہوا ہو۔ بچتے بچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں کمری کی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اس کی ہنسی تھکی تو وہ بولا "تجھا؟" تم اس فائبر اسٹار ہوٹل اور اس کے گرد گروپ آف کپینرز کے مالک ہو؟" لہجہ پہلے سے زیادہ شہزادانہ تھا۔

”تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟“ میں نے ملاٹکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں بھلا شک کرنے والا کون ہوں؟“  
میں تو مشورہ دیتا چاہتا تھا کہ ذرا اور اچھی طرح یاد کرلو۔ ذہن  
ذرا اور زور دے لو کہ کراچی کی مزید کون کون سی جگہ تھیں۔  
کون سے کارخانے، ماری ملکیت ہیں۔ ہو سکتا ہے بعض سے  
تمہارے ذہن سے کٹ گئے ہوں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔  
”میں نے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر تمہیں اطلاع فرمانے کی“

”دور تم خالی ہاتھ جا کر ان چاروں سے بھڑکے تھے۔ واہ بے  
ہرزین کے بچے! وہ تمہارا لہجہ میں بولا۔“

”میں نہیں بھڑا تھا۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مجھ سے توجو  
 سکا تھا میں وہ کر رہا تھا“ میں نے ملا ٹمٹ سے کہا۔

”جس وقت ہم نے حمیس قابو میں کیا اس وقت مونز سا نیگل کی ایک چٹن اور لوہے کی ایک عام موٹی سی زنجیر تھارے ہاتھوں میں تھی“ اس نے گویا براہم کھنڈ اٹھایا۔

”بے شک تھی“ میں نے حلیم کیا ”وہ دونوں زنجیریں میں نے انہی سے جھنجھکی تھیں۔ اگر تم ملاحظہ نہ کرتے تو میں انہیں ان کی غذا گروہی کی ٹھیک ٹھاک سزا دیتا۔ تم نے فکر کام سنوارا نہیں۔ بگاڑا۔“

[illegible]

”ہاں، واقعی ہم غلطے بد معاش بڑے ہی کیسے بڑے ہی  
 گھٹیا لوگ ہیں۔ ساری بدامنی ہم ہی لوگوں کی وجہ سے ہے“ میں  
 نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”لیکن وہ چاروں شریف اور معزز لوگ  
 کہاں ہیں؟ انہیں تم نے حوالات کی کس کوٹھری میں ڈالا ہے؟“

”وہ رپورٹ لکھو اگر چاہے۔ اگر ضرورت پڑی تو دوبارہ آجائیں گے ورنہ تمہیں تو انجام تک پہنچانے کے لیے ہم ہی کافی ہیں۔ مدعی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت تو میں خود بھی مدعی ہوں۔ تم نے شاید کسی ایسے اچھوٹے دانت کو زنا قرار سمجھا ہو گا۔“

”اصل میں اس وقت تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ میں کسے کھوٹا رسید کر رہا تھا اور جب میں نے دیکھا تو مجھے یہ قانون کا احترام غالب آیا۔ اگر مجھے معلوم ہو تاکہ تم اتنے بڑے گمراہ ہو تو میں تمہارے رشتہ نہیں بلکہ شکا توڑتا۔“ میں نے لائیک لہجے میں نہایت جھنجھکی سے کہا۔

پھر یکدم غیر ارادی طور پر میرا الجھ بدل گیا۔ میں نے گنج کر کہ  
 ۳۷؎ گدھے! وہ چاروں کہاں چلے گئے؟

اس کی رحمت متغیر ہو گئی۔ مزید فحش سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ دانتوں کی کھلی اور بُری طرح سوجے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ

اُبال پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "چھاتم مجھے ایک فون کرنے کا موقع تو دے۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ بس مجھے ایک فون کرنے دو۔ اس کے بعد جو کچھ بھی کہنا ہو گا وہ دوسرے ہی آکر تم سے کہیں گے میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"یہ حالات ہے یا رہے ایک کال آفس نہیں ہے۔ وہ اطمینان سے بولا اور میرا اطمینان رخصت ہونے لگا۔

"دیکھو... مجھے اپنی اتنی فکر نہیں ہے۔ مجھے ان چاروں بد معاشوں کی زیادہ فکر ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش جاری رکھی "اول تو مجھے یقین ہے کہ وہ نکل چکے ہیں لیکن اگر ابھی تک نہیں نکلے ہیں تو تساری کٹ جتنی میں نکل جائیں گے ان میں سے ایک... جس نے اصل میں فساد شروع کیا تھا، مجھے میرے ہوٹل میں ہی جیسا نظر آیا تھا لیکن میرا خیال ہے وہ لوگ میرے ہوٹل میں نہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ کہیں اور سے آئے ہوئے تھے۔ تم ان کی غیر ملکی ہونے سے مرعوب ہو گئے اور وہ نکل گئے۔ وہ اپنے خاصے دارا سے معلوم ہوتے تھے۔"

"تمہیں ان کی فکر میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے مشورہ دیا۔

"چھاتم اگر تم مجھے فون کرنے کا موقع نہیں دے سکتے تو کم از کم خود ہی میرے ہوٹل فون کر کے میرے بارے میں کچھ معلومات کرلو" میں نے کہا۔

"میں اتنا فارغ نہیں ہوں۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔

"جی اتنی دیر سے اپنا یہ کھڑکی والا منہ لیے میرے سامنے کھڑے ہو اور دیکھو اس کیے جارہے ہو۔" آخر مجھے دوبارہ کچھ غصہ آگیا "یار اتم تو بہت ہی خردماغ آدمی ہو۔ کسی طرح بات مان کر ہی نہیں دیتے۔"

"اگر میں اپنے بچوں سے ہوئے ہر آدمی کی بات ماننے لگوں تو پھر میں کرچکا تنہا داری۔" وہ سر جھٹک کر بولا "میں تو ہر کوئی ایک نئی کہانی سنانا ہے۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور ذرا نرمی سے بولا "تساری جیب سے کوئی ایسی چیز نہیں نکلی جس سے تساری شناخت میں مدد ملتی ہو۔ اور نہ ہی کوئی رقم وغیرہ تھی۔"

اسے گویا میری جیب سے رقم برآمد ہونے کا افسوس تھا۔ رقم سے ہی شاید وہ میری حیثیت کا تعین کرتا۔ میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی "میں تو کھانا کھانے کے لیے اوپر اپنے کمرے سے نیچے ہال میں آیا تھا۔ میں کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔"

میں نے جلدی جلدی اسے مختصر اس جھگڑے کا پس منظر بتایا کیونکہ وہ کچھ توجہ سے میری بات سمجھنے پر تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ معلوم نہیں میرے جلدی جلدی بتانے کی وجہ سے بات اس کی سمجھ میں آئی بھی یا نہیں۔ ہر حال اس کے بعد میں نے کہا۔ "ویسے بھی

ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟ جو لوگ ان چیزوں کے مالک ہوتے ہیں ان کے سینک ہوتے ہیں یا ڈم ہوتے ہیں؟" میں نے اس کی بے نیکی پر اصرار ان ہوتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے سر ہلایا "میں اور سینک تو پاگلوں اور گمراہوں کے بھی نہیں۔" تھ۔

"تم مجھے پاگل سمجھ رہے ہو یا گمراہ؟" میں نے اسے گھورا۔ "یہ تو تمہارے تفصیلی حاشئے۔ بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔"

آج کی رات تم ہمارے صدا خانے۔ گزار لو گے تو پھر کل میں قید کروں گا کہ مجھے تمہارے بارے میں کیا رائے قائم کرنی چاہیے۔ فی الحال میں اپنی رائے محفوظ رکھ رہا ہوں۔" وہ بڑے مذہبانہ لہجے میں بولا۔

"آخر یہ بے اعتباری کیوں ہے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو جن کی۔" وہ گویا میری ٹانگی پر

الوس کرتے ہوئے بولا "لوگ۔ ایک نایاب اشارہ ہوٹل اور

گروپ آف کینیز کا مالک بچھلی گل میں ٹھنڈوں سے دست برد

لڑا پھر رہا تھا؟ اوسے تمہارے پاس کوئی بندہ نہیں تھا اس قسم کے

کاموں کے لیے؟ کوئی سیکرٹری گاڑا۔ کوئی گاڑی کا رنڈ۔ کوئی چھاپا۔

آج کل تو دکانداروں نے بھی گاڑی رکے ہوئے ہیں۔ تم

اپنے آپ کو جتنا بڑا سیٹھ بتا رہے ہو تاکہ اسے بڑے سیٹھ تو فقیر کو

شعاف گرو بابا بھی اپنے منہ سے نہیں کہتے۔ اس کام کے لیے

بھی انہوں نے کوئی رکھا ہوتا ہے۔ تم وہاں سنسان گل میں چار چار

تویلوں سے پنگا لے رہے تھے جو تمہارے دعوے کے مطابق

بد معاش بھی تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔"

اسی نے بڑے سادہ الفاظ میں اپنی بے اعتباری کی وجہ بیان

کر دی تھی۔ تب اس کے دوسرے پر میری حیرت کافی حد تک دور

ہوئی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یار اے دوست! آدمیوں

کی تو میرے پاس کوئی کمی نہیں۔ گاڑی وارڈ بھی ہیں۔ لیکن کیا

کولہ۔ عاویں دست بھی ہوئی ہیں۔ سب سے بڑی عادت تو یہ ہے

کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنی گاڑی

تک خود ڈرائیو کرتا ہوں۔ ویسے تمام ضروری کاموں کے لیے آدمی

موجود ہیں۔ بلکہ پوری فوج ہے لیکن اتفاق کچھ ایسا ہے کہ اکثر

ضروری موقعوں پر تو انہیں کھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ یا پھر میں

خود بھول جاتا ہوں۔ میری یہ تفصیر صاف کر دو یہاں کیا یہ اتنا بڑا کمانہ

تو نہیں ہے کہ تم اُٹھا کر مجھے حالات میں ڈال دو اور رات کو

"پتھول شروع" کا پروگرام بتانے لگو۔"

"پروگرام پتھول شروع سے مت آگے جانے کا پتہ ہے۔"

اس نے میری تقریر سے متاثر ہوئے بغیر بڑے شیریں لہجے میں کہا

"دیکھئے تم نے جیسا خوب دلا ہے۔ آدمی ذہین معلوم ہوتے ہو۔"

میرا دل کچھ ڈوب سا گیا۔ وہ گویا میری بات پر یقین کرنے

کے لیے تیار معلوم نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اُٹھتے

معلوم ہوتے ہیں۔ گتا کیا ہے کہ آپ تو کچھ نہ کچھ دے دلا کر کسی اور زیادہ بڑے آدمی کا فون وغیرہ آتے پر جھوٹ ہی جان کر گئے۔ لیکن یہاں سے جاتے وقت ذرا ہم غریبوں کا بھی خیال رکھ کر گئے۔ ہمیں تو کوئی چھڑانے والا بھی نہیں ہے۔ اور ہمارا تو یہ بہت بڑا احقر کر رہا ہے۔ اس کی آواز بھرانے لگی۔

”تمہیں کس سلسلے میں پکڑا لیا ہے؟“ میں نے ہمدردانہ لے میں پوچھا۔

”ڈپل سواری موٹر سائیکل چلانے کے جرم میں۔“ اس نے جواب دیا۔

”جب پابندی ہے تو تم یوں چلا رہے تھے ڈپل سواری؟“ ہم نے پوچھا۔

”دفعتاً۔“ اس نے گھبرا کر دوسرے لڑکے کی طرف دیکھا۔

”مجھ پر کی آن پڑی تھی کی؟“ دوسرا لڑکا جلدی سے بولا۔  
دونوں کو فوری طور پر ایک جگہ جانا پڑ گیا تھا۔ بہت جلدی کا کا تھا۔ سواری نہیں مل رہی تھی۔ فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔  
نے سوچا تھا وہ مٹھ کی تو بات ہے۔ بچے بچا تے گزر رہے تھے۔  
شاید راستے میں کوئی پولیس والا نہ گرائے۔“

پہلا لڑکا غصی سانس لے کر بولا ”ویسے میںوں تک کوڑا پولیس والا نظر نہیں آتا۔ لوگ بڑی بڑی وارداتیں کر کے بھاگ جاتے ہیں۔ کچھ بچے بھگے ہوئے بازاروں میں واردات کر کے ٹکیوں اور کارڈوں میں بھاگ جاتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں روک پاتا۔ کبھی کبھی ہم جیسے غریب غریبوں میں بھی ڈپل سوارا جا رہے ہوتے ہیں تو دو چار قدم بعد ہی پکڑے جاتے ہیں۔“

”بے شک۔ بہت ہی عجیب بات ہے۔“ میں نے اس کی پہلا چوٹی چیلکی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تمہارے لیے کوئی بھاگ دیا کرنے والا نہیں ہے؟“

”نہیں سر! ہم دونوں کے تو ماں باپ بھی نہیں ہیں۔“ اس نے لمبے میں مسکینی تھی۔

”کرے کیا ہو؟ پڑھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں سر! پڑھنا تو ہمارا چھوٹ بچا ہے۔ میں ایک دکان میں کام کرتا ہوں۔ یہ ایک کہنی میں کام کرتا ہے۔“ اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ ”موٹر سائیکل اسی کی تھی۔ اسے کچھ کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔“

”تمہارے ماں باپ نہیں ہیں تو رہے کس کے ساتھ ہو؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں اپنے شادی شدہ بھائی کے ساتھ رہتا ہوں۔“ بچے نے اپنے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن انہیں پتا چلے گا تو وہ ہمیں چھڑانے کے بجائے اتنا لاقصد بن جائیں گے۔ تو وہ ویسے ہی ہم سے ہٹا

زیادہ بڑے کا دہاری لوگ جب میں رقبے لے نہیں گھومتے۔ میں تو اس وقت ایک طرح سے اپنے ”گھر“ میں ہی بیٹھا تھا۔ ویسے بھی میں اپنی جیبوں میں کوئی ایسے کاغذات لے نہیں پھرتا جن سے میری حیثیت کا پتا چلا ہو یا یہ ظاہر ہو تا ہو کہ میں فلاں فلاں چیز کا مالک ہوں۔ کبھی یہ ثابت کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ زندگی میں کبھی تم جیسے ٹیڑھے آدمی سے واسطہ پڑ جائے گا۔ اور وہ بھی ایسے حالات میں۔“

میں غصی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ لیکن وہاں ”نہیں۔“ جہد نہ جہد کچھ ”ولا معاملہ معلوم ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں جو سنگ سا تھی تھی سو جاگتی تھی۔ اس کے اثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

وہ جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا ”فی الحال تم آرام سے بیٹھو۔ تم سے ”سمان خانے“ میں ہی ساری ضروری باتیں ہوں گی۔ وہاں آدمی ذرا دوسری طرح بات کرتا ہے۔“

جاتے جاتے اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ گویا مجھے یاد دلانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دانت ٹوٹنے والی بات بھولا نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ تو بہت ہی بڑا ہوا تھا۔ اگر یہ بد بخت خادم حسین کسی بھی طرح میری بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا تو میں کس طرح اس پر اپنی شناخت ثابت کر سکتا تھا؟ وہ کسی سے میرا رابطہ کرانے پر تیار نہیں تھا۔ میں تو بیٹھے بیٹھے اچھی بجلی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میرا تو آج شام فرح کی طرف چکر لگانے کا پروگرام تھا اور میں یہی سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ اگر مشکل کھلا ل گیا تو رات بڑی رنگیں گزرے گی۔ یہاں تو رات کسی اور ہی طرح گزرتی نظر آ رہی تھی۔ ابھی تو سر کے گھر میں ہی بیٹھیں اُنھہ رہی تھیں۔ کل تک تو داستان ٹھم نہ جانے کس موڑ تک پہنچ سکتی تھی۔ ہوئی میں کم از کم کل تک تو کسی کو احساس نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کہیں غائب ہو گیا ہوں۔

اس کے بعد اگر احساس ہو بھی جاتا تب بھی شاید کسی کے وہم و گمان میں نہ ہوتا کہ میں کسی حوالات میں بھی پایا جاسکتا ہوں۔ میری گمشدگی کا تاثر واضح ہونے میں شاید تین چار دن لگ جاتے اس کے بعد بھی اگر مجھے تلاش کیا جاتا تو شاید حوالات کے سرا جاتی ہر جگہ کھانسی جاتی۔

مجھے ذرا پریشانی کے عالم میں بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں نوجوان کھینکے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ اب ان میں سے ایک بولا تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ نرمی اور احترام سے بولا ”سر! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ تمہارے دماغ کا پتچہ آپ پر پڑنا ڈال رہا ہے۔ بہر حال کسی نہ کسی وقت آپ کے بارے میں تصدیق ضرور کرے گا۔“ وہ نوجوان اور کم عمر ہوتے ہوئے بھی اس طرح بات کر رہا تھا جیسے اسے ان معاملات کا کافی تجربہ تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”آپ بہر حال بڑے آدمی

چہ بچے والے ہوں گے۔

”اوہ!۔۔۔“ میں کراہ کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا مجھے ان لوگوں کے بچے چڑھے جنہیں کھنے گزر چکے تھے۔ تین بیگے کے قریب میں اپنے ہوٹن کی قبضی لگی میں نکلا تھا۔

میں ایک لمبھی سانس لے کر سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر پٹائی پر لیٹ گیا۔ اب میں انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ خدا داغ تھانے دار میرے ہوٹن فون کر ہی لے اور وہاں سے اسے میرے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں۔

میری اس دعا کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آیا۔ برابری کو ٹھہروں سے لوگوں کے آنے جانے اور کسی کو لانے کسی کو لے جانے کی آوازیں آتی رہیں لیکن ہم تین حوالتوں پر گویا کوئی خصوصی کرم تھا کہ کسی نے آکر ہماری کوٹھری میں جھانکا تک نہیں۔

حوالات کی ساخت بھی کچھ عجیب سی تھی۔ ہماری کوٹھری کا فرش کچھ ایسا تھا کہ برابری کو ٹھہروں میں آنے جانے والوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے آوازیں دے کر بھی کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ طبیعت پر جبر کرتے ہوئے تھوڑا بہت شور بھی مچایا لیکن تب بھی کسی نے آنکارا نہیں کیا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی دھمکی نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوٹھری جھانک کر ہمارے لیے ختب کی گئی تھی کہ وہ لوگ ہمیں اس میں ڈال کر بحال کر جائیں۔

آخر کار میں مایوس ہو کر واپس پٹائی پر آ بیٹھا۔ میں نے خود کو تن پر تقدیر چھوڑ دیا۔ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میں نے محسوس کیا بول بول رات گم ہوئی تھی ان دونوں لوگوں کے چہرے گویا سوکھتے جا رہے تھے ان کے منہ خلوارا نہیں جھینٹتا زرا سے نکل آئے تھے۔ ہونٹوں پر پٹریاں جم چکی تھیں۔ اب ہمارے ارد گرد سکوت چھا چکا تھا لیکن یہ سکوت شاید انہیں اور بھی زیادہ خوف زدہ کر رہا تھا۔

بے بسی اور مایوسی نے مجھے بھی کچھ پڑمروہ سا کر دیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ میں نے بہت بڑے حالات میں بھی کبھی اپنے آپ کو ایسا پڑمروہ محسوس نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بدو جہد کے لیے کم از کم آزاد ہوتا تھا۔ مجھے توجہ تھوڑا ہوا تھا کہ بے بس چوہے کی طرح کسی چوہے دان میں پھنس جانا اپنی جگہ ایک سزا تھی۔

اس عالم میں شاید چند لمبے کے لیے میرے ذہن پر غنودگی نے بھی غلبہ پایا تھا۔ میں نے ملے قدموں کی آواز سن کر چوٹا اور تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ غنودگی خورانی غائب ہو گئی۔ کشیدگی اور تازہ آنے اس کی جگہ لے لی۔ قدموں کی یہ آوازیں میرے لیے نہ جانے کیا پیغام لے کر آ رہی تھیں۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

جہانے کا کوئی بھانڈا ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ سب سے ہماری کچھ درد منور کر سیں۔ آپ کو دعائیں دیں گے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔“ یہ لوگ ہم پر پتا نہیں کون کون سا عقدہ ڈال دیں۔“

”پٹلے میں اپنی مدد کا کوئی طریقہ سوچو۔“ اگر میں خود اپنی مدد کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر تمہاری مدد تمہارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔“ میں نے لمبھی سانس لے کر کہا ”یہ احوال تو میں خود بہت برا چھنی گیا ہوں۔ اس قسم کی صورت حال کا تو میں نے بھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ صرف ایک ٹیلی فون کال سے میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اور یہ بد بخت۔ ایک فون کرنے کا موقع نہیں دے رہا۔“ میری مٹھیاں سمجھ گئیں۔

”موقع تو وہ یقیناً دے گا۔“ ایک نوجوان نے مہینا نہ لیجے میں گویا مجھے تسلی دی ”بھی وہ بڑے شے میں ہے۔ آخر آپ نے اس کے رانت تو تھے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات واقعی نہیں ہے۔ اس کا تواپنے علاقے میں بڑا دید ب ہے۔ بڑے بڑے دادا گیر اس سے کسی کتراتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے؟“ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی ناک بڑی ٹوکیلی تھی۔

”ہمارے علاقے کا تھانے دار ہے نا۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا ”آخر انسان کو اپنے علاقے کی باتوں کا تو پتا ہوتا ہے۔ ہم اور دوسرے گھومتے پھرتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔“

”الہ۔۔۔ یہ بات تو ہے۔“ میں نے سر ہلایا اور پھر اپنے گھر کو سٹرایا۔

دوسرے نوجوان نے مجھے مزید تسلی دی ”ابھی تو اس کا دانت ٹوٹنے کا درد بھی کم نہیں ہوا ہو گا۔“ ڈاکٹر کے پاس سے آیا ہو گا۔۔۔ دو اور خیر کھائی ہوگی۔ جب دوا کا اچھی طرح اثر ہو گا۔ تکلیف کم ہوگی تو اس کی کھوپڑی لمبھی ہوگی پھر وہ یقیناً تو خود آپ کے بارے میں معلومات کرے گا یا پھر آپ کو ایک آجودہ فون کرنے کا موقع دے گا۔ بہر حال آپ کے بارے میں تھوڑی بہت تسلی کیے بغیر وہ آپ کو اٹنا نہیں لٹکائے گا۔“

پھر ایک لمحے خاموش رہ کر وہ بولا ”وہیے آپ نے اپنے بارے میں جو دعویٰ کیے ہیں اگر وہ ٹھیک نہ ہوئے تو پھر آپ کا بڑا براہشر ہو گا۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک لمحے خاموشی کے بعد پوچھا ”ہم کون کیا ہوا ہو گا؟ تمہیں سے کسی کے پاس گھڑی ہے؟“

”گھڑی۔۔۔“ ایک نوجوان استہزائیہ انداز میں ہنسا ”آپ کی طرح ہمارا بھی سب کچھ انہی کے پاس ہے سوائے توکتے ہیں بے شک۔ ہمارے کپڑے بھی آٹا لیں۔ بس ہماری کمال ہمارے جسم پر پائی بیچوڑیں۔ اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔“

”دوسرا نوجوان بولا ”وہیے مجھے وقت کا اندازہ ہے۔ اس وقت

لیے مجبورے دونا ہوں لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ہمارا مسئلہ ہونے کے لیے اچانک کوئی سبب بن جاتا ہے۔ حکم گویا آواز بادل چھٹ جاتے ہیں اور سورج نکل آتا ہے۔

اس وقت مجھے کچھ ایسا ہی تجربہ ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا میرے سامنے مایوسی کی تاریکی کبھی تھی ہی نہیں۔ آپ یاد کریں آپ کو بھی زندگی میں ایسے بہت سے مواقع یاد آئیں گے جب آپ کو مایوسی کی دلدل میں اترتے اترتے یکدم ہمارے آگے تھے۔ میں ہی دل میں اس تجربے سے لطف اندوز ہونے میں کچھ اس طرح تھا کہ مجھے شفیع شاہ اور ذرتاج سے یہ پوچھنے کا بھی خیال نہیں تھا کہ وہ وہاں کس طرح آئے تھے۔ شاید غلام حسین نے ہر ہوٹل سے رابطہ کر لیا تھا حالانکہ وہ یہ ذمت کسے پر اتار دے نہیں آتا تھا۔

غلام حسین خاصے خادمانہ انداز میں ہتے ہوئے ہوا۔ آپ کے لیے جانے وغیرہ مذاقوں یا پہلے آپ کھانا کھانا پیند کر کے؟ ٹھیک ہے آپ فائو اسٹار ہوٹل کے مالک ہیں۔ آج کر ہوٹل میں ہی رہ رہے ہیں۔ وہیں کے کھانے کھاتے ہوں گے۔ آج ہم غریب پولیس والوں کے ساتھ بھی کھانا کھا کر دیکھ لیجئے۔ ”غریب پولیس والے۔“ میں کراہ کر رہ گیا۔ ”اس خوشحالی علاقے کا ایسا انجانا ہوتے ہوئے تو ایسی بات مت کہو۔“ ”خدا ان چھوٹیں سرا! آپ بتائیں کیا کھانا پیند کریں گے؟“ آپ پیند کریں گے، حاضر ہو جائے گا۔“ غلام حسین بر سرِ سرکار تے ہوئے ہوا۔

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔ جو میں پیند کروں گا حاضر ہو جائے گا۔“ میں نے کمری سانس لے کر کہا ”اگر تم مجھے کچھ کھانا پیند چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ چار چھ پچترہ پانچ سات ٹھہرے۔ آٹھ دن گھوٹے۔ بارہ پندرہ پچترہ اور بیس تیس گالیاں کھلو اور۔“ اس وقت ذرا ہلکا پھلکا ہی کھانے کا موڈ ہے۔

وہ زور سے ہنسا لیکن اس کی ہنسی کراہ سے مشابہ تھی ”ہاں کیوں مذاق اڑاتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہم سے غلطی ہوئی لیکن یہاں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ تھوڑی بہت غلطی آپ کی بھی تھی۔“

”تھوڑی بہت نہیں۔ زیادہ غلطی میری تھی“ میں نے حتم کیا ”لیکن اس سے بھی بڑی غلطی اب تم کر رہے تھے کہ میں جیسا اپنے بارے میں بتا رہا تھا لیکن تم اس کی تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ شکر ہے آخر تم نے میرے ہوٹل رابطہ کر لیا اور میری شامت آتے آتے رہ گئی۔“

وہ کچھ کھینکا سا نظر آنے لگا۔ اس کی وجہ مجھے تب معلوم ہوا جب ذرتاج نے کھانا کرکھا صاف کیا اور بولی ”انہوں نے لاپ بھی کسی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہم ان کے رابطہ کرنے پر تو قیلا نہیں پہنچے ہیں۔ اور یہ جو تمہیں اتنے مہربان نظر آ رہے ہیں انہیں

تین افراد میری کونٹری کے دیوانے پر آئے تھے اور میرے بچے سے بے اختیار ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ تین افراد شفیع شاہ، ذرتاج اور ایسا انجانا غلام حسین تھے۔ غلام حسین آگے آگے تھا۔ ذرتاج اور شفیع شاہ اس کے پیچھے تھے۔ ان کے چوہوں پر کمری بھید کی تھی۔ ایسا انجانا کا چوہہ حورم ہوٹنل سے قطع نظر سپاٹ نظر آ رہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا انجانا اوڑھے خود آگے بڑھ کر کونٹری کا تالا کھولا اور صرف مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں باہر آچکا تو اس نے کونٹری کو دوبارہ تالا لگا دیا۔ میں نے پلٹ کر ایک نظر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ وہ پرامیدی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے آنکھوں سے آنکھوں میں گویا انہیں تسلی دی کہ میں... ان کے لیے ضرور کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔

نہایت خاموشی سے ہم تینوں ایسا انجانا کی رہنمائی میں ایک طرف کوچنگ دیے اور تب مجھے حالات کی دوسری کونٹریوں پر نظر ڈالنے کا موقع ملا جن میں حوالاتی بھڑ بھڑکیوں کی طرح گھٹنے ہوئے تھے۔ ہم تاریک اور غمست زدہ سے راستوں سے گزر کر ہم غلام حسین کے ساتھ اس کے آفس میں پہنچے تب اس کے چہرے پر کچھ تاثرات نمودار ہوئے جو پہلے کے تاثرات سے بہت مختلف تھے۔ اس نے صرف شفیع شاہ اور ذرتاج کو ہی نہیں، مجھے بھی نہایت ادب سے کمری پیش کی اور بڑی نرمی و احترام سے بولا ”سرا“ میں معذرت چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔“

”نہیں پیارے غلام حسین! تکلیف تو شاید میں نے خود اپنی وجہ سے اٹھائی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کمری پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا ”لیکن شاید یہ تکلیف دو دانت ٹوٹنے کی تکلیف سے بھر بھی کم تھی۔ اور شکر ہے اصل ”تکلیف“ شروع ہونے سے پہلے ہی حالات نے پلٹا کھالیا۔“

وہ منظرانہ انداز میں جھڑکیوں کو ہاتھوں میں مٹھاتے ہوئے خوش دلی سے ہنسا۔ اب اس کے چہرے پر ہفتہ اور غمست نہیں تھی تو اس کے سوجے ہوئے ہونٹ بھی برے نہیں لگ رہے تھے۔ میں اس کے تاثرات کی اس تبدیلی کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں قدرت کے کاموں پر حیران ہوا تھا۔ جب بھی آپ کسی مشکل میں ہوتے ہیں، بڑے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، بڑے جتن کرتے ہیں، انجی سی ہر دھڑلاتے ہیں مگر آپ کی ایک نہیں ہلکی۔ کہتے ہیں مایوسی گھر ہے، مایوس نہیں ہونا چاہیے، بہت نہیں ہانپنا چاہیے لیکن فطری سی بات ہے۔ انسان زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت مایوس ضرور ہوتا ہے۔ پوری طرح شکست خوردہ نہ سہی لیکن خود کو تھوڑا بہت دل گرفتہ ضرور محسوس کرتا ہے۔

ایسے میں اچانک کوئی مجبور سا دونا ہوتا ہے۔ شاید اسے مجبور نہیں کہنا چاہیے۔ ہم جیسے گناہ گار اس قابل کہاں ہیں کہ ہمارے

تو پھر ایسی ہی انہوں نے ہوتی ہیں "ذرتاج بولی "ہر حال... ہمارے  
پریشان پھرتے رہے۔ ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی گزرتا  
تھی۔ آخر کار ہمیں ایک "مرد دھڑی" سی گاڑی کے پاس ایک بو  
سایا سی کوڑا ملا۔ اسے شاید ہماری پریشانی پر کچھ ترس گیا۔  
کے ٹھکر کی ایک کڑی ایسی تھی جس میں کھٹکی ہے۔ اس کڑی کے در  
اس نے سب کچھ دیکھا تھا لیکن جیسا کہ ہمارے ہاں عام ہوا  
ہے۔ وہ بے چارہ بھی پریشانی سے بچنے کے لیے اور پولیس  
پکڑوں سے دور رہنے کے لیے خاموش تھا اور انجان بنا ہوا  
اس نے پہلے ہم سے وعدہ کیا کہ ہم اسے کسی کی چکر  
لوٹ نہیں ہونے دیں گے۔ پھر اس نے بتایا کہ اس نے کئی  
کس طرح جھگڑا ہوتے دیکھا تھا۔ کس طرح ایک شخص بے ہوش  
ہوا۔ کس طرح پولیس اسے سوا کل میں ڈال کر لے گئی۔ تو  
قسمتی سے سوا کل کا نمبر اوز ملانے کا نام بھی اس نے دیکھا تھا  
وہ اپنے ہی علاقے کی سوا کل تھی۔ میں نے فوراً ڈی آئی جی ساد  
سے رابطہ کیا۔ وہ میرے جانے والے ہیں۔ ان کا تعلق ذرتاج  
کے ایک قریبی گاؤں سے ہے۔ اتفاق سے وہ ہمارے بھی جا  
والے نکل آئے۔"

"ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے ہم جیسے غریب فرما کو یاد  
ہوا ہے۔ روت پولیس والے بھلا کب کسی کو یاد رکھتے ہیں؟" میں  
خادم حسین کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کرسی پر کسمسا تھا۔  
ذرتاج سلسلہ کام جوڑتے ہوئے بولی "انہوں نے یہاں  
کر کے تصدیق کی کہ کیا اس خطے کا کوئی آدمی یہاں لایا گیا تھا؟  
اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا؟ خادم حسین صاحب نے  
مشکل سے اقرار کیا۔"

"پھر بھی شکر کا مقام ہے کہ اقرار کرتویا" میں نے کہا "اگر  
مجھے "مسمان خانے" میں جھوٹے ہوتے تو شاید ان کے لیے آ  
کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔"

"نہیں جی۔ وہ تو میں ایسے ہی ذرا آپ کو دکھانے کا  
تھا۔" خادم حسین کھدائی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میں نے آ  
کو ایسے ہی مسمان خانے میں نہیں بھیج دیا تھا۔ پہلے آپ  
بارے میں تو خودی بہت تحقیقات تو کرنی ہی تھیں۔"

"مزید تو نہیں تھی۔ ہر حال۔ تم کہتے ہو تو ان لینا ہوں۔"  
نے سر ہلایا۔  
ذرتاج مجھ سے مخاطب ہوئی "ہم نے اپنی داستان غم تو جہ  
مکادی۔ اب اُنھیں اور چلو۔ بے چاری آنگریز مینا کی  
ہمارے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔"

کی وجہ بھی صرف ہم نہیں ہیں۔ انہیں ڈی آئی جی صاحب نے  
فون کیا ہے۔ اس لیے ان کے لیے سے شدت تک رہا ہے۔"  
"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا "انہوں نے تم سے رابطہ  
نہیں کیا؟ تو پھر تم لوگ یہاں کس طرح پہنچے؟"  
ذرتاج ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہاری قسمت اچھی تھی  
جو پہنچ گئے۔ ورنہ شاید آج خادم حسین صاحب قوم کے خادم کی  
حیثیت سے تمہاری کچھ نہ کچھ خدمت کری گزرتے۔"  
"پھر بھی؟" میں نے تجسس سے پوچھا "کیسے ممکن ہوا؟"  
"در حقیقت سلوانے تمہاری عدم موجودگی کو محسوس کیا اور  
اسی کو اس معاملے میں کچھ گڑبگڑ کا بھی احساس ہوا۔" ذرتاج بتاتے  
لگی "اس نے دیکھا تھا کہ تمہیں باہر سے کوئی رشتہ آیا تھا اور اس  
کے بعد سے ہی تم اس طرح پراسرار سے انداز میں غائب تھے کہ  
تمہارا سوا کل فون بھی اس روز ڈویژن پر رکھا گیا۔ وہ شام کو جنرل  
فیور سے مل کر اس سلسلے میں بات کر رہی تھی جب اتفاق سے میں  
بھی تم سے ملنے کے ارادے سے وہاں جا پہنچی۔ وہ ٹی والے اس  
لے زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہو رہے تھے کہ اس طرح غائب ہونا  
اور آتے جاتے رہنا تمہارا معمول ہے۔"

"میں خود اسی بات سے ڈر رہا تھا کہ وہ یہی سوچیں گے" میں  
نے کراہ کر کہا۔

"انسان کو خود بھی اپنی بڑی عادتوں کا پتا ہوتا ہے" ذرتاج  
خندیدگی سے بولی۔ میں نے اسے گھورا تاہم اس نے بات جاری  
رکھی "ہر حال سلوانے تشویش زدہ رہی۔ اس کی چھٹی جس اس سلسلے  
میں اس کی بھیج رہی تھی۔ مجھے بھی اس کی تشویش میں  
شرک ہونا پڑا۔ اسی دوران شفیع شاہ بھی وہاں آن پہنچا۔ یوں ہمارا  
کام آسان ہو گیا۔ شکر ہے شفیع شاہ نے تمہاری عادتوں سے واقف  
ہونے کے باوجود اس معاملے کو غیر اہم نہیں سمجھا۔"

اس نے مسکرا کر شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ شفیع شاہ نے  
سر جھکا لیا۔ بات ذرتاج نے ہی جاری رکھی "ہم نے سلوانے کو تو اس  
کے کمرے میں بھیج دیا اور تمہارے بارے میں "تفتیش" شروع  
کی۔ پتا چلا تمہیں پچھلے گیت کی طرف جانے ہوئے دیکھا گیا تھا۔  
پچھلے گیت کے راستے ہم دونوں پچھلی گلی میں پہنچے اور پہنچے کا جائزہ  
لیتے ہوئے کافی دور تک نکل گئے۔ آخر ایک جگہ ہمیں "بیرود نظر  
آئی جس میں کافی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی۔ اس کا مالک پریشان تھا  
کہ کون اس کی گاڑی کا یہ حشر کر گیا تھا۔ ہم نے بھی کئی لوگوں سے  
پوچھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"وہ ایک عجیب گلی ہے۔" میں نے کہا "بہرحال کبھی وہاں گھٹنے  
کھینے، دو دو گھٹنے تک کسی کا گزرنے نہیں ہوتا۔" پھر میں نے ٹھنڈی  
سانس لے کر کہا "لیکن کمال یہ ہے کہ آج پولیس وہاں پہنچ گئی جو  
اکثر بھرے بازاروں میں ہونے والی وارداتوں پر نہیں پہنچ پاتی۔"  
"ہاں۔ تمہاری طرح جب کسی کی قسمت میں ذلت لکھی ہو

میں معصوم ہوں۔"

"کیا مطلب۔؟ ان لوگوں نے کچھ کیا ہے کیا؟" میں نے ٹھک زدہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے خاموشی سے اپنی میز کی درازیں کھولیں۔ ہزار ہزار کے کی نوٹ، دو ٹی بی پوتل، ایک چاقو اور دو شناختی کارڈ اس نے دراز سے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ ایک لمبے ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر وہ بولا "ہم نے انہیں ایک بینک کے پاس محکوک انداز میں منڈلاتے ہوئے پکڑا تھا اور ان کے قبضے سے یہ چیزیں برآمد ہوئی تھیں۔"

"جہاں بات ہے؟" میں نے پوچھا، "اپنی طرف سے تو ان کے کھاتے میں نہیں ڈال رہے ہوں؟"

"میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ یہ ان کے قبضے سے برآمد ہوئی ہیں۔ چند ہزار سے زیادہ کی رقم ہے۔ اور یہ میں آپ کو صاف گوئی سے بتا رہا ہوں کہ یہ میں اپنی جان کا۔ یہ میں ان کے کھاتے کے بجائے اپنے کھاتے میں ڈال لوں گا لیکن آپ مجھ سے جیسی چاہیں قسم لے لیں۔ یہ انہی کی جیبوں سے نکلی ہیں۔ یہ دو نوڈ ٹی بی ہیں۔ یہ ایک کان کے دو جھلی کارڈ ہیں۔ میں نے کانچے سے تصدیق کر لی ہے۔ اس کانچے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس سوز سائیکل پر یہ سوار تھے وہ چوری کی تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ معصوم ہیں تو پھر میں تو نوکری چھوڑ کر کھرچا کر بیٹھ جانا چاہیے۔ ہماری یہاں کیا ضرورت ہے؟ اس کے لیے میں بیچ کی غمی تھی۔ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کرسی کے پٹے سے ٹیک لگایا۔

"ٹیک ہے یا رے! میں تمہارے کام میں ٹانگ نہیں اُڑاتا۔" میں نے غصہ سی سانس لے کر کہا "میری ٹانگ پہلے ہی اتنے معاملات میں اُڑی ہوئی ہے کہ اب تک اسے نوٹ جانا چاہیے تھا۔ پچ نہیں کس طرح بنی ہوئی ہے۔ اب میں چلا ہوں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ہی زرتاج اور شفیق شاہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ غلام حسین کے سر سے گویا کوئی بوجھ اُڑ گیا۔ وہ باہر رانہواری تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ تھانے سے باہر زرتاج کی بیخود کوئی تھی۔ شفیق شاہ اسی کے ساتھ آیا تھا۔ اپنی گاڑی نہیں لایا تھا۔

میں نے زرتاج کے ساتھ جھپٹے ہوئے کہا "تم زندگی میں بہت ہی اہم موقعوں پر میرے کام آؤ گی۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کس طرح تمہارا شکر ادا کر سکتا ہوں۔"

"کسی میں حوصلہ عمارت کی محنت سے پھلانگ لگا کر؟" زرتاج نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا "میرے اس مشورے پر عمل کرنے سے تمہارے بھی دوستوں کا بھلا ہوگا جو بے چارے تمہاری دہ سے ہر دہت سی دہت کسی مشکل میں گرفتار رہے ہیں۔"

"ابھی کچھ نہیں بڑا تھا اس لیے زیادہ معافیاں مانگتے کی ضرورت نہیں" میں نے فراخ دلی سے کہا "مجھے بھی تم سے معافی ملنی چاہیے۔ میں نے بھی بڑا لنگھی میں تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔ برہان۔ اب اس قصے کو بھول کر تم دو کام ضرور کرو۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ تم ان چاروں غیر ملکی لنگھوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرو جو نہیں مل رہے کر مجھے پھنسا کر کھٹک گئے۔ غیر ملکیوں کی تلاش کرنا زیادہ مشکل تو نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ تمہارے بچے جڑھ بائیں تو انہیں ٹھیک ٹھاک قسم کا رگڑا لگاؤ۔ غیر ملکی ہیں۔ ان کے سفارت خانے ضرور مداخلت کریں گے لیکن ان کی مداخلت کے باوجود جس حد تک رگڑا لگا سکے، ضرور لگا دیتا۔ تم لوگوں کے پاس اس مسئلے میں کافی گہرائی ہوتی ہے۔ جب تمہیں کسی کو رگڑا لگانا ہو تو بڑی سے بڑی مداخلت کے باوجود لگا دی دیتے ہو اور ہاتھ پاؤں بھی چاہیے۔"

غلام حسین انکساری سے مسکرایا اور بولا "آپ بے فکر رہیں۔ میں انہیں بھی دیکھ لوں گا اور ان کے سفارت خانوں کو بھی۔"

"سوچ لو۔ ان میں سے تین گورے ہیں۔ سرخ روپ ہو جائے گی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب سفارت خانے والے بیچ میں آئیں گے تو تھوڑا بہت سرخ روپ ہوتا ہی پڑے گا لیکن میں رگڑا پہلے لگا دوں گا۔ سرخ روپ بعد میں ہوتا رہوں گا۔" وہ بولا۔

"بہت خوب!" میں نے سر ہلایا "آؤ تم ہوشیار ہو حالانکہ شکل سے نہیں لگتے۔ تم بے فکر سے انہیں رگڑا لگاتے۔ اگر تم پر اس کے نتیجے میں کوئی مشکل پڑے گی تو مجھے یاد کر لیتا۔ مجھ سے جو بھی ہو سکا کروں گا۔ اور اگر تم سے ان کی جان چلری چھوٹ جائے تب بھی انہیں چھوڑنے سے پہلے مجھے ضرور اطلاع دینا پھر میں بھی انہیں تھوڑا بہت سبق دلوانے کا بندوبست کروں گا۔ ایسے لوگوں کی مجھے بھی تلاش رہتی ہے۔"

"بہت بہتر سرا!" غلام حسین نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ "دوسرا کام تم سے یہ ہے کہ کسی اور کی سفارش پر تم مجھے چھوڑ دے۔ اب میری سفارش پر ان دو لوگوں کو چھوڑ دو جو میرے ساتھ کوٹھی میں تھے۔ کوئی ایسا سنگین جرم نہیں ہے بے گناہی کا" میں نے کہا۔

"آپ یہ کام مجھ سے مت کئے صاحب۔" وہ گویا یکدم ہی بیٹھے سے اُکھڑتے ہوئے بولا "یہ ٹھیک ہے کہ ہم لوگ بھی غلطی سے۔ اور کبھی جان بوجھ کر بھی غلط آؤ گی پکڑ لیتے ہیں اور کبھی بڑے بڑے پکڑ کھڑکیں سے گناہ بھی لپٹتے ہیں آجاتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم جتنے بھی لوگوں کو پکڑتے ہیں، سارے کے سارے ہی بے گناہ ہوتے ہیں۔ پچاس آدمیوں کے قاتل کو بھی جس وقت ہم پکڑتے ہیں اس وقت وہ بھی کتا ہے کہ

ہیں۔ بلکہ شاید آج کل تو بہت بہتر ہیں۔ تم نے تو مجھے اس  
گیس زیادہ جہت تاگ حالات میں دیکھا ہے۔  
”بالہ۔ دیکھا تو ہے۔ کاش نہ دیکھا ہوتا۔“ وہ کہہ  
ہوئی۔

میں نے پلٹ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شفیع شاہ کی  
دیکھا اور کہا ”شفیع ڈیرا تم کیوں اتنے خاموش ہو؟ کچھ تو  
ہو سکے تو تم بھی مجھے سن سکتے تھے۔ آج میرا سن طعن نہیں  
ہے۔“

”میری یہ بھال کہاں سر!“ وہ سکرانے ہوئے بولا ”میرا  
ی دل میں خود کو سن طعن کر رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ ایسے  
ہو گیا اور میں آپ کے ہمراہ نہیں تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔“  
”زر تاج بولی اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟ اس  
ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ آخر تمہارا پاس ایک  
صورت، نوجوان انگریز لڑکی کی نظر میں ہیرو بننے گیا تھا۔“  
”ایسے میں شرارت تھی۔ وہ غالباً سلیوا سے سارا واقعہ معلوم  
آئی تھی۔“

”ایک شریف اور بڑا حیا موب پر ایسی جتنیں مت دھو۔“  
”کراہ کر کہا۔“ اس خوب صورت نوجوان، انگریز لڑکی کو تو میر  
بھی نہیں گیا تھا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔“

”لیکن اب یہ ضرور بتانا کہ تم کہاں سے آ رہے ہو۔“  
”نظر میں تمہاری قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔“ ظول میں بھی  
عاشق اپنی محبوبہ کی وجہ سے نیل کی ہوا کھاتے ہیں۔“ اس  
پر ستور شرارتی تھی۔

”اگر تم نے اپنی یہ ٹیٹ پونجیا قسم کی چلی کٹی بائیں؟  
رکھیں تو میں دو روزہ کھول کر تمہاری پیچیدہ سے چٹا بک لگاؤ  
اور میرا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔“ میں نے دو روزہ کے  
پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اس سے پہلے کہ تمہارا خون میری گردن پر ہو۔ میرا  
تمہاری گردن پر ہو گا۔“ وہ نہایت مشتاقی سے ایک سوز کاٹنے  
ہوئی۔ اس کا ایک بازو کمر کی میں نکا ہوا تھا اور وہ صرف ایک  
سے اسٹریٹنگ و ہیل سنبھالے ہوئے تھی۔ ایک تو پیچیدہ روپے  
کچھ غیر نسوانی سی گاڑی تھی۔ اوپر سے اس کا زرائعہ تک کا  
بھی خاصا غیر نسوانی تھا۔ اس کے باوجود اس میں نسوانہ  
اور خوبصورتی کی کمی نہیں تھی۔ یہی اس کی افراط تھی۔  
”یعنی اب تم دراز دستی وغیرہ بھی کرو گی؟“ میں نے پوچھا  
سے کہا ”میں تو جیسے کافی امن پسند، منہب اور ڈینٹ  
لڑکی سمجھا تھا۔“

”وہ تو میں ہوں۔ لیکن لوگوں کو بے ہودہ قسم کے کاموں  
دکھانے کے لیے ہاتھ پاؤں تو ہلاتے جاتے ہیں نا؟“ وہ بولی۔  
اسی قسم کی باتیں کرتے ہم ہو گئے۔ چنانچہ زر تاج نے

”دوستوں کو تکلیف دینا دوستوں کا اخلاقی فرض ہے۔“ میں نے  
کہا اور وہ مجھے گھور کر رہ گئی۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد بولی  
”ہی آئی بی صاحب کے ٹیلی فون کے باوجود بے چارے تعاقب دار کو  
چھین نہیں آیا تھا کہ تم کوئی بڑے توی ہو کیونکہ اس نے تمہیں  
تھوڑے سیٹ بد مصاحف کی طرح لڑتے دیکھا تھا۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے کھدے اچکائے ”دست  
بدست لڑائی کا بھی تک کوئی ایسا یاد کار طریقہ ایجاد نہیں ہوا جس  
میں انسان نہایت با عزت اور فرست ریت نظر آئے۔ تھوڑے سیٹ  
بد مصاحف سے تو انسان تھوڑے سیٹ بد مصاحف کی طرح ہی لوسکا  
ہے۔ اگر میں مرتبان مرغ قسم کا سینہ صاحب نظر آنے کی کوشش  
کرتا تو صرف میری جھنجھکی و تدفین ہی فرست ریت ہو سکتی تھی۔“  
”تم نے معمولی لشکروں سے جھنجھکے کے لیے تم کسی اور کو بھیج سکتے  
تھے۔“ وہ بولی۔

”ہنس کی غلطی ہو گئی“ میں نے تسلیم کیا ”لیکن کیا کیا  
جائے۔ فرست کے زمانے کی یاد میں جاتی نہیں ہیں۔ اکثر اپنے  
چھوٹے چھوٹے کام بھی خود کرنے لگ کر ہوتا ہوں۔ اس کے سوا  
مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہاں چار لنگے میرے ہتھکڑیوں کے  
اصل فساد صرف ایک سی تھا۔ میرا خیال تھا کہ صرف وہی باہر  
میرا ہتھکڑی ہو گا۔ ایک آدھ ہاتھ میں ہی اس کا دماغ درست کر کے  
واپس آ جاؤں گا۔“

”اس کے بجائے تمہارا اپنا دماغ درست ہو گیا۔“ زر تاج بے  
نیازانہ سے اعزاز میں ڈرائیو تک جا پہنچی رکھتے ہوئے بولی  
”ختم۔“ اچھا ہوا جس تھوڑا سا ڈزل کیا۔ کافی دن ہو گئے تھے  
جس آرام کی زندگی گزارتے ہوئے۔“

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”اگر وہ منوس گلے دیتی  
میں نے تو پہلی بار کہہ پاک کرتے اور کھک آتے۔ ویران چلی کا  
کچھ تو کاغذ اٹھاتے۔“ اس کا لہجہ سرسری تھا کیونکہ وہ کسی نہایت سی  
معمولی سے کام کی بات کر رہی تھی۔

”شاید میں ایسا کر کر رہا۔“ افسوس کہ میرے پاس اس وقت  
کوئی گن نہیں تھی ”میں نے جواب دیا۔

”متم ان حالات میں بھی بغیر گن کے بھرتے رہتے ہو؟“ اس  
نے ترجیحی نظر سے میری طرف دیکھا۔

”بھئی کھار غلطی سے خالی ہاتھ نکل آتا ہوں۔ سوچا ہوں ہم  
جیسے مانت پرست اور گناہ گار انسانوں کو صرف ہاتھ بیوں پر۔  
اور ہاتھ پاؤں پٹانے والے پر بھی بھروسہ کر کے دیکھنا چاہیے۔  
تینویں مرتبہ یہ تجربہ کر کے دیکھ چکا ہوں اور ابھی تک زندہ ہوں۔“  
”ختم یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ڈھنٹ لوگ آسانی سے  
نہیں مرتے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی ”تمام حالات کی مناسبت  
سے ہمیں کچھ محتاط رہنا چاہیے۔“

”حالات تو میرے اکثر ایسے ہی رہتے ہیں جیسے آج کل



گویا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

شفیع شاہ دیر سے نہیں کرولا "آپ کو ذرا آرام سے کریں  
پر کر نکاتے ہی اصل مسئلہ یاد آگیا۔ میرا تو خیال ہے آپ اب  
جا کر آرام کریں۔ مسئلے مسائل پر کل بات کر لیں گے۔"

"بات چیت میں کون سا ذور لگا ہے شفیع نیزا آرام تو مجھے  
کرتا ہی ہے۔ آج کا تقریباً پورا دن ہے کار قسم کی یک یک میں ضائع  
ہو گیا ہے۔ اگر سونے سے پہلے کوئی کام کی بات ہو جائے تو شاید دل  
کو اطمینان ہو" میں نے کہا۔

"یہ بھی کام کیا ہے سر۔ خدمتِ خلق ہی ہے" وہ مسکراتے  
ہوئے بولا۔

"میری نظر میں یہ اپنے کاموں سے بھی زیادہ اہم ہو گیا ہے۔  
مجھے لگتا ہے کہ اس قسم کے کاموں میں کوئی بھی قوت بھی انسان کی  
مدد کرتی ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں آئندہ ہم جان بوجھ کر اس قسم کے  
کسی نہ کسی کام میں ہانک اڑائے رکھا کریں گے" میں نے کہا۔

وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسا "ہمیں ہانک اڑانے کی  
ضرورت کیا ہے۔ ہماری ہانک تو خود بخود ہی جا کر نہ جانے کس طرح  
کسی نہ کسی معاملے میں ضرور اڑ جاتی ہے۔"

"میرے خیال میں تو یہ اچھی مصروفیت ہے۔ دنیا کے کاروبار تو  
چلتے ہی رہتے ہیں۔ صرف بزنس کرتے رہنے اور دنیاوی معمولات  
انجام دیتے رہنے میں اب کوئی لطف محسوس نہیں ہوتا۔ کچھ کام  
ایسے بھی ہونے چاہئیں جن میں مقصدت ہو۔ بھان خیزی اور  
مشغلی ہو۔ لو گرم رکھنے کا کوئی سامان ہو۔ اور ساتھ ساتھ اس میں  
دوسروں کا بھلا بھی ہو۔ ایک عام بزنس میں کی طرح صبح سے شام  
کھانا۔ اور رات کو خواب۔ تو رگڑا لیاں کھا کر سو جانا کوئی قابل  
رہنمائی زندگی نہیں ہے" میں نے اپنے مشترکاتوں میں اٹھایاں  
بھیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہمارے درمیان بہت پہلے طے ہو گیا تھا سارا" وہ شہجیرگی  
سے بولا "حقیقت میں تو اسی لیے "دی سرکل" کی بنیاد رکھی گئی  
تھی۔ اور درحقیقت ہمیں اب تک تو عام بزنس میں کی طرح  
زندگی گزارنے کا موقع ملا بھی نہیں ہے۔"

"ہمارے حق میں شاید یہ اجماع ہی ہے" میں نے طمانیت سے  
کہا "اب اس آواز ترین پیکر میں مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ  
ہم مونا تک بدوقت نہیں پہنچ سکے اور اسے نہیں بچا سکے لیکن میں  
چاہتا ہوں اس کی قربانی کسی کام آجائے۔ ہم اس خوفناک صحنہ سے  
کاغذاتہ کر سکیں جو اندری اندر لوگوں کی زندگی برباد کر رہا ہے اور  
ہماری سوسائٹی میں ایک خطرناک فتنہ پھیل کر برباد کر رہا ہے۔ اگر  
کچھ لوگ ایاں سمجھ یا کسی حد تک آواز خیال بھی ہیں۔ یا خود بزنس  
میں کوئی مقام بنانا چاہتی ہیں تب بھی ان کی کمزوریوں سے اس طرح  
فائدہ اٹھانے اور انہیں اپنے پنگل میں پھنسا کر کسی اور ہی سمت  
میں لے جانے کی اجازت کسی کو نہیں ملنی چاہیے۔ اب ہم نے

کے محدود دواؤں سے پر گاڑی ہوئی لیکن اس کے اترنے کے آثار  
دیکھائی نہ دیے۔ میں نے دواؤں کو کھولے ہوئے کہا "خیر چلو نا۔ تم  
نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اب مجھے جو اب تمہاری کچھ خاطر  
دورات کو کھینی چاہیے۔"

"خاطر دارات اب تم جا کر سلوا کی کرے۔" وہ استہزیک  
دہن پر اٹھایاں چھانٹے ہوئے بولی "میں تو پہلے ہی حسین حاش  
کرنے کے پیکر میں کافی وقت بھاد کر چکی ہوں۔ شام سے خوار  
ہو رہی ہوں۔ اب کل ہی کسی وقت آرام سے چند کرکٹ شپ  
کریں گے۔ میں پہلے فون کروں گی۔ فی الحال تم جا کر اپنی حالت  
لوک کر۔ کافی صحت افزا مقام سے آ رہے ہو۔"

میں نے اسے کوڑھ مار کر اٹھائی سے سلاتے ہوئے کہا "ایک تو  
یہ حق کل کی حسنا نہیں نہ جانے کیوں اتنی سنگدل منہ پھٹا رہی  
ہے۔ چھٹ ہوئی ہیں۔ کسی مذہب آدمی کے جذبات کی تو انہیں کوئی قدر  
ہی نہیں ہوتی" میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "جائے۔  
مذاہف!"

اس نے مسکراتے ہوئے زبانی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔  
میں اور شفیع شاہ اندر آئے تو یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ  
پہلی پڑا سارا گشتہ کی خبر ہوئی کے پورے محلے میں پھیل چکی  
تھی اور سیکرٹری والوں سمیت کافی لوگ اس محلے میں پریشان  
تھے۔ میرے گرد آں جمع ہوئے۔ میں نے انہیں تسلی دے کر ان  
کے کاموں پر واپس بھیجا اور آفس میں داخل ہوا۔ وہاں سلوا اور  
برائی موجود تھے۔

میری "پڑا سارا گشتہ" کی خبر سلوا ہی نے بھیلانی تھی۔  
اس نے مجھے فائدہ تو پہنچا تھا کہ ذرا تاج اور شفیع شاہ نے مل کر مجھے  
اصول نکالا تھا لیکن وضاحتیں بھی بہت کم پڑی تھیں۔ ان باب  
کی کوئی سارا واقعہ نہ ملتا پڑا جس کے بعد وہ در تک افسوس اور  
اندویش کا اظہار کرتے رہے اور سفید فاقوں کی افلاکی گراؤں پر  
شرعہ ہوتے رہے۔ قیمت تھا کہ ابھی انہوں نے اپنی آنکھوں  
سے یہ نہیں دیکھا تھا کہ ہمارے اپنے لوگ یہاں کیا کرتے پھر وہ  
تھکے نہ نہ شاید وہ مجھ سے کاہن باری مذاکرات مکمل کیے بغیر ہی سر پر  
اٹک کر کوئی ایس جھگ لیتے۔

کافی دیر بعد وہ دونوں رخصت ہوئے تو میں نے طویل سانس  
لے کر اٹھ کر ٹوک جھک کے پتے سے نیک لگایا۔ اب نہ جانے کیوں  
بہرے سر کا گھڑنا وہ تکلیف میں دے رہا تھا۔ شاید اپنے آرام  
عاجل میں واپس پہنچنے کے صرف نفسیاتی ہی نہیں بلکہ جسمانی  
خزاں بھی بہت تیزی سے ظاہر ہوتے تھے۔

شفیع شاہ نے عجیب و غریب اور بے ہودہ معاملہ سچ میں اُٹھ  
کر اٹھا اور اتنا وقت ضائع ہو گیا۔ ہم اصل ٹریک سے ہٹ گئے۔  
میں نے جس مسئلے پر کام کر رہے تھے اس میں کوئی پیش رفت ہوئی  
نہیں تھی۔ جس مزید کچھ معلومات حاصل ہو گیا یا نہیں؟ میں نے

اس کا پتا صاف کر دیتے ہیں۔ "شفیع شاہ نے تجویز پیش کی  
"ہمارے لیے انہیں لکھ کر بھیج دیا جائے گی۔ پھر انہیں کوئی  
موتی شخصیت نہیں ہے۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ  
ہمارے بارے میں خبردار ہو چکا ہے کہ ہماری نظر اس تک  
ہے۔ اس لیے پہلے اس نے ڈرامے بازی کر کے ہماری قوم  
کی کوشش کی۔ اور اب اس نے اپنے خائنوں کو  
برہانے کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا بندوبست بھی کیا ہو گا کہ  
اچانک کچھ ہو جائے تو شہر فوراً ہم پر آئے۔ میں فی الحال ام  
انہیں مول لینا نہیں چاہتا۔"

"سے کوئی حادثہ بھی تو پیش آسکتا ہے۔ اس کی کا  
بھٹ سکتا ہے۔ کوئی ٹرک اس کی گاڑی سے ٹکرا  
ہو سکتا ہے۔" شفیع شاہ نے تجویز کیا۔

"اس کے کسی بھی صورت میں مرنے کے نتائج نہیں  
پڑیں گے اس لیے ہر ملک کے قانون اس پر ہاتھ ڈالنے  
وقت بے شک یہ ظاہر ہو جائے کہ ہماری وجہ سے ایسا  
ہیں اگر کوئی پریشانی اٹھائی ہے تو قانون پر کوئی اجلا  
اٹھائیں۔ یہ نہ ہو کہ ہم ایک نیک کام کریں اور اٹھانا  
میں ہماری حیثیت بگڑ کر ہی ہو جائے۔"

شفیع شاہ ایک لمحے کچھ سوچا پھر خفیف سی مسکرا  
ساتھ بولا "جڑیں تو ہماری بھی بہت گہری ہیں۔ پھر انہیں  
اگر کوئی گواہ نہیں ہے تو کیا ہو۔۔۔ آپ نہیں صاحب  
صورت حال بتا کر ان سے کہنے کہ وہ اس جملے پر کھینچے  
کوئی بندوبست کریں۔"

"اس معاملے کے لیے وہ زیادہ بڑے آدمی ہیں۔  
کے مسئلے کو لفت میں کرائیں گے۔ وہ ان مسائل میں  
ہیں جن سے ملکی سلامتی کو خطرہ ہو۔ اور انہیں ان سے  
نہیں ہے۔ خیر۔ ابھی اس مسئلے میں زیادہ سرمت  
نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ  
ہے کہ اصل مجرم کا پتا چل گیا ہے۔ اب اسے قابو میں کر  
کوئی نہ کوئی طریقہ نکل ہی آئے گا۔" اس نے کہا  
"میں ابھی اس لڑکی سے دو چار گفتیں اور کر کے دیکھا  
وہ اپنا ارادہ بدل ہی دے اور ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو  
شفیع شاہ کے نظریے پر ہنسنے پر مسکراہٹ ڈراما  
اس پر ذرا محنت کیجئے گا۔ جو لڑکی پہلی ملاقات میں  
کھولے۔۔۔ سارے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ  
اپنی موجودہ زندگی کو ختم دینے اور ہمارے شانہ بٹانہ کھولنے  
جو صلہ بھی کر سکتی ہے۔ آپ ابھی قسمت آزمائی جائی  
دیکھیں پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؟"

"شمار کیا خیال ہے۔ میں نے قسمت آزمائی  
ہے کیا؟ میں تو پہلے ہی کہہ رہا ہوں کہ میں ابھی اس

اس سلسلے میں تاک آڑی ہے تو میں چاہتا ہوں ہم اسے انجام تک  
پہنچا کر ہی چھوڑیں۔ موت کی ساتھ بات قسم نہیں ہو جانی  
چاہیے۔ بلکہ میرا خیال ہے بات شروع ہی اب ہوئی ہے۔"  
"فی الحال مجھے اس سلسلے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہیں  
ہو سکیں۔" شفیع شاہ مسدود خوابانہ سے لہجے میں بولا۔

"مجھے ایک لڑکی ملی ہے۔ اس نے حیرت انگیز اعکاشات کیے  
ہیں۔ اس سارے دھندے کے پیچھے تو پیرائش کا ہاتھ نکلا۔ میں  
نے کہا۔ "بلکہ مجھے تو اندیشہ ہے کہ اس شہر میں ہونے والے اور نہ  
جانے کس کس خرقہ دہندے کے پیچھے پیرائش کا ہاتھ ہو۔"

"لڑکی وہی ہے جس کے نقاب میں آپ ان پورٹ سے روانہ  
ہوئے تھے؟" شفیع شاہ نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ اس کا نام فرح ہے۔ یا کم از کم فی الحال اس نے یہی  
نام بتایا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر میں نے شفیع شاہ کو وہ ساری  
باتیں بتائیں جو فرح نے مجھے بتائی تھیں۔ صرف یہ نہیں بتایا کہ وہ  
فطری غیر متوقع طور پر کس حد تک مجھ پر مہمان ہوئی تھی۔ شفیع شاہ  
ایک لمحے کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"اس نے تو ہمارے سامنے موجود تمام سوالوں کے جواب  
دے دیے۔ آخر وہ بولا۔

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں" میں نے اس کی تائید کی۔  
"نہیں اس کا انجام بھی مونا جیسا نہ ہو۔" اس نے آندیشہ ظاہر  
کیا۔

"اس کا امکان نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے نہایت صاف  
کوئی سے ہماری کوئی عملی مدد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وقت  
پڑنے پر وہ صاف بکھر جائے گی کہ اس نے ہمیں ایسی کوئی بات بتائی  
تھی۔ اس کی پوزیشن مونا والی نہیں ہے اس لیے اس کا انجام مونا  
جیسا ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔ وہ نہ تو زیرِ حساب ہے اور نہ ہی اس کا  
بہادرت کا کوئی ارادہ ہے۔ اس نے اپنے دل کی بجز اس ضرور نکالی  
ہے اور اپنی زندگی سے کچھ لمحے چُر کر اپنی مرضی سے گزارے  
ہیں۔ اور شاید آئندہ بھی گزارتی رہے۔ اس طرح کی کچھ اور  
باتیں بتائی رہیں۔ لیکن درحقیقت وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں  
چاہتی۔ وہ اپنے بچنے پر تیار ہے۔" کھینچا ہوا ہوا۔

"آپ کا مطلب ہے پیرائش پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا؟" شفیع شاہ  
نے دریافت کیا۔

"صرف ایک مضبوط گواہ مل جائے تو ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے۔"  
میں نے جواب دیا۔

"اگر مضبوط گواہ نہ ملا تو وہ یونہی آزاد چھوڑا رہے گا۔ اور  
اپنے گھناؤنے دھندوں سے سوسائٹی کو زہر پلاتا رہے گا؟" شفیع  
شاہ نے تصدیق چاہی۔

"فی الحال تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" میں نے جواب دیا۔  
"ہم اسے قانونی طریقوں سے انجام کو پہنچانے کے بجائے خود

واپس ہوئیں چھوڑ کر اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔

میں نے گاڑی فرخ کے بیٹے کی عقیقی گلی سے بھی کچھ دوری چھوڑ دی۔ اس وقت شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ میں چٹل قدمی کے سے انداز میں چلتی گلی میں پہنچا اور یہ دیکھ کر میرا دل بارغ بارغ ہو گیا کہ اس مخصوص جگہ کے کونے میں درختوں کے درمیان ایک اونٹنے پول پر نیلے رنگ کا وہ گلوب روشن تھانے میں نے اور فرخ نے شکل مقرر کیا تھا۔

چاروں طرف دیرانی اور نٹائے کا راج تھا۔ میں ٹھٹھے کی سے انداز میں اس چھوٹے سے گیٹ تک پہنچا جس کا رنگ اور ڈیزائن دیوار سے اس حد تک ہم آہنگ تھا کہ سرسری نظر میں اس پر توجہ بھی نہیں جاتی تھی۔ فرخ کی دی ہوئی جالی میں نے بہت احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ اسے نکال کر میں نے بے آواز طریقے سے گیٹ کا ٹالا کھولا اور اندر جا پہنچا۔ گیٹ میں سے نہایت آہستہ سے اپنے عقب میں ٹھٹھے کی گلی کی آواز کے ساتھ بند کر دیا۔

میرے سامنے پالے کے اونچے درخت تھے۔ چند لمبے میں ان درختوں کی اوٹ میں ہی رہا اور سرسبز لان کے عقیقی حصے کا جائزہ لیتا رہا۔ جب کوئی آتا جانا دکھائی نہ دیا تو میں آگے بڑھا۔ ایک پختہ درخت عبور کرنے کے بعد مجھے سو ٹھٹھے پول دکھائی دیا۔ سو ٹھٹھے پول کے کنارے پر وہ رنگ جن موجود تھی۔

اس کی پشت میری طرف تھی اور وہ ایک لمبی ایڑی پیڑز پر نیم دراز تھی۔ اس کے لیے بھروسے بال کر سی سے نیچے جھول رہے تھے اور ایک آدھ لٹ دم ہوا کے جھوکوں سے نہایت آہستہ سے لرز رہی تھی۔ میں صرف اتنا دیکھ سکتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر پھولدار رنگین بیٹ رکھا ہوا تھا۔ شاید وہ ورزش کے طور پر سو ٹھٹھے کرتی تھی اور اس وقت بھی سو ٹھٹھے کرنے کے بعد سنٹاری تھی۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ مجھے گھر سے باہر لی ل گئی تھی۔

میں دبے قدموں سے اس کے قریب پہنچا۔ میں عقب سے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے سے بیٹ اٹھا کر اچانک اسے حیران کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے گلوب روشن رکھا تھا۔ شاید اسے میری آمد کی ایک مہموم سی امید رہی ہو۔ شاید اس وقت وہ میرے بارے میں ہی سوچ رہی ہو۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہلکا چھکا کپڑے کا بیٹ اس کے چہرے پر آٹھایا۔

دوسرے ہی لمحے میں اس بری طرح لڑکھایا کہ اگر میں سو ٹھٹھے پول کے زیادہ قریب ہوتا تو شاید اس میں گر جاتا۔ وہ فرخ کا چہو نہیں تھا جو میری طرف تک رہا تھا۔ اس قسم کے چہرے ڈراؤنی اور بیٹ ناک فلوں میں تیز موسیقی کے ساتھ اچانک اسکرین پر نمودار ہوتے تھے۔

مطلقاً سے ابھری ہوئی پھٹی پھٹی ساکت اور بے نور آنکھیں۔ سوچے ہوئے سے نیم دا ہونٹ اور پھولا پھولا ماسٹیکول

تھیں اور کمرے دیکھوں گا۔۔۔ بلکہ مجھے تو ان بھی اس کی طرف جاننا چاہیے۔" میں اپنے سر کے گوشے ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ "میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا" وہ اٹھنے کے لیے ہونے لگا۔ "میرا خیال ہے اپنی احوال آپ آرام کریں۔"

میں نے اپنے سر ہاپ پر نظر ڈالی۔ میرا حلیہ کافی خراب نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنا حلیہ درست کرنے اور آرام کرنے کی واقعی ضرورت تھی۔ میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور شیخ شاہ کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں گیا۔ مونا اور فرخ کی دوڑی کیٹشس جیسے کمرے میں بے پردائی سے بڑی تھیں۔ یہ کیٹشس کچھ نہ کچھ اہم ثابت ہو سکتی تھیں اور کسی وقت کسی نہ کسی حد تک کام آسکتی تھیں۔ میرے کمرے میں وہ زیادہ محفوظ نہیں تھیں کیونکہ وہ سر حال ہوئی کا کرا تھا۔ میں نے سیکرٹری اپنا جواز ڈانڈو کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور اس کے ہاتھ وہ کیٹشس ہوئی کی سیف میں رکھوانے کے لیے بھگواں اور خود شاد رے کر لباس تبدیل کر کے سویا۔

دوسرے روز دوپہر تک سونے کے بعد میں اٹھ کر تیار ہوا اور نیچے آیا تو سلوا کا پیغام میرا منتظر تھا۔ وہ باپ جی آج بھی دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا چاہتے تھے اور ڈانٹنگ ہال میں میرے منتظر تھے۔ میں لٹری سانس لے کر رہ گیا۔ ان کے ساتھ کل کھانا کھانا تو مجھے خاصا مگرا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ آج کوئی ایسا واقعہ نہ ہو۔ مجھے سر حال ڈانٹنگ روم میں جانا پڑا۔ ایک تو وہ سماں تھے دوسرے ان سے کاروباری تعلق بھی تھا اور ان دونوں باتوں سے بڑھ کر یہ کہ ان دونوں کا خلوص میرے لیے حیران کن تھا۔ میں نے سفید فاصلوں میں کبھی یہ خلوص اور گرم جوشی نہیں دیکھی تھی۔

میں شام ڈھلے تک ان کے ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ رنگ میں آکر میں انہیں گاڑی میں بٹھا کر کراچی کے دو تین اہم مقامات بھی دکھایا جہاں خاص طور پر میرے ساتھ جانے کے لیے سلوا بہت پراسٹیا تھی۔ ان جگہوں پر اس نے بُرائے دوستوں کی طرح میرے گلے میں بانٹیں ڈال ڈال کر اپنے گہرے سے تصویریں بھی ڈھونڈ نکلی۔ تصویریں انارٹھنے کا فریضہ اس کے والد گرامی نے اہم قرار دیا۔

وہ اس کے بعد بھی میرے ساتھ رہنے کی فکر میں تھی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب میں بھی اس کی ذات میں دلچسپی محسوس کرنے لگا تھا لیکن سب سے میرا ذہن فرخ میں اٹکا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف ایک پیکر کا کردار دیکھتا چاہتا تھا۔ شاید آج اس سے ملاقات ہو ہی جاتی۔ میں چاہ رہا تھا کہ ایک ملاقات پیر وائس کے لائل ایٹ سے واپس آنے سے پہلے ہو جائے۔ پیر وائس اگر شرعیان اور سکون میسر نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سلوا سے ایک خصوصی کام کا بہانہ کر کے معذرت کی اور ان باپ جی کو

چھو! یہ وہ صورت تو نہیں تھی جو دیکھنے والے کو مقابلے کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی۔ یہ تو انسان کو خوابوں میں دہشت زدہ کر دینے والا چوہا تھا۔ چوہہ فری کا تھا لیکن اس پر کوئی قیامت مگر نہ گئی تھی۔

ایک لمبے کے لمبے میرے حواس جواب دے گئے۔ یہ جھٹکا میرے لیے بہت ہی غیر متوقع تھا تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح سنبھل کر ذرا جھک کر دیکھا تو فرح کے اس حال کو دیکھنے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ وجہ وہ حقیقت اس کی سرسری گردن کے گرد موجود تھی۔ وہ گردن گلاب سرسری نہیں رہی تھی۔ باریک سے ایک تار کا چند اکروان پر لپٹا ہوا تھا اور گوشت میں اڑ گیا تھا۔

میں شاید اس دھچکے سے سنبھلنے کے بعد ذرا غور سے اس کا جائزہ لیتا لیکن اچانک مجھے کسی مظلوم خطرے کا احساس ہوا۔ مجھے گھر کے اندر کوئی کھٹکائی دیا تھا۔ ایک دودھے کی طرح یک لخت میری تمام حسیات بیدار ہوئیں۔ میں نے اندرونی جیب سے گن نکالی۔ اسی لمحے دھڑکنے میرے سامنے "سو ٹنگ پول" کے دوسری طرف مکان کا قصبی دروازہ کھلا اور ایک وقت دو تین بڑی بڑی گھنٹیں باہر آتی دکھائی دیں۔ اوپر پھٹ کے کنارے سے بھی کچھ گھنٹوں کی تائیں نمودار ہوتی دکھائی دیں۔

شاید میں نے اندھا دھند فائر کر دیا ہوتا لیکن ان گھنٹوں کے حجب میں مجھے پولیس کی وردیوں کی جھلک بھی نظر آئی اور میری انگلی بروقت ٹک گئی۔ میں نے اپنی چلاٹک لگائی اور لان کی گھاس پر لڑھکھا چلا گیا۔

"خیر! اب ٹک جاؤ۔" ایک وقت کئی گھبراہٹ ہوئی سی آوازیں گونجیں لیکن مجھے ٹکے میں غایت نظر نہیں آئی۔ وہاں کوئی زبردست چال میرا خنجر تھا۔

فضا گولیوں کے دھماکوں اور ترزاہٹ سے مرتعش ہو کر رہ گئی۔ پانی کے چھپا کے بھی کھٹائی دیے تھے شاید کچھ گولیاں سو ٹنگ پول کے پانی میں بھی ٹھنڈی ہوئی تھیں۔ کوئی بھید نہیں تھا کہ کچھ گولیاں فرح کی لاش میں بھی بیست ہوئی ہوں۔ اسے بھی غالباً لاش کی بے ترستی ہی کہا جاسکتا تھا۔

کچھ ننھے ننھے گھڑے اور ریت سی مجھ پر بھی آکر گری تھی۔ شاید وہ سو ٹنگ پول کے کنارے لگی ہوئی خوب صورت ٹائلوں کے گھڑے تھے۔ میں نے چلاٹک بروقت ہی لگائی تھی ورنہ یقیناً میرا جسم گولیوں سے چھٹی ہو چکا ہوتا۔ غصہ تھا کہ دوبارہ گولیوں کی پوچھا رہوئے سے پہلے مجھے پا پڑ کے درختوں کی آڑ میں سر آجی اور میں ان کے درمیان سے بھاگتا چلا گیا۔

گولیوں کی ترزاہٹ چند سیکنڈ ہی جاری رہی۔ اس کے بعد انسانی شور شروع ہو گیا۔ کوئی آواز اوج نہیں سمجھ کر پھر بھی اس شور کا اپنا ایک مضمون تھا۔ یہ "مادامہ پکڑا۔" جیسے نہ پائے۔ "ختم کا شور تھا۔ میں اس وقت تک چھوٹے چھوٹے گھنٹ پر پوچھ رہا تھا۔

شکر کا مقام تھا کہ اس میں اندر کی طرف سے چالی گز ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ میں نے لیور جھکا کر تالا کھولا اور گھر نکل کر گیت کو اپنے عقب میں ایک جھٹکے سے بند کرتے ہوئے تیزی سے دوڑا کہ اس وقت میں اوپنک بزمی ریس میں تھا۔ انعام لے سکتا تھا۔ مزید حیرت اور مزہ شکر کا مقام یہ تھا کہ مجھ میں کوئی میرا خنجر نہیں تھا۔

میں تیزی کی طرح اپنی کار تک جا پہنچا جو ایک سٹیشن پر تھی۔ میں اس میں بیٹھ کر اسے اشارت کر کے وہاں سے نکلے روانہ ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک کوئی میرے قریب میں نمودار نہیں ہوا تھا۔ لیکن ہے اس وقت تک کوئی ہم چھٹی گیت سے باہر بھی نہ آسکا ہو۔ میری گاڑی ایک غصہ درندہ کی طرح فراگرا کر دوپہیں پر گھوم کر شاید سڑک پر چڑھا سیاہ نشان چھوڑتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوئی۔

میں نے گلیوں کے راستے فرار ہونے کی حکمت عملی اپنائی۔ اگر کسی میں راستے پر ناکا بندی وغیرہ کا انتظام ہو تو اس کا پتہ جاسکے لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ پولیس کی مجھے گھیرنے یا شاید خاص "پولیس مقابلے" میں صاف کرنے کی تیاریاں مکمل تھیں۔ شاید میں کسی کے اندازے سے کچھ پہلے وہاں پہنچا۔ شاید ابھی جال پوری طرح بچھایا نہیں جاسکا تھا اور مجھ پر ہلکے ڈار بد تھی میں ہاتھ ڈالنے یا میرا پتہ صاف کرنے کی کوشش تھی۔

جب میں نے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کیا تو میں۔ ہر سکون انداز میں ڈرائیونگ شروع کی اور گاڑی میں داخلہ لیا۔ مجھے یہ بھی فیصلہ کرنا تھا کہ اس وقت مجھے کہاں جانا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں آفس پہنچا تو وہاں کوئی پولیس آؤ خنجر ہوتا جو مجھے آندھی طوفان کی طرح آتے دیکھ کر پھینکا اس وقت کہاں سے آیا تھا؟

اس لیے میں نے پہلا فیصلہ تو یہی کیا کہ مجھے جہاں کہ جانا تھا، آندھی طوفان کی طرح نہیں پانچل ہر سکون اور ڈارل میں پہنچنا تھا پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میرا آفس جانا ہی بہتر تھا۔ میں اسی ہر سکون انداز میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنی آفس میں داخل ہوا تو کم از کم میرا ایک اندیشہ قفل ہوا۔ وہاں چھوٹا بڑا کوئی پولیس آفسر کھڑا تھا۔ وہی میرا تھا۔ میں نے نمبر کے قفل سے تمام اسٹاف کو ہدایت دلا۔ کوئی میرے بارے میں پوچھے تو یہی کہا جائے کہ میں یہاں آفس میں کام میں مصروف تھا۔

میں اپنے سامنے چند فائلیں اور کاغذات لے کر بیٹھ گیا۔ میرا دھیان ان میں نہیں تھا۔ میری نظروں کے اس پر فیصلہ لڑی فرح کا سرخ شہہ سا چہرہ تھا۔ وہی فرح تھی جسے دے کر اسے آپ کو مصیبت ہوئی تھی۔ میں ڈان چاہتی تھی۔

کیسے توخ ہو سکتی تھی کہ میں اس وقت اوھر اٹھوں گا؟ پولیس کو وہاں گویا باقاعدہ میرا شکار کرنے کے لیے انتظار میں بٹھایا گیا تھا۔ کیا پیر دانش ٹل ایسٹ سے واپس آچکا تھا؟

اس قسم کے بہت سے سوالات تھے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ انجینئر اور غلط تو اپنی جگہ تھی لیکن اس واقعے نے مجھے صدمہ بھی بہت پہنچایا تھا۔ میرے اندر برف کی ہیخ بھگی بھگی مٹی تھی۔ محسوسات کے اس برف زار کی گھراؤ میں کہیں کوئی طوفان کو نہیں لے رہا تھا۔ بہت دیر تک میں سانس بٹھا اپنے سامنے موجود ٹاکوں اور کاغذات وغیرہ کو ہٹا رہا۔ ان پر موجود الفاظ مجھے محض آؤی ترجمی اور بے معنی لیکھوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر بے ہوشی بٹھا اپنے دل کی افسردگی سے اپنے آپ کو افسانہ رستا رہتا کہ اسی اثنا میں مجھے اطلاع ملی کہ پیر دانش مجھ سے ملے آیا تھا۔ میری یکہ بڑی امیر چٹھی کر کے جا چکی تھی۔ یہ اطلاع گارڈ نے دی تھی۔ پیر دانش میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آچکا تھا۔ میں نے کھلے اور بند ہوتے دروازے سے اس کے گارڈز کی جھلک دیکھی۔ گارڈز باہر ہی ڈک گئے تھے۔

میں اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آمد سے کم از کم ایک بات کی توقع تھی ہو گئی تھی کہ وہ ٹل ایسٹ سے واپس آچکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ پولیس لے کر آیا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے گارڈز کے ساتھ آیا تھا۔ شاید یہ اندازہ اسے بھی تھا کہ محض ذہانی کچھ کہہ کر یا کوئی الزام لگا کر مجھے گرفتار کرانا کوئی آسان کام نہیں تھا خواہ وہ کتنا ہی بارسوخ آوی تھا۔

اس کے چہرے پر بالکی ہی افسردگی کے سوا کوئی قابل ذکر تاثر نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح دوستانہ انداز میں ملا۔ میں نے بھی کو شش کی کہ میرے چہرے سے کوئی تاثر واضح نہ ہونے پائے۔ وہ آج بھی تھری ہیں سوٹ میں تھا۔ ہونٹوں میں سگارد ہوا تھا۔

”بھئی معاف کرنا افضل پیارے!“ وہ ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا ”میں اپنی آمد کی اطلاع دیے بغیر ملاقات کا وقت ملے کیے بغیر آجاتا ہوں۔ دراصل دوستوں سے میں اسی طرح ملتا ہوں۔ آج دلی زیادہ اس تھا۔ راستے میں تمہارا ہوٹل نظر آیا۔ سوچا۔ اگر تم موجود ہو تو ملتا چلوں۔ ویسے میری روحانی طاقت مجھے بتا رہی تھی کہ تم مجھے اپنی میز پر بیٹھے لوگے“ اس نے سگارش کش لے کر ٹوٹو میں کے درمیان سے نیم دا آٹھکوں سے میری طرف دیکھا۔

”لگتا ہے اب مجھے بھی آپ کی روحانی قوت کا قائل ہونا ہی پڑے گا پیر صاحب!“ میں نے بگی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا ”ویسے نصیحتیں سننا۔ آپ آؤ اس کیوں ہو گئے؟ کیا مونا کی موت کا مددہ کم نہیں ہوا؟“

نہ فی میں زندگی اک برقی تپاں کی طرح رواں تھی۔ جسے زندگی سے بہت پار تھا اور جس نے زندگی کے بارے میں بہت لمبی پلاننگ کر لی تھی۔ کیا وہ واقعی مرچکی تھی؟ کہیں میں نے جانتی آٹھکوں سے اس کے بارے میں کوئی ڈرافٹ خواب تو نہیں دیکھا تھا؟

وقت ٹوٹوں کے معاملے میں میرے ساتھ کچھ عجیب سے ڈانچ رہا کرتی تھی۔ فرجین ٹائی ایک لڑکی نے مجھ سے ایک معاملے میں مدد طلب کی تھی۔ وہ قتل ہو گئی تھی۔ مونا کو بہت تاخیر سے مدد کی غرض سے مجھ سے رابطہ کرنے کا موقع ملا تھا لیکن میں کچھ مہینوں میں اس کے بھی کسی کام نہیں آسکا تھا اور وہ قتل ہو گئی تھی۔

فرج نے تو فرج مجھ سے کوئی مدد طلب نہیں کی تھی بلکہ اٹا مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی لیکن اسے بھی بالکل ہی غیر متوجہ طور پر لال کر دیا گیا تھا۔ فرجین کا تو خیر الگ قصہ تھا لیکن مونا اور فرج ایک ہی کہانی کے دو کردار تھے۔ کہیں کسی لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق دکھائی ہو جرم نہیں ہو گیا تھا؟

اس صورت میں تو مجھے تو فیروز اور سفید کام سلویا کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے تھا جو مجھ سے کسی دوستی استوار کرنے کی خدمت خواہش مند نظر آ رہی تھی۔ ذرا تاج کے بارے میں بھی شاید مجھے سوچنا چاہیے تھا جس سے میرے تعلق کی نوعیت بڑی عجیب تھی۔ بے تعلق میں بھی ایک تعلق خاطر تھا پھر راجیلہ تھی۔ اس کا تعلق مادی تعلق تھا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ سلویا ”ذرا تاج اور راجیلہ“ ان کے بارے میں تو میں خواہ خواہ ہی سوچ رہا تھا۔ بات وہاں تک نہیں جاتی تھی۔ جو لڑکیاں قتل ہوئی تھیں ان کی اپنی الگ اور بچہ دہی کہانیاں تھیں۔

فرج کے قتل نے صحیح معنوں میں مجھے بلا دیا تھا کہ یہ میرے لیے بہت ہی غیر متوجہ اور نا قابل قسم تھا۔ کیا پیر دانش کو یہ معلوم دیکھا تھا کہ فرج کی ایک شب نوازشات میرے ساتھ گزری تھی اور اس نے ساری باتیں مجھے بتادی تھیں؟ لیکن اسے یہ کس طرح معلوم ہو سکتا تھا؟ وہ تو اس رات ٹل ایسٹ گیا ہوا تھا۔ خود فرج کی طرف سے اتنی بے فکر تھی ورنہ وہ مجھ سے اس طرح کہاں قتل کتنی تھی؟

ظلمت گھوب جلائے کا سٹل صرف اس کے اور میرے درمیان غمرا ہوا تھا۔ اور جب میں اس سے ملنے پہنچا تو گھوب روشن تھا لیکن وہ اندر مری پڑی تھی۔ کیا اس نے کچھ دیر پہلے ہی گھوب جلا دیا تھا اور اس کے بعد ہی اسے قتل کیا گیا تھا؟ لاش زیادہ دیر کی معلوم نہیں ہوئی تھی۔

فرج میں ایسا تو نہیں تھا کہ اس سے سب باتیں معلوم کر لی تھیں۔ گھوب کسی اور نے جلا دیا ہو۔ شکار کو چاروا لے کے لیے! لیکن میرا اور فرج کاٹنے کے لیے کوئی وقت تو مقرر نہیں تھا۔ کسی کو

”بچوں والی باتیں مت کرو افضل پیارے! اس طرح دوست اس لیے تو نہیں رکھی جاتیں کہ وہ آپ کے منہ پر جھڑک بھاگ جائیں۔ اور خاص طور پر ہماری دوست! اس نے اپنی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پُر خیال انداز میں ہنسنے لگا دیا۔ اس کے لیے میں طاعت کی بات میں بھی بڑی سفاکی قائم کرتا ہوں۔ ہمارا کوئی دوست بھاگنے کی جرات کیسے کر سکتا ہے؟ ہمارا دوست... چاہے وہ مرد ہو یا عورت... وہ تبھی بھاگے گا جب اسے بھاگنا ہوگا۔“

”تو پھر کیا ہو؟“ میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

”اسے کسی ظالم نے قتل کر دیا۔“

”اوہ... نو...“ میں یکدم دوبارہ میز پر جھک آیا۔ اس واقعہ میں مجھے کافی محنت کرنا پڑی۔

”یہ قیامت کے آثار ہیں افضل پیارے!“ اس کی تواضع کو ٹھیک سی محسوس ہونے لگی۔ ”اس شخص میں جسے ہم دوست دیتے ہیں... کوئی اسے بھی قتل کرنے کی جرات کر سکتا ہے؟ یہ تو ہم کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“

”ہاں... یہ تو واقعی بڑی تشویش کی بات ہے میرا صاحب! نے سہلایا۔ ”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ میں قاتل تلاش کرنے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں... کیوں نہیں...“ اس نے سگاری دکان کا رخ کر کے جھاڑی۔ ”تمہیں تو ہم ضرور تکلیف دیں گے۔ تم قاتل کی تلاش میں ہماری سب سے زیادہ مدد کر سکو۔“

”میں ہر طرح سے حاضر ہوں میرا صاحب!“ میں نے غور سے کہا۔

”بس... حاضری رہنا۔ جب تمہاری ضرورت پڑے تو نہ ہو جانا۔“ وہ سگاری کے ٹیکے سرے کے اوپر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں غائب ہونے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں! صاحب!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بے شک... بے شک...“ اسی نے سہلایا پھر سگاری دکان کے لیے بھاگتا ہوا دیکھا۔ ”اچھا بھلا ہمارے سامنے نہ کے بعد غائب ہو گیا۔“

”غائب ہو گیا...؟ وہ کیسے میرا صاحب!“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”پولیس قتل کی تفتیش کے لیے اس گھر میں آئی ہوئی تھی۔ سب اندر موجود تھے۔ اس دوران قاتل کو شاید دوبارہ سہلایا جائے اور بات پر آنے کی ضرورت پیش آگئی۔ وہ پھیلنے لگا۔ چپکے چپکے جگہ میں داخل ہوا۔ اسے شاید امید نہیں تھی کہ پولیس یا کوئی اور موجود ہوگا۔ پولیس نے اسے لگا لگا کر...

”اس کی موت کا صدمہ تو شاید کبھی کم نہ ہوا افضل صاحب!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”وہ ذمہ تو ابھی ہر اسے تھا لیکن لگتا ہے یہ عین ہمارے لیے ذمہ پر ذمہ کھانے کا مہینہ ہے۔ ہم نے اگر خود اپنے علم کی مدد سے اپنے مستقبل کا حال دیکھ لیا ہوتا تو شاید ان دشمنوں سے بچنے کے لیے کوئی پیش بندی کر لیتے لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ دنیا بھر کو قسمت کا حال بتاتے ہیں وہ خود اپنی قسمت کا حال جانتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ عموماً اس نظر سے پریشان رہتے ہیں کہ نا انصافی میں بڑی راحت ہے۔ اس لیے وہ اپنے مستقبل سے بے خبر رہتے ہیں۔“

”شاید اسی کو چراغ تلے اندھیرا بھی کہتے ہیں“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال... یہ دوسرے ذمہ کا کیا قصہ ہے؟“

”بہت دردناک قصہ ہے میرے دوست!“ اس نے پہلے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر سگاری کا کش لیا۔ ”تمہیں تو معلوم ہی ہو گا میں مثل ایسا کیا ہوا تھا۔“

”مجھے بھلا کہاں سے معلوم ہونا تھا۔ مجھے کون سا آپ بنا کر گئے تھے؟“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے طاعت سے کہا۔ اگر وہ مجھے باتوں باتوں میں کوئی پکڑنا چاہتا تھا تو میں اتنی آسانی سے پکڑ میں آنے والا نہیں تھا۔

”ہاں... شاید تم سے تو کوئی ذکر نہیں ہوا تھا!“ اس نے بڑے سرسری سے انداز میں گویا اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ ”بس... برسوں گیا تھا“ آج واپس آگیا۔ بڑا مختصر سا کام تھا۔ صرف ایک شخص سے ملنا تھا لیکن واپس آیا تو ایک صدمہ میرا منتظر تھا۔ اپنی ایک بڑی پیار... بڑی خوب صورت سی دوست تھی۔ اسے گھروں میں لے کر دیا ہوا تھا۔ تمہیں پتا ہے ہم چیسے لوگوں کو اداوارا دھم... کوئے کھدوے میں ایک آدھ ایسی دوست بھی رکھنا ہی پڑتی ہے۔“ غیر ارادی طور پر اس کی ایک آنکھ تھوڑی سی دب گئی۔ بات کرنے کے دوران اس کی نظر مسلسل بچھ رہی تھی۔ میں نے اس سے نظر نہیں چرائی۔

”آپ کے اندر ضرور کسی پرانے بادشاہ کی روح ہے میرا صاحب!“ میں نے مسکراتے ہوئے حمایت طاعت سے کہا۔ ”پرانے دفتروں میں آپ نے ضرور بڑے حرم آباد کیے ہوں گے۔ معلوم نہیں آپ نے کن کن کوئے کھدروں میں کون کون سی دوست رکھی ہوئی ہے۔“

”حرم؟ ہم سے بھی زیادہ چراگاہوں میں جرتے ہیں افضل میاں! لیکن وہ زیادہ لیے چڑے خرچے نہیں پالتے۔“ وہ سگاری کو انکھوں میں گھماتے ہوئے مریانا لیے میں بولا۔ ”اپنا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہر کام کا قاعدے قرینے سے کرتے ہیں۔“

”تو وہ ذمہ کا قصہ کیا ہوا؟ کیا وہ دوست آپ کی عدم موجودگی میں کہیں بھاگ گئی؟“ میں نے مصیبت سے پوچھا۔

اور سوچا رہا پھر غیر ارادی طور پر آہستگی سے میرے منہ سے نکلا  
”گو حاکمیں کا؟“

”جی اسی وقت شیخ شاہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور  
سکراتے ہوئے بولا ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“  
”نہیں۔ تم گودھے نہیں ہو سکتے“ میں نے اپنی کرسی پر بیٹھے  
ہوئے کہا۔

”مجھے ہٹا چلا ہے یہاں بیرواٹش آیا ہوا تھا۔ ابھی ابھی  
رخصت ہوا ہے“ وہ بولا۔

”میں اسی کی بات کر رہا تھا“ میں نے لفافے چراگ کرنے کی  
ایک چھری کے کند پھل پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا ”میں اس شخص  
کا جلدی ہر کچھ بددست کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کچھ کر کر کے  
گا۔ ہم اس وقت ایک سانپ سے کھیل رہے ہیں۔“

”آپ صرف کھم دیتے سراسنپ کا سر پھل دیا جائے گا“  
شیخ شاہ میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے اطمینان سے بولا۔  
”سانپ بت نہ رہا ہے۔ میں ممکن ہے سر پھلے کی کوشش  
میں صرف اس کی دم کھلی جائے۔ اس صورت میں زیادہ خطرناک  
ہوگا۔ بہت مناسب موقع دیکھ کر کچھ ڈالنا ہوگا۔“

”موقع کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے سراسنپ  
کے فیصلوں پر عمل درآمد کرنا میرا کام ہے“ شیخ شاہ دیکھتے ہیے میں  
بولا۔

ایک لمحے تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد  
میں نے کہا ”سونا کے علاوہ جس دوسری لڑکی کی ہم نے دیکھ لی تھی  
تھی۔ جس کے تعاقب میں میں ان پورٹ سے بھاگا تھا۔ اور جس  
نے مجھے ساری باتیں بتائی تھیں۔“

”آپ فرح کی بات کر رہے ہیں یا؟“ شیخ شاہ بولا۔

”ہاں۔ اسے قتل کر دیا گیا ہے“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔  
شیخ شاہ کی صرف آنکھوں سے ظاہر ہوا کہ اسے خفیف سا  
جھٹکا لگا تھا۔ چند لمحوں کے بعد بالکل خاموش رہا اور ایک تک میری طرف  
دیکھا رہا۔

”بیرواٹش...؟“ آخر اس نے تصدیق چاہی۔

”ظاہر ہے“ میں نے گہری سانس لے کر کہا ”کسی اور کو اسے  
قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی شاید کسی طرح یہ بات ظاہر ہو گئی کہ  
اس کی مجھ سے بہت طویل ملاقات رہی تھی اور اس نے بیرواٹش  
کے بارے میں سب کچھ مجھے بتا دیا تھا۔“

”اس کے باوجود بیرواٹش آپ سے ملنے آیا تھا؟“ شیخ بولا۔

”ہاں۔ میں... گہری سانس لے کر بولا ”وہ میرے ساتھ  
چرے کی کھیل کھیل رہا ہے لیکن ان اہمال فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ  
ہم میں سے چوہا کون ہے اور کی کون۔“ پھر میں نے شیخ کو بتایا کہ  
کس طرح اس نے مجھے اپنی دانست میں ”رنگے ہاتھوں“ پکڑوائے  
یا پولیس کے ہاتھوں مروانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ موقع ہاتھ

نہر کچھ قازم بھی کی لیکن وہ بہت ہی پکڑتا تھا۔ صرف پکڑتا تھا۔  
نہیں۔ شاید خوش قسمت بھی بہت تھا۔ گولیوں کی بو چھانیں فرار  
ہو گیا۔“ وہ ایک بار پھر مونچھ کو بل دینے لگا۔

”ورد۔ یہ تو بہت بڑا ہوا ہیر صاحب“ میں نے اس کی آنکھوں  
میں جھانکتے ہوئے کہا ”آپ نے اس کی صورت تو دیکھی ہوگی؟“

”جی تو انوس ہے۔“ وہ سنا کر کوٹھیلوں میں کھماتے ہوئے  
بولا ”میں صحیح طور پر اس کی شکل صورت نہیں دیکھ سکتے۔ کچھ چیزیں  
مجھ میں حاصل تھیں۔ ہم تو صرف اس کی پچھلی ہی دیکھ کر حیران  
ہوئے رہے۔ وہ ہماری آپ کی طرح سوڈو بونڈ آوی تھا۔  
پراسمز جسم کا قاتل معلوم ہوا تھا۔“

”نہیں۔“ میں نے پھر ٹوک لیا ”میں کا“ آج کل کسی بھی بات  
پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ بڑے بڑے معزز لوگ بڑی بڑی عجیب  
ترتیبیں کرنے لگے ہیں۔ بہر حال۔“ شیخ کرکٹا جائے گا۔ میرا دیسے  
بھی ایمان ہے۔ کسی بے گناہ کا قاتل پتا نہیں ہے اگر زمین  
دالوں کی سزا سے شیخ کو کھلے تو اسان دالے کی گرفت میں بہر حال  
رہتا ہے۔ زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔“

”ہولہ۔!“ اس نے پھر خیال انداز میں ہنکارا بھرا اور اٹھ کھڑا  
ہوا ”اب میں چلا ہوں۔ اور میرے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا جیسے  
بھی اس واقعے کی اطلاع دتا چلوں۔ پھر ملاقات ہوگی“ اس نے  
مٹانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے مضبوطی سے اس سے مصافحہ کیا۔ وہ میرا بازو دھرا  
اور نکالنے کے لیے میرے کونٹ کی آستین پر لگی ہوئی کوئی چیز ایک  
انگلی سے جھڑکتے ہوئے بولا ”کیا تمہارے آفس میں بھی گھاس  
پائی جاتی ہے جس پر لوٹے رہے ہو؟“ لہجہ سرسری تھا۔

میں نے اس سے ہاتھ پھڑکاتے بغیر آستین پر نظر ڈالی۔ میری  
کونٹ کے قریب آستین پر گھاس کے چند ٹکے چپے ہوئے تھے اس  
نے ان پر انگلی کاٹا خن مار کر انہیں جھڑک دیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میرے آفس میں نہ سہی۔  
لیکن ہول کے سامنے تو ان موجود ہے۔ کبھی کبھی میں وہاں بھی  
جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ بلکہ لیٹ جاتا ہوں۔“

”تو احتیاط کیا کر افضل میاں؟“ اس نے میرا کندھا  
پکڑتے ہوئے ”گھاس اور پودوں وغیرہ کے درمیان کپڑے کو ڈسے بھی  
ہوئے ہیں۔“

”میں خاما ساخت جان آدمی ہوں ہیر صاحب! کپڑے کو ڈسے  
بھلا میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”خدا  
خائف۔“

”خدا حافظ“ وہ حتی الامکان باوقار انداز میں گھوما اور رخصت  
ہو گیا۔ جھوٹے قد کے باوجود وہ شاہانہ انداز میں چلنے کی کوشش کرتا  
تھا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک میز کے قریب کھڑا رہا

”ٹھیک ہے۔ میں چلا ہوں“ شفیع شاہ اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”تم زرا سلیا کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرونا“ میں نے  
 اسے ہدایت کی ”محض احتیاطاً یہ کہہ رہا ہوں۔ صرف میرے ہاتھ  
 نظر آنے کی وجہ سے بھی اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے  
 یونہی۔ محض مجھے تک کرنے کے لیے سلیا میرے لیے دشمنوں  
 کھڑی کرنے کی غرض سے بھی اس کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ  
 پیش آ سکتا ہے۔“

”وہ باپ بیٹی تو کل لاہور چلے جائیں گے“ شفیع شاہ نے بتایا۔  
 ”احتیاطاً وہاں بھی راجیلہ کو فون کر دینا کہ اس کی حفاظت کا  
 خیال رکھے۔ میں فون کر کے یہ بات کہوں گا تو وہ سمجھے گی میں اس  
 لڑکی کا بھی عاشق ہو گیا ہوں۔“

شفیع شاہ دھیرے سے ہنسا اور ہوا ”ٹھیک ہے سراسر یہ انتظام  
 کرادوں گا۔۔۔ دیے میں بھی راجیلہ کے بجائے فونی سے کہہ دوں  
 گا۔“

میں اسے خدا حافظ اور شب بخیر کہہ کر اوپر اپنے کمرے میں  
 آیا۔

○●○

فوج کی موت کی خبر دوسرے روز اس کی بڑی خوب صورت  
 تصویر کے ساتھ اخباروں میں آگئی تھی۔ اس کے قتل کو چار ماہ  
 قرار دیا گیا تھا۔ پولیس نے اس پر کوئی رائے ظاہر نہیں کی تھی۔  
 اسے ایک امیر زادی بتایا گیا تھا جس کے والدین اس کے لیے کل  
 دولت چھوڑ کر مرے تھے۔ پیر دانش سے اس کے کسی تعلق کے  
 بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ خبریں ایسا بھی کوئی ذکر نہیں  
 کہ پولیس نے جانے واردات پر تفتیش کے دوران کسی شخص کو  
 دیکھا تھا اور اسے زندہ یا مرنے کی کوشش کی تھی۔ میں  
 سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ جن واقعات کے پیچھے بے ہاتھ کام کرنے  
 تھے ان کے سلسلے میں اخباروں میں چھپنے والی خبریں حقائق سے  
 بعض اوقات کتنی مختلف ہوتی تھیں۔

دوسرے کھانے کے بعد میں اور شفیع شاہ سلیا اور اس کے  
 باپ کو انٹرویو چھوڑنے چلے گئے۔ وہاں سے شام تک وہاں  
 ہوئی۔ میں شفیع شاہ کی گاڑی میں تھا۔ شفیع شاہ کو کہنی کے آغوش  
 تھا۔ میں نے اس سے خودی فرمائش کی کہ وہ مجھے ہوسل کے سامنے  
 فٹ پاتھ پر بیٹھا کرے۔

فٹ پاتھ پر اتر کر میں دونوں ہاتھ چٹون کی سیڑیوں میں ڈالے  
 ملنے کے سے انداز میں اندر کی طرف چل رہا۔ میں اپنے گرد بٹنی  
 سے بے خبر نہیں تھا۔ سڑک پر کافی ٹریفک تھا۔ یہ لوگوں کا گھروں  
 واپس جانے کا وقت تھا۔ اب تو زندگی کی یہ روانی اور باہمی تعاون  
 معمول گنتی تھی اور دل کو کچھ تھوکت سی لگتی تھی کہ زندگی کا وہاں  
 ہر حال اب بھی کسی نہ کسی طرح رواں تھا۔  
 ہوسل کے سامنے پرلے کوٹنے کی طرف فٹ پاتھ پر ایک

سے نکل جانے کے بعد دوبارہ وہی پہلا سا پیر دانش۔ اور ہمارا  
 دوست بن گیا تھا۔

شفیع شاہ نے جڑ خیال انداز میں سر ہلایا ”دلچسپ آدمی ہے  
 سراسر“  
 ”ختم۔۔۔ میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا ”تم بتاؤ کیسے آتا ہوا؟  
 کوئی خبر آئے ہو یا یونہی ٹپٹے ہو۔ آگئے۔“  
 ”کیا تو یونہی ٹپٹا ہوا ہوں۔“ وہ ہانکے پٹے سے ٹپک  
 لگاتے ہوئے ہوا۔ ”ویسے میرے پاس آنا۔ خبر بھی ہے۔ معلوم  
 نہیں انہم سے کیا نہیں۔“

”یہ فیصلہ میں کروں گا، تم بہر شاہ۔۔۔ نے کہا۔  
 ”سینا ملک کی سرگرمیاں بالکل بند ہو گئی ہیں۔ اس کو بھی  
 تالا پڑ گیا ہے جہاں خاص فلوں کے شو چلے تھے اور لڑکیوں کی ہنگ  
 وغیرہ ہوتی تھی۔ وہ آدمی بھی غائب ہو گیا ہے جو یہ سارے انتظامات  
 کرتا تھا“ شفیع شاہ نے بتایا۔

”اچھی خبر ہے“ میں نے طمانیت سے سر ہلایا ”لیکن زیادہ  
 اچھی تب ہوگی کہ یہ انڈیا دوبارہ نہ کھلے پائے۔۔۔ اس وعدے کا  
 عمل قلع قمع ہو جائے اور اس کے پیچھے کام کرنے والی اصل  
 شخصیت بھی کیفر کراد کر پھینچ جائے۔ اس کے سر نہ جانے کتنی  
 زندگیوں کی بربادی کی ذمہ داری اور کتنے انسانوں کا خون ہے۔  
 ایک کو بھی پڑ تالا پڑ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے  
 افسانے عارضی طور پر تو بند ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جلد یا بدیر پھر کھل  
 جاتے ہیں۔“

”وہ آپریشن بھی غائب ہو گیا جو وہاں سارے انتظامات چلا رہا  
 تھا۔“ شفیع شاہ تدریسے متناقدانہ لہجے میں ہوا ”اس کی حیثیت ایک  
 چھوٹے موٹے سراج کی تو تھی۔“

”اس کے غائب ہونے کا افسوس مت کرو۔ تم اس پر ہاتھ تو  
 ڈالنے چکے تھے۔ اچھی طرح دیکھا لگے چکے تھے۔ اس سے زیادہ کارآمد  
 معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اسے جانے دو۔ وہ چھوٹی پھولی  
 تھی۔ مجھے چھوٹی پھولیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ میرا قلعہ ہے کہ  
 بڑائی کی جڑ ختم کرنے کی کوشش کرو، شاخیں اور پتے خود ہی سوکھ  
 جائیں گے۔ ہمارے ہاں بڑائی کے خلاف بے دلی یا انیم دلی سے جو  
 بھی خودی بہت کوششیں ہوتی ہیں وہ اسی لیے تو کامیاب نہیں  
 ہوتیں کہ ساری مشینری معمولی تپوں اور شاخوں کو چھانٹنے میں لگی  
 رہتی ہے۔ جڑ آرام سے پھلتی پھوٹی رہتی ہے۔ ہمیں پیر دانش کا  
 سر کلپنا ہے۔۔۔ اور اس طرح کلپنا ہے کہ ہماری لاشیں نہ ٹوٹنے  
 پاسکے۔ یہ وعدہ یہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔“

”آپ کا اب کیا پروگرام ہے؟“ شفیع نے دریافت کیا۔  
 ”کئی افعال تو میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں“ میں نے جواب  
 دیا ”میں بہت کم کسی سوچ بچار کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ یوں سمجھو ایک ختم  
 کا مرتبہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دل آؤ اس سے۔“



”ہمارا رض نہ ہوں سینہ صاحب“ وہ بدستور باجھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ اس کے آثارات وہی رہے لیکن اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ بچی آواز میں بولا۔ ”افضل صاحب! میں دراصل ظفر جمال ہوں۔“ فوٹو گرافر ظفر جمال۔ شاید آپ کو میری تلاش تھی۔ دیکھیے۔ حیرت وغیرہ کا اظہار مت کیجئے گا۔ اسی طرح بات کرتے رہنے کا چاہیے میں آپ کے ہاتھ فزردستی کچھ پھل بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہیں سے کوئی نامعلوم آنکھ نہیں دیکھ رہی ہو۔“

اس کی باجھیں اسی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک اور سیب اٹھا کر مجھے دکھاتے ہوئے بولا ”مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ شاید میں بھی آپ کے کسی کام آسکوں۔ میں اس طرح آپ سے ملنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی آپ کی یا میری نگرانی کر رہا ہو تو اسے شک نہ ہوئے پائے۔ کوئی طریقہ بتائیے۔“

وہ اگر مجھے بدایت نہ کرنا تب بھی میں حیرت زدہ نظر نہ آتا کیونکہ اگر وہ ظفر جمال تھا تو مجھے اس کو اس ٹپے میں دیکھے بغیر بھی اندازہ تھا کہ وہ کتنے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ میں نے سیب اس کے ہاتھ سے لے کر درلان کی طرف پیچک دیا اور غصے سے کہا ”دفع ہو جاؤ۔ مجھے کوئی پھل نہیں چاہیے۔ مجھے ان گلے سزے پھلوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ کیوں کا ایک چمکا اٹھا کر مجھے دکھاتے ہوئے بولا ”میں نے آج صبح اخبار میں فرح کے قتل کی خبر پڑھی ہے۔ میں نہیں بدلی کر بڑی مشکل سے جان بچائے پھر رہا ہوں لیکن میں کب تک بچ سکوں گا؟ میں چاہتا ہوں کہ اگر جان جانی ہی ہے تو کسی کام آجائے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ لیکن بے فائدہ موت نہیں مرنے چاہتا۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میرا انجام موت اور فرح سے مختلف نہیں ہوگا۔“

میں نے بے زاری سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”تم ایسا کہ چندہ منٹ بعد اسی طرح پھل بیچتے ہوئے ہوٹل کی پچھلی گلی میں پہنچو۔ ہوٹل کا ایک باوردی چوکیدار تمہیں اپنے ساتھ پچھلے ایک راستے سے ہوٹل میں لائے گا۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔“

میں نے اس کا کیوں کا پتھا پر ہی سے اس کے نوکرے میں بیخ دیا اور تیزی سے اندر جانے کے لیے گھوم گیا۔ وہ بظاہر ہر نامی کے عالم میں اپنا نوکر سرب رکھ کر واپس چل دیا اور میں ہوٹل کے اندر چھپا۔

آفس پہنچ کر میں نے اپنے ایک سمجھ دامد کو کیدار شادمان خان کو بلوایا اور اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ وہ سہرا کر رخصت ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں ہوٹل کے دروازے میں کھڑا تھا۔ مزید چند منٹ کے انتظار کے بعد میں نے شلمان شروع کر دیا۔ یہ بہت بڑا خانہ تھا۔ اس میں اسٹور بیج دوم تھے۔ لائڈز کی کھینچیں لگی ہوئی تھیں۔

فصل نوکرے میں پھل لے بیٹھا تھا۔ نوکروں میں جیس جیس بیچنے والے نام طور پر اس ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر نہیں بیٹھتے تھے۔ یہاں اس طرح جیس جیس کا امکان بہت کم تھا۔ یہ خواہنے والوں سے جیس خریدنے والوں کا علاقہ نہیں تھا۔ وہ پھل فروشی شاید تھک کر راستے کے لیے وہاں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے اندر اسے یہی ظاہر ہوا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اپنا نوکر اٹھا کر میری طرف لپکا اور اچھا یہ لے لے میں بولا ”صاحب! کچھ پھل لے لیجئے۔ آج پورے دن میں کچھ نہیں بکا۔ ستارے دوں گا۔ آپ کی بڑی سہیلی ہوگی۔“

مجھے بھلا اس سے پھل خرید کر کیا کرنا تھا۔ ہوٹل میں محض فون کرنے سے میرے لیے ہر چیز آجاتی تھی۔ میں نے محض نفی میں سرہانے پر اٹھا لیا اور ہوٹل کی حدود میں مڑ گیا جہاں سے لپکا چڑا زرا پورے شروع ہوا تھا۔ وہ وہاں بھی میرے پیچھے آ رہا تھا ”صاحب جی۔ لے لیں با۔۔۔ فریب آدمی کا بھلا ہو جائے گا۔“

کچھ عرصے سے بھیک مانگنے والوں نے بھی یہ انداز اپنا لیا تھا۔ وہ بھی تھوڑی سی مقدار میں کوئی چیز اٹھا کر پھرتے رہتے تھے۔ ظاہر یہی کرتے تھے کہ دن بھر مارے مارے پھرنے کے باوجود ان کا کچھ نہیں بکا اور حقیقت وہ بھکاری نہیں ہیں ”ان سے کچھ خرید لیا جائے تو موٹی ہوگی ورنہ ویسے ہی ان کی کچھ مدد کر دی جائے تب بھی دُعا دیں گے۔ میرے خیال میں وہ بھی کچھ اسی قسم کا کر رہا تھا۔

میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ مضبوط کسرتی جسم کا جوان تھا۔ لگتا تھا اس نے کچھ اچھا وقت دیکھا تھا مگر غربت پر مدد حالی اور فوادہ مشقت کی وجہ سے سر جھکا رہا گیا تھا۔ اس کی داڑھی بڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے تلخ تھے اور چہرے پر میل کیل کے دھبے تھے۔ ٹخنوں سے اونچی ایک میلی سی دھوئی اور اس سے بھی فوادہ سیلا سا ایک کڑے اس کے جسم پر تھا۔ سر پر میلی سی پگڑی تھی جو اس کی پیشانی تک ڈھلک آئی تھی۔

میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”جاؤ۔ میرا پیچھا چھو دو۔“

اس نے نوٹ لے لیا لیکن میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے نوکر ایک بازو پر سنبھلتے ہوئے ”مرے ہاتھ سے مجھے ایک سرخیا ہوا سا سیب دکھاتے ہوئے بولا ”دیکھیے صاحب جی! کیا شاندار کشمیری سیب ہے۔ حکم کر لیں۔ کتنا تول دوں؟“

اس وقت ہم باورنگ لائٹ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ میں نے ایک ستون کے قریب رُک کر سر دھکیں میں کہا ”اس سے پہلے کہ میرا دم کا ہڈیہ لٹھڑا پڑ جائے یہاں سے چلے جاؤ۔ ایمانہ ہو کہ میں کونسا مار کر تمہیں تمہارے اس نوکرے سمیت باہر پھانسلوں۔ اس کے بعد تمہاری اپنی شکل بھی کسی جگہ نہ ہوئے نوکرے جیسی نظر آتے نہ لگے گی۔“

نہیں گے۔

میں نے ایک لمبے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور فیصلے پر پہنچے ہوئے کہا۔ ”نہیک ہے، اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ فی الحال تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
 وہ خانے میں بھی دیوار پر ایک فون نصب تھا۔ میں نے چائٹ شفٹ انچارج کو کچھ بلایا اور اسے ہدایت کی کہ اس شخص کو کوئی خالی کمرہ دو اور صاف کپڑے فراہم کرو۔ داؤد چوہدری سے کتا اس کی حفاظت کا خاص طور پر انتظام کرے۔ جو کمرہ اسے دو اس کا نمبر مجھے بتاؤ۔“

پھر میں نے ظفر جمال کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا ”ایک گھنٹے بعد تم سے ملاقات ہوگی پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ جس چیز کی ضرورت ہو، مردم سروس کو فون کر کے منگوالیا۔“  
 وہ شکریہ ادا کر کے سپردائز کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ اس کے باقی اور بے کار سے پھلون کا نوکرا وہیں رکھا رہ گیا۔ میں چند لمبے لمبے گھڑا انہیں کھتا رہا اور سوچتا رہا کہ حالات بعض اوقات کیسے عجیب و غریب انداز میں گھٹ لیتے تھے۔ آخر میں بھی اندر والے ہی راستے سے اوپر پہنچ کر لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ شاوئر لے کر میں نے لباس تبدیل کیا، کھانا کھایا اور کافی پیئے کے بعد گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ اس دوران مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ ظفر جمال کو کمرہ نمبر 7 بیٹن دیا گیا تھا جو مجھ سے ایک فلور ہی اوپر تھا اور نہ جانے کیوں یہ ایک کلی نمبر محسوس

اچھے پہلے کمروں جتنے فریج اور فریزر موجود تھے۔ اس کے باوجود اتنی جگہ خالی تھی کہ ڈیوڑی، ٹرک بھی اندر آجاتے تھے۔  
 آخر کار وہ گیٹ کھلا جس سے ڈیوڑی، ٹرک اندر آتے تھے۔  
 لمبی روشنی میں ڈھلوان راستے پر ظفر جمال پھلون کا نوکرا اٹھائے لہو دار ہوا۔ شاندار خان اس کے ساتھ تھا۔ اندر آکر اس نے میٹ بند کر دیا اور خاموشی سے اندرونی راستے سے ہو کر میں چلا گیا۔ میں اور ظفر جمال آتے آتے سامنے کمرے وہ گئے۔ میں نے ایک دیوار پر سوچ بولڈ دیکھ کر چند من دبا سے اور وہ خانے میں تیز روشنی چمک گئی۔

اب میں نے ذرا اور بہتر طور پر اس کا جائزہ لیا۔ وہ نوکرا اٹھائے خاموش کھڑا رہا۔ آخر میں نے گہری سانس لے کر کہا ”چھو! تم ظفر جمال ہو! بہت دیر کی سواں آتے آتے۔“  
 ”میں مجبور تھا سراسر! اور دھڑلہ بھگا پھر رہا تھا۔ میری کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ وہ بوٹوں پر نیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ اس کے بوٹوں پر پیریاں بھی ہوتی تھیں۔  
 ”نوکرا نیچے رکھ دو۔ اب اس بوجھ کو اٹھائے پھرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا اور جب وہ نوکرا رکھ کر بیٹانی سے بیٹن پہنچ چکا تو میں نے پوچھا۔ ”پھر کب اور کس طرح تمہاری کچھ میں آیا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے؟“

”میں نے آج سب کچھ کو فون کیا تھا۔ بہت مایوسی اور دل شکست کے عالم میں۔ مجھے تھوڑی سی رقم کی ضرورت تھی۔ میں کراچی سے بھاگنا چاہتا تھا۔ فریج کی موت کی خبر نہ سنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی دور دراز شہر کی طرف بھاگ جاؤں۔ لیکن میرے پاس کرائے اور کچھ دن کے گزارے وغیرہ کے لیے بھی رقم نہیں تھی۔ تمہیں کے بارے میں میں نے بیٹھ محسوس کیا تھا کہ وہ ایک ٹانگہ دل ٹوٹی تھی۔ میں اس شرمین سیکڑوں لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہاں بہت سے لوگ مجھ پر بڑی مہربانیاں کرتے رہے ہیں لیکن اس وقت میں کسی کے پاس جانے کا خفیہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ باقی میں سب کچھ کے پاس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس امید پر فون کیا تھا کہ وہ میری مدد کی کوئی صورت نکال لے گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ مونا کی مدد کرنے کے کتنی شدت سے خواہش مند تھے اور اس کے لیے آپ کس حد تک جانے کو تیار تھے؟“

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے میل زدہ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر کئی دن سے منہ نہیں دھویا تھا کہ چونکہ وہ سے زیادہ ناقابل شناخت رہے پھر وہ ٹھہرے ٹھہرے لیے مل بولا ”اگر آپ مونا کی مدد کرنا چاہتے تھے تو یقیناً آپ میری بھی مدد کریں گے۔“

”کسی مدد؟“ میں نے سیاہ لمبے میں پوچھا۔  
 ”یہ تو کب پر بھی واضح ہو سکے گا جب آپ میری پوری بات



ماگے بھون  
 اقلیم علیم

جلد اول :-/ 150 جلد دوم :-/ 150

ماشرمکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

ہوتا تھا۔

میں بیڑیوں ہی کے راستے اور پہنچ گیا۔ راہداری میں تین گاڑی قیامت تھے۔ ایک راہداری کے ایک سرے پر کھڑا تھا اور دوسرا دوسرے سرے پر۔ جبکہ تیسرا گاڑی بیڑیوں اور لفٹ کے درمیان کھڑا تھا تاکہ دونوں راستوں سے آنے والوں پر نظر رکھ سکے۔ داؤد نے اچھا کیا تھا کہ انہیں ظفر جمال کے کمرے میں قیامت نہیں کیا تھا۔ اب یہ جانتا مشکل تھا کہ وہ کس کمرے کی عمرانی کر رہے تھے۔ وہ گویا پورے طور پر ہی نظر رکھنے کے لیے کھڑے تھے۔

میں ظفر جمال کے کمرے میں پہنچا تو وہ مجھے ایک مختلف انسان دکھائی دیا کہ اس کی شکل و شبہات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن پگڑی اتر جانے اور کلیہ صحیح ہونے پر ہی ذہن آسان کا فرق پڑ گیا تھا۔ وہ ایک وجہ سے مختص غلام پہلے نالابا نہیں شیور تھا۔ اب اس کی شبیہ کافی بڑھی ہوئی تھی۔ کمرے میں تپائی پر جانے کے برتن موجود تھے اور اس کی انگلیوں میں سگریٹ دہی ہوئی تھی۔ ہم بیٹھ چکے تو وہ بولا "میں آپ کا کس منہ سے شکریہ۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کانٹے ہوئے کہا "میری باتیں جوڑو۔ کام کی بات کرتے ہیں۔"

اس نے سگریٹ کا طویل مکمل لیا۔ ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا "بات بہت لمبی ہے اور میں تفصیل سے سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"میرے پاس بہت وقت ہے۔ میں رات بھر جاننے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تمہاری بہت جواب نہ دے جائے۔" میں نے کہا۔ "میں بھی آپ کی پناہ میں آجائے کی خوشی میں جاگ سکتا ہوں۔" وہ ذرا تنگھے تنگھے سے انداز میں مسکرایا۔ "وہ غسل کر چکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے اوپر سے گویا کالک کی کوئی سوئی یہ آڑھی تھی۔ صاف شہرے عمر اور تے شلوار قمیض میں وہ یکدم ہی ایک بد حال بھلے فردوش کی جگہ خوش حال طبقے کا فرد دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شب بیداری کی سرفی تھی لیکن ایک سارا محسوس آجائے کی وجہ سے وہ واقعی مستعد دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے اپنی کمانی نشانہ شروع کی جو کم و بیش وہی تھی جو فرح مجھے ملنا چکی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ ہر بات تفصیل سے بتا رہا تھا کیونکہ اسے تفصیلات معلوم تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی کمانی میں ان باتوں کا اضافہ ہو چکا تھا جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے تھا۔ فرح سے بات ہونے کے بعد بھی اس پر پہنچے تھے جس جو گریں باقی تھیں وہ ظفر جمال نے کھول دیں۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ ملگاتا رہا اور سب باتیں بتاتا رہا۔ وہ واقعی ہیرو دانش کا کھڑا کھڑا تھا۔

آخر وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے میں گہرا سکوت پھیل گیا۔ ہم دونوں چہلے اس طرح خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں اپنی رگ و پھ میں خفیف سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

"چھ۔ تو چالیس لاکھ کی رقم پر تمہارا ہیرو دانش سے اختلاف شروع ہوا۔ اچھی خاصی مولی رقم ہے؟" بالآخر میں نے کسی سانس لے کر کہا۔

"جی ہاں۔ تقریباً آدھا کروڑی سمجھ لیں۔" وہ بولا "محقق کاموں کے سلسلے میں اس نے مجھے جو معاوضے دینے کے وعدے کیے تھے ان کے حساب سے میرا اس کی طرف تقریباً آدھا کروڑا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے وقتاً فوقتاً تجھے رئیس دتا رہتا تھا لیکن ظاہر ہے میرے پڑھنے پر اخراجات پر اصرار رہتی تھیں۔ اوہار کا خیال بڑھتا رہا پھر اس کی نیت ہی بدل گئی۔ اس کا خیال یہ ہو گیا کہ میں نے ایسی کوئی خاص خدمات انجام نہیں دی تھیں کہ مجھے اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کی جانی۔ اس کے خیال میں جس طرح میں وہ غریب سے میں زندگی بسر کر رہا تھا وہی کافی تھا۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر وہ انفرادی سے مسکرایا پھر "افضل صاحب! ہم جیسے کم کردہ راہ لوگ راتوں رات دولت بننے کے لالچ میں ہی توڑے سے بڑا کام کرتے ہیں۔ اپنے تجربہ سودا کرتے ہیں۔ غیرت کو ٹھکادیتے ہیں۔ بے حس ہوجاتے ہیں۔ آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ اس دولت کے تارے ہر کچھ نہ کچھ خواب بھی تراش لیتے ہیں جس کے آنے کی ہمیں امید ہوتی ہے۔ لیکن خوابوں کی اس دنیا میں پہنچ کر کوئی اچھا کام آپ نہیں کر سکتا۔ تو کبھی کبھی تو مل بھی بڑا شدید ہوتا ہے۔"

"چنانچہ تم باقی ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "اصل بنیاد مونا والے معاملے پر شروع ہوئی۔ وہ بھی ایک گناہ گار سی لڑکی تھی۔ میں بھی ایک نہایت گناہ گار آدمی تھا۔ دو گناہ گار ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ اور ان طرح ہوئے کہ انہوں نے بڑے بڑے راست باڈوں کو مات دی۔ ہم دونوں سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر بالکل الگ تھلک ہو جانا چاہتے تھے اور کسی گوشہ عافیت میں جا کر گمنامی اور شرافت کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔" وہ بولا۔

"مگر ہیرو دانش تمہاری رقم دے دیا اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت دے دیا تو حالات بہت مختلف ہو گئے۔" میں نے تاسف سے کہا۔ "مگر وہ اسی دوران مونا بھی غیر متوجہ ہو کر بچاس ساٹھ لاکھ کی جائیداد کی وارث بن گئی تھی جس کا شائبہ اب بے چاری کو پتا بھی نہیں چل سکا۔ میاں بیوی کی حیثیت سے ملا۔ تم ایک آئینہ بل زندگی گزارتے۔"

اس کی آنکھوں میں کرب و حقیر کی وحشتلاہٹ سی نمودار ہوئی۔ لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پایا۔ شاید وہ فیصلہ کن جدوجہد کے اس دور میں ذرا بھی کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

مجھے نے بھی وہ بولا "ہیرو دانش اپنی مرضی سے کسی کو کمانا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جو لوگ بھی اس سے وابستہ ہیں یا کسی بھی حیثیت سے اس کے لیے کوئی کام کرتے ہیں یا کمانا"

ارادے سے نکلا۔ مجھے کافی دیر ہو گئی۔ میرے پیچھے وہ بھی کوڑے کرنے کے ارادے سے... اور کچھ پریشانی کی وجہ سے رادھ نلی فون کرنے نکلی تو دیکھ لی گئی۔ وہاں کچھ منشیات فروش کارندے رہتے تھے وہ بھی پیر دانش کے خیر تھے۔ میں دانش کے سونا کی لاش مجھے پسند ہے میں جھوٹی ہوئی لی۔ پیر دانش کے میری کھات میں بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تو شاید قسمت اچھی اچھی میری زندگی بانی تھی کہ میں بچ نکلا۔ انہوں نے بہت دور میرا تعاقب کیا۔“

”شاید اسی دوران ہم وہاں پہنچے تھے جب تم وہاں سے بھاگ کر نکلے اور دو لوگ تمہارے تعاقب میں لگ گئے۔ ہمیں صرف سونا کی لاش ملی تھی۔ کسی سے ہمارا سامنا یا ٹکراؤ ہمیں نہیں ملتا۔“

”میں تو اس کی لاش کو بھی نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا۔ وہ! سی آواز میں بولا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”ہمت سی بات سے معلوم ہو گئی تھیں۔ تمہاری زبانی بھی اس ذخیرہ کی بہت کڑیاں ملی گئی ہیں لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی اتنی جلدی کیسے ماری گئی؟“

میں نے اسے بتایا کہ کس طرح سونا اور فرح کی سیکھ ظفر حال نے ہی پیر دانش کو بیک میل کرنے کے لیے رکھی میرے ہاتھ لگی تھیں۔ پھر کس طرح فرح میری نظریں آ اور کس طرح میں اس کے ہنگامے پر جا پہنچا تھا۔ کس طرح وہ مرہان ہو گئی تھی اور اس نے ساری باتیں مجھے بتادی تھیں طرح ہمارا آئندہ بھی ملتے رہنے کا پروگرام طے پایا تھا۔

”اس ملاقات کے بعد صرف ایک دن بچ میں آیا میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس کے بعد میں کل ش سے ملنے کے خیال سے گیا تو میں نے اسے عمرہ پایا اور پورے پورے کے ہاتھوں مرتے مرتے پچا۔ پیر دانش تو چلو جلد ایسٹ سے واپس آ گیا ہو گا لیکن فرح کے اتنی جلدی مارے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“

”وہ بے چاری خوش حسی میں ماری گئی ہوگی“ ظفر بلا تامل بولا۔ ”وہ پیر دانش کے محض ایک دو حوں کے ایسٹ چلے جانے کے بعد اپنے آپ کو بہت آزاد آزاد اور محسوس کر رہی ہوگی۔ اس نے اس آزادی کو انجوائے کیا، سمجھ رہی ہوگی کہ وہ آئندہ بھی اس سلسلے کو جاری رکھ سکتی۔ دانست میں اس نے تمام ضروری احتیاطیں بھی کر لی ہوں اسے مطمئن نہیں ہو گا کہ پیر دانش کے سناٹے میں کوئی بھی کافی نہیں ہوئی۔ وہ موجود ہو یا نہ ہو، کسی نہ کسی طریقے۔ عجیب آکھ اس کے آؤمیل کی بھرائی کر رہی ہوئی ہے۔ مجھ پر فرح جیسے بیسیوں افراد جو یہ سمجھتے تھے ہیں کہ وہ چوہہ پیر دا

اس کے ذریعہ غلام ہیں۔ بلکہ غلاموں کو بھی شاید کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں، انہیں وہ بھی حاصل نہیں ہیں۔“

اس نے سرگت کا ایک کٹلے کے گریب سے انداز میں مرچا پھر مری سانس لے کر بولا ”ہتھیہ... افضل صاحب! یہ سب تو دراصل ہمارے ہیں۔ قدرت جب کسی کو اس کے گناہوں کی سزا دے جاتی ہے تو گریب گریب غیر متوقع قسم کے جواز تخلیق کر دیتی ہے۔ اس دہرہ کی ذلت اور خانہاں بربادی نے مجھے بڑے سبق دیے ہیں۔ بڑی بڑی چیزیں میری نظر میں حقیر ہو کر رہ گئی ہیں جن کے پیچھے بھاگنے میں ہم پوری زندگی گواہ رہے ہیں۔ حرام و حلال کی تیز کوڑھتے ہیں۔ بے غیرت بن جاتے ہیں۔ ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ سب سراب ہیں۔ ایک لمحے میں ہم سے چھن سکتی ہیں۔“

اس کی آواز بھراسی مچی ”میں بہت گناہ گار ہوں افضل صاحب! میری وجہ سے نہ جانے کتنے گمراہوں کی آہو خاک میں ملی ہوگی۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد ہوئی ہوگی۔ حتیٰ کہ ایک پولیس عرس تک میری حیثیت دلال کی سی رہی۔ مگر مجھے جیسے کچھ نظری نہیں آتا تھا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے کبھی اپنا اصل مقام، اصل حیثیت نظری نہیں آئی۔ میں سمجھتا تھا میں بہت باعزت، بہت آسودہ حال آدمی ہوں۔ میرے بڑے

گناہ ہیں اور میں بڑی پیش کی زندگی گزار رہا ہوں۔“

وہ خود استہزائی کے انداز میں مسکرایا ”مٹی چرب نہانی سے میں نے نہ جانے کتنی لوگوں کو کیا کیا دھوکے دیے۔ کتنے لوگوں کی رقیس مار لی۔ دھوکے دھک دھانڈلے سے جس کی ہر چیز دبا سکا۔ دھوکے اور بڑا خوش رہا۔ اس کے بعد مجھ پر اسی شر میں یہ وقت بھی آیا کہ ڈاکٹرس والے ہنگامے کے الگ سے چوری چوری میں نے ہنگامہ چھڑا کر دو سال کا کارایہ مار کر بھاگنے کا فیصلہ کیا تو میں اپنا سامان بھی اٹھا کر دو مری جگہ تک نہیں پہنچا سکا۔ وہ بھی مجھ سے راستے میں پیر دانش کے آدمیوں نے چھین لیا اور مجھے خود جان بھاگ رہا تھا پڑا۔ اس کے بعد سے بس دہرہ رہی ہے اور میں ہوں۔ اُمیں اس پوڈیشن میں نہیں تھا کہ کسی سے ایک ہزار روپے بھی آؤا ہر مانگنے یا سکول۔ میں کسی کے سامنے آنے کا خلوہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اس شر میں کسی کے ساتھ کوئی بھلائی ہی نہیں کی تھی کہ کوئی آؤے وقت میں میرے کسی کام آتا۔ اور میرے ساتھ بالکل بجا طور پر یہ بورا تھا۔ میں اسی کا سچ تھا۔“

”سونا تمہارے ساتھ تھی؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

اسی نے اہمیت میں سر ہلایا ”اس کی وجہ سے مجھے زیادہ ڈراما کی گئی۔ میرے لیے اکیلا چھپنا ہی مسئلہ بنا ہوا تھا۔ چہ جائیکہ ساتھ اس کی حفاظت کی فکر بھی کرنا پڑی تھی۔ ایک ٹرانس فلیٹ کے حوالے سے اس غریبانہ مصفااتی بستی میں وہ مکان خالی مل گیا تھا۔ وہاں ہم چھپ گئے تھے۔ ایک روز میں کچھ قسمت آزمائی کے

مجھے پتا ہے جن کے ذریعے اس کی دولت کے ابادوں میں افزائش ہو رہا ہے۔ پاکستانی لڑکیوں کی ان فلموں کی تیاری اور بہت اونٹنی ریت پر انیس چلا اس کا تازہ ترین پروجیکٹ تھا۔ جلی پیکر تو وہ ہے ہی۔ اسمگلروں اور منشیات فروشوں کو وہ تحفظ اور امن یا دہرازم کرتا رہا ہے اور اپنے دھندوں میں ان سے مدد لیتا رہا ہے۔ اسیا درجے کے تاجروں کو اغوا کر کے تواں وصول کرتا رہا ہے۔ جس قیمت کا لڑیاں تک چوری کر آ رہا ہے۔ ہر طرح کے جرائم پر لوگ اس کی پناہ میں آنے کے بعد محفوظ ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی فلموں والے دھندے کی تو بیشتر تفصیلات کا مجھے علم ہے کیونکہ وہ بد بخت کا کردار ہی اس میں سب سے اہم تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کس طرح لڑکیوں کو گھیرا جاتا رہا۔ کہاں کہاں شریک ہوئیں۔ کن کن "ہنرمندوں" نے خدمات انجام دیں۔ میں یہ سب کچھ عدالت کے کمرے میں کھڑے ہو کر بیان کرنا چاہتا ہوں۔"

"جس یقین ہے کہ تمہاری کو اسی اسے چھانی کے پھوسے تک پہنچانے کے لیے کافی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔  
 "یقیناً" وہ قدرے جوش سے بولا "بشرطیکہ کچھ طاقتور بارہو اور دیانت دار لوگ میرا ساتھ دیں۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ میں صحیح طور پر زبان کھولنے سے پہلے ہی مارا جاؤں گا۔ میں اس کی شاعر اور اجد حمانی کے پیچھے رکھا ہوا ڈاکٹار ہوں لیکن میں از خود کوئی دھماکا نہیں کر سکتا۔ کچھ مضبوط اور بے جھجک ہاتھوں کی ضرورت ہے جو مجھ سے صحیح کام لے سکیں۔"

کمرے میں ایک بار پھر گوا سکوت چھا گیا۔ میں ایک بار پھر خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میرے ذہن میں خاما طونان بچا تھا۔ کمرے کی فضا سنگینوں کے دھوئیں سے بو جھل ہو چکی تھی۔ آخر میں نے فون کی طرف ہاتھ پڑھایا اور ریسیور اٹھا کر آپہنچ کر غبرچہ پکچا۔

"آپ کے فون کر رہے ہیں؟" اس نے یکدم ذرا تشویش سے ہو کر پوچھا۔ اس کے ذہن میں شاید کسی اندیشے سے سراٹھایا تھا۔  
 "ایک اور مضبوط ہاتھ کہ۔ جو ہیرا دانش کو کھینچ کر چھانی کے پھندے تک لے جانے میں ہماری مدد کرے گا۔" میں نے جواب دیا۔

ظفر جمال کے چہرے سے تشویش کے آثار غائب ہو گئے۔ پہلے شاید وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے ہیرا دانش یا پھر قانون کے حوالے کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ وہ قانون کی تحریل میں تو جانے کے لیے تیار تھا مگر اس شرط پر کہ اس کی گواہی سے ہیرا دانش کے گنگے میں پھندا پڑ جائے۔ کیس ایسا نہ ہو کہ وہ تو برسوں کے لیے جیل پہنچ جائے اور ہیرا دانش اسی طرح آزاد ہو جائے۔ وہ "شان و شوکت" سے اپنی سلسلت چلاتا رہے۔

ہمت کی باتیں جانتے تھے ہیں اس لیے وہ اس کے ترسیل آدمی بن گئے ہیں۔ درحقیقت ہمت ہی خطرناک خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ محض یہ خوش فہمی بھی انہیں موت کے منہ میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔ غداری یا اس کے اعتماد کو دھوکا دینا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہیرا دانش کو پتا چل گیا ہو کہ فرح اس کی عدم موجودگی میں مجھ سے یا کسی سے کی گئی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یقیناً" وہ دھوکے سے بولا "ہیرا دانش عجیب و غریب شیطانی ذہن کا مالک ہے۔ وہ اپنے قریب ترین لوگوں کی جاسوسی کرانے کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست رکھتا ہے۔ میں ممکن ہے جب آپ سو ٹھیک پول پر اس سے باتوں میں مگن ہوں اس وقت کسی درخت پر پتوں میں چھپی ہوئی کسی ڈیڑھ کمرے کی آنکھ آپ دونوں کا عکس محفوظ کر رہی ہو۔" میں ممکن ہے بیڑہ دم میں کسی الیکٹرانک کمرے نے آپ کی تصویر کھینچی ہو یا کسی اور آلے نے آپ کی آواز میں ریکارڈ کی ہوں۔ ایسی کوئی بھی چیز کسی بھی ایسا جگہ پر پوشیدہ ہو سکتی تھی جہاں آپ کا خیال بھی نہ جاتا۔ وہ تو ایسی ضیبت چیز ہے اس نے اپنی تینوں بیویوں کے بیڑہ دم تک "ٹیک" کر رکھے ہیں جو برسوں سے اس کی وفادار زندہ بیویوں کی طرح زندگی گزار رہی ہیں۔"

اس کی بات درست ہو سکتی تھی۔ وہ ہیرا دانش کو مجھ سے۔ بلکہ شاید اس کے دوسرے قریبی آدمیوں سے بھی بہتر جانتا تھا۔  
 "بھی وہ خود بھی اس کا قریبی ہی آدمی تھا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" ایک طویل سکوت کے بعد میں نے پوچھا۔

"میرا تو سب کچھ لٹ چکا ہے افضل صاحب! میں برباد ہو چکا ہوں۔ میرا بھی مرچکی ہے۔ اور ہمارے سارے خواب بھی آج بچے ہیں۔ اب کیا باقی رہ گیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔" اس نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے "گھوڑا چھوٹے گناہ کاروں نے تو اپنے گناہوں کی سزا پائی ہے۔ اب بڑے گناہ کار کا بھی تو حساب ہونا چاہیے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ہم تو ایرانی سے بغاوت کرنے کے "جرم" میں برباد ہو جائیں اور وہ اپنی تمام تر! بلایت کے باوجود راج سنگھان پر بیٹھا بیٹھ کر رہے۔ معاشرے میں زہر گھول رہے۔ لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا رہے۔ یہ تو بڑا عظم ہو گا افضل صاحب!"

اس نے نئی سگریٹ نکالی۔ اس کی انگلیوں میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ ایک گمراہی لے کر وہ بولا "میں اسے چھانی چڑھتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے صرف آپ جیسے ایک مضبوط آدمی کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں اس کے رستے سے رازوں سے واقف ہوں۔ کئی ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں مجھے علم ہے جنہیں اس کے حکم پر قتل کیا گیا۔ کئی ایسے ناجائز، خطرناک اور غموم دھندوں کا

”پھر بھی... سہم!“ ظفر جمال بدستور متذہب و متحرک  
کل کو قریب سے جاتے بغیر میری بات کو سمجھا اس کے لیے  
تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔

”سرا آپ اسٹے بڑے آدمی ہیں۔ کیا آپ کی انجینئر  
اور کے لیول تک واقفیت نہیں ہے؟“

مجھے بھی اچھی۔ وہ قدرے تعجب سے میری طرف دیکھ رہا  
میں نے لائٹ سے کہا۔

”واقفیت تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ واقفیت تو آئی جی۔  
آئی جی اور اس سے بھی اوپر کی سطح تک ہے۔ اور وہ کچھ اور  
اوقات کی وجہ سے ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب بڑے بڑے برٹش میں ہر

رج سے نہیں ہے۔۔۔ دولت مند اور بڑے بڑے برٹش میں تو اس طرح  
مجھ سے کہیں بڑے بڑے موجود ہیں۔ میری شناسائی کی وجہ  
کچھ اور ہیں۔ بہر حال۔۔۔ اس کام کے لیے میں انجینئر ریم کچھ

ی موزوں سمجھتا ہوں۔ پیروائش کے لیے یہ مزید تکلیف کی  
ہوگی کہ وہ ایک انجینئر کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔“

”دیکھ کیجئے سہم! مجھے مروانہ دیتے گا۔“ اس نے کہا  
گویا چیخ کرتے ہوئے بولا ”میرا مطلب ہے میں مرنے کے لیے  
تیار ہوں لیکن اگر مجھے مرنے کی بجائے تو میری موت رائیج

جانی چاہیے۔ پیروائش کو واقعی انجام تک پہنچانا چاہیے۔“  
”تم سے زیادہ مجھے اس کی فکر ہے“ میں نے کہا ”یہ میری  
عزت کا سوال ہے۔ بہر حال اس معاملے میں انجینئر ریم کل ج

ظفر میں آئی جی ڈی آئی جی سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اصل کام  
سطح کے آدمی کو کرنا ہوتا ہے۔ اوپر افسر تو صرف احکامات جاری  
کر سکتے ہیں۔ ان احکامات پر عملدرآمد کا اہتمام تو نیچے والوں پر

ہوتا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پیروائش کی ہوائش ریم  
کے تھانے کی حدود میں ہے۔ اس معاملے سے اصل تعلق تو آئی  
جی ہے گا۔“

ظفر جمال خاموش رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مطمئن نہیں  
لیکن مجھے فی الحال اس کی بے اطمینانی کی پروا نہیں تھی میں نے  
سمجھتا تھا کہ پیروائش پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ریم کل موزوں تھا

تھایا نہیں؟  
ظفر جمال نے ایک اور سرٹ ساگلی۔ چند لمحوں بعد کل جی  
ریم کل لائن پر تھا۔ میں نے بی ٹی چھپڑنے کے انداز میں  
”ہمت دیر سے لائن آئیجی تھی۔ کس حینہ سے بائیں ہوئے

تھیں؟“  
”حینہ؟“ وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا ”ہاں  
واقعی ہمت ہی پیاری حینہ سے مکالمہ ہو رہا تھا۔ میں تو ڈی کا  
بد مزگی پر تھی کہ اس حینہ کی ایک ایک فٹ کی سوچیں اور

بچپن اچھے سے زیادہ تھی۔ لیکن۔۔۔ خبریں کی قیمت ہے کہ اس  
ڈی فون پر بات نہیں ہو رہی تھی اور اس کی خوبصورتی کا فقدان تھا

میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر طمانیت لوٹ آئی اور اس  
نے قدرے اشتیاق سے پوچھا ”کیا وہ کوئی بہت بڑا آدمی ہے؟“

”ہاں۔ بہت بڑا آدمی ہے“ میں نے آپریٹر کو ریم کل کا نمبر  
بتایا اور دوبارہ ظفر جمال کی طرف متوجہ ہوئے ہوئے کہا ”جو آدمی  
پولیس کے محکمے میں ہوتے ہوئے رشوت نہ کھا رہا ہو۔ کوئی ناجائز

کام نہ کر رہا ہو۔ قانون اور اصولوں کی پاس داری کے لیے اور  
انسانیت کی فتح کے لیے بڑے بڑوں کی مخالفت مول رہا ہو۔  
جائز کام کے سلسلے میں کسی سے بھی ٹکر لینے سے نہ ڈرتا ہو۔ میری

ظفر میں تو بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ جہاد کر رہا ہے۔“  
آپریٹر نے بتایا کہ ریم کل کا نمبر انجینئر جی رہا تھا۔ جوش خالی  
ملا وہ مجھے تیل دے دے گا۔ میں نے ریسپونڈ کر دیا۔ ظفر جمال نے

پہلو بدلتے ہوئے پوچھا ”کیا وہ بہت بڑا پولیس آفیسر ہے؟“  
”میں نے نہیں جو کچھ بتایا“ کیا اس کے بعد بھی تمہیں اس  
کے بڑا ہونے میں شک ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں سہم! لیکن عہدہ تو بہر حال اہم ہوتا ہے۔ میرا  
مطلب ہے۔۔۔“ وہ کچھ گڑبڑا کر رہ گیا۔ بات مکمل نہ کر سکا۔  
”عہدہ نہیں۔۔۔ کردار اہم ہوتا ہے۔ ایک بے کردار بڑے

افسر سے ایک پاکردار کا فیصلہ بہتر ہے“ میں نے اپنا نظریہ بیان کیا  
”بہر حال۔۔۔ عہدے کے لحاظ سے یہ شخص صرف انجینئر ہے۔“  
ظفر جمال کے چہرے پر باؤسی چھا گئی ”صرف انجینئر؟“ اس

نے مرود سے لہجے میں دہرایا ”ایک انجینئر بھلا پیروائش کا کیا بگاڑ  
سکتا ہے؟“  
”جو شخص کردار کے لحاظ سے ایک چٹان کی طرح مضبوط

ہو۔۔۔ وہ بڑے بڑے بد معاشوں کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے“ اس کا  
تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”پھر بھی۔۔۔ سہم! عہدے کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔  
سرکاری نظام کا بہر حال اپنا ایک حساب کتاب ہے۔ افسر کے  
اقتدار کی حدود اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ چھوٹا افسر اپنی جگہ

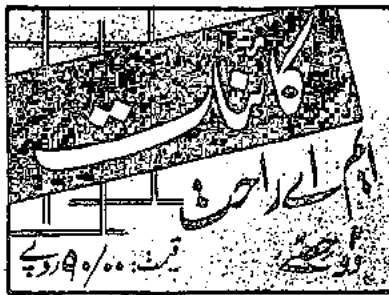
لاکھ کچھ کرنا چاہے لیکن اگر اوپر سے بڑے افسر کا آرڈر آجائے تو وہ  
مجبور ہو جاتا ہے“ ظفر جمال بولا۔

”ریم کل ان چیزوں سے نمٹتا جاتا ہے۔“ میں نے مسکراتے  
ہوئے کہا ”جس طرح مام پاپس والوں کو بد عنوانی اور ناجائز  
کاموں سے روکنے کے لیے۔۔۔“

”تو زمین اور مٹا لے موجود ہیں مگر  
وہ اس کے باوجود جو رہتا ہوتا ہے۔ اگر گزرتے ہیں اپنی مرضی چلانے  
کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے ہیں اسی طرح ریم کل بھی سچ اور

جائز کام پر ڈٹے رہنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے۔ قانون کی  
باریکداری سے وہ بہت اچھی طرح واقف ہے۔ اس نے لاء میں  
ماسٹر ڈگری لی ہوئی ہے۔ جس طرح بعض افسر کرپشن میں

اسپیڈلٹس ہوتے ہیں“ اس طرح ریم کل فیسٹ لوگوں سے ٹکر  
لینے میں اسپیشلسٹ ہے خواہ وہ کتنی ہی بار مسخ ہوں۔“



کہا ہوا تھا۔ "میں نے کہا۔"

پھر وہ خیال تو میرا بھی یہی تھا۔ "وہ ٹھنڈی سانس لے کر یوں کہیں وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے رضامند نہیں ہوگی کیونکہ اسے ہمارے غلطے میں ایس ایس پی کے فرائض انجام دینا پڑتے ہیں۔"

"اور کیا کہہ رہے تھے وہ؟" میں نے یہی بات برائے بات

کہی۔ "تو... اعداد و شمار ہی تم نے انھیں مونٹ سے لڈ کرنا دیا؟" وہ ٹھنڈی سانس لے کر یوں کہتا تھا۔ "ان بے چاروں کو کتنا کیا ہوتا ہے! بس یہی کہ فلاں کو چھوڑ دو... اس سے بستر کے کٹھن کو چھوڑ دو... فلاں کے لیے فلاں کا فون آیا ہے... اور فلاں کو چھڑانے کے لیے فلاں تک کرنا ہے۔ میرے کان کوئی ایسی کال سننے کے لیے ترس گئے ہیں جس میں کہا جائے کہ فلاں کو ڈر کر تم بے قصور اور بے گناہ پاؤ تو اسے قانونی موٹائیوں میں الجھائے بغیر۔ اور کسی بھی سفارش کے بغیر فوراً رہا کر دیا اور کسی کو اگر تم مجرم پاؤ۔ خواہ اس کے خوف سے کوئی گواہی دینے والا میر نہ ہو۔ اور خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی سفارش آئے اسے ہرگز مت چھوڑنا۔ ایسا کوئی فون کب آئے گا افضل پیارے؟"

"اس وقت تم ایسا ہی ٹیلی فون سن رہے ہو وزیر رحیم گل!" میں نے گویا اسے من کی مراد پوری ہونے کی نوید سنائی۔

"تمہارے فون سے کیا ہوتا ہے؟" وہ ہنسی سے بولا "تمہارا کون سا اس ملک کا نظام چلانے میں کوئی کردار ہے۔"

"کچھ نہ کچھ کردار تو ہو گا یار! آخر میں اس ملک کا ایک معزز شہری ہوں" میں نے کہا۔

"تمہارا کردار میں اتنا ہی ہے کہ تم مجھ جیسے گدھوں کو وقت بے وقت فون کر کے ان کے کان کھاتے رہا کر دو کیونکہ اتفاقاً ہم جیسے گدھوں کی تم جیسے گدھوں سے دوستی ہو جاتی ہے" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"میری سارا! اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" میں نے اسے تسکین دی "مجھ جیسے اور تم جیسے لاکھوں گدھے جس صبح باران کاغذ بن کر پڑیں وہ اس ملک میں کبھی نہ کبھی ضرور آئے گی۔ اس کے لیے کام اپنا اپنی جگہ جو بھی معمولی سے معمولی کام کر سکتے ہیں وہ میں کر سکتا رہتا ہوں۔"

"اس وقت تم نے مجھے یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے؟" وہ تسکین سے بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارے خیال میں یہ بات اہم نہیں ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"کام کی بات کرو یار تم نے یقیناً کسی کام سے فون کیا ہو گا۔"

لہذا بستر پر ہی ہے کہ اصل بات کرو۔ میرا مغز مت چاہتا اور وقت ضائع مت کرو۔ میرا مغز اور وقت دونوں بہت اہم اور قیمتی ہیں۔ وہ مصنوعی رکھائی سے بولا۔

"ہاشا اللہ۔" میں نے کہا "وقت قیمتی ہونے کی بات تو میں مان سکتا ہوں لیکن یہ مغز کہاں سے قیمتی اور اہم ہو گیا؟"

"کیوں..." مغز قیمتی اور اہم کیوں نہیں ہو سکتا؟" "بھی قیمتی اور اہم تو وہی چیز ہو سکتی ہے جو انسان کے پاس موجود ہو۔ جو چیز تمہارے پاس موجود ہی نہیں۔ اس کے اہم یا قیمتی ہونے کا کیا سوال؟"

"سب کو اپنے بیہوشات سمجھا کر۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار لوگوں کو تم سے بہت شغف بنایا ہے۔" وہ فوراً بولا "اب سیدھی طرح کام بتاؤ ورنہ میں فون بند کرنے لگا ہوں۔ کافی رات گزر چکی ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"میرے بے ایمانانہ کہ یہ تمہارا جائے کا وقت ہے۔ کیا اب آؤ اسے کابل ہو گئے کہ راتوں کو بھی سوئے گئے؟ کام کی بات سنو یار! میں ایک بہت اہم کیس تمہارے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں جس میں بڑا پتھنج پوشیدہ ہے اور جس میں پتھنج والے کام کرنے میں ہی سب سے زیادہ لطف آتا ہے۔ اگر تم نے ایک مضبوط اور بے خوف انسان کی طرح اس معاملے کو ہینڈل کیا تو تمہاری شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے۔"

"اگر میں نے تمہارے کہنے پر کسی معاملے کو ہینڈل کیا تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ میرے ہاتھ میں صرف سائیکل کا ہینڈل آئے۔ بہر حال... تم نے مجھے مردانے کا کوئی نیا طریقہ سوجھایا ہے تو وہ بھی بیان کر دو۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم سے دوستی کے بعد انسان کی زندگی جین سے نہیں گزر سکتی" وہ بولا۔

"افسوس..." تم نے بھی اسی طرح کی باتیں شروع کر دیں۔ تمہیں تو میں اتنا بڑا اور تجربہ دار نہیں سمجھتا تھا۔ میں تو تمہیں شرق اور اڑنے مشق کی کھیل کارآمد دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم نے بات سننے سے پہلے ہی بد فائلیں زبان سے نکالنا شروع کر دیں۔ اگر تم ایک بہت بڑے کام کا کرڈٹ نہیں لینا چاہتے تو تمہاری مرضی" میں نے گویا بات ختم کرنا چاہی۔

"اب یہ دوستی کی طرح غرے دکھانے بند کرو اور بتاؤ

کیا بات ہے؟ وہ جلدی سے بولا۔

”جیسی داف! تمہیں تو ابھی پہلی بیوی ہی نصیب نہیں ہوئی۔ یہ دوسری کے بارے میں تجرہ کہاں سے بول پڑا؟“ میں نے بات بکلی۔

”یعنی ضروری تو نہیں ہے کہ انسان ہر بات ذاتی تجربے کی روشنی میں ہی کرے۔ دوسروں کے تجربات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ تم یہ مثال وغیرہ کو چھوڑو۔ اصل بات بتاؤ۔ وہ بولا۔

”بات بہت لمبی ہے۔ تم میرے پاس آ جاؤ۔ ہمیں ایک باضابطہ قسم کی میٹنگ کرنا پڑے گی۔ ایک بہت بڑے ذرائع کا بہت اہم کردار ابھی میرے پاس موجود ہے۔ میں تمہیں اس سے بھی ملوانا چاہتا ہوں۔ میٹنگ میں ہم تینوں ہی ہوں گے۔“

”یار! تم اس معاملے کو صبح پر نہیں رکھ سکتے؟“ اس نے گویا مجھے سنانے کے لیے فون پر آواز کے ساتھ ہماری ل ”ب“ تو میں سونے کے لیے جا رہا تھا۔ سلیپنگ سوٹ بھی پہن چکا ہوں۔“

”ایسی تیزی تمہارے سلیپنگ سوٹ کی!“ میں نے وائٹ چپس کر کہا۔ ”ابھی تم مجھ پر دوسری بیوی کی طرح غرے دکھانے کا الزام دھر رہے تھے۔ اب خود کسی اونچے درجے کے ماڈل کی طرح غرے دکھا رہے ہو۔ سلیپنگ سوٹ پہن لیا تو کیا ہوا۔ کوئی زبرد بکتر تو نہیں پہن ل۔ ویسے بھی تمہارا پولیس آفیسر کو سونے سے کیا کام؟ وہ تو چومیں مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔“

”ہاں۔ اسے بھلا نیند کی کیا ضرورت؟ وہ کوئی انسان تھوڑا ہی ہے۔“ وہ تو پولیس والا ہے۔ میں نے فقرہ دیا۔

”تمہاری بیکو اس سننے سے بہتر ہے کہ میں تمہیں جاؤں۔ وہ بولا۔ ”آپ کی ہے تم نے عقل کی بات“ میں نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ ”یہ فیصلہ تم پہلے ہی کر لیتے تو ہم دونوں کا تنازعات بچتا۔“

”میں تو سوچ رہا ہوں آئندہ فون پر تمہاری جھیلو“ سننے ہی تمہاری طرف دوڑا کر اٹھا گا۔ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر۔ ”وہ جل کر بولا۔

”اُور تمہارے پیچھے بیٹے ہوا کریں گے۔ ہاتھوں میں پتھر لیے“ میں نے گما۔

”میں آ رہا ہوں“ وہ بولا۔ ”تو پھر آ جاؤ۔ اس میں اس طرح دھمکی دینے کی کیا بات ہے؟“ میں نے کہا۔

اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا ”بیکو اس سے قطع نظر۔“ مجھے بالکل سمجھی گئی تھی۔ تمہارے اندازے کے مطابق اس بات حیرت میں تھی در لگ جائے گی؟

”پوری رات بھی لگ سکتی ہے“ میں نے جواب دیا۔ ”او۔۔۔ مائی گاڈ! کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟“ وہ گویا خوفزدہ ہو کر بولا۔

”میں بے حد سنجیدہ ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں سنجیدہ تھا۔ یہ معاملہ بھی بہت سنجیدہ ہے“ میں نے جواب دیا۔ ”لگتا ہے تمہاری سنجیدگی اور مذاق میں کوئی خاص فرق ہے۔ میں بندر منٹ میں پہنچ رہا ہوں“ وہ بولا۔

”صرف بندر منٹ میں؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”ہاں۔ جب تم جیسے کہنے آؤی سے ملنا میری مجھ کو ٹھہرا۔ تو پھر جنسی جلدی ل لیا جائے اتنا ہی ستر ہے۔ تاخیر کسا کیا تاکہ؟“ اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے ریپور دیکھا تو تقریباً عجیب سے نظروں سے طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی ایک طرز تشنگی سی تھی۔ یقیناً وہی کافی عجیب لگ رہی تھی۔ اگر وہ دونوں طرف کی منظر رہا ہو تو مزید حیران ہوتا۔ شاید ہماری گفتگو میں غیر سنجیدگی کے کو محسوس کرتے ہوئے اس کا یقین کچھ اور متزلزل ہو گیا تھا۔ شاید اسے امید نظر نہیں آ رہی تھی کہ محض ایک انپیکٹر میرے پر بیزدانش پڑا تھا ڈال سکتا تھا۔ شاید وہ یہ بھی سوچ رہا ہو کہ اس نے میرے پاس آکر غلطی کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف لگایا تھا۔

میں نے اٹھ کر اس کے قریب جا کر کندھے پر جھکی۔ ”تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں غھر جال! تم صبح آؤی کے کام پہنچ گئے ہو۔ تمہیں اب اس سلسلے میں ذرا بھی غور و خوض کی ضرورت نہیں۔ اب یہ صرف میرا اور انپیکٹر رحیم گل کا دور ہے۔ تمہیں صرف اپنی تمام معلومات رحیم گل کو منتقل کرنی ہیں اس کے سوا تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا“ میں کرے میں چلنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں خوف کچھ کم ہوا۔ پچھلی سی مسکراہٹ ساتھ وہ بولا ”انپیکٹر رحیم گل آپ کا بچپن کا دوست معلوم ہو ہے۔ بہت بے تکلفی ہے آپ دونوں میں۔ ایسی بے تکلفی جو بچپن کے دوستوں میں پائی جاتی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے“ میں نے اس کی غلط فہمی دور کر کے ”کچھ عرصہ پہلے تک تو میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہاں سے کالی دور بہت عجیب و غریب حالات میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ یقیناً ممکن تھا کہ اس وقت وہ مجھے قاتل کر لیتا۔“

”واقعی؟“ تقریباً بے چینی سے بولا اور پھر دیکھا کہ شاید اسے اسے تفصیل بتاؤں گا لیکن میں نے اس قدر کہ کو یہیں چھوڑا اور کڑی میں جا کر ڈال دیا۔ منڈکھاس کے پار سات منزلے سڑک پر گاڑیوں کی بٹیاں متحرک چراغوں کی طرح اُدھر اُدھر متحرک تھیں۔ ٹریفک بہت کم تھا اور گاڑیوں کی آوازیں بھی کرے میں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس لیے میرے ارد گرد سکوت تھا۔ رات کا اپنے من میں کوئی بھید بچھپائے ہوئے تھی۔ تقریباً کالی بونڈ پر چائیں مجھے منڈکھاس میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خاموشی جیسا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں



کر دیا۔ تمہاری نظموں سے تو پولیس والوں کو بھی پھیند آئے لگتا ہے۔ چلو۔ میں جلد بازی اور بے اطمینان کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ اطمینان و سکون سے تمہاری داستان غم سنوں گا۔ تمہارے پکڑیں پھنس گیا ہوں۔ رات تو اب بھڑا ہوئی ہی ہے۔ جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔

وہ ٹائی کی گرہ ڈھیل کرتے ہوئے ناگہم پھیلا کر بیٹھ گیا۔ سب ذرا چائے یا کافی وغیرہ بھی منگوالو کہ میں ذرا بیدار ذہن کے ساتھ تمہاری داستان سن سکوں۔ انیسویں صدی کا ماضی کچھ کچھ بول دینا وہ بھی آج تمہاری طرف ہوتا۔ تمہارے قانع اشارہ ہوئی کی باسی اور پیکلی۔ سبھی چیزیں جگہ کر دیتے۔

”آخر پولیس والے ہوں۔ کیس پہنچے ہی پہلے کھائے پینے کی فکر شروع ہو گئی۔“ میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔ ”یہ میری داستان غم سننے کے لیے ذہن کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ دل پر بھی ہاتھ رکھ لو۔ یہ داستان سننے اور بھسم کرنے کے لیے تمہیں بڑے حوصلے کی ضرورت ہوگی۔“

”حوصلے کی تم فکر نہ کرو۔ اپنے ہاں حاضر اشاک میں بہت حوصلہ دستیاب ہے۔“ اس نے مجھے تسلی دی۔

میں نے فون پر دھم سروس کو کافی وغیرہ کے لیے کہا۔ کافی آچکی اور ہم تینوں نے اپنے اپنے کپ سنبھال لے تو خیر ارادی طور پر بغیر کسی تمہید کے خود بخود ہی اصل موضوع پر گفتگو شروع ہو گئی۔ جوں جوں بات آگے بڑھی رحیم گل بموت سا ہوا گیا۔ اس نے نہایت توجہ اور انہماک سے تمام تفصیلات سنیں۔ اپنے لیے اس نے ایک کے بعد کافی کا دوسرا کپ تیار کیا۔ میرے پورے بیان کے دوران اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی کوئی غیر سنجیدہ بات کی۔

مجھے پورا اقدار سناتے میں کافی دیر لگ گئی۔ آخر میں ہمیں نے ظفر جمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میری تمام باتوں کی تصدیق ہی تمہیں کر سکتا ہے۔ ظفر جمال ہی جس شخص کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہ یہی ہے۔ یہ مزد بہت ہی باتیں تمہیں بتا سکتا ہے۔ ان کے ثبوت کو چیل کر سکتا ہے۔ یہ تمہارے لیے وعدہ صاف گواہ بننے کو تیار ہے لیکن اگر تم اسے معافی نہ دلا سکو تو بھی کوئی بات نہیں۔ یہ سوئے بازی یا بائی جان پھلانے کے لیے گواہ نہیں بن سکتا۔ اگر اسے معافی نہیں مل سکتی تو یہ اپنے حصے کے جرائم اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے۔ یہ اب اس انقلابِ بڑات سے گزر رہا ہے جس میں انسان جان دے کر بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔“

رحیم گل نے طویل ہنگامہ بھر کر گویا نئے زاویے ظفر سے جمال کا سر کیا جائزہ لیا اور اس سے کوئی سوال کیے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا ”میں تمہیں سچی بات بتاؤں گا۔ یہ شخص عیروالدی کے لیے عیروالدی کی نظر میں بالکل برا شخص ہے۔ یہ ایک معصومانہ شخص ہے۔ اگرچہ

لگا۔ ایک بندہ منٹ بند کر کے دوا دے پر دستک ہوئی۔ میں جم کل کے بارے میں نیچے پڑا ہوا دے چکا تھا کہ وہ آئے تو اسے کہنے میں بھیج دیا جائے۔ ظفر جمال دوا دے کھولنے کے لیے اٹھا لیکن میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور خود آگے بڑھ کر کیمک آئی سے باہر دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد دوا دے کھولا۔

الیکٹرک جم کل اندر آیا۔ وہ قہری ڈیس سوٹ میں تھا اور بالکل آندھم نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا بڑے انجام سے تیار ہو کر آیا تھا۔ گوارا قی کسی اہم رابطہ جسم کی کاغذیں میں جا رہا تھا۔ بس ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس کی کمی تھی۔ صرف بندہ منٹ میں وہ اتنے انجام سے تیار ہو کر اپنے کمرے میں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ کم بخت بیٹیا اس وقت اسی کمرے میں تھا جب فون پر مجھ سے بات کر رہا تھا۔ سلیپیگ سوٹ میں ہرگز نہیں تھا۔

شاید وہ نہیں جانے کا پروگرام ملٹی کر کے میرے پاس آیا تھا کہ میرے پاس پہنچے ہی اس نے کمرے کی نظموں سے ظفر جمال کا جائزہ لیا۔ ظفر جمال کچھ متعجب نظر آئے لگا۔ وہ رحیم گل کے استقبال کے لیے غیر ارادی سے انداز میں اٹھ کر آیا ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی رحیم گل کی شخصیت سے مرعوب نظر آئے لگا تھا۔ اسے یقیناً اندازہ ہوا تھا کہ رحیم گل کوئی روایتی پولیس آفیسر نہیں تھا۔

رحیم گل نے مضبوطی سے اس سے مصافحہ کیا ”ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر ایک سونے پر ڈیر ہوئے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا ”ہاں۔ سناؤ تمہارے پاس کیا کمائی ہے۔“

”تم نے یہاں کمرے تک آنے کی بھی زحمت کیوں کی؟“ میں نے طاقت سے کہا۔ ”مجھے ہی سے مجھے اپنی آمد کی اطلاع کر دیتے ہیں۔ مجھے اگر بارنگ لائٹ میں تمہاری گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر تمہیں کمالی سنا دیتا۔ بلکہ یہ زحمت بھی غیر ضروری تھی۔ تم راستے ہی میں موبائل فون پر مجھے اپنی آمد کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ دوڑا دوڑا آکر تمہیں سچ راستے میں ملتا اور تمہاری گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے کمرے میں سے سروال کر جس کمالی سنا دیتا۔ دوچار سنگٹوں تک کمائی ختم ہو جاتی۔“

اس نے گہرا غصہ ظاہر کرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ فون پر وہ جی پڑا ہوا اور جیڑا لگا اٹھا رہا تھا اس وقت اس کا کہیں ہمارے نشان بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو وہ بالکل تازہ دم ہشاش بشاش اور خوش نظر آ رہا تھا۔ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”کون سا گناہ تھا؟“ ”گناہ ان کا تھا۔ وہ غفلت ہی ہے تم نے۔ جس کی بنا پر اس وقت یہ مصیبت پڑا رہا ہے۔“

میں نے اسے گوارا تو وہ جلدی سے بولا ”اس طرح صحت گھبرا

چیدہ اور گھنٹی کمانی برآمد ہوگی۔

”تمیں میرا دلش کی طرف سے دوبارہ کبھی پیغام میرا  
موصول نہیں ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے شاید میرے انکار کو اپنی توہین سمجھا۔ دوبارہ میرا  
طرف سے اس قسم کا کوئی پیغام نہیں ملا اور نہ ہی کسی سلسلے میں  
کی کوئی سفارش آئی۔ اس وقت مجھے صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں  
کہ وہ میاں کی کتنی بڑی شخصیت تھا حالانکہ اخبارات وغیرہ  
اس کا تذکرہ بہت کرتا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس کے ”دور“

میں تو مجھ سے نہیں اور نہ تک کے افسر حاضری دیتے تھے اور ان  
سے بعض تو اس کے تمام کثرت سے واقف ہونے کے باوجود  
کی ”مدد مانی“ قوتوں سے بھی مرعوب تھے۔ یہ بھی حیات کی  
ہے۔ اس نے تو گویا مجھ جیسے چھوٹے افسر کو مدعو کے بغیر براہ  
کیا تھا۔ میری عزت افزائی کی تھی۔ میرے انکار سے یقیناً  
انکو غصہ بھی ہوگی۔“

ظفر جمال نے کھنکار کر گھٹا صاف کرتے ہوئے کھنکھو  
راہلت کی ”مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ ایک بار وہ اپنے بچوں کا  
آدمیوں کے سامنے رجم کل ناکی پوئیس آفیسر کاہت ہوا  
سے ذکر کر رہا تھا۔ کسی کام کے سلسلے میں وہ انہیں نصیحت کر  
کہ اس پولیس والے سے بچ کر رہنا“ وہ ہمارے مطلب کا  
معلوم نہیں ہوگا۔ اس پر ایک بچے خاں قسم کے کارندے کا  
تھا کہ اگر وہ پیر صاحب کے مطلب کا آدمی نہیں ہے تو پیر  
ملائے میں کیسے رہ سکتا ہے۔ اسے کسی اور ملائے میں بھج  
چاہیے اور اگر اس میں کوئی دشواری ہو تو پیر دوسرے  
بھجوانے چاہیے۔“

رجم کل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا مگر اسے اس اطلاع  
خوشی حاصل ہوئی ہو ”ظاہر ہے۔“ وہ مرتباً لیے میں بولا  
قسم کے لوگوں کی مصلحتوں میں مجھ جیسے لوگوں کا ذکر انہی الفاظ

ہونا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پیر نے کیا جواب دیا  
”پیر نے کہا“ نہیں۔۔۔ جب تک وہ ہمیں نہیں بھجواتا  
اسے بھجوانے سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ جہاں تک مجھے  
ہے اس کے الفاظ یہی تھے ”ظفر جمال نے جواب دیا۔

”بہت خوب“ رجم کل نے سناٹھی انداز میں سر ہلاتے ہوئے  
ذہن معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ ذہم میں آکر غیر ضروری خطرات

نہیں لیتا۔ شاید اسی لیے اپنے دھندوں کو پھیلانا اس کے  
میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ہر حال۔۔۔ کبھی نہ کبھی ایسے لوگوں کا  
مجھ جیسے کسی نہ کسی افسر سے ہو جاتا ہے۔ شاید یہ قانون

ہے۔ دوسرے ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کام ہونا ضرور ہے۔  
”بعض اوقات نہیں بھی ہوتا ہے۔“ میں نے کہا کہ ہم  
تم جیسے سر بھرے ہوتے کہاں ہیں؟ کبھی کبھار کوئی غلطی

اس کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ اپنے علاقے کے تھانے میں  
جو نئی میری نینیاں ہوتی“ اس شخص نے مجھ سے پوچھے بغیر میرے  
انداز میں اپنے بچنے پر ایک تقریب رکھ لی تھی اور اس کا ایک  
قاصد نہایت اطمینان سے مجھے دعوت دینے کے ساتھ ساتھ  
تقریب کی تفصیلات سے بھی آگاہ کرنے آیا تھا۔ بڑی دھڑائی سے  
جاتے گا کہ وہاں ضرورت لڑکیاں ہوں گی۔ شراب پانی کی طرح  
میںے گی۔ اور میرے لیے مزہمت کچھ ہوگی۔“

”تم نے اس آدمی کو ان تو نہیں لکھا؟“ میں نے پوچھا۔  
”اب میں اتنا بھی جلد باز نہیں ہوں“ وہ بولا ”میں نے  
مصرفیت کا اندر کے نہایت مذہبانہ انداز میں اس کی دعوت قبول  
کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن میں نے اس نام کا کارڈ اپنے ذہن  
کے کچھ ٹیس ڈال دیا تھا۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پُر خیال انداز میں غور سے  
ہوئے بولا ”اس قسم کے کرداروں کی یہ حرکتیں نئی نہیں ہیں۔  
ہزاروں سال سے یہ سلسلے چلے آ رہے ہیں۔ تاریخ میں بھی نہیں  
اس قسم کے واقعات ملتے ہیں کہ کسی علاقے میں کوئی نام کا مہتمم  
سرکاری اہلکار پہنچا تو وہاں کے آمر یا ناجائز دھندے کرنے والے  
اس کے اندر گرج ہو گئے۔ کچھ کا مقصد صرف یہ ہوا تھا کہ  
واقفیت اور شہاسی رہے تاکہ کبھی کوئی کام پڑے تو دشواری نہ ہو۔  
کچھ کا مقصد ”مقام سے“ دوسری کاغذ کر دو سروں پر اپنا رعب قائم  
رکھنا ہوتا تھا اور کچھ کو اپنے ناجائز دھندوں کے لیے تحفظ درکار  
ہوتا تھا۔ آج کل بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی طرح کے طبقات  
سرکاری اہلکاروں کو گھیرے رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پرانے  
دقتوں میں کوئی کوئی اہلکار ان کے بچنے چڑھتا تھا۔ آج کل کوئی  
مشکل سے ہی بچ پاتا ہے۔ آج کل آنے والا پہلے ہی سے اپنے سینے  
پر ”برائے خوف“ کا بورڈ لگا کر آتا ہے۔“

”لیکن تمہارا بورڈ تو راستے میں کہیں گر چکا ہے“ میں نے کہا۔  
اس نے ہونٹ ہنچ کر مجھے گھورا پھر کہا ”جن کے ایک مرتبہ  
بورڈ لگ جاتا ہے وہ پھر اسے گرنے نہیں دیتے۔ میں نے اپنے سینے  
پر کبھی بورڈ لگنے ہی نہیں دیا۔“

”اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔  
یہ تازہ پیر لکھا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ کمری سانس لے کر بولا ”اسپیکٹر اور ایس ایچ او کوئی بڑا عہدہ  
نہیں ہے لیکن اپنے علاقے میں اس کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اس  
سے شاطر لوگ بخوبی واقف ہیں اس لیے وہ اپنے طریقہ و ادوات  
کے مطابق اسے اپنی جیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیر دانش کی  
طرف سے اس قسم کی دعوت کا پیغام ملنے ہی میرا ماتھا ٹھکا تھا۔  
ظاہر ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کوئی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔ میں  
نے سوچا تھا زار فرست لے گی تو اس کے بارے میں جہاں ہیں  
کہہ دے گا۔ میں نے ان کی بات کو سمجھ کر کچھ سوچا۔

”میں تو پچھلے دنوں اتنے بڑے پنگے میں الجھا ہوا تھا جس میں میرا بزنس بالکل ختم ہو سکا تھا لیکن خدا کا شکر ہے سب کچھ اسی طرح چل رہا ہے۔ میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔“

”تم جیسے خبیثوں کے لیے کسی بھی بات سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا“ وہ غصے سے سانس لے کر بولا۔

”ناتوا جمل جمل کر اور تپ تپ کر بات کہنے کی ضرورت نہیں“ میں نے اسے ڈانٹا ”اس وقت بیچیدگی سے بات ہو رہی ہے۔ اسے سمجھ کی سی جاری رہنے دو۔ خواہ مخواہ ایک بار بیک بک شروع ہو جائے گی۔ اصل بات سچ میں ہی مدھ جائے گی۔ ہم دو معزز تو میں نے تمہیں یہاں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ تم ہمیں جلی کی سٹانڈ“

”معزز تو میں؟“ وہ میری بات کانٹے ہوئے کراہنے کے سے انداز میں بولا ”دو معزز تو میں۔ تم؟“

”ہاں۔ دو معزز تو میں“ میں نے زور دے کر کہا ”تم کو اس چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اتنی طویل اور غناک داستان سننے کے بعد تمہارا پروگرام کیا ہے؟“

”پروگرام کیا ہوتا ہے؟“ وہ پُر خیال انداز میں اپنی ناک سے کھینچے ہوئے بولا ”کل صبح بیٹھ کر میں اس چھوٹے سے آپریشن کی تھوڑی سی منصوبہ بندی کرتا ہوں اور دوپہر کو کچھ نئی لے کر پورا دن اس کے گھر سے گرفتار کر لیتا ہوں۔ کل دوپہر کا کھانا اسے حالات میں کھلا دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے تھو کے ہاں چھوٹے ٹھیک رہیں گے۔ وہ ہمارے قہانے کے قریب ہی ٹھہرا لگا ہے۔“

ظفر بیٹل گویا ہڑبڑا کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا ”کیا واقعی آپ اسے کل ہی گرفتار کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟“

”نہا پر ہے اب میں یہ کام بیچ سالہ منصوبے کے تحت تو نہیں کر سکتا“ رحیم کل اطمینان سے بولا ”کسی مفکر یا دانشور کا کہنا ہے کہ مشکل اور ناکوار کام جتنی جلدی کر لیا جائے اتنی ہی اچھا ہے۔ اصل مشکل کام تو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالا جائے یا نہیں؟ جب فیصلہ ہوئی گیا تو اس پر عملدرآمد کل بھی کیا جا سکتا ہے اور چار دن بعد بھی۔ کل کر لینا اس لحاظ سے بہتر ہے کہ پورا دن کو سنبھالنے کا کم سے کم موقع ملے گا۔ کارروائی جتنی اچانک ہوگی اتنی ہی اس کے ہاتھ پاؤں زیادہ پھیلیں گے۔ اس قسم کے لوگوں کو ایسی کسی کارروائی کی توقع ہی نہیں ہوتی تھی۔ تم خود ہی بتا رہے ہو کہ اس نے اپنا ٹیٹ ورک سینیٹا شروع کر دیا ہے۔ اسے خطرے کا احساس ہو چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو دو چار شہوت ہاتھ آئے ان کے امید ہے وہ بھی غائب ہو جائیں اور ہمارا انحصار صرف تمہارے بیان پر ہی رہ جائے۔“

ایک لمحے کے توقف سے اس نے ظفر بیٹل سے پوچھا ”تمہیں کل کارروائی پر کوئی اعتراض ہے کیا؟“

”اس کا زیادہ دباؤ وہاں اس شخص پر ہے“ اس نے ظفر بیٹل کی طرف اشارہ کیا پھر براہ راست اسے مخاطب کیا ”تمہیں واقعی کچھ غور و فکر کرنا ہے؟ میں میری مدد کرنا ہوگی۔ ایسے لوگوں کے ٹھیک ٹھیک لکھے جتنا ہوں گے جو اس کے حکم پر سبکیں پڑاؤں گا۔ کتاب کہتے رہے ہوں۔ صرف ان کی صحیح شانہ ہی ہوتی ہے۔ ان سے سب کچھ اٹھانا میرا کام ہے۔“

ظفر بیٹل غصے میں ہونے پر زبان پھیر کر بولا ”مجھے خود دوش ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری اطلاعات بالکل نازہ ہیں۔ بہر حال میں دوش کی صورت میں بھی اس کے بارے میں باخبر رہنے کی اپنی سی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے میں اب بھی اس حد تک مدد کا ضرور ثابت ہو سکتا ہوں کہ اسے چاہی کے چندے تک پہنچایا جا سکے۔ دینے میرے اندازوں کے مطابق اسے خطرات کا احساس ہو چکا ہے۔ اس نے اپنا ٹیٹ ورک سینیٹا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بہت سے قوی غائب ہو چکے ہیں۔ زیادہ خطرناک تھے لیکن اب بھی اگر جرات مندی سے پورا دن براہ راست ہاتھ ڈال دیا جائے اور میری مدد بھی شامل رہے تو بہت کچھ ہاتھ آسکتا ہے۔“

”میں شرمندگی اور ندامت اٹھانا نہیں چاہتا۔۔۔ اور نہ ہی اتنی بڑی کچھ بے اختیار مرنے چاہتا ہوں۔“ رحیم کل ٹھوڑی سکتے ہوئے بولا ”مطلب یہ کہ میں اس پر کیا ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا۔“

”اس پر ہاتھ ڈالنا ہی اصل مسئلہ ہے۔ اگر آپ صرف ہاتھ ڈالنے کی جرات کر لیں تو ہاتھ کچا ہی نہیں سکتے۔ اس کے خلاف تو تمام مواد موجود ہے کہ خود بخود ایک سیلاب آنے پڑے گا۔۔۔ بالکل تو اس کی شخصیت کا ایک ہوا ہوا ہے۔ ایک ہار سا کھڑا ہوا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اس ہار کے پیچھے کیا ہے اور کسی کے انہی میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس ہار کو ہلایا بھی جا سکتا ہے۔ تب بہت کر لیں گے تو کام خود بخود آسان ہو جاتا چلا جائے گا۔ میں تو بددعوی ہوں۔ امید ہے میری معلومات اور میری گواہی سے آپ کام بالکل آسان ہو جائے گا۔“

”میں بھی اس کیس میں ایک گواہ ہوں گا“ میں نے کہا ”مجھے کچھ حقائق سے براہ راست میرا تعلق ہے۔“

”تو تو میں ہی عادی“ چپے ہاتھ“ وہ پنگا لیے بغیر بھلا تم کیسے رہ گئے لیکن سوچ لو۔ تم اس قسم کے معاملے میں ناگ اڑانے ہاتھ نہیں ہوسکتے ہو۔ پنگے بازی تمہاری عادت سی۔ لیکن ساتھ ساتھ ایک بزنس میں بھی ہو۔ یہ معاملہ کافی پیچیدگی حاصل کرے گا اور اس پیچیدگی کا شہ قہی بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں تمہارے بزنس کا اثر نہ پڑے۔“

”میں بھول تمہارے پنگے بازی میری عادت ہی قصری تو پھر اس کے بارے میں کیا سوچتا“ میں نے بڑے ڈانٹ سے کہا

کرتے ہیں۔“

ظفر جمال بولا ”مذرت کے ساتھ کون گا سہہ! اس بار نہیں ہوتے لوگوں کی اکثریت بے حس ہو چکی ہے اس لیے لوگ ان باتوں میں سر نہیں کیا تے۔“

”انہیں بے حس بھی شاید حالات ہی نے بنایا ہو“ رجم کل بولا۔

”نہیں... کچھ لوگ فخر تابی بھی حس ہوتے ہیں“ ظفر جمال مسکراتے ہوئے بولا۔ اب اس کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ ایک سطحی آدمی نہیں تھا جتنا میں اسے سمجھ رہا تھا۔

پھر وہ جھرجھری سی لے کر بولا ”سہر حال... میں حیرت کے ان جھٹکے سے سنبھل نہیں پارہا ہوں کہ میری آپ جیسے دو افراد نے ملاقات ہو گئی ہے۔ ایک کا تعلق بزنس سے ہے اور دوسرے کا پولیس کے تعلق سے۔ ان دونوں شعبوں کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں گے۔“

”ہم جیسے ایسا تو اکثر افراد ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں“ میں نے کہا ”جس روز یہ ایسا تو کبھی ختم ہو گئے اس روز یہ موسمی و ماحول سے متاثر کے بل انکری گے۔“ پھر میں نے رجم کل کو مخاطب کیا ”اچھا... تو پھر یہ طے ہو گیا کہ کل تم میرا دلش کو گرفتار کر رہے ہو؟“

”ہاں“ رجم کل نے غیر حشرل لہجے میں جواب دیا ”میں ایسے ہی کیسوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ انسان کو کچھ چاہیے کہ اس نے کچھ کیا ہے۔ چھوٹے موٹے مجرموں کو پکڑنا تو کی کارہ نہیں ہے جب کہ میں مسلسل کارنامے انجام دینا چاہتا ہوں۔ زندگی بڑی مختصر ہے۔ اور نہ جانے کب کسی مجرم کی کوئی ایسی غلطی ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں جلدی جلدی چند قابل ذکر کام جاؤں۔ معاشرے کی غلطی کچھ تو کم ہو۔“

”میں چاہتا ہوں میرا دلش کی گرفتاری کے موقع پر میں تمہارے ساتھ رہوں“ میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”میری دشواریوں میں اضافہ کرنا چاہیے ہو۔ پولیس کے اس قسم کے جھانے کے وقت ایک ممتاز بزنس مین کا پولیس کے ساتھ ہونا کبھی نہیں لگتا۔ میرا دلش اسے قانونی مسئلہ بنا سکتا ہے۔ پولیس کے لیے دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔“

”میرا اس کیس سے تعلق جتا ہے۔ میں بھی اس کے خلاف کوئی دواں کا“ میں نے کہا۔

”اس کے لیے تم تھانے آ سکتے ہو۔ عدالت میں میں بھی ہوں۔ لیکن اس کی گرفتاری کے وقت تمہارا موجود ہونا پولیس کے علاوہ خود تمہارے اپنے حق میں اچھا نہیں۔ وہ اور اس کے خلاف تاثر لے سکتے ہیں کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔“

میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔“

”اوپر دوڑے کے خبیثوں کا سر کھینچنے میں جلد بازی سے کام لیتا جا رہے۔ ہمارے ہاں المیہ یہی تو ہے کہ ہم چھوٹے مجرم کو پکڑنے میں پھر بھی تھوڑی بہت مستعدی دکھاتے ہیں لیکن بڑے مجرم پر ہاتھ ڈالنے میں لیت و لعل سے کام لیتے رہتے ہیں۔ اس دوران وہ مجرم کچھ اور طاقتور ہو جاتا ہے۔ جب جن پولس سے نقل آتا ہے تب ہم اسے اپنے کنزرو اور پکاپا ہٹ زدہ ہاتھوں سے قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدتوں ہم صرف شاخیں اور پتے چھانٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ بڑے تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب تک جرم کی جڑ کو ختم نہ کیا جائے، جرم ختم نہیں ہو سکتا۔ کارندوں کو پکڑنے سے کسی گروہ کا قلع قمع نہیں ہوتا۔ جب تک گروہ کے سرخشاہ کا سر نہ پکڑا جائے گروہ کے ختم ہونے کی امید نہیں رکھتی جا رہے۔ یہ سیدھی سی بات نہ جانے کیوں ہمارے نظام کو چلانے والے دنگا دیوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔“

”سمجھ میں سب کچھ آتا ہے۔ سب کو ہر بات معلوم ہے“ میں نے کہا ”لیکن سسٹم اتنا دیکھ زدہ ہو چکا ہے۔ رشوت، کرپشن، بزدلی اور نا اہلی نے نظام کو اتنا کنزرو کر دیا ہے کہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ہر شخص ہر کام عارضی بنیادوں پر کر رہا ہے۔ اپنا وقت پورا کر رہا ہے۔ کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ وہ جس چیز کو جس حال میں چھوڑ کر جا رہا ہے کل کو اس کا کیا بنے گا۔“

”لیکن میرا جہاں تک بس چلتا ہے اور جتنی بھی میری حیثیت ہے۔ میں اس کے مطابق بڑے سے بڑا جرات مندانہ قدم اٹھانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو“ رجم کل نے بڑے عزم سے اپنا فلسفہ دہرایا جس سے میں پہلے ہی اچھی طرح واقف تھا۔ ظفر جمال بھی میری طرف اور کبھی رجم کل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رجم کل سے کہا ”اس بے چارے کو ہم دو عظیم فلسفیوں کی گفتگو ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ آؤ ہم آسمان اور عام فہمی گفتگو کرتے ہیں۔“

ظفر جمال دریا چھٹکے ہوئے قدرے کھپا ہٹ سے بولا ”ایسی بات ہمیں ہے سراسر آپ کی گفتگو آسمان اور عام فہمی ہے۔ اصل المیہ یہ ہے کہ لوگوں نے ایسی باتیں سننا ان پر کان دھرنا اور ان سے کسی قسم کی انپازیشن حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے۔“

رجم کل بولا ”اصل میں یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے۔ لوگ سوچتے ہیں اسے چھوڑو۔ ان باتوں سے کیا ہو آئے۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ انہیں چونکہ معاشرے کے چیلن میں کوئی تبدیلی ہوئی نظر نہیں آتی اس لیے وہ اپنے آپ کو ادھر ادھر سے زیادہ دلچسپ باتوں میں الجھا کر اپنے لاشعوری دکھ کو دھانے کی کوشش

کی وردی کوئی اور جوتے وغیرہ بھجوانا۔

”وردی وغیرہ کا انتظام کرنا کون سا مشکل ہے یا راجا نہیں سکتے  
اور اموں وغیرہ میں غلہ دریاں استعمال ہوتی ہیں۔ شرمیں نہ جانے  
کتنے وارداتیں پولیس کی وردیاں پہنے پھرتے ہیں۔ مجھے یہاں آئے  
زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ دو تین جلی پولیس والوں کو تو میں پکڑ چکا  
ہوں۔“ رحیم گل بولا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ مجھے تو اس کے  
لیے صرف ایک فون ہی کرنا ہو گا لیکن ایک تو وقت کم ہے۔  
دوسرے میں چاہتا ہوں کہ پولیس والا بے شک جلی ہو لیکن کم از  
کم اس کی وردی تو اصلی ہو۔ اب اتنی بھی دھوکے بازی اچھی نہیں  
یار! آخر ضمیر بھی کبھی جڑ ہے۔“ میں نے کہا۔

”چھا ٹھیک ہے یا ضمیر صاحب۔! وہ میرا سر تاپا جائزہ لیتے  
ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں تمہاری حساست کے مطابق کسی کی وردی  
بھجوا دوں گا۔ تمہارا ساتھ ہونا دیے کچھ فائدہ مند بھی رہے گا۔ تم  
اکیلے میرا خیال ہے دس یا پندرہ پولیس والوں پر بھاری رہو گے۔“  
”آخر تمہیں ابدولت کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑیگا۔“  
میں نے کہا۔

”تم نے پوری بات نہیں سنی“ وہ مجھیدی سے بولا ”میں یہ کرنا  
چاہ رہا تھا کہ تم اکیلے دس یا پندرہ پولیس والوں پر بھاری رہو گے۔  
جمال اور حماقت میں۔“

”اب بات کو پھینکے کی کوشش مت کرو۔ جو اصل بات تھی وہ  
مذ سے نکل چکی ہے۔ جس قسم کے تمہارے پولیس والے ہوتے  
ہیں ان کو دیکھتے ہوئے تو شاید میں دس یا پندرہ سے زیادہ پر بھی بھاری  
رہوں۔“ میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

”جیس۔ جس۔ اب زیادہ شجی میں آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ  
اتھ اٹھا کر بولا ”تمہیں اپنی اس بے ہودہ شکل صورت میں بھی کچھ  
تبدیلیاں کرانی ہوں گی۔ دیے تو صرف وردی اور ٹوپی وغیرہ کی وجہ  
سے بھی تمہاری شخصیت کا تاثر مختلف ہو جائے گا اور شکل بھی بدلی  
بدلی ہی لگے گی۔ اس کے باوجود کچھ تبدیلیاں ضروری ہیں۔ میں  
ہرگز نہیں چاہوں گا کہ اس موقع پر پھر دانش تمہیں بچائے۔“  
”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی ”پھر دانش تو کیا  
مجھے تم بھی نہیں بچاؤ گے۔ میں ممکن ہے پہلی آہٹ کو میں اسی لئے  
میں تمہارے قریب موجود ہوں تو تم مجھے تنخواہ بھی تمہارے۔“

”ہائے۔“ قرآن جاؤں اس سادگی کے۔! رحیم گل نے  
ایک بہت ہی طویل اور ٹھنڈی سانس لی ”تنخواہ میں نہیں بانٹنا۔  
جہاں تک مجھے میں اصل پولیس والوں کو اس طرح آسانی سے تنخواہ  
نہیں ملتی جس طرح تم سمجھ رہے ہو۔ خاص طور پر بے چارے بچے  
درجے کے اہلکاروں کو تو تنخواہ لینے ہوئے داخل ہوئے آجاتا ہے۔“  
”نچلا طبقہ بے چارہ ہر جگہ ہی پھرتا رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

ذرا وقف سے بولا ”جو کہ حقیقت بھی ہے۔ لیکن یہ بات صرف  
ہم تین ہی کے درمیان رہے تو چھاپے۔“

”اگر پیر دانش اور اس کا کردہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب میرا کیا  
دعا ہے تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔“ میں نے وضاحت کی ”بقول  
تمہارے۔ جب ”پنگے بازی“ میری عادت ہی تھی۔ تو پھر اب  
کیا ڈرتا۔ مغلہ تو میں کافی پہلے ہی پیر دانش سے پنگا لے چکا ہوں۔  
اب تو تم قانون کے محافظ کی حیثیت سے اس پنگے میں شریک  
ہو رہے ہو۔ پنگے باز تو تم ہی اول درجے کے ہو۔ اب تو جو بھی  
ہو گا ہم دونوں ہی کو بھگتنا ہو گا۔ ہر حال۔ تم چھاپے کے وقت  
مجھے ساتھ رکھنے کی کوئی صورت نکالو۔ اچانک گرفتاری کے وقت پیر  
دانش کی کیا حالت ہوگی۔ میں یہ منظر دیکھنا اور اس سے پوری  
طرح محفوظ ہونا چاہتا ہوں۔“

”بچنا نہیں کیا تمہارا ابھی تک رحیم گل نے ترمیم آئیر  
نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”پیر قوی کے اندر زندگی بھر ایک بچہ چھپا بیٹھا رہتا ہے بڑے  
ہال یا بچہ کسی مظاہرہ انشورے کا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
”فریڈ نے کہا ہے جاہل آدمی! رحیم گل نے گویا میرے علم  
میں اضافہ کیا۔

”کہا ہو گا۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”دیے کسی نے یہ  
میں کہا ہے کہ یہ مت دیکھو کون کہہ رہا ہے۔ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا  
ہے۔ فی الحال۔“ ”تاؤ کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“  
”کس سلسلے میں؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”یہ جو میں اتنی دیر سے تمہارے سامنے دست و پاء درخواست  
کر رہا ہوں۔ اس کے سلسلے میں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مسلوم نہیں تم کیوں پیر دانش کی گرفتاری کا منظر دیکھنے پر غل  
لگے ہو۔ شاید تمہیں کچھ میں قلم چھیرنا غور دیکھنے کی بہت عادت  
ہی ہے لیکن میں نہیں بتاؤں کہ اصل زندگی میں اس قسم کے  
حاکم میں کوئی خاص ڈراما نہیں ہوتا۔ نہ تو کچھ گریج کے ساتھ لیے  
بڑے مکالموں کا تبادلہ ہوتا ہے اور نہ ہی میں منظر سے ڈرامائی  
مہکتی ادا کرتی ہے۔ میں ماحول میں بے پناہ کشیدگی ہوتی ہے۔  
نظام کا بھی خوفناک استفسار ہوتا ہے۔ تمہیں کوئی مزہ نہیں آئے  
”رحیم گل نے گویا مجھے باز رکھنے کی کوشش کی۔

”بے فکر ہو۔ اگر مجھے مزہ نہ آیا تو میں تم سے کٹ کے پیچے  
دانش میں جاؤں گا اور نہ ہی کرسیاں توڑوں گا۔“ میں نے وعدہ کیا۔  
”بہت حریف آدمی ہو۔ تم نہیں مانو گے۔“ وہ چند لمحے کچھ  
سہرا ہوا بولا ”ایک صورت ہو سکتی ہے کہ تم پولیس کی وردی  
لیجے۔ پولیس بائیں میں شامل ہو کر میرے ساتھ چلو۔ اسے ایس  
آئی اے ایف کا ٹیٹلشن وغیرہ دینا پسند کرو گے؟“

”میں تم میں شامل ہونے کے لیے تو میں خاک و بربنا بھی  
دینا پسند کروں گا۔“ میں نے جواب دیا ”تم مجھے مجھے کسی پولیس والے

ٹاپ ٹیکٹ ہے۔" اس نے فائیت رمی اور صفد تپا  
سٹرکٹ کے ساتھ کہا۔

"واہ بھئی۔ کیا کہنے تمہارے ٹاپ ٹیکٹ کے ہیں  
استراٹجیجیجیجی میں کہا تمہاری بی اور ہمیں سے ٹانگہ  
اس وقت کوئی اور مناسب عمارت نہیں سوچ رہا ہے اس لیے  
سے کام چلا رہا ہوں۔ ہم تمہارے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر  
کام کر رہے ہیں اور اس کے سلسلے میں ہم سے ہی راز و لاوم  
شروع ہو گئیں۔ بہت خوب!"

"احتیاط بہر حال ضروری ہے۔ پولیس کی اپنی مصلحت  
ہے؟" اس کی خمیدگی میں فرق نہ آیا۔ قہری پس سوٹ کے لیے  
وہ ایک دم خالص پولیس والا نظر آنے لگا تھا۔  
"مجھ سے پچانے میں کیا مصلحت ہے؟" میں نے پوچھی  
جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"ظفر جمال اس وقت ایک اہم سرکاری گواہ بن چکا ہے اور  
خود ہی بتا چکا ہے کہ کس طرح اس کی تلاش جاری ہے۔ یہ  
آدمیوں کو اگر اس کی ذرا سی بھی بجک دینگی کہ وہ اس ہوگی  
موجود ہے تو وہ اسے ہلاک کرنے کی خاطر پورے ہوئی کو بم  
اڑانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ پولیس پر اب اس کی حفاظت  
بھاری ذمہ داری عائد ہو چکی ہے۔ اب اسے ایک عام شہری  
پاس نہیں چھوڑا جاسکتا۔" اس نے بڑے قہر سے گویا کسی کا  
مغز فحش کو اپنا مقصد سمجھا۔

"میں تمہاری نظر میں عام شہری ہوں؟" میں نے آنکھیں  
لٹکائیں۔

"اصولی طور پر قانون کی نظر میں تم ایک عام شہری ہو۔  
یہ دو سری بات ہے کہ دو تہی کی وجہ سے میں تمہاری اصلیت  
واقف ہوں کہ تم کتنے ہی بدعاش ہو۔" وہ شاید بڑی خوشی سے اس  
خمیدگی پر قرار دیتے ہوئے بولا "تاہم کہ تم بھی اس کی حفاظت کرتے  
ہو لیکن اصولی طور پر میں اب اسے تمہارے پاس نہیں چھوڑ سکتا  
اسے کہاں رکھا جائے گا؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اس لیے میں تمہارے  
کہنے کے تحت اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ میں اسے ساتھ لے جاتا  
وقت راستے میں فیصلہ کروں گا۔ فیصلہ کرنے کے بعد بھی میں  
اس لیے نہیں ہٹاؤں گا کہ کسی کی حفاظت کے سلسلے میں راز و لاوم  
پہلی شرط ہوتی ہے۔ گواہ کو اگر محفوظ اور زبردست سلامت رکھنا ہے  
کم سے کم لوگوں کو یہ علم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔"

"اب مجھے بہت حق پر حاض ہے۔" میں نے غور کر کہا۔  
وہ میری بات کانٹے ہوئے بولا "میں سمجھا تمہیں یہی ہے کہ  
سکتا ہوں؟ تمہاری خوشی سے ہی ظاہر ہے کہ تم نے بہت سنا  
رکھے ہیں۔"

"تمہاری دیو میں تم نے یہ دو سری مرتبہ میری شکل  
پر طوفان کیا ہے۔ لگا ہے کہ آج کل تم میری وجہ سے کانٹے

"لیکن خیر۔ تمہارے چلے طبقے کو اس لیے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی  
ہوگی کہ وہ اپنی خزانہ لادائیں سمیت قسطنطنیہ میں دوسری جگہوں  
سے وصول کر رہا ہے۔"

رجیم گل نے مجھے گھورا تو میں نے جلدی سے کہا "شعبہ میری  
اس بجواس پر دھیان مت دو۔ یہ بتاؤ کہ کل میں کتنے بچے تیار  
رہوں۔"

"میں ساڑھے گیارہ بچے جنہیں فون کروں گا۔ جنہیں اس  
وقت وردی میں اپنے مکمل گٹ اپ کے ساتھ تیار رہنا چاہیے۔  
میرا فون آتے ہی تم فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ جانا۔ ٹھیک بارہ بجے ہم  
بیروافش کے گھر میں داخل ہو جائیں گے۔"

"وام۔ وام۔ کیا عمدہ وقت منتخب کیا ہے" میں نے سر ہلایا  
"میرا خیال ہے اس وقت تمہاری کمپوزی پوری طرح گھومی ہوئی  
ہوگی۔"

"ہاں۔ اس میں کیا شک ہے" وہ کہنا ہوا ہے بغیر بولا "جب  
تک انسان کی کمپوزی نہ گھومی ہوگی وہ اس قسم کے کام نہیں  
کر سکتا۔ پھر وہ اچھے ہوئے بولا "مجھ وقت آرام کے لیے بھی  
کمال پتا چاہیے۔ کل کا دن کافی سخت ہو گا۔ بیروافش کو گرفتار  
کرنے کے بعد شاید ہمیں کئی دن آرام نصیب نہ ہو سکے۔ کافی لاپل  
برہا ہوگی۔"

"تمہاری یہ چند دن کی بے آرامی نہ جانے کتنی زندگیوں کو چٹائی  
سے بچائے گی اور تمہاری سوسائٹی نہ جانے کتنے بڑے بگاڑ سے  
محفوظ ہو جائے گی" میں نے خمیدگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہ کام کر گزروں گا۔" رجیم گل پُر خیال  
انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "لیکن شاید بحری جہاز کے مسافر کی  
طرح میں بھی بعد میں پرہیزوں کا کہ مجھے دھکا کسے نہ دے گا۔" پھر  
اس نے خودی چھیکی۔ "لیکن مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہوگی؟"  
دھکا دینے والا تو پہلے ہی میرے سامنے کھڑا ہے۔

"مرد وہ انشاء اللہ آئندہ بھی جنہیں دلتا تو دلتا دھکا دتا رہے  
گا۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے بڑے غلوں سے  
کہا۔

رجیم گل نے ظفر جمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جنہیں  
میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"ابھی۔۔۔ اسی وقت؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ وہ شاید  
اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے بھی اس کی توقع نہیں تھی۔

"ہاں۔ ابھی اور اسی وقت" رجیم گل فوراً دسے کر بولا  
"جب فوری طور پر فیصلہ کن قدم اٹھانا طے ہو گیا ہے تو پھر مجھے لو کہ  
اس سلسلے کی ضروری کارروائی بھی شروع ہو گئی ہے۔ تم اس وقت  
سے اپنے آپ کو پولیس کی تحویل میں سمجھو۔"

"تم اسے کہاں لے جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔  
"سوری۔۔۔ یہ تمہیں نہیں بتایا جاسکتا۔ اب یہ پولیس کا

شادی ہاتھ لگ گئی تھی حج کے ایک طرف محفوظ رکھا ہو گا۔

تیس تو تیس تھیں دس دوں کا لیکن شادی حج کرنے کے بہانے کیس بیٹھے انہیں دیکھتے ہی نہ رہا کہ کم از کم یہ خیال کر لیا کہ ان میں سے ایک لڑکی بے چاری اب اس نظام میں ہے۔ بڑے غلا وقت پر ہی غلامانہ موت مہنگی ہے۔ ہمیں سنا تھا۔

اس قسم کے شوق تھیں ہوں گے۔ مجھے نہیں ہیں۔ وہ منہ بنا کر بولا اور ظفر جمال کو اپنے ساتھ چلے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "چلو بھئی۔ اگر ہم اس کی بگو اس میں لگے سب تو یہ رات ہمیں گزر جائے گی۔"

"ایک منٹ۔" میں نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایک طرف تم ظفر جمال کی حفاظت پر اتنا زور دے رہے ہو اور ایک طرف اسے علی الاعلان اپنے ساتھ لے جا رہے ہو جبکہ تم اس وقت اکیلے ہو اور ساتھ لباس میں ہو۔"

"بے فکر ہو۔ مجھے تم سے زیادہ اس بات کا خیال ہے۔ میں اس طرح گاڑی میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا کہ کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

وہ رخصت ہو گیا تو تیس صوفے پر زحیر ہو گیا اور آنکھیں بند کیے کافی دیر تک سوچوں میں الجھا رہا۔ رجم کل نے واقعی مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس کو اس کام پر اتنا ہر کرنے کے لیے بڑی تکدود کرنی پڑے گی لیکن اس نے تو نہ صرف اپنی ہر کے مجھے حیران کر دیا تھا بلکہ میری توقع سے کہیں زیادہ تیزی سے اس پر عمل درآمد کرنا فیصلہ بھی کر ڈالا تھا۔ اب ہمیں اس کے نتائج سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔

آخر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہاں سے میں نے شفیع شاہ کو فون کر کے تمام حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ کل کے لیے کیا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ وہ بھی اس اچانک فیصلے پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

ساری بات اس کی سمجھ میں آئی تو میں نے کہا "تمیں اب یہ کرنا ہے کہ کل جب ہیرا دانش کے بنگلے پر چھاپا پڑے تو تم اپنے چند آدمی لے کر آس پاس ہی موجود رہو۔ بنگلے پر ہر وقت کئی مسلح افراد موجود رہتے ہیں اور بنگلے سے کہیں کوئی پیغام چلا گیا تو مزید بھی آسکتے ہیں۔ قصاص یا مزاحمت کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ پولیس پر مجھے کچھ زیادہ بھروسہ نہیں ہے۔ صرف رجم کل کی دھمکی مستعدی اور ذہنی صلاحیتوں کا مجھے علم ہے۔ باقی لوگوں کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ کیسے ہوں گے۔ اور ان کی کارکردگی کیا ہوگی۔ چنانچہ تم لوگ صرف پولیس کی مدد کے لیے آس پاس موجود رہو گے اگر تم صورت حال بگڑے یا قصاص کی نوبت آئے دیکھو صرف اس وقت مداخلت کرنا دوسرے نہیں کچھ نہیں کرنا ہے اور کسی کی نظر میں بھی نہیں آتا ہے۔ تمہاری مداخلت سے اگر صورت

ہو رہے ہو۔" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
"مجھے اس پر ہر روز صورت سے جھلس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو بات کا جواب دے رہا ہوں۔" وہ رکھائی سے بولا "تمیں کیا معلوم ایک پولیس آفیسر کی ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہوتے ہیں۔"

"چھانسا۔ یہ بتاؤ اے ذمہ دار اور فرض شناس پولیس آفیسر! میں نے لاٹ سے کہا "کیا تمہارے خیال میں۔۔۔ اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ ظفر جمال کہاں ہے تو میں دوڑا دوڑا کر واپس لوٹتا ہوں گا؟"

"غیر۔ تم اتنے اچھے درجے کے خدائر تو نہیں ہو سکتے۔" وہ گویا میری تالیف قلب کا خیال رکھتے ہوئے بولا "لیکن ہمیں تمام امکانات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ تم کوئی محفوظ زندگی تو گزار نہیں رہے ہو۔ نہ جانے کس کس معاملے میں تمہاری ٹانگ اڑی رہتی ہے۔ ہیرا دانش کو یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ تم نیچے سی نیچے اس کی جڑیں کاٹنے کے لیے کچھ کر رہے ہو۔ تمیں افواہ بھی کیا جاسکتا ہے اور خارج کر کے تم سے ظفر جمال کے بارے میں معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تمیں یہ بات معلوم ہی نہ ہو؟"

میں نے ناک سیڑھتے ہوئے کہا "تو میں وائوں سے اچھے کام کی قیامد نہیں رکھی جاسکتی لیکن کبھی کبھار انہیں بات تو اچھی کر سکتا ہوں۔ اور ایسے موقعوں پر میں بھی کہا جاتا ہے کہ شکل اچھی نہ ہو تو کم از کم بات ہی اچھی کر سکتا ہوں۔ تم ان دونوں جہلوں میں سے کوئی ایک اپنے لیے منتخب کر سکتے ہو۔"

"تم یہ دونوں ہی اپنے پاس رکھو۔" وہ بولا۔

"یہ باتیں تم منہ سے نکال رہے ہو میں نہیں۔" میں نے کہا۔  
"تمیں یہ باتیں نہیں۔" امکانات کہتے ہیں۔" اس نے ہجج کی۔

"چھانسا۔ اب تم اپنے امکانات سمیت دفع ہو جاؤ۔" میں نے وال فلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب میں سونا چاہتا ہوں۔" مجھے وردی کتنے پیسے تک مل جائے گی؟"

"انڈازانہ دس پیسے تک۔" اس نے جواب دیا۔ "وردی پن کر آس پاس کے پھیلے والوں پر عرب ڈالنے اور ان سے چائے پانی وصول کرنے نہ چل دیتا۔"

"تمہارے آدمی اس کام کی دوسروں کے لیے محتاجات ہی کہاں پہنچاتے ہیں۔"

"میرے ٹھانے کے لوگ ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔" وہ خیر سے بولا۔

"اے دے انسان کی خوش فہمیاں۔!" میں نے لہجہ بازی کر لیا۔

اسے گویا کچھ یاد آیا۔ دو دانے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "نکاح وردی پن کرتا رہا کہ میری طرف آؤ تو فوج اور سونا کی دواؤں تھیں بھی لیئے آتا جن کا تم نے ذکر کیا ہے۔ اب جتنی بھی

حال قابو میں آجائے تو پھر محسن عاتب ہو جاتا ہے، وہاں کسی کو غیر ضروری طور پر اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلاتا ہے۔  
”میں سمجھ گیا میرا“ شفیق شاہ بولا ”باد بجے ہم لوگ چلے گئے آس پاس موجود ہوں گے۔“

اسے ہدایات دینے کے بعد میں مطمئن ہو کر سو گیا۔ چند گھنٹے کی نیند لینے کے بعد صبح جلدی اٹھ کر میں نے ایک اور ضروری فون کیا۔ ہماری فلم کینیڈا میراج آفس کراچی کے ایک اسٹوڈیو میں بھی موجود تھا۔ کوئی مشہور مرزا صاحب اس کے انچارج تھے جنہیں میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا لیکن عاتبانہ طور پر ہم ایک دوسرے سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں فلم کینی کے سلسلے میں خواہ عملی طور پر کچھ نہیں کر رہا تھا لیکن بہر حال مالک میں ہی تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کچھ ضروری سامان کے ساتھ مجھے ایک میک اپ مین کی ضرورت تھی۔ ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک گھنٹے کے بعد میک اپ مین ضروری سامان کے ساتھ میرے پاس پہنچ جائے گا۔ یہ انتظام کرنے کے بعد میں نے شاور لینے کے بعد اطمینان سے ناشتا کیا۔

ذرا تاخیر کے ساتھ اشتیاق سے مجھے اطلاع ملی کہ اسٹوڈیو سے کوئی آدمی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے اسے اس کمرے میں بلوایا جس میں رات کچھ دیر کے لیے مختصر مجال ٹھہرا تھا۔ ایک دھڑکنے والے اسے اس کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو میک اپ مین ندیم انداز میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ کچھ مرکاٹولا سا ایک دھلا چٹا شخص تھا۔ اس کے سامنے میز پر ڈاکٹروں کے میڈیکل بیگ جیسا ایک سیاہ بیگ رکھا ہوا تھا لیکن وہ ذرا بڑا تھا۔ میک اپ مین نے کچھ زیادہ ہی مودبانہ انداز میں میرا استقبال کیا۔ اس نے اپنا نام امتیاز بتایا۔

میں نے اس کی ہدایات کے مطابق گلے میں کپڑا ڈھونڈا ہندہ کر ڈرننگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا ”امتیاز صاحب! آپ کو زیادہ لمبا چڑھا کام نہیں کرنا ہے۔ بس میرے چہرے پر ذرا موٹی موٹی پارب سوچیں گا اضافہ کروں گی کیونکہ وہ واقف رات میں لگ سکتیں۔ گلہ وال پر کسی ایک آدھ پائندہ قسم کا موٹا سا مساجی چپک سکتا ہو تو وہ بھی چپکا دیں گمردہ گھنٹے دو گھنٹے بعد اکثر کر کرنا نہیں چاہیے۔ اور میرا خیال ہے کہ ٹھوڑی پر مختصری فریج کٹنا اور بھی گامی دیں۔“

میں نے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ بال تو پولیس کی ٹوپی میں چھپ ہی جاتے تھے اتفاق سے ان دونوں میرے بال زیادہ لمبے نہیں تھے۔ پولیس والے کے بالوں کے طور پر چل سکتے تھے۔ آئینے میں چھپانے کے لیے میں آدھ پائندہ چپک لگا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی تہہ تیہوں کے ساتھ پولیس کی وردی میں میرا دلش بھی مجھے قریب سے پہچان نہیں سکے گا۔  
امتیاز نے اپنا بیگ کھولا جو عموماً میری زنجیل معلوم ہوتا تھا۔

میرا میک اپ شروع کرتے ہوئے وہ چٹکاپٹ آئینہ انداز میں ”سرا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا میک اپ کرانے کا مقصد ہے؟“ میرا مطلب ہے۔ اگر یہ گستاخی نہیں ہے تو۔“

میں نے آئینے میں اس کی طرف دیکھا اور اس نے کمر بڑھا دیا اور ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے سرسری سے لمبے سے کہا میں ایک صاحب! مقصد کیا ہوتا ہے۔ بس پوچھنی ذرا دودھار ڈال کے کہیں ہیں۔ چار چار قتل کہنے ہیں۔ بدست گردی کی مزید ایسی ہی وارداتیں کرتی ہیں۔ کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔“

وہ ندیم انداز میں ہنسنے لگا۔ ”لو۔۔۔ سرائے آپ تو شہید ہو گئے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں تو بس لمبی پوچھ رہا تھا۔ آپ جیسا معزز آدمی بھلا۔“ اس نے ایک بار پھر ہاتھ اودھرا چھوڑ دیا۔

”اگر آپ کو میرے معزز ہونے کا علم ہو ہی چکا ہے تو اس یقین بھی کر لیجئے۔“ میں نے طماننت سے کہا ”آج ایک دوست۔ کمر فیس ڈریس پاسل ہے۔ میں اسے کچھ زیادہ حیران کرنا چاہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”مجھے اندازہ تھا۔“ مجھے اندازہ تھا ”سرا“ جلدی سے بولا۔ ”خاک اندازہ تھا“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے بہت کم تشکو ہوئی۔ میک اپ مین کو خاصی دیر لگ گئی لیکن اس کا رکوئی مودھی۔ ابھی میں وردی میں نہیں تھا اور ایک پیش بھی نہیں لگایا تھا لیکن شخصیت کافی بدلی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے شہر کے ساتھ کچھ رقم امتیاز کی خدمت میں پیش کی۔ اس کی تو قہقہے سے بہت زیادہ مودھی۔ وہ بہت ہی زیادہ شکر گزار آئے گا اور اسی شکرگزاری کے عالم میں رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک انتظار کرتا ہوا اخبارات دیکھتا رہا۔

مجھے اس وردی کا انتظار تھا جو رحیم گل نے مجھ کو کادوا تھا۔ آخر میں نے اسے فون کیا۔ کئی منٹ کی کوششوں کے بعد اس سے رابطہ ہو سکا۔

”کہاں ہو بھئی؟“ میں نے پوچھا ”تم سے بات کرنا تو تکلیف کسی انتہائی اہم شخصیت سے بات کرنے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔“

”میں یارا! وہ۔۔۔ آج والے کام کے سلسلے میں ہی مصروف تھا۔“ وہ بولا۔

”وہ تو اندازہ ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا ”میں تو حیران ہوں۔ ایک شخص کو گرفتار کرنا تمہارے گلے کے لیے شرمناک ہے۔“ وہ گیا ہے۔“

”تم اپنے فانیہ اشارہ ہوئی کے از کذبہ کر رہے ہیں۔“ اس طرح کی باتیں کر سکتے ہو چہاں! وہ ٹھنڈی سانس لے کر ”میں تمہارے گلے کی دشواریوں کا اندازہ نہیں ہے۔“ آج کی



"ہاں۔۔۔ مجھے خیال نہیں آیا" اس نے حلیم کیا مہر حال اب بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ وردی تمہارے پاس پہنچے ہی والی ہے۔"

"تمہاری بتا دیاں مکمل ہو گیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔  
 "ہاں۔۔۔ مکمل ہی سمجھو" وہ بولا "تمہارے علاوہ میرے صرف دو آدمیوں کو معلوم ہو گا کہ ہم وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔ وہ میرے بھروسے کے آدمی ہیں۔ ہم چاروں آگے آگے ایک ہی گاڑی میں جائیں گے۔ باقی تھری پیچھے دو سری دو گاڑیوں میں آئے گی۔ انہیں پچھلے کے قریب پہنچ کر ہی اصل مقصد بتایا جائے گا اور ہدایت دی جائے گی۔ میں انہیں گواہ کھتا پہلے ہی اصل بات سے آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ "میں" جیسے قوی کے خبر کماں کماں موجود ہوں۔"

"کیا اس وقت تمہارے آس پاس کوئی موجود نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس لیے تو اس حد تک بھی بات کر رہا ہوں۔ اچھا۔ اب اجازت۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔ ٹھیک ساؤتھے گیا دیکھتے ہیں کہاں پہنچ جائے۔"

"موجود۔ بشرطیکہ وردی مجھے مل گئی۔ اتنی دیر میں تو میں خود بھی ہرزوہت کر لیتا" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند منٹ بعد ہی ایک نو عمر ویرانیک مصروف لاٹری کا بیگ لے لے آن پہنچا۔ اس نے بتایا "سرا یہ بچے ایک شخص آپ کے لیے دے گیا تھا۔"

بیگ بڑھا۔ اس کے منہ پر چوڑی نیپ و نیوہ لگی ہوئی تھی۔ وہ بڑے مزے بتایا "سیکرٹری والوں نے اسے کھولے بغیر چیک کر لیا ہے۔ اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم پر خود اس کے اس میں کتنی خطرناک چیز ہے۔ مگر یہ بات سیکرٹری والوں کے آلات نہیں بتا سکتے" میں نے ایک اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

وہ جا بجا تو میں نے اپنی تلمی شروع کی۔ چند منٹ میں تیار ہونے کے بعد میں نے قہر آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھ لیا۔ میں تقریباً ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ میرا گٹ اپ کم از کم ان پولیس والوں سے بہت بہتر دکھائی دے رہا تھا جو ظلوں میں نظر آتے تھے۔ مطمئن ہو کر میں کمرے سے نکل آیا۔

میں لفٹ کاٹھن دیا کہ اس کے انتظار میں کھڑا ہوا تو بیڑیوں سے دھار سیکرٹری چیف واڈو اترا دکھائی دیا۔ وہ ٹک زوہ سی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا قریب آکر کھڑا ہوا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے ہی لفٹ کا انتظار تھا لیکن میرے لیے ایوانہ کا مشکل نہیں تھا کہ وہ میری طرف سے نکلتا گیا تھا۔

آخر وہ بولے بغیر نہ کہ "مگر آپ براہ راست نہیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں اور کس کی تلاش میں آئے

ہو؟" میں نے جواب دیا "میرا کام ہے کہ میں اپنے کسی ماتحتوں کی نوکریاں اور ان کے گھر پر جاؤں۔"

"آپ کیسے ہونے کی کچھ قیمت تو ادا کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔  
 اس طرح دونوں کے لیے کیا ضرورت ہے؟ اگر تم میں یہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہے تو اب بھی وقت ہے یہ ارادہ ترک کر دو۔"

"ماب تو میرے کمان سے نکل چکا ہے۔ اور وہ عمر میں خود ہوں۔" رحیم کل بولا "میں تمہارے سامنے دو آدمیوں کو رہا ہوں۔ نہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آؤت آف دی وے جا کر کوئی کام کرنے میں نہیں بھی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہمارے لیے یہی کام آسان نہیں ہوتا۔"

"جو بات مجھے معلوم ہے وہ مجھے مت بتاؤ" میں نے کہا "بلکہ وہ بات بتاؤ جو مجھے معلوم نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ وردی ابھی تک کیوں نہیں پہنچی؟ میں تو یہاں پہنچا ہوا پولیس آفسر بننے کے شوق میں تیار ہوا بیٹھا ہوں۔ زیادہ دیر گزر گئی تو میری بارعب بیڈی میڈ موٹرس اعلیٰ کی نہ جائیں۔ انہی موٹروں کا کیا کام ہو چھوڑ کر کم کی طرح ادا کر دی ہوئی نہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ موٹرس اگر نیچے کی طرف محوم جائیں گی تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ تم سمجھ لیا کہ گردش زمانہ نے بے چارے بچھڑوں کو بھی اٹا کر دیا ہے" رحیم کل بولا۔

"ات کو ذرا ق میں نالے کی کوشش مت کر دیا اور وردی کماں ہے؟ تم بھگوانا بھول تو نہیں گئے؟" میں نے پوچھا۔

"میری مصروفیت اپنی جگہ ہے لیکن میں یہ کام بھولا نہیں ہوں۔ بھول کیسے سکتا تھا۔ یہ بھی آپریشن کا ایک حصہ ہے۔ اصل میں تمہارے ٹاپ کی ایک سی وردی لی تھی اور وہ ذرا "مفتاحی" طلب تھی۔ اس میں بے چارے محنت کش پولیس والے کے پیسے کی کوئی رقم ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں تم سے پیسے سے ہی انکار نہ کر دوں۔ آدھوں کی طبع نازک کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے ذرا اس کی مفتاحی کا بندوبست کیا تھا۔ میرا آدمی ڈرائی کلیر کے پاس سے لے کر تمہارے پاس پہنچے ہی والا ہو گا" اس نے بتایا۔

"میں تمہیں اور تمہارے محنت کش پولیس والوں کو خوب جانتا ہوں۔ موقع پاتے ہی اپنے جگہ کی شان میں زمین آسمان کے فاصلے طاعت شروع کر دیا کہ "میں نے اسے ڈانٹ پلائی" اور یہ تمہاری کاہنگ و فریو کے چکروں میں کماں پڑ گئے۔ تم مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں اپنی یاد میں رکھتا ہوں کہ میں ہوش میں جو لاٹری شاپ موجود ہے ان لوگوں کے پاس جدید ترین لاٹری مشینیں موجود ہیں۔ اگر مجھے وردی کو پولیس والوں کے جراثیم سے پاک ہی کرانا ہو تو میں وہاں کرا لیتا۔"

مگے اب ہمیں ذرا دیکھنا پڑے گا کہ یہ قصہ کیا ہے۔"

لفٹ آہنگی تھی لیکن ڈاؤن اسے کوئی "لفٹ" نہ کرائے بغیر اڈا لرا کر مجھے میرے ہی کمرے کی طرف چلے گا اٹھا کر کہے ہوئے کو "ڈورا ادر چلو۔" اب تم سے آرام سے بیٹھ کر بات ہوگی۔ یہاں راستے میں کھڑے ہو کر بات نہیں ہو سکتی۔ ہمارا کوئی سہمان ادر آؤ گلاؤ فرخاد فرخاد خوف پیلے گا۔ چلو۔"

"میں نہیں جا سکتا۔ میرے نئے میں موج آگئی ہے۔" میں نے کراچے ہوئے اپنی اصل آواز میں کہا۔ ڈاؤن کو جھکا سا لگا۔

"دفعہ سرا" وہ غیر ارادی طور پر میرے قریب آکر بخود میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب اتنا بھی قریب مت آؤ۔ میں چاہوں تو آسانی سے تمہارا ماؤزر جیٹ سکا ہوں" میں نے کہا۔

وہ کھپانے سے انداز میں ہنسنے ہوئے بولا "سرا! آپ نے تو مجھے حیران ہی کر دیا۔"

"اور شاہی تھوڑا سا پریشان بھی" میں نے کہا۔

"تھوڑا نہیں۔ اچھا خاصا" اس نے تسلیم کیا اور ماؤزر واپس ہولشیں اڑا لیا۔

"میں۔۔۔ مجھے کیا دیکھنا تھا" میں نے لمبائیت سے کہا "مگر تم دھوکا کھا سکتے ہو تو اس کا مطلب ہے جہاں میں جا رہا ہوں وہاں تو کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ کیا چکر ہے سرا؟ آپ کس قسم پر جا رہے ہیں؟" ڈاؤن نے حیرت کے جھٹکے سے شہینے ہوئے پوچھا۔

"کئی احوال یہ مت پوچھو۔ کبھی فرمت میں نہیں کے تو میری قصہ سن لینا" میں نے کہا "ویسے۔ آئندہ کسی پولیس والے سے اپنی زیادہ سختی سے مت پیش آنا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے اصل پولیس والا اس قسم کی باتیں نہیں کر سکا جیسی آپ کر رہے تھے اس لیے اس کے ساتھ یہ ردیہ اختیار کرنے کی نوبت نہیں آ سکتی۔"

"پولیس والا بہت حال پولیس والا ہی ہوتا ہے بھائی! اچھے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس وقت کیا کہہ ڈالے اور کیوں کر سب اچھا خدا حافظ" میں نے ہن دبا کر لفٹ کو روکا ہوا تھا۔ میں اسے حیران چھوڑ کر اس میں گھس گیا اور چند لمحوں بعد نیچے جا پہنچا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے موبائل فون پر رجیم گل کو اطلاع دے دی کہ میں روانہ ہو رہا ہوں۔ میں جب اس کے قہارے پہنچا تو وہ قہارے سے باہر ہی ایک سیاہ سرکاری لینڈ کروزر میں مجھے اپنا خھر ملا۔ وہ اسے ایس آئی جیٹلی سیٹوں پر موجود تھے۔

سیٹ خالی تھی۔ پیچھے ایک موبائل اور ایک سفید فونس دیکھ کر بھی نظر آ رہی تھی۔ ان میں بھی باوردی پولیس والے موجود تھے۔ میں نے رجیم گل کی ہدایت پر اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی اور اس کا اشارہ پا کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے ساتھ دو

"ہر اتومیں ضرور سناؤں گا" میں نے اپنی اصل آواز سے کہیں زیادہ بھاری نچبیر کو آڑ میں لگا کر سوچے کو آڑنگی سے علی را میں یہاں اس ہوٹل کے مالک مسٹر افضل کو گرفتار کرنے آیا تھا۔"

"کس جرم میں؟" ڈاؤن نے جھٹکے لیے میں پوچھا۔

"میں ان اسٹروں میں سے ہوں جنہیں کسی کو گرفتار کرنے وقت جرم بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی" میں نے ایک شیشوں کی پیٹک بچھ اور احتیاط سے ناک پر تھامے ہوئے کہا۔

اس نے برہمی سے مجھے کھورا۔ میری وردی پر موجود نشانات کی حد سے میرے جملے کا اندازہ لگایا اور سخت لیے میں بولا "ایک سب الیکٹرو کر آپ کچھ زیادہ ہی بڑی باتیں نہیں کر رہے ہیں صاحب؟" میرے سینے پر لگے ہوئے سچ کے مطابق میرا نام نصیر احمد تھا۔

"میں بڑی بڑی باتیں نہیں۔ بڑے بڑے کام کرنے کا عادی ہوں۔ افضل صاحب اس وقت مل جاتے تو میں انہیں پھٹکی لگا کر لے جا رہا ہوتا۔" میں نے خزانے سے انداز میں کہا حالانکہ میرے پاس پھٹکی نہیں تھی۔ "ویسے بانی داوے تم کون ہو؟"

"میں یہاں کا سیکرٹری چیف ہوں۔ ڈاؤن میرا نام ہے" وہ بہ دستور سخت لیے میں بولا "آپ کے پاس افضل صاحب کے لیے کوئی وارنٹ وغیرہ موجود ہے تو مجھے دکھائیں۔" اس نے اپنا مضبوط ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہلکی سی چھری رسید کرتے ہوئے پہلے سے زیادہ سخت لیے میں کہا "ہاتھ پیچھے کرلو۔ مجھے بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلانے والے لوگ بالکل پسند نہیں۔"

اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا لیکن اس کی آنکھوں میں برہمی بڑھ گئی۔ اس نے دانت سختی سے سمجھ لیے۔ وہ اب ایک ننگ جھگڑا رہا تھا۔ میں نے مڑلاتے ہوئے کہا "اچھا۔ تو تم سیکرٹری چیف ہو۔ اور وردی کے بغیر گھوم رہے ہو۔ اور بے جلت میں ماؤزر بھی لگایا ہوا ہے۔ آج کل سیکرٹری والوں نے بھی بڑا اندر چر چلایا ہوا ہے۔ ہمیں خفیہ اطلاعات ملی ہیں کہ بعض سیکرٹری والے وارنٹوں کو روکنے کے بجائے خود وارنٹوں میں لوٹ ہیں۔ اپنے اسلحے کا لٹا استعمال کر رہے ہیں۔ افضل صاحب تو نہیں ملے ہیں۔ چلو تم ہی ذرا میرے ساتھ قہارے تک چلو۔ تم سے ہی کچھ تھوڑی بہت گفتیش ہو جائے۔"

میں نے اس کی کھائی پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا لیا لیکن وہ بھرتی سے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی سے اس نے ماؤزر نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ سخت لیے میں بولا "تم اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ رہے ہو ایس آئی! مجھے تو تم خود کسی واردات پر نکلے ہوئے لگتے ہو۔ شاید اسی لیے ایک نظر آ رہے ہو۔ قہارے میں نہیں جاؤں گا بلکہ قہارے والے اب خود یہاں آئیں

میں نے اس کی کھائی پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا لیا لیکن وہ بھرتی سے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی سے اس نے ماؤزر نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ سخت لیے میں بولا "تم اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ رہے ہو ایس آئی! مجھے تو تم خود کسی واردات پر نکلے ہوئے لگتے ہو۔ شاید اسی لیے ایک نظر آ رہے ہو۔ قہارے میں نہیں جاؤں گا بلکہ قہارے والے اب خود یہاں آئیں

میں نے اس کی کھائی پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا لیا لیکن وہ بھرتی سے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی سے اس نے ماؤزر نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ سخت لیے میں بولا "تم اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ رہے ہو ایس آئی! مجھے تو تم خود کسی واردات پر نکلے ہوئے لگتے ہو۔ شاید اسی لیے ایک نظر آ رہے ہو۔ قہارے میں نہیں جاؤں گا بلکہ قہارے والے اب خود یہاں آئیں

میں نے اس کی کھائی پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا لیا لیکن وہ بھرتی سے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی سے اس نے ماؤزر نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ سخت لیے میں بولا "تم اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ رہے ہو ایس آئی! مجھے تو تم خود کسی واردات پر نکلے ہوئے لگتے ہو۔ شاید اسی لیے ایک نظر آ رہے ہو۔ قہارے میں نہیں جاؤں گا بلکہ قہارے والے اب خود یہاں آئیں

میں نے اس کی کھائی پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا لیا لیکن وہ بھرتی سے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی سے اس نے ماؤزر نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ سخت لیے میں بولا "تم اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ رہے ہو ایس آئی! مجھے تو تم خود کسی واردات پر نکلے ہوئے لگتے ہو۔ شاید اسی لیے ایک نظر آ رہے ہو۔ قہارے میں نہیں جاؤں گا بلکہ قہارے والے اب خود یہاں آئیں

میں نے اس کی کھائی پکڑنے کے لیے ہاتھ پھیلا لیا لیکن وہ بھرتی سے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی سے اس نے ماؤزر نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ سخت لیے میں بولا "تم اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ رہے ہو ایس آئی! مجھے تو تم خود کسی واردات پر نکلے ہوئے لگتے ہو۔ شاید اسی لیے ایک نظر آ رہے ہو۔ قہارے میں نہیں جاؤں گا بلکہ قہارے والے اب خود یہاں آئیں

”اوپ“ میں نے سہلی بہائی ”پھر تو اس بے چارے کو واقعی بڑا زوردار بھٹکا گئے گا۔“

”میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ہمیں اس کے بچلے میں دوستانہ انداز میں داخل ہونا چاہیے ”رجیم کل بولا“ مگر ہم گیت پر ہی اس کے گاؤں وغیرہ کو تاڑ دے دیں گے کہ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں تو عین ممکن ہے وہ لوگ گیت بند کر کے سوچا بند ہو کر بیٹھ جائیں اور وہ بنگلا کسی قلعے سے کم نہیں ہے۔ اس دوران شاید وہ کسی طرح کسی بڑی شخصیت سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جائے اور وہ مداخلت کرنے آگے پہنچے گو کہ میں نے ٹھیک باؤں بچے اس کے سامنے ٹیلی فون بند کرانے کا بندوبست کر لیا ہے لیکن اگر ہم لوگ اندرون پہنچ سکے تو ہمیں صحیح پتا نہیں چلے گا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اگر ہم صرف چار آدمی بھی اندر ہوں گے اور باقی لوگوں نے بچلے کو گھیرا ہوا ہو گا تو مجھے اطمینان رہے گا۔ اس صورت میں مجھے تصادم کی بھی زیادہ پروا نہیں۔ جو کچھ ہو گا کم از کم ہماری آنکھوں کے سامنے تو ہو گا۔ ہم خود کو زیادہ بے بسی محسوس نہیں کریں گے۔“

”لیکن! اس میں ہماری جانوں کو خطرو زیادہ ہو گا“ اے ایس آئی اکرم بولا ”ہم ایک طرح سے اندر بند ہو کر رہ جائیں گے اور ہماری اطلاعات کے مطابق جبر کے گھر میں ہر وقت کافی تعداد میں مسلح آدمی موجود رہتے ہیں جن میں سے کئی پیشہ ور مجرم ہیں جنہوں نے اس کی شخصیت کی تعزیر کے پناہ لی ہوئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم چاروں اپنی اپنی جگہ بہت خاص آدمی ہیں“ ”رجیم کل الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا“ ”اگر ہم چاروں مل کر بھی اندر کی صورت حال کو کنٹرول نہ کر سکتے تو ہم چاروں کی زندگیوں پر لعنت ہے۔“

”لعنت کو تم تین اپنی زندگیوں تک محدود رکھو“ میں نے جلدی سے کہا۔

”بیک! اب تو جو کچھ بھی ہو گا ہم چاروں کے ساتھ اسی طرح ہو گا“ ”رجیم کل ششادہ لہجے میں بولا“ ”اور اگر کہیں بات بگڑ گئی۔ تمہارا جی پی پیس والا ہوا غائب ہو گیا تو پھر میرے ساتھ اور بھی بری ہوگی۔ مجھے اس کے علاج بھی سمجھتے نہیں گے۔ ظاہر ہے اس کی ذمہ داری مجھ پر آئے گی۔“

”جیسے مشقی پیلوؤں کی طرف مت جاؤ اور حسد عادت بدقل منہ سے مت نکالو“ میں نے کہا ”یہ اتنی بڑی کم بھی نہیں ہے جتنی ہم... لوگوں نے تصور کر رکھی ہے۔ البتہ ذرا بعد کے حالات سے منٹنے کے لیے کم مشہور رکھنا۔“

یونسی باتوں باتوں میں ہم پیر دانش کے گھر کے قریب جا پہنچے۔ رجیم کل نے دو تین گلی پہلے ہی گاڑی روک لی اور اکرم کو اشارہ کیا۔ وہ اتر کر پولیس کی دو سری گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ آج صبح قاصدہ رکھ کر ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔

اے ایس آئی موجود تھے ”ان سے میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ میں نے فوری کیا تھا کہ رجیم کل تمام محاللات میں صرف ان دونوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام اکرم تھا۔ وہ نظری کی ہماری کاپیوں کا تھا اور اگر وردی میں نہ ہوتا تو ممکن اور سیدھا حاسانہ مافکر معلوم ہوتا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان تینوں کے چہروں پر غور کیا۔ مجھے پولیس کی وردی میں دیکھ کر رجیم کل کے ساتھیوں کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ میں نے گہری دیکھی۔ سارے گیسواہ بچے تھے۔ میرے پیچھے ہی تینوں گاڑیاں تیزی سے آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔“

”تمہارا مکتب اب صبح ہے“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد رجیم کل نے تہس کو کہا ”تم تو اس محلے میں اچھی پہلی وارداتیں کر سکتے ہو اور پولیس کے گھنے کو نام کر سکتے ہو۔“

”پر نام اسے کیا جاتا ہے ہر ٹیک نام ہو“ میں نے کہا ”تمہارے محلے میں مزید نام ہونے کی گنجائش کہاں ہے۔“ اس نے بری طرح مجھے گھورا اور دانت چیں کر بولا ”پھر شروع کر گئے!“

”تم خود ہی کوئی ایسی بات جھجھو دیتے ہو کہ میری زبان پھسلے گئی ہے“ میں نے طاقت سے کہا۔

”تم اگر کم اس وقت تو اپنی زبان پر قابو رکھو۔ اس وقت تو تم ہماری ہی وردی میں ہو“ وہ بولا۔

”اوپ“ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا“ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پکڑ لیا۔

”جس مجرم کو ہم گرفتار کرنے جا رہے ہیں“ اب کہیں اس کے سامنے کچھ کرپولیس کو برا بھلا کہنا شروع نہ کرے گا“ وہ بولا۔

”یہ باتیں تو صرف تم سے ہی کرنے میں عود آتا ہے۔“ میں نے مکرراتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کے وقف سے میں نے پوچھا ”تم نے یہ تصدیق بھی کر لی ہے یا نہیں کہ پیر دانش گھر ہی موجود ہے؟“

”یہ بات تو مجھے اتنا کہ حاکمیں سمجھتے ہو؟“ وہ اسٹیرنگ دھکیل کر اقدام کر بولا۔ ”ذرا نیچے اس وقت وہ خود ہی کر رہا تھا“ ”کیا میں اتنا اچھا ہو سکتا ہوں کہ اس کی موجودگی کی تصدیق کیے بغیر پورا جلوس ملے کر چل دوں؟“

”آج کل کا دور کچھ عجیب سا ہے۔ کسی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب کیا کر گزرے“ میں نے سادگی سے کہا۔

”تمہاری اطلاعات کے لیے عرض ہے کہ میری پیر دانش سے فون بات ہوئی ہے۔ اس سے طاقت ملے ہوئی ہے۔ وہ بے چارہ تو بڑا خوش خوش میرا انتقاد کر رہا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے ذرا تاخیر سے اس کا بلاؤ قبول کیا ہے اور خود اس کا ٹھکانے کے بعد ”راہِ راست“ پر قہر ہوں“ اس نے بتایا۔

رجیم گل کھڑکی میں کھتی نکا کر گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "باتی لوگوں کو اکرم اب بتائے گیا ہے کہ ہم کس مشن پر جا رہے ہیں۔"

"میں سمجھ چکا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے ہماری سانس لے کر گھڑی دیکھی۔ اس دوران میری نظر آگے ایک گلی کے کونے پر کھڑی ایک سفید کار پر پڑی۔ کار ایک بنگلے کے گیٹ کے قریب کچھ اس طرح کھڑی تھی جیسے اندر سے کسی کی آمد کی۔ یا پھر گیٹ کھلنے کی خشر ہو۔ اس کی اگلی سیٹ پر کوئی چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔

دانت اس نے اخبار ڈرا سا جٹا کر لینڈ کرور کی طرف دیکھا اور میں ہماری سانس لے کر رہ گیا۔ گو کہ فاصلہ کافی تھا اور وہ شخص فیلٹ ہیٹ ڈاؤر کلا سر بھی لگائے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ شفیع شاہ تھا۔ اس ٹکے میں بھی وہ ایک کھلڈرا امیر زادہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔

گاڑی میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے اس نے اپنے آدمیوں کو کہاں اور کس طرح پھیلایا تھا۔ ان کے لیے پولیس سے ڈرا اور رہتا بھی ضروری تھا۔ ہر حال مجھے اس سلسلے میں کوئی فکر نہیں تھی۔ شفیع شاہ ان کاہنوں میں باہر تھا۔ معلوم نہیں اس نے بھی مجھے پہچانا تھا یا نہیں؟ اس سے پہلے کہ رجیم گل اس کی طرف متوجہ ہوتا اس نے اخبار چھوڑ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور دوسرے ہی لمحے اس کی گاڑی موڑ کر گھوم کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔

چند لمحوں بعد اکرم لوٹ آیا اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ رجیم گل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا "پہچانے کی خبر سن کر ہمارے آدمی پریشان تو ہوئے ہوں گے؟"

"نہیں۔ یہ ٹیمٹ ہے کہ یہ زیادہ پریشان نہیں ہوئے" اکرم نے جواب دیا "البتہ حیران ضرور نظر آ رہے ہیں۔"

"خوفزدہ تو ہیں؟" رجیم گل نے پوچھا۔

"نہیں" اکرم نے جواب دیا "میں معلوم ہے ایسے معاملات میں زیادہ ڈسے داری افسر ہوتی ہے۔"

دونوں گاڑیاں اب رینگتی ہوئی ہمارے پیچھے آ رہی تھیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان فاصلہ اب بڑھ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد رجیم گل نے گاڑی پیروائش کے عظیم الشان بنگلے کے سامنے لے جا کر روکی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بنگلے کا بلند والا گیٹ فوراً ہی کھل گیا۔

اندھ بنگلے کی طویل و عریض ڈرائیج وے میں اور گیٹ کے دونوں طرف کلا شکوف برادر محافظ کھڑے نظر آ رہے تھے مگر ان کے اعزاز میں بے پروائی تھی۔ وہ الرٹ نہیں تھے۔ پولیس کی لینڈ کرور دوپکے کر بھی ان کے انداز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ رجیم گل گاڑی اندر لے گیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں درحقیقت رجیم گل کا انتظار ہو رہا تھا۔

پیروائش خود سامنے یہ نفس نہیں برآمدے میں موجود تھا اور یہ گویا آنے والوں کے لیے ایک آزمائش تھا۔ اس قسم کے لوگ شاید نادری کسی کے استقبال کے لیے باہر آتے تھے۔ ایک ایسے ایجنٹ کی تو حیثیت ہی کیا تھی اس سے کہیں بڑے بڑے عدسے والوں کو بہت بہت در ان کے ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پیروائش کے دائیں بائیں دو چھوٹے جسم کی شخصیتیں موجود تھیں۔ گو کہ ان میں سے ایک ہماری پس منظر میں تھا اور اپنی حرکات و سکنات سے حتی الامکان معزز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چھپو گیری نے گویا اس کے چہرے پر اپنے نقوش چھوڑے ہوئے تھے۔

پیروائش آج اپنے ٹکے سے واقعی کوئی غور نظر رہا تھا۔ اس کے سر پر اور بھی سی ٹیوٹی تھی جس کا اوپری حصہ گنبد سے مشابہ تھا اور وہ ایک ہماری بھرم "سٹلٹ فاخر" قسم کا لباس پہنے ہوئے تھا جس پر خوبصورت زری کا کام تھا۔ لباس دور سے سے جھلجھلک کر دکھائی دے رہا تھا۔ پردوں میں شامی قسم کے زری والے جوتے تھے۔

پیروائش شخصیت سے مار کھاتا تھا اور نہ اس ٹکے میں وہ واقعی بہت متاثر کن اور با عجب نظر آ سکتا تھا مگر یہی چیز اسے اور بھی زیادہ بالکل آدمی ثابت کرتی تھی کہ اس شخصیت کے ساتھ اس نے کیا مقام بنایا تھا اور کہاں کہاں پہنچے گاؤ لیے تھے طریقے خواہ کچھ بھی تھے۔ لیکن وہ جتنا اوپر پہنچ چکا تھا اس مقام تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔

ہم چاروں گاڑی سے اتر کر اس کی طرف بڑھے۔ گیٹ ہمارے عقب میں بند ہو چکا تھا۔ عام حالات میں پولیس والوں کے پاس زیادہ سے زیادہ ایک ایک گھن ہوتی ہے لیکن ہمارے پاس اس وقت دو دو گھنیں تو ظاہری طور پر نظر آ رہی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق میری طرح مزید ایک آدھ ہتھیار سب نے چھپا بھی رکھا تھا۔ تاہم پیروائش نے گویا اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔ باری باری ان تینوں نے ہم سب سے مصافحہ کیا۔ پیروائش نے میری طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی تمام تر توجہ صرف رجیم گل پر تھی۔ میرے حق میں یہ ہماری تھاگو کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ انہی خاص توجہ دینے پر بھی مجھے پہچان پاتا۔ اس کے باوجود میرے خیال میں میرا اس کی نظر میں نہ آتا ہوا ہوا تھا۔

البتہ میرے لیے قدرے تشویش کا بات یہ تھی کہ اور تیس پر اس کی ماں جیسے میں نے دل ہی دل میں گاؤد کا کام دیا تھا موجود تھی اور گھری نظر سے فرار فرما ہم سب کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی نظریں ہر سے کی طرح انسان کو اپنے وجود میں گڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں اس وقت دو خوبصورت اور نوخیز لڑکیاں موجود تھیں۔

”یہ بڑی بڑی کے اوقات میں۔۔۔ ان کلف لگی درویشوں میں۔۔۔ اس طرح بڑے کلف سے انداز میں آنے کے بجائے آپ قاصر وقت میں۔۔۔ سادہ لباس میں۔۔۔ ساری مصروفیات ذہن سے بھٹک کر ہمارے پاس آتے اور درپیش ہو کر بیٹھے تو ملاقات کا لطف ہی بہت اور ہوتا۔“

”بہر صاحب! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میرے پاس قاصر وقت تو کوئی ہوتا ہی نہیں۔۔۔ ویسے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے درحقیقت حالات یہاں لے آئے ہیں۔“ رحیم گل ملاشت سے بولا۔  
”نہیں۔۔۔ اگر حالات بھی لے آئے ہیں تو اس پر اتنا افسوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید اسی میں آپ کی بہتری ہو۔“ بہر دانش لے لگا ساتھ تھپہ لگایا پھر اس نے مشفقانہ انداز میں رحیم گل کی کمر باندھ دیکھتے ہوئے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے آخر کار یہی محسوس کیا کہ اسے کسی گریز کا احساس نہیں تھا۔ وہ بالکل بے فکر، مطمئن اور مسرور نظر آ رہا تھا۔

رحیم گل کو کہ اس کے اشارے پر آگے نہیں بڑھا تھا لیکن بہر دانش اسے اس کا وہی کلف اور ہنگامہٹ سمجھتے ہوئے بولا۔  
”اسپیکٹر صاحب! آپ بے شک آخر سے آئے ہیں۔۔۔ اکیلے نہیں آئے۔ اور دوسری میں آئے ہیں۔“ اس کے بازو دھم آپ کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رہیں گے چلے گا۔ اندر چلے۔“ رحیم گل نے ایک لمحے سوچا۔ ہمیں باقی پولیس فورس کو ملت دینی تھی کہ وہ بیٹھے کے کردار صاحب حکمت عملی کے ساتھ گیارہ ڈال لے۔ شاید یہی سوچ کر رحیم گل اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں نے ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ بہر دانش کے کلا خوف بردار محاذ ہے پروائی سے اوپر اور پھر وہ بے تحاشہ شاید ان کے لیے پولیس والوں کا یہاں آنا کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کوئی بات نہیں تھا وہ سمجھ رہے ہوں کہ اسپیکٹر صاحب اپنی ترقی کے لیے کوئی ستارہ یا بھر ”دو عالمی عمل“ کروانے آئے ہوں گے۔

بہر دانش کے ساتھ ہم ایک عظیم الشان ڈرائنگ روم میں پہنچے میں سوچ رہا تھا کہ عام پولیس والے تو واقعی ان عظیم الشان مکمل میں قدم رکھتے ہی مرعوب ہو جاتے ہوں گے۔ جب قانون کے محاذ مرعوب یا خوفزدہ ہو جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ مجرم کو آؤ گی تو میں حاصل ہوگی۔

”ہم نراعت کہ بے صوفیوں میں دھن چکے تو بہر دانش بولا۔  
”اتنے کلف سے بیٹھے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اطمینان سے اچھے ڈھالے ہو کر بیٹھے۔۔۔ بڑی کو بھول جائیے اور اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھئے۔“

”میں اس گھر کو اپنا گھر کیسے سمجھ سکتا ہوں بہر صاحب!“ رحیم گل بولا۔ ”میں جس ایئر کنڈیشن میں رہتا ہوں اس کی قیمت سے نکالنا کا تو صرف اس ڈرائنگ روم میں فرنیچر موجود ہے۔ اور میں تو خوش قسمت ہوں کہ میرا تعلق ایک آسودہ حال چھوٹے سے

ان میں سے ایک تہ جاتی لڑکیوں کی طرح ذرا چھوٹی اور چچی ہاک کے ساتھ اتنی کیونٹ نہ رہی تھی کہ بے اختیار میرے قدم رکھ لگے۔ مل چلا کہ ایک لمحے کے لیے رک کر ذرا بہتر طور پر اس کا جائزہ لیا جائے لیکن مجھے فوراً خیال آ گیا کہ اس وقت میں افضل نہیں تھا اور نہ ہی کسی ہوٹل یا کلب میں تھا۔ اس وقت میں ایک فرض شاس پولیس افسر تھا اور بڑے اہم مشن پر آیا ہوا تھا۔ اگر میں اصلی پولیس والا ہوتا تو شاید اس قسم کے ”فضول“ خیالات میرے دل میں جگہ نہ پاتے اور میں آرام سے رک کر گرمی نظر سے اس جاپانی لڑکی کا جائزہ لے لیتا۔

معلوم نہیں دونوں ماں بیٹا کسی کے استقبال کے لیے کمرے سے نکلے وقت بھی دائیں بائیں دو افراد کو کمرے رکھنا کیوں ضروری سمجھتے تھے؟ میں نے بعض تصویروں اور کچھ تاریخی فلموں میں دیکھا تھا کہ بادشاہ سلامت یا ملکہ عالیہ تخت پر نیم دراز ہوتی تھیں تو دائیں بائیں دو خادم یا کنیریں کمری مورچہ جاپانی نظر آتی تھیں۔ یہ چاروں افراد بھی کچھ اسی طرح کمرے نظر آ رہے تھے لیکن ان کے ہاتھوں میں مورچہ جاپانی کی کی تھی۔

ہم برآمدے کے قریب پہنچے تو میرے ہمارے سروں کے اوپر آگئی اور یوں گاؤں ہمارے نظروں سے اوچھل ہو گئی۔ بہر دانش مصافحہ کر چکا تو درجن ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”فہم فییب۔۔۔ زبہ فییب۔۔۔ رحیم گل صاحب تشریف لاتے۔ میں نے سوچا خود باہر نکل کر استقبال کروں۔۔۔ مجھے بل بل کی اطلاع ملی رہی تھی کہ کب آپ تھانے سے روانہ ہوئے اور کب گھر کے قریب پہنچے۔ میں تو سمجھا تھا آپ بھی اس غریب خانے کو مدق نہیں بخشیں گے۔“

میری دھڑکن ذرا تیز ہو گئی۔ اس بد بخت کو کیا واقعی رحیم گل کی تمام تر احتیاطوں کے باوجود پہل بل کی اطلاع ملی رہی تھی؟ یہ تو کوئی اچھا گھون نہیں تھا۔ کیا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ مزید پولیس فورس بھی تھی جو کچھ دیر بعد اس کے ”غریب خانے“ کے گرد گیارہ ڈالنے والی تھی۔ اکسار کے بعض الفاظ کا استعمال بھی بعض اوقات قسم عرفانہ لگتا تھا۔ اگر اس خانہ خراب بہر دانش کا گھر غریب خانہ تھا تو پھر ”میر خانہ“ نہ جانے کسے کہا جا سکتا تھا؟

”بہر صاحب! میں آپ کی دعوت کے جواب میں نہیں آیا۔ میں تو خود اپنے طور پر آیا ہوں۔۔۔ یاہوں کہنے کے حالات مجھے لے آئے ہیں۔“ رحیم گل غمرے غمرے سے بولے۔

بہر دانش کے چہرے پر کوئی تغیر نظر نہ آیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا؟ وہ بدستور خوش دلی سے بولا۔  
”چلیں خیر۔۔۔ کسی طرح بھی سہی۔ آپ آگئے۔ یہی سب سے اہم بات ہے۔“

پھر اس نے ذرا تیزی نظر سے ہم تینوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

باتیں کرتا ہے لیکن رختہ رختہ اسے محل آجاتی ہے۔  
 "یادیں کئے کہ کس کی محل ایش کی بیعت چڑھ جاتی ہے"  
 رحیم گل اس کی بات کانٹے ہوئے بولا۔

پیر دانش گویا اس کے تہرے کو خاطر میں لائے بغیر بولا "آپ  
 نے اپنا کیا جو مجھ سے لئے آگئے۔ ہم سے آپ کا ربط منقطع رہے گا تو  
 آپ بہت کچھ سیکھیں گے۔ آپ کو بڑے فائدے پہنچیں گے۔ کوئی  
 بوجہ نہیں ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ بھی ایسے ہی عالی شان گھر میں رہ  
 رہے ہوں۔" اس نے چاروں طرف اشارہ کیا جس میں ہماری باتوں  
 پر اور تھوڑا بہت ہم پر بھی دھیان رکھیں۔

"یہی صاحب۔" رحیم گل کی غیبی میں کوئی فرق نہ آیا  
 "مجھے حرام کی کمائی سے محل بنا کر رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔  
 بلکہ کسی بھی قسم کی کمائی سے محل بنا کر رہنے کا کوئی شوق نہیں  
 ہے۔ شان و شوکت۔ بڑے بڑے بنگلے۔ پُر جیش گزراں۔  
 چمک دھمک کرنے کے لیے بہت بڑا بینک بینک۔ یہ چیزیں میرا مسئلہ  
 نہیں ہیں۔ میں کسی بھی جگہ کسی بھی حال میں خوش رہ سکتا ہوں  
 اور زندگی کو انجوائے کر سکتا ہوں کیونکہ زندگی انسان کے یہاں  
 ہوتی ہے۔" اس نے سینے پر ہل کے مقام پر ہاتھ مارا پھر چاروں  
 طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "زندگی شاندار مکانوں۔ عالی شان  
 فرنیچر اور بیش قیمت قالینوں میں نہیں ہوتی۔"

"الیکٹرک صاحب! کیا آپ مجھے کیا بتانے کے لیے یہاں آئے  
 ہیں؟" میرے نے بظاہر مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں پوچھا لیکن  
 اس کے لہجے میں خود بخود ایک بلاکسا عجیب پن آیا تھا۔  
 "نہیں۔" رحیم گل نے اطمینان سے جواب دیا "یہ باتیں تو  
 ان گنت لوگ بتا کر چاچے ہیں۔ لوگوں نے اب ان پر کان دھرنا  
 چھوڑ دیا ہے۔ حتیٰ کہ آپ جیسے بڑوں نے بھی۔"

"تو پھر آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟" پیر دانش کے ہونٹوں  
 پر مسکراہٹ اور لہجے میں طاف بہت بڑھ چکی۔

"بتادیں گے۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" رحیم گل مسکراتے  
 ہوئے بولا پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ میرا اندازہ تھا کہ پولیس والے  
 اب تک بنگلے کو گھیرے میں لے چکے ہوں گے تاہم رحیم گل اب  
 بھی اصل بات زبان پر لائے بغیر بولا۔ "آپ مجھ جیسے آدمی سے مل  
 کر کافی بد مزہ ہوئے ہوں گے؟"

"نہیں۔" پیر دانش نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا  
 "میں جس سے مل کر بد مزہ ہوتا ہوں اسے افسوس کر گھر سے باہر  
 پھونک دیتا ہوں۔ خصوصاً یہ باتیں تو ہوتی تو ہیں گی۔ یہ بتائیے کہ آپ  
 حضرات کیا چاہتا ہوں کہ میں؟ میرے ہاں ہر ذوق کے آدمی کو چہنے  
 کے لیے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ دنیا کی تین تین شراہوں سے لے  
 کر تازہ دہی کی لکڑی تک۔ بلا تکلف بتائیے کہ آپ میں سے کون  
 کیا چاہتا ہوں کہ میں؟" پھر اس نے اپنی کلائی پر ہلکا کلائی گھڑی کو  
 ایک ٹھہر دیا۔ "ٹھیک ایک بجے کھانا لگا دیا جائے گا۔"

دوبارہ مکرانے سے چپ اس لیے میں پوش طلبانے کے ایک  
 دفعہ اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں دو دن الیکٹرک اور اس سے چھوٹے  
 محلے کے بعض پولیس والے ایسے لکھیں اور گوارنٹوں میں بھی  
 رہے ہیں جن کی حالت موجودہ وقت کے کلچر رات سے مشابہ

"وہ بہت ہی بے وقوف پولیس والے ہوں گے رحیم گل  
 صاحب۔" پیر دانش نے ایک گونجا ہوا قہقہہ لگایا "توجہ کے دور  
 کیا آپ کے گھر میں ایسے افراد کھل رہے ہیں؟ چرائی کے لے  
 جڑنے والے ہوں گے۔"

"چھوٹے والوں کو ہر حال مل ہی جاتے ہیں۔" رحیم گل نے  
 نہایت اصرار کیا۔

"بعض اصناف پسندوں کو تو ہم نے ایسے حال میں رہنے دیکھا  
 ہے۔" پیر دانش مسکراتے ہوئے بولا "ان کا معاملہ شاید یہ ہوتا ہے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیجے غالب  
 لکھائے اہل کرم دیکھتے ہیں  
 اس قسم کے افسروں کے ثبات رنڈا منٹ کے بعد دیکھتے  
 لے ہوتے ہیں۔ ہر حال میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ میں تو  
 یہ کہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ جس قحطی میں آئے ہیں یہ تو  
 لے کی کان ہے مگر یہ بات مجھے آپ کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔  
 یہ کہ تو بے بسی معلوم ہوگی۔ اس قحطی میں اپنا چال کرانے کے  
 افسر افسر آپ نے نذرانہ دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"  
 "مگر میں کوئی نذرانہ دیلے بغیر یہاں آیا ہوں۔" رحیم گل  
 نے غصے سے لہجے بولا۔

پیر دانش نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا "رحیم گل صاحب! آپ  
 یہ دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ مجھے کسی اور سی دنیا کے باسی لگتے

"الہم میں اس دنیا کا باسی ہوں جسے آج کے دور کے ان  
 نہ لکھیں مل کر آباد کر دیا ہے اور اس کی جگہ انہیں کی  
 لکھیں کی اور سی دنیا آباد کر لی ہے اسی لیے ہر کوئی دنیا  
 ناگوار ہے۔" رحیم گل نہایت غیبی کے بولا۔

پیر دانش نے ایک اور بلند آہنگ گونجا ہوا قہقہہ لگایا۔ وہ گویا  
 اگلے کی جھینڈ باتوں سے اسی طرح محظوظ ہو رہا تھا جس طرح  
 انہیں سے ہوتا ہے اس کے تاثرات کچھ ایسے لگ رہے  
 ہیں جو دل ہی دل میں کہہ رہا ہو۔ میں خوب سمجھ رہا ہوں  
 ہاں تاہم مجھے متاثر کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہے ہو لیکن  
 ان باتوں میں۔ جلد ہی اپنی اصلیت پر آمادہ گے۔

پھر آہستہ آہستہ ہوئے ہوئے بولا "رحیم گل صاحب! میں  
 یہ آپ اپنی فوج رانی کی دوج سے ناخبر کار ہوں۔ آپ کی  
 مانگہ پرانی معلوم نہیں ہوتی۔ شروع میں آدمی اس طرح کی

ذائقہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے جو نہایت عجیبی سی ہے کیا جائے۔

رجیم گل نے کچھ اس طرح سرھلایا جیسے اس بیان سے اسے  
ولی مدد ہو چکا ہو پھر وہ مغموم لہجے میں بولا "یہ کوئی نئی بات نہیں۔  
جب بھی کسی فرعون صفت شخصیت کا انجام اس کے سامنے آتا  
ہے تو اسے یقین نہیں آتا۔ بہت دیر تک وہ اسے ذائقہ ہی کہتا  
رہتا ہے۔ خصوصاً اس وقت تو اسے بالکل ہی یقین نہیں آتا کہ  
انجام اچھا نکلا۔ اور اس کے حوالے کے دوسری سامنے آتا ہے۔  
"اسپیکٹر رجیم گل۔" "یہ درائنش کے لیے میں بلا کی سوسنی  
در آئی "میں ذائقہ کو صرف ایک حد تک پسند کرتا ہوں۔ جس قسم  
کے الفاظ تم استعمال کر رہے ہو اپنے بارے میں اس قسم کے الفاظ  
میں ذائقہ میں بھی برداشت نہیں کرتا۔" وہ "آپ" سے "رجیم  
گل۔"

"یہ صاحب! آپ تو ذائقہ کو ایک حد تک برداشت کرنے کی  
بات کر رہے ہیں۔ میں تو آپ جیسے لوگوں سے ذائقہ کتنا سہلے سے  
پسند ہی نہیں کرتا۔" رجیم گل کے لیے میں اب بھی ملائت نہیں کرتا  
وہ اسے "آپ" ہی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

یہ درائنش نے دیرے دیرے یوں غلی میں سرھلایا گویا وہ کلا  
باقابل یقین منتظر کی طرح رہا ہے۔ سررائی ہی آواز میں بولا "میں  
نہیں۔" رجیم گل! تم کسی نہ کسی طرح مجھے یقین ضرور دلاؤ کہ تم  
ذائقہ نہیں کر رہے ہو۔"

"ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں اٹھ کر آپ کے انھوں  
میں پھٹکیاں ڈال دوں۔ اور یہ میں کرنا نہیں چاہتا۔" رجیم گل  
پُر سکون لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں آپ نہایت پرسکون اور  
باعزت انداز میں اٹھ کر میرے ساتھ چلیں تاکہ کسی کے بھی  
سامنے تماشائی بننے سے بچ سکیں۔"

"یعنی تم مجھے تماشائی بنائے گے۔؟" یہ درائنش کو چسپے اب کی  
اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا "ایک اسپیکٹر  
تسماری جڑات اور تسماراح اصلہ قابل دوا ہے رجیم گل! یہی نہیں  
میں نہیں آ رہا ہوں جس میں کسی طرح دوا دوں۔"

"آپ مجھے دوا نہ دیں۔ اٹھ کر میرے ساتھ چلیں۔" رجیم  
گل کے لیے میں ملائت پر قرار تھی۔

کمرے کی فصاحتیں زبردست تھوڑا آگیا تھا۔ ہم چاروں کے لیے  
اپنی اپنی گھونٹیں کھینچ کر دھو رہے تھے۔ یہ درائنش کے عقب میں  
ہوئے دونوں افراد اب بھی خالی خالی نظروں سے جا رہی تھیں۔  
رہے تھے۔ وہ گویا کمرے میں ہوئے والی منگھو میں نہیں رہے تھے  
لیکن میں ان کے سپاٹ چروں کی وجہ سے ان کے بارے میں  
خفا تھا۔ میرے خیال میں اس قسم کے لوگ ان سے زیادہ  
خطرناک ہوتے تھے جو گھر سے برستے نظر آتے تھے۔  
یہ درائنش پر یکدم ہی جیسے کوئی دودھ پڑ گیا۔ اس کی طرف  
جھکیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ باجھوں سے مٹھی ساٹھ بھی پٹھان

اس نے سوالیہ نظروں سے ایسی باہری ہم چاروں کی طرف  
دیکھا۔ اس کے دونوں آوی بیٹھے نہیں تھے۔ وہ ہاتھ بانٹے اس  
کے پیچھے بہت کڑے تھے۔ ان کے چروں پر کوئی تاثر نہیں تھا۔  
میں تیار کی گئی کی ادٹ سے ان دونوں پر اور یہ درائنش مسلسل  
نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے وہ  
دونوں آوی کس قسم کی مخلوق تھے؟ کیا وہ اس کے عام قسم کے خادم  
تھے۔ یا در حقیقت وہ اس کے باڈی گارڈ تھے؟ ان کے پاس کوئی  
ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے لباس میں زیادہ سے زیادہ کوئی  
دیوار یا پائل مٹل ہو سکتا تھا۔ وہ باڈی گارڈ ہونے کے اہل بھی  
دکھائی نہیں دیتے تھے۔ خصوصاً ان میں سے شلوار لیس والا تو  
بالکل ہی چند دکھائی دیتا تھا لیکن ان دونوں کا مستقل سر پر سوار رہنا  
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رجیم گل ایک طویل سانس لے کر بولا "یہ صاحب! شراب تو  
ہم چاروں میں سے کوئی نہیں پیتا۔"

یہ اس کی بات کانٹے ہوئے بولا "بھئی اس معاملے میں  
شرابے اور زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت نہیں۔ اس گھر کی  
کمانیاں باہر نہیں جاتیں۔ یہ گھر نہیں ایک سمندر ہے۔ اور  
سمندر بھی ایسا جس میں غوطہ خوروں کا دھانڈا بالکل بند ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔" مجھے یقین ہے "رجیم گل نے اثبات میں  
سرھلایا "لیکن ہم محض احتیاطاً ہی یہ کار نظر آنے کی کوشش نہیں  
کر رہے۔ ہم میں سے واقعی کوئی بھی پینے پلانے کا شوقین نہیں۔  
دوسرے بے ضرورت قسم کے شروبات سے فضل ہو سکتا تھا اور کھانا  
بھی کھایا جاسکتا تھا لیکن انوس کہ اس وقت ہم آپ کی اس  
پیشکش سے بھی استفادہ نہیں کر سکتے۔"

"لیکن کیوں؟" یہ درائنش نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ دیکھیں۔" یہ کچھ اچھا نہیں لگے گا کہ ہم آپ کے  
ساتھ بیٹھ کر اچھے اچھے مٹھے قسم کے شروبات پئیں۔ پھر آپ  
کے ساتھ بیٹھ کر اچھے اچھے کھانے کھائیں اور اس کے بعد آپ کو  
گرفتار کسے چل دیں۔"

کمرے میں ایک لمبے کے لیے گھرا سکوت چھا گیا۔ مسکراہٹ  
یہ درائنش کے ہونٹوں پر گویا چمک رہی تھی۔ اس کے بعد وہ بولا تو اس  
کے ہونٹوں نے گویا حرکت ہی نہیں کی "آپ نے لفظ "گرفتار"  
استعمال کیا رجیم گل صاحب؟" اس کے لیے میں بلا کی ملائت  
تھی۔

"مئی ہاں یہ صاحب! رجیم گل نے نہایت مزیدار لہجے میں  
جواب دیا۔ "میں بڑے انوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دے رہا  
ہوں کہ میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔" انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ  
یہ درائنش کو اس کی کسی عجز ہستی کے انتقال کی اطلاع دے رہا ہو۔  
یہ درائنش نے پھر ایک گونجا ہوا آواز سے کہا "ذائقہ اچھا کر لینے  
ہیں آپ۔! اپنی عجیبی برقرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ





میرے لیے ناگزیر حالت اس وقت ہو سکتی تھی جب وہ نہ ٹکرا جائے گا۔ یعنی میں اسے مزید ایک آدھ لمبے کی مسلت دینے کے لیے تیار تھا۔

اس دوران اسے ایس آئی اکرم نے جیب نکال دکھایا۔ مجھے کم از کم اس سے اس نکال کی توقع نہیں تھی۔ وہ اوپر مر قیاد اور ہماری بدن کا ٹک تھا۔ سوئے شیروں اور سوئے فریم کی ٹیک لگا تھا۔ میں تپا چکا ہوں کہ وہ نیم دیہاتی اور مسکین قسم کا ٹرک دکھائی دیتا تھا۔ اس قسم کی شخصیتوں سے انسان پہلی کی توقع نہیں رکھتا لیکن اکرم نے جس پہلی ہی نہیں دکھائی بلکہ میرے خیال میں پہلی کا ایک حیرت انگیز رکاز کا کام کر لیا۔

وہ اپنی جگہ سے تقریباً اڑنا ہوا اور پیر دانش کے سوئے کو بھلا گیا ہوا اس شخص تک پہنچا۔ اس وقت وہ غصے میں سیدھی بھی نہیں گیا تھا جب اکرم نے اس کی کلائی پر کرائے کی چاپ رسید کی۔ مگر اس کے ہاتھ سے جھوٹ کرنے جانے کلاں جاگری اور وہ ہلکی سی ایک جھج کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی تمام کر دینے لگا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی کلائی ٹوٹ چکی تھی۔

اکرم نے ایک لمبے بھی تھپ نہیں کیا۔ اس کا وہی ہاتھ گھوما اور غلام رئیس والے کی چٹائی پر پڑا کیونکہ وہ بھی رئیس کے نیچے ہاتھ ڈال کر قابو لینے میں اڑی ہوئی کلاں نکال چکا تھا۔ اس کی چٹائی پر چاپ پڑنے کا وہ عمل کچھ ایسا ہی ہوا جیسے جھوڑا پڑا ہو۔ وہ الٹ کر چیخے جا کر اوروں میں سناکت ہو گیا۔

اکرم کی پہلی تو میرے لیے ناقابل یقین تھی۔ اس کا کرائے میں اس درجہ باہر ہوا مزید ناقابل یقین تھا۔ میں نے وہیں دم بخود کھڑے رہ کر وقت ضائع نہیں کیا۔ اس دوران باہر سے کچھ دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ حالانکہ کمرے میں کوئی شور شرابا نہیں ہوا تھا لیکن شاید باہر والوں کو کسی طرح احساس ہو گیا تھا کہ اندر کوئی گڑبڑ تھی۔

میں دودھانے کے قریب ہی تھا۔ میں ذرا اور پیچے ہو کر دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک کلا شکوف ہوا دودھانا ہوا کمرے میں داخل ہونے کا تو میں نے چاک کا ٹک آگے کر دی۔ وہ ٹانگ میں الجھ کر کمرے لگا اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس عالم میں نہ ٹکرا نہ ہوا۔ میں نے اس کی کپڑی پر اپنی کمر کا دست رسید کیا۔ وہ اندر سے منہ اپنی کلا شکوف کے اوپر کر اوروں میں سناکت ہو گیا۔

رجیم کل دودھانے کی سیدھ میں تھا۔ وہ بھی اپنی کلاں چکا تھا۔ اسے غالباً کوئی اور بھی دودھانے کی طرف آنا دکھائی دیتا تھا کیونکہ اس نے کمرے میں آگے بڑھ کر ہاتھ دیا اور پھر تھوڑے تھوڑے اندر مت آنا دینے لگی ماسوں کا۔

باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ رجیم کل پیر دانش کی طرف دیکھے بغیر اس سے ٹکاپ ہوا جیسے تو میں سے

کو ہتھیار پیچک دیر سے ہمارا امکان اس وقت پورے ہو گیا تھا۔ اگر اندر ایک بھی گولی چلی تو میرے کوئی دوا نہ ملے گا۔ یاد رہے کہ ہمارے اندر آجائیں گے اور میں نہیں کہ سکتا تھا۔

ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ذمے دار صرف تم ہو گے۔ ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ذمے دار صرف تم ہو گے۔ ہمارے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ذمے دار صرف تم ہو گے۔

کے قتل کرنے ہو کر صوفے کی آڑ میں کمرے میں تھے۔ قتل کرنے کے لیے اب پیر دانش کو دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ وہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین معلوم ہوتا تھا اور اس کے مسلح آدمیوں کا رویہ زیادہ ہی دھم دھاپ بھی کچھ خاص کام نہیں آسکتا تھا۔

میں دودھانے پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی ہاتھ لے رہا تھا۔ میں نے اس کی رگت حشر ہوتے اور چہرے پر کمرے کے آثار نمودار ہوتے محسوس کیے لیکن وہ اپنے منہ میں اب بھی کوئی تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ غرت و غفلت سے بولا "اس میں تو شور مچ رہی ہے" اور ان میں ہمارا لاش ضرور ہو گی۔

اسی لمحے اندر کی طرف بھاگنے والے دودھانے کو پہنچا۔ میں نے تیزی سے اپنی کمر کا رخ کر لیا لیکن اندر سے کسی کلا شکوف ہوا در کے بجائے پیر دانش کی ہاں کمرے میں آئی۔ اسے چوٹ سے لگتے ہوئے قدم اور پھوٹوں جیسے ہماری ہلکے ہلکے ہوا۔ باوجود وہ نہایت ہی ہلکے ہلکے انسانوں کی طرح گویا ہوا کے دھڑکیں لگتے ہوئے آئی۔ اندر آئی تھی۔ اس کے دائیں بائیں سوچ رہے والی تو بخیر ہی لڑکیاں اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھیں۔

گو کہ اس وقت گاؤں کی آنکھیں بھی انکادوں کی طرح دھڑکیں رہی تھیں لیکن جب وہ پہلی تو اس کے لیے جس نری تھی گو کہ اندازہ تھا کہ اسے ہی تھا۔ گاؤں کی گولیاں چلانے اور لاشیں گرانے کی بات نہ کرے۔ وہ ہاتھ اٹھائے ہوئے کمرے چھوٹے چھوٹے کمرے کو پانی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے بولی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اب تک کمرے میں ہونے والی تمام کھنگھنی رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی تھی شاید تمام تو اس سے پہنچ رہی تھیں۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ ہمارے اس کمرے میں پہنچے ہوئے بھی ہمارے کمرے میں پہنچ چکی ہو۔

کمرے کا نظریہ بھی تقریباً سناکت ہی تھا۔ اب سکوت کا کچھ اور کمرہ ہو گیا۔ گاؤں کے گردن کھما کر اپنے لالے کے نیچے کی طرف دیکھا اور اسے ہلکی سی ڈانٹ جانے کے انداز میں بولی "دیر سے بیک بیک کیے جا رہے ہو۔ ابھی تک جیسے انیسویں صدی کے پوچھنے کی ترقی نہیں ہوئی کہ یہ جیسے کس اقامت میں گراؤ لگا چاہتا ہے۔"

گاؤں کے آگے ہی پیر دانش کچھ اس طرح منہ پر سنا ہوا اور سکڑا سنا دکھائی دینے لگا تھا جیسے پرائمری اسکول کے گراؤں میں کوئی شہر اور فساد کی پچھ کسی سے دست برد گریں ہوا اور انک

یہی اس صاحب سر پر آن پہنچے ہوں۔  
 ان کی بات سن کر اس نے کمری مافس لے کر کہا جانے والی  
 نظروں سے رحیم گل کی طرف دیکھا اور بارب لہجے میں پوچھا  
 ”اے! تم مجھے کس الزام میں گرفتار کرنا چاہتے ہو؟“ پھر اس نے  
 مگر مزید عقل مند کی کاغذ پڑھ کر دے ہوئے اپنی طرف سے اضافہ  
 کیا ”ڈارنٹ ہے تمہارے پاس؟“  
 رحیم گل کے کمن والے ہاتھ میں ذرا بھی جھنجھ نہیں ہوئی۔  
 دوسرے ہاتھ سے اس نے جیب سے ایک شدہ کاغذ نکالا۔ اسی  
 ہاتھ سے ہوا میں جھکا دے کر اس نے اسے گولا اور لڑاتے ہوئے  
 کہا ”ان شکلات کی تم جیسے آدمیوں کے معاملے میں کوئی ضرورت  
 نہیں ہوتی لیکن میں نے احتیاط یہ غاند پڑی بھی کر رکھی ہے۔ یہ  
 ہے تمہاری گرفتاری کا ڈارنٹ۔ اور جہاں تک تمہارے جرائم کا  
 تعلق ہے تو ان کی فرست اتنی جی ہے کہ اگر میں پڑے بیٹھ گیا تو  
 شام ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض اسٹے شرمناک ہیں کہ اگر کسی  
 اور ہاں بیٹے کے سامنے پڑے جائیں تو وہ دونوں شرم سے ڈوب  
 مریں لیکن مجھے معلوم ہے تم دونوں میں سے کوئی بھی اتنا باغیرت  
 نہیں۔“  
 ہیروائٹس نے ایک بار پھر جلال میں آنے کی کوشش کی۔ وہ  
 بڑی طرح ہلک کر ہاتھ نہ چاٹے ہوئے بولا ”تم میری شان میں جتنی  
 گستاخیاں کر چکے ہو تمہاری موت کا سامان کرنے کے لیے وہی کافی  
 ہیں لیکن اگر تم نے میری ماں کی شان میں گستاخی کی تو میں ساری  
 احتیاط بالائے طاقت رکھ دوں گا اور۔۔۔“  
 اس دوران باہر نعرہ چڑکی آواز میں سنائی دیں۔ رحیم گل  
 پڑسکون لہجے میں بولا ”تمہارے آدمی کمرے کے آس پاس جمع  
 ہو رہے ہیں۔ ان سے کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ یہ تم سب کی  
 زندگی کا سوال ہے۔ میں چاہتا ہوں تم زندہ میرے ساتھ چلو۔“  
 رحیم گل نے ہیروائٹس کو مخاطب کیا تھا لیکن جواب اس کی  
 ماں سے دیا۔ وہ رحیم گل سے بھی زیادہ پڑسکون لہجے میں بولی ”یہ تو  
 زندہ ہی یہاں سے جائے گا اور زندہ ہی واپس آجائے گا۔ سوچنا تو  
 تمہیں اپنے بارے میں چاہیے۔“  
 ”تمہارا خیال ہے میں بغیر سوچے سمجھے ہی آیا ہوں؟“ رحیم  
 گل ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔  
 ”بعض اوقات انسان کی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ کوئی کام بہت  
 سہل سمجھ کر کر رہا ہے لیکن درحقیقت اس کی سوچنے سمجھنے کی  
 صلاحیتیں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ وہ کسی زان میں ہوتا ہے گاؤں  
 طاقت سے بولی۔  
 باہر سے اب بھی دے دے قدموں کی آوازیں سنائی دے  
 رہی تھیں۔ رحیم گل ذرا سخت لہجے میں بولا ”تمہارے آدمی سمجھ  
 رہے ہیں کہ ہم ان کے گھر سے ہیں لیکن ان احمق کو یہ  
 احساس نہیں ہے کہ یہ سب خود بھی پولیس کے گھر سے ہیں۔“  
 اگر ہمیں کوئی نقصان پہنچا تو اس گھر میں کوئی بھی ذمہ نہیں ہے  
 گا۔“  
 گاؤں در نہایت مہماندہ انداز میں مسکراتی ”یہ سب انسان  
 نہیں۔ مدوٹس ہیں۔ انہیں اپنی زندگی موت سے کوئی دلچسپی  
 نہیں۔ ان کے ذہن کے کپیٹر نہیں صرف ایک ہی پروگرام فیڈ کیا  
 گیا ہے اور وہ یہ کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم ہاں بیٹے کو کوئی نقصان  
 نہیں پہنچنا چاہیے۔ ان کا کیا ہے گا؟ اس بارے میں کپیٹر کو کچھ  
 معلوم نہیں بہر حال۔ تمہاری بات معقول ہے۔ تم ایک کام  
 کرنے پر تکتے ہوئے ہو۔ اور ہم ہاں بیٹا حرام موت مرنا نہیں  
 چاہتے۔ اس لیے میں انہیں سچ کر دیتی ہوں۔“  
 اس نے دواؤں کی طرف منہ کر کے یہ آواز بلند پکارا ”تم  
 سب لوگ اپنی اپنی جگہ واپس جاؤ۔ کوئی گھر سے باہر نہ جائے۔ کوئی  
 آدمی اس وقت تک کچھ نہ کرے جب تک میں ختم نہ دوں۔  
 پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں صرف بات چیت ہو رہی ہے۔“  
 اس کی آواز یکدم اتنی بھاری اور گونجی ہو گئی تھی کہ اس وقت وہ  
 بغیر آواز پٹیکر کے ”بھٹے بھٹے جمع سے خطاب کر سکتی تھی۔  
 گاؤں در یقیناً بیٹے سے بہت مختلف حکمت عملی لے کر سامنے  
 آئی تھی۔ باہر قدموں کی آوازیں دور جاتی سنائی دیں۔ کمرے میں وہ  
 آدمی بے ہوش پڑے تھے گاؤں در نے ان کی طرف ذرا بھی توجہ  
 نہیں دی تھی البتہ اس نے اس سوئیز پر ہونٹ غصے کی طرف دیکھا جو  
 ابھی تک اپنی کالی پکڑے بیٹھا تھا۔ غالباً اپنی کراہیوں دہانے کے لیے  
 اس نے مچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پینہ  
 تھا۔  
 ”تم بھی باہر جاؤ“ گاؤں در نے اسے حکم دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا  
 اور باہر کو چل دیا۔ رحیم گل نے اس کے جانے پر کوئی اعتراض  
 نہیں کیا لیکن جب اس کے جانے کے بعد گاؤں در آگے بڑھ کر  
 دواؤں بند کرنے لگی تو رحیم گل تیزی سے بول اٹھا ”دواؤں بند  
 کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“  
 گاؤں در کے بازو اپنی جگہ ساکت ہو گئے لیکن وہ دواؤں سے  
 ہاتھ ہٹائے بغیر اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لائٹ سے بولی ”ہو سکتا ہے  
 ہمیں کوئی رازدارانہ بات کرنی پڑ جائے۔“  
 ”یہاں کوئی رازدارانہ بات نہیں ہوگی۔ ہر بات آن ریکارڈ  
 رہ سکتی ہے۔“ رحیم گل بغیر حرج لہجے میں بولا۔  
 گاؤں در نے کمری مافس لی اور پچھتے ہوئے لائٹ سے بولی ”تم  
 واقعی بہت ضدی فوجی ہو۔“  
 ”بعض معاملات میں ضدی ہونا انسانیت کے حق میں بھلا ہوتا  
 ہے۔“ رحیم گل نے جواب دیا۔  
 ”آرام سے بیٹھ جاؤ اور تمہیں چھی کر دو۔ معزز اور بڑے لوگ  
 عجمین معاملات کو بھی آرام سے چن کر مہذبانہ ماحول میں طے کیا  
 کرتے ہیں گاؤں در کے لہجے میں لائٹ برقرار تھی۔

کے تھے اور ہم چاروں ہمیں سنبھالے الٹ کھڑے تھے ایک کھڑے کے لیے میں نے اپنے آپ کو سخت محسوس کیا۔ ہم نہایت مطمئن اور بے پروا نظر آ رہے تھے جب کہ قانون کے خلاف اپنے اعصاب پر بے پناہ ہوجھ لیے کھڑے تھے۔

"آخری بیٹھ جانے میں کیا حرج ہے؟" گاڈمر نے ایک بارہم ملانے سے پوچھا۔

"آخر تم کیوں ہمیں بٹھانے پر تکی ہوئی ہو؟ ہم کر رہے ہیں کھڑے ہیں۔ ایکشن میں تو نہیں کھڑے۔ کہ ہمیں بٹھانا ضروری نظر نہیں آتا ضروری ہو گیا ہے؟" رحیم گل بھی ویسی ہی ملانے سے بولا۔

گاڈمر نے اپنے پہلوؤں جیسے کندھے اُچکائے اور سگارا مزید ایک کش لے کر بولی "اصل میں تمہارا قصور نہیں۔ تم ذکر پیش لوگوں کو کھڑے رہنے کی کچھ زیادہ ہی عادت ہوئی ہے۔ میں چاہتی تھی ہم سب معزز لوگوں کی طرح آرام و سکون سے بیٹھ کر بات چیت کریں اور اس مسئلے کو حل کریں۔"

"تمہارے خیال میں یہاں کون سا مسئلہ ہے جو حل طلب ہے؟" رحیم گل نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا واحد مسئلہ تو اس وقت صرف تم ہو گاڈمر نے سوال کوئی سے کہا "اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس ایک ایک وائٹ کو گرفتار کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے اور اس سے ہمیں کیا حاصل ہو گا؟"

رحیم گل نے جھگڑے انداز میں کمری سانس لی "اگر ہمیں قانون "اخلاقیات اور معاشرتی نظام کے بارے میں ذرا سا بھی شعور ہے تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ پولیس کا ٹھکے کیوں بنایا گیا ہے اور وہ مجرموں کو کیوں پکڑتا ہے؟"

گاڈمر نے ایک لمحے کے لیے سر جھکایا اور سگارا اگلے میں چھاتے ہوئے غور سے دیکھتی رہی پھر سر اٹھا کر کمری سانس لے کر بولی "بعض پولیس افسر جرح جوائی میں پولیس کے ٹھکے میں آتے ہیں تو ان کے دماغوں میں اس قسم کے مت سے خناس ہوتے ہیں وہ معاشرے کی اصلاح... قانون کی سربلندی... اور اس طرح کی دوسری نہ جانے کیا کیا خواب و خیال کی باتیں دہراتے رہتے ہیں لیکن بعد میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک کی کان میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ انہیں پتا چل جاتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔"

"لیکن بعض "ٹھیک" نہیں بھی ہوتے" رحیم گل نے لہجہ ڈالا۔

گاڈمر کو اس کی بات سے بغیر سلسلہ نظام جاری رکھتے ہوئے بولے "آئیڈیل ازم کا شکار لوگ اب بہت کم پائے جاتے ہیں۔ روز ان کی تعداد کم ہوئی جا رہی ہے۔ آج کی سوسائٹی میں وہ گتے ہیں۔ ان کی اپنی اولاد بھی انہیں گالیاں دیتی ہیں۔ زیادہ صاحب اولاد ہونے سے پہلے ہی آئیڈیل ازم کے دورے سے

"میں زیادہ بڑا اور زیادہ معزز آدمی نہیں ہوں" رحیم گل تدریس رکھائی سے بولا "ایک معمولی سا انشپکٹر ہوں۔ اس علاقے کے قحطی کا انجمن ہوں، محض ایک انشپکٹر ہاؤس آفیسر۔ ایس ایچ او۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے تمہارا بیٹا مجھے میری اوقات یاد دلایا تھا ہے۔"

"جس وائٹ کی باتوں کا برا نہیں منانا چاہیے۔ یہ بڑا جذباتی بچہ ہے" گاڈمر نے پیار بھری سرزنش کے انداز میں کہا۔

اس کا چالیس سالہ بن سانس تھا "بچہ" ذرا متہ پھلا کر بولا "اما! اب آپ مجھے دوسرے کے سامنے ڈی کر لیتے مت کیجئے گا۔ خاص طور پر اس انشپکٹر کے سامنے۔" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں سے رحیم گل کی طرف اشارہ کیا۔

"زیادہ جیس جیس مت کرو اور خاموشی سے بیٹھ جاؤ" گاڈمر نے اسے پیار سے ڈانٹا اور وہ ذرا دھمکے دھمکے انداز میں... مگر سر حال سعادت مندی سے بیٹھ گیا۔

گاڈمر ہم سب سے مخاطب ہوئی "تم لوگ بھی بیٹھ جاؤ۔" "ہم یہاں بیٹھنے نہیں آتے ہیں" رحیم گل نے گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم اپنے لاڈلے بچے کو میرے ساتھ روانہ کرو۔" میں یہاں مزید وقت ضائع کرنا اور فوراً نہیں کر سکتا۔

"اگر ضروری ہو تو وائٹ تمہارے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے" گاڈمر نے گویا اسے قہقہہ دی اور اپنے لیے سے لیاوے کی بجی سیج میں ہاتھ ڈالا۔ فوراً ہم چاروں کی نگاہیں رخ اس کی طرف ہو گیا۔ اس عورت سے کچھ بعید نہیں تھا کہ ہم لوگوں کی ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس بھاری بھر کم لیاوے کی اس زنجیل نما جیب سے کوئی ٹی بی یا ڈونر وغیرہ نکالتی اور پہلے ہم چاروں کو لٹکا کر دیتی۔ وہ جہات کی نسل سے معلوم ہوتی تھی۔

اس نے ہمارے انداز پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کا ڈبل روٹی نما ہاتھ باہر تھا تو اس میں ایک سگارا اور طلائی لائٹریک وقت دیا ہوا تھا۔ مجھ سمیت شاید چاروں نے غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی تھی۔ میں نے اپنی گن کا رخ ایک بار پھر باہر کی طرف کر لیا۔ میں دواؤں کے کی اوٹ سے باہر نظر رکھے ہوئے تھا۔ باہر سے ہونے والی ہر قسم کی بلیکار کو دیکھنا میرے ذمے تھا لیکن باہر اب سکون تھا۔ کسی بلیکار کے کوئی آثار نہیں تھے۔

گاڈمر نے نہایت مشاطی سے سگاری کی سیلفین انار کر پھینکی۔

وائٹوں سے ایک سراقہ ڈکر "تمہ" کر کے ایک طرف پھینکا اور خوبصورت لائٹ سے اسے شکار کر طویل کش لیا۔ میں نے سگارا پینے والی ایک آدھ عورت زندگی میں اور دیکھی تھی لیکن ایسی ماں اور بیٹا زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے جو دونوں ہی سگارا پیتے تھے۔

طویل کش لینے کے بعد گاڈمر اطمینان سے ایک سوٹے پر ٹانگ پر ٹانگ کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ماں بیٹا شاہانہ انداز میں بیٹھ

”اپنی دانست میں تو میں ہر کام ہی بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہوں“ رحیم گل نے جواب دیا۔

”تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ آدمی کو گرفتار کر لیتا اور بات ہے۔ اس کے جرم کو ثابت کرنا اور بات؟“ وہ نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے، ملکہ عالیہ! رحیم گل بظاہر منہ دانت لیکن درحقیقت اس پر ایسے انداز میں گردن کو فہم دیتے ہوئے بولا۔

”فواد کامیڈین بننے کی ضرورت نہیں“ پیر دانش غریبا۔ گاؤدر نے ایک بار پھر اسے پار پھرے انداز میں ڈانٹا، انہیں نے جنہیں خاموش رہنے کے لیے گتا تھا۔ یہ معاملات تمہارے بولنے کے نہیں ہیں۔ ان میں صرف مجھے ہی بولنے دو۔“

پیر دانش خوشخوار نظروں سے رحیم گل کو گھور کر کہہ گیا۔ گاؤدر دوبارہ رحیم گل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی، ”انرا بات کی فہم نہ تم بہت ہی تیار ہے ہو۔ تم نے یقیناً خاطر خواہ ثبوت جمع کر لیے ہوں گے؟“

”ظاہر ہے“ رحیم گل بولا، ”میں آئیل یسٹ ضرور ہوں لیکن احمق نہیں ہوں۔ دوسرے ثبوت تو اپنی جگہ ہیں لیکن میرے پاس تو ایک چٹا پھرتا زندہ سلامت ثبوت بھی موجود ہے۔ آخر مجھے یوٹی تو تمہارے جیتے بڑے کی گرفتاری کا وارنٹ نہیں مل گیا۔ اس نے اپنی جیب میں تھپائی جس میں وہ وارنٹ واپس رکھ چکا تھا اور جسے کسی نے بھی ایک نظر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ صرف مجھے معلوم تھا کہ وہ وارنٹ جعلی تھا۔ وہ رحیم گل کی اپنی کارگیری تھی۔ اس کا کتا تھا کہ پیر دانش جیسے آدمیوں سے منٹنے کے لیے ہر حربہ جائز تھا۔“

”چٹا پھرتا۔ زندہ سلامت ثبوت۔! گاؤدر نے ذہن پر لایا۔ میرے خیال میں رحیم گل کو اس صورت حال میں بھی اپنی زبان اور اپنے اوصاف پر بڑا قابو تھا لیکن یہ بیٹے پھرتے اور زندہ سلامت ثبوت والی بات وہ نواہ خواہی کر گیا تھا۔ یہ ایک غیر ضروری بات تھی لیکن جہاں تک بک فوادہ ہوتی ہے وہاں کوئی نہ کوئی غیر ضروری بات، ہر حال زبان سے نکل ہی جاتی ہے۔

پیر دانش اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر بے تاب ہو کر چلا یا، ”میں سمجھ گیا ہوں یہ سب اس حرامزادے افضل چوہدری کی بد معاشی ہے۔ تم بھی اسی کے بل بوتے پر زیادہ اکر رہے ہو۔ مجھے بتا چلا ہے تمہاری اس سے دوستی ہے۔“ وہ رحیم گل سے مخاطب تھا پھر اس نے افضل چوہدری کو دو چین اور موٹی موٹی گالیاں دیں۔ مجھے فہم نہ تو بہت آیا۔ دل چاہا کہ گن کی نال اس کی پیشی پر رکھ کر اس کی کمر بڑی اڑا دوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اس وقت افضل چوہدری میں سب انیسٹر نصیر تھا۔ افضل چوہدری کو گالیاں پڑتے سن کر مہر کرنا ہی میرے لیے بہتر تھا۔

رحیم گل نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نظروں ستور پر

بھارا رہا لیکن ہیں۔ ہماری بد قسمتی ہے کہ تم اس زمانے میں ہم سے لڑنے کو سب سے پہلے یہ دودھ پڑا ہوا ہے۔“

”اے۔ یہ تو ٹھیک ہے“ رحیم گل نے تائید کی ”یہ تمہاری بد قسمتی ہے۔ لیکن میرا عقائد اور دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ تمہیں زیادہ بلدیادی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ابھی تمہیں ملازمت کرتے ہوئے بعد آٹھ دن نہیں ہوئے ہوں گے اور تم نے اتنے بڑے بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا“ گاؤدر ترم آمیز نظروں سے رحیم گل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میری ملازمت سات سال پرانی ہو چکی ہے“ رحیم گل نے اسے مطلع کیا، ”اور میری اپنی پیشی ایسے ہی لوگوں پر ہاتھ ڈالنا ہے جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ مادر پدر آزاد ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ میں ایسے ہی لوگوں کو پکڑ کر بد حالی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ اسی لیے ابھی تک صرف انیسٹر ہوں۔ پبلک ہراس کیشن کے قہود میں ڈی ایس پی بھرتی ہوا تھا۔ اب تک مجھے نہیں لیا ہوا جانا چاہیے تھا لیکن میں اپنی دانستاری کے ”فٹاس“ دوڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کے شوق کی وجہ سے ڈیوٹ ہو کر لپکڑا گیا ہوں۔ پولیس کے محکمے میں اس قسم کی مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔“

گاؤدر نے گہرا اس کی بات ہے واقعی دلی طور پر محکوم ہوتے ہوئے ایک بار آہنگ قہقہہ لگایا۔ پیر دانش بھی مسکراتے ہوئے بول اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی عجیب مخلوق کے قہارے سے محکوم ہوا ہو۔

گاؤدر کی غبی قسمی تو وہ بولی ”پھر تو تمہاری بیماری کافی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو کس تم ترقی کرتے کرتے کاٹھنیل ڈال دیتے ہیں گاؤ۔“

”میں اس حیثیت میں بھی جو کچھ کر سکا کرتا رہوں گا“ رحیم گل بولا۔

”حق نہیں آتا کہ تم جیسے پاگل آج کے دور میں بھی پائے جاتے ہیں“ گاؤدر نے متاثرانہ انداز میں سر ہلایا، ”نہ صرف پائے جاتے ہیں بلکہ مختلف محکموں میں بھی محسوس آتے ہیں۔“

”یہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے“ رحیم گل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مجھے اب تم ہمارے گلے پڑی گئے ہو تو میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہوں گا۔“ گاؤدر کے لیے میں یکدم ہی سرد مری اور جھکلیں ہلک آئے۔ چند لمحوں کے لیے اس کے لیے میں جو خوشگوار سی قہقہہ تھی وہ اب اس کی جانب ہو گئی، ”تم جیسے احمق اور کوئی کارنامہ کر کر دے گا تو میں لوگوں سے بولی تو کسی بھی حماقت کی توقع رکھنا جاسکتی ہے لیکن مجھے یقین ہے دانش پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ تم نے پھر بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہو گا؟“

دانش پر بھی رہی اور وہ مسکراتے ہوئے بولا "تمہاری موتی گالیاں  
موت دو۔ عین ممکن ہے اس تک پہنچ جائیں۔"  
"تمہاری بچھاؤ گئے۔ اور کون بچائے گا؟" پیر دانش جل کر بولا  
"بلکہ عین ممکن ہے تم نے اپنی جیبوں میں کچھ الٹیں ایک نکالت  
پھپھار کے ہوں جن کی مدد سے وہ یہ ساری کارروائی اپنے دفتر میں  
بیٹھنا شروع رہا ہو۔"

"اس قسم کی بتائیاں تمہیں لاحق ہیں۔ میں اسے تردد میں  
نہیں دیتا۔" رحیم گل منہ بنا کر بولا "وہیے بھی افضل سے میرے  
ایسے تعلقات نہیں ہیں کہ میں اسے اپنے فرائض میں مانگ  
اڑاؤں گا موقوف دوں لیکن اگر تم اس سے الجھو گے۔ یا الجھ چکے  
ہو۔ یا اس کے پاس تمہارے خلاف کوئی کارآمد ثبوت ہو تو میں  
اسے بھی عدالت میں لاؤں گی کو خوش ضرور کروں گا۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "وہیے تم ہو تو بڑی جتنی  
قسم کی مخلوق۔ اس قابل تو نہیں ہو کہ تمہیں کوئی دوستانہ یا  
غلطانہ مشورہ دیا جائے۔ اس کے باوجود میں تمہیں مشورہ دے  
رہا ہوں کہ تم افضل چوہدری سے نہ الجھنا۔ تم جتنے لوگوں سے الجھ  
چکے ہو اور جتنی چیزوں میں تمہاری مانگ پھنسی ہوئی ہے اتنا ہی کافی  
ہے۔ یہی سب کچھ تمہیں چاہی کے پسند سے تک پہنچا رہے گا۔"

پیر دانش نے اس کی بات سے خوفزدہ یا فکر مند ہونے کے  
بجائے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور خوشدلی سے بولا "جب چاہی  
کے تختے پر چھٹائی گھسرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کیا  
کرسے اور کیا نہ کرسے۔ جب مرنا ہی مقدر ہو تو پھر دل کے انسان  
نگال کر مرنا چاہیے۔"

"تم جیسے تمام ٹیڑھے داغ والوں اور ایسی فطرت رکھنے  
والوں کی یہ ذہانت ہوتی ہے کہ جب مرنا ہی ہے تو دنیا کو زیادہ سے  
زیادہ نقصان پہنچا کر مرے۔ حالانکہ انسان یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ  
موت تو مقدر ہو ہی چکی ہے۔ آخری لمحوں میں ہی دو چار نیکیاں کرلی  
جائیں۔ شاید گناہوں کا بوجھ دلی دہشت کم ہی ہو جائے لیکن تم جیسے  
لوگوں کا چونکہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں ہوتا اس لیے مرتے  
مرتے بھی دنیا میں زیادہ سے زیادہ شر پھیلا کر مرنا چاہتے ہو۔ اسی  
لئے میری خوش ہوتی ہے کہ تم جیسے لوگوں کو جتنی بھی جلد ممکن  
ہو سکے دوسری دنیا کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ تم جیسے لوگ جتنی  
جلدی چشم رسید ہوتے ہیں دنیا میں خدا کو ہونے کی امید اتنی ہی  
قوی ہوتی ہے۔"

"اے مولوی صاحب! گاؤں نے استہزائیہ انداز میں اسے  
اپنی طرف متوجہ کیا۔ "تم یہاں دانش کو گرفتار کرنے کا شوق پورا  
کرنے آئے تھے موقوف لٹنے ہی تم نے وہ خط شروع کر دیا۔ مجھے نہیں  
معلوم تھا تمہارے بغیر داغی کے چہرے کے پیچھے کوئی مولوی چھپا  
ہوا ہے۔"  
"میں مولوی کہاں ہو سکتا ہوں۔ میں تو بہت گناہ کار سا انسان

ہوں۔ پیر دانش کو گرفتار کرنے کا بھی مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔  
اس کے اعمال اور میرے فرض کا تقاضا ہے کہ میں اسے گرفتار  
کرنے کے عدالت میں پیش کروں۔" رحیم گل نے غایت حجاز  
و تارسے جواب دیا۔  
"میں تو پھر اصل موضوع پر بات جاری رکھوں۔ اور اگر تم  
کی کیا ضرورت ہے؟" گاؤں بولا۔

"بات آخر تک تک جاری رہے گی؟" رحیم گل کی قدر  
بجاری سے بولا "مجھے مجبور مت کہو کہ میں تمہارے اس جتنے  
کو گرفتار نہ کر کے پکڑ کر گھٹینا ہوا لے جاؤں۔ یا تمہیں بہت پرہیز  
اب تم اسے لایا یا پھر دے کر میرے ساتھ بھیج دیو۔"

گرمیاں پکڑ کر گھٹینے کی بات پر گاؤں اور پیر دانش دونوں  
رنگت ایک لمحے کے لیے حیرت ہوئی لیکن پیر دانش کچھ نہیں  
گاؤں پر بھی نرم لہجے میں بولی "لالی باپ میں اسے نہیں۔ تم  
دعا چاہتی ہوں۔ دیکھو۔ ہم اس موضوع پر کتنی زاموں سے  
کر چکے ہیں۔ اب ایک اور زاویے سے بھی بات کر لیتے ہیں۔  
اگر روپے پیسے کا ہے تو اس کے لیے اتنے گناہ پورا کی ضرورت  
نہیں۔ آرام سے بیٹھ کر سیدھی طرح بات ہو سکتی ہے۔"

"وہ۔۔۔ میرے خدا! رحیم گل نے ایک لمبی سانس  
لی۔ اس کے تھے ہوئے کندھے ایک لمحے کے لیے ڈھیلے  
"جس موضوع سے میں چٹا چاہتا تھا" آخر کار تم اسے کچھ گاؤں  
لے ہی آئیں۔"

"بہاں پورس ہوگی وہاں روپے پیسے کی بات تو ہوگی؟"

بولی۔  
"لیکن جہاں رحیم گل ہو گا وہاں روپے پیسے کی بات  
ہوگی" رحیم گل کے الفاظ کو پھر پھر لکیرتے رحیم گل کی باتوں  
اس وقت مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس میں بہلا  
گامی تھی۔ شاید اسی لیے میری اس سے اتنی گہری دلچسپی  
ہو چکی تھی۔ اس کے اور میرے انکار و نفی کے بعد ملے تھے  
دونوں گناہ کار سے انسان ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر خود کو  
انسانیت کو زندہ رکھنے کے لیے کوشاں تھے۔

"تو کچھ نہ کہہ گاؤں کے لیے جو ایک دن وقت لگا  
الٹا بھی تھی اور ہمیں یہ دھمکی بھی۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں اتنی جلدی کر کے  
کرخص اس لیے آیا ہوں کہ تمہاں بیٹے کے ساتھ اتنی دیر  
کرنے کے بعد رقم لے کر بے شرموں کی طرح رخصت ہو جاؤں  
رحیم گل گیا اس کی ذہنیت پر خرس کھاتے ہوئے بولا۔

"اس قسم کے اہتمام اور انتظام صرف اپنی قیمت  
کے لیے ہوتے ہیں" گاؤں در اطمینان سے بولی "تم اپنی اپنی  
مذہبی قیمت دی جا رہے گی۔ ہم تو پہلے ہی ہدیہ صاحب  
تمہاری خدمت کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔"

تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔ دانش کے حواس میں لے جانے کی خبر نہیں میں نہیں آئی چاہیے گاؤں در گھرے گھرے لیے میں ہوں۔ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بیان کوئی سوادہی نہیں ہوتا تو تم میں اپنا شرائط نامہ لکھوانے پر تکی ہوئی ہو۔ میں تم لوگوں سے بھولے سامی مرتے کا لحاظ کرتے ہوئے کافی وقت ضائع کر چکا ہوں لیکن مجھے مجبور نہ کہہ کہ تمہارے اس جہل پر کو عادی مجرموں کی طرح ہی گھبرائی ہو اے چلوں۔ اس سے کہو کہ اب اٹھ کر میرے ساتھ چلو۔" رجم گل نے گن کو حرکت دی۔

گاؤں در کے سکون اور چل میں اب بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی گفت سے ہوئی "آخری بار سوچ لو انگریز اقامت اپنے گھر کے آخری آدمی نہیں ہو۔ تم سے اوپر۔ اوپر بہت اور تک لوگ ہوتے ہیں۔ اور ان سب کو تمہاری طرح انسانی بننے کا حق نہیں ہوتا۔ پچھلے دنوں ہمیں قسم میں تم جیسا ایک انسانی آدمی ملا تھا۔ ہمارا ایک کام چھنا ہوا تھا۔ ہم نے ایک نئی سرسبز کی چاہاں اس کے سامنے رکھی اور اس سے کہا "پارے افسر! صرف ایک ہزار روپے میں یہ سرسبز تمہاری ہوئی۔ سو کہہ جاؤں گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نہیں مانے گا تو ہمارا کام کارے گا۔ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے سرسبز ایک ہزار روپے میں نہیں لے۔ اس کے بڑے افسر نے دو ہزار میں لے لے۔"

ایک سیکنڈ کا وقفہ دے کر گاؤں در نے حمایت ہی نرمی اور شفقت سے پوچھا "کیا تم بھی ایسے ہی کسی قہرے کا کردار بننا چاہتے ہو جس کا انجام اتنا المیہ ناک ہو؟"

"اس میں المیہ ناک کردار چھوٹے افسر کا نہیں بڑے افسر کا ہے۔" رجم گل اطمینان سے بولا "اس قسم کے تو بیسیوں قہرے روزانہ میرے ظلم میں آتے رہتے ہیں لیکن میں نے ان سے متاثر ہو کر تو آج تک اپنی دوش نہیں ہلای۔"

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ الفاظ پر ذرا زور دیتے ہوئے بولا "ایک بات اور یاد رکھنا خاتون بائیں حصے کے لحاظ سے ضرور چھوٹا افسر ہوں لیکن اوقات کے لحاظ سے چھوٹا نہیں ہوں۔ میرے بارے میں جب بھی کہہ کرنے لگو بہت سوچ سمجھ کر کہنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں اس پر پچھتائے کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

پھر وہ دانش کی طرف مڑتے ہوئے یہی طرح کر گیا "چلو دانشو"

اس کے لیے اور انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ دانش شاید غیر ارادی طور پر اوجھل کر اٹھ کھڑا ہو۔ اس نے اسکول کے کسی بچے کی طرح ہاں سے پوچھا "اما! چلا جاؤں؟"

گاؤں در نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر سر ہلا کر کہی "ہاں۔ چلو جاؤ۔ ایک رات کے لیے انگریز کے صمان نہ لو۔ یہ بھی کیا یاد کہے گا۔ صبح تک تم کمرہ جاؤ گے۔"

پھر وہ رجم گل سے مخاطب ہوئی "میرے بچے کو کوئی تکلیف

نہ آئی قیمت لینا چاہتے ہو تو ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔" ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ محسوس ہوا کہ رجم گل آگے بڑھ کر اس کے منہ پر چھتر سید کر دے گا لیکن اس نے منہ سے کام لیا۔ خود میرے ہاتھ میں بڑی دیر سے کھلی ہوئی تھی لیکن یہاں اتنا بانی اور دھمکا شقی والے حالات نہیں تھے۔ یہاں اگر کوئی مجھ کو شروع ہوا تو کوئی اس ہی چلتی تھی۔ چھتر لا تم اور گھونٹے دینو نہیں۔

"بھئی بھئی مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے۔" رجم گل بڑبڑایا "یہ بلا ہم جیسے لوگ اس طرح کی بات کچھ اس انداز سے کرتے ہیں جیسے انہیں یقین ہو کہ اس دنیا میں ہر انسان بکا ہے۔" "ہاں۔ اس دنیا میں ہر انسان بکا ہے۔" گاؤں در پلا تال ہوئی "نق صرف قیمت کا ہوتا ہے۔ بعض انسان صرف اس لیے پکتنے سے نہ جاتے ہیں کہ ان کی وہ قیمت نہیں لگائی جاتی جو وہ چاہ رہے ہیں۔ قیمت میں تمہاری وہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں جو تمہارے دل میں ہے۔ پھر تو سہی۔"

"چھتر! تو پھر سنو۔ میری قیمت یہ ہے کہ تم اپنی تمام دولت و جائیداد ان لوگوں میں بانٹ کر لاؤ جن میں تقسیم کرو جن کی زندگیوں تمہارے بیٹے کی وجہ سے برباد ہو گئیں یا جو اس کے آثار سے پر تزلزل کر دے گئے۔ مجھے ایک چھتر بھی موت۔ تم دونوں میں بیٹے اپنی تمام دولت و جائیداد ان لوگوں میں بانٹ دو۔ میں یہ دانش کو چھتر دوں گا۔ تم دونوں میں بیٹا خالی ہاتھ بھاڑ کر گئے۔ سب سے زندگی کا آغاز کرو۔" رجم گل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

گاؤں در نے استہزاء سے انداز میں بکا سا قہر لگایا اور آنکھیں میچکے ہوئے سکار کا ایک گمراہی لینے کے بعد بولی "انسانی باتیں مت کہو۔ لیکن میرا خیال ہے میری قیمت فضول ہے۔ تمہارا کہ بیکس ہی اصل میں یہی ہے۔ انسانی آدمی بننے کی کوشش کرنا۔"

"مجھے اس کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑتی۔" رجم گل مسکرایا "میں بتانا ایسا ہی آدمی ہوں جو آج کے دور میں تم جیسے لوگوں کو انسانی لگتا ہے۔"

چھتر۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ ہم انسانی سے آدمی کی انسانی ہی قیمت لگا دیں گے شاید اتنی قیمت آج تک کسی انگریز کی نہیں لگائی گئی ہوگی۔ مگر اب تم اتنے بھی زیادہ انسانی مت بنو کہ ان کی تمام دولت جائیداد نہ جانے کن کن ان دیکھے ان جانے بھڑا کر دینا کہ ان کی باتیں کرنے لگو۔ اگر تمہیں یہ دانش کو یہاں ٹھہر کر دینا کارا نہیں ہے تو تمہیک ہے۔ تم اسے لے جاسکتے ہو۔ تمہارے تمہارے ساتھ بیٹے رہتی ہوں لیکن صبح سے پہلے اے گھر ہوا کھاسیے۔ صبح سے پہلے ہی تمہاری مطلوبہ رقم کا برف کیس

پولیس کے ساتھ ایجنے کی کوشش نہ کرے۔ تم سب کو معلوم ہے کہ ہم قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں اور قانون کے خلاف کام نہیں کرتے۔

ڈرائیو دے میں اور ستونوں کے پیچھے کم از کم پانچ گھنٹہ بردار موجود تھے۔ کوئی بید نہیں تھا کہ ہماری نظروں سے لپٹا کچھ دوسری جگہوں پر بھی مسلح افراد موجود رہے ہوں۔ ہر حال لوگ راستے میں حائل تھے انہوں نے راستہ چھوڑ دیا لیکن ایک شخص بددانش کا کچھ زیادہ سی دوانہ معلوم ہوا تھا۔ وہ چلا آیا "پولیس پیر صاحب کو نہیں لے جا سکتی۔ پولیس کو جو بھی بیان ہے "نہیں لے۔"

اس نے کلا شکوف سیدھی کر لی۔ عین ممکن تھا کہ وہ ابو دھند فارنگ شروع کر دیتا لیکن ہم سب اس طرح ایک دوسرے آڑ میں تھے کہ اگر وہ صرف پولیس والوں کو نشانہ بنانا چاہتا لیکن نہیں تھا۔ پیر دانش اور گاؤں در بھی ضرور گولیوں کی دوا کرتے۔

اگر وہ پیر دانش کا اتنا اندھا عقیدت مند تھا تو یقیناً کوڑھ مارا اور جاہل تھا مگر اتنی عقل اس کی ناکام کھوپڑی میں بھی موجود تھی کہ اس نے اندھا دھند برست نہیں مارا۔ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا اور ایک آواز سیکڑے اس پر پیش لینے میں لگ گیا۔

اتنی دیر میں میں اس کے سر پر پتھر چکا تھا کہ وہ میرے اس کے درمیان ہی فاصلہ سب سے کم تھا۔ میں اب بھی ڈر نہیں چاہتا تھا کیونکہ اگر ایک بار گولی چلا شروع ہو جائی تو یہ زیادہ خرابی کی ہو سکتی تھی۔ وہاں کوئی سورج باندی تو نہیں آئے سانسے کا مقابلہ تھا جو ایک قسم کی خود کشی ہی کے مترادف ہوتا ہے۔ وہ بے بھی ہم کو یہاں رکھاؤ قائم کرنا چاہتے تھے کہ ہم گولی چلائے بغیر پیر دانش کو گرفتار کر کے لے آئے۔ شکل مڑا لے ہو چکا تھا۔ اب ہم جانتے جاتے رہکار ڈر خراب کرنا نہیں چاہتے تھے کہ کم از کم میرا خیال تو یہی تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ گودھا زنگہ دانا میں نے اپنی منہ دایم سے بائیں ہاتھ میں شکل کرتے ہوئے اس کی پٹیلی پر پوری زور سے گھونسا دیکر دیا۔ اس گھونسنے کے پیچھے کیا میری غیلاوت کا کام کر رہی تھی۔ مجھے اب تک اپنی "ملا جیتوں" کے جو ہر ملک کا کوئی خاص موقع نہیں ملا تھا۔ ایک شخص کو کمر کا پٹ باندھ کر ہوش کرنے کے سوا میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔

حالا کہ یہ ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ اسی کام میں اس اور پیر سکون انداز میں ہو گیا تھا۔ رحیم گل کی مدد سے تھی کہ یہ کام کسی شور شرابے اور خون خرابے کے بغیر ہو جائے۔ مجھے بھی اس سے اتفاق تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں نہ ہو کہ بچوں کے تاثرات دیکھ دیکھ کر میرے ہاتھوں میں کھلی تھی حالانکہ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اپنی ننگی موچوں کے

نہیں ہونی چاہیے۔ اسے حالات میں بھی فانیہ اشار ہو گئی جیسا آرام ملتا چاہیے۔ ورنہ ہمیں اس کا بھی نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ " رحیم گل نے کہا اس کی فرمائش سے محفوظ ہوتے ہوئے قہر لگایا "آج کل تو خود فانیہ اشار ہو گئی فانیہ اشار ہو گئی جیسا آرام نہیں ملتا۔ تم حالات میں بانگ رہی ہو۔ آج اگر شیخ چلی زندہ ہوتا تو وہ بھی ایسی فرمائش نہیں کر سکتا تھا۔ تم واقعی بہت دلچسپ قانون ہو۔"

گاؤں در نے اپنا سونا سا پہلا ہونٹ دانتوں سے دبایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ پیر دانش نے غرہ سے انداز میں رحیم گل کے آگے آگے قدم بڑھایا۔ دونوں ہاں بیٹا ہم چاروں کی گلوں کے نرنے میں تھے۔ اس میں شک نہیں تھا کہ دونوں ہاں بیٹے نے اب تک بڑی آکڑوں دکھائی تھی اور ہمیں مرعوب کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ ان کی دھمکیاں کھ کھلی بھی نہیں تھیں۔ وہ انہیں عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری اہلیت رکھتے تھے لیکن اب کچھ یکدم ہی دھڑل ہوا۔ بیٹے کی بہت ٹوٹ کر رہی تھی۔

انہوں نے ہر وہ حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا تھا جو ان کی دانست میں کارگر ہو سکتا تھا۔ اب کیا ایک ہی وہ نتیجہ مجھے سے دکھائی دینے لگے تھے شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا بالائی کسی بالکل ہی سر پرے پولیس والے سے پڑ گیا تھا۔ اگر اس وقت اس کے سامنے ان کا کچھ بس نہیں چل رہا تھا تو بعد میں بھی کسی کوشش کا کامیاب ہونا مشکل ثابت ہو سکتا تھا۔

گاؤں در آگے بڑھتے ہوئے غرہ سے لپے میں بولی "پہلے مجھے باہر نکل کر اپنے آدمیوں کو حکم دینا پڑے گا کہ وہ دانش کو ہمارے ساتھ جانے دیں ورنہ وہ اسے پولیس کے نرنے میں ہرگز کھرے جانے نہیں دیں گے۔ جان کی پروا کیے بغیر بھڑ جائیں گے۔ خواہ خواہ خون خراب ہو گا۔"

"ٹھیک ہے تم دو قدم آگے چل سکتی ہو" رحیم گل نے اسے اجازت دی "لیکن اگر تم واقعی خون خرابے سے بچنا چاہتی ہو تو کوئی ہو شیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔"

گاؤں در نے اسے گھور کر دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ وہ ہم سے پہلے کمرے سے نکلی۔ میں اس کے پیچھے تھا تاہم میں نے اپنی منہ کا رخ اس کی کمری طرف نہیں رکھا تھا۔ باقی تینوں افراد پیر دانش کو گھیرے میں لے میرے پیچھے آ رہے تھے۔

پیر دانش کے آدمی ڈرائیو سے جمع تھے۔ دو تین آدمیوں نے ستونوں کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ ان کے چہروں پر بھی تھی اور وہ ہمیں سنبھالنے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ گاؤں در نے کسی ملکہ کی طرح ہاتھ ہوا میں بند کر کے کیا انہیں غصے سے رعبے کا اشارہ کیا اور یہ "آواز بلند بولی" پیر صاحب ایک مقدمے کے سلسلے میں ضروری بیان دینے کے لیے تھا نے تک جاب ہے ہیں۔ وہ اپنی رضا مندی سے جاب ہے ہیں۔ کوئی ان کا راستہ روکنے یا

ہاں جلد رہنے کی ضرورت تھی۔ دھچکا مٹتی اور ہاتھ پائی سے  
پہنچنے کی کوشش کرتی جا ہیے تھیں لاشعوری جھنجھلاہٹ بہر  
الہی جگہ تھی۔

نہ نہ انا ذور ہاں تھا نہ وہ شخص کرمیرے اندازے  
میں زیادہ دور جا کر اور وہیں ساکت ہو گیا۔ باقی لوگ جو ایک  
لے کے لیے دم بخود ہو گئے تھے کھانکھنوں کا رخ ہماری طرف  
رہے گئے گاؤں میں بھی ایک سیکڑ کے لیے ہر دھڑا ہونے لگی تھی  
بہن وہ فوراً ہی پہنچتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخیں۔ ”خیر دار کوئی  
لانا نہ چلائے۔“

اس کی آواز دودھ اور کرمیرے قہقہے کے لیے کافی تھی۔  
انہوں نے طرف مڑ کر اس کو دیکھا لیکن یہ کچھ ایسا ہی سکوت تھا جیسے  
ب کو کسی بھی لمحے کوئی نہ پہنچنے کی توقع ہو۔

رجیم کل کے چلنے سے قہقہے نے یہ سکوت توڑا۔ وہ گاؤں میں سے  
غائب تھا۔ ”ختم نہ دیکھا۔؟ میرے ساتھ جو لوگ ہیں ان کا ایک  
بک ہاتھ برداشت کرنا بھی ان کرانے کے ٹوٹوں کے بس کی بات  
میں ہے۔ ایک ایک سوٹا کے لیے صرف ایک ایک ہاتھ ہی کافی  
ہے۔“

گاؤں میں سب سے پہلی بولی ”لیکن شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ یہ  
جہ جیوں کی لڑائی کا زمانہ نہیں ہے۔ سچ چلے گی ہوئی صرف  
یک کرلی بڑے سے بڑے پہلوان کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس لیے  
نہ کل ڈھبہ پہلی کا وہ آدمی بھی شہر سے دور ہے جس کے ہاتھ میں گن  
ہے۔ میں اگر جاؤں تو ابھی یہاں تم جاؤں گی کلاشیں لو میں تھوڑی  
نظر آئی مگر میں قانون سے ٹکر لےنا نہیں چاہتی۔“

رجیم کل مسکرایا ”یہ شخص تمہاری خام خیالی ہے کہ یہاں  
صرف ہماری کلاشیں لو میں تھوڑی نظر آئیں گی۔ یہاں جولا میں  
چل پائی جائیں گی ان میں تمہاری اور تمہارے پتے پتے بیٹے کے  
غلطی نہ جانے کتنے مائنڈوں کی کلاشیں بھی شامل ہوں گی۔ میرے  
یہ ساتھی صرف ہاتھ پاؤں چلانے میں ہی نہیں ”گھنٹیں“ چلانے میں  
میں بہر حال تمہارے ان گدھوں سے کہیں زیادہ ماہر ہیں۔ ہم تو  
جان اٹھا رہے ہیں کہ کتنے ہیں۔ ہمیں تو جان کی پروا نہیں۔ اگر تم  
اور تمہارے عزم کے یہ غلام مرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو انہیں کوئی  
چالنے کا حکم دے دو۔“

گاؤں میں جس کا اصل نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا، پھلا  
ہوئے ہاتھوں میں دبائے چند سیکڑ رجیم کل کو گھورتی رہی۔ وہ ایک  
کیس صورت حال تھی۔ سب کی انگلیاں ٹرکروں پر نہیں مگر کوئی  
کل نہیں چلا رہا تھا۔ ہر شخص گویا جتنی ہوتی پر گڑھا تھا۔ جب  
تک دہری پر قہقہے تک زندگی تھی۔ دہری کے نیچے موت نہ  
پانے اس کی خیر تھی۔

جہ جیوں کے آدمیوں کو تو یقیناً موت کی پروا نہیں تھی۔ اس  
کے لوگوں کے کارندے واقعی دہریوں سے مختلف نہیں ہوتے۔

اے آقا کا اشارہ پا کر وہ آنکھیں بند کر کے اندھے کوئیں میں بھی  
چلا گیا۔ لگا کتے ہیں۔ وہ اپنی سوچتے کھنکے کی مٹا سکتی ہے آقا کے  
پاس گرو دی رکھ دیتے ہیں۔ وہ خدا اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا  
چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے چلنے میں ہر فیصلہ ان کا آقا کرتا ہے۔  
چنانچہ ان کا مجھے پتا تھا کہ ان کے لیے کوئی چلانا یا گولی کھانا کوئی  
قابل غور مسئلہ نہیں تھا لیکن گاؤں میں دریا پر دالیں ایک خراش کی  
تخلیف بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اگر وہ اس وقت ہماری  
مکوں کی زد پر نہ ہوتے۔ کسی محفوظ مقام پر ہوتے اور اپنے  
آدمیوں کو حکم دینے کی پوزیشن میں ہوتے تو وہ یقیناً ہم پر گولیوں کی  
برچھا کرانے سے دریغ نہ کرتے ”خارج“ خواہ کچھ بھی ہوتے لیکن  
اس وقت خود ان کی اپنی زندگی واؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے گاؤں  
میں اپنے پتے بڑی احتیاط سے مکمل رہی تھی۔

وہ ہماری سانس کے گویا اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے بولی  
”اس سے پہلے میں نے یہ سنا تھا۔“ ”داشت جواب دے جائے۔ تم  
لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔“

پھر اس نے پیر دالیں کو بچی آواز میں مخاطب کیا ”گھبرا  
مت۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

پیر دالیں مسکرایا اور حیرت انگیز طور پر طمانیت سے بولا ”اس  
میں گھبراہٹ کی کیا بات ہے اما۔“

ہم واقعی جتنی بولی رہی پر چلنے کے سے انداز میں آگے بڑھے۔  
ہمیں ہر طرف نظر رکھنا پڑی تھی۔ گاؤں کے سخت احکامات کے  
باوجود پیر دالیں کا کوئی سر پر انعام اچھا کچھ کر گزرنے کا فیصلہ  
کر سکتا تھا لیکن اب سکوت ہی رہا اور ہم خیریت سے گیت تک  
پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ گیت ہاؤس کے قریب کھڑے ہوئے  
ایک شخص نے گیت کھولا اور رجیم کل، پیر دالیں کو گاڑی میں بٹھا  
کر باہر لے گیا۔ ہم لوگ بعد میں اگلے قدموں چلے ہوئے باہر  
پہنچے۔

انداز گاؤں میں آواز گونجی اور گیت بند ہو گیا۔ وہ گیت تک  
نہیں آئی تھی۔ میں نے دیکھا۔ ”چلے“ کے دھوکوں کوئوں پر پولیس والے  
مکوں کے لیے مستعد کھڑے تھے۔ مجھے معلوم تھا چلنے کے عقب میں بھی  
پولیس فورس موجود رہی ہوگی۔ اگر کم سے راکہ نائی پر انہیں اطلاع  
دی کہ پیر دالیں نے گرفتاری دے دی تھی اس لیے خاصا عزم کیا  
جائے گا۔ ”خدا لوگ واپس روانہ ہو جائیں۔“

ہم گاڑی میں آ بیٹھے۔ سب لوگ جس ترتیب سے آئے تھے۔  
اسی ترتیب سے واپس روانہ ہوئے۔ پیر دالیں اب بالکل خاموش  
تھا تاہم وہ اب بھی بے پروا نظر آنے کی پوری پوری کوشش کر رہا  
تھا۔ گاڑی رجیم کل اب بھی خود راہیہ کر رہا تھا۔ پیر دالیں اس کے  
ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہم تینوں پچھلی سیٹوں پر تھے۔

راستے میں ایک جگہ رجیم کل نے شکل پر گاڑی روکی تو پیر  
دالیں خود کھائی کے سے انداز میں غراہ ”یہ سب اس۔۔۔ افضل کا



کیا دھرا ہے۔

یہ جملہ کئی سوئی سوئی گالیوں سے مرتع تھا۔ میں قدمے حیرت سے سوئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس قسم کے بیرون فقیروں کی عقیدت مند اگر انہیں ایسی کنڈی کنڈی گالیاں دیتے ہیں تو ان کے تاثرات کیا ہوں؟ لیکن میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ ان کی عقیدت و احترام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ہمارے ہاں عقیدوں کا سلسلہ مکمل عیسائی تھا۔ ہر ایک ہارنے عقیدوں کے اوئے سکھاس پر بٹھا دیتے تھے۔ پھر خواہ اسے کچھ بھی کہتے یا کہتے دیکھ لیتے۔ سن لیتے۔ مگر عقیدت میں فرق نہیں آسکتا تھا۔ اذہم عقیدت کی اصطلاح شاید۔ ہمارے ہی لوگوں کو دیکھ کر ایجاد ہوئی تھی۔

مجھے لے پڑی تکلیف کا مقام تھا کہ میں میں بیروانش کے بچے بیٹھا تھا اور دوسری مرتبہ اپنی شان میں قصیدہ خزانہ سن رہا تھا لیکن میں اسے کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ نہ تو عملی طور پر اور نہ ہی لسانی طور پر۔ عجیب ہے کہ کئی قسمی۔ کاش میں اس کی کھوپڑی پر کم از کم ایک ہاتھ تو رسید کری سکتا! انصر صاحب کہ کھوپڑی میں میرے سامنے تھی۔

رجیم گل گویا میری دلجوئی کے لیے بیروانش سے مخاطب ہوا "تمہاری سوئی خواہ تیرا افضل پر ایک کرہ گل ہے۔ تمہارے خلاف یہ کارروائی صرف افضل کی کوشش کی وجہ سے نہیں ہو رہی۔ اب تم بار بار اسے زور و شور سے اس کا نام لے رہے ہو تو شاید میں خود اسے اس کیس میں کھینٹ لادوں اور بطور گواہ اس سے جو بھی بدلہ مل سکے وہ حاصل کر دوں۔ لیکن تمہاری گرفتاری اصل میں کسی اور کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ وہی تمہیں پچاسی کے تختے تک پہنچائے گا۔"

بیروانش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اپنی "عظیم" ماما کی طرح سمجھو گی میں بھی اس کی خود امدادی پر قرار تھی۔ گو کہ اس کا قہقہہ کچھ کھلکا سا تھا لیکن وہ خوفزدہ ہر حال نہیں تھا۔ اس نے گویا مفلوظا ہوتے ہوئے رجیم گل کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولا "تم نے تو واقعی ابھی سے مجھے پچاسی چڑھانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ کیا تم واقعی اسے ہی احمق ہو؟"

"ہاں۔ میں اتنی ہی احمق ہوں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ"

رجیم گل نے تسلیم کیا "تم جیسے لوگ مجھے ایسے امور کو پیش سے احمق ہی کہتے آئے ہیں لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ تم جیسے... مگر محمول پر ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ مجھ جیسے احمق میں ہی ہوتا ہے۔"

"عام طور پر ان احمقوں کا انجام بھی میرے کا ہی ہوتا ہے" بیروانش بولا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کس کا انجام میرے کا ہوتا ہے" رجیم گل بے ہودائی سے بولا۔

"وقت تو جتنا ہے گا سو تائے گا۔ فی الحال تم مجھے یہ بتاؤ کہ کس کے کہنے پر تم آج اچھل رہے ہو؟ جس کی سب سے بھی تو خوفزدہ

دی ہوگی جس کی وجہ سے تم نے آج بڑا قدم اٹھایا ہے؟" بیروانش بولا۔

"ہاں۔ مجھے میرے خیر نے جھکی دی تھی" رجیم گل نے جواب دیا۔

میں بیروانش کا صرف ساٹھ پوز دیکھ رہا تھا۔ اس کو میرے چہرے سے ہی اس کی بد مزگی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

وہ ہزاری سے ہاتھ ہا کر بولا "اما اس قسم کی باتیں میں ہو چکیں۔ اب ٹھیک ٹھیک بات کرو۔ میں نے اور میری والدہ نے تم سے اتفاق کیا ہے۔ تمہارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا۔"

"ہاں۔ اب تو شاید باضمیر پولیس افسروں کو اس بات پر بھی بڑے مجرموں کا شکریہ ادا کرنا پڑا کرے گا کہ انہوں نے مقابلہ کے بغیر گرفتار ہو کر افرایا۔" رجیم گل غصے میں بولا۔

"دیکھو۔ اگر تم اتنے ہی باضمیر اور قانون کے استے ہی دانتدار خانہ ہو تو تمہیں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیے۔" بیروانش غایت لائٹ سے بولا۔ "مجھے کبھی یہ الٹے لے بجز قرار نہیں ملتا ہے اس لیے تمہیں قانون اور اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے مجھے ابھی سے مجرم مجرم کہہ کر مخاطب نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صرف تمہارے اپنے خیالات ہیں اور تمہارے خیالات کا نام قانون نہیں ہے۔"

"درست ہے" رجیم گل نے ہلکا سا تسلیم کیا "مجھ میں یہ خرابی موجود ہے کہ میں زیادہ خبیث لوگوں کے معاملے میں زیادہ جذباتی ہو جاتا ہوں لیکن۔۔۔ چلو۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے عدالت کے فیصلے سے پہلے تمہیں مجرم دیکھو کہ کر مخاطب نہیں کروں گا۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمہیں ہر صاحب کہہ کر مخاطب کروں گا۔ ہاں۔ تو میرے لیے کیا حکم ہے ہر صاحب؟"

بیروانش نے اسے گھورا پھر گویا خود پر غصہ کرتے ہوئے بولا "ایک خرم کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہوتا ہے۔ میں اپنے دفاع کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کس شخص کی شہ پانکرتی تم نے مجھ پر ہاتھ ڈالا ہے۔ مجھے اس کا نام معلوم ہونا چاہیے تاکہ اسی مناسبت سے میں اپنے دفاع کا انتظام کر سکوں۔"

"یہ بھی تمہیں وقت ہی بتائے گا" رجیم گل بظاہر غصہ کرتے لیکن درحقیقت اسے چڑانے والے نیچے میں بولا "مجھ وقت نہیں تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم کس کی وجہ سے پچاسی چڑھ رہے ہو۔"

"میرا یہ پچاسی؟" آخر بیروانش جھپٹایا "کیا تم نے مجھے پچاسی چڑھا دیا؟ آسان کہیں کچھ لیا ہے کہ مجھے کیس کے اچھی تمہارے سامنے بڑا لبا سفر دیا ہے۔ مجھے پچاسی کے پھندے تک کیا۔۔۔ خیال تک پہنچانے میں بھی تمہیں دانتوں پیچے آجائی گئے۔"

"میرا یہ پچاسی؟" آخر بیروانش جھپٹایا "کیا تم نے مجھے پچاسی چڑھا دیا؟ آسان کہیں کچھ لیا ہے کہ مجھے کیس کے اچھی تمہارے سامنے بڑا لبا سفر دیا ہے۔ مجھے پچاسی کے پھندے تک کیا۔۔۔ خیال تک پہنچانے میں بھی تمہیں دانتوں پیچے آجائی گئے۔"

کے بعد بتایا "شاید اس وقت بھی میری میرزہ فون کی کمرنگ ہوگی۔"

"تم نے سفارش کرنے والوں کو کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو کوئی فون من ہی نہیں سکا کیونکہ میں اس وقت قحطانے میں موجود نہیں ہوں۔" اس نے مصموٹ سے جواب دیا "مگر ازم فون کرنے والوں کے لیے تو میں کل تک قحطانے میں موجود ہی نہیں ہوں گا۔ میں باہر کچھ ضروری کارروائیاں میں بے پناہ مصروف ہوں گا۔ اگر غلطی سے میں نے کبھی خودی فون اٹھالیا تو یہ جواب شاید مجھے خود بھی نہ پڑ جائے گا۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "میرزا حال سفارش کرنے والوں کے نام فون کیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے سب بڑے لوگ ہی ہیں۔ سفارش بڑے لوگوں ہی کی جاتی ہے۔ زمر کے سلسلے میں ان سب کو بھی کنگناں کا کہ ان کے اس پیر فرقت سے کیا ملاقات وابستہ تھی۔"

"کل تک گاؤں پر زیادہ تیزی سے حرکت میں آجائے گا۔ یکم اور ڈویریاں بلائے گی۔ شاید پیر دانش کو چھڑانے والے خود پہنچا شروع ہو جائیں۔" ہمیں یقین ہے کہ تم اس دباؤ کا مقابلہ کر کے "میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن مجھے اس سلسلے میں بہت تیزی سے ساری کارروائیاں کرنی ہوں گی ورنہ اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کی ایف آئی آر تو میں کاٹ چکا ہوں۔ اس سے پہلے کہ اس کے دو کیلن کاٹنا جمع ہو کر کوئی شیطانی منصوبہ بنائے "میں اسے عدالت میں پیش کر کے اس کا کام ازم کم پس پندرہ دن کا ریمانڈ لینا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ پرسوں تک مجھے اس کو عدالت میں پیش کرنا پڑے گا۔"

"ہاں۔۔۔ تو پیش کرنا۔ اس میں کیا قیادت ہے؟" میں نے کہا۔

"پیش کرنے میں تو کوئی قیادت نہیں۔ لیکن اس کا ریمانڈ لینے میں مجھے کافی دقت پیش آسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں ظفر جمال کو بھی عدالت میں پیش کروں۔ اس کے تفصیلی بیان کی بنیاد پر مجھے ریمانڈ مل سکا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ گینگ صاحب پیر دانش سے مرعوب نہ ہوں اور صرف قانونی مشورہ نگاہوں میں نہ انہیں بلکہ اس معاملے کو ذرا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر دیکھیں۔"

"اگر تم نے اپنا کیس اچھے طریقے سے پیش کیا تو مجھے امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا" میں نے ایک بے عنوانی خود احمادی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پیر دانش کے لیے جو فون اتنی جلدی آپ کے ہیں ان میں انسانی صاحب کا فون بھی شامل تھا۔"

"کوئی بات نہیں" رحیم گل بے پروائی سے بولا "میرزا کام محنت کرتا ہے۔ نتیجہ میں اوپر والے پر چھوڑنا ہوں۔"

پیر دانش سرگ کی طرف دیکھنے لگا اور چند لمبے خاموشیوں کے بعد دوبارہ رحیم گل کی طرف گردن ہمکاتے ہوئے بولا "میرزا خیال ہے تمہیں میرے خلاف کوئی خاص گواہ میرا لگایا ہے۔ اس کا نام ظفر جمال تو نہیں؟"

میری ریزہ کی پٹی میں ایک سردی لہر دوڑ گئی۔ رحیم گل کو بھی پتہ چلتا تھا کہ ظفر جمال میں مقرب سے صحیح طور پر اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ پیر دانش اس شخص میں تھا۔ اس شخص کو اسے ہاتھ پاؤں نہیں پھیلا سکتے تھے پیر دانش نے پھیلائے ہوئے تھے پھر بھی ہمیں اس سے اتنی دانشمندی کی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال ہے میری طرح رحیم گل کو بھی تو قحطانے میں تھی کہ پیر دانش اتنی جلدی اتنا صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرے گا۔ "ظفر جمال۔۔۔؟" رحیم گل نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا "وہ کون ہے؟"

پیر دانش نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے گھبرانے پر اتفاق کیا۔ رحیم گل ایک سوڑا کانتے ہوئے بولا "تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

"جواب مجھے نہیں۔" ہمیں دینا چاہیے "پیر دانش بولا۔" "مجھے تو معلوم نہیں یہ ظفر جمال کون ہے" رحیم گل بولا "لیکن اب تمہارے منہ سے اس کا نام نکل ہی گیا ہے تو مجھے اسے تلاش کرنا پڑے گا۔ تمہارے سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص تمہارے خلاف بہت کارآمد گواہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اشارہ دینے کا شکریہ۔"

پیر دانش نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور خاموشی سے مزید چند لمبے رحیم گل کو گھور رہا تھا پھر سرگ کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم قحطانے جا پہنچے۔ رحیم گل "پیر دانش کو اپنے ماتحتوں کے گھیرے میں اندر لے گیا۔ میں باہر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ میں صرف پیر دانش کو حراست میں لے جانے تک ہی رحیم گل کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اس سے آگے صورت حال کو وہ خود سنبھال سکتا تھا۔ مجھے اس کی مزید کارروائیوں کو دیکھنے کا جی نہیں تھا۔

میں اب اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن وہ کافی دیر بعد دوبارہ باہر گیا۔ میں پائیس کی گاڑی سے اتر آیا۔ رحیم گل گاڑی کا سارا لپٹے ہوئے بولا "میں نے اسے حالات میں ڈال دیا ہے اور حفاظت کا ٹھیک ٹھاک بندوبست کروا ہے۔"

"جلدی اس کے لیے سفارشی ٹیلی فون آنے شروع ہو جائیں گے" میں نے خیال ظاہر کیا "اب تمہیں سفارشوں کی بیلار اور دوسرے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ٹیلی فون ہمارے پاس پہنچنے سے پہلے ہی آنا شروع ہو چکے ہیں" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے

رجیم گل نے بتایا۔

”لوگوں انصاری صاحب؟“ میں نے جانا چاہا۔

”سلام فرید انصاری صاحب... جن کا ظاہری کاموں کے سلسلے میں بہت اونچا مقام ہے“ رجیم گل نے بتایا۔ ”بہت بڑی ملاتی شخصیت ہیں۔“

”اجھا... وہ!“ میں نے گہری سانس لی ”شعبہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہیرا دانش قسم کے لوگ فلائی انجنوں کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے فراخ دلی سے عطیات دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ ہیرا دانش کو تو شاید اس شعبے کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ملے ورنہ کوئی بھید نہیں تھا کہ وہ خود اپنی کوئی فلائی انجن بنالیتا اور اس میدان میں بھی برنامہ بنالیتا۔ بعض اوقات تو اس قسم کے لوگ ایک طرف کسی سیٹھ وغیرہ کو اگر اکراد کے کوڑے کوڑے کاغذیں وصول کرتے ہیں۔ دوسری طرف اس میں سے تو کچھ کسی فلائی مشین کو بیٹے کے طور پر دے دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے قلم فرید انصاری صاحب بڑے وقت میں ہیرا دانش کے لیے تھوڑے پتھر کر کے آئے ہوں۔ تعاون کے بعد بھی نہ بھی جوابی تعاون کا بھی قیودت آتا ہے نا۔“

”بالہ۔ یہ بات تو ہے۔“ رجیم گل نے تائید میں سر ہلایا ”بہر حال۔ اگر رعایا ضل جاتا ہے تو میرا کام بہت آسان ہو جاتا ہے گا۔ اس دوران کوئی بڑی شخصیت بھی اسے ضمانت پر ربا کرانے کے لیے مداخلت نہیں کرے گی کہ اس میں اس کے گرد فتنہ مضمحل سے کسی دن کا لیکن میں ظفر جمال کو اتنی جلدی عدالت میں پیش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرا رپ کا پتا تھا۔ میں اسے زرا دیر سے کیلینا چاہتا تھا۔“

”ان چکران میں مت پڑو“ میں نے مشورہ دیا ”اگر رعایا لینے کے لیے ظفر جمال کو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کرنا ضروری ہے تو کرو۔ ہمارا مقصد تو صرف ہیرا دانش کو کیڑے کراد تک پہنچانا ہے۔ کوئی کرینٹ لینا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ اس لیے جس طرح بھی اصل مقصد حاصل ہوتا ہے کرو۔“

اس نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا ”تم نے ظفر جمال کو کہاں رکھا ہے؟“

”وہ شہر سے انداز میں سکرایا“ تم سمجھ رہے ہو میں عدالتی میں جس کی بنا دلوں گا؟ میں اتنا غیر حاضر مان نہیں ہوں۔“

”مجھے یہ جاننے کا شوق نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے“ میں نے اسے گھورا ”مجھے صرف اس کی حفاظت کی فکر ہے۔ ہیرا دانش کا شیطانی ذہن اس امکان تک پہنچ چکا ہے کہ ظفر جمال ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔“

”جیسے فکر کرنے کی ضرورت نہیں“ رجیم گل نے مجھے قہقہے

”اے“ وہ جانتی ہی بہت حفاظت سے ہے۔“

”اسے کوہت میں پیش کرتے وقت بھی حفاظتی انتظامات کا

بہت زیادہ خیال رکھنا“ میں نے تاکید کی۔

”یاس۔ اب تم مجھے میرا کام سکھانے کی کوشش مت کرو“ رجیم گل معمولی ہنسی سے بولا ”انا کہ تم نے پولیس کی وردی پہن رکھی ہے لیکن اب اپنے آپ کو بچ چکی ہو پولیس والا مت سمجھنا شروع کرو۔ اور اگر یہ وردی واقعی تمہاری اپنی بھی ہوتی اور تم بچ چکی ہو پولیس والے ہوتے تب بھی اس وردی کے لحاظ سے تم میرے ماتحت ہوتے اور اب تک کم از کم دو تین مرتبہ مجھے سیلوٹ مار چکے ہو۔“

”خدا نہ کہے کہ میں پولیس والا ہوں“ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا پھر میں نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”اب میں چلتا ہوں۔“

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا ”وردی جلد واپس بھجوا دینا۔ اس کا اصل مالک اپنی نہایت پرانی اور کبھی پٹی وردی پہنے اندر بیٹھا بیٹھ کر رہتا ہے۔“

”میں تو خود جلد از جلد اس سے پھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اسے پہن کر تو میرا عجیب عجیب حرکتیں کرنے کوئی چاہ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”جس۔ اب بیکواس مت شروع کرنا“ رجیم گل نے میری بات کاٹتے ہوئے مجھے ڈانٹا۔

پھر میں اپنی کار کے قریب پہنچا تو وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”اس کی طرف تو میں نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ تم کسی عیسیٰ یا کھارا کار میں نہیں آسکتے تھے؟ تمام راستے پولیس کے ہنگے کو بدنام کرتے ہوئے آئے ہو گے اور اب بدنام کرتے ہوئے ہی جاؤ گے یہ وردی پہن کر ایسی گاڑی میں اتنا ضروری نہیں؟ راستے میں تمام دیکھنے والوں نے یہی سوچا ہو گا۔ ذرا دیدہ دلبری دیکھو۔“

انہی ہونے کو کسی دھڑائی سے اتنی شاندار اور جیتی گاڑی میں بیٹھا جا رہا ہے۔ حرام کی کمانی سے خریدی ہوگی۔ مگر اب تو ان لوگوں کو ذرا بھی شرم نہیں رہی۔ حرام کی کمانی سے خریدی ہوئی چیزوں کی سرعام نمائش کرتے ہیں۔ اب ہمیں واپس جانے دیکھ کر بھی لوگ یہی سوچیں گے۔“

”کی تو میں چاہتا تھا“ میں نے اسے چالایا ”میں تو جان بوجھ کر اچھی گاڑی میں آیا تھا“ پھر میں نے لکھڑی سانس لی ”تو جانے گئے پولیس والے ہوں گے جو فواد بڑے افسر نہیں ہوں گے لیکن اس قسم کی گاڑیوں میں گھومنا اور ڈر سکتے ہوں گے۔ یہ دو سی بات ہے کہ فی الحال انہوں نے اپنی خواہش کر دیا رکھا ہو گا اور راز مٹ کا اظہار کر رہے ہوں گے۔“

”بھئی ان پولیس والوں کی بھی بات کیا کہ جو دہانہ مارا تو ان کا

ہی مجھ سے ورنہ نہیں اترا لی شاید تمہیں خیال آیا ہو گا کہ نور  
سوچیں گے پولیس والوں نے اب خود پولیس والوں کے ساتھ بھی  
وہی کام شروع کر دیا جو وہ عام شہروں کے ساتھ کرتے ہیں۔  
”ہم نے کتنی جگہوں پر گتے شہروں کے ساتھ یہ سلوک ہونے  
دیکھا ہے؟“ رحیم گل نے چپکے لیے میں پوچھا۔

”نہ کبھی تو نہیں۔ لیکن سنا ہے“ میں نے جواب دیا۔  
”جی سنا ہی باتوں پر یقین مت کیا کرو۔“ وہ رکھائی سے بولا  
”وردی جلدی واپس بھگا دو۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“  
”وردی کا انتظار کرنے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لو یا۔“ میں  
نے کہا۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔

میں نے وردی پیک کروا کے ایک آدمی کے ہاتھ روانہ کر دی  
اور خود پیچھے آؤش میں گیا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ شفیع شاہ آن  
پہنچا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”مبارک ہو۔ شکار بغیر کسی ہنگامے  
کے ہاتھ آیا۔“

”گاؤنڈر حلقہ تھی۔ اس نے زیادہ ہنگامہ برپا نہیں ہونے دیا۔“  
میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
شفیع شاہ کمرے ہی کمرے بولا ”لیکن وہ ہنگامہ برپا کرنے میں  
آں پہنچی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے ذرا چپکے ہوئے پوچھا۔  
”ہم دوسرے راستے سے آ رہے تھے اتفاق سے ہم نے  
اسے پیر میں ہوئی کی طرف مڑتے دیکھ لیا۔“ شفیع شاہ بتانے لگا  
”ہم نے احتیاطاً اسے پارکنگ لٹ میں ہی روک لیا۔ چار مسلح گارڈ  
اس کے ساتھ ہیں اور وہ ان سمیت آپ کے پاس آ جا رہی ہے۔  
ہمارے آدمیوں نے انہیں گاڑی سے اتارنے نہیں دیا۔ انہوں نے  
گاڑی کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ اب جیسے آپ کہیں ویسے کر لیا  
جائے۔“

”اوہ۔۔۔!“ میں نے ریو لوئنگ چیئر کے پتے سے ٹیک لگائی  
”ایک تو ان لوگوں کو اپنے گاڑی کی نمائش کرنے کا پراشوق ہوتا  
ہے۔ خواہ خواہ راستے میں خوف و ہراس پھیلاتے ہوئے چلے  
ہیں۔“

پھر میں نے اپنی گمن وغیرہ چپک کرتے ہوئے کہا ”ویسے ایک  
بات مانتی پاسکی شفیع شاہ! یہ عورت اس عمر میں بھی بے پناہ ایکٹو  
ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ پیر دانش کی گرفتاری کے بعد اس نے نہ  
جائے کتنے اہم اور ممتاز لوگوں سے رابطہ کر کے ان سے تھانے فون  
بھی کرا لیے اور یہاں بھی تنہی۔ یہ جھکا اس کے لیے قطعی غیر  
متوقع تھا۔ اس کے باوجود اس نے شاید سوچ بچار اور حیرانی پریشانی  
میں ایک لمحہ بھی متاثر نہیں کیا۔“

”اس میں شک نہیں رہے۔ کہ وہ ایک غیر معمولی عورت ہے۔“  
شفیع شاہ نے تسلیم کیا ”آخر میں بھی پردہ کہ پیر دانش کی ایسا کر  
نے کیوں کدھی ہے۔“

کی کوئی لگ جاتی ہے۔۔۔ جن کی یہ اوکں اور بکتے بچوں کو کچھ عرصے  
بعد ان کا اپنا ٹکڑہ بھی نہیں پوچھتا۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”نہ ہی تو فرق ہے تمہاری اور میری عینک میں“ میں نے  
لٹھری سانس لی ”تمہاری عینک سے کچھ اور نظر آتا ہے۔ میری  
عینک سے کچھ اور۔“

”اصل میں ہمارے ہاں ہر ایک نے تعصب کی عینک لگا رکھی  
ہے۔ تعصب کی عینک اتار کر دیکھو تو ہر چیز کے دو پہلو نظر آئیں  
گے ایسا شاید دوسری ہوتا ہے کہ کوئی سو فیصد اچھا ہو۔ اور کوئی  
سو فیصد برا۔ کسی میں اچھائی زیادہ ہو سکتی ہے اور کسی میں برائی  
زیادہ۔“

”اچھا۔ اب میں چلا ہوں“ میں نے اس کی بات کاٹ کر  
کاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔  
”ہیں۔۔۔ گہرا گئے؟“ اس نے ہلکا سا تعجب لگایا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا ”مجھے ہر اہم  
بات سے آگاہ رکھنا۔ خاص طور پر کورٹ میں پیشی کے پروگرام سے  
ضرور قبل از وقت مطلع کرنا۔“ نظر جمال کو پیش کرنے کے باوجود  
اگر جس میں پیر دانش کا ریمانڈ لینے میں دقت پیش آئے تو پھر میں کچھ  
کروں گا۔ اپنا بھی حقوذا بہت اثر رسوخ ہے۔ یہ مجھ کو ایک بار  
قلم میں آیا ہے۔ اب اسے لکھنا نہیں چاہیے۔“

”تم سے زیادہ یہ میری خواہش ہے“ رحیم گل بولا اور میں  
اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

ہوئی پہنچ کر اپنے کمرے میں جا کر میں نے سب سے پہلے  
اپنے میک اپ اور وردی وغیرہ سے چھٹکارا حاصل کیا۔ شاور لینے  
کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور پیچھے آؤش میں جانے کی تیاری  
کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف رحیم گل تھا۔  
”یار۔۔۔ وہ تم نے وردی واپس نہیں بھجوائی؟“ وہ بولا۔

”خدا کی پناہ!“ میں نے حقیقتاً سر ہیٹ لیا ”خدا ہو گئی یا ر  
تمہیں تو وردی کا ہو گا لگ گیا ہے۔ مجھے پتا ہو گا کہ وردی دے کر  
تمہارا یہ حال ہو گا تو میں اپنی ہی سلوا لیتا۔ مجرموں کے منظم قسم کے  
کردوں میں تمہاری وردیاں درجنوں کے حساب سے پائی جاتی  
ہیں۔“

”وہ اور بات ہے۔۔۔ لیکن یہ سو فیصد اصلی وردی ہے“ وہ  
خوشگوار لیے میں بولا ”تمہیں کیا معلوم تمہیں اپنے ماتحت کی وردی  
دے کر اور اس قسم میں پولیس والے کے طور پر شریک کر کے میں  
نے کتنا بڑا رسک لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری عینک نامی اور  
ساکھ پر کوئی حرف آئے۔“

”اتھ صاف کرے“ میں نے لٹھری سانس لی ”ایک تو معلوم  
نہیں تمہیں کس نے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ تمہاری  
کوئی سناکھ بھی ہے اور تم بڑے نیک نام ہو۔ تمہاری بے آملی دیکھ کر  
اب تو میں شکر کر رہا ہوں کہ تم نے وہیں تھا نے کے سامنے بڑک کر

”ہیں ابھی تک اس کا اصل نام معلوم نہیں۔ ہم نے خود اس کا نام گاؤں در رکھا لیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میری معلومات کے مطابق عالمی مصلحتوں میں اسے سز شاہی کر دیا جاتا ہے۔ اصل نام شاید کسی کو بھی معلوم نہیں“ شفیع

شاہ نے اس وقت بھی ہواستان اُخذانہ کئے تھے اسی سز شاہی میں نے جتنے ہوئے کہا جس معاملہ تم جا کر سز شاہی سے کو کر آؤ اور اپنے کوئیل کے ساتھ ہی میرے پاس آنا چاہتی ہیں تو وہ اپنی جھنڈی گاڑی میں ہی رکھ کر آئیں۔ ان پر واضح کر دیا کہ ہمیں ان کی کٹوں کی پروا نہیں ہے لیکن یہ ہوئی کی سیکورٹی کا تقاضا ہے۔ لیاؤں میں چھپی ہوئی چھوٹی جھنڈی لے کر آنا چاہیں تو آجائیں۔ کوئیل کی نمائش کئے ہوئے نہ آئیں۔“

”ٹھیک ہے سر“ شفیع شاہ نے سر ہلایا اور وہ اسی کے لیے مڑا۔ ”میں نے اسے پکارا“ اگر وہ معقولیت کی بات اسنے پکارا، فکر نہ آئے زیادہ وہ بھانڈے کی کوٹھن کرے تو اس پر واضح کر دیا کہ اسے اس کے کوئیل سمیت اٹھا کر باہر فٹ پاتھ پر بیٹھا جاسکتا ہے۔ اور اگر وہ حد سے براحتی فکر اسے تو اپنی اس بات پر عمل بھی کرے دیکھا۔“

شفیع شاہ نے اہمیت میں سر ہلایا اور وہ اسی چلا گیا۔ میں بظاہر برعکاس کام میں مصروف ہو گیا لیکن میری توجہ دو آوازوں کی طرف تھی۔ بڑے بچے میرا ایک ہاتھ کٹ کی جیب میں گھسنے کے دستے پر

کہہ رہے تھے۔ دو آوازوں کا۔ دو آوازہ کھولنے والا شفیع شاہ تھا۔ وہ گاؤں کو اندر آئے گا اشارہ کر رہا تھا۔ گاؤں در ایک چھتی کی طرح ڈھرائی کر رہا تھا۔ ایک ایسی چھتی تھی جس میں کافی دھار اور دھبہ ہو رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے چار آدمی کرے میں داخل ہوئے۔ وہ ٹال ہاتھ ہی تھے۔ ان میں سے دو ایک طرف اور دو دوسری طرف ہمارے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ شفیع شاہ ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے وہ سب پر نظر رکھ سکا تھا۔

”وہ سز شاہی آئے آئے آئے۔“ تقریب رکھیے۔“ میں نے لڑی سے اٹھے بغیر گردن کو ذرا تقصیم سے خم دیتے ہوئے خوش فہمی اور کرمجوشی سے کہا پھر میں نے اپنے مقابل کر کے کی طرف

ٹٹاؤں کیا۔ اس نے کر کے کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ شطہ بار نظروں سے علی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پگڑی ہانک کے تنے میں لٹا ہوا تھا۔ پگڑی کے تنے میں لٹا ہوا تھا۔ اس کے سوز کا کوئی ٹوٹا نہیں ہوئے۔ بدستور خوش خلقی سے پوچھا ”خیریت تو ہے۔“ آپ کی طرف سے کیا ہے۔“

”بھلا یہ کیا اداکاری۔“ وہ ہماری مگر جلی، مضبتاک در تھریا موانہ آواز میں بولی ”آج انجان بننے کی ضرورت نہیں تو اس کے بارے میں ہل ہل کی اطلاعات مل رہی

ہوں گی۔“ میں نے کہا اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے لیے سے مجھے دلی صدمہ پہنچا ہو۔ نام میں نے ملاحت سے کہا ”کیسی خبریں سز شاہی؟“ خیریت تو ہے؟ آپ کہہ آپ سیٹ لگ رہی ہیں۔ خدا نخواستہ کیا یہ صاحب کے بارے میں کوئی بری خبر ہے؟“

”تم سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ اداکاری ہمیں دھوکا دے سکے گی؟“ وہ گرتی ”تم سمجھ رہے ہو کہ ہمیں تمہاری سازش کا اندازہ نہیں؟“

”کیسی سازش سز شاہی؟ آپ کی باتیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں تو کسی۔ اور ذرا دھمک سے مجھے اصل بات بتائیں۔“ میں نے اب بھی ملاحت سے کہا ”آپ کس سازش کا ذکر کر رہی ہیں؟“

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں اور نہ ہی مجھے تمہاری بیعتیہ باتوں سے کوئی دلچسپی ہے۔“ وہ حقارت سے بولی۔

میں نے اپنا تجربہ بدلتے ہوئے اور سرد مری اختیار کرتے ہوئے کہا ”جتنے میری منافقانہ باتوں کو چھوڑ دے۔ آپ کچھ مہمانانہ اور شاہ فرما ہے“

”تم سمجھ رہے ہو کہ تم نے میرے بچے کو گرفتار کروا کے جرات پر لایا ہے۔“

”میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کسی سانس لی تو پھر دانش صاحب گرفتار ہو گئے ہیں۔ اس لیے آپ اتنی برہم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ ابھی یہ خبر اخبارات میں نہیں آئی۔ میری معلومات کا بڑا ذریعہ تو ہیں اخبارات ہی ہیں۔ مگر آپ نے یہ کہیں فرض کر لیا کہ پھر دانش کی گرفتاری سے میرا کوئی تعلق ہے؟ اسے گرفتار کرانے کے لیے تو اس کے اپنے اعمال ہی کافی تھے۔ بے شک مجھے اس کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم تھیں لیکن ابھی تو میں نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔“

”کیوں کر رہے ہو تم۔ مجھے معلوم ہے تم کچھ عرصے سے اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ آخر تم نے اسے جھڑوا کر چھوڑا لیکن جس زیادہ خوش ہونے کی ضرورت تھی۔ پہلی چوٹی پر ہی وہ ٹیل سے باہر ہو گا۔ بشرطیکہ اسے عدالت میں پیش کرنے کی نوبت آئی۔“ وہ بڑے دھڑلے سے بولی پھر اس کے سونے موٹے ہونٹوں پر سٹاکاؤٹ مسکراہٹ نمودار ہوئی ”اس کے بعد تم سے بھی منہ لیں گے تم نے توجہ نہ کیا تھا کہ اب زیادہ تم اپنی خبر مٹاؤ۔“

میں نے کسی سانس لے کر کر کے کے پیچھے سے ٹھک لگاتے ہوئے کہا ”آجے“ ابھی لا قانون! ابھی در سے میں تم سے منہ نہ اور شائستگی سے بات کرنے کی کوشش کیے جا رہا ہوں لیکن تم یہیانا انہی لوگوں میں سے ہو جنہیں عزت داس نہیں آتی۔ اگر تم نے اسی لیے میں صحتگو جانی رکھی تھی تم کو انوار کا بڑا بیٹا ہے گا۔ حالانکہ جس اٹھانے کے لیے بھی کسی چھوٹی سوتی کرین کی ضرورت پڑے گی لیکن یہ حالت مجھ پر میرے قوی ہی کرین کا کام

بھی کر لیں گے۔

”ٹھیک ہے۔“ جتنی یا اس کے بچے کو گولی مارنے کے بجائے جال ڈال کر پکڑنے کی کوشش کی جائے تو وہ اودھم تو مچائے گی۔ اب دعا گو کہ جال مضبوط ثابت ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ان کے بدلے مل کے لیے تو میں ہر حال میں تیار رہتا ہوں۔“

”اگر آپ اجازت دیں تو میں دو تین خاص آدمیوں کو ساتھ لے کر کچھ عرصہ دور دور سے آپ کی نگرانی کرنا ہوں۔“ شیخ شہزاد نے پوچھا۔

”میں نے ایک لمبے سوچا پھر کہا۔ ”ہاں۔۔۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب تک یہ معاملہ منٹ نہیں جاتا۔“ شیخ شہزاد نے کہا۔

اس کے بعد دوسرے بھی شاید میں لاہور چلا جاؤں۔“

اسی اناٹا میں باہر سے ہمارے آدمیوں نے اطلاع بھجوائی کہ گاڑی در اپنے آدمیوں کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ تب ہم زرا بے فکر ہو کر بیٹھ گئے۔

دوسرے روز دوسرا کورجیم گل نے کھانے سے زرا پہلے پلٹ کر غفور کو موڈ میں مجھے اطلاع دی۔ ”دیکھیں کی ایک بڑی مصروف فرم بیرواٹس کو چلانے کے لیے حرکت میں آئی ہے۔ وہ دو گاڑیوں کے ساتھ آج شیمن کورٹ میں درخواست دائر کی تھی کہ بیرواٹس کو بھیسے جائے۔“

”بھروسہ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ دوسرے سے جتنا قدرت اس نیک کام میں ہماری کچھ مدد کر رہی ہے۔ عام طور پر اس قسم کی درخواستوں پر عدالتیں بالائی کا حکم دے دیتی ہیں لیکن یہ درخواست شیمن کورٹ نے مسترد کر دی۔ میں نے عدالت میں گرفتاری کا پس منظر بتانے کے ساتھ ساتھ دیکھوں کی تقریر پکار کر جواب سے ان کے جیبر میں بھی ملاقات کی تھی۔ سچائی کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے۔ وہ ایک بار پھر دوسرے سے ہنسنا۔ اب کل اسے کورٹ میں پیش کرنا اور رہائشی کی درخواست کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ ایف آئی کر کے بے ہوش کر دینے کی ضرورت ہی تھا۔“ اس نے مزید بتایا۔

”میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ ایف آئی آکر تم نے کس کی طرف سے کالی ہے؟“ میں نے کہا۔

”ظفر بھال کی طرف سے۔“ رجم گل نے جواب دیا۔ ”وہ اس مقدمے کا ڈی اور سب سے بڑا گواہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”کل کتنے بچے کورٹ پہنچ رہے ہو؟“

”ٹھیک آٹھ بیس۔“ رجم گل نے جواب دیا۔ ”بچی خواہ سچی بیس ہو لیکن میں وہاں آٹھ بیس موجود ہونا چاہیے۔“

”مروادو یا۔۔۔!“ میں نے گراہ کر کہا۔ ”آٹھ بیس وہاں پہنچنا مطلب ہے۔“ صبح بہت جلدی اٹھنا پڑے گا۔ یہ تو میں نے پہلے سے ہی بتائی تھی۔“

رجم گل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”خدا کی فوج ارجنہ کا آغا ہوئی ہے اور آپ کی سرطی پر کرا رہے تھے۔“

اس کے حلقوں میں سے ایک نے نیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے اس سے کہیں زیادہ تیزی سے گن گناں کر اس کے سینے کا نشانہ بنیے ہوئے کہا۔ ”میں یا رہے۔“ ایسی کوئی غلطی نہ کرنا۔ یہاں سے تو تمہاری لاش بھی باہر نہیں جاسکے گی۔“

اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ گاڑی روکی۔ ”اپنے گھر پر بھی شیر ہوئی ہے۔“

میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے اور گن گن رہنے ہوئے کہا۔ ”تم جہاں کو میں وہاں چلنے کو تیار ہوں۔“

وہ آنکھیں میچڑتے ہوئے اور دوسرے دوسرے گردن لاتے ہوئے پلٹ کر باہر آجائے وہ پھر ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم کہاں چلنے کو تیار ہو۔“

”تمہارا ذوق اب کھلا ڈالا جو سب سے معاشوں کا ایک بد معاش ہے۔“ اگر ذیل چلائی گیا ہے تو اب اس کے باہر آنے کی امید زرا کم ہی رکھو۔ اب شاید اس کی روحانی طاقت بھی اسے باہر نہ لاسکے۔“ میں نے کہا۔

”کہا۔۔۔ میں قریب ہی کہہ رہی تھی کہ اس کا ردوائی کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔“ بھی تو تم یہ بات اتنے یقین سے کہہ رہے ہو۔ وہ تیزی سے بولی۔

”میرا پہلے تو اس کا ردوائی میں کوئی ہاتھ پاؤں دیکھ نہیں تھا لیکن اب تمہارے مدد سے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس معاملے میں ضرور ٹانگ اڑاؤں۔ میرے پاس بھی تمہارے اس ”معموم“ بچے کے بارے میں کچھ مواد موجود ہے جو میں عدالت میں پیش کروں گا۔ تم میں طاقت ہو تو مجھے روک لینا۔“ میں نے کہا۔

”ہم کسی کو بھی نہیں روکیں گے۔“ وہ حقارت سے بولی۔ ”تم سب بے شک اگلے نکل جاؤ۔ تم دائیں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔“

”کیا صرف یہی بتانے کے لیے تم نے اتنی دور آنے کی زحمت کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ میں صرف یہی بتانے آئی تھی۔“ وہ ہاں ہی بخ کر بولی اور اپنے آدمیوں کو وہاں ہی کا اشارہ کرتے ہوئے دواڑے کی طرف مڑ گئی۔ میں اور شیخ شاہ خاموشی سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ شیخ شاہ کے دونوں ہاتھ اب تک بندوں میں تھے جو دوسرے دوسرے باہر آ گئے۔

”چس۔۔۔ چس۔۔۔ چس۔۔۔“ وہ نرم آہر لے کر بولا۔ ”اس صدمے نے بے چاری کے پیروں سے زمین نکال دی ہے۔“

”اسل میں انہوں نے کسی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ ان کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے شیخ شاہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اور جی ہاں یہ ہے کہ رجم گل کی ”خردائی“ کے بشیرے ممکن بھی نہیں تھا۔“

”یہ جتنی برا انسان پائے گی۔“ شیخ شاہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

شاید اس کا اپنا اثر و رسوخ بھی کام کر رہا تھا اور شاید اسی وجہ سے بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس معاملے کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہو۔

لینڈ کروڈز کے پیچھے پیچھے ایک بہت بڑی ٹیلی گاڑی لے آئی تھی۔ اس ٹرین لیا اور گھر کھڑائی ہوئی قریب آ کر۔ اس قسم کی گاڑی قیدیوں کو لانے کے جانے میں استعمال ہوتی تھی۔ لیکن ان کی حالت تباہ نظر آتی تھی جب کہ یہ گاڑی تقریباً اسی دور سے تھی۔ یہ گاڑیوں طرف سے بند تھی اور عمل طور پر پلٹ ہدف معلوم ہوتی تھی۔ اس کی دھڑا اسکرین تک کے پیچھے اسٹیکل کی موٹی خاکی مائل لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک پولیس سبائل بھی تھی۔

پلٹ ہدف گاڑی کا دواڑہ پیچھے کی طرف تھا جسے میں اپنی گاڑی میں بیٹھے نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم میں گاڑی سے نہیں اترتا۔ رجیم کل نے میری گاڑی دیکھی تاہم اس نے اپنی الحال مجھ سے لے کر قریب آنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ پولیس والوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ پیراڈائن مسلح پولیس والوں کے رٹے میں تھا۔ مجھے توقع تھی کہ آج ضرور کوئی کورٹ روبرو اسے دیکھ لے گا اور شاید تمام ترہیں پر وہ کوششوں کے باوجود کل تک اس کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں آنے سے نہ رک سکے۔

رجیم کل کی ہدایات پر پلٹ ہدف گاڑی کا پچھلا دواڑہ کھلا گیا اور میں نے مسلح و مستعد پولیس والوں کے کھیرے میں غفر حال کو آگے آتے دیکھا۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ رجیم کل نے اسے کہاں رکھا ہوا تھا۔ اس نے یقیناً اسے جیل میں رکھا ہوا تھا۔ شاید اس کے لیے وہی محفوظ جگہ تھی۔ تاہم وہ بالکل تازہ دم اور مطمئن سرور نظر آ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا خیر مطمئن تھا۔ وہ نہایت پر اعتماد و افسانہ پرانے آدمی تھا۔ پیراڈائن کے قریب آ کر۔

دونوں مسلح پولیس والوں کے الگ الگ کھیرے میں تھے۔ اس لیے دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ میں دونوں کے اثرات صاف دیکھ سکتا تھا۔ غفر حال کے چہرے پر قدرے غم و غصہ اور عقارت تھی۔ شاید آج وہ پہلی بار اپنے آپ کو پیراڈائن سے ہر محسوس کر رہا تھا۔ پیراڈائن کا چہرہ ساٹھا تھا لیکن وہ پلک جھپکے بغیر غفر حال کو گھور رہا تھا۔

پھر اچانک یوں دیکھیے غفر حال پیراڈائن کی نظروں کی تاب نہ لا کر لاکڑا کر گر رہا ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں پیراڈائن کی نظر کا کوئی کمال نہیں تھا۔ غفر حال کا پیشانی میں سوراخ ہو چکا تھا اور اس سے خون اُبل رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پیراڈائن کا چہرہ اب بھی ساٹھا تھا۔ غفر حال کو کرتے دیکھ کر صرف ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں فاتحانہ سی چمک ابھری تھی مگر ذرا ہی غائب ہو گئی تھی۔ وہ گویا اپنے گرد و پیش سے (اور تمام)

"خیر... کوئی بات نہیں۔ میں پہنچ جاؤں گا" میں نے کہا۔ کورٹ کی مین روڈ والی سائڈ پر مجھے ملتا "رجیم کل بولا "ویسے اس کو پٹی پر تسماری ضرورت تو نہیں ہے لیکن کارروائی سے آگاہ رہنے کے لیے تم موجود رہنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اسی گاڑی میں پلڈ تک کے کونے پر موجود رہوں گا جو تم کل دیکھ چکے ہو۔ جب تم ضروری سمجھو تو مجھے اندر عدالت میں بلوایا" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے" اس نے بھی مطمئن لمبے میں کہا اور سلسلہ متعلق کر دیا۔

دوسرے روز میں آٹھ بجے سے پہلے ہی عدالت کی عمارت کے کونے پر مین روڈ کی طرف اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ کورٹ کی عمارت شہر کے پرانے، گنجان آباد اور کاروباری علاقے میں واقع تھی۔ دن چڑھے تو مجھے یہاں گاڑی کھڑی کرنے کے لیے بھی جگہ میسر نہیں جاسکتی تھی لیکن ابھی کاروباری ادارے اور دکانیں وغیرہ نہیں کھلی تھیں، صرف کورٹ میں آنے والوں کی آمد جاری تھی اس لیے زیادہ رش نہیں تھا۔ اسی روڈ پر عمارت کے دوسرے کونے پر شفیع شاہ ایک سفید کار میں دو آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔

یہاں سے ہم پوری سڑک پر نظر رکھ سکتے تھے جو زیادہ طویل نہیں تھی کیونکہ ایک سرے پر اسے زیادہ بڑی سڑک اس کرری تھی اور دوسری طرف کچھ ہی فاصلے کے بعد یہ سڑک گھوم جاتی تھی۔ میں نے گاڑی کے شیشے بند ہی رہنے دیے تھے۔ شیشے اندر تھے۔ مجھے باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے انجن اور اسے سی پٹا رہنے دیا تھا۔ یہ قدم سی سرسراہٹ سننے ہوئے میں انتظار کی گھڑیاں گزرتے لگے۔ شفیع شاہ نے سبائل کل فون پر مجھے بتایا تھا کہ گاؤں کے دروازے کے دیکل اور دوسرے کئی آدمیوں کا ٹولہ پہلے ہی اندر پہنچ چکا تھا۔

میں نے بڑے سکون اور تحمل سے انتظار کیا جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ وقت کی جرت انگیز پابندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹھیک آٹھ بجے رجیم کل کی لینڈ کروڈز بڑی سڑک کی طرف سے کونے پر نمودار ہوئی اور مجھ سے ذرا ہی فاصلے پر آ کر۔ عدالت کا مین ٹریٹ چھوٹی گلی میں تھا لیکن اس طرف رش زیادہ تھا۔ گاڑیاں اندر نہیں جاسکتی تھیں۔ رجیم کل کو وہیں اترنا پڑا۔

آج گاڑی ایک کانسٹیبل چلا رہا تھا۔ اس کے برابر دوسرا مسلح کانسٹیبل موجود تھا۔ پچھلی سیڑیوں سے رجیم کل اور پیراڈائن اترے۔ دو مزید مسلح کانسٹیبل ان کے ساتھ اترے۔ پیراڈائن کو آج بھی جھکنی نہیں لگی ہوئی تھی تاہم چھینس کھینے ہی پولیس کی تحویل میں رہ کر اس کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ شخصیت کی منہمکہ فیزی کے باوجود اس میں جو ایک غلط و کمائی دتا تھا وہ آج نہیں تھا۔ وہ کچھ بجا بجا سا دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی اس کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں نہیں آئی تھی۔

# چاہ پابل

دیوتاؤں کے شہر پابل کی کہانی

جسے مصنف نے 35 سال کی رسرچ کے بعد

قلمبند کیا۔



اردو بازار لاہور

ی گئے تھے۔ اے بھگتی! تم نہیں گئی ہو گی لیکن اصل بات یہ تھی کہ اسے فرار ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

اس قسم کے لوگ قانون ہی کی گزروں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے بال سے نہایت اطمینان سے نکلتے ہیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوتے ہیں۔ یہی ان کا فرار ہوتا ہے۔ انہیں پیشہ ور مجرموں کی طرح فرار ہونے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

میں نے دو ڈٹے دوڑتے اشارے سے رحیم گل کو بتایا "وہ بلڈنگ ہے۔"

وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور تیزی سے میرے پیچھے لپکا۔ صرف اسی سے میں بھرتی کی توقع رکھ سکتا تھا۔ باقی پولیس والوں میں سے کسی کو ساتھ لیتا فٹنل تھا۔ جتنی دیر انہیں حکم دینے اور بات سمجھانے میں لگتی اتنی دیر میں نوکرہ کے گرد فرار ہو سکتے تھے۔ اس قسم کی صورت حال میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔

شیخ شاہ کی گاڑی کچھ دور تھی لیکن مجھے امید تھی کہ ہمیں بھاگنے دیکھ کر وہ بھی تیزی سے ہمارے پیچھے آجائے گا۔ میں دو طرفہ ٹرنک کے درمیان سے جس طرح ڈنگ ٹرنک کرتا ہوا "جس رفتار سے اس عمارت تک پہنچا" میرا وہ عمل کسی ماہر شعبہ باز کے شعور سے کم نہیں تھا لیکن یہ ایک ایسا شعبہ تھا جو میز پر کھڑے ہو کر نہیں بلکہ سڑک پر دوڑتا تھا۔ چند سیکنڈ میں "میں جہاں سے عمارت تک پہنچا تھا دیکھنے والوں نے شاید اسے قریب نظر سمجھا ہو۔"

مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں دوں دوں ٹرنک کے درمیان

ملا سے فطری لاقفل تھا۔

پولیس والوں کی سمجھ میں جب بات آئی تو وہ سب کہیں نہایت گریوں سینے کے بل آڑے تہمتے کر گئے جیسے ان پر کسی گروہ نے حملہ کر دیا ہو۔ کسی کی گھن کا رخ کسی طرف تھا، کسی کا کسی طرف۔ یہ بھی کیفیت تھا کہ انہوں نے انہو حارند فارنگ شروع نہیں کر دی ورنہ سارے علاقے میں بھگدڑ مچ جاتی۔

اس دوران میں گاڑی میں بیٹھی سی بیٹھی چاروں طرف کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ ایک نہایت عجیبان آباد علاقہ تھا۔ یہاں کی بیشتر عمارتیں قیام پاکستان سے بھی پہلے کی تھیں۔ ان میں تین چار منزلہ پرانی اور پوسیدہ عمارتیں بھی تھیں جو چھوٹے بڑے فلٹیوں پر مشتمل تھیں۔ ان کی بالکونیاں اور کمرے کایاں میں روڑیا کیوں کی طرف تھیں اور ان میں سے بعض میں اکاڈا کا موزونوٹس یا بچوں کی فٹس و حرکت نظر آ رہی تھی۔ بعض بند کمرے کے عتب میں تاریکی تھی۔

میں نے گولی کی سمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس کے باوجود یقین سے کچھ کنٹراشل تھا۔ اس سمت میں بھی کئی جگہیں ایسی تھیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ گولی وہاں سے آئی ہوگی لیکن اسی لئے مجھے ایک عمارت کی چھت پر ایک سیاہ سی چیز کی جھلک نظر آئی۔

سیاہ ہونے کے باوجود اس چیز پر دھوپ کی کرنیں منعکس ہوئی تھیں۔ صرف ایک ثانیے کے لئے جھلکا کر وہ چیز ناپ ہو گئی پھر اسی جگہ پر ایک لمبے کے لئے کسی کی کھوپڑی متحرک نظر آئی۔ فوراً ہی وہ بھی ناپ ہو گئی۔ ایک سیکنڈ کی تاخیر سے بات میری سمجھ میں آئی۔

وہ کسی گھن کی سیاہ سنیل کی ٹال کا ایک حصہ تھا جس پر سورج کی زرد کرنیں منعکس ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی دو زمین کا ایک نہایت چھوٹا سا عمارت۔ جھلکا ہوا تھا جو شاید گولائی میں ایک انٹنی سے زیادہ ہوا نہیں تھا۔ وہ ٹیلی اسکوپک سائٹ والی ایک دور مار و فٹل گولی جس کی ٹال منڈیر کے ایک سوراخ سے نکال کر گولی سینے کے ٹپ لینا ہوا تھا۔

جس وقت میں نے اس عمارت کی طرف دیکھا، وہ شخص اٹھ کر چڑھواؤں کی طرح بھاگا تھا لیکن منڈیر پر چونکہ زیادہ اونچی نہیں تھی اس لئے مجھے اس کی کھوپڑی حرکت کرنی دکھائی دے گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر چلا نکلا۔ گولی میرے ہاتھ میں آگئی تھی۔ رحیم گل بھی وہاں سے اپنا رولر اور نکال چکا تھا اور یہی ہی گاڑی کی آڑ لے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

خود دلائل چاہتا تھا اس وقت بڑے اطمینان سے فرار ہو سکتا تھا پھر اگر اس کو شش کے دوران رحیم گل اسے گولی نہ مار دیتا۔ اس کے سوا اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ اب وہ پولیس والوں کے گھر سے نہیں تھا بلکہ پولیس والے تو شاید فی الحال اسے بھول



نچے آنے کے بجائے اوپر ہی اوپر سے کسی طرح گزارا جاتا اس لئے میں تھک کر بیٹھ کر غور کر رہی تھی کہ کیا کرنا چاہیے۔

پہلی اور دوسری منزل کے درمیان ایک بچی جو ہاتھ میں کوئی برتن اٹھائے بیڑیاں اتر رہی تھی مجھے گن اٹھائے اور آتے دیکھ کر خوف کے مارے بیڑیوں سے گرتے گرتے بچی میں نے ہی ہاتھ بڑھا کر اسے گرنے سے باز رکھا۔ پس مجھے ایک لمبے کے لئے رکتا پڑا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی لیکن اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے وہپ سے اسے بیڑی پر بٹھا کر اوپر کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔

تیسری منزل کے ایک قلیٹ سے "لہا سالباہہ" ہنسنے ایک عورت نکلی اور بیڑیوں کی طرف آئی۔ میں اس وقت تیسری منزل سے ذرا نیچے تھا۔ پرانی عمارتوں میں خبریں بھی آج کل کے مقابلے میں ذرا اونچی ہوتی ہیں۔ عورت ابھی بیڑیوں پر قدم رکھنے ہی لگی تھی کہ اس کی مجھ پر اور میرے ہاتھ میں موجود گن پر نظر پڑی۔

"ہائے اماں..." وہ اسے اختیار چینی اور چوڑی سے محوم کر اٹے قدموں والی قلیٹ میں گھس گئی۔ میں اس کا خوف اور غلا فمی دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بہت اچھا ہوا کہ اس نے کھانک سے اپنے قلیٹ کا دروازہ بند کر لیا کیونکہ جو بچی میں اوپر بیڑیوں کے موڑ پر پہنچا مجھے ایک شخص درمیان والی رائل سنہما لے لی کی طرح دے قدموں اوپر سے آتا دکھائی دیا۔

وہ غالباً یہ سمجھا تھا کہ عورت اسے دیکھ کر چیختی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کھلا دروازہ دیکھ کر اوپر لکھا بھی تھا۔ شاید وہ قلیٹ میں گھس کر چھپے کسی کو یہ خیال بنائے یا وہ اسے فرار کی کوئی تدبیر کرنے کی فکر میں تھا لیکن دروازہ کھانک سے بند ہوا تو وہ مزید بیڑیاں اترنے کے لئے مڑا۔

میں اسی وقت اس کی مجھ پر نظر پڑی اور اسی لمحے میں نے اسے "بند زاپ" کا حکم دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کرے گا تو میں اس کے ہاتھ یا بازو پر ناز کر کے اسے باز رکھوں گا۔ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کا مدخل بالکل ہی غیر متوقع رہا۔

اس نے رائل ہی میرے منہ پر پیچ بک ماری۔ مجرم نام خود پر آخری لمحے تک اپنے ہتھیار سے غرور ہونا گوارا نہیں کرتے لیکن اس کے لئے گویا رائل گولی کا شخص ایک بے کار تھا تھی۔ شاید اس لئے کہ اسے اس سے جو کام لیتا تھا وہ لے چکا تھا۔ اپنا دفاع اس کے نزدیک زیادہ اہم نہیں تھا۔

رائل اگر میرے منہ پر چڑھ جاتی تو شاید میں پشت سے گولی بیڑیوں پر جا کر آتا اور لڑھکتا ہوا بچنے جا بیٹھتا کیونکہ اس وقت میرا ایک ہاتھ لینڈنگ کے کنارے پر اور دوسرا وہ بیڑی میں چھپا تھا۔ زیادہ مضبوطی سے نہیں کھڑا تھا۔ ذرا سا ہوا بھی مجھے ہلکا سا

سے کس طرح گزرا تھا۔ ذہن میں بس ایک ہی دھن تھی کہ اس شخص کو کھانا نہیں چاہیے۔ خطرہ حال قیقا مرچکا تھا۔ جس انداز سے گولی اس کی پیشانی میں پھرتی ہوئی تھی اس کے بعد کسی کا ذہن رہتا ممکن نہیں تھا۔ قاتل بھی اس کے بارے میں اتنا ہی یقین تھا کہ اس نے دوسری گولی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بے شک اس نے اپنی اسکوپ سائٹ والی رائل استعمال کی تھی اس کے باوجود مجھے اعتراف تھا کہ وہ کوئی غصہ کا نشانہ نہ تھا۔

عمارت کے قریب پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم محل مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ تاہم وہ کافی تیز دوڑا آ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس سے ذرا ہی پیچھے قلیٹ شاہ اور اس کا ایک ساتھی بھی آ رہے تھے۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لئے رک کر انہیں اشارہ کیا کہ وہ وہیں رک کر عمارت پر آگے اور پیچھے سے نظر رکھیں تاکہ کسی طرف سے کوئی نکل کر فرار نہ ہو سکے۔

یہ اطمینان کرنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ میری بات سمجھے تھے یا نہیں؟ میں دوسرے ہی لمحے محوم کر عمارت میں گھس گیا۔ وہ قلیٹوں پر مشتمل ایک دیسی ہی کتہ سال عمارت تھی جہیں پرانے کراچی میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض کو گرا کر گرنے سے سے بنایا جا چکا ہے لیکن نئی شکل میں بھی وہ پہلے سے بدتر درخشاں قلیٹس پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بعض کو کافی مرمت اور لپکا ہوتی سے سارا دینے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے ان کی شکل کافی تبدیل ہو جاتی ہے۔

میں جس عمارت میں گھسا تھا وہ اپنی اصل شکل میں تھی۔ یوسیدہ لیکن کشادہ بیڑیاں اوپر چاری تھیں۔ عمارت میں کشتی کی ایک شخص پر کھلا بھی ایک بو محسوس ہو رہی تھی جو شاید کئی خوشبویں اور پلاؤں کا مرکب تھی۔ بیشتر قلیٹوں میں شاید ابھی ناشپاٹیں رہا تھا۔ کوکے قلیٹوں کے دروازے بند تھے لیکن خوشبو میں بدلے میں ادھر ادھر چکر اڑتی تھیں۔

میں ایک ساتھ دو دو بیڑیاں چلا گیا اور چڑھا۔ میرے انداز سے مخاطب میں جتنی دیر میں گاؤں سے اتر کر یہاں تک پہنچا تھا اتنی دیر میں وہ شخص ایک منزل سے زیادہ نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس کا نیچے آنے کا ارادہ ہوتا۔ میں نے روانہ ہوتے وقت دیکھ لیا تھا کہ اس عمارت کے دونوں طرف والی عمارتوں کی چھتیں اس سے زیادہ اونچی تھیں لیکن قاتل ان پر چڑھنے کی کوشش تو کر ہی سکتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس نے رسی کی کسی کند و غیرہ کا بھی بندوبست کر رکھا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اوپر ایک سے زیادہ افراد موجود رہے ہوں۔

میرا اس طرح اندھا دھند اوپر چڑھنا میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر اوپر سے اترتا ہوا کوئی شخص گن لے چا پک میرے سامنے آ جاتا تو فائر کرنے کے لئے وہ بہتر پوزیشن میں ہوتا لیکن میں اس وقت احتیاط برتنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرا جی

ہوئی تازہ بھی کیا لیکن وہ لفظوں کا ہوا مندر پر پہنچ چکا تھا۔ مجھے وہاں ایک کہنی کنڈا ایک کنگرے میں پھنسا ہوا دکھائی دیا جس کے ساتھ بندھی ہوئی رسی یقیناً نیچے جا رہی تھی۔ یعنی وہ دونوں راستوں سے فرار کا بندوبست کر کے آیا تھا۔ برابر کی جھت پر چڑھنے کے لئے بھی اس نے کندہ لگا رکھی تھی اور نیچے اترنے کے لئے بھی پچھلی طرف کندہ لگا رکھی تھی لیکن ان دونوں راستوں پر قسمت آزمائی کرنے سے پہلے اس نے میز جیوں کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اگر مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر ہو جاتی کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی... اور اس کے علاوہ میں برق رفتاری سے یہاں نہ پہنچا ہوتا تو وہ شخص میز جیوں کے راستے بھی یہاں سے نکل کر فرار ہو سکتا تھا۔ ایک بار عمارت سے نکلنے کے بعد یہاں سے نائب ہونا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ علاقہ ہی کچھ اس قسم کا تھا۔

میں نے اس پر دو سری گولی اس لئے نہیں چلائی کہ وہ مری نہ جائے میرا خیال تھا کہ میں اسے رسی کے ذریعے نیچے اترنے سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن میرا اندازہ ٹھوڑا سا غلط ہو گیا۔ اس کا رسی کے ذریعے اترنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ اس نے مندر پر چڑھنے ہی نیچے چلا ٹنگ لگا دی۔ میرا دل ایک لمحے کے لئے ڈوب سا گیا۔

اس کے کندہ کو استعمال نہ کرنے کی اصل وجہ مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں نے مندر تک پہنچ کر بیچے جھانکا۔ رجم گل اور شیخ شاہ عمارت کے عقب میں پہنچے جگہ تھے۔ دونوں کے احوال میں گھس گھس۔ انہوں نے عمارت کے عقب میں پہنچنے میں کافی پھرتی دکھائی تھی۔

یقیناً انہی کو دیکھ کر اس شخص نے کندہ کے ذریعے نیچے اترنے کا ارادہ ترک کر دیا ہو گا۔ اسے اس کا کوئی ناکندہ نظر نہیں آیا ہو گا کیونکہ وہ زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا جانتا تھا۔ وہ اب ایک ٹھکری کی سی صورت میں سڑک پر سناٹا پر تھا۔ ایک ایسی ٹھکری جس پر تیزی سے سرخی پھیلنے جا رہی تھی۔ رجم گل اور شیخ شاہ بھی لاش کی طرف اور بھی سرانٹھا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے تمہیں اپنے لباس میں چھپائی اور تیزی سے واپس جانے کے لئے پلانٹ کیا تھا۔ اب مجھے جھت پر ایک کونے میں گھٹا کا ایک کیس کھلا پڑا نظر آیا۔ قافلہ یقیناً اپنی ٹیلی اسکوپک راکٹ اور گندیں اسی میں چھپا کر جھت تک لایا تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور تیزی سے میز جیوں اترنے لگا۔ تمام فلیٹوں کے دروازے بند تھے اور میز جیوں میں بھی میرا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ ایک عورت اور ایک بچی بے جھجے گن لے کر اوپر چڑھتے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید اب تک تمام فلیٹوں میں خبر پھیل چکی تھی کہ بلڈنگ میں دہشت گرد گھس آئے ہیں۔

عمارت میں میز جیاں ایک طرف ہی تھیں لیکن دروازے آگے پیچھے دونوں طرف موجود تھے بلکہ ایک دوسرے کی سیدھ میں ہی تھے۔ پچھلا دروازہ مکمل کا تھا۔ میں اس سے نکلا تو خرابی لاش

نہ جانے کے باوجود خطرناک تھیں۔ اگر کوئی ایک آدمہ مرتبہ ان کے کناروں سے گھرا جاتی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان کا انجام کیا ہوتا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ میں کسی بڑے انجام سے بچ گیا۔ نہ کسی طرح میں بوقت سر جھکانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ اس حد تک کہ راکٹل میرے جسم کے کسی حصے سے مس نہ ہوئے۔ سیدھی نیچے والی لینڈنگ پر جا کر ہی۔ اس کے گرنے کی دھماکی زوردار تھی۔

میں نے سر اٹھا دیا تو وہ شخص میرے سامنے سے غائب تھا۔ میں ہل کے سوڑ پر گھوم کر تیزی سے مختصر راہ اری میں لپکا تو وہ اگلی میز جیوں تک پہنچا دکھائی دیا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر تازہ

مجھے یقین تھا کہ گولی اسے گئی تھی کیونکہ میں نے ایک لمحے کے لئے لڑکھاتے دیکھا لیکن اس میں اس وقت نہ جانے کون سا طرح طویل کئے ہوئے تھی۔ وہ رکائیں بلکہ اگلی میز جیوں کے پیریمیٹر سے اوپر چل گیا۔

جب میں اس سوڑ تک پہنچا تو وہ مجھے میز جیوں پر نظر نہیں آتا۔ گولی گرنے کے باوجود وہ کسی چھلاوے سے کم ثابت ہوا تھا۔ ان میز جیوں کا اختتام جھت پر ہی ہو رہا تھا۔ اس کا بے قاعدہ اوپر جھت پر پہنچ چکا تھا۔

میں نے شاید دو تین رکتوں میں ہی باقی میز جیاں طے کیں۔ میز جیوں کے اختتام پر مجھے ایک لمحے کے لئے رکنا پڑا۔ ہل کے اختتام پر دروازہ تھا اور دروازے سے اندھا دھند ٹھیک نہیں تھا۔ وہ دروازے کے عقب میں میرا خضر بھی تھا۔ بے شک اس نے راکٹل مجھ پر کھینچ ماری تھی لیکن اس میں وہ سر اٹھا رہی ہو سکتا تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازے سے سر نکالا لیکن وہ دروازے کے پیچھے نہیں تھا۔ دائیں طرف جھت سے جڑی ہوئی برابر والی شاہی راہ پر نظر آ رہی تھی۔ دوسری عمارت اس سے ایک اونچی تھی لیکن قافلہ کے مقصد کے لئے عملی وقوع کے اعتبار سے عمارت زیادہ اچھی تھی جسے اس نے استعمال کیا تھا۔ برابر عمارت کی دیوار پر پلٹر نہیں تھا اور وہ ایک کندہ کے سارے پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے اب نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگ سے بتا ہوا خون دھار پر ادا تھا۔

اوپر پڑنے کی کوشش کے دوران وہ گردن گھما تھا کہ پیچھے بھی ہاتھ تھا۔ اس نے مجھے میز جیوں کے دروازے سے سر نکالنے کا ارادہ اندازہ ہو گیا کہ اب اس کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس نے رسی چھوڑ دی اور چھلانگ لگا کر عقبی مندر کی دیوار تک پہنچا۔

تو کہ ہاتھ میں نے جھت پر پہنچے ہوئے چیخ کر کہا اور ایک

”جس کیسے معلوم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اسے تمہارے ہوکل میں تمہارے ساتھ دیکھ چکا ہوں اس کے علاوہ اس نے ابھی احتیاطاً خود بھی بتا دیا تھا۔ اگر تمہیں اس کے بارے میں علم نہ ہو تا تو وہ یوں کہیں اٹھائے میرے ساتھ لاؤ پھر سنا سکتا تھا کھانز کھیں کے؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”تم پولیس والوں کا کچھ بھروسہ نہیں ہو تاکہ کہے کیا کر رہو۔“ میں نے کہا۔ پھر میں نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس پتلے کے جھرم جھرم ہو اور قیاس آرائیاں شروع ہوں، معاشرے کا بوجھ تو اٹھاؤ۔“

اس دوران کچھ اور پولیس والے بھی وہاں پہنچ چکے تھے رحیم گل نے انہیں لاش اٹھوانے کے لئے ایمر پولیس وغیرہ کرنے کی ہدایت کی اور ہم دونوں واپس کورٹ کے گیٹ پر آئے کچھ پولیس والے پیر دانش کو شیم دائرے میں لئے کھڑے تھے، نہایت اطمینان سے لیڈر کو در سے ٹیک لگائے سگاہ کے کئی رہا تھا۔ پتلے اس کا چہرہ پٹا تھا۔ اب اس کے چہرے پر ظاہر نظر آرہی تھی۔

جب اس کی نظر مجھ پر اور رحیم گل پر پڑی تو طمانیت ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر فاقہاتی سی چمک بھی دکھائی دینے لگی ظفر جمال کی لاش دیں پڑی تھی اور عدالت میں آنے جانے والے افراد اوپر اوپر ٹوئیں میں جمع ہو کر دور دور سے اسے دیکھتے تھے۔

رحیم گل پیر دانش کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دو رازدق فاف دانش سے خامسا لبا تھا۔ پیر دانش کی شخصیت بھی کسی حد تک مشککہ فیزی تھی۔ اس کے باوجود اس میں ایک عجیب سا حال بھر گیا تھا۔ یہ ہماری بھر گیا، محض جسمانی نہیں تھا۔ بلکہ ہی پیر دانش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی چہرہ تھا۔ اس کی شناخت بھی عام آدمی کو مرعوب کرتی تھی۔ رحیم گل کا اس سامنے تن کر کھڑے ہونا بھی کچھ ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی باربا کرگ باربا دیدہ قسم کے بزرگ کے سامنے کھڑا کرکائی نوذراں۔ آپ کو سوائے کے کو شش کر رہا ہو۔

”تم سمجھ رہے ہو کہ ظفر جمال کو قتل کروا کے تم میرا تے جاؤ گے؟“ رحیم گل اپنا تاریک پیشہ انداز کر جب میں دیکھتا ہوں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا۔

پیر دانش کے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں سگار دبا ہوا دو سرے ہاتھ سے نہایت آہستگی سے مونچھ کو گل دیتے ہوئے اپنے مخصوص نیپلے سے انداز میں مسکرایا۔ وہ کھانا اس وقت تک گل کی کیفیت سے پوری طرح محفوظ ہو رہا تھا۔

”کس ظفر جمال کی بات کر رہے ہو وزیر رحیم گل؟“ میں نے استغنائی سے کو چلی سی آواز میں بولا۔ ”میں تو کسی ظفر جمال کی بات جانتا اور جب میں کسی کو جانتا ہی نہیں۔ تو بھلا کس کی مراد ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ میرا آدمی تھا۔ تمہیں اندازہ ہوا؟“

تک جا پہنچا۔ یہ بھی ایک چھٹی لیکن نہایت مصروف سڑک تھی مگر شاید سڑک پر ایک لاش اور اس کے قریب ایک بارودی اور ایک بے دردی کن ہزار کی موجودگی کی وجہ سے یہاں تیزی سے ویرانی پھیلنے لگی تھی۔ بیشتر دکانیں دھیر تو ابھی کھلی ہی تھیں لیکن آمدورفت بھی گویا فوری سا مڑ ہو گئی تھی۔

وہ شخص شاید سر کے بل سڑک پر گر تھا۔ اس کی کھوپڑی تیزو کی طرح چمک رہی تھی اور گردن اس طرح مڑ چکی تھی کہ کندھے سے لگ چکی تھی۔ شکل کافی حد تک سب سے ہو چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت اور بھی خراب ہوتی جائے گی۔ چہرہ مشکل سے ہی شناخت کے قابل رہے گا۔

”انسوس کہ ہم اسے زندہ نہیں پکڑ سکتے۔“ رحیم گل ربا اور ہولسٹریں رکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”ظاہر ہے اس کے شش میں یہ بات شامل تھی کہ اسے زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا ہے۔“ میں نے گرد پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اس نے اپنے آپ کو قربانی کے کمرے کے طور پر پیش کیا ہو گا۔ اس کے لواحقین کو شاید بہت بڑی رقم مل جائے گی۔ انسانی زندگی کی یہ تجارت کہیں کسی شکل میں، کہیں کسی شکل میں بہت سی پچھل پچھل رہی ہے۔“

”اور اور کوئی تو نہیں تھا؟“ رحیم گل نے پھت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کام کے لئے ایک ہی آدمی کافی تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنا کام عموماً سے انجام دیا۔“

”اب کیا ہو گا؟“ رحیم گل نے تاریک چشمے کی اوٹ سے میری طرف دیکھا۔ اس بلند حوصلہ اور جرأت مند شخص کے لیے میں شکستہ لگتی تھی۔

”لگتا ہی ہے رحیم گل ٹھیک ہے!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”مگر چھٹی۔ بلکہ کچھ تمہارے ہاتھ میں آکر پھل گیا ہے لیکن دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی زندگی میں ایسی اونچ نیچ تو آتی ہی رہتی ہے۔“ میں نے مسکرا کر اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

پھر میں نے شیعہ شاہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ری بیٹر تھی ”تم سڑک پر اپنی گمن کی غنائش مت کرو۔“ میں نے اسے ہدایت کی۔ ”اور اپنی پوزیشن پر واپس چلے جاؤ۔ اپنا دھرا آدمی بھی اگر سامنے کے دروازے کی طرف ہے تو اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔“

وہ جا چکا تو میں نے رحیم گل کو بتایا۔ ”یہ میرا آدمی تھا۔ تمہیں اندازہ ہوا؟“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اندازہ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟“

لوگ گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے سنتے ہوئے بھی اندر سے اور برے بن جاتے ہیں۔ ہمارا قانون تو ایسی کڑائی کے ان کارندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تو بہت بڑی چیز ہوں پیارے! اس حقیقت کو مان لو ہمارا در بدر سرگم ہو جائے گا۔

پھر اس نے خود ہی ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”اگر عدالت میں چلے ہیں۔ پیشیاں شروع ہو چکی ہوں گی۔ شاید ہماری باری آج ہی ہے۔ مجھے عدالت میں پیش نہیں کرو گے کیا؟“

رحیم گل نے گردن تھکا کر ایک نظر میری طرف دیکھا اور مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا لیکن میرا اندر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں صرف اس وقت عدالت میں جانا چاہتا تھا جب مجھے گواہ کی حیثیت سے طلب کیا جاتا۔

پیر دانش نے فوراً رحیم گل کو مخاطب کیا ”اس کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ اسی کے کٹنے میں آکر تو تم نے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا لیا ہے۔ یہ تو تمہیں ایسی جگہ لے جا کر مروائے گا جہاں تمہیں پانی بھی نہیں ملے گا۔ یہ تمہاری کیا مدد کرے گا۔ یہ تو خود بہت بڑا کرسل ہے۔ یہ تو تمہیں قریانی کا بکرا بنا رہا ہے۔ مجھے ذرا بری ہو لینے دو پھر تمہاری اور اس کی باری آئے گی۔ تم دونوں جو کچھ کر رہے ہو، پہلے تمہیں عدالت میں اس کا حساب دینا پڑے گا اور اس کے بعد اگر ضروری ہوا تو۔۔۔“ اس نے مسکرا کر جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا۔

وہ اس موقع پر بھی ہم دونوں کو اشتعال دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اب وہ خود کو ہلکا چٹکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سر سے گوارا ہٹ گئی تھی۔ شاید میری طرح رحیم گل کا ذہن بھی بہت سی باتوں میں الجھا ہوا تھا اس لئے وہ مزید متغافل ہونے کے بجائے بولا ”چلو۔۔۔ چلو۔۔۔ اندر چلو۔۔۔“

رحیم گل اور پیر دانش کے ساتھ بیشتر لوگ اندر چلے گئے۔ میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا کچھ دیر ظفر جمال کی لاش کو تھکا رہا۔ سرکاری اہلکار اس کے ارد گرد بھر رہے تھے اور اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ اس کا ایک رخسار سرگم پر نکلا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے گرد اس کا ہانا خون جمع تھا جو دھیرے دھیرے جھننے لگا تھا۔ میرے دل میں ایک جانی پچھانی سی افسردگی جھیل گئی تھی۔ کسی کسی شخص کا انجام میرے لئے ایسی افسردگی لے کر آتا تھا۔

یہ ایک ایسے شخص کا انجام تھا جسے بہت تاخیر سے احساس ہوا تھا کہ وہ ذات کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے اپنے اعمال کی خلائی کا خیال آیا تھا۔۔۔ اور وہ محبت سے بھی آشنا ہوا تھا مگر افسوس کہ اوپر والے کے ہاں اس کی ملت ختم ہو چکی تھی۔ مہنا کی بھی کم دہش یہی کمائی رہی تھی۔ دونوں ہی کی ملت تقریباً ایک ساتھ ختم ہوئی تھی۔ دونوں آگے پیچھے ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ کسی کو بھی خلائی کا موقع نہیں مل سکا تھا اور کیا میری افسردگی کی وجہ تھی۔ اگر وہ اپنی گمراہی کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتے تو مجھے شاید افسوس نہ ہوتا خواہ ان کا انجام کتنا ہی عبرت ناک کیوں نہ

زبردست پہرے اور نگرانی میں ہوں۔ میں بھلا کسی کو مروانے۔۔۔ انھوں نے۔۔۔ مروانے کا انتظام کیسے کر سکتا تھا؟ تم ایک ڈسے وار افسر ہو رحیم گل لیکن تمہیں اس قسم کی غیر ذمے دارانہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

ایک حد تک اس کی بات ٹھیک بھی تھی۔ ظفر جمال کو مروانے کا بندوبست اس نے نہیں گاڑ دینے کیا ہو گا۔ بات ایک ہی تھی لیکن قانون کے پتھروں سے ہر بات میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ ”تم۔۔۔ تمہاری وہ شاہراہیں۔۔۔ جو تاجا ہے کرلے لیکن ایک بات یاد رکھنا۔“ رحیم گل انگلی اٹھاتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا ”تمہیں اپنے گناہوں کی سزا بسر حال بھٹکتی پڑے گی۔“

”میں نے کوئی گناہ نہیں کیا میری جان! وہ بڑی ملامت سے بولا ”تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ ہمارا اپنا ایک لائف اسٹائل ہے۔ اب اگر ہمارا لائف اسٹائل ہی تمہیں گناہ نظر آئے تو تم کیا کہتے ہیں۔“

”مالی کے کیزے کا بھی اپنا ایک لائف اسٹائل ہوتا ہے لیکن دنیا اسے نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔“ رحیم گل دانت پیس کر بولا۔

پیر دانش ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا اور گھٹی گھٹی لیکن غضب ناک آواز میں بولا ”دور دی پن کر میرے سامنے کھڑے ہو کر اتنا مت اکڑو رحیم گل! کہیں خشک نشی کی طرح ٹوٹ نہ جانا۔“ پھر اس کے لہجے میں ترم جھٹک آیا ”تم جیسے لوگوں کا پرالیم یہ ہے کہ ان کے دماغ میں کہیں سے یہ فحاش گھس جاتا ہے کہ قانون بہت طاقتور چیز ہے۔ یہ فحاش اپنے دماغ سے نکال دو جذباتی نوجوان! قانون بہت کمزور۔۔۔ بہت مجبور ہی چیز ہے۔ یہ تو بے چارہ ثبوت اور گواہوں کے بغیر بڑے سے بڑے مجرم کو سزا نہیں دے سکتا۔ چاہے قانون کے کسی مخالف نے اپنی آنکھوں سے کسی کو قتل کرتے دیکھا ہو۔ اس کے باوجود وہ عدالت سے قاتل کو سزا نہیں دلا سکتا۔ وہ صرف تقیضی افسری کلائے گا۔ گواہ اور ثبوت اسے الگ سے پیش کرنے پڑیں گے اور ہم جیسے لوگوں کے خلاف گمراہی دینے کو ان عدالت میں آئے گا نیز رحیم گل؟“

وہ مسکرایا۔ رحیم گل خاموش رہا۔ پیر دانش کی مسکراہٹ اور واضح ہو گئی۔ وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے میں غضب ناک نہیں تھی ”گلی کوچوں میں سے پکڑے گئے لادارث یا غریب غلام۔ کسی بچکے کو کسی سے پکڑے گئے نوکر خاندان اور مالی و فیزیکی بات اور ہوئی ہے۔ ان بے چاروں نے جرم نہ بھی کیا ہو تب بھی تم لوگ انہیں الٹا لٹکا کر ان کی چوڑی اوچڑ کر کے ان کی ہڈیاں توڑ کر مٹا سکتے ہو۔ ہم جیسے لوگوں کی بات اور ہوتی ہے جو اوائل تو کسی کام میں خود اپنے ہاتھ کندے نہیں کرتے۔۔۔ اور اس سوسائٹی میں ہاتھ کندے کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ یہاں پیسے کے لئے ہر کام کرنے والے مل جاتے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ جنہیں کوئی کارروائی کرتے دیکھ کر

ہوتا۔ خواہ وہ بد رانسی جیسی خبیث شخصیت کے ہاتھوں ہی انجام تک پہنچے۔

کچھ دیر بعد ایمرینس آجی اور ظفر جمال کی لاش اٹھائی گئی۔ وہاں صرف گاڑی اور ادھرتے خون کا ایک بڑا سا دھبہ رہ گیا جو اس واقعے کی شہادت دے رہا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کیا رہا تھا کہ مجھے وہاں موجود رہنا چاہئے تھا؟ چلے جانا چاہئے تھا یا اندر عدالت میں جا کر کارروائی منی چاہئے تھی؟ مجھے اندازہ تھا کہ عدالتوں کی کارروائیاں بہت آگے دینے والی ہوتی تھیں۔

میں نے سوچا کسی فیصلے پر پہنچنے تک مجھے گاڑی ہی میں بیٹھنا چاہئے۔ بے دھیمی کے سے عالم میں دو واڑہ کھول کر میں گاڑی میں بیٹھا تو ایک دلچسپ خوشبو میرے منتھوں سے ٹکرائی۔ خوشبو میری گاڑی میں پہلے بھی پھیلی ہوئی تھی لیکن یہ خوشبو اس پر حاوی تھی۔۔۔ اور انہی تھی!

میں نے فوری طور پر گردن گھما کر نہیں دیکھا البتہ میری نظر عقب نما آئینے کی طرف اٹھ گئی۔ میرا خیال درست ہی تھا۔ عقی بیٹ پر کوئی موجود تھا۔ میں شہر ہا مگر کسی پستول وغیرہ کی نال میری نگاہ پر آکر نہیں گئی اور نہ ہی کسی نے مجھے غائب کیا۔

تب میں نے نہایت احتیاط اور آہستگی سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ پہلے تو مجھے یہی لگاں گزرا کہ وہ راجیلہ تھی جسے شاید ڈرامائی انداز میں میرے پاس پہنچنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔ کم از کم ملنے کے اعتبار سے وہ بالکل راجیلہ تھی۔ دیبا سیاہ شیش پر تن۔ اسی طرح مکمل طور پر نقاب میں لپیٹی ہوئی آنکھیں۔ حتیٰ کہ آنکھوں پر سیاہ چشمہ بھی موجود تھا۔

اس کا ہاتھ پیچر سیٹ کے پٹے پر لگا ہوا تھا اور میں نے اسے ہاتھ سے ہی پہچانا۔ یہ ایک مہمزن خوب صورت اور سبک ہاتھ تھا۔ راجیلہ کا ہاتھ بھی کم و بیش ایسا ہی تھا لیکن ساخت میں کچھ نہ کچھ فرق تھا اور سب سے بڑا فرق عمر کا تھا۔ یہ ایک نہایت کم عمر زخیر لڑکی کا ہاتھ تھا۔ راجیلہ سے وہ یقیناً کافی چھوٹی تھی اور اس وقت کو کہ وہ بیٹھی ہوئی تھی لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ راجیلہ کی طرح سرفرد نہیں تھی۔ وہ راجیلہ نہیں تھی۔

میں جب گاڑی سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ بند کرتا تھا تو گاڑی خود بخود شغل ہو جاتی لیکن ظفر جمال کے قتل کے بعد جب میں اس عمارت کی طرف بھاگا تھا تو دروازہ پوری طرح بند نہیں کر سکا تھا جس کی وجہ سے باقی دروازے بھی کھلے رہ گئے تھے۔ شاید اسی دوران وہ پچکے سے کسی طرف سے گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔

ایک لمحے گاڑی میں گہرا سکوت طاری رہا۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے اور میری آنکھوں کے درمیان تاریک شیشوں کی دیوار حائل تھی۔

”آپ نے پوچھا نہیں کہ میں کون ہوں۔“ آخر اسی نے سکوت توڑا۔ اس کی آواز خوب صورت اور حترم تھی۔ آواز سے بھی اس کی کم عمری کا آثار نمایاں تھا۔ وہ سیاہی کے پردوں میں بری

”تم اپنے آپ کو اس بری طرح چسپا کر بیٹھی ہو تو یقیناً مجھے یہ بتانے کے لئے تو نہیں بیٹھی ہو کہ تم کون ہو۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا ”ہر حال۔۔۔ اگر تم اپنا کوئی فرضی نام دینا چاہتی ہو تو بنا سکتی ہو۔ میں وہ بھی توجہ سے سنوں گا اور اگر تم چاہو گی تو اسی شمارا اصل نام بھی مجھ لوں گا۔“

”توئی آپ ذہین معلوم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ذہانت۔۔۔ خیانت کے مقابلے میں مات کھا جاتی ہے۔“ وہ سیٹ کے پٹے سے اٹھا ہاتھ جٹاتے ہوئے اور ذرا پیچھے ہٹکے ہوئے بولی۔

”نہیں کب اور کیونکر اندازہ ہوا کہ ذہانت کبھی کبھی خیانت کے مقابلے میں شکست کھا جاتی ہے؟“ میں نے ذرا محوم کر بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”اچھی اچھی۔۔۔ کچھ دیر پہلے۔۔۔ جب ظفر جمال کو اس بجے پر سے بازار میں اس عدالت انصاف کے سامنے قتل کروایا گیا اور قاتل بھی ہاتھ نہ آسکا۔“ اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ میرے جسم میں ایک سروی لرزہ ڈگئی۔ شاید ایک کم عمر لڑکی کے لہجے کے اس ٹھہرانے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ یا پھر شاید یہ خوف کی نہیں بلکہ اس انفرادی کی لہر تھی جسے میں اب تک دل میں دبا رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے دیکھے لہجے میں کہا ”شاید مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے ظفر جمال کو پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اسے اپنی ہی تحویل میں رکھتا۔ اس کی اس سے بہتر حفاظت تو میں خود کر سکتا تھا۔“ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں آشف جھلک آیا۔

”اس میں پولیس کا کوئی قصور نہیں۔ اپنے طریقہ کار کے حساب سے تو انہوں نے بڑی ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ورنہ اس ننگے کا جو حال ہے اس سے تو اتنی بھی توقع نہیں تھی۔ اب وہ ہر کوئے کھدوے سے آنے والی گولی کو تو نہیں روک سکتے۔“ اس نے کمری سانس لی ”اور آپ اگر اس مسئلے کو قانونی طریقے سے حل کرنا چاہتے تھے تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ آپ ظفر جمال کو پولیس کی تحویل میں دے دیجئے۔“

”لیکن تم کون ہو۔۔۔ ان تمام معاملات سے تم کیونکر واقف ہو۔۔۔ اور ان سے شمارا کیا تعلق ہے؟“ میں نے ایک ساتھ تین سوالات کر ڈالے۔

”میں آپ کو کچھ بتانے نہیں۔۔۔ آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہوں افضل صاحب۔“ وہ دھجے لہجے میں بولی۔

”تم مجھے جانتی ہو؟“

”بلا ہر ہے بھی میں آپ سے اس موضوع پر بات کر رہی

ہوں۔" اس نے جواب دیا اور اس لئے مجھے اپنا سوال احتیاط  
عسوس ہوا۔  
اس کے باوجود میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا "تم مجھے کیسے جانتی  
ہو؟"

"آپ کو جانتا کوئی مشکل کام تو نہیں۔ اس شہر میں بہت سے  
رگ آپ کو جانتے ہوں گے لیکن آپ انہیں نہیں جانتے ہوں  
گے۔"

"کیا میں جہیں جانتا ہوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا میں اس کا ہوں؟"

"نہیں بی المال نہیں۔" اس نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے

بعد جواب دیا۔

"پھر کب؟" میں نے ایک لگ اس کی طرف دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

"یہ بھی میں نہیں جانتا سکتی۔"

"مجھ سے تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟" میں نے جانتا چلا۔

"کیا آپ اب کیا کریں گے؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"بہر دانش کے سلسلے میں اور کس سلسلے میں؟"

"مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا کروں گا۔" میں نے جواب

دیا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں بہر دانش کے سلسلے

میں اب کیا کروں گا۔ یہ کوئی ذلیلہ تک جواب نہیں تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "میں ابھی عدالت کے

فیصلے کا انتظار کروں گا شاید ظفر جمال کے بیان کے بغیر بھی بہر دانش

کا چند دن کا رہنا بدلتا جائے اس دوران رحیم گل شاید تحقیق کے

ذریعے اپنا کیس مضبوط کر لے۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ شاید اسے کچھ کہنے کی ضرورت

نہیں تھی۔ اس کی یہ ہنسی کہہ رہی تھی۔ اس سادگی پر کون نہ

مریاضے اسے خدا۔

میں حیران تھا کہ اتنی کم عمری کے باوجود اس کے انداز گفتگو

میں یہ پختگی، یہ فہم اور یہ خود اعتمادی کہاں سے آئی تھی؟ پھر میں

نے اپنے آپ کو سنبھالا کہ آخر میں نے اس کی صورت دیکھے بغیر

محض چند جسم امتحان کی بنیاد پر یہ کیوں فرض کر لیا تھا کہ وہ واقعی کم

عمر تھی؟ لیکن ممکن تھا کہ وہ کوئی مروجہ قسم کی شخصیت رہی ہو۔ میں

نے کئی ایسی خواتین کو دیکھا تھا جو اچھی بھلی جہان پروردہ ہونے کے

باوجود کس نظر آتی تھیں۔ سر سے پاؤں تک سیاہ برقع اور تاریک

چٹختے میں چھپ جانے کے بعد تو یہ تاثر دیتا اور بھی آسان تھا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے گویا پراسانت ہے ہوئے

پوچھا۔

"آپ اسے بڑے بڑے برنس میں ہیں۔ میرا خیال تھا بڑے

بریکٹیکل قسم کے آدمی ہوں گے لیکن آپ تو کافی خوش قسم معلوم

ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو کچھ خاص پتا نہیں ہے کہ  
ہمارے ہاں عملی زندگی میں۔ اور سرکاری چار دیواریوں میں کیا  
ہوتا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے آپ اتنی ممتاز شخصیت کی عمر کتنی گئی  
کےیں آپ کی یہ دولت اور بڑے برنس موہلی تو نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا "لیکن خوش

قسم رہنے میں حرج بھی کیا ہے؟ کبھی کبھی انسان کی خوش نصیبی اور

خوش گمانیاں عملی صورت بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ ہمارے خیال

میں کیا خوش قسم اور خوش گمان لوگ ترقی نہیں کرتے؟"

"کرتے ہوں گے۔" وہ بے پروائی سے بولی "میرا تجربہ اس

سلسلے میں زیادہ وسیع نہیں۔ میں نے تو اپنی مختصر عمر میں جتنے بھی

اپنے لوگ دیکھے جنہیں معاشرے میں بڑے آدمی کہا جاتا ہے

انہیں بے پناہ بریکٹیکل۔ ستاک اور بے حس پایا۔"

"بعض لوگوں کے حصے میں صرف سطح حیات آتے ہیں۔ خیر تم

یہ بتاؤ کہ تم بہر دانش کے بارے میں میرے ارادے کیوں جانتا

چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تم سے بہر دانش کی جاسوس ہوں۔" وہ ایک بار پھر

دھیرے سے ہنسی۔

میں نے اپنی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ایک لمحے کی

خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولی تو اس کے لہجے سے بھی گرمی سنجیدگی

میاں تھی "کیا واقعی آپ نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ آپ

آپ کیا کریں گے؟"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" میں نے لامنت سے کہا "تم تو

یوں کہہ رہی ہو جیسے بہت تاخیر ہو گئی ہے۔ میں صرف ظفر جمال کے

مرنے سے اتنا مایوس نہیں ہوں۔ ابھی رحیم گل اور میں تو زندہ ہیں

اور ہم دونوں بڑے خنڈی ہیں کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔"

"ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔" ظلاب توقع اس نے اچانک ہی

کہا اور دو دروازے کے پالش میں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ جیسے

ذرا مائی انداز میں آئی تھی ویسے ہی ذرا مائی انداز میں جانے بھی لگی

تھی۔

میں نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ اس نے

کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کی کلائی میں گداز بھی تھا اور

زندگی کے بے پناہ حرارت بھی۔ جو کہڑوں کی دھڑکتے کے باوجود برقی

رو کی طرح میرے ہاتھ تک پہنچی اور میرے رگ دپے میں ایک

انوکھی سنسنی مدد کی۔ مگر اس گرم و گداز کلائی میں خاصی مضبوطی

بھی تھی۔ اس نے کلائی چھڑانے کے لئے کافی زور لگایا۔ میرے

اندازے کے مطابق اس مختصرے دھڑکے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی

چاہئے تھی۔

آخر کار وہ مرحض لہجے میں بولی "مجھے جھوڑ دیں افضل

صاحب۔ اور نہ میں شر مچا دوں گی۔ عدالت کے احاطے میں رہا رہ

بھی موجود ہیں۔ بہت بڑا اسکینڈل بن جائے گا۔ جو میرے لئے

نہیں آپ کے لئے ہوا کہن ہو گا۔"



نہیں جائے گا لیکن جب گھر پہنچے گا تب ضرور میں مختلف قسم کے بیڑا خوشی کی دُھنیں بجا کر اس کا استقبال کریں گے گلی میں سرخ قالین بچھے ہوں گے۔ استقبال بیڑے لگے ہوں گے۔ گھر کے برابر واسے میدان میں ٹینٹ لگے ہوں گے۔ وہاں غریبوں کو کھانا کھلایا جائے گا اور اندر لان پر بہت سے معززین کے لئے کھانے کا انتظام ہوگا۔ ان سارے کاموں میں لے باقاعدہ ایک استقبال کمیٹی کام کر رہی ہے۔ سب چیزیں تیار رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے کمیٹی کو مسئلہ دے دیا ہے کہ وہ حرکت میں آجائے۔ اب مجھے جا کر کاموں پر صرف نظر رکھنی ہے۔“

میں نہں دیا۔ وہ بھوس اُچکاتے ہوئے بولی ”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”تم بہت دلچسپ عورت ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہم خوشی کو خوشی کی طرح مناتے ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ دافنس کس طرح جوئے الزامات سے بری ہو کر آتا ہے۔“ وہ خسرے کر دینا ذرا اکڑاتے ہوئے بولی۔

”ابھی اس کی ضمانت بھی نہیں ہوئی اور تم نے اس کے لئے ”بری“ کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔“ میں نے دھمکے لہجے میں کہا ”تج کے مرحلے میں اگر زیادہ سے زیادہ کچھ ہوتا تو یہی ہو گا کہ اس کی ضمانت ہو جائے گی۔ مقدمہ تو پھر بھی چلے گا۔ بری ہونے نہ ہونے کا فیصلہ تو نہ جانے کب ہو۔“

”ہمارے لئے اہم مسئلہ ضمانت کا تھا۔ ضمانت ہو گئی تو سمجھو بری بھی ہو ہی جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”کیا آئندہ پیش ہونے والے گواہوں کا بھی یہی حشر کرانے کا ارادو ہے؟“ میں نے ظفر بتال کے سر پرک پرے ہوئے خون کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تم اتنی اچھی اچھی بیاری بیاری باتیں کرتے کرتے ایک دم ایسی بے ہودہ باتیں کیوں شروع کر دیتے ہو۔“ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں جس کی وجہ سے اس کی بے ہودہ پیشانی اور بھی زیادہ دایمات نظر آنے لگی۔

میں نے گواہی ان سنی کرتے ہوئے کہا ”ہر بار ایک ہی طریقہ تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر بار کسی قرانی کے کبرے کو کسی اونچی بلڈنگ پر بڑھا کر تو گواہ کو نہیں مروایا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے اگلی پیشی پر ظفر بتال سے بھی زیادہ اہم کوئی گواہ یہاں آئے اور وہ یہ خیر عاقبت گواہوں کے کبرے تک پہنچ جائے۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گر کر گیا لیکن وہ اپنی اداکاری جاری رکھتے ہوئے بولی ”تم نے پھر وہی بدستون تراشی شروع کر دی۔۔۔ یہی بات۔۔۔ میں جنہیں دافنس کے استقبال کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ایک قابلِ ردِ مظهر ہو گا جب دافنس گھر پہنچے گا۔ میں نے دافنس سے کہا ہے کہ عدالت سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ جان بوجھ کر کچھ تاخیر سے ہی گھر آئے تاکہ اس کے استقبال کی تیاریاں

مجھے پہچلا تھا کہ اس کا تیسرا شوہر شاہ جی کے نام سے معروف تھا۔ ذرا توقف کے بعد اسے گویا میرے سوال کا جواب دینے کا خیال آیا اور وہ بولی ”ہاں میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ اس لئے دافنس کو مجھے تم بھی بڑے نہیں لگ رہے۔“

”کیوں خوش ہو؟ کیا پیر دافنس کی ضمانت ہو گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”معاذت۔۔۔ ابھی تو اس کی پیشی بھی نہیں ہوئی۔“ اس نے نظر اٹھانے میں جواب دیا پھر مصموبت سے پوچھا ”کیا تمہارے ہاوس جنہیں اندر سے بل پل کی ترخیں نہیں پہنچا رہے؟“

”میرا کوئی جاسوس اندر نہیں ہے اور نہ ہی مجھے ”جاسوس“ ہانے کا شوق ہے۔“ میں نے جواب دیا ”مجھے اگر کارروائی کے خالق بنانا ہو گا تو میں خود اندر چلا جاؤں گا لیکن میں عدالتی کارروائی دیکھ کر رنجور نہیں ہونا چاہتا۔ میں پہلے ہی بہت بور ہوں۔ زندگی سے بیزاری کی حد تک بور۔“

”چہ۔۔۔ چہ۔۔۔“ وہ حرم آئینہ میں بولی ”ایسی جوانی میں انسان کو اتنا بور نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے دیکھو۔۔۔ اس عمر میں بھی اتنی خوش ہوں۔ میری رگ رگ میں زندگی کی ترنگ ہے۔“

”اس وقت شاید یہ ترنگ کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی ہے۔“ میں نے سر ہلایا ”دوے کیا تم حد سے زیادہ خوش ہونے میں کچھ جلد بازی سے کام نہیں لے رہیں؟ ابھی تو پیر دافنس کی ضمانت نہیں ہوئی۔“

”نہ۔۔۔ سمجھ لو کہ وہی گئی ہے۔ بہت اندر سے۔۔۔ یا یوں سمجھو کہ بہت اوپر سے خبر ملی ہے۔“ اس کی خوش دلائی مسکراہٹ بفرار رہی۔

میرے دل میں افسردگی کی لہر کچھ قوی ہو گئی تاہم میں نے کوشش کی کہ میرا چہرہ سہاگن ہی نظر آئے اور میرے آثارات سے اسے اندازہ نہ ہوئے پائے کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے گھسی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”پھر بھی اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”مجھے جا کر دافنس کے استقبال کی تیاریاں کرنی ہیں۔ بلکہ یوں سمجھو کہ تیاریاں تو ہم نے پہلے ہی کر رکھی تھیں لیکن احتیاطاً ابھی انہیں ظاہر نہیں کیا تھا کہ تمہیں بعد میں سبب نہ ہو۔ جب تک بات بگڑ نہ ہو تب تک کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے تو اپنی تیاریاں ظاہر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ اب میں جا کر ذرا اشتغالات کا جائزہ لوں گی۔ دافنس اب کوئی یونی چپ چپاتے گھر والیں تھوڑا ہی آئے گا۔“ وہ بڑے مسرور اور قاتحانہ لہجے میں بولی۔

”تو کیا وہ بیڑا ہے کے ساتھ گھر پہنچے گا۔ برات کی طرح؟“ میں نے قدرے استہزاء سے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر بولی ”ہمارے لئے تو یہ برات جیسا موقع ہی سمجھو۔ وہ یہاں سے تو بیڑے کے ساتھ



میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

پھر دودھ دواڑے پر کچھ اور چمکتے ہوئے نہایت شیریں لمبے میں بولی "توج" بیریل میں جشن کا سا سماں ہو گا اور ہاں دیکھو ہم بعض ایک دہل میں رکھنے والے لوگ نہیں ہیں تم بھی چاہو تو اس جشن میں آئیے ہو۔ جمیں دی آئی لی ٹیٹ منٹ دیا جائے گا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اسے بھول جاؤ اور اب اپنے طرز زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کرو۔ ایک بچے کے بعد تم کسی بھی وقت آ سکتے ہو۔ کیا میں امید رکھوں؟"

"اپنے طرز زندگی کی اصلاح کرنے والا تمہارا مشورہ مجھے قابل غور لگا ہے۔ میں اس کے بارے میں ضرور سوچوں گا لیکن تمہارے جشن میں آنے کے سلسلے میں میں ابھی کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ شاید میں کسی اور ہی موقع پر "بیریل" آؤں۔" اور ہی "پر میں نے خاصا زور دیا تھا۔

وہ گاڑی کے دواڑے پر سے کھٹی چٹا کر سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے تم کسی "اور ہی" موقع پر آ جاؤ۔ بشرطیکہ ایسا کوئی موقع آئے۔ ہمارے دواڑے پچھ ہی تمہارے لئے کھلے رہیں گے۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ خود چار گاڑا کے ساتھ ایک نئی، پتھر میں سوار ہو گئی۔ ذرا نیچے سیٹ اس نے خود سنبھال۔ باقی لوگ پیچھے کھڑی سرخ رنگ کی ایک اونچی اور بڑی سی کھلی جیب میں جا بیٹھے۔ چند سیکنڈ بعد پتھر وڈن سے میرے سامنے سے گزری۔ گاڑی نے اپنا شستیر جیسا بازو ہلایا۔ کچھ دھل اڑ کر میری گاڑی کی طرف آئی۔ میں نے بلدی سے دواڑہ بند کر لیا۔

گاڑی دے چڑھاتے گاڑوں کے ساتھ پیچرو بھاگ کر گویا میرے منہ پر خاک ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پیچھے کھلی جیب میں خوشخواری صورتوں والے لوگ جیب ہی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے گزرے تھے۔ میں کمری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ بلاشبہ بڑے ہی عجیب انسانوں کا گروہ تھا۔

گاڑی کا قاتلانہ اور حد سے زیادہ غیر اعتماد انداز بتا رہا تھا کہ بازی فی الحال اس کے حق میں پلٹ چکی تھی۔ مجھے اپنا مزہ دہاں کھڑا وقت ضائع کرنے کے حراف محسوس ہوا۔ میں نے سوچا جب میرا دل ضمانت منکرو ہوئے کے بعد اپنے بچے کچھ آدمیوں کے ساتھ عدالت سے نکلے گا تو وہ بھی یقیناً میرے پاس رک کر کچھ نہ کچھ باتیں کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ گاڑی کے مقابلے میں زیادہ بے سرواڑہ تھکے ہوئے ہوں۔ میں ممکن ہے میری کھوپڑی گھوم جائے اور اب ہر دم کوئی فساد برپا ہو جائے۔

یہ معاملہ چونکہ اب منظر عام پر آچکا تھا اس لئے اس پر اب میں ہر کام فساد کرنا میرے حق میں اچھا نہیں تھا۔ اگر میں نے جپ چھپاتے اس مسئلے کو فٹلانے کا فیصلہ کیا ہوتا تو پھر کوئی بات نہیں تھی۔ اگر میں نے کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کے بغیر رائل کا پتا

صاف کر دیا ہوتا تو میرے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوتا لیکن مسئلہ اس معاملے کو قانونی طور پر نبھانے کی کوشش کی تھی ابھی میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا فیصلہ میرے حق میں غلط ثابت ہوا تھا یا نہیں فی الحال میرا محتاط رہنا ضروری تھا۔ میں نے اس کے لئے بھی اہل اس رخصت ہونا بستر سمجھا کہ بعد میں مجھے رجیم گل سے مکمل رہا رہا۔ لی لی جائے گی۔

میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا اور ہم لوگ آگے پیچھے اہل آگے۔ باقی لوگ باہر ہی رہے۔ شفیع شاہ میرے ساتھ آگے آگیا۔ میں نے کافی مشکوئی اور ہم دونوں خاموشی سے کافی بیٹے گئے۔ اور کچھ ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی جنازے میں شرکت کر کے آ رہے تھے۔ یہ تقریباً حقیقت ہی تھی۔ آخر غائب سامنے ظفر جمال کی لاش تو اٹھی ہی تھی۔ وہ ہمارا دوست نہ کسی لیکن ہمارے لئے کام دو دوستوں والا ہی کرنے چاہیہ تھا۔

آخر میں نے کپ ایک طرف رکھ کر کرسی کے پٹے سے لپک لگاتے ہوئے کہا "کچھ اچھا نہیں ہوا شفیع شاہ۔"

وہ مجھے اور ہچکاہٹ زدہ لہجے میں بولا "میرا میں نے تو پہلی کہا تھا۔ خاموشی سے میرا دل کا پتا صاف کر دیتے ہیں۔"

"صحیح معنوں میں اس کا موقع کبھی نہیں آئے گا۔ جب ہم نے اس پلو پر غور کیا اس وقت تک اس کی اور ہماری دشمنی واضح ہو چکی تھی اور واضح دشمنی کے بعد کسی ایسی مشہور اور با پس منظر شخصیت کو لٹکانے لگانا اپنے گلے میں مصیبت ڈالنے والی بات ہوئی۔" میں نے غصے سے کہا۔

"مصیبت تو ہر حال میں گلے پڑی گئی ہے سراسر۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے تو اپنی دانست میں صحیح راستہ اختیار کیا تھا۔" میں نے انہوں سے کہا۔

"ظفر جمال کو اڑا کر انہوں نے بڑی مستعدی کا ثبوت دیا۔" وہ بولا۔

"مجھے ظفر جمال سے زیادہ اپنی نیت پر بھروسہ تھا۔ میرا خیال تھا میری نیت تک ہے۔ مجھے اس کا پھل ضرور ملے گا۔ میں ایک اچھے مفقہ کے لئے قدم اٹھا رہا ہوں، مجھے ضرور کامیابی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے اس راستے سے بھی انصاف ملے گا۔" مجھے واقعی برا انہوں سے تھا۔

"اگر آپ کو یقین تھا کہ وہ تو پھر اپنی بلدی واپس ہونے کی ضرورت نہیں۔" شفیع شاہ نے گویا مجھے تسلی دی "میں تو پہلی کوشش ہے۔ اگر ضمانت ہو گئی تب بھی کیس تو چلے گا۔ ثبوت تو اور بھی بہت سے ہیں۔"

"وہ سب شاید ان ماں بیٹے کی حکایتوں کے سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں۔ گاڑی کے دواڑے مجھے بہت کچھ بتا رہا ہے۔ ظفر جمال کا عدالت کے سامنے جان ہونا تو کچھ

کچھ اس بری طرح اس شیطانی پکر میں جکڑے ہوئے ہیں کہ نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔"

جنہیں چھوڑو ان باتوں کو۔ ”میں نے ہاتھ پا کر کہا۔ مجبور ہو کر میں آخر میں یہی کہا کرتا تھا۔ اس قسم کے مسائل پر دوسرے لوگوں کی بات چیت کا اختتام عموماً الفاظ پر ہوتا ہے۔

میں نے مزید افسوس سے کہا "ہمارے پاس ایسے غامض  
وساکن ہیں جنہ پر ہم بے خوف ہیں، ہماری اپنی خاصی بھوں  
تک رسائی بھی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں صرف ایک حیرت انگیز  
انجام تک پہنچانے میں دانتوں پیسے آ رہے ہیں۔ ہم کوئی اور مسئلہ  
کیا حل کریں گے اس قوم کی گردن پر تو اس سے بھی بڑے بڑے  
اور نہ جانے کتنے احمق سوار ہیں۔ ہم سب کچھ جانتے ہو جیسے بھی اوز  
کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے حتیٰ کہ دو چار لوگوں کو ان کے محرکے بھی  
شیر نکال سکتے۔"

”لیکن سر! شفیق شاہ مسکراتے ہوئے بولا ”اس کے باوجود آپ کا سبق ہے کہ ہم اپنی سی جدوجہد کرتے رہیں گے۔ کوئی نکتہ نہ نکلے گا۔“

”اے فقیر شاہ! ہم جدوجہد کرتے رہیں گے“ میں نے  
عزم کو دہرایا، ”کیونکہ جدوجہد زندگی ہے اور پھر ہم اپنی فطرت  
بھی عبور کریں۔ اس دنیا میں آیا ہوا ہر شخص اپنی اپنی فطرت  
مطابق کام کر رہا ہے۔“

”بہر حال... میں پیر دانش کے سلسلے میں بھی ابھی ایسا  
 ہوں۔“ شفیق شاہ بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپس کی بات ہے ایسا  
بھی نہیں ہوں۔ بس یو خبی ذرا اواس کی ایک ٹرنگی ہے۔  
جائے گی۔"

”میرے لئے اب کیا حکم ہے؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”تم اپنے آدمیوں سمیت آج ہوٹل میں ہی موجود رہو۔  
 کسی نظر میں آئے بغیر ادر اور کھڑے رہو۔ کسی کو تم لوگو  
 موجودگی کا احساس نہ ہونے پائے لیکن بوقت ضرورت تم  
 میں سے کما۔“

”کیا آپ کو یہاں کچھ گزیر کا فطرو ہے سر؟“

جیشن کی تارواں کہنے کھر کھی ہے۔ میرا خیال ہے پی الی الخال  
دھیان کوئی گھڑ کہنے کی طرف میں ہے پھر بھی میں  
اٹھا کھ رہا ہوں۔ کہیں وہ گرہا۔۔۔ پھر دانش ہر اٹ  
کے بعد ادھر کا رخ نہ کرے شاید اسے دوچار ہو کہیں  
ہارنے کا شوق چراگے بڑک سمجھتے ہو؟

اور بات ہوئی۔ "میں نے کہا "اس کا قاتل زندہ ہمارے ہاتھ آجائے  
اور رحیم محل اس کا ہیرا دانش سے حلق ثابت کرنے میں کامیاب  
ہو جائے تب بھی پچاسی کا پچھدا ہیرا دانش کے گلے میں بڑے کی امید  
رکھی جا سکتی تھی لیکن کرائے کے اس قاتل کو تو یقیناً سب سے اہم  
ہدایت میا دی گئی ہوگی کہ اسے زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا ہے۔  
اس کی شناخت بھی یقیناً نہیں ہو سکے گی۔ ہیرا دانش جیسے لوگوں کے  
معاملے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے لئے ہر جائز اور  
ناجائز کام کرنے والوں کا ان کے ساتھ ملے پیسے کے علاوہ  
حقیریت کا بھی رشتہ ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا کام کرتے ہوئے بھی  
ان کے ضمیر کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہر صاحب  
نے حکم دیا ہے تو اس میں کوئی ٹیک متھند ہی پنہاں ہوگا۔ اب ظفر  
جمال کے قاتل کو یہی لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ مہرے وقت بھی اس  
کے ذہن میں یہی خیال ہوگا کہ اس نے جنت کا ٹکٹ کما لیا ہے۔  
اس قسم کی معاشرتی خرابیوں کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔  
میں نے ایک بار پھر پوچھل سائنس لی۔

”علاج تو ہے سہو۔ لیکن جس طرح دوسری بہت سی بیماریوں  
علاج کوئی نہیں کرنا چاہتا... اس طرح اس بیماری کو بھی لاعلاج  
چھوڑ دیا گیا ہے۔“ شفیع شاہد ہم مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔  
”کہا علاج ہے تمہارے خیال میں؟“ میں نے پوچھا۔

وہ تعلیم عام ہو جائے اور پھر دانش جیسی ہر شخصیت اس دانش کو پہنچے رہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ ان کے کروت بڑے فرائض سے منظر عام پر آتے رہیں۔ تب کہیں جا کر بہت عرصے بعد لوگوں کو شعور اور آگہی آئے گی۔ ”وہ بولا۔“

[illegible]

صحیح معنوں میں کسی بھی مرض کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔  
 "یہی تو مسئلہ ہے سراسر! علاج سب کو معلوم ہیں لیکن اس  
 لئے قرآن یاں دینی پڑتی ہیں۔ وہ کون دے گا؟ کائنات پچنے کی  
 سے نجات ملے تو کسی کے دل میں علاج کے سلسلے میں غلو  
 سے شیعہ شاہ ہوا۔"

ہو۔ "سچ سناؤ۔"

"ایک مسئلہ یہ بھی ہے شفیق شاہد کہ اگر لوگوں میں شعور اور آگہی تو انہیں مطوم ہو جائے گا کہ انہیں بے وقوف بنادے ہیں۔ اس لئے دل ہی دل میں بھی چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ لوگوں سے زیادہ جاہل بے شعور اور آگہی سے محروم رکھا جائے۔ حد تک تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں ان کے

”میں تھانے میں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔  
میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا ”پولیس دانوں سے دوستی  
میں ایک نقصان یہ بھی ہے وہ ہر وقت تھانے ہلاتے رہتے ہیں۔“  
”حالانکہ تھیس تو پاگل خانے ہانا چاہئے۔“ وہ جل کر بولا۔  
”تمہاری ذہنی حالت میں رہی تو مجھے قوی امید ہے کہ مستقبل  
قریب میں میرے لئے تمہارے فون دیں سے آیا کریں گے۔“ میں  
نے کہا۔

”تھیس کسی بھی وقت جو اس کرنے سے کوئی نہیں مدد  
سکتا۔“ وہ زیادہ جل کر بولا۔

”جو اس تم سے شروع کی ہے۔“ میں نے کہا ”میں تو کوشش  
کر رہا ہوں کہ تھیس کام کی بات کرنے پر آمادہ کر سکوں۔ تم مجھے  
تھانے کیوں بلا رہے ہو؟“

”یہاں سے اکٹھے کس کل چلیں گے۔ میں اس وقت سادہ  
لباس میں ہوں۔ کس چل کر کسی فٹ اتھیرا رستوران میں بیٹھ کر  
کھانا کھاتے ہیں۔ جہاں زندگی اپنے اصل مدپ میں ہو، بھانت  
بھانت کی باتیں کرنے والے رنگا رنگ لوگ ہوں۔ کھانوں میں  
ڈانٹتے ہو۔“

”برتنوں میں غلامت ہو اور گلاسوں میں پندرہ بیس بیاریوں  
کے جراثیم ہوں۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”وہ سب کچھ تمہاری اس اونچی منافی سوسائٹی کے ذہریلے  
اثرات سے بہتر ہے ان سے کم نقصان دہ ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں  
بولے۔

”اچھا۔۔۔ اچھا میں سمجھ گیا۔“ میں نے رساں سے کہا ”تمہارا  
اس وقت دولت مندوں کو۔۔۔ اونچی سوسائٹی کو بلند والا چسکی دیکھی  
عمارقوں کو گالیاں دینے کوئی چاہ رہا ہے۔ کوئی انتہائی قسم کی فلم دیکھ  
لی ہے کیا؟“

”ہاں صبح سے دیکھ تو رہا تھا وہ فلم۔ جس کے دیانت کا براہی تم  
تھے۔“ وہ غفلت سے بولا۔

”فلم تو اچھی بجلی تھی۔ میری بدانتکاری بھی ٹھیک ٹھاک  
تھی۔ اپنی ناقص اور۔۔۔ نکمی پر کارمنس پر تھیس خود کو ملن طعن کرنی  
چاہئے۔ مجھ پر کیوں غرا رہے ہو؟“ میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی  
بحر زنی سے کہا ”اچھا خیر۔۔۔ ایک بک چھوڑو۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا  
پروڈانٹ کی ضمانت ہو گئی؟“

”ظاہر ہے۔“ وہ بدستور غفلت سے بولا ”اتنے معصوم بن کر  
کیوں پوچھ رہے ہو؟ تھیس تو پہلے ہی پتا ہو گیا۔ اسی لئے تو براہی  
میں تھے۔“

”میں بھاکا نہیں تھا۔ بد مزہ ہو کر واپس آ گیا تھا۔ بھانے اور  
بد مزہ ہو کر واپس آنے میں بڑا فرق ہے۔“ میں نے کہا۔

”خیر۔۔۔ اب مجھے فرق مت سمجھاؤ۔ اپنے اس گھٹیا قسم کے  
فائیو اسٹار ہوٹل سے نکلو۔ چل کر کسی اعلیٰ درجے کے چھوٹے

چر لئے بندہ رخصت ہو گیا اور میں اپنے آپ کو کام میں  
لے کر کوشش کرنے لگا۔ کام میں دل تو نہیں لگ رہا تھا لیکن  
بالخصوص تیز لمحات میں کام ہی میری پناہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے  
بوصرف رکھنے کا یہ ایک پناہ تھا۔ اس وقت میں کس جانا  
نہا جاتا تھا وہ وقت گزاری کے لئے ذرا تاج کا گھر بہتر  
نقدہ کی مرتبہ بلا بھی چکی تھی۔

کہ نہ کسی طرح چند گھنٹے گزریں گے حتیٰ کہ میں نے دوسرا  
کی گالیاں۔ رجیم کل کی طرف سے کوئی اطلاع نہ آئی۔ میں  
نے تھانے فون کیا کیونکہ مجھے اس کی طرف سے تفریق  
آئی تھی۔ تھانے سے پتا چلا کہ ابھی وہ عدالت سے واپس  
آئے۔

”تو راضی بیچ کے بعد اس کا فون کیا۔ چھوٹے ہی بولا  
نا غائب ہو گئے تھے بھی؟“ لہجے میں تھکن بھی تھی۔  
”نہیں۔ اور ایک مجبور قسم کا غصہ بھی۔“

”یہاں کھڑے نہ کر کیا کرنا؟ قانون کی سب سے کمزور نمائشا  
ہیں کی بات نہیں تھی۔“ میں نے ملائمت سے جواب

اورد بھی آگئے تھے۔ ”وہ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد  
اس کے لیے سے غصہ اور جھنجھلاہٹ غائب ہو گئی تھی۔  
یہ وہی تھی۔“

”ناراضی زیادہ قریب سے دیکھنا؟“ میں نے اسی ملائمت سے

۔۔۔ کیواس مت کرو۔ ”اس نے کھوٹے لہجے میں مجھے  
شک کی ”تم اس وقت کہاں ہو؟“ اس نے میرے  
برابطہ کیا تھا۔ شاید اس لئے اسے اندازہ نہیں تھا کہ  
میں کتنا۔

”میں ہوں۔ اپنے آفس میں۔۔۔“ میں نے جواب

دیا ”اس نے کوئی ایسی بے دھیانی کے سے عالم

یا کیا جاتا ہے؟“ میں نے اناس سے سوال کیا۔  
”جو سنا ہے؟“ وہ قدم سے کھسیا ہٹ سے بولا ”تم  
کی بھی وقت۔۔۔ کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تم کوئی نارمل  
سے بلکہ کسی بھی تو مجھے تمہارے افسانہ ہونے کے  
بہتے لگتا ہے۔“

”کیا تم کر کے اپنا کھسیا ہٹ ملانے کی کوشش  
کیا کرو۔ کیا کتنا چاہتے ہو؟“ میں نے سنجیدگی سے

پتہ تھا کہ تم میری طرف آ جاؤ۔“ وہ بولا۔  
”میں نے پوچھا۔“

رستوران میں کھانا کھاتے ہیں۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔  
”کیا یہ تمہارا غم غلط کرنے کا طریقہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”یہی سمجھ لو۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”کاش تم کوئی فلمی ہیرو ہوتے تو چھتر رستوران میں جانے کے بجائے کسی عجیب و غریب قسم کے شراب خانے میں جاتے جو شراب خانے کے بجائے خلائی اسٹیشن معلوم ہوتا۔ نہایت اچھوتے قسم کے لباس میں کوئی رقص لالہ پری اور نیلی بلی دیوانوں کے درمیان رقص کر رہی ہوتی۔ دھن دھن سے وہ تمہارے گلے میں ہاتھیں ڈال کر جھولا جھولنے کی کوشش کرتی۔ غم غلط کرنے کا یہ طریقہ زیادہ دلچسپ معلوم ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”تم آ رہے ہو یا نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”یاد مجھے آئے ہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔  
”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی اعلیٰ قسم کے چھتر رستوران میں کھانا کھانے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔“

”کیوں۔ کیا تم بھی کلاس کا نشیٹ ہو گئے؟“ اس نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”کلاس کی ایسی تھی۔ کلاس کو گولی مار دی۔“ میں نے کہا۔  
”مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے اس گھٹیا قاتیہ اسٹار ہوٹل میں کھانا کھا چکا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں ویسے ہی تمہارے خستے سے دل کو تسلی دینے کے لئے آسکتا ہوں۔ مجھے یہ جان کر ہلکا صدمہ ہوا ہے کہ تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ میں معدے کی گھڑائیوں کے ساتھ تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ اگر تم کو تو تمہارا ساتھ دینے کی خاطر جینے کی حد تک کھانے میں تمہارا ساتھ دے دوں گا۔ یعنی یہی کوئی دو چار ٹان اور دو چار پلیٹ سالن ایک دوہ پلیٹ سلاڈ کے ساتھ کھالوں گا۔ دوستی میں انسان اتنا تو کر ہی سکتا ہے۔ ویسے بھی میری تو زندگی ہی انار کا دو سرا نام ہے۔“

”اچھا تو بھائی انار پسند صاحب! آپ شریف لائے۔“ بندہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا پھر اس نے سلسلہ منتقل کر دیا۔

میں نے باہر جانے سے پہلے شفیع شاہ کو اپنے پروگرام سے مطلع کیا۔ وہ بولا ”میں گاڑی میں ایک آدھ گھنٹہ کے ساتھ آپ کی نگرانی کے لئے پیچھے پیچھے رہوں گا۔“

”میرا خیال ہے اب اہل کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن خیر اگر ہمیں زحمت نہ ہو۔ اور کسی خاص کام کا حرج نہ ہو تو ٹھیک ہے۔“ میں نے نیم رضامندی سے کہا۔

میں جب تھانے پہنچا تو وہ باہر ہی سادہ لباس میں گاڑی میں میرا خنجر تھا۔ گاڑی سرکاری تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اس گاڑی کو چھوڑ کر میرے ساتھ آن بیٹھا۔

”کہاں جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ساحل کی طرف لے چلو۔“ وہ ایک لمبے سوچ کر بولا۔

میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور پوچھا ”تم نے کیا تھا؟“  
بھی ڈرنک موم بنا رکھا ہے جو اس وقت دھڑکی کے جھلے لباس میں نظر آ رہے ہو؟“ پھر اس کے جواب کا انتظار کرتے ہوئے خود ہی کہا ”ہاں، جی اگر بنا بھی رکھا ہو تو کیا عجیب کی بات ایسے اچھے اور آخر تھانے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اندر جس قسم کا ہے بنا۔“

اس نے مجھے گھورا اور کہا ”روم وغیرہ تو کئی ایسا نہیں ہے لیکن سادہ لباس بہر حال تھانے میں موجود ہوگا۔ ایک پولیس آفیسر کو کسی وقت سادہ لباس میں بھی کہیں با ضرورت پیش آسکتی ہے۔ مگر اس وقت دراصل میں کمر کا لگا کر آچکا ہوں۔“

”اوہ۔“ میں نے کہا اور ایک لمبے کے توقف سے ”اس معزز پیر کی شانیت عدالت نے کس وقت منظور کی؟“  
”ایک پہچے کے قریب۔“ اس نے بتایا۔

”مگر آؤ کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاتھی شاد تھی۔“ اس نے مختصر سے جواب دیا۔  
”عدالت کو اس وقت تک یہ تو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اہم ترین گواہ کو عین عدالت کے دروازے پر قتل کیا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سڑک کی طرف اشارہ کر دیا۔ ”اس کا تو رنگ سے مقدمہ درج ہوا ہے۔ اب اس کی تحقیق ہوگی اور فی الحال یہ مقدمہ ”نامعلوم قاتل“ کے ہوا ہے کیونکہ جب تک پیر دانش سے اس کا تعلق ثابت نہ ہو جائے تب تک اس سلسلے میں اس کے خلاف مقدمہ ہو سکتا تھا۔“

پھر وہ گہری سانس لے کر بولا ”بہر حال ابھی تک جمال کی نشاندہی پر دو تین افراد میرے ہاتھ آئے ہیں۔ چھوٹی پھیلیاں ہیں۔ بڑی پھیلیاں غالباً یہ ہیں۔ عدالت نے اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔ وقت کم ہو رہا ہے۔“  
”شاید ہم اسے تو قوی مدت سزا دلوائیں؟“  
”جو جائیں لیکن جو خواب ہم نے دیکھا تھا وہ شاید دروازے کی اپنی شانیت کے بعد پیر دانش نے تم سے کہہ کر پوچھا۔“

”میرا اس سے سامنا نہیں ہوا۔“ میں سامنا کیا تھا۔ ”اس نے اب بھی میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔“  
”صاحب کے اٹھنے کے بعد بھی کافی دیر تک وہ یہی سرکاری وکیل سے باتیں کرتا رہا۔“  
”جب میں باہر آیا تو وہ چاکا تھا اور اس دروازے کی کافتی کا روڑا بھی مل کر چکے تھے۔“  
”پھر ایک لمبے کے توقف سے وہ۔“

انتظام تو نہیں کیا جا رہا تھا؟ لیکن غالباً اس نے اس خیال سے جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا تھا کہ کہیں میں اسے بدگفتی نہ سمجھوں۔  
”تمہارے خیال میں مجھے اس کا کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے پوچھا۔

اب تم اتنے ہی تجھے ہو گئے ہو؟“ وہ خشکی سے بولا پھر اس نے قیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر چوٹی سی ایک آٹونیک گن نکالی۔ وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے اور نفیس قسم کے شکاری قیص میں تھا۔  
”گاڑی آگے زیادہ سنسان حصے کی طرف لے جاؤ۔“ اس نے ہدایت کی۔

اب وہ گردن کھما کر سر ذرا نیچا کر کے گاڑی کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یکدم جاق و چوبند نظر آئے لگا تھا۔

”اوہ بھائی طرم خان! اب اتنی بھی زیادہ مستعدی دکھانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے جلدی سے اس کے گمن والے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”اس نیچے کو اچس نیچے میں رکھ لو۔“

اس نے مجھے گھورا اور گہری سانس لے کر بولا ”تمہارے اپنے آدمی ہیں؟“

”ہاں“ میں نے جواب دیا۔

وہ سیدھا اوپر کر بیٹھ گیا اور منہ بنا کر بولا ”بچوں کی طرح مذاق کرنے اور بات گھما پھرا کر کرنے کی تمہاری عادت نہ جانے کب چلے گی۔“

”بچے بات گھما پھرا کر کرتے ہیں چند روز تو بالکل سیدھی بات کہنے سے منہ پر مار دیتے ہیں۔“ میں نے ہنسی کی ”اور میں تم سے مذاق تو ڈرا ہی کر رہا تھا۔ میں تو ذرا دیکھ رہا تھا کہ پولیس والے بے وقت اور بے موقع بھرتی دکھاتے ہوئے کیسے لگتے ہیں۔“

”تم بڑی خفیہ مداح ہو۔“ وہ گمن کو قیص کے نیچے چھپاتے ہوئے بولا ”آج کے دن بھی تم مذاق کرنے سے باز نہیں رہ سکتے گا۔“ وہ جس طرح ظفر خیال کو مروا دیا اور پھر واپس جس طرح ہمارے ہاتھ سے تقریباً نکل گیا اس کا شاید ہمیں ذرا بھی صدمہ نہیں ہوا۔ تم تو آرام سے جا کر اپنے آئین میں بیٹھ کر کام کرنے لگے اکیلے اکیلے کھانا بھی کھا لیا! اسے گویا میری حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔

”تو کیا میں سر کے بل کھڑا ہو جاتا اور اسی عالم میں بھوک ہر حال شروع کر دیتا؟“ میں نے خشکی سے پوچھا۔ وہ خاموش رہا تو میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا ”میں کچھ دیر تمہاری طرح منہ لٹکائے بیٹھا رہا تھا اور کام بھی میں درحقیقت ذرا بھی دلچسپی سے نہیں کر رہا تھا۔ کام میں تو دراصل میں بے تاملش کرنا ہوا اور اب میرے بزنس میں میرے کام کرنے یا نہ کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ ہر حال کچھ دیر تک منہ لٹکائے بیٹھ رہنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اس طرح بیٹھ رہنے سے کسی کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لئے میں کام سے بل بل بلاتے اور اپنے آپ کو صحیح

کر لی اور بات کر دو۔“  
”بھئی دل خشکی کی ایک علامت ہوتی ہے۔ انڈیان کسی بارہ صبح سے کھڑا ہے یا بہت سی ڈھیلے ڈھالے انداز میں نکلا ت کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہے۔“

”فٹ تو میں بارہا بھیچ چکا ہوں۔“ میں نے علامت سے کہا۔  
”نہ بھینچا اور بات ہے اس کے بارے میں جاہل خیال کرنا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”تمہیں ہر گاڑی پچھلے ہی سے جتن کی تیاریاں کر کے رکھی ہوئی ہیں دقت شاید جتن شروع ہو چکا ہو۔ کوئی بہت نہیں کر دو بدو کرے۔ اس موقع پر شاید وہ زیادہ سے زیادہ قسم بخانی کوشش کرے۔“

”تم غریب بننے کا حق حاصل ہے۔“ ورجیم گل میا لے کر واپس کی رہائی میرے اور تمہارے منہ پر ملنا چاہے۔  
”شاید یہ میرے اور تمہارے منہ پر نہیں کالوں کے منہ پر

بھی معلوم ہے اور میں شاید تم سے زیادہ معصوم ہوں۔  
”اے دل لٹکائے لینے سے کچھ نہیں ہو گا۔ کوشش کرتے ہیں لکے کے اثرات سے نئی قوت نئی توانائی حاصل کریں۔“  
”لیکن میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔“

”دشمن کہنے کے لئے تو بے کام چھوڑ پھاؤ کہ کچھ دیر اہل۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا ”اوجھڑو۔“ وہ مجھے لگا۔ ہم سائل پر پہنچ چکے تھے۔ اس کی ہدایت پر میں اسے توازی چلائے لگا۔

”کی گئی خاموشی کے بعد وہ بولا ”پہلے مجھے شک تھا۔ اب

”ت کا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔  
”پھر کھلی ایک نظر عقب نما آئینے کی طرف دیکھ کر ہم قلعے سے روانہ ہوئے ہیں سفید رنگ کی ایک نقاب میں ہے۔ کار سوار کی صورت میں اب تک

”لایت کے احساس سے میں مسکرا دیا۔ گویا ورجیم گل دل خشکی نے بھی اس کی پیشہ ورانہ مستعدی اس گہرا اپنے گرد پیش سے بے خبر نہیں تھا۔  
”کی صورت تم دیکھ بھی نہیں سکو گے۔“ میں نے لڑکھا ”تیرے گاڑی چلانے سے نہیں میرے ہوٹل پگھلی ہوئی ہے۔“

”وہ برقی طرح چلا۔“ پھر تم نے اس کا کچھ بے غرض خیال والا۔“ اس نے جملہ اوجھڑا چھوڑ

لاہا تھا کہ کہیں ظفر خیال والا واقعہ دہرا ہے گا۔

اترے۔ ہوٹلوں اور اس دیوار کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اس لئے کوئی بیرونی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ویسے بھی شاید انیسویں صدی میں بھی کسی ایک شاندار گاڑی سے اترنے والا سوئے ہوئے شخص اور نہایت عمدہ شلوار قمیص ویت کوٹ وغیرہ میں نظر کرنے والا کوئی جاگیردار نائب صاحب ان کی مچھلی کھانے میں دلچسپی رکھ رہا ہوگا۔ رجم گل نے خود ہی ایک ہیرے کو اشارے کر کے بلایا۔ ہیرے اس کے اشاروں کی طرف متوجہ ہوئے تو پھر اگلے دو دن دوڑے دوڑے آگئے۔

”تم میں سے شیدی کے چھتر کا ہیرا کون ہے؟“ رجم گل پوچھا۔

”میں ہوں جی۔“ بولے بچے ایک نوجوان نے جھپٹے ہوئے آگے بڑھ کر کہا۔ اس نے المونم کی ٹرے سے ہیرے لگا کر کہا وہ ننگے پاؤں تھا۔

”شیدی سے جا کر بولو رجم گل کے لئے بہترین ہیرا کر کے بھیجے۔“ وہ جو کچھ اور جس طرح منگوانا چاہتا تھا اس سمجھانے لگا۔ دوسرے ہیرے قدرے مایوسی کے عالم میں ہاتھ دھوئے۔

لڑکا آرڈر سمجھ کر مستندی سے واپس جانے لگا تو اسے کا سو کا سا بازو پکڑ کر روکے ہوئے کہا ”یارے بھائی اگر تم کو اپنی بی بیات دے دی ہیں۔ ایک آدھ ہدایت میری بھی ہے مچھلی پھینک دے دن سے زیادہ پرانی نہیں ہونی چاہئے کہ کشتی اسے اس طرح پکایا جائے کہ اسے کھانے کے بعد اس میں بی بی کی ایسے بچک میں لانا جسے سال دو سال میں ایک تھ ضرور دھوا جاتا ہو۔“ سمجھ گئے؟“

لڑکا ذرا کھائی پانی میسٹر ایٹ کے ساتھ بولا ”نہیں شیدی کے ہوش میں بھی تازہ پانی ہے۔ سب چیز اگل ایک دم ٹپس کلاس لائیں گا۔“

رجم گل پکچلی بجا کر اسے جانے کا اشارہ کرتے ہو۔ جاؤ۔ بس شیدی کو صرف میرا نام بتا دینا۔ ان صاحب دھیان مت دو۔ یہ جب سے اسیر ہوئے ہیں انہیں ہرگز نکالنے کی عادت ہو چکی ہے۔“

لڑکا موقع غیبت جان کر فوراً دوڑ پڑا تو میں نے رجم گل کا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے نہایت عوامی اور فحش کی طرف لوٹ کر جانے کا دورہ کبھی بھی نہیں ہوگا۔ میں ان چیزوں کے لئے اب بھی قوت برداشت رکھتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان میں کچھ آئے ان بے چاروں کی مچھلی کٹی کٹاں سے یہ زیادہ تر بڑی سڑکی پر رہتی ہے۔ شہر میں فنڈ ہال چھوڑا اور بھی چھپیں۔“

طور پر سوچ بچار کے قابل بنانے کی کوشش کرنے لگا پھر کچھ دیر بعد تھرا رٹون آگیا۔

وہ خاموش رہا۔ ہم ساحل کے دران جسے کی طرف نکل آئے تھے۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی ذرا مدھمکے ہوئے بچے کی طرح بیٹھا تھا۔

”آخر جانا کہاں ہے؟“ میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔

”واپس موٹو لگا ڈری۔“ وہ بولا۔

”تھماری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تم اس وقت کسی عیسی یا ڈرائیور والی سرکاری گاڑی میں سفر نہیں کر رہے ہو جو شہانہ انداز میں حکم دیئے جا رہے ہو۔ اور ہر موٹو اور موٹو۔ واپس لے چلو۔ سیدھی طرح اور فیصلہ کن انداز میں بتاؤ جانا کہاں ہے۔“ میں نے اسے مزید تھوڑی سی ڈانٹ پلائی۔

”میں بھولا نہیں ہوں بھائی! مجھے انہیں طرح یاد ہے کہ اس وقت میں ایک بڑے سیٹھ صاحب کی خالہ صاحبی گاڑی میں سفر کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں لیکن سیٹھ صاحب کو کڑا ویسے پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ میں سیٹھ صاحب کو گاڑی سمیت اس سمندر میں غرق کر دوں گا۔“ وہ الفاظ چاہتے ہوئے بولا۔

”واہ بے“ دور حاضر کے ماڈرن دادا گھبراہٹ میں نے گاڑی موڑتے ہوئے استہزائیہ ستائش کے انداز میں سر لایا۔

اب ہم واپس ساحل کے متوازی چلی سی سڑک پر جا رہے تھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر سمندر کی تفصیل کا کام دینے والی موٹی سی اور چھوٹی سی پرانی دیوار تھی جس کے زرد پتھر بھی شاید غم دور اس کے بوجھ سے شکست و ریخت کا شکار ہونے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد ہمارے دائیں ہاتھ پر ان پتھر سے تروانوں کی قطار شروع ہو گئی جہاں زیادہ تر تلی ہوئی مچھلی اور تان لٹے تھے۔ ان کی خاص ڈش یہی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کسی کے پاس کچھ ہوتا تو اسے بوس سمجھنا چاہئے تھا۔ فضا میں مچھلی کی بو پھیلی ہوئی تھی جو اشتیاق انگیز مغموم ہونے کے بجائے خاصی حد تک بھوک بھگانے والی محسوس ہو رہی تھی۔

ساحل پر خاصی حد تک دیرانی ہی تھی۔ ان دنوں تفریح کا ہوں پر مستقل طور پر ہی وقت کم ہو چکی تھی اور پھر یہ تو وقت بھی ایسا ہی تھا۔ اس وقت تو کوئی بہت ہی زیادہ فاصلہ البال یا پھر ہماری طرح کسی خاص ہی قسم کی بے تاملی دل کا مارا ہوا انسان ساحل کا رخ کرنے کا متحمل ہو سکتا تھا۔ کیس کیس دو دو تین تین افراد کی ٹولیاں چل قدی کرتی نظر آ رہی تھیں لیکن ایسی دستوں میں اتنے سے افراد کا ہونا نہ ہونا برابر لگتا ہے۔ اس کے باوجود پتھر سے تروانوں کے ہیرے ہاتھ میں گندی سی ٹرے اٹھائے شاید کسی سوہوم سی امید کے سارے گاہک کی تلاش میں رت پر اوھر اوھر نکل رہے تھے۔

رجم گل نے دیوار کے قریب گاڑی رکوائی اور ہم نے

دوسری سماجی انسانیاں بھی ہیں۔ طبقاتی فرق بہت زیادہ ہے۔ ایک طرف غریب کی کوئی اتنا نہیں ہے۔ دوسری طرف دولت کی کوئی اتنا نہیں ہے۔ ایسے میں بہت سے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو عہدہ طبقات کے جذبات کو خوب ایکسپلائٹ کرتے ہیں۔ مکی ان کا کاروبار ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے سینوں میں چھپی ہوئی چنگاریاں کو شعلہ بناتے ہیں۔ لوگوں کی عموماً دو دو ہوں نہ ہوں، ان کے اپنے دلور ضرور دھل جاتے ہیں۔ دولت کے ڈھیر بھی لگ جاتے ہیں۔ ایک اشارے پر پہل بھی بڑا ہونے لگتی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بد صورتی ان لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔

وہ چند لمبے پرخیاں انداز میں غاموش رہا "یار! بچپن اتنا خوب صورت کیوں لگتا ہے؟"

"کیونکہ بچپن میں انسان زیادہ سمجھدار نہیں ہوتا۔" میں نے لکھنؤی سانس لے کر مسکراتے ہوئے جواب دیا "اسنے اپنے معاشرے۔ ملک اور دنیا کے مسائل کی تو کیا۔ خود اپنے گھر کے مسائل کی بھی سمجھ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ بڑا خوش۔ بڑا مگن اور بڑا مست رہتا ہے۔ اس کی نظر بہت کم نااطل تک جاتی ہے۔ اس لئے اسے دنیا کی بد صورتیاں کم نظر آتی ہیں۔ بڑے ہو کر وہ بفرار ہو جاتا ہے۔ جتنی زیادہ سمجھ آ جاتی ہے اتنی زیادہ تکلیف دہ جاتی ہے۔ آگنی بڑا غلاب ہے۔ سوچ اور شعور سے محروم لوگ ہر عمر میں ہی مزے میں رہتے ہیں۔ انہیں صرف ڈال اور لٹی مسائل توڑا بہت تنگ کرتے ہیں۔ اندر کوئی دو گ نہیں لگا ہوتا۔"

مزید چند لوگوں کی غاموشی کے بعد وہ اچانک بولا "یار! افضل! ہم بھی بچہ دانش قسم کی کوئی چیز کیوں نہیں بن گئے؟ اس قسم کی چیز بننے کے لئے حالات تو ہمارے حق میں بھی بہت سازگار ہو سکتے تھے۔"

"لاحول ولا قوتہ" میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا "اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے تمہیں کیا بھولنا خیال آیا۔"

"کیوں کیا خرابی ہے اس میں؟" اس نے لکھنؤی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "دولت ہے حسین عورتوں کے گھٹنے ہیں۔ معاشرے میں عزت، تقدس اور احترام ہے۔ اثر و رسوخ ہے۔ بڑے بڑے لوگ درجہ سلام کرنے حاضر ہوتے ہیں۔ کس چیز کی کیا ہے اس کے پاس؟"

"تعمیر کی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور دیر تک ہنستا رہا۔ جتنی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ آنسو زیادہ چھنے کی وجہ سے نہیں آئے تھے۔ یہ یقیناً اس کے دل میں جمع تھے۔ راست ہا کر یاہر کو دھلک آئے تھے۔ پیر دانش کا صدمہ اس نے کچھ زیادہ ہی دل کو لگا لیا تھا۔ اس نے بڑی جرات لے غنی اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیر دانش پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ پکٹی پکٹی کی طرح پھسل کر کل گیا تھا۔ اس کے اندر موجود اصول پسند انسان کو تو خود چپ کا کاغذ

وہ گویا میری کم فنی پر متبادل انداز میں مسکرایا "شاید تمہارا خیال درست ہو لیکن جہاں میں نے اس لڑکے کو بھیجا ہے اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں اور پھر ذرا میرے نام کے اثرات دیکھنا۔ کھانا کھانے کے بعد رائے دتا۔"

"ہاں یہ بات اور ہے۔" میں نے تسلیم کیا "آخر یہ تمہارا علاقہ ہے! بادشاہ وہ تم اس علاقے کے۔"

"اے لعنت! سبکو بادشاہی پر۔ ہم کہاں کے بادشاہ ہیں۔ ہم تو پیر دانش جیسے ایک سنبولے کو بھی نہیں پکڑ سکتے۔" پھر اس نے نہایت صوفیانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "ہیں اللہ بڑا بادشاہ ہے۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ ٹھیل رہے تھے۔ اچانک اس نے مجھے گھورا اور بولا "تم سمجھ رہے ہو شیدی میری حیثیت کی وجہ سے میرے لئے خصوصی اہتمام کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ اس لیے چارے کو تو معلوم ہی نہیں ہے کہ اس علاقے کا انیس اچھ او میں ہی ہوں۔ اس سے میری شناسائی کی بنیاد کچھ اور ہے۔"

"بہت خوب۔" میں نے آنکھیں میکرے ہوئے اسے گھورا "تم نے بھی کافی پر پڑے نکال لئے ہیں۔ ادھر ادھر اصرار ت پھیلائے گئے ہو۔"

وہ اپنا خوب صورت اور نفیس قسم کا تاریک چشمہ ہاک پر ٹھیک طرح سے بناتے ہوئے بولا "آؤ دیوار پر بیٹھتے ہیں۔"

ہم کھنڈرے لوگوں کی طرح دیوار پر جا بیٹھے۔ دوسری طرف پڑے پھروں پر ہم نے اپنی ٹھالیں۔ ابھی موسم کھنڈا چل رہا تھا۔ سمندر میں زیادہ تھن نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی دھت اور تہت اپنی جگہ تھی۔ در تک ہم اپنی اپنی جگہ غاموش بیٹھ رہے اور ہماری نظریں سر مٹی فضا میں پھلتی رہیں۔ میں بھی بہت کچھ سوچ رہا تھا اور شاید اس کا ذہن بھی دشت خیال میں دو در در تک پھنک رہا تھا۔

آخر وہ بہت دھیمی آواز میں بولا "یار! افضل! اللہ نے اسے دنیا کو اتنا خوب صورت بنایا ہے۔ یہ انسان ہر وقت اسے بد صورت بنانے پر کیوں تیار رہتا ہے؟"

"اب صرف چند ہی ملک ایسے رہ گئے ہیں جہاں لوگوں میں کچھ مجبورانہ رجحانات پائے جاتے ہیں اور وہ دنیا کو بد صورت بنانے پر تکتے رہتے ہیں ورنہ دنیا کے بیشتر باشندوں کو اب سمجھ آگئی ہے کہ دنیا میں کس طرح رہنا چاہئے۔" میں نے آفتی پر پھیلے دھندلکے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اس کی ایک وجہ سخت نا شکراہی اور قاحت کا نہ ہونا بھی ہے۔" وہ بولا "ہمارے ہاں بہت سے لوگ اپنی زندگی پر اطمینان اور قاحت نہیں رکھتے۔ ہر وقت بے چین اور مضطرب نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے رہتے ہیں کہ کوئی مجبورہ دنیا ہو گا اور وہ راتوں رات فرش سے فرش پر پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" میں نے تسلیم کیا "ساتھ ساتھ کچھ

ہمارے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ چھٹی ماہ سلاو فیو، سب چیزیں واقعی صاف تھیں رے میں بڑے اہتمام سے رکھ کر بھیجی گئی تھیں اور ان سے آؤ کی ملک اٹھ رہی تھی۔

رجیم گل کمانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ شخص جو اردو ٹیک طرح سے بول بھی نہیں سکتا" "اردو میں شاعری کی کوشش کرتا ہے۔ امان ٹھیک کرتا ہے۔"

"اللہ... اللہ... میں نے پھلی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "شاعری بھی انسان کا بنیادی حق ہے۔ جو چاہے لکھ لکھا ہے۔" "یہ چاہیے کہ شاعری کے رموز و قواعد کو تو چاہیں تعلیم بھی کوئی خاص نہیں۔ تین چار شاعرت پڑھا ہوا ہے۔ شعر تو نہیں کہہ سکتا۔" "بہاری کرتا رہتا ہے۔ اسی کو شاعری سمجھتا رہتا ہے۔ امان شیدی کے نام سے معروف ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن کوئی بے چارے کو "امان کے نام سے بکا رہا ہی نہیں۔ سب صرف شیدی کہتے ہیں۔"

"تمہاری باتوں سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ یہ کوئی دلچسپ کردار ہے۔" میں نے کمانا شروع کرتے ہوئے کہا۔

"بہت دلچسپ" "رجیم گل بولا "ٹھیک اس نے خوب چھانٹ کر رکھا ہے۔ بے چارہ واقعی سراپا امان ہے۔ اس کے دل میں نہ جانے کتنے امان گٹ گٹ کر مرنے کے قریب ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ وہ لی اور فلموں میں ہیرو آتا۔ اپنی اداکاری سے دنیا میں دھوم مچا دیتا۔ اس کا دوسرا امان ہے کہ یہ کسی طرح اس شہر کا میزبان بن گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر اسے صرف دو سال خدمت کا موقع دیا جائے تو یہ اس شہر کو پیرس اور لندن وغیرہ جیسا خوب صورت بنادے۔"

میں نے ہنسنا لگا۔ "رجیم گل سنجیدگی سے بولا "اے لوگوں کی سادگی بڑی غور طلب چیز ہوتی ہے۔ تمہیں ان کا حوصلہ عجیب نہیں لگتا؟ ناگھن چیزوں کو اپنی منزل بنا کر بڑے غلوں اور گن سے زندگی بھر تک دو میں گتے رہتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کی طرح اپوس نہیں ہوتے۔ یہ اس شہر کو لندن اور پیرس بنانے کے خواب دیکھتا ہے حالانکہ اس نے لندن اور پیرس خواب میں بھی نہیں دیکھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اس قسم کے سارے لوگوں کو تو ہاتھوں میں اگر اختیارات آجائیں تو شاید یہ واقعی کچھ کر سکیں۔ کوئی کارنامہ دیکھا نہیں کسی انمولی کو ہونی چاہیے۔"

"جیسے ساپ بچو، بیٹھنے کے بعد کچھ اور بن امان ہمارے نظام میں موجود ہیں وہ انہیں کب کچھ کہنے دیں گے۔ وہ ایک ہی دن میں انہیں کھا جائیں گے ان کی بٹائیوں کی دس گے" میں نے کہا۔

"ہاں کیا تو سہل ہے۔" وہ ابھی سے بولا "ان سے جان

کا جائیں ایک غیرت مند اور دہلے والے ان کی حیثیت سے شاید اس نے اپنی خدمت تو بن بھی محسوس کی تھی۔ وہ عدالتوں اور ہمارے نظام انصاف کے بارے میں بھی مکمل کر تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس کے اندر ان کا بے ضرور دھپک ہے۔

"خیر کس؟" آخر کار اس کی انہی تھکی تو وہ ذہیر نے لیے میں بولا "یہ کس چلنا کا نام ہے اور ہماری سوسائٹی میں اس کی کیا قدر ہے؟"

"مگر اس کی قدر میں رہی تو کچھ لوگوں کو تو اس کی قدر بحال کرنے کے لئے کام کرنا پڑے گا۔" میں نے لافٹ سے کہا "اگر بھی نے خیر کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو ایک روز ہم بڑی ذات کی موت مریں گے۔"

وہ خاموش رہا تو میں نے کہا "خیر بھی شاید انسان فطرت کی طرح اپنے ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔ یعنی میرے خیال میں بعض لوگ پیدا ہی باخیر ہوتے ہیں اور بعض بے خیر پیدا ہوتے ہیں۔ خیر ایک ہمار ساتھ لگ کر آجائے تو پھر انسان کا چھپا نہیں چھوڑنا اور اگر کسی کے پاس خیر موجود ہی نہیں ہے تو آپ اسے بار بار کہہ لیں باخیر نہیں بنا سکتے اس کے لئے لاکھ کوششیں کرتے رہیں۔" وہ ملاحظہ سے "تقریریں کرتے رہیں سب اس کے ایک کان سے گھس کر دوسرے سے نکلی رہیں گی۔"

اسی دوران میرا اور ایک دوسرا شخص دوڑے اٹھائے آگئے۔ اپنے دوسرے کے مطابق وہ بڑے اہتمام سے ہمارے لئے کھانا لائے تھے۔ میں دوسرے شخص کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ چھپرہ لہ ستودان کا مالک شیدی ہو گا۔ وہ مجھے ہونے جسم کا ایک اوجیز عمر ماہ نام شخص تھا جس کے بال حد سے زیادہ ٹھکرائے تھے۔

میں نے ہمارے درمیان رکھ کر وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بن نہیں چل رہا تھا کہ وہ رجیم گل کے قدموں میں بچھ جاتا "سائیں! آپ ہو! میں تشریف لاتا ہوں۔ میں آپ کے لئے قائلین بچھواتا۔"

میری مداح کے مطابق وہ بھی اپنے چھپرہ ستودان کو ہوٹل کا کہہ رہا تھا۔ اس کے پیچھے میں چلائی تھی غلوں تھا۔ چہرے پر حد سے زیادہ شکرگزاری تھی۔ شاید رجیم گل نے بھی اس پر کوئی اصرار کیا ہو۔ میں نے اس سلسلے میں اسے کبھی نہیں تھا۔ میں نے لکھا سوچا تھا کہ اگر وہ مناسب کچھ کا تو خود ہی بنا دے گا۔

رجیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اگر قائلین پری بیٹھنا ہوتا تو مال کیوں آتے۔"

وہ بازی سے مسکراتے ہوئے بولا "کوئی اور خدمت ہو تو تاکیں۔"

"جو کچھ بھی ہو گا وہاں ہمیں پیٹھ بچھوادوں گا امان شیدی! اب تم چلو۔" "رجیم گل اس کا کندھا سنبھالے ہوئے بولا۔

وہ رخصت ہو گیا۔ میرا کچھ دور جا کر ٹھٹھٹا۔ شاید اسے صرف



چھوٹے بھی تو کوئی کچھ کہے گا۔ اس بے چارے امان شیدی کے ہر حال اور بھی بڑے بڑے امان ہیں۔ دنیا کی سیاست کرنا۔ چھبوں کے لئے ایک بہت بڑی ہانگہ اسٹیم بنانا۔ اور نہ جانے کیا کچھ خوابوں کی دنیا کا آدمی ہے مگر بہت بڑا انسان ہے۔  
”آئندہ کبھی فرصت میری تو تیں اس سے ملوں گا۔“ میں نے کہا ”مجھے دلچسپ کرداروں کی تلاش رہتی ہے۔“

”لیکن اسے میرے بارے میں یہ مت بتانا کہ میں پولیس میں ہوں۔ پولیس کے بارے میں اس بے چارے کے خیالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔“ رحیم کل جلدی سے بولا۔

”مگر لوگوں کی طرح۔“ میں نے ہنسنے ہوئے کہا۔  
”ہمارے ہاں پولیس کو برا کہنا فیشن بھی تو ہے نا۔“ وہ اپنی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا ”اکثر ایسے لوگ بھی پولیس کو برا کہتے ہیں جنہیں کبھی پولیس سے واسطہ نہیں پڑا ہوتا۔“  
”برا کہنے کے ساتھ ساتھ وہ دیا بھی کرتے ہیں کہ اللہ انہیں

کبھی واسطہ نہ ہی ڈالے۔“ میں نے کہا۔  
”لیکن افسوس کہ لوگ بیروانی جیسے لوگوں کو برا نہیں کہتے۔ خواہ ان کے کروتے کتنے ہی گھماؤنے ہوں۔ خواہ ان کی وجہ سے کتنی ہی زندگیاں برباد ہوئی ہوں۔ وہ نیک نام اور معاشرے میں بڑے اونچے مقام کے مالک ہی رہتے ہیں۔“ رحیم کل فوراً بولا۔

اس بار میں نے تقریباً زندگی بچنے ہوئے کہا ”کن تمہارے ذہن پر بیروانی سوار ہے۔ تم نے یہ غم کو کیوں لگایا ہے؟ ابھی تو شاید بڑی عمر ہی ہے۔ نہ جانے کب تک تمہیں پولیس کی نوکری کرنی ہے اور ایسے نہ جانے کتنے واقعات تمہیں پیش آئیں گے۔ تمہارا کیا حال ہو گا؟“

”نی بنی لگ جائے گی۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔  
”پھر تو تم پولیس کی نوکری کے لئے نااہل ہو۔“ میں نے کہا۔  
”مگر میرا استعفا دینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ یہ اعتراف شکست لگانے اکہ ہر شخص اسی طرح شکست تسلیم کر کے پیچھے ہٹا رہا تو پھر کبھی کوئی تبدیلی نہیں آسکے گی۔ امید ہی ختم ہو جائے گی۔ اور امید ختم ہو جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

چھٹی واقعی بہت عمدہ تھی اور لذیذ بنی ہوئی تھی۔ میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود اس سے لطف اٹھو نہ ہوتے ہوئے کہا ”اب تم میرے فلسفہ حیات کے قریب آگے ہو۔ اسی پر قائم رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔“

”عافیت کم ہے؟“ اذیت زیادہ ہے۔“ وہ بولا ”تم نے ٹھیک کہا ہے۔ جو انسان صبر سمیت پیدا ہوا ہے اسے دنیا میں صبر کے ساتھ ہی رہنا ہے اور خوب اذیتیں برداشت کرنی ہیں۔“

”اس کے باوجود صبر کے ساتھ ذمہ دہتا بیروانی نہیں کر ذمہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔“ میں نے کہا ”تم کہہ رہے تھے نا کہ ہم

والتی کیوں نہیں بن گئے۔ اب تو خیر میں مالی اعتبار سے بیروانی کی فکر کے لوگوں میں شامل ہوں لیکن اگر میں غریب بھی رہتا رہا بھی شاید میں کبھی بیروانی بننا پسند نہ کرتا۔ میں صرف لا کھوں سے نوجوانی کے ابتدائی دور تک ذرا بھنگا ہوں۔ اس کی بڑی وجہ بھی میری کم عقلی نا تجربہ کاری اور غلط شناسائیاں تھیں لیکن جو کچھ میری عمر بڑھی، مجھے صحیح اور غلط کی تمیز آگئی۔ میں نے بہت کچھ سے صحیح راستہ اختیار کر لیا اور شکر ہے اس پر قائم رہا۔ میں قصبات میں نہیں رہا۔ جائز طریقوں سے بھی میرے پولیس نے جتنی قہر کی اتنی تیزی سے شاید ناجائز طریقوں سے نہ کرتا۔ اب تو میرا یہ خیال ہو گیا ہے کہ جتنا انسان اس حد تک میں لکھا ہوا ہے وہ اسے مقرر ہے لیکن انتخاب کا حق شاید اللہ نے انسان کو دے رکھا ہے کہ وہ اس کے لئے اچھے راستے اختیار کرتا ہے یا برے۔ میں اس کے غیر کا پکا چٹا ہے۔ اگر اس کا اختیار اچھائی سے اٹھا ہے تو اس کا پلڑا اس کی طرف جھک جائے گا اور اگر اس کا غیر خفاقت سے اٹھا ہے تو وہ اس طرف چلا جائے گا۔ ہر حال میری فکر میں سب سے بڑی

برائی اور خفاقت غلط خدا کو اذیت دینا ہے۔ جو کچھ بھی غلطی خدا کو اذیت دے کہ۔ ان کی زندگیاں خراب کر کے حاصل کیا جاتا ہے وہ سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ چاہے وہ دولت ہے چاہے وہ شہرت ہے چاہے وہ مادی مرتبہ ہے۔  
وہ خاموشی سے منہ چلاتے ہوئے مجھے گھر آ رہا پھر بولا ”کاف کا تالو لا کھن اور نوجوانی میں کیا کرتے رہے ہو؟“  
”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ جتنا کچھ بتا رہا ہوں یہی بہت ہے۔“ میں نے کہا۔

رحیم کل گویا میری بات سننے بغیر بولا ”کچھ اسٹیک اور کالے وٹنڈول جو میرے تعلق تھا تمہارا؟“

”اب اتنا زیادہ فوری ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے زرا سخت لہجے میں کہا۔ ”تو میں تمہاری اداسی اور دل کشکی دیکھ کر تم سے ذرا نکل کر بات کر رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تمہیں زندگی کی ہر بات بتا دوں گا۔“  
”اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں اندازے لگا رہا ہوں گا۔“ بولا۔

”ہاں اندازے بے شک لگاتے رہو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”اندازے لگانے سے کوئی کسی کو منع نہیں کر سکتا۔“  
”چلو۔ بتا دو یا رانا اتنا سرا رکھیں بن رہے ہو۔ میں اب گڑے ٹوکے اٹھاؤں گا کہ تمہیں گرفتار کرنے سے تو رہا۔“ وہ بولا۔  
”گرفتار تو خیر اس وقت بھی کوئی نہیں کر سکتا جب یہ ٹوکے گڑے نہیں تھے۔“ میں نے فحش کر کہا ”جو بچے نہیں اتنی زیادہ تشویش میں مبتلا ہوںے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں زیادہ قابل دست اندازی پولیس نہیں تھا۔“  
اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ اس کے بعد ہم نے

گاؤں میں اسی طرح ایک چلیا تھی۔ اس کے پاس ایک چھپرہ رستوران تھا۔ کبھی کبھی جب فالتویہ جمع ہو جاتے تھے تو ہم دو تین دوست مل کر بالکل اسی طرح اس چلیا پر بیٹھ کر "عیاشی" کے طور پر اس کے ہاں سے کھانا کھاتے تھے پھر دودھ پتی کا دور چلا تھا اور آخر میں ایک ایک سگریٹ منگائی جاتی تھی۔ یہ گویا عیاشی کی انتہا ہوتی تھی۔ سگریٹ پینے کے دوران دُزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے بھی رہتے تھے کہ کہیں کوئی بزرگ یا شناسا تو نہیں آ رہا۔ حالانکہ اس وقت ہم کالج میں پڑھتے تھے لیکن محض سگریٹ پیتے ہوئے بھی اس خوف سے روح فنا ہوتی تھی کہ محلے کا کوئی بزرگ نہ دیکھ لے۔"

"واقعی... اور آج کے بزرگوں کی 'نوجوانوں کو دیکھ کر مدح فا' آتی ہے۔" میں نے بھی ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کیا بات ہے نوجوانوں کا ذکر آتا ہے تو کھاشکوف کا خیال آتا ہے۔ کھاشکوف کا خیال آیا تو میں نے رحیم گل سے کہا "یار... اُورا غور تو کرو ہم یہاں اس طویل و عریض ساحل کی دیوار پر چڑھتے بیٹھے ہیں۔ ماحول کی اس وسعت میں اس وقت کہیں کہیں آدمی دکھائی دے رہے ہیں اور ہم نے گویا اس وقت اپنے آپ کو اونچے اونچے پر سجا رکھا ہے۔ کوئی چاہے تو کہیں دور سے بھی کشتی آسانی سے ہمیں شوٹ کر سکتا ہے۔"

"لیکن حیرت ہے کہ ابھی تک کسی نے ایسا نہیں کیا۔" وہ بے پروائی سے مسکراتے ہوئے بولا "خصوصاً جبکہ پیرا فاش جیسا آدمی اس وقت ہم دونوں کے خون کا پاسا ہے۔"

"جبکہ ظفر جمال پولیس کے زبردست گھیرے میں تھا۔ ہم دونوں بھی وہاں موجود تھے۔ میرے آدمی بھی تھے اور اسے گولی لگ گئی۔" میں نے کہا۔

"یہ سب بڑی قابل غور باتیں ہیں اور پس پردہ کسا دست قدرت کی موجودگی کا ثبوت دیتی ہیں۔" وہ بولا۔

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔

چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کش لیتے رہے۔ حتیٰ کہ دونوں کی سگریٹ ختم ہو گئی۔ میں نے ٹوٹا پتھر پر ملے ہوئے کہا "تمہارے دل کا بوجھ بٹکا ہوا یا نہیں؟"

وہ اپنا ٹوٹا دور رت پر پھینکتے ہوئے بولا "میرے دل پر تو کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں تو صرف اپنے ذہن کو ذرا یکسوئی سے سوچنے کے قابل بنانا چاہتا تھا۔ تمہارے کے ماحول میں میں اپنے آپ کو صحیح طور پر سوچنے کے قابل نہیں پارا تھا۔ ذہن بیک وقت کئی مسئلوں میں الجھا ہوا تھا۔"

"راہ یار! میں خواہ مخواہ اتنی دیر سے تمہاری دلداری اور غمگساری میں لگا ہوا تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا میرا بار ادا اس ہے۔ دیر ادا بنا ہوا ہے۔ اس کا تم بٹانا چاہتے۔" میں نے غصے سے اسے گھورا۔

خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ پیرا اس دوران دوبارہ ہمارے سر پر منڈلانے لگا تھا۔ اس نے جبکے ہمارے ہاتھ دھلوئے اور میری ہدایت پر میری گاڑی سے ٹشو پیپر کا ڈیڑھا نکال کر لایا۔ بے چارہ بار بار حیرت سے ایک ٹک ہمیں دیکھنے لگا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ مجھے پہلے دولت مند نظر آنے والے ان دو خوش لباس آدمیوں کو کیا سمجھی ہے جو گندی دیوار پر ریت پر چوڑی مارے بیٹھے ہیں۔

ہاتھ پونچھ کر رحیم گل نے میرے گونگم دیا "اب دو شاندار قسم کی دودھ پتی بھی لے آؤ اور ہاں سنو... کوئلڈیف کی دو سگریٹ بھی پکڑے لانا۔"

وہ ایک بار پھر سر ہلا کر مستعدی سے دوڑنا چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو ٹرے میں دودھ پتی کے صاف ستھرے برتنوں کے ساتھ کوئلڈیف کا ایک نیا پیکٹ بھی موجود تھا۔

"بے وقوف! تم سے پیکٹ لانے کو کس نے کہا تھا؟" رحیم گل نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی "صرف دو سگریٹ لائے تھے۔ ہم کوئی اسموکر تو نہیں ہیں۔ یونہی ذرا لڑکھن کی یاد آؤ کر رہے ہیں۔"

اس نے دو سگریٹ نکال کر باقی پیکٹ اس نوجوان کی بیب میں ٹھونپے ہوئے کہا "ہماری طرف سے یہ تم ہیانا۔ پیش کرنا۔" وہ بے جاں حیران حیران سا وہاں چلا گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یادیں کیسے تازہ کی جاتی ہیں اور اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔

دودھ پتی بھی ایک الگ سی قسم کی ہوا پتی چیز ہے۔ ہم نے دھیرے دھیرے چسکیاں لے کر وہ گاڑھا اور گرم مشروب ختم کیا۔ میں صرف رحیم گل کا ساتھ دینے کی غرض سے آیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مجھے بھی خامسا سرور آیا۔ میرے اپنے فائبر اسٹار ہوکل ٹکا یہ سرور نہیں تھا۔

چائے کے بعد رحیم گل نے ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبائی اور دوسری میری طرف بڑھائی سگریٹ سٹگانے کے بعد وہ طویل کش لے کر بولا "اس کی سگریٹ سٹگانے کا اپنا ایک الگ سی لطف ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تمہارے کیا حالات تھے لیکن میرے گھرانے میں انھیں خاصی آسودہ حالی ہونے کے باوجود مجھے ایک دنیا بوزانہ اور کبھی کبھی دو روپے جیب خرچ ملتا کہ کیونکہ دوسرے میرے ہم عمروں کو کبھی اتنا ہی ملتا تھا۔ آبائی نے یہ بات معلوم کرنے کے بعد میرا یہ جیب خرچ مقرر کیا تھا۔ کہتے تھے تمہاری جیب میں زیادہ پیسے ہونے تو تم کہیں اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے برتر نہ سمجھنے لگو۔"

"یاس! یہ ہمارے بزرگ بھی بڑی کمال چیز ہوا کرتے تھے۔" میں نے کہا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ اب بزرگوں کے بھی وہ طور طریقے وہ سوچیں نہیں رہیں اس لئے معاشرے کا طبع بھی بگڑا جا رہا ہے۔" اس نے ایک لود کش لیا پھر فٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہمارے

”خیر۔ یہ تو تم نے اچھا ہی کیا۔“ وہ اطمینان سے بولا ”بعض اوقات انسان ادا اس ہوتا ہے لیکن اسے خود پتا نہیں ہوتا البتہ اس کے غلط دوست کو پتا ہوتا ہے۔“

ہم نے اٹھ کر کپڑے بھانڈے۔ رات تنگ تھی۔ نورانی کپڑوں سے جھڑکی۔ رنجیم گل نے ہیرے کو بلا کر بل کی ادا بھیجی کے لئے کچھ رقم نکالی تو وہ سر کھاتے ہوئے بولا ”شیدی نے کیا تھا آپ سے کوئی پیسا نہیں لیتا ہے۔“

”تم بل پتاؤ۔“ کہتا ہوا۔ شیدی کو گولی مارو۔“ رنجیم گل بارعب لہجے میں بولا ”تم جا کر زبردستی شیدی کو پیسے دینا اور میری طرف سے بول دینا کہ وہ کہہ دے تھے اگر شیدی نے پیسے نہ لئے تو میں آئندہ یہاں نہیں آؤں گا۔“

بڑی روداد کے بعد ہیرے نے بل اور ٹپ۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوئے۔ اسے تھانے پر آتا رہے ہوئے میں نے پوچھا ”انگلی چوٹی کس تاریخ کی پڑی ہے؟“

اس نے تاریخ بتائی اور بولا ”آج سے ٹھیک پچیس دن بعد ہمیں پھر پیش ہونا ہے۔ اس دوران تم کچھ سوا دینے کرنے کی کوشش کرو۔ میں بھی اس دوران سرتوڑ کوشش کرتا ہوں۔“

”کس کا سرتوڑو؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

اس نے مصنوعی غصے سے مجھے گھورا لیکن مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کی آنکھوں میں اب وہ پرتھوٹا نہیں تھا جو یہاں سے رینگتے ہوئے وقت نظر آ رہی تھی۔ میں نے جواب کا انتظار کئے بغیر گاڑی آگے بڑھادی۔

میں آفس پہنچا تو سورج ڈھلنے کو تھا۔ اندر پہنچ کر میں ابھی صبح طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے ڈائریکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک طویل سانس لے کر میں نے ریسپونڈ اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک چٹکھاتی ہوئی آواز سن کر میرے کانوں کے پردے جھنجھٹا اٹھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کون بول رہا تھا اور کیا بول رہا تھا۔

”کون پاگل کا بچہ بول رہا ہے۔ تیز سے بات کرو۔“ میں نے یہ سوچے بغیر کہ وہ کون ہو سکتا تھا اگر بڑی میں اسے سختی سے ڈانٹ پلائی۔ مجھے وہ آواز بھی سخت بری لگی تھی اور انداز بھی۔ الفاظ میری سمجھ میں آئے ہی نہیں تھے۔

دوسری طرف سے کچھ سنہیل کر دیا گیا اور تب میری سمجھ میں آیا کہ وہ پاگل کا بچہ نہیں بلکہ بچی تھی۔ یا پھر شاید یوں کہنا چاہئے کہ وہ بچے کی اماں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ گاڈمدر تھی۔ وہ مشرقی انداز میں پنج رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی آواز ناقابل شناخت ہو گئی تھی۔

تاہم اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ پوچھ رہی تھی ”افضل! میرا بیٹا کہاں ہے؟“

”تمہیں کس آلہ کے پتے نے مشورہ دیا تھا کہ یہ بات تم مجھ سے پوچھو؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔“ وہ کچھ اس طرح اپنی رہی تھی جیسے کہیں دور سے دوڑ کر آنے کے فوراً بعد اس نے مجھے فون کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ مجھے یہ شبہ بھی ہوا کہ وہ کافی پیچھے ہو۔ تھی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو زیادہ صحیح اندازہ ہو جاتا۔

”کیا معلوم ہے تمہیں؟“ میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

”ڈانٹ کو تم نے انوارا کر لیا ہے۔“ وہ کشت آواز میں جھنجھکی۔

”مجھے بھیڑیوں۔۔۔ اڈوہوں اور کلز بھگوں کو انوارا کرانے ا قلعہ گاؤں کی شوق نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”جھوٹ مت بولو اور ہیرے بیٹے کو ایسے ناموں سے مت پکارو۔“ وہ جھنجکی۔

”اے! واقعی مجھے تمہارے بیٹے کو بھیڑیوں اڈوہوں اور کلز بھگوں وغیرہ سے تشبیہ نہیں دینی چاہئے۔ بھیڑیے اڈوہے اور کلز بھگے تو اس پر شرم سے ڈوب مریں گے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”میں کہتی ہوں میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ ورنہ میں تم سمیت تمہارا ہوٹل بم سے اڈو اڈوں گی۔“ وہ پھر جھنجکی۔

”اگر تمہارا وہ چاند سا بیٹا بھی اس ہوٹل میں موجود ہوتا تو شاید میں تمہیں ہوٹل کو بم سے اڈوانے کی اجازت بھی دے دیتا۔“ میں نے کہا ”لیکن اسے تو اس وقت تمہاری بھٹی میں ہونا چاہئے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ ایک بچے کے قریب بدالت نے اس کی عزت منکھر کر لی تھی۔ وہیں کانڈی کارروائی بھی مکمل ہو گئی تھی اور وہ گھر روانہ ہو گیا تھا۔“

”وہ گھر نہیں پہنچا ہے۔“ وہ بدستور ایک ہی انداز میں پھٹی پھٹی سی آواز میں بات کئے جا رہی تھی۔ اس آواز میں غیظ و غضب بھی تھا اور مجبوری دے بی بی بھی۔ اس میں ہزاروں اندیشے بھی پنپاں تھے اور مت ہی وحشوں کی جھلک بھی۔

”تو پھر میں کیا کروں؟ اپنی اس منحوس آواز سے میرے کانوں کے پردے کیوں خراب کر رہی ہو؟ شاید وہ گھر کا راستہ بھول گیا ہو۔ اتنا چھوٹا سا۔۔۔ تمنا سا تو ہے بے جا۔۔۔ تم پولیس سے رجوع کرو۔ رپٹ کھو دو۔ میں نے یہاں آئندہ جانوروں کو تلاش کرنے کا ارادہ تو نہیں کھلی رکھا۔“ میں نے برہمی سے کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ میرے لئے بھی یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی۔ اگر گاڈمدر بول رہی تھی اور یہ وائش ابھی تک گھر میں پہنچا تھا تو یہ تعجب کی بات تھی اور گاڈمدر کا انداز تو یہی بتا رہا تھا کہ وہ بچہ بول رہی تھی۔ اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ تشویش اور پریشانی اسے کا کچا پھانپ رہا تھا۔

”تم بات کو ٹالنے کی کوشش مت کرو۔“ اس کے لہجے میں بے بسی کا عنصر زرا بڑھ گیا ”مجھے معلوم ہے اسے تم نے انوارا کر لیا ہے۔ تمہارے سوا کسی کی یہ جرات نہیں ہو سکتی۔“

”تمہارے منہ میں کتنی شکر۔“ میں نے بی بی کی بات کا بچہ

ہوئے کہا ”لیکن افسوس کہ مجھے یہ شعرا خیال نہیں آیا تھا۔“

”جس تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتی۔“ وہ بولی۔

”تو مت کہہ یقین۔ میں کیا تمہارے پاؤں پر دم ہوں کہ تم میری بات کا یقین کرو؟“ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے تم اقرار کر رہے ہو کہ دانش تمہارے لیے ہے؟“ وہ بولی۔

”تم ایک انتہائی چالاک، عیار دار اور مکار عورت ہو لیکن اس وقت شاید تمہارا دماغ کسی پتھری کے دماغ سے زیادہ ناکام ہو چکا ہے۔ جس کوئی بات سمجھنا نامت مشکل ہے۔ میں تمہارے ساتھ زیادہ غزباری نہیں کر سکتا۔ بہر حال میں تمہیں اتنا بتا دیتا ہوں کہ عدالت سے تمہارے رخصت ہونے کے بعد میں بھی دفتر لگایا تھا۔ میں نے تمہارے پیارے بیٹے کو صرف عدالت میں جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ نہیں دیکھا۔“

میں دوسری طرف اس کی تیز تیز سانسوں کی خرخرات سن رہا تھا۔ اس وقت تک مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ یہ ان لوگوں کا کوئی یا ڈراما نہیں تھا۔ یہ دانش واقعی گھر نہیں بچا تھا اور گاؤں پر حقیقتاً برطانوی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں کہا ”تم نے اس کے ساتھ وہاں یقیناً کچھ آدمی چھوڑے ہوں گے۔ تم لوگ تما تو کہیں آئے جانے کے مادی ہی نہیں ہوؤ آدمی کہاں ہیں؟ ان سے پوچھو دانش کہاں ہے۔“

”چوچہ لیا ہے۔“ وہ سسکی سی بے کرا ایک بار پھر تقریباً چیختے ہوئے بولی ”مجھی تو تمہیں فون کر رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ دانش کو عدالت میں سر سے پاؤں تک سیاہ برقع میں لپیٹی ہوئی ایک لڑکی لٹی تھی جو اسے ایک کونے میں لے گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں نے کھسپ کھسکی تھی پھر دانش نے چاروں کانڈو گھر جانے کا حکم دے دیا تھا اور خود اس لڑکی کے ساتھ کس مروتان ہو گیا۔“

”تو پھر مجھے فون کرنے کی کیا تنگ ہے؟“ میں نے ایک بار پھر زور اختیار کر لیا۔ ”میں وہ برقع پوش لڑکی تو نہیں ہو سکتا۔ ابھی تھوڑا سا وقت نہیں آیا کہ برقع پوش لڑکی بن کر تمہارے لاڈلے بھی حلق کو اغوا کرنا پھروں اور پھر اگر میں برقع پوش لڑکی بننے کی کوشش کرتا تو شاید میرے پیچھے لوگوں کا جھلس جھج ہو جاتا جو تاکہ مجھ جیسے قہقارے کی لڑکیاں ذرا کم ہی پائی جاتی ہوں گی۔“

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں بھلا اتنی جلدی اس برقع پوش لڑکی کو کیوں بھول گیا تھا جو مجھے اپنی گاڑی میں لی تھی اور لڑکی سی معلوم ہو رہی تھی؟ جس حکم چپ ہو گیا۔

وہ لڑکی اتنی آواز میں بولی ”میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم برقع پہن کر آگے تھے بلکہ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ یقیناً تمہاری بیٹی ہوئی کئی فنہ قسم کی چیز ہوگی۔ خوب صورت لڑکیاں دانش کی کمزوری ہیں۔ جس میں اس کمزوری کا پتا ہے۔ تم نے اسے چار ڈال کر ہنسنا سبک بھٹس معاملوں میں وہ بڑا افس ہے۔ میرے مشورے کے بغیر

کوئی قدم اٹھاتا ہے اور نقصان اٹھاتا ہے۔“

مجھے اپنے کانوں کی لویں گرم ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے ایک لمحے کے لئے رات برونات، جالے پھر آتشکی سے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا ”اگر تم اس وقت میرے سامنے ہو تیں تو میں تمہاری بد نما کپٹی پر ایسا کھونسا رسید کرتا کہ تمہاری محسوس زبان کی گھٹنے کے لئے بند ہو جاتی۔ تم مجھے اتنا گھنیا انسان سمجھتی ہو کہ تمہارے اس ٹکڑے کو اغوا کرانے کے لئے میں خوب صورت لڑکی کا چار استعمال کرتا؟ میرے پاس چارے کے بغیر بھی اس قسم کی مخلوقات کو اغوا کرنے کا معقول بندوبست ہے۔ جو دو ایک لڑکیاں میری جاننے والی ہیں وہ بھی کچھ اس قسم کی ہیں کہ اگر انہیں تمہارے اس لومڑ کو اغوا کرنے کی ضرورت پیش آجی جاتی تو وہ اسے جوڑو کرانے کے دو چار واڈو لگانے کے بعد پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی لاتیں۔ اپنے حشک کا چار اڈال کر نہیں۔“

پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے پوچھا ”تمہارے تومیں میں سے کسی نے اس لڑکی کی صورت شکل کی تکلیف دیکھی؟“

”میں؟“ اس نے جواب دیا۔

”پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ اسے اپنے حشک کا چار اڈال کر لے گئی؟“ میں نے تیزی سے کہا ”شاید بات کچھ اور تھی۔ شاید وہ اسے جانتا تھا۔“

گاؤں کے میرے اٹھائے ہوئے اس نکتے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے اسی خدی لیے میں بولی ”وہ اسے جانتا تھا یا نہیں لیکن میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اپنا جانا چاہئے۔“

”افسوس۔۔۔ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ میں نے ملائمت سے کہا ”اب تمہاری عمر بھی اتنی ہو گئی ہے کہ ڈیپلیٹ کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ تم کیس اور آتا کیا کرو۔“

میں متاقب نہیں ہوں۔ بھوت نہیں یوں لگا۔ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی ہے لیکن اس بات کا افسوس بھی ہوا ہے کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں انجام نہیں پاسکا۔“

”میں تمہارے ہوٹل کی حلاشی لوں گی۔“ وہ اچانک بولی۔

میں نے بے ساختہ سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا ”تم اس بیٹا دونوں ہی بہت خوش فہم معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا خیال ہے اگر میں واقعی اس گھر سے کو اغوا کرنا تو اسے فائبر اسٹار ہوٹل میں چھپانا؟“

مجھے اپنا ہوٹل کھڑا نہیں کرتا تھا۔ میں اسے کسی اصطبل میں بند کروانا۔ اور وہ بھی وہاں پہلے سے موجود گھرے گھرے ڈول سے اجازت لے کر۔ دزدن بین ٹھکان ہے وہ براہِ مہجرت۔ یا پھر اس کے لئے بڑے ساز کی کوئی ٹالی ڈھونڈنا۔ سنا ہے ٹالی کا کیر ٹالی میں ہی خوش رہتا ہے۔“

”تم بتنا چاہے بڑھ بڑھ کر باتیں کر لو لیکن میں تمہارے ہوٹل کی حلاشی ضرور لوں گی۔“ وہ چلائی۔

”تمہارے خیال میں تم کیس طرح حلاشی بے یکتی ہو سکتی

اب یہ بات اس کے دماغ سے ٹھکی مشکل نظر آ رہی تھی۔  
میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”تمہیں وقت ضائع کرنے کا  
انتاشوق ہے تو ضرور ضائع کرو۔“

اچانک وہ گلو گیس آواز میں بولی ”تم نے اچھا نہیں کیا۔  
یہاں جشن کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ تم ذرا یہاں آکر دیکھو۔ کیا  
خوب صورت سہا تھا۔ قالین بچے ہوئے ہیں۔ قاتیں ٹکی ہوئی  
ہیں۔ بڑی بڑی لائٹس نصب ہیں۔ نئے قسم کے میز چار کھڑے ہیں۔  
شہر کے بہت سے معزز لوگ جمع ہیں اور انتظار کرتے کرتے ٹھک  
چکے ہیں۔ پورے گھر کی آرائش کی گئی ہے۔ تم نے خوشی کے اس  
موقع پر جو چاہے میں اس کے لئے تمہیں کبھی معاف نہیں  
کروں گی۔“

”بالکل..... بالکل میں خود بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم  
مجھے بالکل معاف نہ کرنا۔ ایسی خوشی کے موقعوں پر رنگ میں ہنگ  
والے والوں کو کبھی معاف نہیں کرنا چاہئے۔“ میں نے غلوس سے  
کہا ”ویسے میں تمہیں اتنے موئے دماغ کی عورت نہیں سمجھا تھا۔“  
میرا خیال تھا کہ بد معاشی اور مکروہ دھندوں کی ایک اچھی خاصی  
ایسا کر کے بچھے تمہارا دماغ کام کر رہا ہے تو تم کافی سکار یا مار اور  
کافی ذہین ہو گی کہ تمہاری ذہانت مثلی قسم کی ہی ہو گی لیکن ذہانت  
بہر حال ذہانت ہوتی ہے۔ چاہے وہ مثلی ہو مگر اس وقت تو مجھے  
تمہاری باتوں میں کسی بھی قسم کی ذہانت کی ہنگ محسوس نہیں  
ہو رہی۔ نہ مثلی نہ مثبت بہر حال..... ”میں نے ٹھنڈی سانس لی“ یہ  
کوئی حیرت کی بات نہیں۔ بعض اوقات بڑے عجیب عجیب لوگ  
عجیب عجیب میدانوں میں کامیابیاں حاصل کر جاتے ہیں۔ میرا  
مشورہ تمہیں اب بھی یہی ہے کہ ذرا عقل کو ہاتھ مارو۔ دماغ کو  
میرے ہوٹل میں تلاش کرنے کے بجائے کہیں اور تلاش کرو۔  
ایسے معاملات میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ  
فضول چکروں میں تم قیمتی وقت ضائع کرو۔“

”مشورے کا شکریہ۔“ وہ سچے سچے میں بولی ”میں دوسری جگہوں  
پر بعد میں دیکھوں گی۔ پہلے تمہارے ہوٹل میں دیکھوں گی۔“  
”تمہاری تمام تر کڑھ مغزی اور جالانہ خند کے بارہو مجھے تم  
پر ترس آ رہا ہے کیونکہ ہر عورت کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے چاہے وہ  
انڈیس کا عکس ہی کیوں نہ ہو۔“ میں نے نرمی سے کہا ”میں تمہیں  
ہوٹل کی تلاش لینے سے اس لئے منع نہیں کر رہا ہوں کہ میں نے  
دماغ کو یہاں چھپایا ہوا ہے اور مجھے اس کے برآمد ہونے کا ڈر  
ہے۔ بلکہ اس لئے منع کر رہا ہوں کہ مجھے اس طرح اپنی توہین کا  
احساس ہو گا۔ آج کل میں ذرا حساس ہو گیا ہوں۔ اپنی توہین بہر  
برداشت نہیں کر سکتا۔“

وہ بات کانٹے ہوئے بولی ”تم برداشت کرو یا نہ کرو۔ میں دماغ  
کی تلاش لینے بغیر یا تمہیں آؤں گی۔“  
”پہلے پوری بات سن لو جاہل عورت.....!“

عقل کی موٹی عورت؟ ”میں نے پرسکون لمبے میں پوچھا۔  
”میں اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ آ رہی ہوں۔“ اپنی دانست  
میں اس نے بہت بڑی دھمکی دی۔

”یہ حماقت مت کرنا۔ میں شارع عام پر ہنگامہ برپا ہونے اور  
اپنا بزنس متاثر ہونے کی پروا نہیں کروں گا۔“ میں نے سر دھکے میں  
کہا ”تم اور تمہارے آدمیوں میں سے کوئی زندہ واپس نہیں جائے  
گا۔ ابھی تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہاں کیسی کیسی ناؤں بدوکار  
چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ تمہارے وہ اسلحہ بردار قتل صرف عام لوگوں  
سے نہیں بلکہ کام آتے ہیں۔“

”میں اپنے بیٹے کے اغوا کی رپورٹ درج کروا رہی ہوں۔ میں  
پولیس کی مدد سے قانونی طور پر ہوٹل کی تلاش لوں گی۔“ وہ ذرا نرم  
پڑتے ہوئے اور دوسرے پہلو کی طرف آتے ہوئے بولی۔ اس کے  
لمبے میں لاکڑاٹ بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اس کے حواس  
ٹھکانے آ رہے تھے۔

”میرے ہوٹل کے رائٹس آف ایڈیشن ریزروڈ ہیں۔ پولیس  
اس کی تلاش نہیں لے سکتی۔ تمہیں کم از کم پڑی گشت سے خصوصی  
حکم نامہ جاری کرانا پڑے گا اور ڈی سی آفس اس وقت بند ہو چکا  
ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”آفس بند ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بولی ”تلاشی کا  
دارنٹ میں ابھی لے لوں گی۔ اور ہاں ایک بات یاد رکھنا تم اس  
دوران دماغ کو ہوٹل سے کہیں اور منتقل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔  
میرے آدمی ہوٹل کے چاروں کونوں سے اس کی نگرانی کر رہے  
ہیں۔ کسی بھی فرد یا کسی بھی ہینڈل وغیرہ کو ذرا بھی مشکوک انداز میں  
کہیں لے جاتے دیکھا تو مجھے اطلاع ہو جائے گی اور اسے کسی نہ  
کسی طرح راستہ میں روک لیا جائے گا۔“

”خواہ اس کوشش میں تمہارے آدمی مارے جائیں؟“ میں  
نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ پوچھا۔

”ہاں چاہے وہ مارے جائیں۔“ اس نے جواب دیا ”مارے  
جا ان کے لئے کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ہمارے کاموں کے سلسلے  
میں جان دے دینا ان کے لئے معمولی بات ہے۔“

”وہ تو میں دیکھ چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں تو چر اب زیادہ بھرتی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ میں  
نے احتیاطاً پہلے اپنے آدمی تمہارے ہوٹل کی نگرانی کے لئے بھیجے  
تھے پھر تمہیں فون کیا تھا تاکہ میرے فون کے بعد تم دماغ کو کہیں  
ادھر ادھر نہ کرادو۔“

”اور اگر وہ پہلے ہی سے کہیں ادھر ادھر ہوا تو.....؟“ میں نے  
ٹھنڈے لمبے میں پوچھا۔

”میں بعد میں ادھر ادھر بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے تمہارے ہوٹل  
کی تلاش لے لیں۔“ وہ بولی۔ یہ بات یقیناً اس کے دماغ میں بیٹھ  
چکی تھی کہ پیر دماغ کو کہیں نے اغوا کر کے ہوٹل میں ہی چھپایا تھا۔

میں پوچھا۔

اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا ہو کہ وہ واقعی کافی وقت ضائع کر چکی تھی۔ میں نے آتشکی سے رہنمائی رکھ دیا اور چند لمبے صورت حال پر غور کرنا رہا۔ میں نے آج جب عدالت کے قریب اپنی گاڑی میں اس برقع پوش لڑکی کو دیکھا تھا، مجھے جیسی احساس ہو تھا کہ وہ صورت حال کو کوئی اہم موڑ دے گی لیکن مجھے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ سوزا اتنا اہم ہو گا۔ پھر دانش کا ایسے موقع پر گھر نہ پہنچنا ایک اہم واقعہ تھا جب اس کی ماں اس کے استقبال کی شاید انتظار کیاں کئے بے چینی سے بھر پور تھی۔

گازدر نے ہوٹل کی تلاش میں اپنے کی خود چھٹی دی تھی اس کے پیش نظر میرے خیال میں اب وقت آیا تھا کہ میں بھی کچھ ڈرویاں بلا لیتا۔ اسے بتانا ضروری ہو گیا تھا کہ شرمیں اثر سونگ صرف انہی کا نہیں تھا۔ میں نے فون اٹھایا اور چند منٹ کی کوشش کے بعد ہنسی صاحب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ مجھے موبائل فون پر دستیاب ہوئے۔

میں نے انہیں مختصر ساری رام کہانی سنائی جو مختصر کرتے کرتے بھی کافی طویل ہو گئی۔ مجھے احساس تھا کہ ہنسی صاحب کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہوتا تھا۔ میں وقت ضائع کئے بغیر اور برابر چھٹی سے گزرتے بغیر انہیں فون کر لیتا تھا۔ یہ سہولت بہت کم لوگوں کو حاصل تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ جس وقت میں انہیں فون کروں اس وقت ان کی مصروفیت کیا ہو؟ اس کے باوجود وہ مہربان سکون سے میری پوری بات سن لیتے تھے اور اس پر اعتبار بھی کرتے تھے۔ اس کے لئے انہیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ صرف اس لئے کہ فیض صاحب نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ میں ان پیسہ لوگوں کے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ ملک قوم اور معاشرے کا خیر خواہ تھا۔ ان کی بہتری کے لئے میں نے قربانیاں دی تھیں اور آئندہ بھی دے سکتا تھا۔

چنانچہ جب کسی معاملے میں کہیں میری "ٹکٹ" نکلتی تھی تو ہنسی صاحب کام آتے تھے۔ وہ خود بھی امرت دھارا قسم کی چیز تھے۔ ہر جگہ میں۔ ہر شے میں ان کا نام اور مرتبہ کام آتا تھا لیکن اگر کبھی معاملہ ان کے دائرہ اختیار سے باہر نکل جاتا تھا تو مجھے فکر نہیں تھی۔ اسلام آباد میں نہیں نہیں صاحب بیٹھے تھے۔

یہ مقام مجھے صرف ریڈ ڈاٹ والے معاملے میں بے پناہ تکالیف دے پڑائیاں اٹھانے اور قوی ٹانگے کے لئے اپنے تمام وسائل جھمک دینے کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ وہ سب کچھ میں جوش و جذبہ میں گزر رہا تھا۔ اس سے مجھے بے سبق حاصل ہوا تھا کہ ہمارا نظام کتنا ہی ناکارہ و بوسیدہ سی لیکن اگر آپ اجتماعی بھلائی کے لئے غلوں میں دل سے کچھ کرتے تھے تو کوئی بڑی قربانی دیتے تھے تو سرکاری سطح پر بھی آپ کو کہیں نہ کہیں کچھ بڑی قربانی ضرور ملتی تھی۔ اگر آپ بے غرض طریقے سے دوسروں کی مدد

وہ ایک بار پھر میری بات کاٹتے ہوئے بولی "سورت ماما کے انہیں مجبور ہوتی ہے۔ میں صرف دانش کی وجہ سے تمہاری نگاہیں برداشت کر رہی ہوں ورنہ اب تک تمہاری زبان گڑی سے چھٹی جا چکی ہوتی۔"

"جن کی اولاد میں ایسی اچلیں صفت ہوں انہیں زندگی بھر پاپس اور بددعا میں ہی مبتلا پڑتی ہیں۔" میں نے محل سے کہا "میں تک میری زبان گڑی سے کھینچنے کا تعلق ہے تو اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے ایسے دعوے کئے تھے لیکن آج وہ خود زبان پالنے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اگر تم مجھے یہ تمہاری ہڈیاں چھلکائی دینے کے بجائے توجہ سے میری بات سنو شاید تمہارا کچھ بھلا ہو۔"

وہ خاموش رہی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تم زہن کا کھار میں ایک پیکش کر رہا ہوں۔ اگر اعلیٰ حکام میں سے کوئی بھی تمہیں میرے ہوٹل کے لئے سرچ و وارنٹ جاری نہ کر سکے تو تم پر اس طرح سے سیدھی میرے پاس آجائے۔ میں تمہیں ہوٹل کی تلاش لینے کی اجازت دے دوں گا لیکن اس کے لئے تمہیں ایک ٹکٹ کرنا پڑے گی۔"

"وہ کیا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہی ہے میرے ہوٹل میں قیام کرنے والے اپنے غیرے تو ہوتے نہیں۔" میں نے سمجھانے کے لئے انداز میں کہا "ان میں اکثر نہایت معزز اور اہم لوگوں کی ہوتی ہے۔ فیکٹری کی ہوتی ہیں تمہارا تمہارے آدمی ان کے دروازوں پر جا کر یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ ان کے کمروں کی تلاش لینے آئے ہیں۔ میرے معزز مسافر سخت برا متائیں گے۔ ہوٹل کی انتظامیہ سے شکایت کریں گے عین ممکن ہے ان میں سے بعض تو ہوٹل کو برا بھلا کہنے کے بجائے اپنے طور پر کوئی ایکشن لے لیں۔"

"چاہا تو پھر؟" وہ غرائی۔

"اس کے لئے میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ مجھے تم سے بددعا ہے اس لئے تجویز بیان کر رہا ہوں۔ تجویز یہ ہے کہ تم ہم میڈیکل ریفرنڈم ہن کر باؤں پر چند توپے اور چادر میں اٹھا کر ہر گھر پر دھک دینا اور نہایت تیز و شائق شکل سے مسافروں کو اطلاع دینا کہ تم توپے اور چادر میں بدلے آئی ہو۔ اس زمانے میں تمام کمروں کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے بعد باقی بیٹوں کا جائزہ لینے کی اجازت میں تمہیں دوس کے طور پر دے دوں گا۔"

"یہ انسان تمہارے دل میں ہی رہ جائے گا کہ تم مجھے اپنے ہوٹل کی میڈیکل ریفرنڈم میں دیکھ سکو۔ میں تم سمیت تمہارا ہوٹل فریڈ کرتی ہوں۔" وہ غصے سے بولی۔

وہ کھینچ پرائیٹ لینڈ ہے جس کا ہوٹل ہے۔ اس کے تو شہر میں کسی کے پاس نہیں ہیں۔ تم اسے کہاں سے خرید لو گی جبکہ میرا اسے انی اعمال پیسے کا کوئی ارادہ نہیں؟ میں نے استہزائیہ لہجے

نہیں ہو گا؟

کہتے تھے تو کہیں نہ کہیں نئی آپ کی مدد کرنے والے بھی نکلیں آتے تھے۔

”ہاں امید ہے اس سلسلے میں میری بات مان لی جائے گی اور وائس کی ماں کا اثر و رسوخ کام نہیں آئے گا۔“ چشتی صاحب نے جواب دیا۔

”میں صرف توہیں کے احساس اور گلابداری ساتھ غراب ہونے سے بچنے کے لئے آپ سے یہ درخواست کرتے پر مجبور ہوا ہوں۔“ میں نے واضح کیا ”ورنہ مجھے کئی طرح سے اسے دھمکی کی تھی کہ کسی ایسے طریقے سے میں اسے اطمینان دلا سکوں ہوں جس سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مسافروں کو یہ احساس نہ ہو کہ ہوٹل کی تلاش لی جاری ہے۔ ایک طریقہ میں نے اسے بتا بھی دیا تھا۔“ میں نے اس طریقے کی وضاحت بھی کر دی۔

چشتی صاحب ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولے ”تم سچے ہوئے کے ساتھ تھوڑے سے شرارت بھی ہو۔ تم اس کی انگوٹھی کی تصویریں پکچازا چاہتے ہو۔“

”سرا میں لوگ دن رات عام اور بے ضرر انسانوں کی انگوٹھیں کہتے رہتے ہیں۔ اگر زندگی میں کبھی کبھار بلکہ شاید صرف ایک آہ بار ان کی انگوٹھی بھی معمولی سی نہیں پہنچ جائے تو کیا حرج ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں... حرج تو کوئی نہیں اگر وہ ان گنی تو یہ تجربہ کر کے دیکھ لیتا۔“ انہوں نے خدا حافظہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے خاصی طمانیت محسوس کرتے ہوئے ریموور رکھ دیا۔ یہ بہت اچھا بندوبست ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے شفیع شاہ کو بلوایا اور اسے ہدایت دی ”خود نظریں آئے بغیر ذرا غیر محسوس طور پر جائزہ لو کہ کیا ہمارے ہوٹل کی چاروں طرف سے نگرانی ہو رہی ہے؟ نگرانی کرنے والے کس قسم کے لوگ ہیں۔“

وہ سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ چند ہی منٹ بعد واپس آیا اور بولا ”سرا چاروں کونوں پر ایک ایک گاڑی میں دو دو آدمی موجود ہیں۔ گاڑی سے ہیں۔ مجھے تو یہ بہر وائس کے آدمی معلوم ہوئے ہیں۔ شکس کچھ دیکھی ہوئی سی لگ رہی ہیں۔ اب وہ گدھا کس چکر میں پڑ گیا ہے؟“

”نی الحال تو وہ گدھا کس قائب ہے۔“ میں نے اسے گاؤد کے فون کے بارے میں بتایا۔

شفیع شاہ سر ہلاتے ہوئے بولا ”میں ممکن ہے وہ خبیث کہیں عیاشی میں مشغول ہو۔ رات کو یا کئی کسی وقت اچانک نمودار ہو جائے۔“

”اں یہ تو میں ممکن ہے۔“ میں نے اس سے اتفاق کیا ”لیکن اس وقت تک گلابداری ترتیب رہے گی اور نہ جانے کس کس کو پریشان کرتی رہے گی۔“

”ان آدمیوں کا کیا کرنا ہے سرا؟“ شفیع شاہ نے پوچھا ”میں کپڑے کا بندوبست کیا جائے، بھگنے کی کوشش کی جائے؟“

”یہ سب کچھ بہت انوس ٹاک ہے جو تم نے بتایا ہے۔“ چشتی صاحب ساری بات سننے کے بعد بولے ”اگر یہ شخص... بہر وائس یا بظاہر ہو جاتا ہے لیکن اسے عدالت کے درپے لے کر گوار تک نہیں پہنچایا جاسکتا تو خیر دوبارہ مجھ سے رابطہ کرنا میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال تم صرف ایک بار اور تصدیق کر دو کہ بہر وائس ہماری تحویل میں نہیں ہے۔“

”سرا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں نے آپ کو بتایا ہے اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کسی مصلحت کی خاطر کسی بات کا تاثر بدلنے کی کوشش کی ہے۔“ وہ گویا بس اتنی ہی شہادت چاہتے تھے۔ مطمئن لیجئے میں بولے ”ٹھیک ہے۔ تم بے فکر رہو۔ کوئی ہوٹل کی تلاش نہیں لے سکے گا۔ ہمارے ہوٹل کے لئے صرف دو تین حکام سرچ وارنٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت تو شاید وہ بھی آمادہ نہ ہوں۔ بہر حال میں انہیں حقائق سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ امید ہے اصل صورت حال جاننے کے بعد کوئی اس معاملے میں ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرے گا۔“

بہر وائس نے سانس لے کر بولے ”افضل میاں! مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بعض اعلیٰ حکام اس لئے بھی کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے اور اس لئے بھی بہت سے فرائض دیانت داری سے انجام نہیں دے پاتے کہ ان کے سامنے سچ نہیں بولا جاتا۔ ان کے سامنے دن رات بڑے قوتار سے جھوٹ بولا جاتا ہے۔ انہیں غلط رپورٹیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کے سامنے جھوٹی معلومات کا ایک طوفان باندھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ اس کثرت سے بولا جاتا ہے کہ وہ سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ جھوٹ کے اس جال میں کبھی کی طرح پھنسے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی صحیح کام نہیں کر پاتے۔ جب تک اس معاشرے میں سچ کو دوان نہیں ملے گا، کبھی بہتری کی امید رکھنا مشکل ہے۔“

”درست ہے سرا میں خود کم از کم اپنی حد تک تو جھوٹ کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ گو کہ اس سیلاب کے سامنے میری حیثیت ایک ٹکڑے کی سی ہے۔ حکام تو سیلاب کے سامنے بند نہیں باندھ سکتا۔“ میں نے کہا۔

”درست ہے۔“ وہ گھٹکتے لیجئے میں بولے ”مگر یہی کافی ہے کہ تم اپنی حیثیت برقرار رکھو۔ وہ تنگ ہی رہے۔ سیلاب کے پانی کا ایک قطرہ نہ بن جائے۔ حکام خواہ سیلاب کے ریلے میں بہ رہا ہو مگر الگ نظر آتا ہے۔ صاف لگتا ہے کہ وہ اس ریلے میں بھی اپنا وجود قائم رکھنے اور پاؤں جمائے کی جدوجہد کر رہا ہے۔“

”سرا میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ یہ جدوجہد جاری رہے۔“ میں نے کہا ”میں امید رکھوں کہ سرچ وارنٹ جاری

پھر۔۔۔؟ اس نے جلد ادھر اوجھڑا دیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ میں نے اچھٹا اٹھاتے ہوئے کہا ”ان کا کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ انہیں اپنا شوق پورا کرنے دے۔ ان بے چاروں کا خیال ہے کہ بیر دانش ہمارے ہوٹل میں موجود ہے اور ہم تلاشی کے ذریعے اسے کیس مشکل کرنے کی کوشش کریں گے ان گدھوں کو ای غلط فہمی میں مبتلا رہنے دو۔“

ہم مزید کچھ دیر بیر دانش کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف رجیم کل تھا۔ خاص چٹکی ہوئی سی آواز میں بولا ”بھئی یہ کیا قصہ ہے۔ سنا ہے تم نے بیر دانش کو اغوا کر لیا ہے اور وہ بھی کسی برقع پوش لڑکی کی مدد سے؟“

”یا اللہ!“ میں کراہ اٹھا ”یہ شخص تو واقعی ”ناک آف دی ٹاؤن“ بن گیا ہے۔ ہر طرف سے اسی کی بات ہوتی ہے۔ ہر طرف سے اسی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔“

”دراصل یہ ٹیلی فون بڑی سی کارآمد ایجاد ہے۔“ رجیم کل گفتگو لیے میں بولا ”پندرہ لمحوں میں بات ادھر سے ادھر پہنچ جاتی ہے۔“

”کیا تمہیں بھی گاؤدر کا کوئی چٹکھاڑنا ہوا ٹیلی فون موصول ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا ”مجھے تو اپنے ایک اعلیٰ افسر کا فون موصول ہوا تھا۔ وہ بے چارے پریشان تھے۔ جانتا چاہ رہے تھے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ انہیں کسی نے اپہرج کیا تھا کہ تمہارے ہوٹل کی تلاشی کا وارنٹ ایڈ کر لیا جائے وہ بے چارے سفارش کی وجہ سے کچھ اچھٹا پاؤں ہلانے لگے تھے کہ اتنے میں بہت اوپر سے فون آگیا کہ وہ آرام سے بیٹھ جائیں اور اس سلسلے میں زیادہ مستعدی دکھانے کی کوشش نہ کریں۔“

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا تو وہ بولا ”گلتا ہے تم نے کام دکھایا دیا اور ساتھ ساتھ بھی پردہ ڈوریاں بھی ہلا دیں۔ یار! تم بڑے حضرت ہو۔ میرے ساتھ سمندر پر بیٹھ کر چھٹی اڑاتے رہے اور مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ میں پردہ کیا ڈرا جا چل رہا تھا۔ اب تو مجھے بتا دو اس گمبختہ کو کہاں رکھا ہے اور وہ برقع پوش لڑکی کون تھی؟“

میں دلی دلی میں شکر کر رہا تھا کہ ان دنوں راجیلہ کراچی میں نہیں تھی۔ اگر رجیم گل یا گاؤدر اسے میرے پاس ہوٹل یا آفس دُفیر میں دیکھ چکے ہوتے تو لازماً مجھے کچھ کے بیر دانش کو لے جانے والی لڑکی اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

”وہ شیطان کی خالہ تھی۔ اور تم چاہو تو شیطان اپنے آپ کو بھی سمجھ سکتے ہو۔“ میں نے کہا ”ویسے تمہیں یہ کمالی کس نے بتایا؟“

”گاؤدر نے اعلیٰ افسر کو سنائی ہوگی۔ اعلیٰ افسر نے مجھے سنائی۔“

”اب تم یہ کہانی مجھے مت سناؤ کیونکہ میں پہلے ہی اسے سن کر کافی بور ہو چکا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”اس سے پہلے کہ تم مزید کچھ قیاس آرائیاں کرو میں تمہیں بتا دوں کہ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ مظلوم نہیں کیوں وہ ہتھی کی بجائی اور کارٹیٹ۔۔۔ یا پھر یوں کہو کہ ڈس کرٹیٹ مجھے دینے پر عملی ہوئی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے میں خواہ مخواہ ہی خوش ہو رہا تھا کہ ہمارے یار نے کام دکھا دیا۔“ وہ قدرے مایوسی سے بولا۔

”اگر میں ایسا کوئی کام دکھاتا تو پھر تم جیسے ہی قانون پسند دوستوں کی فرض شناسی کی رگ ذرا پرکھ اٹھتی۔ پختلوی اٹھا کر مجھے گرفتار کرنے چل دیتے۔“

”ہاں اگر ایسی کوئی رپورٹ درج ہوتی تو پھر یہ تو کتنا پتہ۔۔۔“

اطمینان سے بولا۔

”مجھے تو پہلے ہی تم سے یہی امید تھی۔ لعنت ہے تم پر۔“ میں نے معذرتی لبوں سے کہا۔

”کیا کریں بھئی۔ قانون تو قانون ہے۔“ اس نے گویا مجھ کو ٹاہر کی ”اب یہی دیکھ لو کہ اگر گاؤدر آج یا کل اعلیٰ حکام میں سے کسی سے سرچ وارنٹ جاری کراتے ہیں کیا سب ہوگئی تو اس کی قبیل کے لئے اس کے ساتھ مجھے ہی تپا پڑے گا۔ تمہارے ہوٹل کی تلاشی مجھے ہی لینا پڑے گی۔“

”تم جیسے مار آئیں سے دوستی رکھنے سے تو بہتر تھا کہ میں بیر دانش سے ہی دوستی رکھ لیتا۔ وہ کم از کم یہاں کا یار تو ہوگا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ابھی یہ حسرت اب پوری کر لیتا۔ ابھی وہ کون سا مرگیا ہے۔ جلد یا بدیر یا زاپ ہو ہی جائے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے وہ خود ہی لوٹ آئے تب جا کر اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جانا اور اس سے اپنی گرفتار خطا کی معافی مانگ لیتا۔ تم جیسے آدمی کو تو وہ پلک کر بیٹھے سے لگائے گا۔“ رجیم گل بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ہاں اب یہی کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا ”اب اجازت ہو تو میں خود ڈاساکام کر لوں۔ آج تم میرے پورا دن برباد کر دیا ہے۔“

”اوہو۔۔۔ کام کی اتنی فکر کب سے ہو گئی تمہیں؟“ وہ استغناء سے لہجے میں بولا ”تم تو کہا کرتے تھے تمہارا بڑا پس خود کار مشین کی طرح چل رہا ہے۔“

”ہاں چل رہا ہے پھر بھی اسٹینرنگ وہیل بھی کھاد کھی خاص سمت میں گھمانے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم کام کرو مصروف آدمی!“ وہ طنز سے لہجے میں بولا ”اسٹینرنگ وہیل ادھر ادھر گھماؤ۔ ایکسپریس ریل گاڑی۔ میں گھماؤ جیسی وقت ضائع کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔“

”خیر۔ اتنا زیادہ شرمزہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے



اس سے بھی جلد پوری ہو جاتی لیکن بس۔ کسی وجہ سے مجھے ذرا دیر ہو گئی۔

وہ خاموش ہو گئی گویا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ مزید کیا بولے۔ یہ خاموشی بڑی عجیب تھی۔ اس کے پیچھے ایک بے عنوان سا تھکا تھا۔ آخر میں نے گویا تمہید اور تھماؤ پھر اڑا کر پالائے طاق رکھتے ہوئے کہا "پیردانش کہاں ہے؟"

دوسرے سے ہنسی "آپ سوال پوچھنے میں زیادہ تاخیر کرنے کے تاویل معلوم نہیں ہوتے۔"

"اس کی ماں اس کی تلاش میں دیوانی ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کو اس کی ماں سے ہمدردی ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"خدا نہ کرے کہ مجھے ایسے لوگوں سے ہمدردی ہونے لگے۔ میں تو ویسے ہی تمہاری معلومات کے لئے تیار رہا ہوں۔" میں نے ملائت سے کہا۔

"مجھے اپنی معلومات میں اس انسانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ اس کی ماں اس کی تلاش میں دیوانی ہو رہی ہوگی۔ میں ممکن ہے وہ پاگل گیتا کی طرح لوگوں کو کاٹنے بھی لگے لیکن افضل صاحب! اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر

لٹھڑی سانس لے "یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اسی شہر میں گزشتہ چند برسوں میں بہت سے گھروں میں ایسی مائیں موجود تھیں بلکہ اب بھی ہوں گی جو اپنے بچے یا بچی کی تلاش میں دیوانی ہو رہی تھیں۔ ان کے بارے میں صرف پیردانش ہی بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں ہیں لیکن کسی نے اس سے نہیں پوچھا۔"

"اوہ! میں نے گھری سانس لے "تم نے اس سے کوئی پراپا حساب بے باقی کرنے کے لئے اسے اغوا کیا ہے؟"

"غور!..." وہ اس بار ذرا زیادہ زوردار انداز میں ہنسی "آپ بھی بڑی عجیب باتیں کرتے ہیں افضل صاحب! میری بھلا کیا مجال کہ میں پیردانش کو اغوا کر سکوں! میں ایک نازک کمزور اور لاوارث سی لڑکی ہوں۔ میں تو اس طرح کی کسی شخصیت کو اغوا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ گورنر سے وہ تمہارے ساتھ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ اپنی خوشی سے... بڑے آرام دہ طینان سے... اور کافی حد تک رازدارانہ سے انداز میں میرے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اسے اغوا کرنا تو نہیں کہا جاسکتا تھا!..." وہ نہایت فخر سے فخر سے مجھے میں سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

"ٹھیک ہے میں تم سے ٹیکنیکل بحث میں نہیں الجھتا۔" میں نے جلدی سے کہا "پیردانش اس وقت کہاں ہے؟"

"کیا آپ کو یہ جاننے میں دلچسپی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔" میں نے جواب دیا۔

زرا مشتاقانہ لمحے میں کہا "تم جیسے دوست تو ہوتے ہی وقت ضائع کرنے کے لئے ہیں یا پھر ان کا مصروف شاید یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھار گرفتاری اور تلاش وغیرہ کو دھکیلا دیتے ہیں۔"

"میرے خوردار! آزاد اس وقت سے۔ جب ان دھکیلوں کو عملی پابند بنانے کی نوبت آئے گی۔" وہ بولا "ابھی خدا حافظ۔"

میں نے ریسورسز رکھ کر ایک طویل انگڑائی لی اور جسم دھکیلا ہمو کر دیا ایک جہز کے پٹے سے ٹھک لگائی۔ میں پیردانش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس وقت کہاں ہو سکتا تھا؟ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک لمحے کے لئے سوچا "کاش میں جا دوں کہ

ہو یا پھر ایسی روحانی قوتوں کا مالک ہو تاکہ آنکھیں بند کر کے دیکھ سکوں پیردانش اس وقت کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔

ٹیلی فون کی کھنٹی نے مجھے خوابوں اور خوابوں کی ان بھول بھلڑوں سے نکال لیا۔ کھنٹی میرے عام ٹیلی فون کی بجلی تھی۔ میری ٹیکسٹری ایمر تو جھنٹی کر کے جا چکی تھی۔ ہوئی کے ٹیلی فون بورڈ پر موجود آپریشنر نے مجھے بتایا "ایک خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"کون ہیں کہاں سے بول رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سرا! انہوں نے صرف اپنا نام غزالہ بتایا ہے اور کچھ نہیں بتا رہے۔ وہ آپ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔"

آپریشنر نے بتایا۔

"ابھی ملاؤ۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا جہاں تک مجھے یاد پڑا تھا میں غزالہ نام کی کسی خاتون سے واقف نہیں تھا۔

لیکن کبھی کوئی سرسری ملاقات ہوئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا تھا۔

لائسنس لی اور دوسری طرف سے ایک ٹھکنی ہوئی سی "ہیلو"

غلاری کی پھر پوچھا "آپ افضل بول رہے ہیں نا؟"

میری مزید کی پڑی میں ایک سردی سردی گویا ٹھک میں نے اس کو آواز کو پہچان لیا تھا۔ یہ اسی برقع پوش لڑکی کی آواز تھی جس نے آج ایک بہت بڑا معنی تخلیق کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں کہہ بھی نہ پال سکا۔

"آپ بولی کیوں نہیں رہے۔ خاموش کیوں ہو گئے؟" پھر جواب کا انتظار کے بغیر وہ خود ہی بولی "شاید آپ نے میری آواز پہچان لی ہے؟"

"ہاں! میں نے ابھی سے انتظار کیا تھا۔"

"تو پھر کیا آپ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے؟" اس کے لیے

میں گویا صدیوں کی ٹھکن تھی مگر وہ شاید ٹھکن کی گتھار کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

"کیوں نہیں۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "تم سے بات کرنے کی آرزو میں تو شاید میں جا رہا تھا۔ دراصل مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کبھی کبھی کوئی آرزو اتنی جلدی بھی پوری ہو سکتی ہے۔"

"الغرض!..." وہ جیسے کچھ طمانیت سے ہنسی "آپ کی آرزو شاید

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اہم نئی فون کال تھی۔

”معملاً ہونا تو دکھائی دے رہا ہے شفیق شاہ! میں نے والی کی گھر درست کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے پیر دانش کا عدالت سے غائب ہونا۔ اس برقع پوش لڑکی کا نمودار ہونا۔ گاؤں کا چنچہ چنگاڑے مجھے فون کرنا۔ ہوٹل کی خلاشی پر اصرار کرنا۔ سچ دارنٹ کے لئے حکام سے رابطہ کرنا۔ یہ سب ایک ڈراما ہے شاید انیس تیس تین ہو گیا ہے کہ میں اس ڈرامے سے متاثر ہو چلا ہوں۔“

اب وہ اس کا ڈرامہ سین کرنا چاہتے ہیں۔

”ڈرامہ سین آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟“ شفیق شاہ نے دریافت کیا۔

”ظاہر ہے مجھے مروانا ہی اس ڈرامے کا کھانا ملے گا۔“ وہ کہتا ہے۔ ”میں نے جواب دیا ”پیر دانش اپنے ذمہ ہونے کے حساب پر اپنے کرنے کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی بے مبرا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ مجھے ایسے طریقے سے مروانا چاہتا ہے کہ الزام اس پر نہ آسکے۔ یا کم از کم ثابت نہ کیا جاسکے۔“ پھر میں نے شفیق شاہ کو چند لمبے پہلے موصول ہونے والی نئی فون کال کے بارے میں بتایا۔

”آپ اس بلاؤسے پر جائیں گے؟“ شفیق شاہ نے پوچھا۔

”یقیناً“ میں نے جواب دیا۔

”اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ آپ کے لئے پال بچایا جا رہا ہے تو آپ اس بلاؤسے کو نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔“ شفیق شاہ مخاطب ہے۔ میں بولا۔ اس نے زور دے کر یہ بات نہیں کہی تھی۔

”کم از کم تم کو تو ایسا مت کہو شفیق شاہ!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم میرے شیر جوان ساتھیوں میں سے ایک ہو۔“

”میں نے کوئی بڑی والی بات تو نہیں کی سوائے وہ بھی جو اُن مسکرایا“ اس نے تو محض فضول شہ کے لوگوں کو نظر انداز کرنا کا جاسکتا ہے۔“

”میں پیر دانش کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے جال و فیر ہمارے لئے پکڑا ہے جیسے ہیں اور ہم اس قسم کے جال میں داخل ہونے کے بعد بھی اسے کھڑی کے جالے کی طرح توڑ کر نکل سکتے ہیں۔“ میں نے بات کرتے کرتے جیب سے اپنی لوزز مین نکال کر جیب کرنے ہوئے کہا ”اس کے علاوہ یہ برقع پوش لڑکی اپنے آپ کو میری فکر میں مصروف بنانے میں کامیاب رہی ہے۔ میں اس کے بارے میں تجس میں جھٹھکا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں یہ کون ہے کیا چنچہ؟“

کس کس انداز میں پیر دانش کے کام آتی ہے۔

”میں دوبارہ جیب میں رکھ کر میں نے اتنے ہوئے عمری مناس لے کر کہا ”اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے۔ جو شاید سب سے زیادہ اہم ہے۔“

”وہ کیا سر؟“ اس نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ یہ کہ میرے تمام اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔“ میں نے

”مجھے بھی امید تھی۔ اسی لئے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔“ مجھے معلوم تھا پیر دانش کے بارے میں جاننے کے لئے دو ہفتیاں سب سے زیادہ بے تاب ہوں گی۔ ایک اس کی والدہ دوسرے آپ۔ لیکن دونوں کی دلچسپی کی بنیاد اور نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہو گا۔ ”اس نے ایک گہری سانس لی ”لیکن یہ بات میں آپ کو فون پر نہیں بتا سکتی کہ پیر دانش کہاں ہے۔“

”تو پھر کیسے بتاؤ گی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ خاص اہم بات ہے۔ اسے جاننے کے لئے آپ کو تھوڑی سی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔“ وہ تیسری لمبے میں بولی ”میں آپ کو ایک ایئر ریس کھواتی ہوں اس پر شریف لے آئیے۔ بہت آسان سا پتہ ہے۔ آپ کو یہاں پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں راستہ بھی سمجھا دوں گی۔ اگر آپ دلچسپی محسوس کریں تو میں بتاؤں؟“

”ضرور ضرور۔“ میں نے جلدی سے کہا اور ایک چپن سنبھال کر فون پڑا دیا۔

اس نے جو ایئر ریس کھوایا وہ ڈیٹس کا تھا۔ اس نے راستوں اور مطلوبہ جگہ وغیرہ کی چند نشانیاں بھی بتا دیں پھر بولی ”لیکن ایک شرط ہے کہ آپ بالکل اکیلے آئیں گے۔ کوئی پولیس والا۔ کوئی گارڈ۔ کوئی دوست۔ کوئی اجنبی آپ کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔“

میں ہنس دیا۔ وہ فوراً بولی ”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ میں چشم نقور سے دیکھ سکتا تھا کہ اس کی توری چڑھ گئی تھی۔

”میں یوں ہی ذرا ہنسی آجی تھی۔ میں بڑا خوش مزاج آدمی ہوں اکثر ہنستا مسکراتا رہتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اں بعض لوگ خوش مزاجی اُڑوڑ کر سکتے ہیں۔ ان کے حالات اس قابل ہوتے ہیں۔“ اس کے لمبے میں ایک عجیب سی جھکی تھی۔

مجھے ہنسی صرف اس لئے آئی تھی کہ فی الحال مجھے ہی محسوس ہو رہا تھا یہ کوئی جال تھا اور لڑکی نے بڑی مصیبت سے فرض کر لیا تھا کہ اس کے بلاؤسے پر میں اکیلا چلا آؤں گا۔ تاہم فی الحال اس کی ہر بات پر اُن کتنے رہنمائی بہتر تھا۔ مجھے اس معاملے کی یہ تک پہنچنا تھا۔

”تو پھر آ رہے ہیں آپ؟“ قدرے توقف سے اس نے پوچھا۔

”یقیناً۔“ میں نے جواب دیا۔

”ایک بار پھر واضح کر دوں کہ اس جگہ میں آپ صرف اکیلے داخل ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی ہوا تو گنٹ نہیں کھلے گا۔ آپ پیر دانش کے بارے میں جاننے سے محروم رہ جائیں گے۔“ اس نے کہا اور یکدم ہی سلسلہ منتقل کر دیا۔

میں نے دھیرے سے دیکھ کر کہا اور شفیق شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا اور ہنسنے لگا تھا۔ میری طرف دیکھ رہا تھا

”وفضل“ میں نے ذرا ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔

”ذرا گیٹ کے سامنے آئیے“ اس نے ہدایت کی اور میں طویل سانس لے کر وہ گیا۔ تاہم میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ میں سمجھ گیا کہ گیٹ میں کوئی ایئر ویک آئی نصب تھی۔ وہ شاید اوپر کی منزل پر موجود تھی اور کسی مائیکرو اسکرین پر مجھے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ کم از کم گیٹ پر تو میں تھامی تھا۔

میں گیٹ کے عین سامنے تیز روشنی میں گیا۔ مجھے یہ بھی نظر آیا کہ ایئر ویک آئی کہاں نصب تھی۔ وہ گیٹ کے بالائی حصے میں تالے کے ذریعے اس میں غلی تھی۔

چند لمحوں بعد کلک کی آواز کے ساتھ ٹالا کھلا جو در حقیقت گیٹ کے وسط میں تھا پھر خود کار گیٹ آہستگی سے صرف اتنا کھل گیا کہ ایک ہی فرد داخل ہو سکتا تھا۔ میں نے اس ٹالی کی طرح چوتھے انداز میں اندر قدم رکھا جو در اس کا کھلنے سے ہی اچھل کر کسی درخت پر چڑھنے کے لئے تیار تھی۔ مگر اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں کسی بھی غیر متوقع قسم کے استقبال کے لئے تیار تھا۔

اندرونی اندھیرے نے میرا استقبال کیا۔ اس اندھیرے کی آغوش سے نامعلوم لوگ نکل کر مجھ پر حملہ آور نہیں ہوئے تاہم یہ امکان موجود تھا کہ کسی کو گتے کھدوے سے کوئی گولی آئی اور میرا ابو چاٹ جاتی ہے۔ خطرہ مجھے ہر حال مول لینا تھا۔ یہ بڑا کھیلے بغیر بات نہیں بنتی تھی۔

اچانک کشادہ پورچ میں بڑی سی ایک روف لائٹ خود بخود روشن ہوئی اور کئی دور تک کا منظر صاف دکھائی دینے لگا۔ میرے تئیں ہوئے اعصاب ذرا دھیلے پڑ گئے۔ کم از کم ظاہری طور پر اس پاس کوئی خطہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دائیں طرف ایک گیٹ ہاؤس موجود تھا لیکن اس کا دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔ میں نے مگر سیدھی رکتے ہوئے دیوار سے لگ کر بائیں ہاتھ سے اسے کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ منقل تھا۔

”اس دروازے پر زور آزادی کی ضرورت نہیں۔“ اچانک قریب ہی سے آواز ابھری اور میں نے تیزی سے گھومتے ہوئے مگر کار سے دھر کر کیا حالانکہ آواز میں نے فوراً پہچان لی تھی۔ یہ اسی لڑکی کی آواز تھی لیکن میں وہ حرکت اضطرابی تھی۔

برآمدے میں نظر آنے والا عربی دروازہ بے آواز طریقے سے کھل چکا تھا اور وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ شب خیزی کے مبینہ سفید لباس میں تھی جس سے اس کے جسم کی چاندنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس کے سیاہ چیلنے اور۔۔۔ بال کدھلوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

وہ کسی حد تک مختصر اور دراز سر ہوا نازک تھی۔ اس مختصر وجود میں بڑی قیامتیں پنہاں معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے جب اسے سر ہوا سیاہ پوشی کی حالت میں دیکھا تھا تو تھک ہی محسوس کیا تھا کہ

مکراتے ہوئے جواب دیا ”اور یہی بات سب سے زیادہ اہم ہے۔ میرے انداز سے صحیح ہیں یا غلط؟ یہی جاننے کے لئے ہمارا وہاں بااوب سے زیادہ اہم ہے۔“

”بات تو ٹھیک ہے“ شفیع شاہ نے سر ہلایا۔

”تم دو تین آدمیوں کے ساتھ حسب معمول میرے آس پاس رہو گے۔“ میں نے ہدایت کی ”میں کوشش کروں گا کہ اگر ذرا بھی کوئی ایسا ہنگامی صورت حال ہوئی جو مجھے اپنے قابو سے باہر نظر آئی تو میں کم از کم ایک فائر ضرور کر سکوں۔ گولی کی آواز سننے ہی نہیں کسی نہ کسی راستے سے اس گھر میں کود آئے۔ کسی راستے سے کسی کو مار کر بھی کھسکا پڑے تو تمہیں پڑا۔ پرواست کرنا کہ کون مارے یا قبول مر رہا ہے۔“

چند لمحوں بعد ہم ہوٹل سے روانہ ہو چکے تھے شفیع شاہ نے اپنی اور میری گاڑی کے درمیان مناسب فاصلہ رکھا تھا۔ ان دونوں کی طرح وہ سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ لیکن ایسا سایہ جو ذرا اعلیٰ پر چلتا تھا اور اس وقت تک اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا جب کہ اندر ضرورت نہ آن پڑی۔

ہم نے بہت تیز رفتار سے فاصلے طے کیا اور یہ محض اتفاق یا نایاب میری خوش قسمتی تھی کہ میں کسی سے پوچھے بغیر مطلوبہ ہنگامی فاصلے میں کامیاب ہو گیا حالانکہ وہ وائٹس کے ایک خاصے باہرہ حصے میں واقع تھا۔ بے ہودہ اس لحاظ سے کہ وہ فیر پوری سڑ آباد نہیں تھا۔ اس میں کئی پلاٹ خالی تھے جس کی وجہ سے زانی کا احساس زیادہ تھا جبکہ وائٹس کے تو اچھے بھلے آباد علاقوں کی بھی رات کو یہ زانی کا احساس ہوتا تھا۔

جس جگہ کا ایڈریس اس لڑکی نے مجھے لکھوایا تھا وہ زیادہ لمبا اور وسیع تھا لیکن نہایت خوب صورت نشاندہ اور دریا تھا۔ اس کا پورچ بہت عمدہ تھا اور اسے باہری سے دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ لڑکی قریب ہی پرچہ بہت مشکل استعمال کی گئی تھی۔ اس پر کوئی نیم لٹ نہیں تھی۔ صرف اس کے گیٹ کے ایک پیر پر روشن خانہ تھوڑا سا جس میں شیشے پر گھر کا نمبر غور دکھائی دے رہا تھا۔

ہنگامی منزل تھا۔ صرف اوپر کی منزل پر کھڑکیوں میں روشنی لگائی دے رہی تھی۔ نیچے کی منزل عمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی کہ پورچ میں بھی روشنی نہیں تھی۔ البتہ گیٹ کی پیشانی پر بے تیز لائٹ اس طرح لگی ہوئی تھی کہ گیٹ کے سامنے کھڑا ہونے والا روشنی میں نما جاتا۔

میں نے گاڑی گیٹ سے کچھ آگے لے جا کر روکی اور پیدل تک واپس آیا۔ میرا ہاتھ جیب میں مگن کے دستے پر تھا۔

”مگن؟“ پلٹ کر منظر کا سر پر آواز ابھری۔ یہ اسی لڑکی کی نامعلوم ہوئی تھی۔

اس سیاحی کے بارے میں مگن کی چاندنی مستور تھی۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے اس کے چہرے پر زندگی کی وہ تب و تاب مفقود نظر آئی جو اس نو عمری اور نوخیزی میں موجود ہونی چاہئے تھی۔ سر پر سیاہ ولفوں کا سا نہ ہو تا توہ سر سے پاؤں تک بدن کے گالے ہنسی دکھائی دیتی۔ قلموں والے چاہتے تو کچھ اچھل اچھلکھٹیں وغیرہ دے کر اس وقت کسی سین میں اس سے ایک خوب صورت روح کا کام لے سکتے تھے۔

میرا ایک ہاتھ دروازے کی تاب پر تھا۔ دوسرے میں مگن تھی جس کا رخ اس کی طرف تھا اور میری گردن اور اسے لگی ہوئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لئے دقت شاید وہیں رک گیا تھا۔ وہ بھی ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میری صورت ذہن میں نقش کر لیتا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں دلچسپی نہیں "افسردگی تھی۔ وہ نکلے پاؤں تھی۔

اسی ٹھہری ٹھہری آواز میں وہ بولی "اس دروازے کو چھوڑ دیں۔ وہاں جگہ کاڑھ موجود ہوتے ہیں وہ اس وقت اندر ہی بے ہوش پڑے ہیں۔"

میں نے اس کی ہدایت پر ایک "معمول کی طرح ہاتھ تاب سے ہٹالیا تو وہ بولی "یہ کمن بھی جب میں رکھ لیں۔ یہاں آپ کو اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں نے اس کے اس حکم کی قبول نہیں کی۔ البتہ مگن نیچے گئی۔ وہ کھوٹے ہوئے بولی "میرے پیچھے آجائیے۔"

میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اس دروازے سے اندر پہنچا۔ وہ ایک آرام دہ و پراست ہال تھا جہاں روشنی بہت کم تھی۔ دروازے کے پاس سے ہی سیڑھیاں اتر جا رہی تھیں۔ وال ٹو وال کارپٹ کی وجہ سے وہ بالکل ہی بے آواز قدموں سے چل رہی تھی۔ ویسے بھی وہ ننگے پاؤں تھی اور اس کا دھڑو جیسا سبک نظر آ رہا تھا اس کی وجہ سے شاید ویسے بھی اس کے قدموں کی آہٹ نہ ہوتی۔ اس کے پیچھے چلتا ایک نہایت صبر آزما کام تھا۔ اچھا ہی تھا کہ اس وقت میرا ذہن دوسری بہت سی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

وہ بہت آہستگی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ جیسے بہت چھکی ہوئی تھی یا پھر اسے نیند کی محسوس ہو رہی تھی۔ "اچھا تو تمہارا نام فرالہ ہے۔" میں نے اب بھی گردو پیش سے مخاطب رہتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اس نے مڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا "بہت عام سا نام ہے۔ اس کو سننے کے بعد آپ بات آگے بڑھانے کی غرض سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بڑا خوب صورت نام ہے۔"

اواسی اور مگن اس کے چہرے پر ہی تھیں "اس کے لیے میں بھی جیتی۔ اس عمر اس سراپا اور اس خوب صورت گہر میں موجود کی باری خود یہ اواسی کچھ عجیب لگ رہی تھی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تمہیں خوب صورت نام کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود خوب صورت ہو۔ ویسے فرالہ بھی کچھ کم خوب صورت نام نہیں ہے۔ اس میں شعوریت اور لگائی ہے۔"

تب اس نے اچانک ہی رک کر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے بھی رکنا پڑا۔ اس کا ایک پاؤں چلی بیڑھی پر تھا اور ایک اس سے اگلی بیڑھی پر۔ اس کے چاندنی جیسے وجود سے چھوٹی ہوئی خوشبو انسان کے حواس کو جھٹلا دینے کے لئے کافی تھی لیکن اس وقت میں اپنا ذہن کہیں اور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا میں واقعی بہت خوب صورت ہوں؟" اس نے نہایت بیچینی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں یہ بات ابھی تک کسی نے نہیں بتائی؟" میں نے جانا تھا۔

"بتائی تو ہے۔" وہ افسردگی سے مسکرائی "بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ انہی چند الفاظ کے ظلم نے ہی مجھے بھلا دیا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے سے شاید میں کسی چڑیل سے بھی نوازا بد صورت ہو گئی ہوں۔"

اس کی اس چھوٹی سی بات کے پیچھے پڑنے ایک بڑی کہانی تھی۔ وہ دوبارہ بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہم ایک سن ٹیرس پر جا پہنچے اس نے ایک دروازہ کھولا اور ہم ایک ہال سے گزرنے لگے۔ برآمدہ جیسے مجھے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ کسی موڑ سے اچانک بہت سے آدمی آٹونٹک گنوں کے ساتھ غنچیں گے۔ گولیوں کی بو بھار رہ گئی اور میرا خون اکٹھا جسم قالین پر ڈیرہ ڈاڑھ جائے گا۔ یہ اندیشہ شاید میری خود ہی ذہن دہی اپنے ذہن میں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میری نامعلوم حیات مجھے بتا رہی تھی کہ یہ خیم صورت اور آرام دہ و پراست مکان اس وقت کسی قدم کھڑکی طرح دیران تھا۔

وہ مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر بولی "میں نے آپ سے کہا تھا مگن جیب میں رکھ لیجئے۔ یہاں آپ کو اس کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن شاید آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں آیا۔ ٹھیک ہی ہے۔ پہلی ملاقات میں کسی کی بات کا اعتبار کرنا بھی نہیں چاہئے۔ میں اس وقت بھی مگن ہاتھ میں لئے چل رہا تھا۔ میں نے اذ اور حردیکھتے ہوئے پوچھا "تم اس وقت یہاں اکلی ہو؟"

"تقریباً۔" اس نے جواب دیا۔ "میری گرفت مگن کے دستے پر مزید سخت ہو گئی ہے۔"

"مطلب؟" "مطلب کو جانے دیجئے۔ آپ مجھے اس گھر میں اگلا ہی سمجھئے۔" وہ ایک دروازے کے سامنے رکتے ہوئے بولی۔ "وہ دروازہ کھول کر اندر چل گئی اور دروازے کو اچھے سے چور رک گئی کیونکہ اشارے سے واپس لا رہا تھا اور میں کچھ بات کر رہا تھا۔ انداز میں باہر ہی رک گیا تھا۔"

”تم نے اسے ڈرکس میں کچھ ملا کر پایا ہے یا یہ دیسے  
لئے میں دمت پڑا ہے؟“ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔  
”آپ خود کھل اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو اندازہ ہو جائے  
گا۔“ وہ بولی۔

میں دھیرے دھیرے اس طرح قدم اٹھاتا آگے بڑھا کہ غزالہ  
پر بھی نظر رکھ سکوں۔ وہ میرے انداز سے میرا مقصد سمجھ گئی۔  
عجیب سے انداز میں ہنسی اور بولی ”آپ بہت ہی زیادہ محتاط آدمی  
ہیں۔“

”جہاں معاملہ پیر دانش کا ہو وہاں محتاطی رہنا چاہئے۔“  
نے کہا۔

”ہاں یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔“ اس نے اثبات میں سر  
ہلایا۔ ”لیکن مجھے یہ بات بہت تاخیر سے بتانی جا رہی ہے۔“

کھل اٹھاتے وقت بھی میں ہر دو تھل کے لئے تیار تھا۔ گو کہ  
میرا دل کہہ رہا تھا کچھ بھی نہیں ہو گا لیکن میں اپنے آپ کو یقین  
دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کھل اٹھاتے ہی کوئی میری پیشانی میں  
جھوٹ ہو سکتی تھی یا خیر میرے سینے میں اثر سکتا تھا۔ میں اپنے  
آپ کو یہ بھی بتا رہا تھا کہ ضروری نہیں کہ کھل کے نیچے پیر دانش ہی  
موجود ہو۔ وہ کوئی اتھالی یا ہر دو مشاق قابل یا گناہ دہی ہو سکتا تھا۔  
ایک ہاتھ سے میں نے کھل اٹھایا۔ میرا دوسرا ہاتھ کسی حد  
تک فضا میں بلند تھا اور بجلی کی طرح حرکت کرنے کے لئے تیار تھا  
لیکن مجھے اس کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غزالہ مجھے  
دھوکا نہیں دے رہی تھی۔ کھل کے نیچے پیر دانش ہی موجود تھا۔ گو  
کہ اس کی شکل کٹانی بدلی بدلی سی لگ رہی تھی لیکن اس کے چہرہ  
دانش ہوئے میں بہر حال کوئی شک نہیں تھا۔

اس کی رنگت پہلے ہی کمری سانولی تھی لیکن اس وقت اس کا  
چہرہ بالکل ہی تھلا اور خورم سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون  
کی ایک پتلی سی لکیر اس کی بائیں آنکھ کی طرف آ رہی تھی اور بند  
آنکھ پر کچھ خون جمع ہو کر خشک ہو چکا تھا۔ اس غلابی خون نے اس کی  
آنکھ کو دھانپ لیا تھا۔

پیشانی سے خون کی لکیر اس لئے برآمد ہوئی تھی کہ وہاں ایک  
کیل جھوٹ تھی۔ وہ کھل پوری کی پوری پیشانی میں جھوٹ تھی۔  
صرف اس کا سر باہر تھا اور سر کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کم از  
کم ایک بائیس لکیر تھی۔ میں نے زندگی میں بڑے بڑے ہولناک  
ظہارے دیکھے تھے لیکن نہ جانے کیوں اس خاموش ظہارے نے  
میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی سردی لڑائی۔

ایک لمحے کے لئے شاید میں فضا میں ہلنا بھی بھول گیا تھا۔ اس  
لئے شاید کمرے میں ایسا سکوت تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی  
جاسکتی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی اور اتنی بگڑا خیر  
کمانی اتنی خاموشی سے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پیر  
دانش کے انجام کو پہنچنے تک نہ جانے کتنی قتل و غارت ہو گئی، کتنے

”آجائے۔ آجائے۔ یہاں کوئی آپ پر حملہ نہیں کرے  
گا۔“ وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔

وہ ایک نہایت شاندار، طویل و عریض اور پُر قہقش بیڑہ دم  
تھا۔ وہاں تک میں اسے دیکھ رہا تھا وہ خالی ہی معلوم ہوا تھا کہ میں  
اندھ چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور ہنر دہا کر قتل کر دیا۔

بیڑہ دم کے وسط میں ایک بہت بڑے گول بیڑے پر گول اور اوپر  
سے مخروطی نیچے کے انداز میں ایک باریک جالی بچھلی ہوئی تھی۔  
اس خوب صورت بیڑے پر ایک طرف کوئی نہایت خوب صورت اور  
چمکیلا سا کھل سر سے پاؤں تک اوڑھے لپٹا تھا۔ اب میں نے کھن  
جیب میں رکھی کیونکہ کمرے کا دروازہ قفل ہو چکا تھا۔ بیڑے پر لپٹا  
ہوا شخص اگر ڈرامائی انداز میں اچانک کھل پیچھے کر اٹھ کھڑا  
ہوتا اور اس کے ہاتھ میں کوئی گھن ہوئی تب بھی مجھے کوئی خاص  
پرہیز نہیں تھی۔ اکیلا آدمی خواہ مسلح بھی ہو تا اس سے شہنا میرے  
لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

غزالہ کا نام ضروری نہیں تھا کہ غزالہ ہی ہوتا۔ تاہم میں نے  
سروست اس کا یہی نام دل ہی دل میں اصل تسلیم کر لیا تھا۔ اس  
نے ایک سا بڑا بڑے سے نہایت کنٹرول اٹھایا اور بیڑے کی طرف اس کا  
سر گھم کے ایک ہنر دہا دیا۔ بیڑے پر پھلایا ہوا جالی کا بڑا سا گنبد سٹ کر  
اوپر اٹھتا چلا گیا اور ایک جگہ ٹوٹنے کی صورت اختیار کر گیا۔  
اب بیڑے پر جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

کمرے کے ایک حصے میں فشت کا بھی انتظام تھا۔ گول گول  
گولے صوفوں کے درمیان بیٹھے کی خوب صورت تپائی پروہنکی کی  
پوش مکی رکھی تھی جس کی تہ میں تھوڑی سی دھنکی باقی تھی۔ ایک  
گلاس میوہ دار رکھا تھا۔ ایک لڑکا ہوا تھا۔ کچھ دیگر لوازمات بھی  
تھے۔ فریج کو سٹل کی بڑی سی ایئر ٹرے میں سگاردوں کے ٹوٹے  
موجود تھے۔ اس کے کنارے پر ایک سگار سالم بھی رکھا تھا۔ کمرے  
میں سگاردوہنکی، گولوں، اڑھنڈی، شراب، سب چیزوں کی خوشبو نہیں  
گھڑکتی تھی۔ اس کے باوجود میں سگارد کی مخصوص منک پہچان سکتا  
تھا۔ یہ پیر دانش کا براہ تھا۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے دل کی دھڑکنیں تھم نہ ہونے  
پائیں۔ میں نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک میٹھے کی طرح  
مالت گھڑی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

”اس کھل کے نیچے پیر دانش ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں  
کی بجائے ہونے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کی آواز جیسے کہیں دور سے  
آ رہی تھی۔

”آپ کو اس کی تلاش تھی؟“ میں نے آپ کو بہت ساری  
بتوں سے پچایا ہے۔ آپ کی خدمت میں پیر دانش۔۔۔! اس  
نے ڈرامائی سے انداز میں ذرا جھک کر بیڑے کی طرف بازو پھیلا دیا  
اب آپ اسے لے جاسکتے ہیں۔“

اس نے سیاہ شیشے کی تباکی تلے ہاتھ ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں اسٹیل کا ایک بڑا سا بھڑوا تھا۔ بھڑوا اٹھنے دکھاتے دے ہوئی "اس سے میں نے یہ کیل اس کی کھوپڑی میں اتاری ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس وقت وہ نشے میں رحت... اور تقریباً بے ہوش تھا اس لئے وہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر سکا ہوگا۔ بلکہ میری خواہش تھی وہ زندگی میں کم از کم یہ ایک اہمیت تو محسوس کر لیتا لیکن ظاہر تھا کہ میں اس کے جانے کے لئے ہوش و حواس میں ہونے تو یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔" اس نے بھڑوا آڑھ لی سے تباکی پر رکھ دیا۔

میں جیسے خواب کے سے عالم میں دھیرے دھیرے چلا ہوا واپس آیا اور اس کے مقابل دو سرے سوئے پر بیٹھ گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اچانک ہی میں نے خود کو بھی کچھ تھکا تھکا سا محسوس کیا تھا حالانکہ میں شاندار دوری محسوس کرنا تھا۔ شاید اس وقت اس گھر کے دہو دار پر اور میراں کی فضا میں تھکن کا بغیر تھا۔ یہ تھکن مجھ پر بھی نہ جانے کس طرح حملہ آور ہو گئی تھی۔ مجھے تو اس وقت خوش اور تازہ دم ہونا چاہئے تھا۔ میرے من کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی اور پھر وائٹ اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اس کے بازو نہ جانے کیوں میں ویسا محسوس نہیں کر رہا تھا جیسا مجھے محسوس کرنا چاہتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہانی کچھ الٹ چل رہی ہے۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "انجام پہلے سامنے آ گیا ہے اور آواز کا کچھ پتا نہیں... سب سے پہلے تو مجھے تم سے یہ پوچھنا چاہئے تھا کہ تم کون ہو؟"

"آپ کو اندازہ نہیں ہوا؟" اس نے پوچھا۔  
"نہیں۔ اس وقت میرا اپنے اندازوں سے ایمان اٹھا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔  
اس کا سر جھک گیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے چند لمبے خاموش بیٹھی رہی۔ اسے گویا بولنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ آخر اس نے شاید سادہ ترین الفاظ میں اپنا تعارف کرانے کا فیصلہ کیا اور کہا "میں پیر وائٹ کی دواشتہ ہوں۔ یا یوں کہئے کہ کچھ دیر پہلے تک تھی۔"

میں ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا نہ کیا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ اب تک مجھے اندازہ کیوں نہیں ہوا تھا؟ فرح نے مجھے بتایا تھا کہ پیر وائٹ کی تیسری دواشتہ اٹھارہ سال کی تھی اور وہ اس کی سب سے قیمتی عورت تھی۔ اس جنگل میں پہنچ کر اس امکان کی طرف میرا ذہن جانا چاہئے تھا۔ میرا ذہن شاید ایک وجہ سے اس طرف نہیں گیا تھا۔ وہ درجہ سوال بن کر میری زبان پر آگئی۔  
"تم نے ابھی انتقام کی بات کی تھی۔" میں نے کہا۔  
واشائیں اپنے رکھنے والوں سے انتقام تو نہیں لیا کرتیں۔ انتقام کس بات کا؟ عورت اپنے آپ کو کرائے پر دینا چاہتی ہے اس سے

بے گنا ہوں اور گناہ گاروں کا خون مجھے گا اور نہ جانے کتنا وقت لگے گا لیکن جب کہانی انجام کو پہنچنے پر آئی تھی تو حکم ہی پہنچ گئی تھی اور شاید بڑی خاموشی سے پہنچ گئی تھی۔ کم از کم ہندوؤں کی حالت تو یوں بتا رہی تھی کہ وہاں کوئی ایسا خاص ہنگامہ برپا نہیں ہوا تھا۔

میں نے آڑھ لی سے پیر وائٹ کا چہرہ دوبارہ کیل سے ڈھانپ دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے سے گویا ایک بھیاک منظر ہٹ گیا۔ میں آڑھ لی سے ہی ٹکی کی طرف گھوما۔ وہ تھکے تھکے سے انداز میں پھولے پھولے صوفے میں دھمکی ہوئی تھی۔

"یہ کس نے کیا ہے؟" میں نے پیر وائٹ کی طرف اشارہ کیا۔  
"میرا مطلب ہے۔ اس کی پیشانی میں کیل کس نے ٹھکرائی ہے؟"  
"کیا آپ کو یہاں میرے علاوہ کوئی اور نظر آ رہا ہے؟" اس نے پیر وائٹ آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے...؟ یہ کیل تم نے ٹھکرائی ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

انسانی کھوپڑی کی پڑی بہت سخت ہوتی ہے شاید اس لئے کہ اس میں حضرت انسان کا دماغ بند ہوتا ہے جو سارے جسم کا بادشاہ ہے اور انسان کے سارے افعال و اعمال کو کنٹرول کرتا ہے۔ قدرت نے اس کی حفاظت کا زبردست بندوبست کیا ہے۔ یہ آسانی سے نہیں ٹوٹتی اور میرا خیال تھا کہ اس میں کیل جیسی ٹوکی چیز گاڑا بھی کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق جس کسی نے بھی یہ کام انجام دیا تھا اسے کوئی ایسا موقع تو میسر نہیں رہا ہو گا کہ وہ تو رام سے بیٹھا بھڑوڑی مار مار کر کیل ٹھونکتا رہا اور دھیرے دھیرے اسے کھوپڑی میں اتار آ رہا ہو۔ اس نے یقیناً ایک ہی ضرب میں یہ کام انجام دیا تھا۔

"کیوں... کیا میں یہ کیل نہیں ٹھونک سکتی تھی؟" اس نے میری بے یقینی کو محسوس کرتے ہوئے ٹیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یہ یقیناً ایک ہی ضرب میں ٹھونک گئی ہے۔" میں نے کہا۔  
"ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ لگتا ہے آپ کو بھی اس کام کا تجربہ ہے۔" اس کے افسردہ چہرے پر مسکراہٹ کی رشت ابھری۔  
"یہ تجربے کی نہیں، کامس کی بات ہے۔" میں نے کہا۔  
"مجھے تمہارے دعوے پر یقین نہیں آ رہا۔ تم ایک نازک اندام اور کمزور لڑکی ہو۔ تم یہ کام نہیں کر سکتی تھیں۔ ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے۔"

"یہ میری نہیں انتقام کی طاقت تھی۔" وہ نہایت فحصرے فحصرے لمحے میں بولی۔ وہ ہلکے جھپکے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی دھندلائی دھندلائی سی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بجلی کود رہی تھی۔ اس کی فحصرے اور اس کے ان الفاظ نے میری روح کو جھنجھٹا دیا۔

پھولوں کی سچ پر پروان چڑھنے  
والے ایک نواب زادے کی  
خودنوشت

## درخشاں

لازوال کہانیوں کے خالق انوار  
صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے  
ایک نئی سوغات تین دوستوں کا قصہ  
جن کے عزم و استقلال سے طوفان  
تھکت کھا گئے تھے۔

دو حصوں میں مکمل



فون: 7224665

مخاطبات پورے کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر آنکھ اسے مہیا کی جاتی ہے۔ اسے اس کے خوابوں کے مطابق رکھا جاتا ہے۔ دونوں فریق جب چاہیں کرائے داری کا وہ معاہدہ ٹوٹ سکتا ہے۔ رکھنے والا اپنا راستہ لے گا۔ اور رکھیل چاہے کئی تو کسی اور قدر دان کی تلاش میں چل دے گی۔ اس میں انتقام..... اور وہ بھی اتنا شدید انتقام کہاں سے نکل آیا؟

افرونگی اس کے چہرے پر کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس نے ہالوں میں انگلیاں پھیریں اور گزروں کی آواز میں بولی ”دنیا کی تمام داستانیں کی کہانیاں یکساں نہیں ہو سکتیں افضل صاحب! آپ میری عمر دیکھ رہے ہیں! میری بد قسمتی ہے کہ میں ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت آگے چلی گئی ہوں۔ میری عمر زیادہ نہیں ہے۔“

”مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا ”اور مجھے کسی نے تمہارے بارے میں بتایا بھی تھا۔“

”فرح نے بتایا ہو گا۔“ وہ فوراً بولی ”بیرو دانش سے تعلق رکھنے والے خاص لوگوں میں صرف وہ مجھے جانتی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بعد وہ ماری گئی۔ اس کا جرم اتنا سنگین تو نہیں تھا کہ اسے اتنی بے دردی سے مار دیا جائے۔“

”بیرو دانش کے ہاتھوں جن لوگوں کی بھی زندگیاں برباد ہوئیں ان میں سے کسی کا جرم بھی اتنا سنگین نہیں تھا کہ اسے بے رحمی و سفاکی سے ہلاک کر دیا جائے۔ کم از کم بیرو دانش کو تو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا تھا کہ وہ پہلے ان کی زندگیاں برباد کرے اور پھر انہیں ذرا سا اپنی مرضی کے خلاف جاتے دیکھ کر کیرے کو ڈوں کی طرح موبوے۔“ میں نے کہا۔

”فرعون ہر دور میں... ہر شعبہ زندگی میں... ہر سطح پر کسی نہ کسی روپ میں جنم لیتے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے۔ کوئی چھوٹا فرعون... کوئی بڑا فرعون... کسی کے چہرے پر کوئی نقاب... کسی کے چہرے پر کوئی نقاب... ہم جیسے انسانوں کی بد قسمتی ہوتی ہے کہ ہم ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔“ اس نے ایک نظریہ کی طرف دیکھا جس پر بیرو دانش کھیل اور مے ابدی نیند سو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غرت کی ہرق کوئدی اور معدوم ہو گئی۔ اس کی جگہ پھر محسن عود کر گئی۔

”میں تمہاری کہانی سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کہانی کا وقت اب گزر گیا افضل صاحب! اب تو کہانی اپنے بدسورت انجام کو پہنچ چکی ہے اور اس کے باقی اوراق وقت کے دوش پر اڑتے پھر رہے ہیں لیکن نہایت اختصار سے میں آپ کو اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گی۔ صرف اس لئے کہ آپ حالات کو کچھ طور پر جنرل کر سکیں اور شاید اس لئے بھی... کہ آپ مجھے ان لوگوں میں شمار نہ کریں جن کی منزل کسی بہت امیر آدمی کی داشتہ... یا وراثت نہایت ہی بٹھا ہوئی ہے۔ میرا خاندانی پس منظر بھی

اس کی ماں اور باپ دونوں بالکل اسی طرح بظہر بن گئے جس طرح بعض قلوں میں دکھایا جاتا ہے۔ انہوں نے لڑکے کو باپ پر بیچنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ عمر بھر ایسی ہوتی ہے کہ انسان غلطی کرے تو تب بھی شکست قبول کرنے یا اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہم دونوں نے گھر سے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔

رات کے دو بجے لڑکا اپنی اسپورٹس کار لے کر ایک جگہ پہنچ گیا۔ میں بھی گھر سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔ وہ جگہ میرے گھر سے قریب ہی تھی۔ لڑکا کچھ رقم بھی لے کر آیا تھا۔ ہمارا جواز کے ذریعے لاہور جانے کا پروگرام تھا۔ راستے میں ہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ ہمیں کار سمیت اغوا کر کے ایک جنگل میں لے گئے۔ وہ کسی اور واردات پر نکلے تھے جس میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ راستے میں انہیں ہم مل گئے۔ انہوں نے اس مال قیمت کو بھی ہتھ بھگا۔ ہم نے انہیں چکر دینے کی کوشش کی کہ ہم بمن بھائی تھے لیکن اس پکڑ میں نہیں آئے۔

بہت سی خواتین اس قسم کے ڈاکوؤں اور بدشت گردوں کے چنگل میں رہ کر بھی اس طرح واپس آنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں کہ ان کی عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکا۔ لڑکے کو انہوں نے خوب مارا پیکا۔ اس کی فیملی کے متعلق معلوم کیا اور اس کے گھر والوں سے تاوان وصول کرنے کا پروگرام بناتے رہے اور مجھے کی دن اور کی رات تک وہ سب باری باری پال کر رہے۔ خوابوں کی ایک پری کو گویا ان کے ہاتھ آگئی تھی۔ وہ اپنے سارے امان نکال لیتا چاہتے تھے۔

وہ پولیس کے خوف سے وہاں چھپے ہوئے تھے اور کوئی معاملہ فہم اڑ جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند دن بعد وہ کراچی سے نکل کر بلوچستان کی طرف فرار ہونا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ایک رات پولیس نے اسی جنگل کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ لڑکا حالانکہ ان کے لئے ایک قیمتی اثاثہ تھا۔ ابھی تک تاوان وصول ہونے کی امید باقی تھی لیکن جان پر پتی تو انہوں نے اسے بھی بددق تھا کر مرنے کے لئے آگے کر دیا اور خود مجھے ساتھ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جس طرح اکثر ڈاکو اور بدشت گرد ہو جاتے ہیں۔ لیکن شاید میری ہی قسمت خراب تھی۔ میری راج سے ان سب پر نحوست کے سائے منتلا رہے تھے۔ لڑکا تو اسی جنگل میں پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں اخباروں میں خبر آئی۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں دولت مند گھرانے کا ایک لڑکا بھی شامل تھا۔

اس کے دو دن بعد وہ بانچول ڈاکو بھگت سمیت بلوچستان فرار ہونے کی کوشش میں راستے میں اچانک پکڑے گئے۔ جس کے بعد اخباروں میں خبر آئی کہ ڈاکوؤں کے گروہ میں ایک نوخیز حبیب بھی شامل تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ میرے والدین پہلے میرے بھاگ جانے اور پھر اس طرح پکڑے جانے کے صدمے کی تاب نہ لا کر

ایسا نہیں تھا۔ افضل صاحب! میں کسی ایسے خاندان کی لڑکی نہیں ہوں جہاں لڑکیوں کو دولت مندوں کے ہاتھ فروخت کرنے یا "کرائے" پر دینے کے لئے پالا جاتا ہے۔ اس قسم کے خاندانوں سے تو دیکھیں پیر دانش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی طرف تو وہ رخ ہی نہیں کرتا تھا۔ میں تو ایک نہایت عام سے... غریب سے... اور شریف سے خاندان کی لڑکی تھی۔"

اس کا یہ انکشاف میرے لئے حیرت انگیز تھا لیکن اس کا یہ پس منظر اس کے موجودہ حالات میں کچھ فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کی کمائی کی بیشتر کڑیاں تائب تھیں۔ اگر وہ اپنے بارے میں مختصر رہی سہی۔ لیکن مزید کچھ بتائی، تبھی شاید بات صحیح طور پر سمجھ میں آتی۔

زرا توقف کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا "مگر آپ اسے خود پرستی اور خود ستائشی نہ سمجھیں تو میں کہوں کہ ایک معمولی سے سفید پوش گھرانے میں پرورش پانے کے باوجود میں جینسن تھی۔ اپنی عمر سے بہت آگے تھی لیکن میرا خیال یہ ہے میری بہت سی بد نصیبیوں میں سے ایک بد نصیبی تھی۔ انسان کی کم عقلی، نا اہلی زیادہ تر دوسروں کو نقصان پہنچاتی ہے لیکن زیادہ آگے سے انسان زیادہ تر خود کو اذیت پہنچاتا ہے۔ زیادہ سمجھ دار لوگ زیادہ دھکی ہوئے ہیں۔ میرے جینسن ہونے نے مجھے متاثر کیا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے پھر خاموش ہو گئی اور اپنی گود میں ٹکائے ہوئے خالی ہاتھوں کو گھومنے لگی پھر بولی "لیکن عمر کے سوہو میں سال میں میں تمہیں دے۔ عمر کا سوہو سال سویت سکس ٹین تہا" وہ یکدم یوں ہنسی جیسے اس کے پہلو میں کوئی زخم نہیں دے رہا ہو مگر وہ کسی کو دھوکا دینے کے لئے ہنس رہی ہو۔

"بہت افسانوی سی اصطلاح ہے یہ۔ سوہو سال۔۔۔" اس نے سلسلہ کلام جوڑا "میں ایک اچھے کالج میں پڑھتی تھی جہاں کو انچوکیشن تھی۔ وہاں مجھے ایک لڑکا مل گیا جس کی ذہنی سطح میری سی طرح بہت بلند تھی لیکن اس میں ایک بڑی خرابی تھی اور وہ یہ کہ وہ بہت امیر گھرانے کا لڑکا تھا۔ ہمارا معاملہ "مواستوری عرف میرا نام ہے محبت" وغیرہ وہی قلوں والا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم بھی محبت کی کوئی امر ہو جانے والی کمائی تخلیق کر رہے ہیں۔ ہماری کھیلنے کھانے کی عمریں تھیں مگر شاید یہ ذہنی بلوغت کی پہاڑی ہوئی قیامت تھی کہ ہم متحدگی سے شادی کی طلب میں گویا مرے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے گھر والوں سے بات بھی کر ڈالی۔ ظاہر ہے اس کے ماں باپ کو زبردست جھکا لگا۔ اس عمر میں کتابوں میں رفتے تو چھپا کر ایک دوسرے کو دیکھ جاتے ہیں، شادی کی باتیں نہیں کی جاتیں۔

اس کے والدین نے یقیناً اس کے لئے کچھ اور منصوبے بنا رکھے تھے۔ وہ تو سچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا نور نظر باریہ کرتا پھر رہا ہوگا اور ایک غریب لڑکی کے عشق میں ادا ہو رہا ہوگا۔



”اور...“ میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا ”تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟“

”ظفر جمال نے“ اس نے جواب دیا ”یہاں کا فون بھی نیپ ہوتا ہے۔ چند دن پہلے اس نے جان پر کھیل کر کسی طرح اس بچکے میں گھس کر مجھ سے رابطہ کیا اور پیر دانش کے بارے میں مجھے وہ باتیں بھی بتائیں جو اب تک مجھ سے بھی چھپی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں پیر دانش کو کیفر کردار تک پہنچانے میں اس کا ساتھ دوں لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ در بدر مارا مارا پھر رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں ایک ہی جوتن ہلایا ہوا تھا کہ وہ پیر دانش کو نیس چھوڑے گا۔ پیر دانش اس دوران خود بھی مجھے تمام حالات سے آگاہ رکھ رہا تھا۔ آپ کے بارے میں بھی بتاتا رہتا تھا کہ آپ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں لیکن وہ بڑا اڑا تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھا کہ کوئی اس کا کچھ نہیں کاڑ سکا پھر مجھے بتا چلا کہ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے تو مجھے امید کی کہ انظر آئی کہ اب شاید وہ انجام تک پہنچ جائے۔ میں بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ اسی لئے میں آج اپنے آپ کو چھپا کر بدلتا بھیجی تھی لیکن

میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ وہ صاف بچ نکلتے گا اور یہی ہوا۔ افضل صاحب! میں نے اس چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ لیکن بس یوں سمجھئے کہ جب میں نے وہاں اپنی آنکھوں کے سامنے ظفر جمال کو مرے اور پیر دانش کو

میرے سلسلے میں کچھ کرنے کے بجائے شہری چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ وہ اتنے عکین معاملے میں کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ معمولی لوگ تھے۔“

اس نے سرائیگر میری طرف دیکھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرا رہی تھی مگر اس کی ایک آنکھ سے ایک آنسو موتی کی طرح لڑھک کر اس کے ہاتھ پر گرا۔ اس نے یوں مٹھی بھینچی کی گویا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس آنسو پر میری نظر پڑے۔

ذرا توقف کے بعد وہ بولی ”پھر نہ جانے کیوں اور کس سلسلے میں پیر دانش اس تھانے میں نمودار ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں بہت برے حال میں تھی لیکن جو بری کی نظر میرے کو ہر حال میں۔ اور تسائی کی نظر کمرے کو ہر حال میں پرکھ لیتی ہے۔ اس نے شاید پہلی ہی نظر میں اس ڈش کو اپنے دسترخوان کے لئے منتخب کر لیا۔ اس کے وکیل مجھ سے ملے اور پھر جلد میری نگہداشتی ہو گئی۔ بیچ کی باتیں کچھ ایسی زیادہ ضروری اور کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ... اس کے بعد... آج میں آپ کے سامنے ہوں۔“

اس نے اتنی تیزی اور اتنے اختصار سے اپنی داستان حیات سنائی تھی کہ میرا سر گھوم رہا تھا۔ بڑی بڑی باتیں اس نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہہ ڈالی تھیں۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن الفاظ میرے ذہن میں گڑبڑ ہوئے جا رہے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی بولی ”ٹھیک ہے۔ ایک طرح سے میں خود ہی اپنی زندگی کی بربادی کی ذمہ دار ہوں۔ میرا جینس ہوتا میرے کسی کام نہیں آیا۔ کسی سنی کے عشق کے شعلے میں نے خود کو بھی جھسم کر لیا اور ایک شاندار گمرانے کے خوب صورت اور اکلوتے لڑکے کو بھی... لیکن میری بربادی میں پیر دانش کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے اگر مجھے ایک دلدل سے نکال ہی لیا تھا تو مجھے کسی حد تک باعزت زندگی کی طرف بھی لوٹا سکتا تھا لیکن وہ خود ایک بڑا مغرور تھا۔ اس نے مجھے ایک دلدل سے نکال کر دوسری دلدل میں ڈال دیا۔ میں بہت عیش و آرام میں تھی لیکن یہ عیش و آرام مجھے زہر لگتا تھا اور پیر دانش کی صورت سے مجھے سخت نفرت تھی۔ اس کے باوجود میں ہر رات اس کے لئے جین کر بیٹھنے پر مجبور تھی خواہ وہ آتیا نہ آتیا...“

اس نے ایک کمری سانس لی ”اس طرح بھی شاید مگر وہی جاتی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک روز جب پیر دانش کا دل مجھ سے ٹکرائے گا تو میں خالی ہاتھ دوبارہ فٹ پاتھ پر ہوں گی۔ مجھے اس کی گئی پروا نہیں تھی بلکہ شاید میں اسی دن کی منتظر تھی لیکن اس دوران مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ پچھلے دنوں مجھے معلوم ہوا کہ وہ گرو جس نے دراصل میری زندگی کو پوری طرح برباد کیا۔ وہ لوگ پیر دانش ہی کے آدمی تھے جو اس کے لئے مختلف خدمات انجام دیا کرتے تھے۔“

ایم اے راحت

کے پراسرار اور ایڈوچر قلم سے

ایک شہر کار ٹول

تاریک وادی



اردو بازار لاہور

دلیل سے نکل کر تیسری دلیل میں جا کر وہی۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ ایسا ہو۔ میں تمہاری زندگی کو کوئی بے رحم اختیار کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک بار بھر عجیب سے انداز میں ہنسی "آپ کو اس ضمن میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے وارڈروب کی طرف اشارہ کیا "اس میں ایک خودکار دیو کیمرا ڈی وی آر ویو سیت موجود ہے۔ میں نے جب پیر دانش کو ہلاک کیا تو کیمرا اینڈ پرفیکس کر کے اشارت کر دیا تھا۔ وہی آر میں صاف ستمبری ٹیپ یہ منظر بالکل محفوظ ہے کہ میں نے کس طرح اس کی چیٹائی میں کل ٹھونک۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس قتل کا الزام کسی اور پر آئے اس کیس سے دوسری طرح کی کئی فلمیں پیر دانش کے حکم پر شوٹ کی گئی تھیں۔ میں نے سوچا آج پیر دانش کی بھی ایک مختصر سی۔ مگر گارڈ فلم شوٹ کر کے رکھ دی جائے۔ اس فلم میں آپ کو یقیناً میرا کام بہت پسند آئے گا۔"

"تم نے یہ ثبوت تیار کر کے رکھ دیا۔ اس کا مطلب ہے تمہارا اس قتل سے انکار کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ تو پھر اس قتل میں ہرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم خود سامنے آکر اقرار کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"میں سامنے آنا نہیں چاہتی۔" وہ بولی "میں قانون کے شکنجے میں پھنستا نہیں چاہتی۔"

"ٹھیک ہے نہیں تمہیں تحفظ فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ تم لباس تبدیل کرو اور فی الحال یہاں سے ٹوکلہ۔" میں نے کہا۔

"آپ میری فکر نہ کریں افضل صاحب! میں نے اپنا بندوبست کر لیا ہے۔" وہ بڑی طمانیت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"یہ دقتی کی باتیں مت کرو۔ تم پھر اپنے آپ کو کسی مصیبت میں پھنسا لوگی۔ میں تمہیں تمہاری مرضی سے کہیں نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں میرے کمرے پر عمل کرنا ہوگا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے نہیں روک سکیں گے افضل صاحب! وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی اور اس کے کچے میں غضب کا عصارہ تھا!

میرے دل میں اس لڑکی کے لئے بے پناہ عزت۔ ایک عجیب سی محبت اور ایک عجیب سا گداز پیدا ہو گیا تھا۔ زندگی نے واقعی اس کے خوب صورت ذہن پر بڑے گہرا ڈھکے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کم از کم اب تو وہ زندگی کی کچھ راحتیں دیکھ لے۔ اب تو اس کے سینے میں دھپتے ہوئے زخموں پر تھوڑی سی اور پس پڑنا ہے یہ محبہ اور یہ باتیں یہ تجربے؟ مجھے جھرجھری سی آگئی۔

میں نے حکم آئیر شفٹ سے کہا "مختل باتیں مت کرو۔ ٹھیک ہے۔ زندگی نے تمہارے ساتھ کچھ ایسا سلوک نہیں کیا لیکن

محنت پر رہا ہوتے دیکھا تو جیسے میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میرے اندر رکھ سے کوئی ذور سی ٹوٹ گئی۔ میں نے اشارے سے اسے ایک کونے میں بلایا۔ اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا تھا تاہم میں نے اسے بتا دیا اور یہی ظاہر کیا کہ میں بے تابی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عدالت میں پہنچی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ وہ چپ کر کے میرے ساتھ چل دے۔ پہلے ہم اس گھر میں چھوٹا سا جشن سائمن گے پھر وہ اپنے گھر جانے کا۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو کر سب کو سرگراں کر دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ میرے ساتھ چلا آیا۔ خاص موڈ میں بھی تھا۔ حالات میں چھٹیں کھینے گزارنا اس کی زندگی کا بہت بُرا تجربہ تھا۔ وہ اس قسم کے "جشن" کے لئے ترس رہا تھا جس کی تجویز میں نے کر رکھی تھی۔ یہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کا اندازہ کرنا آپ کے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ یہ صرف دو نظری جشن تھا، صرف میں اور وہ جشن منا رہے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے تو کچھ زیادہ مشکل نہیں لگا۔ آپ کو شاید لگ رہا ہو۔

میں نے سوچا اب وقت آگیا ہے کہ اس شخص کو انجام تک پہنچا جانا چاہئے اور مجھے لگ رہا تھا کہ بے پناہ طاقت رکھنے والا قانون۔ آپ جیسے مضبوط لوگ۔ اور ظفر جلال جیسے سرپرست کی قربانی بھی اس شخص کو اس انجام تک نہیں پہنچا سکے گی جس کا یہ مستحق تھا۔ اس کے لئے مجھ جیسی کردار۔ باتوں اور انوکھ اندام لڑکی کو کسی کچھ کرنا پڑے گا۔ سو میں نے کر دیا۔ میں نے زندگی کا فرض ادا کر دیا۔"

اس نے دیکھ کر ہلکے سے ایک گلاس میں پانی اٹھا لیا اور وہاں ایک شیشی اٹھاتے ہوئے نکلا کہ کی طرف دیکھ کر بولی "میں دوا کا نام ہو گیا ہے۔ میں بہت بُری طرح تھک بھی گئی ہوں افضل صاحب! میں ذرا اپنا دنا خنز کا کپڑا بول کھاؤں۔" اس نے شیشی سے ایک کپڑا بول نکالا اور پانی سے نکل لیا۔

پانی پی کر اس کی حالت کچھ بہتر نظر آنے لگی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "میں واقعی بہت تھک گئی ہوں۔ آج کا دن بہت مہرِ زما تھا۔ اوپر سے نشے میں دھت ہونے کے بعد پیر دانش ڈیک پر انگریزی موسیقی کا کیسٹ لگا کر پانگوں کی طرح اسی کمرے میں میرے ساتھ ناچنے لگا۔ آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ ہم کس حالت میں ناچتے رہے اور کتنی دیر تک ناچتے رہے۔"

"میں اندازہ کر سکتا ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔

وہ دھیرے سے ہنسی پھر اس نے صوفے کے پٹے سے ہلک لگائی اور پھٹ کر گھومنے لگی۔ میں نے کہا "تم نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ اگر میں تمہیں قتل جانے دے دوں تو اس قتل کا الزام مجھ پر آجائے گا۔ اس کی ماں۔ وہ گاندھر نما عورت بچے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائے گی کہ میں قانون کی مدد سے اس کا کچھ نہیں لگاؤں گا تو میں نے اسے خود مار ڈالا یا کسی سے مروا دیا۔ اگر تم سامنے آتی ہو اور پیر دانش کے قتل کا اعتراف کرتی ہو تو تم دوسری

## پروفیسر ایم اشرف ایم۔ اے

|       |                        |
|-------|------------------------|
| 50/-  | شاہ فاروق حاکم مصر     |
| 50/-  | شاہ فیصل شہید          |
| 90/-  | ہٹلر کی حیات معاشرۃ    |
| 75/-  | ہٹلر کے آخری دس دن     |
| 75/-  | ہٹلر اور نازی جرمنی    |
| 90/-  | سکندر اعظم             |
| 75/-  | نیپولین بوناپارٹ       |
|       | رومانی شاعر لارڈ بائرن |
| 60/-  | کی حیات معاشرۃ         |
|       | مہاراجہ رنجیت سنگھ     |
| 75/-  | اور ان کی عیاشیاں      |
| 100/- | ہردور ہٹلر کی کہانی    |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

تم نے خود بھی اپنے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ تم نے نہیں ہونے کے باوجود ایک نادان بچے کی طرح دُور کو ٹھیکھانے کی کوشش میں اور بھی زیادہ اچھا لیا ہے۔

”میں تو پہلے ہی اپنے اس ”جرم“ کا اعتراف کر چکی ہوں۔“ وہ انفرنگی سے مسکرائی۔

”لیکن اب میں تمہیں حالات کی اس دُور سے مزید کھیلنے نہیں دوں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ”میں تمہیں تھماری مرضی سے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ تم ایک بار پھر حالات کی دُور کو مزید الجھاؤ گی۔“

”آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں؟“ اس کی انفرنگی سی مسکراہٹ قدرے استہزائیہ مسکراہٹ میں بدل گئی۔

”میں تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں اس کا شاید تم تصور بھی نہ کر سکو۔“ میں نے جواب دیا ”تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی تلاش میں تم اب تک بھٹکتی رہی ہو۔“

”کیا میرا گویا ہوا عشق بھی؟“ اس کی مسکراہٹ عینکی ہو گئی۔

”اس کا میں وعدہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے دانت داری سے کہا ”لیکن بہت سی چیزیں کا میں وعدہ کر سکتا ہوں۔ قانون تمہیں تلاش نہیں کر سکے گا اور کم از کم پیر دانش کے آوی یا کاغذ پر بھی تمہارا کچھ نہیں لگا سکے گی۔ زندگی کی تمام آسائشیں اسی طرح تمہیں حاصل رہیں گی جس طرح اس وقت ہیں۔“

”اور۔۔۔؟“ وہ گویا میری پیشکش سے محفوظ ہو رہی تھی۔

”اور یہ کہ زندگی رہے گی۔ تحفظ حاصل رہے گا تو شاید کسی موڑ پر اس عشق کا تبادلہ بھی مل جائے جو سولہ برس کی عمر میں تم سے چھین گیا۔ پہلا عشق خاص طور پر کم عمری کا عشق بہت شدید ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسان میں ضد بہت ہوتی ہے۔ اس کا عشق بھی جذبی ہوتا ہے لیکن جب ضد کم ہوگی تو شاید عشق کا تبادلہ بھی مل جائے گا۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اپنے پہلے عشق کی ناکامی کے بعد وہ معاشرے کا لیکن وہ زندہ رہتا ہے۔ جیسے تم اب تک زندہ ہو۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وہ متبادل کو قبول کر لیتا ہے۔ تم بھی کر لو گی لیکن پہلی شرط تو یہی ہے تاکہ تم زندہ سلامت رہو۔ اندھے قانون اور پیر دانش کے سرپرستوں یا بیرو کاہلوں سے محفوظ رہو۔ اس کے لئے تمہیں مجھ جیسے آوی کی پناہ کی ضرورت ہے اور میں تمہیں پورے غلو میں دل سے بنا دینے کے لئے تیار ہوں۔“

اس کے ہونٹوں سے استہزائیہ سی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ اسی انفرنگی نے لے لی جو میں شروع سے اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں گدیلے صوفے کے پٹے سے ٹھک لگاتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی ”آپ کی باتیں

بہت خوب صورت ہیں افضل صاحب! آپ آوی بھی خوب صورت ہیں۔ شاید اندر سے بھی اتنے ہی خوب صورت ہوں جتنے باہر سے نظر آتے ہیں۔ گتا ہے آپ انسان کے دل میں زندگی کی امید بچانے اور اسے زندگی کی خوب صورتیوں کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”ہر ایک کو نہیں۔“ میں نے اعتراف کیا ”بہت کم لوگ اس سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔“

”مجھے اندیشہ ہے کہ میں نے آپ کی پیشکش قبول کی۔ اور آپ کی پناہ میں آئی تو کہیں آپ میں اپنے عشق کا متبادل نہ تلاش کرنے لگوں۔“ وہ بات کرتے ہوئے بار بار گھڑی بھی دیکھ رہی تھی جیسے اسے کہیں جانا ہو۔

”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ میں نے گویا کر جلدی سے کہا ”تمہارے بارے میں تو شاید میں ایسا کبھی سوچ بھی نہ سکوں۔“



نہیں ہوئے۔

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن پھر بھی میں تم سے کافی بڑا ہوں اور لوگوں کا کیا ہے۔ لوگ تو اس دنیا میں نہ جانے کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں۔ میں کسی کاروں کو دیکھ کر کاروں تو نہیں بن سکتا۔“

”آپ بہت مختلف آدمی ہیں افضل صاحب! مجھے آپ سے مل کر آپ کو جان کر بہت خوش ہوئی۔“ یکدم وہ بہت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے تاثرات بالکل بدل گئے۔ اس نے ایک بار پھر گڑی دیکھنی ”مگر میں جانے کا فیصلہ نہ کر چکی ہوئی تو آپ کو جان کر مجھے اور بھی زیادہ خوش ہوئی ہوئی۔ لیکن اب جبکہ جانیسی غم گریا ہے تو پھر غم میں خوشی میں غم جبکہ کسی جذبے میں اُٹھنے کا کیا فائدہ؟“ وہ اُنٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ تم نے کیا جانے جانے کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔“ میں نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا ”تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں افضل صاحب! آپ مجھے نہیں روک سکیں گے۔“ وہ کچھ اس طرح بول چسپے کسی ضدی بچے کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”جیسے میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے چنڈا!“ میں نے طاقت سے کہا ”ٹھیک ہے۔ تم نے ایک مغرب کو ختم کیا ہے اس کی پیشانی میں کیل ٹھوکر کی ہے۔ لیکن تم خود ہی کہہ چکی ہو وہ تمہارے انتقام کی طاقت تھی۔ ورنہ حقیقت میں تو تم دی پھولی لڑکی ہو۔ میں تمہیں ہاتھ سے روکنا نہیں چاہتا۔ زبان سے کہنے پر ہی رک جاؤ۔ آخر تم مجھے راستے سے ہٹا کر کیسے جاؤ گی؟ تم کوئی مارزن تو نہیں بن گئی ہو۔“

”آج میں مارزن سے زیادہ مضبوط ہوں کیونکہ مجھ پر ضد سوار ہے۔ میرے پاس ارادے کی طاقت ہے۔“ وہ غم سے غم سے لہجے میں بولی۔

”ایک طرف رکھ دو اپنے ارادے اور ضد کو۔“ میں نے اس کے اور دواڑے کے درمیان حاکم ہوتے ہوئے کہا ”تم وہاں جاؤ گی جہاں میں کون کا ورنہ اپنی ضد کے باعث ایک بار پھر تم اپنا مضر خراب کر لو گی۔“

”نہیں! اب میرا کچھ نہیں بکڑے گا۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ وہ دواڑے کی طرف جانے کے بجائے جہازی سائز کے بیٹھو بیڈ کی طرف جا رہی تھی۔ شاید اس نے اب اپنا ارادہ بدل دیا تھا لیکن بظاہر ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ میں نے غیر محسوس طور پر ذرا اطمینان کی سانس لی۔ میں واقعی اس کے ساتھ ذرا بھی سختی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وقت نے پہلے ہی اس کے ساتھ کیا کیم خفیاں کی تھیں؟ ویسے بھی وہ میری اور قانون کی محسن تھی۔ جو کام اس نے کیا تھا اس میں مجھے بھی دانتوں پیسنے آجاتے اور قانون کی بھی سانس پھول جاتی۔

وہ بیڈ پر بیٹھ وائش کے قریب لیٹ گئی۔ وہ بہت بڑے سکون نظر

آ رہی تھی۔ میں نے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ لیکن یہ وقت لینے کا نہیں ہے۔ جلدی سے اٹھو۔ اپنا ضروری سامان لو اور میرے ساتھ چلو۔“

”میں نے ہرگز اپنا ارادہ نہیں بدلا ہے افضل صاحب!“ اس کا لہجہ اب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا ”چھا ہوا آپ بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ دیئے تو دور حقیقت مجھے آپ سے باتیں کرنا بہت بھلا لگا ہے۔ آپ کو بہتر طور پر جاننے میں مدد ملی ہے لیکن جی بات یہ ہے کہ میں یہ سب باتیں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیپول کھانے کے بعد سے میرا مقصد آپ کو کھل باتوں میں لگانے رکھنا تھا۔ مجھے پندرہ منٹ گزارنے تھے جن میں سے چودہ گزر چکے ہیں۔“

میرے ذہن میں چھٹکا سا ہوا ”تمہارا مطلب ہے وہ کیپول؟“ آواز میرے منہ میں اٹک گئی۔

”بالا وہ کیپول نہ ہر کا تھا۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ میں نے سمجھ کر ایک گڑیا کی طرح اسے بہتر سے اٹھایا۔ وہ ابھی بالکل ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ باتیں کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے جلد طبی امداد میرا آجاتی تو اس کے بچ جانے کا امکان تھا۔

اچانک اس کے چہرے پر اتنی زیادہ تکلیف کے آثار ابھر آئے کہ میں اسے اٹھائے دواڑے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی تکلیف اندوہی نہیں تھی بلکہ وہ اس طرح اٹھائے جانے پر تھا تھی۔

وہ بیڑی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”مجھے آرام سے لیٹی رہنے دیں افضل صاحب! خواہ مخواہ مجھے کچھ تکلیف کر میری زندگی کے آخری لمحات کو زیادہ تکلیف دہ نہ بنائیں۔ اس شیشی میں بالی کیپول وہاں مڑی کے ہیں۔ وہ ٹھیک رنگ کا کیپول تھا اور صرف وہی ایک کیپول نہ رہے۔ پھر اہوا تھا نہ ہر بھی کوئی معمولی نہیں ہے۔ سناٹا ہے لیکن کیپول کو تحلیل ہونے کے لئے پندرہ سولہ منٹ درکار تھے جو اب تقریباً پورے ہو چکے ہیں۔ کیپول تحلیل ہوتے ہی سناٹا کھدے میں پھیلے گا تو مجھے مرنے میں چند سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔ اب اتنی سی در میں تو آپ مجھے اسپتال نہیں لے جا سکتے؟“ اس لئے کیوں خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور مجھے بھی پریشان کرتے ہیں۔ اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ آپ مجھے نہیں روک سکیں گے۔ میں بہت دور جا رہی ہوں افضل صاحب!“ ایک لمحے کے لئے میرے ہاتھ پاؤں اکڑے گئے۔ میرا جسم گویا جھرکا ہو رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں کھلی از مرگ سی وحدت لا الہ پھیل چکی تھی مگر وہ کسی شرابی کی طرح مسکرا رہی۔

جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بچوں والا نہیں بڑوں والا تھا ”مجھے راہیں بیڈ پر لٹا دیں۔ شاباش۔ بہت اچھے بیٹے ہیں آپ۔ میں کسی ایسی ہی آدمی تر چھی حالت میں مر گئی تو میری لاش اسی طرح نہ اکڑ جائے کہ کم از کم مرنے وقت تو مجھے ٹھیک حالت میں رہنے دیں۔“

میں نے آنکھیں کھلیں تو اسے وہاں بیٹھ کر لٹا ہوا۔ وہ گویا نہایت احتیاط سے سانس لیتے ہوئے بولی "ہاں اب ٹھیک ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں اور بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے جیسے ثبوت میں ملتی ہو۔

میں نے اپنے مقل میں پھنسا ہوا گولا سا گتے ہوئے کہا "تم نے اچھا نہیں کیا غزالہ۔۔۔۔۔۔" اہم از کم مجھ سے ملاقات کے بعد تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم ذرا انتظار تو کر لیتیں۔ کوئی ایسی قیامت نہیں آجلی تھی کوئی تیسرا بار کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ سب ٹھیک ہو جاتا۔" مجھے بولنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں اب آپ سے باتیں کرنے کے بعد مجھے بھی احساس ہو رہا ہے کہ شاید سب ٹھیک ہو جاتا۔" وہ دھچکے لہجے میں بولی "اس کے باوجود مجھے اپنے کئے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے میں نے جو کیا، ٹھیک ہی کیا۔ مجھے اب زندہ رہنے سے کچھ خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب مجھے یہ اطمینان ہے کہ مرنے سے پہلے میں نے ایک قابل ذکر کام تو کر لیا یعنی میرا دائی گوشہ۔۔۔۔۔۔"

اچانک اسے ہلکی سی آنگلی۔ اس کے پورے جسم کو زبردست جھٹکا سا لگا۔ آواز اس کے مقل میں ہی اٹک گئی۔ اس کے ہرے اور گردن کے عضلات سمجھ کر رہ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اسی چٹکوں کی حالت میں لٹی رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید وہ اس کی جگہ سے ہٹنے کی اور غفلتانی ہنسی کے ساتھ کہے کی "میں تو ذرا ہی کر رہی تھی افضل صاحب! ایسی اینکنگ کی؟ ذرا دیا تا آپ کو؟"

پندرہ سیکنڈ اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میری یہ امید دم توڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے وگ دوپے میں زندگی کی حرارت بھی دم توڑ گئی۔ مجھے اپنا آپ بہت سرد سا محسوس ہوا لیکن میری پکوں تنے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میرے دل میں ہی نہیں بلکہ میرے چاروں طرف بھی گویا گھبراہٹ چھا گیا تھا۔ دنیا سے جیسے میرا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں کسی چیز سے بے تعلق تھا۔ صرف رخ ہواؤں کی مستابٹ میری سماعت سے گھرا رہی تھی۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر اسی عالم میں کھڑا رہا۔ شاید پندرہ سیکنڈ۔ یا پھر پندرہ گھنٹے۔ پھر نہ جانے کس طرح میں اپنے حواس پر یسویج ہنگل لے کر ذرا آگے بڑھا اور ہاتھ پھیلا کر نہایت آہستگی سے میں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ بہتر کی چادر سمجھ کر اس کی دونوں ٹھنڈوں میں دبی ہوئی تھی۔ وہ میں نے اس کی ٹھنڈوں سے نکال دی اور اس کے ہاتھ سیدھے کمرے لے گئے۔ ابھی اس کے اعضا میں زری تھی۔ ابھی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈی کی طرح نہیں اترے تھے۔

میں کچھ دیر اس پر گھبراہٹ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ہرے کے عضلات اکڑ جانے کے باوجود اس کی خوب صورتی میں کچھ زیادہ کی نہیں آئی تھی لیکن اب دھیرے دھیرے اس کی رنگت میں غلاہٹ نمودار ہو رہی تھی۔

اچانک میرے حواس پر جی ہوئی منوں منوں برف ایک زور دار کڑا کے سے چلک گئی۔ ایک لمبے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ درحقیقت وہ زوردار کڑا کا انیس بلکہ دروازے پر مصل ایک ہلکی سی دھتک تھی۔

میں تیزی سے گھوما۔ گن گویا خود بخود ہی میری جیب سے نکل کر ہاتھ میں آگئی۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے مطلوب سے اعصاب کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور دے قدموں دروازے کے قریب جا پہنچا۔ ایک لمبے کے لئے میں نے سوچا کہ دروازہ کھولوں یا نہیں؟ دھتک دوبارہ ہوئی۔

"گوں ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔ میرے خیال میں یہ سوال کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اپنا لہجہ میں نے بارعب رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کوشش میں خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی حواس پر جی ہوئی برف کے اثرات پائی تھے۔

"سرا" باہر سے صرف اتنا کہا گیا۔ اس ایک لفظ کے پیچھے بڑی طمانیت پوشیدہ تھی۔ میں نے بھی ذرا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے باب گھبرا کر دروازے کا ہالا حوالہ دیا۔

دروازے کی آڑ میں ہی رکتے ہوئے میں نے ذرا سر نکال کر باہر جھانکا۔ شفیق شاہ بھی دروازے کی اوٹ میں رکتے ہوئے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو کچھ کر مری سانس لے کر رہ گئے۔

"سرا! یہاں سر خیریت تو ہے؟" اس نے پڑتوش لہجے میں پوچھا۔

"خیریت؟" میں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا لیکن اپنی ہنسی خود مجھے بھی ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی "یہ اچھا لفظ استعمال کیا ہے تم نے ہاں یہاں خیریت ہی ہے اور تمہاری خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔"

میں دروازے کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ ذرا کھینچا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے کوئی گولی تو نہیں چلائی تم کیسے آگئے؟"

"تب کو اس گھر میں داخل ہونے کا دیر ہو چکی تھی سرا" وہ اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھچکے لہجے میں بولا "مجھے کچھ تشویش ہونے لگی تھی۔ اس گھر پر کچھ عجیب سا سکوت۔ بلکہ شاید سو گواہی مل رہی ہے۔ ایک عجیب سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں رہ نہیں سکتا۔ میں نے آپ کی ہدایت کی خلاف ورزی کر ڈالی۔" وہ بدستور کچھ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

وہ میرے لئے چھوٹے ہمایوں کی طرح تھا لیکن ڈسٹن کو بھی

نہیں بھول تھا اور یہ ڈیلکن اس نے خود ہی اپنے لئے مقرر کیا ہوا تھا۔ میری فراکش نہیں تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے طاقت سے کہا "تم نے بہت اچھا کیا جو آگے۔ میں اس وقت تمہاری ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ شاید اسی لئے تم آگے۔ میری خاموشی صدا تم تک پہنچ گئی۔ تم نے میرے محسوسات کا وہ شکل ریسو کر لیا جو کلمات کا خارج نہیں۔"

وہ ذرا مطمئن نظر آئے۔ لگا۔ ایک قدم آگے آکر اس نے کمرے میں جھانکا۔ ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد اس کی نظر پڑی موجودہ سائیکل جسوں پر جم کر رہ گئی۔ ایک کھل سے ڈھکا ہوا تھا اور دو سرا تقریباً بے پردہ ہی تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے سوالیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم نے ٹھیک ہی محسوس کیا تھا شفیع شاہ!" میں نے کمری سانس لے کر کہا "یہ گہرا واقعی ایک عجیب سی سوگوری میں ڈوبا ہوا ہے۔ معلوم نہیں یہ موت کی سوگوری ہے یا افعال کی۔ اس وقت مجھے خود اس خوب صورت اور آراستہ ویراستہ مکان سے بڑی وحشت ہو رہی ہے۔"

غزالہ نے پکا کام کیا تھا۔ غالباً اسے اس بات کی بہت فکر تھی کہ اس کے کئے کی وجہ سے کوئی مشکل میں نہ پھنسے۔ یہ اس کے باخیر ہونے کی دلیل تھی۔ بعض لوگوں کے حالات خواہ کچھ بھی ہوں مگر ضمیر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ میں نے رقعہ دوبارہ اسی پاکٹ میں ڈال دیا اور شفیع شاہ سے کہا "یہ گہرا اور دی نی آؤر احتیاط سے اٹھاؤ۔"

اس نے دونوں چیزیں اٹھالیں۔ الماری کے پاس سے بچے وقت وہ کن انہیوں سے بند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غزالہ کو تو سر سے اڈا تک تقریباً صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ اسے اس کے بارے میں تجسس نہیں تھا۔ اسے کھل سے ڈھکے ہوئے جسم کے بارے میں زیادہ تجسس تھا۔

میں نے اسے ہاتھ دئی بہتر سمجھا "اس کھل کے عجیب ورائش ہے۔ اس کی ڈیشٹلی میں نہ جانے کتنی لمبی اور موٹی ایک میل پوسٹ ہے جو شیریں میں مل ٹھونکنے کے کام آتی ہے۔"

اسے خفیہ سا جھکا لگا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکاوٹ تجزی سے چلیں جھپکا کر رہ گیا۔ بس یہی اس کا شدید حیرت کا اظہار تھا۔ میں نے غرور اور اڑکی ہوئی غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقریباً سرگوشی سے سے انداز میں کہا "اور یہ کام اس گڑی لڑکی نے کیا ہے۔ ہم، جو خود کو بڑا۔ ذہن زور دیتے ہیں ہم جیوں کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

اس نے ایک ٹائٹل کے لئے سر جھکا لیا پھر آہستگی سے کہا "سرا میں نے تو آپ سے گزارش کی تھی کہ وائش کا پتا صاف کر دیتے ہیں۔ آپ نے اجازت نہیں دی تھی۔"

"مجھے یاد ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا جھپکا کر کہا "میں ابھی اس مسئلے پر سوچ بنیاد کرنا چاہتا تھا۔ ہم سوچ بنیاد کرتے ہی نہ گئے۔ یہ لڑکی بازاری ہے کئی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ یقیناً کر سکتے تھے۔ اور اس

نہیں بھول تھا اور یہ ڈیلکن اس نے خود ہی اپنے لئے مقرر کیا ہوا تھا۔ میری فراکش نہیں تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے طاقت سے کہا "تم نے بہت اچھا کیا جو آگے۔ میں اس وقت تمہاری ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ شاید اسی لئے تم آگے۔ میری خاموشی صدا تم تک پہنچ گئی۔ تم نے میرے محسوسات کا وہ شکل ریسو کر لیا جو کلمات کا خارج نہیں۔"

وہ ذرا مطمئن نظر آئے۔ لگا۔ ایک قدم آگے آکر اس نے کمرے میں جھانکا۔ ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد اس کی نظر پڑی موجودہ سائیکل جسوں پر جم کر رہ گئی۔ ایک کھل سے ڈھکا ہوا تھا اور دو سرا تقریباً بے پردہ ہی تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے سوالیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم نے ٹھیک ہی محسوس کیا تھا شفیع شاہ!" میں نے کمری سانس لے کر کہا "یہ گہرا واقعی ایک عجیب سی سوگوری میں ڈوبا ہوا ہے۔ معلوم نہیں یہ موت کی سوگوری ہے یا افعال کی۔ اس وقت مجھے خود اس خوب صورت اور آراستہ ویراستہ مکان سے بڑی وحشت ہو رہی ہے۔"

"دونوں مر چکے ہیں؟" شفیع شاہ نے تصدیق چاہی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا "سرا آپ کے ہاتھوں سے؟" اس نے سوال اور حیرت بھرا دیا۔

"نہیں۔ اپنی اپنی قسمت کے ہاتھوں۔" میں نے جواب دیا "میں نے تو اسے یہ نیت سے ان دونوں میں سے کسی کو چھوٹا تک نہیں دیا۔ وہ خاموش رہا لیکن چلیں جھپکا کر بغیر میری طرف دیکھا رہا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آؤ چلے ہیں۔ اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں رہا۔ جب میرے حواس پر سے برف پگھلے گی تو میں تمہیں ساری تفصیل بتاؤں گا۔"

وہ خاموشی سے مڑا اور ہم دونوں راہداری میں سن ٹیرس کی طرف چل دیے۔ میں نے شفیع شاہ سے پوچھا "تم سیدھے یہیں پہنچ گئے تھے یا سب کمرہ میں جھانکتے ہوئے آئے ہو؟"

"سب کمرہ میں اندھا رہا ہے۔ میں نے کسی طرف جانے کی ذمت نہیں کی۔" اس نے سادگی سے کہا "صرف اس کمرے میں اعلیٰ و اعلیٰ دہشتی کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی کمرہ کیوں پر بھی بلا تڑا کرے ہوئے ہیں۔ میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا یہاں آن پہنچا۔"

اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں یکدم رک گیا۔ دکھ کی دلیل سے انویٹوں کے سانپ نکل آئے تھے۔ شفیع شاہ کا ہاتھ یکدم بلند ہو گیا۔ گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں۔ خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے مڑتے ہوئے کہا "مڑا واپس چلو۔ وہ چیزیں ساتھ لے کر ضروری ہیں۔ ورنہ کوئی ان شادیوں کو متاخر کرے گا اور خواہ مخواہ ہمیں اس معاملے میں الجھانے کی کوشش کی جائے گی۔"

”تم ایک انتہائی قدر ناشائس اور ناشکرے انسان ہو۔ مجھ جتنا کام کرنے والا کوئی پولیس آفیسر شاید ہی اس وقت شہر میں موجود ہو۔ میں تو چوبیس گھنٹے ہی ڈیوٹی پر ہوتا ہوں۔ گھر پر ہوتا ہوں تب بھی ڈیوٹی ہی کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر رہا ہوتا ہوں۔ حتیٰ کہ اکثر میرا تم کو فون کرتا بھی ڈیوٹی ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔“

”مثلاً اس وقت تمہارے اس فون کا شمار ہی ڈیوٹی سے کیا قلم ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم شاید واقعی سمجھ رہے ہو کہ میں نے تمہاری حسین آواز سننے کے لئے فون کیا ہے؟ اس خوش فہمی میں جھلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”اب کچھ کہو گے بھی یا وقت ہی ضائع کرتے رہو گے؟“ میں نے ذرا سختی سے کہا۔

”تمہارے لیے میں اس وقت دو واس بول رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی غناک واقعہ رونما ہوا ہے۔ کیا قاعدہ ہے؟“ وہ بدستور جھک رہا تھا۔

”تم میرے قاعدے کو چھوڑو۔ پہلے اپنا قاعدہ بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس قاعدہ تو کوئی نہیں ہے۔ بس تمہیں معمولی سی ایک اطلاع دینی تھی۔ میں نے سوچا شاید تمہارے لئے کارآمد ہو۔“ وہ بولا ”میں نے گاؤں کی عمرانی پر ایک سادہ لباس والے کو تعینات کیا ہوا ہے۔ اس نے کچھ دیر پہلے گاؤں کو چار سب آدھوں کے ساتھ گھر سے روانہ ہوتے دیکھا ہے اور ذرا اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے بھی سنا ہے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا شاید تمہیں پہلے سے خبردار کرنا فائدہ مند ہو۔ آج میں تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم وہاں نہیں تھے۔ موبائل فون پر رابطہ کیا۔ وہ بھی ریسپونڈ نہیں کیا گیا؟“

میرا موبائل فون بھی گاڑی میں ہی ڈیش بورڈ کے اندر موجود تھا۔ جتنے میں جاتے وقت میں اسے رکھ گیا تھا۔ اس کی کھنٹی شاید میرے واپس آنے سے کچھ پہلے بج چکی تھی۔ رجیم کل بات باندھا رکھتے ہوئے بولا ”میں نے سوچا تمہاری گاڑی والے فون پر ہی قسمت آزمائی کر کے دیکھ لوں۔ شاید تم سے رابطہ ہو ہی جائے۔ شاید تم کہیں آدھ کر دی پر نکلے ہوئے ہو۔ موبائل فون کہاں رکھا ہوا ہے؟“

”مختصر سوالات کو چھوڑو۔ اور گاؤں کو بھی گولی مارا۔ چار مسلح احمقوں کے ساتھ لے کر وہ کوئی قلعہ خیم کر سکتے۔ ویسے میں اس وقت ہوٹل کی طرف ہی جا رہا ہوں اگر وہ مجھ سے پہلے پہنچ جائے تب بھی میرے قوی اس سے نمٹ لیں گے۔ ویسے میں فون پر انہیں آرٹ بھی کر دیتا ہوں لیکن۔“

”میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو وہ فوراً بولا ”کیوں کیا؟“ ”میرے پاس تمہارے لئے اس سے زیادہ اہم اطلاع ہے۔“ میں نے کہا ”ملاقات تمہارا نہیں ہے لیکن کیس تمہارا ہے۔ میں آ رہا

لاؤں سے بہتر انداز میں کر سکتے تھے یعنی سانب بھی میرا تاؤ اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ اس لڑکی کی طرح کسی کو خودکشی کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں تو صرف اس لڑکی کی جرات پر حیرت کا اظہار کر رہا ہوں۔ اس نے ڈھری جرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک تو پیر دانش کو ٹھکانے لگایا۔ اور پھر نہایت پیش و آرام کی زندگی کو خیرباد کہہ کر موت کو گلے لگایا۔ وہ فون ہی کام حیرت انگیز ہیں۔“

”جی۔۔۔ یہ بات تو ہے۔“ شفیع شاہ نے پُر خیال انداز میں اثبات میں سر ہلایا ”انسان کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ بڑے عجیب نمائش دکھائی ہے۔“

”میں نے بیک وقت ہی غزالہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ شاید ہم دونوں ہی میں اس کی طرف مزید دیکھنے کی سکت نہیں تھی۔ البتہ شفیع شاہ نے اندازہ ضرور کیا کہ منہ پھرنے سے پہلے دوسرا کھل اٹھا کہ اسے بھی سر سے پاؤں تک ڈھانپ دیا۔ میں نے پٹائی پر رکے ہوئے اسٹیل کے جھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اسے بھی دھال سے پکڑ کر اٹھاؤ۔ فگر پر جس ضائع نہ ہوئے پائیں۔“

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ہم خاموشی سے مکان سے باہر آگئے گاڑی کی طرف جاتے وقت میں نے پلٹ کر ایک نظر اس خوب صورت ہنسل کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورتی اپنی جگہ تھی مگر یہ لڑکی ایک مزار کی خوب صورتی تھی۔ اس میں زندگی کا رنگ نہیں تھا۔

شفیع شاہ کی گاڑی وہاں سے کہیں دور کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا ”یہ جیسر تم اپنے پاس ہی رکھ لو۔ جب میں منگواؤں گا تو لے آتا۔ لی الحال تم مجھ سے الگ ہی رہو۔ میں اب رجیم کل کو اس دانتے کی اطلاع دیتا ہوں۔ دیکھتے ہیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔“

اس نے سر ہلایا اور گلی کے کونے کی طرف چل دیا۔ چند لمحے بعد وہ اندر سے میں میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ میں اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ابھی میں نے گاڑی اشارت نہیں کی تھی کہ گاڑی میں نصب ٹیلی فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ میں سمجھا شاید شفیع شاہ کو اپنی گاڑی میں پہنچ کر مجھ سے کچھ پوچھنے کا خیال آیا تھا اور اس نے اپنے موبائل فون پر مجھ سے رابطہ کیا تھا لیکن جب میں نے ڈیش بورڈ کے قریب سے ریسپونڈ اٹھا کر کان سے لگایا تو پتا چلا کہ دوسری طرف رجیم کل تھا۔

”کہاں آدھ کر دی ہو رہی ہے پیارے؟“ وہ چکا۔

”میرے ٹیلی فون نمبروں کا کچھ منوں میں فائدہ تم اٹھا رہے ہو۔“ میں نے کمری سانس لے کر کہا۔

”فائدہ میں نہیں اٹھا رہا۔ بلکہ اٹلا میں تمہیں فائدہ پہنچا رہا ہوں۔“ وہ اسی خوشگوار لہجے میں بولا۔

”میں نے تم جیسا قاتل الہال پولیس آفیسر نہیں دیکھا۔“ میں نے کہا ”کیا تمہیں مجھ کو فون کرنے کے سوا دنیا میں کوئی کام نہیں ہے؟“



دیر بعد ہمیں فون کرنے ہی والا تھا۔ اچھا ہی ہوا تھمارا فون آگیا۔ ایک ایڈریس نکھڑا۔ اور فوراً کچھ آدمیوں کو لے کر اس پر پہنچ جاؤ۔

”کیا ہو گا وہاں؟“ فوراً اس کے لیے میں سنجیدگی آگئی۔

”ایک جہت آموز کامانی تمہاری شکر ہوگی۔ اس علاقے کی پولیس کو بھی ساتھ لینا قانونی یا اخلاقی طور پر بہتر سمجھو تو لے لیتا۔ ویسے بھی وہ تمہارے پڑوسی ہی ہیں۔ کامانی کا سربراہ کچھ میں نہ کہے تو مجھ سے رجوع کرنا۔ اس کی گشتہ کریاں میرے پاس ہیں۔“

”یہ کیا کام اس ہے۔“ وہ ذرا فحشی سے ہولا ”تم شرلاک ہوسر بننے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟“

”اے چندا میں شرلاک ہوسر نہیں۔ تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں چاہا ہوں کہ ایک بہت بڑے کیس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کریڈٹ ہمیں مل جائے۔ اگر کیس کا ڈر اس جگہ پہلے پہنچ جاتی تو شادتیں نہ جاسے کیا مرغ اختیار کر چکی ہو تیں۔ الزام نہ جانے کس پر آتا ہے۔ تم سر پیٹھے مر جاتے لیکن اس مٹنے کو کبھی حل نہ کیا ہے۔ کم از کم صحیح طور پر حل نہ کیا ہے۔“

”لیکن تم نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اسے صحیح طور پر حل کر لیا؟“ وہ طنز سے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس میں ذہانت کا نہیں، فیملی مدد کا زیادہ دخل ہے۔“ میں نے صدقہ دل سے کہا۔ ”اب تو تم خوش ہو؟ اب تو اپنی جگہ سے مل جاؤ۔“

”اچھا میں جا رہا ہوں۔“ وہ یکدم ہی نرم ہو گیا۔

میں نے فون بند کیا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہوٹل فون کیا۔ پتا چلا کہ ابھی گاڈ مرد وہاں نہیں پہنچی تھی۔ میں نے راز کو بدایت کی کہ وہ سیکورٹی والوں کو الارٹ رکھے اور خود بھی الارٹ رہے۔ اس کے بعد میں تیز رفتاری سے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ گاڈ مرد مجھ سے پہلے ہوٹل پہنچ چکی ہوگی کیونکہ میں اس کے روانہ ہونے کے بعد خاصی دیر تک درجیم کھل سے فون بہ بات کرتا رہا تھا لیکن شاید وہ سست رفتاری سے آئی تھی یا پھر کہیں اور سے ہوئی ہوئی آ رہی تھی کہ جب میں ہوٹل کے کونے پر پہنچ کر گاڈی ڈرائیو دے میں موڑنے لگا تھا میں اسی وقت سامنے سے اس کی پیچیدہ آکر رہی۔ گاڈ مرد صبح کی طرح خود ڈرائیو کر رہی تھی مالا مال ڈرائیو رہی پیچیدہ میں موجود تھا۔ اسے گاڈ مرد نے پیچھے بیٹھ رہ بھایا ہوا تھا۔ ڈرائیو تک گاڈ مرد وہی جارحانہ تھا اور کچھ زیادہ بھی لگتا تھا جیسے گاڈی کو وہ انجین کی طاقت سے چلانے کے بجائے اپنی جسمانی طاقت سے چلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ شکر تک وکیل تھماتے وقت اس کے ہاتھ جیسے بازوؤں میں قاعدہ مردوں کی طرح موٹے موٹے مسل حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔

پہلوں کی تیز چڑچڑاہٹ کے ساتھ اس کی گاڈی میں میری گاڈی کے سامنے آکر رہی۔ دونوں گاڈیوں کی گویا ناک سے ناک ملنے میں تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی۔ پیچرو میں بھی اس کے ساتھ ڈرائیو کے علاوہ دو تین آدمی موجود تھے جو یقیناً مسلح رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ سب معمول پیچرو کے پیچھے مکمل جیب میں بھی تین چار آدمی موجود تھے۔

میں چاہتا تھا کہ گاڈی ڈرائیو ریورس کر کے ڈرائیو دے میں لے جاسکا تھا۔ کافی جگہ بھی لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش کرنے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی میں گاڈی سے اترا۔ پیچرو میری گاڈی سے ذرا اونہی تھی۔ وہ چند لمبے اسی طرح بلندی سے مجھے نمودنی رہی۔ میں پُر سکون انداز میں ایک بازو ایشیئرنگ وکیل پر ٹکائے پلک جھپکاتے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میں چشم تصور کی مدد سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب وہ لوہے بننے کی لاش دیکھے گی تو اس کا کیا عالم ہوگا؟ میں کوئی واضح اندازہ تو نہیں لگا سکتا لیکن ایک بات بہرحال ملے تھی کہ اس کا جو بھی رد عمل ہو گا نہایت شدید ہوگا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے اور اس کی تمام خیاثوں سے دیوانوں کی طرح پار کرتی تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب کجوجہت تھی۔ دونوں ماں بیٹے درحقیقت ذہنی طور پر نارمل نہیں تھے۔ کم از کم انسانیت اور شرافت کے پانوں سے تو نارمل نہیں تھے۔ عموماً ایسے لوگوں کے بر عمل اور رد عمل میں بڑی شدت ہوتی ہے۔

ہمارے آدمی مستعد تھے۔ ڈرائیو دے میں آنے والی گاڈیوں کے لئے ایک پیڑ لگا ہوا تھا۔ صرف کچھ مخصوص حالات میں اگر کسی گاڈی کو اندر آنے سے روکا نہ مطلوب ہوتا تھا بھی اس پیڑ کو نیچے لایا جاتا تھا۔ ایسا ہی ایک پیڑ اس طرف بھی لگا ہوا تھا جس طرف سے گاڈیاں ڈرائیو دے سے باہر جاتی تھیں۔ کبھی باہر جاتی ہوئی کسی گاڈی کو بھی روکنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج تک کبھی ایسا اتفاق ہوا بھی تھا یا نہیں؟

بہرحال اس وقت گاڈی کی پیچرو کو اندر جانے سے روکنے کے لئے نہ صرف پیڑ پر گراوا گیا تھا بلکہ اس کے پاس مسلح گارڈز بھی نمودار ہو چکے تھے۔ کچھ گارڈز نے آکر پیچرو اور جب کو بھی گھیر لیا تھا لیکن انہوں نے نہیں سیدھی نہیں کی تھیں کیونکہ گاڈی دیا اس کے آدمیوں نے ابھی کوئی جارحانہ حرکت نہیں کی تھی۔

سیکیورٹی والوں کا انداز نہایت پُر سکون اور دوستانہ تھا جیسے وہ کسی رکی کارروائی کے لئے آگے آئے ہوں۔ ہوٹل میں ہماری پیچرو یہی تھی کہ ہم بڑے بڑے مسئلے سے بھی حتی الامکان خاموشی سے ٹٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ بڑی سے بڑی کارروائی بھی اس طرح کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ جھگڑے یا ہنگامے کا تاثر پیدا نہ ہونے پائے۔ مسانوں اور گاؤں دیگو میں خوف و ہراس نہ پھیلے۔

میری دعا تھی کہ اس وقت بھی تصادم کی نوبت نہ آئے۔ اگر

وہ گھوم کر آئی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر دم سے میرے برابر دلی میٹ پر گر گئی۔ اس کے وزن سے گاڑی ہچکلا کھا کر وہ گھٹ میں نے ملائت سے کہا "میں آداب میرانی کا حضور خیال رکھتا اور تمہارے آدمیوں کو اندر آنے دیتا لیکن تمہیں اندازہ ہونا چاہئے کہ یہ ہوٹل کا معاملہ ہے اور وہ بھی ایک فانی استاد ہوٹل کا۔ اتنی تعداد میں مسلح لوگ اپنے ہتھیاروں کی نمائش کرتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں تو بھان چلتا ہے۔ میری کچھ میں نہیں آتا تم اپنے ساتھ یہ جلوس لے کر کیوں چلتی ہو۔" "یہ ہمارا اسٹاکل ہے۔" اس نے ساہ ماہو جواب دیا۔ "طغیت ہے ایسے اسٹاکل پر۔" میں نے زیر لب کہا۔ "کیا کام تم نے؟" اس نے دروازہ تک کر پوچھا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ کیا ایک آدھ آدمی سے تمہارا کام نہیں چلتا؟"

"نوادہ آدمی ساتھ ہوتے ہیں تو زیادہ رعب دیتا ہے۔" شاید یہ منطقی پہلے بھی بیان کر چکی تھی اور میرا دلش بھی اسی منطقی پر یقین رکھتا تھا۔

"کتنی شوق ہے تمہیں رعب ڈالنے کا۔" میں نے گرمی سانس لے کر ستانہ لیجے میں کہا اور گاڑی ڈرائیو سے میں موڑنے گاڑی در کے ڈرائیو نے اسٹیرنگ وینل سنبھال کر پیچھے ہٹا لی تھی۔ تاہم اس نے میرے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید گاڑی در اسے پہلے ہی بدانت کر چکی تھی۔ گویا اسے خود بھی اندازہ تھا کہ اس بار اس کے لاؤ فلٹر کو اندر جانے کا موقع نہیں ملے گا۔

گاڑی میں نے سڑک سے اندر لے جا کر پارکنگ سٹاٹ میں اس جگہ کھڑی کی جو میرے لئے مخصوص تھی۔ وہاں سے آفس تک جانے کے لئے خاصا فاصلہ پیدل لے کر تھا۔ گاڑی در بھی کسی طرح جھومتی جھامتھی میرے پیچھے آدمی تھی۔

آفس پہنچ کر وہ ایک صوفے پر بصر ہو گئی۔ اس نے اپنے شاندار لیکن ویلے دھالے لباس کے جیب سے ایک سگار نکال کر منگایا۔ خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ وہی برانڈ تھا جو میرا دلش پیتا تھا۔ مجھے زندگی میں آئندہ ایسی ماں دیکھنے کی اُمید کم ہی تھی جو سگار جتنی تھی اور وہ بھی اپنے بیٹے والے برانڈ کا۔

خاصی دیر تک اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ سرجھکائے بیٹھی رہی اور سگار کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لیتی رہی۔ آخر اس نے سر اٹھایا۔ میں اپنی میز کے عقب میں بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سرخ اور خورم لگ رہی تھیں۔ پینے کے ساتھ ساتھ شاید وہ مدتی بھی رہی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ہلاکی بے چارگی تھی۔ اس فرعونیت کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا جو اس کی شخصیت کا لازمی حصہ معلوم ہوئی تھی۔

اولاد کی محبت بھی عجیب چیز تھی۔ بڑے بڑے فرعونوں کا عجیب حال کر دیتی تھی۔ جی بات تو یہ تھی کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر

کوئی کارروائی ناگزیر ہی ہو جائے تو وہ بھی کچھ ایسی مغالطی اور تیزی سے انجام دے دی جائے کہ عام لوگ معاملے کی نوعیت سے آگاہ ہی نہ ہوتے پائیں۔ میرے پیچھے گاڑی میں کہیں شفیق شاہ اور دوسرے آدمی موجود تھے۔ وہ بھی اس صورت حال کو سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ تو سیکورٹی گاڑی کی نسبت کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے اور گاڑی کو قبل از وقت ان کی موجودگی کا تو علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان سب کی موجودگی میں مجھے اطمینان تو تھا کہ گاڑی در کے آدمیوں کو حرکت میں آنے سے پہلے ہی جاؤں گا کیا جاسکتا تھا۔ وہ یونسی جاہل سے لوگ تھے۔ تاہم خواہش میری یہی تھی کہ وہ کوئی ہنگامہ نہ کریں۔ میرا دوسرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گن کے دستے پر تھا اور میں کسی بھی لمحے گولی چلانے کے لئے تیار تھا لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

گاڑی در نے پیچھے سے اتر کر میری گاڑی کی طرف بڑھی۔ کوئی مسلح شخص اس کے ساتھ نہیں تھا اور اس کے تاثرات بھی بالکل بدلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں انکاروں کی طرح سرخ تھیں اور چال میں بیکری لڑکھراہٹ تھی لیکن وہ بہ حال ایک بالکل مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر وہ جارحانہ پن، وہ نفرت، وہ تکبر، کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی جگہ اضمحلال، شکست خودی اور پریشانی نے لے لی تھی جس کی وجہ سے وہ بالکل بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ یہ چو گویا اس کا اپنا چہرہ ہی نہیں تھا۔

میں اب بھی گاڑی سے نہیں اُترا البت میں نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر لیا۔ وہ گاڑی پر جھکی تو کسی بیارہتگی کی طرح شوشوں کی اچھی خاصی زور دار آواز کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ داسکی کی پوکا جبکہ بھی میرے ہتھوں سے ٹکرایا۔

وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی مختلف تھا "افضل! میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔ اندر چلو۔" اس کے لہجے میں اب بھی رعوت اور جھک کی جھلک تھی تاہم اسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ برسوں کی پختہ عادتیں یکدم تو نہیں جاتی۔ اس کے سابقہ انداز و اطوار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس لہجے کو کافی حد تک مہذب ہی کہا جاسکتا تھا۔ "ہمیں کلو۔ جو بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ بات یہاں کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتی۔" وہ جھل سے بولی۔

"مگر اندر جا کر بات کرنی ہے تو پھر تمہارا یہ لاؤ فلٹر ساتھ نہیں جائے گا۔" میں نے اس کے ساتھ آنے والے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ ان میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں اکیل چلوں گی۔" وہ خلاف توقع کسی جیل جنت کے بغیر بولی۔ ورنہ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ بحث تو ضرور کرے گی اور زیادہ جوش میں آجی تو خوں کی مہیاں مہانے اور ہوٹل کو کم سے آزاد پینے کی دھمکیاں دے گی لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس پر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

سکھتے ہوئے اس نے ایڈریس پڑھا اور سر اٹھا کر ٹنگ زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ ایڈریس تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟ یہ تو رائلٹی کی ایک داشتہ کا ایڈریس ہے۔ غزالہ نام ہے اس کا۔"

"تم واقعی ایک عظیم ہاں ہو۔" میں نے کہا "تم نے اپنی اولاد کی پرورش بڑی توجہ سے کی ہے۔ تم اپنے بیٹے کی دانشمندی کے نام اور چوں تک سے واقف ہو۔ کاش تم ان لوگوں کے محسوسات سے بھی تھوڑی سی واقفیت رکھتے جن کی زندگیوں میں تم ہاں بیٹے کی وجہ سے برباد ہو گئیں۔"

"تم پھر لمبے جھگڑے پھیر رہے ہو۔" وہ بے تابی سے بولی۔ پھر اس نے گویا محل سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "دیکھو۔ یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

"دوسروں کے حساب سے جب ایسی باتوں کا وقت آتا ہے تو تم جیسے لوگ کئے گئے ہو کہ یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ خیر تم سستی ہو تو میں ایسی باتیں فی الحال بند کر دیتا ہوں۔ یہ تھے کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا ہوں۔"

"بہت شکریہ۔" اس کے لمحے میں طہر نہیں تھا "اب تم مجھے بتاؤ کہ یہ ایڈریس مجھے دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"جب تمہیں یہ معلوم ہی ہے کہ یہ ایڈریس کس کا ہے تو میں تمہیں اس حد تک اور بتا دیتا ہوں کہ کورٹ سے وائٹل کو جو برقع پوش لڑکی اپنے ساتھ لے گئی تھی وہ غزالہ ہی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"او۔۔۔۔۔" اس کی آنکھیں سبز تھیں۔ اس نے بڑ خیال انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس نے میری کم از کم اس بات کا یقین کر لیا تھا "لیکن غزالہ کے گھر۔۔۔ اور اس جیسی دوسری تمام جگہوں پر تو میں نے فون کر کے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔ غزالہ نے مجھے یہی جواب دیا تھا کہ وائٹل اس کے ہاں نہیں تھا۔"

میرے لئے یہ اطلاع حیرت کا باعث نہیں تھی۔ غزالہ یہی جواب دے سکتی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس وقت وائٹل ہوش و حواس ہی میں ہو اور غزالہ نے اس کی طرف دلچسپی کے مضمین خیر انداز میں آنکھ راستے ہوئے یا ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے یہ جواب دیا ہو۔

مجھے خاموشی دلچسپ کر کاؤ در جیب سے موبائل فون نکالنے ہوئے بولی "میرے حال اگر تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں موجود ہے تو میں اب فون کر کے دیکھ لیتی ہوں۔" وہ فون کی طرف دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ شاید وہ غزالہ کا نمبر یاد کر رہی تھی۔

"تمہارا فون کرنا بے کار ہے۔" میں نے کہا "وہاں کوئی فون کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

میرے اس جواب سے اس کے چہرے پر رگڑ مڑنے کے بجائے

ترس گیا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس قسم کے لوگ ہمدردی کے سختی نہیں تھے۔ اپنے دل سے ان کی ہمدردی کو نکالنے کے لئے ان کے اعمال یاد کر لینا کافی تھا۔ تاہم اب میرے دل میں پہلے جیسا غیظ و غضب بھی نہیں تھا۔

گاؤدر ریمبرٹانی ہوئی سی آواز میں بولی "فضل ایس بہت پریشان ہوں۔"

"یعنی تمہیں بھی پتا چل گیا کہ پریشانی کسے کہتے ہیں۔" میں نے ہنسی سا سن لے کر کہا۔

"مگر تم سننا ہی چاہتے ہو تو پتہ میں کہہ دیتی ہوں کہ مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔" وہ جیغ شکست غورور سے لمحے میں بولی "میں نے بہت کوشش کی لیکن میں تمہارے ہوئی کی تلاش لینے کے لئے سرچ وادرت حاصل نہیں کر سکی۔ وائٹل کو مجھے ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ میں ہوئی کی دہم میڈیسن ہسپتال کی چادریں اور تھیلے تبدیل کرنے کے بجائے ہر کمرے میں جانے کے لئے تیار ہوں۔"

اس کا سر جھک گیا اور شکست کے احساس سے آواز ٹوٹ کر نکلی۔ وہ ہنگامی لے کر بولی "میں ہر کمرے میں جانوں گی چاہے اس کام میں ساری رات لگ جائے۔"

میں نے نرم لمحے میں کہا "مجھے تم کو یا وائٹل کو شکست دینے یا تمہارے منہ سے اعتراف شکست سننے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ بات صرف انسانیت اور اصولوں کی تھی۔ تم جیسے لوگوں سے میری تو صرف اتنی ہی انتہا ہوتی ہے کہ انسان ہو اور انسانوں کے دوست رہو۔ کوئی خواہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہو۔ کچھ بھی کرنا ہو اگر وہ صرف انسان رہے اور انسانوں کا دوست رہے تو دنیا اتنی ہی صورت نہ ہو۔ بے شمار لوگ کسی نہ کسی ہمارے کی آؤ لے کہ کوئی نہ کوئی جواز گزر کر اس دنیا کو بد صورت بنانے میں دن رات جتے جتے ہیں۔ ان کے سب فلسفے ہو اس ہیں۔ سارے جواز جھوٹے ہیں۔ سارے ہمارے محض ہمارے ہی ہیں۔ ایسے لوگ بے شمار ہیں۔ میں سب سے تو نہیں لڑ سکتا لیکن جس کے ساتھ میرے سینکڑوں چمن جاتے ہیں پھر اس کا تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑا ہے۔"

"مجھے میں اب لمبی بحث میں الجھنے کی طاقت نہیں ہے۔" وہ جھگڑے لگے لمحے میں بولی "تم کسی روم میڈ کا یونیفارم منکواؤ تاکہ میں اپنا کام شروع کر سکوں۔"

"تمہارے ساز کا یونیفارم تو ہمارے ہاں نہیں ہو گا۔" میں نے کہا "لیکن دوسری اور اصل بات یہ ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

میں نے اس "کیوں" کا جواب دینے کے بجائے کاغذ پر لکھا "ایڈریس اس کی طرف پڑھا لیکن اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ وہ بلدی سے آٹھ کریمز کے قریب آئی۔ میرے دوسری طرف سے ہاتھ پڑھا کر اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ آنکھیں

ہوئیں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آنی "وہیے میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہو رہی ہوں کہ شاید تم اتنے بڑے آدمی نہ ہو جتنا تمہیں میں اور دانش سمجھ رہے ہیں۔"

میں اس وقت اس کے لئے دل میں ہمدردی کی لہر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بغیر نہ سکا "بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو دوسروں کی ذات میں اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔ انسان خود غیبت ہوتا ہے لیکن اسے ساری دنیا غیبت دکھائی دیتی ہے۔"

اس نے مجھے گھورا لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنے کے بجائے بولی "فی الحال تو میں جا کر ان دونوں کو ٹھڈے مار کر بچاؤں ہوں۔" اس نے ٹھڈے مارنے کے لئے "جگہ" کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ شرفا کی گفتگو میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا شرمناک سمجھا جاتا ہے جو اس نے استعمال کیے تھے لیکن ظاہر ہے گاؤں کا شمار شرفا میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "بعد میں اگر میں تم سے بات کروں گی۔ شاید دانش بھی میرے ساتھ آئے۔"

میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکا کہ دانش کو ساتھ لے کر میرے پاس آنے کی اب اس کے دل میں حسرت ہی رہ جائے گی۔

وہ اُنھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر راستے میں رک کر بولی "مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ پتا نہیں کیوں مجھے خیال نہیں آیا کہ مجھے صرف فون پر معلومات کرنے کے بجائے کچھ جیسوں پر خود جا کر آیا آدمی بھیج کر دکھالینا چاہئے تھا۔"

میں خاموش رہا۔ وہ ذرا زیادہ واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ تمہیں یہ اطلاع کیسے ملی۔ ہر حال دانش کے بارے میں اطلاع دینے پر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔"

وہ مسکرائی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اب اس کی جال بہت مختلف تھی۔ میں بہت دیر تک وہیں ساکت بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب وہ دانش کی لاش لے کر اس گھر سے نکلے گی تو ایک بار پھر مجھے اس کی شدید مڑھل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت تو وہ نہایت پرامن اور شکست خوردہ انداز میں آکر چلی گئی تھی لیکن اندیشہ یہی تھا کہ اس سے آئندہ ملاقات خوشگوار نہیں ہوگی۔

اسی دوران میں میں نے شفیق شاہ سے وڈیو کیرا اور وڈیو ٹیپ دیکھا۔ وہ غیور و شگوار آفسی کے سیف میں رکھ لیا۔ اس کے بعد بھی میں وہیں بیٹھا رہا اور مختلف دفتر میں مصروفیات میں دقت گزارنے کی کوشش کرتا رہا۔ دراصل مجھے رحیم کل کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس بیٹلے پر بیٹھنے کے بعد صورت حال کو سمجھنے کے لئے مجھے فون ضرور کرے گا۔ لیکن ممکن تھا وہ خود ہی چلا آتا لیکن میرا انتظار کافی طویل ہو گیا۔ وہ تو خود آیا اور نہ ہی اس کا کئی فون آیا۔

آخر کار میں آگیا کہ آفس سے نکلا اور اوپر اپنے کمرے میں

اطمینان جھٹک آیا اور وہ سہلاتے ہوئے بولی "میں سمجھ گئی۔ وہ چنگی خزانہ اسے گورنر سے گھیر گمار کر اپنے ہاں لے گئی ہوگی۔ میرے جشن سے پہلے وہ اپنے ہاں جشن منانا چاہتی ہوگی۔ وہ خزانہ تو دیکھ ہی سرتے پاؤں تک آگے کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے چھوٹے سے وجود میں کچھ زیادہ ہی جوانی بھری ہوئی ہے۔ اسی نے دانش کو منع کیا ہو گا کہ وہ وہاں اپنی موجودگی کی اطلاع مجھے نہ دے۔ اس نتیجہ کی جی کی میری پریشانی کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ کوئی موقع تھا اس قسم کے چلنے پھرنے کا۔ آج میں اس کی جوانی کی ٹمک ابھی طرح ٹھنڈی کرواؤں گی۔"

اس نے خزانہ کو دو تین سوئی موٹی گالیاں بھی ٹھانسیں اور تیزی سے موبائل فون پر سربراہ کرنے لگی۔ اس نے خود بخود ہی فرض کر لیا تھا کہ دانش کی گمشدگی کا معاملہ ہو چکا تھا اور وہ یکے بعد دیگرے بہت خوش معلوم ہونے لگی تھی۔ اب اس کا غیظ و غضب صرف خزانہ کے لئے تھا کہ اس کی وجہ سے اسے اتنی پریشانی اٹھانا پڑی تھی۔ اپنی اصل پریشانی دور ہوتے ہی وہ پہلی سی سرشاہی یا گاؤں کا مظالم ہونے لگی تھی۔

میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ دیر فون کان سے لگا کر رکھا۔ دوسری طرف یقیناً فون نہیں اٹھایا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی رحیم کل بھی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ تاہم جواب نہ ملنے پر گاؤں کا در پریشان نہیں ہوئی۔ اس کے مفروضے کے مطابق اصل مسئلہ تو حل ہو چکا تھا۔

اس نے فون دبا کر فون بند کر کے واپس اپنی بڑی سی جیب میں ڈالنے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے دونوں کینت خوب ملی جا کر کرن ہو کر اوندھے بڑے ہوں گے۔ یہ سوز کا پتہ دانش بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس قسم کی حرافوں کی بغل میں جا کر تو یہ بھی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اسے بھی کوئی ماں کی پریشانی کا احساس خود بخود ہی ہوتا ہے۔ اور جب یہ اس قسم کا رویہ اختیار کرتا ہے تو جیسی نقصان اٹھاتا ہے۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس بار اس کا لاڈلا ایسا نقصان اٹھا چکا تھا جس کی خدائی ممکن نہیں تھی اور آئندہ کے لئے وہ تمام نقصانات سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں سروسٹ میں کھل کر ساری بات اسے نہیں بتا سکا۔ اس کے بجائے میں نے آہستگی سے کہا "تمہارا وہاں پہلے جانا ہی بہتر ہے۔ تمہیں وہاں بہت سی باتیں معلوم ہوں گی جن کا جان لینا ہی اب تمہارے حق میں بہتر ہے۔ جو کچھ تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ وہ تم دوبارہ میرے پاس آکر مجھ سے سمجھ لیتا۔"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے ٹمک کی پرچھائیاں سی نمودار ہوئیں لیکن اس نے خوشی کا جو احساس از خود ہی اپنے دل میں بخھایا تھا وہ اس ٹمک پر غالب آ گیا۔ وہ سہلاتے ہوئے بولی "ہاں تمہارے پاس تو بہر حال مجھے آتا ہی پڑے گا۔ شاید ابھی نہیں جینو کہ بہت سی باتیں ملے کئی چیزیں۔" اس کے مونہے مونے

آئی۔ میں اس وقت لباس تبدیل کر کے سونے کا ارادہ کر رہا تھا جب رحیم گل کا فون آیا۔ اس کے لیے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس وقت بالکل سنجیدہ تھا۔

”میں تو بہت دیر سے تمہارے فون کا منتظر تھا۔“ میں نے کہا

”کیا خودی معاملہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے؟“

”معاصل ہو یا نہ ہو۔ پولیس کو اپنا ایک ابتدائی نقطہ نظر تو قائم کرنا پڑتا ہے۔“ وہ تنبیہ کیے سے بولا ”ہم لوگ یہاں تفتیش میں مصروف تھے۔ اس مکان پر قیامت رہنے والے گاؤں ریگٹ ہاؤس میں بندھے۔ انہیں ہماری آمد پر ہی ہوش آیا تھا۔ ان کے بیانات دہرائے جا رہے تھے۔ میں اور علاقہ انچارج مل جل کر ابتدائی تفتیش مکمل کر چکے ہیں۔ میں نے سوچا تھا اپنا کام مکمل کر کے ہی جیس فون کروں گا۔ تم سے تفصیلی بات چیت تو ملاقات پر ہی ہوگی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ گاؤں ریگٹ ہاؤس پہنچا تو کیا ہوا؟“

”میرے پاس پہنچنے کے بعد تو اسے رخصت ہوئے بھی بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں نے اسے اسی پتے پر بھیجا تھا جس پر اس وقت تم موجود ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ رحیم گل بولا ”میںاں ہمارے پہنچنے کے چند منٹ بعد وہ بھی اپنے بہت سے ہندو بھادوں کے ساتھ آن پہنچی تھی۔ میں بتائیں سسکا کہ یہاں اس لڑکی اور دانش کی لاشیں دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوئی اور اس نے کیا بیگانہ برپا کیا۔ بہر حال اس سے ہمیں کم از کم یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لڑکی خوالہ کلائی تھی اور پیر دانش کی داشتہ تھی۔ ہمیں یہ بھی اسی سے پتا چلا کہ پیر دانش کو بدلت سے جو برقع پوش لڑکی لے گئی تھی وہ یہی تھی۔ اس سے ہم نے کچھ اندازہ تو قائم کر کے ہیں۔ باقی باتیں تم سے معلوم ہوں گی لیکن میں یہ پوچھ رہا تھا کہ گاؤں ریگٹ ہاؤس سے ایک بار پھر تمہاری طرف روانہ ہوئی تھی۔ کیا وہ ابھی تک تمہارے پاس نہیں پہنچی؟“

”اب میں ذرا چوٹا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔“ میں نے وہ یہاں تو نہیں پہنچی۔“ میں نے جواب دیا ”کیا وہ دانش کی لاش لینے کے لئے بھی نہیں رہی تھی؟“

”لاش اس کو ابھی تو نہیں ملی تھی۔“ میں نے جواب دیا ”اس کا تو بہت ارٹم دینا ہو گا۔ لاش ایک دو دن بعد ہی اس کے حوالے کی جاسکے گی۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں نے سوچا شاید اس نے پوسٹ مارٹم دینا دیکھ کر اسے سے انکار کر دیا ہو اور لاش ابھی سے جانے پر اسرار کیا ہو۔“ بڑے اور بارسوخ لوگوں کی بات تم پولیس والے اکثر مان ہی لیتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”میںاں ابھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ گاؤں ریگٹ ہاؤس کوئی کڑوا نہیں کی۔“ وہ ناکھانے سے بولا ”اس کی حالت غیر ضرور تھی لیکن یہ بہر حال فطری ہی بات تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہر حال کافی مستقل عورت لگ رہی تھی۔“

”یہ بھی غیبت ہے کہ وقت کسی کو ذلیل کرے تو اس میں تھوڑی بہت چل آجائے۔ بعض لوگوں کو تو وقت ذلیل کرتا ہے تو وہ اور زیادہ صیبت ہو جاتے ہیں۔“ رحیم گل بولا ”خفیہ فی الحال حیرت کا مقام یہ ہے کہ گاؤں ریگٹ ہاؤس میں کیوں نہیں پہنچی؟“

”شاید اس نے راستے میں ارادہ تبدیل کر لیا ہو۔ مگر جلی جی ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا ”میں طرمان بلا قسم کی چیز تو راستے میں غائب ہونے سے رہی۔ خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ اس کا ناؤ لشکر بھی موجود ہے۔“

”خفیہ ابھی ہوشیاری رہا۔ شاید وہ آخر سے پہنچے۔ لیکن پہنچنے کی ضرور۔ اس کا انداز میں بتا رہا تھا۔“ رحیم گل بولا ”وہ اصل بات جاننے کے لئے بے تاب تھی۔ دیئے اسے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ تم اسے اصل بات ہی بتاؤ گے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تمہاری چلایا ہوا کوئی پکر ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ہم خواہ خواہ ہی خوش ہو رہے ہیں۔ اس کے دل کا خناس آج بھی کاویں ہے۔“ میں نے لٹھری سانس لے کر کہا پھر میں نے پوچھا ”تم سے کب ملاقات ہو رہی ہے؟“

”میں اور کچھ دوسرے پولیس افسران تم سے کل ہی ملے آئیں گے۔“ اس نے جواب دیا ”آج رات تو ملاقات کی نوبت آتی مشکل ہے۔“

”میرے لئے یہ قدرے حیرت کی بات تھی کہ رحیم گل حقائق کی گمشدہ کڑیاں جوڑنے کے لئے زیادہ بے تاب معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے انداز میں کھنکھوڑے براؤں سکون معلوم ہو رہا تھا۔

”میں نے کہا۔“ ٹھیک ہے۔ میں کل تمہارا منتظر ہوں گا۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔

رحیم گل نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اب بھی گاؤں ریگٹ کے پتے کا امکان تھا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب اس کی امید نہیں رہی تھی۔ اسے اگر اتنا ہوتا تو اب تک ابھی ہوتی۔ اس سے ملاقات بھی شاید اب کل ہی جا پڑی تھی۔ میں ممکن تھا کہ اس دوران میں وہ کسی سازش کا آنا یا جان لی۔ بہر حال میں نے اس کے خیال سے بچھا چھڑایا اور سو گیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے نیند سے جگایا۔ میرے سونے کے دوران میں صرف ڈائریکٹ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کا ریسیور اٹھایا۔ میری غنودگی وہ آواز تھی ”ہیلو“ سن کر دوسری طرف سے جو شخص بولا وہ پچھتا رحیم گل تھا۔ تب میں نے ایک آنکھ دھری کھول کر ٹھیک کلاکت کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ درحقیقت

# حکایت

## انوار صدیقی

ہوا۔

”بھئی! امرا اس لئے بھی ڈرائیو کو ساتھ رکھتے ہیں کہ حادثے کی صورت میں اس پر ڈنڈے داری ڈالی جاسکے۔ اسے قربانی کے کنبے کے طور پر آگے کیا جاسکے۔“ میں نے کہا ”اور پیر والٹس یا گاؤدر جیسے لوگوں کی تو ساری بادشاہی قربانی کے کنبوں پر ہی چل رہی ہوتی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ رحیم گل بولا ”لیکن جس طرح گاؤدر کا حادثہ ہوا ہے اس میں تو وہ ڈرائیو کو قربانی کا کبرا بنانے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہی تھی۔ وہ تو خود قربانی کی بکری... بلکہ بیٹیس بن گئی تھی۔ وہ اسٹیرنگ ویکل اور سیٹ کے درمیان پھنس گئی تھی۔ وہ بہت طوفانی انداز میں ڈرائیو تک کر رہی تھی جبکہ میرے خیال میں اس وقت اس کی حالت سرے سے ڈرائیو تک کرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔“

”اس نے گاڑی کسی دو سری گاڑی میں مار دی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے آگے ایک ٹرک جا رہا تھا جسے کسی وجہ سے اچانک بریک لگانا پڑا۔ گاؤدر نے انجیرو پیچھے سے لے جا کر اس میں ٹھونک دی۔ جبکہ رفتار بہت تیز تھی۔ پہلوں کے نشانات بتاتے ہیں کہ اس نے آخری لمبے تک بریک لگنے کی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے حادثہ زیادہ خطرناک ہو گیا۔ شاید اسے آخری لمبے تک احساس نہیں ہوا کہ اس کی گاڑی ٹرک سے ٹکرانے لگی تھی اور جیسے معلوم ہے ٹرک تو پھر ٹرک ہی ہوتا ہے۔ اس سے خواہ آگے سے ٹکرانا پیچھے سے۔ نتیجہ خطرناک ہی ہوتا ہے۔“

”اب اس کی حالت کیا ہے اور اسے کون سے اسپتال لے جایا گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے ایک سرکاری اسپتال کا نام بتایا پھر بولا ”فی الحال وہ آپریشن جیمیری میں ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ سر اور رینجہ کی ہڈی پر بھی شدید چوٹیں آئی ہیں۔ ڈاکٹروں کو انہی کی وجہ سے زیادہ تشویش ہے اور وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہوش میں آنے پر اس کا کیا حال ہو۔“

میں چند سیکنڈ خاموش رہا تو وہ بولا ”کیا سوچتے گئے؟“ ”قدرت کے کاموں پر غور کرو۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں۔ قدرت کے کام واقعی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔“ وہ

اسے صبح کے تین گنا چاہتے تھا۔  
”سور ہے تھے؟“ رحیم گل نے نہایت شریں لہجے میں پوچھا۔  
”نہیں۔“ ٹھنک ڈانس کر رہا تھا۔ ”میں نے ہل کر جواب دیا۔“  
”اس کی جگہ ٹھنک ڈانس کرو تو نتائج زیادہ حوصلہ افزا ہوں گے۔“ اس نے مشورہ دیا۔

”وہ ذرا مشکل ہے۔ تم جیسے فائدہ انی استاد کی رہنمائی کے بغیر نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا پھر یکدم ڈرائیو پر چڑھا۔ ”پیارے رُ کے بچے! مجھے اس وقت کیوں دیکھا ہے؟“

”ایک اہم خبر سنانے کے لئے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے؟“ میں نے کات کھانے والے لہجے میں کہا۔

”میں نے سوچا کیسے تم شکوہ نہ کرو کہ تمہیں وہ خبر تاخیر سے کیوں دی گئی۔“

”کیا تمہیں بھی وہ خبر سوتے سے اٹھا کر سنائی گئی ہے جس کا انتقام تم مجھ سے لے رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں تو ابھی سویا ہی نہیں ہوں میری جان! ہماری قسمت میں نیز کہاں! اس نے ٹھنڈی سانس لی ”میں تو شاید صبح تک بھی نہ سو سکوں۔ اس کے باوجود تم لوگ کہتے ہو کہ پولیس والے کام نہیں کرتے۔“

”نام تو کرتے ہیں۔ البتہ کوئی صحیح کام نہیں کرتے۔“ میں نے جھجکی ”جو بھی کرتے ہیں غلط ہی کرتے ہیں۔ خیر اس پرانی بحث کو پھوڑو اور وہ خبر سناؤ جس نے تمہیں اتنا بے چین کر دیا ہے۔ خوش خبری ہے یا بد خبری؟“

”میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے خوش خبری سمجھوں یا بد خبری۔“ وہ اب سنجیدگی سے بولا ”ایک عام آدمی چونکہ تھوڑا سا کینسر پرور بھی ہوتا ہے اگر میں عام آدمی بن کر سوچتا ہوں تو یہ خوش خبری لگتی ہے لیکن اگر اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچتا ہوں تو یہ بد خبری لگتی ہے۔ اس پر افسوس ہوتا ہے۔“

”خیر۔ تم اتنی موٹی موٹی باتوں میں مت الجھو۔ تمہارے منہ سے ذہن کے لئے یہ بوجھ ناقابل برداشت ہو گا۔ تم اصل بات بتاؤ۔“ میں نے مشتاقانہ لہجے میں کہا۔

”اصل بات یہ ہے کہ رات گاؤدر تمہارے پاس اس لئے نہیں پہنچ سکی تھی کہ راستے میں اس کو حادثہ پیش آیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”اور؟“ میری نیند غائب ہو گئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا ”کیا وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی؟“

”ہاں۔“ لگتا ہے اسے خود ڈرائیو کرنے کا زیادہ شوق تھا جبکہ ڈرائیو کو ساتھ بٹھائے رکھتی تھی۔ حالانکہ عموماً جو لوگ خود ڈرائیو کرتے ہیں وہ پھر ڈرائیو کا مجبوت نہیں پالتے۔“ رحیم گل

دوسرے روز دوسرے کے کھانے کے بعد رحیم گل میرے پاس پہنچا۔ علاتے گاڑی ایس لی بھی اس کے ساتھ تھا کہ وہ رحیم گل کے سامنے کچھ ایسا سوڑب نظر آ رہا تھا جیسے رحیم گل اس کا افسر ہو۔ بے چارہ کوئی شریف آدمی معلوم ہوا تھا۔ پولیس کے جگے میں کسی شریف آدمی سے مل کر مجھے واقعی حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی۔

میں اس وقت آفس میں تھا۔ رکی باؤں اور خاطر مدارات وغیرہ کے بعد رحیم گل ذرا ٹیکل کر بیٹھے ہوئے بولا "تمہارے چیلے میں جو بیلی ہے اب وہ نکال کر ہمیں دکھا دو۔ ورنہ ہمارے علاقے کے ڈی ایس لی صاحب کو مجبوراً تمہیں ہی پیر وائش کے قتل کے شبے میں حراست میں لینا پڑے گا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دیوالونگ چیز کے پٹے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ پیر وائش کے قتل کی اطلاع ہمیں تم نے ہی دی تھی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا عہدہ اور مستقل جواب ہے!" میں نے سر ہلاتے ہوئے واو دی "یعنی تم لوگوں کے ہاں واقعی یہ دواج پایا جاتا ہے کہ جو شخص کسی جرم کی اطلاع دے اس جرم کے الزام میں اسی کو دھر لے؟ میں تو سمجھا تھا لوگ خواہ مخواہ مہانے سے کام لیتے ہیں اور تمہارے جگے کے بارے میں افسانے مشہور کئے رکھتے ہیں۔"

"تم ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔ لوگوں کی باتیں تو زیادہ تر مبالغہ آرائی اور افسانہ طرائزی ہی ہوتی ہیں۔" رحیم گل اپنی چٹری تھماتے ہوئے بولا "لیکن تمہیں ہم محض اس لئے پیر وائش کے قتل کی اطلاع دینے پر اسی قتل کے الزام میں حراست میں لے لیں گے کہ تمہارا یہ اطلاع دینا۔ اور وہاں پایا جانا غلطی از علت نہیں ہو سکتا۔ تم محض اتفاقاً تو وہاں نہیں پہنچ گئے ہو گے جہاں پہنچنے کا خیال اس کی بات کو بھی نہیں آیا تھا۔"

"لگتا مڑکیس کے! اس صورت میں تم پہلے مجھ سے یہ سوال کرو کہ میں وہاں کیسے پہنچ آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"سوال تو ہم تم سے بہت سے کریں گے۔" رحیم گل نے بڑی متانت سے سر ہلایا "پہلے تم ہمیں بتاؤ کہ تمہارے پاس اس کیس کی کون سی گمشدہ کڑیاں ہیں؟ تم نے فون پر اس قسم کی کوئی بات کی تھی۔"

"پہلے تم بتاؤ۔ تم لوگوں نے کیا رائے قائم کی ہے؟" میں نے کہا۔

"پولیس والے کسی کیس کے بارے میں اپنا نقطہ نظر مناسب وقت آنے پر بیان کرتے ہیں۔" رحیم گل نے اپنی متانت برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس موقع پر ڈی ایس لی نے مداخلت کی اور مجھ سے مخاطب ہوا "فضل صاحب! ہمیں رادھر اُدھر کی باتوں اور انہی مذاق میں

غور نہ بولا۔" لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جنہیں قدرت کے کاموں پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے وہ تو غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ ہم تم جیسے لوگ غور کرتے رہتے ہیں جو پہلے ہی ادھر والے کی قدرت کے بڑے قائل ہیں اور ہر وقت اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔"

"میں دن میں کسی وقت گاؤر کو دیکھنے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ابھی جانے کا کوئی ناکہ نہیں۔ ایک آدھ دن تو شاید وہ انتہائی تجدد اشت کے دار و زمین ہی رہے جہاں کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہوگی۔" شیشے لگنے سے اس کا چہرہ بھی بری طرح ڈنڈی ہوا ہے۔ "اس نے بتایا۔"

میں ایک بار بحر ستافانہ سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ رحیم گل بولا "میں تمہیں ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا۔ اس سے تمہیں قدرت کے کاموں پر غور کرنے کا ایک اور پہلو نظر آئے گا۔"

"وہ کیا؟" میں نے ذرا بے آگاہی سے پوچھا۔

"گاؤر کے ذرا نیور کو شخص معمولی سی چیز نہیں آتی ہیں حالانکہ وہ اس کے برابر ہی بیضا تھا اور درحقیقت وہی ساڈرٹک سے ٹکرائی تھی جدھر ذرا نیور تھا لیکن پیچرو کے گیارٹک سے مس ہوتے ہی اس کی طرف کا دھواڑہ کل گیا اور وہ بھڑائی سے انداز میں اچھل کر باہر جا کر آگرتے وقت ہی اس نے گاڑی کے ٹوٹے پھوٹے کی آواز سنی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تاہم حادثے کی دہشت سے اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ساری بات بتانے کے قائل ہوا ہے ورنہ اس سے تو صحیح طور پر پورا ہی نہیں جارا تھا۔"

رحیم گل نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ واقعی ایک اور قابل غور پہلو تھا لیکن اس نے یہ بھی ٹھیک کہا تھا کہ جنہیں غور کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے وہ غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔

قدرے توقف سے رحیم گل بولا "جس فی الحال میں تمہیں یہی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ مجھے یہ اطلاع اہم محسوس ہوئی اس لئے میں نے فون کرتے وقت یہ نہیں لکھا کہ رات کا کون سا پہرہ ہے۔ امید ہے تمہاری ناکام کھوپڑی میں اب میرے خلاف زیادہ اہل نہیں اٹھ رہا ہو گا۔"

"بہال تو اٹھ رہا ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں تمہیں صاف ہی کر دوں۔" میں نے ناپائیدار لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکر ہے علی سہانی۔" اس نے طعنے شکر گزاری سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں چاہنے کے باوجود دیر تک سو نہ سکا۔ میں بستر پر بیٹھا سوچا رہا اور میں سوچ ہی رہا۔ اس وقت شاید سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا جب تیرہ دے قدموں میرے حواس کے آئین میں آتری اور میں بستر پر لٹک گیا۔

مشکل نہیں تھا کہ وہ زندہ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی کسی درندے کے چہرے پر اس وقت ہو سکتی تھی جب وہ کوئی فکار پٹ کے حکم سے رو کر لٹا ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ درندے کے چہرے کو چہرہ کہا جاسکتا تھا یا نہیں اور درندے مسکرانے کے اہل تھے یا نہیں۔ لیکن میرے ذہن میں اس وقت یہی تصور ابھرا تھا۔ کسی درندے ہی کی طرح وہ اس وقت قطری لباس میں تھا۔

کیمرہ چونکہ ایک ہی جگہ فوس تھا اور خود کار طریقے سے چل رہا تھا اس لئے وہ تک ایک ہی فریم آنکھوں کے سامنے رہا۔ پھر اچانک غزال اس فریم میں داخل ہوئی۔ غزال کی صورت، شکل، جسم اور نائٹ گاؤں میں کبھی وہی تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ اس کے بلوچوں نہ جانے کیوں وہ مجھے ایک مختلف غزال محسوس ہوئی۔ یہ کوئی دوسری ہی لڑکی تھی۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے چہرے پر بھی ایک عجیب سی درندگی اور وحشت تھی۔ وہ اپنے حسین چہرے اور نازک سراپا کے بلوچوں پر داخل ہی سے لٹی جلتی کوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے چہرے پر بھی اس وقت درندگی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرا دل اس کا چہرہ ایک آہود درندے کا چہرہ تھا جبکہ غزالہ کے چہرے پر خون کی پیاس تھی۔

اس کے ہاتھ میں وہی ہتھوڑا تھا جو اس وقت میرے پاس محفوظ تھا۔ اس نے ابھی طرح کمرے کی طرف دیکھ کر گویا اپنا چہرہ کمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیا تھا۔ وہ واقعی اپنے کئے کا ٹھوس ثبوت چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کی نظر میں اپنا پروگرام واضح تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے قوت موت کو لگے لگائی تھا اور اس نے بڑی جرات سے اپنے اس فیصلے پر یقین میری آنکھوں کے سامنے عمل کر کے دکھایا تھا۔

اس نے کمرے کے سامنے دوسرے ہاتھ میں لمبی سی ایک کھل بلند کر کے دکھائی جو چھوٹے موٹے شہتیروں اور بلیوں وغیرہ میں ٹھونکنے کے کام آتی تھی پھر وہ سرانے کی طرف سے اس طرح پیرا دلش کے قریب پہنچی کہ فریم سے باہر نہ ہونے پائے اور کمرہ اس کی تمام حرکات و سکنات کو محفوظ کر سکے۔ اسے یقیناً ابھی طرح اندازہ تھا کہ کمرے کی رسائی کہاں تک تھی۔

کس طرح اس نے ہتھوڑا بلند کر کے کھل پیرا دلش کی پیشانی پر ٹکا کر ایک ہی دادرش پوری کی پوری کھل کھڑکی میں آکاوری۔ یہ میری زندگی کے ناقابل فراموش مناظر میں سے ایک تھا۔ اگر کمرے کی آنکھ نے اس منظر کو محفوظ نہ کیا ہوتا اور میں زبانی یہ بات کسی کو بتاتا تو وہ شاید ہی یقین کرتا۔

رجیم گل اور ڈی ایس بی بھی دم بخود بیٹھے تھے۔ اس قسم کے منظر کی یقیناً انہیں بھی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے ازراہ مروتانی زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ لیا ہو گا کہ میں پیرا دلش کا قاتل نہیں تھا لیکن یہ

وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔ مجھے اس سلسلے میں جلد حکام بالا کو تصدیقی رپورٹ پیش کرنی ہے۔ وہ اس معاملے میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس کے لیے میں بھی بڑی سنجیدگی تھی اور چہرے پر بھی۔ وہ مزایا کافی سنجیدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں انہیں دلچسپی لینی بھی چاہئے۔ آخر ان کا ایک معزز کرم فرما دینا سے رخصت ہو گیا ہے۔ میں تو خود ذرا سا بھی وقت ضائع کئے بغیر اصل بات کرنا چاہتا تھا لیکن یہ جو آپ کا الیکٹرون ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بتا نہیں چلا کہ یہ کب بلیو ہے اور کب مذاق کر رہا ہے۔ آپ اسے سرکاری طور پر منظم دیں کہ یہ مذاق کرتے وقت ہاتھ کھڑا کر لیا کرے۔ میں تو اسے سنجیدہ ہی سمجھ کر بھیجی تھی۔ اس کی باتوں کے جو آپ دے رہا تھا۔"

"میں سنجیدہ ہی ہوں۔ ڈی ایس بی صاحب تم سے مذاق کر رہے ہیں۔" رجیم گل جلدی سے بولا "میرا حال۔ یہ مسئلہ زیادہ اہم نہیں ہے کہ کون سنجیدہ ہے اور کون مذاق کر رہا ہے۔ اصل اہم چیز وہ ہے کہ جو ہمیں اپنے فیصلے سے ٹھاننی ہے۔ یہی ذرا باخبر اور ہوشیار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لمبی کی جگہ تم وہ چہرہ نکال کر دکھاؤ جو پاؤں کھڑے نہ ہو کر نہ ہوتا ہے۔ وہ مٹا کر مٹا دینا ہے۔"

"میرے فیصلے میں ایک الیکٹرون کی کمی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "۳۴ میڈ ہے وہ ہمارے لئے قتل پیش ثابت ہوئی اور مجھے گرفتار کرنے کا جو شوق ہمارے دل میں جل رہا ہے اسے تم لوہاں دے کر کٹاؤ گے۔"

میں نے آفس کی سیف سے بیک میں موجود دو بیکس کھرا اور دو ٹی آر نکالا۔ آفس کے ایک کونے میں ٹی آر اور دو ہی موجود تھا جو ہوش کے بھگم سے بھی مشکوک تھا۔ ہوش کے کمرہ میں مہمانوں کو جو فلیش وغیرہ دکھائی جاتی تھیں وہ اس آفس میں بھی دیکھی جاسکتی تھیں اور بوقت ضرورت سوچ دیا کہ یہ سلسلہ محفوظ کر کے اپنی مرضی کی کوئی کیسٹ بھی لگائی جاسکتی تھی۔

میں نے کیسٹ نکال کر وہی آفس میں لگائی اور اسے دی وائنڈر کر دیا۔ رجیم گل اور ڈی ایس بی دونوں بغور میری طرف دیکھ رہے تھے۔ رجیم گل اب زور دھڑوڑھکی باتیں بھول گیا تھا۔

کیسٹ چلا کر میں نے وائیں آکر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کیسٹ میں پیرا دلش کی "موت کا منظر" محفوظ ہے۔ میں نے خود بھی ابھی تک یہ منظر نہیں دیکھا۔ اب آپ دونوں حضرات کے ساتھ جہز کر کے پارک کیجئے گا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کس انداز سے اس منظر کو دکھایا گیا ہے۔"

میرے یہ کہنے تک اسکرین پر منظر اچانک ہی نمودار ہو چکا تھا۔ منظر کیا تھا میں پیرا دلش اسی جگہ سے سائے کے بیڑی بند پر چپٹا رہا تھا۔ تاہم اس کی توجہ اور دیکھنے کے زہر دم سے یہ اندازہ نہ



ان کا یہ شرفانہ رویہ عمل دیکھ کر میں نے بھی صلح جویمانہ لہجہ میں کہا "آپ میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں کہ میں کس طرح اس لڑکی تک پہنچا اور اس سے میری کیا گفتگو ہوئی۔ ساری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا۔"

وہ کچھ منہبیل کر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں سارا قصہ سنایا جو انہوں نے نہایت انتہاک سے سنا۔ آخر میں نے کہی سانس لے کر کہا "یہ ساری بات جس قصے کو میں آپ اور ہماری عدالت انجام تک نہیں پہنچا سکی اسے ایک دستو خمی کی معمولی سی جینش نے انجام کو پہنچا دیا۔"

دونوں ہی نے پُر خیال سے انداز میں سر ہلایا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "پیر دانش کی موت سے میری بلا حلقی ثابت کرنے کے لئے یہ شواہد کافی ہوں گی یا مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ڈی ایس بی نے کھار کر گھا صاف کیا۔ اس کا نام ٹار احمد تھا۔ وہ حلقہ کے جسے بیولا "میرا خیال ہے آپ کو کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب ہمیں ذرا انتظار کرنا ہو گا اور یہ دیکھنا ہو گا کہ دانش کی ماں اگر صحت یاب ہوتی ہے تو عدالت میں کیا منظر اختیار کرتی ہے۔ میرا حال۔ اس صورت میں بھی اگر مرگتا ہوا تو آپ کو شاید ایک بار اپنا بیان رکھنا پڑے۔ عدالت میں حاضر ہونا پڑے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اصل داد اور توپوں کی قہقہہ شری رپورٹ پر ہوتا ہے۔ ہم نے آپ کی بات پر یقین کر لیا تو سمجھ لیں عدالت نے بھی یقین کر لیا۔ پیر دانش کی موت کے بعد آپ اس کیس کو تقریباً ختم ہی سمجھیں۔ اس کی ماں نے اگر اسے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی تو اسے زیادہ کامیابی نہیں ہو سکے گی۔"

"یہاں ہی تو تو بہتر ہے۔" میں نے کہا "بی بی زندگی میں تو پیر دانش لوگوں کی زندگیوں برباد کرتا رہا۔ اب کیس مرنے کے بعد لوگوں کا وقت نہ برباد کرتا رہے۔"

"میرا قہقہہ کہہ کر ایسا نہیں ہو گا۔ میرا حال دیکھتے ہیں کہ مسز شاہ جی اسپتال سے نکلنے کے بعد کیا کرتی ہے۔ ڈی ایس بی ٹار احمد لے کر پھر وہ اٹھتے ہوئے بیولا "جس نے ہم لے جا رہے ہیں۔ ایک زحمت آپ کو کرنا ہو گی جو بائیں آپ نے ہمیں بتائی تھی وہ تحریری شکل میں کار آمد ہوں گی۔ یہ سب کچھ ہمیں آپ کے بیان کی صورت میں آپ کے دستخطوں کے ساتھ درکار ہو گا۔ عدالت نے ضروری سمجھا تو تصدیق اور جمع کے لئے آپ کو طلب کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے دیکل صاحب میرا تحریری بیان آپ کو پہنچا دیں گے۔" میں نے انہیں رخصت کرنے کے لئے اٹھتے ہوئے کہا۔

امکان شاید ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ اسے ٹھکانے لگانے والی وہ نازک اندام ہی لڑکی تھی جو انہیں پیر دانش کے پتلون میں ہی محروم پڑی ملی تھی۔ ان کا تخیل اس سلسلے میں کوئی اور ہی کمائی بننے کی کوشش کر رہا ہو گا۔

خزانہ کی زندگی کا وہ مظاہرہ چند لمحوں ہی میں ختم ہو گیا۔ اس کے حلق سے اس دوران میں دردوں کی غراہٹ چھٹی آواز بھی نکل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ جو خنی کل پیر دانش کی پیشانی میں بیٹھ ہوئی وہ اس عدوٹی یا خمار کی بے ہوشی میں بھی اچھل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک لمبے کے لئے مکمل کٹی تھیں اور چاندوں کا چھہ ہوا میں بلند ہو گئے تھے لیکن دوسرے ہی لمبے وہ دیوان چٹ کر اور ساکت ہو گیا۔ آنکھیں بھی دروازہ بند ہو گئیں۔ وہ تو تڑپا اور نہ ہی اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی۔

اس کے ساکت ہونے ہی خزانہ کیمبرے کی طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے حلق سے بدستور عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں اور چہرہ اندھولی کھٹاؤ سے بگڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمبے اس کے جسم نے کیمبرے کے ٹیس کو ڈھانچ لیا اور پھر مقرر قلاب ہو گیا۔ اس نے قریب آکر کیمرا آف کر دیا تھا۔ پانی کیسٹ ساہو معلوم ہوئی تھی۔

میں نے ریموٹ سے ٹی وی اور وی سی آر آف کر دیا۔ ریو الوچ چیز کھما کر میں نے آواز نوٹی ایس بی اور ریم کمل کے چوں کا جائزہ لیا۔ آج کل شہر کے کچھ حالات تھے ان میں وہ یقیناً عودانہ ہی اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے دوران میں کوئی نہ کوئی ہولناک نظارہ دیکھتے ہی تھے لیکن اس نظارے نے بھی یقیناً انہیں اندر سے ہلادیا تھا۔

کیمبرے وغیرہ کا بیگ میرے حطب میں میرے بیروں کے قریب ہی رکھا تھا۔ میں نے جبکہ کر کٹھ پیر سے تمام کر اس میں سے جھوڑا نکال کر میز پر ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ جھوڑا جو ابھی آپ نے فلم میں اس لڑکی کے ہاتھ میں دیکھا۔ اس پر لڑکی کی انگلیوں کے نشانات ابھی محفوظ ہیں۔"

پھر میں نے بیگ کی جیب سے خزانہ کا خط بھی نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا "اس لڑکی نے صرف اس فلم کو ہی کالی نہیں سمجھا۔ مزید تصدیق کے لئے اپنے ہاتھ سے یہ خط بھی لکھا۔ اس بے چاری کی بڑی شدت سے خواہش تھی کہ پیر دانش کے قتل کے سلسلے میں کسی بے گناہ اور غیر متعلق شخص کو قصفاً ٹھک نہ کیا جائے۔" پھر میں نکلا گئے بغیر نہ رہ سکا "شاید اس بے چاری کو تجربہ تھا کہ ہماری پولیس کیسی ہوتی ہے۔"

ریم کمل اور ڈی ایس بی شاید ابھی جھکے سے سنبھلے نہیں تھے۔ انہوں نے اس ریمارک پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ ہی کوئی احتجاج کیا حتیٰ کہ صفائی پیش کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ وہ دم بخود بیٹھ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

ساتھ گاؤدر کا لقب موزوں محسوس ہوتا۔ یہ محض مبالغہ آرائی معلوم ہوتی۔

وہ ایک ٹوٹی پھوٹی، ٹکست خوردہ اور قابل رحم عورت تھی۔ ان دو عیبوں میں اس کا وزن نہ جانے کتنا کم ہو چکا تھا۔ وزن کم ہونا تو اس کے حق میں شاید بہتری ہی ہو لیکن اس سے اس کی شخصیت بدل کر نہ گئی تھی۔ صرف یہی نہیں، چہرے پر متدل زخموں کے نشانات نے ری سی کسر پوری کردی تھی اور اسے بالکل ہی ناقابل شناخت بنادیا تھا۔

اس کی گردن ذرا نیڑھی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے سر ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ اس وقت گو کہ وہ گردن میں مخصوص سرخیوں کا کار پنے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود سر ایک طرف کو ذرا جھکا ہوا ہی دکھائی دے رہا تھا۔

ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ چند سینکڑ خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی رہی گویا پہچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرے خیال میں وہ ہمیں پہچان تو چکی تھی بس یہ شاید اس کی عدم دلچسپی کی اختتام تھی۔ اس کے سامنے بہت سی لان چیزیں موجود تھیں۔ آخر اس نے ہائیں ہاتھ سے ہمیں بیٹھے کا اشارہ کیا کیونکہ وہ اب بول بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی قوت گریانی جاتی رہی تھی۔

میں گو کہ حادثے کے بعد اسے دیکھنے نہیں جاسکا تھا لیکن مجھے اس کے بارے میں خبر چرچائی رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے بارے میں سرخوں کا کہنا تھا کہ اگر کسی مجبوز کے تحت ہڈیاں صحیح طرح بچر جائیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ریزہ کی ہڈی کی چوٹ کی وجہ سے اس کا بخلاہر مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ اب بیرون ملک علاج کرا رہی تھی۔ قاتل بھی چلنے کے قابل نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات کچھ عرصے بعد کا میٹک سرجری کے ذریعے کافی حد تک ٹھیک کئے جاسکتے تھے۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اسے یہ نشانات دور کرانے سے بھی دلچسپی رہی تھی یا نہیں؟

ہم بیٹھ چکے تو اس نے ملازم ہم سے پوچھنے لگا ”آپ لوگ کیا کھانا پینا پسند کریں گے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ کسی عطف کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف ایک چھوٹے سے سرکاری کام سے آئے ہیں۔“ رحیم گل بولا پھر گاؤدر سے مخاطب ہوا ”بھیرا ناکھ کی سورت کے بعد سرکار نے اس کے خلاف قائم کئے گئے مقدمات ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاہم اگر آپ یا اس کا کوئی اور قریبی رشتہ دار اسے بعد از مرگ ہی کرانے کے لئے مقدمات کی پیروی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

گاؤدر نے اپنی ذہنی چیز کے ہتھ پر رکھے ہوئے چھوٹے سے فوٹ بیڈ پر بائیں ہاتھ سے کچھ کھسا اور کانٹہ بھاڑ کر رحیم گل کی طرف بڑھایا۔ اس پر ٹکست اور نیڑھے میز سے الفاظ میں کھسا تھا

وہ جانچے تو میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ میرے سر سے جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا تھا۔

○●○

اس کے تقریباً دو ماہ بعد مجھے ایک بار پھر ”پیپر بیس“ جانے کا اتفاق ہوا۔ میں رحیم گل اور ڈی ایس بی ٹار احمد کے ساتھ گیا تھا۔ ”پیس“ گاؤدر سے کچھ قانونی کاغذات پر دستخط کرائے تھے۔ رحیم گل نے مجھے فون کیا تھا تو اتفاقاً اس بات کا ذکر کر دیا تھا کہ آج اسے گاؤدر سے ملنے پیپر بیس جانا تھا۔ تب میں نے خود ہی فرائض کردی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں گا۔ وہ میری طرف آیا تو کیا نہیں تھا۔ ڈی ایس بی ٹار احمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں انہی کی گاڑی میں چلا گیا تھا۔

پیپر بیس کے دو دوپٹے اور سی تھے مگر وہ ایک بڑا بلا کمرنگ رہا تھا۔ محل نما وہ مکان گویا افسردگی کے خلاف میں لپٹا ہوا تھا۔ ہماری آمد کی اطلاع پر ایک شخص نے گیٹ کھول دیا اور پولیس کا ڈرائیور گاڑی اندر ہی لے گیا۔ اب وہاں کوئی بھی کم نظر آ رہے تھے۔ جتنے موجود تھے ان کے چہرے میرے سے بھی اس وجہ سے اور غصے کا اعتبار میں ہو رہا تھا جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ پھر بھی مکان آجاز آباد سا لگ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی غیر ملکی چیز تھی جو آج بھی تھی۔

میں گاؤدر کو اپنی آمد کی اطلاع بھجوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سامنے لان پر ہی موجود تھی۔ وہ وہاں جیسے ہی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر ٹھنڈوں سے اوپر تک اب بھی پلاسٹر چسایا ہوا تھا۔ یہ پلاسٹر اس کی ٹانگوں پر تھیمی مریج چھلایا گیا۔ اس کی ٹانگوں کے تین آہریشن ہو چکے تھے مگر نہ تو ٹانگوں کے ان ٹکڑوں کو کچھ طور پر جوڑا جاسکا تھا جو ریزہ ریزہ ہو گئے تھے اور نہ ہی ان میں اسکیل کی رازفٹ ہو سکی تھی جس سے یہ امید رکھی جاسکتی تھی کہ وہ کچھ عرصے کے بعد چلنے کے قابل ہو سکے گی۔

اس کے دو کیلوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ سرخوں پر کیس کرے کہ اس کا علاج ٹھیک طرح نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر سرخوں نے برا عجیب و غریب جواب دیا تھا۔ انہوں نے خود معافیہ کیا تھا کہ جلد از جلد اس مشورے پر عمل کیا جائے اور اگر کسی بد حالت میں یہ ثابت ہو گیا کہ کسی دوسرے ترقی یافتہ ملک میں بھی اس کی ٹانگوں کے اس سے بہتر آپریشن ممکن تھے تو وہ پریکٹس چھوڑ دیں گے۔

تاہم گاؤدر نے اس جواب سے پہلے ہی مقدمے بازی وغیرہ سے منع کر دیا تھا۔ اس حادثے سے اس کے جسم میں ہی نہیں۔ اس کے ذہن میں بھی بڑے انقلابات آئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے قسمت پر شاکر رہنا سیکھ لیا تھا۔

ہم جب اس کے قریب پہنچے تو اس کی حالت زیادہ واضح طور پر دیکھ کر مجھے ایک دم ہکا سالا۔ حادثے کے بعد میں پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ ایسی عورت دکھائی نہیں دے رہی تھی جس کے

میں بیٹھ کر گیت سے نکل آئے تو میں نے کہا ”معافی مانگتے اور معاف کرنے کا سلسلہ اگر اتنا آگے جانے سے پہلے شروع ہو جیلا کسے تو کتنا اچھا ہو۔ لوگ نہ جانے کتنے نقصانات سے بچ جائیں۔“

”فروعیت کا جادو بڑی مشکل سے اُترتا ہے۔“ رحیم گل لٹری سانس لے کر بولا ”فروعیت بڑی عجیب چیز ہے۔ انسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود اسے اپنا آپ بہت اچھا لگتا ہے۔ اپنے گناہ بھی کارِ خیر نظر آتے ہیں۔ اپنی خفاہ بھی خوب صورت معلوم ہوتی ہے۔“

ثار احمد بولا: ”اس سچی عورت کے بارے میں تو یہ بھی قیامت ہے کہ اس حال کو پہنچنے کے بعد بھی اس میں اتنا اکتھاپ آگیا ورنہ مجھے تو اندیشہ تھا کہ رتی جل گئی ہوگی مگر بل نہیں گیا ہوگا۔“

”بعض شائیں ٹوٹ جانے کے بعد پلک دار ہو جاتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

رحیم گل بولا: ”جی تو گاؤں کو ایک اور ٹکٹ اور ریستہ کا سامنا ہوگا۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہیرا دانوں کی پکلی ہوی کے تین بچے باقی ہیں۔ دوسری ہوی کے دو بچے باقی ہیں۔ تیسری ہوی کے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ ان سب نے ان درافت کے جھگڑوں کے لئے آتشیں چھانا شروع کر دی ہیں۔ ہیرا دانوں کے مالی معاملات بہت الجھے ہوئے ہیں۔ حرام کی گناہیں میں انکوائری طرح ہوتا ہے۔ مرکزی شخصیت ایک ہی ہوتی ہے سارا انکھیل تماشا اسی کے بل پر چل رہا ہوتا ہے۔ اب بہت سی دولت اور اثاثے تو دیے ہی غائب ہو جائیں گے۔ جس کے جو ہاتھ لگے گا وہ لے جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ تینوں بیویاں اپنے بچوں کو آگے کر کے مقدمے بازیوں میں لگ جائیں گی۔ اس سارے چکر کے دوران میں وہیل چیمبر پیش ہوئی گاؤں کا نہ جانے کیا مشہور ہوگا۔“

ثار احمد بولا: ”اگر وہ چاہتی تو شاید اب بھی حالات پر گرفت رکھ سکتی تھی لیکن وہ ظاہری طور پر ہی نہیں اندر سے بھی ٹوٹ چھوٹ گئی ہے۔“

”ٹوٹ چھوٹ بعض لوگوں کو بہتر انسان بنا دیتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”گاؤں کے بارے میں ابھی یہ بات چین سے نہیں کی جاسکتی۔“ رحیم گل جھجکی سے بولا ”میں سن رہا ہوں کہ یہ شخص ایک عارضی کیفیت ہو۔ ایسے لوگوں میں خفاہ کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔“

میں نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی۔ اس کے کتنے میں وزن تھا۔

”مجھے اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ بہتر ہے اب اس قصبے کو ختم کرو۔“

رحیم گل نے ان باتوں میں سر ہلایا اور ایک فائل کھول کر اس کی طرف بڑھتا ہوا ایک ٹائپ شدہ عدالتی کاغذ پر اپنی ریکی اس صورت میں آپ کو اس پر دستخط کرنا ہوں گے۔ وہ ملا بہت سے بولا ”آپ چاہیں تو اسے پڑھ لیں یا اپنے وکیلوں کو بلا لیں۔“

گاؤں کے وکیلوں کو بلا تاؤں کا اس کاغذ کے مندرجات پر نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی اور رزے ہوئے ہائیں ہاتھ سے دستخط کھینٹ دیے۔ رحیم گل نے بغور دستخط کا جائزہ لیا پھر اسی فائل کے ایک اور کاغذ کو دیکھ کر غالباً گاؤں کے دوسرے دستخط سے موازنہ کیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سفردت خواہانہ سے مجھے میں بولا ”اب جو کچھ آپ ہائیں ہاتھ سے دستخط کرتی ہیں اس لئے یہ آپ کے بچے کے لئے دستخط سے نہیں لیتے آپ کو تھوڑی سی زحمت اور کٹنی ہوگی۔ دستخط کے ساتھ ہی آپ کو انکوائری کا نشان بھی لگانا ہوگا اور اپنے دو نوٹوں کے دستخط بطور گواہ کرانے ہوں گے۔“

اس نے جیب سے ایک بیڑ نکال لیا۔ اس نے یقیناً تمام امکانات کا خیال رکھا تھا اور تیار ہی کے ساتھ آیا تھا۔ گاؤں کے اسی کی مدد سے ملازمین پیش آنکھ سے کاغذ بھی لکھا۔ پھر اپنے ٹیکسٹری اور نمبر کو لکھا کہ گواہ کے طور پر دستخط بھی کر لیں۔ صرف چند منٹ میں یہ کام ہو گیا۔ رحیم گل اور ثار احمد اٹھنے کے لئے پر تڑپنے لگے۔

باہر پر ایک عجیب الجھن آئیں سا سکوت طاری تھا۔ گاؤں کے خالی خالی قطعوں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے ان آنکھوں میں اپنے لئے نفرت کی پرچائیاں تلاش کرنا چاہیں لیکن وہاں میرے لئے نفرت کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ زندگی میں بہت دنوں بعد ایسا موقع آیا تھا کہ میں اپنی پوری بھول گیا تھا۔

آخر ثار احمد اور رحیم گل اٹھ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ جب میں نے کھڑا کرکھا صاف کرتے ہوئے کہا ”میرا شاہی باجو کچھ ہوا اس پر مجھے الشبوس ہے۔ میرا منتظر نہیں تھا۔ شاید آپ کو اب احساس ہو گیا ہو۔“ میں نے بلبلہ اور صورا چھوڑ دیا۔ میں نے ذکر کرنا چاہتا تھا کہ ان ماں بیٹے کے کروتے نے مجھے ان کے خلاف حرکت میں آنے پر مجبور کیا تھا لیکن میں یہ بات نہ کہہ سکا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اس نے ایک اور پرچی پر کچھ لکھنا اور پرچی میری طرف بڑھا دی۔ اس پر لکھا تھا ”میں نے تمہیں معاف کیا۔ تم بھی مجھے معاف کرو۔ اللہ بھی ہم سب کو معاف کرے مجھے اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم جاسکتے ہو۔“

میں خاموشی سے ڈرائیو سے کی طرف چل دیے۔ ہم گاؤں

البتہ ہم نے اسے گاؤں سے اپنی آج کی ملاقات کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں اور رحیم کل دونوں ہی ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر رحیم کل اسے آج کی ملاقات کا احوال بتانے لگا۔

رحیم کل نے بات ختم کی تو زرتاج ایک طویل سانس لے کر بولی "بڑی افسوس ناگ سی کمانی ہے لیکن زیادہ افسوس ناگ بات یہ ہے کہ انسان ایسی افسوس ناگ کمانیوں سے قطعاً عبرت نہیں لگاتا۔"

ایک لمحے کی بوجھل سی خاموشی کے بعد میں نے کہا "سرمال اس سارے واقعے سے میرا جو صلہ بہت بڑھا ہے اور اس نظریے پر میرا ایمان مزید پختہ ہو گیا ہے کہ اگر آپ غلط نیت کے ساتھ کسی صحیح کام کے لئے جدوجہد کر رہے ہوں تو ضرور کامیابی ہوتی ہے۔"

"غلطی نیت تو بڑی کمال کی چیز ہے پیارے! رحیم کل غلطی سانس لے کر بولا "غلطی نیت کی وجہ سے تو بعض اوقات بڑے لوگوں کو اپنے بڑے کاموں میں کامیابی نصیب ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بڑے کام بھی یہ سمجھ کر کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ کوئی بڑا جہاد کر رہے ہیں۔"

میں نے ایک فیصلے پر پہنچنے ہوئے کہا "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ حیران دل والے قہقہے کو میں نے ہی انجام تک پہنچایا ہے اس معاملے میں تم سمیت کئی لوگوں نے میری مدد کی۔ اس کے باوجود درحقیقت ایک عجیب باتھ نے ہی ہمارا کام آسان کیا ورنہ ابھی اس میں بڑی دشواریاں تھیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کام کا آغاز میں نے ہی جوش میں آکر کیا تھا۔ اس کے بعد خود بخود گویا اسباب بننے چلے گئے۔ نقصان تو اس میں بہت ہوا۔ ہم موناہ فرح، خوالہ اور ظفر، نال کو حرنے سے نہیں بچا سکے۔ شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ساحرے سے کم از کم ایک فتنہ تو کم ہوا۔ دنیا کی بد صورتی کچھ تو کم ہوئی ہوگی۔

فتنہ برابر ہی سی۔  
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ اصل بات کرو۔" رحیم کل نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اب میں عقل کے طور پر اسی قسم کے کام کیا کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔  
"کس قسم کے کام؟" رحیم کل نے وضاحت ہائی "جیسے حیران دل کر رہا تھا؟"

"تمہارے تئیں میں خاک۔" میں نے تیزی سے کہا "فدا نہ کرے کہ میں حیران دل کے نقش قدم پر چلوں۔ میں تو اس قسم کے لوگوں کو انجام تک پہنچانے کی بات کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ جس طرح مونا کی بہن خدرا میرے پاس مذکور درخواست لے کر آئی تھی اس طرح اگر کوئی کسی معاملے میں مجھ سے مدد چاہا کرے گا

کچھ دیر بعد انہوں نے مجھے ہوٹل کے سامنے آتا دیکھا اور خود ایسی روانہ ہو گئے۔

اسی شام رحیم کل سے میری دوبار ملاقات ہوئی لیکن اس وقت وہ کسی کام سے نہیں بلکہ محض کپ شپ کے لئے آیا تھا اور ماہ لباس میں تھا۔ اسے کچھ فرصت میرا آگئی تھی یا یوں کہنا چاہئے غاکر اس نے زبردستی اپنے لئے فرصت نکالی تھی۔ اس کے ذہن پر دیگر معاملات کے علاوہ حیران دل والے قہقہے کی وجہ سے کافی مایہ خاں۔ اب وہ کچھ سستا چاہتا تھا۔

انفاق اس کی آمد کے یکدم بعد ہی زرتاج بھی آ پہنچی۔ رحیم کل کی موجودگی میں وہ کچھ ریزہ ریزہ ہو جاتی تھی اور رحیم کل کے انداز و اطوار اور گفتگو میں بھی خواہ مخواہ ایک تکلف اور کھنچاؤ سرا آجاتا تھا لیکن اس روز میری کچھ دیر کی کوشش سے یہ تکلف اور کھنچاؤ دور ہو گیا۔ میں نے ان دونوں سے ایک وقت پچھڑ چھاؤ اور ہرے بازی شروع کر دی۔

وہ بھی چرچے والے نہیں تھے۔ موڈ خواہ کیا بھی ہوتا۔ حسب موقع جواب دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح میرے ایک وقت دونوں نمازوں پر پچھڑ چھاؤ کرنے سے خاصی پچھڑیاں پھوٹیں اور ماحول خوشگوار ہو گیا۔ ورنہ وہ دونوں ایک وقت میرے سامنے آجاتے تو میرے لئے بڑا مسئلہ سا کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس وقت شاید ہم تینوں ہی کچھ دیر کے لئے اپنے اپنے نظرات سے نجات پا فرار چاہتے تھے۔ اس لئے جلد فنی مذاق میں لگ گئے۔ ہلکے ہلکے اسٹیکس اور کافی وغیرہ کا دور چل رہا تھا۔

اسی دوران میں زرتاج بولی "گفتا ہے اب تمہارا میاں ہوٹل کے کام میں کافی دل لگ گیا ہے۔ کافی دیر سے تم نے لاہور کا رخ ہی نہیں کیا۔"

"لاہور کا نام نہ لو۔ ابھی راحیلہ کا فون آجائے گا۔" میں نے فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے تو دیے بھی گویا الامام ہو جاتا ہے کہ کب تم میرے پاس پہنچی ہو۔"

رحیم کل ہچکچاتے ہوئے بولا "یہ۔۔۔ راحیلہ کیا تمہاری کوئی چاہنے والی ہیں؟"

زرتاج نے استہزائی سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور رحیم کل سے مخاطب ہوئی "کیوں ہے چارے کے دل کے زخموں کو پچھڑ رہے ہو۔ معاملہ آگتا ہے۔ راحیلہ ان کی چاہنے والی نہیں ہے بلکہ موصوف راحیلہ کے چاہنے والے ہیں اور اُدھر وہ معاملہ ہے کہ۔۔۔"

میں نے زرتاج کو گھورا اور اس نے بات اور دوسری چھوڑ دی پھر وہ کچھ ہی گویا ایک جھٹکے سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولی "تم کہہ دوں حیران دل والے پکڑے کھل طور پر پھٹکا رہا ہے کچھ نہیں؟"

زرتاج بھی اس معاملے کی تمام تفصیلات سے واقف تھی

تو میں ذرا ابتدائی معلومات کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد ای بھر لیا کروں گا۔"

رحیم گل خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی "خدا جب میرے پاس موت کی تلاش کے سلسلے میں مدد کی درخواست لے کر آئی تو میں نے اسے گمشدگی کا ایک عام سا معاملہ سمجھ کر انکار کر دیا تھا۔ ویسے بھی میں تم پولیس والوں کے کاموں میں ہانک اڑانا نہیں چاہتا تھا لیکن جب مجبور ہو کر میں نے اس کی مدد کی ہائی بھری تو یہ معاملہ نہ در نہ کچھ اور ہی نکلا چلا آیا۔ اس کی کڑیاں نہ جانے کہاں سے کہاں جا ملیں اور ایک چکر میں نہ جانے کتنے چکر نکل آئے۔"

"اب تمہیں شوق چڑھ رہا ہے کہ اس قسم کے کاموں میں آئندہ بھی ناگ اڑائی چاہئے؟" رحیم گل بدستور مجھے گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا "ذرتاج استہزائیہ سے لمبے میں مجھ سے مخاطب ہوئی "گلتا ہے کاروبار میں آج کل تمہارا دل نہیں لگ رہا؟ یا پھر رویہ بدست لگایا ہے؟"

"کاروبار میں اس طرح تو میں نے بس دل نہیں لگایا کہ اس کے پیچھے جان دے دوں۔" میں نے جواب دیا "ویسے بھی میرا کاروبار تو "خود کار" ہے۔ میں دلچسپی لوں یا نہ لوں چل ہی رہا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ چل چھل رہا ہے۔ حالات کی تمام تر خرابی کے باوجود محتاج دے ہی رہا ہے اور ہر تھوڑے عرصے بعد اس میں کوئی نہ کوئی وسعت بھی آتی جاتی ہے۔ میں نے کاروبار کے چکر میں اپنے آپ کو پاگل نہیں بنا رکھا۔ میں زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس اب بھی جتنا کچھ ہے یہی میری سات نسلوں تک ختم نہیں ہوگا۔ اور ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نسلیں دنیا میں آئے ہیں یا نہیں۔"

"اگر راجیلہ کے چکر میں رہو گے پھر تو شاید کاغذ اب نہیں ہوں گی۔" ذرتاج نے فوراً قلم دیا۔

میں نے ایک بار پھر اسے گھورا "بھئی راجیلہ کو کچھ میں مت لاؤ۔ اس وقت کچھ اور طرح کی گفتگو ہو رہی ہے۔ بہت عجیبہ موضوع پر بات ہو رہی ہے۔"

"میں سمجھی رہی راجیلہ بھی بہت عجیبہ موضوع ہے۔" ذرتاج مصو بہت سے بولی۔

"نہیں۔ دور عجیبہ موضوع ہے۔" میں نے کہا۔ رحیم گل اصل موضوع پر رچے ہوئے بولا "تمہارا مطلب ہے کہ اس قسم کے "چنگ" لینے کا عمل جاری رکھا جائے؟"

"بھئی میرے پاس فرصت بھی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں جب چاہوں، جتنی چاہوں فرصت نکال سکتا ہوں۔ دساکل بھی لیں۔ کچھ ساتھی بھی ہیں۔ تم جیسے مجھے اور ملائی پولیس افسران سے دوستی بھی ہے اور بھی تو زیادہ مت اثر دسو۔" میں نے کچھ قہقہے کا مگر کیا مانے صرف کاروبار کرتے رہنا تو کوئی ذرا نہیں

ہے۔" "تمہیں خدمتِ خلق کا شوق چڑھ گیا ہے؟" اب ذرتاج نے بھی مجھے گھورا۔

"نہیں اسے خدمتِ خلق بھی نہیں کہہ سکتے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "یا پھر شاید یہ ذرا مختلف قسم کی خدمتِ خلق ہوگی۔ میں پوچھی اٹھ کر ہر ایک کی مدد کے لئے نہیں چل دوں گا۔ فرض کرو کوئی غریب انسان میرے پاس کسی معاملے میں مدد کی درخواست لے کر آتا ہے اور معاملہ اہم معلوم ہوتا ہے تو میں اس کو خدمتِ خلق ہی سمجھ کر اس کے کام آئے کی کوشش کروں گا لیکن اگر کوئی لکھ پٹی یا کوڑ پٹی آتا ہے تو اس سے تھوڑی سی کاروباری گفتگو بھی ہوگی۔"

"یعنی اس سے فیس لوگے؟" رحیم گل فرمایا۔

"اگر لے بھی لوں گا تو اس سے تمہیں تو تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔" میں نے جواب دیا "اگر کسی دولت مند آدمی سے اپنے قیمتی وقت کا معمولی سا معاوضہ لے بھی لیا جائے تو اس میں کیا بُرائی ہے۔"

"وہ "معمولی" سا معاوضہ کیا ہو گا؟" رحیم گل جھینٹے ہوئے لمبے میں بولا۔

"میرا خیال ہے اس کا کوئی طے شدہ اصول تو نہیں ہو سکتا۔"

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ یہ سب کچھ اسی وقت میرے ذہن میں آ رہا تھا اور میں ساتھ کے ساتھ بات کئے جا رہا تھا "کسی بھی معاملے میں اس کے بہت سے پہلوؤں کو بر نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً جو شخص مسئلہ لے کر آیا ہے اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔ یعنی وہ اہم ہے یا غیر اہم اسے حل کرنا آسان ہے یا مشکل۔ اندازاً اس میں میرا کتنا وقت صرف ہو جائے گا۔ یہ سب باتیں سوچنا چاہئیں گی۔ کیا معاوضہ چند ہزار بھی ہو سکتا ہے اور چند لاکھ بھی۔"

"بلکہ دھندلا چل نکلا تو معاملہ کو ڈوڈ کر ڈک بھی جاسکتا ہے۔" رحیم گل بدستور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں۔" میں نے اسے چرائے والے انداز میں کہا "لیکن تم اس کے لئے "دھندلا" کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہو غیبت آئی؟ میں کوئی یہاں جس پر فردی بیرون فروشی یا ایسے کی اسٹالک ڈیفو تو شروع نہیں کر رہا ہوں۔ تم پولیس والوں کو تو شرٹا کا برفس "مشغلے" خدمتِ خلق سب کچھ ہی "دھندلے" نظر آتے ہیں۔"

"تم اپنے آپ کو شرٹا میں شمار کرتے ہو؟" وہ استہزائیہ لمبے میں بولا۔

"کم از کم کسی پولیس والے کے مقابلے میں تو میں بہت زیادہ شریف آدمی ہوں۔" میں نے اس کی ذمہ داری درگہ چھوڑ دی۔

"لا، پچھو لا، اس نے سب کچھ اس لئے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے

بلے سے لیے جس کما "باتی سب لوگ جو چاہے کرتے پھر ان کے اعمال کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ گالیاں کھانے کے لئے ایک پھل نہیں لی ہوئی ہے۔"

زرنج گویا ہمارے درمیان صلح صفائی کراتے ہوئے بولی "تم دونوں کو ایک دوسرے پر الزامات کی گولا پاری کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی پہلی مصلحت ٹھنڈک ہو رہی تھی کہ تم نے سونکوں کی طرح لڑنا شروع کر دیا۔"

پھر اس نے رحیم گل کو سمجھایا "بہتر افضل آخر پرنس میں ہے۔ پرنس میں ہر معاملے میں پرنس کا پہلو تو دھڑکتی رہتا ہے۔ یہ لوگ تو کسی کے جنازے میں شرکت کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی کوئی پرنس ذلیل کرتے ہیں۔"

"آخر تم بھی غواہی کری گئیں۔ دھڑکنے سے جا ملیں۔" میں نے آہ بھر کر کہا "آخر جاگیر دارانی ہو نا۔ جاگیرداروں اور پولیس والوں کا پیشہ ہے کہ جو ڈر رہا ہے۔"

"تم تو اب سیاسی خیالات پر اتر آئے۔" زرنج معمولی عقلی سے بولی "سیاسی خیالات سے پرہیز کرو۔ ہم سیاسی لوگ نہیں ہیں۔" "سودی۔" میں نے فوراً ضرورت کی "اگر تمہیں میرے الفاظ سے سیاست کی بوسہ بلکہ بددعا آئی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن تم لوگ بھی قبول دیکھانے والی باتیں کر رہے ہو۔ میں تو یک نیتی سے ایک مشعل شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے اس میں پیدا گیری کے پہلو تلاش کرنے شروع کر دیے جیسے یہ بھی کوئی سرکاری منصوبہ ہے۔ تم پہلے پوری بات تو سن لیتے۔"

"چلو سناؤ۔ جو کچھ نہ دیکھا ہے وہ بھی سناؤ۔" رحیم گل گویا دل پر پھر کھینچے ہوئے بولا۔

"اگر میرے پاس کوئی ایسا شخص مسئلے لے کر آئے گا جو میرے وقت کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہوگا لیکن اس کا مسئلہ حقیقتاً سنگین اور قہر طلب ہوگا تو میں بلا حاشیہ بھی اس کے لئے جو کچھ کر سکا وہ ضرور کروں گا۔ بلکہ اگر اٹلا کوئی مدد کا مستحق ہوا تو میں اس کی مدد بھی کروں گا۔"

"ہاں اگر اتنی دولت میں سے دو چار ہزار نکال بھی دو گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔" رحیم گل حثارت سے بولا "مستند سے چند قطرے نکل جائیں تو اس میں کمی نہیں آئی۔"

"میں نے سیکڑوں ہزاروں کی بات نہیں کی ہے۔" میں نے اسے لانت پلانے کے انداز میں کہا "مسئلہ اگر لاکھوں کا بھی ہو تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"مجھے میرا رحیم گل نے ہاتھ اونچے کر کے ہلکی سی نالیاں بجاتیں۔" آج اپنے بیٹھ صاحب بڑی سخاوت کے موڈ میں ہیں۔

زرنج منہ بھر کر بولی "ابھی صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ جب عمل کی ضرورت آئے گی تب یہ کہیں گے۔"

رحیم گل مجھ سے قاطبہ ہوا "ویسے بالی داوے۔ تم یہ باتیں

ہیں کیوں بتا رہے ہو؟

"پہلی کی مشغوری کے لئے۔" میں نے جواب دیا "یہ خیال چونکہ کچھ دیر پہلے ہی میرے ذہن میں کھلنا شروع ہوا ہے اور فی الحال صرف تم دونوں ہی حاضر اسٹاک میں دستیاب ہو۔ اس لئے تمہارے کان میں بات ڈال دی ہے کہ شاید کوئی قسمت کا بار تم لوگوں سے ہی آکر آئے اور تم دونوں اپنی اپنی بیوریوں کی وجہ سے اس کے لئے کچھ نہ کر سکو تو اسے میری طرف بھیج دینا۔ یہ لاکھ پلٹی ہے۔ اکثر کام اسی طرح محدود پیمانے سے شروع ہوتے ہیں نا۔"

"اس کام کی تو اگر پہلی ہو گی تو تمہارے ہاں کوئی تو ہفتہ شروع ہو جائے گا۔ یعنی تمہارے ہوش کی تمام کمزوریاں ٹوٹ جائیں گی۔ بلکہ میں ممکن ہے تمہارے اپنے چمکے کی بھی شامت آجائے۔ خصوصاً اگر لوگوں کو پتا چل گیا کہ تمہاری اس شخصیت میں خدمت غلط۔ اور مستحق کی ہر طرح کی امداد وغیرہ کے پہلو بھی شامل ہیں پھر تو لوگ اپنے اپنے مسائل کے انبار کے کریم پر ٹوٹ پڑیں گے جس سے تو اندازہ ہی ہوگا کہ تمہارے ہاں ملحق خدا کس قدر پریشان پڑ رہی ہے۔ ہر شخص اپنے کندھے پر مسائل ڈکھوں اور پریشانیاں کا پتلا نہ اٹھائے پھر رہا ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں عمومی مسائل کی بات نہیں کر رہا ہوں جو ہمارے نظام۔ مختلف محکموں یا لوگوں کی نجی زندگیوں کی اصلاح کا کچھ پیداوار ہیں۔ ان سے شے کے لئے تو مجھ جتنے مسائل اور کچھ جیسی سوچ رکھنے والے کو ڈو کو ڈو کامیوں کی ضرورت ہوگی۔"

"بیکہ نہیں ایک ہی چراغ لے کر دھوئے سے ملتا ہے۔" زرنج نے لہجہ دیا۔

"بے شک" میں نے پیچیدگی سے سر ہلایا "ہمارے ہاں تو لوگوں کے خاص مسائل بھی اب عام ہو چکے ہیں۔ میں ان میں اُلجھا افروز نہیں کر سکتا۔ میں تو کسی بہت ہی خاص یا نہایت غیر معمولی مسئلے کی بات کر رہا ہوں جس میں انسان کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور بات بہت ابھی ہوئی بھی ہو یا اس کی وجہ سے سوسائٹی میں کوئی نیا یا کچھ پیدا ہو رہا ہو۔ ہمارے ہاں پہلے ہی اتنا بگاڑ موجود ہے کہ مزید بگاڑ ہم افروز نہیں کر سکتے۔ کہیں اور مسائل کے معاملے میں ہم ایک خود قبیل قوم ہیں بلکہ اگر ان چیزوں کی ایک رپورٹ کی تجاویز ہوتی تو ہم بہت زیادہ زبردست کام کر رہے ہوتے۔"

"پر عورتوں کی ایک رپورٹ میں بھی کچھ بد عورتیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔" زرنج بولی۔

"جیسا کہ" میں نے اس کی تائید کی "میرا حال۔ میرا تم لوگوں کو اس پر گرام سے آگاہ کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ تم ہر ایک سے ذکر شروع کرو کہ یہاں ایک سیما بیٹا ہوا ہے جس کے پاس ہر

”ہاں وہ قاسم بھائی والے پکر میں مجھ سے حصار ہوئی تھی۔ ہزار نامی ایک اسکول بچہ اس کی بڑائی دوست نکلی۔ امیر اسے ساتھ لے کر اس سفارش کے ساتھ میرے پاس آئی تھی کہ میں اس کی گشتہ بہن کو تلاش کرنے میں اس کی کچھ مدد کروں۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کے کاموں میں میرے ٹانگ اڑانے کی کوئی تک نہیں بنتی۔ میں نے اسے تو باپوں کے بھیج دیا لیکن بعد میں ایک وجہ ایسی بن گئی کہ میں نے اس کی بہن کو تلاش کرنے کی ہائی بری اور اس تلاش کے دوران میں بات کہاں سے کہاں تک پہنچی یہ سب تفصیلات تم دونوں ہی کو معلوم ہیں۔ یہ افسوس ناک واقعات کا ایک سلسلہ ہے لیکن مجھے اس پر خوشی بھی ہے۔ ہمارے ہاتھوں ایک بہت بڑا اور بہت پستلو قسم کا قتلہ ختم ہو گیا۔“

”... اور اب تمہیں چاٹ لگ چکی ہے کہ اس قسم کے حکام کسے دھتلا جائے۔“ رجم گل بھٹی نے سانس لے کر بولا۔

”میری اس تجویز میں تھیر کا پہلو پنہاں ہے۔“ میں نے ایک بار پھر اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

”ہاں اس میں کیا شک ہے۔“ اس نے سر ہلایا ”تم اس میں بھی کچھ کمائی کر لو گے۔ اور ظاہر ہے کمائی سے قیصر ہوتی ہے۔ ممکن ہے چند برس میں تم ایک اور ناپوش اشار ہو کر قیصر کر لو۔“

”پولیس کی نوکری میں واقعی انسان کی فطرت غراب ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایک کی نیت پر شک کرتا ہے۔“ میں نے غصے سے اسے گھورا مڑبڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم تو اب کوئی اچھی بات سننے کے بھی قابل نہیں رہے۔ میرا خیال ہے پولیس والوں کے سامنے تو کوئی اچھی بات کرنی ہی نہیں چاہئے۔“

”بس بس“ رجم گل ہاتھ اٹھاتے ہوئے ششمان لہجے میں بولا ”زیادہ غصا لے کر ضرورت نہیں پیارے خدا کی فوج داماد میں تو یونہی ذرا تم سے جھلس ہو رہا تھا۔ بھئی تم جیسے انسانوں سے جھلس ہونا مجھ جیسے انسانوں کا اخلاق فرض ہے۔“

”کس بنیاد پر؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی ایک بنیاد ہو تو بتاؤ۔ بنیادیں ہی بنیادیں ہیں۔“ وہ آہ بھر کر بولا ”تم مجھ سے زیادہ دولت مند ہو۔ مجھ سے زیادہ بارسوخ ہو۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں سے تمہاری گہری دوستی ہے جبکہ ہم غریبوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔“

”پھر وہ جیسے اصل موضوع کو بھول کر مزید جھگڑا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مصنوعی شہجیرگی سے بولا ”ہوئیے۔ بار بار جگ بتاؤ اور شہجیرگی سے تیار۔ آفراس کی کیا وجہ ہے؟ کوئی ٹوکی بھر چر مہیاں کیوں نہیں ہوتی جبکہ میں تم سے زیادہ پیڑم ہوں۔“

”تم مجھ سے زیادہ پیڑم ہو؟“ میں نے آنکھیں پھاڑ کر تفرقا کرنے کرتے کہا۔

”ہاں اس میں کیا شک ہے۔“ وہ اپنی مصنوعی شہجیرگی برقرار

دکھ درد کا طعنہ موجود ہے۔ اس طرح تو واقعی کڑکیاں درد اڑنے سے کچھ ٹوٹ جائے گا۔“

”تمہیں اطمینان رکھو۔ ہم تمہارے پاس بہت سی خاص قسم کے کیس بھیجا کر دیں گے۔“ در تاج نے مجھے تسلی دی۔

”ہمارے پاس ایسے کیس آئیں گے جیسی تمہیں گے گا۔“ رجم گل بولا ”میرے پاس تو اگر کوئی مسئلہ آتا ہے تو ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے میں خود اسے حل کرنے یا اس کی تحقیقات کرنے کا پابند ہوتا ہوں۔“

”اصل میں تم تو ذرا نایاب قسم کے پولیس آفیسر ہو۔ اس لئے تم اپنے آپ کو مسئلہ حل کرنے یا اس کی تحقیقات کرنے کا پابند محسوس کرتے ہو ورنہ تمہارے منگے والے تو اپنے آپ کو ایف آئی آوریج کرنے کا بھی پابند نہیں سمجھتے۔“ میں نے طاقت سے کہا اور اسے جواب میں کچھ بولنے کا موقع دے بغیر بات جاری رکھی ”مہربان! اس سے قطع نظر۔ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں تم جیسا پولیس آفیسر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بہت سی جگہوں پر اس کے آڑے آجاتی ہیں یا پھر یہ ہوتا ہے کہ معاملہ تو تمہارے علم میں آجاتا ہے لیکن جس شخص کا وہ معاملہ ہوتا ہے وہ پولیس کی مدد حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے معاملات تم میرے علم میں لاسکتے ہو۔ بعض معاملات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو میرے علم میں آجاتے لیکن مجھے ان کے سلسلے میں کسی سر میرے پولیس آفیسر کی مدد کی ضرورت ہو۔ ایسے موقعوں پر میں تمہیں تکلیف دوں گا۔ جیسا کہ میں نے ہر دانشور والے معاملے میں کیا تھا۔ اس طرح تمہارے ضمیر کو بھی کافی خوش اور مطمئن رہنے کا موقع ملے گا۔“

”میرے ضمیر صاحب تو پہلے ہی کافی خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ ان کی صحت بھی خاصی بہتر ہے۔“ رجم گل بے پروائی سے بولا۔

”مجھے تو کافی کمزور اور محض دکھائی دیتے ہیں۔ سنا ہے کبھی کبھی ان کی آواز بھی تم تک نہیں پہنچتی۔“ میں نے کہا۔

”ظاہر سنا ہے تم نے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا ”ان کی چیخ پکار سے تو میرے روبرو تک تک رہتے ہیں۔“

”خیر تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔“ میں نے احسان بنانے کے سے انداز میں کہا ”میرا مقصد یہ ہے کہ ایک دورے کو اس قسم کے معاملات سے آگاہ وہ کہہ کر ہم کبھی کبھار کوئی اچھا بھلا بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اب یہ جو دانشور والے معاملے کو ہی لے لو۔ میرے قریب وہ مکان میں بھی نہیں تھا کہ اس معاملے میں کوئی فرد دانشور بھی نکلی آئے گا۔ اس طرح کوئی سے کڑی ملتی جائے گی اور ایسے ایسے ہوش ربا انکشافات ہوں گے۔ یہ تو محض اتفاق ہی تھا کہ میں نے امیر کو ٹیکہ ماری رکھ لیا تھا۔“

”وہ بھی تو ایسے ہی کسی قتلے کی وجہ سے تمہارے حصے میں آئی تھی۔“ رجم گل بولا۔

دعوت سے کہہ دوں گا کہ وہ فوٹے پھوٹے اور غلیظ برتنوں میں سو کھائے امید ہے پھر تو تم دونوں کو کھانے میں مزہ آجائے گا۔ رحیم گل کی بھی ایسی اوقات ہے۔ ایک باری مجھے ساحل پر لے جا کر اسی میاں کی چھٹی کھانا چکا ہے۔

”خیر تم میری خاطر انا ایسا رمت کرو۔“ زرتاج شرمندہ ہوئے بغیر بولی ”میں کھر مار کھا لوں گی۔ مجھے ایک بہت اچھا لک لک گیا ہے۔ تم دونوں اب بھی میرے ہاں آکر کھانا کھاؤ۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔“

”کیا وہ خوش شکل ہے؟“ میں نے تشریف سے پوچھا۔  
”کون؟“ وہ حیران ہوئے ہوئے بولی۔  
”نیک“ میں نے کہا۔

”اس کے چہرے پر بالکی سی سرفی آئی۔ دانت ہیں کرولی“ اسی کوئی بات نہیں ہے۔ کالا بھنگ ہے۔ وہ چھوٹا سا ہے۔ چھٹی سی ناک ہے۔ خود آکر دیکھ لیتا۔“

”توہ میں تو ذرا سی کیا تھا۔“ میں نے گویا اطمینان کی سانس لی  
”اصل میں خطرہ ہی رہتا ہے۔“  
”کیا خطرہ؟“ اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”بندہ خوش شکل ہو اور اسے بہت اچھا کھانا پکانا بھی آتا ہو تو تم جیسی لڑکیوں سے ذرا سی رہتا ہے کہ کہیں اس سے شادی نہ کر لیں۔“ میں نے کہا۔

زرتاج خوشخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی ”دل چاہ رہا ہے پیروٹ اٹھا کر دے ماہول۔“

”اس وقت پولیس آفیسر کی قریب ہی بیٹھا ہے۔ اقدام قتل کا مقدمہ درج ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔“ میں نے رحیم گل کی طرف دیکھا پھر غصیلی سانس لی ”مگر یہ بے چارہ تمہارے خلاف مقدمہ کھال درج کرے گا۔ یہ تو تم پر کوئی آج آنے سے پہلے بنی ہوئی ہے۔ چلا آگ لگا کر جان دے دے گا۔“

رحیم گل یکدم ہی جھجھکیا نظر آنے لگا اور زرتاج کے چہرے پر سرفی گہری ہو گئی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی ”اب تو میں چلی ہی جاتی ہوں۔ درنہ نہ مستعمل ہو اس کہتے رہو گے۔“

میر کا بڑی بڑی گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے ہاتھ بڑھا کر درو سری طرف سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے پیچھ کر بٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ سے ایک برقی دی سی میرے جسم میں سرات کر گئی۔ ایک طویل عرصے بعد میں نے اسے چھڑا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اسے چھوٹا میرے لئے پہلے سے زیادہ خطرناک تھا۔

دیے بھی اسے اس کی مرضی کے خلاف محض ہاتھ پکڑ کر پیچھ کر کر رہی پر بخارنا آنا آسان نہیں تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھا جن کے دجور میں شعلوں کی سی حرارت، چولوں کی سی ملائمت اور فواد کی سی مضبوطی ایک دقت موجود ہوتی ہے۔ اسے میرے درو سری طرف سے ہلانے میرے لئے بھی ذرا مشکل تھا۔ اس کے لئے

رکتے ہوئے بولا۔ ”زرتاج کو چھوڑ کر۔ اور کسی بھی لڑکی سے فیصلہ کرالو۔ وہ مجھ پر سمان ہو یا نہ ہو لیکن جیڑم ہونے کے معاملے میں اس کا دوت میرے حق میں ہو گا۔“

”ٹی دی پر پتھوں کے لئے ایک پروگرام آتا تھا۔ کیا۔“ میں نے گھرے گھرے لہجے میں کہا ”اگر تم نے بھی دیکھا ہو تو شاید تمہیں یاد ہو۔“

”ہاں یاد ہے۔“ وہ ہلاتا بولا۔

”اس میں ایک جیڑم ہوا کرتا تھا۔ تم اسی قسم کے جیڑم ہو۔“ میں نے کہا۔

زرتاج منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔ رحیم گل نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور ایک مصرع کی غانگ توڑتے ہوئے دو دناک لہجے میں بولا ”جنہ چ نکھے تھا وہی گدے ہوا دینے لگے۔“

میں نے رو الوم چیز کے پیشے سے نیک لگاتے ہوئے کہا ”یارے رحیم گل! تمہاری جس مزاح کچھ بھڑھوتی جا رہی ہے۔ یا پھر اصل بات یہ ہے کہ جب پولیس کی درو دی تمہارے جسم پر نہیں ہوتی تو تمہاری ذہنی ملا جھتی جاگ اٹھتی ہیں؟“

رحیم گل جھگے سے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ”خدا کے لئے پولیس ڈیپارٹمنٹ کا بیچا چھوڑ دو یا آج تو تم پیٹے اور کوم جھاڑ کر پولیس کے پیچھے بڑھتے ہو۔ پولیس کو برا بھلا کہنے کے لئے کافی لوگ ہی کافی سے زیادہ ہیں۔ تم یہ فریڈ اپنے ذمے مت لو۔“

”معاف کرنا۔ میں بھول گیا تھا کہ یہ تمہاری دیکھتی ہوئی دہم۔ میرا مطلب ہے تمہاری دیکھتی رگ ہے۔“ میں نے معذرت کی۔

زرتاج اٹھنے کے لئے برقعے ہوئے بولی ”جی میں اب آپ دونوں دہم دار حضرات سے اجازت چاہوں گی۔ پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔“

”تم ابھی سے کہاں چل رہی۔“ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے پیشے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بہی اتفاق سے تو ہم تینوں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اب اکٹھے کھانا بھی کھالیں گے۔ دیے بھی تم جیسے یا رحیم گل جیسے قیمتی مسکن میرے ہاں آتے ہیں تو میں انہیں کھانا کھانے بغیر نہیں جانے دیتا۔“

”جی۔“ مجھ جیم مسکن کو تو معاف ہی رکھو۔“ زرتاج بولی ”میں تمہارے اس ہونے کے پیچھے بیٹھے کھانے کھا کھا کر رو رہی ہوں۔ اس سے تو اچھا ہے انسان کسی بھنیار خانے پر جا کر کھائے۔“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا ”انسان کو اپنی اوقات یاد رکھنی چاہئے۔ آج تم اسے ہی بھننا خانہ سمجھ لو۔ میں شیفت سے کہہ دوں گا کہ کہیں سے المونیم کی گدھی اور مڑی مڑی سی پتلی وغیرہ ڈھونڈ کر لاؤں اور اس میں کھانا تیار کرے۔ مختلف چیزوں کا پکا کچھا موغن اس میں ڈالے اور تمام سالوں کے ڈبے بھی اکٹھے دے۔“



کل منہ ہا کر بولا۔

”چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے شریف انسان کی بات کی اپنی بات نہیں کی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

رجیم گل ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور زرنج کی طرف دیکھ کر بولا ”اب رخصت ہو لیا ہوا ہے حق میں بہتر ہے۔“

”اسے اپنے ساتھ لانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ وہ تمہاری ساتھی نہیں ہے۔“ میں نے گویا اسے خبردار کیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ جس تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس وقت اس کی

سنجیدگی مصنوعی تھی یا حقیقی؟ ہم خود اُن کی بھی بظاہر سنجیدگی سے ہی کرتے تھے لیکن اس لمحے اس کے لیے میں واقعی سنجیدگی کی

جھٹک محسوس ہوئی۔

میں نے اپنے الفاظ کا اثر کم کرنے کے لئے جلدی سے کہا ”ساتھ نہیں آئے۔“ میں نے یہ جملہ منہ سے غیر جانبدار

لئے، یہ دھڑکنے والے لفظوں کو بولنے کے لئے پھوڑا ہوا ہے۔ اس سے زرنجہ زخمی ہو گیا ہے یہ خود بھی اسے ایک آدھ مرتبہ

چہچہا رہی تھی۔ ہمیں اس خود غرض مرضی کی سازش کو سمجھنا چاہئے اور خود ہو کر مقابلہ دار اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔“

”کلی کسی نشست میں اس پر غور کریں گے فی الحال تو میں چلا دوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ میں ان دونوں کو چھوڑنے کے

لئے ان کے ساتھ ساتھ ٹھٹھا پارکنگ لاٹ تک چلا گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ہاتھ دلاتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ میں

چٹون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لیٹا بیٹھا اٹھک رہا تھا۔ اس کی ذمہ داری ہال میں آگیا اور کھانا کھانے کے بعد اوپر اپنے کمرے کی طرف چل

دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اب یہی مکان کر سوں گا اور ہوسکا تو کل شام کو ہی انھوں گا۔

بظاہر ان دونوں مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پیر دانش والا معاملہ بھی ختم چکا تھا۔ صرف وہی نہیں اس کی ماں بھی گویا اپنے

انجام کو پہنچ چکی تھی۔ آج میں اسے جس حال میں دیکھ کر گیا تھا اس پر مجھے طمانیت کا احساس ہونا چاہئے تھا لیکن نہ جانے کیوں

میرے اندر کہیں ایک بے عنوان سا اضطراب تھا۔ کئی بات تو یہ تھی کہ جب سے پیر دانش والے فقے کا آغاز ہوا تھا تب سے ہی

میری زندگی کے سکون میں کچھ خلل سما گیا تھا۔ جبکہ میری زندگی میں ویسے بھی سکون کا عمل دخل کچھ کم ہی تھا۔

بہر حال پیر دانش سے سامنا ہونے کے بعد تو مجھے ذہن پر مستقل طور پر کوئی محسوس ہی چھائی تھی۔ شاید اس کے اعمال کی

نحوت سمجھ رہی اڑا ہوا ہونے لگی تھی۔ اب اس کا قہقہہ گج معوض میں ختم ہو چکا تھا۔ اب میں بھی اس باپ کو صحیح معنوں میں

بند کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سوکر انھوں کو میرے ذہن میں پیر دانش یا گاڈز کی یاد کی کوئی پرچھائیں موجود نہ ہو۔ میرے

مجھے میز کے گرد گھوم کر اس کے قریب جانا پڑا جبکہ رجیم گل کی نظر میرے اور زرنج کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک

عجیب سا رنگ آکر گزر گیا۔ میں نے جلدی سے زرنج کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”بہنی آج میں تم دونوں کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔“ میں نے پہلے ہی جیسی روٹانہ بے تکلفی سے کہا۔ میرے اور

زرنج کے درمیان تعلیق کی نوعیت کیا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رجیم گل اسے سمجھے یا سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کی کوشش میں

زنا اندازے قائم کرے۔ اس طرح اس کا دکہ بڑھ سکتا تھا۔ فی الحال اس کا دکہ عروسی اور نرسائی کا دکہ تھا۔ پراس کے دکہ میں

بایو سی اور بداحتمالی کا دکہ بھی شامل ہو سکتا تھا۔ رجیم گل گویا کسی خیال کے پھندے سے لپکتے ہوئے بولا ”مجھے

تو اس لئے یہاں کھانا کھانے سے معاف رکھو کہ کسی اخباری آدمی نے دیکھ لیا اور وہ میرا مصورت آشنا ہوا تو فوراً کل پرسوں کے اخبار

میں خبر لگ جائے گی کہ تمناؤں کے ایسے اچھے اوقات میں اشار ہو گلا، میں کھانا کھاتے ہیں۔“

”اس میں کوئی ایسا خاص سہانہ نہیں ہوگا۔“ میں نے ایک بار پھر اسے چھیڑا ”ٹھیک ہے۔ وہ لوگ بے چارے تھے دیکھنے

والوں کے ذریعے ہی نائے اشار ہو گلوں میں کھانا نہیں کھاتے لیکن کھانا چاہیں تو پانچوں وقت کھا بھی سکتے ہیں۔“

”پانچوں وقت؟“ زرنج نے اپنی فکلی بھولنے ہوئے بھوسیں اُچکا کیں۔

”ہاں۔ عام لوگ تین وقت کھاتے ہیں لیکن پولیس واسے پانچ وقت کھاتے ہیں۔ خاص کر اسٹریٹ لوگ۔“ جس میں ان کی صحت

نہ اتنا زور نہیں ہوتا؟“ میں نے مصیبت سے کہا۔ ”آج تو ہمیں پولیس والوں میں کھانے کے لئے کا دوہ پڑا ہوا

ہے۔“ رجیم گل اب قدرے گھٹتے لہجے میں بولا ”گتا ہے دل میں کسی پرانی دشمنی کا غم جاگ اٹھا ہے۔“

”خدا نہ کرے میری پولیس والوں سے دشمنی ہو۔“ میں نے جلدی سے کہا ”میں کافی عرصے سے کاروبار کر رہا ہوں۔ کاروباری

آوی بھلا پولیس سے دشمنی رکھنا کہاں افروز کر سکتا ہے۔ میرے تو بھٹسے پولیس والوں سے بڑے خوشگوار تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ اور جب سے تم سے دوستی ہوئی ہے تب سے تو گویا مجھے پولیس

والوں سے ایک عجیب سی محبت ہو گئی ہے۔ جب بھی کسی پولیس واسے کو دیکھا ہوں دل چاہتا ہے کہ آگے بڑھ کر اسے گلے

لا لوں۔“ ”اور آنکھ بچا کر گھا دوادوں۔“ رجیم گل نے گھبراہٹ سے کہا۔

”اب یہ تو تمہارے اپنے دل کا چرہ بول رہا ہے ورنہ میں غلوں سے بات کر رہا تھا۔“ میں نے گندھے اچکا کر کہا۔

”اللہ ہر شریف انسان کو تمہارے غلوں سے بچائے۔“ رجیم

دل کے کسی گوشے میں کوئی غلطی کوئی اضطراب نہ ہو۔  
یہ خواہش دل میں لے گئی تھی اپنے کمرے میں پہنچ اپنا دی آگئی  
لی سوٹ میں نے خود چھوڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ عام  
سافروں کے کمروں کی نظار کے درمیان رہنا زیادہ محفوظ تھا۔ عام  
آدمیوں میں کھلے ہوئے شخص کو تلاش کرنا ذرا مشکل ہوتا  
ہے۔ دی آگئی اپنی طور طریقوں کے ساتھ انسان دور سے نظر میں  
آ جاتا ہے۔

دورانہ منتقل کر کے میں نے اپنا کی رنگ اور اس سے خشک  
فیک ایک خاص دیوار گیر خانے میں ڈالا۔ اس کمرے کی بنیاد  
دوشن ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے  
کی نیچے ہو گئی کیونکہ سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑی وہ ایک  
آئینہ تھ کہ گمن کی ٹال تھی جس پر سائنسری فنٹ نظر آ رہا تھا۔  
میں نے دو سرا قدم آگے نہیں بڑھایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ  
صاحب ہتھیار کاغذ کیا تھا۔ اسے میرے قدم بڑھانے پر اعتراض  
ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی بعض لوگوں کو تو زیکر دبانے کی بہت جلدی  
ہوتی ہے۔ وہ محض کسی ہانے کے شہر ہو رہے ہیں۔

مکن ایک نہایت کنگ سائز قسم کی مٹی میں دلی ہوئی تھی۔  
میری نظر اس ہاتھ سے پھسلتی ہوئی ہاتھ والے پر جم کر رہ گئی۔ وہ  
کمرے کے ایک کونے میں اس صوفے پر پر ایمان تھا جس کا رخ  
سیدھا دروازے کی طرف پڑا تھا۔ وہ اتنا تنیم اور دروازہ قد شخص  
تھا کہ صوفے کی مشکل سیٹ اس کے نیچے تقریباً چھپ کر رہ گئی  
تھی۔

اس کا وہ لمبا چوڑا وجود محض چلی اور پلٹے کوشت کا انبار  
نہیں تھا۔ وہ ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب  
تھی اور وہ اچیلے ڈھالے مگر نہایت عمدہ سوٹ میں تھا تاہم میرے  
لئے اس کی جسمانی ساخت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے  
یقیناً نوجوانی میں سخت محنت مشقت یا ورزشیں کی تھیں جن کے  
اثرات ابھی تک باقی تھے۔ اور کوئی بعد نہیں تھا کہ وہ اب بھی  
جان کو تکلیف دتا ہو کر اب جسم قابو سے کچھ باہر ہو چلا تھا۔

اس کا سرخ و سپید چوہا پاٹ تھا اور وہ بالکل چھپکائے بغیر  
میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ اس  
کی آنکھیں کسی حیرت طرار کوئی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ وہ طاقتور  
مردور نظر آ رہا تھا لیکن اس کا ذہن شاید زیادہ تیزی سے حرکت  
نہیں کرتا تھا۔

”ہمت انتظار کر لیا آپ نے افضل صاحب؟“ وہ ہماری اور

کو چیل میں ہلا۔  
تو اس کے وجود سے مناسبت رکھتی تھی ورنہ میں نے ہاتھی  
چھپے ڈیل ڈول کے ایسے لوگ بھی دیکھے تھے جن کے حلق سے  
منشائی ہوئی باریک سی آواز برآمد ہوتی تھی۔ اس کا لہجہ بھی کچھ  
ایسا طربیدار نہ تھا لیکن ہاتھ میں سائنسری فیک ایک نہایت

جدید قسم کی گمن بہر حال موجود تھی جس کی وجہ سے میں اسے اپنا  
دوست تو شمار نہیں کر سکتا تھا۔  
”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ میرا انتظار کر رہے ہیں حضور  
والا! ورنہ میں اس سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔“  
میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور قدم نہایت احتیاط سے آگے  
بڑھایا۔ اس نے میرے آگے آئے پر اعتراض نہیں کیا تاہم اس  
کی چوڑی پیشانی پر غصے کی لہر آئی۔ شاید اسے میرا لہجہ پسند نہیں  
آتا تھا۔

میں نے مزید ایک قدم بڑھایا۔ اس نے تب بھی کوئی اعتراض  
نہیں کیا۔ اس نے مجھے ہاتھ اٹھانے کا بھی حکم نہیں دیا تھا لیکن  
اس کے اس نرم ہلکے کا کوئی قوری کاغذ نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ  
میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں اپنی گمن نیچے آفس  
میں میری دراز میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ میرے کمرے میں بھی دروازہ  
دوب کے ایک خانے میں اور میرے بند کے سامنے بیڑیوں کے  
نیچے ایک ایک گمن موجود تھی۔ جن کا میرے ہاتھ دو دم کی کینٹ  
میں بھی ایک گمن رکھی رہتی تھی لیکن جس طرح اچانک اس شخص  
سے سامنا ہوا تھا اس کی وجہ سے اب کوئی بھی گمن میری رسائی  
میں نہیں تھی اور تینوں کی الحال میرے لئے بیکار تھیں۔ یہ بھی ممکن  
تھا کہ وہ شخص انہیں تلاش کر کے قبضے میں لے چکا ہو۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا کر کے وسط میں پہنچ چکا  
تھا۔ تب اس کے ہلے نما ہاتھ میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔ گمن  
کا رخ خیرے ہیٹ سے سینے کی طرف ہو گیا۔

”اب مزید آگے مت آنا۔“ اس نے کہا مجھے دی ہوئی  
رعایت قسم کرنے کا اعلان کیا ”جب میں ہاتھ ڈال کر یا دوسرا دوسر  
بھاگ کر کوئی ہتھول یا ریا اور دوسرا بھی نکالنے کی کوشش مت کرنا۔  
ایسی بھاگ دوڑ فضول ہوگی۔ تساری تیزوں گئیں میرے قبضے میں  
ہیں۔“

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔  
تاہم میرا یہ اندازہ شاید ٹھیک نہیں تھا کہ وہ ذہنی طور پر کچھ ست  
واقع ہوا تھا۔ اس نے کمرے میں آئے کے بعد محض میرے انتظار  
میں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کیا تھا اور ادا ہو چکا ہوا ہٹل  
ریا اور دوسرا چھوڑ نکلا تھا۔ ست ذہن والے کے اپنے ہاتھ میں  
گمن ہو تو پھر وہ اس قسم کی خدمت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔  
اس کے خیال میں اس کا اپنا مسل ہو ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ دوسرے  
خطرات کو خاطر میں نہیں لاتا۔

میں نے اپنے اس اندازے کی حجت کرتے ہوئے ایک اور  
اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میری گمنیں اس نے کہاں چھپائی  
تھیں؟ اس کے جسم پر خیرہ لاسوٹ تھا جس کی جینیں کچھ پھٹی  
پھولی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں ممکن تھا کہ اس نے گمنیں چھپائی  
میں رکھ لی ہوں لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے ان کا وزن اپنے

لے میں ہوا۔

میں دلی دل میں بیٹے بغیر نہ رہ سکا۔ باقی باتیں تو ٹھیک تھیں لیکن یہ اعلیٰ تعلیم پانڈے والا نکلا اس نے خواہ مخواہ ہی ٹانگ دیا تھا۔ میری تعلیم کے بارے میں شاید اس بے چارے کو کسی نے غلط اطلاع فراہم کر دی تھی یا اس نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ تعلیم تو میری محض انٹر شخصی جس کی بنیاد پر آج کل کے زمانے میں چڑا سی کی نوکری بھی مشکل سے ملتی ہے لیکن ایک لحاظ سے اس کی بلکہ کسی اور کی غلط فہمی ایسی حیرت انگیز بھی نہیں تھی۔

میرے پاس ڈگری نہیں تھی لیکن میں محنت، پشت، برخواست، اہلیت میں شاید بہت سے بڑے بڑے ڈگری یافتگان سے بہتر تھا۔ مجھے تعلیم زندگی دے دی تھی اور زندگی کی دی ہوئی تعلیم بڑی کھری ہوتی ہے۔ اب تک میری عمر کا ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھنے میں ہی بسر ہوا تھا۔ مجھے قریب سے جاننے والے بھی مجھے اعلیٰ تعلیم پانڈے ہی سمجھتے تھے۔ میں نے کسی کے اس خیال کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں میرے پاس تعلیم بہت تھی۔ گناہ کا ایک ٹکڑا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خصوصاً جبکہ مجھے کہیں نوکری کے لئے درخواست بھی نہیں دینی تھی۔ ”اچھا... تو تم چھوٹے آدمی ہو!“ میں نے سر ہلایا۔

”ہاں بھئی۔ میں تو ایک معمولی سا قاصد ہوں۔ اور تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ آج کل تو چڑا ہی کو بھی قاصد... بلکہ نائب قاصد کہا جاتا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ وہ کسی پہاڑی علاقے کا باشندہ معلوم ہوتا تھا لیکن اردو بہت صاف بول رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا شیریں قاف بھی درست تھا۔ گناہ تھا کہ اس کی زندگی شہر میں ہی گزری تھی لیکن بعض ایسے لوگوں میں تو یہ خوبی شہر میں زندگی گزارنے کے بعد بھی پیدائش ہوئی۔ شاید یہ اس کی سیکھنے کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔ میں نے کمری سانس لے کر کہا ”جی ہاں یہ ہے کہ کبھی کبھی تم جیسے چھوٹے آدمیوں سے مل کر مجھ جیسے بڑے آدمیوں کو بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔“

”کیوں؟“ اس نے مجھوں اپنا کیم۔

”بھئی دیکھو نا۔ مجھ جیسے بڑے آدمی کا یہ برا سا ہوٹل ہے۔ میں خود بھی برا محتاط رہتا ہوں۔ اور اس ہوٹل کا اپنا سیکورٹی کا نظام بھی ہے۔ اتنے بہت سے لوگ ادھر ادھر قیام رکھتے ہیں۔ گھومتے پھرتے بھی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود تم جیسے چھوٹے چھوٹے آدمی منہ افکار میرے کمرے میں آکر کھس بیٹھتے ہیں۔ جب مالک کا بیٹا یہ حال ہے تو وہ ہوٹل کے دوسرے عام مسافروں کے تحفظ کا بڑی کس طرح کر سکتا ہے؟“

اس نے ایک بار پھر کو بجیلا سا قہقہہ لگایا اور اپنی عظیم الشان داغوں کو ذرا پھیلاتے ہوئے مشتعلانہ لہجے میں بولا ”افضل میاں! آئیے سیکورٹی دھیرو بالکل فضول چیزیں ہیں۔ توچے والے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تو میرے ہوٹل ہے... پبلک ٹریس ہے۔ اس کے تو کسی بھی جیسے میں پوچھنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لوگ تو انتہائی ترقی یافتہ

لباس میں ٹھوسا پسند نہ کیا ہو۔ خصوصاً جبکہ اس کے پاس اپنی گن بھی موجود تھی۔ شاید اس نے کہیں کمرے میں کہیں اور چھپا دی ہوں۔“

”آپ کی تعریف؟“ میں نے طاقت سے پوچھا۔

”مجھے جان کر کیا کر کے افضل میاں! میں بڑا غیر اہم سا آدمی ہوں۔“ وہ بزرگانہ لہجے میں بولا۔

”بڑی خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ پہلے آدمی ہیں جو گن ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو غیر اہم کہہ رہے ہیں ورنہ آج کل تو کسی کے ہاتھ میں گن ہو اور سامنے والا نہتا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ اس سے زیادہ اہم آدمی دنیا میں کوئی نہیں ہے اور اسے زندگی موت کا اختیار مل گیا ہے۔“

”یہ بڑی بڑی باتیں ہیں۔ تم جیسے بڑے بڑے آدمی ہی بڑی بڑی باتیں سوچ سکتے ہیں افضل میاں! میں تو پھر سا آدمی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں سوچتا ہوں۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

”تم چھوٹے سے آدمی ہو؟“ میں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اس طرح اس پر نظر ڈالی کہ اسے خود بھی اپنی غیر معمولی صامت کا احساس ہو جائے۔ اب میں نے بھی اسے ”آپ“ کے بجائے ”تم“ سے ہی مخاطب کرنا شروع کر دیا ”اگر تم چھوٹے آدمی ہو تو پھر بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟“

مجھے ایک موموں سی امید تھی کہ شاید میری نظروں کی تقلید میں وہ خود بھی اپنے سر پر نظر ڈالے۔ یوں ایک لمحے کے لئے اس کی نظر مجھ پر سے ہٹ جائے اور مجھ اس پر چلا کر لگانے کا موقع مل جائے۔

وہ ایسا غیر محتاط ثابت نہیں ہوا۔ اس کی نظر مجھ پر سے نہیں ہٹی البتہ اس نے ایک بلند آنکھ اور کو بجیلا سا قہقہہ لگایا جس سے ہماری ہر کمر صوف بھی لرز کر رہ گیا۔

”اب تم مجھے نظروں کا پکر دینے کی کوشش نہ کرو افضل میاں!“ قہقہہ سمجھتے ہوئے بولا ”میں چھوٹا آدمی ضرور ہوں لیکن بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے جسم بڑا ہونے سے انسان بڑا نہیں ہو جاتا۔“

”پھر بڑے آدمی کیسے ہوتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ میں اسے باتوں میں لگا کر کچھ کر کرنے کا کوئی موقع تلاش کر رہا تھا۔ اس کا من پکڑنے کا انداز خطرناک تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی چلانے میں ذرا بھی چپکا بہت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اوپر سے اس کی گن پر سا مظاہرہ لگا ہوا تھا۔ مزید سہم یہ کہ وہ جسمانی طور پر بھی کسی سائز سے کم معلوم نہیں ہوا تھا۔ میں کوئی کا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اطمینان اور خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک اس نے موموں سے اٹھنے کی بھی ذمت نہیں کی تھی۔

”بڑے آدمی تم جیسے ہوتے ہیں افضل میاں! فانیہ اشار ہوٹلوں والے۔ کو نہیں بنگلوں والے۔ بڑے بڑے کاروباروں والے۔ انٹر سوش والے۔ اور اعلیٰ تعلیم پانڈے۔“ وہ دہر سطور صریحانہ

# گنگا کے بھاری ناک

اے چھپرہ ۵۰/۵۰ قیمت ۱۳ روپے

میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔ جہاں ہو وہیں رکے رہو۔

میں نے گمری سانس لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا "تجارت پھر مجھے اپنی شرافت سے جائز فائدہ اٹھانے کا موقع دو۔ اور یہ بتا دو کہ تم یہاں کس لئے پائے جارہے ہو؟ کس مقصد سے آئے ہو؟"

"ہاں یہ معقول سوال ہے۔" اس نے حنا سے اپنا براہ راست سر ہلایا "لیکن اس سے پہلے میں معذرت کروں گا۔ یعنی مزید شرافت کا مظاہرہ کروں گا۔ امید ہے تم نے اس طرح میرے یہاں پائے جانے کا برا نہیں منایا ہوگا۔"

میں نے ایک لفظی سانس لے کر کہا "شرافت کے اس مظاہرے پر تو میں جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"لیکن میں تمہاری جان لینے نہیں تمہیں لینے آیا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ میرے خدا!" میں نے آنکھیں پھیلانیں "تمہارا انداز تو بالکل ایسا ہے جیسے کسی کی ڈول لے جانے کی بات کی جاتی ہے۔"

"ہاں تقریباً یہی سمجھ لو۔" وہ گویا تشبیہ سے معقول ہوتے ہوئے بولا "فرق بس یہ ہے کہ ڈولی کی جگہ کار ہوگی اور جی نی کی جگہ نازک اندام دلہن کی جگہ تم جیسا ہے وہ وہ لسا توڑا گیا مردہ ہوگا۔ شہنائیوں کی جگہ گولیوں کی خرخرات بھی گونج سکتی ہے اگر تم نے کچھ گزرو کی۔" پھر وہ اٹھنے کے لئے پر توڑے ہوئے بولا "کیا خیال ہے اب چلا جائے؟"

"نازک تمہارے ہاتھ میں گمن ہے بڑے بھائی! پھر بھی میری ڈولی لے جانا اتنا آسان قوت سمجھو۔ یہ تو میری توہن ہے۔ کم از کم کچھ تو سیاق و سباق کا نوالہ دو کچھ تو اپنا جغرافیہ بیان کرو۔ آخر تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو مجھے کہاں اور کیوں لے جانا چاہتے ہو؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"اب سوال و جواب کا اتنا لمبا سلسلہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔" وہ گمری سانس لے کر بولا "میں تو پہلے ہی تمہارے انتظار میں کافی وقت ضائع کر چکا ہوں۔ میری شرافت دیکھو کہ میں نے تمہارے آفس میں تمہیں کمرہ تمہاری محفل خراب نہیں کی۔ تم بہت خوشگوار موزوں معلوم ہوتے تھے۔ اس خوب صورت خاتون اور اس لہجے اور اس وقت کے خوب کپ شپ پہل رہی تھی جو اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ میں نے سوچا اس وقت رنگ میں بھگ والا مناسب

مغربی ممالک کے ایسی تحقیقی مرکوز میں جا پہنچے ہیں اور نہ جانے کیا کچھ چلا آتے ہیں۔"

آدنی بظاہر غور و ساگادی معلوم ہوتا تھا لیکن بات عقل کی کر رہا تھا۔ اسی شفقانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولا "یہاں سیکیورٹی کے لئے کھن چنہ گارڈ تعینات ہیں جو شاید صرف کسی مشکوک ملے والے کو ہی روکیں۔ وہ بھی اگر ان کی نظر پڑ جائے تب درندہ مشکوک ملے والا پہچان نہ جائے کس کس کوئے کھدوے تک پہنچ سکتا ہے یا پھر وہ اس وقت تیزی سے حرکت میں آئیں گے جب وہ کسی کو خطی الاعلان سے انداز میں اسلحہ اٹھانے آتے دیکھیں گے۔ میں تو پہلے سے اچھا بھلا معزز آدمی نظر آتا ہوں اور ظاہر ہے میں اس چھوٹی سی گمن کی نمائش کرتا ہوا بھی ہوئی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میرا ذہنی توازن خراب نہیں ہے۔"

"لیکن جسمانی توازن کچھ خراب لگتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ خوش دلی سے ہنسا "دوسرے تمہارا۔ میں اب بھی نوجوانوں سے زیادہ فٹ ہوں۔ روزانہ دو گھنٹے میلے کلب میں سخت ورزش کرتا ہوں۔"

اس کی پرسلی بات جیسے عمل نہیں ہوئی تھی اور اسے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ دوبارہ اسی طرف آتے ہوئے بولا "بات سیکیورٹی کی ہو رہی تھی۔ میں تو لمبی پتھروں پر بھی چاچکا ہوں جہاں بہت زبردست اور جدید قسم کے حفاظتی آلات نصب تھے اور یہ میں یہاں کی نہیں۔ امریکا، انگلینڈ، دبی وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے تو ان ملکوں میں بھی جہاں جانا چاہا یا یوں گو کہ جہاں بھی مجھے بھیجا گیا میں ہر حال میں وہاں ہو کر آیا خواہ وہاں کسی بھی قسم کے حفاظتی انتظامات موجود تھے۔"

"بہت خوب۔ گویا تاروں کو لپیٹا نہ ہو۔" میں نے سر ہلایا۔

"بالکل بالکل۔" وہ خوش دلی سے ایک بار پھر ہنسا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "کچھ سائنس دان اور انجینئرز بیٹھے سیکیورٹی کے آلات ایجاد کرتے رہتے ہیں اور کچھ سائنس دان انجینئرز وغیرہ بیٹھے ان کا توڑ ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کچھ سائنس دان بیٹھے تیار کچھ ہتھیار ایجاد کرتے رہتے ہیں اور کچھ سائنس دان ان کا مقابلہ کرنے والے ہتھیار ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ دنیا میں دونوں کی ڈیمانڈ رہتی ہے اور یہی نوع انسان دونوں ہی کو خریدنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گلشن کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔"

"یاد رہے تم تو ٹھیک ٹھاک صاحب دماغ قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ معاف کرنا میں تو ہمیں یونہی یا مگر دو قسم کی چیز سمجھا تھا۔" میں نے حسین آہستہ لہجے میں کہا اور ساتھ ہی ذرا آگے ہٹنے کی کوشش کی۔

اس کے گمن والے ہاتھ کو فوراً خفیف سا ہموار کیا اور اس کے تاثرات کو مدد مل گئے "سیر، سیر، سیر! ہوگا۔ مجھے کھسکا کر

اس بار میرے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر ہی سٹی کی سی آواز نکل گئی۔ مرزا اکرم بیگ کا نام لے کر اس نے گویا میرے سر پر ہتھوڑا رسید کر دیا تھا۔ سینچہ رمضان نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا اور کچھ معلومات میرے اپنے ذرائع سے بھی حاصل ہوئی تھیں۔ وہ بہت بڑے اور خطرناک قسم کے اسمگلروں میں سے ایک تھا۔

اسے اور پیر والٹھ کو بعض معاملات میں ایک دوسرے کا تعاون حاصل تھا۔ جس کو غمی میں "سینیا کلب" والوں کے لئے مخصوص قہلوں کے شرچلے تھے اور لڑکیاں بک ہوئی تھی وہ کوہ کرائے کی غمی لیکن مجھے یہ چلا تھا کہ اس کا اصل کرائے وار بھی مرزا اکرم بیگ تھا۔ لیکن وہ پیر والٹھ کے دمنڈوں کے لئے استعمال ہو رہی تھی۔

مرزا اکرم بیگ کے بارے میں مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ کوڈر پتہ... بلکہ شاید ارب جی ہونے کے باوجود ملک میں اس کی کوئی جاکد اور نہیں بھی اور وہ کرائے کی بچوں سے کام چلاتا تھا۔ پچھلے دنوں اس قبیل کے لوگوں کے خلاف کچھ سخت کارروائیاں شروع ہوئیں اور جاکد کو مذہبی و غیرہ کے لئے بھی کچھ جگہ حرکت میں آئے تو ان میں سے بیشتر لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اور کسی کی کوئی جاکد اور بھی ہاتھ نہیں آئی۔ مرزا اکرم بیگ کی تو تمام بچیں کرائے ہی کی تھیں۔ لیکن باقی لوگوں کی بھی جس تھوڑی بہت جاکد اور کا سراغ لگ سکا ان میں سے بعض پلاٹوں پر پلازا بن کر فروخت ہو چکے تھے بعض پر ہاؤسنگ اسکیمیں انوائس ہو چکی تھیں اور عوام سے ان کی فیس وصول کی جا چکی تھیں اس لئے معاملہ الجھ گیا تھا۔ بعض جاکد اور کو راتوں رات پرانی تاروں میں فروخت شدہ ٹاہر کر کے ٹھکانے لگا دیا گیا تھا۔

ظاہر ہے جو لوگ اونٹوں والوں سے یاراند رکھتے تھے وہ اپنے گھروں کے دروازے بھی بڑے دیکھتے تھے۔ جو لوگ اپنے اونٹے بنانے پر ایسے کام کرتے تھے انہوں نے آؤے وقت کے لئے بھی سب بندوبست کئے ہوئے تھے اور ہر مسئلے کا حل سوچ رکھا تھا۔ ویسے بھی ہمارے ہاں اس قسم کے لوگوں کو بڑی سولیات میسر ہیں۔ پیسے کھلا کر ہر کام ہو جاتا ہے۔ نوٹوں کی چالی سے یہ لوگ ہر بند دروازہ کھول لیتے ہیں۔ اس لئے کبھی اگر بہت ہی زیادہ تہی آجائے تو بات دوسری سے ورنہ ان کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

مرزا اکرم بیگ کے بارے میں بھی مجھے معتبر ذرائع سے یگانا پتا چلا تھا کہ وہ ملک سے مفرد تھا اور اس نے غالباً وہی وغیرہ میں کسی ذریعہ لگا دیا ہوا تھا۔ لیکن اب شرافت علی میرے لئے اس کا پلاوالے کر آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے "مستتر" ذرائع کچھ ایسے معتبر بھی نہیں تھے۔ شرافت علی رات کے وقت اس طرح مگن دیکھا کہ یقیناً مجھے دئی لے جانے کے لئے تو نہیں آیا تھا۔ میرے لئے ہر حال یہ ایک خطرناک پلاوا تھا۔ مرزا اکرم بیگ

نہیں۔ بہتر ہے کچھ دیر انتظار کر لیا جائے پھر بھی غیبت سے کہ میرے آنے کے بعد تمہاری مصلحت زیادہ دیر جاری نہیں رہی۔ لیکن انتظار کی گھڑیاں ہر حال طویل محسوس ہوتی ہیں اور ہر موقع بھی کچھ ایسا نہیں تھا کہ زیادہ وقت ضائع کیا جاتا۔ اس کے باوجود میں نے کوٹے سے زیادہ وقت خرچ کر لیا ہے۔

اس نے سرسری سے لمبے میں بات کی تھی مگر مجھے دور حقیقت خاصا زور دار ہٹکانا تھا کہ وہ کہیں سے آفس میں بھی بھاگ کر چلا گیا تھا اور وہ درحیث مگن کو بھی پہچانتا تھا جبکہ میں اندازہ لگانے سے قطعی قاصر تھا کہ آخر وہ کون ہو سکتا تھا؟

میں نے ایک بار پھر کسی نظر سے اس کا جائزہ لے کر اپنے ذہن کو کھٹکے لے کر کوشش کرتے ہوئے کہا "تمہاری شرافت کا تو میں واقعی دل و جان سے قائل ہو گیا ہوں مگر اسے شرافت کے کنگ سائز ٹیکہ جہاں غمی نے اتنی دیر ٹر کر کے اور مجھے بھی ٹر پر مجبور کر کے اتنا وقت ضائع کیا ہے وہاں چند لمبے اور سی... ان ماریک مساکل پر کچھ تو روشنی ڈالو۔ زیادہ نہیں تو کم از کم زبرد کے بلیب جتنی روشنی ہی ڈال دو۔ آخر تم کون ہو۔ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"میں اصل میں شرافت کی اتنی تکرار کر رہا ہوں کہ اب مجھے اپنا نام بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔" وہ اپنا مگن والا ہاتھ صوفے کے پتھر پر ٹکاتے ہوئے بولا۔ "مگن کا سرخ اب بھی میری طرف ہی تھا۔"

"کہوں کیا اتنا شرمناک ہے تمہارا نام؟"

"دراصل میں شرافت کی جتنی تکرار کر رہا ہوں اس کے بعد اپنا نام پتا مشکلہ خیر سا لگتا ہے کیونکہ میرا نام ہی شرافت علی ہے۔" وہ زرا ہلکا پتے ہوئے بولا۔

میں بے اختیار گراہ کر رہ گیا۔ اس قسم ظریفی تھی۔ اس کا نام شرافت علی تھا اور وہ مگن دیکھا کر مجھے اغوا کرنے آیا تھا۔ ویسے ضروری نہیں تھا کہ یہ اس کا اصل نام ہی ہوتا۔ میں لیکن تھا کہ وہ ایسی جس مزاح کا مظاہرہ کر رہا ہوتا۔ نام میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ہر سکون لمبے میں پوچھا "شرافت علی! شرافت کا تعلق کیا ہے کہ تم مجھے یہ بھی بتا دو کہ آخر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"جیسے پاس لے جایا ہے۔" آخر وہ گویا کوئی بہت بڑا راز کھولتے ہوئے بولا۔

"اوہ! میں نے بھی سی سٹی بجائی" اس پاس کا بیٹھنا کوئی نام بھی ہو گا؟ اس کے بغیر تو میرے لئے جانا مشکل ہو گا کہ تم کس پاس کا تذکرہ کر رہے ہو کیونکہ اس شرمیں ہر جہ تھوڑی کسی نہ کسی کا پاس ہے۔"

"نہیں وہ اتنا معمولی دور ہے کہ پاس نہیں ہے۔" اس کے لمبے میں ہلکا سا خرخک آیا "اس کا نام مرزا اکرم بیگ ہے۔"

ہلکا سا تھک لگا۔

”بے شک۔ بے شک۔“ میں نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ میں اس کی کیفیت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ کسی کو دبوچنے کے لئے وہ دقت بہتر ہوتا ہے جب وہ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ چکا ہو۔ میرا خیال تھا اب میں اسے اس منزل پر لے آیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”وہی بھی تمہارا یہ خیال ظاہر ہے کہ اس دقت تمہیں اُٹھایا جا رہا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو تمہیں اغوا کیا جا رہا ہے؟“

میں نے کندھے اچکائے ”تمہارے خیال میں مجھے کیا سمجھنا چاہئے؟“

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے گویا مجھے تسلی دی ”میں تو نہایت محبت اور احترام سے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں۔“

پھر وہ یکدم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے عظیم آؤی کا یوں یکدم پھرتی سے اٹھ کھڑے ہونا خاصا حیرت انگیز عمل تھا ”اب چلتا چاہئے۔“ وہ فیصلہ کن سے لہجے میں بولا۔

”تم کبھی گاڑی وغیرہ میں آئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں۔“ اس نے جواب دیا ”تمہاری گاڑی کس لئے ہے؟ اسے ڈرائیج بھی تم ہی کرو گے۔ ظاہر ہے مجھے اس کھلونے کا بار بھی تو تمہاری طرف رکھنا ہے۔“

”تمام راستے تم ہی طرح مجھ پر یہ پستول آنے رہو گے اور اسی طرح مجھے دھکیلے جاؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں اتنی سوتی عقل کا آدمی نہیں ہوں۔“ وہ بولا ”پستول میری جیب میں ہوگا۔ اس کا بار تمہاری طرف ہوگا۔ میں بالکل تمہارے ساتھ لگ کر چلوں گا۔ میری انگلی ٹھیک رہے گی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میری انگلی خاصی سوتی ہے۔ اس لئے ٹھیک پر پلے

ہی کاٹنی دباؤ رہتا ہے۔ اور ہر تم نے ذرا سا اسے ”روت“ سے ہٹ کر حرکت میں آنے کی کوشش کی اور اور ٹھیک رہا۔ اس پستول کے سائز پر مت جانا۔ اس کی گولی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ انسان کو اندر سے اڈھیر کر رکھ دیتی ہے۔ تم جیسے ٹھیک خاک جوان کے لئے

بھی ایک ہی کافی ہوگی۔“

”تم کو کافی عقل مند اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں تو تمہیں یو ٹی گاڑی سا سمجھا تھا۔ اگر تم یو ٹی محنت سے اپنا کام کرتے رہے تو شاید یہ نائب قاصد کے عہدے سے ترقی کر کے

نائب قائل ہو جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔

وہ ذرا میرا سامنا کر بولا ”مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تم بائیں ہت چار چار کرتے ہو۔ اس لئے مجھے تمہارے انداز ٹھیک پر حیرت نہیں ہو رہی۔“

”لیکن مجھے تمہارے انداز ٹھیک پر ہو رہی ہے۔“ میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا ”اگر سب بڑے بڑے اسکولوں میں

یقیناً پیروائش کا دوست تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کچھ دھندوں میں اس کی بارگزر شپ بھی رہی ہو۔ پیروائش اور اس کی ماں کا جو انجام ہوا تھا اس سے یقیناً مرزا اکرم بیگ کو دھچکا لگا ہو گا اور اس قسم کے لوگ اس قسم کے دھچکوں کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔

پیروائش کی موت خواہ کسی بھی انداز میں واقع ہوئی تھی اور پھر اس کا ذمے دار خواہ کوئی بھی تھا لیکن اگر مرزا اکرم بیگ کو تمام حالات سے آگاہی حاصل ہو چکی تھی تو اس نے اصل ذمے دار مجھے ہی ٹھہرایا ہوگا۔ اس صورت میں مجھے اس کی طرف سے غیظ و غضب کی توقع ہی رکھنی چاہئے تھی۔

تمام اس صورت میں بھی زیادہ امکان تو یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرنا اور اس میں حملہ کرانے کی کوشش کرنا۔ کیسے راستے میں ”چھاپا“ ڈالنا۔ کیسے دس بیس آدمی اچانک نمودار ہوتے اور جدید ترین ہتھیاروں سے تہی پھیلائے اور میرے پرچے اڑانے کی کوشش کرتے۔ مرزا اکرم بیگ کی جس قسم کی شہرت مجھ تک پہنچی تھی اس قسم کے لوگ تو ایسی خونی کارروائیوں میں ماہر ہوتے ہیں۔

مگر اس نے ایسی کوئی کارروائی کرنے کا تردد نہیں کیا تھا اور محض ایک شخص کو بھیج دیا تھا کہ مجھے لے جا کر اس کے حضور پیش کرے۔ مانا کہ آدمی دہراؤ تھا اور اس کے ہاتھ میں ساختر نعلی ایک چھوٹی گن تھی۔ اس کے باوجود یہ انداز مجھے کچھ زیادہ ہی شائبہ لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا مرزا اکرم بیگ نے میرے بارے میں بہت کچھ جان لینے کے بعد بھی مجھے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی تھی اور یہی سمجھا تھا کہ اس کا ایک قاصد نائب آدمی مجھے گن دکھا کر کان سے پکڑ کر لے جائے گا اور اس کے سامنے حاضر کرے گا۔

میں دل ہی دل میں اپنی اس بے وقوفی کا برا سامنا بغیر نہ رہ سکا لیکن پھر میں نے نہایت خوش خلقی سے باجیں پھیلائے ہوئے کہا ”اے تم مرزا اکرم بیگ کے قاصد ہو! تو اس کے لئے اتنی ہی حمید باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ میرے لئے تو یہ ایک اعزاز ہے کہ مرزا اکرم بیگ نے مجھے بلایا ہے لیکن مجھے کچھ یقین سا نہیں آتا۔ مجھ جیسے حقیر آدمی کو بھی انھوٹے کے لئے مرزا اکرم بیگ آؤں کہ اپنے کارندوں کی کم از کم ایک گاڑی تو میر کر بھیجی جائے گی۔“

اب وہ پہلے سے کچھ زیادہ مسرور و مطمئن نظر آنے لگا اور اپنی ستون نما ٹانگوں کو مزید ذرا پھیلائے ہوئے بولا ”ایسا عام طور پر ظلموں میں ہوتا ہے یا پھر کسی کوج میں کیڑے کو ڈوبی کی طرح غم لینے والے بہت خور قسم کے نئے نئے بدعاش اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں کہ جہاں بھی جاتے ہیں چھوٹا سا ایک جلوس لے کر جاتے ہیں۔ ویسے بھی میں تو ایسا ہی ایک چھوٹے موٹے جلوس کے برابر ہوں۔“ اس نے اپنی بات سے گویا خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے

یازوں اور دہشت گردوں کے نمائندے تمہاری طرح مذہب، شائستگی اور خوش اطوار ہوا کریں تو اور اوتوں، قتل و غارت اور اغوا وغیرہ میں کس قدر خوب صورتی اور سلیقہ پیدا ہو جائے لوگوں کا ازراہ حروت، یا محض یکسانیت سے فرار حاصل کرنے کے لئے بھی اغوا ہونے کو جی چاہئے گئے۔

”چھا۔ باتیں بہت ہو چکیں۔ اب ذرا دھر کو گھوم جاؤ۔“ اس نے مجھے منہ دوسری طرف کھینے کا اشارہ کیا۔

”یہ تو تم کچھ اس طرح حکم دے رہے ہو جیسے مداری پتہ جھورا کودتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”ارادے کیا ہیں؟“

”ذرا تلاش کی لینی ہے تمہاری۔“ وہ ذرا بیزاری سے بولا ”یہ مت سمجھنا کہ میں باتوں میں الجھ کر یہ کام محمول گیا ہوں۔“

”میں تم جیسے فرض شناس قاصد سے یہ امید نہیں رکھ سکتا۔“ میں نے کہا ”لیکن میں نہایت افسوس سے تمہیں اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں ہے۔ پھل کاٹنے والا جیسی چاقو تک نہیں ہے۔“

”اگر مجھے اسی طرح دوسروں کی زبان پر اعتبار کرنے کی عادت ہوتی تو میں اس عمر کو نہ پہنچ پاتا۔“ نوجوانی میں ہی گلی کوچوں کے بد مصائب کے ہاتھوں اللہ کو پیارا ہو چکا ہوتا۔ ”وہ استہزائیہ لہجے میں بولا ”میرا خیال ہے تم مجھے باتوں میں الجھنا کر مزید کچھ مصلحت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو حالانکہ میں تمہیں پہلے ہی کافی مصلحت دے چکا ہوں۔ کیا تمہیں کسی کے آنے کی امید ہے؟“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔ ویسے بھی جہاں تم جیسے لوگ آجائیں وہاں کسی اور کے آنے کی کیا امید رکھی جاسکتی ہے۔“

”اگر کوئی آیا بھی تو نقصان میں رہے گا۔“ وہ بولا ”میں اب ہر ایک کے ساتھ ایسا دوستانہ رویہ اختیار نہیں کر سکوں گا جیسا تمہارے ساتھ کیا ہے۔“

”میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میری تو خود بھی دعا ہے کہ اس وقت کوئی اور یہاں نہ آئے خواہ خواہ جاری اس خوشگوار اور دوستانہ گفتگو میں غلط پڑے گا۔“ میں نے باجمیں نکالا۔

”چھا اب گھوم جاؤ۔“ اس نے گمن کو حرکت دی۔

”میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ میری تلاش لینے کی ضرورت نہیں۔ خواہ خواہ وقت ضائع ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”جہاں اتنا وقت ضائع ہوا ہے وہاں چند سیکنڈ اور سہی۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”ویسے بھی میرے کچھ اصول ہیں۔ میں جب کوئی چیز لینے جاتا ہوں اور دکاندار میرے سامنے اس چیز کا کوئی نمونہ رکھ کر اس کی تعریفوں کے گُل پاندھتا ہے تو میں وہ نہیں نہیں لیتا۔ میں اس چیز کا کوئی دوسرا نمونہ نہیں نگھڑتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دکاندار جس چیز کی تعریفوں کے گُل پاندھ رہا ہوتا ہے اس

میں کوئی نقص ہوتا ہے اس طرح جب کوئی اصرار کرتا ہے کہ میں اس کی تلاشی نہ لیں تو میں ضرور تلاشی لیتا ہوں اور وہ عام طور پر سو منہ ثابت ہوتی ہے۔“

”کتنے عقل مند ہو تم۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”ویسے اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ تم مجھے لباس تبدیل کر لینے کی اجازت دیجئے۔ صبح سے انگریزوں کی اس یادگار میں لینے لینے میں بور ہو گیا ہوں۔“ میں نے اپنے سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”آئی ہی بیزاری ہے تو مت پنا کرو۔“ وہ طنز لہجے میں بولا۔

”کیا کروں۔ مجبوری ہے۔“ میں نے کندھے اچکائے ”آج کل آدمی کی قدر کم، اس کے سوٹ کی زیادہ ہے۔ کسی محفل میں لوگ آدمی کو بد میں اس کے سوٹ کو پہلے دیکھتے ہیں۔“

”زمانہ تو بیک سے ایسا ہی چلا آ رہا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”میرحال میں تمہیں لباس تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی ہم کسی پائل میں نہیں جا رہے ہیں اور اس سوٹ میں کوئی خرابی بھی نہیں ہے۔ نہایت عمدہ اور ٹیکس سوٹ ہے۔ ٹائی بھی شاندار ہے۔“ اس نے تنقیدی نظر سے میرا جائزہ لیا۔

”میں سوٹ کے معیار کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ شلوار تمہیں پہن لوں ذرا ایڑی ہو جاؤں۔“ میں نے کہا۔

”آؤ ایڑی ہونے کے لئے آخر اپنا ہی لباس یاد آتا ہے۔ زندگی سوٹ بوٹ اور ٹائی میں گزر جاتی ہے مگر ان میں خود کو ایڑی محسوس کرنے کی عادت نہیں پڑتی۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

پھر اس نے بازو پھیلا کر اپنا شہ نما سوٹ دکھاتے ہوئے کہا ”ایڑی رہنا چاہئے ہو تو ایسا سوٹ پہنا کرو۔ چلو اب دھر کو گھوم جاؤ۔“

”چھا مجھے ہاتھ منہ ہی دھو لینے۔“ میں نے فریاد کی۔

”چندا۔! مجھے گولی دینے کی کوشش مت کرو اور جو میں کہہ رہا ہوں، سیدھی طرح اس پر عمل کرو۔“ وہ نہایت ششمانہ لہجے میں بولا۔

میں چاہتا تھا اسے شبہ ہو جائے کہ میرے پاس کوئی ہتھیار تھا تاکہ وہ ذرا اچھی طرح میری تلاش لے۔ جب وہ گولی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کرتا جو میرے پاس نہیں تھی تو یقیناً اس کے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی جو میرے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اب اسے صرف شبہ نہیں بلکہ کافی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار موجود تھا۔

چنانچہ میں نے عارداراً ہتھیار ڈالنے ہوئے کہا ”چھا ابھی۔“ اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو لے لو تلاش۔۔۔ زمانہ ہی کچھ ایسا آگیا ہے کسی کو کسی کی بات کا اعتبار ہی نہیں رہا۔“ میرے لہجے میں زمانہ بھر کا دکھ ٹھٹھک آیا۔

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ عقب سے میرے قریب آیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے گن میری کٹنگ پر لگی اور دوسرے

ہاتھ سے مجھے ٹولنا شروع کیا۔ وہ نہایت تفصیل سے جراثیمی جگہ ہاتھ مار کر دیکھ رہا تھا جہاں کوئی اختیار پوشیدہ ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔

"اتنی کمرانی سے تلاشی مت لو یا راگدگدی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ میں گردن ہٹا کر تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان کتنا فاصلہ تھا۔ وہ میرے جتنا قریب ہوا اتنی ہی بڑھتا تھا۔

"گدگدی تو نرم و نازک اور مڑ مڑا ہاتھوں سے ہوتی چاہئے۔" وہ مجھے ٹٹولنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے بولا "میرے ہاتھوں سے تو تمہارے جسم میں خوف کی لہر دوڑ سکتی تھی لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ہماری ملاقات دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔"

"تو جی میں تمہارا یہ عالم ہے تو دشمنی میں واقعی بچے کیے بیٹھتے ہو گے۔" میں نے اپنے لیے سے ہلکی سی مروجیت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

یہ گویا اس کے لئے تو معنی الفاظ تھے۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میں نے اپنی کمر اس کے کونٹ کا لمس محسوس کیا۔ اس کا مطلب تھا وہ میرے بالکل قریب تھا۔

"تمہیں شکر کرنا چاہئے کہ ہماری بالکل ملاقات دشمنوں کی حیثیت سے نہیں ہو رہی۔" اس نے گویا مجھے کسی بڑے سامنے سے نکال جانے کی خوش خبری سنائی۔

"تو پھر یہ گئی۔۔۔ یہ تلاشی کس سلسلے میں ہے؟" میں نے شکوہ کیا۔

"ہمیں معلوم تھا کہ تم مرزا اکرم بیگ کا نام سن کر آسانی سے میرے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہو گے۔ اس لئے یہی اندازہ بڑھ تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تم آزاد کر تو کیجئے۔" میں نے شکوہ جاری رکھا۔

اس بار اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ یقیناً اس کی پریشانی شروع ہو چکی تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے ہاتھ پر شکنیں نمودار ہو چکی ہوں گی۔ وہ میرا پورا بالائی مڑھ اور مہیشیں ٹٹول چکا تھا۔ ابھی تک کوئی اختیار برآمد نہیں ہو سکا تھا۔ صرف میرا ہوا برآمد ہو سکا تھا۔ جسے اس نے جیب سے نکال کر بنے پردائی سے ایک طرف پھینک دیا تھا۔

چوٹی سے ایڑی تک تلاشی مکمل کرنے کے لئے اب اس کا جھٹکا ضروری تھا اور یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے لئے اسے گئی۔ کی ٹال میری کچھنی سے بٹنا پڑی۔ اب غالباً وہ اسے میری کمریا ہڈیوں پر ٹکاتا چاہتا تھا لیکن یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ میرے لئے حرکت میں آنے کا لمحہ تھا۔

میری نظر اس کے گئی۔۔۔ والے ہاتھ تک آسانی سے جاری تھی۔ میں نے آسانی پھرتی سے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈالے ہوئے یکدم دہرا ہو کر اسے کمر ہٹا کر آگے پیچھک دیا۔ میرے اس داؤ

کی کامیابی کا تمام تر داؤد صرف چھڑتی اور اندازوں کی درستی پر تھا۔

میری کوشش کامیاب رہی۔ اسے اٹھا کر پھینکا کوشت کے ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر پھینکے اسے کھم نہیں تھا۔ فرش پر دھیرے قائلین موجود تھے اس کے باوجود زوردار دھمک محسوس ہوئی۔ دائیں بائیں دونوں طرف کے کھم از کھم گزروں میں یہ دھمک ضرور محسوس کی گئی ہوگی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر ان میں کوئی موجود ہوا تو میں وہ دھمک دے کر پوچھنے نہ آجائے کہ کسی انوکھے اتفاق کے تحت صرف اس کمرے کی کھمت الگ ہو کر بچے نہیں آگئی تھی؟

اگر فرش پر دھیرے قائلین موجود ہوا تو شاید وہ پورا فلور لرز کر رہ جاتا اور اوپر بچے کی منزلوں پر بھی اس کے اثرات محسوس کئے جاتے۔ اس کی تاہمیں بہت بڑی طرح بیٹھ سے جا ٹکرائیں لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس پر بھی بہت سی بیٹھیں موجود تھیں۔ اس کی تاہمیں بڑی طرح ہوا میں اچھل کر رہ گئیں ورنہ شاید بیٹھ یا تاہمیں دونوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور ٹوٹتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے گولی چلانے میں دیر نہیں کیا تھا یا پھر شاید زنگ پر اس کی موٹی انگلی کا دباؤ بڑھ جانے کی وجہ سے مارتا لی سے انداز میں گولی چلی تھی۔ بہر حال میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا۔ اسی لئے اسے اٹھانے کے ساتھ ہی اس کی کلائی پر بھی ہاتھ ڈالا تھا۔ اس کا گن والا ہاتھ اوٹا ہوا ہوا تھا اور "ٹھٹھ" کی تیزی تواڑ کے ساتھ چلنے والی گولی نے فائوس کے چند کرسٹل اور چھت کا تمواڑ سا پلٹر بچے کر دیا تھا۔

وہ دوسری گولی نہ چلا سکا کیونکہ اس کا گن والا ہاتھ اس کے اپنے بچے دھک گیا تھا۔ یہ بھی اچھا رہا کہ زنگ اتفاقاً دوبارہ نہیں ڈوب گیا ورنہ شاید گولی خود اسے ہی لگ جاتی۔ میں نے اسے ہاتھ سیدھا کرنے اور گولی چلانے کا موقع بھی نہیں دیا۔ میں اس کے بارے میں کئی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا۔

یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ جگہ جھٹکتے میں کس طرح میرے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جا کر تھا۔ کم از کم ایک لمحے کے لئے وہ ضرور بدحواس ہو گیا ہو گا ورنہ پورا دیوار پر دھیرے قائلین تھا۔ اس کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بہت پھرتی سے اٹھ کھڑا ہو گا۔ اس کے بعد شاید اس کمرے کی محدود جگہ میں میرے لئے اس پر قابو پانا خاصا دشوار ہوتا اس لئے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کے بغیر لپک ٹھکر اس کی کچھنی پر اور دوسری اس کی ہڈیوں پر رسید کی۔ ان دونوں کھوکھلوں نے اسے اٹھنے سے باز رکھا۔

وہ اٹھنے اٹھتے دوبارہ کر گیا۔ میں نے اس پر مزید کوئی وار نہیں کیا۔ میں اسے زیادہ گزند بھی پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ لمبا ہی لٹ جائے اور اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ مجھے گزند پہنچانے کے قابل نہ رہے۔



ہوئے میں نے گمن دانیس ہاتھ میں ہی رکھتے ہوئے غلام انداز میں آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ دیکھ کر اسے سامنے نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی کھال نہیں مل رہا تھا بلکہ واقعی اس کے خواس اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

ایک ہاتھ سے اسے اٹھانا کسی ست الوجہ گیرے کو اٹھانے سے کم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اسے اٹھا کر بٹھارایا۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ وہ دوبارہ چپ نہیں ہوا۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا تب بھی وہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھ ہی رہا۔ پھر اس نے دو چار مرتبہ سر جھٹکا اور اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ کچھ کم ہوئی۔

میں ایک بار پھر اس سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے بال کھرمکے تھے۔ کپڑے چرم روگئے تھے۔ چہرے کا گوشت نہ جانے کیوں اتنی سی دیر میں ہی کچھ لٹکا لٹکا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ ایک بالکل مختلف انسان نظر آنے لگا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ اس کی سمجھ میں آئے گا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ البتہ یہ شاید اب بھی سمجھ میں نہیں آیا ہو کہ وہ اچانک اس حال کو کیونکر پہنچ گیا تھا۔

”امید ہے اب تمہارے دماغ کے کپڑے جھڑکے ہوں گے اور کھوپڑی میں جو تھوڑا بہت رنگ لگا ہوا تھا وہ بھی اتر گیا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف دیکھ کر آنکھیں پٹ پٹانا رہا۔ میں نے گمن کو حرکت دیتے ہوئے ذرا سخت لمبے میں کہا ”اب ذرا فرش سے اٹھو اور اپنی کرسی ڈال کر بیٹھ جاؤ۔“

”الکے کیا؟“ اس کا منہ کسی تجویز الخواس شخص کی طرح کھل گیا۔

”اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ اس نے ایک بار پھر سر کو چند جھٹکے دیے۔ اس کا ہونٹوں کی طرح کھلا ہوا منہ بند ہو گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن اٹھنے میں اسے کافی دقت پیش آئی۔ وہ جوڑوں کے درد کے پرانے مریض کی طرح سمفون پر ہاتھ رکھ کر اٹھا۔ وہ اتنی لوگوں میں سے تھا جو زیادہ قدر آور اور قیمتم ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے گرتے ہیں لیکن جب گرتے ہیں تو درحقیقت ان کا گرا کسی بڑی عمارت کے ڈھسے جانے سے مشابہ ہوتا ہے۔ ان کا دوبارہ اٹھنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

تاہم وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا ہو گیا۔ لڑکھاتا ہوا وہ کرسی کے بجائے دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔ شاید اس وقت وہ زیادہ آرام دہ چیز کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں پھر کھلی آئینہ سے لمبے میں پوچھا ”کیا تمہارا یہ سب کچھ

اس کا مڑا ہوا ہاتھ اس کے نیچے سے نکل آیا تھا لیکن اب گمن اس ہاتھ میں نہیں تھی۔ وہ اس کے نیچے ہی دب گئی تھی اور فی الحال شاید وہ گمن کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کی کوشش کی اور اس کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ ابھی اس میں خاصی توانائی باقی تھی۔ میں نے اس کے بازو پر ایک ٹھکر اور اس کی کھوپڑی پر کرائے کا ایک ہلکا ہاتھ رسید کیا۔ وہ ایک بار پھر چپ ہو گیا لیکن اس بار میں نے اس کے کرنے سے پہلے اس کی گمن دھڑکنے کا اس کے نیچے سے نکال دی جس پر اسی لمحے میری نظر بڑی تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے اوپر سے دوسری طرف چھٹا ہلکا کر گمن اٹھالی۔ میری یہ ساری کارروائی شاید چند لمحوں کے انتہائی تیز بریک ڈانس سے مشابہ رہی ہو لیکن اس وقت میں اپنی حرکات و سکنات کی مضحکہ خیزی پر غور نہیں کر سکتا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ میری کوشش کامیاب رہی تھی اور میری اچھل کود کا نتیجہ وہی نکلا تھا جو میں نے چاہا تھا۔ کوئی اعزازہ ذرا سا نکلا ہونے پر ہاتھ ڈرا سا دھوپا پڑنے پر نتیجہ کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔

گمن ہاتھ میں آتے ہی میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور وہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اعزازہ ہوا کہ گمن کی اب کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے لئے جو کام ضروری تھا وہ ہو چکا تھا یعنی شرافت علی اب حلقہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میری نظر میں اب وہ شرافت کا پیکر بن چکا تھا۔

وہ چپ پڑا چھت کی طرف دیکھ کر آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ اٹھنے کی کوشش اس نے ترک کر دی تھی۔ اس کا چہرہ ایک خالی لالہ بن گھس کا چہرہ تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ میں وہ یادداشت تو نہیں کھو بیٹھا تھا۔ اس کی حجامت کے لحاظ سے میں نے اس پر کچھ زیادہ خطرناک وار نہیں کیے تھے لیکن میں ممکن تھا کہ کھوپڑی پر کرائے کا ہاتھ یا ٹھکر رسید کرنے سے اس کے ذہن کا کوئی نلکا سوچ دب گیا ہو اور اس کی یادداشت کے خانے میں اندر میرا چھاپا ہو یا اس کے ذہن کو سوزاؤن رکھنے والے کچھ خلیات درہم برہم ہو گئے ہوں۔ میں تو یہ ساری دماغی قدرت کا ایک کارخانہ عجائب ہے۔ بشرطیکہ انسان خود کہے مگر انسانی ذہن تو بہت ہی بڑا کارخانہ عجائب ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا اس میں کب کیا تعمیر دہنا ہو جائے۔

میں کئی سیکنڈ تک ٹھکر کھڑا رہا مگر اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں دھندلائی دھندلائی ہو دکھائی دینے لگی جس اور وہ بالکل خاموش تھا۔ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ کہیں وہ مکاری سے تو کام نہیں لے رہا تھا؟ میں ممکن تھا کہ میں اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا تو وہ اچانک کوئی کام دکھاتا۔ تاہم مجھے اس کے بارے میں تشویش بھی ہو چکی تھی۔

میں نے مزید چند سیکنڈ انتظار کیا۔ آخر کار غصہ مول لیتے

کرنا ضروری تھا؟

”نہیں۔ کچھ ایسا خاص ضروری تو نہیں تھا۔“ میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور اس کے سینے پر بیڑ پر جا بیٹھا۔  
”تو تم پر کرنے پر کیوں کیا؟“ اس نے ذرا غصے سے پوچھا۔

”مجھ سے اس لمحے میں بات مت کرو ورنہ میں ابھی اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔“ میں نے سر ہلے میں کہا۔ ”یہ تو لگاؤ ڈونڈ تھا۔ تمہیں تمہارے وجود کی مناسبت سے ہماری ڈونڈ بھی مل سکتا ہے۔“

اس کی عقلی اور برہمی جھاک کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ صوفے پر کچھ سکرٹس سا گیا۔ اس کے جن میں اچھائی تھا کہ اس نے غصہ دکھانے کی خواہش پر جلدی قابو پایا تھا۔ میں نے ذرا نرمی سے کہا ”مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا کہ کوئی اپنی جسامت اور طاقت کی وجہ سے یا کسی بڑے بد معاش کا کارندہ ہونے کی وجہ سے مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کرے۔ اگر آج تم مجھے ہسپتال دکھا کر لے جاتے میں کا پیاب ہو جاتے تو تمہارے صوفے دباغ میں بیٹھ کے لئے یہ بات بیٹھ جاتی کہ افضل تو کفرے کی چٹلی ہے، عیب جی چاہے گا ہاتھ ڈال کر پکڑ لیں گے۔ جب باس غم دے گا تبھی جا کر اسے گردن سے پکڑ کر لے آئیں گے اور باس کے حضور میں پیش کر دیں گے۔“

وہ خاموش رہا۔ ذرا توقف سے میں نے کہا ”کسی بھی اچھے یا فطرت کی کھوپڑی میں اس قسم کے خیالات کا جنم لینا مجھے پسند نہیں ہے اور یہ میری آئندہ زندگی کے لئے پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے جبکہ میری زندگی میں تم جیسے بے ہودہ کرداروں کی بڑی ریل ویل ہے۔ آج دن کوئی نہ کوئی ٹھکانا ہی رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی کبھی کھوپڑیاں اس قسم کے خیالات سے بالکل پاک صاف رہیں۔ کچھ آئی مجھ میں بات؟“

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے کن کا سر پر دستور اس کی طرف رکھتے ہوئے کہا ”اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں تمہارے پاس سے ملنا نہیں چاہتا یا میں اس سے خوف زدہ ہوں۔ مجھے تو خود اس سے ملنے کا تجسس ہے۔ اور یہ جاننے کے بعد تو تجسس اور بھی بڑھ گیا ہے کہ وہ ہمیں موجود ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ مفروز ہے اور ملک سے باہر ہے۔“

شرافت علی نے سر اٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ خاصی حد تک ہموار لمحے میں ہوا۔ ”مرزا محرم بیگ بہت عجیب لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے انسانے مشہور رہتے ہیں لیکن حقیقت کا علم بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔“

”بہت خوب!“ میں نے سر ہلایا۔ ”یہ مقام بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔“

وہ میرے ہٹھ کو سمجھ گیا۔ سر سلائے ہوئے ہوا ”تمہیں اس کے بارے میں بد گمان نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ بڑا آدمی نہیں ہے۔“

”میں اب اسے بڑا آدمی کہہ رہا ہوں۔“ میں نے لامنت سے کہا۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اچھے لوگوں سے بھی اس طرح ملتا پسند نہیں کرنا کہ ان کے کارندے میری کھوپڑی پر ہسپتال رکھ کر مجھے ان کے دربار میں لے جا کر پیش کریں۔ تم نے بڑی تکلیف کی کہ مجھے لینے آئے۔ میں مرزا محرم بیگ کا بھی شکر ہے اور ان کے کارندے اس نے تم جیسے بے اخلاق انسان کو مجھے لینے کے لئے بھیجا لیکن بجائے اس کے کہ تم مجھے لے کر جاؤ۔ اب میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔ یہ زیادہ اچھا لگے گا۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے تھوڑا اٹھ کر پوچھا۔  
”تم اچھے خاصے ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اتنی سادہ سی بات کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟ کبھی تو ڈی سی دی کے لئے بھول جاؤ کہ تم مجھے لینے آئے تھے۔ تم بد معاش بنے اور ہسپتال دکھا کر کسی کو لے جانے کا شوق پھر کسی وقت پورا کر لیا۔ اس وقت میں تمہیں مکن پوائنٹ پر تمہارے ہی پاس کے پاس لے چلوں گا۔“

”متحدہ تو نہیں ہے کہ تم باس کے سامنے پہنچ جاؤ۔ لیکن اس طرح کچھ اچھا نہیں لگے گا۔ باس ناراض ہو گا۔“ وہ ٹھوڑے سے لہجے میں ہوا۔

”کس پر؟ مجھ پر یا تم پر؟“ میں نے پوچھا۔  
”شاہ بدلوں پر۔“ وہ ہوا۔

”مجھے اپنے ساتھ مت گھسیٹو۔“ میں نے کہا ”اگر وہ ناراض ہوا تو صرف تم پر ہو گا۔ ظاہر ہے اپنے کرگوں کی نالائقی پر باس ناراض ہی ہوتے ہیں۔ امید ہے مجھ سے تو وہ خوشی ہو گا۔ اگر وہ خوش نہ ہوا تب بھی میری بلا سے۔ مجھے اس قسم کے لوگوں کی طرف اتنی ہی پروا ہوتی ہے جتنی اپنے پرانے جوتے کی۔“

”بہت بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔“ اس نے بھروسہ اچکا نہیں۔ ”زندگی کی جنگ نے مجھے بہت سخت جان بنا دیا ہے۔ میرے شرافت علی!“ میں نے کمری سانس لے کر کہا ”جراثیم کی دنیا کے بہت بڑے بڑے جراثیم اب مجھے محض بوئے لگتے ہیں۔ میں نے ان سے مرعوب ہونا چاہا۔ مگر وہ ہے۔ صرف شریف آدمی میری نظر میں بڑا آدمی ہے۔ چاہے جتنا بڑا وہ کتنا ہی معمولی ہو اور صرف نام کا شریف یا شرافت علی نہ ہو۔“

پھر میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا ”کیا اب تم جتنا پسند کر دے گے کہ تمہارے پاس نے مجھے کس مسئلے میں داخل فرمایا ہے؟ وہ میری حق ہوئی جو انا چاہتا ہے یا مجھے سالم روست کرنا چاہتا ہے؟“  
”نہیں! میں ان کی کوئی بات نہیں سمجھتا۔“ وہ جلدی سے ہوا۔  
”اس نے تو کہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں تمہیں بہت عزت کے ساتھ لے کر آؤں۔ لیکن یہ اسے بھی معلوم تھا کہ تم اس کا نام کون کدک جاؤ گے۔“

”تمہارے ہاں جس کی عزت افزائی کرنا مقصود ہوتی ہے اسے

کر دی رو۔  
 "میں کیا کروں جس سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے  
 نہیں معاف کر دیا ہے؟"  
 "یہ گن گنھے واپس دے دیں اور اسی طرح میرے ساتھ  
 چلیں جس طرح ایک معزز آدمی دوسرے معزز آدمی کے ساتھ جاتا  
 ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہاری یہ فرمائش پوری کرنی تو میرے لئے بہت مشکل  
 ہے۔" میں نے کہا "میں نے اگر تمہارے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر بھی  
 لیا تو اس طرح چلنا میں ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ میں تو معزز آدمی  
 ہوں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن تم جیسے آپکوں کو میں نے  
 معزز میں شمار کرتا ابھی شروع نہیں کیا۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے اگر  
 تمہارے ساتھ چلوں بھی تو اس طرح چلوں جس طرح ایک پولیس  
 والا کسی جیب کترے کو رکھتا ہے تو اس کے بعد چلا ہے تم  
 نے بھی یہ معزز دیکھا ہے؟"  
 اس نے بے چارگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"بڑا عبرت ناک منظر ہوتا ہے۔" میں نے کہا "میرا خیال تو  
 یہی تھا کہ تمہیں اس منظر کے بارے میں بہت اچھی طرح معلوم  
 ہو گا۔"

"نہیں کیا تھا تمہیں یہ خیال؟" اس نے ہنسنے ہوئے لہجے  
 میں پوچھا۔

"میرا اندازہ تھا کہ تم نے ایک جیب کترے کے طور پر ہی  
 اپنے کیرئیر کا آغاز کیا ہو گا اور ترقی کر کے اس مقام تک پہنچے  
 ہو گے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے گھور کر اور اذیت پیش کر رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی  
 کے بعد وہ گرا خنجر پر شبہ کرتے ہوئے بولا "پلیز اب چلو۔ میں پہلے  
 ہی بہت وقت ضائع کر چکا ہوں۔ اگر تم یہ گن گنھے نہیں دے سکتے  
 تو اسے جیب میں رکھو۔ تم مجھ سے جو قسم چاہو لے سکتے ہو کہ میں  
 کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔"

"اگر تم نے کی بھی۔ تو شاید وہ تمہاری اس مینے کی آخری غلط  
 حرکت ہو۔ اس کے بعد تم مزید کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہ  
 جاؤ گے۔" پھر ایک لمحے کے لئے صورت حال کے بارے میں  
 سوچنے کے بعد میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں تمہارے ساتھ  
 ضرور چلوں گا اور یہ گن گن بھی جیب میں رکھ لوں گا کہ اس کا رخ  
 تمہاری طرف ہی رہے گا اور میری انگلی ڈیکر پر ہی رہے گی۔ بالکل  
 اسی طرح جیسے تمہارا مجھے لے جانے کا پود گرام تھا لیکن اس سے  
 پہلے میں ایک فون کروں گا۔"

میں شفیق شاہ سے رابطہ کر کے اسے صورت حال کے بارے  
 میں بتانا چاہتا تھا۔ شرافت علی بے آبی سے بولا "تمہیں جو بھی کرنا  
 ہے جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پاس کوئی مہارت کرنے کی بھی  
 گنجائش نہ رہے۔ فی الحال تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں تلاش

کُن رکھانی جاتی ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا اور جواب کا  
 انتظار رکھے بغیر کہا "خس کی زیادہ ہی عزت افزائی مقصود ہوتی ہوگی  
 بالآخر اس کی کھوپڑی میں ایک آدھ گولی مار دی جاتی ہوگی۔"  
 "میں نہیں یہ بات نہیں ہے۔" اس نے ذرا بے تابانہ  
 انداز میں اپنا بھاری بھر کم ہاتھ ہوا میں لہرایا لیکن پھر کراہ کر اسے  
 دوسرے ہاتھ سے تمام لیا۔ اس کا وہ ہاتھ مڑ کر اس کے نیچے دب  
 گیا تھا۔ شاید اس میں سوچ آگئی تھی یا پھر ٹھوڑی بہت تکلیف  
 تھی۔

چند سیکنڈ بعد وہ ہاتھ کو گود میں نکالتے ہوئے بولا "پاس لے تو  
 نہیں لانے کا معاملہ مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کا مقصد تو  
 صرف تم سے ملاقات کرنا تھا۔ یہ میرا دوسرا حق تھا کہ میں تمہیں کیسے  
 لے کر جاؤں۔ یہ گن گن والا آئیڈیا میرا اپنا تھا۔"

"بہت ہی بے ہودہ آئیڈیا تھا۔" میں نے کہا "تمہی بڑی کھوپڑی  
 میں اتنے بے کار قسم کے آئیڈیا آتے ہیں؟ تم اس کی اور ہانگ  
 کرو۔"

"اور ہانگ تو ہو گئی ہے۔" وہ کھوپڑی سسلاتے ہوئے بولا۔  
 اس کی کھوپڑی پر قیصر کا انکم دو جگہ تو گھومنا پڑا ہے ہوں گے "اگر  
 کھوپڑی سائل کی طرح مضبوط نہ ہوتی تو شاید یہ جیج بھی ہوتی۔"

"اگلے مرحلے میں جیج بھی سکتی ہے۔" میں نے کہا "سائل کی  
 طرح مضبوط ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر تمہارے ذہن  
 نا کوئی اور ہے وہ آئیڈیا کیا تو تمہیں اس کا نتیجہ تو بھگتنا پڑے  
 گا۔"

"مفضل میاں! کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟" وہ اچانک ہی  
 اسی لاجب سے بولا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید اب وہ  
 جیج کی چال چلنا چاہتا تھا۔

"واہ! میں نے ذرا حیرت سے کہا "تم تو اب جیج شرافت  
 ماننے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا ارادے ہیں۔ کوئی نیا آئیڈیا ذہن  
 میں آیا ہے؟"

"نہیں۔ بخیر! میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے اب احساس  
 رہا ہے کہ میں غلطی کر بیٹھا ہوں۔" وہ ہچکچاہٹ آہن لہجے میں بولا  
 "میں تمہارے بارے میں بہت معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ اس  
 کے علاوہ میرا خیال ہے میں تمہیں صحیح طور پر نہیں جان سکا۔  
 بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکا۔ صحیح طور پر یہ فیصلہ  
 لی کر سکا کہ میرا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔"

"تمہاری یہ "صحیح صحیح" کی حکمرانی اب جگہ صحیح ہے۔ لیکن مجھے  
 اب اس میں سب سے زیادہ افسوس یہی دیکھ کر ہوتا ہے کہ اب مجھے بھلے  
 ہیں کہ بہت تاخیر سے یہ احساس ہوتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط  
 یہ اس وجہ سے بھی بڑے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔"

مجھے اپنی غلطی کی بڑی ٹھیک ٹھاک سزا مل گئی ہے۔ "وہ ایک  
 اور اپنی کھوپڑی اور ہاتھ سسلاتے ہوئے بولا "اب تم مجھے معاف

کرنے میں دیر ہو گئی تھی۔

”اس سے پہلے کہ میں فون کروں۔ تم مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم نے میری بیٹیوں تمہیں کہاں رکھی ہیں؟“ میں نے کہا۔

اس نے اس صوبے کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ پہلے بیٹھا تھا۔

”اس کے نیچے پڑی ہیں۔“ تمہیں ان کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے اس کی بات کی تصدیق کی زحمت نہیں کی اور ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں اسی لمحے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریمپور اٹھانے سے پہلے شرافت علی کو خبردار کیا ”یہ مت سمجھنا کہ فون سننے میں میری توجہ بٹ جائے گی۔ زیادہ ہوشیار اور پھر بڑھاپے کی کوشش نہ کرنا۔“

وہ برا سا سنہ بٹا کر بولا ”یہ کبھی فون بھی ابھی آتا تھا۔ خدا کے لئے جلدی بات ختم کرنے کی کوشش کرنا اور میری طرف سے تم بے فکر رہو۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔“

”شباباش!“ میں نے بارے میں کہا ”بعض لوگوں کو ٹھوکر کھانے کے بعد عقل آتی ہے۔ خصوصاً کھوپڑی پر ٹھوکر کھانے کے بعد!“

میں نے پتھوں کا رخ اور نظروں کی طرف دیکھتے ہوئے ریمپور اٹھا دیا۔ وہ میرا ڈائریکٹ فون نہیں تھا۔ دوسری طرف سے آپریشن بولا

”سر! کوئی مرزا اکرم بیک آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ آپ بات کریں گے؟“

میں فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ یہ میرے لئے اس دن کی ایک اور جرح تھی کہ مرزا اکرم بیک مجھے فون کر رہا تھا۔ میں ریمپور پر دوسرا ہاتھ نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ میرے دوسرے ہاتھ میں گن تھی۔ میں نے اسی ہاتھ سے ہاتھ چپس کو ڈھانپنے کی کوشش کی جس سے ریمپور تھا ہوا تھا۔ پھر میں نے شرافت علی کو آگے مارتے ہوئے کہا ”تمہارے آیا جان کا فون بھی اٹھایا۔“

اس کی رگت کچھ درد پکڑ گئی اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آیا جان سے میری مراد کیا تھی۔ میں نے آپریشن سے کہا ”بات کراؤ۔“

کلک کی خفیف سی آواز کے ساتھ دوسرے ہی لمحے بھاری اور گونجیلی سی ایک آواز فون پر ابھری ”سر! قتل! میں مرزا اکرم بیک بول رہا ہوں۔ فون بند مت کیجئے گا۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

وہ ایک نہایت خوب صورت مردانہ آواز تھی جیسی عوام بہت مجھے ہونے لڑے اور ٹیشن یا دیگر صدا کا دل کی ہوتی ہے۔ لہجہ نہایت ہی سادہ و سادہ انسان کا تھا اور وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں اچھی جگہ ساکت بیٹھا حیرت سے سوچتا رہا کیا واقعی مرزا اکرم بیک مجھ سے مخاطب تھا؟

ایک ٹاپ کا اس اسمگلر اور وہ بھی منشیات کا۔ انسان

کے ذہن میں بہت سی خوف ناک ساقبورا بھرتا ہے۔ خصوصاً انہیں دیکھنے والوں کے ذہن میں تو بہت سی عجیب تصور آتا ہو گا۔ لمبے لمبے روکے پیچھے سے بال۔ تاریک چشمہ یا بھر چٹے کے بغیر بھی کبھی سی خون آشام آنکھیں۔ چہرے پر خوفناکی۔ گرفت کمزوری اور پتھلا ڈی ہوئی سی توانا۔ بات بات پر خوف ناک قہقہے لگانے والا۔ کبھی آگے بھی پیچھے جا کر ڈرامائی انداز میں کھڑے والا اور بات بات پر خود اپنے ساتھیوں کو بھی گولی مار دینے والا۔ اور ان کی لاشوں کے سینے پر پاؤں رکھ کر قہقہے لگانے والا۔ شکاریوں جیسا لباس اور لمبے بوٹ پہننے والا۔!

میرے ذہن میں خیر مرزا اکرم بیک کا ایسا نقشہ تو نہیں تھا کیونکہ مجھے زندگی میں منشیات کے دو چار اسمگلروں سے ”شرقی ملاقات“ حاصل رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اسمگلر ”قائل دہشت گرد“ کسی بھی عام آدمی جیسے ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے وہ آسمان سے نہیں اترتے تھے۔ وہ ہم میں سے ہی ہوتے تھے۔ کسی دوسرے سیارے سے بھی نہیں آتے تھے کہ ان کی کوئی الگ پہچان ہوگی۔ اتنا ضرور تھا کہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے چہرے پر۔ یا آنکھوں میں ایک خاص خبیثانہ قسم کا رنگ ضرور جھلک آتا تھا۔ لیکن وہ ذرا توجہ سے دیکھتے پر۔ یا پھر خاص ہی قسم کے حالات میں نظر آتا تھا۔

تاہم اپنے تمام تر تجربے کے باوجود میرے ذہن میں مرزا اکرم بیک کا ایسا تصور نہیں تھا جو فون پر اس کی آواز سن کر ابھرا تھا۔ بڑے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ محض آواز سن کر مجھے زیادہ خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہئے تھا اور اپنے عقل کے گھوڑے کو زیادہ دور تک نہیں دوڑانا چاہئے تھا۔

میں صرف ایک لمحے کے لئے ان خیالات میں الجھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے سنبھلنے کوئے کہا ”اگر مجھے فون بند کرنا ہو تو میں آپریشن کو منقطع کر دیتا کہ میں بات کرنا نہیں چاہتا۔“ میں نے شکوک کا آغاز انگریزی میں کیا تھا اس لئے میں نے بھی انگریزی میں ہی جواب دینا سیکھا۔

وہ خوشگوار لہجے میں بولا ”بالکل ٹھیک۔ کیا آپ نے“ ”فرمایا۔ آپ نے کیسے فون کرنے کی زحمت کی؟“ ”میں نے اپنا ایک حامد آپ کو لینے کے لئے بھیجا تھا۔“ اسی خوب صورت آواز اور شستہ و دو اس انگریزی میں بولا ”اسے گئے ہوئے اتنی دیر ہو چکی ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ شاید وہ آپ کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔“

”میں تو یہی کہنا کہ معاملے میں اتنا جلد باز و فاع نہیں ہوا ہوں۔ بشرطیکہ جان پر نہ آتی ہو۔“ میں نے خوش حالی سے جواب دیا۔

”بہت خوب!“ اس نے شاید قدرے اطمینان کی سانس لے کر ”اس کا مطلب ہے وہ دو ٹوکوں والا تھی آپ کے پاس بیٹھ چکا۔“

اور ابھی زندہ بھی ہے۔ دراصل وہ بھی کبھی ایک بتل سے بھی زیادہ گھماڑو جاتا ہے اس لئے مجھے اندیشہ تھا۔" اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جملہ ارحور اچھوڑ دیا۔

وہ اپنے آدمی کی متوقع موت کا ذکر نہیں کر رہا تھا جیسے اسے ایک آئہ بلی سی چت لگ جانے کے اندیشے کا افسار کر رہا ہو۔ میں نے شرافت علی کی طرف سے ایک لمبے کے لئے بھی نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اسے مطمئن ہو گیا تھا کہ میں کس سے بات کر رہا تھا۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھل گیا تھا اور اب وہ واقعی کچھ گھماڑو دکھائی دینے لگا تھا۔

"مجھ لیجئے کہ سرورست تو آپ کا یہ اندیشہ غلط ہے" میں نے سکون لے کر کہا "وہ میرے سامنے بیٹھا ہے اور دنیاوی معیار کے مطابق زندہ ہی نظر آ رہا ہے۔"

"میری گڈ" وہ ہلکی سی ہنسی سے بولا "لیکن یہ تاخیر تیار ہی ہے کہ وہ آپ کو میرے پاس آنے کے لئے قائل نہیں کر سکے۔"

"اس نے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ سائنسور دلی ایک کس کے ذریعے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ بالی گاڈ!" وہ یوں کراہ اٹھا جیسے کسی نے اس کے بلو میں گھونسا رسید کر دیا ہو "میں نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ کوئی ایسی جگہ حرکت نہ کرے۔ دینے وہ بہت کچھ وار اور سلجھا ہوا انسان ہے لیکن بس کبھی کبھی اس پر کوئی سک سوار ہو جاتی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس اس وقت اس کے سوا کوئی آدمی نالو نہیں تھا جسے میں آپ کے پاس بھیج سکتا۔"

"آپ کو میرے پاس "نالو" آدمی نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے ٹاٹ سے کہا۔

وہ بے تامل انداز میں دیر سے ہنسا "خیر وہ اتنا بھی نالو نہیں ہے۔ آدمی تو کام کا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اپنی مفاقت کے باوجود وہ اس وقت زندہ ہے۔ حالات اجازت دیتے تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا لیکن صورت حال کچھ عجیب سی ہے اور مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد کی ضرورت؟" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا "میرزا کرم بیگ کو میری مدد کی ضرورت؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے افضل صاحب!" وہ اب اردو میں بات کرنے لگا۔ اس کا اردو بولنے کا انداز بھی نہایت خوب صورت اور شہر تھا "میں کوئی ایسا انسان تو نہیں ہوں جسے کسی کی مدد کی ضرورت پیش نہ آ سکے اور آپ اتنے معمولی آدمی نہیں ہیں کہ کسی کی مدد نہ کر سکیں۔"

"بات نہت ابھی ہوئی سی لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"جب آپ میرے پاس آئیں گے تو سلجھ جائے گی۔" وہ بولا۔ "لیکن بات کے بجائے میں خود الجھ جاؤں گا۔ آپ نے شاید میرے لئے کوئی بہت ہی خاص قسم کا جال تیار کیا ہے۔" میں نے

لازوال  
کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

کے

شاہکار ناول

خبیث (۵ حصے) ۲۰۰/-

برہمچاری ۱۵۰/-

درخشاں (۲ حصے) ۹۰/-

رقص ابلیس ۱۵۰/-

آسیب زندہ ۱۱۰/-

دستک ۱۰۰/-



مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

فون ۲۲۳۶۶۵

بغیر نہ سکا۔

"اوہ! نو۔ ہرگز نہیں۔ یہ کسی قسم کا جال نہیں ہے۔" شدت جذبات سے وہ ایک بار پھر انگریزی بولنے لگا "آپ میرے بارے میں سنی سنائی باتوں کی وجہ سے یقیناً بہت بڑی غلط فہمی میں ہوں گے اور مجھے اپنا دشمن خیال کرتے ہوں گے لیکن میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ میں آپ کو دوست سمجھتا ہوں۔ میرے پاس آپ سے دشمنی رکھنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن آپ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس لئے آپ کا مجھ پر بھروسہ نہ کرنا اپنی جگہ صحیح ہے مگر جب آپ میرے پاس آئیں گے تو سب غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور آپ یقیناً میری مدد کرنے پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک لمحے جواب کا انتظار کیا پھر بڑے مان سے بولا "میں میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ کو اتنا ہوگا۔"

میں نے ایک لمحے سوچا۔ آخر دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے کسی سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔ آپ نے مجھے جنس میں جھٹکا کر دیا ہے۔ اب اس مسئلے کو حل کے بغیر مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"بہت شکریہ افضل صاحب! اس نے یوں غول سانس لی جیسے اس کے سینے سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو" کیا میں شرافت علی سے بات کر سکتا ہوں؟

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا "ضرور۔"

پھر میں نے شرافت علی کو اشارے سے بتایا کہ اس کا پاس اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ریسیور سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خود گمن لے کر دروازہ دھک کیا۔ میں نے اب بھی گمن کا رخ اسی کی طرف رکھا۔ وہ ہوتلوں پر زبان پھیرا بیٹھ گیا اور میٹریں میں دھنک کر فون سننے لگا۔

بیشروقت وہ دوسری طرف سے کچھ سنتا رہا۔ خود اس نے دو تین مرتبہ "میں سمجھ نہیں سکتا۔" کے سوا کچھ نہیں کہا۔ آخر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ آہستگی سے وہ میری طرف گھوما۔ گمن کی ٹال پرستور اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا تھا لیکن گمن دیکھ کر اس کے چہرے کے عضلات پھڑپھڑائے اور وہ یکدم ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "خدا کے لئے اسے جیب میں رکھ لو۔ پھر مجھے کوئی ہی مار دو۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ تمہاری لائن ایسی ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی تمہا کیس مودے گا۔ اب واپس اپنے سونے پر چلو۔ مجھے ایک فون کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور دوایان جا کر سونے پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اب بھی گمن جیب میں رکھنے کا خطلہ سول نہیں لیا اور اس کا

رخ بدستور اسی کی طرف رکھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے مرزا کرم بیک سے زبردست جھڑپڑی تھی اور اب وہ بے ضرر کچھ سے کی طرح بیٹھا تھا۔ اس کے بازوؤں میں احتیاط ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ یہ سب کچھ بہت ہی عموماً کے تیار کئے گئے کسی ڈرامے کا حصہ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے آپریٹر کے ذریعے شفیع شاہ کے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا۔ میں جب سونے کے لئے اوپر اپنے کمرے میں آجاتا تھا تو شفیع شاہ بھی اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ میرے "ہمزاد" کے طور پر اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت بھی وہ اپنے گھر چلا گیا ہوگا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے دریافت کیا۔ "میں نیچے ڈانکنگ روم میں ہوں۔ آج نہیں کھانا کھانے کے لئے رک گیا تھا۔" اس نے جواب دیا پھر قدرے تشویش سے پوچھا "خیریت؟ کمرے میں جانے کے بعد مجھے کیسے یاد کیا؟" "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی "کھانا کھا چکے؟"

"جی ہاں۔ کافی کا تقریباً آخری گھونٹ حلق سے اتر رہا تھا۔ اس کے بعد اٹھنے کا ارادہ تھا۔" اس نے بتایا۔

"بہت خوب۔ کیا بروقت تم سے رابطہ ہوا ہے؟" میں نے اس عجیب اتفاق پر اطمینان کی سانس لینے ہوئے کہا "آج بھی تمہاری ڈیوٹی کچھ لمبی ہو گی۔ ہم مرزا کرم بیک سے ملنے جا رہے ہیں۔"

"اچھا؟" شفیع شاہ کو اگر حیرت کا اظہار کرنا بھی ہوتا تھا تو نہایت ہی دبیجے انداز میں کرتا تھا۔

"بائی لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔ "جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک صاحب مجھے لینے آئے ہیں۔ میں ان کے ساتھ نکل رہا ہوں۔" میں نے بتایا "خود کرم نے بھی بہت محبت بھرے انداز میں ٹیلی فون کیا ہے۔"

مجھے شفیع کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے کیا کرنا تھا۔ وہ اب اپنے کام میں بہت ماہر ہو چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ دور دراز گھرانی کس طرح کرنی تھی اور کس موقع پر کیا کرنا تھا۔

"سب کچھ بالکل ٹھیک تھا کہ ہے نا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"نی لالال اور بظاہر تو ٹھیک ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے بہر حال بہت الٹ رہنے کی ضرورت تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم پارکنگ لائٹ کے قریب آپ کے دفتر ہوں

## تاریخی ناول

|                        |                    |
|------------------------|--------------------|
| خالد بن ولید           | الماس ایم۔ اے۔/200 |
| سلطان ٹیپو شہید        | الماس ایم۔ اے۔/200 |
| نواب حیدر علی خاں      | الماس ایم۔ اے۔/200 |
| سلطان صلاح الدین ایوبی | الماس ایم۔ اے۔/50  |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

طرح آباد نہیں تھیں کیونکہ ان کی پیشتر کہانیوں میں تاریخی نظر ابھی تک ملے۔ ان میں سے ایک تو شاید نامکمل ہی تھی۔ وہ سندھ سے بہت ہی قریب تھی۔

جس عمارت کے کپاڑے میں شرافت علی نے گاڑی ہوئی تھی وہ اس منزل تھی اور کافی شاندار معلوم ہوتی تھی۔ عمارت کے کپاڑے میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی کا احساس تھا۔

”مرزا اکرم بیگ کیا امارت میں رہتا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ بے اندازہ دولت کا مالک تھا۔ یہ قدرے خوش حال متوسط لوگوں کی ہائیں عمارت معلوم ہوئی تھی لیکن مگر جیسے آدمی کا یہاں رہائش رکھنا میرے لئے ناقابلِ یقین تھا۔

”وہ یہاں رہتا نہیں ہے۔“ شرافت علی نے گاڑی سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ کنارت مشکل ہے کہ وہ درحقیقت کہاں رہتا ہے۔ ہر حال اس بلڈنگ کی سب سے اوپر کی منزل پر چنٹ ہاؤس اس کے پاس ہے اور وہ بھی کرائے پر ہے۔ اسے وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔“

”سنگھ کی بھی اب کتنا معززانہ کام ہو گیا ہے۔“ میں نے لہجہ سانس لے کر کہا ”انسان شاندار علاقوں میں باقاعدہ دفتر وغیرہ رکھتا ہے۔“

شرافت علی مجھے گھور کر دیکھا تو ہم کچھ بولا نہیں۔ میں نے کن اب جیب میں رکھی تھی لیکن اس کا رخ بدستور اس کی طرف تھا اور میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ لابی میں پہنچ کر اس نے لفٹ کے لئے ٹپکا دیا۔ لفٹ کیسے اوپر تھی۔ عمارت میں کیسے کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی کیسے سے کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حتیٰ کہ کسی بچے کے بولنے یا

کے۔“ شفیق شاہ نے جواب دیا۔ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ شرافت علی کو شاید کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے اس ٹیلی فون کا مقصد کیا تھا۔ وہ ذرا اچھے تھکے سے لیٹے میں بولا ”اس تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ تم خواہ مخواہ اتنی زیادہ احتیاط برت رہے ہو۔“

”اگر تم جیسے اور تمہارے باپ جیسے۔ میرا مطلب ہے تمہارے پاس جیسے آدمیوں کے معاملے میں بھی احتیاط نہ برتی جائے تو پھر کس کے معاملے میں احتیاط برتی جائے گی؟“ میں نے کہا ”چلو اٹھو۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کن جیب میں رکھی لیکن میرا ہاتھ اس کے دستے پر ہی رہا اور رخ اسی کی طرف رہا۔ وہ اب متوازن قدموں سے چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ہم لفٹ کے ذریعے چھ آئے اور پارکنگ لائٹ میں پہنچے۔ شفیق شاہ اور دوسرے دو آدمی حیرت انگیز پگھلائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گاڑی میں پہنچ چکے تھے اور گاڑی پارکنگ لائٹ سے باہر ایک شوروم کے پاس کھڑی تھی۔ مگر گاڑی میں۔۔۔ اور اس کے آس پاس اندازہ ہونے کی وجہ سے انہیں صحیح طور پر دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کر میں نے چابیاں شرافت علی کو تھما دیں ”تیس ڈیڑا ڈیڑا بیگ کا فریضہ انجام دے گا۔“ اس نے خاموشی سے اسٹیرنگ وکیل سنبھال لیا۔ چتر لے لے ہوا گاڑی سڑک پر روانہ ہوئے۔ میں نے اب ہسپتال کی ٹال اس کی پسیلوں پر نکالی ہوئی تھی۔

”خدا کے لئے اب میرے ہی ہسپتال کی ٹال میری پسیلوں سے توڑنا۔ میں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔“ وہ چڑھ کر بولا۔ ”تم جیسے لوگوں کو زندگی سے بیزار کرنے میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اس نے کیا اس صورت حال پر مہر کر لیا اور چند لمحے بعد عقب نما آئینے میں سڑک کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”تمہارے آدمی کہاں ہیں؟ پیچھے تو کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔“ ”وہ سیلابی ٹوٹی پھن کی سڑک پر سڑک کرتے ہیں۔ عام لوگوں کو نظر نہیں آتے۔“ میں نے جواب دیا۔ یہ شخص اتفاق تھا کہ شفیق شاہ وغیرہ کی گاڑی عقب نما آئینے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہمیں نہ کہیں ضرور موجود ہوں گے۔

شرافت علی نے ہونٹ دانتوں میں دبایا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا ”تم واقعی بڑی غیبت چیز ہو۔“ ”توہ نواز ہے تمہاری۔“ میں نے انکار سے کہا۔

گاڑی کنٹینر دھڑ بھڑا رہا تھی۔ آخر وہ کنٹینر کے ایک دور افتادہ حصے میں جا پہنچی۔ پھر سندھ کے قریب ایک ابارٹمنٹ بلڈنگ میں جا کر۔ یہ طائر ابھی نیم تباہ تھا۔ ٹھوسے ٹھوسے فاصلے پر تین چار ابارٹمنٹ بلڈنگیں سرسراہٹے کھڑی تھیں جو شاید پوری

تھا۔

”میں کو چھوڑ دیجئے افضل صاحب!“ وہ مسکراتے ہوئے بولا  
”میں کوئی کوئی نہیں چلے گی۔ ایک کوئی یہاں پہلے ہی چل چکی  
ہے۔ اسی نے بڑی پریشانی کھڑی کر دی ہے۔ ہم مزہ شوٹنگ انورڈ  
نہیں کر سکتے۔ دیکھتے ہی یہاں اس وقت مجھ اور آپ جیسے معززین  
کے علاوہ کئی اہم سرکاری شخصیات بھی موجود ہیں۔ ان کی موجودگی  
میں آپ کو ہنگامے اور بددعائی بازی کا خطرہ محسوس نہیں کرنا  
چاہئے۔“

میں نے ایک کلمہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیب سے ہاتھ  
نکال لیا اور اس سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا تاہم اس  
نے مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی اس لئے  
میں نے بھی اسے بخش دیا اور مجھ دو ستانہ سامعہ کیا۔ وہ میرا  
ہاتھ تھامے مجھے اس بڑے سے کمرے میں لے گیا جہاں صوفوں پر  
بٹھائی ہوئی وہ پراسرار سی شخصیتیں گردنیں اونچی کر کے خطرے  
انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اندر قدم رکھتے ہی  
ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ کمرے میں ایک ہی بڑی سی شاندار میز تھی  
اور اس کے قریب ایک سوئیڈ پوائنڈ شخص چادروں خانے چپٹ پڑا  
تھا۔ اس کی دائیں آنکھ کے اوپر گولی کا سوراخ نظر آ رہا تھا اور اس  
کی چوٹائی کا کچھ حصہ خون میں گھرا ہوا نظر آ رہا تھا جو اب خشک  
ہو چکا تھا۔

میرے جسم میں ایک سردی لرزہ ڈگئی۔ اس کی وجہ مجھ سے  
نہیں تھی کہ میں نے ایک لاش دیکھ لی تھی۔ لاشیں دیکھنے کا میرا  
تجربہ اب نامناسب ہو چکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کسی عام آدمی کی  
لاش نہیں تھی۔

وہ ایک اعلیٰ عدالت کے جج کی لاش تھی۔ میں اتفاق سے ہی  
انہیں پہچانتا تھا۔ چند دن قبل میرے ہی ہوش میں ہونے والی ایک  
تقریب میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی جہاں میں بھی شخص  
ایک شناسا کے اصرار پر چلا گیا تھا۔ وہ تقریب میرے مزاج کی  
نہیں تھی۔ نہایت خشک قسم کی تھی۔ جج صاحب اس میں مہمان  
خصوصی تھے۔ میرا بھی ان سے تعارف کرایا گیا تھا اور میں نے  
انہیں اپنا ڈوشنگ کارڈ بھی دیا تھا۔ اسی لمحے ان کی صورت یاد  
آگئی تھی لیکن اس وقت وہ چوڑنگی سے محروم تھا!

وہی چلنے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن جو کئی لفٹ نیچے آئی اور  
دروازہ کھلا۔ نہ جانے کس طرف سے دو قوی اور نمودار ہو کر  
ہمارے ساتھ لفٹ میں داخل ہو گئے۔

میں چڑھا تھا لیکن وہ ہم سے بالکل لا تعلق نظر آ رہے تھے۔  
ان کے چہروں پر بے پناہ تنہید کی تھی مگر اس تنہید کی میں کچھ  
پراسراریت سمجھی۔ وہ مجھے عام آدمی نہیں لگ رہے تھے۔ لفٹ ٹاپ  
فلور پر پہنچی مئی اور انہوں نے کوئی غیر متوقع حرکت نہیں کی۔

ٹاپ فلور پر ایک ہی اپارٹمنٹ تھا۔ وہ دقیقہ بہت بڑا ہو گا۔ وہ  
دو تین افراد لفٹ سے نکل کر کارڈزور کی ایک کمری کے پاس جا کر  
کھڑے ہو گئے۔ اس حیل تک صرف وہی لوگ آ سکتے تھے جن کا  
اس اپارٹمنٹ سے کوئی تعلق ہو تا۔ وہ کسی کام سے اپارٹمنٹ میں  
آئے مگر ان کا اپارٹمنٹ میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر  
وہ اس فلور تک کیوں آئے تھے؟ یہ سوال میں نے شرافت علی سے  
بھی نہیں پوچھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو شیخ شاہ  
وغیرہ ان سے نمٹ لیں گے۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ بند تھا تو اس فلور پر بھی ویرانی کا احساس  
تھا لیکن جو کئی شرافت علی کی کال بیل کے جواب میں دروازہ کھلا  
اندر کافی بدوقت کا احساس ہوا۔ اندر تیز روشنیوں دکھائی دے رہی  
تھیں۔ بیوی بچے ہاں ہی درہانوں کے سے انداز میں دو افراد کھڑے  
تھے۔ انہی میں سے کسی نے دروازہ کھولا تھا۔ ان کے کندھوں پر  
کاٹھنوں نہیں تھیں۔

میں ٹھٹک گیا لیکن ان میں سے کسی نے کلاٹھکوف ہاتھ میں  
نہیں لی۔ میں شرافت علی کے پیچھے تھا لیکن شرافت علی ایک طرف  
کو ہٹ گیا جیسے اس کا کام ختم ہو گیا ہو۔ سامنے ایک بڑا سا کمرہ تھا  
جس کی آرائش داخلی کسی شاندار آئین کی سی تھی۔ وہاں کئی افراد  
نظر آ رہے تھے۔ وہ سب بھی انہی دو افراد کی طرح کچھ پراسرار سے  
تھے جو لفٹ میں ہمارے ساتھ آئے تھے۔

اچانک اس کمرے سے ایک نہایت خوش لباس اور نفیس  
مفصل نکل کر میری طرف بڑھا۔ اس کی عمر پچیس تھیں اور پچاس کے  
درمیان تھی۔ اس کے چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی تھی جس میں کہیں  
کہیں معمولی سی سفیدی جھلک رہی تھی۔ داڑھی مختصر سی تھی اور  
اس کے سرخ و سپید چہرے پر بہت بچ رہی تھی۔ وہ دروازہ اور  
مضبوط تھا۔ تھری ڈیس سوٹ میں تھا لیکن اس کے ذرا اٹھے اٹھے  
سے بازو بتا رہے تھے کہ اس کی دونوں ہٹلوں میں ہولسٹر موجود تھے۔  
”آپ نے بہت انتظار کر لیا افضل صاحب! مجھے مرزا اکرم  
بیک کہتے ہیں۔“ اس نے نہایت دوستانہ لہجے میں کہا اور معائنے  
کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

میں ایک لمحے کے لئے تذبذب میں رہا کیونکہ میرا دایاں ہاتھ  
جب میں گن کے دستے پر تھا اور میں اسے کھانا نہیں چاہتا تھا۔  
اس کی نظر گویا ایک سرے تھی اور وہ دیکھ سکا تھا کہ میری جیب میں کیا

زندگی کے افسانے پڑھنے کے لئے  
میں نے اس کے ہاتھ میں لے لیا  
میں نے اس کے ہاتھ میں لے لیا  
میں نے اس کے ہاتھ میں لے لیا



# سکس



محمود احمد مودی

کوئی آچار نہیں تھے جن سے میں سمجھتا کہ میرا راستہ روکنے یا مجھے واپس جانے سے باز رکھنے کے لئے کوئی بندوبست کیا گیا تھا۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ مجھ سے شرطانہ اور پراسن ماحول میں کوئی بات کرنا ہی مطلوب تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے محرم بیک بولا ”وہیے بھی مجھے شرافت علی کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ اس نے آپ کے ساتھ بد تیزی کی سزا بھگت لی ہوگی۔“

میں نے جیب سے شرافت علی کی سائٹلسر والی مگن نکالنے ہوئے کہا ”نی الحال اس کی یہ مگن میرے پاس موجود ہے۔“

محرم یہ بد تیزی بات کاٹتے ہوئے خوشگوار لمحے میں بولا ”اسی سے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہاں کیا ہوا ہوگا۔ اُمید ہے شرافت علی کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آئندہ اگر میں اسے آپ کے پاس بھیجوں تو اسے کیا طرز عمل اختیار کرنا ہوگا۔“

”ہاں امید تو ہے“ میں نے اس کی تائید کی ”لیکن نی الحال میں اس کی یہ مگن واپس نہیں کروں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ محرم بیک بے پروائی سے بولا ”اے ایک گدھے کی ممانعت کی نشانی سمجھ کر آپ ہی دیکھ لیجئے گا۔“

”میں ممانعت کی نشانیاں مع نہیں کرتا۔ خصوصاً وہ سروں کی ممانعت کی۔“ میں نے کہا ”واپس جانے وقت دے جاؤں گا۔“

”یہ آپ کی کشادہ دلی ہوگی۔“ وہ بولا۔

میں نے ایک نظریج صاحب کی لاش کی طرف دیکھا اور بے نازی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟“

”میں نے آپ کو فون پر بتایا تو تھا کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“ وہ بد مشور شاخصل سے بولا۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑا تھا لیکن نہایت مہذبانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

”ایک برنس مین“ مرزا محرم بیک کی کیا مدد کر سکتا ہے؟“ میں نے ہمیں اچکا نہیں۔

”بہری افکار میں سروں بہت تیز ہے افضل صاحب!“ مرزا بیک مسکرایا۔ ”آپ خود کو صرف برنس مین نہ کہیں۔ آپ کی

اُمیدیں ہوئے خیالات اور اندیشوں کا ایک طوفان میرے ذہن میں برپا تھا اور میں کسی کے کچھ بتانے سے پہلے کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اعلیٰ عدالت کے جج کی لاش ایک بہت بڑے اسمگلر کے دفتر میں پائی جانا کوئی معمول بات نہیں تھی۔

میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس معاملے میں کہاں فٹ ہوتا تھا؟ میں تو جج صاحب یا مرزا محرم بیک۔ دونوں ہی سے صحیح طور پر واقف نہیں تھا۔ آخر اس موقع پر مرزا محرم بیک نے اتنے ہمار اور اصرار سے مجھے کیوں بلوایا تھا؟ کہیں یہ اس کی کوئی خوف ناک چال تو نہیں تھی؟ بدروانی کے پتکوں سے تو میں جج نکلا تھا۔ اب کہیں مرزا محرم بیک تو مجھے کسی جگہ میں پھانسنے کی فکر میں نہیں تھا؟

اندیشوں کا ایک سیلاب میرے ذہن میں اُسنے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کر ایک نظر شرافت علی کی طرف دیکھا جو مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ بیرونی کمرے میں ہی ٹوک گیا تھا اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑا تھا۔

محرم بیک نے مجھے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو جلدی سے معذرت خواہانہ لمحے میں بولا ”اس سے جو بھی گستاخی سرزد ہوئی توہم کی اس کے بارے میں کچھ پوچھتے بغیر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ بروست میں اسے اس لئے معاف کر رہا ہوں کہ یہ آپ کو یہاں لے آیا ہے۔ نی الحال اس کا یہ کارنامہ کافی ہے۔“

”یہ مجھے یہاں نہیں لایا۔ میں اسے یہاں لایا ہوں۔“ میں نے جج کی ”اور اس میں تمہاری ٹیلی فون کال نے زیادہ اہم بدلہ ادا کیا ہے۔“

محرم بیک مسکرایا ”شکریہ۔۔۔ بہر حال میرا مقصد آپ کو بلانا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ شرافت علی سے میں بد میں غمناک رہوں گا۔ نی الحال تو میرا آپ سے بات کرنا ضروری ہے۔ پہلے ہی آپ کے انتظار میں کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔“

اس نے منہ پھاندا انداز میں ہاتھ لٹے ہوئے ان چند جملے اصرار سے افراد کی طرف دیکھا جو نہایت سنجیدگی سے ہم دونوں کو گھور رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ بے شک جھوٹی کمرے میں کلا شکوفہ ہوا در موجود تھے لیکن ایسے

ہانگ نہ جانے کس کس معاملے میں ازی رہتی ہے۔ میں تو یہ کھوں  
کا کہ بڑی آپ کے لئے ہانوی چن رہا ہے۔  
جیسی اپنی کوشش تو کی ہوئی ہے کہ میں کسی بھی معاملے میں  
ہانگ نہ آزاؤں۔ میں نے طاقت سے کہا مگر خود ہی میری  
ہانگ پکڑ کر کسی نہ کسی معاملے میں آزاؤتے ہیں۔

وہ دھڑ سے ہنسنا۔ اس کے انداز سے قطعاً ظاہر نہیں ہو رہا  
تھا کہ کمرے میں ایک لاش موجود تھی اور وہ بھی ایک اہم آدمی کی  
لاش۔ وہ تو اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی  
اسی کی طرح لاش کی طرف سے بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہا  
تھا۔

میں سمجھ لیں کہ اس وقت بھی میں آپ کی ہانگ پکڑ کر ایک  
معاملے میں پھنسانا چاہتا ہوں۔ "کرم بیک ہوا۔

"کس معاملے میں؟" میں نے پوچھا۔  
"قل کے معاملے میں۔" اس نے پُر سکون لہجے میں جواب  
دیا۔

"کس حیثیت سے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے  
ہوئے پوچھا "قل کی حیثیت سے۔ یا متولی کی حیثیت سے؟"  
"اوردو۔" وہ مسکراتے ہوئے جلدی سے ہوا "مجھے ہرگز اچھا  
نہیں لگے گا کہ میں آپ کو ان دونوں میں سے کسی بھی حیثیت میں  
دیکھوں۔ میری نظر میں تو آپ کا نیچے اور ہی مقام ہے۔"

"اس مقام کی کچھ وضاحت نہیں ہو سکتی؟" میں نے پوچھا۔  
"ہم۔ یوں سمجھ لیں کہ اس وقت میری نظر میں آپ کی  
حیثیت ایک جگہ کی ہی ہے۔" وہ غصے غصے سے لہجے میں ہوا۔

میں نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں ہمارے  
ہاں بیچ بھی اس انجام سے دوچار ہونے لگے ہیں۔ براؤ کرم مجھے بیچ  
نہ ہی بناؤ میرے حق میں بھڑ ہو گا۔ کیا تم مجھے بھی ایسے ہی انجام  
سے دوچار کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔" وہ جلدی سے ہوا "میں تو  
آپ کے بارے میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شریف اور معزز آدمی کے  
بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری نظر میں آپ کی حیثیت  
بیچ کی ہی یوں ہے کہ بیچ کا کام حالات و واقعات اور شادوں کا جائزہ  
لے کر کسی کو قصور وار یا بے قصور قرار دینا ہوتا ہے۔ میں چاہتا  
ہوں آپ مجھ پر کرم فرمائیں اور میرے لئے کچھ ایسی قسم کا کردار ادا  
کریں۔ میں آپ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا۔"

ایک تو اس کے بعد سے زیادہ مذہبانہ اور دوستانہ رویے نے  
مجھے الجھن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اوپر سے اس کی باتیں بھی سننے سے  
کم نہیں تھیں۔ اس کی باتوں کے علاوہ بھی کئی باتیں تھیں۔ میری سمجھ  
میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں؟ اس کی کسی بات  
کا کیا جواب دوں؟ یا یوں کہنے کہ اس کی کس بات کے جواب میں  
کیا سوال کروں؟

خیالات کا جہم واقعی میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ سب

سے پہلے تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ مکرم بیک اور  
ملک میں نظر کیسے آ رہا تھا؟ میری معلومات کے مطابق بہت بڑے  
اسٹنگروں کے خلاف بڑی زبردست مہم جاری تھی اور وہ ملک سے  
مفرور تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کس لگاؤ  
سے مفرور قرار دوں؟

وہ تو اپنی تمام تر خوش لباسی، اطمینان اور سکون کے ساتھ  
میرے سامنے موجود تھا۔ نہ صرف خود موجود تھا بلکہ اس کے ساتھ  
محافظین بھی موجود تھے اور اطمینان سے بیٹھ کر کمرے میں ٹھہر رہے  
تھے۔

میرے لئے یہ امر بھی قدرے حیرت کا باعث تھا کہ شہر میں  
اس کا باقاعدہ ایک دفتر بھی موجود تھا۔ شہر کے اس پورے علاقے  
میں اس سنگی سی بلڈنگ میں یہ بڑا سا پارٹمنٹ ایک باقاعدہ دف  
معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے ایک دو کمروں کے کچلے دروازوں سے  
مجھے اندر کی جھلک نظر آتی تھی۔ کمروں میں شاندار میزیں، عکاسی  
فائلنگ کینٹ، ٹیلی فون، فیکس مشینیں اور ایک اچھے دفتر کے دیکھا  
تمام لوازمات نظر آ رہے تھے۔

میرے لئے دوسری بڑی حیرت اس دفتر میں بیچ صاحب کی لاش  
تھی۔ ان بیچ صاحب کا نام عبدالسلام تھا اور میں نے سنا تھا کہ وہ  
بہت ہی سخت گیر اصول پسند اور کسی کے سامنے نہ ہلنے والے  
تھے۔ ان کی وراثت داری کو کسی قسم کے شک و شبہ سے بالا تر کر  
جاتا تھا۔

فکری طور پر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ کیا ان کا  
وراثت داری اور اصول پسندی ان کے لئے سزا بن گئی تھی؟ کیا مکرم  
بیک کا کوئی مسئلہ ان کے پاس انکب گیا تھا اور وہ کسی طرح اسے اپنے  
مرضی کے مطابق حل کرانے میں ناکام رہا تھا؟ کیا اسے آخری طر  
ہی نظر آیا تھا کہ بیچ صاحب کو راستے سے ہی ہٹا دیا جائے؟ کیا اب  
ہمارے ملک میں بھی اسٹنگروں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ  
اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو قتل کرانے لگے تھے اور وہ بھی میں اس  
آفس میں؟

یہ کچھ ایسا بھید از امکان بھی نہیں تھا۔ بلکہ شاید اب تو کچھ  
بھی بعید از امکان نہیں رہا تھا۔ ایسے ایسے ہولناک واقعات رونے  
ہو رہے تھے جنہیں محض تسلیم نہیں کرتی تھی کہ انسانوں کی بھڑ  
بڑی اور کھان آباد ہستیاں میں ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ ایسے  
واقعات بھی سننے میں آتے تھے جن میں ہٹا ہر کوئی ہولناکی نظر نہیں  
آتی تھی لیکن اگر ان کے نتائج اور دور رس اثرات پر غور کیا جاتا  
مستقبل کا نقشہ بڑا ہولناک نظر آتا تھا۔

خدا پچھلے دنوں میں نے سنا تھا کہ ایک بہت بڑے ڈرگ اسمگلر  
کے خلاف زیادہ سخت کارروائی ہوئی تو اس نے ملک کی ایک بہت  
ہی بڑی شخصیت کے قریبی عزیز کو اغوا کر لیا تھا اور اسے اپنے  
علاقے میں اپنے محل میں ایک طرح سے پُر غلام بنا کر رکھ لیا تھا۔  
یہ کچھ ایسی قسم کی باتیں تھیں جن کے لئے جھوٹے گھر تھے کہ

”بلوانے کے لئے اٹھا خود نہ کرتا۔“ وہ کئی دہائی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”میری نظریں آپ ایک خاص۔۔۔ بلکہ بہت ہی خاص آدمی ہیں۔ اور موجودہ صورت حال میں تو آپ میرے لئے جتنے خاص ہو کر رہ گئے ہیں اس کا آپ خود بھی تصور نہیں کر سکتے۔“

”میں سوچ رہا ہوں اگر میں بھی اسی طرح تمہاری کھوپڑی میں ایک گولی اتار دوں جس طرح تم نے بیج صاحب کی کھوپڑی میں اتاری ہے تو میں اور کئی زیادہ خاص القاس آدمی ہو جاؤں گا۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”چلیں۔۔۔ چلیں۔۔۔ افضل صاحب!“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا ”میں ایک بار پھر کیا درخواست کروں گا کہ آپ صورت حال کو دیکھ کر وہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہ کریں جو کوئی بھی عام آدمی اخذ کرے گا۔ یہ آپ کی انکساری ہے کہ آپ خود کو عام آدمی تصور کرتے ہیں لیکن مجھے بھی معلوم ہے۔ اور خود آپ کو بھی معلوم ہے کہ آپ عام آدمی نہیں ہیں۔ اگر آپ قتل سے میری بات سنیں تو شاید آپ کی وہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آجائیں جن کی اس وقت مجھے ضرورت ہے۔“

”میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔ ”بیج صاحب کو میں نے قتل نہیں کیا۔“ وہ بڑے اختصار سے بولا۔

”ظاہر ہے اس قسم کے کام تم اپنے ہاتھ سے تو انجام دیتے رہے۔“ ”میں تو صرف زبان ہی ہلاتی رہی ہوگی۔ بلکہ بعض اوقات تو شاید زبان ہلانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی ہوگی۔“ ”آکھ سے اشارہ کرنا ہی کافی ہوتا ہوگا۔“ میرے لہجے میں سختی برقرار تھی۔

”میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے افضل صاحب!“ وہ بڑے قہر سے بولا۔ ”وہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن اس کا اندازہ خطاب مؤدبانہ تھا جبکہ میں نے اسے ”تم“ سے خطاب کرنا شروع کر دیا تھا۔“

”چھ!“ تو پھر شاید عبدالسلام صاحب کو اچانک خودکشی کا خیال آگیا ہو گا اور انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس کام کے لئے مرزا کرم بیگ کے دفتر سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔“ ”میں مشکل میں پھنسانے کے لئے انہوں نے یہاں آکر خود کو گولی مار لی ہوگی۔ کیا تم نے مجھے یہ کہانی سنانے کے لئے یہاں بلایا ہے؟“

”نہیں!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تو آپ کو صرف وہی کچھ بتا سکتا ہوں جو میرے علم میں ہے۔ مجھے نہیں معلوم عبدالسلام صاحب نے خودکشی کی ہے یا کوئی اور پکڑ ہے۔“

”ظاہر ہے اگر تم اسے خودکشی قرار دیتے تو میں یہ بھی پوچھتا کہ وہ پھول یا روٹو لور کہاں ہے جس سے انہوں نے خودکشی کی ہے۔“ میں نے سر ہلایا ”کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے؟“

”نہیں!“ اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا ”مجھے صحیح بات

اصلاح اشتہال کی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں ایسے نہ جانے کتنے ”کلمات کفریہ“ روز آتے تھے اور گزر جاتے تھے کسی کو گھر کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب گھر سے بے نیاز ہو چکے تھے۔“

میری نظریں ارادی طور پر بیج صاحب کی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ ایسے غورسیدہ نہیں تھے شاید اپنی نیک نائی اور ساکھ کی وجہ سے۔ یا پھر اپنی قابلیت کی بدولت اس عمر میں مصطفیٰ کے خاصے بلند مقام پر پہنچ چکے تھے۔ انہیں تقریباً جوان ہی شاد کیا جاسکتا تھا۔ ان کے بالوں میں معمولی سی سفیدی تھی۔

میں نے جب انہیں ایک پہل میں قریب میں دیکھا تھا تو دل ہی دل میں انہیں اچھے خاصے دلچسپ آدمیوں میں شمار کیا تھا۔ ان کی رنگت سرخ و سپید، بال سیاہ چمکیلے تھے۔ اس سیاہی میں سفیدی کی جھلک بھی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ چشم لگاتے تھے مگر شاید صرف لکھتے پڑھتے وقت انہیں اس کی ضرورت پیش آتی تھی۔ کانٹہ سے نظر بناتے تھے تو چشمہ اتار لیتے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی خوب صورت تھیں۔ ان بھوری آنکھوں میں زندگی کی چمک نمایاں تھی۔

لیکن اس وقت جو چہ میرے سامنے تھا وہ کسی دلچسپ آدمی کا چہرہ نہیں تھا۔ موت کی بد صورتی نے اس پر بری طرح چنے گاڑ لئے تھے۔ سرخ و سپید رنگت نمایاں رہ گئی تھی اور چہرہ کچھ متورم نظر آ رہا تھا۔ ایک آنکھ میں تو خون بھر گیا تھا اور وہ اس کے نیچے چھپ چکی تھی مگر دوسری آنکھ کھلی تھی اور گویا چمکتی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً آنکھ کو بھی گویا موت کی دھندلاہٹ نے وضاحت لیا تھا۔

میرے حلق میں سختی سی پھیل گئی۔ میں نے لاش سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر کرم بیگ کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر زندگی اور صحت مندگی کی ہلک اپنی بار بار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکاتے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میرے محسوسات کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کیا تم نے مجھے اپنے اس کارنامے کا تماشا کی بنانے کے لئے بلایا ہے؟“ میں نے گہری سانس لے کر سرد لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی افضل صاحب!“ وہ قدرے ناسف سے بولا۔

”کیا امید نہیں تھی؟ کیا کہ میں یہ بات تمہارے منہ پر کہہ دوں گا؟“ میں نے بانٹا چالا۔

اس نے گویا بڑے قہر سے کام لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا ”نہیں۔۔۔ مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آپ کے ذہن میں بھی وہی بات آئے گی جو کسی عام آدمی سے آدمی کے ذہن میں آ سکتی ہے۔“

”میں بھی ایک عام سادی آدمی ہوں کرم بیگ!“ میں نے دیکھے لہجے میں کہا۔ ”مجھے کسی کے سامنے خاص آدمی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور تم سے تو دوسرے بھی میری یہ پہلی ملاقات ہے۔“ ”میری نظریں اگر آپ عام آدمی ہوتے تو میں آپ کو یہاں

”کیا ایسا ہوا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔ ایک گناہ فون کال کے ذریعے ایک خیر انجمن کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو اطلاع دی گئی کہ مرزا کرم بیگ کے دفتر میں بیج عہد السلام کو قتل کر دیا گیا ہے۔ خیر انجمنی کے اہلکار میر اس وقت یہاں پہنچے ہیں جب میں بھی اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ یہاں پہنچا ہی تھا اور ہم لوگوں کو ٹالا کھول کر پارکسٹ میں داخل ہوئے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”جست خوب؟“ میری دلچسپی کچھ بڑھنے لگی ”قابلاً ان حضرات نقلی خیر انجمنی سے ہے؟“

میں نے ان پر اسرار سے لوگوں کی طرف دیکھا جن کے چہرے سناٹ تھے اور جو بدستور خاموشی سے ہماری طرف دیکھے جارہے تھے۔ ان کا مہرہ کھل اور خوب ضبط قائل واد تھا کہ ہماری اتنی دیر تک بیگ کے دوران انہوں نے ایک نظم کی حد سے نہیں نکالا تھا۔ بہر حال اب ان کی خرا سرارت میری سمجھ میں آگئی تھی اور یہ سخت سی دہ میرے لئے کچھ ایسے پراسرار نہیں رہے تھے۔

کرم بیگ نے اثبات میں سر ہلایا اور سلسلہ کلام جو فرہ ہوئے کہا ”اب قابلاً اس حد تک تو بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہو کہ میں اتنا احمق نہیں ہو سکتا جتنا اس صورت حال میں نظر آہوں۔“

میں خاموش رہا تو وہ کرنا مجھے اپنے احمق نہ ہونے کا قیام دلانے ہوئے کچھ اور زور دے کر بولا ”اضل صاحب! میری چیز بے لگ نہیں ہیں لیکن میری زندگی کا بیشتر حصہ دوسرے ملکوں میں گزرا ہے۔ دوام لاس انجمنس لندن“ میری اور دینی میں میر اس سے بہتر واقف تریں جیسا آپ اس وقت یہاں دیکھ رہے ہیں۔“

”در بظاہر تمہارا بزنس کیا ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹہ ہوئے پوچھا۔

وہ دھیرے سے ہنسا ”بے لفظ بظاہر“ آپ نے خوب استخلا کیا ہے لیکن میں آپ کے اس طعنا پر انہیں مناسبتیں گا۔ اس وقت میں آپ سے اسی قسم کی باتوں کی توقع کر رہا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ جب دھیرے دھیرے بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی تو آپ ہر دریاں میرے ساتھ ہو جائیں گی۔“

اس نے خاموش ہو کر سر ہٹا لیا گیا سوچ رہا ہو کہ سلسلہ کا کو کیسے آگے بڑھائے۔ ہم سب اس کمرے میں اس طرح صوفوں بیٹھے تھے کہ کوئی دفتری سینک جلی رہی ہو۔ کمرے کی آرائش و فنروالی ہی تھی۔ صرف دھلاش دہاں غیر متعلق سی رنگ تھی اسیا معلوم ہوا تھا کہ فی الحال کسی کو اس کی فکر بھی نہیں تھی شاید ابھی تک کسی نے اسے وہاں سے اٹھانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

”میں نے تمہارے بزنس کے بارے میں پوچھا تھا۔“ میں دھچکے لیے میں کرم بیگ کو یاد دلایا۔

”میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ وہ سر اٹھاتے ہو۔

معلوم نہیں۔ لیکن اتنا اندازہ میں بھی لگا سکتا ہوں کہ بیج صاحب نے خود کئی نہیں کی۔ میری معلومات کے مطابق ان کے حالات میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو انہیں خود کئی پر مجبور کر دیتی۔ ایک بیج کی زندگی عموماً خطرات میں گھری ہوتی ہے۔ خصوصاً ایک بہت وادعت دار نہایت بے لگ اور سخت اصول پرست بیج کی زندگی میں تو خطرات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں لیکن عہد السلام صاحب ان خطرات سے فانس ہو چکے تھے اور وہ اتنے کمزور یا زور پرک نہیں تھے کہ ان خطرات سے گھبرا کر خود کئی کر لیتے۔ اتنا مجھے یقین ہے۔“

اس نے ایک فکر ان نامعلوم پراسرار سے لوگوں کی طرف دیکھا جو ابھی تک گونگے بیروں کی طرح بیٹھے تھے، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”بیج صاحب کے لئے سب سے بڑا خطرہ تو میں خود تھا۔“

”کیوں؟“ میں نے محض وضاحت کی خاطر پوچھا حالانکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی بات کا مطلب کیا تھا۔

”اس لئے کہ میرے خلاف سب سے زیادہ خطرناک مقدمات انہی کی عدالت میں زیر سماعت تھے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا ”پولیس۔ خیر انجمنی۔ این سی بی یعنی نازکوں کے کسٹوڈی بورڈ کے تحت کام کرنے والے ادارے۔ بہت سے صحافی اور ہر وہ آدمی جسے اس قسم کے معاملات سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی ہوتی ہے اس حقیقت سے واقف تھا۔“

”بہت خوب۔“ میں نے کہا ”صرف میں واقف نہیں تھا۔“

”آپ اس لئے واقف نہیں تھے کہ آپ ابھی میری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے اور آپ کو ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔“

”لیکن جس ڈرامائی انداز میں تم نے مجھے بلوایا ہے اس کے بعد مجھے دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

”میں میں چاہتا تھا۔“ اس نے قدرے طمانیت سے سر ہلایا ”آپ دلچسپی لیں گے جی میرا مسئلہ حل ہو گا۔ یہ تو آپ کی سمجھ میں آئی گیا ہو گا کہ بیج صاحب کے سامنے میری پوزیشن بہت نازک تھی۔ جب تک میرے خلاف کئی سنگین مقدمات ان کی عدالت میں زیر سماعت تھے جب تک کیا میں ایسی حماقت کر سکتا تھا کہ انہیں مردانے کی کوشش کرتا۔ اور وہ بھی میں اپنے آفس میں۔“

میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی کوئی تبصرہ کیا۔ اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ ذرا تیزی سے بولا ”کیا میں اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ عہد السلام صاحب کو نہ صرف اپنے آفس میں شوث کر داتا بلکہ ایک خیر انجمنی کی ایک بڑی شخصیت کو فون کر کے اطلاع بھی دلواتا کہ میرے آفس میں بیج صاحب کی لاش موجود ہے۔ نہ صرف لاش موجود ہے بلکہ میں خود بھی موجود ہوں۔“

ہوا "مجھے تو اب صحیح طور پر یاد بھی نہیں رہتا کہ میرے کون کون سے بزنس ہیں۔ اسپورٹ ایکسپورٹ، جو میلرز مارکیٹنگ، شپنگ، ریکسٹل اسٹیت کے علاوہ ایک چھوٹی سی انٹرلائی بھی میری ملکیت ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ملکوں میں ڈیپارٹمنٹل اسٹورز ہیں اور کچھ دوسرے کاروباروں میں بھی مجھے داری ہے۔"

میں سوچا ہوا تھا کہ اس نے اپنے سب سے اہم "بزنس" کا نام نہیں لیا تھا۔ جو بزنس وہ گوارا ہوا تھا۔ یہ سب تو دراصل اسی ایک "بزنس" کو آؤ فرامز کرنے کے اختطافات تھے تاہم میں نے اس حیلے میں سہرست کوئی سوال کرنے کے بجائے کہا "تمہارے کاروباروں میں جانے ادا کا کاروبار بھی شامل ہے لیکن کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ یہ ملک۔۔۔ جہاں بقول تمہارے "تمہاری جڑیں ہیں۔ یہاں تمہاری کوئی جائداد نہیں؟"

وہ ایک بار پھر ہولے سے جتا "بہت خراب اچھا سوال کیا ہے آپ نے۔۔۔" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ٹی وی کے کسی ڈاکٹرے میں کوئی مہمان "کمپیئر کو داد دے رہا ہو" اس کا مطلب ہے آپ بھی میرے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے ہیں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوش ہوئی ہے۔ یہ اچھی علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ میری ذات میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ میں کیسی چاہتا تھا۔ جب آپ کسی کی ذات میں دلچسپی لیتے ہیں بھی کسی کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ میرے کام آئیں گے۔"

"میرا سوال اب بھی بڑا جواب ہے۔" میں نے کہا۔  
"اصل میں سوال در سوال کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ اور یہ اچھا ہی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھے اچھی طرح جان لیں۔ میں نے اب یہاں کوئی بھی چیز ذاتی ملکیت میں رکھنے سے قوتہ کر لی ہے۔ میں صرف اس ملک سے جذباتی وابستگی رکھتا ہوں جو یہاں سے اپنا تعلق برقرار رکھے ہوئے ہوں ورنہ میں کبھی طور پر درحقیقت یہاں کوئی ایسا خاص کام نہیں کرنا۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ دوبارہ بولا تو اس کے لیے میں کبھی سی افسرو کی در آئی تھی "میں یہاں کے ایک چھوٹے سے شر کو براؤنوال کے ایک غریبانہ سے ٹیکے میں پیدا ہوا تھا لیکن میری وابستگی بہر حال پورے ملک سے ہے۔ مجھے کبھی شہر اپنے گھٹنے ہیں اور مجھے کبھی سے چار ہے۔ میں ہر شہر کے کچھ کچھ سے مانوس ہوں۔ اپنی تمام تر رغبت اور تاسا سہ حالات کے باوجود میں نے بزنس اور صنعت کی دنیا میں بڑی تیزی سے اپنا مقام بنایا تھا۔ لیکن میں "میں نے وگان مارکیٹ" کو لیکن میں چند چلتی ہوئی مصنوعات کی ڈیپارٹمنٹ لے فوجوانی میں ایک چھوٹا سا کارخانہ لگایا اور تیس سال کی عمر کو پہنچے تک میں چار بڑے کارخانوں کا مالک تھا۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میری اپنی کمائی بھی اس سے ملتی جلتی تھی لیکن وہ تو میرا بھی استاد معلوم ہوتا تھا۔ اب میں تنجیدگی سے اس کی طرف توجہ دیتے پر مجبور ہو چکا تھا۔ نج صاحب کی لاش نے جہاں اتنی دیر انتظار کیا تھا وہاں کچھ دیر اور

انتظار کر سکتی تھی۔ ایک دو در۔ کمائی مکمل کر سائے آوری تھی۔ مرزا محرم بیگ بھی یقیناً انسانی اصل کو حیران کر دینے والا ایک کردار تھا اور حیران کر دینے والے کردار میری کمزوری تھے۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "۱۳ مریکا کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہاں ذہن اور محنت کرنے والے لوگ بڑی تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ یہ بات درست بھی ہے۔ ہمارے ہاں ذہن اور محنتی لوگوں کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ بدولت اور بے ایمان لوگوں کے لئے یہاں کا ماحول برا زرخیز ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگ صرف اور صرف ذہانت و محنت کے ثل بوتے پر حیرت انگیز زرقار سے ترقی کر کے دکھاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ: ذرا نام ہو تو یہ ملی بڑی ذر زرخیز ہے ساقی۔"

مجھے ذرا سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ ایک رسوائے زمانہ اسٹریکٹار اقبال کی شامی کا حال دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے اس پر کیا تبصرو کرنا چاہئے ویسے بھی میں اسے دہائی سے بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت بے ساختہ باتیں کر رہا تھا۔

"میرے چار کارخانے بھی میری ایسی محنت کا ثمرہ ہوں ثبوت ہیں۔ جس کا میں اب تصور بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے سلسلہ نکلام جوڑا "میں نے انہیں اپنی فوجوانی کے لہو سے سینچا تھا۔ میں نے بزنس کی طرح کام کیا تھا۔ مجھے بزنس اور صنعتکار کی کا جنون تھا۔ مجھے لڑکھنڈ فوجوانی میں بھی کوئی ایسا شوق نہیں تھا جو اس عمر میں ہونا چاہئے تھا۔ میں اس معاملے میں ابنا رہا تھا۔ اور غیر معمولی کارنامے انجام دیں لوگ ہی انجام دیتے ہیں۔"

کسی حد تک اس کی بات صحیح تھی لیکن میں نے دیکھا تھا "ابنا رہا لوگوں کی غیر معمولی اور بختائی صلاحیتیں عموماً مٹتی ہوئی تھیں۔ وہ شر کے میدان میں بڑے کارنامے انجام دیتے تھے۔ غیر کے میدان میں نہیں۔"

وہ بات باری رکھتے ہوئے بولا "ایک عمر تک مجھے کاروبار کے سوادہا کی کسی چیز کی طرف توجہ دینے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ چار کارخانے میرا خواب تھے۔ میں یہ سوچ کر سستا لگا تھا کہ میں کی میری حوصلہ تھی۔ مجھے اس سے آگے نہیں جانا تھا۔ بے شک ان کارخانوں میں سرکاری بینکوں کا قرضہ بھی شامل تھا لیکن قرضہ میں نے وراثت داری سے حاصل کیا تھا اور وراثت داری سے ادا کر دیا تھا۔ زیادہ اہم چیز میری انتھک محنت اور شاندار اپنا ٹھکانہ تھی جسے کسی غیر ملکی ماہرین نے بھی سراہا تھا۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے لمبھی سانس لی اور قدرے افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولا "۱۳ مریکا پر ہوا ہے کہ راتوں رات میرے کارخانے فیشلز کر کے گئے۔ میری رہائش بھی ایک کارخانے کے اندر ہی واقع جگہ میں تھی۔ مجھے کڑے بیویوں اس سے نکال دیا گیا۔ مجھے کوئی معاونہ نہیں دیا گیا۔ بینکوں کے قرضوں کی وجہ سے لمبے چوڑے جھگڑے کھڑے کر دیے گئے جن میں کسی اصول، کسی قاعدے کو مدلل نہیں تھا۔ میں ایک طویل عرصے تک

اور بار بار لاٹش کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن کرم یک کو گواہی کی کوئی پروا نہیں تھی۔

وہ اپنی ٹانگی کی گہرے درست کرتے ہوئے بولا "میرا حال یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں دراصل آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا شخص جس نے اپنی عمر کو بچنے تک اتنے کارنامے انجام دیے ہوں جسے ہر انسان کا وہ باری طعنوں میں جینٹل سمجھا جانا وہ کیا وہ اسحق ہو سکتا ہے کہ اس بچ کو اپنے دفتر میں نقل کر دے جس کی عدالت میں اس کے خلاف کی مقدمے چل رہے ہوں؟"

"اس سوال کا جواب دینے سے پہلے خود میرے ذہن میں کچھ سوالات ابھر آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ مجھ سے کوئی بھی سوال کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ کتنا ہی توہین آمیز محسوس ہو۔ میں آپ کے ہر سوال کا۔ اپنی رابطہ کے مطابق تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ آپ میری طرف سے مطمئن ہوں گے۔" یہی میری کوئی مدد کر سکیں گے اگر آپ بدگمان یا دوسروں کا شکار ہیں گے تو پھر میرے کام نہیں آسکیں گے۔"

"سب سے پہلے تو مجھے یہی بات عجیب لگ رہی ہے کہ عبدالسلام صاحب کی عدالت میں تمہارے خلاف مقدمے چل رہے تھے۔ بتول تمہارے اپنے۔ تم تو ایک شریف اور جینٹل بزنس میں ہو۔ تمہارے خلاف مقدمے چلنے کی روایت کیوں آگئی؟" وہ استغراب سے انداز میں ہولے سے ہنسا سوال آپ نے بظاہر جو پوچھا ہے کیا ہے لیکن مجھے معلوم ہے اس میں آپ کی ہوشیاری نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے ہاں یہ کوئی نئے شہ قاتل ہوا نہیں ہے کہ شریف اور جینٹل بزنس میں عدالت کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چل سکتا۔ اگر کوئی بتائے پری فل جائے تو پھر تین بیویاں مقدمے میں جاتے جاسکتے ہیں۔ میرے ساتھ دیے بھی خاص طور پر ایک بھائی رہی ہے۔"

"جگہ تم بہت دولت مند ہو گئے؟" میں نے تعجباً۔

"اے اللہ! یہی کچھ کہتے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "میں نے دولت مند ہونا لوگوں کے لئے خوش قسمتی کی علامت سمجھ لیکن مجھے دولت کے ساتھ تھوڑی سی بد قسمتی بھی شامل ہو کر ملی ہے۔ میں نے چرک و کرہ مرتبہ خالی ہاتھوں سے جدوجہد شروع کرنے کے بعد خالی ہاتھیں حیرت انگیز سے تنہی کی اس لئے میری شخصیت میں لوگوں کے لئے کچھ برائیاں، کچھ انسانیت سی پیدا ہو گئی۔ ویسے بھی ہمارے ہاں کوئی تیزی سے امیر ہو جائے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کا سنگت کر رہا ہے۔"

"بعض اوقات یہ بات درست بھی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"بعض اوقات نہیں۔ بلکہ اکثر اوقات درست ہوتی ہے۔"

اس نے تسلیم کیا۔

"لیکن بد قسمتی سے میرے معاملے میں یہ بات درست نہیں تھی لیکن بس افسانے اڑتے رہے اور میرے بارے میں یہ تاثر

مختلف دفاتروں کے درمیان فٹ بال پڑا ہوا۔ کسی نہ کسی طرح کینچن آنا کر یہ ثابت کر دیا گیا کہ میں کچھ لینے کا حق دار نہیں تھا۔ اگلا میری طرف سرکار کا چکر لگتا تھا۔ یہ صرف میری کمائی نہیں تھی۔ نہ جانے کتنوں کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ ان کی برسوں کی محنت پر شب خون مار لیا گیا۔"

"اگر اس سارے عمل سے وہ مفید حاصل ہو جاتے جس کے دعوے کئے جا رہے تھے تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھ جیسے لوگ شاید جلد اس حد سے کو بھول جاتے کہ چلو ایک فرد ایک غائبانہ کے نقصان کی کوئی بات نہیں قوم کو تو فائدہ پہنچا کر افسوس آیا بھی نہیں ہو سکا۔ قوم کے نام پر تو قیامی مئی معنوں کا جو مشر ہو اور قوم کی بچھی ہوئی کر رہی جس طرح مزید بوجھ کا اضافہ ہوا وہ سب کے سامنے۔"

میں اپنی رام کمائی کو زیادہ تفصیل سے گویا نہیں چاہتا کہ اس میں بڑے غیرت انگیز واقعات موجود ہیں مگر یہ وقت تفصیل میں جانے کا نہیں ہے۔ آپ کو مختصر بھی اس لئے سب کچھ بتا رہا ہوں کہ آپ میری شخصیت سے کسی حد تک واقف ہو سکیں۔ مختصر میں یہی کہ اس کے بعد میں دل شکستہ ہو کر باہر چلا گیا اور ایک بار پھر سترے سے جدوجہد شروع کی۔ وہاں بھی میں نے تیز رفتار ترقی کی حیرت انگیز رفتار کا قیام سمجھا۔ مگر آپ اسے خود پرستی یا خود ستائشی نہ سمجھیں تو میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ میں ایک کاروباری جینٹل ہوں (فصل صاحب)۔"

"ہر آدمی کو اپنی کچھ بوجھ کے مطابق اپنی صلاحیتوں کا کریڈٹ لینے کا حق ہے۔" میں نے کہنے سے اچکاتے ہوئے کہا "میں اعتراض کرنے والا کون ہوں؟"

"شکریہ۔" اس نے سلسلہ کلام جوڑا "میں جلد ہی اپنے چار کارخانوں کا مقدمہ بھول گیا۔ میں نے اس ملک سے تعلق نہیں توڑا۔ میری زیادہ تر کاروباری سرگرمیوں کے مرکز دو سرے ہی ملکوں میں تھے لیکن میں جیش میاں آتا جاتا رہا اور میرے کئی دفاتر میاں بھی کام کرتے رہے البتہ میری ایک اہمیت جاری رہی کہ میں نے میاں پر اپنی نہیں بنائی۔ میاں کچھ پتا نہیں ہے کب کون سا حکم اچانک نازل ہو جائے میں دودھ کا جلا ہوں۔ چھاپہ بھی پھونک پھونک کر رہا ہوں۔ ویسے بھی کینچن آئی ہمارا قوی شعار ہے ایک آتا ہے۔ دو کوئی منصوبہ قوم کے سرے لادتا ہے۔ ابھی قوم اس کے بوجھ سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے کہ دو سرا آتا ہے۔ وہ اس منصوبے کو اس کے سرے آتا دیکھتا ہے اور اس کی جگہ اپنی سیاسی فیکٹری کا تیار کردہ منصوبہ لادتا ہے۔ اسی کینچن آئی میں بے چارے عوام اور معیشت۔ دونوں کی کمرٹھنے کے قریب ہے۔"

وہ ایک لمبے لمبے غامض ہوا۔ وہ پراسرار غصہ میں جن کے بارے میں اپنے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا تعلق خفیہ ایجنسیوں سے تھا "اب قدرے اضطراب سے پھلو بدل رہی تھیں

اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں کی وجہ سے مجھے کچھ بانی فائدہ بھی پہنچا رہا لیکن یہ بڑا مٹا کھرا قاتل میرے دل میں جو رہیں، ٹرانسفر ہوتی رہیں انہیں قتل کا جائز کاروباروں میں شائع میں سے اپنا حصہ سمیٹتا رہا۔ اگر مجھے بروقت معلوم ہو جاتا کہ وہ لوگ کس طرح سے سب کچھ کارہے تھے۔ کتنا کارہے تھے اور مجھے کتنے کم پر خرابے تھے تو میں فوراً اس سلسلے میں کم از کم اتنا تو کرنا کہ ان سے کاروباری تعلق توڑ لیتا۔ دوستی اور مروت بعد کے مسئلے تھے۔

”تمہارا مطلب ہے صرف ان لوگوں کی وجہ سے تم ہر شے سے وغیرہ قائل تھے اور انہی کی وجہ سے تمہاری شہرت خراب بھی ورنہ تم ایک نیک نام تاجر ہو تے اور تمہاری شہرت بہت اچھی ہوتی؟“ میں نے پوچھا۔

”جیسا کہ میرا یہ دعویٰ تو نہیں ہے۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا ”میں نے کمانا کہ کچھ اتفاقات کچھ غلط فہمیاں کچھ میری شخصیت کی پراسراریت اور کچھ ٹھیکوں کی بد معاشرہ کی وجہ سے میں رسوائیوں کی زد میں تو تھا اور میرے خلاف کارروائیاں بھی چلتی رہتی تھیں لیکن اگر یہ لوگ اپنے اعمال کا پورا پورا جواب دے دیتے تو میں زیادہ مشکل میں نہ ہوتا اور میرے گرد رسوائیوں کی دھول اتنی گہری نہ ہوتی۔ میرے لئے پاکستان میں زندگی گزارنا دشوار نہ ہوتا۔ ان لوگوں کی وجہ سے میں ایک جسم کی دلدل میں پھنس گیا ہوں اور مجھے زیادہ تر ملک سے باہر رہنا پڑا تھا جبکہ میں ایسا چاہتا نہیں تھا۔“

”میں نے تو کیا سنا تھا کہ ان دنوں بھی تم مفروز تھے۔“ میں نے بغیر نہ سکا۔

وہ بڑے حتمی سے مسکرایا ”میرے لئے مفروز کی اصطلاح استعمال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں کہیں بھی پولیس کو مطلوب نہیں ہوں۔ جس عدالت یا جس خفیہ ایجنسی میں بھی میری پیشکش ہوتی ہے یا مجھے بلایا جاتا ہے اور میرا دل پہنچا مفروز ہوتا ہے تو میں ہرگز میرے دیکل پہنچتے ہیں۔ ہر دور حکومت میں میرے خلاف کوئی کارروائی چلتی رہی ہے۔ میں اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون کرتا رہا ہوں۔ تحقیقات سے ڈر کر میں کبھی نہیں بھاگ۔ ویسے میں ہر وقت حالت سفر میں ہی ہوتا ہوں۔ کبھی کسی کیس میں میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کیا جاسکا۔“

اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ گویا کسی تصور سے محفوظ ہوتے ہوئے بولا ”میرے بارے میں پراسراریت اور افسانویت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ اس کے اثرات دیگر ممالک تک بھی پہنچ چکے ہیں۔ وہاں بھی ایک طرف کاروباری حلقوں میں مجھے جیش قرار دیا جاتا ہے تو دوسری طرف بعض طبقے میرے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے ہیں جن میں بعض ایسے خیانتدان بھی شامل ہیں جنہیں میں نے ان کی انتہائی محبت و دیگر سیای سرگرمیوں کے لئے ہماری عطیات دینے سے انکار کر دیا۔ میں

بہت مضبوط ہو گیا۔ اس میں کچھ اتفاقات کو بھی دخل تھا اور اس سلسلے میں میرے بعض دوستوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوئی گا کہ میں بڑا یا رہاں اور دوست پرور آدمی ہوں حالانکہ ایک کئی برس تک دوست پرور نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں جذبات کی گہرائی نہیں ہوتی۔ کاروبار تو اچھی خاص سفاکی مانگتا ہے لیکن میں اس مقام پر پہنچنے کے بعد بھی جذبات کو ساتھ لے پھر رہا ہوں۔“

یہ تو اس کجست نے میرے دل کی بات کر دی تھی۔ کیس سے میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی اچھی تو حاصل نہیں تھی؟ کیس اس نے میری غلط فہمیاں تو نہیں چڑا رکھا تھا؟

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”یہ جذباتیت ہی کا کمال ہے کہ میں اس ملک میں نظر آ رہا ہوں اور یہاں میرے وفات قائم ہیں ورنہ مجھے یہاں رہنے اور کاروباری سرگرمیاں جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ میری دوست پروری سے میرے دوستوں نے بڑا جائز فائدہ اٹھایا۔ میں اپنے دوستوں کی وجہ سے بڑا بدنام ہوا۔“

”تم نے ایسے دوست بنائے ہی کیوں؟ بڑے لاؤصحوں کا کمانا ہے انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔“ میں نے بڑے لاؤصحوں ہی کے لئے بے بسی کہا۔

”جیسا کہ مجھ سے بھی بڑی غلطی ہوئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے تسلیم کیا ”جو کہ دراصل کاروبار میں تعلق استوار کرنے کے بنائے میرے قریب آتے تھے۔ کاروبار کو وسعت دینے کے لئے مجھے ہمیشہ لوگوں کی ضرورت رہی۔ چنانچہ آسودہ حال اور اثر رسوخ رکھنے والے لوگوں کے لئے میرے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ اس طرح وہ لوگ میرے قریب آئے اور پھر ان سے کاروباری تعلق دوستی میں بدل گیا لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے مجھے بہت دیر میں جا کر پتا چلا کہ میرے قریب آنے والے ایسے لوگوں میں سے اکثر بد عنوان، بد کردار اور جرائم پیشہ تھے۔ ان کی آسودہ حالی یا اثر رسوخ سے مجھے تو کیا فائدہ پہنچا تھا۔ انہا انہوں نے میرے نام اور اثر رسوخ سے فائدہ اٹھا کر نہ جانے کیا کچھ کر ڈالا اور یہ میری حماقت تھی کہ میں اصل بات جان لینے کے بعد بھی مروت میں ”جھٹلا“ رہا اور کوئی سخت اقدام نہ کر سکا۔“

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی اس بات پر یقین کیا جائے یا نہیں؟ کیا وہ واقعی اتنا وسیع دار اور باصورت ہو سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب شاید اتنی جلدی نہیں مل سکتا تھا۔ میں نے اسے بات جاری رکھنے کا موقع دیا۔

وہ کہہ رہا تھا ”میری شخصیت کے گرد افسانویت اور پراسراریت کی جو دیوار کھڑی ہو گئی تھی وہ بھی ان لوگوں کے بہت کام آئی۔ اس دیوار کو اٹھا کر نہ میں درحقیقت انہی لوگوں کا ہاتھ تھا۔ اس کی آڑ میں ان لوگوں کے نہ جانے کیا کیا وعدے چلے رہے اور ان کی قسمت ملامت میرے کھاتے میں جمع ہوتی رہی۔



نے ہر جگہ ہر شخص پر یہ واضح کر دیا کہ میں نہ تو اپنے ملک میں کسی سے بیگ نہیں ہوا ہوں اور نہ دوسرے ملکوں میں کسی سے بیگ نہیں ہوں گا۔ میرا دل چاہے تو میں کسی پر بلا کوں ڈال رہا بھی تھا مگر ہوں لیکن میرا دل نہ چاہے تو میں کسی کو ایک پاکستانی مددگار بھی نہیں دل گا۔ ظاہر ہے میرے اس طرز عمل پر بہت بڑی بڑی شخصیات چراغ پا ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بیرون ملک بھی میرے خلاف مختلف زاویوں سے تحقیقات ہوتی رہی ہیں۔ کبھی مجھے منشیات کا اسمگلر سمجھا گیا۔ کبھی اسلحے کا کیشن ایجنٹ سمجھا گیا کبھی الیکٹرانکس اور ایٹمی مواد کا اسمگلر سمجھا گیا۔

دو دھیرے سے بٹا اور میری آنکھوں میں بھانکنے ہوئے ہوا "اور آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ ان کے تحقیقاتی ادارے کیسے ظالم ہیں۔ بال کی کھال نکال لیتے ہیں۔ وہ اپنے ملکوں میں تو کیا۔ دوسرے ملکوں میں بھی جا کر اپنے جرم تلاش کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہاں بھی میرے خلاف کبھی کچھ ثابت نہیں کیا جا سکا۔ حتیٰ کہ کبھی ٹیکس چوری کا بھی کوئی الزام ثابت نہیں کیا جا سکا جس کے لئے انہوں نے سر توڑ کوشش کی۔ اس سے تب کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟"

"میں کیا تو تم واقعی ٹھیک آدمی ہو۔ یا پھر ان کے تحقیقاتی افسروں سے بھی زیادہ ذہین ہو۔ واقعی جینٹلمن ہو۔ لیکن ایول جینٹلمن۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آپ ملک کا فائدہ اٹھانے کا اپنا حق ضرور محفوظ رکھیں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ پہلی ہی ملاقات میں مجھے فرشتہ سمجھنا شروع کر دیں لیکن اتنی درخواست ضرور کروں گا کہ پلیز مجھے شیطان بھی مت سمجھیں۔ مجھے ایک عام آدمی سمجھ کر میرا موقف نہیں اور میرا جو ایجنٹ بنا ہوا ہے اس سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔ یہ اس ایجنٹ ہی کا کمال ہے کہ آپ مجھے مفروضہ سمجھ رہے تھے حالانکہ میں کافی عرصے سے نہیں ہوں البتہ کچھ عرصہ پہلے میں دہلی میں تھا جہاں ہر دانش مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔" ہیر دانش کا ذکر آیا تو میرے اعصاب نے ہلکی سی جھرمیر مچائی۔ میں غوراً اس کا ذکر چھیڑنا چاہ رہا تھا لیکن گفتگو میں کوئی مناسب موقع تلاش کر رہا تھا تاکہ اچانک اس کا نام لے کر محرم ایک کا ذکر عمل دیکھ سکوں لیکن اس نے خود ہی اس کا ذکر کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری وجہ سے ہیر دانش جس انجام کو پہنچا تھا اس پر محرم بیگ کے دل میں میرے خلاف کینہ ہو گا۔

ابھی تک میرے ذہن میں یہ امکان موجود تھا کہ شاید اس نے مجھے کسی سازش کے جال میں پھنسانے ہی کے لئے بلایا ہو اور اس کی خوب صورت طرانی گفتگو محض مجھے ہلانے رکھنے کا ایک ذریعہ ہو۔ آخر میں یکدم حیران سے کوئی انکشاف میرے سر پہ آئے۔

حالا کہ ہیر دانش جس انجام کو بھی پہنچا تھا میرے خیال میں تو

اس کا "کریڈٹ" مجھے نہیں جانا تھا لیکن اگر محرم بیگ اس "الزام" مجھے دے چاہتا تو میں اس سے انکار نہ کرتا یا پھر اپنے تمام محسوسات ضرور بیان کر دیتا کہ بھائی صاحب! ہیر دانش صحیح معنوں میں تو میرے ہاتھوں انجام کو نہیں پہنچا لیکن خواہی میری کسی کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں انجام پانا اور اب بھی مجھے کسی کم از کم اس بات کی ضرورت خوش تھی کہ اس سے چیز چھڑا دی ابتدا میں۔ کی تھی۔

تاہم ابھی تک مرزا محرم بیگ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ اس سلسلے میں اس کے دل میں کوئی غم و غصہ تھا۔ ہیر دانش ڈر کر بھی اس نے بڑے ہموار لہجے میں کیا تھا۔

میں نے بھی بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا "ہیر دانش بھی تمہارا دوست تھا۔ وہ کس قسم کے دوستوں میں سے تھا؟"

"وہی۔۔۔ مار آئین قسم کے دوستوں میں سے۔" اس نے

اطمینان سے جواب دیا "اس کی وجہ سے تو مجھے سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔"

یہ جواب میرے لئے حیران کن تھا تاہم میں نے حیرت اظہار نہیں کیا۔ اس قسم کے لوگ بیچ در بیچ شخصیتوں کے مالک ہوتے تھے۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سرے پر کس سی نیپلی آتا کر وہ کس سوپ میں آجائیں۔ ابھی میں اس شخص پر مجبور ہو سکا کہ کے لئے تیار نہیں تھا۔ جب تک اس کی پوری کمانی سامنے نہ آجاتی اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بھی مشکل تھا۔

"کس قسم کا نقصان؟" میں نے ایک تک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اچکائے "آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ کر رہا تھا۔"

"تو اب تم یہ دعویٰ کر رہے گے کہ اس میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی؟" میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میرے تو فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں تھی افضل صاحب! وہ لہڈی سائنس لے کر بڑا "میں کوئی بہت اعلیٰ انسان ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ میں شاید اسمگلر یا شاید منشیات اسمگلر بھی ہو سکتا تھا لیکن میں کم از کم اتنا گھٹیا نہیں ہو سکتا تھا جتنا ہیر دانش تھا اور اس کج فہمی کی وجہ سے یہ اثر پیدا ہو گیا کہ شاید میں بھی اس کے بعض انتہائی گھٹیا دھندوں میں شریک تھا یا اسے میری سرپرستی حاصل تھی۔"

مجبور ہو گیا مجھے یقین دلانے کے لئے الفاظ پر زور دیتے ہوئے تقریباً اتنا ہی سے لہجے میں بولا "بخدا! ایسی کوئی بات نہیں محرم افضل صاحب! یہ میری بد قسمتی تھی کہ وہ بعد کوشش مجھ سے دو تھر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ اس کی شخصیت نفراؤ تھی۔ اس کی بیری فیکری سے بھی میں متاثر نہیں تھا۔ میں نے دنیا کی خاک چھانی ہوئی ہے اور میں بڑا عملی آدمی ہوں۔ میں اس قسم کی شبیدے بازوں سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا لیکن ایک دوست

کی حیثیت سے مجھے اس کی غنیمت میں بعض خوبیاں نظر آئیں اور میں نے محسوس کیا کہ وہ "ست پائے جانے کے لائق تھا۔" اس نے ایک لفظی سانس لی "مجھے بہت تاخیر سے معلوم ہوا کہ اس کی وہ خوبیاں بھی محض ذرا باہمی کی پیدوار تھیں۔ وہ انسان کو متاثر کرنے اور شے میں آمارنے کے فن سے واقف تھا۔"

"مجھ سے بھی اس کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور اس نے مجھے بھی متاثر کرنے کی کوششیں کیں لیکن میں تو اس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ مجھے تو اس کی کوششیں بہت بے اثر لگیں۔ اس نے مجھے جتنا متاثر کرنے کی کوشش کی میں اس کی طرف سے اتنی ہی زیادہ ہنگام ہوا۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے آپ اس کی طرف سے پہلے ہی ہنگام ہوں۔" "تھکے ہوئے ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "اور جب انسان کسی کی طرف سے پہلے ہی تھکا ہوا یا ہنگام ہوتا ہے تو اس کا زاویہ نظر بالکل بدل جاتا ہے۔ یہاں معاملہ ذرا مختلف تھا۔ میری اس سے بہت زیادہ ملاقاتیں یہوں تک ہوئی تھیں۔ آپ اس سے یہیں لے تھے۔ آپ اسے اس کے پس منظر سمیت زیادہ قریب سے دیکھ سکتے تھے۔"

پھر وہ اپنے مخصوص صیانتہ انداز میں مسکرایا "اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاید آپ مجھ سے زیادہ ذہین اور مرموش فکری ہوں۔"

"دیکھو۔ میری تعریفیں وغیرہ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے سمجھانے کے لیے انداز میں کہا "میں کھن پر وف واقع ہوا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے سر ہلایا "اگر مجھے یہ شبہ بھی ہوتا کہ آپ جمہوری طریقوں سے متاثر ہو سکتے ہیں تو میں آپ کو ہرگز یہاں آنے کی زحمت نہ دیتا کہ وہ کام بہت اہم ہے جس کے لیے میں نے آپ کو یہاں سے بٹھانے کے لیے آئی اس مسئلہ میں میری مدد نہیں کر سکتا۔"

ابھی تک وہ اس کام کی طرف نہیں آیا تھا جس کا ذکر کرنے جا رہا تھا۔ میں نے بھی اس سے اصل موضوع پر آنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ وہ اگر مرحلہ وار اس طرف آتا چاہتا تھا تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شاید اس طرح بات زیادہ بہتر طور پر میری سمجھ میں آتی۔ البتہ اس لاش کے مسئلے میں ضرور میرے دل میں تھوڑا سا اضطراب تھا جو بے چاری ایک طرف پڑی شاید دھیرے دھیرے انکریسی ہو چکی ہو۔

کرم بیک نے بات جاری رکھی "ہیر دانش بھی چند چھوٹے سونے پرائیویٹ میں مجھے پارٹنر بنانے میں کامیاب ہو گیا جس کے بارے میں میں کبھی پلٹ کر نہیں دیکھ سکا کہ ان کی آڑ میں وہ حقیقت کیا ہو رہا تھا۔ ہاں۔ میں بے ضرور تسلیم کروں گا کہ اس کی طرف سے کچھ منافع میرے اکاؤنٹس میں جاتا رہا اور میں اسی خیال میں کن رہا کہ چلے بیٹھے بھانے کچھ آمدنی ہو رہی تھی۔ میری

بہت سی چیزیں ہیر دانش کے استعمال میں رہیں۔ میں کوئی کوئی نہیں کہیں کوئی لا لچک۔ کہیں کوئی چھوٹا سوا بکری جہان۔ حتیٰ کہ یہ دفتر بھی۔ جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں۔ جب میں نے اسے پایا یا پٹ کیا تھا تو شروع میں کچھ عرصے یہ ہیر دانش کے ہی پاس رہا اور بعد ازاں مجھے آج تک معلوم نہیں کہ وہ اس میں کیا کرتا تھا۔"

"اس پر بھی نہیں دعوئی ہے کہ تمہاری افکار میں سروس بہت اچھی ہے۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔

"اس وقت اچھی نہیں تھی جب کہ یہ باتیں ہیں۔" اس نے تسلیم کیا "ویسے بھی میں اس قسم کے لوگوں میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا جو اپنے دوستوں اور کاروباری شراکت داروں کے بارے میں جاسوسی کر لے رہے ہیں۔ البتہ جو واقعات میرے ساتھ پیش آئے ان کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ایسا کر لیتا ہی بہتر تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنی "افکار میں سروس" کو بہتر بنایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے ہیر دانش کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں جو میرے لئے خاصی ہولناک تھیں۔ میں نے اسے پیغام بھیجا کہ میرے ساتھ نام نداد پارٹنرشپ میں اس کے جو بھی دعوے بدل رہے تھے وہ انہیں فوری طور پر بند کر دے اور یہی جو کرائے کی جگہیں اس کے استعمال میں تھیں انہیں فوراً خالی کر دے۔ یہ پیغام اس کے بعد دو ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس کو دیا گیا۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت کا ذکر کر رہا تھا جب میں رات کو ہیر دانش کی ایک داشتہ فرج سے متعارف ہوا تھا اور اس نے مجھے اس کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ اسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہیر دانش اچانک اپنی روانہ ہوا تھا۔ اسی دوران میں کوئی پر بھی آلا رہ گیا تھا جہاں "سینا کلب" کے شروع ہونے اور لڑکیاں بیک ہوتی تھیں۔ اب یہ کتنا مشکل تھا کہ مرزا کرم بیک کی دھمکی کی وجہ سے ایسا ہوا تھا یا ہیر دانش کو اس احساس ہو گیا تھا کہ اس کے گرد میری اور قانون کی گرفت دھیرے دھیرے مضبوط ہو رہی تھی اور اس نے احتیاطی اقدامات شروع کر دیے تھے۔ بہر حال اتنا ضرور تھا کہ کرم بیک کی باتوں سے کچھ اور کڑیاں ملتی نظر آ رہی تھیں۔ محبت یا بچ بھوک کا مسئلہ تھا۔

کرم بیک بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہیر دانش سے میری آخری ملاقات ڈھنگوار نہیں تھی۔ میں نے اسے کھری کھری سنائیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سے وہ میری آخری ملاقات تھی ورنہ شاید میں اتنا سخت رویہ اختیار نہ کرتا۔ بنیادی طور پر میں ایک نرم دل انسان ہوں۔"

میں استغاثہ انداز میں مسکرایا لیکن کرم بیک میری مسکراہٹ کا کوئی اثر لے بغیر بولا "ہیر دانش میری برہمنی بر حواس یافتہ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں لوگوں پر میری بڑی دہشت بھی ہوئی ہے۔ حالانکہ میں کوئی قلمی قسم کا گروہ باز دہشت گرد نہیں ہوں کہ جس کو چاہوں مرادوں جس کو چاہوں اٹھالوں۔ جو تم چاہے کر مرادوں اور اپنی ادا کی جنگ میں خون کی نہاں بہاؤں۔ اس قسم کی

باتوں کے بارے میں میں کبھی سوچتا بھی نہیں ہوں۔"

دو میرے سامنے ایک نیا ہی کرم بیک بن کر آ رہا تھا۔ میں اب بھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اس کے دعویٰ پر یقین کر لوں یا اس کے بارے میں جو تاثر مجھ تک پہنچا تھا اسی کو ٹھیک سمجھوں۔ ہر حال یہ کوئی ایسی تشریح کی بات نہیں تھی۔ تو دیر سے کوشش اور توڑے بست انتھار کے بعد عموماً ہر شخصیت کھل کر سامنے آ ہی جاتی تھی فی الحال کرم بیک کی باتیں سنتے رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ویسے کرم بیک نے مجھے حیران ضرور کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا جو تصور تھا وہ اس سے بالکل مختلف انداز میں میرے سامنے آیا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "ہم اتنا ضرور ہے کہ میں کسی کو بھی اپنے ساتھ کوئی بد معاشری نہیں کرنے دیتا۔ دو سڑی اور مروت میں لوگ جو فائدہ اٹھا جائیں سو اٹھا جائیں لیکن ایک تو دھونس دھاندلی سے کوئی بڑے سے برا اپنے خان بھی مجھ سے کوئی کام نہیں کرا سکتا۔ دوسرے جب کسی پر سے میرا اعتماد اٹھ جائے اور میں اس کی طرف سے بدگمان ہو جاؤں تو پھر چاہے مجھے اس سے کدوڑوں کا فائدہ پہنچ رہا ہو میں اس سے قطع تعلقی نہیں رکھتا۔"

اس نے ایک لمبے وقفہ کیا پھر پیرائش کی طرف واپس آتے ہوئے بولا "میرا اس سے قطع تعلقی کرنا اس کے لئے بہت برا دھچکا تھا۔ اس کے اپنے الفاظ میں وہ اس روز صبح محفل میں بیٹھ ہوا تھا۔ کفایت مہافتہ آرائی بھی بہت کر رہا تھا۔ اس کے وہ دھندے اور بد معاشریاں جو خالصتاً اس کی اپنی تھیں وہ مجھ کو بھی کم منافع بخش نہیں تھیں۔ کوئی ایسا ناجائز دھندہ انہیں تھا جس میں اس کی ٹانگ نہیں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ میری حمایت سے محروم ہونے پر اپنے آپ کو کافی کمزور محسوس کر رہا تھا۔"

"وہ خود ہی اپنی جگہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن ہمیں وہ اپنا گاؤں تصور سمجھتا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں کسی کی نظر میں اس قسم کا مقام حاصل کرنا پسند نہیں کرتا۔" وہ بولا "یہ گاؤں فارم کی چیزیں کبھی بھی میرا آئینہ دل نہیں رہیں۔ ویسے بھی اب یہ چیزیں آؤٹ لفٹ ہو گئی ہیں۔"

"اصطلاح میں نام اور القاب بدل جاتے ہیں لیکن شخصیتیں ہر دور میں کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"شاید۔" وہ ہنس لہجے میں بولا "میرا حال۔ میں نے پیرائش سے جان بچ کر اپنے آپ کو کافی ہلکا چمکا محسوس کیا۔"

"تسرا ساتھ چھوٹا اس کے لئے بڑی نعمت کا باعث ثابت ہوا۔" میں نے کہا "بے جاہ فوراً ہی قانون کے جھگڑے میں آگیا۔ قانون تو شاید اب بھی اس کا کچھ نہ بگاڑتا لیکن کسی اور طرح بے جاہ کے کوڑے کی سے اتنے دھمکے پڑ گئے۔"

"مجھے ساری تفصیلات معلوم ہو چکی ہیں۔" کرم بیک بولا "دراصل اسی سارے چکر کی وجہ سے میں غائبانہ طور پر آپ سے

مشارف ہوا اور میں نے اپنے آدمیوں کو آپ کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی ہدایت کی۔ جب بہت سی معلومات جمع ہو گئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو اتفاق سے ایک بہت شاندار آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا ہوں میرا دوست ہونا چاہئے تھا۔"

"کیا مار آتھیں پائے کا شوق ابھی پورا نہیں ہوا؟" میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
"اوہ۔۔۔ نوہ۔" وہ ایک بار پھر یکدم جذباتی ہوتے ہوئے انگریزی میں بولا "آپ کے بارے میں تو میں ایسا سوچ بھی سکتا۔ مجھے معلوم ہے آپ میرا دوستی کا پرہا ہوا ہاتھ نہیں تھا۔ گے کو کوک ابھی آپ میرے بارے میں غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا شکار ہیں لیکن رفتہ رفتہ آپ مجھ سے واقف ہو جائیں گے تو میرے بارے میں آپ کی رائے بدل جائے گی۔"

"نہیں رائے پہلے سے زیادہ بڑی نہ ہو جائے۔" میں نے خفا ظاہر کیا۔  
"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔" وہ اعتماد سے بولا "ہم اس کے دو ایسے ممتاز افراد ہیں جو ایک دوسرے کو بہت زیادہ فائدہ دے سکتے ہیں۔"

"خیر مرزا کرم بیک! میں نے لامنت سے کہا تھا کہ وقت فائدہ ہی کی تلاش میں رہتے ہو؟"  
"نہیں میں نقصان اٹھانے کے لئے بھی تیار رہتا ہوں۔" بلا تامل بولا "اور نقصان اٹھاتا بھی رہا ہوں۔"  
"اس سارے قصے میں یہ لاش کمال فٹ ہوئی ہے؟" میں نے

بج صاحب کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔  
اس نے مسافانہ سی نظروں سے بج صاحب کی لاش کی طرف دیکھا اور زرا بد لے ہوئے لہجے میں بولا "یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ کوئی اتھالی بے وقوف انسان ہی یہ سمجھ سکتا ہے کہ میں لاش حرکت کر سکتا ہوں یا اس پر خوش ہو سکتا ہوں۔ تاہم اس لاش۔ میری پوزیشن بہت ہی مشکوک بنا دی ہے اور مجھے بڑی مشکل کا ڈال دیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ گولیاں نافٹ اور پشانی کے اثرات نکل آیا۔ گہری سانس لے کر بولا "میرا حال۔ کبھی کبھی بڑی صورت حال میں بھی اچھائی کا کوئی لمپٹاں ہو آتا ہے شاید واقعہ میرے اور آپ کے درمیان نزاع گہرے اور کراہت تعلقات قائم ہونے کا سبب بن جائے۔"

وہ تعلقات اور دوستی استوار کرنے کی باتیں کئے جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ مجھے اپنے دوست پیرائش کی موت کا ذکر دے سمجھتے ہوئے میرا دشمن بن چکا ہو گا۔ اور وہ ہر حال ایک طاقتور آدمی تھا۔ میں اسے اپنے خلیفہ کا دشمنوں میں شمار کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے تھا لیکن وہ اپنے مدد سے مجھے پکڑا دینے پر غلام تھا۔

یقین تھا کہ مجھے ان میں سے کسی میں سزا نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک مقدمے کا تو فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ میں اس میں بری ہو چکا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اسی طرح ایک ایک کر کے میں باقی مقدموں میں بھی بری ہو جاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے کسی نے جج صاحب کا قتل ہی میرے گٹے میں ڈال دیا۔

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے خلاف توجہ تک قتل کا کوئی مقدمہ نہیں ہے۔"

اس کی زبانی یہ سن کر مجھے واقعی حیرت تو ہوئی لیکن کچھ زیادہ نہیں۔ میں پہلے ہی اس سلسلے میں اس کے منہ پر ہی اظہارِ خیال کر چکا تھا۔ اگر وہ واقعی اسی قسم کا توئی تھا جیسی اس کی شہرت سمجھ تک پہنچی تھی تو ظاہر ہے ایسے آدمیوں کو خود کسی کے خون میں ہاتھ رنگنے نہیں پڑتے تھے۔ انہیں تو صرف زبان ہی ملا نا پڑتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات تو زبان بھی ملانا نہیں پڑتی تھی۔ صرف آنکھ کا اشارہ ہی کافی ہوتا تھا۔

قانون سر حال بری عجیب چیز ہے۔ بعض انسانوں کو تو قانون کی موٹائیوں کا بہت ہی زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ بعض لوگ ہزاروں انسانوں کو قتل کرانے کا باعث بنتے ہیں لیکن چونکہ انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا ہوا اس لئے قانون میں ان کے لئے بڑی گنجائشیں کھل آتی ہیں۔ ان پر کسی کے قتل کا مقدمہ قائم ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ نوبت تو ابھی جائے تو انہیں قابلِ ثابت نہیں کیا جاسکتا اور بعض اوقات تو ہزاروں انسانوں کے قتل دیوتا کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ دنیا ایک عجیب تماشا گاہ تھی اور یہ اس کے ہزاروں عجیب و غریب تماشوں میں سے ایک تماشا تھا۔

چنانچہ اگر مرزا کرم بیگ کہ رہا تھا کہ اس کے خلاف کبھی قتل کا کوئی مقدمہ نہیں چلا تو اس میں میرے لئے زیادہ حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ کہ رہا تھا "لیکن اب اچانک ہی ایک ایسا قتل میرے سر ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو واقعی میرے لئے بھاری کا پھندا بن سکتا ہے لیکن اگر محفل سے کام لیا جائے تو فوراً احساس ہو جائے گا کہ اس میں جلد بازی میں بڑے جھول دے گئے ہیں۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ میں بارے سے اپنے اپارٹمنٹ میں آتا ہوں تو مجھے یہاں جج صاحب کی لاش پڑی ملتی ہے۔ ابھی میں اور میرے گارڈز حیران ہی ہو رہے ہیں اور مجھے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کیا باز رہے تو اسی دوران خفیہ پولیس کے یہ صاحبان یہاں پہنچ جاتے ہیں۔" اس نے بے زبان قسم کی ان پر اصرار غصیبوں کی طرف اشارہ کیا جو اب میرے لئے پر اصرار نہیں رہی تھیں۔

کرم بیگ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے عام مقامی پولیس کو اطلاع دینے کی خدمت نہیں کی تھی بلکہ براہِ راست ایک مقامی خفیہ ایجنسی کو مطلع کیا تھا۔ معاملہ چونکہ سنگین تھا اس

دو ایک بار پھر پرنسپل کا ذکر پھینرتے ہوئے بولا "آپ مجھے پرنسپل سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ ایک احسان کر چکے ہیں۔ یہ وہ تمہارے میں خود بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انسان اچھا ہوا بڑا۔ اگر برسے اس سے تعلقات نہ بن چکے ہوں۔ ہم نے ایک ساتھ کچھ بھارتیہ بھی کر دیا ہو تو پھر میں تعلقات بگاڑ جانے کے بعد بھی اس سے کوئی بڑا سلوک نہیں کر سکتا۔ پرنسپل کو بھی سزا دینا اس سے بچ سکتا تھا۔ قطعاً قتل کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ آپ نے میرا یہ کام آسان کر دیا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے سر ہلایا "اس کی موت تو خالصتاً اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی لیکن اسے اس انجام کی طرف لے جانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔ میں اس کردار کے لئے آپ شکر گزار ہوں۔ اسی سارے قصے سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ آپ یقیناً ابھی تک پیچیدہ معاملات کو سلجھانے اور ان کی بہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں نے سوچا مرنے اچھا ہے۔ مجھے بھی آپ کی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

میں ذرا چڑکا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "آپ شایہ حیرت ہو رہی ہے؟"

"حیرت تو مجھے اسی وقت سے ہو رہی ہے جب میں نے شرافت کو اپنے کمرے میں بیٹھے دیکھا تھا۔" میں نے تسلیم کیا "لیکن یہ حیرت میرے لئے اب کوئی ایسی حیرت ناک چیز نہیں رہی۔ رات اب میری زندگی کی سہ ماہی ہے۔ قدم قدم پر کوئی حیرت میری گھر ہوتی ہے۔"

"یعنی آپ نے حیرت انگیز باتوں پر بھی حیران ہونا چھوڑ دیا ہے؟"

"تقریباً۔" میں نے جواب دیا "میں بھی کبھی ذرا الحافہ دروز ہونے کے لئے حیران ہو لیتا ہوں۔ سر حال تم ذرا وضاحت سے بات کرو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔ پس سھر تو میری کچھ سا گیا ہے۔ اب ذرا پیش سھر کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔"

"پیش سھر کی بات ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ پیش سھر ظاہر ہوا اور سامنے لیکن درحقیقت یہ بہت الجھا ہوا ہے۔" وہ اپنے ہاتھ بیک دو سرے کے ساتھ رگڑنے کے بعد امیں بغیر دیکھتے ہوئے بولا ظاہر ہے ایک اعلیٰ عدالت کے جج کا قتل معلوم بات نہیں ہے راج بھی ایسے جو اپنی طاقت داری اور اصول پرستی کے لئے کچھ ذہنی مشغور تھے اور جن کی عدالت میں میرے کی مقدمے تھے اور موت تھے ظاہر ہے کسی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی ہے۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر میرے چہرے پر گویا زعمِ عاشق کرنے کی کوشش کی اور شاید اس میں ناکام رہنے کے دیو "میرے جو مقدمے جج صاحب کی عدالت میں تھے" مجھے

لے ابھی فوراً حرکت میں آئی۔ متوکل بھی ایک بڑا آدمی تھا اور جسے قاتل کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی جارہی تھی وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ چنانچہ فوری طور پر یہ صاحبان یہاں آکر پہنچے۔

وہ ایک لمبے کے لمبے خاموش ہوا پھر جسم کو ذرا ڈھلا پھوڑ کر بیٹھے ہوئے بولا "اتام میں اتنی آسانی سے حراست میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے بھی کچھ ڈوریاں ہلائیں۔ کچھ بڑے لوگوں کو فون کئے۔ میری شہرت کیسی بھی سہی... اور بے شک میرے خلاف بہت سے مقدمات چل رہے ہیں لیکن آپ کو یقیناً اندازہ ہو گا کہ ان سب باتوں کے باوجود مجھے جیسے لوگوں کا اپنا ایک اثر رسوخ ہوتا ہے۔ بڑے لوگ ہمیں جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ بعض اوقات تو ایسے لوگوں کے خلاف کارروائیاں محض فوراً منتفی ہوتی تھیں اور بعض اوقات بڑے بڑے خاص حکموں کے کرنا دھڑا اس قسم کے لوگوں کے خلاف جان دانتے تھے کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی آپریشن کیا جائے گا۔ یہ کہنا ہوتا تھا۔ وہ کہنا جائے گا لیکن رات کو دبی بڑے بڑے افسران اس قسم کے لوگوں کے ساتھ محفلیں جمانے تھے اور درویش دیتے تھے۔

اس قسم کے بیانات دینا یا کہی کہی اپنی گیند بھیکوں کی تشریح کرنا ان کی مجبوری تھی۔ انہیں خاندانی بڑی کے لئے اپنے حکموں کی کچھ نہ کچھ کارکردگی تو دکھانی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اس قسم کی گیند بھیکیاں یا محض رسمی ہماگ دوڑان کی سیاسی ضرورت ہوتی تھی۔ انہیں کسی کو خوش کرنا ہوتا تھا۔ کیا وجہ تھی کہ اس قسم کے عناصر قسم ہوتا تو درکنار دن بے دن زیادہ سے زیادہ طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔ بعض اوقات تو عامرے ارباب اختیار قلعے ہوتے ہوئے اور دلی خواہش رکھتے ہوئے بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ نظام ہی کچھ ایسا تھا۔ ان کے خلاف جتنی کارروائی شاید ہی کبھی ہوتی تھی اور اس سے بھی بہر حال ان کے اثر رسوخ میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس لئے مجھے مرزا اکرم بیگ کی کم از کم اس بات پر کوئی شبہ نہیں تھا کہ کچھ بڑے لوگ اسے جانتے بھی ہوں گے اور مانتے بھی ہوں گے۔

مرزا اکرم بیگ خفیہ ابجی کے تین آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ان صاحبان نے یہاں آکر اپنی تحقیق شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے نج صاحب کی بیوی کی تلاش کی۔ ان کی بیویوں سے چند دوسری اہم شخصیات کے وزٹنگ کارڈز کے ساتھ ساتھ آپ کا وزٹنگ کارڈ بھی نکلا۔ تب اس کا میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ گزشتہ دنوں میں آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوا اور مجھے اندازہ ہوا تھا کہ بیرواٹس کے معاملے میں آپ نے حقائق کا کھوج لگانے

اور معاملے کی بے شک پہنچنے کے سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ میرے ذہن میں اسی لئے آئیڈیا آیا اور میں نے اسی لئے فیصلہ کرنا کہ میں آپ کی مدد حاصل کروں گا۔"

"اور؟" میں طویل سانس لے کر کہہ گیا "تو سہ یہ ہے اس قصہ..."

"قصہ تو شاید ابھی شروع ہوا ہے۔" حکرم بیگ مسکرا کر اپنے لئے اسی خفیہ ابجی کے سربراہ سے بات کی جو فوری طور پر میرے خلاف حرکت میں آئی تھی۔ بڑے افسر عام طور پر کالی معتقل ہوتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے انسان کی ان تک رسائی ہو اور ان کے ساتھ دلیل اور معقولیت کے ساتھ بات کی جائے تو وہ مان لیتے ہیں۔ میری مزید خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ آپ کو بھی جانتے اور مانتے تھے۔

"آہ! میں کراہ کر رہ گیا۔"

"میں نے تمام صورت حال انہیں سمجھا کر قاتل کرنے کی کوشش کی کہ نج صاحب کے قتل کے ذریعے وہ حقیقت کھلی۔ مجھے پھانسنے کی سازش کی تھی اس لئے مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کچھ سہلت دی جائے۔ میں نے پہلے بھی ہر ازام مقابلہ کیا ہے اور اب بھی کروں گا۔ میں پہلے بھی کیس نہیں ہار تھا۔ اب بھی نہیں ہاروں گا۔ اور پھر میں نے کہا کہ اس معاملے میں ایک پہنچنے کے لئے میں افضل صاحب کی مدد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میری بات پہلے ہی تقریباً مان لی تھی۔ آپ کے لئے گویا کام آسان کر دیا۔ انہوں نے میری یہ درخواست قبول کرنا کہ مجھے فوری طور پر حراست میں لے کر بے دست دپا نہیں کیا جائے گا۔ میرے پاس اب دو تین دن کی سہلت ہے۔ اس دوران مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنی ہے بلکہ مجھے کیا۔ آپ ہی کو ثابت کرنی ہے۔"

"بہت خوب مرزا حکرم بیگ! میں نے سہلایا "تم واقعی ایک عجیب و غریب آدمی ہو۔ تم نے ایک عجیب و غریب موقع پر۔ ایک عجیب و غریب کام کے لئے۔ ایک عجیب و غریب آدمی کا انتخاب کیا ہے۔"

"ایسے عجیب و غریب فیصلے کرنا میری پرانی عادت ہے۔"

اش کو بالکل اسی حالت میں دیکھ لیں جس حالت میں وہ پانی مٹی  
تھی۔

اس لیے مجھے ایک بات یاد آئی اور میں بے اختیار مسکرائے  
گا۔ حکرم یک بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ کو ایسا کیا  
بات یاد آئی ہے جس سے آپ محفوظ ہو رہے ہیں؟"  
اس کا مشاہدہ اچھا تھا۔ ہوتا جیسا چاہتے تھا۔ وہ کوئی عام آدمی  
نہیں تھا۔ میں نے دیکھے لیے جسے کہا "میں محفوظ نہیں ہو رہا تھا۔  
قدرت کے عجیب و غریب کاموں اور اتفاقات پر حیران ہو رہا  
تھا۔"

تاہم میں نے وضاحت نہیں کی کہ میری مسکراہٹ کاپس مسٹر کیا  
تھا۔ شاید اسے یقین نہ آتا کہ میں اس شام ہی سوچ رہا تھا اور  
پروگرام بنا رہا تھا کہ فضل کے طور پر کسی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کی  
کوشش کیا کروں گا۔ اس سلسلے میں رحیم گل اور زور ناج سے  
تفصیلی تبادلہ خیال بھی ہوا تھا۔ سچ میں کبھی مذاق بھی چلا رہا تھا  
لیکن میں نے ہر حال بات سنجیدگی سے کی تھی لیکن مجھے بے امید  
ہرگز نہیں تھی کہ "مسئلہ" اتنی جلدی میرا آجائے گا اور وہ بھی  
مرزا حکرم یک کی طرف سے! حالات کی یہ کدورت واقعی حیران  
کن تھی!

تاہم مجھے مرزا حکرم یک کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ  
وہ مجھ سے جس قسم کا کام لینے کی خواہش کا اظہار کر رہا تھا اس کی  
مجھے تلاش تھی اور میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے اتنی جلدی  
میرا آجائے گا۔

میں نے اپنی مسکراہٹ کو طنز پر سادہ رنگ دینے کی کوشش کرتے  
ہوئے سلسلہ کلام جوڑا "دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم  
سے ان حالات میں ملاقات ہوگی اور تم اس قسم کی فراہم کر  
گے میں تو تمہارے بارے میں کچھ اور ہی طرح کے پروگرام بنائے  
بیٹھا تھا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" وہ ہلکا سا بولا "میں اصل میں ایک تیر  
سے دو نہیں۔ بلکہ کئی شکار کر رہا ہوں۔ ایک تو اس کام کے  
بنائے آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کے ذہن میں میری شخصیت کا  
جو غلط تاثر اب تک موجود رہا ہوگا اسے دور کرنے میں مدد ملے گی  
کچھ تو آپ مجھے اب تک جان گئے ہوں گے میری مدد کرنے کی  
کوشش کریں گے تو مزید جان لیں گے اور اگر آپ واقعی مجھے بے  
لگاہ ثابت کرنے میں میری کوئی مدد کر سکتے تو یہ سب سے بڑا فائدہ  
ہو گا۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر اس میں مجھے کیا فائدہ  
ہو گا؟" میں نے ذرا شائستہ سا سوجھ بوجھ اختیار کرنے کی کوشش کرتے  
ہوئے کہا "آخر میں بھی ایک برزس میں ہوں۔ مجھے بھی اپنا فائدہ  
تھکان سوچنے کی عادت ہے۔ تم تو ایک تیر سے کئی شکار کر رہے ہو۔  
مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میرا تیر کہیں غلامی جا کر غائب ہو جائے

گا۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "افضل صاحب! آپ اس قسم کے  
برزس میں نہیں ہیں جیسا بننے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن خیر۔  
مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر آپ کسی مصلحت کی  
وجہ سے برزس میں بن کر بات کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر کوئی  
اعتراض نہیں۔ ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ موقع دیکھ کر  
سوئے بازی کرے۔ آپ اگر شوقیہ بھی ایسا کرنا چاہتے ہیں تب بھی  
مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"نہیں۔ اس میں شوق یا موقع پرستی کی کوئی بات نہیں۔"  
میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا مگر دل ہی دل میں اس  
کے گھٹنے کی قوت مشاہدہ پر ایک بار پھر حیران تھا "دراصل میں  
تمہاری باتوں سے کچھ متاثر تو ہو گیا ہوں لیکن ابھی تک میرے دل  
میں تمہارے لئے خاطر خواہ غلوس پیدا نہیں ہو سکا۔ اس لئے بات  
جیت اگر مادی بنیادوں پر ہی چلے تو ٹھیک ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے اس پر بھی خوشی ہوگی۔" وہ اطمینان  
سے بولا "آپ بتائیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"کیا بتاؤں۔" میں نے قدرے تذبذب سے کہا "وہی ہے۔  
میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ میں تمہاری کوئی مدد کر بھی سکوں گا یا  
نہیں؟ ظاہر ہے میں کوئی پرائیویٹ سرائرس نہیں ہوں۔  
مجھے اس قسم کے کاموں کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہے اور نہ جانے  
کیوں تم نے مجھ سے اتنی توقعات وابستہ کر لی ہیں۔"

"پرائیویٹ سرائرس تو خیر ہمارے ملک میں ہوتے ہی نہیں  
ہیں۔ لیکن اگر ہوتے تب بھی شاید میں ان کی خدمات حاصل نہ  
کرنا۔ ہمارے ہاں شاید وہ سرائرس کے بجائے بلیک میلر یا پولیس  
کے ٹاؤٹ بن چکے ہوتے۔" حکرم یک متنبہ بنا کر بولا "وہی ہے مجھے  
نازک معاملات میں پیشہ ور لوگوں کی خدمات حاصل کرنا کچھ زیادہ  
پیشہ نہیں۔۔۔ میں نے تو مفصلی ممالک میں بھی ضرورت پڑنے پر  
کبھی پرائیویٹ سرائرس کی خدمات حاصل نہیں کیں حالانکہ ان  
پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے تقریباً چالیس فیصد بد عنوان  
نہیں ہوتے لیکن اس قسم کے سرائرساں وہاں نہیں پائے جاتے  
جیسے انگریزی کمپنیوں، لٹریچر یا لی دی میرز وغیرہ میں دکھائے جاتے  
ہیں۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ مسکرا کر بولا "لیکن میں بھی  
کیسا بے وقوف ہوں۔ آپ کو یہ باتیں بتا رہا ہوں۔ آخر آپ نے  
مجھ کو تو دیکھا بھی ہے۔"

"ہاں لیکن شاید میرا اتنا وقت ملک سے باہر نہیں گزرا جتنا تم  
نے گزارا ہو گا۔ مجھے دوسرے ملکوں کو زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھنے کا  
موقع نہیں ملا۔ اور میں نے کوشش بھی نہیں کی۔" میں نے بتایا۔  
"خیر۔ کوئی مایوس دوسرے ملکوں کو۔ اور ان کے پرائیویٹ  
سرائرساں کو۔" حکرم یک ہاتھ ہلا کر بولا "ہم اپنی بات کرتے

اور وہ ناقابل واپسی ہو گا۔

”مجھے منگور ہے۔ آپ بولے تو سی۔“ وہ ہلا تامل بولا۔  
 کبشت کسی طرح چٹکاپا ہٹ کا مظاہرہ ہی میں کر رہا تھا۔  
 ”میں دو ملین روپے لوں گا۔ میں لاکھ۔“ میں نے کہا۔  
 میرا خیال تھا وہ ایک لمبے کے لئے بے نیازی کا مظاہرہ کر  
 بھول جائے گا۔ انسان خواہ ارب پتی ہو، کسی بھی چیز کی قیمت میں کم  
 ایک بار ضرور ناک بھول چھاتا ہے لیکن کرم بیک کی پیشانی پر ہلکا  
 سی شکن بھی نہ ابھری۔

”تو پراگم۔“ وہ بدستور خوش دلانہ لہجے میں بولا۔

”میں چیک نہیں لوں گا۔“ میں نے اپنی راست میں ایک اور  
 رکاوٹ کھڑی کی۔

”تو پراگم۔“ وہ اسی جے پروائی سے بولا۔ اس نے میری کمرز  
 کی ہوئی اس رکاوٹ کو بھی گویا ایک انگلی کے اشارے سے ایک  
 طرف ہٹا دیا تھا۔

”نہیم!“ اس نے ذرا اونچی آواز میں پکارا۔

براہر کے ایک کمرے سے فوراً ایک شخص نکل کر آیا۔ وہ  
 مضبوط کاشی کا ایک جوان شخص تھا جس کی دو ٹیمیں ہر تاشے  
 عاری تھیں۔ اس کے رخساروں کی بڑیاں ابھری ہوئی تھیں اور  
 کھنسی موچکوں نے اس کے بالائی ہونٹ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس نے  
 سوا لہ نظروں سے کرم بیک کی طرف دیکھا۔

”دو ملین پاکستانی روپے۔“ کرم بیک نے نہایت اختصار سے  
 حکم دیا۔ اس نے جملہ پورا کرنے کی بھی ذمہ داری نہیں کی۔ نہیم نے  
 بھی یہ نہیں پوچھا کہ دو ملین پاکستانی روپوں کا کیا کرنا تھا؟ جیسے  
 تھے۔ چلائے تھے۔ خیرات کرنے تھے۔ یا کسی کو ادا کیگی کرنا  
 تھی؟ اگر ادا کیگی کرنی تھی تو کسے؟

وہ سر کو خفیف سی جنبش دے کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ چ  
 لہے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ہزاروں کے نوٹوں کا  
 بیس گنڈیاں تھیں۔ وہ گنڈیاں لئے سیدھا ہوں میری طرف آیا چ  
 وہ چند نوٹ تھے جنہیں میں اطمینان سے کسی بھی جیب میں رک  
 سکتا تھا۔

میرا پسلا ہی تجربہ خود میرے لئے حیران کن تھا۔ مجھے یقین  
 نہیں آ رہا تھا کہ میں نے واقعی میں لاکھ کی رقم کا مطالبہ کر دیا تھا  
 میں واقعی یہ بات اپنے منہ سے کہنے میں کامیاب ہو چکا تھا؟ اور یہ  
 یہ مطالبہ وہیں کھڑے کھڑے پورا بھی کر دیا گیا تھا۔ عجیب بات ہے  
 کہ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ میں اب اس سلسلے میں کیا کروں؟  
 مجھے بھلا اس قسم کے کاموں کا کیا تجربہ تھا؟ لیکن میں نے خود ا  
 شامت کو دعوت دی تھی۔ اتنی باتیں کرنے کے بعد اب میں پسا  
 بھی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ کرم بیک نے میرے لئے کوئی راہ فر  
 نہیں چھوڑی تھی۔

میں نے رحیم گل اور زر تاج کے سامنے بیٹھ کر پروگرام

ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ میرے لئے کچھ کر سکیں گے یا  
 نہیں۔ اصل بات غلطی نیت کی ہوئی ہے۔ غلطی نیت ایک  
 کا دوبارہ آوی میں بھی ہونا چاہئے۔ آپ بے فکر مجھ سے  
 کا دوبارہ بن کر بات کیجئے۔ میں بڑا نہیں مناسک گا لیکن میرے لئے  
 کو شش غلطی نیت سے کیجئے گا۔ آپ کو میرے اس موقف میں تو  
 کچھ جان نظر آتی ہے نا۔ کہ میں اتنا احمق نہیں ہو سکتا تھا۔“  
 ”تو احمق؟“ میں نے گویا چوکتے ہوئے پوچھا۔

”کہ میں بیچ صاحب کو اپنے ہی آفس میں لگا کر مار دیتا اور  
 رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا؟“

”ہاں۔“ خیر تمہاری بات تو دل کو لگتی ہے کہ تم اتنے احمق  
 نہیں ہو سکتے۔“ میں نے تسلیم کیا۔

”جس۔“ اگر آپ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر کچھ سوچیں  
 گے تو یقیناً میرے لئے کچھ نہ کچھ کر سکیں گے۔ میں آپ کو غائبانہ  
 طور پر جانتا ہوں لیکن مجھے آپ کی نہایت برہمرو سا ہے۔“

”معلوم نہیں اب یہ تمہاری خوش قسمتی ہے یا بد قسمتی۔ کہ  
 تم غائبانہ طور پر ہی میری نہایت کے قائل ہو گئے ہو۔ ویسے تو مجھے  
 خوش ہونا چاہئے کہ مجھے اپنی نہایت کا پسلا دو دان میرا تیا ہے اور  
 اس خوشی میں تم نے کوئی کا دوبارہ بات نہیں کرنی چاہئے لیکن کیا  
 کروں گا دوبارہ چھوڑ کر ادھر ادھر وقت ضائع کرنا اور خود نہیں  
 کر سکتا۔ اس لحاظ سے میں بہت مرگ آدی ہوں لیکن کرم بیک! میرا  
 وقت بہت قیمتی ہے۔“ میرا خیال تھا کہ رقم کی بات سن کر وہ بدک  
 جائے گا۔

بہر حال مجھے اپنا پروگرام یاد تھا۔ میں نے رحیم گل اور زر تاج  
 سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کسی مولیٰ اسامی نے مجھ سے  
 رجوع کیا تو میں اس سے اپنے وقت کی ٹھیک ٹھاک قیمت وصول  
 کروں گا لیکن اگر کوئی بدک شہنشاہی نظر آیا تو پہلے اس کی بد بھی  
 کروں گا بشرطیکہ اس کا مسئلہ اس قابل ہو کہ میں اس میں دلچسپی  
 لے سکوں۔ اب کم از کم پہلے دن تو مجھے اپنے طے شدہ پروگرام سے  
 نہیں ہٹنا چاہئے تھا۔ حالانکہ کرم بیک کے قہے میں مجھے دلچسپی  
 محسوس ہو رہی تھی لیکن میں دولت مندوں کے لئے مفت کوئی کام  
 کر کے ان کی عادت نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

”آپ اپنے وقت کی قیمت تو لگائیے افضل صاحب!“ کرم  
 بیک پُر دھار لہجے میں بولا۔ ”نا کہ آپ بڑے آدمی ہیں لیکن کرم  
 بیک بھی اتنا چھوڑا آدمی نہیں کہ آپ کے وقت کی قیمت نہ دے  
 سکے میرے لئے آپ کی رائے یوں بھی اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ  
 اس اہم خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے بھی آپ کی رائے کو قبول  
 کرنے کا عندیہ دے دیا ہے جس کے نمائندے اس وقت یہاں  
 موجود ہیں۔“

”خود ہی نہیں ہے کہ میں کوئی حتمی رائے دے سکوں۔“ میں  
 نے مختصر ہاتھم کے طور پر کہا۔ ”لیکن میں اپنا معاونہ پیشگی لوں گا

کے ذہن میں اس کے بارے میں جو خاک ہوگا، اب اس کا وہ سابی  
قام نہیں رہا۔ "مکرم بیگ بولا۔  
"ہیادوہ رٹس روڈ پر بن کباب کا ٹھیلہ لگانے لگا ہے؟" میں نے

پوچھا۔  
"نہیں، "مکرم بیگ مسکرایا "میں شاندار آدمی کا اب ایسا بڑا  
نجام بھی نہیں ہوتا چاہئے تھا۔ وہ اب اندرون شریک ٹھیلے سے  
پانے ہوٹل کو ٹیکے پر جاتا ہے۔ اس کے لئے بہر حال اپنے ماضی  
کو دیکھتے ہوئے یہ کام رٹس روڈ پر بن کباب کا ٹھیلہ لگانے کے برابر  
ی ہے۔"

"چھانچہ۔ جس بدایت واصل کا فون آیا۔ پھر کیا ہوا؟" میں  
نے پوچھا۔

"میں کچھ کاروباری بات چیت کرنی تھی۔ وہ جانا چاہ رہا تھا  
کہ مجھ سے ملے آسکا ہے یا نہیں۔ میں نے پہلے تو دوائی میں اس  
سے کہہ دیا کہ وہ آجائے ملاقات کا وقت پانچ بجے ملے یا کیا پھر  
اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے دو تین ہفتوں پر جانا تھا لیکن مجھے امید  
تھی کہ میں جلدی لوٹ آؤں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بہر حال  
آجائے اگر میں یہاں نہ ہوا تب بھی میں اس کے لئے دروازہ غیر  
مقتل چھوڑ جاؤں گا۔"

"بہت خوب۔ کیا تم اکثر ملاقاتوں کو یہ سولت دیتے رہے  
ہو؟" میں نے ذرا چستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، "اس نے نفی میں سر ہلایا "اول تو یہاں ملاقاتوں کے  
آنے کی فوری کمی آتی ہے۔ دوسرے اس قسم کی سولت تو خاص  
حالات میں کسی خاص ہی ملاقاتی کو دی جاسکتی ہے۔ بدایت واصل  
سے ملنے میں خود میرا مفاد نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو  
کوئی پرمانہ ملے اور وہ ملاقات کا پروگرام ہفتی کر دے۔"

"اس کے باوجود۔ جس میں اس طرح آؤں کہ غیر مقتل چھوڑ  
کر جانے میں کوئی اندیشہ محسوس نہیں ہوا؟" ہمارے ہاں ماحول ابھی  
کچھ ایسا قابلِ رشک بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس بلڈنگ میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں بھڑکھاڑ  
نہیں ہے۔ بلڈنگ زیادہ بڑی نہیں ہے۔ بہت ہی پرسکون ماحول  
ہے۔ اگر ایک ماہ تک آپ کے اپارٹمنٹ کا دروازہ بند رہے تو  
پڑوسی یہ پوچھنے نہیں آئے گا کہ کیا بات ہے اور اگر اندر کہیں کا  
انتقال پر حال ہو چکا ہو تب بھی اس کی لاش کافی تاخیر سے ہی  
دریافت ہونے کا امکان ہے اور یہ ٹاپ فلور ہے اس پر صرف ایک  
ایک اپارٹمنٹ ہے۔ یہاں تو ویسے ہی کوئی نہیں آتا۔"

"پھر بھی مجھے ہمارا یہ بات عجیب لگ رہی ہے۔" میں نے  
صاف کوئی سے کہا۔

"لیکن مجھے یہ ٹھکانا عجیب نہیں لگی تھی۔ میں پہلے بھی کئی بار  
کسی ملاقاتی کے لئے یا کسی اور وجہ سے دروازہ کھدو کر کے لئے غیر  
مقتل چھوڑ کر چاچکا ہوں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"آخر..... دفتر میں ضروری کاغذات ہوتے ہیں۔ خیر  
دستاویزات ہوتی ہیں اور پھر ہمارے دفتر میں تو غالباً چھوٹا سا  
خزانہ بھی ہوتا ہے۔" میں نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جس  
سے ہم نے برآمدہ کر رکھے اور انجلی کی تھی۔

"دوست۔" وہ دھیرے سے ہنسا "کاغذات۔۔۔ کاغذات۔۔۔ مثیل چیزیں  
دفتر و کمروں کے اندر بھی زبردست حفاظتی انتظامات کے ساتھ  
مقتل رجحان ہیں اور جہاں تک خزانے کا تعلق ہے تو اس کا نظام کسی  
کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی آتا اور جاتا رہتا  
ہے۔ کسی انجینیئری کے پاس کچھ ہاتھ نہیں آسکا۔" اس نے ہم انداز  
میں جواب دیا۔ لگتا جیسا تھا کہ وہ اپنے انتظامات کے بارے میں  
مطمئن تھا۔ اس لئے دروازہ غیر مقتل چھوڑ کر جانا اس کے لئے  
کوئی خاص بات نہیں تھی۔

"تاہم میں نے نکتہ اٹھایا "تم اپنے دونوں گارڈز میں سے کسی  
ایک کو یہاں چھوڑ کر جاسکتے تھے۔"

"میں جہاں جہاں جا رہا تھا وہاں میرے ساتھ گارڈز کا رہنا  
ضروری تھا۔ "مکرم بیگ نے جواب دیا "بلکہ جب میں یہاں سے  
نکلتا تو میں نے راستے میں ایک جگہ سے شرافت علی کو بھی اپنے  
ساتھ لیا۔" میں نے ضروری کام نمٹانے تھے۔"

"ہم کتنے جگہ یہاں سے نکلے تھے؟" میں نے اپنے ذہن کو پوری  
طرح بیدار رکھتے ہوئے حرج کر رہا تھا اور کوئی کارآمد بات دریافت  
کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ آخر میں نے بین لاکھ روپے  
لئے تھے لیکن جی بات یہ تھی کہ ابھی تک مجھے صحیح طور پر معلوم  
نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو اس رٹم کا مستحق ثابت بھی کر سکوں گا  
یا نہیں؟

"میں ساڑھے چار بجے یہاں سے نکلا تھا۔ "مکرم بیگ نے  
بتایا "اس وقت تک میری مزید کچھ لوگوں سے فون پر بات ہو چکی  
تھی۔ میرا پروگرام کچھ لمبا ہو چکا تھا اور میرا فوری طور پر نکلنا بھی  
ضروری تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے باہر کافی دیر لگ جائے گی۔ کم از  
کم ساڑھے سات تو ضرور بیچ جائیں گے اس لئے میں نے سوچا کہ  
بدایت واصل سے ملاقات کا پروگرام ہی کوئی ایسا کر دیا جائے تو بہتر  
ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اٹل کے آؤں فون کیا مگر وہاں کسی نے  
اٹھا ہی نہیں۔ شاید وہ میری طرف روانہ ہونے سے پہلے کہیں اور  
چاچکا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے لئے ایک دفعہ لکھ کر چھوڑ دیا۔"

"کہاں چھوڑ دیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میر۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔  
میں نے میز کے قریب جا کر دیکھا اس پر براہِ سادہ ایک سفید  
کاغذ ہچک وٹ کے نیچے دبا رکھا تھا جس پر بالِ پوائنٹ سے بڑے  
بڑے الفاظ میں کھینچا گیا تھا۔

"میں اندازاً ساڑھے سات بجے تک وہاں آ جاؤں گا۔ اگر  
انتظار کر سکتے ہو تو کرلو۔"



دائیں ایک مدت سے میرا پچاس لاکھ کا مقروض ہے اور وہ اب بھی لنگ جائے تو یہ رقم ادا نہیں کر سکتا۔ جب اس کا ذوال "عروج" پر تھا تو اس نے یہ رقم مجھ سے ایک نئے منصوبے کے لیے بھیجی۔ ذوال پر یہ رقم کو کوئی قرض نہیں دیا کرتا لیکن میری سے بہت پرانی شناسائی تھی۔ چچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کا علاج تھا۔ آئی ہسپتال بلا کاؤ ہے جسے اور اس نے جو منصوبہ کیا وہ بھی مجھ سے بہت پسند آیا تھا لیکن مسئلہ وہی ہے کہ جب ہم بار بار ہوا ہو تو ہمت و غیور سب دھری رہ جاتی ہے۔

اس نے میری سانس لی اور ایک لمحے کے وقفے میں چلا گیا۔  
 نے اپنے نئے منصوبے میں میرے پکاس لاکھ کی ڈیڑھ دیے۔ نام  
 کو کہ اس کے مقدار نے ڈیڑھ دیے۔ تب سے اب تک وہ قرض  
 طرح چلا آ رہا ہے اگر میں ان شرائط پر عمل در آمد کرواؤں  
 قرض لیا گیا تھا قیامت واری اپنے آپ کو کچھ بھی وہ قرض  
 نہیں کر سکتا۔ ان شرائط کو تو چھوڑیں۔۔۔ اگر میں اس وقت  
 لے کر اب تک عام بینکوں کی مروجہ شرح سے بھی اس سے  
 رقم پر مبالغہ طلب کروں تو وہ زندگی بھر ہلکا درد کر کے صرف  
 بھی ادا نہیں کر سکتا۔“

ذرا خاموش رہ کر وہ بولا "مسئلہ یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ  
سلوک بھی نہیں کر سکتا جو مجھ جیسے اصول پرست لوگ  
تائید مانگان کے ساتھ کرتے ہیں۔ جس شخص کے لئے میری  
خاطرات ہو اس کے ساتھ میں شخص رقم کی خاطر کوئی اونچ نیچہ  
نہیں دیکھ سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔ کلر برنس میں اسی لئے کہ  
پس کہ برنس میں لحاظ داری نہیں چلتی۔"

اس نے ایک بار ہجرت کر کے عطشی سانس کی "اس لئے  
نے اپنی دیگر شرانگہ اور سناخ وغیرہ کا خیال تو ذہن سے نکال دیا۔  
ابستہ کبھی کبھی تاسف سے سوچا کرتا ہوں کہ اگر میری اصل رقم  
واپس مل جاتے تو کبھی غیبت ہے لیکن ظاہر ہے ہدایت و امنی اور  
کسی بھی طرح اصل رقم بھی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور مجھے  
معلوم ہے اس میں اس کی بدینگی کو دخل نہیں ہے۔ وہ بے جا  
واقعی مجبور ہے اسی لئے میں نے اسے بخشا ہوا ہے کہ وہ آج کل  
لوگ ویسے مقروض کو بھی نہیں بخشے جو بچ مجبور ہوتا ہے۔  
میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔"

”اچھا... ایک وجہ تو یہ ہو گئی۔ دوسری وجہ تم کیا جانے۔“  
”تھے؟“ مین نے پوچھا۔

”دوسری وجہ یہ ہے کہ ہدایت و ارشاد کے دل میں بھی نوح صاحب کے بارے میں کچھ اچھے جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔ میرے مقدمے تو ابھی نوح صاحب کی عدالت میں لٹک رہے ہیں لیکن ہدایت و ارشاد تو انہیں بہت اچھی طرح جھگڑ چکا تھا۔ بلکہ اس کے خیال میں تو اس کے زوال میں بھی نوح صاحب کا بہت ہاتھ تھا۔“

رقعہ اس طرح رکھا تھا کہ اگر کوئی آکر ملتا تھا تو اس والی کرسیوں میں سے کسی پر بیٹھتا تو اس کی نظر ضرور پڑتی۔

حکمر یک بولا "میرا اندازہ ٹھیک ہی رہا۔ میں تقریباً ساڑھے سات بجے ہی یہاں واپس پہنچا۔"

”ایسا چاہت وادنی جہاں سو تو کہ؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”نہیں“ کرم بیگ نے جواب دیا ”یہاں بیج صاحب کے سوا  
 کوئی نہیں تھا۔ اور بیج صاحب اسی حالت میں تھے جس میں تم  
 نہیں دیکھ رہے ہو۔ میری والدہیں پھر میرے گارڈز کے علاوہ شرافت  
 خانی بھی میرے ساتھ تھا۔ لاش ہم چاروں نے ایک ساتھ دیکھی۔  
 مجھے اعتراف ہے کہ ہم چاروں بولا گئے تھے۔ واپس رہے کہ ہم  
 سنبھالی سے بولکھانے والے لوگ نہیں ہیں۔“  
 ”مجھے اندازہ ہے“ میں نے نہایت مدبرانہ انداز میں  
 فرمایا۔

”جب ہم اپنی ہنگامت پر قابو پا چکے تھے اس کے چند منٹ بعد خیر انجمنی کے یہ صاحبان ان پینتے تب بیری خیرات کا سہرا سرط شروع ہوا لیکن وہ راز دوسری طرح کی گھبراہٹ تھی۔ وہ میں نے ان صاحبان پر ظاہر نہیں ہوئے دی۔ وہ حقیقت وہ توتلش تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کسی نے مجھے جاننے کی زبردستی کو شش کی ہے۔ ان صاحبان نے اپنی ابتدائی تفتیش مکمل کی اور اس دوران میں نے ان کے صاحب سے بات کی۔ انہوں نے پولیس کو تو ایسی طلب نہیں کیا لیکن پولیس مرجن کو ضرور طلب کر لیا تھا۔ وہ ابھی ابتدائی معائنہ کر کے جا چکا ہے۔“

”تم نے پراہت داملی سے رابطہ نہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں۔ اس سے پہلے میں نے آپ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ  
کر لیا تھا۔ میں نے سب اور ان صاحبان نے نمائندہ ہیرو سکون سے  
آپ کا انتظار کیا۔ خدا کا شکر ہے آپ مل گئے۔ آگے۔ اور میں  
آپ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔“  
”میں بھی سے اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں  
شراک ہو کر نہیں ہوں۔“

”مجھے انسانی دنیا کے کسی کدوار کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ مکرملہ ہوا ”ظاہر ہے کوئی انسانی کدوار میرے کسی کام نہیں ہے۔“ میں حقیقی دنیا کے کسی فرد سے ہی کوئی تھوڑی بہت امید رکھتا ہوں۔“

”تمہارے خیال میں جج صاحب کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟“

”برائیت وارثی کے سوا کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے اٹھا کھڑے سوال کر دیا۔

”لیکن اسے بیچ صاحب کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

اس نے عرض کیا۔

”دو جنوہات ہو سکتی تھیں۔“ مگر ہم بیک ہوا ”ایک تو ہر ایت

”صرف بغیر شادی کی حد تک بات ٹھیک تھی لیکن ہدایت دارٹی کا تعلق کسی بھی شراب پی کر غل غباؤ کرنے والی کلاس سے نہیں رہا۔ وہ جب نائٹ کلبوں اور شراب خانوں کا مالک تھا تب بھی خود شراب نہیں پیتا تھا۔ ہے بالکل بات؟“

”نہیں“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔

”وہ بے چارہ تو گردن پر دلوں میں چھپائے۔ بڑی خاموشی۔۔۔ بڑی گنتائی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ مسئلہ اصل میں بڑوں کی دیکھی کا تھا اور بے چارے ہدایت کی بد قسمتی دیکھیں کہ جس روز سادہ لباس والے اس کے گھر آئے اس روز اس کے دو تین گھنٹے اور آوارہ گرد قسم کے شہساز بھی اس کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ ہدایت نے ان کے ساتھ بیٹھ کر شغل شغل میں یوں بیٹھی ایک آدھ دھیک بھی چڑھایا تھا۔ وہ باقاعدہ پینے والا نہیں تھا۔ بس یوں ہی کبھی کبھار بے قول اس کے ’موشل ڈر ٹنگٹ‘ کر لیتا تھا یعنی عقل میں دو چار چٹکیاں یا ایک آدھ دھیک۔۔۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس روز بھی بے چارہ کھنگدے دوستوں کا ساتھ دے رہا تھا اور وہ عورت۔۔۔ غائبانہ اس کا نام تھا۔ وہ محض اس کی خوشنودی کی خاطر اس کے کنگال سے دوستوں کی خاطر بد رات کر رہی تھی۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ جب کسی کے خراب دن آتے ہوئے ہوں اور اس قسم کی صورت حال میں پولیس آکر چھاپا مارے تو کیس کچھ اس طرح کا بنتا ہے کہ نکال نکال مقام سے اتنے مرد ایک عورت کے ساتھ ”رنگ رلیاں“ مانتے ہوئے یا ”داؤنٹش“ دیتے ہوئے چلا کر گئے۔ ہدایت دارٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

”تو میں عدالت نے اسے سزا شادی۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ اب اس میں وہ پہلا سا غصہ باقی نہیں رہا مگر جلی ہوئی رستی میں بھی مل تو رہی جاتے ہیں۔ وہ اعلیٰ عدالت میں چلا گیا۔ وہاں بد قسمتی سے اس کا پالا عبدالسلام صاحب سے پڑ گیا اور یہ بات اس کے حق میں پہلے سے زیادہ بڑی ثابت ہوئی۔ یہی قسمت تھا کہ ہدایت دارٹی نے پولیس سے کم از کم اس حد تک تو معاملہ کر لیا تھا کہ اس کا کیس شری عدالت میں نہیں گیا تھا ورنہ اس کا نہ جانے کیا بنتا لیکن عبدالسلام صاحب نے بھی اس کی خوب کھپائی کی اور اس کی سزا مزید بڑھا دی۔ اسے بہر حال پوری سزا تو میں کاٹنی پڑی۔ ایسے سلوک اور دیگر ذہنات کی بنا پر وہ کچھ جلدی رہا ہو گیا لیکن یہ اس کی زندگی کا تلخ ترین تجربہ تھا۔ اس کے دل میں عبدالسلام صاحب کے بارے میں کچھ جھنجھکی تھی۔ اوپر خود جج صاحب بھی ہدایت دارٹی جیسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اس قسم کے لوگ معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کے زبے دار تھے جنہوں نے کبھی مثبت اور شرفناک ذرا مت بے دھیا کیا تھا نہیں سیکھا تھا۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے عدالتی فیصلے میں اس ناؤ کا اعتراف کر دیا تھا۔ جج صاحب راست گو اور دھنگ آدمی تھے۔ اپنے نظریات کا اعتراف کرنے میں ہچکچاتے نہیں تھے۔“

”دراصل ہدایت دارٹی کی جتنی بے نیاد تو نائٹ کلب۔۔۔ شراب خانے اور اسی قسم کے دوسرے کاروبار تھے۔ اب یہ شرفا اور ایک خاص ذہن کے لوگوں کی نظر میں کوئی ایچھے کاروبار تو نہیں ہیں۔ تب تک سیاسی حالات ہدایت دارٹی کے حق میں تھے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ جتنی کہ اگر واقعی کسی معاملے میں وہ قانون کی جگہ سے بے جا فائدہ اٹھا رہا تھا تب بھی کسی نہ کسی طرح چارہ بازی میں جب حالات بدلے تو ایک تو بے ہی رنڈ رنڈ اس کا سبز پورا گول ہو گیا۔ دوسرے اس کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی بڑی جتنی گہنی عبدالسلام صاحب کی عدالت میں اس کے بارے میں جو بھی مقدمہ کیا۔ انہوں نے ہدایت دارٹی کے خلاف ہی فیصلہ دیا۔ گو کہ انہوں نے پوری طرح قانونی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے ایسا کیا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بد مذہب بنار بھی کار فرما رہا ہو گا۔ وہ دیکھا محسوس کر رہے ہوں گے کہ وہ معاشرے کو پڑا تھیں سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جتنی کہ پچھلے دنوں تو انہوں نے ایک پھوٹے سے مسئلے میں ہدایت کو کوئی مبینوں کے لئے جیل بھجوا دیا تھا اور اسے ہدایت کی جتنی کہ کم از کم ایک تو وہ انسان کا بچہ بن جائے۔“

”وہ چھوٹا سا مسئلہ کیا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہدایت کی بیوی کچھ سال پہلے اس سے طلاق لے کر کینڈا چلی گئی تھی۔ دو بیٹے تھے۔ وہ بھی کہیں اُدھر اوڑھ چلے گئے تھے۔ زوال آتے ہی سب کو اس سے سنگین اختلافات ہو گئے تھے۔ بہر حال کئی برس سے وہ تمام گھر بھر دی پر چھوٹے موٹے کو دار کرنے والی ایک ٹوٹی پھوٹی سی آرٹسٹ اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔“

”اب تو ہدایت دارٹی فاسی عمر کا ہو گیا ہو گا۔ ابھی تک اس نے یہ وعدہ نہیں پھروڑا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں کچھ ایسا زیادہ عمر رسیدہ گیا کر گزرا تو نہیں ہے۔ تو میرے بال سفید ہیں مگر اب بھی پینٹم اور اسٹارٹ لگتا ہے۔ بال رنگے کی بھی ذمہ نہیں کرتا۔ اسے بالی زوال آیا ہے۔ جسمانی نہیں۔ جو لیوی آرٹسٹ اس کے ساتھ رہ رہی تھی عمر میں اس سے کڑھی تھی۔ خوش شکل۔ جاذبِ نظر۔ اور بڑی زندہ دل عورت تھی۔ دونوں بڑی محبت سے ساتھ رہتے تھے۔“

”پھر کیا ہوا؟ کیا لٹک کچ کرنا کر ان کی خوشیاں ایک آنکھ سے کھینچ لیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”بالکل ان کے برابر کے اپارٹمنٹ میں رہنے والے کسی مینو کے آدمی نے لٹک کچ گرفتاری کی تھی اور ان کے بارے میں پولیس کو مطلع کیا کہ وہ بغیر شادی کے ساتھ رہتے ہیں۔ شراب پی کر غل غباؤ کرتے ہیں ماحول کو گندا کرتے ہیں لوگوں کے انتظام پر اثر پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”نیاد حقیقت ایسا نہیں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

جاتا جیسا کہ ان موقعوں پر عموماً کیا جاتا ہے۔ دروازے کا ذکر ہو رہا تھا تو پہلے دروازے کو دیکھ لینا چاہئے تھا۔ میں نے بیوی کمرے سے گزر کر اس دروازے کا جائزہ لیا جسے کھل کر اپارٹمنٹ میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔

میں نے دیکھا دروازے کی اندر کی ٹاپ سیاہی بالکل تانبے کی تھی جبکہ باہر کی ٹاپ پیپر وٹ کی طرح ٹرانسپیرنٹ تھی مگر اس کے اندر پھول پونے نظر آ رہے تھے دونوں ہی عمدہ اور پرامنہ معلوم ہوتی تھیں اور ان کی ساخت بھی یکساں تھی مگر وہ بہر حال ایک جیسی نہیں تھیں۔

”یہ کیا پکڑ ہے۔ یہ دونوں ٹاپیں ایک جیسی کیوں نہیں ہیں؟“ میں نے اپنی دانست میں ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

”اصل میں آج ہی آنے کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ ٹاپ

میں کوئی خرابی ہے۔“ کمر یک دھجے لمبے میں تانبے کا ”خچے

ایک آدمی رہتا ہے۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں۔ بلکہ شاید بیشتر

لوگوں کو معلوم نہیں۔ سب اسے ”اموں اموں“ کہتے ہیں۔ وہ

بھگت اموں ہے۔ وہ اس بلڈنگ کے نگران کے فرائض بھی انجام

دیتا ہے اور اس کی ایک دوسری حیثیت بھی ہے۔ وہ ٹیکنیکل قسم کا

آدمی ہے۔ بلڈنگ میں کسی کو بھی کوئی ٹیکنیکل قسم کا مسئلہ درپیش

ہو ”اسی کو بلایا جاتا ہے اس طرح وہ کافی مصروف رہتا ہے اور

شاید یہی اس کا اصل ذریعہ معاش ہے۔ کینوں کی ایسوسی ایشن کی

طرف سے اسے تھوڑی بہت تنخواہ بھی ملتی ہے اور ان لوگوں نے

اسے رہائش کے لئے ایک کمر اور انٹرکام وغیرہ بھی دیا ہوا ہے۔

مجھے ضرورت ہوتی ہے اسے بلایا ہے۔ میں نے بھی آج ہی اسے

بلایا تھا اور ٹاپ تبدیل کرنے کے لئے کہا تھا۔ فوری طور پر اس

علاقے میں اس پرانی تانبے کی ٹاپ سے ملتی جلتی ٹاپ نہیں مل سکتی

تھی۔ اس نے عارضی طور پر یہ..... ٹاپ لاکر لگا دی تھی۔ کہہ

رہا تھا کہ پھر کبھی کہیں سے ایسی ہی لاکر لگا دے گا۔ میں نے اس سے

کہا بھی۔ کہ اگر ملتی جلتی نہیں مل رہی ہے تو دونوں ہی ٹاپیں بدل

دے لیکن وہ مجھے سمجھانے لگا کہ اس طرح زیادہ پیسے خرچ ہوں

گے۔ اس فنڈل خرچہ کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس قسم کے لوگوں

کے ساتھ دماغ سازی کے کے اپنا وقت اور انہی ضائع نہیں کرتا۔

اس لئے وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا میں نے اسے کہنے دیا۔ ممکن ہے

یہ ٹاپ اس کے اپنے پاس پڑی ہو۔ چار پیسے کمانے کے لئے بے

چارے سے موقع دیکھ کر اسے کھپا دیا ہو۔ مجھ نے موٹے لوگوں کی

پیسے کمانے کی یہی چھٹی سوئی ترکیبیں ہوتی ہیں۔“

اس کے لئے میں بے نیازی سی آگئی تھی۔ پھر وہ مسکرایا اور

بنور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں نے

حقیقت کی تلاش کے لئے بالکل صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ آپ

چھٹی چھٹی چیزوں کو بھی نظر انداز نہیں کر رہے ہیں۔“

پھر اس نے خفیہ مجھے کے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے

ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ بولا ”چنانچہ اس میں منظر میں ہدایت

وائلی کے لئے ایسی کوئی تدبیر سوچنا پڑا تاکہ وہ نہ تھا کہ جس کے

ذریعے ایک تیسرے دو شکار ہو سکیں۔ بیچ صاحب کو قتل کر کے ایک

تو اس کے جذبہ انتقام کی تحسین ہو سکتی تھی۔ دوسرے اگر میں تیل

چلا جاتا ہوں یا ملک سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں تو ہدایت وائلی

کو اس کے اپنے خیال میں چچاس لاکھ کے قرض سے نجات مل

جائے گی۔ حالانکہ اس نے اگر ایسا سوچا ہو گا تو یہ اس کی خام خیالی

ہوگی۔“ اس نے پھر ایک لمحہ توقف کیا اور قدرے ڈرامائی سے انداز

میں بولا ”یہ سب میں آپ کو بتا رہا ہوں لیکن درحقیقت میرے

خیال میں ہدایت وائلی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس پر یقین نہیں

ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ایک ایسی جتنی وجہ موجود ہے جس کی بنا پر میں ہدایت وائلی

کو بے گناہ سمجھتا ہوں۔ اور میں ایسا انداز ہی سے کام لیتا

چاہتا ہوں۔ اس وجہ کو چھپانا نہیں چاہتا ہے۔ کوئی اچھی بات نہیں

ہوگی کہ میں موقع دیکھ کر اور اپنے طور پر عین گناہ کے الزام اس

پر ڈال دوں۔ یا اگر الزام اس پر آ رہا ہو تو خاموش رہوں۔ اس کی

مصلحتی میں میرے پاس ایک نکتہ ہے جسے میں چھپانا نہیں چاہتا۔“

”وہ کیا؟“ میں نے حیرتاً جیسے سے پوچھا۔

”میں ہدایت وائلی کے لئے دروازہ غیر متعلق چھوڑ کر جاتا

بھول گیا تھا۔“ کمر یک نے جواب دیا ”اور اپنی بے بھول مجھے

بہت اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے جاتے وقت روائلی میں اندر کی

ٹاپ کاٹھن دبا رکھا جس سے دروازہ لاک ہو جاتا ہے اور یہ بات

مجھے اس لئے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ باہر نکل کر دروازہ بند کرنے

کے بعد میں نے باقاعدہ باہر والی ٹاپ کو کھٹکا کر اطمینان کیا تھا کہ

دروازہ لاک ہو گیا ہے یا نہیں؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دروازہ

متعلق تھا۔ اس لئے میرے ذہن سے ہی نکل گیا تھا کہ ہدایت وائلی

کو مجھ سے ملنے آتا تھا اور مجھے اس کے لئے دروازہ غیر متعلق چھوڑ

کر جانا تھا۔ بے خیالی میں بھی کبھی کسی خاص موقع پر ایسی حرکتیں

کر رہا ہوتا ہوں۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔ جب اس نے

ہدایت وائلی کے بارے میں مختصر اٹالیا تھا تو میرے ذہن میں ایک

نکتہ کے لئے خیال ابھرا تھا کہ وہ کسی کو توڑنا کا کیرا بنانے کی کوشش

تو نہیں کر رہا تھا؟ کو کہ غیر جانبداری سے سوچتے ہوئے میں نے بھی

محسوس کر لیا تھا کہ اس کی بات سچ بھی ہو سکتی تھی مگر اب اس کی

بات سے..... ہو رہا تھا کہ وہ موقع دیکھ کر ہدایت وائلی کو پھانسنے

کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوا تھا کہ اس کی

نیت وائلی کی تھی اور وہ حیرتاً کسی وجہ کی میں پھنسا ہوا تھا۔

میرے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ کچھ ”معائنہ“ وغیرہ کیا

صاحب کا قاتی ثابت کرنے کا جواز نہیں چاہئے گا۔ اور یہ بہر حال ایک ایسا قتل ہو گا جس کی سزا سے میرا اثر رسوخ بھی مجھے نہیں بچائے گا۔ میری شخصیت کی مناسبت سے یہ ایک بہت بڑا جال تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور ہم دونوں اس کمرے میں آ گئے جس پر پہلے موجود تھے۔ میں نے اوپر اڑھریں دیکھتے ہوئے پچھا "اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ تو نہیں ہے؟"

"دیکھو تو اس بلڈنگ میں پیچھے کی طرف ٹک اور بل کمانی ہوئی بیڑھیاں بھی نصب کی گئی ہیں جو ہر اپارٹمنٹ کی کھڑکی کے قریب سے گزر رہی ہیں۔" "کرم ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا "وہ ہنگامی حالات میں استعمال کرنے کے لئے ہیں لیکن آپ کو پتہ ہی ہے ہمارے ملک میں اس قسم کی چیزیں عموماً کینوں کے ٹیسٹس، چوڑوں ڈاکوؤں کے کام آتی ہیں۔ اس لئے شاید کینوں کا ان سے استفادہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ایمرضی کا معاملہ انہوں نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تقریباً سب اپارٹمنٹس کی ان کھڑکیوں پر کرنل لگی ہوئی ہے جو ان بیڑھیوں کے قریب پڑتی ہیں۔ یوں گویا وہ بیڑھیاں بے کاری ہو کر رہ گئی ہیں۔ اپارٹمنٹ میں داخلے کا دروازہ ایک ہی ہے۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ ہدایت واصلی اسی سے اندر آیا تھا؟" میں نے بظاہر سرسری سے کہنے میں کہا۔

اس کا ذہن ایک لمحے کے لئے بھی غیر حاضر نہیں تھا۔ وہ جلدی سے بولا "میں کوئی بھی خیال ظاہر نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف ایک امکان بیان کر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہدایت واصلی اندر آیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ اندر آیا تھا تو پھر زیادہ امکان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ دروازے کے راستے ہی آیا ہو گا۔"

"لیکن وہ بلا جع صاحب کو یہاں کیسے بلا سکتا تھا؟ یہ بات کچھ حلق سے نہیں اُڑتی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "ج صاحب بلا فون پر کسی ایسے شخص کے بلاوے پر اس اپارٹمنٹ میں کیسے آ سکتے تھے جس کی شہرت اور کردار ان کی نظر میں اچھا نہیں تھا۔ جسے وہ ذاتی طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ اور جسے وہ ماضی میں جیل بھجوا چکے تھے؟"

"میرے خیال میں یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔" "کرم بیک بھی کچھ سوچتے ہوئے بولا "اس سلسلے میں بھی میں امکانات ہی کا ذکر کروں گا۔ ایک امکان تو یہ بھی ہے کہ ہدایت واصلی نے انہیں اپنی اصل حیثیت سے فون نہ کیا ہو۔ کچھ اور سن کر فون کیا ہو۔ اس کے علاوہ میری باتوں سے آپ کو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ جع صاحب کس قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے دل میں معاشرے کی تعمیر کا جذبہ بڑی شدت سے کار فرما تھا۔ میں نے سنا ہے کسی اچھے عقیدے کے لئے وہ خود جیل کر کے جانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے اور لگے بندھے اصولوں سے ہٹ کر بھی کوئی قدم اٹھایا کرتے تھے۔

ہوئے کہا "حیرت ہے کہ ان صاحبان نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔"

وہ صاحبان اس وقت ہمارے قریب آ کھڑے ہوئے تھے اور اس وقت ذرا شرمندہ نظر آنے لگے تھے۔ میں نے جلدی سے ان کی طرف سے توجہ ہٹاتے ہوئے کرم بیک سے تصدیق چاہی "بہر حال یہ بات ہے کہ جب تم آئے تب بھی دروازہ قفل تھا؟"

"ہاں" میں چابی سے ٹالا کھول کر اندر آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"میں کا مطلب ہے تمہاری ہدایت واصلی والی حیدری تو دھری رہ گئی؟" میں نے کہا۔

وہ حقا کہنے میں بولا "میں اپنی طرف سے کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف وہ حقائق بیان کر سکتا ہوں جو میرے علم میں ہیں۔ ان کے سارے حقیقت کی۔ تب تک آپ کو پتہ چلتا ہے۔"

یہ کہنے کے باوجود وہ گویا اظہار خیال کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا "بہر حال دروازہ قفل ہوا کوئی بہت زیادہ اہم بات نہیں ہے۔ بہت سے تالوں کی چابیاں دوسرے تالوں میں لگ جاتی ہیں۔ آئے کھولنے کے دوسرے طریقے بھی ہوتے ہیں۔"

کوئی پتہ نہیں تھا کہ خود کرم بیک نے اپنی زندگی میں بہت سے آئے کھولے ہوں۔ تاہم میں نے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نہیں سکتا کہ ہدایت واصلی یہاں پہنچا ہو اور اس نے دروازہ قفل پایا ہو تو مجھ گیا ہو کہ میں بھولے سے آٹا لگا گیا ہوں۔ اس نے سوچا ہو کہ اس کا تو چکری ضائع ہو جائے گا۔ آج کے دور میں ہر شخص بڑی مشکل سے کسی کام کے لئے وقت نکال کر کہیں جاتا ہے۔"

وہ بات تشہی چھوڑ کر خاموش ہو کر گویا کچھ سوچنے لگا۔ "کرم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" میں نے گویا اسے اپنی حیدری کو آگے بڑھانے کے لئے کہا۔

وہ بولا "شاید وہ کسی طریقے سے ٹالا کھول کر اندر آیا ہو۔ اس نے میز پر رکھا ہوا میرا تھ پڑھا ہوا اور سوچا ہو کہ میں تو کم از کم دو گھنٹے تک وہاں نہیں آؤں گا۔ اس وقت کا بہتر استعمال کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے ذہن میں اچانک اسکیم آئی ہو۔ شیطانی اسکیمیں انسان کے ذہن میں اچانک ہی آتی ہیں اور عام طور پر انسان ان پر اچانک ہی عمل کر گزرتا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے بھی وضاحت چاہی۔

"یعنی اس نے جع صاحب کو کسی بہانے یہاں بلا لیا ہو اور انہیں گولی مار کر مجھے رستے ہاتھوں پکڑوانے کے لئے خاموشی سے رخصت ہو گیا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ میں اگر اس صورت حال میں پکڑا گیا تو میرے خلاف ایسا بہت سا مواد نکل آئے گا جو مجھے جج

دیا جاتا ہے۔ دو گز زمین کے ٹکڑے پر ٹھوڑی سی خاص فائدہ گزار اور اس میں لوہے کے دو گز چھانڈاں لگائے۔ جسوے نصب کر کے اسے بچوں کے تقریبی پارک کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ہاتھ روم جتنے کسی کمرے پر فٹ کس سینٹر کا بورڈ لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی بہت سی ذرا سے بازاریاں کی جاتی ہیں۔

پھر اس نے کندھے اچکائے اور خود ہی دوسرے فرق کا دفاع کرتے ہوئے بولا "بہر حال۔۔۔ بلڈرز کے اپنے بھی بہت سے مسائل ہیں۔ مہنگائی کی مصنوعی کمربند ہر صنعت کو اپنے بچوں میں جکڑے رکھتی ہے۔ دوسری رکاز میں بھی ہوتی ہیں۔ بلڈرائی اعلان کردہ قیمتوں میں صحیح معنوں میں ڈھنگ سے وہ چیزیں فراہم نہیں کر سکتے۔ میرا خود کسی زمانے میں یہاں کنسٹرکشن کا بھی بڑا حصہ تھا۔ میں نے بند کر دیا۔ اب اس کا میں کمرہا ہوں وہاں ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ بہت آسانیاں اور سولتیں میسر ہیں۔"

"خیر تو یہ گارنٹی شیوٹ ہے۔" میں نے کئی سلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس مجھے اور شکاف کی طرف دیکھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا "خیر اور اس وقت بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ بڑی سولت رہے گی۔ گھر میں کھڑے کھڑے اپنے کو ڈرا پکڑا اس خانے میں ڈال دیا کریں گے اور وہ خود بخود پکڑا خانے میں پہنچ جایا کرے گا جہاں اسے ٹھکانے لگانے کا بندوبست ہو گا لیکن یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ایک تو گارج شیوٹس ناکام تعمیر کئے گئے تھے۔ دوسرے ہمارے ہاں اچھے بھلے خوش حال طبقے کے بڑے کھلے لوگوں کو بھی ایسی ہی چیزوں کے استعمال کا پلندہ نہیں۔ کچھ ہی عرصے میں ان شیوٹس کا بڑا حال ہو گیا۔ پکڑا خانے کا نظام بھی صحیح طور پر نہیں سنبھالا جا سکا۔ دوسرے ملکوں میں تو بجلی سے پکڑا جلاتے کی بھینیاں چلتی ہیں۔ یہاں گیس سے بھی نہیں چل سکتی۔ اس لئے یہ سب کچھ ناکام ہو گیا ہے۔ بلڈنگ والوں کو منع کر دیا گیا ہے کہ ان میں پکڑا نہ پینگیں۔"

باتیں کہنے کے دوران میں ہم ایک سے دوسرے کمرے میں جاتے رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کی سینک ڈی تھی جو اس نے بتائی تھی۔ ایک کمرہ بڑا روم تھا۔ باقی کی ترتیب و آرائش دفتروالی تھی۔ کسی کمرے میں ان کے سوا کوئی فرد موجود نہیں تھا جنہیں میں دیکھ چکا تھا۔

میں نے تمام کمرے دیکھ کر بھی باز نہ لیا تھا۔ اپارٹمنٹ میں داخلے کا واقعی کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ صرف اس کمرے کی گرل کاب کمرے کوئی اندر آ سکتا تھا جو بنگا کی بیڑیوں کے قریب تھی لیکن اس کی گرل صحیح سلامت تھی۔ میں نے چند منٹ میں ہی معائنہ مکمل کر لیا۔

"واقعہ۔۔۔ اس میں تو سائے والے دروازے کے سوا کسی راستے سے کوئی اندر نہیں آ سکتا۔" میں نے تسلیم کیا "اور تمہارا

یہ کام کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے جو ان کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہوا تھا۔ بشرطیکہ انہیں اس میں کوئی بڑا مقصد نہ نظر آتا۔ اپنی نئی زندگی میں ان کا رویہ افسر شاہی میں تھا۔ ہو سکتا ہے دہائیت وادائی نے کوئی ایسی کمائی کفر کر گنج ہو کر لپٹا لی ہو کہ وہ مجھے ہوں کہ وہ معاشرے کی کوئی بہت بڑی شخصیت انعام دینے جارہے ہیں۔"

"چھپچھپ صاحب کی کوئی گاڑی یا مکن میں وغیرہ بھی موجود ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" کرم بیک نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر خفیہ ادارے کے ایک طرف اشارہ کیا "یہ صاحبان چپک کر چکے ہیں۔ نیچے کوئی گاڑی موجود نہیں ہے جسے بیج صاحب کی گاڑی بھی جاکے اور نہ ہی کوئی مکن میں وغیرہ موجود ہے۔ ممکن ہے یہ درویش صفت کسی عیسوی وغیرہ میں آیا ہو اور تنہا ہی آیا ہو۔ شاید دہائیت نے اپنی کمائی کے مطابق انہیں وازدادائی سے کہنے کی بات کی ہو۔ فی الحال تو اس طبقے میں صرف قیاس ہی کیے جاتے ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "اس اپارٹمنٹ کل کتنے کمرے ہیں؟"

اس نے ذرا سوچا پھر جواب دیا "جیسے۔۔۔ ان میں سے صرف کومیں نے بند کر دیا ہوا ہے کیونکہ کچھ بھی مجھے یہاں آرام ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ باقی سب دفتر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔"

"میں انہیں ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔ "کیوں نہیں۔" اس نے فوراً کہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے لاؤنج کی طرف چل دیا۔

لاؤنج میں پہنچتے ہی میری کئی کسی چیز سے ٹکرائی۔ میں نے اپنی راہ منبہ کرتے ہوئے دیوار کی طرف دیکھا۔ دیوار میں سے عجیب بے ہودہ سے انداز میں چھوٹا سا ایک جھجکا ہوا ٹکڑا ہوا تھا۔ اس نے نیچے دیوار میں چوکر خلا سا نظر آ رہا تھا جسے ہارڈ بورڈ کا گریڈ رنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ ایک خوب صورت اپارٹمنٹ شاید بدنامی مجھے حیرت انگیز لگی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

کرم بیک مبتلا کر بولا "آپ کو معلوم ہی ہو گا ہمارے ہاں ہر خانے میں مہرب کی خالی کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ہم کسی چیز کو وہ معیار نہیں دے پاتے۔ اس بلڈنگ کی تعمیر کے وقت اس میں گارج شیوٹس بھی بنا کر دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اپارٹمنٹس پہنچنے کے لئے اشتیادوں کی حد تک تو منصوبے میں دنیا کی بہت سی سولیات اور آسانیاں جمع کر دینے کے وعدے کئے جاتے ہیں اور موعنے کے طور پر بعضی قسم کی چیزیں دکھانے کے لئے بھیج دی جاتی ہیں۔ مثلاً چارکر کا حوض بنا کر اسے سو ٹھنگ پول کا نام دے

کافی ہے۔ میں نے کہا۔

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے اور  
تو ہر حال بتانا ہی پڑے گا۔ یہ صاحبان درحقیقت اسی انتظار  
بیٹھے ہیں۔“ اس نے غصے لگے کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

”کوئی بات نہیں۔ یہ لوگ کچھ دور اور انتظار کر لیں  
انہوں نے اب تک بھی نہایت صبر و تحمل اور شائستگی کا مظاہرہ  
کیا ہے۔ امید ہے یہ سیرے جانے کے بعد بھی اسی طرح تم سے  
جاری رہیں گے۔ تم پولیس کو ہر بات بالکل اسی طرح بتاؤ گے  
جس طرح تم نے مجھے بتائی ہے۔ تمہارے بیان میں کوئی فرق  
آنا چاہیے اور پولیس تمہارا کوئی جھوٹ نہ پکڑے پائے۔“

”جب میں جھوٹ بول ہی نہیں ہا تو وہ پکڑے گی کیسے؟“  
وہ اطمینان سے بولا ”وہ مجھ پر وہ فارمولا تو آزمائیں سکتی جس  
”ج“ جھوٹ میں۔ اور جھوٹ ”ج“ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“

”سکرایا“ لیکن آپ اس دوران میں کہاں جا رہے ہیں؟“  
”ہدایت دوائی سے لٹے۔“ میں نے جواب دیا ”یہ بتاؤ وہ  
وقت کہاں لگے گا؟“

”اگر وہ اس قتل میں ملوث نہیں ہے تو میرا خیال ہے وہ  
ہوٹل میں ہی لٹے گا۔ وہ لٹے پر چلا رہا ہے۔ اس کا زیادہ  
دیر نہ گزرتا ہے۔ لیکن آپ کو اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت  
ہے؟ اسے نہیں پتا لیتے ہیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ اگر وہ  
ہو تو فوراً آجائے گا۔“ ”تکرمیر ہوا۔“

”نہیں۔ میں اسے خبردار کرتے ہوں اس کے اپنے لٹکانے پر  
جا کر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اب تم نے مجھے ایک عجیب و غریب  
کام میں پھنسا دیا ہے تو میں اپنی عقل کے مطابق چلا جاتا ہوں  
دیکھا ہوں مجھے کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کے ہر  
کام کا کیا ہے۔ اور اگر وہ کچھ زیادہ ہی گمنام ہے تو ایسے  
بتاؤ۔“

”آپ کے لئے وہ شاید گمنام ہو۔ لیکن کچھ حلقوں میں تو  
بہت ہی مشہور ہے۔“ ”کرم بیگ منی خیر انداز میں سکرایا۔ پھر  
نے مجھے ہوٹل کا نام بتایا اور میں بے اختیار کمری سانس لے کر  
گیا۔ ہوٹل کا نام ”لارڈز ان“ تھا۔“

”کرم بیگ بدستور سکرارے ہوئے بولا ”گتا ہے اس کی شہر  
آپ تک بھی پہنچ چکی ہے؟“

”میں بھی ہوٹل کے بزنس میں ہوں۔ کسی خاص ہی خفیہ  
بتا پر کسی کسی ہوٹل کی شہرت مجھ تک پہنچ ہی جاتی ہے۔“ میں۔  
جواب دیا ”اپنے ماضی کی روشنی میں ہدایت دوائی کوئی ایسی  
ہوٹل دیکھ کر بے سکتا تھا۔“

”لارڈز ان“ اس قسم کے ہوٹلوں میں سے تھا جنہیں ان کے  
دعوت کے زمانے میں بھی کوئی اشار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ہر حال کسی  
زمانے میں اس قسم کے ہوٹل کافی تعداد میں پائے جاتے تھے

گمنام کہ تم اسے مشعل کر گئے تھے۔“

”کاش مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا! وہ ٹھنڈی سانس لے  
کر بولا ”اس طرح سب کا کام آسان ہو جاتا۔“

”اب تمہاری پوزیشن بدستور مشکوک ہی ہے۔“ میں نے  
کہا۔

”مجھے معلوم ہے لیکن میں آپ سے جھوٹ بولنے کی حماقت  
نہیں کرنا چاہتا۔ میں ضمیر و فہم کی بات نہیں کروں گا کیونکہ آپ کو  
شاید اب بھی یقین نہ آئے کہ مجھ جیسے آدمی کے پاس ضمیر و فہم  
جیسا بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں شخص عقل کے حوالے  
سے دیکھ رہا ہوں۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ میں جھوٹ نہ بولوں  
بلکہ بول کر فی الحال تو شاید میں الزام کا پھندا اپنے گلے  
سے نکال کر ہدایت دوائی کے گلے میں ڈالنے میں کامیاب ہو جاؤں  
لیکن آگے چل کر اس سے زیادہ بڑی طرح بھس جاؤں۔“

وہ بدستور ہر بات بڑی عقلیت سے کر رہا تھا۔ مجھے ابھی تک  
یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا عقل مند آدمی ہو سکتا تھا۔ میں خاموشی  
سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ہم دوا میں اسی بڑے کمرے میں آچکے  
تھے جو اصل میں ڈرائنگ روم تھا کراپ آفس کا مین کراوی  
معلوم ہوا تھا۔ اس میں دوائی کے دو دروازے تھے لیکن دونوں  
اپارٹمنٹ کے اندر ہی تھے باہر کی طرف اس کا کوئی دروازہ نہیں  
تھا۔

”اب؟“ ”کرم بیگ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
”کیا یہ کیس پولیس کے پاس جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ضابطے کی کارروائی تو وہی کرے گی۔ کیس کا اندراج  
بھی پولیس ہی کرے گی۔“ ”کرم بیگ نے جواب دیا ”خیر۔ ایجنسی تو  
صرف اس کیس کی تحقیقات کرے گی کہ اس میں کوئی گھپلا نہ ہوئے  
پائے کوئی فرق پولیس سے ساز باز کر کے دیکھا کلا کے یا کوئی اور  
چکر بازی کر کے سزا سے نہ بچنے پائے۔ اہم آدمی کے قتل کا معاملہ  
ہے۔“

”تم مجھے تقریباً ایک گھنٹے کی مسلت دو۔“ میں نے سوچتے  
ہوئے کہا ”میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ یہاں آؤں گا اور اگر نہ آسکا تو  
فون پر تم سے رابطہ کروں گا۔ اس کے بعد تم پولیس کو بلا لیتا۔“

”ہم پولیس۔۔۔؟“ اس نے عجیب اچکا میں۔ اس کی آنکھوں  
میں ہلکی مرتبہ میں نے تشویش کی ہلکی سی پرجھٹکی دیکھی۔ وہ اسے  
اثر و رسوخ کا مالک تھا کہ ابھی تک پولیس سے زیادہ خطرناک لگے  
کے لوگوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ معلوم نہیں کیوں پولیس  
کے نام پر اس کی آنکھوں میں تشویش کی پرجھٹکی ابھری تھی  
حالانکہ میرے خیال میں اس کے لئے پولیس سے محفوظ رہنا زیادہ  
آسان تھا۔

”ظاہر ہے پولیس کو تو بتانا ہی پڑے گا۔ ضابطے کی کارروائی  
آخر اور کتنی دیر کے لئے مانی جاسکتی ہے؟ جتنی تاخیر ہو سکی ہے وہی

نہیں کرتا تھا۔

مجھے کیا بار اس ہوٹل کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے ہدایت دہانی کیجیے پر چلا رہا تھا۔ ممکن ہے اتنی بہت سی معلومات کے ساتھ بھی ہدایت کا نام بھی سامنے آیا ہو لیکن میرے ذہن میں یہ خیال نہ آیا ہو کہ یہ وہی ہدایت دہانی تھا جو ماضی میں بڑی ادنیٰ چیز رہا تھا۔

مکرم بیک بولا "کیا آپ کا وہیں جا کر اس سے ملنے ضروری ہے؟"

"ہاں۔ میں اچانک اس کے سامنے جا کر اسے سر پر اترو دیا چاہتا ہوں۔ میں ایک غیر حلقی آدمی ہوں۔ اسے یقیناً یہ جان کر کافی حیرت ہوگی کہ میں اس معاملے میں اس حد تک دلچسپی لے رہا ہوں۔ دوسرے وہاں جا کر شاید کوئی اور کام کی بات بھی معلوم ہو جائے۔ ہر جگہ کا اپنا ایک الگ ماحول ہوتا ہے۔ مشاہدہ کرنے والی آنکھ کو ماحول بھی بہت بتاتا ہے۔"

"دوست کہا آپ نے۔" مکرم نے سر ہلایا۔

"ہاں۔ یاد آیا۔" رخصت ہونے سے پہلے میں نے کہا "تم نے اس صورتِ ظلم کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں، جس کی وجہ سے ہدایت کو نیل جانا پڑا تھا۔ اس کا کیا بنا تھا؟"

"اسے بھی مرزا ہوئی تھی لیکن ہدایت سے کہ۔" مکرم بیک نے جواب دیا "جج عبدالکلام صاحب بھی طور پر اس کی اصلاح پر نکلے ہوئے تھے۔ وہ اسے نیل بھیج کر بمبئی نہیں تھے۔ اس کے نیل سے نکلے ہی انہوں نے اسے بلایا اور سمجھا بھجا کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جس کی زندگی کی کمائی اسی سے کچھ کچھ ملتی چلتی تھی۔ جج صاحب کا خیال تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اچھے سامعین ثابت ہوں گے۔ دونوں کو سارے کی ضرورت تھی۔ دونوں درخت سے ٹوٹے ہوئے فواں رسیدہ پتوں کی طرح تھے۔ ہدایت ابھی نیل میں ہی تھا۔ جج صاحب کی توقعات پوری نہیں ہو سکیں۔ ظلم اور اس کے شوہر میں جلد طلاق ہو گئی۔ پھر شاید جج صاحب نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ آخر ایک مصروف شخص کب تک مصلحت قوم کا کردار ادا کر سکتا ہے؟ جو نئی ہدایت نیل سے باہر آیا، ظلم واپس اس کے پاس چلی گئی۔ اب بھی اسی کے پاس ہے۔ اس کے ہوٹل میں ہی کام کرتی ہے۔ بیک وقت ہوٹل کی ریسیپشنسٹ، ہدایت کی سیکرٹری اور کبھی کبھی آپریٹر کے علاوہ نہ جانے کیا کیا فرائض انجام دیتی ہے۔ وہ ایک عجیب جڑوا ہے۔"

دونوں کو ایک دوسرے میں یقیناً کوئی خاص ہی کشش محسوس ہوتی ہوگی جس نے انہیں ایک ساتھ باندھا ہوا ہے۔ ورنہ ان کی عمروں میں تو کافی فرق ہے۔ میں ممکن ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو۔ بعض انسانوں کو زندگی میں محبت بڑے عجیب موڑ پر۔ بڑے عجیب حالات میں۔ اور بڑی تاخیر کے ساتھ ملتی ہے۔"

دوسرے کے صاف سترے ہوٹلوں میں شمار ہوتے تھے اور طبقے بری ان کے پرنس کا داماد رہا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان پر زوال چھا۔ عمارتیں پرانی ہو، مکان کی زندگی کی کمائیوں میں نہ جانے کون کون سے موڑ، جن کے اثرات ان کے ہوٹلوں پر بھی پڑے۔ بعض مالکان اس دنیا میں نہیں تھے۔ بعض ہوٹل ٹوٹ گئے۔ بعض دکھتریں، در بعض غیر رسمی قسم کے ہوٹلوں میں تبدیل ہو گئے۔

ان میں سے دو چار نے بھاگ دو سرائی راست اختیار کیا۔ ساڑھ انہی میں سے ایک تھا۔ یہی معلومات کے مطابق اس میں بے غور کے کمرلوں میں مختلف دکھتر قائم تھے۔ ان میں سے بعض قسم کی کہنیوں کے تھے جن کے نام کے ساتھ "انٹر پرائس" لکھا ہوتا ہے مگر ان کی تمام ترین الا قوانیت صرف ایک کیس تک محدود ہوتی ہے۔

ان میں سے بعض کہنیاں چند ماہ یا سال دو سال میں غائب آتی ہیں۔ بعض کے مکان غائب ہو جاتے ہیں۔ قرض خواہوں دیگر تھکے رادوں کا سامنا کرنے کے لئے بے چارہ انسان رہ جاتے ہیں۔ حالات کا مارا ہوتا ہے اور اب تنخواہوں کے ادا میں بیٹھا ہوتا ہے مگر تنخواہوں کے بجائے انہیں دفتر کے چکر لے والوں کی دھمکیاں ملتی ہیں۔

اس کے فرسٹ فلور سے اوپر کے کمرے اب بھی ہوٹل کے ریل کے طور پر ہی کرائے پر اٹھائے جاتے تھے۔ ہوٹل کے معاہدہ کیجئے ہوئے ان کے کرائے غائب ہوئے تھے لیکن کمرے لینے والوں کو ان پر اعتراض نہیں ہوتا تھا کیونکہ جو "سہولیات" انہیں میسر تھیں، کہیں اور مشکل سے ہی ہو سکتی تھیں۔ انہیں یہ ماندا ہوتا ہوا کہ اگر آخر ہوٹل کی آمدنی میں سے کافی حصہ ملاقاتیوں اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی جاتا ہوگا۔

وہاں بعض شادی شدہ حضرات غیر شادی شدہ خواتین کے تھے اور بعض شادی شدہ خواتین غیر شادی شدہ حضرات کے تھے تشریف لے جاتی تھیں۔ بعض شادی شدہ حضرات بعض ہی شادی شدہ خواتین کے ساتھ بھی تشریف لاتے تھے مگر وہ ان کی پاس نہیں ہوتی تھیں۔ بیشتر حضرات کچھ ایسی خواتین کے ساتھ تشریف لاتے تھے جن کی راتیں عموماً ہوٹلوں کے کمرلوں میں ہی رہا۔ ایسے کمرلوں میں گزرتی ہیں جن میں ہوٹلوں کی ہی خصوصیات پائی

لی ہیں۔ ان میں گراؤ کا طور پر اب بھی رستوران چل رہا تھا۔ ماشام کو زیادہ تر اسٹینج اور لی وی وغیرہ پر ہاتھ پاؤں مارے ہوئے کار اور اواکارائیں بیٹھی ٹھہرتی تھیں۔ انہیں وہاں کے ماحول، شاید کچھ اپنا بیت اور آزادی کا احساس ہوتا تھا۔ رستوران بال زیادہ رنگ بھی نہیں تھا۔ وہاں کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ گزارا کئے تھے کوئی انشیر، چمکانے والے، جسے استعمال

ی ہیں۔ جو چند پارٹیز ہیں وہ بھی کاغذی ہی ہیں۔ ان کہیں آمدنی بھی آپ کی ٹیجی ہی ہے۔  
"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے تسلیم کیا "پھر بھی یہ کچھ اور با ہے۔"

"سرا یہ کیا کوئی یاد پنجر شروع کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔  
"ہاں کی کچھ لوہ۔ یہ اس و پنجر کے حلقے میں "ہوتی" ہے۔ آقا ز اچھا ہوا ہے۔ تفصیل نہیں کل بتاؤں گا۔ فی الحال "لارڈز ان" جا رہا ہوں۔ اب ذرا اس کمائی کو حلال بھی ہے۔"

"اور کیا ہو رہا ہے سر؟" اس نے ریف کیس بٹل میں دیا ہوئے پوچھا۔

"جو کچھ بھی ہوا ہے بہت بڑا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا "ایک شریف اور دانا دار آدمی مارا گیا ہے جس کا وجود معاشرے کے لئے مفید تھا۔ قدرت کی مصلحتوں کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے لوگ بے وقت مارے جاتے ہیں جن کے دم سے انسانیت بڑا سارا ملتا ہے اور بعض ایسے غلب انسانیت نہیں پیدا ہوتے۔ مر جانا چاہئے تھا کسی طرح مرنے میں ہی نہیں آتے۔"

میں درد اذہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور شفیع شاہ تیزی سے اندر سے میں گاڑی ہوئی ایلن گاڑی کی طرف چل دیا۔  
نے اسے گاڑی تک پہنچنے کے لئے چند سیکنڈ کی صلت دی۔ پھر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

جب میں لارڈز ان پہنچا تو اس کے رستوران میں دو قہ پر تھی۔ اس کی ایک دیوار میں سڑک کی طرف کا بیڑا شیش لگا تھا۔ یہ بیڑا گلاس تھا کھرا کھرا تو کچھ اندر دو شیشیاں ہوئی تھیں۔ رستوران کا منظر باہر سے بھی دیکھا جاسکتا تھا۔

میں نے گاڑی ہوئی سے کچھ دور ہی چھوڑ دی تھی اور چند لمحوں کے لئے باہر ہی دک کر اندر کے منظر کا جائزہ لیا۔ رستوران کی تقریباً سب میزیں بھری ہوئی تھیں۔ سکرپٹرز، اداکار، موسیقار، پکارا راتنام، البتہ باتوں کی جھنجھٹ باہر تک پہنچ رہی تھی۔

رستوران میں براہ راست داخل ہونے کے لئے بھی بیڑا ایک درد اذہ موجود تھا جبکہ ہوٹل کا اصل درد اذہ دوسرا تھا جو سیلابی میں کھٹکا تھا۔ لابی کے اختتام پر استقبالیہ ڈسٹر تھا۔ اس ایک طرف غالباً چھوٹا سا آفس تھا۔ اسی کے پاس ایک اور کمرہ سے کہیں میں غالباً لابی فون کا بورڈ نصب تھا۔ کوئی سے بیڑا اوپر جا رہی تھی۔

اس لابی اور رستوران کے درمیان بھی ایک عمارتی در موجود تھا۔ دوسرے بھی رستوران میں داخل ہو سکتے تھے۔ ہوٹل کا اصل درد اذہ بیٹے کا نہیں تھا لیکن میں رستوران کی کی دیوار سے ادھر کا منظر بھی آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ کاؤنٹر

"اور شاید وہ شادی کر کے اس محبت کو برباد کرنا نہیں چاہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا پھر پوچھا "وہ اب بھی بغیر شادی کے ہی ساتھ رہ رہے ہیں؟"

"غالباً" کرم بیک نے بے یقینی سے جواب دیا "مجھے ان کی ٹیجی زندگی کی تازہ ترین صورت حال کا علم نہیں۔ بہر حال وہ دونوں ہوٹل میں ہی پائے جاتے ہیں۔"

"بیج صاحب کے بارے میں تو نیلم کے دل میں بھی کچھ اچھے جذبات نہیں ہوں گے؟" میں نے تصدیق چاہی۔  
"شاید" کرم بیک ہنسے میں بولا "میں نے سنا ہے وہ بیٹھ پیچھے انہیں بدعاشیوں کا کٹی گئی کہ ان کی وجہ سے اس کی زندگی برباد ہوئی۔" وہ دوسرے سے ہنسا "حالا کہ کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ آخر اس سے پہلے اس کی زندگی کون سی "آباد" تھی۔ پانچ آئندہ اس کے "آباد" ہونے کے کون سے امکانات تھے؟ اس قسم کی عورتوں کی زندگی تو اسی طرح گزرتی ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں وہ اپنے اعمال کے حساب سے بہت اچھے حال میں ہے اور کافی حد تک باعزت زندگی گزار رہی ہے۔"

"خفیہ میں جا کر ان سے ملتا ہوں۔" میں نے کہا اور ریف کیس اٹھا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں نیچے پہنچا تو شفیع شاہ میری گاڑی سے نکل لگے کھڑا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس وقت اوپر سے میرے خاقاب میں کوئی نہیں آیا تھا اور وہ جبکہ ایسی تھی جہاں کرم بیک اپنے اپارٹمنٹ کی کسی کھڑکی سے مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے شفیع شاہ سے بات کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"تم یہاں کیوں آن کھڑے ہوئے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو اوپر اس اپارٹمنٹ تک بھی ہوا تھا ہوں سرا لیکن وہاں مجھے ماحول پر سکون ہی نظر آیا۔ اسی لئے میں نیچے آ گیا۔ اس کے باوجود اب مجھے کچھ تشویش ہو چکی تھی۔ میں فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔" اس نے بہت بچی آواز میں جواب دیا۔

"ذرا کرات بہت لمبے ہو گئے۔" میں نے بتایا "لیکن خیر۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وقت ضائع نہیں گیا۔ میں لاکھ کما کر لایا ہوں۔ مزید بھی جو وقت ضائع ہو گا اس کی قیمت بھی پیشگی وصول کر لی ہے۔"

پھر میں نے ریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ بیج میرے پرسل اکاؤنٹ میں بیج کروا دینا۔ یہ خالصتاً میری ٹیجی کمائی ہے۔ میرے گروپ آف کیپیٹل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"کیپٹیاں بھی آپ ہی کی ہیں سرا" شفیع شاہ ریف کیس لپٹے ہوئے مسکرا کر بولا "سب پرائیویٹ لینڈ ہیں۔ مالک و مختار تو آپ



کس کم رو عورتیں شوہرئیں میں ایسے خاص مقام پر تھیں۔ شاید اس میں ایکنک کی کوئی خاص صلاحیت نہ ہو۔ وہ محض اس درجہ کی اداکارانہ ہوس درجہ تک تقریباً بر عورت ہوتی ہے۔

وہ بیڑیوں پر عتاب ہو گئی اور میں اپنی دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے عمرانی دروازے سے گزر کر رستوران میں آگیا۔ باتوں کی وہ تیز جھمکاہٹ جو ہر جگہ تک نہیں پہنچ رہی تھی اب یکدم ہی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ سڑکوں کے دھوئیں اور چائے کافی وغیرہ کی منک سے جو بھل ہوا نے میرا اشتعال کیا۔ بال میں دو دھڑکیں تھیں۔

میں نے کوئی ایسی میز تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے میں کاؤنٹر پر نظر رکھ سکوں۔ ظاہر ہے وہ بد بخت کاؤنٹر کوئی ایسا چیز نہیں تھا جس پر نظر رکھی جاتی۔ کاؤنٹر پر نظر رکھنے سے میرا مقصد ٹیلم پر نظر رکھنا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یکم اور لوگ بھی اپنے دل و ذہن میں یہی مقصد لے کر آئے ہوئے تھے۔ ایسے زاویوں پر رکھی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں جن سے کاؤنٹر نظر آتا تھا۔ تاہم مجھے کافی چھپے ایک میز خالی مل ہی گئی۔ چھوٹی سی وہ میز ایک کونے میں گھسی ہوئی تھی۔ مرکز نگاہ ذرا دور ہو گیا تھا لیکن میرے لئے ہر حال اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مجھے امید تھی جب وہ کاؤنٹر پر واپس آئے گی تو میں یہاں سے بھی صاف طور پر اس کا جائزہ لے سکوں گا۔

میں نے اس کی آمد سے پہلے رستوران کا جائزہ لیا۔ اس کا ماحول تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ میں نے ایشیائی ملک کے اور مل دورے کے رستوران کا ہو سکتا تھا۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جاتا تو یہاں ذرا مختلف قسم کی کمائیاں کر رہی تھیں اور کھائی دے رہی تھیں۔ یہاں چائے کی پیالیوں میں طوفان اٹھانے جا رہے تھے۔ ایک بیڑ پر دہلی چلی سافولی اور کم رو سی لڑکی لمبے بالوں والے ایک ڈبلے بٹے کو جو ان کی طرف جھکی ہوئی تھی جس کی استخوانی اکھیں میں سگریٹ دہلی ہوئی تھی۔ حالانکہ ان کے سانسے صرف چائے کے برتن بکھرے ہوئے تھے مگر فوجوں کی آنکھیں کچھ یوں محموری تھیں جیسے اس نے کچھ اور دہلی رکھا ہو۔

وہ نہایت مدبرانہ انداز میں لڑکی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سعادت مندی سے سر ہلا رہی تھی۔ شاید وہ اسے مستقبل کے سنہرے خواب دکھا رہا تھا کہ وہ فقر و غریبی کی دی کی پر اشارے والی تھی اور اس کے بعد قلموں میں شعلہ چھانے والی تھی یا پھر شاید وہ اسے کامیاب اداکار بننے کے کہتا رہا تھا جبکہ اس کے اپنے کامیاب اداکار بننے کے خواب شاید بھی کے بکھر چکے تھے۔

ایک اور میز پر تین مرد اور بیکی سی رعیت کی ایک لڑکی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ نیچی آوازوں میں۔ مگر خاصے جوش و خروش کے ساتھ گفتگو جاری تھی۔ شاید کسی فلم کا منصوبہ بن رہا تھا۔ شاید

ب میں ایک عورت تھیں جس کی لیکن میں اس کا چہرہ صحیح طور پر یاد کر کے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک سوٹے سے رجسٹر پر جھکی ہوئی تھی بہت مصروف نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے کاؤنٹر پر کاغذات کی پلے سے بھی رکے نظر آ رہے تھے۔ وہ بیٹیاں ٹیلم تھیں۔ باہر سے در کاؤنٹر ذرا ٹکھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اس باتوں کی چمک لبازں نظر آتی۔ اس نے بالوں کا جو ڈایا رکھا۔ اس کے بالوں کی چمک بہت تیز تھی۔ نہایت ہی نہیں اور شہمی بال تھے۔ شاید قلموں میں نہیں آتے تھے۔ اسی لئے اس نے میں سمیٹ کر ڈھانپا ہوا تھا۔

عالمی اور ان میں کاؤنٹر کے نیچے چھپے ہوئے کسی لکھنوی کی بیٹی تھی۔ اس نے ہاتھ بچے سے جا کر ایک سرخ ریشور پر آکر بیٹھا۔ رکان سے لگایا۔ میں نے لابی والے دروازے سے ہی اندر نے کافی لے لیا۔

دروازہ کھلی ہی چڑھا ہوا تھا۔ میں نے جب لابی پر قدم رکھا تب بھی وہ میرا اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ بھی آواز میں کسی سے بات کر رہی تھی۔ لیکن بات کرتے کرتے ہی اس نے نہایت گہری نظر سے ایک بن لے میں میرا سر تپا جائزہ لے ڈالا۔ میں نے غصے کی ایک وہ کچھ پوچھ لی تھی۔

ایک لمبے کے لئے مجھے تب ہوا کہ شاید وہ مجھے پہچانتی تھی اور ابا اس نے یہی سمجھا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچوں گا لیکن میں نے یہاں کے ماحول کو سمجھنے کے لئے پہلے کچھ دیر رستوران میں بیٹھے کافی لے لیا۔ اس نے مجھے رستوران کی طرف جانے والے لابی دروازے کی طرف پرستے دیکھا تو اس کے اثرات پہلے ہی پیسے ہو گئے۔

اسی لمبے وہ ریشور کاؤنٹر پر رکھ کر اس کے عقب سے نکلی اور تقریباً دوڑتی ہوئی بیڑیوں کی طرف بڑھی۔ تب میں نے گردن مٹھا کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور یہ بڑا خطرناک تجربہ تھا۔ اسے دوڑتے ہوئے بیڑیوں تک جاتے اور پھر اسی طرح بیڑیاں چڑھتے دیکھا ایک نہایت مختصر۔ مگر ایسا تجربہ تھا جسے دیر تک نہیں بھلایا جاسکتا تھا۔ وہ سر تپا تقریباً ہوا تھی۔ اور تقریباً ہوا تھی۔ اور اس کی چمک کر اسے چمک کر دے۔ جس کی وجہ سے سامنے بیٹے میں اٹکے گئے۔

وہ ان گھڑیوں میں سے تھی جن کی عمر تیس سے پچاس سال کے درمیان ہوتی ہے لیکن یہ پانچ نہیں چھٹا کہ کہاں ہے؟ وہ دروازہ اور ذرا بھاری پن کی طرف مائل تھی لیکن بھاری پن وہ نہیں تھا جو چمکی کی پیدوار ہوتا ہے۔ یہ بھاری پن بہت ہی خطرناک مقامات پر تھا۔ مجھ کی طور پر وہ کسی اشارے کی بجائے چمکی کی عمر لڑکی سے زیادہ مشرخی تھی۔ شکل صورت بھی بڑی نہیں تھی۔ اچھی خاصی خوش شکل اور گہری چہرہ تھی۔ خصوصاً آنکھیں تو بہت اچھی تھیں۔ معلوم نہیں ان کی دی اور قلم میں کیوں نہیں چلی تھی۔ اس سے

لاکھوں کی باتیں ہو رہی تھیں مگر میں ممکن تھا کہ اٹھتے وقت انہیں یہ پریشانی لاحق ہو جاتی کہ ان میں سے چائے کا پلہ کون دے گا؟ نہ جانے کیوں ان کی غصیوں کو دیکھ کر میں اندیشہ محسوس ہوتا تھا۔ ایک اور میز پر ذرا چٹخ م سالاکا قدرے بہتر ملنے میں موجود تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی چین چمک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ذرا بہتر شکل کی ایک گوری چٹی لڑکی موجود تھی۔ کمرے سرخ لباس نے اس کی شخصیت کو کچھ اور امارت کر دیا تھا۔ میز کے عقب سے وہ پوری نظر نہیں آ رہی تھی مگر جتنی نظر آ رہی تھی اتنی بھی خاصی دیر نہ رہی تھی۔

لڑکا شاید دو چار ڈراموں میں چھوٹے موٹے رول کر چکا ہو کیونکہ وہ بار بار دوسرے کرداروں کے ہمارے متوقع سی نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگتا تھا گویا اسے امید ہو کہ کوئی نہ کوئی ضرور اسے پہچان لے گا اور شاید آؤ گراف لینے آئے گا۔ جب اسے کوئی آثار دیکھائی نہ دیتے تو وہ دوبارہ بڑے اٹھناک اور ذودو شد سے لڑکی سے گفتگو میں مصروف ہو جاتا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بات پر اصرار کر رہا تھا جبکہ لڑکی بار بار قدرے بے بسی سے نفی میں سر ہلاتے جاری تھی۔ شاید لڑکا اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر وہ اس کے کہنے پر عمل کرے تو کامیابی نہ صرف اس کے قدم چمکے گی بلکہ خود لڑکے کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا مگر لڑکی شاید کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ جس کی وجہ سے لڑکے کے چہرے پر کچھ باؤسی اور جھنجھلاہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

قریباً ہر میز پر شاید کچھ اسی قسم کی کمائی کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے بیک کی باتوں سے مجھے پہلے ہی اس ماحول کا کافی حد تک اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں ٹیم بیڑیوں سے واپس آئی دکھائی دی۔ اس کے اترنے کا منظر بھی کافی حد تک دماغی حشر خیز تھا جیسا چڑھنے کا تھا۔

بیڑیاں چڑھنے اور اترنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر تھوڑے کے آثار تھے جو میں دوسرے بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کاؤنٹر کے عقب میں پہنچ کر ایک بار پھر ریور اٹھایا چند ہی کیلینڈ بات کی اور دوبارہ ریور کاؤنٹر کے عقب میں ہاتھ لے جا کر کمرہ دیا۔

دوبارہ دھڑکی طرف متوجہ ہونے سے پہلے اس نے ذرا سر ہٹا کر ہال کا تھیلی جائزہ لیا۔ اس کی نظر ایک ایک میز پر گھوم رہی تھی۔ میرے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اسے میری تلاش تھی۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کی نظروں کو اس نے میری تلاش نہیں تھی کہ وہ پہلی نظر میں ہی مجھ پر مرتلی تھی بلکہ بات شاید صرف اتنی تھی کہ وہ مجھے پہچانتی تھی یا پھر اسے اس جگہ میرا وجود کچھ ایسی اجنبی سالگ رہا تھا۔ یہاں نشست و برخاست رکھنے والوں کا شاید ایک مخصوص طبقہ تھا اور میں اسے اس طبقے سے باہر کی کوئی چیز دکھائی دیتا تھا۔

آخر اس کی نظروں نے مجھے تلاش کر لی لیا۔ ایک لمبے لمبے ہماری نظریں ملیں۔ سچ میں ہلکے سے رنگین شیشے کی دیوار تھی لیکن میں اس کی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے اندر نظر دوسروں کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ شاید اس نے محسوس کر لیا کہ میری آمد خالی از علت نہیں تھی۔ میں وہاں بیٹھ کر کسی کھانسی ڈرائے یا پراسٹیوٹ پروڈکشن کی تیاریاں کرنے نہیں کیا تھا۔ یہی چائے پانی پینا وقت گزاری کرنا یا ہاتھ پاؤں مارنے ہوئی اور اکالہ کے ساتھ کپ شپ کرنا میرا مقصد تھا۔

وہ یقیناً کوڑھ مغز نہیں تھی۔ ایک ذہین عورت تھی۔ اور انسان کے ارادوں کے بارے میں اندازے لگانا یا جتنی ہدایت دانی جیسا کہ بار بار میں دیکھتا ہوں وہی اس کی ذات کا نہیں تھا اور وہ بھی یقیناً ہدایت دانی میں کوئی خاص بی محسوس کرتی ہوگی جس نے اب تک انہیں ایک تعلق کی دور ہاتھ رکھا تھا ورنہ اس عورت کو اب بھی ایسے خاصے دولت اور اپنے ہم محسوس بلکہ شاید اپنے سے بھی کم محترمہ رواں میرے جیسے شاید ان دونوں کو واقعی ایک دوسرے کی ذات میں اپنے آپ کو پہچاننے کی کھیل کا امکان دکھائی دیتا ہو۔ اس قسم محسوسات رکھنے والے ہی ایک دوسرے کے بہت مضبوط ثابت ہوتے ہیں خواہ بظاہر ان کے درمیان کتنی ہی بڑی علی نظر آتی ہو۔

دوسرے ہی لمحے اس نے نظر ہٹائی اور دوبارہ دھڑکی متوجہ ہو گئی۔ اسے گویا صرف یہی اطمینان کرنا تھا کہ میں ہال موجود تھا یا نہیں؟ دھڑکی کو دیکھ کر وہ قریب رکے گاغہا کچھ اندراجات کرنے لگی۔ شاید علی بنا رہی تھی دستوراً ایک الگ کاؤنٹر موجود تھا۔ اس پر گھنٹا سا ایک اوپنر عرصہ تھا۔ اس کی شکل پر کچھ ہزاری سی طاری تھی۔

کچھ ایسی ہی ہزاری چہرے پر لے ایک دھڑکی قریب کھڑا ہوا۔ ماحول میں اتنی دلچسپیاں اور ہنگامہ فیزی ہوئے باوجود نہ جانے کیوں ان لوگوں کے چوں پر ایسی ہیزاری طاری شاید یہ لوگ روزانہ ایک ہی سانس دیکھ کر روبرو ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ اس منظر میں ان کی کوئی خاص اہمیت یا مقام نہیں میں نے سو کا ایک کڑا کڑا تا ہوا نوٹ نکال کر میز پر رکھا تو تھوڑی سی سرکھانے لگا۔ شاید یہ نشان دہا تھا کہ میں کچھ اپنے بغیر کس چیز کی ادائیگی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس قسم کے رشتہ میں تو کھانے پینے کے بعد بھی بلکہ بعض اوقات تو کچھ نہ کچھ پینے کے باوجود بھی لوگ بہت دیر تک بیٹھے رہتے ہیں۔ اور فوٹ بڑی مشکل سے آتی ہے۔

”یہ تمہارے لئے ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔ اس نے ایک نظر فوٹ کو دیکھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت کہ اس کے ہونٹ قدرے ناگوار سی سے سکڑ گئے۔ میں تو

ہوا اور اس نے نوٹ اٹھائے۔

نوٹ جب میں رکھ چکے کے بعد وہ بولا "ویسے یہ باتیں تو آپ بغیر ٹیپ کے بھی پوچھ سکتے تھے۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" "کوئی بات نہیں۔" میں نے بے نازی سے کہا "مجھے کم آمدنی والے لوگوں کے کام اگر خوشی ہوتی ہے۔" "آپ کیا کھانا پینا پسند فرمائیں گے سر؟" اب وہ ذرا پرسکون لہجے میں بولا۔

"صرف چائے ہی پلا دو۔" میں نے کہا اور ساتھ ہی پوچھا "ویسے باقی واوے۔۔۔ جب میں نے سو کا نوٹ میز پر رکھا تو تم کیا کہتے تھے؟"

"کچھ نہیں سر۔" وہ ایک بار پھر کچھ گڑبڑا دیا "لوگ کچھ ایسی دلی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلاں لڑکی کہاں ہے کب آئے گی، فلاں لڑکی سے بات ہو سکتی ہے یا نہیں، فلاں کو یہ پیغام پہنچا دو گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں اس قسم کے چکر دلوں میں نہیں پڑنا سراپا ہوں، میں کوئی سوچی سمجھا کر گزارا کر لیتا ہوں۔" "جست چھا کرتے ہو۔ تمہارے بچے حلال کی کمانی پر لپٹیں گے تو شاید بڑے ہو کر صحیح معنوں میں بڑے آدمی بنیں۔" میں نے کہا۔ وہ خیم استراٹیا سے انداز میں بولا "مطمئن نہیں صاحب۔ قتل جھوٹی ہے یا سچی۔ ہر حال اسی قتل کے سارے زندگی بسر ہو رہی ہے۔"

پھر وہ چائے لینے چلا گیا۔ میں ایک بار پھر فلیم کا ہانڈہ لینے لگا۔ کو کہ اس بے ہودہ کاؤنٹر نے اس کے وجود کا بیشتر حصہ اپنے عقب میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس کا ہانڈہ لینا خاصا فرحت انگیز عمل تھا۔ وہ بدستور سر جھکائے کچھ اندر اجاٹ کرنے میں مصروف تھی۔

وہ چائے لے کر گیا۔ اس نے بڑی مستعدی دکھائی تھی۔ کچھ زیادہ ہی جلدی لگایا تھا۔ وہ برتن میز پر رکھ رہا تھا تو میں نے سرسری سے لیے میں پوچھا "میرا خیال ہے وائٹ صاحب آج شام سے یہیں موجود ہوں گے؟"

"سر! آپ جی بات سننا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ ایک شریف آدمی سے انسان جی بات ہی کی توقع رکھتا ہے۔" میں نے اپنی رانست میں جج کے سٹیلے میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"تو پھر جی بات یہ ہے کہ مجھے اس سٹیلے میں صحیح طور پر کچھ مطمئن نہیں ہے۔" اس نے صاف کوئی سے جواب دیا۔ اور یہ صاف کوئی خاصی حوصلہ شکن تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور یہ بات آپ کو کوئی بھی وغیرہ صحیح طور پر نہیں بتا سکا کیونکہ ہم لوگ ادھر اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں جبکہ وائٹ صاحب وہاں نہ جانے کتنی عرصہ اپنے آفس سے نکلی کر کبھی اور کبھی باہر جاتے اور آتے رہتے ہیں۔ ہماری نظر تو کسی کھادری ان پر پڑتی ہے اور

خوشی سے اس کی باجیس پھیل جائیں گی۔" میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں سر! وہ دھیمی آواز میں

"میں اس قسم کا آدمی؟" میں نے جانا چاہا۔ "جی ہاں! آپ مجھے سمجھ رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تو ہمیشہ شریف آدمی سمجھ رہا ہوں۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو تم شریف آدمی نہیں ہو۔ اور میں نے تمہارے بارے میں غلط اڑھ لگایا ہے؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

اب وہ ذرا گڑبڑا کر بولا "میں نہیں میرا مطلب یہی ہے کہ شریف آدمی ہوں۔"

"میں سمجھ کر تو میں تمہاری خدمت میں یہ نوٹ پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے یہ کچھ کم ہے، اکیلا اکیلا سا نوٹ کچھ سب نہیں لگ رہا ہے۔" میں نے ایک نوٹ اور نکال کر اس پر دیا "وہ اصل میں شریف آدمیوں کا مت بڑا قدر دان ہوں۔" اس نے نوٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ نہیں برہایا اور لپک زدہ لہجے میں بولا "مجھے کرنا کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "صرف دو تین سوالات۔ جواب دینا ہوں گے اور وہ سوال ایسے ہیں کہ ان کے جواب سے کسی بھی انسان کی شرافت پر ہرگز کوئی شک نہیں آسکتی۔"

"تمی پوچھئے۔" وہ اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ "وہ سامنے کاؤنٹر پر جو عورت کھڑی ہے وہ ٹیلیفون ہے نا؟"

"تمی ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "اور ہدایت وائٹ اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میں نے آفس میں بیٹھے ہیں جی۔" اب اس کے لہجے میں لپاہٹ آگئی۔

"آفس کہاں ہے؟" "وہ جو میز صوفوں کے نیچے چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا ہے وہ آفس ہے۔" اس نے شاید ذرا ڈرتے ڈرتے بتایا۔ اشارہ اس نے ہاتھ سے نہیں صرف آنکھوں سے کیا تھا۔

پھر اس نے ذرا ڈرتے ڈرتے ہی پوچھا "خیریت تو ہے سر۔ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مجھے ذرا ان سے ملاقات کرنی۔ میں نے سوچا پہلے ذرا دور سے دیکھ لوں، مگر اس قسم کے لوگ۔۔۔ پھر میں نے خاصی سادگی سے پوچھا "تم اتنے پریشان کیوں لگتے؟"

"فکری۔۔۔ آج کل حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ کوئی کسی کے لئے میں پوچھا ہے خوف محسوس ہوتا ہے۔" وہ اپنی انشیل کی کھوپڑی سے لگاتے ہوئے بولا۔

"یہ فکر رہو۔ میں بھی ایک شریف آدمی ہوں۔" میں نے قہر لگائی۔ میرے شرفانہ چلنے سے بھی شاید اسے کچھ اطمینان

ویسے بھی میری تو ذیولنی شروع ہوئے ہی صرف ایک گھنٹا ہوا ہے۔ بہر حال جب سے میری ذیولنی شروع ہوئی ہے تب سے وہ اپنے آفس میں ہی موجود ہیں۔ اتنا مجھے معلوم ہے۔

”بھئی تم بت ہی معقول آؤی ہو۔ مجھے تمہاری صاف گوئی، دیانت داری اور شرافت پر خوشی ہے۔“ میں نے ستائشی لہجے میں کہا ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی ہنسٹنٹ۔“ اس نے قدرے شرانے ہوئے بتایا۔

”اوہ!“ میں نے اختیار گہری سانس لے کر کہہ دیا۔

وہ میری گہری سانس کا مطلب کچھ گیا۔ میرے کونچے سے بلا ضرورت پوچھتے ہوئے بولا ”آپ بھی سوچ رہے ہوں گے نام ہنسٹنٹ ہے اور کام اس چھوٹے سے ہوٹل میں ہوا کیسی؟“

”مجھے زندگی میں اکثر نام اور شخصیت کے اس الٹ پھیر سے واسطہ پڑتا ہے۔ بہر حال۔۔۔ اس میں ایسا دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ زندگی اسی کا نام ہے۔“

میرے الفاظ سے شاید اسے کافی حوصلہ ملا اور وہ ذرا خوش دلی سے بولا ”گوئی اور چیز لاؤں سر؟ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو حکم فرمائیے۔“

”بس تمہارا بہت شکریہ۔ مجھے بس ایک ہی بات معلوم کرنی تھی۔ تم سے وہ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔“

”سے تمہیں زیادہ باخبر رہنا چاہئے۔ دیگر تو چنا چنا ہو رہا ہے۔ ہوتا ہے۔ ٹی وی کا خبرنامہ نہیں۔ اپنے اور گرد کے ماحول کا خبرنامہ۔“ میں نے تاحسانہ لہجے میں کہا۔

”بس میں اس اپنے کام سے کام رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”غیر کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بس کسی کے معاملات میں تاہم مت اڑاؤ۔“

”بہت بھرپور!“ وہ لمبائی سانس لے کر بولا ”شاید آپ آئندہ آئیں تو مجھے اب سے زیادہ باخبر کریں۔“

”کوشش تو میری کیا ہوگی کہ مجھے آئندہ بیان نہ آتا ہے۔“ میں نے چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا ”بہر حال زندگی کا کچھ پتا نہیں ہوتا انسان کو کب کہاں لے جائے۔“

وہ سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں نے بد مزہ ہی چائے کے چند چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق سے آتا رہے۔ ہال میں افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ باؤن کی جنیمناہٹ تیز ہو چکی تھی اور فضا گویا سگریٹوں کے دھوئیں وغیرہ سے لہو۔ لہو زیادہ ہو چلا ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ دیر بعد میرے سامنے کی کرسیاں بھی خالی نہیں رہیں گی۔ اپنے معیار کے حساب سے اس ہوٹل کا بزنس کچھ برا نہیں تھا۔

نیلیم نے اب دھڑلے اور کاغذات وغیرہ کاؤنٹر کے پیچھے کھینچ رکھے تھے اور غالباً کسی اونچے اسٹول پر بیٹھ کر ایک بار پھر ریسیور

کان سے لگایا تھا۔ اب شاید وہ خود کسی کو فون کر رہی تھی کرتے وقت اس کی نظر میری میز کی طرف تھی۔

”کیا وہ کسی کو فون پر میرے بارے میں بتا رہی تھی؟“ سوچا مگر مجھے اپنے آپ سے اس کا کوئی واضح جواب نہ ملا۔ بات کرتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ دلکش تھی۔ میں خنجر تھا کہ شاید بدایت واپس بھی اپنے کواٹر نکل کر کاؤنٹر آجائے اور میں اس سے ملنے سے پہلے اسے دیکھ سکوں لیکن کئی منٹ کے انتظار کے بعد بھی مجھے کواٹر چھوٹے سے دروازے سے باہر آنا دکھائی نہیں دیا۔

دوران میں کچھ بعد دیگرے دو جوڑے کاؤنٹر پر آئے۔ نیلیم نے ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر ریسیور نکال سامنے کاؤنٹر رکھ لیا۔ نہایت مستعدی سے اس نے جوں لے کرے بک کئے، رقم وصول کر کے کاؤنٹر کے پیچھے کیسی جوڑے ایک ویٹر کی رہنمائی میں آگے پیچھے میز میزوں سے گئے۔ دونوں جوڑوں کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا اور ان تیار تھا کہ وہ میاں بیوی نہیں تھے۔

میں نے سوچا اس سے پہلے کہ ”بزنس“ مزید زور پکڑے نیلیم اور بدایت واپس سے مل ہی لیتا چاہئے۔ میں ماحول مشاہدہ کر رہا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ میں چائے تو می چھوڑ کر مزید ایک نوٹ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت نیلیم کاؤنٹر رکھے اور پھیل کر ٹھوڑی ٹھکانے لالہ کے بند دروازے کی دیکھ رہی تھی گویا کچھ اور ایسے ہی جوڑوں کی راہ تک رہی کے دم سے اس کے گلشن کا کارہ بار چل رہا تھا۔ اس کا افسانوی قسم کا تھا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر خامسے غیر افسانوی انداز کا کارہار سے اپنی طرف متوجہ کیا حالانکہ میرے خیال میں ضرورت نہیں تھی۔ وہ بہت اچھی طرح آگاہ تھی کہ میں طرف آ رہا تھا۔ تاہم اس نے بے خبری کی نہایت عمدہ نمائندگی کرتے ہوئے گردن کھائی اور اس کی لمبی لمبی پلکوں کی بو بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔

”رہے۔ افضل صاحب۔ آپ!“ اس کی گویا سانس اور اور بچے کی پیچھے رہ گئی۔ اس کا اظہار حیرت، زبردست تھا۔ اگر مجھے موقع ملتا تو میں محض دو سیکنڈ پر کارہار میں ہی اس کے لئے پراڈ آف پر کارہار میں کرتا۔ معلوم نہیں لی دی پردہ کیوں کا سیاب ادا کا رہا تھا۔

تھی جبکہ وہ تو کوئی ایسی پوڑا دار پارنا قسم کی چیز بھی نہیں رہی پوڑیو سروں نے اس سے جو توقعات رکھی ہوں ان پر پورا کرنے لئے تیار نہ ہوئی ہو۔ بعض اوقات تو شو بزنس کا حساب بالکل ہی سمجھ میں نہیں آتا۔

میں ایک طویل سانس لے کر کہہ گیا۔ میرا یہ انداز

”خیر۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے والی نہیں ہوں کہ آپ مجھ ناچیز پر دورے ڈالنے کی کوشش کریں گے میں بڑی حقیقت پسند عورت ہوں۔ بے چاری ہم جیسی عورتوں تک پہنچنے کے لئے آپ جیسے لوگوں کو دودلوں کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔ ہم تو خود ہی کے دوا کے سے بندھی پٹی آتی ہیں۔“ وہ کچھ بے نیازی اور کچھ غصے سے بولی۔

”اچھا؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں ”تم تو اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی ڈی گریڈ کر رہی ہو ورنہ مجھ پر تو شمار اتنا عجب حسن تھا کہ میں دروازے سے داخل ہونے کے بعد سیدھا تھما سی طرف آنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ میں دراصل اسی لئے پہلے رستوران کی طرف چلا گیا تھا کہ اپنے اندر جرات اور ہمت پیدا ہونے کا انتظار کر سکوں۔ لیکن تم پہلی عورت ہو جو اتنی شاندار شخصیت کی مالک ہونے کے باوجود اپنے بارے میں اس قدر انکسار سے کام لے رہی ہو ورنہ میں نے تو بڑی بڑی کم دوا خواتین کو بڑی بڑی خوش فہمیوں ہی میں مبتلا پایا ہے۔“

اس کی مسکراہٹ یکدم ہی غائب ہو گئی اور آنکھوں میں پھیلا ہوا غار سا مہمی مہدوم ہو گیا۔ وہ یک لخت ہی بالکل عجیبہ و کھانی دینے لگی۔ وہ بالکل بدلے ہوئے لیجے میں سرگوشی کے سے انداز میں بولی ”افضل صاحب! اور اگر آپ باتیں بہت ہو چکیں۔ اصل بات کیجئے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرتاً ذرا حیرت سے کہا۔ اس کے رویے میں اس اچانک تغیر سے مجھے واقعی حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔

”مطلب یہ کہ آپ یہاں نہ تو چائے پینے آئے ہیں۔۔۔ یہاں دنیا کی کوئی ٹایپ چائے تو ملتی نہیں۔ نہ ہی آپ مجھ سے جیسی ملیں باتیں کرنے آئے ہیں۔ میں بھی کوئی ایسی ٹایپ عورتوں میں سے نہیں ہوں۔۔۔ اور نہ ہی مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے۔ مجھ میں کسی عام۔ پھر نے مونے آوی کے لئے بہت کشش ہو گئی ہے۔“ آپ جیسے آوی کے لئے نہیں۔“ وہ نہایت گھبرے گھبرے لیجے میں بولی۔

میں ایک تک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا پھر میں نے آہ بھر کر کہا ”اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں بھی ایک عام اور چھوٹا موٹا ہی آوی ہوں۔ میرے لئے جی بہت اچھی۔ بہت اچھی۔ بہت پرکشش خاتون ہو۔“

اس لحاظ سے وہ واقعی بڑی منفرد عورت تھی کہ میرے قریبی الفاظ کا اس پر بڑا ہی اثر نہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں جو سرد مہمی در آئی تھی وہ اس طرح برقرار رہی۔ وہ بدستور سچی اور سزاوارتہ نہیں بولی ”ویسے۔۔۔ افضل صاحب! آپ کو دیکھتے ہو میرے بارے میں۔۔۔ یہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کو جو کچھ بھی معلوم کرنا تھا آپ دروازے سے

درست نکلا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی تھی۔ یہ شاید کچھ ایسی زیادہ عجیب بات نہیں تھی لیکن مجھے پھر بھی عجیب لگتی تھی کہ اس قسم کی عورتیں عموماً شہر کے دولت مندوں اور خاص خاص شخصیتوں کو صورت سے پہچانتی تھیں۔

”اچھا تو تم مجھے پہچانتی ہو؟“ میں نے کاؤنٹر کے سارے کھڑے ہونے ہوئے بظاہر گپ شپ کے سے انداز میں کہا۔ ”جی ہاں اور جب آپ اس دروازے سے داخل ہوئے تو مجھے جیت کا جھٹکا لگا تھا۔ میں کبھی تھی شاید آپ رات بھول کر اور اتر آئے ہیں۔ آپ کو بھلا اس معمولی سے ہوٹل میں آنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی تھی؟ پھر میں کبھی شاید آپ مجھ سے بات کریں گے شاید اتفاق سے آپ کو ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں سے کوئی کام آن پڑا ہو۔ لیکن پھر آپ رستوران کی طرف چلے گئے۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ آپ کو اس ہوٹل میں چائے پینے کا شوق تو نہیں ہو گا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ شاید آپ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر باخول کا جائزہ لیتا چائے تھے۔“ ”کیا اندازے صرف میں ہی نہیں لگا رہا تھا؟“ ”جی ہاں وہی لگا رہی تھی اور اس معاملے میں مجھ سے کچھ کم نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس عورت سے بہت محاذ ہو کر گفتگو کرنے کی ضرورت تھی۔“

وہ بڑے دل نہیں انداز میں مسکرائی۔ اس کے موتیوں جیسے ہموار دانت جھلکا اٹھے۔ وہ ذرا چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے میں کچھ زیادہ ہی بول رہی ہوں۔ آپ پریشان ہو گئے ہوں گے۔“

”وہ خاتون ہی کیا جو زیادہ نہ بولے اور پھر تمہیں تو زیادہ بولنے کا اعطائی حق حاصل ہونا چاہیے۔ تم بولتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ خاموش بیٹھی بھی تم اچھی ہی لگ رہی تھیں۔“ میں نے اس کی بڑی بڑی حیران سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ یہ حیرانی جھوٹی تھی۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں دھوکا دینے والی آنکھیں تھیں۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ انہوں نے اب تک بدانت واصل کو کوئی دھوکا نہیں دیا تھا!

وہ حترم انداز میں دیکھتے سے غمی اور کھنی کے سارے کاؤنٹر پر کچھ اور آگے جھک گئی۔ اس کے بالوں اور وجود سے چھوٹی ہوئی نہایت مدہم سی خوشبو میرے نھتوں سے نکل آئی اور میرے حواس میں خفیف سی گدگدائی ہوئی۔

”میں نے سن رکھا ہے کہ آپ خاتون سے بہت لچھے دار گفتگو کرتے ہیں اور وہ بے چاری اس میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔“ وہ ذرا شرم سے لیجے میں بولی۔

میں نے ایک غصہ کی سانس لی ”یہ بڑی مشکل ہے کہ کسی خاتون کی کسی خفیہ کا اعتراف کرتے ہوئے سچے دل سے اس کی تعریف کرو تو وہ سمجھتی ہے کہ لچھے دار گفتگو ہو رہی ہے۔ اس پر دوسرے ڈالے بارے ہیں۔ دیکھو دیکھو۔“

بات کر رہی ہو۔" میں نے ذرا بھروسے سے لمحے میں کہا۔

"آپ کا رویہ آوی ہیں نا۔ اس لئے "آخر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لوٹ آئی۔

"میں ہر جگہ کا رویہ اس ساتھ لئے نہیں بھرتا۔ میں یہاں کوئی کا رویہ نہیں رکھتا۔ اور اگر آپا بھی تھا تو مجھیں دیکھ کر بھول گیا ہوں۔" کا رویہ اور کا رویہ گفتگو کو گولی مار دینے کا کیا تم پر ہوتی اس طرح مصروف رہتی ہو؟ کبھی اپنے اس حشر خاوم کے لئے بھی تھوڑا بہت وقت نکالو۔ کسی غیر کا رویہ ہی ہر پرینہ کر کوئی دن۔ کوئی چٹو وغیرہ ہونا چاہئے۔"

وہ دیکھ اس طرح مسکرائی جیسے وہ کوئی اسکول بچہ تھی اور میں اس کی کلاس کا کوئی ایسا بچہ تھا جو اسے غلام کر قرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "افضل صاحب! مجھے دانت ڈالنے کی یہ کوشش چھوڑ دیں۔ دانت ڈالنے کے لئے بھی تھوڑی بہت سنجیدگی درکار ہوتی ہے۔ گو کہ وہ ذرا الگ قسم کی سنجیدگی ہوتی ہے۔ مجھے اس پر بھی اعتراض نہ ہوتا لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آپ کے پاس تو وہ سنجیدگی بھی نہیں ہے۔ آپ تو بس بے رحمی۔ جو نہ میں آپا ہے بولے جارہے ہیں۔ اندر میرے میں تیرے چارے ہیں کہ شاید کوئی نشانے پر پینہ ہی جائے آپ کی باتیں بڑی خوب صورت ہیں۔ دل نہیں ہیں۔ حوصلہ بڑھانے والی ہیں۔ آپ انسان کو اس کی قدر و قیمت بڑھ جانے کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اب عمر کی اس منزل سے نکل چکی ہوں جہاں اس قسم کی باتوں کا سحر کار کر ہوتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں اس عمر میں تھی تب بھی میں نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ لیا تھا۔ برت لیا تھا کہ اس قسم کے الفاظ اپنی کشش کو بیٹھے تھے۔"

"یہ تو بہت بڑی بات ہے۔" میں نے سر کھاتے ہوئے کہا "ایک تو تم جیسی مشکل عورتوں سے مل کر انسان کے تمام خوب صورت جذبات اور احساسات پر بھراؤ پھر جاتی ہے۔ اچھا نہیں کس قسم کی گفتگو سنا کر کرتی ہے؟ مثلاً آج فیکشن میں نمازیں اور نمازیں کے ریت گر گئے اور نکاح میں سونے کے ریت چھ گئے۔ واضح رہے کہ یہاں سونے سے مراد وہ والا سوتا ہے جس کے لئے بستر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کی گفتگو جس میں بند ہے؟" اس نے ہونٹ سمجھنے لئے اور مجھے گھورنے لگی لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ اس وقت وہ واقعی سمجھنا ہٹ کا شکار تھی۔ اس کے ہونٹ بھرے بھرے تھے اور ان پر گہری سرخ چمکیلی لپ اسٹک تھی۔ اگر ان ہونٹوں میں کچھ بے گینی آجی چکی تھی تو وہ اس لپ اسٹک میں چھپ چکی تھی۔ میں نے گویا اس کے گھورنے سے سم کر معصومانہ سے انداز میں بالکیں جھپکا دیں۔

آخر وہ ذرا سیدھی کھڑی ہوئے ہوئے خامے حمل سے بولی "افضل صاحب! پلیر سبک دیکھنے سے بات کیجئے مجھے نہیں ہے آپ

داخل ہوتے ہی سیدھے میرے پاس آکر دریافت کر لیتے ہیں آپ کو ہر بات کا بہت سیدھا اور سچا جواب دیتی۔ کیونکہ میں بہت سیدھی اور سچی عورت ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ کبھی بھی منافقت سے کام نہ لوں۔ جیسی ہوں ویسی دنیا کے سامنے رہوں۔ بالکل کھری اور ملاوت سے پاک۔"

میری کہنی بے اختیار کاؤنٹر سے پھسل گئی۔ شاید مجھے کسی غیر ملکی چیز سے دھکا دیا تھا۔ ممکن ہے وہ غیر ملکی چیز اس کے الفاظ ہوں۔ میں جب دوسرے بات کر رہا تھا تو وہ رجسٹر سر جھکائے کچھ لکھ رہی تھی اگر وہ ہماری طرف دیکھتی تب بھی میں فرض کر لیتا کہ اس نے اندازہ لگایا ہو گا کہ میں اس کے پاؤں کو دینے کے بارے میں بات کر رہا تھا لیکن اس نے تو سراٹھا کر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ ایسے احماد سے یہ بات کر رہی تھی جیسے مجھ سے یا دوسرے اس کا ٹیلی منشی کے ذریعے ذہنی رابطہ تھا اور اسے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ ہمارے درمیان کیا گفتگو ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ نظر اٹھائے بغیر چاروں طرف نظر رکھنے والی عورت تھی۔

میں نے اس جھٹکے سے شیطانی ہوئے مسکرا کر کہا "تم تو اپنے کھری اور ملاوت سے پاک ہونے کا ذکر کچھ یوں کر رہی ہو جیسے تم عورت نہیں، گھٹن بالائی قسم کی کوئی چیز ہو۔"

"مرد تو عورت کو گھٹن اور بالائی قسم کی ہی کوئی چیز سمجھتے ہیں نا۔ جہاں نظر آئے ہڑپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہڑپ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو سو فیصد پر تاؤ دیتے ہوئے آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔" وہ سر دھری سے بولی۔

"اوہ!" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں "تم بھی یہ مرد اور عورت کی بحث میں الجھنے کی عادی ہو؟ میں تو سمجھا تھا تمہارے اس صنف کے ساتھ تعلقات زندگی بھر سے خوشگوار چلے آ رہے ہوں گے۔"

"تعلقات خوشگوار ہونا الگ بات ہے۔ اور کسی کے بارے میں اپنی ایک رائے رکھنا الگ بات۔" وہ بولی "لیکن آپ ان باتوں کو چھوڑیے۔ آپ اصل بات کے سلسلے میں ابھی تک مجھے ڈالے جا رہے ہیں۔"

"تم ایسی چیز کہاں ہو کہ تمہیں کوئی ٹال سکے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "نی انٹال تو میں تمہارے مشاہدے پر حیران ہو رہا تھا۔ تم نے مجھے دوسرے بات کرنے دیکھ لیا تھا؟ میں تو سمجھا تھا تم اپنے کام میں مصروف ہو۔"

"ان دو آنکھوں کے علاوہ عورت کے پاس احساس کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔" وہ اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"مگر تمہارے پاس احساس کی آنکھیں ہیں تو احساس کی زبان بھی ہونی چاہئے۔ لیکن تم تو اس وقت خالصتاً کا رویہ کی زبان میں



جی ساڑ کن تھا۔

میں نے اس کے لئے اپنے دل میں تاسف کی ایک خطا  
لر محسوس کرتے ہوئے کہا "کوئٹہ تو میری جی ہوتی ہے کہ  
کے لئے کوئی بد خبری لے کر نہ جاؤں۔ لیکن واقعات میرے  
طرح دوہنا ہو چکے۔ دوتے ہیں اسی طرح رہتے ہیں۔ انہیں  
جانسک۔ ہم وقت کے پہلے کو ان نہیں گنما سکتے۔ بہر حال  
وقت دیے بھی بات تمہاری نہیں۔ ہدایت دانی کی ہوری  
"میری زندگی بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسے چھ  
آتی ہے تو وہ میری زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔" وہ چو  
ی آواز میں بولی۔

اس کے لئے میں ایک ناقابل بیان سا غلام  
نا قابل تفریح سا درد تھا جو میرے دل میں کہیں ایک پھاس کو  
گیا۔ ہدایت دانی ایک خوش فہم آدمی تھا۔ اسے ایک  
عورت کی رفاقت میری تھی۔ یہ ولداری یہ وفاداری تو بعض  
میں بھی نہیں پائی جاتی۔ وہ تو اپنے آپ کو ہدایت دانی کی  
دوست کہہ رہی تھی۔ جسے ایسے دوست میرے ہوں اسے دنیا  
م ہو سکتا ہے؟

"بہر حال میرا اس وقت ہدایت دانی سے الٹا نہ  
ہے۔" میں نے دیکھے لئے میں کہا اور کوئے میں بے ہوئے  
آفس کے پھولے سے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس دروازے  
تک پہنچنے کے لئے کاؤٹر کے عقب میں جانا ضروری تھا اور  
کے پیچھے جانے کے لئے ایک الگ دروازہ موجود تھا لیکن مجھے  
جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

ہدایت دانی کو گویا کسی عجیب قوت نے مطلع کر دیا تھا کہ  
اس کا ذکر ہو رہا تھا اور کوئی اس سے ملے آیا تھا۔ وہ آفس  
دروازے پر اچانک ہی نمودار ہوا۔ یہ شخص میرا اندازہ تھا کہ  
ہدایت ہی ہو سکتا تھا۔ شاید میں نے بھی کہیں اس کی تصویر  
دیکھی ہوں لیکن وہ میرے ذہن میں نہیں تھیں کیونکہ اسی  
شاید میں نے سوچا بھی نہیں ہوا کہ زندگی میں کبھی مجھے اس  
واسطہ پڑے گا۔ حقیقی زندگی میں آج میں پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا  
اسے دیکھ کر مجھے تڑپے لایو ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ  
غیر معمولی شخصیت کا مالک ہو گا۔ آخر غیلم جیسا عوامہ عور  
اس سے اس طرح متاثر تھی کہ زندگی کی ذور اس کے سنا  
باندھے ہوئے تھی۔ میرے خیال میں ایک ایسے شخص میں کوئی  
خاص بات ہونی چاہئے تھی لیکن کم از کم یہی نظر میں تو مجھے ہوا  
دانی میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ پھر میں نے سوچا شاید  
میں کوئی ایسی خوبی ہو جو مجھے نہیں۔ صرف غیلم کو ہی نظر آ سکتی  
دیے بھی صاحب۔ عورت کا کیا ہو سکتا۔ کسی کی کسی ادا  
مرنے۔ کون کیا کہہ سکتا ہے!

وہ چہرے جہم کا ایک جانہ قامت شخص تھا۔ اس

"تمہارا سوال کیا تھا؟" میں نے سر کھاتے ہوئے کہا "میں تو  
سوال ہی بھول گیا۔ زیادہ دیر اور نوہر کی باتیں کرنے کا یہی نتیجہ  
ہوتا ہے۔"

اس نے پھر ایک لمبے کے لئے مجھے گھورا۔ آخر خود پر ضبط  
کرتے ہوئے بولی "میں نے پوچھا تھا آپ یہاں کس لئے آئے  
ہیں؟"

"ارے ہاں۔ یہ تو اچھا یاد دلایا۔" میں نے گویا یکدم ہولنے  
ہوئے کہا "میں تو اتنے ضروری کام سے آیا تھا کہ باتوں میں الجھ کر  
بھول ہی گیا۔ ایک تو یہ میرے جذبات و احساسات میرے کاموں پر  
غالب آ جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں ہدایت دانی  
سے ملنے آیا ہوں۔"

"کیوں؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔  
"ارے وہ کیا تم اس سے ملنے آئے والے ہر شخص سے  
پہلے اس کا مقصد وغیرہ معلوم کرتی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "بعض اوقات تو میں ان کا  
تفصیلی انٹرویو لیتی ہوں۔ خصوصاً ان لوگوں کا جن کے بارے میں  
بالکل اندازہ نہ ہو یا ہوا ہو کہ ان کی آمد کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے اور کاؤٹر چھوڑ کر سیدھا  
کھڑا ہوتے ہوئے کہا "بہت عجیب۔ بلکہ متعین معاملہ ہے۔ مجھے  
اس سے کچھ ضروری باتیں کہنی ہیں۔"

وہ بہت دیر سے مجھ سے سنجیدہ ہونے کی فرمائش کر رہی تھی  
لیکن میں سنجیدہ ہوا تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس کی خوب صورت  
آنکھوں کی میں ہلکا سا خوف جھلک آیا۔ اس کی لب اسٹک غالباً  
خواب دہنے والی نہیں تھی تاہم اس نے نہایت احتیاط سے  
ہوٹوں پر زبان پھیر لی۔

پھر وہ سر کوئی کے سے انداز میں بولی "مسٹر افضل پلیز۔۔۔!  
میں کوئی بڑی خبر نہ سنائیے گا۔ ہم نے بہت طویل عرصہ اس طرح  
مکرا رہے کہ ہمارے چاروں طرف بڑی خبروں کے سوا کچھ نہیں  
تھا۔ اب کچھ عرصے سے زندگی میں ذرا سا سکون اور ذرا سی آسوی  
آئی ہے۔ میں اب اپنی زندگی میں کوئی پہلے پیدا ہونے سے بہت  
ڈرتی ہوں۔ ٹھیک ہے، مجھے اعتراف ہے ہم اب بھی کوئی زیادہ  
باعزت روزی نہیں کما رہے۔ لیکن اس دنیا میں۔ اس ملک  
میں۔ اور اس شہر میں۔ لوگ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے بڑے  
گناہنے اور ہولناک کام کر رہے ہیں اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ  
پاتا۔ پلیز میں بھی سر کھاکر اپنی اس چھٹی سی دنیا میں۔ اس شہر  
بے کراں کے ایک کونے کھدے میں پڑا رہنے دیجئے گا۔"

میک اپ کی ہلکی سی میں اس کی رنگت کچھ پیمکی پڑ گئی تھی۔  
اس کے شعور یا لا شعور میں نہ جانے کتنے خوف رہتے ہوئے تھے  
جنہوں نے اسے یکدم سدا تھا۔ اس لمبے وہ مجھے پھر اور ابھی  
گئی۔ اس کے الفاظ میں سچائی کی خوشبو تھی اور اس کا انداز گفتگو



پلے میں ذرا رستوران اور کچن کا ایک چکر لگا آؤں۔ تب تک تم افضل صاحب کو بٹھاؤ۔۔۔ ان کی خاطر تواضع کرو۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایک بڑا آدمی ہمارے اس بھلے خانے میں آیا ہے۔" پھر اس نے نہایت رسمی سے معذرت خواہانہ انداز میں میری طرف دیکھا "ہم ایک نئے سرے سے ہٹا کی جنگ لڑ رہے ہیں افضل صاحب! ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر میں مقررہ اوقات میں رستوران اور کچن کا چکر نہ لگاؤں تو لازم لوگ کوئی نہ کوئی گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ ہمارا ہوٹل آپ کے ہوٹل کے معیار کا تو ہے نہیں جہاں سارا انتظام خود بخود چلا رہا ہے۔" "میں نے

کہا۔ "یہ دعویٰ تو میں نہیں کر سکتا۔" وہ مختصر لہجے میں بولا "ہم ہر حال۔۔۔ میں ہوٹل انتظامی کا آدمی ہوں۔ اگر میں ایک خاصہ انتظام ہوٹل کے مالک کو نہیں بچاؤں گا تو یہ میری مثال تھی ہوگی۔" پھر وہ کاؤنٹر کے عقب سے نکلے ہوئے بولا "میں ابھی آیا۔ آپ ٹیلم کے پاس بیٹھے اور اگر کسی چیز کی طلب ہو تو بلا تکلف اسے پتا دیتے۔"

ٹیلم نے اسے مطلع کیا "افضل صاحب ادائیگی کر کے اور وٹر کو خاصی بھاری ٹپ دے کر ہمارے ہوٹل کی قربانہ چائے پی چکے ہیں۔" "وہ یہ تو انہوں نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ خبر میں آکر ان سے بات کرنا ہوں۔" وہ جاتے جاتے بولا۔

اب میں ایک بار پھر ٹیلم کے ساتھ اکیلا تھا۔ اس نے مجھے کاؤنٹر کے عقب میں ہی بلایا تھا۔ اس جیسی ٹھیک ٹھاک خاتون کو چھوڑ کر ہدایت دہائی کے پیچھے پیچھے کچن میں جانا ایک بے ہودہ حرکت ہوئی۔

وہاں ایک اور اونچا اسٹول موجود تھا۔ ٹیلم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "نی الحال میں آپ کو بیٹھنے کے لئے یہی پیش کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ آفس میں چل کر بیٹھتی لیکن اس وقت میں کاؤنٹر نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ بڑی کا وقت ہے۔" "کیسا بڑا زمانہ آیا ہے۔" میں نے لہجہ میں سانس لے کر اسٹول پر نکلے ہوئے کہا "خوب صورت عورتیں بھی کیسی بڑنس مانتی ہو گئی ہیں۔ قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔"

وہ مجھ سے بھی زیادہ لہجہ میں سانس لے کر گزریں مونڈ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "افضل صاحب! لگتا ہے آپ صرف مجھے ایک خوب صورت عورت ثابت کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ لیکن میں اس خوش قسمتی میں مبتلا ہونے والی نہیں ہوں۔ نہ تو میں کوئی غیر معمولی عورت ہوں اور نہ ہی آپ یہاں مجھے یہ بتانے کے لئے آئے ہیں۔ آپ اصل بات شروع کیوں نہیں کر لیتے؟" "ٹھیک ہے۔" میں نے گویا بڑے افسوس سے کہا "مگر تم ایسی

سے زیادہ بال سفید تھے تاہم چہرے سے وہ اتنی عمر نہیں ور اس نے بالوں کو ریتھ کی زحمت نہیں کی تھی۔ جوانی کا وہ تک خوش شکل رہا ہو گا لیکن بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ بال کھل میں نہ جانے کیا لگتے اور سخت ہوتے ہیں کہ اچھا ل شکل آدمی بھی عام سا دکھائی دینے لگتا ہے۔ جوانی جوانی ہے اور بعض لوگوں کی تو ساری خوب صورتی ہی ان

س کا سوت پھینا کئی سال پرانا تھا۔ اس کے باوجود اس کی میں خوش لباسی کا تاثر نمایاں تھا۔ اس کی آنکھیں سموری نہ نہایت پلٹے پلٹے تھے۔ یہ ہونٹ بھی سی سفیدی اور ہنسنے کا سراغ دیتے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ چہرے میرے ناظرین کا آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی انصافیت اور حرکات و سکنات سے جھلکتی ہوئی خود اعتمادی اس کے ماضی کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جاسکتا تھا کہ یہ اس کے کا زمانہ تھا لیکن اس کا چہرہ ابھی ایک فاتح بادشاہ کا سا چہرہ سے دیکھ کر کوئی شبہ تک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک زوال زدہ

س نے ایک لمحے کے لئے وہ اڑے پر ہی رک کر میرا جائزہ لیا کی سموری آنکھوں میں شگنائی کی بجلی سی سر ابھری اور اٹھ گئی۔ ٹیلم اس کی طرف دیکھ کر بڑی دلکشی سے مسکرائی اور عجیب شہانہ سی تمکنت کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ وہ نے شانہ بہ شانہ آن کر کھڑا ہوا۔ ٹیلم قدم اس کے تقریباً برابر

ٹیلم نے مسکراتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا "یہ مسٹر افضل کی ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا ہے؟"

"میں مجھے یہ شرف حاصل نہیں ہوا لیکن میں انہیں پہچانتا ہوں۔" وہ بے تپ سے انداز میں مسکرایا۔ ہونٹوں کے عقب سے کے دانتوں کی جھلک نظر آئی۔ اس عمر میں بھی اس کے دانت سفید اور چمکے تھے وہ ان لوگوں میں سے تھا جس کے ہونٹ وقت بوقت ہی تم حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا لہجہ مانت پنا تھا۔ اس نے مجھے پہچاننے کا اعتراف ضرور کیا تھا کسی خاص کر مجھ کی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ تاہم اس نے مجھے کے لئے ہاتھ ضرور بڑھا دیا۔

"مجھے اس پر حیرت بھی ہے اور خوشی بھی۔ کہ آپ مجھے ملتے ہیں۔" میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا سر اور نرم و نازک سا تھا۔ اگر اسے جیل میں مشقت کرنا ہوگی تو قیقا ہے چارے کا برا حال ہوا ہوگا۔

ٹیلم نے گویا آزمائشی کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا "مسٹر لکھتے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں ہدایت!" "ضرور۔ ضرور۔" ہدایت نے کسی تشویش کے بغیر کہا "لیکن

اور اصرار دیکھ رہی تھی۔ مرد بڑا حیا، انداز میں کہہ کر  
ہوا۔ وہ گرگ باران دیدہ معلوم ہوا تھا۔ نیلم کو دیکھ کر  
لے کے لے لے اپنی ساتھی کو بھول گیا اور خیالوں ہی خیالوں  
کس دور نکل گیا۔

نیلم نے ہنکار کر اسے واپس آنے پر مجبور کیا اور پھر  
لبے میں بولی "جی فرمائیے؟"

"گرا جا ہے۔ ذل بیڈ۔" وہ منہ پر کر بولا۔  
سکریٹوں کا پلٹت اور خوب صورت لائسنس اس نے گاڑی کا  
سیٹ کاؤتھر رکھا۔

"تجربہ ضرور۔" نیلم نے رجسٹر کھول لیا اور غاص  
لبے میں بولی "تاہم؟"

"سٹریٹ سڑک پر۔" مرد فرامی سے بولا جبکہ  
اس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے دوپٹے کا  
انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" نیلم نے رجسٹر  
کرتے ہوئے پوچھا۔

"حیدر آباد سے۔" مرد الٹی۔ یہ جو بھی اس کا نام تھا  
بولا۔

"آؤ کا مقصد؟" نیلم نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔  
"شاپنگ۔"

"اندازاً قیام کب تک ہوئے گا؟"  
"صبح تک۔"

"وہ جتنا کہہ دیجئے۔" نیلم نے رجسٹر اس کے سامنے رکھ  
تقم اسے چھایا۔ اس نے بے پروائی سے ایک کالم  
میدے دھتکہ ٹھیکٹ دیکھے۔ نیلم نے ایک دیگر کولر کچا  
وہ دونوں اس کے پیچھے چل دیے۔ نیلم نے ایک دن  
کرایہ وصول کیا تھا وہ بھی قابل غور تھا۔

وہ بیڑیوں پر نظر سے اوجھل ہو چکے تو میں نے  
ہوئے نیلم کی طرف دیکھا۔ اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ  
نے ساتھی انداز میں سہلائے ہوئے کہا "بہت خوب  
ہاں کرائے فائبر اشار ہوئی سے کچھ ہی کم ہیں۔ کتنی تو  
میں جاری ہوگی؟"

"خاک منافع میں جاری ہے۔" وہ منہ بک بولی "جو  
میا کرتے ہیں ان کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگوں کو خوش  
ہے نہ جانے کہاں کہاں کتنا کچھ جاتا ہے اس کے بارے  
کی نہ کوئی یہاں آکر آکھیں نکالنا رہتا ہے۔ غرا نامہ  
دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔"

یہ سب کچھ کہہ کے بھی لوگ اگر خاص فائدے میں  
تھے تو پھر نہ جانے کیوں کرتے تھے؟ یہ بھی شاید ایک عجیب  
بکر تھا جس میں چھپنے والا کبھی نکل نہیں پاتا تھا۔ بات دہ

ی غیر افسانوی اور فیروہانوی قسم کی عورت ہو تو میں دوسری قسم کی  
باتیں کر لیتا ہوں۔ میں صرف یہ پوچھتا ہوں تھا کہ آج شاپنگ کیجے  
سے لے کر ساڑھے سات بجے کے دوران میں تم کہاں تھیں؟ مجھے  
خود احساس ہے کہ یہ ایک نہایت بے ہودہ سوال ہے۔ تم جیسی کسی  
بھی عورت سے یہ نہیں پوچھتا چاہئے کہ وہ کس وقت کہاں تھی  
لیکن کیا کوئی بے مجبوری ہے۔ تم خود مجھے موضوع تبدیل کرنے پر  
مجبور کر رہی ہو۔"

اس نے کمری نظر سے میری طرف دیکھا "کیا آپ سنجیدگی سے  
پوچھ رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے۔ اس قسم کے سوال میں بھلا مذاق کی کیا گنجائش  
ہو سکتی ہے؟"

"لیکن کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس کے لبے میں حقیقتاً تھوڑا  
ساقب تھا۔

"ہیں۔ پوچھی۔" میں نے کندھے اچکائے۔

"سورہی تھی۔" اس نے گویا بادل باخراست جواب دیا۔

پوچھتا تو میں کچھ اور چاہ رہا تھا لیکن میں نے اپنے بے ساختہ  
سوال کو ہنسن کی بازگاہ کر دیا اور ایک لمبے کے توقف سے  
پوچھا "کتنے بجے آگئی تھیں؟"

"سات بجے۔" اس نے جواب دیا "میں روزانہ سہ پہر کو  
آرام کے لئے لپٹی ہوں اور تقریباً سات بجے اٹھ کر تیار ہو کر یہاں  
کاؤنٹر آکر کھڑی ہوتی ہوں۔"

"اس سے پہلے یہاں کون کھڑا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہدایت۔" اس نے جواب دیا "اگر اسے کسی ضروری کام  
سے جانا ہو تو بیڑی ویرا کا ڈسٹنڈ غیرہ کاؤنٹر منیجیل لیتے ہیں۔"

"آج ساڑھے چار سے ساڑھے سات بجے تک ہدایت کاؤنٹر  
پر موجود تھا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ آپ ہدایت سے ہی پوچھئے گا۔ میں اس کے جے گئے  
سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔" اس نے قدرے ہزاری سے  
کہا "ویسے بانی داد ہے یہ سوالات کس سلسلے میں ہیں؟"

"سلسلہ بھی جلد تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔" میں نے  
جواب دیا۔

"آپ نے کیا پولیس پاسی آئی اے وغیرہ میں پارٹ ٹائم  
لازم کر لی ہے؟" اس نے نیچے نظروں سے میری طرف دیکھا۔  
"ابھی مجھ پر اتنا بڑا وقت نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

اچانک مرد اڑھ کھڑا اور میری عمر کا ایک مرد برف کیس اٹھائے  
لائی میں داخل ہوا۔ اس کے سر اٹھ سے کچھ خوش حالی عیاں تھی۔  
اس کے پیچھے اوسط شکل و صورت کی ایک لڑکی تھی لیکن ایک لحاظ  
سے وہ خوب صورت تھی۔ یعنی عمر کے لحاظ سے۔ جوانی کی اپنی جو  
ایک خوب صورتی ہوتی ہے وہ اس کے ہم قدم تھی۔ اس کی عمر  
مشکل بائیس چوبیس سال ہوگی۔ وہ کچھ گھبراہٹ ہوئی تھی نظروں سے



ایک نوجوان کی سنسنی خیز لمبرنگ  
خودنوشت

بہشت گرد  
سلیم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود  
دہشت گرد کہلاتا تھا۔

○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے  
ہاتھ لہو لہان ہو گئے تھے۔

○ ”جی کمائیاں“ کا ایک مقبول  
ترین ایڈونچر سلسلہ چار حصوں میں  
شائع ہو رہا ہے۔

اس کے پیچھے لمبا ترنگ اور گہری سانولی رحمت کا ایک بے ہودہ  
سافھض ہے ہودہ ہی سے نکلے کر آتا ہوا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس  
کے ہاتھ میں شراب کی ایک ٹوٹی ہوئی بوتل تھی جس کے ٹوکیے  
کٹارے کئی خنجروں کی طرح اٹکے ہوئے تھے۔ وہ محض ٹوٹی ہوئی  
بوتل میں ایک خوف ناک ہتھیار تھا۔

اچانک عذرا شاہد راہداری کے پارنے اور گھسے پٹے قالین  
میں الجھ کر گری۔ لمبا ترنگ سانولا سافھض اس کے سر پہ آن پہنچا۔ وہ  
یقیناً نشتے میں دھت تھا۔ اس نے بوتل والا ہاتھ بلند کیا۔ اس کا  
انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس خوف ناک ہتھیار کو استعمال کر کرے گا۔  
”خبردار!“ ہدایت دہائی پیچھا ”رک جائے۔ ورنہ شوٹ  
کر دوں گا۔“

میں نے دیکھا اچانک ہی اس کے ہاتھ میں ایک ہتھول نظر  
آئے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب سرورم کی جگہ شدید غصہ  
اور سفاکی تھی۔ وہ اب ایک قطعی مختلف ہدایت دہائی نظر آ رہا  
تھا۔ یہ میرے لئے گویا ایک دوسری حیرت تھی۔

میری نظر اس کے ہاتھ میں موجود ہتھول پر جم کر رہ گئی تھی اور  
میری آنکھوں میں مرزا حکیم بیگ کے دفتر کا منظر بھی ابھر آیا تھا۔  
میں چشم تصور سے جج صاحب کی لاش دیکھ رہا تھا جس کی آنکھ سے  
ذرا اوپر کوئی کاسور اڑ رہا تھا۔!

ہدایت دہائی کا ہتھول پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے  
استعمال کرنے کا بھی اہل تھا۔ بلکہ شاید وہ اس میں اچھا خاصا ماہر  
تھا لیکن اس وقت مسئلہ یہ رہا کہ وہ کوئی چلانے میں ایک لمحے کے  
لئے ہچکچا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ہوٹل کا معاملہ تھا۔

دیسے تو کسی بھی ہوٹل میں کوئی چلانے کے بزنس کے معاملے  
میں پتاہ کن ہوتا ہے لیکن ہدایت دہائی اپنے ہوٹل کی جو رپورٹیشن  
بنانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے لئے تو کوئی ہنگامہ فساد ہونا اور بھی  
زیادہ خطرناک تھا۔ اس بے چارے نے اس ڈگر پر کاروبار چلا کر  
چار پیسے کمانے کے لئے اپنی بچی بچی انا اور غیرت و غیرہ کو بھی  
بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود اگر اس بزنس کو کوئی زیادہ  
بڑا جھٹکا لگ جاتا تو یہ اس بے چارے کے لئے موت ہی بڑا صدمہ  
ہوتا۔

بس شاید یہی سوچ اس کے لئے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کا  
باعث بن گئی اور اس وقت ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کی کوشش  
نہیں تھی کیونکہ اس لمحے ترنگ، مقبوض اور سانولے سے شخص  
نے ہتھول کی ہدائیں کی تھیں۔ شاید نشتے نے اس کے حواس کو کچھ  
زیادہ ہی دھندلایا ہوا تھا اور غالباً اسے اپنے لمحے ترنگ و خود پر بھی  
کچھ گھمنہ تھا۔ کوئی عیب نہیں تھا کہ اس لمحے وہ محسوس کر رہا ہو کہ  
کوئی بھی اس کا کچھ نہیں گاڑ سکتی تھی۔

اس معاملے کو درحقیقت بے آواز طریقے سے۔۔۔ یعنی خالصتاً

بہشت گرد

فون: 7224665

ہوٹ قابل ذکر ہے۔ اس نے نہایت خوب صورت ہونٹ اس کے چہرے پر یوں الگ سے نظر آتے تھے جیسے کسی حسین عورت سے مستعار لے رکھے ہوں تاہم میں پہلے بھی محسوس کر چکا تھا کہ وہ کچھ ایسی ڈھانچا جسم کی چیز بھی نہیں تھی جیسی نظر آتی تھی۔ وہ خلیب و فزاز سے کچھ ایسی عروم بھی نہیں تھی۔ اس کی جسمانی ساخت میں ایک ایک ہی قسم کی اساتر تھیں اور خوب صورتی تھی۔

اس وقت اس کا علیہ بھی ایسا تھا کہ میری اس رائے کی نہایت آسانی اور معمولی سے تصدیق کی جاسکتی تھی لیکن میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے وجود کی خوب صورتی، گداز، حرارت یا وہ خود مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ بے شک ایک عام سی اور معمولی سی لڑکی تھی لیکن مجھ سے اس کی جو چند ملاقاتیں رہی تھیں ان کے دوران میرے ذہن میں اس کا بہت اچھا اور پاکیزہ سا ایجنج بن گیا تھا۔ میری نظر میں وہ بہر حال ایک اچھی ٹینک دل اور شریف لڑکی تھی۔ صرف یہی نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت مقدس پیشے سے بھی وابستہ تھی۔ اور پھر میرے پاس سے رخصت ہوتے وقت اس نے جس جذباتیت، مگر خوب صورتی کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا تھا کہ ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھا۔

اس لڑکی کے لئے میرے ذہن میں ایک بے عنوان سی اُنیت اور بہت سی عزت تھی۔ میں نے اسے اس قسم کے ہوٹل میں اس قسم کے آدمی کے ساتھ اس حال میں دیکھنے کا شاید کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے خامسا دھچکا لگا تھا۔

تاہم ابھی اپنے صدمے کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔ میری نظر اس سانولے اور پختہ العمر شخص پر تھی جو اس کے ساتھ دائرہ پیش دینے آیا تھا لیکن شاید اس دوران غرض سے کچھ زیادہ سی لی گیا تھا اور اس کی کند کوہ پی اٹھ گئی تھی۔ میں نے احتیاطاً اس کی پالیوں میں بھی ایک ٹھوکریاں کر دی تھیں۔

اکثر کوڑھ مغز بڑی سخت کوہ پی کے مالک ہوتے ہیں۔ شاید وہ بھی کوئی کوڑھ مغز ہی تھا یا پھر ویسے ہی اس کی کوہ پی غیر معمولی طور پر مضبوط تھی۔ کوہ پی پر وہ میری ٹھوک اور دیوار سے ٹکر بھی برداشت کر گیا تھا۔ نئے میں یہ دونوں چیزیں ٹھکانے کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن پالیوں پر اس کے ستابے میں خاصی ہلکی ٹھوک کساتے ہی وہ خرکوش کی طرح اچھلا اور "غفل" کی سی آواز کے ساتھ تے کر کے چٹ ہو گیا۔ اب وہ ساکت تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

مجھے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کراہیت محسوس ہوئی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہوا تھا۔ ہدایت واصل

صرف اچھ بیروں سے نکلنے کی ضرورت تھی اور یہ ہدایت واصل کے بس کی بات نہیں تھی۔ سانولے شخص نے ٹوٹی ہوئی بوتل جس کے کنارے تنگ کی ٹوکوں کی طرح نظر آ رہے تھے اندر کے جسم میں گھونپنے کے لئے بلند کر لی تھی۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا نتیجہ ہدایت واصل کے حق میں اس کے گولی چلانے سے بھی زیادہ برا ہوتا لیکن شاید ہدایت فوری طور پر اس کے بارے میں سوچ نہیں سکا تھا۔

مجھے اس کی ہچکچاہٹ کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ میری ناگ تیزی سے بلند کی تک گولی اور میری ٹھوک اس شخص کی کپٹی پر پڑی۔ وہ درد جاگرا اور دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے گرنے اور دیوار سے ٹکرانے کی آواز کسی موٹے سے شہیرے کے گرنے کی آواز سے کم نہیں تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ ہدایت واصل نے پہلی پہلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ میری ناگ سی تھی جسے اس نے اس تیزی سے گھومتے اور لمبے ترے سانولے شخص کے سر تک بلند ہوتے دیکھا تھا۔ تاہم مجھے اس کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ میری نظر سانولے شخص پر تھی۔

جس طرح میری ٹھوک اس کی کپٹی پر پڑی تھی اور جس طرح گرتے وقت اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس کے بعد اسے بے ہوش ہو جانا چاہیے تھا اور وہ ایک لمبے کے لئے گر کر ساکت بھی ہو گیا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ بے ہوش ہو گیا تھا لیکن وہ بد بخت بھر بھر سی لے کر اٹھ بیٹھا۔

تاہم وہ کھڑا نہیں ہو سکا۔ کم از کم وہ ناگوں پر قہمیں کھڑا ہو سکا۔ البتہ کدھ لے کر چپانے کی طرح چاندوں اچھ بیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر شاید دھندلا گئی تھی۔ اس نے سر کو ادھر ادھر جھٹکا اور آنکھیں بچاڑ بچاڑ کر فرش پر کچھ تلاش کئے لگے۔

میں سمجھ گیا کہ وہ چند اپنا ہتھیار یعنی وہی ٹوٹی ہوئی بوتل تلاش کر رہا تھا۔ وہ اپنی منہ کا بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس نے اندر کے جسم میں بوتل گھونپنے کا تجربہ کر رکھا تھا۔ یہ خواہش اس کے ذہن کے کسی خانے میں ایک کر رہی تھی۔

اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بوتل بھی دیوار سے ٹکرا کر اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر مزید کھدوں میں ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ہاتھ میں پکڑنے اور ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

غذرا جلدی ہے اچھ کچھ سے آن پہنی تھی۔ اس نے میری آڑ لے لی تھی۔ وہ بھی کے کسی پیچھے ہونے کی طرح قہر قہر کانپ رہی تھی۔ اس صورت حال میں بھی اس کا وجود مجھے خوب صورتی گداز اور حرارت کا احساس دلاتے بغیر نہیں رہ سکا۔

وہ نہایت معمولی سی شکل صورت کی لڑکی تھی۔ چہرے سے استخوانی ساخت کی نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف اس کے

ابھی انسان بننے کی فرمت نہیں مل سکی۔ تم مجھے فرشتہ بنا ہوئی ہو۔“

”یہ تو آپ کا انکار ہے افضل صاحب۔“ وہ دیر سے متنبہل رہی تھی۔ صورت حال قایم میں قایم احساس سے یقیناً اسے اطمینان ہوا تھا ”یہ تو مجھے ہی معلوم آپ کئے اپنی دوسرے کے انسان ہیں۔ آپ کے انکار پر یہ بھی بہت زیادہ حیرت زدہ ہو چکی ہوں۔“

”اور میں تمہاری ”سستی“ پر حیرت زدہ ہوں۔“ یہ زہریلے لہجے میں کہا۔ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ڈانٹ ہو گیا تھا۔ وہ عام طور پر میں کسی کی کئی زندگی میں دخل نہیں کرتا تھا اور نہ ہی لفظوں میں اس کے بارے میں کسی انکار کرتا تھا۔

وہ گویا میرا مطلب تو نہیں سمجھ سکی لیکن اسے میرے کئی کا اندازہ یقیناً ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی ”بھلا بھلا بلاگ بلا ہے افضل صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”آپ مجھ سے خفا ہیں؟“ اس نے تقریباً اپنے ہوئے ایک سال سوال کر دیا۔

”جب انسان اپنے دل جانیں تو کیا بے چارے لہجے کو تھا بھی بدلے کا حق حاصل نہیں؟“ میں نے اسی لہجے میں کہا۔

”میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھتی۔“ اس نے

بننے کی بڑی کامیاب اداکاری کی لیکن مجھے یہ مصیبت ڈھائی لگی۔

میں اپنی ناگوارمی پر اب بھی قایم نہ پاسکا۔ میں نے جا انداز میں سر ملاتے ہوئے کہا ”تصور تمہارا بھی زیادہ نہیں خاصی ہو چکی ہے۔ زندگی کی مسلسل بے کیفی تمہارے لیے برداشت ہو گئی ہوگی۔ اور پھر تدریس کا پیشہ بھی تو خاصا ہے۔ شاید تمہیں اپنے ارد گرد کوئی رعینے نظر نہیں آئی ہوگی۔“

انتظار کرتے کرتے تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہوں۔ پھر بھی۔ میرا خیال ہے تمہیں انداز نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خواہ کی تسکین کا کوئی اور راستہ ڈھونڈنا چاہئے تھا جس میں تو کوئی تو رازداری ہوئی۔ شرافت کا تصور اب تو بھرم رہ جاگتا۔ اب بھی کیا رموا کی کہ انسان آتے باکیزہ اور بلند مقام سے اتر کر کمر نہیں ہی جا کر رہے۔“

اس کی آنکھوں کے کنارے پہلے ہی سرخ اور متورم تھیں لیکن میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ شاید وہ وہی ہو بلکہ مجھے کہاں گزرا تھا کہ شاید مرد کے شغل سے لوثی میں نہ بھی تو بہت شریک رہی ہو کم از کم اس حد تک۔ کہ جو اس پر اس کا تہ ہوئے پائے کیونکہ وہ پوری طرح ہوش و حواس میں نظر آ رہی لیکن شاید ان کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ شرابی دیر سے بھی طرف سے زیادہ پی لیتے ہیں تو لڑنے مرنے کا بہانہ ڈھونڈتے

کو مجھ سے اس قسم کی کارروائی کی یقیناً توقع نہیں تھی مگر وہ اپنی حیرت کے جھٹکے سے متنبہل چکا تھا۔

ایک دیر وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ دوسرا ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے پاؤں سے پکڑ کر اس شخص کو اٹھایا۔ دیانت نے پستول جیب میں رکھ کر جلدی سے آگے بڑھ کر خود اس کی ٹانگیں پکڑیں۔ ان تینوں کو بھی اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ محسوس ہوا کہ کالبا ترنگ آ رہی تھا اور دیسے بھی سر وہاں ہے ہوش آدمی کا وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

تاہم میں نے ان کا ہاتھ پٹانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے جتنا کرنا تھا انی کرنا ہی کافی تھا۔ میں نے دیانت دامن کوئی الحال سگین سگے سے تو بچالیا تھا۔ اب اپنا کوڑا کرکٹ انہیں خود بھی اٹھانا چاہئے تھا۔ دشواری کے باوجود انہوں نے خاصی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس سے پہلے کہ رازداری میں دوسرے کمروں کے دروازے کھلے، وہ تینوں اسے اٹھا کر جلدی سے اس کے کمرے میں لے گئے جس کا دروازہ کھلا تھا۔

دوسرے لوگوں نے شاید دروازے تھوڑے بہت کھول کر جھری وغیرہ سے یہ منظر دیکھ بھی لیا ہو لیکن دیکھ رہے ہیں ہی حالت کبھی ہو یا پھر شاید وہ لوگ اس پوزیشن میں ہی نہ ہوں کہ جلد دروازہ کھول کر دیکھ سکتے ہوں۔ بہر حال اس طور پر تماشا نہیں کھتے آیا اور دیانت دامن ویشوں کی مدد سے اس شخص کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لے جا کر بیڈ پر لٹاتے۔ بلکہ یوں کہنے کے بیٹھے میں کامیاب ہو گیا۔

میں بھی کمرے میں جا پہنچا تھا اور میرے ساتھ تقریباً چپکی ہوئی ذرا بھی آگئی تھی۔ دروازہ میں نے اپنے عقب میں بند کر دیا۔ وہ تاجروں کا سا کرا تھا کہ ہم سب کے آنکھوں سے گویا وہاں قتل دھڑلے لوچکے نہیں رہی تھی۔

غذا کو شاید اب اپنے طے کا احساس ہوا۔ اس نے ایک بڑی سی چادر اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لی۔ ایک ساتھ گویا خوب صورتیوں کے کئی آداب غروب ہوئے کدہ خوف کے غلبے سے ابھی تک نہیں نکلی تھی لیکن یہی کیفیت تھا کہ اتنی جلدی اسے اپنے طے کی موزونیت کا احساس ہو گیا تھا۔

اس وقت اس کی بڑے بڑے سے شیشوں والی عینک اس کے رے پر نہیں تھی جس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں کچھ کی سی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ بے پردا سی لگ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں خوف کے سامنے لے نہ میری طرف دیکھ کر لڑزائی سی داز میں بولی ”آپ اس وقت میرے لئے گویا رحمت کا فرشتہ بن کر نچے افضل صاحب۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس طرح آپ کا لڑیہ ادا کروں۔“

میں غیر ارادی طور پر استہزائیہ سے انداز میں ہنس رہا ”مجھے تو

نصوح جب ان کے سامنے کوئی کزور حلق ہو تب تو کچھ زیادہ ہی آپ سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ گلو گیری آواز میں ہوتی اس کی آوازوں میں آنسو آجئے۔ وہ گلو گیری آواز میں ہوتی میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی افضل صاحب۔ لیکن مجھے اتنا اندازہ ضرور ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہیں اور میں آپ کی خفگی برداشت نہیں کر سکتی۔ میں آپ سے خفگی کی وجہ نہیں پوچھوں گی البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے ناروا لگے۔ پلیز اپنی نفرت کی انتہت پہنچانے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے مگنی مار دیں۔

وہ واقعی اپنی پستی سے بے خبر نظر آ رہی تھی۔ شاید اس کے دوا میں ابھی ٹھکانے نہیں تھے یا پھر اس نے بہت سی حد تک ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ یہ اس کے لئے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کے استخوانی سے چرے پر واقعی ایک بے خبر انسان کی سی سادگی تھی۔

مجھے مزید غصہ بھی آیا۔ میں نے صحیح طور پر دل کا بخار نکال لینا ہی بہتر سمجھا۔ میں نے ذہریلے مگر لائق مجھے میں کہا "میں بیکدم اتنا نہیں گرنا چاہتا تھا خدا را۔" مجھے حیرت ہوئی کہ میرے لیے میں میری دل انتہت تک اتنی "کمال" وہ کھیلے سی سادہ سی لڑکی جس کا چہرہ سفید روپے کے طبقے میں گھرا ہوا تھا اور جس کے حدود خال پر شرافت کی چائنی بھیلی ہوئی تھی اور جو بچوں کو تعلیم دیتے جیسے معزز بیٹے سے وابستہ تھی۔ "میں نے ایک گھری سافٹی لی "اور کہاں اس بدنام ہوئی میں کھانسی حالت میں بھاگتی ہوئی۔ لڑکی جس کے عاقب میں ایک بدست شرابی دوڑا آ رہا ہو، کیسی باندی۔ کیسی پستی!"

ذات دماغی قرب ہی کھڑا تھا اور میں نے اس کے سامنے ہی اس کے ہوئی کو بدنام کیا تھا تاہم اس کے چرے پر ناگوار کی کے اثرات نمودار نہیں ہوئے۔ وہ یقیناً ایک حقیقت پسند آدمی تھا۔

خود را کے چرے پر البتہ ذہریلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کے ہونٹوں کی پھر پھر ہاتھ تباری تھی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رہا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کس طرح وہ خود پر قابو رکھنے ہوئے رہ گیا ہوئی سی آواز میں ہوتی "اب میں سمجھی ہوں کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ میں بد نصیب ہر بات کچھ تاخیر سے ہی سمجھتی ہوں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میرے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اب بھی مدرس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہوں۔ یہ ہوئی بدنام ہے یا نیک نام۔ اس کا مجھے کھلم کھلا علم نہیں کیونکہ میں اس سمندر نما فطرت میں اب بھی اچھپی ہی ہوں۔ میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ میں گھر میں گر گئی ہوں لیکن اس گھر میں مجھے میری ماں نے رکھا دیا ہے۔ مجھے تو میرا شوہر جہاں لایا میں جلی آنی۔ قسم خورٹی یہ ہے کہ ہم یہاں ہی مومن منانے آئے ہوئے ہیں۔ شاید میرے شوہر کے خیال میں

ہی مومن اسی طرح بنایا جاتا ہے۔

اس کی آواز بالکل ہی رندہ تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ وہ اپنی سسکیوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں اس کے جسم کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ "کیا ہے؟" میرے حلق سے سرسراہٹ سی آواز نکلی "یہ حسرا شوہر ہے؟" میں نے بے یقینی سے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو بیل پر آنکھیں بند کئے جت پڑا تھا۔ اس کا منہ خود سا مگلا تھا اور وہ میرے دیر سے خزا رہا تھا۔ "جی ہاں۔" اس نے متعل سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

"کب ہوئی تمہاری شادی؟" میں نے پوچھا۔ یہ سوال یونہی غیر ارادی طور پر کیا تھا۔ درحقیقت میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے انکشاف پر میں صرف حیران ہی نہیں، سخت شرمندہ بھی ہوا تھا۔ میرے ذہن میں غم دھبے کے جھڑکے تھے اور کچھ زیادہ ہی گمراہانا پھیل گیا تھا۔

"دو ماہ ہوئے۔" اس نے جواب دیا "میں بڑی تاخیر سے ہی مومن پر روانہ ہوئے۔ کاش نہ ہی روانہ ہوتے ہوتے مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ میرے لئے ہی مومن نہیں "ذلت کا ایک سفر مسلسل ہو گا۔"

"تم نے مجھے یا امیر کو اس شادی کی اطلاع نہیں دی۔" میں نے یونہی اس جھٹکے سے مزید سنبھلنے کے لئے کہا۔ درحقیقت میرے لیے میں گھو نہیں تھا۔

اس کے ہونٹوں پر استہزائی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تب میں نے دیکھا اس کے صاف شہرے سے چرے پر ایک آدھ ٹیک اور خراش کے نشے ہوئے سے نشان موجود تھے۔

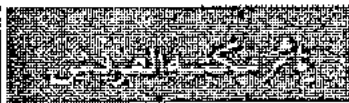
"اول تو مجھے اس کی سلت ہی نہیں ملی۔" اس نے جواب دیا "اس شادی کی بات حجت تو کافی دنوں چلتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوا تو بالکل اچانک ہی ہو گیا۔ مجھ جیسی لڑکی کی شادی کی کما رہے آپ کے لئے کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ اس لئے جی بات ہے میرا آپ کو مطلع کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ اچانک سارا پروگرام بن جانے کی وجہ سے امیر کو بھی مطلع نہیں کر سکی اور بعد میں اطلاع دینے کی ہمت اس لئے نہیں پڑی کہ شادی کے ساتھ ہی ایک مسلسل شرمندگی کا دور شروع ہو گیا۔ یہ شوہر نہیں "ذلت و شرمندگی کا ایک چٹا پھرتا اشتہار ہے۔ جس کے ساتھ مجھے ہتھی کر دیا گیا ہے۔ میں کس منہ سے کس کو بتاؤں کہ میری شادی ہو گئی ہے۔ میں آپ کی اور امیر کی نظروں سے اوجھل رہ کر ہی سسک سسک کر اپنی زندگی پوری کر کے خاموشی سے مر جاتی تو اچھا تھا مگر مجھے اس حال میں آپ کے سامنے آنا تھا۔ اس ذلت کا بھی سامنا کرنا تھا۔ آپ نے مجھے اس عفویت کے ہاتھوں مر ہی جانے دیا ہو تا تو اچھا تھا۔"

# چاہ بابیل

دیوتاؤں کے شہر بابل کی کہانی

جسے مصنف نے 35 سال کی رسرچ کے بعد

تھک بند کیا۔



اردو بازار لاہور

وہ ایک بار پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چپا کر سسکیاں لینے لگی۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی دھیرے دھیرے چادر کھینچی جا رہی تھی۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اسے ایک بازو کے تلخے میں لے کر اپنے قریب کر لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا سر قہقہہ پٹا اور چادر کو صحیح طور پر اس کے جسم پر لپیٹا۔

اچانک اس کے شوہر نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھولیں اور اگلے ہاتھ سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے کینہ بھری نظروں سے عذرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”یہ کیا تیرا پرانا عاشق ہے جس کے سینے سے لگ کر دل کے پھپھو لے چھوڑ دی ہے اور شوہر کو گالیاں دے رہی ہے؟“

مجھے ایک اور خفیف سا جھکا لگا۔ وہ بد بخت بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ شاید صرف تھوڑی دیر کے لئے اس کے حواس کمزور ہوئے تھے۔ شاید اس نے ہماری ساری گفتگو سنی تھی۔

عذرا اس لئے کمال جزا کا مٹا ہوا کرتے ہوئے لٹھڑی سانس لے کر بولی ”میری ایسی قسمت کہاں کہ افضل صاحب جیسے لوگ میرے عاشق ہوتے۔ میری قسمت میں تو تم جیسا زمانہ بھر کا گند لکھا ہوا تھا۔“

وہ اپنے کانچے ہاتھ سے سر سلاتے ہوئے ایک گندی سی گال دے کر بولا ”شکر کرتے تھے مجھ جیسا جوان مرد لگیا اور نہ تجھے تو کسی غار میں زندہ رکھتے تھے بھی اگر نہیں سو گھنا تھا۔ تیری جوانی کو بیٹھے بیٹھے دیکھ لگ جاتی۔“

اس نے ایک بار پھر کینہ توڑ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”لیکن یہ ضرور کسی وجہ سے تیرا عاشق ہے۔“ جیسی اس کی صورت دیکھتے ہی مجھ میں اتنی جزا آگئی ہے ورنہ تو میری صورت دیکھ کر تھر تھرا کا پٹنی تھی۔“

”میں نے عذرا کی طرف دیکھ کر لٹھڑی سانس لے کر کہا ”تمہارا یہ ہاتھلو سا شوہر واقعی خاصا سخت جان ہے۔ میرا خیال ہے اس کے لئے لگاؤ ڈھونڈنا کافی نہیں رہا اور تم اجازت دو تو میں اسے ذرا ٹھکرا سا دوڑوںے دوں گا؟“

”رہے دبی خواہ خواہ مر جائے گا۔“ عذرا بے اختیار میرا ہاتھ تھام کر مجھے روکھتے ہوئے بولی ”میں نہیں چاہتی آپ اس کے گندے خون میں اپنے ہاتھ نہ رکھیں۔“

اس کے شوہر نے گویا ان الفاظ پر جلال میں آکر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے ذرا گھورا تو وہ دوبارہ لیٹ گیا اور کراچے ہوئے بولا ”میرا زادہ! اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تجھے جتنا چمکا ہے چمک لے لیکن رونا تو تجھے میرے ساتھ ہی ہے۔ میں تجھ سے حساب لوں گا ان ساری باتوں کا۔ یہاں نہ کسی گھر جا کر لوں گا۔ تو سمجھ رہی ہے اپنے یہ کروت مجھے دکھا کر بھی بچ جائے گی۔“

”میں تمہارے ساتھ گھر جاؤں گی جب حساب لوگے گا۔“ عذرا مجھے سے بولی ”میں اب جان دے دوں گی مگر اس گھر میں نہیں جاؤں گی جو تمہاری وجہ سے میرے لئے جہنم بنا ہوا ہے۔“

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب کوئی انسان کی جان لینے کی کوشش کرتا ہے تو انسان جان بچانے کے لئے جھگڑتا ہے۔ جس طرح چند لمبے لمبے عذرا بھاگ رہی تھی۔ لیکن اکثر جذباتی لوگوں میں وہ جان دینے کی بات کرتا ہے۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا ”تمہیں شادی کے لئے یہی چاہنا ہے؟“

عذرا تلخ لہجے میں بولی ”یہ سوال آپ میری والدہ سے کیجئے۔“

”نہیں اس شادی میں تمہاری پسند نہ مل نہیں تھی؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہر لڑکی کی طرح مجھے بھی شادی کا امان ضرور تھا۔ لیکن میں شادی کے لئے اس طرح مری نہیں جا رہی تھی کہ اس وحشی درندے کے چلے بندھ جاتی۔“ اس کے زور چرے پر اس وقت مرنے کی جھجک تھی پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی ”افضل صاحب! لڑکیوں کی عمر ذرا زیادہ ہو جاتی ہے تو ان باپ انہیں بوجھ کیوں سمجھتے ہیں؟ جیسا تیرا بھی لڑکا نظر آتا ہے اتنا کر اس کے چلے باندھ دیتے ہیں۔“

”معلوم نہیں۔“ میں نے ذرا گھبرا کر کہا ”میں ان والدین



تھی۔

”اور اب؟“ میں نے پوچھا۔

”چشمیں یہ میری خوش قسمت تھی یا بد قسمت کہ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ جائیداد امی کے نام ہو گئی۔“ وہ سسکی سی کر بولی ”تب سے میری جان زیادہ غراب میں ہے نہ جانے کس بے آبی سے اس بات کا انتظار ہو رہا تھا۔ اب وہی جائیداد کوئی جڑ ہے۔ جھگڑا کسی بھی بات سے شروع ہو تو ان اسی بات پر ہوتی ہے کہ آخر میں اپنی ماں سے وہ جائیداد اپنے نام کیوں منتقل نہیں کر لیتی جبکہ میں اب ان کی واحد اولاد ہوں اور وہ ہر وقت تیار رہتی ہیں۔“

میں نے کمرے کی کچی سی چھت کی طرف دیکھ کر بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہی جائیداد کے بھگڑے۔ وہی پیسے کی ہوس۔ وہی مال و زر کی کینٹھناٹائی۔ ہر سطح پر لوگوں نے اسی ہوس میں اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ جھگڑا خواہ کوئی بھی تھا۔ اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی تھی۔ اس کی تہ میں صرف اور صرف رویا تھا۔

اچانک غلام نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور تجسس سے اندر اڑیں اندر بھاٹکا۔ سب کا جائزہ لینے کے بعد وہ خفیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”میرا خیال ہے اب یہاں امن و امان قائم ہو چکا ہے۔ میں اندر آ سکتی ہوں؟“

”ہاں۔ امن و امان تو قائم ہو چکا ہے لیکن برا چڑبائی سین چل رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ہاؤس بھی ٹھل ہے لیکن برہ حال تم آج ہاؤس۔“

وہ اندر آگئی اور ذہانت و ادب کے قریب کھڑی ہو گئی جو اب بے چینی سے اپنا وزن کچی ایک پاؤں پر اور بھی دوسرے پاؤں پر منتقل کر رہا تھا۔ غلام شاید صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ معلوم نہیں اس کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں۔ میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ذہانت کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ وہ پوچھتیلیں اور ہانپندی کی سے عبد القدر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے ہاتھ پر ہمارا عبد القدر کے لیے لیے اور چٹائی زدہ سے بال اس طرح مٹھی میں بکڑے کہ وہ بیچ آغا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے اس کی گردن کو ایک سٹاکا سے راسخ کیا اور اس پر جھپٹے ہوئے دھمکے کر فیصلہ کن سے بے چینی میں کہا ”میں کھول کر سن لو کہ تم! اگر زندہ رہنا چاہو تو آئندہ اس لڑکی کو خوش رکھنا۔ اسے خوش رکھو گے تو رفتہ رفتہ جائیداد بھی مل جائے گی۔ عرصے کو ہفتہ ذکر کے کھاتے ہیں۔ جلد بازی کرو گے مگر گرم کھانا گے تو نہ مل جائے گا۔ بلکہ تمہارے معاملے میں تو نہ بیش کے لیے بند بھی ہو سکتا ہے۔“

غدا جلدی سے بولی ”اگر یہ ایک نارمل انسان ہو یا شریفوں کی ہی زندگی بسر کر رہا ہوتا اور دیکھو اس سے امید ہوئی کہ اس

کے محسوسات سے زیادہ وقت نہیں ہوں جن کی لڑکیوں کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے عمر زیادہ ہو یا کم لڑکیاں برہ حال بالذکر کی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہیں اور ذمہ داریاں برہ حال دھمکی کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ ایک سناپی پراہم تو ہے لیکن مجھے یقین ہے کوئی ماں اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتی۔ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وہ اچھا فیصلہ کرتی ہے۔ اب اس کی منتظر ہی محدود ہو یا مقدر ہی غراب ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ایک بات شاید یہ بھی ہے کہ شادی کے وقت انسان کچھ اور نظر کر رہا ہوتا ہے دوسرے دوسرے کھلے ہے تو کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔“

غدا یکدم دھیمی پڑتے ہوئے بدلے بدلے سے لمبے میں بولی ”اں شاید یہی بات ہے۔ یہ محض اور اس کی ایک نام نواز عزت جب رشتے کے لئے چکر لگا رہے تھے تو ہمیں شبہ تک نہیں تھا کہ یہ ایسا شرابی۔ عیاش اور اہل ہوگا۔ اس وقت تو یہ اتنا شریف، مذہب اور نرم خو نظر آتا تھا۔ عاجزی اور انکسار اس میں اس قدر تھا کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ان کے قدموں میں لوٹنے لگے شادی کے بعد تو اس کے اندر سے گویا ایک نیا ہی عبد القدر نکلی آیا۔“

غدار کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ گلہ گیر آواز میں ”رحم طلب سے اندر اڑیں بولی“ افضل صاحب! یہ مجھے بہت سارے۔ بٹھے میں تو اسے بالکل ہی اپنا ہوش نہیں رہتا۔ بازاری عورتوں کے چکر میں بھی رہتا ہے اس کے اپنے تمام انداز و اطوار بھی بازاری ہی ہیں۔ میرا خلق بے شک کچھ متوسط طبقے سے تھا افضل صاحب! لیکن میں برہ حال ایک نفیس اور شانستہ لڑکی تھی۔ میں نے ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ شادی کے بعد زندگی اس طرح گزرے گی تو میں بھی شادی کے لئے ہاں نہ بھرتی۔ میں نے نہا کر کے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کی ہر رائی کو برداشت کیا ہے لیکن اب میری قوت برداشت جواب دے سکتی ہے۔ اب میرا اس شخص سے چھپا چھڑا بیٹھنے۔“

”اس کا پراہم کیا ہے؟“ میں نے اس شخص کی طرف دیکھا جس کا نام غدار نے عبد القدر بتایا تھا۔

”میرا خیال ہے جس وقت یہ لوگ رشتے کے لئے ای کے پیچھے لگے“ میں اس وقت ہی سن سگئی تھی کہ چالیس پچاس لاکھ کی جائیداد امی کے نام ہونے والی ہے۔“

”تاکا یہ اسی جائیداد کا ذکر ہے جو تمہارے رشتے کے ایک چچا نے تمہاری بہن موتا کے نام کی تھی مگر وہ اس کی ایک بیٹی سے پہلے ہی گئی ہو گئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے آنسو پیٹے ہوئے اثبات میں سر ہلایا ”مگر وہ جائیداد بڑی بھاری دوڑ کے بعد امی کے نام ہو چکی ہے لیکن جن دنوں یہ لوگ میرا رشتہ لے کر آئے ان دنوں یہ کام ہونے کی امید نظر نہیں آ رہی تھی تاہم ان لوگوں کو سن سگئی شاید مل گئی

جانک اور کو اگر یہ برصا نہیں کے کا تو کم از کم یہاں بھی نہیں کرے گا۔  
تو میں ضرور اپنے نام کراچی اور پھر اس کے اختیار میں بھی دے  
دیتی۔ جو اس کا اصل مقصد ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے یہ تو چاروں  
میں اسے برابر کر دے گا۔ میں پھر خالی ہاتھ کی خالی ہاتھ ہوں گی اور  
یہ مجھے لات مار کر گھر سے نکال باہر کرے گا۔ لیکن اس کے برے  
دلوں میں جب کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی ایک خدا سا  
نہیں دیکھے گا اس وقت میری حیثیت اس کے ظلم و ستم سننے اور ہر  
وقت اس کی خدمت کرنے والی ذر غریہ لودھی کی سی ہوگی۔ اس  
لئے میں ہائی نہیں بھرتی۔“

”یہ تو غیر تم اچھا کرتی ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا  
اور عہد افتدہ کو ایک اور جھکا دیا۔ وہ ایک بار پھر بیچ اٹھا۔ ویسے  
بھی وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔

”میں رہے ہوتا تم؟“ میں نے اس پر کچھ اور جھک کر کہا۔ ”یہ جو  
کچھ بھی کہہ رہی ہے یہ سب کچھ نہیں ہوتا چاہئے۔ اس لڑکی کو کوئی  
تکلیف نہیں پہنچتی چاہئے۔ اگر آئندہ مجھے کسی بھی ذریعے سے پتا  
چلا کہ تم نے اسے کوئی تکلیف پہنچائی تھی تو پھر خواہ تم بھاگ کر دنیا  
کے کسی بھی کونے میں چلے جانا۔ موت سے نہیں بچ سکو گے۔“

اس کی خوشخبری ہوا ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ جو ڈکرو  
دینے والے انداز میں ہوا ”خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ آئندہ خدا  
کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔“

مجھے اس کے اتنی جلدی سیدھا ہونے کی امید نہیں تھی لیکن  
اس قسم کے لوگوں کی جان پر ہتی ہے تو وہ ہر قسم کا وعدہ کر لیتے ہیں  
مجھے یقین تو نہیں تھا کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہے گا لیکن فی الحال  
اسے سوچ دینے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ فی الحال میں اسے زیادہ  
تخت سبق بھی نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے اسے مزید جھکا دیے بغیر ذرا نرمی سے کہا ”جو کچھ تم  
تشریف ظلم۔ دھونس دھکی، بلیک میلنگ۔ زندگی اور شناخت  
سے حاصل کرنا چاہے ہو اسے محبت، شرافت، نرمی، درگزر اور  
ظلم سے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تم ناکہ میں رہو گے  
اور سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی انکی خصوصیات پر قائم  
رہنا۔ پھر اس سے بھی زیادہ ناکہ میں رہو گے۔ یہ میں وہاں نہیں  
کر رہا ہوں۔ میں ایک گاڑی باری آ رہی ہوں۔ جسیں گاڑی باری  
مشورے دے رہا ہوں۔ وہ بڑے احمق ہوتے ہیں جو تم جیسے  
ظریفوں سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ  
گھائے میں رہتے ہیں۔ میرے مشورے پر عمل کر کے ضرور  
وہ نکلتا۔“

میں نے اس کے بال جھڑپ دیے اور اسی لئے پٹ سے اس کی  
آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے اسے ہلایا جلايا۔ اس کا جسم ڈھلا  
پڑ چکا تھا۔

”کیا یہ مر گیا؟“ عذرا نے فوراً پوچھا۔ اس کے لیے میں امید

بھی تھی اور خوف بھی۔ امید شاید اس بات کی تھی کہ جس منیت  
میں وہ پھنس گئی تھی اس سے اس کا چھٹکارا ہونے والا تھا لیکن تمام  
ترہ سے حالات کے باوجود شاید شوہر کی رفاقت سے کرم ہو جائے  
کا تصور ہر عورت کے لئے ایک بے عنوان خوف اور بیکراں  
احساس زیاں کا باعث بھی ہو آ ہے۔ عذرا کے لیے میں بھی وہی  
خوف تھا۔

”طیہان رکھو۔ یہ مرا نہیں ہے۔ صرف بے ہوش ہوا  
ہے۔“ میں نے اسے کھلی دی ”تمہارے شوہر کی کمرہ میں ضرور  
کوئی میو لیچرنگ ٹاٹ ہے۔ جب میں نے اس کی کمرہ پر ٹھوکر  
رہید کی اور اس کا سر دیوار سے بھی ٹکرایا تب تو یہ بے ہوش نہیں  
ہوا۔ اب صرف بال زور سے کھینچنے اور تھوڑا سا جھکا دینے پر بے  
ہوش ہو گیا۔“

”اس کا موٹا دل غ جوت کا سٹیل دیر میں رہیہ کرنا ہو گا۔“  
ہدایت وائل نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔

میں نے عذرا سے کہا ”جس پریشان ہونے کی ضرورت  
نہیں۔ ہم تمہارے اس بے ہوش شوہر کے لئے ڈاکٹر کا انتظام  
کریں گے۔ اس وقت میں ایک زیادہ اہم مسئلے میں پھنسا ہوا  
ہوں۔ اس کے ساتھ مزید مغز ماری کا مشغل نہیں ہو سکتا لیکن تم  
بہر حال اپنا کھر کا ایڈریس۔ اور اگر کوئی فون نمبر تو وہ بھی مجھے  
دے دو۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا اور اسے آئندہ سیدھا کر کے کا  
بندوبست کروں گا۔ مشکل وقت میں بھی اگر اتنی محنت میری ہو کر  
تم کسی طرح مجھ سے رابطہ کر سکو تو ضرور کر لیتا۔ میں خواہ تم سے  
بہت دور ہوا تب بھی کسی نہ کسی طرح تمہاری مدد کرنے کی کوشش  
کروں گا۔“

پھر میں نے ہدایت وائل اور غلام سے کہا ”جب تک بے ہوش  
یہاں ہیں تب تک آپ لوگ بھی ان کا خیال رکھنے کی کوشش کیجئے  
گا۔ یہ آپ کا بھرا پر احسان ہو گا۔“

ان دونوں نے ہی چڑ خیال انداز میں میری طرف دیکھے ہوئے  
مض دھیرے سے سر ہٹائے پر اکتفا کیا۔ عذرا نے ایک کاغذ پر ایک  
ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر اپنے ہاتھ سے تحیت کر میری طرف بڑھایا۔  
ایڈریس سکری ہر کا تھا۔

وہ عرض تو ازمیں ہوئی ”فضل صاحب! میں شاید ذرا دیر  
بھی آپ کا شکر بھی ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف حالات کا تالیف کرنے  
کے قابل ہو جاؤ۔ میرے لئے یہی خوشی کافی ہو گی۔“ میں نے کہا ”تم  
اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔ نیلم تمہارے لئے چائے وغیرہ کا اور اس  
کے لئے ڈاکٹر کا بندوبست کریں گی۔“ میں نے نیلم کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا۔

”میں تب تک لباس تبدیل کر لوں۔“ وہ جھرمجھری سی لے کر  
تدرے شرمندگی آمیز انداز میں دامدوب کی طرف بڑھتے ہوئے

”رسمیات کی ضرورت نہیں۔“ میں نے آفس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ بہت چھوٹا سا آفس تھا لیکن اس میں الماریوں، شیٹوں اور کینٹینوں میں بے شمار چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ریڈیو، فائبر، کتابیں، کاغذات، کارڈز اور اسی قسم کا عالم غلبہ آفس کی مناسبت سے دیانت کی میز کافی بڑی تھی۔ وہ بھی لدی پسندی تھی۔ دیانت مقرر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”داستان پکڑا خوشگوار نہیں ہے۔“ میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے ماضی اور حال کی الجھنوں اور مسائل کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا کہ میں آپ کو کوئی ناخوشگوار داستان سناؤں لیکن اسے خوش گوار بنانے کا بھی مجھے کوئی طریقہ نہیں سوچ رہا۔“

”تو پھر اسے اس کی ناخوشگوار سیبت ہی میری طرف منتقل کر دیجئے۔“ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس مسکراہٹ سے اعلیٰ کی لہجہ کی میاں تھی۔ وہ یقیناً فکر مند تھا۔

میں نے اسے شروع سے آخر تک سب کچھ سیدھے اور سچے انداز میں بتا دیا۔ میں نے بات دہاں سے شروع کی جب شہزاد علی مجھے میرے ہوٹل سے لینے آیا تھا۔ وہ خاموشی، توجہ اور انتہا سے میری بات سن رہا تھا۔ بظاہر وہ بالکل پرسکون تھا۔ وہ اپنی پریشانی کو چھپائے رکھنے پر قادر و مطمئن ہوتا تھا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ سرور گرم پیشہ تھا۔ ”آپ آپ کی باری ہے کہ آپ مجھے کچھ بتائیں مسٹر وارثی!“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”پہلے مجھے حیران تو ہونے دیں۔“ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ یہ مسکراہٹ گویا اس کے ہونٹوں پر جامد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں اس کا ارادہ شامل نہیں تھا۔ ”کس بات پر؟“ میں نے اس کی حیرانی پر قدرے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اس بات پر کہ آپ اس معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔“ وہ بولنے لگا۔

”انہی میں نے چونکہ جس مقرر نہیں بتایا تھا کہ میں نے کیوں اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تھی اور نہ ہی میں نے یہ تذکرہ کیا تھا کہ مرزا کرم بیگ سے میں نے دو ملین روپے بیٹنگ فیس وصول کی تھی اس لئے اس کا حیران ہونا لازمی تھا۔ میں ممکن تھا میں یہ تفصیلات اسے بتاؤں اور وہ بھی زیادہ حیران ہو جاتا۔“

”میں کچھ دنوں سے اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔“ میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا۔ ”آپ اسے میرا ”کاروباری حقوق“ یا پھر ”شوخی کا دیار“ کہہ لیں۔ میں کچھ ایسی ہی وجہ کے تحت اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ بہر حال یہ اہم بات نہیں ہے کہ میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں البتہ یہ آپ کے فائدے میں ضرور جاتی ہے۔“

”ہم لوگ باہر آجئے۔ دیانت وارثی نے گویا اطمینان کی قسم لی۔ میں نے ٹیبل سے کہا ”ان لوگوں کے لئے آپ کو جو بھی مل خراج کرنا پڑے۔ کوئی بھی کوٹ آف دی وے کام کرنا۔“ اس کا بل میرے ذمے ہو گا۔ مجھے بھجوا دیجئے گا۔“

”فیلم دیکھ کر اس کے ساتھ بولی“ افضل صاحب! آپ سامنے ہم بے لگ جھوٹے لوگ ہیں لیکن اتنے چھوٹے بھی ماہرین کہ آپ سے یہ جھوٹے جھوٹے حساب کرنے لگیں۔ آپ دوست ہماری بھی دوست ہے۔“

”یہ میری کچھ ایسی دوست بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو پھر کیا ہے؟“ اس کی مسکراہٹ میں شرارت سی جھلک

”مطمئن نہیں۔“ میں نے جھینپتا بے بسی سے کندھے کاٹے۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

”دیانت وارثی عجیب کی سے بولا“ افضل صاحب! آپ نے ورت حال کو سمجھنے اور طریقے سے قابو میں کیا اس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اگر وہ بد بخت تھے میں اس کا لالہ رہنے سے اس لڑکی کو مار دیتا۔ یا شاید زخمی کر دیتا یا لڑکی کو بچانے یا کوشش میں میں اس گدھے پر گولی چلا دیتا تو میرے لئے بڑی بھینس کھڑی ہو جاتیں۔ بڑی مشکل سے میں نے کچھ جھٹکا شروع کیا۔ شاید میرے حالات پھر خراب ہو جاتے۔“

”یہ مسئلہ تو فی الحال ٹل گیا۔“ میں نے میز چایاں اترتے دے کر کہا۔ ”لیکن وہ مسئلہ سچ میں ہی رہ گیا جس کے لئے میں دراصل ہاں آیا تھا۔ انسان کی زندگی بھی کبھی الف لیلہ کی طرح داستان رواں ہوا کرتی ہے۔“

”بھی کبھی نہیں بلکہ انسان کی زندگی مسلسل ہی ایک داستان رواں ہوا کرتی ہے۔“ دیانت نے گویا صبح کی۔

”شاید“ میں نے بہم لہجے میں کہا۔ اس دوران ہم نیچے پہنچ چکے تھے۔

”وہ دوسری داستان کیا ہے؟“ اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میرے اسے خود ہی خیال آیا کہ ہم لابی میں کھڑے تھے جلدی سے بولا ”آئیے تو رام سے آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ مجھ کو ٹیبل سے مخاطب ہوا ”ابھی کاؤنٹر ترم ہی سنبھالو۔ افضل صاحب کا چھوٹا رہا ہے کہ معاملہ کچھ سنجیدہ ہی ہے۔“

”فیلم مسکراتے ہوئے بولی“ ایک بڑا آدمی کسی غیر سنجیدہ مسئلے کے سلسلے میں توجہ نہیں چل کر ہمارے ہاں نہیں آسکتا تھا۔“ اس کی مسکراہٹ کے عقب سے فکر مند کی جھانک رہی تھی۔

میں اور دیانت وارثی آفس میں جا بیٹھے۔ دیانت بولا ”میں اس کی چیزیں آپ کے شاہانہ شان نہیں۔ پھر بھی آپ کچھ کھانا چاہنا پسند کریں گے؟“

”وہ کس طرح؟“ اس نے محسوس کیا کہ میں نے اس کو گولی سرکاری شخصیت۔ یا

شخصیات قیمتی آپ کے نیچے اور مجھ پر بھی کیا یہ اس سے بستر نہیں ہے کہ ایک منڈب اور معزز شخص درستانہ ماحول میں بیٹھا آپ سے بات کر رہا ہے؟“ میں نے طماننت سے کہا۔

”ہاں۔ بہتر ہے۔“ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد اس نے جلسہ کیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جج صاحب کے قتل کا سن کر چند لمبے کے لئے اس کا چہرہ زور پڑ گیا تھا مگر اب وہ سنبھل چکا تھا۔

آویں وہ یقیناً بہت گرا تھا۔ بظاہر حسرت سے بولا ”کاش ہم بھی اس قابل ہوتے کہ آپ کی خدمات حاصل کر سکتے۔“ درحقیقت اس کے الفاظ میں خفیف سا طنز پوشیدہ تھا۔ میں نے کاروباری شوق یا شوق کاروبار کے جو الفاظ استعمال کئے تھے اس سے وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ میری دلچسپی کہ میں روپیہ بھی کام کر رہا تھا۔

ایک لمبے کے توقف سے وہ بولا ”جو ایسے آپ بتائیں تو سہی۔ اگر میں آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہوں تو آپ کی کیا شرائط ہوں گی؟ شاید میں کسی طرح سمجھ کر آپ کو انورڈ کر سکے گا بندوبست کر دیں۔“

”کس معاملے میں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانستے ہوئے پوچھا۔

”اسی معاملے میں۔“ وہ ہوا لمبے میں بولا ”مجھے کچھ خطرے کی جو محسوس ہو رہی ہے شاید مجھے بھی آپ کی خدمت کی ضرورت پڑی جائے۔“

”ایک ہی معاملے میں؟“ میں نے دو تومروں کے لئے کیسے کام کر سکتا ہوں وراثی صاحب؟“ میں نے فز سے کہا ”یہ تو کاروباری افلاقیات کے خلاف ہے۔ ابھی تو مجھے اس شوق میں مبتلا ہوئے جہد جہد آئندہ دن بھی نہیں ہوئے اگر میں ابھی سے بے اصولی شروع کروں گا تو جلد ہی کسی جہرت پاک انجام کو پہنچ جاؤں گا۔ آپ نے شاید کچھ غلط تاثر لیا ہے وراثی صاحب! اس شوق کاروبار یا کاروباری شوق میں لانا جو دخل نہیں ہے۔“

اس نے پھر خیال سے انداز میں سر ہلایا۔ میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا ”میرا سلسلہ بہت مختلف اور بہت عجیب سا ہے۔ شاید اتنی جلدی آپ کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ بہر حال ایک بات کا یقین رکھیے۔ اگر آپ میرے ساتھ جج پولیس کے تو قاتل کے میں رہیں گے۔ اگر اس معاملے میں آپ بے قصور ہوئے تو میں بغیر کسی مالی فائدے کے بھی آپ کے لئے سب کچھ کروں گا اور آپ پر کوئی آج نہیں آئے دوں گا لیکن اگر آپ نے مجھ سے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی تو وہ آپ کے لئے زیادہ نقصان دہ ہوگی۔“

اس کے ہونٹوں سے وہ غیر ارادی سی مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی۔ وہ چند لمبے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ بظاہر

پرسکون تھا لیکن اس کے ذہن میں یقیناً الجھن برپا تھی۔ آخر سانس لے کر بولا ”تھک ہے افضل صاحب! آپ کو چور پوچھنے میں بہت آپ کو بالکل جج بتاؤں گا۔“

”بالکل ٹھیک۔ میں آپ کے کچ کے لئے آپ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ آج کے دور میں جج کو غاش کرنا سب سے مشکل کام رہ گیا ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے پوچھا ”کیا آپ مرزا حکیم بیگ کے پچاس لاکھ کے مقروض ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے بلا تاہل جواب دیا ”اصولاً تو اس رقم بہت زیادہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن یہ مرزا حکیم بیگ کی شرافت کہ وہ اب تک صرف اصل زرعی شمار کر رہا ہے۔ اس میں سوڈا نہیں کر رہا۔“

”کیا وہ اس قرض کی واپسی کے لئے آپ پر دباؤ ڈال رہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مرزا حکیم بیگ جیسے لوگوں کو کسی پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا صرف کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے اور اگر کئی سال کے دوران وہ مجھ سے تین چار مرتبہ کہہ چکا ہے۔ آویں کو اس کا صرف ایک مرتبہ ہی کہہ دینا کافی ہوتا۔ اس نے تو وہ شخص رقم کا بندوبست کرنا یا پھر جان بچانے کے لئے ہو کر کسی محفوظ گونے کھدوے کی تلاش میں کسی سمت میں شروع کر دیتا۔ امید نہیں ہے کہ اسے زیادہ دور تک بھانگا ہوتا۔ اسی ملک میں۔ یا پھر دنیا کے کسی اور ملک کے کسی گناہ میں اس کی زندگی کی شام ہو جاتی۔“

”لیکن آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اس کی میرانی ہے۔ اس کا شخص سلوک ہے۔ مجھ کے تعلقات خاصے درستانہ رہے ہیں۔“

”آپ ابھی یہ قرضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں؟“ ہرگز نہیں۔ ورنہ میں بھلا حکیم بیگ کو قاتل کر دیتا کیوں دیتا؟ میں دراصل ابھی تک بڑی کمی دلیل میں پچھا۔ اب دھیرے دھیرے باہر آ رہا ہوں۔ ابھی تو میں اور غلط پوٹھی سے زندگی گزارنے اور ذرا سکون کی سانس لینے کے ہوئے ہیں۔ پہلے میں نے چھوٹے چھوٹے نوکوں کے چھوٹے قرضے ادا کرے ہیں۔ اس قسم کے قرض خواہ ذرا قوت سے ہوتے ہیں۔ توڑے تھوڑے جیسوں کے لئے سر راہ۔

کے پرل جاتے ہیں۔ اور سر راہ بے عرقی کرانے کی نیند لگی کو بے میں گولی کھا کر مرنا یا میرے لئے قابل تزیج ہے۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ قرض آپ نے کس مقصد سے لیا تھا؟“

”یہیں نہیں۔ اس میں چھپانے والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ناؤں سے بولا ”مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے ملک اور مردموں کے لحاظ سے میری کمائی کے ذرائع بھی کچھ زیادہ

ہو جائیں تو انسان بالکل ہی اوندھے منہ گرتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "آپ نے آج اسے فون کیا تھا۔ پھر کے قریب؟"

"ہاں۔" اس نے بلا جھجک کہا۔

"آپ اس سے ملنا چاہتے تھے؟"

"ہاں۔ وہ ان دنوں باہر سے آیا ہوا تھا۔ دروازے سے ملنا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا اس نے کوئی ایسی بات کی تھی کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ جائے گا؟"

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ وہ اب بھی بلا جھجکا ہٹ بولا "ہاں اس نے کہا تھا کہ وہ آفس کا بیرونی دروازہ غیر منتقل چھوڑ جائے گا کیونکہ اسے اچانک کہیں جانا پڑا تھا۔ وہ اس قسم کے کام کرتا رہتا ہے۔ اسے ان باتوں کی کوئی خاص فکر نہیں ہوتی۔ وہ اس شہر میں بھی۔ ان حالات میں بھی کبھی کبھی تیس لاکھ گاڑی کا دروازہ لاک کے بغیر۔۔۔

چالی انگلیش میں چھوڑ کر کسی دفتر وغیرہ میں کام سے چلا جائے گا اور اسے یقین ہوتا ہے کہ کوئی اس کی گاڑی کو نہیں چھوئے گا۔

حالا کہ ظاہر ہے گاڑی پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ یہ مرزا اکرم بیگ کی گاڑی ہے۔"

"بہت خوب۔" میں نے کہا "حالات کا وقت کیا ملے پالا تھا؟"

"پانچ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ اس سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اس سے قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں مزید حوصلہ حاصل کرنا چاہتا تھا اور خاصی لمبی حوصلہ حاصل کرنا چاہتا تھا کیونکہ مستقبل قریب میں تو میرے پاس اتنی بڑی رقم کا کوئی انتظام ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس اس موضوع پر اس سے ذرا تفصیلی بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے تمام حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور کئی سیکنڈ تک کچھ نہ بولا تو میں نے کہا "پھر آپ اس سے ملنے گئے؟"

"ہاں میرے پاس ان دنوں ایک پرانی سی گاڑی ہے۔ وہ خراب تھی۔ بیکینک کے پاس تھی۔ اس لئے میں جیسی میں گیا اور ٹھیک پانچ بجے اس کے دفتر پہنچا لیکن اس اپارٹمنٹ کا دروازہ منتقل تھا جسے وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مجھے دھچکا سا لگا کہ

اس نے وعدہ خلائی کیوں کی تھی۔ میں نے کئی بار کال کی، بجائی کہ شاید ابھی وہ اندر ہی ہو مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے سوچا شاید اس نے دروازہ غیر منتقل چھوڑ کر جانے کے بجائے چالی کس چھپا کر جانا بھڑ بھڑا ہوا۔ میں نے اپارٹمنٹ کے سامنے ٹیرس نما سے پر

رکھے ہوئے تمام گلوں کو بھی اٹھا کر دیکھا کہ شاید چالی ان میں سے

نہیں رہے۔ میں ذرا مفلحانہ سے ذہن کا آدمی تھا۔ شاید میری حریت کچھ مختلف رہی تھی یا آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میری حریت میں کچھ خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ بہر حال میں ٹائٹ کلب اور شراب خانے وغیرہ چلانے کو کچھ ایسا میوہ نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ میں کیا

ان دنوں بہت سے لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اور اگر اب آسانی سے اجازت ملنے لگے تو اب بھی بہت سے لوگ ان کا دباؤ کی طرف

لپکتے تھے۔ بہر حال مرکز شد برسوں کے دوران جب حالات اس قسم کے کاموں کے لئے بالکل ناموزوں ہو گئے تھے تو میں نے لائن بدلتے

اور کچھ دوسری طرح دیکھنا کما لے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ذہن بیش بہے کا دباؤ کی طرف بھاگتا تھا۔ چھوٹے موٹے کاروبار کرتا یا

محض گزارا کرتا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر کچھ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ شاید ماضی کے کچھ خوب صورت لمحوں کا ٹکس اس کی

نظروں کے سامنے رہا تھا "یہ تو میں اب آپ کو ذرا قناعت پسند سکون اور ذرا منظر الزان نظر آ رہا ہوں ورنہ میں تو ہر چیز کی

بے خواب طلب رکھنے والا۔۔۔ پارے کی طرح متحرک اور گردن ذرا لرزتی رکھ بات کرنے والا ہوں تھا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے کہا۔

"خیر۔ تو بات ہو رہی تھی ذرا مختلف قسم کے منصوبے کی۔" وہ لٹھری سانس لے کر بولا "آہم اس کا تعلق بھی تقریبات کے شعبے

سے تھا۔ میں نے کراچی کے ایک اور ساحلی مقام پر ایک اور بڑے لمبے لینڈ کا منصوبہ بنایا تھا جس میں دوسروں کو شریک کرنے کا کوئی

پروگرام نہیں تھا۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو جمع کر کے بھان مٹی کا کعبہ بنانے کے بجائے اکیلا ہی اپنی مرضی سے سب کچھ کرنا اور بڑا

شرکت وغیرہ مالک رہنا چاہتا تھا۔ شاید اور والے کو میری یہ سوچ پسند نہیں آئی یا پھر شاید کسی اور طرح دولت کمانا میرے مقدر میں

ہی نہیں تھا۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے گویا بات عمل کی "منصوبہ غلاب ہو گیا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "حالا کہ بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا گیا تھا۔ میں خود اپنے آپ کو تقریبات کے میدان کا بہت بڑا

باہر سمجھتا ہوں لیکن اس میں دوسرے کی ماہرین کے مشورے بھی شامل تھے مگر کسی کی کوئی تدبیر نہیں چلا۔ ذہن کی لیزر خورج کی مٹی

رقم ضائع ہو گئی۔ پابلی پر لاکھوں روپا ضائع ہو گیا۔ مختراہوں پر لاکھوں روپا ضائع ہو گیا۔ جیتی مٹیوں کو بڑے بڑے ڈنک لگ گیا

روہ کاغذ کاٹنے کے برابر ہو گئیں۔ صرف کرم بیگ سے ہی ہوئی رقم باقی رہی۔ بہت سے دوسرے چھوٹے موٹے قرضے اور میری اپنی بچی ہوئی مٹی بھی ڈوب گئی۔ میں نے بہت بڑا بچا اٹھایا تھا۔ اس میں کوئی محفوظ چلو نہیں رکھا تھا۔ یہی میری سب سے بڑی حماقت

ہی۔ ایسے پراجیکٹ بہت خطرناک ہوتے ہیں جو اگر غلاب

چنانچہ میں ٹیکسی میں بیٹھا اور یہاں آگیا۔

میں ایک لمحے غامضی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ سڑک پر نہ بولا تو میں نے کہا "ظاہر ہے اس قسم کی مصروفیت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران آپ کو اپنا کوئی جاننے والا دست یا شاسا تو میں ملا ہو گا جس نے آپ کو ساحل پر یا پانچ وغیرہ میں دیکھا ہو؟ جو اس بات کی شہادت دے سکتا ہو؟"

میں نے جرم و سزا کی بحث ہی کہانیوں میں چڑھا کر اس کی شہادت کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ ظاہر تھا کسی جانے تو وہ کسی مشتبہ شخص کی غیر حاضری کا ثبوت حاصل کرنے کے جوہر ذرائع ممکن تھے یہ ان میں سے ایک تھا کہ اہمیت وارنٹ پر کام انداز میں مسکرایا چیت اسے میری یہ بات کچھ پکا نہ دی گئی ہو۔

"ظاہر ہے انسان چل نہ دی... سمندر کے نظارے یا پانی میں بغیر کسی پروگرام کے کچھ وقت گزارنے جاتا ہے تو کہیں اس تحریری ریکارڈ محفوظ کر کے نہیں آتا اور نہ ہی لوگوں کو پکڑ کر اپنی صورت دکھاتا ہے کہ خواہ مخواہ حضرات! ذرا غور سے دیکھئے۔ میں یہاں موجود ہوں اور وقت بھی نوٹ کیجئے۔ وہ اسٹریٹ سے لےجے میں بولا۔

میں ایک ننگ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نورانی غبی ہوتے ہوئے بولا "یہ مغربی تفتیش کے طور طریقے اپنے ایں پا بہت مشکل ہیں افضل صاحب! میں تو نہایت ساف گوئی سے اعتراف کر رہا ہوں کہ میری اتنی دیر کی مصروفیت کا کوئی ثبوت قیام ہے۔ مجھے تو اس وقت اگر کلکشن کی ان بکٹوں پر کوئی شاسا جانے والا نظر بھی آجاتا تو شاید میں خود ہی اس سے نظر اٹھالیتا۔ پھپھالیتا۔ میں اس وقت کسی کا ساسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت ایک عجیب سی کیفیت میں گھوم رہا تھا جسے شاید آپ سمجھ سکیں۔"

"میں خوب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اسے اطمینان دلا "انسان پر مختلف حالات میں جو کیفیتیں گزرتی ہیں میں ان سب لذتوں اور لذتیوں سے واقف ہوں۔"

"یہ بھی غمیت ہے۔" اس نے سر ہلایا "بہر حال آپ کو بھی اندازہ ہونا چاہئے کہ اگر انسان کی کوئی واردات کر گزرتے نیست ہو تو پھر جانے واردات سے اپنی غیر موجودگی کے ثبوت تیار کرنا مشکل کام ہے؟ اگر میرے دل میں چر رہا تو میں آپ سے یہ نہ کہتا کہ میری اتنی دیر کی مصروفیت کا کوئی ثبوت یا کوئی گواہ نہیں۔ اس کے برعکس میں ثبوت اور گواہ کا پہلے ذکر کرتا۔"

پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا "بلکہ اگر زیادہ مجبوری آن پڑے تو میں اب بھی اپنے بیان میں ترمیم کر سکتا ہوں کہ میں کہتا ہوں کہ میں تو اس دوران قلائل شخص کے ساتھ اور ایسا کوئی "قلائل شخص" پیش کرنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔" ان سب باتوں کا مجھے بھی احساس ہے۔" میں نے حل

کسی کے نیچے ہو کر نہیں تھی۔ میں نے نیچے آکر چوکیدار سے بھی پوچھا کہ شاید وہ اسے دے گیا ہو مگر اس کے پاس بھی نہیں تھی۔ "پھر آپ نے کیا کیا؟"

"فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ کہیں اس کا موزا خراب ہونے کی نشانی تو نہیں تھی؟ میرے ذہن پر پہلے ہی کافی بوجھ تھا۔ اچانک بوجھ کچھ زیادہ گیا۔ پچھلے دنوں میرے سینے میں بھی کچھ تکلیف رہی تھی۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے میرا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد یہ "جنتی" مشورہ عنایت فرمایا تھا کہ میں فطرات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر دوں۔"

وہ دیکھتے لیکن استہزاء سے انداز میں ہنسا "ڈاکٹر کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دیتے ہیں۔ گویا فطرات سے پیچھا چھڑالیتا انسان کے اپنے بس کی بات ہے اور بہت آسان سا کام ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ انسان کے کپڑوں پر دھول مٹی لگ جائے تو وہ بھی آسانی سے نہیں جھڑتی۔ فطرات کو ذہن سے جھٹکنا تو بہت مشکل ہے۔ وہ تو نہ ہر کی طرح انسان کے خون میں سرایت کر جاتے ہیں۔ لیکن خیرے چارے ڈاکٹروں کا بھی کوئی تصور نہیں۔ مریض کی تحمل کے لئے انھیں کچھ تو کرنا ہوتا ہے۔ ان کے پاس یہی چند رنے رے سے ملتے ہوئے ہیں۔"

میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ اس کی سوچ سطحی نہیں تھی۔ وہ گہری سوچ کا مالک تھا۔ تاہم میں نے اسے اصل موضوع پر لانے کی کوشش کی "بیب کرم بیک کا آفس آپ کو مشغل ملا اور چاہی بھی نہیں مل سکی تو آپ نے کیا کیا؟"

"میں بتانے کے لئے میں پہلے آپ کو اپنی اس وقت کی ذہنی کیفیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ ملاحت سے بولا "میرے ذہن پر بوجھ تھا۔ میں نے سوچا ذرا ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ موسم برا خوشگوار تھا۔ ساحل وہاں سے دور نہیں تھا اور قدرے خشک ہوا ذیل کے بھیاک دھوئیں سے پاک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نوجوانوں کی طرح سہلے جانا، ٹھٹھا ہوا ساحل کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ مجھے اپنی نینش کچھ کم ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر میں پلے لیٹنے چلا گیا۔"

"پلے لیٹنے؟" میں نے ذرا حیرت سے دہرایا۔ "جی ہاں" وہ مسکرایا "پلے لیٹنے کے دونوں حصوں میں خوب رونق تھی۔ بہن بڑوں، عورتوں مردوں کا ہجوم تھا۔ میں انھیں دیکھتا رہا اور اپنے پلے لیٹنے کے غلاب منصوبے کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہاں سے میں نے در تین مرتبہ کرم بیک کے وٹرفون کیا لیکن وہاں کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے ملاقات اور مذاکرات کے لئے جو وقت نکالا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ میرا یہاں ہونے کا پتہ ضروری تھا۔

ابھی میں ایک مسئلہ حل نہیں کرپاتا تھا کہ دوسرے میں الجھ جاتا تھا۔ اس لحاظ سے تو کارکردگی بری نہیں تھی ویسے بھی ابھی تو محض آغاز ہی تھا تجربات ہر حال انسان کو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔

ہدایت لے بات جلدی قسم کر لی اور میرے ساتھ چل دیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹیلم کچھ اس طرح ہماری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں اس کے محبوب کو کسی قربان گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔

ہم جب کمرم بیگ کے دفتری اپارٹمنٹ پر پہنچے تو انسپکٹر رحیم گل نے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا ”اودا تم یہاں پہنچ گئے اب تو تفتیش کا لہڑی حاظف ہے۔“

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مذاق کے موڑ میں نہیں تھا۔ اس وقت وہ وردی میں تھا اور گرد اس کے ماتحت سرگرم نظر آ رہے تھے اور وہ ایک اہم آدمی کے قتل کے سلسلے میں جانے واردات پر تھا۔ ان حالات میں شاید اس کا مذاق کرنے یا مذاق سننے کا سوڈ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میری بات کے جواب میں جب اس نے مھس گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے پر اتفاق کیا تو میں نے اس کی مزید خبر نہیں لی اور اس کا مزید مذاق نہیں اڑایا۔

خفیہ ایجنسیوں کے آدمی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ صرف ایک ٹرا سرادر چوڑو اور ڈھڑنڈا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شاید پولیس کی کارروائی کی عمرانی کر رہا تھا۔ اب وہاں بہت سے پولیس والے دکھائی دے رہے تھے۔ جج صاحب کی لاش اٹھا کر لے جانی جا چکی تھی۔ اس کے باوجود پولیس والے نہ جانے کیوں بڑی مستعدی سے اوپر اڑھڑاتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ معلوم نہیں وہ اپنے آپ کو کن کاموں میں مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں ہدایت دانی کا تعارف کراتا، رحیم گل بنور اس کی طرف دیکھتے ہوئے خودی اندازہ لگاتے ہوئے بولا ”آپ یقیناً ہدایت دانی ہیں؟“

”جی ہاں۔“ ہدایت دانی نے شاید غیر ارادی طور پر ہونٹوں پر زبان بھرنے کے بعد جواب دیا۔

رحیم گل مجھ سے مخاطب ہوا ”مکرم بیگ نے مجھے بتایا تھا کہ تم ان کی طرف گئے ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم انہیں لے آؤ گے۔ اسی لئے میں نے پولیس کو دہا نہیں بھیجا تھا۔“

”بہت شکریہ۔“ میرے بتائے ہدایت دانی نے جواب دیا۔

اگر پولیس عین اس وقت وہاں پہنچی جب عذرا کا جالگوس شوہر زونی ہوئی بوش سے اس کا قہر بیانے کی مگر میں تھا تو ایک نیا ہی چکر شروع ہو جاتا۔

رحیم گل نے اپنی چھری دھیرے دھیرے دوسرے ہاتھ پر راتے ہوئے نہایت چڑخیال نظروں سے ہدایت دانی کی طرف

لگا ”اس کے باوجود بات کرنے سے ہی کوئی نتیجہ نکلا ہے۔ بات تو لڑنا ہی پڑتی ہے۔“

”ہاں یہ بات درست ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے تسلیم لیا پھر پوچھا ”آپ کا پروگرام کیا ہے؟ کیا مجھے آپ کے ساتھ لانا ہے گا؟“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا ”آپ کے حق میں بہتر تو کیا ہے لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو پولیس یا کسی خفیہ ادارے کے ایک ڈکڑا ہے ساتھ لے جائیں تو وہ آپ کی مرضی ہے۔“

”میں میں آپ کے ساتھ چلا پھرنے کوں گا۔“ اس نے ایک شدید سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ میں فوراً ہی اٹھ کھڑا رہا۔ اس نے میری تقلید کی۔

کالونز پر اُکڑو ٹیلم سے مخاطب ہوا ”میں شاید ”غیر معینہ“ کے لئے افضل صاحب کے ساتھ جا رہا ہوں۔ فی الحال ہونٹوں نظام جیسے تھامی سنبھالنا پڑے گا۔“

”یہ کیا پتھر ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔“ ٹیلم نے بظاہر مسکراتے رہے مگر حقیقت وہ گہرے نظر آنے لگی تھی۔

”پتھر کوئی خاص نہیں ہے۔“ میں نے اسے قہر دینے کی دھمکی لی لیکن ہدایت شاید اس وقت مصلحت اندیشی کو بہتر نہیں سمجھ رہا تھا یا پھر مصلحت اندیشی اس کی عادت ہی نہیں تھی۔

وہ میری بات کاٹنے ہوئے ٹیلم سے مخاطب ہوا ”پتھر بہت صاف ہے۔ جج عبدالسلام صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ ہے کہ یہ میرا کام ہے۔ جس جج عبدالسلام صاحب یا وہیں“

”میں بھلا انہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔“ ٹیلم تلخ لمبے میں بولی پھر بھی مجھے کچھ تو بتاؤ۔ تم پر قتل کا شبہ کسے اور کس طرح ہونے لگا؟“

ہدایت نے کافی اختصار سے اسے ساری صورت حال بتائی اس کے دوران ٹیلم ہاں پوچھتے ہوئے ہونٹوں میں دبانے ایک لگ اس کا طرف دیکھتی رہی اور غیر ارادی طور پر ایک ہاتھ سے دھڑکے ران کا پھڑکائی رہی۔ میں نے گہری دیکھی ”اب مجھے کچھ اضطراب احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے مکرم بیگ کے دفتری میں بھی کافی تفت صرف کر دیا تھا۔ اس سے پہلے جب شرافت علی مجھے میرے کس سے لے جانے کے لئے آیا تھا تب بھی کافی وقت ضائع ہو چکا۔ اب اور اب میرا بھی مجھے کافی دیر لگ گئی تھی جبکہ یہ ایک ہنگامی حالت تھا۔“

گھبراہٹ کی کارکردگی کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں تھی لیکن اگر اس تباہی سے دیکھا جائے کہ میں نہ تو کوئی بہتر انا اور تجربہ کار پولیس فیکر تھا اور نہ ہی کسی منفی ملک کا کوئی برا ہیوٹ سراغ رساں۔ تو یہ کارکردگی کچھ ایسی بری بھی نہیں تھی جبکہ میرے ساتھ ایک ملکہ یہ بھی تھا کہ ہر جھگڑے میں ایک نیا جھگڑا ہی نکلا رہتا تھا۔

دیکھتے ہوئے کہا "میں بہت بے چینی سے آپ کے بیان کا انتظار تھا  
ہدایت وارٹی صاحب!"

میں نے محسوس کیا کہ ہدایت کی رحمت ذرا پہلے پر گئی۔ رحیم  
محل کا یہ انداز نہ جانے کیوں بڑے بڑوں کا پتا بانی کر دیتا تھا حالانکہ  
اس کے چہرے پر شخوت، سفائی یا کونجی وغیرہ نہیں تھی۔ وہ ایک  
وجہہ نواز، جوان تھا۔ بظاہر اس کی شخصیت میں کسی کو مرعوب یا خوف  
زدہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی مگر شاید یہ اس کی دیانت داری  
اور بے خوفی کا رعب تھا جس سے سامنے والے کی شمی گم ہو جاتی  
تھی۔

ہدایت نے اچھی دہی رام کمانی شروع کر دی جو وہ مجھے سنا چکا  
تھا۔ میں اس دوران کرم بیک کی طرف چلا گیا۔ وہ کچھ دور ایک  
صوفے پر بیٹھا اس طرح سٹار کے کسل لے رہا تھا جیسے اس صورت  
حال سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گویا کسی پورسی تقریب میں  
آیا ہوا کوئی مہمان تھا۔ جو ایک طرف بیٹھا دل میں دعا کر رہا  
تھا کہ جلد از جلد تقریب ختم ہو تو وہ اپنے گھر جائے۔

"شرافت علی نظر نہیں آ رہا۔" میں نے اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے  
کہا۔

"پولیس کے آنے سے پہلے میں نے خود ہی اسے غائب ہونے  
کی ہدایت کر دی تھی۔" کرم بیک نے اطمینان سے جواب دیا  
"اس بے چارے کی شخصیت ہی کچھ ایسی ہے کہ ہر جرم کا شبہ فوراً  
اس پر جاتا ہے۔ اوپر سے اس کا ماضی بھی کچھ ایسا بے راز نہیں  
ہے۔ میں نے سوچا تھیں اس کی موجودگی کی وجہ سے پولیس اس  
کیس کو کچھ کا کچھ نہ بناوے۔ اس لئے میں نے اسے غائب کر دیا  
ہی بہتر سمجھا۔ ویسے میں نے خفیہ ادارے والوں سے اجازت لے  
لی تھی اور ضرورت کے وقت اسے واپس بھی بلا جا سکتا ہے۔"

"تم نے انیسٹر کو سب کچھ بتا دیا؟" میں نے دریافت کیا۔  
"ہاں جس طرح آپ نے مشورہ دیا تھا میں نے اسی طرح  
ساری بات جیج بتا دی ہے۔" اس نے جواب دیا پھر ایک لمحے کے  
توقف کے بعد پوچھا "یہ انیسٹر آپ کا دوست ہے؟"

میں نے احتیاطاً اس کا اعتراف نہ کرنا ہی بہتر سمجھا اور غصہ ڈی  
سانس لے کر کہا "پولیس والے بھلا کب کسی کے دوست ہوتے  
چیں۔ لیکن اس سے بہر حال شناسائی ہے۔ تمہیں کیسے اندازہ  
ہوا؟"

"جس طرح آپ اس سے آکر لے تھے اس سے میں نے  
محسوس کیا تھا کہ آپ اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔" وہ بولا۔  
"لیکن آپ نے دیکھا۔ اس نے جو آپ کی سردہری کا مظاہرہ  
کیا؟" میں نے گویا گھڑ کیا۔

وہ حرم امیر سے انداز میں دھیرے سے ہنسا اور بولا "یہ بے  
چارے بھی کیا کریں۔ مجبور ہوتے ہیں۔ جو بھی ان کی طرف دوستی  
کا ہاتھ بڑھاتا ہے یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ بھی نہ بھی ان سے کوئی  
کام تھا بڑھاتا ہے۔"

رحیم محل گویا خود پر مضطرب کرتے ہوئے بولا "جیج صاحب  
سے اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں رہتے آ رہے تھے۔ ان  
زندگی میں بھی گھر وغیرہ کا پتہ پالا ہی نہیں تھا۔ بہت محدود  
زندگی تھی اور بس۔ ہوٹل ہی ان کا گھر تھا۔ بہت سادگی۔  
تھے۔ ان کی تنخواہ اور دیگر مراعات وغیرہ میں سے اگر کچھ  
تو رفاہی کاسوں میں خرچ کر دیتے تھے یا بے گناہ پکڑے جا۔

باجائز کام کرانے کی کوشش کرے گا۔ ان کی دوستی سے  
انھانے کی کوشش کرے گا۔"

"اور وہ بھی مفت میں۔" میں نے لہجہ دیا۔  
وہ ذرا خوش دل سے ہنسا "جیج صاحب شاید یہ خیال بھی آپ  
شاید کیا بلکہ یقیناً آتا ہو گا۔"

رحیم محل نے اس دوران ہدایت وارٹی سے بات چیت  
کر لی تھی۔ وہ ٹپکنے کے سے انداز میں ہماری طرف آگیا۔  
شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ گشہہ گائے  
اُدھر اُدھر دیکھتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"تمہارے آنے سے پہلے ہم نے کچھ تحقیق بھی کر لی۔  
رحیم محل نے مجھے مطلع کیا۔

"بہت مستعد ہو گئی ہے ہماری پولیس۔" میں نے  
سانس لے کر کہا "جیج صاحب کے قتل کا معاملہ تھا۔ کا  
عام آدمی کے قتل کے سلسلے میں بھی تم لوگ اتنے تھ  
ہو جاؤ۔"

"تم قتل تو ہو کر دیکھو۔ ہم تمہارے قتل کی تحقیق بھی  
مستعدی سے کریں گے۔" وہ جواب دے بغیر نہ رہا۔

"میرا مسئلہ اور ہے محترم انیسٹر! تمہیں معلوم ہے کہ  
میں عام آدمی نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر تم نے میرے  
کیفر کردار تک نہ پہنچایا تو میری زندگی... بلکہ بد بدھ  
میں سے نہیں رہنے دے گی۔ ویسے... ہائی وائی۔ تم نے  
چلایا۔ میرا مطلب ہے تم نے کیا کچھ معلوم کیا ہے؟"

رحیم محل ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورنے کے بعد  
تو شاید تمہیں معلوم ہی ہو کہ جیج صاحب نے شادی نہیں کی  
"اوہ نہیں" مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے مشکل  
تھے۔ ذہن اور لائق تو وہ یقیناً ہوں گے کیونکہ اسے اہم  
کاغذ تھے لیکن شادی نہ کرنا یہ ذرا ایک الگ ہی قسم کی  
ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہاری یہ بے موقع چٹنے والی زبان ذرا دیر کے  
بائے تو میں مزید کچھ بات کروں۔" اب رحیم محل ذرا اذیت  
فرمایا۔

"ایک تو تم جہاں جاتے ہو انسان کی اگلا یہ خیال کی  
جینینے کی کوشش کرتے ہو۔" میں نے انہوں سے کہا "میرے  
کو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

رحیم محل گویا خود پر مضطرب کرتے ہوئے بولا "جیج صاحب  
سے اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں رہتے آ رہے تھے۔ ان  
زندگی میں بھی گھر وغیرہ کا پتہ پالا ہی نہیں تھا۔ بہت محدود  
زندگی تھی اور بس۔ ہوٹل ہی ان کا گھر تھا۔ بہت سادگی۔  
تھے۔ ان کی تنخواہ اور دیگر مراعات وغیرہ میں سے اگر کچھ  
تو رفاہی کاسوں میں خرچ کر دیتے تھے یا بے گناہ پکڑے جا۔



کاشٹیل دوسرے کمرے سے ایک بارش چھان کو لے کر آیا۔ اس کے کندھے پر اس دقت بھی ایک پرانی تھری مات تھری رانگل لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ادا کردار سننے پولیس والوں اور دیگر لوگوں کو دیکھ کر ریٹان تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ پھیلی پھیلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں جب شرافت علی کے ساتھ آیا تھا تو میں نے اسے بلڈنگ کے گیٹ پر نہیں دیکھا تھا آہم نے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ دوائی قسم کے چوکیدار اپنی ڈیوٹی کے دوران ادھر ادھر ہوتے رہتے ہیں اور آج کے دور میں مجرم بھنے طاقتور اور منظم ہو گئے ہیں اس کو کہتے ہوئے تو چوکیدار کے ہونے یا نہ ہونے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ چوکیداروں کے ہوتے ہوئے بھی وارداتی ہو جاتی تھیں اور منظم گروہوں سے قتل رکھنے والے مجرم تو بعض اوقات چوکیدار کو بھی ٹھکانے لگا جاتے تھے۔ سب سے زیادہ تیز رفتار ترقی جرائم کے میدان میں ہو رہی تھی۔ رجیم گل نے ہدایت دانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا ”تم نے اس سے پہلے کبھی اس آدمی کو دیکھا ہے؟“

”جی صاحب۔۔۔ ام نے اس کو آج ای دیکھا تھا۔“ چوکیدار نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا ”یہ بلڈنگ میں آئی تھی۔“

”آج کس دقت؟ صبح صبح نام بتاؤ۔“ رجیم گل بولا۔

”نیم تو ام کو ٹھیک یاد نہیں اے صاحب۔ لیکن یہ بلڈنگ میں آئی تھی۔ اما را خیال ہے اس وقت باجی بھائی کنگ اس دقت ام مصر کا نماز پڑھنے کے لئے وضو کرتی تھی۔“ چوکیدار نے بتایا اور پریشانی کے عالم میں سر کھانے کے لئے ہاتھ بلند کیا۔ پھر شاید اسے یاد آیا کہ اس کے سر پہ بکری تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا ہاتھ رکھا لیکن پھر اس نے بکری ہی نکھالیا۔

”ٹھیک ہے“ ج صاحب کی لاش تو تم دیکھ ہی چکے ہو اور تاپکے ہو کہ تم نے انہیں بھی اندر آتے دیکھا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ دونوں میں سے کون پہلے آیا تھا؟“ رجیم گل نے طاقت سے پوچھا ”ذرا دباؤ پر زور دو۔“

چوکیدار نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بار پھر سر کو بائیں کئے کے چپکی کو کھمایا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں ”ہاتھ لے“ لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھا پھریں ادھر ادھر دیکھا جیسے بھانسنے کے لئے راؤ غرار تلاش کر رہا ہو۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بیٹھے بٹائے کسی معیت میں چھن گیا۔ چند لمحے کے لئے اس نے پھر آنکھیں بند کیں۔ شاید ذہن پر زور دے رہا تھا جو بیٹھنے کے لئے ایک مشکل کام تھا۔

آخر کار اس نے آنکھیں کھولیں اور نہایت سادگی و دہانت داری سے بولا ”ام کو ٹھیک سے یاد نہیں اے۔ ام کو کیا نام تھا کہ یہ باتیں یاد رکھنے کا ضرورت پڑے گا۔ ایہ ہرزیا بڑا صاحب لوگ آتا

ی نہ کسی شخص کی مدد کرتے رہتے تھے۔ بہت ہی عجیب لائف ٹائل تھا ان کا۔ ان کا رہن سہن اور معمولات دیکھ کر کسی کے لئے یقین کرنا مشکل ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ نہالت کے ایک نہایت سینئر افسر تھے۔“

”ہاں اس قسم کے کردار تو اب قہے کمائیں کی نہنت ہوتے رہے ہیں۔“ میں نے اب سنجیدگی سے کہا۔ اس قسم کے کرداروں نے اس انجام پر واقعی دل میں آسف کی لہر ابھرتی تھی۔

رجیم گل سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا ”وسط درجے کے سہولت میں دو کمروں پر مشتمل ایک سوئٹ ان کے لئے مخصوص تاجس کا وہ پرانی اور معانی شے سے امانہ کر لیا اور کرتے تھے اور صرف فون کرنے پر انہیں ضرورت کی ہر چیز وہیں مل جاتی تھی۔ ان کے ایک پر آہ جاننے والے نے بتایا ہے کہ انہیں اسی طرح رہنا نہ تھا اور انہیں نے کبھی گھر کا کھیر پالنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔“

رجیم گل صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے ہدایت کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ہدایت کی طرف ہنور بیٹھتے ہوئے بولا ”آج شام جج صاحب کو ایک ٹیلی فون کال موصول ہوئی تھی۔ یہ کال ریسیو کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ ہوٹل کی آپریٹنگ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ باہر جا رہے تھے اگر ان کے لئے کوئی فون آئے تو اس نمبر پر ملا دیا جائے۔“

اس نے نمبر بتایا اور کچھ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے سپینس بڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مرزا کرم بیگ اور ہدایت بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر اسے خودی کھتا پڑا ”وہ یہ بیان کا نمبر ہے۔ یعنی جج صاحب کسی کا فون آئے پر یہاں کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ آپریٹنگ سے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ فون کس کا تھا اور کیا بات ہوئی تھی۔“

”فون کس دقت آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپریٹنگ صبح طور پر یاد نہیں۔ ظاہر ہے وہ ٹیلی فون بوڈ پر کافی مصروف رہتی ہے۔“ رجیم گل نے جواب دیا مہر جال اسے اتنا اندازہ ہے کہ وہ کال چار سے چوبیس کے درمیان آئی تھی۔“

وہ کرم بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”فون آپ نے کیا تھا بیک صاحب؟“

”نہیں۔ میں نے نہیں کیا تھا اسلئے صاحب!“ کرم بیگ نے انگریزی میں جواب دیا۔

”سفر واپس آیا آپ نے۔؟“ رجیم گل نے ہدایت دانی کی طرف دیکھا۔

”نہیں جناب! میں نے بھی نہیں کیا تھا۔“ ہدایت نے منہ داند لیجے میں غراب دیا۔

رجیم گل نے انگلی کے اشارے سے ایک کاشٹیل کو قریب بلایا اور اسے حکم دیا ”چوکیدار کو بلاؤ۔“

زیادہ شامت اسی کی آئے گی۔ اسی کی چڑی اور حسے کی چڑی  
نے تو قربانی کا بکرا بننے کے لئے دل ہی دل میں اپنے آپ کو  
بھی شروع کر دیا تھا۔ اتنی آسانی سے گلو خلاصی ہوئے اسے  
خواب لگ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد رحیم گل نے اس طرح دو دو  
چہرے پر رگڑے جیسے مسکندہ دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔  
کسی سانس لے کر اس نے خواب ناک سی نظروں سے  
دائیں کی طرف دیکھا اور غری سے بولا "حالات آپ کے  
کچھ اچھے نہیں ہیں دائیں صاحب!"

"میرے حق میں تو حالات ایک مدت سے اچھے نہیں  
الیکٹرک صاحب!" ہدایت دائیں ذرا سختی سے مسکرایا "کچھ دنوں  
میں اس خوش قسمتی میں مبتلا ہونے ہی کا تھکا کر شاید میرا ساتھ  
سے نکل آیا ہے لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے یہ خوش  
دل سے نکال دینی چاہئے۔"

"شاید" رحیم گل اس کے لیے کی جذباتیت سے متاثر  
غیر مبہم سے لیے میں بولا "آپ کا اعتراف ہے کہ آپ غرا  
بیک کے پچاس لاکھ کے مقروض تھے۔ اور یہ فرض کافی پرانا  
تھا؟"

"جب محرم بیک صاحب اس بات کا تذکرہ کریں گے  
میں بھلا اس کو کیسے بھٹکا سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔  
"اس قرضے کا کوئی تحریری ثبوت موجود ہے؟" رحیم گل  
پوچھا۔

"نہیں سر! بیک صاحب جیسے لوگوں کو تحریری ثبوت  
ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ جب چاہیں کسی سے اپنا قرضہ وصول کر  
لیں۔ اور اگر انہیں ایک لیسہ بھی امکان نظر آ رہا ہو کہ وہ کسی  
اپنا قرضہ وصول نہیں کر سکیں گے تو اسے وہ قرضہ دیں گے  
نہیں۔" ہدایت دائیں نے محرم بیک کی طرف دیکھتے ہوئے  
دیا۔

"ٹھیک ہے" رحیم گل نے سر ہلایا پھر کھارگر گلا  
کرتے ہوئے کچھ مختصر سے لیے میں بولا "مجھے یہ بھی بتا دیا  
جج عبدالسلام صاحب کے بارے میں آپ کے دل میں کچھ  
جذبات نہیں تھے مجھے ان کی وجہ بھی معلوم ہو چکی ہے۔  
میں آپ کے منہ سے سنا چاہوں گا کہ آپ کی ان کے بارے  
کیا رائے تھی؟"

"اب جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں کیا میرا ان کے بارے  
اپنی رائے ظاہر کرنا ضروری ہے؟" ہدایت گویا جرات سے  
ہوئے بولا۔

"جی ہاں" رحیم گل نے خشک لیے میں جواب دیا  
پوری امید رکھنے کے میں آپ کو کسی غیر ضروری کام کی ذمت  
دوں گا۔"

یہ ام تو بس گیت کا خیال رکھتی ہے۔ ام کو آواز اسے کہہ رہی  
دیکھنے کے کوئی شرارتی اور بد معاش قسم کا لڑکا مرکا لوگ اندر نہیں  
آئے کوئی اسلمہ بدوق لے کر اندر نہیں آئے جو آدمی چل چل  
سے شریف اور بد صاحب لوگ نظر آتی ہے ام اس کو نہیں بدلتی۔  
کچھ نہیں پوچھتی۔ یہ صاحب بھی اندر آئی اور وہ جو صاحب کوئی کھار  
مرکا اسے وہ بھی اندر آئی۔ لیکن ام کو یاد نہیں کہ کون پہلے آئی۔  
ام ایسی چیزوں کو یاد نہیں رکھتی۔ ابھی آپ بولے گی تو آئندہ یاد  
رکھے گی۔"

رحیم گل نے کسی قسم کی برہمی کا اظہار کرنے یا اس پر دعب  
جھاڑنے کی کوشش نہیں کی اور قطعی انداز میں سر ہلاتے ہوئے  
ملاحظت سے بولا "ٹھیک ہے کسی چوکیدار سے اس قسم کی کوئی  
بات معلوم ہونے کی امید مشکل سے ہی پوری ہو سکتی ہے پلو خیر  
بتاؤ کیا تم نے ان صاحب کو داپس جانے دیکھا تھا؟" اس نے  
ہدایت دائیں کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں صاحب! ام اس کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔" چوکیدار  
نے اب ذرا سکون کی سانس لیتے ہوئے جواب دیا "ایک بات تو  
یہ کہ اندر گیت کے پاس ایک جگہ ام نماز پڑھتی اسے ام اندر  
نماز پڑھتی تھی تو کافی لوگ اندر بھی آئی۔ باہر بھی گئی۔ شاید یہ اس  
وقت نکلی ہو۔ ام اس کو جاتے نہیں دیکھا۔"

"بلذتکے سے باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟" رحیم  
گل نے پوچھا۔

"جی صاحب! پیچھے دو سرا گیت بھی اسے چھوٹا گیت۔"  
چوکیدار نے جواب دیا۔

"لیکن تم نے سر حال ان صاحب کو جاتے نہیں دیکھا؟" رحیم  
گل نے تصدیق چاہی۔

"نہیں صاحب! ام جھوٹ نہیں بولے گا۔ بے شک ذکر کی  
جائے ام اس کو جاتے نہیں دیکھا۔ مگر یہ امارا غلطی نہیں اسے  
صاحب۔ مگر پھر بھی۔ اگر امارا غلطی اسے تو ام مانی آجی اسے۔"  
اس کے چہرے پر زبردست الجھن کے آثار تھے۔

اس کے انداز پر رحیم گل کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی  
مسکراہٹ آگئی۔ تاہم وہ اسے دباتے ہوئے جلدی سے کانٹیل  
سے مخاطب ہوا "اس کا بیان لے لیا گیا ہے؟"

"جی سر!" کانٹیل نے مستعدی سے جواب دیا "مکرم  
صاحب نے بیان لے لیا ہے اور اس سے انکو خاموشی لگوا لیا ہے۔"  
رحیم گل چوکیدار سے مخاطب ہوا "ٹھیک ہے تم جاؤ اور اب  
ذرا زیادہ دھیان سے اپنی ذمہ داری۔"

"ام جانے؟" چوکیدار نے حیرت سے پوچھا۔ شاید اس بے  
چارے کو یقین نہیں تھا کہ اسے اتنی آسانی سے جانے دیا جا رہا  
تھا۔ اس نے تو شاید ہی سوچا ہو کہ ایک بڑے آدمی کا اس بلذتک  
میں قتل ہو گیا تھا اور چوکیدار ایک چھوٹا آدمی تھا اب سب سے

ہو جاتے ہیں اور مجھ جیسے بے ضرر لوگ جن کے جرائم کی نوعیت درحقیقت اخلاقی ہوتی ہے وہ آپ کے قابو میں آجاتے ہیں۔ ان پر آپ خوب اپنا غصہ نکالتے ہیں۔ انہیں روک کر آپ کو اپنے سارے اخلاقی اصول یاد آجاتے ہیں، کچھ اس قسم کی جذباتی تقریر کی محفل میں نے۔ اس سے پہلے کہ پولیس والے مجھے تھکیت کر دور لے جاتے ہیں نے خوب دل کا غبار نکالا تھا۔ بیج صاحب نے مجھے دایم لہ لایا تھا۔ میں سمجھا وہ میری جذباتی تقریر سے متاثر ہو گئے ہیں۔ قلموں میں اسی ہوتا ہے مگر انہوں نے تو ہیں عدالت کے جرم میں میری سزا میں وہاں کا اضافہ کر دیا۔

”میں نے سنا ہے اس کے علاوہ بھی آپ نے کچھ کہا تھا۔“

رحیم گل اس کے چہرے سے نظر نہائے بغیر بولا۔  
ہدایت نے ایک لمحے کے لئے سر جھکا لیا۔ یکدم ہی وہ غصا افسردہ دکھائی دینے لگا۔ ذرا اٹھکا ہٹ کے ساتھ وہ بولا ”نیکم بھی نیل جلی جلی تھی۔ اگر آپ سب کچھ جانتے ہیں تو پھر نیکم کو بھی جانتے ہوں گے۔ وہ میری دوست ہے۔ ہم دونوں کی وفات کی وجہ سے ہی سارا افسار کھڑا ہوا تھا۔ بہر حال وہ مجھ سے بہت پہلے نیل سے باہر آئی اور بیج صاحب نے مجھے آٹھ ان کر ایک لفٹ سے اس کی شادی بھی کرادی۔ اپنی وفات میں انہوں نے بڑی ملاتی خدمت انجام دی تھی۔ اس وقت مجھے پہلے سے زیادہ غصہ آیا تھا اور میں نے نیل میں کالی بکواس کی تھی۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”مثلاً؟“ رحیم گل اس سے سب کچھ کھلانے پر تیار ہوا تھا۔  
”میں نے یہی کہا تھا کہ میں برا شریف اور مذہب آدمی ہوں لیکن زندگی میں اگر کبھی موقع ملا تو میں بیج صاحب کا بی ضرور صاف کر دوں گا۔“ ہدایت اٹھکا ہٹ آمیز لہجے میں بولا پھر گویا اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ”انسان مذہب جذباتی ہوتا ہے تو اس قسم کی بکواس کر آپ سے معلوم نہیں ہوگا کہ کبھی کبھی اس قسم کی بکواس گلے بھی جذباتی ہے۔ لاشعور ہی طور پر مجھے احساس تھا کہ نیل کی چار دیواری تو بہت اونچی ہوتی ہے اور نیل کے باسی ہو گیا دینا سے کتے ہوتے ہیں۔ میری بات بھلا قیدیوں کے سوا کس نے سنی ہوگی لیکن مجھے بعد میں پتا چلا کہ باہر کی دنیا میں بھی یہ بات بہت سے لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ یہ دینا واقعی ایک حیرت کدہ ہے۔“

”ہاں یہ دنار واقعی ایک حیرت کدہ ہے۔“ رحیم گل نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ ”لیکن اگر اب میں اپنی رائے کا اظہار کروں تو آپ کو زیادہ حیرت زدہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ ایک منطقی رائے ہوگی۔“

ہدایت نے سوالیہ نظروں سے رحیم گل کی طرف دیکھا تو وہ بولا ”یہ ایک حیرت سے دو شکار کرنے والی بات ہے۔ آپ یہاں آئے آپ نے دیکھا کرم بیک موجود نہیں ہے اور ساڑھے سات تک اس کے واپس آنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ آپ کے ذہن میں اچانک ایک منصوبہ آیا۔ آپ نے بیج صاحب کو فون کیا اور کوئی

”گناہ ہے تب اس معاملے میں میری پوزیشن اور بھی زیادہ خراب کریں گے جبکہ مجھے پہلے ہی اپنی پوزیشن کچھ اچھی نظر نہیں آ رہی۔“ ہدایت واپس اب کافی احتیاط سے بات کر رہا تھا۔ اب شاید اس کے اندر کا خوف کچھ کم ہو گیا تھا۔ کرم بیک قدرے لا تعلقی سا بیچاریہ منتظر رہا تھا۔

”میں تو خود کو آپ کی پوزیشن اچھی یا خراب کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں تو اس کا زیادہ انحصار خود آپ پر ہے۔ آپ سچ بولنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کو کم نقصان پہنچے گا۔“

رحیم گل نے فلک الجبہ میں مشورہ دیا۔  
”یہ آپ کا خیال ہے انسپٹر صاحب! ہدایت واپس کراہنے کے سے اعزاز میں بولا ”بیج صاحب کے بارے میں اگر میں سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کروں گا تو مجھے زیادہ نقصان پہنچے گا۔“

”اس کے باوجود میں آپ کو سچ ہی بولنے کا مشورہ دوں گا۔“ رحیم گل نے اصرار کیا۔ ہدایت واپس نے چمت کی طرف دیکھ کر کمری سانس لی اور بے بسی آہ عزائم میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا ”تھیک ہے! اگر آپ مجھے سچ بولا کر بھائی چہ حوائے نہ کئے ہی ہوئے ہیں تو مجھے شاید اسی کو اپنا نصیب سمجھنا پڑے گا۔ یہی نصیب ہے کہ مجھے تھانے میں کمال اور حوڑاتے ہوئے سچ نہیں بولا دیا بلکہ اس عمر پارٹمنٹ میں۔ مزید لوگوں کی طرح صوفے پر بیٹھ کر ایک مذہب اور شائستہ پولیس آفیسر کے سامنے بولا پڑا ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا اور کچھ سوچ کر بولا ”ویسے بات کچھ ایسی خاص بھی نہیں ہے اور اب تو میں بیج صاحب کو تقریباً بھولنے ہی لگا تھا۔ میں تو ان کے خلاف صرف اس وقت بھڑکا تھا جب انہوں نے مجھے سزا سنائی تھی۔ میں نے کچھ بکواس کی تھی جس کے نتیجے میں انہوں نے تو ہیں عدالت کے جرم میں میری سزا میں وہاں کا اضافہ کر دیا تھا۔“

”میں اصل میں یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے کیا کہا تھا؟“ رحیم گل سے بولا۔

”میں نے کچھ اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔ بیج صاحب! اس معاشرے میں بڑا بڑا انسانی خطرناک و ہشت گرد قاتل اور بے شمار سنگین جرائم کے عادی لوگ دہشتاں پھر رہے ہیں مگر ان پر آپ کا کوئی بس نہیں چلا۔ اگر ان میں سے ایک آدھ کبھی کبھار کسی طرح گرفتار ہو کر آپ کے سامنے پہنچ بھی جائے تو آپ پولیس کو گواہ پیش کرنے کا حکم دیتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کے لوگوں کے خلاف کون کونسی دے کر اذیت کی موت مرنا چاہیے گا یا اپنے بچوں کو تشدد سے موانہ چاہیے گا چنانچہ گواہ بیسرنہ ہونے کی وجہ سے وہ پیشہ ور اور انسانی خطرناک جرم ہوتے ہوئے بھی سینہ آگے اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے آپ کی عدالتوں سے رخصت

ذہن قسم کی کوئی چیز بنانے پر تکتے ہوئے ہیں۔ جس کو ایک عام  
برکس میں ہوں۔" اس کے اس اکسار پر میں بھی دل ہی دل سے  
اسے داد دے بغیر نہ سکا۔

رجیم گل ایک بار پھر ہدایت دہائی کی طرف متوجہ ہوئے  
ہوئے بولا "آپ کے پاس اپنی اس وقت کی مصروفیات کا بھی کیا  
ٹھوس ثبوت نہیں ہے جس دوران جج صاحب کو قتل کیا گیا۔ کہ  
نے خودی کہا ہے کہ آپ قتلے رہے۔ پھر بے لینڈ چلے گئے  
ایسی مصروفیت نہیں ہے جس کا کوئی ثبوت نہ پیش کیا جاسکے۔  
معاملے میں آپ کے سوا کسی اور کی طرف ذہن جاننا بہت مشکل  
ہے۔"

"دراصل اس وقت میری گردن پٹی ہے۔ پھندا میری گردن  
میں فٹ آتا ہے۔" ہدایت قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

"ہدایت صاحب کو قاتل ثابت کرنے میں ایک دکاندار  
ہے۔" میں نے کھنگو میں داخلگی کی "جب یہ یہاں آئے  
اپارٹمنٹ کا دروازہ منتقل تھا اور اس کا اعتراف خود کرم  
صاحب کر چکے ہیں۔ اپارٹمنٹ میں داخلے کا کوئی اور راستہ  
نہیں ہے۔ آخر ہدایت صاحب اندر کیسے پہنچے؟"

"سوال تو معقول ہے افضل صاحب۔" رجیم گل نے میرا  
طرف دیکھ کر سہلے ہوئے ذرا اٹھکے لیجے میں کہا "مگر ہے کہ  
نے واقعی ان معاملات میں بڑی گہری دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔"  
"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب انسپکٹر صاحب  
میں نے طریقے طور پر مذکور لیجے میں کہا۔"

رجیم گل اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ہدایت سے مخاطب  
"آپ ذرا کھڑے ہونے کی زحمت کریں گے ہدایت صاحب؟"

ہدایت اٹھ کھڑا ہوا۔ رجیم گل اس کے سامنے جا پہنچا اور  
لامٹ سے بولا "میں نہایت شرطانہ سے انداز میں آپ کی علامت  
لینا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ برائیاں متائیں گے۔"

"میں برا متائے کی پوزیشن میں کہاں ہوں انسپکٹر صاحب؟  
ہدایت خراستہ زانی کے سے انداز میں بولا۔

رجیم گل نے اس کی جیبوں سے چھریں نکال کر پٹائی پر رکھ  
شروع کیں۔ ان میں ایک بڑا تھا۔ چابیوں کا ایک کچھا تھا۔ ایک  
قلم تھا۔ سیلفین میں بیک شدہ دو سگار "ایک ٹکٹھا اور ایک بندوق  
تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن جب ہدایت کی اندرونی جیب سے  
پستول برآمد ہوا تو ہدایت کی رگت پھینکی پڑ گئی۔ رجیم گل پستول اس  
مکانہ کے لگا۔

ہدایت گریا اپنی جرات مجتمع کرتے ہوئے بولا "میں اس پستول  
کو اپنے ہاتھ میں ہی چھپا کر بھی آسکتا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ  
نہیں تھا۔ اتفاق سے افضل صاحب اسے دیکھ چکے تھے۔ میں اسے  
چھپا کر آتا تو زیادہ مشکوک معلوم ہوتا۔ دیسے برسرِ سبیل خاک ہوتا۔  
چلوں کہ اس کا شمس موجود ہے۔"

پکڑے کر اٹھیں یہاں ہلا لیا۔ انہیں گولی مار کر آپ یہاں سے  
جائے ہو گئے۔"

"گٹھ میں اتنا ذہین اور اتنا جرات مند ہوا کہ اس قسم کے  
منصوبے اتنی تیزی سے میرے ذہن میں آیا کرتے اور اتنی ہی تیزی  
سے میں ان پر عمل بھی کر کرتا۔" ہدایت ٹھنڈی سانس لے کر  
بولا۔

"آپ جیسے انسانوں سے اگر اس قسم کے کام سرزد ہوتے ہیں  
تو چاہیک ہی سرزد ہوتے ہیں۔ سوچ کچھ کر اور باقاعدہ منصوبہ بندی  
سے تو پیشہ ور مجرم کام کرتے ہیں۔" رجیم گل بولا "میرا حال آپ کا  
چند منٹ یا چند سیکنڈ نہیں بتایا ہوا منصوبہ بھی برا نہیں تھا۔ اس طرح  
ایک تو آپ کو جج صاحب پر اپنے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع  
مل گیا۔ دوسرے آپ نے مرزا کرم بیک کو ایسی پوزیشن میں  
پھنساوا کہ اس کے لئے آپ سے اپنا قرضہ وصول کرنا تقریباً ناممکن  
ہو جائے۔"

ہدایت کراہنے کے سے انداز میں ہنسا "انسپکٹر صاحب! آپ  
اس طرح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس طرح کمائوں  
میں کئے جاتے ہیں مگر یہ کمائوں کی نہیں 'خاتون' کی دنیا ہے۔ میری  
غصے کی آگ تقریباً ٹھنڈی ہی ہو چکی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں  
تو جج صاحب کو تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ انسان کی زندگی میں کبھی  
کبھار ایسے جذباتی لمحے آجاتے ہیں جب وہ اس قسم کے دعوے کر  
گزرتا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں میری مراب زیادہ عرصے تک  
اپنے جذباتی دعووں اور ارادوں میں پھنسے رہنے کی نہیں ہے۔  
دوسرے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں  
کہ کرم بیک کو جیل بھجوا کر میں اس کا قرضہ ادا کرنے سے بچ سکتا  
ہوں۔ کرم سامنے بیٹھا ہے۔ میں اس کی پٹہ پیچھے بات نہیں کروں  
گا۔ کرم ان لوگوں میں سے ہے جن کا نیت درگ ان کے جیل  
جائے۔ یا کہیں بھی جائے کے بعد بھی کام کرتا رہتا ہے۔ اس کا  
قرضہ دینے سے تو میں ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہوں کہ میں خود  
جیل چلا جاؤں۔"

"ہو سکتا ہے آپ نے یہی سوچا ہو۔" رجیم گل اب واضح  
مسکراہٹ کے ساتھ بولا "مثلاً آپ نے کرم بیک کے قرضے کی  
ادائیگی سے بچنے کے لئے ہی اپنے جیل جانے کا بندوبست کیا ہو۔"  
"ابھی میں اپنی زندگی سے اتنا تیز اثر نہیں ہوا تھا۔" ہدایت  
نے جواب دیا۔

رجیم گل نے گردن ہٹا کر کرم بیک کی طرف دیکھتے ہوئے  
سجیدگی سے کہا "میں بیک صاحب، ایسا وارثی صاحب بچ کر رہے  
ہیں کہ آپ جیسے لوگوں کا نیت درگ ان کے جیل چلے جانے کے  
بعد بھی کام کرتا رہتا ہے؟"

"خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" کرم بیک اکسار سے  
مسکراتے ہوئے بولا "وارثی صاحب تو خواہ مخواہ ہی مجھے گاؤں دار یا

دروازے پر پہنچ کر کہنے لگا۔ "اے کھلائی رکھتے ہوئے اس کی اندرونی تاب کا نشان دیا کر"۔ "نہیلا اور ایک چالی بار دہرائی اب میں داخل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ چالی سوراخ میں داخل ہی نہیں ہوئی۔ تب اس نے دوسری چالی آزمائی۔ وہ چالی سوراخ میں داخل تو ہوئی لیکن گھوم نہیں سکی۔ تیسری بھی سوراخ میں داخل ہوئی لیکن گھوم نہیں سکی۔

رجیم گل نے جو چھی چالی کو آزما کر دیکھا اور اس بار کلک کی بلکی سی آواز کے ساتھ تاب کا دبا ہوا نشان دہاں ابھرا اور آٹالے کی زبان اندر چلی گئی۔ رجیم گل نے تیسری سے چالی کو کئی بار کھمایا اور کئی بار آٹالوں کھلا اور بند ہوا جیسے کوئی ساپ بار بار اپنی زبان منہ سے نکال رہا ہو۔

آخر کار رجیم گل نے چالی آٹالے سے نکال لی۔ دروازہ زور سے بند کر دیا اور میری طرف کھڑے ہوئے بولا "اب غالب تمہاری سمجھ میں آگیا ہو گا کہ مسٹر ہدایت دارنی کس طرح اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے یا اب بھی تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت ہے؟ مزید کوئی ثبوت درکار ہے؟"

ہدایت دارنی کا چہرہ یکدم شدید بدلتا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے کچھ لہرا سا گیا۔ ایک لمبے لمبے کے توجھے شبہ ہوا کہ وہ مجھ پر گر پڑے گا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو رجیم گل اس سے قاطب ہوا "آپ اس پر کوئی تبصرہ کریں گے دارنی صاحب؟" اس کا لہجہ بظاہر بڑی لٹامت لے ہوئے تھا لیکن ہدایت دارنی اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا تھا کہ اس میں جیسے زہر کا اندازہ نہ کر سکتا۔

"مم۔۔۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میری واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ بھلا یا "یہ چالی میری نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔ میری چاہیوں میں کیسے آئی۔"

رجیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "چاہیوں میں بھی اب بڑی بے راہ روی پیدا ہو گئی ہے۔ خود بخود گھر سے نکلتی ہیں اور جس کی رنگ میں چار اچھی چاہیوں دیکھتی ہیں اس میں جا کھتی ہیں۔" ہدایت کی کیفیت اس وقت یقیناً ایسی نہیں تھی کہ اس کے کھڑ و مزاج سے محفوظ ہو سکتا۔ کرم بیک کی سنجیدگی میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

رجیم گل نے غالب مزید کھڑ و مزاج کے مظاہرے کا ارادہ ترک کر دیا اور ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مدبرانہ لہجے میں بولا "یہ کام آپ دونوں میں سے کسی ایک کا ہے یا تو کرم بیک اتنے احمق تھے کہ انہوں نے ایک ایسے جج کو اپنے عدالتی فیصلے میں قتل کر ڈالا جن کی عدالت میں ان کے مقدمات ایسی زبردست تھے کہ ان کی ہر ہدایت صاحب نے انہیں پھانسی کی رسیک سوجھی اور اس پر عمل کر گزرنے ان دونوں میں سے کوئی ایک بات سمجھ ہے۔"

ہدایت دارنی اب بھی کچھ جھوٹا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ رجیم گل نے بظاہر اسے سارا دینے کے لیے کہا۔ "اب غالب تمہاری

"مجھے یقین ہے کہ لائسنس موجود ہو گا۔ میں لائسنس دیکھنے کے لئے جی نہیں کروں گا۔ جس ممکن سے کسی کو قتل کیا جاتا ہے اس کا لائسنس ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لائسنس صرف اس اختیار کا ریکارڈ رکھنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ کسی کو قتل کرنے کا لائسنس نہیں ہوتا۔" رجیم گل بولا۔

"میرا ماننا کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں نے یہ ہسپتال جائز اور قانونی طریقے سے رکھا ہوا ہے۔" ہدایت خفیف سی چڑچاہٹ کے ساتھ بولا۔

اس دوران رجیم گل ہسپتال کا میگزین کھول کر دیکھ چکا تھا اور اسے سوچنے بھی چکا تھا۔ وہ سر ملاتے ہوئے بولا "آپ خواہ مخواہ اس ہسپتال کے بارے میں وضاحتیں پیش کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے حال ہی میں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کا میگزین پورا بھرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بڑے کیلیبر کا ہسپتال ہے۔ میں جج صاحب کی پیشانی پر موجود سوراخ کا بڑی باریکی سے معائنہ کر چکا ہوں۔ انہیں نہایت کم کیلیبر کے ہسپتال سے گولی ماری گئی تھی جس کی قواؤں میں شاید اس اپارٹمنٹ کے بند دروازوں سے باہر نہ گئی ہو۔"

ہدایت کے چہرے پر قدرے غلامت کے آثار نمودار ہوئے لیکن رجیم گل دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈرامائی سے انداز میں بولا "اہم بات یہ نہیں ہے کہ آپ کی جیب سے وہ ہسپتال برآمد نہیں ہوا جس سے جج صاحب کو قتل کیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ کے پاس ہسپتال موجود رہتا ہے یعنی آپ ہسپتال استعمال کرنے کے اہل ہیں۔ ہسپتال کا کیا ہے؟ ایک انسان کی جیب میں ہو سکتا ہے۔ دوسرا کہیں اور بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ ممکن ہے کام ہو چکے کے بعد اب وہ دوسرا ہسپتال سمندر کی تہ میں گھس موجود ہو۔ سمندر میرا سے زیادہ دور بھی تو نہیں ہے اور آپ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ بے لیز بھی گئے تھے۔ سمندر اور بے لیز کے درمیان چند قدم ہی کا فاصلہ ہے۔"

"آپ جو چاہیں فرض کر سکتے ہیں جناب۔" ہدایت بے بسی سے بولا "کوئی کسی کو کچھ فرض کرنے سے کیسے روک سکتا ہے؟"

"کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر کے روک سکتا ہے۔" رجیم گل نے جواب دیا اور ہدایت کی باقی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے فون نمبر کی چھٹی سی نوٹ بک کے اوراق سرسری انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھے۔ پھر اس کے بڑے میں جھانکا۔ دونوں چیزیں اس نے دیکھی تھیں۔ یہ وہی چاہیوں اور چاہیوں کا چھٹا اٹھایا جو چہرے کے ایک چھوٹے سے ٹکس میں لپٹا ہوا تھا۔

اس نے ایک لمبے کچھ سوچا پھر چاہیوں کا چھٹا لے بیٹھو دروازے کی طرف چل دیا۔ ہدایت گویا غیر ارادی طور پر کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے کرم بیک کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گویا باہلی خواست افکار اور میرے ساتھ چل دیا۔

در حقیقت وہ اسے اور زیادہ مرعوب کرنے کے لئے اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے بولا "آپ نے آخری بار کسی ہسپتال سے فارغ کب کیا تھا رائل صاحب؟ آج شاہم؟"

"نہیں نہیں ہرگز نہیں۔" ہدایت ہڑا کر جلدی سے بولا۔

"ایک تودہ دن پہلے؟" رحیم گل بدستور اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں۔" ہدایت ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "آپ شاید میری بات کا فہم نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہسپتال ہمیشہ میرے پاس رہا ہے مگر میں نے آج تک کوئی نہیں چلائی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ زندگی میں صرف چند ایک مرتبہ ہسپتال جیب سے نکالنے کی فورت آئی اور سامنے والے کو محض مرعوب کرنے سے ہی کام چل گیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میں نے صرف اپنے دفاع کے خیال سے ہسپتال اپنے پاس رکھا ہے لیکن دل ہی دل میں ہمیشہ یہی دعا کی ہے کہ مجھے کوئی چلانے کی ضرورت نہ پڑے۔ مجھے معلوم ہے انجیکٹر صاحب! ایک بار کوئی چلتی ہے تو پھر سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔ مجھے کبھی کوئی چلانے کی خواہش محسوس نہیں ہوئی۔ ہسپتال بھی محض اپنے چٹے اور اس دور کی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے رکھا ہے ورنہ میں یہ بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے اس قسم کی چیزیں رکھنے یا اپنی طاقت کا اظہار کرنے کا تقاضا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں بہت سی سببیں اور اس پسند آوری ہوں انجیکٹر صاحب!" وہ بہت بے ساختگی اور دہائی سے یہ سب کچھ کہتا چلا گیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ رحیم گل پر اس کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس کا بازو چمکڑا اور ہدایت کو اس سادے کے لئے میرے کندھے سے آگے نکالا۔ رحیم گل اب کرم بیگ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "آپ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟ آپ نے آخری مرتبہ فارغ کب کیا تھا؟"

"مجھے اپنے ہاتھ سے فارغ کرنے کی ضرورت شاید نادری پیش آتی ہے۔" کرم بیگ نہایت بے خوفی اور خود اعتمادی سے مسکراتے ہوئے بولا "انہم دو ماہ پہلے میں نے اپنے ہاتھوں سے بہت سے فارغ کئے تھے۔"

"کس بد نصیب پر؟ یا مجھے یوں پوچھنا چاہئے کہ کس بد نصیبوں پر؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔

"کچھ خرگوش تھے کچھ مرغابیاں تھیں۔ کچھ خیر تھے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "میں دراصل اپنے ایک زمیندار دوست کے ساتھ ٹھہرے قریب اس کے علاقے میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا ذرا نشانہ ہی تو لایا جائے کس بالکل ہی آؤٹ آف پیکس نہ ہو جاؤں۔"

"مقتصد یہ کسے؟ آپ دونوں کا دعویٰ ہے کہ آپ میں سے کسی نے بھی حال ہی میں کسی کس سے کوئی نہیں چلائی؟" رحیم گل نے ایک بار پھر تصدیق کے لئے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ کرم

بیگ نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا جبکہ ہدایت نے بھی سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے اگر آپ دونوں کے ہاتھوں کا پورا ٹیسٹ کر لیا جائے تو آپ دونوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟" گل بولا۔

"ہیرا فین ٹیسٹ؟" ہدایت نے قدرے حیرت سے دہرایا کرم بیگ خاموش رہا۔

"ہاں یہ ہاتھوں کا ایک ٹیسٹ ہوتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ کسی نے حال ہی میں کس سے فارغ کیا ہے یا نہیں۔ پچھلے ٹیسٹ صرف ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا تھا۔ حالانکہ بہت کمزور اور سادہ سائٹ ہے۔ اب اپنے ہاں بھی ہونے لگا ہے۔" رحیم گل نے بتایا۔ پھر وہ کرم بیگ سے مخاطب ہوا "آپ کو یہ ٹیسٹ کرانے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"کرم بیگ کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولا "مجھے تو کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں چاہتا ہوں پولیس اچھی طرح اطمینان کر لے۔ میری پوزیشن پہلے ہی بڑی نازک ہے۔ میں اچھا نمائی نہیں چاہتا۔"

"آپ کو اگر اعتراض ہو آج بھی آپ کو ٹیسٹ کے لئے ہی پڑتا ہے کہ صاحب!" رحیم گل نے گویا اس کی خوش فہمی دور "میں تو رہا پورا چھٹا مجھے ہر ذرا سے بے ساختگی کی کارروائی پوری کرنی ہے۔ آپ دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"دونوں کو نہیں۔ تینوں کو۔" میں نے لقمہ دیا "میں یہاں جا کر کھیاں تو ذرا ہی ادا ہوگا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ ہمیں کہنے یا نہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم تو ہر حال میں ساتھ ہی جاؤ گے تم تو اس معاملے میں اب یقیناً پولیس کے کوم چلتے ہیں کچھ ہو۔" رحیم گل منہ بنا کر بولا۔

"بلوخر تم نے اعتراف تو کیا کہ پولیس کی کوئی ڈم بھی ہوتی ہے جس میں کوئی چلا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

رحیم گل کہا جانے والی نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ اس نے اب نے جواب دیا کہ کہ بات بدعائن کی کو شش نہیں کی۔ اس نے اب ایس آئی آکر کرم کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہم پولیس کی جیب میں روانہ ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ کرم بیگ اور ہدایت دامنی دونوں ہی اس وقت خبردار سی حراست میں تھے اور اسے ایس آئی آکر ان پر نظر رکھتے ہوئے تھا۔ ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ کرم

یا ہدایت میں سے کوئی بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے باوجود اسے ایس آئی آکر کا ہاتھ مستقل طور پر اس کے ہولسٹر پر تھا۔ رحیم گل نے جیب ڈرائیو کرنے کے لئے کسی کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہدایت کو اب گویا چپ لگ گئی تھی۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد کرم بیگ نے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

مصرے سینہ کو جکھ تانا چاہتا ہوں۔" رحیم گل بولا پھر وہ میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تم جیسے لوگوں نے جو یہ اثر بنا رکھا ہے تاکہ پولیس کے جکھے میں شاید کوئی ایسا آدمی ہو آئی نہیں جو رشوت نہ کھانا ہو۔ یہ اثر درست نہیں ہے۔ میں اپنی صفائی تو فراموش کرنا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں بھی چند منٹ کی فرصت ملے تو میرے قہانے میں آنا۔ میں تمہیں ایک کاسٹیل سے ملواؤں گا جو پانچ وقت کا نمازی ہے، شری داؤھی رکھے ہوئے ہے اس نے زندگی میں کبھی رشوت نہیں کھائی اور اس کا بیٹ اس سے ملتا ہے کہ وہ ایک بچی بہتی کی جھونپڑی میں رہتا ہے اور اس کے بچے اکثر اوقات چٹنی سے روٹی کھاتے ہیں مگر اس دور میں اور ان حالات میں بھی اس کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہو سکا۔"

"میرے خدا۔" میں نے بے اختیار لخصی سانس لی "تیک لوگوں کے یہی حالات سن کر تو بانی لوگوں کی بہت فوٹ جاتی ہے اور وہ لالچ کے مغرب کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں لیکن خیر۔ ایسے بے مثال لوگوں کو اور دلائل جانے کیسے عظیم الشان ملے سے نوازے۔ شاید ایسے لاکھ لاکھ لوگوں کی وجہ سے ہی تمہارا حکم ابھی تک قائم ہے ورنہ شاید اب تک تو لاکھ بدمعاش اور بدبخت گردن لوگوں کا آلیٹ بنا کر کھا چکے ہوتے۔"

حکرم بیک کو شاید میرے ارشادات غالب اور پولیس کے حالات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تدرے بے چینی سے پہلو بدل کر ٹانگ سے بولا "اگر آپ پولیس لیبارٹری کے حال سے ایسے ہی غیر مطمئن ہیں تو پھر اس کے رزلٹ پر کیسے مجھوسا کیا جاسکتا ہے؟"

"میں تو میں تانے لگا تھا۔" رحیم گل بولا "اس وقت ہم پولیس لیبارٹری نہیں جا رہے ہیں۔ ایک بہت اعلیٰ جدید اور منظم قسم کا کیونٹی اسپتال اس شہر میں موجود ہے۔ اس کی لیبارٹری بڑی عمدہ اور جدید قسم کی ہیں۔ بعض نازک اور خاص معاملات میں ہم ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور اس کے لئے معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ اپنی لیبارٹری اور سرکاری اسپتالوں کے علاوہ ان کی رپورٹ بھی ہمارے جکھے میں مستعملی جاتی ہے۔ اس وقت ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

"وہ حکرم بیک نے صرف اتنا کہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد رحیم گل بولا "میں جس ٹیسٹ کی بات کر رہا ہوں، بیرونی ممالک میں تو یہ آتشیں ہتھیار استعمال ہونے کے ہر مقررہ کیس میں بیسیوں سال سے ہوتا رہا ہے ہمارے ہاں چند سال سے ہی شروع ہوا ہے لیکن بہت کم آفسر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں زیادہ تر پولیس والے ہر کیس میں سب سے زیادہ ذرا تنگ دہم لیبارٹری اور چمچر ٹیسٹ یا ڈیٹا ٹیسٹ سے

مصرے تو ہمیں پولیس لیبارٹری جانا چاہیے تھا لیکن ہم وہاں نہیں جا رہے۔" رحیم گل نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"پولیس لیبارٹری کو جدید بنانے کی تھوڑی بہت کوششیں کی گئی ہیں لیکن زمانے کے لحاظ سے وہ اب بھی خاصی فرسودہ ہے اور اس کا سادہ سامان ناقابل اعتبار ہے۔ پولیس کے پاس اس قسم کے کاموں کے لئے تھوڑی نہیں ہوتے۔" رحیم گل نے بتایا۔ میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا "اگر پولیس والے اپنی تنخواہ جکھے کی جیسے طور پر دے دیا کریں اور خود صرف اور سبکی کامی پر گزارا کریں تو حکم بہت سے کاموں میں خود کفیل ہو سکتا ہے اور پولیس والوں کی صحت پر بھی کوئی خاص فرق نہ پڑے۔ بے چارے خواہ مخواہ ہی کھٹنا اپنی حیرتی تنخواہیں وصول کئے جاتے ہیں۔ تنخواہوں سے ان کے بچوں کا بیج خراج بھی پرا نہیں ہوتا ہو گا۔"

رحیم گل نے گردن جھکا کر اس طرح مجھے دیکھا کہ اگر نظروں سے غفل ہونا ممکن ہوتا تو اس وقت میں تین چار مرتبہ گل ہو چکا ہوتا۔ میں نے ہلدی سے مصنوعی کھیرا ہٹ کے ساتھ کہا "سامنے دیکھو میری جان! اس رفتار سے ذرا نیچے تک کرتے وقت قاتل نظروں سے لاپرواہ نہیں دیکھا کرتے۔ آدمی منزل پر پہنچنے کے بجائے یہ دھواور پہنچ جاتا ہے۔ کم از کم میں پولیس کی گاڑی میں مرزا پسند نہیں کروں گا۔"

"اگر تم نے پولیس کے بارے میں اس قسم کی مزید کوئی بات اس کی تو میں لات مار کر تمہیں گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔" وہ غرا۔

"ناؤک ٹانگ میں موج آجائے گی۔ مجھے لات مار کر پیچھٹانا آسان نہیں ہے۔" میں نے اسے مزہ چلا "تو یہ جب تم اپنی بات کو تو یہ میت کہا کہ کولات مار کر پیچھٹ دوں گا بلکہ اس طرح کہا کہ کولات مار کر پیچھٹ دوں گا۔"

حکرم بیک دھڑکے سے نہیں دیا۔ رحیم گل اس کی طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "آپ اس کی باتوں کا برا مت منائیے گا کچھ سال پہلے تک یہ سرکس میں سمجھو ہوا کرتا تھا۔ اللہ کے چمچتر چاڑھ کر دلت دے دی سیٹھ بن بیٹھا۔"

"پنڈ کیس کے اوہ برا نہیں منا رہے۔ جس رہے ہیں۔ برا منانے والے ہنسنا نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔

ہدایت بدستور خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت درم ہی مسکراہٹ تھی اور وہ بھی روح سے خالی تھی۔ حکرم بیک نے نہایت مزہ بانہ انداز میں رحیم گل کو واپس اصل موضوع پر لانے کی کوشش کی "تپ لیبارٹری کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

"جی ہاں۔ وہی بتاتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں اس

استفادہ کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر لکھ دیا۔

اس بارور جم کل نے مجھ سے ایجنسی کی کوشش نہیں کی اور سنی ان سنی کر دی۔ یہ شاید اس کی نئی حکمت عملی تھی۔ کرم بیک نے نہایت سنجیدگی سے اس سے پوچھا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس قسم کا ٹیسٹ ہوتا ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم تو ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں گا تو سائنس کے موضوع پر چھوٹا سا ٹیکہ ہو جائے گا۔ کیا آپ اس قسم کا ٹیکہ پسند کریں گے؟" رجم کل بولا۔

"معلومات میں خود اس اضافہ ہی سی۔" کرم بیک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "آپ ذرا آسان زبان میں سمجھائیے گا۔"

"بات ہی بڑی آسان اور سیدھی سی ہے۔" رجم کل بولا "جب بھی کسی آنکھیں اٹھیا رہے ہوں تو ناکھٹ کے کچھ ذرات ناکھٹ کرنے والے کی پٹیلی پر جم جاتے ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتے اور بہت جلدی آسانی سے صاف بھی نہیں ہوتے۔ ہیرافین ٹیسٹ کے ذریعے اصل میں انہی ذرات کی موجودگی کا پتا چلایا جاتا ہے۔ ہاتھ پر شفاف، نظر شدہ اور نیم گرم ہیرافین کا اسپرے کیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی ایک تہ جم جاتی ہے۔ ٹائٹریٹ کے ذرات اگر مساموں میں بھی کھس گئے ہوں تو ہیرافین کے گرم ہونے کی وجہ سے نکل آتے ہیں اور ہیرافین پر چپک جاتے ہیں لیکن اب بھی وہ آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ اس ہیرافین کی تہ اُتار کر ایک اور کیمیکل میں ڈالی جاتی ہے اس کا نام ذرا مشکل سا ہے اگر آپ کہیں تو وہ بھی بتا دوں؟"

"ٹیسٹ بتا ہی دیں۔ کیا صحیح ہے۔" کرم بیک نے جواب دیا۔ میں نے کرم بیک سے کہا "آپ اس بے چارے کو اپنی قابلیت بھانسنے کا پروا اور اس موقع فراہم کر رہے ہیں یہ اصل میں صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ پولیس والے اسے بھی جاہل نہیں ہوتے جتنا انہیں سمجھا جاتا ہے۔"

رجم کل نے اس بار بھی میری طرف توجہ نہیں دی اور کرم بیک کو بتانے لگا "اس کیمیکل کا نام "ٹوائی فینی لائن" ہے جس میں ہیرافین کی بھی ہوئی پٹیوں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ ان پٹیوں پر اگر ٹائٹریٹ کے ذرات موجود ہوں تو وہ پٹے ہو جاتے ہیں اور صاف نظر آنے لگتے ہیں اس کا مطلب ہوتا ہے کہ پچھلے چند گھنٹوں کے دوران اس شخص نے ناکھٹ کیا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ میرا ٹیکہ ختم۔"

"خیر۔" اٹھٹیس ٹیکہ ٹیکہ نہیں تھا۔ "کرم بیک مسکراتے ہوئے بولا "صرف اس کیمیکل کا نام ذرا بھاری بھر کم تھا۔"

چند منٹ بعد ہم لوگ اسپتال پہنچ گئے گاڑی پارکنگ لائن میں کھڑی کر کے رجم کل ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ اے ایس آئی آکرم پیچھے پیچھے تھا اور اس کا ہاتھ بدستور ہولسٹر تھا۔ مجھے

ایک آدھ مرتبہ پہلے بھی کسی کی عیادت وغیرہ کے سلسلے میں اس اسپتال میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ واقعی قریبی رشتہ محالہ ہے۔ معیار کا اسپتال تھا۔

مگر اونٹن طور پر ہی ایک بہت بڑے رشتے میں لیبارٹری چلا ہوئی تھی۔ جس میں گاؤں بڑوں پر قطار در قطار کپڑا اونٹن وغیرہ چھلی ہوئی تھیں۔ سائنسی آلات بھی جگہ جگہ سرانجامے کھڑے تھے اور ان کے درمیان سفید اور زرد میں اساتر اور کپڑے چھلکے اور خواتین لیبارٹری ٹیکنیشنز یا چیتھالو جٹ وغیرہ اور مردوں کو آگے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ لیبارٹری کے چاروں طرف شیشے کی دیواریں تھیں۔ اس سے نہ صرف خوب صوفی پیدا ہو گئی تھی بلکہ اسپتال میں آتے جاتے ہوئے تمام لوگ اس جدید لیبارٹری کے نظارے سے مرعوب بھی ہو سکتے تھے۔

رجم کل نے استقبال پر اپنا دماغ تیار کیا۔ استقبال ٹکر کے فوراً فون پر کسی سے بات کی۔ چند لمحوں بعد ہی ایک سوڈا بونڈ فضا ایک طرف سے پکا چلا آیا۔ اس کی جیب پر اکاڑ احمد کا کالج کیڑا تھا اور عمدہ ڈائریکٹر لیبارٹری درج تھا۔ رجم کل نے انہیں بڑی ہی اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔ وہ ہمیں فوراً ۳۳۳ سیکنڈ میں روم "میں لے گیا۔ اس سے ملتی ایک وینٹ لائن پر بھی موجود تھا۔ اکاڑ احمد نے انٹرکام پر کسی سے رابطہ کیا۔ چند لمحوں بعد لیبارٹری ٹیکنیشن آگیا۔ پہلے کرم بیک کو ٹیسٹ کے لئے پیش کیا گیا۔ اس کے تمام کوائف درج کئے گئے انہیں کپڑے میں ڈھک لیا گیا۔ پھر ایک مشین سے رجم کل کی موجودگی میں اس کے ہاتھ پر ہیرافین کا اسپرے کیا گیا اور اس نمونے کو ایک جار میں ڈال کر اس پر نام وغیرہ کا جو ٹیکل چسپاں کیا گیا اس پر رجم کل کے علاوہ میرے دستخط بھی کواہ کے طور پر حاصل کئے گئے۔ بڑی احتیاط سے سب کام ہو رہا تھا۔

نمونہ لیبارٹری میں چلا گیا اور چند منٹ بعد ہی کپڑے چھپی ہوئی رپورٹ کے ساتھ واپس آگیا۔ جس میں ایک مختصر خط میں لفظ "ہمیکینو" نمایاں تھا۔ یعنی کرم بیک کے ہاتھ پر ہیرافین ٹائٹریٹ کے ذرات نہیں پائے گئے تھے۔ کرم بیک پہلے بھی کچھ ایسا پریشان نہیں تھا لیکن اس رپورٹ کے اند کو اس کے چہرے پر ہلکا سا ہلاکت پڑ گئی۔

اب ہدایت وائلی کی باری تھی۔ اسی طریقہ کار کے مطابق اس کا بھی ٹیسٹ لیا گیا۔ چند منٹ بعد رپورٹ آئی تو اس میں لفظ "بازو" نمایاں تھا۔ یعنی اس کے ہاتھ پر ٹائٹریٹ کے ذرات پائے گئے تھے۔

"تمہیں یقین ہے کہ رپورٹ بالکل درست ہے؟" رجم کل نے لیبارٹری ٹیکنیشن سے پوچھا۔

جواب اس کے بجائے ڈائریکٹر نے دیا "آپ کو معلوم ہی ہے آپ کے گلے کے لئے ہمارے ہاں رپورٹ کتنی احتیاط سے تیار کی



سے بولا "اب مجھے یہ کرنا پڑے گا کہ دو تین ماہ تک ملک سے باہر نہیں جاؤں گا تاکہ آپ کے یا عدالت کے کسی بھی اچانک بلاوے پر حاضر ہو سکوں۔"

"ہاں بہتر یہی ہے۔" رحیم گل بولا "نبائے اس کے کہ ہمیں آپ کا نام الیکٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کرنا پڑے یہ زیادہ اچھا ہو گا کہ آپ اپنی خوشی سے ہی ملک میں رہیں۔"

"جو حکم سرکار کا۔" کرم بیک بیٹے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو ذرا ٹم دیتے ہوئے بولا "میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

رحیم گل نے اپنے احتیاط کو چلنے کا حکم دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوا "اگر تمہارے پاس گاڑی نہیں ہے تو میں تمہیں ہوسٹل تک چھوڑ دوں گا۔" اس کا لہجہ کسی حد تک دوستانہ ہی تھا۔

"شکر ہے میرے پاس اس وقت گاڑی موجود ہے اور میں تمہارا احسان لینے سے بچ گیا ہوں۔" میں نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کس کس احسان سے بچ گئے؟" وہ شاید اپنی مسکراہٹ کو شاطرانہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "جس قسم کے کاموں میں تم ٹانگ اڑانے لگے ہو ان میں تو ہمیں قدم قدم پر ہمارا احسان لینا پڑے گا۔"

"خدا مجھے ایسے وقت سے بچائے۔" میں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

وہ مسکراتا ہوا اپنے آدھیں اور اس پراسرار سی شخصیت کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد یکدم ہی فلیٹ میں سناٹا چھا گیا حالانکہ ابھی پہنچا ہوا افراد ہیں موجود تھے کسی میں 'کرم بیک' اس کے دو گمنامین اور وہ شخص جو غالباً اس کا کیشئر 'اکاؤنٹنٹ یا غیر قسم کی چیز تھا۔

میں اور کرم بیک چند لمبے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر کرم بیک مسکراتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے اس پکرے خاصے آسمانی سے میری جان بچوٹ گئی۔ ورنہ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرا کام ختم ہو گیا یا نہیں؟" میں نے یہ سوال گویا اپنے آپ سے کیا تھا۔

"ظاہر ہے ختم ہو گیا۔" کرم بیک دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "میں نے آپ کی مدد صرف اس لئے حاصل کی تھی کہ جج صاحب کے قتل کا الزام مجھ پر نہ آنے پائے۔ متعلقہ پولیس آفیسر نے مجھے شک و شبہ سے بالاتر قرار دے دیا ہے۔ میرا مقصد پورا ہو گیا ہے اب اگر محض ایک گواہ کے طور پر مجھے بھی تھانے پکڑی میں پیش ہونا پڑا تو ہولوں گا۔ ایسے معاملات میں مدد کے لئے میرے پاس بہت سے وکیل موجود ہیں۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں نے چند گھنٹے میں بیس لاکھ روپيا کما لیا ہے۔" میں نے اس سادہ لوح رسائی کی سی حیرت سے کہا

جاتی ہے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تجربہ خود بیف بیٹھا ہو بیٹھنے لگا ہے۔"

ہدایت دہانی اس وقت میرے قریب بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ پکڑا کر مجھ پر لڑھک گیا۔ اسپتال میں ایک نئی بنگ دوڑ شروع ہو گئی۔ ہدایت کو اسٹرچر پر ڈال کر امیر جیسی دارو میں لے جایا گیا۔ دو تین ڈاکٹر آگئے لیکن ہدایت کو چار پانچ منٹ بعد ہی ہوش آ گیا اور وہ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود خود ہی اٹھ بیٹھا۔

اب اس کی حالت بہتر نظر آ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی مدد سے یا اندیشے کی انتہا سے گزر جانے کے بعد پوسٹکون ہو جاتا ہے۔ شاید اس کا شعور میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہر مصیبت سر پر پڑنا خود کو تو پڑی گئی ہے اسے تو اب بھگتنا ہی پڑے گا خواہ خواہ غم و تشویش سے ہلکان ہونے کا کیا فائدہ۔ شاید ہدایت کی کیفیت کچھ اسی قسم کی تھی۔

رحیم گل نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ ساتھ چلنے کے لئے تیار تھا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکٹروں نے بھی اجازت دے دی تاہم وہ اسے ایک آدھ انگلیشن لگانے سے باز نہیں رہے۔ کچھ دیر بعد ہم گاڑی میں بیٹھے واپس جا رہے تھے واپسی کا سفر خاصی سوگوار سی خاموشی کے ساتھ طے ہوا۔

کرم بیک کے اپارٹمنٹ میں واپس پہنچ کر رحیم گل نے وہاں موجود اٹھری پراسرار سی شخصیت کو ایک طرف لے جا کر رازدارانہ سے انداز میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر واپس آکر ہدایت سے مخاطب ہوا "مجھے افسوس ہے مسٹر وائی! لیکن مجھے بہر حال آپ کو جج صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنا پڑے گا۔"

"ان رسمی الفاظ کی کیا ضرورت ہے انسپکٹر صاحب! ہدایت قدرے سچی ہے بولا "میں تو کافی دیر سے خود کو گرفتار ہی سمجھ رہا ہوں۔"

رحیم گل نے دو پولیس والوں کو بلایا اور ہدایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میں جھکڑی لگا کر نیچے لے جا کر گاڑی میں بٹھاؤ۔ لیکن دیکھو کوئی بد تمیزی یا سختی نہ کرنا۔"

پولیس والے اسے جھکڑی لگا کر لے گئے۔ جاتے وقت اس نے جن نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا وہ بلاشبہ دل میں غش پیدا کر دینے والی تھیں۔ میں جو اپنا حضرت خرابانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

کرم بیک بولا "میں تو اب خود کو آپ لوگوں کے شبے سے آزاد سمجھوں یا؟"

"تمہاں لیکن جب بھی پولیس یا عدالت کو آپ کی گواہی کی ضرورت پڑی تو آپ کو آنا پڑے گا۔" رحیم گل نے جواب دیا۔

میں نے اب تک ہر طرح سے تعاون کیا ہے اور آئندہ بھی میں ہر طرح سے تعاون کے لئے تیار ہوں۔ "کرم بیک خوش خلقی

جس کی کوئی بڑی لائری نکل آئی ہو۔

"افضل صاحب! آپ ایک بڑے بزنس مین ہیں آپ کو تو اس پر حیران نہیں ہونا چاہیے" حکم بیک گویا میری حیرانی پر حیران ہوتے ہوئے بولا "بڑے بزنس میں تو ایسا ہی ہوتا ہے بعض اوقات راہ چلتے لاکھوں کا فائدہ یا لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ایک بار جمنا میں منگا پور سے لندن جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک بڑا پاکستانی صنعت کار سفر کر رہا تھا۔ یوں سمجھ لیں وہ اس وقت کا نیکسٹل میکس تھا اور ان دنوں ہماری نیکسٹل انڈسٹری کے حالات بھی بہت اچھے تھے۔ اسے ایک کارخانہ لگانے کے لئے خاص قسم کی مشینری کی ضرورت تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ نئی جیسی لیکن تھوڑی بہت چلی ہوئی مشینری مل جائے۔ اس میں اسے بہت فائدہ تھا۔ اتفاق سے میری پندرہویں سالہ بیٹی جانان کے ایک صنعت کار سے منگا پور میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی کمپنی کے پاس بالکل دینی مطلوبہ مشینری معمولی استعمال شدہ حالت میں بڑی تھی اور یوں سمجھئے کہ وہ اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا لیکن ابھی اس نے اس کے لئے کوششیں شروع نہیں کی تھیں۔ اتفاق سے اس کا وزٹنگ کارڈ میرے پاس موجود تھا۔ میں نے پاکستانی صنعت کار کو پیشے میں اتار دیا۔ لندن سے بھاگا بھاگا دوسرے روز پاکستان پہنچا۔ اسی آفس میں بیٹھ کر میں نے صرف چند فنون اور پندرہ فیکس کئے۔ اپنا کیشن پکا کرتے ہوئے اور دونوں کے فائدے کا خیال رکھتے ہوئے میں نے سودا کرایا اور صرف تین دن کی گفت و شنید میں مجھے تین ملین ڈالر مل گئے۔ روپے نہیں امریکی ڈالر۔"

وہ مریات سے انداز میں مسکراتا "تو صاحب! بزنس تو اسی کو کہتے ہیں۔ بلکہ میں تو اسے کاروبار ہی کہتا ہوں۔ یعنی شخص کسی کاروبارنگ کارڈ آپ کے پاس موجود ہونے کی وجہ سے کوئی بڑی بزنس ذیل ممکن ہو جاتی ہے۔ آپ کے ساتھ بھی میرا معاملہ شاید صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ بیج صاحب کی بیب سے آپ کا کارڈ نکل آیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ پیردانش کے معاملے میں آپ نے کیا کیا تھا۔ اتفاق سے مجھے اس کے کہیں کے بارے میں ساری معلومات حاصل تھیں" بیجے اندازہ تھا کہ اس میں آپ نے کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی لئے مجھے آپ کی مدد حاصل کرنے کا خیال آیا اور میرا فیصلہ واقعی بڑا کارآمد ثابت ہوا۔

"لیکن یہ درحقیقت بزنس تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"میں تو ایسی بڑی بزنس ہی سمجھتا ہوں جس میں کم از کم کسی ایک پامال کو کسی کچھ فائدہ پہنچ جائے۔" حکم بیک بولا "اگر یہ بزنس نہیں تھا تب بھی مجھے اس پر خوشی ہے آپ کی آمد میرے لئے بھانگوان ثابت ہوئی۔ دونوں ہی کو کچھ فائدہ پہنچ گیا۔ آپ کو آپ کے وقت کی قیمت مل گئی اور میں ایک بڑے پیکر میں ملوث ہونے سے بال بال بچ گیا۔"

"چلیں۔ آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہو جاتا ہوں۔"

میں نے اجازت چاہی تو وہ لفٹ تک مجھے چھوڑ دیا اور مضبوطی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا "رابطہ دینا چاہئے افضل صاحب!"

"رابطہ یقیناً رہے گا۔ کام منٹ جانے کے بعد بھی انسان کے مراسم تو ختم نہیں ہو جاتے چاہئیں۔" میں نے اس کی تائید کی لفٹ آنے پر بیچے آیا۔

شفیع شاہ بے چارہ اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں صبح تک کے لئے اسے گھر جانے کی ہدایت کی اور اوپر آکر اسے کمرے میں پہنچ کر سو گیا۔



صبح اپنے کان کے قریب ٹھک ٹھک کی آواز سن کر میری آنکھیں کھلی لیکن بیدار ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ آواز کان کے قریب سے نہیں آ رہی تھی بلکہ کوئی دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ نیز سے پوچھ لیا اس کے ساتھ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو حیران سے دھندلک دم بھٹ گئی۔ سامنے غلام کھڑی تھی۔

وہ کل شام جیسی تروتازہ اور سراپا قامت تو نہیں لگ رہی تھی لیکن اب بھی کچھ کم پر کشش نہیں تھی۔ اس وقت وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔ میک اپ معمولی سا تھا اور خاص اہتمام سے نہیں کیا گیا تھا۔ آنکھوں میں شاید شب بیداری کی سرخی تھی اور وہ ناپائیدار غمت میں تیار ہو کر آئی تھی تاہم اس کے وجود سے کچھ ایسے کلون کی مدد سمیٹ کر ضرور پھوٹ رہی تھی۔

میں نے کچھ ہاتھ بٹھے بغیر اسے اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔ وہ معمولی حد تک غریبی کی طرف مائل ایک دروازہ پر عورت تھی لیکن ہوا کے ایک نہایت سبک خرام جھوٹے کی طرح اندر آئی۔ میں نے دروازہ آگے سے منتقل کر دیا۔ پھر گھوم کر اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا لیکن وہ کمرے کی نگ رابرداری میں ہی تن کر کھڑی تھی اور اپنے بھروسہ پر وجود سے گویا میرا بھی راستہ دکھاتے ہوئے تھی۔

"ہدایت کو گرفتار کروا کے آپ کو کیا مل گیا؟" سوال نہایت نرم لہجے میں کیا گیا تھا، اس کی آنکھوں یا الفاظ میں میرے لئے نفرت نہیں تھی لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ مجھ سے قفا تھی۔

"تم آگے تو چلو۔ بیٹو تو سہی۔" میں نے سونوں کی طرف اشارہ کیا۔

"دلی تو نہیں چاہ رہا۔ لیکن میں مجبور ہوں بیٹھ جاتی ہوں۔" وہ پلٹ کر اپنی مخصوص حشر خیزی کی چال کے ساتھ ایک صوفے کی طرف بڑھی۔

"تو دردناک انداز میں اپنی مجبوری کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "تمہیں یہ خیال کیو کر آیا کہ ہدایت کو میں نے گرفتار کرایا ہے؟"

"ظاہر ہے وہ آپ کے ساتھ ہی ہوٹل سے گیا تھا۔ اس کے

”خدا وہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ ہو؟“ میں نے جانتا چاہا۔  
 ”ہاں۔ خدا وہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ ہو۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

پھر اس نے کچھ اور قریب ٹھیکتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ اپنے گداز ہاتھوں میں قیام لئے اور مجھے اپنے اوپر جھکانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”پلیز تم اسے بچانے کی کوشش کرو۔ اس کے عوض میں تمہارے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ میں خود سر آپا رضاعت کی بن کر تمہاری خدمت میں حاضر ہوں۔ اگر تمہیں میری ذات سے کوئی دلچسپی ہے تو میں ہر طرح سے تیار ہوں۔“  
 میری دھڑکنیں بے قابو ہونے لگی تھیں۔ میں نے بے مشکل انہیں قابو میں رکھا اور آہستگی سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چمڑا کر انہیں سلیپنگ گاؤں کی بیڈوں میں ٹھونسے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس سے دو قدم دور چلا گیا۔ وہ ایک سیل مدام تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نہ بہا لے جائے۔ اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

”بڑے انوس کی بات ہے کہ تم نے مجھے اتنا گھٹیا آدمی سمجھا۔“ میں نے جھجھکے میں کہا۔

”گھٹیا آدمی؟“ اس نے حیرت سے دہرایا ”اس میں گھٹیا پن کی کیا بات ہے؟“ میرے لئے یہ ایک اور حیرت تھی کہ اس کے لئے اس میں گھٹیا پن کی کوئی بات نہیں تھی۔

”تمہارے نزدیک اس میں گھٹیا پن کی کوئی بات نہیں کہ میں ایک عورت کو ایک طرح سے بلیک سیل کروں؟ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اسے ایک شہری موقع سمجھتے ہوئے اپنے اندر کے شیطان کو برساتنے کی کوشش کروں؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔

”اگر یہ گھٹیا پن ہے تو معاشرے میں بہت عام ہو چکا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ یہ گھٹیا پن ہے یا بڑھیا پن۔“ وہ اپنے لیے کی لڑش پر قابو پاتے ہوئے بولی ”اس سوسائٹی میں کوئی بھی کام کروانے کے لئے قدم قدم پر رشوت و عطا پتی ہے بڑے کاموں کے لئے رشوت بھی بڑی ہوتی ہے۔ میں بڑی رشوت دینے کے قائل نہیں ہوں۔ میرے پاس سب سے فتنی اثاثہ میں خود ہوں۔ اگر میں محسوس کرتی ہوں کہ کیس میری وجہ سے کوئی اشد ضروری کام نکل سکتا ہے تو میں اپنے آپ کو پیش کر دیتی ہوں۔“

میں نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا اور جیج عجوب سے کہا ”عجیب عورت ہو تم بھی۔۔۔“

”مجھے خود سے زیادہ تم عجیب لگ رہے ہو۔“ وہ بولی ”میری پیشکش کا کوئی جواب ہی نہیں دے رہے۔ کیا تمہیں میری ذات سے دلچسپی نہیں؟ اس معاملے میں میرے اندازے غلط نہیں ہوتے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لئے دلچسپی کی جھلک

اس کا فائدہ سے فون آیا کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔ میں اس سے نتیجہ اخذ کرتی؟“  
 ”اس نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ کن حالات میں اور کن اور کن کی بنا پر گرفتار ہوا؟“ میں نے اس کے مقابل چبھتے ہوئے چما۔

”تھانے والوں نے اسے ایسی بات کرنے کی اجازت نہیں دی۔“  
 ”نہیں نے بتایا۔“

”اس کے باوجود تم نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اسے میں نے گرفتار کرایا ہوگا؟“ میں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا۔  
 ”میں اس وقت گامی اندر سے تھک رہے تھے۔“

”میری سمجھ میں تو یہی بات آتی ہے۔“ وہ اب کچھ گزرا کر لے۔

”میری معلومات کے مطابق تم نے غاصہ دیکھ کھائے ہیں۔“  
 ”نہی کو قریب سے دیکھا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ میں اب بھی کچھ زیادہ عقل نہیں آئی۔“  
 ”تمہیں پہلے جا کر اس سے ملنا چاہئے تھا۔“  
 ”اصل بات معلوم کرنی چاہئے تھی۔ پھر مجھ پر کوئی الزام عائد کرنا چاہئے تھا۔“ میں نے تدریس سے انکار سے کہا۔

اب وہ نرم پڑ گئی اور حقیقتاً مجبور سے لہجے میں بولی ”میں فائدہ سے ہی سے آ رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے اس سے ملنے نہیں دیا۔ معاملہ بھی تو بہت سنگین ہے۔ اس پر جج عبدالسلام صاحب کے فیصلے کا الزام ہے۔ مجھے پہلے کسی بڑے توجہ داری وکیل سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کس سے رابطہ کروں۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی۔

”تم واقعی بدایت کے لئے بہت پریشان ہو؟“ میں نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے فیرا داری طور پر چما۔

”تمہیں کچھ شک ہے؟“ اس نے تنکلی ٹھٹھکیوں سے میری طرف دیکھا ”اگر میں بال بکھرے جتنی چلاتی اور دہائی دیتی رہاں نہیں پہنچی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں پریشان نہیں ہوں۔“  
 ”مجھے اپنے آپ کو کچھ کر بھی اسے چمڑا پڑے تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔“

وہ اچانک اٹھ کر میرے قدموں میں آ بیٹھی۔ دونوں ہاتھ اس نے میرے ٹھٹھکیوں پر رکھ دیے اور التجائیہ لہجے میں بولی ”پلیز مجھے قادیہ سب کیسے ہو؟“

میں ایک لمحہ اس کے صبح چہرے اور ہر تھراتے ہوئیوں کو دیکھتا ہوا میرے لئے نہایت دلچسپی لہجے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس کے صبح چہرے پر حتمی بات آ گئی۔ وہ تھکے میں بولی ”یہ کوئی سازش ہے بدایت جج صاحب کو قتل نہیں کیے سکتا۔ اگر اس نے قتل کیا تو آتا ہی بات مجھے ضرور معلوم ہو جی جی کہ اس نے اگر ایسا ارادہ بھی کیا ہو تا تب بھی مجھے معلوم ہو نہ۔ اس کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہو ہی نہیں سکتی۔“

دیکھی تھی۔ آپ یہ مت کہنا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

”نہیں جنہیں غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ تم جیسی سرود گرم پوشیدہ عورت کو بھلا غلط فہمی کیسے ہو سکتی تھی؟ مڑو کی آنکھوں میں دلچسپی کی لہر کو محسوس کرنے کے معاملے میں تو کوئی نوخیز لڑکی بھی کبھی دھڑکا نہیں کھاتی۔ ان سنگتوں کو ریسو کرنے کے معاملے میں منفرد نازک کا نظام بڑا حساس ہوتا ہے۔“ میں نے استہزائیہ سے لیے

میں کہا۔

”تو پھر اب تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے جانا چاہا۔  
”حیرت ہے اتنی سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ میں نے کھڑکی کے تاریک شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا  
”اگر تمہیں میری ذات میں دلچسپی محسوس ہوئی ہوگی، تم سے دوستی استوار ہوئی ہوگی تو بات کچھ اور ہوتی۔ تمہاری کسی مجبوری سے لاکھو اٹھاتے ہوئے نہیں رشوت میں وصول کرنا میرے نزدیک بڑا گھٹیا پن ہوگا۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ تم نے مجھے سمجھتے میں غلطی کی ہے۔“

وہ چند سینکڑ بالکل خاموش رہی۔ میں نے لپٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے دوسرے بھی اس کی آنکھوں میں غمی کی جھلکا ہٹ نظر آگئی۔ وہ سر ہٹا کر گھو گھری آواز میں بولی ”میں نے اپنے آپ کو تمہاری دوستی اور قہر کے قائل نہیں سمجھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے لئے تمہارے قریب آنے کا کوئی باعث راستہ بھی نکلا ہے۔“

”اگر تم اپنے آپ کو اس قائل نہیں سمجھتی تھیں تو پھر اپنے آپ کو میرے سامنے رشوت میں پیش کے جانے کے قابل بھی مت سمجھو۔ میرے لئے ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں ہے جنہیں اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن میرے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہے۔ دوستی اور کسی طرح کا ذہنی تعلق استوار ہونے کے بعد جب دھیرے دھیرے تمام رٹے لٹے ہوتے ہیں تو ان میں کسی اور سی طرح کی سنسنی ہوتی ہے میرے لئے اس سنسنی میں زیادہ کشش ہے۔“

وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ عقب سے اس نے دونوں بازو میرے گلے میں ڈال دیے اور بدلے ہوئے لیے میں بولی ”میں نے واقعی تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا اس میں دراصل میرا بھی قصور نہیں۔ مجھے کبھی زندگی کے نہیں پہلوؤں کی طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

میں نے اس کی قہر کے خطرناک اثرات سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”بہر حال تمہاری اور ہدایت کی جوڑی واقعی بڑی عجیب ہے۔ ایک طرف تم اس سے اتنی محبت کرتی ہو اس سے وابستہ ہو اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے دوسری طرف اتنی آسانی سے کسی اور کی خراب گاہ کی ذہنیت بننے

کی پینکشن بھی کر دیتی ہو۔ کچھ عجیب سی بات ہے۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“ اس نے تسلیم کیا ”ہمارا تعلق اپنی جی گھرا ہے لیکن اس میں ایک دوسرے کی مفصلی آزادی اور ناپسند جوں کی توں محفوظ ہے۔ تعلق اپنی جگہ برقرار رہتا ہے رہتا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آئے پاتا لیکن سچ میں اگر میرا کسی پر دل آجائے کوئی مجھے اچھا لگ جائے تو میں ہل جاتی ہوں۔ ہدایت اس کا برا نہیں مٹاتا اور اگر ہدایت اس پر بھی کسی سے رسم و رواج بڑھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو عداوتی عورتوں کی طرح ہنگامہ برپا کرنا تو درکنار آگے اٹھنا کرنا تک نہیں۔“

”بہت خوب۔“ میں نے استہزائیہ لیے میں کہا۔  
”بعض اوقات تو ہدایت کا نہیں کوئی کام انک جانا ہے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ مجھ جیسی عورت کے جانے سے اس کا نکل جائے گا تو وہ خود مجھے حلقہ آدمی کے پاس بھیجتا رہا ہے۔ بہر حال کام نکلا کر آتی ہوں۔ ہدایت کو اس سے غرض نہیں کہ کس طرح نکلا کر لائی ہوں۔“  
”معلوم تو ہوتا ہی ہوگا۔“ میں نے کہا۔  
”ظاہر ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”اس کے باوجود جنہیں اس سے محبت ہے؟“ میرے لیے حیرت برقرار تھی۔

”محبت؟“ وہ ایک لمبے کے لئے جیسے سرج میں پڑتی ”شاید محبت نہیں ہے“ مجھے غمی اس پہلو پر بھی غور کرنے کی فرصت ملی۔ ”اس نے اعتراف کیا“ شاید یہ ضرورت ہے ”شاید ہم دوسرے کی ضرورت بن گئے ہیں۔ شاید ہم ایک دوسرے کے زیادہ اچھی طرح مزاج آشنا ہو گئے ہیں کہ اب ہماری کسی اور ساتھ میں ہی نہیں سکتی۔ ہم ایک دوسرے کی پناہ گاہ ایک دوسرے کی وصال ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ہمیں زندگی زیادہ مشکل ہے۔“

میں نے محض ہنگامہ بھرنے پر اکتفا کیا۔ اس نے مجھے بازو کے تعلق سے آزاد کر دیا تھا۔ میرے لئے سانسوں کی آمد و رفت آسان ہو گئی تھی۔ میں واپس صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ بھی میرے مقابل آئیسی۔ اب وہ بالکل پرسکون نظر آ رہی تھی۔  
”ہدایت رہا ہو جائے گا؟“ اس نے کچھ اس طرح پوچھا اب تک میں اسے ہی اطمینان دلا رہا تھا۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ میں نے جواب دیا۔  
”کیا تم اس لمحے میں میری کوئی مدد نہیں کر گئے؟“ اس نے مجھ میں باؤں کی درختی۔  
”اگر اس نے یہ جرم کیا ہے تو پھر میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا ”میرا نظریہ ہے کہ جس نے جرم کیا

ضرور ملنی چاہئے چاہے وہ میرا میری محبوبہ کا بھائی ہی ہو۔ نگہ جی پوچھو تو اس سلسلے میں میرا ایک اور نظریہ در

لی ہے۔

”وہ بھی بیان کر دو۔“ وہ سمجھتے ہوئے مجھے بے یوں۔  
”یہ کہ اگر ہماری عدالتیں اور ہمارا نظام انصاف اپنی  
موجودہ اور ناکام بدینہ کی وجہ سے کسی مجرم کو اس کے جرم  
اندر سے نکالنے کے بجائے اسے کسی اور ذریعے سے سزا ملتی  
ہے۔ مجرم کو سزا نہ ملنے کا عمل بڑی قیامت برپا کرتا ہے ورنہ رشتہ  
رہے مجرموں کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا پہلے ہی بڑی  
رت جگ ہے۔ مجرم اسے اور بھی زیادہ بھانک بھاگتے ہیں۔“  
”آئی ایم سوری۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بڑے مسلح  
وہ“ وہ نظریے مجھے میں بولی۔

میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”مظفر خان کی ضرورت  
مجھے مسلح قوم ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔ مسلح قوم میں  
ملا میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟ یہاں کوئی خاص شخص کچھ بھی نہیں  
ملکہ میں صرف اپنی فکیریں اور اپنے اطمینان کی خاطر کچھ  
برصوں کی قوت زندہ رہنا چاہتا ہوں اور جس مصلحتی سی حد  
بھی میرا پس پس چلا ہے وہاں تک کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا  
ہے۔ اگر مرتے وقت مجھے یہ احساس نہ ہو کہ دوسرے ان گنت  
ان کی طرح میں بھی جیڑ کر یوں کی زندگی گزار کر اس دنیا سے  
بھٹ ہو رہا ہوں۔“

”کیا آپس کی طرح تم نے بھی فرض کر لیا ہے کہ ہدایت مجرم  
ہے؟“ اس نے میرے فلسفہ حیات میں کوئی دلچسپی محسوس کیے بغیر  
کہا۔

”اطمینان نہ کرو۔ پولیس آج ہی ہدایت کو پھانسی تو نہیں چڑھا  
سے گی۔ ابھی تو مزید تحقیق ہوگی۔ کیس چلے گا۔ نہ جانے کیا کیا تھی  
تمہارے آئیں۔ جیسی کوئی حتمی رائے قائم کرنا ممکن ہو گا۔“  
میں نے کہا۔

”فی الحال تمہاری رائے حتمی نہیں ہے؟“ اس نے جانا چاہا۔  
”میں اپنی جلدی حتمی رائے قائم نہیں کرتا۔“ میں نے جواب  
دیا۔ تب اسے گویا کچھ اطمینان ہوا مگر چند لمحے بعد ہی اسے ایک  
اور طرح کی تشویش نے آن گھیرا۔

”اگر پولیس نے اسے مار پیٹ کر اور اپنے دوسرے ہتھیار  
نواز چھکڑے استعمال کر کے اس سے اعتراف جرم کرایا تو کیا  
ہو گا؟“ اس نے گویا ہونے ہوئے پوچھا۔

”اس کی خوش قسمتی ہے کہ اس وقت وہ ایک ایسے پولیس  
آفیسر کی تحویل میں ہے جو کم از کم ہدایت جیسے لوگوں کے ساتھ اس  
کے اس طریقے استعمال نہیں کرے گا۔ وہ صرف پیش در مقابلہ  
خبریں حاصل اور اپنے آپ کو بھروسہ سمجھنے والے قاتلوں کے ساتھ اس  
ختم کا سلوک کرنا ہے ورنہ بڑے سا سنگت طور ہتھیاروں پر چلنے والا

آوی ہے۔“ میں نے اسے اطمینان دلایا۔

”میری تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس قسم کے کیس کے  
سلسلے میں مجھے کس دلیل سے ملنا چاہئے۔“ وہ بالوں میں انگلیاں  
پھیرتے ہوئے بولی ”ایک فوج داری دلیل ہمارے جاننے والے  
ہیں۔ میں ان کی طرف سے ہوتی آئی ہوں لیکن اس وقت وہ بھی  
اپنے آفس میں نہیں تھے ان کے آفس کے دو اڈے پر پہنچ کر  
مجھے یاد آیا کہ یہ وقت تو ان کے عدالت میں رہنے کا ہوا ہے۔“

پیشانی میں مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

”کیا نام ہے ان کا؟“ میں نے پوچھا۔  
”وہ اتنے بڑے یا معروف دلیل نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے  
جاننے والے دیکھوں میں بس دی ہیں جو فوج داری مقدمات لڑتے  
ہیں۔“ اس نے مجھے نام بتایا۔ وہ اگر بڑے یا معروف دلیل بھی  
ہوتے تب بھی میرے لئے ان کا نام شناسنا نہ ہو گا۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”تم اپنا فون نمبر وغیرہ میرے  
پاس چھوڑ جاؤ۔ میں اپنے ایک آوی سے کون کا وہ نمبر دے لے  
ہندوستان کو دے گا اور تمہیں فون کر کے بتا دے گا کہ فلاں وکیل  
سے جا کر مل لو۔“ میرا ارادہ تھا کہ اس سلسلے میں شفیع شاہ کو ہدایت  
کروں گا۔ وہ ہر شعبہ زندگی کے لوگوں کو مجھ سے بہتر جانتا تھا۔  
”میں اور ہدایت زیادہ لمبی چوڑی نہیں کے متحمل نہیں  
ہو سکتے۔“ وہ بولی۔ لیکن میں بدستور پیشانی تھکی۔  
”تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے کہا۔

تب وہ مطمئن ہو گئی۔ اتنی دیر میں کالی بار اس کے چہرے پر  
زندگی کی اصل جگہ نمودار ہوئی جس نے اس کی دلکشی کو برعکاس  
وہ بہت مختلف مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”تم میری اور ہدایت کی  
جوڑی کو عجیب کہہ رہے تھے جبکہ میرا خیال ہے تم خود بہت عجیب  
انسان ہو۔“

”یہ بات اتنے بہت سے لوگوں نے مجھ سے کہی ہے کہ اب  
مجھے خود بخود یقین آنے لگا ہے کہ شاید میں واقعی ایک عجیب  
انسان ہوں۔“ میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔

وہ ایک باز بھرا ہوا کمرے کے قریب قالین پر آ بیٹھی اور اس  
کے بازو میرے گھٹنوں پر رکھ لے۔ اس کی غرائی آنکھیں جو کچھ دیر  
پہلے تک وحشت زدہ دکھائی دے رہی تھیں اب کچھ خورسری دکھائی  
دینے لگی تھیں۔

میں نے اس کی پیش قدمی کو روک دیا کہ اسے کہا ”اب ہر شے  
مگراری کا اظہار نہ شروع کرو۔“ تمہیں شاید شکر مگراری کے  
اظہار کا ایک ہی طریقہ آتا ہے۔“

”اس سے زیادہ حسین اور دلچسپ کوئی طریقہ ہے تو مجھے  
بتا دو۔ میں اس پر عمل کروں گی۔“ وہ وہ جمل لے کر بولی۔  
میں نے خود کو جواب محسوس کیا تاہم میں نے ایک بار پھر

”وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہے اور تمہارا خداوند کرم سے ٹیک چاہتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔  
 ”پولیس کی تحویل میں آدمی بخلا خیریت سے کیسے ہو سکتا کوئی اس سے چھوٹا جھوٹ بولویا؟“  
 ”پولیس کے بارے میں ذرا اگلنے کے سوا بھی کبھی کبھار کرایا کرو۔“ وہ فری سے بولا۔

”ایک پولیس والے سے پولیس کے سوا بھلا کس معلوم بات کی جا سکتی ہے؟ تم بتاؤ تم نے کیسے فون کر لیا؟ کل تو یہودی بات نہیں کر رہے تھے۔ خود کو واقعی کوئی بہت برا افسر سمجھتے۔“ میں نے شکوہ کیا۔

اس نے لٹکا سا قہقہہ لگایا ”لوگوں کے سامنے اسی طرح ہے یا راورنہ لوگ سمجھیں گے کہ اس بدعاش قسم کے سید ایک شریف قسم کے پولیس افسر کو اپنی دوستی کے جال میں رکھا ہے، معلوم نہیں اس سے کیا کیا ناجائز کام لیتا ہو گا۔ لوگوں کے سامنے خود کو تمہارا دوست ظاہر کر کے اپنا بیچ کرنا نہیں چاہتا۔“

”جتنی زیادہ مزاحیہ باتیں مت کیا کرو یا انہیں پس کر بیٹھ بیٹھ پڑنے لگتے ہیں۔“ میں نے کراہ کر کہا ”اس سے زیادہ مزاحیہ برداشت نہیں کر سکتوں گا۔ اب سنجیدگی سے بتاؤ ہدایت دانا مزید کوئی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟“

”میں پوچھنے کے لئے تو میں نے تمہیں فون کیا ہے کہ تمہیں اس کیس کے سلسلے میں کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی؟“ وہ فری سے بولا۔

”عجب آدمی ہو یا راورنہ! میں نے ذرا ڈانٹنے کے بعد اندازہ کیا ”پولیس والے تم ہو یا میں؟ اب اپنے حصے کے کام بھی کرو گے؟ کیس حل کرنا تمہارا کام ہے۔ میرا نہیں۔“

”لیکن اس معاملے میں تو تم پولیس سے زیادہ مستعد رہے ہو، بڑا شوق چڑھا تھا تمہیں اس قسم کے معاملات میں، اڑانے کا۔ اب خوش قسمتی سے تمہیں موقع بھی مل گیا ہے کہ کچھ کارکردگی دکھاؤ۔“ وہ بولا۔

”دکھا تو ہی ہے کارکردگی۔“ میں نے کہا ”میری کارکردگی نیچے میں ہی تو تم پر کرم تک پہنچے ہو۔ اگر میری ٹانگ بچ جائے نہ ہو، تم سیدھے کرم بیک سے جا کھڑاتے اور وہ تمہیں ناگوں چھوڑتا۔“

”یہ تو خیر بعد کی بات تھی کہ کون کسے ناگوں پنے چھوڑتا ہے پروانی سے بولا ”نی احوال تم یہ بتاؤ تم نے اس معاملے میں اڑانے کے لئے کرم بیک سے کتنا مال کھینچا۔“

”ابا۔ آخر کار اصل تکلیف زبان پر آئی تھی۔ خواہ تو اس دیر سے اور دھڑلے کی باتیں کئے جا رہے تھے۔ آخر پولیس والے مال کے خیال سے بیٹھ ساری رات خیریت سے، آؤ، آؤ، لیکن تم

اسے اپنا فلسفہ یاد دلانے کی کوشش کی ”لیکن مجھے نوازشات وہ اچھی لگتی ہیں جس کے پیچھے کوئی غرض، کوئی مجبوری، کوئی سودے بازی کام نہ کر رہی ہو۔ میں خود کو بلیک میلر محسوس کرنا نہیں چاہتا۔ ہر قدم دل کے کہنے پر اٹھنے کو تیار تھو اور ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھتے ہوئے بولی ”تندرہ میں اس وقت تمہارے قریب آؤں گی جب یہ ضرورت اور مجبوری کا بحران درمیان سے ہٹ چکا ہو گا۔ اس وقت میں ایک سیلاب کی طرح ہوں گی اور تمہیں ہمارے کالے جاؤں گی، اس وقت مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔“

”میں تو پہلے ہی تمہارے بارے میں محسوس کر چکا ہوں کہ تم ہر حال میں ہی ایک سیلاب کی طرح ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”ایک عورت جس کی جوانی ڈھلے کا دور شروع ہو چکا ہو۔ اس میں اتنی بلا خیزی نہیں ہے کم ہی دیکھی ہے۔“

”عمر کا یہی دور تو سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے مری جان! نو جوانی سے بھی زیادہ۔“ وہ میرا رخسار جھپٹاتے ہوئے کچھ بھاری آواز میں بولی اور دواڑے کی طرف بڑھ گئی۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ میرا بیٹھے رہنا ہی بہتر تھا، دواڑے پر رک کر وہ چلتے ہوئے بولی ”مجھے اور میرے ہدایت کو بھول مت جانا۔“ پھر وہ رخصت ہو گئی۔

مجھے جو کچھ کرنا تھا وہیں کرم بیک کے لئے کرنا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہدایت کے لئے میں کیا کر سکتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ اسے کم از کم ایک اچھا وکیل فراہم کر دے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ آگے اس کی قسمت۔ یا اس کے اعمال!

تاہم اتنا ضرور تھا کہ اس سلسلے میں میرے ذہن میں کوئی خلش موجود تھی۔ میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ کوئی نئی قوت مجھے بتا رہی تھی کہ ابھی اس سلسلے میں مجھے اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

میں خلش ذہن میں لئے میں تیار ہوا اور ناشا کرنے لگا۔ ناشے کے بعد میں نیچے آؤں میں جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف رجم گل تھا۔ اس کی آواز پہچان کر میں نے چپکے سے سے انداز میں کہا ”کیا حال ہے پیارے دشمن جان! میں تمہیں فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہارا فون آگیا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا ایسے موقعوں پر کیا عمارت بولا جاتا ہے؟“

”عمارے کو کولی مارو۔ تمہیں یقیناً کوئی نئی تکلیف شروع ہو گئی ہو گی تو مجھے فون کرنے کا سوچ رہے تھے؟“

”تکلیف میں تمہیں فون کرنے کا کون سوچ سکتا ہے پیارے! تم تو خود ایک تکلیف ہو۔“ میں نے جواب دیا ”میں تو بے چارے ہدایت دانوں کے بارے میں پوچھتا چلا رہا تھا کہ اس کا کیا حال چال ہے۔ تمہارے زیر سایہ اس کی شپ تم کسی گزری؟“

تفتیش کا ارادہ ترک کر دیا ہے؟ کسی اور واسطے سے اس کیس کو نہیں دیکھو گے؟

”تفتیش تو جاری رہے گی۔“ اس کے لیے میں فوراً پیشہ ورانہ دلچسپی جھٹک آئی ”محض ایک چال اور پورٹین ٹیسٹ کی بنیاد پر تو ہدایت کو قائل ثابت کرنا بہت مشکل ہو گا۔ ابھی تو تازہ قتل بھی برآمد نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کیس کا ایک اور زاویہ بھی سامنے آیا ہے بات بہت مبہم سی ہے لیکن اس پر بھی تفتیش کرنی پڑے گی۔“

”کیسی بات؟“ میں نے ذرا چرتکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے معلوم تھا اس کا غصہ اس کی چڑچڑاہٹ سب کچھ معصومی تھا اور بظاہر وہ مجھ سے بات چمپانے کی بھی کوشش کرے گا لیکن درحقیقت وہ مجھے کچھ بتانا ہی چاہتا تھا اسی کے لئے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ مجھے کوئی اشارہ دیتا چاہتا تھا اور اس طرح اپنے کام کا پورا پورا کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا بظاہر وہ ایسا ہی انداز اختیار کرے گا جیسے وہ مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتا کوئی خاص بات مجھ سے چھپائے رکھنا چاہتا ہے لیکن میرے ذور دینے اور مجبور کرنے پر بالکل غرضانہ بن جائے گا۔ یہ ساری کچھنا آگئی میرے لئے کچھ دلچسپ ہوئی تھی اور اسے بھی یقیناً اس میں لطف آتا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق وہ بولا ”وہ بات میں نہیں نہیں بتا سکتا۔“

”کیوں؟ کیا اس کا تعلق تمہاری زندگی کے کسی شرمناک پہلو سے کلنل تباہ ہے؟“ میں نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

”شرمناک پہلو تمہاری زندگی میں ہوں گے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔“ وہ بولا۔

”تمہیں اور شریف آدمی؟“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”مجھ میں نہیں آدمی اسے اس سال کا سب سے بڑا جھوٹ شمار کروں گا سب سے بڑا لطف!“

”تم جو چاہے شمار کرو لیکن میں وہ بات نہیں بتاؤں گا۔“ وہ بلند ہوا۔

”آخر کیا؟“ میں نے معصومی جھنجھلاہٹ سے پوچھا۔

”یہ کہ اس کا تعلق ایک لڑکی سے ہے اور لڑکی کا ذکر سننے ہی تم چھوٹے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاؤ گے۔“ وہ بولا۔

”کوئی تم کو گئے تو میں چھوٹا ہوا نہیں جاؤں گا۔ آرام سے چلنا ہوا جاؤں گا تم بتاؤ تو سمجھیں۔“ میں نے پیار سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ جلدی سے بولا ”لڑکی کا تو ذکر سننے ہی ریشہ عطلی ہونے لگے۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔“

”بھئی ایک مرد کو اگر ریشہ عطلی ہونا ہی ہے تو بہتر یہی ہے کہ لڑکی کے ذکر پر ہو۔ اب کوئی صحیح الدماغ مرد تمہاری طرح کے لڑکی یا اور بلاؤ اور کلرک جیسے وغیرہ کے ذکر پر تو ریشہ عطلی ہونے سے بھا۔ ہاں تو یہ لڑکی کا کیا قصہ ہے؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

”خیال کیجئے کرنا کہ میں نے کرم بیک سے مال کھینچا ہو گا؟“  
”کلمہ ہے تم رات کو وہاں خدمت فلتن کے شوق میں تو مجھے بجائے نہیں پھر رہے تھے۔“ وہ جل کر بولا ”ابھی تمہارے دل میں اس قسم کے جذبات اس حد تک موجزن نہیں ہوئے اس کے علاوہ جب تم اس قسم کے چھکوں میں دلچسپی لینے کا پروگرام بنا رہے تھے تو تم نے کہا تھا کہ موٹی اسامیں سے تم باقاعدہ ٹھیک ٹھاک قسم کا معاوضہ وصول کرو گے اور کرم بیک بہر حال موٹی اسامی ہے۔“

”یہ سب دلیلیں چھوڑو۔ یہ کوکر پولیس والے مال کی خوشبو بہت دور سے سونگھ لیتے ہیں۔“ میں نے کہا ”بہر حال یہ میرا لڑے ٹیکٹ ہے۔ میں نہیں کیوں بتاؤں گا؟ تم توہ لینے کی کوشش چھوڑو۔“

”تمہارا انداز تو واقعی بالکل نینیدہ اور پیشہ ور لوگوں والا ہو گیا ہے جب تم نے بات کی تھی تو میں سمجھا تھا یہ کسی کوئی ناخصل خواش کرنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن تمہیں اپنے اس شرکی کی تحسین کا راستہ نہیں مل سکے گا مگر تمہیں تو فوراً ہی کلاٹک میسر آئے گی۔“

”کلاٹک بھی ایسے جو گھر سے اٹھانے پر تکتے ہوئے تھے۔“  
”نہایت ہی اچھا کیس میرے سر پر لا رہے تھے انکار مستحالی نہیں چاہتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”تو یہ بے مانا پڑے گا یا رہے۔“ وہ کمری سانس لے کر بولا ”مگر آدمی تم کی قوم جو بھی وعدہ شروع کرتے ہو اتنا ذہنی سے چمک جاتا ہے۔ لگتا ہے تمہاری یہ بے نام کمپنی بھی اچھا برنس کرے گی۔“

”میں یہ اوپر والے کا کرم ہے۔ تم بھی اسی سے مانگا کرو۔“  
میں نے نہایت صوبانہ لہجے میں مشورہ دیا۔

”تمہارے خیال میں اور کس سے مانگتا ہوں۔“ وہ ذرا ہنسنے لگا۔

”اس کے علاوہ اپنے اعمال بھی ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔ سب سے پہلے تو پولیس کی نوکری چھوڑو۔“ میں نے مزید مشورہ دیا۔  
”اچھا اب میں فون بن کر رہا ہوں مجھ میں مزید کچھ اس سننے کی تاب نہیں رہی۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ آج میں ہدایت وارڈن کے خلاف چالان تیار کر رہا ہوں۔ کل عدالت میں ٹھیک کھول گا۔“ وہ بولا۔

”میں کیا اس کا کوئی مفاتی ہوں جو مجھے بتا رہے ہو؟“ میں نے گویا راستانے ہوئے کہا۔

”تم کو کسی کے وکیل مفاتی کہاں ہو سکتے ہو۔ تم تو صرف وکیل گند کی ہو سکتے ہو گندے آدمی!“ وہ جل کر بولا۔

اس کے لیے مجھے بھی اپنی اپنی میں نے شہانہ لہجے میں کہا ”ہیلو تمہارا چلنا۔“ رات میں۔ اچھا۔ بتاؤ کیا تم نے مزید

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”اصل میں یہ دسی مغرب کی ہے راہ روی ہے جس سے وہ خود پریشان ہیں۔ ہمارے خوش حال طبقے کے توسط سے دھیرے دھیرے یہ ہمارے ہاں بھی مراہت کر رہی ہے آگے چل کر وہاں جیسی صورت ہی اختیار نہ کرے۔“ وہ اب بالکل سنجیدہ تھا۔

”خدا نہ کرے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میں جس لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں وہ اسی قسم کی لڑکیوں میں سے ایک ہے۔“ وہ بولا۔

”لیکن اس قسم کی لڑکی جج صاحب کی زندگی میں کہاں سے آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی ان کا اصلاح معاشرہ کا شوق!“ رجم کل لٹھڑی سانس لے کر بولا ”اس لڑکی کے والدین سے شاید ان کی واقفیت رہی تھی۔ مگر سے باقی ہوئے کے بعد لڑکی شاید کسی پکڑ میں لوٹ ہو کر ان کی عدالت میں بھی پیش ہوئی تھی اسی مجھے تفصیلات معلوم نہیں ہیں لیکن میں جلد معلوم کر لوں گا۔“

میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اشارہ دینے کا مقصد یہ تھا کہ اگر میں اس سے پہلے کچھ مفید معلومات حاصل کر سکتا تھا تو کروں اور یوں ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی کوششوں اور اپنے اپنے وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے کسی وحیدہ معاملے کو جلد از جلد سلجھائے اور انجام تک پہنچائے کی کوشش کریں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”جج صاحب نے غالباً لڑکی کی اصلاح کی اپنی ہی کوششیں کی تھیں اسے گھر واپس بھیجے کی بھی کوشش کی تھی۔ وہ اسے واپس گھر تو نہیں بھجوا سکے البتہ اس کی بے راہ روی اور آوارہ گردی کچھ کم ہو گئی تھی۔ جج صاحب کو امید تھی کہ مستقبل میں وہ کافی مدد کر جائے گی۔ وہ اس کی مالی مدد بھی کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود تو زیادہ آسودہ حال آدمی نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنا اثر و سوج استعمال کرتے ہوئے اسے کچھ مالی فائدے پہنچائے تھے پھر اس کے مستقبل کی بہتری کے خیال سے خود اپنی انشورنس پالیسی میں بھی اسے وارث مقرر کر دیا تھا۔ ان کی اپنا بڑی یا بیٹی تو تھے نہیں۔“

یہ سب کچھ تھا کہ اس نے مہر کی سانس لی اور گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا ”یہ ہے کل قصہ!“

”اپنی داستان میں تم نے سارا قصہ سنا دیا لیکن لڑکی کا نام اب تک نہیں بتایا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے معلوم تھا تم نام جاننے کے لئے تڑپ رہے ہو گے۔ میں نام بتاؤں گا تو پھر تم ایڈمنسٹریٹو پوچھو گے اور میرے فون بند کرتے ہی تمہاری گاڑی جھاڑی و رفتار سے اس کے گھر کی طرف اڑی جا رہی ہوگی۔“ وہ طعنے لیتے ہوئے بولا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن مقصد وہ نہیں ہو گا جو تم جیسے کسی فقور کے ذہن میں ہو گا۔ چند کہیں کہ! انسان کو اپنے کاموں کے سلسلے

وہ گویا اپنا قصہ ضبط کرتے ہوئے خفگی آمیز سے لیے میں بولا ”مجھے آج صبح ہی پتا چلا ہے کہ جج صاحب نے کچھ عرصہ پہلے ہی خاصی بڑی رقم کی ایک سیر پالیسی لی تھی اور ایک خانہ بدوش قسم کی لڑکی کو اپنا وارث بنایا تھا۔“

”خانہ بدوش قسم کی لڑکی؟“ میں نے ذرا مایوسی سے کہا۔

”دل چھوگا کرتے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے مجھے تسلی دی ”خانہ بدوش سے میری مراد واقعی کسی گھنے میں رہنے والی بچنے پرانے کپڑوں والی چلی چلی لڑکی نہیں ہے۔ حالانکہ تم سے کچھ بعید نہیں ہے کہ ایسی کسی لڑکی کے پاس بھی دم لگاتے ہوئے کبھی جاؤ۔“

”بھئی لڑکی تو لڑکی ہے جس حال میں بھی ہو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ لیکن بلائے کے لئے دم گھنے تم سے مستعار لینی پڑتی کیونکہ کچھ سائنسی کتابیں پڑھ کر گھنے پتا چلا ہے کہ احتیاط نہ لے کر میری دیم تو صدیوں پہلے تمہیں کھس کھس کر غائب ہو چکی ہے لیکن تمہارا تعلق جس نسل سے ہے اس کی دیم ابھی تک صحیح سلامت چلی آ رہی ہے۔“

”چرا؟“ اگر اتنی بکواس کو دے تو میں تمہیں اس لڑکی کے بارے میں نہیں بتاؤں گا تم خود ہی اسے دھونڈ لو۔“ بوقتِ شام اب اسے دھونڈ چارنگ دیم لیا لے کہ میں فون بند کر رہا ہوں۔ وہ بولا۔

”ایک تو یہ تم ہر وقت دو ٹوٹی ہوئی حسد کی طرح فون بند کرتے کی دھمکی مت دیا کرو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دیم تمہاری زندگی کا ایک حساس موضوع ہے۔ چلو میں اب دیم کا پائلٹ ذکر نہیں کروں گا اور مستعار بھی نہیں مانگوں گا۔ اچھا تو اس لڑکی کے خانہ بدوش ہونے سے تمہاری مراد کیا ہے؟“ میں نے ملا نکت سے پوچھا۔

”وہ کچھ زیادہ ہی امیر اور مازن گھرانے کی لڑکی ہے۔“ رجم مکمل ذرا توقف کے بعد بولا ”اسی قسم کے لوگ جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید وہ غلطی سے پاکستان میں پیدا ہو گئے ہیں ورنہ درحقیقت انہیں امریکا، انگلینڈ یا یورپ وغیرہ میں پیدا ہونا تھا۔ ذہنی طور پر وہیں رہتے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر ناک بھونچ جاتے ہیں اور وہیں کے تصورات میں کھو کر لٹھڑی آجیں بھرتے رہتے ہیں مگر مستقل طور پر وہاں جا کر آباد بھی نہیں ہوتے۔“

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”اس قسم کے بعض گھرانوں کی نئی نسل کے لئے شاید وہ آزادیاں بھی کافی نہیں ہوتیں جو انہیں میسر ہوتی ہیں۔ ہر سولت ہر پیشہ و تمام اور ہر آزادی میسر ہونے کے باوجود یہ نئی نسل اپنے والدین سے ناراض رہتی ہے۔ پہلے اس میں زیادہ تر لڑکے ہی ہوا کرتے تھے مگر اب لڑکیاں بھی انہی خاصی تعداد میں نظر آنے لگی ہیں۔ ان کو گھربار، ماں باپ، معاشرہ سب سے بے شمار شکایات ہوتی ہیں ان میں سے بعض کی شکایات اتنی بڑھتی ہیں کہ وہ گھرباری پھر ڈھونڈتی ہیں۔“



قائم کی جاسکے گی۔" میں نے کہا۔

"اس کو دیکھنے کے لئے اتنے قریب مت چلے جانا کہ بعد میں ہم جنہیں ڈھونڈنے ہی نہ جائیں۔" وہ ایک بار پھر غیر سنجیدگی کی طرف لوٹ آیا۔

"ایک تو میرے بارے میں تمہاری رائے بہت ہی غلط تصورات پر مبنی ہے۔ جنات کے پلندے۔" میں نے کمری سانس لے کر کہا۔

"تو پھر تم اس کی طرف کب روانہ ہو رہے ہو علم و دانش کے چکر؟" اس نے دریافت کیا۔

"تم خود ہی تو پیش گوئی کر چکے ہو کہ تمہارے فون بند کرتے ہی میری گاڑی جواز کی رفتار سے اس کے گھر کی طرف اڑی جاری ہوگی۔" میں نے جواب دیا "میں سوچ رہا ہوں اب تمہارا دل کیا توڑنا۔ مجھے تمہاری توقعات پر پورا اترنا چاہئے میں ایسا ہی کروں گا جیسا تم نے کہا ہے۔ دیے بھی بہت دنوں سے کسی سبز قسم کی آواز نہ ملنے سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"آج صبح موت بولا کرو۔ مجھے پتا چلا ہے کہ رات ہدایت دہلی کی دوست خلیصہ سے تمہاری طویل ملاقات رہی ہے۔ میں نے سنا ہے اس خاتون کی جوانی بھی خاموشی اور سنگین مگر مگر ہے؟" وہ زور دہنچس سے بولا۔

"تمہاری آواز سن کر کچھ ایسا محسوس ہوا ہے جیسے تمہاری رال چٹکنے ہی والی ہے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ تم سے دوستی کا فیماں انجام ہونا تھا۔ آخر صحت کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہوتا ہی ہے۔" اس نے ترکی بے ترکی جواب دیا۔

"چین تم نے ہم جیسے قدر دانوں سے حسن اور جوانی کی قدر رانی نہیں سیکھی۔" میں نے کہا "تم تو اس طرح اس کی جوانی گزر چکے گاؤ کر رہے ہو جیسے برہانے کی انتہائی حدوں کو پہنچنے کے بعد آخر کار اس کا انتقال پر مال ہو چکا ہے اور تم اس کے جسم میں بھی شرکت کر چکے ہو۔" یہاں تک کہ اس کی جوانی گزر رہی ہے پوری طرح گزر تو نہیں چکی۔"

"خیر۔ یہ تو جنہیں زیادہ صحیح طور پر معلوم ہو گا تم تو جوانیاں بننے کا سب سے زیادہ قابل احسان ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"خیر جنہیں فطری کمزوری کی وجہ سے اس کی عمر اور عمر لیا کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں ہوا ہو گا۔ اس میں تمہارا قصور بھی نہیں۔ بوجہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے تم نے اسے ہدایت دہلی سے بھی لئے نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"ہدایت دہلی سے میں نے اسے احتیاطاً لئے نہیں دیا۔" وہ سنجیدگی سے بولا "اسی حیرت و طرار اور جہانگیرہ عورتوں سے میں محتاط رہ رہتا ہوں۔ یہ کسی بھی وقت کوئی ناپسندیدہ کڑا کے پالیس کے لئے مسئلہ پیدا کر سکتی ہیں۔ کیس کو بگاڑ سکتی ہیں یا اس پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔"

میں نہ جانے کہاں کہاں جاتا رہتا ہے۔ اب تم جیسے بھلا اس سے کچھ اور مطلب افادہ کرتے رہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو اگر گیا تو شاید کوئی کام کی بات معلوم کر کے جلد ہی واپس آجائوں لیکن تمہارے بارے میں تو اندیشہ بڑھ جاتا ہے کہ اگر تم اس قبیل کی کسی لڑکی کے ہاں مجھے تو جنہیں تو واپس لانا ہی مشکل ہو جائے گا۔ اب کیوں اس چور ڈور اور نام بتاؤ۔"

"ہم تو اس کا بار بار اپنے ملحقہ احباب میں وہ ہنگامی کے نام سے مشہور ہے۔" رحیم گل نے جواب دیا "ایڈریس نوٹ کر لو۔"

"یہ ایڈریس کا ایک ایڈریس ہے۔" اس نے ایڈریس بھی بتا دیا۔

"تم ان غلط پر سوچ رہے ہو کہ انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے چکر میں شاید لڑکی ہی یہ کام کر گزری ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"محتمل ممکن ہے۔ اس قسم کی آوازہ گرد۔ زیادہ آزاد خیال اور بے خوف قسم کی لڑکیوں سے کچھ بعید نہیں۔" رحیم گل بولا "ان کے مراسم اور رابطے بھی ہر طرح کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس نے خدا اپنے ہاتھ سے یہ کام کیا ہو لیکن وہ ایسی کسی سازش میں شریک یا سازش کی خالق ہو سکتی ہے۔"

"یہ ایسا انشورنس کی رقم بہت بڑی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی رقم کو چھوٹا یا بڑی کہنے کا ہر انسان کا ایک الگ معیار ہوتا ہے اور مختلف قسم کے حالات میں یہ معیار بدل بھی رہتا ہے۔ کسی وقت انسان کے لئے پانچ دس ہزار کی رقم بھی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس کے لئے قتل کر گزرتا ہے۔"

"یہ کیفیت رحیم گل بھی کبھی بڑے بڑے کی بات کہہ جاتا تھا تاہم میں نے اسے داد دینے کے بجائے ڈانٹ کر کہا "زیادہ غلط بولنے کی کوشش مت کرو۔ جاہلوں کی زبان پر غلط زب نہیں دیتا۔ یہ ایسا انشورنس کی رقم کتنی بڑی ہے؟"

"دس لاکھ۔" اس نے جواب دیا۔

"مستقل رقم ہے۔" میں نے کہا "اب دیکھنا یہ بڑے کا کہ لڑکی کے حالات ان دنوں کیسے ہیں اور کیا وہ اتنی غلط فہم ہو سکتی ہے کہ رقم کے لئے اپنے جسم کو قتل کر سکے۔"

"اس کے بارے میں جو معلومات مجھ تک پہنچی ہیں اور ان کی روشنی میں لڑکی کی شخصیت کا جو خاکہ میرے ذہن میں ابھرا ہے اس کے اعتبار سے تو میرا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ اس قسم کی لڑکیوں سے ایسی حرکت یا کم از کم ایسی کسی سازش میں شریک ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ان لڑکیوں نے اس قبیل کے لڑکوں کے نزدیک جذباتی رشتوں کی اہمیت ہی کہاں ہوتی ہے؟ جو لوگ اپنے نئے والدین کے فراموشوار یا ان کے بوجہ کا سارا نہیں بن سکتے ان کے نزدیک کسی اور خیر خواہ کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟" اس کے لیے میں پابندی کی گئی۔

"خیر۔ اس کو دیکھنے اور بات کرنے کے بعد زیادہ صحیح رائے

طرح خوشی یا غمایت حاصل نہیں ہوتی تھی جس طرح ایک مجرم کی گرفتاری پر ہوتی جاتی تھی۔ لاشعور کے کسی گوشے میں کوئی غلطی موجود تھی۔ جیسے کہیں کوئی کی گئی کسر نہ لگی تھی۔ کام مکمل نہیں ہوا تھا یا شاید صحیح طریقے سے نہیں ہوا تھا۔ ابھی کوئی کشیدہ کڑی تلاش کرنے کی ضرورت باقی تھی۔

مطلوبہ بلڈنگ تلاش کرنا خاصا آسان ثابت ہوا۔ دو دینیس کے ایک کمرشل علاقے کے قریب ہی واقع صاف ستھری تقریباً بیس دس منزلہ عمارت تھی۔ اس علاقے اور اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس میں اپارٹمنٹ کی قیمت یا کرایہ انقدر کم ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ ماریا عرف چکی اگر اس عمارت میں رہ رہی تھی تو اس کے مالی حالات یقیناً خراب نہیں کئے جاسکتے تھے۔

میں نے گاڑی ایک مناسب جگہ پر کھڑی کی اور چلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ ٹھیک کے سے انداز میں عمارت میں جا پہنچا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا لیکن اس نے سرسری نظر سے میری طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ معذور آدمی نظر آئے گا یہ بڑا فائدہ تھا کہ چوکیدار وغیرہ کے یا زیادہ بچہ کچھ کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

اپارٹمنٹ کا نمبر آٹھ سو آٹھ تھا۔ حجرے سے مجھے اندازہ تھا کہ اسے آٹھویں فلور پر ہونا چاہئے تھا لیکن جب میں لفٹ کے ذریعے آٹھویں فلور پر پہنچا تو آٹھ سو آٹھ نمبر مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اسی دوران ایک اپارٹمنٹ سے ایک جوڑا نکلا دکھائی دیا۔ مواد اور عورت دونوں نوجوان خوب صورت اور خوش لباس تھے۔ میں نے زیادہ دیر تک یہی سے تلاش کرنے کے بجائے آسان راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی اور انگریزی میں مرد کو مخاطب کیا "معاف کیجئے گا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اپارٹمنٹ نمبر آٹھ سو آٹھ کس طرف پڑے گا؟"

دونوں میاں بیوی خاصی عجیبہ طبیعت کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ اس سوال پر دونوں ہی نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ بلکہ یوں کہنے کے میرا سر تپتا جائزہ لیا۔ دونوں رک گئے تھے اور یوں خاموش تھے گویا فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ مجھے کیا جواب دیں۔

"چکی کے ہاں جانا ہے؟" آخر مرد نے سوال کیا اور میں سوچے بغیر نہ سکا کہ موصوفہ اپنے پاس پڑوس میں خاصی مشہور معلوم ہوتی تھیں ورنہ اس قسم کے ملاؤں میں لوگ خواہ ٹیلیفون میں رہتے تھے تب بھی اپنے اندوس پڑوس کے لوگوں کے بارے میں بے خبر ہوتے تھے۔

"جی ہاں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ وہ ذرا آنکھٹے ہوئے لیکن انگریزی میں ہی بولا "وہ جو سامنے دیوار نظر آ رہی ہے اس کے پاس سے بائیں ہاتھ پر مڑنا ہے۔ آپ

نظم اس کے اندازوں سے مختلف عورت تھی۔ بہر حال اس کی احتیاط اور اندیشے اپنی جگہ درست تھے۔ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے وہ اپنی ذمے داریوں اور اپنے کام کے تقاضوں کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی کارکردگی بھی حیرت انگیز تھی۔ خاصو شی سے وہ اندر ہی اندر نہ جانے کیا کچھ کر گزرتا تھا اور کہاں کہاں پاس پھیلائے رکھتا تھا کہ کم سے کم وقت میں وہ بہت زیادہ باتیں معلوم کر لیتا تھا اور اپنے اعتراف کو بھی اسی طرح مصروف رکھتا تھا۔ خود سوتا تھا نہ انہیں سوتے دیتا تھا۔ کچھ صحیح بنا نہیں چلا تھا کہ وہ کس وقت آرام کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا اگر ہمارے ایک چرٹائی پولیس آفیسر بھی ایسے ہوتے تو ہمارے حالات نہ جانے کتنے مختلف ہوتے۔

"متم غوروں سے اسی طرح ذرا کرو اور اسی طرح غماز رہا کرو۔" میں نے مشورہ دیا "تمہارے دل میں بہتری ہے۔"

"بہت بہتر استاد محترم کی کوئی اور حکم۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "حکم یہ ہے کہ اگر اس لڑکی کا فون غیر معلوم ہے تو وہ بھی تیار ہو۔ میرا خیال ہے میں اسے فون کر کے اس کے ہاں جاؤں تو بہتر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے انتہائی قیمتی وقت میں سے بچاؤں گاں کر اس کے ہاں پہنچوں اور وہ کہیں آواز نہ کر دی پر نگلی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"کیا کہنے تمہارے قیمتی وقت کے؟" وہ طعنے انداز میں ہنکارا بھر کر بولا "بہر حال ابھی مجھے اس کا فون غیر معلوم نہیں ہو سکا۔ شکر کہ میں نے اتنے کم وقت میں اتنی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ فون نمبر اگر میرے پاس ہوتا تب بھی میں تمہیں یہ مشورہ نہ دیتا کہ فون کر کے جاؤ۔ اس حکم کے لوگوں سے کوئی کام کی بات معلوم ہونے کی امید ہی صورت میں کی جاسکتی ہے کہ اچانک ان کے سر پر پہنچ جاؤ۔ فون کر کے جاؤ تو وہ اپنی تمام تر عیاریوں، مکاریوں اور چالاکیوں کے ساتھ آپ کے استقبال کے لئے تیار ہو کر بیٹھتے ہوتے ہیں۔"

یہ اس نے کام کا نکتہ بتایا تھا لیکن میں نے اسے وادہ کرنے کے بجائے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا "جی ہاں اپنی اوقات پر رہو۔ زیادہ شکم۔" تجربہ کار اور جھانڈو پولیس آفیسر نے کی کوشش مت کرو۔ اور ہاں ہر وقت فون پر لوگوں کے کان کمانے کے بجائے کبھی کبھے کام بھی کر لیا کرو۔ خدا حافظ۔" اس سے پہلے کہ وہ جواب مجھے کچھ سنائیں گے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں گاڑی میں دینیس کی طرف جا رہا تھا لیکن رجم گلی کی چلی گئی پیش گوئی کے مطابق ہوائی جہاز کی رفتار سے اڑا نہیں جا رہا تھا بلکہ نہایت سست رفتاری سے جا رہا تھا کیونکہ اس وقت میں واقعات پر از سر نو غور کر رہا تھا۔

میں غموس کر رہا تھا کہ بدایت دہائی کی گرفتاری پر مجھے اس

مانے ہی چکی کے اپارٹمنٹ کا دروازہ نظر آجائے گا یہاں  
 اسی سے اس کا دروازہ نظر نہیں آتا۔ اور یہ شاید چکی کے حق  
 بہتر ہے شاید اس نے دیکھ بھال کر خود ہی ایسا اپارٹمنٹ  
 کیا ہو۔

میں نے یوں تیزی سے چلتی چمپکے میں گھبراہٹ کی کچھ سمجھ میں  
 آیا ہو۔ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے لٹ کی طرف بڑھ  
 گیا۔ اس کی پیشانی پر ناگوارگی کی شکلیں تھیں۔ لٹ کا دروازہ بند  
 پاؤں میں طویل سافٹل اور اس کی تالی ہوئی سست میں بڑھ

در حقیقت میں دیکھ نہیں سکا تھا کہ اس طرف کی دیوار پر  
 دیوار کا اختتام نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایک تنگ سارا سٹاپا میں  
 ف کو بھی چارہ تھا۔ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ اپارٹمنٹس  
 نے کے چکر میں بڑے عجیب عجیب انداز میں ہمارے قریب کی ڈرائنگ  
 چالی ہے۔ اس راستے کے اختتام پر واقعی ایک اپارٹمنٹ کا  
 دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر آئندہ سو آئندہ خبر بھی موجود تھا

دروازے پر کارڈ پورٹر وائر فلڈ سے تاریکی کی ایک تجریدی  
 بنگ بھی چسپاں تھی جسے دیکھ کر قہقہہ ہنسا سو کی مدد ترقی ہوگی۔  
 میں ایک جانور نظر آ رہا تھا جو ٹھہر بھی ہو سکتا تھا اور کدھالیا  
 لہذا مجھے۔ جس کی اس پر بھی ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکتا تھا۔

اس کی کمر گول سی کوئی چیز رکھی تھی۔ وہ تیز دھیمی ہو سکتا تھا  
 در غلط بھی۔ لیکن زیادہ امکان یہ تھا کہ مصروف ہے وہ دنیا یا کدھ  
 مرض کا مضمحل بنایا تھا۔ یعنی اس ٹھہر کدھ لے آیا تھی نے دنیا کا بوجھ  
 غلام ہوا تھا لیکن یہ عجیب دنیا تھی جس کی ایک بازیگ سی دم بھی  
 گئی ہوئی تھی۔ مجھے اس لئے فوری طور پر معلوم ہو گیا تھا۔ یہ کسی  
 مصروف کے فن کا نمونہ تھا کہ اس کے ایک کونے پر خاصے جلی  
 نوب میں مارا لکھا ہوا تھا۔ مصروفوں کا یہ طبقہ بھی مجھے عجیب سی  
 لگا تھا جو اپنی فکاردانہ صلاحیتوں کو دروازے پر ٹانگ دیتا تھا۔

ابھی میں نے کال بیل کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ  
 دروازہ خود بخود کھل گیا۔ کچے رنگ کی ایک نیم خیم عورت میرے  
 سامنے کھڑی تھی جس کے چہرے پر شکلیں نمایاں تھیں۔ اس کے  
 ذرا اوپر کوائے ہوئے دانت ہونٹوں سے جھانک رہے تھے۔ بلکہ  
 یوں لگے کہ ہونٹوں سے باہر پھدکتے ہوئے دکائی دے رہے تھے  
 کیونکہ وہ اس تیزی سے پان چار رہی تھی جیسے پان سے کوئی پرانا  
 غلامانی انتقام لے رہی ہو۔

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس اپارٹمنٹ میں کیا کوئی ریگوت  
 کنٹرول کم کا نظام کام کر رہا تھا کہ اوپر بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا  
 اور اوپر دروازہ کھل گیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ  
 میں اس وقت در عورت باہر آ رہی تھی جب میں نے کال بیل بجایا  
 پھاٹی تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا کہ اگر وہ مارا گیا تھی تو مجھے اگلے

قدموں واپس جانے کے بارے میں سوچ کرنا چاہئے تھا لیکن فوری  
 میں نے اپنے آپ کو سمجھایا "برخوردار افضل! فرض کو خشن پرستی  
 پر غالب رہنا چاہئے۔" حالانکہ میں جس سلسلے میں وہاں آیا تھا وہ  
 میرا فرض نہیں تھا لیکن میں خود کو ثابت قدم رکھنے کے لئے کسی  
 بیماری بھر کر فلسفے کا سارا لہجہ چاہتا تھا۔

اسی لمحے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ بہر حال مارا نہیں ہو سکتی  
 تھی۔ میں نے اس کی شخصیت اور طبعیت پر غور کر لیا تھا۔ وہ  
 بے شک غامض صاف تھریے سلسلے میں تھی لیکن بہر حال ملازمہ قسم  
 کی شخصیت تھی۔ دروازہ کھولنے ہی مجھے سامنے پا کر وہ کدھ گڑوا  
 گئی تھی۔ پہلے تو شاید اس نے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنے کا ارادہ  
 کیا تھا لیکن پھر سنبھل کر بولی "کس سے ملنا ہے آپ کو؟" لہجہ  
 کثرت اور اکڑا اکڑا سا تھا۔ اور یقیناً اس کی زبان نہیں تھی  
 لیکن روانی سے بول رہی تھی۔

"چکی سے۔" میں نے ذرا بارعب لہجے میں کہا۔  
 وہ چٹکناٹ آئینہ انداز میں بولی "میں تو اس وقت کام ختم  
 کر کے جا رہی تھی لیکن آپ فہرست میں بی بی کی کو بتائی ہوں۔  
 دیکھ بی بی اس وقت شاید کسی سے بھی ملنا پسند نہیں کریں گی پھر بھی  
 میں بولی رہتی ہوں۔"

وہ شاید دروازہ بند کر کے اندر اطلاع دینے کے لئے جانا چاہتی  
 تھی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں آگے بڑھ کر  
 دروازے میں حائل ہو چکا تھا۔ وہ اب شاید اندر جانے کے سلسلے  
 میں الجھن میں پڑ چکی تھی۔

میں نے جلدی سے کہا "جسٹین اندر جا کر اطلاع دو وغیرہ دینے کی  
 ضرورت نہیں۔ تم اگر کام ختم کر کے جا رہی ہو تو جاؤ۔ میں خود ہی  
 مل لوں گا۔ تم ملازمہ ہو؟"

"ہاں جی۔ میں اس گھر کی مامی ہوں۔ دو دیکھنے کے لئے آئی  
 ہوں۔ پھر بھی میں بی بی کی کو خبر کو بتی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"  
 وہ بدستور میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔

"ہام کو چھوڑو۔ میرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔" میں نے بچی  
 تو اڑا میں کہا۔

"سی آئی ڈی؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں "ٹھیک ہے  
 صاحبہ! آپ خود ہی بی بی کی سے مل لیں۔ میرا تو جانے کا نام ہو رہا  
 ہے۔ میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے صاحب! میں تو اوپر  
 صرف پارٹ ٹائم کام کرتی ہوں۔ اسی ہوں فرسے گیادہ بچے تک۔  
 آج تو مجھ کو باؤنٹ گئے ہیں۔ دیر ہو گئی ہے۔ میں تو چلتی ہوں۔"

اس نے مجھ سے کھڑا کر لیا جانے کی کوشش کی۔ میں نے اس  
 کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے باہر کی طرف تقریباً چلا گیا  
 لگاتے ہوئے بولی "ہمت بہت مہربانی صاحب! اللہ آپ کا بھلا  
 کرے۔" وہ تیزی سے تنگ راستے کے سولہ پر غائب ہو گئی۔ میں  
 نے دروازہ نہایت آہستہ سے بند کر کے کھڑا رہ کر منتقل کر دیا۔

مازل نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اس کے حوصلے کی داد دینا  
کہ اس بے چارے نے اپنے پوز میں فرق نہیں اُٹلے  
چارہ اچھی بجلی آزمائش میں پڑا ہوا تھا۔ وہ گویا ایک بچہ  
کی ٹول پر معلوم تھا۔

ایک تو باڈی بلڈرڈ کی پوزنگ دیکھ رہی تھی اسان نہیں  
چند سیکنڈ کے لئے جو پوز بناتے ہیں اس میں سخت قسم کی  
کی طرح زور لگتا ہے اور توانائی صرف ہوتی ہے جبکہ وہ  
جانے کب سے اسی قسم کے ایک پوز میں بیٹھا تھا۔ اس  
مصور کی صورت میں اس کی مزید آزمائش کا سامان  
سامنے موجود تھا۔ اس آزمائش سے گزرنے پر ایک کے ہم  
نہیں تھی۔

مازل کے پوز میں تو فرق نہیں آیا لیکن اس کی آواز  
چینی سے حرکت کرنے لگیں تب شاید مصور کو احساس  
دروازے پر کوئی موجود تھا۔ حالانکہ اس کی بھی دروازے  
پشت نہیں تھی۔ وہ ذرا ترجمی بیٹھی تھی۔ چاہتی تو گردن  
بھی دروازے کی طرف دیکھ سکتی تھی لیکن شاید بے جا  
سے عجیب محبت تھی۔ فن کی گمراہیوں میں ڈوب جانا اسی  
اسے گرد پیش کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

وہ کس حد تک فن کی گمراہیوں میں اتری ہوئی  
ایوانہ اس کے سامنے موجود اس کے زیر تحویل شاہکار  
جاسکتا تھا۔ اگر اس باڈی بلڈرڈ نے اپنی وہ پوز نہ دیکھی،  
اس کے مبرا اور حوصلے کی مزید داد دینی چاہئے تھی کیونکہ  
انسان کے بنانے کوئی ایسا دلچسپ معلوم ہو رہا تھا جس کے  
غیم سے جھڑکنے سے یا پھر کسی قسم کی غارش نے اسے ہر  
تک گھٹا کر دیا تھا۔ اس کے جسم کے وہ خیب و فراز جو  
میں کافی دلکش معلوم ہوتے ہوں گے اس پیشنگ میں  
معلوم ہو رہے تھے پیچیدہ سیلاب گزر جانے کے بعد کچے  
میں گڑھے پڑ گئے ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ  
تجربہ کی تھی یا حقیقت پسندانہ؟ ممکن ہے وہ ان دونوں کے  
کی کوئی چیز رہی ہو۔

مصور نے ذرا گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور  
اٹھی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ جس چار سال پہلے  
بھی زیادہ خوب صورت رہی ہوگی۔ وہ ان لڑکیوں میں  
ہوتی تھی جو اپنی خوب صورتی اور جوانی کا سرمایہ بڑی بے  
دیا دلی سے لٹاتی ہیں اور جلدی خالی خالی دیکھائی دینے  
اس کی آنکھیں شرمیلی ہال تراشیدہ اور مورے تھے۔  
پسیدہ تھی اپنی نظریں تو گماں گزرتا تھا کہ اس کا تعلق  
سفید فام نسل سے تھا۔ وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی بڑی سی  
تھی۔

اس کی نظریں پڑ پڑی تو اس کی آنکھیں کچھ جھل جھل

پھر میں دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے یوں ٹھٹھا ہوا آگے بڑھا  
گویا وہ میرے کسی یا رعبار کا گھر تھا۔ وہ ایک کشان اپارٹمنٹ تھا۔  
شاید بھی دروازے پر ہونے والے مکالمے کی آواز اندر تک نہیں  
پہنچی تھی یا پھر شاید اس گھر کے کھین چٹس میں جھلا ہونے کے قطعاً  
عادی نہیں تھے۔ انہوں نے دروازے کی طرف آنے یا آواز دے  
کر کچے پونچنے کی کوشش نہیں کی تھی اندر بہ ستور سنا تھا۔  
میں جرحی راہ راہی سے گزر کر لاؤنج میں پہنچا مجھے کچھ ایسا  
جھکا لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ میں گھونسا رسید کر دیا ہو۔ مگر میں  
شاید یہ مثال میں نے غلط دی ہے کیونکہ اس جھکے سے مجھے حلیف  
نہیں ہوئی تھی۔ اس قسم کے جھکے کھانے کی قیاس آزد کرتے  
ہیں۔

لاؤنج کے سرے پر بڑے سے ایک کمرے کا دروازہ چھٹ کھلا  
تھا۔ وہ کمرہ کسی آرٹسٹ کا اسٹوڈیو معلوم ہوا تھا اور آرٹسٹ  
سامنے ہی بیٹھی تھی اور جس حالت میں وہ بیٹھی تھی اسی کی وجہ سے  
میرے پیٹ پر گھونسا پڑا تھا۔

میں نے یہ تو سنا تھا کہ بعض آرٹسٹ ایک خاص طرز کی  
تصویریں بنانے کے لئے بیٹھی جاگتی مازل کو اس حالت میں سامنے  
بیٹھا تھے لیکن یہ نہیں سنا تھا اور نہ ہی کبھی دیکھنے کی توقع کی تھی  
کہ خود آرٹسٹ صاحب اس حالت میں پیشنگ فرمائی ہوں گی۔

میں شاید اسے مازل ہی سمجھتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے  
ایک ہاتھ میں رنگوں کی پلیٹ اور دوسرے میں برش موجود تھا۔ اسی  
کے سامنے ایبل پر کیوں سجا ہوا تھا۔ وہ ایک چوکور اسٹول پر موٹا  
سار تھیں کشن رکھے بیٹھی تھی اسے آرٹسٹ سمجھنے کے سوا کوئی  
چارہ نہیں تھا۔

وہ اپنے کام میں کچھ اس طرح منہمک تھی کہ میری آہٹ شاید  
اس نے سنی ہی نہیں۔ اور اگر سنی تو لبثت کر دیکھنے کی زحمت نہیں  
کی۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو مجھے مصور کا مازل بھی نظر  
آ گیا۔

وہ ایک دلچسپ اور باڈی بلڈرڈ لڑکا تھا۔ اس کا جسم تانے کی  
طرح چمک رہا تھا اور وہ ایک دیوار کے قریب اسٹول پر باڈی  
بلڈرڈ والا ایک مخصوص پوز بنانے بیٹھا تھا جس میں اس کے پیچھے  
اور جسم کی خوب صورتیاں خوب نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ مصور  
اور مازل دونوں یکساں ہی لباس میں تھے۔ یعنی نہ ہونے کے برابر گو  
کہ مصور تو باڈی بلڈرڈ نہیں تھی۔ اسے تو قدرت نے جیسا بنا دیا تھا  
وہ اسی طرح غصب کی چیز تھی۔ وہ اگر اس میں کچھ کی بیشی کی  
کوشش کرتی تو شاید اس کی خوب صورتیوں کا اس تک جائیداد کو کہ  
وہ ذرا چھوٹے قد کی تھی اور کچھ بھاری پن کی طرف مائل تھی مگر  
اسی طرح ٹھیک تھی۔ وہ قدرے گول منڈلی قیامت تھی اس کی  
رنگت آنہ نیلے گلابوں کی سی تھی۔

میں دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

میں کوئی ہوتا اور اندر کس طرح آئے؟ اس نے انگریزی میں سوال کیا۔  
 "جی ہاں، یہی مسئلہ ہوا تھا۔" میں نے انگریزی میں جواب دیا۔

"ہنگی! اگر تم کو تو میں اس گدھے کو اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہوں؟" ہنگی ایک ہنسناکی ہوئی سی آواز نکالی دی۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسی ہنسناکی ہوئی سی آواز اس لڑکانہ لڑکے کے شہسوار وجود سے برآمد ہوئی تھی۔ ایک تو شاید اس کی آواز ہی ایسی تھی دوسرے شاید کلاں دہرے اسی مبر آواز میں چٹپٹے بیٹھے اس کی آواز پر مزید کچھ حقیقی اثرات مرتب ہوئے تھے۔

مجھے لفظ "گدھے" پر غصہ تو مت آیا، مگر ہنگی کا کہ آگے بڑھ کر اس میں اور اس کی پورٹ میں کچھ مشابہت پیدا کر دوں لیکن ایک تو میں اس ملاقات کا آغاز ہی دیکھنے لگا تھا۔ وہ میرے مسئلے پر بھی تھا کہ راستے میں وہ مصروف مسرت اور اس کا ساؤدھان مائل تھا۔

مجھے ملتی ہی دل میں ایک بار پھر اس عظیم مصروف کے اس عظیم مائل کے صبر و استقامت کی یاد دہانی پڑی کہ اس نے بات کرتے ہوئے بھی اپنے پوز میں فرق نہیں آئے تھا۔ اس کے باوجود ہنگی نے اسے ڈانٹا "جی تم آرام سے بیٹھے رہو اور اپنے تاثرات غراب مت کرو۔ مجھے تمہارے جو تاثرات درکار ہیں وہ آج ہی مشکل سے تمہارے چہرے پر پیدا ہوئے ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر اس کی پورٹ پر نظر ڈالی کہ ان تاثرات کا نظارہ کتنوں جنہیں وہ عظیم مصروف کیوں پر نظر کر رہی تھی مگر وہاں تاثرات تو درکنار چہرے کا ہی صحیح پتہ نہیں مل رہا تھا کہ کہاں تھا؟ تاہم مصروف میرے بارے میں اپنی تشویش کو فوراً ہی بھول کر دوبارہ نہایت مسکون انداز میں اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اس نے کیوس پر اس جگہ پرش سے چند اسٹروک لگائے جہاں غالباً اس لڑکانہ کی ٹھونڈی تھی۔ تاہم میں یقین سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ پشیمانی بھی ہو سکتی تھی۔

میری نظر ہنگی پر جمی ہوئی تھی۔ اگر اس عالم میں بھی کسی کی نظر اس پر نہ پڑتی تو یہ بڑی ناقدہ دل کی بات ہوتی۔ مجھے احساس تھا کہ اس کا بڑی بلڈر مائل ہونے سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری وجہ سے اس نے ہمارے کے لئے صحیح طور پر اپنے پوز میں بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر ہنسنا "ہنگی! تم اس آدمی سے پوچھو تو کسی سے یہاں کیوں آیا ہے؟" وہ بھی انگریزی میں ہی بات کر رہا تھا۔ وہ دونوں اسی طبقے کے افراد معلوم ہوتے تھے جو کہ ماکاز کی دالے سے بھی انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس بے جا سے کی کچھ سمجھ میں آئے یا نہیں۔  
 گو کہ میری نظر لڑکی کے چہرے سے بچی تھی لیکن میں اس کے

چہرے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ چوتھے شناسا محسوس ہوا تھا لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس سے پہلے میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ اگر میں اس سے ملا ہوتا تو مجھے ضرور یاد ہوتا۔ کم از کم لڑکیوں کے بارے میں میری یادداشت ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی۔  
 اپنے مائل کی فرمائش پر مصروف نے میری طرف دیکھے بغیر دریافت کیا "ہاں تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

"میرا نام افضل چوہدری ہے۔" وہ میری بات کاٹنے ہوئے ہوئی "میں نے تمہارا نام نہیں کام پوچھا ہے۔ میرا مطلب ہے یہاں کس کام سے آئے ہو؟ نام اتنے شوق سے کیوں تار ہے ہو؟ یہ تو کوئی ایسا نام نہیں ہے جسے سن کر میں خوش یا حیرت سے اچھل پڑوں یا میرے جسم میں ہنسنا کی لہر دوڑ جائے۔"

"تم جیسے لوگوں کے جسم میں ہنسنا تو ڈنڈا ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جو بڑی مشکل سے دھماکا ہوتا ہے۔ مجھے غریب کے نام میں اتنی طاقت کہاں کہ محض اسے سن کر تمہارے جسم میں ہنسنا کی لہر دوڑ سکے۔ ہنسنا کی تلاش میں تو تم لوگ نہ جانے کیا کیا جنم کرتے ہو۔" میں نے ہنسناکی مائل سے کہا۔

وہ ایک بار پھر میری بات کاٹنے ہوئے ہوئی "تم کیا یہاں کوئی دھماکا دیکھ کر آئے ہو؟" میں نے تو کوئی رشتہ مرا مولوی معلوم نہیں ہوئے۔

"میں نے کہا کہ میں افضل چوہدری ہوں۔" میں نے دباؤ سے تم کس گاؤں کے چوہدری ہو؟ تمہاری اونچے چلنے والی چوڑی۔ تمہاری کلف مگی دھولی اور تمہارا زور و بالا کھٹا کہاں ہے؟ تم تو بڑے ہینگے جسم کے سوٹ بوٹ میں دکھائی دے رہے ہو۔ تم کس قسم کے چوہدری ہو؟" اس نے بدستور پرش چلائے ہوئے پرسیکون کے میں پوچھا۔

"وہ گاؤں آؤ پڑ چکا ہے جس کا میں چوہدری تھا۔ میں شہر آکر ملازمن ہو گیا ہوں۔ سوٹ بوٹ پہننے لگا ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو معافی چاہتا ہوں کچھ دن بعد واپس گاؤں چلا جاؤں گا۔" میں نے ملائمت سے جواب دیا۔

جی ایک بار پھر ہنسنا "ہنگی! خدا کے لئے اس آدمی سے خبیثگی سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ یہ کیا چاہتا ہے؟" ہنگی نے اسے ہی طرح ڈانٹتے ہوئے کہا "خدا کے لئے تم مجھے یہ بتانا بند کرو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ مجھے جو کچھ بھی پوچھا ہو گا میں خودی پوچھ لوں گی۔ تم اپنا یہ سخاسات بند رکھو اور اسی طرح بھوکے نظروں سے صرف میری طرف دیکھو جس طرح کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری اس پشیمانی کا عظیم طاقت اور ہوس ہے۔ میں طاقت اور ہوس کی عکاسی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے چہرے پر طاقت تو نظر آ رہی ہے ہوس کا کہیں چہرہ نہیں مل رہا۔ وہ پہلے ہی مت کم تھی۔ اس ابھی چوہدری کو

دیکھ کر تو بالکل ہی عائب ہو گئی ہے اب صرف غصہ ہی غصہ نظر آیا ہے۔ غصہ مجھے نہیں چاہئے مجھے غصہ ہیٹ نہیں کرنا ہے۔  
نوجوان نے میری طرف سے نظر ہٹائی اور اپنے چہرے پر ہوس  
ناکی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کا چہرہ کچھ  
ایسا دکھائی دینے لگا جیسے وہ بیٹ کے درد میں مبتلا ہو۔ ہلکی دویاہ  
اشہاک سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس نے گویا بھلا دیا تھا  
کہ میں وہاں موجود تھا۔ یا پھر شاید اس کے لئے یہ قطعہ کوئی اہم  
بات نہیں رہی تھی۔

میں چند لمے اسے اٹکے سیدھے برش مارنے دیکھتا رہا پھر میں  
نے یکدم بدلے بدلے اور سخت لمبے میں کہا ”مس ماریا عرف بنگلہ  
پیتھنگ کی یہ بیروڈی بڑ کر اور چتر منٹ کے لئے میری طرف توجہ  
دو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری اور عجیبہ گفتگو کرنی ہے۔“  
اس نے گویا جھنجھلا کر رنگوں کی پیٹ ایک طرف اور برش  
دوسری طرف پیٹھک دیا اور تنک کر بولی ”اس شہر میں انسان کہیں  
بھی پیتھ کر تحقیق کام نہیں کر سکتا۔ لگتا ہے سکون کی تلاش میں اب  
مجھے قبرستان ہی جانا پڑے گا۔“

وہ میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ قدم میں مجھ سے بہت  
چھوٹی تھی۔ سر اٹھا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے باوجود  
گویا میں اسے بہت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔  
میں نے فصرے فصرے لمبے میں کہا ”مگر قبرستان جانے کا  
پرگرام بن بھی جائے تو اس حالت میں مت جانا۔ مڑوے قبروں  
سے اٹھ کر بیٹھیں گے اور سخت برا مانا کریں گے۔ وہ اس بات کو ہرگز  
پہنہ نہیں کر سکتے کہ کوئی ان کے جذبات سے کھینچنے کی کوشش کرے۔  
سکون میسر آنے کے بجائے وہاں تمہارا رہا سا سکون بھی برباد ہونے  
کا اندیشہ ہے۔ مڑوے تمہارا بیجا درد بھر کر دیں گے۔“

وہ گویا اب تک اپنی حالت سے قطعی بے خبر تھی۔ اب اسے  
اندازہ ہوا کہ میری نظر کہاں سے کہاں تک بھٹک رہی تھی اس نے  
اپنے سر اُپر نظر ڈالی اور ذرا چونک کر بولی ”ارہا۔“

اس بے خبری اور بے پروائی پر قربان جانا چاہئے تھا لیکن میں  
اس وقت قربان جانے کا متمثل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے قریب ہی  
ایک کرسی کے نشے پر پڑا ہوا ریشمی گاؤن اٹھا کر پہن لیا اور ایک بار  
پھر گویا میرے لئے وضاحت کی ”میں نجی کے چہرے پر ایک خاص  
تأثر پیش کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا  
تھا۔“

”تم جیسے سچے فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔“ میں نے سر  
ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا ”یہ تمہاری نگاہوں سے تمہارے ہاتھ لگا  
ہے؟“

”ہاتھ لگا ہے؟ کیا مطلب؟“ وہ ناک سیکڑ کر بولی ”تم تو کچھ  
اس طرح بات کر رہے ہو جیسے بے چارہ ٹی ٹیوں میں تو اوارہ بھرا  
ہوا کوئی پلائی بلی کا بچہ تھا جو اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ یہ ایک

معزز اور دولت مند گھرانے کا لڑکا ہے۔ اس کے والد عوامی رہنما  
سفر پر کچے ہیں آج کل ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔“  
”کیا وہ کسی عمر رسیدہ مصور خاتون کے لئے مازنگ کرے  
ہیں؟“ میں نے غلامت سے پوچھا۔

”اورہ پلینز صحت کر۔“ نجی براہ راست پائے گا۔ اس کا غصہ سر  
خواب ہے۔“ وہ گویا ہنسنے ہنسنے لگی۔ پھر اس نے گردن جھکا کر  
میں کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک پوزہ بنائے اڑا بیٹھا تھا۔

”لوہ نجی پلینز۔ اب تم اسٹول سے اتر آؤ۔ فی الحال کام درکار  
کیا ہے۔“ بنگلہ نے اسے مطلع کیا۔ گویا وہ بے چارہ خود دیکھنے سے  
تاصر تھا۔ وہ نہایت سعادت مند سی اسٹول سے اتر آیا۔ چند  
گہری گہری سانسیں لے کر اور جسم کو جھٹکے دے کر اس نے شاید  
اکڑاؤ دور کیا اور آگے آگیا۔

وہ کینہ توڑ نظروں سے مجھے گھور رہا تھا مگر ہاتھ پھیلا کر بولا  
”سگریٹ ہوگی تمہارے پاس؟“

”بنگلہ ابھی تباہی خیزی کر رہا ہے اب کا بہت بڑا بزنس ہے۔  
لیکن سگریٹ مانگ کر پیتے ہو۔ کیا یہ بھی تمہارے خاندانی بزنس کا  
ایک حصہ ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر  
پوچھا۔

اس کا ختمنا ہوا سا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔ بازوؤں کی  
پھلیاں پھرن پھرنے لگیں ”میرا سگریٹ کا پیکٹ نیچے میری جیب میں  
رہ گیا ہے بد تمیز آدمی! مرنے کیوں جا رہے ہو۔ اگر ایک سگریٹ  
میں دے سکتے تو سیدھی طرح انکار کر دو۔“

”مسک۔ یہ ہے کہ مجھے سیدھی طرح انکار کرنا آتا نہیں ہے۔  
کیونکہ میں سگریٹ پیتا نہیں ہوں۔“ میں نے اب ذرا نرم لمبے میں  
کہا ”اور تم جیسا باڈی بلڈر میں نے پہلی بار دیکھا ہے جو سگریٹ پیتا  
ہے۔“

بنگلہ نے اس کی طرف دیکھ کر گویا اسے تسلی دی ”سگریٹ  
میرے پاس اندر پڑی ہے۔ میں ابھی تمہیں لاؤتی ہوں لیکن پہلے  
میں اس عجیب و غریب اجنبی سے بات کرنی چاہئے آخر یہ چاہتا  
کیا ہے۔“

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی ”دیکھو مسٹر! تم جو  
کوئی بھی ہو۔ لیکن تمہیں میرے بوائے فرینڈ کی توہین کرنے کا کوئی  
حق حاصل نہیں۔ ایک تو تم پہلے ہی نہ جانے کس طرح منہ اٹھائے  
میرے گھر میں کھس آئے ہو۔“

زمانہ واقعی کچھ زیادہ ہی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ کچھ عرصے  
پہلے تک اس طبقے کی لڑکیاں بھی بوائے فرینڈ کی اصطلاح استعمال  
نہیں کرتی تھیں کم از کم انہیں ان کے سامنے تو اس قسم کے لڑکوں کو  
”کزن“ وغیرہ کے مشہور زمانہ رشتے سے ہی متعارف کراتی تھیں  
لیکن بنگلہ نے بڑے اطمینان سے اسے اپنا بوائے فرینڈ قرار دیا تھا۔  
”یہ تمہارا بوائے فرینڈ ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی۔



ہاں۔ جس کو اعتراض ہے کیا؟" ہنگامی سرکش لہجے میں

اعتراضات تو تم نے اپنے والدین کے بھی نہیں سنے ہوں  
برے اعتراض کرنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ "میں نے سر  
ہوئے کہا اور از سر نو کہری نظر سے اس نوجوان کا جائزہ لیا۔  
کے اشارے پر کسی کو قتل کرنے کا پوری طرح اہل معلوم  
ہاں۔ کوئی عیب نہیں تھا کہ اس کے پاس اعشاریہ تین دو کا  
بھی موجود رہا ہو۔ رحیم گل نے مجھے بتایا تھا کہ بیچ صاحب کو  
تین دو کے پتول سے گولی ماری گئی تھی۔

گولی بولی "ایک آؤٹ کو پرائیویسی کی ضرورت ہوتی ہے۔"  
"بے شک۔" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا "تھوڑا  
نہ آؤٹ کو تو مت ہی پرائیویسی میسر ہوتی ہے۔"  
وہ میری بات پر دھیان دے بغیر جیڑی سے چمیل "تم میری  
لہجہ میں قتل ہوئے ہو۔ زبردستی میرے گھر میں داخل ہوئے  
ہی نہیں پائیں گے حوالے کر دیں گی۔"

"تو اہل خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم لگے۔" میں نے  
پر کی انگریزی گفتگو میں پہلی بار اردو کا صریح اضافہ۔  
"ہاں؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"میرے چہلو اور یہ تمہاری سمجھ میں آنے والی بات نہیں  
"میں نے کہا "پہلے تم مجھے ایک بات سمجھاؤ جو میری سمجھ میں  
آ رہی ہے۔ مجھے تمہاری صورت کچھ شناسائی لگ رہی ہے۔

کہاں ہے؟ کیا ہم پہلے ہی مل چکے ہیں؟"  
"ہاں ہم پہلے ملے ہوئے تم اتنی آسانی سے مجھے نہیں بھول  
تھے۔" وہ آنکھیں میسر کرتے ہوئے بولی "اور تم بھی اس قابل  
ہو گئے ہو کہ جس بار کھا جاتا۔ میرا خیال ہے کہ جس میری  
رہت اس نے جانی پہچانی لگ رہی ہے کہ میں ماؤنگ کرتی ہوں  
اپنے اور پش میں کئی اشتہاروں میں آنچلی ہوں۔"

"اگر وہ ہاں بالکل یقین بات ہے۔" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے  
ماکی تائید کی۔

"تم کل میں ڈرا اور روٹ ہو رہی ہوں اس لئے میں نے  
لنگ چھوڑی ہوئی ہے۔ اب میں خوب زبردست ڈانٹنگ شروع  
دوں گی دوبارہ سلم اور اسٹارٹ ہو کر زیادہ زور و شور سے ماؤنگ  
لے میدان میں آؤں گی۔" اب اس کا لہجہ تھوڑا سا دوستانہ ہو چکا  
ہاں۔

"ضرور آؤنگ ضرور آؤنگ۔" میں نے سر ہلایا "یہ بتاؤ تم بیچ  
بد القوم صاحب کو جانتی ہو؟"

"جی نہیں۔" وہ بلا تامل بولی "وہ میرے ڈیڑی کے دوست  
ہیں بلکہ یہ کہ انہوں نے میرے دوسرے ڈیڑی بننے کی کوشش  
کی تھی میری ایک سی ڈی ڈی سے بڑی مشکل سے جان بچائی تھی  
اس لئے میں کوشش کرتی تھی کہ وہ میرے دوسرے ڈیڑی نہ بنے

|                        |        |      |
|------------------------|--------|------|
| اسلام کے نامور مجاہدین | قرتکین | 50/- |
| اسلام کی نامور خواتین  | قرتکین | 40/- |
| موسلمان مشاہیر         | قرتکین | 75/- |
| ملک ملک کی عورتیں      | قرتکین | 35/- |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

پانچم۔

اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار  
ہوئی "بہر حال اتنے آدمی ہیں۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی  
کہاں ہیں آج کل وہ؟ کیا تم ان کا کوئی پیغام ملے ہو؟"  
"وہ اب وہاں ہیں جہاں سے کوئی پیغام بھیجنا ناممکن ہی ہوتا  
ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔  
"میں کل شام کسی نے قتل کر دیا ہے۔" میں نے کہا اور  
اس کے چہرے پر نظر پڑنے لگی۔

"وہ تو۔" وہ کھڑے کھڑے ذرا لڑکھڑائی مٹی۔ "جی نے فوراً  
لپک کر اپنے منسوب ہانڈوں میں اسے سہارا دیا اور گدی کی کرسی پر  
بٹھادیا۔ اس کی رحمت کچھ مختصر ہی ہو گئی تھی۔  
"پڑاؤ لڑائی؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ قہر آمیز

سے انداز میں پڑاؤ لائی۔  
"کیا تمہیں معلوم ہے کہ پڑاؤ لڑائی نے ایک انشورنس  
پالیسی لی ہوئی تھی اب اس کی رقم دس لاکھ تھی ہے اس پالیسی میں  
انہوں نے تمہیں وارث مقرر کیا ہوا تھا؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" وہ ہر سکون لہجے میں بولی "وہ ہے  
چارے میری مدد کرنا چاہتے تھے۔ ان دنوں میرے حالات کافی

خواب تھے۔ ہاں باپ سے میری جی جی ملٹھ گئی ہوئی تھی۔ اب میں اپنے حالات بہتر کرنے کے لئے بے چارے جج صاحب کی موت کا انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے میں نے خودی ہاتھ پاؤں مار کر اپنے حالات بہتر کر لئے تھے۔ لیکن اب تم یہ خبر لائے ہو۔ کیا تمہارا تعلق انشورنس کمپنی سے ہے؟

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ابھی ہمارے ہاں انشورنس کمپنیاں اتنی مستعد نہیں ہوئیں کہ آدمی کے قتل کے دوسرے دن ہی وارنٹ کے گریپنگ جائیں۔ بے چاری انشورنس کمپنی کو تو ابھی اس واقعے کی اطلاع بھی نہیں ہے۔“

”تو پھر تم کون ہو؟ تم پولیس والے تو نہیں ہو سکتے۔ اور پرائیویٹ سیرا فرمیں ہمارے ملک میں ہوتے نہیں ہیں۔“ اس نے مجھے گھورا۔

”درست ہے۔“ میں نے سر ہلایا ”میں نہ پولیس والا ہوں اور نہ ہی پرائیویٹ سیرا فرم۔ میں بتا چکا ہوں میرا نام افضل چہ درسی ہے اور میں ایک نہایت ہی مامول آدمی ہوں لیکن مجھے ایک مستقل قسم کے سوال کا جواب چاہئے۔ کل شام پانچ سے سات بجے کے دوران تم اور تمہارا یہ ذرا چٹلے درجے کا تارزن بوائے فریڈ کہاں تھے؟“

اس کی آنکھیں سکو گئیں اور ان سے فیضانِ غضب کا اظہار ہونے لگا۔ جی کے تختے بھی چھوٹے پچھلے لگے۔ وہ مجھے لیکن غصیل آواز میں بولی ”اب میں سمجھی کہ تم کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہو۔ شاید تم نے کچھ انگریزی کا نام یاد کر لیا ہے جنہوں نے تمہارا دامغ خواب کھینچا ہے۔ پاکستان میں انشورنس کے لئے قتل نہیں ہوتے۔“

”پاکستان میں کیا نہیں ہوتا مائی ڈیئر بنگی!“ میں نے طویل سانس لے کر کہا ”جو کچھ بھی مغرب میں ہوتا ہے۔ جہں ہمیں پچاس سال بعد اور فیض اوقات اس سے پہلے مشرق میں بھی ہونے لگتا ہے۔ تو ڈرایا زیادہ لیکن ہونا ضرور ہے جب یہاں بوائے فریڈز ہو سکتے ہیں تو انشورنس کے لئے قتل بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے ایک بار ایک انشورنس کمپنی کے بہت اعلیٰ افسر نے بتایا تھا کہ یہاں بھی انشورنس کے لئے کیا کچھ ہوتا ہے اصل مسئلہ تو پیسے کا ہے نا تو پیسے کے لئے یہاں کیا نہیں ہوتا؟“

وہ مجھے گھورتی رہی۔ میں نے اپنا سوال ڈہرایا تو وہ ابھٹکی سے بولی ”کل شام میں اور میری ایک آرٹ گیلری میں تصویروں کی نمائش دیکھ رہے تھے۔“

”اس کا کوئی ثبوت؟“

”ثبوت کے بچک۔“ جی رہی سے پہلے اسد میں بولا پھر فوراً انگریزی کی طرف منظر ہوتے ہوئے چلتا ”میں دتا ہوں تمہیں ثبوت۔ تم ہوتے کون ہو ہم سے ثبوت مانگنے والے بہت ہو چکے۔“

وہ بازوؤں کے مسل پٹلائے میری طرف بڑھا۔ بھی بھول چک رہے تھے۔ بنگی نے ہاتھ کے اشارے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے پُرسکون لمبے میں کہا ”جواب حاصل کرنے کے بعد مجھے اس گھر کی تلاش بھی ”اب مدد ہو گئی ہے بنگی!“ جی طعنا تک لے کر میں اس نمونے کو اٹھا کر کمر کی کے راستے چلے بیٹھ گیا۔ اس نے دوسری مرتبہ مجھے اٹھا کر پچھنے کا ارادہ شایہ دہت اٹھاتے اٹھاتے اسے ہر چیز کو اٹھا ہاتھ سے تھا۔ میرے ہاتھ ابھی تک چٹوں کی جیسوں میں تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی اصرار سے خوف ناک انداز میں مجھ پر اثر انداز نہیں کر سکا ہو کہ کب میرا ہاتھ جیب سے باہر میرا گھونسا اس کی چٹائی پر پڑا۔ یہ وہ گھونسا تھا جس نے شفیق شاہ کے کئی بارس باور گاہن کا م کام کر دیا ہوا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے بچتا تھا اس سے کہیں زیادہ سے بچنے کرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جھپکی۔ بنگی کو شاید لیٹین نہیں آتا تھا کہ اس کا بار بار گھونسنے میں اس طرح جت ہو گیا تھا۔

میں نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا ”اطمینان سے لی جاسکے گی۔ یہ خواہ مخواہ جج میں نہیں تھا۔ میرا خیال ہے میں اس کے کمزوروں سے ہی غاشی شہد پھر بار نمٹ کو دیکھوں گا۔“

میں نے دوسری کرسی کے پتے پر اس کا سوٹ لہو دیکھ لیا تھی۔ بنگی ایک تک میری طرف دیکھے جاری تم اس بے چارے کو بلا جلا کر دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی میں نے آگے بڑھ کر کرسی کے پتے سے سب سے کوٹ اٹھایا۔ مجھے اس کی ایک جیب میں کچھ وزن کم وزن ہوئے کے وزن سے کچھ زیادہ محسوس ہوا تھا۔ اس سے پہلے اسی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے ہاتھ نکال کر دیکھا۔ کایا ہوشیار تھا۔

میں نے اس کا میگزین نکال کر دیکھا۔ اس میں ”جی“ تب میں نے بنگی کی طرف دیکھ۔ وہ بدستور بولی ”سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔“

**حسٹک**

انوار صدیقی (ذریعہ طبع)



ہو جاتے۔ اس کی کوششیں اس کے باڈی بلڈ رائڈل سے زیادہ مؤثر تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دھڑ اور گدا اذکیل سے جان چھڑا لینا ہی بہتر تھا۔ میں نے اسے دور اچھال دیا۔ وہ اپنی رنگ کی ٹیڈیوں، آکس کے ڈبے اور نہ جانے کس کس کاٹھ کیاڑ کو بھینتی ہوئی اپنے بوائے فریڈ پر جاگری۔ جس حسین انداز میں وہ اس پر جاگری تھی اس سے اس بد بخت کو ہوش آ جانا چاہیے تھا مگر شاید وہ بے ہوشی کے جنگل میں کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا تھا۔ اتنا کرٹ لگنے بلکہ پاور پلانٹ کے کیپے دھب جانے پر بھی ہوش میں نہ آیا۔

جنگی نجات پھرتی سے اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بار وہ جس طرح مجھ پر حملہ آور ہوئی اس سے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ وہ جو ڈوڈ گرائے بھی جانتی تھی۔ زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس نے پہلی مرتبہ ہی حملہ کرتے وقت اپنا ہی ہنریکیں نہیں آزمایا تھا؟ اس وقت وہ کیوں خالص زنانہ انداز میں حملہ آور ہوئی تھی اور میرا منہ نوچنے کی کوشش کرنے لگی تھی؟

اسی کو شش میں وہ کسی حد تک میرے قابو میں آگئی تھی۔ شاید بہلت اس کے ہنر پر غالب آگئی تھی۔ عورت نمناغھے اور غیظ و غضب کے عالم میں کی گئی ہے۔ ”منہ نوچ لوں گی۔“

بہر حال حیرت ہی حیرت میں مجھے اپنے کندھے پر اس کی ایک فلائنگ کلک برواشت کرنی پڑی۔ شیر کی پٹنی میں اچھی بجلی طاقت اور پھرتی تھی۔ میں نے اس کے باڈی دو تین داڑ خالی دیے اور آخر فیصلہ کیا کہ اسے قہوراً بہت ڈوڈ زنا ضروری تھا۔

پھر میں نے سونار کی ایک لوہار کی والے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے بتایا کہ امراتہ کس طرح وار کرتی ہیں۔ کھوپڑی پر ایک سی چاب پڑی تو وہ ایک فولڈنگ کری پر اس طرح جاگری کہ کری سمیت الٹ گئی۔ وہ وہیں ساکت رہی تو مجھے ذرا تشویش ہوئی کہ کہیں وہ بھی اپنے بوائے فریڈ کی طرح بے ہوشی کے جنگل کی طرف تو نہیں نکل گئی تھی؟

چیزوں کو پھلانگتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر فولڈنگ چیز ایک طرف ہٹا کر رکھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ اچانک ہی ایک بمبیاک چمک کے ساتھ نہ اٹھ کھڑی ہو اور تنہا اسٹروالے اسٹاکل میں اچھل کر میری کھوپڑی نہ پٹکارے لیکن وہ چپ پڑی آنکھیں پٹ پٹ بھاری تھیں۔

وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن ابھی کی آنکھوں میں اتر آئے والی خفیف سی وحند لاہت جاری تھی کہ اس کا ذہن سست پڑ گیا تھا۔ میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے فولڈنگ چیز سپرڈھی کی اور کلکی کو گردن سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اس پر بھڑک دیا۔

اس نے اب مجھ پر حملہ نہیں کیا اور ڈیلے ڈھالے انداز میں کری پر ڈھیر ہو گئی۔ ذرا دقت سے ہی کسی لیکن بات بہر حال اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ میں اس کے بس کی چیز میں تھا۔ تاخیر سے ہی

میں نے ایک بار پھر میگزین کا جائزہ لیا اور سر ہلاتے ہوئے اشاریہ تین دو کا پتہ مل گیا۔ اور بیخ صاحب کو ان دو کے پتوں سے ہی قتل کیا گیا ہے۔ اس کے میگزین میں بھی کم ہے۔“

لوا موثر حال کی جھٹکی کا احساس کرتے ہوئے ذرا کھانے والے انداز میں بولے۔ ”یہ تو کسی کو قاتل ثابت نہ آتا ان طریقہ ہے۔“

اسے تو اتنی بھی زحمت کرنی ہے۔ پولیس کے پاس تو کسی کو کر کے اس سے بھی کہیں زیادہ آسان طریقے موجود نہ نکالے۔

یہ تم کون خدا کی فوج دار ہو۔ اور کیوں اس طرح اچانک گلے دینگے؟ وہ دیر ہی سے چٹکی۔

بات زرا دیر سے تساری سمجھ میں آئے گی۔ میں نے

لے اچانک پھری ہوئی جنگلی ٹلی کی طرح مجھ پر حملہ کر دیا۔ لے مخصوص موافق انداز میں اس نے میرا منہ نوچنے کی۔ لیکن میں نے اس کے ناخن اپنے چہرے تک نہیں جھنپتے سے نکال دیوں سے پکڑ کر قابو کرنے کی کوشش کی۔

یہ ٹھوکریں مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے اس کو اور طرح قابو میں کرنے کی کوشش کرنا پڑی اور اس کو شش پارا صفت و دور میرے ہاتھوں میں بٹھرنے لگا۔ وہ جس انداز میں کل رہی تھی اس عالم میں اسے قابو میں کرنا تھا۔

سے وہ مجھے دائیں سے کانٹے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔ ل کے دائیں سے پیچھے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش ہوئی۔ اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح دائیں سے کانٹے کو کچھ اور کہتے ہیں۔ میں کہیں وہ نام دینا نہیں چاہتا۔ آگئی ہوئی ہے۔“

اچھے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ اس کے ایک ایک میں ٹائی پھری ہوئی تھی۔ شاید یہ توانائی کی زیادتی ہی ہوئی ہے۔ جسے اس قسم کی دوہیں کچھ زیادہ ہی باقی ہو جاتی ہیں۔ انٹی مل باپ سے باقی معاشرے سے باقی اصولوں سے باقی کہہ رہی ہے۔ باقی۔

تو بھی رستم سے کم نہیں تھی۔ اوپر سے اس کا کاؤن رہی میرے ہاتھوں سے پھسل پھسل چاری تھی۔ اسے قابو میں نہایت مشکل تھا۔ ایک بار تو اس نے میری ٹانگ پر ٹھکری لے لی کوشش کی۔ غیبت تھا کہ اس کا قہقہہ تھا۔ پٹلے داس کا سر صرف میری ٹھوڑی سے ہی ٹکرا سکا۔

باکھر سے ٹھوڑی کا کچھ نہیں بچا۔ البتہ اگر ٹھکراک پر پڑنا تو یقیناً کبیر بھرت جاتی اور مجھ پر چوہہ طبق روشن

ہے کل جب میں اور فی قصور دل کی غماز سے  
تھے تو ہمیں راستے میں ایک رستوران میں کھانا  
کافی دیر ہو گئی تھی۔ پھر ایک جگہ راستے میں گاڑی  
مینڈیکل اسٹور میں کوئی دوا لینے چلا گیا۔ گاڑی میں  
ماڈل کی بجیڑ ہے۔ میں گاڑی میں ہی بیٹھی تھی۔ اس  
موڑ سائیکل پر تین لڑکے لڑے ہوئے آئے۔ ان کے  
ہتھل تھے۔ انہوں نے مجھے بچے اڑ کر بجیڑ پر چڑھا  
بلکہ ایک نے تو کھڑی میں سے ہاتھ ڈال کر اچھینچ  
ٹال لی۔

وہ جیسے پوٹے پوٹے تھک گئی۔ سانس لینے  
آشناک سے سن رہا تھا۔ اس نے سلسلہ کلام جوڑا  
سب کچھ دیکھ لیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکے کا  
کوشش کر رہے تھے۔ فی ایک بے خوف نوجوان۔  
بھی بہت تیز ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ  
زندہ کیسے ہے۔

”صرف اس لیے کہ اوپر والے نے ابھی اس کا  
ہوئی ہے“ میں نے سادگی سے جواب دیا۔ ”بہر حال کچھ  
”یہ رادھ اور دھرم کے بھائے تیر کی طرح  
طرف آیا۔ اس نے ہتھل فوراً ہی ٹھٹھال لیا تھا اور  
بھی رہا تھا۔ اس نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی  
تھے اور ان کے پاس لیٹے تھے۔ فی اکیلا تھا اور اس  
یہ تھا۔ اس ہتھل تھا جو آج کے دور میں کھلتا تھا  
”تم بھی تو تھکے۔ تم بھی کسی کھانڈے سے کم نہ  
کہا۔

”نہتا انسان مارشل آرٹس سے بھی واقف  
افراد کے سامنے اس قسم کے حالات میں تقریباً  
ہے“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”مجھے اعتراف ہے کہ  
خوف زدہ ہو گئی تھی۔“

”مجھے معلوم ہوتا تم اس طرح خوف زدہ ہو  
تمہیں اسی طرح خوف زدہ کرنے کی کوشش کرنا۔“  
سانس لے کر کہا۔

”کیوں اس مت کو“ اس کے لیے میں پھر ذرا  
”مجھے اعزاز ہو گیا ہے تم سرکوں پر گوت مار کرنے  
کے لیے دل اور بد محاشوں سے زیادہ خطرناک چیز۔“  
”شکر ہے۔“ وہ نوازی ہے تمہاری۔“ میں نے  
کر گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے کہا۔

وہ اسی طرح نیم دراز ایک لمبے مجھے گھور  
آنکھوں میں اضطراب دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا  
ظہر پر حواس میں آ رہی تھی۔

”زندگی میں کبھی موقع ملا تو میں تمہیں سمجھنے

سہی۔ لیکن اس نے بہر حال اس حقیقت کو حلیم کر لیا تھا۔  
میں نے ہاتھ بھاڑتے ہوئے کہا۔ ”محذرت خواہ ہوں کہ  
میرے بارے میں تمہارے اندازے غلط نکلے۔“

اس کے برائے فریڈ کا پتہ دل اور اس کا گریڈ میں نے ایک  
طرف پیچک دیا تھا۔ وہ دونوں چیزیں اٹھاتے ہوئے میں نے سلسلہ  
کلام جوڑا۔ ”میں پولیس کو فون کرنے لگا ہوں۔ کیا تم ہٹا پھینک  
گی کہ تمہارے برائے فریڈ نے بچ صاحب کو خود اپنی مرضی سے  
قتل کیا تھا یا یہ تمہاری ہدایت تھی؟“

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کاپی آئیز سے انداز  
میں ہلکی جھپکائی رہی۔ ایک کونے میں مجھے فون رکھا نظر آ گیا تھا۔  
میں اس کی طرف دھما۔ تاہم میری نظر ہلکی پڑی تھی۔

میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھا تو وہ جھکی جھکی سی آواز میں بول  
اٹھی۔ ”مجھے تمہارا دلخ نراب معلوم ہوتا ہے۔“

”تمہیں کیا مجھے خود بھی کبھی کبھی اپنا دلخ نراب معلوم ہوتا  
ہے“ میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

”محض مطلوبہ کیلیبر کے پستول اور اس میں ایک گولی کم  
ہونے کی وجہ سے تم نے فی کو اور مجھے ایک ساتھ قاتل فرض کر  
لیا۔“ اس کی آواز اب کچھ غونگی زدہ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ”یہ  
پستول آج کے دور میں بہت حقیر اور آؤٹ ڈیٹڈ سا اختیار ہو کر رہ  
گیا ہے۔ اب تو لوگ نہ جانے کیا کچھ لیے پھرتے ہیں۔ اس کے  
باوجود اب بھی شرمیں بیکٹول لوگوں کے پاس یہ پستول موجود ہو گا  
اور ان کے میگزین میں ایک یا ایک سے زیادہ گولیاں کم ہوں گی۔  
حمیس ان سب کو بھی بچ صاحب کے قتل کے الزام میں پکڑ لیتا  
چاہیے۔“ وہ اب بھی بات انگریزی میں ہی کر رہی تھی۔

”پستول یقیناً بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے۔ ان کا کیلیبر  
بھی یہی ہو گا اور وہ ان سے فائر بھی کر چکے ہوں گے لیکن ان کے  
پاس بچ صاحب کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہو گا۔“ میں نے  
ملاحظہ سے کہا۔

وہ متحائل مگر استہزائیہ سے انداز میں ہنسی۔ ”تمہارے خیال  
میں اس شرم میں جتنے بھی قاتل ہو رہے ہیں وہ جواز کے ساتھ ہو رہے  
ہیں؟ ان کے لیے اگر کچھ جواز گھر بھی لیے گئے ہیں تو وہ سب  
جھوٹے اور بکواس ہیں۔ اصل جواز صرف یہ ہے کہ بہت سے  
انسانوں میں بے پناہ خفاشت اور خون کی پیاس پیدا کر دی گئی ہے۔“  
”دورست ہے مگر بچ صاحب کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ وہ  
ایک الگ سلسلہ ہے۔ بچ صاحب کا قتل ایک الگ مسئلہ ہے۔“  
میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

”نصیحت۔“ وہ اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر بولی۔

میں نے ریسیور دھپ دھپ کر اس امید کے ساتھ اس کی طرف  
دیکھا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کرنے لگی تھی۔ وہ بوجھل لمبے میں  
بولی۔ ”میں تمہیں بتاتی ہوں، فی کے پستول میں ایک گولی کیوں کم

کہانی! اس لیے نئی کے ہسپتال میں ایک گولی کم ہے۔ نئی نے ہسپتال پولیس والوں کو بھی دکھا دیا تھا۔ اس کے پاس لائسنس موجود ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ جہاں تک جج صاحب کو قتل کرنے کا تعلق ہے تو بے چارہ نئی تو ایسا سوچ بھی نہیں سکا کہ یہ قوت جج صاحب کو جانتی تھیں اور نہ ہی اسے یہ پتا ہے کہ میرے اور جج صاحب کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ اس سے میری دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس سے آج تک جج صاحب کے بارے میں میری کوئی بات نہیں ہوئی۔“

میں نے ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے کلمہ ہو کر کہا۔ ”مجھے اس واقعے کی تصدیق کرنا ہوگی۔“

میں نے ایک بار پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور رحیم جی کا نمبر اٹھ لیا۔ میری نظریہ ستور چکی پر تھی۔ نئی کے بارے میں مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ ابھی تک اسی طرح چپ رہا تھا۔

میں جب لائن ملنے کا انتظار کر رہا تھا اس دوران میں چٹکنا نہ جانے کیوں عجیب سے لمحے میں ہوئی۔ ”میں اور نئی اتنے برس نہیں ہیں جتنے تم کچھ برس ہو۔“

”شاید تم درست کہہ رہی ہو لیکن یہ سب کچھ تم اتنی اچھل کود و جھجکاؤ شقی اور چیخ و پکار کے بغیر بھی کہہ سکتی تھیں“ میں نے نرمی سے کہا۔

”تم نے ہم سے صحیح طریقے سے بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ وہ اب خاموشی طاعت سے ہوئی۔ ”اس کے علاوہ مجھے اس بات پر بھی بہت غصہ تھا“ نئی کو بھی آیا ہو گا کہ تم نے آکر ہماری پرائیویسی میں دخل دیا تھا۔ ہمارے ہاں لوگ ویسے ہی دوسرے کی پرائیویسی کا کوئی احترام نہیں کرتے اور تم نے تو حد ہی کر دی تھی۔“

”میں اس معاملے میں دوسروں سے کافی مختلف ہوں اور لوگوں کی پرائیویسی کا بہت احترام کرتا ہوں“ میں نے معافی بخش کرنے کی کوشش کی۔ ”میں اپنی دانست میں دوستانہ انداز میں آیا تھا اور میرے ذہن میں کچھ خلوک و خبیات تھے جو ابھی دور نہیں ہوئے ہیں بہر حال مزاجوں کے فرق کی وجہ سے کچھ غلط فہمیاں سی پیدا ہوئی چلی گئیں۔ مجھے شکریہ ادا کر دیکھنے والے اور خود کو بہت بڑا سمجھنے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑنے پر میں اپنی حدود سے کچھ تجاوز کر جاتا ہوں۔ تاہم اگر تم دونوں جج صاحب کے قتل سے اسی طرح لا متعلق ثابت ہوئے جس طرح تم ہماری ہوتوس ہاتھ جو ذکر تم سے معافی مانگ لوں گا۔“

”صرف معافی؟“ اس کے ہونٹوں پر اب خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ہاں تمہیں صرف معافی پر ہی گزارا کرنا پڑے گا اور یہ بھی میرے انتہائی شائستہ و انصاف پسند ہونے کی دلیل ہوگی کیوں کہ

کہانی۔“ وہ بولی۔  
”یہ فضول باتیں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں نے کہا پھر اسے یاد دلایا۔“ تم اس واقعے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔“

”میں نئی نے سوچے جیسے بغیر ایک قاتل بھی کر دیا تھا“ وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے ہوئی۔ ”ایک لڑکے کے ہاتھ پر گولی لگی۔ اس کاٹی ٹی ٹی گر گیا مگر وہ فوراً ہی دوسرے لڑکے نے اٹھالیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اسی لمحے وہاں سائزن کی آواز سنائی دینے لگی حالانکہ وہ شاید کسی امیبولنس کے سائزن کی آواز تھی لیکن لڑکوں پر کچھ گھبراہٹ سی ہماری ہو گئی شاید انہوں نے سمجھا ہو کہ پولیس کی کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ وہ فوراً موٹر سائیکل پر بیٹھے اور بھاگ نکلے ہماری دوسری خوش قسمتی یہ تھی کہ انہوں نے ہم پر فائرنگ نہیں کی حالانکہ بھاگتے بھاگتے انہوں نے چند ہوائی فائر ضرور کیے شاید اس لیے کہ کوئی ان کا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرے۔ ان کی گولوں کا رخ ہماری طرف بھی ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔“ اس نے خاموشی جو کہ ایک گہری سانس لی اور ذرا سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”اس واقعے کا کوئی گواہ؟“ میں نے پوچھا۔  
وہ ایک آہ بھر کر سیدھی ہوتے ہوئے ہوئی۔ ”میں ابھی تک سوچ رہی تھی کہ کیا تم یہ اتھارن سوال بھی کرو گے؟ تم نے میری قوت پوری کر دی۔“

”میں لوگوں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہوں“ میں نے غصے سے کہا۔ ”خدا کوئی مجھے اتنی ہی سمجھ لے اس سے میری ذہانت پر کوئی خاص اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ کیا مجھے اپنا سوال دہرا کرنا پڑے گا؟“

”نہیں“ وہ ایک لحظہ سی سانس لے کر بولی ”سب سے بڑے گواہ تو وہ لوگ ہیں جن کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا“ وہ چھوٹی سی مارکیٹ تھی اور تین چار دکانیں اس وقت بھی کھلی ہوئی تھیں۔ گو کہ اس واقعے کے بعد وہ بھی تیزی سے بند ہو گئیں لیکن دکانداروں نے بہر حال سب کچھ دیکھا تھا۔“

اس نے مجھے اس جگہ کا اور مارکیٹ کا نام بتایا پھر بولی ”اس کے علاوہ نئی نے ایک ٹھکانہ یہ بھی تھی کہ گھبراہٹ کے عالم میں بدھماکرانے کے بجائے پہلے تھانے جا کر اس واقعے کی رپورٹ درج کروائی تھی۔ انہوں نے کئی ایف آئی آر تو درج میں کی تھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ لوگ پکڑے گئے تو پھر وہ بھی ایف آئی آر درج کر لیں گے۔ بہر حال پولیس اپنے دیکھاڑے کے لیے اس قسم کے واقعات ایک انگور میں لکھ لیتی ہے جسے کبھی ایف آئی آر کہا جاتا ہے۔ آج کل بہت سے جرائم کے سلسلے میں یہی طریقہ چل رہا ہے۔ یہ مجھے اس بارہ تھانے جا کر پتا چلا۔“

اس نے دوبارہ کرسی کے پختے سے ٹپک نکالی۔ ”یہ ہے کل

معلوم ہوئی یا نہیں؟" رحیم گل کے لیے میں ابلیسی اٹھا تھم۔  
 "ہاں۔ ایک کام کی بات معلوم ہوئی ہے لیکن وہ اس وقت  
 فرش پر بے ہوش پڑی ہے" میں نے جواب دیا۔

"بات فرش پر بے ہوش پڑی ہے؟" رحیم گل نے دہرایا۔  
 "ہاں۔ خاصی دلتی سی بات تھی۔ پاؤں ملز رحم کی" میں نے  
 جواب دیا۔ "اور دوسری شعلہ جو کہ رحم کی بات سامنے تجلی  
 مریاں نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ خیر میں تمہیں بتا۔  
 کی کوشش کرتا ہوں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ شاید بات تمہاری کا  
 میں آجائے" پھر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

میں خاموش ہوا تو وہ بولا۔ "یہ تو میرے ہی تھانے کا معاملہ  
 ہے۔ میں ابھی معلوم کر لیتا ہوں کہ ایسے کسی واقعے کی رپورٹ  
 درج ہوئی تھی یا نہیں۔ تم ہولڈ رکھنا" وہ مجھے ہولڈ کر کے کسی سے  
 بات کرنے لگا۔

میں نے ماؤ تھو پھینکا پر ہاتھ رکھ کر ہنگامی سے کہا۔ "میری تمہارا  
 بات کی تصدیق ہو جائے گی۔"

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ "تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟"  
 "میں صرف اپنے لیے کام کرتا ہوں" میں نے فلسفیانہ لہجے  
 میں جواب دیا۔ "ایک صرف میرا ہی ذکر کیا۔ میرے خیال میں  
 دنیا کا ہر شخص صرف اپنے لیے ہی کام کرتا ہے۔"

اس فلسفے کی مار مارنا مناسب رہا۔ اس نے مزید کوئی سوال  
 نہیں کیا۔ میرے لیے اس کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ میں کس  
 لیے کام کرتا تھا۔ اسے اتنا اندازہ ضرور ہوا تھا کہ فی الحال  
 کسی پولیس آفیسر سے بات کر رہا تھا۔

فون پر دھیمی دھیمی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ رات  
 گلی کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ "ایک ذرا سی بات پوچھ لو تو پورے قاتل  
 پر معصیت بڑجاتی ہے۔ جھگڑا اور افرا تفری مچ جاتی ہے۔ میں  
 لوگوں کو آگے ناکڑا اور سارے کام کو سسٹیک بنانے کی انتہی کو  
 کر رہا ہوں لیکن تم لوگ سدھر کر ہی نہیں دیتے۔" رحیم گل  
 غالباً ریسیور میز پر رکھ دیا تھا اور اسے خیال نہیں رہا تھا کہ آواز  
 تک پہنچ رہی ہوگی۔

چند سیکنڈ بعد دوبارہ فون پر رحیم گل کی "ہیلو" ابھری تو میں  
 کہا۔ "ہم ان بے چاروں کو آگے ناکڑا اور سسٹیک ہونے  
 بارے میں ڈانٹ پاتے ہو۔ ان بے چاروں کو تو ان الفاظ  
 سمجھائی بھی معلوم نہیں ہوں گے۔"

پھر میں نے حسب معمول اسے بھیڑنا ضروری سمجھا۔  
 "بھی جن کے اس قسم جیسے نالا حق اور گتے ہوں وہ بلا کب سدھ  
 ہیں۔"

"کیوں اس بند کو؟" وہ غرا۔ "جنگی کا بیان ہر حال صحیح۔  
 واقعہ میرے علم میں نہیں تھا۔"

"تمہارے علم میں ہو تا ہی کیا ہے" میں نے فوراً اس کا

میں نے تم دونوں پر حملہ کرنے میں ہل نہیں کی تھی۔ میں نے تو  
 صرف اپنا دفاع کیا تھا" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔  
 "تمہارا باڈی ملز ریڑا معلوم نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کرنے  
 کے لیے دانت نہیں کر چکا تھا۔ اس قسم کے ڈیل انجن  
 کو دیکھ کے لیے مجھے کچھ تو کرنا تھا ورنہ وہ مجھے کچھتا ہوا گزر جاتا۔

میں نے تمہیں بھی شرافت سے دیکھنے کی ہمت کوشش کی تھی لیکن  
 تمہیں مجھ پر طبع آزمائی کا ہمت شوق چڑھا ہوا تھا۔ اگر میری جگہ  
 کوئی عام آدمی ہوتا تو اس بے چارے کا نہ جانے کیا مشر ہوتا۔ اب

اگر تم میری معذرت کا مطلب یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارے  
 پوائے فریڈ کو اپنی پیشانی پر ٹھونکا رسد کرنے اور تمہیں اپنی  
 گھوڑی پر کرائے کی چاپ مارنے کا موقع دل کا تو میں اپنی  
 معذرت واپس لے لیتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی۔ اس دوران میں رحیم گل فون پر آچکا تھا۔  
 میں نے جنگی کی طرف سے ٹھہرنا ہی بغیر کہا۔ "کہاں مر گئے تھے؟"  
 "تمہارے سوئم میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا" وہ جلتے کئے  
 انداز میں بولا۔

"اتنی اہم تقریب میں مجھے ساتھ لے بغیر ہی چلے گئے تھے؟"  
 میں نے پوچھا۔

"کہاں سے بول رہے ہو؟" اس نے مزید الجھنے کے بجائے  
 فوراً سوال کیا۔

"وہیں سے جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا۔" میں نے جواب دیا۔  
 "سو ہو؟" تم ابھی تک وہیں ٹھکے بیٹھے ہو۔" اس کے لہجے میں  
 بیزاری کچھ کم ہو گئی "کیا لڑکی نے فٹلی سے چائے پانی کو پوچھ لیا  
 ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "پلے لڑکی کے باڈی ملز  
 دوست نے مجھے غالباً دو چار گھنٹوں اور ایک آدھ دھنچ پڑے کی  
 پیمیاں کھلانے کی کوشش کی تھی پھر خاتون نے کرائے کا کاکا کولا  
 پلانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے معذرت کے ساتھ انکار کر  
 دیا۔"

"رپورٹ کیا ہے؟" اب اس کے لہجے میں واضح دلچسپی جھلک  
 آئی۔

"میں کیا تمہارا ملازم یا محنت ہوں جو مجھ سے رپورٹ مانگ  
 رہے ہو؟" میں نے گویا برا مانتے ہوئے کہا۔  
 "تو پھر کس لیے فون کیا ہے؟ کیوں کان کھا رہے ہو؟ بند کرو  
 فون۔" اس نے ڈانٹ پالکی۔

"میں نے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے فون کیا تھا کہ اپنی ڈیوٹی پر  
 موجود بھی ہوا اور ہر گھنٹہ میں آواہ پھر رہے ہو۔ حرام خور انسانوں  
 کی ذرا گھبراہٹ رکھنی پڑتی ہے نا۔" میں نے کہا۔ جنگی اب قدرے  
 حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اچھا" تم کیوں اس چھوٹے اور ننھیلے سے بناؤ کی کام کی بات

ہوں۔ میرے کہنے کا جو کام تھا وہ میں نے کر لیا۔ میں نے نکاسا  
جواب دیا۔

”عملے کی کیا پوچھتے ہو جاہلی اور کافری دوست۔“ وہ لٹھری  
سائنس لے کر بولا۔ ”کام کے مقابلے میں عمل ایسے ہی ہے جیسے  
اونٹ کے منہ میں ذریعہ۔“

”اور اس عملے کے ساتھ تمہارا ہونا ایسے ہی ہے جیسے پھیرے  
کے ت میں ذریعہ۔“ میں نے ٹھنڈا لگایا۔ ”اس سے پہلے کہ تم مزید  
کچھ بکواس کرو میں جا رہا ہوں۔“

”مجھے یہاں کافون نہریتا دو۔“ وہ جلدی سے بولا۔  
میں نے ٹیلی فون سیٹ پر دیکھ کر نمبر اسے بتا دیا اور خدا حافظ  
کہہ کر رمیجر روڑہ کرانٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اب چلتا ہوں۔“ میں نے ہنگی سے کہا۔  
وہ اب کافی حد تک ہوش و حواس میں دکھائی دے رہی تھی  
اور سر سلا رہی تھی۔ چل کر بولی۔ ”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو  
جیسے بڑے مہذبانہ انداز میں یہاں سوشل کال پر آئے ہوئے  
تھے۔“

”مگر تم اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتی تو یہ سوشل کال بھی  
ہو سکتی تھی۔“ میں نے گویا اظہارِ افسوس کیا۔  
”تم جس طرح آئے اور جس طرح تم نے باتیں کیں اس کے  
نتیجے میں تمہارا انتقال بھی ہو سکتا تھا۔“ وہ تڑکی۔ تڑکی بولی۔

”پلوغیر دونوں ہی کی تھوڑی تھوڑی غلطی تھی۔ حساب برابر  
ہو گیا۔ دعا کرنا آئندہ اگر ملاقات ہو تو خوشگوار حالات میں ہو۔“ میں  
نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور کمرے سے نکل آیا۔ وہ اپنی جگہ  
بٹھی مجھے حیرت سے دیکھتی رہی۔ یقیناً اس کی سمجھ میں اب تک  
نہیں آیا تھا کہ میں کون تھا اور یہ سب کچھ کیوں کرتا پھر رہا تھا۔

اس نے اب تک اپنے پوائے فریڈ کی طرف قطعاً توجہ نہیں  
دی تھی۔ میں نے دوا اڑے پر روک کر مڑتے ہوئے کہا۔ ”ذرا اپنے  
اس بن ہالوں کے بچے کی بھی کچھ فکر کرو۔ اسے ہوش میں لانے کی  
کوشش کرو۔ اس کے منہ پر لٹھڑے پانی کے چھینٹے مارو۔“

”میں ابھی فون کر کے ڈاکٹر کو بلائی ہوں اور تمہارے خلاف  
رپورٹ بھی درج کرادیں گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔  
”تمہاری سولت کے لیے تمہارا انچارج خود ہی یہاں آ رہا  
ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ نہ آیا تو اس کا کوئی  
ناکت ضرور آئے گا۔ تم میرے خلاف جو بھی رپورٹ درج کراؤ  
چاہو بڑے شوق سے کرا لیتا۔ ویسے اس ٹکلف کی ضرورت نہیں  
ہے۔ تم جب بھی غم دو گی میں خود ہی۔۔۔ بغیر کسی جرم کے۔۔۔  
اپنے ہاتھوں میں پھنکڑی لگا کر تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں  
گا۔“

”اب تک اس کا جو موڈ نظر  
آتا رہا تھا۔“ یہ مسکراہٹ اس سے قطعی غلط تھی۔ اس کے اندر

”جس بھلا کیا تھا کہ تمہارے تھانے کی حدود میں کیا ہوتا  
۔۔۔ غم کسی بے ہودہ قسم کے بادشاہ سلامت سے کم تھوڑا ہی ہو  
۔۔۔ مضمون ہی نہیں ہو کہ اس کی رعایا کے ساتھ کہاں کیا ہو رہا  
ہے۔ تم جیسے جلافتی اور نیکے افسروں کی وجہ سے ہی تو شہر اس حال  
پر پہنچا ہے۔“

وہ میری بات کانٹے ہوئے غرایا۔ ”حق آدمی! اس دسویں  
فروری کو بلا کے سامنے بیٹھ کر شہر میں مت جھاڑو اور اس پر رہب  
ت والو کہ تم کس طرح پولیس افسروں کو ڈانٹتے ہو ورنہ وہیں پہنچ  
را افسرین تلوار سے نیچے پھینک دوں گا۔ فٹ پاتھ پر تمہارا امیدہ پڑا  
دگا۔“

”ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔“ میں نے ہنگی  
کی ہنگی کے ساتھ کہا۔ ”یہ تو دنیا ہی دیکھے گی کہ فٹ پاتھ پر لمبیدہ کس  
کا پڑا ہو گا۔“

وہ ذرا نرمی سے بولا۔ ”دیکھو میرے تھانے کی حدود میں  
ہوئے والا ہر واقعہ میرے علم میں نہیں ہوتا۔ رپورٹ میں نہیں  
قراردین کرتا ہے۔ میں بھی کہیں ہوتا ہوں۔ کبھی کیس لیکن جلدیا  
پر ہر حال ہر بات میرے علم میں آتی رہتی ہے اور پو پو سیکر کے  
نہت ہر مسئلے پر ترتیب وار کارروائی ہوتی رہتی ہے۔ اب تم جیسے  
جاہلی آدمی کو میں کیا سمجھاؤں کہ ہر بڑے ادارے کا ایک مسلم ہوتا  
ہے جو کام کرتا رہتا ہے۔ واقعہ ہر حال دیکھا پڑ موجود ہے لیکن  
زادہ اہم نہیں تھا اس لیے اس کے بارے میں مزید کارروائی نہیں  
ہوئی۔“

”زادہ اہم تو تب ہوتا جب وہ تینوں فیکٹریں ان دونوں کو  
گلیوں سے چھلنی کر کے سرک پر لٹا جاتے اور پچھرو لے کر قرار  
ہو جاتے۔“ میں نے اس سے پچھڑھار جاری رکھی۔

”یاد رہے پولیس والوں کو برا بھلا کہنے کا شوق اس وقت پورا کر  
لیتا جب مجھ سے ملاقات ہوگی۔ فی الحال کام کی بات کرلو۔“ اس نے  
منت کی ”جنگ کی کمانی تو ٹھیک ہے پھر بھی تمہاری بات سن کر نہ  
جائے کیوں مجھے یہ نوجوان کچھ مٹھوگ لگ رہا ہے۔ میں اس سے  
مزید بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ تم اسے میرے پاس تھانے میں  
نہیں لائے۔“

”موکات میں رہو میرے چاند! میں نے شفقت سے کہا۔  
”میں تمہارا مال بڑا درمزدور نہیں لگا ہوا ہوں جو اس دہائی پوری کو  
کھسے پر لاؤ کہ تمہارے پاس لاؤں۔ وہ ابھی تک بے ہوش  
ہے۔“

”آخر رہے جا جاہلی کے جاہلی۔“ وہ بولا۔ ”اور پولیس والوں کو  
جاہلی کہنے کا شوق ہے۔ چند کہیں کے! اسے ہوش میں لاؤ اور  
گاڑی میں بٹھا کر لاؤ۔“

”یہ لائے لے جائے گا کام خود کو پر اسے! انہی کاموں کے  
لے سرکار نے تمہیں اتنا عملہ دے رکھا ہے۔ میں تو اب مگر جا رہا

”اب تک اس کا جو موڈ نظر  
آتا رہا تھا۔“ یہ مسکراہٹ اس سے قطعی غلط تھی۔ اس کے اندر

”اب تک اس کا جو موڈ نظر  
آتا رہا تھا۔“ یہ مسکراہٹ اس سے قطعی غلط تھی۔ اس کے اندر

”اب تک اس کا جو موڈ نظر  
آتا رہا تھا۔“ یہ مسکراہٹ اس سے قطعی غلط تھی۔ اس کے اندر

”اب تک اس کا جو موڈ نظر  
آتا رہا تھا۔“ یہ مسکراہٹ اس سے قطعی غلط تھی۔ اس کے اندر

دوامت دارائی کا خیال آیا تو مجھے غلیم بھی یاد آگئی۔ مذہب کیوں مجھے ابھی تک ایک سوہوم ی آس تھی کہ اس صورت مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے ہونے کی طرف جاتے جاتے غیر ارادی سے انداز میں اس کے ہونے کی طرف گاڑی موڑ لی۔

میں سہ پہر کے قریب وہاں پہنچا۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ میرے بیٹ میں چوہے کوئی بڑا بیچ کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے بلکہ دارم اب بیچ تو انہوں نے شروع بھی کر دیا تھا۔

میں نے دیکھا، غلیم کا ڈاکٹر موجود نہیں تھی۔ اس کی جگہ پتلا اور سالنار سا ایک نوجوان کھڑا تھا جس کی سوچیں اس کے بازوؤں سے زیادہ موٹی تھیں۔ میں نے اس سے غلیم کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی اور اپنے کمرے میں ہی تھا۔

شام تک اس کا بیٹے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ میں ہی چلا گیا کہ اس سوچے پر نوجوان نے دے دے لفظوں میں بتا کر مجھے مسخ کرنے کی کوشش کی تھی کہ میڈم اس وقت آرام رہی ہوں گی۔ مگر میں نے اس کی اس زیر موچہ بڑا ہٹ پر تھیں دی اور اس نے بھی مجھے روکنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔

میری کئی بار کئی جگہ دھک کے بعد غلیم نے دروازہ کھولا۔ اس وقت یہ سوچ کر واپس جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ شاید کمری خیزہ سوری تھی، اسے بے وقار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

شب خرابی کے لیے اس میں تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی ڈورے تھیں۔ اس وقت زیادہ خطرناک لگ رہی تھیں۔ اور سے شب خرابی کا لبادہ، ناقابل ترمیم تھا۔ وہ اچھے بھلے پاراسوں کے لیے جا

پھرتی آنا نہیں بی ہوئی تھی۔

”حالاں کہ میں بہت ذہین آدمی ہوں“ میں نے کھکا کر صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس وقت کافی شرمندہ ہوں۔“

”کیوں؟ تم نے ایسا کیا کام کر ڈالا ہے جس پر تمہیں شرم ہونے کی ضرورت پیش آگئی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے تمہیں سوتے سے جگایا۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ تو تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ کسی کو خواب غفلت سے جا بگی ہے؟“ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر پہنچا تو

نے دروازہ مٹھل کر دیا۔

”میں تو اب واپس جانے کا سوچ رہا تھا۔ تین چار بار دھک دینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شاید تم کمری خیزہ سوری ہو۔ تم میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا مگر تم وقت پر تم نے دروازہ کھول دیا۔“

”مگر تم واپس چلے جاتے تو یہ میری بد قسمتی ہوتی“ وہ بد قسم

مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیوں؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”یک وقت ہی جیسے کوئی دوسرا سوچ کن ہو گیا تھا۔ بہت تھکن مزاج لڑکی معلوم ہوتی تھی جس کے بارے میں یہ کتنا شاید بہت مشکل تھا کہ اگلے لمحے وہ کیا کر کر رہے گی۔“

وہ بالکل صاف تھکی اردو میں بولی۔ ”تم جو کوئی بھی ہو لیکن ہو بڑی غیبت چیز!“

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت اچھی طرح اردو بولنے پر قادر تھی لیکن چاہے کر اپنے اوپر انگریزی کا خول چڑھائے ہوئے تھی۔ ہماری سوسائٹی میں یہ بھی ایک خاص طبقہ موجود تھا جس کا خیال تھا کہ انگریزی بولنے سے انسان زیادہ باعزت نظر آتا تھا اور

اردو بولنے سے شاید اس کا سماجی مقام گھٹ جاتا تھا۔ اس لیے وہ بہت اچھی اردو آتے ہوئے بھی اردو نہیں بولتے تھے۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ ظاہر کرنا فیشن میں داخل ہو چکا تھا کہ انہیں اردو نہیں آتی۔ انہیں فخر سے بڑوسیوں کو بتاتی تھیں۔ ”میرا بیٹا اردو میں بڑا کزور ہے اردو میں اکثر نکل ہو جاتا ہے۔“

میں خود کوئی دقیانوسی آدمی نہیں تھا۔ میں اس بات کو اچھا سمجھتا تھا کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ انگریزی آتی ہو بلکہ میرے خیال میں تو انسان کو زندگی جتنی بھی سہولت دے اور وہ جتنی بھی

زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھ سکے، اتنا ہی اچھا ہے لیکن یہ ایک انسانی قابلیت ہے۔ تاہم اگر انسان کو انگریزی نہ آتی ہو تو یہ کوئی ایسی شرم کی بات نہیں البتہ اگر انسان کو اپنی مادری زبان نہ آتی ہو

تو یہ ضرور شرم کا مقام ہے مگر مجھے یہ بات بڑی عجیب لگتی تھی کہ لوگ اردو نہ آنے کا ذکر فخر سے کرتے تھے بلکہ بچوں کے اردو میں

نکل ہونے پر خامے خوش نظر آتے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ لوگوں کا انداز فکر اگر یہی رہا تو کب تک اردو کے بچہ میں نکل ہونے پر ملٹائی بانٹنے کا رواج نہ شروع ہو جائے۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے تھمیں آمیز لہجوں سے بچکی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”واہ! پہلے آگ اگل رہی تھیں۔ اب منہ سے پھول

جھڑ رہے ہیں۔ اب تم سے منہ سے سب سے ملاقات کرنے کوئی چاہ رہا ہے لیکن مجھے دیر ہو چکی ہے۔ پھر کسی وقت سنی“ میں نے ایک بار پھر ہاتھ ہلایا اور اسے اسی طرح مسکراتے چھوڑ کر اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف واپس جانے وقت میں سوچ رہا تھا کہ راجیم گل کا یہ خیال شاید ٹھیک ہی تھا کہ غمی کچھ شکوک معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے یہ دوزخ فرزند راجیم گل کے لیے چھوڑ دیا

تھا۔ راجیم گل میرے تعاون سے ہدایت دارائی کو مجرم قرار دے کر اس کے خلاف چلان پیش کرنے کی تیاری تو کر رہا تھا لیکن اپنی اس

قتضیت سے شاید وہ خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ ادھر میرے ذہن میں بھی ایک غلطی ہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس معاملے کی کوئی کڑی غائب تھی لیکن وہ کڑی کیا تھی اور کہاں غائب تھی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا

تھا۔

کسی قابل نہیں سمجھتا۔ ہمیں کیا معلوم کہ تمہارے خواب میں آنا میرے لیے کتنی بڑی خوشی کی بات ہے۔

”تو پھر ہمیں کیا تکلیف ہے جو ہتھ پتھتے دہرے ہونے یا کھڑکی سے چلا گئیں لگائے کی باتیں کر رہے ہو؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”تکلیف یہ ہے کہ مجھے اس بات پر یقین نہیں“ میں نے کراہ کر کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ اس قسم کی باتیں مرد کرتے ہیں اور اس طرح عورتوں کا دل بھاتے ہیں۔ انہیں خوش فہمی میں مبتلا کرتے ہیں لیکن میاں تو الٹا ہی معاملہ ہو رہا ہے۔“

”میں عورت اور مرد کی تفریق میں نہیں پڑتی کہ عورتیں یہ کرتی ہیں اور مرد یہ کرتے ہیں یا عورتوں کو یہ کرنا چاہیے اور مردوں کو وہ کرنا چاہیے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”میں تو بس ایک سیدھی اور سچی بات کرتی ہوں۔ جو میں سوچتی ہوں، جو محسوس کرتی ہوں یا جو مجھ پر غور کرتی ہے صاف بتا دیتی ہوں۔ فضول قسم کی مصلحت کو کسی میں نہیں پڑتی کہ میں نے فلاں بات کی تو بلور عورت میرا مرتبہ کھٹ جائے گا یا فلاں بات مجھے ”دوسرے کے منہ سے سننے کا شہر رہنا چاہیے۔ یہ فضول اور رکی باتیں ہیں۔“

”کتنے روشن خیالات ہیں تمہارے!“ میں نے حسین آہیز لہجے میں کہا۔ ”میرے حال خواب پھر بھی میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ میں اتنا خوش قسمت نہیں ہو سکتا۔ میں تو آج تک ایک چھپچھپے کے طور پر کسی لمبی کے خواب میں بھی نہیں آیا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر طلوع ہونے لگی۔ ”ہو سکتا ہے کہ لمبی نے حسین بتایا ہی نہ ہوا!“

”میرے حال میں نے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارا افسار ہے جو یقیناً عورتوں کے حق میں بڑی ہی خنک بات ثابت ہوئی ہوگی“ اس نے ایک طویل انگریزی لہجے میں نے کراہ کر کہا۔ ”کیا اب تمہارا انگریزی لیتا بھی ضروری ہے؟“

”میری انگریزی سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے واقعی تکلیف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

”کیا تکلیف ہے؟“ اس نے جانا چاہا۔

”بعض تکلیفیں ناقابل بیان ہوتی ہیں“ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

”آخر تکلف بھی کوئی چیز ہے“ میں نے کہا۔

”تم سے کس گدھے نے کہا ہے کہ تکلف کرو؟“ وہ اپنی مسکراہٹ گودبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کہا ہے ایک گدھے نے۔ وہ گدھا میں خود ہوں“ میں نے سر جھکاتے ہوئے گویا اعتراف جرم کیا۔

”میرے ایک خواب کی تعبیر داپس چلی جاتی“ اس نے مجھے سچے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک معتدل اور کشادہ کمر تھا۔ اسی کے لیے کہ اس کا نام لیا گیا تھا۔ میں ایک کاؤچ پر جا بیٹھا اور وہ کمرے میں متاعیل بیڈ کی پائنتی کی طرف لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بیڈ پر آنا اور غائب ہونے کا کچھ شیخ اور کچھ معنی خیزی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار تھی اور وہ گویا آنکھیں بھی نہیں جھپک رہی تھی۔

”خواب کی تعبیر داپس چلی جاتی؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں۔ اگر میں تمہیں ایک بات بتاؤں تو تم یقین کر لو گے؟“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”دوسرے عورتوں کی بات کا یقین تو نہیں کرنا چاہیے لیکن تم بہت ہی بڑے بڑے لوگوں کا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہیں کتنی عورتوں نے دھوکا دیا ہے جو تم نے عورتوں کی بات پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے؟“ وہ زرا تھکے لہجے میں بولی۔

”ایک نے بھی نہیں“ میں نے اپنی شکل پر مسکین طاری کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے مجھے اس اعزاز کے قابل ہی نہیں سمجھا کہ مجھے دھوکا دیا جائے۔ خواتین سے دھوکا کھانا بھی ہر ایک کے نصیب میں کہاں ہوتا ہے۔“

”زادہ مسکین بننے کی ضرورت نہیں“ اس نے مجھے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ ”مگر ازم تمہارے معاملے میں تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی عورت دھوکا نہیں دے سکتی۔ البتہ تم نے نہ جانے کس کس کو دھوکا دیا ہوگا۔“

”یہ تو تمہاری ذمہ داری ہے جو تم اس حیرت انگیز تعبیر کو اس قابل سمجھ رہی ہو ورنہ مجھ میں اتنی اہلیت کہاں“ میں نے احساس عروسی سے بھرپور لٹھڑی سانس لے کر کہا۔

”سادہ اور معصوم بننا تمہیں خوب آتا ہے“ وہ مجھ سے بھی زیادہ لٹھڑی سانس لے کر بولی۔

”چھاپا۔ لٹھڑی سانس لینے کا مقابلہ مت کرو اور وہ بات بتاؤ جس پر تمہارے خیال میں مجھے یقین آتا مشکل ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”میں اس وقت تمہیں خواب میں دیکھ رہی تھی“ اس نے زیادہ روشن مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”اور جب دستک سن کر میری آنکھ کھلی تھیں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تعبیر دواڑے پر کھڑی ہوگی۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہتھ پتھتے دہرا ہو جاؤں“ کاؤچ سے کہ پڑاؤں یا کھڑکی کے راستے باہر سڑک پر چلا گیا۔ ”گاہ“

”میں نے تمہیں گھوڑی سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیوں۔ کیا میرے خواب میں آنا تمہارے لیے اتنا ہی اہم ہے؟“ اس نے بھروسے سے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں خواب میں ہی دیکھ سکوں؟“

”بات کو الٹا منہ دینے کی کوشش مت کرو“ میں نے کہا۔

”جہاں تک قابل ہونے کا تعلق ہے تو میں صرف اپنے آپ کو ہی

میں یہ فیصلہ تو نہیں کر سکا کہ کون کس کا امتحان لے گا لیکن امتحانی سلسلہ میں حال موقوف ہو گیا۔ میں نے محنت نہیں کیا۔ میں ہر حال انسان تھا اور اس قسم کے امتحانوں میں زیادہ ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا۔

وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ پھر وہ ساڑھے نیل پر رکھے ہوئے ایک تھرموس سے اپنے اور میرے لیے کافی اٹھائیتے ہوئے تھا۔ "میں اس وقت دم سروس نے کسی وٹر کیساں بلانا نہیں چاہتا اس لیے تھرموس کی کافی پر ہی گزارا کرو۔"

وہ اب بہت خوش اور بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس ذہن پر پہلے گویا کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جو اب اتر گیا تھا۔ اس نے اعصاب گویا کسی شعلے کی گرفت میں تھے جو اب آزاد ہو گئے تھے ہم بیڈ پر ہی پاس پاس بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ کافی خوب گرم تھی اس میں تھرموس والی بڑی مڑی ابھی تھرموس نہیں ہو رہی تھی۔

میں کافی کی چکیاں لیتے ہوئے..... کن انگلیوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی ہلاکت تھی۔ وہ بڑی کام کی عورت تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر نے شاید اس کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اس میں اور بھی توانائیاں بھردی تھیں۔ ایک اور بات بڑھ بڑی حیرت تھی۔ کل تک وہ دہانت والی کے بارے میں خود پریشان، متحش اور فکر مند تھی۔ آج اس کے چہرے پر فکر مندگی شاید تک نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج وہ دہانت سے یاد نہیں تھا۔ میں اسے یاد دلانا چاہتا تھا۔

خاموشی سے کافی کے دو نہیں گھونٹ بھرنے کے بعد میں نے کہا۔ "اگر اس وقت کسی اتفاق کے تحت اچانک دہانت وارا آجائے تو کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نہایت اطمینان سے بولی۔

"کیا وہ خفا بھی نہیں ہوگا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں" اس نے اس بار بھی اطمینان سے جواب دیا۔ "حیرت ہے!" میں نے بغیر نہ سکا۔

"اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں" وہ بولی۔ "میں نے جیسا پہلے بھی بتایا تھا لیکن بات شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا وہ دہانت کا رشتہ شاید اسی لیے بہت زیادہ مضبوط ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو کسی بندھن میں نہیں باندھ رکھا۔ ہم ایک دوسرے کے نہایت تھکنے ساتھی بھی ہیں لیکن اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد بھی ہیں۔ دہانت نے کبھی مجھے اپنی مقبوضہ چیز بنا کر نہیں رکھا۔ میرا مسئلہ یہی ہے کہ میرا اب کسی ایسے مرد کے ساتھ گزارا بھی نہیں ہو سکتا جو مجھے پابندی اپنی مقبوضہ چیز بنا کر رکھے۔"

"اور آتم ایک گمشدہ گائے ہو۔ جگل جگل چرتی پھرتی ہو۔" میں نے سر ہلایا۔

"تمہارے گدھا ہونے میں تو واقعی کلام نہیں۔ جہاں تکلف کو بہت برا سمجھا جا رہا ہو وہاں بھی تکلف کرنے والے کو گدھا ہی کہا جا سکتا ہے بلکہ اس تشبیہ پر تو شاید گدھا بھی برا مانتے۔ وہ بھی شاید کہے گا کہ ٹھیک ہے" میں گدھا ہوں مگر اتنا بھی گدھا نہیں ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے برابر آئی تھی۔

پھر اچانک ہی جیسے اس پر کوئی دھبہ پڑا۔ اس نے دانت پکپکا کر میرے بال ٹھیکوں میں جکڑے اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی "غیث! تمہیں معلوم ہے میں کب سے تمہارے لیے مری جا رہی ہوں؟" "نہیں" مجھے نہیں معلوم" میں نے چوہے دان میں چھنے ہوئے چوہے کی سی آواز نکالی۔

"اس وقت سے جب میں نے تمہارے ہوٹل میں مختصر عرصے کے لیے ملازمت کی تھی" اس نے بتایا۔ "میں نے اپنی ملازمت کے مختصر عرصے میں تمہاری صرف ایک جھلک ہی دیکھی تھی اور وہ بھی دور سے۔ اس وقت ہی میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا تھا۔ واہ کیا چیز ہے! کاش! لیکن اس کاش سے آگے میں نہیں سوچ سکتی تھی کیوں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی ایک نہیں بلکہ بڑے حد جہت قسم کے فرق حاکم تھے۔ ایک نہیں کئی غلطیوں تھیں۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ تمہاری جھلک بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی"

اس نے ایک طویل سانس لی۔ یہ سانس شاید شعلوں کو چھو کر آئی تھی۔ یکدم ہی اس کے لیے میں کچھ دھیما بن گیا۔ "ایک طویل عرصے بعد میں نے تمہیں جج صاحب والے چکر میں دوبارہ دیکھا اور آج خواب میں دیکھ رہی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا اس وقت تم میرے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو گے قسمت بھی انسان سے کیسی انگلیاں کرتی ہے۔"

"خواہ مخواہ ہی مجھے غیث کہہ رہی تھیں" میں نے شکوہ کیا۔ "تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم خود غالباً سال با سال سے کافی غیث قسم کی چیز چلی کرتی ہو۔"

"ہاں۔" اس نے مجھے ایک کونے میں دھکیل دیا۔ "مجھ میں یہی تو ایک خرابی ہے جس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا یا پھر شاید یہی ایک خرابی ہے مگر میں ہر ایک پر تو اپنی اس خرابی کا اظہار نہیں کر سکتی نا۔ میں صرف دل کی غلام ہوں دلی جس پر تباہ ہے۔"

"بہر حال میرا کوئی تصور نہیں ہے۔ مجھے یہ بات کسی نے نہیں بتائی تھی" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"اب تو بتا دی ہے نا۔ اب تو گدھے سے انسان بن جاؤ۔" اس نے مجھے ایک گمشدہ زار بید کیا۔

"میں تو پہلے ہی سے انسان ہوں اور بہت خطاوار قسم کا انسان ہوں۔ میرے ممبر کا امتحان مت لو" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"ممبر کا امتحان میں لے رہی ہوں یا تم؟" وہ غرائی۔



میں تسلیم کیا۔ ”جس سے سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ میں یہاں کس لئے آیا تھا اور تم نے مجھے کس پکڑ میں ڈال دیا۔“  
 ”تم جس پکڑ میں آئے تھے کیا وہ اس سے زیادہ حسین تھا؟“  
 وہ نیچے کے سارے بچہ کراہ کر ایک سگڑٹ سلگائے ہوئے ہوئی۔  
 ”اب مجھے اس قسم کے غیر شاعرانہ بلکہ غیر انسانی موازنے کرنے پر مجبور مت کرو۔ میں تو تم سے کچھ پوچھنے آیا تھا جو ظاہر ہے ایک نہایت نامعقول قسم کا کام ہے۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے لیے ایک بار پھر کافی انڈیٹے پلٹے ہوئے ہوئی۔ ”لیکن میں نے تمہارے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ تم اگر سوالات کرنے میں لگے رہے تو میرے بارے میں ایک صدی میں بھی اتنا کچھ نہیں جان سکتے تھے جتنا ان دو تین گھنٹوں میں جان گئے ہو گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تمہارے لیے بھی اور کافی ڈالو؟“

”نہیں“ میں نے لقمی میں سر ہلایا۔ ”اس کافی کی شکل بتا رہی ہے کہ اب یہ بے کار ہو چکی ہے اور ہاں میں تمہارے بارے میں پوچھنے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میں ہدایت دانی کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔“

”کیا پوچھنے آئے تھے؟“ اس نے دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔  
 ”یہی کہ اب بھی وقت ہے۔“ جس میں اس کے بارے میں کوئی خاص بات یاد آ رہی ہے تو مجھے یاد دلا دیا۔ ”میں نے سنجیدگی سے کہا۔“  
 ”مجھے اس وقت اس کے بارے میں جو باتیں یاد آ رہی ہیں وہ نہایت لمبی قسم کی ہیں۔ وہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے ہوئی۔

میں ایک لمحے کے لیے اسے گھورتا رہ گیا۔ ”آج تم پر بہت سی خباثت طاری ہے۔“ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ کل تم ہدایت دانی کی فکر میں مدد کر بلکان ہو رہی تھیں۔ سخت وحشت زدہ تھیں۔ آج ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں اس کی ذمہ داری پر داؤ لگ گیا۔“

”ہر دو آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کل تھی اور آئے دانی کل کو بھی اتنی ہی رہے گی لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھ پر غم، غوشی، فکر اور دیگر سب ہی خاص جذبے آندہ کی طرف ان کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں اور اسی طرح معدوم ہو جاتے ہیں۔ میرے اندر بگولا سا اضمحنا ہے اس کے بعد میں اس معاملے کے بارے میں جو کچھ بھی کہتی ہوں بڑے ٹھنڈے دل سے کہتی ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے یہ جو میرے بارے میں تمہارے وجود میں بگولا سا اضمحنا ہے یہ بھی کل تک معدوم ہو جائے گا مگر رہ جائے گا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ”لیکن یہ بگولا دو چار

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔“ اس نے معذرتی غصے سے بچے گھورا۔ ”مجھے سمجھنے میں غلطی مت کرو۔ میں ایک ناقابل رسائی عورت ہوں۔ شاید نادری کوئی میرے ذہن، میرے دل اور میرے وجود تک رسائی حاصل کرنا ہے بلکہ میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میرے اندر بہت کم بات اونچے ہیں۔ جو لوگ عموماً میرے قریب آتے ہیں ان کی خوش کرتے ہیں وہ مجھے اچھے نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے میں ناقابل رسائی ہوتی ہوں اور جو مجھے اچھے سمجھتے ہیں ان کی نظرس نہیں اور ہوتی ہیں۔ وہ میری اوقات سے بہت اونچے ہوتے ہیں۔ میرے لیے ناقابل رسائی ہوتے ہیں۔“

”یہ رسائی یا رسائی کا پکڑ بھی عجیب ہونا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”یہ شک۔“ اس نے تسلیم کیا۔ ”یہی پکڑ انسان کو سب سے زیادہ غمزدہ رکھتا ہے۔“

”لیکن میں غریب تمہاری رسائی میں آیا۔“ میں نے مقلدانہ انداز میں کہا۔

”تم آجے سکتیں ہو نہیں جتنے بعض اوقات بننے کی کوشش کرتے ہو۔“ اول درجے کے بد معاش ہو تم۔“ وہ کپ رکھتے ہوئے مسکرائی۔

”یہ خراج حسین تم مجھے پہلے بھی پیش کر چکی ہو۔“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم آج نیچے گاؤں پر اپنی ڈیوٹی دینے نہیں جاؤ گی؟ اب تو تمہارا کام بنانے کے لیے ہدایت بھی موجود نہیں ہے۔“

”دوسرے لوگ ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام سنبھالے رکھتا ہے۔“ وہ بے پروائی سے ہوئی۔ ”آج مجھے کام مت یاد دلاؤ اور ہدایت کے بارے میں بھی میرے فکرات کو بنگالے کی کوشش مت کرو۔ آج مدت بعد میں اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کر رہی ہوں۔ میری خوشی کو عمارت مت کرو۔ مجھے جشن منانے دو۔“

”بہت عجیب موقع ڈھونڈا ہے تم نے جشن منانے کا۔“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے انسان تو شاید نادری موقع ڈھونڈتا ہے۔ اکثر اوقات تو موقع انسان کو ڈھونڈتا ہے۔ میں بڑی خوش قسمت ہوں۔ آج مجھے یہ موقع نے ڈھونڈا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر میرے سینے میں منہ چھپایا۔

بہت دیر بعد بہت اونچی فضاؤں سے واپس زمین پر قدم رکھتے ہی میری فکرا ایک بار پھر گھڑی کی طرف چلی گئی۔ اس نے مجھے گھڑی پر نظر ڈالنے دیکھ لیا۔ غار زدہ سے سبب میں ہوئی۔ ”تم بہت ہی بے ہودہ آدمی ہو۔ بار بار گھڑی دیکھ کر اپنے بارے میں کوئی اطمینان کرنے کی کوشش کر رہے ہو یا اس عالم میں بھی تمہیں کوئی کام یاد آ رہا ہے؟“

”میں واقعی بہت بے ہودہ انسان ہوں۔“ میں نے فمزوہ انداز

دل بعد پھر اسی شدت سے دوبارہ سراٹھا سکتا ہے۔ گویا کڑر جانے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ عین ممکن ہے کل یا پرموں ہدایت کے بارے میں سوچنے وقت میں پھر اتنی ہی جذباتی ہو جاؤں۔

”میرا خیال ہے کہ میں یہاں سے نکل ہی بھاگوں تو بہتر ہے“ میں نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم بھی عورتوں سے خوف آتا ہے جو پل بھر میں شعلہ ہوتی ہیں پل بھر میں آندہ می اور پل بھر میں برف کی پھوار“

”غیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے“ وہ مسکرتہ کا ایک طویل سس کے کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”البتہ اگر تم نہانہ کر کے بھاگنا چاہے ہو تو بات دوسری ہے۔ تم میری بات کی غلط تفسیر کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”تم مجھے ہدایت کے بارے میں کوئی کارآمد بات نہیں بتا رہیں؟“ میں نے ایک بار پھر جمیدگی سے پوچھا۔ میں ہاتھ دم کی طرف جاتے جاتے رک گیا تھا۔

”مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں آ رہی جو تمہارے لیے ہدایت کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہن پر زور دو“ میں نے اصرار کیا۔

”کالی عرصے بعد وہن اتنا ہلکا ہوا ہے۔ تم چاہتے ہو میں پھر اس پر زور دے کر اسے بوجھل بنا لوں۔ واقعی یہ دنیا بھی کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتی۔“

”نہیک ہے“ میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم خوش رہنا چاہتی ہو تو رو۔ مجھے کیا پڑی ہے ہدایت کی فکر میں رہا ہونے کی؟ میں تو تمہاری ہی وجہ سے اس کے بارے میں فکر مند ہو رہا تھا۔“

”پہلے تم نے اسے حالات پہنچا دیا۔ اب اس کے بارے میں غور مند ہو رہے ہو؟“

”میں نے پہلے بھی تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی“ میں نے زری سے کہا۔ ”ہدایت کو میں نے نہیں“ حالات نے حالات میں پہنچایا ہے یا پھر یوں کہو کہ اس کے خلاف میرے آنے والی شاد میں اس کے لیے مصیبت بنی ہیں۔ میں بھلا کیا کر سکتا تھا؟ میری اس سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ میں نے تو پر سوں سے پہلے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔“

”مفتائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں“ اس کی مسکراہٹ اب بھی برقرار تھی۔ ”میں درحقیقت شکوہ نہیں کر رہی تھی۔ میں صرف جانتا چاہ رہی تھی کہ تمہارے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہے یا نہیں؟“

”پھر تمہیں کیا اعتماد ہوا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میرا خیال ہے اسے حالات سمجھو اگر تم بھی خوش نہیں ہو“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں“ میں نے اعتراف کیا۔ ”وہ پکڑا ضرور گیا ہے مگر جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ دل میں ایک غلشی ہو رہی ہے۔“

”یہ فلک کی غلشی ہے“ وہ دھڑکی سے بولی۔ ”۳۳ کا مہر ہے تم اس کے بارے میں چچین نہیں ہو کہ وہ مجرم ہے اور اب تمہارے دل میں اس کے بارے میں فلک کی غلشی موجود ہے۔ تم یقیناً اس کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔“

”میں تو کوشش شروع بھی کر چکا ہوں“ میں نے کہا۔ ”تجربہ سے میں اس مسئلے میں حرکت میں ہوں۔ ایک امکان نظر میں آیا لیکن وہ بھی ختم ہو گیا“ میں نے اسے ہنسی اور اس کے دوست کے بارے میں بتایا پھر کہا۔ ”میرا حال پولیس ابھی باریک بینی سے سمجھنے کے زور اور دھمکے کے لیکن مجھے کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔“ وہ گرمی سانس لے کر بولی۔ ”میں جو تمہیں اتنی مطمئن کر رہا تھا اب نظر آ رہی ہوں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میرے دل کا قرار سا اٹھ گیا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہدایت۔ گناہ ہے اور وہ اس پکڑے بغیر وعایت نکل آئے گا۔ یہ ایک عارضی پریشانی ہے۔ ایسی پریشانی ہم پر آ رہی ہیں۔“

”اچھا تو تم بھی دل کے کتنے پر ہنسی ہو!“ میں نے سر ہلایا۔

”دل کے کتنے پر ہی تو سب سے زیادہ جیتی ہوں“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”۳۳ کے علاوہ ایک دوسری وجہ ہو رہی ہے۔“

”وہ بھی بتا دو“

”تم نے میرے لیے جس وکیل کا بندہ دست کر دیا تھا میں جاگ اس سے ملی تھی۔ اس نے سارا قصہ سننے کے بعد مجھے تسلی دی ہے کہ اس کیس میں بالکل جان نہیں ہے۔ وہ بہت بڑا وکیل ہے۔ اگر اسے تو اس سے کیس زیادہ تکنیک کیسوں میں لوگوں کو رہا کر دیا ہے اس کا کہنا ہے کہ وہ پہلی پیشی پر ہی ہدایت کو ضمانت پر رہا کرالے گا۔ اس کے بعد کوئی عدالت بھی اسے سزا نہیں سنائے گی۔ جن قسم کی شادی میں اس کے خلاف موجود ہیں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔“

خیر! اچھی بات ہے کہ وکیل نے جیسے حالات کا روشن پہلو دکھایا ہے اور اسی وجہ سے تم اتنی خوش ہو۔ وہ میرے ہی گروپ آف کیپٹنز کے لیے کام کرنے والے بہت بڑے وکیلوں میں سے ایک ہے لیکن میں نہیں کم از کم اتنا ضرورتاً چاہوں گا کہ وکیل کا کام ختم نہ ہو۔ اگر تک لازم کو تسلیاں دینا ہے جس طرح ڈاکٹر اس وقت تک تھک کر بیٹھ کے لیے کوئی نہ کوئی دوا لکھ رہا ہو تا ہے جب اسے آخری قسط دیا جا رہا ہو تا ہے۔“

”تم بہت ظالم ہو۔“ اس نے ہونٹ سیکڑ کر مجھے گھورا۔ ”تم نہیں چاہتے کہ میں خوش رہوں؟“

”یہ بات کہہ کر میرے دل پر گھونسا مت مارو“ میں نے چپکے

کہ سکا تھا۔ میں اس سے وعدہ کر چکا تھا اور وعدہ بہر حال ذاتی محسوسات سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

عقبنی گھوڑوں میں تاریکی تھی۔ اس طرف دکانیں ہی دکانیں تھیں جو بہت پہلے بند ہو چکی تھیں۔ گلیاں دیران تھیں اور ٹرنگ کی بجائے جھانڈے ختم ہونے پر اب کچھ کشادہ کشادہ دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے گاڑی ایک آہنی شنگے کے قریب کھڑی کی تھی۔ اب وہاں ٹھکرا اندھیرا تھا۔ آہم دور سے بھی گاڑی کے کچھ حصے جھلکاتے نظر آ رہے تھے جس سے پتا چل رہا تھا کہ گاڑی کہاں کھڑی تھی۔

نیلیم نے اندھیرے میں گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نہیں کہہ سکا کہ وہ کون سی حس یا کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے اچانک ہلک کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ شاید وہ کوئی غیبی طاقت تھی جس نے ایک لمحے کے لیے میری گردن پیچھے کی طرف گھما دی تھی۔

اسی لمحے مجھے صوب میں عمارتوں کے درمیان ایک نہایت عجیب سی گلی سے ایک انسانی بیولا ہوا آدمی دکھائی دیا۔ اگر وہ صرف انسانی بیولا ہی ہوتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس کے ہاتھوں میں بیولے ہی کے انداز میں مجھے ایک اور چیز کی ہلک بھی دکھائی دی تھی۔ مجھے یکدم گھبراہٹ ہوئی وہ بیچ کا کرنٹ لگا۔

میں نے نیلیم کا بازو پکڑ کر ایک خاص انداز میں جھٹکا اور اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے سڑک پر گر چا۔ سنسان گلی گلیوں کی ترخا بہت سے گونج اٹھی۔ گولیاں بیٹھا ہمارے سر پر سے گزری تھیں۔ میری گاڑی سے بہت پہلے ایک اور کار فٹ ہاتھ سے گلی کھڑی تھی۔ میں نیلیم کو ساتھ لے کر اٹھا ہوا اس کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔

اس وقت تک دو سرا برست بھی مارا جا چکا تھا لیکن میں اور نیلیم نہ صرف گولیاں چلانے والے کی نظر سے اوچھل ہو چکے تھے بلکہ ہمیں گاڑی کی آڑ بھی میرا آچکی تھی۔ نیلیم بیٹھا اس اچانک افتادے سے ہلکا چکی تھی۔ اچانک کرنے سے شاید اسے چوٹ بھی لگی ہو لیکن اس وقت چوٹ کا کسے ہوش تھا؟

اب مجھے نیلیم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بدحواس ہو کر خود ہی کسی چھوٹے بچے کی طرح میری کر سے چٹ چکی تھی اور میں اس عالم میں بھی محسوس کر سکتا تھا کہ وہ قہر قہر کانپ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جب سے مشین ہٹل نکالا اور گاڑی کے وکیل کے صوب سے سر نکالا۔ اس وقت تک ایک برست اور مارا جا چکا تھا اور وہ بھی ضائع ہو چکا تھا۔ گولیوں نے نہ جانے کتنی دکانوں کے شیشوں اور دوسری چیزوں کو چھلنی کیا تھا۔

میں نے جب گاڑی کے پینے کی اوٹ سے جھانکا اس وقت وہ بیولا دوبارہ اسی عجیب سی گلی میں غائب ہو رہا تھا۔ میں صرف ایک ناکر کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے اس بیولے کو ایک جھٹکا سا

ہاتھ رکھ کر کراہ کر کہا۔ "میں تو اس دنیا میں ہر شخص کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور ہر شخص کی آنکھوں میں امیدوں کے ستارے چمکاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تمہیں مایوسی اور ایسٹ میں جکڑ کر نہیں تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم شخص دیکھ کی بات پر مطمئن ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر مت بیٹھ جانا۔ اپنی سی خوشحالی جاری رکھنا۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ بے بسی سے بولی۔ "اب میں ریمر کی طرح کوئی توپ جتنی روزنی گن اٹھا کر تھانے اور حوالات کو گولوں سے اڑا کر توہدایت کو نہیں چھڑا سکتی۔"

"میں نہیں ایسا کہنے کا مشورہ بھی نہیں دوں گا۔ یہ طریقے صرف غلوں میں ہی کامیاب رہتے ہیں۔ عملی زندگی میں ایسا کہنے والے کسی اور کو اس طرح باہر لاتے لاتے خود اندر پلے جاتے ہیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ حالات سے باخبر اور مستعد رہو۔ شرفیادہ طریقوں سے ہدایت کے لیے جو بھی ممکن ہو کرتی رہو۔ کوئی زرا سی بھی کارآمد بات معلوم ہو تو اس سے مجھے مطلع کرو۔"

"اے کہ باس! اس نے پیڑ پر پیٹھے پیٹھے ہی مجھے سیلون کیا پھر سرکٹ الٹیں نرے میں ملنے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "تم ایک بار ہدایت سے میری ملاقات کرو۔" مجھے تو اس معاملے پر اس سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ دیکھنے ملاقات کا معاملہ کل برسوں کا ڈال رہا ہے۔"

"برسوں تک تو شاید اس کا حالان ہی عدالت میں پیش ہو جائے۔ اس وقت تو تم عدالت میں بھی مل سکو گی" میں نے کہا۔ "اس لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ اس کے عدالت میں پیش ہونے سے پہلے کم از کم ایک بار تو اس سے میری ملاقات کرو۔ ہمیں بھی تمہارے اثر رسوخ کا کچھ فائدہ پہنچ جائے۔"

"اچھا۔ چلو تمہاری ملاقات کراہی دیتے ہیں" میں نے شانہ انداز میں کہا۔ "تم بھی کیا یاد کرو گی کہ حاتم ملانی کے کسی قریبی عزیز سے پالا ہوا تھا۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم دونوں تیار ہو کر دو صاف ستھرے معزز اور نہایت سنجیدہ شہروں کی طرح ہوئی سے برآمد ہوئے۔ وہ ہوٹل چل کر شہر کے نہایت گنجان اور مرکزی علاقے میں واقع تھا جہاں پارکنگ کا بڑا مسئلہ رہتا تھا اس لیے میں نے اپنی گاڑی کچھ دور ایک عجیب سی گلی میں کھڑی کی تھی۔ میں نیلیم کو ساتھ لے کر اس طرف چل پڑا۔

شاہد لینے کے بعد نیلیم کے وجود سے پہلے سے زیادہ دلچسپ ملک پھوٹ رہی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ میں بھی خود کو فریٹس محسوس کر رہا تھا اور رات کے سامنے گھرے ہوئے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس وقت تو انسان کو تھانے حوالات بھی بے ہودہ جکڑوں کے بجائے کسی خوب صورت اور مدیان بددی کی جگہ پر جانا چاہیے تھا لیکن اب یہ بات میں نیلیم سے نہیں

کر اس کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حملہ آور کے عاصب کے امکانات بڑھ گئے تھے۔

مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ ان گلیوں میں اتنا اندازہ حالانکہ یہ کوئی قطعی گلیاں نہیں تھیں جس میں گونا گونا گونا گے ہیں۔ یہ شرکار کی علاقہ تھا اور تک تک یہ یہ قتل و قتل بھی اچھے خاصے کا دہائی مراکز تھے۔ ان میں دکانوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ جس گلی سے بھولا برآمد اس کے بلب تو اس نے قاتل کیے ہوئے ہوں۔ اب ان اطراف میں کیس کیس جو تھوڑی بہت روشنی آ رہی تھی وہ دکانوں کے سامنے بنے ہوئے نہایت پرالے اور بوسیدہ فلٹین میں سے آ رہی تھی۔ وہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

میں قدرے باؤسی کے عالم میں نیلم کے پاس آ گیا۔ علامہ بیٹھا دیکھ بھل کر مگر دو پیش کا اچھی طرح جائزہ لے کر فرار کی حتمین کر کے اور ہر امکان کو ذہن میں رکھ کر اپنا کام کر کے آتا البتہ یہ امکان شاید اس کے ذہن میں نہ رہا ہو کہ میں اسے غیر خطرے میں سے بھی سکتا تھا۔ نہ شاید وہ اکیللا نہ آتا۔ دو چار آتے تو حلقہ ستموں سے آتے۔

میں نے دیکھا نیلم گاڑی کے نیچے ٹھکنے کی کوشش کر رہی تھی مجھے واپس آتے دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا اور اس نے بے کوشش رک کر دی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ اٹھتے ہوئے آ رہی تھی کیوں کہ اس طرح وہ گاڑی کی اوٹ سے باہر ہو جاتی۔

وہ ابھر اور دیکھتے ہوئے عرض کرکشی میں بولی۔ ”مجھے آ رہی تھی تو گلی میں آئے تھے۔ وہ کہاں گئے؟“

”ڈنڈومت۔ وہ اپنے ہی آ رہی تھے۔“ میں نے اسے قلمی تپ اس نے ایک طویل سانس لے۔ شاید اس کے اعصاب پرستہ ہو چکے تھے۔

شفیع چند سیکنڈ بعد ہی لوٹ آیا اور نیچے آواز میں بولا۔ ”ایم سوری میرا میں یہاں پہنچنے میں چند سیکنڈ کی تاخیر ہو گئی۔“

”نہیں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے اس کا کھانا چھینکے ہوئے کہا۔ ”تم تو میرے اندازے سے زیادہ جلدی پہنچے ہو۔“

وہ دور در میری عمرانی کرتا تھا۔ وہ اس گلی سے کافی دور تھا جس میں میں نے گاڑی کھڑی کی تھی جب کہ حملہ آور تو اس کی بھی ایک بٹلی گلی میں چھپا ہوا تھا۔ شفیع شاہ یقیناً ٹانگہ کی آواز سن کر حرکت میں آیا ہو گا۔ اس اعتبار سے اس نے گاڑی سے اتر کر یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگا کی تھی۔ وہ اور دوسرے دونوں آدمی چھلانے کی ہی پھرنا سے محض چند سیکنڈ میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ اب اس سے زیادہ پھرنا کی تو کسی سے توقع نہیں رہی جاسکتی تھی۔

دوسرے دونوں آدمی واپس نہیں آئے تھے۔ شفیع شاہ یقین سے بولا۔ ”وہ آدمی بھاگا نہیں ہے۔ ساتھ اسی چوکور سے مجھے

لگتے دیکھا لیکن بھولا گواہ نہیں۔ تاہم مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی ضائع نہیں گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ گلی اس کے کندھے پر گئی تھی۔ گلیوں کی ترزا ہٹ کے بعد یکدم گرا سکتا تھا۔ دور سے آتے ہوئے ٹھٹھک و فریو کی مدد میں آوازیں بھی جیسے کسی طرح رک گئی تھیں اور جہاں تک گلیوں کی آوازیں گئی تھیں وہاں تک لوگ گویا اپنی اپنی جگہ دیک گئے تھے۔ اس محل میں یہ مشکل تین یا چار سیکنڈ لگے تھے۔

میں نے یہ مشکل اپنے آپ کو نیلم سے چھڑایا۔ وہ ٹھٹھک رہی تھی۔ ”پلین۔“ مجھے چھوڑ کر مت جائے۔“ ”یہاں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دانت بخر رہے تھے۔

میں کیس نہیں جانتا ہوں۔ تم ایک منٹ میں یہاں رکو۔“ میں نے بڑی مشکل سے اس سے ہاتھ چھڑایا اور اس تک گلی کی طرف دوڑا۔ گلی کے سرے پر پہنچ کر میں نے احتیاط سے دیوار کی اوٹ سے سر نکالتے ہوئے گلی میں جھانکا۔ میرے اندیشے کے مطابق بھولا قاتل ہو چکا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی دہلی آوازیں سن کر میں نے تیزی سے رخ بدلا۔ میں دیوار سے چپک گیا تھا اور میرے ہاتھ میں موجود ٹھٹھک ٹھٹھک اٹھنے کے لیے تیار تھا۔ تین اور پورے گلی میں داخل ہوئے لیکن میں ایک طویل سانس لے کر ذرا آگے آ گیا۔ وہ پورے دراصل شفیع شاہ اور میرے دوسرے دو آدمیوں کے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گھٹیں تھیں۔

جس طرح میں نے شفیع شاہ کا بھولا دیکھ کر اسے پہچان لیا تھا اسی طرح اس نے بھی مجھے ٹھٹھکے اندھیرے میں پہچان لیا۔ مجھے گلی کے سرے پر کھڑے دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ حملہ آور کہاں گیا ہو گا۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور گلی میں گھس گیا۔

اس کا اس طرح اندھا دھند گلی میں گھسنا بھی غلط تھا۔ اگر حملہ آور گلی میں ہی کیس چھپا ہوتا تو آسانی سے شفیع شاہ کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ مجھے ہوئے آدمی بھی جلد بازی اور جہالت میں ایسی غلطی کر جاتے ہیں میں بھی اسے نہیں روک سکتا تاہم مجھے کچھ اطمینان بھی تھا کہ شفیع شاہ بھی کبھی کبھار آنکھیں بند کر کے اچانک ایسے خطرات کے منہ میں چلائی لگا رہا تھا تو وہ عین آخری لمحے میں اس سے اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔

اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو دوسری اطراف سے محکم کر گلی کے دوسرے سرے پر پہنچنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک اگلے قدموں دوڑتا چلا گیا۔ دوسرا مخالف سمت میں دوڑا۔ دونوں حلقہ ستموں سے گلی کے سرے پر پہنچنا چاہتے تھے۔ میں گلی میں جھانک کر شفیع شاہ کو اندھیرے میں آگے جاتے دیکھ سکتا تھا۔

گلی کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں دیکھی ایک اور گلی اس گلی کی

کس عتاب ہوا ہے۔ کیا ہم علاقے کو گھیرنے اور تلاش لینے کی کوشش کریں؟

وہ جس چوکور حصے کی بات کر رہا تھا اس میں ٹک وٹاریک راستوں اور نہ جانے کیسے کیسے چور و دزدوں والی بیسیوں ایسی مٹاریں پھیلی ہوئی تھیں جن کے بچے دکائیں ان سے اور دفتر ور کٹاچیں اور نہ جانے کیا کچھ تھا پھر ان سے اور وڈا نما ظلیت پھیلے ہوئے تھے۔ سچ میں اور دوسرے آئے جانے کے دسیوں راستے تھے۔ محض ہم چار آدمیوں کا اتنے بڑے اور بڑے حصے کو گھیرنا اور تلاش لینے کی کوشش کرنا بے کار تھا۔ یہ کام تو پیس بھی اچھی خاصی نفی کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی محض بے فائدہ قسم کی پکڑ دھکڑ کر سکتی تھی۔ ٹٹکے والا آسانی سے نکل سکتا تھا۔

”اس کا کوئی فائدہ نہیں“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس شخص کو صرف ایک پرچا نہیں کی طرح دکھا ہے لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ پرچا نہیں کسی کی تھی اور اسے کھل تلاش کرنا چاہیے۔ اس لیے یہاں وقت ضائع کرنے اور اپنے لیے الجھنیں کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے آدمیوں کو واپس بلا لو۔ ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ مزید ہدایات میں تمہیں راستے میں موبائل فون پر دوں گا۔“

”اگے سر!“ وہ پلک کر اسی جگہ ہی گلی میں غائب ہو گیا۔ پھر میں نے کسی پردے کی سی آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو واپس آنے کے لیے منتظر رہے رہا تھا۔

میں قلم کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گاڑی کی طرف لگا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے روف لائٹ آن کی۔ میرے اور قلم کے کپڑے مٹی میں تھڑکے تھے تاہم زیادہ برا حال نہیں ہوا تھا۔ ہم نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اپنے آپ کو جہاز پوٹھ کر اپنا طیلہ درست کیا پھر میں نے گاڑی اشارت کرنے اور ریورس کرنے میں بھی جان بوجھ کر چوکیدگی کی تاہم۔ میں شفیع شاہ کو یہ دیکھنے کا موقع نہ دیا جتنا تھا کہ میں کوھر کا سر گرہا تھا۔

جب میں نے اس کی گاڑی گلی کے ایک سرے پر نمودار ہوتے دیکھ لی تو اپنی گاڑی گلی کے دوسرے سرے کی طرف ہٹا لی۔ گھٹان علاقہ اس وقت نکلیاں محسوس نہیں ہوا تھا اس لیے میں نہایت آسانی اور تیز رفتاری سے وہاں سے نکل آیا۔ اس وقت تک کسی بھی طرف سے پولیس وغیرہ کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔

گلاڈان روڈ پر پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار بالکل کم کر دی اور فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔ سڑک کے کنارے کنارے نہایت سست رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے میں نے شفیع شاہ کو کچھ ہدایات دیں۔ پھر میں نے رجم گل سے رابطہ کیا۔ وہ میری آواز پہچانتی ہی بولا۔ ”ابھی میں نے تمہیں ہوش فون کیا تھا۔ تم وہاں نہیں لے تو اب میں تمہارے موبائل نمبروں پر رابطہ کرنے کی سوچ

رہا تھا۔“

”نہیں؟ کیا تکلیف تمہیں؟“ میں نے گاڑی ایک جگہ روکے ہوئے پوچھا۔ میں چاہ رہا تھا اس سے اطمینان سے بات کر لی جائے۔

”وہ تم نے چکی اور فی نام کی جو دو عجیب و غریب ظہرات مجھ سے کرائی تھیں ان کے بارے میں تمہیں بتانا تھا“ اس نے خوش گوار لہجے میں جواب دیا۔

میں نے اسے چلانے کے لیے کہا۔ ”اتنے شکایتی لہجے میں بیکوں بول رہے ہو؟ فکر کرو کہ اس زمانے میں ایک ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی سے تعارف حاصل کرنے کا موقع مل گیا ورنہ تمہارے مفرد میں اس قسم کی بلکہ کسی بھی قسم کی لڑکیوں سے ملنا کہاں!“

”تم اس ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی کو اپنے پاس ہی رکھو۔“ وہ بولا۔

”چلو ٹھیک ہے“ رکھ لوں گا“ میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارے بس کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ بتاؤ اس کے بوائے فریڈ سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟“

”ہاں معلوم ہوئی ہے۔“

”کیا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”یہ کہ چکی جیسی لڑکیاں کس قسم کے مردوں کو پسند کرتی ہیں“ اس نے جواب دیا۔

”خیر ان میں تمہارا کوئی ذکر نہیں ہو گا۔ تم نہ میں ہوں نہ تمہیں۔“

”تم نے نہایت شفقت سے کہا۔“ تم صرف اپنے پولیسیا نہ کاموں میں دلچسپیاں لیا کرو۔“

”ہاں۔ لڑکیوں میں دلچسپی کے لیے تو صرف تم ہی ایک گھٹان کے بچے رہ گئے ہو۔“ وہ بولا۔

”اتنا مت جلد۔ دھواں یہاں تک پہنچ رہا ہے۔ ٹیلی فون بیٹ سے برآمد ہوا ہے“ میں نے گویا پارے اسے سمجھایا۔ ”تم نے فی کے بیان کی ابتدائی تصدیق تو کر لی تھی۔ یہ بتاؤ کہ کیا ذرا کمزوری سے جائزہ لینے پر بھی وہ بے قصوری معلوم ہوتا ہے؟“

”ہاں۔ میرا خیال ہے سچ صاحب کے نقل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اسے جھوڑا ہے۔“ اس نے غبیگی سے جواب دیا۔

”شاید تم نے ٹھیک ہی کیا۔ یہ بات میں صبح تک زیادہ یقین سے کہہ سکوں گا“ اب میں نے بھی غبیگی سے بات کی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ فضول باتوں میں وقت برباد کرنا ٹھیک نہیں تھا۔

”فی ایسا تھا کہ وہ بات سن لو اور انہیں اپنے ناکارہ دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرو۔“

”تم اس وقت بول کہاں سے رہے ہو؟“ وہ میری بات کانٹے

ہوئے ہوا۔

”مغضول سوال کرنے کی تمہاری عادت کبھی نہیں جائے گی“ میں نے اسے ڈانٹ پائی۔ ”اس بات سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں؟“

”فرق کیوں نہیں پڑتا؟ بہت فرق پڑتا ہے۔“ وہ بحث کے لیے تیار معلوم ہوتا تھا۔

”میں عالم بالا سے ذرا دو چار فٹ اُدھر سے بول رہا ہوں“ میں نے کہا۔ ”سرگرم کر بیچے دیکھنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت عالم بالا ہی سے بول رہا ہوتا لیکن پھر کسی نیک مدد سے میری بات ہو رہی ہوتی۔ تم جیسی بد مدد سے نہیں۔“

”چھا تم اس وقت سپینر پیدا کرنے کی اپنی مجبوری کو محسوس کر رہا ہو اور جو اصل واقعہ بتانا چاہ رہے ہو وہ بتاؤ؟“ رجم کل بولا۔

میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی اور اصل واقعہ اسے بتا دیا۔ میں خاموش ہوا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”آؤ کیا عقیم الشان گدھا تھا وہ؟ معلوم شخص جو اتنا اہم کام صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکا۔ اگر وہ ذرا سی مستعدی دکھاتا تو اس وقت دنیا کو کتنی بڑی مصیبت سے نجات مل چکی ہوتی۔ ماحول کتنا صاف ستھرا ہو چکا ہوتا۔“

”مستعد تو وہ بہت تھا میرے لال بھکڑا اگر تمہیں اس سے واسطہ پڑ گیا تو تمہیں بتا چل جائے گا کہ عقیم الشان گدھا وہ ہے یا تم؟ میں نے کہا۔ ”لیکن فی الحال تم اپنی چرچ بند کرو اور اپنے اس کاکل و جوکھو کو تھوڑی سی حرکت دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

میں نے تفصیل سے کچھ ہدایات دیں اور کہا۔ ”ان ہدایات پر عمل کرنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ فوری طور پر حرکت میں آ جاؤ۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت بلکہ تمہارے ساتھ تو مسئلہ یہ ہے کہ تمہارے پاس صرف وقت ہی نہیں بلکہ عقل بھی کم ہے۔“

وہ میری ہدایات سن کر ٹھوڑا مزاج بھول گیا تھا۔ نہایت بخیدہ بلکہ کسی حد تک شکرانہ لہجے میں بولا۔ ”تم بالکل بخیدہ ہو؟“

”میں تو اس وقت رنجیدہ بھی ہوں کہ مجھے تم جیسے مجھے آوی کا تعاون بھی حاصل کرنا پڑ رہا ہے۔ مخلص اس لیے کہ تم قانون کے لحاظ سے ہو۔ ورنہ میں تو خود ہی اس مسئلے سے نمٹ لیتا۔ دیے بھی اب تم جیسے کوڑھ مغز سے تھوڑی بہت دوستی ہے تو میں چاہتا ہوں تمہیں میری ذات سے کچھ فائدہ پہنچ جائے خود اپنے بل بوتے پر تو تم زندگی میں مشکل سے ہی کچھ کر سکو گے۔“

غلاف تو فتح اس نے میری ان سلیکے والی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ”میں اب روانہ ہو رہا ہوں۔ تم بھی تیزی سے حرکت میں آ جاؤ ورنہ کوئی الجھن کمزور ہو سکتی ہے۔ تمہیں تو سانپ سوگتہ گیا ہے۔ مجھے ابھی بتاؤ تم بروقت پہنچ سکو گے یا نہیں؟“

”پہنچ جاؤں گا، پہنچ جاؤں گا۔ مرے کیوں جا رہے ہو؟“ تیزی سے بولا۔

میں نے اسے شب بخیر کہا اور فون بند کر کے نلیم کی طرف دیکھا۔ وہ اب اس رچکے سے سنبھل چکی تھی جو اسے اچانک سے لگا تھا تاہم اب وہ میری گفتگو سے پریشان نظر آ رہی تھی۔ ”یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے تھے اور ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”تم نے ایک ساتھ دو سوال کر دیے۔ میں نے گاڑی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اکثر اسی قسم کی باتیں کرتا ہوں۔ خصوصاً اس شخص سے جس میں اس وقت بات کر رہا تھا۔“

”تم انیسویں رجم کل سے بات کر رہے تھے؟“ اس نے تعجباً چاہی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”بہت سخت کیراؤ ہے۔ میں نے صرف ہدایت سے ملاقات کے سلسلے میں اس سے کچھ کی بہت مت کی۔ ہمارا جو تھوڑا بہت اثر رسوخ ہے اس کے حوالے دیے۔ بڑی رحمانے والی مسکرائشیں بھی اس پر بھجوا دیں۔ مگر بد بخت شمس سے مس نہیں ہوا بلکہ محض اشارہ نہیں دے سکے۔ لہذا کاؤ کر کیا تو اتنا برا مانا گیا کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کوئی نا لگا کر مجھے ہی اندر نہ کر دے۔“

”ہاں۔ اس سے یہ بھید تو نہیں تھا؟“ میں نے پکی سی ہنسی ساتھ کہا۔ پھر غیر ارادی طور پر میں بخیدہ بلکہ ایک لمحے کے لیے افسردہ سا ہو گیا۔ ”لیکن ہمارے ملک کو اس قسم کے ”مردود“ ”بد بخت“ ”بولیس“ افسروں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ تم شکر کرنا۔ ہدایت اس کی تحویل میں کیا ہے۔ اگر وہ بے گناہ ثابت ہو گیا تو زحمت اور کسی جسمانی نقصان کے بغیر عزت و آرام سے گھر آ جائے گا ورنہ بے گناہ ہونے کے باوجود اس کا قتل نکل جانا تو تمہاری اس سے حالات میں ملاقات اتنی ضروری نہیں تھی۔ ا کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے۔ زبردستی ظلم خیر و عدالت سے ہو۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی، تشدد وغیرہ نہ ہو رہا ہو تو پھر ملاقات ضروری نہیں۔“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے“ ایک کمری سانس لیتے ہوئے اس نے حلیم کیا۔ مگر حال اب تم مجھے ہدایت سے ملوانے تو یقیناً نہیں جا رہے۔ تمہارا پروردگار ہم بدل چکا ہے نا؟“

”ہاں۔ تمہیں تمہارے دوسرے سوال کا جواب تو مل رہا ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کہاں جا رہے ہیں۔ رجم کل سے میری جو گفتگو ہو رہی تھی اس سے تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”ہاں۔ اس نے حلیم کیا۔ ”وہ میں غیر ارادی طور پر پوچھ رہا ہوں۔ دراصل مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

”تم چاہو تو میں تمہیں راستے میں اپنے ہوٹل پہنچا دیتا ہوں۔“

ہے۔ عورت قدرت کی ایک خوب صورت تخلیق ہے۔ اس کے منہ سے ریشم جیسی نرم اور پھولوں جیسی مسکی مسکی باتیں اچھی نکلتی ہیں۔ کہ دوری باتیں مردوں کے لیے چھوڑ دو۔“

”لیکن مجھ پر یہ مانی ڈیڑھ افضل!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”ہر عورت ریشم جیسی ملائم اور پھولوں جیسی مسکی مسکی باتیں نہیں کر سکتی کیوں کہ ہر عورت کی زندگی ریشم جیسی ملائم اور پھولوں جیسی مسکی مسکی نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں خوش فہم نہیں ہوں۔ تم اگر میرا دل بڑھانے والی باتیں کر رہے ہو یا ہم کچھ ایجادات ساتھ گزار چکے ہیں تو اس سے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ تم مجھ پر عاشق ہو چکے ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک خاصا ناقابل رشک ماضی رکھنے والی وطنی عمر کی عورت ہوں جس کے دامن میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس پر تم فخر کر سکو۔“

”مثنیٰ فخر کرنے کے لیے نہیں ہوتا تو کی دم!“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”مثنیٰ تو صرف اپنی روح کو سرشار کرنے کے لیے اور اپنے اندر موجود خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر تم وطنی عمر میں ایسی ہو تو جو جانی میں کیا چیز رہی ہوگی؟“ ”تو جوانی میں بالکل بے کاری چیز تھی۔ بہت سی بے وقوف بہت سی بے کشش سی لڑکی تھی۔ واقعی آؤ کی دم تھی“ وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”میرا خیال ہے کہ تم عمر کے ہر دور میں ہی اپنے لیے بہت زیادہ کمر تنہی سے کام لیتی رہی ہو۔ میں نے تم جیسی کمر تنہی کی عورت میں نہیں دیکھی۔ میں نے تو بڑی بڑی عجیب انہقت خواتین کو اپنے بارے میں سخت خوش فہمی میں مبتلا دیکھا ہے۔“

”مجھے شاید بچپن سے ہی خود آگئی کی بتاری لگ گئی تھی“ وہ بولی۔

”اور کچھ زیادہ ہی لگ گئی تھی“ میں نے آستے سے کہا۔ ایسی ظالمانہ حد تک خود آگئی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ خود کشی کی طرف لے جاتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ میری روح تو کافی عرصہ پہلے خود کشی کر چکی ہے۔ یہ صرف میرا جسم ہے جس میں زندگی گزارنے کی انگ بڑے زور شور سے زندہ ہے“ وہ بولی۔

”اچھا اب فضل اور ذہن کس کے لیے والی باتیں مت کرو ورنہ میں تمہیں گاڑی سے نیچے دھکا دے دوں گا اور اندھیرے میں ادھر ادھر دوڑتا ہوا کوئی بد ذوق اور جالال چہا تھا میری یہ خوب صورت سی تاک کٹر لے گا“ میں نے گویا اسے ڈرایا۔

”اندھیرے میں دندنا تے ہوئے دو ناخن والے بھٹیٹے کبھی میری مرضی کے خلاف میری ناک نہیں کتر سکتے چہا کیا جڑ ہے“ اس کے ہونٹوں پر اس کی پُرکشش سی مسکراہٹ واپس آئی دکھائی دی۔

”تم میرے کمرے میں اطمینان سے میری واپسی کا انتظار کرنا دو اگر مجھے واپسی میں دیر ہو جائے تو وہیں سو جاؤ۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”نہیں“ خیر“ اب اتنا بھی ڈر نہیں لگ رہا“ وہ گویا اپنا حوصلہ بچھ کرتے ہوئے مسکرائی۔ ”تم جس آدمی کے ٹھکانے کی طرف جا رہے ہو وہ بلاشبہ بہت خطرناک آدمی ہے لیکن میرا خیال ہے تم خود بھی کچھ کم خطرناک آدمی نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ جاتے ہوئے مجھے خوف ذرا نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں ایک معصوم اور بے ضرر انسان پر بہتان تراشی کر رہی ہو۔ مجھے جیسا سیرھا آدمی تمہیں کہاں لے گا جو ہر ایک سے تھوڑی تھوڑی محبت کرنے لگتا ہے۔ جو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خوب صورتی تلاش کر لیتا ہے۔ جو ہر ایک کی صرف خوبیوں پر نظر رکھتا ہے“ ”خامیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے“ میں نے اپنا دفاع کیا۔

”تم بچے بد معاش ہو!“ وہ سیٹ سے سر نکا کر کمری سانس لے کر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ”ہر ایک کو اس کی نظر میں اہم بنا دیتے ہو“ ہر ایک کا دل رکھتے ہو۔ اپنے دل کا بھید کسی کو نہیں بتاتے۔ تم ہر اعتبار سے خطرناک ہو۔ مجھے تم سے دور رہنا چاہیے ورنہ اندیشہ ہے کہ میں اس وطنی عمر میں تم سے مثنیٰ نہ کرنے لگوں۔“

”تو پھر کروانا کس نے منع کیا ہے؟“ میں نے گویا یکدم خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں تو مثنیٰ کا بہت بڑا قدر دان ہوں۔ میں تو کسی کے مثنیٰ کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم بچے بد معاش ہو۔ ہر ایک کو محل باتوں سے خوش کرتے رہتے ہو۔ پارسانے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ زور ہڈیوں اور خواہشوں کے بارے میں ایک عام انسان نظر آتے ہو لیکن دل کا فواد دی دوا دواہ منبھوٹی سے بند رکھتے ہو۔ اس بات کا پورا پورا خیال رکھتے ہو کہ کوئی تمہارے گلے کا ہار نہ بننے پائے۔“

”اور میرے خدا!“ میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ ویکل سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سر قہام لیا۔ ”تم تو میرا پسندیدہ گم کسٹہ پر لگی ہو۔ تم سے دو سچی تو خود میرے لیے بہت ہی نفع بخش بات ہو سکتی ہے۔ تم کیا کوئی ماہر نفسیات قسم کی چیز ہو؟“ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

”واہ اسٹیرائیٹ انداز میں نہیں۔“ بے چارے ماہرین نفسیات کو نفسیات کا کیا پتا؟ آؤ میرے ماہرین نفسیات تو خود نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ تمہیں اگر نفسیات کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو، خصوصاً کھول کی نفسیات کے بارے میں تو مجھ جیسی کسی عورت سے معلوم کیا کرو جس نے زندگی کو اس کی تمام تر سفاکی کے ساتھ قریب سے دیکھا ہو۔“

”نہیں۔ اب اتنی کمزوری باتیں مت کرو“ میں نے جھرمجھی لے کر کہا۔ ”مجھے کمزوری باتیں کرنے والی عورتوں سے خوف آتا

”بڑی دلیر نظر آنے کی کوشش کر رہی ہو!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھ کو پہلے تو بڑی خوف زدہ ہو گئی تھیں۔“

”گولیوں کی بو چھار ایسی ہی چیز ہوتی ہے“ وہ بولی۔ ”اور پھر اتنا اچانک حملہ!“ اس نے ہنسنے لگی۔ ”مختی طمانیت“ خوشی اور سرور کے سے عالم میں میں تمہارے ساتھ چل رہی تھی۔ مرثیہ بد میں نے اپنے آپ کو اتنا خوش محسوس کیا تھا۔ اس مردود گتے کے بلے نے میری چند گولیوں کو وہ عارضی سی خوشی بھی برپا کر دی۔“

”شکر کرو کہ بات صرف خوشی پر ٹل گئی“ میں نے کہا۔ ”خوشیاں تو زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن زندگی چلی جائے تو لوٹ کر نہیں آتی۔“

”ہاں یہ تو ہے“ اس نے ہنسنے لگی۔ ”اس نے تمہارے انداز میں حلیم کیا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا میری طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے اس حملے نے اچانک تمہارے ذہن کو پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ تم ایک نکتہ ہی جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہو۔ اس سے پہلے گویا تم انداز میرے میں ٹانگ لٹوایا مار رہے تھے۔ تمہیں اچانک ہی مدد دینی نظر آ گئی ہے۔“

میں دلی دلی میں اس کے مشاہدے کی داد دے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بعض اوقات تجویز کی کوکھ سے خیر جنم لیتی ہے۔ میں بڑی الجھن میں تھا لیکن اس حملے کے بعد ذہن میں جیسے کوئی بند کھڑکی کھل گئی۔ مجھے کے کھڑے بست ہی تیزی سے جڑتے چلے گئے۔ ابھی کچھ باتوں کی تصدیق ہونا باقی ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ جس طرح میں سوچ رہا ہوں بات اسی طرح ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ حملہ ذہن میں رحمت ثابت ہوا ہے۔“

”تم کچھ الجھی الجھی سی گفتگو نہیں کر رہے؟“ وہ گردن تڑپتی کرتے ہوئے بولی۔

”یہ صرف تمہارے لیے الجھی الجھی ہے اور نہی الحال الجھی الجھی ہے۔ تھوڑی دیر بعد الجھی الجھی نہیں رہے گی“ میں نے کہا۔ اس وقت تک ہم ایک نیم تاریک اور سنسان سی گلی میں پہنچ چکے تھے۔ یہ گلی کشن کا علاقہ تھا۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی کھڑی کی۔ میری کوشش تھی کہ گاڑی کسی کی نظر میں نہ آئے میں اسے اپنی اصل شکل سے کچھ دور ہی چھوڑ رہا تھا۔ غلیم اب خوف زدہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ پُر احتیاط انداز میں قدم اٹھاتی میرے ساتھ چل رہی تھی۔

ایک ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ پیدل لے کر ملے کے بعد ہم اس خوب صورت عمارت کے سامنے جا پہنچے جس کے باپ فکر پر مرزا حکرم بیگ کا وہ اپارٹمنٹ تھا جسے وہ ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس وقت بلڈنگ کا گیٹ بند تھا لیکن اس کے عقب میں ایک کرسی پر چوکیدار موجود تھا۔ شاید بیچ صاحب کے قتل والے واقعے کے بعد اسے سبق

حاصل ہو گیا تھا اور وہ مستعدی سے اپنی ذہنی دہشے کا تقابہ اپنی قسمت اچھی تھی کہ اس کا واسطہ نہ رہیم گل جیسے پولیس آفیسر بڑا تھا اور نہ شاید وہ ابھی حالات میں ہو اور تفتیش کے نام پر کاغذ جانے کیا حشر ہو چکا ہو۔ تفتیش میں بھی خوب ہی کی ہو سے زیادہ شامت آتی ہے۔ کمرے ملازموں چوکیداروں اور اس قسم کے دوسرے معمولی کام کرنے والوں سے سب سے زیادہ ناخوش تفتیش ہوتی ہے۔

چوکیدار نے گیٹ تھوڑا سا کھول کر مجھے دیکھا اور پیچھے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ ورنہ مجھے کوئی اور طریقہ استعمال کرنا پڑا۔ اس نے مجھے درجیم گل کے ساتھ دیکھا تھا جب اسے بلوا کر اس پر چوچہ جگہ کی گئی تھی۔ شاید وہ مجھے بھی ساہو لباس والا کوئی آفیسر اسی طرح کی کوئی اور اہم سرکاری شخصیت سمجھ رہا تھا۔

اس نے جب باج میں کھلا کر بڑے ادب سے مجھے سلام میں لے اٹھا سرکاری انشورنس والے انداز میں ذرا سخت سے گردن ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور بارعجب لہجے میں پوچھا ”ماسوں کا کرا کر اکر رہے؟“

”ماسوں؟“ چوکیدار ایک لمحے کے لیے حیران پریشان ہو گیا۔ ”یہاں بلڈنگ میں ایک توڑی رہتا ہے نا۔ وہ چھوٹے مو۔ مرثیہ کے کام کرتا ہے۔ پانی کی موٹر چلاتا ہے۔ اس کا نام با معلوم نہیں۔ سب اسے ماسوں ماسوں کہتے ہیں“ میں نے وضاحت کی۔

”او اچھا۔ اچھا“ چوکیدار نے اطمینان کی سانس ”آپ ظاہر ماسوں کو پوچھتی ہے اس کا کرا بلڈنگ کے پیچھے طرف ہے۔ آپ اندر سے ساتھ آؤ“ اس نے ہمیں پیچھے لٹا اشارہ کیا۔

میں اپنی کتنی سلاستے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی۔ سرگوشی میں بولی۔ ”یہ تم کس ماسوں کے پکڑیں پڑ گئے؟“ میں نے تھی کہ تم ہمیں مرزا حکرم بیگ سے ملنے آ رہے تھے۔

”ہاں ملنا تو حکرم بیگ سے ہی ہے لیکن اس سے پہلے مجھے قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری بات یاد آگئی اور اس کے ساتھ ہی الماری سے ا از میں ایک اور بات احساس ہوا۔ میں نے سوچا ہے قسمت آزمائی کر کے دیکھ جائے“ میں نے جواب دیا۔

غلام نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں وضاحت کے سے انداز میں کہا۔ ”انسانی ذہن واقعی قدر کارخانہ عجائب ہے۔ میں کبھی کبھی اس کی طعنائی ظاہر کرتا ہوں۔ حیران ہوتا ہوں۔ بیچ صاحب کے قتل والی رات جب مجھے بلڈنگ میں مرزا حکرم بیگ کے اپارٹمنٹ میں تھا تو میری بالائی دیوار میں الجھرے ہوئے ایک چھتچے سے ٹکرائی تھی اور غلام



چو کیدار نے نکڑی کے چھوٹے سے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھنکھس رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑایا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ چو کیدار نے دو تین مرتبہ زور سے دستک دی پھر میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ہاموں جانہ خراب برا خال میں بند ہوتی ہے۔ بڑی مشکل سے اُختی ہے۔“

اس نے ایک بار پھر دستک دی اور مجھے اندر بٹھوس ہوا کہ دروازہ نیچے ہی نہ آ رہے۔ تاہم اس دستک پر چند ہی چند ہی سی آنکھوں والے ایک ادبیز عمر شخص نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی میلی اور شکن آلود سی شلوار لیس پر گریس کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ شاید وہی اس کے کام کرنے کے کپڑے تھے جنہیں وہ شب خرابی کے لباس کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ہو گیا تھا۔

میں نے چو کیدار کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ مجھے اس سے کچھ ضروری بات چیت کرنی ہے۔ تم چاہو تو اب آرام کرنے بھی جاسکتے ہو۔ اب کافی دیر تک یہاں پولیس والوں کا آنا جانا لگا رہا ہے گا۔“

وہ چہرے پر ابھرنے کے آثار لیے لیکن اثبات میں سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ اس سے زیادہ ابھرنے والا ہمارے چہرے پر نظر آ رہی تھی۔ اس کی چند ہی چند ہی آنکھیں بھٹکا بھی پھیل سکتی تھیں، پھیل چکی تھیں۔ میں اور غلام اس سے اجازت لینے بغیر اندر پہنچ گئے اور دروازہ میں نے اپنے عتب میں بند کر دیا۔

وہ ایک چھوٹا سا کراٹھ لگا لگا گراہی کیا، ایک کو فوری ہی تھی جس میں ایک چارپائی، ایک ٹرک اور دو سرائی چھوٹا سونا سامان موجود تھا جو کسی بھی مزدور ٹائپ آدمی کے ٹھکانے پر نظر آ سکتا ہے۔ ظاہر ہاموں ایک سیدھا سادہ شخص معلوم ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر عیاری مکاری کی کوئی علامت نہیں تھی۔

”سرا آپ لوگ کون ہیں؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں“ اس نے ہونٹوں پر زبان بھیر کر گویا جرات سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”جان پہچان کو چھوڑو ظاہر ہاموں“ میں نے اس کی چند ہی چند ہی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے تم سے صرف چند ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں پولیس سے واسطہ نہ پڑے اور تم کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنسو تو مجھے میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ تمہاری جان ہمیں چھوٹ جائے گی۔ ذرا سا بھی جھوٹ بولو گے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری گردن کتنی سختی سے پولیس کے شکنجے میں پھنسنے کی اور تم کہاں تک کھنکھتے پھرو گے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں صاحب“ وہ جیسی بیٹھی سی آواز میں بولا۔ کمرے میں صرف ایک ہی کڑور سا زرد بلب روشن تھا۔ اس کی ٹانگائی سی روشنی میں میں اس کی رنگت کچھ خیر نظر آنے لگی تھی۔

”میرا سوال ضرور تمہاری سمجھ میں آجائے گا“ میں نے اس

پرچٹ لگ محی تھی۔ کرم بیک نے بتایا تھا کہ وہ ایک گارج وٹ کا دانہ تھا۔ یہ بڑی جدید بلڈنگ ہے اس میں ہر پارٹمنٹ ہائوس میں سے کچھ کڑا بیٹھنے کے لیے گارج خیلوں میں بھی بنائے گئے لیکن بہت سے دوسرے ترقی پسند منصوبوں کی طرح یہ صوبہ بھی غلاب ہو گیا کیونکہ ترقی کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قوم کا منہ اس قابل بنایا جائے کہ وہ کچھ تو کھنوں کو ایسی چیزیں استعمال کرنے کا شعور نہیں کیوں کہ روپیہ جیسا تو بہت سے لوگوں کے پاس ہے لیکن تعلیم کم لوگوں کے پاس ہے۔ دوسرے ہر ذریعہ معیاری بنائی جاتی ہے اس لیے یہاں یہ سسٹم بھی بے کار پڑا ہے۔“

”ہاں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی“ غلام بولا۔ ”ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ اس لیے تمہاری سمجھ میں میں آئی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آج جب ہم پر حملہ والا دوسرے تھیں ساتھ لیتے ہوئے سرگرم کر رہا تو ایک بار پھر میری نہیں کئی پرچٹ لگی۔ یہ تجربہ شاید تمہیں بھی ہوا ہو۔ انسان کے جسم کے اس حصے پر اکثر دوبارہ چوٹ لگ جاتی ہے جو پہلے ہی کسی چوٹ سے دکھ رہا ہوتا ہے لیکن اس دوسری چوٹ نے میرے لیے کیا سوچ کی راہیں کھول دیں۔“

”ہاں۔ ہر پرچٹ انسان کے لیے سوچ کی راہیں کھولتی ہے۔“ غلام غصہ مائل لے کر بولا۔

”دوست ہے لیکن میں زیادہ گہری نہیں، ایک عام اور سلیکی بات کر رہا ہوں۔ اس چوٹ سے مجھے گارج شیٹ یاد آیا اور پھر ایک اور چیز یاد آئی جو میں نے کرم بیک کے پارٹمنٹ میں دیکھی تھی۔ میرے ذہن میں ایک شے نے سرا بھارا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کرم بیک کے سامنے جانے سے پہلے ذرا قسمت آزمائی کرنا چاہوں۔ تم قمار کھینچ رہو۔ بات دھیرے دھیرے تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔“

”اگر نہ بھی سمجھ میں آئی تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”میں ہر بات سمجھنے کے لیے زیادہ دماغ نہیں کھپاتی۔ میری دلچسپی سب سے زیادہ اس بات میں ہے کہ بدایت حالات سے باہر آجائے۔“

”بہت زیادہ امید ہے کہ آئندہ ایک دو گھنٹے میں اس کا فیصلہ ہو جائے گا“ میں نے کہا۔

میں غارت کے گرد گھوم کر عقب میں پہنچ چکے تھے۔ چو کیدار ایک چھوٹے سے دروازے پر رک چکا تھا۔ یہ میزبانی کے نیچے بنا ہوا ایک کراٹھا جو ہر سے ہی چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار پر بجلی اور گیس کے میٹروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس سے آرا آگے چڑھا ایک ڈھولان راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بیٹھا تھا غلام نے راستہ تھا جس کے اختتام پر لوہے کا گرل والا گیت دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر بڑا سا کالا جھول رہا تھا۔

بولے۔ ”جی۔ انہوں نے ایک ہزار روپے کا قلمد میں نے تو صرف پچاس روپے مانگے تھے۔ میں اتنے زیادہ پیسے لیے نہیں رہا تھا۔ انہوں نے زبردستی دیے تھے۔ مجھے اس وقت ہی شبہ ہو رہا تھا کہ کوئی گزربڑ ہے۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا پیسے لینے کو لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گزربڑ کیا تھی؟“

”تیرے بہت زیادہ ہوشیار لوگوں کے سمجھنے کی باتیں ہیں“ میں نے کہا۔ ”تمہارے سمجھنے کی نہیں ہیں۔ دیے اگر تم ایک کرا آگے بڑھ کر دیکھ لینے تو گزربڑ شاید تمہیں قایلین پر چت پڑی نظر آجائی لیکن اس نے تمہیں دوواڑے سے آگے بڑھنے نہیں دیا ہوگا اور باقی کھروں کے دوواڑے بند ہوں گے؟“

”جی ہاں“ اس نے اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی۔  
”جو ناب تم نے دوواڑے سے آگے آگے کیا وہ کرم بیک نے تمہیں دے دی تھی اور ہدایت کی تھی کہ اسے کہیں بھیج دیا“  
”خالی کرنا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ وہ انہوں نے مجھ سے واپس لے لی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ خود اسے کہیں بھیج دیں گے“ ظاہر ماموں نے جواب دیا۔

”تمہارے خیال میں اس نے وہ کہاں بھیج دی ہوگی؟“ میں نے پوچھا اس سے رائے طلب کی۔  
”میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ میں تو وہاں سے واپس آ گیا تھا“ اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

”میرا ایک اندازہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن چلو قسمت آزمائی کر کے دیکھ لیتے ہیں“ میں نے کہا۔ ”اس ملامت میں جو گانچہ۔۔۔ شیوٹس بنائے گئے تھے ان کا کوڑا جھونے کے لیے یعنی تہ خانے میں پھانسی گئی ہوگی؟“

”جی ہاں۔ لیکن وہ تو بڑنگ بننے کے کچھ عرصہ بعد سے ہی ناکارہ پڑی ہے“ ظاہر ماموں نے جلدی سے بتایا۔  
”مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو میں اس پر قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اس پر کوئی ٹالا لگا ہوا ہے؟“

”جی ہاں۔ اس کی جالی میرے پاس ہے“ اس نے جالی کے بارے میں میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیا۔ ”بڑنگ والوں کی ایسی ہی ایشن جلدی اس جگہ کو صاف کر کے اسے کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔“

”یہ بھی اچھا ہوا کہ ابھی اس پروگرام پر عمل در آمد نہیں ہوا ہے۔ آج کل کرا سے ذرا ایک نظر دیکھ لیں“ میں نے کہا۔  
میں نے محسوس کیا کہ جگت ماموں اب کچھ پرسکون ہو چکا تھا تاہم جالی تلاش کرنے سے پہلے اس نے شک زدہ سے لہجے میں یہ ضرور پوچھا۔ ”مرا میں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسوں گا؟ سراسیمہ بالکل سیدھا سادہ اور غریب سا آدمی ہوں۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا اور نہ ہی کبھی لانا نہیں چلا ہوا ہوں۔“

”کیا برسوں شام کسی وقت کے کدے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔“ کیا برسوں شام کسی وقت کے کدے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا برسوں شام کسی وقت کے کدے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔“

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔  
”اس نے تمہیں ناب تبدیل کرنے کی بات کہی کیوں کہ یہ بات کرم بیک خود سوال پر ہلاک بننے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ بات کرم بیک خود مجھے بتا چکا ہے۔ میں صرف تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کام تمہارے ہی ہاتھوں میں ہوا تھا اور کرم بیک نے مجھ سے جھوٹ نہیں دیا تھا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا۔ ”تم نے صرف اپنی طرف کی ناب تبدیل کی تھی؟“

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔  
”اس نے تمہیں ناب تبدیل کرانے کی کوئی وجہ بتائی تھی؟“

”جی ہاں۔ ان کا کہنا تھا کہ کبھی کبھی ناب گھومتی نہیں ایک آواز ہے“ اس نے جواب دیا۔  
”لیکن جس وقت تم نے چیک کیا اس وقت ناب ٹھیک تھی؟“

”جی ہاں۔ مجھے تو وہ ٹھیک ہی معلوم ہو رہی تھی لیکن کرم صاحب کا حکم تھا کہ میں اسے تبدیل کروں“ اس نے بتایا۔  
”کیا وہ یہ کام کرانے کے لیے بہت جلدی میں دکھائی دے رہے تھے؟“

”کیا ہاں۔ معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا کہ انہیں اس کام کی بہت جلدی تھی“ ظاہر ماموں اکتاتے ہوئے بولا۔ ”جلد بازی کی وجہ سے ہی تو صرف ایک ناب بدلی جاسکی اور دوواڑے کے دونوں طرف الگ الگ ڈیزائن کی ناب لگ گئی۔ وہ دونوں طرف کی ناب لگانا ہمارے تھے لیکن یہاں آس پاس ہارڈ ویئر کی کوئی دکان نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے صرف ایک ناب مل سکی۔“

”یہ شاید قدرت کی طرف سے ہوا تھا“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”قدرت کو اس طرف میری توجہ مبذول کرانا مقصود تھا۔ اگر دونوں طرف ایک جیسی ناب لگ جاتی تو شاید میری توجہ اس طرف نہ جاتی اور میں کرم سے اس سلسلے میں سوال نہ کرتا اور پھر ارادائی طور پر وہ یہ اعتراف نہ کرتا کہ اس نے ناب تبدیل کرانی کے لیے بہت قدرت کے کام ہوئے ہیں مانی ڈیزائن ماموں! میں نے اس کا کدہ کا پتہ پتہ پایا۔“ تم یہ بتاؤ کہ تم نے کس وقت یہ کام انجام دیا تھا؟“

”مجھے تو نیچے یاد نہیں۔ میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی۔ میرا شام کا کدہ میرا کدہ ہو چکا تھا“ اس نے جواب دیا۔  
”میں نے تمہیں اس کام کے لیے پیسے بھی اچھے خاصے دیے ہوں گے؟“

ظاہر ماموں کی چٹکچٹ اور بڑھ گئی۔ وہ بہت اٹک اٹک کر

لگا ہوا تھا جو کسی بہت بڑی تجوری کے دروازے سے مشابہ نظر تھا۔  
 ”کیا میں اسے واقعی کھول دوں سر؟“ طاہر عرف ماسوں  
 اجازت چاہی۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ  
 ایسے بے درد کام کی فرمائش کر سکتا ہوں۔  
 ”طاہر ہے۔ ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں“ میں نے جڑ  
 ریا۔

”سر! اس میں بڑا گند اور کاٹھ کباڑ ہے اسے کھولنے کی  
 کا بجھا آئے گا“ طاہر نے گویا مجھے ڈرایا۔  
 ”کوئی بات نہیں“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”ہم  
 ستھری زندگی گزارتے ہوئے ہمیں کبھی کبھار گندگی اور کاٹھ کا  
 بڑ بھی بھانسنے رہنا چاہیے۔“  
 بڑ میں نے ٹیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بلاڈنگ  
 ہمارے معاشرے کی طرح ہے۔ باہر سے خوب صورت اور  
 دیکھتے آرام دہ و پیراستہ اپارٹمنٹ، خانے میں بدبو دار کاٹھ کا  
 ڈمیر جسے از ٹائٹ دوازدہ بند کر کے چھپایا گیا ہے۔ بلکہ ہمارا ماحول  
 تو اوپر سے بھی اتنا خوب صورت اور پیراستہ نہیں۔  
 محض لیپا پوتی سے ہی کام چلایا جا رہا ہے اور نہ ہی بہت ہی  
 سزا دے ہے۔“

ٹیلم مسکرا دی اور طاہر شاید اس فلسفے کو بھی اپنے لیے  
 سمجھتے ہوئے دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے ایک بڑا  
 چابی تالے کے سوراخ میں ڈال کر کھمائی اور مضبوط آٹنی پٹلا  
 پکڑ کر شاید پوری طاقت سے کھینچا۔ اس بے چارے کی ہر  
 طاقت بھی بس یوں ہی تھی۔ سر حال دوازدہ کھل گیا۔ مضبوط  
 دروازے زیادہ عرصہ بند رہیں تو خاصی دشواری سے اور  
 مخصوص جڑ چڑا ہٹ کے ساتھ کھلتے ہیں۔

طاہر نے ٹھیک کہا تھا۔ دوازدہ کھلتے ہی بدبو کا ایک ڈنڈ  
 بھٹکا ہمارے نگوںوں میں آن کھسکا۔ ٹیلم تو کافی پیچھے ہٹ کر دوا  
 جا ٹھیک۔ طاہر نے پلٹ کر گویا میرے آغوش کا جائزہ لیا۔ میں  
 کی تسلی کے لیے مسکرا دیا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اس  
 کی بدبو دس سے گھبرائے والا نہیں تھا۔  
 مسئلہ یہ تھا کہ وہ بھٹی یا کباڑ خانہ کسی حیثیت کے دل کی  
 تاریک تھا۔ خانے کی روشنی اس میں دو ٹوٹ سے آگے تک  
 جاری تھی۔ میں نے طاہر سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس  
 ہوگی؟“

دو وہیں موجود ایک آٹنی الماری سے بڑی سی خارج نکال  
 میں نے اس کے ہاتھ سے خارج لے لی اور اسے روشن کر کے  
 میں داخل ہونے لگا۔

طاہر گویا ہلکا کر غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ پکڑے  
 ہوا۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر؟“ آپ اندر جائیں گے۔

”آئندہ بھی کوئی غلط کام نہ کرنا اور نہ لالچ میں مبتلا ہونا۔ بہت  
 سکھ میں رہو گے۔ اپنی عزت سے پریشان مت ہونا۔ زندگی عزت  
 کے ساتھ گزر جاتی ہے۔ جرم کے ساتھ نہیں گزرتی“ میں نے نری  
 سے کہا۔  
 ”میں نے خیال میں تمہیں نے کوئی جرم نہیں کیا سر!“ وہ گویا  
 زمین پر زور دیتے ہوئے ہوا۔

”تمہارے اس خیال سے میں بھی متفق ہوں“ میں نے کہا۔  
 ”تم مجھ سے تعاون کر رہے ہو اور مجھے امید ہے کہ تم نے مجھ سے  
 کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تم کسی  
 پریشانی میں نہ پھنسے پاؤ۔“

”لیکن سر! مجھے کرم یک صاحب سے نہ جانے کیوں بہت  
 خوف آتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات ہو جس سے وہ مجھ  
 سے ناراض ہو جائیں“ اس کے لہجے میں واقعی خوف تھا۔  
 ”مطمئن رہو۔ بات ان تک نہیں پہنچے گی۔ اس لیے تو میں  
 پہلے تمہارے پاس آیا ہوں۔ میں نے تمہیں کرم یک کے سامنے  
 نہیں بلوایا۔ آئندہ شاید کبھی کرم یک سے سامنا نہ ہو“ میں نے  
 تسلی دی۔

اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے اپنی چارپائی کے نیچے سے لوہے  
 کا ایک ٹریک نکال کر اس میں سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور  
 ہمیں ساتھ آئے گا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے نکلا۔

خانے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بولا۔ ”میں نے سنا ہے کرم  
 یک صاحب کے اپارٹمنٹ میں کسی جج صاحب کا قتل ہو گیا ہے؟“  
 ”تم نے ٹھیک سنا ہے“ میں نے اختصار سے جواب دیا۔  
 ”پھر تو معاملہ بہت سنگین ہو گا؟“ وہ آنکھیں کچھ پھیلاتے  
 ہوئے بولا۔

”ہر انسان کے قتل کا معاملہ بہت سنگین ہوتا ہے لیکن ہم نے  
 اپنی آنکھوں پر طرح طرح کی ٹینکین چڑھالی ہیں۔ کوئی قتل ہمیں  
 سنگین نظر آتا ہے۔ کوئی ذرا بھی اہم نہیں لگتا اور کسی پر ہم خوش  
 ہوتے ہیں“ میں نے ملاشتہ سے جواب دیا۔

میرا فلسفہ شاید اس لیے کا تھا تھا۔ معلوم نہیں اس کے حلق  
 سے اترا یا نہیں ہر حال وہ خاموش رہا۔ اس نے خانے کا تالا  
 کھولا اور میں اندر پہنچ کر ٹیلم ہمارے ساتھ تھی۔ اس کے چہرے پر  
 الجھن ضرور تھی لیکن بڑی نہیں تھی۔

خانہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ پارکنگ کے لیے بھی استعمال  
 ہو سکے لیکن یہاں غالباً صرف دو دو چار گاڑیاں پارک کی جاسکتی تھیں  
 جنہیں زیادہ دونوں کے لیے کمزوری کرنا مقصود تھا۔ ان میں سے کسی پر  
 کپڑا چڑھا ہوا تھا اور کسی پر گرد کی دھبی ہوئی تھی۔ آخر ہم ایک  
 طرف بنے ہوئے ایک بڑے سے کمرہ نما حصے تک پہنچے جو چاروں  
 طرف سے کھلی طور پر بند تھا البتہ اس میں سے کچھ موٹے موٹے  
 پائپ نکال کر اوپر دھر جا رہے تھے اس میں لوہے کا چکر دوازدہ

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ میں نے برا منانے کی اور اکاری کی۔  
”کاش تم اس وقت آجینے میں اپنے آپ کو دیکھ سکتے“ وہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ ”یہ معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئلے کی کان میں کئی دن رہ کر آئے ہو۔“

”ہاں“ میں نے کمری سانس لے کر کہا۔ ”یہ معاملہ کسی حد تک کوئلے کی دلائی جیسا ہی تھا اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ کوئلے کی دلائی میں صرف ہاتھ ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی منہ بھی کالا ہو جاتا ہے۔“

پھر میں نے باب طاہر کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”یہی باب تبدیل کی تھی نا تم نے؟“  
اس نے ہنسی بھری آنکھوں سے ایک بار پھر باب کو دکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جی ہاں آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ یہاں پائی جائے گی؟“

”ہاں۔۔۔ آتے ہیں فیب سے یہ مضامین خیال میں“ میں نے واضح اسے واپس دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس کوئی شاہنگ بیک ہوگا؟“

اس نے الماری سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مجھے ایک مڑا مڑا اور سیلا شاہنگ بیک بھی لا دیا۔ میں نے ناب و ستائے کی گھڑی اور وہاں اس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ابراہیم بہت سی کام کے قوی ہو۔ اب تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں ماموں کتنے لگوں۔“

میں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے گوت پر ہی کسی حد تک صاف کر کے جیب میں سے پرس نکالا اور بزار کا ایک نوٹ نکال کر طاہر کی طرف پڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بغیر کسی جیل جت کے مجھ سے تعاون کیا۔ یہ تمہارا انعام ہے لیکن یہ حکم بیک کے انعام کی طرح ایک غلط کام میں تعاون کرنے کا صلہ نہیں ہے بلکہ یہ قانون سے تعاون کرنے کا انعام ہے۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے سر! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا“ وہ اپنے ہاتھ جیسے ہٹاتے ہوئے بولا۔

میں نے غلم کی طرف دیکھ کر کمری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سادہ دلی لوگوں کی کیا بات مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ وہ کسی کی کوئی اہم خدمت انجام دے کر بھی یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا جب کہ مجھے اور کم ظرف لوگ کچھ نہ کر کے بھی ڈھونڈ رہا پینٹے مچھاتے ہیں کہ انہوں نے فلاں کے لیے نہ جانے کون کون سے ہمارے توڑ دیے۔“

پھر میں نے نوٹ طاہر کی جیب میں ڈال دیا اور کہا۔ ”اس ساری کارروائی کا کسی سے ذکر نہ کرنا اور بالکل لاپٹم بنے رہنا۔ یہ میں اپنے بھلے کے لیے نہیں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اب تم جا کر آرام سے سو جاؤ اور دینا سے بالکل بے تعلق ہو جاؤ۔ کم از کم صبح تک کے لیے۔“

میرا مطلب ہے آپ خود؟“ اس کی چند سی چند سی آنکھیں بھی جھپکیں جھپکیں تھیں۔  
”ہاں۔ اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے سر!“  
”کوئی بات نہیں۔ یہ تو کچھ دیر پہلے بھی خامے خراب ہو چکے ہیں۔ میں اس سوٹ کو ڈرائی کلین کروانا یا اسے پیکیج کر دے سرا غریباں اور نہ کر سکتا ہوں۔ کپڑوں کے خیال سے میں اپنے ضروری کام کو تیزی میں کر سکتا“ میں نے کہا۔

”پھر بھی سرا! اندر بہت بدبو کا کٹھ کپاڑا اور کالا کپ ہے سرا! آپ کس طرح برواشت کریں گے؟“ وہ بے جاہ مجھ سے ہمدردی کر رہا تھا۔

”تم خود ہی دیکھنا میں کس طرح برواشت کروں گا“ میں نے جواب دیا۔

”آپ مجھے حکم کریں سرا! آپ کیا غلاش کرنا چاہتے ہیں؟ مجھے سمجھا دیں میں اندر چلا جا آؤں“ اس نے پیشکش کی۔

”تم شاید وہ چیز غلاش نہ کر سکو جس کی مجھے غلاش ہے۔ یہ کام مجھے ہی کر لینے دو۔ مجھے اطمینان ہو جائے گا“ میں نے کہا اور اسے مزید کہہ کئے کا موقع دے بغیر اندر ٹھس گیا۔

وہ ایک چھوٹا سا جاننا حیرت تھا مگر گدا اور بدبودار تھا۔ ابتدا میں وہاں کو ڈاکہ بڑا جلا بھی گیا ہو گا مگر اس کی بھی صفائی نہیں کی تھی۔ ”تیسرا رکھ“ اودھ جلی چیزیں اور دو اردوں وغیرہ پر کالا کٹی۔ بغیر پٹے کوڑے کرکٹ کی قمیص بھی کافی اچھی تھیں۔

مجھے اپنی متوقع چیزیں واقعی وہاں مل گئیں اور اس میں نہ تو زیادہ دیر لگی اور نہ ہی زیادہ وقت پیش آنی چھین میرا دل بہت سی بلی طرح خراب ہو گیا۔ میں اپنی شکل تو خود نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ بھی داغ دار ہو چکی تھی۔ مجھے اس کی ذمہ داری پورا نہیں تھی۔ اپنا اندازہ درست ثابت ہونے اور اپنی توقع پوری ہونے کی مجھے اتنی خوشی تھی کہ پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے یا یوں کہنے کے پاؤں کھڑے پر نہیں پڑ رہے تھے۔

میں جب بھٹی سے برآمد ہوا تو میرے ہاتھوں میں دو دانے کی ایک ٹب نہایت شاندار اور تھیں قسم کے دستاویز کی ایک جوتی ایک ہسٹل اور ایک اعلا قسم کا روٹال تھا۔ گوکہ ساتویں منزل سے لڑکھ کر اس کی کچرا خانے میں پہنچے پہنچے ان چیزوں کی حالت کچھ خراب ہو چکی تھی۔ پھر بھی ان کے معیار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

غلم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پہلے ان چیزوں کو اور پھر مجھے دیکھا۔ طاہر بھی پہلے سے زیادہ حیران پریشان تھا۔ غلم منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔ وہ شاید اب اپنی پریشانی وغیرہ بھول چکی تھی۔

"بہت بھروسہ" وہ سعادت مندی سے بولا۔

مجھے گھورا۔

"خود ہی نہیں کہ تم ہر چیز دیکھ سکو" میں نے جواب دیا۔  
وہ ایک لٹری سائنس کے سرکوشی میں قیامات جاری کر رہا  
ہوئے بولی۔ "میں تو تمہیں محض ایک بڑا بزنس مین سمجھتی تھی۔  
کالی پراسرار قسم کی چیز ہو۔"

میں نے ہوش پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ  
اور کال بیل کا ٹیپ دیا۔ اندر بدم اور حرم ہی آواز اچھی  
پہلے بیسای سنا تھا کیا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ اندر موجود افراد  
دروازہ کھولنے میں کچھ تامل تھا اور شاید کوئی صلاح مشورہ جاری  
تھا۔ میں نے دوبارہ بیل دی۔ بلکہ آئی سے بیٹھا بیٹھ دیکھا جا  
تھا۔ اسی لیے دروازہ کھلنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔

میں تیسری بار بیل دینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دروازہ کھل گیا  
دروازہ کھولنے والا خود کرم یک ہی تھا۔ باہر سے اپارٹمنٹ والا  
اس طرح تاریک اور گہرے سکوت معلوم ہوا تھا جیسے اندر کوئی  
نہ ہو اور اگر ہو بھی تو وہ قیام و غیرہ بجا کر کسی بند سوا ہو اور کچھ  
دروازہ کھلنے ہی تیز روشنی میں نہائی ہوئی چھٹی سی ایک دنیا سامنے  
آجاتی تھی۔

بازار حرم کی طرح اس دنیا میں بھی شاید راتیں جاگتی تھیں  
اور دن سوتے تھے۔ کرم یک اسی طرح خوش لباس اور آؤدم  
آہا تھا جیسے ابھی ابھی اس کے آفس کے اوقات شروع ہوئے  
ہوں اور اس نے آکر اپنی کرسی سنبھالی ہو۔ اس کے بال سیٹے  
سورے ہوئے تھے۔ نہیں سوٹ مک رہا تھا۔ اور جوتے ہلکا  
رہے تھے۔ بیرونی کمرے میں صرف اس کے دو گن میں نظر آ رہے  
تھے۔ دو دونوں بھی آؤدم اور چاقو دھند معلوم ہوتے تھے کہ  
ان کے چہرے پھرائے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ کندھوں پر  
ہوئی گنوں پر تھے۔

"اے افضل صاحب! یہ آپ نے کیا طبع بنا رکھا ہے؟"  
کرم یک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اور اس وقت ان  
ٹپے میں آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"  
میں نے یہ انتظار نہیں کیا کہ وہ مجھے اندر آنے کی دعوت دے  
بلکہ میں خود ہی اسے ایک طرف ہٹانے ہوئے اندر جا پہنچا۔ میں نے  
محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ کر درحقیقت اتنا حیرت زدہ نہیں تھا  
پریشان ہو گیا تھا لیکن اس جیسے مضبوط اعصاب کے آدمی کے چہرے  
سے اس کی پریشانی کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔

میں نے اپنا کالک میں تھرا ہوا کوٹ ایک انگلی سے جھانپ  
ہوئے اور غیر محسوس طور پر اوپر اوپر جا بازو لیے ہوئے کالک  
"قدرت کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں کرم یک! حالات کی  
مناسبت سے تو اس وقت مجھے عالم بالا پر ہونا چاہیے تھا لیکن  
یہاں پایا جا رہا ہوں۔ کسی ان دیکھی قوت نے مجھے یہاں بھیج دیا۔"  
"بہت خوب، بہت خوب" وہ عجیب سے انداز میں ہنس رہا تھا۔

میں نے شائیکہ ایک ہاتھ میں لگایا اور چل کر ساتھ آنے کا  
اشارہ کرتے ہوئے نہ خانے کے دروازے کی بل دیا۔ ٹیلم  
میرے شانہ پہلے ہوئے تاک سیکڑ کر بولی۔ "تم میں سے کو  
آ رہی ہے۔"

"وقت وقت کی بات ہے" میں نے لٹری سائنس نے کر کہا۔  
"کبھی کبھی خوشیوار دوست بھی بددودار ہو جاتے ہیں۔ جب ہم  
ہوئی سے چلے تھے تو غسل کر کے تڑاؤ ہو کر کٹھن وغیرہ لگا کر  
کبھی شان سے نکلے تھے۔ یہاں کچھ تک تھرا خوب صورت اور  
صاف تھرا لباس کئی جگہ سے ملا ہو گیا اور میں تو باقاعدہ میڈیکل  
کارپوریشن کا کنڈی میں نظر آنے لگا۔ شاید فلک بگ رفتار کو ہماری  
مقامی سٹور کی پسند نہیں آئی۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ ممبر کو  
برداشت کرو۔"

میں نے دیکھا "اب چوکیدار گیت رہیں تھا۔ اس کا مطلب  
تھا کہ مجھے جن لوگوں کا انتظار تھا وہ پہنچ چکے تھے۔ گو کہ وہ کہیں نظر  
نہیں آ رہے تھے لیکن مجھے اطمینان ہو گیا۔ ہم لٹ تک جا بیٹھے۔  
ٹیلیم بولی "اس ٹپے میں مرزا کرم یک کے سامنے جاؤ گے؟"

"جب میں اس ٹپے میں تم جیسی خوب صورت خاتون کے  
ساتھ چل سکتا ہوں تو کرم یک کے سامنے جانے میں مجھے کون سی  
قیامت محسوس ہو سکتی ہے؟ وہ تو ایک لومڑی صفت مرد ہے اور وہ  
بھی بارٹش" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہم لٹ کے دریچے ٹاپ گھر پر پہنچے تو وہاں غضب کا سناٹا تھا۔  
ٹیلیم میرا بازو تھامتے ہوئے سرکوشی میں بولی۔ "مجھے تو خوف محسوس  
ہو رہا ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا تھا، تمہیں راستہ ہی میں ہولن میں چھوڑ  
دیا ہوں مگر تم نہیں مانیں۔ اب بھگتو" میں نے اوپر اوپر دیکھتے  
ہوئے نیچی آواز میں جواب دیا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے  
تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "بہر حال" اسی طرح کچھ عرصہ  
میرے ساتھ دوستی رہے گی تو خوف تمہارے دل سے نکل جائے  
گا۔"

"اور اگر خوف دل سے نہ نکل سکا تو کم از کم مدد تو جسم سے  
نکل ہی جائے گی" وہ گویا چل کر بولی۔

میں نے بے آواز طریقے سے ہنسنے ہوئے کرم یک کے  
اپارٹمنٹ کی طرف قدم بڑھایا تو وہ بولی۔ "کرم یک یہاں موجود  
ہو گیا نہیں؟ لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے اس اپارٹمنٹ میں کوئی  
موجود نہیں۔"

"یہاں تو بیشی ہی ایسا لگتا ہے" میں نے جواب دیا۔ "لیکن  
مجھے شکل مل چکا ہے کہ وہ موجود ہے۔"  
"میں نے تو دیکھا نہیں، تمہیں کب شکل مل گیا؟" اس نے

ایک گھر میں نے آگے بڑھ کر دواؤں بند کر دیے۔ اُس نے مجھے روکے کا اشارہ کیا۔  
میں اس کمرے میں جا چنپا جسے وہ اپنے آفس کے طور پر  
تھال کر رکھا تھا۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں  
نے کہا: "میں ہی نہیں تو بہتر ہے۔ تمہارا قیمتی صوفہ خراب  
ہو جائے گا۔"

جائے گا۔  
 "صوفی آپ سے زیادہ جتنی نہیں ہے، بفضل صاحب! ایسے  
 ارادوں سے آپ پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے  
 بلا۔ اس کی مسکراہٹ میں اب قطع نمایاں ہونے لگا تھا۔  
 "تم نے یہ کہہ کر میرا دل بڑھا دیا کرم بیک! یہی فطرت میں  
 پری رہی بڑھادی ورنہ میں خود کو کسی قربانی کا بکرا محسوس کر رہا  
 تھا۔" میں نے دھم سے صوفی پر زہر ہوتے ہوئے کہا اور غلام کو  
 میرا بچہ قریب پیٹنے کا اشارہ کیا۔  
 کرم بیک میز کے سارے تختے ہوئے غلام کی طرف بھڑو دیکھ  
 کر بلا۔ "یہ خاتون غالباً غلام ہیں؟"

دور از اجال عارفانہ کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ  
 عالم کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ظلم نے بھی اس بات کو محسوس کر  
 لیا۔ مجھے لہجے میں بولی۔ "لما تفسد تو آپ سے کسی ہو چکی ہیں لیکن  
 یہ بھی غیبت ہے کہ آپ کو شک بھریہ انداز میں ہی سیرا نام یاد  
 ہے۔ آپ جیسے بڑے لوگ کسی کو اس حد تک بھی یاد رکھ لیں تو بڑی  
 بات ہے۔"

”جیسی یہ رکھی کھنکھ نہیں ہونی چاہیے“ وہ مصنوعی ہنسی کے ساتھ انگریزی میں بولا۔ ”مجھے یاد آگیا ہے میری بدابت سے چند ایک ملاقاتی کے دوران میں آپ اس کے ساتھ موجود تھیں۔ معذرت خواہ ہوں کہ مجھے ذرا صحیح طور پر یاد نہیں رہا تھا۔“

گوں کہہ سکتا تھا کہ اتنا مذہب و شائستگی نظر آنے والا اور اتنی ملائمت سے کھنکھ کرنے والا انسان انگریز سے کیا تھا۔

وادی طرف متوجہ ہوئے ہوئے بولا۔ "میرا حال" خاتون سے  
 میں بدتمیز بات کر دیا گا۔ پہلے آپ سے بات ہو جائے۔ آپ بڑی  
 بڑا اسرار مبی کشمکش کر رہے ہیں۔ یہ عالم اگر پائے جانے کی باتیں یہ  
 عجیب و غریب طبع۔ آخر یہ کیا پکڑ ہے؟ پکڑ تاجیے تو سہی افضل  
 صاحبہ۔

”کافی عرصہ کاٹنے کے باوجود میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عرصہ کا آسمان نہیں ہے۔“ میں نے اپنے سر ہاپکا مائزہ پر لیتے ہوئے کہا۔  
”عصر کا آسمان واقعی بہت مشکل کام ہے افضل صاحب! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ جائزہ جائزہ، مائزہ ذرائع ہے عرصہ کا آسمان بھی کوئی آسمان کام نہیں ہے جیسا کہ لوگ عموماً سمجھتے ہیں۔“ اس نے سر ہاپکا۔

کہا۔ ”الہ یہ بات تم سے بہتر کون جان سکتا ہے“ میں نے فوراً

اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے سلسلہ احکام جوڑا۔ ”اب مجھے یہ ملے لو۔ میں نے تم سے میں لاکھ روپے فیس تو لے لی لیکن اب اسے حلال کرنا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں دیکھو میرا کیا ہے کیا حال ہو گیا ہے!“ میں نے اپنے سرپاکی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بتائے کیا تو آسان ہوتا ہے لیکن اس کا حق ادا کرنا کافی مشکل ہوتا ہے“

”میرا خیال تھا کہ آپ حق ادا کر چکے تھے، افسوس صاحب! اس کی کٹاؤں، چیشاں پر گھنٹیں ابھر آئیں۔“ معاملہ ختم ہو چکا تھا۔  
جیل پولیس کی تحویل میں جا چکا تھا۔“

”میں بھی یہی سمجھا تھا کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور قاتل پولیس کے ہاتھوں میں پکچر چکا ہے لیکن قدرت کو ہماری غلطی کی اصلاح منظور تھی۔ قدرت کے کام واقعی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ میں اکثر ان باتوں پر حیران ہوا ہوں اور اکثر ان کا تذکرہ کرتا ہوں۔ اب یہی دیکھ لو کہ قاتل نہایت ہوشیاری سے کسی اور کو جال میں پھنسا کر محفوظ ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ عقل کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی طرح آرام سے بیٹھا رہتا۔ اس میں اس کا فائدہ تھا لیکن اسے نہ جانے کیا سوچیں کہ اس نے مجھے بھی راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا پرگانہ مجھے قتل کرنے کے لیے بھیج دیا۔“

”اور! کرم بیک کے ہونٹ سکر گئے ”تو آپ کا یہ علیہ اس  
چکر میں ہوا ہے؟“

”نہیں۔ اس پکڑ میں تو ملیہ اتنا خراب نہیں ہوا تھا۔ یہ بات کی کہ جگہ پہنچنے کے پکڑ میں زیادہ خراب ہوا ہے“ میں نے اس کے چہرے سے فکرمناغہ بغیر جواب دیا۔

ابن مسعودؓ سے کہنا شروع کیا کہ میں نے آپؐ کی ایک بات سنی ہے جس سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اب اپنی معذرت منکر اہٹ بھی ہو توں پر سچائے رکھنا بھول گیا تھا۔

”ہاں۔ لیکن یہ صرف اس لیے ممکن ہوا کہ میں حلقے میں بیٹھی  
ورنہ بات کی نہ تک پہنچنے کے بجائے میں قبر کی نہ تک پہنچ سکے۔ مجھے  
بات یہ ہوئی کہ میں نہ صرف حلقے میں بیٹھی گیا تھا کہ میں نے حملہ آور  
ایک جہولے کی صورت میں دیکھ بھی لیا۔“ میں نے بڑے مسرور  
انداز میں اسے بتایا۔

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے“ اس کا لہجہ اس کے الفاظ  
ساتھ نہیں ملے رہا تھا۔ ”لیکن کیا صرف یہ یاد دیکھ کر آپ کسی  
پرچہ مجھے؟“

”اس شخص کی جسمانی سائنس اتنی غیر معمولی اور منفرد ہے  
میں تو کیا کوئی بھی شخص جس نے اسے ایک مرتبہ بھی دیکھا ہو  
دوبارہ شخص اس کا ہیولا دیکھ کر بھی اسے پہچان ہی لیتا“ پھر میں  
ایک نظر غنیم کی طرف دیکھا۔ ”مگر وہ ہر کام اپنے مقصد  
کا سیاق ہو جاتا تو یہ بے چاری خاتون فراہ خواہ ہی میرے سامنے  
ہماری جاتی جس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہم دونوں

لاشیں اٹھنی سڑک پر تھیں تو نہ جانے کیا کیا افسانے بننے لگے۔  
افواہوں کی اتنی دھول اڑی کہ اصل بات اس میں کس جھپ کر رہ جاتی۔

کرم بیک کے دونوں گن مین اس دوران میں کمرے کے دروازے پر آن کھڑے ہوئے تھے اور بڑی بدتمیزی سے اندر جھانک رہے تھے۔ گن مین عثمان مالک کے حکم کے بغیر اس قسم کی حرکت نہیں کرتے اور ان کے یہ انداز و اطوار نہیں ہوتے لیکن ظاہر تھا کہ کرم بیک کے گن مین کوئی عام گن مین یا درانی باڈی گارڈ نہیں تھے۔ وہ یقیناً پیشہ ور قاتل اور ماہر گن مین کا نظریا کماٹرو قسم کی چیز تھے۔

دروازہ انہوں نے روک رکھا تھا اور ہمارے سامنے کرم بیک بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کے بھی دونوں بازوؤں تلے گھیس موجود ہوتی تھیں۔ دوسرے کمروں کے دروازے بند تھے لیکن میرا خیال یہی تھا کہ ان میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس وقت اس کمرے میں ہماری حیثیت چرچہ دان میں پہنچے ہوئے چہلوں کی سی تھی۔ وہ نام نہاد گن مین یقیناً اسی احساس سے کافی مطمئن تھے۔ انہیں یقیناً صورت حال کا سارا پس منظر معلوم تھا اور وہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ شکار خود جال میں آئے پھنسا تھا لیکن کرم بیک اتنا بے خوف نہیں تھا۔

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر تشویش میں مبتلا تھا لیکن شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے پُر اعتماد انداز میں کوئی فرق آئے۔ اسے یقیناً اندازہ تھا کہ اگر میں صورت حال کو کچھ چکا خاتو پھر میں اتنا احمق نہیں ہو سکتا تھا کہ منہ اٹھا کر اس کی پکھار میں چلا آتا اور ایک خاتون کو بھی ساتھ لے آتا جو خفا آنے سے بھی زیادہ بری بات تھی۔ لڑائی جھگڑوں اور غارتگی کے دوران میں کسی ایسی خاتون کی موجودگی انجمنیں ہی پیدا کرتی ہے جو اس لڑائی میں حصہ لینے کی اہل نہ ہو۔

کرم بیک یقیناً اس انجمن میں تھا کہ باہر سے کون اگر دخلت کر سکتا تھا؟ پولیس کسی خفیہ ادارے کے لوگ یا پھر میرے آوی؟ یا پھر تینوں ہی بیک وقت اپارٹمنٹ کو گھیرے میں لے چکے تھے؟ وہ مجھ سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی یقیناً اس موقع صورت حال سے غٹنے کے لیے کوئی حکمت عملی بھی سوچ رہا تھا۔

میں نے اب گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے سیدھی طرح پوچھا۔ "کرم بیک! کیا آج کل تمہارے پاس توپیں کی کئی ہے؟"

"آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" اس کا لہجہ اب بھی موڈ باز اور شائستہ ہی تھا۔

"تم شرافت علی کو پہلے مجھے بلانے کے لیے بھیج چکے تھے۔ جیسے معلوم تھا کہ میں اسے اچھی طرح پہچانے لگا ہوں۔ اس کے باوجود آج تم نے اسی کو میرا کام تمام کرنے کے لیے بھیج دیا۔"

لیکن شاید اس میں تمہارا قصور نہیں۔ ایک تو وہ ان کا بہت ماہر ہو گا۔ دوسرے جیسے توقع نہیں ہوگی کہ میں بے تکلفے زندہ رہوں گا کہ مجھ پر حملہ کس نے کیا تھا۔ یہی بات تھی اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کے آواز میں تبدیلی آئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس یقیناً آج کل توپیں کی کئی ہے ورنہ اس قسم کے کام کے لیے تو تمہارے پاس ٹولیاں کی ٹولیاں موجود رہتی ہوں گی۔ کل یقیناً تم پر سخت وقت آیا ہوا ہے اور تم بہت محتاط رہ کر رہے ہو۔ تم نے اپنے بیشتر توپوں کو اوپر اوڑھ کر لیا ہوا ہے۔ میں چاہے کہ تمہارا کوئی کوئی کہیں کسی جگہ میں خرابی کے بہتے چڑھے اور تمہاری انجمنوں میں اضافہ ہو۔ اسے صرف چند محب توپوں سے کام چلا رہے ہو اور آج کل وہی تمہارے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔"

"میں کبھی بھی اپنے ساتھ بھڑبھار کرنے والا کوئی چیز افضل صاحب! وہ بڑے سکون کیسے میں بولا۔ "میں صرف تمہارے وقت ہی توپوں کا انتظام کرتا ہوں لیکن آپ کی باتیں کچھ میں نہیں آتیں۔ آپ کس شے کی بات کر رہے ہیں؟ آپ پر حملہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں تو یہی کچھ میں نہیں آتا۔ میں نے تو جیسے جیسا کے قتل کے الزام سے بچانے اور ایک بڑے گناہ کو اس جگہ میں بھجوانے میں تمہاری مدد کی تھی۔ اس کے باوجود تم نے بے صاف کرانے کی کوشش کی۔"

وہ اس بزرگ کی طرح شگفتانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ بچے کی بے سرو پا باتوں سے محظوظ ہو رہا ہو۔ میں نے بات بڑھائی۔ "کیا تم سے اس میں لاکھ روپے کی رقم کا وصول ہوا؟ نہیں ہوا تھا جو تم نے فیس کے طور پر مجھے ادا کی تھی؟ یا پھر اندیشہ تھا کہ میں جلد یا بدیر بات کی یہ تک پہنچ جاؤں گا اور تمہارے لیے مشکلات پیدا کروں گا؟"

"آپ کی باتیں واقعی بہت عجیب ہیں افضل صاحب! ایک غلطی سانس لے کر میرے چہرہ پر کراٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ فیس کی علامات بھی موجود نہیں ہیں ورنہ میں یہی سمجھتا کہ آپ کے عالم میں یہی سبکی باتیں کر رہے ہیں۔"

"وہ بڑا خطرناک وقت ہوتا ہے جب کسی کی ہوش منہ باتیں کسی کو بھی سبکی باتیں محسوس ہونے لگیں۔" میں نے نشانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بہر حال مختصر بات صرف اتنی کہ تم نے مجھے اسی کام کے لیے فیس ادا کی تھی کہ میں جیسا کہ کے اصل قاتل کا پتا چلاؤں اور میں نے تو یہی سی غلطی کرنے بعد آخر کار صحیح نتیجہ اخذ کر لیا ہے اور قاتل کو تلاش کر لیا ہے۔ یعنی میں نے فیس حلال کر لی ہے لیکن تمہارے لیے ظاہر ہے کیا انکشاف نہیں ہو گا۔"

ہیں وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”اس لیے کہ قاضی تم خود ہی ہو“ میں نے جواب دیا۔

”جیت خب“ اس کی مسکراہٹ میں تازہ آیا۔ ”۳۳ ورہیں آتا

بار قبل قاضی تھا کہ قتل کرنے کے بعد کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈنا

بہاؤ تھا جو میں لاکھ روپے لے کر مجھے قاضی ثابت کر سکے۔ وہی

ن لاکھ میں پولیس کو دے کر تحقیق کا رخ موڑ سکتا تھا اور اپنے

بڑا بھائی بدست کر سکتا تھا۔“

”تمیں کر سکتے تھے“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”ایک تو تمہیں

علوم تھا کہ تمہارے علاقے کا پولیس آفیسر رشوت خور نہیں تھا۔

اجت اصول پرست تھا۔ اور تم رشوت دینے کی کوشش کرتے

اور اگر تم شکوک ہو جاتے سب سے پہلے تم ہی گرفت میں

لے دیے جیتے یہ جس جج کے قتل کا معاملہ تھا اسے آسانی سے

فرار ہوا وہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی کرہ پولیس آفیسر بھی شاید

نہاری زیادہ مدد نہ کر پاتا۔ اسی لیے تم نے اپنے علاقے کے پولیس

آفیسر کے چکروں میں پڑنے کے بجائے اس کے قریبی دوست کو گھیرا

یہی کام وہیل میاں میں درحقیقت بڑا احرام کرتا ہے۔“

”آپ کا الزام ہے سہو ہے افضل صاحب! میں اس الزام

زادگی کے خلاف کسی قسم کی ضروری کارروائی کا حق محفوظ رکھتا

ہوں“ اس کے لیے میں بھی یہی غراہٹ اٹھی۔ اس کے اندر اصل

کرم یک پیدا ہو رہا تھا جسے اس نے اب تک پٹی عمر کی سے

سکایا ہوا تھا۔

”یقیناً۔۔۔ یقیناً“ میں نے سر ہلایا۔ ”ہر مجرم اپنے دفاع کے

حق کے بارے میں بے گناہوں سے بھی زیادہ غور کرتا ہے اور ان

تم بے وقت ہرگز نہیں تھے کرم یک! تم تو مت ہی زیادہ چلا لاک

تھے اتنی چلا لاک سے ایسے کسی قتل کا منصوبہ بنانے کے بارے میں

ہمارے ملک میں تو شاید ہی کوئی سوچ سکتا ہو۔ تم یقیناً جیشیں

اسے جیشیں۔“

”مگر آپ کا خیال ہے کہ میں اس قسم کی تعریف پر خوش

ہو جاؤں گا تو میں آپ کو بتا دوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے“ وہ خشک لہجے

میں بولا۔

”میں اس وقت کوئی بھی بات تمہیں خوش کرنے کے لیے

نہیں کر رہا ہوں“ میں نے اس کی خوش حمی دور کی۔ ”میں خود بھی

اس وقت خوش نہیں ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کیسے

کیسے ذہین لوگ اپنی ذہانت کا استعمال کیسے کیسے حقی کاموں میں

کرتے ہیں۔ تم نے دہرا نقیائی داؤ کھیلنا۔ تم نے خود اپنے آپ کو

شکوک بنایا جس سے واقعی دہرا یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ تم اتنے

اجتن تو نہیں ہو سکتے کہ اس طرح اپنے جتنے کا بددست کرو۔ تم

نے درحقیقت جسے چاہنے کا بددست کیا تھا“ خود ہی نہایت

مصعوبیت سے اس کی بے گناہی کی گواہی بھی دینے کی کوشش

کرتے رہے۔ میں واقعی تمہاری ذہانت کی داد دے رہا تھا۔

سکتا۔ مگر کہ اس قسم کی ذہانت کو میرے خیال میں ذہانت نہیں

ذہانت کہتا جاوے۔“

اس کے ظاہری سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ تاہم میں دیکھ رہا

تھا کہ اس کی کشادہ چشماں پر پسینے کی نہایت ٹھنی ٹھنی سی بوئیں

نمودار ہو چکی تھیں جو کمرے کی تیز روشنی میں نئے نئے موتیوں کی

طرح چمک رہی تھیں۔

”میں آپ کی باتوں کو پاگل پن کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا

افضل صاحب!“ اس نے شاید اپنے اوصالی تازہ کو کم کرنے کے

لیے کمرے میں خلنا شروع کر دیا۔ اس کے دونوں ہاڈی کا رڈنگٹوں

کے دستوں پر ہاتھ رکھے شاید اس کے حکم کے خشک تھے۔ میری غیر

محسوس طور پر ہر طرف نظر پھیلائی اور میں پوری طرح مستعد تھا۔ کچھ

بعد میں تھا کہ کرم یک ہلٹے ہلٹے اچانک مڑا تو اس کے ہاتھ میں

کچھ ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید وہ آخری لمبے نمک شرارت کا

ڈراما جاری رکھنا چاہتا تھا۔

”کچھ لمبے الفاظ اب تمہاری کیا دکر سکتے ہیں کرم یک؟“

میں نے ملاحت سے کہا۔

”الفاظ تو آپ کے بھی ایسے ہی ہیں جو آپ کی کوئی مدد نہیں

کر سکتے“ وہ میری طرف گھومتے ہوئے بولا۔ ”لیکن چوں کہ میں کسی

کاہلے کا حق طلب نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے آپ کو بھی آزادی

ہے جو چاہیں پولیس۔“

”۳۳ جازت کا شکر یہ جہاں پناد!“ میں نے آستہرانیہ لہجے میں

کہا۔

وہ ایک تک مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہم اس معاملے کو شروع سے لیتے ہیں۔ تمہیں عدالتی کارروائیوں

یا جج صاحب کے مدد پر پھر ان کی کمی بات سے یقین ہو گیا تھا کہ

وہ تمہیں بہت سخت سزا سناتے والے ہیں۔ ملک سے تمہارے فرار

کے راستے بھی مسدود کر دیے گئے تھے۔ میں نے گزشتہ دوڑ

معلومات کی ہیں۔ تمہارے اصل پاسپورٹ کے ساتھ تمہارا۔ ایک

جعلی پاسپورٹ بھی عدالت کے قبضے میں ہے اور تمہارا نام ایگزٹ

کنٹرول لسٹ میں بھی شامل ہے ورنہ شاید تم ان دونوں میاں نظری

نہ آ رہے ہو۔ ان دونوں تم یقیناً اپنے آپ کو چھپا دینا میں

پہنچا محسوس کر رہے ہو گے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تمپ اپنی بات کرتے رہیں افضل صاحب! مجھ سے میری

راے طلب نہ کریں۔“ اس نے ملاحت سے مشورہ دیا۔

”تم نے فیصلہ کیا کہ جج صاحب کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ یہ

قتل تمہارے لیے بہت اہم تھا۔ اس لیے تم نے اپنے گھروں پر بھی

بھروسہ نہیں کیا۔ یہ کام تم نے اپنے ہاتھوں سے انجام دینے

دست سے تم نے اس قسم کے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینے

چھوڑ دیے ہوں گے مسئلہ یہ تھا کہ اس کام کے لیے تمہیں قربانی

کے ایک جگہ کی بھی ضرورت تھی جو بہت ہی بدوقت تمہیں میر



آئی۔

دانت کو سنا ہوا دردہ نظر آ رہا تھا۔

”وہ کون تھا؟“ اس نے انجان بنے ہوئے پوچھا۔

”ظاہر ہے ہدایت دہشت۔“ میں نے جواب دیا ”وہ تمہارے اس دہری چال والے تانے بانے میں فٹ بیٹھا تھا۔ وہ تمہارا چکاس لاکھ کا مقروض تھا اور کوئی رسید یا کاغذات وغیرہ نہ ہونے کے باوجود اس قرض کو حلیم کو تھما۔ چنانچہ یہ عین ممکن نظر آتا تھا کہ اس نے تمہیں بیچ صاحب کے قتل کے الزام میں جھٹانے کی سازش تیار کی ہو۔ اگر تم جج صاحب کے قتل کے جرم میں صحیح طور پر گرفت میں آجاتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں جینی طور پر پھانسی کی سزا ہوتی۔ یوں ہدایت اس قرض سے بچ جاتا جس کی اور انگی کی اس میں جان ہی نہیں تھی۔ اس لئے اس امکان کو حلیم کرنے کو فوراً ہی مانتا تھا کہ اس نے تمہیں پھانسنے کی سازش تیار کی تھی۔ صرف یہی نہیں، تمہاری خوش قسمتی سے اس جال میں پھنسے سے یہ ضروری کلی پھندے بھی ٹکے ہوئے تھے یعنی ہدایت کی مزید بد قسمتی یہ تھی کہ باغی میں وہ بھی بیچ صاحب کے شکلے میں آچکا تھا اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی بھی دے چکا تھا۔ کسی شدید چڑبائی میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے تھے جو اس کے کھلے کا پھندا بن گئے۔ گویا بالکل تمہارا من پسند قزاقی کا ٹکڑا موجود تھا۔ میرے اندازے ٹھیک جا رہے ہیں؟“

”میں فی الحال کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔“ وہ سہاٹ لے کر بولا۔

”یہ منہری موقع کو کہ اچانک تمہارے سامنے آیا تھا لیکن میں تمہاری خیانت نما ذہانت کی ایک بار پھر داد دوں گا کہ وقت کی کمی کے باوجود تم نے ہارک ترین جزئیات کا خیال رکھا۔ تمہارا منصوبہ نہایت جدت پسند انداز تھا۔ بد قسمت ہدایت دہشت نے اس روز تمہیں فون کیا اور تم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ گویا قزاقی کا بکرا خود چمڑی تلے آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ تمہارے شیطانی ذہن نے فوراً منصوبے کی کڑیاں جوڑ لیں۔ تم نے اسے باغ بیچے آنے کا وقت دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر تم موجود نہ ہو تو وہ بیٹھ کر انتظار کرے گا۔ اسے دو روزہ غیر منتظر ملے گا۔“

”میرے یہ کہنے سے بھلا کس طرح میرے شیطانی منصوبے کی نشاندہی ہوئی ہے افضل صاحب؟“ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

”تم چاہتے تھے کہ وہ جینی طور پر دردہ کے گائب کو کھما کر دیکھے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر جھانک کر کہا۔

آخر کار اس کے مضبوط اعصاب ذرا ہل ہی گئے۔ اس کے چہرے پر مجھے خفیف سا قہر نظر آیا۔ شاید اسے بہت زیادہ یقین تھا کہ اس کی چال کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی۔ گو کہ اس کے دانت بدستور ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے مگر اب وہ اپنی تمام تر وجاہت کے باوجود مسکراتے ہوئے انسان کے بجائے

”آپ میرے اندازوں سے زیادہ چالاک ہیں اور صاحب! اس کے ہونٹوں سے کوئی خاص حرکت نہیں کی گئی۔ کے رانٹوں کے عقب سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز آ رہی ہوگی۔ مجھے چالاک کیوں کہہ رہے ہو غیبت آدمی! میں نے اس سے کہا ”تو یہ کہتے ہوئے کیا تمہیں موت آ رہی تھی؟ یا قہر؟ سو اس کی گواہی نہیں سمجھتے۔“

”چلو۔۔۔ میں اپنے علاوہ تمہیں بھی ذہین حلیم کر لیتا ہوں۔ بہت دھمکی آواز میں بولا۔ آخر کار وہ ”آپ“ سے ”تم“ پر منتقل ہوا۔

”کیا اپنے ذرا سے کی مزید تفصیلات بھی سننا چاہتے ہو؟“ نے پوچھا۔

”میں ہر وہ بات سننا چاہتا ہوں جو تمہیں معلوم ہے یا پھر کچھ میں کامیاب ہوں۔ اس کے بعد شاید ہم کوئی کاروبار بات کر سکیں۔“ وہ بولا۔

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس قسم کی حماقت نہ کرتا۔ مطلب ہے کاروباری بات کرنے کی حماقت۔“ میں نے کہا ”جرم اور کاروبار کا بالکل الگ الگ رکھنا چاہتا ہوں۔ انہیں آپ دوسرے میں گڈ نہ کرنا نہیں چاہتا۔“

”چلو خیر۔ یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم اصل بار کرو۔“ وہ بولا۔

”ہدایت دہشت کو باغ بیچے آنے کا وقت دے کر تم نے صاحب کو ان کے ہوٹل فون کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے ان سے بہت جذباتی اور ڈرامائی گفتگو کی ہوگی۔ بیچ صاحب معاشرے کا اصلاح کے سلسلے میں بڑے شدید جذبات رکھتے تھے اور اس سلسلے میں قانون اور عدالت سے ہٹ کر کبھی بہت سے غیر رسمی کام کرتے رہتے تھے۔ کسی جثت کام کے لئے وہ ہر ممکن ذمت اٹھانے کو تیار رہتے تھے۔ تم ان کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ تم نے شاید انہیں چکر دیا ہو کہ تم اپنے جرائم کا اعتراف کرنا چاہتے تھے پھر اس کے لئے تمہیں کوئی تمہارا سا باعزت راست چاہئے تھا۔ تم عدالت سے باہر اس معاملے پر تھوڑا خیال کرنا چاہتے تھے اور ان کے لئے فوری ملاقات ضروری تھی۔

جج صاحب نے اس موقع کو قیمت جانا ہو گا۔ وہ دلیر آدمی تھے۔ تم جیسے بڑے دولت مند بار سوخ اور خطرناک مجرموں کے بلاوے پر بھی چلے جانا ان کے لئے ایک معمولی کام تھا۔ اس کے علاوہ یہ تو انہیں گمان بھی نہیں ہو گا کہ تم انہیں باقاعدہ اپنے ٹھکانے پر بلاوے کے قتل کرنے کی جرات کر سکتے ہو۔ انہوں نے غالباً یہ سوچا ہو گا کہ زیادہ سے زیادہ تم ان سے کچھ زہری کی افواہ کو گھس کوئی سودے بازی کرنا چاہو گے یا پتھیرا دلانے کے عوض کوئی رعایت حاصل کرنا چاہو گے۔

”وہ کس طرح؟“ اب اس کی آواز طلق میں کچھ پھینے لگی تھی۔

”کیونکہ تم نے اس ناب پر بارود کے ذرات یا پھر شاید سوڈیم ہائیڈرولرائٹ کے ذرات بہت اچھی طرح چھڑک رکھے تھے۔ یہ بہت عام سی چیز ہے۔ عام زبان میں اسے پلوپنگ پاؤڈر کا ایک حصہ کہہ سکتے ہیں۔ سائنسی نام ذرا مشکل لگتا ہے لیکن اسے دھوبی تک استعمال کرتے ہیں۔ دونوں ہی چیزیں حاصل کرنا تمہارے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں نے کل ہی اس مشہور اسپتال کی لیبارٹری والوں سے فون پر بات کی ہے جہاں تمہارے اور ہدایت کے ہاتھوں کا ٹیسٹ ہوا تھا۔ ان سے بات کر کے میری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ بارود کے ذرات کے علاوہ سوڈیم ہائیڈرولرائٹ کے ذرات کا بھی ہیرافین ٹیسٹ میں ویسایہ رزلٹ آتا ہے۔ اب یہ تو ناب کے تجربے سے معلوم ہو جائے گا کہ تم نے دونوں میں سے کون سی چیز استعمال کی تھی۔ اتفاق سے اس وقت وہ ناب بھی اس شاہک بیک میں موجود ہے جو تم نے تبدیل کرادی تھی۔“

میں نے ایک بار پھر شاہک بیک اونٹھا کر کے اسے دکھایا۔ اس بار اس کی فکھر شاہک بیک پر جم کر رہ گئی۔ شاید وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ رہا تھا جس سے میں اور فلیک شاہک بیک سمیت ہوا میں تحلیل ہو جاؤں۔

میں نے طویل سانس لے کر کہا ”میں بے چارے ہدایت وائل کے ہاتھوں کے ٹیسٹ نے اسے مروا دیا اور تمہارے ہاتھ صاف نکلے۔ تم پیشہ سے ہی ہر کام میں ہاتھ ڈالنے کے باوجود اپنے ہاتھ صاف رکھنے میں بڑے ماہر ہو۔“ میں نے شاہک بیک صوفے کے نیچے گھسیڑ دیا۔ میں اس میں موجود سب چیزوں کے بارے میں اسے بتا چکا تھا۔

”چھوٹا تو پھر؟“ اس نے کہا۔ اس کا ذہن یقیناً کہیں دور تھا۔

”پھر تم شرافت علی کے ساتھ یہاں واپس آئے تم نے ظاہر عرف ماموں سے بگلت میں ناب تبدیل کرائی جسے تم نے شاید ردوال سے پکڑ کر گھمایا تھا۔ پھر تم نے مجھے لانے کے لئے شرافت علی کو بھیجا۔ اب اس معاملے کو تمہاری مرضی کے مطابق لینے کا مرحلہ درپیش تھا۔ جسیں اندازہ تھا کہ ایک معزز اور بار بار سوچ آئی ہوئے کے ساتھ ساتھ میں رجیم کل کا دوست بھی ہوں۔ میری مدد تمہارے لئے بہت اہم تھی۔ خصوصاً مجھے میں لاکھ دینے کے بعد تو شاید تمہارا خیال یہ رہا ہو کہ میری زبان تمہارے خلاف کھلے گی ہی نہیں۔ لیکن اب تمہیں پتا چلا ہو گا کہ میں اور رجیم کل دو سرے امکانات پر بھی غور کر رہے ہیں اور عملی طور پر بھی اوپر آدھریاگ درڑ کرتے پھر رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہدایت وائل کو گرفت میں لے لینے کے باوجود ہم مطمئن نہیں تھے۔ یہ تمہارے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔“

بے چارے بیچ صاحب کچھ زیادہ سی غیر دو اچھی اور کچھ زیادہ سی دشمن ٹھہرے کی وجہ سے مارے گئے۔ تم نے وہ کام کر ڈالا جو ان کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یعنی تم نے میں اپنے دفتر میں نہیں اپنے مقابل بٹھا کر گولی مار دی۔ تمہارے دونوں بھتیجیوں میں جو رولور موجود ہیں یہ یقیناً لائنس یافتہ ہوں گے تم نے ان دونوں میں سے کوئی استعمال نہیں کیا۔ اس کام کے لئے تم نے ایک الگ ہی ہسپتال نکال کر رکھا ہو گا جس کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ہو گا۔ اتفاق سے وہ ہسپتال۔ دوسرے لوازمات کے ساتھ اس وقت اس گندے سے شاہک بیک میں موجود ہے۔“ میں نے شاہک بیک ذرا اونٹھا کر کے اسے دکھایا۔

اس کی چٹائی پر جھلکتی ہوئی پینے کی بوتلیں اب کچھ نمایاں ہونی جاری تھیں۔ آہم وہ بولا تو اس کا گھبراہٹ اب بھی متزلزل نہیں تھا بلکہ اس میں کھڑکی جھٹک تھی ”شاید تم بھول گئے کہ میرے ہاتھوں کا ہیرافین ٹیسٹ ہوا تھا اور وہ صاف پائے گئے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ میں نے کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ جبکہ ہدایت وائل کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات پائے گئے تھے۔“

”میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام تھا۔ جس میں معلوم تھا اس قسم کے معاملات میں کہیں کہیں ہماری پولیس نے بھی ہیرافین ٹیسٹ کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ بلکہ اگر رجیم کل ایسا نہ کرتا تو شاید تم خود اس طرف اشارہ دیتے کیونکہ تم نے اس کا بدولت پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ تم نے فائر کرتے وقت سوڈ کے نہایت خراب صورت اور غصے دستانے پن رکھے تھے جنہیں تم نے بعد میں غالباً ردوال سے پکڑ کر اٹا رہا تھا یا پھر شاید ہسپتال کو ردوال میں لپیٹا تھا۔ یہ مراحل ردوال اور دستانے بھی اس شاہک بیک میں موجود ہیں۔ اب یقیناً یہ بھی تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ہیرا طیلہ ایسا کیسے نظر آ رہا ہے۔ اس متروک کارڈر شیٹ کے ذریعے جسکی ہوئی تمہاری یہ چیزیں تلاش کرنے کے لئے مجھے کالک اور پتھر سے بھری ہوئی ایک بدولت دار کان میں اترا پڑا لیکن میں نے سوچا چلو کوئی بات نہیں۔ میں لاکھ میں دوسری دہائی و جسنائی سمجھ جان کے ساتھ یہ رشتہ بھی اٹھا لیتے ہیں۔ سودا پھر بھی مڑا نہیں۔ خصوصاً جبکہ تم جیسی بڑی بھٹی ہاتھ آوری ہو۔“

وہ خاموش تھا۔ اس کے بازو گارڈز اس کے حکم کے انتظار میں ساکت تھے لیکن وہ انہیں کوئی حکم نہیں دے رہا تھا۔

میں نے سلسلہ کام جوڑتے ہوئے کہا ”بیچ صاحب کو ٹھکانے لگا کر تم یہاں سے رخصت ہو گئے لیکن تم نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جاتے وقت تم ردوازہ منتقل کر جاؤ تاکہ ہدایت وائل آئے تو اسے کھیل نہ سکے کیونکہ اندر بیچ صاحب کی لاش پڑی ہوئی تھی لیکن تم چاہتے تھے کہ ہدایت وائل ناب کو اچھی طرح ڈور لگا کر گھسانے کی کوشش ضرور کرے کیونکہ یہ دہری چال کا ایک اہم حصہ تھا۔“

”چھوٹا پھر؟“ اس نے وہی الفاظ دہرائے لیکن اب اس کی نظر میرے چہرے پر تھی۔

”پھر یہ کہ تم نے بنگالی طور پر میرا پتہ صاف کرنے کا بھی پروگرام بنالیا۔“ میں نے اطمینان سے کہا ”جرم ایک ایسی ہی دلیل ہے۔ ایک جرم سے دوسرے جرم کی کڑی جڑی چلی جاتی ہے۔ کڑی سے کڑی مل کر زنجیر بن جاتی ہے اور کبھی نہ کبھی یہ زنجیر مجرم کے پیروں میں پڑ جاتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اس کی دوزخ تم ہو جاتی ہے۔ جرم کی دلیل اسے مل جاتی ہے۔“

”پھر نہیں۔ کام کی بات کرو۔“ وہ سپاٹ لمبے میں بولا ”شاید ہم ایک بار پھر ایک دوسرے سے مزید کاروباری معاملات پر بات کر سکیں۔ میں لاکھ دیکھا میرے لئے کوئی آخری حد نہیں ہے۔“

”ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا ”لیکن ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔“

”چلو تم اپنی بات بھی مکمل کرلو۔“ وہ حیرت انگیز حد تک پرسکون لمبے میں بولا۔ دولت والے کو اپنی دولت کی طاقت پر آخر وقت تک اعتماد رہتا ہے۔

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ شرافت علی کا کیا بنا؟ وہ مجھے قتل کرنے گیا تھا ابھی تک واپس نہیں آیا۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں؟“

”کیا وہ تمہارے ہاتھوں مارا گیا؟“ اس نے جس مہربانوں سے یہ سوال کیا اس طرح کوئی کسی کے تیلی کے سرے کے بارے میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”فسوس کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں پایہ پھیل کر نہیں پہنچ سکا۔ میرا خیال ہے میں اس دروازہ کا صرف کندھا زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ کہیں مریض بن کر رہا ہو گا۔ اسی لئے اسے واپسی میں دیر ہو گئی ہے۔ مریض بنی کروا کرو مہربان! ہمیں دوڑا آئے گا۔ اس کا زخمی حالت میں یہاں آنا اس کے اور تمہارے دونوں ہی کے حق میں برا ثابت ہو گا۔ اگر اس کے پاس مہیا کل فون موجود ہے تو اسے فون کے کہے یہاں آنے سے منع کر دو۔“

میں نے یہ مشورہ نہایت ہمدردانہ لمبے میں دیا تھا۔ اس نے میر کی طرف دیکھا۔ میرے تین عام فون اور ایک مہیا کل فون موجود تھا مگر اس نے کسی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اس میں کوئی چال پوشیدہ تھی۔

اگر وہ میرے سامنے فون پر شرافت علی کو یہاں نہ آئے کا حکم دیتا تو کم از کم وہ تسلیم کر لیتا کہ اس نے شرافت کو مجھے قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ شاید اسے یہ بھی اندیشہ ہو کہ اس کا فون ٹیپ نہ ہو رہا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شرافت علی کے پاس مہیا کل فون موجود ہی نہ ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ کرم بیک کو شرافت علی کی اتنی بھی پروا نہ ہو جتنی ظفر کے کھلاڑی کو پتہ چلے والے گھرے

# آسیب زدہ

انوار صدیقی (زیر طبع)

کی ہو سکتی ہے۔

وہ ایک بار پھر کمرے میں بیٹھنے لگا لیکن اس کی نظر پھر پھر چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ بولا ”پولیس کو اس میں سے کچھ معلوم ہے؟“

”کی اللہ کچھ بھی نہیں۔“ میں نے معمولی سا جھوٹ بولا۔ ”بہت خوب۔ بہت خراب۔“ اس کی آنکھوں میں کچھ طمانیت جھلک اُٹلی۔ ”تو ابھی کاروباری بات چیت ہوئے؟“

وہ ابھی تک روپے پیسے سے میرا منہ بند کرنے کے ہاتھ پیرامید تھا اور میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ امیدوارا جانے کے بعد اس کا رد عمل کیا ہو گا؟

”کیا پولیس نے اپارٹمنٹ کو گھرے میں لے رکھا ہے؟“ اس نے دو سوال کیا۔

”مجھے کیا معلوم“ میں نے انہماں بنے ہوئے کہا ”اپنے ایک کارڈ کو باہر بھیج کر کال کرو۔“

وہ استہزائیہ انداز میں اس دوا جیسے کہہ رہا ہوا میں اٹکایہ وقف نہیں ہوں۔

”تم اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ سب کچھ جان لینے کے بعد اس طرح منہ افکار تھا یہاں پہلے آئے۔“ وہ بولا۔

”میں خفا تو نہیں ہوں۔ کیا تمہیں میرے ساتھ اتنی سوچ اور دلچسپی غائب نظر نہیں آتی؟“ میں نے گویا براہ راستہ ہونے کہا۔

”خاتون تو تمہارے لئے اور بھی مسئلہ بن سکتی تھی۔ اس سے تو تمہارا خانا کافی بڑھتا۔“ وہ بولا۔

”میں خفا بھی آسکتا تھا اور کسی جم فیکر کو ساتھ لے کر بھی آسکتا تھا۔ میری کمپوزیٹ محوم جانے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن کرم بیک اتم ابھی مجھے سمجھ ہی نہیں سکے۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر دوسرے کے دانت کھنسنے کے سے انداز میں مسکرایا اور پھنکارتی سی آواز میں بولا ”کرم بیک انسانوں کو بچانے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔ یہی تو اس کی کامیابی کا راز ہے۔“

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”اس سے زیادہ مزاحیہ بیان تو میں نے اس ہنسنے میں کبھی سنا تھا اس کا بھی نہیں پڑھا۔“ پھر میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا

خوف زدہ نہیں تھی اور اس قسم کی صورت حال اس کے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ نہ صرف دوسرے کے سیدھ میں لٹ کر آدمی صوفیہ کے پیچھے ہو گئی تھی بلکہ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک ہسٹل بھی نظر آنے لگا تھا جو اب تک اس نے اپنے لباس میں نہ جانے کہاں چھپا رکھا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں ہلکی سی لڑکش تھی لیکن اس نے انتہائی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے گاڑو کو محض خبردار کرنے کے لئے اس پر ایک فائر کر دیا تھا۔

گولی گاڑو کو نہیں لگی تھی۔ شاید غلطی نے جان بوجھ کر نہیں ماری تھی۔ اس کا مقصد غالباً اسے ہلاک یا زخمی کرنا نہیں بلکہ محض اسے اپنی جدید ساخت کی کلا شکوفہ استعمال کرنے سے باز رکھنا تھا۔ وہ اس مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ گاڑو اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں دلی دلی میں غلطی کو دوا دے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اس سے اس حوصلے کی توقع نہیں کر رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ واقعی اگر گولیاں پلٹیں تو وہ میرے لئے مسئلہ نہ بن جائے۔ لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ شرافت علی کے اچانک حملے نے اسے ضرور حواس باختہ کر دیا تھا لیکن ذرا سا بھی ہتھی اندازہ ہونے کی صورت میں وہ اس قسم کے حالات میں گھبرانے والی عورت نہیں تھی۔

کرم بیک کا ہاتھ گاڑو ہو گیا تھا اور اس کے وجہ سے چہرے پر کسی زخمی دروسے کی سی خوفناکی آگئی تھی۔ معلوم نہیں یہ تبدیلی تکلیف کی وجہ سے آئی تھی یا اس کا اصل روپ سامنے آ رہا تھا۔ میں نے فرش پر لیٹنے پر لیٹنے پر سکون لیے میں کہا "میں نکالنے اور فائر کرنے میں کچھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے میری جان! الفوس کہ آج کل امریکا میں دہشت گرد قتلیم ہانے کا رواج ختم ہو گیا ہے ورنہ میں تو ہائی روڈ جا کر اس لائن میں بھی اچھا خاصا کیمپ بن سکتا تھا۔ اپنے کس فائنٹ کے سین کسی ڈپٹی کیٹ یا اسٹیشن میں کے بغیر کیمپ بنائے کر دیا کرتا۔ بڑی قدر ہوتی میری۔"

میرا خیال تھا کہ کرم بیک اپنے دل میں اس بات کا اعتراف کر لے گا کہ وہ بازی ہار چکا تھا اور اپنے لئے مزید دشواریاں پیدا نہیں کرے گا لیکن ایسا لگتا تھا کہ کھٹ کھٹ کھٹ کر اس کی سرشت میں نہیں تھا۔

اس لمحے اس نے ایک ایسی حرکت کی جس کی میں قطعاً توقع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود ایک بمیاک بیج کے ساتھ تنہا بائیں طرف سے اسٹائل میں اچانک ہوا میں اچلا اور سیدھا میری طرف آیا۔ مجھے کم از کم دوسرے گاڑو کی طرف سے خلعہ نہیں تھا۔ اسے غلطی سے گور کر رہا تھا۔

میرے لئے کرم بیک بے ہمتا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن میں اسے مزید زخمی نہیں کرنا چاہتا تھا اور جس طرح وہ فضا میں اچلا تھا اگر میں اس عالم میں اس پر مشین بمائل سے فائر کرتا تو یقیناً ممکن تھا کہ وہ مری جاتا۔ گولی نہ جانے کہاں لگتی۔ بس اسی جھجک میں فائر کرنے میں ایک لمحے کے لئے چوک گیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ میں ایک طرف کو لڑھک گیا ورنہ وہ کسی چھوٹی سی چٹان کی

پلو خراب کیا۔ مردم شہی تو تھماری کاسیالی کا راز تھی۔ اب ہمارے ذوال کار از کیا ہو گا؟  
اس نے کندھے اچکائے اور اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہاتھ پچھا "تھیں کب اصل بات کا اندازہ ہونا شروع ہوا؟"  
"میں میں شروع" ہونے والا کوئی سلسلہ نہیں رہا۔ میں نے جواب دیا "کچھ ہی دیر پہلے جب میں اور نیکم شرافت علی کے شرفانہ حملے سے بچے اور میں نے اندھیرے میں اس کے پوسلے کو پکڑا تو نیکم ہی میرے ذہن میں ساری کڑیاں دل گئیں۔ ظاہر ہے اگر ہمارے دل میں چرند نہ ہوتا تو تھیں مجھ پر حملہ کرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ ہمارے دل میں چرند تھا تو ہماری باتوں کو سمجھنا اور ان کے جواز تلاش کرنا قطعاً مشکل نہیں تھا۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "متم نے بے چارے واپس آرائی کے چابیوں کے پیچھے میں اپنے اپارٹمنٹ کی چابی بھی ڈال دی۔ یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ چابیوں کے بارے میں زیادہ غماز آدمی نہیں ہے۔ اس کے ہوش میں بہت سے ملازم ہیں۔ شاید تم نے کسی ملازم کو رشوت دلو کر یہ کام کر لیا ہو۔ تم جیسے لوگ اپنے کاموں میں رشوت کی طاقت کو بہت استعمال کرتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر کسی سوچ میں الجھا نظر آ رہا تھا۔ لیکن بدستور کمرے میں ٹھل رہا تھا۔ میری نظر ایک لمحے کے لئے بھی اس پر سے نہیں ہٹتی تھی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں پہنچا تو اس کی پشت ایک لمحے کے لئے میری طرف ہو گئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں جج صاحب کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

اس لمحے اس نے غالباً آخری جوا کھینچنے کا فیصلہ کیا۔ اس نور جو حال میں وہ جگہ بقیہ بہت اچھی تھی۔ وہاں ٹھس کر وہ بڑی کی بڑی آؤ بھی لے سکتا تھا جو بقیہ چھوٹی کمرے کی بہت سی گولیاں کے لئے تو مہم وہاں ثابت ہو سکتی تھی۔ کوئی عیب نہیں تھا کہ وہ ایک ہدف ہی رہی ہو۔

جونی اس کی پشت میری طرف ہوئی "اس نے کسی دہشت گرد کے بیرو کی سی چھری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھٹل سے رہو اور نکال کر ایڈول کے مل کو جتے ہوئے اندر حاوند گئی چلانا چاہی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔"

میں اس کا ہاتھ بھٹل تک جانے سے پہلے ہی صوفیہ سے پھسل چکا تھا اور نیکم کو بھی میں نے نیچے کھینچ لیا تھا۔ میرا مشین بمائل جب سے باہر اچکا تھا۔ کرم بیک کو گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔ نہ صرف اس کے ہاتھ سے رہو اور غائب ہو گیا بلکہ دو آڑے پر ایک گاڑو بھی ہلکی سی ڈکراہٹ کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ کس کدے سے اتار چکا تھا۔ میں ممکن تھا کہ کرم بیک کے ساتھ وہ بھی ہم پرست ہوتا۔

اس بار نیکم نے بھی کمال کر دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اب

طرح دھم سے بچھ پر آن کر گئے۔

تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس کے جوتے کی اڑی بہت زور سے میری کلائی پر پڑی۔ میرا بازو جھنجھکیا اور مجھے ہانپنی نہ چلا کہ کب مشین ہٹل میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ دایاں ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود وہ کسی جتنی رچھہ کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ میں اس کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ اپنا بایاں ہاتھ مشین ہٹل کی طرف بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کا وہ بازو پکڑ لیا تھا۔

میرا ایک بازو میرے اپنے ہی نیچے دب گیا اور میں اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ کمرم بیک اپنے وزن سے اور اپنی طاقت کی خاص ٹیکنیک سے مجھے فرش سے ہی چپکائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ زندگی اور موت کی مکش کے لئے تھے۔ کوئی بھی لمبہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ تو اذن موت یا زندگی۔ دونوں میں سے کسی بھی طرف بگڑ سکتا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ خطرہ دوسرے کارڈ کی طرف سے تھا۔ مجھے معلوم تھا اس صورت حال میں وہ زیادہ دیر تک اس بات کی پروا نہیں کرے گا کہ اسے تسلیم نہ کر کر رکھا تھا اور وہ اپنی جان پر کھیل کر اپنے مالک کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کرے گا۔

کمرم بیک کے ساتھ زیادہ دیر زور آزمائی میں اٹھنا بہت بڑا خطرہ بنے والی بات تھی۔ رحیم گل نے جانے کہاں گر گیا تھا۔ کم از کم گولی چلنے کی آواز سن کر اسے اپنے اومیوں کے ساتھ اپارٹمنٹ میں کھس آنا چاہئے تھا۔

آخر میں نے کمرم بیک کو ہوا میں اچھال دیا ہی بہتر سمجھا۔ میں اسے زیادہ اونچا تو نہیں اچھال سکا لیکن اس کے نیچے سے نکل گیا۔ ساتھ ہی میں نے مشین ہٹل کو ہاتھ مار کر رو کر رکھا دیا۔ اس کے زخمی ہاتھ سے کچھ خون میری آنکھوں میں گر چکا تھا۔ اور مجھے دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ آنکھیں پونچھنے کی سہولت نہیں تھی۔

کمرم بیک کے بائیں ہاتھ نے میری گردن گرفت میں لے لی تھی اور یہ گرفت کسی آہنی شے سے کم نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ اپنی زندگی سے بازو ہونچکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اب موت تو کسی نہ کسی صورت میں اس کا حقد ہو چکی تھی۔ اس کی ساری جدوجہد اب صرف اس بات کے لئے تھی کہ مرے مرتے مجھے بھی ساتھ لے کرے۔ یہ سوچ کر تو جب کوئی گھور انسان بھی لڑتا ہے تو بڑی مصیبت بن جاتا ہے۔ کمرم بیک تو پھر بھی ایک طاقتور آدمی تھا۔ لیکن ادھر ایک گالیال مجھ میں بھی آیا۔

اس نے جب میری گردن ہاتھ کے گھٹنے میں دبوچی تو میری کھوپڑی گھوم گئی۔ میں نے تمام احتیاطوں اور رعایتوں کو ہالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے چہرے پر وہ گھونسا رسید کیا جس کے پیچھے میرے غیظ و غضب کی طاقت ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ پلے تو صرف شے کی شدت سے بگڑا ہوا تھا لیکن اب بچ بچ بگڑ گیا۔ میری گردن پر اس کی گرفت و مضبوطی بڑھ گئی۔ میں نے گھٹنا موڑ کر

اس کی کمر میں رسید کیا۔ وہ درختے کی طرح غرایا اور میں نے اس کی ایک ضرب سے گویا فیصلہ کن وار کرتے ہوئے اسے آگے دھکی دیا۔

اس کے اور میرے درمیان خاصا فیصلہ پیدا ہو گیا تھا اور مرنے کو قیمت سمجھتے ہوئے غالباً اس کے گارڈ نے اس سے کہا کہ اسے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی دانت میں مجھ پر برسرِ بارو لیکن ہوا یہ کہ میں اس لئے اپنا مشین ہٹل اٹھانے کے لئے یہ عصب میں لڑکھ چکا تھا جبکہ کمرم بیک دوبارہ مجھ پر چھپنے کے لڑاکا پسینے کی طرح میرے عصاب میں لپکا تھا۔ وہ اس برسرِ بارو میں آگیا اور گولیوں کے دھچکے سے اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ قلم نے گارڈ کو دو سر برسرِ بارو کی سہولت نہیں ملنے دے پتھل کے قاتل کی آواز سنی اور گارڈ اور مجھ سے منہ چھٹ کر اندر آن کر ا۔ اس لئے مزید چند گولیاں چلیں لیکن یہ اندر نہیں تھیں۔ کسی نے باہر سے برسرِ بارو کر دیوئی دروازے کا قاتل آنا تھا۔

دروازہ کھلا اور رحیم گل کی قیادت میں بہت سے ہاتھ والے ”خبردار“ خبردار“ کرتے ہوئے مجھیں آئے اور حذر کر کے اندر گھس آئے اور ادھر ادھر کر کے کھدوں میں پوزیشن لینے کی کوشش کرنے لگے۔

”بہت دیر کی مہیاں آتے آتے“ میں نے کہا کہ میرا کامنا لے کر اٹھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا پھر میں نے ان پولیس والوں دیکھا جو ادھر ادھر بیٹھے تھے لیٹ کر مجھیں سیدھی کر رہے تھے۔ میں نے انہیں مخاطب کیا ”آپ لوگ کیا اب کر رہے ہو؟“

میروں اور صوفوں وغیرہ سے مقابلہ کریں گے؟“ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور وہ کھڑے رہے کہ گارڈ ہاتھ بیک میں سے کوئی حرکت کرے تو وہ اس پر گولی چلائیں۔ رحیم میرے قریب آتے ہوئے ہوا ”دراصل ہم نے پیچھے ہٹنا ہی تھا۔ ایک شخص کو تعینات کیا ہوا تھا۔ وہاں سے وہ اس کمرے کی در کھڑکی سے چوری مجھے جھانک کر اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔“

اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا لیکن میں اس کے اشارے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کی مراد کون سی کھڑکی سے تھی کیونکہ میں دونوں پہلے اس کھڑکی کا محاسبہ کر چکا تھا۔

رحیم گل بات جاری رکھتے ہوئے ہوا ”اس آدمی کے لئے ہمارے درمیان طے پایا تھا کہ وہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں متنبہ کرے گا کہ کس وقت ہمیں اندر گھسنا چاہئے۔ یہ احتیاط میں نے اس لئے ہی کیا تھا کہ ہمیں ہمارا اچانک اندر گھسنا چاہئے لوگوں کے لئے فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث نہ بن جائے کسی غلط موقع پر کسی لٹا آدمی کے ہاتھوں کوئی غلطی ہو گئی ہو جائے۔“

بات اس کی مناسب تھی۔ میں نے ہوجھا۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ وہ تو بھر کر ہوا ”بھر ہوا یہ کہ ہم نکل کا انتظار ہی کرتے تھے“

یہ جاننے کے لئے اس کی نبض دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مرچکا تھا۔ اس کے باوجود رجم گل نے جگ کر اس کی بھی نبض دیکھی۔ شاید اس وقت اس پر کسی خطی ڈاکٹر کی مدد سایہ ظن تھی۔  
 ”یہ مرچکا ہے۔“ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھتے ہوئے اعلان کیا۔

”جہاں؟“ میں نے حیرت سے کہا ”کمال ہے! اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ مذاق کر رہا ہے۔“  
 رجم گل کی آنکھوں سے ایک بار پھر قہر و غضب جھانکنے لگا۔ میں نے مسکین سی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں کیا کہوں یا ر۔۔۔ بعض اوقات تم بات ہی اتنی اعتقاد کرتے ہو کہ یقین نہیں آتا تم الیکٹرک رجم گل ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم لکڑیاں رجم گل ہو۔“

مگر میرے کہیں کے پولیس کی کارروائی میں ہر بات ضابطے کے مطابق کی جاتی ہے۔ تم اسے خانہ مجر کی کرنا بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ الفاظ رجم گل کا زہر آتے ہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ مرچکا ہے۔ میں مرے ہوئے کوئی کو ایک میل دور سے دیکھ کر تھکا سکتا ہوں کہ وہ مرچکا ہے لیکن ضابطے کی کارروائی کے طور پر مجھے اس کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ پولیس کے ضابطوں اور قاعدوں کے سلسلے میں ”میں گنہگار نہیں ہوں۔“

”اوه۔۔۔ معاف کرنا پارے بھائی! یہ باتیں مجھ گھسیارے کو معلوم نہیں تھیں۔“ میں نے معذرت کی۔  
 عیلم سوئے پر دم بخود سی جنبی تھی۔ ہسپتال اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رجم گل سے کہا ”تو اس کی بھی نبض دیکھ کر ضابطے کی کارروائی کے مطابق اعلان کر دو کہ اسے زندہ سمجھا جائے یا مرنے؟“

رجم گل کی آنکھیں کچھ زیادہ سی قہر کو دو ہو گئیں۔ ویسے بھی امارٹس کی فضا کچھ سوگوار سی تھی۔ میں نے سوچا زیادہ کچھ اس کرنا ٹھیک نہیں۔ میں رجم گل کے قریب چلا گیا۔ وہ ایک بار پھر کرم بیک کی طرف متوجہ ہو گیا اور بڑے اٹھناک سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔

”کھلا شکوف کا برست لگا ہے۔“ اس نے بڑوانے کے سے انداز میں تبصرہ کیا۔

”اس میں حیرت کا پتلو یہ ہے کہ جس شخص کو اس نے مخواہ پر اپنی جان کی حفاظت کے لئے رکھا ہوا تھا اس کے ہاتھ سے یہ کر گیا۔“ میں نے دھمے بیچے میں خمیدگی سے کہا۔  
 ”ایسر یس کے آئے سے پہلے تم مجھے دقے کی تحصیلات بتاؤ۔“ رجم گل نے فراخی کی ”یہاں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ کس کی گولی سے کون مرا۔“  
 میں نے اسے تحصیل سے سب کچھ بتایا۔ وہ طمانیت سے سر

مگر محفل نہیں ملا۔“  
 ”میں نے والوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ میں نے باپ سی

سے کہا۔  
 ”میں نے والا نے چاہا کیا کرتا۔ وہ اس ٹک سے ہنگامی زینے کی دو برسی خیل سے گر پڑا تھا۔“ رجم گل نے بتایا ”اس طرف اندر جرات اور اس شاندار بلڈ ٹک کا ہنگامی زینہ نہایت گھٹیا اور بے کار بنا ہوا ہے۔“  
 ”یہ جڑوں تو کھنڈ کھانڈے کی ہوتی ہیں۔“ میں نے اثبات میں

سرا پایا۔  
 ”اس کا ہنگامی زینے کی وجہ سے ہمارا آدمی نیچے گر گیا۔ شکر ہے ابھی وہ برسی خیل پر ہی تھا اور نیچے زمین پر کی تھی۔ اگر وہ ٹاپ فورسے گر رہا ہوتا تو زمین پر کی تو پچھتی ہو جاتی۔“  
 ”میں نے والوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ میں نے سر ہاتھ ہونے ایک بار پھر کہا ”وہ سیدھا ٹاپ فورسے آئے کے بجائے راستے میں کسی اور ٹیک میں آکا جھکا کر لے لگا ہوا گا۔“  
 رجم گل نے قہر کو دو نظروں سے مجھے گھورا اور اکڑوں بیٹہ کر یکسو دو ٹول گاڑو کی نبض دیکھنے لگا۔ جلدی وہ خاصی مسرت سے بولا ”یہ دونوں تو زخم ہیں۔“

”یقیناً ہوں گے خبیث آدمی بڑی مشکل سے مرے ہیں۔ وہ ٹیک لوگ ہوتے ہیں جو بے چارے بھی کبھی صرف ٹھوکر لگتے۔“  
 ”اور بعض اوقات تو کھنڈ شرم سے مرنے لگے ہیں۔“ میں نے

کہا۔  
 ”میں ایسر یس کے لئے پہلے ہی فون کر چکا ہوں۔ ہمارا بھی جو آدمی پڑھیلوں سے گرا ہے سخت زخمی ہے۔“ رجم گل بولا۔  
 ”حق آدمی! ایسر یس تو جنہیں ساتھ ہی لے کر آنا چاہئے تھا۔“ میں نے اسے ڈانٹ پایا۔

اسی نے مجھ سے مجھے گھورا لیکن مجھے کے پیچھے درحقیقت اس کی آنکھوں میں ایک التجا چمکی ہوئی تھی کہ ماحول کے سامنے مجھے اتنی قہر کو دو دیکھو جیسے القاب سے مت پکاؤ۔

میں نے اس پر رجم کھاتے ہوئے ذرا فری سے کہا ”کیا جنہیں اذاتہ نہیں تھا کہ یہاں کیا کچھ ہو سکتا ہے؟ ہم یہاں کسی محفل مطالعوں کو قہر کو نہیں تھے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور محفل مجھے گھورے پر ہی اکتفا کیا۔ گھورنے سے قہر کو دو کرم بیک کی طرف بڑھا۔ کرم بیک پہلے سے چہرے پہلے ہتھ خورفاک دکھائی دے رہا تھا ”اب نہ ہلے کیل اتنی ہی مسکین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے حیثیات انرا نہ جانے کیوں موت کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر نمودار ہوئے تھے۔ اس کا بائیں اور خون میں تھرا ہوا چہرہ کچھ کر نہ ہائے کیل کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بے چارہ کوئی شریف آدمی قہر کو دو ہی مار گیا تھا۔“

ہلاتے ہوئے بولا ”چلو خیر۔ ایک بہت بڑا کس بہت کم دقت میں انجام کو پہنچا۔“

”اب اس کا سرا تم اطمینان سے اپنے سر باندھ لیتا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ تمہارا سر خالی خالی کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ میں نے بیانی سے کہا۔

”تمہاری فکر کافی کمزور ہو گئی ہے۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا ”میرا سر خالی نہیں ہے۔ اس پر پولیس کی ٹوٹی موجود ہے اور میرے لئے یہ کافی ہے۔ تم اپنا سرا اپنے پاس ہی رکھو۔“

”میں بیرونی طور پر سر کے خالی ہونے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اندر سے خالی ہونے کی بات کر رہا تھا۔ سر کے کڑ میں اس قسم کا خالی پن ذرا زیادہ! مجھی طرح چسپ جاتا ہے۔ پولیس کی ٹوٹی سے تو اور بھی زیادہ شہ پیدا ہوتا ہے کہ ٹھونڈی اندر سے خالی ہوگی۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”اگر تم نے مزید بکواس کی تو میں تمہیں کمر بیک کے قتل کے نتیجے میں گرفتار کر لوں گا۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”تم سے میری امید کی جا سکتی ہے۔ آخر انی احسان فراموش ہو۔“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”تمہیں اتنے بڑے فطرت سے اتنی آسانی سے نجات دلا دی لیکن احسان مند ہونے کے بجائے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے مجھے گرفتار کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہارے لئے مناسب یہی تھا کہ زندگی بھر کمر بیک کے سامنے دم ہلاتے پھرتے رہتے۔“

”تم نے مجھے کب کسی کے سامنے دم ہلاتے دیکھا یا؟“ وہ تازہ کہا کر بولا۔

”ہزاروں مرتبہ دیکھا ہے۔ تمہیں خود ہاتھ نہیں چلا ہو گا۔ اگر کو تو آئندہ تمہاری دم نہ ہونے دیکھ کر تمہیں خود مار کر دیا کروں؟“ میں نے چنپی تواڑ میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ زیادہ جل جھن کر مزید کچھ کہتا، ایک دیو قامت شخص اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا اور چہرے سے کافی حواس پاختہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شرافت علی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی شرافت سے گرفتاری پیش کرنے آیا تھا۔

اچانک وہ میں اور مجھ سے کمرے کے وسط میں آگرا جیسے کسی گینڈے نے اس کی کمرہ گھر رسید کی ہو۔ گینڈے سے کتر کسی جانور کی گھراسے اتار آگے لاکر اور مجھ سے نہیں گرا سکتی کیونکہ وہ خود کسی آگھی سے کم نہیں تھا لیکن جب وہ سامنے سے ہٹا تو ہاتھ چلا کہ اس کے عقب میں کوئی گینڈا نہیں بلکہ شفیع شاہ موجود تھا۔

شفیع شاہ جیسا چہرے جسم کا اسارت تو ہی شرافت علی کے جتنی وجود کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی جس کی نال روہ شرافت علی کو یہاں تک لایا تھا لیکن جرت کی بات یہ تھی کہ شفیع شاہ جیسے بیک آوی نے شرافت علی کی کمرہ لات رسید کی

تھی تو وہ اور مجھ سے ہال کے وسط میں آگرا تھا۔

شفیع شاہ اندر آگیا۔ اس کی گن کا سرخ شرافت علی کی طرف تھا۔ ہم دوسرے کمرے میں تھے شفیع شاہ دور سے ہی مجھ پر غلبہ ہوا ”آپ کا اندازہ ٹھیک تھا سرا! اس نے آپ پر غلبہ ناکام ہونے کے بعد اپنے کندھے کی مرہم پٹی کڑا کر اوپر کاٹ کر لیا تھا۔ یہاں اس کے استقبال کے لئے ہم اندر سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ نہایت آسانی سے ہی ہمارے بیٹھے چڑھ گیا۔“

اس نے منہ پھیر کر اپنے ایک ساتھی کو آواز دی ”مراؤ شرافت علی کی گن لے آؤ۔“

خود ہی ایک اور شخص اندر آگیا۔ وہ ایک کلا شکوفہ اندر ہوئے تھا۔ شفیع شاہ نے اس سے کلا شکوفہ لے کر دور سے شہ دکھاتے ہوئے کہا ”سرا! اس گن سے آپ پر حملہ کیا گیا تھا۔“

رجیم گل نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شفیع شاہ سے کلا شکوفہ لے لی۔ شرافت علی اس وقت تک اٹھ بیٹھ چکا تھا اور اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں کندھے پر پڑے ہوئے تھا۔ میں کندھے پر اس کے کوٹ میں ایک سوراخ دیکھ چکا تھا۔ شفیع شاہ نے مجھے بتایا ”آپ کے فائر سے اس کا کندھا زخمی ہوا تھا سرا! لیکن زخم خطرناک نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کندھے پر ہوسکتا ہے۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال سے پیچھے کڑا کے ہے۔“

میں نے رجیم گل سے کہا ”اس دیو زاد کو بھی سنبھال لو۔ یہ جج صاحب کے قتل کے کیس کی اہم کڑی ہو گا۔ بلکہ اس کے تو قتل کر دیتے ہوئے اسے قتل کی بجائے کڑا کھانا چاہئے۔“

”کون ہے یہ؟“ رجیم گل نے ہال میں پہنچ کر پوچھا۔

”ہر گینگسٹر اور انسانی قسم کی شخصیت کے پاس یوں تو کچھ بددلی بردار ہوتے ہیں جو مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خاص ہوتے ہیں اور ایک آدھ تو خاص الخاص ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ کمر بیک کا خاص الخاص آدمی ہے۔ چنپ ہے۔ اس کے ذریعے تمہیں کمر بیک کی سہولت کھانے میں مدد ملے گی اور بیٹھنا سے انکشافات سامنے آئیں گے شرافت علی کہ یہ آگھی زندہ سلامت تمہارے ہاتھ آتا ہے۔“

شرافت علی اٹھ کر آگرا ہوا تھا اور مجھے نے کندھوں کے باہر وہ ہم سب میں نمایاں نظر آ رہا تھا لیکن اب وہ اس شاندار مقام کی طرف توجہ کھینچا تھا خاص فیئر کے باعث کسی بھی لئے ڈیرہ کو تھی۔ دراصل اس کی فخر دوسرے کمرے میں پڑی ہوئی تھی بیک کی لاش پر پڑ چکی تھی۔ اس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہوا کہ یکدم ہی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ گاؤں اور قسم کی شخصیت کا اپنا ایک الگ ہی انداز ہوتا ہے۔ وہ ذات خود کو اپنی غیر معمولی شخصیت نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے جسم میں کوئی جتنی طاقت مقید ہوتی ہے۔ ان کا سارا رعب و دبدبہ رشت و طاقت شرافت

میں سکون کی سانس لیتا۔ "وہ اطمینان سے بولا۔

"لیکن افسوس۔ تمہارے مقدّر میں سکون کی سانس نہیں ہے۔ البتہ میں اب سکون کی سانس لینے جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔"

میں نے شفیق شاہد غفور کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور جسم گل

کو وہیں تذبذب کے عالم میں چھوڑ کر باہر گیا۔

لفٹ کی طرف جاتے وقت میں نے حسیب اپنے اصحاب میں

ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ میں نے شفیق شاہد سے کہا "جی

وائٹس والے بہت اہم اور بہت بڑے معاملے کے بعد یہ دوسرا بڑا

اور اہم معاملہ ہے جو ہم نے نمنایا ہے۔ جیروائٹس والا معاملہ تو

خود بخودی ہمارے سر پہ آن پڑا تھا اور ہم غیر ارادی سے انداز میں

اس سے مشتے چلے گئے تھے لیکن اس معاملے کی تو ہم نے باقاعدہ

ذمہ داری لے کر اسے نمنایا ہے۔"

"بے حارے کرم بیک نے دو ملین روپے میں اپنے لئے

موت خریدی۔" شفیق شاہد مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی جیروائٹس سے کچھ کم خبیث چیز نہیں تھی۔" میں نے

لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا "یہ دو لوگ ہیں جن کی خباثتیں سب

کوچوں میں نظر میں آئیں لیکن معاشرے کی شکست و ریخت میں

یہ لوگ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہماری سلامتی قدروں کو اگٹ

پلٹ کرنے والے اصل میں یہی لوگ ہوتے ہیں۔ بظاہر بڑے اچلے

اچلے دکھائی دیتے ہیں۔ بہترین علاقوں میں شرفاء اور معززین کے

شانہ بہ شانہ رہتے ہیں۔ عموماً گاڑیوں میں کھڑے ہیں۔ بڑے لمبے

ساف تھمبے اور بڑے خوش اطوار نظر آتے ہیں لیکن روپے

پیسے، طاقت اور غناث باٹ کے لئے یہ تمام انسانی قدروں کو خدا

مانڈ کر چکے ہوتے ہیں۔ جیروائٹس میں بھی کچھ دیکھی ہیں تھا لیکن

کرم بیک کا لیوڈ تک ویلنٹائنز ڈے ہو چکا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کا

زیادہ وقت باہر گزرنا تھا تاہم جیروائٹس کی خباثتیں اس سے زیادہ

عظیم تھیں۔"

ہم نیچے پہنچ چکے تھے اور اپنی گاڑیوں کی طرف روانہ ہو رہے

تھے۔ اس وقت تک بلڈنگ کے کئی اپارٹمنٹس میں دو خبیثاں نظر

آننے لگی تھیں اور کچھ لوگ قدرے سستے سے سے انداز میں

کمر کیوں اور بالکنیوں سے جھانکتے بھی دکھائی دیے تھے پولیس

اور میرے ساتھیوں کی تمام تر خاموشی اور راز داری کے باوجود

بلڈنگ کے کینٹین کو احساس ہو چکا تھا کہ بلڈنگ میں کوئی بڑی

کارروائی جاری تھی۔

ہم سڑک پر آئے تو ٹریفک نے مجھ سے پوچھا "اب تو بد امت جلد

رہا ہو جائے گا؟"

"حقیقتاً۔" میں نے جواب دیا "میرے خیال میں اسے کل

چھٹکارا مل جانا چاہئے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ابھی رجم گل نے اس

کے خلاف چالان عدالت میں پیش نہیں کیا تھا ورنہ بڑی مگر بڑھتی۔

سب کے لئے انجینس کڑی ہو جاتیں۔"

لاچے لوگوں کی مرہون منت ہوئی ہے۔ وہ بھی دوسرے ان

کے انسانوں کی طرح ڈالتے ہوئے ہیں۔

اس کے باوجود جب کسی دن اچانک وہ ٹوٹے ہوئے کھولنے

کی طرح سامنے بڑے نظر آتے ہیں تو وہ ستون بھی ریت کے

پتھر کی طرح چٹختے نکلتے ہیں جو اس بار بھرم عمارت کو اپنے سر پہ

اٹائے کڑے ہوتے ہیں۔ شرافت علی بھی کرم بیک کی لاش دیکھ

کر کدم ہی ڈبے کھاتا۔

اسی اثنا میں ایسویٹس بھی آن پہنچی۔ رجم گل نے شرافت

علی کو پھٹکی لگوائی اور ذمہ گارڈز کو اسپتال بھجوانے کے لئے

شور و گلاہت دینے لگا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے

ہوئے کہا "مگر اب چلتے ہیں۔ ہمارا اب یہاں کوئی کام نہیں رہا۔

معاشرے کا کچھ بکرا اب تم لوگ میلو۔"

"مجھے تمہارے شخصی بیان کی ضرورت ہوگی۔" رجم گل

بولا۔

"ٹھیک ہے۔ کل کسی وقت مجھ سے اپائنٹ منٹ لے کر

آنا۔" میں بیان دینا نہ کرادوں گا۔ میں بہت نیک دل آدمی ہوں۔

پھر بے چارے تو میری سب سے بھی بہت تعاون کرتا ہوں۔ گھبراؤ

نہیں۔ میں کو شش کردوں گا کہ اس کیس میں تمہیں کچھ تھی بھی مل

جائے۔" میں نے شفقت آمیز انداز میں اس کا کدھ حاضرت کیا۔

اس نے پہلے اپنے ہاتھوں ویسوی کی طرف دیکھا کہ کوئی یہ

بانیس تو نہیں رہا تھا لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب

لفٹ کاموں میں مصروف تھے۔ بعض مصروف ہوتے ہوئے بھی

بہت مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تب رجم گل دانت نہیں کر بولا "تم کم از کم ایسے غناک

موجود ہو تو مجھ پر ہارو۔"

"یہ موقع تمہارے لئے غناک ہو گا۔ اگر کوئی نیک اور

شریف آدمی مرا ہوتا تو یہ موقع میرے لئے غم ناک ہوتا۔ غم اور

خوشی کے بارے میں بھی ہر ایک کا اپنا اپنا ایک زاویہ نظر ہوتا ہے

نہ۔" میں نے کہا۔

"موت کسی کی بھی ہو" اس پر افسوس کرنا چاہئے۔" وہ بچی

کواڑیں بولا۔

"اور۔۔۔ اس وقت تو تم بڑے نیک اور خالص لوگوں جیسی

باتیں کر رہے ہو۔ خیریت تو ہے؟ کیا تمہارے جسم میں کسی اور کی

لش داخل کر گئی ہے؟" میں نے شک بھری نظروں سے اس کا جائزہ

لیا۔

لاچک نہ بولا تو میں نے کہا "ویسے صورت حال کافی مختلف بھی

ہو سکتی تھی۔ کوئی ہیرہ نہیں تھا کہ جہاں کرم بیک کی لاش پڑی ہے

وہاں میری لاش پڑی ہوتی۔ بلکہ میں ممکن ہے بد امت دانتی کے

ہوٹل کے قریب میری اور ٹریفک کی لاش پڑی ہوتی۔ پھر تم کیا

کرتے؟"



انجام نہیں دی۔ اس میں میری اپنی بھی کچھ دلچسپی کچھ مصلحت اور کچھ نظریات کارفرما تھے۔ بڑی مشکل سے بات ان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اور وہ کچھ بڑے سکون ہوئے ہیں۔

”اس قسم کے کاموں میں اگر کبھی میری خدمات کی ضرورت پڑے تو میں بھی حاضر ہوں۔ میری ذات بخود شہرہ آفاق ہے اگر کبھی آپ کو ایسی کوئی بھی خوشی ہوگی۔“ زرتاج بولی۔

”یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”تمہارا پیشکش سے پہلے ہی میں نے تمہیں اپنے ساتھیوں میں شامل کر رکھا ہے۔ کسی بھی وقت، کسی بھی کام کے سلسلے میں جس میں چاہا وہاں آ جاؤ۔“

”مجھے تمہارے کسی کام آ کر خوشی ہوگی۔ میں آج کل خرا کچھ ناکامی محسوس کر رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”بہت تاخیر سے تمہیں اپنے ناکام ہونے کا احساس ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہی کیفیت ہے کہ ہر آدمی۔“ وہ تڑکی۔ تڑکی بولی ”میں لوگوں کو تو زندگی بھر ساری نہیں چلا کہ وہ اس دنیا میں بالکل مصروف ہیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا میرے ڈائریکٹ فون کی بجائے میں نے ریسیور اٹھایا۔ دو مری طرف راجیلہ تھی۔ میں جڑا ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یوں تو راجیلہ کا فون دیکر اوقات میں بھی آ رہی رہتا تھا۔ وہ لاہور میں ہیڈ آفس چلا رہی تھی اور ساتھ ہی میرے مندرجہ شدہ پتے کو بھی دوبارہ تحریر کر رہی تھی۔ اسے اکثر ہی مجھے راجیلہ کہنے کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن یہ بات تو گمراہی ہے کہ تھی کہ جب زرتاج میرے پاس پہنچی ہوئی تھی تب اس کا فون ضرور آتا تھا۔ اب تو واقعی میرا دل بھی اسے محض اتفاق سمجھنے چار نہیں ہوتا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یہاں ساتھ لا کر مجھے بچھٹانا نہیں پڑا۔ تم کافی باہمت عورت ثابت ہو گئیں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی ”یہ مت پوچھو کہ اس باہمت عورت کا انداز سے کیا حال ہے۔ میری باتیں ابھی تک کانپ رہی ہیں اور دل پٹنے کی طرح لرز رہا ہے۔“

”کچھ عرصے ہمارے ساتھ رہو گی تو یہ بیماریاں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ میں نے اسے قہقہہ دیا۔

شفیق شاد نے اپنی گاڑی میری گاڑی سے کچھ ہی دور کھڑی کی تھی۔ چند منٹ بعد ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

○●○

ایک ہفتے بعد۔ جبکہ یہ قصہ کافی پرانا ہوتا ہے۔ ایک دن ”حق“ میں اپنے آفس میں بیٹھا زرتاج کو بڑی تڑکی میں اس کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ زرتاج سے ملاقات کی دن بعد ہو رہی تھی اور وہ اس قہقہے کی تفصیلات سے واقف نہیں تھی۔

سب کچھ سننے کے بعد وہ حیرت سے بولی ”تم تو واقعی اس دھندے میں جمل نکلے ہو۔ اب تو میں ہی تمہارا یہ حال ہے تو اس کا مطلب ہے آگے چل کر کافی ترقی کر گئے۔“ پھر وہ کچھ فکر مند سی ہوئے ہوئے بولی ”لیکن اس قسم کے چکر میں تمہارے ساتھ خدا تمہارا ساتھ نہ کوئی اونچ نیچ بھی ہو سکتی ہے۔“

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ میں نے براہ الومک چیز کے پٹے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ”اونچ نیچ کا کیا ہے۔ وہ تو انسان کے ساتھ کسی بھی کام میں ہو سکتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو کوئی کام کے بغیر ہی کوئی اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ انسان کو جب کوئی اچھا اور تعمیری کام کرنے کے مواقع میسر ہوں تو اسے ضرور کرنا چاہئے۔“

زرتاج مسکراتے ہوئے بولی ”اور میرا خیال یہ ہے کہ انسان کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے لئے سو جواز ڈھونڈ لیتا ہے۔ خواہ کام اچھا ہو یا برا۔“

پھر وہ جلدی سے بولی ”یہ مت سمجھنا کہ میں اس کام کو برا کہہ رہی ہوں۔ یہ تو کسی بھی لحاظ سے برا نہیں ہے۔ اس سے تو تمہیں بھی فائدہ پہنچا۔ کچھ دوسرے لوگوں کو بھی اور معاشرے کو بھی۔“ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”نیلیم اور بہت دانت دانتی تو تمہارے بہت شکر گزار ہوں گے؟“

”ارے۔۔۔ کچھ مت پوچھو۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا ”ان کی شکرگزاری نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ شکرگزاری سے بھی میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ میرے ہونٹوں میں آکر غرور اور عجز کے خزانے انجام دینے لگیں۔ اور وہ بھی بغیر مجاہدہ کے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا ہے کہ یہ خدمت میں نے خواہشات ان کے لئے

### تاریخی ناول

|       |          |                      |
|-------|----------|----------------------|
| 100/- | قر تسکین | دنیا کے نامور فاتحین |
| 100/- | قر تسکین | شیر مصر              |
| 100/- | قر تسکین | شمشیر اسلام          |
| 100/- | قر تسکین | ترک مرد میدان        |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

لیجے میں بولی۔

”ہاں اب طبیعت کچھ بہتر معلوم ہو رہی ہے۔ اب بولو کیا بات ہے؟“ میں نے طمانیت سے کہا ”ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ مجھے تمہاری بیویانہ کڑکڑ زیادہ اچھی لگتی ہے۔“

”بیویانہ کڑکڑ سننے کی تو تمہیں حسرت ہی رہے گی۔ ویسے تمہاری مرضی ہے کہ گفتگو کو جو بھی نام دیتے رہو۔“ وہ اب نہایت ملاحت سے بولی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فصد کھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا ”میں تو تمہیں صرف یہ اطلاع دینا چاہ رہی تھی کہ کل یہاں تمہارے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سالانہ میٹنگ ہے اور اس میں تمہاری شرکت نہایت ضروری ہے۔ کئی اہم فیصلے ہونے ہیں جو تمہاری موجودگی کے بغیر نہیں کئے جاسکتے۔“

”ہیں۔ اتنی سی بات تھی؟“ میں نے بے پروائی سے کہا۔  
”تمہارا آنا بہت ضروری ہے۔“ اس نے ایک بار پھر گویا مجھے معاف کی اہمیت کا احساس دلایا۔  
”تو آجاؤ گے؟ حضور! ایسی کیا پریشانی ہے؟“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ راجیلہ بولی۔  
”تمہارے کان ہمیشہ سے کچھ بے اعتباری سے ہی چلے آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے اب تم کان تبدیل ہی کرالو۔ یہ کان کنوا کر خرگوش کے لگوالو۔ وہ دیکھنے میں بھی زیادہ خوب صورت لگیں گے۔“

”تم نے جو اپنی جینوئن ڈم کنوا کر گدھے کی لگوائی تھی اس کا کیا حال ہے؟“ وہ چل کر بولی۔  
”بالکل ٹھیک چل رہی ہے لوگ اب اسے ہی جینوئن سمجھتے ہیں۔“ میں نے ہلکا سا جواب دیا۔

”ہیں ٹھیک ہے۔ تو پھر کل اپنی ڈم سمیت لاہور پہنچ جاؤ۔ میٹنگ دوسرے کے کھانے کے بعد شروع ہوگی اور اس کا اختتام شہر معمول ڈیز پر ہوگا۔ اور ہاں۔۔۔ سیدھے لاہور ہی آنا۔ راستے میں کوئی ٹوکی نظر آجائے تو ڈم ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے کہیں اور نہ پہنچ جانا۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ڈم ہلانے والا جانوروں کا ہونا ہے۔ میری ڈم تو ویسے بھی تمہارے سوا کسی کو کچھ کر پڑتی ہی نہیں ہے۔ میں بھلا کسی اور کے پیچھے کہاں جاسکتا ہوں۔“ میں نے دردناک لیجے میں کہا۔

”جھوٹ بولنے میں بھلا تمہیں کون شکست دے سکتا ہے۔ سب جاننے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے لٹنڈورے ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تمہاری جینوئن ڈم ہرڑکی کے پیچھے چل مل کر بوسیدہ ہو کر ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ بہر حال میں اس سلسلے میں اب مزید کچھ اس سنا نہیں چاہتی۔ کل زیادہ سے زیادہ دو بجے تک تمہیں لاہور میں ہونا چاہئے۔“ اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے مسکرا کر زرتاج کی طرف دیکھا اور دو فوراً سمجھ گئی کہ منی کا تھا۔ اس اتفاق پر اسے بھی حیرت ہوئی تھی۔ راجیلہ بولی ”اے کراچی میں تمہارا بہت ہی دل لگ گیا ہے؟“  
”یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟“ میں نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے

”جہاں سے دن ہوئے تمہیں وہاں بیٹھے ہوئے اس دوران میں بار بھی تم نے لاہور کا چکر نہیں لگایا۔ کبھی فون تک نہیں لگے۔ جب بھی کرتی ہوں میں ہی کرتی ہوں۔ لگتا ہے یہاں کے لڑکی تو تمہیں کوئی قدر ہی نہیں ہے۔“  
”وہاں کے بڑسی کی فکر کرنے کے لئے تمہیں وہاں چھوڑا ہوا ہے۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟“ میں نے خوشگوار لیجے میں

”لیکن شاید تم بھول گئے ہو کہ تمہارا ہیڈ آفس یہاں ہے اور لی کی اہمیت کراچی آفس سے کہیں زیادہ ہے۔ سال میں کم از کم پسپا ہو کر تمہارا یہاں ہونا ناگزیر ہے۔“ وہ بولی۔

”جی جی تم بیویوں کی طرح کڑکڑ مت کرو اور ایک باصلاحیت پریزنٹ ڈائریکٹر کی طرح سیدھے سلیس اور ڈائریکٹراںہ انداز میں انوکھ مسئلہ کیا ہے۔“ میں ایک بار پھر زرتاج کی طرف دیکھ کر کرا لیا لیکن اب وہ کچھ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا ذہن گویا نہیں دور تھا۔

”جیہاں کی طرح کڑکڑ کرتی ہے میری جوتی۔“ راجیلہ چل کر اٹھ گئی۔  
”یہ تو تم نے اور بھی زیادہ بیویانہ مکالمہ بولا ہے۔“ میں نے ات کاٹے ہوئے کہا۔

”تم بہت ہی غیبت ہو۔“ اس کے لیجے میں جلدی شکست خوردگی ٹھٹھکی تھی ”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تمہیں فون ہی نہیں لیا کھل گیا۔ یہ تمہارا ڈیز ہے۔ جب تمہیں ہی اس کی فکر نہیں ہے تو مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔“

”یہ تو اور بھی زیادہ بیویانہ انداز ہے۔ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے راجیلہ؟“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ”آخر تم کیوں بھول جاتی ہو کہ تمہارا مقام اور مرتبہ کچھ اور ہے۔“  
”تم نہیں کیا میرا مقام اور مرتبہ۔“ وہ جھٹکا کر بولی۔

”کئی چیز کو تم بھاڑ میں بھیج رہی ہو کسی کو جہنم میں۔ اور تمہارے الفاظ سے بھی کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے تم نے انکسے چارے رکے ہیں۔ آخر قصہ کیا ہے؟ کیا لاہور میں بہت زیادہ گرمی پڑ رہی ہے۔ یا تم نے غلطی سے نیم چڑھا کر پٹا پکا کر کھالیا ہے؟“

”میں نے تو آرام سے بات شروع کی تھی۔ تم ہی انسان کو غصہ دلا دیتے ہو۔“ وہ گویا عکس عملی تبدیل کرتے ہوئے ذرا نرم

لازوال کتابوں کے خالق

انوار صدیقی

کا ایک پراسرار ایڈیٹر نجل

برہمچاری

قیمت: -/150 روپے



اردو بازار لاہور

میں نے ریسیور رکھ کر ذرا تاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں اب اس بات کو کھن افاق کھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"  
"کس بات کو؟" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔  
"یہ کہ جب تم یہاں ہو تو راجہ کا فون آجاتا ہے۔ اسے ضرور ٹیٹا جیٹی کے ذریعے پتا چل جاتا ہے۔" میں نے کچھ یقین اور کچھ بے یقینی سے کہا۔

"لیکن اس بار اس نے میرا کوئی ذکر تو نہیں کیا۔" ذرا تاج بولی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ گفتگو میں اس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔

"ذکر تو نہیں کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے اس کا ذہن تمہارے خیال سے خالی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ وہ شاید اس موضوع پر کوئی اظہار خیال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یکدم اس کے چہرے اور لہجے کی شکل کئی کم ہو گئی تھی۔ اس لمحے کی طرح جو چند لمحوں پہلے تک زیادہ دلچسپ سے جھگڑا تھا لیکن اب وہ بیچ کم ہونے کی وجہ سے یکدم بدمزاج ہو گیا تھا۔

"میں صبح لاہور جا رہا ہوں۔" میں نے اسے مطلع کیا۔  
"غیر بہت؟ کوئی ایمر جیسی آن پڑی کیا؟" اس نے دیکھے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ اسے ایمر جیسی تو نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن راجہ نے مجھے اطلاع عین وقت پر دی ہے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سالانہ میٹنگ ہے جس میں میری شرکت ضروری ہوتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"تب تک واپس آجاؤ گے؟" اس نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اگر کوئی اور ضروری کام نہ نکل آیا تو پرسوں لوٹ آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے فون کرنا۔ میں تمہیں لینے ان پورٹ آجاؤں گی۔ اپنے آدمیوں کو ذمہ مت دنا۔ مجھے ان پورٹ پر کسی کو ریسیور کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔" اس کے لہجے میں ایک لمحے کے لئے فوخی لڑکیوں کی سی معصومیت جھلک آئی۔

"کسی کو بھی ریسیور کرنا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔  
"ہاں کسی کو بھی ریسیور کرنا۔" اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"پھر تو یہ میرے لئے کوئی اعزاز کی بات نہ ہوگی۔" میں نے ذرا مایوسی سے کہا۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ ہر بات میں اپنے لئے اعزاز تلاش کیا کر؟" اس کی مسکراہٹ میں ہلکی سی شرارت جھلک آئی۔

"دراصل زندگی میں بہت کچھ غیر متوقع سے اعزاز میں مل گیا ہے۔ شاید اس لئے کچھ خوش فہم سا ہوتا جا رہا ہوں۔"

"یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ابھی سے اپنا علاج کرتے رہے۔"

"میرے خود تو اپنا علاج نہیں کر سکتا۔ اور جو معائنے لگے آ رہے ہیں وہ سب کے سب گئے ہیں۔" میں نے افسردہ سر ہلاتے ہوئے کہا "میری دائیں ٹانگ میں تکلیف ہوتی ہے بائیں پر پلستر باندھ دیتے ہیں۔ اوپر کی داڑھ میں درد ہوتا ہے کی داڑھ نکال دیتے ہیں۔ میں درد دل کی بات کرتا ہوں یا بھیڑیوں کا علاج کرنے لگتے ہیں۔ کچھ میں نہیں آتا میں کیا کیاں جاؤں۔"

"تم کہیں بھی بہت جاؤ۔ فی الحال میں جاتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوئی۔

"کیا تمہیں کسی کو ان پورٹ پر صرف ریسیور کر کے خوش ہے۔ سی آف کرنا اچھا نہیں لگتا؟" میں نے پوچھا۔

"سی آف کرنا تو اس کو دینے والا کام ہے۔ اس میں ہونے یا اچھا لگنے والی کوئی بات ہے؟ میں تمہیں چھوڑنے جاسکتی۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"میں تو صرف ایک دن کے لئے لاہور جا رہا ہوں۔ کھانا وغیرہ کر کے سمندر پار تو نہیں جا رہا۔" میں نے دلیل دی۔

"کچھ بھی ہو۔ میں سی آف کرنے نہیں جاؤں گی۔" وہ فیصلہ بنایا۔

"اچھا بابا۔ تمہاری مرضی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "سی آف کرنے مت جانا لیکن میں ورنہ اسے تک نہیں آئے کرنے چاہوں۔"

ہم باتیں کرتے پارنگ لائٹ تک جا پہنچے اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ کینٹ کے علاقے میں راجت ٹیکری والے چوک پر ٹکٹل بند تھا۔ ٹوٹی نے گاڑی روک لی۔ ان پورٹ کی طرف سے آنے والا کافی ٹریفک ہمارے دائیں بائیں موجود تھا۔ میں ٹوٹی کے برابر ہی پیپر سیٹ پر موجود تھا اور اس سے دفتری معاملات کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے گاڑی کے رنگین شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

اچانک میری نظر اپنے برابر رکی ہوئی گاڑی کی ڈرائیو سیک سیٹ پر پڑی۔ اس گاڑی میں صرف ڈرائیو ری موجود تھا لیکن وہ ڈرائیو ر کے بجائے خانساں کی دودھی میں نظر آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے سر پر خانساں والی لوپن سی سفید ٹوپی بھی موجود تھی جبکہ اس کا ہاتھ بھی پیٹھے خاصا لبا تھا جس کی وجہ سے ٹوپی گاڑی کی بھت کو چھو رہی تھی۔

اسی لمحے اس نے بھی گردن ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ ہماری گاڑی کے شیشے تو پینڈو تھے اس لئے وہ مجھے صاف طور پر نہیں دیکھ

اس کے ساتھ باہر جاتے وقت میں نے راستے میں امبر کے لمبے لمبے رک کر اسے ہدایت کی کہ وہ میرے لئے صبح کی کسی پائٹل میں لاہور کے لئے ہنگ کرادے۔

امبر نے جرت اٹھتے بھرتی دکھائی۔ یا پھر شاید یہ ہمارے نپولین کی مستعدی تھی کہ میری داہنی تک میری سیٹ تک ہو چکی تھی۔ میں زور ناک کر پارنگ لائٹ تک چھوڑنے چلا گیا تھا۔ وہ اپنی بیکر میں بیٹھنے لگی تو مجھے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ بولی "تم لاہور سے ابھی آؤ گے تو میں تمہیں ایک عورت سے ملا دوں گی۔"

بہت مت شکریہ۔ کتنی اچھی ہو گئی ہو تم۔" میں نے انتہائی کمزورانہ لمحے میں کہا "کیا عمر ہے اس عورت کی اور کیا وہ سناری ہی طرح خوب صورت ہے؟"

اس نے شے سے مجھے گھورا مگر ٹھہرے ٹھہرے لمحے میں بولی "اوہ ایک اوجڑ مرہوہ ہے اور عام سی شکل صورت کی مالک ہے۔" "اوہ" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا "اب میری یہ وقت رہ گئی ہے کہ میں اوجڑ مرہوہ اس سے ملا دوں؟"

"تمہاری تو یہ اوقات بھی نہیں ہے۔" زور تاج بولی "یہ تو میری مہمانی ہے کہ میں تمہیں اس سے ملادوں گی۔ میری اس سے ملاقات ڈیڑھ گھنٹے کی ایک گھنٹے خاص گھنٹے ہی قریب میں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے وہ بھی ایک کیس ہے جو تمہارے لئے خاصا دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے۔ اب تم نے باقاعدہ طور پر ایسے کاموں میں دلچسپی اٹھانا شروع کر دی ہے تو ایک کام یہ بھی سہی۔ تم لاہور سے واپس آ جاؤ تو میں اس کی مزید تفصیلات معلوم کر کے تمہیں بتاؤں گی۔"

"بہت بہت۔" میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا اور وہ بیچرو میں بیٹھ کر رخصت ہو گئی۔

میں واپس آیا تو امبر نے بتایا کہ صبح ساڑھے نو بجے والی فلائٹ پر میری سیٹ تک ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی اور نپولین ایجنٹ کی مستعدی کی دہائی اور اسے ہدایت کی کہ وہ لاہور آؤں گا میری آمد کی اطلاع دے دے تاکہ ان پورٹ پر کوئی مجھے لینے آجائے۔

"دوسرے روز میں گیارہ بجے لاہور پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ راجہ مجھے لینے آئی ہوگی لیکن ان پورٹ پر ٹوٹی موجود تھا۔ وہ مگر کوشی سے مجھ سے گلے ملنے ہوئے بولا "سرا کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے رسول بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔"

"حالا کھ میں کراچی میں چند ماہ کا بی عرصہ گزار کر آیا ہوں اور اس دوران میں بھی میرا ایک آدمہ چکر لگا ہے۔" میں نے اس کے ہاتھوں کے آگے شیشے سے آزاد ہوتے ہوئے کہا۔

"تھر بھی میرا یہاں آپ کی بہت کی محسوس ہوتی ہے۔" وہ براہ راست کہنے لگا "پارنگ لائٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "طلوعی میں اپنے عرصے کے لئے یہاں ڈیرا لے آؤں گا۔" محمد نے کہا اسے سہل دی۔

## غیر ملکی زبانیں سیکھئے

مصنف: پروفیسر ایم اشرف

- کورین اردو ریڈر 80/-
- رشین اردو ریڈر 80/-
- رشین فرہنگ 75/-
- چائنز اردو ریڈر 80/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

## فرنچ اردو ریڈر

پروفیسر محمد اشرف قیمت: 90/-

## اے حمید کی ایدو پنچر سیریز

### عاطون

- ۱۔ اہرام مصر سے قرار 50/-
- ۲۔ اندلس کی آخری شمع 25/-
- ۳۔ ٹرپہ کی ناگن 125/-
- ۴۔ عاطون موت کے دروازے پر 100/-

### شیپوسینا کے دہشت گرد

- ۱۔ ٹاپ بیکرٹ مشن 150/-
- ۲۔ کشمیر کے غازی 150/-
- ۳۔ کمانڈو ایکشن 200/-
- ۴۔ گولکنڈہ کے مجاہد 200/-

- گنگا کے سچاری ناگ (ادل) 150/-
- گنگا کے سچاری ناگ (دوئم) 200/-

### مکتبہ القریش

اردو بازار، لاہور

فون : 7224665

سکا تھا لیکن میں اسے صاف طور پر دیکھ رہا تھا وہ طوطے کی چوچ بھی تاک والا ایک سیاہ فام شخص تھا سفید لمبی ٹوپی اور سفید بٹن کوٹ کے درمیان اس کا استخوانی سیاہ چہرہ ایک عجیب سا تضاد پیش کر رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے منہ پھیر کر گاڑی آگے رجھادی کیونکہ گٹل گٹل چکا تھا لیکن اس چہرے کو دیکھ کر میرے ذہن میں کوئی سرخ تخی چلتے بچنے لگی تھی۔ ٹوٹی ہوئے اطمینان سے دھیمی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا جبکہ وہ خانہ سالن نما ڈرائیور یا تھوڑا خانہ سالن الٹی بڑی سی پرانی ہنڈا سوک میں گاڑی آگے نکل چکا تھا۔

میرا ذہن اس کی صورت میں ایک چکا تھا اور میں ٹوٹی سے بات کرنا بھول گیا تھا۔ عین اس وقت جب وہ گاڑی گاڑی آگے ایک موڑ پر پائین طرف مڑتے وقت میری نظر سے اوجھل ہو رہی تھی تو میرے ذہن میں چھٹا کا سا ہوا۔

مجھے یاد آگیا تھا کہ وہ شخص کون تھا۔ یاد آنے میں تاخیر اس لئے ہوئی تھی کہ میں اس وقت اس شہر میں تھا۔ اس جگہ۔ اس محلے میں اس شخص کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ ڈاکٹر بنا رہا تھا!

میں نے بے اختیار ٹوٹی کا کندھا چا کر اس طرح ہلایا کہ اس کے ہاتھوں میں اسٹیرنگ وکیل بھی ہل گیا اور گاڑی ایک لمحے کے لیے بری طرح ہلرائی۔ قیمت تھا کہ کسی کو ساڑھ نہیں لگی تھی۔

ٹوٹی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔ "ٹوٹی! تم نے وہ گاڑی دیکھی" میں نے موڑ کی طرف اشارہ کیا جہاں اب اس گاڑی کا نام و نشان بھی نہیں تھا البتہ دوسری کئی گاڑیاں چالی و کھائی دے رہی تھیں۔

"کون سی گاڑی سر؟" اس نے وضاحت چاہی اور رفتار کچھ اور کم کر دی۔

"سفید رنگ کی وہ پرانی ہنڈا سوک جو اس موڑ پر قابض ہوئی ہے۔" میں نے اشارہ کیا "رفتار بڑھاؤ اور جیڑی سے اس کا تعاقب کرو۔"

اس نے شاید اس گاڑی پر توجہ نہیں دی تھی تاہم اس نے رفتار بڑھا دی اور پچھلی گاڑیوں کی پروا کیے بغیر چند لمحے بعد موڑ کاٹا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ برنامہ ہماری گاڑی کے تاریک پیشوں کی وجہ سے مجھے نہیں دیکھ سکا ہو گا اس لیے وہ بروقت خطرے سے آگاہ نہیں ہو سکے گا اور اسے آخر سے تعاقب کا احساس ہو گا۔

ٹوٹی نے فوری طور پر میری ہدایت پر عمل شروع کر دیا تھا لیکن اس کا ذہن اصل کام کی طرف سے بھی نہیں ہٹا تھا۔ اسے احساس

ایا تھا کہ کوئی ناپاکر شروع ہوئے گا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔

مٹلے میں تھا۔ سر اونی سفید ٹوٹی تھی۔  
"ہاں۔۔۔۔۔ ہاں مجھے یاد آگیا۔" ٹوٹی جلدی سے بولا۔ "لیکن سر اودھ تو سیاہ نام تھا۔"

"سر اودھ سالانہ میٹنگ۔۔۔۔۔"  
"سے یاد آ رہا نہیں تھی میٹنگ۔" میں نے۔ پوچھا۔ "تو اس وقت جو آئی مجھے نظر آیا ہے اسے پکڑنے کے لیے میں اس سالانہ میٹنگ میں منع کر سکتا ہوں۔" پھر میں نے اضافہ کیا۔  
"لیکن انیسویں کے میں بڑا دل سال تک زندہ نہیں رہوں گا۔"  
"گڈی موڈ نکلت کر والٹن کی طرف جانے والی سڑک پر آگئی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا کہ اس سڑک پر دور دور تک اس لمحہ گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ کیا ڈاکٹر برناڑ نے تاریک پیشوں کے وجود مجھے دیکھ لیا تھا؟ اس صورت میں تو اس نے تقریبی طور پر کی طرح گاڑی سمجھائی ہوئی اور اس کا ہاتھ آنا بہت مشکل تھا۔

ٹوٹی نے بھی دیکھ لیا تھا کہ اس سڑک پر کوئی سفید گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے قدرے ابھرنے لگے میں پوچھا۔ "سر! اس گاڑی میں تھا کون؟ کیا کوئی بہت اہم آدمی ہے جسے پکڑنا ضروری ہے؟"

"میرا خیال ہے جس میں بتایا ہوں تاکہ تمہارے جسم میں بھی کرنٹ دوڑ جائے۔" میں نے اودھ اور دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس گاڑی میں ڈاکٹر برناڑ تھا جسے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں نہ جانے کتنی انگلیں تلاش کر رہی ہیں مگر ابھی تک اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ آج خوش قسمتی سے وہ نظر آئی گیا ہے تو اسے قایم نہیں ہونا چاہیے۔"

میرا اعتماد صحیح تھا۔ ٹوٹی کے جسم میں واقعی کرنٹ سا دوڑ گیا ہو گا کیوں کہ میں نے محسوس کیا اسے جھٹکا سا تھا اور اس نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھادی تھی۔ ٹوٹی کو بھی بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر برناڑ کون تھا اور میں اس کی کیوں تلاش تھی۔ ہانسی ہے قاعدہ ہی تنظیم "دی سرکل" جن جن لوگوں پر مشتمل تھا وہ بھی اپنی اپنی جگہ برناڑ کی تلاش کے سلسلے میں اپنے کردار پیش کرتے ہوئے تھے۔

میری جہاں تک بھی رسائی تھی اور میرے اپنے جتنے بھی وسائل تھے ان سب کو میں ایک عرصے سے ڈاکٹر برناڑ کی تلاش کے سلسلے میں استعمال کر رہا تھا لیکن قسمت یاوری نہیں کر رہی تھی۔ آج جب کہ میرے دوہم مکان میں بھی نہیں تھا تو مجھے اس کی جھگ نظر آئی تھی مگر وہ ایک داہے کی طرح قایم ہو گیا تھا۔

ٹوٹی بولا۔ "اب مجھے یاد آ رہا ہے ہمارے بائیں طرف جو گاڑی کوئی شخص نے اس کے رنگ وغیرہ کی طرف توجہ نہیں دی تھی لیکن اس کی ڈرائیگ میں سیٹ پر مجھے کوئی غلط قسم کی شخصیت دکھائی دلی تھی۔"

"نظر نہیں ٹھیک۔" میں نے حجب کی۔ "وہ خانا ماہی والے

میں نے کراہ کر کہا۔ "تم بھول رہے ہو وہ سرے تمام ساتھیوں کی طرح جنہیں بھی اطلاع دی گئی تھی کہ ڈاکٹر برناڑ کی تلاش کے سلسلے میں نظر رکھتے وقت رکعت کو اہمیت نہ دی جائے رکعت تبدیل کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے تاہم میرے خیال میں وہ اپنی رکعت اس طرح کے انداز میں تبدیل نہیں کرنا جس طرح اس نے راجیلہ کا اوجھا چوسایا کیا ہے۔ اپنی رکعت وہ غالباً عارضی بنیادوں پر تبدیل کرنا ہے۔ تاہم پچھل مرتبہ جب وہ مجھے کراچی کے ایک جزیرے پر مقامی رسوائی کے روپ میں دعوتی داسٹک میں نظر آیا تھا تو اس وقت بھی وہ تقریباً سیاہ نام ہی بنا ہوا تھا۔ وہ کوئی بہت پرانا جلدی پیشی قسم کا کمرائی نظر آ رہا تھا۔ اب بھی اس کی رکعت تقریباً ویسی ہی تھی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر شبہ نہیں کر سکتا کہ وہ سفید نام ہوگا۔"

اب ہم دور اسے پہنچ چکے تھے۔ بائیں طرف سڑک والٹن ہی کی طرف جاری تھی لیکن دائیں طرف ذرا آگے مزید ٹم کھانے کے بعد کیو لری گراؤنڈ کی طرف جاری تھی۔ ہمیں اب فیصلہ کرنا تھا کہ کس طرف جانا چاہیے۔

بائیں طرف کی سڑک تو دور تک صاف نظر آ رہی تھی۔ اس پر کسی سفید گاڑی کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ دائیں طرف کی سڑک کا منظر ہم دور تک نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ میں نے اسی پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ تاہم یہ شخص اندر سے میں سمجھتا ہوں ہی کے حروف تھا۔

اس سڑک پر بھی اگلا موڑ ملنے کے بعد ہم کیو لری گراؤنڈ کی طرف نکل آئے مگر سفید گاڑی کیس نظر نہ آئی۔ سڑک دور تک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے ٹوٹی سے کہا۔ "مگر ڈاکٹر برناڑ واقعی اس طرح جھٹک دکھا کر نکل گیا تو میرے دل میں زندگی بھر کے لیے غلطی نہ جائے گی۔ شاید میرے لیے راتوں کو سونا مشکل ہو جائے۔"

وہ ایک ٹم دار سی سڑک تھی۔ دائیں طرف میدان میں کچھ لوگ ورزش اور پلے کر رہے تھے۔ ٹوٹی اودھ اور دیکھتے ہوئے پُر خیال لیجے میں بولا۔ "سر! ہم غلطی کر رہے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ "گاڑی وہاں سوڑ ہو چکے تھے بھی ابھی خیال آیا ہے کہ اتنی جلدی وہ اتنی دور نہیں نکل سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ وہ چوکنا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ یقیناً راستے میں کسی گھر میں داخل ہوا ہے۔ ہم خواہ مخواہ اتنی دور نکل آئے۔"

ٹوٹی نے گاڑی واپس سوڑی اور ہم اسی سڑک پر آگئے جس پر

ہمارے اندازے کے مطابق ڈاکٹر برنارڈ کسی گھر میں داخل ہوا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس سڑک پر بہت سے مکان تھے۔ سب ہی سڑک سے کافی ہٹ کر درختوں کی قطاروں کے عقب میں تھے اور تقریباً سب ہی کے گیٹ بند تھے۔

بہرحال ہم نے گاڑی کےچے میں اتار کر اسے درختوں سے بچاتے ہوئے پورے اوجھر پر گیٹ کی چھری وغیرہ سے جھانکنا شروع کیا کہ شاید کسی کو طعنی کے پوسج میں سفید گاڑی کی جھلک نظر آجائے۔ ایک گیٹ کا کچھ حصہ ہٹکا تھا تھا۔ اس کے عقب میں ہمیں ایک سفید گاڑی کی جھلک نظر آئی۔

ٹوٹی نے فوراً گاڑی روکی اور میں نے اس گیٹ پر جا کر باقاعدہ روک کی سی حالت میں جاتے ہوئے اندر جھانکا۔ وہ گاڑی سفید ضرور تھی مگر پرانی سوک نہیں تھی۔ اس وقت اگر کوئی ہماری طرف توجہ دیتا تو شاید یہی سمجھتا کہ ہم معززانہ سٹیلے اور معززانہ گاڑی میں ضرور تھے۔ لیکن یقیناً کسی واردات پر غلط ہوئے تھے۔ ہماری حرکات و سکنات سخت مشکوک تھیں مگر اچھی بات یہ تھی کہ اس سڑک پر تقریباً ستائیس تھا۔ لاکھ گاڑیاں گزرتی نظر آ رہی تھیں۔

ہم نے گاڑی چھوڑ کر پیدل ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ میں سڑک کی ایک طرف اور ٹوٹی دوسری طرف پر گیٹ سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں ہم کافی دور تک پہلے آئے۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ کسی کو بھی کےچے پر کیدار کی نظر ہم پر نہیں پڑی اور اس نے ہماری گردن نہانے کی کوشش نہیں کی۔

چانک ایک گیٹ کی ایک سائڈ سے جھانکتے ہوئے میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس گھر کے پوسج میں وہ سفید گاڑی کھڑی تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس میں کوئی نہیں تھا بلکہ ہمارے گھر پر ہی دیرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس گھر میں چوکیدار بھی نہیں تھا۔

میں نے جلدی سے اشارہ کر کے ٹوٹی کو اپنے قریب بلایا اور نیچے آواز میں اسے بتایا کہ مطالبہ گاڑی، نظر آگئی تھی۔ پھر میں نے اسے دہرایت کی کہ وہ اپنی گاڑی وہیں لے آئے۔ وہ چپے کی طرح بے آواز قدموں سے دوڑتا ہوا گیا اور چند سیکنڈ میں گاڑی لے کر آگیا۔ گاڑی اس نے گیٹ کے سامنے اس طرح کھڑی کر دی کہ اندر سے نکلنے والی کوئی گاڑی نہ گزر سکے۔

وہ گاڑی سے اتر گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ گیٹ خامسا اور چھٹا تھا اور صرف گیٹ پر ہی نہیں بلکہ چار دیواری پر بھی تھرو لاکو کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ویسے تو ان سب باتوں کے باوجود میرے اور ٹوٹی کے لئے گیٹ با دیوار پتلا تک جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن میں نے یہی سوچا کہ شاید قسمت مزید ساتھ دے اور ہمارا مقصد سیدھے طریقے سے ہی پورا ہو جائے۔

نکل جانے کے بعد میں نے اور ٹوٹی نے گیٹ کی سائڈوں سے

معروف مصنف

ایم اے راحت کا پر اسرار ایڈیٹر

ناول

طلسم زادہ

جلد اول :- 150 جلد دوم :- 150



اردو بازار لاہور

ناک جھانک بند کر دی۔ کوئی ہماری یہ حرکت دیکھ سکا تھا۔ دسکون سے کسی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ہمارے ہاتھ بیڑا اپنی اپنی گن کے دھتے پر تھے۔ میں ممکن تھا کہ گیٹ کھولے ڈاکٹر برنارڈ ہی ہوتا۔

چند لمبے بعد بھٹی گیٹ کھلا اور اس کے عقب سے پہلے ایک اور حیرت برآمد ہوئی۔ وہ موٹے موٹے عدرسوں کی جگہ ایک ہوش سالوچوان قابو دراز قد اور صحت مند ہونے کے لیے جھول نظر آ رہا تھا۔ اس کے لیے ہتھکڑیاں بال بکھرے ہوئے تھیں۔ ایک ناک کی نوک پر پھٹی ہوئی تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا اور چہرہ حفاض کے ڈوگرے برس پہلے تھے۔ وہ سیلیپک سوٹ کما بیڑوں میں ہوائی چپل تھی۔

میں نے پہلی نظر میں ہی اسے پہچان لیا۔ وہ وہم احمد تھا۔ نہایت احمق نظر آتے والے وہ سالوچوان میرا پرانا شاگرد تھا۔ میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ بی بی اے احمق تھا یا اس کے ذہانت اور چالاک کی حماقت کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ طویل عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور میں نے تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد تھا وہ اندرون شہر کسی پرانے اور مخمجان علاقے میں رہتا تھا۔ اس کا مرحوم باپ چھوٹا سا صنعت کار اور اپنی وراثت وغیرہ حاصل کرنے کے عزم میں وہ میرا شکر گزار

ما ملانی مد تک اس کے حالات سے آگاہ تھا لیکن اس وقت میرے  
 ان میں درد و رنج اس کا خیال نہیں تھا اور میں سوچ بھی نہیں  
 سکتا تھا کہ اس کو کسی سے دور رکھ دیا جائے گا۔ یہ خاصا سنگین علاقہ تھا  
 اور جس کو کسی سے دور رکھا تھا وہ بھی خاصی تنگی دکھائی دے رہی  
 تھی۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ اس کی اوقات سے زیادہ تھا۔  
 اسے دیکھ کر میں اتنا حیران ہوا کہ واقعی طور پر ڈاکٹر برٹراڈ کو  
 بھول گیا۔ اس کے بعد خود سہرا احمد نے مجھے کافی کچھ بھلا دیا۔ اس  
 نے اپنی پہلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ سوئے ہوئے سول کے عقب میں  
 اس کی آنکھیں اور بھی زیادہ پٹی پٹی دکھائی دے رہی تھیں۔  
 دوسرے ہی لمحے وہ مجھے پہچان کر بیک وقت اذو اور باجیس  
 پھلائے ہوئے یوں میری طرف لپکا جیسے مجھے کوئی اٹھا کر جذبات  
 کی شدت میں نیند پر دے بارے کا لیکن میرا چونکہ اپنی جگہ سے  
 بچنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے وہ مجھ سے لپٹ کر لپکا لیکن زور لگا  
 کر دیا۔ میں نے جہش نہیں کی۔

وہ اپنا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ میں اگر حیرت زدہ نہ ہوتا تو اسے  
 اس حد تک بھی بے تکلفی کی اجازت نہ دیتا کہ وہ یوں اکتوں کی  
 طرح مجھ سے لپٹ جاتا۔

”مر۔۔۔۔۔“ اس نے یوں دونوں ہاتھ پھیلائے  
 گویا میری شان میں کوئی قصیدہ پڑھنے کے لیے اشارت لے رہا  
 ہو۔ ”آپ تو چاند کی عین۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے عید کا چاند  
 ہو گئے ہیں۔ میں تو کئی بار آپ سے ملنے کے لیے آپ کے آفس بھی  
 گیا لیکن آپ کے آفس والے مجھے لفٹ ہی نہیں کرائے۔ آپ  
 کے بارے میں میری طرح کچھ بتاتے ہی نہیں ہیں کہ آپ سے  
 کب نکال اور کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے۔ آپ انہیں بتاتے  
 کیل نہیں ہیں کہ میرے اور آپ کے تعلقات کتنے گہرے ہیں اور  
 تم کس زمانے سے ایک دوسرے کے دوست چلے آ رہے ہیں۔“

وہ کچھ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ناشہ قار سے میرا دوست  
 چلا آ رہا تھا۔ انہی دنوں اس سے میری شگنائی اتنی پرانی نہیں تھی۔  
 ہٹنا وہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا دوسرے یہ ابھی تک محض  
 شگنائی ہی تھی۔ میں آج تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے اپنے  
 دوستوں میں شمار کروں یا نہیں؟ کبھی اتنی سہرا احمد کی غور کرنے کی  
 محنت ہی نہیں لی تھی۔ تاہم وہ ایک دلچسپ کردار تھا۔ میں اس کی  
 ذات میں دلچسپی محسوس کرتا تھا اور اس کے بارے میں کسی حد تک  
 جنس میں بھی جھٹا تھا۔

”دراصل آفس والوں کو میں نے خود ہی منع کیا ہوا ہے کہ  
 مجھے بارے میں کسی کو بھی صحیح معلومات نہ دلا کریں۔“ میں نے  
 معذرت فرمادے سے لہجے میں کہا۔  
 ”تو کیوں سر؟“ اس نے گول گول آنکھیں چھائی۔  
 ”ہیں۔۔۔۔۔ حالات ہی کچھ ایسے ہیں“ میں نے گول مول  
 جواب دے کر اسے ہانپنے کی کوشش کی۔

”سہرا آپ کے حالات بیشہ کچھ خطرناک سے ہی رہتے ہیں۔  
 آپ کوئی کچھ پراسرار سے ہیں۔“ اس نے یوں قہقہہ لگایا جیسے کوئی  
 زوردار لطیفہ سنایا ہو۔ صرف یہی نہیں اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ  
 مارنے کے لیے ہاتھ بھی اونچا کر لیا۔ مجھ پر ہاتھ آگے کرنا پڑا۔  
 میں اس وقت اس کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا تھا۔  
 میری آنکھ جھٹکے کے پاس ہی گئی ہوئی تھی تاہم مجھے اطمینان تھا  
 کہ سفید گاڑی پورچ میں موجود کسی تو وہ غیبت ڈاکٹر برٹراڈ بھی اندر  
 ہی موجود تھا۔ میں دوسرے سے اطمینان سے اس کے بارے میں بات  
 کرنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا ان دونوں کے درمیان کیا  
 تعلق تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل  
 جائے جسے سن کر وہ سہرا بدک جائے۔

”خیر۔۔۔۔۔ میری پراسراریت کو چھوڑو۔ تم خود مجھ سے کہیں  
 زیادہ پراسرار آدمی ہو۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ یہ گویا اس  
 کے لیے تفریحی الفاظ تھے اس نے خوش دلی سے ایک قہقہہ لگایا۔  
 میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی دیکھ لونا کہ  
 آخری مرتبہ میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو تم کرشن ٹکڑ میں کہیں  
 رہتے تھے۔ تمہارے پاس پرانی سی ایک ٹوکسی تھی۔ آج ڈینس  
 میں ٹکڑ آ رہے ہو۔ پورچ میں دو مشعل گائیاں بھی کھڑی ہیں۔ کیا  
 پکڑے؟ کہیں باہر کے پکڑے تو نہیں لگائے شروع کر دیے؟ کوئی  
 پاؤڈر وغیرہ کی کٹائی۔۔۔۔۔؟“

اس نے گویا پٹنے ہوئے دہرے ہوئے کا ارادہ کیا لیکن پھر  
 ہلکی کرکٹ تاہم اس کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ گئے۔ اس نے اپنی  
 مونے مونے شیشوں والی ٹیک آئار کر آنکھیں پونچھیں پھر ٹیک  
 دوبارہ تاک پر جھانپے ہوئے بولا۔ ”آپ بھی برا شیشہ خاں کرتے  
 ہیں افضل بھائی! میں تو گاڑی میں۔۔۔۔۔ پاؤڈر کا ڈالنا ہے ہوئے  
 ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی اسے بھی دوسرا پاؤڈر سمجھ کر نہ دھر لے۔  
 مانجھ اس خوف سے جب میں نہیں رکھتا کہ کہیں آتش گیر مادہ  
 اپنے قبضے میں رکھنے کے الزام میں اندر نہ ہو جاؤں۔ وہ دوسرے  
 والا پاؤڈر ملک سے باہر لے جائے گی مجھ میں بہت کماں!“  
 ”مزید پھر یہ ترقی۔۔۔۔۔ یہ غائب ہوتے۔۔۔۔۔؟“ میں نے جھٹکے کی طرف  
 اشارہ کیا۔ کوئی ایک ٹک وسم احمد کو دیکھ جاتا تھا۔  
 ”یہ سب آپ کی مہربانیاں ہیں“ وسم احمد تفکر سے مطلوب  
 لہجے میں بولا۔

”میری مہربانیاں۔۔۔۔۔؟“ میں نے واقعی حیرت سے کہا۔  
 ”جیسی یہ مہربانیاں میں نے کب کر لائیں کہ مجھے جانی نہیں چلا؟“  
 ”ہیں آپ کی مہربانیوں کی وجہ سے میرے گھریلو جھگڑے ختم  
 ہوئے“ کاردار میرے ہاتھ میں آگیا اور میں نے اسے پچھلانا شروع  
 کیا تو بس یہ پچھلایا جا رہا ہے۔ ابھی تو میرے ذہن میں ترقی کے  
 بڑے بڑے منصوبے ہیں۔“  
 اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا کر معدوم ہو گئی۔



جب وہ اس قسم کی بات کرتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک لمبے کے لیے گویا ایک غیر ارادی سی تبدیلی آتی تھی تب ہی مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ درحقیقت وہ دوسرا آدمی نہیں تھا جو نظر آتا تھا۔ اس کے اندر ایک اور دوسرا آدمی رہتا تھا۔

وہ گویا اپنی اس لحالی تبدیلی سے بے خبر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے یوں ۳۰ یا ۴۰ جملے بنانے کا کارخانہ تھا وہ اس میں برسوں سے صرف دو تین ذرا تن کی چھلک بناتے جا رہے تھے۔ وہ چھلک انہیں سب سے زیادہ مجھ پر ہی آزمائے کا شوق تھا۔ ان سے وہ اکثر میری پٹائی کیا کرتے تھے۔ جب سے ان کا انتقال ہوا ہے اور کاددار میرے ہاتھ میں آیا ہے میں نے اس میں بڑی جوش میں دل کھول کر فریج کیا۔ اسی حساب سے اس میں تکی ہوئی۔ دیگروں سے قرضہ وغیرہ بھی لئے لگا۔ اب تو کاددار یوں چارہا ہے۔ اس نے ہاتھ سے یوں اشارہ کیا جیسے جنازہ آسمان کی طرف جا رہا ہو۔

”مبارک ہو۔۔۔۔۔ مبارک ہو۔۔۔۔۔ میں نے اس کا کدوا تھپتہ پایا۔“ ”پلو تمہارے حالات میں تبدیلی کا کبھی منظر تو مجھ میں آگیا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے کلا سا۔۔۔۔۔ کیا ساتھ خانہاں کب سے رکھا ہے جس کی تاک طوطے کی طرح مڑی ہوئی ہے؟“

اس نے پلٹ کر ایک نظر اندر کی طرف دیکھا اور گویا خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا۔ ”مہبل کی بات کر رہے ہیں؟ بھی بڑا ہی کمال کا نوکر ہے۔ آج کل اچھی بیوی اور اچھا نوکر قسمت سے ہی ملتے ہیں۔ بیوی تو مجھے بس یونہی کر رہا ہے لائق ہی ملی ہے لیکن نوکر بہت اچھا مل گیا ہے۔ مٹی پر پڑ قسم کی چیز ہے۔ خانہاں بھی ہے، ذرا نور بھی ہے، مالی بھی ہے۔۔۔۔۔ فریج لٹی دی اے سی وغیرہ بھی ٹھیک کر لیتا ہے۔ گاڑی خراب ہو جائے تو اس کے نیچے مجھے تمس کر لیت جاتا ہے۔ حیرت انگیز آدمی ہے۔ ایسا ہر فن مولا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جب سے وہ آیا ہے ہماری زندگی بڑی آسان سی ہو گئی ہے۔“

”جوں سمجھو تم نے ایک تنخواہ میں پورا اسلاف رکھ لیا ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بے شک“ اس نے جوش و خروش سے تائید میں سر ہلایا۔ ”اور تنخواہ کا بھی کیا پوچھتے ہیں۔ بغیر تنخواہ ملے کیے آنا کی طور پر آیا تھا اور تنخواہ آج تک ملے نہیں ہو سکی۔ اپنے منہ سے کچھ مانگا ہی نہیں۔ جو دے دو رکھ لیتا ہے اور نہ دو تو کھانا ہی نہیں کرتا۔ ہم نے اسے ڈرتے ڈرتے رکھا تھا کہ نہ جانے کس قسم کا انسان ہو۔ اب ہمیں یہ دلگ رہتا ہے کہ کہیں یہ ہمیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ ہمیں اس جیسا دوسرا آدمی نہیں مل سکے گا۔“

میں نے دل میں سوچا۔ ”مگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مزید کس کس ہنر سے واقف ہے تو شاید تم حیرت سے بے ہوش ہی ہو جاؤ اور پھر شاید تم اسے اپنے پاس رکھنے کے اتنے زیادہ خواہش مند نہ رہو۔“

”لیکن یہ ہمیں مل کہاں سے گیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہنس۔۔۔۔۔ یونہی سر راہ مل گیا تھا۔“ ”وہ تم سے جواب دہ بھی کبھی کوئی بہت اچھی چیز راستے میں پڑی مل جاتی ہے۔“

جب انسان کا ستارہ زودوں پر ہو۔۔۔۔۔ اور آج کل شاید ہر قسمت کا ستارہ زودوں پر ہے۔ ورنہ انسان کو کوئی معمولی سی چیز ڈھونڈنے سے نہیں ملتی لیکن اپنا یہ عالم ہے کہ جس چیز کی تلاش ہوتی ہے وہ گویا خود ہی مجھے تلاش کرتی ہوئی مل جاتی ہے۔ اس کا اپنی خوش قسمتی پر نازان ہونا شاید بجا تھا لیکن میں اس اتفاق پر حیران تھا کہ ڈاکٹر برٹانڈ نے کراچی سے فرار ہو کر، پتہ نہ پتا ہو سکا تھا کہ وہ کونسا ملک ہے یا اسے کونسا ملک ہے میرے خیال میں یہ محض اتفاق ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس ریڈ ڈاٹ یا ڈاکٹر برٹانڈ کا کوئی خاص مقصد نہیں ہو سکتا کیوں کہ انہیں یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ دوسرا آدمی سے میری کونسا شائستگی تھی۔ جن دنوں میں ریڈ ڈاٹ سے الگ ہوا تھا ان دنوں دوسرا آدمی سے کبھی میرا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔

دوسرا آدمی کو گویا کوئی خیال آیا۔ چوتھے ہوئے بولا۔ ”کیا سارا باتیں کپٹ پر کپڑے کپڑے ہی ہوتی رہیں گی؟ آئیے اندر آئیے ایک نوڈل لے کر کدو کا ملاحظہ فرمائیے اور ہو سکے تو کچھ مٹھوڑا سے لوانے۔“ آج دن سہرا کھانا آپ کو میرے ساتھ کھانا پڑے گا۔ آج تو جو بھی دال دلیا تیار ہو گا وہی حاضر کیا جائے گا لیکن پھر کچھ دن باقاعدہ پود گرام ملے کر کے آپ کے اعزاز میں ایک چمکھٹا یا ذرا کا اجتام کیا جائے گا۔ امید ہے آپ اپنے اس خادم کی بہ دعوت قبول فرمائیں گے۔“

”پیارے خادم یہ بتاؤ کہ اس وقت تمہارا وہ برفن مولا قسم خانہاں کہاں ہو گا؟“ میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر پوچھا۔ وہ مجھے اندر چلے کا اشارہ کر کے تھا لیکن میں اندر قدم رکھنے سے پہلے انہوں کو چاہتا تھا کہ ڈاکٹر برٹانڈ کمر کے کس حصے میں ہو گا۔

دوسرا آدمی نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کچھ دیر پہلے وہ سدا مٹھ لے کر آیا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت وہ کچن میں ہو گا لیکن آپ اس کے بارے میں اس طرح کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کچھ کہہ ایسا دل رہا ہے جیسے آپ اس کا بیجا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ مجھے آپ سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا۔

”مطلب یہ ہے کہ تقریباً اتنی سال کی عمر تک انسان اگر کبھی خوب صورت خاتون کا چچا کرتے ہوئے کسی مکان تک پہنچے تب تو ٹھیک ہے لیکن ایک کالے بیجک، پانس نما خانہاں کا تعاقب کرتے ہوئے کاددار پھر اس کی ٹوہ لیتا تو بد وقتی ہی لگتا ہے۔“ آخر آپ کو اس کی عمر کے بنگالی میں کیوں اتنی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے؟“



کھاتے ہوئے کما چکا تھا۔ اس صاف یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس معاملے سے آپ کا کیا تعلق ہے؟  
اسے یقیناً خیال آیا ہو گا کہ میں کوئی سرکاری آدمی تو نہیں تھا۔ میں کیوں اتنے زور شور سے خودی کارروائی کرنے پر رخصا ہوا تھا؟

میں نے ایک نیک اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا سخت لمبے میں کہا۔ ”میری تم خودی کر چکے ہو کہ میں کچھ پراسرار سا آدمی ہوں۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کس کس معاملے سے میرا کیا تعلق ہے۔ ہر بات تو بتانے کی نہیں ہوتی اور اگر بتائی بھی جائے تو اس کا کوئی مناسب وقت ہوتا ہے۔“

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا پھر گیت کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”کیا میں اندر جا کر اس سے کون کہ آپ لوگ اسے لینے آئے ہیں؟“

”وسم چارے! اچھی بجلی محل کی باتیں کرتے کرتے یکدم اتنی سادگی پر مت اترا آیا کرو۔“ میں نے کراہ کر کہا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ تمہاری بات میں کدو سعادت مندی سے سر جھٹکائے تمہارے پیچھے پیچھے چلا آئے گا؟“

”میری نیک تو وہ ایسا ہی سعادت مند رہا ہے۔“ وسم نے جواب دیا۔

”تمہاری بات سننے ہی اسے خطرے کا احساس ہو جائے گا اور جو بھی اسے خطرے کا احساس ہو گا، تم اس کی سعادت مندی کو یاد کرتے رہ جاؤ گے۔“

”تو پھر...؟“  
”ہم تمہارے ساتھ اندر چل رہے ہیں۔ ہم خودی اس سے منت لیں گے کہ تم صرف ہماری رہنمائی کرو کہ وہ کہاں موجود ہو گا۔ اس کے بعد تم خود ذرا الگ تھلک ہی رہنا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس چکر میں تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔“ میں نے کہا۔

”سرا آپ تو واقعی مجھے ڈرا رہے ہیں۔“ وہ کچھ سہم کر بولا۔ ”مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے اب تک میں نے گھر میں کسی خوفناک ڈاکو کو پتا دے رکھی تھی جس نے سوچا اس قتل کیے ہوئے ہیں۔ مجھے تو وہ بہت بے ضرر سا لگتا ہے۔“

”یہی بات تو اس قسم کے لوگوں کو زیادہ خطرناک بناتی ہے کہ یہ بظاہر بے ضرر نظر آتے ہیں۔ ایک خوفناک ڈاکو جس نے سوچا اس قتل کیے ہوں وہ تو قتل سے ہی کسی نہ کسی حد تک خطرناک اور خونی نظر آئے لگتا ہے۔ انسان اسے دیکھ کر ہی ہوشیار ہو سکتا ہے۔ اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر سکتا ہے لیکن اس قسم کے لوگ جو پوری پوری قوموں کے قتل کی سازش میں شریک ہوتے ہیں اور بغیر تم جیسے بے وقوفوں کے بالکل بے ضرر نظر آتے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور یہ بد بخت تو بائیں جیسے جسم کا ایک اور ایک ڈاکو و سرجن ہونے کے باوجود انفرادی طور پر بھی بڑا خطرناک ہے۔“

یہ برائے قسمت یافتہ کاغذ کے ٹکڑے سے بھی نکل سکتا تھا۔  
راہ میں آئے رائے کسی بھی شخص کو قتل کر سکتا ہے۔“  
”یقین نہیں آتا سراسر؟“ وسم سر جھٹک کر بولا۔  
”جن لوگوں نے اس قسم کے لوگوں کا اصل روپ نہیں دیکھا۔“

”ہو تا“ انہیں واقعی یقین نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔ ”پہلو کہاں چلے۔“

”سرا مبدل مجھے بہت یاد آئے گا۔“ وسم غم زدہ سے لمبے بولا۔ ”کیا وہ واقعی سفید قام ہے؟ کوئی سفید قام ایسا سیاہ دم نظر آسکتا ہے؟“

”یہ شاید اس کے ہاتھیں ہاتھ کاکیل ہے۔ اس قسم کے شاید قتل کے حساب سے اس کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ لے لے تو وہ اتنی آسانی سے ہمارے نہ جانے کس کس شخص کی کس کی آنکھوں میں کب سے دھول جھونک رہا ہے۔“

میں اور ٹی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے۔ میں عدالت سے منہ صاف کرنے کے بجائے اپنا چہرہ تقریباً چھپائے ہوئے تھا۔ ویسے بھی اس وقت فلیٹ ہیٹ سر پر رکھے ہوئے تھا اور اس سرے سرے فریم کی تاریک شیٹوں والی عینک بھی لگا رکھی تھی۔ اور فوری طور پر پچھانا مشکل تھا۔ ویسے بھی ہم وسم کے پیچھے چھوٹی سی قطار کی صورت میں چل رہے تھے تاکہ سامنے سے فوراً کوئی نہیں اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔

اس طرح ہم ذرا تنگ دھرم میں جا پہنچے۔ وسم بولا۔ ”اٹھنا۔ میں ابھی معلوم کر کے آپ کو بتاؤں گا۔“

”ہم یہاں اٹھنا سے بیٹھے نہیں آئے وسم بڑا...“  
”اور اگر وہ دیکھ کر مکان کی ساخت کا اندازہ کرتے ہوئے کہہ گا۔ بہر حال زیادہ عالی شان اور زیادہ بڑا نہیں تھا۔“ تم ذرا جلدی نہ دیکھ کر بتاؤ کہ کہاں ہے اور وہاں تک ہماری رہنمائی کر کے اہم کرے میں چلے جاؤ۔ اپنے اہل خانہ کو بھی اپنے کمرے تک لے کر رکھا اور کسی بھی حال میں وہاں سے نہ نکلنا۔“

”کیا خون خرابے کا نظریہ؟“ وہ ایک بار پھر سہم کر بولا۔ ”کو شش تو ہماری میکی ہوئی کہ خون خرابا نہ ہو۔ ہم اسے قاتلات کا قتل کرنا چاہتے ہیں۔ لی احوال ہمیں بھی اس کی غایت بہت عزیز ہے۔ ہمیں نے جواب دیا۔

اسے کمرے سے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور دوران میں ایک اور چیز مہرورت نے کمرے میں بھاگا۔ وہ طائرہ معلوم ہوئی تھی۔ ایک نظر ہمیں دیکھ کر وسم سے مخاطب ہوا۔ ”سمان آئے ہیں صاحبی؟“ کچھ کھانے پینے کو لایا۔  
وسم نے ہونٹوں پر اٹکی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر اس کے قریب جا کر نیچی آواز میں بولا۔ ”مبدل اس وقت کہاں ہے؟“

”میں میں ہے صاحب بی! کھانا پکا رہا ہے۔ کیوں؟“ وہ شاید اس کے رازدارانہ انداز پر قدرے حیران ہوتے ہوئے بولی۔  
”جی۔۔۔ ٹھیک ہے۔ تم بیگم صاحب کے پاس کمرے میں زور دواؤ بند کرلو۔ میں بھی ایک منٹ میں آ رہا ہوں۔“ دس

لا۔ ملازمہ اس کی ہدایت کے مطابق رخصت تو ہو گئی لیکن اس کا بیویا تھا کہ وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو چکی تھی۔ دس خدو بھی بچے کو دشت زوہ نہیں تھا۔ شاید بے چارہ اس گھڑی کو کوس رہا تھا۔ اب اس نے کال بیل سن کر کھٹکھٹا ہوا تھا۔ تاہم اس نے ہمیں بچے بچے آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دبے پاؤں اس کے پیچھے چلے گئے۔ ڈرائنگ روم سے ہم ڈرائنگ میں آئے۔ یہاں قالین نہیں تھا۔ اس لیے ہمیں اپنی آہٹ کو دبائے میں اور بھی احتیاط کرنا پڑی۔ لیکن اسی کشادہ لاؤنج کے ایک سرے پر تھا۔ وہاں سے برتنوں کی کھڑکڑاہٹ اور کسی کی دھیمی سی سٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آوازوں سے اندازہ ہوا تھا کہ کوئی بڑے اشناک سے کچن میں کام میں مصروف تھا۔

پھر ایک مشین کے چلنے کی بھی آواز آئی۔ غالباً گرائیڈر میں سالاد یا جارباف تھا۔ دس سرگوشی میں بولا۔ ”وہ مصروف ہے۔“ ”میرا خیال ہے“ عینی لان کی طرف کچن کا دوسرا دروازہ بھی ہے؟“ میں نے سرگوشی میں ہی تصدیق کی تھی۔

دس نے ان بات میں سر ہلایا۔ ہم ایک طرف لاؤنج کی دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا اور کسی بھی لمبے ڈاکٹر برٹاز عرف عبدل اچانک باہر آسکتا تھا۔ اس صورت میں بھی اسے توجہ حیرت کا شدید جھٹکا لگتا۔ میں اسے سر پرانزی دینا چاہتا تھا لیکن بہتر یہی تھا کہ میں کچن میں جا کر ہی اسے سر پرانز دیتا۔ لیکن اس کے لیے زیادہ مترجم سے دان ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے فونی کو اشارہ کیا۔ وہ بی بی کی طرح دبے قدموں وہاں اس ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا تاکہ اس کے دروازے سے نکل کر تمہارا سا پکڑ کاٹ کر کچن کے عینی دروازے پر پہنچ جائے اور ڈاکٹر برٹاز کو اوجھ سے فرار ہونے کا امکان نہ رہے۔ مگر اب اس کے ہاتھ میں تھی۔

میں چاہتا تھا کہ لاؤنج کے اس دروازے کا بھی بولٹ چڑھا دلوں جو ڈرائنگ روم کی طرف کھلتا تھا اور ساتھ ہی میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی بند کر لینے کے بارے میں سوچا کیوں کہ میں ڈاکٹر برٹاز کے لیے کوئی راہ قرار چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر میں نے یہ ارادہ مٹوی کر دیا کیوں کہ کھڑ پڑی ذرا سی بھی آواز ہوتی تو ڈاکٹر برٹاز جھانک کر باہر دیکھ سکتا تھا۔

میرے ہاتھ میں اب میرا مخصوص مشین مائل موجود تھا۔ میں نے ہم کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے کمرے میں چلا جائے۔ وہ بچوں کے غن پر تھا اور اپنی بی بی کی طرح بے آواز قدموں سے رخصت ہو گیا۔

گرائڈر چڑھنے کے لیے غائب رہنے کے بعد دوبارہ کھول کھول کر لگا تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر برٹاز کو سر پرانز دینے کے لیے یہ لمحات موزوں تھے جب وہ گرائڈر پر مصروف تھا۔ میں ذرا سی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر کچن کے کھلے دروازے کے قریب جا پہنچا لیکن میں دروازے کے سامنے نہیں تھا، کچن کی دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو خبی گرائڈر خاموش ہو گا میں کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہوں گا۔

”ہیلو ڈاکٹر برٹاز! میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم سے ملاقات ایک کچن میں ہوگی جہاں تم دینائے طہ کا کوئی حیرت انگیز آپریشن کرنے کے بجائے ہنسیا پکارتے ہو گے۔۔۔“ مجھے تعین تھا کہ پہلے وہ انجان بننے کی کوشش کرے گا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر وہ تردید کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا کہ وہ ڈاکٹر برٹاز ہرگز نہیں ہے اور وہ تو اس نام کے کسی آدمی کو جانتا تک نہیں وہ تو صرف اور صرف عبدل ہے۔

گرائڈر کے خاموش ہوتے ہی میں نے کچن میں قدم رکھا اور میری خیال آرائی دھڑکی دھڑکی۔ میری ”ہیلو“ میرے ہونٹوں پر نہ آسکی۔ اپنی باقی مختصر تقریر تو میں ویسے ہی بھول گیا کیوں کہ کچن خالی تھا!

گرائڈر کا شاید ٹائم ریسٹ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وقفے وقفے سے وہ خود ہی چل رہا تھا اور بند ہوا تھا۔ میں نے ایک لمبے میں پورے کچن کا جائزہ لے لیا۔ عینی دروازہ بند تھا۔ کیا وہ فونی کے اوپر پہنچنے سے پہلے ہی نکل چکا تھا؟ یا پھر ملازمہ کی اطلاع ملا تھی؟ یہ سوالات بھی اسی ایک لمبے میں میرے ذہن میں ابھرے تھے۔ میرا مشین مائل والا ہاتھ اٹھا کھا کھا سی رہا تھا۔

دس نے ہی لمبے میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ کہاں ہو سکتا تھا مگر میں اسی لمبے میری آنکھوں کے سامنے بقی سی کو نہ دیکھ سکا۔ میں نے ہاتھ پر دیا سفر فتح تھا اور وہ اس کے پتلو میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک برٹاز جھللا ہوا چار تھا جس سے گوشت کے ٹکڑے کاٹے جاتے ہیں۔

اگر میں نے اپنا مشین مائل والا ہاتھ پیچھے کرنے میں ایک ثانیہ کی بھی تاخیر کی ہوتی تو میرا ہاتھ مشین مائل سیت کٹ کر دور جا کر ہوا اور اگر اس کے بعد بھی مجھے زندہ رہنا نصیب ہوتا تو کم از کم پیچھے لوگ مجھے افضل ٹھٹھا کے نام سے یاد کیا کرتے۔

بجائے اس کے کہ میں ڈاکٹر برٹاز کو سر پرانز دیتا، اس نے مجھے سر پرانز دے دیا تھا۔ اپنا اتنا زور دار وار خالی جانے پر بھی وہ اچھی جموٹک میں آگے نہیں آیا بلکہ جس رفتار سے اس کا ہاتھ آگے کی طرف گھوما تھا اسی تیزی سے واپس آیا اور اس دوران میں چارہ کار میں تبدیل ہو چکا تھا۔

میں نے بھی اسی جیسی پکڑی کا مظاہر کرتے ہوئے مشین مائل

میں اپنا چو بیچے کر لیا ورنہ شاید چار میرے چہرے پر پڑا ہوا اور میرا چوڑے رخ سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ میں بس اضطراری طور پر ہی اس دورے سے گئی کیا تھا ورنہ میں تو در حقیقت اس کے پہلے وار کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے تو کچن میں قدم رکھتے وقت کسی حملے کی توقع ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ نے اگر کچھ کیا بھی تو اس وقت کر کے کا جب وہ میرے دیے ہوئے سر پر ان کے اثر سے سنبھل جائے گا۔

جی بات یہ تھی کہ اب میرے لیے اس کے دیے ہوئے سر پر اثر سے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ جب الٹا گھومتا ہوا واپس آیا اور میں نے اپنے چہرے کو چارے سے بچالیا تو چارے کی زوردار آواز کے ساتھ فریج کے دروازے میں بیست ہو گیا۔

اسی لمحے میں نے مشین پمپل کا دستہ اس کی پیشانی پر رسید کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ مشین پمپل صرف اسے دھکائے اور اس سے اپنا حکم منوانے کے لیے تھا ورنہ میں اس پر گولی چلاتا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اسے زخمی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری تو خواہش یہی تھی کہ وہ بالکل صحیح حالت میں یہ قانچی ہوش و حواس ہمارے ہاتھ میں آجائے کیوں کہ مجھے راجحہ کے چہرے کی رنگت ٹھیک کرانے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس حالت میں ہمارے ہاتھ میں آئے کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور داغ بالکل ٹھیک کام کر رہا ہو۔

میں نے اس کی پیشانی پر پمپل کا دستہ بھی مجبوراً رسید کیا تھا کیوں کہ اس وقت جو کچھ بھی کرنا تھا فوری طور پر کرنا تھا ورنہ چارے تیسری مرتبہ بھی قوس کی صورت میں گھومتا ہوا واپس آسکتا تھا اور اس بار شاید میری پسلیاں اس کی فودیں ہوتیں۔

میں نے چارے کو واپس سے بچتے ہوئے اس کی پیشانی پر پمپل کا دستہ رسید کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس ضرب سے وہ وہیں ڈھیر ہو جائے گا لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی۔ اس کا سر شاید لوہے کا بنا ہوا تھا۔ چارے تو وہیں فریج کے دروازے میں بیست رہ گیا۔ برنارڈ کا سر بیچے دیوار سے گرایا۔ گویا اسے وہ طرف سے چوٹ لگی تھی اساتے سے میں نے پمپل کا دستہ رسید کیا تھا اور بیچے سے سر دیوار سے گرایا تھا۔ اس کے پاؤں و اس کے حواس پر ایک لمحے کے لیے کوئی اثر نہ پڑا۔ بجلی کی سی تیزی سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے کبے کی طرح میرے پیٹ پر گر رسید کی۔

مجھے کچھ ایسا ہی لگا جیسے کسی نے بھاری شیشہ کا سرا پوری قوت سے میرے پیٹ میں دے مارا تھا۔ آتشیں گوا اچھل کر معلق میں آگئیں۔ میری کمر بیچے مارپل کے کاؤسے سے گرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ریزہ کی ہڈی کو کسی نے کھڑائی سے دو کڑے کر دیا تھا۔ میرے جسم کے نچلے حصے میں یکدم گویا بجلی کا کوئی سوچ آف ہو گیا اور پمپل دھڑ جیسے یک لخت بے جان ہو گیا۔ ناگہی شل ہو گئیں۔ میں فرش پر گر پڑا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ میں گر گئے

کی وجہ سے نہیں گرا تھا بلکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ میری ٹانگوں نے میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وحشت سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ نے سن رکھا تھا کہ ریزہ کی ہڈی پر بعض اوقات کسی خاص زاویہ سے چوٹ لگ جائے تو داغ کا ایک خاص حصہ متاثر ہوتا ہے انسان عمر بھر کے لیے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی بالائی زخم یا وکیل چیز پر ہی گزر سکتی ہے۔ اس احساس نے مجھے دہشت کر دیا تھا کہ کہیں میرے ساتھ ناگہانی طور پر ایسا ہی تو نہیں تھا؟

اس وقت تک ڈاکٹر برنارڈ ایک چملاوے کی طرح پھلاگ کر کچن سے نکل چکا تھا۔ مجھ میں گویا اس کی فکر کرنے کے بارے میں سوچنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی لیکن جو کچھ وہ چہرے سے فرش پر گرا کر لیا ایک مجبور سا ہوا میرے پچھلے حواس سوچ آف ہوا تھا وہ گویا آتن ہو گیا۔ جتنی وہ متعلق رہے گا وہ صرف ایک لمحے تک ہی محدود رہا لیکن اس ایک لمحے میں ہی مجھ پر قیامت ہی گزر گئی۔ صرف ایک لمحے میں میرا جسم پیسے سے مٹ ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے جب میں نے محسوس کیا کہ میں اٹھ سکتا ہوں میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے بیچے بھاگا لیکن اس ایک لمحے کے تجربے نے میرے اعصاب مرشش کو پیسے سے میرا مشین پمپل وہیں کہیں گر گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھانے کے چکر میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور خالی ہاتھ ہی ڈاکٹر برنارڈ کے قہقہہ میں بھاگا۔ برنارڈ کا چارے بھی فریج کے بلائی حصے میں بیست ہی رہ گیا تھا اور ابھی تک ہونے والے ہلے کر رہا تھا۔

لاؤنج میں آکر مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ لگ گیا کہ وہ لاؤنج کے دروازے سے ہی پورچ کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ ڈانگ دم میں نہیں گیا تھا۔ میں تیزی سے نیم وا دروازے سے نکلا تو وہ لاؤنج کا چھت والا حصہ عبور کر کے ڈرائیو سے میں پہنچ چکا تھا۔

اس کی ٹوپی جو مجھے گر رسید کرتے وقت چپک چکی تھی راستے میں گری پڑی تھی اور وہ اولمپک دھن میں حصہ لینے والے کھلاڑی کی طرح میٹ کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبا ناگہی ہانسیوں کی طرح لیکن مشینی انداز میں حرکت کر رہی تھی۔ گیت منتقل تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ آلا کھولنے کی ذمہ داری نہیں کرے گا۔ اس سے کم وقت میں وہ نہایت آسانی سے گیت پھلاگ جائے گا۔ ایک بار وہ گلیوں میں نکل جاتا تو پھر اسے پکڑا حال تھا۔ میرے پاس مشین پمپل بھی نہیں رہا تھا۔ اسے دہانے کے لیے میں اس کی ٹانگ پر قانچہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ہائیوی کی لہر نے مجھ پر غلبہ پایا لیکن میں نے فوراً ہی اس سے نجات پاتے ہوئے اونچے برآمدے میں سہارا لیا ایک لمبی زلف لگا لی۔ میں اسی وقت میں نے دیکھا مکان کے پرستے

کونے کی آڑ سے اچانک ایک گھڑی سی لڑھکتی ہوئی نکلی اور ڈاکٹر برنارڈ کے راستے میں آگئی۔

برنارڈ نہ تو سنبھل سکا اور نہ ہی ہدایت اسے پہلائی گئی۔ وہ اس میں الجھ کر اس کے اوپر سے ہوتا ہوا ڈرائیوے میں قلابازی کھا گیا۔ اس وقت تک میں دیکھ چکا تھا کہ وہ "گھڑی" دراصل وہم احمد تھا۔ وہ مکان کے کونے والے دروازے سے نکل کر تقریباً آٹھ سو سی حالت میں اچانک ہی چھدک کر برنارڈ کے راستے میں آگیا تھا۔ اندازہ کیا تھا یہ وہ اسی طرح آٹھ سو سی حالت میں ڈرائیوے کو کراس کرنے کے لیے نکلا ہو اور غلطی سے برنارڈ کے راستے میں آگیا ہو۔ غلطی بھی ایسی جو اس سے ناواقفگی میں سرزد ہوئی ہو کیونکہ اس دروازے سے اچانک نکلنے والے کو واقعی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دوسری طرف سے کوئی آتا تھا۔

میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح اچانک مجھے کوئی مدد میسر آجائے گی۔ اس سے پہلے کہ برنارڈ اٹھ پاتا، میں نے وہم کو پھلانگتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے دو بج لیا مگر اسے روکنا کبھی کسی آنکھوں کو روک دینے کے برابر تھا۔

اس کے ہاتھ پاؤں یوں تو عام انسانوں کی طرح دو دو ہی تھے لیکن وہ جس بری طرح چلا، بھاگا اور جس طرح اس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، اس سے کچھ یوں لگا جیسے وہ کئی ہاتھوں اور کئی ناگوں کا مالک تھا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں آنکھوں سی کی طرح جلیبی جی تھیں اور ان میں دسکی سی پلک بھی تھیں لیکن وہ فولاد کی طرح مضبوط بھی تھیں۔

ایک بار تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ میری تمام تر طاقت، مہارت اور مضبوطی کے باوجود وہ میری گرفت سے نکل جائے گا لیکن عین اس وقت کوئی وہاں آن پہنچا۔ اسے غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی اور وہ قطعی لان سے دوڑا دوڑا آیا تھا۔

میری بات یہ تھی کہ اس وقت تک مجھے اپنے طریقہ کار پر کچھ متاثر ہونے لگا تھا۔ ہم نے خواہ مخواہ ہی خوش فہمی میں رہتے ہوئے اپنی دانست میں اسے بے خبری میں جا ڈپونے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے یقیناً کہیں سے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ آہم اتنا ضرور تھا کہ وہ اندیشہ سے ہماری آمد کے بارے میں باخبر ہوا تھا۔ اگر ذرا پہلے باخبر ہوا ہوتا تو یقیناً قطعی دروازے سے نکل چکا ہوتا اور ہم ایک بار پھر اس سانپ کے نکل جانے کے بعد ٹیکس پینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

اب جب کہ یہ سانپ میرے ہاتھوں میں پھسل جانے کو تھا تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پختہ فرش سے گھرا دوں اور اس وقت تک ٹکرائوں جب تک وہ مطلوبے میں تبدیل نہ ہو جائے۔ اگر اسے صحیح سلامت پکڑنے کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو شاید میں ایسا کر گزرتا۔

کوئی نے سوچ چاہا یا نہیں میں وقت ضائع نہیں کیا اور نہ ہی

اس نے اپنے ہاتھوں کو دھست دی۔ ویسے بھی اس کے اس میں گھس گھس تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ برنارڈ میری گرفت پر طور پر نہیں آسکتا تھا اور پھسل کر نکل جانے کو تھا تو اسے کچھ کھینچ کر پاپاؤ سے ایک زوردار ٹھوکری سیڑ کی۔

اس ٹھوکرے کی پیچھے اس کی جھنجھلاہٹ بھی کام کر رہی تھی کہ میں نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو رکھا تھا۔ وہ کاڑھا توڑیجے اور فوکیلے جوتے پہنے ہوئے تھا جس کی ٹوکھا پر گمانے کے کلپ سے بھی لگے ہوئے تھے۔ برنارڈ کی کھوپڑی کی تمام تر کے باوجود ہر حال اس کی کھوپڑی پر میرے ہاتھ کی مضبوطی نہ کچھ اثرات تو موجود رہے ہی ہوں گے کوئی کی ٹھوکری پوری کر دی۔ ویسے بھی یہ ٹھوکرا احساس سے پڑی تھی۔ برنارڈ کی ساری چورچند کی حرکت و تڑپ کوئی اور اس طرح شہرہ چلتا وجود میری گرفت میں ساکت ہو گیا۔ اس نے اسے فوری طور پر نہیں چھوڑا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا اور اوپر وہ اچانک ٹوٹنے والے اپر طرح اچھل کر بھاگ لے گا۔

کچھ دیر بعد میں نے اسے چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اس کا رخ اس کی طرف کیے چار کھڑا تھا لیکن وہ ابھی اٹھا۔ وہ واقعی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس دوران میں ڈاکٹر ہمارے قریب آگیا ہوا تھا۔ میں نے ہنور اس کی طرف دیکھ کر چہرے پر حسب معمول حماقت برس دی تھی۔ "تم اچانک گھر سے کیسے نکل آئے؟ تمہیں تو بہت اذیت تھی۔" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر تو مجھے ابھی تک مارا ہے۔" وہ جھرمجی سی لے "ڈاکٹر کی وجہ سے ہی میں اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ زیادہ سے میں اپنے کمرے سے نکل کر اپنی دانست میں چپکے سے کواڑ کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں مہلکے میں آ جاؤں گا۔"

میں نے ہنور اس کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر الجھو گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی ڈاکٹر کا کہنا تھا۔ شاید س سے بہت ہدایت دے دی تھی اور شاید اس کا خوف اتنا تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا۔ چاہ رہا تھا۔

اسے گویا اندازہ تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔ وہ جیسے میرے کا سر ہڈی کے لیے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف متوجہ ہونے پر زور دے رہا تھا۔ "فصل بھائی کیا آپ کو یقین ہے کہ گنا مطلوبہ آدمی ہے؟"

"مگر یہ ہمارا مطلوبہ آدمی نہ ہوتا تو چاہے سے میرے ہاتھ کی کوشش نہ کرتا اور ہم سے بچنے کے لیے ہوتا تو میں نہ دوڑتا۔" میں نے کہا۔ "مگر تم اسے چاہے سے

تھیں۔ ٹوٹی نے مائیکلن کی زوری نکال کر ڈاکٹر مرزا کے ہاتھ پست پر باندھے۔ بیروں میں بھی زوری باندھی اور منہ پر نیپ چپکایا۔  
"پارسل تیار ہے سر!" وہ ہاتھ جھاڑ کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

اس دوران میں دسٹم اس طرح مگن اٹھائے اندر سے آتا دکھائی دیا جیسے وہ کوئی زندہ مخلوق ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ وہ کسی بھی لمحے اسے کاٹ کھائے گی۔ وہ کچھ دیر اٹھا بھی ہوتا تھا۔  
قریب آکر بولا "سر! آپ تو کہہ رہے تھے کہ کسی نقصان کے بغیر جان چھوٹ گئی۔ آپ نے اندر مگن میں فریج کا شہر رکھا؟ اس کے فریج کے دروازے میں کس طرح چارہ پوت ہے؟ پورے بیس ہزار کا فریج تھا۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی تو خریدہ تھا۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"ہیں..... ہیں اب کہیں باقاعدہ دوا نہ شروع کر دیتا۔" میں نے مگن جیب میں رکھنے کے بعد اس کا کندھا چھتا پایا۔ "اس جیسے فریج تو بازار میں ہزاروں مل جائیں گے لیکن اگر وہ چارہ میرے چرے پر پوت ہو گیا ہوتا تو مجھ جیسا دوسرا پیش مانا بہت مشکل تھا۔"  
"آپ کا مطلب ہے..... کہ اس نے آپ پر دیا کیا تھا؟"  
دسٹم کی آنکھیں ایک بار پر پھیل گئیں اور بالکل گول دکھائی دینے لگیں۔

"ظاہر ہے۔ اس نے فریج کی مضبوطی چیک کرنے کے لیے تو اس میں چارہ نہیں گھسیڑا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ اس کا دوسرا وار تھا۔ اس سے پہلے ایک وار خالی کیا تھا۔"  
دسٹم احمد نے کچھ اس طرح جھرمجھی لی جیسے کلاسیکل ڈانس کے لیے اشارت لینے لگا ہو۔ میں نے ٹوٹی سے کہا۔ "کل کسی سے کہہ دیا کہ دسٹم کے لیے بازار سے کوئی بڑا سا عمدہ سا فریج خرید کر یہاں پہنچا دے۔"

دسٹم گویا بڑا کر جلدی سے بولا۔ "نہیں سر! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ نفع نقصان تو زندگی میں چلتے رہتے ہیں۔ میں اپنے ابا محرم کی طرح چھوٹے دل کا نہیں ہوں۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہے" میں نے قہقہے دینے والے انداز میں کہا۔ "لیکن تم بھی میرا مطلب ملاحظہ کر رہے ہو۔ میں فریج تمہیں اپنی خوشی سے تحفہ بھجوانا چاہتا ہوں۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کتنا خوش ہوں۔ یہ محض کیا ہاتھ آیا ہے بس یوں سمجھو کہ ہماری زندگی کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ میرے تو دم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ مسئلہ یوں رواں چلتے اچانک حل ہو جائے گا جس کے سلسلے میں نہ جانے کتنے افراد کہاں کہاں سر بھوڑ رہے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر! مجھے بھی خوشی ہے کہ آپ کا کوئی مسئلہ

دیکھ لینے تو ہمیں اندازہ ہو جاتا کہ یہ کتنا غیر معمولی آدمی محض فاناناں نہیں ہو سکتا تھا۔"

"مجھے تو اس کو روڑے اور آپ کی گرفت میں جدوجہد کرنے کی بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔" دسٹم نے یہ بھی کہا کہ یہ بھی مشکل معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کوئی عام آدمی ہو سکتا ہے۔"

اس نے اپنی انگلی پر ذرا سا جھوک لگایا اور مرزا کے پاس بیٹھ کر اس طرح وہ انگلی اس کی کلائی پر رکھنے لگا جیسے اسے امید ہو کہ الٹی سے رنگ اتر کر اس کی انگلی کو لگ جائے گا۔ میں نے بھیجی دیکھا تھا کہ وہ عین کپڑا خریدتے وقت اس طرح اس کا رنگ لپٹا کر لے گیا تھا کہ کپڑا بے پانچہ دسٹم کی انگلی پر ڈال رہی تھی جیسا ہی

اس نے فک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اس کا

مکمل ہونا ہے۔" میں نے اسے غور سے دیکھتے دیکھتے کہا۔ "اس کا رنگ لے کر تو نہیں کبھی سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "بہر حال تم کی ہیکری من پڑو۔ اپنے منہ سے ذہن کو پریشان مت کرو۔ یہ ملے بیٹے کی باتیں نہیں ہیں۔ اگر ہو سکا تو ہم سفید فام حالت میں بھی تمہیں اس کا دیا کرادیں گے پھر میں نے ٹوٹی سے کہا۔ گاڑی اندر ہی لے آؤ۔ اسے لے کر چلنے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

دسٹم اٹھ کھڑا ہوا اور آہ بھر کر بولا۔ "میرا عبدل..... اس کے بغیر زندگی کیسے گزرے گی؟"

"تم اب بھی اسے عبدل ہی سمجھتے ہو؟" میں نے ہنسنے لگا۔

"میرے لیے تو یہ ہمیشہ عبدل ہی رہے گا۔" وہ مقنوم لہجے میں بولا۔

"نام فخر زدہ ہو۔ نہ کی ضرورت نہیں۔" میں نے ملاحت سے کہا۔ "عبدل ہمیشہ سے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے بغیر جب تم آتے ہوئے حتیٰ کہ شادی شدہ بھی ہو گئے تھے تو باقی زندگی بھی گزر ہی جائے گی۔ جس میں تو شہر کرنا چاہیے کہ کوئی نقصان اٹھائے بغیر۔ تمہاری جان چھوٹ رہی ہے۔"

پھر میں نے اسے دہانت کی۔ "تمہارے بچن میں میری مگن کر گئی ہے۔ زوار اٹھا لاؤ۔"

"گنہ گنہ؟" اس نے قہقہہ لگایا۔ "آپ تمہیں ہتھیاروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی میری جان جاتی ہے لیکن خیر..... آپ کا حکم ہے تو آئے آہوں۔"

دو دروازے کی طرف چل دیا۔ ٹوٹی اس دوران میں گاڑی اندر لے آیا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹیک دو بائیں ہند کر دیا۔ ہماری گاڑیوں میں ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں پڑی رہتی





”جہاں سے تم پہنچے ہو ایسا راستہ کو جزا تو لے آ رہے ہو؟“  
 نہیں تو بتا پہلے پہنچے ہو یا جا رہے تھے۔“  
 ”کیا بات ہے؟“ جیسی سے میرا انتظار کر رہی ہو؟“ میں نے

”جیسی سے پوچھا۔“  
 ”مجھے کیا پڑی ہے بے چینی سے انتظار کرنے کی۔“ وہ یکدم بکڑ  
 گئی۔ ”مجھے تو ان سولہ افراد کا خیال آ رہا ہے جو ہوٹل میں بیٹھے  
 کھا شروبہ ہونے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ان کے پیٹ میں  
 بے پرواہی ہے ہوں گے۔ اگر وہ کھانے سے پہلے ہی اتنے بڑا حال  
 ہو گئے تو یہ کچھ میں کیا خاک حصر لیں گے۔“

”ان کے پیٹ میں ابھی کچھ دیر اور چھ ہوں کو ڈھلے دو۔“  
 ”وہ کیا ہمارے چلنے کا بنیادی حق ہے۔ ڈاکٹر کیلڈز اگر بڑا حال ہو بھی  
 گئے تو کھانا کھانے کے بعد دوبارہ چاقو وچھہرہ ہو جائیں گے۔ ہمیں  
 بھی تو ڈیڑی دیر اور لگے گی۔“

”آخر تم کہتے کیا پھر رہے ہو؟“ وہ ذرا جھنجھلا کر کہتی۔  
 ”ہمارے لیے ہی کچھ کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا  
 ”دراصل مجھے خیال نہیں تھا کہ کانی دونوں بعد تم سے ملاقات ہونے  
 والے ہیں۔ خالی ہاتھ آتے کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے  
 سوچا کہ کانی تھنڈی لیتا چلوں لیکن سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا لے  
 کر چلوں۔ کوئی اچھا سا تھنڈی نہیں مل رہا تھا۔ اب ایک تھنڈی ملا تو  
 ہے لیکن ابھی اس کی پیکنگ و فیو کا مرحلہ درپیش ہے اس لیے  
 توڑی دے اور لے گئی۔“

”کیا لکڑا ہے؟“ اعلیٰ کے گڑھا کان کھڑے ہوئے۔ ”تم اور  
 تھنڈی ناگن۔“ تھنڈی زبیدی میں اپنی شکست کی مصححات کہاں  
 سے کی کاٹاؤ کس پیکس ہو؟“  
 ”تم تو جانتی ہی ہے ہوا اور سختی ہے جس قسم کی لڑکی  
 ہو۔“ میں نے تم زہدے میں کہا۔ ”تمہیں زندگی میں کبھی نہ تو کسی  
 کے جذبات کا اعتبار آئے گا اور نہ ان کی فہم رہی۔“

”تمہاں سے جس طرح سے کھانے ہیں کمالو۔ مجھے صرف  
 یہ تھا کہ کانی در تک پہنچ رہے ہو تاکہ میں ڈاکٹر کیلڈز کو فون پر قتل  
 دے سکوں جو ہوٹل میں جمع ہیں اور تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“  
 راجیلہ گویا اس موضوع سے جان چمڑاتے ہوئے بولی۔ شاید اس  
 کی ایک وجہ یہ احساس بھی تھا کہ کوئی میرے ساتھ سڑک کر رہا تھا۔  
 ”میں تو ڈیڑی دیر اور لگے گی۔ اس زمانے ڈاکٹر کیلڈز کو بھی  
 تم زہدیت پہنچ جائے کہ بھوک کے کہتے ہیں۔“ میں نے جواب  
 دیا۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں بھی اب ہوٹل ہی پہنچ رہی ہوں۔ تم  
 دونوں رہیں آجیائے۔“ راجیلہ نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ فانیو  
 اشارہ کر جس میں لے جانے کا انتظام کیا گیا تھا ہمارے آفس سے زیادہ  
 دور تھی تاکہ اسی سڑک پر تھا۔  
 میں نے سوچا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کو کوئی کے گھر چھوڑتے چلیں

میں اس کا گھر گھرک میں تھا جو یہاں سے دور نہیں تھا اور میرے  
 اشارے پر لٹی اور گاڑی موڑ بھی چکا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ  
 تھی کہ کوئی کے گھر میں چھوٹا سا ایک بے خانہ بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر  
 برنارڈ کو ذرا تھکے اور محفوظ جگہ پر رکھنا ضروری تھا۔  
 چند منٹ بعد ہی ہم کوئی کے گھر جا پہنچے۔ محل کا دروازے کھٹ  
 کھولا اور اس نے گاڑی اندر لے کر دروازے کے بالکل قریب ہی لے  
 جا دی۔ اس نے اور گاڑی لے کر ڈاکٹر برنارڈ کو بے خانے میں  
 پہنچایا۔ وہ بدستور رہے ہوش تھا۔ بے خانے کا فرش صاف ستھرا تھا۔  
 انہوں نے اسے فرش پر رلا دیا۔

”نی الحال اسے اسی طرح چار رہنے دو۔ ہاتھ پاؤں اسی طرح  
 بندھے رہنے دو۔ ہونٹوں پر ٹیپ بھی رہنے دو۔ میٹنگ سے فارغ  
 ہو کر ہی آکر اس سے ہمیں گے۔“ میں نے کہا۔  
 ”بے خانے کا دروازہ کوئی نے قفل کر دیا۔ برنارڈ کے ہاتھ پاؤں  
 پہلے ہی بندھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود کوئی نے اپنے گاڑ کو  
 قفل کر دیا۔“ اگر یہ آدمی غائب ہو گیا تو تم اپنی زندگی کی قیمت  
 سمجھنا۔“

”سرا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں اور بے خانے کا  
 دروازہ بھی آپ لاک کر کے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد تو یہ صرف  
 اسی صورت میں غائب ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی بدسلوک ہو۔“ گاڑ  
 منکراتے ہوئے بولا۔  
 ”بظاہر تو یہ انسان ہے لیکن تم اسے بدسلوک ہی سمجھنا۔“ میں  
 نے گاڑ کو پدایت کی۔

وہاں سے ہم ہوٹل پہنچے۔ کوئی کو معلوم تھا کہ لے جانے کے لیے کس  
 ہال میں رہ رہو پیش تھی۔ وہ مجھے سیدھا ہال لے گیا۔ راجیلہ ہال  
 کے دروازے پر موجود تھی۔ وہ اپنے اسی قلاب پوش حینہ والے  
 چیلے میں تھی۔ ہم کانی دونوں بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں  
 سراپا اشتیاق تھا لیکن میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔  
 میں تو اس کی آنکھوں میں بھی نہیں جھانک سکتا تھا۔ وہ بھی بڑے  
 بڑے تاریک شیشوں کے چشمے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔

میں جب بھی اسے اس چیلے میں دیکھا تھا مجھے انوس ہوتا  
 تھا۔ میں خود کو مجرم سا محسوس کرتا تھا کہ شاید میری وجہ سے یہ  
 سب کچھ ہوا تھا۔ اگر یہ سب کچھ پردے کے نقطہ نظر سے ہوا تب  
 بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ جن جگہوں پر بہت اونچے طبقے کی نشست  
 و برخاست اور آمد و رفت رہتی تھی وہاں بھی کبھی کبھی پردے کی  
 بہت زیادہ پوری کرنے والی کوئی خاتون اس سے ملنے چلتے چلتے میں  
 نظر آ جاتی تھی۔ سینہ باند اور میٹنگوں میں بھی کبھی کبھار اس قسم  
 کی کوئی شخصیت دکھائی دے جاتی تھی لیکن راجیلہ کا معاملہ پردے  
 کی حدود سے بھی کچھ آگے کا لگتا تھا۔

وہ ان جگہوں پر کچھ عجیب سی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً اسے خود  
 بھی اس بات کا احساس ہوتا ہو گا لیکن اس نے آج تک بڑے

رہو نہیں پیش کی گئیں۔ آؤنٹز کی رپورٹ چھ کرنا لی کی  
منصوبوں کی منظوری لی گئی۔ کچھ چیزوں سے میں نے اختلاف  
ان کی جگہ کی تجاویز پیش کیں جنہیں کچھ بحث اور ترامیم  
منظور کر لیا گیا۔

میننگ رات کے آٹھ بجے تک جاری رہی۔ ہر حال  
تسلیم بخش میننگ تھی۔ بہت سے اہم معاملات طے پا گئے  
ہو کہ میں کسی نہ کسی طرح شرکت کے لیے پہنچی گیا تھا  
میننگ ملتوی نہیں ہوئی تھی۔ میننگ کے دوران میں ڈاکٹر  
میں تقریباً بھول ہی گیا حتیٰ کہ اس دوران میں راحیلہ پر گولی  
پڑنے کے باوجود مجھے اس کا خیال نہیں آیا۔ راحیلہ میرے  
ہاتھ پر بیٹھی تھی۔ وہ اور ٹونی بھی کپنی کے ملازم ڈاکٹر  
شامل تھے میری غیر موجودگی میں سب سے زیادہ اختیار  
کے پاس ہوتے تھے۔

میننگ کے اختتام پر کافی کا ایک اور دور چلا۔ تمام امیر  
اسٹولی سے طے پا جانے کے بعد ڈائریکٹرز کے چوں پر جانشین  
آنے لگی تھی ورنہ اس سے پہلے ان کے چرے کچھ ایسے  
دے رہے تھے جیسے پوری دنیا کے معاشی مسائل کا بوجھ ان  
چاندوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔

کافی کا دور بھی ختم ہو چکا تو مجھے اچانک ڈاکٹر برٹن کا  
آیا۔ ہمیں اس بد بخت کو نہ خانے میں پٹے ہوئے کچھ زیادہ  
ہو گئی تھی۔ میں نے تمام حضرات سے اجازت طلب کی اور کافی  
دوم سے باہر گیا۔ صرف ٹونی اور راحیلہ میرے ساتھ تھے۔  
”تم ہمارے ساتھ چلو“ میں نے راحیلہ سے کہا۔  
”کہاں؟“ اس نے جانا چاہا۔

”یہ مت پوچھو۔ کیا تم اپنا تحفہ دیکھنا نہیں چاہتی؟“  
کہا۔

”تحفہ وغیرہ تو خریدا ہو گا۔“ وہ بے چینی سے بولی ”ہر حال  
تمہاری یہ نئی شہدے بازی دیکھنا چاہتی ہوں۔ ذرا تو چلے آؤ  
چاری سے کیا نکال کر دکھانا چاہتے ہو جس کے لیے بچوں کی  
جنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

ہم تینوں بچے آکر ٹونی کی سرسبز میں بیٹھے۔ ٹونی ذرا باؤ  
تھا۔ گاڑی کے بیٹھے رہ گئیں تھے۔ اس لیے راحیلہ نے چرے  
غلاب ہٹا دیا اور سیاہ چٹر بھی اٹار لیا۔ اب میں اس کے آواز  
دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچھ استہزائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ  
تھی جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی شرارت کو سمجھنے ہوئے ہو  
ہو۔ اس کے آگے سیاہ اور آدھے سفید چرے پر ہلکا  
مکراہٹ بھی کچھ ایسی عسوس ہوئی تھی گویا اسے بھی  
میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔ یہ احساس میرے لیے بڑا جاں فزا تھا کہ  
یہ معجزہ خیزی زیادہ دیر کی بات نہیں تھی مگر راحیلہ اس بات  
بے خبر تھی کہ اسے کتنی بڑی خوش خبری ملنے والی تھی۔

حوصلے سے صورت حال کا مقابلہ کیا تھا۔ اپنی کسی بات سے اس نے  
کبھی کسی تاسف، شکوے یا احساس کمتری کا اظہار نہیں ہونے دیا  
تھا۔ اس نے پہلے ہی کی طرح بالکل نارمل انداز میں وقت گزارا تھا  
جیسے اس کی ذات کے ساتھ کوئی مسئلہ وابستہ نہ ہو۔ اس کی جگہ  
کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو شاید منہ چپا کر گھر میں بیٹھ جاتی اور اس  
وقت کو روٹی جب اس نے میرے شانہ بہ شانہ ریڈ ڈاٹ سے جھکرا  
مہل لیا تھا۔ ایک ایسا جھکرا جس سے اس کا اپنا کوئی تعلق نہیں  
تھا۔

آہم اب اس کے قریب جاتے ہوئے میرے دل میں ایک  
عجیب سی خوشی کی لہر ابھری۔ اب یہ زیادہ دیر کا مسئلہ نہیں تھا۔ اب  
اسے اس کا اصل رنگ روپ واپس ملنے والا تھا۔ اس کا چہرہ  
درست ہونے والا تھا جس کے بعد وہ اپنی نارمل زندگی کی طرف  
واپس آ سکتی تھی۔ میری مدد پر۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا  
تھا۔

”تم تو میرے لیے کوئی تحفہ لا رہے تھے۔“ وہ سیاہ غلاب کی  
اوٹ سے بولی۔ ”تمہارے ہاتھ تو ہتھکڑیوں کی طرح خالی ہیں۔“  
”ہتھکڑیوں کے ہاتھ خالی کہاں ہوتے ہیں بے وقوف!“ میں  
نے کہا ”ان کے ہاتھوں میں تو ہتھکڑی ہیں لیکن نہیں ہوتی ہیں۔“  
”تمہارے ہاتھ میں تو ایسی بھی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ میں  
اسے ہی تحفہ سمجھ لیتی“ وہ قہقہے والی بات سے جھنسن میں جھلا  
ہو چکی تھی اور اس کی نہ کو بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہو۔ میں نے واقعی  
تمہارے لیے ایک شاندار تحفہ تلاش کیا ہے لیکن وہ تمہارے بڑا  
میں نے سنجیدگی سے کہا ”اسے یہاں لانا بہت مشکل تھا۔ ہمیں خود  
مل کر تحفے کے پاس جانا پڑے گا۔“

شاید وہ تاریک پیشوں کے عقب سے مجھے گھور رہی تھی۔ ایک  
لمحے کے وقف کے بعد بولی ”اچھا۔۔۔ چلو۔ اندر چلو۔ سب لوگ  
تمہارے انتظار میں بھوکے مر رہے ہیں۔“

میں ہال میں پہنچا جہاں ہمارے گروپ آف کمپنیز کے تمام  
سرکردہ افراد موجود تھے۔ وہ کچھ اس طرح مجھ سے ملے جیسے میں  
برسوں سے ان سے ملچڑا ہوا تھا۔ میں نے انہیں زیادہ دیر باتوں میں  
نہیں الجھا دیا اور بزنس چلنے شروع کر دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں بہت کم  
وقت کے لیے جاری رہیں۔ جلد ہی گوم پھر کسب کا دوبارہ آگئے  
حالانکہ ابھی باضابطہ میننگ شروع نہیں ہوئی تھی مگر وہ سب بنیادی  
طور پر کا دوباری لوگ تھے۔ کا دوبار ان کا اور دھڑا پھوٹا تھا۔ وہ بے  
شک کپنی میں ملازم تھے لیکن ہر شخص اپنے شیعے کو اپنے ذاتی  
کا دوبار کی طرح چلا رہا تھا۔

نہایت پر تکلف چلنے کے بعد ہم لوگ بینڈ آفس آگئے اور  
کاٹریس دوم میں باضابطہ طور پر سالانہ میننگ کا آغاز ہوا۔ یہ ایک  
نہایت تنگ قسم کی کا دوباری کا دوبار والی تھی جس میں طویل طویل

کوئی زندگی دے کر فوراً ہی واپس لے لی جائے۔ ڈاکٹر برنارڈ کی صورت میں مجھے امید کی جو کہ نظر آتی تھی وہ میرے لیے گویا اتنی ہی اہم تھی جتنی کسی سب گورمریٹ کے لئے نئی زندگی۔

ٹونی کے ذہن میں بھی یہی تھی اسی اندیشے نے سر ابراہام تھامس سے میں دو چار تھا۔ وہ لپک کر برنارڈ کے قریب پہنچا اور اس نے فرش پر بیٹھ کر بڑی توجہ سے اس کی نبض دیکھی پھر میری طرف دیکھ کر بڑے سرور سے میں بولا "سراپہ زندہ ہے۔"

مجھے اس کی اطلاع پر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت تک میں برنارڈ کے سینے میں خفیف سی حرکت محسوس کر چکا تھا۔ یعنی سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ پھر بھی اس کا اتنی دیر تک بے ہوش رہنا ہر حال باعث تشویش تھا۔

"یہ کون ہے؟" راحیلہ نے ذرا دور سی کھڑے کھڑے پوچھا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔

"میری تو ہے وہ خند جو تمہاری خدمت میں پیش کرنا تھا" میں نے جواب دیا "افسوس کہ ہمیں اس کی اچھی سی گفت بیگانہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔"

تب راحیلہ قریب آگئی۔ اس نے جھک کر برنارڈ کا چہرہ سیدھا کر کے ذرا غور سے دیکھا اور گہری سانس لے کر سیدھی ہو گئی "اچھا! تو اس کے لیے تم اتنی ذرا سے بازی کر رہے تھے؟"

"کیا مطلب؟ تم نے پہچان لیا یہ کون ہے؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

"سے پہچانا کون سا مشکل کام ہے۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں ہے" وہ بے پروائی سے بولی "میں بھلا اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟ یہ ڈاکٹر برنارڈ ہے۔ میں سوچ تو رہی تھی کہ کہیں یہ خبیث تو تمہارے بچے نہیں چڑھ گیا۔ لیکن مجھے یہ کچھ بعید از امکان سا نظر آ رہا تھا۔"

"اس دنیائیں کوئی بھی بات بعد از امکان نہیں راحیلہ! میرا" میں نے تلقینانہ لہجے میں کہا پھر آنکھیں سیڑھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا "لیکن تمہارے لہجے میں خوشی کی کوئی جھلک نہیں ہے۔ کیا تمہیں ذرا بھی خوشی نہیں ہے کہ جب ہم اس مردود کی طرف سے تقریباً باپوس ہو چکے تھے تو یہ قطعی غیر متوقع طور پر نہ صرف ہمیں نظر آیا بلکہ تمہارے قابو میں بھی آگیا؟"

"تمہارے خیال میں مجھے اس پر کیوں خوش ہونا چاہیے؟" اس نے پُر سکون لہجے میں پوچھا۔

"حق لڑکی! ظاہر ہے اب تمہارا یہ دور لگا چو ٹھیک ہو جائے گا" میں نے تیزی سے کہا۔

"میرے لیے اب یہ کوئی اتنی بڑی خوش خبری نہیں ہے" وہ بے پروائی سے بولی "میں نے کئی بار تمہیں بتایا تو ہے کہ اب میں اس نقص کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ جو خوشخبری تم مجھے سناتا چاہ رہے تھے اس کا اب مجھے کوئی خاص انتظام

میں طرح بڑی بی بی بن کر ایسی بزرگانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی کہ "میں نے واقعی تمہارے لیے ایک عظیم الشان ختمے کا بندوبست کیا ہے۔ دیکھو کی تو اچھل پڑ گئی۔"

"ختمے کوئے کا کام تو میری طرف سے تم ہی کر لیا" وہ اسی شگفتہ کی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میرے اثرات کا اندازہ تو نہیں میرے اچھے کوئے بغیر بھی ہو جائے گا۔"

پھر وہ ٹونی سے مخاطب ہوئی "ٹونی! تم ہی بتا دو کیا پکڑ ہے تمہارے پاس کو تو اسی طرح تجسّس پیدا کرنے اور پھر پراڈ کھو کر چاٹا کالنے کا شوق ہے۔"

"میں معلوم ہے اس کے معاملات میں" میں ٹانگ نہیں اڑا سکتا۔ مجھے اپنی ٹانگ عزیز ہے "ٹونی نے عقب نما آئینے میں دائری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ آئی ایم سوری میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم تو اسی گرو کے چیلے ہو۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی داری کے پچھ جھوڑا ہو۔ تم بھلا اس کے سامنے اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی جرات کہاں کر سکتے ہو" راحیلہ نے اپنا لہجہ پُر تعجبیتانے کی کوشش کی۔

"بالکل بجا ارشاد فرمایا آپ نے" ٹونی سعادت مندی سے بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک سمجھیں۔ میں دی ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تو پھر اپنی چونچ بند رکھو" راحیلہ نے غصے سے کہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ قطعی معنوی تھی۔ درحقیقت وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ مزہ پھیر کر کھڑکی کے رنگین شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

چند منٹ بعد ہم ٹونی کے گھر جا پہنچے۔ گاڑ گیت پر ہی موجود تھا۔ ٹونی نے اس سے پوچھا "تم نے اس کی خبر چلی تھی؟"

"میں خبر فرم کیسے لے سکا تھا صاحب! گاڑ نے موڈ بانہ لہجے میں کہا "میرے پاس تو یہ خانے کی چابی ہی نہیں ہے۔"

"اوسے یہ تو میں بھولی ہی گیا تھا" ٹونی نے کہا اور تیزی سے یہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور راحیلہ اس کے پیچھے تھے۔

ٹونی نے میز پر ہاتھ رکھ کر جب سے چابی نکال کر یہ خانے کا آئنی دروازہ کھولا۔ میری نظر سامنے کی تو میرے دل میں تشویش کی ایک لہری دوڑ گئی۔ ہم ڈاکٹر برنارڈ کو جس حالت میں چھوڑ گئے تھے وہ فرش پر اسی حالت میں پڑا تھا۔

یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ ہمیں مجھے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے کہ یہ وہ اس دروان میں کسسا یا بھی نہیں تھا؟ کیا اس نے کوئی لینے کی بھی کوشش نہیں کی تھی؟ وہ بالکل ساکت نظر آ رہا تھا۔ میرے لاشعور کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ ابھرا تھا کہ کسسا کہ کی وجہ سے مرنے نہیں گیا تھا؟ میرے لیے یہ ایک ناقابل یقین امور ہوتا۔ یہ کچھ ایسی ہی بات ہوتی جیسے کسی لپ گورمریٹ

نہیں رہا۔

”تم کہو بے حس اور غیر انسانی مخلوق نہیں ہوئی جا رہی؟“  
میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تم جو چاہو کہہ سکتے ہو؟“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی  
”ہاں صرف اتنی سی ہے کہ میں نے غیر ضروری امیدیں اور غیر  
ضروری توقعات رکھنا چھوڑ دی ہیں۔ میں نے بہت بڑی باتوں کی  
پردہ کھینچ کر رکھا ہے۔ اس طرح زندگی میرے لیے بہت آسان  
ہو گئی ہے۔“

”غیر۔ اب زندگی کو اپنے لیے اتنی آسان بھی مت بناؤ کہ وہ  
زندگی کے بجائے اردو کا آسان قاعدہ لگے۔ اس میں غم،  
خوشی، محبت اور دیگر انسانی جذبات کی تھوڑی بہت گنجائش تو رہنے  
دو ہونی چاہی۔“ میں نے دبے دبے غصے سے کہا ”تمہارا رد عمل دیکھ کر تو  
میں اپنے آپ کو سخت چنچل محسوس کر رہا ہوں۔“

”وہ تو خیر تم ہو ہی۔ اس میں محسوس کرنے کی کیا بات ہے؟“  
وہ مسکراتے ہوئے بولی ”ظاہر ہے انسان اپنے آپ کو وہی محسوس  
کرتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔“

”میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر برنارڈ کے ہوش میں آنے پر ہم  
اس کے پیروں میں گر کر اس سے معافی مانگتے ہیں اور یہ جس ملک  
جانے کی فرمائش کرے اسے وہاں کے جہاز پر سوار کرا کے آتے  
ہیں۔“

”غیر۔ اب اتنا بھی بدل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بولی  
”میرے چہرے کا مسئلہ اگر چھوڑ دیا جائے تب بھی تم اس خبیث  
سے اور بہت سی باتوں کا حساب کتاب لے سکتے ہو۔ ریڈ ڈاٹ کے  
نقشے کی کچھ باتیں اگر سال دو تین میں تو تم اس کے ذریعے ان کا پتا  
چلانے کی کوشش کر سکتے ہو۔“

پھر وہ ایک گرمی سانس لے کر گویا میرا دل رکھنے کو بولی ”فرض  
کہ میں اس خوش خبری کی قدر و قیمت کا احساس کرنے کے لیے  
تیار بھی ہو جاتی ہوں۔ جو تم مجھے سنا رہے ہو تب بھی اس بات کی کیا  
محنت ہے کہ تمہاری توقع واقعی پوری ہو جائے گی۔ یعنی ڈاکٹر  
برنارڈ واقعی میرا چہرہ ٹھیک کرنے پر آمادہ ہو جائے گا؟“

”اسے آمادہ ہونا پڑے گا۔“ میں نے غیر ارادی طور پر تیزی  
سے کہا۔ ”اس کا تو آپ بھی آمادہ ہو گا۔ میں اس کی ہڈیوں کا کٹرہ  
بناؤں گا۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا۔ میں اس سے  
یہ بات متوا کر چھوڑوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کوئی بھی حربہ  
استعمال کرنا پڑے۔“

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی ”تم واقعی ہر  
قدم اٹھانے پر تکتے ہوئے ہو؟“

”حقیقت میں نے بلا تامل جواب دیا۔

تب راحیلہ کچھ بدلے بدلے سے لہجے میں بولی ”میں یہ نہیں  
کہہ سکتی کہ مجھے اپنا چہرہ ٹھیک ہونے کی قطعاً کوئی خوشی نہیں ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ میں بھی مارل زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ تمام  
عام لوگوں کی طرح کسی کی نظر میں محبوبہ بنے بغیر آزادی اور  
کھری کے احساس کے ساتھ ادھر ادھر آنا چاہتی ہوں لیکن  
جانے کیوں مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میرا چہرہ اب  
ٹھیک نہیں ہو گا۔ اسی لیے میں اس سلسلے میں زیادہ پرجوش و  
رہی۔ میں نے گویا مبر کر لیا ہے۔ مجھے قرار سا آ گیا ہے۔ میں  
اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”لیکن اب تو صورتحال بدل چکی ہے۔ اب تو ڈاکٹر برنارڈ  
مل گیا ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔

”اس کے باوجود مجھے کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ معلوم نہیں  
کیوں مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ یہ نہیں مانے گا۔ رابطہ  
ہو گی۔“

”لگتا ہے تمہارا چہرہ تو ادھائی کالا ہوا تھا۔ زبان پوری کالا  
ہو گئی ہے۔“ میں نے جل کر کہا ”نہم از کم اپنے لیے تو کوئی ٹیکہ نکال  
منہ سے نکالو۔ میں برنارڈ سے تمہارا چہرہ ٹھیک کرا کے چھوڑ دوں گا۔  
یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

وہ بڑے تحمل سے مسکراتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے۔ تم  
کوشش کر دیکھو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے جس  
اپنے محسوسات کے بارے میں سچ سچ بتایا ہے۔ کانٹے کو کیوں دھڑ  
رہے ہو؟“

میں نے ٹوٹی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا ”یار! اس خبیث  
کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں اس سے بات کرنے کے  
لیے بے تاب ہوں۔ یہ منہ تو کچھ زیادہ ہی لمبا ہے ہوش ہو گا۔  
تمہارے جوتے کی نوک تو پھسل کے دستے سے زیادہ خطرناک ثابت  
ہوئی ہے۔“

ٹوٹی مسکرایا اور دے خاتے میں موجود کرسیوں کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ دونوں اطینان سے تشریف رکھیں۔ میں  
اس مردود کو کھنچ سکتا ہوں۔“

”وہ کیا ہوا ہے؟“ میں نے اپنے اور راحیلہ کے لیے کرسیاں  
کھینچتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ ٹوٹی نے مصیبت سے جواب دیا  
”میں نے بھی بچپن میں صرف پرانی کمانڈوں میں ہی اس کا ذکر  
پڑھا تھا۔ میں نے تو فرض کر رکھا ہے کہ ہر وہ چیز جس کے سونچنے  
سے کوئی بے ہوش انسان ہوش میں آجائے“ کھنچتے ہوئے۔“

میں نے راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تو کھاتے لے  
مارے ملک میں کیسے کیسے قابل لوگ پڑے ہوئے ہیں۔“

”بے شک۔ لیکن تمہاری قابلیت کو پھر بھی کوئی نہیں  
سکتا۔“ راحیلہ گرمی سانس لے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں دونوں دلچسپی آمیز نظروں سے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف دیکھتی  
تھی جسے تو نے سر ہا کر دیا تھا۔“ وہ اس کے ساتھ آئی۔

ڈاکٹر برنارڈ نے گویا اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ ایک کمری سانس لے کر سنبھلتے ہوئے اس نے تقریباً جھوٹے سے انداز میں وہی سوال دہرائے پھر وہ اپنے ہاتھ پاؤں بندھنوں سے آزاد کرانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر ذرا اطمینان ہوا کہ اس میں توانائی عموماً کتنی تھی۔ وہ بیڑا حال یا نیم جاں نہیں تھا لیکن اس کی زور آزمائی کے انداز میں واقعی دیوانگی کی جھلک تھی۔

اپنی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد اس نے پھر اپنے سوالوں کی تکرار شروع کر دی۔ چند لمحوں کے لیے تو یہ محسوس ہو گیا کہ شپ بریڈا زور سے یہ آواز ابھر رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس آواز میں لمحہ بہ لمحہ فصد بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم تینوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تینوں ہی ایک ننگے اسے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے ہمیں گالیاں دینی شروع کر دیں۔ قیمت تھا کہ انگریزی میں گالیاں اتنی سنگین محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ وہی گالیاں اگر وہ ہمیں اردو میں دے رہا ہوتا تو ہم اپنے آپ کو زیادہ شرمندہ محسوس کرتے اور راجحہ کی موجودگی کی وجہ سے یہ شرمندگی بڑھ جاتی۔ ٹوٹی میری طرف دیکھ کر کمری سانس لے کر بولا "یہ تو قلمی سین شروع ہو گیا۔ یہ شیطان کا چیلنا یادداشت کھوجانے کا ڈراما کر رہا ہے" وہ انگریزی میں ہی بات کر رہا تھا۔ شاید ڈاکٹر برنارڈ کو سناتے کے لیے۔

میں نے مسکراتے ہوئے استہزاء بھے میں کہا "بھئی۔ کیا بعد ہے تمہارے جوتے کی نوک خطرناک ثابت ہوئی ہو۔ تمہاری ٹھوکرے شاید اس بد روح کا کوئی غلا جھیل دب گیا ہو۔ اب تم ایسا کرو کہ اس کی دوسری کھپٹی پر دوسری ٹھوکرہ رسید کرو۔ شاید اس سے جھیل ٹھیک ہو جائے۔ صحیح نثریات آنے لگیں۔ قلموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک چوٹ سے یادداشت جاتی ہے" دوسری چوٹ سے واپس آ جاتی ہے۔

"ہیکو اس مت کرو۔" برنارڈ اب ذرا خوف زدہ سے انداز میں سر دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔ وہ گویا متوجع ضرب سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مجھے مت مارو۔ تم لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں۔ میں کون ہوں؟ تم لوگوں نے مجھے آواہن کے لیے اغوا کیا ہے؟ جب مجھے معلوم ہی نہیں ہو گا کہ میں کون ہوں تو میں تمہیں آواہن کیسے دلاؤں گا؟ کس سے دلاؤں گا؟ اور دیکھو۔ میرے اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میری جیبیں دیکھ لو۔ میری جیبیں خالی ہیں۔" اس کی بات میں بے ربط تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ تمہاری جیبیں خالی ہیں؟" میں نے اسے گھورا "تمہاری تو یادداشت کھو گئی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ پھٹی پھٹی آواز میں چنچا "میری جیبیں خالی ہیں۔ مجھے معلوم ہے میں غریب آدمی ہوں۔ مگر تم مجھے بتاؤ میں کون ہوں؟ میرا قصور کیا ہے؟" کوئی ہٹلائے کہ ہم تھامیں کیا۔ "ٹوٹی نے یہ کہتے ہوئے

کے بچے وہ مجھے تھے۔ ٹوٹی نے اس کے ہاتھ کھولے نہیں تھے۔ البتہ اس کے ہونٹوں سے شپ اس نے اُٹا دیا۔

اس نے دوبارہ اس کی قبض دیکھی۔ سینے سے کان لگا کر دھڑکن سن کر آہستہ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے پتلیوں کا پائے کیا۔ پھر اسے بلایا جھلایا "خسار پتھپتھائے مکروہ بے جاں سے انداز میں ہمارا۔"

یہ خانے کے ایک گوشے میں چھوٹا سا ایک فریج بھی موجود تھا۔ ٹوٹی اس میں سے لھنڈے پانی کی ایک بوتل نکال لایا اور دوبارہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا "سنگھانے والا غلط تو موجود نہیں ہے۔ چڑکنے والا غلط استعمال کر کے دیکھتا ہوں ورنہ پھر اپنے غامض ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا۔"

میں ایک ڈاکٹر دوست کی خدمات بھی حاصل تھیں۔ جو ہمارے غیبی معاملات میں کسی لالچ کے بغیر ہماری مدد کرتا رہتا تھا اور وقت ضرورت لگاتے پر آ جاتا تھا۔ اسے یہ یقین اور اعتماد تھا کہ ہم بھڑانہ نیت سے کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے۔ کسی بے گناہ کو گرفتار نہیں پہنچاتے تھے اور ہماری کسی بھی خلاف معمول کارروائی کا مقصد قہری ہوتا تھا۔

ٹوٹی نے برنارڈ کے چہرے پر خاصی مقدار میں لھنڈا پانی چھڑکا۔ پھر ایک بریک فین کا رخ اس کے چہرے کی طرف کیا۔ آخر کار اس نے جھرجھری سی لے کر آہستہ کھول ہی دیں لیکن ان آنکھوں کو دیکھ کر مجھے کچھ کھٹکا سا ہوا۔ ان آنکھوں میں اضطلال کے ساتھ ساتھ دیوانگی کی جھلک تھی۔

اس نے سر کو پل بھلایا جیسے آنکھوں کے سامنے پہلی ہوئی دھندلاہٹ دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن ناٹو سر کی تکلیف سے دانت بچھچھ کر رہ گیا۔ ٹوٹی نے دیوال سے اس کا چوہ پونچھ دیا اور اسے اٹھا کر دیوار کے سارے بٹھارہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر برنارڈ نے کھلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے رکھا۔

"ہیلو ڈاکٹر برنارڈ! ٹوٹی نے مسکراتے ہوئے نہایت خوش خلقی سے اسے مخاطب کیا لیکن وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ہماری باری ہم تینوں کی طرف دیکھ رہا۔ اس کی آنکھوں میں شاسائی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ پھر وہ یوں کسمپاسا گویا اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دینا چاہتا ہو لیکن شاید اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔

اب تک اس کے حلق سے کھر کھراتی ہوئی غصیلی سی آواز برآمد ہوئی۔ میں کون ہوں۔ میں کہاں ہوں۔؟ تم لوگ کون ہو؟ تم مجھے کیوں اٹھو رکھا ہے؟" سوالات اس نے انگریزی میں کیے تھے۔

"تمہیں آہستہ آہستہ" ٹوٹی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے انگریزی میں ہی کہا "تم نے تو ایک سانس میں چار سوال کر دیئے۔ اور کالوں ہی نہایت غیر ضروری اور فضول۔"

میری طرف دیکھ کر غصہ ہی سانس لی۔

میں نے راجیلہ کی طرف اشارہ کر کے ڈاکٹر برنارڈ کو گھورتے ہوئے کہا "اس لڑکی کو غور سے دیکھو اور مجھے بتاؤ اس کا کیا تصور تھا؟"

ڈاکٹر برنارڈ نے وحشت زدہ سی نظروں سے راجیلہ کو دیکھا اور جھٹی جھٹی سی آواز میں بولا "کون ہے یہ؟ اس کا چہرہ ایسا کیوں ہے؟" ہم خاموش رہے۔ ہم تینوں ایک ٹک اسے گھور رہے تھے۔ اس نے بدستور راجیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا اشارے کے ساتھ ایک بار پھر اپنے سوالوں کی گردان شروع کر دی "یہ کون ہے؟ تم کون ہو؟ میں کون ہوں؟"

اس کا دماغ تو نہ جانے خراب ہوا تھا یا نہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی یہ ٹھکارا سن کر میرا دماغ ضرور خراب ہو جائے گا۔ ہم تینوں اسی طرح خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے جا رہے تھے۔ آخر کار وہ خود بھی گویا اپنی ٹھکارا سے تھک گیا۔ اس میں دوا لگی کا اثر ابال سا آیا تھا وہ ختم ہو گیا۔

اچانک ہی وہ دیوار کی طرف منہ کر کے ہلک ہلک کر رونے لگا۔ چٹکیاں لپٹتے ہوئے وہ مدھم سی آواز میں کہنے جا رہا تھا "مجھے کوئی نہیں بتانا" میں کون ہوں۔۔۔ مجھے کوئی نہیں بتانا" میں کون ہوں۔۔۔"

"کیا وہ واقعی یادداشت کھو چکا تھا؟" یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ جیسی باموسی اور دل فشکی اس وقت مجھ پر غلبہ پا رہی تھی اس سے مجھے زندگی میں پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا اور ڈاکٹر برنارڈ جب ہمارے قایم ہیں آگیا تھا "اس وقت میں نے جو خوشی اور سرشاری محسوس کی تھی وہ بھی اس سے پہلے میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ میں واقعی یہی محسوس کر رہا تھا کہ میں راجیلہ کے لیے ایک بے ہمت اور بے بدل ختم لے جا رہا تھا۔ اس کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لے کر جا رہا تھا۔"

اب گویا کسی نے میرے پیروں تلے سے زمین سمجھ لی تھی۔ میرا دل ٹھٹھی میں لے کر سسل دیا تھا اور ہر خوشی کا احساس اس میں سے نچوڑ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے آپ کو راجیلہ کی نظروں میں بہت جلد بھی محسوس کر رہا تھا حالانکہ اگر ڈاکٹر برنارڈ واقعی یادداشت کھو بیٹھا تھا تو اس میں میرا کوئی تصور نہیں تھا لیکن میں پھر بھی خود کو بہت شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے گویا اسے کوئی بہت بڑی امید دلانے کے بعد اپنے آپ کو اس کی نظر میں جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔

میں نے دُزدیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گویا میرے محسوسات سے بالکل بے خبر تھی اور اسے شاید اس صورت حال کا کوئی خاص دکھ بھی نہیں تھا۔ یا پھر شاید بات یہ تھی کہ وہ بہت گہری عورت بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مجھے نہ اذیت و شرمندگی میں مبتلا دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے اس نے

بے فکر دھبے پر دوائی کا پانا ایک فلسفہ تراش لیا تھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "اسے کتنا نماز بخشوانے جانا اور روزے کتنے پڑھانے۔۔۔ مجھے اس سے کتنا میرا چہرہ ٹھیک کرتا۔۔۔ پہلے جس میں اس کا دماغ ٹھیک کرنا بندوبست کرنا پڑے گا۔ اب کیا کرو گے؟ کیا اسے کسی بیٹھنے میں داخل کراؤ گے؟" وہ اردو میں بات کر رہی تھی۔

"میں اتنا فارغ البال نہیں ہوں کہ اس قسم کے چکھل خوار ہوتا چکوں۔" میں نے افسردگی کے دھندلکے سے بھرپور ہوئے کہا۔ "وہیے بھی مجھے یقین ہے کہ اس بد بخت کی یاد دہانی وغیرہ ہرگز نہیں کھوئی ہے۔ مجھے یہ ہر اقدار سے بہت اونچا لگتا ہے۔ بدستور ڈراما کر رہا ہے۔ اس قسم کے دماغی انحراف کرنے کے لیے یہی اسپتال بہت اچھا ہے۔ دو چار چھوٹے مضمونوں سے ہی اس کی گندہ یادداشت واپس آجائے گی۔"

میری کہنیوں میں دھمک سی دھوری تھی۔ خون کی گردن تیز ہو چکی تھی۔ میں نے ٹوٹی سے کہا "اس پر کار مولا بھرا آؤ۔ اسے چھپی کیا ہوں کا حوزہ بچھاؤ۔"

ہم یہ گفتگو اردو میں کر رہے تھے۔ اس دوران میں ڈاکٹر گویا اپنے گرد و پیش سے بے خبریوار پر رخسار لٹائے آنکھیں کیے بدستور رونے جا رہا تھا۔ آفس اس کے رخساروں پر برہنہ تھے۔

ٹوٹی نے خانے کی ایک الماری سے خاص ساخت کا ایک ساہیڑ نکال لیا۔ اس نے تیز کاٹ لگ لگایا۔ وہ چند سیکنڈ میں اپنے میں ڈاکٹر برنارڈ کے سر پر جاکھڑا ہوا۔ میرے دل میں اندازہ واقعی بے بسی آہیز غصہ اٹھ رہا تھا۔

میں نے دانت چب کر کہا "ڈاکٹر برنارڈ! اب بھی وقت۔ تم یہ ڈرامے بازی چھوڑ دو۔ ورنہ ایک دردناک انجام کھانا ہے۔"

"میں کون سی ڈرامے بازی کر رہا ہوں؟" وہ جھکی جھکی لائی میں چیخا "تم مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔ ڈاکٹر برنارڈ ہوں۔۔۔ تو کس چیز کا ڈاکٹر ہوں؟ کہاں پر کھینس کر رہا میرا گھریا کہاں ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔۔۔ اگر تم مجھے نہیں رہے ہو تو کم از کم میرے بارے میں کچھ بتا دو۔"

تب گویا میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں جلا دھج لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوئے ہی تھے لیکن اسے بری طرح بکڑ لیا اور ذرا بھی حرکت کرنے کے قابل نہ چھوڑا۔ ایک ہاتھ میں نے اس کی گردن کے پیچھے سے اس کے منہ پر جھانپا تھا۔

ٹوٹی نے اس کی ٹانگوں پر ٹھٹھا جھانپا اور پھر اس کے ایک ٹکڑے سے لگاوا۔ وہ میری طرح چلا لیکن میں۔۔۔

بے لطف کے بچے سے اس کی "مدح" مدح کی سی آوازیں

چند لمحے بعد میں نے ٹوٹی کا اشارہ کیا۔ اس نے اس کے پاؤں  
تھپڑ مارا اور دھیرے دھیرے میں نے بھی ڈاکٹر برنارڈ کے منہ  
پر ہاتھ مارا۔ میں نے اس کی چیخوں کا گلا تو کھونٹ دیا تھا لیکن  
اس کے منہ سے مفکرات کا سیلاب استہزائیہ تکلیف سے

کا چوسنا سہو کر رہ گیا تھا۔  
پھر اس کے پاس گویا گالیاں ختم ہو گئیں اور وہ ایک عجیب بے  
آہستہ غرت کے ساتھ ہمیں بددعا میں دینے لگا۔ میں ڈاکٹر برنارڈ  
بہت قریب سے تو نہیں جانتا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ  
بے لطفی اس کی طبیعت تھی۔

تو کیا وہ واقعی یادداشت کھو چکا تھا؟ کہیں میں ایک بے خبر  
نفس پر غور کر کے ظلم کا مرکب تو نہیں ہو رہا تھا؟ میرے دل میں  
بے لطفی سی ابھر آئی۔ راجیلہ اٹھ کر کمرے میں چلنے لگی تھی۔ وہ  
میری سوتیلی ماں تھی۔

میرے ذہن میں تذبذب کا جھج پھوٹ چکا تھا تاہم میں نے اپنی  
تکلیف کو بے پروا قرار دیتے ہوئے غضب ناک لمحے میں کہا "معلوم ہوتا  
ہے کہ لڈو سے تمہاری یادداشت واپس نہیں آئے گی۔ اس  
پرچے کو تو ہماری زبان میں "چٹلی کباب" والا طریقہ کہا جاتا ہے۔  
تو تمہارے پورے جسم کو چٹلی کباب بنانا پڑے گا۔ اب  
میرے دوسرے پاؤں کی باری ہے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے  
مکے پرے کی باری آئے گی۔"

وہ دستور داتے ہوئے بولا "تم کہیں مجھ پر ظلم کیے جا رہے  
ہو؟ تمہیں کیوں میری بات کا یقین نہیں آ رہا؟ میں تو ماننے کو تیار  
ہوں کہ میں ڈاکٹر برنارڈ ہوں۔ لیکن اس کے بعد اگر تم مجھ سے کچھ  
پرچہ مانگے ہو تو وہ میں کیسے بناؤں گا؟ جو باتیں مجھے معلوم ہی نہیں  
ہیں وہ میں کیسے بنا سکتا ہوں؟ مجھے تو یہ بھی تم سے ہی معلوم ہو رہا ہے  
کہ میں ڈاکٹر برنارڈ ہوں۔ میں تو خود اپنے بارے میں پریشان  
نہیں ہوں۔ تم نے مجھے جلائے شروع کر دیا ہے۔ خدا کرے کہ تم  
میری اسی طرح جنم کی آگ میں جلیو۔" وہ ایک بار پھر کراہنے اور  
پلٹنے لگے۔

راجیلہ بولی "حقی الحال یہ سلسلہ بند کرو۔ ہم لوگ ذرا اوپر چل  
کیا بات ختم کرتے ہیں" وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ڈاکٹر برنارڈ سے کہا "تم کچھ اور  
تواؤ! حق کلاؤ۔ تم کو تو دیر میں اگر تم سے سنتے ہیں۔ یہ بات  
بہت سہل ملے ہے کہ تمہاری یادداشت واپس آجائے گی۔ یہ دوسری  
بات ہے کہ اس وقت تمہیں صرف چند سانس باقی ہیں۔"

میں نے بیکر الہادی میں واپس دھک دیا اور گارڈ کو بلا کر اسے  
بیمار کی عمرانی پر کھڑا کر کے ہمارے ساتھ اوپر آگیا۔ ہم ڈاکٹر

راجیلہ ایک کرسی پر بیٹھ کر کینٹیناں ملتے ہوئے بولی "میرا  
خیال ہے وہ ذرا ماٹھیں کر رہا۔ تم دونوں نے جب اسے پکڑا تھا تو کیا  
کیا ہوا تھا؟"

میں نے اسے بتایا کہ برنارڈ کس طرح قابو میں آیا تھا۔ ساری  
تفصیل سننے کے بعد وہ بولی "تم نے اس کی پیشانی پر مشین پھنسل کا  
دستہ مارا۔ بعد میں ٹوٹی نے اس کی کینٹین پر ٹھوکر ماری۔ اور تم  
دونوں اوپر رہے کے غیبت ہو۔ تم دونوں کی لگائی ہوئی ضرب  
معمولی نہیں ہوتی۔ کیا بعید ہے کہ وہ یادداشت کھو بیٹھا ہو۔ انسانی  
کھوپڑی بے شک بہت مضبوط ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر برنارڈ کی  
کھوپڑی شاید تمہارے اندازے کے مطابق اور بھی زیادہ غیر معمولی  
طور پر مضبوط ہو لیکن انسانی ذہن بہر حال ایک پُر پیچ مشین ہے۔  
اس کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔"

میں اور ٹوٹی خاموش تھے۔ میں نے ٹوٹی سے پوچھا "تمہاری کیا  
راے ہے؟"

"میری رائے بھی راجیلہ کی رائے سے تقریباً ملتی جلتی ہی  
ہے" وہ بلا تحمل بولا۔

"اگر تم دونوں کی رائے درست ہوئی پھر تو ہم برنارڈ کے ساتھ  
جو کچھ بھی کریں گے ظلم ہی ہو گا اور ہمیں بیٹھ دعویٰ رہا ہے کہ ہم  
ظلم کے خلاف ہیں" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"تمہاری اپنی رائے کیا ہے؟" راجیلہ میز پر کینٹیاں ٹکاتے  
ہوئے بولی۔

"میرے ذہن میں صرف خفیف سا شک ہے" میں نے صاف  
گوئی سے کام لیا۔ یہ ہم ساتھیوں کی روایت تھی۔ ہر ایک بلا جھجک  
اپنی دانت دارانہ رائے کا اظہار کرتا تھا۔ "لیکن میں تم دونوں کی  
رائے کے احترام میں برنارڈ پر مزید سختی کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔"  
پھر میں نے راجیلہ کو مخاطب کیا "اس کے ساتھ ہی تمہارا چرو  
ٹھیک ہونے کی آخری امید بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ تصور میری روح  
کے لیے ایک گھاؤ سے کم نہیں کہ تمہیں باقی زندگی اپنے چرے کے  
اسی نقص کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔"

وہ غصائی سانس لے کر بولی "کاش مجھے کوئی ایسا طریقہ معلوم  
ہوتا جس سے میں تمہیں سمجھا سکتی کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔ جب مجھے  
فکر نہیں ہے تو تمہیں اس فکر میں ڈوبنے ہونے کی کیا ضرورت ہے۔  
اس کے علاوہ وہ ایک محاورہ بھی ہے ناکہ کہ جب تک سانس تب  
تک آس۔ میں بھی آس نہیں چھوڑوں گی۔ بظاہر تو میں نظر آتا  
ہے کہ میرے چرے کو ڈاکٹر برنارڈ نے خراب کیا تھا اور وہی اسے  
ٹھیک کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔  
لیکن اگر اب ڈاکٹر برنارڈ اس قابل نہیں رہا تو میں کوئی اور آس دل  
میں بیاںوں گی۔ فرض کروں گی کہ دنیا میں کوئی نہ کوئی اور ایسا فرد  
ضرور موجود ہو گا جس کے پاس میرا چرو درست کرنے کا فارمولا  
موجود ہو گا اور وہ مجھے مل ہی جائے گا۔ یا کوئی اور طریقہ بھی نہ

کبھی نکل آئے گا۔"

میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے اس کی طرف بغور دیکھا وہ بڑے مطمئن انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا پھر ڈاکٹر برٹنڈ کے بارے میں سوچا اور سر جھٹک کر کہا "کافی رات بیت گئی ہے۔ بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر میں اپنی تجویز پیش کروں گا کہ ڈاکٹر برٹنڈ کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک" فونی فوراً بولا اور اس نے خانہ سالن کو کھانا لگانے کی ہدایت کی۔

کھانے کے دوران میں راحیلہ کے ذہن پر یقیناً بوجھ تھا جس سے دھیان ہٹانے کے لیے وہ ادرہ اوٹھ کر کی باتیں کرتی رہی۔ کراچی آفس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ حتیٰ کہ اس نے ذرا تاج کی خیر و برکت بھی دریافت کی۔

"میرے خیال میں تو وہ ٹھیک ٹھاک سی ہے۔" میں نے جواب دیا "مزید معلومات کے لیے تم خود کبھی اسے فون کر لیتا۔ اس کے گھر پر دو تین فون ہیں۔ موبائل فون بھی ہے۔ اور اب تو اس نے آفس بھی کھول لیا ہے۔ تین چار فون آفس میں بھی ہیں۔"

"آفس۔۔۔" راحیلہ نے خفیف سے خفیف سے دہرایا "کیا کام شروع کیا ہے اس نے؟"

"ریٹیل اسٹیشن کا۔" میں نے بتایا "وہ بہت مہنگی قسم کی پراپرٹی کی خرید و فروخت کرائی ہے۔ وہ خود تو زیادہ تر بیس منظر میں ہی رہتی ہے۔ خاص خاص موقوفوں پر، صرف خاص خاص پرائیڈوں کے سامنے ہی آجاتی ہے۔ بیشتر کام اس کا ایک جہانغیرہ قسم کا منیجر کرتا ہے۔ اس نے بہت لمبات بات سے کام شروع کیا ہے۔ اور وہ چل بھی پڑا ہے۔ قہوڑے سی عرصے میں اس نے ٹھیک ٹھاک دلایا کما لیا ہے۔"

"دوبلا واقعی روپے کو کھینچتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ شاید ہم تینوں ہی کافی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ اس دوران میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ میرے ساتھ ساتھ یقیناً وہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی سوچ میں اچھے ہوئے تھے۔

آخر راحیلہ نے پوچھا "تم ڈاکٹر برٹنڈ کے بارے میں کوئی تجویز پیش کرنے کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں۔۔۔" میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کر کب میز پر رکھا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد اپنی تجویز بیان کی۔ ان کی آنکھوں میں دلچسپی کی نہایت معمولی لہر ابھری۔ شاید انہیں اس کا کوئی خاص قاعدہ نظر نہیں آتا تھا۔ سر حال وہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔

ہم دوبارہ خانے میں پہنچے۔ ڈاکٹر برٹنڈ زمین پر پڑا کرادیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا۔ فونی نے الماری سے

ٹپ ٹپ ٹپ لالا اور اس کا ایک کھڑا کٹ کر اس کے ہونٹوں پر چڑھا لگا۔ میں اس دوران میں اس کے قریب کھڑا تھا۔

میں نے بڑا بڑا کرتے ہوئے انگریزی میں خود کھانے کے سامنے میں کہا "جب یہ ہمارے کسی کام ہی نہیں آسکتا تو پھر اس میسر یہاں لائے رکھنے کا کیا فائدہ؟ اس سے جان ہی چھڑا لیتے ہیں۔" گاڑی اور فونی نے اسے اٹھایا اور ایک بار پھر اسے اوپر پہلے ہی کی طرح گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ ہوش میں تھا۔ راحیلہ اب مکمل خواب پریشی والی حالت ہمارے ساتھ تھی۔ فونی ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی سست رفتار پر گلیز گلیز کی سڑکوں پر سفر طے کرنے لگی۔

ہم اب نیچی آوازوں میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ آوازیں برٹنڈ بھی سن سکتا تھا۔ راحیلہ بولی "میں تو تم کو ہی دیر سے راوی کا خیال چھوڑ دو۔ خواہ مخواہ اتنی دیر تک سفر کرنے کیا ضرورت ہے۔ میں گلیز میں بھی ضرور سوچ رہے ہوں اس سے کیا کیوں نہیں اٹھاتے؟ وہ بھی اچھی خاصی کمری ہے۔ آج کل ڈاک میں خوب پانی آ رہا ہے۔"

"اس میں یہ اچھی طرح ڈوب بھی جائے گا؟ کیا کہہ رہے۔ کیس کوئی تدبیر تو نہیں کر لے گا؟" فونی نے ذرا تھپتھپایا پوچھا۔

"اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ منہ پر پٹ باندھا گیا خاک کرے گا؟" راحیلہ ہانکوا رہی سے بولی "مزید احتیاط کے پر ہم اس کی کمر کے ساتھ قہوڑا بہت وزن بھی باندھ دیں گے۔" "میرا خیال ہے تمہاری تجویز مناسب سی ہے۔" میں نے بولی "میں نے اسے کی خاموشی کے بعد کہا "ہمیں راوی تک جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو اسی علاقے میں پورا ہوجائے گا۔ خیال ہے محکمہ ٹائون والے ٹپ پر چلتے ہیں۔ وہاں اس وقت ہٹا سٹا ہو گا۔ ہم ڈرائیو میں اس سے اپنا کام کر سکیں گے۔"

"تو پھر میں گاڑی محکمہ ٹائون کی طرف موڑ لوں؟" فونی پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "گاڑی کی ڈکی میں کوئی ہتھیار چھ سوچو ہے؟"

فونی نے ایک لمحے سوچا پھر بولا "گاڑی کا ایک ٹائو ہٹا موجود ہے۔ میرا مطلب ہے صرف لوہے کا رسپ ہے۔ اس کا نہیں ہے۔ وہ کافی دھڑلی ہے۔"

"بس۔۔۔ وہی ٹھیک رہے گا۔ وہی باندھ دیں گے۔ اب راوی کے اندر میرے میں وہاں سر کے کنارے چھوڑ دو کون طاقی کر پھرے گا۔" میں نے طمانیت سے کہا۔

ڈاکٹر برٹنڈ اس دوران میں مڑی مڑی حالت میں فونی ساکت پڑا تھا۔ میں کچھ سیٹ پر تھا اور میرے پاؤں اس کی ہونٹوں پر ٹکے ہوئے تھے۔ ہم جان بوجھ کر اردو میں بات



ری تھی لیکن آنکھوں کا سفید سفید حصہ گویا الگ ہی جگہ رہا تھا۔ وہ چند لمبے کمری کمری سانس لیتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ٹھیک ہے میں اپنی ٹکٹ نکلتے چلے گا۔ خدا کے لیے مجھے جلدی واہیں لے پلو ورنہ میں سرخس کرے بغیر ہی مر جاؤں گا۔“

”یعنی تمہاری یادداشت واہیں آگئی ہے؟“ میں نے معنوی بے چینی سے پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں۔ اب طرہ وقوع موت کو۔ میری یادداشت بالکل ٹھیک ہے اور تم مجھ سے بھی بڑے شور کے بچے ہو۔“ وہ غماہت زدہ لہجے میں بولا۔

”کتنی خوشی کی بات ہے کہ عین آخری لمحے پر تمہاری یادداشت واہیں آگئی۔“ میں نے گویا خوشی سے نال ہوئے ہوئے کہا ”خدا کا شکر ہے ابھی ہم نے تمہیں ہاتھوں سے چھوڑا نہیں تھا۔“

میں نے جلدی سے اس کی کمر سے رپٹ ہٹایا اور ہم نہایت بھرتی سے اسے گاڑی میں واہیں لے آئے اور پچھلی سیٹ پر بٹھارے۔

”اب تم کسی حد تک باعزت لوگوں کی طرح سزا سکتے ہو۔“ میں نے کہا ”بہر حال احتیاط ضروری ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے شپ اس کے ہونٹوں پر دوبارہ چپکرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ فونی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم تیزی سے واہیں روانہ ہو گئے۔

میرے ذہن سے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کر رہا تھا۔ ساری تحکین دور ہو گئی تھی۔ فونی اور راحیلہ بالکل خاموش تھے۔

”کیسا ختم لوگوں نے۔ کیسی بارکت ضرور ہے۔“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا ”اس کے اوپر جھلا جھلانے سے بے چارے ڈاکٹر برنارڈ کی یادداشت واہیں آگئی ورنہ بے چارہ اس دنیا سے یادداشت کے بغیر ہی رخصت ہو جاتا۔“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ برنارڈ منہ پھیر کر کوفی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھا۔ جلدی ہم فونی کے گھر واہیں جا پہنچے۔ ایک بار پھر ہم نے یہ خانے کا رخ کیا۔ ڈاکٹر برنارڈ کو اب بھی افکار کچھے پہنچایا گیا۔ یہ خانے میں ایک گوشہ حوالات کی کوٹھری سے مشابہ تھا۔ اس کا دروازہ بھی آہنی سلاخوں والا تھا۔

اس بار ہم نے برنارڈ کو اس میں پہنچا دیا اور فرش پر بھیجے مگر وہ برنارڈ۔ میں نے اس کے منہ سے شپ ہٹا کر کہا ”مگر تم ایسے انسانوں کا سادہ یہ اقتدار کو گے اور سوچ لے کر فرار کی کوئی اسکیم بنانے کی کوشش نہیں کرو گے ڈورڈر ہنتر اور باعزت انداز میں رہ سکو گے تمہارے ساتھ مسافروں کا ساملوک کرنے کی کوشش

کر رہے تھے تاکہ برنارڈ یہ سمجھے کہ ہم اسے اپنی منگٹوں کے مقصد سے بے خبر کرنا چاہ رہے تھے۔ جبکہ مجھے یقین تھا برنارڈ کافی حد تک اردو بہت تھا۔ وہ جس طرح آنکھیں بند کیے ساکت پڑا تھا اس سے مجھے سوس ہوا تھا کہ وہ کان لگا کر ہماری منگٹوں سے رہا تھا۔

جلدی ہم سر کے مشعل گاڑن والے ٹبل پر پہنچ گئے جہاں سے درے قیپ میں ایک راست ایف سی گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ہم اس کی دوسری طرف آگئے۔ یہاں دونوں طرف کی سڑکوں پر اتفاق سے لائسنس بھی اس وقت بند تھیں جس سے ہمارا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ ویسے بھی یہاں دونوں طرف خاصا اونچا اونچا سبزہ درختوں کی قطاریں تھیں جن کی وجہ سے چرا سرار اور ٹھیکاسا ڈراما پچلا رہا تھا۔ فونی نے گاڑی ذرا قیپ میں درختوں کے درمیان لے جا دی۔

نہر کے دونوں طرف دنوں سے سڑکیں تھیں جو وحدت دہاد اور ٹھیل کو ملتی تھیں۔ ان پر حسب توقع اس وقت گاڑیوں کی عروفت ختم ہو چکی تھی۔ ہم تینوں چرا سرار سڑکیں کی طرح گاڑی سے اتر آئے اور ہم نے برنارڈ کو تقریباً کھینچ کر گاڑی سے نکالا۔ اس درندہ قابیل کھٹی کھٹی کچھ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کراہ اٹھا۔

فونی نے نہایت بھرتی سے ڈکی سے وٹیل کا آٹنی رپٹ نکالا۔ ہم نے اسی بھرتی سے اسے ٹائیلوں کی ڈوری کے ذریعے برنارڈ کے سر سے باندھ دیا۔ رپٹ سمیت وہ کافی بوزنی ہو گیا لیکن ہم تینوں نے لے لی کر اسے اٹھا ڈیڑھ فٹکل نہیں تھا۔

ہم نے اسے اٹھایا اور احتیاطاً ڈھکڑھکڑھکے گاڑی کی طرف ہلکا ہلکا کر ڈورڈر تک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی نہیں دیں۔ یہ سمجھ کر ہم تیزی سے اسے چھوٹے سے ٹبل پر لے آئے۔ ٹبل پر ڈورڈر بہت بھرتی تھی۔ بچے نہر کے پانی کی سطح آبلوں کی چٹکی دھکی میں کھس کھس سے جھلکا اٹھتی تھی۔ چاندوں طرف گہرا لٹ خالی تھا۔ صرف پانی کی بدھم سی سرسراہٹ یا پھر کبھی مگر کھجور کے پونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ہم تینوں نے ٹبل کی ٹیچی سی دیوار پر ڈاکٹر برنارڈ کو جھولا دیا اور سرخس اٹھائے ہی لگے تھے کہ اس کی ”اور اور“ کچھ حیرانگی میں گویا یکدم ہنگامی انداز میں خود ڈر گئے ہوئے اور اپنے فٹل ساتھیوں کو دھکنے کی کوشش کرتے ہوئے گہرا ہٹ آئیر واٹش کی ”فٹ فٹ“ فٹ فٹ شاید یہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

ہم نے اسے ٹبل کی دیوار پر لٹایا اور میں نے اس کے منہ پر ٹائپ ہٹک سے دھانے ہوئے کہا ”مگر تم نے بچ جانے کی کوشش نہ کرو ورنہ میں تمہیں سرخس کر دوں گا۔“

اس نے کچھ نہیں ماری۔ نیپ بٹتے ہی وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ پھر وہ اس سے دوڑنا کہتا ہوا۔ اس وقت یقیناً اس کی جلیان برنی ہو چکی تھی۔ اس کی کمری ساتھی رخت فوٹلیجے اندھیرے سے میل کھا

کی جائے گی۔ رہو گے تو تم اسی ڈھانچے میں۔ لیکن تمہیں حالات نما اس کفری سے نجات مل جائے گی۔  
”تم چاہتے کیا ہو؟“ اچانک اس نے پوچھا۔ اس کے لیے میں اضحلال اور تسکین تھی۔

”نہا ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

”میری کیا سمجھ میں آیا ہے؟“ اسے تم چھوڑو۔ میں تمہاری زبانیا سنتا چاہتا ہوں۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ اب وہ ایک محتول انسان معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے راجحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ لڑکی جس کا چہرہ تم نے بکا ڈا تھا۔ ہم چاہتے ہیں اس کا چہرہ ٹھیک کر دو۔“  
”ہیں؟“ اس نے تصدیق چاہی گویا میرا مطالبہ اس کی توقعات سے بہت کم رہا ہو۔

”تم اور کیا سمجھ رہے تھے؟“ میں نے دریافت کیا۔  
”میں سوچ رہا تھا شاید تم ریڈ ڈاٹ کے بارے میں مجھ سے وہ باتیں پوچھنے کی کوشش کرو گے جو مجھے خود بھی معلوم نہیں ہیں۔“ وہ بولا۔

”نی الحال میں نے تمہاری ریڈ ڈاٹ پر لعنت بھیجی ہوئی ہے۔ چونکہ فی الحال ہمیں ایسی کوئی اطلاع نہیں مل رہی ہے جس سے پتا چلا ہو کہ وہ دوبارہ ہمارے ملک میں سرگرم ہونے کی کوشش کر رہی ہے یا اس کی باتیات نے سرے سے منظم ہو رہی ہیں۔ اس لیے ہم نے بھی اس کا پتھا چھوڑ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے ابھی تمہارے علاوہ بھی تمہاری تنظیم کے کچھ بچے کچھ لوگ یہاں موجود ہوں لیکن جب تک وہ کوئی شرارت نہیں کریں گے ہم ان کے پکڑ میں نہیں پڑیں گے۔“

وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں یوں پھیلانے ہوئے تھا جیسے کچھ اور بھی سننے کی توقع رکھتا ہو لیکن صرف اتنا سن کر اس نے گویا سکون کی سانس لے لی۔

میں نے اب قدرے دوستانہ لہجے میں کہا ”اگر تم راجحہ کا چہرہ ٹھیک کر دیتے ہو تو میں باقی ہر بات بھول جاؤں گا۔ خفیہ اداروں کو اگرچہ اس وقت بھی تمہاری تلاش ہے لیکن میں دل پر جبر کرتے ہوئے تمہیں ان ٹپے بھی بخیناؤں گا۔ اگر تم ملک سے فرار ہونا چاہتے ہو اور تمہیں اس میں کوئی مسئلہ درپیش ہے تو میں وہ بھی حل کرادوں گا۔ تمہیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔“

وہ متبادلہ انداز میں مسکرا دیا ”اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ میں جب تمہارے ملک سے نکلنا چاہوں گا، نکل جاؤں گا خواہ تمہارے تمام خفیہ ادارے تمام راستوں کی نگرانی کر رہے ہوں۔ میرے لیے بس اتنی ہی کافی ہو گا کہ مجھے تمہاری قید سے رہائی مل چکی ہو۔“

اس نے اتنی خود اعتمادی سے یہ بات کی تھی کہ میں حیران

ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ شاید میری آنکھوں میں حیرت کی لہر چھڑ کرتے ہوئے بولا ”تمہارے ملک میں کھٹا اور یہاں سے نکالنا۔ دونوں ہی بڑے آسان کام ہیں۔ معمولی درجے کے برصغیر و پشت گرد، خزیب کار، اسٹیکر اور غیر قانونی تاجر کین و مل یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ میں تو پھر بھی ریڈ ڈاٹ کا آدمی ہوں۔“

بات افسوسناک تھی لیکن سچ تھی۔ میں دل دلی دل میں اس شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تاہم میں نے اپنی شرمندگی کا اعتراف نہیں کیا۔ بعض اوقات ڈھیت بنے رہنا انسان کی مجبوری ہوتا ہے۔

”تو پھر تم اب تک نکلے کیوں نہیں تھے؟ پاکستان میں ہی نکل کے ہوئے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”شاید اس لیے کہ میری قسمت میں تمہارے ہاتھوں میں نکلی ہوئی تھی۔“ وہ گھنٹی سانس لے کر بولا ”وہیے اس کا جواب کیا ہے کہ ابھی مجھے ہائی کان کی طرف سے یہ ملک چھوڑنا کی اجازت نہیں مل سکی۔“

”خیریت تو ہے؟“ میرے کان کھڑے ہوئے ”کیا ابھی یہاں کچھ اور فساد پھیلانے کا پروگرام ہے؟“

وہ ہنس رہا لیکن دوسرے ہی لمحے تکلیف سے کرا دیا ”نہیں۔ نہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اپنی تکلیف پر ضبط کرتے ہوئے اس نے گویا مجھے تسلی دی ”مجھے یہاں روکے رکھنے کی وجہ کچھ اور ہے۔ اب یہاں میرے اور ریڈ ڈاٹ ایک دوسری شخصیت کے سوا تنظیم کا کوئی آدمی موجود نہیں ہے مزید کسی کے آنے کا پروگرام بھی نہیں ہے۔ ایک توہ مجھے یہاں شاید باہر سے ہائی کان کی طرف سے ہمارے لیے بھی کچھ اکٹھا آجائیں۔“

”دوسری شخصیت کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”تم نے کہا تھا کہ تم ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کوئی سوال نہ کرو گے۔“ اس نے فوراً مجھے یاد دلایا۔

”یہ وعدہ صرف اس صورت میں ہے کہ تم راجحہ کا چہرہ ٹھیک کر دو گے۔“ میں نے کہا۔

”میں اس کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے تم میری حالت کا رونا خیال کرو۔ میرے پاؤں میں شدید تکلیف ہے۔ میرا جو رونا پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ اس وقت تو مجھے قیمت ہے کہ وہ ذہنی طور پر اس قابل ہوں جو تمہاری باتوں کا جواب دے سکیں۔“ اب وہ غصے سے منظر نظر آ رہا تھا۔

”تم خود ڈاکٹر ہو۔ فی الحال اپنا علاج جیسے خودی کرنا ہے گا۔ جن دواؤں کی ضرورت ہو وہ کوئی کام نکھو دو۔ ابھی مجھے جانتی تھی۔ ایک توہ دن میں تمہاری حالت بہتر ہو جائے تو راجحہ کا چہرہ ٹھیک کرنے کے لیے کام شروع کرنا ہو گا۔“  
”تم میرے لیے جلدی سے دوا میں منگوا دو۔“

ضرورت نہیں۔ بلکہ جنہیں سبھو حیل سے میری ہدایات کے مطابق کام کرنا ہوگا۔  
میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آپ کو سبھو حیل پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور زرا زری سے پوچھا کیا وشاریاں پیش آنے کی توقع ہے؟

دل کی بات کر دی۔ اور خدا کے لیے میرے ہاتھ بھی دلا۔ اب تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے بازو ہل سے چل رہے ہوں۔  
اب کہ ملتیانہ تو نہیں دکھاؤ گے؟ میں نے گویا اطمینان کرنا ہوئی کہ معاشی تو نہیں دکھاؤ گے؟

”وشاریاں کچھ خاص نہیں ہیں۔“ وہ کراہ کر بولا ”مجھے تو زرا سامان اور کار ہو گا جو عام اسکولوں کالجوں کی لیبز و زمریوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ٹیسٹ ٹیوبس۔ پیکر۔ جاب۔ وغیرہ۔ کچھ کیمیکلز وغیرہ جو جنہیں کسی بھی بڑی دوا ساز کمپنی سے مل سکتے ہیں تاہم وہ بھی عام آدمیوں کو نہیں دیے جاتے۔“  
”ہم عام آدمی نہیں ہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”تم ان چیزوں کی فکر چھوڑو۔ جو کچھ تم کو ملے“ جنہیں فراہم کر دیا جائے گا۔

”جہو میں اب یہ معاشی کی بہت ہی کہاں ہے۔“ وہ کراہ کر بولا  
”یہ تو جان رہی ہوئی ہے۔“  
”میرا حال۔ اگر تم نے کوئی نیا حرکت کرنے کی کوشش کی تو مجھ تک تم اپنے ساتھ دشمنی کرو گے۔“ میں نے کہا اور نفی کو اٹھایا۔ اس نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔  
”اٹھایا۔ اس نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔“  
”میں نے ایک کانٹہ اور لکڑی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ تم اپنے لیے دوا نہیں خود ہی لکھ والو۔“

”لیکن ایک کیمیکل شاید جنہیں بھی آسانی سے نہ ملے۔ اسے رکھنے کا لائنس صرف ایک ملٹی پٹیشنل کمپنی کے پاس ہے جس کا ہیڈ آفس امریکا میں ہے لیکن اس کی ایک فیکٹری یہاں بھی کام کر رہی ہے۔ اس کی چند نہایت سنگین پروڈکٹس یہاں بھی مارکیٹ ہوتی ہیں۔“

”میرے ہاتھ ابھی کھینے کے قابل کہاں ہیں۔“ وہ بازوؤں کو لٹا کر حرکت دیتے ہوئے بولا جیسے وہ مرے تک فانی کا شکار بننے کے بعد ٹھیک ہونا شروع کر رہے ہوں۔ ”یہ تو مجھے مطلوب سے سوس ہو رہے ہیں۔“ اس نے ہاتھوں کی انگلیاں پلانے کی کوشش کی۔

”تم ان پکڑوں میں مت پڑو کہ کون سی چیز ہمیں کیسے ملے گی۔“ میں نے قدرے بے آہی سے کہا ”ہم وہ چیز دنیا میں کہیں موجود ہوتی جاوے۔ ہم جنہیں لادیں گے۔ خواہ وہ ہمیں بچہ کر لیا واکا ڈال کر لانی پڑے۔“

”میں تو جنہیں صرف امکانات سے خبردار کر رہا ہوں۔“ ڈاکٹر برنارڈ بولا ”دیے تو مجھے معلوم ہے کہ تم سب کتنے لوہے درجے کے فنکار ہو۔ تم ہی لوگوں کی وجہ سے تو یہاں ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کا شرخا ب ہو گیا اور آج میں بھی یہاں اس حال میں پڑا ہوں۔ تمہارے سرکاری اداوں سے تو ہم نے کبھی کوئی فلوو محسوس نہیں کیا تھا۔“

”میں تو جنہیں صرف امکانات سے خبردار کر رہا ہوں۔“ ڈاکٹر برنارڈ بولا ”دیے تو مجھے معلوم ہے کہ تم سب کتنے لوہے درجے کے فنکار ہو۔ تم ہی لوگوں کی وجہ سے تو یہاں ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کا شرخا ب ہو گیا اور آج میں بھی یہاں اس حال میں پڑا ہوں۔ تمہارے سرکاری اداوں سے تو ہم نے کبھی کوئی فلوو محسوس نہیں کیا تھا۔“

”میں نے برنارڈ سے کہا ”تم نے دیکھا؟ اگر کوئی ہمارے ساتھ شرافت سے چلے تو اس کے لیے ہم کتنے ایسے لوگ ہیں؟ اب ہم تمہاری تیار داری بھی کریں گے۔ جنہیں کچھ اندازہ ہے کہ رابطہ کا چوبھٹک کرنے کے لیے تم کب کام شروع کر سکو گے اور اس میں کتنا وقت لگ جائے گا؟“

میری سمجھ میں نہ آیا ”اس کی اس بات پر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا یا شرمندہ ستانچہ میں نے اس موضوع پر کوئی بات کرنے کے بجائے اپنے اصلی مسئلے کے بارے میں ہی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”کل ہی تم مجھے ان تمام چیزوں کی فرست بنا دو جو جنہیں اس کام کے سلسلے میں درکار ہوں گی تاکہ جب تک تمہاری حالت بہتر ہو تو تب تک ہم ان کا بندوبست کریں۔“

”میرے ہاتھ ابھی کھینے کے قابل کہاں ہیں۔“ وہ بازوؤں کو لٹا کر حرکت دیتے ہوئے بولا جیسے وہ مرے تک فانی کا شکار بننے کے بعد ٹھیک ہونا شروع کر رہے ہوں۔ ”یہ تو مجھے مطلوب سے سوس ہو رہے ہیں۔“ اس نے ہاتھوں کی انگلیاں پلانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“ وہ کراہ کر بولا ”اب یہ کام ہو جائے گا۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے۔ بس تم اس خاص کیمیکل کا بندوبست کرنے کی فکر کرو۔ اس کے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہوگا۔“

”میرے ہاتھ ابھی کھینے کے قابل کہاں ہیں۔“ وہ بازوؤں کو لٹا کر حرکت دیتے ہوئے بولا جیسے وہ مرے تک فانی کا شکار بننے کے بعد ٹھیک ہونا شروع کر رہے ہوں۔ ”یہ تو مجھے مطلوب سے سوس ہو رہے ہیں۔“ اس نے ہاتھوں کی انگلیاں پلانے کی کوشش کی۔

”وہ کیمیکل اگر روئے زمین پر پالا جاتا ہے تو جنہیں ضرورت مل جائے گا لیکن اگر تم کسی فرضی کیمیکل کے نام سے خواہ مخواہ مجھے چکر

اترے۔ ہوٹلوں اور اس دیوار کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اس لئے کوئی چہ اٹھاری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ دیکھتے ہی شاید انہیں امید نہیں تھی کہ ایک شاندار گاڑی سے اترنے والا سوئٹزرلینڈ کے اور نہایت عمدہ شلوار قمیض 'وسٹ کوٹ' وغیرہ میں نظر کرنے والا کوئی جاگیردار غائب سا شخص ان کی مچھلی کھانے میں دلچسپی رکھ رہا ہو گا۔ راجیم گل نے خود ہی ایک ہیرو کے اشارے کے لئے آیا۔ ہیرو اس کے اشاروں کی طرف متوجہ ہوئے تو پھر اگلے دو دن دوڑے دوڑے آگئے۔

"تم میں سے شیدی کے چچتر کا ہیرا کون ہے؟" راجیم گل پوچھا۔

"میں ہوں گی۔" دہلی پتلے ایک نوجوان نے جھپٹتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا۔ اس نے انہیں گھر سے سینے سے لگا رکھی تھا وہ ننگے پاؤں تھا۔

"شیدی سے جا کر بولور جیم گل کے لئے بہترین ہفتہ کر کے بھیجے۔" وہ جو کچھ اور جس طرح منگوانا چاہتا تھا ان کو سمجھانے لگا۔ دوسرے ہیرے قدرے مایوسی کے عالم میں رہا ہوئے۔

لڑکا آرڈر سمجھ کر مستعدی سے واپس جانے لگا تو میں نے اس کو کہا سا باؤد کچر کر دیتے ہوئے کہا "پیارے بھائی! راجیم گل تو اپنی بدایات سے دے دی ہیں۔ ایک آدھ ہر ایت میری مچھلی پھل پھنٹے دس دن سے زیادہ پرانی نہیں ہونی چاہئے کہ کھل اس طرح پکایا جائے کہ اسے کھانے کے بعد ہمیں پیڑھا پانی کسی ایسے جگ میں لانا جسے سال دو سال میں ایک توہ ضرور دھوا جاتا ہو۔ سمجھ گئے؟"

لڑکا ذرا کھانسی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "نہیں شیدی کے ہوٹل میں بھی آواز ملتی ہے۔ سب چیز باطل ایک دم ٹس کلاس لائیں گا۔"

راجیم گل چنگی بجا کر اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے جلد ہی شیدی کو صرف میرا نام بتا دیا۔ ان صاحب دھیان مت دو۔ یہ جب سے امیر ہوئے ہیں انہیں ہر چیز نکالنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

لڑکا موقع نشیست جان کر فوراً دوڑ پڑا تو میں نے روم کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت عوامی اور فضا کی طرف لوٹ کر جانے کا دورہ بھی کسی بھی عوامی مقام میں ان چیزوں کے لئے اب بھی قوت برداشت کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان میں کچھ آئے۔ ان بے جا دلوں کی مچھلی کئی کئی کماں سے برباد زیادہ تر بڑی سڑکی پر ہوتی ہے۔ شہر میں فٹ پاتھ چلا اور بھی چلیں گے۔"

ظہر پر سوچ بچار کے قابل بنانے کی کوشش کرنے لگا پھر کچھ دیر بعد تھکارتوں میں آیا۔

وہ خاموش رہا۔ ہم ساحل کے دیر ان حصے کی طرف نکل آئے تھے۔ میں نے ایک نفر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی ذرا دھنچے ہوئے بچے کی طرح بیٹھا تھا۔

"آخر جانا کہاں ہے؟" میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔

"واپس سوڑو لگاڑی۔" وہ بولا۔

"تھماری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تم اس وقت کسی عیسوی یا ذرا تیر دانی سرکاری گاڑی میں سفر نہیں کر رہے ہو جو شاہانہ انداز میں حکم دیے جا رہے ہو۔ اور ہر سوڑو لگاڑی۔ واپس لے چلو۔ سیدھی طرح اور فیملہ کن انداز میں تاد جانا کہاں ہے۔" میں نے اسے مزید تھوڑی سی ڈانٹ پلائی۔

"میں بھولا نہیں ہوں بھائی! مجھے ابھی طرح یاد ہے کہ اس وقت میں ایک بڑے سیٹھ صاحب کی خالہ صاحبی گاڑی میں سفر کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں لیکن سیٹھ صاحب کو کرنا وہی پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ میں سیٹھ صاحب کو گاڑی سمیت اس سمندر میں غرق کر دوں گا۔" وہ الفاظ چپاتے ہوئے بولا۔

"واہ بے" دور حاضر کے ماڈرن داؤد اگیرو! میں نے گاڑی موڑتے ہوئے استہزائیہ ستائش کے انداز میں سر ہلایا۔

اب ہم واپس ساحل کے متوازی چلی سی سڑک پر جا رہے تھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر سمندر کی تفصیل کا کام دینے والی موٹی سی اور چھوٹی سی پرانی دیوار تھی جس کے زرد پتھر کی شاید غم دوراں کے بوجھ سے شکست و ریخت کا شکار ہونے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد ہمارے بائیں ہاتھ پر ان چھتر رستورانوں کی قطار شروع ہو گئی جہاں زیادہ تر تھکی ہوئی چھلی اور تان لٹے تھے۔ ان کی خاص ڈش یہی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کسی کے پاس کچھ ہوتا تو اسے بونس سمجھنا چاہئے تھا۔ فضا میں مچھلی کی بو پھیلی ہوئی تھی جو اشتہا انگیز معلوم ہونے کے بجائے خاصی حد تک بھوک بھگانے والی محسوس ہوتی تھی۔

ساحل پر خاصی حد تک دیرانی ہی تھی۔ ان دنوں تقریباً گاؤں پر مستقل طور پر ہی رونق کم ہو چکی تھی اور پھر یہ تو وقت بھی ایسا ہی تھا۔ اس وقت تو کوئی بہت سی زیادہ فاسٹ فوڈ کی پھر ماری

طرح کسی خاص ہی قسم کی بے تابی دل کا مارا ہوا انسان ساحل کا رخ کرنے کا متحمل ہو سکتا تھا۔ کہیں کہیں دو دو تین تین افراد کی ٹولیاں چل قدمی کرتی نظر آ رہی تھیں لیکن ایسا دوسروں میں اتنے سے افراد کا ہونا نہ ہوتا برابر لگتا ہے۔ اس کے باوجود چھتر رستورانوں کے ہیرو ہاتھ میں گندمی سی ٹرے اٹھائے شاید کسی سوہوم سی امید کے سہارے گاؤں کی تلاش میں رست پر اوپر اوپر نکل رہے تھے۔

راجیم گل نے دیوار کے قریب گاڑی رکوائی اور ہم نے

کتنی طاقتور ہو جائے لیکن اسے شکست ہو جاتی ہے۔  
 "میرے بیٹے، میرے بیٹے" راجیلہ نے بے آواز آواز بھائی "بہی  
 کبھی میں سوچتی ہوں۔ اور حیران ہوتی ہوں۔ کہ تم لیڈر ہو سکتے تو  
 کیا ہو تے؟"

"ہمت برا ہوتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "دنیا میں  
 فساد کچھ اور بڑھ جاتا۔"  
 "اور فی الحال تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے مجھے لیے میں  
 پوچھا۔

"فی الحال تو میں اپنی سلا کے مطابق فساد کو کم کرنے میں  
 زندگی گزار رہا ہوں۔ دنیا میں قدم قدم پر فساد کے بڑے بڑے پہاڑ  
 کھڑے ہیں۔ اگر میں ان میں سے دو چار ڈکے ہی کم کرنے میں  
 کامیاب ہو گیا تو میرے لیے یہاں بڑی کامیابی ہوگی۔ بظاہر تو کوئی فرق  
 پڑتا نظر نہیں آئے گا لیکن میں خود کافی طمانیت کے ساتھ اس دنیا  
 سے رخصت ہوں گا۔"

"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرا اور اس کی انگلیاں دھیرے  
 دھیرے دوبارہ اسٹیرنگ ویل کو ٹھکھٹانے لگیں۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی "مکان کی تعمیر کا کام قریب  
 جا کر نہیں دیکھو گے؟"

"تم دیکھتی رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اذیت میں سر ہلایا تو میں نے کہا "میں۔ تو پھر میں دیکھ  
 کر کیا کر دوں گا۔"

"چھ۔ تو پھر آفس چلتے ہیں۔" وہ گاڑی اشارت کرتے  
 ہوئے بولی "تمہارا کرا کافی دنوں سے خالی رہا ہے۔ تمہاری یاد میں  
 آئیں بھرا رہتا ہے۔ کہیں تم سے بڑا کوئی آسیب اس میں میرا نہ  
 کرے۔"

"جب تم جیسی بد روح اس کی حفاظت کے لیے بیٹھی ہے تو پھر  
 آسیب اس میں کھنے کی جرات کیسے کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔  
 اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی گھما کر سڑک پر لے آئی۔  
 کچھ دیر بعد ہم آفس پہنچے اور پہنچ کر میں سب لوگوں سے  
 ملاقات کے بعد اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا تو راجیلہ میرے  
 ساتھ ہی تھی۔ کیئرٹن نے اپنی میز سے اٹھ کر میرا استقبال کرتے  
 ہوئے "ہیلو۔" اپنے "دفتر کے ہمارے کے بعد بتایا "کچھ دیر پہلے ہی  
 گراچی سے آپ کے لیے زور تاج کا فون تھا۔"

میں نے غیر ارادی طور پر راجیلہ کی طرف دیکھا لیکن اس کا  
 چہرہ ابھی تک غائب اور تاریک منہ کی بنا میں تھا۔ میں اس کے  
 تاثرات نہ دیکھ سکا۔ استہزائیہ ہی ہوں گے!  
 میں نے کیئرٹن سے پوچھا "کوئی خاص بات؟" اس نے کوئی  
 پیغام تو نہیں چھوڑا؟

"نہیں سارا۔" اس نے جواب دیا "وہ جس آپ کی خریدت معلوم  
 کرنا چاہ رہی تھی اور یہ پوچھ رہی تھی کہ آپ کا قیام کہاں

ہے۔ کب تک وہاں رہی ہوگی۔ یہ باتیں مجھے خود بھی معلوم  
 تھیں اس لیے میں انہیں کچھ نہیں بتا سکی۔ وہ کہہ رہی تھی  
 ممکن ہو تو آپ انہیں فون کر لیتے گا۔"

میں نے سر ہلایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔  
 میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ذرا استہزائیہ  
 میں بولی "بے چاری کے لیے انتظار کی گھنٹیاں گزارنا مشکل  
 ہے۔ ایک دن میں ہی بے تاب ہو گئی۔"

"تمہارے منہ میں کبھی شکر۔" میں نے اپنی روح الٹ  
 دھیر ہوتے ہوئے کہا "کاش ایسا ہی ہوتا لیکن ایسا  
 نہیں۔ جب میں وہاں ہوتا ہوں تب تو وہ چار چار دن فون  
 کرتی۔ اب رٹا کر لیا ہو گا۔ دوسرے شہر آیا ہوا ہوں۔"

"صفائیاں کیوں پیش کر رہے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے  
 وہ میرے مقابل بیٹھ چکی تھی۔ غائب اس نے ہٹا دیا تھا اور  
 اندر کر میز پر رکھ دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میری توقع کے  
 مطابق استہزائیہ تھی۔

"مجھے صفائیاں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں۔

"ابلتے یہ حسرت ضرور ہے کہ کبھی وہ وقت بھی آئے جب  
 صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت پیش آئے۔" میں نے پاؤ  
 ایک حسرت بھری آواز کر بھرا اس کی طرف دیکھا۔ اس  
 تو میرے چہرے کا گلابی پن کچھ گرا ہوا گیا۔

"تو اس مت کہو۔" وہ فوراً موضوع بدلتے ہوئے بولی  
 "تاکہ اسے دنوں بعد اپنے اس آفس میں بیٹھنا کیسا ناگوار ہے؟  
 "ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں کہیں گیا ہی نہیں تھا۔"  
 نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک۔" وہ طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولی  
 آرام سے مہاں بیٹھ کر کام کرو۔"

"کام؟" میں نے کراہ کر کہا "کیسا کام؟ ابھی کل ہی تو  
 بے کراہی سے یہاں تک سفر کر کے راستے میں ڈاکٹر پر ہلاک  
 لپاؤ کی کر کے اتنی طویل اور داغ سوز قسم کی میٹنگ بھگائی؟  
 کیا اب بھی میرے لیے کچھ کام باقی ہے؟"

"تمہارے یہاں نہ ہونے سے بہت کام جمع ہو چکا ہے۔  
 جانے سے پہلے کچھ تو تمنا جاؤ۔" وہ جلدی سے بولی۔  
 "تم لوگ آخر کس مرض کی دوا ہو؟" میں نے کچھ ایسے  
 انداز میں کہا جیسے کوئی پرانی مصیبت میرے۔ چوری ہو۔

"ہم سے تو جو ہو سکتا ہے کرتے ہی رہتے ہیں۔ فون اور  
 پر بھی تم سے رابطہ رہتا ہے۔ دو زمانہ ضروری کاغذات دھو  
 لیے تھیں وہاں بھی بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ  
 رہ جاتے ہیں۔"

"دفعہ خدا یا۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر قائم کیا  
 میں اپنے آپ کو کام چھوڑ کر غائب کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا

”تھلنے میں کروں گا۔ آخر پراسیس کی بھی کوئی چیز ہے۔ ذرا تاج سے بات کرنی ہے کسی خوشخبر سے نہیں۔“  
 ”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“ وہ مسکرا کر اٹھنے ہوئے ہوئی  
 ”میں تو جانی رہی ہوں۔ تم بے شک اطمینان سے چمت سے اٹے  
 نلک کر بات کرو۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے واقعی ذرا تاج کو فون کر لیا۔  
 بات کوئی خاص نہیں تھی۔ اس نے صرف میری خیر دعائیت پوچھنے  
 اور واپسی کا پروگرام جاننے کے لیے ہی فون کیا تھا۔  
 ”میں آیا تو صرف ایک دن کے لیے ہی تھا لیکن اب پانچ نہیں  
 کتنے دن لگ جائیں۔ میں یہاں ایک اور ہی چکر میں پھنس گیا  
 ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”تم جہاں جاتے ہو پھر تمہارے بھتر ہوتے ہیں۔“ وہ ہلکی  
 ہنسی کے ساتھ بولی۔  
 ”کیا کروں۔ قسمت ہی کچھ ایسی پائی ہے۔“ میں نے بے بسی  
 سے کہا۔

”کیا یہ خاصا خوبصورت ”چکر“ ہے؟ کیا عمر ہے اس کی۔ اور  
 کہاں رہتی ہے؟“ اس نے مصمانہ سے لیے میں پر چما۔  
 ”آہ۔ ہر طرف سے مٹر کے تھپ۔“ میں نے کراہ کر کہا ”کیا تم  
 لڑکیوں کو اس قسم کی باتیں کہنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا؟“

”اے اتنی دولت اسی لیے تو نہیں کٹائی تھی کہ مجھے پھر بھی کام  
 دولت تو جتنی زیادہ کماؤ گے۔ کام اتنا ہی بڑھتا چلا جائے

”میں دن میری کمپوزنگ محکم کی ترسب کچھ چھوڑ چھوڑ کر کھڑ  
 ایک چلا چن کر بیگل میں جانتی ہوں گا۔ سن پاس لے لوں  
 جب بال سفید ہو جائیں گے تو شیشی بابا کھلا لے لگوں گا؟“  
 ”جیت مشکل ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی ”پانچوں میں دولت کی  
 یازدہ سو۔ گلے میں دنیا داری کا طوق ہو تو اتنی آسانی سے جان  
 ن چھوٹی۔ لہذا بہتر ہے کہ یہ فیصلہ ”میں نہیں“ کرنے کے  
 نے کچھ ضروری کاغذات دیکھ لو۔“

اس نے آخر کام پر جنرل شیخ اور فیروز ایکسپورٹس کو کچھ فائلیں  
 بے کمرے میں بھجوانے کی ہدایت کی۔ فائلیں آگئیں تو وہ مجھے  
 کم کفایت کے بارے میں الگ الگ ہر ضروری بات بتانے لگی۔  
 پاس نے مجھے کام میں الجھا دیا لیکن اٹھنے سے پہلے بولی ”ویسے  
 زبے کام میں زیادہ مصروف ہونے سے پہلے اس بے چاری  
 تاج کو فون کرو۔ شاید وہ بے تابی سے تمہارے فون کا انتظار  
 رہی ہو۔“

”تمہارے سامنے تمہارا ہی کروں گا فون۔“ میں نے فوراً کہا

## صاحب طرز ادیب قمر اجنالوی کی تاریخی کتب

|       |                         |       |                |
|-------|-------------------------|-------|----------------|
| ۲۰۰/- | نئی دنیا                | ۱۲۵/- | پرتھال         |
| ۹۰/-  | لاڈو                    | ۱۰۰/- | پٹنڈارے        |
| ۶۰۰/- | بغداد کی رات (اول دوئم) | ۱۵۰/- | ولی عہد        |
| ۶۰۰/- | دھرتی کا سفر (اول دوئم) | ۱۵۰/- | شمشیر          |
| ۴۰۰/- | مقدس مورتی (اول دوئم)   | ۲۰۰/- | چاہ بابل       |
| ۱۷۵/- | جہان لوح و قلم          | ۳۰۰/- | سلطان          |
| ۱۵۰/- | غزالہ                   | ۱۵۰/- | جنگ مقدس       |
|       |                         | ۱۲۵/- | اور خان الغازی |

مکتبہ القریش • اُردو بازار لاہور اخوند: ۷۲۳۶۶۵

لیتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہارے چہرے کا اصل حالت مجھ کے آگے“

”مجھے تو شاید یقین ہی نہ آئے“ وہ مسکراتے ہوئے حال اس نے اس امید کی مسرت کو محسوس کرنا شروع کر کے اس کا چہرہ ٹھیک ہو سکا تھا وہ پہلے تو وہ ایسی کے غلٹ لٹنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”ٹھنی آج اسی سلسلے میں انتظامات کرتا ہوں۔ تم نے جتنا کام میرے سپرد کیا تھا میں نے اس سے کمال ہے شام تک باقی بھی منٹ جائے گا۔ میں تمام کام ادا کرے گا۔“

”جب تم سنجیدگی سے کام کرنے بیٹھے ہو تو میںوں کاہ میں تنہا لیتے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا کریں۔ جب تم جیسا سخت باس سر ہو تو کام کرنا ہے۔“ میں نے مقلوبانہ لہجے میں کہا۔

”حراخوری کی ایک تنگ خوب کرتے ہو۔ اگر تم حراخوری بزنس کو ادا پھیلا نہیں سکتے تھے۔“ راحیلہ بولی۔

”بزنس کو پھیلانے میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اس کا بڑا بھی صحیح طور پر جان نہیں کہ یہ کیسے پھیلاتا چلا گیا۔ میں نے یہ سب خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔“ میں نے کہا۔

میں جب یہ بات کرتا تھا تو عام طور پر لوگوں کو یقین نہ تھا کہ میرے لیے یہ سب کامایاں غیر متوقع تھیں لیکن وہ اثبات میں سرلاتے ہوئے بولی ”کمز کا سیاب لوگوں کے ہوا کی ہوتے ہیں۔ وہ جب بلندی پر پہنچ جاتا ہے تو پھر انہیں اپنا سزا یک خواب لگتا ہے۔ یہ سب اوپر والے کے عجوبے ہیں بعض اوقات انسان کے لیے اپنی عنایات اور نوازش پھلانے سے کہ وہ سوچا ہی نہ جاتا ہے کہ یہ سب کیا ہو گیا ہو گیا؟ دو دنوں میں عمل خواب چمکے ہیں۔“

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر ”آج کے دور میں ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے کہ ذرا سی کٹ بات کو تو لوگ عجیب سی نظروں سے آپ کی طرف دیکھنے لگے گویا انہیں شبہ ہو رہا ہو کہ آپ کی کھوپڑی کا کوئی پونہ کرنا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا ”میرے پریشانی کی بات یہ ہے کہ میرے اور تمہارے خیالات اچے بدلتے کیوں ہیں۔“

”تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں ہر اچھی بات پر پریشانی ہے۔“ وہ ترحم آمیز لہجے میں بولی۔

”کھانے اور کانی کے بعد میں اپنے کمرے میں گیا اور وہ کام میں جگت کیا۔ چار بجے کے قریب ٹوٹی کافون آیا ”سراپا“ باقی سب سامان جمع کر دیا ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔“

”چھانے تو کوئی اور بھی اس قسم کی باتیں کرتا رہا ہے؟“ وہ چرکی۔

”جو وہ دعائی لڑکیاں اشفاق سے میری جاننے والی ہیں وہ آج کل اسی قسم کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسا برا زمانہ بھی آئے گا جب خوبصورت اور جوان لڑکیوں کے پاس بات کرنے کے لیے اس قسم کے موضوعات کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں ہوگا۔“

”زمانہ تو خیر اس سے بھی برا آئے گا جب لڑکیوں کے پاس تم سے بات کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوگا۔ اور اگر ہو گا بھی تو وہ زیادہ سے زیادہ دیرافت کریں گی“ بابائی اگھائی اپ کیسی ہے؟ ہاتھوں کا عرصہ کچھ کم ہوا یا نہیں؟ جوڑوں کے درد کو کچھ آرام ہے یا نہیں؟“ کبھی نہ کبھی تمہیں وہ دن بھی دیکھنا ہی ہے۔“ وہ ہنسنے لگی گویا اس وقت کے تصور سے محفوظ ہو رہی ہو۔

”آج بھیاک نقشہ کھینچ کر مجھے مجبور مت کرو کہ میں بھی حضرت جوش کی طرح دعا کرنے لگوں کہ خدا وہ وقت آنے سے پہلے ہی مجھے اٹھالے“ میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا ”اور یہ مت بھولو کہ جب مجھ پر ایسا وقت آئے گا تو تمہاری حالت اس سے بھی زیادہ جہنم تک ہوگی۔“

”دیکھا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولی ”بہر حال یہ فرق ضرور ہو گا کہ مجھے اس پر کوئی خاص افسوس نہیں ہوگا۔ میں تو میرے شکرے دن گزار لوں گی لیکن تمہیں بہت افسوس ہوگا۔ دن رات چٹھے آہیں بھرو گے۔“

”تم نے اس وقت کے تصور سے ڈرانے کے لیے ہی صحیح فون کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ سو میں نے جسیں یاد دلانے کے لیے فون کیا تھا کہ ہو سکے تو ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ یہاں بھی ایک پکر تمہارا منتظر ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا لیکن یہ ذرا عمر سیدہ اور بڑھ چکا ہے۔ جس میں اس قسم کے پکر سے کوئی دلچسپی تو نہیں ہو سکتی لیکن میں چاہتی ہوں کہ میری خاطر تم دلچسپی لے لو۔ میں بھرپور سفارش کر رہی ہوں۔“

”تمہاری خاطر تو دلچسپی لیتی رہے گی۔“ میں نے کہا۔

”بہت شکریہ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں رہیہور رکھنے کے بعد بھی کچھ دیر تک اس کے بارے میں سوچا رہا۔ کیا واقعی اس نے صرف اتنی سی بات یاد دلانے کے لیے فون کیا تھا؟ میں نے اس موضوع پر زیادہ غور کرنے کے بجائے اپنے آپ کو کام میں الجھانے کی کوشش کی۔

کام میں دقت گزرنے کا چاہی نہ چلا حتیٰ کہ خانجریک ہو گیا۔ راحیلہ نے اپنے اور میرے لیے کھانا قریبی رستوران سے منگوایا ہوا تھا جو ہم نے کافرنس روم میں بیٹھ کر کھایا۔

کھانے کے دوران میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ

میکل کا دیا گیا ہے۔ وہ تو واقعی نیرنگی کھیرا بن گیا ہے۔  
 "میرا اما تھا شکا۔"

"ڈاکٹر نارڈ نے نہیں جس ملٹی پلکس امریکی کمپنی گپسن فارما  
 اس میں لکھ کر دیا تھا۔ یہ کمپنیکل صرف ان کے پاس ہوتا تھا  
 ان کی بھی صرف ایک ہی پروڈکٹ میں استعمال ہوتا تھا۔ وہ کچھ  
 قسم کے زخموں کی دوا تھی۔ اس کمپنیکل کو دو اساز کمپنیوں کے  
 نام ذرا ان میں فارمولا اے کہتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ سب باتیں تو ڈاکٹر نارڈ نے ہمیں بتائی تھیں۔"

"لیکن آئندہ ترین صورت حال اس غیبی کو بھی معلوم نہیں  
 ہے۔ یہ ہے کہ زخموں کی وہ دوا اتنی بافہ ممالک میں تو تقریباً  
 اصل پہلے چین ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں اسے تقریباً چھ ماہ پہلے  
 شائع قرار دیا گیا ہے۔"

"اس کے بارے میں شبہ پایا گیا ہو گا کہ وہ اگر زخموں کو کچھ  
 دیتی ہے تو کوئی دوسری ملک بنامی بھی پیدا کرتی ہے؟" میں  
 خیال ظاہر کیا۔

"جی ہاں" ٹونی نے جواب دیا۔

"یہ کوئی نئی کمپنی نہیں" میں نے آسف سے کہا "ہم چپے  
 ڈوان مغربی سائنس دانوں کے لیے ان چھوٹی اور بڑیوں  
 اہمیت بھی نہیں رکھتے جن پر یہ لوگ طرح طرح کے تجربات  
 کرتے رہے ہیں۔ ان چھوٹی اور بڑیوں کے تحفظ کے سلسلے میں  
 بالخصوص مٹی ہوئی ہیں اور ان کی حمایت میں جلتے جلوس ہوتے  
 جاتے ہیں لیکن ہمارے بارے میں کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں ہو گا  
 میں یہ لوگ اپنی ایجادات کے سلسلے میں تحفظ ملنے دیتے رکھتے  
 ہیں۔"

"جی ہاں" ٹونی بولا "پہلے یہ ایک دوا ایجاد کر کے ہمارے ہاں  
 آئی ہے۔ اپنے ہاں تو یہ جلد ہی اس کے خطرناک نتائج سے  
 ہو کر اسے بند کر دیتے ہیں۔ اس سے جان چھڑا لیتے ہیں لیکن  
 اسے اگر ان کی اپنی کمپنی بھی اس دوا کو مارکیٹ کر رہی ہو تو یہ  
 مارکیٹ کرانے کے سلسلے میں سخت اور واضح بدایات نہیں بیچتے۔  
 اسے ہمارے سرکاری محکمے اور انسپکشن تو ویسے ہی سونے پہ  
 گاڑیں۔ آٹھ دس سال تو ویسے ہی ان کے کان پر جوں نہیں  
 لگتا۔ بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ عرصے کے بعد جا کر  
 مرنے پڑتا ہے کہ فلاں دوا کے اثرات خراب ہیں اور وہ فلاں  
 لوگ میں آٹھ سال پہلے چین ہو چکی ہے۔ اس وقت تک نہ  
 نے کچھ بڑھیب ان دواؤں کی وجہ سے پیچیدہ اور ملک امراض  
 پھیل رہے ہوتے ہیں۔"

"الٹے یہ سلسلہ تو ہمارے ہاں بہت عرصے سے چل رہا ہے"  
 رائے آسف سے کہا "زخموں کی وہ دوا چین ہو چکی ہے اس لیے  
 دواؤں کے ساتھ ساتھ..."

"جی ہاں" ٹونی نے میرے بدترین خدشے کی تصدیق کی "دوا  
 ساز کمپنی کے پاس جتنا اسٹاک تھا۔ کمپنی کے نہایت بڑے دار  
 افراد کے بیان کے مطابق وہ کچھ عرصہ قبل ہی ضائع کر دیا گیا ہے۔"  
 "تم نے کوئی اور ذریعہ۔ کوئی اور راستہ تلاش کرنے کی  
 کوشش کی؟ کسی کیسٹ وغیرہ کو؟ فارمی کے کسی ماہر کو روپے  
 پیسے وغیرہ کا لالچہ دے کر؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

وہ میری بات کانٹے ہوئے بولا "اے پکڑیں تو اتنی دیر لگ گئی  
 سر باقی کام تو بچے سے پہلے ہی منٹ گئے تھے۔ میں نے کوئی سراغ تلاش  
 کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارمولا اے  
 بہت جلد ہی قلعہ بارنہ بن گیا۔ کسی کو اس کے بارے میں کچھ یاد  
 نہیں۔ کسی کو صحیح معلومات نہیں ہیں۔ ویسے بھی وہ اپنی جگہ ایک  
 مکمل فارمولا تھا اور تیار شدہ حالت میں امریکا سے ہی امپورٹ  
 ہوتا تھا۔ یہاں کسی نے اسے تیار کرنے یا اس کا فارمولا محفوظ  
 کرنے کی کوشش نہیں کی۔ زخموں کی اس دوا کے بارے میں شبہ  
 پایا گیا تھا کہ وہ کینسر کا سبب بن رہی ہے اور اس سلسلے میں سب سے  
 زیادہ شبہ "فارمولا اے" پر ہی جارہا تھا اس لیے اب گویا کوئی بھی  
 اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی واقفیت ظاہر کرنا ہی نہیں  
 چاہتا۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے جلدی سے کہا "کیس یہ  
 ڈاکٹر نارڈ کا کچھ ہمارے ساتھ کوئی اور بی کر تب تو نہیں کرتا چاہتا؟  
 کیس ایسا نہ ہو کہ بظاہر راجلہ کا چھوٹا ہو جائے۔ ہم برٹارڈ کو  
 رہا کر دیں اور بعد میں راجلہ کسی نئی مصیبت میں پھنس جائے؟"  
 "میں نے اس امکان پر غور کیا تھا۔ میری ایک بہت بڑے  
 کیسٹ سے بات ہوئی ہے۔ میں اصل قہہ تو اسے نہیں سنا سکتا  
 تھا لیکن میں نے اس سے فارمولا اے کے استعمال کے بارے میں  
 رائے لی تھی" ٹونی نے بتایا "اس کا کہنا ہے تھا کہ فارمولا اے اپنی  
 جگہ مکمل دوا نہیں ہے۔ وہ محض ایک کمپنیکل ہے۔ اصل دوا درکار  
 اس کے استعمال پر ہے۔ جس طرح زہر کھا کر انسان مر جاتا ہے  
 لیکن ایک ماہر کی دواں اسی زہر سے طرح طرح کی دوائیں تیار  
 کرتا ہے اسی طرح فارمولا اے کو بھی کوئی پیش اس طرح  
 استعمال کر سکتا ہے کہ اس سے کوئی عجوباتی دوا تیار ہو جائے۔ وہی  
 چھری والی بات ہے۔ کہ کوئی اس سے گلا بھی کاٹ سکتا ہے اور  
 کوئی دوسرے ہزاروں تھیری کام لے سکتا ہے۔ ڈاکٹر نارڈ بہر حال  
 ایک پیشہ ور ہے۔ نہ جانے اس نے کس کس چیز کے کیا کیا استعمال  
 دریافت کر رکھے ہوں گے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اب وہ ہمارے ساتھ  
 بد مصاشی نہیں کرے گا۔"

"ہم کچھ امید کی کلن بھی نظر آئی یا نہیں؟" میں نے  
 پوچھا۔

"جی ہاں۔ ابھی ایک امید باقی ہے" ٹونی خوشگوار لہجے میں بولا



اور دیکھو کہ فطرس صورت حال کے بارے میں کیا کہنے کے علاوہ ڈاکٹر برنارڈ کے ذہن کو ٹوٹنے کی کوشش کرنا ساتھ کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہا۔ میں نے ہدایت کی کہ بات تمہارے علم میں آجے جو تمہیں ذرا سی بھی اہم ہو۔ سو بال فون پر فوراً مجھے مطلع کرنا۔ شاید کچھ دیر بعد میں میں نہ ملوں۔

”میرا آپ کے ساتھ آنا تو ضروری نہیں؟“ اس نے سنا۔ ”نہیں۔ اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو بلا لیں گا۔ کما اور سلسلہ منقطع کروا۔“

میں چند لمحوں سوچا رہا۔ یوں تو امریکی جیسے لوگوں میں ایک حاکمانہ شان کے ساتھ رہتے ہیں لیکن میں سمجھا اگر میں اپنا مکمل ختلاف کرانے کے بعد ہیرس سے باز تو شاید وہ مجھے کچھ اہمیت دینے اور میری بات توجہ سے نہ ہو جائے۔

پھر میں نے سوچا کہ اس سے بہتر طریقہ یہ ہو گا کہ میں سے ہیرس تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ وہ بے شک امریکا کی ملٹی ٹیکسل کمپنی کا پریذیڈنٹ تھا لیکن ہر حال اس کا ایک کامداری منصب کی بھی اور اس کا کامداری و سازشی ہر حال ہماری وزارت صحت کی ہدایات کی کچھ نہ کچھ پابندی پڑتی ہوگی اور ہماری اس وزارت کے ٹیکہ بندی کی افسروں یا ڈیروں کی اس کی فطرس میں کچھ نہ کچھ توجہ تھی۔ یہ تھا کہ پہلے میں اس سطح کے کسی شخص سے اس کو فون کر کے بعد خوب بات کرتا۔

میں نے ان لوگوں کو یاد کیا جن سے کسی نہ کسی وجہ سے ہیرس رسد درآہ تھی۔ پھر میں نے اسلام آباد چند لوگوں کو یاد آخر کار ایک بہت سی کار آمد شخصیت اچھا تھی۔ یہ شخص وفاقی وزیر کے برابر اہم تھی۔ میں نے اس سے مدد مانگنا سنے وعدہ کیا کہ وہ فوری طور پر ہیرس کو فون کر دے گا۔

اس کے بعد میں فون بند کر کے کالی منگوا کے تمام چسکیاں لینے لگا۔ مجھے تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ مایوسی ہونے لگی۔ میں نے سوچا شاید وہ شخصیت اتنی اہم نہیں تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ یا پھر شاید اس نے میرا اہمیت نہیں دی تھی۔

عین اس وقت جب کہ میں ہیرس سے براہ راست اپنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، کیتھرس نے مجھے انٹر کام میں سٹرکیری ہیرس مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مجھ پر غلبہ مایوسی کی سخت دور ہو گئی اور میں مسکرائے بغیر نہ نہ زیادہ بہتر رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں گیری ہیرس کو اپنا ختلاف کرانا اور اپنی رام کمانی سناؤں وہ مجھے فون کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس سے کیا کام تھا؟

پر قسمت آزمائی کرنا پسند کریں اور کوئی اچھی خبر لے کر آئیں۔ ورنہ مجھے یہ حکم دیتے ہیں۔ میں اس ذریعے کو بھی کھال کر دیکھ لوں گا۔ ”کیا ہے وہ ذریعہ؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں اس کے لیے کمپنی کا پریذیڈنٹ امریکی سی ہے اور وہ توجہ کل چھٹی پر ہے۔“ ٹونی بتانے لگا۔ ”شاید وہ کچھ زیادہ ہی تیز ار ہو کر چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ اس نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ وہ ہفتے تک کسی بھی کامداری یا دفتری معاملے میں اس سے رابطہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کی جائے۔ کمپنی کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے امید ظاہر کی ہے کہ شاید اب بھی فارمولا اے کا چھوٹا سا شاک کہیں موجود ہو لیکن وہ صرف پریذیڈنٹ گیری ہیرس کے علم میں ہو گا یا وہ کم از کم رہنمائی کر سکے گا کہ ہم اس کی تھوڑی بہت مطلوبہ مقدار کہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ ہمارے بارے میں مطمئن ہو کہ ہم ٹھیک ٹھاک۔۔۔ قاتل، احتیاد اور معزز لوگ ہیں۔ اس قاتل ہیں کہ فارمولا اے ہمارے ہاتھ میں دیا جاسکے۔ اور یہ کہ ہم اس کا کوئی غلط استعمال نہیں کریں گے۔“

میں نے اس کے الفاظ پر غور کرتے ہوئے کہا ”مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسے اصل کمانی تو نہیں بنا سکتے۔ ہم اسے یہ تو نہیں بنا سکتے کہ فارمولا اے ہمیں اصل میں ایک جینیٹس کے لیے چاہیے۔ اور وہ جینیٹس اختلال سے اس وقت ہمارے نہ خانے میں قید ہے اور ہم نے اس محدود کا ایک پاؤں بھی جلا رکھا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ امریکی سی ہو اور اس انکشاف پر براہ راست دہشت ہاؤس میں کھلبلی مچ جائے۔ ریڈ ڈاٹ کو خفیہ طور پر تو تمام شقی یافتہ سفید فام قسوں کی حمایت حاصل تھی۔ کوئی عہدید نہیں کہ برنارڈ کوئی بہت اہم امریکی ہو۔ اس لیے اس کا تو ہم ذکر تک نہیں کر سکتے۔ امریکیوں کی یہ بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کہ وہ اپنے ایک معمولی سے شہری کی حفاظت کے لیے بھی سرحد کی بازی لگا دیتے ہیں اور اپنے تمام وسائل استعمال کرتے ہیں۔ برنارڈ کے لیے تو دہشت ہاؤس تک میں کھلبلی مچ سکتی ہے۔“

”ہم کوئی اور دردناک کمانی گھر کرنا سکتے ہیں جو گیری ہیرس کے جذبہ انسانیہ کو اپیل کر سکتے ہیں۔“ ٹونی بولا ”یہ لوگ بعض اوقات بڑے انسان دوست بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کسی اعلیٰ اور نیک متعدد کے لیے فارمولا اے کی ضرورت ہے۔“

”اس صورت میں بھی شاید وہ ثبوت دیکھے بغیر اور اپنا اطمینان کیے بغیر ہماری مدد نہ کرے۔“ میں نے تمام امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا ”ہر حال تم یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اپنی سی کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ تم نے اس کا فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ تو حاصل کر لیا ہو گا؟“

”جی ہاں۔“ ٹونی نے مجھے دو فون نمبر اور ایڈریس لکھوایا۔ ”ٹھیک ہے۔ تم اب کچھ وقت ڈاکٹر برنارڈ کے سر سوار چو

شہر آیا جاتا ہے۔

”مجھے معلوم ہے مسٹر بیرس!“ میں نے دھجے لیے میں کہا  
”آپ اطمینان رکھیں۔۔۔ وہ کیمیکل ایک ایسے شخص کے ہاتھوں  
میں استعمال ہوگا جو میڈیکل اور فارمیسی کی دنیا کا ایک بہت بڑا  
جینیٹس ہے۔“  
”میں اس کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ اس نے فوراً سوال کیا۔

مجھے اسی سوال کا اندیشہ تھا۔

”اس نے اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی درخواست کی ہے کیونکہ کام  
نئی نوعیت کا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ویسے آپ کو اس ضمن میں  
تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے مسٹر بیرس! اگر اس کیمیکل کے  
بارے میں یہ شہ درست ہے تو پھر اس ملک کے ہر شخص ضرورت  
مندوں پر وہ دقت بھی گزرا ہے جب اس سے بنی ہوئی دوا عام  
میڈیکل اسٹورز پر رک دی تھی۔ یعنی لوگ اپنی جیب سے قیمت ادا  
کے کے کینسر خرید کر گھروں کو لے جا رہے تھے۔“

”وہ لاعلمی کی بات تھی مسٹر چوہدری! لاعلمی میں تو آپ کے  
ذہن میں بھی بڑی بڑی غلطیاں معاف ہیں۔“ وہ خوشگوار لہجے میں  
بولے۔

”غلطی! میں نے چاہتے ہوئے سے لہجے میں دہرایا۔“ یہ بڑا  
حقانہ کار حکم کا لفظ ہے۔ اپنے اعمال کا جواز پیش کرنے کے سلسلے  
میں بہت کام آتا ہے۔ یہ کچھ اسی قسم کی غلطی ہے جیسے کسی بڑے  
مقام پر فائز شخص ایک اشارے سے ہزاروں افراد کو اذیت کی  
سوت مروا دے اور پھر کے اوپر۔ معاف کیجئے۔ مجھے سے ذرا غلطی  
ہوگئی۔ اگر ایسی غلطیوں کو غلطی تسلیم کرنے کا رواج شروع  
ہو جائے تو اس دنیا کا انجام مزید بھیاک ہو سکتا ہے مسٹر بیرس!

جب کہ یہ پہلے ہی خامے بھیاک انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔  
پھر میں نے ذرا سنی خیر سے لہجے میں کہا ”سیرا خیال ہے اس  
دوا کے بارے میں کبھی کوئی اسٹوری نہیں سنیں تھی؟ جہاں  
تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ایسا کوئی قصہ کبھی اخبارات میں نہیں  
پڑھا۔“ میں اسے اشارہ دیتا چاہتا تھا کہ پہلے اگر اس سلسلے میں  
اخبارات میں کچھ نہیں آیا تھا تو اب آسکتا تھا۔ پہلے اگر کسی کے  
اثر رسوخ یا دولت کی طاقت نے اس اسکینڈل کو دبا دیا تھا تو اب  
کسی کا اثر رسوخ اور دولت کی طاقت اس گڑھے مڑے کو اکھاڑ  
بھی سکتی تھی۔

وہ سیرا اشارہ سمجھ گیا۔ اس کے لہجے میں ایک نمایاں تبدیلی  
آگئی۔ وہ پہلے خامے دوستانہ اور خوشگوار لہجے میں بات کر رہا تھا۔  
اب بولا تو اس کے لہجے میں خفیف سا تناؤ آگیا۔ اس کی مصنوعی  
خوش مزاجی رخصت ہوگئی۔ بہر حال مجھے اس کی کوئی خاص پروا  
نہیں تھی۔ مجھے اس کی مصنوعی خوش مزاجی کی نہیں، نارمولا اسے  
کی ضرورت تھی۔

”آپ کافی رخ آوی ہیں مسٹر چوہدری!“ وہ بولا۔

پہلی بات پر کچھ نہیں نے اس سے لائن ملائی۔ دوسری  
فرق سے ایک بھاری ہونچلی مگر چپکٹی ہوئی سی آواز سنائی دی  
جس پر مسٹر افضل چوہدری ایسے ہیں آپ؟ مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس  
دقت میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کو مجھ  
سے کچھ کام ہے۔ گو کہ میں ان دنوں چھٹی پر ہوں۔ پھر بھی مجھے  
آپ کے کام اگر خوش ہوگی۔

”نہایت دوستانہ لہجے میں نہایت روانی سے بات کیے چلا  
جایا تھا۔ معلوم نہیں وہ دھنا گرم جوش تھا یا میرے کرائے ہوئے  
ٹیکانوں نے اس کے لہجے میں گرجوٹی بھڑکی تھی۔

”بہت شکریہ مسٹر بیرس!“ میں نے پُر دقار لہجے میں کہا ”میں  
آپ کو زحمت نہ دیتا لیکن مجھے واقعی آپ سے ایک بہت ضروری  
کام ہے۔“ اور پھر میں نے اچانک ہی اپنے مطلب کی بات  
کر دینے کی ٹیکنیک آزمائی۔ بعض اوقات اس ٹیکنیک کے بہت سی  
افعی نتائج سامنے آتے تھے۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”مسٹر بیرس! مجھے تھوڑی  
سی مقدار میں وہ کیمیکل چاہیے جسے فارما سیوٹیکل کمپنیوں والے  
آسان زبان میں فارمولا اے کہتے ہیں۔“

”فارمولا اے۔۔۔؟“ اس نے دہرایا اور چند سیکنڈ کے لیے  
گولہ اسے سانپ ہو گئے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید اچانک  
بات کر دینے کی میری ٹیکنیک کچھ اچھی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ بعض  
اوقات انسان اس کے جواب میں ہر بڑا کرانکار بھی کر سکتا تھا۔

”آپ کو اس کی کیا ضرورت پڑگئی؟“ آخر اس نے گویا  
نہیل کر پوچھا۔

”ایک انتہائی نئی ضرورت سمجھ لیجئے۔ میں آپ کو اطمینان  
دلاتا ہوں کہ اس کا کوئی غلط استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ایک انتہائی  
لائق و انوکھا اپنے ایک فارمولے کے تحت اسے ایک انتہائی نیک  
بھندہ کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ استعمال صرف ایک فرد تک  
محدود ہوگا۔ اور یوں سمجھ لیجئے یہ اس فرد کی زندگی اور موت کا  
مسئلہ ہے۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ وہ سارا جوش و خروش جو مجھ  
سے بات کرتے وقت اس کے لہجے میں محسوس ہوا تھا، یکدم ہی گویا  
جہانگ کی طرح بجڑ گیا تھا۔ کوئی بعد نہیں تھا کہ وہ اپنی خوش خلقی  
کے اس مظاہرے پر پختہ رہا ہو۔ میں نے اچانک ہی فیصلہ کیا تھا کہ  
اسے اصل افراد کے بارے میں تو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن بات  
حقیقت سے قریب تر کروں گا۔ سچ بولنے پر میرا روحانی اعتقاد تھا۔  
اس معاملے میں بھی حقیقت بنیانی کے اثرات دیکھنا چاہتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بیرس کھنکھار کر بولا ”مسٹر  
چوہدری! آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہ ایک ممنوعہ کیمیکل ہے۔ کوئی  
مکمل شخص جو اس کے استعمال کا پوری طرح اہل نہ ہو وہ اس کی وجہ  
سے کسی کو کینسر میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اس کیمیکل کے بارے میں یہ

५५

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ مگر کہ آج کل کے زمانے میں ہم بات پر اعتبار کرنے کو قبول نہیں چاہتا۔ لیکن میں آپ کی بات بھروسہ کرتا ہوں۔ آپ میری طرف سے تقریباً وعدہ فرمائی ہیں لیکن میں پہلے کچھ دیر آپ کے ساتھ بیٹھ کر کہہ دوں گا۔ آپ سے بات کر کے ذرا اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کس قسم کے کوئی کام میں اپنے طور پر ذرا مطمئن ہونا چاہتا ہوں کہ میں کسی غلط کوئی ایک اہم چیز نہیں دے رہا۔ اس دوران میں میں ذرا آپ بارے میں مزید معلومات بھی کر لوں گا۔ امید ہے آپ برا نہ منائیں گے۔“

”ہرگز نہیں“ میں نے جواب دیا ”مگر آپ میرے پاس  
علاقے کے تھانے سے بھی معلومات حاصل کریں گے تو میں  
نہیں مناؤں گا۔“

وہ اب ذرا کھل کر بٹا اور بولا "نہیں۔ نہیں۔ خیر۔ مجھے امید ہے کہ آپ اتنے غیر معزز آدمی نہیں ہیں جو آپ بارے میں علاقے کے حلقے سے معلومات حاصل کرنے ضرورت پڑے۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں ایک اور بات واضح کرنا  
ہوں۔ میں صرف چند گرام فارمولا نے کی نہ مانی قیمت کا  
کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے شروع میں یہ پیش کرنا چاہی  
میں ہوا کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو لانچ دینے  
کو پیش کر رہا ہوں لیکن اب جب کہ آپ تقریباً آمادہ ہو چکے ہیں  
یہ بات کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ آپ جائز  
مکوں میں بھی اس کی قیمت طلب کر سکتے ہیں۔"

”اودھ میں اب بھی یہ سمجھ سکتا ہوں کہ آپ مجھے لانا چاہتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

تیس صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر اس چیز کی اب بھی آپ  
 لڑ میں کوئی قیمت ہے تو وہ آپ بلا تکلف مجھ سے وصول کر  
 لیں۔ میں کسی کی شرافت سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا  
 ہوں۔

”بعض لوگوں کے نزدیک قیمت چیز کی نہیں۔ ضرورت کی  
 قی ہے۔ وہ عیندگی سے بولا ”لیکن وہ تقریباً ایک میلر ہوئے گا  
 میں تمہارا سامیجی ایک میلر نہیں ہوں مشرچہ دی اور ایک میل  
 ب استعمال ہوتا تھا اب بھی اتنا مرچ نہیں تھا اور اب تو اس کا  
 ت مٹی کوڑے کے برابر بھی نہیں۔ بلکہ اب تو اس کا کسی کے  
 میں موجود ہوگا جس جرم قرار دیا جاسکتا ہے میں اتنا برا تو لی نہیں  
 کہ آپ کی ضرورت کا سن کر پھیل جاؤں۔ میں آپ سے اتنا  
 دلی قیمت نہیں لولواں۔“

”ہمت مت شکر“ مسٹر میرزا بیگم شکر ”میں نے  
بتا شکر گزاری سے کہا ”کیا وہ آپ کی رسائی میں ہے؟“

”میں سچ ہرگز نہیں ہوں ستمبر میں اس میں نے فوراً اپنے بے  
میں خوشخبری لاتے ہوئے کہا ”لیکن اگر کسی کا کوئی اشد ضروری  
اور ضمانت معمولی سا جائزہ کام بھی نہ ہو رہا ہو تو وہ سچ بھی ہو سکتا  
ہے۔“

”آپ ایسا کر لیں۔“ دو عالم! کچھ سوچ کر بولا، ”نیکہ آج شام چھ بجے مجھ سے ملاقات کریں۔ اس وقت تک میں ذرا اور خورد و خورشید کر لوں گا۔ ہم دو ستانہ ماحول میں بیٹھیں گے۔ دو چار ڈر کس لیں گے اور کئی نہ کسی پیچھے پانچ جائیں گے۔“

”مشرقیوں، مسئلہ اتنا بڑا کہ ہے کہ میں مصلحت ملاقات براۓ ملاقات کا تحمل نہیں ہو سکتا۔“ میں نے ملاقات سے کہا ”مجھے کوئی واضح وعدہ۔ کوئی قوی امید چاہیے۔ اگر آپ یہ کام نہیں کر سکتے۔ یا کرنا نہیں چاہتے تو صاف انکار کر دیجئے میں برا نہیں ماناں گا اور کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔“

میرے۔۔۔ سا بے شک طاقت بھی لیکن میں نے بات دو  
ک کی تھی۔ میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔ درحقیقت  
میرے سامنے فی الحال تو کوئی دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔ میں تو خواہ  
روا ہوا اور کچھ دھمکی آمیز سے اشارے دے رہا تھا۔ وہ جو اپنا  
کاروبار بھی کر سکتا تھا اور اپنے افکار پر ابھری مسکتا تھا۔ اس صورت  
کی کسی جائز اور قانونی راستے پر چلے ہوئے تو میں اس سے اپنی  
ت منوانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے سوچ لیا  
کہ اب جب کہ مطلوبہ آدمی میرے سامنے آیا تھا، میں نیز می  
ٹیوں سے بھی تمکی نکالنے سے روک نہ سکوں گا۔ خواہ اس کے  
مجھے ناگوار اور تکلیف دہ نتائج ہی کیوں نہ بنسکتے ہوں۔

چند لمحے کی مبرا آزا خاموشی کے بعد وہ غلاب توتھ خوشگوار  
میں لولا "آپ بہت خدی آدی بھی ہیں مسٹر جہد ری!"

”مذہب کے ساتھ کون کا کہ میں نہ تو مذہبی ہوں اور نہ ہی  
 ”میں نے بھی خوشگوار لپے میں کہا ”صرف ضرورت نے مجھے  
 مانوا ہے۔ اور ضرورت بہت تکلیفیں تو حیت کی ہے اگر عام  
 ت میں آپ سے ملاقات ہوئی ہوتی تو شاید آپ مجھے بہت  
 آدمی محسوس کرتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ آپ مجھے  
 انصاف پسند یہ وہ دوستوں میں شمار کرنے لگتے۔“

”وہ کیا واقعی؟“ وہ دھڑکے سے ہنسا۔ اس کی ہنسی بھی  
 لڑائی کی تھی۔ ”یقین نہیں آتا۔“ پھر وہ سنجیدہ لہجے میں بولا  
 ”آپ مجھے ضرورت کی نعمت بتا سکتے، کھل کر بات کر سکتے۔“

کام ہو جانے کے بعد شاید میں آپ کو سب کچھ بتا دوں۔  
 یاد اس شخصیت کو بھی آپ کے سامنے لا کر آ کرں جس کے  
 تقریباً زمری موت کا ساملہ ہے۔ پھر آپ یقیناً خوش ہوں  
 آپ کے اہل خانہ سے تقریباً لاٹھی میں ایک بہت نیک کام

رکاوٹ باقی ہوئی تو وہ بھی دور ہو جائے گی۔  
”تمہاری خاطر میں یہ بھی گزر رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی کہنے میں  
عار نہیں تھا لیکن میں مصلحتاً تمہیں دہاں نہیں لے جانا چاہتا“ میں  
نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا ہے وہ مصلحت؟“ وہ بدستور شر سے انداز میں  
مسکرا رہی تھی۔

”وہ تمہارے چوکنے پر یہ عجیب و غریب کارروائی دیکھ کر ضرور  
جنس میں جھٹا ہو جائے گا کہ آخر یہ انوکھا قسم کا کارنامہ کس کا ہے  
اور کون اسے درست کرنے کا فارمولہ تیار کر رہا ہے۔۔۔ وہ فارمولا  
کیا ہے۔۔۔؟ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ دینے سے پہلے وہ زیادہ تفصیل پوچھ  
چکے نہ شروع کر دے۔ دوا سازی کے برٹس سے اس کا تعلق ہے۔  
ایسے کسی انوکھے معاملے میں تو اس کی دلچسپی بہت شدید ہو سکتی  
ہے۔“

راجلہ خاموش رہی۔ تاہم اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ  
برقرار تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اس سے بھی  
زیادہ حد تک مجھے اس بات کا ہے کہ کہیں گہری بہرس کا تعلق بھی  
ہو جاتا ہے نہ ہو۔ یا ماضی میں نہ ہو چکا ہو۔ سن ممکن ہے وہ  
تمہارا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ جائے کہ یہ ڈاکٹر برٹاؤ کی کارروائی ہے۔  
اسے معلوم ہو کہ اس شخص کو ٹھیک بھی برٹاؤ کی کر سکتا ہے۔ ظاہر  
ہے اس کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ اس وقت  
برٹاؤ کسی نہ کسی انداز میں ہمارے قلم میں ہے۔ اور میں فی الحال  
کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا چاہتا کہ ہمیں برٹاؤ کے  
بارے میں کچھ معلوم ہے۔“

”بہت عقلمند اور دور اندیش ہوتے جا رہے ہو۔ لگتا ہے  
تمہاری عقل داڑھ نکل آئی ہے“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔  
”میری تو ہر داڑھ عقل داڑھ ہے۔ تم شاید۔۔۔ تمہارے بھی  
دودھ کے دانت نوٹے یا نہیں؟“ میں نے ہنسنے کی طرف دیکھا۔  
”یہ ابھی سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔  
ساتھ ستر سال کی عمر میں پوچھنا؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی ”اب کام کر دو۔  
ابھی تو چھ بیٹے میں کافی دیر رہے۔ جانے سے پہلے کچھ کام تو خفا  
جاؤ۔“

”خدا کی پناہ!“ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی  
طرف دیکھا ”ہم تمہارے اتنے بڑے مسئلے کے پیچھے مڑتے پھر رہے  
ہیں اور تمہیں کام کی پڑی ہوئی ہے۔“

”یہ مت سمجھ لینا کہ میں کام کے بارے میں فکر مند ہونے کی  
ایک ننگ کرتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی ”کہتی ہے اب جو کچھ مجھے  
مل رہا ہے۔ جتنی سوچاوت اور جتنی آسائش مجھے حاصل ہیں۔۔۔  
جتنے اختیارات تم نے مجھے دے رکھے ہیں اور جس طرح سب کچھ  
مجھ پر چھوڑ رکھا ہے اس کام نے مجھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ سب  
کچھ میری توقعات اور ضروریات سے بہت زیادہ ہے۔ میں محسوس

کرتی ہوں۔ جب آپ وہ مجھے دینے کا حتیٰ فیصلہ کر لیں گے تو  
میں خود پر دے سکیں گے یا نہیں؟ کہیں کسی ٹیکری یا گودام وغیرہ  
پر تلاش تو نہیں کرانا پڑے گا؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔ ٹیکری یا گودام وغیرہ میں تو اب اس کا  
تلاش بھی نہیں لے گا۔“ اس نے جواب دیا ”جن دنوں اس کا  
اتناک خانہ لکھا جا رہا تھا۔ میں نہ جانے کیوں اس کے دو تین  
پہرے لپے اٹھا کر گھر لے آیا تھا۔ میں تو انہیں تقریباً بھول ہی چکا  
تھا۔ اب تم نے اتنی شدت سے ذکر چھیڑا تو مجھے یاد آئے تھے۔۔۔ نہ  
جانے کس اسٹور میں پڑے ہوں گے۔ تلاش کرانے پڑیں گے۔  
میرے گھر میں کئی بڑے بڑے اسٹور دوم ہیں اور سب میں نہ جانے  
کیا کیا کالہ کاڑ بھرا ہوا ہے۔ بہر حال وہ دل جانیں گے۔ یہ کوئی  
مسئلہ نہیں ہے۔“ اس کے لیے میں اطمینان تھا۔

میری مدد میں ایک عجیب سی سرشاری اتر آئی۔ اگر وہ شخص  
میرے سامنے ہوتا تو شاید میں اس کے ہاتھ چوم لیتا۔ میں نے اس  
کا انٹھ لپکا اور کیا کہ وہ شرمندہ ہو گیا اور بولا ”مت بھولیں کہ ابھی  
میں نے آپ کا کام کیا نہیں ہے مسٹر چنڈیاری!“

”میرے ننھا نظر سے تو کبھی دیا ہے“ میں نے کہا۔ وہ ہنس دیا  
اور میں نے گہری دیکھتے ہوئے کہا ”ٹھیک چھ بیٹے آپ سے ملاقات  
ہو گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا“ اس نے کہا میں نے اسے  
فدا خانہ لکھا اور فون بند کر دیا۔

اس وقت ساڑھے چار بجے تھے۔ مجھے زیادہ گھٹنا مزہ گزارنا  
قلم میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو کام میں الجھالیا۔ بچے تابی  
اپنی جگہ تھی لیکن اب مجھے ضمانت بھی اتنی حاصل ہو چکی تھی کہ  
زیادہ گھٹنا گزارنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں وقت کی ستم  
گزرا کر حیران تھا۔ بعض اوقات کوئی ایسی چیز۔۔۔ حاصل کرنا بھی  
جسے خریدنے سے کم نہیں رہتا جس کی قدر و قیمت بقتل بہرس  
کو اتنے کرکٹ کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ آپ اس کی منہ مانی  
قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں مگر وہ آپ کی رسائی سے دور  
ہوتی ہے۔ بہر حال۔۔۔ قسمت مجھ پر مہربان تھی اور یہ مسئلہ حل  
ہو گیا تھا۔ میں نے فون کر کے ٹولی کو بھی اطلاع دے دی اور اسے  
تلاش کا چھ بیٹے میری بہرس سے ملاقات ملے پانچ تھی۔

راجلہ کو بھی میں نے یہ خبر سنائی۔ وہ فوراً بولی ”میں بھی  
تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”کیوں؟“ میں نے اسے گھورا۔ وہ اس وقت میرے کمرے  
میں آئی ہوئی تھی۔

”تم اپنے بچ کو کھل ہی کرنا“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”اسے  
میں صحت و کھانا اور درد ناک لمبے میں اپنی کرنا۔ حضور والا!  
یہ سب تم دیکھ لو گی جس کے لیے دراصل مجھے فارمولا اسے کی  
ضرورت ہے۔ اس کے حال پر رحم کھائیں۔ اگر کوئی تھوڑی بہت

کرتی ہوں کہ اس کے عوض میں جو کچھ کرتی ہوں وہ کم ہے۔ مجھے اس سے بھی زیادہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس لیے میں ہر وقت کام کو سر پر سوار رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہوں کہ اپنی تنخواہ اور مراعات وغیرہ حلال کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

”تم اب تک میرے لیے جو کچھ کر چکی ہو اور جو قربانیاں دے چکی ہو وہی اتنی کافی ہیں کہ اب تم ہماری عمر بٹہ کر بھی سمجھتی ہو کہ یہ سب کچھ وصول کرتی رہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”تو کئی سے ہٹ کر اگر میں نے کچھ کیا ہے تو وہ دوستی میں تھا۔ اسے تو کئی میں شمار مت کرو“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اچھا بابا۔ یہ حساب کتاب کا موقع نہیں ہے“ میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”مگر مجھ سے تنخواہ امت کام کرنا ہے تو میری جان چھوڑ دو۔“

|       |                    |         |
|-------|--------------------|---------|
| 70/-  | صحرا کا چاند       | اے حمید |
| 50/-  | پہلی محبت کے آنسو  | اے حمید |
| 20/-  | اداس جھگی کی خوشبو | اے حمید |
| 100/- | چاند چہرے          | اے حمید |

مکتبہ القزقریش اردو بازار۔ لاہور۔ 2

”مفضل چہدہری صاحب آگئے ہیں“ یہ جملہ اس نے اپنے ہی کہا تھا۔

چند لمحے بعد سامنے کا چوٹی دروازہ کلک کی ہلکی آواز کے کھلا اور ایک بادیہی بٹرا ہر آگیا۔ وہ بری مطوم ہوتا تھا۔ اس مجھے محض ایک ہی جلی مسکراہٹ سے نوازنے پر اکتفا کیا۔ نہ کچھ نہ بولا تنہید ہی نظروں سے اس نے نہ صرف میرا جائزہ لیا بلکہ میری گاڑی کو بھی کمری نظر سے دیکھا۔ شاید لڑا کر رہا تھا کہ میری ”موتوات“ میرس سے ملنے کی ہے بھی یا نہیں۔

ڈرائیو نے میں پہلے ہی تین چار شاہد اور جلی قیادت کاٹا کھڑی تھیں۔

میں نے بٹرا کو ذرا سرد کیا ہوں سے گھور دیکھ سنا۔ اور اس نے فوراً مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہماری لم منتقل چوٹی دروازہ ایک بار پھر کلک کی ہلکی آواز کے ساتھ آدھریں بٹھے کے پیچھے اندر پہنچا۔ دو دروازے کے عقب سے ہی ڈرائیو اور تھیں قائلین سے دھکا ہوا تھا۔

جلی دوشنی نے میرا استقبال کیا۔ ایک خوبیل و مریش بال۔ کور کریم میز جیوں کی طرف بڑھے سامنے لاؤنج ڈائننگ روم وغیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ تین کہیں کوئی ڈی صبح نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہی کسی طرف سے کسی قسم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

باہر سے وہ مکان خوبصورت اعلیٰ شان اور بڑھوہ خالہ دیکھ کر صبح میں ایک ہی انگ اور دل میں زندگی کی تڑپ محسوس ہوتی تھی لیکن اندر پہنچ کر نہ جانے کیوں مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مقبرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس مکان میں جینا نہ تھا۔

کی تمام اعلیٰ ترین آسائشیں موجود تھیں۔ اس کا ہر گوشہ تین تین دور کی تمام کیشیات سے آراستہ تھا۔ اس کا وجود نہ جانے کیا کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بقول ناصر کاظمی مرحوم ”اس کچھ کے دور و دیوار پر ادا دلی بال کھولے سورہی تھی۔ اس جلی بدلتا

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے تم جیسے بور آوی کے پاس بیٹھنے کا۔ تم نے خود ہی مجھے بلایا تھا“ وہ دوازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”ہیں۔ غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔ کبھی کبھی انسان کا دماغ الٹ بھی ہو جاتا ہے“ میں نے اس طرح بڑوانے کے سے انداز میں کہا کہ وہ آسانی سے سن لے تاہم اس نے سیز فائر کر دیا اور کوئی جواب دیے بغیر رخصت ہو گئی۔

پونے چھ بجے میں آفس سے نکل کھڑا ہوا۔ میرس کا اینڈر نیس مائل ٹائون کا تھا۔ فاصلہ خاصا تھا لیکن ٹھیک چھ بجے میں اس کے مکان کے سامنے موجود تھا۔ وہ ایک عظیم الشان حویلی نما مکان تھا۔ ذرا پرانی طرز کا تھا لیکن اس پرانے پن میں ایک انگ سی قسم کی شان تھی اور وہ نہایت پر شکوہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے لان کی خوبصورتی بھی قابل دید تھی۔ اس کی ترتیب و آرائش کی ذمے داری یقیناً بہت سی ماہر اقدوں میں تھی۔ گھاس میں چھپے ہوئے آٹو بیگ اسپرنگز یا چھوٹے چھوٹے فوارے خود بخود دھکے دھکے سے رنگ رنگ خوبصورت پھولوں اور پودوں کو جھک رہے تھے گاڑی ڈرائیو نے میں نے جانتے ہی مجھے کھڑکیوں کے شیشے اٹارنے سے پہلے ہی فرحت کا احساس ہوا۔

دو لمبے ترنگے سطح محافظوں نے میری گاڑی کا پارن تن کر گیت تو فوراً ہی کھول دیا تھا لیکن جو غمی میں نے ذرا آگے بڑھ کر گاڑی روکی تو وہ دونوں طرف کی کھڑکیوں پر آن ٹھکے۔ وہ مقامی ہی تھے میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے انہیں بتایا ”سٹر گیری میرس کے ساتھ چھ بجے میری ملاقات ملے ہے۔“

”آپ کا نام افضل چہدہری ہے؟“ ان میں سے ایک نے خامے مہذب اور شائستہ لہجے میں پوچھا حالانکہ شکل و صورت اور وضع قطع سے وہ نہایت اکثر اور کثرت مزاج دکھائی دیتا تھا۔

”ہاں“ میں نے اپنا ڈرائیونگ کارڈ اسے تھما دیا۔ اس نے اپنی کمن کنسے پر ٹھکا۔ تے ہوئے جیب سے وائیٹ ٹائل اور اندر کسی کو اطلاع دی۔

بر طرف سے باجیت سا پہلن تھی۔

باز میں بھی دیکھتا تھا اور خفیف سی آہٹ بھی  
میں ہوتی تھی۔ بالائی منزل پر بھی ہم ویسے ہی ایک ہال سے  
بہ اور راداری میں آگئے۔ اس نے ایک کمرے کی طرف  
لپکا اور ٹپکی پہلی سی اردو میں بولا "صاحب۔ اور اسٹڈی میں

اس نے باب سمٹا کر میرے لیے دو اونڈہ ذرا سا کھول دیا اور  
پچھ بٹ گیا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ دو اونڈہ کلک کی بجلی  
آواز کے ساتھ میرے حجب میں بند ہو گیا۔ کمرے میں جھنکی  
نی خوشبو چلی ہوئی تھی۔ کوئی عمدہ قسم کا از رنگ پتھر چکر لگا تھا۔

ایک شاعر اسٹڈی اور لائبریری تھی۔ چاروں طرف  
ارکیر لائبرری میں کتابوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں اور  
ایک ہی سمت تک بند تھیں۔ اس کمرے میں بھی روشنی زیادہ تیز  
ہی تھی آہم ایک عظیم الشان میز پر روشنی اسپاٹ لائٹ کی طرح  
لوگ تھی۔ اس دودھیا روشنی میں میز کے حجب میں چڑے کی  
کھل دیالی آؤٹ پٹش کی ایک کرسی میں بیٹھ کر دھنسا ہوا تھا۔

اس کا چوہ دو اونڈے کی طرف ہی تھا۔ اس کے حجب میں  
وہ سا ایک دو اونڈہ بڑی سی ٹی بکس پر کھلا ہوا تھا اور اس طرف سے  
کئی منکی خوشگوار ہوا کمرے میں آ رہی تھی تاہم اس طرف کا جالی  
اور اونڈہ بند تھا۔

گہری میز میرے تصور سے بہت مختلف تھا۔ وہ بہت بھاری  
برک اور لمبا چوڑا کوئی معلوم ہوتا تھا۔ جزیں کا گوشت لٹکا ہوا  
تک پہلے وقت وہ یقیناً خصل خصل کرتا ہو گا۔ اس کے بال برف کی  
طی اسٹڈی تھے اور وہ دھیا روشنی میں چمک رہے تھے۔ انہیں دیکھ  
کہ نہ جانے کیوں یہ احساس ہوتا تھا کہ انہیں لانا سلیقے سے جے  
ہو گیا ہے۔ تاہم یہ وہ اس وقت تک بچے پر ترجیح سے تھے۔

گھو گھویر رہا۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔

میں تو آواز کو کسی مقبرے کے گمبذ میں گونج کر واپس آئی۔  
میرا تو خیال تھا کہ وہ گرجا میں سے میرا استقبال کرے گا۔ خود مجھے  
"ہلو" اور "ہلو" ایک "و" کے ساتھ اس نے تو میری "ہیلو" کا  
مکمل جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے معمولی سی غصت کا  
احساس ہوا۔

ایک لمحہ میں چوکا۔ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ میں نے کمرے  
میں داخل ہوتے ہی اس چیز کو کیوں محسوس نہیں کیا تھا؟ شاید اس  
کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب  
طرت ایک ہی نظر میں اس کا مکمل جائزہ لینے کی کوشش کرتے رہا  
تھو کہ کمرے میرے ذہن میں دور دور تک ایسا امکان نہیں تھا

میں نے غیر ارادی سے انداز میں سانس روک کر آنکھیں  
باز کیا مگر کرسی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ میں

ان آنکھوں کا رنگ بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ شفاف نیلی آنکھیں  
تھیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت وحدت لائٹ تھی وہ شاید برصا پے کی  
وجہ سے تھی لیکن جس چیز کو میں نے ایک لمحے کی تاخیر سے محسوس  
کیا تھا وہ یہ تھی کہ وہ آنکھیں بے نور تھیں۔

ایک قدم آگے بڑھ کر میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ میری کے  
دونوں بازو در حقیقت کرسی کے پتھروں پر لگے ہوئے نہیں تھے بلکہ  
پتھروں میں جھول رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے  
سامنے اندام اصرار چھا گیا۔ کیا اس پر دل کا دھڑکا تھا؟ کیا وہ واقعی  
مرہکا تھا؟

میں سنبھل کر جیڑی سے اس کی طرف لپکا اور میز کے حجب  
میں پہنچا۔ میں نے دیکھا اس کی پٹلیوں میں میں دل کے مقام پر  
ایک مختصر بیست تھا جس کا صرف دست باہر تھا۔ اس کے خیمہ نما  
کوٹ کے بن بن کھلے تھے اور اس کی بجلی نیلی دھاریوں والی تھیں کا  
بہت تھوڑا سا صحر خون میں تر تھا اور کچھ خون رستا ہوا اس کی  
پٹلیوں کی جھلک تک چلا گیا تھا۔ وہاں تشوہ مزاحمت یا تکلف کی کوئی  
ظانی موجود نہیں تھی۔ وہ نہایت ہی پرسکون انداز میں بیٹھے بیٹھے ہی  
مر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے رضا کارانہ طور پر اپنی  
پٹلیاں کسی دشمن جان کے سامنے پیش کر دی تھیں اور فرائض سے  
کہہ دیا تھا کہ جو قسم آتا ہے، آتا ہے۔

یہ طعنے خیال نہ جانے کیوں میرے دل میں آیا۔ حقیقت یہ  
تھی کہ اس وقت تو میرا دماغ کوئی چاہ رہا تھا۔ میں بے اختیار  
دونوں ہاتھ چمت کی طرف اٹھا کر کراہ اٹھا "خدا یا۔" اس وقت  
میں تقدیر کا یہ مذاق برداشت نہیں کر سکتا۔ میری زندگی میں ہر قدم  
پر بڑی سستی ہے۔ ہر ہنگامہ ہے۔ ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی ڈراما میرا  
ختم ہوتا ہے لیکن کم از کم اس وقت مجھے سستی سے محفوظ  
نہا رہا ہے۔ اس وقت مجھے کوئی ڈراما نہیں چاہیے۔ اس وقت کسی  
باہوی کا سامنا کرنے کی مجھ میں سکت نہیں۔

میری اس آواز کا سے صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔  
میری اسی طرح ساکت رہا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح بے نور ہیں  
اور مختصر کا دست اسی طرح اس کے پلو سے جھانک رہا۔ میں اس  
وقت اس شخص سے زیادہ تکلیف میں تھا جس کی کندہ لہجہ بام بکج کر  
ٹوٹ گئی ہو۔ میں چونکہ قسمت "تقدیر" رضائے الہی و غیبی کا بہت  
زیادہ قائل تھا اس لیے بڑے تأسف اور دکھ سے سوچ رہا تھا کہ کیا  
راجہ کا چوہ ٹھیک ہونا اس کے مقدر میں نہیں تھا؟ کیا میں اس  
کے لیے اپنی بھاگ دوڑ کر کے در حقیقت تقدیر سے لڑ رہا تھا؟

مجھے احساس یہ نہ رہا کہ میں کتنی دیر تک ساکت کھڑا بیٹھ رہا  
کہ چرے کو تنکا باجو زندگی سے محروم تھا۔ اس کی جلد موتی سی  
دکھائی دینے لگی تھی اور وہ دھیا روشنی میں اس کے چرے پر ایک  
مریخا نہ ہی چمک رہی تھی۔ اس کی پٹلیوں میں مختصر  
بیست ہوئے یقیناً زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اگر میں چند منٹ

پہلے اس کے پاس پہنچ جاتا تو شاید وہ یکمیل مجھے مل جاتا۔ لیکن میں بھلا چند منٹ پہلے کیسے آسکتا تھا؟ اگر آج بھی جاتا تو شاید وہ مجھ سے نہ ملتا۔ اس نے مجھے چوبیس بجے کا وقت دیا تھا اور اس طبقے کے لوگ۔۔۔ خصوصاً غیر ملکی تو وقت کے پابند ہوتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قدرت ان سے بھی زیادہ وقت کی پابند ہوتی ہے۔ آسمان پر اس کی موت کا جو وقت لکھ دیا گیا تھا اس سے تو ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو میرا یہ سوچنا ہی فضول تھا کہ میں ہوتا تو یوں ہو جاتا۔

یہ سوال ناگ کی طرح پہن پھیلانے میرے سامنے کھڑا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ ایک برصغیر سانس لے کر میں اس ارادے سے مڑنے ہی کا تھا کہ گھر کے کسی فرد سے رابطہ کیا جائے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آسکی۔

”پہلی جگہ سے حرکت مت کرنا بد معاش!“ میرے عقب میں ایک کھوڑی اور جھکمانہ سی آواز گونجی۔ جملہ امریکی میں کہا گیا تھا اور بعد خاندان امریکی تھا۔ ”ہاتھ اوپر اٹھا دو۔“ مجھے دوسرا حکم ملا۔

میں نے ہاتھ نہایت آہستگی سے اٹھائے اور اس سے بھی زیادہ آہستگی سے تھوڑا سا گھوما۔ میرے گھومنے پر اعتراض نہیں کیا گیا۔ میں نے دیکھا دو اڈہ ٹیم وا تھا اور مجھے حکم دینے والا اس دوران میں اندر آچکا تھا جب میں اذیت ناگ سرجوں میں الجھا ہوا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں نہایت جدید سائنس کی نیپلوں کن چمک رہی تھی۔ اس کی عمر تین اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ اس کی شخصیت کسی باڈی بلڈر قسم کے تھی۔ سیدھے قصور پروری اتنی تھی۔ اوپر ہاتھ پیر ڈی جھاتی ہر قسم جسم اور کھردرا مگر گڑبگڑ کش چوہ۔ وہ آدھی آہستہ کی سرخ لیس اور گری نیلی جینز میں تھا۔ لیس کے دو بٹن کھلے تھے اور بالوں بھرے سینے پر سونے کی موٹی سی چین چمک رہی تھی۔ اس کے مضبوط ہاتھ میں گن بالکل سناکت تھی اور اس کا منہ میرے سینے کی طرف تھا۔ اس کی بڑی ناخن آنکھوں میں ایک وحشیانہ سی چمک تھی۔ اس نے خاصی حارث سے مجھے ”بد معاش“ کا خطاب دیا تھا اور یہ حارث اس کے چہرے پر بھی ٹکھری ہوئی تھی۔ وہ مجھے سے ہی قیاس صورت سے بھی خالص امریکی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے لیے اور چہرے کی حارث نے میری کپڑوں میں چنگاریاں ہی بھڑکی۔

”تم نے مجھے بد معاش کہا؟“ میں نے دھیمے اور گھبرے گھبرے لہجے میں شدید چاہی۔

”ٹھیک ہے، میں ہیٹھون سیٹ کو تو بد معاش نہیں کہہ سکتا تھا۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”تمہارا خیال تھا کہ تم مسٹر بیرس کو قتل کر کے سناٹ بچ کر نکل جاؤ گے؟“

”اوغہ یہ قصہ ہے!“ یہ کہتے ہوئے میں نے ہاتھ نیچے کر لیے۔

امریکہ سے امریکہ طارق اسٹیل سارگر - 50/-  
سوویت اور عالم اسلام طارق اسٹیل سارگر - 25/-  
کورٹ مارشل طارق اسٹیل سارگر - 100/-  
آخری گناہ کی مہلت طارق اسٹیل سارگر - 150/-

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

”ہاتھ اوپر اٹھا بد معاش!“ اس نے چیخ کر ایک بار پھر مجھے اسی لقب سے نوازا۔

”میں جو ڈول کے درد کا مریض ہوں۔ زیادہ دیر ہاتھ اوپر نہیں رکھ سکتا۔“ میں نے ملاحت سے کہا۔ میری فکر زبردستی ہوئی اس کی انگلی پر تھی۔ اس انگلی کی حرکت پر میری حرکات سکناٹ کا وار و مدار تھا۔ میں نے دوستانہ سے لہجے میں پوچھا۔ ”تمہاری تعریف؟“

”اول بریڈن۔ فرام ایف بی آئی۔“ اس نے بارعب لہجے میں جواب دیا۔

”ایف بی آئی؟“ میں نے واقعی حیرت سے دہرا لیا۔ خوب۔ بہت خوب۔ ایس نے ایف بی آئی کی قابلیت اور مشیقا کے بے شمار قصے سنے اور پڑھے ہیں لیکن آج تو میں اس کی مشیقا کا ایسا نمونہ دیکھ رہا ہوں کہ حیرت سے بے ہوش ہو سکتا ہوں۔ اب ایف بی آئی والے سات مسند پر پار ہوئے والے کسی قتل پر بھی پچھ لکھوں میں جائے واردات پر پہنچنے لگے ہیں۔ یقیناً ان کے پاس آلہ دین کے ایک نہیں بلکہ چار ہوں گے۔“

”تو اس مت کہو۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا ”میں یہاں گیا اور سلیٹ میں تیار ہوا ہوں اور مسٹر بیرس کے انائی سمان کی چیٹ سے ان کے ہاں گھبرا ہوا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی ہو گئے تھے۔ گھبرے ہوئے ہیں۔ مسٹر بیرس میرے ذاتی دست ہیں۔ سناٹا ان کو کہ ہے۔“

”تو کہہ توڑی دیر اور زندہ رہے تو یقیناً میرے بھی ذاتی سہیل۔“ غیر ذاتی ”حکم کے دست تو میں ہی جانتے۔“ میں نے ملاحت سے کہا ”میرے حال۔ تم ان کے سمان ہی سہیل۔“ میری تعریف کا رنگی قابلِ داد ہے۔ تم نے قاتل کو رکھے ہاتھوں کر لایا۔“

ہوا۔ کیسے ہوا۔ کیوں۔؟

آجہائی میری اس کے سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھا تاہم میں نے اس موقع کو غنیمت جانا جب بریڈن کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ مجھے ایک ہی فرد سے نمٹنا تھا۔

میرا آٹھ میز کے قریب تھا اور اس کے کنارے پر ایک خوبصورت بیروٹ رکھا تھا جو کسی میرے سے مشابہ تھا۔ میں نے بیروٹ کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا آٹھ ایک کٹ ٹوٹے والے اسپرنگ کی طرح حرکت میں آیا اور بیروٹ وہیں سے اڑے ہوئے گولی کی طرح بریڈن کی پیشانی سے گرایا اور اس سے پہلے ہی میں قالین پر گر کر لڑھک چکا تھا۔

بریڈن کی گن سے گولی نکلی لیکن وہ مجھے نہیں لگ سکی۔ کوئی شیش ٹوٹنے کا چھٹا کسانا دیا۔ اس وقت تک میں قالین پر لڑھک کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے دوسرا فائر کرنے کی سہمت نہیں دی۔

بیروٹ پیشانی سے ٹکرانے کے باعث وہ چکر لڑھکنا چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں بقیہ نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں الجھاتے ہوئے اسے اوڑھے منہ گرا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کی کمر سوار تھا۔ میں نے اس کے بازو پر کرائے کا وارڈ کیا۔ گن، اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ وہ حینہ مسز بیرس اسے اٹھا سکتی تھی۔

بیروٹ کٹنے کے بعد جو کمرہ مٹی تھی وہ میرے دو چار گھونسلوں نے پوری کر دی۔ ول بریڈن کو شاید اپنے کمرے بدین پر بہت تازہ رہا ہو لیکن چند سیکنڈ بعد وہ میری گرفت میں ڈھیر ہو چکا تھا اور کسی مریض کی طرح کراہ رہا تھا۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے اس کی کتھنٹی پر ایک گھونٹا اور رسید کر دیا۔ پھر میں نے اس کے اوپر سے اترتے ہوئے اسے اٹھا کر ککڑی کے ایک معمولی مٹھے کی طرح دیوار کی طرف اچھال دیا۔ وہ وہاں سے نہیں اٹھا۔

مسز بیرس نے شوہر کی لاش دیکھ کر قہقہے نہیں ماری تھی لیکن اب اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اٹھ کر دو دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کا بھانجا بھی زیادہ گھس تھا لیکن یہ حُسن کو خراج حسین پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔

میں نے خاصی بد زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لپک کر پیچھے سے اس کے خوبصورت دوشی سنہرے بالوں کی پونی ٹیل کو بے دردی سے مٹھی میں پکڑا اور اسے واپس پیچھے کر قالین پر پٹ دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اور وہیں پڑی ایک فلتہ گڑیا کی طرح سسکیاں لینے لگی۔

میں نے اس پر جھٹکے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں کہا ماموٹ ہارٹ! اب بتاؤ۔ اصل قصہ کیا ہے؟

میں نے اپنے ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے ان کا جائزہ لیا گیا تو فری ہو کر ان پر مجھے کیس رکھ لگا ہوا نظر آجائے گا۔

”وہ فریاء۔“

”میں تو سمجھتا تھا کہ صرف پاکستانی ظلوں میں پاکستانی پولیس ہاتھوں میں اس طرح عین موقع پر آگے ہاتھوں قاتل چڑے آئے ہیں۔ اور اگر اوقات تو وہ بے چارے آلا قتل کو بھی ہاتھ لگاتے ہیں۔ لیکن اب تو بات ایف بی آئی تک جا پہنچی ہے۔ ایف بی آئی کے حال پر رحم کرسے۔“

پھر میں نے کمری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”میں مارا کاڈنچہ سکا ہوں مسٹر بریڈن؟“

اس نے ہاتھیں ہاتھ سے جیب سے چڑے کے کور میں لپٹا ہوا آلا کاڈنچہ نکال کر لرایا۔ اتنے لمحوں سے میں اس پر اس کی رنگین سویر کی ہلکے سے سوا کچھ نہ دیکھ سکا۔ وہ کسی مزدور یا زمین کا کارڈ کی طرح تھا۔ اس وقت تک ویسے بھی میری کمپوزٹیج اتنی گھوم گئی تھی کہ اگر وہ واقعی ایف بی آئی کا کارڈ تھا تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔

میرا وہ دروازے سے اچانک ایک حسین نسوانی چہرے نے درجھا تھا اور سبھی سبھی نظروں سے صورت حال کا جائزہ لیا۔ ان کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ ول بریڈن کو گویا اس کی طرف دیکھتے بغیر اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔

”مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر ہوا“ اندر آجاء مسز بیرس! اس امکان لطف نے کمرہ اسے شوہر کو قتل کر دیا ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ تم پلانٹ کی قہقہے چل کر کہہ دو پھر پولیس کو فون کرو۔“

میرا خیال تھا کہ وہ عورت مسز بیرس کی انداز میں چلتی ہوئی اندر لے گئی اور میری لاش سے لپٹ جائے گی لیکن سحر نامہ میری قہقہے کے مطابق نہیں رہا۔ وہ جھپکاتے ہوئے اندر آگئی اور دروازہ کھلے اپنے صوب میں بند کر دیا۔ میرس کی لاش کی طرف دیکھ کر اس کے صوب میں ہونٹوں پر زبان پھیرنے پر اکتفا کیا۔

”تقریباً چالیس کی عمر کی ایک انتخابی حسین اور پرکشش اورت تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ فوجیوں میں وہ کیسی رہی ہوگی لیکن مجھے خیال میں وہ انہی عورتوں میں سے تھی جن کا حسن ہائیکس کی عمر کے قریب پہنچ کر اور بھی ٹھہر جاتا ہے۔ وہ اور بھی زیادہ لگے جاتے تھے۔ اور بھی زیادہ قیامت ڈھانے لگتی ہیں۔ شاید ان کی منہ ڈال ڈال ایک ڈیڑھیں رہی ہو۔ اگر اس عمر میں وہ میرس جیسے لڑبیروہ کوئی کی بیوی تھی تو پھر میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ میرس ان میں سے کس پر رنگ کیوں اور کس پر الموس؟

”تکے جو کہ ایک کمری پر تقریباً ڈھیر ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں نہ پچا کر سسکیاں لینے لگی“ وہ مسز بیرس! یہ سب کیا



مسٹر میرس نے پٹی پٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔  
ان آنکھوں میں ابھی تک آنسو تھے مگر مظلومیت یا احساسِ زباں کی  
جھلک نہیں تھی۔ میں نے اس کے بال چھوڑ دیے تو گویا اس کی  
جان میں جان آئی۔

"قتلہ؟ کیا قصہ؟" اس نے حیرت اور دشت سے  
پوچھا مگر میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ حیرت بھی  
معنوی تھی اور دشت بھی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی اور  
اس کوشش میں کالی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ  
اسے صرف تھوڑی سی سہلت کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد وہ  
میرے کان کھرنے کی کوشش کرے گی۔ میں کالانہ ہوتے ہوئے  
بھی آخر اس کی نظر میں محض "کالا پاکستانی" ہی تھا۔ مجھے بے  
وقف بنانا شاید اس کا قوی فریضہ یا پھر یہی ارادہ تھا۔  
"میں اپنی بیٹی کو لے کر چلی آئی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس  
بچہ کی کالانہ سلا پہلے سے تیار کیا گیا تھا یا جلدی میں کوئی فارمولا  
آزایا گیا ہے جس کی وجہ سے نتائج ایسے برآمد نہیں ہو سکے لیکن  
بچہ کی ضرورت ہے کیونکہ مجھے اس کی خوشبو آ رہی ہے۔ بلکہ  
یوں لگتا جیسے کہ اب تبدیل آ رہی ہے کیونکہ بچہ کی جل جلی  
ہے۔"

میں ایک کرسی سمجھ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا لیکن اپنا پاؤں  
میں نے اس پوزیشن میں رکھا تھا کہ وہ ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی  
کوشش کرتی تو میری ٹھوک کا نشانہ بن سکتی تھی۔ اتنی ضرورت  
اور بظاہر نرم و نازک نظر آنے والی عورت کو ٹھوک کر رسید کرتے  
ہوئے مجھے یقیناً روحانی تکلیف ہوتی لیکن مجبوری میں انسان کو اس  
قسم کے غیر شاعرانہ کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا امریکی عورتیں۔۔۔ بلکہ بیشتر سفید فام عورتیں  
بظاہر نرم نازک اور نہایت شائستہ و خاصیت پسند نظر آنے کے  
باوجود بہت سی ایذا دہانی اور افتراقی عورتوں سے زیادہ سخت جان  
مضبوط اور توانا ہوتی ہیں۔ ان پر دشت سوار ہو جائے تو نہ جانے  
کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ غمزہ خاتون بھی میری  
تائید سمجھ کر مجھے بچہ گر کر مجھے کچھ چپانے کی کوشش کرتی۔ اٹھانچ  
میں میری سلا جیتوں کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھ لینے کے باوجود وہ  
قسمت آزمائی کا فیصلہ کر سکتی تھی۔

"کیا اس مت کر۔" وہ ہنستے سے چینی۔ اس کا مٹاؤ بڑی تیزی  
سے لوٹ آیا تھا۔

"میں تو ایک کام ہے جو مجھے سب سے زیادہ کرنے کی عادت  
ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یعنی  
کیواس۔۔۔ کیواس۔۔۔ اور کیواس۔"

وہ گویا بعد کوشش اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے زرا دھیمے مگر  
نہایت ذہریلے لہجے میں بولی "تم بہت خوش بچنے کی کوشش کر رہے  
ہو لیکن یہ شرفی جس جس بہت مہنگی پڑے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا  
ی چیز مہنگی پڑتی ہے اور کون سی سستی۔۔۔ میں اس قسم کی بات  
میں دماغ نہیں کھپاتا۔ میں نے تم سے جو بات پوچھی ہے اس  
جواب دو۔"

اس نے ایک بار بحرِ مٹی ان سنی کردی اور انا مجھ سے ہر  
کردیا "کیا تم نے اسے ہلاک کر دیا ہے؟" اس کا شاندار بدلہ  
کی طرف تھا۔

"کوشش تو میری ہی تھی کہ نہ مرے۔" میں نے مزید  
طرف سے نظر ہٹائے بغیر کہا "دیسے بھی بے غیرت لوگ آسانی سے  
نہیں مرتے اور یہ تو اچھا خاصا پاؤں ہلا کر معلوم ہوتا ہے۔ ہر  
حال۔۔۔ میں نے امریکیوں ہی کے انداز میں بے پروائی سے  
کندے اچکائے "اگر مگر بھی کیا ہو تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"  
"تمہاری یہ بے پروائی دوسری رو جائے گی۔ جب مجھے  
معلوم ہو گا کہ یہ کون ہے۔" اس کے لیے میں ایک بار پھر خود بخود  
عود کر آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا غصہ "خود بخود" ہر قسم  
قابو پر کاربہر لے لیے میں بات کرنے کی کوششیں۔۔۔ یہ سب  
معنوی تھا۔ درحقیقت وہ اندر سے خوفزدہ تھی۔ اسی لیے میں زیادہ  
مطمئن اور پرامن تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ ہمارے سفیر کا سالا ہے۔"  
اس نے "ہمارا زبان لا" کی اصطلاح استعمال کی تھی اور کوئی  
وضاحت نہیں کی تھی۔ میں ممکن تھا اس کی مراد ہونی رہی ہو  
لیکن میں نے سلا ہی فرض کیا تھا۔

میں چند لمبے استہزائیہ انداز میں ہنستا رہا جس کے دوران میں  
وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہی۔ میں نے اُسی دنگے  
ہوئے کہا "معلوم نہیں تم نے کیوں اس کے تعارف میں وسیع کا  
فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے مجھے خود اپنے من سے بتایا تھا کہ یہ  
ایف بی آئی ایجنٹ ہے۔ اس وقت تم کرے میں نہیں تھیں۔ شاید  
اس لیے یہ تم سے مشورہ نہیں کر سکا کہ اسے کیا بنا چاہیے۔"  
پھر اب تم نے اسے انیم کچھ بدل دی ہے؟

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ان آنکھوں میں غمناک  
غضب اور نفرت کی آگ روشن رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی  
لیکن اس کوشش میں اسے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اس  
آگ کی۔۔۔ سے خوف کے برف ڈاؤر جھانک رہے تھے۔

"وہ سفیر کا سالا بھی ہے اور ایف بی آئی ایجنٹ بھی۔" انا  
شرمندہ انداز میں بولی۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ دیر بعد تم اسے صدر امریکا کا قریبی  
عزز بنادیا کی اور خفیہ ایجنسی کے ڈائریکٹر وغیرہ کے حصہ سے  
نازک کر دو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "اس سے کہیں بڑھ  
ہو گا کہ تم مجھے حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کر نہیں۔ اس طے  
تم اپنے آپ کو بہت سی غیر ضروری تکلیفوں اور معیبتوں سے

عرسے سے بڑی بڑی میٹھنیں سب لپٹا لپٹا میرا مشغلہ بن گیا ہے۔  
تمہارے اشناک میں اور بھی جو اونچے درجے کی میٹھنیں ہیں وہ  
میرے سر ڈال دو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تمہاری باتیں واقعی سمجھ میں نہ آنے والی ہیں۔" وہ ٹھنڈی  
سانس لے کر بولی "اور نہ ہی یہ میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ آخر  
جہیں کسی بھی بات کی پروا کیوں نہیں ہے۔ اپنے انجام سے تم  
جیسا بے پناہ آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ تم مجھے صرف  
توفصل جہل یا سفیر کو فون کہنے دو۔ پھر تم خودی دیکھ لینا کہ تمہارا  
کیا سفر ہوتا ہے۔ تمہاری ساری خوش فہمیاں دور ہو جائیں گی۔"

"توفصل جہل اور سفیر کو فون تم نہیں۔ بلکہ میں کروں  
گا۔ میں خود انہیں یہاں بلاؤں گا۔ جہیں اتنی زحمت کہنے کی کیا  
ضرورت ہے سوٹ ہارٹ؟ ان کو بلانے کے سلسلے میں تم اتنی  
پریشان کیوں ہو؟ جہیں تو کچھ دو سری باتوں کے سلسلے میں پریشان  
ہونا چاہیے۔"

"مثلاً؟" اس نے جھپٹتے ہوئے لمبے میں پوچھا۔  
"مثلاً؟ کہ اب دو سرا قربانی کا بکرا کہاں سے تمہارے ہاتھ  
آئے گا؟ یہ قربانی کا بکرا تو جی ترا کر بھاگ رہا ہے۔" میں نے  
اپنی طرف اشارہ کیا "کیونکہ یہ ذرا سرکش قسم کا بکرا واقع ہوا ہے۔  
پتلے بھی اسے بار بار قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی تھی ہے لیکن یہ ہر  
بار بھاگ نکلے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب تو یہ اس معاملے میں  
بست تجربہ کار ہو چکا ہے۔"

"تم فصول بکواس میں وقت ضائع کیے جا رہے ہو اور میرے  
شوہر کے قتل کو زیادہ سے زیادہ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اسی طرح  
کوئی اہم شہادت ضائع ہونے کا بھی خطرہ ہے۔" وہ شاید آخری لمبے  
تک اپنا بھرم دکھاؤ اور ڈرامے بازی برقرار رکھنے کی کوشش  
کر رہی تھی۔

"کتنا صدمہ ہے جہیں اپنے شوہر کے قتل کا۔۔۔ اور سچی  
فکر ہے جہیں قتل کی کوئی شہادت ضائع ہونے کی۔" میں نے  
سر ہلاتے ہوئے کہا "قتل کی سب سے اہم شہادت تو کچھ دیر پہلے ہی  
میرے ہاتھوں ضائع ہوتے ہوئے بنی ہے۔"

"کون سی؟" اس نے شاید غیر ارادی طور پر پوچھا۔  
"وہ۔۔۔" میں نے دل پریشان کی طرف اشارہ کیا "وہ میرے  
ہاتھوں مر بھی سکا تھا لیکن میں نے اسی لمبے ہاتھ بکرا کا کہہ کر وہ  
مر گیا تو میرے قربانی کا بکرا بننے کے امکانات کچھ روشن ہو جائیں  
گے اور یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ میں جہیں تپا چکا ہوں کہ  
قربانی کا بکرا بننے سے مجھے سخت نفرت ہے اور میں اکثر عین موقع پر  
رہتی ترا کر کھاتا رہا ہوں۔"

"اگر تم کچھ وضاحت سے بات کرتے تو بہتر تھا۔ شاید مجھ کم  
عقل کی بھی کچھ سمجھ میں آسکا۔" وہ دہر لے لے میں بولی "اہم اب  
اس کے تاثرات میں کچھ دھیان نہ لیا تھا۔ شاید اسے یقین ہو گیا

پانچیس  
"تکلفیں اور مصیبتوں میں تو تم نے اپنے آپ کو پھنسا لیا  
ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ میری کو قتل کر کے اور بریڈن کو تقریباً  
چار ماہ کر تم قتل جاؤ گے؟ تم پاکستانی واقعی بڑے خوش قسم ہوتے  
ہو۔"

"جے جے۔" میں نے پہلی مرتبہ نہایت خوش دلی سے اس کی  
تذکرہ کی "خوش قسمی ہمارا بہت بڑا قوی اثاثہ ہے۔ یہاں پانچواں  
بندوگلوں کی زندگی کس نہ کسی خوش قسمی کے سہارے ہی بسر ہو رہی  
ہے۔ تم مجھے اس پر فخر کرنے والی کون کہتی ہو؟"

"وہ عاشق رہی تو میں نے ملائمت سے کہا "لیکن اس وقت تم  
لمبے اپنے سے زیادہ خوش قسم لگ رہی ہو۔ آخر تم نے کیا سوچ کر  
انگریزی اسکیم بنائی تھی؟"

"جیسی اسکیم؟" وہ گویا بڑی طرح چوہا۔  
"مجھے یہ دیکھ کر اٹا پلاٹ لگ رہا ہے جس پر تمہارے امریکا میں  
ہزار ایک نئی تجارتیں تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ افسوس کہ  
تم لوگوں نے یہاں اگر بھی اس پلاٹ پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش  
کرنا ہی نہیں کی ہے بغیر نہیں دے سکتا کہ یہ ایک بھڑائی کوشش  
تھی۔" میں نے حسانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"حسٹم نہیں تم کیا کرنا کہیے جا رہے ہو۔ میں ابھی اپنے  
توفصل جہل کو اور اسلام آباد اپنے سفیر کو فون کرتی ہوں۔"

اس نے انھیں کی کوشش کی لیکن میں نے جوتے سمیت سختی  
سے اس پر پابندی رکھ دیا۔ قسائی بعض اوقات کسی بکرے کو ذبح  
کرتے وقت اسی طرح پاؤں یا گتے لٹکے دبانے کی کوشش کرتے ہیں  
کہ ایک مہینے اور سفید نام عورت کے معاملے میں کسی قسائی سے  
کی اس قسم کی بد فہمی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے بچوں  
میں آنکھوں سے ایک نظر میرے جوتے کو اور ایک نظر مجھے دیکھا۔

شاید وہ سوچ رہی ہو کہ کاش یہ جوتا میرے ہاتھ میں ہوتا اور میں  
پہنی طاقت سے اس شخص کے منہ پر رسید کر سکتی!

گولی بھید نہیں تھا کہ اس کے دل میں اس سے بھی کہیں زیادہ  
لیکن اور خطرناک خرابیوں کو نہیں لے رہی ہوں۔ بہر حال مجھے  
ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ میرے پاؤں سے چل کر وہ بھی لیکن  
بہت زور لگانے کے باوجود اٹھ نہیں سکی۔ اس نے میری ٹانگ کو  
نچھٹے کمرے کی کوشش نہیں کی اور اپنی جدوجہد ترک کرنے میں  
کی ناکاہت سمجھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کس قسم کے آدمی ہو۔" وہ  
اپنے ہونے بولی "کیا جہیں ذرا بھی پروا نہیں ہے کہ تم کن لوگوں  
کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ اور تمہارا انجام کیا ہو سکتا ہے؟ تم کچھ بہ  
کرنا لڑا سے زیادہ بڑی مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔"

"میں تو تم دونوں سے سب سے بڑی غلطی مرزدہ ہونے کی تم نے  
یہاں سے غیر مجھ پر ہاتھ ڈال دیا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ ایک

تھا کہ فتنہ اور رعب دکھائے یا دھمکیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

”مگر تم اب بھی معصوم بننے پر تکی ہوئی ہو تو وضاحت کرو تا ہوں ورنہ میرے خیال میں کم از کم تمہیں تو وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ وضاحت کی ضرورت تو مجھ غریب کو ہے لیکن مجھ سے ہی وضاحت مانگی جا رہی ہے۔ کیا اتنا زمانہ آگیا ہے؟“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر بات جاری رکھی مگر حال میں چونکہ مصلحت اپنی کھوپڑی پر ذرا زور دینے اور اپنی حیثیت کو ہر وقت بیدار رکھنے کی وجہ سے وضاحت کرنے کی پوزیشن میں ہوں اس لیے میں یہ غصہ انتہا تک پہنچا رہا ہوں۔

”وہ کسمپاشی تو میں نے اس کے جسم پر اپنی کا دباؤ کم کرتے ہوئے کیا مگر تمہارا کل پر سکون رہنے کا وعدہ کرو اور زیادہ اچھل کود نہ دکھاؤ تو میں تمہیں مسز لوگوں کی طرح کر سی پر بیٹھنے کی دعوت بھی دے سکتا ہوں۔“

وہ کوئی وعدہ کرنے کے بجائے کھاجانے والی نظروں سے مجھے گھورتی رہی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب اس نے زیادہ تیزی طراری دکھانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ میں نے پاؤں اس کے اوپر سے ہٹا لیا اور وہ اٹھ کر بدستور مجھے تھر تھر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دوران میں اس نے ایک بار بھی اپنے آنچلی شہرہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جو درجہ الونگ چیر پر اسی پوزیشن میں موجود تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بے چارہ اسی حالت میں نہ اڑ جائے۔

”مسز بیرس! کیا تم بتانا چاہتے ہو کہ مسز بیرس سے شادی سے پہلے تم کیا کرتی تھیں؟“ میں نے اب سنجیدگی اور ملاحت سے پوچھا۔

”تم نے پولیس انسپروں کی طرح مجھ سے سوالات کرنے کا نہیں بلکہ مجھے کچھ بتانے کا وعدہ کیا ہے۔“ اس نے گویا مجھے یاد دلایا۔ اس کا لہجہ اب پہلے کی طرح جارحانہ نہیں تھا لیکن اس میں ٹیکھا پن مگر حال پر قرار تھا۔

”فیکٹس اپنے سوال پر اصرار نہیں کریں گے۔ یہ اچانک سوال نہیں ہے۔ مگر حال اس سے مجھے تم کو بہتر طور پر جاننے میں مدد ملتی۔ لیکن میں اپنے اندازوں کی مدد سے تمہیں بتا جان سکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ حال دل دی کافی ہے۔“ پھر میں نے اچانک دل برعکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”اس سے تمہارا معاشرہ کب سے چل رہا ہے؟“

”کیا تم اس سے؟“ وہ پھر یکدم ہنسنے سے انکڑ گئی۔ اس نے برہمی کا اظہار کرنے کی ایک بار پھر کمر پور کوشش کی تھی لیکن مجھے اس برہمی کی تہ میں چھپے ہوئے خوف کا سراغ مل گیا تھا۔ مگر حال وہ بڑی باہمت عورت تھی۔ ابھی تک اس ڈرامے میں اپنے کردار پر

ڈن ہوئی تھی۔

میں نے گواہ اس کی برہمی پر توجہ دے کر بغیر بات جاری رکھی تھی۔ میں نے اپنے اس خیال پر اب بھی قائم ہوں کہ تم نے بہت کچھ بتا دیا۔ اس کا سارا لے کر زور مارا جانے کی کوشش کی ہے۔ اگر جسٹس مسز بیرس سے نجات حاصل کرنی ہی تھی تو اس کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کر لیتیں۔ اس بے چارے کو قتل کرنا ہی کیا ضروری تھا؟“

وہ اس طرح میری طرف دیکھتی رہی جیسے بہ زبان غوثی مجھے بتانے کی کوشش کر رہی ہو کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ میں ہلکا سا کرکتی ہوں۔

ایک لمحے کے وقف سے میں نے کہا ”لیکن مسئلہ وہی لالچ آجاتا ہے۔ لالچ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل کرتا ہے۔ ظاہر ہے بیرس کی دولت کی خاطر ہی تو تم نے اس سے شادی کی ہوگی ورنہ اس عمر اس سراپا اور اس حسین چہرے کے ساتھ جسٹس ایک مومن نے بے جھگم اور عمر رسیدہ شخص کے لیے ہندوئی کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے طلاق حاصل کرنے کی صورت میں امریکی قوانین کے مطابق جسٹس لہجہ چڑا کر نقصان پہنچا ہو گا۔ اور میرا خیال ہے تم انہی عورتوں میں سے ہو جو زندگی میں کبھی کھانے کا سودا کرنا پسند نہیں کرتیں۔“

میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا تو وہ کات وار لہجے میں بولی ”جسٹس کو اس کوئی ہے کرتے رہو۔“

”وہ تو میں مگر حال کروں گا۔ اس کے لیے مجھے تم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اطمینان سے کہا ”وہیے بتاؤ دے۔۔۔ تم بیرس کی دوسری بیوی ہو یا تیسری؟ میرا خیال ہے تیسری سے آگے جانے کا تو امریکیوں میں حوصلہ نہیں ہو تا۔ اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔“

”تیسری۔“ اس نے گویا کسی غیر ملکی ذہن کا کھنٹ بھرے ہوئے جواب دیا۔

”آہ!“ میں نے یوں ٹھنڈی سانس لی جیسے اس انکشاف سے مجھے شدید روحانی صدمہ پہنچا ہو ”گھبرا آجمنی مسز بیرس! کیا لالچی ہی تھے اسے بھی لالچی کی ایک قسم کہا جا سکتا ہے کہ انفاق آخر عمر تک جوان اور حسین عورتوں کی صحبت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہو اور پھر دولت کے زور پر خواہشوں کا لالچ دہرا کر آٹا پلا جائے۔ کبھی کبھی اس لالچ کی سزا بھی جھٹکتی پڑی جاتی ہے۔ تم نے بیرس کو کھانے لگوانے کے لیے دل برعکس کرنا سیکھ لیا تو اب تمہیں یہ سیکھ رہا ہے؟“

”کیا اس نے جسٹس بتایا کہ وہ ایف بی آئی ایجنٹ ہے اور ایک خاص مشن پر چند دن پہلے ہی پاکستان گیا ہے؟“ مسز بیرس تیزی سے بولی۔

”بتایا تو ہے۔ بتایا تو تم نے بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن میں

کے معمول اور سلیقہ ذہن خالص میں بیٹھے ہوئے کسی جملہ سے تیار کیا ہو گا مگر قتل بر حال اصل کے میں مطابق ہے۔ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے معتمد ماہرین کی کچھ کمی نہیں۔ ان معاملات میں ہم بھی خود نکیل چس لیکن اس کاڑ کی بات یہ کہ اور ہے۔ اس مقام اور ان سہولیات تک رسائی رکھنے والے ماہرین ہمارے ہاں ذرا مشکل سے ہی ملتے ہیں۔ القوس کی بات یہ ہے کہ یہ ماہر ہمارے ہاں کسی شمار نظام میں نہیں ہو گا۔ چند ڈالر میں یہ کام کر کے دیتا ہو گا۔ غربت کی زندگی بسر کرتا ہو گا اور اپنے سامنے سے بھی ڈرتا ہو گا۔ ہمارے ہاں ہو تا تو خاصی خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا ہوتا اور شاید چند آن کر چلتا۔

پہلیا تم نے اس سے پہلے بھی ایف بی آئی کا اصل کاڑ دیکھا ہے؟ اس نے گویا میری طویل تقریر ان سنی کرتے ہوئے فہمے فہمے لیے میں پوچھا۔ اب غالباً اس نے بار بار طرز عمل اختیار کیے رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اپنی حکمت عملی بدل رہی تھی۔ اس حسین چہرے کے پیچھے یقیناً ایک شیطانی ذہن کام کر رہا تھا۔ اور اس ذہن نے اسے بہتر تہا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

”تمہارے اندازوں کی انہی غلطیوں نے تو تمہیں موارا ہے۔“ میں نے لفظی راسخ لے کر کہا ”معلوم نہیں کیوں تم نے مجھے بالکل ہی گھٹیا رافضی کر لیا تھا۔ شاید تمہارے اس عاشق نے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کیا ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے صرف ایف بی آئی کا کاڑ دیکھ رکھا ہے بلکہ کاڑ بار کے سلسلے میں امریکا میں قیام کے دوران میں ایف بی آئی کے ایک خاص شعبے کے ڈائریکٹر سے میری خاصی ملاقاتیں بھی رہی ہیں۔ اس سے تقریباً دو سنی ہو گئی تھی۔“

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ اُبھرا۔ بہت گہری عورت تھی۔ اس کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ آسانی سے کسی بات سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ میرے انکشاف پر اس کا مرحوب ہونے کا یقیناً کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”تمہارے ہاں کے سراغی“ جرم دسرا اور اسپاکی انکٹوں کی کتابیاں لکھنے والے مصنفوں نے خواہ خواہ ایف بی آئی والوں کو ایک ماورائی سی حقوق عطا کر رکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر ہماری تمہاری طرح عام سے آدمی ہی ہوتے ہیں۔ بس وہ ذرا ایک مخصوص حریت سے گزر کر آتے ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض ذرا زیادہ اچھن ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ عام لوگوں میں بھی کچھ لوگ ذرا زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ سب لوگوں کی طرح ایف بی آئی والوں میں بھی عام سی بشری کمزوریاں ہوتی ہیں اور شاید تم حب الوطنی کے جوش میں میری اس بات سے اتفاق نہ کرو کہ ان میں سے بعض تو اپنے خالص سونے دماغ کے بھی ہوتے ہیں۔ بالکل تمہارے اس آشکا طرح۔“

اس خرافات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تمہاری فکر میں شاید ہر پاکستانی بے وقوف ہوتا ہو گا سزبیرس! لیکن میں کم از کم اپنے بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم نے فرض کر لیا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی ہے اور میرے پاس گو کہ بڑی بڑی ڈگریاں نہیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں بہت سے بڑے لکھوں سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں۔ تم باتیں ہو کہ کوئی بھی سفید فاس دس چندہ فٹ دور سے مجھے کوئی کاڑ لرا کر دکھائے اور میں یقین کر لوں کہ وہ ایف بی آئی کا ایجنٹ ہے۔“

”خوار کیا اس کے لیے خود ایف بی آئی کے ڈائریکٹر کو تاکہ ہمارے سامنے دست بستہ گزارش کرنا پڑے گی اور خلیہ بیان دتا پڑے گا کہ فلاں شخص واقعی ان کا ایجنٹ ہے اور تم بھی مبرا ہی فرا کرے ایجنٹ تسلیم کر لو؟“ وہ گویا جل کر رہا۔

”نہیں۔۔۔ خلیہ۔۔۔ اتنے بھی تردد کی ضرورت نہیں۔ میرا طرز ہی مجھے بتاتا ہے کہ کس کا دعویٰ کس حد تک صحیح ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اسے تنبیہ کی ”تم اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم دیکھ رہی ہو کہ میں خوبصورت عورتوں تک کے معاملے میں کس قدر بد لحاظ واقع ہوا ہوں۔ خصوصاً بد صورت لڑائیں رکھنے والی خوبصورت عورتوں کے معاملے میں۔۔۔“

میں دل بریزن کے پاس پہنچا جو اسی جگہ بے ہوش پڑا تھا۔ جہاں میں نے اسے پھینکا تھا۔ میری نظر سزبیرس پر بھی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ میں نے خاصی تیزی سے دل بریزن کی تلاشی لے والی۔ میں نے سب سے پہلے اس کے کاڑ کا جائزہ لیا جو اس کے گھٹے دور سے دکھایا تھا۔ سزبیرس نے اس دوران میں خاصی شرافت کا ثبوت دیا اور اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس نے کوئی چالاکی نہ کرائی کہ کوشش نہیں کی۔ میں نے اس کی تلاشی بھی نہیں کی۔ جسے اس کے لباس میں کہیں اپنی گنجائش تو نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس کے اندر سے کوئی چھوٹا سا زانا جسم کا پتھول برآمد کر سکتی۔ میں بر حال اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔

دل بریزن کا کاڑ واقعی ایف بی آئی کا تھا۔ اس پر ایک سٹرا کا کچھ بہت تھا اور کبھی ہوتی جرد غیر بھی جی ہوتی تھی۔ وہ ایک کچھ نازک و ظریف تھا اور ہر اعتبار سے متاثر کن تھا۔ ہمارے ہاں اگر کہہ کی انہی پہلے چڑھنے لکھے پورے آفیسر کو بھی دکھایا جاتا تو وہ ضرور مرحوب ہو جاتا اور شاید اسے غلط سمجھنے کا خیال بھی دل میں نہ آتا۔ لیکن میں نے جانے کیوں اس معاملے میں اپنے دل کی بات ماننے سے غلط ہوا تھا۔ اور میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ وہ شخص ایف بی آئی کا ایجنٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی جب بھی شخصانہ میں سے میرے دل میں کوئی بات آتی تھی تو اسے مان کر میں اس میں نہیں مان رہا تھا۔

مجھے اس کا پتہ تھا کہ اس کا کاڑ کو ہوا میں لڑاتے ہوئے اس کا انداز نہیں تھا۔ حالانکہ یہ کاڑ وہاں کی کسی عورتی گلی

میں نے ایک بار پھر دل پر ہڈوں کی طرف اشارہ کیا۔ سزبیرس نے بظاہر ہونٹ داڑھوں کے دابلیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس میں شک نہیں کہ یہ بھی کو شش کرنا تو ایف بی آئی ایچٹ بن سکتا تھا۔ اور شاید اسے شوق بھی رہا ہو جس کی تکمیل وقتاً فوقتاً عملی کارڈ کے ذریعے کرتا رہا ہو لیکن شاید اسے عمر رسیدہ دولت مندوں کی جوان اور حسین بیویوں سے شامانی پڑھانے سے فرصت نہ ملی ہو جس کی وجہ سے یہ ایف بی آئی میں جانے کا صحیح راستہ اختیار نہ کر سکا ہو۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا۔ میں اس کے کچھ بولے کا خطرہ تھا لیکن وہ خاموش رہی۔ دل پر ہڈوں کی گھن پٹنے ہی میرے قبضے میں آچکی تھی۔ اب اس کی تلاشی کے دوران میں اس کی ٹانگ سے بندھن ہوئی ایک خصوصی غلام سے خاص خوفناک شکل کا ایک جھلٹلا ہوا خنجر بھی رتد ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں بھی اسی طرح ایک خنجر اپنی ہڈی سے بندھن میں رکھتا تھا لیکن اب میں نے چھوڑ دیا تھا۔ میرے خیال میں اب میرے لیے حالات اتنے خطرناک نہیں رہے تھے کہ میں ایک فاضل ہتھیار کے طور پر خنجر بھی ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتا۔

میں نے دل پر ہڈوں کا خنجر دوری سے ہندو لم کی طرح بھٹلاتے ہوئے سزبیرس کو دکھا کر کہا "اب شاید تم یہ بھی کوئی کہ ایک ایف بی آئی ایچٹ کے لیے ٹانگ سے خنجر باندھ کر گھٹنا بھی ضروری ہو آجے ورنہ اس کا افسر اس سے جواب طلبی کر سکتا ہے؟"

وہ بدستور خاموش رہی تو میں نے ملائمت سے چپا "آخر تم دونوں نے کیا سوچ کر مجھے سزبیرس کے قتل کے پکڑ میں پھنسانے کا فیصلہ کیا تھا؟ کیا تمہارے خیال میں یہ کام اسی آسان تھا؟"

اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کہا "شاید تم سے یا تمہارے اس عاشق سے یہ قتل اچانک سرزد ہو گیا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ ایک پاکستانی تمہارے شوہر سے ملنے آنے والا تھا۔ تم نے اور تمہارے عاشق نے مل کر اس بے چارے پاکستانی پر ہلا ڈالنے کا بیگناہ پروگرام بنالیا ہو۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک اعتقاد ہی کو شش تھی۔ تمہیں اس پاکستانی کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل کتنی چاہیے تھیں۔ کچھ تو معلوم کر لیا چاہیے تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔ کچھ اہم ورک تو کر لیا چاہیے تھا۔"

پھر میں نے خودی جواز پیش کر دیا "لیکن مسئلہ یہ رہی آجنا ہے۔ شاید تمہارے پاس وقت نہیں تھا۔ تم نے ایک اہم عملی چال چلی تھی جو بالکل تمہارے منہ پر آن پڑی۔ وہ پاکستانی انا چند نہیں نکلا جتنی تمہیں توقع تھی۔ وہ تمہارے ہڈی بلند عاشق کے ہاتھ میں گھن ہونے کے باوجود اس کے قابو میں نہیں آیا۔"

پھر میرے لمحے میں حقیقی الجھن در آئی "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اگر تمہارا عاشق اپنے کسے جسم کو زیادہ زحمت

دے کر بغیر محض گھن کے قتل ہوتے پر مجھے قابو میں کر لیا اور اسی طرح کمانی کے ساتھ مجھے پولیس کے حوالے کرنا۔ اور یہ کچھ نہیں ایک عام اور غیر اہم سا کوئی ہو آسکتا۔ جب بھی کیا تھا اسے اس کے لیے اپنی کمانی کو کثابت کرنا کافی مشکل نہ ہوتا؟"

اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ لگتا تھا کہ اس نے کچھ زیادہ سختی سے اپنی زبان بند رکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ نہ جانے اس میں کیا مصلحت تھی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کیا وہ مجھے پولیس کے حوالے کرتے وقت بھی اپنے آپ کو ایف بی آئی ایچٹ ہی کاہر کرتا؟" گو کہ وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی لیکن میں گراؤ پر آمیز بن کر کچھ نہ کچھ دے بیٹھے جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ حالانکہ پولیس کی کم علمی اور باطلی کی شہرت عام طور سے لیکن عام بھی۔ اس سے اتنی زیادہ ہے وقت کی توقع تو نہیں رکھنی چاہیے تھی کہ دل پر ہڈوں اپنے آپ کو ایف بی آئی ایچٹ کہہ کر حکایت کرنا اور سب پولیس والے آنکھیں بند کر کے چلنے کیلئے کم پولیس آفیسر کے ذہن میں تو سوال پیدا ہو گا کہ یہ کیا ایف بی آئی ایچٹ ہے جس کی آمد کی اسے بھی اطلاع نہیں۔ مارے ہلا کہ ایف بی آئی ایچٹ کی آمد بڑا اہم واقعہ ہوتی ہے۔ اخباروں پر خبریں چھپتی ہیں۔ کیا تمہیں نہیں ہے کہ تمہارا عاشق پولیس کے سامنے بھی آخری وقت تک اپنا فراڈ بھانے میں کامیاب رہتا کسی بھی مرحلے پر اس کا پل نہ ٹھٹکا؟"

اس نے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دیا تو میں نے بظاہر سانس لے کر کہا "اے خوبصورت چوہ! آخر تم کب تک خاموش رہو گی؟"

"جب تک میرے وکیل یہاں نہیں پہنچ جاتے مجھے اب کچھ بھی کہنا ہو گا اپنے وکیلوں کی موجودگی میں کہوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"چلو۔۔۔ خدا کا شکر ہے تم نے کسی سوال کا جواب دیا۔۔۔" میں نے کمری سانس لے کر دل پر ہڈوں کا خنجر ہٹا کر سزبیرس کے سامنے جھڑپ کر دیا۔ میں نے اسے دیوالی کی دھڑ سے گھرا اور اس پر اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں آنے دیے تھے۔

میں نے دوبارہ سزبیرس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اب تم تو قنصل جنرل اور سفیر سے بات کرنے کے بجائے اہم وکیلوں سے بات کرنے پر تیار ہو۔ چلو۔۔۔ تمہارا مطالبہ کچھ تو آیا۔ ویسے یہ بھی امریکوں کا خاص اسٹائل ہے۔ جب ان کی بات میں نہیں آتا کہ اب مزید جھوٹ کیسے بولا جائے تو وہ اپنے دیکھنا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔"

اچانک میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی میرے میں اداسی کی ایک لمبی امبری تھی۔ میں نے آنجنابی سزبیرس

میں گویا آسمان سے پاتال کی طرف سفر شروع کر دے؟ کیا تم اس کی کیفیت کا اندازہ کر سکتی ہو؟  
میں اسے گھور رہا تھا۔ اس نے خطرہ لے لیا۔ میرا ہی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر پلے سے زیادہ بے دردی سے اس کے بال ٹھکی میں جکڑاؤں اور اس کے منہ پر ایسا گھونسا رسید کروں کہ زندگی بھر کے لیے اس کا چہرہ مسخ ہو کر نہ جانے پھر اسے اتھا کر اس طرح دیوار سے دس باروں کہ وہ دوبارہ نہ اٹھے۔ نہ جانے کس طرح میں نے خود پر قابو کر لیا۔

اس نے کچھ یوں میری طرف دیکھا جیسے میری بات کا اصل مضمون سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے ایک لمحے کے لیے دانت بچھنے کے پھر کہا "تم جیسی عورتوں کی منہ زور خواہشات بیک وقت نہ جانے کتنی زندگیاں برباد کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔ اور انفسوس کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات خود ان کے اپنے ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا۔۔۔۔۔"

میرے دل پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔ میں نے ٹھکی بنی ہی آواز میں بات جاری رکھی "محض چند منٹ سے بڑا فرق پڑ گیا۔۔۔۔۔ تمہارا اور دل بریڈن کا ماسٹریٹ پر میری کورائے سے بٹانے اور اس کی دولت پر قبضہ کرنے کی ہوس۔۔۔۔۔ یہ سب تمہارا دل بریڈن کا۔۔۔۔۔ کیا پھر تمہارے شوہر کا دودھ سرقا۔۔۔۔۔ مجھے اس سے ذرا بھی غرض نہ ہوئی۔ مجھے شاید کسی بات کا علم بھی نہ ہونے پاتا۔ میں آتا۔۔۔۔۔ میرس سے ایک معمولی سی چیز لیتا اور خاموشی سے رخصت ہو جاتا۔ تمہارا منصوبہ چند منٹ یا چند گھنٹے بعد بھی عملی شکل اختیار کر سکتا تھا اور اس میں الجھنے والا میرے بجائے کوئی اور بھی ہو سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں قسمت کو یوں منظور تھا۔۔۔۔۔!"

میں نے ایک طویل سانس لی جس نے میرے دل پر خراش سی ڈال دی۔ شاید اس میں ایک اچھا پلو تو یہ تھا کہ تمہیں اور تمہارے عاشق کو انعام کو پہنچانا تھا لیکن بڑا پلو یہ ہے کہ ایک بے قصور لڑکی کی زندگی کو بربادی سے بچانے کی جو تدبیر ہوئے والی تھی دھری کی دھری رہ گئی اور اس کے لیے میرے سامنے کوئی قبائل راستہ بھی نہیں۔ ایک عرصے کی تک دودھ کے بعد امید کی کرنا نظر آتی تھی تو وہ بھی تمہاری وجہ سے دم توڑ گئی تھی عورت!"

میں نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دانت میسے۔ پہلی بار اس کی رحمت زور پر گئی اور وہ ہڑوا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری آنکھوں میں پھینکا کوئی بات تھی جس نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میں نے اپنے اندر پھلے ہوئے ایک دہرنے کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھا ہوا تھا۔

میں اس کی طرف بڑھا تو وہ دہشت زدہ سے انداز میں اُلٹے قدموں دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ حتیٰ کہ دیوار سے جا لگی۔ میں اس کے قریب جا کر۔۔۔۔۔ وہ مراٹھاں میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی سانس گویا سینے میں انک محسوس تھی۔ اس کا چہرہ مجھے سے صرف چند

طرف دیکھا۔ اس کی چادر میں ہلکی سی ٹیلاہٹ اور نموم کی سی ٹیلاہٹ نمودار ہوئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر مسز بیرس کی طرف توجہ ہوتے ہوئے کما میں اب سمجھ گیا ہوں۔۔۔۔۔ دل بریڈن کا ایف بی آئی والا ڈراما صرف میرے لیے تھا۔ اسے بھی یہی مضمون ہو گا کہ وہ اس فراڈ کو زیادہ آگے تک نہیں چلا سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ ایف بی آئی والا ڈراما صرف مجھے بد چاس کرنے کے لیے تھا۔ دل بریڈن اور میں نہ جانے کہاں کہاں یہ ڈراما کر چکا ہو گا اور اس کے سناڑے نہ جانے کیا کچھ کر چکا ہو گا۔ اس کا سارا پہلو تباہ پلے گا۔۔۔۔۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ۔۔۔۔۔ آگے گزر گیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کما مہر حال مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ میرے بارے میں اس کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے مجھے نہیں ہلاک کر دیا تھا۔۔۔۔۔ مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا تھیل میں ہوتا تھا۔ بعد میں ٹالیاں پولیس کو کچھ اس قسم کی کمانی سنا کہ میں نے میرس کو قتل کر دیا تھا اور تازکی آواز سن کر جب وہ یہاں پہنچا تو میں نے اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے دھڑکنے کوٹھکا چلا کر مجھے ہلاک کر دیا۔ یہ سیدھا سادہ خود خفاقی کا کس بن جاتا اور بریڈن کا کچھ بھی نہ بچتا۔ پولیس مفراتی رہتی اور اپنا سر ہونوئی داتی کہ آخر میں میرس کو کین قتل کرنا چاہتا تھا؟ میں ممکن ہے وہ جلدی کوئی جزا تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی یا پھر کوئی مفرودہ قائم کر کے کس کو دافیل دفتر کر دیتی۔ تم لوگ غریبی ہو۔ دولت اور اثر و سوجن والے ہو۔ وہ تمہیں زیادہ تنگ نہ کرے گا اور تم سب کو بچا کر اچھا کر اطمینان سے رخصت ہو جائے۔ امریکا جا کر کہیں خوبصورت ساحلوں پر ایک دوسرے کے گلے میں بائیں ڈال کر دھوپ پینکٹے پائے جاتے۔"

وہ دستور خاموش تھی۔ ویسے اب اس کی آنکھوں میں ایک فحشہ دور نما ہوا تھا۔ ان کی کمرانی میں کچھ باہمی نظر آ رہی تھی۔ اس فحشہ کی طرح جس کے تمام جسمی رازوں تک کسی کی رسائی ہو چکی ہو لیکن وہ پھر بھی انہیں بچانے کی کوئی تدبیر سوچ رہا ہو۔

میں اپنے دل میں ابھرتی ہوئی آواز سی کی کر دیا نے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاید مجھے اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ میں جب ہلاک تو میرے لیے میرا ہی جیغ افسردگی تھی۔ مجھے خود بھی حیرت ہوئی۔

"تم سن۔۔۔۔۔ دل بریڈن نے بہت ہی غلط وقت پر میری کو قتل کیا۔ مسکرت ہی غلط وقت۔۔۔۔۔" میں نے کہا "تم اس شخص کے عسکرات کا اندازہ کر سکتی ہو جو ایک مدت سے ماؤنٹ ایمرسٹس کر کے کی کوشش کر رہا ہو اور میں اس وقت جب چوٹی اس سے ڈھانچا ہوا تھ کے قاصد پر ہو چکا تھا میں گڑھی ہوئی وہ سچا فحشہ جیغ جس پر اس کا پاؤں ٹکا ہو۔۔۔۔۔ جس کی کمرے بندھی ہوئی فحشہ کی فحشہ۔۔۔۔۔ وہ دورہ بانی دھندلوں میں لٹی سر کی فحشہ

امج کے فاصلے پر تھا۔ اس کی رحمت زور دہی اور چشمانی پر پڑنے کی  
یونہی ہلک رہی تھی۔

چند یکنے کی اعصاب جسکی خاموشی کے بعد جب میں بولا تو مجھے خود اپنی آواز کسی دوسرے کی غراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی "تم کتنی خوش قسمت ہو مسز ہیرس۔ کہ تم قانون کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی۔ میرے ہاتھوں میں۔"

اس کی خواہش اور مرضی اور مراحمی وار کردن کو گرفت میں لینے کے لیے میرے اچھے کے معاملات اکڑے جا رہے تھے لیکن میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو قابو میں رکھیں ہوئے انہیں کردن کے بجائے اس کے بازو کی طرف پھرایا۔ دہشت کے مارے اس کے منہ سے کبھی یہ چیخ نکلی مگر لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں نے صرف اس کا بازو تھا تو اس نے شاید یہ مشکل اپنے آپ کو مزید چھیننے سے باز رکھا۔

”تم اپنی جگہ سے حرکت مت کرو مگر ہیرس!“ میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا ”جس کرسی پر میں نے تمہیں بٹھایا تھا“ اسی پر چینی رہو۔ ہیرے محسوسات میں اس وقت ایک بارودی سرنگ بھیلی ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا پاؤں اس بارودی سرنگ پر رز جائے اور سب کچھ دھماکے سے اڑ جائے۔“

میں نے اسے بازو سے پکڑے پکڑے لا کر واپس کر سی پر  
 بٹھادیا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ اس کی آنکھیں بدستور  
 چمکی ہوئی تھیں اور وہ قہر قہر کانپ رہی تھی۔ اب یقیناً اسے اندازہ  
 ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ ایک بالکل مختلف قسم کے آدمی سے چڑا  
 تھا۔

میں نے دل پر غزن کو ایک ٹھوکرا دیا کرتے ہوئے کہا "اس  
مردے کے بچے کی بے ہوشی تو کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔ اب تک تو  
اسے ہوش میں لانا چاہیے تھا۔ مجھے اس سے بھی دو دو باتیں کرنا  
تھیں۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ خیر میں اب اس کے ہوش میں آنے کا انتظار  
نہیں کر سکتا۔"

ایچانک دوداڑے پردنک ہوئی۔ دنک کا اندازہ ٹوہانہ اور  
جٹا سا تھا۔ میں ایک لمبا سا ڈک بھر کر دوہانہ سرسبزیرس کے قریب  
جا کر اہوا۔

”پوچھو کون ہے۔“ میں نے سرگوشی میں اسے حکم دیا ”کونکی خیر ضروری کیگا اس کہنے یا کسی کو مدد کے لیے بلانے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ کس ایسا نہ ہو کہ تم ہر قسم کی مدد سے بچنے کے لیے بے غاڑ ہو جاؤ۔“

میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر وہ اس سے زیادہ  
دہشت زدہ تھی جتنی شاید کسی ہتھیار بردار کو اپنے سر پہ کمرے دیکھ  
کر ہو سکتی تھی۔ اس نے تھوک لگا اور جب آواز بلند ہو چھا "کون  
ہے؟"

”ہٹس میڈم! آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“ شاید

بھاری بھرکم اور ساؤنڈ پرف چوٹی دواؤں کے کی وجہ سے باہر سے آواز بہت جلد آ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگائے کی کوئی خوشحال گھر ایک زہرہ نہیں تھا؟ لیکن مجھے اس میں شک کا سراغ نہیں ملتا۔ سنہیرے اس بار میری ہدایت کے بغیر ہی ہوئی "میں نے لوگ اس وقت ضروری مینگ کر رہے ہیں۔ کوئی نہیں باہر سے کہہ سکتا۔" اس کے لیے میں خفیہ سا ارتقا میں تھا۔ لیکن امید تھی کہ بھاری بھرکم دواؤں کے بارے میں اس ارتقا میں محسوس نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ ایک میں جلا بھی ہو جائے تب تک کوئی خاص پروا نہ ہوئی۔ دواؤں کے مقتل تھا۔ اگر اس کے پاس ڈیجیٹل چالی تھی تب بھی اس کے دواؤں کے کھانے تک کی مراد میرے لیے بہت کچھ کر گزرتے کو کافی ہوئی۔

”بہت بستر بیدم!“ بلوکی قوازا کی اور پھر سکوت چھا گیا۔  
 میں اسٹڈی کی بڑی سی میز کے قریب جا بیٹھا۔ شیٹین میں  
 اپنے قریب کھکا لیا۔ تب مسز میزس نے تھوک نکل کر پوچھا  
 ”کے قون کرنے کے ہو؟“

”تمہارے قونصل جنرل اور سفیر کو۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”جہیں ان دونوں سے بات کرنے کا بہت شوق تھا۔“  
 ان سے جتنی دیر چاہو بات کر سکو گی۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ پہلے  
 ان سے بات کروں گا اور تمہاری معلومات میں یہ اضافہ ہو گا  
 میری بھی کچھ کام کے لوگوں سے شناسائی ہے۔ ان دونوں سے بات  
 کرنے کے بعد میں اپنی کسی صاحب سے بھی بات کروں گا۔ وہ ان کا  
 آئیں گے یا کسی معقول آدمی کو بھیجیں گے۔ کچھ دیر میں میرے  
 اندازوں کی تصدیق ہو جائے گی اور اگر کوئی بات میرے اندازوں  
 کی رسائی میں آنے سے روک لی ہوگی تو وہ بھی معلوم ہو جائے گی۔“  
 ”مخصوص ایک صحت مخصوص میری بات سنو۔“  
 متذبذب سے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بول۔ اس کا چہرہ  
 تھا کہ اس نے جس معنوی خود اعتمادی اور جارحانہ پن کا سہارا  
 تھا وہ اب اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے یہ فکر  
 تسلیم کر لی تھی اور اب اسے کسی راہ فرار کی تلاش تھی۔  
 میں اپنے مطلوب نمبر معلوم کرنے کے لیے اپنے آفس  
 کرنے لگا تھا۔ میں نے ہاتھ روک لیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی  
 طرف دیکھا۔

طرف دیکھا۔  
 ”تم نے کسی چیز کا ذکر کیا تھا۔ جو تم میری سے لے کر  
 تھے۔ کیا چیز تھی؟“ اس نے پوچھا تو ہوئے پوچھا۔  
 میرے دل میں ایک سوہوم ایسا نے سر اٹھایا۔  
 ولف پوچھ کر ہو گیا۔ میں نے قدرے نرمی سے کہا ”ہاں“  
 مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ جس میں اس چیز کا نام  
 ہوں۔ شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔ مجھے فارمولا ہے۔  
 میں نے اسے اس کا یہی نام ہی بتا دیا۔  
 یہ مقدار میں یہ کیمیکل ہے۔





تو اسے چار یقین ہونا چاہیے کہ جلد یا بدیر کوئی پلٹ کر اس کی طرف بھی آئے گی۔ "میں نے کہا۔

"بے گناہ!" وہ استہزائیہ انداز میں جیسی "تو فرم ہوا۔ سرو کی حمایت میں وہ یولوگے تمہارے خیال میں اس کے معاملات میں وہ تمام بوڑھے مکرر دولت مند اور ہوس پرست کے سرو بالکل بے قصور اور بے گناہ ہوتے ہیں جو دولت کے ہوتے ہیں جو ان اور خوبصورت عورتوں کو خرید لیتے ہیں؟

"مجھے تمہارے طبقے کی ایک سفید فام عورت کے منہ سے اس کی بنیادیں سننے کی توقع نہیں تھی۔" میں نے مانگو ایسی بات کہی ہمسائہ معاشرے کی عورت کے منہ پر تو شاید یہ بات جاتی لیکن تم ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک کے انتہائی آوازدار عوام کی عورت ہو۔ تم اس جواز کا سارا لے کر اپنے آپ کو ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"اگر تم اصل کمائی سے واقف ہوتے تو یہ بات کرتے۔" اس کے لیے میں کھلی جھلک آئی "لیکن کمائی ہے۔ اور یہ لمبی کمانیاں پھرنے کا وقت نہیں۔"

"بات پہلے ہی بت لی ہو چکی ہے۔ میں بھی لمبی کمانیاں میں الجھتا نہیں چاہتا۔" میں نے وہ کانٹہ کر کے خبب میں جس پر اس نے دو تین جملے لکھے تھے "تم مجھے ٹیکسی تلاش کرو۔ میں تمہاری تمام تر خیانت کے باوجود تمہارا غم رہوں گا۔"

اس نے شاید لفظ "خیانت" کے استعمال پر مجھے غور کیا لیکن پھر لفظ کی سانس لے کر کندھے اچکا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جوانے لیے میں بولی "تلاش کہاں کرنا ہے۔ وہ اوپر بازار میں پڑا ہے۔ یہ محل اتفاق ہے کہ مجھے اس کے بارے میں ورنہ مجھے اس کے بارے میں کیا خاک پڑا ہوتا تھا۔ اور یہ بھی نہیں تمہاری خوش قسمتی ہے یا میری۔ کہ یہ بات مجھے گئی۔ بہت پہلے کی بات ہے جب وہ ڈبے جھڑکی سے گر کر آئی اور میری نے باتوں باتوں میں مجھے ان کے بارے میں پتا چلے جس میں وہ ٹیکسی کتنی مقدار میں چاہیے؟"

"صرف آدھا پاؤنڈ۔" میں نے جواب دیا۔

"صرف آدھا پاؤنڈ؟" اس نے حیرت سے دوبارہ پوچھا۔

خانے میں تو اس کے کئی کارٹن پڑے ہیں۔ میں تو بھی کئی سارے اٹھا کر لے جانا چاہو گے۔ میری تو پچھلے دنوں میں

کرانے کا تھا پھر نہ جانے کس لیے بات چیت میں نہ تھی۔

میں حالات کی اس قسم کی قسم خریشوں پر اس کو حیران کر رہا تھا اور اس سے محفوظ بھی ہوتا تھا۔ میں جس چیز کے لیے

مقدار کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا اور جس کے لیے

بھاگ دوڑ کر رہا تھا وہ میاں کپڑاؤں خانے میں نہ جانے کس

پڑی تھی۔ یہ پہلو بھی کچھ کم قابل غور نہیں تھا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم مستقبل میں مجھے بلیک میل نہیں کرو گے؟" اس نے ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے ابھی لفظ "شرط" استعمال کیا تھا۔ یہی ایک طریقہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ شرطانہ انداز میں چلنے پر مجبور کیے رکھے گا۔ ورنہ ظاہر ہے نہ تو تمہیں میری زبان پر اعتماد ہے اور نہ ہی مجھے تمہاری زبان پر۔ ایک دوسرے کی طرف سے کسی خطرے کی گواہی دینا ہی نہیں ہے کی تو دونوں ہی ٹھیک رہیں گے۔ میرا تو خیرو پیسے بھی ٹھیک ہی رہنے کا ارادہ ہے لیکن تمہیں اس بات کا یقین دلانے کا میرے پاس کوئی طریقہ نہیں۔ تم بہت حال مجرم ہو۔ تمہیں زیادہ رسک لینا پڑے گا۔"

چند سیکنڈ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر میں نے قدرے ہنسی سے پوچھا "تم تیار ہو یا نہیں؟"

اس نے ایک طویل سانس لی اور اس کے کندھے کچھ ٹھٹکتا خود گی کے سے انداز میں جھک گئے۔ میں نے میز سے رائٹنگ پیڈ اور قلم اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا اور کہا "لکھو۔"

میں نے دو جملوں میں اپنے مطلوبہ انداز میں اس سے ایک طرح سے تحریری اقبال جرم کرایا۔ اس نے نیچے اپنے دستخط جمعیت دیے۔ میں اس کے سر پر کھڑا تھا۔ میں نے کہا "جانے سے پہلے میں کسی دوسری اہم چیز پر موجود تمہارے دستخط دیکھ کر اطمینان کروں گا کہ یہ واقعی تمہارے دستخط ہیں یا نہیں۔ اس لیے صحیح دستخط کرنا۔ مجھے پکڑ لینے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مجھے لیے میں بولی "یہ واقعی میرے دستخط ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے اب نہایت مہذبانہ لیے میں کہا اور میز پر رکھے ہوئے ایک قلمدان پر سے ایک فاؤنٹین پین اٹھالیا۔ پھر اچانک میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور فاؤنٹین پین سے اس کے ایک انگوٹھے پر روشنائی لگائے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" وہ ہاتھ پھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی لیکن مجھ سے ہاتھ پھڑانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر وہ میرا مقصد سمجھ کر اور اس کا بازو ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کاٹھ پر اس کے انگوٹھے کا نشان بھی ثبت کر لیا۔

"اب کام ڈرا پکا ہو گیا۔" میں نے کانٹہ رائٹنگ پیڈ سے اٹھوہ کرتے ہوئے طمانیت سے کہا۔

"میں نے واقعی اپنی موت کے پرانے پر دستخط کر دیے ہیں۔" وہ ہنسنے کے سے انداز میں بولی۔ اس کے لیے میں فکر مند لیکن ہنسنے پر مسکراہٹ تھی۔ یہ ایک عجیب فساد تھا۔

"موت کے پرانے پر تو تم نے اسی وقت دستخط کر دیے تھے جب تم نے بے گناہ میری کو کوئی کا نشانہ بنانے یا بنوانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ جو شخص بھی کسی بے گناہ کو ہلاک کرتا ہے، میرے خیال میں

سے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر یہ کام بچ میں نہ کیا تھا اور میرس  
فریاد کیا تھا۔ میں قدرت کو سمجھنے نہ جانے کس کس بچہ کو خم  
سے گزارنے کے بعد میرا مسئلہ حل کرنا منظور تھا۔  
میرس نے ایک نظر اپنے آنجنابی شوہر کی طرف اور پھر  
برینڈن کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس نے دونوں ہی کی طرف  
سے ذرا نظر پھرائی اور دو دانے کی طرف چل دی۔  
"ایک منٹ ٹھہرو۔" میں نے برینڈن کے قریب پہنچ کر میرس  
کو پکارا "میں نہیں چاہتا کہ ہم اوپر جائیں اور پیچھے پیچھے  
تھکرا رہے ہوں۔ ہوشیار کوئی اختیار اٹھائے یا گھر کے دوسرے  
لازمین کو ساتھ لے آجائے اور میری کھوپڑی توڑنے کی کوشش  
کرے۔"

میرس نے مجھے ایسی کوئی چیز دکھائی نہ دی جس سے میں اس  
کے اچھے پاؤں باغداد میں جیب میں بنگالی ضروریات کے لیے  
ٹائیلوں کا ایک ٹار موڈور سٹا تھا لیکن وہ صرف اس کے ہاتھ  
باندھنے کے لیے کافی رہا۔ اس کے پاؤں باندھنے کے لیے میں نے  
اپنی بالی استعمال کی اور بالی بار مجھے احساس ہوا کہ کبھی کبھی کوئی  
بے کار چیز بھی کتنا کام دے جاتی تھی۔ میں میرس سے کوئی چیز  
منگوانے کے لیے اسے تنہا پر بھیجنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی برینڈن  
کو تنہا کرے میں اس طرح چھوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ  
پاؤں کٹے ہوتے۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا کہ وہ کس لمحے ہوش  
میں آجائے اور اسے چونکہ علم نہیں تھا کہ میرس میرے لیے ہوش  
ڈاکرات ہوئے تھے اس لیے وہ کوئی بھی حرکت کر کے سنبھلے ہوئے  
مسلک کو دہرا لے گیا تھا۔

میں ڈاکو خاص ترکیب سے برینڈن کی ٹانگوں پر پلٹ کر گرہ لگا  
رہا تھا میرس بولی "تم واقعی بہت احتیاط پسند آدمی ہو۔"  
"تم پیچھے لوگوں سے منہ کے لیے احتیاط پسندی تو سب سے  
زیادہ ضروری چیز ہے۔ اور انسان نے ذرا سی بے احتیاطی کی اور  
ادھر جہت ہوا۔" میں نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے اسے  
یہ نہیں بتایا کہ اس سے معاہدہ ہوجانے کے باوجود ابھی تک میں  
اس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اب بھی  
وہ منع پٹے کی کوئی چیز اٹھا کر میری کھوپڑی پر دے مارتی۔  
وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں ہر  
گز تو قی نہیں تھی کہ میرس سے ملنے کے لیے آنے والا پاکستانی اس  
جس کی چیز ہوگا۔"

"قصہ اسی طرح کبھی کبھی انسان کو خوش فہمی میں مبتلا کر کے  
گواہ بناتا ہے۔" میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے بددعا نہ کیجی میں  
کہا "دیکھو تمہارے اس باڈی بلڈز کو اب تک ہوش میں آجائے  
تو اسے شاید یہ افکار مضبوط نہیں ہے۔ ہمتا میں سمجھ رہا تھا۔"  
"وہ جتنا مضبوط ہے میرے لیے اتنی ہی کافی ہے۔" وہ پلٹ کر  
ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی "آخر وہ بے جاہ انسان ہی ہے۔"

اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا واسطہ تم جیسی فیر انسانی مخلوق سے  
پڑ جائے گا۔"  
ہم اس وقت بیضی ٹیرس سے گزر رہے تھے۔ یہاں سے  
مکان کا سامنے کالاں اور گیٹ وغیرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ گیٹ پر  
بدستور سولہ کارڈ قیادت تھے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اوپر کیا  
ڈراما چل چکا تھا۔ اسی دوران میں میں نے بلر کو بھی گھر کے ایک  
کونے سے نکل کر دوسرے کونے کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی  
چال میں اچھی خاصی شاہانہ سی حکمت تھی۔ وہ بلر خود اپنی جگہ  
کسی نواب زادے سے کم نہیں تھا۔

اس نے سر اٹھا کر ہم دونوں کو آگے پیچھے ٹیرس سے گزرتے  
دیکھا اور رگ گیا۔ شاید اسے توقع تھی کہ اس کی ٹانگوں اسے بلانہ  
لے۔ میرس نے رگ کر پلٹے ہوئے مجھ سے پوچھا "تو بلا تاش  
کرانے کے لیے کسی ملازم کو بلاؤ اور؟ کبڑا خانہ واقعی کبڑا خانہ  
ہے۔ اس میں بے پناہ کاٹھ کبڑا ہے اور دراصل بھی جی ہوگی۔ میں  
نے تو عمر سے اس کی صورت نہیں دیکھی۔"  
"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "میں خود ہی  
ڈھونڈ لوں گا۔ تم مجھے ہی اپنا خادم سمجھو۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر آگے بڑھ گئی۔ مجھے لان پر نظر نے بھی  
شاید ٹھنڈی سانس لے کر کندھے اچکائے اور آگے بڑھ گیا۔  
وہ مکان واقعی کسی محل سے کم نہیں تھا۔ قالین سے ڈھکی  
ہوئی میز میاں چڑھ کر ہم اوپر پیچھے چست کافر ش بھی ماربل کا تھا  
لیکن اس کے ایک حصے میں راف گاڑن بھی موجود تھا اور اس پر  
تقریبات وغیرہ کے لیے بالی کیو کا انتظام بھی تھا۔

میرس نے جس کمرے کو کبڑا خانے کے نام سے یاد کیا تھا  
وہ بجائے خود کسی چھوٹے موٹے مکان سے کم نہیں تھا۔ اس کا  
دروازہ غیر متعلق ہی تھا۔ میں اس کی رہنمائی میں کمرے میں داخل  
ہوا تو ایک جوان حیرت میرا منتظر تھا۔

کر کیا تھا؟ ایک کباب خانہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی  
ہر چیز وہاں لاکر رکھ دی گئی تھی۔ کوئی بھی ایسی دنیادی ضرورت کی  
چیز جس کا تصور کیا جاسکتا تھا وہاں موجود تھی۔ کمرانابت طویل و  
عریض تھا اور پھر اس میں شلٹ وغیرہ بھی پائے ہوئے تھے۔ ہر کونہ  
کھدرا چیزوں سے بھرا ہوا تھا اور سب پر واقعی مٹی کی بڑھی ہوئی  
تھی۔

ایک لمحے کے لیے میرا سر گھوم گیا۔ اس کبڑا خانے میں تو  
واقعی اپنی مطلوبہ چیز تلاش کرنا بہت دشوار تھا۔ شاید ایک لمحے کے  
لے میں اپنے آثارات چمچا بھول گیا تھا۔ میرس بغور میری  
طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں مسکرا کر بولی "چلو  
پیارے خادم! اب اپنا یہ عمدہ موٹا آئینہ اور صرف اندر میرس  
اس بجز غار میں چلا گیا۔"

میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "میں ذرا شرمیلا قسم کا آدمی

# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                    |
|-------|--------------------|
| 200/- | اندھیروں کے سادبان |
| 200/- | تاریک رزم گاہ      |
| 150/- | عقیلہ کا مجاہد     |
| 150/- | عقاب               |
| 150/- | صحرا کی آگ         |
| 150/- | قتیبہ بن مسلم      |
| 150/- | موت کے مسافر       |
| 150/- | یثرب کا ابلیس      |
| 150/- | سنہری غول          |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

ہوں۔ معزز خواتین کے سامنے اندھیر میں اس قسم کے بے ہودہ کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ میں سوٹ سمیٹ ہی تلاش کروں گا۔

وہ اب ذرا واضح انداز میں مسکرائی اور اسے گویا مجھ پر ترس آیا۔ کافی حد تک دوستانہ لہجے میں بولی میں تمہاری کچھ رہنمائی کر دیتی ہوں۔ تمہارا کام کافی آسان ہو جائے گا۔

کمرے میں کارٹونز اور گتے کے چھوٹے ڈبوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ کئی جگہ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ شیلٹن میں بھی موجود تھے سب سے زیادہ گردانسی پرچی ہوئی تھی۔ وہ ایک کوٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس جتنے میں ایسے مسزود شدہ کمپیکٹر اور پیش قیمت دوائیں رکھی جاتی ہیں جنہیں بیکٹری کے گوداموں یا اسٹورز وغیرہ میں چھوڑنا مناسب نہیں ہوتا۔ انہیں خارج کرنے کے لیے بھی خصوصی حفاظتی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی فرمت میسر آئے تو یہ کام کیا جاتا ہے۔ تم صرف اسی جتنے میں وہ کارٹن تلاش کرو۔"

"اس کی کوئی نشانی.....؟" میں نے گویا کمرہت کئے ہوئے پوچھا۔

"کارٹن سادہ ہیں۔ اندر ٹین کے چکرورڈے ہیں۔ ڈبوں پر جلی حروف میں "بیمیکل اے" اور نیچے اس کا کیمیائی فارمولا لکھا ہوا گا۔" اس نے بتایا "میں نے اتفاق سے بیرس کے سامنے ایک ملازم کو ایک کارٹن کھولتے دیکھا تھا اور ان کی باتیں مجھے یاد رہ گئی تھیں۔"

فرش پر صبح معنوں میں قی و دھر نے کو جگہ نہیں تھی لیکن میں کسی نہ کسی طرح پاؤں دھرتے مختلف چیزوں کے انباروں کے درمیان سے گزرتا وہاں تک پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اب بھی مسز بیرس پر نظر رکھنا چاہتا تھا۔

وہ غالباً اس بات کو سمجھتے ہوئے ذرا چڑکھائی "خدا کے لیے تم میری فکر چھوڑو اور اطمینان دیکھو کی سے اپنی مطلوب چیز تلاش کرو۔ اب میں کوئی گزب نہیں کروں گی۔ گزب کرنے کا وقت اب گزر چکا ہے۔"

"موت تم سمجھ رہا ہو۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ سمجھدار لوگوں سے ہی اکثر بڑے احمقانہ جرائم سرزد ہوتے ہیں۔" میں نے سر ہلایا اور کارٹنوں وغیرہ کا جائزہ لینے لگا۔

"اب تو میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی مطلوب چیز لے کر جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جاؤ۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

"بہت ہی قدر تشانس قسم کی خاتون معلوم ہوئی ہو۔" میں درد ناک لہجے میں کہا "میری زندگی میں شاید نادر ہی کسی خاتون نے میرے بارے میں اس قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہو گا۔"

پھر میں نے گویا خود ہی اس کی وجہ سمجھتے ہوئے کہا "اودہ..... دراصل ابھی وہ بد بخت دل پریشان زندہ سلامت ہے

تاکہ کیا تم ایک آدھ عاشق اسپیر میں رکھنا پسند نہیں کرتی؟  
اسٹیفنی کے طور پر.....؟"

اس نے دور سے ہی خوشخوار نظروں سے مجھے گھورا۔ مینا جلدی جلدی ایک ایک گرد آلود کارٹن کو اٹھا کر کھول کر دیکھنے کے بعد دوسری طرف رکھنے لگا۔ چند لمحوں کے وقف کے بعد "اودہ" قدرے خوشگوار لہجے میں بولی "اگر تم سے کچھ اچھے ملاقات ملاقات ہوئی ہو تو شاید میں اس امکان پر غور کرتی لیکن اس وقت تو میں تمہارا خون پی جانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو رہا ہوں۔"

کرتے ہوئے بولی "تم چاہو تو سارے کارٹن لے جا سکتے ہو۔ یہ اب ایک منوہ کیسٹیکل ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن مجھے سارے کارٹنوں کی ضرورت نہیں۔ میں تو اب بھی اپنی ضرورت سے زیادہ لے جا رہا ہوں۔" میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑا اور دونوں ہاتھوں سے یوں ڈبوں کو حتم کر دیا کہ وہ کسی طرف بڑھا چھوے وہ کسی بہت بڑے عالمی مقابلے کی ٹرائی تھی اور میں اسے جیتنے کے بعد دنیا بھر کے رپورٹروں کے سامنے اسٹیج پر جا رہا تھا۔

اب میں آگے آگے تھا اور مونیکا میرے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے مگر تمام احتیاطوں کو بلائے طاق رکھ دیا تھا۔ مونیکا چاہتی تو عقب سے میری پشت میں خنجر گھونپ سکتی تھی۔ اس کی مہمانی بھی کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔

میڈیموں کے قریب پہنچ کر میں رُک گیا۔ میں نے پلٹ کر مونیکا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت لہٹ چلی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ وہیں سے مجھے خدا حافظ کہہ دے گی اور اسٹڈی میں واپس چل جائے گی لیکن وہ دیکھنے لہجے میں بولی "میں تمہیں گیت تک چھوڑنے چلتی ہوں۔ گاڑیاں دوسرے ملازمین تمہاری یہ حالت دیکھ کر تمہیں مشکوک نہ سمجھیں۔"

وہ میرے ساتھ میڈیمیاں اُترنے لگی۔ ہالِ راہداروں اور مرمرین فرش سے آراستہ گزر گاہوں سے جوتے ہوئے ہم گیت تک پہنچے۔ مونیکا میرے ساتھ تھی اس لیے کسی گاڑی نے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا اور خود کار گیت میرے لیے کھل گیا۔

وہ میری گاڑی کے قریب رُک کر بچی آواز میں بولی "تم نے مجھ سے جو اعتراف نامہ لکھوایا ہے..... اسے حفاظت سے رکھنا..... کسی اور کے ہاتھ نہ نکلے پائے..... اور ہو سکے تو جلد ہی اسے ضائع کر دنا۔"

"وہ میرے پاس ایک اہانت کی طرح ہے جیسے ہی محسوس کروں گا کہ مجھے تمہاری طرف سے کسی سازش کا خطرہ لاحق نہیں..... میں اسے ضائع کر دوں گا..... یا اگر تم چاہو گی تو تمہارے اطمینان کے لیے تمہیں واپس بھی دے دوں گا۔ اگر تم یہ ملک چھوڑ کر جاری ہو گی تو مجھ سے رابطہ کر کے اس مسئلے میں بات کر لینا۔ شاید تب تک میرے حساب سے مناسب وقت آپکا ہو۔"

"ٹھیک ہے....." اس نے گاڑی کی کھڑکی سے ہٹ کر سیدھی ہوتے ہوئے ایک طویل سانس لی۔ اب اس کے چہرے پر طمانیت سی نہیں "ایک روشن مسکراہٹ بھی تھی۔ میں نے گاڑی ڈرائیو سے میں سوئی اور وہ ہاتھ پا کر واپس چل دی۔

یہ بھی میری بد قسمتی ہے کہ جب بھی کسی ڈھنگ کی خاتون اوقات ہوتی ہے حالات اچھے نہیں ہوتے۔" میں نے حسرت سے لہجے میں کہا۔

تم قول درجے کے جھوٹے معلوم ہوتے ہو۔ کم از کم اس لیے۔"

"بڑے انوس کی بات ہے..... کسی سے میل ملاپ رکھے اور کسی کو آزمائے بغیر تو اس قسم کی رائے کا اظہار نہیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ میں جلدی کارٹنوں کی چلی قطار تک پہنچا ہاں دران میں تمام تر احتیاط کے باوجود میرے ہاتھ مٹی میں لڑکے کے اور کپڑوں پر بھی کئی جگہ مٹی لگ گئی تھی مگر مجھے اس پر غور نہیں تھا۔

جس چیز کی تلاش یا طلب جتنی شدید ہوتی ہے، کبھی کبھی وہ ناقابلِ آخر اور کتنے ہی میر آزما مراحل کے بعد ہاتھ آتی ہے لیکن اسے "کے کارٹن سب سے پیگے دیے ہوئے تھے۔ جب بڑے ہاتھ میں پکچلے نہیں کا وہ ڈیا آتا جس پر "ڈیکریکل اسے" کے جلی لوف پھلا رہے تھے تو فرط جذبات سے میری حالت عجیب سی ہو گئی۔

چند لمبے کے لیے میں اس ڈبے کو کھتا ہوا گیا اور مجھے اپنی نظر دیکھو خدا لاں سی محسوس ہوئی۔ اس معمولی سی چیز کے لیے مجھے اتنی غمراہی اٹھانا پڑی تھی۔ ڈبے پر اس کا وزن ایک پاؤنڈ لکھا تھا۔ وہ یہی ضرورت سے رکنا تھا۔ احتیاط میں نے ایک ڈیا اور اٹھا لیا۔

ہاں ان ڈبوں سے بھرے ہوئے تین چار کارٹن موجود تھے۔ میں گہرا ساری تکلیف اور دوشادیں کو بھول گیا اور شاید وہاں کے دوئل پر اُڑتے ہوئے مسز بیرس کے پاس پہنچا۔ میں نے اب گرا ایک سٹی سے زائد یہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے ابھی تک تمہارا نام معلوم نہیں۔" غیر ارادی طور پر میرا لہجہ باطنی بول گیا تھا۔

"میرا نام مونیکا ہے۔" وہ نہایت دھیمے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں بھی اب جیسے برف سی پکھل رہی تھی۔

میرے ایک ہاتھ پر دونوں ڈبے نکلے ہوئے تھے۔ گرد میں تھرتھرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا صاف ستھرا نرم رازک ہاتھ قہقہے ہوئے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں کہا "مونیکا! اب کچھ بھی ہو اس پر مجھے انوس ہے۔ لیکن ہو سکے تو جیسے کھائیں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ بہت زیادہ۔"

اس نے ہاتھ چُڑانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی سانسیں بھی کچھ مرتضیٰ ہو گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ قرقراتے شاید اس نے کچھ اور کہنا چاہا تھا لیکن ارادہ ملتوی

کے ساتھ اس فرق کو سمجھ بھی نہ سکوں۔

برٹارڈ نے خاصی بے اعتنائی سے ایک ڈاکٹر اٹھا کر دیکھا اور فارمولا دیکھ کر ہنسا پھر بولا "ہاں۔۔۔ میں یہ کیا سمجھ رہا ہوں ٹھیک سی ہو گا۔۔۔ ڈاکٹر! میں، دیکھا ہے تھا۔ کھانا ہو تو کھا کا اسکان ہو سکتا تھا۔۔۔ اور یہ تم دوڑے کیوں اٹھا لائے؟ یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ مجھے تو یہ بہت تھوڑی سی مقدار چاہیے۔"

دل تو چاہا کہ اسے جواب دوں "دوسرا ڈاکٹر تمہاری کردار کرکھڑکی کے دو ٹکڑے کرنے کے لیے آیا ہوں۔" لیکن مجھے اس جواب کا بھی اپنے دل میں ہی کھا گھونٹا۔ وہاں میں نے نہایت ملامت اور تنبیہ کی سے جواب دیا "فاضل ڈاکٹر! میں احتیاطاً لے آیا ہوں۔"

"کافی رقم خرچ ہو گئی ہوگی۔ ترجیح کل تو اس کا نام ہی دیا تھا۔" "چنانچہ اسے نہ جانے کیوں بالی پٹو کا خیال آ گیا۔" "تم تو خرچ نہیں ہوئی۔۔۔ البتہ میں خود خرچ ہوتے ہو۔"

وہ گیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"دوسرا؟ چھاپا؟ خطرناک معاملہ تھا؟" اس نے پھر بھی اچانک میری طرف دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی خاص خطرناک معاملہ نہیں تھا۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا "بس ایک دولت مند غیر ملکی شخص مل ہو گیا اور وہ قتل ہوتے ہوئے بچ گئے۔"

"چھاپا؟ بہت خوب۔" اس نے یوں دلچسپی سے لہجے میں لے کر کوئی خوشخبری سنائی تھی "کیا تھا ہے؟ کچھ بتاؤ؟" وہ بانی کسے کے ساتھ ساتھ اپنا کام کرتا جا رہا تھا۔

"تم قصے کہانوں کو چھوڑو اور اپنا کام کرو۔" میں اب اپنا چرچا اسٹو کو نہ چھوڑا کہ آہم میں نے پھر بھی خود پر کافی حد تک رکتا تھا۔ میرے لیے نہایت "مہولی" چرچا اسٹو کا اٹھانا تھا۔

ڈاکٹر برٹارڈ کسی بد روح کی طرح ہنسا اور بولا "نکلا ہے وافر کافی مشکل پیش آتی ہے کیمیکل اسے حاصل کرنے میں سب سے بڑا حال۔۔۔ میں نے اپنا کام تقریباً ختم ہی کر لیا ہے۔ تمام کاموں پر کل ہیں۔ مجھے صرف اسی کیمیکل کا انتظار تھا۔ اب مجھے آدھا گھنٹہ درکار ہوگا۔ تم چاہو تو اس دوران میں لڑکی کو بلاتے ہو۔"

"راہد کمال ہے؟" میں نے زبنت کر ٹوٹی سے پوچھا۔ "وہ آفس سے اپنے گھر چل گئی تھی سر! ٹوٹی نے بتایا کہ"

نے مجھ سے کہا تھا کہ جب اس کی ضرورت ہو اسے بلا لیا جائے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے اس کا فون آیا تھا۔ میں اسے فون کرتے بلالیتا ہوں۔ تب تک آپ شمارے کر لیاں تبدیل کر لیں۔" "ٹھیک ہے۔" میں نے واپسی کے لیے بیٹھے ہوئے کمرے میرے ساتھ ساتھ = خانے سے باہر آیا اور کھٹ سے وہاں

میں جب ٹوٹی کے گھر پہنچا تو وہ = خانے ہی میں تھا اور = خانہ ایک قسم کے چھوٹے موٹے پوٹی پارلر کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہاں ایک بڑی سی میز اور دیوالوںک جیسے کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میز پر ایک ڈاسا آئینہ، پوٹی پارلر میں استعمال ہونے والا ایک اسٹیک، مختلف ڈبے شیشیاں، برش اور نہ جانے کیا کچھ موجود تھا۔

ڈاکٹر برٹارڈ اب بندشوں سے آزاد تھا۔ اس کے پاؤں پر بیڑی لگی ہوئی تھی اور وہ نکلنا ہوا، شیشے کے کچھ باؤل وغیرہ ہاتھ میں اٹھائے اور صحت کو دھر نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ ٹوٹی شاید اس کی نگرانی کے لیے ایک اسٹیل پر موجود تھا۔ ویسے = خانے کے دروازے پر ایک مسلح گارڈ بھی مستقل تعینات تھا۔ دروازہ وہی کھولا اور نہ کرنا تھا۔

ٹوٹی مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرایا۔ وہ میرے ہاتھ میں دے دیکھ کر کچھ کہہ گیا تھا کہ میں اپنے مشن سے کامیاب ہوا تھا لیکن ڈاکٹر برٹارڈ نے سب تو جی سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر پوچھا "کیمیکل لے آئے؟"

دل تو چاہ رہا تھا پہلے اسے ایک ایسا گھونسا رسید کروں کہ وہ اچھل کر پست سے جا گرائے پھر جواب دوں "ہاں۔۔۔ لے آیا ہوں ابلیس کے چپے اگر تم نے اتنی = خفا نہ دکھائی ہوئی تو میں اتنی سمجھتے نہ اٹھائی ہوتی اور راجیل کو بھی اتنا عرصہ اتنے مشکوک خیر انداز میں نہ گزارنا پڑتا۔"

آہم میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور یہ نہیں کیا۔ ابھی ہمارا کام اس کے ہاتھ میں اٹکا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے اب بات بچی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے بڑے تحمل سے جواب دیا "ہاں۔۔۔ لے آیا ہوں۔"

اس نے ڈپوں کی طرف ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور شیشے کی ایک پیالی میں کچھ گھولتے ہوئے بے اعتنائی سے بولا "اور پھر میز پر رکھ دو۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اس نے گھر کے کسی نوکر بچے کو دو چار روپے کی بھڑی لانے بازار بھیجا تھا اور اب وہ لے آیا تھا تو بے پروائی سے انہیں ایک طرف رکھنے کا حکم دے رہا تھا۔ شاید اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ اس چیز کے لیے ہمیں کتنے پاز پیٹنٹے پڑے تھے۔

میں نے خون کے گھونٹ پیئے ہوئے ڈبے دیکر ساڑو سامان کے پاس میز پر رکھ دیے اور بدستور ملامت سے کہا "نہیں دیکھ تو لو۔۔۔ کیا یہ واقعی وہی کیمیکل ہے جو تمہیں درکار تھا؟"

میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خوف موجود تھا کہ میں جان جو کھوں میں ڈال کر جو چیز اٹھا کر لایا تھا کس ڈاکٹر برٹارڈ ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد پیشانی پر تل ڈال کر ناگواری سے نہ کہہ دے "یہ تو وہ کیمیکل نہیں ہے جو میں نے منگوایا تھا۔ میں اس اور میرے مطلوبہ کیمیکل میں یہ فرق ہے۔۔۔" اور میں اپنے غیر کیا پسند ذہن

فونی کے گھر میں دو سرا کوئی کار بھی موجود تھا۔ اس وقت گیت پر تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی "تم صرف گیت پر مت رہو۔ چار دیواری کے اندر ہی رہتے ہوئے مکان کے چاروں طرف گشت بھی کرتے رہو اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد جا کر یہ خانے کی میز میوں میں بھی جھانکتے رہنا۔"

"ٹھیک ہے سرا!" اس نے مستعدی سے کہا اور اپنی گن سنبالے حرکت میں آگیا۔ وہ دونوں عام اور دو اتنی سے گاڑی میں تھے نہایت یانہ کمانڈو تھے۔ کسی جگہ یا فرد کی حفاظت کے معاملے میں ان کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ میں نے اسے مطلع کیا "میں دو آدمیوں کو اور بلوار پر ہوں۔ وہ بھی تمہارے ساتھ گھر کی نگرانی کریں گے۔"

"بہت بہتر۔" اس نے سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں میں سے صفدر اور سلیمان کو فون کیا۔ وہ صورت حال سے آگاہ تھے۔ میں نے انہیں فونی کے گھر پہنچنے کی ہدایت کی اور کہا "صرف ڈاکٹر برنارڈ کی کڑی نگرانی کرنا ہے۔ تمہیں اسے ہمارے قبضے سے چھڑانے کی کوشش نہ کی جائے۔"

"سرا! اسے دو نمبر پر کیوں نہ شفت کروا جائے؟" صفدر نے تجویز پیش کی۔ "دو نمبر" ہمارا بہت بڑا خفیہ ٹھکانا تھا۔ وہاں اکثر کسی افراد موجود رہتے تھے۔ مس نوب اس طویل و عریض مکان اور اس کے نیچے موجود اتنے ہی بڑے خانے کی انجانج تھی۔ وہاں حفاظتی انتظامات بھی بہت بہتر تھے۔ شاید ہم ڈاکٹر برنارڈ کو شروع میں ہی وہیں لے جاتے لیکن اس وقت ہم نے کوئی خاص خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔

"اب اسے گھر سے نکالنا اور کہیں منتقل کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "نی الحال وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دو اور اسی جگہ کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے کی کوشش کرو۔ بعد میں دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے راجیلہ کے سلسلے میں ہم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہوں اور کوئی خاص بات نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے سرا!" صفدر نے کہا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں جس رفتار سے راجیلہ کے ہاں پہنچا وہ بھی لاہور کی ٹیڑھی میڑھی سڑکوں پر ایک ریکارڈی تھا۔ گھبرگ تو پھر بھی لاہور کا پوش ملاط تھا اور میرا سفر اسی علاقے میں تھا۔ یہاں کی سڑکیں اور ان کی پلاننگ تو پھر بھی کچھ نہایت تھی۔ پرانے شہر میں تو انسان کسی بھی گاڑی میں گدھا گاڑی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے سفر کر ہی نہیں سکتا تھا۔

میں جب راجیلہ کے ہاں پہنچا تو میرے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے گھر کا گیت چوٹ کھلا دیکھ کر میرے دل کو جیسے کچھ

نفل ہو گیا۔ مجھے ہاتھ دھو میں گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہچکچاہٹ بہتے انداز میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ "ہذا کی پناہ۔" میں نے شور بند کرتے ہوئے یہ آواز بلند کیا۔ انسان کی زندگی ایسی بے ہودہ بھی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ گناہ سے بے گناہی نہ سکے۔

"نئی ایم ایکسٹر۔" سوری سرا! "باہر سے فونی کی آواز سنائی دئی۔ اس کے لیے سے جھپٹتا ہے پناہ شرمندگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں آپ کو اس وقت ہرگز دست نہ دیتا لیکن مجھے کچھ گز بڑا کام تھا۔ راجیلہ کے گھر کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ اگر راجیلہ گھر نہ ہو تب بھی ملازمہ یعنی خالہ بی ضرور فون ریسیو کرتی ہوتی۔"

میرے جسم میں ایک سردی سردی لہر دوڑ گئی اور بے لرحضے پانی کی دھ سے نہیں تھی۔ میں نے چہرے سے پانی پوچھتے ہوئے کہا "راجیلہ کے پاس موبائل فون بھی تو ہے۔ اس پر فون کر کے دیکھا؟"

"ہی سرا! اس پر بھی کوئی جواب نہیں مل رہا۔" فونی نے ادب دیا "میں فوری طور پر اس کے گھر جا رہا ہوں۔ میں نے شبیر شیخ اور سردار علی کو بھی فون کروا ہے کہ اس کے گھر پہنچیں۔ آپ انہما سے وہاں پہنچ جائیے گا۔ جلد بازی نہ کیجئے گا اور پریشان نہ ہوئے گا۔ ہم دیکھ لیں گے کیا معاملہ ہے۔" اس نے اطلاع کے ساتھ ساتھ گویا مجھے تسلی بھی دی۔

وہ تو یہ کہ کر رخصت ہو گیا لیکن میں اس کے مشورے پر عمل نہ کر سکا۔ یعنی جلد بازی سے نہ بچ سکا۔ میں نے جتنی تیزی سے فون کیا اور کپڑے پہنے اس سے یقینہ کوئی مامی ریکارڈ قائم ہوا ہو گا لیکن اسروس کہ ایسی باتوں کا مامی ریکارڈ رکھا نہیں جاتا۔

اس کے بعد میں بھی تیزی سے گھر سے نکلتے ہی لگا تھا لیکن مجھے کچھ خیال آگیا۔ میں خود پر جبر کرتے ہوئے یہ خانے میں چلا گیا۔ وہاں سب کچھ جوں کا توں تھا۔ آہنی دروازہ منقل تھا۔ گن میں مستعد تھا۔ میرے اشارے پر اس نے دروازہ کھولا اور میں نے اندر جھانکا۔ ڈاکٹر برنارڈ بدستور کام میں مصروف تھا۔ شاید اس کا کام آخری مرحلے میں تھا۔ وہ کسی سائنس دان کی طرح ٹیسٹ ٹیپ ہاتھ میں لیے روشنی کے سامنے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس میں نیلے رنگ کا کوئی چمکیلا۔ سیاہیال نظر آ رہا تھا۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا اور اشناک سے اس سیاہیال کے معائنے میں مصروف رہا۔

میں نے دروازہ دوبارہ منقل کر دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنی جگہ ڈاکٹر افراقی میں ہمیں ڈاکٹر برنارڈ کو نہیں بھولنا چاہیے تھا اور حاضی انتظامات کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شاید کوئی ایسی بات میں ہو۔ میں تیزی سے اوپر آیا۔

ہوئے لگا۔ راجہ کامکان زیادہ برا نہیں تھا۔ وہ ذرا پرانی ساخت کی ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ کوٹھی کی گاڑی مجھے سامنے ہی بوجھ میں کھڑی نظر آئی۔ اس سے آگے راجہ کی اپنی گاڑی کھڑی تھی۔ پورچ میں تیسری گاڑی کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے اپنی گاڑی باہری چوڑی اور تیزی سے اندر بچھا۔ راجہ کے ہاں کوئی کارڈ وغیرہ نہ تھا، عام سا کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا اور نہ وہ بڑے گھر میں رہتا پسند کرتی تھی۔ اس مکان کے بارے میں بھی اس کا کتنا تھا کہ یہ اس کی ضرورت سے بڑا تھا۔

ہمارے پاس دوساں کی کی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تو اپنے لیے کوئی بڑی کوٹھی یا بنگلا پسند کر سکتی تھی۔ کارڈز وغیرہ بھی رکھ سکتی تھی۔ آج کل وہ ہمارے گروپ آف کپتینز میں جس حیثیت سے کام کر رہی تھی اس کی مناسبت سے اس کا حق بھی بنا تھا۔ وہ خاصے ثقات ہاٹ سے رو سکتی تھی لیکن اس سرپہری لڑکی کی کھوپڑی میں کچھ اٹھانی سے کپڑے کھس گئے تھے۔

وہ کتنی تھی کہ اس نے زندگی میں بہت ثقات ہاٹ دیکھے لیا تھا اور یہ سب بے معنی چیزیں تھیں انسان کی ہوں عجیب و غریب سراپوں کے پیچھے دوڑا دوڑا کر، تھکا کر مار دیتی تھی اور ان سب باتوں کے باوجود اس کی ذات میں کوئی سرخاب کار نہیں لگ جاتا تھا۔ آخر کار وہ کسی بھی عام اور غریب سے کوئی کی طرح خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا۔

ویسے بھی جس ملک میں ہیں ہیں افراد پر مشتمل بعض کنیوں کو رہنے کے لیے ایک کرا بھی میسر نہیں تھا اور سفر کرنے کے لیے بس میں ٹکٹ کی جگہ بھی میسر نہیں تھی وہاں اس کا زیادہ اچھے گھر میں رہنے، سنگی گاڑی میں سفر کرنے اور دیگر غیر ضروری تعینات کے ساتھ زندگی گزارنے کو دل نہیں مانتا تھا۔

میں جب ان معاملات میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کرتا تھا تو وہ مجھے سراپے دارانہ ذہنیت کا مالک اور نہ جانے کیا کچھ قرار دیتی تھی۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ میں بہت سے لوگوں کی عملی مدد کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں لیکن یہ مسئلہ نظام کا ہے جب تک بورا نظام تبدیل نہ ہو تا تب تک کوئی خاص تبدیلی نہیں آسکتی تھی۔ اکیلا چاہتا ہوں نہیں چھوڑ سکتا۔

اس پر وہ ٹھکی سے کہتی کہ سب یہی تقرر کرتے رہتے ہیں۔ عملی طور پر کوئی کچھ نہیں کرتا۔ سب کو بہتر بنانا ملا ہوا ہے کہ جب تک نظام تبدیل نہیں ہوتا تب تک ہمیں تو ہمیش سے رہنے دو اور نظام تبدیل ہونے کے بعد تک صدیوں تک کوئی آثار نہیں اس لیے ہمیش پرستوں کے لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔

پھر وہ انگریزی کا وہ مقولہ بھرائی جس کا مطلب تھا کہ خیرات اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ میں اسے بتاتا کہ یہ سب کچھ کہنے کو میرا اس سے زیادہ شہرت کے ساتھ دل چاہتا تھا لیکن ابھی میں خود پراسا تھا۔ یہ عجیب دولت مندی اور ثقات ہاٹ خود میرے

خواب تھے جن کی جڑیں میرے ذہن میں بہت گہرائی میں تھیں۔ ابھی تو میں ان چیزوں سے میری نہیں ہوا تھا کہ عموماً میں نے میری مدد پر جو کچھ آؤ چھوڑے تھے ان میں عرصہ نہیں گزرا تھا۔

ابھی میں نہ جانے کتنے عرصے تک ان تعینات ہاٹ سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا جو کبھی کبھی مجھے خوابوں میں چھوٹی لگتی تھیں۔ اس کے بعد میرا بھی کچھ چاہ نہیں تھا کہ سب کچھ جاگ کر دوستی کی زندگی بسر کرنے لگوں یا انہی دوست کاموں کے لیے وقف کر دوں۔

اس پر وہ استہراسیہ انداز میں ہنسی اور کتنی کہہ جاتا تھا مگر آتا جائے گا اتنا ہی اس ارادے پر عملور آؤ زیادہ دیا جائے گا، تم ان تعینات کے اتنے عاوی ہو جاؤ گے کہ عموماً کا قصور بھی محال ہو گا اور یہ سب ارادے خراب جائیں گے۔

پھر وہ گویا اپنے موقف کی وضاحت کرنے کی کوشش میں یہ بھی نہیں کہتی کہ بالکل ہی دوستی کی زندگی گزارنا سناؤں میں کھڑا ہوں اور سر میں خاک ہو۔ میں خود سے زیادہ غیر ضروری تعینات ترک کرنے لگتی ہوں لیکن مصیبت یہ ہے کہ تمہارے طبقے کے لوگ زیادہ غیر ضروری تعینات کو بھی اپنی اہم ضروریات شمار ہیں۔ میری طرح اوسط درجے کی زندگی گزارنا یا سکتی ہے اگر اس ملک کے تو بے یقین لوگوں کی زندگی سے اسے اپنا کی زندگی کا بھی موازنہ کیا جائے تو یہ بھی نہایت پرکشش لگے گی۔

اس قسم کی بے نتیجہ بحث ہمارے درمیان چلتی رہتی ہم دونوں ایک دوسرے کی باتیں ایک کان سے سن کر دھم نکالتے رہتے تھے لیکن اس وقت راجہ کے گھر میں اس وقت نہ جانے کیوں ایک لمبے کے اندر اندر یہ سب باتیں آئیں۔

میں انہیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے ہوا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر بچھا۔ مگر میرے اچھے میرے حواس شاید شکار پر ٹپکے ہوئے دروازے کی طرف تھکاؤ میں داخل ہوتے ہی میں کسی سانس لے کر نہ لے سکتی تھی سامنے ہی موجود تھا اور فرش پر پڑے ہوئے تھے میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خالی لی کچھ اٹھائی تھی خالی لی نہیں تھیں۔ وہ تقریباً بیسٹائیس کی عمر کی ایک موٹا مضبوط جسم کی عورت تھی۔

ابھی خاصی خوش شکل تھی۔ فوجی میں اس کا خوبصورت لڑکپن میں رہا ہو گا۔ ہر وقت پانچ پانچ رشتہ منید دوپٹے کے طبقے میں گھرا رہتا تھا۔ یہ عورت اٹھانے

”راہیلہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“ ٹوٹی نے مجھے دیکھتے ہی مطلع کیا۔

میری ماسطوم جس مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس طرح کی کوئی بات ہو چکی ہے لیکن میں ایک سوہوم سی امید کے سارے خود کو تمام راستے تسلی دے آیا تھا کہ شاید ایسا نہ ہوا ہو۔ اب وہ اُمید ٹوٹ گئی اور میرے دل کو دوچکا سا لگا۔ راہیلہ کا چہرہ ٹھیک کرنے کے لیے ہم نے کس جس سے مطلوب چیزیں منجی تھیں۔ اس سے پہلے جب ڈاکٹر بڑا ہمارے ہاتھ آیا تھا تو اسے میں نے اپنی کتنی بڑی خوش قسمتی سمجھا تھا۔

اسے اس کام پر آمادہ کرنا ایک الگ مرحلہ ثابت ہوا تھا۔ ان تمام کٹھن اور جاں کسل مراحل کے بعد اب جبکہ وہی ڈاکٹر بڑا تمام تیاروں کے ساتھ اس سے خانے میں راہیلہ کا شکر بیٹھا تھا تو راہیلہ غائب ہو گئی تھی۔ بد قسمتی واقعی اس لڑکی کے خالق میں تھی لیکن مجھے بھی گویا خدا ہی ہو گئی تھی کہ میں اسے اس بد قسمتی کے چنگل سے نکال کر رہوں گا۔ یہ ستم ظریفی آخر تک تک جاری رہ سکتی تھی؟

میں نے ڈانٹک دوم کا عقی دوواڑہ کھول کر باہر جھانکا۔ یہ چھوٹے سے عقی لان کی طرف نکلتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ راہیلہ کو اسی طرف سے لے جایا گیا تھا۔ دوچار نرم و نازک سے پھولدار پودے کچلے ہوئے نظر آ رہے تھے اور چھوٹا سا عقی گیٹ بھی نکلتا تھا۔

میں پلٹ کر دوبارہ ٹوٹی کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بولا ”میں نے شیریں اور سردار علی کو دوبارہ فون کر دیا ہے کہ وہ یہاں آنے کے بجائے آس پاس کے علاقے اور خاص خاص سڑکوں کا کثرت کریں۔ کوئی مشکوک گاڑی نظر آئے تو کسی ہمارے اسے روک کر اندر جھانکنے کی کوشش کریں۔“

پھر ایک لمبے کے توقف سے وہ بولا ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے پاس سر حال مین باؤر اور راہیلے کے ذرائع زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ کم وقت میں کافی بڑے علاقے کی ناکا بندی کر سکتے ہیں۔“

میں نے ایک لمبے سوچا۔ میرے دل میں یکدم جھلجھل جانے والے اندھیرے میں امید کی کوئی کرن نہ جھللائی۔ میں نے ٹوٹی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”اس معاملے میں ایک ایک لمحہ ٹھہرتی ہے۔ پہلے ہی کچھ نہ کچھ تاخیر ہو چکی ہے۔ جب تک میں اوپر والوں سے بات کروں گا۔۔۔۔۔۔ وہ امکانات جاری کریں گے اور پولیس ناکا بندی کی حکمت عملی طے کر کے حرکت میں آئے گی اور اہم پرائیویٹس پتہ تک بہت تاخیر ہو چکی ہوگی۔ اس طرح کی کارروائی کرنے والوں نے بھی ان تمام امکانات کے بارے میں سوچ رکھا ہوتا ہے اور اپنا بندوبست کر رکھا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں

اول میں تھی۔ اس کی اپنی ایک الگ کمائی تھی۔ کافی عرصے سے وہ راہیلہ کے ہاں ملازم تھی اور خاصی کثیر القاعد قسم کی چیز تھی۔ مگر کے سب کام وہی کرتی تھی۔ مگر ایک طرح سے اس کے ہی سپرد تھا۔ راہیلہ اکثر خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ آج کے دور میں اسے اپنی کام کی عورت مل گئی تھی۔

اور سب باتیں تو بڑی جگہ تھیں لیکن مجھے اس اعتبار سے وہ دنیا کی افوی عورت لگتی تھی کہ اسے بزرگ بننے کا شوق تھا۔ میں نے زندگی میں وہ پہلی عورت دیکھی تھی جو اپنی عمر سے بڑی ہونے کا اثر دیتی تھی اور ہر معاملے میں اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی بزرگانہ ہوتا تھا۔

وہ کبھی میک اپ کرنا تو درکنار اپ اسٹیک تک نہیں لگاتی تھی۔ اس کے سر میں جو تھوڑے سے سفید بال موجود تھے انہیں جھانکنے کے لیے اس نے کبھی میر کلر وغیرہ کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ مہلا وہ کوئی ایسا مذہبی قسم کی عورت بھی نہیں تھی۔ مجھے راہیلہ یا ٹوٹی وغیرہ کو وہ اتنی شفقت سے بیٹا یا بیٹا وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتی تھی کہ گلاں گزرتا تھا وہ ہم سے دس پندرہ سال بڑی نہیں بلکہ ہماری دادی یا مانی کی عمر کی تھی ورنہ میں نے تو کئی دیکھا تھا کہ لوگ اپنے سے پانچ سات سال چھوٹوں کو بھی انکل یا آئی وغیرہ کہہ کر مخاطب کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کا بس نہیں چاہتا تھا کہ اپنے بارے میں یہ ثابت کر دیں کہ ابھی تو ان کے دلہہ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔

اس عورت کا نام غالباً زیدہ تھا لیکن وہ نام سے پکارے جانے پا جائی، آپا وغیرہ کہلانے کی نسبت خالدی کہلاوا زیادہ پسند کرتی تھی۔ میں راہیلہ سے کہا کرتا تھا ”ایک تو تم خود ہی کچھ کم عجیب نہیں تھیں اوپر سے جیسے گھر سنبھالنے والی خود سے بھی زیادہ عجیب مل گئی۔ اللہ نے ملائی جوڑی۔“ اس پر وہ مجھے گھور کر کہہ جاتی۔

اس وقت خالدی اس طرح جیت پڑی تھی کہ ان کی باتیں لادج میں تھیں اور بالائی دھڑا ڈانٹک دوم میں۔ وہ محرابی دوواڑے کے بیچ میں پڑی تھیں۔ ٹوٹی ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ وہ غالباً مجھ سے چند منٹ پہلے ہی یہاں پہنچا تھا۔ موسم ٹھنڈا تھا مگر کڑکیاں دوواڑے کھلے تھے اور پچھلے پوری رفتار سے گھوم رہے تھے۔ کڑکیاں دوواڑے غالباً ٹوٹی نے ہی اتر کھولے تھے پچھلے بھی اسی نے ان کیے تھے۔ کمرے میں خفیف سی ایک بو محسوس ہو رہی تھی جو کچھ دیر پہلے تک یقیناً کافی تیز رہی ہوگی۔ ڈانٹک دوم میں ایک کرسی الٹی پڑی تھی اور اس کے عقبی دوواڑے کے قریب خوبصورت سی ایک سرخ جیل پڑی تھی جو یقیناً راہیلہ کی تھی۔ اس کا موبائل فون لادج میں سائڈ بوریڈ پر رکھا ہوا تھا۔ الٹی ہوئی کرسی اور دوواڑے کے قریب پڑی چیل کے سوا ڈانٹک دوم یا لادج میں کہیں کسی قسم کی کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی تھی۔



”ڈاکٹر برار! ہمارے ہاتھ آیا ہے۔“ ٹونی نے بلا اہل خانہ

”جیسا کہ اسی کا ذکر عمل ہے۔“ نہ جانے کیوں غیر ارادہ طور پر میرا لہجہ پُر یقین سا ہو گیا۔

”آپ کا مطلب ہے..... ریڈ واٹ.....؟“ نعلی نے چوکی پر میری طرف دیکھا۔

میں نے انہات میں سر لایا تو وہ بولا "کیسے ہمارے ذلیل  
میں تو ہم نے ریڈ ڈاٹ کا منایا کر دیا تھا۔ تمام انجینئرز بھی اس  
ٹپلے میں مطمئن ہو چکی تھیں۔ ہم نے اپنی دانست میں غلطی  
ایکریک بنی ہے کام لیا تھا۔ شاید تو یہی بتاتے تھے کہ ریڈ ڈاٹ کی  
آفات میں صرف ڈاکٹر برنارڈی رہ رہا تھا۔"

وہ بات بھی کرتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ خال بی کو ہوش ملی  
لانے کی اس کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ وہ ان کے چہرے پر  
کے لہجے پانی کے جھپٹے مارا اور انہیں چہرے کو جو ان کا  
پنکھا بھی چل رہا تھا۔ چہرہ زیادہ گھٹا ہو جاتا تو نئی تولیے سے ہاتھ  
دھو۔ خال بی اس دوران میں ذرا کسمپاشی تھی اور ان کے  
سے خفیف سی آواز بھی نکلی تھی لیکن ان کی آنکھیں بند تھیں  
ہیں۔ تاہم امید نظر آنے لگی تھی کہ اب وہ جلد ہی ہوش میں  
آجائیں گی۔ نئی نئی وقفے وقفے سے انہیں ہلکا جلا بھی رہا تھا  
دوسرے دوسرے آواز میں بھی دے رہا تھا۔

میرے اندر ایک عجیب سا اضطراب کو محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں ٹھٹھٹے ہوئے کپڑے پہن کر "مثنوی" (عقیدہ معلوم ہے) سرجن جب ناسلزلہ آپریشن کر رہا تھا تب بھی کچھ عرصے بعد وہی تکالیف محسوس کی کہ کسی حد تک لوٹ آتی ہیں جو ناسلزلہ وجہ سے ہوئی تھیں یا جسم میں کوئی اور پھٹتی یا کسی قسم کا اجماع پیدا ہوتا ہے اور اسے آپریشن سے نکال دیا جاتا ہے تو کچھ عرصے بعد وہ پھر وہی محسوس کرتا ہے اور پھر پھر اجماع سے نکلنے کے خیال میں اس کی ہڈیاں وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کو کوئی نہ کوئی نشو و نما ملتی ہے جو باقیہ دور وہ پھر نہ ہو سکتا ہے۔ کچھ دور سے قسم کے طبی ماہرین کا خیال ہے کہ اور ہے۔ لیکن ہر حال ایسا ہوتا ہے۔"

”آپ کا مطلب ہے ریڈ واٹ کا بھی کوئی شوبانی ہو گا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ اب بھی تنگ کر رہا ہے؟“ ننی نے گردن جھکا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے تہہ ذوق چاہی۔

”یقیناً“ میں نے اثبات میں سرہاتے ہوئے کہا ”مگر کچھ لوگوں نے کافر شایہ اور بھی زیادہ شک کرے۔“

فونی نے پُر خیال انداز میں سہلایا لیکن پھر ذرا الجھن سے  
 اگر یہ واقعہ ریڈیو ڈاٹ کے کسی قومی کام ہے اور ڈاکٹر بانڈے  
 خواجہ کا جواب ہے تو وہ میرے گھر سے براہ راست ڈاکٹر بانڈے کو  
 کر لے جانے کی کوشش بھی تو کر سکتا تھا؟

”صحیح بات تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ ابھی تو ہم صرف

کوئی بڑی سے بڑی واردات کر کے بھی نکل جانا بہت آسان ہے۔ اسی لیے تو اتنے بڑے بڑے جرائم ہو جاتے ہیں اور پولیس لیکر پھرتی رہ جاتی ہے۔ کوئی شخص کسی قسم کا مشکوک معاملہ دیکھ کر پولیس کو اطلاع نہیں دیتا اور ایسے کسی مسئلے میں الجھنا پسند نہیں کرتا، جس کا پولیس سے تعلق بنتا ہو۔ ان حالات میں توجہ تھوڑے بہت مجرم پکڑے بھی جاتے ہیں وہ زیادہ تر قوانین اور تقاضات کے اپنے نظام انصاف کے تحت ہی پکڑے جاتے ہیں۔“

میں ایک لٹھڑی سانس لے کر ایک ڈانگ چیر ٹھیک کر بیٹھ گیا۔ ایک لمبے کے لیے میں نے خیر ارادی طور پر کچھ ایسے پرامید سے انداز میں اٹنی ہوئی کر سی کی طرف دیکھا جیسے وہ مجھے کوئی سراغ دے گی..... وہاں کیا ہوا تھا اس کے بارے میں کچھ بتائے گی لیکن کر سی بہر حال کر سی تھی۔ وہ خاموش رہی اور میں اپنی بچکانہ امید پر لٹھڑی سانس لینے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

توئی اب بھی خالہ بی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔  
میں نے پوچھا ”اس قانون کے سرور غیر پر کیس کوئی جوت کا نشان تو  
نہیں ہے؟“

"تمہیں۔" فونی نے جواب دیا "بہر حال۔۔۔ چنانچہ یہ خاتون  
 پر۔۔۔ اور بہت مختلف قسم کی خاتون ہیں۔۔۔ شاید اس لیے میں  
 جھجکا کا شکار رہا۔۔۔ میں نے زیادہ متوجہ نہ کیا کہ ان کی  
 جسمانی کیفیت کیا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ یہ گیس کے اثر سے  
 بے ہوش ہوئی ہیں۔ احتیاطاً میں نے اپنے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے  
 لیکن شاید اسے آنے میں کچھ دن لگ جائے۔ ماحصل زیادہ ہے۔"

”تم انہیں اٹھا کر ڈرائنگ روم میں صوفے پر..... یا راحیلہ کے پیڈ روم میں بیڈ پر لٹا دو۔“ میں نے ہدایت کی۔

وہ ایک لمبے کے لیے ہچکچایا لیکن اس نے ہر حال میری ہدایت پر عمل کیا۔ ذرا تنگ دم سامنے ہی تھا اور اس کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ خالہ بی ذرا دیر کے بدن کی عورت تھی اور اس وقت بے ہوش تھی۔ بے ہوشی میں نہ جانے کیوں انسان کا وزن کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے لیکن جھریے جسم کے ٹوٹی نے اسے کسی چھوٹی بچی کی طرح اٹھایا اور صوفے پر لٹا دیا۔

ہم ذرا انگ دوام میں ہی آگئے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”سوچنے کی بات یہ ہے کہ راحیلہ کو کون اغوا کر سکتا ہے؟“

”میرا ذہن خود اسی سوال میں الجھا ہوا ہے۔“ ٹونی بولا ”آج کل تو ہم کسی خاص سلسلے میں کچھ ایسے سرگرم بھی نہیں ہیں۔ یہ دس دس سوڑے طریقے سے، بزنس میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں چل رہی۔ پھر یہ اچانک کیا ہکر نکل آیا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”تم نے یہ غور نہیں کیا کہ چھپلے ایک دو دن کے دوران میں کیا خاص بات ہوئی ہے؟“ نس نے پوچھا۔





”یہی تھی وہ؟“ میں نے بے غالی سے پوچھا۔  
 ”جہت خوبصورت تھی“ خالد بی نے سادگی سے جواب دیا۔  
 ”نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ خوبصورتی کے علاوہ کوئی خاص  
 بات۔ اس کی کوئی خاص پہچان وغیرہ۔“ میں نے جلدی سے  
 بنات کی۔

”ہیں۔ وہ نہیں۔ دلہا نہیں۔ اسرار تھی۔“ خالد بی کو  
 بہن پر زور دیتے ہوئے پولیس ”اس کے بال بٹے کٹے ہوئے تھے۔  
 معلوم نہیں کس رنگ کے تھے لیکن اندھیرے میں بھی گویا چمکتے سے  
 دکھائی دے رہے تھے۔ اور اس کی شکل کے بارے میں میں تمہیں  
 کیا بتاؤں۔“ وہ پیسے الجھن میں پڑ گئیں۔ چند لمبے ذہن پر زور  
 دیتے کے بعد وہ پولیس ”ہیں۔ یہ احساس تو ہے کہ وہ بہت  
 خوبصورت تھی۔ لیکن یہ خوبصورتی کچھ عجیب سی تھی۔ وہ جیسے  
 گلابی برف سے تراشی گئی صورت تھی۔ گوشت و پوست کی صورت  
 معلوم نہیں ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ عجیب اس کی آنکھیں  
 تھیں۔ ان آنکھوں کا پیسے کوئی رنگ ہی نہیں تھا۔ وہ شفاف نیل  
 بھی ہو سکتی تھیں۔ بڑی ناکل بھی۔ اور شفاف سرسبز بھی۔  
 میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“ انہیں گویا اپنا مفہوم بیان  
 کرنے میں دقت پیش آنے لگی تھی۔

میرے ذہن میں چمکا کا سا ہوا۔ میں نے ان سے وضاحت  
 نہیں چاہی۔ وہ جس عورت کا ذکر کر رہی تھیں اس کے بارے میں  
 انہوں نے جتنا کچھ بتایا تھا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ خصوصاً جب کہ  
 اس امر سے میں گھبرا اٹھا تھا اور خود ان کے اپنے حواس پر  
 وھلا ہوا غلبہ پاری تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود ان کا مشاہدہ  
 بہر حال قابلِ داد تھا۔

میرے دگ دوپے میں نہ جانے کیوں ایک سردی لہر دوڑ رہی  
 تھی۔ اس عورت کو میں نے دو تین بار مختلف مقامات پر دیکھا تھا  
 لیکن آج تک میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا تھا۔  
 میں تو کیا اس کے بارے میں خفیہ ادارے بھی کچھ نہیں جان سکے  
 تھے۔ یہ تو بہر حال ملے تھا کہ اس کا تعلق ریڈ ڈاٹ سے تھا لیکن  
 اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ یہ ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں  
 تھا۔ ریڈ ڈاٹ میں اس کی کیا حیثیت تھی؟ یہ ہم میں سے کون سا  
 باغ تھا۔

تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ اب تک زندہ سلامت اور آزاد  
 پھر رہی تھی۔ مجھے پہلے ہی اس کے بارے میں اندیشہ تھا کہ وہ  
 ہمارے ملک میں ہی نہیں موجود تھی۔ اور اگر موجود نہیں بھی تھی  
 تب بھی جس وقت جانتا ہی کہیں بھی آجاسکتی تھی۔ اس اندیشے سے  
 نہ جانے کیوں اکثر میری دھڑکیں تیز ہونے لگی تھیں۔ آج اس  
 اندیشے سے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ فونی سے میں نے ریڈ  
 ڈاٹ کے جس باقی رہ جانے والے ”نٹو“ کا ذکر کیا تھا، میں ممکن تھا  
 کہ وہ تشویشی ہو۔ بلکہ میرا دل کہتا تھا کہ وہ ”نٹو“ سے بڑھ کر کوئی

چیز تھی۔ خالد بی نے سلسلہ کلام بڑھا ”میری آنکھوں کے سامنے  
 اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں پلٹ کر باہر نکل جاتی۔  
 وہ لوگ پچھلے دواؤں کے کی طرف جارہے تھے۔ شاید میں اگلے کمرے  
 پر پہنچ کر کسی سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔“

میں دل ہی دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ امید کم اور خوش  
 فہمی زیادہ تھی۔ بھلا اس قسم کے معاملات میں کون ٹانگ اڑاتا تھا؟  
 اور پھر ریڈ ڈاٹ کے معاملات میں اڑائی جانے والی ٹانگ کی  
 حیثیت تو ایک سنگے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی جسے توڑا بھی جاسکا  
 تھا اور فحارت سے ایک طرف پھینکا بھی جاسکا تھا۔

خالد بی کہہ رہی تھیں ”مگر میں یہ دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہ  
 رکھ سکی کہ وہ لوگ میری راجیلہ دنیا کو یوں اٹھا کر لے جا رہے تھے  
 میرا ذہن بازو ہو رہا تھا لیکن میں بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھلی  
 رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی طرف لپکی۔ میری حالت چاہے  
 کچھ بھی تھی لیکن میرا غیظ و غضب کچھ کم نہیں تھا۔ اگر اس دقت  
 میرے ہاتھ میں کوئی بھی ہتھیار۔ بندوں۔ ہسپتال۔ خنجر۔ کچھ  
 بھی ہوتا۔ میں وہ لے کر پاٹوں کی طرح ان پر حملہ آور ہو جاتی  
 چاہے وہ ہتھیار استعمال کرنا میرے بس کی بات نہ ہوتی۔“

انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنا مجھے بھی اندازہ تھا۔  
 وہ ایک بار پھر جھرجھری سی لے کر پولیس ”وہ اس دقت تک کھانے  
 کی میز کے پاس سے گزرتے۔ ایک کمری گراتے عقیبی دروازے  
 تک پہنچ چکے تھے لیکن میں درمیانی دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ  
 میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں بڑی طرح لہرائی۔ میں  
 نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ سنبھل سکی بلکہ اس کوشش  
 میں شاید میں دوبارے ٹکرا کر گھوم گئی۔ مجھے یہ احساس ہے کہ میں  
 دھم سے گری تھی۔ کوشش کے باوجود میں اٹھ نہ سکی۔ آخری  
 بات مجھے بس یہ یاد ہے کہ دروازے پر رک کر انہوں نے فحارت  
 سے میری طرف دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاتے جاتے مجھے  
 ہلاک کر چکا ہیں گے لیکن انہوں نے میرے قریب آنے کی بھی  
 زحمت مگوارا نہیں کی۔ میں جہاں گری تھی، انہوں نے مجھے دوپٹوں  
 پر سے رہنے دیا اور میرے سامنے دروازہ کھول کر نکل گئے۔ میں کچھ  
 بھی نہ کر سکی۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔“

انہوں نے خاموش ہو کر ہمارے چہروں کی طرف دیکھا اور ان  
 کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سسکی سی لے کر وہ پولیس ”آخر کون  
 لوگ تھے وہ؟ کیا دانش تھی انہیں میری بیٹی سے؟“ نہ جانے میری  
 بیٹی کس حال میں ہوگی۔“

میں نے ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے چاروں  
 طرف کا جائزہ لینے کے بعد فونی سے کہا ”انہوں نے پہلے کئی باپ  
 وغیرہ کے ذریعے۔ یا کوئی چیز اندر پھینک کر کمرے میں نہیں  
 پھینکائی ہوگی۔ اور وہ بہت سربللا اثر نہیں ہوگی۔ اپنے خیالوں  
 میں ممکن بھی راجیلہ کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ خالد بی کہ

کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس گیس کو اکثر کھانے کے لئے چند سیکنڈ کی کافی تھی۔ وہ لوگ نہایت خاموشی سے اپنا کام کرنا چاہتے تھے۔

خالہ بی کو جیسے کچھ یاد آیا اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے ذرا حیرت سے بولیں۔ ”لیکن خود ان لوگوں پر گیس کا اثر کیوں نہیں ہوا تھا؟ انہوں نے تو اپنے منہ پر کوئی ماسک دیکھ نہیں لگایا ہوا تھا اور نہ ہی ناک پر کچھ لپیٹا ہوا تھا۔ وہ تو بڑے اطمینان سے جا رہے تھے۔“

”ویسے تو ان لوگوں کے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں۔ اس قسم کے شعبہ کے ان کی جیبوں میں چڑے رہتے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اندازاً بالکل صحیح وقت پر اندر آئے ہوں جب راحیلہ بے ہوش ہو چکی ہو اور وہ فوراً ہی اسے افکار چل دیے ہوں۔ یہ چند سیکنڈ کا کام تھا۔ اتنی دیر کے لئے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ دیر کے لئے تو سانس بھی روک جاسکتی ہے“ میں نے انہیں سمجھایا۔

انہوں نے پُر خیال انداز میں سرھلایا پھر ان کے آنسوؤں سے ہچکی آنکھوں میں ذرا ہلکے امیری اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پُراسید سے لمبے میں بولیں۔

”تمہاری باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ان لوگوں کو جانتے ہو۔ تو پھر جلدی کچھ کرنا بیٹے!“

”جی ہاں! آئی آپ کو نہ کچھ تو کریں گے۔ اسی لئے تو آپ سے یہ سب کچھ پوچھ رہے تھے تاکہ فیصلہ کیا جاسکے کہ کیا کرنا چاہئے“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ اپنی سچوں میں الجھا ہونے کی وجہ سے بے خیالی میں میں نے انہیں خالہ بی کے بجائے آئی کہہ کر مخاطب کر لیا تھا۔

میرے خیال میں تو بات ایک سی تھی لیکن خالہ بی صریح اور فکر کے ان لحاظ میں بھی تنک کر بولیں ”بہنئی مجھے آئی رانی مت کہا کہ۔ سید صاحبہ خالہ بی جو کتنے ہو دی ٹھیک ہے۔ کتنی دلکشی اور اپنائیت ہے اس رشتے میں۔ مجھے یہ انگریزی میں رشتے تاتے یا القابات جو زنا بالکل پسند نہیں ہے۔ اب آئی بھی بھلا کوئی لفظ ہے؟ کچھ چائیں چلا اس سے مراد پھولی ہے۔ خالہ جیسے۔ کمانی ہے۔ یا چچی ہے۔ انگریزوں کی نظر میں شاید یہ سارے رشتے برابر ہوں گے۔ اس لئے افکار ایک ہی نام رکھ دیا۔ لیکن ہماری تہذیب میں ان سب رشتوں کی اپنی باریکیاں اپنی خوبصورتیاں ہیں“ انہیں گڑبڑ نہ کرو۔ انگریزوں کا کیا ہے۔ وہ تو افکار سارے اور ہنوں دونوں ہی کو برادرانہ قرار دے دیتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں تو ایسے مختلف رشتوں کو ایک ہی لفظ سے نہیں پانکا جاسکتا۔“

”جی ہاں۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ سناٹی چاہتا ہوں خالہ بی! میں نے شرمندہ دے ہوئے ذرا جلدی سے کہا۔

پھر میں نے انگریزی میں لپٹی سے کہا ”اگر یہ ریڈ ڈاٹ کا کام ہے تو اس کا کوئی نہایت ہی واضح مقصد ہو گا جو جلد کچھ میں آجائے

گا۔ ریڈ ڈاٹ کی یہ بچی کبھی سی طاقت اگر اسے دونوں کی طاقت بعد حرکت میں آتی ہے تو اس کا مقصد ضرور کچھ حاصل کرنا ہوگا۔ آئیں آنکھوں والی عورت شاید خود اس سلسلے میں رابطہ کر میرا خیال ہے اس وقت کارروائی کرنے والی اصل شخصیت ہوگی۔ وہ مقامی لوگ شاید کرائے کے بد معاش ہوں۔“

جو خبیثی میں خاموش ہوا تو خالہ بی بول اٹھیں ”تم لوگوں اچانک انگریزی میں کیوں بات چیت شروع کر دی؟ اگر رازدارا مقصود ہے تو میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں“ ان کا لہجہ تھا کہ شاید وہ تو رازدارا سا بڑا مان گئی تھیں۔ لطف کی بات یہ کہ انہوں نے یہ دونوں جملے نہایت روانی سے انگریزی میں بولے۔ وہ یقیناً انگریزی بھی روانی سے بولتی اور سمجھتی تھیں۔

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ حیرت شاید نفی کو بھی تھی۔ ان کی یہ الہیت آج تک ہم سے بھی پوشیدہ تھی۔ رابطہ بھی ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید اتفاق تھا کہ ایسا کوئی تذکرہ آیا تھا۔ ہر حال۔ یہ دنیا تھی اور ہر طرح کے کرداروں سے! ہوئی تھی۔

خالہ بی شاید آج مجھے کچھ زیادہ ہی شرمندہ کرنے پر تھیں۔ میں نے بیٹھنے ہوئے مسدورت خواہانہ لمبے میں کہا ”کوئی بات نہیں ہے آئی۔ میرا مطلب ہے خالہ بی! آپ تم سے ہی ایک بات ہیں۔ کہنے کے ایک فرد کی طرح ہیں۔ آپت رازدارا؟“

یہ بات راحیلہ کا کرتی تھی ”میں اور خالہ بی۔ رازدارا مشتعل ایک کہہ ہیں۔“

ایک بار میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا ”کاش میں اس کہنے میں شامل ہوتا۔ مجھے ایک طرح کی ریڈی میڈ سانس بخیر نہیں مل جاتی۔“

اس پر راحیلہ مجھے گھونسا سید کرتے کرتے دھکی تھیں۔ میں نے شرمندگی کے مزید اظہار کے لئے خالہ بی سے کہا ”تو آئی انگریزی میں منہ مارنا ہماری عادت ہے۔ آپ اس کے ہمیں معاف کر دیں اور یہ مت سمجھیں کہ ہم رازدارا کی کدو۔ ایسا کر رہے ہیں۔ اور اب جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ آپ انگریزی بولتی اور سمجھتی ہیں تو یہ بھی کہاں کی رازدارا رہی؟“

”تو پھر مجھے بھی بتا دیے ریڈ ڈاٹ کیا ہے؟“ وہ فوراً بولیں۔ اس مرحلے پر رازدارا نے اجازت طلب کی۔ اچانک ٹوٹی کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف شہیرا تھا۔ سردار علی جی اس کے ساتھ تھا۔ وہ ایک سی گاڑی میں تھے شہیر نے بتایا کہ انہوں نے پہلے طرانی سے انداز میں اور پھر رازدارا سے آپ پاس کی سڑکوں پر چکر لگایا تھا لیکن انہیں کوئی کار دیکھی نہیں دی تھی جسے وہ مشکوک محسوس کرتے۔ ”کسی گاڑی میں کوئی سفید فام مرد یا عورت دیکھی تھی“

لاٹھت سے پوچھا۔ میرے ذہن میں ایک آنسو سی جھل رہی تھی۔  
میں بات اس سے کر رہا تھا لیکن سوچ کچھ اور بھی رہا تھا۔  
”دی جس کے بارے میں اس وقت بیٹھے سوچ رہے ہو اس  
نے جواب دیا۔

میں نے یہ آواز اس سے پہلے بھی نہیں سنی تھی البتہ اس  
عورت کی صورت مجھے دو تین مرتبہ ضرور نظر آئی تھی لیکن اس  
وقت فون پر اس کے بولنے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ انہی  
آنکھوں والی لڑکی کی آواز تھی اور اب وہ منہ منہ سے بول رہی تھی  
اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی شہی نہیں رہ گیا تھا۔

میں نے فون کو اٹھا دیا کہ وہ فہر نہیں کرانے کی کوشش  
کے جس سے کال کی جارہی تھی۔ فون اپنا موبائل فون اٹھا کر  
برابر کے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے بات کو طویل دیتے ہوئے کہا ”مجھے تو اس وقت کئی  
طرح کی پریشانیوں لاحق ہیں۔ تم نہ جانے کس پریشانی کا ذکر کر رہی ہو۔  
میں تو یہ سوچ کر بھی پریشان ہوں کہ اگر انسان کی تین نگاہیں ہوتیں  
تو خاصا مسئلہ برپا کرتا۔ پہلی تین نگاہیں والی سلوانی بڑی۔“

”اس قسم کی بکواس کر کے تم نہ اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے  
ہو اور نہ مجھے۔“ اس کے لیے میں سنجیدی تھی ”مجھے معلوم ہے تم  
اس لڑکی کو کتنا چاہتے ہو۔ اس کے لئے شاید تم اپنا سب کچھ داؤ پر  
لگا سکتے ہو۔“

”اس طرح کی تو کم و بیش ایک درجن لڑکیاں ہیں۔ تم کس کی  
بات کر رہی ہو؟ نام لے کر بات کر دو تو آسانی رہے گی“ میں نے کہا۔  
”اس قسم کی بکواس کر کے دوسرے کے خیالات کو ابھانے کی  
کوشش کرنا شاید تمہاری عادت ہے“ وہ پُر سکون لیے میں بولی ”لیکن  
میں اپنے نزدیک سے بچنے والی عورت نہیں ہوں۔“  
پھر اس نے نہایت دو ٹوک لہجے میں پوچھا ”تم کام کی بات کرنا  
چاہتے ہو یا نہیں؟“

”کام سے پہلے نام کی بات ہونی چاہئے“ میں نے کہا ”میں کسی  
ایسی عورت سے کام کی بات کیسے کر سکتا ہوں جس کا مجھے نام تک  
معلوم نہیں“

”نام میں کیا رکھا ہے“ اس کے لیے میں ملاٹھت آگئی ”دیے  
تم مجھے ”دی لیڈی“ کہہ سکتے ہو۔ جتنے لوگ مجھے جانتے ہیں ان میں  
سے بیشتر اسی نام سے جا۔ نہ ہیں۔“

”یہ اعزاز تو خیر مجھے آواز سن کر بھی ہو گیا تھا کہ تم کوئی لیڈی  
ہی ہو سکتی ہو۔ لیکن تم دی لیڈی ہو۔“ ٹھٹھ لیڈی نہیں ہو۔ یہ  
سن کر زیادہ خوشی ہوئی۔ تو پھر کام کی بات کہاں سے شروع کی  
جائے؟ مقامی مارکیٹ کے آثار چڑھاؤ سے یا بین الاقوامی منڈیوں  
کے بحران سے؟“

”تمہاری محبوبہ دنواڑے۔ جس کا چہرہ تو حسیا ہوا جانے  
کے بعد بھی تم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا“ وہ ستر پُر سکون لہجے

”شیر خن نے جواب دیا۔  
”جی۔ اب ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل  
ہوئی ہیں۔ فون کچھ سوچتے ہوئے بولا ”ان کی روشنی میں ذرا زیادہ  
درجے کے ملائے کا جائزہ لینے کی کوشش کرو۔“ وہ اس سلسلہ  
ام عورت اور دو مقامی آدمیوں کا علیحدہ علیحدہ لگا۔ اس نے خالہ بی  
سے پوچھ کر مزید کچھ تفصیل شامل کی پھر بولا ”اب تاخیر ہو چکی ہے۔  
ان لوگوں کے نظر آنے کی کوئی خاص امید نہیں لیکن قسمت آزمائی  
میں کوئی حرج نہیں۔ بعض اوقات بڑے عجیب اتفاقات بھی رونما  
ہو جاتے ہیں۔“

اس نے فون بند کر دیا تو خالہ بی ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولیں ”میری  
دعا ہے کہ وہ پہلے سے جاںیں اور میری بچی ابھی گھر واپس آجائے۔“  
ان کی دعا شاید اس حد تک تو قبول نہیں ہوئی مگر اتنا ضرور ہوا  
کہ اسی لمحے میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بات کرنے  
کے لئے فون دیا تو بیٹی جیسی مگر جذبات خیزی ایک نسوانی آواز  
نے تصدیق چاہی ”اضل۔ تم ااضل ہو نا؟“ وہ گہری بات  
کر رہی تھی۔

”ہاں۔ میں ااضل بول رہا ہوں“ میں نے ایک لمحے کی  
ناوشی کے بعد جواب دیا۔  
”تم پریشان ہو؟“ بولنے والی نے یوں پوچھا جیسے وہ میرے  
سامنے بیٹھی بات کر رہی تھی۔ میں اس آواز میں الجھ کر رہ گیا تھا۔  
وہ بتی عجیب آواز تھی۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا  
کہ اسے بیٹی جیسی ہی آواز کہا جاسکتا تھا یا کھنکھاتی ہوئی؟ اس میں  
دونوں ہی خصوصیات کی جھلک موجود تھی۔ لہجہ پُرانے اور شائستہ  
تھوڑا سا والا تھا جو صاف تھکی اور داغ انگیزی بولتے تھے۔  
پھر فون کے امریکیوں کی طرح انگریزی کا علیحدہ بنانے والا انداز  
بھی تھا۔

”ہاں۔ میں پریشان ہوں“ میں نے اعتراف کر لینے میں عار  
نہیں محسوس کی ”تم نے کیا میری پریشانی دور کرنے کے لئے فون کیا  
ہے؟“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میرے جسم میں بھری سی دوڑ گئی  
لیکن ابھی اس کیفیت کے بارے میں بھی میں یقین سے نہیں کہہ  
سکتا تھا کہ اس کی اصل وجہ کیا تھی؟ کیا یہ قہقہہ جذبات خیر تھا؟ اس  
کی وجہ سے میرے اعصاب میں گہ گہری سی ہلکی سی یاد حقیقت  
میرے جسم میں خوف کی بھری دوڑی تھی؟

”جو پریشانیوں خود مولی ہیں جاتی ہیں انہیں دور کرنے کی تدبیر  
میں خود کو گناہ دیتی ہے جی“ وہ بڑی محبت سے بولی۔ کوئی اور وقت  
ہو نا تو اس کا یہ لہجہ مجھے ان گنت خوش کن تصورات کی دنیا میں  
لے جاسکتا تھا۔

”تمہاری محبوبہ دنواڑے۔ جس کا چہرہ تو حسیا ہوا جانے  
کے بعد بھی تم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا“ وہ ستر پُر سکون لہجے

”میں نے خود کو کئی پریشانیوں میں ڈال دیا ہے؟“ میں نے

”میں نے“

تھی۔

”ہم مشرقی لوگ ہیں۔ اتنی آسانی سے کسی کا بچھا نہیں چھوڑتے۔ میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ پھرے کا کیا ہے۔ چہ تو پر ابھی کالا ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انسان کا دل کالا نہیں ہونا چاہیے۔ اب ایسے سفید فام ہونے کا کیا فائدہ کہ انسان کے سینے میں شبہ تاریک سے بھی زیادہ کالا دل دھڑک رہا ہو۔“

وہ ایک لمبے خاموش رہی پھر گہری سانس لے کر بولی ”مگر تم دل کے اسے بڑے قدر دان ہو تو دل کے بارے میں ایک اہم بات سن لو۔ آج رات کے ٹھیک بارہ بجے تمہاری محبوبہ کا دل دھڑکنابند کر دے گا۔ کل صبح تم کو شش کو گئے تو شکر کے کسی کوڑے دان سے تمہیں اس کی لاش مل جائے گی۔“

”غیر فانی تو تم بھی نہیں ہو آجی انھوں دلی ڈارنگ! ہو سکتا ہے کبھی تمہاری لاش بھی کسی گندے ٹالے میں پڑی پائی جائے۔“ میں نے جواب دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے الفاظ سے میرے دل پر گھونسا سا قہقہا لگ گیا۔ میں نے اپنے لیے یہ بے اعتبار نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کی بات کا میں نے ذرا سا بھی اثر لیا تھا۔

”بہت مشکل ہے۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولی ”تم ازم تمہارے لئے مت مشکل ہے۔“

”میرے لئے مشکل سی۔۔۔ اور پر والے کے لئے تو مشکل نہیں ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”لوہر والا۔۔۔؟“ اس نے دہرایا ”دھس! اچھا! خدا کی بات کر رہے ہو۔“ وہ دھیرے سے ہنسی ”تو کبھی کبھی خدا کو بھی یاد کر لیتے ہو؟“

”کبھی کبھی نہیں۔۔۔ اکثری کر لیتے ہیں۔ مشکل اور دشمن وقت میں کچھ زیادہ ہی یاد کر لیتے ہیں۔ شاید اسی لئے تو تم سے ایسے کام کر گزرتے ہیں جو بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”اب یہی دیکھ لو کہ کیا ریڈ واٹ جیسی طاقت کا بیڑا غرق کرنا ہی جیسے لوگوں کے بس کی بات تھی؟“

وہ ایک لمبے خاموش رہی پھر بولی ”تم نے ایک ایسی جنگ کو دوبارہ شروع کیا ہے جو ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے فکست تسلیم کر لی تھی۔ ہمارے بچے کچھے نوک بھی رخصت ہو چکے تھے۔ ہم نے تمہارے ملک کا بچھا چھوڑ دیا تھا۔ دنیا بہت بڑی ہے اور یہاں اکثریت پس ماندہ ملکوں کی ہے۔ ہمارے سامنے کام کرنے کے لئے بہت بڑا میدان پڑا ہے۔ تمہارے ملک کو ہم پھر کبھی اپنا آڑا بنائیں گے اور وہ وقت شاید ایسا ہو کہ تم جیسے سوا فضل چوہدری اور ہزار تیس خان بھی مل کر کچھ نہ کر سکیں۔“ اس کا لہجہ رکوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو برف بنا دینے والا تھا ”اس وقت تمہارے اپنے گلی کہڑوں میں کئی کئی ریڈ واٹس موجود ہوں گی۔ تمہارے اپنے لوگ ہمارا کام بہت آسان کر دیں گے۔“

کام تو اس وقت تک ہمارے اپنے بہت سے لوگوں نے آسان

کیا ہوا تھا۔ مستقبل کا نقشہ تو اور بھی خوفناک تھا لیکن میں نے اپنے رگ دے میں بیٹھتے ہوئے خوف کو اپنے لیے ٹک نہ لیا اور بظاہر بے فکر سے کہا ”تم مستقبل کی باتیں چھوڑو۔ حال کی بات کرو۔ میں نے اس جنگ کو وہاں کیسے شروع کیا ہے؟“

”ڈاکٹر برنارڈ کو اغوا کر کے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ کو میں نے اغوا کیا ہے؟“ میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

”افضل نیڑا تم ریڈ واٹ کو تقریباً اتنی ہی جانتے ہو جتنا ہم خود۔ تمہیں اس قسم کے پچگانے سوالات نہیں کہنے چاہیے۔ ہمارا نیت و درک بے شک ختم ہو چکا ہے لیکن اس قسم کی بھولی بھولی باتیں معلوم کرنا ہمارے لئے اب بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لئے تم اس کی تردیدوں میں اچھ کر وقت مت ضائع کرو۔“

میں اسے جھٹلانے کے لئے مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ روایت جاری رکھتے ہوئے بولی ”تم نے بہت سی غلط وقت پر یہ کام کیا۔ پھر دن بعد ہم ڈاکٹر برنارڈ کو ساتھ لے کر یہاں سے جانے والے تھے صرف چند دن کی بات اور تھی۔ ریڈ واٹ تمہارے لئے ایک تھا۔“

پارہ۔۔۔ ایک بھولی بھری کمائی بن جاتی لیکن تم نے ہمارا سارا پروگرام دور ہم پر ہم کر دیا۔۔۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خود اپنے لئے بھی کچھ کی مصیبتوں کو دعوت دے دی۔“

”اگر تم چند دن بعد جانے والے تھے تب تو یہ کام شاید بالکل بیوقت سا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ تو چلا جاتا لیکن شاید زندگی بھر اسے یہاں تلاش کرنا پڑتا۔“

پھر میں نے نہایت نرم اور صلح جویانہ لہجے میں کہا ”دیکھو۔ پہلے بات کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ اب ہمارے درمیان کوئی جنگ نہیں چل رہی۔۔۔ اور اگر تم پہنچے کچھ لوگ بھی چارے ہوتے تو سمجھو کہ ہمارے رہے سے اختلافات بھی ختم ہو گئے۔ ڈاکٹر برنارڈ کو میں نے ہلاک کرنے یا خفیہ اداروں کی تحویل میں دینے کے لئے نہیں پکڑا۔ یہ بات میں نے خود اس پر بھی واضح کر دی ہے۔“

”پھر تم نے اسے کس لئے پکڑا ہے؟“ وہی لہجہ لے کر پوچھا۔

”اس کا جواب راجیلہ کی صورت میں تمہارے پاس ہے۔۔۔ تم تو ڈاکٹر برنارڈ کو لے کر چلی جاؤ گی لیکن کیا راجیلہ اپنی اپنی زندگی اسی طرح آدھے کالے اور آدھے سفید چہرے کے ساتھ گزارے گی؟“

”تم نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا۔۔۔ یہ اس کی نہایت مشکل سزاؤں میں سے ایک ہے۔ تمہیں تو اس پر ہی شکر کرنا چاہئے تھا کہ وہ کم از کم زندہ سلامت تو ہے۔“

”تم لوگ یہاں جو کچھ کر رہے تھے۔۔۔ اور جو کچھ مزید کرنا چاہتے تھے وہ تم کسی بھی ملک میں جا کر کرو گے تو وہاں تمہارے ساتھ یہی ہوگا۔ بشرطیکہ وہاں مٹھی بھر بھی محبت وطن لوگ نہ ہوں گے۔“

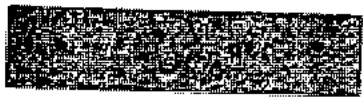
مقبول شاعر قاتل شکاری کے کردار و کلام کا

مفصل تعارف و انتخاب

قاتل سب سے جمیل

مرتبہ ضیاء ساجد

قیمت - /100 روپے



لکھا تھا۔

”یہ معلوم کرنا ہمارے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا“ وہ بولی۔

”لیکن اسے چھڑانا ضرور مشکل ہوگا“ میں نے کہا ”اب لاشوں کے چادلے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب ایک کام سیدھے طریقے سے ہو سکتا ہے تو اسے مشکل بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا ڈاکٹر برنارڈ میرے پاس ایک امانت ہے۔ میرا وعدہ ہے میں یہ امانت تمہیں لوٹا دوں گا۔“

پھر جیسے مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے گویا اسے ایک خفیہ سے دھچکے کے لئے تیار کرتے ہوئے کہا ”لیکن ایک بات میں واضح کر دوں۔ کس قسم بعد میں یہ نہ کہو کہ میں وعدے اور معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ میں راجیلہ کا چہرہ ٹھیک ہونے کے بعد بھی کچھ دن اسے اپنے پاس رکھوں گا۔ جس یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ اس نے اپنا کام ٹھیک کیا ہے اور راجیلہ کے چہرے پر کوئی رد عمل یا خراب اثر ظاہر نہیں ہو رہا۔“

”تمہیں دن دو کو گئے اسے؟“ اس کے لیے میں ایک بار پھر ہلکی سی نچی آئی۔

”کم از کم ایک ماہ“ میں نے دانت اڑی سے جواب دیا۔ ”ایک ماہ؟“ وہ تقریباً چلا اٹھی ”نہیں۔ افضل ڈیڑھ ہمارے درمیان معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ بات صرف میری شرائط پر ہوگی۔ آج رات دس بجے سے پہلے ڈاکٹر برنارڈ کو رہا کر دو۔ ورنہ کل صبح تمہیں راجیلہ کی لاش ملے گی۔“

جب تم مجھے حب الوطنی پر پیکر دینے مت بیٹھ جانا“ وہ لڑکتے ہوئے ”میں تمہارے ہاں حب الوطنی کے ڈھنڈورے لڑاؤں گا“ وہ جواب دیا۔ ”میں نے ٹھنڈی سانس لے کر

”جیس بھی جان مانی ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم ذرا ہی کیر ہو۔“ ”درواز سے کچھ مختلف ہو۔ اصل میں ریڈ ڈاٹ غلطی ہے۔ ہولی کہ اس نے جس اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ہم نے اس غلطی کی بہت بڑی سزا بھگتی ہے۔ ہم باہر لایا اپنا کام کرتے چہ تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہو۔“ ”تمہیں صرف اس نہ پتا چلتا ہے۔ یہ ڈھانچا زہن یوس ہو جانا۔“ ”خیر۔ جو ہوا۔ سو

”جو ہوا۔ سو اب نہ ہو چکنی کی شکل نہیں دی جاسکتی۔“ ”لیکن راجیلہ کے ساتھ جو ہو چکا ہے اسے تو پہلے والی بات پر لایا جاسکتا ہے“ میں نے ملائمت سے کہا ”یہ محض اتفاق ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے صرف راجیلہ کا چہرہ بنا کر اسے قابو میں کیا ہے۔ میرا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اس کے انتظامات مکمل ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر برنارڈ کے لئے یہ ایک معمولی سا کام ہے۔ تم اسے یہ کام دے دو۔ اس کے بعد تم جہاں کو بھی میں خود اسے بہت عزت و احترام سے پہنچا دوں گا۔ میرے لئے اس سے بڑی خوشخبری کیا دہکتی ہے کہ تم لوگ خود ہی یہاں سے جا رہے ہو۔ اس سلسلے میں لڑکھارہ شادی ہو تو میں خود تمہاری مدد کے لئے تیار ہوں۔“

اس کے نزدیک گویا یہ بڑی چنگاڑی سی بات تھی۔ اس نے انتہائی سہمہ بھرا لہجہ میں کہا ”نہیں۔ بہت شرم ہے۔ میں تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ ہم ابھی اتنے محتاج نہیں ہوئے۔“

”تو پھر راجیلہ کو رہا کر دو۔ اپنی معمولی سی بات کو تصادم کی بنیاد نہ ڈالو۔ حقیقت پسند بن کر سوچو۔“ ”سچی ہوئی صورت حال کو لکھنا کوئی دانشمندی نہیں۔ مجھے اب ریڈ ڈاٹ سے یا ڈاکٹر برنارڈ سے کوئی لڑکھائی نہیں ہے۔“ میں نے ملائمت سے اسے سمجھانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجھے یقین ہو تاکہ وہ منت سے بات ان بات کی تو شاید اس وقت میں اس کی منت بھی کر لیتا۔ میں اس وقت اسید اور نا اسید کی دو میان ایک عجیب سے غلام میں مل گیا تھا۔ میری جیتیلیوں سے ہلینہ پھوٹ رہا تھا۔“

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر اچانک ہی اس نے پوچھا ”تم نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟“

”اب اتنی آسانی سے اپنی معلومات میں اتنا اضافہ مت کرو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ دوجرے سے نہیں۔ مجھے یہ جان کر خوش ہوئی کہ کم از کم ابھی انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کو کل رہا کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کوئی کاکھنی والی کچھ محفوظ



رہے۔ اس نے غالباً اب اس چہرے کے ساتھ زندگی گزاری  
لیا ہے۔ اگر ہمیں اس سے اتنی ہی محبت ہے تو تم بھی اپنے  
دلی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنا اور لوگوں میں اگلا شہرہ بننا چاہو  
تو فیصلہ کن سے مجھے میں بولی۔

اب میں اسے کیا تاکہ راحیلہ اس چہرے کے ساتھ میری  
سے شادی کے لیے تیار نہیں تھی ورنہ شاید میں اس طرح  
زندگی گزارنے کی تجویز قبول کر لیتا اور اس کا عادی بھی ہو جاتا۔  
”مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے کہ میں ڈاکٹر برنارڈ کو رہا کر دوں  
تم لوگ بھی واقعی راحیلہ کو رہا کر دو گے“ میں نے صاف کر دیا۔

”میں بھی تم پر اعتبار نہیں ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ سے راجہ  
چو ٹھیک کرانے کے بعد تم اسے زندہ جانے دو گے“ وہ بلا آواز  
”تم اتنے دانت دار آدمی نہیں ہو سکتے۔ کم از کم ہمارے محلہ  
میں!“

”میں نہیں اپنی دانت داری کا قائل کرنے کی کوشش ہم  
کر رہا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں لا حاصل کام نہیں کرنا  
راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ہونے کے بعد مجھے برنارڈ کو رہا کر دیا جا  
ہوگا؟ خصوصاً جبکہ مجھے یہ یقین ہے کہ تم لوگ واقعی اس ملک  
بچھا چھوڑ کر جا رہے ہو۔“

”مسک دے بے اعتباری کا آجاتا ہے“ وہ بولی ”ہمیں ہم  
اعتبار نہیں اور ہمیں تم پر بھروسہ نہیں۔ یہ تمہیں کیسے سمجھے گی؟  
”کسی کو بھگوانا تمہارے ہاتھ میں ہے“ میں نے کہا۔

اس نے ایک لمبے سوچا پھر بولی ”میں ایک گھنٹے بعد پھر تم  
بات کروں گی۔ مجھے مزید سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ  
میں تمہارا سا غلط فہمی نیت ڈال دیا جائے تو شاید بات بن جائے  
دوبارہ خون کروں گی تو برنارڈ سے بھی بات کرنا چاہوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ برنارڈ سے تمہاری بات ہو جائے گی اور وہ  
تک غلط فہمی نیت کا تعلق ہے تو میری طرف سے تو غلط فہمی نیت  
ہے۔ ہمیں اپنے ہاں یہ غمراہی کرنا پڑے گا۔ تم لوگ کہو  
یہ چیز خاصی نایاب ہے“ میں نے کہا۔

”ہاں اس مت کرو۔ زیادہ خطرہ گھسنے کی ضرورت نہیں۔  
لے ڈانا اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا“ ایک گھنٹے بعد میری  
فون کا انتظار کرنا۔ اور ہاں۔۔۔ جتنا کم چالاک بننے کی کوشش  
کر دو گے اتنا زیادہ ناکامی میں رہو گے۔“

”مجھے معلوم ہے“ میں نے دھجے لیے میں کہا ”یہ چالاکی  
کا وقت نہیں ہے۔“

اس نے سلسلہ متعق کر دیا۔ اس دوران میں فون دوسرا  
کمرے سے واپس آچکا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔  
وہ دھجے لیے میں بولا ”نہر نہیں نہیں ہو سکا۔ مایوسی  
کچھ میں اپنے جانتے والے جو افسر موجود ہیں انہوں نے خود

”جلد بازی والی بات مت کرو“ میں نے حق سے اسے  
سمجھانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا میں اسے رکھنے کی مدت  
کچھ کم کر رہا ہوں۔ میں اسے ایک ماہ کے بجائے صرف ایک ہفتے  
بعد چھوڑ دوں گا۔ اسے اپنی پیداکوئی خرابی کو تسلی بخش طور پر  
ٹھیک کرنا ہوگا۔ یہ کوئی بے جا مطالبہ نہیں ہے۔ وہ لڑکی جتنی سزا  
بجٹت چکی ہے وہی کافی ہے۔ یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ اس نے اس  
قتل کے ساتھ بھی زندگی گزارنے کا دمٹک سکے لیا اور اپنے  
معدلات میں کوئی فرق نہیں آئے رہا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی  
ہوتی تو شاید پریشانی اور احساس کسری کے باعث نفسیاتی مریض بن  
جاتی اور اگر اپنے حسن کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی تو  
شاید خودکشی کر لیتی۔ اگر ڈاکٹر برنارڈ جاتے جاتے اپنی اس حرکت کی  
حفاظت کر جائے گا تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”خیر۔ اگر ڈاکٹر برنارڈ نے یہ کام کرنے کی ہامی بھلی ہے تو وہ  
ضرور کر دے گا اور ٹھیک طرح ہی کرے گا ورنہ وہ ہامی ہی نہ  
بجرتا۔ وہ ایک عجیب قسم کا سنگی ہے۔ تم نے اس پر شک دیکھا  
ہوگا؟“

”تھوڑی سی سختی تو کرنا پڑی تھی“ میں نے قدرے شرمندگی  
سے اعتراف کیا۔ ”وہ بات مان جو نہیں رہا تھا۔“  
”ٹھیک ہے۔ ہم بھی لڑکی پر تھوڑی سی سختی کریں گے“ وہ

بولی۔  
”پلینہ ایسا مت کرنا“ میں نے جلدی سے کہا ”اس سے  
کون سا ہمیں کوئی بات منوانی ہے۔“ میری دھڑکنیں تیز ہو گئی  
تھیں۔

”یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ ڈاکٹر برنارڈ کو کہاں رکھا گیا ہے“  
وہ گویا میری کیفیت کا تصور کر کے محفوظ ہوتے ہوئے بولی۔  
”اس سے یہ بات ابھی معلوم نہیں ہے۔ اسے مارچ کرنا فضول  
ہوگا“ میں نے جھوٹ بولا۔

”وہ اٹیس کی خالہ اس قسم کے جھوٹ سے بے دخل والی نہیں  
تھی۔ خطرے کے لیے میں بولی ”ایک طرف تم اتنے اصول پرست اور  
راست گو بننے کی کوشش کرتے ہو۔ دوسری طرف جھوٹ بولنے  
سے بھی باز نہیں آتے۔“

اب میں اسے کیسے یقین دلانا کہ جھوٹ مجھے کسی کی جان  
پہانے یا کسی کو گمراہ پہنچانے کے لیے بولا چڑھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی  
”جب ڈاکٹر برنارڈ تمہارے ہتھے چڑھا ہو گا تو سب سے پہلے تم  
راحیلہ کو ہی یہ خوشخبری سنائے دوڑے ہو گے اور وہاں یہ ذکر بھی  
ضرور آیا ہو گا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے“ وہ بولی۔

”خیر۔ تم اس قسم کی بحث وغیرہ میں الجھنے کے بجائے مسئلے کو  
حل کرنے کی کوشش کرو“ میں نے درخواست کی۔  
”حل یہی ہے کہ آج رات دس بجے تک برنارڈ کو رہا کر دو۔  
تک راحیلہ کو بھی رہا کر دیا جائے گا۔ اس کا چہرہ جیسا ہے ویسا ہی

باد جو رکھ چکا رہی تھیں۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔“ میں نے بندھی سے کہا ”اس وقت تو کوئی بھی تجوز مٹا ہوا معلوم ہو گا۔“

”را حیلہ بنیا کا چو ٹھیک کرانے کے لیے اسے اس خزانہ کے پچگل سے چھڑوانا ضروری ہے اور وہ بدعا عمار کی دہ سے اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ تم اس سے کہو را حیلہ بنیا کو پھوڑیں اور خزانہ کے طور پر ہماری خاکہ بی کو رکھ لیں۔ میں را حیلہ بنیا کی جگہ خزانہ کے طور پر بیٹھے دن بھی ضرورت ہو۔ رہنے کے لیے تیار ہوں۔“

”اگر انہوں نے بدھمدی کہتے ہوئے یا کسی اور وجہ سے مجھے مار بھی ڈالا تب بھی کوئی بات نہیں۔ میں بنیا کی رہائی اور اس کا چھو ٹھیک کرانے کے لیے اپنی جان کا داؤ کاٹنے کے لیے تیار ہوں۔“

میں نے بغور خالہ بی کی طرف دیکھا۔ آج درحقیقت ان کی ذات کی تمکین مکمل رہی تھیں۔ وہ کافی حد تک ایک خیران کن عورت تھیں۔ وہ ایک عام سی عورت ہر حال میں تھیں۔ میں ان کے اخلاص اور جلال ثنائی سے حاشا ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے ان کی تجویز پر صرف ایک لمحے کے لیے غور کیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ تجویز دی لڑکی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔

را حیلہ کے عوض وہ بھلا خالہ بی کو خزانہ کے طور پر کیسے قبول کر سکتی تھی۔ وہ یقیناً کسی سوچتی کہ خالہ بی جتنی کسی عورت کی بھلا ہماری نظر میں کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ اور جو شخصیت ہمارے لیے اہم نہ ہوتی اسے وہ خزانہ کے طور پر کیسے قبول کر سکتی تھی؟

تاہم خالہ بی کی تجویز نے مجھے ایک راہ ضرور بھائی تھی۔ میں نے فوری کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے خالہ بی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا ”آپ کا جذبہ قابل قدر ہے خالہ بی! اہم تو آپ کا شعور ہے اور کرانے کے قابل بھی نہیں ہیں لیکن ہمیں اندازہ ہے کہ ان فیثوں کے لیے یہ تجویز قابل قبول نہیں ہوگی۔ ہر حال ہم اس تجویز کو قابل قبول بنانے کی کوئی اور صورت نکالیں گے۔ فی الحال ہمیں اجازت دیجئے۔ ابھی ہمیں اس مسئلے میں نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑے۔ ایک گھنٹے بعد اس خوب صورت بدھمد کا پھر فون آئے گا۔ ہم آپ سے رابطہ رہیں گے۔ اگر کوئی نئی بات آپ کے علم میں آئے تو آپ بھی فوری طور پر ہمیں اطلاع دیجئے گا۔ ہمارے نمبر فون آپ کے پاس ہیں نا؟“

”ہاں جی! را حیلہ بنیا نے مجھے سب کچھ بتا رکھا ہے“ انہوں نے گویا مجھے تسلی دی۔

میں اور فونی انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آئے۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فونی بولا ”را حیلہ کی جگہ خزانہ کے طور پر میں ان کے پاس چلا جا رہا ہوں۔“

مجھے معلوم تھا کہ خالہ کی بات سننے ہی اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال مٹا گیا تھا۔ میں نے فوراً کہا ”تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔ میرے پیچھے را حیلہ کا چھو

ٹھیک کرانے کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جس ٹیلی فون سے کال کی پڑی تھی اس پر کوئی آلہ لگا ہوا ہے جو نمبر نہیں دیتا۔“

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ حضرت انسان بھی واقعی بے عقل تھا۔ ایک طرف تجوز اور تلواریں ایجاد کرتا تھا۔ دوسری طرف اس سے بچنے کے لیے زہر بکتر ایجاد کرتا تھا۔ ایک طرف اپنی اسلحہ کو ناکام بنانے کے لیے بمبار طیارے ایجاد کرتا تھا تو دوسری طرف طیارہ شکن توپیں۔

ایک طرف اگر ایسے آلات موجود تھے جو کال کرنے والے کا نمبر نہیں کر سکتے تھے تو دوسری طرف انہیں ناکام بنانے والے آلات بھی موجود تھے۔ گویا ایک طرف تھی تو دوسری طرف زندہ زنی کے ساتھ اس کا توڑ موجود تھا۔ جب ہر چیز کا توڑ موجود تھا تو اس چیز کو ایجاد کرنے کا فائدہ کیا تھا؟ میں اکثر سوچتا تھا اور جڑاں ہوتا تھا کہ درحقیقت کہیں انسان وہیں کا وہیں تو نہیں کھڑا تھا بلکہ وہ لاکھوں سال پہلے تھا؟ اس کا سفر کھن ایک دائرے میں تو نہیں تھا؟

خالہ بی نے مجھے میرے خیالوں سے چوٹایا ”اے بھئی کچھ مجھے ہی بتاؤ یہ کون کون سا ماری تھی جو را حیلہ کو اٹھوا کر لے گئی اور اب اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہو رہی؟“

گویا خالہ بی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کسی عورت سے بات کر رہا تھا۔ میں نے پُر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ایک نوع نہ مہر جاس خالہ بی! آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔“

معلوم تو مجھے بہت کچھ ہو گیا ہے بیٹا! میں اپنی کوڑھ مفرور بال نہیں ہوں جتنی تم سمجھ رہے ہو“ وہ اب بالکل چاق و چوبند نظر آ رہی تھیں۔

”میرے بھئی خالہ بی! میں بھلا آپ کو جاہل اور کوڑھ مفرور کی بات کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو ہم جیسوں کے کان کو سن سکتے ہیں“ میں نے کہا۔

”میرے بھئی کان کترنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے یہاں کترنے کا شوق ہے۔ وہ میں کترتی رہتی ہوں۔ میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ تمہاری باتیں تو میں نے سن لی ہیں لیکن کافی حد تک مجھے اس خزانہ کی آواز بھی سنائی دیتی رہی جو تم سے بات کر رہی ہے۔ میں نے کان ادھر ہی لٹکاے ہوئے تھے۔ جو باتیں میری سمجھ میں نہیں آ سکیں ان کے بارے میں بھی میں نے کافی حد تک اندازہ لگایا ہے۔“

خالہ بی خود بھی یقیناً کافی تیز تھیں اور ان کی سماعت بھی تیز تھی۔ وہ بات ہماری دیکھتے ہوئے بولیں ”میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتی ہوں۔ شاید اس سے یہ صحیح سلجھ جائے جو ایک دوسرے پر براجمالی کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں اپنی تجویز بیان کر دوں گا۔“ وہ اپنی تمام تر بے باکی اور تیزی و طراری کے

ٹھیک کرانے کے کام کی عمرانی تو تم بھی کر سکتے ہو۔"

"لیکن آپ کو جانے کی کیا ضرورت ہے؟" ٹوٹی بولا "ہم اسنے ساتھی جو موجود ہیں۔ خصوصاً میرا اپنے بارے میں تو یہی خیال ہے کہ وہ مجھے طمانت کے طور پر ضرور قبول کر لیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ میں آپ کے نمائندہ قریبی ساتھیوں میں شامل ہوں۔ میں راحیلہ اور شفیق شاہ بتتے اہم آپ کے لیے ہیں، یرغمال کے طور پر اتنے ہی اہم ان کے لیے ہوں گے۔"

"میں اپنے نئی معاملات میں اپنے کسی ساتھی کی جان داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔" میں نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کا بھی معنا نہیں ہے سرا؟" وہ زور دے کر بولا "راحیلہ ہم سب کی ساتھی ہے۔ وہ ہر مسئلے پر ہمارے ساتھ رہی ہے۔ وہ دشمنی اور اجتماعی جبر و جبر میں ہمارے ساتھ شریک رہی ہے۔

ہم سب لوگ ایک خاندان کی طرح ہیں اور وہ جب سے کراچی سے آئی ہے اس خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کے لیے بھی اپنی جان کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرے گی۔۔۔ تو پھر اس مسئلے پر ہم کیسے پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ خصوصاً مجھ پر زیادہ دے داری عام ہوئی ہے کیونکہ لاہور

میں موجود ساتھیوں میں شاید مجھے ہی ریڈ ڈاٹ والے سب سے زیادہ آسانی سے یرغمال کے طور پر قبول کریں گے۔ آپ کی ضرورت جو تک ہم سب کی عدم موجودگی میں بھی سب سے زیادہ رہتی ہے اس لیے آپ خود کو یرغمال کے طور پر ہرگز پیش نہ کریں۔

کوئی بھی ساتھی اس پر رضامند نہیں ہو گا اور نہ ہی اس بات کو پسند کرے گا۔ حتیٰ کہ خود راحیلہ بھی آپ کے عوض رہا ہونے اور اپنا چہرہ ٹھیک کرانے کو ترجیح نہیں دے گی۔"

میں چند سیکنڈ اسے نکلتا رہا اور سوچتا رہا کہ آج کے دور میں جیسے ایسے ساتھی میسر ہوں اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا تھا؟ آؤ انکس کے مرحلوں میں یہ خیال مجھے ہمیشہ ہی آتا تھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہو جاتا تھا۔ میں بے پناہ تشکر کے ساتھ سوچتا تھا کہ بچپن اور لڑکھن میں اگر میری زندگی میں کسی بھی قسم کے احساسِ محرومی کو دخل رہا تھا تو اب تک ہزار طریقوں سے اس کی تلافی ہو چکی تھی۔

ٹوٹی خھر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس مخصوص کیفیت کے حصار سے باہر آتے ہوئے کہا "ٹوٹی! میں نہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے ان لوگوں کی زبان پر اعتبار نہیں ہے۔ مجھے وہ ایسے وعدہ نبھانے والے نہیں لگتے کہ ہمارے یرغمالی کو زندہ چھوڑ دیں۔"

"کوئی بات نہیں سرا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا "جان جانے کے مسئلے تو اس سے پہلے بھی ادا آئے ہیں۔ ہم محفوظ طریقے سے ان کے ساتھ بازی کھیلنے کی کوشش کریں گے۔ جب تک ڈاکٹر برنارڈ ہمارے قبضے میں ہے وہ ہماری نرم شرانگہ تومان ہی لیں گے۔"

"چلو۔۔۔ خیر۔۔۔ فی الحال ڈاکٹر برنارڈ کے پاس چلتے ہیں۔ اس کی بہت زیادہ حفاظت کرنی چاہیے۔ تم تمام ساتھیوں کو بلا کر اپنے مکان پر تعینات کر دو۔ لیکن اس طرح کہ باہر سے کوئی انہیں دیکھنے نہ پاسکے اس کے علاوہ انہیں خاص طور پر یہ بات بھی کر دینا کہ تمہارے گھر پہنچنے وقت ہر ایک خصوصی احتیاط کرے اور ہر اوجھر گھومتے پھرتے بچنے اور اچھی طرح اطمینان کر کے کہہ کر کا تحاقب نہیں کیا جا رہا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تمہارا گھر ابھی ذات کی باقیات کی نظر سے بچا ہوا ہے۔ اب اسے ان کی نظر سے بچا کر ہی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بھی شاید زیادہ دیر

آپ ان سے کہہ دیجئے کہ راحیلہ کے بدلے آپ ایک بچہ لیں۔ بچے یرغمالی کے طور پر ان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ چارلہ ایک ساتھ عمل میں آئے گا۔ یعنی اوپر سے وہ راحیلہ کو کر آئیں اور اوپر سے بچے لے جائیں۔ چھوٹی موٹی تعینات اسی طرح طے کر لیں گے جس طرح عثمان کو ان لینے والے کر ہیں۔ ایک ہفتے بعد اپنے ایک یرغمالی کو واپس لینے اور لاہور کو ان کے حوالے کرنے کا مرحلہ بھی اسی طرح طے کیا جائے گا۔ گویا "اس ہاتھ دے۔۔۔ اس ہاتھ لے" والا معاملہ ہو گا۔ نہ شرط ماننے سے صاف انکار کر دیجئے گا کہ پہلے ہم ڈاکٹر برنارڈ کریں، بعد میں وہ ہمارے یرغمالی کو رہا کریں گے۔ اس قسم کی بھٹکانا ہر حال ان کی بھی مجبوری ہے۔ اس لیے امید ہے کہ شرط مان لیں گے۔"

"کسی بھی قسم کے تبادلے کا طریقہ تو میں نے بھی یاد کیا تھا۔" میں نے کہا "اب اس کی طرف سے میں یہ بات ماننے کے میں زیادہ پر امید نہیں ہوں اور یہی ان کی بد نیکی کی دلیل ہو گی۔ وہ واقعی شرافت سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہوں گے تو ہماری تجویز منظور کر لیں گے۔" ڈی لیلی "کے نام سے یہ جو آ آٹھوں دہائی عورت سانسے آئی ہے، اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتے۔ معلوم نہیں ریڈ ڈاٹ میں اس کی حیثیت کیا ہو اور یہ معاملات میں کیسی ہو۔ فی الحال معاملہ شاید اسی کے میں ہے۔ میرا خیال ہے یہ بات کو بنا بھی سکتی ہے اور کڑی بھی ہے۔"

"بہر حال آپ بات انہی خطوط پر کریں اور یرغمالی کے طور پر صرف میرا نام پیش کریں۔ اپنا نام ہرگز نہ لیں۔ کہیں وہ واقعی بچل نہ جائیں۔"

"تمہارا اصرار ہے تو ایسا کر کے دیکھ لینے ہیں۔ تبادلے کے بارے میں تو میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ اس ہاتھ دے اور اس آٹھ لے کے سوا کوئی طریقہ اختیار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے یرغمال کے طور پر پیش صرف اپنے آپ کو پیش کرنا چاہتا تھا۔

"کوئی بھی ساتھی اس پر تیار نہیں ہو گا۔ خواہ آپ سب کو ان کے کہے بات کر لیں۔" ٹوٹی بولا۔

"چلو۔۔۔ خیر۔۔۔ فی الحال ڈاکٹر برنارڈ کے پاس چلتے ہیں۔ اس کی بہت زیادہ حفاظت کرنی چاہیے۔ تم تمام ساتھیوں کو بلا کر اپنے مکان پر تعینات کر دو۔ لیکن اس طرح کہ باہر سے کوئی انہیں دیکھنے نہ پاسکے اس کے علاوہ انہیں خاص طور پر یہ بات بھی کر دینا کہ تمہارے گھر پہنچنے وقت ہر ایک خصوصی احتیاط کرے اور ہر اوجھر گھومتے پھرتے بچنے اور اچھی طرح اطمینان کر کے کہہ کر کا تحاقب نہیں کیا جا رہا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تمہارا گھر ابھی ذات کی باقیات کی نظر سے بچا ہوا ہے۔ اب اسے ان کی نظر سے بچا کر ہی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بھی شاید زیادہ دیر

لازوال  
کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی

۷

شاہکار تاول

خبیث (۵ حصے) ۲۰۰/-

برہم چاری ۱۵۰/-

درخشان (۲ حصے) ۹۰/-

رقص ابلیس ۱۵۰/-

آسیب زندہ ۱۱۰/-

دستک ۱۰۰/-



مکتبہ القلش

اردو بازار لاہور

فون ۲۲۲۶۶۵

اندھ بن گئے۔  
"ٹوٹا جائے گا" ٹوٹی ہے پردائی سے کدھے ایک کر بولا  
پھر وہاں ہم لوگوں کی وہاں موجودگی کے دوران میں تو وہ ڈاکٹر پرنا  
وہاں سے نکال کر نہیں لے جاسکتے۔ خواہ وہ اپنی ساری سائنسی  
ابتکارات بھی لے کر آجائیں۔ وہ جو کچھ بھی کر سکیں گے ہماری  
اشیاں پر سے ہی مکر کر کر سکیں گے۔

"میرا خیال ہے" اب سائنسی ابتکارات ان کے پاس کوئی  
اپنی خاص نہیں رہیں۔ سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔" میں نے کہا  
"وہ نہ وی لیڈی کا بات کرنے کا انداز کچھ اور ہوتا۔"

"مگر انہیں سائنسی ابتکارات کی مدد حاصل نہیں ہے تب تو  
انہیں ہمارے قبضے سے کسی کو چھڑانے کے لیے چھوٹی موٹی فوج کی  
ضرورت ہوگی" ٹوٹی بولا۔

"میرا خیال ہے اب ان کے پاس زیادہ آدمی بھی نہیں ہیں۔"  
میں نے کہا "بہر حال بڑے بڑے خطرناک مقامی بدعاشوں اور ہر  
شیز زندگی کے دوسرے لوگوں کی خدمات انہیں پہلے بھی بڑے  
مکرم اعزاز میں حاصل رہی ہیں۔ اب بھی کسی نہ کسی طرح کام تو  
چل رہے ہوں گے۔"

ٹوٹی نے طبیعتی انداز میں سر ہلایا اور سواکل فون پر ساتھیوں کو  
دلیات دینے لگا۔ پھر ہم اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر الگ الگ  
راستوں سے ٹوٹی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ طے کیا بلیا تھا کہ  
ہم ایک ڈوڑا اور دھڑا کر کھڑے کھاتے ہی وہاں پہنچیں گے۔

مجھے راستے میں یقین ہو گیا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا۔  
جب میں نے ٹوٹی کے گھر کا رخ کیا۔ وی لیڈی کو غالباً اندازہ تھا کہ  
تعاقب وغیرہ فرسودہ طریقے تھے اور ہمارے معاملے میں اس سے  
کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں تھی۔ تعاقب کے سلسلے میں ہم اکثر  
یہی مشاہدہ کرتے تھے۔ اس میں تو ان کی کسی کو لینے کے دینے بھی پرکتے  
تھے یعنی تعاقب کرنے والا ہمارے پیٹے بھی چڑھ سکتا تھا۔ اس  
صورت میں اسے ہمارے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہونے  
کے بجائے شاید اپنے بارے میں بہت کچھ اگلا جاتا۔

میں اور ٹوٹی تقریباً ایک ساتھ ہی اس کے گھر پہنچے۔ ٹوٹی نے  
ہماری رپورٹ دی کہ اس کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔ مندر اور  
طیہان وہاں پہلے سے موجود تھے اور چار دیواری کے اندر ہی رہتے  
ہوئے مستعدی سے گھر کی نگرانی کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد شیر شاہ  
اور سوار علی بھی آ پہنچے۔ دو گاڑی پہلے ہی موجود تھیں۔ سب نے  
عکسٹر بمبلی ملے کرتے ہوئے مختلف جگہیں سنبھال لیں۔ ہمارے  
تھیں اور ساتھی منیر، مسعود اور احمد بھی پہنچنے والے تھے۔ اب یہ  
مکان گویا ایک مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔

ہم جب تھ خالے میں پہنچے تو ڈاکٹر پرنا ایک ریوٹر لکھ چھیر  
بجلاؤ کہ رہا تھا۔ ہماری آمد پر چونکا اور ایک طویل بجائی لیتے  
اُسے بجلاؤ "بھئی کہاں ہے وہ لڑکی؟ میں اس کے انتظار میں ہوں۔"

ہو رہا ہوں۔ حالانکہ میرا زہن کی بھرپور دعا کرنے کا پروگرام میں ہے۔  
 ”میں نے کیا تم نے سدا بہار جوانی کا کوئی نسخہ بھی دریافت کر لیا ہے؟“ میں نے اسے گھرا۔

”ہاں“ اس نے اذیت میں سر ہلایا۔ ”اور اسے مذاق سے کہنا۔ سدا بہار جوانی کا نسخہ بھی میرے دریافت کردہ عجیب و غریب چنگوں میں سے ایک ہے۔ اگر میں صرف اسی کو دنیا بھر میں مارکیٹ کرنے کا بندوبست کروں تو ادب پتی ہو سکتا ہوں۔ ایسے کسی نسخے کی تلاش میں دنیا بھر کے سارے سارے گھر گھومتے ہیں۔“

پھر وہ پراسید سے لمبے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔  
 ”جس میں چاہیے؟ اب تم یہ تعلقات کچھ دوستانہ ہی شکل اختیار کدے ہیں تو میں سوچ رہا ہوں کہ جاتے جاتے تمہیں کوئی غصہ دے جاوے۔“

”تم اپنا غصہ اپنے پاس ہی رکھو“ میں نے سخت لمبے میں کہا۔  
 ”میں بھی اصل کام بیچ میں لگا ہوا ہے اور تمہیں دائمی جوانی کے نسخے کی پڑی ہوئی ہے۔“

اس غیبت کا کوئی مجھ کو مانتا نہیں تھا کہ جاتے جاتے دائمی جوانی کے نام پر کوئی ایسا غصہ دے جاوے کہ انسان اپنی موجودہ جوانی کو بھی چراغ کے گرد ڈھونڈتا پھرے۔ ویسے بھی مجھے سدا بہار جوانی کی کوئی ایسی ہوس نہیں تھی۔ جب انسان کے ظاہری سراپا بالکل ہی زوال آجائے تو پھر جوانی کچھ بے میل ہی چیز ہو جاتی ہے۔ بری پینک میں اچھا سامان کچھ ایسا اچھا بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ قدرت کا اپنا نظام بس جس طرح چل رہا تھا اسی طرح ٹھیک تھا۔ اس میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

”کام بیچ میں تو تم نے لٹکایا ہوا ہے“ ڈاکٹر برٹنڈیولا۔ ”میری تو سب تیاہیاں مکمل ہیں۔ تمام ٹیمیکل اور فلٹرز تیار ہیں۔ میں تو انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ لڑکی کہاں ہے؟ اب تو واقعی خود مجھے بھی اس پر ترس مانتے لگے۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر اپنا قارمولا آزما کر زیادتی کی تھی۔ چلو یہ بھی اچھا ہے کہ مجھے اپنی زیادتی کی ظانی کا موقع مل رہا ہے۔“

وہ واقعی ایک بڑا ہوا انسان لگ رہا تھا لیکن افسوس جب وہ بدلا تھا تو صورت حال بھی بدل گئی تھی۔ میں نے گہری دھمکی دی۔ لڑکی نے ایک کھٹے بعد فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ ایک گھنٹا پورا ہوئے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔

ڈاکٹر برٹنڈیولا۔ ”تم جیسا قدر شناس آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میں کسی اور کو اپنا نسخہ دینے کی بات کرتا تو وہ خوشی سے اچھل کر چھت سے جا گرتا اور پھر میرے پیروں میں گر پڑتا۔ لیکن۔۔۔ تم۔۔۔ دنیا پر تم کے بے ہودہ لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ فی الحال اس معاملے کو چھوڑ دیجئے ہیں۔ لڑکی کہاں ہے؟ بلاؤ نا اسے۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ”میں اسے کہہ چکا ہوں کہ اسے سب کچھ چاہیے تو لڑکی نہیں آسکتی۔ البتہ جس میں غولی کا چاہیے کہ جس میں لک میرا بھی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ذرا چڑکا۔  
 ”یہ کام ہو جانے کے بعد دیئے بھی ہمارا ارادہ جس میں کر دیتے گا ہی تھا۔ ہم نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے صدقہ ملنے بجائے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن میں وقت پر تمہاری ”دی لڑکی“ کی ضروری مستحق کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہاری مدد کو پہنچ گیا۔ اس نے راجیل کو اغوا کر لیا ہے اور اسے چھوڑنے کے لیے اس نے شرارت کی ہے کہ پہلے جس میں رہا کیا جائے۔“

”دی لڑکی؟“ ڈاکٹر برٹنڈیولا نے بے چینی سے ڈھیر لادہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی۔ ”کیا اس نے واقعی راجیل کو اغوا کر لیا ہے؟ کیا دی لڑکی نے خود تم سے بات کی تھی؟ اس نے کچھ اس طرح یہ سوال کیا تھا جیسے دی لڑکی کا کسی سے بات کا اس شخص کے لیے ایک اعزاز ہو۔

”البتہ اس نے خود مجھے شرف بہکلائی بخشا تھا۔ کسی ترخان کے توسط سے بات نہیں کی تھی“ میں نے استہزاء بے میں کہا۔

وہ میرے لمبے میں پنہاں ہٹ کر محسوس کرتے ہوئے ہلا۔  
 میں ہٹ کر کوئی بات نہیں ہے۔ تم اسے اپنے لیے واقعی اعزاز سمجھ کر دی لڑکی نے تم سے بات کی ہے۔ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ ورنہ شاید تم بھی اس کی آواز نہ سن پاتے۔ ریڈ ڈاٹ کے خلاف اتنا بڑا آپریشن ہونا۔ ریڈ ڈاٹ تمہارے ملک میں غلامی قائم ہوئی لیکن اس دوران میں ”دی لڑکی“ نے تم سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے بعد میں دی لڑکی کے لیے بے پناہ احترام اور عقیدت تھی۔

”تم تو کچھ اس طرح اس کا ذکر کر رہے ہو جیسے وہ کسی ایسے ملک کی سربراہ ہے جو سپر پاورز میں شمار ہوتا ہے“ میں نے جان بوجھ کر اب بھی اپنا لہجہ استہزاء ہی رکھا۔

”وہ تو خود اپنی جگہ ایک سپر پاور ہے“ وہ غصی سا لہجہ بولا۔ ”تم اس سارے قصے کے دوران میں اسے نہیں جان سکتے شاید یہ تمہارے حق میں اچھا ہی ہوا۔ اگر کوئی مرد اس کے عرصہ گرفتار ہو جائے تو پھر وہ پورا نہ ہو کر ہی مرے گا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں وہ میں مرتبہ دور سے اسے دیکھ چکا ہوں۔ تم خواہ مخواہ کسی ماہر داستان کو گمراہ کر دیتے ہو۔ بھڑکانے کی کوشش مت کرو۔ میرا اس کے عرصہ گرفتار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

”جس دن تم نے اسے قریب سے۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ معنوں میں قریب سے دیکھ لیا اس دن یہ جملہ تمہاری زبان سے آئے گا۔ وہ تمہیں کبھی بنا کر دیکھو اسے چپکائے گی اور تم بچو“

اعجاز کرنے کی کوشش کی۔

”تمہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے“ وہ مجھ لیجے میں

بول۔

”میرے لیے یہ خوشی کا مقام ہے“ میں نے کہا ”میں اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ بہر حال یہ حیرت کی بات ہے کہ ریڈ ڈاٹ سے اتنے طویل تصادم یا دوستانہ ملاقاتوں کے دوران میں کبھی اس سے یا قاعدہ سامنا نہیں ہوا۔ کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا۔“

”اس کا سامنے آنا ضروری نہیں تھا۔ اس وقت اس کی حیثیت واقعی ایک ملک کی تھی۔ بہر حال تمام کارروائیوں کو وہی کنٹرول کر رہی تھی۔“

”کبھی ریڈ ڈاٹ کا بیڑا غرق ہو گیا“ میں نے سہلاتے ہوئے

کہا۔

”وہ ایک الگ کہانی ہے جس پر طویل بحث کی جاسکتی ہے“ وہ

بول۔

”جس کا اب کوئی نامہ نہیں ہے“ میں نے کہا ”شعبہ ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ ریڈ ڈاٹ کا مرکزی سربراہ کون ہے؟ سب سے بڑا آدمی۔۔۔ بگ باس؟ یا وہ بھی کوئی عورت ہے؟“

”یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ جتنے لوگ یہاں کی شاخ سے متعلق تھے، کم از کم انہیں تو معلوم نہیں تھا“ اس نے جواب دیا۔

”ہنگو اس مت کرو۔ تم جھوٹ بول رہے ہو“ میں نے دوستانہ لیجے میں کہا۔

”بگ باس“ میں نے جھٹ کی طرف دیکھ کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں ”تم تو واقعی اس کی شان میں کوئی لمبا فیصلہ تحقیق کرنے کی فکر میں ہو۔ یہ سب کچھ اس تم ذاتی تجربے کی بنا پر کر رہے ہو یا سنی شائیاں باتیں ہیں؟“

”ہم جیوں کی یہ خیال کہاں کر اس سے ذرا بے تعلقی سے بات بھی کر سکیں۔ ہمارے لیے تو اس کی حیثیت تقریباً وہی ہے جو ملاہوں کے لیے ملک کی۔ لیکن اس کے حرمیں الجھ کر میں نے تم سے کبیں زیادہ باور روزگار حرم کی خصوصیتوں کو یوں تباہ ہونے دیکھا ہے جیسے پرانے شبن کی طرف چلکا ہے اور ایک لمحے میں خاک ہوا ہے۔“

”جس بس۔ ایسی شاعرانہ مثالیں مت دو۔ تم تو واقعی اپنی طرح اس کا حق شک ادا کرنے پر تلے ہوئے ہو“ میں نے ڈرے بڑا دی سے کہا۔ ”اسے شمع سے تشبیہ بھی مت دو۔ شمع تو شعلہ بردوش ہوتی ہے۔ دی لیز کی کو دیکھ کر تو کلیئیر کا خیال آتا ہے۔ ناقص نظر پھیلا ہوا ایک برف زاب؟“

”مظاہرہ ہی ہے تمہاری۔ نظر کا دھوکا ہے“ وہ ہاتھ ہلا کر گویا میری کسی یادیدہ خیر پر خطہ متنبخ پھیرتے ہوئے بولا ”بعض آتش لظان بھی کلیئیر کا لبادہ اوڑھے کھڑے ہوتے ہیں۔“

”تم اس کی شان میں شاعری ہی کیے جاؤ گے یا یہ بھی بتاؤ گے کہ وہ درحقیقت ہے کون؟“ میں نے قدرے ناگوار دی سے کہا۔

”وہ ریڈ ڈاٹ کی پاکستان میں ریڈیٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ میرا مطلب ہے وہ تو اب بھی ریڈیٹنٹ ڈائریکٹر ہے۔ لیکن ریڈ ڈاٹ کی مقامی شاخ ختم ہو چکی ہے۔ شاید اب اسے کہیں اور تعینات کر دیا جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”وہ خدا یا۔۔۔“ میں نے طویل سانس لی ”تم نے تو اس طرح طرہ نامہ رکھا تھا جیسے دنیا کی کسی اہم ترین شخصیت کا ذکر کر رہے ہو۔ لیکن ہے۔ ریڈ ڈاٹ ایک بہت ترقی یافتہ اور بہت ہی جدید خطوط پر استوار ”تنظیم“ ہے۔ اسے تمام ترقی یافتہ سفید فام قوموں کی بھرپور پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ پھر بھی شادی اور پر تو اس کا کام بہرنامہ اور ترقی پزیر ملکوں کی جڑیں مزید کھوکھلا کرنا۔ انہیں ہر وقت فتنہ فساد اور عدم استحکام سے دوچار رکھنا۔ ان کے وسائل پر قبضہ کرنا اور رنز و رفتہ انہیں قلام پھٹائی ہے۔ اس لحاظ سے اسے ایک کمزور تنظیم ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی مقامی شاخ کی ریڈیٹنٹ ڈائریکٹر ہونا کوئی ایسے فکر کی بات نہیں۔“

”تمہاری نظر میں نہیں ہوگی۔ ہماری نظر میں تو ہے“ وہ دھٹائی سے بولا۔

”چھانچھ۔ اختلافی پہلو کو تو چھوڑ دو۔ ویسے بھی یہ کوئی بہت بڑا معاملہ تو نہیں ہے“ میں نے اپنے لیجے سے قدرے حشرات کا

جالب کی شعری سیاسی جدوجہد کی معتبر و موثر دستاویز

**جالب انصاف کا طالب**

مرتبہ: ضیاء ساجد

قیمت: =/100

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

”میں اب جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم ان باتوں کو چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ دی لیڈی نے تم سے کیا کہا؟“ اس نے تجھ سے پوچھا۔

”وہ چاہتی ہے کہ ہم جیسے رہا کریں۔ بعد میں وہ راحیلہ کو رہا کرے گی۔ اگر اس نے واقعی راحیلہ کو رہا کر دیا تب بھی اس کا چہرہ ٹھیک کرانے کا معاملہ سچ میں ہی رہ جائے گا۔ ساری جدوجہد بے کار ہو جاتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

اسے گویا ہماری پریکٹسوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ باجیس کھاتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میرے سلسلے میں اس نے خود تم سے بات کی اور اس معاملے میں خود آگے آئی ہے۔ وہ بہت ہی اہم معاملات میں خود آگے آتی ہے۔ موجودہ حالات میں میں تنظیم کے لیے ایک قیمتی اضافہ ہوں“ وہ گویا غرور سے بولا۔

”کیا کہنے اس اضافے کے؟“ میں نے اس کے سر ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ہوتے ہیں اضافے؟“ اس اضافے نے بھی آہستہ میں شکل دیکھی ہے اپنی؟“

”جیہ“ میں بڑا نہیں مٹاؤں گا“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو دراصل کھیاں کی کھیاں توج رہی ہے۔ یہ بتاؤ ملے کیا پایا ہے؟“

”تمہاری ملکہ عالیہ نے ایک کھینے بعد دوبارہ فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ اب کسی بھی لمحے اس کا فون آنے والا ہو گا“ میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

فونی نے موبائل فون کو ایک اسٹیوینٹ سے منسلک کر دیا تھا تاکہ ہم جیسے دوسری طرف سے آنے والی آواز بیک وقت اچانک پر مٹ سکیں ”تمہاری ملکہ عالیہ تم سے بھی بات کرنا چاہتی ہیں“ میں نے ڈاکٹر برنارڈ کو مطلع کیا۔ ”مجھے اس سے تمہاری بات کرانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو کہ زیادہ ہو شمار بننے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم نے کوئی بھی غیر ضروری بات کی یا کسی بھی بات سے ہمارے مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو یہ بات یقینی ہوگی کہ آئندہ تم بات کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔ میرا مطلب ہے“ اس جہان قالی سے کوچ کر جاؤ گے۔ دیکھو ہائی داد سے۔ ہمیں میری یہ ”بات“ کی تکرار کرنی پڑی؟“

”بہت بُری۔“ اس نے جلتا ہوا جواب دیا ”مجھے دھمکیاں دینے کی کوشش مت کرو۔ میں ایسی باتوں کا بہت بُرا مانتا ہوں۔ دیکھو۔ آپس کی بات ہے۔ تم نے کو کہ میرا پاس جلا کر بہت بُرا کیا۔ اس کے باوجود اب میں واقعی دل میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس لڑکی کا چہرہ ٹھیک کر دینا چاہیے۔ میں یہ کام اپنی خوشی سے کر رہا تھا اور میرا اس میں گریز کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن بہر حال۔۔۔ اب میں جو کچھ بھی کروں گا“ دی لیڈی کی ہدایت کے مطابق کروں گا۔“

”چاہے تمہارا دوسرا پاس بھی جل جائے؟“ میں نے پوچھا۔ ”چاہے میں سارا ہی جل جاؤں“ اس نے بے غورانہ جواب دیا۔

میں نے محبت کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں ہاتھ اٹھا دیے۔ ”وہاں بہت سے اللہ میاں! اس دنیا میں جتنی بڑا درد سرے بندوں کے حکم کے کتنے آتی ہیں۔ لیکن آپ انہوں سے بڑے ہیں۔ خالق کائنات ہیں۔ آپ کا وہ ایک حکم نہیں ماننے۔“

میں نے ہاتھ نیچے کر لیے اور لاشی سانس کے کرہ کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا ”یہ تم نے کیا دیکھا کر دیا تھا؟“

”گدھے کہیں کے! یہ دعا نہیں تو۔۔۔ یہ تو بندوں کی ہمت پرستی پر ذرا حیرت کا اظہار تھا“ میں نے لاشی سے کہا۔ ”میں نے یہ باتیں تو تو نے ہی سچ میں آجائی ہیں۔ اصل اور اہم بات یہ ہے کہ تم اور تمہاری وہ ملکہ عالیہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ تم تو کافی محسوس آؤ گی۔ ریلڈ ذات سے تعلق رکھنے والا ظاہر ہے کہ اچھا آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اگر ہو سکے تو اس معاملے میں کوئی اچھا کردار ادا کرنے کی کوشش کرنا کہ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تمہاری ہم سے اور ہماری تم سے جلد از جلد جان چھوٹ جائے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ راحیلہ کا جو تسلی بخش طور پر ٹھیک ہوئے بغیر ہم جیسے نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ کام نہایت بڑے سکون طریقے سے ہو جانا“ اگر تمہاری یہ ملکہ عالیہ سچ میں نہ کوہڑیں۔“

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں“ وہ دھیمے لہجے میں بولا ”میں تمہارا نظریں کتنا ہی محسوس آؤ گی سہی لیکن اس کام کے سلسلے میں میرا غور سے سمجھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہر حال صاف گولی اور دانت داری کی بات یہ ہے کہ اب میں وہی کروں گا جو دی لیڈی کا حکم ہو گا۔“

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ میرے گھورنے کا اس نے کوئی فوٹ نہیں لیا اور پُر اشتیاق نظروں سے فون کو دیکھنے لگا۔ چہرے پر ہر لمحہ تنگی آئی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اگر یہ دی لیڈی ہی کا فون تھا تو اس نے واقعی ہانڈی وقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد فون آیا تھا۔

میں نے فون آن کیا۔ دوسری طرف دی لیڈی ہی تھی۔ ”ام دیو کی تعریف کے بعد اس نے پہلا سوال ڈاکٹر برنارڈی کے بارے میں کیا“ برنارڈیاں موجود ہے یا نہیں؟“

میرے جواب دینے کے بجائے برنارڈ خود ہی بول اٹھا ”میں! میں یہاں موجود ہوں“ اس کے لیے سے عجیب سا اشاریہ عیاں تھا۔ میں ممکن ہے وہ مجھ سے اشتیاق رہا ہو۔ مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہوا ہو۔ بعض لوگوں کی محبوبیت یا عاشقی میں بھی تو ہچکچاہٹ پن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا

ایہا اور کانوں سے نہ سن رہا ہوتا تو شاید مجھے یقین نہ آتا کہ  
پائے لب اور سانس کا ایک ایسا جھینش کچھ لوگوں کے ہاتھوں  
پر کھلنا پڑتا ہوگا اور اس میں اس کی خوشی بھی شامل ہوتی  
ہوگی۔ بہر حال دنیا ایک جانب خاتمہ تھی۔ لاکھوں سال سے مفکرین  
دور انداز سے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک میں بے جا رہ  
کے شاد و قطار میں تھا۔

اینٹیوٹ کی وجہ سے ہم تینوں بیک وقت دی لیڈی کی آواز  
سن رہے تھے اور سیٹ ہاتھ میں لینے کی زحمت کیے بغیر اس سے  
بات بھی کر سکتے تھے۔ یہ گویا چار افراد کے درمیان کا ٹرنس شروع  
ہو رہی تھی جن میں سے ایک نہ جانے کہاں تھی۔  
”ہر بارہ! انہوں نے تم پر تشدد تو نہیں کیا؟“ دی لیڈی نے  
خستہ سے لہجے میں پوچھا۔

برنارڈ نے باری باری میری اور نونی کی طرف دیکھا پھر یکدم غیر  
اداری سے انداز میں ہل اٹھا ”میڈم! انہوں نے میرا پاؤں دبڑے  
ٹپا اٹھا۔“

”کوئی بات نہیں۔۔۔ ہم راحیلہ کے دونوں پاؤں دبڑے  
جلا دیں گے“ دی لیڈی سناک لہجے میں بولی ”میں دیکھ چکی ہوں“  
اس کے پاؤں بڑے خوب صورت ہیں۔ جل کر جب وہ مڑی تھی  
فل اٹھار کر س کے تو تمہارا حساب برابر ہو جائے گا۔ تم دل چھوٹا  
ذکرہ افضل آتم سن رہے ہو نا؟“

میرے جسم میں سر دی لہر دوڑ گئی۔ مجھے معلوم تھا وہ صرف  
مجھے سنانے کے لیے یہ بات نہیں کر رہی تھی۔ میں نے اپنے لہجے کو  
پاکوں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”معاذات کو مزید پیچیدہ  
مت بناؤ دی لیڈی! ہم تقاضا تشدد پسند لوگ نہیں ہیں۔ ہم نے شخص  
لفظ اندوز ہونے کے لیے برنارڈ کا پاؤں نہیں جلا یا تھا اور نہ ہی  
اس سے کوئی ناجائز مطالبہ یا ایسی فرمائش کر رہے تھے جو برا کرنا  
اس کے کسی کی بات نہ تھی۔ راحیلہ کا چہرہ اسی نے خراب کیا تھا  
اور یہ اسے ٹھیک بھی کر سکتا تھا۔ ہم اس سے صرف یہی مطالبہ  
کر رہے تھے اس میں کون سی ایسی ناجائز بات تھی؟ مگر یہ کسی  
طرح مان کر ہی نہیں دے رہا تھا اور یادداشت کھوجانے کی  
اولاد کی کہنے پر تلا ہوا تھا۔ ہم نے جو کچھ کیا باہل باخواسہ اور  
بائی جھوڑی کے عالم میں کیا۔ ہمیں اس پر تقاضا خوش نہیں ہے۔ اگر  
اس نے جلدی وہ کام کر دیا ہوتا تو شاید مسئلہ یہ سرخی اقتدار نہ کرتا  
اور اس وقت اس کی رہائی قریب ہوتی۔ اس سے پوچھ لو کہ جب  
اس نے اپنی بی بی کی ہوائی اس حرکت کی تلائی کا وعدہ کیا ہے کیا  
اس کے بعد سے اسے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟ اسے اس کے سوختہ  
پالکے کے طلاق کے لیے ہر سولت فراہم کی جا رہی ہے۔ یہ خود اپنا  
طلاق کر رہا ہے۔ اس سیاق و سباق کو غور نظر رکھتے ہوئے اسے ظلم  
نہیں کیا جا سکتا۔“

دی لیڈی غالباً سمجھ چکی تھی کہ ہم بیک وقت اس کی آواز سن  
رہے تھے۔ وہ برنارڈ سے خطاب ہوئی ”کیا افضل ٹھیک کہہ رہا ہے

نگہتراش

اعظم علیم قیمت 300/-

کئی باتیں ضروری رہ گئی ہیں

محسن نقوی

قیمت: =/100

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور

برنارڈ؟“

”ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی انہیں ایسا نہیں کرنا  
چاہیے تھا۔“ برنارڈ نے جواب دیا۔ یہ عجیب منطق تھی۔ اس کا  
لہجہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے گلی کو پتے میں کوئی پتہ اپنے ہم عصروں سے لا  
بھڑ کر مار کھانچا ہو اور اوپر سے اس کی ماں آگئی ہو۔ وہ اس کے  
سامنے دو رو کر اپنے اوپر ہونے والے مظالم بیان کر رہا ہو اور جب  
اس کی ماں نے تصدیق کرنے کی کوشش کی ہو کہ اس کا بھی کوئی  
قصور تو نہیں تھا۔۔۔ تو وہ شکوہ آمیز انداز میں کہہ رہا ہو۔ ”مگر میرا  
قصور تھا تب بھی تمہیں حمایت کرنی چاہیے۔ تم تو میری ماں  
ہو۔“

فرق صرف یہ تھا کہ دی لیڈی اس کی ماں نہیں تھی۔

میں نے دی لیڈی کو مخاطب کیا ”میری تم سے درخواست ہے  
کہ نئے جھگڑوں میں الجھنے اور نئی بحث پھیلنے کے بجائے اصل  
مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ یاد رکھنا کہ اگر راحیلہ کو کچھ ہوا  
تو ہم اس کی بازیابی یا اس کا چہرہ ٹھیک کرانے کے معاملے میں میر  
کر لیں گے۔ ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے لیکن ڈاکٹر



کے کردہ بانوں کی طرح "جنگلی قیدیوں" کا جالہ عمل میں آتا تھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہم بھی اسے ایک تھراپیڈیٹر سمجھ کر قبول تو کر سکتے ہیں لیکن مجھے ایک بار پھر بوجھنے کے لیے تم سے کچھ ملت لینا پڑے گی۔ میں پندرہ منٹ بعد ایک بار فون کروں گی۔ اگر ہمیں یہ تجویز منظور ہوئی تب بھی اس پر آمادہ عمل کسی وقت ہی ہو سکے گا۔ ہم دن کی روشنی میں ہی اس عمل درآمد کرنا پسند کریں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ میری نیت صاف ہے۔ صرف تمہاری بے اعتباری کی وجہ سے یہ سارا اتروڈ کرنا پڑا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"بے اعتباری کا مسئلہ تو اس تجویز میں بھی حاکیں ہو رہا لیکن ہر حال۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا" وہ بولی۔

"مجھے برف پگھلے گی۔ جیسی کہہ چکے گی" میں نے کہا۔  
 "میں پندرہ منٹ بعد تمہیں دوبارہ فون کروں گی۔ اور آؤ براؤڈ! تمہارا کیا موڈ ہے؟ تم اس لڑکی کا چو ٹھیک کرنا چاہتے نہیں؟"

"جیسے آپ کا حکم ہو میڈم" براؤڈ کچھ اس طرح متوجہ ہوا جیسے وہ اپنی ملکہ عالیہ کی آواز محض فون پر نہ سن رہا ہو یا قاعدہ اس کے دربار میں حاضر ہو۔ حتیٰ کہ اس کا سر بھی جھکا ہوا گویا نظر اٹھا کر دیکھنے پر اسے گستاخی کا مرتکب ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

"اس معاملے میں تمہاری اپنی رائے کو بھی اہمیت دی جا۔ گی۔ ان لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوتا چاہیے کہ انہوں نے تمہاری مرضی کے خلاف بھی کام لے لیا تھا" وہی لڑکی اپنے سے اپنے آپ کو واقعی کوئی ملکہ ہی ثابت کرنے کی کوشش کرنا لگی تھی۔

"آپ تو آپ سے رابطہ ہو گیا ہے۔ اب کوئی مجھ سے ہر مرضی۔ یا آپ کی مرضی کے خلاف کام نہیں لے سکتا" براؤڈ کے لیے میں ایک لمحے کے لیے فخر جھک گیا لیکن پھر وہ گماہر چنگی تھی۔ بلکہ ڈرتے ہوئے بولا تو ایسے میرا خیال تو ٹھیک تھا کہ کام کر ہی دیا جائے تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ اور پھر ہم لوگوں جانا بھی ہے۔ اب کوئی دشمن نہ پڑے تو اچھا ہے۔ ہر حال۔ آخری حکم تو آپ کا ہی پلے گا۔ ہمیں وی کرنا چاہیے جو مناسب سمجھتی ہوں۔"

وہ تقریباً گھٹایا در تھا اور مجھے اتنے تیز و طرار اور شاطر انسان گھٹکاتے دیکھ کر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں پندرہ منٹ بعد پھر فون کروں گی۔" وہ لڑکی نے کہا اور سلسلہ منتقل ہو گیا۔

مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس معاملے میں کوئی قیادہ کرنے سے پہلے کسی سے مشورہ کر رہی تھی۔ کوئی ہیڈ نہیں تھا کہ

براؤڈ کی لاش کے کٹے چھبر کسی دیران سڑک پر مل جائیں گے۔

"مجھے دھمکیاں مت دے" وہی لڑکی نے گویا مجھے پکارا لیکن اس مشق نہ لیجے اس درحقیقت تجویز کی کٹ پھانسی تھی۔  
 "تم بھی راجیلہ کو کوئی اہمیت دینے کا خیال دل سے نکال دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "وہ بغیر کسی قصور کے پہلے ہی کافی سزا بھگت چکی ہے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی تو میں نے تجویز سے کہا "ان فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کی بات کرو۔ میں ایک تجویز پیش کر رہا ہوں۔ تمہیں منظور ہو تو اس میں دونوں کا بھلا ہے۔ میں راجیلہ کے بدلے اپنا عزیز ترین ساتھی حمانت کے طور پر تمہاری تحویل میں دے دیتا ہوں۔ تم راجیلہ کو چھوڑ دو۔ راجیلہ کا چو ٹھیک ہونے اور ایک ہفتہ گزرنے کے بعد میں براؤڈ کو چھوڑ دوں گا۔ اس کے بدلے تم میرے ساتھی کو چھوڑ دیتا۔ دونوں مرتبہ تیار لے آئے سائے اور بیک وقت عمل میں آئیں گے اگر ہم میں سے کوئی بھی زیادہ ہو شیار بننے کی کوشش نہ کرے اور شرافت سے اس تجویز پر عمل کرے تو ایک دوسرے پر تمام تر بے اعتباری کے بارود پر مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو سکتا ہے۔"

وہ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر اٹھ کر اس کا ہنگامہ اُبھرا "اس تجویز پر عمل درآمد کس طرح ہو گا؟"

"بالکل سیدھے سادے اور روایت دارانہ طریقے سے" میں نے جواب دیا "جبکہ تم تجویز کرنا۔ کوئی ٹھکانہ سیدان یا دیران سڑک ہوئی چاہیے جہاں ہم دوسرے ایک دوسرے کو آتے دیکھ سکیں اور یہ بھی دیکھ سکیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے مزید کچھ لوگ تو نہیں آ رہے؟ تم بھی صرف ایک گاڑی لے کر آنا۔ ہم بھی صرف ایک گاڑی میں آئیں گے میرے ساتھ ٹوٹی کے علاوہ دو آوی اور ہوں گے تم بھی اپنے ساتھ راجیلہ کے علاوہ دو آوی لا سکتی ہو۔ ہمارے پاس ہتھیار ہوں گے تم لوگ بھی ہتھیار لا سکتے ہو لیکن یہ شخص ایک احتیاط ہوگی۔ تم اپنے آویوں کو یہ ہدایت کر کے ساتھ لانا کہ تمہارے حکم کے بغیر کوئی گولی نہیں چلانے کا اور میرے آوی بھی میرے اس حکم کے پابند ہوں گے۔ ہم دونوں کو اپنے آپ سے یہ عہد کر کے چنا ہو گا کہ کوئی گولی نہیں چلے گی ورنہ پھر تمہیں سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم میں سے کون زندہ رہے گا اور کون نہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی مشکل ہو گا کہ کوئی بچے گا بھی یا نہیں۔ میرا خیال ہے ہم میں اتنی محفل تو موجود ہی ہے کہ ہم ایک بے کاغذ تصادم سے بچنے کی کوشش کریں۔ تم راجیلہ کو ہمارے حوالے کرنا۔ میں ٹوٹی کو حمانت کے طور پر تمہارے سپرد کروں گا۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد اسی طرح پرامن اور پرسکون انداز میں ٹوٹی اور ڈاکٹر براؤڈ کا تبادلہ عمل میں آجائے گا۔"

وہ دیر سے یہی بہت خوب۔ بہت خوب۔ گویا گھٹیا قسم

ایات بیرون ملک سے آری ہوں۔ ڈاکٹر برٹارڈ سے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا منظور تھا۔

دی لیڈی سے بات کرنے کے بعد برٹارڈ کے چہرے پر شائستہ چمکی تھی۔ اس کا گویا بیرون خون پڑھ گیا تھا۔ اس کی رنگت کو کہ اب بھی کافی سی تھی۔ اس کے باوجود اس کی گفتگو کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے اوپر جو سیارہ رنگ چھایا ہوا تھا وہ اس کے حساب سے ”چمکا“ تھا۔ گو کہ ویسے تو وہ بھی کسی چیز سے اثر نہیں سکتا تھا لیکن جب وہ چاہتا تو پانی میں محض ایک بمبیکل گھول کر نہانے سے اسے آسرا سکتا تھا۔ یعنی وہ ہاتھ دوم میں جاتا تو سیارہ فام ہوتا۔ باہر آتا تو سفید فام ہوتا۔ کینٹ نے جب نارسلے سے تیار کر رکھے تھے۔ انسانوں کو کیا یا پکار نکلتا۔ کپڑوں کو رنگنے کے برابر بنایا تھا۔

”اب ہمیں تسماری ملکہ عالیہ کے فون کے لیے مزید چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا“ میں نے ناگواری سے کہا۔

ڈاکٹر برٹارڈ نے لپکا سا قہقہہ لگایا۔ اب وہ گویا میری حالت سے ٹھوکانے کی پوزیشن میں آ گیا تھا ”پہنچے تم خوب ہو!“ وہ چمکا ”دی لیڈی نے تسماری ڈھکی رگ پکڑی ہے۔ اب کیسے شرفانہ سادوں کی پیشکش کرنے پر اتر آئے ہو ورنہ تم ایسی شرفانہ تجویزیں پیش کرنے والے کہاں تھے!“

”میں نے تو پہلے بھی بہت سی شرفانہ تجاویز پیش کی تھیں جن کا تمہیں علم نہیں ہے دو ٹاکوں والے ٹیکڑے!“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”مگر ریڈ ڈاٹ کو وہ تجاویز سننے کی فرصت کہاں تھی۔ سب سے شرفانہ تجویز تو یہی تھی کہ وہ اپنے تمام ”خیشانہ“ برادر ام سمیت کمریاں سے دفعتاً ہوجاتی تو اس کا اور ہمارا کوئی بھگوان نہیں تھا لیکن وہ مجھے اور میری تجاویز کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پہلے انہوں نے مجھے اپنا آواز کارہانے کے لیے گھر بٹھایا اور میرے مسلسل انکار کے بعد مجھے اپنا سب سے بڑا مقرب قرار دے دیا۔“

”یہ سب کچھ مجھے معلوم ہے۔ میں اس کھیل کا ایک حصہ تھا“ برٹارڈ بولا۔

”تسمارے اس منہوس کھیل نے کتنی حجابی پھیلائی“ میں نے نفرت سے کہا۔

وہ ایک بار پھر ہنسا۔ اب تو وہ اپنے پاؤں کی تکلیف بھی بھول چکا تھا ”مجھے تو تم سے چھوٹ گئے ہو۔ جو کچھ آگے چل کر ہونا تھا اس کے مقابلے میں تو یہ حجابی کچھ بھی نہیں تھی۔“

میں نے اسے گھورا۔ وہ اپنی ٹیڑھی میز می استخوانی سی انگلیوں سے میز کھٹکاتے ہوئے کچھ ٹکٹانے لگا۔ میں نے ٹوٹی کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ صاف تھا۔ پندرہ منٹ بھی آخر کار کسی نہ کسی طرح گزر رہی تھیں۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ دی لیڈی کی آواز ایک

بار پھر میرے احصاب میں ارتعاش ساید اکٹھے لگی۔

”... ٹھیک ہے۔“ میں تسماری تجویز منظور ہے ”وہ کہہ رہی تھی۔“ خفیلات ہم صبح اٹے کر آگے ہم اسے ایک چھوٹا۔ ایڈیو پھر سمجھ کر قبول کر رہے ہیں لیکن تم اس میں کوئی جوا کھیلنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”ہرگز نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں“ میں نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

اس نے خدا حافظ کے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کا انداز گفتگو نہایت کاروباری تھا۔ وہ فصول باتوں میں ذرا بھی وقت ضائع نہیں کرتی تھی۔ اس نے کل فون کرنے کا کوئی وقت نہیں بتایا تھا۔ وہ یقیناً احتیاط برت رہی تھی اور پروگرام اچانک بتانا چاہتی تھی۔

میں نے ٹوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اب ہمیں صرف انتظار کرنا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کھانا کھا کر سو جانا چاہیے اور علی الصبح اٹھ کر تیار رہنا چاہیے۔ کل کسی وقت بھی دی لیڈی کی طرف سے بلاوا آسکتا ہے۔ یہ تجویز تمہاری ہے۔ ایک بار پھر اس کے بارے میں سوچ لو۔“

”اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں سراسر“ ٹوٹی مسکراتے ہوئے بولا ”خوشی کی بات یہ ہے کہ ہماری فضا کے مطابق معاملے طے پا گیا۔ اس میں زیادہ خطرات پوشیدہ نہیں ہیں ورنہ میں تو اس کی بتائی ہوئی جگہ پر تھا اور نہتا جانے کے لیے بھی تیار تھا۔“

”ٹوٹی! تم مجھے اتنا ذرا نہ کہو کہ میں بالکل ہی سر نہ اٹھا سکوں۔“ مجھے خود اپنا لہجہ عجیب سا محسوس ہوا۔

”سراسر آپ کیسی باخبر کر رہے ہیں۔ ہم تو جان دے کر بھی آپ کو زیر بار نہیں کر سکتے کیونکہ آپ سے طاقت نہ ہوئی ہوئی تو شاید یہ جان بھی کسی پولیس مقابلے میں جا چکی ہوئی۔ یہ سارا فحاش باٹ۔ معاشرے میں یہ عزت آپ ہی کی وجہ سے ہے ورنہ اگر ہم زندہ بچ بھی گئے ہوتے تو شاید آج بھی گولیوں سے بچتے بچتے جنگوں ہی میں بھٹک رہے ہوتے۔“ وہ دھیمی آواز میں کہتا چلا گیا۔

”گڑے گڑے مت اکھاڑ کر۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔

پھر ہمیں کل کی صبح پر ساتھ لے جانے کے لیے دو ساتھیوں کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا۔ ڈاکٹر برٹارڈ بڑے غور سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کی معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لیے ہم دو خانے سے نکل آئے اور آکر ہم نے فیصلہ کیا کہ کل شیریں شاہ اور سردار علی کو ساتھ لے جایا جائے گا۔ ہمارے ساتھیوں میں ٹوٹی اور شفیق شاہ کے بعد وہی سب سے زیادہ باصلاحیت تھے۔ عمر میں گو کہ وہ ٹوٹی اور شفیق شاہ سے کچھ بڑے تھے لیکن صلاحیتوں، تجربے اور مشائی و نہارت میں ان سے ذرا پیچھے تھے۔ ٹوٹی اور شفیق شاہ تو بڑے ہی باکمال اور بے مثال نوجوان تھے۔

یہ فیصلہ ہو جانے اور ان دونوں کو صورت حال سمجھانے کے

بعد میں کھانا کھا کر کافی اطمینان کے عالم میں سو گیا۔ صبح الارم نے بجے جگایا اور میں خاصی پھرتی سے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ گیا۔ وہاں ٹونی، شیر شیخ اور سردار علی پہلے سے موجود تھے اور میرے ہی خنجر تھے۔ ٹونی اور سردار علی بے فکری سے کچھ نمی مذاق کر رہے تھے جبکہ شیر شیخ خاموشی سے اپنی گھٹی اور بارمب مونچھوں کو پر خیال انداز میں مل دے رہا تھا۔ ٹونی کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ فرخوان اپنے آپ کو ایک ایسی عظیم کی سر راہ کے پاس بطور پر غمال جانے کے لیے پیش کر رہا تھا جس کے ساتھ ہم نے ایک طویل عرصے تک زندگی اور موت کی جنگ لڑی تھی۔

میرے پیچھے ہی ناشتا میز پر لگا رہا تھا۔ اسے بعد بانی ساتھیوں کو ناشتا کرتا تھا۔ فی الحال وہ چاروں طرف سے مکان کی گھرائی کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد ہم نے اپنی کرسیں ویرہ چیک کیں۔ ہم کسی بھی لمحے چلنے کے لیے تیار تھے۔

ہمارا انتظار طویل ثابت نہیں ہوا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ٹونی نے اسے بدستور ایشیو سیٹ سے منسلک کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف دی لیڈی سی تھی۔ مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ وہ صبح جلدی فون کرے گی۔

میری آواز سن کر وہ بولی "افنی پر سوچ کر خود مار ہو چکا ہے اور اس کی کنبی کرئیں میدانوں، کھیتوں اور سبزہ زاموں کو جیک لگاری ہیں۔ پھولوں کے رخساروں پر ابھی خنجر تھر تھرا رہی ہے لیکن پرندے کب سے رزق کی تلاش میں گھونسلوں سے نکل چکے ہیں۔"

"یہ تم شاعری کر رہی ہو یا پھر موسم کی کوئی ذرا بہتر قسم کی کنسری تمہارے آتھ لگ گئی ہے" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں نہ تو کبھی شاعری میں الجھتی ہوں اور نہ ہی شاعری میں" اس نے جواب دیا "موسم کی کنسری سے بھی مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مسموں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا عزم کیا ہوا ہے۔"

"تو پھر اس اتفاقی کا مطلب؟" میں نے پوچھا حالانکہ میں مطلب خوب سمجھ رہا تھا۔

"مطلب یہ کہ تم بھی اپنے گھونسلے سے نکلنے کے لیے فوراً تیار ہو جاؤ" وہ بولی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم تو پہلے ہی تیار بیٹھے ہوئے تھے۔

"تیار ہونے کے بعد کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً مار لٹک دو پھر پہنچ جاؤ اور بااچہ پورے ایک میل آگے نکلنے کے بعد روک جاؤ۔ ہماری گاڑی وہاں پہلے سے موجود ہوگی یا چند گھنٹے پہنچ جائے گی۔ تمہیں ٹھیک آتھ جبکہ وہاں ہونا چاہیے اور طرف رکنا چاہیے۔ ہم سرخ رنگ کی بڑی لینڈ کروزر کے پیچھے رہیں ہوں گے تمہاری گاڑی

کون سی ہوگی؟" ہم سیاہ مرسڈس میں ہوں گے۔ اس کے پیچھے بھی ریمینٹ کے "میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب" وہ ہنسی "کوئی دونوں ہی کے لیے اچھا لگتی مشکل ہو گا کہ گاڑی میں درحقیقت کتنے لوگ آسکے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی پلاسٹک بھی کھیلنا چاہیے۔ ہماری گاڑی مذکورہ مقام پر تمہارے سامنے کی سمت میں پہلے سے کھڑی ہوگی اسی طرف سے آ رہی ہوگی۔ تمہارے آگے پیچھے دو دروازے کھلی گاڑی نہیں ہونی چاہیے ورنہ لینڈ دھور وہاں ہی کے لیے خطرناک ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" میں نے فوراً قدرے تشویش سے کہا "اپنی رانٹ میں تم نے ایک سستان مڑک کا انتخاب کیا ہے اور وقت بھی ایسا ہے۔ اس کے باوجود ہو سکتا ہے اتفاقاً کوئی گاڑی ہماری گاڑی کے آگے یا پیچھے آ رہی ہو۔"

"اس صورت میں تم اپنی گاڑی مڑک کے ایک طرف روک لو گے اور اسے گزر جانے کا موقع دو گے جب وہ کافی دور نکل جائے تب تم دوبارہ آگے بڑھو گے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ گاڑی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اس پر ایت پر تمہیں ہر صورت میں گل کرنا ہے۔ خواہ ہماری گاڑی نظر آ رہی ہو یا نہیں۔"

"بہت ستر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"تمہاری گاڑی سے سب سے پہلے ٹونی اترے گا اور وہ چند قدم آگے آجائے گا۔ ہماری گاڑی سے سب سے پہلے راجیلہ کو اُتاراجائے گا اور وہ بھی چند قدم آگے آجائے گی۔ پھر تم اپنی گاڑی سے اُتر گے اور ذرا پیچھے ہی رہو گے۔ اس کے بعد میں اُترنا لگے۔"

"اس تبادلے کے لیے تم خود آ رہی ہو؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی امید ذرا کم ہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ مجھے خود ہی اُتار پڑے گا۔" اس نے غصی مافس لی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی "ہم دونوں کے مسلح ساتھی اپنی اپنی گاڑی میں ہی رہیں گے۔ یہ خیال رکھنا کہ اس وقت کی اقلیات ٹریڈرز ہوں گی۔ کوئی ذرا سی غلطی۔ یا ہوشیاری دکھانے کا کوئی معمولی سی کوشش کم از کم چار افراد کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔"

"یعنی میں۔۔۔ تم۔۔۔ ٹونی اور راجیلہ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اور میں ممکن ہے دونوں گریز یوں کے تمام افراد کی ایک وقت ایک دوسرے کو ہلاک کر بیٹھیں۔ اس لیے معاملہ ہے۔ عمل کرنے میں ہی دونوں کا ناکوہ ہے۔" اس نے گہرا تنبیہ کی۔ "ہم اتنے احمق نہیں ہیں کہ اسے ہی تجویز کر دے کہ معاملہ کو سیدھا ٹو کریں۔" میں نے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے۔ تو پھر تم روانہ ہونے کی تیاری کرو۔ کوئی بات نہ ہے۔“  
 یہی راجیلہ اس وقت بھی تمہارے آس پاس ہی ہے؟ میں

نہیں۔ وہ کسی اور جگہ ہے۔ میں کسی اور جگہ سے بول رہی ہوں۔ اس نے ملاحت سے جواب دیا۔

”اچھا۔ آٹھ بجے ملاقات ہوگی۔“ میں نے کہا۔  
 اس بار اس نے خدا حافظ کہنے کا کلف کر لیا۔ اس کا لہجہ بھی غراؤہہ بات اور خالص کا دیاری نہیں رہا تھا۔ سلسلہ منقطع رہا تو میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنی اپنی کڑی دیکھی۔ ٹوٹی بولا ”ہم تو کچھ دیر بعد بھی روانہ ہوں تو آرام سے بیچ وقت پر پہنچ سکتے ہیں۔“

ہم پندرہ منٹ بعد روانہ ہوئے اس دوران سردار علی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم انہیں ہلاک کرنے یا توہین کرنے کی حکمت عملی تیار کرنے کے بارے میں غور کریں لیکن میں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ ریڈ ان سے اصل قتلش رکھنے والے شاید وہ چار افراد ہی باقی بچے ہوں گے اور ان کی بھی روانہ ہونے کی تاہمیاں مکمل تھیں۔ ہمارا مقصد یہ امن طریقے سے پورا ہو رہا تھا تو ہمیں کوئی خطرہ ک قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟

میں اپنے کسی بھی ساتھی کی جان داؤ پر لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا مقصد صرف یہی تھا کہ راجیلہ بہ نحریت دایں آجائے اس کا چہرہ ٹھیک ہو جائے اور ریڈ واٹ کے بچے کچھ لوگ اس ملک کی جان بچوڑ دیں۔ دواہہ پاؤں بنانے کی کو مشکل نہ کریں۔ طے شدہ معاہدے پر عمل کرنے سے یہ نتیجہ مقاصد پرے ہو رہے تھے۔ دیگر تمام صورتوں میں خطرات ہی خطرات تھے میں نے سردار علی کو زری سے سمجھا بھاجا دیا۔

ہم باہر پورے پہنچے تو آٹھ بجے میں پانچ منٹ تھے ٹھیک آٹھ بجے نظریہ مقام پر پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہماری گاڑی ریڈنگ کی لارڈز سے سڑک گئی۔ اس وقت باہر سے آگے ٹرنک بالکل ٹھیک تھا۔ کسی زمانے میں تو باہر پر تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے کے حروف سمجھا جاتا تھا۔ راستے میں دونوں طرف دیرانی کا راج تھا لیکن اب لاہور کی آبائی بھی کراچی کی طرح بھیجی ہوئی بہت دور تک چلی گئی تھی۔ شہر بہت میں بہت پھیل چکا تھا۔

زرا تھک میں کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں صرف ایک بس باہر سے آگے جاتی دیکھائی دی۔ میرے خیال میں دی ریڈی اتنی اتنی تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ سمجھ لیتی ہم بس ساتھ لے کر آ رہے ہوں گے اس کے باوجود احتیاطاً میں نے گاڑی ایک طرف تقریباً دوک خیال اور بس کو بہت آگے نکل جانے کا موقع دیا۔ وہ دھمکیں کے اگلے پھر زرق جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر میں نے دیکھا، سڑک کے دونوں طرف دور دور تک چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خاردار جنگلی جھاڑیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں دور دور تک کوئی ایسا چیز نہیں تھی کہ انسان بھاگ کر جس کی آڑ میں چھپ سکتا۔ کہیں مورچہ بند نہیں ہوا جاسکتا تھا۔ کہیں کسی کو قتل از وقت نہیں چھپایا جاسکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔

کسی سرخ لینڈ دور کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تھا۔ میں نے گاڑی سڑک کے کنارے دی ریڈی کی پٹائی ہوئی ایک نشان کی قریب کھڑی کر دی تاہم انجین اشارت ہی رکھا۔ انجین کی بجلی ہی کھر کھر اہٹ، ایئر کنڈیشنر کی سرسراہٹ میں مدغم تھی۔ اس خفیف آواز کے باوجود وہ جمل سکوت کا احساس ہو رہا تھا۔

ایک منٹ بعد ہی بہت دور سڑک پر ایک سرخ کھانا سا نمودار ہوا دکھائی دیا۔ وہ ایک سرخ لینڈ دور تھی جو تیزی سے قریب آتی چلی گئی۔ گاڑی کیا تھی گویا ایک خوبصورت مغربت تھا۔ اس کے شیشے تاریک تھے۔ اس کے عقب میں مجھے دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آئی اس لیے میں نے اپنا ہاتھ جیسٹریور سے ہٹا لیا تاہم انجین اشارت ہی رہنے دیا۔ شیر شاخ اور سردار علی کی انگلیاں بجلی شیشوں کیوں کے زنگیز رہیں۔ پچھلی دونوں کھڑکیوں کے شیشے تھوڑے تھوڑے نیچے کر لیے گئے تھے اور ان کے اوپر مٹوں کی تالیس بجی ہوئی تھیں۔ لینڈ دور کے شیشوں پر دھوپ جھلکائی اور ان کے کناروں سے بھی مجھے ایک ایک گمن کی بال بھانکتی دکھائی دی۔ لینڈ دور پر کوئی فبریلیٹ نہیں تھی اور وہ نہ جانے کہاں سے

آ رہی تھی۔ شاید راستے میں اسے کہیں بھی کسی نے نہیں روکا تھا۔ قریب کچھ کر لینڈ دور ہماری سائڈ پر ہی آگئی اور چند گز دور ہماری گاڑی کے مقابل ایک دھچکے سے رک گئی۔ اس کا انجین بھی اشارت ہی رہا۔ فضا میں ایک عجیب سی کشیدگی تھی۔ شاید یہ بے اعتباری کی کشیدگی تھی۔

میں نے گویا اس کشیدگی کا دھماکا توڑنے میں پہل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ٹوٹی کوا اشار کیا اور وہ دواڑہ کھول کر دونوں

بالاق

چار حصے

قیمت: ۲۸۰/۰۰

نے نہایت آہستگی سے چاندوں طرف سر جھکا کر گردوغبار  
لینے اور شاید صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں  
میں برف دارے سے پھیلے ہوئے تھے لیکن جب اس کی نظر اٹھی تو  
لے کے لیے دی لیڈی پر رڑکی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا  
زادوں میں نفرت کی برق کو محسوس کی۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ دی لیڈی سے ہرگز  
مجاہد سے بھی لاعلم تھی۔ شاید دی لیڈی نے اسے کچھ بتایا  
ذمت نہیں کی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی بندھن میں کھینچ کر  
زمین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں بھی کھولے۔

دونوں کا زبوں کے انجنوں کی خفیف سی گھر گھراہٹ  
بارجہ و فضا میں سکوت کا احساس اس قدر شدید تھا کہ بچا کی  
شاید اس کی آواز الگ سے سنائی دیتی۔

بندھنیں کھلنے کے بعد راجیلہ چند لمبے لمبی کالیاں سلگتی  
میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک راجیلہ کسی نجاتی طرح فضا میں  
اوردو سرے سے اس کی لات دی لیڈی کے منہ پر پڑی۔  
دی لیڈی اپنی لینڈر دور کے دروازے سے کھڑائی گھر  
صرف ایک لمبے کے لیے ٹوکڑائی تھی۔ اس نے راجیلہ کو  
وار کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سی ٹھنڈی  
حرکت میں آیا لیکن راجیلہ کو اس کے وار سے بچانے کے لیے  
بچ میں آگیا۔

دی لیڈی کی پوری کلائی کی ضرب میری گردن پر پڑنے  
قریب پڑی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی عورت کی  
کی ضرب تھی۔ مجھے کیا محسوس ہوا تھا جیسے لوہے کی ایک  
ٹھوس سلاخ کسی طاقتور شخص نے پوری طاقت سے گھما کر  
دبید کی تھی۔

دوسرے ہی لمبے میں نے اپنے آپ کو اونٹ سے مٹانے  
پایا۔ میں نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کسی عورت  
داریوں مجھے زمین جڑا سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلے  
ستارے تاج گئے تھے۔

دوسرے ہی لمبے فضا گریوں کی ترزاہٹ سے گونجی تھی  
اس اندیشے سے گویا میری دھڑکنیں ختم تھیں کہ اب سب کچھ  
ہوئے کو تھا۔

ہاتھ اٹھائے گاڑی سے اتر پڑا۔ وہ گویا گن گن کر آہستگی سے قدم  
اٹھاتا آگے برسا۔

چار قدم آگے بڑھ کر وہ رک گیا۔ بچی سی کلک کی آواز کے  
ساتھ لینڈر دور کا دروازہ کھلا اور اس نے راجیلہ کو اگلے راجیلہ  
اپنا چوہا چپائے رکھنے کے لیے جہنم کرنی تھی اس وقت ان کے  
لوازمات سے محروم تھی۔ اس کا برقع اور تاریک چشمہ اس کے  
پاس نہیں تھا اور آدھے سفید آدھے سیاہ چہرے کے ساتھ وہ کوئی  
بڑا سرادھ لٹوٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر البتہ  
تاریک چشمے کی جگہ سفید بنی موجود تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے گھریلے  
سے سفید شلوار قمیض میں تھی جو کچھ میلا ہوا چکا تھا۔ اسے اس کے  
گھر سے اغوا کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً جیسے اور برقعے کے بغیر  
تھی۔

اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور جب اس نے  
آگے بڑھنے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے پیروں میں  
بھی ڈوری کی بندھنیں تھیں لیکن ان میں اتنی دھکیل چھوڑی گئی تھی  
کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتی تھی۔ دو تین چھوٹے چھوٹے  
قدم بڑھا کر وہ رک گئی۔ فونی کے اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ  
تھا۔

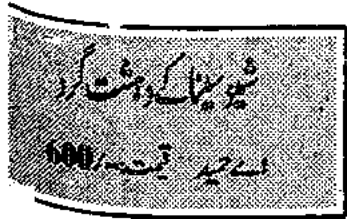
تب میں گاڑی سے اترنا۔ میں نے بھی ہاتھ اور اٹھائے ہوئے  
تھے حالانکہ مجھے اس کی ہدایت نہیں کی گئی تھی لیکن میں اپنا مدتیہ  
زادہ سے زیادہ صلح جویانہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

میں راجیلہ کے قریب پہنچ کر رک گیا اور تب دی لیڈی گاڑی  
سے اترتی۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی ایک کلک کی سی شان اور  
حکمت تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ ایک پتیلی  
سی ڈھیلی ڈھالی اسپرٹس شرٹ اور نیوی بلیو جینز میں تھی۔ گلے میں  
نہ جانے کیوں اسکاٹش کی طرح ایک خوبصورت دھال بھول رہا  
تھیلہ اس کے خوبصورت برٹشی اور سنہری تراشیدہ ہال ہوا میں لہرا  
رہے تھے۔

آج میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دروازہ قد  
عورت تھی لیکن لمبے قدم اس کی نسوانی دلکشی کو متاثر نہیں کیا  
تھا۔ اس کی جسمانی سالمیت غضب کی تھی۔ اس کی آنکھوں کا تاثر  
واقعی آئینی سا تھا۔ ان کے رنگ کا تعین کرنا مشکل تھا۔ ان  
آنکھوں سے وہ بھی بغور میرا جائزہ لے رہی تھی اور میں محسوس  
کر رہا تھا کہ اس کی نظریں میرے وجود کے بارہوتی جاری تھیں۔

”اگر اجازت ہو تو میں راجیلہ کی بندھنیں کھول دوں؟“ میں  
نے بدستور پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کھول دو۔“ اس نے نہایت اختصار سے جواب دیا لیکن اس  
کی آواز وہی اصحاب سے چہیزھا کر کے والی تھی۔  
میں نے سب سے پہلے راجیلہ کی آنکھوں سے بنی کھول۔ اس



اُردو کے خوبصورت شاعر اکبر الہ آبادی  
سے لے کر آج کے دور کے جانے  
پچھانے شاعروں کا منتخب اور دلچسپ  
ظریفانہ کلام۔۔۔۔

اُردو کی ظریفانہ شاعری

☆۔۔۔۔ ہما علی

قیمت: -/75 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

میں اندھا چرا چھا گیا تھا اور تمام اعضا گھبرا کر حرکت بھی کرنے کے قابل  
نہیں رہے تھے لیکن اب جیسے وہ میں سوچ رہا ہوں آج ہو گیا تھا۔  
تاریک وجود میں روشنی پھیل گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے  
منظر دوبارہ واضح ہو گیا تھا۔ اعصاب میں جھنجھٹا ہٹ کر کہ باقی تھی  
لیکن اب میں دیکھنے، سونچنے، سمجھنے اور کچھ کرنے کے قابل تھا۔  
میرے حواس پر یہ قیامت کزرنے اور میرے سنبھلنے کے درمیان  
شاید مشکل سے تین چار سیکنڈ کا وقفہ ماحول رہا ہو گا لیکن مجھے  
محسوس کی ہوا تھا جیسے اس میں گھنٹوں لگ گئے تھے۔  
سب سے پہلا احساس مجھے یہ ہوا تھا کہ فائرنگ نہیں ہو رہی  
تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مھل ایک دوڑتے ہوئے مارے گئے تھے اور  
دوسرے لئے خاموشی چھا گئی تھی۔ یہ احساس خوش کن بھی تھا اور  
ہولناک بھی۔ کیا دونوں فرق بیک وقت سنبھل گئے تھے اور انہوں  
نے فائرنگ کو غیر ضروری سمجھ کر ہاتھ روک لیا تھا۔۔۔۔۔ یا پھر  
فائرنگ کرنے والوں کی دونوں طرف بیک وقت لاشیں گر چکی  
تھیں؟ اس سوال کا جواب خوش کن بھی ہو سکتا تھا اور ہولناک  
بھی۔

میں نے شاید سیکنڈ کے دسویں یا بیسویں حصے میں صورت حال  
کا جائزہ لے لیا۔ دونوں طرف گاڑیوں کی کھوکھلیں سے گھنوں کی  
تالیں جھانک رہی تھیں اور کسی گاڑی کے شیشے ٹوٹے ہوئے دکھائی  
نہیں دیے تھے۔ گاڑیوں کے کسی اور حصے پر بھی گولی کا کوئی نشان  
نظر نہیں آیا تھا۔  
اس کا مطلب تھا دونوں طرف کے آدمیوں نے غلطی کا

میری حالت اس قابل نہیں تھی کہ میں اٹھنے کی کوشش  
کریں۔ میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ مدد سے اور اندیشے  
کے بغیر انسان کو ڈھانچا بھی دیتے ہیں۔ اس طرح گرا دیتے ہیں کہ وہ  
اپنے اپنے کے قابل نہیں رہتا لیکن یہی مدد سے اور اندیشے بھی  
انسان کو اٹھا کر کھڑا بھی کر دیتے ہیں۔

میرے ساتھ اس وقت کیا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے ہلاک  
سننے کے لیے گولیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ہلاک کرنے  
لے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ میں جس مسئلے کو حل کرنے کے  
لے اپنی جگہ دوڑا جا جو توڑ کر رہا تھا، مھل راحیلہ کی ذرا سی  
لگت کی وجہ سے اس کا حل ہونا تو ایک طرف رہ گیا تھا۔ لگتا اب  
ان کے لالے پر گئے تھے۔ نہ جانے کون کون ہلاک ہو چکا تھا اور  
نہ کون کون موت کے منہ میں جا لے والا تھا۔

اس موقع پر میرا اٹھ کھڑے ہونا بھی ایک حماقت ہی تھا۔ مجھے  
اندازہ نہ تھا کہ گولیاں کہاں سے اور کس سمت میں چل رہی  
ہیں۔ وہ میرا لوہا چاٹتی ہوئی بھی گزر سکتی تھیں اور میرے لیے ایک  
لے میں یہ قدر ختم ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی  
کہ ایسا نہیں ہوا۔

میرا اٹھ کھڑے ہونا قطعی اضطراری تھا۔ اس میں میرے  
دماغ کو دخل نہیں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب بھی نیلے  
پیلے اور نارنجی رنگ تھے اور مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ  
یہی یہ حالت ایک عورت کے بازو کی ضرب سے ہوئی  
تھی۔ جبکہ وہ بازو دیکھنے میں کچھ ایسا غیر معمولی یا آہنی نظر  
نہیں آتا تھا۔ وہ مھل ایک خوبصورت اور اساتذت عورت کا بظاہر  
نرم بازو اور منہ دل بازو تھا۔ وہ سر تپتی خوبصورت تھی اور یہ  
بازو اس کی خوبصورتی کا ایک حصہ تھا لیکن میں سوچ بھی نہیں  
سکتا تھا اس خوبصورتی کے ختب میں ایسی طاقت، ایسی تباہ کاری کی  
طاقت کہاں تھی۔

اس فکرمیں میں 'میں یہ سوچے بغیر بھی نہیں رہ سکا کہ اگر یہ  
فیب راحیلہ کو لگی ہوئی تو اس کا کیا حال ہوگا؟ بے شک وہ بھی  
اولیٰ آدمیوں کی زبردست ماہر تھی اور اس کی قوت برداشت  
کا کوئی جواب نہیں تھا جس کے مظاہرے میں بہت سے موقعوں پر  
لوگوں کا تھا۔ اس کے بازو پر یہ قوتور مجھے بے حد ہولناک محسوس  
ہو رہی تھی۔

میں جب سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مجھے  
اندازہ ہوا کہ اس وقت تک کوئی گولی میرا لوہا چاٹتی ہوئی نہیں  
گولی تھی تو یک لخت ہی جیسے میرے حواس ٹھکانے آ گئے۔ وہی  
پہلے کی ضرب نہ لگوا میرے وجود میں چھپی ہوئی تمام جانی انجانی  
طاقت کے سرچشمے کا میں سوچا کہ آف کر دیا تھا۔ میرے رگ و پے



19/7  
کی وجہ سے شاید بجا طور پر کبھی کبھی مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ میرے وجود میں ایک شے زور چھپا ہوا تھا۔  
کئی بار مجھ سے طاقت کے ناقابل یقین مظاہرے ”سرزد“ ہوئے تھے اس کے باوجود میں نے اس فکریے کو بہر حال اپنی زندگی سے خارج نہیں کیا تھا کہ ہر سیر کے لیے کمپین نہ کہیں کوئی نہ کوئی حواسیر موجود ہوتا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے حصے میں وہ ”سواسیر“ ایک سروقتہ خوبصورت اور اساتذہ سفید نام عورت کے روپ میں آئے گا جو بظاہر بالکل نازک اندام نظر آتی ہوگی۔

میں نے پوری قوت صرف کر ڈالی تھی۔ میرا خیال ہے اس وقت میرے ہر ماسم سے ہمین پھوٹ رہا تھا کیونکہ میں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک ہچکا ہوا محسوس کر رہا تھا مگر میں اس کے بازوؤں کو چوڑا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ میں اس کے وار سے سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن شاید میری اصلی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ شاید میری وہ قوت عود کر نہیں آسکی تھی جس پر میں کچھ زیادہ ہی بھروسہ کرنے لگا تھا۔

اس کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ گہرا ہو گیا۔ چیلنج کو یاد اور مضبوط ہو گیا۔ بے بسی سے میں نے اپنے آپ کو زمین میں گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس لمحے میں نے صدقِ دل سے دعا کی۔ اسی سے ہمدردی کا جو آئزے وقت میں ہم سب کو یاد آتا ہے اس کے سوا شاید کوئی چاہے ہی نظر نہیں آیا تھا۔ مجھ جیسے لوگ جو ایک تو دیئے ہی بڑے گناہ گار ہوتے ہیں۔۔۔ پھر انہیں اکثر آڑتے وقت میں ہی اوپر والا یاد آتا ہے۔ گرنا ملک کا کمال ہے کہ جسے دل سے پکارو تو جیسے سب کچھ بھول بھال کر پھر نظرِ کرم کودتا ہے۔ شاید شرط صرف غلوں میں دل کی ہے۔

میں نے کوئی ایسی چوڑی دعا نہیں کی تھی..... بلکہ سچ پوچھنے تو دعا ہی نہیں کی تھی۔ اس وقت ایک ایک لمحہ جیتی تھا۔ میں صرف دلی لیدی کی اس گرفت کو لمحہ بہ لمحہ سخت تر ہونے سے روکنے میں کامیاب ہوا تھا۔ لیکن آثار بتا رہے تھے کہ میں اسے زیادہ دیر نہیں روک سکوں گا اور راجلہ مزید بڑھتے ہوئے دباؤ کو چند لمحے بھی برداشت نہیں کر سکے گی۔

مازک کموں کی اس کشش میں بھلا میں دعا یوں کر مانگ سکتا تھا؟ میں نے بس شاید ایک لمحے کے لیے اوپر ولے کو یاد کیا تھا۔ اور بس! لیکن اس ایک لمحے میں ہی ساری التجائیں سمٹی ہوئی تھیں۔ اس ایک لمحے میں ہی بے بسی کا سارا قصہ سمیٹا تھا۔

اسی ایک لمحے میں دل کو نہ جانے کہاں سے بے پناہ تقویت مل گئی۔ ایک لمحہ پہلے جسم گرتی ہوئی عمارت کی طرح ہونے کو تھا مگر دوسرے ہی لمحے یوں سنبھل گیا جیسے اس عمارت کو ہزاروں باریدہ ستروں کا سہارا مل گیا ہو۔ میں نے دانت پر دانت تھامے۔ میرے گھٹنے زمین پر گئے ہوئے تھے۔ میں نے اتنی قوت صرف کی کہ مجھے

عجیب بات یہ تھی کہ اس عورت سے واسطہ پڑنا سب سے دور وہ  
 کاظم کی قسم کی صورت حال میں واسطہ پڑنا میری زندگی کا ایک  
 لیکن عجیبہ تھا۔ مجھے دانتوں پیسنے آگے تھے سب اور عجیب  
 یہ تھی کہ مجھے کو وہ کھنڈ ایک عورت تھی!  
 میں اس کے دونوں بازو پکڑ کر چڑے کرنے کی کوشش کر رہا  
 کہ راحیلہ کی گردن اس کی گرفت سے چھوٹ جائے لیکن  
 یا بازوؤں کا چڑے ہونا تو درکنار ان میں معمولی سا قہقہہ بھی  
 آتا تھا۔ بس شاید اتنا سا ہی فرق پڑا تھا کہ راحیلہ کی گردن پر  
 کراہتا ہوا کے آہنی ٹکٹے کا پڑھتا ہوا دباؤ رک گیا تھا۔

مطمئن نہیں وہ بھی میری کوشش سے رکا تھا یا اس میں بھی وہی  
 کی کرنی کو دخل تھا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے سے دو چار اونچ  
 کا پتلے پر ہی تھا۔ میں اس کی آنکھیں سانسوں کی تپش اپنے  
 پر محسوس کر سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس عورت کی آنکھوں میں  
 زار پہلے ہوئے تھے بلکہ اس کی پوری شخصیت کا تاثر ہی  
 زاروں میں تھا لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر تو  
 اس لڑکھائی کا جو پھٹ پڑے شے۔ وہ اب اُگل رہی تھی۔  
 اس کے ہر سام جان سے تپش پھوٹ رہی تھی۔ اس وقت  
 کی رسائی میں آنے والی کوئی بھی چیز کوئی بھی شخص راہ ہو سکتا  
 میں نے اس سے پہلے شاید زندگی میں کبھی کسی عورت کو ایسی  
 بنانہ ایسی شعلہ جوالہ نہیں دیکھا تھا۔

مگر جس لمحے میں نے اس کے بازو گرفت میں لیے تھے اور ان  
اور توانائی شہرہ کی تھی اس کی آنکھوں میں کوندی ہوئی، جلیلاں  
میں دم نہ پڑی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں  
لے ہوئے تھے۔ پلک بھپکاتا وہ گویا جانتی ہی نہیں تھی۔ مجھے یاد  
آتا تھا کہ جب سے اس کا اور میرا سامنا ہوا تھا میں نے اسے  
نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس وجہ سے اس کی آنکھیں اور بھی  
اب اس کی لگتی تھیں۔

ان آنکھوں میں غیظ و غضب کے ساتھ اب جو تاثر شامل ہوا  
اور مسخراورد تضحیک کا تھا۔ شاید اسے ایک طرح کا چیلنج  
مل گیا جاسکتا تھا۔ وہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی  
اجالو! تو تم سارا خیال ہے کہ تم میرے بازوؤں پر زور آزمائی کر  
رہے ہو؟ دوست کو میری گرفت سے چمڑا لوگے؟ کیا اس سے پہلے  
اس نے بھی شیرلی کے جڑے سے اس کا شکار چمڑایا ہے؟  
شیرلی نے کہا "جواب کیوں اپنا وقت ضائع کرنے اور اپنے آپ کو  
اکت می ڈالنے آگئے ہو؟ شاید تمہیں اپنی طاقت پر بہت سمجھنہ  
پیشہ طور کوئی بات نہیں۔ زور آزمائی کر کے دیکھو  
نفس اسپند کا مان نکال لو!"

میں اپنے بارے میں کبھی بھی خوش فہمی میں تو جلا نہیں رہا تھا۔ زندگی میں بہت سے دشمن مرحلے ضرور آئے تھے جب سنا کہ اس طاقت کی آزمائش کا تین پڑا تھا اور گولی یا بندوق کیس بچے کو لگی تھی۔ ایسے موقعوں پر دل دھڑکتا رہتا ہے۔ مجھے سرخرو کا تھا جس







تاریخی ناول

|                |                      |
|----------------|----------------------|
| ایلیس مصر      | الماس ایم۔ اے۔ 100/- |
| حسن بن صباح    | الماس ایم۔ اے۔ 25/-  |
| راجکمار        | الماس ایم۔ اے۔ 150/- |
| نور الدین زنگی | الماس ایم۔ اے۔ 250/- |
| سلطان عادل     | الماس ایم۔ اے۔ 150/- |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

”لیکن تم دیکھ نہیں رہی ہو۔۔۔ اس وقت ہم سب ایک دوسرے کی نگاہوں کی زد پر ہیں۔ ایک اشارے پر بیک وقت سب ہی ایک دوسرے کو خون میں غلا دیں گے اور جانوں کے اس ڈھانچے کا کچھ بھی قطعاً کوئی قائم نہیں ہوگا۔“

”اور ہو۔۔۔ تو اب تم بھی قائم رہے نقصان کے بارے میں سوچنے لگے ہو۔۔۔“ وہ کراہ کر بولی مگر کراہنے کا انداز بھی غیر تھا۔

”میں پیشہ ہی سے سوچتا آیا ہوں مگر نہیں شہلہ اب تک زندہ نہیں ہوا ہوگا۔“ میں نے زری سے کہا۔

”لیکن میں سوچتا نہیں چاہتی“ اس پر واقعی ضد سوار تھی۔ آج شاید اس پر اندر کی عورت غالب آگئی تھی۔ اور عورت کا ضد تو مشہور ہے!

وہ اردو میں گفتگو کر رہی تھی۔ کوئی بید نہیں تھا کہ وہی بولی پوری طرح اردو سمجھتی ہو یا اسے کم از کم مفہوم کا اندازہ تو ہوا گیا تھا۔ وہ گویا راحیل کی حالت سے کچھ اور محفوظ ہوئے ہوئے دیکھ رہی تھی بولی ”تم اسے چھوڑ دو نہیں دیتے؟ میرے قوی گلی نہیں چلا میں گے۔ تم بھی اپنے آئینوں کو نہیں رکھ دیجے گا تم دے دو۔ کلا میدان یہاں سجدو ہے۔ میں خالی ہاتھ اس سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اسے دل کا ارمان نکال لیتے ہیں مجھے اس کی آرزو پوری کر کے خوش ہوگی۔“

”نہیں۔“ میں نے سختی سے کہا ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہاں کسی قسم کی شرمگاہ پر نہیں آئے ہوئے ہیں۔“ حقیقی زندگی کا تھوڑا سا ایڈ پٹر سی۔ وہ مسکراتے ہوئے بڑی خوش مزاجی سے بولی۔

میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا مجھے معلوم تھا راحیل کو زندہ نہیں بھڑوئے گی۔ وہ راحیل کے ہم سفر کی طرح نہیں

”بھڑ میں کیا تمہارا معاہدہ۔۔۔“ اس کے حلق سے عجیب پھٹی پھٹی سی آواز نکلی۔ جس حد تک اس کا گلا دبایا گیا تھا اس کے بعد اس کی آواز کی ٹالیاں کام کر رہی تھیں۔ یہی بڑی بات تھی ”میں۔۔۔ میں اپنی عورت کو نہیں چھوڑوں گی۔ یہ اپنے آپ کو جھپٹی لیا ہے۔ اس سے کہو کہ اپنے آئینوں کو ایک طرف ہٹاؤ اور کچھ میدان میں مجھ سے مقابلہ کرے۔“

مجھے اس کے الفاظ پر حیرت ہوئی۔ اگر اسے صورت حال کا علم نہیں تھا تب بھی میرے کہنے سے بات اس کی سمجھ میں آجانی چاہیے تھا۔ لگتا تھا کہ اسے وہی بولی کی کسی بات سے کچھ زیادہ ہی زک پہنچی تھی۔ بولی بار میں نے اسے کسی بات کو اس طرح اپنی آٹا کا مسئلہ بناتے دیکھا تھا۔ وہ بھی ایسے نازک موقع پر۔

راحیل میری گرفت میں بری طرح پکڑ رہی تھی۔ میں نے یہ مشکل ایک نظریہ بولی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ بظاہر میں دیے چند قدم دور نہایت پُر سکون انداز میں کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ گویا اس صورت حال سے خاصی محفوظ ہو رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو کھینا یا سمجھوٹ لیا۔

”تم اس سے بات نہ کرو۔“ وہ ایک بار پھر پھٹی پھٹی بولی بولی بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ شاید اس نے جینے کی کوشش کی تھی تب اتنی آواز نکلی تھی۔ اس کا اشارہ وہی بولی کی طرف تھا۔ اسے کمالی سی آگئی۔ اس کا چہرہ مٹی میں گھس گیا تھا لیکن اس کی وحشت اور خون میں کی نہیں آئی تھی۔

میں ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اسی مجنونا نے مجھ میں بولی ”یہ عورت۔۔۔ صرف یہ عورت ہمارے تمام مصائب کی ذمہ دار تھی۔ اور اس سے کبھی صحیح طور پر ہمارا سامنا نہیں ہوا۔۔۔ صرف اس کی وجہ سے ہم نے اتنی تلخیوں اٹھائیں۔ اس کے حکم پر سب کچھ ہوا تھا اور یہ خود بڑے مزے سے ہمیں منظر میں رہی۔۔۔ یہ اب بھی بڑے مزے میں ہے۔ اس کے کلمات بات اور عیش و عشرت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ ریڈ ڈانٹ کی پاکستان براؤچ کی سربراہ تھی۔۔۔ براؤچ ہمارے ہاتھوں چاہ ہو گئی۔ مگر یہ ہم سے بھی بڑی ری اور عظیم کی ہائی کمان کی طرف سے بھی اس پر کوئی قاب نہیں کیا۔“

چند سیکنڈ کے لیے ساکت رہ کر اس نے پھر اپنے آپ کو چمکانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ آہم اب میں اس پر گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ میں نے لپٹا کر قمر حشر مجھ میں کہا ”مجھے معلوم ہے۔۔۔ سب کچھ معلوم ہے۔ لیکن اس وقت صورت حال کا تقاضا کچھ اور ہے۔“

”تم صورت حال کی ہدایت کرو“ راحیل نے نہایت ”دانشورانہ“ مٹھو دیا ”یہ عورت شخص اتفاق سے سامنے آگئی ہے اسے جانے مت دو۔ یہ بہت بڑے فساد کی جڑ ہے۔“

”یہ بھی مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اب بھی حشر سے کہا

ایسی ہی نظروں سے دی لڑی کو گھوری تھی۔ دی لڑی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اسے گویا اس کی قدر برابر بھی پروا نہیں تھی۔

وہ میڈی طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولی "خدا کا شکر ہے کہ تمہاری ساقھی۔۔۔ بلکہ تمہاری نائب انسانیت کے جانے میں آج بھی۔" گویا اس غیبی عورت کو یہ بھی معلوم تھا کہ راجیل کی حیثیت میری نائب کی ہی تھی۔

میں نے مذرت خواہانہ سے لیے میں کہا "آخر عورت ہے نا! کبھی کبھی آپ سے باہر ہو جانا عورت کی سرشت میں شامل ہے۔" "فضول بات مت کرو۔" وہ سر کو جھکا دے کر بولی "تاہم لہجہ خوشگوار ہی تھا۔" تم مشرقی لوگ عورت اور مرد کی تخصیص کیے بغیر بات ہی نہیں کر سکتے۔

"بے شک۔" میں نے بلا تامل تسلیم کیا "عورت اور مرد کی تخصیص کے بغیر بات کرنے سے ذرا صل بات بنتی نہیں ہے۔ قدرت نے بلاوجہ ہی تو دونوں میں اتنا فرق نہیں رکھا۔ اس فرق کو مٹانے کی کوشش کرو تو کچھ عجیب سا نقشہ بن جاتا ہے۔ انسان نہ اُدھر کاربٹا ہے نہ اُدھر کا۔"

"نہیں۔ یہ اس بحث میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔" وہ بالوں میں اٹکیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ اس کی آہنی سی آنکھیں اب کسی شفاف جمیل کی طرح چمک رہی تھیں "میں تو یہ کہتی ہوں کہ عورت میں مرد سے کہیں زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ لیکن سائنس اور طب کی تمام تر ترقی کے باوجود ابھی تک ان تمام صلاحیتوں کو متحرک و متحرک درکار۔ ابھی انہیں پوری طرح دریافت بھی نہیں کیا جاسکا۔ اس کے علاوہ کچھ عورتیں پیدائشی طور پر ہی غیر معمولی بھی ہوتی ہیں۔"

"وہ تو بعض مرد بھی ہوتے ہیں۔" میں نے تقریر کیا۔

"لیکن غیر معمولی عورت اگر غیر معمولی محنت کرے تو وہ غیر معمولی مرد کو بھی بہت پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ بہت پیچھے۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کی یہ مسکراہٹ نہ جانے کیوں ریزہ کی لڑی میں ایک سردی لہر دوڑائی تھی۔ اس کا ذہن جیسے یہاں سے بہت دور نکلیں اور مصروف عمل تھا۔

پھر وہ گویا ذرا چوتھے ہوئے اور اس نامعلوم جگہ سے واپس آتے ہوئے بولی "بہر حال۔۔۔ تم بہادر کیا دے سکتی ہو۔ تم ایک غیر معمولی مرد ہو۔ میرا جو وارہہ کہ تم اٹھ کھڑے ہوئے ہو اسے برواشت کرنا ہی کسی مرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس دار کے بعد کوئی نہایت مضبوط خوند اور دلزدہ کلاس باڈی بلڈ ریڈ پشور فائز بھی شاید اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہو تاہم اگر کم از کم کچھ دن کے لیے اسپتال بھی چکا ہو نا۔ جس میں اپنے آپ پر غرور ہوتا ہے۔"

"غیر۔" میں نے کراہ کر کہا "میں شرم سے ڈوب مرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم مجھے فکر کرنے کا مشورہ دے رہی

تھی۔ خالی انہوں اس کو موت کے گھاٹ اتارنے میں تو شاید مجھے کی راضی تھے آجاتے اور اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو اس کے اٹھنا میرا ارے جانا بھی کچھ ایسا بعید از امکان نہیں تھا۔ میں بھی طرح اندازہ کر چکا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی عورت تھی اور اس سے سننے کے لیے غیر معمولی صلاحیتوں ہی کی نہیں ایک خاص فطرت اور کمپیوٹر سے زیادہ بہتر رفتار سے کام کرنے کی طاقت ذہن کی ضرورت تھی۔ میں جانتے بوجھے راجیل کو موت کے دہانے ذہن کی دھمکی سے ڈھکا تھا۔ خصوصاً جبکہ اس پر ہوش کے بجائے وہ میں غالب تھا۔ وہ خود بھی ایک غیر معمولی عورت تھی لیکن میں نے اہل اسے دی لڑی کی ہم چلے یا اس سے رتر سمجھنے کا رعب لینے کے لیے چار نہیں تھا۔

راجیل ایک بار پھر کسمالی اور اس نے مجھے اوپر سے اچھال چمکے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ ایک بار پھر ای غیر انسانی کی آواز میں غرائی "اب تو چھوڑ دو مجھے۔ وہ چیخ دے رہی ہے۔ گویا اس نے طے کی ضمانت بھی دے رہی ہے۔"

"شٹ آپ۔" اب میں نے سختی سے اسے ڈالنا "تم شاید بھول گئی ہو کہ ہمارا بھی ایک ڈیپن ہے۔ تم اس کی خلاف ورزی کر رہی ہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہ فضول باروداڑی نہ کرو اور جس طرح کہا جائے اس طرح کرو۔"

ان الفاظ اور میرے کہنے کے باوجود کاسا اٹھ کھایا۔ اس کا جسم اچھا پڑ گیا۔ اس میں وہ نرمی لوٹ آئی جو انسانیت کی علامت ہوتی ہے۔ اس کا سارا جوش خروش جھاک کی طرح بندھ گیا۔ جدوجہد دم آڑی۔ یہ بھی غیبی سی تھا وہ مجھے تو اندیشہ تھا کہ وہ میرے حکم سے کبھی ہلاکت کو دے گی۔

اب بھی میں اسے چھوڑتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کبھی وہ مجھے چا دینے کی کوشش نہ کر دیتی ہو۔ اوپر میں اسے چھوڑنا اور اوپر وہ پھر اس رنگ والے گڈے کی طرح اچھل کر اٹھ کھڑی ہو۔ مارشل آرٹس میں اسے غیر معمولی مہارت تھی۔ شے اندیشہ تھا کہ وہ پھر کوئی کر بھوکھانے کی کوشش نہ کرے۔

بہر حال مجھے رعب تو اتنا ہی تھا۔ میں اسے پوچھ رہی تھی تو میں نہ سکا تھا۔ صورت حال خاصی مضحکہ خیز تھی۔ بلکہ شرمناک تھی تاہم میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر راجیل نے اب بھی میری ہدایت کی غلاف ورزی کی تو میں خود اس کی کینٹی پر گھونسا رسید کر کے اسے ہلاک کر دیتے کے لیے بے ہوش کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔

اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ کچھ گھٹ خورہ سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کپڑے بھاڑنے کی بھی ذمیت نہیں کی۔ اب تک اس کے وجود میں گویا کوئی خرابی نہ نظر آئی ہو تھا جو یک دم ہی ختم ہو گیا تھا۔ تاہم نظروں سے نظروں میں اگر کسی کو قتل کرنا ممکن ہو تا تو اب بھی دی لڑی اس کی نظروں سے کم از کم دس مرتبہ قتل ہو چکی ہوئی۔ وہ کچھ

نئی قسم کی برہمی تھی "شاید فونی کے بدلے میرا ہتھلہ اٹھا ہے۔"

اسے واقعی اس سوچے باز کی کاظم نہیں تھا۔ میں نے ان کو جواب نہ دیا تو وہ فونی میں سر ملاتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے کی طرح بولی "اگر یہ سچ ہے تو مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے۔ مجھے فونی کے بدلے اپنی رہائی منظور نہیں ہے۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے اپنے کسی بھی ساتھی کی جان نذرانے کے طور پر پیش کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"تو اس مت کرو۔" میں نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا "تو یہاں وان جانے کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ فونی خیر عافیت سے واپس آجائے گا۔ ابھی ایک تار مار اور ہوتا ہے۔"

"تو میں ان لوگوں کی زبان پر اعتبار ہے؟" راجیلہ نے زہر پلے بچے میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا "مقدار نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو یہ سارا کھٹ راگ بچایا تا پھر اسے درخت اس کی کیا ضرورت تھی؟ محض زبان سے کہنے سے سارا کام ہو جاتا ہے جس طرح ان سے کہتا یہ کر لیتے۔ یہ جس طرح مجھ سے کہنے میں کر لیتا کام بہت آسان ہو جاتا۔ اتنا فساد کیوں کھڑا ہوتا؟ لیکن مسئلہ وہی ہے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی زبان پر اعتبار نہیں ہے۔ اسی لیے تو ایک دوسرے کے پاس حقائق رکھوانی جاری ہے۔ اتنی سادہ سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی؟"

"اب تو آتی ہے۔" وہ بدستور برہمی سے بولی "اس کے باوجود مجھے ان لوگوں پر اعتبار نہیں ہے۔"

دی لیڈی ایک ننگ راجیلہ کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کا آنکھیں اس وقت ہلا کی سفاک نظر آ رہی تھیں تاہم وہ کچھ نہیں بولی۔

"اب حالات بہت خفیف ہیں۔ انہیں ہم کو باہر میں ان کو دھوکا دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح کی کوئی حرکت کر کے دونوں نقصان میں رہیں گے۔ ڈاکٹر برنارڈ ابھی ہمارے پاس ہے ابھی ہمارے درمیان ایک تبادلہ اور ہوگا۔ اب تم زیادہ بھٹ مت کرو اور چل کر گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے اپنے لیے میں سختی پر زور رکھی۔

وہ گویا باہل تاخراست گاڑی کی طرف چل دی۔ وہ بہت آہستگی سے قدم اٹھا رہی تھی۔ دی لیڈی کھٹک داری آواز میں بولی "تیرے افضل! تم ایک دو دن بعد۔ اسی وقت۔ اسی جگہ۔ دوسرا تبادلہ عمل میں آئے گا۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چالاک بچے کی کوشش مت کرنا۔ پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی کو سچ میں ڈالنے یا ہمارے پیچھے لگانے کی حماقت مت کرنا۔ یہ فونی کی زندگی کا سوال ہے۔ اور میرا خیال ہے وہ تمہارے اہم ترین ساتھیوں میں سے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارا دوست بھی ہے۔"

ہو۔ میری زندگی میں تم پہلی عورت ہو جس کے ایک وارنے مجھے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ میری زندگی میں بھی ایسا وقت بھی آئے گا۔"

اس نے ایک کھٹک دار سا تھپتھپ لگایا اور بولی "اسی لیے تو میں کہہ رہی تھی کہ عورت اور مرد کی شخصیتیں کے بغیر سوچا کرو۔ اس طرح تمہیں کم صدمہ پہنچے گا۔"

راجیلہ اب بھی خوفناک نظروں سے اس کی طرف دیکھے جاری تھی مگر دی لیڈی گویا اب بھی اس کی طرف سے غلطی ہے یا زخمی۔ میں نے سر ملاتے ہوئے کہا "مشورے کا شکریہ۔ اب کچھ کام کی بات ہو جائے۔"

"بات کیا ہونی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی "باتیں تو بہت ہو چکیں۔۔۔۔۔ بلکہ اب تو خاصا ایکشن بھی ہو گیا۔۔۔۔۔" اب اس نے ایک نظر راجیلہ کی طرف دیکھا "ویسے اس لڑکی میں بڑا غیظ و غضب بھرا ہوا ہے۔ لگتا ہے تم اسے اچھی طرح کام ڈال کر نہیں رکھتے اسے قابو میں رکھو ورنہ یہ تمہیں کیسے مودا دے گی۔"

راجیلہ اپنی جگہ تھلا کر رہ گئی۔ شاید اس نے خود کو دی لیڈی پر چھلانگ لگانے سے یہ مشکل باز رکھا تھا۔ میں نے سکین سی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم سے پہلے بھی کئی سیانے ہی مشورہ دے چکے ہیں لیکن کیا کر لیں۔۔۔۔۔ یہ لگام ڈالنے کے لیے مجھے قریب پہنچنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ تم کہتی ہو تو ایک بار پھر اپنی سی کوشش کر دیکھیں گا۔"

راجیلہ نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا گویا فیصلہ کر رہی ہو مگر دی لیڈی پر حملہ نہیں کیا جاسکتا تو نہ سہی۔۔۔۔۔ لیکن کم از کم مجھے تو ایک "منہ توڑ" قسم کی بات رسید کرنی ہادی جائے۔ میرا خیال ہے یہ میرا دم نہیں تھا کہ اس کے ایک پاؤں نے اپنی جگہ سے تھوڑی سی حرکت بھی کی تھی۔

میں نے جلدی سے دوبارہ دی لیڈی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اس سے پہلے کہ یہاں میرے باضابطہ حکم کے باوجود دوبارہ دھکا فساد شروع ہو جائے، ہمیں تبادلے کی کارروائی مکمل کر لینی چاہیے۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ ضرور۔" دی لیڈی نے سر ملایا۔

میں نے فونی کو اشارہ کیا۔ اس نے میرے دھیرے پھرتے ہوئے لینڈور کی طرف باقی فاصلہ طے کیا اور اس میں جا بیٹھا۔ کو کہ گاڑی کا ایک دواؤہ تھا لیکن میں اب اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی کے پیشے تاریک تھے۔ اسے یوں ان لوگوں کے نرنے میں جاتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرے دل کو کچھ ہوا لیکن میں نے اپنے آپ کو قہری دی اور دل کو مضبوط کر لیا۔

پھر میں نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجیلہ سے کہا "پلو۔۔۔۔۔ تم اس میں بیٹھو۔"

وہ جیسے چرنگی "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس کے لیے میں اب ایک



کا پروگرام ٹھیک ہے۔

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ تھوڑی سی گزیر کے بعد جو تم سے ملاقات خوشگوار رہی۔“ عجیب بات تھی کہ اس کے ہاتھ میں نسوانیت کا گداز بھی تھا اور فولاد کی سی سختی بھی۔ بات صرف اسی تضاد پر ختم نہیں ہوتی تھی اس ہاتھ میں زندگی کی بھرپور حرارت بھی دوڑ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ جھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں سیڑھی آکھوں میں جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

بھرہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی ”مجھے حسرت رہے گی۔۔۔ کاش تم نے ریڈ واٹ کی ویکس قبول کی ہو لی اور تم آج ہمارے سامنے نہ آتے۔“

”خدا کا شکر ہے کہ میں ذلت میں پڑنے سے بچ گیا اور لالچ میں نہیں آ گیا۔۔۔ کو کہ لالچ بہت بڑا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کا منہ بن گیا۔ بد مزگی کے تاثرات سے اس کی خوبصورتی میں یوں فرق پڑ گیا جیسے کسی روشن بلب کی روشنی کم ہو گئی ہو۔ میں نے طول پکڑ جانے والے مصافحے کو اختتام تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے کہا ”اچھا۔۔۔ تو پرسوں تم سے آخری ملاقات ہو گئی۔“

اس نے گویا بد مزگی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کی خوبصورتی کی روشنی بحال ہو گئی اور وہ ٹھنکتے سے لمبے میں بولی ”آٹھ دنوں سے پرسوں کی ملاقات کو آخری ملاقات مت کہو۔ دنیا اتنی بڑی نہیں ہے۔۔۔ اور ہم اتنے جموٹے لوگ نہیں ہیں کہ اس کی بھیڑ میں کھو جائیں۔ ہمارے لیے تو یہ دنیا ایک مکان کی طرح ہے۔ بے شک مکان بہت بڑا ہے اور اس میں بہت سے کمرے ہیں لیکن بہر حال مکان ہے۔ ہم تو ایک سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ کسی بھی وقت۔۔۔ کسی بھی کمرے میں۔۔۔ یعنی کسی بھی ملک میں تم سے دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ تم بھی پرنس میں ہو۔ اور دھر آدھر آتے جاتے ہی رہتے ہو۔۔۔ اور کچھ بعید نہیں ہے کہ اسی ملک میں بھرے ملاقات ہو جائے۔“

”ایسا تو مت کہو۔“ میں نے کراہ کر کہا۔

وہ ہنسی ”ضروری تو نہیں کہ اس وقت بھی میں کسی عالی سائز کے تخت میاں پائی جاؤں۔ میری اپنی فنی زندگی بھی ہے۔ میں گھومنے پھرنے۔۔۔ کسی سے ملاقات کرنے بھی آسکتی ہوں۔ کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔“

”بے شک۔ بے شک۔“ میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا اور وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر یک دم ہی مشتقی سے انداز میں اپنی گاڑی کی طرف مڑ گئی۔

گاڑی میں چڑھ کر وہ اس کا دروازہ بند کرنے سے پہلے گردن نکال کر بولی ”تم ابھی دو منٹ بیٹیں روکو گے۔ ہمارے دور نکل جانے

لا تعذر اور ایڈیو نچر کہانیوں کے خالق

ایم اے واجت کی

ایک اور ایڈیو نچر کہانی

○ ایک ایسی کہانی جس کو مکمل کئے بغیر  
مکمل ناممکن ہے۔

○ چار حصوں میں شائع ہو گئی ہے۔

○ کتابیں پیپر بیک پرنو بھونٹ مشرق  
کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

قیمت فی حصہ: ۶۰/۰۰ روپے

مکمل سیٹ: ۲۸۰/۰۰ روپے

مکتبہ الفکر

اردو بازار لاہور

لہذا ہمارے گاڑی ہال سے حرکت نہیں کرے گی۔“

میں نے اذیت میں سر ہلایا اور وہ بڑی سی سرخ لہندہ رتھری سے گھر کر سڑک کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں آہستہ سے اپنی گاڑی کی طرف ہڑا جس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ آتے وقت گاڑی کی پٹری چلا رہا تھا۔ اب میں نے ڈرائیو تک سیٹ سنبھالی تو میرے بازو ٹوٹی کے بجائے راجیلہ بیٹھی تھی۔ ٹوٹی ان لوگوں کے ساتھ جا چکا تھا۔ ایک لمبے کے لمبے پھر گیا میرے دل کو کچھ ہوا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر اس ٹوٹی پھر ہمارے ساتھ ہو گا۔

راجیلہ کچھ دھنچے سے انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اجنبیت سی تھی۔ میں نے تری سے کہا ”مجھے تم نے قاصی بد مزگی کی۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس غیبت نے بھی مجھے نہیں بتایا تھا۔“ وہ غرائے کے سے انداز میں بولے۔ اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہرگز نہیں تھا۔

معلوم ہو جانے کے بعد بھی تمہارے دوستی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے شکوہ کیا ”آج تو تم کو کیا کام لگاؤ نے پر تلی ہوئی خمیں۔“

میرے اس شکوے میں اپنا بیعت تھی لیکن وہ گویا کات کھائے والے لمبے میں بولی ”افضل! تمہیک ہے۔ ہم لوگوں نے تمہارا علم ماننے کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔ اور میں اس حلف پر قائم ہوں۔ آج بھی قائم رہوں گی لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ایسا کوئی معاہدہ ہرگز نہ کرتی۔“

میں نے پہلی بار راجیلہ کے لمبے اپنے دل میں ناگوار کی ایک خوف سی لہر محسوس کی تاہم میں نے اپنے لمبے میں طاقت برقرار رکھتے ہوئے کہا ”ابھی اس میں میں کوئی حرج نہیں سمجھا اس لیے میں نے یہ معاہدہ کر لیا۔ مجھے اس میں فائدہ نظر آیا تھا۔ اور یہ سب کچھ ہم تمہارے لیے کر رہے تھے۔ ٹوٹی نے خود ہی خوشی یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس نے خود اپنے آپ کو عقائد کے طور پر پیش کیا تھا۔“

”اس کا غلوس اور ایمان اپنی جگہ ہے۔ مگر تمہیں اس تجویز کو سزا دینا چاہیے تھا۔“ وہ اسی طرح پُر زور لمبے میں بولی ”میں نے کب کہا تھا میں نے کب چاہا تھا کہ تم لوگ میرے لیے اتنا تردد نہ کرتے۔ اتنی پریشانی اٹھاؤ۔ کسی کو قربانی کا پکارنا ہوتا ہے تو کب سے تمہیں یہ یقین دلائے کی کو خوش کرتی آئی ہوں کہ میرا مسئلہ اتنا زیادہ اہم نہیں ہے۔“

وہ سب لہجہ ایسا کہیں تھی لیکن ہم تو ایسا نہیں سمجھ سکتے تھے۔ دیکھ کر زیادہ امکان کی تھا کہ وہ کھلف میں ایسا کہتی تھی۔ کون تو ایسا جیسے جس کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزار سکتی تھی؟ میں نے غلامش اور قدسہ اسفرنگی سے سڑک کی طرف دیکھا۔ سرخ

لہندہ رتھری سے اوجھل ہو چکی تھی۔ شیر شیخ اور مردار علی نے گویا کاشیش چڑھا کر ہلکی مشین گھسیٹیں کے نیچے رکھ لی تھیں۔ مجھے گاڑی میں محسوس ہوئے تھی تھی۔ میں نے انٹرکنڈیشنل سڑک کے گیسٹر لگایا اور گاڑی کو آہستہ سے سڑک کی جانب سواڑا۔

راجیلہ بولی ”میری آنکھوں سے پانی آئی تو میں نے سمجھا تم نے کسی طرح مجھے ان کے قبضے سے رہا کرانے کا بندوبست کر لیا ہے اور یہ موقع اچھا ہے۔ ہمیں فوراً ایکشن میں آکر اس حرافہ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔“

”جڑ وہ نہیں تھی۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طاقت سے چھج کی ”بڑا ب بھی کہیں اور چھوڑا ہے۔“

”ہر حال ہمارا معاملہ تو اسی پر جا کر ختم ہوا تھا۔ اس لیے میں چاہتی تھی وہ ہمارے ہاتھ آجائے۔ اگر میں صورت حال کو غلط سمجھی تھی تب بھی میرے ایکشن میں آجانے کے بعد تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ تمہیں اتنا معافی ملانی والا روایت اختیار کرنے کے بجائے اس موقع کو قیمت سمجھتے ہوئے ان لوگوں کو قابو میں کرنے یا ہلاک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔“

میں نے بدستور طاقت سے کہا ”تمہارے حواس شاید ابھی تک صحیح طور پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ تمہیں ابھی تک صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا کہ صورت حال کیا تھی۔ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کی سب مشین گھنوں کی زد پر تھے۔ سوچا بندی کے لیے آس پاس کہیں کوئی آؤ میسر نہیں تھی۔ میں تمہیں اور ٹوٹی سمیت کسی بھی سامی کو بے مقصد خاک و خون میں نہلاتا نہیں چاہتا تھا۔“

”ہم نے اس سے پہلے بارہا اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال میں محض اپنی بھرتی طاقت، قوت قبیلہ اور بے خوفی سے پانسا اپنے حق میں پلایا ہے۔ تمہیں کسی قسم کی حکمت عملی اپنے ذہن میں لے کر چلنا چاہیے تھا۔ میں نے تم لوگوں کو ایک اسٹارٹ دیا لیکن کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ مجھے پہلی بار یوں لگا جیسے تم موت سے خوفزدہ تھے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی موت سے خوفزدہ نہیں پایا۔ اور شاید اب تک تمہارے پیچھے چلے آنے کی وجہ بھی یہی ہے۔“

”اں۔۔۔ میں موت سے خوفزدہ تھا۔“ میں نے اعتراف کیا ”لیکن اپنی موت سے نہیں۔ اپنے ساتھیوں کو موت سے۔۔۔ خصوصاً بے مقصد موت سے۔“

وہ میرے لمبے کے اعظام سے متاثر ہوئے بغیر یک دم ہی سچ لمبے میں بولی ”موت اور زندگی کے معرکے تو اس سے پہلے بھی بارہا برپا ہوئے ہیں۔ پہلے تو کبھی تم اتنے احتیاط پسند اور مصلحت کوش نظر نہیں آتے۔ یوں کہو کہ ایک حسین اور غیر معمولی عورت کو دیکھ کر تم ریشہ محلی ہو گئے تھے۔ تمہارے اعصاب فزاد کے بجائے



لے کے لیے گاڑی لرائی مگر پھر میں نے گاڑی کو بھی سنبھال لیا۔  
خود کو بھی۔ ایک لمحے کے وقف کے بعد میں نے ٹھہرے ٹھہرے  
میں کہا ”کچھ عرصے سے تم میں برسات کا غلط مطلب اٹھ کر رہا  
عادت بھی پیدا ہو گئی ہے۔“

”مجھ میں ہر قسم کی بری عادت پیدا ہو چکی ہے۔ میں لڑائی  
ایک بری عورت ہوں۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم مجھ سے بچنا  
چھڑاؤ۔“ وہ سپاٹ لیجے میں بول۔

”میں نے واقعی چھڑائیں گزاردی ہیں اور اعصاب برسے ہوئے  
کرنے کے لیے کچھ دن کسی پُر قصا مقام پر گزارنے کی بات کی  
تھی۔“

”میرے اعصاب اتنے کمزور نہیں ہیں کہ اتنی جلدی  
جائیں۔ تم میرے اعصاب کی فکر چھوڑو اور اپنے دل کی بات  
کو۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

”اکڑ لوگوں کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہوتی ہے کہ ان کے  
اعصاب بہت مضبوط ہیں اور وہ حالات سے متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن  
کچھ دن کچھ حالات ایسے ضرور ہوتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ایسا  
ضرور آتا ہے جب مضبوط سے مضبوط آدمی کے اعصاب بھی کھنکھ  
کچھ متاثر ضرور ہو جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے خود  
نہ چلے۔“ میں نے نہایت تحمل سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا  
”بہر حال۔۔۔ اگر تم میری تجویز کو جان چھڑانے کی غصہ نہ کھینچو  
مگر وہ تو میں اس کی تردید نہیں کروں گا۔ بہت سی باتوں کی تردید  
کرتے کرتے میں اب تھک چکا ہوں۔ لیکن مجھے اب بھی  
نہیں آتا کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ میں نے صحیح سمجھا ہے یا تم  
واقعی کراچی واپس جانا چاہتی ہو؟ پیش کے لیے؟ کچھ چھوڑ  
کر ہم سب کو چھوڑ کر۔۔۔؟“ مجھے اپنی آواز گھٹے میں اچھی  
محسوس ہوئی۔

”ہاں۔۔۔“ وہ منہ ڈرا دوسری طرف کرتے ہوئے ہلکا سا  
محسوس کر رہی ہوں کہ میں تم لوگوں کے لیے صرف پریشانی کا باعث  
بن رہی ہوں اور میری یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب  
بہتر بھی ہر کام چل سکتا ہے۔۔۔۔۔ بلکہ شاید زیادہ بہتر طور پر چل سکا  
ہے۔“

”یہ صرف تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔۔۔۔۔ ہمارا نہیں۔“ میں نے  
کہا ”ہم میں سے تو کسی سے تم نے اس فیصلے میں رائے لینے کی کیا  
زحمت نہیں کی۔ بہر حال۔۔۔ تم اس پر ابھی مزید سوچ لو۔ اگر  
تمہارا فیصلہ برقرار رہا تو ظاہر ہے کہ ہمیں اس پر عمل درآمد کی  
آزادی ہوگی۔ تم ہماری غلام نہیں سنا سکتی ہو۔ جلت اور دھڑکی  
سب باتیں انی جگہ ہیں لیکن تمہاری شخصی آزادی بہر حال انی جگہ  
برقرار ہے کیونکہ ”دی سرکل“ بہت قریبی اور جاں نثار دو خلیا کا  
ایک حلقہ ہے۔ کوئی ناپا نہیں۔ ہم صرف قہری کاموں کے لیے  
اکٹھے ہوئے ہیں لیکن اگر کوئی دوست اس سے بڑا ہو کر بنا رہا ہے

رہنم کے ہو گئے تھے۔ غیر معمولی۔۔۔۔۔ بلکہ شاید کسی بھی قسم کی  
عورت تمہاری کمزوری ہے۔“

میں نے حیرت اور بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ناک  
کی سیدھ میں دیکھنے لگا۔ اس نے گویا کسی عجیب سی قوت کے زیر  
اثر اپنے دل کا غبار نکال لیا تھا لیکن اس میں مجھ سے نظر لانے کی  
ہمت نہیں تھی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ شیریں شاہ اور  
سروار علی اپنی اپنی طرف کی کوزی کے شیشے پر ناک ٹکائے بیٹھے  
تھے۔ بظاہر ان کا متقدم چاروں طرف نظر رکھنا تھا لیکن مجھے معلوم  
تھا اس طرح وہ گاڑی کے اندر ہونے والی بحث سے لاجعل نظر  
آنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

میں نے دہلی دلی آواز میں کہا ”میں تو تمہیں بھی غیر معمولی  
عورت سمجھتا ہوں راجیہ! لیکن آج تم مجھے ایک نہایت دنیانوی  
اور نہایت روحانی ہی ہوئی گئی ہو جس کی ازدواجی زندگی کے  
دن میں سال اسی طرح بک بک جھک جھک کرتے اور شہر کے  
کان کھاتے گزر چکے ہیں۔ ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔  
ابھی سے تمہارا یہ حال ہے۔ مجھے تمہاری باتیں سن کر افسوس ہوا  
ہے!“

”اسی لیے تو میں تم سے شادی کے لیے ہاں نہیں بھرتی۔ مجھے  
معلوم ہے میں تمہیں اس سے بھی زیادہ جڑی لگنے لگ جانوں کی جتنی  
اب لگی ہوں۔“ وہ بدستور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولی۔  
”تم مجھے بری لگتی نہیں ہو۔ لیکن تم شاید آج کل سر توڑ  
کوشش کر رہی ہو کہ مجھے جڑی لگے۔“ میں نے حیرت سے متاثر  
کہا ”میرا خیال ہے تمہارے اعصاب پر دباؤ کافی بڑھ گیا ہے۔ میں  
نے تم پر کچھ زیادہ ہی بوجھ ڈال دیا ہے اور کچھ عرصہ پہلے تک۔ ہمیں  
بہت سی اعصاب شکن حالات سے واسطہ رہا ہے۔ میرا خیال ہے  
اب ان سب باتوں کے اثرات تمہارے اعصاب پر ظاہر ہونے  
لگے ہیں۔ تم کچھ دنوں کی مضامینات گزارنے مری سواٹ کو کھنکھ یا  
کسی اور مضامین جگہ چلی جاؤ۔ اپنی کھوپڑی کو کھنکھانے کی کوئی  
تنبیہ کرو۔ تمہارے دماغ کو کچھ کڑی چڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔ بلکہ ان  
علاقوں کو بھی چھوڑو۔ اگر تم بہتر سمجھو تو کچھ عرصے کے لیے سونہر  
لیٹڈ وغیرہ چلی جاؤ۔“

”تم واقعی مجھے کبھی بھیجے کے معاملے میں سیریس ہو؟“ اس  
نے اب بھی میری طرف دیکھے بغیر پاٹ سے بچنے میں پوچھا۔

”ہاں۔ میں بالکل سیریس ہوں۔ میرے خیال میں ایسا کرنا  
بہت ضروری ہو گیا ہے۔“

”تمیک ہے۔۔۔۔۔ اگر تم مجھ سے جان چھڑانا ہی چاہتے ہو تو پھر  
مجھے واپس کراچی بھیج دو۔ کچھ عرصے کے لیے نہیں۔۔۔۔۔ پیش کے  
لیے۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر گویا دل میں کلبلا ہوا  
کوئی راز اگل دیا۔

میرے ہاتھ اسٹیرنگ و ہیل پر مرقع سے ہو کر رہ گئے۔ ایک

اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ پھر اس کا لہجہ استہزائیہ سا ہو گیا۔  
 ”لیکن تمہیں تو اس کی واہسی کے تصور سے خوش ہو رہی ہوگی۔  
 قتلوں کا کیا ہے۔ قتلوں سے منٹے رہتا تو تمہاری بالی ہے۔“  
 ”شکر ہے تم نے یہ نہیں کہہ دیا کہ اس کے عشق میں کھن پکر  
 ہو کر میں اس کی خندہ انگیزیوں کو بھی نظر انداز کر دوں گا۔ بلکہ  
 شاید اس مرتبہ خودی سرکے مل جا کر ریڈ وائٹ میں شامل ہو جاؤں  
 گا۔ ان کا آواز کاربن جاؤں گا۔“ میں نے پیچھٹے ہوئے لمحے میں  
 کہا۔

وہ خاموش رہی۔ شاید وہ ابھی اس سطح تک جانے کے لیے  
 تیار نہیں تھی۔ یہ بھی اس کی سروانی تھی ورنہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا  
 جیسے اب کچھ بھی اس کی سوچ سے بعید نہیں تھا۔  
 تاہم چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”پہلے صرف تم ہی  
 نہیں ہو۔ وہ بھی خود اس پھل ہے۔ وہ ضرور واہسی آئے گی۔  
 اب تک وہ پس منظر میں رہی تھی۔ آئندہ وہ خود قہیں پینڈل کرے  
 گی۔“

میں نے صرف دیر سے سے ہنسنے پر اتفاق کیا۔ اپنی رانستہ  
 میں نے ٹھہرے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی ہنسی خود مجھے  
 ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی۔ راجہ میں واقعی شادی سے  
 پہلے ہی بچ چکی، بھگوانو اور شکی بیویوں والی خصوصیات پیدا ہو چکی  
 تھیں۔

”اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ گویا کچھ اور بڑے کر  
 بولی۔ اس کی عجیب سی آواز کچھ اور عجیب تر ہو گئی تھی۔ وہ بھی  
 مضبوط عورت تھی۔ شاید وہ بھی اپنے کچھ آنسوؤں کو بچنے سے  
 روکے ہوئے تھی جو اس کی خراب آواز کو خراب تر بنا رہے تھے۔  
 اس کی گردن پر دی لیڈی کی انگلیوں کے نیلے نیلے نشان ابھر آئے  
 تھے۔ گلا کچھ سوجا سوجا سا لگ رہا تھا۔

میں خاموش رہا اور بالآخر غم ٹوٹی کے گھر جا پہنچے۔ بچلے کے  
 پورج میں وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولی ”شکر ہے ٹوٹی کی فلی  
 نہیں ہے۔ اگر اس کے گھر والے ہم سے پوچھنے کے ہم ٹوٹی کو کہاں  
 چھوڑ آئے۔ تو ہم کیا جواب دیں؟“

”اگر اس قسم کے سوالوں کا امکان ہوتا تو میرے پاس جواب  
 بھی موجود ہوتا۔“ میں نے دیکھے لمحے میں کہا ”نی الحال تم ان  
 سوالوں میں نہ الجھو جو ہم سے پوچھے نہیں جا رہے۔ میرا خیال ہے  
 تم اب گھر جا کر آرام کرو اور رات کو دوبارہ آجاؤ۔ ڈاکٹر برنارڈ کا  
 کام چند گھنٹے کا ہے اور تمہاری حالت فی الحال شاید اس قابل نہیں  
 ہے کہ چند گھنٹے کے لیے کرسی پر ساکت بیٹھ سکو۔“

”اگر مجبوری ہوتی تو بیٹھ بھی جاتی لیکن اس وقت میں تمہارے  
 مشورے پر عمل کروں گی۔ ایسی کون سی آفت آ رہی ہے۔ برائے  
 پرسوں تک ہمارے پاس ہے۔“ وہ بولی۔  
 ”شیر شیخ اور سردار علی حمید اس گاڑی میں کمرہ لے جائیں

جہاں اس کے لیے واہسی کے دروازے کھلے ہیں۔ اگر تم کراچی میں  
 ہی کوئی دوسری وادی قبول نہیں کرنا چاہو گی اور بالکل ہی لائق  
 رہا چاہو گی تو مجھے بتانا۔ لیکن ابھی نہیں۔ دو چار دن  
 ابھی تمہاری کھوپڑی گھومی ہوئی ہے۔“

وہ خاموش رہی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کمری  
 سانس لے کر کہا ”اگر تمہارا جانے کا فیصلہ برقرار رہتا ہے تب بھی  
 بر حال ڈاکٹر برنارڈ سے تمہارا چوٹیک کرانے کے پروگرام پر تو  
 عملدرآمد ہوتا ہی ہے۔ یہ تمہارا بچھ پر ایک بہت بڑا قرض ہے۔  
 اب تمہیں کی واہسی اور بھی زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تو اس کام کے لیے اتنا تردد کیا جا چکا  
 ہے۔ اتنی پریشانی اٹھائی جا چکی ہے۔ سب تیاریاں مکمل  
 ہیں۔ اب یہ کام ہو ہی جائے تو اس میں کوئی مزاح نہیں۔ لیکن  
 اس کے بعد جلد ہی میں تم سے اجازت چاہوں گی۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی میں جیسے بوجھل سا سکوت  
 چھا گیا تھا۔ اس سے زیادہ سکوت میرے دل میں چھا گیا تھا۔ میں نے  
 ایک دم ہی اپنے آپ کو بے حد تھا تھا سا محسوس کیا۔ محبتیں،  
 واقعتاً انسان اور انسان کے خواب سب کچھ کتنا بے بات اور  
 کیا ناقابل اعتبار تھا۔ خوابوں کی سرزمین پر سفر کرتے کرتے میں  
 اپنی کبھی انسان کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔

میرے مقل میں گڑواہٹ سی مکمل تھی اور میری جگہیں گویا  
 بٹلے گئی تھیں۔ جگہیں تلے گویا کسی نے انگارے بھروسے تھے۔ شاید  
 یہ انگارے نہیں۔ وہ آنسو تھے جو بہتا جا چکے تھے۔ مگر بہ نہیں  
 رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میں ایک مضبوط آدمی  
 تھا۔ میرے اعصاب فولادی تھے۔ اور مضبوط لوگ رویا نہیں  
 کرتے۔ گوکہ کچھ دیر پہلے میں خودی کہہ چکا تھا کہ کبھی کبھی مضبوط  
 اور فولادی اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں لیکن میں خود اس  
 کی عملی تفسیر بنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں بالکل پرسکون اور  
 خاموش رہا جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔

تاہم کچھ دیر بعد میں معافی بخش کرنے کے سے انداز میں کے  
 بٹرن نہ رہ سکا۔ ”وہ غیر معمولی سفید قام عورت۔ سیدی  
 لیڈی۔ جس پر تمہارے خیال میں میں پھسل گیا ہوں۔ جلد از  
 جلد اس ملک سے رخصت ہونا چاہتی ہے۔ اس لیے بھی میں نے  
 خون خرابے سے پرہیز کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہمارا مقصد تو اس  
 سے پہلے حاصل کرنا ہی تھا۔ یہ کام اگر خون خرابے کے بغیر ہو رہا  
 تھا تو شاید اس کے لیے کیا ضرورت تھی۔“

”وہ جاری ہے تو کیا تمہارے خیال میں بھی واہسی نہیں آئے  
 گی؟“ راجہ نے اب بھی میری طرف دیکھے بغیر تندر سے لہجے میں  
 اچھا قسم میری یہ بات لکھ لکھ۔ وہ جلد یا بدیر واہسی آئے گی اور  
 ملک کے لیے پہلے سے بڑا فائدہ بن کر آئے  
 گی۔“

زہن پر چھائی دُھند کچھ چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ تینوں لاؤنج میں موجود تھے اور چائے پی رہے تھے۔ وہ اب نازہ دم نظر آ رہی تھی۔ اس کے گلے پر پٹی لپی ہوئی تھی۔ کچھ نے لازم سے میرے لیے بھی چائے منگوائی۔ کچھ نے گلے اور سر سے مائل میں چائے پی گئی حالانکہ یہ ہمارے لیے خوش موقع ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایسا کام ہونے جا رہا تھا جس کے لیے ہم سب ایک عرصے سے اپنی اپنی جگہ کو شش کر رہے تھے اور دن دن پہلے تک اس کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ اس صحن میں کھڑے تھے۔ ایک باؤس ہو چکے تھے۔ عراب پر متوجع سے انداز میں وہ کام ہونے کی فورت آئی تھی تو ہم پیسے اس پر خوش ہونے کے قابل نہیں رہے تھے۔

چائے پی کر ہم تہ خانے میں آئے۔ سلسلہ گاؤں نے ہمارے لیے آہنی دواؤں کو کھلا جو منتقل تھا۔ اندر ڈاکٹر برٹنڈو نے ابھی پھیلا کر ہمارا استقبال کیا۔ وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی یہاں قریب آگئی تھی۔ اس کے باؤں پر پٹی تو بند ہو چکی تھی لیکن وہ چلتے پھرتے ہوئے اب بہت کم نظر آ رہا تھا۔ صند اور سلیمان جو گھر کی گھرائی پر مامور تھے مجھے بتانے لگے کہ دی لیڈی کا فون کیا تھا لیکن میں اس وقت سو رہا تھا اس لیے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا گیا۔ وہ ڈاکٹر برٹنڈو سے بات کر رہا تھا۔ صند اور سلیمان نے اپنی گھرائی میں برٹنڈو سے اس کی بات کر لی تھی اور اسٹیو سیٹ پر خود بھی سنتے رہے تھے۔ دی لیڈی نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ جلد از جلد اور دواؤں دارانہ طریقے سے اپنا کام کر دے۔ اس کا مطلب تھا کہ دی لیڈی نے اپنے ذہن کے مطابق فون کیا تھا جبکہ مجھے یہ بات یاد بھی نہیں رہی تھی اور میں نے اس کے فون کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب اس کام کو نٹانے کے معاملے میں غلط تھی۔

ڈاکٹر برٹنڈو راحیلہ کو دیکھ کر بڑی کر محوشی سے اگھر بیٹھ گیا۔ "آؤ۔۔۔ تو یہاں لڑکی اس کری پر بیٹھ جاؤ۔۔۔" اس نے ایک بڑے سے دیوار گیر کرسی پر بیٹھ کر دیکھنے اور لمبی چوڑی سیر کے پاس رہی ہوئی ریو لوکس چیرکری طرف اشارہ کیا۔ میرے خلف ساؤد سامان سے ملنا ہوئی تھی۔

راحیلہ بیٹھ چکی تو ڈاکٹر برٹنڈو نے خامے مشن لے لیے میں ہوا "کیسی رہی دی لیڈی سے تمہاری ملاقات؟" اس کی جانب راحیلہ تھی۔

راحیلہ نے کہا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر برٹنڈو نے سر ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بڑا متانے بغیر بولا "آؤ۔۔۔ لڑکی ابھی تک مجھ سے ناراض معلوم ہوئی ہے۔"

اب میں اسے کیا بتاؤں کہ وہ کس کس سے ناراض تھی۔

میں نے کہا "میں نے کہا اور یہ دونوں تمہارے گھر پر ہی قیامت رہیں گے۔" میں نے کہا اور گاڑی سے اُتر گیا۔ وہ محض کدمے اُچکا کر رہ گئی۔ شیریش نے آگے آکر ڈرائیو تک سیٹ سنبھال لی اور گاڑی اسے لے کر روانہ ہو گئی۔

میں چند لمبے ڈرائیو سے میں ہی کھڑا رہا حتیٰ کہ گیت دوبارہ بند ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر برٹنڈو سے بھی ملنے کی زحمت نہیں کی اور اس گیت مدم میں آکر لپٹ گیا جو فونی نے میرے لیے مخصوص کیا تھا۔ میرے ذہن میں ابھی تک آندھیاں ہی چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر راحیلہ نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا؟

گھوم پھر کر میرا ذہن ابھی تک پراکھرا کہ بے شک راحیلہ کو زندگی کی ہر آسائش، میسر بھی، گھر بھی ہے ایک بے کیف زندگی تھی۔ اس میں مسلسل آزمائشیں تھیں، تکلیف تھی، نار دھاز اور ناقابلِ یقین حالات کی پلٹاؤ تھی۔ ایک لڑکی کے اعصاب آخر تک تک اس کا ساتھ دے سکتے تھے؟ مگر وہ اسے ماننے پر بھی تیار نہیں تھی۔ وہ اس کے کچھ اور جواز تراش رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میری سوچوں کا ناقابلِ بیان سا بوجھ میرے ذہن کو شل کر رہا تھا۔ دیر سے دیر سے میرا ذہن خود کی میں ڈوبتا چلا گیا۔ شاید میں ان سوچوں سے فرار چاہتا تھا اس لیے کسی نئی ہی طاقت نے مجھے سلا رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے زندگی میں شاید کبھی اتنا ڈپریشن محسوس نہیں کیا تھا۔ میری بند کمر کی مددوش شرابی کی سی چند تھی۔ میں بن پنے نشے میں تھا۔ کبھی کبھی افسردگی میں بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو دیر سے دیر سے حواس کو کند کر دیتا ہے۔

انگرام کے پرزے مجھے بگاڑا۔ میں نے آنکھیں کھول کر پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ایک لمبے کے لیے گویا مجھے یاد ہی نہ آیا کہ میں کہاں موجود تھا۔ کمرے میں ٹکاپا اندھیرا پھیلا ہوا تھا کیونکہ کمرہ کیوں پر پردے پھیلے ہوئے تھے اور شاید شام ہو چکی تھی۔ میرے دل کے آگے میں بھی کچھ ایسا اندھیرا تھا۔ شاید وہاں بھی شام اُتر آئی تھی۔

میں نے انگرام کا ریموڈر اٹھایا۔ دوسری طرف شیریش تھا۔ وہ مجھے لیے میں بولا "سرا میڈم راحیلہ آگئی ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر برٹنڈو سے پوچھ لیا ہے۔ وہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے تیار ہے۔ آپ آجائیں تو کام شروع کرایا جائے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں دس منٹ میں آ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور ریموڈر رکھ دیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ افسردگی کو ذہن سے جھٹکنے کے لیے تیزی سے حرکت میں آجائے کبھی ایک کارگر تدبیر تھی اور مجھے یہ تدبیر آزمائی جا چکے۔ ورنہ افسردگی مجھے کھن کی طرح کھا جائے گی۔ میں نے نہایت پکرتی سے شارڈ لیا لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکلا۔

یہ کام آئے ہی اس کی پیشانی پر چلتیں نمودار ہو چکی تھیں  
میں نے دیکھے لیے میں ڈاکٹر بنارو کی بات کا جواب دینے کی  
فکرت کی "جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ کیا اس کے  
خوشی کے ساتھ ساتھ اسے تھا؟"

وہ ہوا میں اٹھ کر لڑنے کے لئے آیا۔ لیکن اس وقت میں نے کہا کہ جو شخص میرا ہے وہ میرا ہی ہے۔

یہ حالت میں طانی کی مگر ہے۔  
 "میں تو انسان کی سب سے بڑی خرابی ہے فتنہ برپا کرنا!" میں  
 نے غلطی سانس لے کر کہا "وہ کسی بڑی سے بڑی فتنہ برپا کرتے  
 وقت بھی یہ نہیں سوچتا کہ شاید کبھی اسے اس کی طانی کرنی  
 پڑے۔"

اس نے اپنے

ہاں... یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ اس نے اپنے

سارے جیسے کردار ملائی اور چاروں جیسے ساتھ ساتھ لگایا۔ اس وقت وہ

نہانے کیوں مجھے کسی انگریزی فلم کا کوئی مزاحیہ کردار لگ رہا تھا۔

اس نے کہا کہ اگر میں میرے رگے سامان کو چھپ کر کتا شروع کر دیتا تھا۔

سامان کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے راجہ سے پوچھا کہ تم نے چار گھنٹے اس کرسی پر ساکت بیٹھ کر گزارا تو کیسی؟ اگر تم کچھ چاہو تو تمہیں خواب آور دوا کا انجکشن دے سکتا ہوں۔ اس طرح تمہیں زیادہ راحت نہیں ہوگی۔ آرام سے اس کرسی پر نیم دراز ہو جاؤ۔

سوتلہ ہو گی۔ آنکھ کھلی کی ترچہ ٹھیک ہو چکا ہو گا۔  
 "کیا اس کام میں مجھے کچھ تعقیف محسوس ہو گی؟" راحیلہ  
 لڑکی نظر اٹھا کر اسے اسے گھور رہے ہوئے لڑکھا۔

لڑی نظر دلوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔  
 "تمیں۔۔۔ تکلیف تو کچھ نہیں ہوگی۔" ڈاکٹر پر بارنائے  
 میں سر ہلایا "اصلی کام بھی صرف آدھے گھنٹے کا ہے اس کے بعد  
 صرف اور صرف انتظار کرنا ہے۔ انتظار کرنا بچا کے خود ایک مہ  
 کام ہے خصوصاً صبا کے بیٹے کا انتظار کرنا۔"

ہمیں انتظار کر لوں گی۔ مجھ میں مہربانی سے انتظار کرنا  
 ہوتا ہے۔ تم مجھے کوئی انجکشن وغیرہ مت لگاؤ۔ وہ سرد  
 ہے۔

اگر مارو نے اس کے گلے سے پتی ہٹادی۔ اُس نے  
 کہا ہوا رکھی تھی جو بے رنگ تھی مگر چھائی کی ایک سی  
 دکھائی دے رہی تھی۔ اس چھائی میں انگلیوں کے نیلے نشانات  
 بھی نمایاں تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ ڈاکٹر ہرنارڈ حیرت سے بولا۔  
”تمہاری دی لینڈی کی محبت کی نشانی ہے اس سے ملنے کے لیے وہ خود اپنے لیے بھی۔“ راحیلہ نے ہر لیے کے لیے میں  
”تم بہت بے مبری لڑکی ہو۔۔۔ ضرور تم نے ہی کوئی کام  
”ڈاکٹر ہرنارڈ ایک بار پھر قلعی چڑیلوں کے اسٹاک  
”ورنہ دی لینڈی سے جس طرح پودا گرام ملے

”میں سمجھ لوں۔“ ڈاکٹر برار کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ  
 ”کچھ اسی سے ملتی جلتی بات ہے۔“ اس نے جاموں کی طرح  
 پھیلا کر راحیلہ کی گردن میں لپیٹ دیا اور بڑے استہساک سے اُس  
 چادر میں جھانکنے لگا۔

جاری ہے۔

میں نے غلامت سے کہا ”تم جہانوں کی طرح کام ضرور کرو  
جہانوں کی طرح ادھر ادھر کے قصے مت سناؤ۔“ ویسے بھی میری  
دوست کے بتول عورت میری کمزوری تھی لیکن اب ایسا  
نہیں ہے کہ میں کسی سو سال کی عورت میں دلچسپی لینے لگوں۔“  
”اے اے! تو وہ کسی سو سال کی نہیں ہے..... اور جب“

”نئی الحال تو دہ سوسال کی نہیں ہے..... اور جب میں

نہیں چاہئیں۔ مجھے تمہارا چہرہ اس طرح چاہیے جیسے کسی مڑے کا چہرہ ہوتا ہے۔

راجیلہ آنکھیں کھول کر اسے گھورتے ہوئے بولی "تم اسے مڑے کا۔۔۔ بلکہ زمانہ غار کے کسی مڑے ہی کا چہرہ سمجھو۔ اس میں اگر زندگی کی کوئی رست تھی تو وہ بھی تم جیسے مخوس لوگوں نے چھین لی ہے۔"

بحرہہ آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ ڈاکٹر برنارڈ... فی الحال شاید اس کی برہی کو مذاق سمجھ کر نالے جا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ بھی صرف یہ تھی کہ اس کا اپنا موزاں وقت برا خوشگوار تھا تاہم میں نہیں چاہتا تھا کہ راجیلہ کی ذہن پرلی جملے بازی جاری رہے اور کسی مرحلے پر برنارڈ کے جذبات مجروح ہو جائیں۔ وہ اس وقت ایک نازک کام میں مصروف تھا۔ اس کا موزاں خوشگوار رہتا ہی بہتر تھا۔

"ڈاکٹر اکلانی جتنا پسند کر دے؟" میں نے پوچھا۔  
"خدا کا واسطہ۔ ایسی باتیں مت کرو۔" وہ فوراً بولا "اس کام کے دوران میں میں کچھ کھانے پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی یہ وقت صرف دو منٹ کا ہے۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔  
میں نے اس وقت خدا کا شکر ادا کیا جب باقی وقت خیریت اور خاموشی سے گزر گیا۔ اس دوران میں راجیلہ نے مزید کسی ذہریلے جملے سے برنارڈ پر حملہ نہیں کیا اور پُر خیال انداز میں آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔

تھیک دو منٹ بعد برنارڈ نے دو سرا جا رہا تھا۔ اس میں سیاہ پینٹ نما سیال موجود تھا۔ اس نے یہ سیال ایک دوسرے نہیں برش کی مدد سے راجیلہ کے باقی آدھے چہرے پر پینٹ کرنا شروع کیا جس کی فطری رنگت برقرار تھی۔ کچھ دیر بعد وہ حصہ سیاہ ہو چکا تھا۔ یعنی اب معاملہ الٹ ہو گیا تھا۔ چہرے کا جو حصہ پہلے سیاہ تھا وہ اب سفید نظر آ رہا تھا اور جو حصہ سفید تھا وہ اب سیاہ ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ اس بار بھی چہرے کو پینٹ کرنے کے ساتھ ساتھ پچو تکیں مار رہا تھا۔ کوئی دیکھی آدمی اس طرح کر رہا ہو تو اسے کسی خاص روحانی عمل کا نام بھی دیا جاسکتا تھا لیکن وہ درحقیقت صرف اس ٹیکہ کی کھانے کے لیے ایسا کر رہا تھا۔ پینٹ مکمل کرنے کے بعد اس نے اسے زیادہ صحیح طور پر سوکھنے کے لیے مزید دو منٹ دیے۔

پھر اس نے راجیلہ سے پوچھا "اب تم تین گھنٹے تک آنکھیں بند کر کے بیٹھنے کے لیے تیار ہو؟ یہ خاصا مشکل کام ہے۔"  
"میں چھ گھنٹے بھی آنکھیں بند کر کے بیٹھ سکتی ہوں کیونکہ اس طرح مجھے تمہاری مخوس شکل نظر آتا بند ہو جاتی ہے۔" وہ بلا تامل بولی۔

ڈاکٹر برنارڈ نے اب بھی خوش دلی سے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا "اس وقت میں تمہارے لیے جو خدمت انجام دے رہا ہوں اس

دلیل کی ہوگی تو تمہاری بڑیاں بھی اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔"  
ڈاکٹر برنارڈ بولا پھر اس نے متاستانہ۔۔۔ بلکہ ترحم آمیز سے انداز میں سر ہلاتا اور بولا "تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگ آسانی سے کسی کی بات پر یقین نہیں کرتے حالانکہ غارے معاملے میں تم بہت سی اہل حین جن جس خدا پر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگوں کے ذہن بہت چھوٹے ہیں۔ سائنسی ترقی کی رفتار کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ کسی بھی نئی بات کو تمہارا پہچانہ دینا قوی نہیں کرتا۔"

"چھوٹا جانی! تم اپنی ترقی پسندی کو اپنے پاس رکھو اور کام کی لڑ دھیان دو۔" میں نے قدرے ہنسنے سے کہا "تمہاری سائنسی ترقی نے ہمیں بتے دکھ دیے ہیں ان کے بعد تو ویسے بھی ان کم کی سائنسی ترقی سے نفرت ہو گئی ہے۔"

اس نے کندھے اٹکائے اور دیوالوگ چیز کو ذرا اٹھا کر راجیلہ کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ ایک مٹھ پر سے اس نے چہرے کا بنور جائزہ لیا پھر دوسرے ایک طرف رکھ کے ایک نہایت نئی قسم کا یاد کو برش اٹھایا۔ یہ برش اس نے پیشے کے ایک جاہل میڈیوا جس میں سفید پینٹ سا موجود تھا لیکن یہ سیال پینٹ سے کچھ تیار اور دھو سے کچھ گاڑھا معلوم ہوتا تھا۔ اس میں اگلی تفرقی لکھ بھی موجود تھی۔

بارہ اور برش ہاتھ میں قیام کر ڈاکٹر برنارڈ راجیلہ کے چہرے پر لگ گیا اور مستعد سے لہجے میں بولا "آنکھیں بند کر لو۔ اور ہلکا سے۔" دیوالوگ چیز کا ایک لیور دبا کر اس نے اسے اس کی جگہ بالک کر دیا تھا۔

اس نے کسی ماہر مسودہ کی سی مشاقی سے وہ سفید غلغل راجیلہ کے چہرے کے سیاہ حصے پر پینٹ کرنا شروع کیا۔ درمیانی حصے کو پینٹ کرنا بڑی مہارت کا کام تھا کیونکہ اس پینٹ نما سیال کو غالباً سفید حصے کی طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔ برنارڈ یہ کام نہایت مہارت سے ہی کر رہا تھا۔ جس خاصیت سے وہ برش استعمال کر رہا تھا اسے دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر وہ پیشتر بھی ہوتا تو شاید بڑا مناسب کمال ہوتا۔

آخر اس نے سیاہ حصے کو مکمل سفید کر دیا لیکن یہ سفیدی پہلے اتنی رنگت کی طرح فطری نہیں تھی۔ کچھ ایسا ہی معلوم ہوا تھا جیسے راجیلہ کے آدھے چہرے پر فطری پینٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کے لیے اس کے چہرے کی سیاہی عمل خود پر چمپ کر رہ گئی تھی۔ برنارڈ اس کے چہرے پر پچو تکیں بھی مار رہا تھا جاہل تھا جس سے وہ ذہن نما سیال غالباً تیزی سے خشک ہوتا جا رہا تھا۔

برنارڈ نے یہ کام مکمل کر کے گویا سکون کی سانس لی اور راجیلہ کو بالک کر دیا "اب کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھل سکتی ہو تاکہ تمہارا ذہن سمجھ نہ ہو۔ آنکھیں ہوگی تو چہرے کے عضلات معمولی طور پر کھینچے اور اس کام کے دوران میں عضلات خراب بھی پڑ سکتے

کی وجہ سے تو جس میری شکل نہایت حسین نظر آتی تھی۔  
 "ڈاکٹر برنارڈ! راجیلہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے  
 بولی "تم خواہ سات مرتبہ بھی جنم لے لو اور اپنا سارا سائنسی علم بھی  
 اپنے چہرے پر آزمائو تب بھی مجھے تمہاری شکل حسین نظر نہیں  
 آسکتی۔ مجھے ریڈ ڈاٹ سے متعلق دیکھنے والا ہر چہرہ منحوس ہی نظر  
 آئے گا کیونکہ ان کے لیے میرے خون میں قدرت مہمل ہوئی ہے۔"  
 "اور میرے خدا۔۔۔" برنارڈ ہمت کی طرف دیکھ کر بولا  
 "تمہیں کیا ہو گیا ہے راجیلہ! میرا کہ تم بہت پر جوش لڑکی ہو  
 لیکن ایسی مطلوب الغضب نہیں ہوا کرتی تھیں۔"  
 "مجھے ہانک گئے تھے کہ کات کھایا ہے۔" وہ کمری سنجیدگی سے  
 بولی۔

"اور تب سے بے چارے کتے کی حالت خراب ہے۔" میں  
 بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسے موقعوں پر اگر راجیلہ کو کوئی جواب نہیں  
 دیتا تو آقا تھا جس میں وہ خوشخوار نظروں سے مجھے گھورتی ضرور تھی  
 لیکن اس وقت اس نے یہ زحمت بھی نہیں کی۔  
 ڈاکٹر برنارڈ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا "میرا خیال ہے  
 مجھے اپنا کام مکمل کر دینا چاہیے۔"

اس نے ویلرٹ نما ایک ماسک اٹھایا اور راجیلہ کے سر  
 پر عبادا۔ اس میں آگے کی طرف ایک خاص ساخت کا موٹا نیٹکون  
 شیشہ لگا ہوا تھا جس سے راجیلہ کا پورا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب  
 اس نے چھوٹے سے ایک اسٹینڈر پر سات مستطیل شیشے فٹ کیے۔  
 ہر شیشہ مختلف رنگ کا تھا اور یہ اسٹینڈر ڈاکٹر برنارڈ نے خود تیار کیا  
 تھا۔

یہ اسٹینڈر راجیلہ کے چہرے کے عین سامنے فٹ کر کے برنارڈ  
 نے ایک بلب ان شیشوں کے پیچھے رکھا جس میں طاقتور مرکزی  
 بلب لگا ہوا تھا۔ پھر وہ راجیلہ سے مخاطب ہوا "اب تم تین گھنٹے  
 تک اپنے آپ کو جتنا ساکت رکھو گی اتنا ہی بہتر ہو گا۔"

میں نے شیر شیخ اور سردار علی سے کہا "تم لوگ جاؤ تو چلے  
 جاؤ۔ تین گھنٹے اس طرح یہاں بیٹھے تم لوگ کیا کرو گے؟ میں تو  
 ہر حال میں بیٹھوں گا۔"

وہ ذرا تجسس سے انداز میں۔۔۔ لیکن خامے مہربانوں سے  
 بیٹھے ہوئے تھے شیر بولا "آپ بیٹھے ہیں تو ہم بھی بیٹھے رہتے  
 ہیں۔"

راجیلہ ماسک کے عقب سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی  
 "بیٹھا رہنے دو تا بے چاروں کو۔۔۔ ان کے سامنے سرکس کی بندیا  
 تیار ہو رہی ہے۔ یہ تماشا انہوں نے زندگی میں پہلے کہاں دیکھا  
 ہو گا۔"

شیر شیخ اور سردار علی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔  
 "آگھوں ہی آگھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور خاموشی سے  
 اٹھ کر چلے گئے میں نے راجیلہ سے کہا "ہنوں جوں مسئلہ حل

ہونے کے قریب آ رہا ہے، تمہاری سچی کم ہونے کے بجائے  
 جباری ہے تم ان مجلس ساتھیوں کی دل آزاری سے بھی باز نہیں  
 رہیں جو تمہارے ایک اشارے پر جان قربان کرنے کے لیے  
 رہتے ہیں۔" ضبط کی کوشش کے باوجود میرے لیے میں ہلکی سی  
 آہنی۔

تب وہ میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں سر ہلا  
 چرے پر ہر طرح کے چٹخت کی وجہ سے اس کا جواب پہلے سے  
 زیادہ عجیب لگ رہا تھا۔ ان دونوں رکھوں میں فزنی کی ہلکی سی  
 اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی لطافت سی ابھری۔ گویا اس کے  
 لیے یہ اطمینان کی بات تھی۔ وہ کسی کی دل آزاری کہنے پر  
 کامیاب رہی تھی۔

پھر وہ بھی انداز میں بولی "آج کچھ دیر سے دل میں ساواہا  
 ہے۔"

"طقت ہے ایسے دل پر۔۔۔ اور ایسے درد پر۔" میں نے  
 آہنی سے کہا۔

ڈاکٹر برنارڈ راجیلہ سے مخاطب ہوا "میں نے تم تین گھنٹے ساک  
 رہنے کی وجوہات کی سچی اس میں تمہاری زبان کا ساکت رہنا  
 شامل تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گی۔ باقی اچھا لگا  
 کر بیٹھوں گی۔" راجیلہ نے وعدہ کیا اور ٹاک کی سیدھ میں دیکھ  
 ہوئے ساکت بیٹھ گئی۔

"آگھیں بند کر لیں۔" برنارڈ نے یاد دلایا۔ راجیلہ  
 آنکھیں بند کر لیں۔

تب برنارڈ نے مرکزی لائٹ آن کر دی۔ تیز چمکی ہوئی  
 مختلف شیشوں سے گزرتی ہوئی راجیلہ کے چہرے تک پہنچے گی  
 شیشے غالباً فلٹرز کا کام دے رہے تھے اس وقت مجموعی طور پر  
 کچھ اس قسم کا تھا جیسے کسی کی تیار کر میں راجیلہ کا کوئی خاص  
 ایک اب ہو رہا ہو اور اسی مقصد کے لیے اس کے چہرے پر ماسک  
 چڑھایا گیا ہو۔ میں ایک تک اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ مرکز  
 بلب کی بہت تیز روشنی ہلکی ہو کر اس کے چہرے تک پہنچی  
 اور مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لمبی لمبی رنگ بدل رہی  
 معلوم نہیں یہ میرا فریب نظر تھا یا حقیقت۔ کہ مجھے اس  
 چہرے پر رنگ رنگ کر نہیں دے سکتی تھی۔

میں بھی راجیلہ کی طرح ساکت بیٹھا تھا اور ایک کچھ  
 مہر دیکھ جا رہا تھا۔ سطر یعنی اپنی جگہ ساکت تھا۔ میں گزرتی  
 رقص جاری تھی۔ ڈاکٹر برنارڈ نے ایک کتاب سجھائی اور  
 اطمینان سے ایک چھوٹے سے بند پر جالیانہ۔

"میرے کرنے کا اب کوئی کام نہیں ہے۔ اس لیے میں  
 مطالعے سے دل بہلاؤں گا۔ میری باقی تو تم ہی جا کر آرام کر  
 اس نے مشورہ دیا "تم اس کے پاس بیٹھے بیٹھے



ہو چکی تھی۔ برنارڈ نے پانی سے بھرے ہوئے ایک جگ میں بے رنگ سی کوئی دو اٹھائی اور وہ جگ راحیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اب تم واش بین پر رکے ہوئے مابین اور اس پانی سے منہ دھو لو۔"

راحیلہ کری سے انجلی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کا جسم بھی بیٹھے بیٹھے اڑ چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ذرا موڑا تو ڈا پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے بولی "ڈاکٹر برنارڈ! اندھا جس میں غارت کرے۔۔۔ سرکس کے کسی مسخرے۔۔۔ کسی کلاؤن کی زندگی بھی اتنی مضحکہ خیز نہیں ہوتی ہوگی جتنا تم نے میری زندگی کو مضحکہ خیز بنایا۔"

"اب جب دعائیں دینے کا وقت آیا ہے تو تم بد دعائیں دینے لگی ہو۔" برنارڈ کے لہجے میں شکوہ تھا۔  
"پہلے بد دعائیں دینے کی فرصت نہیں مل سکی تھی۔۔۔۔۔ مصروفیت بہت زیادہ تھی۔"

راحیلہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ پھر وہ جاکر واش بین پر اس جگ سے پانی لے کر اور انجلی طرح مابین مل کر نہایت آہستگی سے ہاتھ منہ دھونے لگی۔ میری دھڑکنیں اس وقت متحرک نہیں۔ شاید راحیلہ کے دل کا بھی یہی حال ہو۔

منہ دھونے کے بعد اس نے تولیے سے خشک کیا پھر دھیرے دھیرے ہماری طرف گھومی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ وہ اسی طرح انداز سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آئینے کے سامنے آنکھیں ہوئی اور مرتضیٰ لہجے میں بولی "برنارڈ! تم اپنی اس ساری ڈرامے بازی سے مجھے بھی جنس میں جھلا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اب میرا آنکھیں کھولنے کا حوصلہ نہیں پڑا۔ تم دیوانت داری سے مجھے بتا دو کہ چرو ٹھیک ہو گیا ہے یا نہیں؟"

اس نے سوال مجھ سے نہیں برنارڈ سے کیا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ ویسے بھی شاید مجھ میں فوری طور پر بولنے کی سکت نہیں تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا چرو واقعی اپنی اصلی حالت پر آپکا تھا۔ اس کے چہرے پر یہی گویا کہ کبھی کبھی ہی نہیں۔ اب اس کے پورے چہرے کی رنگت شگفتہ گلاب کی سی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا اور دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ انسانی ہو چکی تھی۔

اس لیے تک میرا دل امید اور ناامیدی کے درمیان کہیں مضطرب تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آخر میں راحیلہ کا چرو جوں کا توں نہ رہ جائے اور برنارڈ مہذرت خوابانہ لہجے میں یہ نہ کہہ دے کہ فلاں گز ہو گئی یا فلاں مسئلہ ہو گیا اس لیے اس کی کوشش سے صحیح نتائج حاصل نہیں ہو سکے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ کام جو بہت سے دشوار گزار سرطوں سے گزرنے کے بعد بھی مجھے مشکل ہی نظر آ رہا تھا آخر کار ہو گیا تھا۔ میرا دل تشکر کے جذبات سے نہ جانے کیوں لرزسا رہا تھا۔ شاید تشکر کے ساتھ ساتھ میرے دل کو

دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ کوئی خواب ہی نہ ہو۔ خواب ٹوٹ جائے اور آکھ کھل جائے تو سب کچھ پہلے ہی کی طرح دکھائی دے گا۔ ڈاکٹر برنارڈ بولا "میں تمہارے سوال کا جواب نہیں مل سکتا۔ تم ایک بادر لڑکی ہو۔ تم نے ایک عرصے تک حالات اور خالق اور مردوں سے زیادہ دلیری سے مقابلہ کیا ہے۔ تم خود آنکھیں کھول کر اب بھی حقیقت کا سامنا کر۔"

"مجھے کھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" راحیلہ غبار کرنے والے انداز میں بولی "اس سے تمہارے بارے میں میری جذبات تبدیل نہیں ہوں گے۔ اگر اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب بھی میرا چرو ٹھیک نہ ہو تو میں جس میں قتل کر کے تمہاری لاش ہی نہ خانے میں دفن کر دوں گی۔"

"آہ۔۔۔۔۔ تمہارے اس خوبصورت سراپا میں مجھ سے بھی زیادہ ضیافت روح متبع ہے۔" برنارڈ لحظہ سا سانس لے کر بولا "بہر حال۔۔۔۔۔ تمہیں تو کھولنا ہی پڑے گی۔ اب اس کے بعد پھر ہو گا سو دیکھا جائے گا۔"

"اچھا۔۔۔۔۔ تم کہتے ہو تو یونہی سی۔" راحیلہ نے گھڑی سانس لی اور یک دم آنکھیں کھول دیں۔ کئی لمبے تھک وہ یک جگے بغیر آئینے میں خود کو دیکھتی رہیں۔ اس کے چہرے پر صرف ایک لمبے کے لیے تغیر سا نمودار ہوا لیکن وہ نہایت معانی سے اسے دبا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چرو آثارات سے عاری دکھائی دینے لگا۔

اس کا چرو ٹھیک ہو گیا تھا تو یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ تاہم چند لمحے بعد آہستگی سے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف مڑی اور نہایت ملاحت سے بولی "تمہارا بہت شکر ہے ڈاکٹر برنارڈ! مجھے زندگیاں میں کبھی تم سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی لیکن اب تم مجھے ایک بالکل مختلف انسان نظر آ رہے ہو۔"

اس کا لہجہ اب بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ تیزی تندی "نقرت" تھی اور حد سے زیادہ برہمی اس لہجے سے منظور ہو چکی تھی۔ پھر انجلیکاٹ آئینے سے انداز میں میری طرف گھومی اور اسی ملاحت سے بولی "تمہارا بھی بہت شکر ہے اپنی اہم نے میری خاطر مت ذہن اٹھائی۔"

میں نے اپنی عجیب و غریب کیفیات کے درد جزر سے نکلنے ہوئے اور سنبھلتے ہوئے ذرا مسکرا کر کہا "بہت شکلف سے بات کر رہی ہو۔ لگتا ہے یکایک ہی تمہارے اندر کسی وضع دار با شکلف اور نرم ذہن انسان کی روح طویل کر گئی ہو۔"

"انسان خود اپنی جگہ ایک بہت بڑی بد روح ہے۔ اس کے اندر سو طرح کے انقلاب آتے رہتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "تو پھر تمہارے اندر کوئی نیا انقلاب آیا یا نہیں؟" میں نے فوراً حیرت آمیز لہجے میں پوچھا "تم نے جانے کا ارادہ لٹوی کیا یا نہیں؟"

"وہ تو جو فیصلہ ہو گیا سو ہو گیا۔ اس میں اب حیرت کی کوئی



نے اپنے لیے سے اپنی اذیت ظاہر نہ ہونے دی اور طویل سانس لے کر کہا "ہاں یہ ہے اصل بات۔ اور اس کے سامنے کوئی دلیل نہیں چل سکتی۔ جانے والوں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔" میں نے گویا بحث ختم کر دی۔

ڈاکٹر برنارڈ اس دوران میں میز کے قریب ہی کھڑا بغور باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور گویا ہماری گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم اردو میں بات کر رہے تھے۔

ہماری باتوں کا کچھ مفہوم گویا ڈاکٹر برنارڈ کی سمجھ میں آ گیا اور وہ باجھیں پھیلاتے ہوئے راحیلہ سے مخاطب ہوا "تم واصل اینڈ کمپنی کو چھوڑ کر باری ہو؟ بہت خوب۔ بہت خوب۔ آخر سے ہی سہی۔ لیکن تم نے اچھا فیصلہ کیا۔ اب تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوارٹرز میں کسی بہت اچھے عہدے پر فائز کر دیں گے۔ ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوارٹرز میں کوئی اچھا عہدہ بغیر غلوں کے سربراہوں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔"

"میں لغت سمجھتی ہوں تم برس۔ ریڈ ڈاٹ پر۔ اور تمہارے اہم عہدے پر۔" راحیلہ ایک دم پھر گویا جلال میں اپنی "اس سے تو کسیں بہتر ہے کہ میں جنگلی سنوڈوں کے ریڈ ڈاٹ میں شامل ہو جاؤں۔" ڈاکٹر برنارڈ کا منہ بن گیا اور وہ ناگوار سی سے بولا "واقعی تم لوگ اس قابل ہی نہیں ہو کہ تمہیں کبھی کوئی اچھی پیشکش کی جائے۔"

"اور تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں اچھائی اور بُرائی کا فرق معلوم ہو سکے۔" راحیلہ ترکی پر ترکی بولی "خدا نے تم لوگوں کی آنکھوں کاٹاں اور دلی پر مہر لگا دی ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے لامنت سے ڈاکٹر برنارڈ کو مخاطب کیا "معاف کرنا چاہے برنارڈ! میں اور راحیلہ تمہارے کے مطابق اپنے کندے کپڑے تمہارے سامنے دھونے بیٹھ گئے تو تم نے اس سے غلط مطلب اخذ کر لیا اور تمہیں بے نقط سننا پڑا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ان چٹکوں میں پڑنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔ یہ بتاؤ کہ اب راحیلہ کو کسی احتیاط کی ضرورت تو نہیں؟"

اس نے کندھے اچکا کر گویا ناگوار سی کوڑھن سے ہٹکا اور ایک بار پھر نیز کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "ہاں۔۔۔ دو چار دن تو احتیاط کرنی ہوگی لیکن وہ شخص اتنی ہوگی کہ دھوپ میں جاتے وقت یہ لوٹن اپنے چہرے پر لگایا کرے۔"

اس نے میز سے ایک شیشی اٹھا کر راحیلہ کی طرف بڑھائی جس میں پانی جیسا ایک بے رنگ مائع تھا۔ راحیلہ شیشی لے کر اسے بغور دیکھنے لگی۔ برنارڈ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دن نکلنے کے بعد کسی وقت بھی انسان کا دھوپ میں پلے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ صبح تیار ہونے کے بعد ہی احتیاطاً یہ لوٹن چہرے پر لگایا کرے۔ یہ پانی کی طرح پتلا اور بے بو ہے۔ چہرے پر اس کی سوجھ بوجھ کا احتیاط کوئی احساس نہیں ہوگا۔"

ناخن نہیں۔" وہ غیر متحرک لیے میں بولی "تمام اب اندہ ضرور کہ میں تم سے کسی ناخوشگوار اور مخ ماحول میں اجازت نہیں مانگی۔ میں دوستانہ ماحول میں رخصت ہوں گی اور شاید آئندہ یہ ملاقات ہوتی رہے۔"

"اب جبکہ تمہاری کھوپڑی ٹھنڈی ہو گئی ہے تو مجھے ذرا قہقہہ سے مسخ طرح کوئی رجب سمجھاؤ تو سہی۔" میں نے لامنت سے کہا۔

"وہ شاید کوئی ایک نہیں۔۔۔ کئی وجوہات ہیں۔" وہ دوبارہ بالوں کی چھڑ پر جھپٹتے ہوئے بولی "شاید تم نے ٹھیک ہی کہا۔ فاسس ٹھک گئی ہوں۔۔۔ اور مجھے عارضی نہیں، مستقل آرام چاہیے۔ میں اپنا لائف اسٹائل بدلنا چاہتی ہوں۔ میں سوئی گئی ہوں کہ جو کچھ میں کرتی ہوں یہ ایک لڑکی کے کام نہیں ہیں۔"

"لائف اسٹائل تو تم میاں رہ کر زیادہ آسانی سے بدل سکتی ہو۔ تمہیں ہر طرح کی سپورٹ حاصل ہوگی۔ تم جیسا لائف اسٹائل چاہو اختیار کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"جی تو مسئلہ ہے۔۔۔۔۔۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اب میں بغیر کسی سپورٹ کے بغیر کسی کی مداخلت کے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"وہ بھی تمہیں رسچ ہوئے کر سکتی ہو۔" میں نے کہا۔ "نہیں کر سکتی۔ میں تمہارے قریب رہوں گی تو وہ خود بخود ہی کا اس میں رہا نہیں ہوگا جو میں چاہتی ہوں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "وہیے تمہارا یہ کتا کی نظر ہے کہ جو کچھ تم کرتی پھر رہی ہو وہ ایک لڑکی کے کام نہیں ہیں۔ یہ تو بچہ میں ان خبیث ریڈ ڈاٹ والوں کی وجہ سے کچھ عرصہ رہا کرتا رہا۔ میں سمجھی کہ لائف اسٹائل بے ہودہ ہو گیا۔ اب تو اس سے مکمل طور پر جان چھوٹ رہی ہے۔ اور ان دونوں جو کچھ تم کر رہی ہو وہ تو اب غیر ممالک میں کیا، پاکستان میں بھی کئی بہت بڑی کمپنیوں کی ملازمت کرنے والی لڑکیاں اور کئی بہت بڑی کاروباری کمپنیوں کی لڑکیاں کر رہی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑے دارانہ قسم کی اور بہت بڑی آفس جاب ہے۔ تم خبردار کی حیثیت سے ایک بڑے کمپنی آف کمپنیز کو چلا رہی ہو۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ ایک لڑکی کا کام نہیں ہے؟"

شاید اب اس سے کوئی دلیل بن نہیں پڑی تھی۔ وہ لڑکھاتے ہوئے خند سے لیے میں بولی "میں اب میں لاہور میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ دی سرکل سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ تمہارے قریب، تمہاری نظریں دیکھنا چاہتی۔"

میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا لیکن میں

ڈاکٹر برنارڈ نے گویا اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے پُراشتاق انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا ”میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”تمہیں معلوم تو ہے۔۔۔۔۔ میں نے قدرے تعجب سے کہا ”پرسوں صبح دوسرا تبادلہ عمل میں آئے گا۔ پروگرام ملے ہو چکا ہے۔“

”افسوس! پرسوں صبح تک کا وقت میں اس قید خانے میں کیسے گزاروں گا؟“ وہ گراہ کر بولا ”میں نے اپنا کام دیا انداز میں سے عمل کر دیا ہے۔ تم مجھے ابھی کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“

”واہ میرے دوست!“ میں نے سر ہلایا ”تم تو کچھ زیادہ ہی پھیلے لگے۔ تمہیں چھوڑ دوں اور ٹوٹی کی طرف سے ممبر کروں جو دی لیڈی کی تحویل میں ہے؟ مجھے تو نہیں معلوم کہ دی لیڈی کہاں رو پڑی ہے اور کس طرح اس سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔“

”میں چلا جاؤں گا تب بھی ٹوٹی واپس آجائے گا۔“ اس نے گویا مجھے نکل دی۔

”میں نے تم لوگوں پر جتنا اعتبار کیا ہے اتنی کافی ہے۔ اب یہ توقع مت رکھو کہ میں بالکل ہی آنکھیں بند کر کے تمہاری ہریات مان لوں گا۔ تم لوگ اتنے بھی نیک اور دیاندار نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ مایوسی کے سے عالم میں خاموش ہو گیا۔ ایک لمحے کے وقت سے میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے تمہیں معلوم ہے دی لیڈی کہاں موجود ہے۔ یہاں سے نکل کر تم اس کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے تھے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میرا تو خود کافی عرصے سے اس سے رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ مجھے اب بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس طرح اس سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ چند کھینچے پہلے گو کہ تمہاری غیر موجودگی میں اس نے مجھ سے بات کی۔ پھر بھی اس نے اس سلسلے میں کوئی اشارہ تک نہیں دیا کہ کہیں تم لوگ تشدد کر کے مجھ سے معلوم نہ کر لو۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر تم یہاں سے نکل کر کہاں جانا چاہتے تھے؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو صرف آزادی کے احساس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ پرسوں صبح تبادلے کے وقت تک تو شاید میں بیس لوٹ آتا اور تمہارے ہی توسط سے دی لیڈی کے پاس پہنچا۔“ اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

میں چند لمبے اسے گھورتا رہا۔ اس کی گویا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیوں گھورتا رہا تھا۔ آخر میں نے تصفی سانس لے کر کہا ”ان چٹا بازوں کو چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔۔ اور آرام سے پرسوں صبح تک کا وقت یہاں گزار دو۔ اب یہ تمہارے لیے قید خانہ نہیں ہے۔ اب تو تمہیں ایک سہان کی طرح زندگی کی ہر آسائش یہاں

میں ہے۔ اب شاید پرسوں ہی تم سے ملاقات ہو۔ خدا حافظ۔“

میں نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور رابطہ کو توڑنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔ اور اگرچہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا اور رابطہ کو اپنے مقابل بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اب جبکہ تم کسی قیت پر اپنا فیصلہ نہ لے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر کل اکاؤٹس ڈیپارٹمنٹ سے باضابطہ طور پر اپنا حساب کتاب کرو۔ اسے واجبات وغیرہ وصول کرو۔ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اگر تم میری طرف سے کوئی چیز قبول کرنا چاہو کرو تو بلا کلف مجھے بتا سکتی ہو۔“

”میری کینیٹر میں نہ سہی، کسی اور کینیٹر میں کوئی بھی نوکری۔۔۔۔۔ غرضیکہ تم اپنی کوئی بھی ضرورت بتا سکتی ہو اور اسے دوستی کی حقیر نشانی سمجھ کر قبول کر سکتی ہو۔“

”مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ میں اکاؤٹس ڈیپارٹمنٹ سے حساب کتاب بھی کرنا نہیں چاہتی۔ میرے سیونگ اکاؤٹس میں ہر عرصے کے گزراوے کے لیے رقم موجود ہے۔ وہ میں کراچی ڈرافٹر کراؤں گی۔ میں نے سب سے اپنی جدوجہد کا آغاز کر کے بڑے حاصل کراؤں گی۔ مجھے زندگی گزارنا آتی ہے۔ مجھے کسی خاص چیز طلب یا ضرورت نہیں ہے۔ میرا حال تمہاری دیکھش کا شہر ہے۔“

تمنایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ کمینٹ کی آنکھوں میں ڈرا بھی آساف، بچھتاؤا یا تغیر نہیں تھا۔ چہرے پر کسی ظالم کے قہر نہیں تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی کمزور دل ہو سکتی تھی۔

”پھر بھی۔۔۔۔۔ ہر کام کا ایک باضابطہ طریقہ ہونا چاہیے۔ میں نے نری سے کہا ”اگر تم اکاؤٹس ڈیپارٹمنٹ سے واجبات لے لو تو اچھا ہو گا۔ اس کے علاوہ پرسوں ٹوٹی واپس آجائے تو میں چاہتا ہوں کہ تم باضابطہ طور پر چارٹس اسے ڈراؤں نے جو اضافی کام تمہارے پُر کر دے گئے تھے جن میں میرے ذمہ مکان کی دیکھ بھال بھی شامل ہے۔ ان کے بارے میں آئندہ صورت حال اسے سمجھا دو۔ اس کے بعد۔۔۔۔۔“

میں نے خاموش ہو کر طویل سانس لی اور ایک لمحے کے قہر کے بعد سلسلہ نظام جو ڈرا ”اس کے بعد میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ کراچی چلو۔ ہمارے سب قریبی ساتھی بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ وہاں میں تمہارا چہرہ ٹھیک ہونے کی خوشی میں اپنے اشارہ ہوئی میں ایک بہت شاندار پارٹی دینا چاہتا ہوں۔ پروگرام بہت پہلے سے تھا۔ میں نے سوچا ہوا تھا کہ جب بھی تم چو ٹھیک ہو گا ہم سب ساتھی کراچی میں اپنے ہوٹل میں جمع ایک طرح کا چھوٹا سونا جشن منائیں گے۔ اب تم اسے ایک الوداعی پارٹی کہہ سکتی ہو۔ یہ فیوژنل پارٹی تمہارے اعزاز ہوگی۔“

اس کے چہرے پر ہلکیا ہٹ کے آثار نظر آئے۔ میں

خوردگی در آئی ”مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔“  
 ”مجھے تم سے کیا امید تھی۔“ اس کے لیے میں ایک قسم کی  
 شکرگزاری تھی۔ اس کے ذہن سے گویا کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔  
 اچانک شیر شیخ اور سردار علی گھر سے داخل ہوئے۔  
 راجیلہ کا چہرہ ٹھیک ٹھاک دیکھ کر وہ دونوں ٹھیک ٹھیکے شاید تمام تر  
 تیاریوں اور ڈاکٹر برٹراڈ کی موجودگی کے باوجود انہیں اُمید نہیں تھی  
 کہ یہ کام ہو جائے گا اور وہ اس انتخاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ  
 سکیں گے۔ تاہم دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے سپات نظر آنے  
 لگے۔ راجیلہ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور یہ ظاہر کرنے کی  
 کوشش کی کہ اب اس کا موافق خراب نہیں تھا۔ لیکن شیر اور  
 سردار کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

راجیلہ کا چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ کام ختم ہو چکا تھا۔ شاید  
 اسی لیے شیر شیخ نے پوچھا ”سرا اب کیا پروگرام ہے؟“  
 ”کوئی پروگرام نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”پرسوں صبح  
 تک اب ہم انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے لیکن اس دوران میں  
 ہر حال پہلے ہی کی طرح الرٹ رہنا ہے۔ تم دونوں راجیلہ ہی کی  
 نگرانی پر رہو۔ جب تک ٹونی واپس نہیں آجاتا ڈاکٹر برٹراڈ کی  
 نگرانی بھی سخت رہنی چاہیے۔ کوئی اسے زندہ سلامت یہاں سے  
 نہ لے جائے۔ کل میں اور راجیلہ آفس آئیں گے۔ پرسوں  
 چارلے کے لیے چلیں گے۔“

”ٹھیک ہے سر“ انہوں نے سر ہلایا۔

”میں اب چلیں۔“ صبح آفس میں ملاقات ہوئی۔ ”راجیلہ  
 اٹھتے ہوئے بولی۔

”تم دونوں اپنے آپ کی طرح راجیلہ کے ساتھ باؤ کے اور اس  
 کے گھر تعینات رہو۔“ میں نے شیر اور سردار علی کو حکم دیا۔  
 انہوں نے اٹھا۔ میں سر ہلایا اور راجیلہ کے پیچھے پیچھے رخصت  
 ہو گئے۔

میں اب تک یہ کہہ کر فارما ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے سامنے  
 کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ تمام اس لیے کہ کارڈینا بہت مشکل  
 کام تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی اثنا میں  
 صفدر میرا موبائل فون اٹھا لے رہے میں آیا۔ میں فون ڈرائنگ  
 روم میں چھوڑ کر تیار تھا۔

”سرا دی لینڈی اب بہت کڑا چاہتی ہے۔“ اس نے فون  
 میری طرف پڑھائے۔

فون مجھے تھا اور رخصت ہو رہا۔ میں نے فون کان سے لگا کر  
 پہلو کھاتو دی لینڈی کا تعہد بولی ”اب تو خوش ہو؟“

”کس بات پر؟“ میں نے غماز لہجے میں پوچھا۔

”میرا اندازہ ہے کہ اب تک تمہاری محبوبہ کا چہرہ ٹھیک ہو چکا  
 ہوگا۔ اصولاً اس وقت تمہیں بہت خوش ہونا چاہیے۔“ وہ ذرا  
 شرع لہجے میں بولی۔

”بلدی سے کہا“ ظاہر نہ کرنا۔ چھانسی چڑھانے جانے والے مجرم کی  
 ہی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ معقولیت کی حدود  
 میں ہو۔ تم نے مجھے بھی چھانسی چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔  
 میں ہی آخری خواہش پر خفاہ خواہ کوئی اعتراض اٹھانے کی کوشش  
 نہ کرنا۔ یہ نہایت معقولیت کی حدود میں ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم  
 ایک دوسرے کو ذرا باعزت انداز میں خدا حافظ کہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی ”مجھے اس  
 برائی اعتراض نہیں۔ لیکن پانی کے کسی مرحلے پر تم قلمی انداز  
 میں اٹھ کر یہ اعلان کرنا نہ شروع کرنا کہ یہ ایک فیڈویل پارٹی ہے  
 اور راجیلہ کے اعزاز میں ہے کیونکہ وہ ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔  
 میں چاہتی ہوں تمہارے ساتھیوں میں بھی جتنے کم سے کم لوگوں کو ظلم  
 ہوئے تو اسی ہی ستر ہے۔۔۔۔۔ اور غیر متعلقہ لوگوں کے سامنے تو یہ  
 ذکر آتی نہیں چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس پارٹی کے بعد  
 نہایت خاموشی سے ہمارے راستے جدا ہو جائیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ اور کوئی شرط۔۔۔۔۔؟“ میں  
 نے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ اور کوئی شرط نہیں۔“ وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔  
 ایک لمحے کے لیے گھر سے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ اس  
 سے پہلے میں نے بھی ایسے سکوت میں اپنے آپ کو آواز مضطرب  
 محسوس نہیں کیا تھا جتنا اس وقت محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اس  
 نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں میں  
 آنسو اور پچھتاوے کی پرچھائیاں نظر آئیں۔  
 ”آئی اے مجھے افسوس ہے۔“ وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔

”کس بات کا؟“ میں نے ملاحت سے پوچھا ”کیا اس بات کا  
 کہ تمہارا چہرہ ٹھیک ہو گیا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ مجھے افسوس  
 ہے کہ سب کچھ اس طرح نہیں ہو سکا جس طرح تم چاہتے تھے۔“  
 ”کچھ پچھاتے ہوئے بولی۔

”شکر ہے جس میں اس پر افسوس تو ہے ورنہ مجھے تو اسی بات کا  
 افسوس تھا کہ تمہیں افسوس تک نہیں ہے۔“ میں نے گہری سانس  
 لے کر کہا ”تو یہ تم نے بھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر اس کی  
 وجہ کیا ہے؟“

”میرے ذہن کا کوئی ٹیڑھا پن۔“ اس نے اطمینان سے  
 اظہار کیا۔

”اور تم اس نیزے پن کو دور کرنے کی کوشش نہیں  
 کر سکتیں؟“

”نہیں ہوں۔۔۔۔۔ مگر کامیاب نہیں ہوئی۔“ اس نے جواب  
 دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ جب انسان کسی معاملے میں مجبور ہو تو پھر  
 یہ ممکن کیا جاسکتا۔“ میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر شکست

لئے حقیقت پسند کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ میں اس طرف  
حقیقت پسند نہیں ہوں۔ ”میں نے کہا۔

”مجھے معلوم ہے تم کس طرح کے حقیقت پسند ہو۔ تم اپنے حساب سے سوچو تب بھی تیس مری بات ان لکھا جا رہی ہے۔“  
طاقت سے بولی۔

”مثنوی ٹھیک ہے نا؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ملازم ہمیں آج کل بہت سی دشواریاں پیش آ رہی ہیں اس کے باوجود ہم نے اس کے ساتھ دبی روٹی رکھا ہے جو انسانی اہم شخصیات کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اس کا ہاؤس ملا سکے۔“

”اس صورت میں ڈاکٹر برٹو تھیس پورای جلا ہوا  
مکان کو تلے کے ایک بد شکل بختے کی صورت میں دیکھے۔  
اس وقت بھی تقریباً ایسا ہی ہے“ میں نے کہا۔

”تم بہت بد معاش ہو۔۔۔۔۔“ دودھ میرے سے انہی ”اور وہ بڑا قسم کر رہا ہے۔ اے اور بھی کچھ نہ کچھ تجربات کرنا رہتا ہے۔ خیر۔ اب تم تلخ باتوں کو چھوڑو اور میری اصل بات کا جواں رو۔“

میں نے ایک لمحے بعد جواب دیا "چھا۔۔۔ لکھ  
سے۔۔۔ کل ہی سہی۔"

”بہت شکریہ۔“ اس کے لہجے کی شیرینی بڑھ گئی۔

”اس کے بارے میں تمہیں کچھ دیر پہلے ہی بتا دیا گیا۔“

”اس وقت ابھی احتیاط جاری ہے۔“ میں نے استہزائیہ  
میں کہا۔

”تمہاری طرف سے تو ہر وقت ہی محاط رہتا ہے۔  
عاشق و دلدارین کہہ بیٹوں ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں۔“ وہ بولی۔  
”اب مجھے اتنا بھی مخمخا ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔  
میں نے گھبرا مانتے ہوئے کہا۔

”بات گھٹیا پن کی نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ تم غلط فطریات..... اپنے گھٹ منہ کے بہت بکے ہو۔ ذہن میں جو باتیں گھٹ کر چکے ہو، اس پر پوری سختی سے قائم رہو۔ حالات بدلتے جاتے ہیں، لیکن تمہاری فطرت سے متاثر نہیں ہوتے۔“ وہ عالمانہ لہجے میں بولی ”مجھے تو اسی پر جرت ہے کہ صبح کی طے شدہ باتیں تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کو کوشش نہیں کی۔ کسی ایجنڈے کو ہمارے بارے میں خبردار نہیں کیا..... بلکہ اپنی محبوبہ کو بھگانے پر پاکرے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ہمیں تم سے اس پھندے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔“

”میں صرف اس آسمے پر اتنا امن پسند ہو گیا ہوں کہ آ

”عجب! میں نے دل ہی دل میں استغاثہ سے انداز میں دُورایا اور دل کے کسی گوشے میں خفیہ سی ایک کک محسوس ہوئی۔ انگریزی میں اس مضموم کے لیے دلی لہجے کی جو لفظ استعمال کیا تھا اس میں ایک عجیب سی دلربائی تھی مگر میں اس سے محفوظ نہیں ہو سکتا تھا اور اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ خوشی کہیں نہیں منظر میں چلی گئی تھی۔ درحقیقت تو میرے دل میں ایک بے عنوان سناٹا بچلا ہوا تھا۔“

”ہائیسس میں بہت خوش ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مادر وہ آگ میں لپٹی ہوئی لڑکی بھی خوش ہے یا نہیں؟“ اس کی آواز میں وہی ایک مخصوص ٹھنک موجود تھی جو دلوں کو گندہ کدیا کی طرح تھمکراتی تھی۔ اس وقت میرا دل بچھا ہوا تھا۔ میں مصنوعی خوش مزاجی کا سہارا لیے ہوئے تھا۔

”ہاں۔ وہ بھی بہت خوش ہے۔۔۔ لیکن یہ خوشی پائیدار ہوئی  
 جا رہی ہے۔“ مگر نے کہا۔

”پائیدار ہی ہوگی۔“ اس کے لیے میں کھٹک کچھ اور بڑھ گئی  
 ”جس میں اس بات پر تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ کم از کم جاتے  
 وقت تو ہم ہمیں ایک عظیم خوشی دے کر جا رہے ہیں۔“  
 ”اگر مجھے شکر ہے جس پر خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو

میں شکر یہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے گھٹنہ لیجے میں کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر ہر نام کو یقیناً معلوم ہو چکا تھا کہ راجیلہ صرف مجھے ہی نہیں، تمام ساتھیوں کو چھوڑ کر جا رہی تھی اور جب وہ دی لہڈی کے پاس جائے گا تو یہ بات اسے بھی بتادے گا۔ اس لیے فی الحال میرا ایسا بائیں کرنا محض بھرم دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور میں محض بھرم دیکھنے کی خاطر کوئی بات کرنے کا کاغذ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس وقت نہ جانے کون میں اسے اصل بات نہ بتا سکا۔

دی لہڑی ہوئی ۳۲ بجے کام بھی ہو چکا ہے۔۔۔۔۔ تم بھی خوش ہو۔۔۔۔۔ دو خطبات کا لڑکی بھی بہت خوش ہے تو پھر اب وقت کیوں ضائع کیا جائے؟ پرسوں کے بجائے کل صبح دو مرا جا رہے کیوں نہ کر لیا جائے؟ ہم جیسے اور تم جیسے لوگوں کے لیے تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ تو رورے جو نہیں سمجھنے کی ہمت ہے۔۔۔۔۔

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا ”جو پروگرام طے ہو چکا ہے اسے اسی طرح رہنے دیا جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا؟“ منیر ایک دن میں راجہ کی طرف سے تھوڑا بہت اور اطمینان ہو جانے لگا۔

”اس کی طرف سے اب تم مطمئن ہی رہو۔ مجھے معلوم ہے برٹارڈ نے اپنا کام دہانتہ ادا کر لیا ہوگا۔ محض ایک دن میں اس سلسلے میں ہمیں کوئی کارروائی نہیں مل جائے گی۔ فی الحال تو ہمیں ہماری زبان کو ہی کارروائی سمجھنا پڑے گا۔ محض انتظار میں ایک دن شائع کرنے کا خیال چھوڑ دو۔ حقیقت پندہ بن کر سوج۔“ وہ بولی۔

”حقیقت پسند تو میں ہوں۔ لیکن ذرا دوسری طرح کا حقیقت پسند ہوں۔ آج کی دنیا میں خود غرض اور بے حس انسان کے

لوگ ملک چھوڑ کر جا رہے ہو۔ میں نے کہا "ویسے کیا  
واقعی تمہاری اس بات پر اعتبار کر لیتا چاہیے؟"  
"بالکل کر لیتا چاہیے۔ لیکن یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ  
یاد رہے تم سے ہم ملاقات ہوگی۔"

میرے ذہن میں راحیلہ کے الفاظ گونج اٹھے اس نے کہا تھا  
میرے پھر آنے کی اور پہلے سے بڑا قند بن کر آئے گی۔ کہیں  
بات نہیں تھا کہ وہ اپنے غصے اور برہمی کے باوجود صحیح بات کر رہی  
لیکن میں اپنی فحش میں اس کا بڑا متاثر تھا۔ بعض لوگوں کے  
بال میں تو عورتوں میں ایک خاص انسانی کیفیت ہوتی ہے جسے  
FEMININE INTUITION کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے خیال  
لی بعض عورتیں، بعض اوقات اپنی اس کیفیت کے تحت کسی  
انسان کے بارے میں پہلے ہی آگاہ ہو جاتی ہیں۔ شاید راحیلہ میں  
ایسی ہی کیفیت ہو لیکن سرورست میں اسے کوئی خاص اہمیت  
دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"ویسے اندازاً کب تمہارے دوبارہ نازل ہونے کا امکان  
ہے؟" میں نے سرسری سے لیجے میں پوچھا۔  
"اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" وہ خوشگوار لیجے میں  
بلی میں تو آسپ ہوں۔ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ پہنچ سکتی  
ہوں۔"

"جلی بار ایسا آسپ دیکھا ہے جو اپنے آپ کو آسپ ہی کہہ  
تا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"جس دن تم اس آسپ کے زیر اثر آ جاؤ گے اس دن  
تمہاری طاقت کی گنا بدھ جانے کی سسر چوہری! تم مجھ سے بھی  
بڑے آسپ بن جاؤ گے۔"

"خدا اچھے اس دن سے محفوظ رکھے۔" میں نے کہا۔  
"مجھ سے آنندہ ملاقات کے بعد تم یہ دعا بھی نہیں مانگو  
گے۔ اور آنندہ ملاقات سے تمرا وہ ملاقات نہیں ہے جو کل  
ہوئی ہے بلکہ اس کے بعد کی کوئی ملاقات۔" وہ ہلکا سا قندہ لگاتے  
کے بعد بولی۔

"کیا تم پھر کوئی قندہ لے کر اس ملک میں نازل ہوگی؟" میں نے  
پوچھا کہ کہ مجھے اس سوال کے دائرہ ارادہ جواب کی توقع نہیں  
تھی۔

"کوہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔" وہ زور دے کر بولی  
"نہیں اس اندیشے میں دھڑا ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اس  
کم کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ  
اسے ملاقات اسی ملک میں ہو۔ اچھا۔۔۔ فی الحال خدا حافظ۔"  
اس نے اچانک ہی بات ختم کر کے ہونے کہا "صبح میرے فون کا  
انتظار کرنا۔ اور اس تپا لے کے وقت اپنی اس اہمیت محبوبہ کو  
ساتھ لے کر مت آنا۔"

"نیک۔۔۔ اس موقع پر تو ظاہر ہے اس کی کوئی ضرورت

نہیں ہے۔ وہ بھلا کیوں ساتھ آنے لگی؟" میں نے کہا۔  
"آخر وہ تمہاری محبوبہ۔۔۔ نائب۔۔۔ ایگزیکٹو ڈائریکٹر  
بھی کچھ ہے۔ تم جہاں چاہو اسے ساتھ لے جاسکتے ہو۔ کل اس کی  
ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن تمہارا کیا بیرو سا کہ محبت میں آکر ساتھ  
اٹھلاؤ۔" وہ شر سے لیجے میں بولی۔

"منظوری باتیں مت کرو۔" میں نے کنوڑ سے لیجے میں کہا۔ میں  
اسے نہیں بتا سکا کہ وہ جتنے دشتے کنواری تھی راحیلہ وہ سب توڑ  
دینا چاہتی تھی۔

اس نے ایک کھٹکتا ہوا قندہ لگایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔  
میں نے فون پر شبیر شیخ اور سرور علی سے رابطہ کر کے انہیں  
پروگرام میں تبدیلی کی اطلاع دی اور بتایا کہ راحیلہ کی ٹھہرائی پر  
سامور رہنے کے لیے میں صبح ہی سفر اور سلیمان کو بھیج دوں گا جبکہ  
ان دونوں کو میرے پاس آ جانا چاہیے۔ تپا لے کے موقع پر آج ہی  
کی طرح میں ان دونوں کو لے جانا چاہتا تھا۔

انہیں مطلع کرنے کے بعد میں نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے  
کمرے میں جا کر سو گیا۔ دوسری صبح فون کی ٹھنکی سے میری آنکھ  
کھلی۔ ٹھنکی سوا کل فون کی بج رہی تھی۔ میں نے فون اٹھانے سے  
پہلے ٹیبل ہلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں  
نے کمر کی کارپوزر دہا کر دیکھا۔ سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

"خدا اچھا۔۔۔! صبح صبح کس کا فون اٹکیا! میں نے بڑبڑاتے  
ہوئے میز سے فون اٹھایا اور خود کی گوزن سے جھٹکنے کی کوشش  
کی۔

دوسری طرف سے دی لینڈ کی ٹھٹکنی ہوئی آواز سن کر خود کو  
خود بخود ہی کافور ہو گئی۔ وہ نہایت مطمئن اور گفتے لیجے میں بولی  
"اٹھو۔ اور تیار ہو جاؤ۔"

"کس کام کے لیے؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔  
"اپنا ساتھی واپس لینے اور ہمارے ساتھی کو ہمارے سپرو  
کرنے کے لیے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم تو بہت سحر خیز عورت معلوم ہوتی ہو۔ کیا تم روزانہ ہی اس  
وقت اٹھ جاتی ہو؟" میں نے جوابی لیجے میں پوچھا۔

"میں تو اس سے بھی پہلے اٹھ جاتی ہوں۔ میرے بس میں بد تو  
میں سویا نہ کروں۔ ہم جیسے لوگوں کو جتنے کام کرنے ہوتے ہیں ان  
کے لیے جو چیزیں کھنے کا دن بھی چھوٹا ہے۔ دن کچھ اور بڑا ہوتا  
چاہیے تھا۔" وہ بولی۔

"تمہاری حد تک تو یہ ٹھیک ہو گا لیکن اس بے ہودگی میں مجھے  
کیوں شریک کر لیا؟" کوئی وقت ہے کسی شریف آدمی کو نیند سے  
جگانے کا؟" میں نے فحش سے کہا۔

"شکر کرو میں نے تمہیں رات کے سوا بارہ بجے نہیں جگایا۔  
اصولاً تو بارہ بجے کے بعد دو سزا دن شروع ہو جاتا ہے۔ گویا سوا بارہ  
بجے وہ دن شروع ہو چکا تھا جب ہمیں معاہدے پر عمل درآمد کرنا



بھی قسم کی گڑبڑ سے پرہیز رکھا ہے۔ میں نے کہا "کاش تم نے شروع سے ہی اس شکر گزاری اور شرافت کا مظاہرہ کیا ہوتا تو اتنی چابی اور اتنے خون خرابے کی نوبت نہ آتی اور نہ ہی اتنے بہت سے لوگ اتنی بہت سی تکلیفیں اٹھاتے۔"

"اگر سب لوگ شروع ہی سے ہر معاملے میں اتنے شریف اور شکر گزار ہو جائیں تو پھر دنیا سے بیشتر جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔ جنگوں اور خانہ جنگیوں کی تباہ کاریاں رک جائیں اور یہ دنیا بشت نظیر دکھائی دینے لگے لیکن۔۔۔۔۔" اس نے ایک طویل سانس لی اور اسی رسان سے بولی "خدا نے دنیا میں ہر طرح کے انسان پیدا کیے ہیں۔ شریف، بد معاش، غبنے، دہشت گرد، سچے، جھوٹے، فرشتہ صفت، ابلیس صفت، سائنس دان، مزدور، کچھ بتانے والے، کچھ توڑنے والے۔۔۔۔۔ غرضیکہ اس دنیا میں ہر قبیل کا انسان موجود ہے۔ ہر صفت رکھنے والا آدمی یہاں پایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور ہر ایک اپنا اپنا کام کر رہا ہے۔ یہی دنیا کی رنگا رنگی ہے۔ کوئی اس دنیا کو مکمل طور پر کسی بھی قسم کے لوگوں سے خالی نہیں کر سکتا۔ ہم بھی اس دنیا کے باشندے ہیں۔ ہمارے ذمے بھی کچھ کام ہیں جو ہماری نظر میں بہت اچھے ہیں۔ تمہاری نظر میں بہت خراب ہیں۔ ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں "تم اپنا کام کرتے رہو۔"

"واہ۔۔۔۔۔ واہ۔۔۔۔۔ تم اچھی خاصی دانشور ہو۔ میں تمہارا بہت بڑا قدر دان بن سکتا تھا لیکن انوس ہے کہ تم جیسے جھنگے ہوئے دانشوروں نے ہی دنیا کو سب سے زیادہ عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم دنیا کو عذاب سے بچانے کی اپنی سی کوشش کرتے رہو۔ میں نے کہا تاکہ ہم سب کو دنیا میں اپنا اپنا کام کرتے رہنا ہے۔" وہ بولی "اور لی افال تم اس کام کی طرف توجہ دو جو ہمیں فوری طور پر درپیش ہے۔ ٹھیک ماڑے سات بجے تمہیں اس جگہ پہنچنا ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔"

"بہت بہتر۔ کوئی اور حکم؟" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "لی افال یہی کافی ہے۔" اس نے تھکتے لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج رہے تھے۔ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم لیٹ ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر برنارڈ اس دوران میں اسی ریلوے جگہ پر جا بیٹھا جس پر اس نے راجیلہ کو بٹھا کر اس کے چہرے کی اصل برکت بحال کی تھی۔ وہ بڑے اشماک سے اپنے چھدرے بالوں میں لٹکھی کر رہا تھا۔

"اس ہارنگر کو چھوڑو۔" میں نے عقب سے اس کا کار پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا "اس سے تمہاری شکل پر برستی ہوئی پینک ریش کی نہیں ہوگی۔ اس سے تو بھر تھا کہ تم اپنے بدزدکی یہ سیاہی دور کر لیتے۔ انسان سفید قام ہو تو کاپنی بد شکل ہونے کے باوجود کم بد شکل لگتا ہے۔ اپنے دل کی سیاہی دور کرنا تمہارے بس کی

بھی قسم کی کوئی کجی اس نہ کرنا۔ ہمارے ہاں ڈسپلن بڑا سخت ہے۔ اس قسم کی غیر ضروری باتوں اور فضولیات کو بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔"

اس لمحے مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ عظیم میں اس کا اتنا اہم نام تھا اور دی لینڈی نے خاص طور پر اس کی بازیابی کے لیے بڑی وقت اٹھائی تھی لیکن میرے چیمپڑے پر بے چارے کا عالم کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی بہت بڑی کشتی کا چہرہ اسی کشتی کے مالک کی بیوی کے اسے میں مشقیہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

"مجا فرم۔۔۔۔۔ تمہیں زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اُسے تسلی دی "میں اپنی زبان بند ہی رکھوں گا لیکن تم بڑی سے تیار ہو جاؤ۔ اگلی بدایات کے لیے کسی بھی لمحے تمہاری نگاہیں کافون آنے والا ہوگا۔"

"تجربہ پاشا کرنے کی سلسلے میں میں لے گی؟" اس نے دوبارہ دانش میں پر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا انحصار تمہاری فکرت عالیہ کی آئندہ بدایات پر ہے۔ شاید سب کو یہ بغیر ہاتھ کے روانہ ہونا پڑے۔ یہ سب تمہاری دی لینڈی کی ذرا سے بازی ہے ورنہ یہ کام آرام سے بھی ہو سکتا تھا۔ ایسے کوئی بنگامی حالات تو نہیں تھے۔" میں نے کہا "مہر حال تمہارے حق میں تو اچھا ہی ہے۔ دی لینڈی تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے بچا رہے پاشا کرانے کی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔"

"تم نے پھر کجاس شروع کر دی۔" وہ چلایا حالانکہ اس کے دہریہ مابین لگا ہوا تھا جس کے جھاک نے اس کے تاثرات کو بچھڑایا تھا۔

"جھکاس تو میں اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر کرتا ہوں۔ تمہیں اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "مہر حال مجھے تمہاری کورسوی کا پتہ چل گیا ہے۔ کوئی اور وقت ہو تا تو میں اس سے کچھ مسئلہ میں ناکمہ اٹھاتا۔ اب تم لوگ ہماری جان چھوڑ کر جانی لہو ہو۔ اس لیے صاف کر رہا ہوں۔"

اس کی گویا جان میں جان آئی اور وہ زرا مستعدی سے ہاتھ نہ دھوئے لگا۔ میری توقع کے عین مطابق چند لمحوں کے بعد فون کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری طرف دی لینڈی ہی تھی۔ وہ بلا تمہید بولی "میں تمہیں صرف ایک گھنٹے کی سلسلے دے سکتی ہوں۔ اس دوران میں تمہیں اس جگہ پہنچنا ہے جس کے بارے میں ابھی تمہیں سمجھا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اگر گھنٹا گش نظر آتی ہے تو پاشا وغیرہ بھی کر لے۔"

اس بار اس نے فیروز پور روڈ پر شہر سے کافی دور صنعتی علاقے سے آگے کے ایک مقام کے بارے میں سمجھایا اور بولی "ٹھیک ماڑے سات بجے تمہیں وہاں ہونا چاہیے۔ طریقہ اور بدایات انچوس دی رہیں گی۔ امید ہے تم اس بار بھی کوئی گڑبڑ نہیں کرو گے۔ میں ذاتی طور پر تمہاری شکر گزار ہوں گی۔"

"میں تمہاری شکر گزاری اور شرافت دیکھ کر ہی تمہیں نے کسی

بات نہیں۔ کم از کم جلد کی سیاسی تو دور کری لیتے۔

وہ اب میرے ذہنی لفظ پر بھی بد مزہ نہیں ہوتا تھا۔ برا منانے کے بجائے وہ اب لطف اندوز ہوتا تھا۔ اپنے مخصوص چلیوں والے انداز میں ہنس کر بولا "میں بھی اس گیت آپ کی ضرورت ہے۔ آپ تو تمہارے ملک سے نکل جانے کے بعد ہی اس سے چھٹکارا لے گا۔"

میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ نظر آتا ہوا میرے آگے چل دیا۔ خانے کے بڑے دروازے پر چھینٹیں مل گئیں اسے میرے ساتھ جاتے دیکھا تو ان میں سے ایک نے پوچھا "سر اب ہمیں یہاں ڈیوٹی دینے کی ضرورت نہیں؟"

"نہیں۔ یہ مصیبت تمہارے سر سے ٹل رہی ہے۔" میں نے برتاؤ کی طرف اشارہ کیا "اب تمہیں پرانے دنوں کے مطابق پورے گھر کی نگرانی کرنی ہے۔"

اوپر آکر میں نے صفدر اور سلیمان کو ساتھ لیا اور میری گاڑی میں ہم چاروں راہیلہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ برتاؤ پچھلے سیٹ پر ان دونوں کے درمیان بیٹھا تھا اور دونوں طرف سے ایک ایک طرف کی ٹال اس کی ہیلیوں پر تکی ہوئی تھی۔

راہیلہ کے گھر پہنچ کر میں نے اندر جانے کی زحمت نہیں کی۔ راہیلہ شاید اس وقت تک سو کر بھی نہیں اٹھی تھی۔ اسے پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع نہیں تھی لیکن شیرخشا اور سردار علی کو بھی جو اس کے گھر پر تعینات تھے۔ وہ خود ہی باہر آ گئے اور انہوں نے صفدر اور سلیمان کی جگہ لے لی۔ صفدر اور سلیمان اندر چلے گئے۔

یہ تبدیلی میں نے ایک معمولی سی وجہ کی بنا پر۔۔۔ اور محض احتیاط کی تھی۔ یوں تو میرے یہ چاروں ہی ساتھی بے مشل قاتل تھے۔ ہر قسم کے ہتھیاروں کے استعمال میں ماہر اور ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے میں یکساں تھے لیکن صفدر اور سلیمان کے بارے میں خاص طور پر میں نے محسوس کیا کہ انہیں کسی جگہ کی نگرانی کرنے اور وہاں موجود کسی فرد کی حفاظت کرنے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ صرف وہ آدمی جہاں موجود ہوتے وہاں سے کسی شخص کو نکال کر لے جانے کے لیے جگہوں کے کم از کم ایک مضبوط دھڑکنے کی ضرورت پڑتی۔

شیرخشا اور سردار علی کسی ایسی صورت حال کے لیے زیادہ موزوں آدمی تھے جہاں ہلکے جھپٹنے میں خود ہی کوئی فیصلہ کر کے خودی عمل کرنا ضروری ہو جاتا۔ وہ ہنسنے مہرے اور ان میں ہلاکی تحمل مزاجی بھی تھی۔ وہ دیکھنے میں بالکل عام آدمی تھے۔ سارے سے آدمی نظر آتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی گولی چلائی تو دور کنار کسی ہتھیار کو ہاتھ بھی لگایا ہوگا۔ ان کی شخصیت سے ظاہر ہونے والی مصونیت اور سادگی۔۔۔ بلکہ کسی حد تک دماغی پن کو دیکھ کر ان کا حریف بھی

ان کے بارے میں بہت غلط اندازے قائم کرتا تھا اور شاید اس لیے زیادہ بری طرح مار کھاتا تھا۔

راہیلہ کے گھر سے ہم فیروز پور روڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ گزشتہ شام جب میں نے شیرخشا اور سردار علی کو پروگرام کی تبدیلی سے آگاہ کیا تھا تو شیرخشا نے پچھلی تے ہوئے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب کوئی یہ حفاظت ہماری تحویل میں آجائے تو رخصت ہونے وقت دی لیڈی اور اس کے ساتھیوں راہچاک اور قطعی غیر حتمی طور پر حملہ کر کے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس بچے بچے قتلے کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

میں نے صرف ایک لمحے اس تجویز پر غور کیا تھا اور اسے مسترد کر دیا۔ حالانکہ ہم تینوں مل کر ایسی شلٹن میں جاتے تھے جو اس قسم کا رسک لے سکتے تھے اور تقدیر کا فیصلہ اپنے حق میں ہونے کی امید کر سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ کوئی بھی ہماری طرف آپکا ہوتا۔۔۔ خالی ہاتھ بھی بڑے کام کا آدمی تھا۔ اس کے باوجود میں نے یہ وارنہ کھینے کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔

میں ممکن ہے شیرخشا اور سردار علی کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا ہو کہ شاید راہیلہ کا شبہ درست ہی تھا اور میرے دل میں دی لیڈی کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا کہ میں نے اس امکان کی پروا نہیں کی۔ مجھے ان سے انسید تو نہیں تھی کہ وہ ایسا سوچیں گے کہ ایسے کسی خیال کا کیزا ان کے دماغ میں رسک بھی جاتا تو یہ سب خیال میں اتنی خطرناک بات نہیں تھی جتنا خطرناک دی لیڈی سے تصادم ہو سکتا تھا۔

دی لیڈی بے وقوف نہیں تھی۔ وہ درہن مقام پر بالکل ٹٹے میدان میں اسی لیے طاقت رکھ رہی تھی کہ ٹکراؤ کی صورت میں دونوں کے لیے رسک یکساں رہے۔ دونوں طرف جنب برابر کی چوٹ والا معاملہ ہو۔ دونوں فریق یکساں طور پر اثر ہوں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں ذرا بھی خوش فہمی نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے پر ذرا بھی اعتبار نہ ہو تو ان کا آپس میں ٹکرا جانا کچھ ایسا بھی ثابت ہو سکتا تھا جیسے کبھی دو پتھر اچانک آپس میں ٹکرائے ہیں تو دونوں ہی پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

میرے دل میں خواہ دی لیڈی کے لیے نرم گوشہ واقعی پیدا ہو جاتا تب بھی اگر میں اسے ہلاک کرنا اپنے ساتھیوں کے علاوہ ملک کے مفاد میں بھی ضروری سمجھتا تو ہر حال میں یہ کام کر گزرتے کی کو شش کرتا۔ خواہ اس میں کتنا ہی رسک ہو اور خواہ اس میں جان ہی چلی جاتی مگر فی الحال میری نظر میں یہ کام ضروری نہیں تھا لیکن شاید یہ بات میں صحیح طور پر اپنے ساتھیوں کو سمجھانے میں ناکام ہو گیا تھا۔ مگر میں نے فی الحال ایسے کسی خیال کی تردید کرنا بھی یا کوئی وضاحت پیش کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ زبان اسکاں کی تھا کہ یہ سب میرے واسطے تھے۔

وقت کے بارے میں میرا اندازہ ٹھیک ہی نہ تھا۔ ہم ٹھیک



چلے۔ اور پھر یہ سفر ہے بھی کیا؟ محض چند میل ہی کی تو بات ہے مجھے معلوم ہے تم اتنے کاغذ تو نہیں ہو۔ ضرورت پڑنے پر تم تو پیدل بھی اتنی دور آ سکتے ہو۔“

”جس تو پیدل جو جرنال یا پنڈی بھی آسکتا ہوں لیکن یہ تم بے اصولی اور وعدہ خلافی کر رہی ہو۔ مجھے تم سے ایسی بے اعتباری کی توقع نہیں تھی۔“

”میں یہ توقع رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ تم ہمارے حق میں فرشتے ثابت ہو سکتے ہو۔ اور میں تم سے بھی یہ فرمائش نہیں کرتی کہ تم ہمارے بارے میں ایسا سمجھو، ہم اپنی جگہ احتیاط کر رہے ہیں۔ تم بھی اپنی جگہ محتاط رہو۔ بس اب کھلی جھوڑو اور دوانہ ہو جاؤ۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پردگراہ میں اس تبدیلی کے بارے میں سن کر شیر شیخ اور سردار نے تو کوئی رد عمل ظاہر نہ کیا لیکن ڈاکٹر برٹارڈ تھیمس انداز میں سر ملاتے ہوئے دھیرے سے ہنس دیا ”وہی لیڈی سے بیٹھ ایسا باتوں کی توقع رکھتی ہے۔“

میں نے اسے ٹھوڑے ہوئے کہا ”۳۱ ساری احتیاط پسندی کے باوجود وہ یہاں ریڈ واٹ کو نہیں پہچا سکتی۔“ پھر میں نے گاڑی سڑک کی طرف موڑ لی۔

”یہاں ریڈ واٹ نے سب سے بڑی غلطی تمہاری ذات میں دلچسپی لے کر اور پھر تم سے اُلجھ کر کی۔ اگر ریڈ واٹ نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اسے آج بھی یہاں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا۔“ وہ مہم کی شجہ دگی سے بولا۔

”وہ تمام بد بخت جو عبرت ناک انجام کو پہنچے ہیں ان سب کی زندگی میں ایسا کوئی نہ کوئی ”اگر“ ضرور آتا ہے۔ ان کی ہائی گاڑی آتا ہے تو عموماً بات اسی طرح ہوتی ہے کہ اگر انہوں نے یہ نہ کیا ہوتا۔ اگر انہوں نے وہ نہ کیا ہوتا۔ لیکن یہ ”اگر مگر“ سب قدرت کے نظام کا ایک حصہ ہیں۔ ہرگز ان کی کو ایک نہ ایک روز اپنے انجام کو پہنچتا ہوتا ہے۔“ میں نے پُر سکون انداز میں ذرا سہک جاری رکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر برٹارڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس بحث میں جتنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سفر خاموشی سے طے ہوا۔ ہم جب گزشتہ روز دالی جگہ پر پہنچے تو مجھے دور سے ہی دیر اپنے میں سرخ لینڈ روڈر کھڑی نظر آئی جس میں وہی لیڈی اور اس کے ساتھی کل آئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹیلی پیجر میں آئے والی بات غلط تھی۔ میں دور سے اسے اس جانی بچالی گاڑی کو دیکھ کر کمری سانس لے کر رہ گیا۔

میں اس تصور سے محظوظ ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا کہ وہی لیڈی کے دل میں ہرنال ہماری طرف سے خوف موجود تھا جس کی وجہ سے وہ اتنی قلابازیاں کما رہی تھی ”اتنی احتیاط برت رہی تھی۔ انہوں نے بھی یقیناً دور سے ہماری گاڑی دیکھیں ہوگی۔ وہ جگہ ہی

میں سات بجے فیروز پور روڈ پر دواؤں کی ایک دیکھری سے آگے کر کے میں آخر اس درباران مقام پر پہنچ گئے جس کی نشانیاں لیڈی نے مجھے سمجھائی تھیں۔ کسی زمانے میں اس سے میلوں تک دیرانہ ہی تھا لیکن اب دیکھایاں اور ہاؤسنگ اسکیمیں اب تک اپنی تھیں۔ جس دیرانے میں ہم آکر رکے تھے، مجھے یاد چند سال پہلے تک یہاں کیت ہوا کرتے تھے۔ اب کیت اُجڑ چکا تھا۔ لیڈی نے دیرانہ تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ ان زمینوں پر اب بھی یہاں کوئی ہاؤسنگ اسکیم بنانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں۔

وہی لیڈی نے بتایا تھا کہ آج وہ لوگ گھرے نیلے رنگ کی ایک جھوڑی میں آئیں گے جس کے پونے پانچ سو ایک انچہ لہرا رہا تھا اور اس کے پینے تاریک ہوں گے۔ مجھے جھاڑیوں کے قریب گاڑی کے پانچ منٹ گزر گئے لیکن کسی طرف سے ایسی کوئی گاڑی آئی دکھائی نہ دی۔ ہم سب کی نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور میں بار بار گھڑی بھی دیکھ رہا تھا۔

مقررہ وقت سے سات منٹ زائد ہو چکے تو میرے سہاگل ڈھان کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون کان سے لگایا تو مجھے توقع تھی کہ دوسری طرف وہی لیڈی ہوگی۔ اندازہ درست ثابت ہونے پر میں نے کہا ”میں نے تم سے کہا تھا۔“

”مید ہے تم میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ چکے ہو گے۔“ وہ بولا۔

”اور اب غالباً تم کسی دوسری جگہ پر پہنچنے کے لیے کوئی؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ اپنے مخصوص ٹھٹھک وار انداز میں ہنسی اور محذرت خواہانہ سے مجھے میں ملی ”مجھ سے بھی ہو تو اب تھوڑی سی تکلیف کر لو۔“

وقت دین ہوگی جہاں پہلے ہوئی تھی۔

”نوس۔ میرے خدا۔!“ میں کراہ اُٹھا۔ وہ جگہ یہاں سے میلوں دور تھی۔ یہ تم نے کیا پیشہ ورانہ اگندہ کان کی سی قلابازیاں شروع کر دیں! میں نے شکوہ کیا۔

”احتیاط تو ہر حال ضروری ہے بالائی ڈیڑہ!“ آج اس کا لہجہ کچھ دیر بولا ہوا تھا۔ اس میں ملائمت، شیرینی اور دوستانہ رنگ کچھ اور لہجہ ہو چکا تھا۔

”جب ہم وہاں پہنچ جائیں تو تم فون کر کے یہ نہ کہو کہ اب دیرانہ کے پینے تاکے پر آ جاؤ۔ میرے خیال میں تو اب تمہیں ڈیڑہ کی اس ٹیکس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”ضرورت تو یقیناً نہیں تھی۔ پھر بھی۔“ اس نے جملہ لہجہ جھوڑا پھر ایک لمبے کے توقف سے گویا بڑے مان سے بولی ”مطلب ابھی جاؤ۔ تمہیں کون سا پیدل یا گھوڑا گاڑی پر آنا ہے۔“

کی گرفت میں تھا جس کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے جی میں  
آتا تھا کہ یہی ہاتھ کھوپڑی توڑ ضربات لگا سکتا تھا۔  
”ہو سکتا ہے ہماری آئندہ ملاقات مختلف حالات میں ہو۔ یہ  
نہایت آہستہ سے ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ آئندہ ملاقات کے امکان  
کو دہرائے جا رہی تھی۔“

”اگر اس وقت ہمارے بارے میں تمہارے عوام میں  
بائے تو مجھے اس ملاقات سے خوشی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”خدا حافظ۔“ وہ میری بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر بولی اور پھر  
ہاتھ چھوڑ کر ایک دم اچھل کر گاڑی میں سوار ہو گئی۔ دروازہ  
بواہر دوسرے ہی لمحے گاڑی کا انجن غیٹے سے انداز میں غرلا اور  
تیزی سے محکمہ کر سڑک کی طرف چل دی۔ میں ہونٹوں کی طرف  
دیں کھڑا رہ گیا۔

چند لمحے بعد میں نے سر ہٹا۔ اس وقت تک میں گاڑی کو  
اڑائی ہوئی خاصی دھول پھانک چکا تھا۔ میں اپنی گاڑی میں داخل  
آ گیا۔ ٹوٹی پتھر سیٹ پر بیٹھا تھا اور جسم سے انداز میں سسکار  
تھا۔

”ان کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا برا ٹوٹی؟“ میں نے پوچھا۔  
”بہت اچھا۔ میں اپنے آپ کو ان کا خاص الحاح محسوس  
محسوس کر رہا تھا۔“ ٹوٹی نے جواب دیا۔

”تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ یہ تمہیں کہاں لے گئے  
تھے۔۔۔ کہاں ٹھہرایا تھا؟“

”جانتے وقت انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی  
اور آتے وقت بھی پٹی باندھ کر لائے ہیں۔“ ٹوٹی نے میری طرف  
مطابق جواب دیا ”اگر اسے بدل سکی گئی ہوتی تو یہ واحد بدلہ  
تھی جو انہوں نے میرے ساتھ کی۔ اس کے لیے بھی بڑی مقدّمہ  
کر رہے تھے۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا ”جہاں انہوں نے مجھے  
جا کر ٹھہرایا تھا وہ کوئی شاندار جگہ معلوم ہوتا تھا جہاں زیادہ تر  
انہی مسلح لوگوں کو دیکھتا رہا جو اس کے ساتھ آئے تھے۔ یہ جہ آؤ  
تھے۔ وہ مختلف زبانیں بولنے والے انگریزیوں کے باشندے ملے  
ہوتے تھے۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ بنگالہ بھی کسی مقامی شخصیت کی  
ملکیت تھا جو خود وہاں نہیں رہتا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ  
انہیں ابھی تک ہمارے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔“

”یقیناً۔“ میں نے جواب دیا ”اس ملک کے خلاف آج تک  
جتنی بھی سازشیں ہوئی ہیں ان میں انہوں کا تعاون شامل حال ہے۔  
ہو تا تو وہ کیونکر پروان چڑھ سکتی تھیں اور کیونکر کامیاب ہو سکتا  
تھیں۔“

ٹوٹی بولا ”میں جانتا تو تھوڑی بہت بارہما ذکر کے یا ان میں  
سے کسی کو قابو میں کر کے وہاں سے فرار ہونے یا یہ معلوم کرنے کی  
کوشش کر سکتا تھا کہ وہ بنگالہ کس کا تھا۔ اس سے آگے مزید

ایسی تھی وہاں دور سے ہی کسی گاڑی کو آتے دیکھا جاسکتا تھا اور  
صورت حال خطرناک ہوتے دیکھ کر میں آخری لمحوں میں بھی راہ  
فرار اختیار کی جاسکتی تھی۔ ان کی گاڑی کے پیچھے فوراً تھوڑے  
تھوڑے نیچے ہو گئے اور ان سے منوں کی ٹائیس جھانکنے لگیں۔ شیر  
اور سردار نے بھی اپنی گنوں کا سرگاہر کی طرف کر لیا۔

میں نے گاڑی میں کل والی جگہ پر ہی جا رہی اور انجن  
منارٹ ہی رہے دیا۔ لینڈ روور کا انجن بھی یقیناً منارٹ ہی تھا۔  
انہاں اس کا دروازہ کھلا اور ٹوٹی گاڑی سے اتر آیا۔ وہ دونوں ہاتھ  
میں لیے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کل والے کپڑوں میں ہی تھا اور صاف  
تھوڑا آدمی نظر آ رہا تھا۔

”انٹرنیٹارڈ گاڑی سے انارنے کے لیے شیر کو گاڑی سے  
اترنا پڑا۔ انہاں کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ لینڈ روور سے  
فوراً گئی کسی اسٹیک پر دی لیڈی کی اتوار اُٹھری جس میں بلی کی  
توشن بھی شامل تھی ”یہ کیا ہو رہا ہے افضل؟“ اس کی گاڑی کی  
کھڑکیوں سے فوراً پتھر اُڑ رہی تھی کی ٹائیس جھانکنے لگیں۔

”اتنا کھیرانے کی ضرورت نہیں۔۔۔“ میں نے کھڑکی سے سر  
نکال کر چیخ کر کہا۔ اس وقت تک ڈاکٹر برنارڈ کو بھی گاڑی سے انار  
دیا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر گویا ان لوگوں کو کچھ اطمینان ہوا۔

برنارڈ ہاتھ اٹھائے ان کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور ٹوٹی ہاتھ  
اٹھائے ہماری گاڑی تک آ گیا۔ وہ دونوں گاڑیوں میں بیٹھ چکے تو دی  
لیڈی گاڑی سے اُٹری۔ وہ آج اورنگ کھڑکی ڈھیلی ڈھالی اسپورٹس  
شرٹ دسیا ہوا ڈور میں تھی۔ سر پر آسانی رنگ کا خوبصورت  
پھولدار اسٹارکاف باندھے ہوئے تھی۔ جدید فیشن کا سیاہ چشمہ لگایا  
ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھپ کر رہ گئی تھیں۔  
میں نے بھی اخلاقا گاڑی سے اتر جانا بہتر سمجھا۔ وہ اپنی گاڑی  
سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز میں ایک پیچھے سا نشان  
تھا گویا وہ کچھ دیر ہو کہ میں اس کے قریب جانے کی بہت نہیں  
کر سکتا لیکن میں بے خوفی سے اس کے قریب چلا گیا اور جب مجھے  
اندازہ ہوا کہ اس کی گاڑی میں پروگرام کے مطابق صرف دو نہیں  
بلکہ کم از کم چھ مسلح افراد موجود تھے اب ڈاکٹر برنارڈ بھی پہنچ گیا  
تھا۔ گاڑی بڑی اور پائی کھینچش والی تھی۔ اس کے باوجود خوب  
بھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈرائیو تک سیٹ خالی تھی۔ دی  
لیڈی غالباً خود ہی ڈرائیو کرتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔

وہ معائنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی ”بہت  
شکریہ۔۔۔ کہ تم نے پرامن انداز میں معاہدہ مکمل کیا۔“

”ہم جیسے بہت امن پسند لوگ ہیں۔ اگر تم ہمارے ملک کی  
جزیں نہ کاٹ رہی ہو تیں اور مستقبل کے بارے میں تمہارے  
اتنے خطرناک عزائم نہ ہوتے تو تم ہمیں بہت اچھا دوست ثابتیں۔“  
میں نے دھمپے سے لہجے میں کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔  
پراسرار سے انداز میں مسکرائی رہی۔ میرا ہاتھ اس کے گداز ہاتھ



راجیل ہیں۔ میں نے غصہ دیا۔

”میں کھڑے ہو کر اس مت کرتے رہو۔ اندر چلو تم سب لوگ۔“ راجیل کے الفاظ تو پہلے جیسے ہی تھے لیکن بعد پہلے بیسٹ نہیں تھا۔ اس لمحے میں وہ اپنا بیٹ نہیں تھی جو اس کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔

ہم اندر پہنچے تو خالہ بی نے فردا فردا ہم سب کی زندگی کے بچے اور راستے میں کھڑے کھڑے ہی ایک خاصی طویل مزید و جس کا خلاصہ صرف یہ تھا کہ راجیل کا چہرہ ٹھیک ہوئے اور تمام معاملات خیریت سے طے پا چائے کی انہیں بہت خوشی تھی۔ ان کی تقریر شاید مزید طویل پڑ جاتی لیکن راجیل نے تقریباً زبردستی انہیں کالی تیار کرنے کے لیے بھیج دیا اور ہم ذرا ٹھک دوام میں آئیے۔

”سنا ہے آپ کراچی واپس جا رہی ہیں؟“ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فونی نے راجیل کو مخاطب کیا۔ اس کے لمحے میں غصہ تھا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔“ راجیل ہاتھ اٹھا کر بولی اور یوں اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

”لیکن ایک بات ضرور ہوگی۔“ میں نے بے پروا بلند کہا ”ہم سب ساتھی چند دن کے لیے کراچی جا رہے ہیں جہاں ہمارے اپنے ہوٹل میں راجیل کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی ہوگی۔ اصل میں تو یہ پارٹی راجیل کا چہرہ ٹھیک ہونے کی خوشی میں ہوگی لیکن ہم لوگ اسے ایک طرح کی الوداعی پارٹی بھی سمجھ سکتے ہو۔“

”یہ تکلیف کیا ضروری ہے؟“ راجیل ملاحت سے بولی۔  
”ہر معاملے میں تم اپنی مرضی چلاتی ہو۔ یہ مجھ سے کام نہ آئے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے کہا“ دیکھو یہی ایک اہم سماجی کی رخصتی اس کے شاندار شان تو ہوتی جا رہی ہے۔“ پھر میں نے فونی سے کہا ”سب ساتھیوں کے کراچی چلنے کے انتظامات تمہارے ذمے ہیں۔ قیام ہوٹل ہی میں رہے گا۔“

فونی نے اہمیت میں سر ہلایا۔ پھر اس دن کا پروگرام طے ہونے لگا۔ راجیل آفس جانے اور الوداعی کام نشتانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ میں نے باقی ساتھیوں سے کہا کہ وہ چاہیں تو آج آرام کر لیں۔ دو دن سے وہ سب خاصے خاصے تھے لیکن انہوں نے بھی انہی ہی جانے کا فیصلہ کیا۔

چند منٹ بعد کافی پی کر ہم سب آفس روانہ ہو گئے اور وہاں سب مصروف ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ راجیل کے جانے کی خبر نے ہم سب کے اعصاب پر جو تاؤ سا مسلط کیا تھا کم از کم میرے ساتھ اب اس کے اثر سے باہر آ رہے تھے۔ انہوں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا اور محسوس کر لیا تھا کہ اس مسئلے میں اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس سے سمجھو آ کر اپنی ہی بہتر تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ غور ہوئی تھی اور میں چند

تفصیلات پر غور کیا تھا۔ مجھے تو یہ پتا تھا کہ اتفاق ہی تھا کہ سارا کام چلتا تھا۔ اتفاق ہی اس فلم ٹیوی ڈائریکٹر تھا۔ سراسر ایک کام ہوئی تھی۔ اب یہ کتنی بھی اپنے بڑا بڑا کام ہو رہی تھی اور نامساعد حالات کے باوجود کچھ نہ کچھ نتائج دینا پڑتے۔ ”میں تو“ مختلف ٹی وی چینل اور حکومتی پالیسیوں پر غور و تدبیر سے تیار کے حق میں حالات اچھے نہیں تھے۔ ہمیں تو دنوں ہماری کمپنی کی دو تین فلمیں شہریت ہو جانے کی وجہ سے کوئی کافی سنبھلا لیا گیا تھا اور اب اس میں میرا سرمایہ جاتے ہوئے کے بجائے واپس بھی آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کامیابی پر مجھے زیادہ اتفاق خوش تھا۔

”سرا مجھے پتا چلا تھا کہ آپ ان دنوں ہمیں ہیں تو میں نے ہر سلام دعا تو کر لی جاسکے۔“ اتفاق بولا ”اب تو بہت مست دن آہستہ بات ہی نہیں ہوتی۔“ وہ بولا۔

”بس۔۔۔ حالات ہی کچھ ایسے رہے۔“ میں نے حذر سے خدائے لمحے میں کہا ”شاید کچھ عرصے بعد میں مستقل طور پر لاہور واپس آ جاؤں۔ اس وقت تک شاید مکان بھی مکمل ہو جائے۔“

”کیا؟“ اتفاق قدرے دلچسپی سے بولا پھر اس نے ”بیکل جگہ“ کہا ”پر سوں ہماری ہی فلم کا پوٹ بھی شوٹنگ کے لیے کراچی روانہ ہو رہا ہے۔ وہاں ہاں کس بے پروا پر چند میں شونہ کسے ہیں۔ سمندر میں اسٹریکٹوں اور کوٹ گاڑ کے دو دروازے متاثر ہے۔ مجھے کچھ مشکل سین ہیں۔ شاید ہمارا بھی میں بیٹھی ہوں قیام رہے۔ اگر آپ زیادہ مصروف نہ ہوئے تو وہاں ملاقات دے گی۔“

”ضرور۔“ میں نے کہا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا فوراً نے پوچھا ”میونخ میں تمہارے ساتھ کون کون جا رہا ہے؟“

”طلب ہے اور کاروں میں سے کون کون شامل ہے؟“

”ہم اراکار تو بھی ہیں۔ بیرون میرا ہے۔ بیرون میرا ہے۔ سولن الفٹ خان ہے۔ ساڈہ ہیرا مکمل اور ساڈہ ہیرا کچھ اور بھی ہے۔ چند دوسرے اداکار ہیں۔“ اتفاق نے بتایا۔  
میرا اور مسعود دونوں ہی فوجواں اور علمی دنیا میں زیادہ تھے۔ ابھی تک ان کی غالباً تین چار فلمیں ہی ریلیز ہوئی تھیں۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ سبھی پڑھتے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ہماری کمپنی کی فلم بھی شامل تھی۔ فلم انڈسٹری کی روایت کے مطابق غالباً ان کے دو دروازے پر ڈائریکٹرز اور پروڈیوسر کی لائن لگ چکی تھی۔ اتفاق فلمی دنیا کے طور پر تھے۔ یہ ابھی طرح واقف تھا۔ وہ بھی نہ صرف ان کی ایک فلم ریلیز ہو چکی تھی بلکہ اب اس کی زیر تخیل فلم میں بھی بی دو دنوں بیرون اور میرا تھے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کئی کئی سالوں کی کوئی فلم بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھی نہیں دیکھی تھی۔



”بھئی دل لگے یا نہ لگے۔ میرا اصل بیڑہ کوادرز تو یہی ہے۔ کراچی میں تو میری حیثیت مسافر کی ہی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”فی الحال تو آپ کا قیام کراچی میں ہی ہے یا مسافر صاحب!  
 ہم نے تو آپ کو صرف بینک میں شرکت کی غرض سے ایک آدھ دن کے لیے لاہور والوں کو مستعار دیا تھا۔ یہ بتائیں کہ فی الحال قیام کہاں کریں گے؟“

”میں معلوم ہے جہاں میں جاتا ہوں وہاں کچھ نہ کچھ پریشانیاں، افزائری، جھگڑا اور کینچیں میری چھتر ہوتی ہیں۔“ میں نے لھنڈی سانس لے کر کہا۔

”تھک خدایا۔۔۔! وہ شاید پشانی پر ہاتھ مارتے مارتے وہ مٹی قحی“ وہ کیا ہی افتادہ آن پڑی؟“

”کوئی خاص نہیں۔۔۔“ میں نے اس تذکرے سے بچنے کی کوشش کی ”بہر حال اب تو میں کل یا برسوں تک پہنچنے والا ہوں۔ آج غلٹ لوگے ہو جائے تو میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں انرپورٹ آؤں گی۔“ اس نے مطلع کیا۔ وہ پہلے بھی اس ارادے کا اظہار کر چکی تھی۔

”تم مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ کراچی میں ہی بے تابی سے میرا انتظار ہو رہا ہے؟“ میں نے کہا۔  
 ”تم اسے خوش فہمی سمجھتے ہو کیوں مصر ہو؟ یہ حقیقت بھی تو ہو سکتی ہے۔“ وہ حیرتمندی سے انہی کے ساتھ بولی۔

”پتے ایسے فیصہ کہاں!“ میں نے لھنڈی سانس لے کر کہا۔

”تم وہ بے ہودہ اور ناشکرے انسان ہو جس نے خود اپنا فیصہ چھوڑا ہوا ہے اور سسکتی اور اکسار کے اظہار کے لیے جو ہر بات پر لھنڈی سانس لے کر کہہ دیتا ہے کہ اپنے ایسے فیصہ کہاں! تم یہ دو ٹوٹی پالیسی ترک کر دو ورنہ کسی دزد میں تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گی۔“ وہ خطرناک سے لہجے میں بولی۔

”اپنے اپنے انداز فکر کی بات ہے۔ ایک ہی مسئلے کے بارے میں کتنے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک اور خاتون نے اس بات کو یوں بیان کیا تھا کہ میں اس طرح دو سرے کی قدر و منزلت خود اس کی اپنی نظریں پر سحائے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسے احساس دلاتا ہوں کہ وہ کتنا اہم اور علاوہ ارفع انسان ہے، میری رسائی اور دسترس سے کتنا دور ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب میرا کچھ میں نہیں آ رہا کہ کس کی بات کو درست سمجھوں۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔  
 ”جب کچھ جانتے ہوئے انجان بنے رہتا۔۔۔ یہ بھی تمہاری ایک ادا ہے۔“

”جیسے سب کچھ معلوم ہے اور سب کچھ بہت اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آتا ہے۔ میں اب تمہیں اچھی طرح سمجھنے لگی ہوں۔“

”یہ وہ کام ہے جو میں خود بھی نہیں کر سکتا۔ میں بھی خود کو سمجھنے کی بہت کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن ابھی تک کوئی خاص کامیابی

نہیں ہوئی۔ اب تمہاری زبانی مجھے خود اپنے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔“

”چھا۔۔۔ اب جھوٹ بولنا بعد کرو اور کسی جگہ ٹکاؤ نہ کرو۔“

”ہاں۔۔۔ کم از کم اس بات کو تو جھوٹ مت سمجھو۔“

”میں حق اطلاع کے لیے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“

اس نے کہا اور پھر خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

○●○

ہم دوسرے ہی روز کراچی روانہ ہو گئے۔ فرسٹ کلاس اٹھیں سٹیشن، میں شام کی فلائٹ میں میرا نہیں۔ راجہ اور لالہ کے علاوہ چھ دوسرے ساتھی میرے ہم راہ تھے۔ شیخ شاہ کے ذرائع ہمیں لینے کے لیے انرپورٹ پر موجود تھے۔ لیکن وہ صرف شیخ شاہ کو تھی کہ میرے ساتھ کون کون آ رہا تھا اور وہاں یوں ایک ساتھ آدھ کا متعدد کیا تھا لیکن ذرائع اس سارے پر سے سب خیر تھی۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ میں تمہاری آ رہا تھا۔

ارائیل لائن میں بھی میں ہی سب سے پہلے پہنچا۔ لالہ ایک قطار کی صورت میں کچھ پیچھے تھے۔ میں لائن میں پہنچا۔ ذرائع نے بڑے اشتیاق اور زور و شور سے دونوں بازو لڑائے۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے شیخ شاہ سے بھی ملنا۔ اس سے بھی زیادہ جوش و خروش سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ جوش و خروش کی لہر شاید اس کے پورے وجود میں ہی دوڑ رہی تھی۔ لالہ کے ہاتھ تپ رہے تھے۔ شیخ شاہ اپنے مخصوص جسم سے انوائڈ مسکرا رہا تھا۔

”خدا کا شکر ہے تم آ گئے۔“ ذرائع بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”مجھے تو اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ تمہیں بلوانے کے غلٹ۔۔۔ بعد معاش یا پھر پولیس سمجھتی پڑے گی۔“

”مجھے جب بھی کہیں سے بلواتا ہوں غلطی سے بھی بھی لڑنا۔ بعد معاش یا پولیس والے نہ بھیج دیتا کیونکہ ان کا اپنا اپنی تو مشکوک ہو جائے گا۔ البتہ کسی حد سے زیادہ شریف آدمی کو نہ دیتا۔ میں فوراً تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ دیئے اظہار عرض ہے کہ مجھے گئے ہوئے صرف چند ہی دن ہوئے تھے کہ آپ نے زیادہ لمبا دم نہیں گزرا تھا۔“

”لیکن ہمیں لگ رہا تھا جیسے تمہیں مجھے ہوئے برسوں گزر گئے ہیں۔“ ذرائع ہلکا سا ہنسی بولی۔

”اچانک اس کی نظر میرے عقب میں کہیں جا گئی اور کہنے اس کے اثرات ہی بدل گئے۔ اس کا سارا جوش و خروش کھانچا۔“  
 ”جہاں کی طرح بیٹھ گیا اور آنکھوں میں پتلا اشتیاق دم توڑ گیا۔“  
 ”یک دم جیسے سب کچھ بحال ہوا۔“ اس کا ذہن جیسے سمجھا اور

دوسرے پلوے میں۔۔۔ مگر پھر جیسے جھرمٹھی سی لے کر میں نے خود ڈنڈی مار دی اور راجیلہ والا پلڑا جھک گیا۔

راجیلہ پیچھے تھبتھے ہوئے جھلوں کا جواب دینے میں کسی سے پیچھے نہیں تھی۔ وہ تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے۔۔۔ بلکہ بعض اوقات تو اینٹ مابلے میں پھل کرنے کی قائل تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ گزشتہ روز سے اس کے دھبے میں ایک نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ اس کے انداز و اطوار اور گفتگو میں ایک عجیب سا ٹھنڈاؤ اور فضا پن آ گیا تھا۔ اب اگر کوئی دوسرا کچھ بات کر بھی رہا تھا تو وہ جیسے ایک بزرگانہ وقار اور سادگی سے اُن کی لڑی تھی اور اگر کسی کے دھبے میں تھکی کی کوئی جھلک بھی تھی تو وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ شاید اس نے سوچ لیا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھایا تھا کہ جب ان لوگوں سے تعلق واسطہ غم ہی ہو رہا تھا تو پھر آخری وقت میں کسی سے لگنے کی کیا ضرورت تھی۔

آخر انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ چھو ڈالا اور زوناج کشیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "بہر حال۔۔۔ آپ کی صورت کو صبح دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ مبارک ہو۔"

"بہت شکریہ۔" راجیلہ نے مسرت سے کہا۔

اس دوران میں ہمارے ساتھی بھی قریب آ کر کھڑے ہوئے تھے۔ کوئیریلٹ پر ہمارا سامان بھی آچکا تھا اور سب اپنا اپنا سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے زوناج سے ان سب کا تعارف کرایا تو وہ بولی "تم تو پوری کرکٹ ٹیم لے کر آئے ہو۔ کیا کسی خاص مشن پر آئے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ ایک بہت ہی خاص مشن پر۔" میں نے اپنا لہجہ پراسرار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس مشن میں تم بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گی۔"

اس نے گہری اور وضاحت طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے سب کو باہر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "میری باتیں یہیں کھڑے ہو کر کرنا ضروری نہیں۔ اللہ نے ہمیں بہت سی پیکیجیں عطا فرمائی ہیں جہاں بیٹھ کر ہم شرکا کی طرح بات چیت کر سکتے ہیں۔"

ہم باہر آ گئے اور پارک لائٹ کی طرف چل دیے۔ زوناج اب بالکل خاموش تھی اور مجھے اس کا افسوس تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے توقع نہیں تھی کہ اسے راجیلہ کی صورت شکل صبح دیکھ کر ایسا دھچکا لگے گا۔

شفیع شام سب کو لینے کے لیے ہوئی کی کوسٹر لے کر آیا تھا جس میں ڈرائیور بھی موجود تھا۔ وہ خود زوناج کے ساتھ اس کی پیچیدگی میں آیا تھا۔ ازپورٹ سے روانہ ہوتے وقت سب ساتھی کو سٹر میں جا بیٹھے۔ صرف میں اور راجیلہ 'زوناج' کے ساتھ اس کی پیچیدگی کی طرف چل دیے۔ راجیلہ بھی کوسٹر میں جانے لگی تھی لیکن میں نے خود قدرے اصرار سے اسے زوناج کی گاڑی میں چلنے کے لیے

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن مٹھا کر دیکھا۔ پیچھے بانی سامنے چلے آ رہے تھے جن میں سب سے آگے تھی۔ دوسرے قریب پیچھے چل رہی تھی اور زوناج کی نظر اسی پر لی تھی۔

راجیلہ مجھے اور آگے آچکی تو میں نے مسکراتے ہوئے زوناج کو "تم نے شاید اسے پہچان لیا ہے۔ یہ وہی راجیلہ ہے جو پچھلی جنسیت بنگالہ پورٹ سینٹر کے روپ میں لی تھی۔"

زوناج کو کیا سنبھل کر کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ بولی "اور اب اس قابل ہو گئی ہیں کہ بے نقاب محسوس کیں۔ واقعی یقین نہیں ہے کہ یہ وہی خاتون ہیں۔ یہ مجھ کو گھر دھو رہا ہوا؟"

راجیلہ اصل اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ اس نے پچھلے کئی ماہ سے یہی نہیں دھوا۔ "میں نے ایک نظر راجیلہ کی طرف دیکھ کر ایک روز اس نے غلطی سے صابن سے منہ دھویا۔ فوراً ہی وضاحت ہو گیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

راجیلہ نے گھور کر مجھے دیکھا پھر صاف نے لیے زوناج کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کھڑے کھڑے لیے میں بولی "اب تک آپ کو یقیناً اچھی طرح معلوم ہو چکا ہو گا کہ یہ بڑا بیکاری محسوس ہے۔ وہ آپ نے اس کی بیکاری پر دھیان دینا بھی چھوڑ دیا ہو گا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن کبھی کبھی یہ کیوں اس بیکاری میں بڑے کام کی بات کر جاتے ہیں۔" زوناج کچھ اور سنبھل کر کھڑے کھڑے مجھے دیکھ بولی۔ وہ ایک نکل راجیلہ کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا اندازہ تھا کہ اس نے راجیلہ سے مصافحہ بڑی مضبوطی سے کیا تھا۔ دونوں کے اچھے اچھے ایک دوسرے میں ہی چپنے ہوئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

دونوں بظاہر مسکرا رہی تھیں لیکن دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب کی کوہمی تھی۔

میں آج پہلی بار انہیں اس طرح آنے سامنے دیکھ رہا تھا اور میرے اصرار سے کہ بھرتی میرے لاشعور میں گویا کوئی عجیب غلطی دونوں کا موازنہ کر رہی تھیں۔ دونوں کی شخصیت مختلف تھی۔ ان کی آنکھیں، نہیں، تخیل، رنگت، شکل صورت، سب کچھ مختلف تھا لیکن دونوں کو ہی بے پناہ خوبصورت لڑکیوں میں شمار کیا جاسکتا تھا اور اپنی اپنی جگہ دونوں اپنے اوصاف کے اعتبار سے بے مثل تھیں۔

اگر میرے دل پر بہت پہلے سے راجیلہ کی تصویر کندہ نہ ہوئی اور ان دونوں کو بیک وقت جاننے کے بعد میرے سامنے ان دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ میری زندگی کا مشکل ترین فیصلہ ہوتا۔ اب بھی اس مختصر سے وقفے میں کسی لمحے اپنے گھر سے جب میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں لڑکیاں نہیں بلکہ ترازو کے دو پلوے تھے اور میرا وجود برابر دونوں کے دو پلووں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک بات ایک پلوے میں رکھا تھا، دوسرا بات

کہا تھا۔

ذرائع کی گاڑی میں اگلی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ عمر رسیدہ تھی مگر بظاہر مرمر رسیدہ نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے بال بھورے ڈاکی کیے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔ آنکھیں ملٹی تھیں۔ پہلی نظر میں اس پر غیر ملکی ہونے کا گمان گزرتا تھا کیونکہ رنگت بھی بے حد گوری تھی مگر یہ گورا پن کپڑے کی سفیدی جیسا تھا۔ ہلکی سی سرفی کی جھلک صرف اس کے ہاتھوں میں نظر آ رہی تھی اور وہ بھی شاید اپ اسٹک کی مرہون منت تھی۔ اس کے ہاتھ پتے سے ہونٹوں میں خفیف سا کھنچاؤ تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت سے ایک عجیب سی سرد مہر اور ہلکی سی سفاکی جھلکتی تھی لیکن جب ذرائع نے اس سے میرا تعارف کرایا تو یہ سرد مہر اور خفیف سی سفاکی گویا ایک تخت عائب ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں یکدم شفقت اور نرمی آ گئی۔ جب وہ بولی تو اس کے غیر ملکی ہونے کا تاثر بھی زائل ہو گیا۔ وہ بڑی صاف اور شستہ اردو میں بولی "کیسے ہو بیٹا؟" اس کے لیے کی شفقت سے ایک ٹھنڈک سی رنگ دے میں آ رہی تھی۔ اس شفقت میں ایک خاص قسم کی اپنائیت بھی شامل تھی۔

اس نے بال ضرور رنگے ہوئے تھے اور ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا جس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ شاید بیشتر لوگوں کی طرح اسے بھی عمر کا کمپلیکس تھا اور اس نے اپنی عمر چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن جس طرح اس نے تعارف ہوتے ہی مجھے بتا کر کچھ کاغذ کر لیا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوا تھا کہ اسے عمر کا کمپلیکس نہیں تھا۔ اس کے پناؤں اور شخصیت وغیرہ سے مستثنا پن بھی عیاں نہیں تھا۔ بزرگی کا تاثر بہر حال ملتا تھا۔ ہمیں گاڑی کی طرف آنکھ کر دہ سیٹ سے اتر آئی تھی۔ تب میں نے دیکھا تھا کہ وہ ایک دراز قد عورت تھی۔ ہاتھ پاؤں اور جسمانی ساخت بتاتی تھی کہ جراثی میں وہ ایک مضبوط عورت رہی ہوگی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس شاندار عمارت پر زوال آچکا تھا۔

"ہمیں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنی سوجوں کے انعکاس سے باہر آتے ہوئے کہا اور سوالیہ نظروں سے ذرائع کی طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں سی آنکھوں میں اس سے سوال کیا تھا "تم نے ان خاتون کا تعارف تو کرایا نہیں۔"

میرا خاموش سوال اس تک پہنچ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ مسز ڈرائی ہیں۔ وہی خاتون۔ جن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ جنہیں ایک مسئلہ درپوش ہے۔"

میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی خاتون ہو سکتی تھیں۔ مگر بھی کچھ شک سا تھا جو ذرائع نے دور کر دیا۔ وہ مسدود خوابانہ سے لیے میں بولی "میں نے مسز ڈرائی سے ذکر کر دیا تھا کہ تم آج اس فلائٹ سے آ رہے ہو۔ یہ ضد کرنے لگیں کہ یہ بھی میرے ساتھ

ان پورٹ چلیں گی۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ تم اکیلے آ گئے اس لیے انہیں ساتھ لے آئی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اسے ساتھ دو سرے لوگ بھی آ رہے ہیں تو میں انہیں نہ لاتی۔"

"خیر۔ اب اسے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ آنے والے میرے دوست ہی ہیں۔ اگر تم ان خاتون کا ساتھ لے آئی ہو تو اس سے پردہ کوئل کی خلاف ورزی نہیں ہوگی کیونکہ ہم دردیٹوں سے ملنے کا کوئل پردہ کوئل ہے ہی نہیں۔"

پھر میں نے مسز ڈرائی سے کہا "آپ ذرائع کی باتوں کا خیال نہ کیجئے گا۔ یہ خواہ خواہ اپنے آپ کو بڑی مذہب نشانہ اور با تکلف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ آپ یہاں آئی ہیں۔ آپ کی محبت اور عنایت ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"جیسے رہو بیٹا! خاتون کے لیے میں شاید منونیت کے بان بلی سی لڑش آئی۔ ان کے ہونٹ تھر تھرائے۔ شاید انہوں نے کچھ اور بھی کہنا چاہا تھا لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔"

ذرائع بولی "تم ان کی آنکھوں کے گرد حلقہ دیکھ رہے ہو؟" میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا "خاتون کی آنکھوں کے گرد واقعی ہا حلقہ دکھائی دے رہے تھے جو پہلے سے ایک آپ کی وجہ سے من نمایاں تو نہیں رہے تھے لیکن بہر حال موجود تھے میں نے وہاں خاتون کے چہرے کا بغور جائزہ لیا اور ذرائع کی طرف دیکھے ہوئے کہا "مگر تم ان حلقوں کے علاج کے سلسلے میں میرا انتظار کرنا نہیں تو تمہیں یہ جان کر مایوسی ہوگی کہ آنکھوں کے حلقوں کا کوئل معقول علاج مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"شروع کوئی دوسرا دھڑکی ہانگی۔" ذرائع نے مجھے گھورا پھر مسز ڈرائی کی طرف دیکھ کر گویا مسدودت کی "آپ ان کی باتوں کا خیال نہیں کیجئے گا۔ انہیں بھیجیں سے ہی مسخو بننے کا شوق تھا کہ وہ نے انہیں معاشرے کا معزز فرد بنا دیا۔"

"اس میں مسخرے پن کی کیا بات ہے؟" میں نے ذرائع کو گھورا "تم نے حلقوں کی طرف میری توجہ دلائی۔ میں نے اس مسئلے میں اپنی کم ملی کا اعتراف کر لیا۔"

"میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم اپنے پردہ گرام کے مطابق جلدی دلیجس آجاتے تو شاید مسز ڈرائی کی آنکھوں کے گرد یہ مسئلہ نمودار نہیں ہوتے۔" ذرائع وضاحت کرتے ہوئے بولی "مگر شہد دونوں میں ان کا مسئلہ زیادہ عمیق ہو گیا اور ان کی راتوں کی نیند آگئی جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پیدا ہو گئے۔"

"اور۔۔۔ اتنا پیچیدہ فلسفہ بھلا مجھ جیسا کوڑھ مغز کہاں سمجھ سکا تھا؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "خیر۔ چلو۔ گاڑی میں بیٹھو۔ راستے میں باتیں ہوتی رہیں گی۔ دوسرے لوگ بے چارے کو کڑی کڑیوں سے جھانک جھانک کر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔"

میں اور راجیہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ خاتون آگے





# ابلیکا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر  
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی  
تاریخ پیش کی گئی ہے

سات جلدوں میں مکمل سیٹ - 1950 روپے

ناشر: مکتبہ القرآن پبلیشرز  
اردو بازار لاہور

میرے لیے یہ تجربہ نیا نہیں تھا۔ میری نامعلوم حس نے  
شاید مجھے چمکانے کے ایک لمبے ہی جھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنے  
ساتھ میں نے راجیلہ کو بھی جھکا دیا تھا لیکن ذرتاج کے بارے میں  
مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ بروقت جھک سکی تھی یا نہیں؟ مسزورانی کی  
طرف تو مجھے دیکھنے کی سلت ہی نہیں ملی۔

گاڑی بڑی طرح لرائی اور دوسرے ہی لمحے رک گئی۔ میں نے  
بریکوں کی چرچاہٹ سنی تھی اور گاڑی کسی دوسری گاڑی سے  
لگرائی بھی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی ذرتاج نے خود  
رہی تھی۔ یہ ایک خوش کن خیال تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ  
گولیاں ذرتاج کو بھی نہیں لگی تھیں۔ لیکن یہ میری خوش فہمی  
بھی ہو سکتی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے انسان کو گولیاں لگیں تو یہ  
بھی عین ممکن ہوتا ہے کہ اس کی ٹانگوں کی اضطرابی حرکت سے  
بریک لگ جائے۔ یہ اس کے زندہ ہونے کی یقینی علامت نہیں  
تھی۔

میرے کانوں میں صرف ایک لمحے کے لیے سنناہٹ سی کوئی  
پھر موت کا سا سکوت چھا گیا۔ کائنات کی گردش جیسے ختم گئی۔ ایک  
ٹانے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں میں تکلیف کے احساس کے بغیر  
یہ حرکت نہیں کیا تھا؟ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔  
پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی وجہ شاید صرف یہ تھی کہ میرے جسم  
کا تمام خون گویا ایک دم سٹ کر سر کی طرف ٹپا تھا۔ اس کے سوا  
میرے جسم میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ کہیں کوئی گولی پڑست نہیں  
ہوئی تھی۔ پیشے کی صرف چند کہیاں اپٹ کر بچھ پر گری تھیں۔

پھر مجھے بریکوں کی چرچاہٹ ملنی طرح کے ہارن بجنے کی تیز تیز  
آوازیں سنائی دیں۔ کچھ جھکدو کا سا احساس ہوا۔ تب مجھے یقین  
ہو گیا کہ میں زندہ سلامت تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے سر اٹھایا  
اور اسی لمحے میں نے راجیلہ کو بھی سراٹھاتے دیکھا۔ اس کے  
چہرے پر بھی اذیت کے آثار نہیں تھے۔ اس کا مطلب تھا اسے بھی  
گولی نہیں لگی تھی۔ دیے بھی مجھے کوئی لگنے کا امکان زیادہ تھا کیوں  
کہ جس طرف میں بیٹھا تھا، ٹانگہ اُدھر سے ہوئی تھی۔

زیادہ گولیاں اگلی کھڑکی پر ڈرائیو تک سیٹ والی سائڈ پر لگی  
تھیں۔ اُدھر ذرتاج تھی۔ اس کے بارے میں سوچ کر میری دھڑکن  
رک جاتی تھی۔ وہ اور مسزورانی دو دونوں ترجیحی ہڈی تھیں۔ میں  
ان دونوں کی طرف متوجہ تھا کہ میں نے اپنے بازو میں کسی کی  
انگلیاں گزرتی محسوس کیں۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ راجیلہ  
تھی۔ وہ بدحواس نہیں تھی لیکن اس کے چہرے کے عضلات گویا  
کھینچے ہوئے اور آنکھیں کچھ پھٹی ہوئی سی تھیں۔

”تم ٹھیک ہو؟“ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔  
”ہاں۔۔۔۔۔“ میرے حلق سے بھی بیٹھی بیٹھی سی آواز نکلی  
”اور تم۔۔۔۔۔؟“

اس نے محض اثبات میں سر ہلادیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر  
نہیں جھانکا اور نہ ہی یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ہمارے ارد گرد کیا  
ہو رہا تھا۔ یہ اندیشہ بھی میرے ذہن میں نہیں آیا کہ شاید وہ گاڑی  
اب بھی آس پاس کہیں موجود ہو جس سے فائرنگ کی گئی تھی اور  
شاید دوبارہ فائرنگ ہو جائے۔

میں فوراً ذرتاج کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں  
ہاتھ بڑھا کر اسے ہلاتا چلا آئیں نے اسے بھی سیدھی ہوتے دکھا  
اور اسی کی تھلید میں مسزورانی بھی اٹھ بیٹھیں۔ میرے سینے  
بے اختیار طمانیت کی گرمی سانس خارج ہوئی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔ وہ ہماری ہی طرف  
مکھونے لگی تھی۔

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے محوم کر ہماری طرف  
دیکھا اور مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ ہی گویا میرے سوال کا جواب  
تھی۔ بلاشبہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ اس کے  
چہرے پر بلکی ہی تھمتاہٹ تھی اور بال ذرا اُلجھ گئے تھے۔ اس کے  
سوا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ اور یہ شاید قدرت کا ایک  
میراثہ ہے۔“ وہ پُرسکون لہجے میں بولی ”وہ گاڑی ہماری گاڑی کے  
مقابلے میں بہت چھوٹی اور بچی تھی اس لیے گولیاں ترجیحی ہڈی  
چھت کی طرف چلی گئیں اگر وہ گاڑی ہماری تھی تو پھر جتنی اگلی ہوئی  
شاید میرا اور مسزورانی کا قصہ تو پاک ہو جاتا۔“

میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ گولیاں  
آگے کی طرف چھت کے وسطی حصے میں سوراخ کرتی ہوئی تھیں

ان سے بھی مکوں کی ٹائیس جھاک رہی تھیں۔  
 انسپکٹر نے گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے جھانکنے کے سے انداز میں  
 ہماری گاڑی کا تیزی سے جائزہ لیا پھر چی کر پوچھا "تپ کی گاڑی پر  
 کس نے فائرنگ کی ہے؟" اس نے ذرتاج کو مخاطب کیا تھا۔ شاید  
 اس لیے کہ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی تھی۔ اس سائڈ کی دونوں  
 کھڑکیوں کے شیشے پھٹا پھڑ ہو چکے تھے۔  
 ذرتاج لحظی سانس لے کر بولی "کاش! ہمیں معلوم ہوتا!"  
 "فائرنگ کرنے والے کہہ کر گئے ہیں؟" انسپکٹر نے تیزی سے  
 تفتیشی انداز میں ہی دوسرا سوال کیا۔  
 "کاش ہمیں معلوم ہوتا!" ذرتاج نے ایک بار پھر دبی جواب  
 دیا۔

انسپکٹر نے خون خوار نظروں سے اسے گھورا اور تیسرا سوال  
 دانا "دو موٹر سائیکل پر تھیا گاڑی میں؟"  
 مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ ذرتاج ایک بار پھر دبی جواب نہ  
 دے دے "کاش ہمیں معلوم ہوتا۔!"

اس کا رد عمل انسپکٹر کی نظر میں شاید اس سے بھی بڑا تھا یعنی وہ  
 ایک لمحے خاموش رہی۔ انسپکٹر کو آگ بگولا ہوتے ہوئے چٹایا  
 "اسی لیے تو مجرم پکڑے نہیں جاتے۔۔۔ کہ جس سے بھی کچھ  
 پوچھو وہ کہتا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔" ذرتاج بڑی نرمی اور  
 لائٹ سے بولی "مجھے یہ تو معلوم ہے کہ وہ گاڑی میں تھے۔ چھوٹی  
 سی سفید گاڑی تھی۔ غالباً سوڑکی۔۔۔ نمبر میں نہیں دیکھ  
 سکی۔"

"وہ کس طرف گئی ہے؟" انسپکٹر نے تیزی سے پوچھا۔  
 "یہ میں نہیں دیکھ سکی کیوں کہ ہمیں جان بچانے کی دھمکی  
 تھی۔۔۔ لیکن ظاہر ہے بدھ مرتکب کا رخ ہے اوہری گئی ہوگی۔  
 کم از کم اگلے سیکل تک تو وہ ادھر ادھر کہیں نہیں مڑ سکتی تھی۔"  
 ذرتاج نے پُر سکون لہجے میں جواب دیا "ہم تو فی الحال اسی بات پر  
 حیران ہو رہے ہیں کہ ہم زندہ کیسے بچ گئے۔ یہ واقعہ کسی مجرم سے  
 کم نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ آپ لوگ پولیس کی مزید غری آنے سے  
 پہلے یہاں سے بالکل نہ لہیں۔" انسپکٹر کا لہجہ جھکا ہوا تھا۔ اس کا  
 ایک ہاتھ گن پر ہی جمارا لیکن دوسرے ہاتھ سے اس نے دائر پولیس  
 کا ٹائیک سنبھال لیا اور موبائل سائزن بجاتی تیزی سے آگے روانہ  
 ہو گئی۔

میں نے دیکھا ٹریفک پہلے سے کم ہو چکا تھا اور گاڑیاں ہماری  
 گاڑی سے کترا کر گزر رہی تھیں۔ شاید جیسے سے آنے والی گاڑیوں  
 کے ڈرائیوروں کو اطلاع ملی تھی کہ آگے کیس فائرنگ ہوئی ہے  
 اور وہ غالباً پچھلے چوراہے سے ہی اوہر ادھر مڑنے لگے تھے۔  
 میں نے ذرتاج سے کہا "پولیس کی مزید غری آنے سے پہلے

میں اس سے ان کے رخ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ میں  
 کہن تھا ایک آدھ گھنٹی ذرتاج کے بالوں کو بھی چھوٹی ہوئی گزری

"ذرتاج ایک نظر پھٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں نے  
 کی گاڑی کی کھڑکی سے ایک گن کی ٹال برآمد ہوتے دیکھی تھی  
 لیکن مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں اپنے اور مسزورانی کے بچاؤ کے  
 بہر میں بڑبڑی حالانکہ میں چاہتی تو سائڈ مار کر اس گاڑی کو روک  
 سکتی تھی کیوں کہ اس کی دوسری طرف گرین سیٹ کی چھوٹی سی  
 بار تھی۔"

"پلز فری۔۔۔ جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔۔۔ جان بچی سولا کھوں  
 اپنے" میں نے کہا اور مسزورانی کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ  
 ایک عام سی عورت کو اس اچانک افتاد پر تقریباً بے ہوش ہو جانا  
 چاہیے تھا لیکن مسزورانی حیرت انگیز طور پر پُر سکون تھیں۔ ان کی  
 آنکھیں کچھ پھیلی ہوئی ضرور تھیں لیکن وہ زیادہ بدحواس معلوم  
 نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے ان کی طرف سے بھی اطمینان ہو گیا۔

میں اس دوران میں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ ہمارے ساتھیوں کی  
 کو سڑت تیزی سے آگے گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اس گاڑی  
 کے قریب میں گئے ہیں جس سے فائرنگ کی گئی تھی۔ انہوں نے  
 تھیا اسے دیکھ لیا تھا لیکن سڑک پر خاصا ٹریفک تھا اور کو سڑت جیسی  
 بلی گاڑی کسی چھوٹی گاڑی کا قریب کرنے کے لیے موزوں نہیں  
 تھی۔

مجھے ان کی کامیابی کی کوئی خاص امید نہیں تھی۔ ایک مسئلہ  
 یہ بھی تھا کہ میں اور میرے جو ساتھی جہاز سے آئے تھے ان کے  
 ہاں اسلحہ نہیں تھا۔ ہم جہاز میں اپنے ساتھ آتشیں ہتھیار نہیں  
 لے گئے تھے چاہے تو لا بھی سکتے تھے۔ اس کے لیے اثر رسوخ بھی  
 استعمال کر سکتے تھے لیکن ہم نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں  
 کی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت کو سڑتیں جو لوگ موجود تھے  
 ان میں زیادہ سے زیادہ صرف شفع شاہ کے پاس کوئی گن موجود  
 دیکھتی تھی۔

اچانک سائزن کی آواز سنائی دی جو تیزی سے قریب آتی گئی  
 اور پھر پولیس کی ایک موبائل ہمارے قریب آن رکی۔ اس کی  
 بہت بڑا ایک مشین گن فٹ تھی اور رشک سے سر نکالے ایک  
 پولیس والا کچھ مستعدی اور کچھ بدحواسی سے اسے اوہر ادھر گھما  
 رہا تھا۔ اس کا سر بھی گن کے ساتھ ساتھ اوہر ادھر گھوم رہا تھا  
 لیکن اس کی سلاخی نظروں کو کوئی ٹارگٹ نہیں مل رہا تھا۔

موبائل کے ایک والے سے میں ڈرائیور کے پاس غالباً انسپکٹر  
 کے محلے کا کوئی پولیس آفیسر موجود تھا۔ وہ ایک مستعد پولیس  
 آفیسر معلوم ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ اس کے دل  
 میں کچھ کرکڑی کا جذبہ موجود ہے۔ موبائل کے پچھلے حصے میں  
 آگے جانے والے کے درمیان چھوٹے چھوٹے کرل سوار موجود تھے۔

باضہ خراب ہو جاتا ہے۔

میں نے اسے گھورا۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ مسز درانی کی طرف دیکھا۔ ان کی دشت تیزی تیزی سے ہلکے فرق میں آیا تھا۔ وہ غالباً اس وقت راحیلہ کی حسرتوں سے لڑا اندوز ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔

وہ اسرار سے بولی "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس وقت صرف اور صرف مجھے ہلاک کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ کپڑا خواہ خواہ لپٹ میں آ جاتے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نام سب کو اپنی امان میں رکھا۔"

"کیا آپ نے فائرنگ کرنے والوں کو دیکھا تھا؟ راجہ راجہ پوچھا۔

"نہیں۔" انہوں نے ذرا ترجمی ہو کر بچے دیکھتے ہوئے ہلکے سے جواب دیا۔

"کیا آپ نے وہ کار دیکھی جس سے فائرنگ کی گئی تھی؟" "نہیں۔" مسز درانی نے تسلیم کیا۔

"تو پھر آپ اسے تین سے کیسے کر سکتی ہیں کہ یہ ملے آپ ہلاک کرنے کے لیے کیا گیا تھا؟" راجہ کا انداز جرح کرنے لگا تھا۔

"میرے پاس اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ہے۔" مسز درانی بے بسی سے بولیں "لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ گولیوں کی بات صرف میرے لیے تھی۔ اور اس ملے کا تعلق اسی ملے سے جس کے سلسلے میں میں نے زرتاج سے۔۔۔ اور زرتاج نے افضل صاحب سے مدد طلب کی۔"

"اور افضل صاحب کو ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ ملے کا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"میں تو آپ کو ان پورٹ پر ہی تانا چاہ رہی تھی لیکن آپ نے کہا کہ راستے میں اطمینان سے بات کریں گے۔ پھر زرتاج نے راستے میں بات شروع ہی کی تھی کہ فائرنگ ہو گئی۔ یوں بات ایک بار پھر سچ میں رہ گئی۔" مسز درانی نے کہا۔

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اسی جلدی بھی کیا ہے۔ ہوئی پہنچ کر آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ اب تو مجھے اس معاملے میں خاصی دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے کیوں کہ اس میں مجھے محسوس گرت سناٹی دے گئی ہے۔ بشرطیکہ آپ کا اندازہ صحیح ہو کہ گولیاں آپ کے لیے چلائی گئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"میں دوثق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ صرف اس لیے میں یہ بات دوثق سے نہیں کہہ رہی ہوں کہ میرا دل گواہی دے رہا ہے۔ بلکہ کل شام مجھے فون پر باقاعدہ دھمکی دی گئی تھی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے ہلاک کر دیا جائے گا۔ اسی لیے میں کل شام سے زرتاج کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور اس وقت دل ہی دل میں یہ حساب لگا کر رہا تھا۔

ہم یہاں سے چلے چلیں تو بہتر ہے۔"

"تم نے شاید انچھڑکی بات صحیح طرح نہیں سنی۔ اس نے کہا تھا کہ مزید فحری آنے تک ہم یہاں سے نہ چلیں۔" زرتاج بولی "لیکن پولیس کے احکامات کی خلاف ورزی کو تو شاید ہمارے ہاں سب لوگوں نے اپنا اعلیٰ فرض سمجھ لیا ہے۔"

"یہ شک۔۔۔ میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا "لیکن جیسے اس سلسلے میں جو بھی ذرا تپ کھڑی ہے وہ فتنہ پھیل کر کر لیتا۔ اس کے علاوہ پولیس کے اہم مسائل کے جواب بھی ہم وہیں بیٹھ کر دے لیں گے۔ میں انہیں وہیں بلالوں گا۔"

"اور اگر وہ فنا ہوئے کہ ہم "جائے وقوعہ" سے "فرار" کیوں ہوئے تھے؟" زرتاج نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا جواب بھی میں خود ہی دے لوں گا۔" میں نے کہا۔

"اور وہ جو ہماری کوشش اس گاڑی کے تعاقب میں ملے ہے۔ کیا ہم اس کی مدد کے لیے ہی جانے کی کوشش نہ کریں؟" عقب میں میرے برابر بھی راحیلہ نے پوچھا۔

"اب تاخیر ہو چکی ہے۔" میں نے جواب دیا "میں معلوم نہیں وہ لوگ کس طرف گئے ہیں۔ میرا خیال ہے پولیس والے بھی ٹانگ ٹوئیاں مار کر واپس آجائیں گے۔ اس قسم کے واقعات کے بعد عموماً یہی ہوتا ہے۔ فی الحال تو میں اسی بات پر خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ اتنی جلدی پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ ہماری پہلی خوش قسمتی تو یہ تھی کہ پولیس اتنی جلدی پہنچ گئی۔ ایسے واقعات خوش قسمت لوگوں کے ساتھ ہی پیش آتے ہیں۔"

پھر میں نے زرتاج سے کہا "چلو۔۔۔ ہوٹل کی طرف اپنا سفر جاری رکھو۔"

زرتاج نے گاڑی اشارت کی۔ گاڑی کسی دھڑکی کے بغیر ہی اشارت ہو گئی اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ میں اس دوران غیر ارادی طور پر مسز درانی کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ وہ ٹانگ کی سیدھ میں دیکھ رہی تھیں اور بت کی طرح سادست نظر آ رہی تھیں۔

انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نکل کر بولیں "یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ یہ فائرنگ وراثت سے میری وجہ سے تھی۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو اتنے بڑے خطرے سے دوچار ہونا پڑا۔۔۔" ان کے لہجے میں شرمندگی، معذرت اور بے پناہ تاسف تھا۔

راحیلہ نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولی "آپ کو اتنے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی شامت کو آواز دینے۔۔۔ مائلے میں ہم لوگ بھی کچھ کم نہیں۔ گولیاں تو اکثر دھڑکتے رہتی ہیں۔ موت اکثر ہمارے بھی تعاقب میں رہتی ہے۔ بلکہ اگر دو چار دن فحیرت سے گزر جائیں۔۔۔ گولیاں نہ چلیں، ہنگامہ و فساد نہ ہو۔۔۔ اتنا خچ نہ ہو تو طبیعت خراب ہی ہونے لگتی ہے۔ عجیب دشت ہی محسوس ہوتی ہے۔



پائیں ہاتھ کا کام ہے۔ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اس شخص نے کہا میں آئے دن نہ جانے کتنے لوگوں پر قازنگ ہوتی ہے جنہیں کچھ پتا نہیں ہوتا کہ آخر ان پر قازنگ کیوں ہوئی ہے جنہیں پتا ہوتا ہے وہ بھی کسی مصیبت یا خوف کی وجہ سے بعض اوقات اصل بات پولیس کو نہیں بتاتے۔ یہ کون سی نئی بات ہے۔

”شکر ہے۔“ مسز درانی کو گویا کچھ اطمینان ہوا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا ”اس کا مطلب ہے آپ نے اپنے مسئلے کے مسئلے میں اس سے پہلے بھی پولیس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”نہیں۔“ مسز درانی نے انہیں سر ہلایا ”مجھے وہ مل گیا مگر مٹی تھی کہ پولیس کے پاس جانے کی صورت میں نتائج زیادہ خطرناک ہوں گے اور جو کچھ ہونا ہو گا وہ جلد ہو جائے گا۔ ابھی تک ڈھکرا مجھے ملت دی جا رہی تھی۔ پولیس کے پاس جانے کی صورت میں یہ ملت بھی نہ ملتی۔“

میں نے ان سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ توڑی دیر بعد میرے باقی ساتھی آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے پولیس بھی چلی آئی۔ انہیں کا دیتے نہایت مؤدبانہ اور ہمدردانہ تھا۔ ہم نے ان سب کی خاطر تواضع قائم اشار ہوئی کے معیار کے مطابق کی جس سے وہ خوش ہو گئے۔ انہیں کی آمد کا مقصد درحقیقت صرف یہ تھا کہ وہ اس بات کو ریکارڈ پر لے آئے کہ جس گاڑی پر قازنگ ہوئی تھی وہ اس کے مسافروں سے ملا تھا اور اس نے تحقیق کے تقاضے پورے کیے تھے۔ مجھے اس کی اس مستعدی پر خوشی بھی ہوئی۔

وہ لوگ رخصت ہو چکے تو مسز درانی نے گویا سکون کی سانس لی۔ تمام گفتگو کے دوران ان سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اب میں ان سے کچھ سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن عین اس وقت آفس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف اتفاق تھا۔

”سر! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کراچی پہنچ چکے ہیں۔“ وہ بولا۔

”بھئی! ماننا پڑے گا کہ تمہاری سی آئی ڈی بہت تیز ہے۔“ میں نے کہا۔

”بھئی! کبھی کوئی جاننے والا بھی سی آئی ڈی کا کام دے جاتا ہے۔“ اتفاق فون کروا ”میرا ایک جاننے والا آپ کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر پہلے لابی میں کھڑا مجھے فون کر رہا تھا۔ وہ آپ کو بھی پہچانتا ہے۔ اس نے آپ کو آتے دیکھا تھا اور باتوں باتوں میں مجھ سے ذکر کر دیا تھا۔ لیکن وہ بتا رہا تھا کہ آپ کے پیچھے پیچھے پولیس بھی چلی آئی تھی۔ خیر تو تھی؟“

”تمہیں معلوم ہی ہے ہمارے پیچھے تو ہر طرح کی بلائیں لگی رہتی ہیں۔ پولیس، برہمچال اب جا چکی ہے۔ وہ ایک الگ جگہ تھا۔ برہمچال تم اسے چھوڑ دو اور یہ بتاؤ اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟ اور پھر میں ہوا کراچی آچکے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”شاید ان سے پھر کبھی ملاقات ہو جائے۔“ میں نے امید ظاہر کی ”گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کر لیا؟“

”گاڑی کچھ دیر پہلے ازبوت کے علاقے سے ہی چھٹی گئی تھی۔ اس سے کوئی سراغ ملنے کی امید نہیں ہے۔ وہ کسی شریف آدمی کی ہوگی۔“ شفیع شاہ نے بتایا۔

”تمہیں اتنی جلدی یہ بات کیسے معلوم ہو گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے پیچھے پیچھے پولیس بھی وہاں آئی تھی۔ ان لوگوں سے پتا چلا۔ انہیں وائز آفیس پر کچھ ہی دیر پہلے اس گاڑی کا نمبر وغیرہ دیا گیا تھا اور انہیں کہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ موبائل میں جو انسپکٹر موجود تھا وہ میرا جانتے والا تھا۔ اس نے یہ بات مجھے بتائی ہے۔“ شفیع شاہ بولا۔

”جاننے والا تھا۔“ شاید اسی لیے اس نے اتنی جلدی تمہاری جان چھوڑ دی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”جان کہاں چھوڑی ہے۔ موبائل میں پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ اب رسمی طور پر آپ سے بھی بات کرے گا۔“ شفیع شاہ نے بتایا۔

”اوہ میرے خدا۔!“ میں کراہ اٹھا ”اب وہ یہاں بھی میرے کان کھائے گا۔ میں تو سمجھا تھا میں اس سے جان چھڑا کر بھاگ آیا ہوں۔“

”میں نے اسے آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔“ شفیع شاہ معنی خیز انداز میں فون کروا ”وہ آپ کے کان نہیں کھائے گا۔ محض رسمی خانہ پڑی کے لیے آپ سے ملے گا۔“

”جی ہاں۔“ آتے وقت اسے بھی آتے دو بھائی! میں نے لٹری سانس لے کر کہا ”غریب خانہ ہے حاضر ہر راک بلا کے لیے۔“

شفیع شاہ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے مسز درانی ’ذرا تاج اور راجہ کو بتایا کہ شفیع شاہ کیا کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ اس وقت آفس میں موجود تھے۔ مسز درانی کچھ تشویش آمیز سے انداز میں پولیس ”کیا آپ پولیس والوں کو بتائیں گے کہ یہ مسئلہ دراصل مجھ پر ہوا تھا؟“

”آپ کیا چاہتی ہیں۔ ہم بتائیں یا نہ بتائیں؟“ میں نے اٹا اٹھی سے سوال کیا۔

”میں چاہتی ہوں۔۔۔ کہ آپ ابھی پولیس وغیرہ اس مسئلے میں بات نہ کریں۔“ مسز درانی ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ہچکچاہٹ آمیز سے کہنے لگی ”پولیس۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ اگر آپ چاہتی ہیں تو ایسا ہی ہو جائے گا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”تو پھر آپ ان سے کیا کہیں گے؟“ وہ بے چاری بدستور پوچھ رہی تھی۔

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ان مسائل سے نمٹنا ہمارے

مسزورانی نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے کہا ”بس۔۔۔ تو پھر اس کا مطلب ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔۔۔“ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”ہم سب کے سب بس کچھ ایسے ہی لوگ ہیں۔ ہمارے روز و شب بلی پلے رنگ بدلتے ہیں۔ کبھی زندگی کا رنگ۔۔۔ کبھی موت کا رنگ۔۔۔ آپ کچھ دیر ہمارے ساتھ رہیں گی تو آپ کو حیران ہونے کے بہت سے مواقع ملیں گے۔ اس لیے آپ اپنی اہل حیرانی کا ذکر چھوڑ دیے اور مجھے کچھ بارے میں۔۔۔ اپنے مسئلے کے بارے میں بتائیے۔“

مسزورانی نے پچھلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور چند سیکنڈ خاموشی سے سر جھکا کر پیشگی رہیں۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ اچانک انہوں نے سر اٹھایا اور عجیب سے لمبے میں بولیں ”میں بہت ضدی عورت ہوں۔“

”یہ کوئی انکشاف نہیں ہے مسزورانی! ہر عورت ہی ضدی ہوتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

”شاید۔۔۔“ مسزورانی مہم لمبے میں بولیں ”میں کچھ جتنی خدمت کم عورتوں میں پائی جاتی ہوگی۔ میں ضد کے معاملے میں موت کی حد تک جاسکتی ہوں۔“

”یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ تقریباً ہر عورت ضد کے معاملے میں موت کی حد تک جاسکتی ہے۔ آخر ”تڑا ہٹ“ خواہ خواہ تو مشہور نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور ایک بار پھر راحیلہ کی طرف دیکھا لیکن وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔

مسزورانی کے چہرے پر قدرے مایوسی ابھرائی۔ وہ بے چاری یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ دوسری عورتوں سے بہت مختلف، منفرد اور غیر معمولی عورت تھیں لیکن میں نے یوں ہی ذرا انہیں معمولی سی جھجھلاہٹ میں جلا کر کے اور اس ہمانے راحیلہ کو یہ بات سنانے کے لیے ان کا دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یوں وہ بات شروع کرتے ہی کچھ انجھن میں پڑ گئی تھیں۔ اس طرح بعض اوقات انسان زیادہ کھل کر بات کرنا ہے۔ ویسے بھی انسان اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف، منفرد اور غیر معمولی ثابت کرنے کی ایک دود میں پیشگی ہی لگا رہتا ہے۔

مسزورانی نے ہچکچاہٹ تیز انداز میں لہر لہر کر دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت سے افراد کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے وہ انجھن محسوس کر رہی تھیں۔ میں نے ٹوٹی اور شفیق شاہ فیہو کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی اس بات کو محسوس کر چکے تھے۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں جا کر کراٹھ کھینے لگے۔ زرنج اور راحیلہ دہیں رہیں۔ راحیلہ بھی جانے لگی تھی لیکن میں نے اسے روک لیا۔

زرنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے مسزورانی سے کہا ”یہ تو ویسے ہی ساری بات ہے۔۔۔ اور آپ کے حالات سے

میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں کراچی چکا ہوں اور آپ ہی کے ہوٹل میں مقیم ہوں۔ ہماری بیرونی برادر بیرونی ہو چکی ہیں۔ لیکن اس وقت میں آپ اور ہوٹل سے بول رہا ہوں۔ اتفاق سے یہاں بھی ایک فلمی فنکار ہوا ہے۔ اس میں بیرونی نگار اور بیرونی جان بھی ہوتی ہے۔ میں نے ان سے بات کی تھی۔ یہ لوگ بھی بہ خوشی آپ کی باتیں کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سمیرا اور مسعود تو موجود ہی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے نمایاں چہرے موجود ہوں گے۔ میں نے سوچا، آپ سے مطمئن کر لوں کہ پارٹی کے بارے میں کیا پروگرام ہے۔ اگر تاریخ اور وقت ناسل ہو گیا ہو تو مجھے بتادیں اگر میں ان لوگوں کو زبانی دعوت دے سکوں۔ اس کے مطابق یہ ان کے شو کے شیڈول کرائے جسٹ کر لیں گے۔“

”ایک منٹ ہولڈ کرو۔“ میں نے کہا اور شفیق شاہ سے پارٹی کے بارے میں پوچھا۔

”کل شام چھ بجے کا پروگرام بن چکا ہے۔ کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔ شفیق شاہ نے تیار ”ہم شخصیات کو ہماری گیسٹ ریلیشنز منیجر نے ذاتی طور پر فون بھی کر دیے ہیں۔ بس آپ لوگوں کا اور ان چند فلمی ستاروں کا انتظار تھا۔“

میں نے اتفاق کو یہ پروگرام بتایا تو وہ ہلکا سا ہنسی سے سراہنے لگی فلمی ستارے میسر ہیں وہ میں آپ کی محفل میں جمع کر دوں گا۔ اب یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان سے آپ کی محفل جتنی ہے یا نہیں۔“

”ضرور سچ کی اتفاق ڈیرا“ میں نے کہا ”دنیا ان کی دیرانی ہوتی ہے۔ ہر طبقہ ان کی پیرانی کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر کل شام پارٹی میں تو آپ سے ملاقات ہو گئی لیکن اس سے پہلے بھی اگر آپ کے پاس وقت ہو اور آپ اس سے ملنا چاہیں تو مجھے فکرے سے بلوائیجے گا۔“ اس نے مجھے اپنا کراٹھ بتایا۔

میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر ریموٹر دکھا تو محسوس کیا کہ مسزورانی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کی نظروں سے مجھے کچھ یوں محسوس ہوا ہے جیسے بہت سے سربسنگ نکل آتے ہیں۔“ میں نے ہنسنے لگا۔

مسزورانی کے ہونٹوں پر تھیں مگر قدرے کھیا پائی سی مسکراہٹ ابھری اور وہ کچھ مذہرت خواہانہ سے انداز میں بولیں ”میں دراصل حیران ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے ہماری گاڑی پر قاتلنگ ہوئی ہے اور ہم میراثی سے انداز میں بچے ہیں لیکن آج اس وقت پل پل پارٹی کا پروگرام ملے کہنے میں مصروف ہو چکے ہیں۔ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔“

”ہم زدنہ بچ گئے ہیں نا۔۔۔ ہمیں خراش تک بھی نہیں آئی ہے۔“ میں نے تصدیق چاہی۔

پڑ سکون نظر آوری تھیں۔ دوبارہ آنکھیں کھول کر انہوں نے جب سلسلہ کلام جوڑا تو ان کے سینے میں بھی بے پناہ غمراہ تھا۔

”وہ مکان بڑی عجیب جگہ پر واقع ہے۔۔۔۔۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں ”گھوکو اونچی اونچی غاروں کے مغربہ تیزی سے اس کی طرف بڑھتے آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی تک یہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی الگ تھلک چھوٹے سے جزیرے پر واقع ہے۔ وہاں غصب کا سکون ہے۔ صرف سمندر آپ سے باتیں کرتا ہے۔ عام لوگوں کو رات کے وقت سمندر شور مچاتا محسوس ہوتا ہے لیکن برسوں سے اس کے کنارے رہنے والوں کے لیے اس کا شور بھی سکوت ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

”میری ساری زندگی اسی بڑے سکون مکان میں گزری ہے۔ شہر، وحشت، تنہا، دھومیں اور ہر قسم کی آلودگی کے سمندر میں دھیرے دھیرے ڈوبتے ہوئے اس شہر میں وہ مکان میرے لیے ایک الگ تھلک سا جزیرہ۔۔۔۔۔ ایک پناہ گاہ ہے۔ سترہ سال کی عمر میں یہی شادی ہو گئی تھی اور شادی کے بعد بھی میں اسی مکان میں رہی ہوں۔ میں جب عمر کے سترہویں سال میں تھی تو ایک برس میں کا نوجوان بنا اپنے باپ کے ساتھ ہمارے ہاں آئے لگا تھا۔ میرے اور اس کے باپ کے درمیان کچھ کاروباری تعلق تھا۔

”میرے اور اس نوجوان کے درمیان دیہاتی طوفانی ماسخیں چلا جیسا کہی نوخیز جوڑے کے درمیان چلی سکتا ہے۔ ہمیں آزادی بھی میسر تھی اور آسودہ حالی بھی۔۔۔۔۔ تاہم ہمارے عشق میں آوارگی کی آمیزش نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد اس کا باپ رشتے سے کر آیا اور شرفاء انداز میں ہماری شادی ہو گئی۔ یہ کم عمری کی شادی تھی۔ پانچ سال گویا ایک خوب صورت خواب کی طرح بیت گئے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ایک سمندری حادثے میں اس کا باپ مر چکا تھا۔ ماں پہلے ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد سے ہی وہ گھر وادہ کے سے انداز میں ہمارے ہاں رہنے لگا تھا۔

”کچھ عرصے بعد چیمبروں کے ایک جھگڑے میں بچ بچاؤ کرائے ہوئے میرے والد کا بھی حادثاتی سے انداز میں اچانک انتقال ہو گیا۔ صدمہ بہت بڑا تھا لیکن ظفر کی رفاقت میری عمر میں اس لیے میں جلد ہی اس صدمے سے سنبھل گئی۔ ظفر میرے شوہر کا نام تھا اور اس کی رفاقت میرے لیے دنیا کی سب سے قیمتی چیز تھی۔ ظفر ساتھ تھا تو کوئی غم ناقابل برداشت نہیں تھا۔

”میرے والد کی زندگی میں ہی ہمارا کاروبار لھڑا پڑنے لگا تھا۔ ہر گزرتے برس کے ساتھ کاروبار کے نئے نئے طور طریقے سامنے آ رہے تھے۔ پرانے طور طریقے تھوک ہوتے جا رہے تھے۔ آئے دن نئی نئی سرکاری پالیسیاں بھی سامنے آتی رہتی تھیں۔ نئے نئے ٹیکس اور پابندیاں لاگو ہوتی جاری تھیں۔ پرانی دھن کے لوگ وقت کے ساتھ چلنے میں ناکام رہتے تھے۔ ظفر بھی کوئی خاص کام

واقف ہے۔ آپ کی رشتہ دار بھی ہے۔۔۔۔۔“ پھر میں نے راحیل کی طرف اشارہ کیا ”اور اس کی موجودگی میں آپ مجھے تنہا ہی سمجھیں۔ اب آپ کھل کر بات کر سکتی ہیں۔“

”میں نے اپنے بارے میں کبھی کسی سے کھل کر بات نہیں کی۔“ مسز ورائی نے مجھے مطلع کیا۔

”شاید آپ نے اچھا ہی کیا۔۔۔۔۔ لیکن مجھ سے ضرور کھل کر بات کیجئے۔“ میں نے مشورہ دیا ”کیوں کہ میں جن لوگوں کو زیادہ قریب سے نہیں جانتا، ان کے مسائل میں دلچسپی نہیں لیتا۔ جب تک ظاہر کے ساتھ ساتھ کسی کا باطن بھی میرے سامنے نہ ہو، میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری مدد کا مستحق ہے؟“

وہ ایک لمحے غاموش رہیں۔ ان کے پتلے پتلے ہونٹ کیچنے رہے۔ پھر وہ گویا دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچے ہوئے پولیس ”میں کراچی میں پیدا ہوئی اور پٹی بڑی ہوں۔ میں نے کراچی کو اتنی قریبی کرتے اور متدرج سمندر کی طرح پہنچنے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرے والد کی دو قین لافیں چلتی تھیں۔ ہم اگر بہت زیادہ خوش حال نہیں تھے تو کچھ ایسے بد حال بھی نہیں تھے۔ ہمارا شمار متوسط طبقے میں کیا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت تعینات کی ہوس اور ایک دوسرے کو کھل کر آگے لٹکے کی دوڑ آج جیسے عذاب ناک سرطوں میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے متوسط طبقہ بھی اپنے آپ کو بہت آسودہ حال محسوس کرتا تھا۔

”تقسیم ہند کے بعد میرے بچپن ہی کے زمانے سے کٹھن دولت مند طبقے کی باتیں کے لیے مخصوص ہو چکا تھا اور اس علاقے میں بڑی بڑی کوٹھیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں جن میں سے کچھ ابھی تک اپنی اصل حالت میں موجود ہیں لیکن اب وہ بہت پرانی طرز کی معلوم ہوتی ہیں۔

”اس وقت کوٹھیوں کی تعداد بہر حال کم تھی اور کٹھن ایک مختصر علاقہ تھا۔ میرے والد نے اس وقت کٹھن سے بہت دور سمندر کے کنارے ایک خاصا بڑا لیکن سیدھا سادہ مکان بنوایا تھا۔ ان کی لافیں بھی وہاں سے قریب ہی سمندر میں کھڑی رہتی تھیں۔ بعض لوگ انہیں باروداری کے لیے اور بعض چیمبرے چیمبلیاں پکڑنے کے لیے کرائے پر لے جاتے تھے۔

”اس وقت وہ علاقہ بہت دور اٹھارہ محسوس ہوتا تھا جہاں وہ مکان واقع تھا۔ چاروں طرف ویرانہ نظر آتا تھا۔ گو کہ اب آبادی اور تعمیرات بھیلتی ہوئی اس کے قریب جا پہنچی ہیں اور فلیٹوں کے کچھ پروجیکٹ اس کے آس پاس ہی آباد ہو رہے ہیں اور بہر حال وہ علاقہ کٹھن میں ہی شمار ہوتا ہے اس لیے زمین اور جائیداد کی قیمت خاصی زیادہ ہے تاہم اب بھی اسے شہر کے قریبی علاقوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔“

مسز ورائی نے ایک گہری سانس لی اور کرسی کے پٹے سے سر نہکا کر چند سینکڑے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ بے حد



کرا تا جا لیکن ہر مال سفید پوشی سے گزر رہا ہو رہی تھیں۔ یہیں  
 کھڑی تھیں۔ کبھی گھر پر ایک دم میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی  
 ایک ایسی بات ہوئی جو میرے دہم و دنگان میں بھی نہیں  
 آئی۔ اس نے یوں سر جھکا لیا جیسے وہ اپنے آپ سے کوئی جرم  
 کا ذکر کر رہی ہو۔

میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے سوچوں کی بھول  
 پہنچا جسکے کا موقع ملا۔ آخر وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی "ظفر  
 میرے لیے جو ذکرِ خاک کیا۔۔۔" "تو از گویا اس کے خلق کو چھٹی ہوئی  
 کی غمی اور یہ بتاتے وقت وہ گویا خود اپنے آپ سے شرمندہ تھی۔  
 "ہاں! میں نے تاتے سے کہا تاہم مجھے اس کا بیان نقشہ  
 کے خاک جانے کا شائبہ نہ ہوگا۔" میں نے منظر ضرور رہا ہوگا۔

مجھے اب بھی کوئی سوال نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی تفصیل بیان کرنے لگی "ہمارے گھر میں ایک زون لائزہ کام کرتی تھی۔ مشکل سے سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ ایک پچھلے کی بیٹی تھی۔ غیبت میں لی بڑی تھی لیکن جوانی ماہ نوٹ کرتی تھی۔ سائنوی سلونی تھی مگر شاید ہر قدم پر مردوں کے دلوں پر ایک نئی قیامت ڈھاتی تھی۔ وہ سر ناپا پر کشش تھی۔ گھرانے ساری باتوں پر میں نے اس وقت غور کیا جب ظفر سے ساتھ لے کر بھاگ چکا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ کبھی اسے اپنے لیے خطرہ محسوس نہیں کیا تھا کیوں کہ میں نے کبھی ظفر کی آنکھوں میں اس کے لیے الغات کی برچھا محسوس نہیں کی تھی۔"

اس نے فکرت خورہ سے انداز میں کمری سانس لی پھر سلسلہ کام جوڑا۔ لیکن درحقیقت وہ دونوں بڑی کامیابی سے مجھے دھوکا دے رہے تھے۔ میرا گھر خاصا بڑا ہے اور کچھ عجیب سی ساخت کا ہے۔ اس میں کئی محفوظ گوشے ہیں۔ پناہ گاہیں ہی ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں ان کے درتغیں لٹھوں کی بیجان خیرداستانیں بکری لٹکی ہوئی۔ وہ درتغیں لمبے جوانوں نے میری آنکھوں میں دھول جوئی کر رکھے ہوں گے۔ دراصل وہ مجھے دھوکا نہیں دے رہے تھے۔ میرا اندھا اعتماد مجھے دھوکا دے رہا تھا۔ وہ اعتماد جو مجھے ظفرِ ناک سے اپنے آپ پر تھا۔ اپنی محبت پر تھا۔ میں بھول گئی تھی کہ میں تین بچوں کی ماں ہیں چکی تھی اور تقریباً چھ برس سے ظفر کی شب و روز کی ساتھی تھی۔

جس پر حال وہ چپا کو لے کر بھاگ گیا۔ چپا اس سانپ کی طرف توجہ نہ دیا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔

فساد کھڑا کیا۔ برسرِ اسٹیشن سے چپا کو لے کر غائب ہو گیا۔ مستقبل کی فکر..... چپا کی قبر پر میرے ساتھ ایک، بھولے برے سے تعلق نہ رکھنا خیال..... غرض یہ کہ کوئی بھی چیز اس کے پیروں کی زنجیر نہیں بنی۔ پھر سبز و رانی نے خود ہی جو از پیش کیا "شاید اس نے اس لیے

کے بیرونی دنیا پر نہیں مکتا۔  
پھر مسز دورانی نے خود ہی جواز پیش کیا ”شاید اس نے اس لیے  
بھی کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اسے  
معلوم تھا کہ میں اسے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے ہی نہیں دوں  
گی۔ میں نے تجھیں بتایا تاکہ میں بہت ضدی عورت ہوں۔ اس  
معاملے میں ظاہر ہے میرے منہ سے افکار ہی نکلتا۔ اور ایک  
بار میرے منہ سے افکار نکل جائے تو اسے اقوام میں بدلنا تقریباً  
ناممکن ہوتا ہے۔ یا اگر میں ایک بار کسی کام کا نتیجہ کر لوں تو پھر  
شاید ہی کوئی طاقت مجھے اس کام سے باز رہنے پر مجبور کر سکے“  
پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولیں ”ظفر نے میرے

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ "ظفر نے میرے  
 ہزار بہت ہی گراگھاؤ لگایا تھا۔ مجھے چھوڑ کر ہمارا جانا۔۔۔۔۔  
 دور وہ بھی ایک نوکرانی کے ساتھ۔! میں نے اسے بھی اٹھا کا  
 سکہ بتالیا۔ اس ٹم میں اندر ہی اندر تو کھلتی رہی لیکن۔ ظاہر میں  
 وہی ایک مضبوط عورت رہی۔ مالی حالات بہت اچھے نہیں تھے لیکن  
 میں نے کسی معاملے میں کم بھی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کسی سے مدد  
 نہیں مانگی۔ اپنے بچوں کی پرورش بہت اچھے طریقے سے کی۔ انہیں  
 اچھے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلائی۔ میرے دو لڑکے اور ایک لڑکی

## ایک تاریخی دستاویز

ہٹلر کے آخری دس دن

پروفیسر اشرف

قیمت :- 75/

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور

میں بولیں "ظفر کو فرار ہوئے جب تین سال ہو چکے تھے اور میرے بچے سمجھ دار ہونے لگے تھے تو ایک نوجوان میرے پیچھے لگ گیا۔"

انہوں نے اس طرح باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا پھر ہم ان کی اس بات کو مبالغہ آرائی سمجھیں گے اور شاید استغناء نظروں سے ان کی طرف دیکھیں گے لیکن ہم تینوں کی پیچیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

تب وہ گویا کچھ بہت کر کے بولیں "میں تو ظفر کے جانے کے بعد سے خود کو ایک کھنڈر ہی محسوس کرنے لگی تھی لیکن شاید اسی کھنڈر میں اصلی غارت کی کچھ خوب صورتی باقی تھی جو اس نوجوان کو بھاگتی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی شہدہ سے میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس کا متعقد حصّہ آوارہ جنوں کی تسکین نہیں تھا۔ وہ غایت پیچیدگی سے مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میری ہر شرط پر اس کے لیے تیار تھا۔ میرے بچوں کو بھی ہر طرح کا تحفظ، سہرہ سنی اور ناپ کا سا پار دینے کا دعویٰ کر رہا تھا۔

"ایک قابل لیکن یہ بات یہ تھی کہ اس نوجوان کو ہر اعتبار سے مجھ سے کیسے بہتر رہتے میرا آگے تھے۔ وہ دوسرے تھا، تعلیم یافتہ تھا۔ اس کا گھرانہ دولت مند اور کاروباری تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ عمر میں بھی مجھ سے چھوٹا تھا۔ تمام قانونی کارروائیاں یہی خود ہی پوری کرنے کے لیے کر رہا تھا۔ ظفر کو غائب ہوئے تین سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کا کتنا تھا کہ میں عدالت میں خبیث نکاح کی درخواست دے دوں۔ ضروری کارروائیاں پوری ہونے کے بعد مجھے دوسری شادی کی اجازت مل جائے گی۔

"یہ ایک آئیڈیل سی صورت حال تھی۔ میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید پھولی نہ ساتی۔ خصوصاً ظفر نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے بعد تو مجھے اس کو پیش کو پس کر قبول کر لینا چاہیے تھا۔ اور یہی بات یہ ہے کہ ایک دو بار میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا بھی ہوا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دل میں گدگد سی ہوئی۔ تین سال سے زیادہ عرصے سے میں پرواؤں کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ میں خود کو ایک بیوہ ہی محسوس کرتی تھی۔

"یہ سب باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن میں نے ابتدا ہی میں اس نوجوان کو سمجھا دیا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اس کے باوجود اس کی ضد بڑھتی ہی گئی۔ معلوم نہیں اسے مجھ میں کیا نظر آیا تھا۔ انسان کا دل بھی عجیب ہے۔ کبھی کبھی بے وجہ ہی کسی پر آتا ہے۔ بہت سے عشق بالکل ہی بے جواز ہوتے ہیں۔ وہ بس عشق ہوتے ہیں۔ کسی منطق سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ شاید اسے مجھ سے کچھ ایسا ہی عشق تھا۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر انہوں نے افسردہ سی سانس

"وہ آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ تینوں کینڈا میں مقیم ہیں۔ تینوں کی شادی ہو چکی ہے۔ انہیں چوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے دنیا کی ہر ضروری چیز بغیر کسی جدوجہد اور بغیر کسی الجھن یا انتظار کے ملتی رہی ہے اس لیے زندگی گزارنا ان کے نزدیک ایک آسان سا کام رہا اور زمانے کی روایات کے مطابق وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ سہولت میں انسان ہیں۔ سب کچھ انہوں نے خود ہی کیا ہے۔ ان کا اس میں کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ کوئی خاص کردار نہیں ہے۔"

وہ مسکرائیں۔ اس مسکراہٹ میں خفیف سی افسردگی کی آمیزش تھی۔ "یہ بات وہ منہ سے تو نہیں کہتے لیکن مجھے معلوم ہے وہ محسوس اسی طرح کرتے ہیں۔ بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی سوچ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ بہر حال۔۔۔ اتنا ہی غیبت ہے کہ وہ مجھے مکمل طور پر نہیں سمجھتے۔ مجھ سے اب بھی ان کی کچھ نہ کچھ وابستگی باقی ہے۔ انہیں بڑی صابر و شاکر قسم کی مخلوق ہوتی ہیں۔ وہ اس برائے نام وابستگی میں بھی خوش رہتی ہیں۔ میرے لیے یہی بہت سے کہ وہ مجھے وہاں بلا لیتے ہیں۔"

"لیکن آپ نہیں جانتیں۔" میں نے گویا ان کی بات مکمل کی۔

"ہاں۔" وہ دہمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ اس احساس سے شاید انہیں کچھ اطمینان ہوا تھا کہ میں ان کی بات سمجھ رہا تھا۔ "میں گھومنے پھرنے کے لیے دو تین مرتبہ وہاں جا چکی ہوں لیکن ان کے پاس رہنے کے لیے نہیں جاتی۔ میں وہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان سے تعلقات کی گہور سی ذور نئی نہیں ہے۔ ورنہ مغرب کی زندگی بڑی ظالم ہے۔ میں چاہتی ہوں میری زندگی کی شام اسی مکان میں ہو جہاں میرا بچپن اور جوانی گزر چکی ہے۔ اور اب بڑھاپا گزر رہا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں پیدائش سے موت تک ایک ہی مکان میں رہنا نصیب ہو۔ اکثر لوگ کسی نہ کسی وجہ سے نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ کبھی اپنی خوشی سے۔۔۔ اور کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے۔۔۔ لیکن میں چاہتی ہوں۔ مجھے موت اسی گھر میں آئے۔ اس کے عقب میں بڑا سا گھر ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے وہیں دفن کیا جائے۔ وہاں بہت سے پھول بوٹے بھی لگے ہوئے ہیں۔ مرنے کے بعد کوئی پھول دار سا پورا میری قبر پر سایہ کیے رہے تو کیا ہی اچھا ہو۔ یہ بھی شاید میری ایک ضد ہے۔"

پھر گویا انہیں کچھ یاد آیا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک محبوب سی مسکراہٹ چمک گئی۔ اس یاد میں شاید بیک وقت کئی بھی تھی اور شیرینی بھی۔ ایک لمحے کے لیے شاید وہ ابھن میں بھی رہیں کہ اس بات کو زبان پر لائیں یا نہیں؟ پھر شاید انہوں نے اسے بیان کر دیا۔ "بہتر سمجھا۔"

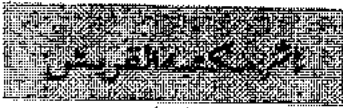
"میں اپنی ضد کی ایک مثال بیان کرتی چلوں۔" وہ دھیمے لہجے

# ابلیکا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر  
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی  
تاریخ پیش کی گئی ہے

سات صدوں میں مکمل سٹ۔ 1950ء



اردو بازار لاہور

سرگشت کا پھر سلسلہ کلام جوڑا "لیکن میرا مسئلہ وہی تھا کہ  
مذہب سے انکار نکل چکا تھا۔ اس کے بعد شانہ نہ کرنا بھی گویا  
مذہب کا چکا تھا۔ شاید ایک بات یہ تھی کہ مجھ میں عشق۔۔۔  
اور کسی کا گھر بنانے کی آرزو مری تھی۔ شاید میری  
ہی حیات مری تھی۔۔۔ یا پھر شاید میں خودی اندر سے  
اٹھ رہی تھی اس نوجوان کی زندگی خراب کرنا نہیں چاہتی تھی  
بہت باتیں میں نے ابتدا میں ہی اسے سمجھادی تھیں مگر وہ مجھ  
سے برا بھلا نہ بن کر مجھے سمجھانے لگا کہ وہ خودی میرے اندر  
دبیدہ عورت کو جگالے گا۔۔۔ بلکہ اگر وہ واقعی مری تھی ہوگی۔  
وہ اسے زندہ کر لے گا۔

"آخر کار میں نے اسے مگر آنے سے نہایت سختی سے منع  
یا اس کا خون سنتا سمجھوڑا مگر وہ بھی شاید میرے ہی مقابلے کا  
ن تھا۔ شاید میں اس کی ضد بن گئی تھی۔ وہ گاڑی لا کر گھر کے  
نہ کمرے کر دیتا اور گھنٹوں اس میں بیٹھا رہتا۔ پرانی قلوں کے  
کی طرح الیہ فلمی فلمے اپنی گاڑی کے ٹیپ ریکارڈ پر اونچی  
زے چلا رہتا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں ایک روایت پسند  
شوہر رست عورت کی طرح ابھی سرد مری کی دلدل میں پھنسی  
ہوں لیکن کبھی نہ کبھی تو اس دلدل سے باہر آ جاؤں گی۔۔۔  
نہ نہ کبھی تو میرا دل کھینچنے لگے گا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میرا  
دور پھر لگے ہو تو ہے اور اسے اقرار میں بدلنا ناممکن ہی ہوتا ہے۔  
"تمہیں تھا کہ میرے آس پاس خالی دیکھتی زمین تھی۔ آس  
پاس کے مکانات۔۔۔ عکس۔۔۔ پردوں پر کچھ نہیں تھا۔ وہ اس  
مادہ کے معمول کی وجہ سے اچھا خاصا قاشاگ جاتا۔ مکانات  
اسطلاح خاص دور ہونے کی وجہ سے میں رسوائی سے تو پچی ہوئی  
لی لیکن مجھے خودی اس کا یہ معمول بُرا لگتا تھا۔ میں خود اپنی  
فلمی اپنے آپ کو رسوا سا ہوتا محسوس کرتی۔ اس کے ٹیپ  
ریکارڈ پر آواز سے گونجتے الیہ فلمی فلمے مجھے زہر لگنے لگے۔ وہ  
فلمی ہو گئیں۔ ان کا سرید ستور جھکا رہا۔

دھندلے خاموشی رہیں۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ ہم میں  
ایک ایک ان سے سوال کرے چٹاں چہ میں نے ہی پوچھ لیا "پھر کیا

"پھر یہ ہوا کہ ایک روز میں نے گھر میں سے لوہے کا ایک موڑ  
نپا لیا اور باہر جا کر اس کی گاڑی کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔  
مگر جبکہ جبکہ سے پچکا پچکا اور اس کا بھی سر پھاڑ ڈالا۔ وہ بے  
پہرہ کیا۔ پرستے پرستے بچا۔ اس کے سر میں اٹھانے ٹانگے آئے  
گئی ہوئی ہڈی کو جڑے میں تین ماہ کا عرصہ لگا۔ "مسز درانی نے  
سہرا۔

"گود مال کی گاڑی۔" "راجلہ اتنی دیر میں پہلی بار بولی "اسے  
پانچ کے ساتھ یہ سلوک!"  
نواہ اچھے اور سچے عاشقوں کے ساتھ تو عورتیں بھی سلوک

کرتی ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا "اوپر  
دور کے گپ بات۔۔۔ جوئے خواب دکھانے والے اور نت  
نئے طریقوں سے پکڑ دینے والے عاشقوں کے ساتھ عورتیں بالکل  
ٹھیک رہتی ہیں۔ اپنا سب کچھ ان پر چھوڑ کر دیتی ہیں اور جیسا وہ  
چاہتے ہیں ویسا ہی کرتی ہیں۔"

راجلہ مجھے گھور کر بولی "میرے تو زبان کو لے ہی تمہیں دل  
کے پھوسے پھوسے کاموں مل جاتا ہے۔"

میں نے دوبارہ مسز درانی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اگر  
ہماری ایک ایک شروع ہو گئی تو پھر آپ کی داستان سچ میں ہی بد جائے  
گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی بات جاری رکھیں۔ اب بات  
شروع ہو ہی گئی ہے تو بہتر ہے پوری ہو جائے۔"

"وہ میرے خلاف کچھ نہیں بولا۔ اس لیے میں جیل جانے  
سے بال بال بچ گئی تھی ورنہ مجھ پر شاید اقام قتل کا الزام آ جاتا۔" مسز  
درانی بولیں۔

"مرو ایسے ہی بادشاہ اور ایثار پیشہ ہوتے ہیں" میں نے غمزہ  
انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

"کیسے؟ ظفر جیسے؟" ذرا کج نے مصدویت سے پوچھا۔  
"میں ظفر کی نہیں" اس نوجوان کی بات کر رہا ہوں جس کا نام  
ابھی مسز درانی نے ہمیں نہیں بتایا "میں نے مصنوعی غصے سے

زرتاج کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کا نام عارف تھا“ مسزدرانی جلدی سے بولیں۔

”حق مغفرت کرے مجب آزاد مرد تھا۔“ میں نے بے اختیار کہا پھر جلدی سے معذرت طلب کی ”معاف کیجئے گا۔ میں نے یہ مہیض تو پرانہ ڈالا لیکن یہ پوچھای نہیں کہ وہ زندہ ہے یا۔“

”مجھے برسوں سے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھی تلک سے باہر چلا گیا تھا“ مسزدرانی نے جواب دیا۔

”پوچھای کیا اس نے۔ اسے چلے ہی جانا چاہیے تھا“ میں نے سر ہلایا۔

مسزدرانی پندر سیکنڈ تک مجھے ایک تک دیکھتی رہیں پھر گویا میری غیر سنجیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں ”تمہیں حیرت نہیں ہوئی کہ میری اس ساری داستان میں میرے مسئلے کا تو کہیں کوئی ذکر بھی نہیں ہے؟“

”خیر اپنی صحت کے لیے کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ اس لیے عرصہ ہوا میں نے زیادہ تر باتوں پر چیران ہوتا چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”دیسے بھی مجھے یقین ہے کہ اس ساری تمہید کا اصل موضوع سے کوئی تعلق ضرور ہے۔“

”ہر اور راست تو شاید کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں ”لیکن میں نے تمہیں اس لیے مختصر سب کچھ بتا دیا ہے کہ تم میرے حالات، میری نظرت اور اس پورے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکو جو میرے اکثر معاملات میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سب کچھ بتانے کے بعد جب میں اپنا مسئلہ بیان کروں گی تو دوسرے لوگوں کی طرح تم مجھے سمجھائے نہیں بیٹے جاؤ گے بلکہ خود کچھ سمجھنے کی کوشش کرو گے۔“

”یقیناً یقیناً۔“ میں نے سر ہلایا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولیں ”یہ سب کچھ جو میں نے تمہیں اپنی ذات اور اپنے حالات کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کے بعد اگر اچانک کوئی شخص نمودار ہو اور وہ مجھ سے میرا مکان پھیننے کی کوشش کرے تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میری کیا کیفیت ہوگی۔“

”اوہ تو یہ قصہ ہے!“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

زرتاج نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ مسزدرانی کو مخاطب کیا ”فلانیانی نہ کریں آئی، اوہ آپ سے مکان چھین تو نہیں رہا۔ وہ تو آپ سے سیدھی طرح خریدنا چاہتا ہے۔ وہ آپ کو ایک کروڑ روپے قیمت دینے کو تیار ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ دے دے۔ بشرطیکہ آپ سووے بازئی کی طرف آئیں۔ جب کہ آپ کے مکان کی مارکیٹ ویلیو پچاس لاکھ بھی نہیں ہے۔“

”میں پھر بھی اسے چھیننا ہی کہوں گی کیونکہ میں اپنا مکان کسی قیمت پر بیچنا نہیں چاہتی اور وہ اسے لینے پر تیار ہوا ہے“ مسزدرانی قدرے برہمی سے بولیں ”قیمت کا سوال تو بعد میں آتا ہے۔ پہلے تو

یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کوئی اپنی چیز بیچنا بھی چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی کسی بھی حال میں بیچنا ہی نہیں چاہتا تو پھر قیمت کوئی مسئلہ نہیں رکھتی۔“

زرتاج میری طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”شاید اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہو کہ آئی باربار زور دے کر اپنے ہندی ہونے کا ذکر کیوں کر رہی تھیں۔ اس شخص نے بات بچوں لاکھ سے شروع کی تھی اور بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ تک آگیا تھا۔“

”اس ملک میں ان لوگوں کے پاس بے حساب حرام کی دولت جمع ہو چکی ہے وہ اسی طرح تو اپنی ہر مطلوبہ چیز کی ہولی بڑھاتے چلے جاتے ہیں“ مسزدرانی ٹھیکے لہجے میں بولیں ”ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جس چیز کی طرف انہوں نے اشارہ کیا وہ انہیں مل جاتی ہے۔ قیمت خرواہ کچھ بھی ہو۔“

پھر وہ گویا اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں ”یہی بات تو اسے اور بھی مشکوک بناتی ہے۔ جس چیز کی مارکیٹ ویلیو پچاس لاکھ بھی نہیں ہے وہ اس کے ایک کروڑ روپے کیوں تیار ہوا ہے؟ بلکہ اس کے پاس حرام کی دولت ہے۔ لیکن لوگ اپنی حرام کی دولت بھی اتنی آسانی سے نہیں بیچ سکتے اسے سینے سے چننا کر سکتے ہیں۔ وہ اگر مارکیٹ ویلیو سے اتنا زیادہ دینے کی بات کر رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی چکر ضرور ہے۔ اور وہ چکر کیا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہو پارہا۔“

”آپ کو چکر سے کیا مطلب آئی؟“ زرتاج بدستور مسکراتے ہوئے بولی ”آپ اپنا ایک کروڑ روپے کھرا کر لیں اور باقی زندگی میٹھ و آرام سے بسر کریں۔“

”مشورے کا شکریہ“ مسزدرانی تلخ لہجے میں بولیں ”یہ کوئی نئی تجویز نہیں ہے۔ جن دو چار لوگوں کو بھی اس مسئلے کا علم ہوا ہے انہوں نے یہی مشورہ دیا ہے۔“

”سوائے میرے“ میں نے نغمہ دیا۔

”میں ممکن ہے دو منٹ بعد تم بھی مجھے یہی سمجھائے بیٹے جانتے“ وہ بولیں۔

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا“ میں نے دیا انداز سے کہا۔ تب مسزدرانی دوبارہ زرتاج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں ”تمہارا خیال ہے کہ ایک کروڑ لے ہی میری زندگی میں آرام سے گزر سکتی ہے؟ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک کروڑ کے بغیر بھی میری زندگی میٹھ و آرام سے ہی گزر رہی ہے۔ مجھے کوئی تنگی یا تکلیف نہیں ہے۔ اور کوئی عیب نہیں ہے کہ بدستور ایک کروڑ دینے کا کوئی ارادہ ہی نہ رکھتا ہو۔ وہ تو کچھ لالچ دے کہ۔ توڑی بہت رقم دے کہ کسی طرح مکان نکال کر الے اور باقی رقم ہمیں کر جائے اتنی آسانی سے ایک کروڑ روپہ کون دیتا ہے۔“

اسے حاصل کرنے پر مائل ہوا ہے۔ اسے تو جینا ہی کہیں کے "سزورانی نے اصرار کیا پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ پولیس میں جمیں تباہی ہوئی تھی۔ کہ میں بہت زور دے رہی تھی۔ میرے منہ سے ایک بار لے اس بات پر بہت زور دے رہی تھی۔ میرے منہ سے ایک بار انکار نکل چکا ہے۔ اب وہ اقرار میں نہیں بدل سکتا۔ ویسے بھی اس مکان کے معاملے میں مسئلہ صرف بند کا بھی نہیں ہے۔ میری اپنی کچھ جذباتی وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں مکان بیٹھا نہیں جاتی۔ کسی کو کیا معلوم کہ وہ مکان میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔"

ان کی آواز کچھ بھراؤنی تھی تاہم انہوں نے بات جاری رکھی "ٹھیک ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کے دلوں میں قانون کا کوئی احترام نہیں رہا۔ خصوصاً جن لوگوں کو کسی بھی قسم کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے وہ تو قانون کو بالکل ہی بیروں تلے روندنے لگتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہم لوگ بہت کم خوف ہیں۔ ہمیں ذرا سی طاقت مل جائے تو بالکل وہی معاملہ ہو جاتا ہے جیسے مجھے کو کاخوں مل گئے ہوں۔ اس کے باوجود میں کسی کے سامنے یہ فریاد ضرور کرنا چاہوں گی کہ ہر انسان کو یہ حق تو حاصل ہونا چاہیے کہ اگر وہ اپنی جتنی بیٹھا نہیں چاہتا تو نہ بیٹھ۔ کوئی اس سے زبردستی توڑ نہ چھینے۔" پھر جیسے انہیں کچھ خیال آیا۔ وہ افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ پولیس "شاید یہ بھی اس شخص کی مرمانی ہے کہ وہ اتنی اچھی قیمت آفر کر رہا ہے ورنہ وہ اتنی طاقت رکھتا ہے کہ زبردستی بھی میرے مکان پر قبضہ کر لے تو میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" غریبانہ علاقوں میں تو آئے دن ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی متوسط اور خوشحال لوگوں کے علاقوں میں بھی ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے بہری طرف سے مایوس ہو کر آپ وہ دوسرے طریقوں پر اتر آیا ہے۔ اب وہ میرا قصہ ہی پاک کرنے پر قائل کیا ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "آپ اور زرنج اس کے بارے میں میرے جنس کو حرج پر لے جانے میں کامیاب رہی ہیں۔ آپ نے اس کے بارے میں اتنی باتیں کی ہیں لیکن ابھی تک مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ آخر وہ کون ہے۔ کیا چیز ہے؟" سزورانی اور زرنج نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر سزورانی پولیس "اس کا نام جبار بیگانی ہے۔"

وہ کچھ ایسی متوجہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں جیسے میں یہ نام سن کر اچھل پڑوں گا یا کم از کم چونک ضرور پڑوں گا۔ میں نے ذہن پر زور دیا لیکن میرے ذہن میں اس نام کی وجہ سے کوئی گھٹتی نہ تھی۔

"کیا مجھے یہ نام سن کر خوفزدہ ہو جانا چاہیے؟" میں نے بڑی سادگی سے پوچھا۔ "بالہ۔ میرے خیال میں تمہارا بہت تو ہونا چاہیے۔" سزورانی نے بھی سادگی سے ہی جواب دیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی سادگی حقیقی تھی۔

اس کی ایسی کی جیسی۔ "زرنج مصنوعی غصے سے بولی "اس حال کے وہ آپ سے فراد کہے؟ ہم اتنے ہی گراں بد معاش ہیں کس لیے بیٹھے ہوئے ہیں؟ ویسے تو میں شریف لڑکی ہوں لیکن آپ کی خاطر غریبی بن جاؤں گی۔" پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا "یہ اپنے افضل صاحب بھی بہت بڑے دادا گیر ہیں۔ ویسے بھی یہ چودھری ہیں۔ آپ نے اگر تمہیں دیکھ رکھی ہوں شاید آپ کو چاہے کہ ان میں وہ جو "چندو چودھری" ہوتا ہے۔" سزورانی کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔

"محنت افزائی کا شکر ہے" میں نے آواز بجالاتے ہوئے کہا۔ تب زرنج نے اچھا ہٹ آہستہ سے انداز میں راجلہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ راجلہ خاتم ہیں۔ میں انہیں زیادہ نہیں جانتی لیکن افضل صاحب کی ساتھی ہیں تو قیقہ کوئی بچی ہوئی چیز ہی ہوں گی۔ ہم سب مل کر اس بد معاش کا بھر کس نکال دیں گے۔ وہ ہماری اپنی کو چکر نہیں دے سکتا۔ ان کا ایک کروڑ روپیہ ہضم نہیں کر سکتا۔ ہم اس کا پیٹ بھاڑ کر بھی رقم نکالیں گے۔"

"میں کئی ڈانٹا شک سننے کے لیے یہاں تم لوگوں کے درمیان نہیں بیٹھی ہوں۔" سزورانی نکلی آہستہ سے میں پولیس "تمہیں معلوم ہے میں جس شخص کی بات کر رہی ہوں اس کا پیٹ تو کیا نہیں چاڑھا بھی آسان کام نہیں ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"میں باری اتنی نہیں بھلا آپ کا مذاق اڑانے کی جرأت کیے کر سکتی ہوں؟" زرنج خوشامدانہ سے انداز میں ان کا کندھا دباتے ہوئے بولی "اگر مجھے آپ کا مذاق اڑانا ہوتا تو میں اتنی عجیبگی سے آپ کو ساتھ ساتھ لے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالے کیوں پھرتی؟"

"تو پھر تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔" سزورانی طاقت سے پولیس "تمہیں تو ابھی طرح معلوم ہے وہ جتنا بڑا بد معاش ہے۔ اس کی بد معاشی کا ایک نمونہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہم لوگ راستے میں دیکھ چکے ہیں۔ کس طرح بھری پڑی سڑک پر ہم پر فائرنگ کی گئی۔"

"یہ تو خیر اب اس شرمیں آئے دن کا معمول ہو چکا ہے۔" زرنج بولی "بہر حال اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کتنا ہی بڑا بد معاش کسی۔ آپ اب اس کے بارے میں سوچنا بھروسہ نہیں۔"

"میں کیسے چھوڑ دوں؟" سزورانی بے بسی سے پولیس "وہ مجھ سے میرا مکان چھیننا چاہتا ہے۔"

"مگر وہ قیمت۔ بلکہ بہت اچھی قیمت کی پیشکش کر رہا ہے تو پھر یہ چھیننا تو نہ ہوا۔ اسے تو غریب بنانا چاہئے گا؟" میں نے اظہار خیال کیا۔

"لیکن میں اسے بیٹھا نہیں چاہتی۔ اور وہ ہر طریقے سے

ہوئے۔ جبار جیلانی تو لینڈ مانا کے بادشاہوں میں سے ایک ہے۔ بنیادی طور پر شاید یہ لینڈ مانا ہی کا آدمی تھا۔ پہلے اس نے اس حیثیت سے ترقی کی۔ بعد میں معزز بلڈرز بھی بن گیا۔ اب اس کے پاس بے اندازہ دولت ہے۔ دولت بجائے خود ایک بڑی طاقت ہے۔ لیکن جبار جیلانی نے تو ہر اعتبار سے ہی اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ علاقے کا امیر اس نے اس کی جیب میں ہے۔ وزیروں سے اس کی دوستیاں ہیں۔ پولیس کے ٹکے میں نہ ہانے کتنے لوگ اس کے وفیقہ خوار ہیں۔ دوچار آدمیوں کو موانع اس کے لیے ایسا ہی ہے۔ چھپے چھپے مسانوں کی آمد پر ہمارا مرغیاں ننگ کرنا۔

میں نے سکرانے ہوئے کہا ”پھر تو واقعی ختمیت ہے کہ اس نے آپ کو آپ کے مکان کی اتنی اچھی قست کی دیکھش کی تھی اور آپ کے مسلسل افکار کے بعد دوسرے چھکنڈوں کی طرف تیار ہے۔ ورنہ یہ چھکنڈے تو وہ شرب سے ہی اختیار کر سکتا تھا۔ آپ کو تو اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے تھا۔“

”وہ تو میں نے کیا تھا اور شکر یہ کے ساتھ اس کی دیکھش مسزود کر دی تھی۔“ مسزودانی نے جواب دیا ”لیکن میرے افکار کی وجہ سے اسے میرا شکر یہ بھی پسند نہیں آیا۔ افکار سننے کا تو وہ حامل ہی معلوم نہیں ہوتا۔“

”کیا وہ خود آپ سے بات کرتا رہا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اس نے صرف پہلی مرتبہ خود بات کی تھی۔“ مسزودانی نے جواب دیا ”اس کے بعد سے اس کے حلق آدمی فون پر بات کرتے رہے ہیں۔ کبھی بیکر بڑی۔ کبھی اسٹنٹ نیچر۔ کبھی جرنل نیچر۔ معلوم نہیں کتنا لہجہ ڈا اسٹاف ہے اس کا۔ انہی لوگوں نے بات چیت جاری رکھی اور رقم بڑھاتے رہے۔ ظاہر ہے وہ جبار جیلانی کی ہدایت پر ہی ایسا کر رہے ہوں گے۔ دو تین مرتبہ اس کی طرف سے کچھ لوگ مجھ سے ملنے بھی آئے۔ انہوں نے بھی دعوی دیکھش دہرائی جو میں فون پر بھی سنتی رہی تھی۔ ان کے انداز گفتگو میں بھی دھمکی پوشیدہ ہوتی تھی۔ آخری مرتبہ جو شخص ایک کوزہ کی دیکھش لے کر آیا اسے تو میں نے خوب بے عزت کر کے گھر سے نکالا۔ اس روز میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے بعد سے چھکنڈوں کا سلسلہ بند ہو گیا اور رقم میں اضافے کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ شاید انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ خطی بڑھیا نہیں ملے گی۔“

”آپ کتنی اکسار پسند ہیں آئی؟“ زرنج ان کا کدھا سلاتے ہوئے بولی ”خود کو خطی بھی کہہ رہی ہیں اور بڑھیا بھی۔ آپ کی عمر اور آپ جیسی اچھی شکل صورت کی کسی عورت کو خطی بڑھیا کہا جائے تو وہ کہنے والے کا سر ہماڑوں کی بلکہ وہ تو بھینا کر کی کسی لڑکی کو یہ اجازت بھی نہیں دے گی کہ وہ اسے آئی کہے۔ آپ سناؤ نہ تبھی تو میں یہ بھی کہوں گی کہ ابھی تو آپ کسی پاکستانی فلم میں ہیروئن بھی آسکتی ہیں۔ بس ذرا زیادہ بیک آپ کا

”دراصل اس شرمیں اب خطرناک لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ ان سب کے ناموں سے واقف ہونا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

زرنج بولی ”جبار جیلانی اصل میں اس قبیل کے لوگوں میں سے ہے جن کا پانا نام زیادہ جانا پچانا نہیں ہوتا۔ اس کی کتنی البتہ بہت مشہور ہے۔ تم نے کبھی اسکا بلڈرز کا نام سنا ہے؟“

”ہاں“ میں نے جواب دیا ”یہ تو کافی مشہور اور بڑی کمپنی ہے۔ اس نے شرمیں بہت سے تعمیراتی منصوبے حاداف کرائے ہیں۔ کچھ مکمل بھی ہو چکے ہیں۔ کچھ آباد ہو چکے ہیں اور کچھ شاید زیر تکمیل بھی ہیں۔“

میری ایک ذیلی کمپنی جو کہ کنسٹرکشن کا کام بھی کر رہی تھی اس لیے مجھے اس شعبے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل تھیں تاہم میں یا میری کمپنی اس شعبے میں زیادہ سرگرم نہیں تھی۔ مجھے اس کا باراد کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی مصلحت ہی نہیں ملی تھی ورنہ اس کام میں بھی بہت دولت تھی۔ میں نے کئی بار اس کام کی طرف بھرپور توجہ دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن ابھی تک اس ارادے پر عملدرآمد کی فہرست نہیں آسکی تھی۔

اسکا بلڈرز کے بارے میں میری معلومات کا بڑا ذخیرہ صرف اخبارات اور اشتارات تھے۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اس کا مالک کون تھا۔ زرنج بولی ”جبار جیلانی اسکا بلڈرز کا مالک ہے۔۔۔ ویسے مجھے پتا چلا ہے کہ ہر تھوڑے دن بعد اس کی کوئی نہ کوئی نئی کمپنی بھی سامنے آجاتی ہے۔“

”یہ تو خیر کوئی حیرت کی بات نہیں“ میں نے کہا ”ٹیکس بچانے کے پکیریں اکثر بڑے بلڈرز اپنا پرنا منصوبہ کسی نئی کمپنی کے نام سے سامنے لاتے ہیں لیکن جاگہوں کو کمپنی کی ساتھ سے حاداف کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اس لیے کسی نہ کسی طریقے سے اصل اور پرانی بڑی کمپنی کا نام بھی پیچھے پیچھے چلاتے رہتے ہیں۔“

”خیر۔۔۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں“ مسزودانی پولیس ”مجھے اس شخص کے بارے میں جو اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق یہ شخص دہری شخصیت کا مالک ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑا اور معزز بلڈرز ہے۔ اس کی وہ آئینی جو بظاہر قانونی اور جائز نظر آتی ہے دسی کچھ کم نہیں ہے لیکن اس کے ناجائز اور ظالمانہ قسم کے ذرائع آئینی بھی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ سنا ہے یہ شخص لینڈ مانا کا بھی ایک نہایت اہم اور سرگرم رکن ہے۔ سرکاری اور نجی خالی زمینوں پر قبضے کرنا۔ فراڈ کے ذریعے انہیں اپنی یا اپنے آدمیوں کی ملکیت بڑا نا۔ راتوں رات ناجائز بھی ہستیاں وجود میں لانا اور اس قسم کے دوسرے بہت سے حاداف بھی اس کی سرپرستی میں جاری ہیں۔“

”اس قسم کے چھوٹے مرنے لوگ بھی کچھ کم خطرناک نہیں

سنائی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ محض ایک افسانہ تھا۔ اور کچھ نہیں۔  
”یہاں تھی وہ کہانی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اس نے تالیا کے میرے مکان کے عقب میں ساحل کا جو حصہ لگتا ہے وہاں کسی زمانے میں پھولی سی کھاڑی ہوتی تھی۔ یہاں تک تو اس کی بات درست ہے لیکن اس سے آگے وہ کہتا ہے کہ اس کا باپ بھی ایک لالچ چلانے والا تھا۔ باربرداری وغیرہ کرتا تھا اور اپنی لالچ اسی کھاڑی میں کھڑی کرتا تھا۔ جبار کہتا ہے کہ اس کے ماں باپ لالچ میں ہی رہتے تھے اور وہ لالچ میں ہی پیدا ہوا تھا۔ اس کا بچپن بڑی غربت میں گزرا۔ اب جب اس کے پاس افسانوی سے انداز میں بہت دولت آچکی ہے تو وہ اس مقام کے قریب ہی اپنا ایک خاص مکان تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس جگہ سے اس کی جذباتی وابستگی ہے۔ وہ اب خود وہیں رہائش اختیار کرے گا۔ یہ سب کچھ اس ہے۔“

”تو آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔  
”مجھے اس ساحل پر کام کرنے والے دو لوگ بھی اچھی طرح یاد ہیں جن کے خاندان اس وقت معدوم ہو رہے تھے جب میں پھولی تھی۔ جبار جیلانی اپنے باپ دادا کے جو نام اور نشانیاں بتاتا ہے ان ناموں اور نشانوں کے لوگ میری معلومات کے مطابق وہاں بھی نہیں تھے۔ دوسری بات پھر وہی آجاتی ہے کہ آخر میرا مکان ہی کیوں؟ میرے مکان کے عقب میں ساحل کم از کم آٹھ میل دور ہے اور اس ساری کہانی میں زمین پر اے فروخت موجود ہے۔ دستیاب ہے۔ یادگار کے طور پر کیا وہ کہیں اور مکان نہیں بنا سکتا؟ میں نے جب اس سے یہ بات کی تو کہنے لگا کہ میرے مکان کی لوکیشن اسے بہت پسند ہے۔ وہ مجھے کوئی بے وقوف اور خطا انگیز عورت سمجھتا ہے اس کا خیال تھا کہ ایک کروڑ کی پیشکش میں کر میری روال ٹھک پڑے گی۔“

”لیکن آپ کی روال نہیں ملے گی۔ اور نہ ہی بچنے کا کوئی امکان ہے۔“ میں نے تصدیق چاہی۔ ”میرا مطلب ہے کہ ایک بار پھر سوچ لیجئے۔ آپ واقعی کسی بھی قیمت پر مکان فروخت کرنا نہیں چاہتیں؟“

”نہیں۔ مسزورانی نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا۔ ”جبار جیلانی نے مجھے یہ یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ کراچی کے کسی بھی اچھے علاقے میں کوئی بنگلا یا شادار قسم کا اپارٹمنٹ مجھے لے دے گا اور باقی رقم میرے نام سے کسی بھی اسکیم میں انویسٹ کر دے گا۔ مجھے مرتے دم تک کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ عیش سے زندگی بسر ہوگی۔ اگر مجھے اس کی تجویز منظور ہوتی تو یہ کام میں خود بھی کر سکتی تھی۔ مجھے اس قسم کے کاموں کے لیے اس کی خدمات کی ضرورت نہیں تھی۔ میں بیٹھے اپنے ہر قسم کے کام خود ہی کرتی آئی ہوں۔ میں کسی بھی معاملے میں اوپر والے کے سوا کسی کی

مدد لینا پسند نہ کرتی۔“ اس قسم کی کجواس کا موقع ہے؟“ مسزورانی نے اسے

گوارا۔  
”کچھ اس کا یوں تو کوئی بھی موقع نہیں ہوتا لیکن یہ تو انسان پر حصر ہے۔ وہ جس موقع پر چاہے کچھ اس کر سکتا ہے۔“ زرنج اطمینان سے بولی ”ویسے میں کچھ اس نہیں کر رہی۔ سچ بول رہی ہوں۔“

”شاید تم مجھے کھن گانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ مسزورانی انہیں سیزتے ہوئے پولیس ”لیکن اس وقت مجھے کھن کی نہیں“

”میں سب آپ کی مدد کے لیے ہی توجہ ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں تو اب آپ کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔“ زرنج بولے۔ وہ شاید اپنی داستان میں مسزورانی کے ذہن سے بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اپنے مسئلے کو ایک لمحے کے لیے بھی زاموش کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر اسی تشویش زدہ سے انداز میں پولیس میری کچھ میں نہیں آ رہا کہ آخر میرے مکان میں اسے کون سا رزق کا پر لگا دکھائی دے گیا ہے اور وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا ہے؟“

”بلڈرز کی اس قسم کی دلچسپی کی وجہ تو عموماً ایک ہی ہوتی ہے۔“ میں نے ریوالتک چیز کے پچھنے سے ٹھک لگاتے ہوئے کہا ”تو کچھ دس سال آگے کی بات سوچنا ہے۔ اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی وجہ سے فلاں جگہ کی اہمیت بڑھنے والی ہے۔ وہ پہلے ہی سے اس اراضی یا پلاٹ پر نظر رکھ لیتا ہے اور اس کے حصول کی کوششیں شروع کر دیتا ہے۔ اہمیت ہی کے حساب سے وہ اس کی قیمت بھی لگا آتا ہے۔“

”اس پمپو پر تو میں نے بھی سوچا تھا۔ مجھے بھی جانے دو کہ لین لینہ وغیرہ کے بارے میں سب باتوں کا اندازہ ہے۔ اسی لیے تو میں قیادہ حیران ہو رہی ہوں کیونکہ میرے دامن بائیں اور سامنے۔“  
”نئی سڑک کی دوسری طرف ابھی تک پلاٹ خالی ہیں۔ لوگوں میں ابھی تک وہاں گھر بنا کر رہنے کا حوصلہ نہیں ہے جہاں میں برسوں سے رہ رہی ہوں۔ وہ پلاٹ دستیاب بھی ہیں۔ میرے بالکل آس پاس۔“ اس نے اس سے آگے قیمت میں پلاٹ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی کم میں مل جائے۔ تو پھر یہ اسی مکان کیوں؟“

”شاید اسے کسی ہر صاحب نے بتایا ہو کہ اس مکان میں کوئی گزاردہ نہیں ہے۔“ زرنج نے ایک بار پھر مسزورانی کو چھیڑا۔

”میرا نام ہے؟“ مسزورانی استغناء سے انداز میں نہیں۔ یہ تو ایک کراہ سے مشابہ صبی ”مکانوں میں دفون خزانے اب کون قیے کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ ویسے اپنی ضد کا جو اڑ پیدا کرنے اور مجھے مطمئن کرنے کے لیے اس نے ایک کہانی بھی گھڑ کر

محتاج نہیں ہوں۔

”آپ کے بچوں کو اس معاملے کی خبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
”نہیں“ مسز ورائی نے لٹی میں سر ہٹایا۔ وہ گویا اس تصور سے  
یہ سمجھ گئی تھیں ”مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں انھیں پتا نہ چل  
جائے۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ دوڑے دوڑے آئیں گے اور میری زندگی عذاب کر دیں  
گے کہ میں فوراً اس چٹکس کو قبول کر لوں۔ مسز ورائی بولیں ”جہیں  
تو اندازہ ہو گا کہ تھی نسل ویسے بھی کچھ کم امانت پرست نہیں ہے  
لیکن یہ مطلبی نکلوں میں رہنے والوں کی تو ذہنیت بالکل ہی تبدیل  
ہو جاتی ہے۔ ان پر بھی گودوں کا بڑا اثر آ جاتا ہے۔ ان کی زندگی  
میں بھی جذباتیت کی گنجائش نہیں رہتی۔ انھیں گویا یاد ہی نہیں  
رہتا کہ جذباتی وابستگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ خصوصاً بے جان  
چیزوں سے تو جذباتی وابستگی کا وہ تصور ہی نہیں کر سکتے۔ وہ میری جان  
عذابیں کر دیں گے کہ اس کھنڈر کے اگر ایک کر ڈھل رہے ہیں تو  
میں فوراً ہاں کر دوں“ اس سے پہلے کہ خریدار ارادہ بدل لے۔ بلکہ  
مجھے تو یہی خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں جبار بیٹائی کو میرے بچوں کے  
بارے میں پتا نہ چل جائے اور وہ ان سے رابطہ نہ کر لے۔ میں  
چاہتی ہوں بس میری زندگی اس گھر میں پوری ہو جائے۔ میرے بعد  
اس مکان کا کیا ہوتا ہے؟ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔“

”بہت خوب!“ میں نے تحسین آمیز انداز میں سر ہٹایا ”مجھے  
خوشی ہے کہ آپ نے لگی لپٹی رکھے بغیر بالکل صاف صاف اپنا  
مقتصد بیان کر دیا۔ آپ نے اپنے محسوسات چھپانے کی کوشش  
نہیں کی۔ دوسرے لوگ شاید اسے شدید ہٹ دھرمی کہیں۔ آپ  
نے خود بھی اپنے آپ کو مذہبی عورت قرار دیا ہے لیکن میرے  
خیال میں یہ ارادے کی مضبوطی ہے۔ خصوصاً جب آپ کو کوئی بڑا  
لاچ دیا جا رہا ہو تو اپنے ارادے پر قائم رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔  
اب آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑیں۔“

”وہ تو میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی ذرا آج کے کہنے پر  
دل ہی دل میں اپنی دانست میں معاملہ تم پر ہی چھوڑ دیا تھا“ مسز  
ورائی بولیں ”لیکن مجھے آسان لکھوں میں سمجھاؤ کہ اب مجھے کرنا  
کیا ہو گا؟“

”آپ اس کے نیچر یا سیکرٹری کو فون کر کے بتا دیں کہ آپ نے  
مکان میرے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ بیٹانہ ہو گیا ہے اور ایک دو ماہ  
میں ڈھل کھل ہو جائے گی اس لیے اب وہ آپ کا چچا پھوڑ دے۔  
اب اس سلسلے میں کوئی بھی بات کرنی ہو تو مجھ سے کرے۔ آپ  
کہہ سکتی ہیں کہ مجھ سے آپ کا سودا ایک کروڑ سے بھی زیادہ میں  
ہوا ہے۔“

”اور وہ اس پر یقین کر لے گا؟“ مسز ورائی استغرائیہ سے لہجے  
میں بولیں۔

”ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ وہ اس پر یقین کرنا چاہے  
نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس کی فحش  
میری طرف مبذول ہو جائے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی فحش  
آوی بھی اس معاملے میں کود پڑا ہے۔ وہ آپ کی جان چھوڑ دے  
اور اگر اسے اُلجھتا ہی ہے تو مجھ سے اُلجھے۔“

”جب وہ اس بات پر یقین ہی نہیں کرے گا تو اس کی فحش  
تمہاری طرف مبذول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ مسز ورائی  
دقوت سے بولیں۔

”چلیں خیر۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں کسی اور طریقے  
اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالوں گا لیکن فی الحال میرا اپنا  
توجہ کسی اور طرف مبذول ہے۔ آپ مجھے دو تین دن کی مسرت  
و شہجہ میں ذرا یکسو ہو جاؤں۔ پھر میں صحیح طور پر آپ کے مسئلے کی  
طرف توجہ دوں گا۔ ویسے میری نظر میں یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے  
معلوم ہے جبار بیٹائی جیسے لوگوں کو کس قسم کے دوزخ کی ضرورت  
ہوتی ہے۔ میں وہ دوزخ بنا جاتا ہوں۔“

”یا یوں کہو کہ دوزخ دینے کی طاقت رکھتے ہو۔“ مسز ورائی نے  
لقہ دیا۔ وہ سمجھدار خاتون معلوم ہوتی تھیں لیکن دنیا کے بڑے  
انسانوں کی طرح ہر حال میں دین کے کئی نہ کسی گوشے میں کوئی سکنا  
کوئی ٹیڑھ موجود تھی۔

”ہاں۔۔۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے“ میں نے ان سے اتفاق کیا  
”امید ہے دوزخ مل جائے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر ان  
دوران زیادہ خطرہ محسوس کریں تو ہمیں میرے ہونٹ میں ٹھمرنگ  
ہیں۔ جب تک جبار بیٹائی کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا تب تک  
آپ ہمیں قیام کریں۔ آپ سے کوئی کرایہ وغیرہ چاہتے نہیں کیا  
جائے گا۔“

”اتنا حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں۔“ زور تاج نے مدافعت  
کی ”ان کے طعام و قیام کا بل مجھے دے دینا۔“

”بہت بہتر جاگیدار امینی صاحب! ہمیں معلوم ہے آپ کے پاس  
بڑی دولت ہے۔ اگر آپ حکم کریں تو میں اور میرے تمام ناگ  
بھی یہاں اپنے قیام و طعام کا بل آپ کی خدمت میں پیش  
کر دیں؟“ میں نے مذہبانہ لہجے میں کہا۔

”میں نے شر کے تمام غرا اور مساکین کا ٹھیکا توڑا ہی ہے  
رکھا ہے۔ مسز ورائی کی ذمے داری تو میں اس لیے لے رہی ہوں کہ  
یہ میری دو بارہ کے رشتے کی خال ہیں اور میرے گھر میں رہنے کے بارے  
میں میں کیونکر یہ کسی کو زیادہ تکلیف دینا پسند نہیں کرتی۔“  
”میں کسی کو یہ تکلیف دینا بھی پسند نہیں کرتی کہ وہ میرا دل  
کسے اور نہ ہی میں کسی کی شرافت کا اتنا ناجائز فائدہ اٹھاؤں  
ہوں کہ اسے ایک بھی ایک خطرے کی طرف بھی دھکیلوں اور اس  
کے ہونٹ میں بھی مفت قیام کروں“ مسز ورائی خفیف سی مسکراہٹ  
کے ساتھ بولیں ”بیٹا! تم میرے لیے جو خطرہ مول لے رہے ہو“



”ہمارے ہاں تو اس کا سب سے زیادہ رواج ہے یہاں ہر ایک نے کسی نہ کسی کے ساتھ بنگالے رکھا ہے لوگوں کی زندگی کا بیشتر حصہ ہی بنگالے بازی میں گزر رہا ہے۔“

”بالکل ٹھیک“ میں نے طمانیت سے کہا ”لیکن المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے بنگالیانا چاہیے ان سے کوئی نہیں لیتا۔ میں ایسے ہی لوگوں سے بنگالیانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ میں آپ کے بنگالی فون پر آہر مدیشن دیکھو گا بھی انتظام کرانے ہوں۔ اگر کسی نے آپ کو دھکی دی تو وہ کال بھی ریکارڈ ہو جائے گی۔ جبار جیلانی نے خود بھی آپ کو براہ راست دھکی دی ہے؟“

”حکماً نہیں“ مسزورانی نے لمبی میں سر ہلایا ”میں نے بتایا کہ اس نے تو مجھ سے بات ہی صرف ایک مرتبہ کی اور اترتے اچھے طریقے سے کہی کہ کوئی منتا تو بھی سمجھتا کہ اس سے زیادہ خوش خلق آدمی شاید ہی اس شہر میں کوئی ہو۔ اس کے بعد اس کے آدمی بھی صرف سوئے باڈی کو آگے بڑھائے یہ سب دھکی ان میں سے کسی نے نہیں دی۔ دھکیاں تو تمام فون کاٹر کے ذریعے لیتی رہیں۔ وہ اب بہت اونچے درجے کا بد معاش ہے اس لیے ہر کام اختیال سے کرتا ہے۔ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جس سے اس کے خلاف کوئی ثبوت مل سکے اس مقام پر پہنچنے کے بعد بد معاشوں کو ایک قاعدہ یہ بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ گندے کیے بغیر ہر گندے سے گنداکام کر سکتے ہیں۔ اس لیے فون پر آہر مدیشن لگوانے فون نیپ کرانے یا اس قسم کے دوسرے ”شریقاتہ“ اقدامات کا کوئی قاعدہ نہیں ہوگا۔“

”۳۱۔ چم۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ دو چار دن بعد اس سے براہ راست ہی بات ہوگی“ میں نے سوچتے ہوئے کہا ”آپ کہاں تو ہیں اس دوران میں آپ کی حفاظت کے لیے اپنا کوئی آدمی آپ کے گھر پر تعینات کر دوں؟“

”یہ فیصلہ تو زرتاج نے بھی کی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے ابھی اس کی ضرورت نہیں“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں ”۳۳۔ اس طرح وہ ہوشیار ہو جائے گا اور جلد از جلد کچھ کرکڑ بننے کی کوشش کرے گا۔ فی الحال شاید وہ مجھے لاوارث سمجھ کر کوئی ایسی غلطی کر جائے جس کی وجہ سے اسے گرفت میں لینا آسان ہو جائے۔“

میں نے اصرار نہیں کیا اور کہا ”جیسا آپ مناسب سمجھیں دینا کر لیتے ہیں۔ ہر حال میں ہر طرح سے مدد کے لیے تیار ہوں۔ آپ زرتاج کی عزت ہیں تو میرے لیے بھی محترم ہیں۔ آئندہ دو چار دنوں کے دوران بھی آپ جب چاہیں۔ جب ضرورت محسوس کریں مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ خلوت محسوس کرتے ہی مجھ سے یا زرتاج سے رابطہ ضرور کر لیتے گا۔ زیادہ خدشہ مت رہے گا۔ نہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی ضد کی محض یاد باقی نہ جائے۔ یا پھر یہ سمجھتا ہو کہ تم ہر وقت آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اس طرح کے بچھڑانے سے ذہن تباہ ہوتے ہیں۔“

”تم میرے قیام وغیرہ کی فکر مت کرو۔ میں آخر دم تک گھر میں ہی رہوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس مردود کو یہ گھر میں خوفزدہ ہو کر گھر گھر ڈرکھاگ گئی۔ یہ گویا اس کی گہ میں اسے فتح کا احساس دلانا نہیں چاہتی۔“

پھر جھرمجھری سے لے کر بولیں ”آج کے واقعے کے بعد تو ایمان اور پختہ ہو گیا ہے کہ اگر آپ کی زندگی باقی ہے تو پھر بسے چلائی گئی کہیاں بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں تو خود اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات چاہتی ہوں۔“

زرتاج دھیرے سے غمی اور بولی ”بہت خوب! آپ پر تو حملے نایا ہوا ہے۔ جبار جیلانی نے سوچا ہو گا کہ اقل تو آج جیلانی کا ہتھیار صاف ہو جائے گا اور اگر کسی مجرے کے تحت وہ بنگالی تو اپنی خوفزدہ ہو جائے گی کہ کھلیاتے ہوئے اس کی ہر بات لے گی لیکن یہاں تو اٹلے بانس پر بلی کو جبار ہے۔ پہلے تو آئی سے خوفزدہ تھیں۔ اب اسے آنکھیں دکھانے پر قہقہے ہوتی ہیں۔“

”میں نے ساری زندگی بے خوفی سے گزاری ہے۔ اب میں عمر آخری دور میں خوفزدہ فکر آتا نہیں چاہتی۔ خصوصاً ایک زندہ بد معاش اور حرام کی دولت انکسار کرنے والے سے تو میں لڑی دینا نہیں چاہتی۔ کوئی زمانہ تھا کہ ایسے لوگ شریفوں سے ملے تھے۔ جب سے شریفوں نے ان سے ڈرنا شروع کیا ہے تب اسے یہ لوگ زیادہ طاقتور ہونا شروع ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اب تو لگتا ہے جیسے سارا انتظام ہی ان کی منگی میں آ گیا ہے۔“

پھر مسزورانی نے لمبائی سانس لی اور مستانہ سے لیے میں ”میری اب زندگی ہی کتنی بے گنجی ہو گئی۔ اگر جبار جیلانی یہ نوک سے برس بھی مجھے چھین سے کر لے لے دیتا تو اس کا کیا باز باؤ؟ ہر حال۔ میں تہہ کیے ہوئے ہوں کہ میں اس کے سامنے لڑاؤ کی لچک کا مظاہرہ نہیں کر دوں گی۔ اگر اپنی اس ضد میں میں جیتا سے ہاتھ دھو بیٹھوں تو تمہیں ایک مضبوط فیاد میر آجائے گی۔ یہی موت کو جو اندازہ کر تم جبار جیلانی کا قاتلہ پیش کے لیے قسم کرنے لگا کوشش کرتا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ خانا خانا اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جبار جیلانی سے غصے کے لیے مجھے کلاش کی ضرورت نہیں۔“

مسزورانی نے دوسرے مایوسی سے بولیں ”شاید تم اندازہ نہیں لگے ہو کہ کتنا خطرناک پارسیخ اور دولت مند آدمی ہے۔“

”مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے“ میں نے انہیں یگانہ دلایا ”یہی سے آدمی سے تو بنگالے میں مزہ آتا ہے۔ پہنچنے کا طلب سمجھتی ہیں یا آپ؟“

”کیوں نہیں“ مسزورانی پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں

میں ماری بھی گئی تو مایہ کسی بچھڑے کو دل میں جگہ نہ دیا۔ مسز درانی ایک کلید سی سکر ایٹ کے ساتھ پولیس "میں سوچ کر اپنے آپ کو سمجھایا کہ ایک اتنی عورت تھی اپنی حفاظت کی بڑا بانی تھی۔"

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں "اب میں چلتی ہوں۔"

زرتاج بھی اٹھتے ہوئے بولی "میں آپ کو گھر پہنچاؤں گی۔"

میں نے زرتاج کو یاد دلایا "جس میں کل پارٹی میں ضرور آنا ہے اور مسز درانی کو بھی ساتھ لانا ہے۔"

"یہ تمہیں بتیئے بھانے پارٹی کھ لیا سوچی؟" زرتاج جانتے جانتے رک کر بولی۔

"زندگی میں بڑی یکسانیت سی آگئی تھی۔ میں نے سوچا کچھ ہٹا کھا ہوتا چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم کہتے ہو تو ان لٹی ہوں" زرتاج بولی "ورنہ میرے خیال میں تو تمہاری زندگی میں یکسانیت نام کی چیز کا کوئی گزر نہیں۔"

پھر وہ رخصت ہو گئی۔ میں نے شفیع شاہ کو بلایا اور دوسرے روز کی پارٹی کے انتظامات کے بارے میں اس سے تبادلہ خیال کرنے لگا۔



شفیع شاہ اور میرے دوسرے ساتھیوں کو پارٹی کی تیاری کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا تھا اس کے باوجود اسے شہر کی نہایت عظیم الشان اور یادگار پارٹیوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ ہوٹل کے چاروں ہال اسی کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے اور اس روز باہر کے کسی پروگرام کے بنگ نہیں رکھی گئی تھی۔

ہر شعبہ زندگی سے شہر کے تمام چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے۔ شو بزنس، تجارت، صحافت، سیاست، شعر و ادب اور صنعت و حرفت۔ فرنیچر ہر شے کے لوگ نظر آ رہے تھے اور وہاں سبھی کی دلچسپی کا سامان موجود تھا۔ پینے پلانے والوں کو بھی اپنی اپنی پسند کا برانڈ بے حساب طریقے سے دستیاب تھا۔ آج میں نے تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ ہال روم بھی ایک عرصے بعد کھول دیا گیا تھا اور رقص کا شوق رکھنے والے جوڑوں کو وہاں رقص کی اجازت تھی۔

ہر طرف موسیقی اور رنگ و نور کا ایک سیلاب تھا۔ ماحول کی خوبصورتی اپنی جگہ تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہاں بہت سے چہرے ایسے موجود تھے جن کے دم سے فضا کچھ اور ہلکا اٹھی تھی۔ دو دو وار کچھ اور بچ گئے تھے میرا اتنے لوگوں سے تعارف کرایا گیا کہ میرے لیے ان میں سے ایک چوتھا ہی کہ بھی نام اور حیثیت یاد رکھنا مشکل تھا۔ میں ایک سے دوسرے ہال میں آ جا رہا تھا۔ تین ہال ایسے تھے جن کے درمیان عارضی چولی دیواریں مائل رہتی تھیں۔ وقت ضرورت انہیں ہٹایا جاسکتا تھا۔ اس وقت انہیں

ہٹا دیا گیا تھا اور ہوٹل کے اس فنڈ پر ایک طویل و عریض حصے میں مسان کھربے ہوئے تھے۔ درانی پروگرام کے لیے ایک طرف اسٹیج بھی لگایا گیا تھا۔ ہال روم بھی اسی طویل و عریض حصے سے خشک تھا مگر کچ میں دیوار مائل تھی۔ زرتاج اور راجیل میرے ساتھ تھیں۔ میرے ساتھ گویا ان کی حیثیت بھی میزبانوں کی کی تھی۔ وہ بھی اپنے آپ کو مسان نہیں سمجھ رہی تھیں۔ مسز درانی بھی اتنی ہوئی تھیں۔ اپنی تمام تر سادگی اور بڑی عمر کے باوجود وہ ایک چار دیواری خاتون لگ رہی تھیں لیکن ان کی شخصیت میں روکنے کے ساتھ ساتھ ایک خفیف سی سفاکی کی جھلک تھی۔ ان کے بڑے پتلے ہونٹ کچھ بچھنے بچھنے سے لگتے تھے جن کی وجہ سے ان کا چہرہ ایک سخت گیر عورت کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود چھوٹی طور پر ان کی شخصیت ایسی تھی کہ میں نے کئی افراد کو جس سے اعزاز میں کھینچوں سے ان کی طرف دیکھنے پایا کہ وہ جانا چاہتے ہوں کہ وہ خاتون کون تھیں۔ لیکن مسز درانی سب سے الگ تھلک ایک کونے میں بیٹھی تھیں اور کچھ کھڑکی کھڑکی سی نظر آ رہی تھیں۔ شاید جوانی کی یادیں ان کی نظروں کے سامنے رقصاں ہوں۔

بہت سے مسانوں کے ساتھ ان گت بائیں کرنے کے بعد بالآخر میں کچھ لوگوں سے جان چڑا کر راجیل اور زرتاج کے ساتھ ایک الگ تھلک سے کونے میں جا کھڑا ہوا جہاں بیچر بھاؤ کم تھی۔ ایک دیر بڑے اٹھائے قریب سے گزرا تو میں نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ٹسے سے اٹھایا، پلے اس کا معائنہ کیا کہ وہ کولڈ ڈرنک ہی تھی، پھر اس میں سے ایک کھونٹ بھرا۔ قریب کے آواز سے اب تک یہ پہلی چیز تھی جو میں نے پیم کی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "مجھے امید نہیں تھی کہ اتنے شارت نویس پر اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ ایک اچھے قسم کے درانی پروگرام کا بھی بندوبست ہو جائے گا جب کہ لوگوں کو قریب کا سر بھی معلوم نہیں ہے۔"

"تمہارے آدھی بوڑے کام کے ہیں۔ جات جات جات۔"

زرتاج بھی ایک کولڈ ڈرنک کی ڈسک لے کر بولی۔

راجیل خاموش تھی۔ وہ قریب کے آواز سے ہی خاموشی چھیلے یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ وہ جب سے کراچی آئی تھی "چپ چپ سی تھی۔ وہ ایسی کم کمر لڑکی نہیں تھی۔ اپنی خاموشی کی وجہ یہ خود کو جانتی سی ہوئی کمر میں بھی اسے سمجھ سکتا تھا۔ یہ احساس قنیت اس کے لیے بھی خوشی کا باعث نہیں ہو گا کہ آج ہمارے ساتھ اس کی وابستگی کا یہ آخری دن تھا۔ یہ بات زرتاج کو بھی معلوم نہیں تھی کہ آج کی پارٹی در حقیقت راجیل ہی کے اعزاز میں تھی اور وہ ایک طرح کی الوادی پارٹی تھی۔

اچانک میں نے اتفاق احمد کو اپنی طرف آنے دیکھا۔ خوبصورت، چمکیلے، سیکس نمالباہرے میں ایک خوبصورت و خوش آوازی بھی اس کے ساتھ تھی جو بوڑے ناز سے قدم اٹھاتی چلی آ رہی

تھا۔ وہ قلعی دیوار کا کھڑا تھا۔ ایک عرصے سے اچھے بُرے شائستہ شائستہ پڑے کھسے، نیم پڑے کھسے، اجڑ گوار، لمبے ہوئے، اچھے ہوئے، غریبہ، ہر طرح کے اداکاروں اور اداکاراؤں کو بھگت رہا تھا۔ اس نے اب اپنی باتوں پر شرمندہ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ اس وقت میرے محسوسات کا اندازہ کرتے ہوئے محفوظ ہو رہا تھا۔

میرا کے استفسار پر وہ سچیدہ ہوتے ہوئے بولا "ہاں بھی کی افضل چوہدری صاحب ہیں۔ ہمیں انجی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟" "ہمیں جب ان کے کلیدیاں دلوں وغیرہ کے بارے میں سنی تھی تو میں نے اپنے حساب سے اندازہ لگا لیا تھا کہ کافی بڑی عمر کے ہوں گے اور کچھ نہ کچھ جٹ قسم کے آدمی ہوں گے لیکن یہ تو جوان بھی ہیں۔ کافی پڑے کھسے بھی لگ رہے ہیں۔ ان میں تو چوہدریوں والی کوئی بات ہی نظر نہیں آ رہی ہے۔" وہ نہایت بے جھجک انداز میں میرا سر تاپا جائزہ لے رہی تھی لیکن غائب اتفاق سے تھی۔

آفاق مشتاقانہ سے امرواؤں اس کا کدھا چھپتا کر بولا "میرا بی بی! اتنا سرے ذہن میں اصل میں صرف وہی چوہدری انکا ہوا ہے جو تم نے قلموں میں دکھا ہے جسے پیشہ بہرہ کنز اس کا کھانا ڈیڈا لکھی لے کر نکارتا رہتا ہے۔ چوہدری صرف ویسا ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت کی دنیا میں چوہدری سب طرح کے ہوتے ہیں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میرے دماغ میں وہ قلم والا چوہدری نہیں تھا۔ مجھے پتا ہے وہ تو پونہمی راسخ لوگوں کا بیٹا ہوا چوہدری ہے۔ لیکن میرے ذہن میں ایسا چوہدری بھی بہر حال نہیں تھا۔" بہرہ اپنا سر میں ہاتھ مٹانے کے لئے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "آپ سے مل کر مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی چوہدری صاحب! میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ قلم لیا۔ اس ہاتھ میں نرمی، گرمی، ہمدردی، بھی کچھ تھا۔ بس غلوں کی حرارت نہیں تھی۔"

میرے سر تاپا جائزے سے فارغ ہو کر وہ در تاج اور راجیلہ کی طرف متوجہ ہوئی اور باری باری ان کا جائزہ لینے کے بعد بولی "یہ دونوں غالباً آپ کی بیگمات ہیں؟"

میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا اور میرا دونوں ہاتھوں سے سر قلم لینے کو جی چاہا۔ آفاق نے اسے کئی اموی اور نجی آواز میں بولا "ہمیں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ چوہدری صاحب غیر شادی شدہ ہیں۔" "دعہ میں مانی چاہتی ہوں۔ ایسی خاص بات میں نے سنی ہوئی تو بالکل نہ ہوتی۔ میرا خیال ہے میں نے دھیان سے سنی ہی نہیں ہوئی۔" وہ جلدی سے سفارت خواہانہ لہجے میں بولی۔

میں نے غم ناک سے لہجے میں کہا "میں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی شوہر ہونے کی تجربات نہیں کر رہا۔ آپ مجھے دونوں کا شوہر بنانے پر تکی ہوئی ہیں۔"

"میں ایک بار پھر مانی چاہتی ہوں۔ وہ دراصل ایویس۔ ذرا جلدی میں میری زبان سے نکل گیا۔" دراصل میں نے اکثر دیکھا ہے

تمی کرنا اسے احساس ہو کر وہ سب کی مرکز ٹکاہ تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ سب تو نہیں، البتہ کچھ لوگ گردن میں گھاٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ مناسب الامعا اور سرود تھی۔ اس کی آنکھیں سفید تھیں کی طرح قدرے نیلی، رنگت کافی سفید، بال بھورے، ریشمی اور زرا شیدہ تھے۔ مجموعی طور پر اسے ایک اسرار، خوبصورت اور پککشل لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ شخصیت اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے وہ اچھے طبقے کی فرد بھی نظر آتی تھی۔

اس کی صورت مجھے دوسرے ہی ماؤس محسوس ہوئی لیکن قریب آنے تک میں اسے نہیں پہچان سکا۔ آفاق مسکراتا ہوا اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا پھر ایک میرے ذہن میں چھٹکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا وہ میرا تھی۔ مٹنے دور کی متبادل قلمی بیرونی، اس کی ابھی چند ہی قلمیں مدلیز ہوئی تھیں لیکن سب کی سب کا سایہ ہوئی تھیں۔ قلمی دنیا میں آئے اسے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اس وقت وہ پُر اسرار تھی۔

ہر طرف اس کے نام کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سنا تھا ہر پردہ پر "سُر" زائر کٹر اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ان گنت پرستاروں کے علاوہ چھوٹے موٹے کئی وزیر سفیر اس کے عشاق کی طویل قطار میں شامل تھے۔ وہ ہماری کٹنی کی ایک مدلیز شدہ قلم کی بی بیرونی تھی اور آئے والی دو ایک قلموں میں بھی کام کر رہی تھی۔ میں نے اس کی کوئی قلم نہیں دیکھی تھی لیکن اس لیے اسے پہچان لیا تھا کہ اخبارات وغیرہ میں اس کے سرواں پر اس کی بے شمار رنگین تصویریں چھپ چکی تھیں۔ اس کے علاوہ میں نے پونہمی اور دوسرے آئے جاتے ایک آدھ لڑکی پر گرام میں اور غالباً کسی ناک شوش اس کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔

آفاق نے قریب آکر ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا تو نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں کچھ جھلکیں تھیں اور وہ ذرا جھٹکے وار سے لہجے میں بولی "واقعی۔ کیا واقعی آپ ہی افضل چوہدری ہیں؟"

"یہ تو آپ آفاق سے ہی پوچھیے۔ جو سکتا ہے یہ آپ سے مذاق کر رہا ہو۔ اسے کبھی کبھی مذاق کرنے کی عادت ہے" میں نے تنبیہ کی سے کہا۔

میرا نے جھک زدہ ہی نظروں سے آفاق کی طرف دیکھا اور انکھیں کے سے عالم میں بولی۔

"سچ سچ بتائیں نا آفاق صاحب! آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں ناں؟ مجھے یہ تو پتا ہے کہ آپ کی طبیعت بڑی مزاحیہ ہے مگر دیکھیں۔ تعارف وغیرہ کے بارے میں مذاق اچھا نہیں ہوتا۔" اس لڑکی کی شخصیت میں جتنی خوبصورتی اور دلکشی تھی اس کا نہ ملنے ہی کرنا اس کا کھڑا غرق ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے اور اندازہ لکھنے کے سارے اثر پر پانی پھیرا تھا۔ آفاق ذرا لب مسکرا رہا

”خیر میری پھولی کے توپورے چار مربع ہیں۔“ اس کے لیے میں غر خٹک گیا۔ شاید وہ بے چاری سوچ بھی نہیں سکی تھی کہ ذرا تاج تھی بڑی زمینداری تھی۔ سیکڑوں مربعوں کا بڑا بادل انگلی زمین کے ساتھ ساتھ کئی فارم بھی تھے۔ اس کا چارہنی کا بڑا کس کی زبردست اعزاز میں چل نکلا تھا جسے دیکھ کر یقین آتا تھا کہ جیسے ہی کو کھینچا ہے۔

سیرا کی بات جاری تھی ۳۰ بھی زمین جگہر میں کو غشی خرید کر فارم ہوئی ہوں۔ اس سے پہلے بڑا اکاڑا تھی۔ میری ذرا دو چار فاقیں اور ریلیز ہو جائیں۔ میں بھی سوچ رہی ہوں کہ لاہور کے آس پاس کسی ایسے سے زرعی علاقے میں دو چار فارم خریدیں گی۔ زمینداری کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس کے بڑے فائدے ہیں۔ ”کہہ دو شاطرانہ اور معنی خیر سے اعزاز میں مسکرائی۔

ذرا تاج دم بخود کھڑی فکر کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ گویا سنبھل کر انگریزی میں ہی بولی ”آپ تو جس کام میں بھی اپنا ڈالیں گی اس میں آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ نقصان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔“

سیرا ذرا اگڑ بڑا کر راحیلہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ راحیلہ پاکستانی لباس میں تھی۔ شاید سیرا نے سوچا ہو کہ وہ اسے انگریزی کی بات نہیں مارے گی۔ اس کے علاوہ میں نے بے بھی عروس کیا کہ اپنی دانست میں وہ بے چاری کو اب محفل جمائے گی پوری کو شش کر رہی تھی۔ وہ شاید یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ ہر ایک کی طرف بھرپور توجہ دے رہی ہے، کسی سے بے رخی نہیں برت رہی۔ بلکہ مکمل دل کر باتیں کر رہی ہے۔ اب یہ الگ مسئلہ تھا کہ بے ساختگی میں اس کے منہ سے کیا نکلتا تھا۔

میرے خیال میں تو یہ بھی قیمت تھا کہ ابھی اس کے اعزاز منگھو میں کسی حد تک بے ساختگی پر قرار تھی۔ ابھی اسے فلم انڈسٹری میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بچہ عرصہ تک اونچے طبقے کی خواتین میں اٹھنے بیٹھنے کا سوچ لے گا تو پھر اس طبقے کی خواتین اور لڑکیوں کے بھی کان کترے گی۔

اپنے ہنساؤ، رکھ رکھاؤ اور شخصیت کے اعتبار سے راحیلہ بھی بہت اونچے طبقے کی فرد نظر آتی تھی۔ سیرا غامض تجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”آپ کیا کرتی ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں“ راحیلہ نے کمری غنجدگی سے جواب دیا۔ ”اچھا۔ اچھا۔ میں سمجھ گئی۔ آپ کا تعلق بیچہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے ہوگا۔“ سیرا نے ایک بار پھر اپنی دانست میں بڑی سمجھداری سے سر ہلایا ۳۱ اس لیے آپ کچھ گھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی ہوں گی۔“

پھر اس نے خودی اپنے خیال کی ترویج کر دی ”ویسے آج کل تو کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں زیادہ کام کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے کام کر رہی ہیں۔ ان کے پاس پیسہ ہوتا ہے تائی۔ وہ ہر کام زیادہ

کہ زیادہ امیر آدمیوں کی دو دو ہویاں ہوتی ہیں۔“ پھر گویا ہے اختیار اس کی زبان سے نکلا ”ویسے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔“

ذرا تاج اور راحیلہ دونوں کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔ انہیں اگر آپ محفل اور موقع مل گا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ سیرا کو ایک ایک بات تو رسید کر دی رہتی اور ان کا ایک ایک بات سیرا جیسی لڑکی کو کم از کم دو چار پھٹے کے لیے اسپتال پہنچا سکتا تھا۔

سیرا اب بھی اندازے ظاہر کرنے سے باز نہ آئی اور بظاہر بڑی سمجھداری سے بھر پور ہوئے بولی ”یہ دونوں شاید آپ کی دوست ہیں۔“

”نہی سمجھ لیں“ میں نے دھجے لیے میں کہا۔

”ماشاء اللہ۔ دونوں بڑی خوبصورت ہیں“ اس نے ایک بار پھر دونوں کا سر تپا پا جائزہ لیا۔ ذرا تاج اور راحیلہ دونوں کے چوں پر ناگواری پر قرار رہی حالانکہ میرے خیال میں کم از کم اس ریمانک پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے تھا اور سیرا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ یہ کچھ کم حیرت انگیز واقعہ نہیں تھا کہ ایک لڑکی نے خود خوبصورت ہوتے ہوئے اور نظروں کی پیرا اشار ہوتے ہوئے دوسری لڑکیوں کی خوبصورتی کی تعریف کی تھی ورنہ عام طور پر کوئی کالی کلونی اور انتہائی کم مد لڑکی بھی اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

ذرا تاج اس مدد مغربی لباس میں تھی۔ سیرا غالباً اس لباس کی وجہ سے اس کے بارے میں ایک اور اندازہ ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکی ”آپ شاید ماڈلنگ کرتی ہیں۔ آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی ہی لگ رہی ہے۔“

”یہ میری بد قسمتی ہے کہ آپ کو میری صورت جانی پہچانی ہی لگ رہی ہے۔“ ذرا تاج انگریزی میں بولی ”ماڈلنگ کے بارے میں میں نے آج تک کبھی سوچا بھی نہیں۔“

”نہی۔“ سیرا ایک دم ذرا اگڑ بڑا کر بولی۔

میں نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا ”یہ ماڈلنگ وغیرہ نہیں کرتیں۔ یہ زمینداری ہیں۔ اور کچھ پراپٹی وغیرہ کا بھی بزنس ہے۔“

”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔“ سیرا نے بڑی حسانت سے سر ہلایا ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ اب خواتین بھی زمینداری کر رہی ہیں۔ میری ایک پھولی کی بھی دارنگ منڈی کے قریب چار مربع زمین ہے۔ علاقے میں ان کا بڑا رعب دیاب ہے۔ ان کے علاقے کا چال بدنام مشہور ہے۔ پھر یک دم ہی اس نے بڑے تجسس سے پوچھا ”آپ کی کتنی زمین ہے؟“

”بس۔“ توڑی ہی ہے۔ وال مدنی چل جاتی ہے ”ذرا تاج نے انکساری سے جواب دیا۔

شہرستان۔ آپ کو تو غلوں میں کام کرنا چاہیے۔  
”خدا نہ کرے جو میں غلوں میں کام کروں“ راحلہ گویا ہے  
ساختہ بولی۔

سیرا جواب تک بڑے جوش و خروش سے اپنی دوشن میں  
باتیں کیے جاری تھی اور دوسروں کی باتوں کے اصل مضمون اور  
تاثر کی طرف کم ہی دھیان دے رہی تھی اس جواب میں چھٹی  
ہوئی کاٹ اور حقیر کو عموماً کیے بغیر نہ ہو سکی۔ ذرا ٹنگ کر کہی  
”کیوں تک غم میں کام کرتے ہیں کیا پرانی ہے؟ مجھے کئی مرتبہ  
تجربہ ہوا ہے۔ کھاتے پیتے کھاناں کے۔ اور زیادہ بڑے کھے  
لوگ اکثر غلوں کے ذکر پر۔ اور غلوں میں کام کرنے کی بات پر  
ناک نہ چڑھتے ہیں مگر جب کسی اشارہ کو دیکھ لیتے ہیں تو اس کے  
ارد گرد رنج ہو جاتے ہیں۔ اسے اپنے گھر آنے کی دعوتیں دیتے  
ہیں۔ درخواستیں کرتے ہیں کہ ہم ان کے یا ان کے بچوں کے ساتھ  
تصویریں بنوالیں۔“

وہ جوش جذبات میں بولنے بولنے ایک لمبے کے لیے سانس  
لے کر وہی پھر سلسلہ نکال کر بولنے لگی ”آپ اس مغل کو ہی  
دیکھ لیجئے کسی زہرست پاہی ہے۔ کتنے بڑے بڑے لوگ آئے  
ہوئے ہیں۔ کسے کیسے گھر گھر یہاں موجود ہیں لیکن جب سے مجھ  
جیسی ایک چھوٹی سی بھلی میاں آئی ہے تب گردنیں موڑ موڑ کر  
دیکھ رہے ہیں۔ اور خدا جوت نہ بلوائے۔ تو کراف دیتے  
دیتے انگلیاں تلک مٹی ہیں۔“

راحلہ کو اپنے لفظوں سے جو تاثر و تاثر دے چکی تھی۔ اب  
غالباً اس نے سیرا کو بخشن دینے کا فیصلہ کیا اور قدرے نرم لہجے میں  
بولی ”شاید میں اپنی بات صحیح طریقے سے نہیں کہہ سکی۔ آپ نے تو  
خواہ مخواہ بات دل پر لے لی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ غلوں میں کام  
کرنا تو بہت مشکل ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خدا مجھے اس  
مشکل میں نہ ڈالے میں تو اپنے دفتری کام میں ہی تلک ہوں۔“  
”اچھا۔ اچھا۔“ سیرا نے سر ہلایا۔ شاید اس کی کچھ تالیف  
قلب ہو گئی تھی۔

وہ شاید کچھ اور بھی کہنے لگی تھی مگر اسی دوران ایک بھاری  
بحرکم غصہ ہمارے قریب سے گزرا۔ سیرا پر نظر پڑی تو خشک اور  
جانتے جاتے پلٹ آیا۔ وہ شاہ نور شہی تھا۔ وہ بہت بڑا قسار  
ڈسٹری بیوٹر بلڈر اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ اس کا باپ ”وہ خود اس  
کے کئی بھائی اور بھانجے بھینچے بھنس میں تھے۔ ان کے نہ جانے کیا  
کیا بھنس تھے بہت بڑی بلی تھی۔“

مجھ سے تو کچھ دیر پہلے اس کی کپ شپ ہو چکی تھی اس لیے  
میری طرف تو اس نے صرف مندرت خواہانہ سرکراہٹ کے ساتھ  
دیکھنے پر اکتفا کیا البتہ سیرا سے رکھی جلوں کے چاڑے کے بعد بولا  
”اچھا ہوا آپ سے یہاں ملاقات ہو گئی۔ مجھے آپ سے بہت  
مزدور کی بات کرنا تھی۔“

ایضاً اسٹینڈرڈ سے کر سکتی ہیں۔ آج کل تو وہ ہر کام میں چھائی ہوئی  
ہیں اب اب بھی کو دیکھ لیں۔ میرے والد بھی اچھے بھلے زمیندار  
ہیں۔ انہوں نے مجھے بڑا منہ کیا کہ غم میں کام مت کرو۔ یہ لین بڑی  
ہیام ہے لیکن میں نے کہا نہیں۔ میں اپنی زندگی خود بنا چاہتی  
ہوں۔ اپنے پیڑوں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ اور راحلہ کا کیا ہے۔  
راول تو انسان خود بنانا ہے۔ انسان خود اچھا ہو تو راحلہ بھی اچھا  
ہو جاتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ انسان خود بڑا ہو تو جا کر  
ایضاً راحلہ کو بھی خراب کر دیتا ہے۔ بس میری باتیں سن کر ڈیڈی  
نے مجھے اجابت دے دی۔“

میں نے یہ تقریر دل پر سنا کر زور شور سے اس کی تائید میں  
سر ہلایا لیکن ذرا آج اور راحلہ کی سمجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ  
اب بھی قدرے خود غوار سی غلوں سے سیرا کو گھورے جاری  
تھی۔ یہ بھی غیبت تھا کہ وہ صرف گھورنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے  
تھی۔ سیرا کی گویا ان کے تاثرات کی طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ وہ  
اپنی دوشن میں تھی۔

وہ خاموش ہوئی تو راحلہ گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولی  
”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کھاتے پیتے گھرانے کی  
نہیں ہوں۔ میرا تو کوئی گھرانہ ہی نہیں ہے۔“

”اچھا۔ اچھا۔“ آپ کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ بڑا  
افسوس ہوا مگر۔“ سیرا نے اپنے کپے میں ہوردی سونے کی  
کوٹھن کی لیکن راحلہ کی بات نے اس کی پوزیشن اور بھی مضبوط  
کی تھی۔ جس کا شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ بلی جمل  
کر جو جواب دیے جاری تھی ان سے سیرا اپنی پروا تو خیل کے  
ملاقات مضمون اتنے کیے جاری تھی۔ وہ اس کے مقام یا پس منظر کو  
بلا کماں سمجھ سکتی تھی۔

ایک لمبے کے وقف کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے بولی ”غیر۔  
کوئی بات نہیں۔ آپ افضل صاحب کی دوست ہیں۔“

وہ مزید کچھ کہتے کہتے دنگ گئی۔ اور یہ اس کے حق میں اچھا  
ی ورنہ شاید وہ راحلہ کے احوال ایک آدھ بہت اہم قسم کی ہڈی  
تذرا ہی چیلنجی اور خود تکلیف اٹھانے کے ساتھ ساتھ قساروں  
کے گورڈوں کے نقصان کا باعث بنتی۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی  
تھیں۔ میں خوب سمجھ رہی ہوں آپ افضل صاحب کی کس قسم کی  
دوست ہیں۔ آپ کے سارے غائب بات تو افضل صاحب کے دم  
سے ہی ہوں گے۔

راحلہ زہر میں تھے لیے میں بولی ”وہ دن پہلے تک میں افضل  
صاحب کے گروپ آف کمپنیز میں انڈیکسنگ ڈائریکٹر تھی۔“  
”اھ۔ اے تو بہت اچھی بات تھی۔“ سیرا آنکھیں قدرے  
پہلے ہوتے ہوئے بولی۔ ”اس کا مطلب ہے آپ کچھ نہ کچھ تو گزری  
تھی۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کچھ نہیں کر تھیں۔“ وہ کرنت  
سے انداز میں ہنسی پھر بولی ”ویسے آپ ماشاء اللہ ہیں بہت

آپ کا اشارہ ہے۔ کم از کم میری اب وہ عمر نہیں رہی کہ اس قسم کی حرکتوں میں دلچسپی لے سکوں۔“

”کیوں۔ کیا ہوا تمہاری عمر کو؟“ میں نے چیخنے کے لئے اہرام میں کہا ”۳۳ بھی تو تم بچاس کے بھی نہیں ہوئے تم سے بڑی عمر کے لوگ گاتے بھرتے ہیں۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔“

”یہ تو اپنے اپنے حوصلے۔ بایں کہنے کہ اپنی اپنی اڑھال کی بات ہے۔“ وہ اپنے بالوں پر ہاتھ بھیرتے ہوئے بولا جن میں سفیدی نمایاں تھی ”پتا تو یہ عالم ہے کہ میرا کی عمر کی ٹوکیوں نے ہمیں اکل کٹا شروع کر دیا ہے۔“

زور تاج بولی ”یہ تو خیر کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ آپ کو اس سے دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ اکل کٹنے کا تو آج کل فیشن ہے۔ آپ تو میرا کی عمر کی ٹوکیوں کی بات کر رہے ہیں۔ اکل تو آپ کو وہ لوگ بھی کہہ سکتے ہیں جو عمر میں آپ کے برابر آپ سے بڑے ہوں۔“

آفاق خوش دلی سے ہنسا اور بولا ”یہ تجربہ بھی بارہا مجھے ہو چکا ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں۔۔۔ تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم میرا کی عمر کی ٹوکیوں کو کچھ نہ کچھ سکھانے یا ان کی گرومنگ کرنے کی کوششیں جاری رکھو۔“

”سراپا میں شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ نوجوانی میں۔۔۔ خصوصاً شادی سے پہلے مزاج میں تھوڑی سی رنگین مزاجی تھی۔ وہ کب کی رخصت ہو چکی۔ اب تو کام کے وقت نہایت سنجیدگی کے ساتھ صرف کام سے ہی غرض رکھتے ہیں۔ اسی لیے تو بہت سے قصبات سے بچے ہوئے ہیں۔“

”چھا بھئی۔ تمہاری مرضی! میں نے لٹری سانس لے کر کہا ”ہم تو تمہارے ہی بچلے کی بات کر رہے تھے۔“

آفاق ایک نظر میرا کی طرف دیکھ کر بولا ”جیسے یہ عمر کا کیکٹس بھی عجیب چیز ہے۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں موجود ہوتا ہے۔ اب ان سوسوف کوئی لے بیٹے۔ عروج میں تھیں سال سے کم نہیں ہے لیکن پچھلے دنوں انہوں نے اپنی سترھویں سالگرہ منائی ہے جس میں نہایت دیدہ دلیری سے انٹرنیٹ کے تمام سرکردہ لوگوں کو بلایا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض تو سوسوف کی پیرائیں کے پس منظر اور دولت وغیرہ سے بھی ابھی طرح واقف تھے مگر ان کے سامنے بھی سوسوف کی والدہ نہایت جھیلے سے ”بچی“ کی عمر ستر سال بتاتے جاری تھیں اور اس ”بچی“ کو اگر آپ روپے پیسے، لین دین وغیرہ کے معاملات طے کرتے دیکھ لیں تو اتنے بڑے کا دوبارہ آدمی ہونے کے باوجود چوڑی بھول جائیگا۔ اس کے باوجود والد مجتہد کو ”بچی“ پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ اسے بے وقوف کہتی ہیں اس لیے سارے کام دوبارہ معاملات خود طے

پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا ”مفضل بھائی! اگر آپ بڑا نہ متائیں تو میں ذرا میرا کو ایک طرف لے جا کر بات کروں؟“

”مجھے بڑا مٹانے کی کیا ضرورت ہے شاہ نور ڈیزا! میں نے بلا غصہ سے کہا ”البتہ خود میرا سے پوچھ لو۔ یہ تو بڑا نہیں مٹائے گی۔“

میرا جلدی سے بول اٹھی ”تو یہ کریں چوہدری صاحب! میں بھلا کیوں بڑا مٹانے لگی۔ منشی صاحب تو ہمارے بہت بڑے کرم فرما ہیں۔ پچھلے پچھلے ہی تو میں نے ان کی دو تھیس سائن کی ہیں۔ بڑے دل والے آدمی ہیں۔“

منشی کے دل کے بارے میں تو مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ کتنا بڑا تھا البتہ جسمانی طور پر وہ خاصا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ جیسے بہت مجھے لیکن ڈھیلے ڈھالے اور کھن آلود سوٹ میں ہوا تھا۔ سوٹ ڈھیلہ ڈھالا ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ بھاری بھر کم نظر آتا تھا۔ مونے فریم کی ٹیک لگاتا تھا۔ داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اپنی اصل عمر سے بڑا لگتا تھا۔ اس کے بال قدرتی طور پر سُرخ مائل تھے۔

وہ میرا کو لے کر ایک کونے میں چلا گیا اور دونوں زور شور سے کوئی بات کرنے لگے۔ منشی دو ذرا دلگ رہا تھا اور میرا اس کے سامنے ایک بازو اٹھام پڑی۔ آفاق کھٹک کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا ”آپ لوگ میرا کی باتوں کا بڑا مت مٹائیے گا۔ انٹرنیٹ میں نئی نئی آئی ہے۔ ابھی صرف انٹرنیٹ میں اور عام سی ذہنیت کے لوگوں میں اچھے پیچھے کے قابل ہوئی ہے لیکن اس قسم کی ٹوکیاں نیچھتی بہت جلدی ہیں۔ آپ لوگ دیکھیں گے کہ تھوڑے عرصے میں ہی یہ آپ کے طبقے میں بھی اچھے پیچھے کے قابل ہو جائے گی۔ اگر اسے گھر پر کچھ نوٹیشن وغیرہ لینے کا وقت مل گیا تو میں ممکن ہے گزراؤں لائق انگریزی بھی بولنے لگے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ یہ ٹوکیاں جب اشارہ بن جائیں تو ان کے پاس کچھ بھی سمجھنے کا وقت نہیں رہتا۔ یہ صرف دھیرے لگانے میں جتنی رہتی ہیں۔ اور یہ کام انہیں کسی سے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

پھر وہ ایک نظر میرا کی طرف دیکھ کر بولا ”صرف ایک ہیروئن کو چھوڑ کر۔ یہ اب تک انٹرنیٹ میں آنے والی تمام ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسے صرف تھوڑی سی گرومنگ کی ضرورت ہے۔ بڑی ٹھیک خاک چیز بن جائے گی۔“

”تمہارے کہنے سے پہلے میں خود ہی سوچ رہا تھا“ میں نے کہی سانس لے کر کہا ”تمہید ہے تمہارے اور وہ تمام دوسرے ہدایت کار جن کی فلموں میں یہ کام کر رہی ہے۔ اس کی گرومنگ“

”کے لیے مجھ پر وہ دودھ کر رہے ہوں گے؟“

آفاق ہنسا ”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہر شخص اسے کچھ نہ کچھ سکھانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جن حرکتوں کی طرف

”ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر لیں کہ واقعہ محترمہ کیا چیز ہوں  
”مجھے زیادہ تجرہ تو نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے فلم لائن  
نے والے بیشتر چیزیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔  
”زرنج نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر سر سے لے لیے میں پوچھا  
”کہیں کی؟ کیا اس بازار کی ہے؟“  
”نہیں۔۔۔ اس بازار کی تو نہیں ہے لیکن گھر کا داخل بازار  
اتنا ہے۔“ اتفاق نے جواب دیا۔

اس دوران دور کوئی نے میں شاہ نور اور میرا بدستور سر جوڑے  
رہے تھے۔ اب شاہ نور حسی نے ایک ڈائری نکال لی تھی اور  
ایک کوئی صفحہ کھول کر سیرا کو دکھایا تھا اور ان پر ہاتھ مار رہا تھا۔  
میرا کی توجہ اندر راجات کی طرف دلارہا تھا اور ایسا معلوم ہوا تھا  
کسی مسئلے پر ان کے درمیان خاصی بحث و تمحیص جاری تھی۔  
”ان کی بحث تو خاصا طویل پکڑ گئی ہے۔ حسی ڈائری کھول کر نہ  
نے کیا دکھایا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مغفوں وغیرہ کا حساب دکھا رہا ہوگا۔ حسی بڑا حساس کتابی  
ادبی ہے۔“ اتفاق بگنی سی غمی کے ساتھ بولا۔ سیرا اگلبرگ لاہور  
یا جو کوئی خریدنے کی بات کر رہی تھی اس کے لیے بھی آدمی  
تم حسی نے ہی دی تھی۔ دراصل ابھی سیرا بہت زیادہ اوپر نہیں  
گئی ہے۔ حسی ابھی سے اسے پوری طرح قابو میں کرنے کی فکر میں  
ہے۔ وہ لاہور میں اسے ہر طرح سے اپنا پابند بنا کر رکھنے کے چکر  
لگا رہے لیکن سیرا پر ان پر پانی نہیں پڑے دے رہی لیکن اس کے  
ہاتھ ساتھ وہ ان قواعد سے بھی ہاتھ دھوٹا نہیں چاہتی جو اسے  
ٹکی سے حاصل ہو رہے ہیں۔ وہ چاہ رہی ہے کہ اس کی چار چو  
ٹھیں اور ریلیز ہو جائیں اور فلمی دنیا کی اصطلاح میں اس کا بھانڈا  
اور بڑھ جائے پھر وہ کسی سے بات کرے کہ پہلے تو جو کچھ لیا دیا گیا  
اس حساب کھاتے کو بند سمجھو۔ اب نئے سرے سے بات کر لو اور  
ٹاکسٹساری پیشکش کیا ہیں۔ مگر حسی بھی کبھی گولیاں نہیں کھینچا  
ہے۔ اس کی عمر زیادہ نہ سہی مگر وہ اس میدان کا پڑا کھلاڑی ہے۔  
لاہور میں اس وقت ہی اس چڑیا کے پر باندھنے کی فکر میں ہے جب وہ زیادہ  
اوپر اڑان کے قابل نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان ایک طنز و سخری  
مکمل رہی ہے۔ دونوں کے لیے مشغلہ اچھا ہے۔“

اپنا ایک راجیلہ جگر جھڑی سی لے کر بولی ”سختی بڑی بات  
سہے۔ ہم لوگ یہاں کھڑے اس بے چارے کے بارے میں غیبت  
کیے جا رہے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی ایک دنیا۔ اپنا ایک لاکھ  
اسٹاکس ہوتا ہے۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی کا مذاق اڑا دیں۔“  
ان کی دیر کی خاموشی میں اس کے دل کی گایا پلٹ چکی تھی۔ خیالات  
بل پکڑے تھے۔

”ہم مذاق تو نہیں اڑا رہے۔“ اتفاق نے جلدی سے سب کا  
تذکرہ کیا۔ ”ہم تو تو اس رنگ برنگی دنیا کے رنگ برنگے کرداروں کی

جاسوسی ڈائجسٹ کا  
مقبول ترین پراسرار سلسلہ

ایلیٹ

نامور کہانیوں کے خالق  
الولہ صدیقی کا ایک اور  
پراسرار ایڈ ونچرٹا ولس  
نئی اور بدی کا خوفناک تصادم

تصویر سرورق، دیدہ زیب  
کتابت و طباعت

قیمت ۱۵۰/-

مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

فون ۴۲۲۲۴۶۶۵

باغش کر کے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

”میں تو ذرا کچھ اور سمنوں سے ملنے ملائے جا رہی ہوں۔ مجھے یہاں غائبے پرانے وقتوں کے کچھ ششما چہرے بھی نظر آ رہے ہیں۔“ راحیلہ بولی۔ اس نے شاید وہاں سے ٹھکنے کا بانہ ڈھونڈا تھا۔

”میں بھی ذرا آٹنی کی خبر لے آؤں۔“ ذرا تاج بولی۔ وہ دونوں کچھ تبدیلی چاہ رہی تھیں۔ دونوں وہاں سے ٹھک گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اتفاق بولا ”سیرا واپس آئے تو میں بھی یہاں سے ٹھک جاؤں گا۔ آپ کچھ وقت فلم انڈسٹری کی ایک ٹاپ اسٹار کے ساتھ گزاریں اور دیکھیں کہ ہماری نو وارد فلمی ہیروئنیں کیسی ہوتی ہیں۔“

”جی تو ایک جیسی نہیں ہوتیں۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں۔۔۔ یہ تو درست ہے۔ سب ایک جیسی نہیں ہوتیں۔“ اتفاق نے حلیم کیا ”ہر ایک کی ایک الگ شخصیت، ایک الگ خامدانی ہیں مگر الگ سوچ، الگ عجوبہاں اور الگ حالات ہوتے ہیں لیکن چند باغش ان میں مشترک ہوتی ہیں۔ وہ آپ محسوس کر لیں گے۔“

اس دوران ایسا دکھائی دیا کہ شاہ نور شعی اور میرا کے درمیان بحث شاید کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی تھی۔ شاید انہوں نے تنازعہ نکالت کو پھر کسی وقت کے لیے اتار رکھا تھا۔ اتفاق نے سیرا کو بلانے دیکھا تو حسب ارادہ جلدی سے وہاں سے ٹھک لیا۔ میرا سمنوں کی دو تین ٹولوں کے قریب سے گزر کر مجھ تک پہنچی تو مجھے تما کھڑے دیکھ کر اپنی خوب صورت بلوری آنکھوں کو مصنوعی حیرت سے پھیلانے ہوئے بولی ”ارے۔۔۔ آپ تما کھڑے ہیں اور تین کلاں چلے گئے؟“

”اس محفل میں بہت بڑے بڑے مقامی مسجود ہیں۔ کوئی کسی کو سمجھنے کر لے جاتا ہے۔ کوئی کسی کو۔“ میں نے جواب دیا ”آپ کو بھی تو آخر کوئی مقامی سمجھ کر لے گیا تھا۔“

”ارے چھوڑیں چوہدری صاحب! آپ بڑے مزاحیہ ہیں۔۔۔“ وہ اپنی مخصوص مصنوعی ہنسی کے ساتھ بولی جس میں ابلیسی کرشماتی محسوس ہوتی تھی ”آپ تو خود بہت بڑے مقامی ہیں مگر آپ کو اپنی طاقت کا اعجاز نہیں ہے شاید۔ یا پھر شاید آپ وہ دکھا رہے ہیں۔ کیا کہتے ہیں اسے۔“ اس نے بڑی اداسے اپنی مغرور اپنی ادھن پیشانی پر اداسی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”اکثر کسی۔“ میں نے کہا۔

”اے۔۔۔ اے۔۔۔“ وہ جلدی سے بولی ”اور وہ جو مجھے سمجھ کر لے گیا تھا۔۔۔ وہ سوچا۔۔۔ وہ مقامی نہیں۔۔۔ تو کبیل ہے کبیل۔۔۔ مگر اس سے جتنا جان چمڑانے کی کوشش کئی ہوں وہ اتنا ہی چمڑا جاتا ہے۔ میں تو اس کی ٹھیکس مانتی کر کے

پہنسی گئی۔“

”لیکن کاہنہ کی دنیا میں ہر حال اسے سیکھنے کا پانی ہے۔۔۔ اور سیکھنے تو شاید آپ سمجھتی ہی ہوں گی۔۔۔“ حنا نے کو کہتے ہیں۔۔۔“

”کیوں نہیں۔۔۔ میں کوئی ان پڑھ تو نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے سیکھنے کا مقامی کس کہتے ہیں۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ میں نے سلسلہ حکام جوڑتے ہوئے کہا ”اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ بیبیوں اور کارائیں خود اس سے دوستی کی خواہش مند رہتی ہیں۔“

”رہتی ہوں گی۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی ”میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں کوئی ایسی کڑی پڑی یا دولت کی لالچی لڑکی نہیں ہوں۔ دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی چوہدری صاحب! میرے لیے کوئی پرستانی بھی ہونی چاہیے۔“ وہ بڑی اداسے مسکرائی اور اٹھا کر کچھ اور قریب آگئی ”جیسے آپ کی۔“

میں پلک جھپکاتے بغیر اس کی شفاف آنکھوں میں جھانک رہا۔ اس کی عمری میں ہی ان آنکھوں میں لڑائی کی سی چمک تھی۔۔۔ آنکھیں میرے چہرے پر اپنے الفاظ کا قد عمل تلاش کر رہی تھیں۔ دیکھ رہی تھیں کہ میں کچھ ریشہ عقلی ہونا شروع ہوا تھا یا نہیں؟

میں نے کوشش کی کہ زیادہ نہیں تو کسی حد تک اس کی خواہش کے مطابق تاثرات دے سکوں گو کہ میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ میرے لیے یہ ایک آزمائش سے کم نہیں تھا کہ کوئی مجھے اچھا نہ لگ رہا ہو اور میں ظاہر کرنے کی کوشش کروں کہ میں اس پر قربان جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ ان لوگوں کے سامنے تو ایسا کرنا میرے لیے اور بھی زیادہ مشکل تھا جس کے تاثرات مصنوعی ہونے تھے۔ الفاظ روح سے خالی۔ اور جذبے محض لالچ اور ہوس کی مجموعی تعمیریں۔ مزید قسم کر رہی تھی۔ ہوتی ہے کہ ایسا کوئی انسان مجھے عقل سے بددل اور کھڑے کی جھلی سمجھ لیتا تھا۔

”کیا واقعی آپ کو میری پرستانی اچھی لگی؟“ میں نے اٹھتائی سے پوچھا۔

”آپ آپ اتنے بھولے نہ ہیں چوہدری صاحب!۔۔۔“ وہ اس طرح اٹھلائی کہ اس کا گردن کندھا میرے بازو سے مس ہونے لگا ”آپ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ بات ابھی تک آپ کو کسی نے بتائی نہیں ہوگی۔ آپ تو آج بھلے بھلے بنائے فلمی ہیرو ہیں بلکہ ہماری انڈسٹری میں تو جی بہت اعلیٰ قسم کے لوگ بھی بیرون کر جا چکے ہیں۔ آپ تو ان سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ آپ نے اپنی فلم کبھی ہوتے ہوئے اس سلسلے میں نہیں سوجھا۔ آپ کو تو بہت پہلے ایسا سوچنا چاہیے تھا۔ آپ نے اپنی فوجداری کے کئی قیمتی سال ضائع کر دیے لیکن خیر۔ اب بھی در نہیں ہوئی۔“

”میرا تو خیال ہے کہ میں اگر کسی فلم میں ہیرو نہ آیا تو وہ کچھ



جلدی سے تفتی امیر انداز میں میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے مخصوص حرکت انداز میں ہنس کر بولی "مجھے پتا تو ہے۔ اتفاق نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ آپ کے اتنے لےنے چوڑے کا لوہا ہوں۔ کراچی میں بھی لاہور میں بھی۔ فلم انڈسٹری میں بھی آپ کا چہرہ لگا ہوا ہے۔ یہ ہو سکتی بھی ہے آپ تو بڑے دولت مند آدمی ہوں گے چوہدری صاحب؟" اس بار اس کی آنکھیں شاید فرارادی طور پر پھیل رہی تھیں حالانکہ اس سوال پر وہ یقیناً پہلے بھی کئی بار غور کر چکی ہوگی۔ "کچھ اتنا زیادہ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "اس ملک میں مجھ سے بھی نہ جانے کتنے بڑے بڑے دولت مند پڑے ہیں۔ اور وہ بھی نہ جانے کتنی تعداد میں۔" میرے اس جواب میں انکساری بھی تھی اور واثق داری بھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔" وہ بڑے خیال سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی "لیکن فی الحال ہم صرف آپ کی بات کر رہے ہیں۔ میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے آپ سے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ اتفاق مجھے اکثر آپ کے بارے میں بتاتے تھے تو میں حیرت سے سوچا کرتی تھی۔ کیا بے نیاز اور بے پروا آدمی ہے۔ اس کی فلم سمجھنی ہے مگر اسٹوڈیو میں کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی۔ یقین کریں۔ میں اکثر آپ کے بارے میں سوچا کرتی تھی لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میرے دماغ میں یہ خیال بالکل نہیں تھا کہ آپ ایسے ہوں گے۔ میرے دماغ میں آپ کی بالکل دوسری طرح کی تصویر تھی۔"

وہ اب بہت قریب ہو کر بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے وجود سے کسی اچھے کلون کی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے آپ کی بات پر کوئی حیرت نہیں۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں میرا ایچ حقیقت سے بہت مختلف ہوتا ہے۔" وہ ہلکی سی جھپکائی بھری ہوئی "آپ کا بڑا آفس تو لاہور میں ہے وہاں آنا جانا تو اکثر ہی ہوتا ہوگا؟"

"میں تو زیادہ تر ریتا رہا ہوں۔ یہ تو اتفاق سے کچھ عرصے سے کراچی میں قیام ڈرا طویل ہو گیا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ آئندہ جب بھی لاہور آئیں گے ساری مصروفیتیں چھوڑ کر سب سے پہلے مجھ سے ملیں گے۔" اس نے اپنی داستان میں بڑے پیار و محبت سے انداز میں غم سنایا پھر اپنے پہلے سے پرس سے ایک خوب صورت وزنگ کاڈ نکال کر قدرے راز دارانہ سے انداز میں میری طرف برہمایا "آپ جب بھی آئیں مجھے بس ایک فون کر دیجئے گا۔ اتفاق سے بھی میرے بارے میں معلومات کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ڈائریکٹ مجھے فون کریں۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا اور کلون

ہو جانے کی کہوں کہ مجھے اداکاری نہیں آتی۔ پر سائنٹی تو بہت سے لوگوں کی اچھی ہوتی ہے لیکن اداکاری کرنا۔۔۔ خصوصاً گہرے کے سامنے اداکاری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔" میں نے ماری سے کہا۔

"چھوڑیں گی۔" وہ ہاتھ لہرا کر بولی اور اس کی مٹول کلائی میں سونے کی دھنکی چڑیاں ٹھکانا لٹھیں "ہماری فلموں میں بہرہ آنے کے لیے کون سا اداکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"نہیں خیر۔۔۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میرے خیال میں تو سب اچھے اداکار ہیں۔ حتیٰ کہ آپ بھی۔" میں نے کہا۔

"میری تو خیر اور بات ہے۔" وہ جلدی سے بولی "میں تو فن کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے بہت محنت کر رہی ہوں لیکن میں کچھ کر رہی ہوں۔ جس پوزیشن پر آپ ہیں اس پوزیشن کے آدمی کے لیے فلم میں بہرہ آنا بالکل مشکل نہیں۔ تو وزارت اداکار تو ہر آدمی ہوتا ہے۔ باقی کام ڈائریکٹر آپ سے خود ہی لے لیتا۔ اتفاق جیسا ڈائریکٹر آپ کا ملازم ہے۔"

"ملازم نہیں۔ وہ میرا کچھ فیصلہ دار ہے۔" میں نے جھجکی۔

"تقریباً ملازم ہی سمجھیں گی۔" وہ تو آپ کا تاجدار ہے۔ آپ کی بڑی ترغیبیں کرتا ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو آپ کے غم کا غلام سمجھتا ہے۔"

"یہ اس کی مہربانی ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا حال آپ میری تجویز پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اسے ذاتی نہ سمجھیں۔" وہ کمری سنجیدگی سے ایسی لمبی باتوں کی بجائیں اور اٹھاتے ہوئے بولی۔

"آپ نے توجہ دلائی ہے تو میں اب ضرور اس پر غور کروں گا۔" میں نے کہا۔

دو بھر اٹھلائی "اور آپ کے ساتھ آپ کی پہلی فلم میں بیروٹن میں ہوں گی۔"

"اس وقت تک شاید آپ اتنی مصروف ہو جائیں کہ آپ سے ڈش لینے کے لیے ہمیں آپ کے پیچھے پیچھے پھرنے پڑے۔" میں نے کہا۔

"مصروف تو میں اس وقت بھی کچھ کم نہیں ہوں لیکن آپ کے لیے اب بھی دل وہاں سے حاضر ہوں اور آئندہ بھی آپ مجھے اپنے اشارے کی منتظر رہوں گی۔" وہ بڑی روشن مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ اس مسکراہٹ میں اُن گت دو تین پنہاں تھیں۔

پھر اچانک اس نے پوچھا "یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کا بچہ چوہدری صاحب؟"

"آپ کو کچھ شک ہے؟" میں اس کے سوال پر حیران ہوئے

بغیر نہ سکا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔" وہ

میں رکھ لیا۔

ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں بنی۔ اخلاق مجھے بھی اس بنی میں کسی حد تک اس کا ساتھ دیتا رہا۔

زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ میرا ایک جوان اور حبیبی لڑکی کے پاس کھڑے ہوئے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا فصیح اس کے لمبے کا کھوکھلا پن اور اس کے ہر لفظ کے پیچھے سے جھانکنا ہوا لالچ تھا۔ میرے خیال میں ایک اداکار کو بھی اتنا اداکار نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کی زندگی سے حقیقی جذبے بالکل ہی رخصت ہو جائیں، ان کا کس ذرا سا سراغ بھی نہ آئے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کس اور اور ہو جاؤں کوئی اگر اسے ساتھ لے جائے یا وہ خود ہی کسی طرف کو چل دے اور مجھے ساتھ آنے کی دعوت نہ دے، تاہم تہذیب کی مخالفت مجھ پر بھی حاوی تھی۔ میں ہونٹوں پر مسکراہٹ بجائے کھڑا تھا۔ گویا میں بھی ایک اداکارہ کے مقابلے پر اداکاری کر رہا تھا۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ہم میں سے کون زیادہ ملامت کا مستحق تھا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو قہری دہی کہ میری اداکاری محض اس کا دل رکھنے اور اسے خود آگئی کے رخ سے بچانے کے لیے تھی۔ شاید یہ کم تر درجے کی بڑائی تھی۔

بہر حال میں الجھن میں تھا۔ قدرت نے میری عری۔ اتفاق نے اگر مجھے اس الجھن سے نکالا۔ وہ چار پانچ خاتونیں حضرات کی ایک ٹولی کو لے کر گیا اور بولا "بھئی میرا۔۔۔! یہ لوگ تم سے ملنے کے بڑے شدید خواہش مند ہیں۔۔۔" وہ سب ہی دولت مند گھرانوں کے جانے بچانے لوگ تھے ورنہ شاید اتفاق انہیں یہاں تک نہ لانا آتا۔ راستے ہی میں کس جان چڑھا کر آتا۔

وہ فرما فرما میرا اس نے اس کا تعارف کرانے لگا۔ میں موقع پا کر وہاں سے کھٹک لیا۔ ہجوم جتنا بڑھ گیا تھا اور لوگ وہاں بٹنے خوش دکھائی دے رہے تھے اتنی ہی مجھے وہاں محسوس ہی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ مجھے قریب کا سب یاد آیا تھا۔ یہ قریب بہر ملاقات نہیں تھی۔ یہ تو قریب بہریدانی تھی۔ کوئی مجھے الوداع کہہ کر جا رہا تھا اور میں نے رنگ "نور" سویتی اور خوشبودن کا یہ میلہ لگا رکھا تھا۔ میں کس کو دھوکا دے رہا تھا؟ دنیا کو یا اپنے آپ کو؟

افسردگی کی ایک لہر میرے سینے سے اٹھی تھی اور دگ دپے میں کھیل گئی تھی۔ سب چہرے اور روئیاں میری آنکھوں کے سامنے دھندلا گئی تھیں۔ سویتی کی دھن گویا کس بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ میں ہال سے نکل آیا۔

اچانک مجھے سامنے ہی لفت نظر آئی۔ اس کا دروازہ نہ جانے کیوں آغوشِ مادر کی طرح دھڑکا تھا۔ شاید کوئی اس کا ہنسا دیا کہ اسی لیے اور اور ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہو تا میں قطعی غیر ارادی طور پر لفت میں داخل ہو گیا۔ میں نے دوسری منزل کاٹنا۔

اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اپنی دانست میں اس نے پسند اس پر گرد پوری طرح کس لیا تھا اور اب میں اس کے حسن شہرت کی کشش اور گھبر کے جال سے کھل نہیں سکتا تھا۔ اس نے گویا ایک "پرائیویٹ" پر کام مکمل کر لیا تھا اور اب اس کی مطلوب نظر میں اور اور پھیلنے لگی تھی۔ اب شاید اسے مجھ جیسی یا شاہ نور جیسی جیسی کسی اور انسانی کی تلاش تھی لیکن یہاں پشتر فطیس اس کے لیے اب بھی تھی۔ ایک لڑکی۔ اور خصوصاً ظلم کی صف اول کی بیرونی کی حیثیت سے اس کے لیے یہ تو بہت مشکل تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر لوگوں سے ملتی۔

وہ تعارف کی محتاج تو نہیں تھی پھر بھی اس وقت اسے یقیناً ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو رونا اور عزت طریقے سے اس کا تعارف بڑی بڑی "اساسی" اور "کام" کے لوگوں سے کرانے پہلے شاید بے خیالی کے سے انداز میں یہ فریضہ اتفاق انجام دے رہا تھا لیکن اتفاق خود یہاں کے لوگوں کو زیادہ نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کے اضطراب سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا "آپ کی والدہ آپ کے ساتھ نظر نہیں آ رہی؟" مجھے اس پر بجا طور پر حیرت تھی۔

اس قسم کی فوجوان اور ابھرتی ہوئی اداکارائیں۔۔۔ بلکہ وہ اداکارائیں جو اپنا خاصا "ٹیکر" بنی ہوئی تھیں۔۔۔ انہیں "دادی" "نانی" یا کسی قسم کی کسی اور سرپرست شخصیت کے بغیر تو ہرگز نہیں نہیں تھیں۔ نکل ہی نہیں سکتی تھیں۔ کچھ غیر ملکی سے ٹھیکے انہیں بکڑے ہوتے تھے لیکن میرا کی ماں شاید اپنی سونے کی چڑیا کی کارکردگی سے مطمئن تھی اور اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ کوئی "بازار" اسے اچک کر نہیں لے جاسکتا۔

وہ جلدی سے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور ایک مشینی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بجاتے ہوئے بولی "آتے وقت یہاں کے از پورٹ پر لازمی کی بیڑمیاں اُترتے وقت جوتی کی ایڑی ٹیڑھی ہو جانے کی وجہ سے اتنی کے پاؤں میں موج آگئی تھی۔ پھر کمری سی حرارت بھی ہوگئی۔ وہ اوپر کمرے میں لپٹی آرام کر رہی ہیں۔ شاید ڈاکٹر کی دوا کا اثر ہے کہ کچھ غنودگی میں ہیں۔"

"دوسرا افسوس ہوا یہ جان کر کہ یہاں آتے ہی انہیں یہ زحمت اٹھانا پڑی۔" میں نے رونا کہا۔

"تکلف تو جو قدر میں ہو وہ اٹھائی ہی پڑتی ہے۔۔۔" وہ لہندی سانس لے کر بولی لیکن پھر اس کی مسکراہٹ بچھ اور واضح ہوگئی۔ وہ وہی تو تھی وہی بولی "بہر حال اس سے آپ کے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ جس وقت چاہیں کمرے میں شریف لاسکتے ہیں۔"

پھر وہ شوش سے انداز میں ذرا آنکھ دبا کر بولی "بلکہ جس وقت اتنی غنودگی میں ہوں اس وقت شریف لائیں تو زیادہ اچھا ہو۔" وہ

# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                  |
|-------|------------------|
| 125/- | صلیب و حرم       |
| 150/- | نیشاپور کا شاہین |
| 150/- | بابل کا بت شکن   |
| 175/- | طلسم کردہ        |
| 150/- | آتش فشاں         |
| 200/- | آخری جہاد        |
| 125/- | بنت نیل          |
| 150/- | ساجہرا کا طوفان  |
| 150/- | آتش و آہن        |
| 150/- | ظلمات            |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

”حالا کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں چھپ چھپ کر لٹنے کی ضرورت پیش آتی ہے ہمیں بھلا کسی کا کیا ڈر؟“ میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا ”لیکن مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ اب ہماری تقدیر میں مٹنا ہی نہیں رہا۔“  
”کیوں نہیں رہا۔“ وہ آہستہ سے بولی ”میں نے تمہیں لے کر تو منع نہیں کیا۔“  
”کیا قاعدہ اب ان ملاقاتوں کا...؟ مجھے ملاقاتوں کی بیک نہیں چاہیے“ میں نے کہا اور ایک بار پھر جھک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔  
”کئی لمحے خاموشی رہی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ چلی تو

دادا۔ یہ چپ کھور تھا۔ ہوش میں اگر مزید فکور ہوتے جب بھی شاید میں سب سے اوپر والا طبقہ ہی دیکھتا۔ میرے لاشعور میں شاید اس وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف جانے کی خواہش رہتی ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت فرار کی خواہش تھی۔  
دوسری منزل پر پہنچ کر میں میزبوں کے راستے چھت پر پہنچ گیا۔ چھت کے ایک حصے پر پروف گارڈن پھیلا ہوا تھا۔ اس میں پام حالات میں بھی دم دم بدلتی دالی پتیاں جلتی تھیں۔ آج وہ بھی جلتی ہوئی تھیں۔ تاہم اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ صبح دم کا سا سماں تھا۔ یہاں گویا پھینے کو تھی۔  
میں ایک بالکونی نما حصے میں جا کھڑا ہوا اور نیچے دیکھنے لگا۔  
پہلے بائیں ہاتھ پر جہازی سائز کے مکلوں کی قطار تھی جن میں چھتری نما پردے سر اٹھائے کھڑے تھے نیچے سڑک پر ٹریفک بہت کم ہو چکا تھا اور اس بلندی سے گاڑیاں یکے چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے بڑے بڑے مکھڑوں کی طرح گویا اوجھل اوجھل لڑکتی جا رہی تھیں۔ ان کے انجنوں کی آواز اوپر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں چند منٹ ساکت کھڑا رہا۔  
”آخر تم کئی عیسائی نہیں پہنچ گئے۔“ اچانک میرے قریب سے سرگوشی ابھری۔  
میرے اعصاب کو خفیف سا جھٹکا لگ گیا۔ میں نے فوری طور پر گردن ہٹا کر نہیں دیکھا۔ مجھے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ سرگوشی کسے والا کون تھا۔ اس آواز کو میں سرگوشی کی صورت میں بھی پہچان سکتا تھا۔ بہت آہستہ سے میں نے گردن ہٹا کر دیکھا۔ وہ بڑے سے گلے اور چھتری نما پردے کی اوٹ سے برآمد ہو رہی تھی۔ اس طرف گارڈن چیز بھی بڑی تھی۔ لیکن تھا کہ وہ ان میں سے کسی پر نہیں رہی ہو۔ وہ راحیلہ تھی!  
کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر وہ گویا بھگور سالیے کر میرے قریب آگئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ یہ بڑا تخیل مجھے دھوکا تو نہیں دے رہا تھا؟ مگر وہ میرے سامنے واقعی موجود تھی اور گلجے اندھیرے میں اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح جھللا رہی تھیں۔  
”تو تم یہاں پہلے سے موجود تھیں۔“ میری آواز شاید سرگوشی سے بھی بچی تھی۔  
”ہاں“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ نہ کوئی وضاحت نہ کوئی غواہ۔  
میں خاموش رہا اور اپنے دل سے پوچھا کہ آخر وہ کون سی چیز تھی جو مجھے یہاں لائی تھی؟ لیکن میرے دل نے شاید مجھے کوئی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور گھڑی کی طرح ٹپک ٹپک کرنا رہا۔  
”اگر کسی نے ہمیں آگے بچھے یہاں آئے دیکھا ہو تو وہ یقیناً کیا سمجھے گا کہ ہم طے شدہ پروگرام کے تحت یہاں آئے ہیں۔“ راحیلہ مکرراتے ہوئے بولی۔

وہ تو فرض ہوتی ہیں۔ وہ بھی عورتوں کے چاہنے والوں نے گمراہی میں  
اور انہیں وفاداری کے سنے اور بچے گھاساں پر بٹھایا ہے۔ مگر  
حقیقت تو یہ کہ اور ہے۔ زندگی تو کچھ اور کچھ ہے۔  
ایک لمحے کے لیے میرے دانت سختی سے بچھ گئے۔ زندگی میں  
پہلی بار خود پر ضبط کرنا مجھے دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ میں جب بولا تو  
خود اپنی آواز مجھے اجنبی محسوس ہوئی۔  
”تم بہت با حوصلہ لڑکی ہو۔ جو اس وقت بھی مذاق کر سکتی  
ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میرا دل چاہ رہا ہے گوشتا مار کر تمہارا دھڑ تڑ  
دول۔“

”تو بھر تو دو۔۔۔ کس نے منع کیا ہے؟“ اس نے اپنا چہرہ  
آگے کر دیا۔  
”مجھ سے قطع تعلق کر کے تمہیں بہت خوشی ہو رہی ہے جو میں  
شوخی بننے کی کوشش کر رہی ہو؟“ میں نے بچھے بچھے سے دانتوں کے  
درمیان کہا۔  
”کس نے کہا ہے کہ میں تم سے ترک تعلق کر رہی ہوں؟“ وہ  
اطمینان سے بولی۔

”کیا؟“ میں ایک ننگ اس کی طرف دیکھا وہ کہا۔ وہ  
سکرا رہی تھی۔ پہلی مشکل سے میرے حلق سے آواز نکلی ”دوہ  
جو تم نے کہا تھا۔ تمہارا مطلب ہے کہ تم مجھے۔۔۔ اور سب  
ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا رہی؟“  
”تم نے یہ یقین کر لیا کہ میں تمہارے بغیر۔۔۔ ان سب  
ساتھیوں کے بغیر اب رہ سکتی ہوں؟“ انا اس کے لیے میں کھڑا تھا۔  
”تم نے مجھے یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں تو یقین کرنا  
نہیں چاہتا تھا۔“ میں نے بچی بچی سی آواز میں کہا۔  
وہ خاموش رہی۔ سکراتی رہی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے پوچھا۔  
”ابتداء میں تو میں نے غصے میں کہا تھا۔ اس وقت واقعی میرا  
ارادہ ترک تعلق کا تھا۔“ وہ دھجے لیے میں بتانے لگی ”لیکن پہلی  
ی رات یہ بات کرنے کے بعد میرے لیے جین سے جینا کھانا تھا“  
سونا سب کچھ حرام ہو گیا اور مجھے اعوانہ ہو گیا کہ میں نے سب  
کو اس کی ہے۔ میں شاید نیا جنم لے کر بھی اس پر عمل نہیں  
کر سکتی۔ میری زندگی کا جو سیٹ اپ ہی گیا ہے۔ جس میں تم  
شامل ہو۔ سب ساتھی شامل ہیں۔ میرا کام شامل ہے۔ وہ  
فوقا سر پر نہ والے مساکل شامل ہیں۔ ان سب کے بغیر اب  
میں زندگی گزار رہی نہیں سکتی۔“

”پھر تم نے یہ بات مجھے کہیں نہیں بتائی؟ کیا اچھی رہی  
مجھے اتنے مدد دینی رہیں؟“ میں نے پتلی پتلی سی آواز میں پوچھا۔  
”پھر مجھے مذاق سوجھا۔ میں نے سوچا جس طرح بات چل رہی  
ہے، چلے وہ۔۔۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنا اثر لوگے۔ چاہیں کہیں

میں مکی تھی؟ لیکن اس کے وجود کی دلچسپ خوشبو میرے پاس  
موجود تھی۔ میں نے گردن ذرا ترچھی کر کے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ  
کھڑی تھی اور ایک ننگ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے اپنے حلق میں پھیلی گڑواہٹ کو نگلتے ہوئے کہا ”اب  
میں خود حیران ہوں۔ بلکہ شاید حیران بھی۔ کہ یہ جو نیچے ہنگامہ  
رنگہ ہو رہا ہے۔ یہ تمہا میں نے کیوں سجایا ہے۔“

میں بہت چاہ رہا تھا کہ اس طرح ایک ایک کرتے ہوئے لیکن  
الفاظ شعلہ کے ساتھ حلق سے برآمد ہی نہیں ہو رہے تھے  
”میرا حال اچھا نہیں ہے۔ نیچے جو صمان آئے ہوئے ہیں۔ سب  
کے سب کیسے خوش ہیں؟ سب پی پلا رہے ہیں۔ کھارہے ہیں۔  
ایک دو سرے کو لٹیفے سارے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں۔ اور جس  
نے یہ محفل سہائی ہے اس کا دل کھنڈر کی طرح خراب ہے۔“

وہ اب بھی خاموش تھی۔ شاید اس کا مجھے اپنی صلیب سکوت  
پر مضطرب کرنے کا ارادہ تھا۔ میں نے نہ چاہے ہوئے بھی پھر ایک  
بار اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ”تمہیں معلوم ہے اس وقت میرا  
دل کیا چاہ رہا ہے؟“

”نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔“ اس نے نہایت پر سکون لہجے میں  
جو اب دل پر جیسے ایک نازہ غراش پڑ گئی۔ کم بہت کے  
لیجے میں ذرا سا بھی تو ارقاش نہیں تھا۔ آسٹ۔ پچھتاوے۔ یا  
خون چھیننے والے ایسے کسی بھی اور جذبے کی دقت تک نہیں  
تھی۔ شاید میں نے اسے کھینچنے میں غلطی کی تھی۔ اس کے سینے میں  
تو دل ہی نہیں تھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے کہ۔۔۔ اس وقت نیچے جتنے لوگ۔۔۔ جتنی  
بھی پی رہے ہیں۔ میں ان سب سے زیادہ ہوں۔ میںیں کھڑے ہو کر  
پول۔۔۔ آج کا جالا نمودار ہونے تک بیٹا رہوں۔ پھر میںیں سے  
جام نیچے پیچک دوں جو سوک پر کرے اور کچی کچی ہو جائے۔  
میں میںیں لیٹ جاؤں اور اسی عالم میں۔ اسی خاموشی سے میری  
مدح اس جسم کے قص سے اگل جائے جتنی خاموشی سے تم میری  
زندگی سے جاری ہو۔“

”تم کوئی قسمی دیر ہو جو میری جدائی کے غم میں بہت سی  
شراب چٹا چٹا چٹا ہو؟“ اس کے لیے میں بھی سی شرفی تھی۔ شاید  
اس کا پرسکون رہنا مجھ پر قسم دھانے کے لیے کافی نہیں تھا جو اب  
اس نے اپنے لیے بھی شرفی بھی سہلی تھی۔ شاید وہ اپنی بچ پنازاں  
تھی۔ شاید یہ اس میںیں کے لیے تسکین کا باعث تھا کہ وہ ایک  
بہت مضبوط دل ہو کہ خون کے آسور لا سکتی تھی۔

اس لیے میںیں نے سوچا یہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ مجھ  
مجھ باتوں میں اس کے لیے غم کا احساس پنہاں ہوتا ہے۔ اور یہ  
محبت کرنا بھلا کیا باتیں اوقاتے ان کا کیا واسطہ؟ کسی کی چاہ میں خود  
کو فنا کر لینا ان کے بس کی بات کہاں؟ لوگ داستانوں کا کیا ہے۔

تھی۔

نمائت کاٹلی آئینے سے انداز میں وہ آنکلی سے اٹھی اور دوبارہ میرے قریب آئی۔ اس کا ایک ہونٹ پٹ پٹ کیا تھا اور خون کی پٹی سی گلیہ پھیل کر اس کی ٹھوڑی کی طرف جاری تھی مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اچانک اس کی زبان کسی درندے کی زبان کی طرح باہر آئی اور اس نے اپنا منہ خود ہی چاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی نم آلودی تھیں اور ستاروں کی طرح جھلک رہی تھیں لیکن نہ جانے کیوں اب وہ راحیلہ کی آنکھیں نہیں لگ رہی تھیں۔

بھاری سی آواز میں وہ بولی ”بھئیے اور ماہو۔ اس وقت تک اسی طرح راتے رہو جب تک میرے جسم کی ہڈی ہڈی نہ ٹوٹ جائے۔“

میرے اندر جیسے کوئی اور روح طول کر گئی تھی۔ میں نے اچانک اور قطعی غیر ارادی طور پر اسے سینے سے چٹالایا اور بن بے آنسوؤں سے بھٹی توڑ میں کہا ”میں یہ بھی تو نہیں کر سکتا۔“ تب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی انگلیوں کے ناخن میری کمر میں پھنس گئے اور اس کے جسم کو تشنجی سے انداز میں جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ کچھ اس طرح بددی تھی کہ لگا تھا اب کبھی چپ نہیں ہوگی۔

اسی عالم میں وہ چٹکیاں لیتے ہوئے بولی ”میں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ اور نہ ہی کبھی تم مجھے چھوڑ کر جانا۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔“

میں بے اختیار فحش رہا اور چند لمبے ہنٹائی رہا۔ اس نے آنسوؤں سے بیجا چہو میرے سینے سے ہٹایا اور مدعا بھول کر حیرت سے بولی ”تو نہیں کیوں رہے ہو؟“

”میں نے کہا اور اس کے آنسو پونچھے لگا پھر میں نے فحاشی کی“ اب تم بھی نہسو۔“

”زبردستی ہے کیا؟“ وہ خستے سے بولی۔

”ہاں۔ زبردستی ہے“ میں نے جواب دیا۔

وہ ابھی میرے ایک بازو کے سلتے میں ہی تھی۔ اچانک بیڑیوں کی طرف سے آہٹ سُنائی دی پھر ایک بیڑا سا ٹکڑے اندر میرے میں ہماری طرف بڑھتا دکھائی دیا۔

اب بھی تمہارے جذبات پر کچھ بے اعتباری ہی ہونے لگی۔ تم بظاہر کچھ برحمانی سے آؤی گئے ہو نا۔ ہر عورت۔۔۔ ہر۔۔۔ جس میں ایک خاص قسم کی کشش ہوتی ہے۔ اگر تم پر من ہو جائے تو تم اس کی غلطوں کا سامنا بھی کرنے میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں کرتے۔“ وہ اب انک انک کر بول رہی تھی۔

”وہ کچھ اور بات ہے۔ تمہاری کچھ اور بات ہے۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے سب باتوں کو گنڈھ دیا ہے نا۔ تمہارے فلفلے عجیب ہیں۔“ وہ بے چارگی سے

”جب تک تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی میرے فلفلے بونی بہ رہیں گے۔ آخر میں انسان ہوں۔ اس دنیا کا جیتا جاگتا انسان۔ کسی قہقہے کمانا کا کردار نہیں ہوں۔ میرے وجود میں لاشیں مقید ہیں۔ میں اپنی ہی آگ میں جل کر سیا پاگل ہو کر انہیں چاہتا۔ اور میں منافق بھی نہیں ہوں کہ اپنے اوپر مائی کا قول چڑھاؤں۔ ورنہ وہ جو چاہے کرنا پھروں۔ کسی کو بنا کاں خبر نہ ہونے دوں۔ وہ لوگ زیادہ خطرناک اور زیادہ بلی اعتبار ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں بھی تو ہوں۔ اور عورتیں بھی تو ہیں۔ وہ بھی تو زندگی راتی ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں ماتے ہوئے بولی۔

”عورت کو شاید قدرت نے ضبط کی طاقت زیادہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی عورت سے یہ طاقت چھین جاتی ہے تو وہ کچھ اور سی چیزیں بن جاتی ہے۔ مرد کو بت پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ اگرچہ اس کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔“

”خیر۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتی“ وہ کندھے اچکا کر بولی ”میں نے تو سہر حال صرف مذاق میں زبان بند کر رکھی تھی۔ میں تمہارا دل دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ سب کچھ عارضی ہے۔ میں واقعی چلی گئی ہوں شاید تھوڑے ہی عرصے میں مجھے بھول نہ جائیں۔ میں ایسی ہی باتیں سوچتی رہتی تھی اور تم سے کچھ نہیں نا تھی۔“

”تمہیں تمہارا مذاق تھا؟“ میں نے اپنے سینے میں رکھی ہوئی سی کی کو دھیرے دھیرے آزاد کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”اں۔“ اس نے جواب دیا اور عجیب سے انداز میں لڑکی۔

تب اچانک میرے اندر جیسے بے پناہ کھچا ہوا کس۔ پریک نکلا۔ میرا ہاتھ مشتیں انداز میں حرکت میں آیا اور میں نے اس ٹھوڑی پر کھونسا سید کیا۔ وہ دودھ جاگتی۔ چند سیکنڈ وہ وہیں پڑی تھی مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ بے ہوش نہ ہو گئی ہو گو کہ مجھے یہ لہذا احساس تھا کہ وہ اتنی آسانی سے بے ہوش ہونے والی نہیں

**گنگا کے بیجاری گٹ**

**اے جمیدہ قیث ۳۵ روپے**

ہمارے شکار کے ارد گرد تو آپ جیسی دو چار اور لڑکیاں موجود ہیں  
جب بھی ہم اسے اچک کر لے جاسکتے ہیں۔ ہم جس شکار پر نظر  
برائیں وہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رہ سکتا۔

تاکہ ہم اس کی موتانی بھی کہ اس نے ترکی بہ ترکی لیا کوئی  
جواب دینے سے گریز کیا تھا تاکہ اس نے جو جواب دیا تھا وہ بھی  
راہیلہ کو جلانے کے لیے کافی تھا۔ وہ زہریلے لمبے میں بلی "میں نے  
کبھی بھی افضل صاحب کے بارے میں فکر مند نہیں رہی لیکن آپ  
چاہیں تو بڑے شوق سے انہیں چڑا کر لے جاسکتی ہیں۔ یہ تو بڑے بھی  
چڑائے جانے کے بڑے شوقین ہیں۔ سرراہ بڑے رہتے ہیں کہ کوئی  
انہیں چڑا کر لے جائے۔ بلکہ چڑانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ یہ  
تو صرف اٹھائے جانے کے خطرہ رہتے ہیں۔"

بلی بار میرا نے بڑے غور سے راہیلہ کی طرف دیکھا اور بلی  
ی بار مجھے اس کی آنکھوں میں لالچ سے جھٹ کر کسی جذبے کی جھلک  
نظر آئی۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا  
اوپر کا خاتہ بالکل ہی خالی نہیں تھا۔ وہ کچھ دماغ بھی رکھتی تھی۔  
شاید وہ بے چاری کچھ حیران پریشان بھی تھی۔ غالباً اس کی کچھ بھی  
نہیں آ رہا تھا کہ آخر میرے اور راہیلہ کے درمیان تعلق کی نوعیت  
کیا تھی۔

تاکہ اس بار وہ بڑے قہر سے مسکراتے ہوئے بولی "تپ  
غصے کی بہت تیز معلوم ہوتی ہیں راہیلہ صاحبہ!"  
"اس میں کیا شک ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔  
"ماٹھے میں ڈیڑھ دو گلوں کا گارے چپائی ہیں اور بالائی کی جگہ چاروں گلوں  
ہیں۔"

میرا مات پر ہاتھ رکھ کر زور سے انہی "افضل صاحبہ آپ  
ڈاکٹری بڑے مزاحیہ ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر بندہ ہنسے بغیر ہی  
نہیں سکتا۔"

"جی تو آپ باتوں پر ہی ہنس رہی ہیں۔ حیرتیں دیکھیں گی  
اس سے زیادہ انہیں گی۔ پچھلے جنم میں یہ سرکس میں جو کر رہا کرتے  
تھے "راہیلہ بولی۔

میں نے ایک نظر راہیلہ کی طرف دیکھ کر قدرے بے چاری  
سے میرا کو مخاطب کیا "اب میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ پچھلے جنم  
میں یہ میرے ساتھ سرکس میں کیا ہوا کرتی تھیں۔"

راہیلہ نے خود غور نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے  
سکس جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "وہ تو میرے خیال میں  
ہم لوگ اس جنم میں بھی سرکس میں ہی ہیں کیونکہ میرے خیال میں  
یہ دنیا محض ایک سرکس ہی ہے اور ہم سب اس میں کام کرتے  
وہاں کے جاندار ہیں۔ شیکسپیر نے کہا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور  
اس کے اداکار ہیں۔ میں نے اس میں تو خود ہی ترمیم کر لی ہے۔  
"مجھے ترمیم ہے" میرا بڑے سحر بخشنے ہوئے بولی "اب  
دیکھتے شاید راہیلہ کی نظروں کی خوفناکی کا احساس ہوا۔ اس نے

میں راہیلہ سے ہنسنے کی فرمائش کر رہا تھا اور وہ اس بات پر  
مجھ سے اچھ رہی تھی لیکن اندھیرے میں اس پہلوے کو اپنی طرف  
پڑھتے دیکھ کر ہم دونوں اپنی اپنی بات بھول گئے اور ایک دوسرے  
سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا وہ بیولا نسواں تھا۔  
دوسرے ہی لمحے مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ وہ کون تھی؟  
وہ فلم اسٹار سیرا تھی!

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے وہ ہمارے قریب آ گئی۔ اس نے  
بھی یقیناً چند قدم کے فاصلے سے ہی ہمیں پہچان لیا تھا۔ قریب آ کر  
اس نے گہری نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیا۔ راہیلہ اس وقت  
نہ اپنے آنسو پونچھ چکی تھی اور بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔ سر  
سیرا مسکرائی اور اپنے مخصوص جہالت آہیر سے لمبے میں  
شوخی سے بولی "اے وہ سہ ماہی تو کون سین ہو رہا ہے۔"

راہیلہ نے کہا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور گہری  
سنجیدگی سے بولی "ہم جیسے لوگ تو صرف لو کہہ سکتے ہیں بلی بلی سین کرنا  
تو آپ لوگوں کا کام ہے۔"

سیرا اس کے نظروں کے اُلٹ بھیرے ذرا بھی محفوظ ہوئے  
بغیر قدرے کاٹ دار سے لمبے میں بولی "بس جی۔ کہنے کو تو سبھی  
لوگ بہت کچھ کرتے ہیں لیکن بدنام ہم قہر دینا والے زیادہ ہیں۔ وہ  
جو بیانے کہتے ہیں نا۔ بد اچھا بدنام بڑا۔ تو وہ شاید ہم فلم لین کے  
لوگوں کے بارے میں ہی کہا گیا ہے۔"

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ دونوں اُلچ نہ پڑیں۔ کچھ نہیں کہا  
جاسکتا تھا کہ سیرا اپنی جہالت کی وجہ سے اور راہیلہ اپنے تیز دماغ  
کی وجہ سے کہاں تک جاسکتی تھی اس لیے میں نے جلدی سے  
مداخلت کی اور میرا کو مخاطب کیا "چھوڑیں سیرا بلی بلی جانے  
والی باتیں چھوڑیں۔ یہ باتیں "تپ اس طرف کیسے نکل آئیں؟"  
بہت کم لوگوں کو ہوش کی چھت پر آنے کا خیال آتا تھا اور  
اس سے بھی کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ ہوش میں دوف گارڈوں  
موجود تھا۔ زیادہ تر ان لوگوں کو علم تھا جن کی ہوش میں بہت زیادہ  
آمد و رفت رہتی تھی۔

میرا سوال سن کر سیرا کے لمبے میں ہلکی سی شوخی لوٹ آئی اور  
وہ گویا راہیلہ کو تیز نظر انداز کرتے ہوئے بولی "بس جی۔ دل کو  
دل سے راہ ہوتی ہے افضل صاحبہ! مجھے یہ تھا "تپ یہاں موجود  
ہیں۔ اس لیے آپ کے پیچھے پیچھے ہم بھی چلے آئے۔"  
"لیکن بد قسمتی سے آگے میں بھی موجود تھی "راہیلہ نے قہر  
دیا۔

میرا بے پروائی سے بولی "ہوا کر میں جی۔ ہمارے لیے اس  
سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے آپ بے فکر رہیں۔ ہم آپ کے  
افضل صاحبہ کو آپ سے چڑا کر نہیں لے جائیں گے۔"  
کہنے کو اس نے یہ کہا تھا لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ اور  
کہنا چاہتی تھی۔ شاید وہ کشتی پر اپنی سہ ماہی کو تکیا جڑیں تھی۔

سوچ سکتا ہے۔ اس میں ذہن کا بھی قصور نہیں ہوتا، بے چارے کو تربیت ہی ایسی ملی ہوئی ہے۔ بہر حال۔۔۔ آپ کے لیے میرا اطمینان دوستانہ۔ مگر حقیر سا مشورہ یہی ہے کہ اپنے ذہن کو خوش اور کشادہ کرنے کی کوشش کیجئے۔ بعض باتوں کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو ظاہری طور پر آنکھ سے دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے۔ اللہ نے آپ کو اچھی عقل۔ خاص قسم کی عقل۔ زندگی کی دوسری تمام نعمتیں اور ہر طرح کے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے مواقع عطا کیے ہیں۔ دولت کی بارش بھی شروع ہو چکی ہے۔ ابھی مزید بارش ہوگی اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اگر آپ ابھی سے اپنے ذہن کو بھی کشادہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں تو تیر ہی اچھا ہو۔ آپ زیادہ فائدے میں رہیں گی۔

میرا دم بخود اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے راحیلہ کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا ”بھئی“ یہ کیا بکواس شروع کر دی تم نے۔ انسان کے ذہن اور مکان کے صحن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ذہن تو ذہن ہوتا ہے۔ کوئی صحن تو نہیں ہوتا کہ جب دل چاہا کوئی دوا روغیر واکر اسے کشادہ کر لیا۔ ذہن تو عمر کے ساتھ ساتھ ہی کشادہ ہوتا ہے۔ ابھی میرا بی بی کی عمری کیا ہے۔ میں نے سنا ہے چند دن پہلے ہی تو انہوں نے اپنی سترہویں سالگرہ منائی ہے۔ ابھی سے تم ان کے ساتھ اتنی بڑی بڑی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ ابھی تو ان کے کھینٹے کھانے کے دن ہیں۔“

”مجھے ان کے کھانے اور کھینٹے پر کوئی اعتراض نہیں“ راحیلہ کے لیے میں اب بھی ہلا کی زری تھی ”یہ بتانا چاہیں کھلیں۔ اور جو کھیل چاہیں کھلیں۔ بتانا چاہیں کھائیں۔ اور جو چاہیں کھائیں۔ بہر حال میرے خیال میں تو ذہن کو کسی بھی عمر میں کشادہ کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ ذہن اور صحن کو کشادہ کرنے میں میرے خیال میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ صحن کو کشادہ کرنے کے لیے اینٹوں کی کوئی دوا درگرا لی پڑتی ہے یا فائو کاٹھ کباڑ پٹانا پڑتا ہے، ذہن کو کشادہ کرنے کی لیے بغض، حسد، تنگ دلی اور خود پسندی کی دوا اوریں گرائی پڑتی ہیں۔ محدود سرجوں کا کاٹھ کباڑ پٹانا پڑتا ہے۔“

”یہ ہر ایک کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی“ میں نے کہا۔ ”کوشش تو کرنی چاہیے“ راحیلہ نے اصرار کیا۔ میرا شاید تجربہ اتنی کہ وہ کس فلسفیانہ کے درمیان پسپا تھی۔ وہ جلدی سے بولی ”میں اب نیچے چلتی ہوں۔ درستی شو شروع ہو رہا ہے۔ آفتاب نے کہا تھا کہ اصل صاحب کی خاطر میں بھی دو چار منٹ کے لیے اسٹیج پر آ جاؤں۔“

”آپ کی بڑی نوازش“ میں نے شکر گزارانہ لہجے میں کہا ”اس میں شک نہیں کہ آپ فلم والوں کے دم سے ہماری توجہ کی محفل زیادہ جگمگائی۔“

”پھر بھی جلدی اس کے ساتھ نہ کرنا چاہیے“ میرا کو دوا نہ کیجئے

شاید اس نے مصلحت کو بھی سمجھا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”راحیلہ صاحبہ! اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو میں معافی چاہتی ہوں۔ یہ سب ہنسی مزاح کی باتیں ہیں۔ آپ میری کسی بات کو دل پر نہ لیں۔ انسان کو کبھی کبھی ہنسی مذاخ ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ چار دن کی زندگی ہے۔ بلکہ پچاس نہیں چار دن کی بھی ہے یا نہیں۔ جتنی بھی ہے، جتنے بولنے مگر جائے تو اچھا ہے۔ آپ خوش رہنے کی کوشش کیا کریں۔“

”اس جیتی مشورے کا بہت شکریہ“ راحیلہ زہر خند کے ساتھ بولی ”ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بہت خوش رہتی ہوں۔ میں جن حالات میں خوش رہتی ہوں ان حالات میں خوش رہنے کا شاید کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ جو خوشخبری ہے، تو یونہی ذرا فضول قسم کے لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہے جو موقع قتل دیکھتے بغیر فضول قسم کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔“

میرا کی شاید سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس موقع پر کیا کہے۔ وہ یونہی بے مقصد سے انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔ تاہم وہ چند لمحے پر خیال نظروں سے راحیلہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے غالباً اس بے نتیجہ سی بحث میں مزید نہ اُلجھنے کا فیصلہ کیا اور مجھ سے مخاطب ہوئی ”میں تو یونہی پرور ہوئی دیکھنے کے شوق میں جہت تک آگئی تھی“ اب اس کا انداز منافی پیش کرنے کا سا تھا۔

”ہمیں آپ کے آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بی بی!“ میں نے مزیدانہ لہجے میں کہا ”آپ بڑے شوق سے پرور ہوئی دیکھیں۔ آپ جہت تو کیا جہت سے مزید اور تک بھی جاسکتی ہیں۔“

وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی مگر اس بار انداز کچھ بے جان سا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”ویسے آپ کو صحیح طور پر پرور ہوئی دیکھنے کے لیے دو صحن کھینٹے دو کار ہوں گے۔ اور اس کے لیے رات کا وقت مناسب نہیں ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔ وہ تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے“ وہ ملاحت سے بولی ”نہ جانے کس کو نہ کھد رہے میں کون کس مصروفیت میں الجھا ہوا ہوں۔“

کم بخت اتنی کو وہ مغز نہیں تھی جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ موقع پاتے ہی اس نے اچھا غاسا کھینکا جملہ نکالا تھا۔ راحیلہ بھلا کہاں چرکے والی تھی فوراً بولی ”ہاں۔۔۔ یہاں تو پھر بھی بعض مصروفیات کے لیے لوگ رات کا انتظار کر لیتے ہوں گے۔ بعض بگنیں تو ایسی ہوتی ہیں جہاں لوگ نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات۔۔۔ انہیں جو کرنا ہوتا ہے غمگن کرتے ہیں۔“

میرا کو گویا سا ب سو گنگہ گیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد راحیلہ ملاحت سے بولی ”ویسے کبھی کبھی انسان کی آنکھ اسے بڑا دھوکا دیتی ہے۔ بعض چیزوں کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو اس کی آنکھ اسے بتاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بعض انسانوں کا ذہن بڑا محدود ہوتا ہے۔ وہ ہر طرف مخصوص چیزوں میں تنگ رہتا ہے۔“

میں نے دیکھے لیے ہیں کہا "جسین معلوم ہے تم نے یہ جو رخصت ہونے اور ملکہ کی اختیار کرنے کا ڈراما شروع کیا تھا یہ میری جان بھی لے سکتا تھا؟ مجھے اہل ایک بھی ہو سکتا تھا؟" "جسین ہارت ایک نہیں ہو سکتا" وہ دھوکے سے بولی "تمہارا دل ایک گینڈے کی طرح مضبوط ہے۔ اور گینڈے کو بھی ہارت ایک نہیں ہوتا۔"

اچانک مجھے بھر سیر کا خیال آیا۔ میں نے شہرہ آفرین لیے ہیں کہا "تم نے سیرا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ مجھے اس طرح کسی کی دل شکنی اچھی نہیں لگتی خواہ وہ ایک خود غرض اداکار ہی کیوں نہ ہو۔"

"میں کو کہ جسین تو کسی بھی خوش شکل لڑکی کی دل شکنی اچھی نہیں لگتی۔" راحیلہ ناک چڑھا کر بولی "جسین اداکار ہو گیا ہے کہ یہ لڑکی پہلی فرصت میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر جسین اپنے بیٹہ دم میں سمجھنے لے گی۔ اس لیے تم پکڑک پکڑک کر اس کی طرف جارہے ہو۔"

"تمہارے من میں بھی شکر" میں نے جلدی سے کہا۔ اس کا من بن گیا۔ میں نے ایک لمبے کی خاموشی کے بعد خبر گیری سے کہا "یہ تمہاری ملاضمتی ہے کہ میں پکڑک پکڑک کر اس کی طرف جا رہا ہوں۔ جسین معلوم ہے کہ لڑکی میں اگر قسطن اور خود غرضی دونوں ہی چیزیں بیک وقت موجود ہوں تو پھر وہ مجھے ہرگز اچھی نہیں لگتی خواہ وہ خوب صورت ہی کیوں نہ ہو۔ میں کم د لڑکی کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہوں بشرطیکہ وہ جس جذبے کا بھی اعتبار کرے" اس میں پچائی ہو۔ بیٹہ دم میں بھی بلائے تو کم از کم بچے دل سے تو بلائے۔ صبح معنوں میں اس کا متعذر نشانہ کی چند گھنٹاں گزارتا ہو۔ کسی کو بے وقوف سمجھ کر بلا تا "اس پر چال چمکنا یا اسے اپنی کسی دو سرگی غرض کے لیے جانتا تو قصور نہ ہو۔ بہت نفرت یا طلب۔ میں ہر جذبے کو خالص دیکھنا چاہتا ہوں۔" "جسین تو وہ کسی نہ کسی خالص جذبے کے تحت بلائے گی کیونکہ تم محض دولت مند ہی نہیں ہو دیکھنے میں بھی ٹھیک خاک چڑھو" وہ بولی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" میں نے گویا خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے کہا "ذرا میری طرف دیکھ کر کو کو کہ میں دیکھنے میں ٹھیک خاک چڑھوں۔"

"مجھے یہ بات کہنے کے لیے تمہاری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے" وہ بدستور سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں نے جسین بہت اچھی طرح دیکھا بھلا ہوا ہے۔ تم میری بات جھوڑاؤ مجھے خواہ خواہ اور اصرار کی باتوں سے بھلانے کی کوشش بھی مت کرو۔ تمہارا دل چاہا ہے کہ کو کو بلائے ہوئے اس لڑکی کے پیچھے جاؤ۔ میں جسین مشورہ دے رہی ہوں کہ اپنی اس خواہش پر فوراً عمل کر ڈالو۔ میں ہرگز پڑا نہیں سناؤں گی۔ ویسے بھی تم نے اور

مجھے میں بات کرنے کا موقع مل گیا" میں تو لوگ طرح طرح کی باتیں سنانے میں ہی لگے رہتے ہیں۔"

"آپ کو سب لوگوں کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔ صرف مجھ جیسے قدر دانوں کی بات سنی چاہیے" میں نے اپنے کنبے میں غلوں سموتے ہوئے کہا۔

"بہت شکر! افضل صاحب! میں اب چلتی ہوں" وہ بولی۔ "میں ہم بھی دوپار منٹ تک بیٹھے آ رہے ہیں۔ درانی شوق ہمیں بھی دیکھتا ہے۔ خصوصاً آپ کو اس سچ پر آتے دیکھ کر ہمیں اپنے دل کی دھڑکنوں کو تیز ہونے کا موقع دیتا ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے اب گویا از سر نو کمری نظر سے میرا جائزہ لیا۔ میری اس بات سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر داہیں آگئی۔ گو کہ اس کی مسکراہٹ اب بھی قسطن سے بھر پور اور روح سے خالی تھی لیکن اس کے خوب صورت چہرے پر بوجھتی تھی۔ وہ دیکھے لمبے میں بولی "آپ بڑے شرمیلے افضل صاحب!" پھر وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔

وہ نظر سے اوجھل ہو چکی تو راحیلہ بولی "میں یہاں نہ ہوتی تو وہ کم از کم آخری منٹاں... بلکہ شاید سارے ہی منٹاں تمہارے گلے میں بائیں ڈال کر بولتی۔" "گو کہ تمہاری موجودگی نے مجھے ایک شاندار موقع سے محروم کر دیا" میں نے کمری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب جسین اس کی طاقی کٹنی چاہیے۔" "گو کہ اس مت کرو۔ میں ابھرتی ہوئی قلمی بیرونی نہیں ہوں جسے بڑی بڑی آسامیوں کی تلاش ہو" وہ کچھ اور پیچھے ہٹ کر کمری ہو گئی۔

"اس کا مطلب ہے جذباتیت کی لہر گزر چکی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" اس نے نیچے سرک پر جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "عفت ہے ایسی جذباتیت پر" میں نے کہا "اتنا مختصر وہ۔۔۔ کم از کم اسے ہارت ایک جتنا طوطی تو ہونا چاہیے تھا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور پیچھے دیکھتی رہی۔ میں نے فحش سی سانس لے کر کہا "شاید یہ وہ ہارت ایک جتنا طوطی تو ہو ہی جاتا بشرطیکہ سیرا خاتم سماج کی طرح نہ آتے پچھنی" میں نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن اس نے خاص طاقت صرف کر کے ہاتھ پھڑپھڑا کر اس میں کشش کا احساس نہیں ہوا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا لیکن ایک بار پھر یہ اتنا سا فاصلہ مجھے بہت بڑی فاصلے کے برابر محسوس ہونے لگا تھا۔ تاہم میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا دودھ ابھی تک کسی انتہائی آگ میں جل رہا تھا۔ میں اتنا دور نہیں تھا کہ اس کے دودھ کی تپش کو محسوس نہ کر سکتا۔



سے وعدہ کیا ہے کہ تم وراثتی شود کھینے نیچے آؤ گے۔ اس بے چاری کی نظرس تھیں تلاش کر رہی ہوں گی۔"

”میرے لیے تو تم بھی ایک درانی شری ہو“ میں نے لمبھی  
 سانس لے کر کہا ”وہ درانی شریں بھی کامیڈین کے بیسیوں مرتبہ  
 سنائے ہوئے لطیفے اور سکرز کے بیسیوں مرتبہ گائے ہوئے نغمے سننے  
 کو ملتے ہیں۔ اگر وہ کوئی نیا لطیفہ سنا دے بھی یا سکر کوئی نیا نغمہ  
 گاتا بھی ہے تو وہ پرانے سے ہزاروں گے بدتر ہوتا ہے۔ تمہارا بھی  
 وہی معاملہ ہے۔ تمہارے پاس بھی وہی جلی کنی باتیں ہوتی ہیں جو  
 میں ہزاروں مرتبہ سن چکا ہوں۔ اگر تم کوئی نئی بات کرتی بھی ہو تو وہ  
 پہلے سے زیادہ جلی کنی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ  
 میری تمہارے ساتھ شادی ہو چکی ہے۔“

”اسی لیے تو میں تم سے شادی نہیں کرتی کہ جب شادی سے پہلے تمہارے محسوسات کا یہ عالم ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا“ راجہ نے ترکی سے ترکی بولی ”شادی کے تو ایک آدھ سال بعد ہی تمہیں ہونے لگے گا جیسے شادی کو صدیاں بیت چکی ہیں۔“

”وہ تو خیر ہوتا ہی ہے۔ شادی خواہ کسی کے ساتھ بھی ہو، یہ تو ہوتا ہی ہے۔۔۔ لیکن اب اس کی وجہ سے شادی کا ارادہ تو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کام بہر حال ضروری ہے۔ کرنا ہی پڑے گا۔ آباد اجداد کی روایت ہے۔ بھائی ہی پڑے گی“ میں نے منہموم سے غراؤ میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ضرور بھانڈا“ میں نے کب منع کیا ہے؟ ”راہیلہ فوراً برلی  
 محنت سی لڑکیاں تھیں شادی کی خواہش مند ہوں گی اور اگر تم  
 انہیں خالی ہے؟“ کا اعلان کر دے تو اور بہت سی مل جائیں گی۔  
 ان میں سے جو تمہیں سوزوں لگے اس سے شادی کر کے یہ جھگڑا  
 ہی نہٹائی دو۔ تم نے خواہ مخواہ اتنا شادی پر کر رکھا ہے۔۔۔ بلکہ اگر  
 شادی کی ساری لڑکیوں سے شادی کر لو تھی مجھے کوئی اعتراض  
 نہیں ہو گا۔ بس اس موضوع پر تم میرے کان کھانا چھوڑ دو۔“

میں نے بھی پرانے زمانے کا کوئی بادشاہ سلامت سمجھ رکھا ہے جو میں اتنی لڑکیوں سے شادی کر کے حرم آباد کروں گا؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

”مزانج تو تقریباً ویسا ہی پایا ہے۔ حالات اب بھی غریبی و محو کے  
کی بادشاہ سلامت سے نئے ملتے ہی ہیں۔ تم ایسا کری گزرو۔ اس  
لہجہ ہی کیا ہے؟ کچھ تو دل کے ارمان نکلیں گے“ وہ بولے۔

میں جھٹکتا تھا میں ہی کو اس کرنے کا ماہروں لیکن کسی بھی  
انچھے پیچھے چھوڑ جاتی ہو "میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر تہہ  
لگا "اؤ اب نیچے چلیں۔ کچھ دیر پہلے تم نے مجھے جو خوش خبری  
ملائی ہے اس کے بعد مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ میں کسی  
ایجنڈے کے سو سال پرانے لطیفے اور کسی شکر کے نانوں کے سال  
پرانے گیت بھی سن سکتا ہوں۔ اب میں کسی اداس لڑکی طرح اس  
جست و جست رہنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور میز میوں کی طرف کھینچا۔ وہ ایک لمبے کے لمبے چمپکائی گویا فیصلہ نہ کر ساری ہو کر اسے میرے ساتھ نیچے جانا چاہیے یا نہیں۔ لیکن پھر اس کی خفیف سی مزاحمت معدوم ہو گئی اور وہ میرے ساتھ چل دی۔

نیچے اسی طرح خوشبو میں اور دو فٹیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مہمان اس ہال میں فطینیں سنبھال چکے تھے جہاں دو رائی پروگرام کے لیے اسٹیج لگا دیا تھا۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ خوش شخص سی ایک نو عمر گلوکار نورجان کے ایک برائے اور لافانی گانے کو اپنی آواز سے ایک نیا قالب دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ نورجان کو کالی کرنا۔ خصوصاً اس کی نوجوانی کے زمانے کی آواز کو کالی کرنا اس کے بس کی بات تو نہیں تھی تاہم وہ اپنی سی کوشش کر رہی تھی اور حاضرین کو شاید اس کی کوشش پسند آوری تھی اس لیے وہ جہہ تن گوش تھے۔

ذرا آج راحیل میرے دوسرے ساتھیوں اور میرے لیے آگے فستیں مخصوص تھیں لیکن میں نے رکھا ان میں سے کوئی بھی آگے نہیں بیٹھا تھا اور ان فستوں پر کچھ دوسرے ہی لوگ راجان تھے جنہوں نے غالباً انہیں غالی یا کرموقع غیبت جانا تھا۔ مجھے معلوم تھا میں اور میرے ساتھی ایسے موقعوں پر آگے بیٹھنے سے گرازا رہتے تھے۔

زور تاج مجھے ایک کونے میں سب سے پہلی قطار میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ مسز درانی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے دور ہی سے ہمیں ٹکلی دے دوائے سے داخل ہوتے رکھ لیا تھا اور گمری نظر سے ہمارا بازو لیا تھا لیکن چونکہ مجھ سے اس کی نظر ملی، اس نے نظر اڑا لیا۔

تب ذرا بج ہماری طرف دیکھ کر خوش حالی سے مسکرائی اور سر را نیچا کر کے ہماری طرف جھکے ہوئے سر کو شیش میں مجھ سے مخاطب ہوئی "آفاق تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔"

”احسن ہے“ میں نے بے پروائی سے کہا ”مجھے ڈھونڈ کر اسے  
 پایا ملے گا۔ اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کو ڈھونڈے جو منہ اٹھائے  
 حرادُ حُر جسکتی پھر رہی تھی۔“

”وہ تو اسے مل گئی ہے“ ذرا تاج بدستور مسکراتے ہوئے بول  
اس وقت وہ اس کے پاس ہے۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”اسٹیج کے مجھے“ زرنج نے جواب دیا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔۔۔ کچھ دیر اسے دل خوش کرنے دو“ میں نے کہا۔

"وہ وہاں دل خوش کرنے نہیں... ورنہ اپنی پروگرام کے  
ظالمین کی مدد کرتے کیا ہے؟" زرتاج نے گھوما اس کے بارے میں  
مالیاتی پیش کی "وہ اپنے ساتھ قلم کے جن آرٹسٹوں کو لے کر آیا  
ہے، کبھی ان سب کو تھوڑی تھوڑی در کے لیے اسٹیج پر لانا چاہتا

”ہیں۔ اس سے بالکل متضاد قسم کی باتیں کر رہی تھیں۔“  
 ”بلندی پر جا کر میرا داغ الٹ جاتا ہے“ وہ اطمینان سے بولی  
 ”نیچے آکر میرا داغ اصل حالت پر آجاتا ہے۔“  
 ”داغ؟“ میں نے حیرت سے گواہ پایا ”تھیں بھلا کیا معلوم  
 کہ داغ کیا ہوتا ہے؟ جس چیز سے انسان پیدا ہوا اس پر غور نہ کیا  
 آدھا ہو اس کے بارے میں اتنے وثوق سے بات کرنا کچھ اچھا معلوم  
 نہیں ہوتا۔“

گو کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے لیے یہ باتیں تقریباً  
 سرگوشی کے سے انداز میں ہی کر رہے تھے لیکن اتنی نیچی آوازیں  
 سے بھی شاید ہم سے اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی دو تین نشین اہل قسم  
 کی لڑکیاں ڈسٹرب ہونے لگیں۔ اس وقت تک وہ فوجی گھوڑا گڑا  
 فوج سنا کر اور اس کے بعد ایک انٹریئر صرف دو منظر سے لطفے ناکر  
 جاچکا تھا۔ اب نئی نسل کا ایک باپ بچہ اچھل اچھل کر تقریباً  
 بازیاں کھاتے ہوئے ایک ایسا نفر ساربا تھا جسے سمجھنا بہت مشکل  
 تھا۔ وہ مرغ کی زبان معلوم ہوتی تھی۔

اس گھوڑا گڑے گانے اور اس کے آکر سڑا کا شرارتا تھا کہ  
 اس میں ہم سرگوشیوں میں ”تو کیا“ اگر چیخ کر بھی بات کرتے تب  
 بھی شاید ہماری آوازیں غار خانے میں طوفانی کی صرا کے مترادف  
 ہوتیں لیکن شاید وہ فوجی اور فیشن ایبل لڑکیاں یہ ظاہر کرنا چاہتی  
 تھیں کہ وہ اس قسم کی موسیقی کی کتنی بڑی تندر دان تھیں اس لیے  
 انہوں نے گردنیں کھما کر بڑی ناگواری سے ہماری طرف دیکھا۔

ایک عمر رسیدہ جوڑا بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ عاتبا ان کے  
 والدین تھے بڑے میاں کا شاندار سوٹ، اکثری ہوئی گردن اور  
 جنک آؤو چہرے پر پھیلی ہوئی غوث تیار تھی کہ وہ دولت مندوں  
 کے ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ  
 ریشٹریا یا حاضر نوکری کے کوئی بہت بڑے سرکاری افسر ہوں۔

ان میں سے ایک لڑکی جس کے ہوائے نک بال اسٹیج پر گانے  
 ہوئے گھوڑا گڑے کہیں جھڑپے تھے خاص بلند آواز میں اپنے برابر  
 والی لڑکی سے بولی ”اب تو فائبر اسٹار ہونٹوں میں بھی معلوم نہیں  
 کیسے کیسے لوگ گھس آتے ہیں۔“

اس نے یہ بات انگریزی میں کی تھی اور آواز فیضی جان بوجھ  
 کر اتنی بلند رکھی تھی کہ ہم آسانی سے سن سکیں۔ اس نے سچ طور  
 پر ہماری طرف دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ انسی ٹوٹوں میں  
 سے معلوم ہوتی تھی جنہیں اپنی ناک سے آگے نظر نہیں آتا لیکن  
 انہیں دوسروں کے بارے میں دیکھنا کس پاس کرنے کی بہت جلدی  
 ہوتی ہے۔

نام میں اس کے تھہرے پر بڑا مٹانے کے بجائے اس سے  
 محفوظ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت میں بہت خوش  
 تھا۔ کچھ دیر پہلے تک جو جگہ تہہ اداسی دل دکان پر بیٹھا تھی وہ اب  
 دور ہو چکی تھی اس لیے اب سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسٹیج

بھی آفاق اس سلسلے میں اس کی مدد کرنے لگا ہے کہ انہیں کس  
 کس برائے اور کس کس طریقے سے اسٹیج پر بلایا جائے گا۔“

”اچھا۔ اچھا۔“ میں نے طمانیت سے سر ہلایا ”اگر وہ اسٹیج  
 کے پیچھے چلا گیا ہے تو شاید پروگرام کچھ بہتر ہو جائے۔“

ذرا ناخوش ہو کر بیٹھ گئی۔ تب راحیلہ مجھے گھورتے ہوئے  
 بولی ”جسٹس کیا توشیح ہو چلی تھی کہ وہ میرا کو لے کر اسٹیج کے پیچھے  
 چلا گیا ہے اور وہاں تختلے سے لائبریری اٹھائے گا؟“

”جہاں لڑکی! اسٹیج کے پیچھے جگہ کہاں ہوتا ہے؟ اور پھر مجھے  
 میرا کے بارے میں توشیح میں چلا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ فی  
 الحال تو وہ میرے بارے میں توشیح میں چلا ہے۔ اس کے علاوہ  
 آفاق کی طرف سے توشیح میں چلا ہونے بھی بھلا کیا ضرورت ہے؟  
 تم نے سنا نہیں تھا کہ وہ بے چارہ کیسی مسکینوں والی گفتگو کر رہا تھا؟  
 خودی کہہ رہا تھا کہ میرا کی عمر کی لڑکیاں تو اسے اٹکل کتنے لگی  
 ہیں۔“

”اس چکر میں نہ رہنا۔ وہ بڑا بیسٹا تو ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس  
 طرح مسکین بن کر سب کو اپنی طرف سے مطمئن رکھتا ہو گا۔ اندر  
 ہی اندر اپنا اکیسوا حار رکھتا ہو گا۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ دوس  
 کے قلمی پیلے میں بھی وہ میرا کے ساتھ کیا قصور دہاں ہوئی میں وہ  
 دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔ میرا کو قلمی پیلے میں بھی  
 دراصل ایسی ہی کوششوں سے لے جایا گیا تھا۔ وہ ابھی اس کی یہ  
 حیثیت تو نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میرا کو قلمی دنیا میں درحقیقت  
 اسی نے متعارف کرایا ہے اور اتنی تیزی سے آگے بڑھنے میں مدد  
 دی ہے۔ اخبار والوں کو مختلف بہانوں سے اس کے گھر پر اکٹھا کرتا  
 رہا ہے۔ اسے کم سے کم وقت میں اتنی زیادہ شہرت دلانے میں  
 آفاق کا بڑا ہاتھ ہے اور ہر وقت ہر جگہ وہ اس کے ساتھ ساتھ  
 چکا رہتا ہے۔ راحیلہ نے بڑے ہمدردانہ انداز میں یہ تفصیل  
 میرے گوش گزار کی۔ وہ میرے دائیں طرف بیٹھی تھی جبکہ ذرا ناخ  
 میرے بائیں طرف تھی۔

میں نے ایک نظر ذرا ناخ کی طرف دیکھا اور پھر راحیلہ کو  
 گھورتے ہوئے پوچھا ”کیا تم یہ جتانے کی کوشش کر رہی ہو کہ میرا  
 میرے دل کی ملکہ ہے اور آفاق کے بارے میں یہ سب کچھ سنتے ہی  
 میں جا کر کوئی پھری تلاش کروں گا اور لے جا کر آفاق کی جھوٹی  
 کلمہ۔ مسموم ہی تو تمہیں گونپ دون گا؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں“ راحیلہ مسموم ہی شکل بناتے ہوئے  
 بولی ”مجھے تو یہ معلوم ہے کہ اگر تمہارا کسی لڑکی سے راز کر لیا  
 جائے اور وہ انہیں کالی کالی لنگری نہ ہو تو چند سیکنڈ بعد وہ تمہارے  
 دل کی ملکہ ہوتی ہے۔“

ذرا ناخ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پُر تجسس نظروں سے  
 میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر خوشخوار نظروں سے  
 راحیلہ کی طرف دیکھا اور کہا ”بہت بر تو تم کچھ اور کہہ رہی

پرین ہنس کی طرح اچھل کود کرتا ہوا گھوڑا بھی اچھا لگ رہا تھا۔  
دل کی تڑپ بھی کیا چیز ہے! مسٹر اور پین مسٹر بھی کچھ بدل دیتی  
ہے۔

راہیلہ اور ذرا تاج نے بھی یہ سمجھنا تھا لیکن انہیں بھی غصہ  
آنے کے بجائے ہنسی آ رہی تھی بلکہ یوں کہتا چاہیے کہ ان کے لیے  
ہنسی منہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ راہیلہ مجھے کئی بار کر سڑکوشی میں  
بولی "یہ بات اس نے تمہارے لیے کی ہے۔"

میں نے ذرا تاج کی طرف دیکھا اور کہا "میرے خیال میں تو  
تمہارے لیے کی ہے۔"

ذرا تاج سڑکوشی میں بولی "ٹھیک ہے۔ میرا تعلق دیہات سے  
ہے۔ لیکن میرا خیال ہے تم زیادہ بڑے "پینڈو" ہو۔ تمہارے  
لے کی ہوگی۔"

میں نے راہیلہ کو گھورتے ہوئے کہا "میرے خیال میں تو اس  
کے لیے کسی ہوگی۔ یہ مسلم ہونے کے شوق میں کسی ناقد ذرا اور چڑ  
قاتیہ لیل کی "چشم چراغ" معلوم ہوتی ہے۔"

"کبھی اپنی عقل دیکھی ہے آئیے میں؟" راہیلہ مٹھنی مٹھنی آواز  
میں بولی "لگتا ہے کوئی تل اپنا بل چموز کر کیت سے فرار ہو کر  
سٹ زپ تن کر کے ہوئی میں آبیٹھا ہے۔ جیسے تو شاید کوئی اس  
ہوئی میں دھڑکی نہ رکھے۔"

"آپے بارے میں میں بھی خوش قسمتی میں مت رہو۔ ہمیں تو شاید  
کوئی کچھ میں برتن دھوئے پر بھی ملازم نہ رکھے" میں نے مختارت  
سے اس کی طرف دیکھا۔

"سب ایسا بھی بات نہیں ہے۔ لیکن میں تو میں جب چاہوں  
کوئی نہ کوئی ملازمت حاصل کر سکتی ہوں" وہ غصے سے بولی۔  
"وہ کیسے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"میں آج شام ڈانٹنگ ہال میں چھٹی کالی ہڈی رہی تھی تو ہیڈ مینٹر  
بلی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا" راہیلہ نے غصے سے بتایا  
"وہ خوش خوش میری سفارش کرے گا۔"

"اس خوش قسمتی میں مت رہنا۔ ہیڈ مینٹر کی نظر کمزور ہے۔ وہ تو  
بہن اوقات ہال کے کسی ستون کو بھی دیر تک مٹی نظروں سے  
دیکھ رہا ہے۔" میں نے خیردار کیا۔

ذرا تاج منہ پر ہاتھ رکھے بے آواز طریقے سے ہنس رہی تھی۔  
سزورانی ہادی طرف جھک کر سڑکوشی ہی کے انداز میں بولیں "تم  
تھکا ہمت بد معاش ہو۔ اگر تم لوگوں کو درائی پروگرام نہیں دیکھا

ہے اور نہ ہی کچھ سمجھتا ہے تو اچھ کر باری چلے جاؤ۔ جن بے  
گاہے دوسرے لوگوں کو دیکھی ہے "تم انکم اہمیں تو سننے دو۔"

"ہاں۔ یہ بات ٹھیک ہے" راہیلہ فوراً بولی "آؤ باہر چلے  
یہ۔"

"باہر بھی کیا رکھا ہے" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر جواب  
لا دیا "میں بھی گانے کے در در ان اچھ کر جانا پڑا لگتا ہے۔ گھوڑا کی

خوشامقاسی ہوئی۔ نئی فصل کا ۱۶ مقابل گھوڑا ہے۔ لوگ بھی کیا  
کھیں گے کہ شاید ہم میں اس عظیم موسیقی اور بے مثال گھوڑا کی  
سے محفوظ ہونے کی اہلیت ہی نہیں ہے۔"

"اس کا صرف ایک گانا ہیٹ ہوا تھا" راہیلہ اسٹیج کی طرف  
دیکھتے ہوئے بولی "اس کے بعد سے آج تک لوگوں کو تو کیا شاید  
اسے خود بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا گایا ہے مگر میں۔ وہ گایا  
ہے۔ اور لوگ سن رہے ہیں۔"

"شاید تم کم رہے ہیں۔ دیکھ زیادہ رہے ہیں" ذرا تاج بولی پھر  
اس کا لہجہ خرم آمیز سا ہو گیا "شاید انہیں نہیں آیا کہ موسیقی  
کسی کو اتنی اذیت میں بھی جٹا کر سکتی ہے۔ ذرا دیکھو تو بے چارہ  
کیسا تڑپ رہا ہے۔"

سزورانی چینی آواز میں بولیں "میرے پرس میں ایک بہت  
لوکیلی بیڑہ میں موجود ہے۔ اگر تم لوگوں نے اب بھی اپنی بکواس بند  
نہ کی تو میں وہ بیڑہ میں باری باری تم تینوں کی بیلوں میں گھونپ دوں  
گی۔"

"پھر تو ہم بھی اسی طرح تڑپے لگیں گے" راہیلہ نے اسٹیج کی  
طرف اشارہ کیا۔

"اور لوگ سمجھیں گے کہ ہم گانے والے کا ساتھ دے رہے  
ہیں" ذرا تاج نے لقمہ دیا۔

"اچھا بس۔۔۔ اب بکواس بند۔" میں نے ہونٹوں پر اٹھائی  
رکھتے ہوئے کہا "اب ہم سنجیدگی سے تھوڑا بہت پروگرام دیکھنے کی  
کوشش کریں گے۔"

"تم اور سنجیدگی؟" راہیلہ نے بے یقینی سے میری طرف  
دیکھا "یہ تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سرکاری ملازم وعدہ کرے کہ  
آئندہ وہ دفتر میں سدی سے کام کیا کرے گا۔"

میں نے بدستور ہونٹوں پر اٹھائی رکھی اور کوئی جواب نہ دیا۔ ہم  
سیدھے ہو کر کرسیوں کے پشتوں سے ٹھک لگا کر بیٹھ گئے اور واقعی  
سنجیدگی سے پروگرام دیکھنے اور سننے لگے۔ چند لمبے ہمدرد پاپ مگر

دھست ہو گیا اور کچھ سترے میرا کو بٹالایا۔ اس کے اسٹیج پر آنے  
کے انداز میں خاصی محتاط اور دلکشی تھی۔ اسنے فاصلے سے اور  
اتنی دوشیوں کے جھرمٹ میں وہ اپنے بچے سنورے سراپا کے

ساتھ ایک پُرکشش شخصیت معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے قریب  
کھڑے ہو کر باتیں کرنے پر اس کے بارے میں جو اثر لیا تھا "اب  
ناظر اس سے خاصا مختلف تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اصل وہی تھا جو

میں دیکھ چکا تھا "عموس کر چکا تھا۔ باقی سب رکھوں "دوشیوں اور  
ریسرلوں کے دھوکے تھے۔ بہر حال لوگوں نے بھرپور تائیلوں کے  
ساتھ اس کا استقبال کیا۔

کچھ خود بھی ایک مزاحیہ اداکار اور اسٹیج کا افسر تھیں۔ اس  
نے میرا سے ذرا چیمیز چھاڑ دی۔ اس پر دو چار جھٹکے۔ میرا نے  
ترکی۔ ترکی جواب دینے یا تنہد طراز بننے کی کوشش نہیں کی۔ اور

کسر بھر نہیں کی لیکن میرے لیے ایک اور الجھن شروع ہو گئی۔ میری نامعلوم جس نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میری یہ جیسی تھی جس سے بھی پہلے خطرے سے خبردار کرتی تھی۔

میری کچھ میں نہ آیا کہ یہاں کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے پورے ہال کا جائزہ لیا۔ سب لوگ غایت اشتہاک اور اشتیاق سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔ دیوانوں کے ساتھ کچھ دیکھ کر بڑے تھے۔ وہ بھی پروگرام میں غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور ان کے "معاونوں" کی کوئی بھی کھانے پینے کی فرائض پوری کرنے کے لیے وہاں کھڑے تھے لیکن کوئی بھی ان سے کچھ نہیں منگوا رہا تھا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کہیں سے کوئی آنکھ ہماری جانب ٹھکرائی تھی لیکن چاروں طرف دیکھتے پر بھی کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو ہماری طرف دیکھ رہا ہو۔ حتیٰ کہ ہمارے سامنے والی قطار میں چنبلی ہوئی لڑکیوں نے بھی گردن ہمارے رخسار کی خوشگلیں نظروں سے ہماری طرف دیکھنا بند کر دیا تھا۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم میٹ لوگ تھے اور کسر پھر سے باز آنے والے نہیں تھے۔

وہیے مجھے یقین تھا کہ ہماری کسر بھر ان کے پروگرام سننے اور دیکھنے میں غل بر گز نہیں ہو رہی تھی ورنہ میں ضرور باز آجاتا۔ مجھے خود کسی کی تقریر یا سکون میں غل ہونا قطعاً پسند نہیں تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ درحقیقت ڈسٹرب نہیں ہو رہی تھیں "انہیں صرف غرا جھانٹنے کا شوق تھا۔

میری نامعلوم جس بدستور مجھے بے چین کیے ہوئے تھی اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ صحیح شکل میں رہی تھی یا اس کے نظام میں کوئی غلط واقع ہو گیا تھا۔ میں نے اس سزا سننے سے لے کر جتنی دیر تک ہال کا جائزہ لیا کہ مجھے کہیں کسی آنکھ کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ اور وہ آنکھ بھی کیا کوئی عام آنکھ نہیں تھی۔ نہ کوئی خفاہت بھری، شیطانی سی آنکھ تھی۔ چاہی کہ پیغام لانے والی۔ نہایت پچھلانے والی!

اچانک میری توجہ بائیں طرف کی دیوار پر گئی۔ وہ درحقیقت ایک چلی پارٹیشن تھا جو بال بال دم اور اس ہال کو الگ کرنے کا کام دے رہا تھا۔ اس کا پلائی وڈ حصہ کچھ چالی دس سا تھا کیونکہ اس میں پھولوں کے ڈیزائن سے بنے ہوئے تھے۔ دوسری طرف بال بال دم میں اندھیرا تھا کیونکہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ تمام صحن اس ہال میں موجود تھے اور دروازائی خود کچھ رہے تھے۔

میں ممکن تھا کہ پارٹیشن کے جالی دار حصے میں کسی سوراخ سے آنکھ لگائے بال بال دم سے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو۔ جالی کچھ اس قسم کی تھی کہ اس کے دوسری طرف کسی کی موجودگی کا پتا نہیں مل سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ دوسری طرف تاریکی تھی۔ اس صورت میں تو خواہ دو چار نہیں بہت سی آنکھیں بھی اس جالی دار حصے پر کسی ہونیں تو ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

یہ اس کے حق میں بہتری تھا۔ وہ دکنش اور ستانت سے متحرک رہی اور یوں زیادہ اچھی لگی۔ اس کے سوتیلے جیسے دانت تیز روشنیوں میں جھلکاتے رہے شاید آفاق نے بڑی کچھ داری سے اسے سہل کرائی تھی۔

کمپریٹر نے اس سے اس کی قلوں اور پسند ناپسند وغیرہ کے بارے میں دو چار سوالات کیے۔ اس نے بہت سنبھل سنبھل کر اپنے تئیں انداز میں جوابات دیے۔ اس کی گفتگو سے مجھے اپنی ظاہر نہیں ہوا۔ حاضرین نے اس کے ہر جواب پر تائیاں بنائیں۔

راجلہ بھی میری طرف دیکھ دیکھ کر استہزائیہ سے انداز میں تائیاں بھاری تھی۔ پھر وہ مجھے شوکا دیتے ہوئے بولی "دل میں تو لگتا پھوٹ رہے ہوں گے کہ اتنی ٹیکرس۔ اتنی مقبول۔ اتنی خوب صورت اور اتنے بڑے نام والی شخصیت جہیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہی ہے؟"

مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ در تاج کو ٹھاننے کے لیے یہ بات کر رہی تھی۔ میں نے غلطی سانس لے کر کہا "میں کچھ غریب کو خوش فہمیوں میں جتا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ مقناطیس کس چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اگر کسی اور کے پاس ہو گا تو یہ مقناطیس اسے بھی اپنی طرف کھینچنے لگے گا۔ اور اس سے پہلے بھی کھینچ ہی رہا ہے۔ البتہ تیس بیس سال کی عمر میں جا کر جب احساس ختمی روح میں بچے گا تو پھر شاید اس مقناطیس کی سوچ بدل جائے۔ پھر شاید یہ دولت کے علاوہ بھی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونے لگے مثلاً دانا۔ محبت۔ گدھا۔ سہالی اور سونول وغیرہ۔"

"اصل بات کو قلم سے اور تیزی شامی میں گم کرنا یا پھر مذاق میں لڑائی جیسے خوب آتا ہے" راجلہ نے بھی انداز میں سہلائے۔ "تو بڑی بڑی تاج گری نظر سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی یا اس وقت اس کے غمور سات کیا تھے۔

اس وقت تک میرا تائیلوں کی گونج میں اسٹیج سے رخصت ہو چکی تھی اور وہی نو عمر گلوکارہ لوٹ آئی تھی جس نے میں سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک پرانا اور لازوال نمونہ ستاری تھی۔ ماحول میں یکدم فضا اور حقیقی نغمائی سی آگئی تھی۔ شاید منتظمین باپ گانوں اور کاسیڈی وغیرہ کی ہنگامہ خیزی کے ساتھ ساتھ اس قسم کے نئے نمونہ پروگرام میں ایک قسم کا توازن رکھنا چاہتے تھے۔ یہ توازن بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ لوگ بھی اس سے محفوظ ہو رہے تھے۔ ان کا رخ ان کی ایک طرف نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ حاضرین میں ہر عمر کے لوگ موجود تھے۔ مسزورانی نے ایک بار پھر ہمیں تنبیہ کی کہ ہمیں اپنی بکواس بند کر لینی چاہیے۔ ہم ایک بار پھر سنجیدہ ہو کر کرسیوں کے پشتوں سے ٹپک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس بار ہم نے خاصی دیر تک

ساتھ جان بوجھ کر کئی ہند کی مٹی تھی، شاید کامیڈین اس مرطے پر زیادہ دلچسپ انداز میں کوئی ٹکڑو چھوڑنے والا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ کامیڈین شاید خوفزدہ نہ ہو سکتا تھا۔

اس کے منہ سے صرف ”ارے... ہارے... ہارے...“ نکلا تھا اور اس کے بعد اسے ساپ سوکھ گیا تھا۔ شاید اسے فوری طور پر یہ صدمہ بھی ہوا ہو کہ اس کے آسم کا تو بڑا غرق ہو آدھا کھا گیا دے رہا تھا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر میں نے اندھا ہوتے ہی لوگوں کی قدرے لطف آمیز سی چیخیں مسموم ہونے سے بھی پہلے یہ کام کیا تھا کہ راجیلہ اور زرنج کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے کرسیوں سے نیچے پھسل گیا تھا۔ یہ کسی حد تک ایک اضطرابی سی حرکت تھی۔ مجھے صحیح طور پر خود بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ جس وقت اندھا ہوا اس وقت مجھے اپنے آس پاس گویا دور دور تک بھی کوئی مشکوک شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔

راجیلہ اور زرنج تو میرے دائیں بائیں تھیں اس لیے میں نے دونوں بازوؤں سے انہیں اپنے ساتھ ہی بچھو دھکیل لیا تھا لیکن مسز درانی، زرنج کے برابر تھیں اور میرا ہاتھ ان تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کڑی سے نیچے پھسل آئی تھیں یا نہیں۔ مجھے ان کے بارے میں تشویش تھی لیکن میں فوری طور پر ان کے بارے میں جاننے کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔

کرسیوں کی قطاروں کے درمیان جگہ زیادہ نہیں تھی۔ میں زرنج سے سرگوشی میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ مسز درانی کو بھی کرسی سے نیچے کھینچ لے۔ میں نے اندھیرے میں جلدی سے زرنج کا بازو تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن میرا ہاتھ کیوں اور پڑ گیا۔ وہ ہدک کر دور ہوئی اور میں خرمندی کے بارے میں اس سے اصل بات کہنا تو درکنار مذمت بھی نہ کر سکا۔

دینے ہوئی میں لائٹ کا تابلو نظام بھی موجود تھا لیکن جزیرہ کے آنے والے اور لائٹ بحال ہونے میں تقریباً دو منٹ لگ جاتے تھے۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ لائٹ پورے ہوئی کی مٹی تھی یا صرف اسی ہال کا کوئی کٹ آؤٹ وغیرہ نکالا گیا تھا۔ لوگوں کی تھوڑی بہت جگہ پار اور آواز دے دیکھنے کا شور مچا تھا کہ اس میں الگ سے کسی آواز کو پہچاننا مشکل تھا۔

مجھے تشویش یہ بھی تھی کہ اگر میں لائٹ میں کوئی کڑی کی مٹی تھی یا صرف اسی ہال کا کوئی کٹ آؤٹ وغیرہ نکالا گیا تھا تب تو شاید جزیرہ کے ذریعے بھی لائٹ بحال ہو جائے۔ بعد ازاں مکان تھا۔ جزیرہ کا خود کار نظام بھی صرف اس صورت میں آن ہو آ تھا جب باہر سے بجلی کی سپلائی منقطع ہوتی تھی۔ اگر لائٹوں میں کوئی کڑی ہوئی یا سچ میں سے کٹ آؤٹ وغیرہ نکل جاتے تو پھر خواہ جزیرہ آن ہو جاتے تب بھی بجلی بحال نہیں ہو سکتی تھی۔

لائٹ جانے کے چند سیکنڈ بعد ہی میری آنکھیں اندھیرے سے

میں فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں ال کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہال میں تک جانے کے لیے مجھے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑا اور اگر وہاں واقعی کوئی موجود تھا تو میرے انٹینی سی وہ ہوشیار ہو سکتا تھا۔ غائب ہونے کے لیے اسے خاصا وقت میرا دینا پڑتا تھا۔

فونی، شیش شاد وغیرہ میں سے کوئی بھی ہال میں موجود نہیں تھا۔ شاید انہیں پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی یا پھر وہ یہ تھی کہ ان کی ایک دوسرے سے ملاقات کافی دنوں بعد ہوئی تھی اور انہوں نے پروگرام دیکھنے کے بجائے کہیں اور بیٹھ کر گپ شپ کرنے کو ترجیح دی تھی۔

مواہل فون میرے پاس تھا۔ میں نے ان میں سے کسی سے مواہل فون کے ذریعے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اس میں بھی مجھے یہی اندیشہ محسوس ہوا کہ میرا مواہل فون کو استعمال کرنا بھی اس عادیہ ہستی کو خیردار کر سکتا تھا۔ اور معلوم نہیں درحقیقت کوئی ہستی وہاں موجود بھی تھی یا نہیں؟ میری اس نامعلوم جس نے مجھے بھی دھوکا تو نہیں دیا تھا پھر میں اس قسم کی باتوں کے بارے میں پیشین گوئی سے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

میں نے زرنج اور راجیلہ سے اس سلسلے میں بات کرنے کے بارے میں سوچا۔ ہم کھسکھسرت بہت دیر سے کرسی رہے تھے۔ مزید کھسکھسرتی کو شک میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی۔ اس دوران کو عمر گو کا وہ اسٹیج سے رخصت ہو چکی تھی اور ایک انٹرفیئر آچکا تھا جو ہارنے لپٹیوں کو لے آہنگ، مٹی تراشیم اور اپنے موتی اثرات کے ساتھ منارہا تھا۔

میری سوچ بچار کچھ زیادہ ہی طویل سمجھتی تھی۔ یہ تجربہ مجھے پہلے بھی دو تین مرتبہ ہو چکا تھا کہ بعض معاملات میں زیادہ دیر تک سوچ بچار میں اٹکے رہنا اور کوئی عملی قدم نہ اٹھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ میں کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا اور اچانک ہال میں اندھا ہوا ہونا کیا۔

ایک ساتھ کئی اضطرابی سی چیخیں بلند ہوئیں جن میں سے بیشتر سنوائی تھیں لیکن ان میں خوف کی آمیزش نہیں تھی۔ سب لوگ ایک خوب صورت ماحول میں بیٹھے تھے۔ سب کو لاشعوری طور پر ایک بے عنوان سے تحفظ کا احساس تھا۔ آس پاس کہیں کوئی بنگاہ بھی رہا نہیں تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ میں اس وقت اسٹیج پر موجود کامیڈین بجلی کے ٹکے کے بارے میں ہی ایک لطیفہ منارہا تھا کیوں کہ میں نے اسے کہنے کے لیے ایک عمدہ لفظ کو سمجھنا کہ بجلی کے ٹکے پر فٹ کر دیا تھا اور اس میں بار بار بجلی جانے کا ذکر تھا۔ شاید اس لیے جنہوں کے ساتھ بے اختیار کچھ قصے بھی بلند ہوئے تھے۔

کوئی بعد نہیں تھا، بعض لوگوں نے سمجھا ہوا کہ اس طرح لائٹ جانا پروگرام کا ایک حصہ تھا اور اس لطیفہ پر بڑی عمدہ تائید کے

ایسے موقعوں پر ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بات بہت تیزی سے پہنچتی ہے بلکہ دوسرے سرے تک پہنچنے پہنچے بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہال میں خوف و ہراس پھیل سکتا تھا۔ تقریب میں بد مزگی تو ہوتی تھی لیکن اگر اس قسم کی کوئی بات ہو جاتی تو پھر تقریب کا بالکل ہی برا غرق ہو سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے کرسی کو تھامنے کے لیے دوسرا ہاتھ بھی پٹھایا۔ ذرا تاج میرے نیچے مزید دبنے سے بچنے کے لیے دوسری طرف کھٹک گئی۔ شاید اس نے جھجکا ہٹ میں میرا بازو بھی فرما تھا کہ اس وقت مجھے کوئی خاص احساس نہیں ہوا۔ وہ ہزارہی تھی۔ پتہ چلا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کرنا کیا چاہ رہا تھا اور کہاں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں دلی دلی میں یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ اور مسزدرانی اندر میرے میں کچھ نہ دیکھنے پائیں۔

ایک ہاتھ سے کرسی تھام کر دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے پٹے میں سے خنجر کھینچ لیا۔ میں نے نشوونما اس کے دستے پر ہی لپٹا رہے رہا اور خاموشی سے اسے اپنے موزے میں اڑس لیا۔ پھر میں پیچھے ہٹ گیا اور ذرا تاج کی گویا جان میں جان آئی۔ یہ سب کچھ بھی محض چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ لائٹ گئے شاید پورا ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا۔

میری نامعلوم جس نے خطرے کا سنبھل ٹھیک ہی رہی ہو کیا تھا۔ وہ محض وارہ نہیں تھا۔ خطرے کا احساس بھی صرف مسزدرانی کے بارے میں ہوا تھا۔ یہ بھی وارہ نہیں تھا۔ کسی نے اندر میرے میں بھی بالکل صحیح طرح تاک کر اپنی دانست میں عین ان کے بیٹے پر وار کیا تھا۔ اس نے شاید سوچا بھی نہ ہو کہ عین اس لمحے وہ کرسی سے نیچے پھسل جائیں گی۔

اب میرا ذہن اصل مسئلے کی طرف گیا۔ یہ ہزاروں سُن سا سوال تھا کہ خنجر کھونچنے والا کون تھا؟ ہم آخری قطار میں تھے اور ہماری نشستیں ایک کونے میں تھیں۔ ہمارے پاسیں طرف اور اگلی قطاروں میں موجود تمام خواتین و حضرات ہمارے ہی مدعو کیے ہوئے معزز مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ لائٹ جانے سے پہلے جہاں تک بھی میری نظر گئی تھی اور جس حد تک بھی میں مشاہدہ کر سکتا تھا اس کے مطابق ان میں سے کوئی بھی اندر جرا ہوتے ہی اتنی بھرتی سے یہاں تک پہنچ کر خنجر کا وار کرنے کا اہل معلوم نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تو بڑی عمر کے دولت مند اور آرام طلب سے لوگ ہی معلوم ہوتے تھے۔

جس پارٹیشن کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ اس کے عقب سے جالی دار حصے سے کوئی آنکھ ہمیں تک رہی تھی اور بال بد میں شاید کوئی موجود تھا۔ اب اس کے بارے میں بھی سوچنا فضول تھا کیونکہ اگر میرا شبہ درست بھی تھا اور وہاں کوئی موجود بھی رہا تھا تب بھی لائٹ جاتے ہی ہلک جھپٹے میں اس کا مسزدرانی کی کرسی سے

ہٹاؤں ہو گئیں۔ تیز و خفیاں یکدم آنکھوں کے سامنے سے محو ہو جائیں تو خاصی دیر تک تاریکی اصل سے بھی زیادہ گہری محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی کیفیت سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ ابھی انہیں اپنے برابر والوں کا ہولناک دکھاائی نہیں دے رہا تھا۔

مجببات یہ تھی کہ اس وقت مجھے اپنی راجہ کی یاد ذرا تاج کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی مسزدرانی کی تھی۔ میں نے ایک کمران کی کرسی کی طرف دیکھا۔ ان کی کرسی خالی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ شاید ذرا تاج نے یہ عمل مندی کی تھی کہ اپنے ساتھ انہیں بھی نیچے کھینچ لیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔

مسزدرانی کی کرسی کے مٹلیں پٹے میں چار پانچ انچ لمبی کوئی چیز اُبھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چیز ہو سکتی تھی اور درحقیقت اسی لمبی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ میں کھڑا بھی نہیں ہوا جانتا تھا۔ تقریباً بیٹھے ہی بیٹھے مجھے اس چیز تک ہاتھ پہنچانے کے لیے کسی حد تک ذرا تاج کو روکنا پڑا جس کا اس نے نام اُڑا دیا۔

وہ گھٹی گھٹی سی سرکشی کے انداز میں غصے سے کچھ بولی اور اس نے مجھے اپنے اوپر سے دھکیلے کی بھی کوشش کی لیکن میں نے اس کی کوشش نامکام بنا دی اور اس کی غصے کی پورا کیے بغیر اس چیز تک ہاتھ پہنچا کر ہی رہا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ میں اس وقت نشوونما بھیہ موجود تھا۔ میں نے اسی سے اس چیز کو تھام۔ میں براہ راست اسے ہاتھ میں پکڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ ایک خنجر کا دستہ تھا۔ خنجر کا پورا پورا پھل مٹلیں گھٹن میں سے ہوتا ہوا چلی تھنے میں بیست ہو گیا تھا۔ کرسی کے پٹے کا پچھلا حصہ چلی تھنے پر مشتمل تھا جبکہ ٹیک لگانے کی جگہ فوم کا بھرا ہوا مٹلیں گھٹن بنا ہوا تھا۔

خنجر کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ جس وقت اسے یہاں بیست کیا گیا اس لمحے اگر مسزدرانی کرسی پر ہی موجود ہوتی تو وہ پٹے کے بجائے عین ان کے بیٹے میں بیست ہوا ہوتا۔ شاید مسزدرانی کے کرسی سے پھسلنے اور اس خنجر کے بیست ہونے میں صرف ایک لمحے کا ہی فرق رہا ہو اور شاید مسزدرانی کو اس بات کا علم بھی نہ ہو کہ موت ان کے سینے قریب سے گزری تھی اور نہ وہ خوف زدگی کے عالم میں خود کوئی حرکت کر تیں۔ عین ممکن تھا کہ انہوں نے چپ ماری ہوئی یاد ذرا تاج سے لپٹی ہو تھیں۔

میں نے خنجر کو پٹے سے نکالنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ وہ نکلی میں اتنا گہرا بیست تھا کہ اتنی آسانی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ کرسی بھی کچھ آگے جھک آئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ شئی ہو تو مسزدرانی اپنی کرسی کے پٹے میں خنجر بیست دیکھ کر خوف زدہ ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دوسرے لوگوں کی بھی اس پر نظر رہ جاتی اور وہ ان سے بھی زیادہ خوفزدہ ہو جاتے۔

قرب پہنچا اور پتھر گھونچا ایک نامکھن سا کام تھا کیونکہ اس پارکیشن کے صرف ایک سرے پر ایک دوواڑہ تھا اور دوسرے سرے پر ایک طرف کو کھسکا ہوا تھا۔

کڑی کے بچے ایک جہاں خارجہ خاصی دور تک چلا گیا تھا۔ یہ جہاں زمین سے تو خاصی بلندی پر تھا لیکن اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر باؤنڈری وال تھی جو خاصی چوڑی تھی۔ تھوڑی بہت بچہانہ مہارت رکھنے والا شخص بھی نیچے پر اتر کر اس دیوار پر کود سکتا تھا۔ بس ذرا توازن برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ دیوار پر کودنے کے بعد باہر سڑک پر کودنا آسان ہی تھا۔

میرے خیال میں کوئی اس موقع سے فائدہ اٹھا چکا تھا۔ ذرا آگے ایک چوراہا تھا۔ وہاں سے گاڑیاں کافی تعداد میں گزر رہی تھیں۔ جانے والا ان میں سے کسی بھی گاڑی میں ہو سکتا تھا۔ کچھ گاڑیوں کو میں نے بائیں طرف مڑتے دیکھا۔ ان میں سے ایک گاڑی نے خاصی تیز رفتاری سے موڑ کاٹا تھا۔ شاید اس کے گاڑ چرچرے بھی تھے۔ ممکن تھا کہ گاڑی چلانے والا کوئی چھپوڑا فوجوان رہا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہال میں کام دکھانے والا اس گاڑی میں فرار ہوا ہو۔

اب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کڑی کا شیشہ بند کیا اور اپنی جگہ پر واہیں آگیا۔ پھر میں نے سوچا ایک ٹھنڈی پارکیشن کے دوسری طرف بھی دیکھ لینا چاہیے۔ میں پیچھے سے گھوم کر کرسیوں کی قطاروں کے پاس سے گزرتا ہوا اس کے دو مہمانی دوواڑے تک پہنچا کہ دو دوسری طرف سے بند تھا۔

مجھے ہال کے مین دوواڑے کی طرف سے گھوم کر دوسرے ہال میں جانا پڑا۔ وہ ہال دوسرا گھبراہٹ کا وقت تھا۔ ہال میں آگ لگی تھی۔ میں دوواڑے میں کھڑا نہیں ہوا۔ ہال کے کسی کسی آریٹنگ گوشے سے کوئی سنسناتا ہوا خبرچیا کوئی میری طرف بھی آسکتی تھی۔ میں احتیاطاً دیوار سے چپک کر کھڑا ہوا اور چند سیکنڈ دیں کھڑا رہا۔ اب میری آنکھیں ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ سکتی تھیں لیکن وہاں کوئی ذی مدفع موجود نہیں تھا۔

لائٹ بحال کرنے کے لیے ہماگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ بہت سے لوگ تیزی سے اوپر اوپر لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ایمرجنسی لائٹس اوپر اوپر پکڑنے لگیں۔ ہوٹل کے عملے کے لوگ انہیں آتھوں میں لٹکائے اوپر اوپر آجارتے تھے۔ ان سے اچھی خاصی روشنی ہو گئی۔ میرے اندازے کے تصدیق اب بالکل سی روشنی میں بھی ہو گئی۔ ہال دوسم میں کوئی موجود نہیں تھا۔

میں ست قدموں سے آؤٹریٹم کی طرف واپس چل دیا۔ جو کچھ ہوا تھا اس میں یقیناً دو آدمیوں کا ہاتھ تھا۔ ایک نے لائٹ میں گزرب کی تھی۔ دوسرے نے پتھر استعمال کیا تھا۔ لائٹ میں گزرب کرنے والا شاید کسی اور راستے سے نکلا تھا اور دوسرے کے کفر کا شیشہ کوئی اور طریقہ سے تھا۔

میں ہوٹل کے حفاظتی انتظامات سے مطمئن نہیں تھا لیکن

پتھر آخر وہ شخص کہاں سے آیا تھا اور کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اس نے یہ کام لائٹ جانے کے بعد یقیناً صرف دو تین سیکنڈ کے اندر اندر کیا تھا کیونکہ اس دوران ہی مسز درانی اپنی کرسی سے پس بٹکی تھیں اور اس وقت تک میری آنکھیں بھی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ اگر میں آس پاس کے لوگوں کو زیادہ صاف طور پر نہیں دیکھ رہا تھا تب بھی ان کی فعل و حرکت تو آسانی سے دیکھ رہا تھا اور مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا تھا جس کے پاس میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسز درانی کو پتھر سے ہلاک کرنے کی کوشش کے بعد فرار ہو رہا تھا۔

مزید چند سیکنڈ اس الجھن میں گزر گئے۔ اچانک مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں ایک برقی لمراہی ہو لیکن یہ برقی میری آنکھوں کے سامنے نہیں بلکہ میرے ذہن میں لمراہی تھی۔ مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ ہمارے دائیں طرف کی دیوار ہمارے زیادہ قریب تھی اور اس پر بھست سے لے کر فرش تک ہماری اور دھڑکے آؤڑاں تھے۔

پردوں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس دیوار کو احاطہ ہوا تھا کیونکہ اس میں بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیاں موجود تھیں۔ یہ کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلتی تھیں اور ان کے کشنگ کی وجہ سے ہر وقت بند رہتی تھیں لیکن اندر کی طرف سے انہیں کھولنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شخص ایک مٹن دیا کہ گھرے رنگ کے کسی بھی ہماری اور ملاؤنگ شیشے کو ایک طرف کھسکایا جاسکتا تھا۔

کیا بعید تھا کہ اس دیوار پر پھیلے ہوئے پردوں کے عقب میں کوئی ہمارے عین قریب چھپا ہوا ہو اور اب تک کڑی کھول کر باہر کود کر فرار بھی ہو چکا ہو؟ یہ خیال مجھے ذرا آخر سے آیا تھا۔ تصور دراصل میرا بھی نہیں تھا۔ میں اس ہوٹل کا مالک ضرور تھا لیکن اس کی ساخت سے اتنی اچھی طرح واقف نہیں تھا کہ تمام تفصیلات ہر وقت مجھے اذیر رہیں۔

میں جلدی سے اٹھا اور عقب میں کرسیوں کے درمیان سے جگہ بنا کر انہیں پھلانگ کر پیچھے خالی جگہ میں پہنچا۔ وہاں سے ایک سرے سے پردہ اٹھا کر میں اس کے عقب میں ٹھس گیا۔ اب میں پردہ اور دیوار کے درمیان تھا۔ ان کے کشنگ ہال میں نقصان کچھ اور تھی۔ ہوا کے ذرا مختلف قسم کے ایک جھونکے نے مجھے بتایا کہ آگے ایک کڑی کھلی ہوئی تھی۔

تاریک اور یک طرفہ منظر دکھانے والے شیشوں سے باہر مجھے دو خفیاں جھلکائی دکھائی دیں۔ حتیٰ کہ ہوٹل کے دوسرے حصوں میں بھی لائٹ موجود تھی۔ کسی طرح صرف اس بڑے ہال کی لائٹ غائب کی گئی تھی۔ ہال فرسٹ فلور پر تھا۔ میں نے جلدی سے دیوار

نہیں ہے۔

راجہ خاوش تھی۔ اسے گویا کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ گویا صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ مسز درانی بھی اب اپنی نشست پر موجود تھیں اور دونوں ہاتھ بٹلوں میں دبیے کر سی کے بیٹھے تھے۔ ایک لگائے بیٹھی تھیں۔ وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھیں لیکن ان کا چہرہ تاثرات سے ماری تھا۔ شاید بے چاری ان قانون کو گمان تک بھی نہیں تھا کہ چند لمحے پہلے انھیں موت چھو کر گزری تھی۔

میری یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ اچانک ہی انہوں نے سناٹ لیجے میں پوچھا "کیا وہ ہاتھ نہیں آیا؟"

"کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی جس نے کسی چیز سے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی؟" وہ بچی آواز میں بولیں۔

"میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی تھی" میں نے انہیں بلائے کی کوشش کی۔

"اب تم نے بھی مجھے گولیاں دہنی شروع کر دیں" انہوں نے بے اختیار ایک توہمیری۔ ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے۔

پھر وہ کر سی پر بیٹھی ہی بیٹھی ذرا ایک طرف کو ہٹ کر گردن چمھاتے ہوئے..... پٹنے کے گد بچے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولیں "یہ کیا ہے؟"

وہ خنجر پوست ہونے کا معمولی سا شگاف تھا۔ خنجر نکل جانے کے بعد کٹن میں اس کا شگاف نمایاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے انہوں سے لیجے میں کہا "ہوئی کا معیار کچھ متاثر ہوا جا رہا ہے۔ میرے آدھوں کا اب باریکوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں رہا۔ معلوم نہیں یہ کیڑا کب اور کس طرح پھنسا ہو گا۔ بہر حال اسے ٹھیک کیا جانا چاہیے غایا کر سی تبدیل کی جانی چاہیے تھی۔"

مسز درانی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے سخت نگاہوں سے مجھے سمجھو اور سناٹ کھرچتی آواز میں بولیں "اب تم نے بھی مجھے بچوں کی طرح بلانا شروع کر دیا۔ اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"

میں اپنی بے وقوف نہیں ہوں جتنی شکل سے نظر آتی ہوں۔ یہ شاید ان کی انکساری تھی کہ وہ محل سے بے وقوف نظر آنے کا اعتراف کر رہی تھیں ورنہ میری ان کے بارے میں یہ رائے ہرگز نہیں تھی کہ وہ محل سے بے وقوف نظر آتی تھیں۔

مجھے تو اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ مدت گری عورت تھیں۔ ان کی شخصیت کی۔ کہ پوچھنا خاصا مشکل کام تھا۔

مجھے خاوش پا کر وہ گویا تسلی دیتے ہوئے بولیں "اگر حسدرا خیال یہ ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد میں خوف زدہ ہو کر مشرکائی ائمہ میں جیجیں اسنے گلوں کی۔ تو ایسی کوئی بات

سیکھ رہی والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ وہ اپنی ائمہ میں تو ایسے فرائض تھری سے ہی انجام دیتے تھے۔ کوئی مشکوک اور مسلح شخص تو اندر نہیں آسکا تھا لیکن ہوئی بہر حال ایک عوامی جگہ تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ راستے بھی بہت سے تھے۔ خصوصاً تقریبات وغیرہ کے دوران مسز افراد کے روپ میں وہ ایک ماہر قسم کے آدمیوں کا اندر کہیں پہنچ جاتا اور چند سیکنڈ میں کوئی کارروائی کر کے فرار ہو جانا بہت زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

دیئے یہ کام بہت آسان بھی نہیں تھا۔ اس میں رسک تو موجود تھا لیکن جراثیم پیشہ افراد رسک تو بہر حال لیتے ہیں۔ ہم سیکرٹری بہت زیادہ ٹائٹ کر کے معزز مہمانوں کی مارا جھنگی بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ ہمارے ہاں ایک رہنما یہ بھی ہے کہ لوگوں کو خود ان کی اپنی حفاظت کے سلسلے میں کوئی زحمت دی جائے تو وہ بڑا متا ہے ہیں۔

واپس ہال کے دروازے کی طرف جاتے وقت مجھے سیکرٹری انچارج راؤد نظر آیا۔ وہ بیڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تاج تھی۔ میں نے آواز دے کر اسے روکا اور اس کے قریب جا کر اس کی تاریخ بچھادی۔ اب ہم علیحدے سے اندر میرے میرے موڑے میں آؤں گا اور میرے خنجر ذرا سی بھی تیز نکل و حرکت میں مجھے نقصان پہنچا سکا تھا یا نکل کر گر سکتا تھا۔

میں نے وہ خنجر نکال کر راؤد کی طرف پھرتے ہوئے کہا "اسے کہیں حفاظت سے رکھ دنا۔ امید تو نہیں ہے کہ اس پر انگلیوں کے نشانات ہوں گے لیکن بعد میں بہر حال چیک کرنا کر دیکھ لیں گے" خنجر کا دست تو نیچے ہی پلٹا ہوا تھا۔

اس نے حفاظت سے اسے اپنی یونیفارم کی پوٹی سی جیب میں رکھ لیا تاہم میں نے کم بدھشی کے باوجود محسوس کیا کہ اس کا منہ ٹپک گیا تھا "سراپا کچھ ہو گیا ہے؟" اس نے بچی آواز میں پوچھا۔

لیجے میں تو بلیں بھی تھی اور شرمندگی بھی۔

"یوں سمجھو کہ ہوتے ہوتے وہ گیا۔ قسمت ابھی تھی" میں نے جواب دیا اور ہال کی طرف بڑھ گیا۔

آؤد ریم کے طور پر استعمال ہونے والے ہال میں دیواروں پر چند ایمرٹس لائٹس آویزاں کردی گئی تھیں جن کی وجہ سے خاصی بدھشی ہو گئی تھی۔ میں اپنی نشست پر واپس پہنچا تو راجہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

تمہاری حرکات و سکنات کچھ مشکوک سی ہیں۔"

"یہ کون سی کوئی نئی بات ہے" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "میری حرکات و سکنات میری پیدائش کے کچھ عرصے بعد سے ہی مشکوک چلی آ رہی ہیں۔"

"بے شک۔ بے شک۔" ذرا تاج نے ستانت سے سر ہلایا "اور زیادہ انہوں کی بات یہ ہے کہ تمہیں اس پر کوئی شرمندگی بھی



ان کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی جگہ ہے“ مسز ورائی پولیس  
معتقدہ میرا دوسرے لیکن جان کی حفاظت کے لیے ہر ممکن تدبیر کرنا  
بھی ہر حال میرا فرض ہے۔ میں بے خوفی کے ساتھ ذمہ دہا جانتی  
ہوں لیکن ایسا طرز عمل بھی اختیار کرنا نہیں چاہتی کہ میری موت  
میرے خود کو بھی نظر آئے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر ان تہیوں میں سے ایک تہیہ ہے کہ  
آج رات سے آپ اسی ہوٹی میں قیام کریں گی“ میں نے کہا ”میں  
نے آپ کا کمرہ دیکھا نہیں۔ لیکن مجھے ابھی طرح اندازہ ہو گیا ہے  
کہ اس کا کل وقوع کیا ہے اور وہ کس قسم کا مکان ہو گا۔ میں نہیں  
چاہتا کہ آپ اپنے شیوں کے لیے آسان شکار بن جائیں۔“  
”یہ نہیں ہو سکتا“ وہ بلا تامل فیصلہ کر لیے میں پولیس۔  
”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ ذرا تاج نے آنکھیں نکالیں۔

”میں ایک رات کے لیے بھی اپنا کمرہ چھوڑ کر نہیں  
بھاگوں گی۔ یہ بات میں پہلے ہی بتا چکی ہوں اور یہ بھی بتا چکی ہوں کہ  
میں بڑی خدی عورت ہوں۔ ورائی ہوں میری روگوں میں شادی  
خون دہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جب میں مرض تو چھوڑا ایسا نظر  
آئے جیسے میں موت سے ڈر کر بھاگے بھاگے ماری گئی ہوں۔“

میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ”میں نے مان  
لیا مسز ورائی!“

”کیا مان لیا؟“ وہ یکدم حیران ہو کر پولیس۔

”جی کہ آپ مجھ سے بھی زیادہ عجیب انسان ہیں“ میں نے

اندھی سانس لے کر کہا۔

وہ مسکرا دیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی مسکراہٹ  
دماغ سے نکلی تھی۔ اچانک لائٹ بج گئی۔ اسیچ اور ہال تیز  
روشنیوں سے جھلکا آفتاب لائٹ بہ مشکل تین چار منٹ قاتب دی  
تھی لیکن کم از کم مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بہت وقت گزر  
گیا تھا اور اس دوران بہت کچھ ہو گیا تھا۔ لائٹ آنے پر ایک بار پھر  
شور مچا رہا ہوا۔ اس وقت تک اسیچ پر تقریباً اندھیرا تھا اور بہت  
سے فکارا دیں آکر کمرے ہو گئے تھے۔ جھگڑا ساگ گیا تھا۔ لائٹ  
آنے پر وہ سب اسیچ کے دنگس کی طرف بھاگے۔ صرف وہی  
فکارا اسیچ پر ہو گیا اور لائٹ جانے سے پہلے لینیہ خار تھا۔

”ہاں تو میں کہ رہا تھا۔“ اس نے سلسلہ کلام جوڑا

”لائٹ جانے پر ایک صاحب نے نکلی کے گئے کو فون کیا۔“

”یہ لینیہ مت متاقت۔ لائٹ پھر مل جائے گی“ کسی نے توازن

کھا۔

”نہیں۔ اب لائٹ نہیں جائے گی“ کامیڈین نے روشنی سے

جواب دیا ”اب لائٹ گئی تو میں خود بھی کمرہ نکلا جاؤں گا۔“

”ہاں بھی لائٹ گئی ہوئی ہوگی“ ایک اور آواز آئی شاید کچھ

لوگ کامیڈین کے متعلقہ میں خود بھی کامیڈین بننے پر تے ہوئے

تھے۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں اتنی بڑول عورت نہیں  
ہوں۔ میں نے تم سے اور ذرا تاج سے مدد ضرور طلب کی ہے لیکن  
اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں خوف سے مری جا رہی ہوں۔ ظفر  
کے چلے جانے کے بعد سے زندگی میری نظر میں اتنی زیادہ اہم نہیں  
رہی۔“

ان کی یہ مختصری تقریر دل بزرگ کر بھی میں فیصلہ نہ کر پایا کہ  
حقیقت حال کا اعتراف کرلوں یا نہیں؟ ایک لمحے کے توقف سے وہ  
اپنی ”اندھیرا“ ہوتے ہی تم کو لوگوں کے ساتھ میں بھی غیر ارادی طور  
پر کسی سے نیچے پھسل گئی تھی لیکن مجھے ہر حال اپنے قریب کسی کی  
نہل و حرکت کا احساس ہوا تھا۔ پھر ہلکی سی ”ٹھک“ کی آواز آئی  
تھی۔ ہماری کرسی کے پاس میری کمر سے گھرائے تھے گویا کڑکاتے  
آگے لپکتی تھی۔ اس کے بعد جب ذرا روشنی ہوئی تو ہم نے نہیں  
تائب پایا اور میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے وقت یہ نشان دیکھا۔ کیا  
نہارے خیال میں ”میں اتنی بے وقوف ہوں کہ ان سب باتوں کا  
شعور نہ سمجھ سکوں؟“

”نہیں۔“ میں نے لٹھری سانس لے کر کہا ”میں بھلا آپ کو  
بے وقوف کیسے سمجھ سکتا ہوں؟ برسوں پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا  
ہوں کہ اس ملک کا سب سے بے وقوف انسان میں ہوں۔“

اس موقع پر راجیہ نے زبان کھلی۔ وہ مجھے لیے میں نہایت  
چمکی سے بولی ”ٹھیک ہے۔ انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے  
لیکن اب اتنی بھی کیا انکساری کہ انسان بھی صلح پر اپنے اصرار  
ہوئے کا اعتراف کرے لگے۔ تم اپنے آپ کو صرف شر کا امتحان  
آزین انسان کہہ کر بھی کام چلا سکتے ہو۔ یہ بھی کافی برا اعزاز ہے۔“

”تم اپنی آپ انک زور چڑچڑے دنگو“ میں نے سرگوشی میں  
اسے ڈانٹ پالنے کی کوشش کی ”اس وقت سمجھو جھگڑو ہو رہی  
ہے۔“

”جیسا؟ واقعی؟“ اس نے استہزائیہ انداز میں آنکھیں  
کھلائے ہوئے تعجب میں چاہی۔

میں نے دوبارہ مسز ورائی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا  
”آپ خوش قسمت عورت ہیں۔ کل اور آج۔۔۔ صرف دو دنوں  
میں دو مرتبہ موت آپ کو چھوٹی ہوئی گزر گئی ہے اور آپ کو خراش  
نک نہیں آئی۔“

ان کے ہونٹوں پر ہلکا سا مسکراہٹ ابھری ”جب تک میرا  
وقت نہیں آئے گا تب تک مجھے کوئی مان رہا سکتا ہے۔“

ذرا تاج نے گویا انہیں چھوڑا ”اگر آپ کا ایمان اتنا ہی مضبوط  
ہے تو آپ نے میرے توسط سے افضل صاحب سے مدد کیوں طلب  
کی؟“

”اتمام حجت کے لیے“ مسز ورائی نے اطمینان سے جواب  
دیا۔

”انسان اور میں جھگڑو کیجئے“ ذرا تاج نے ترمیمی نظروں سے

کی بات سے بکھڑا ہوا تھا جیسے وہ اپنے زندہ رہنے کے بارے میں زیادہ یقین نہیں تھیں لیکن دوسری طرف زندگی اور موت کے بارے میں ان کا عقیدہ بھی بڑا مضبوط تھا اور وہ اپنی خود بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

میں نے بغیر نہ سکا ایک طرف آپ کے ذہن میں کبھی ہے کہ معلوم نہیں کل تک زندہ رہوں یا نہ رہوں۔ دوسری طرف آپ کسی کی بات ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔

میں نے بات اس لیے توڑی کہ رہی ہوں کہ مجھے جگر جیلانی کی طرف سے خطرہ ہے۔ وہ گویا وضاحت کرتے ہوئے بولیں "جگر جیلانی یا اس جیسا کوئی اور شخص کسی کا دشمن ہونا نہ ہو۔ وہ بھلا یقین سے کہے کہ سکا ہے کہ کل تک وہ زندہ ہو گا یا نہیں؟ اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو وہ سخت احمق ہے۔ بھروسہ تو اگلی سانس کا بھی نہیں ہوتا تھا؟"

میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ ذرا تاج نے استہزائی سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر بولی "تم آگنی سے باتیں نہیں جیت سکتے۔ بھلا کسی جنگلی سے کوئی کیسے جیت سکتا ہے؟"

"کیا؟" مسز درانی نے آنکھیں نکالیں اور معنوی شکل سے بولیں "تم مجھے میرے منہ پر قبضی کہہ رہی ہو؟" پھر انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا "تسبیب؟ کیا زمانہ آیا ہے۔ اب تو سی سیل موبائل کا بھی انتظار نہیں کرتی کہ بڑے بوڑھوں کو چنچہ پیچھے ہی قبضی کہہ لیں۔ اب تو صاف منہ پر ہی کہہ دیتے ہیں۔ کیا تم نے بھی وہ کہیں پڑھ لی ہیں جن کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے شعر کہا تھا؟"

"گوں سا شعر؟" ذرا تاج نے انجان بنے ہوئے پوچھا۔

"ارے دی مشہور زمانہ شعر۔

ہم ایسی سب نکالیں قابل قبضی کہتے ہیں

کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو قبضی کہتے ہیں"

"نہیں۔ میں نے وہ کہنا نہیں پڑھیں لیکن آج کل میں

تھوڑے بہت لی دی پروگرام دیکھ رہی ہوں۔ شاید ان کا اثر ہو۔

ذرا تاج مصوبیت سے بولی۔

مسز درانی نے جنگلی آہیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو

ذرا تاج جلدی سے ایک بازو ان کے گرد حائل کر کے انہیں اپنے

ساتھ لگاتے ہوئے بولی "ارے آپ میری بزرگ کہاں ہیں۔ آپ

تو صرف آگنی ہیں۔ آگنی کا کیا ہے۔ آگنی تو عمریں بھانجے کھینچے

چھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ سے تو دیے بھی ابھی بزرگی بہت دور

ہے۔ ابھی تو آپ کے چہرے سے بچپن کی مصوبیت بھی رخصت

نہیں ہوئی۔"

پھر اس نے مجھ سے تصدیق چاہی "کیوں افضل۔ میں آپ

کہہ رہی ہوں نا؟ آگنی کے چہرے پر بچوں جیسی مصوبیت ہے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری آئینہ غلط نہیں تھی۔ مسز

درانی کے چہرے پر گوکہ بڑی عمر کے اثرات موجود تھے اور غلط

تھے۔

"یہ تو خیر اچھا ہو گا۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں" کامیڈین نے مائیک پر جواب دیا۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ بڑی مشکل سے کامیڈین اپنے لٹیفے کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنے میں کامیاب ہوا۔

کچھ دیر بعد میک بولی انچارج داؤد ہال میں آیا۔ اس کی حلاشی نظروں مجھ تک آن پہنچیں۔ مجھ پر میرے عقب میں ٹکڑے اطلاق دینے کے انداز میں سرگوشی میں بولا "مرا کسی نے دیوار میں چھپا ہوا شیشے کا پاس توڑ کر اس ٹکڑے کا الیکٹرک مین سوچ خراب کر دیا تھا۔ جینیٹیس والوں نے لی اگال لائن ڈائریکٹ کر دی ہے۔"

"کونسی مشکوک آدمی بھی ہاتھ تیا کیا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سرا" اس نے تدریسے خیالت سے جواب دیا۔

"ہیں۔ تو پھر بجلی کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ

مت کر۔" میں نے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نرمی

سے کہا۔ وہ کھیلنے سے انداز میں واپس چلا گیا۔

اس کے بعد دو راتیں پروگرام خیر دعائیت سے جاری رہا۔ رات

کے بارے بچے تو ذرا تاج اٹھ کھڑی ہوئی اور نیچی آواز میں بولی "مجھے

اب اجازت دو۔"

پروگرام ابھی جاری تھا اور لوگ محفوظ ہو رہے تھے۔ مسز

درانی بھی ذرا تاج کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ میں نے اٹھتے

ہوئے کہا "پروگرام تو پورا کر دیکھ لیتیں؟"

"جتنا دیکھ لیا۔ اتنا ہی کافی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں

"ایک مدت بعد کسی پروگرام میں آگنی دیکر بیٹھی ہوں۔"

راجہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم ہال کے عقبی دروازے کی

طرف چل دیے۔ میں نے مسز درانی سے پوچھا "آپ بھی ذرا تاج

کے ساتھ ہی جائیں گی؟"

"ہاں۔ میں آگنی بھی تو اسی کے ساتھ تھی" انہوں نے جواب

دیا۔

"اگر آپ ہوش میں نہیں ٹھہر سکتیں تو کم از کم ذرا تاج کے گھر

ی ٹھہر جائیں۔ وہاں آپ کچھ لوگوں کے درمیان تو رہیں گی" میں

نے ایک بار پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ مہربان انداز میں مسکرائیں پھر گویا کسی بچے کو سمجھاتے

ہوئے بولیں "جیسے میرے گھر پر میرے تمام رہنے کے بارے میں

لڑاؤ ہو کر منہ نہیں ہوتا چاہیے۔ میرا گھر کافی محفوظ ہے۔ میری

مرضی کے بغیر اس میں کوئی داخل نہیں ہو سکا۔ میں نے کافی

حفاظتی انتظامات کیے ہوئے ہیں۔"

وہ واقعی ایک مندی عورت تھیں۔ میں نے اصرار نہیں کیا

البتہ اتنا ضرور کہا "کل فون کر کے اپنی خیر دعائیت کی اطلاع دے

دیتے گا۔"

"اے۔۔۔ زندہ رہی تو ضرور اطلاع دے دوں گی" وہ

مسکرائیں۔ مندی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عجیب بھی تھیں۔ ان

سوچ رہا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ٹوٹی نے سر کی جنبش سے شیخ شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ مجھے سمندر کی سر کرانے لے گیا تھا۔"

انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسکول لیٹ پہنچنے پر کوئی بچہ منٹائی پیش کرنے کے لیے منچر کے سامنے اپنے ساتھی بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہو "مرا یہ مجھے بھکا کر ایک جگہ لے گیا تھا ورنہ میں تو بہت شریف بچہ ہوں۔"

"رات کو اس وقت سمندر کی سیڑھی؟" میں نے حیرت سے کہا "تم دونوں ہوٹل کا دورانی پروگرام چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں سمندر کی سر کر کے لیے گئے ہوئے تھے؟"

"سرا! ٹوٹی اپنے مخصوص انداز میں مجھے لمحے میں بولا "شیخ نے بتایا تھا کہ ہماری خشک کہنی میں ایک نئی لالچ لگی ہے۔ ابھی وہ مٹی گیری میں استعمال نہیں ہوئی۔ یعنی اس میں پھلیوں کی بو نہیں رہی۔ اس میں سمندر کی سر کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ خاص طور پر رات کے وقت سمندر کی سر کرنے کا ایک الگ ہی لطف ہے۔ رات کے وقت سمندر ایک پراسرار جذباتیت میں جھلا ہوتا ہے۔ کچھ اس قسم کی تقریر کی تھی اس نے۔"

"۳۰ تم اس کی تقریر سے متاثر ہو کر سمندر کی جذباتیت کا نظارہ کرنے چل دیے؟ یعنی تم نے بھی تقریروں سے متاثر ہونا شروع کر دیا؟" جیسے معلوم نہیں، تقریروں سے متاثر ہونے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ جیسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انسان "جانور سمندر یا قندی ٹالا۔۔۔ کوئی بھی چیز ہو۔ جب اس میں جذباتی اُبال آیا ہوا ہو تو اس کے قریب نہیں جانا چاہیے" میں نے معنوی شکل سے اسے ڈانٹ دیا۔

"تاہم سر شیخ شاہ تو کہتا ہے جب کسی چیز میں جذباتی اُبال آیا ہوا ہو جیسی اس کے قریب جانا چاہیے" ٹوٹی مصویت سے بولا۔

"یہ جیسے مڑا دے گا۔ تم اس کی باتوں میں مت آیا کرو" میں نے سمجھانے کے لیے انداز میں کہا پھر مشتاکانہ لہجے میں پوچھا "۳۱ چھاپے پتاؤ تمہارے ساتھ لالچ میں کوئی چھپی بھی تھی یا تم دونوں اس امید پر گئے تھے کہ کوئی چھپی سطح سمندر پر آواہ گردی کرتی ہو ٹل جائے گی؟"

"سرا! آپ کو معلوم ہے ہم شریف بچے ہیں۔ ہم پھلیاں نہیں پکڑتے" اس بار شیخ شاہ نے منٹائی پیش کی۔

"۳۲ چھاپے پھلیوں کا ذکر چھوڑو اور ایک کمرچھ کا نام نوٹ کرو" میں نے انصواریات کا باب بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی سرا! وہ دونوں یکدم مستعد اور ہر حق گوش ہو گئے۔ کمرچھ کا نام جبار بیلائی ہے" میں نے نیچی آواز میں کہا "بہت بڑا بلڈر اور درپردہ لینڈ لائیا کا ٹکٹ ہے۔ مٹا ہے بہت بار سوخ ہے۔ اس کے بارے میں جتنی زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں اتنی

بات میں مختلف چیزوں کا پرتو بھی نظر آتا تھا مگر ان سب کی تہ میں بال ایک بچکانہ سی مصویت جاگزیں نظر آتی تھی۔ شاید اسی اس عمر میں جی ان کا چہرہ خامسا دھنک نظر آتا تھا۔

"اب تم مجھے اتنا کمین نہ لگاؤ جو میری صحت کے لیے نقصان ہو" مسز ورائی مسکراتے ہوئے بولیں۔ اب وہ ذرا بھی خشک نظر نہ آ رہی تھیں۔ وہ خامسے مضبوط اعصاب کی عورت معلوم ہوتی تھی اور واقعات کے اثرات کو جلد از جلد ذہن سے جھٹکنے میں مایاب ہو جاتی تھیں۔

میں نے انہیں مزید کچھ سمجھانے بجائے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے خیال میں مسرت انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا بہتر تھا۔ میں اور راحیلہ انہیں چھوڑنے ہوٹل کے پورٹی واڑے سے نکل کر پارکنگ لائٹ تک گئے۔ ذرا آج کی جس پیچیدہ گزشتہ شام فارنگ ہوئی تھی وہ غالباً رچرچک کے لیے جا چکی تھی۔ وہ آج سیاہ رنگ کی ہینڈ کارڈ میں آئی تھی۔

وہ مسز ورائی کو ساتھ بھا کر رخصت ہو چکی تھیں لے راحیلہ نے ساتھ ہوٹل کی طرف واپس آتے ہوئے پوچھا "تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم غریبوں کا کیا پروگرام ہوتا ہے۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر مٹی دھونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "ہیں۔ کمرے میں جا کر دباؤں کی۔"

"اور امیروں کا کیا پروگرام ہو گا؟" میں نے اسے گھورا۔

"مجھے کیا معلوم۔۔۔ یہ تو امیروں کو ہی پتا ہو گا" وہ کندھے ہٹا کر بولی۔

"امیروں کا پروگرام اس سے بھی بدتر ہو گا۔ وہ مسٹر ریٹ کر کوش بدلیں گے" میں نے معنوی سانس لے کر کہا "کمرے کی لڑکی سے اگر تمہارا بہت آسان نظر لگتا اور اس پر تارے بھی نمودار ہوتے تو شاید وہ تارے مگن مگن کردات گزاردیں۔"

"اب یہ تو ان کی ٹالا کتنی ہے۔ وہ چاہیں تو تارے گننے کے بجائے ٹکی ستاروں کے ساتھ بھی رات گزار سکتے ہیں۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنسی بولی۔

"ٹل چاہتا ہے ایسے بے اورد مشورے دینے والے کی گردن ٹوڑی جائے" میں نے کہا۔

"ٹکی کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں ہے" وہ طویل سانس لے کر لکھ۔

ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو سامنے سے ٹوٹی اور شیخ شاہ ہاتھ ملتا ہاتھ ڈالے آتے دکھائی دیے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر راکھ تو شیخ شاہ بولا "سنا ہے آؤنڈر میں کچھ گزیر ہوئی تھی؟"

"ہاں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ خیریت ہی رہی" میں نے کہا پھر پوچھا "تم دونوں کہاں غائب تھے؟ پورے ہوٹل میں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں اب موبائل فون پر تم سے رابطہ کرنے کی

ٹوٹی مکرایا اور بولا ”ٹھیک ہے سرا اگر وہ ایسی ہی توپ چڑھے تو اس توپ کا گولہ نکال دیتے ہیں۔ گولے کے بغیر توپ بے کار ہوگی۔ محض لوہے کا زہر ہوگی۔“

”ابن شاہ کی کرنا پڑے گا“ میں نے اور دوا دھر دیکھتے ہوئے کہا ”اب مسئلہ محض ایک بے سارا عورت کے ساتھ جبراً زیادتی کا نہیں رہا بلکہ اس میں ہماری اتنا کا مسئلہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے جبار جیلانی نے ہماری غیر ملکی ڈوم پر پاؤں رکھ دیا ہے۔۔۔۔۔ اور تمہیں معلوم ہے کسی کی غیر ملکی ڈوم پر پاؤں رکھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ ہم جیسے لوگوں کے معاملے میں تو یہ جرم زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔“

”بے شک“ ٹوٹی نے مسرت سے سر ہلایا ”ہم تو اپنی ڈوم کی فراہم اولین فرصت میں سنتے ہیں۔“

”دکم کے اجرام کا تھکا ہے کہ اس پر جو بھی پاؤں رکھا گیا ہے اس کی فوراً ذرا اچھی طرح خبر لی جائے“ شفیع شاہ نے بھی نیچر کی سے تائید کی پھر کہا ”تین جلد از جلد جبار جیلانی کے بارے میں ضروری معلومات جمع کر کے آپ کو مطلع کرتا ہوں۔“

یہ کام اس کے سپرد کر کے میں مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد راجہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اوپر آیا۔ میں پھر گرام ختم ہونے تک آؤ تو دم میں رہا پھر شفیع شاہ کے ساتھ دروازے پر کھڑے ہو کر مسافروں کو رخصت کرتا رہا۔ ان کا ریکی شکر یہ ادا کرتا رہا۔ میں صبح کا اُجالا پھیلنے سے کچھ ہی پہلے اپنے کمرے میں پہنچا۔

دوسرے روز میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔ پھر اٹھا تو ناشتے دیکھ کر بعد مصروفیت ہی شروع ہو گئی۔ لاہور والے درست واپس جا رہے تھے۔ صرف ٹوٹی کو میں نے روک لیا تھا۔ راجہ بھی واپس جا رہی تھی۔ سب ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ہم سے علیحدگی اختیار نہیں کر رہی تھی۔ اندری اندر سب خوش ہوئے تھے لیکن اسے زچ کرنے کے لیے سب نے اس کا خوب مذاق اڑایا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے آئندہ اس قسم کی ”ذرا سے بازی“ کی تو اسے اٹھا کر کسی جوتہ میں پیچک دیا جائے گا۔

ان لوگوں کے رخصت ہونے تک میں کچھ ایسا مصروف رہا کہ مجھے مسرورانی کا خیال ہی نہیں آیا۔ شام کو جب ذرا فرصت میری آئی تو مجھے خیال آیا کہ انہوں نے فون کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ان کا فون نہیں آیا تھا۔ ذرا تاج بھی نہ تو خود آئی تھی اور نہ ہی اس کا فون آیا تھا ورنہ شاید اس سے ان کے بارے میں کوئی اطلاع ملی جاتی۔

ایسا معلوم ہوا تھا کہ ذرا تاج کی طرح شاید مجھے بھی اس قانون سے خاصی انیت ہو گئی تھی اور اس انیت کے نتیجے میں اس وقت ہمارا ٹیلی پیچک رابطہ قائم ہو گیا تھا کیونکہ جو نئی میں نے انہیں فون کرنے کا ارادہ کیا، میری یکہ بڑی امیر نے بتایا کہ ان کا

اجما ہے۔ کزور پہلو کیا ہیں، کہاں کہاں راجیلے ہیں، اس سے ”چکا“ لینے سے پہلے جتنا ہم درک ضروری ہو، وہ کرلو۔ اسے توڑنا سنا سبق دنا ہے۔“

”مسرورانی کے سلسلے میں؟“ ٹوٹی نے تصدیق کرتی تھی۔

”ہاں۔ ذرا تاج کی سفارش ہے۔ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا“ میں نے کہا۔

”میں اسے توڑنا ہیمت جانتا ہوں سر۔“ شفیع شاہ بولا ”ایک تھوہ مرتبہ ملاقات بھی ہو چکی ہے لیکن شاید اسے یاد نہ ہو۔ اس کے بارے میں ہم درک کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔“

”دو چار روز میں مجھے اس کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دو۔ پھر دیکھیں گے کہ اس پر کس ذرا لے سے ساتھ ڈالنا مناسب رہے گا اور کہاں کہاں اس کے اثر و رسوخ کا ٹوکڑا ہو گا“ میں نے کچھ اور نیچے آؤ میں کہا ”مجھے ذاتی طور پر بھی اس شخص پر کچھ خاصا اچھی ہے۔ اس کے آدمیوں نے ہماری موجودگی میں مسرورانی پر بھری پڑی سرک پر فائزنگ کر کے انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ انہیں جیتنا معلوم ہو گا کہ اس وقت مسرورانی کس کے ساتھ جا رہی تھیں لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کچھ دیر پہلے اسی وقت میں مسرورانی کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔“

”ارے!“ ٹوٹی نے ہلکی سی سہمی بجائی اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ شفیع شاہ نے پُر خیال انداز میں ٹھوڑی ملتے ہوئے سر کو خفیف سی حرکت دی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اگر جبار جیلانی ایسی ہی توپ چڑھے جیسا کہ اس کے بارے میں سنتے ہیں آپا ہے تو اس کا بد معاشی کا نیت درک بھی خاصا وسیع اور مضبوط ہو گا۔ اس صورت میں اسے اب تک پتا چل چکا ہو گا کہ مسرورانی ہم سے مدد طلب کر چکی ہیں۔ ظاہری طور پر بھی کل سے وہ ہماری پناہ میں نظر آ رہی ہیں۔ اس کے باوجود جبار جیلانی کے آدمیوں نے آج ہمارے ہی ہونٹ میں مسرورانی کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اسے ہماری کوئی پروا نہیں۔ اور وہ ہمیں قطعاً خاطر میں نہیں لہا رہا۔“

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر میں نے گہری سانس لی پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”ذیر فریڈ زانچے ایسے لوگ بالکل پتہ نہیں ہیں جو ہمیں خاطر میں نہیں لاتے اور ہماری آنکھوں کے سامنے۔ بلکہ یوں کہو کہ ہماری ناک کے نیچے بری سے بدی بھرتا کارروائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں یہ تو پتا چنا چاہیے کہ اس شخص کو کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں جنہیں اس طرح کی کارروائیاں پتہ نہیں۔ اور جو اس طرح فروغیت زدہ انداز میں بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو دھک سکتے ہیں۔“

”بلکہ ہفتہ ضرورت توڑ بھی سکتے ہیں“ شفیع شاہ نے اضافہ کیا۔

زبان ہے۔

میں نے فون اٹھایا تو وہ میری آواز سننے ہی بولیں "افضل! یہی صاف کرنا۔۔۔ میں حسب وعدہ صبح تیس فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دے سکی۔ دیکھو کچھ زیادہ خیریت تھی بھی نہیں۔ صبح سے میری کھوپڑی گھومی ہوئی ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"بھئی وہ جبار جیلانی تو قاتلانہ حملوں کے بعد بالکل ہی بعد ارادہ جڑوں پر اُتر گیا ہے" وہ بولیں۔  
"کیا مطلب؟"

"آج میں دن چڑھے سوکرا تھی تو میرا ڈرائیو دے، مچن اور مکان کے ارد گرد کی نشی زمین کندے پانی میں ڈبلی ہوئی تھی۔ رات بارش بھی ہوئی تھی۔ اس سے گویا سونے پر ساگا ہو گیا۔"

"اصل وجہ کیا تھی؟"

"اصل وجہ بڑی "تفتیش" اور "تحقیقات" کے بعد معلوم ہوئی۔ میرے کئی گھنٹے اس چکر میں دوڑتے بھاگتے اور بعد ازاں سے اُلٹتے مگر کہئے۔ وہ سیورج کا پانی تھا اور رات رات اس کی سطح اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ میرا مکان بہت پرانا ہے لیکن شکر ہے اس کی اصل عمارت کا فرش اب بھی کافی اونچا ہے ورنہ شاید کنڈا پانی مکان میں داخل ہو جاتا اور میرا جو بھی غریبانہ ساز و سامان ہے سب برباد ہو جاتا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میرے مکان کی سیورج لائن میں ایسے مقام پر سینٹ کی بوری پھنسا دی گئی تھی کہ اس راک پر میرے مکان سے کافی پہلے جو سٹے ٹیلوں کی بلڈ ٹینکس وغیرہ ہیں ان کے کندے پانی کا بہاؤ بھی رک گیا تھا اور وہ پانی میرے مکان کے کنڑوں اور ہاتھ و پاؤں وغیرہ سے اُٹل پڑا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"خیرت ہے۔!" میں نے واقعی حیرت سے کہا "اس قسم کی ڈیر تو کوئی نہایت بدبودار ذہنیت کا مالک ہی سوچ سکتا ہے میں تو جبار جیلانی کو خاصا اونچے درجے کا بدعاش سمجھا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنا نیچے چلا جائے گا کہ کنڑا ٹینک تک جا پہنچے گا۔"

"بنیادی طور پر تو اس قسم کے لوگ گز کے چوہے ہی ہوتے ہیں نا۔۔۔ مسز ودائی فقرت سے بولیں "معاشرے کی گندی ٹالیوں کے کدے دینے لوگوں کے گھروں میں نصب لگے والے چوہے! مجھے تو اس سے کسی بھی قسم کی حرکت کی توقع ہی ہے۔ بہر حال اس سببت سے سنٹ کر ٹینگی تو ایک سرکاری گاڑی میں دو آدمی آگئے۔ انہوں نے ایک گھنٹے کا نام بتایا اور کہنے لگے کہ وہ اس کے کدے زیادہ سنٹ سے آئے ہیں۔"

"آپ نے انہیں اندر تو نہیں گھسنے دیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"تم کیا مجھے بالکل ہی بے وقوف سمجھتے ہو؟" انہوں نے گویا بڑا ملاتے ہوئے پوچھا۔

"مگر گز نہیں۔" میں نے دانت داری سے جواب دیا۔

"بس۔۔۔ تو پھر میں بھلا انہیں اندر گھسنے کا موقع کیسے دے سکتی تھی؟ میں نے تو ان کے لیے گیٹ بھی نہیں کھولا۔ میرے گیٹ میں چھوٹا سا ایک چوکور ٹکڑا ہے۔ اس کے پیچھے بھی مضبوط آہنی شٹر لگا ہوا ہے۔ کسی بھی انجینی سے میں اسی ٹکڑا کے راستے بات کر سکتی ہوں۔ اگر میں اس کی کوئی ذرا بھی مشکوک حرکت دیکھوں تو فوراً ایک طرف ہو کر شٹر بند کر سکتی ہوں۔ گیٹ بہت مضبوط ہے چار ڈیڑھ ڈیڑھ خاصہ اونچی ہے اور اس پر خاردار بازو لگی ہوئی ہے۔ اندر سے مکان بے شک کھنڈر ہو رہا ہے لیکن اس میں بلا اجازت گھسنا بہر حال بہت مشکل ہے۔ تم میری بہت کی داد دو کہ میں تو سیورج والے سٹے سے بھی اس طرح فٹنی رسی کے گیٹ بند کر سکتا ہوں کہ لے لے بھی لگتا نہ رہتا ہے۔ اس سلسلے میں جب مجھے خیال ہوا کہ لگتا بھی پڑا تو میں اپنے آپ کے زمانے کی رائے کو مٹانے کے لیے کہنے لگا "ان کے لیے میں فخر ٹھک گیا۔"

"آپا کے زمانے کی رائے۔۔۔؟" میں نے کرا کر پوچھا "وہ قاتر بھی کرتی ہے یا نہیں؟" کہیں اس کی گولی رور میں میں تو نہیں جاتی؟"

"ہذا حق آواز نے کی ضرورت نہیں۔" ان کے لیے میں ہلکی سی فٹکی اُٹھی "وہ "مہرنگن" رائے ہے۔ آج بھی بہترین حالت میں ہے اور اس کی کارکردگی آج کل کی جدید رائےوں سے اچھی ہے۔"

"وہ۔۔۔ صاف سمجھ گئے۔ میں بھول گیا تھا کہ بعض چیزوں کا "اولڈ انڈر کولڈ" والا سالہ ہوتا ہے۔" میں نے ان کی آئینہ قلب کے لیے کہا "بہر حال۔۔۔ ان دو آدمیوں کے بارے میں بتائیے۔ انہوں نے مزید کیا کہا؟"

"کہہ رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی ہے یہ مکان بہت مخدوش حالت میں ہے اور اس میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے یا تو اس کی مرمت کرائی جائے اور پھر سروے فٹارمنٹ سے معائنہ کرایا جائے ورنہ اسے خالی کر دیا جائے۔" مسز ودائی نے بتایا۔

"بہت خراب!" میں نے ہلکی سی ہنس کے ساتھ کہا "جبار جیلانی ہر طرف سے دباؤ پر سامنا ہے۔ ہر حربہ آزمایا ہے۔ آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں ایک جلابی خاتون ہوں لیکن جلابی میں آنے سے پہلے میں نے گیٹ کے ٹکڑا سے ہی خوار و غریبوں سے انہیں گھورتے ہوئے تھوڑی سی جرح کی کہ آخر انہیں اطلاع کس نے دی کہ میرا مکان مخدوش حالت میں ہے؟ اس کا تو بھی سروے ہی نہیں ہوا۔ میرے پاس پڑوس میں کوئی نہیں رہتا جو جا کر کسی گھنٹے کو اس قسم کی اطلاع دیتا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انہیں ایسا ہوا تھا۔ فرشتوں نے اطلاع دی تھی یا مکان خود جل کر ان کے پاس گیا تھا کہ جناب میری حالت زار ملاحظہ فرمائیے؟"

ان کے انداز پر مجھے ایک بار پھر ہنسی اُٹھی "پھر وہ کیا بولے؟"

میں نے پوچھا۔

"وہ میرے طور مزاح سے قطعاً محفوظ نہیں ہوئے اور انہوں نے مجھے مروجہ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ معلوم نہیں کون کون سے سرکاری کاتھرات لہرا لہرا کر مجھے دکھاتے رہے کہ مجھے فلاں فلاں دفعہ، فلاں فلاں قانون کے تحت نوش باری کیے جائے۔ رہے ہیں لیکن میں نے کسی کا کوئی جواب نہیں دیا اس لیے میرے خلاف فلاں فلاں کارروائی ہو سکتی ہے۔ اور یہ کہ عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ان کے اپنے ذرائع ہوتے ہیں۔ اور اس مکان کو تو بے ہوش دیکھنے ہی اتنی مدت گزر چکی ہے۔ وہ دیکھو دیکھو۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

"پھر میں جلال میں آگئی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ فوراً اپنی منحوس شکلیں لے کر دفع ہو جائیں ورنہ میں کسی نامعلوم دفعہ کے تحت ان شکلوں کو مزید نگاہ دوں گی۔ وہ میرے رعب اور برہمی کو خاطر میں نہیں لائے۔ کہنے لگے کہ میرا دیتے بہت خراب تھا اور میں سرکاری کام میں مداخلت، مزاحمت اور نہ جانے کیا کچھ کر دی تھی، اس لیے میرا جلالان ہو گا۔ وہ ایک فائل گاڑی کے پوٹ پر رکھ کر معلوم نہیں کاتھ پر کیا کچھ کہنے لگے۔ تب میں نے اپنی اس پرانی دندانہ دار راکٹ کی ٹال گیٹ کے سوراخ سے نکالی اور انہیں بتایا کہ میں صرف تین تک گزوں گی۔ اگر اس دوران وہ وہاں سے رخصت نہ ہوئے تو ان کی کھوپڑیوں کے ٹکڑے ہوا میں اڑ رہے ہوں گے اور کچھ دیر بعد ان کی لاشیں پر چلیں گے اور گدھ چشمن سارے ہوں گے۔"

وہ غالباً سانس لینے کے لیے دیکھیں تو میں نے پوچھا "ان پر آپ کی دھمکی کا اثر ہوا؟"

"بہت اچھا اثر ہوا" مسزورانی نے مسرورہ لیے میں بتایا "وہ دُور دبا کر بھاگے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ہی یہاں سے دفع ہو گئے۔"

"حیرت ہے!" میں نے کہا "انہوں نے آپ کی راکٹل کے جواب میں آپ کو کوئی کا شکوف وغیرہ نہیں دکھائی؟"

"نہیں" مسزورانی بولیں "وہ جیج سرکاری ملازم ہی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں بھجوانے کا انتظام تو جبار جیلانی نے ہی کیا ہو گا لیکن وہ میرا اصل سرکاری ملازم معلوم ہوتے تھے۔ اس کے کڑکے یا بد سانس نہیں تھے۔ بے ضرر معلوم ہوتے تھے۔ راکٹل دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے تھے۔ انہیں اس قسم کے استہلال کی توقع تھی نہیں تھی۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا "میں نے ٹھیک کیا؟"

"بالکل ٹھیک کیا" میں نے بالفاظِ کہا "اب آپ کو اپنا دیتے دیباہی رکھنا ہے کیونکہ اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"جب تم میرے ساتھ نہیں تھے تب بھی اکثر معاملات میں میرا رویہ تقریباً ایسا ہی ہوتا تھا" مسزورانی گفتے کیے میں بولیں "اب تمہاری پشت پٹائی میرا بھی ہے تو میں ذرا اور شریک شادی شیری ہو گی ہوں۔ لیکن مجھے شیری بڑا کر موانہ نہ ملے۔" وہ میرے سے نہیں۔

مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ اتنے دباؤ، دھمکیوں اور جسمانی بھاگ دوڑ کے بعد اس عمر کی کوئی خاتون اس زعمہ ملی اور کلکل سے بات کر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں اس پر مجھے ایک انتہائی سی خوشی ہوئی۔ میں نے مجھے لیجے میں کہا "زندگی اور موت کے بارے میں تو آپ اپنا فلسفہ بیان کری چکی ہیں۔ آپ کا اور میرا فلسفہ تقریباً یکساں ہے۔"

"میں تو مذاق کر رہی تھی" وہ جلدی سے بولیں "میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ میں تو یہ گھر چھوڑنے سے ڈرتی ہوں۔ یہ گھر چھوڑنے کے نتائج میں مجھے مرنا تا زیادہ آسان لگتا ہے۔"

"حیرت ہے۔!" میں نے بے اختیار کہا۔ وہ واقعی ایک عجیب عورت تھیں۔ میں نے گھر کے بارے میں بہت سے لوگوں کو جذباتی وابستگی میں گرفتار دیکھا تھا مگر یہ شدت اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

"میرے محسوسات کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا" وہ بولیں۔

"میں سمجھ رہا ہوں" میں نے انہیں اطمینان دلایا۔ "کافی حد تک آپ نے سمجھا ہوا ہے مزید کہنے کی کوششیں میں جاری رکھوں گا۔ اچھا یہ بتائیے۔۔۔ ان دو سرکاری ملازموں کے جانے کے بعد سے تو سکون ہے نا؟ راوی یقین لگھ رہا ہے نا؟"

"یقین کماں ہے میرے نصیب میں!" وہ لفظی سانس لے کر بولیں "یہ تمہارے راوی اور چناب سبھی مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیا اور کوئی بھی؟ کیا تھا؟" میں نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

"ہاں۔ مہمان خصوصی تو بعد میں ہی آیا تھا۔ یہ کہہ کر انہوں نے توقف کیا۔ شاید وہ تجسّس پر اکرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور اس کو خشش میں کافی حد تک کامیاب تھیں۔

"کون تھا وہ؟" میں پوچھنے بغیر نہ سکا۔

"جبار جیلانی کا چھوٹا بھائی غفار جیلانی" انہوں نے جواب دیا۔

"اور خدا اے۔!" میں بے اختیار کراہ اٹھا "یک نہ شدہ وہ۔"

"مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ جبار کا کوئی چھوٹا بھائی بھی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ سناشرے میں گند پھیلانے کے لیے وہ اکیلا ہی کافی ہے مگر یہ تو دوسرا بھی نکل آیا۔" وہ بولیں۔

"میرا آدمی اب اکیلا دیکھا کماں ہوتا ہے مسزورانی! ان کی تو ڈلیاں ہوتی ہیں۔ گردہ ہوتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ پوری فوج

انوج ہوتی ہے زمانے کی ترقی نے ان کا کام بھی آسان کر دیا ہے۔ ان کا اپنا ایک نیٹ ورک ہوتا ہے۔ میں نے لٹریچر سائنس نے کرکنا ایک مدت سے بد معاشی بھی جدید خطوط پر استوار ہو چکی ہے۔ اب وہ پڑانے زمانے والی باتیں کمال ہیں۔

”ہاں۔۔۔ یہی تو مصیبت ہے۔“ انہوں نے تسلیم کیا ”بد معاشوں کا اتحاد ہے شرفا میں انتشار ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔ یہی بات میں اپنے جاننے والوں کو ایک عرصے سے بتاتا رہا ہوں مگر شرفا کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔ یہ چھوڑنے میں باتوں کو۔۔۔ یہ بتائے غفار بیٹائی نے کیا تقریر؟

”ابوہ اپنے ساتھ کچھ بد معاش وغیرہ بھی لے کر آیا تھا؟“

”ارے۔۔۔ اسے بد معاشوں کی کیا ضرورت تھی؟ وہ لٹریچر سائنس لے کر بولیں۔“ وہ تو خود سو بد معاشوں کا ایک بد معاش معلوم ہوا تھا۔ اس کا تو چہرہ ہی اس کا تعارف تھا۔ وہ جو مصراع ہے۔۔۔ کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔ تو اس طرح موصوف کو دور سے ہی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کیا چیز چلی آ رہی ہے۔ حالانکہ سوٹ بوٹ میں تھا اور جین گاڑی میں آیا تھا۔“

”ماڈرن بد معاش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ دو صوبوں یا اندھ کر گزرا اس کا اڑی بالا بھی کدھر سے پر دھ کر نہیں آتے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن کچھ چیزیں ایسی تھیں جو اس کے ماڈرن ٹھیلے کے ساتھ شامل نہیں کھا رہی تھیں۔ مثلاً اس کا چہرہ ایسا تھا جیسے اس پر بہت سے باکرمش کرتے رہے ہوں۔ ناک چکی ہوئی اور کئی دھڑوں کے کدھم ٹھان۔۔۔ ایک ابوہ کا کچھ حصہ غائب۔۔۔ لچھا اونٹ چھ میں سے کٹا ہوا۔“

”غربت کے زمانے کی نشانیوں ہوں گی۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”مثلاً یہ مسزورانی پولیس، بہر حال اب تو دولت کی چمک دکھانے چہرے کی خوراک کے آثار کو بڑی حد تک چھپایا تھا۔ چھٹ سے اوپر اس کا دھڑا اور اچھا خاصا پاڈی بلڈر معلوم ہو رہا تھا۔ سوٹ میں بھی اس کے مسل پختہ دکھائی دے رہے تھے۔ حالانکہ مگر اچھی خاصی تھی۔ وہ کوئی نوجوان نہیں تھا مگر خدوخال پر زوال کے آثار نہیں تھے۔ اس نے کچھ ایسی آواز میں بات چیت شروع کی جیسے رنگ تلوڑ آ رہی ہے کسی گیلی گولی کو کاٹنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔“

”کیا اسے آپ نے اندر آنے دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ جی۔۔۔ ایسے اہل خانہ سوالات مت کرو۔ میں تو آج کل ملی کے کسی مفندہ بچے کو بھی گھر میں داخل نہیں ہونے دے رہی۔ ایسے آدمی کے لیے بھلا کیسے گیٹ کھول سکتی تھی جو شکل سے ہی ماڈرن چنگیز خان معلوم ہو رہا تھا۔“

”گیا تمام مذاکرات گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی ہو رہے تھے؟“

میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔“ انہوں نے جواب دیا ”میں ہنگام کے اندر کی طرف تھی اور وہ بار کھڑا تھا۔ کچھ میں صرف دی جھوٹا سا چور سورخ تھا۔ میرا خیال ہے اس نے اپنی دانست میں کافی نرم لہجے میں بات شروع کی تھی لیکن اس کا نرم لہجہ میں بات کرنا بھی ایسا ہی تھا جیسے بھیڑیا کسی بھیڑ پر غرار ہو۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اپنے بھائی کی طرف سے مجھ سے بات کرنے آیا تھا۔ میں اس کے بھائی سے ایک مرتبہ اتفاقاً مل چکی ہوں۔ جب یہ مکان کا چکر نہیں چلا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس کا بڑا بھائی کم از کم ظاہری طور پر تو ہزار درجے بہتر ہے۔ وہ پھر بھی تو ہوا بہت خاندانی اور مہذب آدمی نظر آتا ہے۔“ وہ ایک لمبے کے لیے خاموش ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے غفار بیٹائی کا قصور کرتے ہوئے ہلکی سی جھڑپ بھی کی تھی۔

پھر انہوں نے سلسلہ کلام جو آٹھ اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس کے بھائی نے مکان کے سلسلے میں مجھے بہت متعلق پیش کش کی تھی لیکن میں مسلسل انکار کر کے اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہی تھی۔ میں نہ صرف ایک بڑی رقم سے محروم ہونے کا سامان کر رہی تھی بلکہ اپنے لیے نہ جانے کتنا بڑا خدوخل مل لے رہی تھی۔ میں نے اپنی دانست میں نہایت غضب ناک ہو کر اس سے پوچھا ”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ وہ بڑے اطمینان سے بولا ”ہاں۔۔۔ دھمکی دے رہا ہوں اور صرف بھائی جان کی تحمل مزاجی کی وجہ سے اب تک اس دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اب بھی وقت ہے۔۔۔ کہہ دو کہ تمہیں ہماری پیشکش منظور ہے۔“ میں نے اسے یہی جواب دیا کہ میں اب بھی اس پیشکش پر غصت بھیجتی ہوں۔“

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے دریافت کیا۔ وہ غالباً سانس لینے کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

”وہ کہنے لگا کہ وہ لوگ کسی بات کے جواب میں انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھ سے واسطہ پڑنے کے بعد وہ انکار سننے کے عادی ہو جائیں گے۔ اس پر اس کا کٹا پھٹا ہونٹ فٹے سے تھڑھکا لگا۔ اس نے مجھے ہانگی، خردماغ برصیا اور اس قسم کے کچھ دوسرے القابات سے نوازا۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئیں۔

”تو پھر آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے اسے اس سے بھی کچھ زیادہ بڑے القابات سے نوازا، مجھے خود بھی آج پہلی بار اندازہ ہوا ہے کہ میں ضرورت پڑنے پر کتنی بد زبان ثابت ہو سکتی ہوں۔ اس کا ناموار چہرہ لال بیہوش ہو گیا۔ اس نے بالکل اسی طرح زمین پر دو تین مرتبہ ہانگی بھی مارا جس طرح مل فافٹک کے میدان میں بھینسا دوڑنا شروع کرنے سے پہلے مارا ہے۔“

میں اس صورت حال کے قصور سے محفوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جبار اور غفار کو واقعی ایک تنہا لاوارث اور عمود سیدہ عورت سے اس قسم کے رویوں کی قطعاً توقع نہیں رہی ہوگی۔ یہی اور

دروازے پر تو کسی کو گولی مارنا کوئی معقول حرکت نہیں ہے۔  
 ”وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اگر گولی اسے ہی لگ جاتی تو ہوا  
 تھا۔ مجھے قطعاً کوئی افسوس نہ ہوتا“ وہ غم زدہ سے لمبے میں بولیں۔  
 ”تو کیا گولی کسی اور کو لگ گئی؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔ ذرا کم بلندی پر اڑتی ہوئی ایک جیل کو لگ گئی۔  
 ایک عجیب اتفاق! بلکہ یوں کہو کہ ناقابل یقین ہی بات ہے۔ اگر  
 میں نشانہ باندھ کر اسے گولی مارنے کی کوشش کرتی تو ہرگز نہ لگتی۔  
 یوں اچانک لگ گئی۔ وہ بے چاری پٹ سے گری اور ایک درخت  
 میں اٹک گئی۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لٹک گئی۔ مجھے بڑا افسوس  
 ہوا۔ اس بے چاری نے میرا کیا کاڑا تھا؟“ وہ بے گناہ جیل کی اس  
 ناگمانی موت کے غم میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئیں۔  
 ”غفار کا کیا حال ہو رہا؟“ میں نے پوچھا۔

”گولی چلنے کے بعد گن کی نال بہت تپ جاتی ہے لیکن اس نے  
 آف تک نہیں کی اور اسی طرح راتقل کی نال پکڑے رہا اور رات  
 پس کر کسی حد تک فطمی انداز میں بولا ”اور گولیاں چلا لے بڑھیا!  
 تجھے ہوا میں گولیاں چلانے کا شوق ہے تو پورا میگزین خالی کر لے“  
 میں نے راتقل کو داپس اندر کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس کی نال  
 گولیاں کسی گٹھے میں پھنسی ہوئی تھیں اور اپنی جگہ ساکت تھیں۔ اچھی  
 بات یہ تھی کہ گٹھ کا وہ چوکور سوراخ چھوٹا تھا۔ غفار نے گویا جوتا  
 راتقل باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس کا میگزین اور دسٹ والا حصہ  
 سوراخ سے نہیں نکل سکا۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد شاید وہ  
 باہر ہی سے نال کو توڑ مروڑ کر اکھاڑ کر دکھ دیتا۔۔۔ اور یہ زیادہ مشکل  
 کام نہیں تھا۔۔۔ پوری نال باہر تھی۔ لیور کے اصول کے مطابق  
 اسے موڑا جاتا تو زیادہ طاقت نہ لگنی پڑتی اور وہ اٹک ہو جاتی مگر  
 میری خوش قسمتی تھی کہ کھینچنے کی نال میں اس کا ہاتھ نال پر سے پھسل  
 گیا اور میں نے فوراً راتقل اندر کھینچ کر کھٹ سے شربتہ کر لیا۔  
 میں اس راتقل کو اپنے آپ کی نشانی سمجھتی ہوں۔ میں اسے کوئی  
 نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔  
 ”یعنی آپ نے ایک ہی گولی چلانے پر اکتفا کیا؟“ میں نے  
 پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ بس وہ بھی جلال میں آکر چلا دی۔ بعد میں کافی دیر  
 تک میں اس ناگز اور کھینچاٹائی کے اثرات سے بدحواس رہی۔  
 میرے ہاتھ پاؤں کا پتہ رہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔  
 ”اب تو ٹھیک ہیں نا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔۔۔ اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا تمہیں میری باتوں سے  
 اندازہ نہیں ہو رہا؟“

”ہاں۔۔۔ اندازہ تو ہو رہا ہے“ میں نے تسلیم کیا ”آپ خوف  
 زدہ معلوم ہونے کے بجائے خوش معلوم ہو رہی ہیں۔“  
 ”اگر سے تو میں کچھ دیر پہلے تک سخت خوف زدہ تھی لیکن پھر  
 مجھے اس احساس سے بڑی خوشی ہوئی کہ جو لوگ مجھے اکیلے اور بے

زور تاج کی حمایت میں آجائے کے بعد واقعی مسزورانی میں  
 بڑا حوصلہ آگیا تھا اور وہ بڑی بے غمی سے ان لوگوں کا سامنا کرنے  
 کے قابل ہو گئی تھیں۔ خدشہ تو وہ پہلے ہی تھیں۔ جبار اور غفار جیسے  
 لوگوں کے دماغ کسی نہ کسی حد تک ہلانے کے لیے اس قسم کے  
 تجربے موثر ثابت ہو سکتے تھے۔  
 ”پھر اس نے دو ڈکریٹ کو فکر تو نہیں ماری؟“ میں نے شکستہ  
 لمبے میں پوچھا۔

”اب وہ اتنا بھی باگل نہیں تھا“ مسزورانی بولیں ”اس نے یہ  
 حرکت تو نہیں کی البتہ میری موت کی تاریخ مقرر کر دی۔ اس نے  
 کہہ دیا کہ اگرچہ دن کے اندر اندر میں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو  
 ساتویں دن میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ میں نے کہا کہ یہ  
 کوشش تو وہ لوگ پہلے بھی کر چکے ہیں لیکن میں دنیا میں موجود  
 ہوں۔ اس پر وہ بولا کہ اب تک وہ حقیقت سنجیدگی سے کوئی کوشش  
 نہیں کی گئی۔ ابھی تو مجھے صرف یہ بتانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے  
 کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

وہ دھیرے سے اسیں لیکن میں نے عروس کیا کہ یہ ایک  
 معطلانہ فہمی تھی۔ پھر وہ بولیں ”کتنا بھول رہا تھا غیبت کہیں  
 کا!“

”آپ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟“ میں نے جانتا چاہا۔  
 ”میں نے اس سے کہا کہ وہ تو ساتویں دن کی بات کر رہا تھا  
 لیکن اگر وہ اپنی جنسی شکل لے کر فوراً وہاں سے دفع نہ ہوا تو وہ  
 آج۔۔۔ بلکہ اسی وقت دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر میں  
 نے اسے اپنی کند سال اور وقار اور راتقل کی جھلک دکھانے کے  
 لیے اس کی نال گٹھ کے سوراخ سے نکالی مگر وہ محسوس ذرا بھی  
 مرعوب نہ ہوا۔ مگر ماری ملازم تو راتقل دیکھتے ہی دم دبا کر بھاگ  
 گئے تھے لیکن وہ انٹائیٹ کے کچے اور قریب آگیا اور خمارت سے  
 بولا ”پاکل بڑھیا! اسے اندر ہی رکھ۔۔۔ اس قسم کے کھلونوں سے  
 ہمارے نوکروں کے بچے کھیلنے ہیں“ کثرت مجھے بڑھیا کہہ رہا تھا۔  
 مجھے تو فوری طور پر گولی چلا دی جاوے تھی لیکن میں نے چند سیکنڈ کی  
 تاخیر کر دی۔“

”اس کا مطلب ہے آپ نے گولی بہر حال چلائی تھی؟“ میں  
 نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں“ وہ اطمینان سے بولیں ”اس نے مجھے مزید کچھ بڑا بھلا  
 کہا تو میں نے راتقل کا رخ اس کی طرف کرنے کی کوشش کرتے  
 ہوئے بے حد کوشش کی لیکن اس بد بخت نے بدوقت راتقل  
 کی نال پکڑ کر اس کا رخ کافی دیر کی طرف کر دیا۔“

”پہلیں ختم۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ فی الحال اسے گولی نہیں گئی۔  
 آپ کے لیے خواہ مخواہ مصیبت کمزوری ہو جاتی“ میں نے اطمینان کی  
 سانس لے کر کہا ”اگر اسے گولی مارنا بہت ہی ضروری ہو جائے گا  
 تب بھی کسی طریقے پہلے سے سامنے پڑے گی۔ میں اپنے گھر کے



کوئی تم سے سیکھے۔

”آپ اسے محض دل رکھنا مت سمجھیں“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”چھاپے تائیں۔ جب آپ نے رات گھل اندر کھینچ لی اور گیت کا وہ سوراخ بھی بند کر لیا تو غبار نے کیا کہا؟“

”اس نے مجھے مزید بڑا ہلکا کیا۔ بڑے سناج کی دھمکیاں دیں لیکن آخر کار درخت ہو گیا“ مسز درانی نے بتایا۔

میں محض ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میں خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں اس عمر میں بھی ایسے سے کہیں زیادہ بڑی قوت سے مقابلہ کرنے اور اس کے جبر کو تسلیم نہ کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ اس کی ”فائنلک اسپرٹ“ ان لوگوں کے لیے ایک نمونہ تھی جو کل جیل کے چھوٹے موٹے بد معاشوں کے سامنے بھی سر نہیں اٹھاتے اور یوں انہیں بلا مزاحمت زیادہ بڑے بد معاش بننے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مسز درانی بولیں ”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”حکم؟“ میں نے اختیار نہیں دیا ”میری کیا خیال کے میں آپ جیسی جلالی خاتون کو کوئی حکم دوں۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کل دوسرے کے قریب آپ کے پاس آؤں گا۔ میں اس دوران میں اپنے وکیل سے آپ کے مکان کے لیے اپنے نام ایک پاور آف اٹارنی تیار کر لیتا ہوں جس کی مدد سے آپ کے مکان کے بارے میں تمام اختیارات مجھے حاصل ہو جائیں گے۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں تو اس پاور آف اٹارنی پر دستخط کر دیجئے گا۔“

”اعمو کی خوب بات کی تم نے۔۔۔“ وہ میری بات کاٹ کر ڈانٹنے کے سے انداز میں بولیں ”تم میرے لیے اتنے فیض اور اتنے خطرناک آدمی سے اپنی کسی ذاتی غرض کے بغیر دشمنی مول لے رہے ہو اور میں تم پر اعتماد بھی نہ کروں تو پھر مجھے اپنے لیے کسی اچھے انجام کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ تم اگر کہو تو میں مکان تمہارے ہی نام کروں یا وصیت کروں کہ میرے انتقال کے بعد یہ تمہیں ملے۔ اسے تم میری طرف سے تحیر سا خند سمجھا۔ اس مکان میں میری دلچسپی تو صرف اتنی ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تب تک کوئی مجھے اس میں سے نہ نکالے۔ میری موت کے بعد یہ کس کے پاس جاتا ہے اس کی مجھے ذہن برابر بھی پروا نہیں۔ اگر تم جیسے کسی شخص کے پاس چلا جائے تو مجھے۔۔۔ یا ہوں کہو کہ میری مدد کو خوشی ہوگی۔“

”کی نہیں۔۔۔ مجھے آپ کے مکان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ ہی میں اسے آپ کی زندگی میں یا آپ کی موت کے بعد حاصل کرنے کی کوئی خواہش رکھتا ہوں“ میں نے بڑے زور سے کہا ”مجھے تو پاور آف اٹارنی کے کاغذات صرف اس شخص ہمارے جلالی کی آنکھوں کے سامنے لہرانے کے لیے چاہئیں۔ میں کاغذات اسے دکھا کر بتاؤں گا کہ مکان کے مسئلے میں مسز درانی نے ہر چیز کا مالک

آہرا سمجھ کر خوف زدہ کرنے آئے تھے میں نے انہیں کیسا سہ توڑ جواب دیا۔ میں ان کے سامنے کڑوا لائی نہیں۔ میں نے ان سے رحم طلب نہیں کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے نظر آنے میں بڑی لذت ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہر انسان ہمدردی دکھانا یا ہمدردی نظر آنا انفرادی نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان فطری طور پر ہمدرد ہوتا ہے لیکن حالات اسے اپنی ہمدردی دکھانے کا موقع نہیں دیتے۔ وہ مصلحت کو سچی یا مجبوروں کے ہاتھوں سے دفن ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی کسی پر ایک کم معصوم شاعر یا راض مجید کا یہ مصرع بھی صادق آتا ہے کہ۔۔۔ میں ہمدرد ہوں مگر ہمارے ہونے لنگھ کر ہیں ہوں۔ لہذا اگر انسان اپنے آپ کو ہمدرد ثابت کرنے کی پوزیشن میں ہو تو اسے اس موقع کو کبھی ایک نکتہ سمجھنا چاہیے۔ اس فقرہ اور کرنا چاہیے۔“

”آج تو آپ بڑے کام کی باتیں کر رہی ہیں“ میں نے کہا۔

”اب مجھ پر سب خوف کی برف چھلی ہے تو میری اصلی شخصیت سامنے آ رہی ہے“ وہ بولیں ”میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے بد معاش اور بچے خاں نظر آتے ہیں اور حقیقت یہ اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں کیونکہ انہیں خود بھی پتا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، ناجائز کر رہے ہیں، ظلم کر رہے ہیں۔ ان کے لاشعور میں ایک احساس جرم ضرور جاگزیں ہوتا ہے جو ان کی بزدلی کی جڑ ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات حالات ان کے حق میں ہوتے ہیں اور انہیں ایک مصنوعی ہی طاقت حاصل ہوتی چلی جاتی ہے اس لیے وہ ہمدرد نظر آنے لگتے ہیں جبکہ ہمدردی اصل میں صرف شریف اور دیانت دار آدمی ہوتا ہے مگر معاشرے میں اس کی تلافی، اس کے حالات اور مجبوریوں اس پر ایسا دخل چڑھا دیتی ہیں کہ وہ بزدل نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ایک عجیب قسم غلطی ہے۔ معاشرے کا یہ الٹ پھیر بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے۔“

میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ درحقیقت اس وقت خون پر محض گھٹنگو سے گویا مسز درانی کا ایک ناپوچ میرے سامنے آ رہا تھا۔ درحقیقت میں گم غم تھا۔ انہوں نے جو بات کی تھی وہ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ درحقیقت یہ میرا ہی فلسفہ تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ میں اپنا یہ فلسفہ مسز درانی کے منہ سے سنوں گا۔ ابھی تک وہ مجھے قدرے سطحی عورت ہی نظر آتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذہین اور حساس ضرور ہیں لیکن میں انہیں ایک گمراہ عورت پر گز نہیں سمجھا تھا۔ اب میں اپنے ذہن میں ان کا ایجنڈا ایک نئے برے سے مرتب کر رہا تھا۔

”خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا میری باتوں سے بور ہو رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں“ میں نے جواب دیا ”میرے تو پہلے ہو رہا تھا۔ آپ کی باتوں سے بوسہ دور ہو گئی ہے۔“

وہ ذرا مسرور انداز میں دوسرے سے انہیں اور بولیں ”دل رکھنا

دوسرے روز میں ان کاغذ اس کی فائل لے کر مسز درانی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے کسی کو اس سلسلے میں مطلع نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو ساتھ لیا۔ میں آج اکیلا ہی ذرا اس مکان کا جائزہ لیتا اور اس کے بارے میں کچھ "فیشل" کرنا چاہتا تھا۔ مسز درانی نے جو جذباتی پس منظر بیان کیا تھا اس کی روشنی میں اس مکان سے ان کی وابستگی اور زندگی کے آخری سانس تک یہاں رہنے کا عزم میرے لیے عجیب یا حیران کن نہیں تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو اس طرح کے پس منظر کی وجہ سے کسی چیز کے بارے میں ایسی ہی جذباتی وابستگی میں گرفتار دیکھا تھا۔

نمبر نمبرو میرے پاس تھا۔ راستہ اور نشانیاں مسز درانی نے سمجھا دی تھیں۔ اس لیے مجھے کسی سے پوچھنے بغیر اس مکان تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تاہم اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ محض مختصرے ایڈریس کے سارے کسی عام آدمی کا وہاں تک پہنچنا واقعی مشکل تھا۔

میں نے گاڑی مکان سے کچھ دوری روک لی اور گاڑی میں ہی بیٹھ بیٹھ اس کا جائزہ لیا۔ یوں تو مکان خاصے بڑے پلاٹ پر بنا ہوا تھا لیکن اسے تقریباً کلڈزری کہا جاسکتا تھا۔ مسز درانی کی انہی شخصیت کی عمارت اس سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں تھی۔ مکان کی چار دیواری کچھ اچھی اور مضبوط حالت میں دکھائی دیتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ صرف چار دیواری کا خیال رکھا جاتا تھا یا پھر وہ مکان سے بہت بعد میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس سے پہلے مکان کے گرد لائن یا باغ یا غیر دیواروں کی بغیر چار دیواری کے چھوڑ دیا گیا تھا۔

وہ ایک چوکور اور سیدھا سادہ سا مکان تھا۔ گیت البتہ خاصاً اونچا اور مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ مکان سڑک سے کافی بہت کر تھا اور اس کے پہلوؤں سے دو پکنڈی نما راستے اس کے پیچھے کی طرف جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مکان میں گزرتا تھا کہ وہ آباد ہوگا۔ بڑی حالت میں تو میں نے بے شمار مکان دیکھے تھے لیکن اگر ان میں سے ایک بھی فرو دیتا تھا تب بھی احساس ہوتا تھا کہ وہ آباد ہیں مگر اس مکان کو دیکھ کر کسی اُٹھان یا بیان کا سا اثر ملتا تھا۔

مسز درانی کا تصور کر کے میرے ذہن میں حتم کی ایک لہر ابھری۔ بعض شاندار عورتوں کی زندگی ایک بے عنوان سی فحش کی نذر ہو جاتی ہے۔ براد ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اُچرے خوابوں کو سننے سے لگائے نامی کے کھنڈر میں دوڑ دھب کر رہتی ہیں۔

میں نے گاڑی وہیں چھوڑی اور ایک پکنڈی کے راستے مکان کے عقب میں چلا گیا۔ مکان کے عقب میں جھانپنا کچھ مشکل ہوا تھا حالانکہ یہاں کی زمین دھلی تھی اور یہ تلی زمین میں مشکل سے ہی کچھ اُٹتا ہے لیکن یہاں دور تک صحرائی سی جھاڑیاں اور قلعہ آدم گھاس پھیلی دکھائی دے رہی تھی۔ بہت دور سرسبز سی وحشت لہٹ میں لیٹے مسند کی لہریں بھی ساحل سے چمک رہی تھیں۔ تاہم ساحل نشیب میں تھا۔ اس سے کافی

دور تھا مجھے بتا دیا ہے پھر اس سے پوچھوں گا اب بتاؤ بیٹا کیا چاہے ہو؟ مکان کے سلسلے میں جو بھی بات کہتی ہے مجھ سے کہو۔ میں اسے دس کروڑ میں بھی بیچنا نہیں چاہتا۔ تم میں طاقت ہے تو مجھ سے چھین لو یا مجھے راستے سے ہٹا کر اس پر قبضہ کر لو اسے یہ پہنچ دینے کے بعد میں دیکھوں گا کہ اس کا وہ عمل کیا ہو آج ہے۔

"اسے یہ پہنچ تو میں بھی دے چکی ہوں لیکن اس نے میرا چچا تو نہیں چھوڑا" مسز درانی بولیں۔

"آپ کے اور ہمارے پہنچ دینے کے انداز میں فرق ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ کو تو ہم درمیان سے ہٹا دیں گے۔ پھر ہم جابیں اور جہاز بیٹائی جانے" میں نے کہا۔ "ہیں... اب آپ کل یہ کام کیجئے کہ اس پاور آف انامنی پر سائن کر دیجئے۔"

"بھئی تم مجھ سے دس پاور آف انامنی سائن کرالو لیکن اس مصیبت سے میرا چچا چھوڑا" مسز درانی بولیں۔

"مجھ لیں کہ آپ کا چچا چھوٹ گیا۔ اب تو شاید جہاز بیٹائی کو ہمارے سلسلے میں کسی کے پاس فریاد لے کر جانا پڑے کہ ان سے میرا چچا چھوڑا" میں نے کہا۔ "اب آپ مجھے اپنے مکان کے بارے میں ضروری تفصیلات بتا دیجئے۔ میں کل پاور آف انامنی کے کاغذات تیار کر کے آپ کے ہاں پہنچوں گا اور دھڑکا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ غالباً خوش ہوتے ہوئے بولیں "میں تمہارے لیے خاص طور پر بڑے اہتمام سے پھلی کی ایک ڈش تیار کروں گی جو شاید تم نے اس سے پہلے نہیں کھائی ہوگی اور اسے کھا کر تم اپنے فانیہ اسٹار ہوؤں گے کھانوں کو بھول جاؤ گے۔"

"انہیں تو میں پہلے ہی کسی شمارتھار میں نہیں سمجھتا" میں نے کہا۔

"بہر حال تم ضرور پانا کیونکہ میرا کسی کے لیے یہ ڈش تیار کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ برسوں بعد میں کسی کے لیے یہ اہتمام کروں گی۔ اگر تم نہ آئے تو میں وہ سارے برتن ہوئی ہی میں لا کر تمہارے سر الٹ دوں گی" ان کے لیے میں مان تھا۔

"پھلی کا سالن۔ اور وہ بھی کسی کے سر پر اُٹ دیا جائے۔ کیا عبرت انگیز منظر ہوگا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں یہ خبر مول نہیں لے سکتا۔ میں ضرور آؤں گا۔ جب یہ کام ختم ہو جائے تو مجھ سے وعدے کرنے کا کیا سوال؟ اب مکان کے بارے میں تفصیل بتا دیجئے۔"

میں نے ان سے کچھ سوالات کیے جن کے انہوں نے جواب دے دیے۔ وہ میں نے نوٹ کر لیے اور خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے اپنے دو کیلیں میں سے ان دو کیل صاحب کو فون کیا جو ہمارے جانکاد کے معاملات ڈھل کرتے تھے۔ انہیں میں نے پاور آف انامنی تیار کرنے کے بارے میں ہدایات دیں۔ رات سے پہلے پہلے کاغذات تیار ہو کر میرے پاس پہنچ گئے۔

”لیکن ہمیں اور آئے کی کیا ضرورت پڑی؟“ وہ نہ جانے کیوں کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہی تھیں۔  
”مٹی کی۔ ذرا سراغ رساں بننے کی کوشش کر رہا تھا“ میں نے جواب دیا۔

”سراغ رساں؟“ ان کی پریشانی گویا کچھ اور بڑھ گئی لیکن پھر وہ کچھ سنبھل کر بولیں ”لیکن مجھے تو تم کچھ اور لگ رہے تھے۔ میں ہمیں اس جانور سے تشبیہ دنا نہیں چاہتی۔ تم تو دیوار سوچتے پھر رہے تھے۔“

تب میں نے ذرا توجہ سے چھوٹے سے آہنی دروازے کی طرف دیکھا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ اس میں ایک بلیک آئی گئی ہوئی تھی جو سرسری انداز میں دیکھنے پر نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا مطلب تھا، مسز درانی نے پچھلا دروازہ کھولے بغیر بھی پچھلی طرف کا جائزہ لینے کا انتظام کیا ہوا تھا اور انہوں نے دروازہ کھولنے کے بعد مجھے نہیں دیکھا تھا بلکہ پہلے سے دیکھ رہی تھیں۔

”بس جانور سے آپ مجھے تشبیہ دنا نہیں چاہ رہیں وہ بھی ایک طرح سے چھوٹا مونا سراغ رساں ہی ہوا ہے۔ بے زبان سراغ رساں“ میں نے کہا پھر کبھی انہیں ذرا پھینچا۔ ”دراصل میں اس لیے آپ کی دیوار سوچ رہا تھا کہ مجھے آپ کے مکان سے خزانے کی خوشبو آ رہی تھی۔ آپ کے مکان میں ضرور کہیں کوئی خزانہ دفن ہے۔“

”خزانہ؟“ ان کے منہ سے سرسراہٹ ہوئی سی آواز نکلی اور ان کی رنگت جگمگ سے میک اپ کے باوجود زرد نظر آنے لگی تھی اپنے مکان میں کسی مدفون خزانے کی بات سنتا ان کے لیے خوش خبری نہیں بہت بڑی بد خبری تھی۔

”ارے۔ آپ تو ذرا گھبراہٹ میں نے خوش دل سے کہا“ اگر آپ کو خزانوں سے اتنا ہی خوف آتا ہے تو آپ اسے تلاش مت کیجئے گا۔ میں اسے تلاش کر کے نکال کے لے جاؤں گا۔ دولت کی کشش تو اپنی جگہ ہے اور دیسے بھی کسی مکان میں دفن خزانہ ملنے کا تصور بڑا دومان انگیز سا لگتا ہے۔“

میں اپنی انکے جا رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوا تھا کہ مسز درانی میری باتوں سے ذرا بھی محظوظ نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ تو بالکل ہی وحشت زدہ اور پریشان نظر آنے لگی تھیں۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔

”یہاں کوئی خزانہ وزان نہیں ہے“ وہ جیڑی سے بولیں ”میں ہمیں کہیں کھدائی کی اجازت نہیں دوں گی۔ تم ایسا کوئی خیال بھی دل میں مت لاؤ۔ میں نے تم سے اپنے خفیہ کے لیے مدد طلب کی ہے اس لیے نہیں کہ تم میرے ہی مکان کی کھدائی کرتے پھر۔“

مجھے ان کے جواب کچھ بدلے ہوئے سے لگے جب سے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی تب سے ان کا رویہ میرے ساتھ بے حد شگفتہ بھی رہا تھا اور اس میں میرے لیے لچہ بہ لچہ بدعتی ہوئی

دودھ تو پھر کی حفاظتی دیوار اور اس کے متوازی پہلی سی ایک سڑک دکھائی دے رہی تھی۔

سامنے ملائے کی مارکیٹ ویلج بہت زیادہ بڑھ جانے کے باوجود یہ کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جس کی قیمت جلد اوپر جانے کی کوئی امید ہوئی۔ اگر جبار جیلانی صحیح معنوں میں ایک بلڈ راور پرنس میں تھا تو پھر میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کس خوبی کی وجہ سے اس مکان کے ایک کمرہ میں رہا تھا جسے کوئی بھی ناخوشوہ شروع کرنے کے لیے ہمارا کرنا ضروری تھا۔ یعنی توڑنے پر الگ خرچ آتا اور ایک کمرہ صرف زمین کی قیمت ہوئی بلکہ اگر مسز درانی سو سے پانچ کے مڑوں میں نظر آتیں تو شاید وہ اس سے زیادہ بھی دے سکتا تھا۔

میں بھی ایک پرنس میں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہاں کوئی ملٹی اسٹوری یا پانی رازر بلڈنگ بنا کر اس کے اپارٹمنٹ منگے داموں بیچنا بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے نہ جانے کتنا طویل انتظار کرنا پڑتا۔ اس دوران اگر بلڈنگ نہ بنائی جاتی تو یہ ایک ڈیڑھ کمرہ دینا ہلاک کرنے والی بات تھی اور اگر بلڈنگ بنائی جاتی تو اس کا شہر خراب ہو جاتا کیونکہ کچنے کی قیمت نہ جانے کب آتی اور اس ملائے کی آب و ہوا اور زمین بہت جلد خیرات کا بیزار غرق کر دیتی تھی۔ جبکہ جبار جیلانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس مکان کو حاصل کرنے کے لیے نہ صرف زیادہ سے زیادہ رقم دینے کے لیے تیار تھا بلکہ مسز درانی کے انکار پر ان کی جان لینے پر تیار ہوا تھا۔

میں دیر تک اور دھرم گھومتا رہا اور اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ کیا واقعی اس مکان میں کوئی خزانہ دفن تھا جس کی جبار جیلانی کو خبر مل گئی تھی مگر خود مسز درانی اس سے بے خبر تھیں؟ میں نے غیر ارادی طور پر یوں عقبنیویہ کر دیا کہ سوچ کر دیکھا جیسے مکان میں اگر کوئی خزانہ دفن ہو تو مجھے یقین سے اس کی خوشبو آجائے گی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے خود اپنی اس حرکت پر ہنسی آگئی۔

پچھلی دیوار میں بھی چھوٹا سا ایک رنگ آلود آہنی دروازہ موجود تھا جو نہ جانے کب سے بند تھا مگر اس وقت اچانک ہی وہ کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے میری نمیں نے کچھ طمسائی سا اثر کیا تھا پھر وہ ”کھل جا سم“ ”تم کی چیز ثابت ہوئی تھی۔“

مسز درانی مجھے اس آہنی دروازے کے عقب سے جھانکتی نظر آئیں۔ ان کے چہرے پر حیرت تھی۔ وہ کالی بنی سنوئی نظر آ رہی تھیں مگر ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

”یہ تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“ وہ جیڑی سے بولیں ”مگر کامین گیت دوسری طرف ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میں ابھی اس طرف آئے ہی ہوں“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے لہنڈی سانس لے کر کہا "ویسے آپ سے میری مژدہ بٹ گزاری ہے کہ بات بے بات اپنی یہ خاندانی رائلٹاٹھا کر ادھر ادھر بھانگی بھرا کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسے استعمال کرنے پر ادھر ادھر کھائے بیٹھی ہیں۔"

"ہر انسان کو اپنی حفاظت کا حق حاصل ہے۔ لوگ مجھ سے میرا گھر چھیننے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرے ہی گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ تو کیا مجھے اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ میں دو چار گولیاں ان کے کندھے پر دوڑھیں؟ تار سکوں؟ میرا دل تو کیسی چاہ رہا ہے کہ "مارو مارو" والی پالیس اختیار کر لوں۔" وہ خامے سے جوش سے بولیں۔ شاید یہ بھی ان کے جوش کا اثر تھا کہ اس وقت انہوں نے رائلٹاٹھا کی طرف سے پلڑا بھی تھا۔

"اب۔۔۔ جبکہ آپ نے معاملہ میرے سپرد کر دیا ہے تو پھر آپ کو اس قسم کی پالیسیاں اختیار کرنے کی ضرورت نہیں" میں نے نرمی سے کہا "اگر آپ خودی "مارو مارو" پر قیاسی کی تو پھر میری کیا ضرورت رہ جائے گی؟"

"ضرورت یا عدم ضرورت کا فیصلہ ہم آرام سے بیٹھ کر کر لیں گے۔ تم اندر تو آؤ۔" وہ اب پہلے سے کافی ستر انداز میں مسکرائیں اور دروازے کو مزید داکر کے خود ایک طرف کو ہو گئیں۔ مجھے جھجک کر اس دروازے سے گزرنے پڑا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا مکان کی حالت حیرے انداز سے زیادہ خستہ تھی۔ ہم اس وقت عقی لان میں کھڑے تھے لیکن اب اسے لان کہا "لان کے تصور کے ساتھ زیادتی محسوس ہوتا تھا۔ وہاں بھاڑ بھانڈا قسم کی گھاس اور کچھ ناقابل شرافت قسم کے پودوں کے سوا کچھ نہیں تھا جو بڑی طرح ایک دوسرے میں اٹھے ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب سے ایک پختہ روش مکان کی طرف جاری تھی۔

اس روش کے قریب لان کے ایک کونے پر تھوڑا سا حصہ صاف ستھرا اور پھول دار پودوں سے آراستہ نظر آ رہا تھا۔ وہ حصہ اس اجڑے ہوئے لان میں ایک خوب صورت پیرامی طرح تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بڑے پیار سے سجایا ستوارا گیا تھا۔

پختہ روش پر چلے ہوئے میں نے اس کیاری نما حصے کی طرف دیکھ کر کہا "یہ آپ نے ٹاٹ میں قفل کا پوند کیوں لگا رکھا ہے؟ اس قفل کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں انکی عورت ہوں۔ لان کا اتنا حصہ میں نے ستوار رکھا ہے جتنا میں ستوار سکتی تھی۔ اس سے زیادہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ملازم یا ملازمہ میں رکنا نہیں چاہتی۔ اگر بے بس اور معذور ہو گئی۔ بستر کو گھنٹی تب شاید کوئی ملازمہ رکھ لوں۔ بشرطیکہ اس وقت بھی افکار نہ کر سکتا۔ روتے ہوئے کسی اپنے اس گوشہ تنہائی میں مرکب چاؤں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

پسندیدگی کی آمیزش بھی تھی۔ انہوں نے جب مجھے بڑے چاؤ سے کھانے پر مدعو کیا تب بھی ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے لیے دل و جان سے کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ میں بغیر کسی غرض یا مفاد کے۔ ان کی ایک بہت بڑی مصیبت اپنے سر لے رہا تھا۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے جواب میں کیا کریں۔ غالباً وہ مجھے کھانے پر مدعو کر کے اور بے پناہ لطف و عنایت کا مظاہرہ کر کے شکر گزاری کے اظہار کی ایک ادنیٰ سی کوشش کرنا چاہتی تھیں۔

مگر اس لمحے گویا ان کے یہ محسوسات کہیں پس منظر میں چلے گئے تھے۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھیں۔ میں نے گویا انہیں کسی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا۔ میرا کہنے کا مقصد یہی تھا کہ جبار بیٹائی اگر اس شدت سے اس مکان کے پیچھے پڑا ہوا ہے تو پھر اس کی وجہ تو کیسی ہو سکتی ہے کہ اس میں کوئی خزانہ پوشیدہ ہے کیونکہ میں نے اس کے چاروں طرف گھوم پھر کر باقی تو ہر اعتبار سے جائزہ لے لیا ہے۔ میرے حساب سے تو اس کی قیمت پچیس تیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اور یہ صرف زمین کی قیمت ہے۔ مکان کو تو اندر سے دیکھتے بغیر مجھے اندازہ اور ہا ہے کہ وہ ایک باعزت قسم کا کھنڈر ہو گا۔"

مسز ودانی نے ایک گہری سانس لی۔ میری بات سن کر گویا ان کی بے عنوان گہراہٹ اور وحشت یکدم کافی کم ہو گئی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لٹ آئی۔ گوکہ یہ مسکراہٹ پچیس سی تھی لیکن قیمت تھی۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" وہ بولیں "جب میں نے نیچک آئی سے جنہیں دیکھا اس وقت تمہاری پیٹہ دروازے کی طرف تھی اور تم ذرا نیچک کر بھاڑوں میں گویا کچھ تلاش کر رہے تھے۔ میں تو جنہیں غفار بیٹائی سمجھی تھی اور اپنے اندر بہت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آج تو اس کی پیٹہ میں گولی آتاری دی جائے۔ اچھا ہوا تم جلدی گھوم گئے ورنہ آج تو شاید میں اس ارادے پر عمل کر رہی گزرتی۔" انہوں نے دروازہ کچھ اور کھول دیا۔ تب میں نے دیکھا ان کے ہاتھ میں ایک رائلٹاٹھا تھی۔ رائلٹاٹھا پرانی ساخت کی تھی مگر اس کی حالت بہت عمدہ تھی۔ یقیناً یہ وہی رائلٹاٹھا تھی جسے وہ اپنے ابا کی نشانی کہتی تھیں۔

"دوستہ" میں نے سہمی بجا کر کہا "اس کا مطلب ہے آج تو مابہ دولت بال بال بیچ گئے ورنہ نیکی کرنے کے شرع میں اپنا تو پتہ صاف ہو جاتا۔"

"تم نے حرکت بھی تو عجیب کی ٹاٹ۔" مسز ودانی بولیں "تم پہلے اندر آتے۔ مجھ سے ملے اور مجھے بتانے کے بعد جہاں کا چاہتے معائنہ کرتے پھرتے۔"

"اگر میں اساتیلے کا آدمی ہوتا تو پھر وہاں ہی کسی بات کا تھا۔"

مسز درانی کو یا مجھے تسلیم دیتے ہوئے بولیں "ان تمام چیزوں کو گندی یا گرد آلود نہ سمجھا۔ آج میں نے بڑی جان ماری کر کے نہایت "تفصیلی" معافی کی ہے لیکن اب اس گھر کی اور تمام ساز و سامان کی حالت ہی ایسی ہے کہ جتنی چاہے معافی کروں "سب کچھ میلا سیلا ہی دکھائی دیتا ہے۔"

"انسان کا دل سیلا نہیں ہوتا چاہیے۔ اتنی خواہ کچھ بھی میلا ہو، فکر کی کوئی بات نہیں" میں نے بھی انہیں تسلیم دینے کی کوشش کی۔

وہ ابھی کھڑی ہی تھیں اور رانگل کو دونوں ہاتھوں میں لیے گویا اس سے کھیل رہی تھیں۔ میں نے یوں ہی ذرا انہیں چھیڑنے کے لیے پوچھا "کیا یہ واقعی اوڑھ ہے؟"

انہوں نے ذرا ہچکے ہو کر میری پیشانی کا نشانہ لیتے ہوئے کہا "تازہ کر کے دکھاؤں؟" وہ بالکل سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر ایک تک ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "اتنا رنگا ثبوت نہیں چاہیے مجھے۔ جس کی تصدیق کے لیے میں دنیا میں موجود ہی نہ ہوں۔"

"تو پھر ایسی امتحان بائیں مت کرو" انہوں نے رانگل کو میری طرف سے ہٹا کر یوں بازوؤں میں لے لیا جیسے کسی بچے کو گود میں اٹھایا ہو۔ پھر وہ اسے واقعی اس طرح پیٹنے سے لگا کر پیار کرنے لگیں جیسے وہ رانگل نہیں بلکہ کوئی ننھا سا بچہ ہو۔

پھر وہ خواباک سے لیجے میں بولیں "آپ میرے لیے کیا قسب سے کار آمد چیز چھوڑ گئے تھے؟"

"ایسا مت سوچیں مسز درانی!" میں نے سنجیدگی سے کہا "ہتھیار کو سب سے کار آمد چیز سمجھنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔ سب سے کار آمد چیز انسانی قدریں ہیں۔ ایک پُرگذاز دل۔ دوسرے کے لیے کوئی قربانی دینے کا جذبہ۔ احساس کی دولت۔ درگزر کرنے کا جذبہ۔ ذہنی کشادگی۔ بلند سوچ۔ یہ کار آمد چیزیں ہیں۔"

"میرے پاس وہ بھی ہیں" مسز درانی۔۔۔ گویا اپنی خواباک کیفیت سے باہر آتے ہوئے بولیں۔

"بعض اوقات انسان کو محض خوش فہمی ہوتی ہے کہ اس کے پاس یہ چیزیں موجود ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے انسانوں کی اکثریت اسی خوش فہمی میں جھلا ہوتی ہے لیکن درحقیقت ہم میں سے بیشتر انسانوں کا انسانی قدروں پر سے ایمان ختم ہو چکا ہے لیکن ہر کوئی اپنے آپ کو بہت اعلیٰ درجے کا انسان سمجھتے پھرتا ہے" میں نے کہا۔

"ہم کیا یہاں دعا کرتے آئے ہو؟" انہوں نے مجھے گھورا۔

"نہیں" میں تو یہاں اچھا سا کھانا کھانے آیا ہوں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تو پھر تم نے یہ کیا تقریر شروع کر دی؟" انہوں نے بدستور

بظاہر وہ مسکرا رہی تھیں لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بات کرتے وقت ان کے دل پر خراش سی بڑی ہوئی۔ یہ واقعی ایک عجیب اور خوف زدہ کر دینے والی ختمائی تھی جس کی آغوش میں وہ زندگی گزار رہی تھیں اور یہ صرف انہی کا مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے نہ جانے کتنے گروا رہے تھے جنہیں مظلوم الحال افراد میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن وہ عجیب ختمائی اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولیں "مجھے کیا پتا تھا کہ تم اصرار سے نازل ہو گے اور یہ سب کچھ دیکھ لو گے ہو بلا قاتی شریف اور مذہب لوگوں کی طرح سامنے کے کیٹ سے آتے ہو وہاں سب کچھ دیکھ ہی نہیں پاتا اور میں شرم کے مارے خود کسی کو اس طرف لاتی ہی نہیں۔ دل میرا بھی چاہتا ہے کہ سارا لان ہی خوب صورت تراشیدہ گھاس اور رنگ برنگ پتوں والے پودوں سے سجا ہو اور ہر طرف ترتیب و سلیقہ نظر آئے لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اللہ نے مجھے زمین دی ہے، قوتی نہیں دی۔ اس لیے میں ایک چھوٹے سے کھڑے کوئی سجا مناد کر شوق پر آ کر کھیتی ہوں۔ جب دل گھبراتا ہے تو یہاں کر سی وال کر بیٹھ جاتی ہوں اور صرف اسی کھڑے پر نظر بھرا کر فرض کرتی ہوں کہ یہی میرا لان ہے اور اس کے آس پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "آپ واقعی عجیب عورت ہیں مسز درانی!" میں نے کہا۔

اس وقت تک ہم مکان کے ایک نقلی گلی شماراتے سے گزر کر سامنے کی طرف آ پہنچے تھے۔ اس طرف ایک کشادہ ڈرائیوے تھا جس کا فرش ہمیں طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ کسی زمانے میں شاید اس طرف بھی لان موجود رہا ہو لیکن بعد میں شاید اس کی دوسری سے بچنے کے لیے یا کسی اور وجہ سے اسے ختم کر کے وہاں سینٹ کا فرش بنایا گیا ہو گا مگر وہ دیسے ہی بڑا ناقص تھا۔ جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور اس میں کیس کیس سے گھاس دو بارہ سر اُبھار چکی تھی۔

مسز درانی رانگل جھاتی ہوئی میرے آگے آگے مارچ کرتے کے انداز میں چل رہی تھیں۔ میں ان کی رہنمائی میں نشست گاہ میں پہنچا۔ کسی زمانے میں وہ ایک میٹاری ڈرائیوے کا دوام رہا ہو گا لیکن صحیح طور پر دیکھ بھال نہ ہونے اور بوسیدگی و کٹنگ کی وجہ سے اس کی بھی حالت خراب تھی۔

وہ اوجھڑا دھڑکھٹے ہوئے بولیں "سمجھ میں نہیں آ رہا تھیں کہاں بٹھائیں۔ کوئی چیز اس قابل نہیں ہے جس پر تھیں بیٹھنے کی دعوت دی جائے۔"

"آپ میرا مقام درجہ اتنا بلند کرنے کی کوشش نہ کریں" میں نے سنجیدگی سے کہا "یہ تو بہت باعزت جگہ ہے۔ میں تو اس سے کیس بدتر جگہوں پر اُٹھتا ہوتا رہا ہوں۔"

میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا جو کافی میلا میلا نظر آ رہا تھا۔

خفت لگا ہوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

تقریباً ایک چھوٹی سی خوشی تھی اور یہ خوشی بھی شاید ان کی تنہا زندگی میں بہت دن بعد آئی تھی۔

دستار دہ بڑے شیریں لمبے میں یولیس "اب تم مجھے کچھ بتاؤ کہ تم مکان کے پیچھے کیا تلاش کرتے پھر رہے تھے؟" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی بچے کو بلا پھسلا کر کوئی اہم بات معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ واقعی اس سلسلے میں بہت سی تجسس معلوم ہوئی تھیں۔

"کیا آپ کے خیال میں واقعی وہاں کوئی ایسی چیز تھی جسے تلاش کیا جاسکتا ہے؟" میں نے انا انہی سے سوال کر دیا۔

"یہی تو میں جانتا تھا تو؟" وہ یولیس۔

"ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے ایک ایسی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ہم دونوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہر حال آپ کے اطمینان کے لیے بتا دوں کہ میں وہاں کچھ تلاش نہیں کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں آپ کو یہ دہم ہو گیا ہے۔ میں تو ذرا گرد و پیش کا جائزہ لے کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس جگہ کی کیا مارکیٹ دہلی ہو سکتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو اس مکان کی مارکیٹ دہلی بہت زیادہ بڑھانے کا سبب بن سکتی ہو۔ اس لیے وہی پڑا خیال میرے دل میں ابھر کر آخر جبار بیٹائی اس کے لیے اتنا دوا نہ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس میں کوئی خزانہ دفن ہے؟ غیر ارادی طور پر میں دیوار کو مسو گھٹنے لگا۔ میں اس قسم کی... بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب حرکتیں اکثر کرتا رہا ہوں۔ جب آپ سے میری شناسائی کچھ پرانی ہو جائے گی تو آپ میری عادتوں سے زیادہ واقف ہو جائیں گی۔ اور شاید ان کی عادی بھی ہو جائیں۔"

"اور... اب شاید انہوں نے حقیقی طمانیت کی قسمی سانس لی۔ ان کی آنکھوں سے شلوک و شبہات کی پرچھائیاں مٹ گئیں اور ان کی خوب صورت آنکھیں اطمینان کی چمک کی بدولت بدواہ روشن روشن دکھائی دینے لگی تھیں۔

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے یولیس "ادھر اُدھر کی باتوں میں اتنا وقت گزر گیا اور میں نے تمہیں ٹھنڈے گرم کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ کھانا لگانے میں مجھے کچھ وقت لگ جائے گا تب تک تم کچھ کھا لو۔"

"اگر آپ پلانا ہی چاہتی ہیں تو ٹھنڈا پانی پلا دیجئے۔ کھانے سے پہلے گرم پلا کر میری جھوک مارنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ نے جو کچھ پکایا ہو گا میں اس کا اچھی طرح صفایا کر کے باؤں گا" میں نے کہا۔

"ضروری نہیں ہے کہ وہ تمہیں اتنا پسند آئے۔" وہ اٹھتے ہوئے مسکرا کر یولیس۔

"اگر پکانے والا مجھے پسند ہو تو پھر اس کا پکایا ہوا بھی مورا پسند نہیں جاتا ہے۔"

"شکریہ۔" وہ آداب بجالاتے ہوئے یولیس "اس عمر

"میں نے سوچا اچھا سا کھانا کھانے سے پہلے کچھ اچھی اچھی باتیں کہلی جائیں" میں نے جواب دیا پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ اچھی اچھی باتیں آپ کو ہرگز اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ صرف نئی نسل کے لوگوں کو... نو عمروں اور نوجوانوں کو اچھی اچھی "ناسمانہ" اور فلسفیانہ باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ انہیں عقل اور تجربہ حاصل نہیں ہوتا۔" وہ ابھی زندگی کی حقیقتوں سے صحیح طرح آشنا نہیں ہوئے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ جیسے ہنر مند سرد گرم چیدہ لوگوں کو بھی عقلانہ اور سنجیدہ گفتگو اچھی نہیں لگتی۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے ایسی گفتگو اچھی نہیں لگتی۔" وہ ناگوار سی بات بولا کر یولیس "میں یہ کتنا چاہتی تھی کہ میں تو پہلے ہی اکثر پریکٹس میں مبتلا رہتی ہوں۔ مجھے زندگی کی حقیقی باتوں کا مزید ڈپریشن میں مبتلا نہ کرے۔ مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے لیکن صرف معلوم ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں نے اکثر لوگوں کو یہی کہنے سنا ہے کہ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے آج تک کسی ایسے انسان سے ملنے کی حسرت ہی رہی جس نے کہا ہو کہ ہاں میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہوں۔ آخر کون اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہے؟"

"ہم سب کو مل کر اس شخص کو ڈھونڈنا چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے یولیس۔

"میں نے تو ڈھونڈ لیا ہے؟" میں نے کہا۔

"کون ہے وہ؟" انہوں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں خود۔" میں نے جواب دیا۔

وہ بے اختیار ہنس دیں۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "اگر ہر شخص اپنے دل میں یہ یقین بٹھائے کہ وہ اس بے ہودہ سوسائٹی کی بہتری کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ خواہ وہ کوشش ذرا برابری کیوں نہ ہو۔ تو شاید حالات کچھ بہتر ہو جائیں۔"

"اچھا... تم یہ یو جمل باتیں چھوڑو۔ معاشرہ تو ایک منہ زور اور پراسرار دریا ہے۔ یہ خدا پناہ راستہ بنا تا چلا جاتا ہے۔ ہم تم جیسے لوگ اس کا منہ تبدیل نہیں کر سکتے۔"

"لیکن اس کا نگاہ لاپن تو کچھ کم کر سکتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے... چھوٹی چھوٹی کوششوں سے..." میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"شاید..." انہوں نے ہنس لیں کہ میں نے انہیں میرے سامنے بتائی پر رکھ دی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ واقعی لوڈ ڈھکی اور سٹیج بھی بنا ہوا تھا۔

وہ میرے برابر آئینہ میں ان کے وجود سے ایک دلچسپ منہ آنکھ رہی تھی۔ آج وہ واقعی خاصے اہتمام سے تیار ہوئی تھیں۔ شاید کسی کو کھانے پر مدعو کرنا بھی ان کے لیے ایک چھوٹی سی

میں بھی انسان کو ایسے خیالات سے آگاہی حاصل کر کے برحال خوشی ہوئی ہے۔ وہ لادریج سے گزر کر غالباً کچن میں چلی گئیں اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

میرے پاس ایک فاکس تھی جس میں پاور آف اٹارنی کے کاغذات لگے ہوئے تھے۔ ان پر مجھے مسزورانی سے دو خط لکرائے تھے۔ اسے میں اب تک مہل میں دبائے ہوئے تھا۔ اب میں نے اسے سامنے پائی پر رکھ دیا اور اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالیا۔ پھر میں نے جب سے اپنا سوا کھن فون نکالا اور شفیع شاہ کا نمبر شیخ کیا۔

سلسلہ طے پر میں نے پوچھا "جبار بیلائی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟ ویسے میں کچھ زیادہ سی جلدی پوچھ رہا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں سرا۔" شفیع شاہ بولا "اس کے بارے میں بنیادی باتیں تو بہت کم وقت میں معلوم ہو گئی ہیں اور میرے خیال میں دسی کافی ہیں لیکن مزید ملت لٹی دسی تو مزید ہوم ورک کرتے رہیں گے۔"

"بنیادی باتیں کیا ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔  
 "وہ واقعی اینڈ ہائی کے بانیوں میں سے ہے پھر اپنے آپ کو اعزت بنانے کے لیے کنسٹرکشن کے بزنس میں گھس گیا۔" دولت اس کے پاس بے حساب ہے لیکن مسزور دولت حاصل کرنے کی ہوس بھی بے حساب ہے خواہ اس کے لیے کسی کا بھی گھنا کرنا پڑے۔ اب اس میں خود تو اتنا دم ٹم نہیں رہا۔ اس کا چھوٹا بھائی غفار اس کے "شیڈ بد معاشی" کا سربراہ ہے۔ حقیقت میں جبار بیلائی کا اثر رسوخ کچھ اتنا زیادہ نہیں ہے لیکن جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ بیلائی کی طرح برتا ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا اصل اثر رسوخ دنیا بھر میں ہے۔ "شفیع شاہ نے بتایا۔

"یہ اثر رسوخ بھی کچھ کم نہیں ہے" میں نے کہا۔  
 "بے شک" شفیع شاہ نے تاکید کی "ویسے اس کا سیاسی اثر رسوخ بھی ہے لیکن میرا خیال ہے اس کی بنیاد بھی معیاشی ہے۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے دریافت کیا۔  
 "ایک نہایت کمرٹ سیاست داں ہے۔۔۔ کے ایم کمال۔۔۔ ہر دور حکومت میں کوئی نہ کوئی منصب اس کے پاس رہتا ہے۔ کافی عرصہ ہو چکی ہے اور یہ بیشتر سیاست دانوں کی طرح اب تک بہت دولت مند ہو چکا ہے۔ لیکن جبار بیلائی کی طرح دولت کی ہوس اب بھی بے پناہ ہے۔ جبار بیلائی کو اس کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے بلکہ میرا خیال ہے ان دونوں کے درمیان ایک غیر رسمی پارٹنرشپ ہے۔ کے ایم کمال کو عام معاشی سے اس کا حصہ پہنچا رہتا ہے۔ اب چونکہ جبار بیلائی کے پاس بہت دولت ہے اس لیے وہ اپنا سیاسی اثر رسوخ مزید بڑھانے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔"

"اس سے پہلے ہی اس کے پرکھ دینے چاہئیں۔ ایسے لوگوں کا سیاسی اثر رسوخ پہلے ہی کیا کم ہے" میں نے کہا۔

"اگر آپ خود سامنے آکر براہ راست اس کی خیریت چاہتے ہیں تو آپ کو کافی اور بے بندوبست کر کے کوئی قدم اٹھانا ہو گا کیونکہ جبار بیلائی کی تو کوئی بات نہیں لیکن وہ کے ایم کمال بہت براشتہ ہے۔ پھر پریس ان لوگوں کا بہت برا احتیاج ہے۔ یہ پرانے مگر کچھ اسے استعمال کرنے کا کڑ جانتے ہیں۔ یہ جب چاہتے ہیں اپنی ناجائز سے ناجائز بات کو بھی صحیح ثابت کرنے کے لیے پریس میں خوب داؤدیاں مچاتے ہیں۔ پریس والے ان کی جھجک مارنے کی خبر بھی پک کر شائع کرتے ہیں۔"

"لیکن تم بتایا ہے کہ کے ایم کمال ایک کمرٹ سیاست داں ہے؟" میں نے کہا۔

"تجربہ کل اس بات سے تو کسی کے مقام و مرتبے میں کوئی خاص فرق ہی نہیں پڑتا۔"

"لیکن کہیں کہیں یہ دھنسی رنگ گرفت میں آجاتی ہے۔ نہیں صاحب زدمہ بابا۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "ان سے ان سب کا دم لٹکا ہے۔ ان کے پاس ان سب کی فائلیں بہت حفاظت سے رکھی رہتی ہیں اور دقت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

"کیا وہ فائلیں پوٹھی خفیہ خانوں میں بھی رہیں گی اور انہیں دیکھ کمانی رہے گی؟ وہ کبھی منظر عام پر نہیں آئیں گی؟" شفیع شاہ کے لیے میں ہلکی ہنسی۔

"وہ اس بیچ و بیچ اور تاریک نظام کی ایک انگ بڑائی۔۔۔ ایک انگ کمانی ہے۔ بہت ابھی ہوئی ہے۔ برحال یہ تو کھتی رہ گئیں سبھی نہ کبھی کام آجاتی ہیں۔ میں نہیں صاحب کو صرف ایک فون کروں گا۔ کے ایم کمال چوں بھی نہیں کرے گا۔ جبار بیلائی کی حمایت میں کوئی پریس کانفرنس کرنے کا سے خیال بھی نہیں آئے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "جبار بیلائی کا بد معاشی کا نظام کیسا ہے؟"

"اس کی بد معاشی کی قمارت صرف چند سٹونوں پر کھڑی ہے۔ آٹھ دس بد معاش ہیں اور تین چار پولیس افسر ہیں جو صرف پیسے کی ڈوری سے اس کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ بد معاش بھی سارے ہر وقت اس کے ساتھ نہیں رہتے۔ بوقت ضرورت ہتھیار موبائل فون وغیرہ پر پتہ نام لے کر فوراً اس کے پاس۔ یا پھر اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں کے بارے میں وہ حکم دے۔ اپنا مشن مکمل کر کے یہ لوگ قاتل ہو جاتے ہیں۔"

"اور اس کا بھائی؟"

"وہی اس کا سب سے بڑا باڑی گاڑ ہے۔ سامنے کی طرح ساتھ رہتا ہے۔ وہی صحیح معنوں میں جان نثار ہے۔ شاید اس لیے کہ مالی مفادات کے علاوہ اس کا خون کارشتہ بھی ہے۔ شر کے نہایت

”میں اور عرادہ کی باتوں میں الجھ کر ہمیں ایک اہم بات بتانا بھول ہی گئی۔ آج صبح جبار جیلانی کے اسٹیٹ منیجر کا پھر فون آیا تھا۔ وہ اپنی پیشکش ایک کروڑ سے ایک دم بڑھا کر ڈیڑھ کروڑ پر لے گیا ہے۔“

”اوہ!“ میں نے بے اختیار سہلی بجائی ”میں تو ایک کروڑ پر ہی حیران ہو رہا تھا۔ یہاں معاملہ یکدم ہی ڈیڑھ کروڑ پر پہنچ گیا۔ حالانکہ کاروبار کی دنیا میں ایسا نہیں ہو گا۔ پیشکش بہت آہستہ آہستہ بڑھاتی جاتی ہیں۔ آپ نے کیا جواب دیا؟“

”میں اپنے جواب پر قائم ہوں“ وہ مسکراتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔

”اور وہ جواب کیا ہے؟“

”یہی... کہ جنٹلمن میں جاؤ!“ انہوں نے سانگی سے کہا۔

”حیرت ہے! آپ کو لالچ کیوں نہیں آتا مسز درانی! اب تو میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ آپ اس پیش کش کو قبول کر لیجئے اور اس کھنڈر سے جان چھڑائیجئے۔ میرا خیال ہے کہ قیمت کے بارے میں اب وہ اس سے آگے نہیں جائے گا۔“

”تو تمہارا خیال ہے کہ میں قیمت زیادہ سے زیادہ بڑھوانے کے چکر میں افکار کر رہی ہوں؟“ انہوں نے غصہ ناک نظروں سے مجھے گھورا۔

”نہیں۔ میں تو دیے ہی مشورہ دے رہا ہوں کہ خدا را اب لالچ میں آتی جاہلے“ میں نے التجائی سے لہجے میں کہا ”اس نے یقیناً یہی بھی کہا ہو گا کہ یہ اس کی آخری پیشکش ہے۔“

”ہاں... اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے قبول کرنے کا آج پہلا اور آخری دن ہے۔ مجھے آج فیصلہ کر لینا چاہیے“ انہوں نے دوشے دوشے سے لہجے میں بتایا۔

”پھر آپ نے کیا سوچا؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا ہمیں بھی مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت ہے؟“ وہ گویا برا مانتے ہوئے بولیں۔ ”اس گھر سے تو اب میرا جنازہ ہی نکلے گا۔“

میں اسی لمحے ایک زوردار چھٹکا ہوا جو دو اصل دو تین چھٹاکوں کا تسلسل تھا۔ مسز درانی اس وقت تک چھوٹی سی ٹرے ہاتھ میں ہی پکڑے کھڑی تھیں۔ اس میں موجود دونوں گلاسوں کو میں نے بیک وقت کٹڑے ہوتے دیکھا۔ کچھ مشروب اور کچیاں اچھل کر چھ پر گریں اور اس کے ساتھ ہی مسز درانی اچھل کر پیچھے جا گریں۔

انہوں نے منہ سے یہ الفاظ نکالے ہی تھے کہ اس گھر سے میرا جنازہ ہی نکلے گا۔ اور میں اسی لمحے ناز ہو رہا تھا۔ شاید وہ قیامت کی کھڑی تھی۔ اس اندیشے سے میری دھڑکن تھمے گئی کہ شاید اس گھر سے مسز درانی کا جنازہ اُٹھنے کا انتظام ہو گیا تھا۔ میں خود چھٹاکے کی آواز کے ساتھ ہی صوفے سے پھسل کر

منگے کا ردیاری خانے میں سب سے اہم شاہراہ پر جبار جیلانی نے حال ہی میں ایک چھوٹے گھر نماٹ منگے پلاٹ پر ایک چھوٹی دکانی عمارت تعمیر کرائی ہے جس میں صرف اس کے اپنے دفاتر چلے ہوئے ہیں۔ کافی اونچی بلڈنگ ہے۔ اس میں ٹاپ فلور پر وہ خود بیٹھا ہے۔ صرف دو بد معاش یا ہراس فلور پر اس کے گاؤڑز کے فرائض انجام دیتے ہیں اور اندر کمرے میں اس کا بھائی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

”بس...؟ کُل یہی لوگ ہوتے ہیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ بانی سب تو دفتری لوگ ہوتے ہیں جن سے بلڈنگ بھری ہوئی ہے۔ وہ سب بے چارے تو شریف شرفا ہوتے ہیں۔ گولی کی آواز سن کر میزوں کے نیچے دیک بانے والے“ شفیع شاہ نے بتایا۔

میں نے حسین امیز لہجے میں کہا ”اتنے کم وقت میں تمہارے ساری ہی معلومات تو جمع کر لیں۔ اب کون سی بات نہ گئی؟“

”کارروائی شروع کرنے کے لیے تو یہی معلومات کافی ہیں لیکن اگر جلد کارروائی شروع کرنا ضروری نہیں ہے تو میرے ”جاسوس“ بدستور اپنی کوششوں میں لگے رہیں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، معمولی جزئیات بھی سامنے آجائیں گی۔ اس طرح کے کاموں میں بعض اوقات معمولی جزئیات بھی اہم ثابت ہوتی ہیں۔“ شفیع شاہ بولا پھر اس نے پوچھا ”آپ اس پر کب ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں؟“

”ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا لیکن تم اور فری تیار رہنا۔ کسی وقت بھی میرا فون آسکتا ہے۔ اس دوران اپنے ”جاسوس“ کو کام کسے رہنے دو اور ان سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد رپورٹ لینے رہو۔ کوئی ذرا سی بھی اہم بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ میں نے الحاح مسز درانی کے ہاں بیٹھا ہوں۔ احتیاطاً میں ابھی اسلام آباد فون کر کے کچھ ڈراماں ہلاتا ہوں تاکہ اگر ہمیں اچانک ہی جبار جیلانی کے خلاف کوئی کارروائی کرنی پڑے تو وہ جواباً کوئی کارروائی نہ کر سکے۔“

”اوکے سر!“ شفیع شاہ بولا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ مسز درانی اس دوران ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنک کے گلاس سچائے میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں اور بدستور کھڑی ہی تھیں۔ انہوں نے ٹرے سے پانی پر نہیں رکھی تھی۔ شاید وہ میری گفتگو میں الجھ گئی تھی اور بھول ہی گئی تھی کہ ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ شغافہ بگلیاں میں بے رنگ سیال سنسٹار ہا تھا اور اس میں برف کے کیوبٹس جم رہے تھے۔

میں نے فون بند کیا تو مسز درانی گویا کسی خیال سے چوکتے ہوئے بولیں ”تم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے؟“

”ہاں تو کافی پہلے سے ہی شروع ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔



روپے انیس سو تین روپے کے برابر بیٹھے تھے۔ کچھ اندیشہ تھا کہ اگر اب بھی کوئی خفا نہ ہوگا۔ اور سکتا تھا۔ مسز دانی جوش اور شہد میں بہادر ترقی ہوئی تھیں لیکن اچانک کسی خطرے کا سامنا ہونے پر وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتی تھیں۔ اچھے اندازہ تھا۔

وہ خاموشی سے ایک طرف کہہ رہی تھیں اور میں جلدی سے کچن میں داخل ہو کر اس کڑکی پر پہنچا جس سے عقی دیوار نظر آتی تھی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا اور سوز سائیکل کی آواز معدوم ہوئی جابری تھی۔ میں کچن سے نکل کر دوڑا ہوا اس آہنی دروازے تک پہنچا جس سے میں اندر آیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر میں ایک کمری سانس لے کر رہ گیا۔

دروازے پر اندر کی طرف بڑا سالا جمول رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مسز دانی نے مجھے اندر نکالنے کے بعد میرے سامنے ہی یہ سالا لگایا تھا۔ میں سخت بد مزگی کے عالم میں چلتا تو میں نے مسز دانی کو اپنے پیچھے کھڑے پایا۔

فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک چابی میری طرف بڑھائی اور بولیں "مجھے معلوم تھا کہ میں میری ضرورت پڑے گی۔ اسی لیے تو میں تمہارے پیچھے آ رہی تھی۔"

میں نے دیکھا اب ان کے چہروں میں چیلیں نہیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ شخص مجھے دکھانے کے لیے راستے میں ایک لمبے کوڑک مٹی تھیں لیکن میرے پلٹنے ہی چیلیں آ کر کر دیاں میرے پیچھے دوڑ پڑی تھیں۔ میں نے چابی ان کے ہاتھ سے بھٹ کر تالا کھول کر آہنی دروازے کی آٹھویں ریتے ہوئے باہر جھانکا۔

باہر چلے ہوئے جھاڑ جھکاڑ کی وجہ سے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ احتیاطاً میں نے جھاڑ جھکاڑ میں تین چار فٹ کیسے توڑ دی تھیں سرسراہٹ کے سوا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ شاید کچھ چوبے اس جھاڑ جھکاڑ میں روبرو کر رہا تھے۔ تب میں نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر باہر جا کر مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑنے ہوئے سمندر کے کنارے والی سڑک کی طرف دیکھا جو یہاں سے محض ایک پتلی سی پٹی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

اس پر مجھے ایک اسپرٹس سوز سائیکل کی صرف ایک جھلک دکھائی دی جس پر وہ آوی موڑ دھکے ہمیں باہر پھینکے جس سے ہمیں آخر ہو چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سوز سائیکل مل گئی تھی سڑک پر سمندر کی حفاظتی دیوار کی اوٹ میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے مقابلے کے بارے میں سوچنا بھی فضول تھا۔ میری گاڑی مکان کے دوسری طرف کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں پہلے اس تک پہنچتا اور اسے اشارت کر کے کافی آگے لے لاتا تو دوسری طرف پہنچنے کے لیے مجھے بہت چڑی رہتی تھی کو محور کرنا پڑا۔ دہلی ہوئے کی وجہ سے گاڑی کے ریت میں کہیں دھسنے کا بھی خدو موجود تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی اس پتلی سی سڑک پر پہنچنے تک سوز سائیکل سوار نہ جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے۔

مجھے اپنے بوسیدہ قالین پر گر پڑنا اور کھٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی کس طرف سے آئی تھی۔ میرا مشین ہٹل میرے ہاتھ میں آچکا تھا اور میں اس درندے کی طرح چوکتا ہوا کھتا تھا جس کی پھلیوں میں کچھ بھجور دیا گیا ہو۔

مجھے مزید فائر ہونے کی توقع تھی مگر ایسا نہیں ہوا البتہ مکان کے عقب میں کہیں دور سے کوئی سوز سائیکل اشارت ہونے کی آواز ابھری اور تیزی سے معدوم ہونے لگی۔ مجھے اس وقت تیزی سے مکان کے بجلی طرف بھاگنا چاہیے تھا لیکن مجھے مسز دانی کی طرف سے بھی تشویش تھی۔ کہیں انہیں فوری طبی امداد کی ضرورت تو نہیں تھی؟

میں اس وقت اس چپائے کی سی پوزیشن میں تھا جو ایک ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے تین ٹانگوں پر کھڑا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک ہاتھ میں مشین ہٹل تھا۔ میں نے پانی کے پیچھے سے جھانک کر دوسری طرف دیکھا تو مجھے مسز دانی بھی اسی حالت میں نظر آئیں۔ وہ ایک ہاتھ پر ہوا کر پتائی پر سے اپنی ران نقل اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

بے اختیار میرے سینے سے طمانیت کی ایک کمری سانس خارج ہوئی۔ وہ نہ صرف زندہ تھیں بلکہ صحیح سلامت بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید انہیں خراش بھی نہیں آئی تھی۔ اس وقت تک مجھے اندازہ نہ ہو چکا تھا کہ کوئی کمر سے آئی تھی۔ کچن مکان کے عقی احاطے کی طرف تھا۔ اس کی دونوں کھڑکیاں آئنے سامنے تھیں۔ دونوں کا شیش ٹوٹ چکا تھا۔

فائر رائل سے کیا گیا تھا۔ کسی نے غالباً عقی دیوار پر چڑھ کر کچن کی کڑکی پر فائر کیا تھا۔ کوئی دونوں کھڑکیوں اور لارڈج سے گزرتی ہوئی ذرا ٹانگ دم کے اندر دہلی دروازے سے آئی تھی اور ہم دونوں کے درمیان سے گزر گئی تھی۔ درمیان میں صرف گھاس تھے۔ کوئی انہیں بھی آڑا توئی ہوئی گزر گئی تھی۔ محض ایک ٹانگے کے فرق نے مسز دانی کی زندگی بچا لی تھی۔ عین اس وقت وہ درندے پتائی پر کھٹنے کے لیے جھکتے لگی تھیں۔ اگر وہ ذرا زیادہ جھک چکی ہو تو گولی گھاسوں کو توڑ کر گزرنے کے بجائے ان کی کپٹیوں سے آہٹا نقل جاتی۔

سوز سائیکل کی آواز دور دروازے سے سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ مزید فائرنگ کا خدو کچھ چکا تھا اس لیے میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا تاہم اب بھی میں نے اپنی احتیاط ضرور کی کہ کوئی کس حالت میں رہا اور اسی حالت میں کچن کی طرف دوڑا۔ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی جکی سی آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مسز دانی بھی میری تحقیر کرتے ہوئے میرے ہی انداز میں سر جھکانے ایک سامی کمانڈو کی طرح رائل اٹھائے میرے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھیں۔

"خدا کے لیے۔۔۔ آپ تو کسی محفوظ جگہ پر آؤ وغیرہ میں

ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ یکدم ہی بے ہوشی چکی رکھائی دینے لگی تھیں۔ میں بھی صوفے پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر کمرے میں گمراہ سکوت طاری رہا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں الجھے ہوئے تھے۔ میں اپنے ذہن میں کچھ پر دیگرام ترتیب دے رہا تھا۔ اب بہت ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں اب کچھ کرسی گزرتا جا رہے تھا۔ اس سے پہلے کہ جبار دیلائی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاتا، مجھے اس معاملے میں پول کر دینی چاہیے تھی۔

چند لمبے کی بو جھل خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "کیا اب میں آپ کو کھانا کھلانے اپنے اوٹ لے چلوں؟"

انہوں نے ہنسنے سے انکار کر دیا۔ "آپ کو کھانا کھول کر خرابا کر سی نظر آ رہی ہے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہنسنے کی لوث آئی اور وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "اور... صاف کرنا... میں تو اس وقت بھول ہی گئی تھی کہ میں نے تمہیں کھانے پر مدعو کر دیا تھا۔"

"لیکن میں نہیں بھولا تھا۔ میں ایسی باتیں نہیں بھولا۔"

وہ ایک غریب سا انسان لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے لاؤنج اور کمرے میں بکھری ہوئی کرسیوں کو دیکھا۔ تپائی اور کالین پر کولڈ ڈرنک کی بجائے دیتے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ کالین آئینے سے انداز میں مسکرائیں اور بولیں "میں تمہارے لیے کولڈ ڈرنک لائی تھی... اور اپنے لیے بھی... مگر یہی نصیب نہیں ہوئی۔ اس پر ہماری مٹر نہیں تھی۔ تم نے دیکھا... جو چیز نصیب میں نہ ہو، کس طرح ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔"

"کولڈ ڈرنک پر ہماری مٹر نہیں تھی یہ تو کوئی اہم بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "البتہ اس بات پر خدا کا شکر ادا کریں کہ اندر آنے والی اس گولی پر ہم دونوں میں سے کسی کے نام کی مٹر نہیں تھی۔" میں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ گولی اس کے پیٹے میں بیٹھ ہوئی تھی۔

"ہاں... یہ تو واقعی شکر کا مقام ہے۔" مسز درانی نے تسلیم کیا اور اثبات میں سر ہلایا پھر وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں "میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر فون اٹھایا اور اسلام آباد کا ایک نمبر مایا۔ اس نمبر پر کالیانی نہیں ہوئی۔ نہیں صاحب کو میں تیسرے نمبر پر تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نیچی آواز میں چند منٹ ان سے بات کرتا رہا۔ اس دوران مسز درانی نے کھانا گرم کر کے ڈرائنگ روم میں ہی موجود ایک پرانی سی ڈرائنگ ٹیبل پر لگوا دیا تھا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر شکر نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

آخر میں نے شکوک ختم کی اور ان کے قریب جا بیٹھا۔ انہوں

میں ایک لمبھی سانس لے کر واپس ہولیا۔ مسز درانی سانس کی طرح میرے ساتھ تھیں۔ ان کا چہرہ تار تار تھا کہ انہیں اپنی رائے استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

"بزدل... بگڑے کہیں کے..." وہ پچھلے دواڑے سے مکان میں داخل ہوتے ہوئے بڑبڑاتی تھیں۔

"یہ بزدلی کا معاملہ نہیں ہے۔" میں نے کہا "مئی اللال ان کا مقصد آپ کو صرف دھمکانا اور بدبخت زدہ کرنا ہے۔ ایک طرف وہ پیش کش بھیجتا ہے۔ جب آپ اسے ٹھکراتی ہیں اور سخت جواب دیتی ہیں تو اس قسم کی کوئی کارروائی ہوتی ہے۔ جب ان کی امید بالکل ختم ہو جائے گی اور وہ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اب آپ سے بات کرنے کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں... تو پھر فیصلہ کن قدم اٹھایا جائے گا..." اور وہ واقعی ہلاکت خیز ہو سکتا ہے۔

ان کے چہرے پر ذرا خوف کے آثار ابھرے اور انہوں نے خفیف سی بھر بھری دلی تاہم اس دوران میں بھی وہ دواڑے کو اندر کی طرف سے تالا لگانا نہیں بھولیں۔

تالا لگا کر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولیں "اور تم مجھے پچانے کے لیے کیا کرو گے؟"

"پچانے والا تو وہ ہے..." میں نے درویشانہ انداز میں آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"اسی نے تو ہمیں میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولیں "اسی لیے تو تم سے پوچھ رہی ہوں تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"یہ میں ابھی اندر جا کر کھانا وغیرہ کمانے کے بعد اطمینان سے قیلولہ کرنے کے انداز میں بیٹھ کر سوچوں گا۔" میں نے مشین پائلٹ کو دوبارہ ہنگامی ہولسٹر میں پھانتتے ہوئے کہا "میں خالی پیٹ زیادہ صحیح طرح سوچ سکتا ہوں۔" میں نے خالی پیٹ ہوتا ہے تو مجھے ذہن بھی کچھ خالی خالی محسوس ہونے لگتا ہے۔

"کیس ایسا تو نہیں یہ محض تمہاری خوش فہمی ہو کہ تمہارے پاس ذہن موجود ہے؟ ممکن ہے سوچ بچار کا فریضہ تمہارا معدہ ہی انجام دیتا ہو۔" وہ مصحوبیت سے بولیں۔ میں نے بغور ان کی طرف دیکھا۔ ان کے اندر بھی یقیناً کوئی پچھل روح تعقید تھی مگر حالات نے اسے دبا کر رکھ دیا تھا۔

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے اس قسم کے حملوں سے زبردست ہونا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے گویا انہیں خراج تحسین پیش کیا۔

"میرا یہ اطمینان... خوشی... تیزی و طراری سب معمولی ہے۔" وہ اندر پہنچ کر ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولیں "اندروں سے سخت خوف زدہ ہوں۔ جب سے میں نے وہ خوفناک چھٹا کا شاع ہے تب سے ابھی تک میرا دل خزاں رسیدہ ہے۔" کی طرح کانپ رہا ہے شاید تمہاری موجودگی کی وجہ سے میرا جو صلہ برقرار

رابطہ کیا۔ وہ میری آواز پہچان چکا تو میں نے کہا "شاہی ڈایا معلوم ہوتا ہے ہمارے پاس انتظار کی گنجائش نہیں رہی۔ جبار بیٹائی کے قوی عین مرتبہ تو میری موجودگی میں مسز درانی کو ہر اسان کرنے کے لیے خاصی خطرناک کاروائیاں کر چکے ہیں جن میں بچ بچ بھی ان کی جان بچاؤ کی گئی۔ میں پہلے ہی تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی کہ وہ ہمیں خاطر میں نہیں لایا۔ اب تو یہ بات بالکل ہی بزدلانہ سے باہر ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے اب وقت آگیا ہے کہ اس سے اپنا تعارف کرا دیا جائے اور وردہ باتیں کر لی جائیں۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں سرا" شفیع شاہ بے پروائی سے بولا۔

"تو را معلوم کہ وہ اس وقت اپنے دفتر میں موجود ہے یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سرا مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے ہی اپنے ایک قوی سے میری فون پر بات ہو رہی تھی۔ میں اس سے آواز ترین رپورٹ لے رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود ہے" شفیع شاہ نے بتایا۔

"بس" تو بھر ٹھیک ہے میں ہوٹل پہنچ رہا ہوں۔ فون کو بھی وہیں بلاؤ۔ ہم تینوں اکٹھے ٹھہریں گے اور جناب جبار بیٹائی سے "شرف ملاقات" حاصل کریں گے" میں نے کہا۔

"کیا ہم ان سے ڈیڑھ ایک ڈاکرات کریں گے سرا" شفیع شاہ نے پوچھا۔

"نہیں" ڈیڑھ ایک ڈاکرات کا وقت نہیں ہے۔ اب ہم ان سے پریکٹیکل ڈاکرات کریں گے" میں نے جواب دیا۔ میرے سامنے ان اصطلاحوں کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔ ان کے لیے صرف اشارہ کافی ہوا تھا۔ اس کے بعد صورت حال کے مطابق وہ خود ہی طے کر لیتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہو گا۔

میں کافی ختم کر چکا تھا۔ فون پر شفیع شاہ کو خداحافظ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور کافی نہیں ہو گئے؟" مسز درانی نے پوچھا۔

"کلھنڈا تو توڑی کافی، کافی است" میں نے صوفے پر سے فائل اٹھاتے ہوئے کہا۔

"واہ۔ کیا عموگی سے تم نے قاری کی ٹانگ توڑی ہے۔ اور ساتھ ہی کافی کی بھی ٹانگ توڑ دی؟" مسز درانی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

میں نے فائل کھول کر ان کے سامنے رکھ دی اور ایک کانڈ پر اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ "میں اس خط کو دیکھتا ہوں۔"

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"پاور آف اٹارنی" میں نے جواب دیا "وہ آپ کے خط کو دیکھ کر دے گی میں آپ کے اس جیٹ کلنڈر کا کھار کھل ہو جائی گا۔ جس کے ہاتھ چاہوں چاہوں اور ساری رقم ہضم کر جائی۔"

نے میری محنتگاریاں دہان کے بغیر کسی قسمی اس لیے شاید ان کی سمجھ میں نہ نہیں آیا تھا۔ انہوں نے ابھی آئینہ نظروں سے میری طرف دیکھا تاہم اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا اور فوراً ہی کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ میں اب بہت مطمئن تھا اس لیے نہایت دل جی کے ساتھ کھانے میں جُت گیا۔ مسز درانی نے صرف پچھلی کی ایک خاص ڈش ہی نہیں "دون ڈشیں اور بھی بتائی تھیں۔" بھی کچھ بہت عمدہ تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں توقع نہیں تھی کہ مسز درانی کو اتنے عمدہ کھانے پکانے آتے ہوں گے۔ ویسے بھی ایک عرصے تک وہ لوگوں کے کھانے کھاتے رہنے کے بعد گھر کے کھانوں میں کچھ زیادہ سی لطف آتا ہے۔ کھانے کے بعد میں نے سوئٹ ڈش پر ہاتھ صاف کیا۔

مسز درانی کافی بنا کر لے آئیں تو میں نے کرسی پر ذرا پھیل کر بیٹھنے ہوئے کہا "خلافت کا تقاضا ہے کہ آپ بیٹھیں میں کم از کم چار چھ مرتبہ میری دعوت کیا کریں۔"

"میری طرف سے تو تمہیں مستقل دعوت ہے۔ تم اگر اس کلنڈر میں رہنے کا حوصلہ کر سکتے ہو تو بیٹھ کے لیے ہمیں رہاؤ لیکن اس سے پہلے تمہیں جبار بیٹائی کا بندوبست تو میرا حال کرنا پڑے گا ورنہ کبھی کبھی سے گولی آتی رہے گی اور کبھی بدوشہ ان سے "مسز درانی مسکراتے ہوئے بولیں۔

"جبار کا بندوبست تو خیر ہو جائے گا لیکن میں یہاں مستقل رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر آپ ایسے ہی کھانے پکانا کر مجھے کھانا دیں گی تو میرا وزن تو کسی جالیانی پہلوں سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔ آپ نے میری خوراک نہیں دیکھی؟"

"میں نے نہیں اپنے ہوٹل میں تو اتنا کھاتے نہیں دیکھا" وہ بولیں۔

"میرا اصول ہے کہ کھانا بہت اچھا لگے تو بے حساب کھاؤ۔ زیادہ اچھا نہ لگے تو کڑا رے لائق کھاؤ اور اگر دو چار دن میرے نہ آئے تو صبح کے اوٹ کی طرح اس کے بغیر بھی ہمیشہ خوشی کام چلاتے رہو" ہاتھ پر ہنسنے لگا۔ نہ آئے وہ اپنے تمام معمولات سکون سے انجام دیتے رہو۔"

"اس اصول کو اپنانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں" مسز درانی کافی کی چسکی لے کر بولیں پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے پوچھا "تم نے جبار بیٹائی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"اب سوچنے کا نہیں" کوئی عملی قدم اٹھانے کا وقت ہے قانون! میں نے گھیسے لیے میں کہا۔ "مجھے اس کافی سے لطف اندوز ہو لینے دیں۔ اس کے بعد ایک مشین کے پڑے حرکت میں آنے والے ہیں۔ اس مشین کو اشارت ہونے سے پہلے کافی مل جائے تو نتائج عموماً ہتر ہوتے ہیں۔"

انہوں نے کندھے اچکائے اور خاموشی سے کافی کی چسکیاں لپٹے لگیں۔ کافی ختم کر کے میں نے ایک بار پھر فون پر شفیع شاہ سے

”ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ ابھی جو کھانا کھایا ہے اس کے ساتھ ہی قسم کر لیا“ انہوں نے بلا تامل کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

میں نے فائل بند کی اور رخصت ہونے کا تودہ میرے ساتھ باہر کی طرف چلتے ہوئے پوچھ لیں۔ ”تو کج تم اس سے بات کر دے گے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پوچھ لیں ”مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے پر فکر مندی کی پڑچھائیاں ابھرنی لگی ہیں۔

”بس گھر سے مت نکلے گا۔۔۔“ میں نے کہا ”گھر میں جو آپ کا دلی چاہئے سمجھئے۔“

وہاں سے رخصت ہو کر میں ہوٹل پہنچا تو آفس میں ٹولی اور شفیع شاہ دولوں میرے منتظر تھے۔ وہ بھی میری طرح عمدہ سوٹ میں تھے اور اوپن رے کے نو جان برنس مین دکھائی دے رہے تھے۔ شفیع شاہ کے پاس تو برف کیس بھی تھا۔

میں نے سائڈ ٹیبل سے اپنا برف کیس اٹھاتے ہوئے کہا ”جس بھی برف کیس ساتھ لے لیتا ہوں۔ آخر میں بھی ایک معزز پرنس مین ہوں۔“

وہ دونوں مسکرا دیے۔ میں نے پاور آف اٹارنی والی فائل اپنے برف کیس میں رکھ لی۔ چند منٹ ہم نے نیچی آوازوں میں باتیں کیں۔ اس دوران چائے کا دور بھی چلا پھر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم تینوں میری مرشدانہ میں روانہ ہوئے لیکن ذرا سیونک سیٹ پر شفیع شاہ تھا۔

جبار بیگانی کے دفاتر جس بلڈنگ میں تھے وہ ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ جلد ہی ہم وہاں پہنچے۔ وہ چھوٹے سے پلاٹ پر بنی ہوئی ایک اوپن اور ٹاور نما بلڈنگ تھی۔ باہر کی طرف اسپورٹنگ فیلڈ لگا کر بہت چمک دھمکی کی گئی تھی۔ وہ اندر کی بارنگ لائٹ اتنی چمکتی تھی کہ ہمیں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ میسر نہیں آ سکی۔ شفیع شاہ نے گاڑی چھٹی گلی میں کھڑی کی۔ یہ بھی ایک لحاظ سے اچھا ہی تھا لیکن ہم عقبی دروازے سے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

محارت کے گرد گھوم کر ہم دوبارہ صدر دروازے پر آئے۔ میں نے دیکھا بارنگ لائٹ میں ایک کونے میں زورونگ کی ایک اسپورٹس موٹر سائیکل بھی موجود تھی۔ مسز درانی کے ہال میں نے رائفٹل کے کنارے بعد جن دو آدمیوں کو موٹر سائیکل پر فرار ہوتے ہوئے بہت دور سے دیکھا تھا وہ بھی زورونگ کی تھی۔ اگر یہ وہی موٹر سائیکل تھی تو مجھے جبار بیگانی کی بے خفگی کی داد دینی چاہیے تھی۔ اس نے اپنی احتیاط کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ جس موٹر سائیکل پر کوئی واردات کرائی تھی، ہم انوکھ اسے قراچی بلڈنگ سے دور رکھنے کی ہدایت کرتا۔

محارت میں گراؤنڈ فلور پر ایسی جگہ پر ریسپشن بنا ہوا تھا کہ

باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص اس کے سامنے سے گزرے بغیر اندر یا اوپر نہیں جاسکتا تھا۔ دیکھتے ہی اس پر ایک ایسی سر ہلانا شروع کی ریسپشنسٹ بیٹھی تھی کہ شاید کسی کا اس سے رجوع کیے بغیر اندر جانے کو دل ہی نہ چاہتا۔

کچھ لوگ پونجی کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی اندر یا پھر سیزینوں اور لفٹ کی طرف جا رہے تھے لیکن وہ یقیناً ان کی رفتار میں ملازم تھے۔ شفیع شاہ مجھے تھپا تھپا کرتا کہ کوئی ایسی اگر اس طرح جانے کی کوشش کرے گا تو اسے روک لیا جاتا تھا۔ سیزیمیاں اور لفٹ پاس پاس ہی تھیں۔ دوبارہ وہی گاڑی وہاں کھڑے تھے اور آئے جانے والوں کا قطعی نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔

ہم خود ہی ریسپشن کے سامنے جا کر کے اور شفیع شاہ نے پری معصوم ہی شکل بنا کر پوچھا ”جبار بیگانی صاحب سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟“ سوال اس نے انگریزی میں کیا تھا۔

اس حشر سماں میں کسی ریسپشنسٹ نے مجھے مسکراہٹ کے ساتھ باہر باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا اور بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں بڑی شائستگی سے انگریزی میں ہی پوچھا ”کیا ان سے آپ کی ملاقات ملے ہے؟“

”جی نہیں۔۔۔ مگر میرا خیال ہے“ وہ ہم سے مل لیں گے۔ ہم ان سے ایک انہم بات کرنے آئے ہیں“ شفیع شاہ نے جواب دیا ”بہت بڑا کاروباری معاملہ ہے۔“

ہمارے ملنے اور شخصیتیں اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کالی قمیص۔ قمیص اور منڈب سی شخصیتوں کے مالک تھیں سونڈوٹ اور نہایت شائستہ پرنس مین یا ایگزیکٹو نظر آنے والے آدمی اس کے سامنے کھڑے تھے جن میں سے دو نہایت قمیص قسم کے برف کیس بھی اٹھاتے ہوئے تھے۔

اپنی قمیص مسکراہٹ پر قرار رکھتے ہوئے اس نے بلینین کی طرف ہاتھ بڑھایا ”میں انہیں کیا بتاؤں؟“

”ان سے کہئے کہ مسز درانی والی پر اپنی کے سٹیلے میں تین صاحبان بات کرنے آئے ہیں“ شفیع شاہ نے جواب دیا اور میری طرف اشارہ کیا ”یہ مسز درانی کے دکان ہیں مسٹر افضل بار اینٹ لا۔“ پھر اس نے اپنی اور ٹولی کی طرف اشارہ کیا ”ہم ریکل اسٹیلٹ کا کاروبار کرنے والی ایک کمپنی پر مشتمل ہیں۔“ اسٹیلٹ میں ”کے نام سے“ ڈینس میں ہمارا دفتر ہے۔“

لڑکی نے حمایت سے سر ہلایا اور نہایت نیچی آواز میں فون پر غالباً جبار بیگانی کو ہی ہمارے بارے میں بتائے گی۔ چند لمحوں بعد اس نے ریسپورر دکھا اور ہمارے لیے باقاعدہ ایک گیسٹ پاس بنا کر کے ہمیں دیا پھر پہلے سے زیادہ قمیص مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”ٹاپ فلور پر پاس کی سیکٹری آپ کی منتظر ہیں۔“ ہم تینوں نے بیک زبان اس کا شکریہ ادا کیا اور لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ ہمیں اتنا شرطانہ رویہ اختیار کرنے کا کھڑا دکھ اس کے

مگر شفیق شاہ تصدیق کر چکا تھا کہ اس بلا جگہ کے راستوں یا لٹ و غیوہ میں کہیں خفیہ کمرے نصب نہیں تھے جن سے جبار جیلانی اپنے آفس میں بیٹھے بیٹھے ٹی وی اسکرین پر ہماری صورتیں دیکھ سکتا۔ ہم بھی غیر محسوس طور پر ادھر ادھر کا جائزہ لے کر تصدیق کر چکے تھے کہ کہیں سے کسی کمرے کی خفیہ آنکھ ہمیں نہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید جبار جیلانی ابھی اتنی احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے اس نے یہ کھڑا گ نہیں بالا تھا۔ اس کے خیال میں اس کے موجودہ انتظامات اور اس کی دہشت ہی اس کے قاتلوں کو اپنی حدود میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔

ہم نے اپنے آپ کو گمن ہواخت پر دیکھ کر کوئی کام دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ہم ایسی کوئی کوشش کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ کافی تھا۔ کوئی کام دکھانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمارے کچھ قریب ہوتے۔ چنانچہ ہم نے تین شریف کاروباری شخصیات کی طرح 'اتنی خزانہ' نہیں دیکھ کر تھوڑا سا نفوس ہوجانے کی اداکاری کی۔ بلکہ ٹولی نے تو ہاتھ بھی اٹھا دیے کیونکہ اس کے پاس بریف کیس نہیں تھا۔ میں نے اور شفیق شاہ نے کچھ ایسی اداکاری کی جیسے ہمارے ہاتھوں سے بریف کیس گرتے گرتے بچے تھے۔

گاڑی کی گھنٹی نہیں 'ان کی صورتیں بھی خاصی خزانہ کی ی تھیں۔ ان میں سے ایک نے گمن سے اور دوسرے نے ایک

بلا بنا پر کہ ہم کراؤنڈ فلور پر ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتے تھے ان کی اطلاع ٹاپ فلور پر بیٹھے جبار جیلانی کو ملتی اور وہ قتل انداز سے ہوشیار ہو جاتا۔ زمسٹیشن نے ہمیں اس لٹ کی طرف لے کا اشارہ کیا جو صرف باس اور اس کے ملاقاتیوں کے لیے مومن تھی اور سیدھی ٹاپ فلور پر جاتی تھی۔ راستے میں کہیں

لٹ کا دروازہ کھلا تو ہم نے خود کو ایک راہداری میں پایا جس پر دونوں طرف کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے ناگ کی دھ میں گولی کا ایک شاندار دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔ راہداری پر دینر قائم بچا ہوا تھا اور بدھشی مدھم تھی۔ اس قسم کی راہزماں اور ایسی آرائش عام طور پر اچھے ہوٹلوں میں دیکھنے میں آتی تھی۔ شفیق شاہ عمارت کی ساخت اور قرب وجوار کی عمارتوں، بارے میں بھی تمام ضروری معلومات حاصل کر چکا تھا۔ وہ مجھے روٹی کو بھی ان معلومات سے آگاہ کر چکا تھا۔

اس بند دروازے کے قریب سے ہی سیڑھیاں اوپر جاری ہیں جن کے راستے چھت پر جایا جاسکتا تھا لیکن دروازے کے اسی طرف باوردی گاڑی ہلکی ٹھٹھیں گمن لیے کمرے تھے جن کا رخ دی طرف تھا۔ ایک لمبے کے لیے تو میں ٹھٹھ گیا کہ کیا بچے سے پر آنے کے دوران ہی ہماری حقیقت کھل چکی تھی؟ کیا جبار جیلانی کو پہنچا تھا کہ میں حقیقتاً کون تھا؟

لاذوال کمانیوں کے خالق  
انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے  
ایک نئی سوغات

رقص ابلیس

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی۔  
ایک آشفٹہ حال کی داستان عبرت جسے قانون نے مجرم بنادیا

قیمت - 150 روپے

ناشر - مکتبہ القریش سرگرم بازار دو بازار لاہور 2

ہاتھ سے ہمیں اشارہ کیا کہ ہم لٹ سے ذرا آگے ہی روک جائیں جہاں ہم پہنچ چکے تھے۔ پھر وہ دونوں غریب ہمارے قریب آگئے۔ میرا دل بار بار ہلکا ہوا۔ کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے جب شکار خود شکار ہوا شکاری کے پاس آجائے۔

”نہ نہ، خیریت تو ہے؟“ میں نے پھکاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ہاں۔ خیریت ہی ہے“ ایک گاڑ گویا ہماری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زبردستی مسکرایا۔ ”اندازہ ہے پلے آپ کو تلاشی دینی ہوگی اور یہ برف کیس کھول کر دکھائے ہوں گے۔ یہ ہمیں کا اصول ہے۔ سب سمان اس سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔“

”دوست! میں نے گویا اطمینان کی طویل سانس لی اور بازو چپے کرتے ہوئے کہا ”تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔“  
 اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ آئیں کے دروازے سے آگے آگئے تھے۔ دیکھتے تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آئیں کا دروازہ ساڑھے پروف تھا اور چھوٹی موٹی کھڑکی آواز میں اندر نہیں جاسکیں گی لیکن یہ اور بھی اچھی بات تھی کہ اب ہم سب دروازے سے غاصے قاصدے پر تھے۔

میں نے اور شیخ شاہ نے برف کیس دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ لگا کر رکھ دیے اور ہاتھ اٹھا کر گویا تلاشی دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک گاڑ نے گمن سے ہمیں گور رکھا۔ دوسرے نے گمن کندھے پر لٹکائی اور غالباً ہمارے لباس کو چھتہ پانے کے ارادے سے دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ ہم اسے تلاشی دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ہم تینوں کے پاس نہ صرف نہیں بلکہ ضرورت کی اور دو چار چھوٹی موٹی چیزیں موجود تھیں جنہیں عام لوگ خطرناک اشیاء میں شمار کرتے تھے۔

چنانچہ اُدھر اس گاڑ کے ہاتھوں نے میرے لباس کو چھوا، اُدھر ان کے سروں پر قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔ دوسرے گاڑ کو شاید پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ کب اور کس طرح اس کے ہاتھوں سے گمن نکل گئی۔ شیخ شاہ اور نوئی کے ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آئے تھے کہ میں خود بھی انہیں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ خان ان دونوں نے گاڑ کے سروں پر کرائے کے وار کیے تھے۔

دو دونوں لڑکھائے لیکن میں نے انہیں گرنے نہیں دیا اور تیزی سے حرکت میں آئے ہوئے دونوں کی گردنیں بازوؤں میں جکڑ لیں۔ اسی اثنا میں ان کی گھٹیں شیخ شاہ اور نوئی کے ہاتھوں میں جا پکڑیں۔ میں نے حصن احتیاطاً ان کی گردنیں بازوؤں کے گھٹنے میں جکڑی تھیں کہ وہ کوئی آواز نہ نکالنے پائیں لیکن اسی لمحے مجھے اندازہ ہو گیا کہ شیخ شاہ اور نوئی کا ایک ایک دھاری ان کے لیے کافی ثابت ہوا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکے تھے تاہم میں نے انہیں گرفت میں نہ رکھا۔

نکال کر اپنی پہلی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے کہ کوئی دیکھ نہ سکیں نہ کہا تاکہ یہ انسانی ہاتھوں کا کام تھا۔ انہوں نے ان کے ہونٹوں پر ٹیپ بھی چپکادی۔ ایک گاڑ کی خوفناک سوچوں کی وجہ سے ہونٹوں پر ٹیپ چپکانے میں چند سیکنڈ زیادہ لگ گئے۔

اس دوران میں نے آئیں کے دروازے پر بھی نظر رکھی تھی کہ کیس دور اچانک نہ کھل جائے اور ان نازک لمحوں میں کوئی باہر نہ آجائے مگر کام خیریت سے مکمل ہو گیا۔ اس میں بہ مشکل ایک منٹ لگا ہو گا۔ میں نے ان کی گردنوں کو بازوؤں کے گھٹنوں سے آزاد کر دیا اور اسی لمحے شیخ شاہ اور نوئی نے جبکہ کراہتیں کندھوں پر لا دیا۔ فورا ہی وہ بے آواز قدموں سے میڑ میڑوں کی طرف دوڑتے پلے گئے۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا ہاتھ بغل پر لٹکا اور نظر آئیں کے دروازے پر تھی لیکن مزید چند سیکنڈ بھی خیریت ہی رہی اور اس دوران شیخ اور نوئی ان دونوں گاڑز کو چھتے پر لٹا کر واپس آگئے۔ وہ اپنا کوٹ اور نوئی ڈیفو ٹیک کرتے آ رہے تھے جن پر صرف چند ٹکٹیں آچکی تھیں لیکن مجموعی طور پر ملنے میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”اب وہ آرام سے کچھ دیر دھوپ سیکھیں گے“ شیخ شاہ بلی آواز میں بولا۔

”اور ان کی گھٹیں؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔  
 ”وہ ہم نے پانی کی گھٹی کی آڑ میں کھڑی کر دی ہیں۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں“ اس نے جواب دیا۔

ہم نے ہاتھ جھاڑے اور ایک بار پھر ہونٹوں پر نہایت غلیظ اور اسمن پسندانہ سی مسکراہٹ سجا کر نفیس کا دھاری لوگوں کی طرف چلتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر جا پہنچے۔ خشک فضا، دو دھیاؤں اور دلفریب خوشبو نے ہمارا استقبال کیا۔ دروازے نے ایک نہایت خفیف اور سترقم سی گھٹتی سے گویا ہماری آمد کا اعلان کیا۔ کمرے کے دوسرے کمرے پر دروازے کے ساتھ ایک خوب صورت میز اور اس کے لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ساڑھے تین تین چار رنگین کے فون، انٹر کام اور کسپیڈر وغیرہ بھی موجود تھا۔ ایک نہایت خوب صورت اور خوش لباس لڑکی کسپیڈر کے کنارے سے کھیل رہی تھی اور نیلی اسکرین پر کچھ اندازہ دو شمار تھا۔ نہایت مدہم اور سترقم گھٹتی کی آواز میں کردہ ہماری طرف توجہ ہوئی لیکن میں اسی وقت اس کے پہلو میں ایک فون منگوا کر اٹھا۔ اس نے اس کا ریسپنڈر اٹھالیا۔

میں نے دروازے پر ہی رک کر سرگوشی میں فونی سے کہا ”فونی! یہ اکثر بڑے دھندے کرنے والے بد معاش اپنے دفتروں کے لیے اتنی خوب صورت اور سلیقے کی لڑکیاں کہاں سے ڈھونڈ لے جاتی ہیں؟“

ہمیں گھور رہا تھا۔ اتنے بے جوڑ بھائی میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔ شاید ان میں سے ایک کی حیثیت ذہن کی اور دوسرے کی جسم کی تھی۔ اس لیے آج کے دور میں بھی دونوں کا ساتھ اتنی محنت سے نبھ رہا تھا۔

جبار بیٹائی کو دیکھ کر مجھے جو خفیف سا جھکا لگا تھا میں نے تو اس کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ کر اپنی حیرت نہیں چھپا سکا۔ مجھ پر نظر پڑنے ہی وہ یکدم میرے کچھ آگے جھک آیا اور سگار سمیت دو انگلیوں سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تھیں تو قافیہ اشار ہوئی کے مالک افضل چو بدی ہو۔۔۔ کہا تم نے اپنے آپ کو نیچے ریسپشن پر مسز رانی کا وکیل ظاہر کیا تھا؟" "ہاں" میں نے اطمینان سے سر ہلایا "وکیل ظاہر نہیں کیا تھا۔۔۔ بلکہ میں جج وکیل ہوں۔ قافیہ اشار ہوئی بے شک میرا ہی ہے لیکن بنیادی طور پر میں برسر ہوں۔ شریعہ طور پر کبھی کبھار اپنے کچھ جاننے والوں کے قانونی معاملات کی ذمہ داری لے لیتا ہوں۔"

اسے شاید کچھ اطمینان ہوا کیونکہ اس کی کردہ بان ریو الویک چیز کے پٹے سے جا ملتی تھی اور یہ گویا اس کے عقب میں کھڑے ہوئے غفار بیٹائی کے لیے اشارہ تھا کہ زیادہ گھڑی کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس کا اپنی جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ واپس اٹھایا تھا اور چہرے پر خوشنودی کے آثار کم ہو گئے تھے ورنہ میرے جھوٹ کا اندازہ ہوتے ہی گویا انہیں خشرے کا احساس ہوا تھا لیکن میں نے فوراً بات بیا کر انہیں مطمئن کر دیا تھا۔ کم از کم عارضی طور پر تو کرسی دا تھا۔

اہم جبار کا وہ یہ پھر بھی زیادہ دوستانہ نہیں ہوا۔ اپنے سامنے بڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "بیٹھو۔۔۔ بیٹھو" شخصیت کے برعکس اس کی آواز نہایت بھاری اور مٹا کر تھی۔ ہم نے جان بوجھ کر کرسیاں میز سے کچھ دور کر لیں تاکہ آسانی سے حرکت کرنے کے لیے کھلی جگہ میسر رہے۔ مجھے پچان لینے کے باوجود اس بد بخت جبار بیٹائی نے بد اخلاقی کی حد کر دی کہ ہنسنے سے گرم کے لیے بھی نہیں پوچھا اور سگار اینٹ ٹرے میں مسل کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر پلاٹیمڈ پوچھا "ہاں۔۔۔ بولیں۔۔۔ کیا بات کرنے آئے ہو؟"

خفیہ کا بچہ اپنی شامت کو آواز نہیں بلکہ آواز میں دیے جا رہا تھا۔ وہ کچھ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے اس کے سامنے ایک فانیہ اشار ہوئی اور ملک کے ایک بڑے گروپ آف کینیڈا کا مالک نہیں بلکہ اس کا کوئی معمولی ملازم بیٹھا ہوا تھا اور اپنی خزانہ میں اٹھانے کا مطالبہ لے کر آیا تھا۔ میری تھوڑی جاس کی حرکتوں کی وجہ سے پہلے ذرا کم گھوم رہی تھی اب تیزی سے گھومتی لگی تھی۔ کپتالیاں چب رہی تھیں۔

میں نے جواب دینے میں توقف کیا تو وہ تدریجاً منتظرانہ لہجے

ہوئے سرگوشی میں بولا "اور پھر خوب صورت لڑکیاں بھی ان کا اہم سرمایہ بنتی ہیں۔"

ہم آگے براہ کمریز کے قریب جا پہنچے تو لڑکی ماؤتھ میں پراہتہ رکھ کر ہماری طرف دوبارہ متوجہ ہوتے ہوئے بولی "آپ لوگ مسز رانی والی پراہتہ کے سلسلے میں آئے ہیں؟"

"جی۔۔۔" شخص نے نہایت شرمیلے لہجے میں کہا۔ "آپ اندر چلے جائیے۔ ہاں آپ کا انتظار کر رہے ہیں" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم اس طرف پیچھے تو اندازہ ہوا کہ جبار بیٹائی کے کمرے کا دوبارہ ایک خوب صورت آرائشی پارٹیشن کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ اس پر تاجے کی نہایت خوب صورت نیم پلیٹ جڑی ہوئی تھی۔

ہم نے یہ دوبارہ گھولا تو اس نے کوئی چوں ہاں نہیں کی۔ جبار بیٹائی سامنے ہی ایک شاندار میز کے عقب میں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھکا لگا۔ میں نے اس کے بارے میں کوئی بہت اونچا تصور تو نہیں بنایا تھا مگر بھی اس کے بارے میں افسانے سن کر توقع تھی کہ تھوڑی بہت بارعب بھاری بھر کم یا متاثر کن شخصیت کا مالک تو ہو گا لیکن اسے دیکھنا ایک طرح سے "گھوراپنا ڈھکا چرپا" والا معاملہ ہی تھا۔

وہ بہت ہی مختصر البود تھا۔ سر سے چپکے ہوئے بالوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ آنکھیں مختصر چہرے پر سینڈک کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ اوپر سے اس نے سوچیں جو کھوں والی رکھی ہوئی تھیں جو اس کے چہرے پر قطعاً نہیں فٹ دیتی تھیں مگر شاید یہ باتیں اہم نہیں تھیں۔ اہم باتیں یہ تھیں کہ وہ کدو فٹتی تھا۔ اس نئے جسم پر نہایت پیش قیمت سوٹ تھا۔ اس کی "انی سیٹلڈ" (INITIALED) ٹائی سی شاید ہزاروں روپے یا کینڈوں والر کی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں تھیں اور وہ کمرے کی فلک نشانی ہونا کے سگار کا ڈھواں نکھیر رہا تھا۔

برائیاں کی حد تک قیامت ٹھیک تھی لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ اس جسم کی شخصیت کا مالک لینڈ بانی کا مدح دواں بھی ہو سکتا تھا۔ لینڈ بانی کو پلاٹا خطرناک لوگوں کا کام تھا۔ میرا مطلب ہے جو دیکھتے ہیں ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ برہ حال۔۔۔ اس شاندار ریو الویک پیچھے میں دھنسنے ہوئے جبار بیٹائی کی شخصیت اگر "خطرناک" سے خالی تھی تو اس نے توازن برقرار رکھنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

اس کی کرسی کے عقب میں گویا ایک بیو زاوا اشارہ تھا۔ اس پر نظر پڑنے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ غفار بیٹائی تھا۔ مسز رانی نے اس کا جو ٹھیکہ اور نشانیاں بیان کی تھیں وہ میرے ذہن میں آواز میں تھیں۔ وہ ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا جسے دیکھ کر ہی ایک کمزور دل آدمی کو جھرمجھی آسکتی تھی۔ وہ گویا اپنے کمزور اور مختصر البود بھائی کو اپنی پناہ اپنی چھائی میں لیے کھڑا تھا اور کینڈوں نظر توں سے

لرائی "اس میں اس مکان کے بارے میں میرے نام پور اثر  
انسانی موجود ہے۔ اب ہمیں اس کے بارے میں جو بھی بات کرنی  
ہو، مجھ سے کرنا اور اس ضمن میں تمہارے لیے سب سے زیادہ  
فائدے کی بات یہ ہے کہ مجھ سے کوئی بات نہ کرو اور اب اس بات  
کو بھول جاؤ۔"

وہ چند سیکنڈ کے لیے بالکل خاموش رہا اور ایک نکل میری  
طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں اتنا گرامر سکوت تھا کہ میں اس کے بھائی  
کی سانسوں کی خرخرات بھی سن رہا تھا جو کسی غصہ و رمان کی  
سانسوں کی شل شلوں سے مشابہ تھی۔

آخر جبار جیلانی نے ایک بار پھر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگایا  
اور کمری سانس لے کر کہا "اس خزانہ کو بھی آخر کار اپنا کھیلنے  
کے لیے ایک چنڈ مل ہی گیا۔" پھر وہ نہایت نرم لہجے میں  
سمجھانے کے سے انداز میں بولا "دیکھو بر خوروارا یہ جو تم نے 'پاور'  
آف اٹارنی' کی بات کی ہے۔ اس میں 'آف اٹارنی' کے الفاظ  
بالکل نالتو ہیں۔ اصل چیز صرف پاور ہوتی ہے۔ اور پاور ہمارے  
پاس ہے۔ اس لیے ہم کسی اٹارنی وغیرہ کو نہیں ماننے میں اس  
ٹیرمی عورت کے ساتھ جتنی شرافت کا مظاہرہ کر سکتا تھا، کر چکا۔  
میں نے اسے وہ آفر دی جو اس مددی میں حاتم ظاکی کا کوئی باقی نہیں  
بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اب بہت ہو چکی۔ اوپر سے تم کاغذ کے یہ  
چڑے لے کر میرا دل جلاتے آگے ہو۔"

اس نے کرسی ذرا سی مٹھا کر اپنے گینڈے نما بھائی کی طرف  
دیکھا اور بڑے پارے کہا "غفار ان شریف شرقا قسم کے لوگوں  
کو بتاؤ کہ پاور اور پاور آف اٹارنی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ فائل  
ان صاحب کے ہاتھ سے لے کر چلاؤ کہ کوئی سے باہر بھیج دو۔"  
غفار کے بیکہ پینے ہوئے پر مسکراہٹ اُبھری گویا اسے اس  
کے پسندیدہ کام کا موقع میسر آ رہا تھا۔ وہ ہماری طرف بڑھا۔ حریت  
انگیز بھرتی سے وہ جیب سے پستول نکال چکا تھا اور پینے کی طرح چمکنا  
نظر آ رہا تھا۔  
۲۰۰۰ء۔ روم، بہت سی عورتیں، عورتوں کی

میں بولا "مجھے پتا چلا ہے، وہ عورت آج کل تمہارے ساتھ  
تمہارے اوٹل میں بہت دیکھی جا رہی ہے۔ تمہاری اس عورت  
میں یا اس کی پر اپنی میں کیا دلچسپی ہے؟" وہ گویا میرا انٹرویو لے رہا  
تھا۔

"اس عورت کی وہ عمر گزر چکی ہے جب اس میں دلچسپی لی  
جاسکتی تھی" میں نے ننگ لہجے میں کہا۔

اس کے سیاسی مائل ہونے پر خفیف سی مسکراہٹ اُبھری گویا  
میں نے اس کا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا ہو اور وہ میرے بارے میں  
ذرا کم پائندہ لگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

"وہ اب بھی خاصی ٹھیک خاک چیز ہے" وہ گیندیاں میز پر  
ٹکاتے ہوئے بولا "منا ہے جوانی میں بڑی شعلہ جولا تھی۔ بہت سی  
چنگاریاں اب بھی باقی ہوں گی۔"

میں کچھ دیر اور مہذبانہ داخل پر قرار رکھنا چاہتا تھا لیکن اس  
کی یہ بات سن کر میں نے ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا "اب اس مت  
کہ۔۔۔ مجھ سے اس کا وہ بڑا گناہ اور شفقانہ ہے۔"

حیرت انگیز طور پر اس نے میری بات کا پراٹھا نہیں مٹایا اور ہلکا  
ساتھ لگایا لیکن غفار جیلانی دانت چس کر آگے آئے ہوئے بولا  
"تم بھائی جان سے اس لہجے میں بات کر رہے ہو! تمہاری یہ  
جرات!"

مگر جبار جیلانی نے صرف ہاتھ اٹھایا اور وہ یوں رک گیا جیسے  
گاڑی کو پوری قوت سے بریک لگا دی گئی ہو۔ وہ بھائی کی طرف دیکھے  
بغیر بولا "ابھی انہیں بات کہنے دو۔ شاید اس سے زیادہ غصے کا  
مرحلہ آگے آئے۔"

پھر اس نے میری بات کا جواب دیا "اس کے بزرگانہ اور  
شفقانہ معنی پر نہ بنا۔ رنگین مزاج عورت ہے۔ جب اس پر  
جذبات غالب آتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتی ہے۔"

مسز درانی کی شخصیت بلاشبہ ابھی مکمل کنڈر نہیں ہوئی تھی  
اور ان میں کشش بھی موجود تھی لیکن مجھے ان کی حرکات و سکنات  
یا آنکھوں میں کہیں بھی رنگین مزاجی کی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔  
بہر حال اکثر لوگ عورتوں کے معاملے میں دور کے تماشاخی ہوتے  
ہوئے بھی بڑے وقتوں سے اپنے "مگر ان قدر" خیالات کا اظہار  
کرتے رہتے ہیں۔

جبار جیلانی نے مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر بات جاری رکھتے  
ہوئے کہا "بہر حال مجھے صرف اس کے مکان سے دلچسپی ہے۔ کیا تم  
لوگ اس پر کچھ پیش کرنا کہنے کے ارادے سے آئے ہو؟"

"میں ہمیں یہ بتانے آیا ہوں کہ مکان کو تھپانے کے لیے تم  
نے بندر کی طرح جو اچھل کود پھاڑ رکھی ہے وہ اب بندہ گود" میں نے  
اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سر دیکھے میں کہا پھر اس کی طرف  
سے نظر ہٹائے بغیر برف کیس سے فائل نکال کر اس کے سامنے

نہایت ہی اچھے اور پیچھے دیکھنے والے ستونوں پر ایک سرکش  
مکاف کی سرگھرائی اُبھرتی چلائی گئی باقی واقعات  
گیتا دھوئیں جیسے مکاف کی پڑھیں۔



# سکس



محمود احمد مودی

11

ہمارے اپنے گل کو چول میں ہونے والا قاتل شائے آہن و سنگ  
ہمارے آپ کے گرد بکھرے ہوئے گوداروں کی داستان ہزار رنگ

B/173

محمود احمد مدودی



جاسوسی  
ڈائجسٹ  
کے  
مقبول ترین  
سرگزشت

فونے

۴۲۳۶۶۵

کتبہ القریش۔ سرکر روڈ۔ اردو بازار لاہور

حقی غدار کے ہاتھ بندش میں بکڑ جاتے۔

میں صرف یہیں تک دیکھ سکا کہ نگہ میں جبار کی طرف سے بھی غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ پہلے سے بڑے شدہ حکمت عملی کے مطابق اسے سبوتاہجی ہی ذمے داری تھی۔ میں اس کے بارے میں کسی خوش فہمی میں بھی جکڑا نہیں تھا۔ وہ بے شک طاقتور اور خطرناک دھمکیاں نہیں دیتا تھا لیکن سابق خواہ مخواہ وجود اور بظاہر بے ضرر نظر آنے والا ہو تب بھی یقین سے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ضرر پہنچانے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔

میرا اس کی طرف سے خیوار رہنا سفیدی ثابت ہوا۔ اسے حرکت میں آنے میں دو تین سیکنڈ کی تاخیر بھی شاید اس لیے ہو گئی کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا ہو گا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اپنے قابل غور ہائی کا یہ مشرہوتے شاید کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ اور وہ بھی چمڑے جسم کے دو ایسے نوجوانوں کے ہاتھوں سے جو ٹیٹے اور صورت سے نہایت شریف بلکہ مسکین جسم کے بڑس میں نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں مینڈک کی آنکھوں کی طرح پلے پی اُبھری ہوئی تھیں لیکن اس دوران شدید جرت کے باعث کچھ اور اُبھر آئی تھیں۔

اس کی میز میں اس کے ہاتھ کے قریب سی جاکوئی ایسا نشانہ تھا جس میں رپہ اور رکھا رہتا ہو گا کہ نگہ اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور اس نے کوئی دراز ذمہ نہیں کھلی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں جدیدہ ساخت کا ایک ڈبل جمل رپہ اور دکھائی دیا تھا جو چہ گولیاں فائر کرتا تھا۔

میں نے اسے رپہ اور سیدھا کرنے کا موقع نہیں دیا اور میرے دو سری طرف سے ہی جھپکتے ہوئے اس کی کٹائی پر ہاتھ ڈال دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کھوپڑی پر کرانے کا وار کیا۔ اس کا رپہ اور دکھائی دیا تھا میز کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھا۔ رپہ اور سر حال لوٹو تھا۔ اس سے فائر ہو گیا۔ دو گولیوں کا دھماکا بھی زیادہ زوردار نہیں تھا کہ نگہ رپہ اور پر ساٹھلے بھی موجود تھا۔ البتہ میز کے کسی حصے کے پر اُٹھنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے اس کی کھوپڑی پر کرانے کا ہاتھ ہٹا کر سیدھا کیا تھا لیکن اس کے لیے وہی کالی ہاتھ۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ اس کی دھڑکنے والی منہری سے پرواز کر گئی تھی کیونکہ اس کا جسم یک لخت بالکل دھلا دھلا دیا تھا۔ رپہ اور ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا کر اُڑا اور اُبھری ہوئی آنکھیں ایک دم کچھ نیچے کو چلی گئیں۔ ان آنکھوں میں شاید مینڈک کی آنکھوں کی طرح پلے پلے اور بکڑنے کی صلاحیت تھی لیکن مختلف کیفیات میں وہ حق اور اُبھری تھیں۔ بغیر یہ تھا کہ ابھی اس کی آنکھیں بند نہیں ہوئی تھیں۔

میں نے اسے گردن سے پکڑ کر میز کے اوپر ہی سے اپنی طرف کھینچ لیا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا۔ اس کے گتے پر ہائی اور کار کا کھنڈ ختم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر نہیں ابھر آئیں تھیں اور سائیں فرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھیں تاہم اس سے مجھے یہ

جبار جیلانی کا اس مدد تک حکمرانہ رویہ میرے لیے جرت کا باعث تھا۔ جسی جی نہیں آتا تھا کہ اثر رسوخ دینا یا سیاسی پشت پناہی اور غصوں کی فوج بھرتی کرنا واقعی انسان کو فروغ بخاتی ہے مگر کوئی نہ کوئی ایسا نمونہ سامنے آ جاتا تھا کہ مجھے یقین کرائی پڑتا تھا۔

ایسا ہی ایک نمونہ جبار جیلانی کے دوپ میں اس وقت میرے سامنے تھا۔ اس کا وہ زار بھائی غدار جیلانی اس کے جسم پر ہتھل سنبھالے کچھ ہیں ہماری طرف بڑھ رہا تھا جیسے اس سے ہماری پوچھنا۔ بلکہ شاید قہر مار کتے ہیں کے سامنے پھینک دے گا۔ ہمارے تیس سوٹ مسکین سی مسکراہٹ اور بے وقوفوں کی طرح پیل پیل سی آنکھیں اسے غلامی میں جکڑنے کے لیے کافی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اس بے جا بے اثری بھی آیا۔ اسے شاید پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا اور کس طرح ہوا۔ فنی اور فنی شاہ اچانک ٹوٹ جانے والے اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ اس کے بعد غدار کا ہتھل ہوا میں اُڑنا ہوا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور وہ خود اُدھے منہ فرش پر پڑا تھا۔

فنی اس کی گھر پر سوار تھا۔ اس نے اس کے بال ٹھکی میں بکڑ کر اس کی پیشانی زور سے فرش پر ماری کہ فرش پر دھڑک لیں موجود تھا۔ اس کے باوجود جگہ سے اُڑا نہ گا مشکل نہیں تھا کہ غدار کی تیز رفتار کھوپڑی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ غدار کو کہ فنی اور فنی شاہ کے مقابلے میں نہایت گراں بیل اور خطرناک نظر آتا تھا لیکن اس وقت پلک جھپکتے میں فنی نے اسے ہوں دھکیا تھا جیسے پلے چہ کہ وہ جی جی ہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ یہ ملی جاست میں چہ ہے سے پھلتی تھی البتہ قد میں اسی کے برابر تھی۔

فنی نے جس طرح اس کا سر فرش سے کھرایا تھا مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید اس کی دھمک گراؤ زور تک تھی ہو۔ اس کی جسمانی ساخت بتاتی تھی کہ اس کا سر لوہے کے گولے کی طرح مضبوط ہو گا لیکن پیشانی کے ساتھ شاید اس کی ناک بھی فرش سے کھرائی تھی اور پک تھی تھی۔

وہی سی سر فنی شاہ نے ہری کر دی۔ وہ غدار کو اُدھے منہ فرش پر کرانے کے لیے اسے تھپا تھپا کھوکھائی چکا تھا۔ اب اس نے جبکہ کر اس کی دونوں کٹھنوں پر ایک وقت میں گھونٹے رسید کیے جیسے کسی بڑے سے تیز زکو پکائے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے خیال میں وہ دیا تھیں بیکنڈ کی یہ کارروائی ہی غدار کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔

اس کا سر تباہ فرش پر نکالی دیا گیا تھا۔ اسی لمحے میں نے فنی کو اس کے ہاتھ پٹ پر لانے دیکھا۔ فنی شاہ اس سے بھی زیادہ چھٹی سے برف کس سے زوری نکال کر اسے دے رہا تھا جس کا ایک مخصوص پھل پلے ہی تار تھا۔ بس اسے کا تیل بچ جانے کی وجہ

حال ملحقہ کرے میں ہی چلتی تھی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں کمرے میں دو دلوں کی جگہ چکی تھی۔ وہ اسے توشیح میں جلا کسے کے لیے کافی تھی۔ ہماری مشائی، صارت اور احتیاء کے باعث اس ساڑھے پونے کمرے سے شاید بہت ہی مدھمی آوازیں نکلنے لگیں تھیں۔ لیکن ہر حال وہ جنس سے مجبور ہو کر پھر اپنے اطمینان کے لیے کمرے میں جھانکے چلی آئی۔

ہم نے جان بوجھ کر دواخانہ اندر سے غیر منتقل کر دیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ وہ اندر جھانکنے کی کوشش کرے گی اور اگر اسے دواخانہ منتقل ملا تو وہ باہر سے باہر کوئی کارروائی کر سکتی تھی اور کسی ممکنہ گزری کی اطلاع اچھے طور پر دوسروں تک پہنچا سکتی تھی۔ اس سے بہتر تھا کہ اسے اندر آنے دیا جائے۔

دواخانے کی باب کھولنے کی خفیہ سی کلک کی آواز سننے ہی فطیح دواخانے کے قریب دو دروازے کا چپکا تھا۔ جو کئی سیکڑی کا خوبصورت سردواخانے سے اندر آیا۔ فطیح شاہ کا ہاتھ ایک کھنٹی کھانڈی کی طرح چپے آیا اور دوسرے ہی سے سیکڑی اونٹنے سے کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ اس کے منہ سے خفیہ سی آواز بھی نہیں نکلی اور نہ ہی اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ فطیح شاہ نے دواخانہ آہستگی سے بند کیا اور وہیں دبا کر منتقل کر دیا۔ سیکڑی کو شاید یہ بھی دیکھنے کی صلت نہیں ملی تھی کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔

”جیسے منصف نازک کا تو کچھ لٹا کرنا چاہیے“ میں نے کہا۔ ”سزا اس نازک صورت حال میں منصف نازک کا لٹا کر کیسے کیا جاسکتا ہے؟“ فطیح شاہ جیسے میں نے بولا ”ابھی یہ کچھ بڑا کرچنے لگتی تو نازک کا سارا تصور پاش پاش ہو جاتا۔ تب بھی شاید ہمیں اس کے ساتھ ہی سلوک کرنا پڑتا۔“

جبار بدلتی اپنی کرسی پر بیٹھا کرنا چاہتی آنکھوں سے کوئی بھیاک خواب دیکھ رہا تھا اور نہ جانے کیوں اس وقت بے حد مضطرب نظر لگ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے تک شاید وہ یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو تاکہ اس کے اپنے آئین میں اس کے ساتھ یہ کچھ ہو سکتا تھا۔

میں نے میز پر اس کے مقابل بیٹھے ہوئے ”تم“ نے دیکھا جبار بدلتی...؟ ”کئی حالات اچانک کس طرح چلا کھا جاتے ہیں۔“ پلک جھپکتے میں کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ ہر حال۔۔۔ جس میں اب کئی حالات سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھو تمہارے دل کی مراد پوری ہو گئی ہے۔ مسز دوانی تو ہمیں مکان دینے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن میں دی مکان ہمیں دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم کچھ سوچے باڑی تو کرو۔ یہ دیکھو۔۔۔ پاور آف اٹائی بھی میرے پاس ہے اور پاور بھی۔ یہ کھنٹس تمہاری خوش فہمی تھی کہ پاور صرف تمہارے پاس ہے۔“

وہ کئی کے خور خانے کے سے انداز میں سانس لے رہا تھا۔ میں نے فائل اس کے سامنے لرائی تو وہ اپنی جگہ پر کچھ سکڑ گیا۔ شاید اسے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ میں فائل پھر اس کے منہ پر رسید کروں گا۔ زور سے ماری جائے تو کھنٹ ایک فائل بھی ٹھہر

اطمینان ہو اگر وہ مرا نہیں تھا۔ اگر وہ کرانے کے اتنے بچے ہاتھ سے ہی مر جاتا تو یہ میرے لیے بڑے افسوس کا مقام ہوتا۔

در حقیقت وہ بے ہوش بھی نہیں ہوا تھا۔ صرف اس کے حواس محفل سے ہو گئے تھے۔ میں نے سرکوشی کے سے انداز میں اس کے کان میں کہا ”بڑی بات ہے میرے چاند ارناس میں زیادہ فساد نہیں پایا کرتے۔ کسی بھی سرکار میں بھی مل جاتا ہے۔“ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے میری بات سنی تھی یا نہیں۔ وہ ہمیں اور نہ حالینا ہوا تھا۔ اس کی ناک میں اس کی کرسی پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اسے کھینچا تھا تو بہت ہی جتنیں میرے پھل کر چپے لگتی تھیں۔ میں اس دوران ٹوٹی اور فطیح شاہ کی کارروائی سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ غبار کے ہاتھ پشت پر پانڈے کے علاوہ اس کے پاؤں بھی پانڈہ پکے تھے اور اسے کسی پارسل کی طرح دو دروازے کے ساتھ لٹا چکے تھے۔ وہ واقعی بے ہوش تھا۔ ٹاک پیک چلی تھی۔ چو خوں میں تر ہو چکا تھا۔

میں نے دوبارہ جبار کی طرف حوجہ ہوتے ہوئے کہا ”تم تو بالکل ہی خاموش ہو گئے۔ کچھ تو بولنا۔۔۔ مجھے مکان کا سوا نہیں کرو؟“ مسز دوانی سے تو تم مکان چھینے پر تکتے ہوئے تھے میں خود جس میں وہ مکان دینے کے لیے تیار ہوں۔ آخر تم مجھ سے لے کیوں نہیں لیتے یہ لو مکان! میں نے فائل زور سے اس کے منہ پر ماری۔

اس کے جسم کا سارا خون گویا اس کے چہرے پر سٹ آیا تھا۔ فائل ایک ٹھنڈی طرح اس کے منہ پر پڑی تو چو کچھ اور شرم ہو گیا۔ میں نے اسے واپس اس کی کرسی پر دھکیل دیا۔ پیوں والی کرسی اس کے وزن کے باعث پھیل دیوار سے ٹکرائی۔ وہ اس طرح کرسی میں فٹ ہو گیا تھا جیسے کسی نے اسے بڑی احتیاء سے بٹایا ہو اور پھر اور سے پوری طرح دبا رہا ہو۔

اتنی دیر میں کوئی بار میں نے اسے چلکے جھپکاتے دیکھا پھر کئی سیکڑے تک وہ جھڑی سے لپکتے جھپکا مای چلا گیا جیسے غلطی سے اس کا کوئی ٹکڑا دھکا ہو اور اس کے وجود میں کوئی دشمن اشارت ہو گئی ہو۔ اس کا سوا سا پتلا ہونٹ کچھ اور نیچے کو لٹ گیا تھا۔ وہ کمری کمری سانسیں لے رہا تھا لیکن شاید اب بھی وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ہمیں کیا قیمت تھا کہ وہ ہوش میں تھا۔

میں نے ٹوٹی اور فطیح شاہ کو اشارہ کیا ”اس کی بھی پیکنگ کرو۔“

انہوں نے حسب سابق چمٹی کے دیکارڈ قائم کرتے ہوئے چند سیکڑے میں اس کا بھی کئی ٹکڑے بندوبست کر ڈالا۔ یعنی اب صورت یہ تھی کہ وہ کرسی پر ہی بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کے ہاتھ کرسی کے عقب میں نائیلون کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں پیوں میں بھی ڈوری کی بندشیں تھیں اور ہونٹوں پر نیپ چپکائی جا چکی تھی۔ اس دوران وہ چلکے جھپکا ایک بار پھر گویا بھول چکا تھا۔

کر اگر کوئی عمل طور پر ساڑھے پونے کمرے میں جس کمرے سے کمرے میں قاذو ہوا تھا اس پر بھی سائینس لگا ہوا تھا لیکن جبار کی سیکڑی سر



تھیں۔ اس کی رہنمائی میں ہم چند سیکنڈ میں قحطی گلی میں جا پہنچے اور ہم نے پھرتی سے غدار کو اسٹیج سے اتارنے ہوئے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ٹھوس ٹھاس دی۔

جس بے دردی سے ہم نے اسے ٹھوسا تھا، اگر وہ واقعی کوئی ایسا شخص ہوتا جسے دل کا درد نہ ہو تو یقیناً وہ اس وقت ہی اس کو پیارا ہو چکا ہوتا۔ ذرا دیر بعد ہی گاڑی بڑگوں پر فرار سے بھر دی تھی۔ ذرا سیٹ تک سیٹ شفیع شاہ نے سنبھال لی تھی۔ غدار کو لے کر نکلنے کا مرحلہ بھی قطعاً دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی جبار بیٹائی کے کمرے کا کھڑکیوں کاٹھ ہو گا۔ وہ کرسی پر بندھا بیٹا ہو گا اور کھڑکی ہو گا کہ کوئی کسی کام سے اس کے کمرے میں آئے اس کی ٹیکہ بنی کمرے کے وسط میں گرد و پیش سے بے خبر اندھ می پڑی ہوگی۔ اس کی میز پر لیلیٰ فون کی کھینچاں بج رہی ہوں گی اور فون کسے والے سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کم بخت کہاں سرگئی۔ گاڑی جب کلفٹن والی سڑک پر پہنچی جلی تو میں نے ذرا پچھل کر بیٹھے ہوئے پوچھا "تم دونوں کے خیال میں جبار بیٹائی کا بد عمل کیا ہو گا؟"

فونی پچھل سیٹ پر جبار کے بھائی سمیت پھنسا بیٹھا تھا۔ غدار کا سراں کی گود میں تھا اور وہ راستے میں اس خسیال کا اکتدار کر چکا تھا کہ اس سے تو بہتر تھا وہ کسی گدھے کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ جاتا۔ جواب دینے میں پہل اس نے کی تاہم اس کے لیے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"میرا خیال ہے وہ سب بے پہلے قانونی کارروائی کرے گا" وہ بولا۔

"اسے ہر روز اذہ بند لے گا۔ کوئی اس کی نہیں لے گا۔ بہت ہوا تو اسے رکھی قتل دے دی جائے گی" میں نے کہا۔

"بد معاشی اس کی فطرت مسلوب ہوئی ہے۔ شاید قانونی کارڈ پر رٹنا کارروائی پوری کرنے کے بعد وہ اپنے آدمیوں کی مدد سے بد معاشی دکھانے کی کوشش کرے۔" شفیع شاہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہم اور ہمارے آدمی جہاں جہاں بھی موجود ہوں گے پوری طرح الرٹ رہیں گے۔ تم ایک بار پھر سب کو بدایت کر دینا کہ کسی بھی مشکوک شخص کو پاس نہ رکھتے، دیکھ کر ابھی طرح اس کی خبر لیں تاکہ کی پروا نہ کریں" میں نے کہا۔

"وہ سب اس کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ بلکہ یوں کہنے کا احوال کسائے بیٹھے ہیں۔" شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہمیں۔۔۔ پھر ریٹائی کی کوئی بات نہیں" میں نے کہا "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ بہت جلد اس کی قتل ٹھکانے آجائے گی اور وہ انسانیت کے جالے میں آکر نہایت شرفناہ انداز میں مجھ سے مذاکرات کرے گا۔ ہم نے آج اسے اچانک جراثیم دیا ہے وہ نفسیاتی اعتبار سے کافی منفرد ثابت ہو گا۔ اس کا بار بار درست ہونے میں اس سے کافی مدد ملے گی۔ یہ "ڈوز" بعض اوقات ایسے لوگوں کو زیادہ اشتعال میں لانے کے بجائے خنودہ کر دیتا ہے بد معاش خواہ کتنا ہی بڑا ہو" اندر سے وہ ہر حال کھوکھلا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے

زبانہ آسان اور کم شفقت طلب ثابت ہوا تھا۔ کوئی خاص مار دھاڑ بھی نہیں ہوئی تھی۔

میں چارنٹ کی اس دیوار کو پھلانگتے وقت میں خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ میرا سینہ بنانے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل اپنے آپ کو باز رکھا۔ اس جہت پر ایک اسٹیج موجود تھا۔ شفیع شاہ کے پاس نے اپنا کام پوری دہری سے انجام دیا تھا۔ اسٹیج پر ایک بڑا شہہ چادر بھی موجود تھی۔ ٹوٹی نے غدار کو اسٹیج پر تقریباً پھینچ دیا۔ وہ دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا جانے والا اسٹیج تھا اور غدار جیسے ذلیل ڈول کے قوی کے لیے چھوٹا قاضی کا کام چلانے کے لیے کافی تھا۔ غدار کی ناک سے خون برساتا ہوا چھٹا تھا۔ میں نے ایک فاصلہ کھینچ کر اس کا چھوٹا حلقہ پھینچ دیا اور اس پر چادر پھیلا دی۔ میں اسے اچھی طرح سر سے پاؤں تک چادر سے ڈھانپ چکا تو شفیع شاہ اور ٹوٹی نے ایک جھگڑے سے اسٹیج پر اٹھایا اور ہم میز صیالانہ کڑی کی حلق پر آگئے جہاں تک لٹ پڑی تھی۔

اتفاق سے اس وقت اس طور پر لٹ آکر ٹوٹی ہی تھی۔ اور لٹ نے اپنے شکم سے چند لوگوں کو اٹھا، اوپر ہم گھبراتے ہوئے انداز میں اس کی طرف بڑھے چند افراد بڑی تیز اور سلیٹ سے لٹ میں سوار ہونے کے لیے تیار بنائے کمرے تھے۔ اپنے ملک میں کہیں کہیں یہ سلیٹ اور منڈیانہ انداز اور اظہار نظر آتے تھے تو ایک فرخ گوار ہی حیرت ہوتی تھی۔

"میر جنسی۔۔۔ امیر جنسی۔۔۔" میں نے اسٹیج کے آگے آگے گھبراہٹ آمیز انداز میں لے لیے ڈگ بھرتے ہوئے کہا "تلاور صاحب کو دل کا درد ہوا ہے۔ ذرا ایک طرف ہٹ جائیے۔" سوگ بڑا اور ایک طرف کو ہٹ گئے۔ بیٹھ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ تلاور صاحب کون تھے؟ خود ہمیں بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ بے چارے جو شاید کئی منٹ سے مہرہ قتل سے لٹ کا انتظار کر رہے تھے "ان میں سے کوئی بھی لٹ میں سوار نہیں ہوا اور ہم تینوں لٹ میں گھس گئے۔

لٹ چھوٹی تھی۔ اس میں اسٹیج کے کمرے کی گنجائش نہیں تھی۔ خصوصاً جب کہ ہم تینوں بھی کچھ ایسے مختصر الزود نہیں تھے اور لٹ میں آہر بنی بھی اپنے اسٹول پر موجود قاضی کا ہم نے خود آڑے رہتے ہو کر اور اسٹیج کو بھی آڈا تر چما کر کے لٹ میں سو بی لیا اور آہر بننے نہایت ٹھنڈی اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے براہ راست گراؤنڈ فلور کاٹھن دیا دیا۔

شاید کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں سوڈیوڈ آوی جن میں سے دو کے ہاتھوں میں ریف کیس بھی بھول رہے تھے "ان کے پاس اسٹیج پر کمال سے آگیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایمر لیس کے لیے آوی مسلوب نہیں ہو رہا تھا۔

اس علامت میں گراؤنڈ فلور پر اس کی چادر پوری کے اندر ہی ایک بٹلی گلی ہی موجود تھی جس کے راستے ہم لٹ سے نکلتے ہی قحطی گلی میں جا سکتے تھے شفیع شاہ کو یہ سب معلومات حاصل

مسز ورائی نے گویا میری بات نہیں سنی اور پٹی پٹی آنکھوں سے ایک تنگ غبار کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں ”تم نے اس کا یہ حشر کرایا؟“

”کوئی خاص بُرا حشر تو نہیں کیا“ میں نے گویا ان کی غلط فہمی دور کی ”یہ تو صرف دو جنم سیکنڈ کی کارروائی ہے۔۔۔ اور وہ بھی میری نصیب۔۔۔ میرے ان ہونہار شاگردوں کی ہے“ میں نے شفیع شاہ اور فانی کی طرف اشارہ کیا ”استاد نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ استاد کی توجہ تو سرسبز اعلیٰ یعنی جبار بیلائی کی طرف تھی۔“

”یعنی۔۔۔ یعنی۔۔۔ تم اسے جبار بیلائی کے سامنے اٹھا کر لائے ہو؟“ مسز ورائی نے ہکھکاتے ہوئے پوچھا۔ انہیں گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟“ میں نے بچ بچ ذرا حیرت سے پوچھا۔

انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر شاید ارادہ بدلتی کر دیا اور کندھے اٹکا کر کہ گئیں ”شاید وہ کہنا چاہتی ہوں۔ تم ان سے بھی بڑے بد معاش معلوم ہوتے ہو۔“

اس کے بجائے وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولیں ”تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”آپ یہ ایک آدھ دن میں رہے گا۔ یہ بھی ممکن ہے اس کا قیام دو چار دن یا ایک آدھ ہفتہ رہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا۔۔۔؟“ وہ تقریباً اچھل پھیل پڑیں۔

”ہم اسے حفاظت کے طور پر ساتھ لائے ہیں۔ جب جبار بیلائی ہمیں کسی طرح اطمینان دلادے گا کہ آئندہ وہ مکان کے سلسلے میں۔۔۔ بلکہ کسی بھی سلسلے میں آپ کو تنگ نہیں کرے گا تو ہم اس کا یہ پیارا بھائی اسے واپس دے دیں گے“ میں نے بتایا ”اس وقت تک یہ ہمارے پاس رہے گا۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ کیا اس کا یہاں رہنا ضروری ہے؟“ وہ ایک بار پھر ہکھکانے لگیں اور پہلے سے زیادہ وحشت زدہ دکھائی دینے لگیں۔

”ہاں“ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا ”میرے خیال میں اسے رکھنے کے لیے یہ مکان موزوں ترین جگہ ہے۔ جبار بیلائی کے دہم و گمان میں بھی شاید یہ بات نہ آئے کہ ہم نے اسے یہاں رکھا ہوا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں ہمیں اس کی نگرانی اور حفاظت کے لیے زیادہ تردد نہ کرنا پڑے۔ ایک آدھ دن شاید میں خود یہاں رہوں۔ میں خود اس کی نگرانی کروں گا۔ میں چاہتا ہوں اس دوران آپ یہاں موجود نہ رہیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ وہ ایک بار پھر اچھل پھیل پڑیں۔ میری باتوں سے آج بے ہماری مسز ورائی کو دھچکے پر دھچکا لگ رہا تھا ”میں قصیر ۲۰ بجے ہوں کہ میں ایک رات کے لیے بھی اس گھر سے دور رہنا نہیں چاہتی۔“

”لیکن اب بہت سخت مجبوری آتی پڑی ہے“ میں نے کہا ”ہم غبار کو یہاں رکھنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق

اس شخص سے اکثر استفادہ کیا ہے۔“

پتلیں گھومتے ہوئے ہم چارہ می مسز ورائی کے گھر پہنچ گئے۔ میں نے شفیع شاہ کو پہلے ہی بتا کر رکھا تھا کہ غبار کو لے کر ہمیں کہاں جانا تھا۔ میری کل نقل کے جواب میں مسز ورائی نے سب معمول سنے اپنے کپڑے کے چھوٹے سے چکر سورخ سے باہر کا جائزہ دیا۔۔۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئیں اور انہوں نے گیت فوراً کھل دیا۔ میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ وہ گاڑی پورچ میں لے گیا۔

گیت بند کرنے کے بعد مسز ورائی نے دیکھا کہ گاڑی کی چھیل سیٹ پر کوئی چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ وہ پُری طرح چونک اٹھیں۔ ہم تینوں فی کر غبار کو گاڑی سے نکالتے تھے۔ اس وقت بھی ہم نے اس پر سے چادر اترنے نہیں دی۔

تب مسز ورائی گھبرائے ہوئے انداز میں بولیں ”یہ تم کیا آٹھ لائے ہو؟ کس لیے یہ کوئی لاش تو نہیں؟“

”تپ کے منہ میں کبھی شکر۔ لاش یہ لاش ہی ہوتی!“ میں نے غلطی سانس لے کر کہا ”لیکن مسئلہ یہی ہے کہ ایسے لوگ زندہ کھوج رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں بہت سے بے گناہ لاشوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔“

”تمہارا مطلب ہے یہ زندہ ہے؟“ انہوں نے ہمارے ساتھ ساتھ چلے ہوئے پوچھا۔ ان کے لیے میں تشویش کچھ کم ہو گئی۔

”بالکل زندہ ہے۔۔۔ اور بغیر کسی شرمندگی کے زندہ ہے“ میں نے انہیں تسلی دی۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لے لی۔

اس وقت تک ہم ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے ہم نے غبار کو بوسیدہ اور گھسے ہوئے قالین پر لیٹا دیا۔ اس کا چہرہ ابھی تک چادر میں چھپا ہوا تھا۔

”آخر یہ ہے کون؟“ مسز ورائی شاید بے چین تھیں کہ آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے چادر ہٹا دیں۔ اس کے چہرے پر چادر کا جتنا حصہ تھا اس میں کہیں کہیں سرخی دکھائی دینے لگی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں غبار کے ساتھ جو اٹھاؤ ہو رہی تھی شاید اس کی وجہ سے اس کی ناک سے دو بارہ خون رستے لگا تھا۔ میں نے مسز ورائی کو زیادہ دیر نہیں میں جتنا نہیں رکھا اور غبار کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ عام حالات میں بھی غبار کا چہرہ دیکھنا کوئی خوش کن عمل نہیں تھا۔ اس وقت تو اس کی صورت کچھ اور بھی گھڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اوپر سے چہرے پر خون بھی نظر آ رہا تھا۔ مسز ورائی گویا سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں حالانکہ وہ آسانی سے سمجھنے والی عورت نہیں تھیں۔

”یہ تو غبار ہے!“ وہ تھوکر اٹھ کر بولیں۔

”بے شک“ میں نے نہایت سداوت مند انداز میں سہلایا

پھر غلطی سانس لے کر غصہ سستا بولے ”اس سے یہ کہا“ ”بھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر عجیب سا دکھ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے شیطان صفت لوگوں کے نام کتنے بُرے فتنے ہوتے ہیں۔ ان کی نفرت میں اتنی خباثت ہوتی ہے کہ ہندس ہندس ناموں کے اثرات سے بھی کم نہیں ہوتی۔“

کے نقطہ نظر سے اپنی گاڑی میں آپ کے پیچھے پیچھے جائے گا اور آپ کو وہاں پہنچا کر واپس آجائے گا۔ ابھی معاملہ نازہ نازہ ہے ابھی آپ کو بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیے بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ جب تک جبار سے کوئی بات ملے نہ ہو جائے تب تک آپ احتیاط ہی برتنیں نہیں لے کر۔

ان کی پرانی کھٹار اسی فیٹ بوج میں ہی کڑی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی ایک چھوٹے سے بیگ میں ضرورت کی چند چیزیں واپس پھر لاداری سے اپنی پرانی رانقل بھی نکال لائیں۔

”آپ یہ بھی ساتھ لے کر جائیں گی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ کیا حاج ہے؟“ وہ اطمینان سے بولیں۔

”نہہ کا واسطہ سرزد رانی!“ میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اس کے لیے آٹار قدرہ کو تو میں مجبور ہوجھتا ہوں۔ یہ صرف میدان جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرنے کا پھر جنگوں میں بڑے جانوروں کا شکار کرنے کے سلسلے میں کام آنے والی چیز ہے۔ گھر کے اندر رہا رہا ہوتے دشمن کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں یہ زیادہ کارآمد چیز نہیں ہے۔ خصوصاً آپ کے لیے۔“

”تمہیں اتنے یقین سے نہیں کہنا چاہیے کہ کون سی چیز میرے لیے کارآمد ہے اور کون سی نہیں؟“ وہ بیگ اور رانقل اٹھا کر دو دوازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدرے بے احتیاطی سے بولیں۔ وہ ایک بار پھر ایک سنگی سی عورت دکھائی دینے لگی تھیں۔ دنیا سے مدھی مدھی اور ناراض سی۔

”ذرتاج کے گھر میں کی جادہ ہتھیار بھی موجود ہیں اور انہیں استعمال کرنے والے آدمی بھی“ میں نے انہیں یاد دلایا۔

”وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ لیکن انسان کے پاس اپنے استعمال کے لیے اپنی ذاتی چیزیں بھی ہونی چاہئیں“ انہوں نے جواب دیا۔ میں اور شفیع شاہ ان کے ساتھ کمرے سے نکل کر گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ جبکہ فنی، غفار کے پاس ہی موجود رہا۔ سرزد رانی نے رانقل اپنی گاڑی کی ڈرائیو تک سیٹ کے نیچے رکھ لی۔

شفیع شاہ نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس کی ڈکی سے کیوس کا ایک ٹھیلہ نکال کر پیچھے دے دیا۔ ہمارا چمکہ غار کو یہاں لانے کا پروگرام پہلے ہی سے طے تھا اس لیے ہم نے کچھ ایسی چیزیں ساتھ رکھی تھیں جن کی ہمیں ضرورت پیش آسکتی تھی۔ دونوں گاڑیوں آگے پیچھے روانہ ہو چکیں تو میں گیٹ منتقل کر کے اندر آیا۔ غفار کو اس وقت تک ہوش نہیں آیا تھا۔

”یہ کیڑے کا تھوڑا کچھ لمبا ہی ہے ہوش ہو گیا“ میں نے اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ”علاوہ ازیں جب تم نے اس کا سر فرش سے کھرا یا تو فرش پر قالین موجود تھا۔“

”یہ آٹا مضبوط اور طاقتور ثابت نہیں ہوا۔ تمہیں سمجھا تھا؟“ فنی بولا۔

”چلو۔ اب اس کے قیام کا بندوبست کر دیں“ میں نے کہا۔ ہمارے مکان کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے ایک کمرہ منتخب کیا جو

اسے چھپانے کے لیے یہ ایک محفوظ جگہ ہے لیکن یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جبار کے آدمی یہاں دھوا بول دیں۔ ضروری نہیں کہ وہ غفار کی تلاش میں ہی یہاں آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف اپنے روبرو عمل کا اظہار کرنے اور آپ کو ہلاک کرنے کے ارادے سے ہی اس مکان پر چڑھ دوڑیں۔ اس صورت میں یہاں خوریزی ہو سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دوران آپ یہاں موجود نہ ہوں۔ فساد کی صورت میں آپ کا یہاں موجود ہونا ہمارے لیے زیادہ پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔“

فساد اور خوریزی کا ذکر سن کر ان کے چہرے کی رنگت کچھ اور پھلکی ہو گئی تاہم وہ آسانی سے ہار ماننے والی عورت نہیں تھیں۔ سنبھل کر منکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں ”تم مجھے ان خطروں سے ڈرا کر ہنگامے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے تم لوگوں کی جانیں بھی اپنی ہی جان کی طرح عزیز ہیں۔ جب تم لوگ یہاں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود رہو گے تو میں بھی مددوں کی بلکہ ہو سکتا ہے میں تمہارا کچھ ہاتھ ہی بنا دوں۔ تم مجھے اتنی کئی گزری مت سمجھو۔“

”آپ کی جزا و دہت کے مقابلے تو ہم دیکھ چکے ہیں“ میں نے حمل سے کہا۔ ”میں مطمئن ہے آپ اتنی کئی گزری نہیں ہیں لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اس پکر میں آپ جان سے ہی گزر جائیں۔ آپ کی جان بچانے اور یہ ثابت کرنے کے لیے ہی تو ہم ساری مصیبت اٹھا رہے ہیں کہ آخری حج اعلیٰ انسانی اصولوں کی ہوئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں ہمارے یہ دونوں ہی مقصد پورے ہوں۔ اگر آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو ہم اپنے آپ کو حج یاب نہیں ٹھکتے خود رسامحوس کریں گے۔“

اس بار وہ خاموش تو رہیں لیکن ان کے چہرے پر آہستگی کے آثار نہیں تھے۔ تب میں نے ذرتا زرد رے کو کہا ”اتنا کہ آپ ایک ضدی عورت ہیں لیکن کم از کم اس معاملے میں آپ ضد چھوڑ دیں۔ میں آپ کے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ ہم آپ کے لیے بغیر کسی لالچ یا غرض کے اتنی مصیبت اٹھا رہے ہیں تو آپ کم از کم ہماری ایک بات تو مان لیں۔ ایک دورات کی تو بات ہے۔ آخر اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔“

انہوں نے غالباً محسوس کر لیا کہ میرے لیے میں غلطی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مڑھ سے لیے میں بولیں ”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔ تم مجھے کہاں بھیجتا چاہتے ہو؟“

”آپ ذرتاج کے ہاں چلی جائیں۔ شفیع شاہ آپ کو چھوڑ آئے گا“ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں اکیلی اپنی ہی گاڑی میں چلی جاؤں گی“ آپ شاید ان کے لیے میں خفیہ سی غلطی متک آنی تھی لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔

”مگر آپ اپنی گاڑی میں جاؤں گی تب بھی شفیع شاہ حفاظت



بازرہ لے رہے تھے۔ جسے کوئی نئی اور انوکھی قسم کا جانور دو سانس  
 وائوں کے ساتھ لگا گیا ہو۔ میں جھک کر دیکھ رہا تھا وہ جب  
 بولا تو اس نے ویسے ہی دیکھ کر دیکھنے کی کوشش کی جو اپنے زہم میں جلا  
 بدحاشا اکثر دکھاتے ہیں۔  
 ”کھتا ہے تم لوگوں کو اپنی زندگی سے بالکل بیزار نہیں؟“ وہ  
 فرمایا۔

”بہت بیزار ہے“ میں نے ذوقدار لہجے میں کہا ”جو تک زندگی  
 اور والے کی دیکھ ہوئی ایک خوبصورت نعمت ہے لیکن مسئلہ یہ ہے  
 کہ ہمیں اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی سے بھی بیزار  
 ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کی زندگی سے۔ جو کسی کو کوئی دکھ نہیں  
 پہنچاتے۔ کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے۔ اس کے باوجود کچھ لوگ ان  
 کا جینا بدبو بھر کر دیتے ہیں۔“

”آخر تمہیں اس عورت سے کیا لچھی ہے جو تم اس کی خاطر  
 یوں اپنی جان داؤ پر لگا رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں واقعی الجھن دور  
 آئی۔

”یہ باتیں تمہارے مرنے والے دماغ میں آنے والی نہیں ہیں۔“  
 میں نے کھٹکھٹ کر سر ہلکے سے لوگ ہیں۔ اکثر ایسے بے سرو پا کام کرتے  
 رہتے ہیں جو دنیا کے بیشتر لوگوں نے کبھی سمجھ نہ سکتے ہیں لیکن تم  
 بھلا کسے سمجھ سکتے ہو کہ دنیا میں کچھ کام بغیر کسی غرض بغیر کسی لالچ  
 اور بغیر کسی معاوضے کے بھی کیے جاتے ہیں۔ تمہاری اس نزو زما  
 کھوپڑی میں تو ایسی باتوں کو سمجھنے والا کوئی خانہ ہی نہیں ہو گا۔“

وہ اپنی ناک اور کھوپڑی کی تکلیف کے سلسلے میں خاصی قریب  
 برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس عالم میں بھی اپنے تاثرات  
 خوفناک بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ناک پر بیڑیج دیکھو کی وجہ  
 سے وہ خاصا مزاحیہ لگ رہا تھا۔

”تم جتنی چاہے بکواس کر لو۔“ وہ غراٹے کے سے انداز میں  
 بولا ”لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو کہ میرا بھائی تمہیں زندہ نہیں  
 چھوڑے گا۔“

”کبھی کبھی وقت کیسا چلنا کھانا جاتا ہے“ میں نے لٹھڑی سانس  
 لے کر کہا ”تمہارا بھائی کسی کو دمکی دینے کے لیے آج تک تمہارا  
 نام استعمال کرنا ہو گا۔ آج تمہیں اس کا نام استعمال کرنا پڑ رہا  
 ہے۔ کیا ہی اچھا ہو گا کہ تم دونوں بھائی کسی کو بھی دمکی اپنے اپنے  
 بل بوتے پر دیا کرتے۔“

”تم میرے ہاتھ پاؤں کھول دو۔“ میں نے بھی ابھی بتا دیا تھا  
 کہ میں اپنے بل بوتے پر کیا کر سکتا ہوں ”وہ پوچھا۔“

”ہم نے تمہیں اسی حالت میں رکھا ہے جس میں درحقیقت  
 تمہیں ہونا چاہیے۔ تم مجھے لوگوں کا کھلا پھرنا نئی نوع انسان کے  
 لیے بڑی تکلیف کا باعث ہوتا ہے“ میں نے بربادانہ سے انداز  
 میں کہا ”وہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ پاؤں کھلے  
 ہی تھے جب تم ہمیں سنبھالنے کے ارادے سے ہماری طرف  
 بڑھ رہے تھے۔ نہ صرف ہاتھ پاؤں کھلے تھے بلکہ تمہارے ایک

ہاتھ کے قریب تھا۔ وہ بیڈم تھا مگر ایک حصے سے شاید کسی بھی  
 استعمال میں نہیں آتا تھا۔ اس میں فریج پر یا کوئی اور کاغذ کیا بڑی بھی  
 نہیں تھا۔ جو تھوڑا بہت سامان موجود تھا وہ بھی ہم نے نکال دیا۔  
 فرش پر کھڑکی کے قریب صرف ایک چادر بچھا دی۔

پھر ہم نے غدار کو اندر اس کمرے میں لا کر چادر پر لٹا دیا۔  
 اس کے ہاتھ ہم نے پشت پر ہی بندھے رہنے دیے تاکہ بیروں کی  
 ہڈی نہیں کھلے دیں لیکن پھر ہم نے اس کے ایک پاؤں میں آٹنی  
 کڑے والی زنجیر ڈال کر زنجیر کو کھڑکی کی سہلی سی سلاخ سے باندھ دیا  
 اور اس میں تالا لگا دیا۔ اب غدار ہوش میں آنے کے بعد اس  
 کمرے میں صرف چند فٹ کے دائرے میں حرکت کر سکتا تھا۔

اپنے اس انتظام سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے فونی سے  
 کہا ”اب اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنا چاہیے۔ بلکہ اگر  
 اسے تھوڑی سی طبی امداد بھی دے دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔“

اب یہ شخص چھپ چھپا ہواں میں چھپے ہوئے چھپ چھپ کی طرح ہے۔  
 فونی پکڑنے کی وجہ سے اسے سانس بھی سی خراجمت کے  
 ساتھ تھری خمی اور معمولی سا خون اب بھی ریسس رہا تھا۔ فونی  
 نے کھسے اچانکے اور کیوں کے خیلے سے آٹنی زنجیر کے بعد  
 ضرورت کا دھرا آٹم یعنی فرسٹ ایڈٹ نکالی۔ خاصی صارت  
 سے اس نے غدار کا چومنا صاف کر کے دوا وغیرہ لگا کر اس کی ناک کی  
 بیڑیج کھڑکی جس کے دوران غدار کھسے لگا اور بالآخر اسے  
 ہوش آگیا۔

اس کے باندھ کر اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے  
 ہم نے اسے چٹ لٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دائیں بٹلو پر  
 لیٹا ہوا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھلیں تو میں اس کے سامنے  
 کھڑا تھا لیکن اس کے چہرے پر شیشہ سائی کا کوئی تاثر نہ ابھرا۔ ایک  
 لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ ہمیں وہ بھی دواؤں پر ناز کی  
 طرح یادداشت کھوجانے کا ڈراما نہ شروع کر دے اس کی آنکھیں  
 دھندلائی ہوئی سی تھیں۔ اس نے سر جھٹکنے کی کوشش کی اور مٹی  
 طرح کراہ کر رہ گیا۔

”میں کہاں ہوں؟“ اس نے کڑوری آواز میں پوچھا۔  
 ”ہو نا تو تمہیں چڑا گھر میں چاہیے تھا لیکن وہاں کے جانور  
 تمہیں کوئی بیخود دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس لیے مجبوراً ہم  
 تمہیں ایک شریف شہری کے مکان میں لے آئے ہیں“ میں نے  
 جواب دیا۔

اس کی یادداشت اگر متاثر بھی ہوئی تھی تو شاید صرف چند  
 لمحوں کے لیے ہوئی تھی۔ فوراً ہی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے  
 لگا کہ اسے سب کچھ یاد آگیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن  
 اٹھ نہ سکا اور ایک بار پھر کراہ کر رہ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ  
 کس طرح بندھا ہوا تھا۔ فونی نے اسے سارا دے کر اٹھایا اور  
 محسوس کر دیا کہ اسے نیک لگا کر بٹھا دیا۔ اس کا پھلا ہونٹ دانتوں  
 میں دب رہا تھا۔

فونی بھی صوبہ برابر تن کھڑا ہوا۔ ہم کچھ اس طرح اس کا

ہاتھ میں ہاتھ بھی تھا۔

”کچھ نہ بولا۔ کینہ توہ نظموں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے گھری سانس لے کر کہا۔“

”خیر۔ چھوڑو ان متنازع مسائل کہ میں خود بھی اس قسم کے بحث سے کام کرتا رہتا ہوں لیکن مجھے بھی اپنے بارے میں مطمئن نہیں کہ میرے ان کاموں کو ادب والے کے دیباہی قیادت حاصل ہوگی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے خبیث بھائی کی کوئی نئی دہائی قبول ہو جائے اور میری کوششیں دھری جا جائیں۔ یہ اوپر والے کے کام ہیں۔ ہم ان میں دخل نہیں دے سکتے۔“

اب وہ کچھ عجیب سی نظموں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید حیران ہو رہا تھا کہ میں نے یہ کس قسم کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ میں نے ایک گھری سانس لے کر یکدم ہڑی دے دی تھی کہ اس مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے پہلے دونوں سوالوں کے جواب بھی چاہئیں۔“

وہ خاموش رہا۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے پوچھا ”تم زبان نہیں کھولو گے؟“

اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔  
”زبان کھلانے کے معاملے میں ہم پولیس سے زیادہ سخت گیر ہیں۔“ میں نے گویا اسے خوار کیا۔

وہ تھوڑے چٹکھٹکے کے بعد بولا ”یہ باتیں بھائی صاحب کو مطمئن ہیں۔ مجھے ان معاملات کا پتا نہیں۔ مجھے تو جو حکم ملتا ہے میں صرف وہ کرتا ہوں۔“

میں نے آسف زہ سے انداز میں گھری سانس لیتے ہوئے کہا ”مجھے پہلے ہی مطمئن تھا کہ سیدھی انگلیوں سے کبھی نہیں نکلے گا۔ تم اپنے بھائی کے معاملات سے اتنے ناظم نہیں ہو جتنے بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن خیر۔ کوئی بات نہیں۔ آج رات ہم ایک جاہلی محل شروع کریں گے جس سے تمہاری زبان کھل جائے گی۔ تم فریو لے لو گے۔“

”مجھے راجہ کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ اس سے پہلے ہی موت تمہیں آن رو پے گی۔“ وہ بے خوفی سے بولا۔

”کیسی باتیں اتنے روٹتی سے نہیں کیا کرتے میرے بد صورت چاند!“ میں نے مشتاقانہ لہجے میں کہا ”یہ ایک طرح سے پھرمانہ بڑی بات والا معاملہ ہو جاتا ہے۔“

وہ کدو میرے الفاظ پر توجہ نہ دے پھر بولا ”تمہاری پچھلی سر حال اب بھی برقرار ہے۔ اگر تم مجھے اب بھی چھوڑ دو تو ہم اب بھی مکان کا سودا کرنے اور عورت کو ڈھکڑھکڑے دینے کو تیار ہیں۔ میں بھائی صاحب سے سفارش کروں گا کہ آج جو کچھ ہوا اسے بھی قبول جائے۔ اگر کوئی جوابی کارروائی ہو رہی ہوگی تو میں اسے دھوکا دوں گا۔“

”مکون کم بخت جوابی کارروائی رکوانا چاہتا ہے؟ میں تو بے چینی سے جوابی کارروائی کا منتظر ہوں۔ میں نے یہ ”سوالی“ کارروائی اس لیے تو نہیں کی کہ جوابی کارروائی رکوانے کے لیے

شاہد ثقات کے احساس سے اس کا چوسٹن ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”اس قسم کی فضول باتیں کرنے اور گیدڑ بھکیاں دینے سے بچ رہے کہ تم ہمیں کوئی دھمک کی بات بناؤ۔“

”مشکل۔۔۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔  
”مشکل؟“ کہ تم دونوں بھائی مسزوریائی کتب بائیں کو کہ اس مکان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ آخر صرف تمہارے ہی نزدیک اس کی اہمیت کیوں بڑھ گئی ہے؟ کیا واقعی تمہارا مسزوریائی کوڈ پڑھ کر ڈر ہو چکا ہے اور اچھی کسے کا ارادہ تھا یا ابھی مکان بھجوانے کے لیے لائی دے رہے تھے؟“

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ گویا کچھ سوچ کر بولا ”میں تمہارے صرف آخری سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ ہمارا ارادہ واقعی اس لیے تھا کہ اگر وہ بے گناہ ہم لوگ لین دیں گے بہت کرب اور زبان کے بحث کے لیے ہیں۔“

”بے شک۔ بے شک۔“ میں نے سر ہلایا ”تم دونوں بھائیوں کی نیکی اور پارسیائی کے تودرودور تک چہرے ہیں۔“

”نیکی اور پارسیائی کا تو ہمیں دعویٰ نہیں۔ لیکن بھائی کے کام شاید میرا بھائی تم سے زیادہ کرتا رہتا ہے۔“ وہ عجیبی سے بولا ”وہ باقاعدگی سے بیواؤں اور ناداروں کی مدد کرتا ہے۔ ظاہری اداؤں کو چھوڑ دیتا ہے۔ بہت سے طالب علموں کے لیے اس نے دلچسپی مقرر کر رکھی ہیں اور ان کی اپنا کلاں میں غریب مریضوں کے لیے اس کی طرف سے کھانا جاتا ہے۔“

میں ممکن تھا وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ میں نے تاباں دھندوں اور ماحولیاتی مادہ حار کے ذریعے بے تحاشہ دولت کمانے والوں کے معاملے میں اکثر دیکھا تھا کہ وہ لین دین کے بڑے کمرے ہوتے تھے۔ تاباں تاباں کسی بھی سلسلے میں کسی کو کوئی رقم دینے کا وعدہ کرتے تھے تو اگر وعدہ بھانپتے تھے جب کہ تاباں اور شرفانہ کا دوبارہ کرنے والے ادا نیکیوں کے معاملے میں اکثر قاضی دایوں کو چٹا دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ تاباں دھندے کرنے والے اکثر عطیات خیرات کے معاملے میں بھی خامیے فراخ دل ہوتے تھے۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو غبار اسے گھرے اشارہ سمجھ کر تھوڑے جوش سے بولا۔

”جب تم ہمارے آفس میں آئے اس وقت بھی میرا بھائی اکثر کام پر کیشیئر کو دے دیا تھا کہ اگر وہ ظہور والے آفس میں بیٹھی ہوئی اور ایک بہت دور دراز پر ہانڈے طائے سے آئی ہوئی یہ وہ عورتوں کو روک تھام کی رقم میں سے کچھ ادا نیکی کر دی جائے۔“

”خیر۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم یہ نیک کام ہو جتے کے بعد پیچھے اور تمہاری وجہ سے اس میں غلط نہیں پڑا۔“ میں نے کہا ”میرا خیال ہے اس قسم کے کام کرنے کے بعد تمہارے بھائی کو اطمینان ہو جاتا ہو گا کہ اس کی دولت پاک صاف ہو گئی اور اس کے گناہ دھل

وہ گاڑی سے چڑھ کر نکل آیا اور ہم ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے بیٹھے ان پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے دوران ٹوٹی کو جیسے کچھ خیال آیا اور وہ بچے کھتے ہوئے بولا۔

"کیا خیال ہے۔ غبار کو بھی کچھ کھانے کے لیے دے دیا جائے؟"

میں نے ایک لمبے سوچے کے بعد اثبات میں سہلاتے ہوئے کہا "میں اس کے ساتھ سلوک خواہ کچھ بھی کرنا چاہے لیکن اسے کھانے سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ تم نے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ تو یہ تک کام تم ہی کو انجام دینا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں اس کے ہاتھ نہ کھولے جائیں۔ غصی قسم کا بد معاش ہے۔ ہاتھ کھل جائیں تو کہیں بیرو بننے کی کوشش نہ کرے اور ہمیں مزید کوئی زحمت اٹھانی پڑے۔ اس سے بہتر ہے اس خبیث کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دیا جائے۔"

"تپ کئے ہیں تو کھانا دلا گا" ٹوٹی ٹوٹے سے لیے میں بولا اور ایک ڈبا لے کر اٹھنے لگا۔

"اب اتنی رحم دلی بھی ضروری نہیں" میں نے کہا "پہلے خود کھا لیو۔ پھر اسے کھانا دے۔ اور خیال رکھنا کہیں ہاتھ پر کاٹ نہ لے۔"

"مگر کاٹ لیا تو جسیں چودہ نیچے لگوانے ہیں گے۔" شفیع شاہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصیدگی سے بولا۔ ٹوٹی اسے گھور کر رہ گیا۔

کھانے کے بعد ٹوٹی دوسرے کمرے میں غبار کو کھلانے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہاں آیا تو میں نے پوچھا "کچھ کھا ہی لیا اس نے؟ یا خیر نہ کھا رہا ہے؟"

"خوب ڈنٹ کر کھالیا۔ میرے امراؤں کے مطابق تو اب وہ ایک آدھ ہفتہ بھی نہ کھائے تب بھی نہیں مرے گا" ٹوٹی نے جواب دیا پھر ذرا دھجھے لیے میں بولا "کھانے کے بعد اس نے سوٹ ڈنٹ کے طور پر مجھ سے دو تین ٹھٹھے بھی کھائے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ایک تو میں اس بد بخت کو کسی ہمدرد۔۔۔ اور شفیع ہاں کی طرح کھانا کھلا رہا تھا اور اسے اس مورد نے مجھے گالی دی" ٹوٹی رو گئے ہوئے بچے کی طرح بولا پھر اس نے لٹھری سانس لی "واقعی آج کل نیکی کا زمانہ نہیں۔ مجھ سے کچھ بچہ چڑھا تھا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو ان کے بچے نے مجھے سولی ہی گالی دی۔"

مجھے اس کے امراؤں پر غصی آگئی "اب وہ کس حال میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹپنا ہوا ہے خبیث" ٹوٹی جمل کر بولا "اب وہ چار کھٹے تو لپٹائی رہے گا۔"

"لپٹک ہے۔ اسے لینا رہنے دو اور تم دونوں میرے ساتھ آؤ" میں نے کہا اور آدھ کھڑا ہوا۔

میں انہیں اپنے ساتھ جلی جانے میں لایا جہاں اب باغیچہ ٹام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ ہر طرف مجاز و جکاڑ پھیلا ہوا تھا

سٹارش ڈسٹوٹا بھولے میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر قدوسہ مایوسی تک آنے لگی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے بہت بڑی جھٹک کھدی تھی جسے ٹھیکرا ہم لوگوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ میں نے دہراؤ سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "اب تم کچھ دیر آرام کر لو کیونکہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے تم سکون کی کچھ گلیاں گزار لو تو اچھا ہے۔"

اس نے اپنے چہرے سے خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا اور غرت سے مجھے گھور آیا۔ میں اور ٹوٹی ڈرائنگ روم میں آگئے۔

اس دوران شفیع شاہ بھی لوٹ گیا۔

"تم نے جب مسز ڈرائی کو زبردستی کے حوالے کیا تو وہ کچھ بولی تو نہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرا ہاں ہو رہی تھی کہ آپ نے مسز ڈرائی کو گھر پر چھوڑنے پر کیسے آمادہ کر لیا۔"

پھر شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا "میں خود اس سے پہلے رہا ہوں۔ کو خوشی کر لی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ مسز ڈرائی ایک رات کے لیے بھی اس کے پاس رہنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔"

"اسے پراہت کھدی تھی تاکہ مسز ڈرائی کی حفاظت کے سلسلے میں ذرا ہوشیار رہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں" اس نے جواب دیا "دوپے بھی زبردستی کے مکان اور رہن سمن کے امراؤں سے ظاہر ہوا ہے کہ اس کے پاس حفاظتی انتظامات خاصے مستعمل ہیں۔"

"آخر جاگیر دارانی ہے۔ شرمیں بھی اپنے جاگیردارانہ اسٹائل سے ہی رہتی ہے" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا "لیکن۔۔۔ سر مال۔ بہت ابھی جاگیر دارانی ہے۔ اگر ہمارے پاس قیدوار جاگیردار بھی ایسے ہو جائیں تو شاید حاشائے میں ایک انتھاب آجائے۔"

شفیع شاہ سہل کر رہ گیا۔ اس وقت تک شام کے سامنے کمرے ہونے لگے تھے ہم نے دوسرے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ میں نے صوفے پر ڈبیر ہوتے ہوئے کہا "شفیع شاہ! بروک سٹار رہی ہے۔ یہاں کا قریب ترین ریستوران بھی خاصا دور ہوگا۔ کہیں سے کچھ کھانے کی چیزیں بیگ کر لالو۔ ہم یہاں ایک طرح سے ایڈجسٹ آئے ہوئے ہیں اور اس دوران خود کچھ کھانا مزید ایڈجسٹ ہو سکتا تھا لیکن میرا خیال ہے یہ ہم میں سے کسی کے بس کی بات نہیں۔"

شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا "مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا کہ ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہوگا۔ اس لیے میں آتے وقت اپنے ہی ہوٹل سے کچھ ریڈی میڈ چیزیں بیگ کر لایا تھا کیونکہ زبردستی کے کمرے اپنا ہوٹل قریب ہی تھا۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے حقدور ہو گئے ہو شفیع شاہ! میں نے کئی سانس لے کر کہا پھر بے گامی سے پوچھا "کہاں ہیں وہ چیزیں؟"

"گاڑی میں" شفیع شاہ ڈرائنگ روم سے باہر جاتے ہوئے بولا۔

رکھی۔

”اچھا اب زیادہ جھڑا مت بنو۔ یہ پاس کا سکھا ہوا سنی ہے۔ پاس کے سامنے یہ ہزار ہے ہو“ ٹوٹی نے اسے کئی ماری۔  
”ظاہر ہے۔ استاد کا سکھا ہوا سنی استاد کے سامنے ہی ڈرنا چاہیے“ شفیع شاہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”مجھے خوشی ہے کہ میرے بھی دوستوں نے میرے سکھائے ہوئے سنی نہ صرف اچھی طرح یاد رکھے ہیں بلکہ ان پر عمل درآمد بھی جاری رکھتے ہیں“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں نے اپنی اہل سوسائٹی سے بچنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت یہ بڑی سنجیدہ میننگ ہو رہی ہے۔ تم دونوں کسی قسم کی نوک جھوک میں الجھنے اور رابطہ کی کئی پوری کرنے کی کوشش مت کرو اور اپنے چوہوں پر پوری سنجیدگی جاری کرو۔“

”میں پاس!“ دونوں نے مستحضر سے بیک آواز میں کہا پھر شفیع شاہ مصوویت سے بولا ”کیا گاڑی سے بریف کس نکال لاؤں؟ جب سنجیدگی سے میننگ ہو رہی ہو تو بریف کیس ساتھ رکھنا اور کبھی کبھار اسے کھول کر اس میں سے کچھ کاغذات نکالنا اور کوئی فائل واپس رکھنا بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔“

”لیکن ہمارے بریف کیسوں میں کاغذات اور فائلیں وغیرہ کہاں ہیں احمق آدمی!“ ٹوٹی نے اسے ڈانٹا۔

”دیسے بھی یہ میننگ کسی اچھے ہوٹل یا آفس کے انٹرکنڈینٹ کانفرنس روم میں جینر کر نہیں ہو رہی“ میں نے یاد دلایا ”اس بجائے جھکاؤ کے درمیان اس نیم شلٹ کر گاڑ پر کھڑے ہو کر میننگ کرنے کے لیے صرف تھوڑی سی سنجیدگی کافی ہے۔ میں اصل میں کتاب چاہ رہا تھا کہ مسز درانی کی مدد ملی جگہ ہے۔ ہم اس سلسلے میں کافی آگے بھی چلے گئے ہیں لیکن میں اس معاملے میں مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوں۔ کل سے ایک غلط میرے ذہن میں ہے۔ کس کوئی پچاس ی سی جی ہوئی ہے۔ درحقیقت میں اسی لیے غبار کو یہاں لا رہا تھا کہ مسز درانی کے سر پر یکدم مصیبت... ڈال کر انہیں ہڑا کر یہاں سے نکالا جائے تاکہ ہم اطمینان سے اپنا کام کر سکیں ورنہ وہ کسی صورت میں یہاں سے جانے والی نہیں تھیں۔ اب سونے میرے ہے تو میں دیکھ ہی لوں کہ میرے شے کی تصدیق ہوتی ہے یا تردید۔“  
شفیع شاہ ایک کونے میں بنے ہوئے مجھ پر تکی لگا کر اسے طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اس کمرے میں باغبانی وغیرہ میں کام آنے والے اوڈر مل جائیں گے۔ آپ نے جب فیصلہ کر لیا ہے تو دیر کیسی۔“

ٹوٹی اسے گھورتے ہوئے بولا ”گٹا ہے تم تو اس خوبصورت کیماری کو اجاڑنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے آپ ہو۔“  
”میں سمجھ لو“ شفیع شاہ بولا ”اس کی دوبارہ آباد کاری کے فرائض تم انجام دے رہا۔“

”نہیں! میں کبھی نہیں نما کرے میں پیچھے اس کے دواؤں سے کوئی کالا وغیرہ نہیں تھا۔ اندر دینا جہاں کا کٹھ کباڑ بیچنا ہے۔“

لیکن بیچ میں ایک جگہ پتہ دوش کے پاس ایک بڑی سی کیماری ترو آدھ پودوں اور رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ دکھائی دے رہی تھی۔ مسز درانی کا کٹھ تھا کہ وہ صرف اتنے ہی کٹھوں کا دھیان رکھ سکتی تھیں پورے باغیچے کی دیکھ بھال ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

میں نے کیماری کے قریب رک کر ٹوٹی اور شفیع شاہ کو یہ بات بتائی پھر کہا۔

”دیسے تو ان کی بات میں وزن محسوس ہوتا ہے۔ لیکن میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں شک کا کوئی سپنیا ہر سرسرا رہا ہے۔ مسز درانی کی زندگی کی تفصیلی کہانی تم دونوں بھی سن چکے ہو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟“

”کیماری کو کھود ڈالتے ہیں“ شفیع شاہ ہلکا سا بولا۔

”اور اگر اس کے نیچے سے کچھ نہ نکلا تو مسز درانی اپنی اتنی خوبصورت کیماری کو چھوڑنے پر ہم تینوں کو اپنی اس زمانہ عمارتی رانکھل سے کوئی مادی کی؟“ ٹوٹی بولا۔

شفیع شاہ بولا ”تم نے وہ کماؤت نہیں جیسی کہ کسی بھی جگہ سے خزانہ نکل سکا ہے بشرطیکہ تم سو فیصد یقین کے ساتھ کھدائی کرو کہ وہاں خزانہ دفن ہے۔“

”وہ سو فیصد یقین کہاں سے لائیں؟“ ٹوٹی نے لٹھڑی سانس لے کر بولا ”سو فیصد یقین تو پاس کو بھی نہیں ہے۔“

”محض ایک کیماری کھودنے کے لیے تو پاس کا محض شک بھی کافی ہے“ شفیع شاہ بے پروائی سے بولا ”اگر کچھ نہ نکلا تو ہم کوئی مالی بیج کر مسز درانی کو دوبارہ ایسی کیماری تیار کروادیں گے۔ زیادہ سے زیادہ چار مینے لگ جائیں گے۔“

”کھدائی کے لیے بھی ہم فون کر کے کسی کو کھلا سکتے ہیں“ میں نے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے سر“ شفیع شاہ جلدی سے بولا ”میں اور ٹوٹی ذرا سی دیر میں اسے کھود ڈالیں گے۔ یہ کون سا مشکل کام ہے اب ہمارے مسلسل کئی کئی دن کا کل دولت مندوں کی طرح غناٹ بات اور آرام طلبی میں گزرتے رہتے ہیں حالانکہ ہماری تربیت کا تقاضا ہے کہ ہمیں عیش پر شقت زندگی گزارنی چاہیے اور کسی نہ کسی برائے انکس میں رہنا چاہیے۔ ہمیں تو آج کالی دنوں بعد کوئی ڈھنگ کا کام نصیب ہو رہا ہے ورنہ زندگی عجیب ہے ہور انداز میں گزر رہی ہے۔ انٹرکنڈینٹ دفینوں میں بیٹنا، انٹرکنڈینٹ گاڑیوں میں گھومتا ملازموں پر حکم چلانا وغیرہ انشاد ہوٹلوں میں کھانا کھانا پارٹیاں اینڈ کرنا۔ یہ بھی کھلا کوئی زندگی ہے!“ اس نے لٹھڑی سانس لے۔

ٹوٹی ہنسنے ہوئے بولا ”ان بے جا دلوں سے چھو جو اس زندگی کے خواب دیکھتے ہیں۔“

شفیع شاہ نے ایک اور لٹھڑی سانس لی ”خواب تو خیر لڑکپن میں ہم نے بھی بہت دیکھے تھے۔ اور یہ زندگی اچھی بھی گنتی ہے۔ لیکن پھر کبھی... میں چاہتا ہوں ہم پرانی اور اس زندگی میں توازن

کوئی بات نہیں۔ میں کمزور مٹن پر زیادہ توجہ دیتی کہنے کا قائل نہیں۔ اس لیے سوال دہرا دیتا ہوں۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ تسارا بھائی مسز دورانی کے اس مکان کے پیچھے کیوں پڑ گیا تھا؟ کیوں اس کی اصل مارکیٹ دلچسپ سے کہیں زیادہ رقم دینے کو تیار ہے؟ اس کے پیچھے کیا راز ہے؟ جس اتنی سی بات جانا چاہتا ہوں میں۔ یہ کوئی بہت بڑا مطالبہ تو نہیں۔ اب بھی میرے سوال کا جواب دو گے یا نہیں؟

”نہیں“ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا ”میں تمہارے اس سوال کا۔۔۔ یا کسی بھی۔۔۔ سوال کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔“

”بہت سی بہت دھرم ہو تم۔ بہت ذہین بڑی ہو!“ میں نے غصی سانس لے کر کہا ”مجھے پہلے ہی معلوم تھا تم کسی سوال کا جواب نہیں دو گے۔ اس لیے میں نے پہلے ہی تمہارا بندوبست شروع کر دیا تھا۔ تم اگر پسند کر تو ذرا کمزور ہو کر ایک نکل اس کمزوری سے باہر ضرور دیکھ لو“ میں نے اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا جس میں اس کے پاؤں کی ذخیرہ کا ایک سراسر سلی سی سلاخ میں بندھا ہوا تھا۔

”جس سے مجبور ہو کر وہ انڈھ کھڑا ہوا۔ اس کمزوری سے مٹنی احاطے کے بجائے جھکاؤ کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اور میرے دونوں ساتھیوں کو کیاری کی کھدائی کرتے بھی دیکھا جاسکتا تھا حتیٰ کہ احاطے کے لب کے زرد دوشنی میں ان کے بازوؤں کی پکڑتی ہوئی پھیلیاں بھی دیکھی جاسکتی تھیں۔ زرد دوشنی بے جہم سائے بھاڑ جھکاؤ پینے سے چمکتے ہوئے دو ورزشی جسم اور آجیب زرد سا مائل۔ یہ سب چیزیں مل کر اس منظر کو خاصا پراسرار اور خوفناک بنادیتی تھیں۔“

”یہ۔۔۔ یہ تو مسز دورانی کا مکان معلوم ہوتا ہے!“ وہ بے تابانہ انداز میں بول اٹھا۔ اس نے شاید اس سے پہلے بھی اس کمزوری سے جھانک کر دیکھا ہو لیکن یہ بات اب اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

”چلو۔ دیر سے سی سی۔۔۔ لیکن کوئی بات تمہاری سمجھ میں آئی تو سہی“ میں نے طمانیت سے کہا ”تم ہماری سمجھ داری کی داد دو۔ تمہیں لانے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی؟ اس مکان کو حاصل کرنے کی تمہیں اور تمہارے بھائی کو شدید خواہش تھی۔ ہم نے سوچا تمہیں اس میں کچھ وقت گزارنے کا موقع دے دیں یا نہ جائے۔۔۔ لیکن تمہیں جس چیز پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی اس طرف تم نے دھیان ہی نہیں دیا۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ میرے وہ دونوں ساتھی اس قدر جانفشانی سے زمین کی کھدائی کیوں کر رہے ہیں۔“

”کیوں کر رہے ہیں؟“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تمہاری قبر تیار ہو رہی ہے“ میں نے کرے میں ہلکے ہوئے جواب دیا ”طے پڑا ہے کہ تمہیں زندہ ہی دفن کر دیا جائے گی کہ تمہارا بھائی ہماری بات ماننے اور اس مکان کا بچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے اسے تمہارا سابقہ سکھایا جائے کہ مکان اور دیگر جائیداد میرے حوالے میں چلا

آئے پلٹے رہیں کہ ال۔ جلدادنیو سب کچھ ٹی کیا۔ چیزیں بہت بڑی اور بڑی تھیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ میں نے بھی اپنے لیے ایک قیمتی اٹھائی تو شیخ شاہ میرا ہاتھ دھکتے ہوئے بولا۔

”آپ کو کھدائی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اتنی سی کیاری کو تو جس میں فٹ گمرانی تک کھودنے کے لیے ہم دونوں ہی کالی ہیں۔“

”میں نے بھی میرا ہاتھ قیام لیا اور پھر آہستگی سے قیمتی میرے ہاتھ سے لے لے۔ میں نے غصی سانس لے کر کہا ”مگر ہے تم لوگ مجھے مسز دورانی کی معاشی نہیں کھدے دو گے؟“

وہ دونوں کمال دنیو اٹھائے واپس کیاری تک آئے۔ کوٹ وہ پہلے ہی آکر کڑا رنگ دوم میں رکھ چکے تھے۔ اب انہوں نے ٹائیاں اور قمیص بھی آکر پھینکیں۔ چلوں کے اپنے کالی اوپر تک چڑھا لیے اور کیاری پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے دیکھتے رنگا رنگ پھولوں سے لدے پورے دور جا پڑے۔ مجھے افسوس بھی ہوا۔

ان کے بازو تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔ چند ہی لمحوں میں ان کے جسم کے مکمل حصوں پر پھینکے لگا۔ ان کے جسم پر کہیں سو پائے یا پہلی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ البتہ ہر حرکت کے ساتھ ان کے مسواحتی تیزی سے پکڑتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں دھرتی تھی۔ ان کا ہر اڑتا ہوا ہاتھ کا واقعی بہت جلد وہ اس کیاری کو بہت گمرانی تک کھود ڈالیں گے۔

میں انہیں اس کام میں مصروف چھوڑ کر اس کمرے میں آیا جس میں ہم نے غدار کو باندھ رکھا تھا۔ وہ دو پار سے ٹپک لگائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوہ خون کی سرشتی تھی لیکن وہ بے حد بچھا بچھا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اس بات سے اسے یابوسی ہوئی تھی کہ ابھی تک اس کے لیے کوئی امر اور نہیں پہنچی تھی۔ مجھے اس پر کسی حد تک حیرت تھی کہ جہاد کی طرف سے کوئی مدد مل سائے نہیں آیا تھا۔ میرے کسی بھی ٹھکانے پر کوئی گڑبڑ ہوئی تو اب تک مجھے اطلاع مل چکی ہوئی۔ میرے قوی ہر جگہ اثر تھے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ کسی سے بھی کسی گڑبڑ کی اطلاع نہیں ملتی تھی جو کہ میرا بہت سی مصروف اور نمایاں ٹھکانا تھا۔

”کیا حال ہیں پیارے بد معاش؟“ میں نے غدار کے قریب پہنچ کر خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خشکی نظروں سے مجھے گھور رہا لیکن اب اس کی آنکھوں میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی۔ اب وہ کچھ تھکا تھکا دکھائی دیتے دکھاتا تھا۔

”سب کچھ تم میرے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟“ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

”مکوں سے سوال؟“ وہ غرایا۔

”یہ افسوس کی بات ہے کہ تم میرا سوال ہی بھول چکے۔ یادداشت بہت کمزور معلوم ہوئی ہے تمہاری“ میں نے کہا ”خیر۔۔۔

توئی تسماری قبر تازہ زنگی ہے یا نہیں۔

میں تیری سے کمرے سے نکل آیا اور تہہ شدہ کیماری کے قریب جا پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ غنار اب کمری سے مجھے دیکھ رہا ہو گا لیکن میں اس کی طرف سے بے پروا بنا رہا۔ قریب جا کر میں نے کیماری کا جائزہ لیا۔ شیخ اور کوئی نے اسے تقریباً ذرا وقت کر رکھا تھا تاہم ابھی تک اس میں سے سوائے مٹی کے کچھ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں غنار کو کیا پکڑ رہا تھا۔ کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اثبات میں سر ملانے لگے کہ مجھے بتا رہے ہوں کہ قبر تازہ ہو چکی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ غنار کمری سے یہ تمام حرکات و سکنات دیکھ رہا ہو گا۔ شیخ شاہ اور کوئی اپنی کوال اور بچے کا سارا لے کر یوں اطمینان سے کمرے ہو گئے جیسے انہوں نے اپنا کام ختم کر لیا ہو۔ کمرے کے کنارے مٹی کا خاصا اونچا ڈھیر نظر آ رہا تھا جس میں پچاسوں پودے جڑوں سمیت اکٹھے اور دبے پڑے تھے۔

میں واپس کمرے میں آ گیا۔ غنار کمری کے قریب ہی کمرانا لیکن اب اس کا رخ میری طرف ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی زنجیر میں کمری کی سلاخ کے قریب لگے ہوئے تالے کی چابی جیب سے نکالی اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”بلو ہمارے! تسماری آخری آرام گاہ تیار ہو گئی ہے۔ تم اس قابل تو نہیں تھے لیکن ہم بھی جی عزت سے دفن ہو رہے ہو۔ بس تھوڑی سی خرابی ہے ہوئی کہ ہم تمہارے مرنے کا انتظار نہیں کر سکتے۔“

مجھے لمبے میں تاحر حقیقی کے باوجود میرے انداز میں ایک سفاکانہ اشتیاق تھا جو اسے یہ یقین دلانے کے لیے ایک تھا کہ اس کے ساتھ قضا کوئی ذائقہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ ہم اس معاملے میں بالکل شہید تھے۔ اس کی ایک ٹانگ میں آہنی کڑا تھا جس کے ساتھ زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ اس کی دوسری ٹانگ ہم نے آزاد کر دی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے اچانک اپنی کمری کے بل گھبرا کر اسی آزاد ٹانگ سے مجھ پر جوڑو کا ایک داڑ آزادانے کی کو شل کر کے۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ میری ٹانگیں پر پاؤں کی ایک خاص ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مجھے پہلے ہی اس کی طرف سے اس قسم کی کسی حرکت کی خبر تھی اور میں اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانا ہوئے اس کی ٹانگ پھری۔ وہ ایک ٹانگ پر پڑنے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ میں زنجیر تھی۔ ہاتھ پتہ پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ پتہ پتہ بار لیکن میں نے اسی ٹانگ کو اس طرح پکڑے رکھا تھا کہ وہ گرنے باز رہا پھر میں نے اسے ایک خاص انداز سے موڑا۔ وہ ٹھنڈے سے بے اختیار چلا اٹھا۔

”اسی طرح ایک سیکنڈ میں تمہارے چھٹے کا جوڑ بھی الگ ہو سکا ہے۔“ میں نے ٹرسکون لیجے میں کہا۔ ”اور اگر تسماری اس اعتبار سے اچھل کود کے نتیجے میں کچھ اور کر دیتا تو میں یقین کر تسماری کوئی ہوئی ٹانگ سے دوبارہ خون جاری ہو جاتا اور خون یہ باز جاری رہنے کے نتیجے میں تسماری موت بھی واقع ہو

ہوئے کا نتیجہ کسی بھی بھی کھل سکا ہے۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی اس مکان سے بہت محبت ہے؟“ اس نے تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اسی میں تسماری قبریں دی ہے۔ تم زندگی میں نہ کسی حرکت کو اس مکان کو پاؤ گے۔ یعنی مرنے کے بعد یہ تسماری دسترس اور رسائی میں ہو گا۔“

میں ایک بار پھر چلنے لگا۔ ”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کنور دشمن کے ساتھ ہم زیادہ سختی نہیں کرتے۔ میں نے سوچا اب کون تم سے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے غصہ پھینڈے اختیار کرے؟“ مارچ کے سنے سنے حرجے آواز تھے۔ اس تردد میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ سیدھا سامانہ کام کرنا چاہیے اور یہ قصہ ہی ختم کر دینا چاہیے۔ ذرا کمراسا کھاتار ہو جائے۔ تمہیں اسی طرح بندھے ہوئے تھے جیوں کے ساتھ اس میں بھیجیں گے اور کمرے کو بھردی کے مسئلے پر مٹی ڈالنا اسے کہتے ہیں۔“

میں نے کمری سانسی لے کر سلاخ کلام جوڑا مگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا تو پھر مجبوراً ہمیں تمہارے پیارے بھائی جان کی قبر بھی تمہارے پہلو میں بنانی پڑے گی۔ مسئلہ صرف یہ ہو گا کہ ان قبروں کا کسی کو علم نہیں ہو گا اور نہ ہی یہ کسی کو نظر آئیگی کیونکہ اوپر سے یہ بالکل سیاہ ہوں گی۔ یہ فیصلہ بھی بعد میں کیا جائے گا کہ ان پر حماد جیٹکا ڈالنے میں جانیں یا خوبصورت پہلوں والے پودے لگائے جائیں۔“

میں نے دھک کر اور پلٹ کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں تھری تھری تھیں کہ اس کے اندر خوف پہنچے گا۔ پکا تھا لیکن وہ بظاہر دلیر نظر آنے کی کوشش ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

”یہ اتنا آسان کام نہیں ہے میری جان! وہ استہزائے لیجے میں ہوا۔“ ہم اتنے چھوٹے لوگ نہیں ہیں کہ تم ہمیں یوں اطمینان سے دفن کرو اور تمہارا کچھ نہ بکڑے۔“

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”ہمارا کیا بکڑتا ہے اور کیا سنو رہا ہے؟“ اس کی ہم نے بھی پروا ہی نہیں کی۔ پیارے! ویسے تسماری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جب کوئی اس قسم کے کام کرتا ہے تو کچھ بندوبست کر کے ہی کرتا ہے۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ ہم بھی کچھ چھپائے آوی نہیں ہیں؟ یا اب بھی تمہیں دنیا میں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا؟ تم نے ابھی تک اس پر بھی غور نہیں کیا کہ ہم تمہیں تمہارے پیارے بھائی جان کے سامنے تمہارے بھرے پڑے آئیں سے اس حال میں اٹھالانے اور ایک چپا پنے کی طرح تمہیں یہاں بندھا ہوا ہے اور ابھی تک ہمارا کچھ نہیں بکڑا۔ کیا اس سے بھی تمہیں اپنی اوقات کا پتا نہیں چلا؟“

وہ خاموش رہا اور کینہ تو زنجیروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے کمرے اُپکائے اور دو داڑے کی طرف بڑھتے ہوئے سرسری لیجے میں کہا۔ ”ختم۔ بعض لوگوں کو مرے دم تک صحت نہیں آتی۔ تم انہی ان موت اٹھوں میں سے ایک معلوم ہوتے ہو۔ میں ذرا دیکھ

لٹا کر اس ذمے داری سے جان بچھڑانا چاہتے ہیں۔

غلامِ آئینی پانینی اور کرواڑے نیک کا جیوہ کیا اور اس نے  
تکلیف دہے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ میں صبر و سکون سے  
اس کے سامنے کھڑا رہا اور اس کے ہونے کا شکر ادا کیا۔ میں اس کی  
کسی خلاف توقع حرکت کے لئے بھی ہراسی طبع متاثر نہ تھا۔

آخر اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھیں کہ کواؤں میں کون ہے۔ یہ بات سہرا مال راز تو نہیں رہتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ فیرا دو بیٹے تک اسے تمام اخبارات میں چھپ ہی جاتا ہے لیکن اسے اس وقت تک راز میں رکھنے کی بڑی اہمیت تھی۔

”پہیلیاں ست چھوڑ دو اور میری تمہیدیں بھی ست باغ صحرے میں نے نری سے کہا۔“

”یہ نہ تو کوئی پہلی ہے اور نہ ہی تہید۔“ وہ تیزی سے ہلا۔  
 ”یہ اصل بات کا ایک اہم حصہ ہے۔“

”مذہب۔ صحاف کا تساری تو دم پر پاؤں کیا۔“ میں نے  
 معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ تم  
 اپنا بیان جاری رکھو۔“

”مکان کے پیچھے کھجے میں جو راز پنہاں ہے، وہ درحقیقت کوئی ایسا خاص راز بھی نہیں ہے۔ ہم کاروباری لوگ جب اس طرح کسی چیز کے پیچھے لگتے ہیں اور اس طرح قیمت آفر کرتے ہیں تو اس کے پیچھے درحقیقت اس سے کئی گنا زیادہ رقم کی کشش کام کر رہی ہوتی ہے۔“ وہ اب غامضی مقلوت سے بولا۔

”یہی امکان مجھے بھی نظر آ رہا تھا لیکن مجھے مستقبل قریب تو  
 کیا، مستقبل بعید میں بھی اس مکان کی مارکیٹ والچہ جوئے کا کوئی  
 امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”جس کی کل راز تھا۔“ وہ کسی سائنس کے کھولہ۔“ سائنس  
 اثر و رسوخ اور سرکاری دہرائی مطلق میں رسائی کا قاعدہ بعض  
 ایسے ہی موقیعوں پر پہنچتا ہے اس مکان کے صوبہ میں جو ایک  
 طویل ساحلی پٹی پہنچتی ہوئی ہے وہ ایک نرسٹ کی ملکیت تھی لیکن وہ  
 نرسٹ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے بہت پرانا نرسٹ تھا۔ حالات کچھ  
 ایسے رہے کہ رفتہ رفتہ وہ ٹوٹ پھوٹ گیا اور قانونی طور پر کاغذ  
 ہو گیا۔ وہ زمین مفت میں حکومت کے ہاتھ آگئی۔ اس سے پہلے کہ  
 اس کی بندوبست شروع ہوتی ایک شریف اور دیانت دار شیر نے  
 اس کے بارے میں ایک منصوبہ پیش کر دیا۔“

مجھے سسکا رہے تھے کہ اس کی پیشانی پر تل پڑ گئے اور وہ جیسے لہجے میں بولا۔ "شاید تمہیں یقین نہیں آ رہا کہ سیاسی اور سرکاری سطحوں میں بھی کوئی شریف اور داناؤ مشیر ہو سکتا ہے؟ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ہر شے میں نیکیوں یا ہزاروں لوگوں میں ایک تو وہ ایسی مثال قریبی کی جاتی ہے۔ شاید ایسی مثالوں کے دم قدم سے یہ نظام چل رہا ہے۔"

”ہاں۔ یہ بات تو تم نے صحیح کہی“ میں نے لٹریچر سائنس لے کر کہا ”ورنہ تم جیسے لوگوں کی وجہ سے تو یہ نظام کب کا جینہ چکا ہوتا۔“

تھی۔ معلوم ہے اس کا مطلب کیا ہو گا؟ میں نے اس کی ٹانگ کو ایک اور تکلیف دے جھکا دیا پھر اچانک ٹانگ جھوڑ دی۔ وہ تکلیف دہ انداز میں رخ کر رہے تھے۔

کے لیے تیار کر رہے ہیں اور تم خود بھی اپنے آپ کو ہلاک ہی کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ گویا ہمیں موت کے منہ میں پھانے میں ہمارا بچہ زیادہ قصور نہیں۔ تم خود بھی مرنا ہی چاہتے ہو۔ اپنے دشمن آپ ہو۔ تم خود کو بھانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے۔ بہر حال ہم جانتے ہیں کہ تم اگر مرنے پر تیلے ہوئے ہو تو پھر زندہ دفن ہو کر ہی مرد۔ خواہ وہ سری انٹی سیدھی حرکتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔

میں اس غم پر رکھے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اس کی ذبح کا  
 کالا کھوکھلی کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے اسے خیردار کیا۔  
 ۴۴ گر تم نے اب زیادہ بھرتی دکھانے کی کوشش کی تو میں اسی ذخیرہ  
 سے تمہیں گوشت اور خون کے مغربے میں تبدیل کر دوں گا۔ گو کہ  
 مجھے بندھے ہوئے دشمن کو مارنا بالکل اچھا نہیں لگتا لیکن تم جیسے  
 آدمی کو اس طرح مارنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔"

میں نے اٹھا کھول کر یکدم زنجیر سے ہی اسے دووانے کی طرف کھینچا۔ وہ کئی فٹ تک چار سمیت گھٹنا چلا آیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ لگتا تھا اس میں اب دم غم نہیں رہا تھا یا پھر اسے اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی نتیجہ خیز مزاحمت کرنے کی کوششیں نہیں تھا۔

جب میں اسے دروازے سے باہر کھینچنے لگا تب اس نے اچانک دروازے میں ٹانگ پڑھائی اور ٹھٹکتا خود کھینچنے میں پڑا۔  
 ”اچھا“ ٹھٹکے میں تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے بعد تم مجھے زندہ دفن کرنے کا ارادہ پھوٹی کر دو گے؟“

”فی الحال صرف میری زبان ہی گارنٹی ہے“ میں نے اسے  
 تھیننے کی کوشش ترک کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میری زبان پر ہر حال  
 تم دونوں بھائیوں کی زبان سے زیادہ اختیار کیا جاتا ہے“

وہ یکدم ہی متحسّل نظر آنے لگا تھا۔ اس نے وہ مجھے اس پر شکوک غارت کی طرح نظر آیا جو یکدم ہی کسی فنی خرابی کی وجہ سے زبیں بوس ہو گئی ہو۔ آخر اس کی اکثر فوض رخصت ہو ہی گئی تھی۔ وہ پہلو کے بل فرش پر ہی چند لمبے اپنا پایا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا اور ملائمت سے کہا۔ ”تم جاؤ تو آرام سے چل کر اسی دروازے کے قریب چادر پر بیٹھ سکتے ہو اور سکون سے بات کر سکتے ہو۔“

اس نے میری پیشکش قبول کر لی اور واپس اسی دیوار کے قریب چلا گیا جس میں سلاخوں والی کھڑکی تھی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک نھر شیخ شہزاد اور فوٹی کی طرف بھی دیکھا۔ وہ کچھ اسی طرح جھجھکیاؤں میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے اپنا کام قریباً ختم کر لیا ہو اور اب اس "زعمہ مڑوے" کو جلد از جلد قبر میں

کر تھا لگاوا۔ اس دوران اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور کافی شیطانہ لمبے میں بولا "تم مجھے آزاد نہیں کر رہے ہو؟"

"ابھی تو صرف تھیں زندہ دفن کرنے کا پروگرام چلتی ہوا ہے" میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "تمہاری آزادی کا ارادہ دار تمہارے بھائی صاحب کے دہشتے پر ہے۔ جس طرح تم نے اس پراجیکٹ سے دست بردار کیا ارادہ ظاہر کرنا ہے اسی طرح اگر وہ بھی راضی ہو گیا اور اس نے کوئی مقبول ضمانت دے دی تو ہمیں رہا کر دیا جائے گا۔"

"تمہارے پاس موبائل فون موجود ہے۔ تم میری ان سے بات کراؤ۔ وہ مان جائیں گے۔ وہ میری بات نہیں مانتے" وہ جلدی سے بولا۔ اب وہ پوری طرح تعاون پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے قابو محسوس کر لیا تھا کہ اب جان بچانے کی سی میں غافیت تھی۔ میں نے ایک لمبے سوچا پھر منکراتے ہوئے دوستانہ لمبے میں کہا "ابھی نہیں۔ ذرا غصہ جاؤ۔ میں تمہارے بھائی صاحب کے برعکس ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں تم سے کہوں گا کہ اس سے رابطہ کرو۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ تم آرام سے ایک دوہ رات ہمارے سامان رہو۔"

"سامان کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے؟" وہ تلخ لمبے میں بولا۔ "جیسا سامان دیا سلوک" میں نے جواب دیا اور باہر آ گیا۔ شیخ شاہ اور فونی کے قریب جا کر میں نے انہیں بتایا کہ ترکیب کارگر ری تھی اور غفار نے وہ راز اگل دیا تھا جس نے ہم سم کو ابھرنے میں جلا کر رکھا تھا۔ میں نے انہیں وہ سب کچھ بتایا جو غفار نے مجھے بتایا تھا۔

شیخ شاہ نے بتا کر بولا "راز تقریباً وہی ہے جس کا میں کچھ کچھ اندازہ تھا۔"

"لیکن ہمارے اندازے کی کسی طرح تصدیق نہیں ہو رہی تھی" فونی بولا۔

شیخ شاہ ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ کدال سنبھالتے ہوئے بولا "یہ راز تو بے نقاب ہو گیا لیکن فی الحال اس کی ادائیگی سے کوئی راز برآمد نہیں ہو رہا۔"

فونی دو مری کدال سنبھالتے ہوئے بولا "ابھی کھدائی بھی تو ہوا سی ہوئی ہے۔ بعض راز خاصی کمرائی میں دفن ہوئے ہیں۔"

"بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھودا جائز نکلا جائے۔"

وہ بھی مبرا ہوا "میں نے کہا کہ ۱۳۸۳ میں ایسا ہو گیا تو دل چھوٹا نہ کرنا۔"

"مرا آپ کو معلوم ہے ہم دل چھوٹا کرنے والے لوگ نہیں ہیں کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

فونی بولا "جب تک آپ نہیں دیکھیں گے ہم یہاں کھدائی کرتے چلے جائیں گے اور کچھ نہیں کو نکویں جتنی کھدائی ہوئے پرانی تو نکلی ہی آئے گا۔"

وہ دونوں دوبارہ مستعدی سے کھدائی میں جت گئے۔ میں نے اس کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا جس میں غفار موجود تھا۔

اس نے ناگوار سی سے مجھے گھورا تاہم اس پر کوئی تبصرہ کے بغیر بات جاری رکھی مگر حال میرے بھائی کو بلاوثق ذرا غصے سے اطلاع مل گئی کہ حلقہ حکام کے آئندہ اجلاس میں یہ منصوبہ منظور کر لیا جائے گا۔ وہ ایک بہت بڑا تقریبی منصوبہ ہے جس میں پرائیویٹ سیکٹور سے بھی لوگوں کو شریک کیا جائے گا۔ اس میں بہت بڑا پارک ہوگا۔ تچوں اور بیوں کے لئے تفریح گاہیں ہوں گی۔ ایک چھوٹا سا اسٹیڈیم ہوگا۔ حتیٰ کہ خاص طور پر صرف اس منصوبے تک آمد رفت کے لئے ایک رعایتی بس سروس بھی چلانے کا پروگرام ہے۔ نئی یافتہ ٹکڑوں کی تفریح گاہوں کی طرز پر یہ منصوبہ بنایا گیا ہے۔ بلکہ میں ممکن ہے وہاں کے کسی منصوبے کی جوں کی توں نقل کر لی گئی ہو۔

"بھائی صاحب نے اپنے ذرائع سے اس منصوبے کے لئے ٹوٹ پلان کی ایک کاپی بھی حاصل کر لی ہے۔ اس نقشے کے مطابق اس منصوبے کے شروع ہونے کی جو بات سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو گا اس پر مسزورانی کا کنڈر سر اٹھائے کھڑا ہے جسے وہ مکان کھتی ہیں۔ آج جو بھی بائیلے پلان حاصل کر لے گی وہ سال دو سال میں اس پر بائیلے راز ملے گا۔ کھڑکی کے کدوٹوں کاٹنے کی۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر ایک لمبے کے لئے خاموش ہوا پھر بولا "ابھی کسی کو اس منصوبے کی ہوا تک نہیں لگی لیکن جب باقاعدہ اجلاس ہو جائیں گے منظوریاں مل جائیں گی اور ساری بات پریس میں آجائے گی تو سب کو نہ صرف مسزورانی کے مکان کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا بلکہ آپس پاس جو چند کئی پلان موجود ہیں۔ ان کی قیمت بھی بہت بڑھ جائے گی پھر تو شاید ان سب لوگوں کو بہت اچھی قیمت دینے کے لئے بہت سی پاریاں سامنے آجائیں۔ اس لئے بھائی صاحب جلد از جلد اس ذیل کو مکمل کر لیتا چاہئے تھے۔ سیدھی یا ٹیڑھی انھیں سے کھی نکال لینا چاہئے تھے لیکن۔ اگر اب مسئلہ جان کا ہی آپ کا ہے تو ظاہر ہے ہم مالی فائدے سے دستبردار ہو جائیں گے اس پروجیکٹ کو چھوڑ دیں گے زندگی رہے تو دولت کمانے والے بہت سے پراجیکٹ سامنے آتے رہتے ہیں۔"

"اگر بات صرف دوسرے کی زندگی سے کھیلنے کی ہوتی تب تو تم اس پراجیکٹ کے سلسلے میں اپنی ضد پر قائم رہتے" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا "لیکن اب چونکہ بات اپنی زندگی کی تن پڑی ہے اس لئے تم بہت بردار ہونے پر تیار ہو گے ہو۔ کہ۔ یہ فرق ہوتا ہے اپنی اور دوسرے کی جان میں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایسے لوگوں کے پاس ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کچھ بحث کرنا چاہیں تو بات دوسری ہے۔ غفار نے کم از کم یہ اچھا کیا کہ کچھ بحث نہیں کی۔

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا مگر حال۔ تمہارا شہر کہ تم نے یہ معمولی سا معاملہ کر دیا جو بظاہر بہت اچھا ہوا نظر آ رہا تھا۔"

میں نے اس کی خیر کار ہوا دوبارہ کھڑکی کی سلاخ سے پاندہ



”معلم تیار ہے باقی دھکیلیں دتا ہے۔“  
 سادہ لہجہ لائی جاری رکھتے ہوئے قدرے مرقش سامنوں  
 کے درمیان بولا ”اگر اس نے ہی دھکیلیں دیں تو ہم اسے بھی  
 اٹھا لیں گے۔“

”میرا خیال ہے اب تک وہ اپنی حفاظت کے لئے اپنے  
 آدمیوں کو اکٹھا کرنے کے علاوہ سرکاری محاذوں کی خدمات بھی  
 حاصل کر رہا ہو گا۔“ میں نے جبار بیلائی کا پہلا تبریع کرتے ہوئے  
 کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ اس کے باوجود اٹھا لیں گے“ فتح شاہ  
 بے پروائی سے بولا۔ ”میں سے بھی پتا چل جائے گا کہ محاذوں کا جوہم  
 اسے کتنا خطرہ فراہم کر سکتا ہے۔“

میں نے تبریع کر کے فون کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف  
 دوسری تیل کے قناز پر ہی فون اٹھا لیا اور بے تابانہ سی ”ہیلو“  
 سن کر ہی میں نے پچان لیا وہ جبار بیلائی ہی کی آواز تھی۔

”کیا حال ہیں سینہ صاحب؟“ میں نے تیسری لمبے میں پوچھا۔  
 ”افضل۔ تم افضل ہو؟“ اس نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔ میں آپ کا حقیر خادم افضل ہی ہوں“ میں نے  
 اپنے لمبے کی مٹاس برقرار رکھتے ہوئے کہا ”سنا ہے آپ نے مجھے  
 یاد فرمایا تھا؟“

”بالکل۔ دیکھو افضل۔ بات یہ ہے۔“ اس کے لمبے کا  
 ارتعاش کچھ کم ہوا۔ اسے گویا میری توازن کر کچھ اطمینان ہوا تھا  
 لیکن شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح کرے  
 حالانکہ میرے خیال میں اس نے انتظار کے لحاظ سے دوران میں  
 بیسیوں مرتبہ ان الفاظ اور ان کی ترتیب کو گھرایا ہو گا جو وہ مجھ سے  
 بات چیت میں استعمال کرنا چاہتا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری  
 توازن کر وہ ساری ترتیب الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔

وہ غلط فہم ترین صورت حال کا سامنا ہونے پر بھی ندوس  
 ہونے والا آدمی معلوم نہیں ہوا جب کہ اس وقت تو میں اس کے  
 سامنے بھی نہیں تھا اور وہ غالباً نہایت محفوظ ماحول میں اپنے گھر میں  
 بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ندوس معلوم ہوا تھا۔ پھر شاید وہ کچھ  
 سنبھلنے ہوئے بولا ”میں تم سے سیدھی صاف اور سچی بات کرنا چاہتا  
 ہوں۔“

”یہ سن کر مت خوش ہوئی۔“ میں نے کہا۔ ”سیدھی سچی اور  
 صاف بات سے ابھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ایسی کوئی بات سننے  
 کے لئے تو میں بے تاب رہتا ہوں۔“

”جو ہوا سو ہوا۔ لیکن میں تم سے تصادم نہیں چاہتا۔“ وہ  
 ملاٹھ سے بولا۔ وہ اب جبار بیلائی تو ہرگز معلوم نہیں ہو رہا تھا  
 جس سے آج۔۔۔ پھر میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں زمانے کے ان  
 فقیرانہ لہجہ کی سانس لے کر بیٹھ رہا تھا۔

وہ واقعی سیدھی اور سچی بات کرنے کے مزمع معلوم ہوا تھا  
 کیونکہ وہ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے اس فقیرانہ وضاحت کردی۔  
 ”میں نے تمہارے بارے میں جانوں طرف سے اپنے ذرا رنج سے

کڑکی میں غھر نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اگر اس نے کڑکی  
 سے جھٹکا اور فتح اور فنی کو دوبارہ کھدائی میں مصروف دیکھا تو وہ  
 کیا سمجھے گا کہ میں نے اسے چھوڑ کر احضار کیا تو معلوم کر لی لیکن  
 اسے دشمن کرنے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔“

میں اسے تسلی دینے کے لئے دوبارہ اس کے کمرے میں جانے  
 کا ارادہ کر رہا تھا کہ میری جیب میں موجود سوا کل فون کی گھنٹی بج  
 اٹھی۔ میں نے جیب سے فون نکالا۔ دوسری طرف میری سیکرٹری  
 امیر کی ہر میری خصوصی ہدایات کی وجہ سے ابھی تک ہوئی میں  
 اپنے کمرے میں ہی موجود تھا۔

اس نے اٹھا لیا۔ ”سراپا میں تو کسی نے حملہ کیا اور نہ  
 ہی سلام افراڑنے ہوئی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ سیکرٹری کا کلام بھی  
 اثر ہوا اور فتح شاہ صاحب کے قیادت کے ہوئے دوسرے  
 تو ہی بھی ہوئی کی گھنٹی کہتے رہے مگر کوئی گڑبگڑ کوئی ہنگامہ نہیں  
 ہوا۔“

”یہ خبر میرے لئے حیرت انگیز ہے۔ سر حال ابھی خبر ہے“  
 میں نے کہا۔

”دوسری اہم خبر یہ ہے کہ چند منٹ پہلے جبار بیلائی کا فون آیا  
 تھا۔ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے“ میرے بتایا۔

”کس اعزاز میں بات کر رہا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”صاف شرافت سے“ میرے بتایا۔

”کمال ہے!“ میں نے بے چینی سے کہا ”تو میرے لئے  
 جیروں کا دن ہے۔“

”میں نے چند فون نمبر چھوڑے ہیں اور درخواست کی ہے کہ  
 آپ ان میں سے کسی پر بھی اس سے رابطہ کریں“ امیر بولی۔

”تم نے یہ بھی پوچھ لیا ہو تاکہ ان میں سے کس کس نمبر پر اس  
 نے کال دیکھا کر کے کا انتظام کیا ہے“ میں نے کہا۔

”مجھ پر کیا قہر؟“ وہ بولی ”وہ خامسے مڑھ سے لمبے میں منطقی  
 چش کہنے لگا کہ اس نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا ہے کیونکہ اس کی  
 کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ناکام تھا۔ اس نے جو کچھ کیا  
 وہ بھی ڈانٹے کی چوٹ پر کیا اور افضل صاحب نے جو جرائی کارروائی  
 کی وہ بھی علی الاطلاق کی۔ دونوں میں سے کسی کی شخصیت بھی  
 پردے کے پیچھے نہیں ہے۔ اس لئے کلمات لگانے اور ایک  
 ”دوسرے کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ  
 تو ایک ”دوسرے کے لئے کھلا پیچھے ہے۔ طاقت کا گیم ہے۔ پیچھے فرق  
 ”دوسرے کا جو کچھ بگاڑ سکا ہے بگاڑ لے۔ یہ میں جبار بیلائی کے  
 الفاظ دہرا رہی ہوں۔“

محبت سمجھ آدمی کی باتیں کر رہا تھا کہ حاکم کا ”ا“ میں نے  
 کہا ”حق خبر مجھے کھو گئی۔ میں اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں کہ  
 ابھی اس کی سمجھ ادرا قائم ہے یا نہیں۔“

امیر نے مجھے تین فون نمبر فون کرائے اور سلسلہ متعلق  
 رکھا۔ میں نے فتح اور فنی کو بتایا ”مبارک ہو۔ جبار بیلائی کا  
 پیغام آ گیا ہے کہ اس سے رابطہ کیا جائے۔ اب دیکھا ہے کہ وہ

اسے تائے گا کہ ہم تو اس پر مٹی ڈالتے گئے تھے۔

"یہ صرف مالی قاعدے کا چکر تھا اور مالی بحرانوں سے زیادہ جتنی نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تمہارے پیارے بھائی نے اس مالی قاعدے کی تحصیل ہمیں بتادی ہے۔" میں نے اسے مطلع کیا۔

"بتادی ہے۔" اسے گویا دھچکا لگا۔ "کیا تم نے اس پر اسے جملہ اور حور اچھوڑا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ہم نے اس پر کوئی تشدد نہیں کیا۔" میں نے گویا اس کی غلط فہمی دور کی۔ "اس نے شرافت سے ہی ہمیں زبردستی زمین اور متوجہ سرکاری منصوبے دیو کے بارے میں بتایا تھا۔"

"واقعی؟" اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "ہاں۔ واقعی۔" میں نے اس کی حیرت سے مسحوظ ہوا ہونے کہا۔

"ختم۔" وہ گویا اس دھچکے سے جھیلنے ہوئے بولا۔ "اب بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اب تو میں اس پر ایک دست بردار ہونے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اب تم یہ بتاؤ کہ غدار کی دھم کی کیا صورت ہوگی؟ جنہیں کس قسم کی ضمانت چاہیے؟"

"کسی بھی شریف، سزاوار اور غیر جانبدار آدمی کی ضمانت۔ اگر آئندہ تم سزاوارتی کو ٹھک نہیں کرو گے۔" میں نے کہا۔ "اور بھی یاد رکھنا کہ اس ضمانت کے باوجود اگر تم نے اپنے وعدے پاس نہیں کیا تو تمہاری تمام تر انسانی و اجتماعی ذمہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔"

"آئندہ جنہیں اس سے پتا چلے گا کہ تم نے شاید تم زندگی بھر بھول پاؤ گے۔ یہ تو کھنڈر بن گیا۔ اگلی مرتبہ جنہیں اصل غدار پڑ جائے گی۔"

"اب میں اس قصے کو ہی بھول جانا چاہتا ہوں تو آئندہ کسی کو شش کا کیا سوال پڑا ہو گا۔" وہ بولا۔

"یہ میں احتیاطاً اس لئے کہہ رہا ہوں کہ شاید غدار کی پختہ عاقبت دہائی کے بعد اچانک تمہاری اتالیق ہو جائے۔" میں نے خیال آئے کہ یہ تو تمہاری بے عزتی ہوئی ہے اور اب انتقام تمہارا انتقامی فرض ہے۔ اس طرح انتقام اور انتقام کا سلسلہ چلے جائے گا۔" میں نے مطلع ہوا کہ انتقام اور انتقام کا سلسلہ بھی نہیں ہوتا۔

"میں انجانا محسوس نہیں ہوں اگر مجھے اس قسم کے فضل پہنچا میں اپنی توانائیاں ضائع کرنا ہوتی تو اب بھی کر سکتا تھا۔" وہ بولا۔

"اس وقت تو تمہارا بھائی جیسا ہوا ہے نا۔ شاید بھائی دہائی کے بعد تمہارے خیالات تبدیل جائیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔" وہ الفاظ پر زور دے کر کہا۔ "میں بد معاشی اپنی جگہ پر لیکن ساتھ ہی میں ایک بد معاش ہوں۔ میں کوئی بھی قدم اٹھانے وقت قطع نقصان کا حساب نہ لگاتا ہوں۔"

"میں کو کہو کہ تم ایک بد معاش بد معاش نہیں ہو۔" میں نے بگایا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

معلومات حاصل کی ہیں اور فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے درمیان تصادم ہم دونوں کے لئے سخت خطرناک ہو گا۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ صرف اپنی بات کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے انسان فیصلہ تو اصل میں اپنے ہی قطع نقصان کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ میں سمجھ لو کہ میں نے صرف اپنے نقصان کے بارے میں سوچا ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔

"آدمی غلط نہ ہو۔" میں نے لگا سا قہقہہ لگایا۔ "میں جو انی میں بھی کسی جذباتی نہیں رہا۔ اور اب تو میری جذباتیت کی عمری نہیں اگر میں جذباتی ہوتا تو شاید بہت پہلے کسی ٹینگ دار میں مارا جاتا ہوتا۔ میں صرف دہل دوا کرتا ہوں جنہیں مجھے کھل کر کاتھیں ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ کمزور پروا دار کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ختم۔" ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میں نے اس شرم میں ایسے بھی بہت سے لوگوں کو سستی سکھایا ہے جو اپنے آپ کو پتا چلنے خاں سمجھتے تھے۔ وہ اب کافی سنبھل چکا تھا اور خاصی خود اعتمادی سے بات کر رہا تھا۔

"میرے خیال میں تو تم خود بھی انی میں سے ایک ہو۔" میں نے ہلکی سے ہنسی کے ساتھ کہا۔

"وہ گویا میری بات ان سنی کرتے ہوئے بولا۔" میری حال میں تم سے ٹینگ دار نہیں چاہتا۔"

"ٹینگ صرف تمہارے پاس ہو گا۔ میرا کوئی ٹینگ نہیں ہے۔" میں نے صبح کی۔ "مور نہ ہی مجھے کسی سے "دار" کا کوئی شوق ہے۔ میں نے صرف ایک اصولی مرقف کے تحت ایک کمزور عورت کی حمایت اور عملی مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"ٹینگ ہے۔ ٹینگ ہے۔" وہ بے تابی سے بولا۔ "تم اپنی جگہ ٹینگ ہو۔ میں تم سے بحث میں نہیں اٹھتا چاہتا۔ میرے خیال میں میں بھی اس عورت کے ساتھ کسی ایسی نا انصافی نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اسے مار کر ڈالنے سے بھی زیادہ جتن دینا چاہ رہا تھا۔"

"نا انصافی تو تب ہوتی جب میں عورت کو کمزور اور بے سارا دیکھ کر کوئی قیمت دیے بغیر اسے اسے مکان سے بے دخل کر کے یا راستے سے ہٹا کر مکان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنا۔ مجھ سے بھی کتر پوزیشن کے لوگ ایسے کام کر گزرتے ہیں۔"

"لیکن جب اس عورت نے انکار کر دیا تو بات ختم ہو جاتی چاہئے تھی۔ اس کے انکار کے بعد تو تم بھی اسی غذا اگر دی پر اثر آئے تھے جسے تم نا انصافی کہہ رہے ہو۔" میں نے یاد دلایا۔

"میں نے کہا نا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اس پر مٹی ڈالو۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

"ٹینگ جیسے ڈال دی مٹی۔" میں نے سادہ مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی

ہنس کے ساتھ کہا۔

"بھٹو۔ تم ہی سمجھ لو۔" وہ اب خوش دلی سے بولا۔ "لیکن میں تمہیں شہر کے بہت بڑے بڑے شرعاً کی حفاظت دے سکتا ہوں۔ شہر کے بلڈرز کی اپنی ایک مضبوط تنظیم ہے۔ اس کے مدد کی حفاظت دلا سکتا ہوں۔ کشش زنی کشش سے کھلا سکتا ہوں۔ تم خود کسی اور شخصیت کا نام تجویز کرو۔ میں کو شش کوں گا کہ اس سے حفاظت دلا سکوں۔"

"نہیں۔ اتنی زحمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم جن شخصیتوں کے نام لے رہے ہو ان میں سے کسی کے کہنے سے بھی کام چل جائے گا۔ یہ تو شخص ایک رگبی کا کارروائی ہے۔ تمہارے الفاظ پر عملدرآمد تو ہم خود ہی کرائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر اس کا کیا طریقہ ہو گا؟" اس کے لیے میں بے تابی جھک اُٹی۔

"تم آسان سا طریقہ ہے۔ میں ہر کام تمہاری سہولت کے مطابق کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں نے کہا۔ "تم ان میں سے کسی بھی شخصیت سے میرے آفس میں فون کرادو۔ میری سیکریٹری فون میں تمہیں اطلاع دے گی پھر وہ خود اس شخصیت کے معدود فون نمبر فون کر کے تصدیق کرے گی کہ کیا واقعی اس نے اس سلسلے میں فون کر کے حفاظت دی ہے؟ اگر اس شخصیت نے تسلیم کر لیا کہ ہاں فون اس نے کیا تھا تو میں سمجھ لو کہ کارروائی پوری ہو جائے گی۔"

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میرے دفتر کے ٹیلیفون سے یہ سب گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو گی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ نیپ شدہ بات چیت کبھی میرے کسی کام آ سکتی تھی یا نہیں۔ لیکن میں نے شخص احتیاطاً یہ بندوبست کر رکھا تھا۔ یقیناً اس امکان کی طرف اس کا ذہن بھی گیا ہو گا لیکن یہ کوئی ایسا بھیاک پلوس نہیں تھا کہ وہ بدک جاتا بلکہ یہ سب کچھ تو شاید اس کی توقعات سے بھی زیادہ آسان ثابت ہو رہا تھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے محسوس ہے۔ اس کے بعد غدار کی دہائی کی کیا صورت ہو گی؟"

"وہ تو اب صحیح ہی گھر واپس آئے گا۔ کم از کم آج رات تو اسے ہماری سمان رہنے دو۔ کبھی بھارے شرعاً کے ساتھ رہنے کا بھی موقع دیا کرو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"تم نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟" اس نے غیر ارادی انداز میں اچانک ہی پوچھا۔

"اتنے نازک رازوں کے بارے میں اتنے سرسری سے انداز میں نہیں پوچھا کرتے۔" میں نے نامحاندہ انداز میں کہا۔

"وہ ٹھیک تو ہے؟" اس کے لیے میں تشویش تھی۔

"اس کا جو بگڑنا تھا تمہارے آفس میں بگڑ چکا تھا اس کے بعد اس میں کوئی مزید نوٹ پھرت نہیں ہوئی۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے اتنا شرطانہ انداز اختیار کرتے ہوئے مسئلہ حل کر دیا ہے اور صلح کا معاہدہ طے پا گیا ہے تو ہم اسے کچھ اور سہولیات

فراہم کر دیں گے۔ اس کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں ہو گا۔ آرام سے رات گزارے گا اور صبح خیریت سے واپس آجی جائے گا۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔" اس نے طمانیت سے کہا پھر ذرا ہلچل سے ہوئے بولا۔ "بہت شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے غلوص سے کہا۔ "معتزلیہ اختیار کرنے والوں کے ہم خدام ہیں۔"

اس نے سلسلہ متقطع کر دیا۔ میں نے فون بند کرتے ہوئے فلیج اور فونی کا حوالہ کیا۔ "ایک بار اور مبارک ہو۔ جبار جبار نے کچھ زیادہ ہی آسانی سے مجھے ٹھیک دے دیں اور صلح کا طم نامہ زیادہ ہی اونچا کر دیا ہے۔" جبار نے جو کچھ کہا تھا وہ میں نے انہیں بتایا۔

"کیس اس میں اس کی کوئی چال تو نہیں؟" فونی غلی لیے میرا بولا۔

"نہیں۔ آدمی کلند معلوم ہوتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کی محفل بروقت ٹھکانے آگئی ہے۔ اور اگر اس میں کوئی چال ہوئی تب بھی اس سے منٹ لیں گے۔ وہ بھی نہیں ہے اور ہم یہ نہیں ہیں۔"

وہ دوبارہ کھدائی میں مصروف ہو گئے۔ میں نے آفس فون کے امبر کو کچھ ہدایات دیں۔ پھر تو اسے معلوم ہی تھا کہ کمر صورت حال میں اسے کیا کرنا چاہیے میں نے اسے یاد دہانی کراہ ہتر سمجھا۔

پھر میں دوبارہ اسی کمرے میں پہنچا جہاں غفار تھیں تھا۔ میں اسے بھی مبارکباد دی اور بتایا کہ اس کے بھائی سے فون پر کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اسے شاید اپنے بھائی کے اس قدر شرفانہ رویے پر بے پروا ہوئی ہوئی۔ شاید اس کی انا بھی مجبور ہوئی تھی کہ اپنی بے فنی بدل لینے کے لئے اس کے بھائی نے کچھ جنگ و جدل دلی غفار نہیں کی تھی تاہم اپنی جان کا..... فوج جانا ہر حال ہر مسئلہ کے لئے شعوری طور پر نہ سہی تو لا شعوری طور پر ضرورتِ راحت باعث ہوتا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک لمحے کی ایوی۔ بعد ایک عجیب سی طمانیت کی جھلک دیکھی لیکن وہ اپنے خوفناک تاثرات برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "زیادہ فوج ہونے کی ضرورت نہیں۔ بھائی صاحب نے صرف اس لئے صلح راستہ اختیار کیا ہے کہ کہیں مجھ پر تشدد تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ برداشت نہیں کر سکتے کہ مجھے کوئی تکلیف پہنچے جس طرح برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔"

"چلو۔ خیر کسی وجہ سے بھی سہی۔ لیکن صلح کا راستہ اٹھا تو کیا۔ صلح میں غایت ہے۔" میں نے کھڑکی کی سلاخ سے اس کی زنجیر کھینچے ہوئے کہا۔ "اب تم یہ رات کسی حد تک آرام نہ کر سکو گے۔"

پھر میں نے اس کی زنجیر کا براہِ تمام کر دواڑے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "دوسرے کمرے میں چلو۔"

بادخود نامور مٹی میں ایک چڑی کی جھلک دیکھ کر نہ جانے کیوں میری رگ دپے میں ایک سوئی لہر دوڑ گئی۔

شفیع شاہ نے جب کہ مٹی میں سے کوئی چڑی اٹھائی اور اس پر سے مٹی بھاڑ کر اسے میری طرف پھسایا۔ میں نے اسے نہیں تھا اور بہتر صرف اس کا جائزہ لینے پر اکتفا کیا۔ وہ انسانی ٹانگ کی ہڈی تھی۔ اس کو کالج میں پڑھا ہوا انٹروی کا طم جس حد تک میرے ذہن میں باقی تھا اور ادر ادر دیکھے ہوئے جو چارٹ وغیرہ یادداشت میں محفوظ نہ گئے تھے۔ ان کے مطابق وہ پتلی کی ہڈی معلوم ہوتی تھی۔

کوئی نے بھی جب کہ اسی طرح ایک چڑی اٹھائی اور مٹی بھاڑ کر مجھے دکھائی۔ وہ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ میں ایک تک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کوئی صدمت خوانہ سے انداز میں بولا۔ ”ہم اب چونکہ کچھ زیادہ پرامید نہیں تھے اس لئے ان دو حادثہ کھدائی کر رہے تھے۔ ہماری بے اعتیالی کی وجہ سے کچھ ہڈیوں پر ضرب لگ گئی ہے اور وہ انجی بھر میری ہو رہی ہیں کہ کوئی جی نہیں اب ہم اعتیاد سے مزید کھدائی کریں گے۔ میرا خیال ہے یہاں صرف ایک ڈھانچا نہیں ہے۔“

”اوہ میرے خدا!۔“ میرے منہ سے نکلا اور میں گڑھے کے کنارے اکڑوں بیٹھ کر اندر جھانکے لگا۔ نامور مٹی میں کب کب کب ہڈیوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ شفیع شاہ نے کھدائی شروع کرتے وقت گاڑی سے ایمر جنسی لائٹ بھی نکال کر وہیں لا کر رکھی ہوئی تھی لیکن ابھی تک اسے روشن نہیں کیا تھا۔ میرے خیال میں اب اسے روشن کرنے کی ضرورت آتی ہو چکی تھی۔

میں نے لائٹ اٹھائی اور اس کا سب سے گڑھے کی طرف کر کے اس کا سوچ آج کیا۔ گڑھے کا منظر واضح ہو گیا کئی انسانی ہڈیاں مٹی سے جھانک رہی تھیں۔ شفیع شاہ اور کوئی گڑھے کے دونوں سروں پر کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں مٹی میں دھنسے ہوئے تھے اور وہ اس وقت کو درکن معلوم ہو رہے تھے۔ گڑھے سے ایک کراہیت آنی لگی سی بو خارج ہو رہی تھی۔ نسبت یہ تھا کہ گڑھے میں کسی قسم کے کیزے کوڑے نہ پڑے جتنے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ اس انسانی جسم کو زمین میں دفن ہوئے بہت سی طویل عرصہ گزر چکا تھا اب شاید کیزے کوڑے خود بھی ختم ہو چکے تھے یا پھر مٹی ان کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔

چند لمبے ماحول پر گھرا سکوت طاری رہا۔ صرف اعلیٰ میں پہلے ہوئے بھاڑ جھانکا کے درمیان ہوا سرسرا رہی تھی۔ آخر کار کوئی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انسانی کھوپڑی گڑھے کے کنارے جمع شدہ مٹی کے ڈھیر پر آسکی سے رکھ دی۔ اس کی آنکھوں کے خالی گڑھے گویا مجھے تک رہے تھے۔ میں نے بہم تصور سے دو آنکھیں دیکھیں جنہوں نے دھیرے دھیرے ان گڑھوں کو بھر دیا۔ ان آنکھوں میں آن گز۔ سوال تھے میں نے ان سے تھرتھری۔ شفیع شاہ نے بھی لمبی سی ہڈی سٹاپ کر رکھی۔

اب انہوں نے بھاڑنے سے منع بل لئے اور کسی حد تک ماہر

”یہ کیا مجھے کئے کی طرح ادر سے ادر چھینے پھر رہے ہو۔ اس ذلت سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے گولی مار دو۔“ وہ غزایا۔

”ضرورت پڑی تو گولی بھی مار دیں گے۔ اتنی بے گالی کس بات کی ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہیے اللہ تعالیٰ تو انسان کو بڑی عزت دینا چاہتا ہے لیکن اپنے اعمال سے وہ گناہین جاتا ہے اب زیادہ غمے مت دکھاؤ اور آرام سے دوسرے کمرے میں آ جاؤ ورنہ میں پہلے ہی کی طرح چھینا ہوا لے جاؤں گا۔ میں تو تمہارے بھلے کی سوچ کر جنیں دوسرے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔ جنیں کچھ عزت سے رات گزارنے کا موقع دینا چاہتا ہوں لیکن معلوم ہی ہوتا ہے کہ عزت جنیں راس ہی نہیں ہے۔“

وہ آگے بڑھ آیا۔ میں اس پر نظر رکھتے ہوئے تقریباً اگلے قدموں چل رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر میں نے کہا۔ ”یہاں بیٹھ سو جاؤ۔ اب تم کم از کم رات تو بیٹھ کر گزار سکو گے۔ کیا یاد کر گئے کہ کسی رحول آدمی سے ملا رہا تھا۔“

وہ غور غور نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کی یہ غوغاری معنوی تھی۔ اندر سے در حقیقت اب وہ خوش تھا۔ اپنے چمکدارے کا تصور بہ حال اس کے لئے خوش کن تھا۔

اس کمرے کی کڑکی میں بھی سوئی سلاخیں موجود تھیں۔ سز زمانی نے حفاظت کے خیال سے یہی کڑکیوں میں بدگالی کا خیال کیے بغیر سوئی سلاخیں لگوا رکھی تھیں۔ مکان دیکھ ہی بہت بڑائی ساخت کا تھا۔ سلاخوں والی کڑکیوں سے اس میں کچھ ایسی بدگالی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس سے میل کھاتی تھیں۔

میں نے غفار کے پاؤں کی دھیرے دھیرے کے قریب کڑکی کی سلاخ میں پاندھ دی اور اس میں تالا لگانے کے بعد ہاتھ بھاڑے ہوئے کہا۔ ”اب جنیں رات فرش پر نہیں گزاریں گے۔“

”لیکن میرا یہ پاؤں اور دونوں ہاتھ اسی طرح بندھے رہیں گے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ اب ہم تم پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتے کہ جنیں بالکل ہی ٹھکا چموز دیں۔ جتنی تمہارے خیمیں لی رہی ہے اسی پر خدا کا شکر ادا کرو۔ اس کے علاوہ جنیں کھانا مل جائے گا۔ ٹانگ کی تکلیف اور دوسری چیزوں کے لئے کوئی بین ٹکرو وغیرہ قبول جائے گا۔ یہ کیا کم میاشی ہے؟“ میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کہا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں اسے اسی طرح پیچ و تاب کھاتے چموز کر باہر آ گیا اور ایک بار پھر شفیع اور کوئی کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں کھدائی کے کھڑے تھے اور اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی سمجھا کہ وہ جھک گئے تھے اور سستا رہے تھے لیکن میں قریب پہنچا تو شفیع شاہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کمری سانس لے کر بولا۔

”سر! آپ کا شبہ ٹھیک ہی نکلا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے جس سے گڑھے میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ خامسا لیلچہ ڈاکڑ تھا اور اب تقریباً تین گھنٹے گھرا ہوا چکا تھا۔ برآمدے کی روشنی اس میں ڈراما کی سی پہنچ رہی تھی۔ اس کے

سے بولا۔

”تم نے دیکھا نہیں کہ وہ اب بھی کیسی جلالی کیسی خندی اور دھن کی کیسی کی عورت ہیں۔ تم تصور کر سکتے ہو کہ جوانی میں وہ کیسی رہی ہوں گی۔ ایسی عورت اس قسم کے جذباتی مسئلے پر کچھ بھی کر سکتی تھی۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

”تمہارا خیال ٹھیک ہے افضل! تمہارے سب انداز سے درست ہیں۔“ ہوا کے دھڑپ پر یہ آواز یوں ہماری سماعتوں سے ٹکرائی جیسے کسی کھنڈر میں ذرا اخیر آواز میں کسی بددست نے سرگوشی کی ہو۔

میں اپنے احصاب پر قابو رکھنے میں صارت تھی ورنہ شاید اس آواز پر ہم تینوں میلی طرح اچھل پڑے ہوتے۔ آواز جلال بھائی تھی مگر میری اس میں ایک سفاکانہ سی اجنبیت تھی۔ ہمیں اندازہ ہو گا تھا کہ آواز کس سمت سے آئی تھی۔ ہم تینوں کے سر نہایت آہستہ سے اس سمت میں گھومے۔

مسز درانی ہمت کی منڈیر کے صوب میں موجود تھیں ان کا توڑے سے زیادہ بالائی دھڑ میں رکھائی دے رہا تھا۔ بانی جسم منڈیر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ دراصل گھنٹوں کے بل منڈیر کے صوب میں بیٹھی تھیں مگر ان کی وہ پرانی سق راکھ منڈیر کے اوپر سے بھاٹک رہی تھی۔ ہم تینوں اس کی زبرد تھے۔ ہم کھلی جگہ میں تھے۔ درمیانی فاصلہ خاصا تھا اور وہ بلندی پر تھیں۔ ہم تینوں نہ تو انہیں قابو میں کرنے کے لئے کوئی مؤثر کوشش کر سکتے تھے اور نہ ہی اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگا تھا کہ وہ بدلی بدلی اور کڑک دار آواز میں بولیں۔

”منہ بوا! افضل! جیسا بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو ورنہ میں گولی مار دوں گی۔ تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ میں تمہارے سلسلے میں ذرا بھی رسک نہیں لوں گی۔“

”یعنی۔ یعنی آپ مجھ پر بھی گولی چلا دیں گی؟“ میں نے دانو بے چینی سے پوچھا۔

”ااں۔ اگر تم نے میری طرف بڑے یا مجھے قابو میں کرنے کے لئے ذرا بھی حرکت میں آنے کی کوشش کی تو میں گولی چلانے میں قطعاً نہیں ہچکچاؤں گی۔“ وہ غیر متزلزل میرے لیے بولیں۔ ”میرا سچے میں ایک ہمت کرنے والی عورت کا دل ہے لیکن جب میرا چہرہ کو گھٹس پہنچتی ہے یا میرے احمق کو دھوکا دیا جاتا ہے تو میں ایک سفاک قاتلہ بھی ثابت ہو سکتی ہوں۔“

”وہ تو میں دیکھ چکا ہوں۔“ میں نے حیرت اور صدمہ سے سنہلے ہوئے کہا۔ ”لیکن میرا تصور کیا ہے؟“

”یہ تصور کیا کم ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ کبھی طبیعت کے مالک ہو۔ تم نے میرے اس راز کو کھود نکالا جسے چھپانے کے لئے میں نے اپنی جوانی تھوادی۔ اب میں عمر کے اس آخری دور میں رسوائی کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟“ ان کے لیے میں ہم دھتے نہ طوفان مچ رہے تھے۔

آہا قدم کے انداز میں ذرا احتیاط اور آہستہ سے گھڑائی کرنے لگے کچھ ان کی کہانیوں سننے کی وجہ سے اور کچھ دیکھنے کی وجہ سے۔ وہ احتیاط سے گڑھے سے باہر نکلتے گئے اور کوشش کرنے لگے کہ وہاں سے بانی حشر جس حالت میں تھا اسے اسی حالت میں نکال لیں مناسب اوزار میسر نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایک دشوار کام تھا۔ بہر حال خاصی دیر کی محنت کے بعد وہی گیا۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ پٹایا۔

اس دوران میں ان کی توجہ گڑھے کے توڑے حصے کی طرف ہی رہی تھی جس کی گہرائی زیادہ ہو گئی تھی۔ اب انہوں نے بانی توڑے گڑھے کی بھی احتیاط سے ملٹی پٹائی شوہر کی جلدی اُدھر بھی کچھ بڑیوں کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ میں متعلقانہ انداز میں خیر ارادی طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا یہ تو میرے اندیشوں سے بھی بڑھ کر تھا۔

دھیرے دھیرے شفع شاہ اور ٹولی دوسرے وہاں سے اس حد تک ملٹی پٹائی میں کامیاب ہو گئے کہ اسے مکمل حالت میں دیکھا جاسکتا تھا۔ بڑیوں اور کھڑیوں کے ساتھ وہیہو کر دیکھتے ہوئے میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان میں سے ایک وہاں چارو کا تھا اور دوسرا عورت کا۔ شفع شاہ اور ٹولی بھی یقیناً یہ نتیجہ اٹھ کر چکے تھے۔ وہ بھی اب اوزار چھوڑ کر گڑھے کی دیوار سے ٹک لگے۔ ستانہ سلسلے میں خاموش کھڑے تھے۔

آخراً، نے ہی گہری سانس لے کر اس پر جھل سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ تھا وہ راز جسے چھپانے میں مسز درانی کی زندگی گزر گئی۔ اسی راز کے مکمل جانے کا خوف ان کے ذہن پر اس جیسی طرح طاری تھا کہ وہ ایک رات بھی اس گھر سے باہر گزرنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھیں اور کسی قیمت پر بھی اس مکان کو فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔“

ان دونوں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔

”عائشہ تم بھی مجھے ہو گئے کہ یہ دونوں وہاں سے گئے ہیں؟“ شفع شاہ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پوچھل سی سانس لے کر بولا۔ ”جی ہاں! مر تو یقیناً درانی صاحب ہوں گے۔ مسز درانی کے شوہر اور نسوانی وہاں چارو کا تھا۔“

”ااں۔“ میں نے انہوں نے گڑھے میں بھاگتے ہوئے کہا۔ ”میں ممکن ہے کہ انہوں نے واقعی ملازمہ کے ساتھ فرار ہونے کا پروگرام بھی بنایا ہو لیکن مسز درانی نے انہیں اس پروگرام پر عملدرآمد کرنے کی سہلت نہ دی ہو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ دونوں وہاں سے آئے سامنے کی ایک پہلی کچھ عجیب سے انداز میں ٹولی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسز درانی نے ان دونوں کو پشت کی طرف سے گولی ماری ہوگی۔“

”اور اکیلی عورت نے اتنا بڑا اور اچھا خاصا گراگڑا کھوکھو کر ان دونوں لاشوں کو اس میں دفن کیا۔“ شفع شاہ قدرے حیرت

”جو تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں اس وقت گہری ہوئی یا نروس ہوں؟“ وہ خوشگوار لہجے میں پوچھیں۔ مجھے اسے فائلے اور کم روشنی کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ وہ مسکرائی تھیں پھر انہوں نے خودی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ”نہیں۔ میں نروس یا بدعواں ہرگز نہیں ہوں۔ میں اس وقت بالکل پرسکون ہوں کیونکہ میرا ذہن فیصلے پر پہنچ چکا ہے اور میرے پاس وقت بھی بہت ہے۔ پوری رات ہی پڑی ہے۔ مجھے کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔ مجھے بس تم تینوں کو کوئی سی قرمانی ہے۔ اپنی قبر تو تم لوگ خود اپنے انھوں سے کھودی چکے ہو۔“

وہ ہمیں گولی مارنے کی بات اتنے سرسری سے انداز میں کر رہی تھیں جیسے کہ رہی ہوں۔ ”مجھے تم لوگوں کو صرف سردی گولیاں ہی تو دینی ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی تیار ہے۔“ یہ اس عورت کا ایک نیا دھوپ تھا۔ یا پھر شاید پرانا تھا مگر ہم اسے پہلی بار دیکھ رہے تھے اور مجھے وہ اپنے ارادے پر عمل کر گزرنے کی پوری طرح اہل معلوم ہوئی تھی۔ اس نے مجھے ملے بظاہر اس سے باتوں میں مصروف تھا لیکن میرا ذہن دوسرے ٹریک پر بھی کام کر رہا تھا۔

میں اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کیا کسی طرح اس کے گولی چلانے سے پہلے اس تک پہنچنا ممکن تھا؟ اس کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ گویا ایک قلعے کی بلند فصیل پر موہجہ بند تھی اور ہم کھلے میدان میں تھے۔ جو لوگ گن لے ہمارے سامنے آ جاتے تھے ان پر قابو پانا ان کے حملے سے بچا ہمارے لئے زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا اور جو شخص گن لے ہمارے قریب چلا آتا تھا وہ گویا اپنی شامت کو دعوت دیتا تھا لیکن مسز ڈالین نے فکری کی تھی۔ وہ بھت پرچہ پھینکتی تھیں لیوان کے پاس لائیک ریٹج رائل تھی۔ پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ ہم گولے میں بندہ کر بھی اپنے آپ کو گولیوں کی زد سے نہیں بچا سکتے تھے۔ خصوصاً ایک طاقتور اور دور مار رائل کی گولیوں سے۔

سب سے اچھے امید کی صرف ایک کرن نظر آ رہی تھی۔ قتل کے ارادے سے نکلا ہوا فرد خواہ بظاہر کتنا بھی پرسکون اور رُحاکو دکھائی دے رہا ہو لیکن اس کے اعصاب درحقیقت دامن کے تاروں کی طرح کشیدہ ہوتے ہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ بات کرتی رہیں۔ غیر ارادی طور پر ان کے اعصاب ڈھیلے پڑتے جائیں۔ پھر شاید سہولت اور دلیل کے سارے ان کے ذہن تک پہنچنے کا کوئی راستہ پیدا ہو جائے۔ شاید کوئی بات ان کے ذہن کے کسی نازک گوشے پر اثر انداز ہو جائے اور وہ ہمیں گولی مارنے کے ارادے سے باز آجائیں۔ ہونا مٹوایا ہے کہ جب کسی کے ہاتھ میں بندوٹ ہو اور اس کے کندھوں پر کسی عظیم جرم کا بوجھ بھی لدا ہو تو وہ کسی کی دلیل نہیں سنتا۔ جرم ایک ایسی دلیل ہے جس میں انسان لحد بہ لحد زیادہ گمراہی کی طرف جاتا ہے۔ خصوصاً قتل۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا قتل آسان تر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اور طاقت قاتل کو نہ روک پائے تو پھر یہ سلسلہ اسی

میں نے اپنی دانت میں پھیر کسی فرض کے آپ کے کام آنے کی کوشش کی تھی مسز ڈالین! میں نے گویا اسے اپنا احسان یاد دل کر مٹا کر کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے اور میرے ساتھیوں نے آپ کی خاطر جان اور اپنا بڑا خطرے میں ڈالا تھا۔ ہم نے ایک ایسے شخص سے کسی ذاتی پر غاش کے بغیر محض آپ کے لیے دشمنی منی لی ہے۔ جو اس شر کے مت سے فرعونوں میں سے ایک ہے۔“

”یہ میری عین نعلی ہے۔ میں نے تم سے مدد طلب کی میں تو درحقیقت جیس جانتی بھی نہ تھی۔ مجھے تو زمانے نے تم سے بھرا دیا۔ لیکن خیر۔ اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں۔ شاید قسمت کی خرابی تھی اس وقت میں واقعی کسی مضبوط اور بے خوف آدمی کی مدد کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔“ ان کا انداز خود بخاشی کا سا ہو گیا۔

”لیکن اب کام نکل گیا تو آپ ہمیں گولی مارنے کے لئے تیار ہیں۔“ میں نے رنج لہجے میں کہا۔

”کام نکلا کہاں ہے۔ کام تو اور زیادہ خراب ہو گیا۔“ وہ شاید اپنے لیے کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”تم سے مدد طلب کرنے کا ان ڈائریکٹ اور حقیقی مقصد تو یہی تھا کہ یہ راز اسی طرح دفن نہ جائے۔ مجھے کم از کم ایک باعزت موت نصیب ہو جائے۔ اس کے بعد اگر اس راز کو بے نقاب ہونا ہو تو بے شک ہو گا۔ لیکن تم نے تو میری مدد کرنے کے ساتھ ساتھ میرے ماضی کی قبر بھی کھود ڈالی۔ اب وہ مدد بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب تو تم تینوں میرے سر پر لکھی ہوئی تھیں لکھو ان کی طرح ہو ذات رسوائی اور سزا کی نگواری۔“

میں نے گہری سانس لے کر دھانچوں کی طرف اشارہ کر کے محض تصدیق کی خاطر ہونچا۔ ”بہر حال آپ کو اعتراف ہے کہ یہ آپ کے شوہر اور ملازمہ کے ڈھانچے ہیں؟“

”ہاں۔“ وہ ہلا نال ہو گئیں۔

”آپ نے انھیں قاتل اعتراف حالت میں دیکھ کر قتل کیا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”نہیں۔“ قاتل اعتراف حالت میں تو انھیں بیسیوں مرتبہ دیکھا تھا۔ پھر وہ استہزائیہ انداز میں انھیں۔ ”تہذیب کے نشانے بھی عجیب ہیں۔ محض شرافت کی حدود میں رکھنے کے لئے جن اصطلاحوں کا سارا لینا پڑتا ہے وہ خاصی مضحکہ خیز لگتی چاہئیں۔ مثلاً بھانہ حملہ! حملہ تو... کسی بھی طرح کا ہو وہ بھانہ ہی ہوتا ہے مگر نہ جانے کیوں ایک مخصوص عمل کو بھانہ حملہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ اصطلاح ”قاتل اعتراف“ حالت ہے۔ حقیقت تو ہزاروں قاتل اعتراف ہوتی ہیں لیکن صرف ایک مخصوص حالت کے لئے ہی یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔“

”مسز ڈالین! میں نے گھرے گھرے لیے میں کہا۔“ مجھے خوش ہے کہ آپ اس صورت حال میں بھی اصطلاحوں کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے قاتل ہیں۔“

اور زندگی سیتے ایک ایک سوٹ کس اُٹھائے تھی کیت سے نکل کے ارادے سے اسی دوش پر پلے جا رہے تھے میں اس ملازمی اسی طرح خاموشی سے اور چہ آٹلی تھی۔ میرے اس بیکراں نکل تھی۔ اس ملازمی میرا ایک بہت قیمتی راقش ہونے بابا کا تھا۔ اس ملازمی سربازار صمدی رسوائی کا سامان ہونے لگا تھا۔

”کیسا راز؟“ میں پوچھا۔  
 ”میں کی میری بیکراں محبت بھی میرے شوہر کو میرا میرا نہیں رکھ سکی۔ مجھے میں نے ٹوٹ کر چلا۔ میرا۔ لے میں نے زندگی بچ دی وہ بھی میرا ہو کر نہیں رہ سکا۔ وہ ایسے معمولات حیوانی جذباتوں کو بھی کام ڈال کر نہیں رکھ سکا۔ اور وہ کئی ایسا زور مرد بھی نہیں تھا۔ میرے وجود میں اس سے زیادہ مزہ نہ دینا جیانی جذبے قہر تھے لیکن میں تو کبھی ان کے برابر نہیں جھکتی ہوئی کہیں نہیں پہنچی۔ میں نے اپنے دو مدعوں کو اس کی لالچہ جانا اپنی ہر سانس میں اسے یاد رکھا۔ دنیا میں اس کے سوا مجھے کوئی نظری نہیں آتا تھا۔ میری محبت بہت شدید بہت طوقانی اور کبھی شراکت برداشت نہ کرنے والی تھی۔ اس کے باوجود میں نے تو کرانی کے ساتھ اس کا انڈیز برداشت کر لیا۔ یہ بات کمر کی چار دیواری میں ہی رہ جاتی تھی میں اپنے اپنے چنے کے اس نامور کے ساتھ زندگی گزارا کرتی۔ لیکن تماشاقواب سربازار جا رہا تھا۔“

انہوں نے ایک اور کمری سانس لی ”ہیں۔ وہاں پہنچ کر یہاں قوت برداشت جواب دے گئی۔ میرے اندر کوئی چیز بڑے زوردار کڑا کے کے ساتھ ٹوٹ گئی اور میری اٹلی کے نیچے زنگر خود بخود دب گیا۔ مجھے اس میں ذرا بھی الجھجھاہٹ یا غریب محسوس نہیں ہوا۔ اور فوری طور پر مجھے کسی خاص دکھ کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ شاید میرے دل سے سو رس رس کر دل میں ہی جذب ہو گیا۔ میں فوری طور پر کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بس میں نے ان کے دلوں میں بھی ایک ایک سوراخ کھدایا۔ میں نے بڑی عمدگی سے نشانہ باندھ کر دونوں فائر کئے تھے اور میرا ہاتھوں میں ذرا سی بھی کر زش نہیں تھی۔“

”لیکن رسوائی تو پھر بھی آپ کے لئے نہ آئی مسزورانی؟“ میں نے اپنے لیے میں دوستی اور ہمدردی کا اثر برقرار رکھنے کو کر کشش کرتے ہوئے کہا ”ویسے مجھے تو آپ کے اس رسوائی والا فلسفے سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ آپ دنیا سے تقرباً کئے ہوئے اور درالہ کمری رہتی تھیں۔ اس وقت تو آپ کے ارد گرد اور گنا زیادہ دور تک دور نہ ہوگا۔ آپ کو تو پلنگ نظر نہیں تھی۔ عوامی شخصیت نہیں تھیں۔ اور میرا خیال ہے کہ ایسا زیادہ سوچی سمجھی (SOCIAL) بھی نہیں تھیں۔ بہت زیادہ لوگوں سے آپ کا میل جول نہیں تھا۔ میرا خیال ہے یہ تو برسرِ دنیا جاسکا ہوگا کہ ایک زمانہ ایک خلقت آپ کو جانتی ہوگی۔“

”چند لوگ آپ کو جانتے ہوں گے۔ پھر بھلا ایسا کیا رسوائی والا ہے!“

”رسوائی انسان کے اپنے اندر بھی تو ہوتی ہے۔ انسان کا

وقت کرتا ہے جب مکافات کا عمل شروع ہوتا ہے اور قاتل خود اپنے ہی ہمارے ہوتے لوہیں زوہب جاتا ہے۔

مسزورانی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں ”میں نہیں جانتی کہ اعتراض حالت میں دیکھ کر میرا تو میں نے سیکہ لیا تھا۔ بلکہ کچھ پچھو تو مجھے ان پر ترس آتا تھا۔ کس طرح ہر وقت وہ سوچ کی آگ میں رہتے تھے۔ کس طرح ٹھپ ٹھپ کرتے تھے۔ بیش و منتلا کے چند لے چرانے کے لئے کیسے کیسے جنم کرتے تھے۔ میں تو سمجھتی ہوں انہیں ہلاک کر کے میں نے انہیں ایک لذت آمیز عذاب سے نجات دلائی تھی۔“

”کیا انہیں ہلاک کرنے کے لئے صرف یہی وجہ کافی تھی؟“

میں نے نرمی سے پوچھا۔

”ہیں۔ یہ تو میں ایک ضمنی بات کر رہی ہوں۔ اصل میں تو میں نے انہیں اس وقت قتل کیا تھا جب وہ فرار ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت میں کمر سے باہر گئی ہوئی تھی جیسے کہ اس وقت تم سمجھ رہے تھے لیکن میں اس ملازمی بالکل اسی طرح چپکے سے وہاں آئی تھی جس طرح آج آئی ہوں۔“

”آپ اندر کیسے آئیں مسزورانی؟“ میں نے ان کی بات کاٹنے ہوئے پوچھا۔

”تم نے شاید غور نہیں کیا کہ بھلی گیت صرف دو تھوں کے ذریعے بند ہوتا ہے۔ اس میں اندر یا باہر کی طرف کوئی کنڈی نہیں ہے۔ یہ انتظام میں ہی کیا ہوا ہے۔ اندر کی طرف سے تو آئے محض لیور ذرا سا ہٹانے سے ”بمیرہ حال کے کھل جاتے ہیں البتہ باہر کی طرف سے انہیں کھولنے کے لئے چابی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ظاہر ہے میرے پاس دونوں کی چابیاں موجود ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

انہوں نے ایک طویل سانس کھینچی جس کی آواز مجھے نیچے تک سنائی دی۔ پھر وہ بولیں۔ ”میں چپکے سے بھلی گیت کھول کر اندر آئی۔ مکان کی بیڑھیاں پورے کچھ کی طرف ہی ہیں۔ اوھر سے میں چھت پر پہنچی تھی۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس دوران میں ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ ویسے بھی مکان کے سامنے والے اور پچھلے حصے کے درمیان خاصا فاصلہ ہے۔ اس کے علاوہ تم تین اپنی اس مٹنی خیر دریافت میں اپنے اٹھے ہوئے تھے کہ تم کوئی بہت تو آواز ہوتی تب بھی تمہیں سنائی نہ دیتی۔“

”شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ ہم زندگی میں بڑے عجیب اور ناقابلِ یقین حالات سے گزرے تھے لیکن وہ ڈھانچے پر آدھ ہونے دیکھ کر کم از کم میں تو واقعی کر دو پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ میں نے مسزورانی کی جوانی نہیں دیکھی تھی ”ان کے شوہر اور ان کی ملازمہ کو نہیں دیکھا لیکن میرا تصور مجھے اسی کے آریک صم خانوں میں لے گیا تھا۔ جس کے ہر اجنبی کو شے میں ایک چشم کشا تماشاجازی تھا۔ میں واقعی کمری کا تھا۔ صموت ہو گیا تھا۔“

مسزورانی کہہ رہی تھیں ”میں پہلے کا وہ دن بھی ایک لحاظ سے آج کے دن سے ملتا جلتا ہی تھا۔ وہ دونوں کمر کی تمام قیمتی چیزیں

لسلے میں اگر قانون کی کوئی مجبوری یا کمزوری آئے آجائے تو خود اسے صحیح سزا دی جائے۔ بلکہ اگر پہلے ہی یہ اندیشہ ہو کہ مجرم قانون کے پسندے میں چھٹنے ہی نہیں پائے گا اور آسانی سے نکل جائے گا تو تم اس کی نوبت اتنے ہی نہیں دیتے اور خود ہی حساب برابر کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟

”ہاں“ میں نے ایک نیک ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”میں جھوٹ بول کر آپ کو کسی خوش فہمی میں رکھنے یا دھوکا دینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں اپنے ذاتی نظریۂ انصاف کے بارے میں بڑا سخت ہوں اور کسی سے فہمی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ میری زندگی کا مشن ہے۔“

”میں تم مجھے بھی قانون کے حوالے کر دو گے؟“ انہوں نے استہزائیہ سے لہجے میں تصدیق چاہی۔

”ہاں“ میں نے ملا تال کہا۔ اس موقع پر بھی میرا جھوٹ اور مصلحت کوئی سے کام لینے کوئی نہیں چاہا حالانکہ ہم تینوں کی جان داؤ پر لگی ہوئی تھی لیکن جھوٹ بول کر انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کرنا اور پھر قانون کے حوالے کرنا مجھے بہت بڑا اور کیسکی آسید دھوکا محسوس ہوتا۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں انہیں اس دھوکے میں رکھوں۔ سوت اس کے مقابلے میں باعزت چڑھ گئی۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”آپ کے شو پر اور ملازمہ کا جرم میرے خیال میں اتنا گہین نہیں تھا کہ انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ آپ نے انہیں مھض جذباتی سزا دی۔ میں جذباتی سزا کا قائل نہیں ہوں۔ جذباتی سزا میں معاشرے میں بڑا انتشار پیدا کرتی ہیں۔ آپ کے اس جرم کے بعد آپ کے لئے یہی رعایت کافی ہے کہ آپ نے اتنے برس آزادی سے گزار لئے۔“

”آزادی سے کہاں گزارے۔“ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولیں ”جس کا معلوم کہ میں کس قید میں رہی۔ میں نے کتنی بڑی سزا کاٹی۔ اس مکان میں اس دہری قبر کے ساتھ میں کس عذاب میں رہی۔“

”وہ ایک جذباتی جرم کی جذباتی سزا تھی“ میں نے کہا ”لیکن اب کم از کم عمر کے آخری دور میں تب کو اپنے جرم کی حقیقی سزا بھی کاٹ لینی چاہئے۔“

”تم مجھے اپنی ذاتی عدالت انصاف سے سزا نہیں دے گے؟“ ان کا لہجہ اب بھی قدرے استہزائیہ تھا۔

”نہیں“ میں نے جواب دیا ”کیونکہ مجھے یقین ہے آپ کو قانون کی عدالت سے ہی اپنے جرم کی صحیح سزا مل جائے گی بلکہ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو کم سزا ملے اور جیل میں قطعاً کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ جیل میں بھی تقریباً گھر کی طرح ہی رہ سکیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ساتھ زیادہ سختی ہو کیونکہ آپ کا جرم مھض جذباتیت کی پیداوار تھا۔ فطری خباثت کا نتیجہ نہیں تھا۔ میں ان جرائم کی زیادہ سخت سزا اس کا قائل ہوں جو مھض اپنی خباثت کی تسکین کے لئے کیے جاتے ہیں۔“

اپنی نعر میں بھی تو ذلیل و رسوا ہوتا ہے اس کے اپنے دل کی دنیا میں بھی اس کا قہار بنتا ہے۔ وہ نہایت گھبرے گھبرے لہجے میں بولیں ”صرف بہت زیادہ مشورہ بہت زیادہ سائی میں بول رکھنے والے لوگ ہی تو رسوا نہیں ہوتے۔“

”ہاں“ اس فلسفے کی طرف میرا دھیان نہیں مٹا تھا ”میں نے قدرے استہزائیہ لہجے میں کہا مہر حال وہ ہلکا تو رہے تھے آپ نے آخری اقدام۔ یعنی گولی کے ذریعے انہیں مدد۔ دل کی دنیا میں رسوا تو ہر بھی ہوئی ہوگی۔“

”ہاں“ انہوں نے تسلیم کیا ”لیکن دل کو کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ جب میں اس دیرانے میں تھا۔ اس پرے سے مکان میں تھاراقوں کا مذاپ جمیل رہی ہوں کی اپنی سچی سچوں کے جنم میں جلا رہی ہوں کی اس وقت وہ دونوں بھی یہاں سے کہیں دور چھگے نہیں اڑا رہے ہوں گے ایک دوسرے کی قزحوں کے مزے کھیں لوٹ رہے ہوں گے اس وقت وہ مجھ سے زیادہ قابل رحم حالت میں زیر خاک ابدی غنود سورہے ہوں گے یہ بھی ایک حقیقت ہوگی“ میں نے تسلیم کیا۔

”وہ دونوں اچھل کر میں اسی جگہ لان پر گرے تھے جہاں تم لے آئیں اور دفن پایا ہے اور جہاں تم لوگ اس وقت کھڑے ہو۔“ وہ بولیں ”میں نے اسی لئے فیصلہ کیا ان کی آخری آرام گاہ کے لئے یہی جگہ مناسب ہے جہاں ان کا لود جذب ہو رہا تھا۔ پوری رات کی محنت کے بعد میں نے اطمینان دفن کیا۔ اس وقت یہ لان کافی حد تک اچھا اور صحیح حالت میں تھا۔ چند دن بعد میں نے محسوس کیا کہ برے بھرے لان میں خاک کا یہ پتلا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کم از کم ان کی آخری آرام گاہ پر تو بیش پول کھلے رہنے چاہئیں۔ دھاک رنگ پھولوں سے لدے سرسبز پودے لٹکانے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے اسی بجھے پر کئی خوبصورت پھولوں کے پودے لگائے اور رفتہ رفتہ جب میں نے پائی لان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے سنبھالنا میرے بس کی بات نہ رہی تب بھی اس گھر کے میں خوب دیکھ بھال کرتی رہی۔ ان پھولوں پر جو بن بھی خوب آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ان کی جڑوں میں ان دونوں کی جوانی کا خون تھا۔“

وہ ایک بھگی سی لے کر اچانک سی خاموش ہو گئیں پھر جیسے گلے میں پھنسی ہوئی کوئی چیز گل کر گھر کی سانس لے کر بولیں ”لیکن راز مجرم بھی راز نہ رہا۔ شاید ہر راز کے کھلنے کا ایک وقت ہوتا ہے لیکن میں اب بھی اس راز کے کھلنے کی تحمل نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتی ہوں یہ راز میری سوت تک راز ہی رہے۔ میں تمہارے بارے میں جو کچھ جان پائی ہوں اور جو کچھ مجھے ذرا آج نے تمہارے بارے میں بتایا ہے اسے ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ تم اس راز کو راز نہ بھگدو گے۔ تم یقیناً مجھے مجرم ٹھہراؤ گے اور مجرم و سزا کے بارے میں تمہارا اپنا کوئی نظریۂ انصاف بھی ہے۔ تم چاہتے ہو کہ مجرم کو پہلے قانون سے سزا دلوانے کی کوشش کی جائے اور اس





”چاہے افضل اچھا حافظہ۔“ مسز درانی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کا نشانہ میں تھا۔ پہلے وہ چھپتا چھپے ہی شوٹ کرنا چاہتی تھیں۔ موت سے بچاؤ کی کوئی صورت تو نظر نہیں آ رہی تھی پھر بھی میں نے نہ جانے کس سوہوم سی امید کے سارے چند لمحوں کی مزید محنت حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا ”میں گولی مارنے وقت آپ کو افسوس نہیں ہوگا مسز درانی؟“

”افسوس تو ہو گا۔ لیکن مجبوری ہے۔“ وہ فیر حزل لہجے میں پولیس۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھی بات انہیں اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا ”کیا حتمی فیصلہ ہے؟ ہم بڑے بڑے پسنے غل غم کے بحر میں کابو میں نہیں آئے لیکن ایک کمزور سی خاتون نے دھوکے سے ہمیں موت کے پھندے میں لاپسٹایا۔ اور موت بھی وہ جس پر ترس کھا کر ہم نے اپنی جانیں اور بدنیں خطرے میں ڈال کر بلا غرض اس کی مدد کرنے کی کوشش کی؟“

”زندگی میں انسان کو کسی بھی قسم کا اتفاق پیش آ سکتا ہے۔ اب اس بات پر افسوس کرنا چھوڑ دو اور تم تینوں افراد آنکھیں بند کر کے کل پڑھ لو۔ افسوس کرتے کرتے اس دنیا سے کوچ کرنے سے کیسے بہتر ہے کہ انسان کل پڑھتا ہو اور دنیا سے رخصت ہو۔“

”آپ کے افعال اور افعال میں شیطانیت کی جھلک ہے لیکن آپ کا مشورہ نیک انسانوں والا ہے۔ آپ یہ مشورہ نہ دیجیے تب بھی ہم ایسا ہی کرتے۔“ میں نے کہا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے چہروں پر بچھڑاؤ خوف یا گھبراہٹ نہیں ایک عجیب سی طمانیت تھی۔ ان کی اس طمانیت سے مجھے بھی حوصلہ ملا۔ میں نے بھی اپنے دل میں ایسی ہی طمانیت اور بے خوفی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے نظر ختم ہی کیا تھا کہ ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا لیکن پھر احساس ہوا کہ مجھے گولی تو کیس نہیں لگی تھی۔ کیا مسز درانی نے مجھ سے پہلے میرے کسی ساتھی کو نشانہ بنایا تھا؟

میں نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ اسی لمحے شیخ شاہ اور نوٹی بھی آنکھیں کھول چکے تھے۔ ہم تینوں نے بیک وقت مسز درانی کو منڈیر پر سے اٹ کر کرتے دیکھا۔ ان کی رائفل پہلے ہی نیچے گر چکی تھی۔ وہ جہاں گری تھیں جہاز جھٹکا ڈوبیں تک چھپتا ہوا تھا اور زمین گچی سی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہم تینوں ہی ساکت رہے۔ فوری طور پر ہم کوئی بڑا عمل ظاہر نہیں کر سکے۔ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ درحقیقت ہوا کیا تھا۔ آہم دوسرے ہی لمحے شیخ شاہ اور نوٹی اچھل کر گڑھے سے باہر آئے۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ہم دوی زندقہ میں دوڑا کہ قرب جا بیچے۔

مسز درانی بے ترتیب گھاس کے درمیان آڑی تر جمی پڑی تھیں۔ ان کے چہرے اور کھوپڑی کا تقریباً اڑھائی حصہ غائب تھا

چند لمحے ہم تینوں ان کے قریب ساکت کھڑے رہے۔ یہی بات یہ تھی کہ اس دھچکے نے اس وقت تو مجھے بھی کچھ کالا سا کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں نے دیکھا کچھ قاضی پر غبار بھی بیڑہ دم کی کھڑکی میں دم۔ خود کھڑا تھا اور یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ساری کھٹکھٹکی وہ یقیناً سن چکا تھا۔ مسز درانی کی پٹنی کبھی کھوپڑی سے بھل بھل خون بر رہا تھا اور بچا کھچا مغز بھی اس میں شامل ہو کر مغز کے کی طرح گھاس پر پھیل گیا تھا۔

”یہ واقعی ایک عجیب عورت تھیں! شیخ شاہ بڑبڑایا۔

”شاید ہر عورت ہی عجیب ہوتی ہے۔“ میں نے دھچکے لمحے میں کہا ”ہر ایک کے ہی دل و ذہن میں ایک کارخانہ کائنات موجود ہوتا ہے مگر ہم ہر ایک کے دل و ذہن کے قفل نہیں کھول پاتے۔ اس لیے اس حقیقت سے لاعلم رہتے ہیں۔“

ہم اب مسز درانی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے لاش کو بالکل نہیں چھیڑا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اندر آ گئے۔ ہمیں پولیس کو یہ عجیب اور پُر پتہ مکانی سنائی تھی اور یہ ایک مہربان کام تھا۔

اس سے پہلے میں غبار کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اس وقت تک کھڑکی میں ہی کھڑا تھا۔ میرے کھکانے پر وہ عجز وہی حالت میں میری طرف مڑا۔ میں نے جب سے زنجیر کے تالے کی چابی نکالتے ہوئے کہا ”میں تمہیں کھول رہا ہوں۔ اب خواہ خواہ اٹھا پانی کرنے“ اپنی طاقت دکھانے یا فساد پانے کی کوشش مت کرنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارے جاؤ گے۔ میں تمہاری گردن مروڑنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہوئی تو آپ تم بالکل پُرسکون رہو گے۔ اب ہمارے درمیان جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں رہی۔ سب کچھ تم نے سن بھی لیا ہے اور دیکھ بھی لیا ہے۔ مسز درانی کی اولاد میں کینڈا میں ہیں۔ مسز درانی کے جنازے پر وہ لوگ یقیناً نہیں گئے۔ تھوڑا سا انتظار کر کے مناسب موقع دیکھ کر تم لوگ ان سے بات کر لیتا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہاری موجودہ جھگڑکے سے بھی کم تر قسم میں یہ مکان تمہیں دے دیں گے۔ ہم اب کسی بھی معاملے میں تھام نہیں آئیں گے اس لیے تمہیں ہماری طرف سے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

ٹھیک ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ دھچکے سے وہ بھی یقیناً اسی تک نہیں سنبھلا تھا لیکن بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب میں نے اس کی زنجیر کا تالا کھول دیا اور زنجیر اس کے پاؤں سے نکال دی۔ پھر میں



اس ساری بے ہودہ کارروائی کے دوران تمہاری محفل کا خیال آتا رہتا ہے کہ یہ ساری صورتیں تو توڑی ہوئی ہیں، یہ ساری باتیں تو جھوٹی ہیں، یہ ساری چیزیں تو بے وقعت ہیں۔ تم نے غما غمک خاک بوقت میں پیدا کیا ہو گا اور ساتھ ہی اپنی قسمت کو کھوٹا دیا کہ جس وقت تم یہیں جینوں کے تھرمٹ میں پھنسا رہے ہو گے اس وقت

میں نے کہا: "میں نے پہلے کھل کیا۔"  
 "میں نے کہا: "میں نے پہلے کھل کیا۔"  
 "میں نے کہا: "میں نے پہلے کھل کیا۔"

دوسری طرف ایک لمبے لمبے غاموشی جھانکی بھر رہا تھا۔

”خوست تو خیر یہاں صبح معزوں میں تمہارے آنے کے بعد پہلی۔ میں تو برسوں سے جمع شدہ خوست کو سینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دور ان میں یہاں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ میں نے کہا۔“

”تمہاری موجودگی میں اگر کوئی گڑبڑ ہو اور تم اس کے حلیے میں مجھے فغان بھی کرنے کی زحمت کرلو تو وہ گڑبڑ نقل سے کم تو نہیں ہو سکتی“ رحیم گل نے گویا کوئی پہیلی جو مجھے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”کون نقل ہو گا؟“

”جی اللہ تو کوئی قتل نہیں ہوا۔۔۔ البتہ پچیس تیس سال پہلے کے دو مکمل دیوانے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خود کش بھی ہے۔ فرض یہ کہ تمہارے لیے مصروفیات کا کافی سامان ہے۔ ایک جہزت انجینئر کی کمائی تمہاری بھرتی ہے۔ جلدی آجاؤ۔“ میں نے اسے اذیتیں سکھایا۔

”تھک چھ میں میں منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے بچے  
 طے انداز میں مستحضر سے کہا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ غفار بولا "اب تم بھائی صاحب کو  
میں بلا لوں۔"

تاک کی ہوئی ہے کی وجہ سے کہ اس کی آواز عجیب سی ہوتی  
تھی پھر بھی اس کے لہجے سے اس کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں  
تھا۔ "بھائی صاحب! صورتحال نے اچانک ہی پلٹا کھایا ہے  
سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔"

مزدورانی کی سوٹ کرنا ان کے لیے خوشی کا سامان تھی۔ ان کے مہلے سے ان دونوں بھائیوں کے لیے "سب کچھ ٹھیک" ہو گیا۔ غلط اس نے اپنے بھائی کو پورا دائرہ بتایا پھر اسے بھانے کی غرض

سے اس نے جو باتیں شروع کیں ان سے اندازہ ہونے لگا کہ جبار جیلانی کو یقین نہیں تھا تھا کہ یہاں واقعی یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اسے پھنسانے کے لیے کوئی جال پھیلایا جا رہا تھا کیوں کہ اس کے ساتھ تو دوسرا پروگرام چلے ہو چکا تھا۔ اب شاید ہم نے اسے گھبرانے کے لیے دوسری کہانی گھڑی تھی اور غفار جو باتیں کر رہا تھا وہ شاید اس سے ممکن پورا غٹ پر کھلوانی جا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے غفار اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ ایسا کوئی پکڑ نہیں تھا پھر میں نے اس سے بات کی اور وہ اپنے وکیل وغیرہ کو ساتھ لے کر آئے براہ دورہ ہو گیا۔

میں نے فون بند کر دیا تو کمرے میں جو جھل سکوت چھا گیا۔ اب ہمارے پاس پولیس اور جبار جیلانی اینڈ پارٹی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

جناب صادق حسین صدیقی  
کی تاریخی کتب

|       |                      |
|-------|----------------------|
| 75/-  | غزوات النبی          |
| 90/-  | ہاشمی دو شیزہ        |
| 125/- | فتوح النعم           |
| 75/-  | حور عرب              |
| 100/- | شہزادہ خضر خان       |
| 100/- | سلطان فیروز شاہ تغلق |
| 80/-  | معرکہ صلیب           |
| 80/-  | عجیب جنگ             |
| 100/- | بت حکم               |
| 90/-  | سنگدل ملکہ           |
| 75/-  | جنگ اسماعیل          |
| 90/-  | بنت حلب              |
| 75/-  | افریقہ کی دہس        |
| 75/-  | محبوبہ اور خان       |
| 75/-  | جوش جہاد             |
| 75/-  | فتح کامل             |

○☆☆○

اس واقعے کے ذریعہ ماہ بعد ہم اسے تقریباً بھولنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ زرتاج بھی افسردگی کے اثر سے نکل آئی تھی۔ مسز رانی کے بیٹا جی ان کی زمین میں تو شریک نہیں ہو سکے تھے لیکن بعد میں کینڈا سے آگئے تھے اور چلم تک کراچی میں ہی رہے تھے۔ جبار بیلائی سے ان کا معاملہ طے پا گیا تھا اور چلم کے بعد وہ کم سے کم وقت میں ذیل فاسل کر کے پلے گئے تھے۔ میں نے ان معاملات میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ مجھے اس سلسلے میں تعویذ بہت خبریں زرتاج سے حتیٰ ری میں یا پھر کبھی بھار رجم گل کچھ بتاتا تھا جس نے اس کیس کی گفتیش کر کے اسے داخلہ دے دیا تھا۔ جبار بیلائی نے اس کے بعد ہم سے کوئی پیچھے چھڑا نہیں کی مگر وہ مجھے تو اندیشہ تھا کہ وہ روایتی بد معاشوں کی طرح دل میں دشمنی نہ پال لے لیکن میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا تھا۔

ہمارے معمولات زندگی ہموار انداز میں چل رہے تھے۔ میں نے اس دوران میں لاہور کے بھی دو چکر لگائے تھے۔ وہاں میرے مکان کی تعمیر جاری تھی۔ رابطہ پہلے ہی کی طرح اپنے معمولات انجام دیتے لگی تھی۔ سیاہ پوش حیدر والے طے سے نبات پاکر وہ اندری اندر تو یقیناً خوش تھی لیکن ظاہر میں کوئی تھی جیسے یہ اس کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ فون یا لکس پر اس سے رابطہ رہتا تھا اور دفتری و کاروباری معاملات کے درمیان بھی اس سے نوک جھونک جاری رہتی تھی۔

اسی روز دوسرے کو میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ سیٹھ رمضان کافون آگیا۔ کئی دن بعد اس کا فون آیا تھا۔ ملاقات کو اس سے بھی زیادہ دن گزر چکے تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے کہا حکم کیا مرے ہوئے ہو؟ کالی دونوں سے تم نے اپنی محسوس شکل نہیں دکھائی۔ فون پر تمہاری محسوس توازن بھی خامے دونوں کے وقفے کے بعد سنائی دے رہی ہے۔

”وقف بہت ضروری ہے افضل یا رے! جس میں اس عظیم قلعے کی اہمیت کا اندازہ ابھی نہیں ہو سکا۔ میں تیس سال بعد جا کر ہو گا۔“ وہ غصے سے لہجے میں بولا ”لیکن اس وقت تم مجھے موضوع سے ہٹانے کی کوشش مت کرو۔ میں نے جس میں ایک ضروری کام سے فون کیا ہے۔ کہیں میں وہ بھولی نہ جاؤں۔“

”کاروباری لوگوں کی یہ بھی ایک پہچان ہے کہ وہ جب بھی کسی کو فون کرتے ہیں کسی کام سے ہی کرتے ہیں۔“ میں نے اپنا لہجہ طہرے پانے کی کوشش کی۔  
”قل توڑنے والی باتیں مت کرو یا رے! وہ گویا بڑا سناٹے

پیدائش اور علم نجوم

رنگ لائے گالو

جلو پاکستان

مراۃ المعوس

اتار کلی

لال عہد کا آخری نمبر

خلافت اندلس

عظیم مدد عظیم قائد

کائنات لہات علی خان

مضامین فرحت

دختران ہند

مکتبہ القریش

اردو بازار - لاہور 2

محرم

75/-

اکرام الدین

75/-

آغا شرف

100/-

ڈپٹی ڈیر احمد دہلی

60/-

ڈاکٹر مارٹن علی

75/-

ظیل احمد مدنی

150/-

لوہب ذوالقدر جنگ نادر

150/-

زاہد حسین ا

125/-

زاہد حسین ا

100/-

مرزا فرحت اللہ

125/-

پروفیسر علم الدین سا

25/-

”جس لکھتی ہے۔ جو وہاں سا بزنس میں ہے۔“ سیٹھ رمضان نے جواب دیا۔

”چم۔ چم۔ چم۔“ پھر تو واقعی برا غریب ہے۔ ”میں نے ترم بھرے لیچے میں کما“ سے مدنی وغیرہ بھی کھانے کو لے جاتی ہے یا نہیں؟“

”جس۔“ سیٹھ جان کر وہ مدنی چل رہی ہے۔

”بے چارے!“ میں نے پہلے سے زیادہ ترم بھرے لیچے میں کہا۔

”یار۔ تم یہ خرد مزاج وغیرہ چھوڑو۔ وہ شریف آدمی ہے۔ اپنا بڑا نیا منہ ہے۔ اس کی ذرا سی مدد کرنی ہے۔“ سیٹھ رمضان طاقت سے بولا۔

”کیا مسئلہ درپیش ہے اسے؟“ میں نے قدرے بے پروائی سے دریافت کیا۔

”اسے ایک خوب صورت دولت مند اور مشہور لڑکی نے تنگ کیا ہوا ہے۔“

”وام۔“ کیا خوب صورت مسئلہ ہے! کیا وہ اتنا بڑا آدمی ہے کہ اس مسئلے سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اسے تو چاہیے کہ زندگی بھر اس مسئلے میں گرفتار رہے۔“

”تم نے یہ جانے بغیر فیصلہ سنانا شروع کر دیا کہ مسئلہ کیا ہے۔“ سیٹھ رمضان قدرے غصے سے بولا۔

”مسئلے کی نوعیت میں اٹھنے کی کیا ضرورت ہے! الجھائی ہوئی لڑکی کی حریمیت“ میں اُلٹتا چاہیے۔ تم بتا رہے ہو کہ لڑکی خوب صورت دولت مند اور مشہور ہے۔ اس قسم کی لڑکی کی طرف سے کوئی مسئلہ ہوتا ہے گلے سے لگا لیتا چاہیے۔“

”کسے؟ مسئلے کو یا لڑکی کو؟“ سیٹھ رمضان نے دریافت کیا۔

”دونوں میں سے جس کا بھی موقع ملے۔“ میں نے جواب دیا۔

”خواہ مسئلہ یہ ہو کہ وہ لڑکی اس شخص کو زبردستی کی کوئی شے کر رہی ہو؟“ سیٹھ رمضان نے جانتا ہوا۔

”ہاں۔ ایسی لڑکی کے ہاتھ سے تو زبردستی کھایا جائے۔“

”میں نے جواب دیا۔“

”اللہ حسین جلد از جلد ایسی کسی لڑکی کے ہاتھوں پاؤں بڑھاتا۔“

انتہائی سرخ لالہ زہر کھانا نصیب کرے کیوں کہ اس سے کم کم تم ہو گے نہیں۔“ وہ جمل کر دیا۔ لیکن میرے نیا منہ کا مسئلہ نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ کیا وہ لڑکی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ مسئلہ ہو تا بہت بھی میرے اس شہساکو اعتراض نہ تھا۔“

”مسئلہ تو یہ ہے کہ اس بے چارے نے تو آج تک اس کی نظر نہیں دیکھی۔ اس سے بات بھی نہیں کی۔ وہ اس کا قانون تک

ہوئے بولا۔ میں نے تو جیسے بغیر کسی مطلب کے بیٹوں ملک سے بھی کالیں کی ہیں۔ اور ہاں۔ ساتھ ہی یہ بھی مت بھرو کہ تم بھی ایک کا دیواری آدمی ہو۔“

”میں تو یوں ہی فحش فحش میں کا دیواری آدمی بن گیا ہوں۔“

کا دیوار میرے خون میں شامل نہیں ہے۔ تم جیسے لوگ صحیح معنوں میں کا دیواری آدمی کہلاتے ہیں۔“

”اچھا یار۔“ اگر خون میں کا دیوار شامل ہونے سے خون

کندا ہو جاتا ہے تو میں خون بد لوگوں کا اگلی مرتبہ لندن، نیویارک یا ٹورانٹو جانے لگوں گا تو یہ دلدل۔ فی الحال یہ خرافات چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ مصروفیات کا کیا حال ہے؟“

”تم کام بتاؤ۔“ مصروفیات کا کیا ہے۔ تمہارے کام کی خاطر ہم اپنے کام چھوڑ دیں گے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ اب اتنا اہم کام بھی نہیں ہے کہ اس کی خاطر تم اپنے ضروری اور طے شدہ کام چھوڑو۔“ سیٹھ رمضان بولا۔ ”وہ جو تم نے کا دیوار میں بنا فحش یا یوں کہو کہ فحش میں نیا کا دیوار شروع کیا ہوا ہے۔“ یہ اس خانے میں فٹ ہونے والی چیز ہے۔ کام نہایت معمولی سا ہے اور تمہارے مطلب کا بھی ہے۔ یعنی کام کا کام اور تفریح کی تفریح۔ ایسے دو تھیلوں کے لیے شاید کوئی محاذ بھی بولا جاتا ہے۔ تم کے آم تم تھیلوں کے دام۔“

یہ یہاں فٹ بند رہا ہے یا نہیں؟“

”یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر فٹ

نہیں بند رہا ہے۔“ میں نے بھی کچھ کوئی اعتراض نہیں۔ ”تم کام بتاؤ۔“

”جیسے کسی خوب صورت لڑکی سے ملے ہوئے کتنے دن ہو گئے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس معاملے میں بھی اپنی قسمت اچھی ہی ہے۔ کسی دن بھی ہاتھ نہیں ہوتا۔ اگر کسی نئی لڑکی سے ملاقات نہ ہو تو پرانی دوستوں سے تو ہوتی ہی رہتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی جیسے ایک خوب صورت لڑکی سے ملتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تم نے یہ کام کب سے شروع کر دیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تینوں مہینے۔“ اس کے لیے میں قطعاً شرمندگی ظاہر نہیں ہوئی۔ ”اگر یہ کام کیا ہو تو بزنس کیے بغیر ہی سیٹھ کہلا سکتا تھا۔“

میں نے تو تمہارے لیے ایک دلچسپ کام تلاش کیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ کام کے بجائے ایک خوب صورت لڑکی سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ ایک خوب آدمی کی مدد بھی ہو جائے گی۔“

”خوب آدمی؟“ کتنا غریب ہے وہ؟“ میں نے دریافت کیا۔

میں کو کہ تم نے اسے میرے حوالے کر کے اپنا وقت بچانے کا فیصلہ کیا ہے۔

۳۳ "یامت کو یار میں تمہارے پاس کلاخٹ بھیج رہا ہوں۔ وہ تمہارے وقت کی قیمت ادا کرے گا۔ تمہیں مناسب نہیں دے گا۔" سیٹھ رمضان نے گویا مجھے لائی دیا۔

۳۴ "میری مناسب نہیں بھی خاصی مناسب ہے۔" میں نے کہا "تم خود ہی کہہ رہے تھے کہ وہ بے جاہ غریب سا آدمی ہے۔ محض لکھ جی ہے۔" میری فیس اخذ کر کے؟

۳۵ "تم کیا کہو لوں میں فیس لینے کے ہو؟" سیٹھ رمضان غفلت سے بولا۔

۳۶ "مجھ سے کوئی بھید نہیں ہے کہ میں کسی کی نوعیت اور کلاخٹ کی فطرت دیکھنے کے بعد کو لوں میں فیس کا مطالبہ کروں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

۳۷ "اگر ایسا ہوا تو وہ بے جاہ سر کے بل میرے پاس واپس دوڑا آئے گا۔"

۳۸ "ہام کیا ہے اس کا؟" میں نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کیے بغیر پوچھا۔

۳۹ "کوئل جان کڑائی۔" سیٹھ رمضان نے جواب دیا۔

۴۰ "یہ کس قسم کا نام ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

۴۱ "مجھے معلوم تھا۔ تم بھی سوال کرو گے۔ اس بد صیب کا نام سننے ہی ہر شخص سب سے پہلا سوال ہی کرتا ہے۔" سیٹھ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

۴۲ "تم یقیناً نام کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ تمہارا اپنا کھڑا ہوا نام ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

۴۳ "میں اس قسم کے کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ اور مجھے گھڑنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب گھڑی گھڑائی جنہیں پہلے سے موجود ہیں۔" سیٹھ رمضان عجیبہ معلوم ہوا تھا۔

۴۴ "حیرت ہے۔" میں نے کہا "خامسا محکمہ خیر سامان ہے۔

۴۵ میں نے دنیا میں جو عجیب عجیب نام سنے ہیں لیکن یہ کچھ زیادہ ہی عجیب لگ رہا ہے۔"

۴۶ "میں خود کوئل کو کئی بار مشورہ دے چکا ہوں کہ بھائی اخبار میں اشتہار دے دے اور ضابطے کی تمام کارروائیاں پوری کر کے اپنا نام بدلے لو اس نام کو سن کر کوئی عجیب سی ٹھنکوں سے تمہاری طرف دیکھتا ہے۔ لیکن اس کے کان پر ہوں ہی نہیں رہتی۔ وہ

۴۷ اس مشورے کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے اور اسی نام کے ساتھ قایم اشار ہو جوں میں اصرار بیٹھتا ہے۔ اونچے طبقے میں افسوس و غصہ رکھتا ہے اور ذرا نہیں شرماتا۔ دراصل وہ قباہی ہے۔" اس نے تارا۔

۴۸ "نفس یہ بات ہے۔" میں نے کمری سانس لی۔

۴۹ "تم یہ چاہتے ہو کہ میری وجہ سے وہ اس کی شکل دیکھنے لگے۔ اس سے بات کرنے لگے اور اس کا فون سننے لگے؟" صاف

۵۰ کہا۔ میں نے یہ کام شروع نہیں کیا۔ تم بھلا کہتے ہو۔" میں نے معذرتی صحت سے کہا۔

۵۱ "ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔" کاش۔ اللہ تمہیں توفیق دے

۵۲ کہ تم کسی کسی کی پوری بات سن لیا کرو۔ میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کی وجہ سے میرے اس جاننے والے

۵۳ کا کموں کا نقصان ہو رہا ہے۔

۵۴ "ابھی تو وہ بات نہیں کرتی۔ فون تک نہیں ٹھنکی اور شکل دیکھنے کی دوا دار نہیں۔" میں نے حیرت سے کہا "پھر بھی لا کموں کا نقصان ہو رہا ہے۔ اگر کہیں میل ملاقات ہو گئی تو نقصان کو لوں تک جانچے گا۔"

۵۵ "یاس۔ خدا کے لیے تم اسے لڑکی اور مرد کا دوسرا چکر

۵۶ بنانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ خاص کاروباری معاملہ ہے۔" سیٹھ رمضان کرہا "میں نے تو پہلے اپنے دوست کو کسی ایسے سے دیکل کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ مشورہ کیا دیا تھا؟

۵۷ اپنے ایک جاننے والے دیکل کے پاس تقریباً بھیج دیا تھا۔ پھر

۵۸ اچانک مجھے تمہارا خیال کیا۔ میں نے سوچا تم کون سا کسی دیکل سے کم ہو۔ ضرورت پڑنے پر تم خود دیکل بن سکتے ہو اور کسی دیکل

۵۹ سے زیادہ فساد چا سکتے ہو۔"

۶۰ "تمہارے اس بیان سے دیکلوں کی توجہ کا پہلو لگتا ہے۔ اگر کسی دیکل نے سن لیا تو وہ تمہیں عدالت میں شہیت لے گا اور

۶۱ اچھی طرح اپنا زہر نکالت دیکھتا ہے گا۔ بعض دیکلوں کے پاس بڑا وقت ہوتا ہے۔ وہ رات چلتے اور صبح دیکھتے رہتے ہیں کہ کوئی شکل

۶۲ انہیں اچھی نہ لگے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کر رہے ہیں۔

۶۳ "میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی جس سے دیکلوں کی توجہ کا پہلو لگتا ہے؟" سیٹھ رمضان کچھ اس طرح برا مانتا ہوئے بولا

۶۴ "مجھے اس میں خود اس کی اپنی توجہ کا کوئی پہلو نظر آیا ہو۔

۶۵ "تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں کسی دیکل سے زیادہ فساد چا

۶۶ سکتا ہوں۔ تمہارا مطلب ہے دیکل فساد چاتے ہیں؟" میں نے ایک دیکل ہی کی طرح پوچھا۔

۶۷ "یاس! میرا مطلب یہ تھا کہ تم بھی اچھی پہلی قانونی

۶۸ کارروائی کر سکتے ہو۔ تم خود بھی قانونی دان بننے سے اچھی طرح

۶۹ واقف ہو۔ اس کے علاوہ مجھے کاروباری چکرلوں میں جن دیکلوں کی خدمات حاصل رہتی ہیں۔ تمہیں اتنا سے بھی زیادہ پتہ ہے اور

۷۰ اسی گرامی دیکلوں کی خدمات حاصل ہیں۔ تم کسی کے خلاف قانونی

۷۱ دیکھا۔ بلکہ ہر قسم کی کارروائی ہی مجھ سے کہیں زیادہ اچھی طرح

۷۲ دیکھ سکتے ہو اس لیے میں نے اس کوئی کو تمہاری طرف بھیج کاروا

۷۳ کیا ہے۔"

”مسئلہ کوئی خاص نہیں ہے لیکن لڑکی بہت خاص ہے۔ اے میں جیسے اس کے پاس پہنچ رہا ہوں۔“ سینہ رمضان بولا۔  
 ”اس اعتبار سے لڑکی کوئی کی گردان سننے سننے کان پر گئے ہیں۔ کیل خواہ علاوہ سپنس پیدا کیے جا رہے ہو۔ بہتر ہے کہ تانے سے پہلے لڑکی کا یہ خوارفہ کرادو۔ آخر وہ کون حیدر مل رہا ہے؟“ میں نے اپنے لیے میں جنس کے بجائے قد سے بے زار کا اہتمام کرنے کی کوشش کی۔

”دل نواز تو وہ معلوم نہیں ہے یا نہیں۔ لیکن سینہ فر ہے۔ کو کہ میں اس سے بھی ملا نہیں ہوں لیکن گزشتہ چند روز کے دوران میں میں نے کئی بار اس کی تصویریں دیکھی ہیں اور یہ دل پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا ہوں۔“ اس نے شاید اس وقت بھی پتہ ہاتھ رکھ کر ایک لمبی سانس لی۔

”تم نے محض دل پر ہاتھ رکھنے پر کیوں اکتفا کیا؟“ میں پوچھا۔ ”کسی بمانے اس سے ملنے کیوں نہیں چاہیے؟ تم تو اس معاملے میں اس عمر میں بھی بڑے فکار ہو۔“

”جین دونوں اس کا نام اکثر سامنے آتا تھا ان دونوں میں حالات کچھ ایسے تھے کہ اس سے خوارفہ حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اور اس کے حالات کچھ اس قسم کے تھے شاید وہ میرے کسی بھی بمانے کے باوجود مجھ سے نہ مل پائی۔“ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ کبھی طلاق ہو رہی تھی۔ کبھی وہ لنگہ باہر تھی۔ خاصی بنگاہ خیر زندگی گزار رہی ہے اس نے۔ سنہ ان ہمارے ہیں انگریزی پریس میں اکثر اس کا ذکر ہوتا رہتا ہے اور پچھلے دور کے فیشن میگزینز میں رکھ رکھ تصویریں بھی لگ رہی تھیں۔ کافی عرصے کی خاموشی کے بعد پھر اس کا نام سننے میں ہے۔ پریس میں تو اب اس کا ذکر نہیں آتا۔ لگتا ہے پریس اور اور اپنے طبقے کے لوگ اسے بھول بھال گئے ہیں۔“ سینہ رط نے خاصی ترک میں بتایا۔

”اوہ۔ اس کا مطلب ہے موصوفہ شادیاں اور طلاق کے مرحلوں سے بھی گزر چکی ہیں۔“ میں نے اپنے لیے سے قد اپنی اس کا اہتمام کرنے کی کوشش کی۔

”اس میں اتنی بات کی کیا بات ہے۔ صرف وہی شاد اور طلاق تو ہوئی ہیں بے چاری کی۔“ سینہ رمضان گوا حوصلہ پھراتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے لیے اس سے کیا فرق ہے۔ بے چاری کی دونوں شادیاں بہت تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے بے قرار رہی ہیں۔ نو جوانی میں ہی وہ مرتبہ کی طلاق ہو چکی ہے۔“

”چھ۔ صرف وہی شادیاں ہوئی ہیں بے چاری کی۔ میں نے گویا سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تو بڑی نازاں۔ بے چاری کو کم از کم آٹھ دس شادیاں کا موقع تو ملنا چاہیے۔“ خیمہ۔ تم بتا رہے ہو کہ ابھی تو وہ نوجوان ہی ہے۔ ابھی تو بہت

سینہ رمضان نے جلدی سے وضاحت کی ”لیکن یہ اسی قسم کا قبائلی ہے جو برس ہا برس سے شہروں میں رہ رہے ہیں پڑتس کر رہے ہیں اور اونچے طبقے میں رہ رہے ہوئے ہیں۔ وہ صرف اپنی دہلیات میں قبائلی ہیں ورنہ ظاہر ان کے طور طریقے ان دنوں سن و فیوہم تم سے قطعاً مختلف نہیں۔ صرف بعض خاص معاملات میں ان کی قبائلی دہلیات ان کی ذرا مختلف سوچ آئے آجاتی ہے۔ مثلاً کوئل جان کڑیالی اس لیے اپنا نام نہیں بدلا کہ چیلے والے کیا کہیں گے کوئل نے شہر جا کر اس باب کا دوا ہوا نام بھی چھوڑ دیا۔“ میں سمجھ گیا۔ ”میں نے کہا۔“ عجیب اتفاق ہے گزشتہ رات بھی اسی قسم کا ایک قبائلی میرا سامان رہا ہے۔ آج صبح ہی اسے خست کر کے بیٹھا ہوں۔ لگتا ہے میرے لیے آج کل قبائلیوں سے ملاقات کا یزین مل پڑا ہے۔ خیمہ۔ یہ تانا۔ یہ جو تمہارا کوئل خان کڑیالی ہے۔“

”کوئل خان کڑیالی نہیں۔ کوئل جان کڑیالی۔“ سینہ رمضان نے میری بات کاٹتے ہوئے صبح کی۔  
 ”دو۔ دو۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اس کا تو ایک سے زیادہ مرتبہ نام لیتے ہوئے بھی زبان میں ”کوئل“ پہنچنے لگتے ہیں۔ ”کوئل“ کا مطلب کھتے ہو؟ سوچ آتا۔۔۔“ خیمہ قسم کے جھگڑے لگا۔

”میں سب سمجھتا ہوں پارے اتھ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کیا کچھ سمجھتا ہوں۔ میں پاکستان میں بولی جانے والی تقریباً تمام زبانیں سمجھتا ہوں۔“ سینہ رمضان۔۔۔ کسی سانس لے کر بولا۔  
 ”حضرت ہے! میں تو جیسے بالکل ہی گماڑ سمجھتا تھا۔“ میں نے کہا مہر حال میں یہ کہنے لگا تھا کہ تمہارا یہ کوئل جان کڑیالی قبائلی ہونے کے باوجود محض ایک لڑکی سے شگ کیا ہے؟ اس نے اپنے انوار میں اس کا کوئی طلاق کرنے کی کوشش نہیں کی؟

”خواتین کے معاملے میں اکثر قبائلی بڑی شرم لحاظ والے ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی اشتہ مجبوری نہ آتا ہے تب تک کوئی سخت قدم نہیں اٹھاتے۔ اور یہ جو میرا دوست کوئل جان کڑیالی ہے۔ یہ تو بہت شریف اور سیدھا آدمی ہے۔ نرم دل بھی بہت ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ پڑتس کیسے کر رہا ہے۔ پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ نیزہا آدمی ہو تا تب بھی اس لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیوں کہ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ اس کا شمار وہی لڑکی لوگوں میں ہوتا ہے۔ کوئل بے چارہ تو اس کے سامنے نہ آ سکتا ہی ہے۔ وہ تو اس سے ملنے بمانے کی بھی عزت نہیں کر رہا تھا۔ اسی لیے تو وہ مجھ سے مدد طلب کرنے آیا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ تو تمہارے مطلب کا کیس ہے۔“

”اہ۔۔۔ مجھے اس میں سے اپنے مطلب کے کیس کی خوش بو تو آ رہی ہے لیکن پہلے تم مجھے یہ تو سمجھاؤ کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔





ہونے کے بعد تو شاید اسے خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں ہوا۔  
کچھ انڈسٹری اور اداکار بڑی بہن کو بھی کھل ہوئے ہیں۔ پھر بھی  
اسے ہر حال کم حصہ ملا ہے۔ معلوم نہیں کیوں باپ نے اسے برابر  
کے حصے کا مستحق نہیں سمجھا۔  
”یہ باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک کاروباری شماس کے ذریعے۔“ سینہ رمضان نے  
جواب دیا۔ ”یہ مشہور لوگوں کی فیملی ہے۔ ان کے بارے میں تھوڑی  
بہت معلومات حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں۔ اصل بات  
میں تمہیں یہ بتانا تھا کہ پرنس سیرا کو دریافت میں جو کاروبار دل  
گیا ہے اسے اس کے سربراہ کچھ پتا نہیں۔ اور نہ ہی وہ اس کی  
طرف کوئی توجہ دے رہی ہے۔ اسے درستے میں ملنے والی کمپنیاں  
میں ایک چلائی کمپنی بھی شامل ہے جو صنعتی ضروریات میں استعمال  
ہونے والا مال چلائی کرتی ہے۔ کوئل جان کر یا لی نے کافی عرصہ  
پہلے ایسے مال کی بہت بڑی کمپنی کا آئڈر اس کمپنی کو دے رکھا تھا۔  
کمپنی کا نام ایچ آر ٹ ایچ پورٹ کارپوریشن ہے۔ پرنس سیرا کے  
والد پرنس سعید کے زمانے میں ہی اس کمپنی کے کام میں بے قادری  
آگئی تھی۔ کوئل کا آئڈر انہی کے زمانے کا ہے اور ابھی تک اس  
کی فیملی نہیں ہو سکی۔ پہلے اسے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا  
اس لیے اس نے بھی زیادہ پوچھا نہیں کیونکہ اسے جہاں مال چلائی  
کرنا تھا اب اسے وہاں سے نوٹس ملے اور کچھ جبران بھی بڑھ گیا  
تب وہ ذرا حرکت میں آیا تو اسے پتا چلا کہ کمپنی کا دفتری بند ہو چکا  
ہے۔ ابھی کچھ پتا نہیں کہ اس کا کیا بن رہا ہے اور اس کا مستقبل  
کیا ہوگا۔ کوئل نے لاکھوں روپے کی رقم بھی کمپنی میں ڈھنگی بیع  
کرائی ہوئی ہے۔“

”وہ کوئی قانونی کارروائی کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے چارے بچاؤ۔“ سینہ رمضان  
لٹھری سانس لے کر بولا۔ ”صرف مجھے ہی نہیں بلکہ خود کوئل کو بھی  
معلوم ہے اور وہ ایک سوچ رہا تھا۔ یہ بات تو میں تمہیں بتا ہی چکا  
ہوں۔ لیکن تمہیں معلوم ہے اس قسم کے معاملات میں عدالتوں  
میں فیصلہ ہوتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت  
میں۔ جب کہ سامنے کوئی موجود ہو۔ یہاں تو سامنے کوئی موجود  
ہی نہیں ہے۔ کمپنی کا دفتر بند پڑا ہے۔ اصل مالکن تک کسی کی  
رسمانی نہیں ہو رہی۔ بلکہ وہ تو اس قسم کے کاروباری مسائل پر  
غور نہ بھی بات نہیں کرتی۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ بات بھی  
کرنے کی تو اسے کچھ پتا نہیں ہوگا۔“

”تو تم چاہتے ہو کہ اب میں جا کر اس سے بات کروں؟“ میں  
نے تصدیق چاہی۔

”شکر ہے یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی۔“ سینہ رمضان نے  
ایک اور لٹھری سانس لی۔ ”لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی شکر  
ادا نہیں کرو گے کہ میں نے تمہارے لیے کیا دلچسپ کام تلاش کیا

ہے۔ یعنی کسی خوب صورت دولت مند اور مشہور لڑکی کے گھر  
جا کر اس سے بات کرنا۔“

”لیکن اس کا گھر ہے کہاں؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”مجھے  
اس کا گھر معلوم نہیں ہے۔“

”معلوم کرنا ہمارا ہی اگر تم کسی دی دی آئی لی جی جی  
خصیت کا گھر بھی تلاش نہیں کر سکتے تو تم اپنے کانٹنس کو کس کم  
کی خدمات مہیا کر گے؟“ سینہ رمضان نے مجھے ہلکی سی ڈانٹ  
چلائی۔ ”یہ تو دیکھو بھی ہمارا فائدہ کیس ہے۔“

”تم اپنا کانٹنس اپنے پاس رکھو۔ میں کوئی پرائیویٹ سربراہ  
رساں تو فراہم ہوں کہ تمہیں لے کر ہر کام کرنا چاہوں۔“ میں نے  
معنوی کھل سے کہا۔

”پھر تم کیا ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں اس سے آگے کی کوئی چیز ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یعنی تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تم کیا چیز ہو؟“

”مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ میں  
اپنی مرضی کا مالک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہاں۔ جب انسان کا ہیٹ بھرا ہو تو وہ اس قسم کی باتیں  
کر سکتا ہے۔ تم پیسے والے ہو۔ غرے دکھا سکتے ہو۔“

”غور نہ کیا ہے۔ غرے تو انسان بغیر پیسوں کے بھی دکھا  
سکتا ہے۔ غور نہ کرو کی خوجہ تو فراہم آتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بات تمہیں ہے یا رسا غور میں غرے خود بخود  
ہو جاتے ہیں۔“

”چھ چلو تمہاری خاطر میں دولت مندی میں غرے کم کرتا  
ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔“ میں نے فراخ دلی سے کہا۔ ”میں گھر  
خود ہی معلوم کر لوں گا۔“

”نہیہ۔ میری معلومات اتنی کم بھی نہیں ہیں۔ میں تو یوں  
تمہیں ذرا زیادہ اکیلے ہونے کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ ایک ایڈیٹر  
نوٹ کرو۔“ اس نے مجھے کانٹنس کا ایک ایڈریس نوٹ کرا دیا۔

”میں ایڈریس نوٹ کر چکا تو وہ بولا۔“ ”یہ ایک جگہ ہے لیکن اس میں  
پرنس سیرا کی رہائش نہیں ہے۔ اسے وہ اپنا اسٹوڈیو کتنی ہے؟“

”اس کا زیادہ وقت نہیں گزر رہا ہے۔ یہاں موصوفہ مقوری، مجتہد  
سازی اور فیروز فراتی ہیں۔“

”اور۔ یہ شوق بھی ہیں موصوفہ کو؟“ میں نے گہری سانس  
لی۔

”ہاں۔ لیکن یہ شوق زیادہ مرانا نہیں ہے۔ آج کل موصوفہ  
چوں کہ ایک غیر شادی شدہ خاتون کی حیثیت سے زندگی گزار رہے  
ہیں اس لیے شاید زندگی میں کوئی کی نہ ہونے کے باوجود کوئی گھر  
مخصوص ہوئی ہے۔ اسی لیے شاید یہ مشاغل اختیار کر لے ہوں۔“

”جگہ موصوفہ نے انہی خرافات کے لیے مخصوص کیا ہوا ہے۔“

”رمضان نے بڑا ٹھیک ہے۔ تم ایک ہڈی سیٹھ ہو لیکن ہار

لئے چلا جاتا ہوں ورنہ ہمیں معلوم ہی ہے کہ مجھے تو لڑکیوں سے  
تفہانہ لڑکی دیکھی نہیں۔ میں نے گویا ہاتھ پاؤں کاٹ کر  
"ہاں۔۔۔ واقعی۔۔۔" سیٹھ رمضان نے لہجہ کی سے کہا میں  
نے خود پر ہوں ہمیں ایک قریب میں دیکھا تھا۔ جس جس طرف  
خواتین بیٹھی تھیں تم ادھر سے منہ پھیر پھیر کر گزرو گے اور اگر  
اچانک کوئی خاتون تمہارے سامنے آجی جاتی تھی تو تم آنکھوں پر  
ہاتھ رکھ لینے تھے۔ تمہاری اس بے نیازی کا تذکرہ تو اخباروں میں  
بھی آتا رہتا ہے۔ شرف اور معززین کی محفلوں میں اس کی مثالیں  
دی جاتی ہیں۔"

"لیکن تم جیسے دوستوں کی وجہ سے مجھے کتنا اہل کار کیا ہے  
کتنی قربانی دینا پڑتی ہے کہ خود جا جا کر خوب صورت خواتین سے ملنا  
پڑتا ہے۔" میں نے کراہ کر کہا "میرا حال۔۔۔ اسی کا نام زندگی ہے  
انسان دوستوں کے لیے ایسا نہ کرے تو جینے کا فائدہ ہی کیا ہے  
اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ میں جلد ہی فون کر کے بتاؤں گا کہ ملاقات  
کانتیجہ کیا رہا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے طمانیت سے کہا اور سلسلہ منقطع  
کر دیا۔



اس شام جب میں اس بچے پر پہنچا تو مجھے خاصی حیرت کا سامنا  
کرنا پڑا۔ میرے ذہن میں کچھ ایسا تصور تھا جیسے اس بچے کے گٹ  
پر کسی قلعہ گاڑ دینا ہوتا ہوں گے اور پرئس میرا سے ملنا واقعی  
کارہے وارد ہوگا۔ معلوم نہیں کس کس کی پوچھ گچھ کا سامنا کرنا  
پڑے گا اور کس کس مراحل سے گزرنا پڑے گا لیکن اس بچے کے  
غیرت رکھنے کوئی باوردی مسلح گاڑ تو کیا کوئی عام سوداچی دھڑا بڑا نور  
حم کا چکر دیوار بھی نظر نہ آئے۔

بچے کی ساخت البتہ اس اعتبار سے بہت اچھی تھی کہ اس  
میں حاضنی اقدامات کا بہت خیال رکھا گیا تھا۔ چار دیواری کچھ اس  
قسم کی تھی اور اس پر ایسے اختلافات موجود تھے کہ اسے پھلانگ کر  
جاسکی اور طریقے سے کسی کا اندر پہنچنا تقریباً ناممکن ہی نظر آتا تھا۔  
اس کے باوجود وہ دو دروازے شاعرانہ حسن بھی لٹائی تھا۔ ساف  
نظر آتا تھا کہ بچے کی قسیمیں کسی صاحبِ ذوق کا بھی ہاتھ تھا۔  
بگلا زیادہ طویل و عریض نہیں تھا لیکن اس کی راکٹ دلچ  
پیش بہت زیادہ تھی۔ گو کہ وہ کسی باوقف جگہ پر واقع نہیں تھا۔ اس  
کے باوجود اس کی لوکیشن بہت اہم تھی اور اسے باہری سے دیکھ کر  
اندازہ ہوتا تھا کہ اندر سے وہ نہایت بُرے سائل ہوگا۔ اس کے  
اند گرد اس سے کہیں زیادہ طویل و عریض بچے پہلے ہونے تھے لیکن  
بہت سے پلاٹ خالی بھی تھے۔ علاقے میں دیرانی کا رائج نظر آتا  
تھا۔

بچے کی دیوار پر ایک خوب صورت عسفی پر جلی انداز میں  
صرف بچے کا نمبر درج تھا جو مجھے دہرے ہی نظر آیا تھا اور میں نے

اس کا اعلان تو مت کر دیا۔ تم مصوری اور مجسمہ سازی و فوجی و  
خواتین کہہ رہے ہو۔ میں نے افسوس سے کہا۔  
"میں مصوری اور مجسمہ سازی کو خرافات نہیں کہہ سکتا  
ہوں۔" سیٹھ رمضان بولا "لیکن مجھے یقین ہے کہ مصوری اور  
مجسمہ سازی کے نام پر جو کچھ پرئس سیرا کرتی ہوگی وہ خرافات ہی  
ہوگی کیوں کہ میں نے آج تک کسی لاش میں اس کے فون پارے  
نہیں دیکھے۔ آرٹ کے والدہ محفلوں میں کہیں اس کا ذکر نہیں  
ہوتا۔"

"شاید ابھی اسے اس طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی ہو۔"  
میں نے کہا "لیکن اگر وہ دولت مند ہے تو پھر رتہ رتہ سب کچھ  
ہونے لگے گا۔ لاشیں بھی ہو جائیں گی۔ ذکر بھی سنائی دینے لگے گا  
چاہے مصوری اور مجسمہ سازی میں اس کا مکمل دخل ہو جائے۔"  
"ہاں۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے۔" سیٹھ رمضان بولا "لیکن  
ہمیں اس سے غرض نہیں۔ وہ بے شک پاسو کی پاشیں بن جائے  
ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ تم اس سے مل کر میرے دوست کا مسئلہ  
حل کرادو۔ ہماری غرض تو صرف اتنی ہے اس سے آگے اگر  
تمہاری کوئی غرض کھل آئے تو اس سے بھی ہمیں کوئی غرض  
نہیں۔"

"اب اتنے بے غرض بننے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہاری  
رگ رگ سے واقف ہوں بوڑھے شیطان!"  
اس نے ایک گونجیلا سا قہقہہ لگایا اور خوش گوار لہجے میں بولا  
"مجھے شیطان بے شک کہہ لو لیکن بوڑھا مت کہو یا راجا!"  
"بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اکثر بوڑھوں کی یہی فرمائش  
ہوتی ہے۔"

"اچھا فضول باتیں چھوڑو۔ ہم دونوں بڑے بڑی میں ہیں۔  
ہزارا وقت جیتی ہے ہمیں اس کو فضول باتوں میں ضائع نہیں کرنا  
چاہیے۔" اس کے لہجے میں جھجک تھی۔  
"تھپ تھپ ہم کیا کر رہے تھے؟" میں نے کہا "نوادہ تو تو ہم  
نے بکواس ہی کی ہے۔ کام کی بات تو اس میں بہت کم تھی۔"  
"یہ تو خیر ہمارا اسٹاکل ہوا۔" سیٹھ رمضان بولا "مگر ہم  
فون کا ریپورڈ کان سے لگائے ہی کام کی بات کرنا شروع کر دیں اور  
ریپورڈ کئے تک صرف کام کی بات ہی کہتے رہیں تو ہماری صحت  
پر اس کے نہایت مضر اثرات پڑ سکتے ہیں۔ یہ تو ہمیں بھی معلوم  
ہے اور تم اسی کے قائل ہو مگر خواتین اور مرد بچنے کی کوشش کر رہے  
ہو۔ کام کی خشک باتوں کو اور ادھر کی تر باتوں میں ملا کر جو مجھوں  
گفت و شنید تیار ہوتا ہے وہ بہت کم کے لیے نہایت مفید ہوتا ہے۔  
اچھا یہ بتاؤ کہ میں سنا کر جاننے کے لیے ہمیں کب فون کروں؟"  
"میں خود ہی فون کروں گا۔" میں نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔  
"لیکن یاد رہے یہ کام ذرا جلدی کرنا ہے۔"  
"یہ! اتنا اصرار کر رہے ہو تو میں آج ہی اس لڑکی سے

تعلیم کے اعتبار سے کچھ اور ہوتے تھے لیکن وہ کسی اور طبقے یا برہمنوں میں بہت کامیاب ہو جاتے تھے۔ اس نے مجھے میرے نام سے تو مخاطب نہیں کیا لیکن وہ مجھے حیرت کا ایک اور جھکا دینے پر بہر حال تکی ہوئی تھی۔ نہایت شیریں لہجے میں وہ انگریزی میں بولی "کیسے ہو۔۔۔؟ اندر آجائو۔۔۔"

اس کے اس مہیاں لہجے پر میرے دل میں تھوڑی سی کھد بہ ہوئی۔ میں نے اپنے ذہن کے گرد ہلکے گوشوں کو کھٹکالا۔ ایسا تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ایسی کسی لڑکی سے ملا ہوتا۔ اس سے میری تھوڑی بہت شناسائی رہی ہوئی اور میں اسے بھول گیا ہوتا۔ میں نے اس امکان کو بیکسر مسترد کر دیا۔ بات کچھ اور تھی۔ اس بات کو جاننے کے لیے اس کی دعوت قبول کرنا ضروری تھا۔ ویسے بھی مجھے اپنا کام تو کرنا ہی تھا۔

اس کے خوب صورت ہونٹوں پر روشن مسکراہٹ برقرار تھی اور اس کے عجب میں کہیں کوئی سسلی یا غیر میل تو ہی نظر نہیں آتا تھا اس لیے میں نے پھوٹے گیٹ سے اندر قدم رکھ دیا تاہم میرا ہاتھ اب بھی اس جیب میں تھا جس میں ایک چھوٹا اور ہلکا جھلا سا لیگن نہایت خطرناک پتھول موجود تھا۔ پرنس سیرا کی مہیاں مسکراہٹ بے شک دل کو گرمانے والی تھی لیکن اس نے مجھے شک میں بھی مبتلا کر رکھا تھا۔ کوئی عید نہیں تھا کہ اندر پہنچے پر مجھے اچانک کسی گڑبڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔

اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے استہزا پھر گیٹ بند کرتے ہوئے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے وجود کی دل فریب ملک میرے حواس میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی۔ میں نے "چلے آپ" والے انداز میں اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور روشن ہو گئی۔ اس کا تپا تپا جگانے والا سراپا اپنی سحرانگیز خوشبو کے جتنے میں ہلکے سے لپٹا میرے آگے چل دیا۔ میں اپنے حواس کو بالکل سے بچانے کے لیے ادھر ادھر توجہ دینے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے گرد و پیش کا جائزہ بھی لینا تھا۔ ہم جس سرسبز راستے پر چل رہے تھے وہ طویل نہیں تھا اور اس کے دونوں طرف پھیلا ہوا لان بھی طویل و عریض نہیں تھا لیکن اس کی خوب صورتی مثالی تھی۔ لان ڈھلوان تھا اور اس پر جا بجا موجود رنگا رنگ پھولوں کی ترتیب و آرائش کسی ماہر باغبان کے ہاتھوں کی رہن منت معلوم ہوتی تھی۔ اس قسم کے لان زیادہ تر تصویروں میں ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔

وگنورین طرز کا ایک بڑا سا چوٹی دو دانہ کھول کر ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ اس میں قدم رکھتے ہی احساس ہوا کہ ہم ایک بڑے آرٹ اسٹوڈیو میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہال میں ایک ٹیس بلکہ کئی امیل استاد تھے جن پر کئی کھل اور ناخصل پینٹنگ نظر آ رہی تھیں۔ دیواروں پر بھی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ کچھ پینٹنگز فرش پر بھی دیواروں کے سارے کھڑی تھیں۔

پچھا گاڑی وہیں ایک طرف روک کر کھڑی کر دی تھی۔ چند قدم پیدل چل کر میں گیٹ تک پہنچا۔ نبردانی کھینچ پڑا اور کچھ بھی روم میں تھا اور نہ ہی کہیں کوئی دوسری کھینچ نظر آ رہی تھی۔

گیٹ کے پیر میں اندر کام نصب تھا۔ میں نے کال بیل بجائی اور اندر کام کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ اندر کام پر کوئی آواز نہ ملے گی جو میرے بارے میں استفسار کرے گی۔ میں نے متوقع سوالوں کے جواب کافی حد تک سوچ رکھے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں پرنس سیرا سے کوئل جان کر لڑائی کا دکیل بن کر ملنے کی کوشش کروں گا۔ آگے چل کر جو بھی صورت حال ہوگی اس کی حساب سے اسے کوئی قدم اٹھاؤں گا۔

اس وقت مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا تھا جب اندر کام پر کوئی آواز نہ ملنے کے بجائے چھوٹا گٹ اچانک کھل گیا اور میں نے ایک خوب صورت لڑکی کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت تھی اور اس قسم کی شخصیتوں میں سے تھی جو اچانک سامنے آجائیں تو پیسے بھی حیرت کا ایک خوش گوار سا جھٹکا لگتا ہے۔ اس وقت اور اس جگہ اس کا اچانک گیٹ کھل کر سامنے آ جانا میرے لیے یوں بھی حیرت کا باعث تھا کہ میں ایک پرنس سے "کیا" کسی عام آدمی سے بھی اس بے اعتنائی کی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ محض کال بیل بن کر گیٹ کھل دے گا۔

شاید اس نے بھگت اتنی یا کسی خفیہ عدوان سے میرا جائزہ لیا ہو لیکن گیٹ کھلنے سے پہلے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ لیکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ میرا معززانہ جلوہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی ہو۔ وہ کچھ ایسی خوشخیزانہ تھیں تھیں لیکن نہ جانے کتنی خوشخیزانہ نوجوان لڑکیوں سے زیادہ خوشخیز شخصیت کی مالک تھیں۔ اور پھر دولت مندی کی اپنی ایک عجیب چمک دکھاتی ہے جو انسان کی شخصیت کے گرد ایک غیر معمولی سا ہالہ باندھتی ہے۔ یہ ہالہ کسی خوب صورت شخصیت کو مزید خوب صورت بناتا ہے۔ وہ ویلوٹ کے سیاہ جست ٹراؤزر اور ہلکی پھلکی سی سفید شرٹ میں تھی۔ تراشیدہ بال کندھوں سے ذرا اوپر بھول رہے تھے۔ اس کی شریتی سی آنکھوں میں نہایت کی چمک تھی۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ ایک لاجبالی لڑکی کا چہرہ تھا۔

مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب وہ مگری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے یوں مسکرائی جیسے مجھے جانتی ہو۔ ایک لمبے کے لمبے تو میں اپنے ہڈ گرام پر نظر ڈالنی کرنے پر مجبور ہو گیا اور سوچے بیٹھے نہ سکا کہ اس کے سامنے دکیل بننے کی کوشش کروں یا نہ کروں؟ کہیں وہ مسکراتے ہوئے کہہ نہ دے "مفضل صاحب! مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ ہو گئے کے مالک اور بزنس میں ہونے کے علاوہ دکیل بھی ہیں۔"

پھر میں نے خدی اپنے آپ کو تسلی دی کہ یہ اس کے لیے کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں ہو سکتی تھی کہیں کہ بہت سے لوگ

کہو تڑپنا اڑنے کے لیے رول ہا تھا۔ اسے دیکھ کر گلن گزر آتا تھا کہ اب آؤا کہ تب آؤا لیکن چھ سینکڑا انتظار کے بعد بھی جب وہ نہیں آتا ہوا کہ تب دیکھنے والے کی کھمبے میں آتا ہوا کہ وہ حوا شدہ تھا۔

”بہنہ جائز۔“ اس نے مجھے اسی کھوتر کے ذریعہ ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے میں ہلکا سا حکم تھا۔ شاید یہ حکم اس کے لیے میں اکثر ہی شامل رہتا ہوں۔

میں نہایت سعادت مندی سے بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب آ کر گردن کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھکانے ہوتے ہیں فوراً سے میرا سانس کسے لگی گویا وہ کوئی موحظہ ڈانکڑی تھی اور میں بہرہ کی بننے کی شوقین کوئی لڑکی۔ ڈانکڑی صاحب گویا تنہا کی نظروں سے ہر زاویے سے امیدوار لڑکی کا سانس فرما رہے تھے۔ اگر وہ اگلے درجے کی چیز نہ ہوتی تو میں یہ مثال بھی دے سکتا تھا۔ وہ اپنے کام میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے والے اس کام کی طرح میرا جائزہ لے رہی تھی جس کی دکان میں کوئی کاپی بلی بار واصل ہوا تھا اور وہ جائزہ لے رہا تھا کہ اس کے ہاں کس کس زاویے اور کس کس انداز سے کاٹنا مناسب رہے گا۔

میں کو کہ گیت پر ہی چند سینکڑا میں اس کا خاصا تھیلی جائزہ لے چکا تھا لیکن اب موقع قیمت جانتے ہوئے میں نے مزہ کمری نظر سے کرا جو اب اس کا جائزہ لے ڈالا۔ وہ اسی قسم کی شخصیات میں سے تھی جن کا زیادہ قریب سے تھیلی جائزہ لینا حواس کے لیے ہر آنا کام تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس کے قریب ہوئی۔ اس عمر میں وہ درجہ کی طلاق یافتہ تھی نہ گزرے ہوئے، دو سال لے گیا اس کا کچھ بچہ ڈانکڑی بلکہ سنوارا تھی تھا۔ میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پھر مجھ سے باتیں کیوں مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ پہلے سے زیادہ دلکش پہلے سے زیادہ ہوشیار تھی۔ اس نے ابھی تک اپنا تعارف کرا نے کی زحمت نہیں کی تھی۔ شاید وہ محسوس کرتی ہو کہ اس کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ کم از کم میری حد تک یہ بات درست تھی۔ میں نے کچھ روز پہلے تک بعض رسائل میں اس کی جو تصویریں دیکھی ہوئی تھیں ان کی یاد کے سارے اسے پہچان لیا تھا۔

اب تو میں دوبارہ اس انگلیں میں تھا کہ کیا وہ بھی مجھے پہچانتی تھی؟ مگر اس نے اچانک بلا تہیہ ایک سوال کر کے میری یہ انگلیں دور کر دی۔ سوال یہ تھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“ یہ ظاہر اس سوال کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتی تھی۔

”مفضل چوہدری۔“ میں نے گویا سکون کی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی مسکراہٹ جو چند لمحوں کے لیے غائب ہو گئی تھی ٹوٹ آئی اور وہ قاسمے شیریں لہجے میں بولی ”میں“ آپ صاحب کے شکایت کے ساتھ بات نہیں کروں گی۔ امید ہے تم مجھ سے

سینے رمضان کی باتوں سے قوی انداز ہوا تھا کہ پرس میرا کو آرٹ کی دنیا میں قدم رکھنے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کا اپنا ناشوق تھا لیکن پیشگوئی تھا وہ اس اعتبار سے حیران کن تھی مگر جب میں نے ان پر اپنی ہونے کی نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ اس میں حیرانی کی کچھ ایسی بات نہیں تھی۔ کوئی بھی آرٹ کو شوق رکھتا تو دن میں اس قسم کی آٹھ دس پیشگوئی تو ہمارے کر ہی سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ان کے قریب ہمارے میں اس سے زیادہ وقت لگا ہوا تھا۔ جتنا پیشگوئی ہونے میں لگا ہوا۔ ایک طرف ایک ہی سی پیر ہمت سے برش رنگ لگوئے اور نہ جانے کیا کیا کاٹہ کپاڑا رکھا تھا۔ میں تجریدی آرٹ کا کچھ ایسا تصور داں نہیں تھا لیکن اس کا مخالف بھی نہیں تھا مگر پرس میرا کی پیشگوئی تو تجریدی آرٹ سے بھی کچھ آگے کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔ لگا قیامت سے چوں نے رنگوں میں برش تصویر کر کیوں پر جگہ و بدل کا مظاہرہ کیا تھا۔ صرف ایک ایبل پر لگی ہوئی ایک ناکمل پیشگوئی کچھ سرور کچھ میں آتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی پر زینت تھی۔ غالباً کسی ترک لڑکی کی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی تھی تاہم وہ کوئی پاکستانی قبائلی لڑکی بھی ہو سکتی تھی۔

اس گھر کی ساقب بھی گویا پرس میرا کی ضروریات کے مطابق تھی اور اس میں شاید ایک ہا قاعدہ قسم کے بڑے آرٹ اسٹوڈیو کے تمام لوازمات موجود تھے۔ اس ہاں سے آگے ایک اور طویل و مضبوط ہاں تھا۔ اس میں ہمت سے اسٹینڈر فٹ طرح طرح کے مجسمے موجود تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہیا تک مجسمہ موجود تھا۔ پرس میرا نے غالباً اپنی دانست میں تو انسانوں کے ہی مجسمے بنائے تھے لیکن معلوم یہی ہوا تھا کہ وہ انہائے سیادوں سے ملے آور ہوئے دانی نہ جانے کس کس خلق کی یاد گاریں تھیں۔ ان میں سے کچھ مجسمے مٹی کے تھے۔ کچھ پتھر سے تراشے گئے تھے اور کچھ شاید کوئلے سے۔ پرس غالباً ہر میدان میں طبع آزمائی کر دیتی تھی۔ تاہم ان تمام چیزوں کی منجھکہ فیزی کے باوجود میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس میں مصوری اور مجسمہ سازی کی صلاحیتیں موجود تھیں اور اس میدان میں قدم رکھ کے اس نے غلطی نہیں کی تھی لیکن اسے ہمت اور ماہرین فن سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت تھی جس کی اس سے امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

دوسرے ہاں سے گزر کر ہم ایک نشست گاہ میں پہنچے۔ اس کی آرائش سے بھی میری طرح اٹھارہ ہوا تھا کہ وہ کسی آرٹسٹ کی نشست گاہ تھی۔ فرنیچر جیب ساخت کا تھا۔ روئے مختلف رنگوں کے تھے۔ ایک طرف میز پر ایک کالی زنہ نیم نشست گاہ اور مختلف سائز کے کئی سلاں خود ہر رنگ کے ہوتے تھے۔ لیکن یہ وہ نوادرات میں سے رہے ہوں لیکن انہیں دیکھتے ہی بے اختیار میرا دل چاہا تھا کہ اٹھا کے باہر بیٹھ دوں۔ ایک صوفے کے پیچھے سے ایک اچھا بھلا چھوٹا سا درخت بھی سر کھائے کھڑا تھا۔ اس پر ایک

کچھ میں نہیں آیا تھا کہ یہاں آئے ہی میرا کس قسم کا اعتراف  
شروع ہو گیا تھا۔ مجھے اس کے ذہنی توازن کے بارے میں کچھ شبہ سا  
ہوئے گا تھا ملاں کہ اس کی آنکھوں میں اس قسم کی کوئی ہمیں سی  
علامت بھی سوجھ نہیں تھی۔

پھر میں نے اٹھنے کے لیے پرتو لیے ہوئے کہا مہمیں کچھ میں  
نہیں آیا کہ یہ کس قسم کے سوالات ہیں۔

اس نے بے تابی سے مجھے پہنچتے رہنے کا اشارہ کیا اور خود  
سامنے ہی ایک گاڑی پر چم راز ہو گئی۔ آپ اس کے خود غافل کچھ  
اور بھی قیامت ڈھانے لگے لیکن اس کی پیشانی پر ناکواری کی بجلی  
سی شکستیں ابھرتی تھیں۔ وہ مجھے لمبے میں ہولی سوالات جو بھی  
پرس اور جیسے بھی ہیں، جنہیں ان کے جوابات دیتے ہوں گے۔ اگر  
نہیں یہ سوالات ناکوار گزریں تو تم جا سکتے ہو۔ تم پر کوئی پابندی  
نہیں ہے۔ اس نے دودھ دانے کی طرف اشارہ کیا جو ملائی تھا۔  
جنس نے مجھے مجبور کیا کہ وہ جو بھی کھیل کھیل رہی تھی میں  
اس میں اس کا ساتھ دوں بھی میری کچھ میں آسکا تھا کہ یہ کیا پھر  
تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ سیدھے سادے طریقے سے وہ میرے  
سوالوں کا جواب دے گی۔ سوال کرنے کا اختیار دینا صرف اپنے  
ی پاس رکھنا چاہتی تھی۔

میں نے اپنے لمبے کو خوش کو ادا کرتے ہوئے کہا مگر آپ  
میری صحت کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ ہے تو مجھے  
موقع دیجئے۔ میں کل اپنا بیٹھ سرٹیکٹ لاکر پیش کھوں گا۔  
”سرٹیکٹوں کا کیا ہے وہ تو جعلی ہیں جن جاتے ہیں۔ ٹی بی کے  
مریض بحرین صحت کا سرٹیکٹ لے کر ملک سے باہر چلے جاتے  
ہیں اور وہاں ملازمت کرنے لگتے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے ہولی  
میں سرٹیکٹوں پر تعین نہیں رکھتی۔

”جو پھر کسی قسم کے عملی مظاہرے کا حکم دیجئے۔“ میں نے پُر  
اشتیاق لمبے میں کہا اور سامنے بڑی بے ہوشی چولی پٹائی کی طرف  
اشارہ کیا مگر اسے ایک گونے میں ہی توڑ کر دکھا دیں۔

”میں طاقت کا ایسا منگا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ  
پٹائی چالیس پچاس ہزار روپے کی ہے۔ مگر اسے امپورٹ کی گئی  
ہے۔“ وہ طاقت سے ہولی۔

مجھے معلوم تھا کہ وہاں موجود بہت سی چیزیں جو دیکھنے میں ذرا  
بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں اس سے بھی زیادہ مہنگی ہوں گی۔  
بعض دولت مندوں کو ایسی چیزوں پر بھی پیسے خرچ کرنے کا شوق  
ہوتا ہے جن کے سمجھنے والے کی دھڑات یوں ہی فضول سی ہوتی  
ہیں۔

میں نے ابو عمر کو دیکھا تو ایک ٹیلی فون زانی پر مجھے تیس بار  
صوتی موبائل ڈائریکٹریاں دکھی نظر آئیں۔ میں نے ان کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا ”یہاں شاید سب سے سستی ڈی  
میں سے کسی بھی ڈائریکٹری کو دونوں ہاتھوں

میں تم بھی چاہو تو مجھے تم کو کہہ کر طلب کر سکتے ہو۔ میں ہر گز برا  
نہیں مانتا ہوں۔“

صحت بخیر۔ میں نے اپنے چہرے سے خوشی کا اظہار کرنے  
کی کوشش کی۔

”تمہاری عمر کتنی ہے؟“ اس نے دوسرا سوال کیا۔  
”پاکل کچ تو مجھے معلوم نہیں۔ اندازاً تیس سال ہوگی۔“

میں نے جواب دیا۔  
”میرا بھی یہی اندازہ تھا۔“ اس نے طمانیت سے سر ہلایا پھر

پوچھا ”غیر شادی شدہ ہو؟“  
میں نے اقرار کر دیا۔

”یعنی تمہاری کبھی شادی طلاق، معنی وغیرہ نہیں ہوئی؟“ اس  
نے گویا مزید وضاحت چاہی۔

”نہیں۔ میں ابھی تک ان خرافات کے قریب نہیں  
پڑا۔“ میں نے جواب دیا۔

”صحت ہے تم ابھی تک شادی سے کیسے بچے ہوئے  
ہو۔“ اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے شادی کوئی بھوت کی  
بتا رہی تھی اور اس طلاق میں عمر دروازے پہنچی ہوئی تھی۔

”جس۔“ کچھ اتفاقات ایسے رہے کہ شادی نہیں ہو سکی۔  
”یہ کچھ میں نہیں آتا کہ اسے اپنی خوش قسمتی کون یا  
رہتی۔“ میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔

”کی اللہ تو اسے خوش قسمتی ہی سمجھو۔“ وہ ہم سے لمبے میں  
دلی پھر ایک لمبے کے وقفے سے اس نے پوچھا ”تمہیں معلوم ہے  
کہ تم ایک اچھے خاندان سے پیدا ہو چکے ہو؟“

”نہیں میں ماہیجے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کسی نے مجھے  
ایسی نہیں سمجھی۔“ میں نے متنبہانہ لمبے میں کہا ”وہیے آپ خود  
اسے اپنی ہی گویا سونے سے پتھر ہیں۔“

اپنی طرف سے کچھ بھی اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی اثر نہیں  
ہوا۔ اس نے یقیناً زندگی میں بے تحاشا اپنی غریبیاں سنی ہوں گی۔  
وہ کہ طرف الٹا جتن ہے کہ جسے سننے سے میں ترانوں کا کبھی مل  
میں بھرا لیکن شاید اس کا میرا کیا تھا وہ ظاہر ہی کرنا چاہتی تھی۔

”ویسے۔“ تم بالکل ٹھیک تھا کہ وہ ۲۰۰۰ اس نے پُر خیال  
ہے۔ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک تھا کہ۔“ میں نے حیرت سے چلیں جھپکا نہیں  
یا مطلب؟

مطلب یہ کہ دیکھنے میں تو بالکل صحت مند اور مضبوط لگ  
ہے۔ حقیقت میں بھی ایسے ہی ہو؟ میرا مطلب ہے جنہیں  
بیماری وغیرہ لاحق نہیں ہے۔

”جیسا کہ مجھے یاد ہے۔“ مجھے زندگی میں وہ چار مرتبہ سرور  
ایک مرتبہ ہونے کی بات تھی کہ اسے وہ سے بخار کے سوا کچھ  
نہیں تھا۔ میں نے قدم سے کچھ سے اس کی طرف دیکھا۔ میری

میں نے ابو عمر کو دیکھا تو ایک ٹیلی فون زانی پر مجھے تیس بار  
صوتی موبائل ڈائریکٹریاں دکھی نظر آئیں۔ میں نے ان کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا ”یہاں شاید سب سے سستی ڈی  
میں سے کسی بھی ڈائریکٹری کو دونوں ہاتھوں

میں نے ابو عمر کو دیکھا تو ایک ٹیلی فون زانی پر مجھے تیس بار  
صوتی موبائل ڈائریکٹریاں دکھی نظر آئیں۔ میں نے ان کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا ”یہاں شاید سب سے سستی ڈی  
میں سے کسی بھی ڈائریکٹری کو دونوں ہاتھوں

میں نے ابو عمر کو دیکھا تو ایک ٹیلی فون زانی پر مجھے تیس بار  
صوتی موبائل ڈائریکٹریاں دکھی نظر آئیں۔ میں نے ان کی طرف اشارہ  
کرتے ہوئے کہا ”یہاں شاید سب سے سستی ڈی  
میں سے کسی بھی ڈائریکٹری کو دونوں ہاتھوں

کھڑے کر کے دکھائیں؟

سے تیار ہو کر آئے ہیں۔

میں اندر ہی اندر کراہ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو اسی امتحان جواز سے مطمئن کر لیا تو جس لمحے اچھٹے تھا۔ دو بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”جسم نے ٹھیکے، گزرائے یا بھلی اور دنیا حاصل کرنے کی کوئی اٹل نہیں کی۔ ہر حال۔ یہ تو جسیں اندازہ ہی ہو گا کہ اگر ان حرکتیں تیار یہ حال ہے تو ہمارا مستقبل روشن ہونے کا امکان کیا ذرا کم ہی ہے۔ کیا خیال ہے؟“

”مستقبل تو جیسی انسانوں کا ایک جیسا ہوتا ہے۔“ میں نے بہ پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”یہ بات تو میں نے آج ہی مرتبہ ہی ہے۔“ وہ قدرے حیرت سے بولی ”جب انسانوں کا مستقبل بلا ایک جیسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بھیکس نا۔ ہر انسان پر اہم ہے۔ زندگی میں نہ جاسا کیا کچھ کرنا ہے لیکن انجام کا رزق مرنے جانا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اپنی مختصری زندگی میں کیا کرنا ہے۔ انجام تو سب کا ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔“ میں نے قہقہہ لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے تم اپنی اس زندگی سے مطمئن ہو؟ تم کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے؟ مستقبل کے بارے میں تمہارے کچھ حرام نہیں ہیں؟“

”کیوں نہیں ہیں۔۔۔ میں نے مکرراتے ہوئے کہا ”میں بھی زمین پر اپنی بہت سی جائداد اور بیگم میں بہت سی دولت چھوڑ کر مرنا چاہتا ہوں۔ یہ آج کے دور کے ہر انسان کا خواب ہے۔“

”تم کچھ قوی انسان معلوم ہوتے ہو۔“ وہ انھیں سید کر کر کر کر ایک نئے زاویہ نظر سے بڑبڑاتے ہوئے بولی ”میں دانا میں جو تکلیف اور دشواریاں اٹھانی ہوں گی شاید ان کی وجہ سے دنیا کے بارے میں تمہارا دینہ رہے اور تمہیں دنیا والوں سے بہت سی شکایات ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے زور دے لہجے میں کہا ”میں تو بڑا خوش مزاج آدمی ہوں۔ مجھے دنیا سے کوئی عادت نہیں۔ بلکہ میں محسوس ہے دنیا والوں کو مجھ سے بہت سی شکایات ہوں۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا میں نے خیر ناک میں دم کیا ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ اس نے گورنمنٹ کی سانس لی لیکن دوسرا ہی لمحے اس کے چہرے پر تعجب کی ایک نئی لہر بھری ”کیسے؟ سیاسی قسم کے آدمی تو نہیں؟“ کو سیاسی پارٹی کے درکار تو نہیں ہو؟“

”میں۔۔۔ اور سیاسی ورک۔“ میں نے تکلیف کے ساتھ عالم میں ہلکا سا قہقہہ لگایا ”میں اٹھانے والی باتیں کرتا ہوں۔ ہمارے پاس آج تک جس قسم کی بہت سی گئی ہے اور اس۔۔۔ اس ملک کا جو مشترک ہے ان کے مجھے سیاست سے نفرت ہے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولی ”تم سے تمہاری صحت کے بارے میں سوال کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تم بھلائی کے ساتھ ہرے شروع کرو۔ یہ بتاؤ تمہارا ذہن، معاش کیا ہے؟ گزراؤ اوقات کے لیے کیا کرتے ہو؟“

اس انداز سے اب میں کچھ محفوظ ہونے لگا تھا۔ اگلے سیدھے جواب دینے میں کچھ لطف آنے لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے اسے اپنی اصل حیثیت کے بارے میں بتا دیا تو یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے گا اور میں شاید اس کا اصل مقصد نہیں جان سکوں گا۔ اس لیے میں نے کچھ دیر اور دوسرا دھر کر ہانکنے کا فیصلہ کیا۔

”میں ظلموں میں اسٹنٹ مین ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”کبھی کبھی ظلموں میں ہیرو کے ڈبلی کیٹ کے طور پر بھی کام کرتا ہوں اور اس کے حصے کے خطرناک کام انجام دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ ظلموں میں جو مشکل مشکل سین نظر آتے ہیں اور انوکھی حرکتیں دکھائی جاتی ہیں ان کے پیچھے اکثر مجھ جیسے لوگوں کا ہاتھ ہی ہوتا ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کراچی میں ظلمیں بہت کم بنی ہیں اور میرے حالات مجھے لاہور جانے کی اجازت نہیں دیتے اس لیے سال میں ایک دو مرتبہ ہی کام کرتا ہے۔“

وہ سہلے ہوئے مہیا نہ انداز میں مسکرائی ”میں سمجھ گیا۔ تم دراصل یہ کتنا چاہتے ہو کہ زیادہ تر تم بے روزگار رہتے ہو۔“ اس کی آنکھوں میں خفیت سی ہو رہی تھی جھلک آئی ”اور تم رہتے کہاں ہو افضل؟“

”زیادہ تر کسی پبلک پارک میں ہی ڈیرا لگا ہوں۔ جہاں کوئی بچہ خالی مل جائے اور پولیس والے ٹک نہ کریں وہاں رات گزر جاتی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ان دنوں زیادہ صفحہ نہیں ہے اس لیے زیادہ پشانی نہیں ہوتی۔“

اس نے طبیسی انداز میں سر ہلایا اور چند سیکنڈ کے لیے کچھ نہ بولی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی حالانکہ وہ ذہن پر زور دینے کی عادی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ مجھے تو اس نے میرے جھوٹ کو آسانی سے ہضم کر لیا تھا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کئی ہزار کا تو میں نے سوٹ پہن رکھا تھا اور میری شخصیت میں کیس بھی وہ ایک خاص قسم کا کلا لپٹ نظر نہیں آتا تھا جو پارک کی بچوں پر سوتے والوں کی نشانی بن جاتا ہے کیا میں کسی ایسے پارک کی بچہ پر سوتا تھا جہاں گھر کی سی تمام سہولیات میری تھیں؟ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس نے فرض کر لیا ہو کہ آج کے اس موقع کے لیے میں خاص طور پر بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آیا تھا۔

”مجھے تمہاری یہ راست گوئی پسند آئی افضل۔ تم بے شک بے ہوا پارکوں میں بچوں پر سوتے ہو لیکن تمہاری شخصیت میں تو ہے۔ تم اس موقع پر کسی امیر کبیر آدمی کی طرح اہتمام

ہے میرے بس میں ہو تو کم از کم سو سال کے لیے سیاست پر پابندی لگا دوں اور اس دوران میں صرف "حکیم" معاشی ترقی اور جذبہ انسانیت کو فروغ دینے کے لیے کچھ ہنگامی اور انقلابی اقدامات کرے۔ اگر سو سال بعد کچھ ماہرین یہ محسوس کریں کہ لوگ سیاست جیسے خطرناک کھلونے سے کھیلنے کے قابل ہو گئے ہیں تو میرے کھلونان کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔"

"بیزر۔ بیزر۔" اس نے کلی بجاتے ہوئے کچھ استہزائیہ سے انداز میں کہا "وہی تو تم کہہ رہے ہو کہ ہمیں سیاست سے نفرت ہے لیکن تم نے پھر ہی وہی یہ تقریر کی ہے یہ خود اپنی ایک خاص سیاسی ہے۔"

"مفتی صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں تقریریں صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کی جاتی ہیں لیکن میں جو کچھ کہ رہا ہوں سچے سچے ہے کہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ پُر خیال انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جو کچھ اس کی تھی اس نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا یا نہیں۔ ویسے میری کوشش یہی تھی کہ اس وقت میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جسے سن کر وہ مجھے سے اگڑ جائے مگر اس سلسلے میں میں نے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے سوالوں کے جواب میں کیا شہنا چاہتی تھی اور کیا نہیں؟ بہر حال اس کے چہرے پر بے اطمینانی نہیں تھی۔

"تو کبھی گرفتار تو نہیں ہوئے؟" اچانک اس نے اگلا سوال کیا۔ "کبھی کسی چکر میں ہمیں حالات یا جیل کی ہوا تو نہیں لگانی پڑی؟"

میں نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر وہی تکلیف کے آثار پیدا کیے اور بھونچے سے لہجے میں کہا "خاتون! میں بے گھر اور غریب تو ہی ضرور ہوں لیکن ایسا بھی غیر معزز نہیں ہوں کہ پچیس بجے پکٹلی پکڑے اور مجھے جیل یا حالات کی سیر کرنی پڑے۔"

"اچھا۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔" اس نے ضمانت سے سر ہلایا "تمہارا طبع اور شخصیت بتاتی ہے کہ جب تم بڑے حال میں بھی ہوتے ہو گئے تب بھی غیر معزز نہیں لگتے ہو گے۔ یہ تاؤ۔ تم مستقل طور پر ایسی رہتے ہو؟" وہ گویا سوچ سوچ کر اس حساب سے سوال کر رہی تھی کہ میری شخصیت کے بارے میں کوئی بات جاننے سے نہ نہ جائے۔

"جی ہاں۔ میں ہمیشہ یہی رہتا ہوں۔ لیکن حالات بہتر ہونے کی امید ہو تو کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔" میں نے اپنی دانست میں تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی۔

"ہوں۔" اس نے ہٹکارا بھرا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے قریبی پائی پر سے غیر ملکی سگریٹ کا ایک پتلا اور لہا سا پکٹ اٹھا۔ "غیر ملک میں" میں نے نوکیں کو اکڑا کر سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔

میں اگر سگریٹ پیوں تو ہمیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر بوٹوں میں دھانے سے پہلے شائع سے پوچھا۔

"میں کون ہونا ہوں گی اعتراض کرنے والا۔" میں نے اگلا سی سے کہا "سگریٹ بھی آپ کی اپنی ہے ہونٹ بھی آپ کے اپنے ہیں اور بھینٹے بھی بلا شرکت میرے آپ کی اپنی طبیعت ہیں۔ آپ جس طرح بھی انہیں نقصان پہنچانا پسند کریں پہنچا سکتی ہیں۔"

"اے۔" وہ سگریٹ "تمہارا یہ انداز کھنگھٹاتا ہے کہ سگریٹ میں پیچھے۔"

"غریب تو ہی ہوں خاتون! جتنی تم سے کم چھڑیں سگریٹ میرے حق میں ان کا ہی اچھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"صحت خوب۔ تم دلچسپ تو ہی ہو۔ معلوم نہیں کہیں ہمیں غریب حکیم کرنے کوئی نہیں چاہتا۔ بہر حال۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک بار پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ دھوئیں کے مرغولوں کے پیچھے اس کا سوچ میں ڈوبا چہرہ اور دھول دکھائی دینے لگا۔ وہ گویا کسی چیلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر وہ شاید "بات برائے بات" کے خیال سے بولی "بھئی لوگوں کو لڑکیوں کا سگریٹ پٹا اچھا نہیں لگتا۔"

"مجھے تو سبوں کا بھی سگریٹ پٹا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن یہ بات میں ان کے منہ پر نہیں کہتا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی بھی ایسی بات نہ کہوں جس سے کسی کی دل آزاری کا معمولی سا امکان بھی ہو۔ ویسے میں بھی کبھی کبھار عقل میں خود بھی سگریٹ دھینو بی لگتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ "دھینو" سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"میں۔۔۔ جاننے دیجئے۔" میں نے گویا قدرے شرار سے جھانکایا۔

"غنیہ۔" اس نے صدم سے لہجے میں صرف اس کا اور ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس بار وہ کچھ زیادہ ہی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی نظر کو کہ اب بھی مجھ پر تھی لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کا ذہن کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔ کہ کہ میرے دل میں سخت کھد بھری تھی۔ جنس سے میرا برا حال تھا اور میرا فوری طور پر جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ کس چکر میں تھی لیکن میں اس کا جنس کو دبانے نہایت صبور احتیاط سے بجا رہا۔ اسے چہرے میں لے کر ہی الامکان سادگی اور مصروفیت طاری کیے رکھی۔ پھر اندازہ تھا کہ اس وقت مجھے اسی کی ضرورت تھی۔ میں اس کے چہرے پر کسی گہرے غم کی پیمائشوں کو دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کن منکھرات میں گہری ہوئی تھی۔ وہ کچھ



تساری ضرورت ہے اس کے لیے موزوں اور قابل احمد آدمی تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ ملاح کہ کام بہت آسان اور دھن ہے۔

”آخر وہ کون سا کام ہے؟“ میں نے سادگی سے دریافت کیا۔  
اسے شاید میری سادگی پسند نہیں آئی۔ اس کی غریب صورت چشتانی پر ایک بار پھر شکستیں ابھر آئیں، ”کیا تمہیں واقعی معلوم نہیں؟“ غصے کی صورت حال سے لطف اندوز ہونے کے لیے انہماں بننے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”مجھے واقعی معلوم نہیں۔“ میں نے اپنی سادگی پر قرار رکھی۔  
”تو حیرتمند چل کر مالا تک کیوں آئے ہو؟“ اس نے آنکھیں

کھینچی۔  
”بس۔۔۔ میں آگیا ہوں۔“ میں ابھی مصلحتاً اپنی آمد کا اصل مقصد واضح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ”آپ یوں کچھ نیچے کر میں آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ اب بتا دیجئے تاکہ دس لاکھ روپے حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“  
”تمہیں صرف مجھ سے شادی کرنا ہوگی۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔

میرے رگ و پے میں سستی کی لہر دوڑی لیکن میں نے دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو سمجھا ”یہ خود ارادِ اصل آزاد و ریشہ مندی ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہلے اس پکار کو بجھنے کی کوشش کرو۔“

وہ بے پناہ دولت مند ہے۔ حسین اور جوان آدمی۔ وہ مرتبہ کی طلاق یافتہ ہونے کے باوجود اگر وہ شخص سرسری طور پر اس خواہش کا کہیں اظہار کر دیتی کہ وہ شادی کرنا چاہتی تھی تو شاید مجھے سے اچھے امیدوار قطار در قطار چلے آتے۔ اسے ایک ایسے شخص کو شادی کے لیے دس لاکھ روپوں کی پیشکش کرنے کی کیا ضرورت تھی جسے وہ مطلق اور تلاش کچھ رہی تھی؟ میں اپنے بارے میں اتنی زیادہ خوش تھی میں تو جانتی ہوں کہ تمہیں ہوسکا تھا کہ مجھ میں کوئی سرخاب نہ پکڑا ہو تھا۔ اگر اس کا چوتھا تھا تو وہ ذاتی ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ اس نے یہ بات پوری جھجکی سے کہی تھی۔  
میں نے تھوکر گل کر زوراً بدحواس نظر آنے کی اداکاری کی اور ایک ایک کر کے ”کیسے۔۔۔ میڈم۔۔۔ امیں۔۔۔“

وہ بھی بات کانٹے ہوئے بولی ”میرا تو خیال تھا کہ تم سوچ کچھ کر رہی ہو آئے ہو گے اس کے باوجود اگر تم انہماں میں پڑ گئے ہو تو فوری جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم مزید سوچ بچار کے لیے وقت لے سکتے ہو۔ میں تمہیں کچھ ملت دے سکتی ہوں۔“

”کتنی ملت؟“ میں نے دریافت کیا۔  
”کھانا دو کھانا سوچ لو۔“ اس نے انہماں سے جواب دیا۔  
”کھانا۔۔۔ دو کھانا۔۔۔“ میں ملی ملی میں استہزا سے انداز

دہانہ دولت کی مالک تھی لیکن شاید دولت بھی اس کے مسائل حل نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی بچہ نہیں تھا کہ دولت ہی اپنے ساتھ مسائل لے کر آتی ہو۔ اس کے دونوں شہروں نے اسے صرف طلاق ہی نہیں دی تھی بلکہ اس کے ساتھ بہت سی دولت و جائیداد بھی دی تھی۔ پھر وہ لہر لعل اس کا باپ اپنی دو بیٹیوں کے نام پر خانے، گنپانیاں، پچھلے اور چنگ پیش و دیو چھوڑ کر مر گیا تھا۔ اس کے بارے میں جس کسی کو بھی یہ باتیں معلوم ہوتی وہ اس پر شک کی کر سکتا تھا لیکن میرے خیال میں یہ بات زیادہ قابل غور تھی کہ یہ سب کچھ میرے ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر ٹھکرات کی پراچھائیاں تھیں۔ وہ اندری اندر کسی زبردست تکلیف میں مبتلا تھی۔

پھر اچانک ہی وہ گویا کسی فیصلے پر پہنچی تھی۔ اس کا ذہن سوچ کے بین صحرائوں میں بھٹک رہا تھا وہاں سے لوٹ آیا۔ وہ کاؤچ پر اٹھ بیٹھی۔ اس کا اٹھنا اس کے نیم درواز ہونے سے بھی زیادہ صبر آزما تھا۔ سکرٹ اس نے اٹل ٹرے میں مسل دی اور اعلان کیا ”مفضلہ! بھراؤں کہ رہا ہے کہ میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ میں عہد کر رہی ہوں کہ تم ایک قابل احمد آدمی ہو۔“

”جے شک۔“ میں نے غلوں سے کہا ”تم سے لوگوں کا بہرے بارے میں یہی خیال ہے اور میں ان کے خیال سے متفق ہوں۔“

”جیسا۔۔۔ یہ بتاؤ کہ خاصی بڑی رقم کمانے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے جانتا ہوا۔ اس کے دھن دھن ہونٹوں پر سکرٹ لٹ آئی تھی۔  
”آپ کتنی بڑی رقم کی بات کر رہی ہیں؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”دس لاکھ روپے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ اس نے بھری آنکھوں میں جھانکا۔  
”میں کی مرتبہ اتنی رقم کا خواب دیکھ چکا ہوں۔“ میں نے کچھ اس طرح کہا کہ میرے خیال میں وہ مجھ سے ملحق کر رہی تھی اور مجھ اس کا یہ لائق اچھا نہیں لگا تھا۔

”تمہارا یہ خواب اب حقیقت میں داخل ہو سکتا ہے۔“ اس کی ٹھہراہٹ کو دھن دھن ہونٹوں سے دیکھی۔

”اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کسی کی پائی کٹی ہوئی یا کسی اٹھا کر لانا ہوگا؟“ میں آپ کی اس طرح کی کسی فرمائش سے پہلے بتا دیا کہ میں اپنی تمام تر منظورِ طلاق ”توانہ کر دی اور خانہ“ کے باوجود ایک شرط کر رہی ہوں۔ میں نے بھی اس قسم کے ”میں نے نہ واضح کیا۔“

”اس قسم کے بے ہودہ کام کرنے کے لیے تمہیں کون کہہ رہا ہے؟“ وہ دستور سکرٹاتے ہوئے بولی ”اس قسم کے کاموں کے لیے یہی بہت آسان سے مل جاتے ہیں لیکن مجھے جس کام کے لیے

میں کچھ یوں ہے۔

اس نے میرے لیے کی تہہ پہلی زرا بھی قوج نہیں دی اور ڈا  
اسے میرا قصہ سننے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بات کا  
ہوئے ہوں مگر یہاں تک کہ ہو قلا ہر ہے کچھ سوچ کر ہی  
ہو گے آپ کیا تم کچھ غصے دکھانے کا ارادہ کر رہے ہو؟

جواب کا انتظار کچھ بغیر اس نے بات جاری رکھی۔

زناہ ابھمن، گریا پریشانی میں بڑے کی ضرورت نہیں۔ یہ ڈ

زناہ عرصے کے لیے نہیں ہوگی۔ صرف ایک یا دو بیچے کی بات

یعنی شادی صرف سینے دو سینے کے لیے ہوگی۔ اس کے بعد

طلاق دے دیا۔ اگر تم نے نہ دی تو میں خودی لے لوں گی کچھ

صورت میں تمہیں وہیں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ہو سکا

تساری تھوڑی بہت پٹائی بھی ہو جائے۔ لیکن اگر تم میرا

پر خاموشی اور شرافت سے مجھے طلاق دے دو گے تو جسیں دار

دے دیں گے۔ میں لیکن ہے کہ میں خوش ہو کر لوں گا

جس میں کچھ اور رقم بھی دے دوں۔ تم اپنے بچے سے کی تو

طرف لوٹ جانا اور مزے کرنا۔ اگر دس لاکھ کی رقم کو تم

بھی سلیپ سے استعمال کیا تو تساری زندگی سنو سکتی ہے۔ تم

اسے بیش و محنت میں بھی اڑا سکتے ہو۔ یہ تساری مرغی

ہے۔ وہ ہر حال تساری رقم ہوگی۔

”آپ کی اس فیاضانہ پیشکش کا بہت شکریہ۔“ آقا

نے فیصلہ کن انداز میں اٹھتے ہوئے کہا ”جی بات تو یہ ہے

پیشکش پر ہمارا بے ایمان ہونا ہے لیکن مجھے یہ ظہر

چراغی نظر نہیں آ رہی۔ آگے چل کر ضرور کوئی بد مزگی ہوگی

میرے خیال میں آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ میں سب

تو میرے ذہن میں کہیں دور دور تک شادی کا ارادہ نہیں

یہاں کسی اور کام سے آیا تھا۔“

”کسی اور کام سے۔۔۔؟ اس کی آنکھیں کچھ کی

کھلیا جس میں بارہ نے میرے پاس نہیں بھیجا؟“

”کوئی ماریہ؟“ میں نے لائٹ سے پوچھا۔ جہاں کی

پڑا تھا میں اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا تھا۔

”ماریہ صبح کو سٹل، ولی ماریہ۔“ اس نے جواب

افسوس کہ میں اس نام کے کسی ادارے سے

نہیں۔ ماریہ صبح کو سٹل۔۔۔ غلطیہ کوئی صبح ہو

نے تصدیق دے دی۔

اس نے انہماک میں سر ہلا دیا۔ کچھ بول نہیں سکی۔

پہلی پہلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں

لائٹ سے کہا ”شادی کے سلیپ میں ابھی مجھے شادی

اداروں کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں پڑی اور جہاں

آپ کو تو خواب و خیال میں بھی اپنے کسی ادارے

مامل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آ سکتی۔ آپ

میں سوچے بغیر نہ سکا۔ اپنی شادی خود میرے لیے ایسا مسئلہ بنی  
ہوئی تھی جسے میں کسی برس سے حل نہیں کر سکا تھا اور وہ مجھے کہتے  
دے دیتے میں فیصلے پر پہنچنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ صرف یہی نہیں  
اس نے کچھ اس طرح حریفی نظروں سے میری طرف دیکھا  
شروع کرنا تھا جسے میں فیصلے پر پہنچنے میں کہتا وہ کہتا بھی نہیں  
تاکڑ کا لگا۔ ایک تودہ منٹ میں ہی اسے جواب سے مطلع کر دیا  
گا۔

”یہ تو تائیں آپ مجھ پر یہ سوائی کیوں فرما رہی ہیں؟“ میں نے

پوچھا۔

”میں نے کہا تھا کہ میرا دل کہہ رہا ہے تم بھروسے کے قابل

ہو۔ کسی نازک معاملے میں تم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ عورتوں میں

اس قسم کی باتوں کا اندازہ کرنے کی ایک خاص جس موجود ہوتی

ہے۔“

میں نے کسی عورتوں کو کسی نہ کسی موقع پر یہی کہتے سنا تھا اور

میرے خیال میں یہ محض ان کی خوش فہمی ہوتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا

تھا میں نے سال بڑھ بڑھ سال پہلے جس انگریزی رسالے میں اس کی

رہنمائی تصویریں دیکھی تھیں ان کے ساتھ انگریزوں میں لکھا تھا کہ وہ

مخت موزی، مندی اور کسی حد تک سخی لڑکی تھی۔ انگریزوں بھی غالباً

کسی خاتون نے ہی لیا تھا اور وہ شاید انگریزی کی کوئی کنڈہ مشین سوائی

تھی۔ اس نے انگریزوں میں سوال دیا آپ کے ساتھ ساتھ جا سجا

نہایت دیانت دارانہ انداز میں اس کے بارے میں اپنی رائے کا

اظہار بھی کیا تھا۔ اس کے بارے میں میں نے دوسرے جو دو تین

انگریز اور غیر بڑے تھے ان میں زیادہ تر خوشامد نہ رنگ ہی جھلکتا

محسوس ہوا تھا لیکن اس تحصیل انگریزوں کو میں نے خاصا لکھا اور

دیانت دارانہ محسوس کیا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی کئی باتیں مجھے

یاد رہ گئی تھیں۔

میں کئی باتوں کی روشنی میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ وہ واقعی کسی

نہ کسی حد تک سخی ضرور تھی۔ اس کے دماغ کا کوئی پڑا اپنی جگہ

سے کھٹکا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر بڑے غور سے میرا جائزہ لے رہی

تھی۔ آنکھیں اس کی خوب صورتی کا سب سے اہم جزو تھیں۔ اگر

اس کے صفات میں شاعر بھی شامل رہے ہوتے تو شاید وہ سب سے

زیادہ فزولیں اور تھیں اس کی آنکھوں کی ہی شان میں کہتے ایک

لمبے کے لیے تو میرا اس کی پیشکش قبول کرنے کو بھی جانا پھر میں نے

اپنے آپ کو سمجھا یا کہ میں وہاں اس کام کے لیے نہیں آیا تھا۔

میرے خیال میں اب بہت ہو چکی تھی۔ وہ کسی تکلیف خیز میں

جلا تھی یا پھر مذاق کر رہی تھی اصل بات خراہ کچھ بھی رہی ہو لیکن

میں کافی حد تک اس کا ساتھ دے چکا تھا۔ اب مجھے اس سلیپ کو

ختم کر دینا چاہیے تھا اور اس کا تہہ عمل دیکھنا چاہیے تھا۔

”دیکھیے پرنس سیرا۔۔۔ میں نے تمکار کر رکھا صاف

کرتے ہوئے زرا بے ہوئے لیے میں بات شروع کی حقہ اصل

اشارے پر امید اداوں کی لائن لگ سکتی ہے۔  
 "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مسئلہ کچھ اور تھا۔" وہ ابھمن  
 آہستہ سے بچے میں بولی۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پاری تھی کہ اس  
 موضوع پر مجھ سے بات کہے یا نہیں۔ پھر گویا وہ غیر ارادی سے  
 انداز میں بولی "میری مین کو نسل کی مانگن اریہ میری تھوڑی بہت  
 جاننے والی ہے۔ پہلے تو اس نے میری ہدایت پر اخبار میں اشتہار  
 بھی دیا تھا کہ ایک خوب صورت کدو بچی عورت کے لیے مناسب  
 رشتے کی ضرورت ہے۔ کوئی شرط نہیں۔ مناسب مالی امداد کی  
 جائے گی، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے جواب  
 میں بہت کم لوگوں نے رابطہ کیا۔ اور جنہوں نے کیا وہ بھی  
 نہایت ہی بے ہودہ قسم کی شخصیات کے مالک تھے۔ اس سے بھی  
 زیادہ بے ہودہ ان کے بیکس سحر تھے۔ بارہ بار تجوں والے بھی چلے  
 آ رہے تھے۔ ماریہ نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس اشتہار کے  
 جواب میں زیادہ لوگ رابطہ نہیں کریں گے کیوں کہ اب لوگوں نے  
 اس قسم کے اشتہادوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔"  
 "کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس بار اشتہار صحیح ایک حسین  
 کدو بچی خانوں نے دلویا ہو گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 اس نے مسکراتے ہوئے مسئلہ کا کام جوڑا "ماریہ نے تو اشتہار  
 بھی امداد اخبار میں دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ امداد اخبار سے تو پھر  
 بھی کچھ رسپانس مل جائے گا۔" انگریزی اخبار سے بالکل نہیں ملے  
 گا۔ بہت سے آدمیوں نے اس قسم کے اشتہادوں کے ذریعے دنیا  
 بڑھنے کو کا دیا رہا رکھا ہے۔ ہر حال جب اس طرح مسئلہ حل  
 نہیں ہوا تو ماریہ نے اخبار میں الگ سے ایک اشتہار چھپوایا۔ یہ  
 اشتہار تو صریح ہمدردی کی طرف سے تھا اور نہ ہی اس میں ضرورت  
 رشتہ کا حوالہ دیا گیا تھا۔ امید اداوں کو صرف فون پر رابطہ کرنے کی  
 ہدایت کی گئی تھی۔ ماریہ نے کہا تھا کہ وہ کوئی موزوں امیدوار خود  
 ہی منتخب کر کے میرے پاس بھیج دے گی۔ چنانچہ کچھ دیر پہلے اس  
 کا فون آیا تھا کہ وہ ایک شخص کو میرے پاس بھیج رہی ہے جس سے  
 اس کی بات ہوئی ہے اور وہ اسے موزوں امیدوار معلوم ہوا ہے۔  
 میں سمجھی تھری شخص ہو۔"  
 "لیکن آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت کیوں پیش  
 آتی ہے؟" میری ابھمن ایک بار پھر لفظوں کی صورت میں میرے  
 ہونٹوں پر آئی۔  
 "میرا ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ میں فی الحال اس پر تم سے بات  
 نہیں کر سکتی۔" اس کے لیے میں ابھی سیڑھی پر اٹھتی آئی۔  
 "اس سے تو اچھا تھا میں امیدوار ہی بنا رہا اور دیکھتا کہ بات  
 کہاں تک پہنچتی ہے۔" میں نے لفظی سامنے لے کر کہا۔  
 اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن وہ  
 فوراً منجمد ہوئے ہوئے بولی "خیر سب بات کو تو چھوڑو۔ یہ  
 تاؤ تم کس مسئلے میں میرے پاس آئے تھے؟"

میں آپ سے کوئل جان کر لڑائی کے بارے میں بات کر  
 گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔  
 "کیا کام ہے؟" وہ چونکے ہوئے ذرا حیرت سے بولی۔  
 "نام نہ ہوا تو وہ بولی "یہ کیا ہے؟"  
 "یہ جج نہیں۔ ایک شخص کا نام ہے۔ اسے آپ  
 کلاٹ سمجھ سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔  
 "کلاٹ؟" اس کی آنکھیں بکھر گئیں اور پچھل گئیں۔  
 "ہاں۔ مجھے آپ ایک دیکھ سکتے ہیں۔ بوقت شہادت  
 خدا کی فوج دار بھی بن جاتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے وعدہ کر لیا  
 کہ تو میں اس کے کام آنے کی جی الا مکان کو کشش کرنا،  
 بشرطیکہ میرے مسئلہ نظر سے دو واقعی مدد کا مستحق ہو۔"  
 "تم کہتے ہو تو کیا تھا۔" اس نے جلد اور حرا چھوڑ دیا۔  
 "میرے کہنے پر مت جانچ۔ ضرورت اور حالات کے  
 میں بہت کچھ کتا رہتا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔  
 بھی جب آپ نے بلا دو کہ ٹوک مجھے اندر بلا لیا اور مجھ پر  
 بائیں شروع کر دی تو میں نے سوچا مجھے آپ کا دل رکھنے کی کڑی  
 کرنی کا ہے۔ شاید یہ کسی قسم کا کھیل ہے اور مجھے اس کھیل  
 آپ کا ساتھ دینا چاہیے۔ بس۔ کچھ اس قسم کی سوچوں کے  
 میں تھوڑی بہت کچھ اس کرتا رہا۔"  
 وہ ایک بار پھر ہم سے انداز میں مسکرائی۔ ایک لمبے  
 وقف سے میں نے کہا "دیکھ مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ تم  
 آسانی سے آپ سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا خیال تھا  
 کافی تک دودھ کھنی پڑے گی۔"  
 "ہاں۔" وہ پُرخال سے بچے میں بولی "مجھ سے ملا تھا  
 آسان کام نہیں ہے لیکن آج اسی اہم کام کی وجہ سے  
 راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر رکھا تھا۔ تم یہ بتاؤ کہ آپ  
 کے کام کے مسئلے میں تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"  
 "میں نے آپ کی وجہ سے اس کالا کوئل کا تھکا  
 ہے۔" میں نے جواب دیا۔  
 "میری وجہ سے۔" وہ ایک بار پھر سراپا حیرت بن گیا۔  
 "آپ کی سمجھی اس سے کچھ مجھے کنٹرول کے تحت  
 نہیں کر رہی۔ اس سے چاہئے کالا کوئل کا نقصان ہو جائے۔  
 میں اس کالا کوئل کا ایذا اُس بھی جمع ہے۔ وہ آپ کے  
 قانونی کارروائی کر کے ہرمانہ وصول کرنے کا حق چھوڑ  
 ہے۔" میں نے دیکھوں کا سلسلہ اپنانے کی کوشش کرنے  
 دوائی سے کہا۔  
 "تم کس سمجھی کی بات کر رہے ہو؟" اس کی پیشانی پر  
 ابھرا آئیں۔  
 "میرا ایک ایسا عجیب و غریب کارپوریٹیشن۔" میں نے جواب  
 اس کی پیشانی پر لکھیں کسی ہو گئیں۔ وہ گویا سچا

کا نعت سے بولی "وہیے میں حسین کا تاری ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ پتا نہیں ہے۔"

"مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔ آپ کو تو شاید یہ بھی پتا نہ ہو کہ اس کچھ میں آپ کا ایک پارٹنر بھی ہے جس کا نام مجید کریم ہے۔ میں نے اسے مطلع کیا۔"

"مجید کریم؟" اس نے بڑے خیال انداز میں دہرایا "میرا خیال ہے میں تو آج تک اس نام کے کسی کوئی سے نہیں ملے۔"

"تو پھر اب وقت آگیا ہے کہ مل لیں۔ انسان کی کم از کم اپنے کا دوبارہ ملے وادوں سے قوافیت ہونی چاہیے۔" میں نے چہچہاتے ہوئے بے میں کہا۔

"مجھے دولت سے دلچسپی ضرور ہے مسز افضل!" وہ کمری سانس لے کر بولی "لیکن کا دوبارہ مسائل "انجمنوں اور پریکٹیشنوں سے میں دور رہنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں بزنس ایک خود کار مشین کی طرح میرے لیے دولت پیدا کر رہے۔"

اس کی صاف گوئی قابلِ تحریف تھی۔ میں نے نرمی سے کہا "یہ بات کم ہو تا ہے۔ آج کے جدید دور میں کو کہ میں ترکا دوبار خود کار ہو گئے ہیں۔ آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں تو بھی منافع کما سکتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ہر وہ بزنس کمزور ہو کر آخر کار بالکل بیفہ جاتا ہے جس کی طرف مالک بالکل بھی توجہ نہ دے۔"

"یعنی تم مٹھو دے رہے ہو کہ مجھے اپنے کا دوبارہ کی طرف توجہ دینی چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "ذیل ہوتے ہوئے بھی مفت مشورہ دینے کا شکر ہے۔ لی الحال مجھے کچھ انجمنیں درپیش ہیں "ان سے نہٹ لوں۔ پھر کا دوبارہ کی طرف بھی ضرور توجہ دوں گی اور ایسے لوگوں کے مسائل بھی حل کرنے کی کوشش کروں گی جن کامیں نے کبھی نام تک نہیں سنا۔ مثلاً تمہارا یہ کاغذ۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا۔؟"

لفظی سانس لے کر مجھے ایک بار پھر اس کا نام دہرایا۔ ساتھ ہی میں نے کہا "وہ اب آپ کی کچھنی کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر ٹکا بیٹھا ہے جس میں کچھنی کی بینک ڈائریکٹر کی حیثیت سے سامری ڈسٹے واری آپ پر آئے گی۔ آپ کا پارٹنر مجید کریم اس کچھنی میں کم تر درجے کا پارٹنر ہے۔ وہ قراطینان سے یہ عذر کر کے بری الذمہ ہو جائے گا کہ اس کے پاس فیصلے کے اختیارات نہیں تھے۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے مسز افضل؟" اس نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے میں اس کے خلاف شکایت کرنے والے کا نہیں بلکہ اس کا اپنا وکیل تھا۔

"میں سمجھتی ہی بات ہے۔ آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کچھنی میں گڑ بڑ کیا ہے۔ کون اس کا ڈسٹے وار ہے۔ پلائی کے آرڈر کسی کی وجہ سے چرے نہیں ہوئے صرف ایک ہی آرڈر تو پورا ہونے سے نہیں رہا ہوگا۔ چیخ اور بھی کچھ کہنا۔"

پھر قد سے بے چینی کے عالم میں سر ہٹاتے ہوئے بولی "پہلے اس نام کی کچھنی مجھے پلائی کے دیگر اداروں کے ساتھ ورلے میں ملی تو ہے لیکن میں ابھی تک اس کا دفتر اس کے کاغذات بھی نہیں دیکھ سکی۔ کئی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی پلائی کے چرے بزنس کے ہی سرور کا کچھ پتا نہیں ہے۔ صحیح معنوں میں ابھی میں نے بزنس ٹیک اور بھی نہیں کیا ہے۔ مجھے ہاں نہ آئے کہ یہ کچھنی پلائی کے اپنی زندگی میں کچھ اور لوگوں سے خریدی تھی۔ اس میں شاید کچھ اندرونی کچھ معلوم اور کچھ قانونی گڑ بڑ ہیں دی تھی جس پر پلائی کا پوچھنا تھا۔ شاید اب کوئی اور قسٹ کٹا ہو گیا ہو۔ وہ جو تمہارا کاغذ ہے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"گولڈ جان کڑوا؟"

"پہلے دی۔ وہ کچھنی کے کسی ڈسٹے وار کوئی سے رجوع کریں نہیں کرنا؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"ہم نہیں میرا۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا "گولڈ جان کڑوا کا نام سن کر آپ کے ذہن میں شاید تصور ابھرا ہو کہ وہ کوئی نہایت اہم گھوڑ اور عقل سے سیدل وصال ہو گا مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ ایک سلما ہوا کچھ دار اور شائستہ بزنس میں ہے۔ میں آج ہی اس سے ملا ہوں۔ اس کی شخصیت اس کے نام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ آغا امین نہیں ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ کٹا ہوئے پر کچھنی کے ڈسٹے واروں سے رجوع نہ کرتا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا لیکن ابتدا میں اسے خرچا جاتا رہا اور پھر کچھنی کا آتش ہی بند ہو گیا۔"

"آتش بند ہو گیا۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

اس سوچ پر میرا دھمک بڑھنے کوئی چاہتا تھا اس سادگی پر کون نہ مہربانے اسے خدا۔ "لیکن میں نے اپنے آپ کو باز رکھا اور نہایت عقل سے دہرایا "تمی ہاں۔ کچھنی کا آتش بند ہے۔"

"وہاں پھر کوئی گڑ بڑ ہو سکتی ہوگی۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں خیال ظاہر کیا "لیکن حیرت ہے کہ میرے دیکھوں نے مجھ سے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔" پھر اسے گویا خود ہی صحیح کا خیال آتا اور وہ نہایت خفیف سی سرمنگی کے ساتھ بولی "کا پھر اب ذکر کیا ہو لیکن میں نے ہی کوئی توجہ نہ دی ہو۔ میں نے اس بارے کو اہم نہ سمجھا ہو۔"

میرا حال۔ سبہ چارے گولڈ کے لیے یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا بزنس میں ہے۔ اس کے لیے لاکھوں کا سامان بہت بڑا نقصان ہے۔ اب تو شخص رقم ہار جائے سے بھی اس کے نقصان کی حافی نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس کے پاس آغا امین کی حافی کا کچھ طریقہ تو کیا ہے کہ اسے مال کا بندوبست کر سکے۔ اس کے لئے مسکونے اپنے کچھ میں معمولی سی چٹائی لے کر کوشش کی۔



موجودہ حرم میں اپنی گاڑی کمری کے کیا تھا۔  
کچھ دیر بعد میں ہوئی واپس آئی کیا۔ آفس سے میرے پاس  
رحمان کو فون کر کے اطلاع دی تھیں تمہاری پرس میرا کیا  
آئی ہوں۔

"جتنے خوش نصیب ہو تم؟" وہ ٹھنڈی سانس لے رہا ہے  
دوسری لے اس نے پراشلیق لیے میں پوچھا "کیسی تم  
میں ٹھیک تھی۔" میں نے قدرے باہمی سے اس کی  
پاؤں میں اس کی۔ ایک دم تھی۔ لے لے کان تھی۔  
"دیکھو۔ مجھے یہ پکڑ دینے کی کوشش نہ کرنا تھی۔  
میرا کے دعوے میں کسی کمری سے مل کر آگئے۔ میں انکار  
نہیں ہوں بتانا تم کچھ رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے تم اس سے زیادہ بے وقوف ہو جا  
اطمان کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا پھر میں کی وضو  
پہلے ہوئے ڈانٹنے کے سے اعزاز میں بولا "بہن نصیب کام کام  
تھیں اپنے دوست کے کام کی فکر نہیں۔ اس کے بارے  
نے کچھ نہیں پوچھا۔ فوراً ہی پرس کے بارے میں پوچھیں  
کرنا۔"

"کام کا کیا ہے۔ کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ پہلا خود  
معلومات حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔" وہ بے غلام  
"مجھے یقین ہے تم پرس سے دوستی تو کاٹھ آئے ہو وہ وہ  
طاقت کہاں لے پائی ہے؟"

"جنم میں۔" میں نے جمل کر جواب دیا۔  
"خیر۔ تم جیسے اور پرس میرا جیسے لوگوں کا آلا تم  
جنم ہی ہے لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ ابھی سے کیا  
کی فکر میں ہو۔ اور والے جتنی سلت دے رکھا ہے وہ  
قائدہ افغان۔" وہ خرم آجیرے لیے میں بولا۔

"مگر تم میرے سامنے ہوئے تو ہمیں اس صلاح  
قائدہ افغانے کا سوچ نہ ملا۔" میں نے کہا "جہاں اتنا  
تھیں اس کام کے بارے میں بتانے کی کوشش کرنا  
میرے سوا کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کرتے ہو  
میری بات کانٹے ہوئے بولا "تم نے پرس کو میرا  
اپنے ہوئی میں ڈر پڑ کر کیا ہو گا؟"

"جیہ۔" میں نے اسے جڑا کر میں ایک ٹاپا میں  
کے لیے دے دیا کیا ہے۔ اپنا یہ وہ پورا کرنے کے  
تھامے کمرے کوں گا جہاں تم اپنے لان پر گھسی پھرا  
اور امید ہے کہ پرس کو دیکھ کر خوشی کے مارے میں  
بھی پلانے لگو گے۔" میں نے کہا۔

"پ میں آج بھی کہہ رہی ہوں۔ اگر میں  
تب بھی پرس کے استقبال کے لیے قوسم ہیں؟"

آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی شرت کچھ معقول لیکن چیز  
لڑنے کی معلوم ہوئی تھی۔ پرانے جوتوں پر کچھ گرد جی ہوئی تھی  
"برایا لگا تھا کہ وہ کسی کے جوتوں سے چلے بھی گئے ہوں گے۔  
ایک وہ کسی بس دھبہ ہے انز کریدل وہاں تک پہنچا تھا۔ اس کی  
نرت کے دو ہلائی تھیں کھلے تھے۔ اس کے سینے پر تھوڑے سے ہل  
در گلے میں لٹکی سونے کی چین نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ ان دونوں  
لی لٹکشی کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ دونوں ہی چیزیں کچھ ایسی بھلی معلوم  
نہیں ہو رہی تھیں تاہم مجموعی طور پر فوجوان کی شخصیت کا تاثر  
خوش گوار تھا۔ وہ کوئی بد معاش یا زیادہ تجر و طرار قسم کا فوجوان  
معلوم نہیں ہو تھا۔

"میرا نام کارمان والٹ ہے۔" وہ چمکچامٹ آجیرے لیے میں  
بولا "مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟"

"کس کام میں؟" میں نے پلکیں جھپکاتے بغیر اس کی آنکھوں  
میں جھانکے ہوئے پوچھا۔

"میں دیکھنے میں۔" وہ کچھ مڑ پڑا کر بولا "مجھے اریہ صبح  
کونسل والوں نے بھیجا ہے۔"

"جہا۔" اچھا۔ شادی کے امیدوار ہو؟" میں نے ایک  
بار پھر کمری نظر سے با ضرورت ہی اس کا سر تاپا جائزہ لیا۔ وہ کچھ  
اور مڑ پڑا گیا۔ مظلومانہ انداز میں ہاتھ لٹے لگا۔

"تم۔" میں اب۔" وہ تھوڑا گل کر بولا "مجھے بتایا گیا ہے  
کہ وہ خاتون میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"اب۔" ہمیں ٹھیک ہی بتایا گیا ہے۔" میں نے کمری سامنے  
لے کر کہا "تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ نہیں  
ہو رہا۔ اور تم اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ہو کہ اس  
دو دانے پر امید ادا کی لاؤں میں لگی ہوئی ہے میدان صاف  
ہے اور تم تو ہی کچھ معقول ہی معلوم ہوتے ہو۔ اگر تمہاری  
قسمت ابھی ہوئی تو تھپ ہو جاؤ گے جانتے۔ جا کر قسمت آزمائی  
کرس۔" میں نے کھلے ہوئے چہرے گیٹ کی طرف اشارہ کیا جسے  
ابھی میں نے بند نہیں کیا تھا پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے اپنا  
ایک وزٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف پھرتے ہوئے کہا "مگر  
آئے دالے چند دنوں کے دوران کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مجھ سے  
رابطہ کرنا۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

اس نے میرے بارے میں کچھ پوچھے بغیر نہایت زور شور سے  
میرا حکریہ ادا کیا اور کارڈ اٹھا لے گیا۔ جب میں رک گیا۔ درحقیقت  
میری دلی خواہش تھی کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ میں جانتا چاہتا تھا  
کہ میرے آنے کے بعد اس پر کیا گزری۔ اس سے اس پر سے  
معاملے کو کھینچنے میں مدد بھی مل سکتی تھی۔ میں نے اسے اندر جانے  
کا اشارہ کیا اور اس نے ہنڈلے ڈالنے کے بعد قدم رکھا جیسے اسے  
اندیشہ ہو کہ فوراً ہی کسی طرف سے کوئی ٹھپک کر اس کی جانک  
پکڑے گا۔ میں نے آہستہ سے گیٹ بند کرنا اور اس طرف چل

میں خودی چلا جائے۔  
 جواب چلے جاؤ۔ رو کا کس نے ہے؟ اگر تم چاہتے ہو کہ  
 کوئل کا قصان بھی پرانہ ہو اور وہ اللہ کے چکر لگاتا رہے تو  
 چلے جاؤ۔ میں نے کیا۔  
 "ہاں۔ تم تو یہی کہو گے۔" وہ غصی سانس لے کر ہوا تم  
 سے کب بداشت ہوتا ہے کہ میں کسی حسین لڑکی سے ملوں۔"  
 "تو تمساری غلطی تھی ہے۔ میں تو دعا کرتا ہوں کہ تم کسی حسین  
 لڑکی سے ملو اور میں تمیں دیکھوں۔ کافی عرصے سے میں نے پہلوئے  
 حور میں نگار نہیں دیکھا۔ میں نے کیا۔  
 "تم تو بڑے غیبت ہو۔" وہ کراہنے کے سے انداز میں ہوا۔  
 "یہ تم عرصے سے کہہ رہے ہو۔ اپنی بات کو اتنی مرہ مت  
 دہراؤ۔ کیا۔ اچھا۔ اب اجازت دو۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ میں  
 ایک مصروف آدمی ہوں۔" میں نے کیا۔  
 "نیک ہے مصروف آدمی۔ تم سے بکرات ہوگی۔ لکھ شاپ  
 ملاقات ہی ہو جائے۔"  
 اس نے کیا اور غور سے کیا۔

ریلیو روکنے کے بعد چھ لمبے ٹیک میں ہی بس میرا کے بارے  
 میں سوچا۔ ہاں۔ ایک دلچسپ کردار تھی اور مجھے اس کردار میں  
 گرا سرارت کی جھلک نظر آتی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی  
 ٹیکہ بنی امیر کو بلایا اور اسے تین چار روز پہلے تک کے تمام اورو  
 اخبارات لانے کے لیے کیا۔ ہر کسی میں تمام اخبارات آتے تھے  
 اور ان کی جانچ بھی کی جاتی تھی۔ امیر نے کچھ دیر بعد ہی مطلوبہ  
 اخبارات میرے سامنے لائے۔

## ابلیکا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر  
 حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی  
 تاریخ پیش کی گئی ہے

سنت جلدوں میں مکمل سیٹ۔ / 19.50 روپے



اردو بازار لاہور

لہذا کراہتا ہوں۔ تمساری طرح۔" سیلو رمضان ہوا۔  
 وہ دکان پر پہنچے ہوئے کی کوٹش میں تمساری کمر میں چپک  
 رہے تھے۔  
 "میں نہیں۔" وہ غصے ہوا۔ "میں اپنی غصوں میں دلن اکثر  
 ہوتا ہوں۔ ان کے اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے۔ ۳۔ نزل چپک  
 "لیکن وہ ان سے بچتی نہیں جاتی۔"  
 "اے اے اے۔" وہ گدھے ایس اس چپک کی تمیں "دوسری  
 "کی بات کہنا ہوں۔" میں نے کیا۔  
 "اچھا۔ اچھا۔ مجھے یاد آگیا۔ کمر میں بھی چپک چ  
 "لیکن افضل فیضان تم کچھ زیادہ عزیز نہیں ہوتے  
 "کہہ رہے ہیں۔" وہ جیسے بات کرنے لگے۔  
 "میں اس سے الگ مرطہ لپاؤ کی کا ہوتا ہے۔ میں اس کے  
 "میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے سمجھتی سے کیا۔  
 "میں کیا۔" وہ جلدی سے ہوا۔ "تمیں آگے آگے بیٹھے  
 "میں ضرورت نہیں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کوئل  
 "بڑے کام ہو گیا ہو گا۔"

بہار۔ "میں اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اس قسم کا کام چنگی بجائے  
 "پرائس ہو سکتا تھا۔ غور سے جب کہنا کہ کوئل اپنے کا ہمارے  
 "میں کچھ پتا نہ ہو۔ لیکن ہر حال۔ کام جلد ہو جائے گا۔  
 "پہلا خود بھی کوئل سے بات کروں گا۔ تم بھی اسے ٹیک دے دو۔"  
 "تم کس حیثیت سے پرس سے ملے تھے؟" سیلو رمضان  
 "وہ دریافت کیا۔  
 "کوئل کے کوئل کی حیثیت سے۔" میں نے جواب دیا۔  
 "تم۔ اور وکیل۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہوا۔  
 "آگے تسارا مذاق نہیں آتا۔"

"میں۔" وہ تمساری طرح جاہل تمساری تھی۔ اسے معلوم تھا  
 "یہ وکیل بھی تمساری طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔ لکھ  
 "نہیں ہے چارے تو تم سے بھی گئے گورے ہوتے ہیں۔ اس کے  
 "ملا وہ میں بیٹے وکیل اور جی جی کا رو کا رو انہیں سے واسطہ نہ  
 "بل اتنا ہے اس کے بعد تو تم خود کو دیکھو وکیل ہو جاتے ہیں۔"  
 "لیکن یہ وہی تم حکیم غلطو جان والی بات ہوتی ہے۔ تم  
 "اسے چھوڑو۔ یہ تو تم اس کے کسی طرح جا کر ملے۔ کیا  
 "کرت ہوئی؟"

وہ سمجھتا ہے کہ میں بتاؤ کہ پرس میرا سے ملاقات میں  
 "کہہ کس طرح محبت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔  
 "میں نے اسے صرف وہ باتیں بتائی ہیں جو کوئل کے سامنے سے غصی  
 "جانتی تھیں۔ وہ جب ہوا تو اس کے لیے سے امید جھلک رہی تھی  
 "میں بھرا خیال ہے اب کوئل کا قصان پر راز ہو جائے گا۔"

"اے اے اے۔" وہ ذرا بدلے ہوئے لیے میں ہوا۔ "میں ہی  
 "میں تمیں نے غلطی کی تھی میں سمجھتا ہوں۔ اس سے ڈرا چکا تھا

دیکھتے امید تو نہیں ہے کہ ضرورت پڑے گی۔ لیکن اگر چاہیے ہم آپ کو مدد دے دیں گے۔  
میں نے اپنا نمبر بتا دیا لیکن اس شخص کے لیے میں نہیں ہوں  
مردم دہیسی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے شبہ تھا کہ اس نے فون نہ  
کیا ہو گا۔ میں نے گنگا پٹ آج سے انداز میں کہا "مگر مجھے  
آپ مجھے تو بتا دیں دے کہ یہ کس قسم کا ادا ہے۔ کیا یہ بھی کہ  
شادی کا دفتر ہے؟"

"نہیں بھائی! اس شخص نے فحشی سائنس کی یہ ایک طرف  
کی بیگل ایڈوانسری سوس ہے۔ گھر میں ہی ایک چھوٹا سا سارا  
سمجھ لیں۔ یہ ایک خاتون دیکن کا گھر ہے جو زیادہ تر فحشی کو رشتہ  
لے کام کرتی ہیں۔ شادی، بیاہ، طلاق وغیرہ کے سلسلے میں مقصد  
لیتی ہیں۔ ماریہ صبح کو نسل والوں سے ان کی دوستی بھی ہے اور  
تھوڑا مدت کا دیاری تعلق بھی ہے۔ کبھی کبھار ان کے لیے  
چھوٹی موٹی خدمات انجام دے دیتے ہیں۔ یہ اشتہار بھی انہی کی  
کلائنٹ کے لیے دیا گیا ہے۔ فون نمبر ہمارا استعمال کیا گیا ہے۔ غرض  
امیدواروں کے انتظار میں بیٹھیں ہوئے تھے۔ لیکن اب ام  
معائنے کو ختم ہی کیجیے۔"

وہ شریف کوئی مطمئن ہوا تھا۔ میری بوجھ جو کہ اسے زیادہ  
خوش گوار محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن میری شکل کے لیے اس۔  
عاباً صحیح صورت حال بتا دی تھی۔ پرنس میرا نے بھی مجھے کیا  
تھا کہ ماریہ صبح کو نسل والی ماریہ نے وہ ساری مرضی اپنے دفتر  
اور "ضرورت رشتہ" کے پکڑے ہٹ کر اس کے لیے عارضہ  
شوہر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اس شخص کی شرافت سے تھوڑا سا ناچا تھا  
اُٹھاتے ہوئے زرا احتیاط سے لیجے میں پوچھا "اور آپ ان خاتون  
وکیل کے ہاں ملازم ہیں کیا؟"

"ملازم سے بھی بدتر ہی سمجھتے ہیں ان کا شوہر ہوں۔"  
فحشی سائنس لے کر بولا۔ اس شریف آدمی میں حس مزاج کی  
موجود تھی۔

"اچھا۔ اچھا۔" میں نے معذرت خواہانہ سے  
انداز میں پٹنے ہوئے کہا "آپ ان کے شوہر غدار ہیں۔"

"ملازم تو نہیں ہوں۔ صرف شوہر ہوں۔" اس نے سنجیدگی  
سے چپکی۔

"آپ کا مت فکر ہے۔ میں نے آپ کا خاموشی غلام  
کیا۔" میں نے خاموشی عاجزانہ انداز میں کہا "ویسے۔ یہ کہ  
قسم کا کام تھوڑے کے لیے اشتہار دیا گیا تھا؟"

"بھائی! اگر آپ کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا ہو تو خود  
اس کی نوعیت بھی بتا دی جاتی۔ اب آپ کا اس سے کوئی تعلق  
نہیں۔ تو نوعیت پوچھ کر کیا کریں گے؟ وہ ایک ملازم ہے۔ کہ  
جس کا کوئی نہیں، اس کا راستہ کیا ہو چکا۔" وہ بدستور ملازم

میں نے انہیں کھانا شروع کیا اور جلد ہی مجھے وہ اشتہار نظر  
آ گیا جو میرے اندازے کے مطابق میرا مطلوبہ اشتہار ہو سکتا تھا۔  
اشتہار زیادہ بڑا نہیں تھا اور ایک اخبار کے پچھلے صفحے پر چھپا ہوا تھا  
لیکن اس قسم کا اشتہار اگر اس سے بھی کم نمایاں طور پر چھپا ہوتا  
تو اب بھی اس کا مت زیادہ ریپائرس مل سکتا تھا۔ اس کا عنوان تھا  
"فحشی مروجہ" اشتہار کا محضون کچھ یوں تھا:

"ایک آسان، دلچسپ اور مددگار کام کے لیے ایک غیر شادی  
شدہ، خوش شکل اور شائستہ نوجوان کی ضرورت ہے۔ کام عارضی  
ہے لیکن معاوضہ اتنا معتدل ہے کہ جس سے زندگی سناواری جاسکتی  
ہے۔ مکمل رازداری کے ساتھ رجوع کیجیے۔"

مجھے صرف ایک فون نمبر دیا گیا تھا۔ چار لے کی سوچ بچار کے  
بعد میں نے وہ نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف وہ ایک کھنٹی بجتی رہی۔  
میرے اندازے کے مطابق یہ "ماریہ صبح کو نسل" کا نمبر ہونا  
چاہیے تھا اور وہ چن کر عام دفتروں کے کھلے رہنے کا وقت نہیں  
تھا اس لیے دوسری طرف کوئی نہیں اٹھا ہوا تھا۔

میں اس وقت جب کہ میں سلسلہ منقطع کرنے والا تھا  
دوسری طرف سے ریپورر اُٹھا لیا گیا اور ایک مردانہ آواز نے  
"ہیلو" کہا۔

"ماریہ صبح کو نسل۔" میں نے تصدیق چاہی۔  
"اگر ایک لمبے کے لیے سکوت چھایا پھر وہ شخص کچھ عرصے  
لیجے میں بولا "جی نہیں۔۔۔ آپ سے کس نے کہا کہ یہ ماریہ صبح  
کو نسل کا دفتر ہے؟"

"ایک خاتون نے۔" میں نے جواب دیا۔  
"کس خاتون نے؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیا یہ تانا ضروری ہے؟" میں نے دیکھے لیجے میں دریافت  
کیا۔

"جی ہاں۔۔۔ کیوں کہ آپ کو صحیح اطلاع فراہم نہیں کی  
گئی۔" وہ شائستگی سے بولا "ہم کبھی کبھار ماریہ صبح کو نسل کے  
لیجے چھوٹی موٹی خدمات انجام دیتے ہیں لیکن ماریہ صبح کو نسل  
بہر حال ایک الگ ادا ہے۔ آپ کو کس سلسلے میں بات کرنا  
چاہی؟"

"میںوں کے اخبار میں آپ کا جو اشتہار شائع ہوا ہے۔  
میں اس کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا  
"میں ایک غیر شادی شدہ، خوش شکل، شائستہ اور نہایت معتدل  
نوجوان ہوں۔"

"اچھا۔" اس نے کہا "اطمینان کی سائنس کی  
"جناب! آپ جیتنے ویسے ہی ہوں گے جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں  
لیکن معذرت کے ساتھ آپ کو مطلع کر رہا ہوں کہ ہم نے اس کام  
کے لیے امیدوار کا انتخاب کر لیا ہے کیوں کہ مسئلہ ذرا ہنگامی  
نوعیت کا تھا۔ بہر حال آپ رابطے کے لیے اپنا کوئی فون نمبر دے



سے بولا۔ میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

اس وقت تک میرے ساتھ نے احتجاج شروع کر دیا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا چنانچہ میں اٹھ کر کڑا تنک ہال میں چلا گیا۔ وہ تنک کا دن تھوڑا جھڑپا تھا۔ اس روز تھا۔ بدھ کا دن تھا اپنی کادو باسی مصوفیات میں مگر۔ اس روز کوئل بھی مجھ سے ہٹے آیا اور میں نے اسے بھی اطمینان دلا دیا کہ صورت حال اس قدر افسردہ نہیں۔

اس رات میں نے ساڑھے دس بجے سوئے کا ارادہ کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شب خرابی کا لباس پہن کر میں سوئے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس بد ذوقی بکچے جلدی سوئے کا موزن مگیا تھا اس لیے فون کی گھنٹی سخت ناگوار ہو گئی۔ میں نے فون کئے والے کو دل میں بکچہ مانتا سب الفاظ سے بھی نوازا۔ میں چاہتا تو بین کھرا کر گھنٹی بند بھی کر سکتا تھا۔ رہیو کر کیپل سے آباد کر بھی رکھ سکتا جا میں بیکہ کی طرح جنس سے مجبور ہو کر وہی گھنٹی پر میں نے رہیو رانھا کر کان سے لگا لیا اور چلو گیا۔

دوسری طرف سے ایک جامعہ حشر میں نسوانی آواز اُڑ سکتی  
ہی۔ آواز کیا بھی ہو گا کان کے قریب جتنی تک پہنچ آگئے۔ میں نے  
فون کرنے والے کو دل میں دل میں جن نامناسب الفاظ سے نوازا  
تھا دل میں دل میں وہ الفاظ فوراً دہرائیں بھی لے لیے۔

”مشرافِ افضل چہ پدری؟“ بولنے والی نے تصدیق چاہی۔ آواز دلکش ہی نہیں، شگفتا بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چہ نس سیرا کی آواز تھی لیکن میں اپنی جلدی اس کے فون کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اور وہ بھی رات کو اس وقت! آج شام ہی میں نے اس کے بارے میں سنا تھا اور ارادہ کیا تھا کہ سچا اسے فون کر دوں گا۔

تکلیف کے سارے اٹھ کر بیٹھے ہوئے کہا۔ میری سستی اور غنودگی کب نسبت کا فور ہو گئی۔

”میں سیرا ہل رہی ہوں۔ پرس سیرا۔“ اس نے نہایت شیریں لہجے میں میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

”بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے فون کیا۔“ میں نے بھی بڑی خوش خلقی سے کہا ”کیسے یاد فرمایا؟“

”جی جی بتائیے۔ کیا راقی آپ کو اس وقت میرے فون سے خوشی ہوئی ہے؟“ اس کے لمبے میں مسرت آمیز تجسس جھلک آیا۔

جواب دیا "آپ بھی خاتون سے گفتگو کا شرف روز بروز تو حاصل ہوتا ہے۔"

”ہیں۔ اب ایسی باتیں مت سمجھئے جیسی اکثر لوگ کرتے

ہیں۔ ”اس نے گویا اپنے لمبے میں سبیدگی لانے کی کوشش کی مگر نے آپ کو ایک کام کے سلسلے میں فون کیا ہے۔“

"آپ کو مجھ سے کام پڑ گیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔  
 "ہاں۔ کیوں۔ کیا مجھے آپ سے کام نہیں پڑ سکتا؟"

”پڑھ سکتا ہے۔۔۔“ میں نے قلیم کیا ”بہر حال میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔“

”جیسی دیکل اور ڈاکٹری ضرورت تو کسی کو کسی بھی وقت پیش آسکتی ہے۔“

”اوپر ایل۔ تی ایل۔ یہ تو صحیح ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس وقت بھولی گیا تھا کہ کل میں اس سے ایک دیکھ کی حیثیت سے ملا تھا۔ لیکن اس کی کو رات ساڑھے دس بجے لوگ کہی یاد کرتے ہیں۔“

میں سمجھیں کہ مسئلہ ذرا ہنگامی نوعیت کا ہے۔ وہ بولی۔  
”کیا واقعی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔ میں آپ سے فوراً بات کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن سارا بات چیت فون پر نہیں ہو سکتی۔ کیا آپ اس وقت آ سکتے ہیں؟“

”جیسے استخوان۔“ اس نے جواب دیا ”میں یہیں نہیں ہوں اب  
آج رات میرا یہیں رکھنے کا ارادہ ہے۔“

ایک لمحے کے لیے مجھے مل نہیں سکے کہ کدی سی ہوئی۔ شاید بیسیوں دیکھوں کو چاہی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ وکیل کاروبار میں اس کے حلقے میں مستقل طور پر اس کے لیے قانونی خدمات انجام دیتے ہوں لیکن اس وقت وہ مجھ سے کے لیے مجھے بھاری تھی جس کے وکیل ہونے کا نہ جانے اس نے کیسے یقین کر لیا تھا۔ مظلوم نہیں یقین کیا بھی تھا یا نہیں؟ اگر یقین نہیں کیا تھا تو اس کے باوجود مجھے وکیل کہہ کر مجھ سے کے لیے بھاری تھی تو مجھے اس کا کیا مطلب سمجھا جاوے گا؟

دوسری لمحہ میں نے اپنے آپ کو سمجھا یا کہ مجھے نوازا  
خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا چاہیے تھا۔ میں ممکن تھا۔ وہ جیسا کہ  
میں صرف کوئی باہر سے لایا جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے خوف سے میں  
نے کہا "تھک ہے۔" مجھے آرمے کھینچنے کی سلسلہ۔ جیسے میں کچھ



میاں بھٹی گھریے۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ اس کا بوجھ کچھ اور  
رہی ہو گیا۔

میں نے ریموور رکھا اور چلا گیا۔ لگا کر بیڈ سے اُترا۔ ہانٹ  
کاؤن کو غیر معینہ وقت کے لیے خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے ایک  
ٹیس سوٹ منتخب کیا اور کم سے کم وقت میں تیار ہونے کا ریکارڈ  
تیار کرنے کی کوشش کی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں ایک بار پھر اس  
پلے کے کمرے میں موجود تھا اور کسی معمول وکیل کی طرح عجیب و غریب  
نظر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کل پتل جہاں جین نہ تو اتر کام پر کوئی تو آواز ابھری  
اور نہ ہی کوئی گیت گھولتے آیا۔ دودھ اور پر کبے سکوت کی چادر  
پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دودھ تل دی تب بھی کوئی رد عمل ظاہر  
نہیں ہوا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں تشریف کی گھنٹی بجی۔ اسی  
لئے مجھے احساس ہوا کہ جھوٹا گیت صحیح طور پر بند نہیں تھا۔ میں نے  
اسے دیکھ لیا تو وہ مکمل کیا۔ اس کے منتقل ہونے میں ذرا سی کسر  
گئی تھی۔

میں جلدی سے اندر جا پہنچا تاہم اندر ملنے دوا اڑے پر میں نے  
ایک لمبے کے لیے رک کر احتیاطاً پرس سیرا کو پہنچا اور بلند پکارا  
لیکن اس کے جواب میں بھی خاموشی رہی۔ آخر میں نے اس کے  
استوا میں قدم رکھ دیا۔ اندر تمام بتیاں روشن تھیں۔ پہلے ہال  
میں اس کی پیشکش نے میرا استقبال کیا۔ ایک ایبل پر ترکی سیڑھی  
کی بائبل ہارنٹ اداس آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں جب دوسرے ہال میں پہنچا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ پرس  
سیرا کی طرف سے کوئی جواب کہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ جواب  
دینے کی ہوشیاری میں غفلت میں آ رہی تھی۔ وہ فرش پر چاؤں خائے  
چت اور ساکت پڑی تھی۔ یہ وہی ہال تھا جس میں کھینچے ویو جے  
ہوئے تھے اس کے ایک حصے میں تین چار نہیں کریاں اور پتائی  
موجود تھی۔ یہ غالباً اس لیے تھیں کہ کام کے دوران بھی اگر بات  
جنت کے لیے کسی سمان ویو کو بٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو  
وہیں بٹھایا جائے۔ پیشکش والے ہال میں بھی ایک گوشے میں  
لشٹ کا ایسی انتظام موجود تھا لیکن مجسموں والے اس ہال میں  
دو کریاں آئی ہوئی تھیں۔ پتائی بھی اصل جگہ سے کھسک ہوئی  
معلوم ہوئی تھی۔

میں نے پرس سیرا کے قریب بیٹھ کر ایک لمبے کے لیے اس  
کا جائزہ لیا اور میرا دل لاپ سا گیا۔ ہمت کو بھی ہوئی اس کی  
آنکھیں بے زوری تھیں اور خوب صورت تراشیدہ بالوں کا کچھ  
حصہ خون میں خنجر دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ خون بالوں کے قریب  
فرش پر بھی پھیلا ہوا تھا اور ابھی پوری طرح خشک بھی نہیں ہوا  
تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر چین نہیں آ رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو

میں خون پر اس لڑکی کی زندگی ہے بھرپور آواز سن رہا تھا۔ اس  
تو اڑ میں کچھ عراغیگز سے ہڈیوں کا آواز جیسا بھی موجود تھا۔  
میں کچھ دیر اس کے قریب گم سمی بیٹھا رہا پھر گویا کسی  
خواب سے جھٹکا۔ میں نے بے اختیار اس کی سرسری کلائی پر  
الٹکیاں رکھ دیں۔ میں اس کی نبض محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس کی  
جلد کے لمس سے مجھے احساس ہوا کہ زندگی کی حرارت کی خفیف سی  
رستی ابھی اس کے جسم میں موجود تھی لیکن اس کی نبض ساکت  
ہو چکی تھی۔ جس چیز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اسے  
زندگی سے محروم کیا گیا تھا وہ اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ وہ سیاہ  
چتر کا تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا ایک جسم تھا جو کہ عمارت تنہا کا نمونہ  
معلوم ہوا تھا۔ پرس سیرا نے غالباً کسی تاریخی ہتھیار کو کلائی کرنے  
کی کوشش کی تھی۔ اسی ہتھیار سے اس کے سر پر ضرب لگا پھر شاید  
ضربیں لگائی گئی تھیں۔

میں ایک سوہوم سی امید کے سارے اس کی کلائی تھامے  
بیٹھا تھا کہ شاید میں صحیح طور پر اس کی نبض نہیں دیکھ پایا تھا۔ شاید  
اب کسی بھی لمبے مجھے نبض کی حرکت محسوس ہونے لگے۔ اس کا  
دل واقعی ساکت ہو چکا تھا تب بھی شاید کسی مجبورے کے تحت دودھ  
دھڑکتے لگے۔

میری یہ توقع تو پوری نہیں ہو سکی لیکن ایک تیز اور بدست  
زہر ی چیخ نے میرے دھڑکنے شروع کرنے کہہ دیے۔ میرے حواس  
جن پر کچھ دیر کے لیے گواہی سی کر چکی تھی ایک دم پوری طرح  
بیدار ہو گئے۔ میں نے تیزی سے محکم کر دیکھا۔ میرے عقب میں  
ہال کے وسط میں لمبی ڈاگ سی ایک عورت کھڑی تھی جس کی نظر  
پرس سیرا پر جمی ہوئی تھی اور آنکھیں خوف و ہشت سے پھلکی  
ہوئی تھیں۔ اس نے شاید منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو روکنے کی بھی  
کوشش کی تھی لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس کا  
ہاتھ اب بھی اس کے منہ پر تھا۔

پھر اس کی نظر میرا کے چہرے سے ہٹ کر میرے چہرے پر  
آئی تھی۔ اس کے ہونٹ قرقرائے اور اس کے حلق سے عجیب  
کھرکرائی سی آواز نکل رہی تھی۔ اسے مار دیا۔

**دو جلدیہ**  
نفت  
۳۰/-  
تاریخ لے دی

یہ سیدھی اور صاف سی بات تھی۔ شاید تہائی سے اس کی سمجھ میں آجانی کیلکہ اس نے اپنے لڑتے ہوئے ہونٹوں کو جھنجھکیا۔ گویا اب وہ واقعی کوٹھن کر رہی تھی کہ اس کے دل سے کوئی آواز نہ نکلتے پائے۔

دوستانہ بنانے کی کوشش کی تھیں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم بالکل ہی کوئی ہو کر کمزری ہو جاؤ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ذرا خواہ مخواہ بچ بکار کر کے دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے بجائے آرام و سکون سے دو سمجھ دار انسانوں کی طرح بات چیت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ صحیح معاملہ سمجھ میں آسکے۔“

”کیا۔۔۔ کیا میرا واقعہ سچ ہے؟“ اس نے گمراہی سے کہا۔  
پرجہا۔۔۔ آواز اب سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

”ہاں۔۔۔“ میں نے دانت داری سے جواب دیا۔ لیکن اسے میں نے نہیں مارا۔ مجھے تو اس نے فون کر کے بلایا تھا لیکن جب میں یہاں پہنچا تو میں نے اسے اسی حالت میں پایا۔ اور میں تم سے صرف ایک دو منٹ پہلے یہاں پہنچا ہوں۔ میں اس کی بخش دیکھ رہا تھا۔ ایک سو سو سی امپر تھی کہ شاید وہ زندہ ہو۔ شاید اسے طبی امداد کی ضرورت ہو لیکن۔۔۔“ میں نے جملہ ادھر اچھڑا

ڈالا۔ دانت داری اور اظہارِ صدمہ سے سیدھے بچے میں بات کرنے کا اپنا ہی ایک اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات بظاہر ہی محسوس ہوتا ہے کہ سامنے والے نے سیدھی سچی بات کا بھی اثر کیا، نہیں کیا ہو گا لیکن درحقیقت اثر ہوتا ضرور ہے۔ کبھی کبھی اس کی تصدیق دیر میں ہوتی ہے۔ تاہم میری بات کا فوری اثر ضرور ہوا۔ عورت کی آنکھوں سے خوف کے سامنے معدوم ہو گئے۔ اس کی جگہ خمدانہ کھاسلا بے ساختہ نکلا۔

اس نے ایک نظر میرا کی لاش کی طرف دیکھا اور سختی سے آنکھیں بند کر لیں گویا کوئی اندرونی اذیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہو۔ وہ پیچھے ہٹے ہوئے دیوار سے جا لگی تھی اور قیمت تھا کہ راستے میں کسی چیز سے ٹکرائی نہیں تھی ورنہ شاید گر بیگی ہوتی۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو نہ جانے کس طرح راستہ تلاش کر کے نکلے اور درختوں پر پھسل آئے۔

میں خاموش رہا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ اب میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کا یقیناً میرا سے کوئی خاص تعلق تھا۔ خاص تعلق کے بغیر اس طرح بے اعتبار آنکھوں سے آنسو نہیں چٹک سکتے تھے۔ اس کے آنسو حقیقی غم کی پیداوار معلوم ہوتے تھے۔ مکانی یا دھماکے میں یہ بے ساختگی نہیں ہو سکتی تھی۔

تاہم اس نے جلد ہی آنکھیں کھول لیں۔ کچھ اور آنسو اس کے رخساروں پر پھیلے لیکن اس نے فوری شوہر سے انہیں خشک کر لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید آنسوؤں کی دھند لاہٹ کی وجہ سے اسے میری صورت صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی اور وہ گویا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تالیا اپنی اس کوشش میں ناکام ہو کر وہ قدرے حیرت سے بولی ”تم ہو کون؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا ”میرا نام افضل چوہدری ہے۔“ پھر میں نے ایک لمحے کے لیے سواہا کہ اسے اپنی اصلی حیثیت کے بارے میں بتایا جائے یا نہیں؟ اسی ایک لمحے میں میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے سامنے مجھے دی حیثیت برقرار رکھنی چاہیے جو میں نے میرا کے سامنے ظاہر کی تھی۔ فی الحال۔۔۔ بلکہ شاید آئندہ بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے بیان پر قائم رہنا ہی بہتر تھا تاکہ کہیں تصادف یا بی ظاہر ہونے کی نوبت نہ آئی۔

صرف ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سلسلہ احکام جوڑتے ہوئے کہا ”میں ایک وکیل ہوں۔ تقریباً دو گھنٹہ پہلے پرنس میرا نے فون کر کے مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔ اس نے صرف یہ اشارہ دیا تھا کہ وہ کسی اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتی ہے۔ میں فوراً آیا۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ میں آپ سے صرف دو منٹ پہلے یہاں پہنچا تھا۔ باہر کا گیٹ صحیح طور پر منتقل نہیں تھا اور میری کال تیل کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا اس لیے میں اندر چلا آیا اور میں نے پرنس کو اسی حالت میں پایا۔“

”لیکن۔۔۔“ وہ آنکھیں آنسو سے لیے میں بولی ”میرا کے وکیل تو دوسرے ہیں۔ میں ان سب کو جانتی ہوں۔ وہ اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کرتی ہے۔ آپ کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔“ میں اب اس سے ذرا تلفظ اور احترام سے بات کر رہا تھا۔ اس کا جواب بھی دیا گیا تھا۔ میں نے ملاقات سے کہا ”پرنس سے میری ملاقات برسوں ہی ہوئی تھی اور شاید انہوں نے مجھے قابلِ اعتماد سمجھ لیا تھا اس لیے آج یاد کیا تھا جس میں سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ۔۔۔“ میں نے دستاویز سے اعزاز میں مندرجہ سانس لے کر جملہ ادھر اچھڑا ڈالا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا ”میں اندر آئے وقت چھوڑا گیٹ منتقل کر کے آیا تھا پھر آپ اندر کچے آ گئے؟“

”میرے پاس اس پچھلے کی ایک چابی موجود رہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا اور اس سے آگے کچھ نہ بولی۔

جواب مختصراً تھا۔ میں سمجھ رہا کہ شاید وہ کچھ وضاحت کرنے اس کے پاس اس پچھلے کی چابی کیوں موجود رہتی تھی لیکن اس نے شاید جواب کی ضرورت محسوس نہیں کی یا پھر اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ آخر مجھے کتنا ہی برا نہیں لگتا تھا کہ میں کون ہوں کیا تھا پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟“

”میں میرا کی بیٹی بن ہوں۔“ اس نے آنسوؤں سے بھیجا بولی تو از میں جواب دیا۔

”وہ۔۔۔“ میں نے صرف اتنی ہی کہا اور میری کوشش کی کہ میرے چہرے سے حیرت کا اظہار نہ ہوئے۔ پانچ گھنٹہ پہلے مجھے تو یہ نہیں تھی کہ پرنس میرا بھی نازک اندام اور بری دیگر لڑکی کی بیٹی بن اس سے اتنی مختلف شخصیت کی الگ ہوئی تاہم یہ غلط میرے لیے کچھ ایسا نیا بھی نہیں تھا۔ بہت سی بہنوں یا بہن بھائیوں

یہ چاہوں گا کہ پولیس کی آمد اور ان کی پوچھ گچھ سے پہلے آپ میرے کچھ سوالوں کے جواب دے دیں۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔  
اس نے کچھ الجھن آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھا  
آہم اثبات میں سر ملایا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ اس وقت اس کی آنکھیں دیران اور چو زندگی کی تباہی و ناب سے محروم نظر آ رہا تھا۔

میں نے لانا تحت سے پوچھا: ”کیا آپ پہلے بھی انکرویش ز رات کو اس وقت اس جگہ پر نس میرا سے لئے آئی رہی ہیں؟“  
”نہیں۔“ اس نے جلا تامل جواب دیا ”مجھے میرا کے سگیتر نے فون کیا تھا۔ اس نے کچھ وضاحت تو نہیں کی لیکن مجھے سے وہ پریشان معلوم ہوا تھا۔ اس نے مجھے گامید کی کہ میں میرا کے پاس پہنچ جاؤں اور ہونے کو آج رات یہیں اس کے پاس میرا جاؤں۔ اس کے خیال میں آج میرا کو یہاں تھا چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ خصوصاً جب کہ آج کل اس کے پاس یہاں گیت پر فیناٹ کرنے کے لیے کوئی گاڑز فریو بھی نہیں تھا۔ یہاں جو گاڑز ہوا کرتا تھا اسے میرا نے چند دن پہلے کسی بات پر ناراض ہو کر ہٹا دیا تھا اور اس کے بعد دوسرے گاڑز کا بندوبست کرنے کا تردد بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے میرا کے سگیتر سے بہت پوچھا کہ کیا کوئی خطرے والی بات ہے؟ تو اس نے بس اتنا کہا کہ ایسے خطرے والی بات نہیں ہے کہ جس کے لیے مسلح گاڑز فریو کی ضرورت ہو بلکہ اصل خلو اس کی ذہنی و جذباتی کیفیت سے تھا۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ گویا وضاحت کے طور پر بولی  
”میرا بڑی سن مری۔ بڑی سرکش اور قتل مزاج لڑکی ہے۔ میرا مطلب ہے۔“  
”اس نے گویا ایک سسکی سی لے کر صبح کی۔ اس کے ذہن نے ابھی صحیح طور پر اس حقیقت کو قبول نہیں کیا تھا کہ میرا اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔“

میرا زہن اس کے پہلے بیانے میں الگ کر دیا گیا تھا۔ میں اس کی باقی باتیں زیادہ توجہ سے نہیں سن سکا تھا۔ پولیس میرا کی وجہ سے میرے ذہن کو پے در پے جو ہنگامے لگ رہے تھے اس نے ان میں ایک اور ہنگامے کا اضافہ کر دیا تھا۔ اگر میرا کا کوئی سگیتر بھی موجود تھا تو پھر اسے اخبار میں ”ضرورت رشتہ“ کا اشتہار دینے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر میں نے سوچا شاید سگیتر سے مراد وہی نوجوان ہو جسے غالباً اس اشتہار کے نتیجے میں منتخب کیا تھا اور جسے منتخب ہونے سے پہلے میں نے دو دو زہل اس وقت اسی ہنگامے کے گیت پر پہنچ دیکھا تھا جب میں یہاں سے رخصت ہوا تھا۔ مجھے ابھی طرح یاد تھا کہ اس نے اپنا نام کارمان دانش بتایا تھا۔

میں نے زیادہ حیرت کا اظہار کیے بغیر پوچھا: ”میرا کا سگیتر؟“

کیا نام ہے اس کا؟“  
”مستور منیر۔“ اس نے جواب دیا ”اس سے میرا کی اس

میں اتنا دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض اوقات اس کی بڑی وجہ شاید ان کے والدین کی غصہ منوں کا تشدد ہوتا تھا۔ کوئی ایک پتہ یا پتہ میں پہنچ جاتی تھی اور وہ سراپتہ یا پتہ باپ پر۔ اور اس طرح دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔  
میرا خیال ہے مجھے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”پولیس؟“ اس کے چہرے پر یکدم حشرات کے سامنے نمودار ہو گئے مسئلہ خواہ کتنا ہی سنگین ہو اور لوگ خواہ کتنے اور بار سونچنے سے تعلق رکھتے ہوں تب بھی پولیس سے واسطہ پڑنے کا تصور انہیں پریشان کر دیتا ہے۔ کیا پولیس کو بلانا ضروری ہے؟“

”میرا پر ہے۔“ میں نے قدرے حیرت سے کہا ”آپ کا تعلق ملک کے اہم اور دولت مند طبقے سے ہے۔ آپ کے طبقے کی ایک نمایاں لڑکی پراسرار حالات میں قتل ہو گئی ہے۔ ہم پولیس کو اس معاملے سے بے خبر تو نہیں رکھ سکتے اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں اور آپ یا غاصبان کے دو چار اور لوگ مل کر خاموشی سے پولیس میرا کی تحقیق کریں اور خاموشی سے ہی جا کر اسے دفن کر دیں۔“

”اگر خدا یا۔۔۔“ وہ ہوا میں گویا کسی غیر مٹی خوف ناک سی چیز کو دیکھ کر جبر جمعی لیتے ہوئے بولی ”پولیس نہ جانے کن کن زاویوں سے تفتیش کرے گی۔ اخبارات میں خبروں کا ایک سلسلہ چل پڑے گا۔ جس کا جہول چاہے گا، لکھنا شروع کرے گا۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگ منہ اکھائے ہمارے گمروں کی طرف تے لگیں گے۔“ اس کے لیے یہ سب تصورات گویا ناقابلِ برداشت تھے۔

”آپ جیسے لوگوں کے لیے ان مسائل سے منہا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے ہمدردی سے کہا ”میرا حال۔۔۔ اگر تھوڑی بہت مشکل پیش بھی آئی تو میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔ پولیس اور پولیس میں میرے تھوڑے بہت تعلقات ہیں جو آپ کو بہت سی غیر ضروری پریشانیوں سے بچا سکتے ہیں۔ میں ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کیا اس کے جواب میں آپ بھی مجھ سے کچھ تعاون کر سکتی ہیں؟“

”کیا تعاون؟“ وہ کچھ چوکی۔ میں اس کی آنکھوں میں صاف پتہ لگا تھا کہ اس کے ذہن میں پہلا خیال کیا آیا ہو گا۔ اس نے چپچپی سوچا تھا کہ میں اپنے تعاون کے جواب میں اس سے کچھ رقم حاصل کرنا چاہوں گا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس دور میں ہر صاحبِ حیثیت شخص کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سامنے آنے والا ہر شخص اس سے کچھ نہ کچھ انجانے کی گھر میں ہو گا۔

”پریشان نہ ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ اس دردمان میں اس نے کچھوں سے اپنے پس کی طرف بھی دیکھا تھا۔ میں صرف

# کائنات

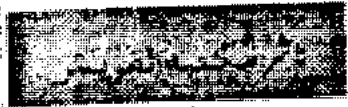
ایم اے راحت قیمت :- 100/-

پنس ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ  
درخشاں

انوار صدیقی

ایک عشق گزیدہ نواب زادے کی ہنگامہ خیز  
سرگذشت

حصہ اول :- 45/ حصہ دوم :- 45/



اردو بازار لاہور

مذہب آدمی معلوم ہوتے ہو۔

”میں اپنی شرافت اور شائستگی کے بارے میں زبانی کلامی تصدیق پر زیادہ یقین نہیں رکھتا۔ انسان کی زبان بدلنے کیا دیر لگتی ہے۔ خصوصاً انہیوں کے بارے میں۔۔۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”ویسے ہائے داووس۔۔۔ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے ابھی تک آپ کا کیا آپ کے شوہر کا نام نہیں پوچھا۔“

”میں داودہ پرویز ہوں۔ احمد پرویز کی بیوی۔“ اس نے گویا باہل خواست جواب دیا۔

اب میرے ذہن میں کچھ گھنٹیاں ہی تھیں۔ بہت سی بھولی ہری باتیں یاد آئے تھیں جو شاید اس لیے ذہن سے محو ہو چکی تھیں کہ آج سے پہلے وہ میرے لیے اہم نہیں تھیں۔ احمد پرویز کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ شہر کا ممتاز صنعت کار تھا۔ دو زحائی سال پہلے تک وہ جمہور آف کامرس کا صدر بھی رہا تھا۔ دو مار مرتبہ اس سے بہت سرسری سی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ رات کسی نے اس کا اور میرا تعارف بھی کرایا تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس نے مجھے ذرا سی بھی اہمیت نہ تو رکھنا میری طرف مہملتی سی توجہ بھی نہیں دی تھی۔

طرح یا قاعدہ رسوم کے ساتھ تو ممکن نہیں ہوئی تھی جس طرح کنواری لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے دو مرتبہ کی طلاق یافتہ لڑکی کے معاملے میں اس طرح کے تعلقات تو نہیں کیے جاسکتے تھے لیکن میرا کی تیری شادی کی بات اس سے کچی تھی۔“

”کب سے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”سات تھو بیسویں سے۔“ اس نے جواب دیا۔

میرا کی شادی کی بات مفرد سیرتانی کسی شخص سے ملے تھی اور وہ شوہر کی تلاش کے لیے اشتہار دے رہی تھی اور وہ شوہر اسے عارضی طور پر۔۔۔ غالباً مہینے دو مہینے کے لیے درکار تھا۔ اگر اس معاملے کا علم مفرد سیرت کو تھا تو اسے پریشان ہی ہونا چاہیے تھا۔

”مفرد سیرت نے تو آپ کو یہاں بھیجے کی وجہ نہیں بتائی۔۔۔ لیکن آپ کو خود کچھ اندازہ نہیں ہو سکا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے آستلی سے نفی میں سر ہلایا ”اہلہ میں دوچ معلوم کرنے ہی یہاں آئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیلی میں پھر کوئی اسکیٹل تو کھڑا نہیں ہو رہا؟ ہم لوگ نہیں چاہتے کہ اب ہماری جیلی کا پرہیز میں کوئی ذکر آئے۔ اخباریوں رسالوں میں ہمارے بارے میں چٹکارے دار انداز میں باتیں چھپیں۔ شاید ہم اب کسی اسکیٹل کے قتل میں مشغول ہو سکتے۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ۔۔۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کمرے میں ایک لمبے کے لیے گھرا سکتا چھایا جس میں موت کی سوگاری بھی شامل تھی۔ میں نے اسے بات مکمل کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ”آپ کچھ کہہ رہی ہیں۔“

اس نے گویا میری بات غلطی ہی تھی۔ وہ جیسے کسی اور سی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر ہوا میں نہ جانے کس غیر ملکی چیز کو تک رہی تھیں۔ اس کا ذہن نہ جانے کن اندیشہ ہائے دور دراز میں الجھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک اندیشہ الفاظ کی صورت میں آخر کار اس کی زبان پر آئی کیا ”میں جاہری تھی کہ

میرے شوہر یہاں آکر فیصلہ کرتے کہ ہمیں میرا کے قتل کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ تاکہ ہم اپنے مسئلے پر خود غمت لگیں؟ میرے شوہر خود ہی پولیس کو اطلاع دے دیں گے۔“

”یہ آپ نے اچھی کی۔“ میں نے ہنستے ہوئے لیے میں کہا ”میں یہاں سے چلا جاؤں تاکہ بعد میں پولیس مجھے ہی اس قتل کے الزام میں گرفتار کرنے پہنچ جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری عدم موجودگی میں یہاں میرے لیے کوئی پسند اچھا ہو جائے۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ وہ بے تابی سے بولی ”یہاں بھلا کیوں ہونے لگا؟ ہمیں تم سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔ مجھے یقین چھایا ہے کہ تمہارا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم ایک شریف اور

اسی ہال میں ایک دیوار گیر فون موجود تھا۔

میں نے رجم محل کے تھانے کا نمبر ملایا لیکن پتا چلا کہ اس وقت وہ دیوبلی پر نہیں تھا۔ مگر فون کیا تو اس کے ملازم نے بتایا کہ وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اب تو اس نے اپنے خرچ پہ موبائل فون بھی لے لیا تھا اور اسے چوں کہ چوبیس گھنٹے اپنے آپ کو دیوبلی پر ہی رکھنے کا شوق تھا اس لیے اس سے موبائل فون پر بھی رابطہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اپنی منگی سی ایکٹر ایک فوٹ بک میں اس کے موبائل کا نمبر دیکھ کر ملایا تو اس نے فوراً ہی فون ریسیو کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ منہ چلا رہا تھا۔ نہایت خفیف سی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا۔

”کہاں ہو اس وقت؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے ایک رستوران کا نام بتایا جو اس کے تھانے سے زیادہ مائلے پر نہیں تھا۔ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔  
”یقیناً اس وقت کہاں تھا رہے ہو۔“ میں نے کہا ”جنگلی کرنے کی سی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔“

”قدرت نے تمہیں غیر معمولی حیات دے کر اچھا نہیں کیا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”تم جیسے اونٹھے انسانوں کے پاس ایسی صفات نہیں ہونی چاہئیں۔“

”میری صلاحیت پر حقیرت کرنا اور اسے اپنے تھانے کی عمل داری میں آنے والی کوئی شے مت سمجھو۔ قدرت جو کرتی ہے، بہتر کرتی ہے اور تم جیسے گدھوں سے پوچھ کر نہیں کہتی۔“ میں نے کہا ”نی الحال تم بتا سکتی ہو اچھے ہو ای پر اکتفا کرو اور ممبر شکر کے ساتھ یہاں آ جاؤ۔“

میں اسے ایڈریس بتانے ہی لگا تھا کہ وہ میری بات کاٹ کر بولا ”خیریت تو ہے؟“

”خیریت کے عالم میں پولیس والوں کو فون کوئی گدھائی کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔۔۔ میں تو بھولی گیا تھا کہ تم جیسے منحوس آدمی سے کوئی خبر کی خبر بھلا کیسے مل سکتی ہے۔“ وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”فیروز۔۔۔ جب بری خبر کی خیریت سننے کو مل جائے تو پھر بری خبر کو بھی جتنی جلد سن لیا جائے اتنی ہی بہتر ہے۔ کوسہ کیا خبر ہے؟ کیا تم نے کوئی گل کھلا دیا ہے؟“

”نہیں۔ یہ فریضہ کسی اور نے انجام دیا ہے۔ تم نے بھی پرنس سیرا کا نام سنا ہے؟“

”نہیں نہیں۔ ایک خاص طبقے میں تو وہ بڑی مشہور شخصیت ہے۔ مجھے تو خود اس سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے ملنے کا کوئی بہانہ بن جائے تو اچھا ہے۔ کیا اس نے کوئی محل کھلا دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہو جائے گی۔“ وہ قدرے پرجوش انداز میں حیرت سے کہتا چلا گیا۔

ایک لمبے کے لمبے صبرے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا چبھتا صورت حال کی افرنگی اور بوجھل پن سے بچنے کے لیے اس پر بھی رجم محل کے ساتھ نوک جھونک کے سارے خود کوئی کی کوشش کر رہا تھا۔ موت ایک بد صورت حقیقت تھی۔ خرس اور دیوبلی کی موت۔! میرے نظرس پڑانے سے یہ موت تو نہیں کتنی بھی پر بھی میں گویا اس سے نظر پڑا نہ تھا۔ بظاہر مجھے معلوم تھا کہ پرنس سیرا کو قتل کر دیا گیا تھا اور میں گل کو اسی واقعے کی اطلاع دے رہا تھا لیکن اپنے دل کو میں خود فریبی میں جھٹا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ ایسی کوئی نہیں تھی۔ یہ محض ایک پادشاه کو خواب تھا جس میں اس طفل تسلیم سے تو خواب حقیقت بن جاتے ہیں اور حقیقتی خوابوں میں ڈھلتی ہیں۔ میرے حلق میں گویا کوئی چڑی رہی تھی۔ میں نے اسے نکلنے ہوئے حتی الامکان ٹھٹھکیا۔ ”نہیں۔۔۔ پرنس سیرا نے کوئی گل نہیں کھلایا۔ وہ جتنے کم سکتی تھی کھلا چکا۔ اب وہ گل کھلانے کی پوزیشن میں نہیں۔ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

”اوہ نو۔۔۔“ اس کی سرسراہٹ سی آواز فون پر ابھری۔ ایک دم خاموش ہو گیا۔

”تمہیں اس سے ملاقات کا موقع مل گیا لیکن افرار۔۔۔ کوئی اچھا موقع نہیں ہو گا۔“ میں نے اس اطلاع کے بوجھل کم کرنے کی کوشش کی۔

وہ شاید چند سیکنڈ اس وقت میں سنبھل چکا تھا اور آہٹا تھا کہ اس کا اصل کردار ایک ڈتے وار پولیس آفیسر کا غیر مہذبانی اور قدرے چورانہ سے لہجے میں بولا ”قتل کیا ہے؟“

”کلشن کے ایک بنگلے میں اس نے اپنا آرٹ اسٹوڈیو کھولا تھا۔ وہ یہاں اکیلی تھی۔ کسی نے اس کے سر پر پتھر کا ایک ٹکڑا کر اسے ہلاک کیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اور تم وہیں موجود ہو؟“ وہ تیز لہجے میں بولا۔

”ظاہر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کسی چیز کو چھیڑنا مت۔۔۔ اس نے تاکید کی۔

”میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”براہمحق اپنے بارے میں یہی کہتا ہے۔“ وہ غراٹا۔

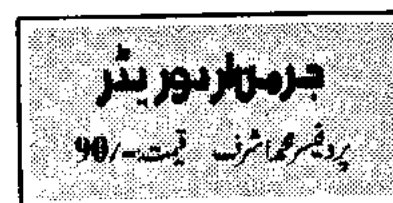
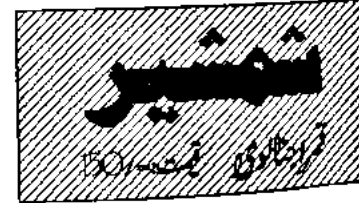
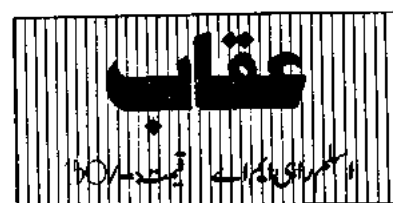
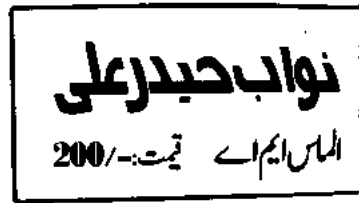
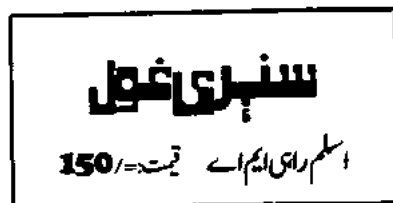
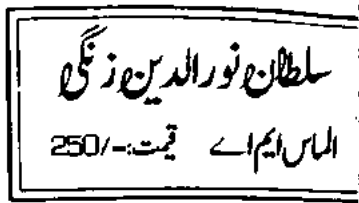
احتمال ہی نہیں بلکہ اول درجے کے منحوس بھی ہو۔ مجھ کی بددعا ہے یا تم پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ خدا کے لیے کہ

کال یا پیر فقیر سے مل کر اپنی نخواست دور کر دو۔ وہ دل

جب بعض جرائم پیشہ کسی خوب صورت لڑکی کو قتل کرنے

خود اچھے باپوں ہلانے کے بجائے تمہاری خدایات حاصل

گئے۔ تم جس لڑکی سے جا کر ملو گے وہ خودی قتل ہو جائیگا۔





اسی ہل میں ایک دہرا گہر فون موجود تھا۔

میں نے رحیم گل کے تھانے کا نمبر لایا لیکن پتا چلا کہ اس وقت وہ دیوٹی پر نہیں تھا۔ گہر فون کیا تو اس کے ملازم نے بتایا کہ وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اب تو اس نے اپنے خرچ پہ موبائل فون بھی لے لیا تھا اور اسے چل کر چھپیں گئے اپنے آپ کو دیوٹی پر ہی سمجھنے کا شوق تھا اس لیے اس سے موبائل فون پر بھی رابطہ کرنے میں کوئی خرچ نہیں تھا۔ میں نے اپنی ہنسی سی ایگزٹیک نوٹ بک میں اس کے موبائل کا نمبر دیکھ کر لایا تو اس نے فوراً ہی فون ریسو کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ منہ چلا رہا تھا۔ نہایت خفیہ سی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا۔

”کہاں ہو اس وقت؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے ایک ریسٹوران کا نام بتایا جو اس کے تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔

”یقیناً اس وقت کھانا کھا رہے ہو۔“ میں نے کہا ”جگالی کرنے کی سی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔“

”قدرت نے تمہیں غیر معمولی حیات دے کر اچھا نہیں کیا۔“ وہ لٹھنی سانس لے کر بولا ”تم جیسے اوجھے انسانوں کے پاس ایسی منافات نہیں ہونی چاہئیں۔“

”میری صلاحیت پر حیرت کرو اور اسے اپنے تھانے کی عمل داری میں آنے والی کوئی نئے سٹ سمجھو۔ قدرت جو کرتی ہے بہتر کرتی ہے اور تم جیسے گدھوں سے پوچھ کر نہیں کرتی۔“ میں نے کہا ”نی الحال تم جتنا بھی کھا چکے ہو اسی پر اکتفا کرو اور ممبر شکر کے ساتھ یہاں آ جاؤ۔“

میں اسے ایڈریس بتانے ہی لگا تھا کہ وہ میری بات کاٹ کر بولا

”خیریت تو ہے؟“

”خیریت کے عالم میں پولیس والوں کو فون کوئی گدھائی کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم جیسے محسوس آدمی سے کوئی خیر کی خبر بھلا کیسے لی سکتی ہے۔“ وہ ایک اور لٹھنی سانس لے کر بولا ”خیر۔۔۔ جب بری خبر کی تہدید مٹنے کو مل جائے تو پھر پری خبر کو بھی جتنی جلد مل لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ کھو۔۔۔ کیا خبر ہے؟ کیا تم نے کوئی گل کھلا دیا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ یہ فریڈر کسی اور نے انجام دیا ہے۔ تم نے بھی پرنس سیرا کا نام سنا ہے؟“

”کیوں نہیں۔ ایک خاص طبقے میں تو وہ بڑی مشہور شخصیت ہے۔ مجھے تو خدا اس سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے ملنے کا کوئی بہانہ بن جائے تو اچھا ہے۔ کیا اس نے کوئی گل کھلا دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب بھی کوئی مصلحت نہیں۔ اس بوائے اس سے ملاقات ہو جائے گی۔“ وہ قدرے پرجوش انداز میں خیر، سے کہتا چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا بچھا صورت حال کی انفریگ اور بوجھل پن سے بچنے کے لیے اس پر بھی رحیم گل کے ساتھ نوک جھونک کے سارے ذوق کوڑھ کی کوشش کر رہا تھا۔ موت ایک بد صورت حقیقت تھی۔ ذہن اور جوتانی کی موت۔۔۔! میرے نظریں پڑانے سے یہ دھم تو نہیں سکتی تھی پھر مجھ میں گویا اس سے نظریں اٹھا چاہتا پھر مجھے معلوم تھا کہ پرنس سیرا کو قتل کر دیا گیا تھا اور میرے گل کو اسی واقعے کی اطلاع دے رہا تھا لیکن اسے دل کو خود فریبی میں جھلا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اسی کو نہیں سمجھی۔ یہ شخص ایک ناخوش گوار خواب تھا لیکن اس لٹھنی تسلیوں سے نہ تو خواب حقیقت بن جاتے ہیں اور حقیقتی خوابوں میں ڈھلتی ہیں۔ میرے مطلق میں گویا کوئی چیز رہی تھی۔ میں نے اسے ننگے ہوئے حتی الامکان ٹھٹھکی نہیں۔ پرنس سیرا نے کوئی گل نہیں کھلایا۔ وہ جتنے سکتی تھی کھلا چکی۔ اب وہ گل کھلانے کی پوزیشن میں نہیں اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

”اوہ فوس۔۔۔“ اس کی سرسراہٹ سی آواز فون پر ابھری ایک دم خاموش ہو گیا۔

”تمہیں اس سے ملاقات کا موقع تو مل گیا لیکن انفریگ کوئی اچھا موقع نہیں ہو گا۔“ میں نے اس اطلاع کے بوجھل کم کرنے کی کوشش کی۔

وہ شاید چند سیکنڈ کے اس رفتے میں سنبھل چکا تھا اور آگیا تھا کہ اس کا اصل گوار ایک ڈنٹے وار پولیس آفسر کا غیر جذباتی اور قدرے پیشہ ورانہ سے لےجے میں بولا ”قتل کما ہے؟“

”کلشن کے ایک جھگے میں اس نے اپنا آرٹ اسٹوڈیو تھا۔ وہ یہاں اکیلی تھی۔ کسی نے اس کے سر پر پتھر کا ایک ٹکڑا اسے ہلاک کیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اور تم کہیں موجود ہو؟“ وہ تھکے میں بولا۔

”ظاہر ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کسی چیز کو جھینڈنا مٹ۔۔۔ اس نے آکھیدی۔“

”میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”برا حق اپنے بارے میں یہی کہتا ہے۔“ وہ فرمایا ”حق ہی نہیں بلکہ اوّل درجے کے محسوس بھی ہو۔ مجھ صورت لڑکی سے ملتے ہو وہ قتل ہو جاتی ہے۔ شاید یہ جتنا کی بد دعا ہے یا تم پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ خدا کے لیے کہ کال یا ایئر فیئر سے مل کر اپنی محنت دور کرنا اور نہ وہ دن جب بعض جراثیم پیشہ کسی خوب صورت لڑکی کو قتل کرنے خود آتھ پائوں ملانے کے بجائے تمہاری خدمات حاصل کیا۔ تم جس لڑکی سے جا کر ملو گے وہ خود ہی قتل ہو جائیگا۔“

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "کر پکے کو اس... یا ابھی اور  
وز کرو گے؟"

"یہ بکواس نہیں" ایک فکر انگیز حقیقت ہے۔ آج نہیں تو کل  
میں اس سیکڑے رنجیدگی سے سوچتا ہوں گا۔ ستر ہے آج ہی سوچ لو  
ورنہ کبھی نہ کبھی تم کسی لڑکی کے قتل کے الزام میں خود اندر ہو جاؤ  
گے۔ آخر میرا دوست ہوتا تمہارے کب تک کام آئے گا؟" وہ  
اب وہی رجم کل بننے کی کوشش کر رہا تھا جس سے میری نوک  
جھوک پلٹی رہتی تھی۔

میں پہلے بھی اس حقیقت کی طرف تمہاری توجہ دلا چکا ہوں  
کہ کئی حسین لڑکیوں سے میری میٹروں بلکہ برسوں سے میل ملاقات  
ہے اور وہ آج بھی اہلی کئی ہیں۔ یہی نہیں "ان میں سے بعض تو میری  
عقارہ سے موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ جا چکے ہیں۔ اور جہاں  
تک اس بات کا سوال ہے کہ تمہارا دوست ہوتا میرے کب تک  
کام آئے گا۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قسم کی خوش  
فضیوں میں کیوں جلا ہو جاؤ ہو۔ محض ایک ایسا لڑکا ہو کر تمہیں مجھ  
سے اس قسم کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں  
تمہارا چالوہ واپس اندرون سندھ کر دوں؟"

"تم میرا چالوہ بند میں کر داتے رہتا۔ میرا خیال ہے نی  
الہال تو میں اگر پہلے تمہیں پر نسیس میرا کے قتل کے الزام میں اندر  
کر تا ہوں، خواہ قاتل بھی جائے واردات پر موجود ہی کیوں نہ ہو۔

واضح رہے کہ یہ بات میں دانت نہیں کر کہہ رہا ہوں۔" وہ بدستور  
غزائے سے سے انداز میں بولا "زرا چالوہ سے ایڈریس لکھو آؤ۔"  
میں نے ایڈریس لکھوایا اور اس نے فوراً فون بند کر دیا۔ میں  
نے بھی ریسیور ہک پر لٹکا دیا اور واحدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ  
بدستور آنکھیں بند کیے چڑی تھی اور گمری گمری سانسیں لے رہی  
تھی۔ غیبت یہ تھا کہ اس کے ہونٹ نیم وا تھے اس کے دانت  
لنگھتی کیفیت میں سختی سے پیچھے ہوئے نہیں تھے۔

میں نے کچن تلاش کیا جہاں فریج موجود تھا۔ میں ایک گلاس  
میں تھوڑا سا لٹھڑا پانی لے کر واحدہ کے پاس واپس پہنچا۔ میں نے  
ابھی اس کے چہرے پر ایک باری چھینے مارے تھے کہ اس نے جھر  
جھری سی لے کر آنکھیں کھول دیں تاہم آنکھیں دھندلائی ہوئی سی  
تھیں۔

"آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں مسز ریڈ؟" میں نے ہمدانہ  
مجھے میں کہا "اگر آپ کہیں تو میں آپ کے لیے ڈاکٹر کو بلا دوں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا تاہم خود ہی ذرا کوشش سے اٹھ کر  
بیٹھ گئی۔ اب تک گرا اسے یاد نہیں آیا تھا کہ وہ کیوں بے ہوش  
ہوئی تھی لیکن اب یاد آیا تو اس کے چہرے پر ڈر لے کے سے آثار  
نمودار ہوئے اس نے صرف ایک نظر اپنی ہن کی لاش کی طرف  
دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چسپاں کیا۔ اس کے ہنم پر کبھی سی  
ٹاری تھی۔ میرے لیے اندازہ نہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے وجود

سپنس ڈائجسٹ کا  
مقبول ترین  
سلسلہ

دش

ایک عشق گنبد نواب زادے کی  
ہنگامہ خیز سرگزشت -  
تین دوستوں کا قصہ جن کے غم اور  
سے طوفان شکست کھا گئے تھے

لازوال کمائیوں کے خالق  
انوار صدیقی  
کے پراسرار تلم  
دو جلدوں میں  
حصہ اول ۲۵% حصہ دوم ۷۵%  
شمار مکتبہ القریۃ  
لاہور بازار لاہور

ہے لیکن قریب جانے پر وہ شیطان دھک ہے۔ کسی کا ایچ شیطان کا ہوتا ہے مگر اگر دوسرے وہ فرشتہ ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ میرا بہت نیک پارہ اور دین دار لڑکی تھی لیکن وہ دیکھی بھی ہر حال میں تھی جیسی اسے سمجھا جاتا تھا۔ وہ عیاش ہرگز نہیں تھی۔ اس نے بیٹھ اپنی حدود میں رہ کر زندگی گزار لی اور اپنے شوہروں کے ساتھ ٹھہر رہی۔ اس کی بد قسمتی تھی کہ شوہروں کے ساتھ اس کی نہیں بن سکی۔ میں اس کی بچی زندگی سے کافی اچھی طرح واقف ہوں۔ کا دعویٰ کر سکتی ہوں۔ اپنے دونوں شوہروں کے سوا اس کے کبھی کسی سے مراسم نہیں رہے۔ اس جتنی دولت اور آزادی و خود بخاری کسی اور لڑکی کو حاصل ہوئی تو اس کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔

وہ ایک بار بحر ایک لمبے کے لیے خاموش ہوئی اور یوں میری طرف دیکھنے لگی جیسے اطمینان کر رہی ہو کہ میں اس کی بات کا یقین بھی کر رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اپنے چہرے پر خفیہ الامکان ہمدردانہ تاثرات رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے سلسلہ کلام جوڑا "وہ فیروزتے دار" ضدی یا سرکش بھی نہیں تھی۔ بات بس اتنی تھی کہ اس کی ترجیحات دوسروں سے ذرا مختلف تھیں اور اس نے اپنا ایک الگ لائف اسٹائل بنایا ہوا تھا۔ جن کو اس کے لائف اسٹائل سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ اسے طرح طرح کے نام دیتے تھے لیکن یہ اپنے آپ میں گھن رہتی تھی۔ کسی کی پدا نہیں کرتی تھی۔ جیسی یہ گھن کر حیرت ہو گی کہ وہ چپکے چپکے نہ جانے کتنے غریبوں کی مدد کرتی تھی۔ کتنی یواؤں کے اس نے دیکھے ہاندھ رکھے تھے۔ کتنی ہی غریب لڑکیوں کی اس نے خود پس منظر میں رہے ہوئے شادیاں کرائی تھیں۔ ہمارے طبقے میں غلامی کام زیادہ تر دکھاوے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ کوئی تنگم صاحبہ تنگم بنا کر اس کے چہرے سے یواؤں کو چند غلامی پیشین بھی دیتی ہیں تو پورے پرس کو جمع کر کے تصویریں کھینچواتی ہیں اور وہ تصویریں جب تک اخباروں میں نہیں چھپیں "انہیں چین نہیں آتا لیکن میرا کسی غلامی تنگم کی مددے دار تو کیا" رکھ بھی نہیں تھی۔ اس کے ان کاموں کا اس کے قریبی لوگوں کو بھی علم نہیں ہوتا تھا۔ اخبارات میں ان کا تذکرہ آتا تو دور کی بات تھی۔"

سکس کے سے انداز میں ایک گہری سانس لے کر وہ پھر ویلی معذرت کے کاموں کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ معلوم نہیں قدرت کو اس کی کون سی ارا پسند تھی۔ وہ چپکے چپکے لوگوں کی امداد کے لیے جتنی رقم خرچ کرتی تھی اس کی دولت میں کسی نہ کسی ہائے اتاری اضافہ ہونا رہتا تھا۔ وہ دولت کے بارے میں جتنی بے پروا تھی دولت اتنی ہی اس کی طرف کشش پل آتی تھی۔

وہ جو کچھ بتا رہی تھی۔ میرے لیے کسی بھی حد تک میرا کی غصیت کا ناقابل یقین پتلوی تھا مگر زیادہ ناقابل یقین نہیں۔ میں کسی کے بچھلے ظاہری ایچ پر زیادہ یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ گویا مجھے

در حقیقت آنسوؤں کا ایک سیلاب تنید تھا جسے وہ روکنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے زیادہ اذیت میں مبتلا تھی۔ میں نے لافٹ سے کہا "آپ اپنے آنسوؤں کو نہ روکیں۔"

آپ کا دلے کوئی پادہا ہے تو ضرور رو لیں۔" بعض اے کو کسی طرف سے اسی شور سے کا انتظار تھا۔ بعض بات کسی کے چند معمولی الفاظ سے کسی کے ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس کے جسم کو کتنی تھکا ہوا انداز میں جھٹکے گئے۔ گلے میں خاموشی سے ایک طرف منتظر رہا۔ آنسوؤں کا سیلاب جتنا شدید تھا اتنی ہی تیزی سے گزر گیا۔ جلدی اس کے جسم کو جھٹکے لگتا بند ہو گئے۔ آنسو بھی ختم ہو گئے اور وہ کافی دیر تک پرسکون ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس کا اس سے صحرا۔ اس نے اس میں سے کئی نشتر ہچکٹائے اور اپنا وہ خوبو پھیلایا۔

بعض اوقات اپنے دکھ کے بارے میں کسی سے بات کرنے سے بھی بل بلکا ہوتا ہے۔ "میں نے لافٹ سے کہا "میں آپ کے لیے ابھی کسی۔ ہر حال انسان ہوں۔"

اس نے حورم سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس دنیا میں اکثر انسانوں کو صرف انسانیت کے رشتے پر ہی مجبور سا کھڑنا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فوری ضرورت کے وقت وہ لوگ میر میں ہوتے جن سے آپ کے خون کے رشتے ہوتے ہیں یا کوئی گرا جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ ایسے میں صرف انسانیت کا رشتہ کام آتا ہے۔

اس وقت شاید اسے بھی یہ رشتہ قیمت محسوس ہوا اور وہ آنسوؤں سے جھلکی توازن میں ہوئی مکیا تم میرا کو بہت اچھی طرح جانتے تھے؟

"نہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا "میں اس سے برسوں ہی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور وہ کسی حد تک سرکشی کی ملاقات تھی۔"

وہ نہ پھر کر ہوا میں کسی غیر ملکی چیز کو سمجھنے لگی۔ اس کی توازن سے کس دور سے آئی محسوس ہوئی "میرا کو کوئی بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ لوگوں نے اس کے بارے میں طرح طرح کے غلط فہمے مشہور کر دیے تھے لیکن درحقیقت وہ سب کے اندازوں سے بہت غلط تھی۔ کوئی اسے قیاس کوئی توازن کوئی غیر ہائے دار کوئی ضدی دوسرے اور کوئی بکری ہوئی مغرب زدہ خواب زادی سمجھتا تھا لیکن درحقیقت وہ ان سب قصورات سے بہت غلط تھی۔"

ایک لمبے کے لیے خاموش ہو کر اس نے سکس کی لی پھر ویلی "وہنا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا ایچ کچھ اور ہوتا ہے لیکن اگر آپ کو ان کے قریب ہوںے کا موقع ملے تو آپ چلا ہے کہ حقیقت میں وہ کچھ اور طرح کے ہیں۔ کسی کا ایچ فرشتے کا ہونا

زیادہ یقین دلانے کے لیے زور دے کر بولی "یہ مت سمجھنا کہ میں اپنی بہن کی محبت میں اگر ایسا کرتا ہوں تو اس کی پھولی پھولی خیروں کو بڑا بنا کر پیش کر رہی ہوں یا اسے افسانوی شخصیت بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی میں تو خود میری بھی اس سے بھی نہیں تھی۔ میں بھی اسے صحت مند کرنے والوں میں ہی شامل رہی اور اس میں میری ہی زیادہ غلطی تھی۔ میں نے بھی اسے بڑی بہن جیسی شفقت اور محبت نہیں دی۔ اب یہ سمجھنا تو زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا۔ میرے تمام تر خراب رویے کے باوجود اس کے رویے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ میرے لیے دیکھی ہی نہیں کبھی مٹوب اور ہر بات پر سر نہکا دینے کی عادی رہی جیسے کسی پھولی بہن کو ہونا چاہیے۔"

اس نے ایک بار پھر سسکی سی لی اور ٹھوہرے سے ناک بو چھی۔ وہ اب میرا کی لاش کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس سے نظر اٹھا رہی تھی۔ شاید اب اس میں اس طرف دیکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

اچانک اسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ ذرا چونک کر بولی "میرا خیال ہے تم نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے یہ بھی تم اتنے مطمئن نظر آ رہے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "آپ کو اس سلسلے میں بریٹان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو پولیس آفیسر یہاں آ رہا ہے وہ بہت سیکھا ہوا اور دانت دار انسان ہے۔ وہ اس معاملے کو بے ڈھنگے طریقے سے پھنسل نہیں کہے گا۔ آپ کی فحش کے بارے میں کوئی اسکینڈل نہیں بنے گا۔"

اس کے چہرے پر یک دم خوف کے جو سائے ابھر آئے تھے میرے تشفی آمیز الفاظ سے وہ کچھ کم ہوئے۔ وہ تھوڑا نکل کر بولی "میرے شوہر کو بھی بلا دو۔ پولیس کی آمد کے موقع پر ان کا بھی موجود ہونا ضروری ہے۔ ان کے موبائل فون کا نمبر۔"

وہ ہنسنے لگی تو میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا "میلے پولیس کو آجانے دیجئے وہ خود جس کو مناسب سمجھیں گے، بلا نہیں گئے۔ آپ بہر حال اطمینان رکھیں۔ آپ کو کوئی بریٹانی نہیں ہوگی۔ پولیس کے آنے تک وقت گزارنے کے لیے مجھے میرا کے بارے میں کچھ اور بتائیں اس طرح آپ کے دل کا بوجھ کچھ اور ہلکا ہوگا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس کی دو ناکام شادیوں کے بارے میں بتائیں۔"

اس نے ایک لمحے سوچا پھر شاید اسے میرا مشورہ معقول محسوس ہوا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ کمزور سی آواز میں بولی "دو شادیوں کی ناکامی ہی نے تو میرا کالج سب سے زیادہ خراب کیا۔ میرا جیسا لائف اسٹائل اور میرا جیسی شہرت رکھنے والی کسی بھی لڑکی کی شادی اگر ناکام ہوتی ہے تو اس کے بارے میں فوراً فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ صرف لڑکی ہی ہوگی۔ شوہر کے

بارے میں تو اکثر لوگوں کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا اور نہ یہ شخصیت زیر بحث آتی ہے۔"

"پرنس میرا کا پلا شوہر کسی غلطی ریاست کا شکار میں نے تصدیق چاہی۔"

"ہاں۔" اس کے لیے میں یک دم سختی چھٹی اور اس کے کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک انجینی ماحول میں اس شہزادوں کے ساتھ زندگی گزارنا کسی لڑکی کے لیے ناپائیدار اور دل گردے کا کام ہے۔ وہ میرا کے ساتھ آکسفورڈ میں تو گزرا اس کی کوئی اور سی شخصیت سامنے تھی۔ میرا اس بیاہ کر اس کی ریاست میں اس کے پیس میں جلی مٹی تو گھسائی ہی پرنس اس کے سامنے آگیا۔ اس کے سارے خواہ رو مانوس دھرا رہ گیا۔ اس کے باوجود میرا نے گوارا کرکے کوشش کی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایک عورت سے شاید یہ کامل بہت جلد بھر جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے مجموعی طور پر ہو لیکن کم از کم میرا کے شوہر کا معاملہ تو یہی تھا۔ جس نے اسے چاڑ سے بیاہ کر لے گیا تھا "ایک سال بعد ہی گواہ اس میرا میں کوئی کشش نہیں رہی۔ اس کی یہ بھی لڑائی تھی ہاں نہ رہے۔ اور اس سب کے باوجود اس نے صرف ایک بعد دو سری اور ذریعہ سال بعد تیسری شادی کرلی۔ میرا چون چاں کی تو اترا تارے وغیرہ کے مطابق کچھ دولت و جائیداد کاغذات اسے تھا کہ طلاق دے کر چلا کر گیا۔ مگر کے طور پر دولت و جائیداد وہ پہلے ہی دے چکا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں تو شادی کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ کا دوبارہ مسائل کی انہیں بھی نہایت فہرہ زبانی انداز میں سناتے ہیں۔ میرا آئینہ دل ازم دھرا رہ گیا۔"

"اس کی دو سری شادی غالباً کسی اداکار سے ہوئی تھی۔ لے ذرا انجان بننے ہوئے پوچھا۔ ویسے یہ حقیقت بھی تھا کہ اس کے بارے میں بہت زیادہ معلومات تو نہیں تھیں۔"

"ہاں۔۔۔ ایک تھوڑا کلاس اور ناکام اداکار۔" اس کے لیے میں بے پناہ ناگواری سے آئی "مگر شکل صورت اچھی تھی اور اس پر بلا کی معصومیت طاری رہتی تھی۔ ج سا گیا کہ زبان بڑے غصے کی پالی تھی۔ جیسی جیسی باتوں کسی کو بھی شیشے میں اتار سکتا تھا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ "زبردست" خیروں کے باوجود وہ زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب لڑکی کا دوبارہ ذاتی پردہ کشن، غرض یہ کہ کسی بھی میدان کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تھی کہ وہ میرا جیسی لڑکی تک پہنچنے اور شادی کے لیے شیشے میں آگاتے میں کامیاب ہو گیا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرا اس وقت دل شکستہ اور احساس غمناکی کا شکار تھا۔ طلاق کے بعد سے اس کے اندر ایک ٹوٹتی ہوئی جھلک چھلکا

عمران نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

”اس کا نام عمران تھا؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟“ واجدہ نے دریافت کیا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا ”میں نے شاید صرف ایک توہ

مرتبی وی پر دیکھا ہے۔“

”زبردست سفارش کے باوجود وہ اپنی بد اعمالیوں کے سبب

وہاں بھی نہیں چل سکا۔ سیرا کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اس کا یہ

انتخاب پہلے سے بھی زیادہ خراب تھا۔ عمران کی سب سے بڑی

خرابی اس کی لالچی فطرت اور دھوکے بازی کی عادت تھی۔ وہ ہر

شخص سے فراڈ کرتا تھا، ہر ایک کو شکار سمجھ کر ذبح کرنے کی کوشش

کرتا تھا۔ بیوی کے نام پر نہ جانے کس کس سے لاکھوں کے فراڈ

کرتا تھا اور ستم خیزی یہ تھی کہ یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ وہ لاکھوں

دو بے جاتے کہاں تھے؟ وہ ہمیشہ تلاش کا تلاش ہی رہتا تھا۔ شادی

سے پہلے اس کے جو فحاش بات نظر آتے تھے وہ جعل سازی اور

دھوکے بازی کے ذریعہ منت ہوتے تھے اور شادی کے بعد جو فحاش

بات رہے وہ سیرا کی بدولت سب سے اس قسم کے لوگوں کو برداشت

کرتا سیرا کی فطرت میں نہیں تھا اس لیے یہ شادی بھی زیادہ عرصے

نہیں چلی سکی۔ سیرا نے اسے کچھ دے دلا کر اس سے خود جان

چھڑائی لی۔“

واجدہ نہایت افسردگی سے مسکرائی اور ایک لمبے کے وقف

سے بولی ”تم سے انسانوں کو خدا مت نوازنا ہے۔ ان کی زندگی

وہ سبوں کے لیے قابل رشک ہوتی ہے لیکن خدا ان کی ذات میں کوئی

ایسی عقلی رکھ دیتا ہے جو زندگی بھر ان کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ سیرا

کی بھی یہ بد قسمتی رہی کہ اسے سب کچھ میرا اور اس نے زندگی

بھی اپنی مرضی سے بسر کی۔ اپنا ہر فیصلہ خود کیا لیکن اسے اپنے

آئیڈیل کے مطابق کوئی شخص اور بے غرض رشتہ جیات نہیں مل

سکا۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ شاید اس کی عقلی یہ تھی کہ اس

نے اس معاملے میں کبھی باپ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں

سمجھی یا یہ معاملہ ان پر نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنی آزادی و

خود مختاری سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس

معاملے میں باپ کو خاطر میں نہیں لائی۔ شاید قدرت نے اسے اس

بات کی مزا دی۔ اس نے اپنی زندگی کی ان دو بڑی ٹھوکروں سے

سبق حاصل کیا تھا اور اب وہ بہت بدل چکی تھی۔ ہماری والدہ تو

ہماری کم سن سی عورت تھیں۔ سیرا نے عہد کیا کہ اب وہ زندگی

کے ہر معاملے میں والدہ کی رائے کو مقدم رکھے گی لیکن اس کے بعد

والدہ ہی اس دنیا میں نہ رہے۔“

وہ ایک بار پھر نشوونما سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں چاہتا تھا

کہ رحیم گل کے آنے تک کنگو کا سلسلہ جاری رہے اور میں جتنی

بھی معلومات حاصل کر سکوں مگر لوں۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد

میں نے کہا ”آہم والدہ کے انتقال کے بعد سیرا نے ایک بار پھر کرنی

جیون ساتھی تلاش کر لیا۔ ابھی صرف عقلی ہوئی ہے اور

کے مکیتر کا نام مندر میرے ہے؟“

واجدہ نے اثبات میں سر ہلایا ”ہاں۔۔۔ سیرا کے دل میں

مغضی میں اپنا گھر بنانے کی خواہش سر حال اب بھی موجود

اس بار بھی مستقبل کے ساتھی کے انتخاب میں والدہ صاحبہ

مشورہ تو شامل نہیں ہو سکا کیوں کہ وہ اس دنیا میں سوچو ہی

تھے لیکن سیرا کا خیال یہی تھا کہ اس بار اس نے قطعی فیصلہ

کر اور نہایت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔“

”مندر میرے کیا کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مپرٹ ایک پورٹ کی کسی چھوٹی سی فرم کا مالک ہے۔

اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں کیوں کہ میں

کے معاملات میں زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کرتی تھی۔ بظاہر ہم

میں زیادہ قربت نہیں تھی۔ میں بتا ہی چکی ہوں۔ ویسے جلد

میری ذاتی رائے کا تعلق ہے۔ مجھے یہ مندر مندر ہی لڑوا

شریف اور دیانت دار معلوم ہوتا ہے۔ سیرا کی بھی اس کے

میں یہی رائے تھی۔ تاہم مجھے اس کی رائے پر زیادہ اچھا

تھا۔“

وہ چند لمبے سوگوار انداز میں خاموش رہی۔ میں نے دیکھا

میں کہا ”آپ سے بات کر کے پرس سیرا کی شخصیت کے

سے عقلی پہلو جاگ رہے ہیں۔“

”میں نہیں کیا کیا بتاؤں۔۔۔“ اس نے ایک بار پھر

لی ”اس کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جس پر کوئی

نہیں کہے گا۔ وہ بظاہر بڑی لالچی ہے پروا۔۔۔ بلکہ بعض لوگ

تو کسی حد تک شاک بھی نظر آتی تھی لیکن درحقیقت وہ نہایت

دل اور حساس تھی۔ اس کی ذات سے وابستہ طور پر شاید کسی

چونکی کو بھی گزند نہ پہنچی ہو۔ اسے قریب کے دور کی سیاست

قسم کے محفلوں سے بے پناہ غرت تھی۔ اسے دنیا کے کسی

گوشے میں کسی بھی بے گناہ کی موت کا مل موہ ہونا تھا۔

وہ ہتھیاروں کی صنعت سے بھی نفرت کرتی تھی۔ تاکتی تھی کہ

اس کا بس پہلے تو وہ ماری دنیا کے ہتھیاروں کے کارخانے

کر اسے ستم خیزی یہ ہے کہ ہمارے اپنے والد کی انڈسٹری

سے ایک انڈسٹری ایسی ہے جس میں ہتھیاروں کی تیار

استعمال ہونے والا سامان بنتا ہے۔ سیرا اکثر ان سے ملتی

انہوں نے وہ انڈسٹری کیوں لگائی۔ وہ ان سے خود کیا کرنی

اس انڈسٹری کو بند کر دیں۔ وہ ہر بار اس کی بات

تھے قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ انڈسٹری سب سے زیادہ

ہے۔“

”ہاں۔ افسوس کی بات تو یہی ہے کہ ہتھیاروں کی تیار

صنعت دونوں دنیا کی سب سے زیادہ مبالغہ بخش صنعت اور

ہے۔ امریکا جیسے ملک کی معیشت انہی کے سارے کھنڈ

ہلائی کے لیے میں نے اللہ اسے ٹوٹ نہیں کھائی گا لیکن ہوتی  
ہی اور کچھ بات میرے علم میں آئی جاہی ہے۔

”میرا گوارا! اصل کمان تو یہ ہے جو میں اپنے بیان کی صورت  
میں نکھوڑ چکا ہوں البتہ اس کا ایک پس سحر بھی ہے۔ وہ میں نہیں  
تا دیتا ہوں۔“ میں نے بھی کمری سنجیدی کے جواب دیا ”کچھ  
تفصیلات اور جزئیات ہیں جو میں نے اپنے رکھی بیان میں بتانا ضرور  
نہیں سمجھیں۔ وہ باتیں آفسی دیکھا کچھ کراہ کر اب سن لو۔“

”بال۔ بال۔ جلدی تا دیا میں تم نے کیا نیا ڈراما رچایا  
تھا۔“ وہ صوفے پر کچھ آگے ٹھیکے ہوئے بولا۔

”میں نے نہ تو پہلے کبھی کوئی ڈراما رچایا تھا اور نہ اب رچایا  
ہے۔ بلکہ اس مرتبہ تو کچھ معنی میں میرے ساتھ ڈراما ہوا  
ہے۔“ میں نے گویا بڑا سناٹے ہوئے کہا ”لیکن مجھے نہیں معلوم تھا  
کہ ڈرامے میں اتنی جلدی ایسا الیہ موز آجائے گا۔ میرا کہ اس  
طرح قتل ہوئے کا مجھے حیرت ملی افسوس ہے۔“

رجیم گل کے چہرے پر ایک رنگ سا اگر گزر گیا۔ اس میں  
فلک نہیں تھا کہ قتل کی اس واردات نے اسے بھی متاثر کیا تھا گو  
کہ لاشیں دیکھنا ان لوگوں کے محمولات میں شامل تھا۔ میں نے  
تفصیل سے اسے سب کچھ بتا دیا کہ کس طرح میری پرنس میرا  
سے ملاقات ہوئی تھی کیا باتیں ہوئی تھیں کیا کچھ مجھے معلوم ہوا  
تھا۔ کس طرح رخصت ہوئے وقت میرا کامران داخل ہوا تو جو ان  
سے سامنا ہوا تھا۔

”اس کا طریقہ وغیرہ تفصیل سے بتاؤ۔“ رجیم گل نے میری بات  
کاٹے ہوئے فرائض کی۔ میں نے وہ بھی بتا دیا تو وہ بولا ”میرا کیا  
ہوا؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ میں نے دیانت داری سے جواب  
دیا ”اس کے بعد تو میں آج رات سیرا کا فون آیا اور اس نے  
فرائض کی کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس  
کے انداز گفتگو سے ظاہر ہوا تھا کہ معاملہ اہم تھا۔“

”تم کہہ رہے ہو کہ تم نے کوئی ڈراما نہیں رچایا۔ ڈراما تو تم  
نے کسی نہ کسی حد تک شروع کر ہی رکھا تھا۔ تم دوکل بنے ہوئے  
تھے تمہارا یہ اقدام جیل سازی کے ذمے میں آتا ہے۔“ اس  
نے سنجیدی کے مجھے گوارا۔

”اسے تم نامک موقع پر اتنی مزاحیہ باتیں مت کہو بار! اس  
وقت پہنچنے کو دل نہیں چاہتا۔“ میں نے کراہ کر کہا ”مجھے اندیشہ ہے  
کہ کہیں اب تم یہ نہ کہہ دو کہ یہ ملک اسی لیے اس حال کو پہنچ گیا  
ہے کہ پرسوں میں نے دوکل نہ ہوئے ہوئے اپنے آپ کو دوکل کہہ  
دیا تھا اتنا بڑا فراڈ شاید ملک کی تاریخ میں آج تک نہیں ہوا اور  
یہاں پہنچنے بھی اخلاقی اور معاشی بحران آئے ہوئے ہیں۔“

اسی غلط بیانی کی وجہ سے آئے ہیں۔ غلط بیان بعد میں ہوتا ہے  
بحران پہلے ہی آگئے تھے۔“

میں نے سانس سے کہا ”جہاں خود کشی کا یہ کاروبار کئی بھی بند  
نہیں کر سکتا۔“

”اچانک آس پاس ہی کہیں حرم سی کالی بیل مٹھان اٹھی۔  
واہدہ گویا کسی خطرے کے سے احساس سے چوٹے ہوئے ہوئی لیکن  
تیار ہو گیا۔“

”میرا خیال ہے پولیس آن پہنچی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
اس کے چہرے پر ایک بار پھر وحشت بڑھ گئی۔ مجھے اندیشہ  
محسوس ہوا کہ وہ واہدہ نہ پکڑا جائے لیکن اس نے اپنے آپ کو  
سنبھال لیا تاہم اس کے ہاتھوں میں صاف طور پر ارتعاش محسوس  
ہو رہا تھا۔ میں نے آخر کام وغیرہ تلاش کرنے کے بجائے خود گیٹ پر  
جانے کا فیصلہ کیا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والا رجیم گل ہی تھا اور وہ  
دردی میں تھا۔ پولیس کی ایک موبائل اس کے ساتھ تھی۔ چل کر  
حاملہ لڑکی کے قتل کا تھا اس لیے شاید احتیاطاً وہ پولیس والیوں  
کو بھی ساتھ لے آیا تھا جو خاصی موٹی موٹی اور باربہر شخصیت کی  
مالک تھیں۔ ان کے علاوہ دیگر خودی حملہ بھی اس کے ساتھ  
تھا۔ وہ بالکل سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

اس نے اندر آ کر بالکل اسی طرح ضابطے کی کارروائی شروع  
کرائی جس طرح ڈھنگ کے پولیس والوں کو کرنی چاہیے۔  
طائشیں ہونے لگیں۔ جائے واردات کا نقشہ بننے لگا ”فنگر پرنس  
اور دیگر شاد نہیں تلاش کی جائے گی۔“ رجیم گل نے نہایت  
سنجیدگی سے میرا درد واہدہ کا بیان بھی لیا جو ایک اے ایس آئی نے  
تلم بند کیا۔ واہدہ کی حالت اس دوران دیدار کچھ بگڑنے لگی تھی  
اس نے رجیم گل نے اس کے جلی ڈاکٹر کو بھی فون کر دیا۔ اس کے  
شوہر کو بھی اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی جس نے غالباً یہ بتایا کہ  
وہ فیسرے ذرا دور کسی صنعتی علاقے میں تھا اس لیے اسے پہنچنے میں  
کچھ دیر لگ جائے گی۔ اس کے علاوہ رجیم گل نے لاش اٹھوانے  
کی فرائض سے ایمر پرنس بلوانے کے لیے بھی فون کر دیا۔

ڈاکٹر کہیں قریب ہی رہتا تھا۔ وہ بہت جلد پہنچ گیا اور اس نے  
واہدہ کو ایک انجکشن لگا دیا۔ اسے ایک بیڑہ میں لٹایا جا چکا تھا۔  
پولیس کی آمد کے ساتھ ہی اسٹوڈیو میں ایک افزائش ہی ہوا ہوگی  
تھی لیکن اب کچھ سکون ہو گیا تھا۔ ایمر پرنس آکر تلاش لے جا چکا  
تھی لیکن پولیس والے اب بھی پورے بیگے میں کھڑے ہر کرتے  
پکار رہے تھے اور ہر چیز کی تفصیل نوٹ کر رہے تھے شاید وہ کوئی  
کڑا تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے خیال میں ان کی  
ان کوششوں سے خانہ بڑی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر کار رجیم گل مجھے ساتھ لے کر ہال کے اس گوشے میں جا  
بٹھایا جہاں نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس نے ٹوٹ کپ  
بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور کمری نکلوں سے میرا ہاتھ لیٹے  
ہوئے بولا ”بال بر خودی! اب مجھے اصل کمانی بتاؤ۔ تمہاری

"جی۔۔۔ بس۔۔۔ اب تقریر مت شروع کرو۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لیے میری تقریر سے بچنے کا ایک طریقہ ہے۔ اور وہ یہ کہ تم ابھی میرے اس ڈرامے کو جاری رہنے دنا۔ فی الحال کسی کے سامنے تردید مت کرنے دیجئے جانا کہ میں دیکل نہیں ہوں۔ میں خودی جہاں ضروری سمجھوں گا اپنے اس ڈرامے کو جاری رکھوں گا اور جہاں اس سلسلے میں زبان بند رکھنا ضروری سمجھوں گا بند رکھوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اچھا خیر۔۔۔ اس کو اس کو چھوڑو۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "یہ بتاؤ کہ پرس میرا نے آج رات جب تمہیں فون کر کے بلایا تو کام کی نوعیت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا؟"

"نہیں۔ اگر اس نے کچھ بتایا ہوتا تو اب تک میں تمہیں بتا چکا ہوتا۔ اس وقت میں تمہارے ساتھ بہت دانت داری سے چل رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا مسٹر دیانت داس۔۔۔!" رحیم کُل کچھ کہنے لگا تھا کہ وردہ اڑھ کھلا اور ایک کا نشیبل اندر آگیا۔ رحیم گلے سے اسے ہدایت کر رہی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اس ہال میں آنے نہ دیا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اگر ہماری گفتگو سننے یا اس میں مداخلت کرے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے کا نشیبل کی طرف دیکھا۔

"مرا ایک صاحب آئے ہیں۔۔۔ اپنا نام احمد پرویز بتا رہے ہیں۔۔۔ ہم نے انہیں اندر آنے سے روک دیا تو سخت ناراض ہو رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں یہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے۔" کا نشیبل نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ انہیں اندر آنے دو۔" رحیم کُل نے بے پروائی سے کہا۔

کا نشیبل چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے احمد پرویز اندر آگیا۔ غصے سے اس کے نچھتے پھول چک رہے تھے۔ شاید اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اس کی سالی کے گھر میں کسی کمرے میں داخل ہونے سے محض ایک کا نشیبل روک دے گا۔ احمد پرویز ان لوگوں میں سے تھا جن کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ ان پر ایک نظر ڈالیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کتنے طاقت ور کتنے بارسوخ اور کتنے دولت مند ہیں۔ وہ اپنی ان خصوصیات کا چلن پھرتا اشتہار ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو برداشت کرنا خودداری کی بات تھی، ان کی طرف دیکھنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے جسم پر غالباً فرانس کی ایک فیشن کمپنی کا تیار کردہ سوٹ اور بیروں میں شاید امریکی ایلی گیزر شوز تھے مگر مجھ کی کھال کے سبے ہوئے جوئے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ خود بھی کسی مگر مجھ سے کم نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے کروڑ۔۔۔ وہ تین کروڑ سے ترسے ہسٹم کیے بیٹھا تھا۔

اپنے تمام تربیش قیمت پناوے اور رکھ رکھاؤ کے باوجود کوئی دولت مند صنعت کار کم اور گورنر زیادہ لگتا تھا۔ وہ پتہ توڑ چوڑے اور گھنے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ گردن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چوڑے کندھوں پر خاصا بڑا سا سر رکھ گیا تھا۔ دولت مندوں کی شخصیت میں عام طور پر ایک خاص غناوت، نزاکت اور نرمی جھلکتی تھی۔ مگر اس کی شخصیت میں ان کوئی خصوصیت ذرا بھی نہیں جھلکتی تھی۔ اس کا تاثر ایک کرکڑ اور کھردری شخصیت کا تھا۔ اس کی رحمت بھی سافلی تھی۔ وہاب کی اور اس کی جڑی پتیہ خاصی عجیب لگتی ہوگی۔ یہی قد میں ش سے خاص اور بھی تھی لیکن نزاکت، برحال دونوں میں سے کسی کو کبھی بھی نہیں گزری تھی۔ واحد کی شخصیت میں البتہ کچھ غار اور اُجڑا پن موجود تھا۔

وہ مختلف مجسموں وضو سے بچتا ہوا ہال کے وسط میں بچ ایک کا نشیبل نے اسے اس جگہ پاؤں رکھنے سے باز رکھا جہاں دیر پہلے تک پرس میرا کی لاش پڑی تھی۔ وہاں چاک سے ٹا بنا دیا گیا تھا۔ احمد پرویز نے خون خوار نظروں سے اس کا نشیبل گھورا جس نے ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے گزر جانے سے روکا اور ذرا ہٹ کر چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ ہمارے متعلق پہنچ کر ذرا دیر ہی رگ گیا۔ قریب میں بے شاید اسے توقع تھی کہ ہم دونوں اُٹھ کر اور آگے بڑھ کر اس استقبال کریں گے۔ رحیم کُل کی جگہ کوئی اور انیس اچا ہو تاڑا ہی کرنا لیکن وہ اللہ کا بندہ بھی ایک ہی شاہکار چیز تھا۔ اس نے فوراً کنارہ اپنی پچھلی ہوئی ٹانگیں بھی سیڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ سبے نیاز سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی کچھ ایسا دیکھنے کی کوشش کی جیسے میں نے توجہ سے اس کی طرف دیکھا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ لگاٹھا نہیں تھا کہ اندر ہی اندر اس پر کیا گزری تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسا سوڈو بزنس سائڈ دکھائی دے رہا تھا جو ہم دونوں کو بیک وقت رید کر کے کے لیے مناسب زاویہ تلاش کر رہا تھا۔

"مجھے فون تم نے کیا تھا؟" اس نے ٹھٹھٹے لہجے میں رحیم کو مخاطب کیا۔

"جی ہاں۔ یہ گستاخی میں نے کی تھی۔" رحیم کُل چپے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے اسٹیلز رحیم کُل کہتے ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تمہارا نام اور عہدہ ہے۔" وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی رعونت اور عمارت سے بولا اور نچا کا دوبارہ طبقہ بھی اپنی تمام تر دولت مندی اور اثر رسوخ باوجود مسلح جو طبیعت کا مالک ہوتا ہے اس طبقے کے لوگ بلا ضرورت پولیس آفیسر یا دوسرے سرکاری ملازموں سے اس کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔ احمد پرویز کے دماغ میں نہ جانے کیا فحاشاں گھسا ہوا تھا۔





الہام تو میرا نہیں ان سے چند سوالات کے جوابات حاصل کرنا ضروری ہے میں انتظار کر رہا ہوں کہ ان کی طبیعت کچھ اور بہتر ہو جائے۔ ”رجیم گل بدستور ٹھہرے ٹھہرے لیے میں بولا۔  
”تو تم ہمیں پولیس اسٹیشن بلانے کے خواب بھی دیکھ رہے ہو؟“ احمد پرویز نے گویا دانت پیس کر پوچھا۔

”ہم آپ کے خادم ہیں جناب! ضرورت پڑے تو پولیس اسٹیشن خود آپ کے گھر بھی آسکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر کسی معزز شہری کو پولیس اسٹیشن آنے کی زحمت بھی دی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی نظام باہمی تعاون سے ہی چل سکتا ہے۔ فرعونیت سے تو کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ فرعونیت بہانے خود ایک مسئلہ ہے اور بے شمار مسائل کی جڑ ہے۔ ”رجیم گل نے ملا ٹھٹھ سے کہا۔  
”تم مجھے فرعون کہہ رہے ہو؟“ احمد پرویز کی خون خراہی ایک بار برپا ہو کر آئی۔

”برگزینہ۔ ”رجیم گل نے فوراً نفی میں سر ہلایا ”میں بھلا ایسی گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔ میں تو ایک عمومی بات کر رہا ہوں۔“ احمد پرویز نے شاید اس سے مزید اچھٹا فضول سمجھا اور پاؤں پٹتا ہوا بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ”رجیم گل دوبارہ میرے قریب آ بیٹھا اور طویل سانس لے کر بولا ”میں کئی ایسے لوگوں سے بھی ملا ہوں جن کی جڑیں اس شخص سے کہیں زیادہ گہری تھیں لیکن ایسی فرعونیت میں نے ان میں بھی نہیں دیکھی اور اس طرح آتے ہی بلا سب تو میں نے کسی کو ایسے پولیس آفیسر چڑھ دوڑنے کی کوشش کرتے نہیں دیکھا جو اپنے واردات پر تفتیش کرنے آیا ہو۔“

”اور چھانڈو ہے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”اس کی فرعونیت اگر مزاحمت پر کارگر رہتی ہوگی۔ اس نے اسے زندگی کا ایک حصہ بنالیا ہوگا۔ اسے ابھی تجربہ نہیں ہوا ہوگا کہ کبھی کبھی فرعونیت گلے بھی پڑ جاتی ہے۔ ویسے۔۔۔ کوئی بنیاد تو ہوگی جس پر یہ اچھل رہا تھا۔“

رجیم گل مسکراتے ہوئے بولا ”ایک محاورہ ہے کہ بھیمیا کھنڈے پڑی اچھلتی ہے۔۔۔ کھونا جتنا مضبوط ہو، منہ زور سونٹھی اتنا ہی زیادہ اچھلتا ہے۔ احمد پرویز کا بھی کہیں نہ کہیں کوئی کھونا تو ضرور ہوگا۔ اس نے چھوٹے ہی آنکلی میں صاحب کا حوالہ دیا تھا۔ ممکن ہے اس کی آنکلی میں صاحب سے رشتے داری یا دوستی ہو۔“  
”پھر تو تمہیں گھنچاکی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دگھری سانس لے کر بولا ”جس میں تو محظوم ہے یا بے۔۔۔ کہ قصاص اس خادم نے نوکری بعد میں شہداء کی جلی اور سمیٹا جاتی ہے۔ لے کے پتلے تیار ہو گیا تھا ورنہ اپنا جو نوکری کہنے کا اسٹانکل اور اپنے جو نظرات ہیں ان کے ساتھ تو آدھی پولیس لائن میں چلی ہی نہیں سکتا۔ یہی طرح پولیس میں نوکری کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا

”ہے۔“

”اصل میں قصاص ابھی کھونا مضبوط ہے۔۔۔ تم بھی اس لیے اچھلتے ہو۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

”لیکن یہ بڑے الحوس کی بات ہے تاکہ اگر انسان کا کھونا مضبوط نہ ہو تو وہ دیانت داری اور فرض شناسی کا مظاہرہ بھی نہ کر سکے ان کاموں کے لیے تو کھنڈے کی ضرورت نہیں پڑتی چاہیے۔ آج کے دور میں تو اگر کوئی سرکاری ملازم دیانت داری اور غیر معمولی تندی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ جادو کر رہا ہے اس کا اگر اسے کوئی صلہ نہیں مل سکتا تو کم از کم شاباش تو ملنی چاہیے لیکن الیہ تو یہ ہے کہ اس نے چارے کو اپنی نوکری بنانے کے لیے کھنڈے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔۔۔“

اس کے لیے میں وی پی اے کا کرب جھٹک آیا اور ایک لمبے کے توقف سے وہ بولا ”ابھی پر سوں ہی کی بات ہے۔ ایک علاقے کے ایس ایچ او نے ایک بڑے منشیات فروش کے کاروبار پر ہاتھ ڈال دیا اور ہماری رشت کی پیشکش کے باوجود اسے نہیں چھوڑا۔ آج اس نے چارے کو لائن حاضر کر دیا گیا ہے۔ یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے۔۔۔ ان حالات میں آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ پولیس کا حکم مدھرے گا یا اس میں کوئی بہتری آئے گی۔ اگر اچھا کام کرنے پر جوتے چڑیں گے تو پھر کوئی باگل ہی ہوگا جو اچھا کام کرے گا۔ رفتر رفتر سب لوگ اس معاشرے کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔ اور پھر جو خود بڑا ہوگا اس میں سب کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔“ ”دو جھرجھری ہی لے کر خاموش ہو گیا۔

میں دل ہی دل میں اس سے سلیفہ شفیق تھا لیکن بظاہر نوک جھونک جاری رکھنا، ہم گویا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ ویسے بھی اس وقت ماحول پہلے ہی کافی بوجھل اور تھکا دہنا تھا۔ کم از کم اس وقت ہم اس قسم کے موضوعات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے نہ ہار کر کہا ”موقع ہو یا نہ ہو۔ تم اپنے ڈھکڑے لے کر بیٹھ جایا کرو۔“

”میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”واقعی۔۔۔ اس دنیا میں ہر کوئی اپنی فطرت کی وجہ سے مجبور ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

اس نے ایک نظر اس بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا جس میں احمد پرویز کی بیوی پہلے سے سو جو تھی اور اب احمد پرویز بھی بیٹھا تھا پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا ”اس دنیا میں احمد پرویز جیسے لوگ کیوں پائے جاتے ہیں؟“

”اس دنیا میں احمد پرویز سے کہیں بدتر لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی دیکھ رکھ دیکھ رہا ہے۔ دی اس کی مصلحتوں کو بھر سکتا ہے۔ میں اور تم کیا کر سکتے ہیں؟ یہاں ہماری مرضی نہیں چل

”جس۔۔۔ جس۔۔۔ اب تقریر مت شروع کیے۔“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لیے میری تقریر سے بچنے کا ایک طریقہ ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ تم ابھی میرے اس ڈرامے کو جاری رہنے دینا۔ فی الحال کسی کے سامنے تردید مت کہنے بیٹھ جانا کہ میں دیکھ نہیں ہوں۔ میں خود ہی جہاں ضروری سمجھوں گا“ اپنے اس ڈرامے کو جاری رکھوں گا اور جہاں اس سلسلے میں زبان بند رکھنا ضروری سمجھوں گا“ بند رکھوں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اچھا خیر۔۔۔ اس کو اس کو چھوڑو۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا ”یہ بتاؤ کہ پرنس میرا نے آج رات جب تمہیں فون کر کے بلایا تو کام کی نوعیت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا؟“

”نہیں۔۔۔ اگر اس نے کچھ بتایا ہوتا تو اب تک میں تمہیں بتا چکا ہوتا۔ اس وقت میں تمہارے ساتھ بہت دانت داری سے چل رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اچھا سٹریٹ دانت دار۔۔۔! رحیم گل کچھ کہنے ہی کا تھا کہ وہ روزہ کھلا اور ایک کانشیل اندر گیا۔ رحیم گل نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اس ہال میں آنے نہ دیا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی آکر ہماری گفتگو سنے یا اس میں مداخلت کرے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے کانشیل کی طرف دیکھا۔

”سرا! ایک صاحب آئے ہیں۔۔۔ اپنا نام احمد پرویز بتا رہے ہیں۔۔۔ ہم نے انہیں اندر آنے سے روک دیا تو سخت ناراض ہو رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں یہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے۔“ کانشیل نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ انہیں اندر آنے دو۔“ رحیم گل نے بے پروائی سے کہا۔

کانشیل چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے احمد پرویز اندر گیا۔ غصے سے اس کے تختے پھول چکے رہے تھے۔ شاید اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اس کی سالی کے گھر میں کسی کمرے میں داخل ہونے سے محض ایک کانشیل روک دے گا۔ احمد پرویز ان لوگوں میں سے تھا جن کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ ان پر ایک نظر ڈالیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کتنے طاقتور، کتنے پارسوں اور کتنے دولت مند ہیں۔ وہ اپنی ان خصوصیات کا چلتا پھرتا اشتہار ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو برداشت کرنا تو دور کی بات تھی، ان کی طرف دیکھنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے جسم پر غالباً فرانس کی ایک فیشن کمپنی کا تیار کردہ سوٹ اور جیروں میں شاید امریکی ایلی گٹر شوز تھے مگر مجھ کی کھال کے بے بنے ہوئے جو تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ خود بھی کسی مگر مجھ سے کم نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے کروڑ۔۔۔ وہ شکر کے قرعے بہم کیے بیٹھا تھا۔

اپنے تمام تر پیش قیامت پستانوں اور رکھ رکھاؤ کے باوجود کوئی دولت مند صنعت کار کم اور گروٹا زیادہ لگتا تھا۔ وہ پستانوں پر چڑھے اور گھٹنے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ گردن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چڑھے کندھوں پر غاصا ہوا ساروہ گھیا تھا۔ دولت مندوں کی شخصیت میں عام طور پر ایک غار غنات، نزاکت اور نرمی جھلکتی گنتی ہے مگر اس کی شخصیت میں ان کوئی خصوصیت ڈرا بھی نہیں جھلکتی تھی۔ اس کا تاثر ایک کرک اور کھردری شخصیت کا تھا۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی۔ داہ کی اور اس کی چوڑی پٹیا خاصا عجیب لگتی ہوگی۔ یوں قد میں ش سے خاص اونچی تھی لیکن نزاکت، سرحال دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں مگر زری تھی۔ واحدہ کی شخصیت میں البتہ کچھ غار اور اُجلا پن موجود تھا۔

وہ مختلف مجتہدوں وغیرہ سے پتا ہوا ہال کے وسط میں پچ ایک کانشیل نے اسے اس جگہ پاؤں رکھنے سے باز رکھا جہاں دیر پہلے تک پرنس میرا کی لاش پڑی تھی۔ وہاں چاک سے بنا بنا دیا گیا تھا۔ احمد پرویز نے خون خوار نظروں سے اس کانشیل گھورا جس نے ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے گزر جانے سے روکا اور ذرا ہٹ کر چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ ہمارے مقابل پہنچ کر ذرا دیر ہی رگ گیا۔ قریب نہیں آتا شاید اسے توقع تھی کہ ہم دونوں اُٹھ کر اور آگے بڑھ کر اس استقبال کریں گے۔ رحیم گل کی جگہ کوئی اور انہیں اچھا ہوتا تھا۔ ہی کرنا لیکن وہ اٹھ کا بندھ بھی ایک ہی شاہکار چیز تھا۔ اس نے ان کو درکنار، اپنی پچھلی ہونٹیاں تانگیں بھی سیکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ سبے نیازی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی ہٹو لیا۔ دینے کی کوشش کی جیسے میں نے توجہ سے اس کی طرف دیکھا۔ ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے اثرات سے اندازہ لگانا خاصا نہیں تھا کہ اندری اندر اس پر کیا کڑی تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسا سوڈو پرنٹ ساڈر دکھائی دے رہا تھا جو ہم دونوں کو یک وقت رسید کرنے کے لیے مناسب زاویہ پر تلاش کر رہا تھا۔

”مجھے فون تم نے کیا تھا؟“ اس نے لکھنے لکھنے لہجے میں رجم کو غائب کیا۔

”جی ہاں۔ یہ گستاخی میں نے ہی کی تھی۔“ رحیم گل چپے ہوئے لہجے میں بولا ”مجھے انہیں زخمی کرنا تھا۔“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تمہارا نام اور عہدہ ہے۔“ وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی رعوت اور حکارت سے بولا۔ اونچا کا دھاری طبقہ بھی اپنی تمام تر دولت مندی اور اثر رسوخ باوجود صلیح جو طبیعت کا مالک ہوتا ہے اس طبقے کے لوگ بلا ضرورت پولیس آفیسر یا دوسرے سرکاری ملازموں سے اس کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔ احمد پرویز کے دماغ میں نہ جانے کتناس گھسا ہوا تھا۔

جیسے اسے یہ بے ہوش مذاق بالکل پسند آیا ہو۔

میرے اندازے کے مطابق وہ اس وقت سرکاری کام کے مژدہ خانے میں ہوگی اور سرجن اس کے پوسٹ مارٹم کی کر رہے ہوں گے یا پھر پوسٹ مارٹم شروع کرچکے ہوں گے۔ نقل کر دیا گیا ہے۔ اور یہ کسی چور ڈاکو یا ٹھیکے کا کام نہیں ہوتا۔" رحیم گل نے ٹھیکے ہونے میں جواب دیا۔ اتنی افسوس ناک خبریں بلا حمید کسی کو سنا دیا اچھا نہیں ہوتا لیکن بعض اوقات اس میں بھی پولیس داخلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اچانک ایسی خبر سنا کر کسی کا بدمعاش بن کر رہ جاتا ہے۔ صدر منیر اس کا خاصا شدید بد عمل ظاہر ہوا۔ اس کے جگر زور دار بھٹکا لگا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا دیا اور رکھ حریف وہ شاید کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔

آخر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی دونوں آنکھوں  
ایک ایک آنسو رواہ پا کر اس کے رخساروں پر پھسل آیا۔ اس  
دوار کی طرف منہ پھیر لیا اور بازو کے حلقے میں پیشانی دوا کر دیا  
میں نے اسے بڑبڑاتے سنا "سور کا پتھر۔ سور کا پتھر۔"  
پھر اس نے دو مرتبہ زور زور سے دوا کر پر گھونسا مارا۔ گھونسا  
اس نے اس طرح مارے تھے جیسے اس کا مقصد مصلیٰ قلعے کا  
کنٹینس بلکہ جگمگ کسی کا منہ توڑنا ہو۔ دوسرے گھونے پر اسے  
باتھ کی بنیوں پر سے کھال اچھی خاصی پھسل گئی لیکن اس دکر  
سے گویا اس کے اندر الجھا ہوا غصہ کچھ کم ہوا۔ اس کا منہ دوا کر  
طرف ہی تھا۔ اس کے سانس لینے سے خرخرابٹ کی سی آواز  
پیدا ہو رہی تھیں۔

رحیم کل اپنی جگہ سناکت و جامد بیجا ایک تک اس کی طرف  
دیکھ رہا تھا۔ آخر میں ہی اُنھ کو اس کے قریب پہنچا۔ میں نے  
گدھا حاکمیت کے ہوتے ہوئے نہ لے کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ  
معاذ ہو چکا۔ فی الحال اسے ایک حادثہ سمجھ کر برداشت کرنا  
پڑا۔

اس نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور  
 نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں۔ شاہد اس نے میرے ساتھ لاپرواہی  
 باوجود فرض کر لیا ہو کہ میرا بھی پوئیس کے جھگڑے سے ی کوئی  
 ہے۔ میں نے اپنا سوال نکال کر اس کے زخمی سے اتار پلٹا  
 دیا۔ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے رجمہل کی طرف گھوم گیا۔

تب رحمِ فل بولا "مجھے معلوم ہے۔۔۔ یہ موقع ایسا ہے کہ آپ کو ملن کا غارت خانے کے لیے جو کہہ رہے ہیں، وہ خراب ہے۔ تو بہتر لیکن کچھ ناگوار فریضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں جلدی انجام دے لیا جائے، ان ہی میں سے ہوتا ہے۔ مجھے بہر حال یہ کہہ سواتا کہ یہ ہیں۔ اگر آپ ابھی اور اسی وقت کے جوابات دے سکیں تو زیادہ اچھا ہے۔ لیکن اگر آپ

”مجھے اس موضوع پر اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل

سکا۔ میں نے جواب دیا۔  
 ”وہ رات کو اس وقت یہاں کیسے آئے تھے؟ اس نے پوچھا۔  
 میں اس کے سوال کا جواب دیتے ہی لگا تھا کہ ہال کا دروازہ  
 زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور ایک دروازہ فوجوان اس عالم میں  
 تیزی سے اندر داخل ہوا کہ اس کا کمر پیچھے سے کاشٹیل نے پکڑ  
 رکھا تھا جسے رجم گئی لے ہال کے باہر کی طرف کھلنے والے  
 دروازے پر قیادت کر رکھا تھا۔ فوجوان کچھ بازی بلڈر ٹائپ تھا۔  
 اس کا کمر باندھ رکھا تھا۔ شاید کاشٹیل کی کھینچا تانی کی وجہ سے کھل  
 گیا تھا۔ گتے میں سونے کی چین بھول رہی تھی۔ کاشٹیل بے چارہ  
 چھوٹے قد کا اور مختصر الوجود تھا۔ وہ اسے دھکے میں ناکام رہا تھا اور  
 بے بسی سے فوجوان کے پیچھے گھسنا چلا آیا تھا۔ فوجوان خاصا  
 پریشان اور دھشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

”سہو! میں نے اسے نوکنے کی بہت کوشش کی۔۔۔ لیکن یہ نہیں ٹکا۔“ کانٹیل نے رحیم گل کے سامنے گویا مفاہیہ پیش کی۔

”اب یہ اندر آئی گیا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ کیوں اس کے ساتھ لٹے ہوئے ہو۔“ رحیم گل نے ہنگواری سے کہا اور کمری نظریوں سے نوجوان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک دلچسپ اور جاذبِ نظر نوجوان تھا۔ خاصائش ایل بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے خاصی سخت ورزش کرتا ہے۔ کبھی عادی ہے۔ کٹشیل نے اس کا کالر چھوڑ دیا اور رحیم گل کا اشارہ لے کر اس باہر چلا گیا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟...؟ سیرا کہاں ہے؟“ فوجوان نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا اور مستحاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

”آپ کی تعریف؟“ رحیم گل نے جیسے ہی میں پوچھا۔ وہ اس کا سر ہٹا پا جائزہ لے چکا تھا۔ پوچھا ہٹ اور دھشت زدگی کی وجہ سے اس کی وجاہت کچھ متاثر نظر آ رہی تھی۔

”میں میرا کامیگر ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس  
 جو غلام ہو اور وحشت کے عالم میں بھی اس کے لیے یہ اندازہ  
 کا نام مشکل نہیں تھا کہ میرا کامیگر ہونا اس کے لیے ایک اعزاز  
 تھا۔ رحیم گل کوئی سیکنڈ کے لیے بالکل غامض رہا۔ شاید اب وہ  
 ایک نئے زاویہ نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”تسارا نام؟“ رحیم گل نے پوچھا۔  
”مصنّف مشہور“ نوجوان نے جواب دیا پھر اپنا سوال دہرایا  
”سیرا کہاں ہے؟“

”سڑکاری اسپتال کے مہد خانے میں۔“ رحیم گل نے جواب دیا۔  
 ”کیا.....؟“ صفور نے کچھ اس طرح رحیم گل کی طرف دیکھا۔

لے اس نے اسی طبقے کے انداز میں زندگی بسر کی۔ برہمچالی صرف اس فرقہ کی وجہ سے بھی اس کے اور پرنس سعید کے درمیان بڑا فاصلہ نظر آتا تھا۔

پرنس سعید کی فراخ دلی یہ تھی کہ انہوں نے زندگی سیرا سے کوئی بات سننے کی کوشش نہیں کی اور اس سے بدستور اتنی ہی محبت کرتے رہے، جتنی ایک باپ کو اپنی بیٹی سے کرنی چاہیے۔ لیکن عمر کے آخری حصے میں وہ کام کی زیادتی، مختلف قسم کے دواؤں اور کچھ زانیہ رجحانات کی بنا پر بھی بے ہو گئے تھے۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھ رہی تھی اور انہیں مختلف بیماریاں چلتی جا رہی تھیں، ان کے لیے یہ احساس بھی سوا ان کے بننا چاہا تھا کہ ایک روز برہمچالی ان کی منتہی ایسا ہوگا۔ ان کی بادشاہت ان سے چھین جائے گی۔ سیرا خیال ہے جب وہ موت کے بارے میں بھی سوچتے ہوں گے تو انہیں دنیا سے جانے یا خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینے کی اتنی فکر نہیں ہوتی ہوگی جتنا اپنی دوسری بادشاہت چھین جانے اور اس سے جدا ہونے کا غم ہوتا ہوگا۔ سیرا خیال ہے اب آپ کو اعزازی کے بارے میں پرنس سعید کے عہدوسات کا کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا؟

رجیم گل نے سر کو نہایت خفیف سی جنبش دی۔ میں نے اس کی بھی زحمت نہیں کی۔ صدر منیر نے ہونٹوں پر زبان پھیری، تھوڑا گھبراہٹ سے شاید قدرے دشواری سے سلسلہ کلام جوا "زندگی کے آخری دنوں میں وہ میرا کے بارے میں بڑی تشویش کا شکار رہنے لگے تھے جو دوسری طلاق کے بعد بظاہر تھائی اور باہمی و نامرادی کی زندگی گزار رہی تھی لیکن اسی دوران میں میری اس سے راہ و رسم بدلتے گئے۔ میں بدقسمتی سے شادی شدہ تھا وہ نہ شاید حالات میں اتنی جھجک پیدا ہی نہ ہوئی۔ میں جلد از جلد میرا سے شادی کر لیتا اور سارے مسائل سیدھے سادے انداز میں حل ہو جاتے۔ میری گھریلو زندگی سخت ناخوش گوار تھی۔ سیرا بھی کچھ اسی قسم کے حالات سے گزر چکی تھی۔ شاید یہ قدر مشترک بھی ہم دونوں کو قریب لانے کا باعث بنی تھی۔ میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن میرے سرسوال والوں نے مجھ پر کچھ مقدمے کیے ہوئے تھے جن کی وجہ سے میری طلاق کی کارروائی کو قانونی طور پر مکمل ہونے میں بہت دیر لگ گئی۔ اسی دوران میں پرنس سعید کا انتقال ہو گیا۔

میں اپنی زندگی کے آخری ایام میں معلوم ہو گیا تھا کہ میں اور سیرا ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ وہ اس بات پر خوش تھے۔ اس کی وجہ جان کر شاید آپ کو مزید حیرت ہو۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میں پرنس اعزازی کا ملازم تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ سیرا اگر اب شادی کرے تو پرنس اعزازی کے کسی ملازم سے کرے خواہ وہ وہاں کا ایک معمولی سا مزدور ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اپنی اعزازی کے بارے میں ان کے جذبات کیا تھے۔ اپنی دوسری بیٹی

نبیلہ۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ بات کانٹے ہوئے بیٹھی بیٹھی ہی تو از میں بولا۔ "آپ کو جو پرہیز ہے پوچھ لیجئے۔"

"چند جائیں۔" رجیم گل نے ایک مومنہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی مقابلہ نظر مندر منیر سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹی تھی۔

صدر منیر چکا تو رجیم گل سر ہلاتے ہوئے بولا "جہاں۔ تو آپ پرنس سیرا کے محبت کرتے؟"

"مجھے باقاعدہ محبت تو نہیں کہا جاسکتا۔" وہ پہلے ہی کی طرح دھجی اور بھٹی بیٹھی ہی تو از میں بولا "مہاری باقاعدہ محبت یا رسم و رنج نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ بات طے تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا کہ میرا تیری شادی مجھ سے کرے گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہمارے درمیان ایک خاص صلتی خاطر تھا۔ ہم۔ ہم ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ پرنس سیرا نے اپنے لیے شوہر کی تلاش کے سلسلے میں اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟" رجیم گل نے پوچھا۔

"بالکل۔ یہ سچ ہے۔" اس کی آواز کچھ اور دم پر مچی۔ اس کے بعد چند سیکنڈ سکوت رہا۔ آخر رجیم گل بولا "کیا اب مجھے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ یہ معاملہ کچھ وضاحت چاہتا ہے؟"

صدر مزید چند لمحے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر بولا "بات شاید مشکل سے آپ کی سمجھ میں آئے۔ لیکن۔ برہمچالی میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں سیرا کا دودھ پار کا مزہ ہوں اور پچھلے میں پرنس اعزازی میں ہی ملازم تھا لیکن میری سیرا کے والد پرنس سعید سے کوئی خاص ملاقات نہیں رہی اور شاید وہ مجھے کچھ زیادہ پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ برہمچالی ان کی سوانحی تھی کہ بہت پہلے انہوں نے مجھے کہیں میں ایک اچھی ملازمت دے دی تھی۔ درحقیقت سیرا اور واجدہ بی ان کی کل کائنات تھیں لیکن کچھ بات یہ ہے کہ انہیں اپنی ان اولادوں سے بھی زیادہ کراچی اعزازی سے محبت تھی۔ انہوں نے اسے پھیلانے کے لیے محنت بھی بہت کی تھی۔"

میں نے ان کا ریاستی نظام اور نوابی دیہوتو عملی طور پر چھین لیا تھا لیکن انہوں نے گویا اس کے متبادل کے طور پر اپنی صنعتی ایسی کڑی کھلی تھی۔ یہ گویا ان کی ایک چھٹی سی بادشاہت تھی اور آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ وہ ایک نہایت زبردست پسند اور دعوت پرست آدمی تھے۔ سیرا کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ان کی بیٹی تھی۔ سیرا بھی درحقیقت آوارہ، بد چلن یا مضرب ذہن نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے کبھی باپ کی مرضی کو اپنی زندگی پر مسلط نہیں ہونے دی۔ اپنے فیصلے خود کیے اور اس کا متعلق چوں کہ اونچے۔ بلکہ بہت اونچے طبقے سے تھا اس



لیکن یہ شوقِ دکانت بھی کسے ہیں۔ اپنے قانونی معاملات سے یہ خودی نہیں دیتے۔“

”جھا۔۔۔“ مندر منبر نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ لیکن یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا یہاں کسی کو دیکھنے کی ضرورت نہیں آتی تھی؟

”پرنس سیرا نے فون کر کے انہیں بلایا تھا کہ وہ کسی اہم مسئلے پر مشورہ کرنا چاہتی ہیں۔“ رحیم گل نے جواب دیا۔  
”کیا مسئلہ؟“ مندر منبر گویا کچھ چرکھا۔

”یہ جاننے کا تو موقع نہیں ملا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں جب یہاں پہنچا تو مجھے پرنس سیرا کی لاش ملی۔“

مندر منبر نے سر جھکالیا۔ ایک لمحے کے لیے بو جھل سی خاموشی طاری رہی پھر رحیم گل بولا۔ ”آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔ اس میں خامے و پیچیدہ حالات کا تذکرہ ہے۔ اس میں وقفہ نہیں آنا چاہیے۔“ وقفہ آیا تو بات کچھ اور اچھی ہوئی محسوس ہوئی۔

مندر منبر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ بتا رہا تھا کہ پرنس سیرا کے وکیل نے یہ تو کہہ دیا کہ وصیت نامہ لندن کے ایک بینک میں محفوظ ہے اور اس نے اسے وہاں سے منگوانے کا بندوبست کرایا ہے لیکن اس کے بعد وہ خود علان اور آرام وغیرہ کی غرض سے ملک سے باہر چلا گیا اور کئی ماہ غائب رہا۔ میں تو خیر دیسے بھی ایک غیر متعلق فرد تھا لیکن سیرا کو بھی وصیت نامے کے بارے میں کچھ ایسی خاص تشویش نہیں تھی۔ ایک تو وہ دوپے پیسے کے معاملے میں حیرت انگیز نہ تک بے پروا لڑائی تھی، دوسرے اسے اطمینان تھا کہ وہ دونوں ہمیشہ ہی ہر حال میں تمام دولت و جائیداد کی وارث ہوں گی۔ ہمیں شبہ تک نہیں تھا کہ وصیت نامے کے سلسلے میں درحقیقت خلیجی بھانوں سے وقت ضائع کیا جا رہا تھا۔“

”آخر کار جب وصیت نامہ وکیل صاحب کے ہاتھ میں آیا اور وکیل صاحب وارثوں کے ہاتھ آئے اور اس سلسلے میں سب کے یک جا ہونے کی نوبت آئی اور وصیت نامہ پڑھا گیا تو سیرا کے اور میرے سر پر گویا ہم پھٹ پڑا۔ سیرا کے پاس شادی کرنے کے لیے صرف ایک ماہ کی ملت باقی تھی اور اس ایک ماہ میں بھی اسے کسی ایسے شخص سے شادی کرنی تھی جو پرنس اعز سزہ کا لازم ہوگا۔ میں تو دیسے ہی اس شرط پر پورا نہیں اتر سکتا تھا کیوں کہ مجھے تو پرنس سعید کے انتقال کے فوراً بعد ہی نوکری سے نہ صرف نکال دیا گیا تھا بلکہ نہیں کے الزام میں مجھے کچھ دن حوالات میں بھی رہنا پڑا تھا۔ اگر سیرا نے مجھے جھڑانے کے لیے کوشش نہ کی ہوتی تو شاید میں لمبے ہی عرصے کے لیے جیل چلا جاتا اور اس کے پیچھے بھی درحقیقت یہی مقصد کارفرما ہو گا کہ کسی طرح میرے پرنس اعز سزہ میں داخل ہوں اور سیرا سے شادی کرنے کا امکان نہ پیدا ہونے پائے۔ اب تو آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ اس سارے چکر کے پیچھے کوئی ”نیپی

حالات“ کام کر رہی تھی جسے وصیت نامے کے مندرجات کا علم ہو چکا تھا اور جسے اس صورت میں کاغذ پہنچا سکا تھا کہ شادی والی شرط پوری نہ کی جاتی۔“

”آپ مکمل کر اس میں بھی حالات کا نام کیوں نہیں لیتے؟“ گل بولا۔

”میں اس کا نام لینے سے ڈرتا نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ بھی اپنی کچھ رائے ظاہر کریں۔“ مندر بولا۔  
”بعض معاملات میں پولیس اپنی رائے اشد ضرورت وقت ہی ظاہر کرتی ہے۔“ رحیم گل غلط لمحے میں بولا مگر منبر آپ کی رائے کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں کوئی حرج محسوس نہ کیا۔ آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ واقعہ وہ نہیں حالات تھے جو میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ رحیم کی بوجھ کر خود اس اناجیان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مندر نے سہلے ہاتھ بولا۔ ”واقعہ نہیں۔۔۔۔۔ اس کا شوہر احمد ہے واقعہ ایک شریف، نیک طبیعت اور بے ضرر عورت ہے درست ہے کہ سیرا اگر وصیت نامے کی شرط پر عمل نہیں کرتا تو اس کا بھاری کاغذ واقعہ ہی کو پہنچے گا لیکن وہ اس کے لیے سازش نہیں کر سکتی۔ کم از کم اپنی بہن سیرا کے خلاف تو ہرگز کر سکتی لیکن اس کا کاغذ پہنچنا اس کے شوہر کو کاغذ پہنچنے کے خلاف ہے اور وہ اتنے بڑے کاغذ کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی سازش کرنے کی ذہنیت بھی رکھتا ہے اہلیت بھی۔“

رحیم گل نے تعجبی انداز میں سہلایا اور ایک نظر اس روم کے دروازے کی طرف دیکھا جو خاص دروازہ تھا۔ وہ بند تھا اور احمد پر دیز ابھی تک اندر اپنی بیوی کے پاس ہی تھا۔ مندر اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ سمجھئے گا کہ مجھے احمد پر دیز کی یہاں موجودگی کا علم نہیں ہے۔ منظر ہے وہ یہاں موجود ہے اور اس کی بیوی بھی۔۔۔۔۔ شاید الگ الگ یہاں پہنچے ہیں۔ میں دونوں کی گاڑیاں باہر رکھوں۔ میں جوج سمجھتا ہوں وہ ان کے منہ پر بھی کئے سے ڈرتا ہوں۔“

وہ یقیناً ایک پرجوش اور تند خو فوجان تھا۔ ایسے لوگ اور دیانت دار بھی ہو سکتے ہیں لیکن جذباتیت میں کبھی اچانک غیر متوقع قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ کوئی عیب نہیں تھا کہ پرنس مجھ سے شادی بھی ایک غلطی ہی ہوتی۔

”آپ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔“ رحیم گل کا اشارہ کے ذریعے شوہر کی تلاش والا معاملہ ابھی رہتا ہے۔  
”اے۔۔۔۔۔“ مندر نے سہلے ہاتھ سے سلسلہ کا ماحول بدلا دیا۔  
”یہ بتا رہا تھا کہ وصیت نامے کا ظاہر ہونا سیرا کے اور میرے سر پہنچنے کے خلاف تھا۔۔۔۔۔ بلکہ گہنی بات تو یہ ہے کہ ہم دو

رف چہرہ سے پتا تھا۔ میرا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر  
 آپ ہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ وصیت نامہ اس کے لیے زیادہ  
 اچھا ثابت تھا۔ وہ اب اس کی تردید کرنے نہیں آسکتی لیکن  
 اس کا بولنا کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے معاملے میں  
 ادب سے بڑا اور من مہجی لڑکی تھی۔ اسے وصیت نامے کے  
 درجات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر باپ کی  
 وصیت دیکھا اور اس کے ساتھ سے جاری تھی تو بے شک جائے  
 اس کے باوجود اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور وہ مجھ سے  
 بڑی کرنے کے لیے تیار تھی۔ میں اپنی بیوی کو زبانی طلاق دے چکا  
 تھا۔ مجھے صرف کاغذی کارروائی مکمل ہونے کا انتظار تھا جس میں  
 ایک ہوا اور آف جاسے اور اس دوران میں وہ صلت بھی ختم  
 جاتی جو وصیت نامے کی رو سے باقی تھی۔

”صلت اگر زیادہ بھی ہوتی تب بھی میں تو اس سے استفادہ  
 ہی کر سکتا تھا کیوں کہ وصیت نامے کی شرط کے مطابق میں تو  
 اس اندسز کا ملازم ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف  
 کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اپنے ہونے والی بیوی کے ہاتھ سے اپنی  
 زیادہ دولت و جائداد کے نکل جانے کا تصور میرے لیے زیادہ  
 تکلیف دہ تھا۔ میں ہی ہاتھ دھو کر میرا کچھ بچا ہوا تھا کہ وہ کوئی  
 ایسی نیک سوچ ہے کہ یہ دولت اور جائداد خواہ مخواہ ہاتھ سے  
 اپنے نہ پائے۔“

”آخر کار اسی نے ابتدا میں مذاق کے سے انداز میں ایک  
 تجویز پیش کی لیکن بعد میں ہم نے جون جون اس پر تبادلہ خیال کیا ہم  
 اس کے بارے میں سنجیدہ ہوتے گئے۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ کرنی  
 طلال ماضی طور پر پرنس اندسز کے کسی ملازم سے شادی کر لے  
 اور جب دولت و جائداد وغیرہ اس کے نام منتقل ہو جائے تمام  
 کارروائیاں مکمل ہو جائیں تو وہ اس سے طلاق حاصل کر کے مجھ  
 سے شادی کر لے۔ ان کارروائیوں میں وہ تین ماہ گئے تھے۔“

”آپ نے اس تجویز کو قبول کر لیا؟“ رچم گل نے قدرے  
 نفرت سے پوچھا۔ ”آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ آپ کے  
 خواہوں کی محبت آپ کی بیوی بننے سے پہلے دو تین ماہ کسی اور کی  
 بیوی بن کر رہے۔ اور آپ کے خواہوں کی محبت کے لیے بھی  
 یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا؟“

”مصدر کے وحشت زدہ چہرے پر ایک لمحے کے لیے ہلکی سی  
 گہرائی آئی لیکن وہ غل سے بولا۔ ”آپ پہلے میری دوسری بات سن  
 لیکن سنا کہ افذ کہنے میں اتنی جلدی نہ کریں۔ یہ عجیب ہے کہ یہ  
 صلت پرستی کا دور ہے اور میں بھی اپنی ہونے والی بیوی کی دولت  
 و جائداد کے بارے میں کافی مایوس پرستی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن  
 اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے پاس جذبات بالکل نہیں تھے یا  
 جذبات اور غیرت و محبت وغیرہ جیسے تصورات کی میرے نزدیک کوئی  
 اہمیت نہیں تھی۔ حقیقت میں تو میری جذباتیت ہی میرا کی نظر میں

میری سب سے بڑی خوبی تھی۔“

”بہت خوب!“ رچم گل نے بھروسہ چکا تھا۔

”مصدر ہماری سانس لے کر بولا۔ ”میرا کی تجویز کا ایک اہم حصہ  
 اصل میں یہ تھا کہ یہ شخص دکھاوے کی شادی ہوگی جس کے دوران  
 میں وہ اپنے نام سناڈ شوہر کو اپنے قریب بھی نہیں پہنچنے دے گی۔ وہ  
 شخص کاغذات میں اس کا شوہر ہو گا لیکن درحقیقت وہ اسے چھوٹے  
 کی بھی کوشش نہیں کرے گا۔“

”اوہ۔۔۔!“ رچم گل نے دھیرے دھیرے جھڑی اپنے ہاتھ پر  
 راتے ہوئے ہماری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کو امید  
 تھی کہ آپ کوئی ایسا مسکین اور بے ضرر شوہر تلاش کرنے میں  
 کامیاب ہو جائیں گے؟“

”اس تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں یہی تو مشکل مرحلہ  
 تھا۔ پہلے ایک مسئلہ یہی تھا کہ اس شخص کو پرنس اندسز کا ملازم  
 ہونا چاہیے تھا۔ پرنس اندسز کی صورت طاقی یہ ہے کہ مختلف  
 مقامات پر اس کے کئی پلانٹ ہیں لیکن ان پر کام کرنے والے  
 تانائے فیدہ لوگ ٹیکنیکل اور مزدور ٹائپ ہیں۔ نہ تھوڑے بہت  
 بھی پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں وہ تقریباً سبھی شادی شدہ  
 تھے۔ یہ باتیں بھی میں صرف اس پلانٹ کے لوگوں کے بارے میں  
 جانتا تھا جن میں خود تعینات رہا تھا۔ باقی پیدائش پر کام کرنے  
 والوں کے بارے میں مجھے کوئی معلومات نہیں تھیں۔“

”اگر معلومات ہوتیں تب بھی یہ بڑا مشکل کام تھا کہ میں جانکر  
 ان میں سے کوئی نہایت مناسب، شریف اور قابل اعتماد نظر آئے  
 والا شخص تلاش کر کے اس سے درخواست کروں کہ تم اپنی  
 اندسز کی ہونے والی ماکن اور میری مستقبل کی بیوی سے فی  
 الحال چند ماہ کے لیے شادی کر لو اور ان چند ماہ کے دوران میں اس  
 کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا اور جب بھی تم سے مطالبہ کیا  
 جائے تم بے چوں پر اس حسین اور جوان خاتون کو طلاق دے کر  
 خاموشی سے گھر چلے جاؤ۔ اس کام کا جسب مستقل معاوضہ مل  
 جائے گا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ہمارے منصوبے کے مطابق ہر شرط پر  
 ہائی بھرے والا کوئی آدمی مل بھی گیا تو وہ شادی کے بعد واقعی اپنی  
 زبان پر قائم رہے گا؟ وعدہ خلافی کرنے والے کے ساتھ ہوں تو ہم  
 بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن اس صورت میں ہمارے لیے کوئی بڑی  
 الجھن کھڑی ہو سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ ”نبی قوت“ مسلسل  
 ہمارے خلاف کام کر رہی تھی اور ہم پر مستقل نظر رکھے ہوئے  
 تھے۔“

”اسی مستقل مسئلے پر غور و خوض میں مزید کئی قیمتی دن ضائع  
 ہو گئے۔ وقت ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ آخر میرا نے اپنی  
 ایک جاننے والی کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جو بارے میں  
 کونسل کی مالک تھی۔ انہی مشوروں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ  
 پرنس اندسز کے تمام پلانٹس اور دفاتر وغیرہ میں کام کرنے والوں

کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان میں سے کسی سے بھی براہ راست رابطہ کرنے کے بجائے اگر ضرورت رشتہ کا اشتہار دے دیا جاتا تب بھی امید تھی کہ جتنے لوگ رابطہ کریں گے "ان میں کچھ نہ کچھ تو ایسے بھی ہوں گے جو پرنس انڈسٹریز میں کام کرتے ہوں۔ اصل انٹرویو کے لیے صرف انہی کو بلا دیا جائے اور باقی سب کو بالاطلاسی ٹرانا دیا جائے۔ جنہیں بلا دیا جائے ان میں سے بھی سوزوں ترین امیدوار کو ماریہ مین کو نسل والے سی منتخب کر کے سیرانک بھیجیں اور اسے پہلے سی اعتماد میں لے لیا جائے لیکن ضرورت رشتہ کے عنوان کے تحت ہماری کوشش ناکام ہو گئی۔

"اس اشتہار کے جواب میں جن لوگوں نے رابطہ کیا ان میں سے صرف دو پرنس انڈسٹریز کے ملازم تھے اور وہ بھی کچھ بے ہودہ سے سی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ مضمون بدل کر کسی اور عنوان کے تحت اشتہار دیا گیا اور اس میں فیکلٹی کیسٹرنز نے والی ایک خاتون وکیل کو بھی ڈالا گیا جو بہت سمجھ دار تجویز کار اور مردم شناس تھیں۔ بڑی چھان پھانک کے بعد آخر کار انہوں نے ایک امیدوار کو منتخب کیا۔ اس کا نام کارمان دانش تھا۔۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر نہ جانے کیوں اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔

اس موقع پر میں نے تنگدلی سے مدد طلب کی "مسز مسند منیر! اتفاق سے مجھے کارمان دانش سے چند لمبے کے لیے ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ ترجیح سے پہلے جب میں پرنس سیرا سے مل کر باہر جا رہا تھا تو وہ مجھے گیٹ پر ملا تھا۔ جب میں پرنس سے ملنے پہنچا تو درحقیقت وہ کارمان دانش سی کی ٹھکانہ تھیں اور وہ مجھے سی کارمان دانش سمجھی تھیں۔ انہوں نے اسی غلط فہمی میں میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے ان کا مذاق سمجھ کر اگلے سیدھے جواب دینے شروع کر دیے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو بے روزگار بتایا تھا لیکن انہوں نے اس پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی معلومات کے مطابق تو مجھے پرنس انڈسٹریز کا ملازم ہونا چاہیے تھا۔"

مسند منیر نے گہری غکلوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا "وہ اسے آپ کا مذاق سمجھی ہوں گی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے کسی امیدوار کو اس کے پاس نہیں بھجھا جاسکتا تھا جو پرنس انڈسٹریز کا ملازم نہ ہو۔"

مجھے خاموش ہونا پڑا۔

رجیم کل بولا "کیا پرنس سیرا نے کارمان دانش کو منتخب کر لیا تھا؟"

"جی ہاں۔" مسند کے لہجے میں ایک بار پھر کچھ خوں خواری سی عود آئی "سیرا نے نہ صرف اسے منتخب کر لیا تھا بلکہ پرسوں رات سی خاموشی اور رازداری سے ان کا نکاح بھی ہو گیا تھا۔ تمام انتظامات پہلے ہی مکمل تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ترجیح شام بھی یہیں سیرا کے پاس موجود تھا۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ خبیث۔۔۔۔۔۔ مجھے

کی شدت سے اس کی تواؤز گونا گے میں جھنک رہی تھی۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ جب اس نے سیرا کے گلے کی گرفت کو غصہ کے عالم میں دبوچا تو وہ کون سے دھوکے پر کھڑی تھی اس کے ذہن میں درحقیقت کارمان دانش سی کا قصور اس کی تنگدلی کے دوران میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شاید سارا غصہ و غضب احمد پور کے خلاف تھا اور اسے کیا گم میرا کا قتل ایک سازش تھی اور اس کے پیچھے احمد پور کا لیکن اب بات کچھ بدلتی نظر آ رہی تھی۔

"نکاح ہو چکا تھا۔۔۔۔۔۔" اس خبر پر رجیم کل بھی حیران بن گئے۔ حیرت کا جھٹکا مجھے بھی لگا تھا۔ یہ لوگ واقعی فنکار اور بہت تیزی سے بہت کچھ کر گزرنے کے عادی معلوم تھے۔

مسند نے اثبات میں سر ہلایا تو رجیم کل جیسے لہجے میں "بڑی پھرتی دکھائی آپ لوگوں نے اس کام میں۔"

"وقت تیزی سے ہمارے ہاتھ سے گلا جا رہا تھا۔ ہمیں اور پریشان تھے۔" مسند نے گویا اندر دھنک کر کہا۔

"کارمان دانش ہر اقدار سے آپ کے اور سیرا کے ہم پورا اترتا تھا؟" رجیم کل نے دریافت کیا۔

"اس کا تفصیلی انٹرویو تو سیرا سی نے کیا تھا اور اسی نے اسے لے لیا تھا۔ بہر حال مجھے بھی وہ آدمی مستقل لگا تھا۔ آج کل کسی کے بارے میں چین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شریف اور بھروسے کے قابل معلوم ہوتا تھا۔" مسند نے اپنی باتوں سے لاپلائی بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چند عجیب و غریب سے وہ اس چیکنک کی طرف متوجہ اور پھر اتار دیا تھا۔ وہ سلجھا ہوا اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا لیکن نہایت ہنسناک تھا۔ ہنسناک تھا۔ حالات کے بہنور سے نظریے کے لیے ہاتھ پاؤں مارا ملک میں پھیلی ہوئی بے روزگاری اور اپنی سماجی مجبوروں کی سے وہ اپنی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود پرنس انڈسٹریز کے پلانٹ پر تقریباً مزدور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک جوان کی شادی کی ذمہ داری اس پر تھی۔ والدین مر چکے تھے اور اس نے ورکشاپ میں قرضوں کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔ خود کارخانہ باہر جانے کے پیکر میں چالیس ہزار قرض لے کر ایک دھماکے آئینے کے ہاتھوں گھونکا تھا۔ قرض خواہ اسے پریشان کرتے۔ دونوں بہن بھائی رشتے کے ایک ماسوں کے گھر میں رہتے تھے کسی طرح سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے زندگی کی گادی کھینچتے تھے۔ بہنوں کی آس لیے تنگ دوڑیں لگے ہوئے تھے۔ ان کی دلی تھی جو آج کل ٹھٹھے گھر ذرا سفید پوش طبقے کے قرض گھر کی کہانی ہے۔"

"وہ شادی کے اس ذرا سے کا ایک اہم کردار بننے کے تیار ہو گیا؟" رجیم کل نے تعجب میں چاہی۔



”سہیل..... مجھے معلوم نہیں۔“ مندر نے فنی میں سر ہلایا  
 شاید میرا نے اس کے بارے میں پوچھا ہو۔ مجھے البتہ کاروان کا  
 پتہ نہیں معلوم ہے۔ اس کا ایڈریس تو خیر نس احمد شریز کے ریکارڈ  
 میں اور ماریہ میسج کو کونسل والوں کے پاس بھی ہوگا۔ ماریہ میسج

”ظاہر ہے جناب...!“ وہ ایک لمحے کے لیے سر جھکا۔

المصدقہ در کوشش کوں گا۔ یہ ایچ بہت بگڑ چکا۔ اب کوئی تو ایسا ہوتا  
ہا ہے جو اسے بہتر بنانے کی بھی کوشش کرے۔" رحیم گل بولا۔

مصدقہ گویا اس کی باتوں سے حوصلہ پا کر بولا "مکن ہے کارمان  
دانش کوئی خاص مقصد لے کر میرا کے پاس آیا ہو۔ وہ مقصد پورا  
نہ ہوا ہو۔ مجھے اور تلخ کالی کی قیمت آگئی ہو۔ کارمان  
سے فوری اشتعال کے تحت یہ قتل ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ  
کارمان پہلے سے ذہن میں کوئی مقصد لے کر نہ آیا ہو لیکن یہاں  
آکر اسے کاغذی شوہر کے بجائے جیج کا شوہر بننے کی سوچھی  
ہو۔۔۔ وہ ہر حال ایک غیر شہہ نوجوان تھا۔۔۔ یہاں کا خوب  
صورت اور مدان پرور ماحول۔۔۔ میرا جیسی لڑکی کی موجودگی۔  
خلوت کا احساس۔۔۔۔۔۔ ایہ سب چیزیں کوئی گل کھلا سکتی تھیں۔  
اور میرا کا انبیج کا وہ بچہ بھی رہا ہو لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ وہ کتنے  
مقبوضہ کردار کی مالک تھی۔ وہ بسک نہیں سکتی تھی۔ وہ مزاحمت پر  
اتر آتی ہوگی۔ کارمان پر شاید شیطان سوار ہو۔"

"اس قسم کی کسی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔"  
رحیم گل بولا "مزید بارگیاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے واضح  
ہو جائیں گی۔ اگر یہ قتل فوری اشتعال کے تحت نہیں ہوا تو پھر  
ہمیں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ کارمان نے کچھ سوچ کر میرا کو قتل کیا  
ہو گا۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ تو اپنے بیروں پر کھڑا ڈی مارنے کے حذر اہ ہے۔  
وہ ایک ضرورت مند نوجوان ہے۔ دس لاکھ کی جس رقم کی امید پر  
وہ اس ڈرا سے میں حد سے رہا تھا اس طرح تو وہ بھی ڈوب گئی ہے۔ یہ  
امریکا تو ہے نہیں۔ کہ جہاں بیوی کی موت کی صورت میں شوہر  
اور شوہر کی موت کی صورت میں بیوی تمام دولت و جائیداد کی مالک  
بن جائے۔ امریکا میں بھی شوہر اسی صورت میں دولت مند بیوی کو  
قتل کر کے سب کچھ حاصل کرنے کی توقع رکھ سکتا تھا جب کہ قتل کا  
الزام اس پر نہ آتا۔ یہاں تو قتل کا الزام کارمان پر آسکتا ہے اور  
اسے کسی بھی طرح میرا کے مرنے کا کوئی فائدہ پہنچتا نظر نہیں  
آتا۔"

"اگر وہ قتل کے الزام سے بچ جاتا ہے تب تو وہ مقدمے بازی  
و فیروہ کر کے دس لاکھ سے کہیں زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا  
ہے۔" مصدقہ نے امکان ظاہر کیا "اور اس سے کہیں زیادہ فائدہ  
واجہ پر پرویز کو پہنچ سکتا ہے اور اسے فائدہ پہنچے کا اصل مطلب احمد  
پرویز کو فائدہ پہنچا ہے۔ وہ عورت تو خیر اس قسم کی گھناؤنی حرکت  
کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"لیکن آپ کے خیال میں احمد پرویز ایسا سوچ سکتا ہے؟"  
رحیم گل فوراً بولا۔

"وہ تو نہ صرف سوچ سکتا ہے بلکہ خود محفوظ رہتے ہوئے ایسی  
کسی بھی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے وسائل اور ہمت بھی رکھتا  
ہے۔" مصدقہ نے بلا آمل جواب دیا۔

گویا آپ کے حساب سے ایک نہیں دو مشکوک آدمی

ہوئے گھنٹی سانس لے کر بولا "مگر ہر انسان بیشہ کج نیلے کرنے  
اور کج اندازے لگانے پر قادر ہوتا تو دنیا کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی  
جو تباہ ہے اور تاریخ کے صفحات تباہیوں کے تذکروں سے اٹنے  
داں دار نہ ہوتے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد رحیم گل بولا "دوسرے لفظوں  
میں آپ کتنا چاہتے ہیں کہ کارمان دانش، میرا کو قتل کر کے فرار  
ہو گیا؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہا۔۔۔" مصدقہ نے فوراً ایک سمجھ دار  
انسان کی طرح باقاعدہ کوئی الزام عائد کرنے کی ذمہ داری سے  
بچتے ہوئے کہا "میں تو ایک امکان کی بات کر رہا ہوں۔ آخر اگر کوں  
میرا کو قتل کر سکتا تھا؟ آپ خود ہی نتیجہ اخذ کر چکے ہیں کہ یہ چوری  
راکے کی واردات نہیں ہے اور آج شام سے میرا کے پاس  
کارمان دانش کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ میرا نے مجھے فون کر  
کے بتایا تھا کہ کارمان اس کے پاس آیا ہوا تھا۔"

"اس نے کوئی وجہ نہیں بتائی کہ وہ کیوں آیا ہوا تھا؟" رحیم  
گل نے فوراً سوال کیا "اس کے آنے کی کوئی خاص وجہ تو نظر نہیں  
آتی۔ نکاح ہو چکا تھا اور اسے میرا کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ یہ  
محض رکاوٹ کی شادی تھی۔"

"میرا نے مجھے کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ ہو سکتا ہے اس وقت  
تک کارمان نے اس کے سامنے کوئی وجہ بیان ہی نہ کی ہو۔ یہ بھی  
میں ممکن ہے کہ کارمان بغیر کسی وجہ کے ہی چلا آیا ہو۔ میرا  
بہر حال جوان، حسین اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ کسی بھی  
نوجوان کا اس سے ملنے کوئی چاہ سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ وہ قانونی  
طور پر اس کا شوہر بھی بن چکا ہو۔"

ایک لمحے خاموشی رہی پھر رحیم گل بہت اخلاقی کے سے  
انداز میں بولا "مصدقہ صاحب! آپ کل کرات کیجئے۔ اپنی احتیاء  
بندی کو خودرا کم کیجئے۔ آپ نے یہاں آتے ہی اپنے ہنڈیات کے  
انبار کے سلسلے میں کچھ بے ساختگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر وہ بے  
ساختگی برقرار رہ سکے تو ہمیں تفتیش میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اگر  
آپ چاہیں تو اپنی کسی ہولی کسی بات کو آف دی ریکارڈ فرار سے  
سکتے ہیں۔ ہم آپ سے اس حد تک تعاون کرنے کو تیار ہیں کہ ہم  
مگر اسے آف دی ریکارڈ ہی سمجھیں گے لیکن اس کے لیے  
ضروری ہے کہ آپ بھی ہم سے کچھ تعاون کریں۔ ہمیں آپ کا  
اصل کچھ نظر معلوم ہونا چاہیے۔"

"میرے کچھ نظر سے کیا ہوتا ہے جی۔۔۔۔۔۔" وہ مجھے لمبے میں  
بولا "بہر حال آپ کے اس ہنڈیانہ اور ہودوانہ رویے کا بہت  
شک ہے۔ میں اپنے ہاں کی پولیس سے اس قسم کے رویے کی توقع  
نہیں کر سکتا تھا۔"

"میں اپنی زندگی میں جس مشن کے لیے کام کر رہا ہوں اس کا  
ایک ہودا صاحبہ یہ بھی ہے کہ میں پولیس کا انبیج بہتر بنانے کی حتی

ہال میں میرے اور رحیم گل کے سوا کوئی تیسرا فرد موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے صندوق کی طرف دیکھا۔ وہ غرت بھری نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ بات کسی حد تک اس کے حق میں جاتی تھی کہ اس نے اپنے طرز عمل یا اپنی باتوں میں احمد پرویز کے خلاف اپنی غرت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی اور منافقت سے کام نہیں لیا تھا۔

چند لمحے بعد احمد پرویز اپنی بیوی کو ساتھ لے بیٹہ دم سے نکلا دکھائی دیا۔ واجدہ نے اس کے بازو کا سہارا لیا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ وہ اس کے ساتھ گویا ٹھٹھری رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی ہال میں سے نہیں گزرے بلکہ بیٹہ دم کے سامنے والی راہ واداسی سے ہی گزر کے دوسرے راستے سے نکل گئے۔ صندوق کھڑکی کے راستے بھی انہیں باہر تک جانے دیکھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں غرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ احمد پرویز نے تو کہہ کر ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے دل میں صندوق کے لیے شاید اس سے بھی زیادہ غرت تھی۔ وہ دونوں بجلی کی ان تاروں کی طرح تھے جن میں نہ جانے کتنے دولت بجلی گزر رہی تھی۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے چھوٹا بھی نہ جانے کتنی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔ تاہم احمد پرویز کے رخصت ہو جانے کے بعد جیسے فضا میں ایک خطرناک تازہ ختم ہو گیا۔ صرف سو گواہی رہی تھی۔ یہ جہاں مرگی کی سوگواہی تھی۔

چند لمحے بعد رحیم گل نے سکوت توڑا اور صندوق کو مخاطب کیا "آپ کے خیال میں احمد پرویز کو ڈول کی دولت دجا کر ادا کے لیے اپنی سالی کو قتل کروا سکتا ہے؟"

صندوق اس سوال کا کوئی براہ راست جواب دینے کے بجائے بولا "اس دنیا میں۔۔۔ بلکہ صرف ہمارے ہی ملک میں نہ جانے کتنے لوگ اس سے بھی کم دولت دجا کر ادا کے لیے اپنی سالی کو قتل کر رہے ہیں۔ سالی تو پھر بھی خون کا رشتہ نہیں ہے۔"

"تھمارا کیا خیال ہے؟" رحیم گل نے میری طرف دیکھا۔

"کوئی خطرناک جیسے۔۔۔!" میں نے بھی فیرواح جواب دینے کی کوشش کی "جین میرا کے قتل کے سلسلے میں اس کا کیا کردار ہو سکتا ہے یہ میں ابھی نہیں سے نہیں کہہ سکتا۔"

رحیم گل ٹھوڑی کھانے ہوئے بولا "مجھے ابھی تک کارمان پر ہی سب سے زیادہ شک ہے۔ ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہاتھ آجائے۔"

میرے خیال میں یہ اس کا بگ تھا۔ کوئی بھی اچھا پولیس آفیسر اس طرح کی صورت حال میں کسی پر حتیٰ انداز میں شک کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی رائے محفوظ رکھتا اور عملی طور پر جو کرنا ضروری ہوتا وہ کرتا۔

صندوق کو گویا کچھ خیال آیا اور وہ رحیم گل سے مخاطب ہوا۔ "آپ نے چوری یا دھپتی کے نکتہ نظر سے اسٹوڈو کا اچھی طرح

تجسس زیادہ باہر تک پہنچنے سے تو بازو نہیں لیا۔ اگر میرا چوری یا دھپتی کے چکر میں چل گیا کیا ہوتا تو اس کے ۲۵ سالے نظر آجاتے۔ کئی اچھی سلی میٹھی چیزیں اور دوسرے کھری ہوئی چیزیں انہیں اغوا کر لے جانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ خود میرا کے جسم ڈانٹنڈ کی دو تین چیزیں موجود تھیں! انہیں بھی نہیں بچھڑا گیا۔"

"ایک آدمہ جگہ ایسی بھی ہے جو زیادہ خفیہ تو نہیں۔۔۔! ٹھوڑی بہت خفیہ ضرور ہے۔ اعتباراً اس کا بھی بازو نہ چاہیے۔ اگر وہاں سے چیزیں بھی غائب ہوئیں تو پھر یہ چور دھپتی کا کیس بھی ہو سکتا ہے۔ اور چور کارمان بھی ہو سکتا ہے۔" صندوق اٹھتے ہوئے بولا۔ میں اور رحیم گل بھی اس کے ساتھ کمرے ہوئے۔

اس کی رہنمائی میں ہم ایک بیٹہ دم میں پہنچے۔ یہ وہ بیٹہ دم نہیں تھا جس میں واجدہ پرویز کو لٹا گیا تھا۔ یہ بجلی اعلیٰ درجے کا تمام ضروری اور غیر ضروری سامان سے آراستہ تھا۔ کتنے کو یہ بگ آرٹ اسٹوڈو کے طور پر استعمال ہوتا تھا لیکن یہاں اعلیٰ درجہ کا رہائش کے بھی تمام لوازمات موجود تھے۔

صندوق نے بیٹہ کے نیچے موجود ایک خفیہ دروازہ کو باہر کھینچا واقعی کچھ ایسی زیادہ خفیہ بھی نہیں تھی۔ آج کے دو درمیں چھلنے والوں کو اس قسم کے تمام ٹھکانوں کا علم ہوتا ہے اور وہ سب سے پہلے انہی کی تلاش ہی لیتے ہیں۔ اس دروازے میں تو کتنا بھی موجود تھا۔ دروازہ باہر آتے ہی ہمیں اس میں زیورات کے کئی گلیں لٹائے رکھے دکھائی دیے۔ صندوق نے سب ڈول کو باری باری کھولا اور ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ سب میں ڈانٹنڈ کے زیورات تھے۔ چھ لکھ لکھ لے لے تو میں بھی دم بخود گیا۔

میرے لیے ایک نظر میں ان کی مالیت کا اندازہ لگانا تو عمل تھا لیکن میں ممکن تھا کہ ان کی مالیت لاکھوں کے بجائے کروڑوں کی حدود میں ہوگی۔ یہ بلاشبہ ناقابل تمیز سی بات تھی کہ انہی لاکھوں کے زیورات بغیر تانے کی ایک دراز میں ایک ایسے جگہ میں پائے ہوئے تھے جس کے دو دروازے پر چوکی دار تک موجود نہیں تھا۔ جہاں زیادہ تر صرف ایک تھا تو ان کی موجود رہتی تھی۔

ان زیورات تک میری اور رحیم گل کی رہنمائی کر کے منے نے گویا اپنی ٹیک نیچی کا ایک واضح ثبوت پیش کر دیا تھا۔ ایسے تو زیورات کے لیے کسی کی بھی نیت خراب ہو سکتی تھی اور انہی لاکھوں کے سوا کسی کو ان کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ اگر اس کی تلاش میں ذرا بھی غلطی آجاتی تو وہ ان کے بارے میں زبان بند کر دیتا تھا اور بعد میں نہایت آسانی سے ان پر ہاتھ صاف کر سکتا تھا۔ کل اور اس کے تو میں نے سرسری انداز میں ہی جانے دیا تھا۔ بازو لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ یہاں چوری یا دھپتی کی کوشش نہیں ہوئی تھی اس لیے انہوں نے دوسرے دھپتی یا دھپتی پائوس نہیں مارے تھے۔ دیے ان کا اندازہ تو ٹھیک سی خاکہ بنا

اس سے مجبوری طور پر معاشرے میں ظاہر ہے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا لیکن دوسرے سمت سے لوگ تو اتنا بھی نہیں کرتے تھے۔ میں کم از کم اس تضاد کے بارے میں سوچتا تھا۔ بے شمار لوگ تو سوچتے بھی نہیں تھے بلکہ شاید وہ اس تضاد سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ اپنی دولت کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرتے تھے۔ میں اپنی سی کو ششیں کرنے کے باوجود معاشرے کے پے ہوئے طبقوں کے سامنے اپنے آپ کو مجرم مجرم سا محسوس کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یا کسی فلاحی ادارے کے نام کر کے کہیں باہر نکل جاؤں لیکن ابھی تک اس ارادے پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی تھی۔

مفرد کہہ رہا تھا "میں میرا سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ وہ ان زیورات کو کہیں لا کر دے دو یہ تو میں رکھ دے لیکن وہ اس تردد میں بھی نہیں پڑتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ مجھے تو کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ میرا کسی وقت بھی انہیں پہننے کا موڑ ہو سکتا ہے اگر اس وقت لا کر کھانا نہ ہو تو میں کیا کروں گی۔ بس۔۔۔ وہ سخت موٹی لڑکی تھی۔ اس سے کوئی بات متوانست مشکل تھا۔"

"اس کے باوجود آپ اس سے شادی کرنے کے لیے بے تاب تھے!" میں نے بغیر نہ رہا۔

"سمت اسی کا نام ہے۔" مفرد افسردہ لہجے میں بولا "دیے اس کی شخصیت کا یہ پہلو کبھی کبھی ہی نمایاں ہوتا تھا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کوئی بات اتنی ہی نہیں تھی۔ اکثر ان بھی نہیں تھی بلکہ کبھی کبھی تو اس کی سعادت مندی ناقابل یقین لگتی تھی۔ اس کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کسی لڑکے کی طرح زندگی گزارنے کی عادی ہونے کے باوجود اسی گھر میں اپنے ہاتھ سے کبھی کبھی میرے لیے کھانا بھی پکاتی تھی۔ کبھی کبھی آڑے وقت میں۔۔۔ اور غلبت کے عالم میں میرے جوتے بھی پالش کرتی تھی۔ آپ اس بات پر یقین کریں گے؟"

"بات تو واقعی ناقابل یقین ہی ہے۔" راجم گل بولا۔

میرے لیے اس میں بے شک دلی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے دیکھے لہجے میں کہا "مورت سے کسی بھی بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔"

"مفرد شادی شدہ ہونے کے باوجود حمیس عورتوں کے بارے میں بہت تجربہ ہے۔" راجم گل نے مجھے گھورا۔

"میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"واقعی!۔۔۔" راجم گل نے سر ہلایا "ہم لوگوں نے تو آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی ہے اور کانوں میں دھلی ٹھوس جھونکی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہاں۔۔۔ کم از کم پولیس کے بارے میں تو یہی کہا جا سکتا ہے۔" وہ نہ بولا ہمارے معاشرے کا یہ حال ہوا۔ "میں نے بے ساختہ کہا۔ راجم گل نے بھی لڑکی نظروں سے مجھے گھورا۔ وہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا تھا کہ پرائی بٹ شروع کرنے کا یہ کوئی موقع

نہیں کی کو شش واقعی نہیں ہوئی تھی لیکن ان کی اس بے توجہی سے کوئی شراغ بھی نظر سے اوجھل نہ سکتا تھا۔

راجم گل کو اپنے آپ کو بے نیاز ظاہر کرنے کی خاصی عادت تھی لیکن ان زیورات کو دیکھ کر وہ بھی سنبھل کر رہ گیا۔ وہ مفرد کو نے بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے تھیں سے انداز میں سر ہلا کر دیکھ کر تھیں میرا ہی پائلش فراصل میں کسی اور جگہ میں بھی تھا؟

"جی ہاں۔۔۔ ڈپٹی کا ایک بھگہ اس کی اصل رہائش تھا۔ وہاں ملازم دے دیا بھی موجود ہیں۔" مفرد نے جواب دیا "لیکن اس کا زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ بعض اوقات وہ ہمیں سے تیار ہو کر دلی دے دیا بھی مل جاتی تھی۔ اسی لیے زیادہ تر زیورات بھی ہمیں رکھے ہوئے تھے لیکن یہاں وہ سکون اور تنہائی چاہتی تھی اس لیے وہاں میرے علاوہ کسی کو بھی ملائی تھی تو اسے ضرورت کے تحت بلا کر ہزار ہا دلی کے خیال سے ملائی تھی۔"

راجم گل ایک لمحے کے لیے پُر خیال انداز میں خاموش رہا۔

تاہم وہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے غربت و ملامت کے اس بھیاک فرق کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی طرف احساس کی نظر سے دیکھنے والوں کا دل دماغی فزنا ہو جاتا تھا۔ ہمارے ہاں ایک طرف دولت کی کمی کوئی حد نہیں تھی اور ایک طرف غربت کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔ ایک طرف تو یہ عالم تھا کہ صرف ایک فرد کے رہنے اور غفلت مسم کے شوق کی تکمیل کے لیے سگے ترین علاقوں میں گھر گھونڈ کے ٹکڑے موجود تھے جن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی تمام نعمتیں بھی تھیں۔ لاکھوں کے۔۔۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ کے زیورات تھے۔ بیٹوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں نہ جانے کیا کچھ ہوا تھا۔ اس پر بھی طوطا یہ کہ مزید بے اندازہ دولت و جائداد اس کے ہاں تھے۔ اس نے دلی تھی جس کے لیے کھینچا جاتی شروعات ہو چکی تھی۔

وہ دلی طرف ایسے بھی بے شمار لوگ تھے جو گندے ہاتھوں کے ستارے ہاندہ بوز، گھاس پھوس اور لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ایسے مکانوں میں رہتے تھے جو تیز بارشوں اور آندھیوں میں ٹھکڑے جاتے تھے اور ان میں بھی جگہ کی گلی کا یہ عالم تھا کہ دس دس افراد ایک ایک کمرے میں سوتے تھے۔ ان محنت لوگ ان جتنوں پر زندگی گزار رہے تھے جہاں زندگی کا تصور محال تھا۔ ان حالات میں کسی سے یہ تھے جن کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ مذہب دنیا کے بہت سے لوگ تو اگر قریب جا کر دیکھتے تو حیران ہوتے کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھے۔ یہ ایک بھیاک تضاد تھا جس کے بارے میں ہمیں اکثر سہارا کرنا تھا کہ کہیں یہ سوسائٹی میں کوئی بھیاک انقلاب تو نہیں آئے گا۔

میں خود بھی اس تضاد کا ایک حصہ تھا لیکن اسے عمل طور پر محسوس کرنے یا اس میں نمایاں کی لانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں انفرادی سطح پر اپنی سی کو ششیں کرتا رہتا تھا۔ کسی کمزور کو سارا دے کر اس کے لانے کے سلسلے میں جو کچھ ہو سکتا تھا کرتا رہتا تھا لیکن

نہیں ہے۔

میں نے اسے بلایا اور زیورات کے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے کہا مہر جال ان زیورات کی موجودگی سے اس شخص کے قصد حق ہو جاتی ہے کہ یہاں کارمان یا کسی اور باطل فہم فرد نے چوری کر کے یا ڈاکا ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی اور میرا بھی کسی کوشش کے دووان میں مزاحمت کی وجہ سے نہیں مارا گیا۔

مفتدر نے پُر خیال انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور بیٹے کی خلیہ دراز کو بند کرنے لگا۔ اسی لمحے میری نظر اس کی کلائی پر بندھی ہوئی جھللائی گئی، پڑی۔ وہ ایک عمدہ اور پیش قیمت گھڑی تھی لیکن اس کے پیچھے بڑی گہری خراش پڑی ہوئی تھی اور وہ بند تھی۔ غالباً اس نے جب دو مرتبہ زور سے دھچکا پر کھوسنا مارا تو اس کی گھڑی بھی دیوار سے رگڑ کھا گئی تھی لیکن میں نے اس وقت اس نقصان کی نشان دہی نہیں کی۔

اس کے بجائے میں نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "کافی رات بیت چکی ہے۔ مجھے تو اب اجازت دو ان پیکلز اکل ملاقات ہوگی۔" میں نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔ "جب کارمان دانش تمہارے سامنے پہنچ جائے تو مجھے بتانا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرتا ہے۔"

رجیم گل نے سخت غصہ ہوا۔ وہ گویا آنکھوں میں ضرورت آن پڑی تھی؟ میں نے آنکھوں میں آنکھوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ فی الحال مجھے بات کچھ آگے بڑھتی نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے میرا دہاں ٹھہرا فضول تھا۔ اس کی توخیر دیوٹی تھی۔ وہ بال کی کھال نکالنے کے لیے تمام رات بھی وہاں ٹھہرا رہتا تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ فی الحال ہمارے سامنے ایک دیوار اٹھ چکی تھی۔ اس دیوار سے سر کرانے کے بجائے اپنے ہونٹ جا کر آرام کرنا بہتر تھا۔

رجیم گل نے گویا بادل یا غماض مجھے جانے کی اجازت دے دی اور میں ہونٹ داپس پہنچ کر دل میں ایک بے عنوان سی غلغلہ اور بے نام سی افسردگی کے پرئس سیرا کے بارے میں سوچنے اور اس پر اسرار سکے پر غور کرتے کرتے سو گیا۔

دوسری صبح میں صبح دے رہے تھا۔ تیار ہونے کے بعد ناشتا اور دوپہر کا کھانا میں نے اپنے کمرے میں مشرق کی کھال پر ایک فاسٹ اور لچ کا یہ مرکب یعنی "برنچ" BRUNCH مجھے اکثر ہی کھا جاتا تھا۔

آقا زاد پیر کے قریب میں چلے اپنے دفتر میں پہنچا۔ کچھ دیر بعد امیر میرے سامنے کچھ قلمی ریکٹے آئی تو مسکراتے ہوئے ہوئی۔ "میرا آپ راتوں رات کافی مشغور ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا چمکتے ہوئے پوچھا۔

"شام کے کئی اخباروں میں آپ کی بڑی اچھی سی تصویر بھی ہے۔ جس خبر کے حوالے سے ہمیں یہ وہ تو افسوس ہاں ہی ہے۔"

چھپائی آپ کی اور مغلان کی تصویریں بہت یاد رکھی ہیں۔ اس میں جواب دیا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کہا "کیا خبر کے مطابق میں بھی مشغول ہو گیا ہوں؟"

"خدا نہ کرے۔" وہ گویا دل کر بے ساختہ بولی "مفتدر صرف ایک مشغول کا ذکر ہے۔ پرئس سیرا کا! آپ نے تو اب لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ اخبار دانوں نے صرف اس حملہ سے بھی آپ کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔"

"میں نے پاس میری تصویر کہاں سے آئی؟" وہ پوچھا۔ "میں نے میری تصویریں کاکوٹی پر پڑنا تو ذکر فرمیں پہنچا تھا۔" میں نے حیرت سے کہا۔ ظاہر ہے امیر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے ساتھ ہی اس سے کہا "میرا وہ اخبارات کا مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

امیر جلدی سے اخبارات لے آئی اور میری میز پر رکھ کر کہا۔ "ان میں تین امیر کے اور ایک اخبار انگریزی کا تھا۔" وہ ریلوے کے چٹے سے ٹپک لگا کر ذرا اطمینان اور پارک سے جاتے ہوئے لگا۔ "درحقیقت وہ صرف پرئس سیرا کے قتل کی قلمی شہین شام کے اخباروں نے اپنی روایت کے مطابق مختصر اور تصویروں کو ذرا سنسنی خیزی میں شہینوں کے ساتھ کالی بھیا شائع کیا تھا۔"

پرئس سیرا کی ایک تصویر زندہ حالت کی تھی جسے پہلے میں اور کی طرف خوب نمایاں انداز میں تین کالی سائز میں چھاپا تھا۔ اس میں کوئی ٹپک نہیں تھا کہ وہ فوری طور پر اپنی توجہ منہ کرانے والی تصویر تھی۔ اس میں پرئس سیرا کا سر اور ٹھکانہ اچھل غاصی نمایاں تھی۔ دوسری اور کالی پھولی تصویر اس کی کالی کی تھی۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ زندگی اور موت فرق تصویروں میں بھی اجاگر ہو جاتا ہے۔

تیسری تصویر اس خاکسار کی تھی جو تصویر میں کچھ ایسا غامض نظر نہیں آتا تھا۔ میری تصویر مشغول کالی ہونے کے باوجود تمام نمایاں نظر آ رہی تھی۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ درحقیقت وہ میری تصویر کی تصویر تھی جس میں شاید میں دوسری دو تین اہم شخصیتوں کے ساتھ موجود تھا لیکن اس خبر کے ساتھ لگانے کے لیے مجھے تصویر کو طالعہ کر کے غالباً بڑا بھی کیا گیا تھا۔

خبر کو کہ صرف پرئس سیرا کے پراسرار قتل کی تھی اور نہ صرف اس حد تک آیا تھا کہ شہر کے ممتاز بریس میں اور انشاہ ہوئی کے مالک افضل چوہدری جب دوپہر آدھی رات سے کچھ پرئس سیرا کے بلاؤس پر اس کے جگہ پر پہنچے تو وہ مردہ پڑی ہوئی کی حالت میں پائی گئی تھی اور حقیقت کے لیے سبھی اخباروں نے اپنی آنکھوں اشاعتوں کا انتظار کرنے کی درخواست کی تھی۔ ان اخباروں کی یہ مستعدی بھی کچھ کم نہیں تھی کہ انہوں نے دوپہر رات کے بعد کی خبر نمایاں تصویروں کے ساتھ شائع کی۔

ہیرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی غفلت تھی لیکن میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ خیالوں کی جھل میں جیسے کوئی پھلی تھی جو دھڑک رہی تھی پھر میری تھی مگر ہاتھ نہیں آتی تھی اور کوئی ٹیپی قوت کہہ رہی تھی کہ اسے پکڑنا بہت ضروری تھا۔

ابھی میں اسی کو شش میں الجھا ہوا تھا کہ اثر کام کے بڑے خیال کی نازک ذور توڑ دی۔ اہمیر نے تپا کہ کوئل جان کریا کی کا فون تھا۔ میں اس کے فون کی توقع کر رہا تھا۔ میری ہدایت پر اہمیر نے لائن طائی تو کوئل دو دینے والی آواز میں بولا "سائیں! یہ کیا ہو گیا۔ ہماری تو فانی ذوق مگی حلالاں کہ ہم نے آپ جیسے آدمی کو ناخدا بنایا تھا۔"

"کیا ہو گیا بڑا در کوئل؟" میں نے ذرا انجان جیتے ہوئے کہا "یہ فلی خیم کے مکالے کیوں بول رہے ہو؟"

"سائیں! یہ فلی مکالے نہیں ہیرے دل کی آواز ہے۔" وہ کچھ اور رقت زدہ سی آواز میں بولا "میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ کے تعاون سے میں نقصان سے بچ جاؤں گا مگر وہ تو بے چاری لڑکی سی مر گئی۔ اور ہاں۔۔۔ یہ آپ اتنے انجان کیوں بن رہے ہیں جیسے آپ کو کچھ بتا رہی نہیں ہے۔ آپ کی تو اس سینے کے پلو میں تصویر چھپی ہے۔ سائیں! مجھے تو لگتا ہے اب میری رقم بالکل ہی ذوق جائے گی۔ بلکہ مجھ پر جمانے اور ہرجانے بھی پڑے گا۔"

"کوئل! یا راپوے افسوس کی بات ہے۔۔۔ ہمیں ایک خوب صورت جوان اور بے قصور لڑکی کے قتل کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ صرف اپنے مالی نقصان کی فکر پڑی ہوئی ہے۔" میں نے کسی حد تک طاقت کے سے انداز میں کہا۔

کوئل کے انداز گفتگو سے ایک عجیب سا دلچسپی محسوس تھی۔ وہ سامنے نہ ہوا اور اس کی گفتگو سنی جاتی تب بھی احساس ہوا کہ کوئی سادہ دل شخص بول رہا ہے اور وہی بول رہا ہے جو اس کے دل میں ہے۔ مباحثت یا زبان سازی اسے بالکل نہیں آتی تھی۔

اس وقت بھی اپنی اسی مخصوص سادگی سے بولا "دکھ تو ہوا ہے سائیں! مگر شاید زیادہ دکھ اس لیے نہیں ہوا کہ میں اسے جانتا نہیں تھا۔ کبھی طاقت نہیں تھا۔"

میں نے یوں ہی اپنے سوا کچھ جو جھل میں اس کی طرف غفلت کرنے کے لیے غفلت سے لیے میں کہا "کوئل! اتنی عجیب بات ہے کہ کسی کے مرنے کا دکھ محسوس کرنے کے لیے بھی ہم نے کچھ شرائط رکھ دی ہیں۔ ان مخصوص شرائط کے تحت ہمیں کسی کے مرنے کا دکھ ہونا ہے۔ مثلاً کیا مرنے والا ہمارا ہم زبان تھا؟ کیا سیاسی طور پر ہمارا ہم تھری تھا؟ کیا اس سے ہمارا کوئی تعلق "واسطے" واقفیت یا فرض تھی؟ اس طرح اپنے دکھ اور افسوس کو ہم نے مخصوص خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ صرف انسانیت کے ہاتھ ہمیں کسی کے مرنے کا افسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض کے معاملے میں تو شاید خوش ہوتی ہے۔"

"میں بات نہیں ہے افضل سائیں!" وہ ذرا شرمندگی سے

تک چلی کر دی تھی۔ گویا اب وہ بھی کافی حد تک مطلبی اخباروں کا طالب کرنے لگے تھے۔

بب تک میں پرنس میرا کے اسٹوڈیو سے واپس آیا تھا اب تک چل کر میں نے کسی اخباری نمائندے کو وہاں نہیں دیکھا تھا اس لیے اس "مستعدانہ" کوریج کے پیچھے مجھے کسی مریاں کا تعاون "مثالی حال لگتا تھا۔" کرائم کی رپورٹوں کے سلسلے میں کرائم رپورٹوں کا خبریں حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ پولیس ہی تھی۔ جس خبر کو پولیس ذرا لیت کرنا چاہتی تھی اس کے سلسلے میں آخری جھکڑے استعمال کر کے اسے کچل لیت کر دیتی تھی لیکن جسے وہ جلد از جلد منظر عام پر لانا چاہتی تھی اس کے سلسلے میں غیر معمولی تعاون بھی کر لیتی تھی اور کوئی تصویر اگر اس کی رسائی میں ہوتی تو وہ بھی فراہم کر دیتی تھی لیکن اگر رپورٹرز اور فوٹو گرافرز خود بدلتے جائے تو قریب پر پہنچ جاتے تھے تو پھر عام طور پر انہیں کسی کے تعاون اور ہمنوائی کی ضرورت نہ رہتی تھی وہ اپنی مرضی اور اپنے اپنے حساب سے رپورٹنگ کرتے تھے۔

میرا کے قتل کی خبر جتنی "پھٹی" اور جس انداز سے چھپی تھی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے پیچھے راجہ گل کا دست خانوں کام کر رہا تھا اور میری تصویر بھی اسی نے اخبارات کو فراہم کی تھی۔ ویسا اس نے کسی بری نیت سے یا زیادہ چالاکی دکھانے کے ارادے سے نہیں کیا تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ زبانی خواہ ہم ایک دوسرے کے کتے ہی بنے اوجھڑتے لیکن نہ تو وہ میرے معاملے میں بدخواہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی میں اس کے معاملے میں۔

اسی خبریں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی تھی۔ وہ کرائم کی ایک سیدھی سادگی اور مختصر سی خبر تھی۔ اس لیے والدین نے اپنے اپنے انداز میں خفیف سا یہ اثر دینے کی کوشش ضرور کی تھی کہ اس واقعے کے پیچھے کوئی اسکینڈل نہ ہو بلکہ یہ سادہ تھا۔ یہ ان کی عادت بھی تھی اور مجبوری بھی۔ انہیں اپنے قریب کو دانہ تو ڈالنا تھا۔ اور پھر پرنس میرا کے قتل کا اب بھی کچھ اسکینڈل تو بننا ہی تھا۔ راجہ گل نے تو صرف اتنی کیا تھا کہ اس رپورٹ کے لیے سوا اور تصویریں فراہم کرنے میں تعاون کیا تھا جس کی وجہ سے اخبارات کے لیے مستعدی دکھانا ممکن ہوا تھا۔ راجہ گل پہلے بھی ایسا کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تب بھی کوئی اہم خبر نہیں آتا تھا وہ کوشش کرتا تھا کہ اسے اخباروں میں اچھا لگتا جائے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ خود میں منظر میں رہا ہند کرتا تھا۔ اس کی کبھی تصویر نہ کیا نام بھی اخبارات میں نہیں آتا تھا۔ اس کا نام کہ صرف مصنفہ پولیس آفیسر کے طور پر آتا تھا۔

ان تمام اخبارات میں وہ خبر پھرنے کے بعد میں دیر تک راکت بیٹھا ہوا اور اپنی کاروباری فائلوں کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ یہی مختصر میں اب بھی گزشتہ رات کے تمام مناظر گھوم رہے تھے اور میں ان کی تمام جزئیات پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہو تو اس کے ساتھ ضرور مہمانی اور ہمدردی کا سلوک کرنا چاہیے۔ لیکن جب اس طرح کا کوئی مسئلہ نہ ہو تو پھر جس طرح بھی ملے اس طرح لے لینی چاہیے۔ لہذا اگر دی 'دادا' گیری یا دہشت گردی ہو تو جب کھلا سکتی ہے جب ہم کسی سے ہستا 'تادان' یا جیسی چھو لے کر خوش کریں۔ کیا خیال ہے؟

"میں کیا خیال ظاہر کروں سائیں! آپ بڑے آدمی اللہ دانش ور ہیں۔"

"اے خدا ایسا! میں نے کراہ کر اس کی بات کیا ہوئے گا؟ کم از کم مجھ پر دانش ور ہونے کا الزام تو مت لگاؤ لیکن میں ہم جنہیں دانش ور سمجھ کر دل میں ان کی کرتے تھے بعد میں جب ان کے قریب ہونے کا موقع ملا تو پتا چلا وہ تو ذہنی طور پر بونے۔ بلکہ باشتی تھے اس کے بعد سے تو وہ دل کی دانش وری سے فیض حاصل کرنے کی تنہا بھی دل سے اٹھتی۔ اب تم مجھے دانش ور قرار دینے پر تھے ہوئے ہو۔ یہ ادنیٰ منصب ہے چارے بھائی! تم مجھے اس خوش فہمی میں کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

"سائیں! ہم جیسے جاہلوں کے لیے تو آپ بھی دانش ور ہیں وہ بلکا فتنہ لگا کر بولا "میں نے تو اپنا کام آپ کے سپرد کیا تو اب آپ اسے کسی دیکل کے سپرد کر رہے ہیں۔ ہر حال آپ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ہی کر رہے ہوں گے میرے لیے اس طرح بھی ٹھیک ہے بس میرا کام ہو جانا چاہیے۔"

"تمہارا کام ہو جائے گا۔ میں خواب ڈرا دے کرے گا لگ گیا ہوں۔ مجھے پرنس میرا کے قاتل کو تلاش کرنا ہے۔"

"اس کام کی فیس آپ کو کون دے گا؟" وہ قدرے حیرت سے بولا۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "تم سے کس نے؟"

"ارے ہاں۔ میں تو بھول گیا تھا کہ آپ تو مریم مالک ہیں سائیں! ہاں۔ سائیں! بونے لوگوں کی بڑی باتیں ٹھنڈی سانس لے کر بولا "قاتل کو آپ تلاش کریں گے تو پتا کرے گی؟"

"پولیس کا فرض ہے مدد آپ کی۔ وہ میری مدد کرے گی۔"

"نہیں۔ نہیں افضل سائیں! میں کسی قسم کی دادا گیری۔ لہذا اگر دی نہیں چاہتا۔" وہ ذرا زور سے ہی کے ساتھ بولا "اس قسم کے کام کرنے ہوتے تو اپنے بڑے زبردست قبائلی یا موجود ہیں۔ وہ ایسے کام بڑی خوشی سے کر سکتے ہیں لیکن میں نے ان سے بھی ایسا کوئی کام نہیں لیا۔"

"بے وقتی کی باتیں مت کرو کوئلہ دار! میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "کسی سے اپنی رقم وصول کرنا غدا اگر دی یا دادا گیری نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ آسانی سے دینے کی توفیق رکھتا ہو۔ اگر کوئی غریب ہو، دیوالیہ ہو گیا ہو اسے کوئی مجبوری تو نہ پڑی

ہو تو اس کے ساتھ ضرور مہمانی اور ہمدردی کا سلوک کرنا چاہیے۔ لیکن جب اس طرح کا کوئی مسئلہ نہ ہو تو پھر جس طرح بھی ملے اس طرح لے لینی چاہیے۔ لہذا اگر دی 'دادا' گیری یا دہشت گردی ہو تو جب کھلا سکتی ہے جب ہم کسی سے ہستا 'تادان' یا جیسی چھو لے کر خوش کریں۔ کیا خیال ہے؟

"میں کیا خیال ظاہر کروں سائیں! آپ بڑے آدمی اللہ دانش ور ہیں۔"

"اے خدا ایسا! میں نے کراہ کر اس کی بات کیا ہوئے گا؟ کم از کم مجھ پر دانش ور ہونے کا الزام تو مت لگاؤ لیکن میں ہم جنہیں دانش ور سمجھ کر دل میں ان کی کرتے تھے بعد میں جب ان کے قریب ہونے کا موقع ملا تو پتا چلا وہ تو ذہنی طور پر بونے۔ بلکہ باشتی تھے اس کے بعد سے تو وہ دل کی دانش وری سے فیض حاصل کرنے کی تنہا بھی دل سے اٹھتی۔ اب تم مجھے دانش ور قرار دینے پر تھے ہوئے ہو۔ یہ ادنیٰ منصب ہے چارے بھائی! تم مجھے اس خوش فہمی میں کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

"سائیں! ہم جیسے جاہلوں کے لیے تو آپ بھی دانش ور ہیں وہ بلکا فتنہ لگا کر بولا "میں نے تو اپنا کام آپ کے سپرد کیا تو اب آپ اسے کسی دیکل کے سپرد کر رہے ہیں۔ ہر حال آپ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ہی کر رہے ہوں گے میرے لیے اس طرح بھی ٹھیک ہے بس میرا کام ہو جانا چاہیے۔"

"تمہارا کام ہو جائے گا۔ میں خواب ڈرا دے کرے گا لگ گیا ہوں۔ مجھے پرنس میرا کے قاتل کو تلاش کرنا ہے۔"

"اس کام کی فیس آپ کو کون دے گا؟" وہ قدرے حیرت سے بولا۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "تم سے کس نے؟"

"ارے ہاں۔ میں تو بھول گیا تھا کہ آپ تو مریم مالک ہیں سائیں! ہاں۔ سائیں! بونے لوگوں کی بڑی باتیں ٹھنڈی سانس لے کر بولا "قاتل کو آپ تلاش کریں گے تو پتا کرے گی؟"

"پولیس کا فرض ہے مدد آپ کی۔ وہ میری مدد کرے گی۔"

"نہیں۔ نہیں افضل سائیں! میں کسی قسم کی دادا گیری۔ لہذا اگر دی نہیں چاہتا۔" وہ ذرا زور سے ہی کے ساتھ بولا "اس قسم کے کام کرنے ہوتے تو اپنے بڑے زبردست قبائلی یا موجود ہیں۔ وہ ایسے کام بڑی خوشی سے کر سکتے ہیں لیکن میں نے ان سے بھی ایسا کوئی کام نہیں لیا۔"

"بے وقتی کی باتیں مت کرو کوئلہ دار! میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "کسی سے اپنی رقم وصول کرنا غدا اگر دی یا دادا گیری نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ آسانی سے دینے کی توفیق رکھتا ہو۔ اگر کوئی غریب ہو، دیوالیہ ہو گیا ہو اسے کوئی مجبوری تو نہ پڑی

رہے گا۔ میں ابھی ابھی اسے قتل دے کر قاصد ہوا ہوں۔ اب فون کر کے اسے یہ خوش خبری سنائی دے گی کہ تم نے اس کا ذہنی سکون و درہم برہم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

”میں نے تمہیں ایک اہم بات بتانے کے لیے فون کیا ہے۔ تم کوئلہ لے کر بیٹھ گئے۔ وہ خبر اری سے ہوا۔ اس کے لیے سے جھکن بھی عیاں تھی۔ شاید اسے گزشتہ رات سے اب تک آرام کا کوئی خاص موقع نہیں ملا تھا۔

”تو بتا بھی چکو۔ اتنی تمہید کیوں باندھ رہے ہو۔“ میں نے ڈانٹ پلانے کے سے انداز میں کہا۔

”مہران دانش پولیس کے ہاتھ نہیں آسکا۔“

”کتنا خوش قسمت ہے!“ میں نے فوراً لقمہ دیا۔

وہ گویا دانت چب کر بولا ”کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ تم سے فون پر بات کرنے کے بجائے پیشہ دروہ بات کیا کروں اور ہاتھ میں ایک موٹا سا زہرا دکھا کروں۔ جب بھی تم بے سرخ کسی بات میں دخل دو، فوراً وہ زہرا تمہاری کھوپڑی پر رسید کروں۔“

”زہرا دل خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

وہ گویا اُن سنی کرتے ہوئے بولا ”لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر تمہاری کھوپڑی پر زہرا لمانے سے بھوسا نکل کر یا ہر گھر گیا تو خواہ خواہ کام بڑھ جائے گا۔“

”یہ میری کھوپڑی ہے۔ کسی پولیس والے کی نہ۔“ میں نے کہا ”میرا حال تم اپنا بیان جاری رکھو۔“

”بیان بس کیا ہے کہ کارمان دانش رات کو کچھ گھبرا یا ہو اگر پہنچا تھا۔ گھر سے مراد اس کے ماموں کا گھر ہے۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد سے وہ اپنی بہن سمیت اپنے ایک بے اولاد ماموں کے گھر رہتا ہے کیوں کہ وہ دونوں بہن بھائی الگ گھر میں رہنا اذیت نہیں کر سکتے۔ رات وہ گھبرا یا ہو اگر پہنچا اور اپنی بہن کو ساتھ لے کر ماموں کو کچھ بتائے بغیر کیس چلا گیا۔ لگتا ہے وہ مدد پوش ہو گیا ہے۔“ رجم گل نے بتایا۔

”تم نے اس کی جگہ اس کے ماموں کو تو نہیں اُٹھرایا؟ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ بیٹانہ لے باپ کو اٹھاؤ۔ سالانہ طے بہنوئی کو اٹھاؤ۔ اعزاء لے تو فری کو اٹھاؤ۔“

”مگر حانہ لے تو افضل چہدری کو اٹھاؤ۔“ اس نے لقمہ دیا ”حالاں کہ اس پر گدھا چارہ ملا سکا ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں جوابی حملہ کر کہ وہ لقمہ سانس لے کر بولا ”یار! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ہر وقت ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ سو میں کوئی ایک آدمہ کیس ایسا ہو جاتا ہے اور وہ نہ جانے کتنے عرصے کے لیے اور کس کس موقع کے لیے ضرب المثل بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی صرف اس لیے بھی ہم ایسا کرتے ہیں کہ ہمیں یقین ہو آئے کہ ہمیں چکر دیا جا رہا ہے اور اس طرح کا کوئی جھگڑا استعمال کرنے سے اصل نفع پیش ہو جاتا ہے۔“

”کچھ کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے لوگوں سے ملے بھی پہنچ جاتی ہے جنہوں نے کچھ نہیں کیا ہوگا۔“ میں نے اسے پھجڑا۔

”کبھی کبھی نہیں۔ اکثر وہ ایسے ہی لوگوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ شاید یہ پوچھنے کے لیے۔ کہ آخر انہوں نے کیوں کچھ نہیں کیا؟“ وہ جیسے جمل کر بولا ”سوال یہ ہے کہ انہیں اس مسئلے میں تھکے اپنے بیان میں ان کو بتا دیا تھا کہ پہلی بار مجھے کس مسئلے پر برس سیرا سے ملے جانا پڑا تھا۔ ظاہر ہے وہ تمہارا کام نہ تمہارا نام میں لگایا۔“ میں نے جواب دیا۔

”مواد!۔۔۔!“ وہ کراہ کر بولا ”سائیں! اس کو کتنے ہیں نماز پٹھانے جانا اور دوزے لگے پڑ جانا۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی تھی میرا نام لینے کی؟ آپ کو شاید پتا نہیں ہے کہ پولیس کو تو تانوں کی تلاش رہتی ہے۔ تانوں کی فرست جتنی بھی ہوگی اتنی ہی ان کے حالات بدتر ہوں گے۔“

”میں اتنا زیادہ غم مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی ادھر ادھر ٹھکنے کی کو شش کرتا۔ خواہ خواہ تمہاری پوزیشن سلوک ہوگی۔“ میں نے اسے سمجھایا ”تمہارے پاس جو پولیس انفرمٹس گاہو تمہارے تصورات سے بہت مختلف ہیں۔ اور پھر میں نے بھی اسے تمہارے بارے میں سمجھا دیا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ ٹھن ایک رکھی کارروائی ہے۔ یہ ایک ایک اعتبار کرتا۔ اور وہ یہ کہ اس کے ساتھ کوئی بموت ہر کرنے والا۔“

”چھ سائیں! آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی کریں گے۔“ وہ لقمہ دیا ”میں نے کہا کہ وہ اس کے تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔

”میں اس میں نے رہیور رکھا ہی تھا کہ رجم گل کا فون لگیا۔ میں نے اس کی تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔

”میں اس میں نے رہیور رکھا ہی تھا کہ رجم گل کا فون لگیا۔ میں نے اس کی تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔

”میں اس میں نے رہیور رکھا ہی تھا کہ رجم گل کا فون لگیا۔ میں نے اس کی تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔

”میں اس میں نے رہیور رکھا ہی تھا کہ رجم گل کا فون لگیا۔ میں نے اس کی تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔

”میں اس میں نے رہیور رکھا ہی تھا کہ رجم گل کا فون لگیا۔ میں نے اس کی تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔

”میں اس میں نے رہیور رکھا ہی تھا کہ رجم گل کا فون لگیا۔ میں نے اس کی تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔

”میں اس میں نے رہیور رکھا ہی تھا کہ رجم گل کا فون لگیا۔ میں نے اس کی تواز نہ تھے یہ کیا؟“ میں نے بابا محسوس کیا ہے کہ پولیس ایسا کی طرح نہیں ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی وہ ہمارا ڈر ہو رہا تھا۔



مجھ پر ہوا جس۔" اس نے گویا خجور اکر کیا۔

"تم یہ حسرت ہی لیے دنیا سے چلے جاؤ گے۔"

"ختم ہے یہ وقت تائے گا۔" لی الحال میں جس میں یہ بات تاربا ہوں کہ مجھے تائے بغیر اس کیس کے سلسلے میں کیا سیدھی حرکت مت کرنا۔" اس نے گویا خجور اکر کیا۔

"میں تو کوئی سیدھی حرکت ہی کروں گا۔" اگلی حرکت کر کے لیے تو میں نے جس پھوڑا کر کا ہے۔" میں نے کہا۔

"تساری پانی کو اس پر بھی فٹوں گا۔" اس نے کہا سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی میں نے ریسرور رکھا ہی تھا کہ امبر کرے میں داخل اور قریب آکر پہلی "سرا" ایک لڑکی آپ سے ملے آئی ہے۔" "کتنا مبارک دن ہے۔" میں نے فوراً کہا۔

"وہ منکراتے ہوئے پہلی "سرا" رہے جاری مجھ سے اگلی گز رہے طبقے کی مٹوم ہوتی ہے اور پریشان بھی نظر آتی ہے۔" "دیکھو جی۔" لڑکی لڑکی ہوتی ہے اور اس کا کوئی بچہ ہوتا۔ میں ویسے بھی طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں ہوں۔ تم جاننے کی کو شش کی کہ وہ مجھ سے ملے سے پہلے ہی پریشان ہے؟

"میرے خیال میں اسے سب سے زیادہ پریشانی تو اس بار تھی کہ آپ اس سے ملیں گے بھی یا نہیں۔" امبر بدستور منکراتے ہوئے پہلی۔

"مجھ میں اتنا ہے ہونہ بد ذوق یا غرور دل تو میں ہا لڑکیوں سے ملنا چھوڑ دوں۔" میں نے کہا تسام کیا ہے اس کا؟ "باب!" امبر نے بتایا "اور اس کے پاس آپ کا ڈنڈا کارڈ بھی ہے۔"

"تسام مجھے پڑانا سنا۔" مگر خوب صورت ہے۔" میں نے زور دیتے ہوئے کہا "لیکن مجھے یاد نہیں پڑا کہ میں نے کیا نام کی کسی لڑکی کو اپنا ڈنڈنگ کارڈ دیا ہو۔ وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہے؟"

"سلسلہ وہ نہیں بتا رہی۔" امبر عجیبہ ہوتے ہوئے پہلی لے لے تو میں اتر کا پام پر اطلاع دینے کے بجائے خود آپ کو بتا ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ معاملہ بہت اہم ہے۔ کسی کی زندگی اور کا سلسلہ ہے لیکن وہ اس کے بارے میں صرف آپ سے بات کرے گی۔"

"دعوت ہے یہ تو کوئی عجیبہ وضع مٹوم ہوتی ہے۔" میں سنبھل کر بیٹھے ہوئے کہا "اسے جلدی سے اندر بھیج دو واقعی کوئی عجیبہ معاملہ ہے یا پھر زار لای ہے۔"

امبر سر ہلا کر واپس چلی گئی۔ چند لمحوں بعد لڑکی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے حسن سادہ کی ایک دگن نظر جاسکتا تھا۔ وہ معمولی لیکن صاف ستھرے لباس میں تھی۔ اچھی کیفیت بھی تھی کھڑی کھڑی تھی۔ پریشانی اور دشت نے ان آنکھوں میں ڈیرے ڈال رکھے تھے لیکن اس سے اس کے

"چھا! سہ۔" چلو ان لیا تم بہت شریف اور مصمم ماہل ان ہوں۔ بتاؤ تسارے تو میں نے کامران کے ماموں کے ساتھ اپنی قصص "شرافت" کا سہا ہرہ کرتے ہوئے مٹوم کرنے کی کو شش نہیں کی کہ کامران کہاں گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ختم ہے میں کچھ ایسی شرافت کے دعوے بھی نہیں کر رہا۔" مصلحتہ قضاے کے لوگ وہاں گئے تھے۔ ان کی باتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بلا وارنٹ مکان کی تلاشی بھی لی تھی اور ماموں میاں کے ساتھ ذرا سختی سے ڈانٹ ٹیٹ بھی کی تھی۔ "وہ بولا۔

"ختم ہے یہ تو معمولی کیس ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر جیسوں پر ایسا کرنا پڑتا ہے بھائی! وہ بڑے نرم بیسے میں بولا "ہماری پبلک میں بھی سب کے سب فرشتے نہیں ہوتے کہ ہر بات بالکل سچ کہتے ہوں اور پولیس کو دیکھتے ہی ملوم کو لا کر سامنے پیش کر دیں۔"

"تقتہ مختصر ہے کہ کامران دانش عائب ہو گیا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کیس کے سلسلے میں یہ پہلی کامیابی مبارک ہو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"تسواں ست کردہ تساری تو زبان ہی کالی ہے۔ تم تو پہلے ہی ہماری ناکامی کی پیش گوئیاں کرتے رہے ہو۔" وہ جل کر بولا۔ "میری زبان کا ذکر چھوڑو۔ وہ نہ کالی ہے نہ پہلی۔ وہ لیکن کمر ہے ہر قسم کے اثرات رکھتی ہے۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ تم نے اب کیا نظریہ قائم کیا ہے؟"

"صرف مندر منبر کے کھنے سے تو ظاہر ہے میں کامران دانش کو قاضی حلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اب اس کے اس طرح عائب ہونے سے مجھے اس پر کافی شک ہو گیا ہے۔" رحیم گل بولا "ماریہ میرے کونسل والوں نے ایک محل مندی کی تھی کہ اس سے اعتویہ کرتے وقت اپنے دونوں کے مطابق اس کی ایک تصویر لے کر رکھ لی تھی۔ وہ اس کی تازہ ترین تصویر ہے۔ اس کے پرنٹ نکھو اکرم میں نے شکر کے تقریباً تمام خانوں کو جاری کر دیے ہیں۔ خاص سرگرمی سے اس کی تلاش شروع ہو چکی ہے۔"

"تج کل تصویریں ملنے کرنے میں تم بڑے مستعد ہو گئے ہو۔ تم نے میری تصویر بھی بڑی بھلی سے شام کے اخبارات کو جاری کر دی۔" شکر ہے میں اشتہاری مجرم نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"چھا۔" تم مجھ گئے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اب میں اچھی سی گھاس نہیں ہوں۔" اتنا گھاس ہوتا تو پولیس میں بھرتی ہو جاتا ہوتا۔"

"اس پڑائے موضوع پر ایک بک کرنے کے بجائے کوئی کام کی بات کرو۔" وہ بیزار سی سے بولا "تم اس سلسلے میں کیا کر رہے ہو؟" "میں جب کچھ کھوں گا، جس میں پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہاں تک مت کرنا کہ میں جسیں پکڑ کر حوالات میں ڈالنے پر

وہ چند مہینے لیکن اندازہ کیا ابھی تھا جسے ذرا سے نکلے رہا مگر  
نکلے گی۔ پہلے اس کے حسنِ سادہ نے میرے دل کی دھڑکنوں کو بے  
ترتیب کیا تھا لیکن اب کسی اور سبب سے میرا دل تیزی سے  
دھڑکنے لگا تھا۔ درجیم گل نے شہر کے تقریباً سب قانون کو کاروان  
دانش کی تلاش میں مستعد رہنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے باوجود  
مجھے اس کی کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ یہ شریکِ سند تھا۔  
اس میں نیکولس جانے بچانے قائل اور بد معاش ایک بار لاپٹا  
ہو جاتے تھے تو انہیں تلاش کرنا۔ تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ کاروان  
تو پھر بھی ایک عام سا فرعون تھا اور پولیس کے پاس اس کا کوئی  
خاص ریکارڈ نہیں تھا۔ تو ذرا بحثِ طویل بدل کر بعض جگہوں پر توجہ  
پولیس کے سامنے سے بھی گزر جاتا تب بھی شاید کسی کو پتا نہیں  
چلتا لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کے بارے میں ایک حسین  
سراغ خود جل کر میرے پاس آیا تھا۔

”میرا خیال ہے پہلے کچھ تعارف ہو جائے۔“ میں نے  
سکراتے ہوئے دستانہ لیے میں کہ۔ میں چاہ رہا تھا اس کا  
اضطراب کچھ کم ہو جائے اس کے ذہن میں پچھلے خیالات کا جھوم  
تھا۔ میرے لیے اور دوسرے سے اسے کچھ حوصلہ ہوا اور وہ کرسی پر  
ذرا پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

”سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا نام باب  
نہیں، صنف ہے۔ آپ کی نیکرنگی کو میں نے اپنا نام ڈر کے بارے  
میں بتایا تھا۔“ اب اس کا لہجہ قدرے پُر سکون تھا جس کا مران کی  
تھکرتوں اور آپ کے پاس ہڈی امید لے کر آئی ہوں۔ آپ کا  
یہ کارڈ مجھے کاروان نے ہی دیا ہے۔“

اس نے میرا وزننگ کارڈ اٹھوٹا کر مجھے دکھایا اور تب مجھے  
یاد آ گیا کہ میں نے کارڈ کا مران کو اس وقت دیا تھا جب میں پرنس  
میرا کے اسٹوڈیو سے نکل رہا تھا اور وہ امیدوار کی حیثیت سے وہاں  
پہنچا تھا۔ میں نے اسی امید پر کارڈ اسے دیا تھا کہ شاید کبھی کچھ  
حقائق معلوم کرنے کے سلسلے میں اس سے کچھ مدد ملے لیکن مجھے یہ  
امید نہیں تھی کہ وہ کارڈ ان حالات میں اور اس طرح اس سے  
راجیلے کا ذریعہ بنے گا۔

صنف بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی ”کاروان کا آپ  
سے صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی چند لمحے کے لیے سامنا ہوا ہے۔  
اس کے بعد ہم نے کچھ جھگڑا کر لیا لیکن میں آپ کی تصویر دیکھنی ہے  
اور تذکرہ پڑھا ہے لیکن محض اتنی سی ”تھمسا سائی“ کی بنیاد پر نہ جانے  
کیوں اسے امید تھی کہ آپ اس کی مدد کریں گے اور مجھے مدد ملے  
بھی گئی گویا دی۔ ہمارے خیال میں آپ ایک مہمانِ گھرے اور  
جرات مند آدمی ہیں۔ آپ کا چہرہ بھی کتنا ہے۔ لیکن آپ کے  
بارے میں یہ رائے قائم کرنے کے باوجود کاروان میرے ساتھ آپ  
کے پاس آنے کی جرات نہیں کر سکا۔ آخری بی بیٹھتے تھے  
مجھے اکیلے ہی اتار پڑا۔“

اس کے گلابی ہونٹ تنگ ہوئے جا رہے تھے اور وہ بار بار ان

بلی میں کوئی کی نہیں آئی تھی۔ اس کا جسم گویا ایک خوب  
صورتِ سانس میں ڈھلا ہوا تھا۔ لباس کو کہ معمولی اور سیدھا سا  
تھا مگر اس میں بھی اس کے خد و خال کی قیاسیں نمایاں تھیں۔ اس  
کی شخصیت کو بس ذرا غرور کے شمار۔ نے مانع کیا ہوا تھا۔ اگر  
اسے زرا دلالتِ شہنشاہی کا محار میر ہو تا تو اس کی شخصیت چاند کی  
جگہ نہیں نظر آ سکتی تھی۔

اس کا چوبیسک آپ سے بے نیاز تھا اور گلابی ہونٹ دھیرے  
دھیرے تر تر رہ رہے تھے ان کی تر تر حالت کو دیکھنے کا فوری طور  
پر ایک سی طرف تھکے میں آتا تھا لیکن میں نے جلدی سے دل ہی دل  
میں اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے یہ خیال اپنے ذہن سے  
ہٹا دیا۔ وہ میرے قریب آن لڑکی اور پھیلی ہوئی حیران سی آنکھوں  
سے ایک لمحہ میری طرف دیکھنے لگی۔

”کیا۔۔۔ واقعی۔۔۔ مسٹر افضل چہ بددی آپ ہی ہیں؟“ اس  
نے سرگرمی کے سے انداز میں پوچھا۔ اسے گویا یقین نہیں آ رہا  
تھا۔

”جی ہاں۔ آپ کو اس میں کوئی شک ہے کیا؟“ میں نے  
سکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ شک تو نہیں ہے۔“ وہ عجیب سے انداز میں سر ہلا  
کر کہی۔

”اس میں اتنی حیرت اور بے چینی کی کیا بات ہے؟“ میں نے  
بدتر سکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل۔۔۔ آپ  
مجھے قصور سے مت متعلق ہیں۔“ وہ جھجکا ہوا آواز میں  
کہا۔

”مگر آپ کو ابھی ہوئی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔“ میں  
نے خوشی سے کہی۔

”نہیں۔ نہیں یہ بات نہیں۔“ اس نے گویا میری غلط فہمی  
دور کرنے کے لیے جلدی سے اپنا سر سر ہلاتے ہوئے کہا ”میں سن کر تو  
بڑا مضطرب تھا۔۔۔ حالانکہ میں اخباروں میں آپ کی تصویر بھی  
دیکھ چکا تھا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ۔۔۔“ اس نے جملہ ادھورا  
بھجوا دیا اور اس کے ہونٹ ایک بار پھر کانپ کر رہ گئے۔

پھر ایک دم جیسے اس کی زبان سے بے بدھ لفظوں کا سلسلہ  
”یہاں ٹھوٹ پڑا۔“ دوسرے دراصل میں کاروان کے سلسلے میں آئی  
تھ۔ بہت بڑی صحبت میں پہنچ گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش  
میں ہے اور اس کی کچھ مجھ میں نہیں تھا کہ وہ کیا کرے۔ میں  
نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ میاں آئے لیکن وہ  
نہیں آیا۔ وہ تو مجھے بھی منع کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی بات نہیں  
مانی اور۔۔۔“

مجھے نے نیشک کے سپاہی کی طرح ہاتھ اٹھا کر اس کے الفاظ کی  
گواہی کو دیکھ کر اور اپنے قریب پڑی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے  
ہوئے کہا ”پہلے آپ آرام سے بیٹھ جائیے۔“

ہوں۔

اس موضوع پر واقعی کسی کو قائل کرنا بہت مشکل  
صحیح صورت حال بتانا ضروری تھا۔ میں نے کسی سالگرہ  
مستقلہ پولیس آفیسر جو اس کیس کی تحقیق کر رہا ہے وہ  
ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تب بھی کچھ زیادہ فرق نہ  
آتا کیا کرنا آدھی نہیں ہوں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں  
دانت یا دائرہ موت بڑی نا انسانی کرتے دیکھیں اور اسے  
سکول۔

”وہ تو ہمیں انداز ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے آپ کا  
اثر سوخ ہے۔ یہی تو آپ پر نس سیرا کی لاش دہشت گرد  
بعد بھی آرام سے پولیس اور مختل کے رشتے واضع  
ہئے رہے ورنہ بعض اوقات تو لاش دہشت گردے کا  
شامت آجاتی ہے۔ سب سے پہلے اسے ہی مشہور قرار  
جاتا ہے۔“ ضیہ بولی ”ہمیں اسی لیے تو آپ کے پاس گئی  
آپ ایک دولت مند اور سوخ قوی ہیں۔“  
”کچھ دیر پہلے تم نے کچھ اور خصوصیات بھی بتائی ہیں  
نے سکرانے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ وہ بھی اپنی جگہ ہیں۔“ وہ بھی جواب سکرانی  
”کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے کتا ہے؟ دل پہاڑ  
بالکل صحیح کتا ہے۔ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان  
گی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔  
”ہاں۔ مجھے یقین ہے۔“ وہ غیر متزلزل لہجے میں  
نے چلکیں بھی نہیں جھپکائیں۔ اس کی خوب صورت آنکھ  
دھند سی چلی ہوئی تھی۔ وہاں کچھ متضادے جذبات کے گم  
دکھائی دے رہے تھے۔

”تو پھر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہمیں چاہتی ہو آپ کا مران کو بچانے میں میری مدد کرنا  
اس کے عوض آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہونا  
اچانک فیصلہ کن لہجے میں بولی۔  
”ہر بات۔“ میں نے اپنی حیرت کو بچانے  
تصدیق چاہی۔

”ہاں۔ ہر بات۔“ وہ کچھ عجیب سرزد انداز میں  
اس کے اندر جیسے کوئی اور روح طول کرتی اور اب وہ اس  
اثر قبول رہی تھی۔

میں ابھی ایک تک اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ  
میری کرسی کے صوب میں آگئی۔ دوسرے ی لمے اس کا  
صوب سے صوبے کے میں حائل تھیں اور میں اپنے رشتہ  
کی عرض سنا سنوں کی تپش محسوس کر رہا تھا۔

مجھے زندگی میں قدم قدم پر نئی چیزوں کا سامنا کرنا  
پڑا کہ اس وقت میں اس طرح کی کسی حیرت کی توقع

پر زبان بھیر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باہر سے کسی کو بلادیں  
اور تنگتر میں خلل پڑے۔ میں نے خود اندھ کر اپنے کمرے کے  
چھوٹے سے فریج سے کوئلہ ڈریک کی ایک بوتل نکال کر اس کے  
سانے رکھی۔ اس نے بے جا تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا اور اسٹرا  
ہو نٹوں میں دبا کر چند گھنٹہ بھرے کے بعد گرمی کمی سانس  
لیں۔ اب وہ بالکل گرم سکون نظر آنے لگی اور یکایک ہی اس کی  
فصیحت کچھ بدلی بدلی کی دکھائی دینے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ  
اس میں تو بلا کی خود بخود رہی تھی۔

میں نے ظاہر نہایت سرسری سے انداز میں پوچھا ”کامران  
ہے کہاں؟“

وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ دہائی میں اس سوال کا جواب  
دے جاتی۔ وہ اطمینان سے بولی ”یہ بات اب میں اس طرح یک دم تو  
ہمیں بتا سکتی ہوں۔“ آپ سے یہ یقین دہانی حاصل کرنا ہوگی کہ آپ  
پولیس کو نہیں بتائیں گے۔“

”لیکن تم ایسی بے وقوفانہ یقین دہانی کیوں حاصل کرنا چاہتی  
ہو؟“ میں نے ملاحت سے پوچھا۔

”کیوں کہ پر نس سیرا کو اس نے قتل نہیں کیا۔“ وہ تودرے  
کر بولی۔

”پھر تو اسے ضرور پولیس کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے۔  
اس طرح غائب ہو کر تو وہ اپنا کیس مزید خراب کر رہا ہے۔“ میں  
نے کہا۔

”یہ آپ نے ابھی کسی کر اسے ضرور پولیس کے سامنے پیش  
ہو جانا چاہیے۔“ وہ سچ سے لہجے میں بولی ”کہ وہ مار مار کر اس  
کی پٹری اور جڑوں میں۔“ وہاں تو ڈوبی اور اعتراف جرم کرائیں کہ  
پر نس سیرا کو اسی نے قتل کیا ہے۔ وہ ایک مشہور اور دولت مند  
عورت تھی۔ اس کے قاتل کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں پولیس پر  
کافی دباؤ ہو گا۔ اس وقت ان کی پوری پوری کوشش یہ ہوگی کہ اگر  
قاتل ہاتھ نہیں آتا تو جلدی سے قربانی کا کوئی بکرا ہی مل جائے جس  
کی گردن میں پھانسی کا پھندا آفت آسکتا ہو۔“

میں نے حتی الامکان دوستانہ اور کسی حد تک مہجانبہ انداز  
میں سکرانے کی کوشش کی۔

”پولیس کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے۔ جو کچھ غلوں  
اور ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے لیے اسے بھول  
جاؤ۔“

”جان باتوں کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے افضل چوہدری صاحب!  
یہ کہانیاں تو سچی سچی لکھی ہوئی ہیں۔“ اس کے لہجے میں کئی ہزار  
رہی ”تمہارے پاس تو کامران کو بچانے کے لیے ہمارا دھوکے سلسلے  
میں خرچ کرنے کے لیے ایک ہزار روپیہ بھی نہیں ہے۔ اور یہ  
پر نس سیرا بھی عورت کا معاملہ ہے۔ پولیس نہ جانے کامران کا  
کیا حشر کرے۔ اس کا دینے اور اس کے مطالبات نہ جانے کیا

# فرنچ اردورینٹر

پروفیسر محمد اشرف قیمت :- 90/-

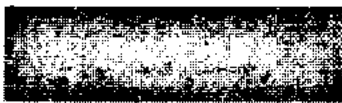
معروف مصنف

ایم اے راحت

کلیک خوبصورت اور شاہکار ناول

## کائنات

جلد اول :- 45/ جلد دوم :- 45/



اردو بازار لاہور

مفت میں نے جانتے تھے ایک انوکھی حیرت سے دو چار کیا تھے اس طرح کی لڑکی ہرگز دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کے اطوار دیکھ کر چند لمبے پہلے تک مجھے شبہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کا ایسا میٹرا بدلے گی۔ میرا تجربہ تو یہی تھا کہ اس طبقے اور ازاد اطوار کی لڑکیاں کسی کے رہ جانے پر بھی ان راستوں کی تسلی نہیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً جب کہ وہ کسی مرد کے ساتھ ملنے کے بندھن میں بھی بندھی ہوتی تھیں۔

ملائی کے اس دھچکنے پر مجھ کو یہ شک بھی نہ رہا کہ اس کے بازو دکھا رہی ہیں نہ نسیب آتھیں سے اس کے بازو اپنی سے ہٹا کر اور رعب الٹے چیز گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ناک دانوں میں دبائے سر ہٹا کر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پر پہلے تک سفید تھے اب دیکھتے سے دکھائی دے لگے تھے میں انہیں چھو کر ان کی خوش کا اندازہ کرنا نہیں

تم نے واقعی مجھے حیران کر دیا ہے" میں نے دھیمے لہجے میں

اس طرح؟" اس نے نظراٹھائے بغیر پوچھا۔  
پہلے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کر کے" میں نے جواب

میں نے کہا کہ یہ قبول ترین رشوت ہے "وہ دونوں لڑکیوں انہیں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے ہوئی۔  
صرف مٹا ہے۔ عملی تجربہ نہیں ہے؟" میں نے اپنی نظر

چھو کر گزرتی۔  
"اس نے کئی میں سہلایا "یہ میری پہلی کوشش

ایک لمبے کے لیے غاموش رہا۔ اس کی جھکی جھکی آنکھیں ملان پر کچھ زیادہ ہی شدت سے نمودار ہونے والی سرخی تھی کہ وہ کھائی کہہ رہی تھی جس سے میری حیرت اور بھی

آخر میں اسے سوچ بھی کیا تھی؟  
میں نے پہلی بار ہی تجربے کے لیے کسی صحیح آدمی کا انتخاب کیا۔ میں نے کسی سانس لے کر کہا۔  
نکھلے کیا آپ بہت شریف "نیک اور پارسا آدمی ہیں؟"  
اب گویا اپنی جرات کو جمع کرتے ہوئے نظر اٹھائی۔ اس

میں نے کچھ زیادہ ہی شدت سے نمودار ہونے والی سرخی تھی کہ وہ کھائی کہہ رہی تھی جس سے میری حیرت اور بھی

میں تو اس قسم کا کوئی دعویٰ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ جرات مند نظر آتے اور جرات مند بننے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ اب اس کے لہجے میں ارتعاش نہیں تھا۔

"مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "اسی کر ہی پر جا کر بیٹھ جاؤ جس سے تم اٹھ کر آئی ہو۔"

اس نے مجھ کو ہی نظر سے میری طرف دیکھا تاہم میری ہدایت پر عمل کیا۔ اسے گویا کچھ باہمی ہوئی تھی۔ اس کے رخساروں سے شوق کا رنگ اترنے کا تاہم وہ انہیں میں پرکھی تھی۔

میں نے ملامت سے کہا "مسئلہ صرف یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں میرے اپنے کچھ فلسفے ہیں۔ میں ان کے خلاف نہیں چل سکتا۔ میں نے اس طرح کسی کسی مجبور لڑکی کا رشوت کاغذ رائے قبول نہیں کیا خواہ وہ کوئی چلتی پھرتی ہی چیز کیوں نہ رہی ہو۔ چلتی پھرتی

ایک بات ہے۔"

"میرا ایک جہان حیرت سے آگے دو سرا جہان حیرت ہے  
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کے لیے ایسا ہو لیکن جو کچھ میں کہنا چاہتی  
میرے اپنے خیال میں اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے  
کچھ سچے ہوئے بول۔

"جسٹس یہ فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہے گا۔ تم کو تو سچی  
چاہتی ہو؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں آپ کو کیسی لگی ہوں؟" وہ کرسی پر ڈرا اوٹنی ہو کر  
آپ کو گولا نمائش کے لیے پیش کرتے ہوئے بولی۔

"سمت اچھی" میں نے دانتہاری سے جواب دیا۔  
"میں جب آپ کے قریب آئی تو آپ کے دل کی دھڑکن  
ہوئی تھی؟"

"سمت زیادہ" میں نے اس بار بھی دانتہاری سے جملہ  
"بلکہ مجھے تو کچھ پس محسوس ہونے لگا تھا مجھے میرا دل کنبھیل  
دھڑک رہا تھا اور کبھی کان کے راستے باہر آنے والا تھا۔"

"حقیقت یہ تھی کہ اس کے سوالوں پر میری دھڑکنیں اب  
تیز ہو رہی تھیں۔ میری کچھ میں نہیں آتا تھا کہ درحقیقت  
کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ میرے سے کسی گراس کی مدد اس کی  
شامل نہیں تھی۔ وہ گویا اپنی تمام توانائیاں اور تمام تر جرات  
ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہوئے اہم بات کہنا چاہتی تھی گویا  
اہم مرحلے پر گزر رہا تھا۔

میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ وہ تھوک گل کر چلی  
بولی "تم... تو پھر آپ مجھے اپنی داستان لہجے۔"

مجھے واقعی حیرت کا دوسرا زور دار ہٹکا لگا۔ میرا  
ہوا آیا اور وہ قدرے مضطرب سے انداز میں بولی "آپ نے  
ابھی جو کچھ کہا تھا میں اس کا بھی خیال رکھوں گی۔ میں  
کا دوبارہ انداز میں آپ کے سر پر مسلط نہیں ہوں گی۔

آپ کے پاس آتا جانا شروع کروں گی۔ ہمارے درمیان  
استوار ہوگی۔ میں آپ کو اچھی تو لگی ہوں۔ دو چار لاکھ  
آپ مجھے اس سے زیادہ بہت زیادہ پسند کرنے لگیں گے۔  
یقین ہے آپ کو اس قفل میں کا دوبارہ سفاکی محسوس  
ہوگی۔ اس میں دوستی اور محبت کی جگہ نہ کچھ خوشبو خور  
رہے گی۔"

"سمت خوب!" میں نے مسکراتے ہوئے بہت فورے  
طرف دیکھا۔ گویا یہ بھی کوئی ڈش تیار ہو رہی ہے جس میں اٹا  
پسند کے اجڑا شامل کئے جاسکتے ہیں۔"

"تمی! بل۔ کیوں نہیں۔" وہ گویا مجھے قائل کرنے کے  
زور دے کر بولی "مجھے یقین ہے کہ سب کچھ آپ کی مرضی  
کی پسند۔ اور آپ کے فلسفوں کے مطابق ہو جائے گا۔"

ی ٹوکیاں بھی کبھی کبھی کسی مجبوری کے بعد سے میں جہنم جاتی  
ہیں۔ ان کے لیے تو اپنے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کرنا کوئی  
مسئلہ ہی نہیں ہوتا اور وہاں تو کوئی بہت بلند و بالا اخلاقی قدریں بھی  
آڑے نہیں آتیں۔ اس کے باوجود میں ایسی کسی پیشکش سے کبھی  
استغناء نہیں کر سکتا۔ تم تو پھر بھی ایک شریف لڑکی ہو۔"

"لیکن کیوں۔ آپ ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟" اس کی ابھرن  
گویا بدھ گئی۔

"اس لیے کہ مجھے ایک گھٹیا قسم کی بلیک بیٹنگ محسوس  
ہوتی ہے اور میں نہ تو گھٹیا ہوں اور نہ ہی بلیک سیلر" میں نے جواب  
دیا۔

"وہ!" اس نے صرف اچانک اور ہماری سانس لے کر  
کرسی کے پٹے سے سر نکالیا۔ بات گویا کسی حد تک اس کی سمجھ میں  
چلی تھی۔

"رقائق دی اچھی لگتی ہیں جو کسی کے دل میں طلب بن کر  
ابھرن اور دوستی یا پسندیدگی کے راستے سے ہوتی ہوئی کسی منہ  
تک پہنچیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوتی کہ مجبوری آپ کو کسی اجنبی  
تک لے آئی اور پہلی ملاقات میں آپ نے خود کو بالی غیبت کی  
طرح کسی کے سامنے رکھا۔ میں غفلت واسطے اور رفاقت کا آدمی  
ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو وہ اچھا لگتا ہے۔ تم نے جس  
شارت کٹ کے ذریعے سارے معاملے مٹائے ہیں اس میں میرے  
لیے کوئی کشش نہیں۔ یہ بہت ہی بے ہودہ اور بے حس سے لوگوں  
کے پسندیدہ راستے ہیں" میں نے بہت ہی فحشہ فحشہ سے لہجے  
میں یہ سب کچھ کہا۔

"میں سمجھ گئی۔" اس نے سر ہلایا اور اس کا چہرہ تیار ہا تھا کہ  
وہ واقعی بات سمجھ گئی تھی۔ اس نے بہت ہی عجیب نظروں سے  
میری طرف دیکھا۔ وہ دل کو لو کو دینے والی نظریں تھیں۔ اس کی  
آنکھوں میں کسی ہی چمک آئی۔ وہ وہاں بولی تو اس کی آواز سرکش  
تھی "آپ خوابوں، خیالوں کے آدمی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ  
جیسے آدمی صرف افسانوں اور کہانیوں میں پائے جاتے ہوں گے۔"

"یہ بات مجھ سے پہلے بھی کسی نے کہی تھی لیکن میں ہر حال  
اسی دنیا میں موجود ہوں اور بہت گناہ گار سا آدمی ہوں۔ میں اسی  
دنیا کی ایک جتنی جانتی تحریری حقیقت ہوں۔"

"یہ بات پہلے بھی آپ سے مجھ جیسی کسی بے نصیب نے کہی  
ہوگی جس نے اپنی دانست میں بہت سی کامیاب فارمولا آزمائے چاہے  
ہوگا۔" وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔

"اس بات کو جانے دو کہ وہ کون تھی" میں نے کہا۔  
"ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہٹا کر دونوں ہاتھ چہرے پر  
بچھ کر گویا کسی قسم کی غمزدگی یا غم کو ذہن سے بھٹکنے کی کوشش کی  
پھر کچھ دے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"چلے۔ یہ بات تو یہاں تک تھی لیکن اس سے آگے بھی

لو اور کچھ دو کے اصولوں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی اسی طرح میرے ساتھ خیالاتی حس کا معاملہ ہے۔ میں سوچتی ہوں مجھے خریدنے والا بھی ایسا ہو جو کم از کم نظروں کو تو بھلا لگے۔ جس کے قریب جاتے ہوئے دل کی دھڑکیں تیز ہوں۔ کراہیت نہ آئے۔ اگر کوئی سینہ میری منہ باگی ہر چیز دینے کو تیار رہی ہو جائے گا لیکن وہ کوئی محرم رسیدہ، موافقہ، بدلہ، صلہ اور بد ذوق آدمی ہو گا تو میں اس کی جو کشش قبول نہیں کروں گی۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ واقعی ایک دلچسپ کردار تھی مگر کیا ابتداء ہی سے تم بہت چوڑی ہو کر چلو گی۔ کسی کے انتخاب کے سلسلے میں تمہارا اپنا ایک معیار ہو گا؟

”بالکل“ اس نے بلاتالی جواب دیا۔

”اور میں تمہارے انتخابی معیار پر پورا اترتا ہوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”آپ اس معیار سے بھی بڑھ کر ہیں“ اس کی آنکھیں کچھ خواب ناکی سے ہو گئیں۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس کی حقیقی کیفیت تھی یا وہ آنکھوں میں زہد و سخی ایک نظیلا پن ساید کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں تھا کہ آپ اس قدر رذوقیت میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں۔ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

”نہیں“ میں نے جواب دیا ”شادی شدہ ہونے سے ان معاملات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے امیر لوگ دو دو بیویاں ہونے کے باوجود راشتائیں رکھتے ہیں۔“

”میں تو میں نے بھی سنا ہے“ وہ قدرے گرجوشتی سے بولی ”لیکن آپ کیسے دولت مند ہیں جو غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود اس معاملے میں اس قدر چٹکناہٹ کا شکار ہیں۔ جب کہ میں آپ کے انداز فکر کو سمجھنے اور آپ کی سوچ کے مطابق چلنے کی بھی اہلیت رکھتی ہوں؟“

”میں اس سلسلے کی کوئی افواہی مثال نہیں ہوں۔ بڑا دل ایسے دولت مند ہوں گے جو غیر شادی شدہ ہوں گے مگر انہوں نے کوئی راشتہ بھی نہیں رکھی ہوگی“ میں نے جواب دیا۔

”ہاں۔ انہیں مفت میں عیاشیوں کے سوا کچھ میر ہوں گے۔ انہیں دولت خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس کے لہجے میں طنزیہ آہنی۔

ایک لمحے کے لیے کمرے میں جو جھل سی خاموشی چھا گئی۔ پھر میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا ”تو کچھ اچھی لڑکی! میرا خیال ہے تم خواہ خواہی اس موضوع میں الجھ گئی ہو۔ یہ تمہاری منزل نہیں ہے۔ تم یقیناً یہاں کچھ اور بات کہنے آئی تھیں لیکن ہر انسان کے ذہن پر کبھی نہ کبھی نہ کسی سنگ کا حملہ ہو آئے۔ میرا خیال ہے تم پر بھی کوئی سنگ سوار ہو گئی ہے۔ اس سے بچنا چھڑانے کی کوشش کرو اور اصل موضوع پر بات کرو۔ مجھے نہیں ہے تم ایسی لڑکی نہیں ہو۔ تم ایک غریب مگر شریف اور باعزت نوجوان کی معیت

کے لیے بہت ذمہ داری ہے۔ بہت خوش کن رہے گا۔“

میں اب ایک ننگ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ حیرت میں سا کردار معلوم ہوتی تھی۔ وہ شاید میری خاموشی کو غور سے محسوس کرتے ہوئے تیزی سے بولی۔ ”میں آپ سے ابتدا میں کبھی نہیں مانگوں گی کہ آپ یہ نہ محسوس کریں کہ یہ حقیقی دنیا کا ادب داری ہے۔ اس میں جذبات، محبت، دوستی یا غلوں کا ذرا بھی رنگ شامل نہیں ہے۔ جب آپ محسوس کریں کہ میں اس میں ہوں کہ مجھ سے کوئی تعلق رکھا جائے تو پھر آپ اپنی خوشی سے کوئی اچھا سا بلگا۔ ایک بہت اچھی سی گاڑی اور ان کے تمام زینات لے دیتے گا۔ بینک میں میرے نام کچھ رقم ڈال دیجئے گا۔ رہ رہتے ہی مجھے معقول رقم دیتے رہے گا۔ ٹھیک ہے؟“

میں اب بھی ایک ننگ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہی بات یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اسے کیا جواب دوں۔ وہ مختصر ہواں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کی گفتگو ہے۔ تم میرے پاس اپنے معیئر کارمان کو بچانے کے سلسلے میں مدد کی خواہش لے کر آئی تھیں۔“

”وہ مسئلہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اسے بھی حل کرنا ہے۔ یہ مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ میں نے سوچا لگے اچھا اس پر بات کرنا چاہئے۔ معلوم نہیں پھر بھی اس طرح تنہائی میں آپ کی دولت مند سے ملاقات اور بات چیت کرنے کا موقع ملے یا ملے“ وہ اب ذرا ہوا ہوا لہجے میں بولی۔

میں بھی خوش فہم اور جرات مند لڑکی کے لیے تنہائی میں کا دولت مند سے ملاقات اور بات چیت کرنا تو خیر کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے کچھ جیسے بہت سے مل جائیں گے جو بہت خوش لگے۔ بلکہ ریشہ مندی ہو کر تنہائی میں تم سے ملاقات کرنا چاہیں گے اور اس قسم کی بات چیت تو وہ بہت ہی ذوق و شوق سے کریں گے۔ مجھے کچھ تم کو دہی ہو“ میں نے کہا۔

”شاید آپ کا خیال درست ہو لیکن میرے سامنے کئی پہلو ابھی ابھی ابھی ہیں۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ میرے خیال میں کا دوا داری اور اس معاملے میں کا دوا داری ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز سے دامنوں کو اپنے لیے کوشش کرتا ہے۔ وہ اس معاملے میں بھی کا دوا داری سے نہیں اٹھنے کا دوا داری میں نے تیرہ کر کہا ہے کہ اب جب کہ میں نے اپنے مسئلہ کو حل کیا ہے تو بہت متکلف دامنوں کیوں کی۔“

”بہت خوب!“ میں نے سہلایا۔ وہ خود ہی نیلے کے جاری نیلے خود ہی اپنے معیار مقرر کے جاری تھی۔ اب تو مجھے شبہ نہ تھا کہ اس کی کھوپڑی کا کوئی پردہ اپنی جگہ سے کھسکا ہوا ہے۔

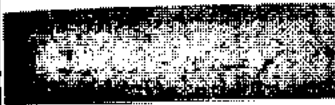
وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی ”دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح آپ کو غائلے اور کمزور قسم کے کا دوا داری حلقوں میں کچھ

محروا سرکاری ایکسٹرننگلنگ نے کھڑی کر دیے دلی دامن

## خبیث

انوار صدیقی کے قلم سے

5 حصوں میں مکمل - 200 روپے



اردو بازار لاہور

وہ ایک لمبے خاموش رہی۔ اس کا منہ ہونٹ دھیرے دھیرے  
لڑ رہا تھا۔ اس نے اسے دانتوں میں دبایا۔ کچھ دیر اس کا سر ہٹا  
رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور افسردہ سے لمبے میں بولی مصلحت  
صاحب! غرت واقعی بڑی ذلیل چیز ہے۔ میں نے اور کامران نے  
بچپن ہی سے غرت اور مساکس کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اب میں  
ان سے چمٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ہم  
نے بہت جدوجہد کی ہے، بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں لیکن ہم  
کامیاب نہیں ہو سکے۔ حالانکہ ہم میں صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے۔  
ہم نے اپنی تمام تر غرت اور اردو میڈیم سرکاری اسکولوں کا کھیل  
میں بڑھنے کے باوجود بہت شاندار نتائج کے ساتھ تمام امتحانات  
پاس کیے۔ جو بھی چھوٹی سوٹی نوکریاں ہمیں ملیں ہم نے ان میں  
نصرت و اندامی اور محنت سے اپنے فرائض ادا کرنے کی کوشش  
کی لیکن ہم غریب کے غریب ہی رہے۔ غرت سے ہمارا کچھ نہیں  
بچھڑتا۔ ہمارے خواب بھی بہت اونچے نہیں تھے۔ ہم انصاف  
باتیں نہیں سوچتے تھے لیکن ہمارے معمولی خوابوں کو بھی تعبیر نہیں  
مل سکتا۔ ہم جوانی ہی میں تھک چکے ہیں۔ خصوصاً میں زیادہ تھک  
چکی ہوں۔ شاید میں اندر سے زیادہ کمزور ہوں۔ اس نے کھلا  
ساکس کی اور کرسی کے پٹے سے سر ہٹا کر واقعی تھکے تھکے اندام  
آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے ملاقات سے کہا کہ اس کے باوجود ایک بات تمہارا  
کچھ میں نہیں آتی کہ غرت اور امارت صرف تھکرے کے پتھر ہیں  
انسان کے ہاتھ پاؤں مارنے سے تھوڑا سا فرق پڑتا ہے

ہو۔ تم جس دنیا کی باتیں کر رہی ہو وہ یقیناً تمہارے خوابوں کی دنیا  
نہیں ہوگی لیکن بعض اوقات کسی سنگ میں اٹھایا گیا ایک قدم  
انسان کو اس کے خوابوں کی دنیا سے بہت دور لے جاتا ہے اور  
واپس کا بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ میں تمہاری اس کھاتی  
کمزوری سے قانع و اٹھتا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ میرے خیال میں  
یہ ایک قسم کا گھٹاپا ہیں ہو گا اور مجھے کسی بھی قسم کا گھٹاپا پسند  
نہیں۔ تم نے اب تک ایک صاف ستھری زندگی گزار دی ہوگی۔ میں  
چاہتا ہوں تم اس پر قائم رہو۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں اس صاف ستھری زندگی پر۔“ وہ یک  
لخت ہی گویا بھڑک اٹھی۔ اس کے لمبے میں جذبات کی شدت کو  
محسوس کرتے ہوئے مجھے دھچکا سا لگا۔ ایک بار پھر اس کا چہرہ لال  
بھوسکا سا ہو گیا۔ ”آپ میرے بزرگ بننے کی کوشش نہ کریں اور  
مجھے نصیحتوں سے نہ نوازیں۔ میں نے زندگی میں ان محنت نصیحتیں  
سنی ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے غریب آدمی کو تو زندگی میں نصیحتوں  
کے سوا سننے کو کچھ ملتا ہی نہیں ہے۔ اور آپ بھلا اتنے یقین سے  
کہتے کہہ سکتے ہیں کہ کسی لڑکی کے خواب کیا ہوں گے؟“

مجھے بے یقینی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ گویا کچھ دھیمی پڑی  
اور اپنے لمبے میں مقبولیت لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی کہ سب  
تک شاید میرے خوابوں کی دنیا دی رہی ہو جس کا آپ ذکر کر رہے  
ہیں۔ اس میں ہر قدم پر شرافت دیا گزرنے کے بلکہ جھگڑے ہوں۔  
آج اچانک ہی میں نے اس دنیا پر بھی لعنت بھیج دی ہے۔ میں اپنی  
ساری یادوں، سارے نظریات، سارے فلسفوں اور اپنے پورے  
ماضی کو کسی سمندر میں غرق کر دینا چاہتی ہوں۔ میں ایک نئی زندگی  
گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنا سفر نئے سرے سے شروع کرنا چاہتی  
ہوں۔ ماضی کی ہر نشانی کو حریف غلام کی طرح مٹا دینا چاہتی ہوں۔ ہر  
پرانے قتل دانے کو شیر باد کہہ دینا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے اس کا  
طرز عمل بتائیے۔ نصیحت مت کیجئے۔

میں اس کی باتوں سے ذرا دلچسپی برداشت نہ ہوا اور نہ ہی مجھے  
فخر آیا بلکہ اب بات کسی حد تک میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔  
میں نے ایک نئے زاویہ نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان کی  
آنکھوں میں اب بھی سرخی تھی مگر اس سرخی کے صتب میں شاید  
ان محنت سلگتی خواہشوں کا دھواں تھا۔

میں نے ملاقات سے کہا ”میرا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ انسان  
کو بصیرت کی سب سے زیادہ ضرورت اسی وقت ہوتی ہے جب وہ  
کھتا ہے کہ اسے نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنا سب سے  
زیادہ نقصان اسی وقت کر رہا ہوتا ہے جب وہ بصیرت مٹاتا نہیں  
چاہتا۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے اندر برسوں سے سوچوں  
کا لاد ایک رہا تھا اور آج اس آتش فشاں کو اچانک کوئی ایسا دھچکا  
لگا ہے کہ یہ پھٹ پڑا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھو اور اپنے  
محسوسات کے بارے میں ذرا محفل سے بچو۔“

داستان میں بننے کی سہی کریں۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس طرح تو معاشرے کا غلط فہم اور بڑھ گیا۔

”مجھے اس سے غرض نہیں ہے“ وہ ضدی لہجے میں بولی ”میں نے معاشرے کا فہم نہیں لے رکھا۔ میں نے اپنی زندگی بدلنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس کے لیے میرے سامنے یہی ایک شارٹ کٹ ہے۔ میں اس سبکی ترستی زندگی سے نکل آچکی ہوں۔ میں زندگی کی تمام بڑی بڑی آسانشوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔“

عمر وہیں سے جھنجھلائے ہوئے اور تنگ آئے ہوئے ہر شخص کا ایک جواب ہوتا ہے۔ یہ جواب بعض اوقات زبان پر نہیں آتا۔ صرف ذہن میں ہی رہتا ہے۔ انہیں سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آہم انسان کے بارے میں جیسے ایک سوہوم ی امید میرے ذہن میں رہتی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا ”اور وہ جو بے چارہ شریف آدمی تمہارا معیت ہے“ اس کا کیا ہے گا؟ وہ تو تم سے شادی کے انتظار میں بیٹھا ہو گا؟“

”اس کا مسئلہ تو مجھ میں آن پڑا ہے“ وہ تیز آواز سے بولی ”وہ اس نے پکڑ میں پھنس گیا ہے۔ وہ انگریزی کسی نہ کسی پکڑ میں پھنس رہا ہے۔ اس بار زیادہ ہی بڑے پکڑ میں پھنس گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اس پکڑ سے نکل جائے۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ بھی ہو گا وہ میں کروں گی۔ میرا اس سے جو بھی تعلق خاطر ہے، جو بھی رشتہ دار ہے، اس کے حوالے سے اس کے لیے یہ میرا آخری تحفہ ہو گا کہ میں اسے اس پکڑ سے نکلوا دوں لیکن اس کے بعد میں اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ بہت سی بے وقوف آدمی ہے۔“

”اور تمہارا خیال ہے کہ تم بہت جلد لڑک ہو؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کم از کم اس سے تو زیادہ جلد ہوں۔ میں نے ابھی تک اپنی عقل کو استعمال نہیں کیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ کھینچتی آ رہی تھی یا یوں کہنا چاہیے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بھی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں جب غربت کی اس کینچلی کو اندر جھینکنے کے لیے میدانِ عمل میں قدم رکھوں گی تو ایک حشر بڑا کدوں گی۔“

”واحد۔ واحد۔“ میں نے ہلکی سی آواز بھائی ”تمہارے عزائم واقعی بڑے بلند ہیں لیکن میرے خیال میں تمہارے معیت کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہو گی۔“

”آپ اس کی بے وقوفی دیکھیں نا۔“ وہ فکرو بھرے انداز میں بولی ”میں نے اپنے حالات کو بدلنے کے لیے ایک انتظامی قدم اٹھانے کا فیصلہ بھی کیا تھا تو وہ بھی کیسا بے وقوفانہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو غربت سے بھی زیادہ بڑی مصیبت میں پھنسا لیا۔“

”بات بھروسہ قدر کی آجاتی ہے“ میں نے حق سے کہا ”قدر خراب ہو تو ہر بات تازہ آتا ہے۔ قدر اچھا ہو تو بے وقوفانہ

فہم نہ رہا نہیں ہوتا۔ مجھے صرف ان کے لیے رہنا ہوتا ہے۔ کتنی بہت ابھی ہوتی ہے۔ آپ محنت کرتے ہیں کہ آپ محنت کا مناسب صلہ لے جاتا ہے۔ خدا کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ لیکن بعض اوقات ہم خدا سے اپنی محنت کے بہت زیادہ صلے کی توقع رکھتے گئے ہیں۔ ہم محنت کرنے کے بعد اپنے آپ کو سستی سمجھتے گئے ہیں کہ اب ہمارے لیے عمل کرنے ہو جائے۔ لیکن ہمیں ہمارے مقدر کے حساب سے ہماری محنت کا صلہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ ہم بیٹ بھر کر روٹی کھا سکیں، معمولی کپڑا پہن سکیں اور کسی بہت کے پیچھے سر جھپا سکیں۔ ہمارا مقدر اتنا زور نہیں دے گا کہ ہمارے لیے مٹی سونائے لگے۔“

وہ دیرے حقیر آئینہ سے انداز میں مسکرائی گویا میں کوئی عمو کے بازو کا اور اسے چکر دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی اس سادگی میں یہ البیہ بھی مجھے دم قدم پر دیکھنے کو ملتا تھا کہ جب آپ دلوں میں سے کسی کو سمجھانے اور صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ کچھ ایسی نظروں سے آپ کی طرف دیکھتا ہے جیسے آپ اس کے دشمن ہیں لیکن زبان کے سامنے ہی بھر کے جھوٹ لے کر ہیں بکواس کرتے ہیں اور انہیں کسی اندھے کوئی طرف اشارہ نہیں ہوتا ہے۔ ان کے پیچھے وہ بڑی عقیدت سے آنکھیں دھڑکے چمکا رہا ہے۔ بعض اوقات تو اندھے کوئی گریختے ہوئے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی برادری کا سبب وہی تھا جسے میں نے اپنی رہنمائی کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ پھر بھی دوسرے کو لایا۔ دوسرے حال کو ہی برا بھلا کرتا رہتا ہے۔

میں جب بولی تو اس کا بعد دم تھا لیکن اس میں ہلاکی تھی۔ لیکن وہی قہر ”ایک مدت سے ہم جیسے قہر دست کو لوگوں کو مقدر کے طعنے کا جھانسا رہا بابا۔ یہ تقدیر کے دھوکے سے بھلا یا جا رہا ہے۔“

”مگر قانون کی نوبت نہ ہو تو غربت اتنی زیادہ تکلیف دہ چیز ہے۔ پانے پانی و قوتوں میں لوگ غربت میں بھی ہنسی خوشی گزر رہا کر لیا کرتے تھے۔ اب غربت کو زیادہ تکلیف دہ اس حقیقت نے بنا دیا کہ ایک آدمی تو چھٹی چھٹی ضروریات کے لیے ترس رہا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے اندر گرد و غبار ڈال ہے تو اسے دولت مندی کے شواہد تلاش کر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہے کہ ضروریات اور خواہشات پر بھی بیسپالی کی طرح بہا رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ خدا کا ستارہ سامنے آ رہے ہیں۔ اس وقت لوٹ مار کا جو طغیانیہ آ رہا ہے، جو آخر انہی پہی ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ خدا کا ستارہ سامنے آ رہے ہیں۔ اس وقت لوٹ مار کا جو طغیانیہ آ رہے ہیں اس خدا کا ستارہ کے خلاف ہوں لیکن میں اس طرح غریبوں سے دور کرنے کے حق میں ہوں۔ میں اس صیاح کا تار کو دور کرنے کے لیے اس کے حق میں نہیں ہوں کہ عموں کے لیے کس کس کے لیے کس کس کو لٹائے لگیں اور اپنے خواب دیکھنے والی لڑکیوں کے لیے خائے تیار کرنے لگیں یا دولت مند لوگوں کی



نیچلے بھی منافع بخش بن جاتے ہیں۔\*

”آپ اپنے اس فلسفے پر خولہ کتنا ہی زور دیتے رہیں لیکن میں جو فیصلہ کر چکی ہوں، جو پروگرام بنا چکی ہوں اس پر ضرور عمل کر کے رہوں گی“ وہ غیر حرج عمل مجھے میں ہوئی۔

”نیک ہے۔“ میں نے خوش دلی سے کہا ”اگر حبسِ دانشہ بننے کا دعویٰ شوق چما ہوا ہے اور تمہارے خیال میں یہ مدتِ باعزت مقام ہے تو ضرور اس تک پہنچو۔“

”عزت کو کھلی ماریں۔“ وہ جیڑا رہی سے بولی ”فلس کی اس  
سوماہی میں کیا عزت ہے؟ عزت تو آپ سے ہے! ٹھانٹا ہاٹ سے  
ہے۔ یہ جیڑی آپ کو حاصل ہوں تو سب آنکھیں بند کر کے عزت  
کرتے ہیں۔ کوئی بھی آپ سے نہیں پوچھتا کہ یہ سب چیزیں کہاں  
سے آئیں اور آپ چاہیں تو کسی کے پوچھنے سے پہلے ہی کوئی  
خوبصورت سی کمانی گھڑ کر اپنے جانے والوں کو متوقع جاے والدہ  
میں پھینکا دیتے ہیں۔“

”جب انسان بہت جلا بھتا اور جھجھلایا ہوا ہوتا ہے تو اس قسم کے بغیانہ فلسفے کا اچھے لگتے ہیں کہ مطلق کی اس سوسائٹی میں کیا عزت ہے؟ عزت وہ ہے پسے ہوئے ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں جیسے یقین دلاتا ہوں کہ یہ سچ نہیں ہے۔ یہ بھی محض ایک دل کا بھلاوا ہے۔ جلدی یہ دل کا بھلاوا ابھی ساتھ چھوڑتا ہے اور پھر دوسری ایک بے اطمینانی ”ایک“ عقل ساتھ دو جاتی ہے۔ پرانی قدروں میں پھر بھی زیادہ جان ہے۔ انسان ان کے سمارے زیادہ مطمئن رہتا ہے۔ زیادہ ر سکون زندگی گزارتا ہے۔“

”آپ مجھے ہلائے کی کوکھوں میں اپنا وقت“ الفاظ خالص نہ کریں۔ اس کے لہجے میں مذمہ نہ ہوگی۔ ”آپ کو دانش کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ مت روکنے اس میں زبردستی والی کوئی بات نہیں۔ یہاں اور بہت سے دولت مند ہیں۔ کوئی تو درواں مل جائے گا۔“

”حقیقت مل جائے گا۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ تم اس میدان میں ہاتھوں ہاتھ لی جاؤ گی“ میں نے کہا ”یقین میں تمہیں بڑا دی واپے ہو گی کے راستے پر خوش آمدید کہنے کا کہیے ٹ لیا نہیں جا پاتا۔ میں نہیں جا پاتا کہ اس راستے پر سلامہ قدم میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ یہ اعزاز کسی اور کو ہی حاصل ہو۔ میں ایک غریب اور شریف لڑکی کو یہ راستہ اختیار کرنے دیکھ کر نہ پھر لیا میری بہتر سمجھوں گا۔ ہاں۔ اس سودے بازی کے بغیر ہی میں تمہارے حالات بہتر بنانے کے لیے تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کے لیے ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ وہ تحریر سے انداز میں مسکرائی۔

”بالہ۔۔۔ کیوں نہیں“ میں نے پلاٹا مل کسا“ حالات بہتر بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔ میں ایک بزنس مین ہوں۔ بہت سے طریقے بتا سکتا ہوں اور جتنی مدد

مرحوم اور ذرا جھٹکے جھٹکے سے لیے میں بولی غصہ۔ یہ سب باتیں  
بہت تحصیل طلب ہیں۔ ہم نے ان میں اب بھی بہت سادہ  
ضائع کر دیا ہے۔ اس کے باوجود جو عجیبیاں جھٹکے سے نکلتی ہیں انہیں  
پھر فرصت میں بیٹھ کر کوئیں گے۔ فی الحال تو صرف یہ بتا ہے کہ  
آپ اسے چلانے کے سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟  
”خود کامران بھی میری مدد حاصل کرنے کا خواہش مند ہے یا  
نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نہیں۔“ وہ جڑی سے بولی ”اس بے چارے کی  
حالت تو اس وقت ڈوبتے ہوئے شخص کی سی ہے۔ اس کے لیے تو  
مجھے کامران بھی پڑی اہمیت رکھتا ہے اور آپ تو تنہا نہیں اشتیر  
ہیں۔“

”اس عجیب و غریب تعریف کا شکر۔ اور اس بات پر مجھے  
خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں کسی کی آنکھ کا شیشیر نہیں ہوں۔“  
میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میں اس کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے  
تیار ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے میں اس کا خوف  
سنوں۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ قتل کی رات اس گھر میں کیا ہوا  
تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس رات کامران پر نفس سیرا کے  
پاس موجود تھا۔“

”موجود تو تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ پر نفس  
سیرا کو قتل کر دیتا۔“ وہ قہر سے ”غصہ خاصے پر خوش سے لیے میں  
بولی۔

میں نے ہاتھ اٹھایا اور اس کی بات کانٹے ہوئے کہا ”مجھے جو  
کچھ بھی سننا ہو گا میں اس کی زبانی سننا پسند کروں گا۔ اگر مجھے خود  
ایک طرح سے اس کا وکیل سفائی بننا ہے تو پھر مجھے کسی اور وکیل  
سفائی کی ضرورت نہیں۔ اگر اس کی باتوں سے یا کسی اور طریقے  
سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ قاتل ہے تو پھر میں اس کی کوئی مدد نہیں  
کر سکتا۔“

”قاتل تو وہ نہیں ہے۔ وہ چاہے بھی تو کسی کو قتل نہیں  
کر سکتا۔“ وہ اصرار سے انداز میں مسکرائی ”لیکن ہر حال میں  
بات کرنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل اہمیت تو صرف اس بات کی ہے  
کہ قانون اور عدالت اسے بے گناہ تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ آپ  
خود اگر اس کے لیے کچھ نہ کریں تب بھی اتنا تو فری سکتے ہیں کہ اس  
کے لیے کسی ایسے سے وکیل کا بندوبست کریں۔ ہم تو کسی معمولی  
دکلی کی خدمات بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ وکیل کی خدمات حاصل  
کرنے کا حق تو ایک مجرم کو بھی ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“ ہوتا تو ہے۔ لیکن میرے ہاں نہیں ہوتا۔“ میں نے  
جواب دیا ”میرا بس چلے تو میں ان تمام دیکھوں کا بھی کوئی بہت سی  
مناسب بندوبست کر دلائں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا مشکل  
مجرم ہے۔“ اس کی دوکالت کرتے ہیں۔ اسے سزا سے بچانے کے لیے  
ایزی چلی کا اندر لگاتے ہیں۔ یہ بے ضمیری بھی بڑے مسائل پیدا

میری دلچسپی محض کتابی نہیں ہیں۔ میں نے ملاحظہ کیا  
میں نے دیکھا بھی ہے۔ ہر طرح کے حالات دیکھے ہیں۔ ذمہ کی کے  
پر گئے ہر وہ دم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔“

”آپ کے اس بیان پر تو مجھے قطعاً کوئی شک نہیں۔“ اس کی  
مسکراہٹ پر قرار دیا ”آپ جیسے لوگوں کے مقابلے میں ہم جیسے  
لوگوں کا زندگی گزارنا تو محض جھک مارنا ہی ہوتا ہے۔“  
”جو پھر نہیں میری بات مان لیا جا رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”غصہ۔“ اس نے کوئی الجھل الجھل کرتے ہیں۔ ویسے آپ کی وہ  
”سرسے“ جڑوں سے مدد والی بد شکل تو ابھی برقرار ہے نا؟“ اس  
نے تھک چکی تھی۔

”ہاں۔“ اور وہ اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک تم  
اپنے ان ارادوں پر ملکہ راند کی کوشش نہیں کرتیں جو نہ جانے  
کس طرح تمہارے دل میں گھس گئے ہیں۔“  
”مسکرائی تو ایک لمحے کے وقفے میں نے کہا۔“ ویسے اگر  
تم واقعی شہ نہ ہو تو میں اور تمہارا منگیز تو کبھی سے تمہارے شوق  
میں گرفتار نہ ہوتا تو میں تم سے دوستی اور قطع کر کے میں خوشی  
فرمان کرتا۔“

اس کی مسکراہٹ کچھ اور روشن و صاف ہو گئی ”اسی تک تو  
میں اس زبانی کلامی معنی کو توڑنے اور اس کا ساتھ چھوڑنے کے  
ارادے پر قائم ہوں۔ معلوم نہیں کیوں میرے دل میں یکایک اس  
کے لیے محبت نہیں رہی۔“

”تم اسے نہیں چھوڑو گی۔“ میں نے فیصلہ کن لیے میں کہا ”اگر  
تم اسے چھوڑو گی تو پھر میری ہر رویاں تمہارے ساتھ نہیں رہیں  
گا۔ اتنی برائی مت بنو۔“ تو کیاں عموماً اتنی برائی ہوتی نہیں ہیں۔  
اس وقت تم صرف غصے اور جھجھکاہٹ کی وجہ سے اس طرح صوف  
رہی ہو۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ کچھ الجھن کے سے عالم میں بولی  
”مگر وہ نہ گھاس کر ایک ہی نہ جانے کیوں میرے دل سے اتر گیا  
ہے شاید مجھے کسی بھی اس سے محبت نہ رہی ہو۔ یہ شخص بچپن کی  
رفاقت اور وضع اس کی ہو جو میں اب تک اس کا ساتھ دیتی آ رہی  
ہوں۔“

”وضع داری کیا ہے کہ یہ ساتھ اسی طرح بھاتی رہو۔“ میں  
نے طنز وار ”ویسے اگر تمہیں اس سے محبت نہ ہو تو تم اسے  
ان کی محبت سے چھڑانے کے لیے اتنی غرمت کیوں ہوتی؟“

”بچپن کی رفاقت کے ہر حال اپنے اثرات تو ہوتے ہیں۔ میں  
اسے کسی بہت بڑے انجام سے دوچار ہونے نہیں دیکھ سکتی۔“  
”شاید اسی کا نام محبت ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”مگر یہ محبت ہوئی تو شاید میں اس سے اس طرح قطع قلع کا  
فیصلہ نہ کر پاتی جس طرح اب مجھے پیشی ہوں۔“ پھر اس نے ایک  
طویل سانس لے کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے ہوئے

کر رہی ہے۔

”کسی ایک جگہ بے خمیری ہو تو اس کا دماغ بھی دوا جائے  
یہاں تو ہر طرف بے خمیری ہی بے خمیری نظر آتی ہے۔“ فیہ تعنی  
سے بولی ”بہر حال۔۔۔ میں یہ کہنے لگی تھی کہ آپ اطمینان سے  
کامران کی مدد کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس نے  
اس امیر زادی کو قتل نہیں کیا۔“

”تاہم اس نے اس سے شادی ضرور کی تھی“ میں نے کہا۔  
”نہیں“ اس نے اسے خود شادی کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ محض  
دکھاوے کی۔۔۔ اور کا دباری قسم کی شادی تھی۔ اس کا اپنا کوئی بھی  
چوڑی جائیداد کا پتہ نہ تھا۔ کامران کو صرف اس بات سے غرض تھی  
کہ اسے دس لاکھ روپے مل جائیں گے تو اس کی زندگی کے شاید  
سارے ہی مسائل حل ہو جائیں گے۔ وہ جب یہ تجویز لے کر دوڑا  
دوڑا میرے پاس آیا تھا تو میں نے اسی وقت اس کی مخالفت کی  
تھی۔ اس قسم کے منصوبے بظاہر خواہ کتنے ہی اچھے معلوم ہوں  
لیکن نہ جانے کیوں دل کو نہیں لگتے کم از کم میرے دل کو نہیں  
لگتے۔ میں نے اسی وقت ہی اس کی مخالفت کی تھی لیکن کامران  
مجھے سمجھانے لگا ”میں کرتے لگا۔ اس نے بہت سے وعدے بھی  
کئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اگر پر نفس اس پر مہمان بھی  
ہوگا۔۔۔ اسے چھوٹے کا بھی نہیں۔“

”پھر تم نے اس کے وعدے پر یقین کر لیا تھا؟“ میں نے

منکرانے ہوئے پوچھا۔

”یقین کرنے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔“  
مفتی سانس لے کر بولی ”اس کے علاوہ اس نے بتایا تھا کہ  
پرنس نے تو خود پہلے اس پر یہی واضح کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو محض  
دکھاوے کا شوہر سمجھے اور کچھ شوہر بننے کی کوشش نہ کرے گا۔  
یہی تھا کہ وہ بڑی تیزی سے یہ ہدایت دے دی تھی۔ کم از کم کچھ  
کامران نے یہی بتایا تھا۔“

”بہر حال تم نے اجازت دے دی؟“ میں نے تصدیق چاہی۔  
”ہاں۔۔۔ بادل ناخواست میں نے اجازت دے دی۔“ وہ کہہ  
سانس لے کر بولی ”میں نے دل میں یہی سوچا تھا کہ یہ بھی کامران کی  
شرافت ہی تھی کہ وہ اس سلسلے میں مجھ سے اجازت لینے آیا تھا۔  
وہ نہ بھی پوچھتا تو میں کیا کرتی۔ میں محض اس کی تکفیری تو تھی  
بیوی تو نہیں تھی۔ اکثر اوقات تو بیویاں بھی اس قسم کے مسئلہ  
میں کچھ بھی نہیں کہتی ہیں جب کہ شوہر کچھ باہر جا کر دوسری  
شادی کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر جو بے چارے اپنا گھر تباہ و  
ہا بھی ہیں اور دنیا کو اپنی ازدواجی زندگی کا قاتل نہیں دکھانا چاہتی  
وہ تو بہت ہی خاموشی سے حالات سے سمجھتا کرتی ہیں۔ بہر حال  
میرا دل نہ جانے کیوں پہلے ہی اندیشوں سے لرز رہا تھا۔۔۔ اور آخر  
کار میرے اندیشے درست ہی ثابت ہوئے۔ اسے لینے کے دینے  
کے۔“

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خود نوشت

## دہشت گرد

سلیم فاروقی

- وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
- وقت کی راہیں تھامتے اس کے ہاتھ لہو لہان ہو گئے تھے۔
- ”جی لانیانا“ کا ایک مقبول ترین ایڈوینچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

میں پوچھا بھی کہ وہ کس لیے آیا تھا لیکن وہ پھر بھی دست سوال دراز نہ کر سکا۔

”کامران نے یہ بتایا کہ پرس اس وقت کیا کر رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے خاص طور پر تو نہیں بتایا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اپنے انہی امیرانہ چہ نظلوں میں مصروف تھی جنہیں یہ لوگ آرٹ و فیکو کا نام دیتے ہیں۔۔۔“ مفیدہ کے لیے میں زہر ملا پن آگیا ”میرا مطلب ہے کہ وہ اپنے انہی مشاغل یعنی پیٹنگ و فیکو میں مصروف تھی۔ اس دوران میں دو تین ٹیلی فون کالز آئیں جن کے بعد پرس نے کامران سے کہا کہ ایک دو مہینوں کے آنے کا امکان ہے یہ بھی امکان تھا کہ ان کے ساتھ زیادہ تر تک بات چیت چلے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہاں ملازم تو ہوتے نہیں ہیں۔ پرس خود کھانے پکانے کے پکڑ میں بھی پڑنا پس چاہتی تھی اور اس کا باہر جانے کا سوا بھی نہیں تھا۔ وہاں سے غاصے یا فیملی پر بوٹ بین کے قریب بہت باؤنٹی مارکیٹ سی ہے جہاں اچھے قسم کے رستوران بھی ہیں۔ وہاں کئی طرح کی کھانے پینے کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ پرس نے کامران کو کچھ رقم دے کر بھیجا کہ وہاں سے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرائے۔ اس نے اپنی پیش قیمت گاڑی کی چابی بھی اسے دے دی۔“

”کامران کو ذرا تنگ آتی ہے؟“ میں نے تھوہین کر لیا۔ ہنر سمجھا۔

”بہت اچھی“ مفیدہ نے جواب دیا ”وہ کچھ عرصے پہلے فیکو پر کسی کی جیسی بھی چلا آ رہا ہے۔ بے چارے کی قسمت کچھ زیادہ سی خراب ہے۔ ایک بار ڈاکو وہ جیسی اس سے چھین کر لے گئے تھے۔ سرے کی ٹی کے دستے سے ضرب بھی لگا گئے۔ جیسی تو بعد میں مل گئی لیکن گولیوں سے چھٹی تھی اور اسے دو تین دوا دواؤں میں استعمال کیا جا چکا تھا۔ مالک نے ہاتھ باندھ کر کامران سے معذرت کر لی کہ اب وہ اسے اپنی جیسی چلانے کے لیے نہیں دے گا۔ بلکہ اسے کیا کسی کو بھی نہیں دے گا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کامران کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ہر حال۔ میں بتا رہی تھی کہ کامران گاڑی لے کر کھانا لینے چلا گیا۔ مارکیٹ میں دُش تھا۔ پرس کی مطلوبہ کھانے کی چیزیں لینے میں کامران کو کافی دیر لگ گئی۔ وہ واپس آیا تو اس نے پرس کو مردہ پایا۔ کالے پتھر کا ایک جھمبہ اس کے پاس پڑا تھا۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”کامران اندر کیسے پہنچا؟ پرس کے اس بنگلے کے گیٹ میں الیٹرنک لاک لگا ہوا ہے۔“

”پرس نے اسے گاڑی کی چابیاں دی تھیں۔ اس کے رنگ میں گیٹ کی چابی بھی تھی اور یہ بات پرس نے خود بھی کامران کو بتادی تھی مگر اگر اس کی دواہی برسرِ کسب اور

مہر حال۔۔۔ تو خے کی رات وہ اس کے اسٹوڈیو میں تھا۔ اس نے جیس بتایا ہے کہ اس رات وہاں کیا ہوا تھا؟ وہ وہاں گیا کیوں تھا؟“

”ہاں۔ اس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے“ وہ سہلے ہوئے ”وہ اس رات اس کے پاس کچھ ایڈوائس لینے کے پکڑ میں گیا تھا۔ آپ اس کے حالات کی محکمہ فیکو پر شاید ہی دل میں پس رہے ہوں۔“

”میں۔۔۔ میں ہرگز نہیں پس رہا“ میں نے اس کی بات کاٹنے سے اسے اطمینان دلایا ”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“

”حالات واقعی بہت خراب اور محکمہ فیکو خے“ وہ ٹھنڈی مائیں لے کر بولی ”وہ کھانے کی شادی کو ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ کرانے کا شوہر خاص مولیٰ رقم ایڈوائس مانگنے کے ارادے سے اس حسین اور دولت مند بوی کے پاس جا پہنچا جسے وہ صرف دیکھ سکا تھا جو نہیں سکتا تھا۔ جس کی دولت مندی کے مظاہرے وہ صرف دیکھ سکتا تھا“ ان سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔

”کیا اسے جیوں کی ضرورت تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں دیکھ۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی ”میرے اور اس کے حالات کے بارے میں جان لینے کے بعد تو آپ کو اس قسم کا حال نہیں کرنا چاہیے۔ جیوں کی قوتانی اشد ضرورت تھی کہ ان کے انتظام میں وہ مرا جا رہا تھا۔ کافی عرصے پہلے اس نے باہر جانے کے پکڑ میں ایک پشمان سے منافع پر رقم لے کر گنوا دی تھی۔ اس کی اس قسم کی غارتگوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہر حال اس پشمان نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ دوسری بھی بہت سی فوری ضروریات تھیں۔ شادی کا صحابہ تو دو زحالی ماو چنا تھا۔ میں مل گیا تھا اس سے بھی زیادہ طویل سمجھتا تھا کہ کامران رقم کے غدار میں ایک ایک دن نہیں بلکہ ایک ایک گھنٹہ گن گن کر گزارا تھا۔ وہ پرس سیرا سے لاکھ دو لاکھ بطور ایڈوائس مانگنے کے اسے سے گیا تھا مگر فوری نوعیت کے مسائل حل کئے جا سکیں راستے کچھ ذہنی یکسوئی حاصل ہو سکے“ وہ خاموش ہو گئی۔

مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں کامران کے لیے ہمدردی کی محسوس ہوئی۔ وہ اور مفیدہ ہمارے ہاں کے لاکھوں نوجوان لڑکے ہیں کی نائنٹی کر رہے تھے جو نہ جانے کن کن کئی کچروں میں رہتے ہوئے تھے اور ایک بے مقصد تنہا دینے والی اور گونا گوں ایک سے بھری زندگی گزار رہے تھے۔

آتے ہیں جن کے تحت کامران پرنس کو قتل کر سکتا تھا۔ ایک کہ اب وہ قانونی طور پر پرنس کا شوہر بن چکا ہے۔ شاہ اس کی دل میں لالچ کیا ہو کہ وہ پرنس کو قتل کر سکے۔ لیکن خود کو یہ ثابت کر کے دس لاکھ سے کہیں زیادہ دولت و جائیداد حاصل کرے گا۔ لیکن پرنس کے قریبی رشتے واصل میں ایک بڑی سہولت کوئی نہیں تھا جسے پہلے ہی والد کی جائیداد میں سے بڑا حصہ حاصل تھا۔

ضیفہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی ۳۳ میں تصویر میں کیا غور کرتے ہیں لیکن ہم صرف ایک دو سوئے سوئے ٹھکان پر کیا کریں گے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے اگر ایسا کوئی منصوبہ کیا تو اس کے مطابق اسے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کچھ بندوبست رکھنا چاہیے تھا۔ جائے واردات پر موجود چاہیے تھا یا پھر وہاں سے اپنی عدم موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت رکھنا چاہیے تھا۔ تو اس کے بجائے وہاں اپنی موجودگی کے لیے جھوٹا کیا۔ اس دوران میں پرنس میرا اپنے منگیت کو بھی فائدہ پہنچا جس کی کامران وہاں موجود ہے اور لاش دیکھنے کے لیے سے فرار ہو کر کامران نے اپنے آپ کو زیادہ مشکوک بنایا۔

اس کے ہونٹوں پر طرہ مسکراہٹ مگر یہ ہونٹیں اور وہ ایک کے قوت کے بعد ذرا نرم لہجے میں بولی "سرا! اگر وہ انکی فوج و طرار اور ایسی خطرناک سازشیں تیار کرنے کا اہل ہو تو انکی ہی کس بات کا تھا۔ پھر وہ اتنا بد حال تو ہوا ہی ہوتا۔ وہ لگتا کہ بہت بڑا پرنس پھیلائے۔ کوئی ایسا پرنس کبھی خود آزام نہ ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ جو لوگ بڑے بڑے پرنس ہیں اور ایسا پرنس کبھی بگڑے ہیں وہ سب کے سب ذہین، پھر اور خطرناک سازشیں تیار کرنے کے اہل ہیں؟" میں نے مسکراہٹ ہوئے پوچھا اور ساتھ ہی واضح کیا "تمہارا یہ بیان بھگوان زمرے میں آتا ہے۔"

"ہرگز نہیں سرا! وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی میں ۳۴ بارے میں ایسا نہیں کہہ رہی لیکن کم از کم تو بے لیدہ کلمہ میں میرا یہ دعویٰ درست ہے اور ضرورت پڑنے پر میں اسے کسی بھی عدالت میں ثابت کر سکتی ہوں۔"

"بہت خوب۔ تم ایک جرات مند لڑکی ہو" میں نے کہا "لیکن اس جرات مندی نے بھی مجھے کچھ نہیں دیا۔" قدرے بیزاری سے سر جھٹک کر بولی "میں نے ابھی کامران کے بارے میں بات کریں گے۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ اتنا ہوشیار اور عذر ہوتا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا اور اہل چالاک اور بے خوف ہوتا تو پھر جائے واردات سے فرار ہو کر ہرگز اپنے آپ کو اس قدر مشکوک بنا کر کتنی ہی مایوس نہ رہتا۔ آپ ذرا سوچیں افضل صاحب! کتنی ہی

ادھر ہوا کام میں مشک ہو تو اسے بار پرنس کو کوئی زحمت نہ ہو۔" ضیفہ نے نہایت محفل سے بتایا "چنانچہ کامران گینٹ کھول کر گاڑی اندر لے گیا تھا۔ اس نے پہلے کھانے پینے کی چیزیں جگن میں رکھی تھیں۔ پھر اس ہال میں گیا تھا جہاں اس نے پرنس کو کام کرنے چھوڑا تھا۔ آپ تو تصور نہیں کر سکتے کہ پرنس کی لاش دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی لیکن میں تصور کر سکتی ہوں۔ اس قسم کی صورت حال میں ہمارے ہاں کی پولیس کا تصور کر کے تو اکثر ہمت شرف کا بھی پتہ چلتا ہو جاتا ہے۔ کامران تو پھر بھی خاصا زور پک اور کم بہت سا توڑی ہے۔ وہ وہاں سے سر پر ہونے لگا کہ کبھا گا۔ اس کی محفل بالکل خبط ہو گئی تھی۔ اس کا یہ فعل بالکل غیر ارادی اور اضطرابی تھا۔ بہت دیر تک وہ وہاں سے بے عالم میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ قیمت ہے کہ اس دوران میں اسے ادھر ادھر گشت کرنے والے پولیس والوں نے نہیں دھریا ورنہ انہیں سو فیصد یقین ہو جاتا کہ وہ کوئی واردات کرنے آیا تھا۔ حالانکہ حاملہ بالکل اٹ ہے۔ واردات کرنے والے بالکل نروس نہیں ہوتے۔ وہ اس طرح دوندناٹے پھرتے ہیں کہ شاید پولیس بھی ان کی طرف سے نظر پھر کر گزر جاتی ہے۔"

میں اس تصور سے مسکرایا کہ اگر اس وقت رحیم گل یہاں ہوتا تو یہ تبصرہ سن کر اس پر کیا گزرتی۔ ضیفہ نے بات جاری رکھی "پھر کامران ایک رستورن میں جا بیٹھا۔ اس نے کچھ ٹھنڈا و فیوہ پیا تو اس کے حواس کسی حد تک ٹھکانے آئے۔ اس نے بہت دیر سوچ بچار کی۔ اس کی سوچ بچار بھی بس ایسی ہی ہوتی ہے۔ گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ بہر حال اس رات اس نے کم از کم یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ اسے ایک بار پھر بنگلے پر جا کر دیکھنا چاہیے اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" وہ سانس لینے کو رکھی۔

"اس نے اس فیصلے پر عمل بھی کیا یا نہیں؟" میں نے جتنس سے پوچھا۔

"ہاں۔ عمل تو کر لیا لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔" ضیفہ منہ بیکار بولی "بہت دیر بعد جب وہ دوبارہ بنگلے پر پہنچا تو باہری پولیس کی اور کئی دو سری گاڑیاں کھڑی تھیں جنہیں اس نے دور سے دیکھ لیا۔ انہیں دیکھ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ گھبرا گیا اور پہلے سے زیادہ پھرتی سے سر پر ہونے لگا کہ کبھا گا۔ بس۔ یہ اس کی کل کمائی ہے۔ اگر آپ اس پر یقین کرنے کے لیے تیار ہیں تو پھر آپ کو اس بات کا بھی یقین آجانا چاہیے کہ وہ بے گناہ ہے۔ دیکھو بھی۔ آپ خودی سوچیں۔ اسے پرنس میرا کو قتل کر کے اپنے آپ کو معیت میں پھانسنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے پاس تو پہلے ہی مسائل اور معیتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"پولیس اس طرح نہیں سوچتی" میں نے نرمی سے کہا "مگر ہم پولیس کے نکتہ نظر سے سوچنے کی کوشش کریں تو دو امکانات نظر

وقت بہت چلاک بہت دلیر بہت احمق اور بہت بزدل نہیں ہو سکتا۔<sup>۳۰</sup> میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا

مہررت کے اس کارخانہ غائب میں بڑی بڑی عجیب چیزیں بھری ہوئی ہیں۔ ہر سال میں تم سے بحث میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا۔ ہم پہلی ہی بہت سادہ وقت ضائع کر چکے ہیں۔ میں پولیس کی فیوری کا دوسرا کتہہ جس میں بتانا چلوں۔ وہ یہ رائے بھی قائم کر سکتے ہیں کہ کامران نے کسی باقاعدہ سازش یا ارادے کے تحت پرنس کو قتل نہیں کیا ہوگا۔ اور اگر وہ ایسا سوچے تو یہ اس کی مرمانی ہوئی کیونکہ اس طرح یہ قتل عمر اور سازش بھرانہ کا کیس نہیں رہے گا بلکہ فوری اشتعال یا جذبات کے غلبے کے تحت کیا گیا قتل قرار پائے گا جس کی مزاحم ہوگی۔ کتہہ یہ ہوگا کہ خدائی میں کامران کی نیت خراب ہو گئی ہوگی۔ وہ قانونی طور پر پرنس کا شہر تھا۔ اس نے اپنے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی۔ پرنس نے مزاحمت کی ہوگی اور کامران نے غصے اشتعال اور جذبات سے مغلوب ہو کر مجسمہ افکار اس کی کھوپڑی پر دے مارا ہوگا۔ یہ کتہہ عدالت کو بھی قریں قیاس محسوس ہوگا۔<sup>۳۱</sup>

اس بارہ وقت پر ہاتھ رکھ کر یوں ہنسنے لگی جیسے میں نے کوئی بہت سی بات تو فائدہ بات کہہ دی تھی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے نکلی تھیں لیکن میں نے کہا "ایک بے گناہ لڑکی قتل ہو چکی ہے اور تم اس کے ذکر پر کبھی بھی گری ہو۔"

میں اس کے ذکر پر کبھی بھی نہیں گری۔ "وہ مہمان کرہ بولی دینے آپ اس کے بے گناہ ہونے کا اتنے وقتوں سے دعویٰ نہ کر لیتے۔ اور اگر وہ بے گناہ بھی رہی ہو تب بھی مجھے اس سے کوئی خاص ضروری نہیں ہے۔ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی اور دنیا میں اس سے سب بگڑے ہوئے لیا تھا۔ یہاں تو آئے ان ایسے کسمن، معصوم اور بے وسیلہ سے لوگ جرم بے گناہی میں مارے جاتے ہیں جنہوں نے زندگی میں کچھ نہیں دیکھا ہو تا پھوٹی سے پھوٹی آسائش بھی ان کے لیے زندگی بھر ایک خواب رہی ہوئی ہے۔ ہم ان کا ماتم کرنا ان پر افسوس کریں یا ان بڑے بڑے عیش پرست مگر پھوٹوں کا گمراہ پولیس؟ اس کی سزا کا نہ صاف کوئی کچھ تکلیف دہی تھی۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی" میں نے کہا "اگر کوئی دولت مند" آزاد اور خود مختار رہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اسے بغیر کسی تصور کے مار دیا جائے اور پھر اس پر اعشار افسوس بھی نہ کیا جائے۔"

میں اس کے بارے جاننے کی حمایت نہیں کر رہی "وہ جلدی سے نکلی میں تو کسی کے بھی مارے جانے کے حق میں نہیں ہوں۔ لیکن مجھے اس کی موت کا کوئی خاص افسوس نہیں ہوا اس لیے میں افسوس کا اعشار نہیں کر رہی ہوں۔ میں متفق نہیں ہوں۔ کسی نے آپ کے بیان کہہ منسوبے پر اتنی غمی کہ کامران پر شیطان

سوار ہو گیا ہوگا۔"

"اس میں بھی ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اور کامران ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ جوانی کے بعد بھی ہم پر کوئی خاص پابندیاں نہیں رہیں۔ ہمیں خدائی میں سب ملالقات کے مواقع بھی حاصل رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کامران کے وجود میں کوئی بہت بڑا شیطان مقید نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا دھیمہ آدمی ہے۔ اس کے اندر کا شیطان بھی کچھ ایسا زیادہ شیطان نہیں ہے۔ ذرا ڈانٹنے اور بعض اوقات تو مٹھ خٹ نظروں سے گھورنے سے ہی قابو میں آ جاتا ہے۔ اگر اس میں ایسی وحشت اور درد کی پائی جاتی تو اتنے عرصے کی رفاقت میں مجھے بھی ضرور اندازہ ہو جاتا۔"

"بہت خوب! تم نے تو اسے بہت اچھی طرح پرکھا ہوا ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس میں کیا شک ہے؟" وہ نظریے بنیاداً مل پڑی۔ چند لمبے کمرے میں خاموشی رہی۔ آخر میں نے گہری سانس لے کر کہا "ختم" میں تو یہ پولیس کے متوقع خیالات بیان کر رہا تھا۔ کامران کے بارے میں میری اپنی رائے بری نہیں ہے۔ بلکہ اچھی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں سنا کیونکہ میری اس سے صرف چند سیکنڈ کی ملاقات ہوئی ہے اور ظاہر ہے چند سیکنڈ میں کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔"

"اس سے ملنے کے بعد پیچھے آپ کی رائے بہت اچھی ہو جائے گی۔ اس میں آپ کو کوئی خرابی نظر آئے یا نہ آئے لیکن آپ کم از کم اس بات کے ضرور قائل ہو جائیں گے کہ وہ کسی کو قتل کرنے کا اہل نہیں ہے" صنیہ ورفق سے بولی۔

"وہ ہے کہاں؟" میں نے اپنی دانست میں ایک بار پھر بے خبری میں داؤ لگایا مگر صنیہ بہت ہوشیار تھی۔

وہ مہمان سے انداز میں سہلاتے ہوئے مسکرائی "آپ بار بار مجھے چکروں سے روک رہے ہیں کہ کوشش نہ کریں۔ میں ویسے ہی آپ کو بتا دوں گی۔ ظاہر ہے میں اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کو اس کی بے گناہی کا یقین دلا سکوں۔ اس کے لیے اس سے ملنا بھی ضروری ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے میں آپ سے وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ آپ ہر طرح سے اس کی مدد کریں گے۔ مردوں والا وعدہ۔"

"میں مردوں والا وعدہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں" میں نے بلا تامل کہا "لیکن میں صرف اس شہر پر کامران کی مدد کروں گا کہ وہ بھی ایک مردوں والا کام کرے۔"

"وہ کیا؟" وہ چوکی۔

"وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرے" میں نے کہا۔

آؤٹ آف دی وے جا کر کوئی کام کیا بھی ہے تو وہ بھی کسی ایسے حکمران اور خزانہ صفت شخصیت کو سبق سکھانے کے لیے آیا ہے۔ ایسے مجبور اور کمزور کی مدد کرنے کے لیے جسے سیدھے طریقے اس کا حق دلانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

”یہ بھی تو ایسا معاملہ ہے۔ وہ جلدی سے بولے۔  
”نہیں۔ اس میں کوئی ایسی پیچیدگی یا مشکل نہیں ہے جو نے نفی میں سر ملاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ کل کلانے نے نہیں کیا۔ مجھے بھی پوری طرح یہ یقین آجائے۔ اور پوری طرح یہ یقین اس سے ملنے کے بعد ہی آسکتا ہے۔ اور بعد کوئی ایسا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ وہ پولیس سامنے پیش ہونے سے ڈر رہا ہے۔ جب وہ میرے قتل پولیس کے پاس جائے گا تو اسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کی۔ کوئی اسے اچھی بھی نہیں لگائے گا۔ سب کے لیے نہ ہو جائے گی۔ اس کے اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔ گویا ایک مصیبت سے نکل آئے گا۔ پولیس بھی اس کی طرف مطمئن ہونے کے بعد کیس کوئی سے اصل قاتل کی تلاش میں جائے گی جب کہ ذاتی دلچسپی کے تحت میں خود بھی اسی کو تلاش ہوں۔ یقین ممکن ہے میں پولیس سے پہلے یہ کام کر گزروں۔“  
وہ خاموش رہی تو ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا اب بھی قاتل نہیں ہوئیں۔ ہلکتا ہے میری ریل گاڑی ہے۔“  
”یہ بات نہیں ہے۔“ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مسکراتی ”قاتل تو میں ہو چکی ہوں۔“

”تو پھر الجھن کس بات کی ہے؟ چلو۔ مجھے کارخانہ کے لے چلو۔“ میں نے اچھے ہونے کہا۔

وہ پھر بھی ہچکچاہٹ کا شکار رہی تو میں نے کہا ”تم بہت اور بہت تیز و طرار لڑکی ہو۔ اتنی سی بات تمہاری کچھ بھی نہیں آ رہی؟ انسان کو جب کوئی جسمانی تکلیف ہوتی ہے تو اس کے پاس جاتا ہے اور اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ اسے کچھ بتاتا ہے۔ اس کے ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح جب انسان کسی دیکل کے پاس اپنا کیس لے کر جاتا ہے تو اس کے سلسلے میں وہ اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ خواہ وہ مجرم ہو نہ ہو۔ دیکل سمجھی اس کا کیس بہتر طور پر لڑ سکتا ہے۔ جب چھوٹی سے چھوٹی تفصیل معلوم ہو۔ میں بھی اس وقت کارخانہ دیکل صفائی کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں بلکہ ایک سے میں دیکل صفائی سے کہیں زیادہ ذمہ داریاں قبول کر رہا۔ لیکن اگر مجھ پر تمہاری بداحادی کا کوئی عالم رہے گا تو پھر بھی کوئی مدد نہیں کر سکیں گا۔ تم جا سکتی ہو اور کوئی دوسرا جہاد کر سکتی ہو۔“

جو فارملا اپنی دانستہ تسلی اور کارگر سمجھتے ہوئے اسے مجھ پر استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اس کے ذریعے تو

”اوہ۔“ اس کے چہرے پر ایسی پھل گئی ”آپ ویسے ہی کہہ دیں کہ وہ اپنے گلے میں پھنسا ڈال کر لٹک جائے۔ یعنی میں جو اتنی دیر سے آپ کے ساتھ مغز ماری کر رہی ہوں۔ بلکہ اس موضوع کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا ہو اس کرکھی اس کا ذہن برابر بھی قانچہ نہیں ہوا۔ پر نا۔ وہیں رہ رہا ہے۔ اگر اسے اس طرح اپنے آپ کو پولیس کے حوالے ہی کرنا ہوتا تو پھر مجھے آپ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

میں نے بڑے قتل سے اس کی بات سنی اور نہایت نرمی سے کہا ”تمہیں اس کی بے گناہی کا یقین ہے نا؟“  
”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ملایا۔

”جی۔ تو پھر جس طرح میں کہہ رہا ہوں اس طرح کرو۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنا یا اتفاقاً ان کے ہتھے چڑھا تو کچھ اور بات ہوتی لیکن اب میں اسے پولیس کے حوالے کروں گا۔ یہ کچھ اور بات ہوگی۔ جب تک وہ دوش پہ یا پولیس سے بھاگ رہا ہے اس وقت تک میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ اس طرح اس کی حیثیت ایک مغرور ظلم کی رہے گی۔ اگر اس کا مستقبل طور پر ہی بھاگتے رہے گا ارادہ ہے تو پھر اسے میری مدد کی نہیں بلکہ جو تون کی ایک نہایت مضبوط قسم کی جوڑی اور ایک آدھ لی لی یا آڈر وغیرہ کی ضرورت ہے تاکہ وہ ذرا دل جی سے اپنی دوزخ جاری رکھ سکے۔ اپنے تعلق میں آنے والوں پر گاہے بہ گاہے دو چار فائر کر سکتے۔ اسی طرح جواب میں ملنے والی کوئی گولی کسی دن اس کا کام تمام کر دے گی اور قصہ ختم ہو جائے گا۔ ایک اور اہم ہے گناہ کی کمال انجام کو پہنچ جائے گی۔“

وہ ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ میری ان باتوں کے جواب میں کچھ نہ بولی تو میں نے کہا ”زمانہ خواہ کیسی آن لگا ہے اور ابھی قدریں خواہ کتنی ہی بال ہو چکی ہیں اس کے باوجود میں ہر کام کو صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا کسی کے بھی اندازوں سے زیادہ اثر رسوخ ہے اور وہ بے پیسے کے مل پر بھی میں بڑی تفت ڈھا سکتا ہوں۔ بڑی دھمائی چا سکتا ہوں۔ بڑے بڑے ناجائز کام کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا کرتا نہیں ہوں۔ شاید اسی لیے بعض بہت اونچی جگہوں پر میرا بہت اعتبار قائم ہے۔ میں کچھ بھی کر گزروں۔ مجھ سے کچھ نہیں چھپا جاتا۔ اس کے باوجود میری پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں اپنی حیثیت کو غلط طور پر استعمال نہ کروں۔ اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤں۔ یہ بڑا حوصلہ کا کام ہے۔ اس کے لیے بڑے مہر و ضبط۔ بڑی قوت برداشت اور بڑا عرق درکار ہوتا ہے۔ ورنہ یہاں تو چوہے کو بھی ذرا سی طاقت مل جائے تو وہ دم پر کھڑا ہو جاتا ہے۔“

”آپ کہنا چاہتے ہیں؟“ وہ زرا الجھن سے بولی۔

”یہ کہ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ آؤٹ آف دی وے جا کر کوئی کام نہ کروں۔“ میں نے جواب دیا ”اگر میں نے بھی





اور رش کی وجہ سے سزاور بھی لہا لگ رہا ہے۔

”نئی دیر میں تو تم حیدر آباد سے ہو کر آ جاتے“ میں نے لکھ  
”آپ کی فرض کر لیں کہ آپ حیدر آباد جا کر وہاں کوہ  
جیں“ اس نے گویا مجھے دلاسا دیا۔

”اردو بھی کرنا گاڑی پر ہے!“ میں نے غصہ کی سانسیں لے  
کہا۔

کانی دیر بعد ہم ایک نہایت دور افتادہ اور غریبہ علاقہ  
آخری سرے پر جا پہنچے۔ راستے میں ہم کئی ایسے مقامات  
گزرے جہاں گاڑی چلتا سرکس میں کمال دکھانے کے حوالہ  
تھا۔ کئی جگہوں سے تو بڑی گاڑی کا گزرتا ہی حال تھا۔ راستے  
ایک جگہ بچوں کے غول بھی گاڑی کے پیچھے لگ گئے تھے وہ گول  
پیچھے سے پکڑ کر روکنے یا پھر اس کی چمت پر چڑھنے کے لیے لکھ  
تھے۔ انہیں گویا ایک عرصے بعد کوئی دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا  
میرا خیال تھا کہ بڑے شہروں کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں  
اب اس قسم کے نظارے دیکھنے کو نہیں ملتے ہوں گے لیکن اب  
کبھی نہ کبھی ان سے پلاڑی جانا تھا۔ بہت سے عورت زہد  
کے ٹوٹے پھوٹے دوداؤں یا ٹٹ کے پردوں وغیرہ کے عقبہ  
سے سے ہاتھیں سے چوہوں نے بھی جھانکا۔

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مشین پائل کی سوجھ  
اطمینان کرتے ہوئے کہا ”آج کل تو ایسے علاقوں کا سفر نہ لگا  
بہتر ہے۔ ایک عجیب غلطکار رہا کرتا ہے۔“

”ڈر رہے ہیں آپ؟“ وہ قدرے شر سے لمبے ذرا بلکہ  
”مجھے ڈرنا نہیں“ تھارہا ہے“ میں نے کہا۔

”میری فکر نہ کریں“ اس نے مجھے تسلی دی ”جب  
خود اپنی کوئی فکر نہیں ہے تو آپ کو فکر میں دہلے ہوئے کی  
ضرورت ہے۔“

”تم اتنے سفاکانہ انداز میں کوئی کمزوری اور کثرت  
مٹ پر دے رہی ہو کہ اسے قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے“ میں  
کہا۔

”میرے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو آپ عادی ہو جائیں گے  
اطمینان سے بولی ”ویسے بریکل تک کہ میں آپ کو غلاموں کا  
ملائے کے جس حصے سے میں اُمیں آپ کو لاری ہوں یہ  
پہچا ہوا ہے اور درحقیقت میں بھی اسی لیے اطمینان سے  
درندہ میں اتنی ہمار نہیں ہوں جتنی نظر آنے کی کو مشعل کر  
ہوں۔ یہ ایک اور کمزوری اور کثرت حقیقت ہے لیکن یہ  
کے منہ پر نہیں مار رہی ہوں۔“

”اس نوازش کا بہت شکریہ“ پھر میں نے گاڑی کو گھوٹ  
پہچاتے ہوئے اور گرد کا جائزہ لینے کی کوشش کی ”اس علاقہ  
واقعی حالات ہمیشہ بہت خراب رہے ہیں لیکن اس  
سکون محسوس ہوا ہے۔ کلی کوچوں میں سوائے تک دھڑکی

پر مٹی بھی لگ جائے تو آسانی سے پچھا نہیں چھوڑتی۔ دکھ درد  
بڑی غالم چیز ہیں۔ یہ تو زہری طرح انسان کے خون میں سرایت  
کر جاتے ہیں“ میں نے کہا۔

اس وقت تک مکمل مکمل چکا تھا اور ٹھیک ذرا پیچھے لگا تھا۔  
میں اس طرف متوجہ ہو گیا تاہم مجھے احساس تھا کہ وہ گردن سڑے  
بنور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمبے کی غاسوشی کے بعد اس نے  
کدھے اچکائے اور ایک بار پھر پٹنے سے ٹھیک لگاڑیلے ڈھالے  
انداز میں بیٹھ گئی۔

”صغیر! میرا دل کہتا ہے کہ تم کوئی بہت غصہ کی چیز ہوگی“  
میں نے اچانک کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی ”میں بھی تک توہنی نہیں۔۔۔ اور نہ ہی بننے  
کے کوئی آثار ہیں کیا پڑھانے میں جا کر بنوں گی؟ یہ تو کچھ اسی قسم کی  
بات ہے جیسے فطرت میں بڑے بڑے کامیاب ترین ایک دوسرے سے  
پوچھتے ہیں ”تم بڑے ہو کر کیا بنو گے“

”پڑھانے تک کا سفر تو تم بہت دیر میں طے کرو گی۔ تمہارے  
پاس ابھی بہت وقت ہے۔۔۔ اور پھر کسی کی ذات اور حالات میں  
انقلاب آتے کیا دیر لگتی ہے؟ بلکہ جھپک کر کوئی دیکھتا ہے تو یوں  
لگتا ہے جیسے اس کے سامنے کوئی انسان یا جنم لے کر کھڑا ہے۔ سر  
سے پاؤں تک۔۔۔ روح سے جسم تک سب کچھ بدل چکا ہوا ہے۔  
میں خیرانی سے سوچ رہا ہوں۔ تم غربت میں اتنے غصہ کی چیز ہو۔۔۔  
جب تمہارے حالات بدلیں گے تو کیا چیز بن جاؤ گی!“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔۔۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولی  
”حالات بدلنے تو دیں۔ ویسے مجھ میں مزید انقلابات کی گنجائش تو  
نہیں ہے لیکن وقت کے بارے میں بھلا کوئی کیا کر سکتا ہے“ پھر  
اس کے لمبے میں یک دم خمیدگی سی آگئی ”آپ کا وہ میری مدد والا  
دھندہ برقرار ہے؟“

”ہاں۔۔۔ جی۔۔۔ برقرار ہے۔ ابھی سے پوچھنے کی ضرورت  
پیش آئی؟ ابھی تو ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا۔ اتنی بے اعتباری ہے تو  
اسٹاپ پیپر پر لکھ دوں؟“ میں نے کہا۔

”اسٹاپ پیپر سے زیادہ میرے لیے آپ کی زبان قلیل اعتبار  
ہے“ وہ کچھ سرور سے انداز میں بولی۔

باقوں کے دوران بھی وہ مجھے راستہ بتاتا نہیں بھولی تھی۔ ہاتھ  
کے اشارے سے وہ رضائی کٹلی جاری تھی اور ہم بس چلے ہی  
جا رہے تھے آخر کار میں نے اسے ٹھہرتے ہوئے کہا ”تم نے کہا  
تھا تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ تمہاری نشت میں  
تھوڑی دیر کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“

”بھئی غریبوں کی نشت میں وقت کی کوئی تدر و وقت نہیں  
ہوتی۔ وہ بے چارے بس میں لگ کر اڑتے رہ دھندے میں بھی گھر پہنچتے  
ہیں تو کیا فرض کر لیتے ہیں کہ بہت جلدی پہنچ گئے“ وہ اطمینان سے  
بولی ”ویسے۔۔۔ بس تھوڑا سا سزاورہ گیا ہے۔ جگہ جگہ ٹھیک جام

شور شرابے کے اور کوئی اہل محسوس نہیں ہو رہی۔ عجیب بات

یہ ضرور ایک بیکراں سند رہے لیکن یہ علاقہ بھی بجائے خود  
کی سند سے کم نہیں۔ اس سند میں اس نکلے کی حیثیت  
درجہ ۱ کی ہے۔ میں جس لائی بھی محفوظ راستوں سے  
لے کر وہاں تک نہیں راستے میں دو کا چاڑھا ہونا گاڑی  
پر چڑھ کر بھی تھکے پاس ہے وہ بھیجنے کی کوشش کی جا چکی  
تھی۔ سارا لوگ کی ٹولیاں غول بیابانی کی طرح ہر طرف پھرتی رہتی  
تھیں۔ منظر یہ تھا۔

”اگرچہ نہیں تو یہاں کے بارے میں بہت معلومات ہیں“

”میں نے قدرے حیرت سے کہا۔  
میرا پہلا ایچہ اور برسے حالات میں آتا جاتا رہا ہے اس  
ساتھ کے کی حصوں میں میرے کچھ عزیز واقارب رہتے ہیں“

”میں نے جواب دیا“ اور میں جہاں جاتی ہوں بہت جلد وہاں کے عہد  
کے لگتی ہوں۔“

”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا ہے تم بہت خطرناک چیز ہو۔ تم  
سے ہوشیار رہنا چاہیے۔“ میں نے سہلے ہوئے کہا۔  
”بہت زیادہ۔“ اس نے بلا تامل جواب دیا۔ پھر اس نے ایک  
دھڑکنے کے نیچے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا اور بولی ”اس سے آگے  
انڈی نہیں جاسکتی۔ ہمیں پیدل جانا پڑے گا۔“  
”وہ خدا ایسا۔“ میں نے غصہ کی سانسی لے کر ”بالکل ایسا  
لوگوں کو ہوا ہے جیسے کامران علاقہ غیر میں جا کر پناہ گزین ہو گیا  
ہے۔“

”علاقہ غیر ماننے کی اب کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ بہت سے  
بہت علاقے اب انہوں کے لیے علاقہ غیر ہو گئے ہیں بلکہ تم علاقہ  
غیر بلا تو وہاں شاید زیادہ اپنائیت کا احساس ہو۔“ وہ تلخ لہجے میں  
کہا۔

میں نے گاڑی لاک کی اور اس کی رہنمائی میں ایک ایسی گلی  
میں داخل ہوا جو بظاہر گلی سی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد  
گلی کی ایک اور پہنچ سلسلہ چل پڑا۔ کہیں کمر کا پانی کھڑا تھا تو  
کہیں خضن کوڑے کے کنارے تھے۔ ان گلیوں میں بھی بہت سی  
گھسی اور فگ زدہ نظروں نے ہمارا تعاقب کیا۔

”مجھے یہ غامضی سے چلنے کے بعد میں نے کہا“ ان راستوں کو  
آدھ کھانسی تھرا ایک کھل ہے۔“

اسے ان راستوں پر چلتے ہوئے گھبراہٹ بھی ابھرنے لگی  
ہوئی تھی۔ وہ پلٹ کر سٹرا آتے ہوئے بولی ”جب انسان کا کسی  
سے ملتی ہوئی ہو تو اس میں ایسے کمالات پیدا ہو جاتے ہیں۔  
پائیل کے لئے کہ اسے ایسے کمالات اپنے اندر پیدا کرنے پڑتے  
ہیں۔“

”میں نے کہا“ اور جو تم کہتی ہو کہ جس کامران سے محبت نہیں

”ابھی تک تو محبت ہے۔“ وہ سٹرائی ”لیکن میں اس محبت  
کو دل سے نکال دوں گی۔ اس محبت نے مجھ سے توجہ تک مجھے  
دیکھ کر پٹانوں اور ٹکڑیوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ آپ کو یہ سن کر  
حیرت ہوگی کہ جب ہم چھوٹے تھے اس وقت کامران کو دوسرے  
لوگوں کے ہاتھوں بچنے سے میں بچایا کرتی تھی۔ جب کوئی کامران کو  
مارتا تھا تو میں جاتی تاکر اس کی پٹائی لگاتی تھی۔ اس میں اپنا وقار  
کرنے کی بھی صلاحیت نہیں تھی۔“

میں بے اختیار فٹ دیا۔ اس نے نیکی نظروں سے میری  
طرف دیکھا ”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔ بس مجھے ذرا اپنا بچپن یاد آ گیا تھا۔“ میں نے  
دھمکے لہجے میں کہا۔

”کیا آپ کے بچپن میں بھی ایسی کوئی محبت کرنے والی آپ  
کے ساتھ تھی؟“

”نہیں۔ میں اتنا خوش نصیب نہیں تھا۔“

”مگر ایسا ہو تو آپ خوش نصیب نہیں بد نصیب ہوتے۔“  
وہ منہ مٹا کر بولی ”مگر اگر وہ لڑکی اب تک آپ کی محبت میں گرفتار  
چلی آ رہی ہو تو شاید وہ بد نصیب ہوئی۔ ہر حال میں نے کم از کم  
اس ایک بد نصیبی سے تو بچا چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔۔۔۔  
۔۔۔۔۔۔ میں ایک کمزور اور بے وسیلہ لڑکی ہوں۔ میں کب تک  
ایک مرد کا سارا حلاش کرنے کے بجائے اس کا سارا بھتی دینا میں  
رہنے کھاتی پھر سکتی ہوں۔“

”گھبراہٹ محبت نہیں یعنی وہ ہو گئی۔ جب دل چاہا سو کچھ ان  
کر دیا۔ جب دل چاہا کھ کھ دیا۔ یا جب مناسب سمجھا تو اس  
کسیں اور جوڑ دیں۔“ میں نے سٹرائی ”میں نے کہا“ کہی ہر حال  
لڑکی ہو تو نہیں۔ اور اپنے ہر حال میں کے لیے ہمارے تلاش کرتی ہو۔  
شعروں کی آواز لینے کی کوشش کرتی ہو۔ محبت میں ایسے ہمارے نہیں  
چلتے۔“

”بھجواؤں سب کر ادھی ہیں۔“ وہ غصہ کی سانسی لے کر بولی  
”کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس محبت کی حد ختم ہوتی ہے اور  
کہاں سے مجھ کی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔“

اس دوران میں ہم ایک ایسی گلی سے گزر رہے تھے جو گلی کے  
بجائے دو پہاڑوں کے درمیان پیدا ہو جانے والی کسی دراڑ سے  
مشابہ تھی۔ اس گلی میں کوڑے کا ایک ڈھیر بھی راہ میں مائل تھا  
اور اس ڈھیر کے نیچے ایک دھڑا ایک مرد عریٰ کو بھینبوڑتے  
ہوئے اپنے اپنے حق ملکیت کا جھگڑا لے کرنے کی کوشش کر رہے  
تھے۔

اس نازک حتم کو عبور کرتے ہوئے ہمیں ان سے تقریباً مس  
ہو کر گزرنا پڑا۔ یہ ایک کراہت انگیز تجربہ تھا۔ وہ نہایت ہی غیر  
معزز قسم کے تھے اور بہت گندی حالت میں تھے۔ منہ ان میں  
سے ایک سے تقریباً مس ہوتے ہوئے گزرنے لگی تو اس نے کچھ  
زبان ہی کہنے کا سہا کر کہے ہوئے عریٰ کی ٹانگ چھوڑ کر اس کی

# رقص ابلیس

انوار صدیقی قیمت / 150

وائس بائیں محبوب و غریب مکانات کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے  
”ہم بھی اور تھی دور جانا ہے؟“

”ہیں اب تھوڑی دیر رہ گیا ہے۔“ وہ مسکرائی۔  
”تھوڑی دیر“ اور ”تھوڑی دیر“ بھی کس  
دال کے وعدے سے کم نہیں ہے۔ ”میں نے ٹھنڈی سانس  
کا“ ”پوسے کا مران نے پتہ کے لیے جبکہ خوب دھوڑی پالم  
سال تک بھی اسے دھوڑتی رہے تو نہیں پاسکتی۔“

”ظاہر ہے اس بے چارے کو کسی ایسی ہی جگہ پناہ  
تھی۔ کسی فرضی نام پتے کے ساتھ کسی قافیہ اشار ہو گئی  
قیام کرنے کی تو اس کی اوقات نہیں تھی۔“ ”میں نے ہولی ٹوپے  
ہم جیسے لوگوں کو پناہ دینے والے زیادہ تر ایسے ہی علاقوں میں رہا  
ہیں۔ جب پولیس یا کوئی دوسرا شخص جیسے لگا ہوا تو ایسے ہی علاقوں  
رہنے والے دوست ’ہم دور دور شکشا آپ کے لیے اپنے گھر  
دور اڑے کھول دیتے ہیں۔ دولت مندوں کے علاقوں میں رہنا  
والے تو آپ کے عزیز رشتے دار بھی ہوں اور آپ عام مکانات  
بھی ان کے پاس جائیں تو ان کے دور اڑے مشکل سے ہی گاہ  
ہیں۔ ہاں اگر آپ خود بھی دولت مند ہوں تو پھر مات دے سکتے  
ہیں۔“ ”اے اے نے لایا کر کر لے ہاتھ۔“

”کامران سے ملنے کی تم خاصی بے ہودہ محسوس ہو رہی  
تھی۔“ ”میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”لیکن تمہاری دلچسپ باتوں  
وجہ سے اس کی باتوں کا احساس نہیں ہوا۔“

”آپ کے لیے یہ دلچسپ باتیں ہوں گی حالانکہ تمہاری باتوں  
ہے۔ میں دل کے پھولے پھوڑی رہی ہوں۔“ ”پھر ایک دن  
مڑتے ہوئے بولی ”سارک ہو گاری منزل آگئی۔“

دہان کی گلیاں بغیر کھدائی کے بھی کچھ ایسی گلی رہی تھیں  
انہیں جگہ جگہ سے کھود ڈالا گیا ہے لیکن اب ہم جس گلی میں داخل  
ہوئے اس میں واقعی کھدائی کی گئی تھی۔ وہ بھی دوسری گلیوں کا  
طرح انتہی چھوٹی گلی تھی کہ کھدائی کے بعد وہاں صرف کھدائی کا  
گلی تھی، گلی غائب ہو گئی تھی۔ گلی کی کھدائی کر کے وہاں کھدائی  
پاپ ڈالا گیا تھا لیکن بعد میں شاید اس کام کا کوئی قاعدہ نظر نہ  
آیا تھا یا پھر کسی اور وجہ سے اسے اوجھڑا چھوڑ دیا گیا تھا۔

میں دیکھے بھی سیوریج کا نظام موجود نہیں تھا۔ شاید یہاں اس  
جسے میں اس کے لیے کوئی ترکیب کرنے کی کو شش کی گئی تھی۔

ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی۔ شاید اسے ٹانگ مردہ مرنے کے بجائے  
زندہ مرنے کی ٹانگ سے دیکھیں یہ اہو گئی تھی اور فی الحال اس نے  
صنید کی ٹانگ کو اس کا قبائل سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

صنید نہ تو خوف زدہ ہوئی اور نہ ہی اس نے عام لڑکیوں کی  
طرح دل دوز چار کر اور حرا دھر مانگنے کی کوشش کی۔ وہ زنانہ  
جوتوں یا سینڈلوں وغیرہ کے بجائے نہایت پرانے سے جوکر پہنے  
ہوئے تھی۔ اس نے بڑی سفاکی سے اپنی ٹانگ پچاتے ہوئے کہنے کی  
ابھری ہوئی پٹلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ بے شک  
ایک فائدہ زدہ سا کتا تھا اور اس کی پٹلیاں ابھری ہوئی تھیں لیکن  
بہر حال خاصا جیم تھا۔ اس کے باوجود صنید کی ٹھوکر پڑنے پر وہ  
تقریباً ایک فٹ اونچا اچھل پڑا اور مردہ مرنے کو بھی بھول کر ہلکا  
ہوا بھاگ اٹھا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے مشین پھل نکال کر ہاتھ  
میں رکھتے ہوئے اس ٹانگ مقام کو عبور کرنا بہتر سمجھا تھا لیکن  
جس کتے کے قریب سے گزرا تھا وہ دم بڑا کر ایک طرف کو ہوا گیا تھا۔  
شاید یہ اس کی اس پسندی کا نتیجہ تھا کہ مردہ مرنے پوری اس کے  
جھے میں آگئی تھی۔ وہ جلدی سے دوسری طرف کو بھاگ گیا۔

صنید ٹھکیوں سے میرے مشین پھل کو دیکھتے ہوئے بولی  
”اوپر تو آپ اس قسم کی چیزیں بھی رکھتے ہیں۔ گویا آپ خامسے  
تلف قسم کے پڑوس میں ہیں۔“

”بے شک۔“ ”میں نے جواب دیا۔  
”لیکن ان مرنے کتوں سے منٹنے کے لیے یہ نکالنے کی کیا  
ضرورت تھی۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی ”کیوں آپ ان لوگوں  
میں سے تو نہیں جو پھر کو بھی توپ سے مارنے کی کوشش کرتے  
ہیں؟“

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرے سلسلے میں اس قسم  
کی سائنس آرائی نہیں کی جاسکتی۔“ میں نے مشین پھل دایں جب  
میں رکھتے ہوئے کہا ”لیکن میں کتوں کے معاملے میں اس قسم کی  
احتیاط کا ضرور قائل ہوں تاکہ معاملہ دور دور سے ہی طے ہو سکے۔  
میں کتوں سے ہاتھ پائی کا قائل نہیں ہوں۔ بلکہ میں کہتا چاہیے  
کہ میں کتوں سے دست و گریب ہونا پسند نہیں کرتا۔ میں مخفروں  
گھوڑوں اور آونیک گھوڑوں کا سامنا تو کر سکتا ہوں لیکن چالیس یا  
چودھ تکیوں کا تصور میرے لیے ہول ٹانگ ہے۔ بلکہ چالیس اور  
چودھ تو کیا۔ میرے لیے ایک نیکے کا تصور بھی خوف ٹانگ ہے۔“

”نہایت ہے!“ وہ دھیرے سے ہنسی۔  
”تو نے تمہاری لات ماشاء اللہ کافی زوردار تھی۔ کتا ہوا میں  
اچھل گیا تھا۔“ ”میں نے اسے دوا دی۔“

”اس میں میری غرت کی قوت بھی شامل تھی۔“ وہ بے نیازی  
سے بولی ”مجھے ایسی ہر غرت سے غرت ہے جو بلا وجہ ہر آتے جاتے  
انسان کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔“

”غاسم، غرت کی غرت ہے۔“ ”میں نے اسے دوا دی۔“

میں آئی ہوں۔"

دوسرے ہی لمحے بھیٹ کے درمیان دواڑے سے جو شخص برآمد ہوا اسے پہلی نظر میں تو میں پہچان ہی نہیں سکا کہ وہ کارمان تھا۔ اس کی شبیہ کلن بھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد دھڑکتے پل بکھرے ہوئے تھے۔ سرخ سرخ آنکھوں اور لیے کیلے کپڑوں کے ساتھ وہ کسی ایسے بین ماس سے مشابہ نظر آیا تھا جو ہم باہری سے خوف زدہ ہو کر کسی عمارت میں جا چھپا تھا اور کئی دن بعد ڈرتے ڈرتے باہر آیا تھا۔ اس کی بائیں آنکھ دو دفعہ دو دفعہ سے پھڑک رہی تھی۔

"آخر تم انہیں ساتھ لے ہی آئیں!" وہ وحشت زدہ اور بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں منیدہ سے مخاطب ہوا۔ اس کے لمحے میں فکر اور اطمینان کے بجائے شکرے اور پتھری کا مضر شامل تھا جیسے منیدہ نے مجھے ساتھ لا کر اس کے حق میں بہت برا کیا ہو۔ منیدہ نے منہ کی سانس لے کر میری طرف دیکھا جیسے زبان خوشی کہہ رہی ہو "دیکھا آپ نے؟ کیا یہ شخص اس قاتل ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تنگی کی جائے؟"

وہ شاید اس سے غصا بھی جانتی تھی۔ جیسے لمحے میں پہلی "اگر تمہیں ان کے آنے سے اتنی تکلیف ہوئی ہے تو یہ واپس چلے جائیں گے۔ انہیں کوئی شوق نہیں تھا اس حسین مقام پر آنے کا۔ میں منت حاجت سے انہیں لائی ہوں۔"

"یہ مجھے پولیس کے پاس لے جائیں گے۔" وہ پہلی پہلی ہی آواز میں بولا۔ اس کے ذہن میں پولیس کا غیر معمولی خوف بھٹا ہوا تھا۔ شاید کوئی نفسیاتی گمراہی تھی۔ پولیس کے نام سے خوف زدہ تو اکثر ہی لوگ ہوتے تھے لیکن اس کی خوف زدگی میں کوئی خاص بات تھی۔ عام لوگوں کے سلسلے میں بھی یہ تضاد بڑا حتمی خطرناک محسوس ہوتا تھا کہ مجرموں کے بجائے شرعاً پولیس سے لرزہ بر اندام رہتے تھے۔

"یہ اگر تمہیں پہچانی دینے والے کسی جلا کے پاس بھی لے جائیں تو چپ چاپ چلے جانا۔" منیدہ نے گویا بڑے خلوص سے اسے مشورہ دیا۔

کارمان نے شاید اس کا مضمون ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا "پولیس کو آپ نے میرے بارے میں بتایا تھا؟"

"مجھے یہ ذمت کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہاں حضور منیر جو موجود تھا سب کچھ بتانے کے لیے۔" میں نے منہ کی سانس لے کر جواب دیا۔

"کوہ سے تو میں بھول ہی گیا تھا۔" وہ مضطرب انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "مگر وہ اس وقت وہاں آئے پہنچا جب میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر واپس آیا تھا اور پھر نس سیرا کی لاش کو دیکھ رہا تھا تو وہ بیچتا مجھے پولیس کے حوالے کرنے کے لیے سر

خیزا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس منصوبے کو اسی حالت میں پہنچا کر گزر چکا ہے اور اب دونوں طرف کے اونچے نیچے کی کھانوں میں رہنے والے سنی کے انہی ڈھیروں پر سے خندق کاٹنے کو پہلا گ کر ایک طرف سے دوسری طرف آ جا رہے تھے۔ پہلے پہلے مجھے بھی اس کام میں مایوس ہو چکے تھے اور بڑی عرصہ کے خندق پہلا گ رہے تھے۔ یہاں بھی اس پاس سے گزرتے دو پار توہیل نے خاص شک زدہ ہی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ یہ کئی شیطان کی آنت کی طرح لگی تھی۔ اس میں بھی خاصا اصرار کرنے کے بعد منیدہ خندق پہلا گ کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ ایک دواڑے پر بار کی کھلی سی رات کا پردہ بھول رہا تھا۔ اس دواڑے کے قریب ایک کھلی کھلی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی تیز رفتار دھڑکی معلوم ہوئی تھی۔ آنے جانے والوں کو راستہ دینے کے لیے سکرٹ کر ایک طرف کو دھکیلتی تھی۔

منیدہ نے پردہ ہٹا کر لوہے کے دواڑے پر دھک دی تو اندر سے ایک گرفت نسواری آواز نے پوچھا "کون ہے؟"

منیدہ نے اپنا نام بتایا تو چند لمحے بعد کھڑک کھڑاٹ کے ساتھ دواڑہ کھل گیا۔ دواڑہ کھولنے والی مضبوط کھلی کی ایک اور چیز عرصہ سے تھی جس کی رکعت شاید کبھی سرخ و سفید رہی ہو مگر اب اسے کبھی بھی پہچانی نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے آٹھ چوڑا اور کھلی چھاپا اور سرگوشی میں منیدہ سے کچھ بات کرنے کے بعد اگلے اندر چلی گئی۔ منیدہ نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا پھر اسی انداز سے دواڑے کا پلٹ چڑھا دیا۔

مکان کی نسبت غیب میں تھا اور اس کی چھت ٹھن کی تھی۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ بارشوں میں اس سے کادور ان مکانوں کا کیا حال ہوتا ہو گا لیکن اندر پہنچ کر جب سے غیر محسوس انداز میں ادھر ادھر دیکھا تو مجھے ایک خوش گوشت اور تازہ ہوئی گدہ پیش کی حالت دیکھ کر میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اندر اتنی صفائی ہو گئی۔ میرے خیال میں اس علاقے کی حالت اس مکان کی عمرت زدگی کو برعکس نظر رکھتے ہوئے اس سے زیادہ کھلی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سینٹ کا عام پائیدار ماسک لگی ہوئی تھی۔ دھواں دھواں اور دھواں پوچھا ہوا تھا۔

دھواں دھواں ہی سانس کا مکان معلوم ہوتا تھا اور پلے کرے کو بہرہ عقدہ ڈراٹنگ دم مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں درست شدہ کرسیاں اور ایک بوسیدہ پائی رکھی تھی۔ فرش پر طش وری جھکی ہوئی تھی۔ پائی پر الونیم کا ایک بال رکھا تھا۔ سات اعلیٰ ٹرے کا کام لینے ہوئے کسی نے اسے سکرٹ کے سامنے بھر دیا تھا۔ شاید یہ کسی کے اشتہار سلسل کی نشانی تھی۔

منیدہ نے اس کمرے سے آگے جائے بغیر ہی پکارا "کارمان!

دھڑکی بازی لگا دیا۔

”میرا خیال ہے کسی کو بھی تمہارے سلسلے میں یہ ذمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے گہری آنکھوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پرسکون لبے میں کہا ”مجھے امید ہے تم خود اپنے گھر میں پانی کا پینڈا اچھی طرح فٹ کرنے کے بعد اپنی کسی حفاظت کی بدولت پولیس کے سامنے پہنچو گے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے کچھ اور زیادہ الجھن اور وحشت سے میری طرف دیکھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

میں نے ملاحت سے کہا ”اگر تمہاری ذہنی حالت یہ ہے کہ تم صبر و صبر کو بھولے ہوئے تھے تو پھر تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔ تم نے یہ غلطی تو کر لی ہے کہ گھبراہٹ میں مدد پرش ہو گئے اور یوں اپنے آپ کو زیادہ مشکوک بنالیا۔ لیکن اب تم سے اس سے بھی بڑی کسی حفاظت کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

اس موقع پر منیب نے مداخلت کی ”آپ دونوں کا کھڑے ہو کر ہی ساری بات چیت کرنا ضروری نہیں ہے۔ آپ بیٹھ بھی سکتے ہیں۔ کامران کی عقل تو ویسے بھی گھٹنوں میں ہے۔ زیادہ دیر کھڑے رہنے سے وہ بالکل ہی ٹخنوں میں چلی جائے گی۔“

کامران نے منیب سے صغیر کی طرف دیکھا۔ شاید غصہ اور جھنجھلاہٹ ہی اس کی آخری پونجی رہ گئی تھی لیکن منیب نے ہلکے صغیر سے صغیر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے دیکھتی رہی ”گویا خلیج گری ہو کہ مجھے ڈانٹ کر دیکھو میں تمہارے من پر کھڑا رسید کدوں کی۔ کامران کچھ نہیں بولا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں چشم تصور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر ان کی شادی ہو گئی اور کسی نہ کسی طرح اسے آٹھ دس سال گزر گئے تو پھر کیا عالم ہوگا۔“

میں ایک غیر آرام دہ سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کامران نے بھی میری تھکید کی لیکن اس کے بیٹھنے کا اندازہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے ذرا سے ٹکے پر بدک کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ میں نے اس کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”بہتر تو تھا کہ تم میرے ساتھ چلتے تمہارے پاس اگر کوئی سامان ہے تو وہ لے لو۔“

”آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟“ اس کے لبے میں وحشت فوراً بڑھ گئی۔

”تم میرے ساتھ میرے ہوش چل سکتے ہو۔ رہیں ہم آرام سے بیٹھ کر پرسکون ماحول میں دو معزز انسانوں کی طرح بات چیت کر سکتے ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”اس جگہ میں کیا خرابی ہے؟“ وہ اکھڑے اکھڑے سے لبے میں بولا۔

”خرابی تو کوئی نہیں۔ بس مجھے تمہاری حالت دیکھ کر ترس آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میں یہاں اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ بولا

”یہاں مجھے حفظ کا احساس ہوا ہے۔ میں نہیں ٹھیک ہوں۔“ اگر اس احمق کو اس علاقے اور اس ماحول میں کو احساس ہو رہا تھا۔ اور حفظ کا احساس ہونے کے بارے میں عالم تھا تو پھر اسے اس کے حال پر ہی چھوڑنا ٹھیک تھا۔

اسی اثنا میں اندر سے ٹھن کی ایک پرانی سی رے میری آنکھ کے لیے بالکل خاموش رہا۔ دس یا دس سال کی ایک بچی کی رے تھی۔ بچی کے لیے بالکل خاموش رہا۔ دس یا دس سال کی ایک بچی کی رے تھی۔ بچی کے لیے بالکل خاموش رہا۔ دس یا دس سال کی ایک بچی کی رے تھی۔

”میں نے جلد ادھر جا چھوڑا۔“ اس نے جلد ادھر جا چھوڑا۔

”میری شان کی تم قطعاً ٹھکر نہ کرو۔“ میں نے کپ ہنساتے ہوئے کہا ”میری کوئی شان نہیں ہے۔ شان ہو شاید میں تمہارا ساتھ میرے ہونے کے بارے میں شک ہے۔“

”آپ میری مدد کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں؟“ اس نے لبے میں پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ اور کیا تمہارے خیال میں میں تم سے ملائی تعلیم کے لیے چند ماہ گئے آیا ہوں؟“

”میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میں جلد نام کوئی خدمت نہیں کر سکتا گا۔ میں شاید کسی بھی شکل میں آپ احسان کا صلہ نہ دے سکوں۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔“

”پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

”پچھا؟“ حیرت ہے! ”میں نے استہزا سے لبے میں کہا ”تو کیا سمجھ کر یہاں آیا تھا کہ ایک ارب بیٹی شخص یہاں چلا ہے اور میں جا کر اس کی مدد کروں گا تو وہ خوش ہو کر کہنا نذرانہ میری خدمت میں پیش کرے گا۔“

”منیب میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی ”اب موصوف کو دیا ہی پایا ہو گا جیسا سنا تھا؟“

”اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔“ میں نے غصہ کی سانسیں جواب دیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ کامران ایک بڑھ چلا تھا لیکن عقل کی طرف سے واقعی بے چارے کا ہاتھ تھا۔

”آپ دونوں کو میرا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں۔“

”تجربہ سے بولا ”کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان ہر حال میں اپنی



رکھ دیتی۔ وہ بھی ضرورت مند تھی، میں بھی ضرورت مند تھا۔ ہماری ضرورتوں کی نوعیت مختلف تھی لیکن ہر حال دونوں ضرورت مند تھے اور دونوں غلوں سے اپنی اپنی جگہ معاہدہ بنانا چاہتے تھے۔

”یہ شادی کرانے میں خود میرا کامیگر پیش پیش تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ سارے انتظامات اسی نے کئے تھے۔“ کامران نے جواب دیا ”کلیج کو رجسٹر ہونے اور نکاح نامہ ملنے میں چند دن لگتے ہیں لیکن اس نے بے کام بھی چھپیں گئے کہ اندر اندر کرایا تھا۔“ لیکن اسے یہ بات ہر حال پسند نہیں تھی کہ تم پر نس میرا کے قریب رہو؟“

”پسند۔“ وہ استہزائیہ سے انداز میں چٹا ”مجھے یقین ہے اگر میں اس کے سامنے پر نس کا ہاتھ پکڑ لیتا تو وہ فوراً میرے ہاتھ گم کرنے کی کوشش کرتا۔“ حالانکہ خود پر نس کا مدیہ میرے ساتھ غاصدو ستانہ تھا۔

اس نے ایک نظر منیہ کی طرف دیکھا اور جلدی سے متائی پیش کرنے کے انداز میں بولا ”لیکن ظاہر ہے منیہ سے بے وفائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”شکریہ۔“ منیہ ہنسنے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ ”مطلب یہ کہ تم ایمان داری سے تار پے ہو کہ پر نس پر تمہارا دل خراب نہیں ہوا تھا؟“ میں نے صاف طور پر وضاحت چاہی۔

اس نے پچھلی پچھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہ رہی ہو۔ پھر وہ تھوک نکل کر بولا ”یہ بلا کیے ہو سکتا تھا؟ میں اس سے بہت زیادہ مرعوب تھا اور جس سے انسان بے پناہ مرعوب ہو اس کے بارے میں کوئی ایسا دیرینہ خیال دل میں کیوں کر سکتا ہے؟“

”خیال آنے پر تو کوئی بھی پابندی نہیں لگا سکتا۔“ میں نے کہا ”ہاں۔ البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اس خیال کے تحت کچھ کرنے کی جرات نہیں ہو سکتی۔“

”پلے آپ ایسا ہی کچھ لیجئے۔“ وہ قدرے چمکے لہجے میں بولا۔ ”میرے سوالوں پر ناگوار سی محسوس مت کرو۔“ میں نے مشورہ دیا ”مگر تمہارے خیال میں میرے سوالات مناسب نہیں ہیں تو اس وقت کا انتظار کرو جب تمہیں پولیس کے سوالوں کے جواب دینے ہوں گے ان کا سوالات کرنے کا انداز تو پھر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔“ یوں سمجھو میں اس معمولی ٹیسٹ کے ذریعے تمہیں ایک بڑے امتحان کے لیے تیار کر رہا ہوں۔“

میری یہ بات اس کے لیے کچھ ایسی خوش کن نہیں تھی۔ اس کی رنگت ایک لمحے کے لیے پھلکی پڑی۔ میں نے جلدی سے اسے اگلے سوال میں الجھانے کی غرض سے کہا ”تم نے بتایا کہ دو تین

فون کالز آنے کے بعد پر نس نے تمہیں کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے بھیجا تھا۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کن لوگوں کے گھر تھے؟“

”ایک تو صفدر میری کا تھا۔ وہ غالباً کسی کام کے سلسلے میں کہیں چٹنا ہوا تھا لیکن جب اس نے سنا کہ میں پر نس کے پاس موجود ہوں تو وہاں آنے پر تل گیا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس وقت پہنچے گا۔“

”اس بے چارے نے اپنی ٹھیکیر سے تمہاری دکھاوے کی شادی تو کرا دی تھی لیکن اسے تمہاری طرف سے اطمینان نہیں تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کی بے اطمینانی کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسے اپنی ٹھیکیر کی طرف سے بھی اطمینان نہیں تھا۔ چلو اسے مجھ پر تو اعتماد نہیں تھا لیکن کیا اپنی ٹھیکیر بھی اعتماد نہیں تھا؟“ کامران پھر اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر منیہ کی طرف دیکھا ”مجھے تو منیہ پر اندھا اعتماد ہے۔ یہ خواہ کبھی نہیں ہو کسی کے بھی ساتھ ہو میں تو کلی ایسا دیرینہ خیال دل میں نہیں لاؤں گا۔“

میں نے منیہ کی طرف دیکھا۔ وہ خطرات انداز میں اپنی کمر پر کھسکا کر ہو گئی۔ میں کامران کو نہیں بتا سکا کہ جس منیہ کے بارے میں وہ اس قسم کے جذبات کا اظہار کر رہا تھا وہ کچھ دن پہلے تک دانشمنی کے لیے کسی بہت موٹی اسامی کی تلاش میں تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب تک اس کے گراں قدر خیالات میں کوئی اور انقلاب آچکا تھا یا نہیں۔ لیکن اگر اس کے یہ خیالات برقرار بھی ہوتے تب بھی میں اسے قابلِ ملامت نہیں سمجھ سکتا تھا جس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے خود اپنے بارے میں پارسیائی کے دعوے نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ میں کسی کی فنی زندگی میں دخل اندازی تو کیا اس کے بارے میں رائے دینی کو بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ تیسرے منیہ کا اپنا غلط بھی قابلِ غور تھا۔ وہ نہ جانے کن کن جبر آزما مرحلوں سے گزری تھی۔ آخر کبھی تو انسان کی فطرت برداشت جواب دے ہی جاتی ہے۔

میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا ”تم اپنا اور ان کا موازنہ مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں مزید کچھ ایسا نہ ہوا کہ پر نس اور صفدر کے درمیان کیا کشمکش ہوئی؟“

”میرا خیال ہے ان کے درمیان جلدی کسی بات پر جبری و تنہی سے بحث و تمحیص شروع ہو گئی تھی۔ پر نس کا انداز صفدر کو ڈانٹ لپٹ کرنے کا سا تھا۔“ کامران نے بتایا ”لیکن میں کچھ زیادہ نہیں سن سکا اور نہ ہی کشمکش کے بارے میں کچھ اندازہ لگا سکتا تھا کہ میں اعلیٰ اختیارات کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر چلا گیا تھا کہ پر نس اطمینان سے بات کر سکتے۔“

”اوہ۔“ میں نے بے اختیار اظہارِ محسوس کیا ”اور کس کس قانون کا؟“

تھا۔ اس پر بھی پرس نس سخت برہم ہو رہی تھی لیکن بات زیادہ اونچی آواز میں کہیں کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بہر حال وہ اس سے بھی برہم تھی۔ شاید وہ اس کا برہمی کا ہی دن تھا۔

”تم اپنی سناؤ۔۔۔ تم پر بھی برہم ہوئی یا نہیں؟“ منیہ نے مکرراتے ہوئے پوچھا۔

”مجھ پر برہم ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی تاہم وہ مجھ پر کچھ ایسی مہال بھی نہیں تھی۔ بس رکی سادہ تھا اس کا۔۔۔ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پُر خیالی سے مجھے بلے پرلا ”ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت سے ٹھکرات میں گم رہی ہوئی تھی لیکن ذہن بٹانے کے لیے اپنے آپ کو کام میں اچھائے ہوئے تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی شدہ۔۔۔ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں۔۔۔ وہ کچھ زیادہ ہی جوش و خروش سے کام میں جتی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے کوئی ڈیٹہ لائن ملی ہوئی تھی۔ اسے کسی مقررہ وقت سے پہلے پہلے بہت سا کام کھل کر کے دینا تھا۔ میں نے تو اس سے پوچھ بھی لیا کہ کیا ایسی کوئی بات تھی۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے بتایا کہ جب اس پر کام کا جنون سوار ہوتا تھا تو وہ اسی طرح کام کرتی تھی۔ اس نے اس کے لیے انگریزی کی اصطلاح CREATIVE FRENZY بھی استعمال کی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس حقیقی جنون کے دوران میں خاصی تکلیف میں رہتی تھی۔ اسی لیے اس پر اس وقت چڑچاہن غالب تھا۔“

وہ کچھ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ میں پھر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ باب ایک لمبے کے وقت سے وہ پرلا ”مجھے حقیقی کام کرنے والوں کو قریب سے دیکھنے کا زیادہ تجربہ تو نہیں۔۔۔ ایسے لوگوں کو کام کرتے دیکھنے کا بھی کوئی خاص اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن میرا خیال پھر بھی یہی ہے کہ پرس نس اس وقت تخلیق کے جنون یا تخلیق کی انت میں جلا نہیں تھی۔ اسے کچھ اور طرح کی پریشانیاں لاحق تھیں۔ وہ فکر مند تھی۔“

”بہر حال۔۔۔ ہمارے موجودگی میں کوئی اس سے ملے نہیں آیا؟“ میں نے صدق پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا ”پھر جب میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر واپس آیا اور میں نے اسے درود دیکھا تو میرے ذہن میں آمد حیاں ہی پلٹے گئیں۔ سب سے پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ یہ کوئی بہت بڑی اور پُر تپ سازش تھی جس کے لیے مجھے پناہ دیا گیا تھا۔ میں قربانی کا کیکر تھا۔ اکثر بڑے لوگوں کے قتل کی سازش میں قربانی کے کیکے ہی جھنڈے ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مناسب امیدوار کی تلاش کا اشتہار جانے لگا کہ دراشت کا قصہ اور دوسری سب باتیں مجھے کسی ڈرامے کا حصہ تھیں۔ کسی کا اصل مقصد شاید پرس نس کو قتل کرنا ہی تھا اور چائی کا چند اٹ کرانے کے لیے ایک حد گردن کی ضرورت تھی۔ میری گردن اسی کام آتی

تھی۔ شاید کوئی جشیہ کرم تھا۔ پرس نس نے اس کا نام دہرایا تھا۔ اس سے پرس نس امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ پرس نس اس پر بھی خوب ناراض ہو رہی تھی۔“

”میرا تم ایک بار پھر بار چلے گئے ہو گے؟“ منیہ نے قہر دیا۔ ”تھکا رہے۔“ کامران نے جواب دیا ”یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ فون پر کسی کی کسی سے کئی منٹوں چل رہی ہو یا بات کرنے والے ایک دو سرے پر برہم ہو رہے ہوں اور آپ اس کے سر پر بیٹھے بیٹھے“

مجھے یاد آیا تھا ”جشیہ کرم امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن“ پرس نس کا پارنٹر تھا جسے پرس نس اس وقت تک جانتی بھی نہیں تھی جب میں اس سے ملا تھا۔ اسی فون نے کوئل جان کر لائی کو بیٹھائی میں جلا کیا تھا اور اسی کی وجہ سے میں پرس نس سے متعارف تھا۔ اس پر پرس نس کا برہم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ کامران میرے اگلے سوال کا انتظار کئے بغیر پرلا ”ایک اور ناکی جمال سعیدی نامی شخص کا آیا تھا۔ اس وقت میں پرس نس لینڈ میں تھا۔“

منیہ نے بڑی طرح چمک کر کامران کی طرف دیکھا ”لینڈ دوم؟“ وہ یہ الفاظ دہرائے بغیر نہ سکی۔

کامران نے اس کی طرف دیکھا۔ پہلی بار میں نے اس کے بطن پر خفیف سی ایسی مسکراہٹ ابھرتے دیکھی جو اصابی خاؤ کی بار بار کہیں تھی۔ وہ ستافان سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے پرلا ”خاک کی پھس۔“ اُن لوگ ملے تھے میں جلا ہونے کے بہانے اونٹن پر لڑ رہا ہوں۔ ہمیں پرس نس خود اس وقت ہال میں ہی تھی۔ اسے ایک فون تک اٹھا کر لانے کے لیے مجھے لینڈ دوم میں بھیجا۔ اُن لوگ اپنا ذہن ادھر ادھر لے جانے کی کوشش مت کر۔ یاد اپنے آپ کو اس کا نوکر سامعہ سو کر رہا تھا۔ مجھیں معلوم ہوا کہ نانا نوکر اپنی انکس کے سامنے کیسا مروجہ رہتا ہے اور اسے رعیت کا رشتہ ہو وہاں کوئی ایسا ایسی بات بھلا دل میں کیسے آتی ہے؟“ وہ کچھ منیہ کے سامنے صفائی پیش کرنے کی کوشش نہا تھا۔

”مجھے یہ ضروری نہیں ہے۔“ منیہ کندھے اچکا کر بولی ”میں تو ایک اور ہوا یا انکس میں طبیعت کی مالک ہوں تو ابتدائی دنوں میں کبھی کبھی ہو سکتا ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم ہے کہ یہاں دونوں ہی باتیں نہیں تھیں؟“ کامران جلدی سے پرلا۔

”مجھے اس وقت مداخلت بہتر سمجھی اور پوچھا“ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ سعیدی کون تھا اور اس سے کس طرح کی گفتگو ہو رہی

تھی اس سے بھی پرس نس کو کوئی کاروباری تعلق ہی معلوم ہوتا



# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                       |
|-------|-----------------------|
| 300/- | سراج منیر (اول و دوم) |
| 100/- | طارق بن زیاد          |
| 75/-  | مقدس دیو داسی         |
| 100/- | سراہوں کے صحرا        |
| 100/- | رقص درویش             |
| 50/-  | دشت کے بھیڑیے         |
| 100/- | غریب کا چوپان         |
| 100/- | شیر شاہ سوری          |
| 50/-  | سندھ کا سورما         |

مکتبہ القرآن اردو بازار لاہور 2

کہ بات کس طرح بتائے۔ آخر وہ پہلے دلتے ہوئے ہوا۔  
ایڈیٹر کے قریب آیا وہاں والے پلانٹ پر کام کرتا ہوا۔  
دوسرے حصوں میں بھی پرنس ایڈیٹر کے پلانٹ ہیں۔  
ایک شخص آکر ہمارے پلانٹ پر مزدور کی حیثیت سے  
اس سے پہلے تو وہاں کا مزدور طبقہ مجھے ہی دیکھ کر جان  
تھوڑا زیادہ تر لوگ بہت دن تک مجھ سے اظہار ہمدردی  
رہے تھے کہ ملک میں بے روزگاری نے کیا حال کر رکھا۔  
جیسے پڑھے لکھے اور مہذب ہوئے نوجوان کو بھی مزدور  
کے پڑے رہے ہیں۔ لیکن اس شخص کے آنے کے  
کریا میرے "صدے" کو بھل گئے۔  
"کہ کون تھا؟" میں پوچھے بغیر نہ سک۔

حق۔ بس یہی سوچ کر میں سر پہاڑی رکھ کر وہاں سے بھاگا۔ اور  
اب کچھ ایسا محسوس ہوا ہے جیسے میرا خیال کبھی تھا۔ پولیس کو  
مرکزی سے اب صرف میری ہی تلاش ہے۔  
"میں اصل میں قاتل کی تلاش ہے اور تم اس سلسلے کی پہلی  
بڑی ہو۔" میں نے کہا۔

"رے صاحب! مجھے ان عقل نہیں سے بھلانے کی  
کو شش مت کیجئے۔" وہ استغاثہ سے لے کر میں ہوا میں کہیں باہر  
سے نہیں آیا ہوں۔ میں اسی ملک کا ایک شہری ہوں اور اس طبقے  
سے تعلق رکھتا ہوں جو پولیس کو زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے۔ مجھے  
ابھی طرح معلوم ہے انہیں کس لیے میری تلاش ہے۔"

"میں،" میں معلوم نہیں ہے۔" میں نے زری سے کہا  
"میں اس وقت معلوم ہو گا جب تم میرے ساتھ پولیس کے پاس  
چلو گے۔ ان کا رویہ ہماری توقعات کے بالکل برعکس ہو گا۔"

وہ ہم سے انداز میں کندھے اٹھا کر رہ گیا۔ ایک لمحے کی  
خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "پتی بن کو تم نے کہاں چھوڑا  
ہے؟"

اس نے صنف کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ میرے  
لے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس نے اپنی بن کو صنف کے پاس  
چھوڑا تھا۔ میں نے ایک بار پھر بین کی جھٹ دالے اس کمرے کا  
بازو لیا اور پوچھا "تم اس وقت سے یہیں ہو؟"  
اس نے انہماک میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا "یہ کس کا کمر  
ہے؟"

"کیا یہ جانتا ضروری ہے؟" اس نے جواب دینے کے بجائے  
الٹا سوال کر دیا۔

"کیا یہ چھپانا ضروری ہے؟" میں نے اسی کے سے انداز میں  
پوچھا۔

اس نے ایک لمبی سانس لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے  
بعد گویا بائبل ناخراستہ ہوا "میرے ایک مزدور ٹائپ دوست کا ہے۔  
وہ قریبی سینٹ ٹیکسٹری میں کام کرتا ہے۔ اس وقت وہیں گیا ہوا  
ہے۔ بال بچے دار آوی ہے۔ میرے ساتھ خواہ کچھ بھی ہو جائے  
لیکن میں چاہوں گا کہ کسی بھی سلسلے میں اس کا نام تک نہ آئے۔"  
"مطمئن رہو۔ کم از کم میرے ذریعے نہیں آئے گا۔" میں  
نے اسے تسلی دی پھر کہا "کوئی اور خاص بات جو تم مجھے بتانا  
چاہو؟"

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر گویا فیصلے پر پہنچے ہوئے ہوا  
"ہاں۔ ایک بات میں آپ کو بتانا چاہوں گا۔ یہ مجھے پہلے ام  
محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اب یہ مجھے ٹھیک رہی ہے۔ بار بار  
خیال آتا ہے کہ شاید اس کی کوئی اہمیت ہو۔"

وہ ابھن آہستہ سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ نتیجہ اس کا  
متحدہ سہنس پیدا کرنا نہیں تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا

میں کا نام تو عمران تھا لیکن جلدی وہ میری ہی کی طرف سے  
 پڑا جانے لگا۔ وہ تھا تو تقریباً چالیس کی عمر کا۔ لیکن اچھا چنڈ سم  
 زنی تھا۔ بلا کا جب زبان اور ہر قسم کے لوگوں میں فوراً مکمل مل  
 جاتا تھا۔

میرے ذہن میں حتمی سی جگہ لیکن میں اپنے جنس کو دبائے  
 بجا رہا۔ کارخانہ نے سلسلہ کام جاری رکھا۔ پتا چلا کہ موصوفی  
 نے بہت چار ڈراموں میں کام کر چکے تھے۔ کچھ لوگوں کو وہ ڈرامے  
 یاد بھی تھے۔ مجھے تو یاد نہیں تھا کہ میں نے اس کا کوئی ڈراما دیکھا تھا  
 لیکن یہ تو کوئی جوت کی بات نہیں تھی۔ مجھے تو فکر معاش نے کبھی  
 یاد نہ گئی تھی وہ دیکھنے کی سلت ہی نہیں دی۔ بہر حال اس کے  
 باوجود مجھے اس کی صورت کچھ مانوس ہی لگی۔ شاید خوش شکل اور  
 دلبر لوگ ویسے ہی کچھ مانوس مانوس سے لگتے ہیں۔

جنوش شکل اور دبیر تو تم بھی ہو لیکن تم مجھے پہلی بار دیکھنے  
 پہ تھا مانوس نہیں لگے تھے۔ یہ کچھ ضرورتوں کی انسانی خصوصیت  
 ہوتی ہے۔ میں نے کہا۔

”تمی ہم کیا اور ہماری وجہات کیا۔۔۔۔۔“ وہ لٹھری سانس لے  
 کر اکساری سے بولا۔ ”میں تو غربت نے اجاڑ کر رکھ دیا۔ ہماری ہر  
 نیل پر مدد ملی ہی جاتی۔“

”تم نے غربت کے احساس کو کچھ زیادہ ہی ذہن پر بٹھا رکھا  
 ہے۔ تم انگریزی کے اس مقالے کو ذہن میں رکھا کہ وہ حالات  
 نہ سے بدتر بھی ہو سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ دل کے بھانے کو اس قسم کی باتیں تو کرنی ہی پڑتی  
 ہیں۔“ وہ لٹھری سانس لے کر بولا۔ ”حالات کے بدتر ہونے کی تو  
 واقعی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن حالات بہتر ہونے میں آخر کیا  
 مضائقہ تھا؟“

”بہتر بھی ہو جائیں گے۔“ میں نے اسے قسلی دی۔ ”یہ سب  
 زندگی کے مختلف موسم ہیں، آتے جاتے رہتے ہیں۔ تم مجھے عمران  
 کے بارے میں بتا رہے تھے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ عمران خود بھی ذکر کرتا رہتا تھا اور اس کے انداز  
 و اطوار سے بھی ظاہر ہوا تھا کہ اس نے بہت اچھا وقت دیکھا  
 تھا۔ شاہانہ انداز میں زندگی گزار رہی تھی لیکن تقدیر اسے گھیر  
 لگا کر کہاں لے آئی تھی۔ ویسے۔۔۔۔۔ پرنس انڈسٹریز کے ان  
 بلاٹس پر کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہاں بیٹے ان بڑھ مزدور  
 جن میں صرف وزن و زور اور پُر شقت کام کرنا ہوتا ہے لیکن کسی  
 تکنیکی بات کو سمجھنے میں جن کے ذہن زیادہ ہی ست ہوتے ہیں وہ  
 نہیں مل سکتے اس لیے وہاں جو طبقہ مزدوروں میں شمار ہوتا ہے وہ  
 بھی خود اہمیت پر مہیا کھتا، سلیمنا ہوا اور کچھ تکنیکیل مائتہ ڈوتا  
 ہے۔ مزدوروں کو وہاں تنخواہ بھی اچھی ملتی ہے۔ دوسری سہولیات  
 بھی ہیں۔ وہاں کے مزدور عام دفتروں کے کلرک سے بہتر حال میں  
 ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے وہ مزدوروں کی خاصی بہتر کلاس ہوتی

ہے۔ اس کے باوجود بہر حال عمران جیسے آدمی کا وہاں نظر آنا قسمت  
 کی قسم کھڑی ہی لگتا تھا۔ وہ چار دن اسے قریب سے دیکھنے کے بعد  
 احساس ہوا تھا کہ وہ شخص کو جش کرنا تو اسے کیس نہ کیس اس  
 سے بہتر کوئی تو کسی کوئی کام مل ہی سکتا تھا لیکن پھر میں نے یہی  
 سوچا کہ شاید قسمت نے اس کے لیے ہر روز اڑھ بند کر دیا ہو۔ زندگی  
 کبھی کبھی عجیب متاثر دیکھائی ہے۔“

”بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قسمت تو دروازے کو کھلتی  
 ہے لیکن وہ انسان کی بری عادات اور بدعتی یا بد معاہدگی وغیرہ کی وجہ  
 سے بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تمکن ہے۔“ کارخانہ نے سر ہلایا۔ ”بہر حال وہ وہاں فرصت  
 کے اوقات میں اپنی زندگی کے شاندار ادوار کے قصبے سنا رہا تھا۔  
 یہ اس کا بھی محبوب موضوع تھا اور اس کے سامعین کا بھی۔ شاید  
 اس لیے بھی کہ اس میں دنیا بھر کی عیاشیوں کے قصبے بھی آتے تھے  
 جنہیں بیان کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی تشدیب کی سطح سے کچھ زیادہ  
 ہی بچے بھی کر جاتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ یہ سب حتمی باتیں  
 ہیں۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا ”اصل جراتی مجھے  
 اس بات کی ہے کہ اتنے دنوں میں اس نے وہاں دنیا بھر کی باتیں  
 کیس نہ جانے کون کون سے قصبے سنا لیے لیکن کبھی یہ ذکر نہیں کیا  
 کہ وہ پرنس سیرا کا شو بر بھی رہا تھا جو پرنس انڈسٹریز اور ان جیسے  
 دوسرے نہ جانے کتنے اداؤں کے مالک کی بیٹی تھی جسے اب باپ  
 کے انتقال کے بعد ان سب اداؤں میں سے نصف ملے والا تھا اور  
 جو پہلے ہی سے خود بھی کچھ کم دولت مند نہیں تھی۔ اس بات کا اس  
 نے کبھی اشارہ بھی نہ کیا کہ نہیں کیا۔“

”پھر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“ میں نے دریافت کیا۔  
 ”جب پرنس سیرا کے قتل کی خبریں اخباروں میں چھپیں تو  
 اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات کا تذکرہ بھی آیا تھا۔ شام  
 کے اخباروں نے تو خاص تفصیل چھاپی تھی۔ پرنس کی دو ناکام  
 شادیوں کے ضمن میں عمران کا تعارف بھی چھپا تھا۔ ایک اخبار میں  
 تو چھوٹی سی تصویر بھی تھی۔ اس سے میں نے پہچاننا کہ یہ تو وہی  
 عمران تھا جسے میں نے حالی ہی میں نورانی آباد والے پلانٹ پر کام  
 کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بات بہت عجیب لگی کہ عمران نے اس  
 بات کا قطعاً ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ پرنس سیرا کا شو بر رہ چکا تھا۔  
 خصوصاً جب کہ وہ شہنی گھارے کا بھی عادی معلوم ہوتا تھا اور اس  
 قسم کے حوالے دینے میں غر محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ بات عجیب  
 نہیں؟“

”تمکن ہے؟ یہ حوالہ اس جیسے ذہین آدمی کے لیے بھی باعث  
 شرم ہو۔ شاید اس معاملے میں اس نے سوچا ہو کہ لوگ کیا کہیں  
 گے جن انڈسٹریز وغیرہ کی وارث اس کی بیوی رہی تھی آج وہ اس  
 کے ایک پلانٹ پر مزدور کے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ واقعی ٹھک سچ

|      |           |             |
|------|-----------|-------------|
| 75/- | حیدر جبین | زیب         |
| 75/- | حیدر جبین | شاخ بریدہ   |
| 75/- | حیدر جبین | حداورد پتھر |
| 75/- | حیدر جبین | کیٹ یہ میرے |

مکتبہ القریش اردو بازار - لاہور 2

رولڈ کی کچھ زیادہ سی جبریت انگیز کارروائی تھی۔" میں نے سکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی اسی جواز سے اپنے آپ کو مطمئن کیا ہے۔" کامران بولا "لیکن میں ممکن ہے کہ اس کی ذمہ داری میں عمران کی کوئی مصلحت ہو۔"

"میں تم سے اختلاف نہیں کرتا۔ وقت آنے پر میں تمہارے اس دوسرے نظریے کی بھی تصدیق کروں گا۔ یہ میں خود ذاتی طور پر معلوم کروں گا۔" میں نے کہا پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تو سب آباد والے پلانٹ پر مزدوروں کی بھرتی کا کیا طریقہ ہے؟ کیا ٹیکا سسٹم ہے؟"

"نہیں۔ ٹیکا سسٹم سے تو وہاں کی انتظامیہ پر ہیڑی کرتی ہے۔ ٹیکے پر مزدور فراہم کرنے والوں کو تو وہ لوگ اپنے ہاں سمجھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں حالانکہ اس طریقے میں کارخانے والوں کو چار پیسے کی بچت ہوتی ہے اور یونین دغیبو کے پیڑوں میں اضافہ ہونے کا امکان بھی گھٹ جاتا ہے۔ اس کے باوجود پرنس انڈسٹریز والے اس قسم کے جھکڑے استعمال نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی مالی حالت بھی بہت اچھی ہے۔ صنعتی اہلی کے اس دور میں بھی ان کی تمام تر انڈسٹریز بہت مستحکم جاری ہیں۔ ان کے بعض پلانٹس پر دفاعی ضروریات کا سامان تیار ہوتا ہے اور گورنمنٹ سے ان کے کنٹریکٹ چلتے رہتے ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں بھٹک رہا تھا کہ وہ میرے سوال کا جواب دے۔ وہ جلد ہی اس طرف آیا "وہاں مزدور کے طور پر بھرتی ہونا مشکل نہیں ہے لیکن مزدور کے معیار پر پورا اترنا ضرور مشکل ہے۔ طریقہ بہت سادہ سا ہے۔ کارخانے میں کیٹ کے قریب ہی ایک ایڈمنسٹریشن آفس ہے جسے مختصر آئی اے میں آفس کہا جاتا ہے۔ اس میں دیگر اسٹاف کے علاوہ ایک لیبر کلرک بیٹھتا ہے۔ پہلے تو امیدوار کیٹ پر ہی گارڈز فریو کو گاتا ہے کہ وہ بھرتی ہونے آیا ہے۔ گارڈز اس کی اچھی طرح تلاشی فریو لے کر اندر جانے دے گا۔ کافی عرصے وہاں ڈاکوں اور بھرتوں کا بہت زور رہا ہے جس کی وجہ سے بہت سی انڈسٹریز آج بھی گنتی ہیں۔ جو انڈسٹریز کامیاب ہیں اور ابھی تک جی ہوئی ہیں ان میں من حیثیہ انتظامات بہت سخت ہیں۔ گارڈز فریو کی چیکنگ سے گزرنے کے بعد امیدوار دفتر میں لیبر کلرک کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہ اسے ایک فارم دے دیتا ہے جو انگریزی میں ہوتا ہے۔ وہ امیدوار کو دیہی کلرک کے سامنے پیش کر دیتا ہوتا ہے۔ جو امیدوار فارم ہی بھرنے کا قابل نہ ہو اسے وہیں سے جواب دے دیا جاتا ہے۔ فارم بھرنے اور اس پر جن تصویروں لگانے کے بعد امیدوار کو پرسنل ہیجر کے پاس بھیج دیا جاتا ہے جو اسے دفتر میں بیٹھتا ہے۔

"فارم کو پڑھنے اور امیدوار کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اگر وہ اسے سوزوں محسوس کرتا ہے اور پلانٹ پر آؤٹی کی ضرورت بھی

ہوتی ہے تو وہ اسی وقت اس کا تفصیلی انٹرویو لے لیتا ہے اور اسے دغیبو دیکھ کر ایک آدھ دن بعد ڈویل پر بلا لیتا ہے۔ اگر امیدوار سوزوں ہوتا ہے لیکن اس وقت پلانٹ پر آؤٹی کی ضرورت نہیں ہوتی تو وہ اس کا فارم مختصر امیدوار کے طور پر رکھ لیتا ہے اور اسے اس کی ترجیح کے لحاظ سے کچھ دن بعد اسے بلا لیا جاسکتا ہے۔ اگر پرسنل ہیجر کو وہ امیدوار سوزوں نہ لگے تو وہیں اس کا فارم پانچواں پیکنگ دیتا ہے۔ کوئی لمبا چڑا پھر نہیں ہے۔ کافی حد تک علم انداز میں کام ہوتا ہے۔ سوئیات بھی کسی حد تک مغرب والی ہیں اور اس طرح منتخب ہونے والے افراد تو لیبر ہی کہلاتے ہیں۔ آپ امیدوار کو کہتے ہیں کہ وہ لیبر سے کافی بہتر لوگ ہوتے ہیں۔" لے لے مجھ جیسے اور عمران جیسے لوگ بھی ادھر ادھر دیکھ لکھتے ہیں۔ بہت سی ڈیپارٹمنٹس سے دوچار ہونے کے بعد کہیں سے مسئلہ حاصل ہونے کی بنا پر وہاں جاتے ہیں اور منتخب ہو جاتے ہیں۔ سب مزدور وہاں منتخب نہیں ہو سکتے۔"

"اس کا مطلب ہے؟ وہاں امیدوار کے منتخب ہونے کا نانا نامہ اور امیدوار پرسنل ہیجر پر ہے؟" میں نے ایک وقت بہت سے فائدہ خور کرتے ہوئے کہا۔

"سب سے زیادہ دامدار تو اس بات پر ہے کہ وہاں ضرورت اور گھٹنا کی موجود ہو۔" کامران نے جواب دیا "دیے گا۔" گارے جگہ تھکی رہتی ہے۔ وہاں کام کرتے ہوئے بھی لوگ اس سے بہتر نوکری کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کی فتنہ یاد دہی کر جاتی ہے۔ کبھی کسی کا باپ سے ملاوٹ آ جاتا ہے۔ پھر یہ خالی ہوتی رہتی ہے۔ اگر آؤٹی کی ضرورت ہو تو پھر کسی کو فتنہ کہنے کا دامدار صرف پرسنل ہیجر ہوتا ہے۔"

"تم نے وہاں رہنے کے دوران کچھ پرسنل ہیجر اور عمران درمیان باس اور معمولی ملازم سے جوہر کرکٹی شناسائی والے تعلق محسوس کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ کچھ بڑھکا اور جلدی سے بولا "شناسائی؟" ارے صاحب! ان میں تو دو جتنی سلطو ہوتی تھی۔ فارغ اوقات میں میں نے کچھ

میں کوئی تمہارا افسر ہو؟  
 "خدا نہ کہے جو تم جیسے لوگ میرے افسر ہوں۔" وہ فوراً  
 بولا۔

"ہاں۔ اگر مجھ جیسے لوگ تمہارے افسر ہو گئے تو تمہارے  
 گھر میں سدھار پیدا ہو جائے گا اور یہ تمہیں کب کو ارا ہے۔" میں  
 نے لٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہر حال۔ بتاؤ۔ کیا تمہارا آئے؟"  
 "تیری تو نہیں مار سکا، میں تو افسوس ہے۔" وہ مجھ سے بھی  
 زیادہ لٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں داجہ پرویز کو فون کے بغیر اس  
 سے ملنے اور اس کا بیان سننے چلا گیا تھا۔ دراصل میں ادرے سے گزر  
 ہی رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو یہ رکی کارروائی بھی کرتے ہیں۔ مجھے  
 نہیں معلوم تھا کہ اس کا وہ شخص گینڈا نما شوہر بھی گھر ہو گا۔"  
 "ایسا تم کو کورجیم گل پیارے؟" میں نے پارسے کہا "کسی  
 کے شوہر کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے کل کو  
 تمہیں بھی کسی نصیبوں میں کلی کا شوہر بنا ہے۔ تم جیسے ساڑھا نو پیرس  
 ہنسر نے اس گینڈا نما شوہر کے پیٹک میں اپنا پیٹک پھنسا دیا  
 ہو گا؟"

"ایک اساتذہ پولیس آفیسر کو ساڑھا کہہ کر تم اپنی خکارا نہ  
 بدزوق کا اعلان مت کرو۔" رجم گل بولا "پیٹک میں نے نہیں  
 پھنسا یا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے وہ کیسے پھنکارا پھر آ ہے۔ مجھ سے  
 کہنے کا تم میری بیگم سے اپنا پیٹک لے بغیر اس کا بیان لینے کیسے  
 آ گئے؟ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے ایک جھانچا رسید کروں تاکہ  
 ابتدا میں ہی دماغ کے کیزے جھڑ جائیں لیکن پھر میں نے کچھ مبر  
 سے کام لیا اور اسے بتا دیا کہ وہ اور اس کی بیگم مشتبہ افراد کی فہرست  
 میں شامل ہیں "اسے شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں نے انہیں تھانے  
 نہیں بلوایا اور خود جل کر ان کے گھر گیا۔"

"پھر اس کا دماغ کچھ ٹھیک ہوا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔  
 "نہیں۔ ابھی۔ جن کے دماغوں میں اتنے برسوں سے  
 فرعونیت بھری ہو وہ کچھ آسانی سے فوراً درست پر نہیں آتے۔ وہ  
 میری جینی اتروانے اور لائن حاضر کروانے کی دھمکیاں دینے کا  
 جس طرح معصوم بچے کو مارا کرتے ہیں جو دراصل اندر سے  
 بہت بھولے ہوتے ہیں۔"

"پھر تم نے اس سے وہیں لپٹاؤ کی تو شروع نہیں کر دی؟" میں  
 نے پوچھا۔

"میں تمہاری طرح جاہل تو نہیں ہوں۔ مجھے اس کی کیا  
 ضرورت تھی؟ میں نے اپنی ناک اس کی بے ہودہ ناک سے ایک  
 انچ کے فاصلے پر رکھتے ہوئے اور حسبِ وقت پھنکارتے ہوئے اسے  
 بتایا کہ پہلی ملاقات پر تو میں نے اس کا لحاظ کر لیا تھا اور اس کی پختے  
 غالی بدداشت کلی تھی لیکن اگر اب بھی وہ اسی طرح پختے غالی  
 دکھاتا رہا تو میں دونوں مہاں بیوی کو بھٹکی لگا کر تھانے لے جاؤں  
 گا۔"

عل غیر صاحب کو پلانٹ پر آتے جاتے اور ادرے اور ادرے کڑے ہو  
 کر حیران سے کب شپ کہتے اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر جتنے دیکھا  
 ہوا کدوں میں حظ مزاحیہ کا مت خیال رکھا جاتا ہے۔ ماحول بڑا  
 عجیب ہے۔ ہر عمل غیر اور لبر کے درمیان ویسے بھی کافی فاصلہ  
 ہے۔ اب میں نے نہیں کہہ سکا کہ ان میں یہ دوستی اور بے تکلفی  
 پہلے سے تھی یا حیران نے وہیں کچھ کے بعد اس سے راہ درم  
 چائی تھی۔ دوستی کا ٹھنڈے میں بہر حال اس کا جواب نہیں تھا۔ یہ  
 ہر بات تھی کہ جلدی وہ اپنی رکھوں کی وجہ سے معطل لوگوں  
 کے دل سے اتر جاتا تھا۔

"ابھی تو وہیں ملازم ہے؟" میں نے دریافت کیا۔  
 "ایک ہفتہ پہلے میں وہاں سے وہ دن کی چھٹی لے کر آیا تھا  
 اور اب تک وہاں نہیں جاسکا ہوں۔ اور معلوم نہیں کب تک  
 نہ جاسکوں۔ میرا خیال ہے میری نوکری تو چلی ہی جائے گی۔ بہر حال  
 جس دن میں نے چھٹی لی اس وقت تک تو وہ وہاں کام کرنے آ رہا تھا  
 اور اس کے کہیں جانے کے آثار نہیں تھے۔ وہ باقی سب لوگوں کے  
 ساتھ بھی کی بس میں ہی شہر آیا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔  
 "نہیں۔ میری تو خبر اس سے زیادہ ہے تکلفی نہیں ہو سکی لیکن  
 بلا خیال ہے اس نے کسی اور کو بھی نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے اس  
 کی کسی دکان میں جیسے لوگوں کی طرح پون ہی ہو اور وہ احتیاط  
 آ کر کوئی اس سے ملنے وہاں نہ آ پھیں۔ یا پھر شاید کوئی اور  
 ہو۔"

ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا "میں ممکن ہے  
 انکا تال ہوئی یہ بات خاصی اہم ثابت ہو۔ معلوم نہیں کیوں  
 وہ ان کے کسی ایک ریکرڈ میں ایک دم ہی لٹھنڈی بج رہی  
 ہو گئی ہو اور کر رہی ہے کہ یہ محض ایک دولت مند "مشہور اور  
 بہ صورت نکل کے قتل کا قصہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی  
 سہ اس سے بھی زیادہ مطمئن اور طولانی کمانی پھیلی ہوئی ہے۔  
 یا کراہا اسے ہاتھ نہیں آ رہا۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ دیکھا  
 گیا۔"

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور جیب سے سواک  
 نکال کر رجم گل سے رابطہ کیا۔ وہ میری آواز پہچانتی ہی بولا  
 "نوکری فریضیطان کی طرح نہیں ہے۔ لیکن خیر۔ تم سے تو یہ  
 نوکری کی نہیں کاہیے کیونکہ تم تو خود شیطان ہو۔ میں تمہیں  
 کچھ فون کرنے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لیا کرو شیطان کے  
 اسماعیل نے اس سے کہا۔

"میں تو کہنے گیا تھا۔ اسی کے بارے میں تمہیں بتانا تھا۔"  
 "میں تو کہتا تھا۔"  
 "میں تو کہتا تھا۔ اس کی رپورٹ اپنے افسرانہ بلا کر دیا کرو۔"



مجھ کو بد چاہو تو ذہن پر زور دے کر تم نام بھی یاد کر سکتے ہو لیکن اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔“

”کیوں۔۔۔ آپ مجھے یہ ہدایت کیوں کر رہے ہیں؟“ اس نے اگڑے اگڑے سے لیے ہیں پوچھا۔

”اس لیے کہ میں خود بھی معاملے کی بہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”پولیس اس کام میں میسوں لگا دے گی اور ممکن ہے مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو۔ اصل قاتل پھر بھی ہاتھ نہ آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ نام سامنے ہونے پر پولیس معاملے کو بکا کر دے۔ اس لیے پہلے میں اپنے طور پر کچھ ہاتھ پاؤں ماروں گا۔ اگر کالی کوشش کے باوجود مجھے کامیابی کے کوئی آثار دکھائی نہ دے تو پھر میں اس معاملے سے ہاتھ کھینچ لوں گا اور پولیس جو بھی کرے گی اسے کرنے دوں گا۔“

میں نے دیانت داری سے اسے اپنا پروگرام بتایا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا ”آؤ چلیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا لیکن وہ گویا کرسی سے ہی چپک کر رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کچھ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ مفید اس سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس جگہ سے نکلنے اور اس معاملے کو کسی انجام تک پہنچانے کے لیے بے قرار معلوم ہوتی تھی۔

”گفتا ہے میری اتنی دیر کی مغز داری کے باوجود خوف تمہارے ذہن سے نہیں نکلا۔“ میں نے اب اپنے دل میں ابھرنے والی ہزاروں کی لہر کو ذرا مشکل سے دباتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔ اس کا چہرہ اسی طرح پتھرایا ہوا سا رہا۔ آخر مفید نے ہی اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور دروازے کی طرف لے چلی۔

”میری کمائی پر یقین تو کر لیا جائے گا؟“ اس نے یوں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا جیسے اسے پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

”ہاں۔۔۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میری وجہ سے تمہیں ان کو یقین دلانے کا موقع میسر آ رہا ہے۔“ میں نے دروازے پر رکھتے ہوئے کہا۔ مفید اندر اطلاع دینے چلی گئی تھی کہ ہم لوگ جا رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”تم اسی طرح پیچھے رہ جے یا بھاگتے رہے تو زندگی بھر تمہاری پوزیشن صاف نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاید ایک آدھ کیس تم پر اور بھی چڑھا جائے۔ پولیس کو تو ایسے آدمی بہت اچھے لگتے ہیں جن پر ایسے مقدمات کا لمبہ ڈالا جائے جو ان سے کسی کنارے نہیں لگتے۔“

”وہ لوگ مجھے حالات میں رکھیں گے؟“ اس نے قہقہہ لگ کر پوچھا۔

”تمہارے حق میں بہتر تو یہی ہے کہ وہ تمہیں حالات میں رکھیں۔“ میں نے جواب دیا ”دہاں تم حفاظت سے رہو گے۔ اگر اس معاملے کے پیچھے کوئی بڑی سازش کام کر رہی ہے تو تمہارا آوار

مرد مرے سمجھ کر بات نہیں کر رہا تھا۔ دراصل اس قسم کی خبر سننے کے بعد ہم پولیس والے اسی انداز میں بات کرتے ہیں۔“

میرے سامنے کا حیران نے بے چینی سے پتلو دلا۔ میں نے میرے درجہ کی سے کہا ”بہر حال تمہیں یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اسے لے کر تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“ میں نے فون کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تم نے جب جگہ ٹھہری ہوئے والی روٹ کرنے والی پولیس پارتیوں کو اس کی تصویر سنبھال رکھی ہے۔ میں جانتا ہوں تم ان سب کے لیے اطلاع نشر کروا دو کرئی مثال اسے تلاش نہ کریں۔ راستے میں خود خواہ تمہارے رواجی نم کے پولیس والوں کی نظر پڑتی تو کام خراب ہو جائے گا۔ انہیں تو ات سمجھائی بھی مشکل ہوتی ہے۔“

وہ ایک لمبے غامض رہا تو میں نے کہا ”یہ میں دیے ہی احتیاطاً کر رہا ہوں ورنہ اسے تم تک لانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس فشر میں تو سیکڑوں اشتہاری مجرم ادھر سے ادھر پھرتے رہتے ہیں اور پارتیوں فرار ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتے تو اس شریف بھوان کو لانا کون سا مسئلہ ہے۔۔۔ اور ویسے بھی اسے تو میں پولیس کے لیے کاپی ہی لا رہا ہوں۔ فرار کرانے تو نہیں لے جا رہا۔ پھر مجھ میں تو ہوا تمہیں بتا رہا ہے۔“

”ایسا۔۔۔ یہ تو تم نے اچھا کیا۔ کبھی کبھی جاہل بھی کوئی متل کی بات کر لیتے ہیں۔“ وہ دھجھکے لہجے میں بولا ”ویسے بہتر یہی تھا کہ تم مجھے جگہ کے بارے میں سمجھا دیتے۔ میں خود اگر اسے اپنی تحویل میں لے لیتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تمہاری ناکام کھوپڑی میں جو قبائل مگس جاتے، تم اس سے بچتے رہے ہو۔ اس لیے میں زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔ میں تمہارے سے اٹھ رہا تھا لیکن اب میں تمہارے انتظار میں نہیں رہوں گا۔ اندازاً کب تک پہنچے گے؟“

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ میں ذرا دور ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں انتظار کروں گا۔ اگر اس دوران میں تمہارا ناکام اور کھوپڑی داغ تمہیں کوئی اور بے ہودہ پروگرام بتانے کا موقع دے تو مجھے اطلاع دے کر نامت بھولنا۔“

”بہت بہتر جناب بھڑا صاحب!۔“ میں نے سعادت مندی سے ہاتھ دھو کر فون بند کر دیا۔

کاروان اپنے خلک ہوٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے قتل کرنے کے لیے انداز میں مکرراتے ہوئے کہا ”تمہیں اس پولیس کانسٹیبل کی چٹا ہے۔۔۔ اور تمہیں اس سے کوئی ناجائز تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تم اسے پوری دیانت داری سے کی طرف لانا کمائی سناؤ گے جس طرح تم نے مجھے سنا ہی ہے۔ صرف اگر تم نے درخواست پر دو چھٹی چھٹی یا تیس بھول جانا۔ تم یہ مت بتانا کہ تم نے پولیس میرا کوفون پر جیشہ کریم اور شمال سیدی سے فون کیسے کیا تھا۔ تم صرف اتنا کہہ سکتے ہو کہ کسی کافون آیا تھا۔

بہرہ ہمارے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہر حال۔۔۔  
اگر ہمیں حالات میں رہنا اتنا ہی تکلف دہ اور خوف ناک لگ رہا  
ہے تو ہمارا کوئی اور بندوبست کر دیں گے۔

منیفہ اندر سے اٹھی اور ہم تینوں اس مکان سے رخصت  
ہو گئے۔ ابھی ہم اسی گلی میں تھے جس میں خندق ہی کھدی ہوئی تھی  
اور میں منیفہ کی طرف حوجہ ہو کر اس کی کوئی بات سننے لگا تھا کہ  
اس بد بخت کا سران نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں اس لئے اس کی  
طرف سے قطعی ناخلف تھا اور مجھے اس سے اس حرکت کی قطعاً توقع  
نہیں تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں اس کا برین واش کرنے میں  
کامیاب ہو چکا تھا لیکن یہ ”مرد ہواں پر کلام نرم و نازک بے اثر“  
والا معاملہ معلوم ہوتا تھا۔

مرد ہواں کم از کم اس حد تک نہایت ذہین ثابت ہوا تھا کہ  
اس نے مجھے دھکا دینے کے لیے بہت سی موزوں جگہ کا انتخاب کیا  
تھا۔ اس گلی میں چلتا دھبے بھی بازی کر کے رہے پر چلنے سے کم  
نہیں تھا۔ اور یہ اس وقت میں منیفہ کی طرف جگہ کر اس کی  
بات سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سرکوشی کے سے انداز میں مجھے کچھ  
بتانا چاہ رہی تھی۔ کا سران نے دھکا پوری طاقت سے دیا تھا جس میں  
اس کی دھشت کی طاقت بھی شامل تھی۔

میں منیفہ کو ساتھ لیتا ہوا خندق میں جا کر ا۔ منیفہ بچے تھی۔  
میں اس کے اوپر گرا تھا اور وہ سیدو بیج کی تانہ لائن پر گری تھی۔  
گری بھی بڑے آواز سے ترچھے ڈاؤن سے تھی۔ یقیناً اس کی ہڈیاں  
کڑکڑاتی ہوں گی بلکہ ایک لمحے کے لیے تو مجھے اندیشہ محسوس  
ہوا کہ اس کی کوئی ہڈی کوئی جو ڈھجواب ہی نہ دے گیا ہو مگر قسمت  
شاید میرا ہی رہی تھی اور وہ بڑی ہامت لڑی تھی۔ میرے اٹھتے  
ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن ہمارا اٹھنا بھی کسی بے ترتیب قسم  
کے رقص سے مشابہ تھا کیونکہ اس خندق میں کہیں صحیح طور پر پاؤں  
بنانے کی جگہ نہیں تھی۔

پائپ لائن کے نیچے کچھ کچڑ اور گدلا بانی بھی جمع تھا۔ پائپ  
لائن کے اوپر بھی بے سلسل تھی۔ چلی بات تو یہ تھی کہ چند لمحے کے لیے  
کامران کا خیال ہی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ مجھے منیفہ کی فکر  
پڑ گئی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا، سمارا دیا اور بڑی تشویش سے  
پوچھا ”تم ٹھیک تو ہو نا؟“

”ہاں۔۔۔ میں تو ٹھیک ہوں۔“ وہ ہینکی سی سٹراہٹ کے  
ساتھ بولی ”آپ اس گدھے کی فکر کریں۔“

لیکن جب تک میں اس خندق سے نکلا اور منیفہ کو بھی سمارا  
دے کر نکالنے میں کامیاب ہوا تب تک وہ مددگار ”اس گلی سے  
غائب ہو چکا تھا۔ میرا اور منیفہ کا طبلہ کالی خراب ہو چکا تھا۔ کپڑے  
کہیں کہیں سے کچڑ میں لتھڑ چکے تھے لیکن یہ ان باتوں کی فکر کرنے  
کا وقت نہیں تھا۔ میں اس کے تعاقب میں دوڑا۔ میں نے سڑک تو

نہیں دکھا لیکن مجھے احساس تھا کہ منیفہ میرے پیچھے آ رہی تھی  
میرے اندازے کے مطابق کامران جس گلی میں گیا ہو  
جی الامکان تیزی سے اس گلی میں مڑا لیکن وہ وہاں بھی کم  
نہیں آیا۔ ہر حال میں تیزی سے دوڑتا رہا۔ وہ کہیں کیا  
سببیاں تھیں۔ غیر ارادی طور پر ہی میں نہ جانے کتنا کھلا  
کڑکھیا۔ ان گلیوں میں گرا کسی غیر سنی چیز کا بہاؤ تھا جو انرا  
اپنے ساتھ لیے جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کامران کو بھی یہی  
طرح لے گیا ہو گا۔ اس لیے میں اپنی دانست میں راستہ نہ  
واقفیت کے باوجود اس کے پیچھے تھا۔ شاید ہیلت کے سامنے  
جس طرح شکاری کتے اپنے شکار کو دیکھے بغیر بھی اس کا پیچ کر  
رہتے ہیں۔

کافی دور نکل آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شاید یہ  
خوش فہمی تھی۔ کامران کی تو مجھے کیس جھٹک بھی نظر نہیں  
آتی تھی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ میں صحیح سمت میں  
تعاقب کر رہا تھا۔ یہ جگہ و تاریک، پڑ پڑ اور کوڑے کرکٹ سے  
ہوئی گلیاں تو جال کی ڈوریوں کی طرح چادروں طرف بکھلا  
تھیں۔

آخر کار میں رک گیا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں  
رہنا فضول تھا۔ بے پلہم، بے ترتیب، کچے کچے مکانوں  
دوڑا نہ بند تھے اور گلی میں سکوت تھا جو مجھے بہت عجیب

پراسرار، ہولناک اور ناقابل فراموش کہلاتا

کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

خون آرزو

قیمت: 70/-

اردو بازار لاہور

اس کی رائے منقول تھی، مطلب بھی واضح تھا۔ اس کے باوجود میں نے گویا محض انعامِ جنت کے لیے پوچھا "تسارا مطلب ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟"

"اگر ہم اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑیں گے تو پھر ہمارا اپنا حال بہت خراب ہو سکتا ہے۔" مفید ہوئی۔

مجھے کاروان کو اس کے حال پر چھوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مجھے فکرِ رجم گل کی ستاری تھی جو اس انتشار میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں کاروان کو لے کر اس کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ مجھ سے عاقبت سرزد ہو چکی تھی کہ میں نے اسے اطلاع دینے میں کچھ زیادہ سی مستعدی دکھادی تھی۔ اب اسے اس بات پر قائل کرنا بہت مشکل ہو گیا کہ اگر کاروان میرے ساتھ نہیں آتا تھا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ ہر حال اس کا مطلوبہ آدمی نہیں تھا۔ وہ پرنس سمیرا کا قائل مطہم نہیں ہوتا تھا۔ رجم گل یقیناً بھی کتنا کہ میں یہ فیصلہ کرنے والا کون ہوتا تھا، کسی کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رائے تو صرف پولیس ہی دے سکتی تھی اور فیصلہ صرف عدالت ہی کر سکتی تھی۔ جب کسی سے کوئی عاقبت سرزد ہو جاتی تھی تب تو اسے شہروں کے فرانسیسی پولیس کے وائٹ کار اور عدالت کی اہمیت و فہم زیادہ ہی یاد آئے لگتی تھی۔

اب مجھے اس صحبت کو بھٹکتا ہی تھا۔ یہ تصور خاصا تکلیف دہ تھا لیکن فی الحال میرے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے لمبھی سانس لے کر دوایں کے لیے مڑتے ہوئے کہا "چلو اے خاتونِ درخشا! اس خدا کی فوجدار۔۔۔ بلکہ خدا کی خوار کون بھول بھولوں سے نکالو۔"

اس نے یوں آسمان کی طرف دیکھا جیسے ستاروں کی مدد سے راستے کا ضمن کرنے کی کوشش کر رہی ہو حالانکہ آسمان پر اس وقت ستارے موجود ہی نہیں تھے۔ پھر اس نے سسکاتے ہوئے مجھے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم کے بعد وہ ایک طرف مڑی جہاں دو دیواروں کے درمیان معمولی سا قافلہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس طرف بھی ایک گل موجود تھی۔ چند قدم آگے دو راستہ کشادہ ہو گیا لیکن ہمارے سامنے گلی کے سین بھونچ ایک تاریک سے چھترتے کتوان بنا ہوا تھا جس پر باقاعدہ ٹکڑی کی چرخی بھی لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس کنویں کے چبوترے پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

مفید ایک اور ٹنگ گل میں مڑی اور دوسرے ہی لمحے ہمارے پیروں تلے سے زمین ٹھک گئی۔ ہم گھاس پھوس اور کوڑے کرکٹ کی جس دھڑ سے گزرتے گئے تھے وہ ایک دم ہی دھنسن گئی اور ہم دونوں خراب سے بچے جا کر۔۔۔ پہلے تو اس اندیشے سے میواں لکھ کچھ اور ڈوب گیا کہ کہیں یہاں بھی کوئی مزدک کتوان تو موجود نہیں تھا لیکن جلد ہی ایک زوردار دھچکے سے ہم زمین سے جا گئے۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن اچانک ٹھکے کی دھڑ سے دماغ ابل گیا۔

تو ایک ایسا چیز تھی جو اس قسم کی گلیوں میں نہیں پائی جاسکتی تھی۔ ہر طرف کے اچھلنے کودنے، شور مچانے، مفلوک الحال سے بچوں کی لڑائیوں، توہلیاں، جیسے۔۔۔ ان ٹکڑوں کا یہاں نظر نہ آتا کچھ غیر ملکی سی بات تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ پچھلی چند گلیاں جن سے میں گزارا تھا وہ بھی ایسی ہی سکوت کی لپیٹ میں تھیں۔ اس سکوت نے شاید غامض ہرے سے کوئی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ جو تھوڑی سی فواریں آ رہی تھیں وہ بھی شاید بہت دور سے آ رہی تھیں۔ یہ سکوت بڑا سراہا تھا۔ کیا ان مکانوں کے کہیں کہیں چلے گئے تھے؟ یا وہ نہیں سکتا تھا۔ مکانوں پر نالے نہیں تھے۔ آگاہی گلیوں پر ہی نالے نظر آتے تھے جو غافل سی بات تھی۔ کئی گھروں کے کمانے پکانے کی خوشبوئیں بھی آ رہی تھیں جو زندگی کا پادہ تھی۔ یہ میں بہت دور نکل آیا تھا۔ کیا پتہ کیا اور کس سمت میں ہے یہ کسی گھر کے کاروان کو نکل لیا ہو۔ لیکن اس طرح ہر ایک ایک اجنبی کو اتنی خاموشی سے کون یاد دے سکتا تھا؟

میرے سب سوال بے جواب تھے۔ میں نے انہیں ذہن سے نکالنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے مجھے مفید کا خیال آیا۔ وہ بد بخت اور ان توکل ہی گیا تھا۔ کہیں میں نے مفید کو بھی تو نہیں کھو دیا؟ لیکن جن ہی میں نے پلٹ کر دیکھا، بے اعتبار اطمینان کی ایک گرمی سانس میرے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ گرتی پڑتی چلی آ رہی تھی۔ جو لوگ کرنے کے سے انداز میں وہ مجھ تک آ پہنچی۔ اگر میں نے میرا سراغ نہیں کھو یا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ تمام راستے بہت جیر تھیں۔ اپنی ہوئی وہ میرے قریب آن رکی۔

"ہم۔۔۔ تسارا یہ بھگتیر نما محبوب یا محبوب نما بھگتیر تو واقعی کیا ہے؟ وہ وہ چیز ہے۔" میں نے کہا "یقین نہیں آتا کہ آج کے دور میں کوئی عمل سے اتنا پیدل بھی ہو سکتا ہے۔"

"اب وہ نہ تو میرا محبوب ہے اور نہ ہی بھگتیر۔" وہ عرض کرنا لگی کہ درمیان ہوئی تھیں نے آپ کو کیا بتایا تھا؟ انسان یوں لڑا لڑا نہیں کی محبت سے بیزار نہیں ہو جاتا۔"

"اب تو میں بھی تم سے بھٹن ہو گیا ہوں۔۔۔ بلکہ میرے خیال میں تم بہت سی صابر اور باہمت لڑکی ہو جو تم نے اب تک اس ساتھ نبھایا ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ وہ مسکرا دی۔ میں نے ابھر کر دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا اس بات کا کوئی امکان موجود ہے کہ ہم بھی کو خوش کریں تو وہ ہمیں مل جائے؟"

"وہ تو اب ہمیں قسمت سے مل سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر اس کی قسمت اچھی ہوئی۔ جس میں مجھے کافی شبہ ہے۔" وہ لمبھی سانس لے کر بولی "ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ یوں سمجھئے، واقعہ مجھے میں آگے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس طرف ہے؟ یا وہ بالکل چھپ گیا ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسے جہاں اور اس طرح بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے، ذلت کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔"



تھا یا پھر میں خود ہی بہت لگا ہو گیا تھا اور کسی والے اور طرح دھیرے دھیرے اوپر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ غامبی دیر تک رہی۔ شاید میں غصے میں جا رہا تھا۔ مگر رہا تھا۔ کبھی اوپر بچے ہوئے لگتا تھا اور کبھی غمایت میں رہتا تھا۔

پھر جیسے میرا لپکا ہوا جسم ہو گیا اور میں دم سے نہیں شاید میری ریزہ کی پڑی پر چڑھ گئی تھی۔ میرے ذہن میں ہوا لیکن یہ جھکاؤ کا صحت افزا تھا۔ میری کیفیت اس قدر لبب کی سی تھی جو زیادہ دات کا تھا لیکن کسی گڑبڑ کی وجہ سے کم ہوتی تو ابھی دل رہی تھی اس لئے وہ کچھ مشکل نہیں تھا بلکہ محض ششما رہا تھا۔

اس آلودہ چمکے ہوئے لپکا ہوتی تو ابھی کسی حد تک محال کہ لیکن میں اب بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں آیا تھا تاہم انہی کہ مجھے اپنے اندر کوئی آوازیں کانی صاف سنائی دینے لگی اور میرے محسوسات پر سے بھی اندھیرا کھسکا ہوا تھا۔ اب کم از کم اتنا ضرور تھا کہ میں اپنے حواس بحال کرنے پر کاکی سانسوں کی مشقوں کا سارا لے سکتا تھا۔ وہ اس سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں ہو گا کہ غمایت یا دم سا جاتا تھا لیکن میں نے کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس قفل نہیں کیا تھا کہ میں ہو گا کی کسی مشق کا سارا لے سکتا۔

اب میں نے یکدم سانس روک لی اور اپنے ذہن کو ایک پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ اور گرد کی آوازیں میری کمرے غل ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن میں انہیں جتے اور ہوئے بھی ان کی طرف سے بے نیاز تھا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میرے گرد کوئی بڑا سارا نہ گھسیل پلٹا ہوا تھا لیکن میں نے ہٹانے یا اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر۔ مٹی کی چھین کے باوجود میں نے آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔ اور گرد جو بھی لوگ موجود تھے ان کی نظریں میں بے ہوشی سے تو بہتر تھا۔

میں اپنے اندر گرد مختلف آوازیں سن رہا تھا۔ پھر تھیں۔ گالی دے کر ہوا "۔۔۔ کا پھر بہت سی بھاری جیسے۔ سوتی کی گلاں ساتھ یہ عزت افزائی میری ہی کی گئی تھی۔ کسی نے صبح کی "ا" سے۔۔۔ کا پھر نہیں باقی کا پھر کو۔ کوئی غزانے کے سے انداز میں دھیرے سے ہنسا اور ہوا کی میں تو نہیں لگتا؟

"مخائے میں لگ رہا تھا۔" پہلی آواز لے اچھے۔ جواب دیا "اور پھر ہم نے اسے پکڑا بھی تو اسی ٹیکہ سے ہوا۔" اچھی پکڑے جاتے ہیں۔" پھر مجھے قریب ہی کسی سے منہ کے کراہنے کی آواز ملتی تھی۔ کسی نے یقیناً اسی سے پوچھا۔

اس بار میں منہ پر نہیں بلکہ منہ پر کمری تھی۔ میں کوا حساب برابر ہو گیا تھا۔ اور سے کوا کرکٹ بھی ہم پر کرا تھا جس کی وجہ سے فوری طور پر تو آنکھیں بند اور حواس غفل سے ہو گئے۔ ظاہر تھا کہ اس گڑھے کو چھپایا گیا تھا۔ اس پر کھاس پھونسی اور کوا کرکٹ بچھا یا گیا تھا تو اس کا کوئی متعدد بھی تھا لیکن اس لگنے کی طرف میرا ذہن ایک لمحے کی آخر سے گیا اور نہ شاید میں بروقت کچھ ہوشیار ہو جاتا۔

اس کے علاوہ مجھے منہ کی بھی لکڑ پڑ گئی تھی۔ میں اسے سنبھالنے میں لگ گیا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں ہم دوسری مرتبہ خدق میں گرے تھے اور یہ خدق کو کہ خشک اور چھوٹی تھی اس کے باوجود یہ تجربہ نہ جانے کیوں پہلے تجربے سے زیادہ خطرناک تھا۔ پہلی بار سہو رنج والی خدق میں گرنے پر میں بد حواس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس بار میں ایک لمحے کے لئے بد حواس ہو گیا تھا کیونکہ مجھے اپنے قریب سے منہ کی چٹائی دی تھی۔

میں نے اس کی خبر لینے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد میرے لئے خود اپنی خبر کھانا دشوار ہو گیا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے اوپر سے آسمان مجھ پر آن کر تھا۔ میں کسی چیز میں بڑی طرح لپٹ کر رہ گیا تھا۔ شاید وہ کوئی بھاری خیر یا پوری تھی۔ میں نے اس سے لگنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن اسی اثنا میں میرے سر پر کسی بھاری اور سخت چیز کی ضرب لگی۔

ضرب یقیناً زور دار تھی لیکن میں جس چیز میں لپٹ کر رہ گیا تھا اسی کی وجہ سے میری کھوپڑی کو تھوڑا سا تحفظ مل گیا اور پھر معاملہ بھی کسی عام کھوپڑی کا نہیں تھا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ فوری طور پر میرے اعضاء جان سے ہو گئے۔ آنکھیں تو پہلے ہی دیکھنے سے قاصر ہو چکی تھیں۔ اس ضرب کی وجہ سے اندھیرا گویا ذہن اور حواس تک بھی آہٹا۔ میں مکمل طور پر بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کہیں محض ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گویا مجھے آنکھوں نے گرفت میں لے لیا۔

بہت سے بازو یا پھر شاید دیاں میرے چاروں طرف لپٹ گئی تھیں۔ میں صحیح طور پر نہیں کہ سکتا تھا کہ وہ کیا چیزیں تھیں لیکن اگر مجھ میں حرکت کرنے کی تھوڑی بہت سکت باقی تھی تو انہوں نے مجھے اس کے قابل بھی نہیں سمجھا۔ تاہم میرا ذہن پوری طرح تاریکی کی دلدل میں نہیں اترتا تھا۔ میرے حواس شاید نہایت معمولی حد تک کام کر رہے تھے۔

مجھے منہ کی چٹائی دی لیکن وہ تو آواز جیسے کسی بہت دور سے اور کسی کنویں کی۔ سے آتی تھی۔ اس عالم میں مجھے اس کنویں کی بھی غمایت دھندلی سی یاد آئی جو ہم نے راستے میں دیکھا تھا اور شاید مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیا منہ دوبارہ اس کنویں تک جا پہنچی تھی اور اس نے کسی وجہ سے اپنے آپ کو اس میں گرا لیا تھا؟ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ شاید مجھے اوپر کی طرف اٹھایا جا رہا

”جس کماں چٹ نگ مچی ہے مری جان۔“ اس سے  
 نے اس نے بتی ی غلیظ سی بات کی جو کسی کے بھی لوہیں اہل  
 نے کے کے کافی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی یکسوئی کو  
 زار رکھا۔

اس کے بعد منیہ بالکل خاموش ہو گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھے  
 مثالی گھٹا اور غلیظ انداز میں بات کرنے کے عادی معلوم ہوتے  
 تھے انہیں میں بھی وہ گالی گلوں کے بغیر بات نہیں کر رہے تھے۔  
 میرے گرد پٹا ہوا وہ کپل اچانک کھینچ لیا گیا۔ میں نے تب بھی  
 انہیں نہ کھینچے۔ مکمل کھینچے جانے سے میں بری طرح مل گیا تھا  
 اور میری سانس کی مشق متاثر ہوئی تھی لیکن میں نے اسے جاری  
 رکھا۔ اب اس کا مقصد پورا ہونے کے قریب تھا۔ میرے سر میں  
 اٹھتی ہوئی دھک معدوم ہو رہی تھی اور میرے جسم میں طاقت  
 باہر آ رہی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ کوئی قریب سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر  
 میرے قریب سے ہی آواز ابھری ”آوی تو امیر مظلوم ہوتا ہے۔“  
 ”اے سائے کی جیہوں کی خلائی لمبے، بڑا دیکھ۔“ امیر  
 تھیں کے پاس زیادہ کیش نہیں ہوتا۔ وہ کیش لے کر نہیں  
 گوتے۔ ہارے لے تو وہ امیر ہے جس کی جیہوں میں ٹوٹ بھرے  
 ہوں۔ میں کسی کے سوٹ ٹائی سے کیا لیتا؟ کسی نے نہایت روانی  
 سے کہا۔ لہذا اس کا بھی گھٹیا قسم کے بدحاشوں والا ہی تھا لیکن اس  
 سے حکم چھٹ رہا تھا۔

ایک ہاتھ بڑی تیزی سے میری جیہوں کی خلائی لینے لگا۔ اس  
 شخص کے لیے ایک بار نیچے آوی کوٹ بھی دلائی گئی۔ میرا ہنر اور  
 کار کی چالیاں دیکھ کر نکال لی گئیں۔ اتفاق سے میرے بڑے میں  
 ماسی فخر رقم کے علاوہ ایک جیب میں بھی خاصی تعداد میں بڑے  
 ٹوٹ موجود تھے۔ ایک سرت بھری آواز ابھری جو یقیناً خلائی لینے  
 والے کی تھی ”استاد! اس کے پاس سے تو اچھی خاصی رقم نکل آئی  
 ہے۔ یہ غالی بیک بک اور کریڈٹ کارڈ لے کر گھومتے والا سینہ  
 نہیں لگتا۔ اور گاڑی کی چابی بھی ہے۔ سریزور کی چابی ہے۔“  
 ”سبے گاڑی تو چاہیں نہیں کہاں گھڑی ہوگی۔ تو مال ادھر لائے  
 گا۔“ آواز نے کہا۔

ایک لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں شاید مال ایک ہاتھ  
 سے دوسرے میں منتقل ہوا پھر پہلی ہی آواز نے کہا ”گاڑی کے  
 بارے میں بھی اپنا چھوٹو خبر لے آئے گا۔ وہ ادھر ادھر گھومتا رہتا  
 ہے۔“ وہ تو سریزور میں پیش کریں گے۔ ”پھر ایک لمحے کے  
 وقف سے وہ بولا ”استاد! اس کا سوٹ بھی سٹی میں ٹھہرا ہوا ہے  
 لیکن یہ بہت شاندار ہے۔ یہ بھی اتار لوں۔“

”اے گاڑی کے بچے! یہ سوٹ کیا اپنے باپ کو پہنائے گا؟  
 پانچواں کٹھ دیکھا ہے؟ جو کر دکھائی دے گا۔“ ویسے خیر۔ تو سوٹ  
 کے بغیر جو کر رہی ہے۔“

”باکوں کماں سے پستانوں کا استاد! اب تو قبر میں ہے۔ اب تو  
 شاید اس کی ہڈیاں ہی نہ مچی ہوں گی۔ ہڈیوں پر سوٹ پستانہ کیا اچھا  
 لگے گا۔“

”خیر۔ جیسا ہی لگے گا“ استاد نے دھشت زدہ سا قہقہہ لگا کر  
 کہا۔ اس کی آواز میں فخر اور زبان میں ہلکی سی کثرت تھی۔  
 قہقہوں کی مزید آوازیں بھی سنائی دیں۔

پھر پہلی آواز نے ہی منت کے سے انداز میں کہا ”استاد! میں تو  
 اس لیے سوٹ اتارنے کو کہہ رہا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی کو بھی نہ  
 آیا تو دو چار سو میں تو آرام سے بک ہی جائے گا۔ ٹائی بھی دیکھو کتنی  
 شاندار ہے۔ اور یہ دیکھو اس پر پٹن بھی لگی ہے۔ اس پر یہ جو  
 چمکیلے سے چمکیلے گئے ہیں شاید یہ میرے ہوں۔“

اس دوران میں میری ٹائی زور سے کھینچی گئی۔ قیمت تھا کہ  
 میں پہلے ہی سانس روکے ہوئے تھا ورنہ شاید میرا دم کھٹنے لگتا۔  
 ایک بار پھر استاد کا استہزائیہ سا قہقہہ ابھرا ”ٹائی کو خواب میں بھی  
 چھپڑے ہی نظر آتے ہیں۔“ ابے۔! اب وہ بیروں وغیرہ والی ٹائی  
 بیوں کا دواج نہیں رہا۔ یہ نقلی میرے ہیں۔ مگر تو نے زندگی میں  
 کبھی میرے دیکھے ہوں تو مجھے پتا ہو۔“

”اب تو دیکھ لے ہیں استاد! کتنی مرتبہ تو بیروں کے زیور  
 کھانے لگے ہیں۔“ پہلی آواز نے کہا۔

”اب دو چار مرتبہ میرے دیکھنے سے کوئی آوی جو ہری تھوڑا  
 ہی بن جاتا ہے۔ اور یہ سوٹ کو بیچنے باپنے کا خیال اپنے بھوسا  
 بھرے دماغ سے نکال دے۔ ہم کو لڑے کا کاروبار نہیں کرنا ہے۔  
 تو اس کی گھڑی اتار لے۔“ مجھے راؤد لگ رہی ہے ”یہ استاد  
 کی محمود آواز تھی۔“

دوسرے ہی لمحے کھٹاک سے گھڑی کی چین کھلی اور گھڑی  
 میرے ہاتھ سے کھینچی گئی پھر وہی سرت بھری آواز ابھری ”ہاں  
 استاد! راؤد ہی ہے۔ میں چھینس ہزار کی تو ہوگی۔ اس کی تو  
 چین بھی سونے کی لگ رہی ہے۔ یہ تو اس سے بھی بہت زیادہ کی  
 ہوگی۔“

استاد کی آواز ابھری ”بے شکور کی اولاد! اتنی زیادہ باجمیں  
 مت پھیلا۔ قیمت خرید کے بارے میں نہیں۔ صرف قیمت  
 فروخت کے بارے میں سوچا کر۔ یہ دیکھا کر کہ چڑکے کی کتنے  
 میں۔ کیا سمجھا؟ ادھر لگا گھڑی۔“

ایک لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں گھڑی یقیناً استاد کے  
 ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔ اس کی محمود مگر طعنت بھری آواز ابھری  
 ”اچھی چیز ہے۔“ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا ”مگر سونے کی بات  
 ہے کہ یہ امیر آوی اس علاقے میں کیا کر رہا تھا۔ مجھے تو کوئی شکوک  
 معاملہ لگتا ہے۔“

ایک نئی آواز ابھری۔ یہ زیادہ کمزوری اور سفاک سی آواز  
 تھی ”یہ اس کی معشوقہ بیٹی ہے نا۔ ہوش حواس میں بیٹی ہے۔“

# آسیب زدہ

انوار صدیقی (ذریعہ)

میش سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ کون سی عیاشی ہے جو کرتے

سفاک اور کھردری آواز ایک بار پھر ابھری۔ ہنر مند ایک بار پھر میں ہی تھا "استاد! اسے رات کے خصل کے لئے لیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کی نکلانی کریں گے۔ ذرا چھوڑ دیے بھی اس ٹھکانے پر آج یہ ہماری آخری رات ہے۔ بڑی نشانی چھوڑ کر جانی چاہیے۔ کوئی کیڑی۔ ادھر میں سلی ہوئی۔ علی ہوئی لاش جس کی مشافت نہ ہو سکے۔ ذرا چھوڑے گا کہ مر رہیں بھریں گے۔ ذلیل شخص سے دی سوراخ کریں گے۔ کلیں ٹھوٹیں گے۔ جب سلا پڑے۔ مینڈک کی طرح چھوڑ کے گا۔ تو کتنا مزہ آئے گا استاد!"

"آج رات اس خصل کی ضرورت نہیں" استاد کی آواز ابھری "آج رات اپنے پاس یہ دو سرا خصل جو موجود ہیں اور اب تو ویسے بھی ایک کی جگہ دو دو مشغول نہیں ہو گئی ہیں۔ فرصت کہیں لے کر"

میں نے منہ کے سسکی لینے کی سی آواز سنی۔ شاید اس ساتھ کسی نے کوئی حرکت کی تھی یا پھر استاد کی بات میں گزار ادھر کی سانس اوپر اور نیچے کی جیسے وہ گئی تھی۔ یہی سانس کی پوری ہو چکی تھی۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھلیں۔ میرے لئے سب سے زیادہ طمانیت کی بات یہ تھی کہ انہیں میرے ہاتھ پاؤں باندھنے یا آنکھوں پر کپڑا باندھنے کی دھت کی تھی۔ شاید ان کے خیال میں شکار کو قابو میں کر کے لانا ہی مسئلہ تھا۔ اس کے بعد تو اس میں اتنی سکت یا جرات ہی نہیں ہو گی کہ وہ ان کے سامنے ہاتھ بھی بلا سکے۔

لطف کی بات یہ تھی کہ جب میں نے آنکھیں کھلیں تو ان سے کسی کی توجہ بھی میری طرف نہیں تھی اور ایک شخص جو ان طرف پشت کئے کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں جھیلے پھالے انداز میں لٹکی ہوئی کلا کھنکھ میرے ہاتھ کی رسائی میں تھی۔ میں جانتا اسے اس کے ہاتھ سے سمجھ کر ان کے سنبھلنے سے پہلے انہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے صورت حال کا ذرا بہتر طور پر جائزہ لیا۔ مناسب سمجھا۔ میں کوئی کچا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ زیادہ کرنا منہ کی تھی۔

میں نے دیکھا وہ ایک دیوار کے قریب ٹپٹی ہوئی کر رہی تھی۔ اس کے قریب بیلے سے کپڑوں میں مجھول سانپوں جیون لٹکی کھڑا تھا۔ اس کی شید بڑھی ہوئی تھی اور بال بے تحاشہ ایک

سز سزیم لوگوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس سے پوچھ لیتے ہیں۔

منہ کی ہلکی سی چیخ ابھری۔ شاید اس کے ساتھ کوئی بد تمیزی کی گئی تھی۔ یہی سانس کی مشعل اس وقت ختم ہونے کو تھی۔ سفاک اور کھردری آواز نے منہ سے پوچھا "تم اس کی کون ہو جان تمنا؟ پوچھ تو نہیں نکلیں۔"

"میں ان کی ملازم ہوں" منہ نے ناگواری سے جواب دیا۔ مجھے یہ اندازہ کر کے اطمینان ہوا کہ اس صورت حال میں بھی اس کا ذہن ٹھیک کام کر رہا تھا۔ اس نے اصل بات انہیں سمجھانے اور زیادہ لمبی چڑی وضاحتیں کرنے کے بجائے عام فہم جواب دیا تھا۔ مگر ان لوگوں کے لئے شاید یہ جواب کافی نہیں تھا۔ استاد کی استہزاء سی سی آواز سنائی دی "کس قسم کی ملازمت ہے تمہاری؟ رات کی نوکری ہے؟"

منہ خاموش رہی۔ سفاک اور کھردری آواز ڈالنے نے غالباً اسے شو کاوا "ہو لو نا یہی دربار! استاد کچھ پوچھ رہے ہیں۔"

"میں ٹائپسٹ ہوں ان کے دفتر میں" منہ نے جواب دیا۔ "باہر بھی ان کے ساتھ بھرتی رہتی ہوں۔ کیا چاہاں کو کہاں کچھ ٹائپ کرانے کی ضرورت پیش آجائے ہے؟" استاد کی زہریلی سی آواز پھر ابھری۔ اس کے ساتھ ہی دو عین حقے سنائی دیے۔ پھر استاد نے غالباً ایک جھگڑے سے انہی دو کڑا خطرناک انداز میں غرا کر پوچھا "تم دونوں اس علاقے میں کیا کرتے پھر رہے تھے؟"

"میں اپنے ایک رشتے دار کو کچھ سمجھانے بجھانے کے لئے باس کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ سفارش کے طور پر۔" منہ کزور سے لہجے میں بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں کچھ خوف بھی جھلک آیا تھا۔ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہوں گی وہ یقیناً ایک لڑکی کو اس سے بھی زیادہ خوفزدہ کرنے کے لئے کافی ہو گا۔

"اوصاف بڑا رحمدل باس ہے!" استاد کے لہجے میں اب بھی ذہر بھرا ہوا تھا "تمہارے کام سے تمہارے ساتھ آگیا۔ کسی مو ملازم کے ساتھ تو کبھی کہیں نہیں گیا ہو گا۔"

منہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ رفتاری آواز ابھری جو میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ سن چکا تھا "استاد! اس سالے کا کرنا کیا ہے؟" شاہد یقیناً یہی طرف تھا۔

استاد سوئی سی ایک گالی دے کر بولا "کو بار سور کے کہیں پھکودو۔ ہمیں اس سالے کا کیا کرنا ہے؟"

"استاد! مولیٰ اسی ہے۔ اس کے بدلے لبا تاوان مل سکتا ہے۔" چلی آواز نے گویا ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی۔

"بے۔ کے بچے! تجھ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ہمارے حالات اس قسم کے پکڑوں میں پڑنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم مسافر لوگ ہیں" استاد کچھ جھنجھلا کر بولا "تو ان کے پکڑ میں بھی لینے کے دینے بھی پڑ جاتے ہیں۔ ہمیں اس کے بغیر بھی کیا کی ہے۔"

تھی۔ کرا کافی بڑا تھا۔ اس میں لکڑی کے دو ٹیڑھے بڑے سے  
ستون بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی باہر دیواروں پر پھیرا  
گیا چونا نیلا ہو چکا تھا اور جگہ جگہ سے اس کی ٹھیس اکڑ چکی  
تھی۔ ان دیواروں پر کس کس بڑے ستانی دیے نظر آ رہے تھے  
جن پر نظر پڑنے ہی سے اندازہ ہو گیا کہ وہ خون کے تھے۔ انہی کے  
آس پاس ایسی لمبی لمبی لکیریں بھی نظر آ رہی تھیں جیسے خون میں  
تھنڑے ہوئے ہاتھ دیواروں پر صاف کئے گئے ہوں۔

ان نشانات کا اثر بہت عجیب تھا۔ کنزور اعصاب کا اتنی  
اضیں دیکھا تو اس کے جسم میں بھر بھری آہستی تھو۔ ویسے وہاں کا  
پر راجا محل ہی جسم میں بھر بھری بلکہ کچھ لالے والا تھا۔ کرا بہت  
بڑا ہونے کے باوجود چاروں طرف سے بند تھا۔ وہاں سین اور ایک  
عجیب سی دیو کا راج تھا۔ شاید وہ غوث کی بدو تھی۔ ابھی رات  
نہیں ہوئی تھی لیکن وہاں گرد آلود سے دو بلب روشن تھے جن کی  
زدہ روشنی وہاں پھیلی ہوئی تھی۔

استاد کے تخت شاہی کے عقب میں ایک دیوار دکھائی نظر آ رہی  
تھا اور اس کے عقب میں ایک سونے کی سی کا پتھر اچھوتا نظر آ رہا  
تھا۔ یہ پتھر کا پتھر تھا اور یہ بھر بھری دلائے والی مزید ایک چیز  
تھی۔ شاید وہاں مزید ایسی بہت سی چیزیں موجود ہوں لیکن فی الحال  
ان تک میری نظر نہیں جا سکتی تھی۔

وہ تھا وہاں پانچ تھے۔ نیسے وہ استاد کے لقب سے پکار رہے  
تھے وہ ان کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ میرے انداز سے کے مطابق  
مکان میں ان پانچوں کے سوا کوئی مزید مسلح فرد موجود نہیں تھا اس  
لئے میں اپنی حکمت عملی آسانی سے طے کر سکا تھا۔ اپنی جیب میں  
ہاتھ ڈالنے پر مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ میرا مشن پھل لانا یا چکا  
تھا۔

مجھے میرے اگلے ہتھیار سے محروم کرنے کے بعد وہ جیتنا  
میری طرف سے ہوا طرح بے فکر ہو گئے تھے۔ معزز اور کچھ  
پرنس میں ٹائپ شخصیت ظاہر ہونے سے مجھے اکثر یہ فائدہ ہوتا تھا  
کہ اکثر یہ معاش اور خطرناک قسم کے افراد میری طرف سے ذرا  
بھی گھر مند نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت بھی کسی کی ذہن میری طرف  
نہیں تھی۔ وہ مجھے ایک بے کار تیز رفتاری طرح ایک طرف پیٹک کر  
گوا بھول گئے تھے۔

اسی اثنا میں چٹائی پر دیوار کے سارے پینے ہوئے ایک  
نوجوان نے فرش پر لڑھکتی ہوئی شراب کی دو خالی بوتلوں کو پاؤں  
سے ایک طرف پٹایا اور استاد کے پہلو میں بیٹھی ہوئی سانولی اور کم  
مڈی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے ہوا ۳۳ ستارہ اس کو تاپ چھٹی  
وے دو تا۔ ہم لوگ کب تک انتظار میں بیٹھیں گے۔ اس کی  
توازیں بھی ختم کی جھلک تھی۔

استاد جیسے کسی خیال سے چڑھا۔ اس نے یوں لڑکی کی طرف  
دیکھا جیسے اب تک وہ بے خیالی میں اسے بازو کے مٹھے میں لیے بیٹھا

کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بلاشبہ ایک قاتل کی  
طرح تھیں۔ میں جو کھڑکی اور سٹاک سی آواز سنتا رہا تھا وہ  
اس کی تھی۔ وہ چڑے سے اپنی تیار اور سخت اذیت پرست نظر  
نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے جوں جوں اس نوجوانی میں اذیت پرستی کے نہ جانے  
کون سے کھیل کھیل چکا تھا۔ اس کے چڑے میں بظاہر کوئی  
نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کے اعمال نے گویا اس کا چہرہ  
کے رکھا تھا۔

منہ کے بال بکھر چکے تھے اور منہ میں تھنڑے نظر آ رہے  
ان میں منہ بھی پینے دکھائی نہ پڑے۔ وہ بظاہر میں ہاتھ  
سر مٹائے ہوں سکری کسی بیٹھی تھی جیسے اسے سر کی لگ  
ہو۔ اس سے دو قدم کے فاصلے پر لکڑی کا ایک تخت پڑا تھا  
پر سیٹا گیا سا ایک گدا بچا ہوا تھا اور گاؤں کیسے بھی پڑے تھے۔  
گدا کیسے سے ایک شخص ٹکے لگائے بیٹھا تھا۔ وہ ذرا زیادہ عمر  
پر تھا۔ جسم کا تھا۔ اس کے سر پر سا دیال بندھا ہوا تھا اور  
میں نے اسے بوجھل گھس۔ صورت سے وہ بھی کچھ کم سٹاک  
نہیں لگتا تھا۔

وہ بیٹائی تھا جسے استاد کے لقب سے پکارا جا رہا تھا۔ اس  
پہلو میں خاشیہ والوں والی ایک سوکھی مڑی سانولی سی لڑکی بیٹھی  
کی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پٹیاں سی جی ہوئی تھیں اور وہ  
بازار پر زبان بکھری تھی۔ استاد اس کی کمر میں بازو دھاگل  
تھا اور اس کا ہاتھ اس وقت شاید وہ خود کو کوئی قدیم دوسن شمشاد  
میں کھڑا تھا اور اس وقت اپنے سلطنت عملی کے تخت پر فزوش  
اور اپنی الجھنے کے کراں کے سیاہ منہ کا مالک تھا۔

لڑکی دو ٹخن پٹیاں جھجھکی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک  
لکے لگایا گیا تھا۔ ایک اور چٹائی پر دیوار سے ٹکے لگائے دو  
تھیں۔ وہ دو ٹخنیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک  
کو گویا لی لی اور دوسرے کی گود میں کا شکوف رکھی تھی۔ وہ  
میں گویا موزے استاد۔ یا پھر شاید اس کے پہلو میں  
خوشی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک اور لڑکا استاد کے پیچھے سونب انداز میں کھڑا تھا۔ وہ  
ساتھ بگڑا ہوا عمرو میار قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ بظاہر وہ  
بہت انداز میں کھڑا تھا لیکن اس کی نظریں بے چینی سے چاروں  
طرف گردش کر رہی تھیں۔ اس کے کندھے پر بھی ایک کا شکوف  
تھا۔ اس کی طرف سے مجھے غلو محسوس ہوا کہ شاید وہ  
میں بکھیرے ہوئے دیکھ لے میں نے جلدی سے آنکھیں  
نہیں کھلیں۔ صرف اتنی سی کھلی رہیں کہ مجھے کسی نہ کسی حد  
تک اندازہ ہو گیا کہ اس کا منہ کھڑا ہے۔

وہاں کا جائزہ لینے کے سلسلے میں میرے لئے صرف چند سیکنڈ کی  
سٹاک کافی تھی۔ بازو میں نے لے لیا تھا۔ وہ کسی بہت سی خست  
طرح مکان کا ہال تھا کرا تھا جس پر سینٹ کی شیٹ کی چھت

تھا۔ اس نے فوراً اپنا بازو سمجھ لیا اور بے پردائی سے بولا "ہاں۔  
ہاں۔ میری طرف سے تو اسے چھٹی سی چھٹی ہے۔۔۔ بلکہ تم  
لوگ بھی جاہو تو اچھی طرح اپنا دل خوش کرنے کے بعد اس کی کئی  
چھٹی سی کرنا۔۔۔ اپنے پاس اب اس سے زیادہ اچھا۔۔۔ زیادہ۔۔۔  
تو نہ آؤ۔۔۔ زیادہ خوب صورت مل گیا ہے۔" اس نے منہ کی  
طرف اشارہ کیا۔ منہ کو کہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی اس  
کے باوجود اپنی جگہ پر مزید سکڑ سٹ کر رہ گئی۔

چٹائی پر بیٹھا نوجوان مسرور لہجے میں سانسوں لڑکی سے مخاطب  
ہوا "آج دو جان تمنا! اب اس شاہی تخت سے اتراؤ۔۔۔ بہت دن تم  
نے استاد کا دل خوش کر لیا۔ اب کچھ ہم فریبوں کا بھی خیال کرو۔"  
سانسوں لڑکی نے اعجاز طلب سی نظروں سے استاد کی طرف  
دیکھا۔ استاد نے سر ہلا کر گویا اسے اعجاز مرحمت فرمادی۔ وہ تخت  
سے اترتی اور جگہ کر فرش سے کوئی پتیر اٹھانے لگی تو استاد نے  
ایک بہت سی کہیں حرکت کی۔ اس نے لڑکی کی پشت پر زور سے  
لات رید کی۔ لڑکی اونٹ سے منہ کھینچتی ہوئی دو بار جگری۔ اس کے  
حلق سے بے ساختہ جیب سی چیخ نکلتی گئی۔

سب نے ہم آہنگ ہو کر ایک بلتر قندہ لگایا۔ وہ قندے نہیں  
گویا بدبو دلوں کی بے چہمی کی آوازیں تھیں جو اس آسیب زدہ سے  
مکان میں گونج کر رہ گئی تھیں۔ لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن وہ سک  
رہی تھی۔ چٹائی اور فرش پر مرکز کھانے کی وجہ سے اس کا توازن  
جھل کر رہ گیا تھا۔ اس نے ڈبڈبائی سی آنکھوں سے استاد کی طرف  
دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایسی بے چارگی اور تبدیلی کی ایسی جھلک  
تھی جسے صرف محسوس کیا جاسکتا تھا! یان نہیں کیا جاسکتا۔

استاد نے صبح طرز پر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اب  
منہ کی طرف متوجہ تھا۔ اپنے قریب خالی ہونے والی جگہ کو ہاتھ  
سے چھپکتے ہوئے وہ باجیس پھیلا کر بولا "آج دو میری دلربا! یہاں  
آج دو۔۔۔ تمہاری جگہ وہاں نہیں یہاں ہے۔"

منہ نے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور فوراً سر  
جھکا لیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ منہ چٹ جائے اور وہ اس  
میں جا جائے۔ وہ کافی بے باک، جرات مند اور تیز و طرار لڑکی تھی  
لیکن اس وقت چڑکڑی بھول چکی تھی۔ وہ شاید بولے بولے کانپ  
رہی تھی اور وہ ایک مرتبہ اس کے منہ سے ٹھکرائی ہوئی سی آوازیں  
بھی نکلتی تھیں۔

وہ جب اپنی جگہ سے نہ چلی تو اس کے قریب کھڑے ہوئے لیے  
بالوں والے نوجوان نے اس کے بال منہ میں جکڑ کر اس کا چہرہ اوپر  
کیا۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلتی گئی۔ وہ نوجوان اپنے  
مخصوص کھورے اور سفاک لہجے میں بولا "استاد کا حکم نہیں سناتم  
نے؟ استاد کے حکم پر دوڑتے ہوئے جانا چاہیے۔ جس پر ہی  
نہیں ہے کہ استاد کتابا کمال آدمی ہے۔ چلو۔۔۔ اٹھ۔"

اس نے اسی طرح بالوں سے سمجھ کر اسے کھڑا کرنے کی

کوشش کی لیکن اسی لمحے استاد کو جیسے کچھ خیال آتا۔۔۔ اشارے  
سے روکتے ہوئے بولا "یار! پہلے اس ہماری لاش کو لٹاؤ۔  
اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پھینک کرے میں پھینک دوں۔۔۔  
سوچیں گے اس کا کیا کرنا ہے۔ سلا خواہ تو اداں جگہ گھیرنا  
ہے۔"

دوئے خن ایک بار پھر میری طرف تھا۔ میں نے آنکھوں  
صرف اتنی جھری رکھی تھی کہ کسی کو نظر نہ آسکے۔ ویسے بھی مجھ  
چہرے پر کسی چیز کا سایہ پڑ رہا تھا۔ لیے بالوں والے نے منہ  
بال چھوڑ دئے اور ڈرامائی سے انداز میں چھوٹے چھوٹے زور  
اٹھاتا میرے قریب آگیا۔ پھر اس نے پلٹ کر استاد سے اعجاز  
طلب انداز میں پوچھا "پہلے اس کے ہوش میں نہ لے آؤں؟"

"بے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ گھما کر کے پچھلے  
نے سکرانے ہوئے کہا۔ اس کے لیے میں لیے بالوں والے نے  
لیے فروغیت کی نہیں بلکہ کچھ محبت کی جھلک تھی۔

"ہوش میں لا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں گے استاد! وہ  
پاؤں کھلے بھی ہوں گے تو یہ کیا کرے گا۔۔۔ اس نے کھلے۔  
ایک موٹی سی کھلی سے نوازا۔

"یہ سلا کچھ تو زور بہت دل والا مسوز آدمی معلوم ہوتا ہے  
دیکھا نہیں۔ اس کی جیب میں سے شیش ہٹل نکلا تھا۔۔۔ اس  
نے یاد دلایا۔

"اگر یہ تو زور بہت دل والا ہو گا تو اسی کے بل بوتے پر  
استاد! جب اختیار ہی نہیں رہا تو اس میں اور بکری میں کئی فرق  
نہیں نہ جائے گا۔" لیے بالوں والے نے بے پردائی سے کہا۔  
"بکری بکری بکری بھی سینگ اردویتی ہے جان عالم! یا! یا! یا!  
بدستور محبت اور شفقت سے سکرانے ہوئے بولا۔

"ایسے سینگوں کی کس کو پروا ہے استاد!" لیے بالوں والا  
خفارت سے اسے کر بولا "میں اسے ہوش میں لانا ہوں۔ اس سے  
تو زور بہت پوچھ کچھ بھی تو کہنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے گاڑ کے پچھلے! تم نہیں مانو گے اس کے حتم  
پانی کے چھینے مارو۔" استاد نے گویا ازراہ شفقت اعجاز دے  
دی۔

"جیسے رہا ہے استاد! این کسی کو پانی سے ہوش میں نہیں  
لائے۔ ویسے بھی جیسے معلوم ہو چکا ہو گا کہ اس علاقے میں پانی کی  
کتنی کمی تھی ہے۔ کسی کو ہوش میں لانے کا اپنا تو الگ ہی طریقہ  
ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اچانک ہی میرے کولے کے قریب  
ٹھوکر رید کی۔

دوڑ کی ایک نئی لہر مجھے برداشت کرنی پڑی اور مجھے اپنے  
فصہ آیا۔ میں نے حرکت میں آنے میں کچھ زیادہ سی دیر کوئی تھی  
اور مجھے یہ خفارت آئیر غمناک بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ وہ سلا  
نقصان یہ ہوا تھا کہ اب سب کی توجہ میری طرف تھی۔ میں منہ

لڑھک گیا تھا اور اسی حالت میں رہ گیا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اس کے سینے میں دل کے مقام پر گولی مارنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نہیں سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ گولی کہاں لگی تھی۔ باقی تینوں آؤسے ترہنے کرے تھے لیکن انداز بتا رہا تھا کہ ایک ایک گولی ہی ان کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔ وہ دار تپ کر ساکت ہو گئے تھے اور ان کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ مجھے خود بھی اپنے آپ سے اتنی مہم کار کوئی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو شاباش دی۔

سانوئی لڑکی غیر ارادی طور پر دوار سے جا گئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اس کے کپڑے تھے اور دوسرا ہاتھ چہرے کے چلے ہوئے صبر پر تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی اور ہنسی پھٹی آنکھوں سے یوں میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں کوئی مردہ تھا جو اچانک زندہ ہو گیا تھا۔ سفید کرسی سے نیچے پھسل آئی تھی اور وہیں ساکت ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ خوف کے باعث پھسل گئی تھی یا اپنی دانست میں اس نے عمل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

لے لے ہالوں والا بدستور میری گرفت میں تھا۔ میں اس کے وجود سے اطمینان ہوئی پسینے اور سستی شراب کی بو کے جھکے محسوس کر سکتا تھا۔ چند لمبے کے لیے مٹھر جیسے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ جب بات یہ تھی کہ لے لے ہالوں والے نے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کے لیے ذرا بھی زور آزمائی نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں جو رائے اس نے میرے بارے میں ظاہر کی تھی وہ خود اس پر صادق آتی تھی یعنی اس کی طاقت کا فنی گویا اس کی ٹی ٹی تھی جو اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی تو وہ یک دم جیسے بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے اس کی گردن بدستور بازو کے کھینچے میں رکھی لیکن اس کی ٹانگوں کو اپنی ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد بھی اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی قلعہ کوشش نہیں کی۔ تب میں اسے لے لے ہوئے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سانس لینے کی کوشش میں اس کے حلق سے خرخرات کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

میں نے ٹی ٹی کی ٹال اس کی کپٹی پر اس طرح رکھی کہ اگر گولی اس کی کھوپڑی سے پار نکل جائے تب بھی میرا بازو زخمی نہ ہو۔ میں نے سرکوشی کے سے انداز میں کہا "میں جیسے خبیث اور مردود جن کا مشغلہ بے گناہوں کو ازیتیں دے کر ہلاک کرنا ہوتا ہے انہیں میں بھی ازیتیں دے کر ٹھکانے کا زیادہ دیر پسند کرتا ہوں لیکن انہوں نے فی الحال میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ تمہاری قسمت ابھی ہے کہ تمہیں آسان موت نصیب ہو رہی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے ٹیکہ دیا اور اس سے پہلے کہ اس کا منہ خون میرے کوٹ کی آستین تک پہنچ پاتا میں نے اسے جھڑپا اور وہ مردہ پھیلنے کی طرح پٹ سے فرش پر گر پڑا۔ میں نے نہایت اطمینان سے ٹی ٹی کا دست اس کی قبضے سے صاف کیا اور ٹی ٹی اسی کے ہاتھ میں پھنسا دی۔ اسی دوران میں مجھے احساس ہوا کہ اب

مستحکم کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساکت بیٹھا رہا۔  
اجازت طور سے انداز میں ہنس کر بولا "بے ایہ تو ہوش میں کیا بھڑکا رہا؟ اسے زیادہ لمبا ہی بے ہوش نہ کر دے۔"  
میرے نہیں استانت۔ ابھی دیکھو کیسا ہوش میں آتا ہے۔"  
میں والے نے مجھے دوسری ٹھوکہ رسید کرنے کے لیے ٹانگ پر میرے خیال میں اب بہت بڑھ چکا تھا۔ غلطو خواہ بڑھ چکا تھا۔ اب کوئی ضروری ہو گیا تھا ورنہ وہ خبیث کا بچہ رہتا۔ میرے لیے زیادہ مشکل مسئلہ اصل میں دونوں لڑکیوں کو نہ کاٹنا۔ اگر اندھا دھند کارروائی کرنے کی گنجائش ہوتی تو پھر خطرے کی بھی پروا نہیں تھی۔

عالم پاک کی ٹانگ۔۔۔ دوسری ٹھوکہ رسید کرنے کے لیے میں آئی۔ اس کے بعد انہیں پتا نہیں چل سکا ہو گا کہ ان ہاتھ کیا ہوا۔ وہ ٹھوکہ رسید کرنے کی حسرت ان کے دل میں ہی پی ہوئی کہ ان کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آگئی تھی اور اس پر دو پک جھپٹے میں خود فرش پر آ گئے تھے۔

میں نے ایک بازو اور ٹانگوں کی مدد سے اسے پک جھپٹے میں اٹھ بٹھا کہ وہ میری ڈھال بن گیا اور ابھی میں پٹائی سے اٹھا رہا تھا۔ صرف میں نے رخ توڑا سا بدل لیا تھا۔ اگر ان میں سے باقی بچنے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا ہتھیار سنبھال بھی لیتا تو کہنے میں کامیاب ہو جاتا تو گولی پہلے زلفوں والی سرکار کی جگہ کہ ان کی طرف سے ایسا کوئی رد عمل ظاہر ہی نہیں ہو سکتا۔

اسی دوران میں لے لے ہالوں والے کی ٹی ٹی میرے ہاتھ میں آئی۔ یہ سحران کے لیے یقیناً ایسا ہی تھا جیسے پہلی کا کونہ ایک ڈوبے شایہ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہوا تھا اور نہ تھا۔ اگر ان میں سے کوئی سمجھ بھی پایا تھا تو شاید اسے اپنی ہونے پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسی لیے ان میں سے کوئی بھی فوری ہائی نہ عمل ظاہر نہیں کر سکا تھا۔

مجھے لے اتنی سلسلے کافی تھی۔ اس وقت شاید میں نے اپنی اپنی تمام تر نشانے بازی کے بہترین نمونوں میں سے ایک نمونہ پیش کیا کی "خیر رفتاری" بھی ناقابل یقین تھی۔ میں نے چشم انداز میں کار افراد پر صرف ایک ایک گولی خرچ کی جس کے نشانے میں نے بے خیال بھی رکھا کہ سانوئی لڑکی اور سفید گولی انہیں نہ آئے پاس۔

پہلی کوشش کامیاب ہی رہی۔ استاد اور اس کے تین چلے گئے۔ جبکہ دوسرے گئے بلکہ استاد تو اپنے تخت شامی سے نیچے ہی گر پڑا کہ اس وقت وہ تخت کے کنارے پر ہی تھا۔ وہ کچھ باطلوں میں گر پڑا تھا اور عجیب سی انداز میں ساکت ہو گیا تھا۔ باطلوں میں گر پڑا تھا جیسے کوئی در تک مرنا بنا رہنے کے بعد اندھا

منہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔  
میں نے لیے ہاتھ والے کی نیکی چٹوں کی جیہوں میں ہاتھ مارا۔ توقع کے مطابق اپنا مشین ہٹل مجھے اس کی جیب سے مل گیا۔ میں نے اسے ہاتھ میں لے رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں پچاسی کا پینڈا لٹکا کھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک نیم تاریک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس میں کوئی موجود نہیں تھا تاہم اس میں جگہ ایسا چیزیں پڑی تھیں جو یقیناً اذیت رسائی کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض پر خون لگا ہوا تھا۔

میں اس کمرے کی دہلیز سے پلٹ آیا۔ اس مکان میں ایک اور کمرہ تھا مگر وہ کالھ کالھ اور برتنوں بھلے وغیرہ سے بھرا ہوا تھا۔ مکان میں ذرا سی بھی کھلی جگہ نہیں تھی۔ وہ کسی شگفتہ حال قسم کے بے خانے سے مشابہ تھا۔ صرف چند سینکڑوں میں میں نے اس کا جائزہ لے لیا۔ اس دوران میں لیے ہاتھ والے کا سمجھا اس کے سر کے سوراخ سے بیٹے لگا تھا۔ سفیدی آہستہ سا خون چٹائی پر پھیل رہا تھا۔ ایک گولی ایک نوجوان کی پیشانی میں گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور ایک ہاتھ کا شگفتہ کھنکھوت کے دوتے پر تھا۔ میں نے استاد کی لاش کو سیدھا کرنا چاہا۔ وہ ایک اور واسطے سے لڑھک گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہی رہے۔ گولی اس کے مٹھوم میں گھسی کر شاید عقب میں کہیں ریزہ کی ہڈی کے بالائی حصے میں پھنس گئی تھی۔ میں نے اس کی جیہوں کی تلاش لی۔ اپنا پرس اور ریمو وغیرہ مجھے اس کی جیہوں سے مل گئی۔ مجھے اپنے پرس سے زیادہ دلچسپی تھی۔ میں اپنی کوئی نشانی یہاں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر میں مشین ہٹل ہاتھ میں لیے سائلی لڑکی کی طرف حوجہ ہوا۔ وہ بدستور دوڑا رہی تھی "زندہ رہنا چاہتی ہو نا؟"  
اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا "خود اہماں سے بھاگ جاؤ اور جو کچھ بھی تم نے دیکھا ہے اس کے بارے میں کبھی کسی کے سامنے زبان نہ کھولا۔ ورنہ موت اس کے بعد بھی آسکتی ہے۔ سمجھ گئیں نا؟"

اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یہ گویا اس کے لیے ایک نوید تھی۔ اس کے جسم میں جیسے جان سی آگئی۔ اس نے چند سینکڑوں میں نہیں ٹھکے اور یوں وہاں سے بھاگی جیسے بدو میں اس کے پیچھے لگی ہوں۔ اس دوران میں منہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لیے ہاتھ والے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "آپہنے اسے بھی مار دیا؟"

میں نے مگر نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور وہ گویا سم کر ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے وہی آواز میں کہا "تم تو کچھ اس طرح یہ بات کہہ رہی ہو جیسے اسے مار کر میں نے بڑی زیادتی کی ہے۔ اسے کہنے میں نیکی براہ کرم لگاؤ۔ اب جو کچھ یہ تمہارے ساتھ

کر رہا تھا یا آنکھ یہ لوگ جو کچھ تمہارے ساتھ کرنے والے تھے کیا میں انہیں وہ کرنے دیتا تو بہتر تھا؟ میں جیسے ان کے روبرو پہ چھوڑ دیتا تو جیسے بہت اچھا لگتا؟ تم اس سے لطف اندوز ہو تیں؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔" وہ دم گڑبڑا گئی اور خرمندی سے غصے آئے گی۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ دراصل کیا کہنا چاہتی تھی لیکن میں ہاتھ کا کہہ نہ ہی سکتی تو بہتر تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ لیے ہاتھ والا میرے قابو میں تھا۔ میں چاہتا تھا اسے چھوڑ سکا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ان زہری خلیات کا اعتراف کرتی۔

"یہ معاشرے کی غلطی ہے۔" میں نے حقیقی غصے سے "معاذ اللہ! اصلاح۔۔۔ اور سی نوع انسان کے لیے ہزار ہا اذیتوں سے بچنے بچنے کا سہارا ہے۔ میرا بس پتہ تو میں ان جیسے کسی کو ڈاکو یا ان اذیت پسندوں کو ختم کر دوں۔"

وہ خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے کی کوشش کی اور اس کا ہاتھ تھامے ہوئے نرمی سے کہا "آؤ۔۔۔ چلیں۔"

اس نے قہقہہ لگا اور سعادت مندی سے میرے ساتھ چل دی۔ باہر آکر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گلی میں سناٹا تھا۔ یہ اسی قسم کی ٹیڑھی پیڑھی گلیوں میں سے ایک تھی جس میں کوئی عمارت سڑجاری رہا تھا۔ اس میں بھی بے ترتیب سے مکانات چھوڑے لیکن ان کی کھڑکیاں دودھ آواز سے بان بند تھے جیسے ان میں کوئی نہ رہا ہو۔ چٹا کافوں کی آواز سن کر بھی کسی نے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جس مکان سے ہم نکلے تھے اس کے دائیں بائیں عین ختم شدہ مکانات تھے۔ سامنے ایک آدھ پلاٹ خالی تھا جس میں جھانپاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر طرف بے رقم مکانات پھیلے ہوئے تھے۔

میں ایک طرف کو لگا چلا گیا۔ ایک بار پھر رمل بھلیوں میں گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جگہ رک کر میں نے منہ سے کہا "تم کچھ رہنمائی کر سکتی ہو؟"

"کہاں تک پہنچنے کے لیے؟" وہ جیسی جیسی آواز میں بولی "جہاں ہم نے گاڑی چھوڑی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ادھر ادھر دیکھتے رہے بولی "کوشش کرتی ہوں۔" اس کی کوشش کے باوجود ہم کافی پر تک پہنچتے رہے لیکن اس میں خود کوشش کرنا تو شاید اس سے زیادہ پہنچتے آخر کار ہم اس کھلی سی جگہ میں پہنچ گئے جہاں میں نے گاڑی کھڑی کی تھی۔ لڑکی صرف یہ تھا کہ اب گاڑی وہاں نہیں تھی۔ مگر نینا نے صرف ہاتھوں کے نشانات بتا رہے تھے کہ اسے ادھر ادھر تھا مگر ایک طرف لے جایا گیا تھا اور یہ یقیناً بڑی فکارتھی تھی کہ ہمیں چاہیے کہ اس گاڑی کا تالا کھولا اور اسے اشارت کرنا کوئی آسان کام

نے کہا "ابن لڑکپن میں میں کافی پریشان رہا کرتا تھا۔"  
"کیوں؟" اس نے ذرا تجسس سے پوچھا۔

"اس وقت میں اس قسم کی کتابیں پڑھا کرتا تھا جن کے عنوان ہوتے تھے۔۔۔ پریشان ہونا چھوڑنے۔۔۔ پریشانیوں اور بگاڑے۔۔۔ پریشانیوں کا آسان علاج وغیرہ وغیرہ۔"

منیف کی مسکراہٹ ذرا روشن ہو گئی۔ میں اپنی جانتا تھا۔۔۔ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "کچھ میں نہیں آتا کہ آپ کی شخصیت کے کتنے رخ ہیں۔"

"ایک بھی نہیں۔" میں نے فوراً کہا "میں تو بغیر رخ و لہر شخصیت کا ہلکا ہوں۔ رخ تو ہمارے رگوں کی شخصیت کے ہوتے ہیں۔ میں بے چارہ کس کی مثال دیتا ہوں۔"

اس نے پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن مٹوی کر دیا۔ چند لمحوں تک سی سڑک پر جا پہنچے مجھے یاد آگیا کہ آتے وقت ہم گاڑی میں ادھر سے گزرتے تھے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے دو عین رکنا کھڑے تھے۔

منیف بولی "آپ خوش قسمت ہیں کہ یہاں اس وقت اس "کھڑت" سے گزرتے کھڑے نظر آ رہے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ آج تو واقعی قدم قدم پر خوش قسمتی کے ثبوت مل رہے ہیں۔" میں نے لعنڈی سانس لے کر کہا۔

تینوں رکشے والے ایک ہی جگہ کھڑے بائیں کر رہے تھے۔ ہم ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے جیتی ہوئی نظروں سے ہمارا سراپا جائزہ لیا۔ میں نے ان میں سے ایک سے گفتگو کرنے کے لیے کہا تو اس نے اور بھی گہری نظروں سے گویا اس پر ہمارا سراپا جائزہ لیا۔

پھر باقی دو نوں رکشے والوں کی طرف مشورہ طلب سی نظروں سے دیکھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ تینوں پراسرار سے انداز میں خاموش ہو چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ رکشے والا انکار کر دے گا یا ہمارا تفصیلی انٹرویو لے گا لیکن اس نے یہ دونوں کام کرنے کے بجائے خاموشی سے گردن ہٹا کر ہمیں اپنے رکشہ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد رکشہ اچھلتا کودنا شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گفتگو کرنے تک کا سفر اتنا طویل محسوس ہوا کہ راستے میں ایک آدھ مروجہ مجھے شبہ محسوس ہوا کہ شاید ہم جگہ پہ جا رہے ہیں۔

نیمت رہا کہ رکشے والے راستے میں بھی کوئی سوال نہیں کیا۔

گفتگو کرنے میں بھی بہت سی جیتی ہوئی نظروں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمارا طبعی ایسا تھا۔ جب میں ریم کل کے آفس میں ٹھہرنے لگا تو ایک ادبی نے ہمارا راستہ روکے اور یہ بتا کر ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کی کہ اندرونی ایس ایس ای صاحب بھی پیچھے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ قصانہ مشورہ بھی دیا کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی واردات ہوئی ہے تو ہمیں پہلے عمر کے پاس جا کر رپورٹ

نہیں تھا۔ اس میں چاروں سے حفاظت کے سارے انتظامات موجود تھے لیکن لے جانے والا ابتدائی تمام انتظامات کو ناکام بنا کر گاڑی لے گیا تھا۔ تاہم وہ زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا۔ اگر اس نے اسٹیشن تک کاٹا ہری لاک کھول لیا تھا تب بھی ایک مخصوص کوڈ نمبر نہ دینے کی وجہ سے ڈیڑھ دو میل کے بعد اسٹیشن تک واپس مل میں خود بخود ایک دو سڑک لگ جاتا تھا اور الارم بجنے لگتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ چرکاڑی کو چھوڑ کر ہمارا جانے کا لیکن کہاں چھوڑ کر ہمارے گا۔ یہ کتنا مشکل تھا۔ اس لیے میں ایک لعنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ منیف میری طرف دیکھ کر پریشانی سے بولی "کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بڑے شاکرانہ لہجے میں جواب دیا "جو کچھ ہمارے ساتھ ہو چکا ہے شاید وہ کافی نہیں۔ اب مزید تھوڑی سی ورزش ہوگی۔"

"مطلب یہ کہ اب تم کسی شاکر کٹ کے ذریعے کسی ایسی قریبی سڑک تک پہنچنے کی کوشش کرو جہاں سے ہمیں جیسی مل جائے گاڑی کی تلاش کا کام میں پولیس کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ خودی اطلاع آجائے گی کہ گاڑی کہاں گئی ہے۔ البتہ اب مجھے اس کی رپورٹ ضرور کرنی پڑے گی۔ کیس میں دو میل کے فاصلے کے اندر ہی اس میں کوئی واردات نہ ہو جائے۔" میں نے جواب دیا۔

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "جیسی تو یہاں دور دور تک ملتی مشکل ہے۔ جیسی والے تو ان اطراف کا رخ ہی نہیں کرتے۔ رکشہ ہی مل جائے تو قیمت ہے۔"

وہ ایک طرف کھل دی۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہم پہ چو گزری تھی 'منیف اب اس کے اثرات سے متنبہ ہو گئی تھی۔ وہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پہلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "آپ پریشان دکھائی نہیں دے رہے اور نہ آپ کے چہرے سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی ہے۔"

"تمہارے خیال میں مجھے کیوں پریشان ہونا چاہیے۔ کیوں ہچکچانا چاہیے؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ یہ نہیں سوچ رہے کہ مجھے کیوں کسی کی مدد کرنے کا شوق چرایا تھا؟ کیا خوار یا اغائی پڑ رہی ہے۔ کس طرح جان جاتے جاتے بنی ہے اور کس طرح میرا بھی مشر خراب ہوتے ہوئے بچا ہے؟"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے لعنڈی سانس لے کر کہا "انسان جب پریشانیوں کو خود دعوت دے تب ہی سمجھ بھج کر بے حد اصرار دلاتا ہو پھر اسے اپنے آپ کو پریشان ظاہر کرنے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں



میں چکر لگایا۔ انہوں نے مجھے اور اس لڑکی منیہ کو کچے میں گرادیا اور خبیثوں نے ٹھنڈے دغیو بھی مارے۔ اور یہ سب کچھ ہماری پڑی سڑک پر ہوا تھا۔ ظاہر ہے جس ملک میں تم جیسے پولیس والے ہوں گے وہاں کی ہوگا۔"

رجیم گل کے جڑوں کے عضلات حرکت میں آئے اور میں سمجھ گیا کہ اس نے دانت پیسے تھے لیکن ڈی ایس پی اللہ بخش نہایت مبہم سکون سے بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا حال وہ لوگ گاڑی لے گئے اور کامران بھی اسی میں رہ گیا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ اتفاقاً رہ گیا یا وہ لوگ جان بوجھ کر اسے لے گئے اور یہ کہ اس کے پیچھے بھی کوئی سازش کام کر رہی ہوگی۔"

میں جان بوجھ کر رجیم گل کو یہ کہانی سنا رہا تھا کہ اگر میری گاڑی کے ساتھ ساتھ اگر کسی اتفاق کے باعث کارچر بھی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اچھی طرح اس کی مصالحتی کریں اور اس سے پوچھیں کہ اس کے باقی سلسلہ ساقی کہاں تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کارچر کا ان ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے کوئی تعلق تھا یا نہیں جو میرے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ میرا حال میں ہوتا تھا اس بارے میں اچھی طرح اس کی فحاشی ہو جاتی۔ میں ممکن تھا کہ اس طرح کوئی انگ کہانی بھی سامنے آجاتی۔

"تم یہ کہنا چاہے ہو کہ کامران کے بارے میں اب تمہیں کچھ علم نہیں؟" رجیم گل بدستور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ اور کامران کے بارے میں تو ہم بعد میں بات کرتے رہیں گے۔ پہلے تم میری کار پھینچنے جانے کی اطلاع دلائیں پر خیر کر دو۔" میں نے کہا۔

رجیم گل اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر بولا "تمہاری رائے میں تو کامران پرنس میرا کے قتل کے سلسلے میں بے گناہ ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔ میری رائے یہی ہے۔" میں نے بلا تامل کہا۔  
"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس جینے سے پرنس کے سر پر وار کر کے اسے ہلاک کیا گیا تھا اس پر ملنے والے فنگر پرنس کامران کے ثابت ہوئے ہیں۔" رجیم گل ٹھہرے ٹھہرے گئے میں بولا۔

ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کا درجہ حرارت کئی ڈگری گر گیا تھا!

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ تمہارے ساتھ واردات تمہارے ایس ایچ او نے کی ہے۔ میرا ایسے بات کریں گے۔" میں نے اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا کہ اسے ہٹانے کے لیے میرا ایک ہاتھ ہی کافی تھا۔ اس نے سلسلے سے پہلے ہم اندر رخصتی چکے تھے۔

میں نے دیکھا کہ رجیم گل اور اس کے علاقے کا ڈی ایس پی اللہ بخش حیرت کو ہلائے طاق رکھ کر نہایت دوستانہ اور داناوانہ انداز میں سر جوڑے بات چیت کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اپنی اپنی کرسیوں پر ڈرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ رجیم گل نے فٹ ٹاؤن سے ہم دونوں کا سر آگیا جائزہ لیا اور بولا "تم تو کہہ رہے تھے کہ میں کامران کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ کیا یہ کامران ہے؟" اس نے منیہ کی طرف اشارہ کیا "کیا اس کی جھن بدل گئی ہے؟" اور یہ تم لوگوں نے طبع کیا بنا رکھا ہے؟"

"دیکھنا میری جان! ایک سانس میں اتنے سوال!" میں نے بے نظر منیہ کی طرف دیکھ کر کہا جو کچھ کہانی ہو گئی تھی "ہم یہ جو مرآت کر رہے ہیں ان میں واقعی کامران کی جھن بھی بدل سکتی ہے۔ اور بدل تک ہمارے طبعے کا سوال ہے تو یہ ہم نے خود کیا بنا رکھا ہے۔ بلکہ اسے زبردستی بنایا گیا ہے۔"

اس نے ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں خود ہی کرسی ٹیبلٹ کر بیٹھ گیا اور منیہ کو بھی میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رجیم گل کے گھور کر رہ گیا۔ ڈی ایس پی اللہ بخش خاموشی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

"تم کو ٹھنڈا دواؤ تو پلو او یا را! آخر ہم تمہیں بہت اہم باتیں بتاتے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

رجیم گل نے اور بھی زیادہ سخت نظروں سے مجھے گھورا لیکن وہ کچھ کہنا نہ کہنا کے کاٹو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس نے ارہلی ڈاکو کو ٹھنڈا لانے کے لیے کہا۔ ارہلی کے جانے کے بعد وہ بولا "میں نے زیادہ خوش غلغلی کی امید تمہیں کسی پولیس والے سے کی تھی نا؟" لیکن اب تم ٹھنڈا آنے سے پہلے زبان بند کر دو۔"

"میں نے زبان تو اتنی کھلی ہوئی ہے کہ لوگ اسے بند کرانے کے لیے جہنم کی آگ سے بھی ڈرتے ہیں۔" میں نے ذرا ناگہمیں پکار کر بیٹھتے ہوئے کہا "میرا حال تو کچھ یوں ہے کہ میں کامران کو گاڑی میں بٹھا کر لے گیا کہ راستے میں ایک جگہ گئے گاؤں میں پینے کی طبیعت چلی گئی۔ ان میں ایک رنگ رہی تھی نا۔۔۔ میں گاڑی ایک طرف روک کر بیٹھ گیا کہ گاڑی کے قریب سے ایک شخص اس طرف سے چار سٹپے لے کر آیا۔ اس نے گاڑی میں تقریباً گھس آئے۔ بے خبری میں اچانک اس نے کسی نے میرے سر پر کھائوٹ کا دست مارا۔ یہ

مکانے اسے اپنے سر پر چوٹ کا گونزدہ کھانے کی کوشش کی



# کالی دنیا

ایم اے راحت قیمت: 100/-



مکمل پڑے گا؟ وہ کات کھائے والے مجھے بھی بولا۔

”ہاں۔ کم از کم اس ربک کا توڑی تو ہونا چاہیے۔“  
 بھی آکر میری بے عزتی نہیں کریں گے کیونکہ اعلیٰ افسر برطانوی  
 افسر ہوتا ہے۔ وہ اخلاق، تہذیب اور اعلیٰ انسانی اقدار دیکھنے کے  
 معافی کسی نہ کسی حد تک جانتا ہے۔ بد زبانی، بد نیتی اور جھوٹا  
 چھوٹی باتوں پر دوسروں کی بے عزتی کرنے کی عادت تو تم چھ  
 چھوٹے چھوٹے افسروں میں پائی جاتی ہے جن کی اپنی کوئی عزت  
 نہیں۔“

”چھا۔ زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جلدی سے  
 میری بات کاٹنے ہوئے بولا ”تمہاری زبان تو واقعی ایک مزہ  
 اشارت لے لیتی ہے تو اسے بریک کٹنے کی فوجی نہیں آتی۔  
 مجھ کی بات کرو۔ یہ بہت عجیب معاملہ ہے۔“

”تمہارے خیال میں اب تک میں غیر مجیدی سے بات کر رہا  
 تھا؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں۔ ”اب اپنی بے عزتی  
 ہونے کی باری آئی تو تم اپنے افسر صاحب کو یہ تاثر دینے کی کوشش  
 کر رہے ہو کہ یہ سب کچھ مذاق میں ہو رہا تھا؟“ میں نے ایک ٹکڑ  
 ڈی ایس بی ایف اللہ بخش کی طرف دیکھا۔ وہ بے چارہ کافی شرف اور کم  
 گو آؤی معلوم ہوتا تھا۔ اب تک وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔  
 بس ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے بیٹھا تھا۔

”بے لگتی ہانکتے رہنے سے تم معیت میں بھی پھنس سکتے ہو۔  
 رحیم نے گویا مجھے خبردار کیا۔“

”معیبتوں کی کیا بات کرتے ہو رحیم گل پیارے؟“ میں نے  
 لٹری سانس لے کر کہا ”تمہارے اس خادم نے پچھلے دنوں کے بعد  
 سے اب تک معیتوں کے سوا دیکھا ہی کیا ہے۔ اور میری زندگی  
 میں جتنی بھی معیتیں آئیں ان میں سب سے بڑی معیت تم ہو۔“

میں نے صنف کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی  
 تھی۔ اس کا انداز بے چارگی، تیز اور معذرت خواہانہ تھا۔ رحیم  
 گل کے انکشاف پر ایک لمحے کے لیے میں اپنی ساری تیزی و  
 طراری بھول گیا تھا اور اس ایک لمحے میں ان گنت سوالات نے  
 میرے ذہن پر طغیان کر دیا تھا۔ کبھی کبھی اس بار میں خواہ مخواہ ہی  
 خدا کی نوجوان بیٹی کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا؟ کیسے یہ میری تعلیم  
 غلطی تو نہیں تھی؟

مجھے یاد آیا کہ کاروان کس طرح غیر معمولی حد تک پولیس سے  
 خوفزدہ تھا۔ یہ درست تھا کہ ہمارے ہاں شرف پولیس سے بہت  
 خوفزدہ رہتے تھے لیکن اس کا خوف کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھا۔ میں  
 نے اسے ہر طرح کے تحفظ کی پیشکش کی تھی۔ اس کے باوجود وہ  
 مجھے اور صنف کو بچاؤ کے رکھا گیا تھا۔ کیسے پولیس کے بارے  
 میں اس کا یہ خوف و حقیقت اس کے احساس جرم ہی کی بدولت  
 نہیں تھا؟ کیسے میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو کر ایک  
 مجرم کی مدد پر تو کمر بستہ نہیں ہو رہا تھا؟

صنف کو یقیناً اندازہ تھا کہ میرے ذہن میں کیا سوالات سر  
 اٹھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اتنی ہی تھک آئی۔ شاید وہ کتنا  
 چاہ رہی تھی کہ مجھے اتنی جلدی کاروان سے بدگمان نہیں ہونا  
 چاہیے تھا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں تمام امکانات پر  
 غور ضرور کرتا تھا لیکن ایک بار جو رائے قائم کر لیتا تھا اس سے اتنی  
 جلدی بنا نہیں تھا۔ کوئی واضح ٹھوس اور ناقابل تردید ثبوت ہی  
 مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

میں نے رحیم گل کی طرف دیکھا۔ وہ کڑی نظروں سے میری  
 طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ بولا ”اٹنی  
 سیدھی کہانیاں تخلیق کرنے کے معاملے میں تمہارا ذہن کسی رائٹر  
 سے بھی زیادہ ذریعہ ہے لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری سٹائی  
 ہوئی ہر کہانی پر آنکھیں بند کر کے یقین کروں گا۔“

”تم چاہو تو آنکھیں کھلی رکھ کر بھی یقین کر سکتے ہو۔ مجھے کوئی  
 اعتراض نہیں ہو گا“ میں نے شیریں لب سے کہا۔

وہ کھانجانے والی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا ”آنکھیں  
 کھلی رکھنے کی صورت میں تو مجھے اس بات کا یقین بھی مشکل سے آتا  
 ہے کہ یہ فعل تمہاری اپنی ہے۔ تم اٹل درجے کے جھوٹے دغا باز  
 اور مکار تو ہو۔“

”دیکھو۔ دیکھو۔ زبان سنبھال کے۔“ الیکٹرک میں نے  
 دھکی تیز انداز میں اٹھ اٹھائے ہوئے کہا ”میں کم از کم الیکٹرک  
 کے لیول کے کسی آدمی سے بے عزتی کرانے کے لیے تیار نہیں  
 ہوں۔ بے عزتی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ جنہیں معلوم ہونا  
 چاہیے میں شہر کا ماسٹر پولیس میں اور نہایت معزز آدمی ہوں۔“  
 ”تو کیا تمہاری بے عزتی کرانے کے لیے آئی جی صاحب کو

نہیں چھوڑوں گا" میں نے کہا۔

وہ اب قدرے بڑے سکون سے بیٹھا ہوا "جو لوگ یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ ان میں کوئی کپکپکس نہیں۔ بعض اوقات انہی میں سب سے زیادہ کپکپکس ہوتے ہیں۔"

"کھانی ملی، انھما کو پنے کی کوشش مت کرو" میں نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

"تم بھی زیادہ بڑا بننے کی کوشش نہ کرو اور اصل موضوع سے مت ہٹو" رجم کل ترکی۔ ترکی ہوا "تمہاری جلی گئے کے رس والی کمانی میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔"

"تم نے اس پر جھنجھٹائی کھیں کا قصور جو کر لیا ہے۔ اس لیے حلق سے نہیں اتر رہی" میں نے مریکا نے انداز میں کہا "بے ملک میں کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں اپنے تصور کو ادھر ادھر بھگتے نہیں دینا چاہیے ورنہ انسان کچھ بھی نہیں کھا سکتا۔ تم تو کھینوں کے صرف جھنجھٹانے کا ذکر کر رہے ہو۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ گنے کے جوس میں دامنوں کے طور پر کھینوں کا بھی کچھ جوس شامل ہوتا ہے۔"

"اس کے باوجود تم اسے پینے کی بات کر رہے ہو؟" رجم کل طریقہ سے بیٹھا ہوا۔

"جہی میں اس ملک کا باشندہ ہوں۔ ایک خت جان قوم کا فرد ہوں اور میں خت جان ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میں غیر ملکوں جیسا۔۔۔ یا غیر ملکوں کی چیزوں پر انحصار کرنے والوں جیسا بننا نہیں چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے غیر ملکی کھانوں کی قیمتیں ہمارے ہاں کھیلنے آتی ہیں تو ان میں سے اکثر پانا پینے کا پانی ساتھ لاتی ہیں؟"

اس نے خاموشی سے مجھے گھورنے پر اکتفا کیا۔ میں نے بات جاری رکھی "حالا کہ کھلاڑی بڑی خت جان مخلوق ہوتے ہیں۔ بے پناہ ورزشیں کرتے ہیں اور آٹھ آٹھ کھینے گری سرور میں میدانوں میں جم کر کھیلنے ہیں اور ہمارے ہاں وہ فاتح انار ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں جہاں پانی کے لئے غلط فائدہ لگے ہوتے ہیں اور جرائم سے پاک۔۔۔ اسٹراٹیزڈ گھاس فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں کا پانی پی کر ان بے چاروں کے پیٹ خراب ہو جاتے ہیں۔ کیا فائدہ ایسی زندگی کا؟"

وہ بدستور مجھے گھورنا رہا۔ میں نے اس کے گھورنے کی پروا کئے بغیر کہا "دوسری طرف ماشاء اللہ اپنی قوم کی خت جانی دیکھو۔ جہاں سے پانی چلائی ہو رہا ہے وہاں پانی میں گدھے اور گتے سرے پرے رہتے ہیں۔ عوامی قسم کے دستروانوں کے کچن دھیکو میں گیزرے جل رہے ہوتے ہیں۔ مچوں میں بھی ہوئی انہیں اور چائے کی پتی میں گدا بوسا ملا کر کھلایا جا رہا ہے لیکن کھانے والے نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ماشاء اللہ اکثر بے گتے رہتے ہیں۔ وہ تو بونیا بھی کھار ڈاکڑوں کی باتوں میں آکر ان کی دوائیں دھیکو کھا کر بیمار ہو جاتے ہیں ورنہ یہ تباہیاں تو ان کے قریب آتے ہوئے ذریعے میں

رجم کل نے پھلا ہونٹ داخل کئے دیا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے مجھے گھورنا رہا پھر گویا خون کے گھونٹ پیچے ہوئے ہوا "نہیں واقعی اس وقت مذاق سوجھتا ہے جب دوسروں کو مذاق زہر لگا رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں پھر کسی وقت بات کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر اس وقت تک پانی سرے گزر چکا ہو گا تو اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں ہوگی۔"

"ہینین" میں نے اس کی تائید میں سہلایا "پانی سرے گزرنے کے ذمے داری تم پر بھلا کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی ذمے داری تو کھڑے تباہی پر ہوگی۔"

رجم کل کے ہینین کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سواک کرے۔ آخر میں نے گویا اس پر زس کھاتے ہوئے کہا "نہیں میری کون ہی بات مذاق لگ رہی ہے؟"

"وہ جو تم نے کبواس کی گئی کہ راستے میں تمہارا گتے کا رس پنے کو پی چل گیا اور تم نے گاڑی روک لی۔ تمہارا خیال ہے کہ تمہاری اس کبواس پر یقین کروں گا؟" وہ غریبا۔

"اس میں یقین نہ کرنے والی بھلا کیا بات ہے؟" میں نے صورت سے پوچھا۔

"تمہارے طبقے کا آدمی سڑک کے کنارے گاڑی روک کر اس لکڑی کی مشین سے گتے کا رس پنے کا جس پر لاتعداد کھانیاں بیٹک دی ہوئی ہیں اور سرور سے نکالنے والے کے ہاتھ بھی رس میں میوہ چھلنے رہتے ہیں؟" وہ ہوا۔

"جی۔۔۔ اتنی سی بات پر تم میرے بیان کو جھوٹ، مذاق اور نہ بننے لیا کچھ سمجھتے رہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا پھر فضولی مانگی "رجم کل! تم واقعی کھانے کے گھاسڑی رہے۔ جہی میں نے قیامت جہت تو نہیں سمجھا ہے کہ وہ صرف تم جیسے کم ظرف ہی دے ہیں جو گاڑی رسات سے اور چھوٹی چھوٹی نیلیوں سے نکل کر اپنے ہیں لیکن شرم میں ڈگر بڑے آدمی بن جاتے ہیں تو اپنے ہیں ہرگز شہانے لگتے ہیں۔ عجیب عجیب مذاق کھانے لگتے ہیں جو اصل میں کسی نہ کسی کپکپکس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ مجھ میں ایسی کم گاڑی کپکپکس نہیں ہے۔ میں نے اپنے دماغی ہونے پر بھی کئی شرم محسوس نہیں کی۔ مذاق کھانے کے مواقع میں میں مذاق کھاتا ہوں لیکن میں نے اپنے اندر کے دماغی کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر وہ بھی باہر آتا ہے اور اپنی بات منوانا چاہتا ہے تو میں اسے دبانے کی کوشش نہیں کرتا۔ انسان کو اپنے اصل سے بازو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اکثر اس میں ہلاکتیں ہوتی۔"

میرے خاموش ہونے کے بعد بھی رجم کل چند سیکنڈ تک مجھے گھورنا پھر ہوا "تمہاری تقریر ختم ہو گئی؟"

"جی! تقریریں کا سلسلہ تو زندگی بھر جاری رہے گا۔ موقع ملے گا۔" میں نے سادہانہ طور پر جواب دیا "میرا تمہارا بیچھا

چمن مٹی تو اس میں قحب کی کیا بات ہے۔  
”وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔“ اس نے کچھ کھٹا ہوا۔

میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے استہزائیہ لہجے میں  
”اے اللہ! اس زحمتی سے اس حقیقت کو حلیم کیا جا رہا ہے۔  
وہ میرا تبصرہ اُن سنا کرتے ہوئے بولا ”لیکن جس طرح  
تیار ہے۔۔۔“ یقین نہیں آ رہا کہ تم سے اس طرح گاڑی بھی  
جاسکتی ہے۔ تم اتنی حیثیت چیز ہو۔ یہ بات میرے دل کو کچھ  
تھیں کہ عام قسم کے ڈاکو، پیرے اور ریزن تم سے اس طرح کا  
چمن کیسے ہیں؟“

”ہو سکتا ہے وہ عام قسم کے ریزن یا ڈاکو نہ رہے ہوں عام  
قسم کے ہوں“ میں نے سادگی سے کہا ”انہوں نے کون سا  
تعارف کرایا تھا یا اپنی درجہ بندی پر کچھ روشنی ڈالی تھی۔ ظاہر ہے  
وہ بے چارے جلدی میں ہوتے ہیں۔ کاندھاری مصوکیات ڈال  
ہوتی ہیں۔ وہ اس قسم کی فضول باتوں میں وقت تو ضائع نہ  
کر سکتے۔“

وہ ایک بار پھر مجھے گھومنے لگا۔ میں نے ترمیم آہو لے لی کہ  
”اس طرح گھور گھور کر تمہاری نظر کھڑ ہو جائے گی۔ اور  
گھورتا ہی ہے تو کسی دلربا حسینہ کو گھورو۔ مجھے گھومنے سے  
تمہاری صحت پر اور بھی خراب اثرات مرتب ہوں گے دیکھو  
یہ کام فرست میں کیا جائے تو بہتر رہتا ہے فی الحال میں میری گاڑی  
چھینے جانے کی اطلاع نشر کرانے۔ یا اتنے معمولی سے کام کے  
بھی مجھے کسی اور سے کنا چڑے گا؟ تمہارے ڈی ایس ایلیا صاحب  
اس وقت قریب ہی بیٹھے ہیں۔ تمہارے مقابلے میں یہ کافی شرف  
اور لائق آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے انہی سے درخواست کرلو۔  
ڈی ایس ایلیا اللہ بخش مجھے جانا تھا اور میرے پس منظر  
تھوڑا بہت واقف تھا۔ وہ بے چارہ مجھ سے خاصا محبوب اور  
رہتا تھا۔ میری موجودگی میں شاذ و نادر ہی زبان کھول کر  
معلوم تھا وہ اس بات پر رنگ کرتا تھا کہ رحیم گل اس کا  
ہوتے ہوئے مجھ سے انکا بے تکلف تھا اور ہمارے درمیان  
فوک جھوٹ چلتی تھی۔“

”اطلاع تو میں نشر کر رہا ہوں۔۔۔“ رحیم گل کا  
باخواسہ اٹھتے ہوئے بولا ”لیکن اگر یہ گاڑی چھینے جانے والی  
فلا ہوئی اور گاڑی تمہارے ہی پاس ہوئی تو میں اسے تم سے  
کر کسی باوجود چوراہے پر کھڑی کر کے اسے آگ لگا دوں گا۔“  
”میں محسوس کر رہا ہوں کہ کافی عرصے سے تمہارا مزاج  
تخریب کارانہ سا ہوتا جا رہا ہے“ میں نے شکرانہ کی  
اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”دیکھو تو خیر تمہارے مجھے  
سے لوگوں میں یہ جراثیم پائے جاتے ہیں لیکن تمہاری  
فوادہی نمایاں ہو کر سامنے آتی جا رہی ہے۔“  
پھر میں نے ڈی ایس ایلیا بخش کو چاہ کیا ”اسی

ایسا ہی انسان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی ثقافت سے رشتہ  
توڑنا نہیں چاہتا۔ تم تو مجھے کے رس پر اعتراض کر رہے ہو مجھے تو  
اگر راستے میں شتو پہنچے نظر آجائیں تو میں وہ بھی پہنچے رک جاؤں  
گا۔ بلکہ میں تو جنگیدی سے سوچ رہا ہوں کہ اپنے قایم اشارہ ہوئی  
میں بھی شتو سروس شروع کر دوں۔ اس سے میرے ہوئی کو سات  
چاند لگ جائیں گے۔“

رحیم گل میز پر سے اپنی موٹی سی سیاہ چھڑی اٹھا لے ہوئے بولا  
”اگر تم نے بکو اس بندہ کی تو میں یہ چھڑی مار کر تمہاری کھوپڑی توڑ  
دوں گا۔“

”اگرچہ اس کھوپڑی پر پہلے ہی ایک حد کو مڑا موجود ہے۔۔۔“  
میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”اس کے باوجود یہ کھوپڑی اس قسم کی  
چھڑیوں سے ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ اس کے لئے جیسے ڈاکا ٹائٹ  
استعمال کرنا پڑے گا۔۔۔“ پھر میں نے ابھرنے آہر لہجے میں کہا  
”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا آخر تم اتنے فحاشی کیوں ہو؟ ایک تو  
ہم اتنی ذلت اور معیشت افکار سے آ رہے ہیں۔ اوپر سے تم آنکھیں  
نکال رہے ہو۔ واقعی ہمارے ہاں کی پولیس بڑی ظالم ہے۔ کارمان  
کے حق میں اچھا ہی ہو اگر وہ کار چھینے والوں کے ہتے چڑھ گیا۔  
تمہارے ہتے چڑھنے کے مقابلے میں کسی کے بھی ہتے چڑھ جانا بہتر  
ہے۔“

”افضل۔۔۔ غیبت! آخر تم کیوں نہیں بول رہے؟“ وہ بہت  
سی زنج ہو کر بولا۔

”میں جی جی تو بول رہا ہوں۔ اب اگر جیسے یقین نہ آئے تو  
اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ میں نے بھی ذرا جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ  
کیا پھر لافٹ سے کہا ”میری داستان غم بالکل جی ہے۔ چلو۔۔۔ اگر  
جیسے مجھے کے رس پر اعتراض ہے تو وہ اس میں سے نکال دیجے  
ہیں۔ گو کہ اس طرح کمالی کچھ ہے رس اور چھکی سی ہو جائے گی  
لیکن اگر جیسے اس طرح پسند ہے تو اسی طرح سی۔ میری گاڑی ہر  
حال میں ہے اور اسی کے ساتھ ہی میں کارمان کو بھی کھو بیٹھا ہوں۔  
ان دو باتوں کے لیے تم مجھے کوئی قسم کمانے کے لیے کہو تو میں اس  
کے لیے بھی تیار ہوں۔“

پھر جیسے مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے بڑی طرح چوکتے ہوئے کہا  
”خدا کی پناہ! تم کیسے غیر ذمے دار آہر ہو۔ تمہارے ساتھ میں  
بھی بکو اس میں الجھ گیا۔ تم نے ابھی تک میری گاڑی کے چھینے جانے  
کے بارے میں اطلاع ہی نشر نہیں کرائی۔ کیا تم انتظار کر رہے ہو کہ  
وہ کسی دوسرے جھوٹے میں پہنچ جائے اور انجن نمبر/چیسر نمبر وغیرہ  
تبدیل ہونے کے بعد فروخت کے لیے تیار ہو جائے؟“

”کیا میں واقعی جین کرلوں کہ تم سے جی جی گاڑی جین لی جی  
ہے؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اب ذرا پر سکون لہجے  
میں بولا۔

”کیوں۔۔۔ اس میں جین نہ کرنے والی کیا بات ہے؟ اس شہر  
میں میں چائیس گاڑیاں مڈانہ چھنی جا رہی ہیں۔ میری گاڑی

کے بعد خاص کر بخوشی سے سلام دعا کی۔  
رجیم گل مجھ سے مخاطب ہوا "انہیں اپنی گاڑی کا نمبر ڈالنا،  
رنگ اور پہنی کا نام وغیرہ لکھوا دو۔ یہ ابھی دائرہ لیس پر پیغام نشر  
کریں گے۔"

پہلے شاید رجیم گل خود جا کر پیغام نشر کرانے کے ارادے سے  
اٹھا تھا لیکن بعد میں نہ جانے کیا سوچ کر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا  
تھا۔ شاید آخری کا احساس غالب آ گیا تھا۔ میں نے گاڑی کی  
تفصیل اکرم کو بتادی۔ چیئر منبر مجھے معلوم نہیں تھا۔ اکرم نے گویا  
مجھے تسلی دی کہ اس کے بغیر کام چل جائے گا۔

وہ کمرے سے جا چکا تو رجیم گل ذرا بد لے ہوئے سے مجھے میں  
گویا از سر نو بات شروع کرتے ہوئے بولا "بکواس بہت ہو چکی۔  
اب تم مجھے سنجیدگی سے۔۔۔ سیدھی طرح بتا دو کہ کیا واقعی کامران  
جنس ملا تھا اور واقعی اسی طرح ہجر کیا جس طرح تم بتا رہے ہو؟"  
"تمہارے ہاں اپنی سچائی کا تعین دلانے کا طریقہ کیا ہے؟"

صاحب! اپنے اس بندے پر کڑی نظر رکھیں۔ یہ ضرور بھی  
اپارٹمنٹ کی بہت زیادہ بدنامی کا سبب بنے گا۔"  
اللہ بخش جو اب تک خاموشی سے بیٹھا مسکراتے جا رہا تھا،  
سمکار کر کھٹا صاف کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا "اے رئیس  
افضل صاحب! اس قسم کے نوجوانوں کی وجہ سے تو اپارٹمنٹ کی  
یکم عزت باقی ہے۔"

میں نے حیرت سے رجیم گل کی طرف دیکھا اور سہلے  
ہوئے کہا "تم نے تو مجھ میں اپنی بڑی منبھوٹا لاپی ہمارا بھی ہے!"  
"مفتول بکواس بندہ کہتا ہے بتاؤ تم سے گاڑی کس علاقے میں  
چھپی گئی تھی۔۔۔ اگر واقعی چھپی گئی تھی! وہ منہ نہ کر بولا۔

"خدا اتم بیساکھی بھی کسی کو نہ بتائے" میں نے غصہ کی سانس  
لے کر کہا "ٹھیک ہے۔۔۔ لک کرنا پولیس کا اخلاقی اور محکمہ باقی  
نفس ہے لیکن اب ایسا بھی کیا کہ تم لوگ بیٹ اسی بے چارے پر  
لک کرتے رہو جو فریاد لے کر آئے۔"

"اچھا۔۔۔ فریادی صاحب! بکواس کو رہنے دو اور میرے سوال  
کا جواب دو۔"

میں نے علاقے کا نام بتایا جہاں سے درحقیقت میری گاڑی  
چوری ہوئی تھی۔ چھپی نہیں گئی تھی۔ علاقے کا نام سن کر وہ  
دواڑہ کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا اور مجھے گھورتے ہوئے  
بولا "تم اس علاقے میں کیا کرنے گئے تھے؟"

"کھولنا۔۔۔ کیا وہ ممنوعہ علاقہ ہے؟" میں نے اٹا سوال کر دیا۔  
"نہی کچھ۔۔۔ بلکہ آج کل تو وہ ممنوعہ علاقے سے بھی کچھ  
بچ کر رہے۔ ان دنوں تو کافر لنگے اور بد معاش بھی اُدھر کاروبار کرتے  
ہوئے گھبراتے ہیں۔ تمہارے طبقے کا آدمی تو دہاں جانے کا تصور بھی  
نہیں کر سکتا۔ تم کیسے چلے گئے تھے؟" اس نے جانتا چاہا۔

"یہ آج تم پر طبقہ بندی اتنی کیوں سوار ہے؟" میں نے تیوری  
پہننے والے ہوئے کہا۔ "کلیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ  
مجھ میں تو ہر طبقے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اسی لیے میں طبقہ  
بندی کا قائل نہیں رہا۔ مجھے خود ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا کہ  
درحقیقت میرا تعلق کس طبقے سے ہے۔ اس لیے تم میرے ساتھ یہ  
طبقہ دیکھو کہ کس منظر میں بات کیا کرو۔"

"میرا اس چلے تو میں تم سے بات ہی نہ کیا کروں" وہ غصہ کی  
سانس لے کر بولا "لیکن کیا کھولنا۔۔۔ تم میرے قدم میں لکھ دیے  
تھے۔"

اسی نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور واپس اپنی کرسی پر  
آویزا۔ مگر اس نے اپنے اردلی کو طلب کیا اور اسے حکم دیا  
"اسکے آئی اکرم کو سمجھو۔"

اور بڑی عرصہ کا اسے ایسی تنی اکرم ٹیک لگا تا تھا اور اس سے  
کچھ پہلے بھی واسطہ نہ چکا تھا۔ وہ بھی مجھے ابھی طرح جانتا تھا اور  
شرف آدمی تھا۔ رجیم گل کے تھانے میں شرفا کافی معقول تعداد  
میں نظر آتے تھے اکرم نے ذرا وقت سے مجھے پہچانا اور پہچانے

پراسرار ہولناک اور ناقابل فراموش کہانیوں

کا انتخاب

ایم اے راحت کے قلم سے

بدن کا قیدی

قیمت: 70/-

اردو بازار لاہور

دستک

انوار صدیقی (ذریعہ طبع)





آپ کو کہاں لئے کے لئے بلایا تھا؟

میرا خیال تھا کہ میں اسے اور ادھر کی باتوں میں الجھائے رکھنے میں کامیاب رہا تھا اور یہ ضروری سوال کہ بھول کیا تھا مگر وہ بھولنے والا نہیں تھا اور نہ ہی وہ سوئے دماغ کا آدمی تھا۔ لیکن مفید بھی خواص یافتہ ہونے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ جس کے ہاں کامران نے پناہ لی تھی ان کا نام ہرگز سامنے نہیں آنا چاہیے تھا اور یہ بھی ملے تھا کہ کامران اب وہاں وہاں نہیں جائے گا چنانچہ ان بے جا روروں کے لئے پریشانی کا باعث بنے گا کوئی کامیاب نہیں تھا۔ مفید گویا اس سوال کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی۔ وہ فطرتاً ہی بغیر ہولی "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں دوپوش تھا لیکن اس نے ہمارے دروس میں فون کر کے مجھے اسی ملائے کے ایک بس اسٹاپ پر لئے کے لئے بلایا تھا۔ جس ملائے میں افضل صاحب کی گاڑی بھی تھی ہے۔"

اس نے بڑی عمدگی سے بات بنائی تھی۔ رجیم گل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس نے پلک جھپکاتے بغیر پوچھا "اور آپ افضل صاحب کے پاس کیسے جا رہی ہیں؟"

مفید نے اسے پورا پس منظر بتایا کہ کس طرح کامران شادی کے امیدوار کے طور پر پرنس میرا کے ہاں انٹرویو دینے گیا تھا اور کس طرح گیت پر اس کی جھ سے ملاقات ہوئی تھی "میں نے اپنی کسی مصیقت کے تحت اسے اپنا وزینگ کارڈ یا تھا جو اس کے ہاتھ سے مفید کے ہاتھ میں پہنچا تھا۔ دوپوش ہونے سے پہلے وہ خود ہی تجویز پیش کر رہا تھا کہ افضل صاحب کے پاس چٹنا چاہیے شاید وہ ہماری مدد کریں لیکن پھر شاید اس کی ہمت نہیں پڑی تھی اور اس نے دوپوش ہونے کو ترجیح دی تھی۔"

مفید بات جاری رکھتے ہوئے ہولی "لیکن دونوں کی دوپوش کے بعد جب اس نے مجھے اس مضائقہ ملائے کے بس اسٹاپ پر لئے کے لئے بلایا تو میری اکیلے جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ تب میں افضل صاحب کے پاس جا پہنچی "اس نے بڑی عمدگی سے معمولی سی ترمیم کرتے ہوئے بات بنائی تھی۔"

"اور یہ فوراً آپ کی مدد پر کمر بستہ ہو گئے ہوں گے" رجیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لوگوں کی مدد کے لئے یہ ہمیشہ کمر بستہ رہتے ہیں۔ یہ ان کا مشغلہ ہے۔"

"اس پکڑ میں انہوں نے تو بڑی تکلیف اٹھائی۔ اتنی جتنی گاڑی بھی چلی گئی" مفید کچھ کھسیا ہٹ اور کچھ آنکھ سے ہول۔

"آپ کو افسوس کرنے کی ضرورت نہیں" رجیم گل جیسے ہوئے لیے بھی بولا "لوگوں کی مدد کے سلسلے میں یہ اس سے بھی زیادہ خراباں اٹھا چکے ہیں۔"

"میں تو ہماری مدد کے سلسلے میں بھی کافی خراباں اٹھا چکا ہوں ہمارے دودھی پوش! انہیں کہوں بھول جاتے ہو؟" میں نے دیکھے تھے یہ ایک۔

"بھولا کہاں ہوں کم حرف انسان! بھول چکا ہوں گا تو انہیں نہیں میں میرے افسوس کے سامنے بیٹھ کر اتنی زبان چلے پاس لے کر اتنی عزت افزائی کیسے کر سکتے تھے؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"عزت افزائی تو خبر میں ہمارے افسوس کی بھی کر سکتا ہوں۔ اور جہاں تک کم حرفی کا تعلق ہے تو تم مجھے لڑکیوں کے طعنے دے دے کر کم حرفی پر اتر آئے پر مجبور کیسے ہو؟ جیسے کیا معلوم کہ میں کس کس کی مدد کر چکا ہوں۔ اگر تمنا ہوں۔ تم ایک بڑے خبر نگار کے جھوٹے "خبر افزا" نہیں تو یہ بھی بتائیں ہو کہ تمہاری ہانگ تے کیا ہو رہا ہے۔"

وہ ایک لمبے خاموشی سے مجھے گھورتا رہا پھر ہاتھ جوڑ کر بولا "چھوڑا۔ اٹھا کے دیکھئے۔ اب تم جاؤ۔ ہماری جان بچو۔ جتنی دیر تم یہاں رہو گے یہاں کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ یہ خداوند چاہا ہو جائے گا۔"

"دیکھا تم نے۔" میں نے مفید سے کہا "میں وہ قسمی ہوں جس کے سامنے پولیس والے بھی ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اور وہ پاکستانی پولیس والے۔" میرا نام گیزیک آف ورلڈ ریکارڈ میں آ چاہیے "پھر میں نے رجیم گل کو مخاطب کیا "اور جہاں تک غلطی کے اندھا ہونے کا تعلق ہے تو اس کا الزام مجھ پر رکھنے کی کوشش مت کرو۔ جس تھانے کے تم انجان ہو گے وہ تو میرا حال اور غلط ہو گا۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ میں اور مفید رخصت ہونے لگے تھے کہ اسے ایسی آنی اکرم ہاتھ میں ایک کاغذ لے کر میں داخل ہوا۔ وہ مجھے رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "واٹس اپ؟"

ہمارے پیغام کے جواب میں اطلاع ملی ہے کہ آپ کی گاڑی لنگر ہے۔ جس جگہ کا آپ نے ذکر کیا تھا وہاں سے کچھ دیر اور اس حفاظتی الارم بجنے لگا تھا اور اسٹیرنگ ویل لاک ہو گیا تھا۔ لڑکے اس میں موجود تھے۔ وہ اتر کر ہانگ رہے تھے۔ افضل نے ایک موبائل وہاں سے گزوری تھی۔ پولیس والوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے ٹی بی سے کئی بار گولی مار دی۔ ایک گولی ایک کانٹیل کی ٹانگ میں لگی ہے۔ ہمارا لڑکے قابو میں آگئے ہیں لیکن۔" وہ ہچکچاہٹ آہستہ سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" رجیم گل نے دریافت کیا۔

"ان کا کہنا ہے کہ گاڑی انہوں نے کسی سے چھپی نہیں تھی۔ انہیں تو ایک جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے انہوں نے کھڑا کر اور انجین کی تاریں جو ڈر کر پڑی تھی "کرم نے بتایا کہ ان میں سے ایک نے کہا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ یہ سب حال انہی معلومات ہیں۔ اصل باتیں تو تفتیش کے بعد ہی بتائیں گی۔"

رجیم گل نے سوالیہ سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے کچھ اٹھا کر دیکھا ہے کہ "مرا خیال ہے، جن میں سے ایک نے





سے کار اور کام نہ آتے تھے

”بھئی نے تو“ دیم کیلئے چھوڑا۔  
 چند گئے بعد وہ تیں پای دو دو انوں کو دیکھتے ہوئے  
 لے گئے ان میں ایک ڈرا لیا اور دوسرا چھوٹے قد کا فٹ بال  
 ڈپٹے پٹے تھے مگر سخت جان معلوم ہوتے تھے لیکن اس وقت وہ  
 ٹپکی طرح نظر آ رہے تھے ان کی شکلیں گور کر اس وقت بھی  
 تھیں اس کے بل بوتوں کے چوں سے سنبھلی یا غلامیہ  
 بلکہ خرافت عیاں تھی۔ گو کہ وہ معلوم اور سنبھلی نظر نہ کی جاتی  
 تھی کو خوش کر دے تھے مگر خوں پر عمل کے نفوذ اسے کھینچ  
 لے کر یہ کو خوش ذرا بھی کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔  
 ان کے ہونٹ سوسے ہوئے تھے اور ان سے خون بہہ رہا  
 تھا ایک کاٹا ساٹے کا ایک رات بھی ڈرا لیا تھا تو اسے چھوٹی  
 پر نیل نمودار ہو چلے تھے اور دیم بھی دکھائی دے رہا تھا  
 ظاہری حالت تھی۔ اور عملی حالت شاید اس سے زیادہ بھی خراب  
 تھی لے بے اعتبار مگر ہی ملی جاتے ہوئے کما حقہ سے تو جھجکا  
 رفتار تھیں جو تھکی ہے۔ انا کو تک اٹھیں۔“  
 ایک کاشییل جو ان میں سے ایک کی چھٹی پکڑے کر دیا  
 گئی تھیں کی سے ہوا۔ ”سنگے تھیں جو کھارے گئے ہیں سب اور  
 پھر انہوں نے تو ہمیں باہر لے کر بھی لٹھا کر کے کی کو خوش کی جاتی  
 وہ تو طلبہ قسمت اچھی تھی جو ان میں سے ایک کے ساتھ سی  
 لی کر گئی ورنہ ہم میں سے کئی تو خبر سے نہیں پھنسے ہوئے ہوتے ہوں گا  
 طرح گاڑی ہی میں اللہ کو پارس ہو جاتے۔ ہمارے ساتھ ہونا  
 سبک ہوتا ہے کہ بھرے ہوں کی طرح گاڑی میں پھنسے ہوئے ہیں۔“  
 وہ کاشییل غالباً دوسرے خانے سے آیا ہوا تھا۔ بات اس کی  
 متعلق تھی لیکن جس طرح میں دیم کی کو چھڑتا رہتا تھا ایسی  
 میں نے کیا اسے بھی ذرا چھڑنے کے لیے کہا تھا۔ کوئی بات  
 نہیں۔ اس کی کی اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب مطلب تک  
 اٹھارے آتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے ان دونوں فوجیوں  
 کی طرف دیکھا جن سے کچھ طرح کڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔  
 کاشییل بدور میری طرف دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب  
 نہ دیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کون ہو سکتا تھا۔  
 میری حالت کچھ ایسی معززانہ نہیں تھی۔ میں کافی بھڑا ہونے لگا  
 یاد دہرائی تھی۔ میں نے کچھ بولا ہوا تھا۔ میرے سوت کی حالت  
 تھی اور شاید اس میں اب بھی کہیں کہیں گھاس پھوس اور بچے  
 دھواں اٹکے ہوئے تھے۔ تمام حیدر علی کے بعد دوسرے مال میں  
 لباس دیم کی موجودگی کچھ اشارے دیتی ہے۔ اور پھر  
 ”صاحب“ کے قریب کر رہی ہر گز نہیں پھیلانے بیٹھا تھا اور  
 کیا جا سکتا تھا کہ مجھے صاحب کی موجودگی کی کوئی خاص ہوا  
 تھی۔  
 نام ایک اسے اللہ آئی جس نے دوسرے دو جوان کی چھٹی

کاشییل دیم کی بھی ہوا ہے۔ کس تو وہاں بھی دیم نہ ہو۔  
 لوگ ابھی انہیں پہچانتے انکار کریں۔“  
 ”میرا نام لیا۔“ دیم کی نے بڑے رعب سے کہا۔  
 بھی کہ نہ کہ بعد میں انہیں تھیں کے لیے بندے یا گاڑی نہ  
 ہوں میں سے جس چیز کی ضرورت تھی وہ انہیں پہچانی جائے  
 گی۔“  
 ”وہ کے سوا“ کہنے میں لپٹ گیا اور باہر چلا گیا۔  
 دیم کی میری طرف دیکھ کر ہلا۔ ”تم ایک بار پھر بندہ جلاؤ۔“  
 میرے مقدور کی خرابی کا وہ ہے۔ آج تم نہ جانتے کہ کچھ میرے  
 سوا ہوا ہو گے۔“  
 ”میرے مقدور کی خرابی کا نہیں“ مقدور چمک اٹھے۔ ”میرے مقدور کو  
 ٹاٹھرے انسان!“ میں نے دوبارہ کر ہی سنبھالتے ہوئے اور صہید کو  
 بھی پٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
 انہیں وہاں کافی دیر بیٹھا رہا۔ اس دوران میں دیم کی فون پر  
 بھی مصروف رہا اور کمرے سے اندر باہر بھی اس کی آمد رفت  
 جاری رہی لیکن جو ہی اسے کچھ دیر بیٹھے کا شروع میرا آواز آئے اور  
 صہید کو کھینچنے کی کوشش کرنا کہ شاید ہمیں کوئی اکیلا ہوا معلوم  
 ہو جو اس کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے لیکن ہم اس کی معلومات  
 میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں خود کچھ معلوم نہیں تھا  
 اسے کیا تھا۔ دیم کی کو اس بات کا یقین نہیں آیا تھا۔  
 وہ مجھے گھورتے ہوئے ہوا۔ ”اب جو کچھ ہمیں خود اس قسم کے  
 معاملات میں ٹانگ اڑانے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اس لیے تم کچھ  
 کچھ ضرور چھپائے رکھنے کی کوشش کرو گے اور آخر میں اپنی  
 بازی گری کو کھانے کی کوشش کرو گے۔“  
 ”دل پھر مات کرو“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”مگر میں نے  
 ایسی کوئی ہائی گری دکھائی بھی۔“ تو اس کا کڑھٹ نہیں دے دیا۔  
 گا۔ افسران بالا کی طرف سے تحریف و توصیف اور شاہی حجاز سے  
 مجھے میں آئے گی۔ تمہارے پاس تحریف استاد کا جو پتہ ہے۔  
 اس میں ایک دوسرے ٹیکٹس کا اور اضافہ ہو جائے گا۔“  
 ”مجھے خیرات میں کڑھٹ نہیں چاہیے۔“ وہ بڑا سادہ بنا کر ہوا۔  
 ”چاکر کڑھٹ اپنے پاس رکھو۔“  
 اس وقت تک ڈی ایس ٹی اللہ بخش اس کے ساتھ بیٹھ کر اور  
 میں کسی بینک کارڈ کر رہا تھا۔ میرے بعد رخصت ہو چکا تھا۔  
 میں نے اور اور دھرم مجھے کے بعد قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے  
 کہا ”اب تمہارا افسر بھی چاکر ہے۔ اب کس لیے اتنی بے  
 غمازی دکھا رہے ہو؟ انسان کو اپنی اوقات اور دوسروں کے احسان  
 نہیں بھولنے چاہئیں۔“  
 ”میں مشورہ میرا تمہارے لیے بھی ہے۔“ وہ حیرت سے ہوا۔  
 اسی طرح کی باتوں اور دیم کی کی معلومات میں کافی وقت  
 گزر گیا۔ آخر ایک کاشییل نے آکر اطلاع دی کہ دوسرے خانے

کڑی ہوئی تھی اہل اغار پولیس فوج کو بھی کسودہ ملگھ ہی  
 کیا آج اور یہ صرف دھڑے کا شوق ہے ہی کا کل ہے گنہ گار  
 چاہیں گا ان انسانوں کے کھل اورد دھول سے بھی زیادہ بھی  
 قدرت رکھنے والے بھی معصوم اور فرستے میں جانتے ہیں اور جان کی  
 پشت پائی کرے والے بھی مختلف اھنگوں کے دے سے ان کی ہے  
 کھلی کھلا کر دے دے چہ وہ  
 بہت خوب یا سہہ ان میں سے آس کا مر یا جاکر لے ہوئے  
 کی جہز و زخم کی کے بھی ملکر معلوم ہوئے کیا ان کے ساتھ  
 پھر تو انھیں نہیں رہے ہی کی ہے۔ میرا اور وہ خاکر شاہ و بھی  
 دوسرے قاتل سے آقا قاتل

وہ بھی میں میرا ہے وہ ہے ہلا۔ ان میں سے قاتل  
 کہہ چکی اس قسم کے لوگ میں ہوا کیا ہی ہے کھلا ہوا  
 بالکل اور دنیا کا۔ تکلیف نہیں ہے۔ کتنی ہوتے ہیں ان کے  
 پکے ہانے کے بعد اسی کی دھڑ میں بہت ہی کام کی باتیں معلوم  
 ہوئی ہیں۔ کئی دنوں سے پولیس کو مطالبہ ہے۔ تب آپ کو یہ سر  
 حیت ہوئی کہ اس سے پہلے بھی یہ کار میں ہی کہنے دینی اور  
 اس کے فوج کا گزراں مینے کے انعام میں باہر چرچہ کیا ہے  
 کیا ہے میں لیکن ہر جہز و زخم ہوا ہوئے ہیں اور یہ بھی ہیں  
 تھک کوئی تھکی ملش شادت نہیں تھی۔ ان کی آوازہ قرین دھڑی  
 اور آج میں کے بعد پولیس کو زیادہ سرگزی سے ان کی تلاش  
 تھی ان کی آوازہ تھک ہیں۔ اور زیادہ یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ  
 جب عزم کو اتنی مرتبہ جرم کرنے پر بھی نہ آئیں تو ہم اس کے  
 حلقہ مت بڑھ جاتے ہیں۔ وہ دونوں سے زیادہ بے خوف ہو جاتا  
 ہے۔

انہی سے دے والے فوجوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بھی  
 ہن پہلے اس نے ایک فوجوں سے ایک جیسی کار چھیننے کی کو مشق  
 کی۔ وہ بھی فوجوں فوج تھانے میں سے اور آخرت کی۔ اس نے  
 لی کی مثال اس کے منہ میں کھینچ کر کو لیان چلا کر۔ اس کا بھیجا  
 اور گیا کہ۔ اور آپ کو معصوم ہے۔ وہ اپنے والدین کا اکھڑ  
 بڑا تھا۔ لدا ہر سے چار لڑا اکاؤنٹ آگور میں کرتے کیا تھا۔ چند دن  
 بعد وہ ایک جگہ ملازمت شروع کرنے والا تھا اور والدین اس کے  
 لئے رہتہ و ضرورتے بھر رہے تھے۔ مرزا آپ ان والدین کی کیفیت کا  
 آوازہ کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی اکھڑے لڑکے کی  
 پرورش اور انہی تعلیم میں صرف کر دی۔ یہ کہہ کر ان کی تمام  
 اس لئے اور اس لئے کا مرکز تھا۔ اور میں اس وقت جب وہ عرق  
 پہنچا تھا اسے فب سرگھ میں اس لیے بے دردی سے مار کر  
 ہلک دیا کیا کہ اس نے اپنی وہ گاڑی چانے کی کو مشق کی تھی جو  
 اس کے بڑے خند اور فراخ منہ کے والدین سے لی تھی۔ وہ ان کے  
 دھاک سے کہہ چوہ کر بھی لیکن اس کے لیے خود لڑنے کے کہ  
 پہنچ کر تھے اور والدین نے بھی کچھ بھیج تان کر کے لے کر دی

تھی۔ میں خود بھی دولت مصلی کے اس قسم کے حکاموں کے  
 خلاف نہیں۔ اس طرح بہت سے دوسرے لوگوں کے دھاک میں  
 لہا اس محرومی پر ہوا ہے۔ اس کے باوجود میرے خیال میں کسی  
 کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ میرا کہی سے اس کی میں جو بھی  
 سے اور مزاحمت پر اس کے ساتھ میں لڑی تھی کہ اس کا بھیجا  
 لڑا ہے۔

وہ بڑا دور۔ اس میں نے نہایت کامیاب و قہر ہے وہی  
 مصلی کی بات کی۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا تھارے مجھے میں دیا  
 دیکھنے والے دور اس سے سوچ بچار کا کام لینے والے بھی موجود  
 ہیں۔

وہ آئے ہیں آج غلامانہ ازبک فرخا لیکن میں نے اسے  
 پروردہ ان کر کر کاٹ کیا تھا۔ وہ حکمرانے ہوئے ہولا۔ ہر تہہ  
 قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اس میں بھی مجھے باکشی بھی ہوتے  
 بارے میں۔ راجے قائم نہیں کرتی جا ہے کہ اس میں ہر قسم کو  
 ایک جیسے ہوں گے۔

پھر وہ چھوٹے قہ کے فوجوں کے مجھے پروردہ رسید کرتے  
 ہوئے ہولا۔ اس کا بھی ایک کارنامہ آپ کو یاد۔ ان دونوں نے  
 چھلے دونوں ایک میں اسلحہ ملاتے سے ایک خانہ سے کاویہ  
 کی کو مشق کی۔ خانوں نے کیا مزاحمت کی یا ان کی مرضی سے  
 خلاف کوئی حرکت کی۔ اس فوجوں کے پاس اس وقت فخر اور  
 لی جو چیزیں موجود تھیں۔ اس نے انہوں استعمال کیں۔ پہلے  
 خانوں کے بیت پر فخر سے اور پھر ان کے جرم سے۔ گوریاں  
 ہوں۔ وہ ہر جگہ پر اس طرح کر رہی کہ اس کی آستیں بھی نکل کر  
 روک رہیں تھیں۔ اور نہ۔

وہ بھی بہت تہہ سے انداز میں ایک سے لے جے جاسوس  
 ہو کر کیا اصل میں جاسوسی ہوئی کوئی چیز تھے ہوئے ہولا۔ میرا وہ  
 خانوں امید سے تھیں۔ آخر اس فوجوں اور اس خانوں کا۔ ان  
 دونوں گاڑی والوں کا کیا قصور تھا؟ صرف یہ کہ انہوں نے سادات  
 مشی سے گاڑی ان بھڑوں کے حوالے نہیں کی تھی۔؟

اس نے دانت چیں کر چھوٹے قہ کے فوجوں کی گاڑی پر ایک  
 زور دار ہاتھ رسید کیا۔ وہ آواز سے نہ گرتے کرتے صرف اس  
 لیے جی کیا کہ اس کی چھتری کی زنجیر کا کھیل کے ہاتھ میں تھی۔  
 اسے ایسے اتلی کر یا اسے غیلا و نصب پر قابو پاتے ہوئے ہولا۔ اس  
 وقت یہ یہاں کھڑے کافی معلوم اور مشکین گف رہے ہیں۔ ان کی  
 شکلیں دیکھ کر شاید کسی کو آواز نہ ہو سکے کہ یہ کیسے کیسے کاروائے  
 انجام دے چکے ہیں۔ یہ تو وہ چند باتیں ہیں جو قوموں کی دہریا  
 ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان کے علاوہ میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ  
 ان کا تعلق کار میں جیسے یا چوری کرنے والے والے اور بات بات  
 پر قتل کرنے والے خطرناک مجرموں کے ایک گروہ سے ہے جس  
 کے چار کاران بچکے دنوں پکڑے جا چکے ہیں۔ ان کی رہائی کے لیے

دو تین بڑے نامور لوگوں کے خون آپکے ہیں اور دوا بھی پڑنا شروع ہو گیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان معاملات کی جزیں کہاں تک پہنچی ہیں اور دوسروں کہاں سے ملائی جاتی ہیں۔  
در حقیقت وہ بے ساری باتیں تو رجم گل کے گوش گزار کر رہا تھا لیکن چچ میں میرے بول پڑنے کی وجہ سے دوسرے تین میری طرف ہو گیا تھا۔ اب رجم گل نے مداخلت کی اور اے ایس آئی سے مخاطب ہوا "بھائی! سب کو سب باتوں کا اندازہ ہے۔ دوا نہیں اس بات کا ہے کہ کہیں کوئی املاح کی صورت نظر نہیں آتی۔"  
پھر اس نے مجھے مخاطب کیا اور دونوں فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ تم سے گاڑی پیچنے والوں میں تو شامل نہیں تھے؟"

اس سوال پر دونوں فوجیوں نے بیک وقت سر اٹھا کر شروع شروع انگوٹوں سے مجھے ٹھکرایا۔ میں نے لٹی میں سر ہلایا۔ تب انہوں نے شاید قدرے مطمئن ہو کر دوبارہ سر جھکایا۔ رجم گل نے تیسرے کا ٹیبل سے پوچھا "گاڑی کہاں ہے؟"  
"سر! پھر کیا دوا نہیں کھڑی ہے۔ اسے کچھ نقصان بھی پہنچ چکا ہے۔" ٹیبل نے جواب دیا۔

رجم گل سر ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "ٹھیک کوئی بات نہیں۔ نقصان بھی پورا ہو جائے گا۔ فی الحال تم گاڑی رکھی کارروائی کے لیے بیس چھوڑ جاؤ۔ میں خود ہی بجوادوں گا۔"  
"گاڑی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے" میں نے بے نیازگی سے کہا "وہ میری انگوٹ کی گاڑی نہیں ہے۔ اصل مسئلہ دوا داتوں کا ہے۔ دوا داتوں کے سلسلے میں کچھ ہونا چاہیے۔"

اے ایس آئی فوراً بول اٹھا "سروان! بد مشاقوں کی گرفتاری کی خبر باہر جاتے ہی انہیں چھڑانے کے سلسلے میں کچھ خاص ہفتیوں کے خون آنے شروع ہو جائیں گے۔"

رجم گل پر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے۔ اس مرتبہ ذرا ان خاص ہفتیوں کے نام نوٹ کرنا شروع کرو۔ بلکہ ہو سکے تو بیس ان کے جو خون آئیں انہیں شپ کرائے کا بھی بندوبست کرو۔ اس مرتبہ ذرا ان خاص ہفتیوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس مرتبہ ذرا گرفتاری سے تفتیش ہوگی۔ ہم سارے شہر میں ہونے والی اس قسم کی دوا داتوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کر سکتے لیکن اس سینٹر ورک کے کم از کم کسی حصے تک تو ہماری رسائی ہوگی اور ہم اس میں کچھ کی تو لا سکیں گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اے ایس آئی کی طرف دیکھ کر کہا "ہاں بھئی۔ اب اس معاملے میں غلط کوئی کامیگ نہیں کیا ہے۔ اب کچھ نہ کچھ تو ہو گا" پھر میں نے اٹھتے ہوئے رجم گل سے کہا "میں اب چلا ہوں۔ تم پرنس میرا والے معاملے کے ساتھ اب اس معاملے کو بھی دیکھو۔ ضرورت پڑی تو مجھ سے رابطہ کر لیا۔"

"یہاں تو نہ جانے کون کون سا مسئلہ ساتھ ساتھ چلا رہا ہے۔ صرف یہ بد مشاق خوزاری ہیں۔ مشاکی کا ایک حصہ جال پھیلا ہوا ہے۔" رجم گل حنفی سانس لے کر بولا پھر اس نے بیس رکھی ہوئی ٹوٹی اٹھا کر سر رکھی اور اسیے ساتھ باہر نکلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

کیا دوا میں آکر میں نے اپنی گاڑی کا جائزہ لیا۔ اس کا ٹیو پڑی ہے دردی سے کھل کر گر کر اٹھا گیا تھا۔ ریمورس کسے وقت گاڑی کہیں ٹنگ بھی گئی تھی جس کی وجہ سے ایک ٹیل لائن ٹوٹ گئی تھی اور کوئٹے میں بہت پرانے پڑ گیا تھا۔ توڑی سی تھی تو پھر اور ایک اگلے دوا داتے پر دو گولیوں کے نشان بھی نظر آ رہے تھے۔

"جتنی دیر میں خاصی ڈرگٹ بن گئی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "رجم گل! بیڑا نہیں معلوم ہے اس گاڑی کا صرف ایک تھانہ میں ہزار روپے میں پڑا ہے۔ اور وہ بھی یہاں باؤ کیٹ میں نہیں ملے گا۔ ڈیڑھ خور اسپرٹ کر کے منگوا کر دیتا ہے۔"  
"تم میری معلومات میں یہ جتنی اضافہ کیوں کر رہے ہو؟"

کر بولا "مجھے خسر آ گیا تو میں اس کے باقی سب آئے بھی ڈرا کر چھوڑا دوں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم لوگ اتنی جتنی گناہاں کیوں رکھتے ہو؟ اسے بے جا اعتراضات اور اپنی دولت کی لاپرواہی کیوں کرتے ہو؟ ہماری سرکوں پر گاڑیاں جمانا دل کی رفتار سے تو دوڑنے سے نہیں۔ ایک کم قیمت گاڑی بھی اتنی ہی تیر دوڑ سکتی ہے جتنی تھماری بے جمانا گاڑی۔"

"کچھ تو قریب کل سب ہم بے چارے دولت مندوں کے خلاف ہو گئے ہیں۔ سب جیلس ہو گئے ہیں۔ اپنی جائز اور طلال کمانی سے بھی ہمیں ابھی چیزیں غریب نے رونا نہیں چاہتے" میں نے حنفی سانس لے کر کہا "پہلے بتاؤ چارے کل اگر میں کم قیمت گاڑی رکھتا تو اس کے پیچھے جانے یا چوری ہونے کا خطرہ ہوتا؟ یہاں تو دس دس میں میں سال پرانی نہایت چھٹی چھٹی گاڑیاں۔ بلکہ سڑا بیکیں بھی جھینلی جاتیں ہیں۔"  
"اس میں نقصان تو کم ہوتا ہے نا" وہ گڑبادی دور کی کوڑی لایا۔

"حق کوئی بات اگر کسی نے بیس بیس جمع کر کے بڑی مشکل سے سڑا سائیکل یا کچھ چھٹی سڑی گاڑی خریدی ہو۔ اس سے اگر وہ بچیں جائے تو اس کے لیے تو اس سے بھی بڑا نقصان ہو گا جتنا میرے لیے بڑی سڑی سڑی چھین جانے کا نقصان ہو سکتا ہے۔"  
وہ خاموش رہا تو میں نے اس کا کدھا چھپکے ہوئے کہا "وہ تھماری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خود لائی یا اپنے خود سے پن کی تفتیش کے لیے ایسی چیزیں نہیں خریدتا۔ میں خود اس کے خلاف ہوں لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں دولت مند ہوں۔ اسی

لے دولت مند و نگر توں گا جین مجھے اپنی دولت مندی کی تلاش کا  
 کیس نہیں ہے۔ ہر حال میں مجھیں اپنے خاندان کا کوئی قریب  
 اہل ہرگز تصور کرتے ہوئے تھاری نصیحت پر بھی کسی حد تک  
 دل کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کر صوفیہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کرنے  
 سے قائل ہوئے۔ چند قدم کے فاصلے پر ہی ہمیں جس کی  
 پہلے میں نے صوفیہ کو اس کے کمرہ چھوڑا۔ اس نے ٹھیک اپنے  
 کمرے کے کچھ دور پر رکوئی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اس وقت تک  
 شام کا صوفیہ کا پہل چکا تھا۔ اس کے ملنے کی خرابی کو زیادہ محسوس  
 نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا کمرہ ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں زیادہ  
 ڈھلچڑھا ہوا تھا۔ اس نے فیروز اور شانیوں کی مدد  
 سے اپنے کمرہ کا پتہ مجھے سمجھانے کے بعد کہا "شام ضرورت کے  
 وقت آپ یہاں مجھ سے ملے آسکتے ہیں۔ ایک مکان کی اوپر کی  
 چلی پر عمارت کروں گا ایک چھوٹا سا پورشن ہے جس کی بھرتہ کچی  
 نہیں ہے۔ برسات میں چھلے ہے۔ فون ہمارے ہاں نہیں ہے ورنہ  
 ہفتہ ضرورت آپ مجھے فون کر سکتے تھے اور میں آپ کے پاس  
 حاضر ہو سکتی تھی۔ الگ مکان کے ہاں فون ہے اور وہ لوگ ازراہ  
 حالت میں ہوا بھی دیتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس پر رابطہ کر سکتے  
 ہیں۔ یہ میں کو شش گھنٹہ کی کہ غرضی آپ سے رابطہ رکھوں۔"  
 "مگر کامران نے تم سے رابطہ کیا یا میں آج تو سب سے پہلے  
 تمہیں اطلاع دے دوں گی" میں نے ہدایت کی۔

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فیصلہ تو میں ہی دل میں پہلے  
 کر چکی ہوں" وہ بولی اور رخصت ہو گئی۔

واپس ہو کر صبح کو اس رات میں نے آرام کیا لیکن دوسرے  
 دن میں بھی سب سے جلد حرکت میں آیا۔ میرے سامنے دو نام تھے۔  
 ایک جیشہ کریم اور دوسرا جمال سعیدی۔ جیشہ کریم کے بارے  
 میں مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ پرنس سیرا کی ایک کنبی امپورٹ  
 ایکسپورٹ کارپوریشن میں اس کا پارٹنر تھا۔ جمال سعیدی سے بھی  
 اس کا کوئی کاروباری تعلق معلوم ہوا تھا۔ کامران نے مجھے جو اپنی  
 نام کمانی سنائی تھی اور اس میں ان دونوں کا ہم نام ذکر مجھے اہم  
 محسوس ہوا تھا۔ کامران نے مجھے بتایا تھا کہ پرنس سیرا کے ہاں  
 اس کا موجودگی کے دوران میں ان دونوں آدمیوں کا اسے بیکہ بعد  
 دیکھے فون آیا تھا "ان دونوں سے اس نے ابھی سے بات کی تھی  
 اور شاید اسے ان دونوں کی آمد کی بھی توقع تھی۔ میں ان دونوں  
 سے ملا اور انہیں کھانا کھانا ہوتا تھا کہ یہ کس قسم کی شخصیتیں تھیں  
 ان کے کامدار کس نوعیت کے تھے اور یہ کس حیثیت کے لوگ  
 تھے۔"

ان کے کھانوں و میزبان کا پانا لگانے کے لیے میں نے شفیع شاہ کو  
 زبانتی۔ وہ اس طرح کے کاموں میں بھی ماہر تھا۔ ایسے لوگ  
 جن کی کسی قسم کے کاروبار سے خواہ کھادے کی حد تک یا حقیقی

تعلق تھا ان کا پانا تو اس کے لیے بالکل ہی مشکل نہیں تھا۔  
 جیشہ آف کامرس کا نیا اور بڑا مکان اس کے پاس موجود تھا۔  
 بیشتر تفصیل تو اسے زبانی یاد تھی۔ معلومات کے اس کے دوسرے  
 بھی بہت سے ذرائع تھے۔ خود اس کا پانا نہیں بھی کسی کہیں نہ سے کم  
 نہیں تھا۔

جیشہ کریم کا تو کچھ سراغ موجود تھا کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ  
 کارپوریشن میں پارٹنر تھا۔ مگر کہ اس کنبی کا دفتر بند ہو چکا تھا لیکن  
 اس سراغ کے سامنے اس کا پانا آسمان تھا۔ جمال سعیدی  
 کے بارے میں بھی میں نے شفیع شاہ کو بتا دیا کہ اس کا پرنس سیرا  
 پرنس انڈسٹریز سے کوئی نہ کوئی کاروباری تعلق تھا۔ پہلے اسی حوالے  
 سے اس کا پانا چلانے کی کوشش کی جائے۔

شفیع شاہ نے ایک گھنٹے بعد رپورٹ دینے کے لیے کہا۔ میں نے  
 اس ایک گھنٹے کے دوران میں ناشا کیا، اخبارات دیکھے اور چند ٹیلی  
 فون کافر کیے۔ ان سب کاموں میں میں نے ایک گھنٹے سے بھی کم  
 وقت صرف کیا اور شفیع شاہ کا فون ایک گھنٹے سے پہلے ہی آیا۔

"سرا جیشہ کریم نامی شخص کا امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن  
 میں پارٹنر شپ کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا اپنا الگ بہت بڑا  
 بزنس بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ شخص بہت بڑا پلانر بھی ہے۔  
 "پلانر؟ کس قسم کا پلانر؟" میں نے بات کاٹنے کی کوشش کی۔

پہچان۔  
 شفیع شاہ دیر سے سے بڑا "سرا" بڑی انڈسٹریز کو تمام مال  
 سپلائی کرتا ہے۔ بندرگاہ اور کئی صنعتی علاقوں میں اس کے بڑے  
 بڑے گودام موجود ہیں۔ کئی دولت مند قومی ہے لیکن امپورٹ  
 ایکسپورٹ کارپوریشن کو شاید یہ دوا الیہ قرار دلا کر بند کھانے کی  
 فکر میں ہے تاکہ کمزوروں کو بچنے کے واجبات اور ہر ماہوں کی  
 ادائیگی کے دعووں سے بچ سکے۔"

"ایڈریس؟" میں نے دریافت کیا۔  
 اس نے مجھے اس کے ہیڈ آفس اور کمرے کے ایڈریس  
 کھوائے۔ دونوں ایڈریس ڈھنچے کے تھے۔ شفیع شاہ بولا "میں  
 ممکن ہے ان کے علاوہ بھی اس کے کھانے ہوں لیکن فی الحال انہی  
 کا پتا چل سکا ہے۔"

"اعلیٰ کانی ہے" میں نے کہا "کسی کا آنا چاہا تو پھر  
 خواہ وہ پاناں میں بھی جا پیے اسے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ جمال سعیدی  
 کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"اس کا تو عجیب ہی قصہ ہے سرا" شفیع شاہ کے لیے سے  
 خفیہ سی جرت کا اکتہار ہوتا تھا "مجھے بہت خاص ذرائع سے  
 معلومات کرنے پر پتا چلا ہے کہ یہ شخص درحقیقت افغانی ہے۔  
 برسوں پہلے افغان جنگ شروع ہوتے ہی یہاں بھاگ آیا تھا۔ یہ بھی  
 سننے میں آیا ہے کہ یہ وہاں کی حکومت کو مطلوب تھا۔ ملک میں غیر  
 ملکی مداخلت اور فوٹ پھوٹ کا محل شاید اس کے حق میں اچھا

جہت ہوا۔ یہ شخص اپنے ساتھ کافی دولت لے کر آیا تھا۔ چاہے  
اب تو لوگوں کو یاد بھی کیس ہا کہ وہ اعلیٰ قیام۔ وہ دولتی ہے  
انگریزی اور دھاری پشاور اور ملو رہا ہے۔

”اس میں حیرت کی تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔“ میں نے  
کہا۔ مجھے معلوم تھا شیخ شاہ قمر ڈی بہت حیرت کا انکار بھی کر  
دیتا ہی بڑی بات پر کرتا تھا۔

”سرا حیرت کی بات یہ ہے کہ“ انہوں نے ہوں کے دوران میں ایک  
قوائیں نے پاکستانی شہریت اور پاسپورٹ و جنسیت پر کچھ حاصل  
کر لیا شیخ شاہ قمر نے ”ختم“ تو بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ یہ  
جانے کتنے ملکوں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ کہانہ  
انجام دے چکی ہے۔ یہ صورتیات ہمارے ہاں اردان میں بڑی  
فرمانی سے فراہم کی جاتی ہیں۔ اصل حیرت کی بات یہ ہے کہ اس  
شخص نے آتے ہی بت بھاری اولیٰ شہریت کر کے پرنس انڈسٹری کی  
چاندیوں میں ڈیڑھ شب خرید لی۔ چاندیوں میں وہ پرنس  
انڈسٹری کی ڈیڑھ شب کا مالک ہوا بہت بڑی بات ہے۔ اس ڈیڑھ شب  
سے ہر سال کوڑوں کا خالص منافع لگایا جاتا ہے جب کہ انڈسٹری  
ٹرانزیکشن ہوتی ہے۔ یہ بات یہ ہے کہ اس شخص نے ڈیڑھ شب  
جن باتوں کے پاس ختمی ”اے“ کا انہیں فروخت کر کے گاؤں اران  
معلوم نہیں ہوا تھا۔ ہر سوے کی ڈیڑھ شب الگ الگ کاروباری  
اداروں کے پاس تھی اور ان کا پرنس بڑے ہوا اور انڈسٹری میں چل رہا  
تھا۔ انہیں کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ پرنس انڈسٹری کو ان سے  
انہیں پرنس انڈسٹری سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن چاندیوں الگ  
الگ پارتیوں نے اچانک اور بیک وقت ڈیڑھ شب ایک غیر ملکی کے  
ہاتھ بیچ دی اور کوئی خاص وجہ بھی ظاہر نہیں کی۔ اور کچھ گواہوں کی  
طلوں میں اس وقت خاص حیرت کی اور وہ بھی ”ختم“

”ہاں۔ یہ تو واقعی کچھ حیرت کی بات ہے“ میں نے جواب دیا۔  
”اس شخص کے بعد سے یہ شخص اور بھی چلتا پھرتا چلا آ رہا ہے۔  
اس نے کئی اور چلتے ہوئے پرنس بھی خریدے ہیں جن کی تفصیلات  
کا ابھی علم نہیں ہو سکا۔ اگر آپ چاہیں گے تو میں وہ بھی حاصل  
کر لوں گا“ شیخ شاہ قمر۔

”ختم۔ فی الحال ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔“ میں نے  
کہا۔ ”یہ تفصیلات تم نامزد وقت میں جمع کر کے ایک شاہد بھی لایا  
آجائیں۔“

”اس وقت اس شخص کا پرنس انڈسٹری میں بہت زیادہ عمل  
دخل ہے بلکہ پرنس میرا کے والد پرنس سعید کے انتقال کے بعد تو  
اس نے کچھ کے سامنے درخواست پیش کی ہے کہ اسے بورڈ آف  
ڈائریکٹرز میں شامل کیا جائے تو یہ انڈسٹری میں بھاری اولیٰ شہریت  
کر سکتا ہے اور کچھ سے پائس لگائے میں مدد سے سکتا ہے لیکن شاہ  
ہے بورڈ آف ڈائریکٹرز اس کی یہ درخواست ضرور کوئی ہے  
حالانکہ یہ شخص پرنس انڈسٹری کے کاویار کا اہم ستون بن گیا تھا

جن شخص میں تھا ہے کہ مرحوم پرنس سعید اسے پرنس بھی کرتے  
تھے صرف برداشت کرتے تھے اس نے ان کی بے خبری کو  
کاویار میں بڑی ہوشیاری سے تسلیم کر لیا۔  
”یہ واقعی خاصی حیرت کی بات ہے کہ وہ پرنس کی بے خبری  
ہوا ایک شخص ایک نئے ملک میں آئے ہوئے ہو کر کچھ کر  
کر رہے۔ اس شخص کو تو واقعی ذرا باریک بینی میں چاہیے  
گا۔ اس کا یہ کہیں تھا۔“

”اس نے اپنا پرنس آؤش قومی علاقے میں ملایا ہے۔ پرنس  
کے علاقے میں ایک کوئی نہیں۔ اس کے دفاتر ہیں لیکن ان کی  
دھاتیں بڑی عجیب جگہ پر جب پرنس والی دسے پچھ سوک کے ان  
بہت کرور ان سے علاقے میں۔ جہاں ابھی مستقبل کی بارش  
انجینئرس بننے کے صرف اطلاعات ہو رہے ہیں۔ تاہم وہاں اس  
نے بہت برا عمل نما کیا۔ بار کما ہے۔ حیرت ہے کہ وہاں ابھی  
مستقبل کی بارش کی ایکسپیکٹا اعلان ہو رہا ہے۔ لیکن وہاں  
ہی ہے لیکن اس کے کی نہیں سکتے وہاں مکان بنایا تھا۔ وہاں  
وہاں دھاتی لگایا گیا تھا۔ وہاں کا حال کہ وہ کسی بھی ایجنسی کے  
شخص سے ملنے علاقے میں رہتا اور وہاں کر سکتا تھا۔

”کچھ ملتا ہے اس کی مستقبل کے لحاظ سے یہ دیکھنا اس کے  
لئے کسی بھی شاندار علاقے سے بہتر ہو“ میں نے بہت سے امکانات  
پر غور کرتے ہوئے کہا۔ میرا حال تم مجھے دونوں جگہوں کے ایک  
نقص اور اور اس حد تک ممکن ہو سکتا ہے۔ ”میں نے کہا۔  
اس نے بحال سعید کے دفتر اور گھر کے پتہ میرے  
تعمیرات بلکہ اپنی حاصل کردہ معلومات کی بدولت میں ان دونوں  
چیزوں کا کچھ فرق بھی اچھی طرح سمجھا۔ پھر اس نے میری حالت  
میں باتیں کر کے ”دوسرے تو ہیں کہ اس مسئلے میں کچھ  
بڑے اہم اثر ہو جائیں گے۔“

”میں۔“ ابھی صورت حال ابھی نہیں ہے۔ میں نے کہا۔  
”یہ کچھ عجیب چارہ نہیں لگا ہوا ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں  
دسے دوں گا۔ لیکن اچانک تم لوگ اپنے اپنے کاموں میں بے خبر  
لے جواب دیا اور وہ احاطہ کر کے سلسلہ متعلق کر دیا۔  
”آؤش سے لگن کریں ہو گئی کے زیر زمین اور کچھ ایسا  
پہنچا اور اپنے لیے وہاں کچھ ایک دوسری کڑی نکالے۔ ان کا  
انتخاب کرنے وقت کوئی ریم کھل کی نصیحت نہ کی گئی تھی۔  
زیادہ مہنگی یا سڑک پر بہت نمایاں نظر آنے والی گاڑی منتخب  
اس میں بیٹھ کر میں پہلے جہیز کیم کے دفتری طرف روانہ ہوا۔  
لے اسے وہاں کر کے معلومات کرنے وقت پہلے کہیں لایا گاڑی  
امارت دیکھو لے کر کلفٹ نہیں کیا۔  
”ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں کچھ حصہ کر کے شہر کے علاقہ  
پہنچا۔ ایسے ہی ایک حصے کا تھا جو کانوں اور دھات و قہر کے  
خصوص تھا۔ وہاں بھی کچھ اپنی مطلوبہ عمارت تلاش کرنے



موجودگی کے اسے اور بھی عجیب بنا دیا تھا۔ یہ خاصا السوس تھا کہ اب دفتروں میں داخل ہو کر قلم سے پہلے کا کھوکھلا



اس کی انجمن پر قرار دی رہے۔

میں نے گویا اس کی کیفیت سے بے خبر رہے ہوئے بات جاری رکھی شاید زمانہ ہی کمال کا گھٹا ہے اب دیکھیں نا۔ یہ کیا کم کمال کی بات ہے کہ سیکرٹری کے کتے پر بھی کاٹھوف موجود ہے۔ واقعی کاٹھوف بہت ہی تیزی سے ہمارے پلچر میں داخل ہو گئی ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے پلچر بابت ہی ہو گیا۔ صرف کاٹھوف نہ گئی ہے کوئی زمانہ آئے گا کہ چراسی کے کتے پر بھی کاٹھوف ہوگی۔ اسٹیز کو افرا اور ٹیلی فون آپرٹرواکیں بھی کاٹھوف نہیں لے چکی ہو کریں گی۔ جہانڈ پوچا کرے والا بھی ایک کتے پر کاٹھوف اور وہ صرف پوچھاؤں کے تیار کرے گا۔ غرضیکہ ہر طرف کاٹھوف کی بیمار ہوگی۔ اور انسانی جان بھر بھی پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہوگی۔ کیا خیال ہے؟

اس نے کوئی خیال ظاہر نہیں کیا۔ ایک ٹک بھگے کھوڑا تاج۔ میں نے گویا ایک تخت اس موضوع کا پچھا پھوڑا اور اس کی ٹانگی پکڑ کر پلچر دیکھتے ہوئے کہا ”مہمہ ٹانگی ہے۔ شاید فرانس کی ہے۔“

انی ٹیٹل INITIALIAED مطوم ہوئی ہے ہار۔ وی ہے۔ اگر مطوم لٹا تو میں بھی آپ کو اسی قسم کی دو تین ٹانگیں تنہا پیش کر دے گا۔

پھر جیسے اچانک مجھے کچھ یاد تھا۔ میں نے جھجک کراتے پراتھ امانتے ہوئے کہا ”محول دلا۔ میں بھی کبھی کبھی بالکل ہی تیزی سے اتر جاتا ہوں۔ میں پہلے کس کام سے آیا ہوں اور کن باتوں میں الجھ گیا۔ ہار۔ تو کمال صاحب! جسد صاحب سے میری ملاقات کرانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

وہ بھی گویا کسی دوری دنیا سے واپس آیا اور جھجک کر ذرا گڑ بڑاتے ہوئے سے انداز میں بولا ”وہ اس وقت ایک صاحب سے بہت ضروری بات جیت کر رہے ہیں۔ لیکن میں کو شش کرتا ہوں کہ وہ اپنی کلنگو کو ذرا انتظار کرتے ہوئے آپ کو ملاقات کے لیے جلدی بلا لیں۔ آپ کو صرف تھوڑی سی دیر انتظار کی زحمت کر ارا کرنی پڑے گی۔ آپ پہلے حریف رکھئے“ اس نے مجھے ہال میں موجود اکوٹی میز پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے لیے میں بے پندہ شائستگی اپنی ٹانگی اور وہ دانی سے ابد ہول دہا خالین میں نے محسوس کیا کہ ابد اس کی زبان میں تھی۔ اس نے عاتقان کی اعلیٰ لمحہ سے جان چڑا لیتے میں ہی مابیت کبھی تھی۔ شاید جسد کریم سے ہی مجھے بارے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا میں نے اس کی درخواست کو شرف قبولت سمجھتے ہوئے اس میں دیر نہ جتا ہی بہتر سمجھا۔ اس طرح مجھے ذرا بہتر طور پر آفس کا بازو لینے کا موقع بھی مل سکا تھا۔

میں نے چہ کا توہ اپنی کاٹھوف جھٹلاتے ہوئے واپس چلا گیا۔ میں نے اسے دو سرا کر ارا مجھ کے ایک تیسرے کمرے کے دو دروازے سے اندر جانے دیکھا اور ابھی میں نے یہ بھی دیکھا کہ

بے قریب ہر کچھ سے معاف کرتے ہوئے گویا احساس کی کہ اس طرف کاٹھوف ہی کی طاقت نہیں تھی بلکہ ہر طرف سے بھی ایک طاقتور اور مضبوط شخص تھا۔ اس کی تانی تھی۔ اس لیے میں نے بھی اسے احساس دلا دیا کہ یہ مجھے گھڑے آدمی کا ہاتھ نہیں تھا تھا۔ اس نے ایک برا سرا کیا جائزہ لے لیا تھا۔ صرف جائزہ ہی نہیں اس غلامی ٹھکان میں میری حلائی بھی لے ڈالی تھی۔ اس جھجکے کی ہار ہار کی شش کی تھی کہ مجھے لباس میں بے اختیار غیہ ہو سکتا تھا۔ تاہم اس نے اس حد تک دعوت کا مظاہرہ ضرور کیا کہ میری ہاتھ وہ تلاش لینے کی

تہ کو جسد صاحب سے جانا ہے۔ اس نے تصدیق

لے صرف بات میں سہانے پر اتھا کیا تو اس نے پوچھا

ملا بہت خاص قسم کا ہے۔ وہ میں صرف اپنی کو بتا سکتا

ہے۔ کئی عجیبی سے کتے۔

ارک۔ کئی اشارہ فیوض؟ اس نے مجھے کھینچا ہوا۔

شب بازی کے میں حق میں نہیں ہوں۔ میں نے اپنی

آواز دیکھتے ہوئے کتے اس کے چہرے پر بھی لگھو دیے۔

تو آواز نمودار ہوئے جیسے میں ریخشت کے چہرے پر دیکھ

ماتے جلدی سے پوچھا ”وہ آپ کو کون ہیں؟“

کی ان کا کتہ بھی بولے۔ کمال۔ اس نے اختصار سے

فر صاحب! آپ واقعی بڑے کمال کے آدمی مطوم ہوئے

کی لے کہ اس طرح اس کے کتے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

لگایا وہ وقت آدمی موقع مل دیکھے پھر کی نہایت عجیبہ

بہ تکلف ہوئے کی کو شش کر رہا ہو۔

لہذا مجھ میں کمال کی کیا بات ہے؟ اس نے ٹھیکس

عالمی طرف سے کیا۔

سب سے پہلی کمال کی بات تو یہ ہے کہ آپ کا نام کمال

بنا کر لائے ہوئے کہا ”وہ ساری کمال کی بات ہے کہ

مجھے یہی کاٹھوف موجود ہے۔ میں نے کاٹھوف

پوچھا ”وہ پوچھا“ سلی ہے؟“

میں نے کئی بار اب دینے کے بجائے ایک قدم پیچھے ہٹ کر

راہ کیا جائزہ لیا۔ اس کی انجمن پڑھ چکی تھی اور وہ بیٹھ

میں کوئی رائے قائم کرنے کی کو شش کر رہا تھا جب کہ

دو شش کر رہا تھا کہ وہ میری صورت اور میرے تاثرات

میں اسے کئی بھی حتی رائے قائم نہ کر سکا بلکہ



اوقات وہ اپنے آپ کو یکے بئی ہی کر کہ حصار کراتے تھے۔  
 تھی لیکن میں نے سوچا کہ احتیاطاً یہ مجھے اسی میز پر چاہیے تھا  
 چاہے جہاں وہ مجھے بٹھا گیا تھا۔ کوئی مجھ نہیں تھا کہ کسی وجہ سے وہ  
 اچانک کرے سے برآمد ہوئے کہ فیصلہ کر لیتا اور یہ کوئی ایسی بات  
 نہ ہوتی کہ وہ کوئی ایسی حالت میں مجھے وہاں سے کانٹے  
 دیکھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں وہاں سے بچنے کے لیے سیدھا  
 ہوئے ہی کا تھا کہ کسی ایسے کون کی خوشگوار ملک میرے ہتھوں  
 سے گرالی اور گھون گھما کر مجھے بغیر مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی  
 جیسے قریب آکر وہ اسے چپ کر کرنا ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے غریب و مل پر قابو رکھے ہوئے فورا گروہ  
 گھما کر اس طرف نہیں دیکھا میں خبردار کہ شاید کسی گن کی ہلی  
 بھی میری پسیلوں سے آن گئے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اندازہ بحث و  
 محاورہ دستور جاری تھی لیکن اب اسی طرف سے میرا وہاں برٹ  
 چکا تھا۔ ویسے بھی مجھے شک کی نوعیت کا اندازہ تو ہو چکا تھا اور  
 میرے خیال میں ایسی کالی تھا۔

میں نے نہایت آہستگی سے گروہ گھما کر دیکھا اور قدرے  
 خوشگوار ہی ایک حرکت سے میرا استقبال کیا۔ وہ ایک مرد قد  
 ادا تھا۔ لڑکی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی رولنگ اور ہاتھ دھو  
 نہیں تھا۔ لڑکی کی رحمت گندی اور نہیں کش چکے تھے وہ ان  
 لڑکیوں میں سے تھی جو خوبصورت دہوتے ہوئے بھی خوبصورت  
 اور بڑے کش نظر آتی ہیں۔ لباس اور میک اپ نہایت سلیس تھا۔  
 ہلی نظر میں اس پر کوئی مائل ہونے کا لگان گورنا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر  
 قدرے اطمینان ہوا کہ وہ نفرت بھری ٹکڑی دہا لڑکی نظروں سے  
 میری طرف دیکھنے کے بجائے قدرے فرارت آمیز سے انداز میں  
 دیکھ رہی تھی مالا کہ اس کا تعلق یقیناً اسی دفتر سے تھا۔ اس  
 حوالے سے تو اسے کچھ پرہیز ہوا چاہیے تھا مجھے شکوک سمجھا  
 چاہیے تھا کہ اگر وہ اچانک شور مچاوتی تو مجھے اس پر بھی حیرت  
 نہیں ہوتی چاہیے تھی لیکن وہ اس کے بجائے خفیف سی مسکراہٹ  
 کے ساتھ سرگوشی میں بولی "بڑی بات ہے۔ کھینچی چوٹوں کی  
 طنز جوں کسی کی کن حویلیں نہیں جیتے۔"

شخصیت کے اعتبار سے وہ مجھے اچھی خاصی مغرب زدہ دکھائی  
 دی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ انگریزی میں مجھ سے ہم کلام ہوگی  
 لیکن اس نے با محاورہ اور دہا بولی کے مجھے حیرت کا دور سراجا سا جھکا  
 لگا تھا۔ غریب طور پر مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کہاں سے برآمد  
 ہوئی تھی۔ بے اختیار میرے حوالے سے نکلا "تم کہاں تھیں؟"

"تم از کم وہاں تھیں تھی جہاں سے مجھے خود بھی کبھی کوئی خبر نہ  
 آتی۔" اس نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ تاہم اس وقت تک  
 میری سمجھ میں آچکا تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہوگی۔ ایک گشتے سے

آئی تھا یا رہا تھا لیکن حیران کے دنوں میں اس نے پلٹ  
 ہی نہیں یا جیسے کہ کسی کی خبر نہیں لی تھی لیکن اب  
 تھی تو یہ ہم ہونے کے لیے آیا تھا۔ اس پر اس  
 میں سے میری سے لگا کہ وہ ان دنوں لیڈوں ملک  
 میں پھنسا ہوا تھا۔ یہ جیسے کہ کم کا فرض تھا کہ وہ  
 غلام کی بھی ملک میں ہوا لیکن جیسے اسے تمام تر  
 کچھ کچھ آکر دیا میں یہ جو بہت دور سا گلی اور راپلے  
 راپلے کے لیے تھے۔ کس لیے تھے؟

نہاں کا کچھ علم نہیں تھا اور پھر زبان بھی ہر حال اتنی  
 چھٹی تھی کہ میں آری تھا اس لیے میں غصہ بہت تھا تو  
 وہ کچھ مٹا لیکن غصہ ہر حال کی تھا اور اندازہ ہی  
 کی تھی کہ سمیت میں بچوں جاتے تھے بعد ایک  
 پر تمام تر اشیائے گندہ والوں کا ہوتا ہے۔ عام طور پر اس  
 جاتی کوئی ایک فرقہ دوسرے کی بات نہیں مانتا اور اپنی  
 بات کا رونا ہے۔

لیکن جتنا کہ میں چکا تھا میرے لیے وہ بھی بہت تھا اور  
 بہت زیادہ تھے اس بات سے جو نکلا تھا کہ ایک ذاتی  
 لڑائی کی وجہ سے اچھوت ایک پورے کارپوریشن کے  
 کا قاعدہ الگ آئی اے کو بھلا ایک عام کھدواری دار ہے  
 کے لیا ضرورت پیش آتی تھی اس لیے غرض کالی کے  
 (مکلفہ آئی اے) جو کہ ملی بیلا تھا اور بڑے موٹا تھا  
 لیکن کئی تحقیقات کرتی تھی اور انگلیں چوری بھی اسی  
 طرف تھی جب کہ اکثر پراسیڈنٹ ادارے سرکاری  
 لڑائی کے بعد ٹسٹ والوں کی ملی بھگت سے لیکن چلنے  
 کے بعد مجھے اس لیے ان میں سے بعض کے پیچھے ایف  
 کے مال تھے۔ میں نے اپنے آپ کو کھانسی کی کوشش  
 کی۔ لیکن اس زیادہ میرا سلیج باجہ کا دینے والی بات نہ ہو  
 لیکن اسے ہر حال اپنے زبان کے خاص خاصے میں ٹوٹ

میں کا سیکرٹری کمال جو اپنے پاس کو ذرا طبری مجھ سے  
 اس کے لیے اندر گیا تھا اس کی توجہ مجھے سرے  
 سے ہٹا دی تھی۔ اس نے یقیناً اندازہ ہانے کے بعد ایک  
 سے تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ  
 میں شکوت کر گیا تھا اور جب تک اندازہ اس کے پاس  
 میں غصے کے ساتھ بحث و خبیث جاری تھی تب تک  
 اور غرض سناس باؤی کا مذہ کے طور پر اپنے پاس کے  
 سے چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ باؤی کا مذہ ہی تھا۔ آج  
 میں غصے کو ان کے باؤی کا مذہ ہے شاکستہ "مطلق اور  
 کے لیے لیکن وہ مدافعتی قسم کے اور خوشگوار نظر  
 کے لیے گھڑا ہے۔ زیادہ خبردار کہ نہ تھی۔

کشتان میں تھی وہ سب کراہتیں کہ ایسی تھی کہ سرسری نظر میں اس کی سوجھ بوجھ کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ میرے اسے غم سے مزہ اور کھل دیکھنے کے لیے اس کے قریب ایک خوبصورت سی چوٹی اسکرین کمری کی تھی۔ لیکن تھا کہ اس طرف کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ غم سے بڑھ کر اپنے دماغ کے مطابق ہاتھ ہر دوامی دوش ہر دوامی کما جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ راداری دفتر کے اس حصے کو کسی اور حصے سے ملاتی ہو کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اس میں گراؤنڈ فور پر بھی مزہ کرتے ہوئے چاہئیں تھے۔

وہ گویا اس راداری کی طرف سے یہی توجہ جتانے کے لیے جلدی سے پہلے میں اس الماری میں تھی۔ اس نے ایک خوبصورت رادار کیمر الماری کی طرف اشارہ کیا جو غالباً ٹیکنک کینٹ کا کام لیتی تھی۔

میں نے غمی میں سہلاتے ہوئے سرگوشی میں کہا "تم بھلا اس میں کیسے ہو سکتی تھیں؟ تم کوئی شگ سی دفتری قائل ہو؟ تم تو کسی خوبصورت سے شاعر کا خوبصورت سا دلچ ان ہو۔"

وہ بے توازن طریقے سے غمی۔ بے توازن ہونے کے باوجود یہ غمی خوبصورت تھی۔ اس کے دانت خوبصورت ہموار اور ہوتی کی طرح چمکلاتے ہوئے تھے۔ توازن کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ تصویریں دیدہ زیب تھیں۔

"میں دماغ ان نہیں۔ صرف غزل ہوں۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "اگر تم غزل ہو تو یقیناً کوئی ایسی ہی غزل ہو جسے مشاعروں میں شاعر مشاعرہ شاعرہ لکھ لیا کرتے ہیں۔" میں نے فوراً کہا۔

"میں غزل ضرور ہوں لیکن مجھے مشاعروں میں شاعرا نہیں جاسکتا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "کیونکہ میرا صرف نام غزل ہے۔" "کیا واقعی؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

وہ گویا میرے لیے کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے بولی "اس میں چین نہ کہنے والی کون سی بات ہے؟"

"نہیں۔ بے چینی والی تو کوئی بات نہیں۔ بس ویسے ہی ذرا حیرت ہو رہی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے بے توازن بھی اچھی بات ہے۔ اگر ہمیں پڑھا نہیں جاسکتا تو صرف ساتھ لے جا کر بھی مشاعرہ لکھا جاسکتا ہے۔ بلکہ تم تو اگر کسی شاعر کے ساتھ جانے کی ہائی محمود خود لکھنے کو تیار ہو جائے۔"

اچانک اس کے آوازات کچھ بدل گئے اور وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے سلیڈ کی سے پہلے میں۔ لیکن بہت لگ چکا۔ اب آپ سیدھی طرح ذرا اصل بات بتائیں۔ کمال جب آپ کو وہاں دوسرے کمرے میں بٹھا کر کیا تھا تو آپ آرام سے وہاں بیٹھنے کے بجائے اس کے پیچھے پیچھے ہی رہیں جاسوسوں کی طرح کان لگا کر باتیں سننے کیوں تیار تھے؟ کس پکڑ میں ہیں آپ؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے نظر نہیں چرائی۔ لڑکی۔ باحوصلہ معلوم ہوئی تھی اور اس وقت اپنے سوال کا

جواب حاصل کرنے کے لیے یہی عجیبہ نظر اٹھاتا تھا۔ تاکہ مجھے مزہ دیوان کھلا کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دوسرے کمرے میں بٹھا کر کیا تھا کہ مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں سے پہنچا تھا۔ مجھے خاموش رکھ کر وہ ذرا اور سخت لگے۔ میں نے اسے میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہا تھا؟ کیا کچھ اور کمال کو لگا کر بتاؤں کہ آپ کیا کر رہے تھے؟ اگر اسے یہ قریح تھی کہ میں اس کی دیکھتی تھی تو میں نے اس کی یہ توقع ہی نہیں ہوئے وہی اور وہاں لے کر مسکراتے ہوئے پھر سکون لیے میں کہا "میں نے کچھ اگر ہمیں پیچھا کر لیں ہوتی تو پہلے ہی کر چکی ہوتی۔" اس سے پیچھے سے اگر وہاں میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں تو کھانا کھاؤں اگر تمہارا نام واقعی غزل ہے تو ہمیں پیچھا کر بھی کر سکتیں ہرگز نہ بے ہوش ہو سکتی۔"

جب کہ میں بگاڑ چکے کسی غم سے بچنے کی غم عجیبہ بننے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی اس کوشش کو زیادہ جاری نہ رکھ سکا۔ عجیبہ کی طرف اس کے پرہیز چل گئی۔ مسکراہٹ کی کرشم نمودار ہوئی۔ وہاں سے وہاں سے وہاں سے میرے لیے میں بولی "بہت چالاک ہیں آپ۔" "دماغ میں تو ذہن بہت دیکھ، تو ذہن بہت لکھتا ہیں۔" "نہیں کریں اور دیکھئے انسان کو کہ نہ دیکھ تو دیکھا جائے میں نے دوسرے کمرے میں غم کرنے والی بیڑی کی طرف "میرا خیال ہے میں وہاں جا کر بیٹھ جاؤں جہاں کمال کے ساتھ وہاں ایک فاضل کرسی بھی موجود ہے۔ اگر تم چاہیں چل کر اس پر بیٹھ جاؤ۔ وہاں وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ اچانک اٹھ کر آئیں تو میں یہاں کھڑے کمرے میں کھڑے ہوں گی کے بارے میں شک میں جھٹکا ہو گا۔ مجھے آپ کی پروا نہیں ہے لیکن کیسے تمہارے حق میں ہے بات کہنا ہو۔"

"ابھی ہی بات ہو رہی تھی ہے۔" میں نے اس کی طرف سے بے غمی سے یہاں کرسی کے ساتھ ساتھ چل کر اس کے پاس پہنچا۔ "میں نے اس وقت تک کہنے کا جب تک جیشہ صاحب کا اعلیٰ رخصت نہیں ہوا۔ اور جب وہ رخصت ہونے لگے گا تو میں یہاں سے چلی جائیگی لیکن پھر بھی آپ کی تجویز بہت مناسب ہے۔" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ "کمال آئے گا تو یہی کھنکے گا کہ اس کی دماغ میں نے آپ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔"

میں دیکھتی اس میں اس طرح جا بیٹھا جسے میں کام کرتا تھا اور وہاں میرے سامنے وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اعلیٰ تھی ایسی کام سے دفتر آئی ہوئی تھی۔

ہم اس دفتر میں کام کر رہے ہیں؟ میں نے تصدیق کر لیا ہے۔  
 "تو ہمارے وہ شری سکرابٹ کے ساتھ ہیں۔  
 کیا کام کرتی ہو؟"  
 "آپ میرا انٹرویو لے رہے ہیں؟" اس نے عجیبی نظر سے  
 فرما دیا۔

"میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ نے سکرابٹ سے جواب دیا۔  
 تو کوئی اور بات نہیں ہے کہ آپ باہر سے آکر ہمارا  
 ریلوے شروع کریں۔ دفتر میں تو لوگ خود انٹرویو دیتے آتے  
 رہے ہیں۔ تاکہ رکھ کر دیکھ سکیں۔ اس کی خفیہ سی سکرابٹ  
 رکھتی ہے۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے" میں نے کہا "دفتر کے باہر سے  
 انٹرویو لینے بھی آسکتے ہیں۔ کسی اخبار یا رسالے کا نمائندہ  
 تھا ہے۔ اور آج کل تو براؤنٹ جیل کے لیے پروگرام تیار  
 کرنے والے بھی گھر سے لیے گئے ہیں۔ کبھی کبھار کسی بھی جگہ نظر آجائے  
 ہاں میں سے کوئی آسکتا ہے۔"

"میں آپ کو کیا سمجھوں؟" اس نے فوراً سوال کیا۔  
 "میں مجھے میرے ذاتی سیزنگز کا نمائندہ سمجھ سکتی ہوں؟" میں  
 جواب دیا پھر ایک لمبے کے وقف سے میں نے کہا "آپ تو  
 یہ سوال کا جواب دے دو۔"

"سوال کیا تھا؟" وہ معنوی معصومیت سے بولی۔  
 "کیا تم اس دفتر میں کیا کرتی ہو؟" میں نے سوال دہرایا۔  
 "میں جیشہ صاحب کی سیکرٹری ہوں" اس نے گویا کسی فیصلے  
 پر ہنس مچائی "میری سانس لے کر جواب دیا۔ وہ فیصلہ غالباً کسی خاکہ  
 پر سال کا جواب دے ہی رہا ہے" اس میں کوئی حرج نہیں

"کمال نے بھی کہا تھا کہ وہ جیشہ صاحب کی سیکرٹری ہے۔  
 تو جیشہ صاحب کے کتنے سیکرٹری ہیں؟ کیا وہ ہر صنف میں سے  
 لیتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ میرے سے بھی" اس نے امیر آدمی کے دو سیکرٹری کچھ زیادہ  
 سے دیکھے اصل سیکرٹری تو میں ہی ہوں۔ کمال صاحب ذرا  
 کمال کے سیکرٹری ہیں۔"

"میں نے تمہیں انداز میں سہلایا" مجھے پہلی ہی اندازہ ہو گیا  
 کہ آپ کے لیے کے وقف سے میں نے کہا "جب میں جیشہ  
 صاحب کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر باتیں سننے کی  
 بات کر رہا تھا تو تم نے مجھے ڈانٹنے ڈپٹے یا سخت رویہ اختیار کرنے  
 کی بجائے دوستانہ رویہ کیوں اختیار کیا جب کہ  
 میں نے اس کی سمجھ دجہ بتا دو۔"

"آپ بہت معمولی سی ہے۔" وہ اب شہتہ انگریزی میں

جاسوسی ڈائجسٹ کا  
 مقبول ترین پراسرار سلسلہ



موت کے سوداگر کے خالق  
 اقلیم علیم کے پراسرار قلم  
 سے لکھی گئی ایک سلسلہ اور اسلامیاتی کہانی  
 جس نے بقولیت کے نئے ایکاد قائم  
 کیے۔ کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہے

قیمت  
 پہلا قسط ۱۵۰/۰۰  
 ۱۵۰/۰۰  
 مکتبہ القریش  
 اردو بازار لاہور  
 فون ۶۲۲۳۶۶۶۵

میں نے پوچھ لیا ہی بستر کھانا کیا یہ دختر بھی  
ایکپورٹ کارپوریشن کی طرح بند ہو رہی ہے؟  
وہ دھڑکنے سے اسی "چماٹ" کو آپ کو اس دختر کے  
کا ہوا ہے۔  
میں جیسا صاحب سے جس مسئلے پر بات کرتے تھے  
کا قطعاً ایسی کہتی ہے کہ "میں نے کہا" میرے دوست  
ہے۔

اس سے پہلے آپ کسی یہاں نہیں آئے تھے؟  
کو دیکھ رہی ہوں۔ "وہ روشن سے بولی۔ اسے گویا اچھا  
بہت اچھا تھا۔

میں تو کبھی ایکپورٹ کارپوریشن کے دفتر میں  
گیا۔ میں نے بتایا "میرا یہ دوست کا مسئلہ نہ تھا۔  
مجھے یہاں بھی آنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس سے پہلے  
جیسا صاحب کا نام بھی نہیں سنا تھا۔"

میرا حال یہ دختر نہیں ہو رہا۔ "وہ میرے سوال کی  
آواز سے بولی "صرف اس کا سبب آپ کچھ نہیں  
تھکا ہے اس میں کچھ لوگوں کا اضافہ ہو جائے۔"  
"نہ۔" میں نے گویا اطمینان کی سانس لی میں تو  
جو موجود ہیں شاید ان کا بھی مفایا ہونے والا ہے۔  
"ممكن ہے ان میں سے کچھ کا مفایا بھی ہو جائے۔  
مکروائٹ کے ساتھ بولی۔

ہاں ان میں تم بھی شامل ہو؟ میں نے یہ بھی پوچھ لیا۔  
"نہیں۔" میں نے میری غلط فہمی دور کر دی۔

میں نے گویا اطمینان کی سانس لی پھر پوچھا "میرا  
صاحب کے پاس کون ہے جس کے ساتھ وہ بیچ پکاری میں  
ہوں؟

اس سے پہلے کار نہیں کا دھاری مساکر پر جادو خیال  
ہیں۔ اس نے صبح کی "جیسا صاحب کے ساتھ اندر  
موجود ہیں ان کا نام حال سیدی ہے۔ ان کے ساتھ جیسا  
کاجب بھی کا دھاری مساکر پر جادو خیال ہونا ہے تو  
دیکھ سکیں میں شروع ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ  
آہستہ آہستہ۔

چماٹ۔ تو یہ حال سیدی صاحب ہیں؟ میں نے سہل  
اس اتفاق پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہا تھا کہ حال  
اسی دختر میں موجود تھا۔ میں اکر یہاں اس سے بات  
کر سکتا تھا تو کم از کم اس کے درشن تو کر سکتا تھا۔ جیسا  
دلوں سے میرا ایک سی ہمت تھے سامنا ہونے والا تھا۔  
"لگتا ہے آپ حال سیدی صاحب کو جانتے ہیں۔  
مجھے ان سے شنائی کا شرف حاصل میں۔" میں نے

علاقے سے پہلے میری اس دختر میں کتنی قربت تھی۔  
شاید اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی ہم سلسلے میں  
تاکید تو اس کی کہ نہیں تھی۔

"ایک سلسلہ کے مسئلہ کا خیال ہے۔ کیا میں اس کی پوچھ  
سکتا ہوں؟" میں نے بھی سوچا کہ اگر اس کی پوچھ آتے  
تھا۔

"میرا خیال تھا آپ کو نہیں پتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک  
کھلی ہے۔ میں نے شاید اس سے جواب دیا۔

وہ جادو کچھ بھی ہو گا۔ شاید میرے لیے اس کا نام نہیں  
میرے لیے تو جیسا صاحب کا مسئلہ وہ ہے۔ اس کا مسئلہ میرے لیے  
الو اور جیسا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے سہل اس کو دیکھا  
تھا۔ اس کے اپنے مسئلے میں جیسا کے مسئلے سے زیادہ متاثر کرنے  
کی کوشش کرتی تھا۔

میں نے راز دار کو دیکھا۔ اس نے گویا "میں کلاں سے دیکھ رہی  
تھی کہ کلاں مجھے یہاں بٹا کر رکھا تھا۔"

میں نے دیکھ نہیں رہی تھی۔ صرف میں ہی تھی۔ اس نے  
طالب دیا۔ "میرا یہ کہہ رہی تھی کہ وہ جادو کلاں کے ساتھ  
تھا۔ وہ کلاں میں اس میں کلاں تھی اور آپ لوگوں کی باتوں کی توجہ  
میں رہی تھی۔ ان سے کچھ اور تھا۔ وہ کلاں کے ساتھ تھا۔  
"اس دختر میں اتنی دیر لگی۔ نظر آتی ہے۔ یہ جانتے  
جسٹس مجھے کافی دیر سے تھا۔

"اس دختر میں ویسے بھی زیادہ کلاں کام نہیں کرتے۔ کل  
الو اور جیسا جن میں سے وہ ان کے پیچھے ہیں۔ کلاں کے  
الو اور جیسا جن میں سے وہ ان کے پیچھے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس دختر میں کتنی کلاں کلاں  
کلاں جلدی تھی۔ کوئی اور نہیں تھا کہ ایکپورٹ  
کلاں پر نہیں کے دختر کی طرح یہ بھی بند ہو گیا۔ میں  
کہ اس لڑکی غزل کو بھی پتا نہ تھا۔ شاید اس کے پاس  
تھے یہ بات کہ میں نے اس دختر میں اس کی جگہ پر تھکا  
تھی اور شاید اسی لیے وہ اس وقت بھی کلاں کے ساتھ  
گیا۔ وہ نہ جیسا کی جگہ پر تھی اس وقت سے اس کے  
اس پاس کہیں موجود تھا۔ یہ تھا اس کے کمرے سے  
کسی جگہ باقاعدہ قسم کی بیٹ پر ہوتا تھا۔ اس کا اس دختر  
سے متعلق نہ تھا۔ اس کا اس کے ساتھ ساتھ اس دختر جیسا  
کے ساتھ اس کی وفاداری بھی حیران ہو رہی تھی تو میرے لیے  
کلاں پر بھی تھکا۔ میں نے کلاں کے پاس اس  
دختر کے اہم راز ہوں لیکن پھر مجھے بھی خیال تھا کہ اس کے پاس  
یہاں کی دختر اور اس کے اہم راز ہوتے تھے۔ میں اس دختر  
کے وہاں سے جلد دوش نہیں کیا جاتا تھا۔ اور مجھے اس لڑکی کے  
صفت تھکا کہیں نہ تھا۔ اس کی مثال مجھے بھی

ہا میں نے ان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ میں انہیں صرف مانتا ہی جانتا ہوں۔ ویسے شاید مجھے کسی وقت ان سے بھی ملاقات کرنی پڑے گی۔ جیسے صاحب سے ان کا کیا تعلق ہے؟

”کادو باری تعلق ہے“ فرل نے بلا آمل خواب دا بھرا اپنی فزلی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر دکھاتے ہوئے بولیں ”ان کے کادو باری معاملات میں ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر کی پاد نثر ہیں۔ میرا مطلب ہے کائنات پر کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن ان میں قربت اور تعاون باضابطہ قسم کے پارٹنر سے زیادہ ہے۔“

”بہت خوب“ میں نے سہلایا۔

ایک لمحے خاموشی رہی مگر مجھے احساس تھا اس دور ان بھی بید کے کمرے میں بحث و تکرار جاری تھی۔ فرل بھی گویا اسی بحث و تکرار کے بارے میں سوچتے ہوئے بول ”میرے خیال میں تو یہ بھی ان کی محبت کا ایک انداز ہے۔ کادو باری سنا کیل پر ان کے درمیان اکثر اسی طرح بحث و تکرار ہو جاتی ہے جو کبھی کبھی گھنٹوں جاری رہتی ہے لیکن ان کی قربت اور تعاون میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

ذرا توقف کے بعد وہ بول ”دیکھ لیجئے۔ آپ نہ تو اخباری رپورٹیں اور نہ ہی ٹی وی رپورٹیں۔ اس کے باوجود میں نے آپ کو کتنا طویل اور معلوماتی انٹرویو دیا ہے۔ اب آپ بھی تو میری معلومات میں کچھ اضافہ کریں۔ آخر آپ ہیں کون؟“

میں نے اپنا پرنس کاڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کاڈ پڑھا اور اس کی غزالی آنکھیں کچھ پھیل گئیں ”آپ چودری لکپ آف سپنر اور اس فائنے اشار ہو کر ویسٹو کے مالک ہیں؟“

”کسے کاڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے غینی سے پوچھا۔

”میں اس اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟“ میں نے منکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں بالکل اسی طرح حیران ہو رہی ہوں جس طرح آپ یہ جان کر حیران ہوئے تھے کہ میرا نام فرل ہے۔ حالانکہ اس میں بھی غرت کی کوئی بات نہیں تھی“ وہ بھی جواباً منکراتے ہوئے بولی پھر میں نے گویا اپنی حیرت کی وضاحت کی ”دراصل میں سوچ بھی نہیں تھی کہ اس طرح۔۔۔ ان حالات میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ میں سال چار سال سے پرنس کیونٹی میں ہی کام کر رہی ہوں۔ کادو باری اور آجری طبقے کے بارے میں میری بھی تھوڑی بہت معلومات ہیں۔ آپ کا نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔“

”جب خوبصورت اور باظوق لڑکیاں ہم جیسے بے ہوش کادو باری لوگوں کو تائبانہ جانتے لگیں تو ہمیں اپنی خوش قسمتی پر دلکشا کا ہے“ میں نے کہا۔

”کسے کس۔۔۔ اب آپ زیادہ افساری نہ دکھائیں“ وہ انگریز سے ہوئے بولی میں یہ کہنے لگی تھی کہ مجھے گمان تک نہیں

تھا آپ سے اسی دفتر میں اس طرح ملاقات ہوگی۔“

”یعنی آپ کو امید نہیں تھی کہ ایک روز جو شخص آپ کو اپنے پاس کے کمرے کے دروازے پر چوہوں کی طرح جھکا دروازے سے کان لگائے ملے گا وہ افضل چودری ہوگا“ میں نے کہا۔

”ہاں“ وہ دھڑکتے ہوئے ”آپ کو یہ سوجھ بوجھ کیا تھی؟“

”جس۔۔۔ میں نے کچھ عجیب کھنٹی سی طبیعت پائی ہے“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”میک تو اس طبیعت کے انہوں مجبور ہو کر یہ حرکت کر رہا تھا۔ دوسرے میں اس فکر میں تھا کہ شاید اس طرح من گھڑنے سے مجھے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو میرے دوست کی مدد کے سلسلے میں میرے کچھ کام آسکے۔“

”مگر کسی اچھی سی لڑکی سے آپ کی دوستی ہو جائے تو کیا اس کے سلسلے میں بھی آپ کی طبیعت اسی طرح کھنٹی رہتی ہے؟“ اس نے شرعی منکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”نہیں۔ اس صورت میں معاملہ عموماً اٹا ہو جاتا ہے“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس کی شرع منکراہٹ گہری ہو گئی۔ کارڈ اٹھا کر اس نے اپنے پتلے سے ٹوٹ بک لہا پس میں رکھ لیا اور بولی ”یہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔ شاید مستقبل میں بھی آپ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔“

”خدا کرے وہ دن جلدی آئے“ میں نے دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”مجھ سے رابطہ دینا کا آسان ترین کام ہے۔ اس کے لیے آپ کو صرف میرا فون نمبر ملنا ہوگا۔ میں خود سر کے بل ڈرائیو کر آتا ہوں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔ میں نے آج تک کسی کو سر کے بل ڈرائیو کرتے ہوئے نہیں دیکھا“ وہ بولی۔

”یہ تو میں نے محاورہ بولا ہے۔ جدید دور میں محاوروں میں کچھ تبدیلیاں آچکی ہیں نا“ میں نے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سنجیدگی سے بولی ”مفضل صاحب! کیا آپ کچھ ایسے ہی غرت ہیں جتنے نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں؟“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں غرت ہوں؟“ میں نے گویا برا متاٹے ہوئے کہا ”میں نہ تو غرت ہوں اور نہ ہی نظر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں تو صرف اعلیٰ اخلاق، منکساری اور دوسروں کی قدر دانی کی معمولی سی مثال قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”چھ۔۔۔ آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔

دفعتاً مجھ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور گویا کسی ٹی وی یا ریڈیو کا ریلیم اچانک مکمل گیا لیکن ریلیم زیادہ نہیں تھا۔ وہ افراد کمرے سے برآمد ہوئے وہ اب کافی حد تک نارمل آوازوں میں باتیں

ہوتے تو معاملات اتنا الجھتی کیوں؟ اب اس نے بھی دیکھ کر  
میں ہی بات کی تھی۔

بھر وہ رخصت ہو گیا۔ جشید اسے چھوڑنے اس سے اٹھ  
نہیں گیا۔ کمال نے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خفیف کی جھنجھ  
ہوئی تھی کہ جمال سعیدی کے ساتھ کوئی گھن میں یا کامزداری نہیں  
تھا حالانکہ اپنے تمام تر بے ضرر سے سراپا کے بارود وہ شعلہ لگائی  
رپورٹ کی روشنی میں جشید سے بھی زیادہ پہنچی ہوئی چیز معلوم ہوا  
تھا اور اس قسم کے لوگ خاص طور پر آج کل بغیر گارڈز وغیرہ کے  
چلتے بھی نہیں تھے۔ پھر میں نے سوچا شاید جمال سعیدی نے اپنے  
گارڈز کو اندر لانے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو اور انہیں باہر کمر  
گازی وغیرہ میں ہی چھوڑ آیا ہو۔ اپنے غبر کی پاد نثر کے دفتر میں  
وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا ہو گا۔

جشید اور کمال دروازے سے واپس آتے ہوئے میرے  
قریب رُکے۔ جشید نے مجھ کو اچکاتے ہوئے غزل کی طرف دیکھ  
تو وہ بی جلیبی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ کو "میں کو شش گری تھی کہ  
آپ کے صمان کو انتظار کی گھڑیاں زیادہ طویل محسوس نہ ہوں۔"  
"تھیک ہو" جشید خشک لبے میں بولا پھر اس نے سر کو جھک  
ی جنبش دی۔ غزل گویا اس کے جسم سے اشارے کا مطلب سمجھ  
ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔

جشید نے اب میری طرف دیکھا اور مٹھنی سے انداز میں  
کہے ہو توں پر رکھی مسکراہٹ بگنی "سسر افضل چوہدری۔" اس  
نے معلوم کیے۔ لہجے ہاتھ بڑھاتے ہوئے تصدیق چاہی۔ اس  
مطلب تھا کہ کمال نے اندر جا کر اسے کم از کم میری آمد سے قوت  
کری رہا تھا اور میرا نام بھی بتا رہا تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ عام لیا اور  
اتھ کھڑا ہوا۔ اس کی صحت کچھ ایسی بڑی نہیں تھی لیکن اس  
ہاتھ کسی سرہ چوہے کی طرح تھا۔ اس کی اصل قوت گواہی ان  
آنکھوں میں۔ یا پھر شاید آنکھوں سے بھی بہت دور نہیں پڑتا  
تھی۔ آنکھوں میں صرف اس کا عکس ٹھک رہا تھا۔ میں نے کچھ  
جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اور آپ ہاتھ  
جشید کریم ہیں؟"

"نابال نہیں۔ میں یقیناً جشید کریم ہوں" وہ نہایت درت  
تلفظ کے ساتھ اردو میں بولا۔ اس کی شخصیت بظاہر عام کی جھنجھ  
آواز بہت خاص تھی۔ اس میں ایک عجیب سا ہمارائی پن تھا۔  
حاکمیت تھی۔ یہ ایک نہایت بڑا احمد شخص کی آواز تھی جسے ان  
کسی نامعلوم طاقت کا احساس تھا۔ وہ بات باری رکھتے ہوئے کہ  
"آپ کا نام میرے لیے ٹالوس نہیں ہے۔ معذرت خواہ ہوں کہ  
آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ دراصل میں ایک بہت ہی بے  
ہودہ شخص کے ساتھ الجھا ہوا تھا جسے آپ نے رخصت ہونے  
ہوئے دیکھ ہی لیا ہو گا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے ٹھکانے کے

کمرے سے تھے۔ میں نے آوازوں سے پہچانے کہ ان میں سے کون جشید  
کریم ہو سکتا تھا اور کون جمال سعیدی۔

جشید کریم کی شخصیت کمال سے ٹھکانے بازی گار نہا سیکھ بڑی  
سے ملتی جلتی تھی جو ان دونوں کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے برآمد  
ہوا تھا۔ زیادہ نمایاں فرق یہ تھا کہ جشید ادبیز عرف تھا اور جمال طور  
پر اپنے سیکھ بڑی کی طرح مضبوط اور سخت جان دکھائی نہیں دیتا تھا۔  
دیے رگت اس کی بھی سرخ و سفید تھی۔ اس کے چہرے پر بھی  
مختصری داڑھی تھی اور وہ بھی تھری چس سوٹ میں تھا۔ ظاہری طور  
پر وہ اعلیٰ درجے کا ایک بزنس میں ہی دکھائی دیتا تھا لیکن جب وہ  
جمال سعیدی سے باتیں کرتا ہوا اس کمرے میں پہنچا جہاں میں اور  
غزل بیٹھے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں ایک بزنس  
میں کی آنکھیں نہیں تھیں۔ کسی بھی بزنس میں میں وہ تمام  
اچھائیاں اور برائیاں ہو سکتی ہیں جو کسی بھی عام آدمی میں ہوتی ہیں  
لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ جشید کریم کی آنکھوں میں  
کوئی ایسا بات تھی جو کسی بزنس میں کی آنکھوں میں نہیں ہو سکتی  
تھی۔

جمال سعیدی گویا ہاتھی کا بچہ تھا۔ اس کا قد کچھ ایسا خاص  
نہیں تھا۔ سوتا ہونے کی وجہ سے قد کچھ اور بھی کم لگ رہا تھا۔ چلتے  
دقت ہوں تو اس کا پورا جسم ہی قفل قفل کرتا محسوس ہوتا تھا لیکن  
تو نہ تو گویا جلیبی کا پاڑ تھی۔ ہر جنبش پر ہی قہر قہر آتی تھی۔ اس کی  
چند یا د مٹھنی میں چمک رہی تھی تاہم اس کے گرد گولائی میں بھرے  
اور سفید "ٹائم سے" دکھائی دینے والے بالوں کی جھال لڑا رہی تھی۔  
وہ گورا چٹا لیکن شیوہ شخص تھا جس کے مرطوب سے ہونٹ غیر  
معمولی طور پر سرخ تھے۔ وہ بھی سوٹ میں تھا لیکن اس نے ٹائی  
لگانے کی زحمت نہیں کی تھی اور یہ شاید اپنے حق میں اچھا ہی کیا  
تھا۔ اس کی ہاتھی جیسی گردن پر ٹائی کا استعمال شاید کچھ اچھا تجربہ  
محسوس نہیں ہوتا ہو گا۔

غزل انہیں دیکھ کر مڑباندہ انداز میں اتھ کھڑی ہوئی تھی۔  
میں نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ ان دونوں نے قریب سے گزرتے  
دقت گری اور مجلس نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ کمال نے سردی  
نگاہوں سے میری طرف دیکھا لیکن تینوں میں سے کوئی ایک لفظ بھی  
نہیں بولا۔ جشید اپنے صمان کو کمرے کے دروازے تک چھوڑنے  
گیا اور سبیش میں کھٹا تھا۔

دروازہ کمال نے آگے بڑھ کر کھولا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اپنی  
کلا ٹھکڑ پر تھا۔ اس وقت جشید نے جمال سعیدی کا سوتا سا  
کنہہ حاکمیت کے آگے بڑھ کر "زیادہ بریشان مت ہوا کہ  
میرے بوڑھے بیٹے! میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ تم یہ سوال مجھ پر  
چھوڑ دو۔"

جمال سعیدی نے اپنے کے سے انداز میں بٹکارا بھرا اور خفگی  
آہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا "اگر تم اس قابل



# اسلم راہی ایم۔ اے کے تاریخی ناول

|       |                       |
|-------|-----------------------|
| 500/- | سراج منیر (اول و دوم) |
| 200/- | طارق بن زیاد          |
| 175/- | مقدس دیو داسی         |
| 200/- | سرابوں کے صحرا        |
| 300/- | رقص درویش             |
| 250/- | دشت کے بھیڑیے         |
| 300/- | غرناطہ کا چوپان       |
| 300/- | شیر شاہ سوری          |
| 250/- | سندھ کا سورما         |

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

یہ آپ سے ملاقات کی جائے مجھے امید ہے کہ میری خوش آوا اور  
زبان اطوار سیکھنے والے آپ کو پورے کا احساس نہیں ہونے دیا  
ہوگا۔ اے شکر کا لیتے ہیں۔  
”یہ ایک“ میں نے اس کی تائید کی۔

اس کی بھروسہ میں خفیف سی حرکت ہوئی تھی اسے مجھ سے  
اس طرح تائید کی توقع نہیں تھی بھروسہ اندر کی طرف اشارہ کرتے  
ہوئے بولا ”آئیے۔ تشریف لے جائے میرے کمرے میں بیٹھ کر بات  
کرتے ہیں۔ وہاں ذرا اطمینان سے بات ہو سکے گی۔“

وہ کچھ اس طرح میرا بازو تھام کر کمرے کی طرف لے چلا جیسے  
مجھے سارا رستہ کر لے جا رہا ہو۔ کمال اس کے ہم زاد کی طرح پیچھے  
چھ چھاپا آ رہا تھا۔ جشید کے کمرے میں داخل ہو کر ہم گویا اہرام  
کے اندر واقع ایک اہرام میں پہنچ گئے۔ میرا مطلب ہے وہاں  
مکتبہ سوری اور زندگی سے محرومی کا سا احساس موجود تھا لیکن  
اس کمرے کی ساخت اور آرائش کی خوبصورتی میں کلام نہیں تھا۔  
کمرے کی چھٹی دیوار پر عظیم دائرے کی سی صورت میں بلند مٹی اور ہلکی  
بزد مٹی اس کے نیچے سے اوپر کی طرف جاری تھی۔ چھت تک  
پہنچے دیکھتے یہ مٹی مٹی بہت دم ہو چکی تھی۔ اس پس منظر میں باقی  
تمام آرائش اور ساز و سامان بھی بہت خوبصورت دکھائی دے رہا  
تھا۔

کمرے کا وہ حصہ جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس  
میں بیٹھنے کی خوبصورت تہائی پر جانے کے برتن پڑے تھے۔ پچھلے  
ہفت دہائیوں کی نظر آ رہے تھے گویا جشید اور جمال کی ملاقات کا  
تازہ خوشگوار ماحول میں ہوا تھا۔ پھر دھڑے دھڑے تلخ کلاسی  
شروع ہوئی تھی لیکن جمال کے رخصت ہونے تک ہر حال طوقان  
گزر چکا تھا۔ جاتے وقت اس کا موڈ ٹھیک سی نظر آ رہا تھا۔ غزل  
لے پٹے کی تان چلی تھی کہ جن دنوں کا وہ باری مساکس تھیں ہوتے  
تھے ان دنوں ان کی ملاقات کا انداز یہی ہوتا تھا۔ اس کی بات  
لیکھتی معلوم ہوتی تھی۔

جشید نے مجھے نشست گاہ میں ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی  
مجھے مقابل بیٹھتے ہوئے بولا ”کیا چاہنا پسند کریں گے افضل  
محب؟“

میرے منہ سے غیر ارادی طور پر کوئی بے توجہ جواب نکلنے لگا تھا  
لیکن میں نے ہدف اپنے آپ کو مدد اور فیصلہ کیا کہ ماحول کی  
توجہ کو برقرار رکھنا چاہیے۔

”کافی۔ اگر آسانی سے مل جائے تو۔“ میں نے جواب دیا۔  
”میں تو اس کا جوہر دیکھتی تھی آسانی سے مل جائے گی جواب۔“  
وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

”یہ شوق میں نے نہیں پالے“ میں نے جواب دیا۔  
”یہ سب حوصلے کی بات ہے“ اس نے قدرے قہقہے آمیز سے  
انداز میں سہلا ہر کمال کو اشارہ کیا۔ اس نے میرے جاکر اندر

کام پر نہایت چلی آواز میں یوں کسی کو کافی اور انتہائی دھیما کے  
بارے میں ہدایت کی جیسے کوئی بہت رازدارانہ سی بات کر رہا ہو۔  
انظر کام پر بات کرنے کے دوران میں بھی اس کی نظر مجھ پر سے نہیں  
اٹھی۔ آدمی بہت مستحکم معلوم ہوتا تھا۔ جشید کے ہونٹوں پر دو مستند  
سکراہٹ برقرار تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ بات جیت جیت شوہر  
ہونے کے بعد نہ جانے کتنی دیر تک یہ سکراہٹ اس کا ساتھ دے  
سکے گی۔

وہ گویا از سر نو میرا تپا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”میری خوشی کی

معلومات کا تعلق ہے۔ آپ تو اس کہنی کے کلاٹ میں نہ  
آپ کو اس سے کیا شکایت ہو گی؟  
شاید کہنی کے کلاٹ میں کسی کی فرست اسے اذیت دیتی ہو۔ ممکن  
کما ”شاید یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس کہنی کا کلاٹ نہیں  
تھا لیکن میرا ایک دوست اس کا کلاٹ ضرور تھا اور اسے اس کی  
وجہ سے ہماری نقصان برداشت کرنا پڑا۔“  
”کون ہے وہ؟“ اس نے مجھ کو اچکاتے ہوئے پوچھا۔  
”کوئل جان کزیالی“ میں نے جواب دیا۔

”وہ آپ کا دوست ہے؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔  
میرے جواب سے اسے گویا دھچکا لگا تھا۔  
”جی ہاں“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”کیا یہ آپ کے لیے  
حیرت کی بات ہے؟“

”نہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ اس میں حیرت کی تو کوئی بات نہیں۔“  
جلدی سے گویا منتقلے ہوئے بولا ”آپ اپنی بات جاری رکھئے۔“  
”میرا خیال ہے آپ کو مسئلے کا اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔ اسے  
تو مال سلائی کیا گیا، نہ اس کی سیکر مٹی داپس کی گئی اور نہ ہی اس کی  
شکایت کا کوئی جواب دیا گیا“ میں نے اپنے لیے جس دوسرا سوال  
لاتے ہوئے کہا۔

”جواب کیسے دیا جاسکتا تھا مسز افضل۔۔۔!“ وہ حسانہ سے  
انداز میں باتھ لٹے ہوئے بولا ”دفتری بند ہو گیا۔ کہنی ختم ہو گئی  
کا ذکر چل آئی تھی۔ پھر کہنی کی جبریا رنٹر فرس میرا کی؟  
اسرار موت کی وجہ سے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ ایک طرح  
سے گئی کے پاس فیصلے کا اختیار نہیں رہا۔“

”لیکن اس ساری افرا تفری میں میرے کلاٹ کا کوئی ضرر  
نہیں تھا۔ ایک طرح سے اس کا نقصان کافی حد تک ناقابلِ علاج  
ہے لیکن اگر ہم صرف مالی نقصان کی بھی بات کریں تو اسے مجبوراً  
طور پر پچیس نہیں لاکھ کا نقصان پہنچا ہے۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا  
نقصان ہے۔ وہ زیادہ بڑا نہیں میں نہیں جانتے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ایک پوے بزنس میں کا دوست ضرور ہے۔“  
مسکرایا۔

”میں تو خود کو بھی بڑا بزنس میں نہیں سمجھتا“ میں نے کہا۔

”جی اسکا ہی اچھی نہیں ہوتی افضل صاحبہ۔“ وہ بدستور  
مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ تو گویا اس کے ہونٹوں پر چھائی ہو کر لگی  
تھی لیکن یہ مسکراہٹ مدح سے خالی تھی۔ اس کی آنکھیں اس  
مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

”بہر حال بات کو زل کی ہو رہی تھی“ میں نے کہا ”میں نے لے  
سے اسے بہت پریشانی اٹھانا پڑی۔ اس کے بزنس پر بہت بڑا اثر  
پڑا۔“

”مجھے افسوس ہے۔۔۔“ وہ بولا ”گو کہ اس کے لیے میں آفس

بات ہے کہ چوہدری گروپ آف کمپنیز اور فائیو اسٹار ہوٹل کے  
مالک جیسی ممتاز شخصیت سے آج ہمیں اپنے ہی دفتر میں شرف  
ملاقات حاصل ہو رہا ہے۔ یہ ایک بڑا سرت موقع ہے۔ میری کچھ  
میں نہیں آ رہا کہ کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کروں۔“

میں نے کہا ”تم جھگڑا یا لڈی ڈال کر اپنی خوشی کا اظہار  
کر سکتے ہو۔“ دیکھ ڈالو یہ ہو جاو گی دھن پر رقص سے بھی  
کام چل جائے گا۔ لیکن میں نے یہ مشکل اپنے آپ کو یہ کہنے سے  
باز رکھا۔ زبان کم بخت بار بار بھٹکنے کے لیے چل رہی تھی۔ اس کے  
بجائے میں نے سنجیدگی سے کہا ”اچھا۔“ تو آپ میری کا دوباری  
منیت کے بارے میں جانتے ہیں۔“

”ایک بڑے کا دوباری آدمی کو دوسرے بڑے کا دوباری آدمی  
کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہیے“ وہ بدستور خوش خلق  
سے بولا۔ کمال انٹر کام چھوڑ کر ایک کونے میں جا کر بت کی طرح  
استادہ ہو گیا تھا۔ اس نے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں سے وہ بوقتِ  
ضرورت نہایت آسانی سے براہِ راست مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ کم از  
کم مجھے تو اس کے اس طرح کھڑے ہونے کا یہی مقصد نظر آیا۔  
شاید یہ فرض کیے رکھا اس کی تربیت کا حصہ تھا کہ کوئی بھی ملاقاتی  
نہایت بڑھکون اور دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر بات کرتے کرتے  
اچانک کوئی خبر یا ہسپتال وغیرہ نکال کر اس کے پاس پر حملہ آور  
ہو سکتا تھا۔ سائے کی طرح ساتھ رہنے والے اور اچھے بازی کارڈ  
بیشہ اسی طرح مستعد رہتے تھے۔ کمال کی قدم دور کھڑا چلک  
جھپکائے بغیر سیاہی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا اور بظاہر  
سویا سویا سا دکھائی دے رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ شکار کی  
ملاش میں نکلے ہوئے چیتے کی طرح چونکا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جھید بولا ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں  
کہ آپ نے کیسے ہمیں ملاقات کی یہ خوشی بخشے کے بارے میں  
سوچا؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”جب آپ کو میری آمد کا مقصد  
معلوم ہو گا تو شاید یہ ملاقات آپ کے لیے زیادہ خوشی کا باعث نہ  
رہے۔“

”آپ بتائیں تو کسی۔ میں ہر صدمے کے لیے تیار رہنے کی  
کوشش کروں گا۔“ وہ اپنی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

”میں آپ سے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بندہ اگلے  
ہوئے ایک مسئلے کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں“ میں نے اس  
کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے قہر سا تھا لیکن دوسرے  
ی لمحے اس نے واقعی گویا اپنے آپ کو ہر صدمے کے لیے تیار  
کر لیا اور اسی خوش خلقی سے بولا ”اوہ۔۔۔ پھر وہی امپورٹ  
ایکسپورٹ کارپوریشن۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی ”یہ کہنی تو  
ہمارے لیے مسائل کی جھلکی بن گئی ہے۔ جہاں تک میری

# قصہ ابلیس

## نیت

### ۱۵۰/ انوارِ صدیقی

ہوا۔

”اس کے لیے میں اس کی طرف سے آپ کا شکر گزار ہوں ستر جیسے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ صرف ہمدردیوں سے اس کا کام نہیں چل سکتا۔“

”اس کا کام کس چیز سے چل سکتا ہے؟“ اس کے لیے میں مطالعہ تھی لیکن یہ مطالعہ ذہن سے زیادہ خطرناک محسوس ہو رہی تھی۔

”تمیں لاکھ روپے سے“ میں نے ہمارے لیے میں جواب دیا ”یہ اس کا صرف مالی نقصان ہے۔ اسے جو ذاتی کوفت ہوئی یا اس کی ساکھ کو نقصان پہنچا“ اسے وہ برداشت کر لے گا بشرطیکہ اس کا مالی نقصان پورا ہو جائے۔ اسے اس کی طرف سے قربانی ہی سمجھیں۔“

”جو آپ اسے نہیں لاکھ روپے دے دیں نا افضل صاحب! آپ اتنے بڑے بزنس میں ہیں۔ اور وہ آپ کا دوست بھی ہے“ اس کی خفیت سی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا رنگ آ گیا۔

”میں تو اسے دے ہی دوں گا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”بلکہ میں ممکن ہے میں نے دے بھی دیے ہوں لیکن حساب کتاب بہر حال حساب کتاب ہوتا ہے۔ جہاں انسان کا حساب لگا ہوا بعض اوقات وہاں حساب برابر کرنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔“

اس اثنا میں دروازے پر خفیف سی دنگ ہوئی۔ کمال نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ خوشبو میں کسی ہوئی ایک خوش شکل اور خوش ادا لڑکی کالی اور ریسکٹوں وغیرہ کی نرے اٹھائے اندر آگئی۔ وہ غزل نہیں تھی لیکن اسی قبیل کی چیز تھی۔ میں دل ہی دل میں حبیبہ کے دفتر کی رنگینوں کی یاد دہانے بغیر نہ سکا۔ کم بخت نے چائے کافی سرو کرنے کے لیے بھی ایک خوش لباس ”خوش شکل اور اساتذہ لڑکی رکھی ہوئی تھی۔

حبیبہ کوئی جواب دینے دینے نہ گیا۔ لڑکی ہم دونوں کے درمیان بیٹھ کر کافی تیار کرنے لگی۔ شکرانہ اٹھاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی دقش مسکراہٹ کے ساتھ انگریزی میں پوچھا ”آپ کتنی شکر لاپند کریں گے؟“

”جتنی مناسب سمجھیں ڈال دیجئے۔“ میں نے بھی مسکراتے

پیش قدمی نہیں تھی۔ ”لیکن آپ خود بزنس میں ہیں افضل صاحب! آپ کا دہیار کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو چیز ہمارے تر مرچوئی نہ ہو وہ ہم کیسے چلائی کر سکتے ہیں؟“

”لیکن آپ نے آرڈر قبول کیا۔ اس کا کنٹرول سائن

”میں نے نہیں۔“ کہنی نے آرڈر قبول کیا۔ اس نے میری بات کا تھوڑے گھبراہٹ محسوس کی۔ میں ان الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے بابک سے فرائی کو محسوس کر سکتا تھا۔ ”فرد اور کہنی میں بڑا فرق ہوتا ہے افضل صاحب!“

”مجھے معلوم ہے“ میں نے چھپتے ہوئے لمبے میں کہا ”جیسے انہی کی زبان اور اس کی نیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“

”بے شک۔۔۔ لیکن بڑے کا دہیار کہنی لاڈ وغیرہ کے مطابق چلتے ہیں۔ حالات میں اونچ نیچ آتی ہی رہتی ہے۔ اپورٹ انپورٹ کا رپورٹیشن بہر حال ٹہری ساکھ کی کہنی نہیں تھی۔ وہ یہاں سے کا دہیار کر رہی تھی۔ فی الحال وہ بحران کا شکار ہو گئی ہے۔ لکچر ایڈ ہے ہم جلد اس پر قابو پالیں گے۔ ہمارے بیشتر کلائنٹ نے ہمدردی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہنی کا اپنا کوڑوں دہیار ملک میں ہمدردیوں ملک چھٹا ہوا ہے۔“ اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں گویا لکچر بھانے کی کوشش کی۔

”شاید سب درست ہو۔ لیکن شاید آپ کو یہ بھی اندازہ ہو کہ میں یہاں کہنی لاڈ اور آپ کی کہنی کے مسائل ڈسکس کرنے گیا تھا۔“

وہ اعلیٰ اٹھاتے ہوئے بولا ”مجھے ایک بار پھر آپ کے بیان کی فوج کر دے گی افضل صاحب! میں کہنی کا سول پور پور انشور اٹھا ملک و خارجہ پر مرکوز نہیں ہوں۔ کہنی میری نہیں، میں انفرادی ہے۔ ٹیکنیکس پر بس سید اور ایک تیسرا شخص جو بیرون ملک بیٹھا ہوا ہے باہر کے معاملات وہ سنبھالتا ہے۔ پرس سید کا انتقال ہو چکا ہے۔ قانونی طور پر اس کا حق پرٹس سیرا کو ختم ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی عیب و غریب وصیت کی وجہ سے وراثت کا مسئلہ ابھی تک صرف یہی نہیں بلکہ مرے پر سو درے کے مصداق ”لائف ختم ہونے سے پہلے اس کی وراثت خود پر اسرار حالات کی بنا پر ہو گئی۔ شاید آپ تصور نہیں کر سکتے کہ معاملات کتنے الجھے ہوئے ہیں اور کہنی کس حال کو پہنچ گئی ہے لیکن ان پر بات کرنے کے لئے میں بہت وقت چاہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہم کئی دن مقرر انتظار کرے دیں شاید تب بھی کوئی نتیجہ نہ نکلتے۔“

”لیکن میں نے کوئل کا یہ معاملہ اسی لیے ہاتھ میں لیا ہے کہ لڑکی کو ممکن بنایا جائے یعنی کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکلا جائے۔“

”نہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں

”میں ہمدردیاں کوئل کے ساتھ ہیں۔“ وہ ہلکے جھپکائے بغیر

سے بھلی ہونے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔  
 حکیمانہ میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے دشمنی دینے کی کوشش  
 کر رہے ہیں مگر اقل ۱۳۹۱ء میں نے نہایت شیریں لہجے میں کہا  
 "کیا امکانات کی طرف اشارہ کرنے کو آپ کے ہاں دشمنی کا  
 جانا ہے؟" میں نے مصیبت سے پرہیز کیا۔

اس نے کافی کا ایک ٹکڑا کھونٹ بھرا اور اس کے بعد بھی ایک  
 لمحے کے لیے خاموش رہا۔ اس دوران میں اس کی نظر میرے چہرے  
 سے نہیں ہٹتی۔ آوی بہت گرا تھا۔ اس کے چہرے سے اندازہ کیا  
 بہت مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا یا کیا محسوس کر رہا تھا۔  
 صرف اس کی سفاک آنکھیں اس کی کیفیات کی تہذیبی بہت جلدی  
 کھاتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ حال سعیدی کے ساتھ وہ کیوں کراچی  
 چل پکار میں مصروف تھا۔ اس طرح چل پکار تو عام طور پر سب سے  
 جذباتی سے لوگ کرتے تھے جنہیں ذرا ذرا سی بات پر اپنے آپ کا  
 گھبراہٹ نہیں رہتا تھا۔ جبکہ تو اس وقت مکمل طور پر ایک ایسا انسان  
 نظر آ رہا تھا جو بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ نہایت پرسکون انداز  
 میں کر سکتا تھا اور کسی گھر سے سندھ کی طرح اپنے جذبات کے گھر  
 چتر اور سوئی، یہی کچھ اپنی دہلی پوٹیدہ رکھ سکتا تھا۔ ہر قسم کے  
 مسائل پر بڑے مہربان سکون سے بیٹھ کر بات کر سکتا تھا۔

میں ممکن تھا کہ وہ پلودار شخصیت کا مالک ہو اور اس کی  
 شخصیت کا وہ پلو صرف مثال سعیدی کے لیے مخصوص ہو چکے  
 بعض لوگ روز تو زندگی میں عام لوگوں کے درمیان بہت عجیب  
 رہتے ہیں اور کم گو نظر آتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے کسی خاص اور بے  
 تکلف دوست کے ساتھ بیٹھے ہوں تو ان کا بالکل عکس برعکس  
 سامنے آتا ہے۔

وہ نہایت آہستگی سے لمبی میں سہلاتے ہوئے بولا "میں سڑ  
 اٹھی! ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ ہم دونوں نہایت شرف مند  
 پسند اور سمجھدار ہیں۔ ہم نہایت عار کے لوگ تو نہیں ہیں۔"

"بے شک" میں نے بڑے غلوص سے سہلا کر کہا "ہم تو ان سے  
 کہیں بدتر ہیں۔"

وہ پھر ایک لمحے چپ رہا۔ شاید اسے مجھ سے اس جواب کی  
 توقع نہیں تھی۔ ایک اور ٹکڑا بھر کر وہ بولا "مسٹر صرف کوئلہ  
 ہی نہیں ہے افضل صاحب! اور بھی بہت سے حاشیہ ہیں جن کی  
 بہت نقصان ہوا ہے۔ اور صرف کلاکٹ کا ہی نہیں آخر کار ان کی  
 بہت نقصان ہوا ہے۔ ہمیں اپنے تمام کلائنٹس سے ہر دن  
 اور آج کل ہم ان رات اسی سٹے پر غور کر رہے ہیں۔"

"خوش!" میں نے استغناء سے انداز میں ہنس کر بولا  
 "خوش کرنا۔ کڑی نظر رکھنا۔ اجازت نہ دینا۔ یہ تمہارا  
 کام ہے جو پچھلے اڑتالیس سال سے ہمارے ملک میں  
 ہو رہے ہیں اور آج تک ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اڑتالیس سال

ہوئے انگریزی میں ہی جواب دہا ہمیں زندگی میں ہر روز وہی کچھ  
 زیادہ عمل و عمل نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں نے اتنی بھولتی بھولتی غیر  
 ضروری باتوں کے لیے پائے مقرر کر رکھے ہیں۔"

وہ ذرا چپ کی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہوئی لیکن دوسرے  
 ہی لمحے شاید اسے یاد آ گیا کہ وہاں جبکہ بھی موجود تھا۔ وہ جلدی  
 سے سر جھکا کر کافی تیار کرنے لگا۔ جبکہ اسے اسے گھر کا کریم کے  
 بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آخر وہ اس تھا۔  
 اس کے بارے میں وہ نہ جانے کیا کچھ باتیں تھیں۔ میں اسے حرمیں  
 اور خوبصورت انگلیوں میں چپے تمام کر شکر عمل کرتے ہوئے دیکھ کر  
 سوچ رہا تھا کہ اگر اسے واقعی صرف اسی کام کے لیے رکھا گیا تھا تو  
 پھر یہ اس کی خیر ضرورت تھی۔ اور وہ بھی ملا جلی تھیں اس میں موجود  
 تھیں ان کا زبان تھا۔

وہ ہمیں کافی کے کچھ حصار رخصت ہو چکی تو جبکہ نے وہیں  
 سے سلسلہ کلام جو ذرا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ گہری سانس لے کر وہ بولا  
 "چھا۔ تو آپ حساب برابر کرنے آئے ہیں؟" میں نے کچھ نہیں سنا  
 کہ یہ سوال تھا یا محض بیان۔ تاہم اس کے لہجے میں جس جذبہ کی  
 بازگشت تھی اسے میں محسوس کر سکتا تھا۔

"کیا کچھ نہیں۔ لیکن اصل فیصلہ آج کی بات چیت کے بعد  
 ہو گا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے" میں نے بے پروائی سے کہا  
 اور کافی کی چٹکی لی۔ اس کی سفاک سی آنکھیں کافی کے کچھ کے  
 اوپر سے میری جانب گھراں تھیں۔ انہیں دیکھ کر رات کے  
 اندھیرے میں جھانپوں میں چپے ہوئے اس بھڑے کا خیال آتا تھا  
 جو اس شکاری کے لیے گات لگائے بیٹھا تھا جو اسے ڈھونڈتا پھر رہا  
 تھا۔ اسی لمحے میں نے پہلی بار کمال کو ذرا مضطرب دیکھا۔ اس نے  
 ایک ہانگ سے دوسری ہانگ پر وزن منتقل کیا۔ اس کا ہاتھ ایک  
 لمحے کے لیے کلا کھوکھلے کے نزدیک کی طرف گیا لیکن پھر واپس آ گیا۔  
 دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ بہت کی طرح مسرت ہو چکا تھا۔

جبکہ نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھنے کی بجائے بہت کوشش  
 کی تھی لیکن آخر کار وہ غائب ہو چکی تھی۔ وہ اب مسکرائے کے  
 تکلف میں بڑے بغیر بولا "گھبراہٹ آج کی یہ ملاقات بہت اہم  
 ہے۔ کبھی کبھی بہت معمولی باتیں کسی بہت بڑے انقلاب کا پیش  
 خیر بن جاتی ہیں۔ بڑے کاموں کی دنیا میں بچپن نہیں لاکھ کی  
 کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن اگر معاملات کو دانش مندی سے پتہ نہ  
 کیا جائے تو یہ کسی بڑے فساد کی بنیاد بھی بن سکتے ہیں۔"

"بے شک" میں نے ذرا گرجوٹھی سے کہا "کی تو میں آپ کو  
 بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ نے کبھی کبھار ایسی خبریں ضرور  
 سنی ہوں گی کہ پانچ یا دس روپے کے لیے کسی کو قتل کر دیا گیا۔ یا  
 دو چار روپے کے مسئلے میں جھگڑا شروع ہوا اور موت قتل تک  
 جا پہنچی۔ جب چھوٹے لیکن دین کی دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے تو بڑے  
 لیکن دین کی دنیا میں بچپن نہیں لاکھ کے لیے کچھ جیسوں کے گولیوں

ٹھاک اثر سوخا ہے۔ روزانہ اچھی خاصی جلی مٹھوں کے ساتھ خبریں لکھتی ہیں۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو واقعی آپ نے پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ بات بتائی۔“ اس نے آہستگی سے سہلایا۔

”اس صورت حال کو آپ جیتا ذرا بھی پسند نہیں کریں گے؟“ میں نے کہا۔

”صورت حال۔۔۔؟“ اس نے قدرے استغنائے لیے میں کہا ”ہم تو اس شخص کو بھی بالکل پسند نہیں کریں گے جو اس قسم کی صورت حال کا سبب بنے گا۔“

یہ سمجھا مشکل نہیں تھا کہ اس جیلے سے اس کی مراد کیا تھی۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس قسم کے لوگ اگر کسی کو پسندیدہ قرار دے رہے تھے تو اس کا کیا انجام متوقع ہو سکتا تھا۔ میں نے بے پروائی سے مسکراتے ہوئے کہا ”ہو سکتا ہے آپ جیسے لوگوں کی نظر میں پسندیدہ قرار پاتا ہی اس شخص کا پسندیدہ مشغلہ ہو۔“

”میں کسی کو نصیحت کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن ادا ضرور کروں گا کہ انسان کو اچھے مشاغل اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

مثنیٰ مشاغل انسان کو مصیبت میں ڈالتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ دوسروں کے لیے بھی پریشانیوں کھڑی کرتا ہے۔ لیکن خیر۔۔۔ یہ

ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم واپس کوئل کی طرف آتے ہیں۔“ اس نے جو اشارہ دیا تھا ”وہ دے دیا تھا۔ اب وہ گریبا نری سے مسئلہ حل کرنے کی طرف مائل تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”جو شخص

تین لاکھ روپے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے اور کہہ کہ ہم اتنی زیادہ ادائیگی کرنے کے پسند نہیں ہیں لیکن ہم اسے اتنا مسئلہ بنانا نہیں چاہتے۔“

”یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ اسے اتنا مسئلہ بنانا نہیں چاہتے“ میں نے پوچھتے ہوئے لیے میں ”لیکن آپ یہ ادائیگی

کرنے کے پسند کیوں نہیں ہیں؟“

وہ ترنم آہیر سے لیے میں بولا ”مفضل صاحب! آپ جہ کہ صرف شوق دیکھ لیں۔“ مجھ کو ہر پرکھش میں نہیں ہیں۔ شاید اس

لے آپ کو اپنا ہوم ورک مکمل کرنے کی عادت نہیں رہی۔ اگر آپ نے اس کیس کو صحیح طرح ایڈجسٹ کیا ہوتا، اپنے کلائنٹ اور

دلاست سے اچھی طرح تبادلہ خیال کیا ہوتا۔ نیز اس کنٹریکٹ کا مطالعہ کیا ہوتا جو ہماری کمپنی کے کلائنٹ مال کا آئڈوز دیتے وقت

سائن کرے ہیں۔ تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اخراجات اور برجانہ و فیو تو دور کی بات ہے۔ ہم تو دور رقم بھی واپس کرنے کے صحیح معنوں

میں پابندی نہیں ہیں جو کلائنٹ ایڈوائس کے طور پر جمع کرتا ہے۔ کنٹریکٹ میں لکھا ہے کہ آئڈوز پر راند کر سکتے کی صورت میں کمپنی

مناسب قانونی تھانے پورے کرنے کے بعد اپنی صوابدیکہ کے مطابق ایڈوائس واپس کرے گی اور مناسب قانونی تھانے پورے کرنے۔

یا اپنی صوابدیکہ و فیو کا مطلب تو آپ اچھی طرح سمجھتے ہوں گے

ہم اخادوں میں کیا پڑھ رہے ہیں اور خبروں میں کیا مٹ رہے ہیں کہ فلاں مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے۔ فلاں سرگرمی پر کڑی نظر

رکھی جا رہی ہے اور فلاں نفلہ کام یا جرم کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس قسم کے بیانات میں مٹ کر مجھے نوکوں کے دلوں کی

مرتبائیوں میں کہیں ڈھم پڑ گئے ہیں۔ آپ کی یہ غور کرنے والی بات سن کر مجھے اپنے کسی ایسے ہی ڈھم میں نہیں سی محسوس ہوئی ہے

کیونکہ یہ بھی مجھے کچھ اسی قسم کا بیان محسوس ہوا ہے۔“ ایک بار پھر وہ غیر معمولی آنکھیں کلائی کے کبک کے اوپر سے

بچے تک رہی تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”ہر حال میں زیادہ لمبے مسائل میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ ہی آپ کے سب

متاثرین کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان سب کی نمائندگی نہیں کر رہا۔ میں تو کوشش کر رہا ہوں کہ صرف کوئل کے مسئلے سے

فرض رکھوں لیکن اگر ضرورت پڑی تو میں تمام متاثرین کی نمائندگی کرنے کے بارے میں بھی غور کر سکتا ہوں۔“

”ہم ہرگز نہیں چاہیں گے کہ ایسی صورت حال پیدا ہو۔“ اس کا لہجہ اب بھی شرس تھا ”لیکن بالقرض حال ایسی صورتوں

میں پیدا ہو بھی جائے تو آپ کسی حیثیت میں ان سب کی نمائندگی کریں گے مسز افضل؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”اگر وہ سب اس بات پر متفق ہوں کہ میں ان کی نمائندگی کروں تو پھر حیثیت کا کیا سوال رہ جاتا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔“ وہ پرخیاں سے لیے میں بولا ”دراصل میں سمجھا تھا کہ آپ عدالتی فیوڈار بننے کی کوشش

کریں گے۔“

”مجھی کبھی میں وہ بھی بن جاتا ہوں“ میں نے اسے مطلع کیا۔ ”اگر وہ واقعی۔۔۔؟ یہ تو دلچسپ بات بتائی آپ نے“ وہ ایک

اور کوئٹ بھر کر اس طرح بولا جیسے واقعی میرے اس انکشاف سے غلغلہ اندوز ہوا ہو۔

مٹھکے کے دوران میں میرا بھی کافی بچنے کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے ایک چٹکی لینے کے بعد کہا ”میں آپ کو ایک اور دلچسپ بات

بتا چاہوں۔ میرے پاس لا کی ڈگری بھی ہے اور بار کی رخصت بھی۔“

مجھی کبھی شوقہ طور پر میں کسی دوست کی قانونی مدد کے لیے خودی کلا کوئٹ ہن کر عدالت میں بھی جا کھڑا ہوتا ہوں۔ محض پرکھش

میں رہنے کے لیے۔ اور اگر مطالعہ اپنے بس کا نہ لگے تو پھر بڑے ادائیگی گرامی دیکھوں گا ایک چاراضی تو موجود ہی ہے۔ میرا بتانے

کا قصور یہ ہے کہ اگر ہم مناسب سمجھیں تو قانونی جنگ بھی لالچے میں لگیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ کافی لمبا راستہ ہے۔ اس کے باوجود

اگر میں آپ کے سب متاثرین کی نمائندگی کا فیصلہ کر سکی ہوں اور

ایسا عدالتی چارہ جوئی سے ہی کی جائے تب بھی خاصی سرگرمی

فعال جاسکتی ہے۔ کافی ہلاک ہو سکتا ہے۔ پریس میں میرا ٹھیک

لاز و نیرہ کا تو ذکر ہی نہ چھیڑیں جمشید صاحب! یہ بڑا تکلیف دہ موضوع ہے۔ ہم نے مغرب سے جدید معیشت، اشیا مارکیٹ اور کچنی لاز کے جو کوہر و دھندے در آمد کئے ہیں اس نے سارے معاشی نظام کو ایک عجیب شیطانی نظام میں عکس کیا ہے آپ کے سامنے ایک پوری کاروباری ایساڑ کھڑی ہوئی ہے۔ آپ اس میں کروڑوں روپے انویسٹ کر دیتے ہیں لیکن جب کوئی کھڑا کرنا ہوتا ہے تو آپ کو پتا نہیں ہوتا کہ اس میں اصل جواہر کون ہے؟ ایک طویل مدت میں آپ کو اگر یہ پتا چل بھی جاتا ہے تو پھر پتا نہیں چلتا کہ آپ اس کے خلاف فوری اور مؤثر کارروائی کی طرح کر سکتے ہیں؟ برسوں میں جا کر آپ کو پتا چلتا ہے کہ درحقیقت کسی کے خلاف صحیح طور پر کوئی کارروائی ہو ہی نہیں سکتی۔ عام طور پر لوگ یہ حیرت انگیز راز جانتے سے پہلے اللہ کو پارسے ہو جاتے ہیں۔ جو پانی پیتے ہیں وہ اس راز کے معلوم ہونے کے بعد صدمے سے اللہ کو پارسے ہو جاتے ہیں۔

میں نے کالی لاکھ پائی کی پر رکھتے ہوئے صومنے کے پٹھے سے ٹیک لگا کر مری سانس لی اور سلسلہ کام جو ۱۳ سی شیطانی قسم کے معاشی نظام کا شاخسانہ ہے کہ ہمارے ہاں کبھی فاس کبھی اور کبھی کو آئریوز کے نام پر ادارے قائم ہوتے ہیں، انسانوں کے فطری لالچ سے قاعدہ اٹھاتے ہیں اور اربوں روپے خسر بود کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ ان کے بھی سیٹ آپ کو پوری طرح کھنگالیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ درحقیقت قانونی طور پر آپ ان کے خلاف کوئی خاص کارروائی نہیں کر سکتے۔ یہ جو پلک کا عاثر ہو رہا ہوئے اور مختلف قسم کے دباؤ کی وجہ سے حکومتیں نیم صلی کے ساتھ تھوڑی مدت کارروائی کرتی کبھی ہیں تو وہ بے نتیجہ رہتی ہے۔ صرف تحقیقاتی اداروں کے کچھ لوگوں کو قاعدہ ہو جاتا ہے۔ چند کروڑ روپے ان کی جیبوں میں چلا جاتا ہے اور میس۔ اربوں روپے انویسٹ کرنے والوں کے حصے میں اخباری بیانات، رالے اور تسلیاں آتی ہیں۔ مغرب کے اسی شیطانی معاشی نظام کی شدہ بازیاں ہیں کہ گھروں کی بین الاقوامی کرنسی اور امانتے اپنی ملکات میں رکھنے والے ایساڑز راتوں رات رست کے گھروں کی طرح بٹھ جاتی ہیں۔ دوسرے روز یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ ان کی دولت ہے کتنا؟ محض کچھ روز پر اعداد و شمار کی تقاریر نہ جاتی ہیں۔ بی سی ای آئی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اسی مغربی معیشت کی بازی گری ہے کہ کھرب ترقی لوگ راتوں رات کنگال ہو جاتے ہیں۔ دینی کے شیخ گھروں کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اسی معاشی دھماکے کا کمال ہے کہ مختلف حکومتیں اور ان میں شامل لوگ اپنے منظر نظر افراد کو بینکوں سے اربوں روپے انھوا کر دے دیتے ہیں اور پھر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ جب کہ دولت دوسروں کی ہوتی ہے جنہیں علم بھی نہیں ہوتا کہ ان کے روپے کا کیا ہو رہا ہے اور اگر سب کے سب لوگوں کی ساری کی ساری اجتماعی دولت بھی ڈوب جائے اور

اس کی مزید وضاحت کنٹریکٹ کے قارئین پر ایک جگہ نہایت باریک حریف میں کی گئی ہے جسے کوئی پڑھنے کی زحمت نہیں کرتا۔ میں خاموش تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا سا کھنچاؤ پیدا ہوا اور وہ تدریجاً وقف سے ہوا "چنانچہ اگر کسی قسم کا اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں کوئی کلائٹ عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کرے تو اسے صرف اپنا ایڈوائس واپس لینے میں برسوں لگ سکتے ہیں۔"

پھر وہ ذرا مائی سے انداز میں مری سانس لے کر ہوا "لیکن اس قسم کی ناگوار صورت حال اس سے پہلے کسی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کچنی کا کام ایک طرح سے اپنی سبک پر چل رہا تھا۔ کنٹریکٹ کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ کلائنٹس ہمارے پاس آنے پر مجبور بھی تھے۔ ہم جیسی سروزر کوئی اور کچنی میا نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ ان حالات کی روشنی میں آپ کا دلیل ہونا تو آپ کے کچھ زیادہ کام نہیں آسکتا۔ اور جہاں تک آپ کے دوسرے مائی گرائی و کیوں کے متعلق کا تعلق ہے تو اس قسم کے مشکل ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ ہم نے کبھی ان پر تکیہ نہیں کیا۔"

"میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہمیں اچھی طرح جانے اور رکھے بغیر آپ اس قسم کے دعوے نہ کریں تو اچھا ہے مسٹر افضل!" وہ طائفت سے ہوا "تاہم میں اس وقت بھی آپ کے دعوے کو جھوٹا سمجھ کر کھوکھلا رہے بنا قرار نہیں دے رہا۔ ہمارے لیول کے لوگ ایک نظر میں بہت سے اندازے لگا لیتے ہیں۔ کھپ میں خود بھی یقیناً یہ صلاحیت موجود ہوگی۔"

"اسی لیے تو میں ایک وکیل کی حیثیت سے آپ کو قانونی نوٹس بھجوانے کے بجائے خود آپ کے پاس آیا ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے معلوم تھا کہ وہ نوٹس شاید آپ تک پہنچے بھی نہ پائے آپ سے بالا کوئی وکیل اس کاری جواب بھجواوے۔ اسی لیے میں نے بقول آپ کے مناسب ہوم درک کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔"

اب وہ بھی ذرا واضح انداز میں مسکراتے ہوئے ہوا "اور چونکہ میں نے آپ کے بارے میں کچھ اندازے قائم کیے ہیں اسی لیے میں اتنے چھوٹے چھوٹے مسائل پر اتنے وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کا سیٹ آپ کچھ ایسا تھا کہ میں تو اس کے اس قسم کے تنازعات کے سلسلے میں قانونی طور پر سرے سے جواہر ہی نہیں ہوں۔ کچنی لاز کے مطابق۔"

میں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے اور اس کی بات کانٹے ہوئے گویا خاصی تکلیف کے سے عالم میں کہا "کچنیوں کے سیٹ آپ اور کچنی

اتنی بڑی رقم نہیں ہے "میں نے سادگی سے کہا۔  
"بے شک میں نے ایسا کیا تھا" اس نے حلیم کیا "لیکن اس سے آپ کو یہ مطلب ہرگز اٹھ نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اتنی رقمیں خواہ مخواہی اخراج کر لوگوں کو دیتے رہتے ہیں۔ سہرا یہ دار اور برنس مین کے لیے رقم چھوٹی اور بڑی تو ضرور ہوتی ہے لیکن غیر اہم ہرگز نہیں ہوتی۔"

مجھ کو کچھ سوچتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا مہر حال۔  
اس سے آپ یہ بھی نہ سمجھیں کہ میں کوئل کو ادا سنگی کرنے سے انکار کر رہا ہوں۔ دراصل برنس مین کو ہر پہلو پر سوچنا پڑتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم کوئل کو ادا سنگی کو دیتے ہیں تو میں نہیں ہے یہ بات راز نہ نہ سکے۔ اس طرح رفتہ رفتہ دوسرے تمام کلائنٹس جن کی تعداد ہزاروں میں ہے "اپنے ایڈوائس اور ہرجانے وصول کرنے کے درپے ہو جائیں گے بلکہ جن لوگوں نے ایڈوائس جمع نہیں کرایا تھا" صرف قمار دارا تھا وہ بھی ہرجانے کے دعوے دار ہو جائیں گے۔ بات کوڑوں تک جا پیچے گی۔ کس ایسا نہ ہو کہ ہم یہ اچھا کام کر کے بری طرح پھنس جائیں۔ ہم پہلے ہی جن مسائل سے دوچار ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ ہمیں رازداری کی ضمانت تو نہیں دے سکتے؟"

"میں کسی بھی قسم کی ضمانت نہیں دے سکتا" میں نے صاف کوئی سے کہا "لیکن میرا خیال ہے یہ بات راز ہی رہے گی۔ ظاہر ہے کلائنٹس کا آپس میں تو رابطہ نہیں ہوتا۔ ایک کلائنٹ کو تمام دوسرے کلائنٹس کے بارے میں تو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کون ہیں۔ اور کوئل کو اگر رقم مل جاتی ہے تو وہ اخبار میں اشتہار دے کر عوام کو مطلع کرنے سے تو ہبا کہ وہ آپ سے رقم وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔"

"آپ کی بات درست ہے" اس نے سہلایا "لیکن ایک کلائنٹ دوسرے کم از کم چار پانچ کلائنٹس سے تو واقف ہوتا ہے۔ اگر وہ صرف ان سے ہی ذکر کرے تب بھی بات پھیلنے چھلنے کافی پھیل جاتی ہے۔ آپ کوئل کو زبان بند رکھنے کی تلقین تو کری سکتے ہیں۔ اگر آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہو تو ہم خود اس سے درخواست کر لیں گے۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ میں تو یہیں کوئل کے مسئلے کو محض دو سری بات پر پھنسنے کے لیے بہانہ بنا کر آیا تھا اور دوسری بات ابھی میں نے شروع ہی نہیں کی تھی۔ مجھے کوئل کا کام ہونے کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ یہ تو بس یوٹی ایڈ میرے میں تھمک گیا تھا۔

دکھائی جا رہے تھے۔ کوئل کو ہرجانہ دلایا۔ اس رقم ایٹنے کی امید نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ یہ خبریں کریمت خوش ہو گا۔ اب مجھے ڈرازی سے کام لیتے ہوئے اس معاملے کو حسی شکل دے دینا ہی چاہیے تھا۔

یک بھی رات کے گھر وندوں کی طرح چبھ جائیں تو وہ کچھ نہیں ہنستے۔ مغرب کا معاشی نظام ایک ایسا شیطانی پتھر ہے جس میں ہر بار چبھنے والا کبھی نہیں نکل سکتا۔ اور اس سے کسی کو رزار ہی نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف دولت کے دیباہر ہے ہیں کھیتوں پر اچھوٹا اور شمار کا ایک طوفان برا ہے لیکن عام آدمی کی حالت تباہ ہے۔ امیر ترین ملکوں میں بھی غربت اور معاشی مسائل بڑھ رہے ہیں۔ امریکا میں بھی لوگ کوڑے کے ڈھیروں پر پڑ چکے ہیں۔ کھانا تلاش کر رہے ہیں اور ہمارے ہاں تو اکثریت جس حال میں زندگی گزار رہی ہے اس کا پوچھیں ہی مست۔"

میں نے حقیقتاً اپنے دل میں دکھ کی ایک لہر محسوس کرتے ہوئے غصی سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے کہا "یہ جو آج وزیر کلمے والا بھی پریشان ہے اور دو کوڑ کلمے والا بھی پریشان ہے۔ اس میں زیادہ دخل تو اسی بات کو ہے کہ انسان میں غنیمت فہم ہو جی ہے لیکن اس میں کچھ حصہ اسی مغربی معاشی نظام کی خوشنوا بھی ہے۔ مغرب کے معاشی شعبہ باز برس برس اس میں شیطانی کھیل کو بھیلانے تو چلے آ رہے ہیں لیکن انہیں خود کی معلوم نہیں کہ اس کی انتہا کہاں ہے۔ یہ جن بوتل سے نکل تو رہے لیکن اسے بوتل میں واپس لے جانے کا طریقہ انہیں خود ہی معلوم نہیں۔ اپنے ساتھ انہوں نے پوری دنیا کو اس جن کے دھنکے میں پھنسا دیا ہے۔ وہ خود تو کسی نہ کسی طرح سوا کر جا رہیں گے۔ ان کی بنیادیں مضبوط ہیں اور وہ بے پناہ شاطر ہیں۔ وہ باقی دنیا کو ان پر کراہتی بھاکا سامان کرتے رہیں گے لیکن میں اپنے ملک کے لوگوں کا سوچتا ہوں۔ ان بے جا دلوں کا کیا ہے؟ دوسرے ملکوں سے خطرناک سیاسی اور سماجی مسائل تو ہمیں جس جہاں سے ہمارے گھر ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں "لیکن ساتھ ساتھ یہ معاشی نظام ناہمیں جس طرف لے جا رہا ہے اس کا تصور کر کے میرے دماغ میں ہوتا جاتا ہے۔"

عشیدہ اب گویا ایک نئے زاویہ نظر سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا منہ پانی پر رکھا اور کندھے اچکا کر بولا "یہ مسئلہ حل کرنے کے مسائل نہیں ہیں۔ ہمیں صرف اپنے کوئی بات کرنی چاہیے۔"

"ظاہر ہے۔ آپ ان مسائل پر کیسے بات کر سکتے ہیں۔ آپ ان نظام کے گورکھ وندوں سے قاعدہ اٹھانے والوں میں سے ہیں۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے یکدم بدترابہ لے ہوئے "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کوئل کو تمیں لاکھ کی ادا سنگی کر رہے ہیں۔ اس کی سرکار بہت میں یکدم شاطرانہ رنگ جھلک آیا۔"

تو کہہ دیجئے گا۔ کہنے میں کون سا زور لگتا ہے اور نہ ہی بدترابہ کہنے میں کوئی طاقت صرف ہوتی ہے۔ آپ خود ہی یہ انداز لگائیں کہ تمیں لاکھ روپے آپ جیسے لوگوں کے لیے کوئی

ایک بیک چہرے کے بجائے ایک ماسک نظر آنے لگا۔ نیم ہوا ہوا تھا  
کے صوب سے جھانکتے ہوئے اس کے دانت کسی درخت کے  
داغوں سے مشابہ محسوس ہونے لگے۔ بظاہر اس کے پوز میں ذرا  
بھی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن اس ایک منٹ نے اس کی پہلی  
شخصیت کا اثر ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس پر گویا بجلی کی گری برس پڑی  
اس کی ذات پر چڑھا ہوا ایک خول سا تار کر رکھ دیا لیکن وہ جیتنے  
کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ عام نظر آنے کے باوجود اس میں کوئی  
خاص بات تھی۔ شاید اسی لیے اس نے دوسرے ہی لمحے اپنے آپ  
کو سنبھال لیا۔ اس میں جو تبدیلی آئی تھی وہ محض دو چار سینکڑے  
لے تھی تاہم اب اس نے ذرا اتھوٹیل سے میری طرف دیکھا۔ پھر  
اس کی نظر کمال کی طرف گھوم گئی۔

ان کے درمیان گویا کوئی نئی جینٹل رابطہ تھا۔ اس نے نہ  
مہ سے بچ کر کہا تھا نہ کوئی اشارہ کیا تھا اور نہ مجھے اس کی آنکھوں  
میں کوئی پیغام نظر آیا تھا لیکن کمال نے کچھ اس طرح اپنی جگہ سے  
حرکت کی جیسے ہوا کے نرم جھونکے سے کوئی روشنی کپڑا اٹھایا ہو۔

میرے اعصاب یک تخت تن گئے۔ میں ہلک بھینکتے میں اپنے  
بجلی ہو لسنر سے مشین پھیل نکالنے کے لیے تیار تھا لیکن کمال نے نہ  
ٹھکا جھک کر دھم سے آنے والے کی کوٹش کی اور نہ ہی اس کا ہاتھ  
کسی بجلی ہو لسنر دھوکہ کی طرف پھیلا۔ اس کی نظر تو مجھ پر ہی رہی لیکن  
وہ اصل میں ایک گوشے میں جے ہوئے خوبصورت فرنیچ کی طرف  
جا رہا تھا جو سرسری نظر میں کمرے کی آرائش کا ہی ایک حصہ نظر  
آ رہا تھا۔

اس نے فرنیچ کھولا تو مجھے اس کے سب سے اوپر والے ریک  
میں ایک خوبصورت پلوری رے میں مخصوص لیے دستے والے  
گلاسوں میں 'جنینس ہائی بائر' کا جانا ہے چند تار شدہ رنگ سرنگی رنگ  
نظر آئیں۔ کمال نے وہ ٹرے لے۔ اٹھائی اور لا کر جیشہ کے سامنے  
رکھ دی۔ وہ بھی معلوم ہوتی تھی۔

"آپ واقعی اس قسم کی کوئی ڈرنگ نہیں لینے مسٹر افضل؟"  
جیشہ نے لمانٹ سے پوچھا۔ میرے سوال کو اس نے فی الحال  
پس پشت ڈال دیا تھا۔

"نہیں" میں نے غیر حوصلہ سے جواب دیا۔  
"دیر کی گز۔ آپ جیتنا ایک مختلف آدمی ہیں۔ کیا بات اس  
سے پہلے کسی نے آپ کو بتائی مسٹر افضل؟" وہ گلاس اٹھا لے۔  
چلا۔

"کئی مرتبہ" میں نے جواب دیا "اور کسی کے بتانے سے  
مجھے معلوم تھی۔ کچھ تو مجھے قدرت نے عطا ہی دیا تھا اور  
اس کے بعد میں نے خود مختلف بننے کے لیے بہت محنت کی ہے۔"  
"ہولہ!" اس نے پُر خیال انداز میں گلاس کو اٹھایا۔  
سمجھا تو ہوئے ہنکارا بھرا ہنریک دم ہی ایک بڑا سا گھونٹ بھر لیا  
گھونٹ طاق سے اترنے ہی جیسے اس کا اعصابی تار توڑ ہے۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے۔ میں  
کوئل کو سمجھا دوں گا کہ وہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرے گو کہ یہ  
مجھے خود غرضی محسوس ہوگی۔ خواہش یہی تھی کہ تمام کلائمش  
کے تصانیف کا ازالہ کیا جاتا۔"

"میرا قصہ مشورہ ہے کہ آپ اتنے بہت سے لوگوں کی  
طرف سے دتے داری کا بوجھ نہ اٹھائیں۔ بعض اوقات بہت  
بڑے کام کے پکڑ میں جھوٹا کام بھی رہ جاتا ہے۔" وہ دوستانہ لہجے میں  
چلا "میں کو خوش کروں گا کہ کوئل کو ایک دو دن میں چیک مل  
جاسکے۔"

"اور کیش بھی ہو جائے" میں نے قہر دیا۔  
اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے "ابھی ہی دل  
دکھانے والی باتیں نہ کریں مسٹر افضل!" وہ گری سانس لے کر چلا  
"یہ تو ممکن ہے کہ ہم کچھ اصولوں یا قانونی بنیادوں پر کسی کو آرائش  
سے انکار کر دیں لیکن ہمارے گروپ آف کپینز کی تاریخ میں ایسا  
کبھی نہیں ہوا کہ ہم نے کسی کو ڈس آنرز ہونے والا چیک دیا ہو۔"  
"آپ کی بات سے مجھے اطمینان ہوا ہے" میں نے کہا اور  
کوٹش کی کہ میری مسکراہٹ اسے دوستانہ محسوس ہو۔

جواب وہ بھی ذرا دوستانہ انداز میں مسکرایا اور چلا "دیکھ  
لیں۔ ہم نے پہلی ہی بار آپ کی آمد کو کتنی اہمیت دی ہے اور آپ  
کا کتنا احترام کیا ہے۔ آپ کو صرف مطہن ہی نہیں 'خوش' ہوا  
چاہیے۔ رگم زناہ وہی نہ سہی لیکن آپ کی یہ کامیابی بہت اہمیت  
رکھتی ہے۔ بس۔ یہی کام تھا آپ کو؟"

"نہیں۔ ابھی ایک اور کام باقی ہے" میں نے کہا۔ مجھے اندیشہ  
تھا کہ میں دوسرے موضوع پر بات شروع کروں گا تو کس کوئل کا  
بنا ہوا کام نہ بگڑ جائے لیکن مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔  
"وہ کیا ہے مسٹر افضل؟" اس کی دونوں بھونیں کمان بن  
گئیں۔

"میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ جس رات پر انس میرا قتل ہوئی  
اس رات اس کے اور آپ کے درمیان کیا معاملہ ہوا؟ کون سے  
کچھ دیر پہلے؟" میں نے گویا ایک نئی جنگ شروع کرتے ہوئے  
کہا جو بظاہر کافی کی میز نہایت تر سکون انداز میں کھل نکلوں کے  
جھپٹاؤں سے لڑی جا رہی تھی لیکن اس کے نتیجے میں بہت کچھ  
ہو سکتا تھا۔ بڑے پائے پر خوریزی کی نرت بھی آگئی تھی۔ مجھے  
بھی معلوم تھا کہ اس کی کل حفاظتی فورس کمال نہیں تھا۔ کمال  
چپے نہ جانے کتنے خطرناک روڈوں لہا انسان کہاں کہاں ایک  
اشارے "ایک فنڈ کے بھترے اور اسے بھی معلوم تھا کہ بظاہر  
میں اکیلا اس کے پاس آیا تھا اور بے ضرر دکھائی دے رہا تھا لیکن  
نہ تو وہ مجھے اکیلا سمجھ سکتا تھا اور نہ بے ضرر۔ ہم دونوں گویا تھے  
ہوئے رستے پر چل رہے تھے۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ جیسے نجد ہو کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ



پر بندہ رہے تھے۔ مثلاً مجھے جینی طور پر معلوم نہیں تھا کہ جیشہ پرنس سے ملنے واقعی کیا تھا یا نہیں؟ یہ بھی میں نے اندھیرے میں سمجھ بھڑا تھا اور میں دلی علی میں دھاک رہا تھا کہ کم از کم یہ ضرور نکلنے پر لگ جائے کیونکہ میرا یہ اندازہ غلط ہونے پر میرا سارا ایمان ہی کچھ کھوکھلا اور بے وزن سا ہو سکتا تھا۔

جب جیشہ نے پرنس اور انداز میں میری بات کی تردید نہیں کی اور بدستور ایک ننگ یہی طرف دکھا رہا تو میں نے اندھیرے میں ایک اور تیر چلانے کی کوشش کی۔ میں نے ذرا نیچے آواز میں کہا ”جیشہ صاحب! آپ یقیناً بہت باخبر تو ہی ہوں گے شاید ہر شخص میں آپ کو اندر کی خبر دینے والے آپ کے مہمان موجود ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ ایک بات آپ کو بھی معلوم نہیں ہوگی جو میں آپ کے فائدے کے لیے آپ کو بتانے لگا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ پرنس میرا کے قتل کی تحقیقات صرف پولیس اور کرائز راج کی نہیں بلکہ حکومت کی ایک خفیہ اہم خفیہ ایجنسی بھی کر رہی ہے پولیس کرائز راج یا سی آئی اے وغیرہ تو اگر کسی قسم کی پوچھ بچھ کے لیے آپ کے پاس پہنچ بھی جائیں تو آپ ان سے نہ مل سکیں گے۔ ان کے ساتھ تو شاید آپ کا گھر کا سا معاملہ ہو۔ لیکن جو باتیں میں آپ کو بتا رہا ہوں اگر وہ کسی طرح پہلے خفیہ ایجنسی تک پہنچ گئیں اور آپ ان کے سامنے تردید کرتے رہے تو آپ کا جھوٹ آپ کو مشکوک بنادے گا۔ یہ تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ اگر پرنس میرا کے قتل کے معاملے میں آپ کسی خفیہ ایجنسی کی نظر میں مشکوک قرار پائے تو آپ کے لیے بڑے سنگین مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔“

اس کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے واضح ہو گئی مگر وہ کمری سانس لے کر ہوا ”میرا آپ کے۔۔۔ ان کے۔۔۔ یا کسی اور کے سامنے جھوٹ بولنے کا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں پرنس کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں یا مجھ سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی فرد یہ حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی موت میں تو ہمارا نقصان تھا۔ ہمارے لیے تو اس کی زندگی جیتی تھی۔ اس کی موت نے تو ہمارے لیے بہت سی الجھنیں کڑی کر دی ہیں۔“

”قتیلہ کرنے والے دو سرے بہت سے تھے بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ کچھ ایسے پہلو بھی ان کے سامنے آسکتے ہیں جن سے ہمارے لیے کہ پرنس کی موت سے آپ کی بہت سی الجھنیں دور ہو گئی ہیں۔ یہ عجیبہ معاملات ہیں جیشہ صاحب! اور آپ کو معلوم ہے جب معاملات ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلے جائیں جن پر آپ کا کوئی اثر و رسوخ نہ ہو تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے مزید اندازہ میں کہا۔

”میں نے کہا کہ میرا جھوٹ بولنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ وہ بظاہر خود احمادی اور تہرے سے بے نیازی سے بات کر رہا تھا لیکن میں

پرچہ اس نے صوفے کے پٹے سے نکل لگائی اور بڑے سرسری انداز میں بولا ”ہاں۔۔۔ تو آپ کیا کر رہے تھے مسٹر افضل؟“ میں یہ جانتا چاہ رہا تھا کہ جیتی جاگتی پرنس میرا کے ایک ہوش میں تبدیل ہونے سے پہلے وہاں کیا ہوا تھا؟ میں نے بڑے فحش سے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے گلاس پٹائی پر رکھ کر بے بسی کے اظہار کے لیے بازو پھیلے ”لیکن میں بھلا یہ بات کیسے بتا سکتا ہوں؟ مجھے کیا مطلب! آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ آپ وہاں موجود تھے“ میں نے سادگی سے کہا۔ ”آپ کو کھانا کھانی ہوئی ہے کسی نے آپ کو کھانا اطلاع فرام کی ہے؟“ وہ پرسکون جیسے میں بولا اور ایک بار پھر گلاس اٹھا کر اس نے پہلے کے مقابلے میں بہت جھڑکھٹ بھرا بلکہ اسے چسکی ہی لکنا زیادہ مناسب تھا۔ کمال ایک بار پھر اپنی جگہ جا کھڑا ہوا تھا۔ ان کا جو کئی ہی کی طرح بدستور تاثرات سے عاری تھا۔ میں نے گھٹے سے صاف کہا کہ وہ بے ہودہ انسان اس طرح ساکت کھڑے کون اپنے آپ کو کیوں تھا رہا تھا؟ بیٹھ کیوں نہیں جاتا تھا۔

وہ ایک ننگ یہی طرف دکھا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت فحش جیسے میں کہا ”میرے سامنے کھانا شاید آپ کے لیے ذرا بھی نقصان دہ نہ ہو لیکن اگر آپ اپنی اہمیت بانی پر مصر رہے تو آگے چل کر آپ کے لیے بڑے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس امر کی ایک ٹھوس شہادت موجود ہے کہ دوسرے کی رات ساڑھے سات بجے آپ نے پرنس میرا کو فون کیا تھا۔ ستم خرابی یہ تھی کہ قانونی طور پر وہ ایک کمیٹی میں آپ کی بیکار آخری تھی لیکن وہ آپ کو نہیں جانتی تھی۔ آپ نے اس سے بات نہ کی۔ اسے اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں بتایا۔ وہ آپ سے ناراض تھی۔ آپ پر برہم ہو رہی تھی اور آپ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں شکایات اس تک پہنچ چکی تھیں۔ بہر حال آپ نے اسے بے پروا کر دیا۔ پھر آپ اس سے چند منٹ بعد ہی ملے بھی پہنچے۔ آپہ آخری فرد تھے جس نے اسے زندہ حالت میں دیکھا۔ یہ ایک اہم ترین حقیقت ہے۔“

وہ جیسے جیسے بھڑکنا بھول گیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں زلف کی نہیں۔ صرف سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ شاید وہ اندازہ لگائے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان باتوں کی کوئی دیتے والا کون ہو سکتا تھا؟ میرا اسے یہ بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ جب وہ فون پر پرنس میرا سے بات کر رہا تھا تو وہاں کامران نامی ایک نوجوان سمجھوتہ خاتون قانونی طور میرا کے شوہر کے درجے پر فائز ہو چکا تھا۔ یہ بھی مجھ کو کچھ جیشہ کو بتا رہا تھا وہ کامران نے مجھے اتنی تفصیل سے نہیں بتایا تھا لیکن اشارے بہر حال مل گئے تھے۔ بانی سب کچھ نہ اندازہ لگائے سے ایک رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ تیر نکلنے

دیکھ رہا تھا کہ اس کی بھونک کے پاس بیٹے کی ہنسی ہنسی ہو گئی  
نمودار ہو چکی تھیں حالانکہ کمرے میں خنکی پہلے سے زیادہ محسوس  
ہو رہی تھی۔

”نی الحال تو آپ اپنے اس ارادے پر عمل پیرا نظر نہیں  
آ رہے“ میں نے کہا۔

اس نے چھوٹا سا ایک کھونٹ بھرا اور ہوار لہجے میں بولا  
”میں جب پرئس سیرا کے ہاں سے روانہ ہوا تو وہ زندہ سلامت  
اور مکمل طور پر صحت مند نظر آ رہی تھی۔ میری اس سے ملاقات  
محض چند منٹ کی تھی اور مجھے اعتراف ہے کہ وہ کچھ خوش گو اور  
باحول میں نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی کہ  
قتل وغیرہ کی نوبت آجائی۔ گارڈز میں کڑی سزدی تو چلی رہتی  
ہے۔ اس سے زیادہ سنگین باتیں تو میرے آپ کے درمیان ہو چکی  
ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے ایک دوسرے  
کو اغلی بھی نہیں لگائی۔“

مجھے ایک خوش گواری حیرت ہوئی تھی کہ اس نے اتنی جلدی  
اس حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ وہ پرئس سے ملا تھا۔ اندر میرے  
میں چھوڑا ہوا میرا سب سے اہم تیر نشانہ پر لگ گیا تھا۔  
”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بچ بولنے کا فیصلہ کیا“ میں نے  
طمانیت کا اظہار کیا۔

”کیا آپ میں بھی آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟“ وہ گلاس کو  
الکلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔

”مثلاً؟“ میں نے جانتا چلا۔

”مثلاً یہ کہ آپ کی معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟“

”کون سی معلومات کے۔“ میں نے وضاحت چاہی۔

”میں کہ پرئس سیرا سے فون پر میری کیا بات سچت ہوئی۔  
پھر یہ کہ میں اس سے ملنے گیا تھا“ اس نے جواب دیا ”مگر نہ جب  
میں اس سے ملنے گیا تو وہ اس جگہ میں تھا جہاں سے وہ اسٹوڈیو کے  
طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا چاہوں گا کہ  
آپ کو ہم سے بھی پہلے کس نے بتایا کہ کوئی خفیہ ایجنسی بھی  
پرئس کے قتل کی تحقیقات کر رہی ہے؟“

”جسٹس صاحب! اب ایسے سوالات تو نہ کریں“ میں نے  
مسکراتے ہوئے کہا ”آپ کو مظلوم ہے اس قسم کی معلومات کے  
ذرائع ظاہر نہیں کئے جاتے۔“

اس نے مہرہ چل سے میرے اس جواب کو برداشت کیا اور  
اسی خوش گواری لہجے میں بولا ”اچھا یہ تو بتادیں کہ آپ یہ ساری پوچھ  
مجھ کیوں کرتے پھر رہے ہیں؟ آپ کس پکڑ میں ہیں؟“

”میں خائف کی پکڑ میں ہوں“ میں نے اطمینان سے جواب  
دیا۔

”لیکن آپ پولیس والے تو نہیں ہیں۔ آپ تو وکیل بھی شوقیہ  
ہیں۔ حقیقت میں تو آپ پرئس کیوں کے آدمی ہیں۔ آپ ان

باریکیوں اور مسائل میں مکمل الجھے پھر رہے ہیں؟“ اس کے لیے  
میں الجھن تھی۔

”اس کی کئی وجوہات ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”میرا  
میرا شوق ہے کہ کوئی ایسا معاملہ جس سے کسی نے نہ کسی حواس سے  
میرا بھی کوئی تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ پیچیدہ صورت اختیار  
کر جاتا ہے تو اسے سمجھنا اور خائف کی تک پہنچنا میں کو اپنا  
اخلاقی ذمے داری سمجھ لیتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ ایک نامور  
ہے جو مجھے لاحق ہو گئی ہے۔ میں تو پہلے پرئس کو بھی ایک تیار ہی  
سمجھتا تھا جو انسان کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے لیکن اب یہ  
دوسری تیار ہی بھی لگ جاتی ہے۔“

اس نے تمہیں آئینہ سے انداز میں سہلایا۔ ”کئی وجہ  
نہیں۔۔۔ دونوں تیاریاں ناکامہ مند ہیں۔“

”لیکن کبھی کبھی دونوں میں نقصان بھی ہو جاتا ہے“ میں نے  
کہا۔

”نفع نقصان تو پرئس میں چلتا ہی ہے۔ اس کے بارہو آپ  
مجھے نقصان میں رہنے والے آدمی نہیں لگتے“ وہ گویا اسی مہرہ چلے  
پٹھے میری پوری زندگی میں جھانک لینے کا تہیہ کر رہے تھے۔

”چلیں میں اس بات پر آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ مجھے  
نقصان ہو بھی جائے تو میں اسے نقصان نہیں سمجھتا کیونکہ اس کے  
پیچھے ہی کوئی ناکامہ سر اٹھائے کھڑا ہوتا ہے“ میں نے خوش ملاپ  
کہا ”بہر حال میں آپ کو وجوہات بتا رہا تھا۔ بعض اوقات ایک وجہ  
یہ بھی ہوتی ہے کہ ان معاملات میں الجھ جائے والا کوئی گوار  
میرے پاس مدد کی درخواست۔ لے کر آ جاتا ہے اور وہ میرا دوست  
و وقت یا شناسا ہوتا ہے۔ یا پھر کسی شناسا کی سفارش لے کر آتا ہے۔

”جیسے اس معاملے کی ابتدا صرف اس طرح ہوئی تھی کہ کوئل  
آپ کی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں فرادے کر  
میرے پاس پہنچ گیا تھا پرئس سیرا سے میری ملاقات ہو گئی۔  
بات سے بات نکلتی گئی۔ پچھلی گئی اور ابجنتی گئی۔ اب مجھے  
جاننے سے بھی دلچسپی ہو چکی ہے کہ پرئس کا قاتل کون ہے۔“

”مہمت خوب“ اس نے ذرا کمر جوڑی سے سہلایا ”مجھے تو  
کی باتیں“ آپ کے ایمز او اطوار اور آپ کی مستعدی۔ سب  
مہمت پسند آیا ہے افضل صاحب! آپ بہت کام کے آدمی ہیں۔ اب  
میں دیکھ لیجئے کہ پولیس یا خفیہ ایجنسی کا کوئی آدمی یہاں نہیں  
لیکن آپ پہنچ چکے ہیں۔ مجھے یہ بات بھی بہت پسند آئی ہے اور  
آپ کا قدر رواں ہو گیا ہوں۔ آپ خائف کی تلاش میں ہیں اور  
یقین ہے کہ جب آپ خائف کی تلاش میں نکلے ہوں گے تو آخر  
انہیں تلاش کر لی لیتے ہوں گے۔“

”بے شک“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”بھیجی  
خائف مجھے بونسی کسی گلی میں آواز پھرتے ہوئے مل جاتے ہیں۔  
”حقیقت مل جاتے ہوں گے“ اس نے سنجیدگی سے سہلایا۔

”بے شک“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”بھیجی  
خائف مجھے بونسی کسی گلی میں آواز پھرتے ہوئے مل جاتے ہیں۔  
”حقیقت مل جاتے ہوں گے“ اس نے سنجیدگی سے سہلایا۔

”بے شک“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”بھیجی  
خائف مجھے بونسی کسی گلی میں آواز پھرتے ہوئے مل جاتے ہیں۔  
”حقیقت مل جاتے ہوں گے“ اس نے سنجیدگی سے سہلایا۔

”بے شک“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”بھیجی  
خائف مجھے بونسی کسی گلی میں آواز پھرتے ہوئے مل جاتے ہیں۔  
”حقیقت مل جاتے ہوں گے“ اس نے سنجیدگی سے سہلایا۔

”بے شک“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا ”بھیجی  
خائف مجھے بونسی کسی گلی میں آواز پھرتے ہوئے مل جاتے ہیں۔  
”حقیقت مل جاتے ہوں گے“ اس نے سنجیدگی سے سہلایا۔

کبھی کو دوبارہ کھولنے کے سلسلے میں کچھ پیش رفت ہو سکے لیکن ان مسائل پر کوئی بات نہیں ہو سکی۔ اس سے پہلے ایک روز دن سے فون پر کالی بات چیت ہوئی رہی تھی۔ بر محل اس ملاقات میں اس نے شروع میں ہی مجھ پر گنا شروع کر دیا کہ میں تمام معاملات کو بگاڑنے کے بعد اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی باتوں پر مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے سوچا بھڑا میں جائے سب کچھ۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ حالانکہ کاروبار میں بہت سی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں لیکن اس کے طور طریقوں کو برداشت کرنا پھر بھی بہت مشکل تھا۔ آپ اس ملاقات کے اختصار اور اس کی ناگواری کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ میں نے وہاں ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پیا۔

”کمال آپ کے ساتھ تھا؟“ میں نے دھوکے کی طرح گھڑے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔ یہ باہر گاڑی میں ہی رہا تھا اور گاڑی گیٹ پر ہی کھڑی رہی تھی“ اس نے جواب دیا۔

”پرنس سعید سے تو بر محل آپ اچھی طرح واقف تھے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”میں انہیں ذاتی سطح پر بالکل نہیں جانتا تھا“ اس نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔ ”میرا ان سے کاروباری تعلق تھا اور میں کاروباری طور پر انہیں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ نہایت اچھے اور کامیاب کاروباری انسان تھے۔ ان کی دیگر خصوصیات کا مجھے کچھ زیادہ علم نہیں۔ صرف اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں وہ ہمارے پارٹنر تھے اس کے علاوہ میری کبھی ”سچے کے انٹرپرائز“ نے ان کی پرنس انڈسٹریز کے لیے کچھ خدمات انجام دی تھیں البتہ ہمارے ایک دوست ہیں جمال سعیدی۔“

”جو کچھ دیر پہلے یہاں سے رخصت ہوئے ہیں“ میں نے جلدی سے کہا۔

”آپ انہیں پہچانتے ہیں؟“ اس کی آنکھیں ذرا پھلکیں۔

”جی ہاں۔ اور قاتلانہ طور پر جانتا بھی ہوں۔ ان کا ہیڈ آفس سوسائٹی میں ہے۔“ میں نے مکمل انڈریس بتا دیا۔

”آپ بہت ناخبر توی ہیں افضل صاحب!“ وہ گہری سانس لے کر بولا ”بر محل۔ میں یہ بتانے لگا تھا کہ جمال سعیدی پرنس انڈسٹریز کے سب سے بڑے ڈیر ہیں۔ ان کا پرنس انڈسٹریز سے بہت گہرا کاروباری تعلق ہے اور وہ مرحوم پرنس سعید کو ذاتی طور پر بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے جبکہ میرا جمال سعیدی سے بہت گہرا کاروباری اور ذاتی تعلق ہے۔ چنانچہ میں سمجھ لیں کہ یہ واقعیت شہسائی اور کاروباری ذرائع تعلق کی ایک شلت سی بنی ہوئی تھی جن میں سے ایک فریق اب نہیں رہا۔ پرنس سعید زندہ بھی رہتی تو شاید اس کی جگہ نہ لے پاتی۔ وہ پرنس سعید کا تبادلہ مرکز نہیں بن سکتی تھی۔ مجھے اب اس کاروباری ایساز کا مستقبل محدود نظر آتا ہے۔“

ملاش کرنے والوں کو سب کچھ مل جاتا ہے۔ آپ اس بات کے متفق ہیں کہ خالق آپ کو مل جائیں۔ آپ کو پکڑ دینے میں کوئی نکل سے کامیاب ہونا ہوگا۔“

”میں کر کے تو لوگ بعض اوقات پکڑ دینے کی کوشش کرتے ہیں“ میں نے ایک بار پھر اس کی بات کالی۔

”لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کو پکڑ دینے کی قطعاً کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ مزید بھی جو کچھ آپ پوچھیں گے میں دانت داری سے اس کا جواب دینے کو تیار رہوں گا۔ لیکن مجھ میں میرے تمام پتے آپ کے سامنے میز پر رکھے ہیں۔“

”یہ بک لخت اتنی مہربانی کیوں جشیہ صاحب!“ میں نے نکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو کالی دیر سے آپ پر مہربان چلا رہا ہوں۔ آپ نے اس دیر سے کیا ہے“ اس نے جواب دیا۔

”ختم۔ تو آپ کا کہنا یہ ہے کہ جب آپ پرنس سعید کے ہاں رخصت ہوئے تو وہ بالکل ٹھیک تھا کہ تھی؟“ میں نے تصدیق

کی۔

”بالکل“ اس نے بلا تامل جواب دیا ”میں اس کا موڈ ٹھیک ہی تھا اور اس کا رویہ دیکھ کر میرا اپنا موڈ بھی کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ نہ کہ زیادہ ہی مضبوط ٹھیک چڑھی اور اپنے سامنے کسی دوسرے کو نہ دیکھنے والی عورت تھی۔ مجھے اس سے مل کر سخت باہوی لگی۔ اتنی خوب صورت عورت اتنی بڑا کہن بھی ہو سکتی تھی یہ سامنے بھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن بر محل۔ میری باہوی کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے یہ ایک لمحے کے لیے سوچا نہیں تھا کہ وہ مر جائے۔“

”یہ تمام تر خاموشیوں کے باوجود وہ ایک فرم میں آپ کی یاد نثر

”یاد نثر کیا تھی جناب۔“ وہ غصہ کی سانس لے کر بولا ”میں ہمارے پلے پڑ گئی تھی۔ میں سمجھیں کہ پرنس سعید کی طرف کیا ایک دوست میں مل گئی تھی۔“

”آپ اسے ذاتی طور پر نہیں جانتے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میں اسے جانتا ہوں تو کبھی بھول کر بھی اپنے کسی کاروبار کے پارٹنر نہ مانا۔ وہ ایک قطعی غیر کاروباری عورت تھی۔ صرف اس قدر بہت اچھا تھا کہ اسے وراثت میں اور دوسرے ذرائع ان کی دولت مل گئی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ان لوگوں میں سے تھیں جو سونے کا بچہ بلکہ ٹیکسیر منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔“

”مگر آپ کی یہ ملاقات خاصی ناخوشگوار اور ناگوار رہی؟“

”میں اس کے پاس اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے کچھ افسران کو اسے لے گیا تھا کہ اس کے مسائل حل کرنے اور

ہوں۔

”میت خوب۔ میت خوب۔ اچھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔“ وہ جوش سے بولا۔ اس کا چہرہ واقعی کسی دل شرت سے جھلکا تا سادہ کمالی دینے لگا۔ کینٹ کو ایک ننگ کا بھی غلاما پلڑہ پہرہ دے دے ہاتھ سے بولا ”بہر حال آپ کو ایک بات کا وعدہ کیا ہو گا۔“

”کس بات کا؟“ میں نے حقا ملے میں پوچھا۔  
”مختصر انجیسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی تھی کہ جس رات پر نس سیرا قتل ہوئی اس رات میں اس سے ملے گئے تھے۔ اگلے پھر وہ جلدی سے مغالی پیش کرنے والے انداز میں بولا ”مجھے اس سلسلے میں کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی میرے دل میں کوئی ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ کے سامنے بھی ایسی بات اعتراف نہ کرتا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان دلوں غیر ضرور انجنوں سے بچا رہوں تو اچھا ہے۔“  
”میں آپ سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا جی صاحب!“ میں نے نہایت صاف کوئی۔ بلکہ کسی حد تک رکھا سے کہا۔

میرا خیال تھا کہ کم از کم اس بات پر تو اس کے چہرے ہلکاری کے آثار نمودار ہوں گے لیکن وہ تو گویا آج خوش مزاج اور کشادہ دل کے تمام رنگا رنگوں پر صفا ہوا تھا۔ یہ سلسلے سے زیادہ جوش و خروش سے بولا ”یہ خدا مجھے آپ کی یہ ادا اور زیادہ پسند آئی۔ یہ صاف کوئی۔ یہ بے نیازی۔ یہ دلانہ داری! آپ واقعی ایک کیاب آدمی ہیں۔ اور میں کیاب تو میں کی تلاش رہتی ہے۔ میں سمجھتا تھا اس طرح کی خصوصیات رکھنے والے لوگ اب نایاب ہو چکے ہیں لیکن آج مجھے ایک فو کوار حیرت سے دوچار ہوا ہوا ہے۔ افضل صاحب آپ کی مائیں یا نہ مائیں آپ کی اہل اہل آبادی کا پر کریں یا نہ کریں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک نہ ایک روز ہم ضرور کسی پرائیکٹ پر کام کریں گے کسی بہت بڑے پرائیکٹ پر کے ساتھ کام کرتے ہوئے پچھتاہیں پر بھی باعث راحت بن جائے گا۔“

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایک طویل عرصے سے مجھے عمر کی سے محسن نہیں لگایا گیا تھا۔ میرے خیال میں وہ اس اس مستحق ہو چکا تھا کہ میں اس کے سامنے تھوڑی بہت نرمی کا اظہار کرتا۔ آخر وہ بے چارہ اتنی محنت کر رہا تھا۔ میں نے کہا اور ”تقدروانی“ سے معمولی سا ساڑھ ہوتے ہوئے ذرا کم رکھائی۔ میں اپنی حد تک وعدہ کر سکتا ہوں کہ میرے ذریعے سے خیر انجیسی تک نہیں پہنچے گی کہ پر نس سیرا کے قتل ہوئے تھوڑی دیر پہلے تک آپ اس کے پاس موجود تھے۔ لیکن اگر اور ذریعے سے یہ بات ان تک پہنچ گئی تو میں اس کا ذمہ نہیں

ایک لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ سر جھٹک کر بولا ”مختصر۔ جس معاملے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے اس کے بارے میں سوچنا ہی فضول ہے۔ میں تو اس معاملے کی بات کرنا چاہتا تھا جس کے سلسلے میں کچھ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی آپ کچھ کر سکتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ آپ۔۔۔“ وہ زور دے کر بولا ”آپ بے پناہ سمجھ دار آدمی ہیں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ ہم بائیسیت لوگ ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ ہمارے لیے بھی کچھ خدمات انجام دیں۔ ہماری بھی نمائندگی کریں۔ ہمارے انجنوں میں۔ ہمارے انجنوں سے باہر۔ جہاں کہیں بھی ہماری نمائندگی اور ہمارے مفادات کی حفاظت کی ضرورت پڑے وہاں آپ ہمارے لئے کام کریں۔ ہم اس قائل ہیں کہ آپ جیسے آدمی کے شایان شان معاوضہ ادا کر سکیں۔“  
پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ کچھ ہلکا پھلکا تے ہوئے بولا ”بلکہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ انجنوں اور دیگر کی بات بھی ہو سکتی ہے۔ میں نہیں انہم آگے چل کر آپ کے تجویز کردہ اچھے کامداری منصوبوں میں افروختہ بھی کر سکتے ہیں۔“

”آپ اتنے مذہب گول مول اور شکر میں لیے نظروں میں کیوں بات کر رہے ہیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”صاف سیدھے اور کھردرے الفاظ میں بات کیجئے۔ آپ میری قیمت جانتا چاہتے ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔“ اس نے ہر زور لیے میں تردید کی ”ہم ایسی بے ہودہ بات کیسے کر سکتے ہیں۔ ہم تو چاہ رہے ہیں کہ آپ جیسا کار آمد آدمی ہمارے قریب آجائے۔ ہم اسے اپنے ساتھیوں اپنے ہی خزانوں میں شمار کرنے لگیں۔ ہم آپ کو خریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں بے قیمت آدمی ہوں۔ کسی ایسے شخص کے لیے بے دام بھی بیک جا ہوں۔“ اس نے گویا جھجکی ”نظروں کی معمولی تبدیلی سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔“

”درست ہے“ میں نے حلیم کیا ”آپ میرے لیے اچھے الفاظ استعمال کر رہے ہیں اسے میں آپ کا حیرن عن سمجھ لیتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں کچھ اور لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ ان کے مفادات کی حفاظت کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں وہ میری ہمدردی اور کوششوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ کہیں ایمان نہ ہو کہ آگے چل کر آپ کے اور ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔ اس صورت میں دو کشتیوں کا سوار ہونا میرے لیے اچھا نہیں رہے گا۔ اس لیے بہتر ہے مجھے ایک طرف ہی رہنے دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے دولت یا اچھی پیشکش سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں خاصی حد تک دنیا دار اور گناہ گار سامی آدمی ہوں۔ میں دنیاوی چیزوں سے بے نیاز نہیں ہوں لیکن میں بے اصول بھی نہیں

کے سوا کچھ نہیں لانا تھا۔

اس نے باقاعدہ کپٹی پر اٹھ کر گویا مجھے سمجھایا کہ ذہن کہاں تھا۔ شاید اس کے خیال میں میں ذہن کے محل وقوع کے بارے میں غلط فہمی کا شکار بھی ہو سکتا تھا۔

”یعنی آپ کے خیال میں آپ کی ایسا صرف آپ کی ذہانت اور ذکاوت کو ششوں کا نتیجہ ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ظاہر ہے“ وہ انگریزی میں بولا ”اور آپ کے خیال میں آپ کی ایسا کس طرح وجود میں آئی ہے؟“

”معلوم نہیں“ میں نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے سادگی سے کہا ”مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ شاید یہ اوپر والے کی مرضی تھی“ میں نے درود شانه انداز میں صحت کی طرف اٹھل آٹھل۔ وہ مجھ سے انداز میں میری طرف دیکھ کر رہ گیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آیا۔ کال ہمارے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے ہال دیو میں نظر دوڑائی لیکن نزل مجھے کیس نظر نہیں آئی۔ جمشید اور کمال مجھے استقبال تک چھوڑنے آئے۔ ریپشسٹ لڑکی اس وقت اپنے ناخنوں پر پالش لگا رہی تھی۔ اپنے باس دیو کو دیکھ کر

اس نے بڑبڑا کر شیشی کاؤنٹر کے پیچھے رک دی اور منسوب ہو کر بیٹھ گئی۔ جمشید اور کمال اس کی طرف دیکھے بغیر وہیں سے واپس ہو گئے۔

باہر آکر میں اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اسے ریمس کر رہا تھا

”اور کسے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے؟“ اس کی پیشانی پر ٹکٹیں

”جب مجھے معلوم ہو سکتی ہے تو کسی اور کو بھی معلوم ہو سکتی ہے۔“ میں نے جواب دیا ”بلکہ میں ممکن ہے مجھے بھی کسی اور سی

زریعے سے معلوم ہوئی ہو۔ میں خود تو وہاں موجود نہیں تھا۔“

وہ ایک بار پھر پُر خیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے

بلاور بھر کر رہ گیا۔ اس کا ذہن یقیناً تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ

انداز لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسا دوسرا ذریعہ کیا ہو سکتا تھا؟

مجھے امید تھی کہ جلدی اس کا ذہن اس امکان کی طرف چلا جائے

کہ وہ دوسرا ذریعہ کارمان ہو سکتا تھا جس کے بارے میں

اخبارات میں آچکا تھا کہ قتل کی رات وہ پرس سے ہاں موجود تھا

اور فی الحال پولیس کے تمام تر شبہات کا مرکز وہی تھا۔ جمشید سوچ

سکتا تھا کہ وہ تو کبھی سمجھ رہا تھا جب پرس سے اس کی ناگوار سی

نکتہ دہشید جاری تھی تو ان دونوں کے سوا کچھ کسی کو موجود نہیں

تھا۔ لیکن میں ممکن تھا کہ کارمان کسی خفیہ گوشے میں۔ کسی

گہرے کدوے میں موجود رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی جمشید کا ذہن

اس امکان کی طرف بھی جاسکتا تھا کہ شاید میرا آپ بھی کسی نہ کسی

انداز میں کارمان سے رابطہ تھا جس کی حیثیت فی الحال ایک

دھوش طرز کی تھی۔ یہ خیال آنے کے بعد جمشید میرے سطلے میں

لگی لگی مٹھو کر ہو سکتا تھا۔ اور میں یہی چاہتا تھا۔

ایسا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ کمال نے جلدی سے آگے بڑھ کر میز

سے فون اٹھا کر کچھ سنایا۔ صرف ”ہا ہا“ کہہ کر گاڈیس فون لاکر

بیٹھ کر تھک رہا۔ جمشید بھی ”ہیلو“ کہنے کے بعد چند لمحوں خاموشی سے

تھکا ہوا پھر بولا ”السلام“ میں نے فون تو کیا تھا۔ لیکن تم کچھ دیر بعد

آؤ۔ ابھی میں ذرا مصروف ہوں۔ السلام۔ ایک میننگ چلی رہی

ہے۔ بس میرا خیال ہے پانچ دس منٹ کی بات ہے۔ جب ٹھیک ہے“

اس نے سوچ تف کر کے فون کمال کو دے دیا جو اس نے واپس میز

پر ڈالے جا کر رکھ دیا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہو سکا کہ فون کس کا تھا۔

دوران ٹھیکو اس نے کوئی نام نہیں لیا۔

میرا خیال ہے بہت باتیں ہو چکیں۔ اب مجھے چلنا چاہیے“

میں نے اٹھنے کے لیے پرتوتے ہوئے کہا۔

وہ گویا سڑک کے بھروسے ٹھل آیا اور اس کے چہرے پر

ٹھٹکی کی تپ و ناپ لوٹ آئی ”آپ سے ملاقات کا تجربہ نہایت

فون کو یاد رہا سزا فضل! آپ میری پیش کش پر ضرور غور کیجئے گا۔

میں کہتا ہوں کہ ایک پُر ضرور کام کر سکتے ہیں۔ میرے ساتھ کام

کے آپ کو ایسی نہیں ہوگی۔ پرس سید جیسا کاروباری جوش

میں سمجھتا ہوں کہ کاروباری تعلق استوار کرنے کے بعد خوش ہوئے بغیر

کچھ نہ سکا تھا۔ میں نے اپنی جو چھٹی سی ایسا تحریر کی ہے۔ ظاہر

ہو گیا کہ میں بن گئی۔ اپنے والدین سے تو مجھے ورثے میں ذہن

## ابلیکا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر  
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی  
تاریخ پیش کی گئی ہے

سات جلدوں میں مکمل سیٹ: 1950 روپے

ناشر: مکتبہ القرآن پشاور

اردو بازار لاہور

”مجھے ذرا معلوم کرنا چاہئے گا کہ یہ کس رینج کا کمپ ہے اور  
تاکس کس کے پاس ہے۔“ وہ بگے سوچتے ہوئے بولے ”تم اپنا کار  
کہ توہ کچھ بعد مجھے فون کرو۔“

میں نے سلسلہ متعلق کر دیا۔ تو مجھے کچھ بعد میں نے فون  
فون کیا تو وہ بڑے عجیبہ اور بوجھل لہجے میں بولا ”جس فیس سے تم  
بات کر رہے ہو یہ بالکل محفوظ ہے۔“

”ہمیں معلومات کے مطابق تو محفوظ ہی ہے۔“ میں نے فون  
گوار لیجے میں کہا ”بھئی نیپے پ کرنے کا بندوبست ہو گا تو وہ آپ  
ہی نوکوں کی طرف سے ہو گا۔“

”خدا نہ کرے کہ یہ فون آئے۔“ وہ بولے پھر ان کی توازیہ  
دہمیں ہو گئی۔

”چھ ماہ تک ایف آئی اے نے تو بعض شکایات کی بنیاد پر  
اس فرم کے صرف مالی معاملات کی چھان بین شروع کی  
تھی۔ لیکن بگے ایسے شواہد سامنے آئے ہیں کہ ایک خفیہ ایجنسی  
بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔ یہ بہت بڑی اور کئی طبقوں میں  
پرنس کرنے والی فرم ہے لیکن شہ پالا جا رہا ہے کہ یہ جائز اور کھلی  
پرنس کے ساتھ ساتھ اسٹے کی تجارت اور اس کی ایئر کرائز  
مارکیٹنگ میں بھی ملوث ہے۔“

”اسٹے کی ایئر کرائز مارکیٹنگ؟“ میں نے ڈھیر لایا اور نہ  
جانے کیوں میرے جسم میں ایک سردی لہر دوڑ گئی۔

”تمنی لعل یہ ٹاپ سیکرٹ ہے“ فیس صاحب خیراد کر کے

والے انداز میں بولے ”حماسی زبان سے یہ بات کہی کہ معلوم  
نہیں ہوئی جا سیکے۔“

”آپ کو معلوم ہے قومی رازوں کی حفاظت میرا ایمان ہے“  
میں نے کہا۔

”اسی لیے تو تم ایسی باتیں کہیں تا بھی دیتے ہیں۔ اب نہ  
بتاؤ کہ تم کس پیکر میں ہو؟ کس فیس خفیہ ایجنسیوں سے چلاؤ  
تو بگے سن مگر فیس لگتی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”یہ میں آپ کو ابھی فیس مناسب وقت آئے پر بتاؤں گا  
میں نے کہا اور سلسلہ متعلق کر دیا۔“

**دوش**

**انوار صدیقی**

**دو حصے**

قیمت: ۹۰ روپے

کہ میں نے چھوٹی سی ایک اسپورٹس کار کو گلی میں داخل ہوتے  
دیکھا۔ کھلی چھت کی اس گاڑی میں پرنس سیرا کے عجیبے مندر  
منبر کو دیکھ کر مجھے حیرت کا خیف سا ہوا گا۔ سواگل فون اس کے  
کان سے لگا ہوا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اپنی  
گاڑی میں دیک سگیا لیکن اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ وہ  
فون پر بڑے اناک سے مصروف گفتگو تھا۔

گاڑی اس نے جیشید کی عمارت کے قریب ہی پارکنگ کی جگہ  
میں روکی اور فون بند کر کے جیب میں ڈال کر اندر چلا گیا۔ شاید چند  
منٹ پہلے اسی نے کہیں قریب ہی سے جیشید کو فون کیا تھا۔ میں یہی  
سوچتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا کہ آخر اسے جیشید سے ملنے کی کیا  
ضرورت پیش آئی تھی؟ بلکہ فون پر جیشید کے اندر گفتگو سے تو یہی  
ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کافی پرانی شناسائی اور میل ملاقات  
تھی۔ یہ بھی ایک نیا اور قابل غور نکتہ سامنے آیا تھا۔

دھنیا میری نظر مقب نما آئینے پر پڑی۔ ڈیٹس کے سن سیٹ  
پلوڈ پر اس وقت ٹھنک برائے نام تھا۔ ایک سیاہ ہنڈا اکڑا میرے  
پچھے چلی آ رہی تھی۔ مجھے کوئی خاص تدبیر کے بغیر چند لمبے بعد ہی  
تھیں ہو گیا کہ وہ میرا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ رنگین شیشوں کی گاڑی  
تھی۔ اس کے باوجود مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی جھلک  
نظر آئی۔ وہ انسان کم اور نہ لایا وہ معلوم ہو رہا تھا۔

میں مسکرائے بغیر نہ سا۔ میں نے راستہ بدلنے کی کوشش

نہیں کی۔ میں کسی ایسی جگہ نہیں جا رہا تھا جسے میں راز رکھنے کی  
کوشش کرتا۔ میں ہوئی واہیں جا رہا تھا اور میرا وہ ٹھکانا بگے ایسا  
خفیہ نہیں تھا۔ وہ سیاہ اکڑا ہوئی کے ڈرائیو دے تک میرے  
تعاقب میں رہی۔ میں نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ وہیں رکی  
رہی تھی یا وہاں پہلی گئی تھی۔

میں سیدھا اپنے آفس میں چلا گیا اور دیا الونک چیز پر بیٹھ کر  
ٹائی کی گرہ ڈھکی کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ  
فیس صاحب کی ہاٹ لائن پر ان سے رابطہ کیا۔ وہ یوں تو صرف  
ایک اہم ترین خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے لیکن مجھے کسی بھی  
ایجنسی سے خاص اور خفیہ معلومات کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھے  
خراہم کر سکتے تھے۔

ہاٹ لائن پر وہ مل گئے اور ان کی توازیہ کرس نے خدا کا  
شکر ادا کیا۔ ان کا سوڈ بھی خوش گوار لگ رہا تھا ”بہت دن بعد یاد  
کیا۔ اور وہ بھی ہاٹ لائن پر۔“ وہ گفتگو لیجے میں بولے ”لگتا  
ہے بہت دن بعد مجھ سے کوئی کام پڑا ہے۔“

”آپ بالکل صحیح کہے“ میں نے ہنس کر کہا ”کراچی کی ایک  
فرم ہے۔ اسپورٹ ایکسپورٹ کار پوریشن۔ مجھے پتا چلا ہے کہ  
ایف آئی اے اس کے بارے میں تحقیقات کر رہی ہے اگر معلوم  
ہو سکے کہ تحقیقات کی نوعیت کیا ہے تو بہت اچھا ہو۔“

# اے حمید کے ایڈو پنر قلم سے شیو سینا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ = 700 روپے

ناشر: مکتبہ المقریش

اردو بازار لاہور

اس کے بعد میرے دون مصروفیات میں ہی گزرے۔ دفتری اور غیر دفتری دونوں قسم کی مصروفیات ہی جاری رہیں۔ میں اپنے طور پر کچھ معلومات جمع کرنے میں مصروف رہا۔ مجھے کامران کے بارے میں بھی تشویش تھی۔ وہ بدستور غائب تھا۔ میں نے "دی سرکل" کے ان چند خاص خاص لوگوں کو "جو کراچی میں موجود تھے اس کی تلاش میں لگا یا۔ شفیق شاہ بھی ان میں شامل تھا۔

کراچی بے شک بہت بڑا شہر تھا "انسانوں کا ایک سمندر اور عمارتوں کا ایک بحر"۔ جنگ تھا لیکن "دی سرکل" کے لوگ بھی کسی کو ڈھونڈنے کے معاملے میں ناقابل یقین ملا جملوں کے مالک تھے۔ کامران کو ڈھونڈنا اگر بڑی عمارتوں کے مطابق گھاس پھوس کے انبار میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھی۔ لیکن وہ لوگ اس قسم کی ناممکنات کو ممکن بنانے کی بڑی حد تک صلاحیت رکھتے تھے۔ کامران کے بارے میں تو پھر بھی کئی مزارع موجود تھے۔ اس سے پہلے ایک آدھ مرتبہ انہوں نے ایسے افراد کو بھی ڈھونڈا تھا جن کے صرف نام اور شکل صورت کی زبانی تفصیل کے سوا انہیں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن کامران کے سلسلے میں ابھی تک ناکامی کی رپورٹیں ہی مل رہی تھیں تاہم ابھی انہیں صرف دو ہی دن ہونے تھے اس لیے میں باپوس نہیں تھا۔

پرنس میرا کے قتل کی حقیقت نہایت مست دلی سے آگے بڑھ رہی تھی بلکہ شاید یہ کتنا ہی کچھ زیادہ صحیح نہیں تھا کہ وہ آگے

نہیں بڑھنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ جب نے اسے کی اندازہ گراؤنڈ مارکنگ کے بارے میں برے اندیشوں کی تصدیق کر دی تھی۔ میں پہلے ہی محسوس تھا کہ پرنس میرا کے قتل کے معاملے کو پھینکا میرے لیے نفقہ ختم کا تجربہ ثابت ہونے والا تھا۔ یہ محض ایک خوب صورت کے قتل کا معاملہ نہیں تھا۔ ایک کڑی سے دوسری لڑائی ہوئی تھی۔ ذخیرہ بہت طویل معلوم ہوئی تھی اور فی الحال یہ ہوئی بھی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا دوسرا ہرا تھا۔ ہوں تو زندگی مجھے بیشک ایک نئے اور انوکھے تجربے سے پار کرتی تھی جو میرے ساتھ تجربات سے بہت مختلف ہو آتا تھا۔ لیکن بالکل ہی مختلف تجربات کا دواؤں ٹھکانا دکھائی دے رہا تھا۔ ہر طرح ایک واقعے کے نیچے دوسرے واقعے کی پرت تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر کا لیکن اب جبکہ میں اس معاملے میں ہاتھ ڈال چکا تھا تو اس نتیجے بغیر مجھے جین بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں اب اس سے بچ سکتا تھا۔

یہ دیر تک ان معاملات پر غور کرتے رہنے کے بعد میں اٹھ رہا۔ آفس سے نکل کر میں ہوٹل کے بڑے دروازے پر آیا۔ کچھ سے انداز میں چٹون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے سامنے چند قدم ایک طرف کو جا کر میں نے ڈرائیو وے پر اٹھا۔ اب وہ سیاہ ہڈا ایکلاؤڈ وہاں نہیں تھی اور نہ ہی وہ انھیں کہیں نظر آ رہا تھا جو اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ گاڑی نہ میرے تعاقب میں آئی تھی لیکن اب جاچکی تھی۔ میں نے فاسر تھا کہ یہاں تک میرے تعاقب کا مقصد کیا تھا۔

برے انداز سے کے مطابق وہ جیشہ کریم کا آؤی تھا۔ کیا وہ میرا ٹھکانا دیکھنے آیا تھا؟ لیکن جیشہ کریم کو تو معلوم تھا کہ میں فاسر اسے میری کاروباری حیثیت کا علم تھا۔ یہ بھی معلوم تھا۔ فاسر اسٹار ہوٹل کا مالک تھا۔ میرے بارے میں وہ جتنا کچھ اور سمجھتا تھا اس کے بعد یہ جانتا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہتا تھا۔ لیکن کون کون سے ہو سکتے تھے کہیں وہ نہ ٹھکانا

کی اور کاروبار نہ نہیں تھا؟ لیکن یہ نکتہ بھی قابل غور تھا کہ فاسر سے میرے پیچھے لگا تھا جب میں جیشہ کے آفس سے فاسر سے پہلے میرا تعاقب نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس معاملے میں شک نہیں رہتا تھا۔

گہمت میں نے اس ٹھکانا فاسر کا تصور ذہن سے جھٹک دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ فاسر کا تعاقب اس کے بارے میں جان لے گا کہ اس کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں ٹھکانے کے سے انداز میں فاسر کے آفس میں داخل ہوا۔ فاسر نے اپنے آپ کو مختلف

بڑھ رہی تھی۔ ابھی شاید تفتیش وہیں اٹھی ہوئی تھی جہاں پہلے دن تھی۔ پولیس وغیرہ نے کچھ اور لوگوں سے پوچھ کچھ ضرور کی تھی لیکن یہ بھی گویا رکھی کارروائی ہی رہی تھی۔ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ بات یہیں کی وہیں رہی تھی۔

دور حقیقت پر انس سیرا کے معاملے میں پولیس جس پر بھی ہاتھ ڈالتی تھی وہ کوئی چھڑا سوتا پتے خاں ہی لکھا تھا اور کسی کے خلاف ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت بھی سامنے نہیں آیا تھا اس لیے پولیس اندھا مہم کسی کو نہیں رگڑ رہی تھی۔ خلاف توقع اس ضمن میں پولیس پر کوئی خاص دباؤ بھی نہیں پڑا تھا اس لیے اس نے بہترین کارکردگی دکھانے کے پتھر میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

سیرا کے ملازموں کی خوش قسمتی تھی کہ ان میں سے کوئی اس کے اسٹوڈیو والے ہنگلے پر تعینات نہیں تھا ورنہ مالک یا مالکین کے ہاں چوری یا اس کے قتل کی واردات میں بے چارے ملازمین کی بھی خاصی شامت آتی ہے۔ کوئی عہدہ نہیں تھا کہ پولیس ان میں سے کسی کو پکڑ کر گزرتی اور وہ بے چارہ چڑی اتر دے سے پہلے ہی۔ یا پھر چڑی اتر دے کے بعد قربانی کا بکرا بننے پر رضامند ہو جاتا اور یہ پسند اپنے گلے میں ڈال لیتا۔ لیکن اس ضمن میں ایک اچھی بات یہ بھی تھی کہ یہ کیس راجیم گل کے ہاتھ میں تھا اور وہ ان جھگڑوں کا قائل نہیں تھا ورنہ وہ پرنس سیرا کے ہاتھ میں ہنگلے سے بھی کسی ملازم کو اس تفتیش میں ٹھیسٹ سکتا تھا اور اس کی تہی کردن میں پسند آفت کر سکتا تھا۔ گھریلو نوکرین وغیرہ کی کردن اگر دیکھنے میں سوتی بھی ہو تب بھی پولیس والوں کی نظر میں شاید وہ چلی ہی ہوتی ہے۔

پرنس سیرا کے والد پرنس سید اگر زندہ ہوتے تو شاید پولیس پر اس سلسلے میں بڑا دباؤ ہوتا۔ صحیح معنوں میں کوئی سرپرست یا وارث نہ ہونے کی وجہ سے پولیس پر دباؤ نہیں پڑا تھا۔ صدر منیر اپنی سی کوشش کر رہا تھا لیکن اس معاملے میں اس کی اپنی پوزیشن کچھ ایسی قابلِ رشک نہیں تھی۔

پرنس کا بہنوئی احمد پرویز خاصی قہقہہ کی چیز تھا۔ وہ واقعی کافی اثر رسوخ والا آدمی تھا۔ وہ چاہتا تو پولیس پر دباؤ بڑھا سکتا تھا لیکن اس قتل سے اس کی اپنی پوزیشن کافی مشکوک ہو گئی تھی۔ پرنس کی فطری یا غیر فطری موت کی صورت میں اس کی وراثت بھی احمد پرویز کی بیوی واجدہ پرویز کو بخش ہوتی تھی۔ وہ پرنس سیرا کی بڑی بہن تھی۔ بے پناہ دولت مند ہونے اور ایک دولت مند و شاعر آدمی کی بیوی ہونے کے باوجود وہ ایک سیدھی سادی اور گھریلو عورت تھی اس لیے اس کی دولت اور اثاثوں میں اضافہ ہونے کا مطلب بھی دور حقیقت احمد پرویز کی دولت اور اثاثوں میں اضافہ ہوا تھا۔

یوں پرنس سیرا کا قتل خود اسے خاصا مشکوک بناتا تھا۔ اگر

وہ کوئی چھڑا سوتا آدمی ہو تو اس قسم کے حالات میں خود پولیس زیر تفتیش رہتا اور اس کے لیے اپنی کردن بھانٹنا مشکل ہو جاتا۔ گوکہ راجیم گل بذاتِ خود بہت بڑا "پچھلے باز" آدمی تھا۔ وہ کم ضرورت محسوس کرتا تھا تو بڑے بڑے پتے خاںوں سے "پچھلے باز" نہیں رہتا تھا لیکن احمد پرویز پر اس نے بھی ایسی انٹیلجنس پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس سے سختی سے پوچھ کچھ ضرور کی تھی اس کی اکڑوں کی پروا نہیں کی تھی۔ احمد پرویز جیسے آدمی کے لیے یہی سبق کافی تھا کہ انسپکٹر کے عہدے کا ایک آدمی اس کے ہاں اس طرح پیش آ رہا تھا اور وہ اس کا چارہ تک نہیں کر سکتا تھے معلوم تھا کہ راجیم گل کو اگر اس کی خلاف ذرا ساجی گھر ثبوت مل گیا تو وہ اس پر ہاتھ ڈالنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرنے گا بعض مشہور دولت مند اور اہم شخصیات کے قتل کے سلسلے میں پولیس پر پرنس کا بھی کافی دباؤ پڑ جاتا ہے۔ اخبارات تمام معاملے کو اچھا لے رہی ہیں پولیس ایک طرح کے تفتیاتی سے دباؤ آ جاتا ہے لیکن پرنس سیرا کے معاملے میں صرف نہیں چارہ ایا ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد شاید انہیں کچھ پیشابدار ہاتھ نہ آسکا تھا۔ تیاں آرائیاں وہ کھل تک کرتے؟ پھر ایک بات یہ تھی کہ زندگی بہت تیز رفتار تھی اور لوگوں کی جاہ کالیاں بہت گئی تھیں۔ ہر گزرتا ہوا دن اپنے ساتھ نئے ہنگامے کی نئی خبریں لے کر آتا ہے جن کے سامنے دیر بے دیر پڑتی خبریں پڑ جاتی ہیں۔ شاید پرنس کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کامران کی البتہ پولیس کو بھی سرگرمی سے تلاش تھی اور ان تمام تر دوسائل کے باوجود ابھی تک اسے بھی اس کا کوئی سارا نہیں ملا تھا جس کی وجہ سے میری تفتیش کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ وقف سامان ہوا جو ان تھا۔ اپنے آپ کو خواہ خواہ مصیبت میں ڈالے ہوئے تھا۔ وہ نہ جانے کن ملاحقوں میں بھٹکا پھر رہا تھا یا کسی کچھ چھپا بیٹھا تھا۔ وہ کسی مقول جگہ پر تو نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اسے بیسیوں قسم کے خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس وقت اس کی ذات پر شہادت کی روٹ تھی۔ اگر وہ اصل قاتل کی نظر میں آ جاتا تو وہ بھی اس کا پناہ کر سکتا تھا۔ اس طرح کامران اپنی ذات پر شہادت کے دلائل اس دن سے رخصت ہو جاتا۔ پولیس بھی ڈھیلی پڑ جاتی اور اس کی کو جلد از جلد داخل دفتر کرنے کی کوشش کرتی۔ یوں اصل قاتل بیشک کے لیے نظر سے اوجھل رہنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ ان سب امکانات کی طرف میری نظر تھی اور میں کسی راز سے غافل نہیں ہوا تھا۔ میں یا میرے سامنے کسی نہ کسی حد تک نہ کچھ کر رہے تھے تاہم گزشتہ دو دنوں میں کوئی اہم بات سامنے نہیں آئی تھی۔ فیض شاہ نے رپورٹ دی تھی کہ کارخانہ داران مکان میں پناہ لینے نہیں پہنچا تھا جہاں وہ پہلے جا کر پناہ گزین تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ مکان میری نظر میں آ جاتا تھا اور یہ بھی



نے کیا کمال کر دیا ہے؟ کیا میری وجہ سے کسی سیاست دان نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا ہے؟ کیا میری وجہ سے کسی بیوروکریٹ نے محنت سے کام کرنا شروع کر دیا ہے؟ کیا میری وجہ سے کسی سرکاری اہلکار نے رشوت کے بغیر کام کرنا شروع کر دیا؟ کیا میری وجہ سے کسی وزیر سفیر نے اس قوم کی خون پسٹ کی کمانی کو تعیشت میں اڑا دیا چھوڑ دیا؟

”نہیں سائیں! ایسا تو کوئی واقعہ نہیں ہوا“ وہ ایسی سے بولا  
”اگر ہوا بھی ہو گا تو اخباروں اور فائلوں میں ہوا ہو گا۔“  
”تو پھر کون سا کمال ہو گیا؟“ میں نے لٹھری سانس لے کر پوچھا۔

وہ جیب سے ایک چمک نکال کر لڑاتے ہوئے بولا ”اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن نے مجھے تیس لاکھ کا چمک بھجوا دیا ہے میرے لیے تو یہی بڑا کمال ہے سائیں! میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔“

”پاگل ہونے کا پروگرام تمہاری الحال ملٹری رکھو“ میں نے خبیثی سے مشورہ دیا ”یہ بتاؤ کہ جس برانچ کا یہ چمک ہے وہاں سے تم نے کفرم بھی کر لیا ہے یا نہیں کہ چمک کیش ہو جائے گا؟“

”جی سائیں!“ وہ طمانیت سے مسکرایا ”اسی لیے تو چمک ابھی تک میرے پاس ہی نظر آ رہا ہے۔ یہ کراس چمک ہے لیکن اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے سے پہلے میں دو ڈاؤنڈ اس برانچ میں گیا جہاں کا یہ ہے۔ وہاں سے میں نے تصدیق کی کہ یہ کیش ہو جائے گا یا نہیں۔ اس برانچ کے منیجر نے بڑی محبت اور شفقت سے مسکراتے ہوئے مجھے کسٹی دی کہ اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن والے یا تو کسی کو چمک ایٹو نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے ہیں تو وہ کیش ضرور ہوتا ہے نیز یہ کہ اگر میں اس کنبھی کے ساتھ کا دبدا کر آ رہا ہوں تو یہ بات مجھے معلوم ہونی چاہیے تھی۔ میں نے ذرا شرمندگی کے ساتھ عرض کیا کہ یہ بات مجھے معلوم تو تھی! پھر میری دل کی کسٹی کے لیے چلا آیا۔ اب میں اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا پہلے یہ خوش خبری آپ کو سنانا چاہوں۔“

چنی بات تو یہ تھی کہ یہ خبر خود میرے لیے بھی خاصی حیرت انگیز تھی۔ جہیہ کہ میں نے واضح طور پر وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ کوئل کو اوائلی کر دے گا لیکن اس نے یہ کام کر دیا تھا اور وہ بھی اتنی جلدی۔ اس نے گویا اپنی طرف سے کشادہ دلی اور خیر سگالی کا مظاہرہ کیا تھا۔ تاہم میں نے کوئل کے سامنے حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے بے نیازی سے کہا ”اس میں خوشی سے اتنا بے حال ہونے کی کیا بات ہے؟“

”مجھ جیسے چھوٹے برنس من کے لیے تو یہ بہت بڑی بات ہے سائیں!“ وہ عاجزی سے بولا ”میری سیکرٹری کی رقم صرف تیس لاکھ تھی۔ مجھے تو اس کے ملنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ انہوں نے

کہ اس مکان کا مالک۔ وہ غریب مزدور پیشہ آدمی تمام تر دوستی و رشتہ داری کے باوجود ذرے ذرے کے کامران کو روکا ہوا پناہ نہ دیتا۔“

ان دونوں میں صفیہ نے بھی دو مرتبہ فون پر رابطہ کیا تھا۔ میں نے بھی یہی اطلاع دی تھی کہ اسے کامران کے بارے میں کوئی خاص نہیں لی تھی اور نہ ہی اس نے کسی ذریعے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اطلاع بھی تشریف میں اضافہ ہی کرتے والی تھی۔ یہ میری معلومات کے مطابق کامران کے اتنے دساکل نہیں تھے کہ وہ اس طرح مدد پوش ہو سکا۔ تاہم میرے خیال میں کسی حد تک اسے اطمینان بات یہ تھی کہ ابھی تک اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ وہ ایک بے وقوف سانپ بن گیا تھا۔ مجھے جانے کیوں اس سے بزدلی ہو گئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کیڑے انعام سے دوچار ہو۔

اس روز میں آفس میں بیٹھا تھا کہ ابہرے کوئل کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اسے اندر بھیجنے کے لیے کہا تو چند لمبے بعد وہ نامعلوم کمرے میں داخل ہوا کہ اس کی باجیس پھیلی ہوئی تھی اور انہیں چھوٹے چھوٹے برقی لمپوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ معاصر کرتے وقت اس نے کچھ اس طرح میرا ہاتھ تمام کر دیا اور انہوں سے لگایا جیسے میں کوئی سیاہ یا غیر سیاہی پیر فقیر یا روکلی پنچا ہوا بزرگ تھا۔

”خیریت تو ہے کوئل جان!“ میں نے اسے پیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا ”یہ اتنی چال ہی کسی سطلے میں رہی ہے؟ ابھی تو میں نے تمہیں کوئی وزیر دفیو بھی نہیں بنوایا۔“  
”دفع کریں وزارت کو سائیں!“ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ”میں تاقوت پسند آدمی ہوں۔ میرے چھوٹے موٹے کام ہو جاتے ہیں اس میں خوش ہو جانا ہوں۔ وزارت سفارت کی مجھے تنہا نہیں ہے۔“

”شکر ہے آج صبح ہی صبح کوئی تاقوت پسند آدمی تو دیکھنے کو ملا۔ حالات تو کچھ ایسے جارہے ہیں کہ باج دس برس بعد شاید کوئی تاقوت پسند آدمی دیکھنے کے لیے کسی بیوزیم دفیو میں جانا پڑے۔“ میں نے ریوڑ لوبک چیخ کے پیٹنے سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا ”معاذ۔ تم اپنی باجیس کھلے کی وجہ بیان کر دو۔“

”سائیں!“ آپ نے تو کمال کر دیا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ خوشی کے بارے کیا کر دے۔ بھگوا ڈالو۔ ہو جالو گانے سے ناچو۔ خلک ڈالو کھلو۔ کیا صرف طلا بایاں کھانے کا بندھ رہا ہے؟“

”تمہاری الحال صرف اس کرسی تک محدود ہو جس پر بیٹھے ہو“ ماسٹہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر گویا اسے روکتے ہوئے کہا ”یہ آفس بادلان حرکات کے لیے قطعاً سوزوں نہیں ہے جن کا تم نے ذکر کیا ہے۔ ان کا بھی سرگرمیوں کے لیے پہلے تمہیں کوئی مناسب جگہ ملنی چاہیے گی۔ سروس تم تو رام سے بیٹھے بیٹھے یہ بتاؤ کہ میں

تیس لاکھ دے دیے ہیں یعنی ہرجانہ بھی ٹھیک خاک ادا کر دیا ہے۔ یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں تو حیران پریشان ہو گیا ہوں سائیں!"

"اب اس حیرانی پریشانی میں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا سائیں!" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے جنس سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو جا کر بس شرافت سے درخواست کی تھی۔ نہایت خوش گوار ماحول میں۔ کافی کے کپ اور دہسکی کے جام پر ذاکرات ہوئے تھے" پھر میں نے وضاحت کرنا بھڑکھا "کافی کا کپ میرا تھا۔ دہسکی کا جام جیشہ کا۔ جو اس وقت امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن اور اس جیسی دوسری نہ جانے کن کن کمپنیوں کا کرنا دھرتا ہے۔"

"ایسی شرافت سے تو یہ کام ہونے والا نہیں تھا سائیں!" وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔ "آپ نے ان کو ضرور کوئی اچھا ڈونر دیا ہے۔ بڑے جلدی اور بڑا اچھا اثر ہوا ہے۔"

"پلو تم بھی کیجیو۔ تمہارا کام ہو گیا۔ جسیں تو میں اس سے غرض رکھتی جاہیے۔ جاؤ اب میں کرو۔ کیا یاد کرو گے کہ کسی کام کے آدمی سے واسطہ پڑا تھا" میں نے فیاض سے کہا۔

"ایسے تو تھیں جاؤں گا سائیں! میں اس لیے تو آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا ہوں" وہ معنی خیز سے انداز میں مسکرایا "سیٹھ رمضان نے جب مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا تو خیوار کر دیا تھا کہ آپ سے کام کرنا کافی مرنگا ثابت ہو سکتا تھا لیکن بنتا انہوں نے اندازہ کیا تھا میں اس سے چار پانچ گنا زیادہ خرچ برداشت کرنے کے لیے بہ خوشی تیار ہوں۔ بالکل غیر متوقع طور پر یہ چیک ملنے کے بعد میرا کچھ کچھ عام ملانی بننے کا سوز ہوا ہے۔"

"میں تو تم سے پہلے ہی یہ سوز بنائے بیٹھا ہوں۔ جاؤ میں نے جسیں نہیں معاف کی" میں نے فیاض سے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا سائیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا "میں نے آپ سے پہلے ہی کہا ہے کہ مجھے تو اپنی اصل رقم یعنی بیس لاکھ بھی ملنے کی کوئی امید نہیں تھی جبکہ مجھے اس کے علاوہ بھی دس لاکھ مدد مل گیا ہے۔ وہ دس لاکھ مدد میں آپ کی نذر کرنا ہوں۔ مجھے اپنے نقصان کا ہرجانہ نہیں چاہیے۔ میں سمجھوں گا میرا کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

وہ واقعی ذرا مختلف قسم کا برنس میں معلوم ہوتا تھا ورنہ زیادہ تر تو اسی قسم کے برنس میں دیکھنے میں آتے تھے جن کے ہاتھ میں اگر پرایا مددیا بھی آجائے تھا تو ان کا وہ بھی لوٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا ورنہ ایسی ادائیگیاں بھی مددیت کر یا پائل تاخیر سے کرتے تھے جو ان کے ذمے ہوتی تھیں یا جن کا انہوں نے وعدہ کر رکھا ہوتا تھا۔ اور ایک یہ شخص تھا جس سے میری کوئی باضابطہ بات چیت

ہی نہیں ہوئی تھی! ابھی چیک اس کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ ہی نہیں ہوا تھا ورنہ مجھ سے میرا مطالبہ پوچھے بغیر مجھے اتنی ادائیگی کرنے پر مٹھا ہوا تھا جس کے بارے میں میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی میں نے اس موضوع پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ اگر مجھے اس سے کچھ لینا پڑا تو کیا میں گا؟ میرا کوئی بے حد حساب کتاب تو تھا نہیں۔ آہم آثار بتاتے تھے کہ یہ مظلوم میرے لیے کافی منافع بخش ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر کاروان اور منہ جیسے تلاش کلائنٹس کے ساتھ ساتھ مجھے کوئل اور پرنسس میرا پیچھے کلائنٹس بھی بسر آتے رہے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ پرنسس میرا نے بھی اپنی زندگی میں میرے لیے سلا اور آخری ٹیلی فون اسی غرض سے کیا تھا کہ وہ کوئل کام میرے سپرد کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ اگر میں اس کے لیے کوئی کام کرنا اور زندگی اسے ملت دیتی تو وہ بھی کوئل ہی جیسی فیاضی سے مجھے ادائیگی کرنے کی کوشش کرتی۔

کوئل نے صرف کیس اپنے سامنے میز پر رکھ لیا تھا اور اس میں سے چیک بک نکال لی تھی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا "کیا تم واقعی دس لاکھ مجھے دینے کے معاملے میں بالکل سنجیدہ ہو؟" "نہا ہرے سائیں! میں آپ سے ایسا بے ہودہ مذاق تو نہیں کر سکتا" وہ قلم بھی نکالتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے ٹکے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "یار! اگر تم

# چاہ بابل

دیو تاؤن کے شہر بابل کی کمپنی

جسے مصنف نے 35 سال کی رسرچ کے بعد

قلعہ بند کیا۔

قیمت = 400/-

800 صفحات



اردو بازار لاہور

میں دیکھا کرتے ہوئے تو خاک کا آگے تم کس طرح ترقی کر گئے؟

”ہم کو کھلے بغیر اس سے ٹھوڑی سمجھاتے ہوئے پُر خیال اور ان میں میری طرف دیکھ کر بولا ”سائیں! اگر آپ میری جگہ لیتے اور آپ کو اس طرح غیر متوجہ طور پر نہ صرف اپنی ذہنی ہونے پر فخر بہت شاندار قسم کا برہانہ بھی مل جاتا تو آپ کیا کرتے؟“

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا ”اے! میں شاید میں بھی ایسا کرنا۔“

”جس۔ تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟“ وہ اطمینان سے بولا

”جب آپ اپنی ایسی ہی سوچ کے باوجود اتنی ترقی کر سکتے ہیں تو پھر ابھی میرے بھی ترقی کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ دیر سو تو ہوئی جاتی ہے۔ میں باغی دس سال بعد۔ آپ سے ذرا بڑی عمر میں ترقی کر لوں گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میرے مزاج میں بڑا فعل ہے۔“

میں نے ایک لمحے ہنسنے کی طرف دیکھنے کے بعد کہا ”یار کوئل! میرے خیال میں تم اتنے بے وقوف تو ہی نہیں ہو جتنے نظر آتے ہو۔“

”سائیں! آپ مجھے ابھی تک بے وقوف سمجھتے رہے ہیں؟“ وہ گراڑا کرتے ہوئے بولا لیکن مجھے معلوم تھا اس کی یہ شکل معنوی تھی۔

”میں نے سمجھنے کی نہیں۔ صرف نظر آنے کی بات کی تھی۔“ میں نے گویا صہجی۔

”بے وقوف نظر آنا تو جیسا ہے بے وقوف ہونے سے بھی زیادہ بُرا بات ہے سائیں!“ وہ کراہ کر بولا۔

”نہیں۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے“ میں نے گویا اسے تسلی دی ”انسان بے وقوف نظر بے شک آئے لیکن اسے بے وقوف ہونا نہیں چاہیے۔ بلکہ ایسے انسان جو بے وقوف نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت بے وقوف ہوتے نہیں ہیں وہ بڑے فائدے میں رہتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی شکل و صورت اور حرکات و سکنات سے بے پناہ جالاک اور تنہا طرار دکھائی دیتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں اور اکثر معاملات میں بڑے گھٹانے میں رہتے ہیں۔“

وہ گہری سانس لے کر بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا ”تم سائیں! آپ ہمارے دوست ہیں، مخلصان ہیں، دلدار ہیں۔ ہم آپ کو چاہے جیسے بھی نظر آئیں اور آپ چاہے ہمیں جیسا بھی سمجھیں۔ ہم اس اب آپ کے مرید ہیں اور ہمیشہ مرید رہیں گے“

اس نے ایک لمحے کے لیے ہاتھ جوڑے پھر چپک لکھنے کے لیے قلم اٹھائے ہوئے بولا ”آپ ہماری طرف سے دس لاکھ کا یہ حقیر سا ہلالا خزانہ قبول فرمائیں۔“

میں نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر اسے دیکھنے کا اشارہ کرتے

ہوئے کہا ”میں تم واقعی دس لاکھ کی رقم سے جان بچوانے پر مجھے ہوئے ہو؟“

”اے سائیں! یہ میرے پاس رہے گی تو مجھے جین نہیں آئے گا۔ یہ مجھے ہضم نہیں ہوگی“ اس نے جواب دیا۔

”چھ! ایسا کہہ! اگر یہ رقم تمہیں اتنی ہی بد بھی کر رہی ہے تو پھر یہ چپک میرے نام کانٹے کے بجائے ایک لڑکی کے نام کاٹو۔ اور تم ہی میری طرف سے یہ چپک اس لڑکی کو دینے جاؤ گے“ میں نے کہا۔

”لڑکی کے نام چپک۔“ وہ یکدم وحشت زدہ سا ہو کر بولا ”اور میں غی اسے دینے جاؤں؟“

”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”آپ کے لیے نہیں ہوگی سائیں! میرے لیے تو ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں ذرا شرمیلا سا آدمی ہوں۔ اسی لیے تو میں اپنے کام کے چکر میں پرنس سیرانک سے ملنے نہیں جاسکا تھا۔“

”میری معلومات کے مطابق تم نے تین شادیوں کر رکھی ہیں کوئل جان!“ میں نے چپک چپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تمہاری دو بیویاں گاؤں میں اور ایک شہر میں ہے۔ تمہیں ان کے پاس جاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“

”ان کی بات اور ہے سائیں!“ اس کے چہرے پر ذرا شرمی آگئی ”وہ بیویاں ہیں غیر لڑکی کی بات ذرا اور ہوتی ہے۔“

”بات چاہے کچھ بھی ہو لیکن یہ کام تم کو کرنا ہے“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”وہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ وہ نہ تو تمہیں کانٹے کی اور نہ ہی ڈانٹنے کی بلکہ وہ تمہاری شکر گزار ہوگی۔ اسے مدد کی اشد ضرورت ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سائیں! میں یہ ٹھوڑی سی کہہ رہا ہوں کہ لڑکی شریف نہیں ہے۔ میں نے لڑکی کے بارے میں تو کوئی خیال ظاہر ہی نہیں کیا۔ مجھے لڑکی کے نام چپک لکھنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ گزارش کر رہا ہوں کہ آپ کے پاس کون سے کوئی بیوی کی کمی ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں لیکن اس خدمت کے لئے آپ کسی اور کی ذیولٹی لگاویں۔“ وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ایسی مسکینی تھی کہ مجھے ہنسی آگئی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ارادہ بدلے ہوئے کہا ”اچھا! اسے میرا خیال ہے تم اس کام کے لیے موزوں آدمی ہی نہیں ہو۔ میں خود اس کام سے بچتا چاہا رہا تھا لیکن لگتا ہے کہ اسے خود کرنا ہی سہی رہے گا۔“

”نیک کام بیٹھ آدمی کو خود اپنے ہاتھ سے ہی کرنا چاہیے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ اس کے چہرے پر طمانیت آگئی۔ ایک بار پھر قلم سنبھال کر اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔



اس کی نشاندہی خاص کی تکلیف دہ سی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ سوئے ہوئے زخم نہیں دینے لگتے ہیں۔

"اتنی زیادہ پوچھ گچھ کر کے اور دہرایا اس کا زمانہ انڈیشن بننے کی ضرورت نہیں" میں نے ہلکی سی ڈانٹ چلانے کے انداز میں کہا "میں نے اس قسم کی گفتگو کرنے کے لیے بینک کا پورا کمر نہیں رکھا۔ دیئے یہ جو تم اچھے طریقے انداز میں ٹیکسٹائل مل، بکٹ فیکٹری، ہوٹل وغیرہ خریدنے کی بات کر رہی ہو۔ تو یہ کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ہمارے آج کی بینک کے بعد کوئی ایسا دن بھی آئے جب تم اس قسم کی کوئی انڈسٹری خریدنے کے لیے کسی سے مذاکرات کرنے جاؤ۔"

وہ ایک بار پھر کراہنے کے سے انداز میں ہنسی اور بولی "میں کو خواب دکھانے کا جنس تو اس قدر ہی مردوں کو آتا ہے۔ بلکہ شاید انہیں دوسرے میں ملتا ہے۔ لیکن آپ تو اس فن میں کچھ زیادہ سی ماہر معلوم ہوتے ہیں افضل صاحب!"

"اس وقت بے اعتبار میرے بیٹے سے ایک توکل گئی ہے لیکن تم اسے سن نہیں سکو گے۔" میں نے منہمکے لیے جس کا "تم بہت ذہین لڑکی ہو لیکن ہمیں بھی فرق کاچ نہیں چلا۔ مجھ میں یہی تو خرابی ہے کہ میں خواب دکھانے والا آدمی نہیں ہوں۔"

"آپ سے پہلی ملاقات پر میں نے یہی رائے قائم کی تھی لیکن ابھی ابھی آپ سے اس نئی فونی گفتگو کے دوران میں۔۔۔ پچھلے چند سیکنڈ میں ہی یہ رائے متزلزل ہو گئی ہے۔" میں نے اس عبارت میں دراڑیں ہی بڑھائی ہیں۔

"کچھ دیر بعد تم آؤ گی تو یہ دراڑیں ٹکڑے سے بھر جائیں گی" میں نے کہا۔

اچانک وہ ہنس دی اور بولی "زیادہ سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی سیریس نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ بس یونی میو اتھورائٹری ساڈن آؤٹارے ہیں۔"

"بیشتر لڑکیوں کی طرح احمق لڑکی! جس میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ جس اب تم باتوں میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو اور یہاں آنے کے لیے چل پڑو۔"

"کیا وہاں آنے کے بعد مجھے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا؟"

ایک بار پھر ہنس کر بولی۔

"حقیقتہً میں نے وقتوں سے کہا پھر خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ دو گھنٹے سے کافی پہلے آن پہنچی لیکن ہر حال بتا رہی تھی کہ اپنی تہمت غرت کے باوجود وہ اصل سے زیادہ خوب صورت اور اساتذت نظر آنے کا پلینہ رکھتی تھی۔ صاف ستھرے اور سادہ سے مگر عمدہ تراش خراش کے گلابی شلوار قمیص میں وہ بڑی نامزدہ دم اور کھری کھری دکھائی دے رہی تھی۔ چہو کو کہ میک اپ کا محتاج نہیں تھا لیکن حسین

پیش کی "ایسے بازک نکات پر بات کرتے وقت انسان کو ذرا بات سے کام لینا چاہیے۔ کسی کو غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔"

وہاں بے وقوف بیٹانے کی کوشش نہ کریں۔ میرا کوئی دوست باب بھی آپ کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا؟

صرف دوست ہونے کا ذکر نہیں کرتا شاید نہ پڑتا۔ لیکن اگر اس کے گھر میں پایا جاتا یہی صحت کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

پہلیں میں آپ کی اس بات سے خوش ہو گئی ہوں۔ لیکن بہت سہراں کچھ یوں ہے کہ میں اس وقت اپنی ایک دوست کے میں موجود ہوں جو اخلاق سے شادی شدہ بھی ہے مگر اب آپ اور تشریف کا اظہار صحت شروع کر دیتے گا۔ اس کا شوہر دفتر آج۔ وہ صوف خور کچن میں مصروف ہیں اور میں کمرے میں ایک اٹھ سے ان کی شیر خوار بچی کو جھولا جھلاری ہوں اور ساتھ ساتھ سے رہیں رہا ہے ہوئے ہوں۔

صحت خوب۔ تمہاری یہ رنگ کشی اور منظر کشی بہت ناہ اور میرے لیے کافی حد تک تسلی کا باعث بنی ہے" میں نے کہا "لیکن اب تم اپنی شادی شدہ دوست کی یہ خدمت گزار کی اپنی مطلب براری یعنی اس کے ٹیلی فون سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دو۔ زیادہ جلد یہاں آ جاؤ۔"

"مجھے ہر حال دو گھنٹے لگ جائیں گے" وہ بولی۔

"بہتر تو یہی تھا کہ تم خواہ مخواہ کے اہتمام میں اتنا وقت ضائع نہ کرنا۔ یہ ایک کاروباری بینک ہے اور کاروباری بینک میں اگر نا قانون اٹھ منہ دھوئے بغیر بھی آجائے تو میں برواشت کر لوں گا۔"

"لیکن خود قانون اس قسم کی حرکت برواشت نہیں کر سکتی گا" بولی "وہ کاروبار میں بھی سلیف، سنگار اور اہتمام کی قائل نہیں ہے۔ اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ کاروبار میں بھی ایسی خوشبو، ذرا سی خوب صورتی کی آمیزش ہو تو یہ خشک بوئیت بھی دلچسپ اور پرکشش بن سکتی ہے" پھر اسے جیسے کچھ لایا اور وہ ذرا بدلتے ہوئے لیے میں بولی "لیکن مجھ جیسی کم وقاش لڑکی کے ساتھ آپ کی کیا کاروباری بینک ہو سکتی ہے؟ میں نے تو ابھی کوئی ٹیکسٹائل مل، کوئی بکٹ فیکٹری، کوئی ٹیکسٹائل فابریکا سیدھ نیل مینڈی وغیرہ خریدنے کا ارادہ نہیں کیا" یہاں آؤ خود راستہ آئی کا ساتھ۔

"یہ تو غور کرنا ہے کہ آخر تم نے اب تک ایسا کوئی ارادہ کیا نہیں کیا" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ تکلیف زدہ انداز میں ہنسی "افضل صاحب! دل دکھانے سلفاق نہ کریں۔ آدمی امیر ہو اور فیشن کے طور پر اپنے آپ کو زیب مزور دہنیو کے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں ذرا لطف آئے لیکن انسان جب سچ گچ غریب ہو تو اسے اپنی غرت کا ذکر

ہمت حوائی ہو چکا ہے میں نے سچا اسے حوائی انداز میں استعمال کیا جائے۔  
 ”ابھی صرف ایک ہی بار لی ہو۔ ابھی سے ٹوڑا رہنے لگے۔“  
 اتنے طویل قسم کے دعوے کرنے کی نوبت کیسے آتی ہے؟  
 ”مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے بعض اوقات ایک سیٹ کافی ہوتا ہے۔“ وہ بدستور سسکارتی تھی لیکن پھر کدیم عظیم ہوئے دونوں کنٹینر بیڑے ٹاکوڈرا آگے کی طرف چلے گئے۔  
 ”خیر۔۔۔ چھوڑتے ان فضول باتوں کو۔ آپ کا وقت جتنی ہوگا آپ نے بتایا تھا کہ یہ پرنس بینک ہے۔ بتائیں ایجنڈا کیا ہے افسوس کہ میرے پاس کوئی عمدہ ساریف کس نہیں ہے ورنہ میں کھول کر کچھ کاغذات اور ٹیکس مافقم بھی دکھاتی۔“  
 ”ان گفتگوں کے بغیر بھی کام چل جائے گا اور ان کے بغیر یہ پرنس بینک ہی رہے گی۔ ایجنڈا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں ہمیں ڈھنگ سے کوئی کام کرنا آتا ہے؟“

”غریب آدمی کو اگر ڈھنگ سے کوئی کام کرنا آتا ہو تو نہ فرم کیوں رہے؟“ وہ استغناء سے انداز میں ہنس کر بولی ”ایا پھر بات کچھ یوں ہے کہ غریب غریبی بڑی عجیب ہے۔ غریب میں کوئی کام ڈھنگ سے بھی کر دیتا ہے۔“  
 ”جلی کئی باتیں مت کرو۔ ذرا سوچ کچھ کر سنجیدگی سے۔“  
 ”وہ۔۔۔ کوئی کام تو ایسا ہو گا جسے تم ذرا اونچے پائے پر اٹھے طریقے۔“

ترین عورت بھی بچہ ننگے ہاؤسنگ کے بغیر شاید خود کو مکمل محسوس نہیں کرتی اس لیے وہ بھی اس بار بکا سائیک آپ کے ہوئے تھی۔  
 وجود سے کسی عمدہ کلون کی مسک بھی اٹھ رہی تھی۔ وہ اس منہ سے بہت عطف و کمالی دے رہی تھی جسے میں نے پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔ اگر وہ غریب میں اس حد تک اہتمام کر سکتی تھی اور اتنی اچھی نظر آسکتی تھی تو یقیناً خوش حالی میں تو قیامت ڈھا سکتی تھی۔  
 میں نے گہری نظر سے اس کا سر پنا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”جیس دیکھ کر توجہ ہو رہا ہے کہ تم پرنس بینک میں نہیں شادی میں شرکت کے لیے آئی ہو۔“

”خواتین تو پرنس بینک میں بھی اس سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ جاتی ہیں افضل صاحب! وہ لٹریچر ہی سانس لے کر بولی ”بلکہ اس سے زیادہ اہتمام کے ساتھ وہ تو کبھی کبھی سوئم اور چالیسویں میں بھی چلی جاتی ہیں۔ میرے تو سائل ذرا محدود ہیں اور میں طبعاً سنگ ریلنڈ بھی نہیں ہوں اس لیے میں نے اتنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔“

میں نے اسے اپنے متعلق پوچھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شکر یہ ادا کر کے پوچھنے کے بعد بولی ”اور یہ سب باتیں آپ کو بھی معلوم ہیں لیکن آپ جان بوجھ کر انہیں بنے رہتے ہیں۔ ویسے اگر آپ کو یہ محسوس ہوا ہے کہ میں شادی میں شرکت کے لیے آئی ہوں تو شاید مجھے آپ کی اس رائے سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آپ سے ملنے آنا میرے لیے شادی کے مترادف ہے۔ واضح رہے کہ یہاں شادی سے مراد صرف خوشی ہے۔ میری یادیں گنگ نہیں۔“  
 ”وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اتنی اردو مجھے بھی آتی ہے“  
 ماہر لسانیات صاحبہ!

”شکر ہے“ وہ گہری سانس لے کر بولی ”ورنہ آپ کے طبقے کے لوگوں کو تو یہ ظاہر کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے کہ انہیں اردو نہیں آتی۔“  
 ”مجھے ابھی دیکھنا کاشوق نہیں پڑا۔“

”یہ بھی قیمت ہے“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”ویسے آپ سے مل کر خوشی محسوس کرنے کا میرا معاملہ سائر لہریانوی والا ہی ہے۔ وہ جو ان کا مشہور زمانہ شعر ہے سوسہ میرے حسبِ حال ہی ہے۔“

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی  
 تم سے مل کر اُداس رہتی ہوں  
 ”وہ۔۔۔“ میں کراہ اٹھا ”تم نے بھی بے چارے ساحر لہریانوی کی جنس تبدیل کر دی۔ اسکول میں پڑھنے والی اور شعر میں کہنے کی شوقین لڑکیاں یہ حرکت کرتی ہیں حالانکہ اس قسم کے اشعار میں اس تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں مذکر مونث کی تخصیص کے بغیر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔“  
 ”وہ تو مجھے معلوم ہے“ وہ مسکراتے ہوئے بولی ”لیکن شعر

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

# ناگے بھون

اقلیم عظیم

جلد اول :- / 150 جلد دوم :- / 150

ناشر: مکتبہ انقریش

اردو بازار لاہور

اس نے کرسی کے پٹے سے سر تھاپا اور کرسی سانس لے کر بولی "آپ نے میری سرپرستی قربانے کا فیصلہ کر لیا!"

"معمولی حد تک۔۔۔ اور وہ بھی ان ڈائریکٹ انداز میں تم ایسا سمجھ سکتی ہو لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا کوئی عمل دخل نہیں ہو گا۔ حتیٰ کہ میرا کوئی مشورہ بھی شامل نہیں ہو گا۔ سب کچھ تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ میں تمہیں صرف یہ دے سکتا ہوں۔"

میں نے کوئل کا دیا ہوا دس لاکھ کا چیک دراز سے نکل کر اس کی طرف بڑھادیا۔

وہ بخور چپک کر دیکھنے لگی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بعض لوگوں کو صرف ایک موقع ملنے کی دیر ہوتی ہے اس کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان میں بے پناہ صلاحیتیں ہوتی ہیں لیکن ان میں سے بعض کا الیہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں وہ ایک موقع نہیں مل پاتا۔ میں تمہیں اوّل الذکر لوگوں میں شمار کر رہا ہوں۔ وہ پہلا موقع۔۔۔ وہ اشارت ہے۔ وہ آغاز تمہیں مل رہا ہے جس کی تمہیں شاید اشد ضرورت ہے۔ اب آگے تمہارا نصیب ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی حد تک تمہاری صلاحیتوں کا امتحان بھی ہے۔ کسی متوسطے علاقے میں درسیاتی سی جگہ لے کر اوسط درجے سے ذرا بہتر قسم کا ایک بیرونی پارکھولو۔ کچھ چھ ماہ کے لیے بھی چکار رکھنا۔ ہو سکتا ہے تم بہت آگے نکل جاؤ۔۔۔ ورنہ آسودہ حالی سے گزر کر برے قابل تو ہو ہی جاؤ گی اور اگر خدا انخواستہ اتنا بھی نہ ہو سکا تو کم از کم یہ حسرت تو نہیں رہے گی کہ زندگی نے تمہیں ایک موقع بھی نہیں دیا۔"

وہ چپک کا اچھی طرح جائزہ لے چکی تھی اور چند لمحوں سے ایک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یکدم ہی اس کے چہرے پر کمری خنجر کی چمکانی تھی۔ میں خاموش ہوا تو وہ بڑے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "یہ آپ کا چیک تو نہیں ہے اس پر آپ کے دستخط یا آپ کی کسی پہچان وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ کیش ہو جائے گا۔ اسے کراس کر کے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانا" میں نے کہا۔

"میں اسے آپ ہی کی نوازش شمار کروں گا؟"

"نہیں، قسمت کی" میں نے جواب دیا "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ کل کھان کو یہ چیک کانٹنے والا کیس اپنی نوازش کا صلہ مع سود وصول کرنے میرے پاس نہ پہنچ جائے" وہ اب سسکراتے ہوئے بولی۔

"تم اس میں بھی دارنے کی کیا بات ہے؟" میں نے بے پروائی سے کہا "ابھی چند دن پہلے تک تو تم کسی بھی دولت مند آدمی کی داشتہ بننے کے لیے تیار تھیں۔ تم یہی سمجھ لیا کہ یہ ایسے ہی کسی آدمی کی طرف سے پہلی ایڈوانس قسط تھی جس کا حساب کتاب

انجام دے سکتی ہوگی؟ ایک بزنس کے طور پر چلا سکتی ہوگی؟" میں نے خنجر کی سے کہا۔

"جیسا!" وہ گویا میرا مطلب سمجھتے ہوئے ذرا بادلے ہوئے لہجے میں بولی "میں تو میں نے پوزیشن کا کورس ٹیکنیکل بورڈ سے بہت اچھے رزلٹ کے ساتھ پاس کیا ہوا ہے اور اس وقت میں ایک چابی پارلر میں پارٹ ٹائم کام بھی کر رہی ہوں، صبح کی شفٹ میں چھوٹے سے ایک اسکول میں پڑھا بھی رہی ہوں۔ میرے انہی درجن کاموں سے تو سمجھتا ہوں کہ گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ کرائے کا مکان ہے۔ ہمارا کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ والد کام کرنے سے معذور ہیں۔ میرا خیال ہے میں یہ دونوں کام اپنے طور پر بھی چلا سکتی ہوں۔ اسکول بھی۔ اور بیرونی پارلر بھی۔"

پھر وہ میری آنکھوں میں جمنا لگتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے گویا اس کا سوال اُن سنا کرتے ہوئے پوچھا "تم ان میں سے کس کام کو ترجیح دیتی ہو؟"

"بیرونی پارلر کو" اس نے بلا تامل جواب دیا "گھر کا اسکول کو ذرا کاروباری نکتہ نظر سے ہی چلایا جائے اس کے باوجود اسے ذرا زیادہ باعزت، زیادہ باوقار اور تیسری کام سمجھا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک اس میں زیادہ سفر کاری اور زیادہ مسائل ہیں۔ میرے لیے نہ جانے کیوں اس میں کشش بھی کم ہے۔ میں اگر بھی اپنا کوئی کام کرنے کا شیخ چلیا نہ خواب دیکھتی ہوں تو وہ بیرونی پارلر کے بارے میں ہی ہوتا ہے۔ شاید میں کچھ ایسا کام چاہتی ہوں جس میں کچھ خوب صورتی، گھیر اور دلچسپی ہو۔"

میں نے چوتھے ہوئے کہا "رہبان کے اعتبار سے کس قسم شو بزنس کی لڑکی تو نہیں ہو؟"

اس کی شکل و صورت، جسمانی ساخت وغیرہ نہایت معقول تھی۔ اگر اس میں ایکٹنگ کی کچھ صلاحیت اور ڈانس کے معاملے میں بے باکی موجود ہوتی تو وہ فلم لائن میں بھی چل سکتی تھی۔ اس سے گئی گزری لڑکیاں بیرونی آدمی تھیں۔ میں اس کے لیے یہ خودست بھی کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے مجھے اس کو لاہور بھیجنا پڑتا۔ ایک لمحے کے اندر اندر میں نے ان تمام امکانات پر بھی غور کر لیا لیکن وہ دوسرے ہی لمحے اس کے جواب سے میری یہ سوچیں ادھکی کی درمیری رہ گئیں۔

"نہیں۔ شو بزنس کا مجھے قطعاً کوئی شوق نہیں" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "مٹی وی پر یا فلموں میں تو ان گنت لڑکیوں کا خواب ہو گا لیکن میرا ہرگز نہیں ہے۔ میں اگر شیخ چلیا نہ خواب دیکھتی ہوں تو کچھ اور طبع کے دیکھتی ہوں۔ میں کوئی بہت نامور اور کامیاب پرفارمنس یا بزنس دوسری دنیا چاہتی ہوں۔"

"نہیں۔" وہ پھر طے ہو گیا "تم اپنی بیرونی پارلر کھولو گی" میں نے گویا فیصلہ سنادیا۔





میں اپنی آئندہ زندگی میں اس کے بارے میں یہ سوچ کر اطمینان محسوس کروں کہ میں نے اسے کسی اچھے سوز پر چھوڑا تھا۔ وہ جیسا بھی ہے دشمن تو سہرا حال نہیں ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں۔ خیر یہ ابھی سوچ ہے" میں نے سہلایا "مجھے اُمید ہے تمہاری یہ توقع پوری ہوگی۔ وہ ایک بار سامنے تو آئے اگر وہ کسی بڑے سوز پر بھی کھڑا ہوگا تو ہم اس سوز کو مزید سوز توڑ کر اچھا بنانے کی کوشش کریں گے۔"

"کاش ایسا ممکن ہو سکے" اس کے ہونٹوں پر دھیمی اور افسردہ سی مسکراہٹ برقرار تھی لیکن پھر جیسے حکم اس نے اس پر جو حمل پن کو ذہن سے ہٹا دیا۔ اس کے چہرے کی کھٹکھٹ لوٹ آئی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "چھال تو پھر میں جاؤں؟"

انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ حقیقت اس کا نشانہ ہو کر میں اسے دھوکا لوں۔ جانے سے منع کروں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی موجودگی اور اس کے خود پسندی کے اشارے اور استعارے مجھے آواز میں جھلا رکھتے تھے میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ہاں۔ تم جاؤ اور فوراً عملی کام شروع کر دو۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ ہنسی گویا کسی خفیف اور بے عنوان سی بامیوس کو بچانے کا اک بانہ تھی۔ اس نے میز کے دوسری طرف سے ذرا جھپٹتے ہوئے معاملے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مجھے وہ ہاتھ قاتما پڑا۔ اس میں محبت کا گداز، کرم جوشی اور مضبوطی تھی۔ وہ ایک لمحہ جیسے ساکت ہو گیا۔

پھر وہ نہایت خفیف سی بھرپوری لے کر گویا کسی اور دنیا سے واپس آئی اور ہاتھ چھڑا کر میز کے قریب سے ہٹے ہوئے نہایت مستعدی سے سلپٹ کرتے ہوئے بولی "تم آرگٹ سرائ" وہ تیزی سے گھومی اور دو دو اے کی طرف بڑھ گئی لیکن دو دو اے پر ٹوک کر وہ پچھتے ہوئے گویا بات کھل کرتے ہوئے انگریزی میں ہی بولی "اس کے علاوہ آپ بہت عجیب بھی ہیں سرائ"

"ہاں۔ وہ تو میں ہوں" میں نے گویا اسے چرانے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا لیکن وہ جواباً نہیں مسکرائی۔ مگر سنجیدگی سے وہ چند لمبے ایک تنگ سی طرف دیکھتی رہی پھر نہایت دھیمی آواز میں بولی "خدا حافظ سرائ"

دوسرے ہی لمحے وہ جسم محری کے ایک سبک خرام جھونکے کی طرح رخصت ہو چکی تھی۔ کمرے میں ایک نہایت خفیف سی خوشبو گویا اس کی موجودگی کی یاد دلانے کے لیے باقی نہ گئی۔ کمرے میں حکم ہی جیسے گرا سکت چھایا تھا یا پھر شاید یہ سکوت میرے اندر تھا۔

میں نے اپنے آپ کو دفتر کے کام میں اُبھاننے کی کوشش کی لیکن اندری اندر جیسے کہیں اضطراب کی سرچھوٹ پڑی تھی۔ آخر کار میں سب کچھ چھوڑ چھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اچانک فیصلہ

لیا۔ میرے پاس ذرا فضل فضل میں ہاتھ پاؤں پلانے کی کمالی ہے۔ "میر ہونے کے واقعی بڑے فائدے ہیں" منیفہ لٹھری سانس لے کر بولی "اور یہ علاوہ واقعی سچ ہے کہ چپا پیچے کو کھینچتا ہے۔ انسان پہلے ہی کافی میر ہو تو اس کے ذرا ہاتھ پاؤں پلانے سے اور ہی اوپر سے لاکھوں روپیا چلا آتا ہے جو اس کے لیے تنک کی بنک کے برابر ہوتا ہے اور کوئی اس سے نئی زندگی شروع کر سکتا ہے" پھر اس نے بہت کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھے اپنائے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ لٹھری آہ بھری اور بولی "واہ الگ آؤنے بھی اپنی دنیا میں بڑے دلچسپ نمائشے لگا رکھے ہیں۔"

"روپیا ہاتھ میں آتے ہی مالک کا ٹھکانا کرنے کے بجائے جلی کی باتیں شروع کر دیتا۔" میں نے اسے گھورا "انسان کی فطرت ہی عجیب ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے لیے بھی بہتری کا کوئی بلو کھلا ہے بلکہ پہلے دوسروں سے اپنا موازنہ شروع کر دیتا ہے۔" اس کا دھیان شکر کی طرف نہیں، شکر کے کی طرف ہی رہتا ہے۔ شاید اس لیے اوپر والے نے خود بھی انسان کو ناشکاری قرار دیا ہے۔"

"رہے۔۔۔ ارے۔۔۔!" وہ گویا حیران ریٹان ہو کر آنکھیں پٹانے ہوئے بولی "آپ تو سیریس ہی ہو گئے اور باقاعدہ دعا لے کر پڑھ آئے۔ میں ناشکاری تو سرائی کر رہی ہوں" میں تو بونسی راجت کا اٹھار کر رہی ہوں۔ دنیا بڑی عجیب نمائشا گاہ ہے۔۔۔ یہ آپ کرنا چاہتے گا۔"

"میں بھی کوئی سیریس تو سرائی ہو رہا ہوں۔ مجھے بھی بس بونسی واسوچ پاکر لوگوں کو تو سرائی بہت ڈانٹ ڈنٹ کرنے کا شوق ہے" کہانے سا دلی سے کہا۔

"ٹھیک ہے سرائ آپ کی ڈانٹ سرائ آکھوں پر" وہ منسوب اٹھتے ہوئے بولی۔ اچانک اسے گویا کوئی خیال آیا اور افسردگی کا ایک سایہ اس کی چہرے پر آکر گزرا گیا۔ وہ ذرا بے ہوش لہجے نڈھالی "وہ کینہ کا مرائن نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگا!"

"ابھی تم نے خود ہی کہا ہے تاکہ یہ دنیا بڑی عجیب نمائشا گاہ ہے۔ وہ کسی اور جگہ کسی اور قسم کے نمائشے کا کوئی کوارینٹا ہوا ہوگا۔ وہ تو ناشانی الحال ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے" میں نے اس کے لیے میں کہا "ویسے یہ غفلت خاطر بھی عجیب ہوتا ہے۔ انسان نے کوئی دینا ہے کہ میں نے فلاں سے غفلت تو دلایا ہے لیکن اس سارے میں فکر مند رہتا ہے سچا رہتا ہے۔ اس کے لیے کچھ نہ نہ کرنے کی تنک دو میں لگا رہتا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموشی سے سر تھکانے رہنے کے بعد وہ باول ہی دل میں اپنا تجزیہ کرنے کے بعد فیصلہ کن لہجے میں بولی "نکس۔ یہ بات تو طے ہے کہ میں اس سے قطع متعلق کر چکی ہوں۔ یہی نہیں کہ یہ جانتی ہوں کہ اس کے بارے میں میرے ذہن میں اپنی فطرت کی خوب صورت 'ابھی اور خوشگوار یاد کا ثبت ہو۔"

ہو سکتا تھا۔ اس کا کوئی ذاتی دوست بھی ہو سکتا تھا۔ شوہر بھی ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی خاص قبیل کی لڑکی تھی تو اس کے لیے وہ کل موٹی امانی بھی ہو سکتا تھا۔ اور یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ شہر میں اس قسم کے معاملات بھی عام تھے۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد وہ میرے دل میں ٹھک سی ہوئی۔ میں نے عقب لہا آئیے میں دیکھ لیا تھا کہ وہ گاڑی اگلے چرہا پر سے ایک سوس وڈو پر مڑی تھی۔ سوس وڈو پر مڑنے کا مطلب یہی تھا کہ اسے قریب ہی کہیں رکتا تھا۔ میں نے فوراً اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی اور کچھ آگے جا کر جو نمی مجھے راستہ میرے تیار تھا دوسری طرف کی سڑک پر موڑ لی۔ جس چرہا پر کو میں پیچھے چھوڑ گیا تھا کچھ دیر بعد میں واپس اس پر پہنچا لیکن راستے میں مجھے ایک سٹنل پر گاڑی روکنا پڑی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید میں اس گاڑی کو تلاش نہ کر سکوں اور وہ میرے سوس وڈو پر پہنچے تک کسی اور طرف لکل چکی ہو لیکن قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے جو نمی گاڑی سوس وڈو پر موڑ لی وہ گاڑی مجھے ایک پربارکٹ کے سامنے پارکنگ ایریا میں کھڑی نظر آئی۔

میری مزید خوش قسمتی یہ تھی کہ اسی گاڑی کے قریب پارکنگ کے لیے خاصی جگہ بھی موجود تھی۔ میں نے فوراً گاڑی وہاں لے جا دی اور چند لمبے گاڑی میں بیٹھا رہا۔ دوسری گاڑی اب غلط تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ گاڑی جس جگہ میں کھڑی تھی وہ سارا ہی کمرشل علاقہ تھا۔ آس پاس بہت سی بڑی بڑی دکانیں اور مارکیٹیں موجود تھیں جو اعلیٰ درجے کی اشیائے ضرورت اور اشیائے تفریح سے بھری پڑی تھیں۔ جہاں غلات اور میاں کے حساب سے دکان دار ہر چیز کی قیمت کے لحاظ سے گاہک کی کمال آمارہ اپنا اعلانیٰ فرض خیال کرتے تھے۔ جو لوگ یہاں شاپنگ کرتے تھے ان میں سے بیشتر اس کے محتفل بھی ہو سکتے تھے لیکن انہی جگہوں پر میں نے آنکھیں بند کر کے فریج کرنے والوں کے شانہ بہ شانہ ان کو ڈپٹیوں کو بھی دیکھا تھا جو دس روپے کے لیے دکان دار سے لڑتے تھے اور جن کی بیگمات وہاں کی قیمتوں سے بڑھ کر اسی وقت جہاں بازار یا سٹنل بازار چلنے کی فراہم کر دیتی تھیں۔

تینوں سے تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ بے جوڑ جوڑاں میں سے کس دکان یا مارکیٹ میں گیا ہو گا لیکن جس... دکان کے سامنے گاڑی کھڑی تھی، میں نے سب سے پہلے اسی میں نشت آنیال کا فیصلہ کیا۔ وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور گپ ایک بہت بڑی دکان تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اسی میں ان کی موجودگی کے امکانات زیادہ تھے۔

اندروں پہنچنے پر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ دونوں مجھے گراؤنڈ فلور پر سامنے کے حصے میں ہی نظر آئے۔ اس ہال خانے میں پانچ چھ بیٹھن تھے۔ بچوں، عورتوں، مردوں کے جلوسات، بچوں

کیا تھا کہ مجھے چل کر دروازے سے ملنا چاہیے۔ کئی دن سے نہ تو اس کا کوئی فون آیا تھا اور نہ ہی وہ خود آئی تھی۔ پہلے میں نے اسے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بارے میں سوچا مگر فیصلہ کیا کہ اچانک جاؤں گئے میں زیادہ لطف رہے گا۔ یہ کسی حد تک اس کے لیے ایک سرگراں ہوگی۔ قریبی دوست کئی دن کے وقفے کے بعد بغیر اطلاع اچانک ملیں تو زیادہ لطف آتا ہے۔ ایک خفیہ مگر خوش گواری حیرت ہوتی ہے۔

میں نے گاڑی نکالی اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت اسے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ ویسے اس کا آفس بھی اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس آفس میں وہ کم ہی بیٹھتی تھی۔ اپنے گھر میں بھی اس نے ایک بڑے کمرے کو عمدہ اور باضابطہ قسم کے آفس کی شکل دی ہوئی تھی۔ زیادہ تر وہ وہیں سے اپنے بزنس اور زمینوں کے معاملات کو کنٹرول کرتی تھی۔

میں اس وقت کلفٹن کے علاقے سے گزر رہا تھا جب میری نظر دوسری طرف کی سڑک پر سامنے سے آئی ہوئی ایک گاڑی پر پڑی۔ اسے ایک سافٹلا سا اوچر مگر خوش پوش اور بارعب شخص ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے پیلوں میں شرح بھڑکیلے سے لباس میں ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی جس کے کھلے ریشمی بال اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے ہوئے تھے۔ لڑکی سر سے کوئی بات کر رہی تھی اور اس کا سر تقریباً سرو کے کندھے پر ہی تھا ہوا تھا۔

وہ دوسرے سڑک تھی۔ ایک طرف جانے والا اور دوسری طرف آنے والا ٹریفک رواں تھا اور ایک سڑک سے دوسری پر گاڑی موزن کے لیے کافی دور تک سچ میں کہیں راستہ نہیں تھا۔ وہ جیس قیمت سفید گاڑی دوسری طرف سے فرما رہی تھی ایک لمبے میں میرے قریب سے گزر گئی لیکن اس پر نظر پڑنے کے باعث میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہو گیا جس کے اثرات فوری طور پر معدوم بھی نہیں ہوئے۔

میں نے جو سفر دیکھا تھا وہ کچھ ایسا اتھکا یا انہوتا نہیں تھا۔ اس علاقے میں... بلکہ بہت سے علاقوں میں آئی جاتی گاڑیوں میں اس قسم کے نظارے عام تھے لیکن بعض اوقات کسی خاص وجہ سے انسان چرک جاتا ہے۔ میرے چرکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مجھے جشیہ کریم کے دفتر میں کافی سرو کی تھی۔ وہ ایک خوب صورت اور اسٹارٹ لڑکی تھی۔ اب گو کہ میں نے اسے صرف ایک لمبے کے لیے دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت اسٹارٹ اور خوش لباس دکھائی دی تھی۔

اس کا کسی اوچر مگر شخص کے ساتھ گاڑی میں یوں اپنا بیت کے ساتھ بائیں کرتے ہوئے گزرتا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ وہ جشیہ کریم کے دفتر میں سے کسی دفتر کا کوئی اہم آدمی بھی

لے تو میرے اشارے پر پیچھے ہٹ گئی تھی اور خاموش رہی تھی لیکن زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ وہ میری رہنمائی اور مشاورت پر عمل گئی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ مجھے کوئی چیز خریدنے کے معاملے میں فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اس لیے میری مدد کرنا اس کا اخلاقی اور پیشہ ورانہ فریضہ تھا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے ایک گاہک کو بھی اپنے کاؤنٹر سے خالی آگے جانے دیا تو اسے کامیاب سٹارگرل نہیں سمجھا جائے گا۔ وہ بولنے سے بے حد کی تناسب والا معاشراکی تھی۔ رحمت زیادہ صاف نہیں تھی لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی اور اس کی مسکراہٹ خوب صورت تھی جس کی ایک وجہ شاید اس کے موتیوں کی طرح چمکلاتے ہوئے دانت تھے۔ جموی طور پر اس کی شخصیت کا آثار اچھا تھا اور وہ واقعی ایک کامیاب سٹارگرل معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کچھ خریدے بغیر آگے بڑھ جانے کا سوچا تھا لیکن اس کے مسلسل استفسار اور خوش خلق مسکراہٹ نے مجھے مجبور کر دیا کہ کم از کم ایک اچھی سی پہنوم تو خرید لی جائے۔

اس طرح مجھے اس نامعلوم جوڑے کا تعاقب کچھ مہنگا پرستکار تھا لیکن میں نے سوچا کہ میں ذرا آج کی طرف تو جا ہی رہا تھا، پہنوم اسے نکلنے کے طور پر پیش کر دوں گا۔ پہنوم مڑی اس کے پاس یا میرے پاس کوئی کی تو نہیں تھی لیکن خند تو میرا حال خند ہی ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے کچھ طمانیت سے سٹارگرل سے کچھ پہنومز دکھانے کے لیے کہا۔ اس نے کمانٹ بہت سی پہنومز نکال کر میرے سامنے تقاریر میں کھڑی کر دیں۔ میرا دھیان پہنومز میں کم اور اس جوڑے میں زیادہ تھا جو اس وقت کسی وجہ سے شاید کچھ دیر کے لیے کیش کاؤنٹر پر چلا گیا تھا۔

ابھی ان کا رخصت ہونے کا ارادہ معلوم نہیں ہوا تھا۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں ان پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ سٹارگرل کو یہ احساس بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ درحقیقت میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ اس کے علاوہ مجھے پہنومز بھی دیکھنی تھیں اور سٹارگرل کی باتوں پر بھی توجہ دہیان دینا تھا۔ ایک وقت یہ سب کچھ کرنا خاصی مشکل لگتی تھی لیکن بہر حال کام چل ہی رہا تھا۔

میں نے تمام پہنومز کو ایک نظر دیکھ کر کئی میں سہلایا اور اسے مزید چند پہنومز کے نام بتائے۔ تب وہ کچھ اور مسکرائی پھر اس نے چند کاؤنٹر کے نیچے سے کوئی چھوٹی اور قدرے خفیہ سی الماری کھول کر چند پہنومز نکالیں اور میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے جلدی سے ایک اضافی قیمت پوچھی اور دوسری سے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ اپنی اسی روشن مسکراہٹ کے ساتھ بولی "وائٹ کیش کاؤنٹر پر رکھ دیجئے" یہ دراصل اس نے انگریزی میں کی تھی۔ جس کا ترجمہ بھی قیمت تھا۔

میں نے بھی اسی جوڑے والی ٹیک استعمال کی یعنی اس سے

پہنومز وغیرہ کے شیعہ دکائی دے رہے تھے۔ ایک آدھ کاؤنٹر پر سٹارگرل کے بجائے سٹارگرل بھی موجود تھیں۔

وہ دونوں زمانہ لمبوسات والے تھے میں نے جہاں تقاریر اور تقاریر پر ایک سے ایک بڑھ کر ان کے فیشن کے خوب صورت صورت "بے ہنگم ہر طرح کے ٹیکوں لمبوسات دکائی دے رہے تھے کچھ شریکوں میں بھی بچے ہوئے تھے اور کچھ چلی بھنوں نے بیہوش کر کے تھے لڑکی لمبوسات دیکھ رہی تھی اور اس کاؤنٹر کی سٹارگرل مستعدی سے اس کے سامنے دھڑا دھڑا لمبوسات ڈھیر کر رہی تھی۔

میں اس سے اگلے کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہوا۔ وہ ایک آپ کے ملان اور پہنومز کا شیعہ تھا۔ اس پر بھی سٹارگرل ہی موجود تھی۔ ایک کریمے قریب آئی اور خوش خلقی کے کچھ دیکھا نام کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس وقت میرا دھیان ان دونوں کی طرف زیادہ تھا جو برابر کے کاؤنٹر پر موجود تھے۔ میری کوشش پر بھی نہ اس لڑکی کی نظر میں نہ آؤں۔ وہ مجھے پہچان سکتی تھی لیکن اہمیت یہ تھا کہ اس کی تمام توجہ لمبوسات کی طرف تھی۔ مراد بالہ پر دھڑا دھڑا کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اندر سے مضطرب تھا لیکن کامیابی سے اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے تھا۔

اسی لمحے میں اس وقت تقاریر شروع نہیں تھا اور یہ بات میرے ذہن میں زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کیونکہ اسی وجہ سے جس جس کاؤنٹر پر میں آؤں گا وہاں کچھ موجود ہے۔ سٹارگرل یا سٹارگرل انیس اپنی طرف توجہ دے کر اسے کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے سٹارگرل کو ہاتھ دے کر اسے اشارے کرتے ہوئے شریکوں میں سوچا۔ ایک آپ بالہ بہت اشیاء کا جائزہ دیتا شروع کر دیا جن کے سر پر کچھ کچھ نہیں تھا۔

وہ اپنے کاؤنٹر پر لڑکی نے کچھ لمبوسات مرد کو مشورہ طلب کر لیں۔ لڑکی نے کوشش کی لیکن وہ عدم دلچسپی سے بولا "جیسے جیسے بات بولے گا۔"

لڑکی نے کچھ گت میں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے مضطرب ہو کر بات کے برعکس بہت زیادہ چیزیں تقاریر دیکھنے "زیادہ بات بولنے" ایسی بات کہنے اور قیظوں پر بحث و تکرار کرنے کے مسئلہ طمانیت کم وقت میں کئی لمبوسات بیک کر لے لیے۔ میں نے کئی لمبوسات دیکھا۔ مرد ادا کی کرنے کے لیے جب سے بڑا وغیرہ لڑکے کے بجائے بڑے نونوں کی ایک موٹی سی ہڈی نکال رہا تھا۔ اس نے بڑائی سے چند نوٹ نکال کر سٹارگرل کی طرف دیکھے جو وہ نے کراس کاؤنٹر پر چلی گئی جہاں لڑکی کی جانی میں سے خیریت ہوئے لمبوسات کے ڈبے اور پکٹ وغیرہ بھی لے دیں۔ بھینچا دیے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اب وہ اسی لڑکی سے بات کرے گا جس پر میں کھڑا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اس دور میں میں یہ رہا تھا کہ سٹارگرل کچھ دیر کے

درخواست کی کہ وہ خود ہی جا کر ادا ہو کر آئے۔ "نیک ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں" اس کی مسکراہٹ بکھ اور وہ سن ہوئی "لیکن کیا اس سے پہلے میں اس کی گنت پیکیٹ کعداں؟" اس نے پرفوم کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں" میں نے پرلوم اشارہ کر کے بدست ہوئے کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا وہ جو ڈا اسی کاؤنٹر کی طرف آ رہا تھا۔

سیکرٹریل مجھے دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے بولی "آپ کا کچھ بتایا ہو گا۔"

"میں ذرا آگے جا رہا ہوں" مجھے وہیں دسے دیتے گا "میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ ذرا آگے درمیانی راستے میں ایک طرف کوچہ گھومنے والے بیگمڑ پر کچھ ٹائیاں لگی ہوئی تھیں اور قیمت تھا کہ وہاں کوئی سلازمین موجود نہیں تھا۔ میں وہاں رک گیا۔ میرا اندازہ درست رہا۔ وہ جو ڈا اسی کاؤنٹر آن رکھا جس سے میں ہٹا تھا اور سیکرٹریل اپنی تمام تھپڑ ورنہ خوش خلقی کے ساتھ ان کے سامنے ان کی مطلوب چیزیں ڈھیر کرنے میں لگ گئی۔ لڑکی کو ان میں اُلجھا پھوڑ کر وہ میرا ہاتھ اور رسید لینے چلی گئی۔ وہ لا کر اس نے مجھے دیں اور دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گئی۔

ادویز عمر مو کی سامی لڑکی میک اپ کا سامان اور پرفومز بھی دھڑا دھڑ خرید رہی تھی۔ یہاں بھی کسی قسم کی بحث و تکرار سودے بازی حتیٰ کہ چیزوں کے انتخاب میں زیادہ تر بے بازی تک نہیں ہوئی اور کئی ڈپے کھانکٹ پیک ہو گئے۔ ایک بار پھر مرنے فونوں کی گڈی سی نکلی اور سیکرٹریل ہی کو ادا ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر کیش کاؤنٹر پہنچ گئی۔ گاہکوں نے اپنے یہ ڈپے بھی دیں پتھر اویسے۔

ادویز عمر فیس کی فونوں کی گڈی بٹھیکے کچھ بکلی ہو چکی تھی اور آثار ہمارے تھے کہ ابھی اسے اور بکلی ہوتا تھا۔ لڑکی دل کھل کر شاپنگ کر رہی تھی اور موبے کی بازی سے ادا ہو چکی کر رہا تھا۔ دونوں ہی کا معاملہ "مال منت دل ہے دم" والا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سوچا یہ عمل شاید ابھی کی سرجہ اور ڈوہرایا جائے گا۔ اس نے میرا دیکھ کر سوچ رہا تھا کچھ زیادہ ضروری نہیں تھا۔ وہ آپس میں بہت کم بات کر رہے تھے جس کی وجہ سے میری معلومات میں کچھ اضافہ ہونے کی بھی کوئی خاص امید نہیں تھی۔ شاپنگ سے فارغ ہو کر انہیں بہر حال باہر ہی آنا تھا اور یہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ ان کی گاڑی کہاں کھڑی تھی "اس لیے میں نے باہر جا کر ہی ان کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

میں باہر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ پھر میں نے گاڑی وہاں سے ہٹا کر ایک اور مناسب جگہ پر کھڑی کر لی تاکہ وہ سامنے سے آئیں تو مجھ پر نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد انتظار شروع ہو گیا جو میرے لیے خاصا صبر آزما کام ہونا تھا تاہم یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد یہ وہ دونوں لدے پھندے سپر مارکیٹ سے

برآمد ہوئے کوئی اور عورت اتنی شاپنگ شاید ہمارے دن میں کسی نہ کوئی جتنی اس لڑکی نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں کر لیا تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور پکٹ و فیو کا ڈی میں سین کرنے کے بعد جب وہ دونوں ایک بار پھر اگلی سیٹل پر بیٹھے تو ایک بار پھر مو کے کندھے پر گری جا رہی تھی۔ اسے کوا کھو چلی کی کوئی پروا یا کسی سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن مو کو وہ جتنے بارے میں کچھ چرکنا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے کندھے پر سے اٹا کر خبر نہیں تھا لیکن میں اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ویسے بھی وہ مجھے پہچانتا نہیں تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو میں ان کے پیچھے تھا لیکن میں قناب احتیاط سے کر رہا تھا تاکہ مو کو اس کا احساس نہ ہونے پائے۔ یہ دیکھ کر میں نے اند کا شکار ادا کیا کہ انہوں نے مزید کچھ کاشٹ نہیں کیا۔ شاید لڑکی کی فرمائشیں ایک ہی جگہ سے پوری ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹے لیکن خوب صورت اور مہنگے رستوران کے سامنے جا کر مکے ساحل سمندر پر واقع ایک رستوران میں ابھی ریش نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں رات گئی ہوئی تھی تو فون میںاں روٹی بدست تھی اور ابھی تو صرف شام کے سرخ میٹھے دامن پہلے رہے تھے۔

میں نے احتیاط سے گاڑی لاک کی اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ ان کا کھانا کھانے کا پروگرام معلوم ہوتا تھا۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ میرا پروگرام کیا ہونا چاہیے۔ ذرا تنگ کی طرف جانے کا پروگرام تو فی الحال دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ بہر حال، اتنا اہم پروگرام نہیں تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ جس پیکر میں پڑ گیا تھا وہ بھی اہم تھا یا نہیں؟ جیسا کہ کم کے دفتر میں مصلحتی سوچنے والی ایک خوب صورت لڑکی اگر ایک ادویز عمر اور نہایت خوش حال دکھائی دینے والے مو کے ساتھ شاپنگ کر لی اور گھومتی پھر رہی تھی تو یہ معاملہ اہم تھا یا نہیں؟ فی الحال تو میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آگے چل کر معاملہ انہیں بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے پہلے بھی کئی بار ایسے تجربات ہو چکے تھے کہ سر راہ اتفاق سے نظر آنے والا کوئی بھارہیر اہم سا کر رہا یا معمولی سا واقعہ آگے چل کر بہت اہم ثابت ہوا تھا۔

چنانچہ میں نے فی الحال ان دونوں کا پیچھا نہ ہی چھوڑنا فیصلہ کیا۔ اگر اب تک وقت ضائع ہی ہوا تھا تو مزید کچھ وقت ضائع کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ سواکس فون پر زور تاج سے رابطہ کر کے اسے بھی پوچھ کر جانوں۔ اس کا گھر اور دفتر دونوں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ اول تو شاید وہاں شارت فوس پر آنے کے لیے قیام نہ ہوئی اور دوسری بات یہ کہ بات پر یور ہوئی کہ یہ خالصتاً ملاقات برائے ملاقات نہیں تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ نہ جانے کس پیکر میں پہنچے پھر رہا تھا۔

یہ ارادہ ملتی کرنے کے بعد میں بھی گاڑی سے اتر کر اندر

رستوران میں چلا گیا۔ بالائی منزل پر اس رستوران میں پیچھے  
سندھ کی طرف ایک کشادہ ٹیرس بھی بنی ہوئی تھی۔ وہاں بھی میزیں  
لگائی جاتی تھیں۔ لوگ چند قدم کے فاصلے پر بھاگ اڑاتے سندھ  
کے نظارے سے محظوظ ہوتے ہوئے کھانے پینے کے لیے وہاں بیٹھے  
تھے۔ چاندنی راتوں میں اس طرف روش بڑھ جاتا تھا۔ وہاں بیٹھے  
الوں میں نودان جوڑے زیادہ ہوتے تھے۔

میرا خیال تھا شاید وہ دونوں بھی وہیں جا بیٹھے ہوں لیکن وہ مجھے  
بچے ہال میں ہی نظر آ گئے۔ وہ سب سے آخر میں ایک کونے کی میز پر  
دو دو تھے۔ ہال میں وہ شیان مدھم تھیں اور میزوں پر شیشیں  
دش کر کے اچول کو مزید رویان پرور بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔  
تی بہ تھا کہ یہ شیشیں ہلکی تھیں۔ دراصل یہ موسم قبل کی سانس  
لے بیٹی تھیں تھے جن کا فصل شعلہ والا حصہ دھبہ کی کمی بیشی سے  
نہ اس طرح دکھائی دتا تھا جیسے شمع کی لوہو کے دوش پر لرز رہی

لڑکی کی بیٹھ میری طرف تھی اور اچھائی تھا۔ اب تک میں  
ما کی نظر سے بچا ہوا تھا۔ میں نے ایک ایسی میز منتخب کی جو ان  
دور نہیں تھی اور میں اپنی نشست سے شکلیوں سے ان کی تمام  
رات و سکناٹ کا جائزہ لے سکتا تھا اور اگر وہ سرگوشیوں میں بات  
کر رہے تو ان کی گفتگو بھی کان لگا کر سن سکتا تھا تاہم میں بظاہر ان  
طرف ذرا بھی توجہ دینے بغیر حتی الامکان بے نیازی سے بیٹھ گیا۔  
اور بھی کچھ ایسا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی صحیح طور پر میرا چہرہ  
نہ دیکھ سکتا تھا۔

ابھی میں صحیح طور پر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ دھڑ دھڑ سوار  
لیا۔ دش نہ ہونے کا بھی فائدہ یا نقصان تھا۔ دوسرا ویران کا  
ماروٹ کر کے لے جا بھی چکا تھا۔ مجھے گویا کوئی خاص جھوک  
نہ تھی لیکن میں نے سوچا شاید قناب طول کھینچ جائے اس لیے  
فائدہ لیا نہ ہی ہستہ تھا چنانچہ میں نے ذرا ہلکے ہلکے سے کھانے کا  
نور سے دیا اور دھڑن میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

دو دونوں چلیک مقامات پر..... خصوصاً کسی کھلی جگہ پر بات  
نا کرنے کے معاملے میں بہت محتاط معلوم ہوتے تھے۔ ابھی تک  
بہت خاموش ہی تھے۔ زیادہ حیرت مجھے لڑکی پر تھی جو لڑکی ہونے  
سباغ اور خاموش تھی۔ البتہ چند لمحوں بعد انہوں نے تقریباً سرگوشی  
سے انداز میں کچھ بات کی جو میں نہیں سن سکا۔ بظاہر میں ابھی  
تقریباً کچھ مطالعہ کے جا رہا تھا جسے وہ محض مینو نہیں کوئی دلچسپ  
قناب یا چٹ پٹا اخبار ہو لیکن درحقیقت میرے کان ان دونوں کی  
زبان سے ہوتے تھے۔ مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں  
حقیقت ان کے بارے میں کیا جانتا چاہتا تھا؟ سب سے پہلے تو  
میں ان کی حقیقت جانتا چاہتا تھا کہ وہ دونوں درحقیقت کون  
اور کون ہیں ان کا کیا رشتہ کیا تعلق تھا؟ اس کے بعد شاید کچھ

اور میں سمجھ ہی آ سکتا تھا۔

رستوران میں کھرتی ہوئی نہایت مدھم موسیقی کی لہروں کے  
درمیان اچانک لڑکی کی دھیمی سی توازی میری سماعت سے ٹکرائی۔  
وہ کہہ رہی تھی میں نے تو آپ کو بہت سی زیادہ زحمت دے  
ڈال دی۔ بہت خراب ہو گیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اور میرا سر مدھم دھیمی توازی میں ہلکا  
ہو گیا۔ "یہ جو کچھ بھی ہے اسے تم اپنا ہی سمجھو۔" اب وہ مطمئن اور  
پُر سکون معلوم ہوتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات یا لہجے سے  
اظہار کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ شاید شام کا اندھیرا گہرا ہونے  
اور اس کم روشنی کم روشنی والی جگہ پر بیٹھنے کے بعد وہ اپنے آپ کو  
مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ ان کے اس انداز گفتگو سے کم از کم ایک  
بات تو واضح ہو گئی تھی کہ وہ میاں پوری نہیں تھے۔

اس کے بعد کھانا آئے تک اور کھانا کھانے کے دوران میں  
انہوں نے یہ مشکل دو تین مرتبہ ایک دوسرے سے مختصر سی بات کی  
ہوئی جو میں نہیں سن سکا کیونکہ ان کی توازیں ایک بار پھر  
سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ شاید احتیاط پسندی غالب آچکی  
تھی۔ اس کے علاوہ شاید وہ ایک کم گو جوڑا ہونے کے سلسلے میں  
کوئی ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کھانا انہوں نے  
پُر کھٹک کھایا تھا۔ سویت ڈش اور چائے کافی وغیرہ کا بھی دور چلا۔  
میرے ایک سگار بھی سٹگایا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کا ریلیکس  
ہو کر کچھ دیر بیٹھنے کا موزع تھا مگر وہ تین کس لینے کے بعد اس نے  
میرے اندازے کے خلاف اچانک وینٹر کو اشارہ کر کے ریل طلب  
کر لیا۔

میں اس وقت اطمینان سے کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں  
نے وینٹر کو نہیں بلایا۔ میں نہیں چاہتا تھا اس شخص کو احساس ہو کہ  
میں اس کی تقلید کر رہا تھا۔ میں نے ان کے آٹھ جاگے اور رخصت  
ہو لینے کا اکتفا کر لیا۔ جب وہ دوواڑے کے قریب پہنچ چکے تب میں  
نے وینٹر کو طلب کیا اور جلدی سے ریل لانے کی ہدایت کی۔ ادائیگی  
وغیرہ کر کے میں تیزی سے دوواڑے پر آیا۔ اس وقت ان کی کار  
حرکت میں ابھی بھی اور رستوران کے قریب سے پورس ہو کر  
میں روڈ کی طرف گھوم چکی تھی۔

جلدی میں نے اسے جالیا اور ایک بار پھر قناب کا سلسلہ  
شروع ہو گیا۔ اس بار گاڑی ڈینس کے اس فیئر میں پہنچی جو ابھی  
پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا لیکن جس سڑک پر وہ گاڑی ایک عرصہ  
بیٹھے کے سامنے جا کر ٹکی اس پر دونوں طرف تو غور شدہ بنگلوں کی  
نظارہ موجود تھی۔ سڑک دو طرف تھی۔ پیچ میں پتلی کی گرین ہیلٹ بھی  
سوئوڈ تھی۔ وہ گاڑی بیٹھے کے گیٹ سے تقریباً جا لگی تھی اور وہ  
محض اڑن دے رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے سے مگڑنا چلا گیا۔ اسے  
یقیناً شبہ تک نہیں تھا کہ اس کا قناب ہو رہا ہوگا۔ وہاں روشنی بھی  
بہت کم تھی۔ اسٹریٹ لائٹس دشمن نہیں تھیں۔ صرف بنگلوں ہی

سے روشنی آ رہی تھی۔

میں کچھ ہی آگے جا کر گھوم کر دوسری طرف کی سڑک پر واپس آ گیا۔ رفتار میں نے بہت کم کی تھی۔ گرین پلٹ کے دوسری طرف سے درختوں کے درمیان سے میں نے دیکھا اس بچلے کا گیت گھل چکا تھا اور ایک سسلخ گاڑا اس شخص کو باقاعدہ سلیوٹ کرنے کے انداز میں سلام کر رہا تھا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔ میں دوسری طرف کے ایک بچلے کے سامنے گاڑی روک چکا تھا۔

میرے دیکھنے ہی دیکھتے اس بچلے نے گویا گاڑی کو ٹھک لیا تھا۔ گیت بند ہو گیا تھا اور ایک بار پھر سڑک پر سناٹا چھا گیا تھا۔ ایک جگہ بنگلوں کے سامنے دو عین گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں ذرا نیوٹیا کوئی اور بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے ان سے ذرا ہٹ کر گاڑی ریورس کر کے اس طرح ایک بچلے کے قریب کھڑی کر لی کہ گرین پلٹ کے درختوں کے درمیان سے میں دوسری طرف کے اس بچلے پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا اور اس طرف کے کسی شخص کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں سڑک کے دوسری طرف سے کسی بچلے کی نگرانی کر رہا تھا۔

کانی دیر تک میں گاڑی میں بیٹھ سڑکوں سے بیجا رہا۔ اس دوران میں کئی بنگلوں میں گاڑیاں آئیں۔ کئی بنگلوں سے گاڑیاں رخصت ہوئیں۔ سڑک پر سے بھی کئی گاڑیاں گزریں لیکن کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ پوش ملا توں میں ایک یہ بھی اچھی بات ہوئی ہے کہ کوئی خواہ مخواہ آپ کی ٹوہ میں نہیں لگا۔ ویسے بھی میری گاڑی کے پیٹھے رنگین تھے۔ شاید کسی کو صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا کہ صرف گاڑی ہی پارک بھی یا اس کے اندر بھی کوئی موجود تھا۔

جس بچلے کی میں نگرانی کر رہا تھا اس کے گیت کے دونوں ہلز پر دو خوب صورت گلوب تو روشن تھے لیکن اس پر نہ تو کوئی نیم پلٹ موجود تھی اور نہ ہی کوئی بیرونی ممبر وہج تھا تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کم از کم نمبر کا تو میں اندازہ کر ہی سکتا تھا کیونکہ اس کے دائرے میں بائیں دونوں بنگلوں پر نمبر موجود تھے۔

نمبر اور لوکیشن وغیرہ ذہن نشین کرنے کے بعد بھی میں گاڑی میں اسی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ دل ہلانے کے لیے میں نیپ بھی آن نہیں کر رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی گاڑی کی طرف توجہ ہو۔ اسی اثنا میں کچھ دور دروازے کا رزکے باز سے بچلے کا گیت گھلا اور بہت سے افراد باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ ایک دم اس پر سڑک کی سڑک کا سکوت گویا درہم برہم ہو گیا۔ فضا میں کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ غور سے دیکھنے پر میری نگاہیں کچھ لوگ اس گھر میں سامان آئے ہوئے تھے اور کچھ لوگ انہیں ہی آف کرنے نکلے تھے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں مرد اور نوجوان ہر طرح کی نمائندگی موجود تھی۔

کانی دیر تک طرح طرح کی توازنوں کا شور مچا رہا۔ آخر کار

دو قلوں نے عورتوں سے بغل گیر ہو کر ان کے رخسار پر ہاتھوں نے ایک دوسرے سے مصالحتے کئے، کچھ دوسے یاد دلانے، اپنے ہاں آنے کی دعوئیں دیں اور آخر کار کچھ لوگ دو گاڑیوں میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ باقی لوگ واپس اندر چلے گئے۔ ایک بار پھر چاندنی طرف وہی سکوت تھا اور اس سکوت میں گاڑی میں بند ہو کر بیٹھے بیٹھے میں نے خود کو بہت اعلیٰ درجے کا چند محسوس کیا۔ جس بچلے کی میں نگرانی کر رہا تھا وہ گھر سے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا پیش تر حصہ تاریک معلوم ہوتا تھا۔ گیت کے عقب میں سسلخ گاڑا کی نقل و حرکت کے بھی کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہ بھی محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اس اوچلے مرد اور خوب صورت نوجوان لڑکی کے اس بچلے سے برآمد ہونے کی فی الحال کوئی امید نہیں تھی۔ کم از کم رات بھر کے لیے ان کا قیام یہیں تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا ۳۳ فضل پارسا! اس صورت میں تم یہاں بیٹھے آؤں گی کی طرح اس بچلے کو گھورنے ہوئے کون سا حکیم کارنامہ انجام دے رہے ہو؟ وہ تو بالآخر اندر کی پریشانی بندہ میں بقول ساحر چند کہاں۔ بلکہ شاید بہت سی ٹھیکیاں نشانہ کی جن رہے ہوں گے اور تم یہاں بیٹھے سوکھ رہے ہو۔ کیا صبح تک اسی طرح یہیں بیٹھے رہو گے؟ یہن ممکن ہے وہ کل پورے دن بھی باہر نہ نکلیں۔ پھر کیا کرو گے؟

میرے اندر کا آوی اس کا کوئی نقلی بخش جواب نہ دے سکا البتہ اس نے اس بات پر میری ہاں میں ہاں ضرور ملائی کہ جو کچھ میں وہاں بیٹھا کر رہا تھا وہ کچھ ایسا عقل مندانہ کام نہیں تھا۔ میں نے اس کے بعد اس بچلے میں کودنے کے بارے میں بھی سوچا۔ اپنے تمام تر معجزانہ طے کے باوجود مجھے اکثر وہ پیشتر اس قسم کے کام کرنے کی ضرورت پیش آتی ہی رہتی تھی اور یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتے تھے بلکہ اس قسم کی سرگرمیاں تو بجا بجا کر میرے معمولات میں شامل تھیں۔

بچلے میں ایک سی سسلخ گاڑا دکھائی دیا تھا۔ اس قسم کے ایک تودہ گاڑا کا تو ہونا نہ تو میری نظر میں تقریباً برابری ہوتا تھا۔ بچلے میں ان دونوں کے سوا مجھے کسی کی رہائش کے آثار بھی دکھائی نہیں دے تھے۔ کسی کتے کی بھی جھلک نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی بھونکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ گتا بھی موجود ہوتا تب بھی مجھے بچلے کے خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ حضرت انسان کے سامنے کتا بچہ بچہ ہے۔ مگر یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میں نے فی الحال بچلے میں کھینے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ چلہ بازی کی ضرورت نہیں تھی مجھے کون سا کوئی ایمر جنسی درپیش تھی؟ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس شخص اور اس بچلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آئندہ قدم اٹھانے میں آسانی ہو۔ معلومات اس بچلے کے اندر رکھنے بغیر بھی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ میں اپنے وسائل استعمال کر سکتا تھا۔



لے کر کہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں گاڑی سے کھنک کی دھڑکی  
لے اُترتا تھا جو میں نے آج شام خریدی تھی۔ ذرا تاج کی گاڑی پر  
نظر پڑے ہی وہ مجھے یاد آگئی تھی۔ اس وقت وہ میرے ہاتھ میں  
تھی۔

میں نے جلدی سے وہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔  
میں تمہارے لیے خند لایا تھا۔

اس نے ایک نعر کھنک کی طرف دیکھا لیکن اسے قہقہے کے  
بجائے مجھے گھورتے ہوئے بولی "کیا اچھا طریقہ ہے خند دینے  
کا۔۔۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے سڑک سے چڑھا کر کسی  
کھینچ کر گارتے ہوئے انسان کہہ دے "یہ لوسہ یہ میری طرف سے  
تمہارے لیے خند ہے۔" اس طرح دیے جاتے ہیں خند؟

"پھر کس طرح دیے جاتے ہیں خند؟" میں نے پرسی  
پوچھا۔ مجھے اس طرح کے کاموں کا تجربہ نہیں ہے۔ کیا اسے دونوں  
ہاتھوں پر رکھ کر اور ایک گھٹنا زمین پر رکھ کر تمہارے خدمت میں  
پیش کروں؟

"اگر خند دینے کا طریقہ نہیں تھا تو کم از کم اس کی گنت بیٹنگ  
ہی کرالاج۔ ذرا دو چار بیٹنگ کے لیے تجسّی ہی رہتا کہ نہ ہائے  
اندہ کیا ہو۔" وہ ذرا نرم پڑتے ہوئے بولی۔

"میں تو میرے سیدھا سا چارو دانت وار ہونے کا ثبوت ہے کہ  
جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ بغیر کسی لیپا پوٹی کے سامنے رکھ دیتا  
ہوں۔ میرے جذبات بھی بغیر بیٹنگ کے ہیں اور میرا خند بھی۔"  
میں نے فوراً کہا "اس کے علاوہ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مجھے  
واقعی ایمر جنسی پیش آگئی تھی۔" تجسّی تو میں اس کی بیٹنگ تک کے  
لیے نہیں رک سک۔

"کیا ایمر جنسی کو گھر تک چھوڑنے چلے گئے تھے؟" اس نے  
نہایت ملانعت سے پوچھا۔

"چلتی ہی تھی۔" آخر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا  
"اس معاملے کا تعلق ایک لڑکی سے ضرور تھا لیکن بات وہ نہیں  
ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"دیکھا؟" میرا اندازہ بر حال ٹھیک تھا؟ "وہ میری بات  
کانٹے ہوئے فاحشہ لہجے میں بولی "بات چاہے کچھ بھی ہو مسئلہ  
بر حال لڑکی کا تھا۔۔۔ اور بات کا کیا ہے۔۔۔ بات تو تم کچھ بھی بنا  
سکتے ہو۔"

"اس لڑکی کے ساتھ ایک ادھیر عمر آری بھی تھا جو اس کا بچا  
یا لچا دھیو ہرگز نہیں تھا۔" میں نے گویا غصہ ضبط کرتے ہوئے  
کہا۔

"اسی لیے تو جس میں اپنا زیادہ اس کوپ نظر آیا ہو گا۔ تم نے  
سوچا ہو گا کہ ادھیر عمر تو کسی کو تو میں آسانی سے ایک طرف ہٹا کر اس  
کے مقام پر گاڑ دو جاؤں گا۔" اب ذرا تاج اپنی شرر مسکراہٹ کو  
تاج میں رکھنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ مسکراہٹ اس کے ہاتھوں

فرار رہے تھے کہ وہ ابھی ابھی ہمارے گھر آئے تھے۔ سلیمانی ٹوپی  
پہن کر آئے ہوں جس میں فکر کیسے آسکتے تھے۔ جس سے تو معلوم ہی  
ہے وہ کیسی بالکل شخصیت ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بس یہی پوچھنا تھا۔ اچھا  
خدا حافظ۔"

اس نے فون بند کر کے کہا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا  
اور بولی "میں اس وقت گھر سے ہی آ رہی ہوں اور میرے ننگے کے  
بعد بھی تم وہاں پہنچے ہو۔ اور اس کے بعد طوفانی رفتار سے گاڑی  
چلائے ہوئے میرے پیچھے پیچھے یہاں آؤں پہنچتے تب بھی تصدیق  
ہو جاتی لیکن انہوں نے کہ جھوٹ کے پاس ڈالنے نہیں ہوتے۔"

"دوسرا اصل بات یہ ہے۔۔۔" میں نے سر کھاتے ہوئے  
کہا "اور یہ بالکل سنی صدیقی بات ہے کہ میں نکلا تو تمہارے گھر  
جانے کے ارادے سے ہی تھا لیکن راستے میں ایک ایمر جنسی پیش  
آگئی۔۔۔"

"میرا خیال ہے جس میں یوں نہیں کہنا چاہیے کہ ایمر جنسی پیش  
آگئی۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایمر جنسی نظر آگئی۔ تم ایمر جنسی  
کے پیچھے چل دیے ہو گے اور میرے گھر جانا تجسّی یاد ہی نہیں رہا  
ہو گا "ایمر جنسی" حقیقتہً کالی خوب صورت ہوگی اور اس کا نام ٹیلم  
ناتک، کئی ٹوڑی یا کچھ اور ہو گا۔۔۔؟"

"بہت خوب!" میں نے تجسّی آئینہ انداز میں سر ہلایا "تم تو  
جلی کئی باتیں کرنے میں مکمل طور پر خود کفیل ہو گئی ہو۔ اتنے عرصے  
بعد ملاقات ہو تو انسان کو کم از کم ایک آدھ بات تو خوش گوار کر لینی  
چاہیے۔ ویسے بھی کسی خوب صورت لڑکی کے منہ سے تنگاک کے  
شعاع برآمد۔۔۔ ہوتے آتے نہیں گھٹتے۔"

"جب ملاقات کا آغاز ہی جھوٹ سے ہو گا تو تنگاک کے شعاع تو  
برآمد ہوں گے۔۔۔ بلکہ میں ممکن ہے جاپان کا زلزلہ بھی آئے۔"  
وہ فون اپنے شلڈر بیگ میں ڈال کر دونوں ہاتھ بظلم میں دے کر  
گاڑی سے نیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔۔۔ مذاق کر رہا تھا تم سے۔۔۔  
گتا ہے اب تو تم نے جھوٹ اور مذاق میں امتیاز کرنا بھی چھوڑ دیا  
ہے۔ آئندہ میں مذاق کرتے وقت ہاتھ کھڑا کر لیا کروں گا اور خبردار  
کرنے کے لیے کچھ۔۔۔ اس قسم کا تمہیدی جملہ بھی بول دیا کروں  
گا۔" واضح رہے کہ فوری اس وقت مذاق کرنے جا رہا ہے۔۔۔  
جس میں معلوم ہوتا چاہیے میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ تم ہی بتاؤ  
اس سے پہلے میں نے تم سے کب جھوٹ بولا ہے؟

"تمہارے جھوٹ نوٹ کرنے کے لیے اب میں ایک رجسٹر  
رکھوں گی۔۔۔ بلکہ اس مقصد کے لیے رجسٹر سے بھی کہاں کام چلے  
گا۔ مجھے بہت بڑی میموری والا کوئی کہیہ ضرور کھانا پڑے گا۔" تجسّی بتا  
سکوں گی۔ مجھ غریب کی یادداشت بھلا اتنے بڑے کام کے سلسلے میں  
کہاں ساتھ دے سکتی ہے۔"

"مبالغہ کرنا کوئی تم لڑکیوں سے نہ کہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس



حکومتوں سے پہلی بڑی تھی۔  
 "یہ ایک بہت عجیب اور گہرے معاملہ تھا۔" میں نے ایک نکل اس کی طرف دیکھتے ہوئے کمری سنجیدی سے کہا "میں آج کل ایک ایسے کس پر کام کر رہا ہوں جو پچھلے ہی چلا جا رہا ہے۔ شاخ میں سے شاخ نکلتی چلی آ رہی ہے۔"  
 "اور اسی حساب سے جوت درجوں لوگیاں سامنے آتی جا رہی ہیں۔" زرتاج نے قلم دیا۔  
 "تمہارے منہ میں کچھ شے... لیکن فی الحال ایسا نہیں ہو رہا ہے۔" پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "کم از کم اندر تو چلو تاکہ شرفا کی طرح بیٹھ کر بات کر سکیں۔۔۔۔۔ اور یہ عقد تمہیں لینا ہے یا نہیں لینا ہے؟" میں نے ایک بار پھر کون کی شیشی اس کی طرف بڑھائی جو خوب صورت ڈبے میں بند تھی۔  
 "خدا کی پناہ! عقد بھی گویا مار پیٹ کر دیا جا رہا ہے۔"  
 زرتاج بڑبڑاتی اور شیشی میرے ہاتھ سے ایک جھٹکے سے لے کر اس نے بے پروائی سے اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ پر تقریباً پھینک دی۔  
 "اور یہ عقد لینے کا طریقہ تو گویا بہت اچھا ہے۔" میں نے جمل کر کہا۔  
 "بھئی جیسا عقد دینے والا ہے اور جیسے اس کے طور طریقے ہیں ویسا ہی عقد لینے والا ہے اور ویسے ہی اس کے طور طریقے ہیں۔" وہ اطمینان سے بولی اور گاڑی لاک کر کے میرے ساتھ چل دی۔  
 ہم آئس میں پہنچ کر بیٹھ چکے تو وہ انگلیوں سے میرے کھٹکتے ہوئے بولی "آج کل کس لڑکی پر۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کس کیس پر کام کر رہے ہو؟"  
 "زرتاج۔۔۔۔۔ زرتاج۔۔۔۔۔! خدا کے لیے کچھ شرم کرو۔ یہ آج جس کیس کیا ہو گیا ہے؟" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "تم کیوں پہلے اپنی نظریں اور پھر دوسروں کی نظریں میری ریپوزیشن کا بڑا فرق کرنے پر مبنی ہوئی ہو؟ تم تو اس طرح بات کر رہی ہو جیسے میں ہر وقت لڑکیوں کے بکس میں رہتا ہوں۔۔۔۔۔"  
 "ملا لاک۔ تم تو لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔" اس نے طنز پر انداز میں قلم دیا۔  
 "تقریباً یہی بات ہے۔ اس میں جھوٹ کیا ہے۔" میں نے فوراً کہا "لوگوں کے معاملے میں مجھ جیسا شریف اور مہربان منہ رکھنے والا آدمی تمہیں مشکل سے ہی کیس لے گا۔"  
 "میں کیا ڈھونڈنے جا رہی ہوں جو مجھے بتا رہے ہو؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔  
 "نہیں۔۔۔۔۔ ویسے ہی مطلع کر رہا ہوں۔" میں نے سہم کر کہا "تم خواہ مخواہ میری شہرت ایک پلے پوائے کی سی بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ میرا ہانا ایک فلسفہ

حیات ہے جس پر میں سختی سے کاربند چلا آ رہا ہوں۔ تم نے کبھی مجھے لوگوں کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے؟"  
 "نہیں۔" اس نے زور شور سے نفی میں سر ہلایا "تم تو سر جھکائے ناؤ دلوں والا پشہ لگائے اپنے راستے پر چلے جا رہے ہوتے ہو۔ لوگیاں خودی لڑھک لڑھک کر تمہارے راستے میں آ جاتی ہیں۔" پھر وہ خیرباد کہنے کے سے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے بولی "میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ جلد ہی تمہاری شہرت ایک پلے پوائے سے بھی زیادہ خراب ہو جائے گی۔"  
 "یہ تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ لوگ تمہیں گے تو کیا کیس لگے۔" میں نے خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔  
 "حسن کر کچھ کہنے کی بات تو چھوڑو۔ یہ سچ کہ لوگ اپنی آنکھوں سے تمہاری حرکتیں دیکھیں گے تو کیا کیس لگے۔" وہ بولے گئے۔۔۔۔۔ سے انداز میں بولی "لوگ جب یہ دیکھیں گے کہ ایک اتنا بڑا بزنس من۔۔۔۔۔ گروپ آف کمپنیز اور فائبر اشار ہوٹل کا مالک بڑے حالوں۔۔۔۔۔ شہر میں نظر آئے۔۔۔۔۔ گندہ کن آلود سونپنے۔۔۔۔۔ بال بکھرائے۔۔۔۔۔ لکھ پالوں میں کچھ ننگے وغیرہ بھی چھائے اور کچھ اسی سے ملنے جلتے ملنے کی لڑکی کے ساتھ ایک کھانا رے رکشے میں بیٹھا تھا تو جا رہا ہے تب وہ کیا سوچیں گے؟ تم نے کبھی اس پبلو پر غور کیا؟"  
 "اور۔۔۔۔۔ ائی گاڈ!" میں نے لعنتی سانس لے کر ریلوے کے پتھر کے پتھ سے ٹک لگا لیا "اب میں سمجھا۔ یہ پتھر کے تیر اس سطلے میں برائے جا رہے ہیں۔! شاید ایسے ہی مواقع کے لیے شاعر نے کہا ہے "جن پر عجب قادی گدے ہو اپنے گدے۔"  
 "تجھے ہوا اپنے گدے۔" وہ صبح کے بغیر نہ رہ سکا۔  
 "مجھے معلوم ہے۔ اتنی اردو مجھے بھی آتی ہے۔ میں نے تو یونہی ذرا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے تبدیلی کی ہے۔ معلوم نہیں کیوں تجھے کے ساتھ گدے کا استعمال زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔"  
 "یہ وہ والا کتبہ نہیں ہے جس پر سر رکھ کے سویا جاتا ہے۔ یہ وہ کتبہ ہے جس کے معنی انحصار کرنا ہوتا ہے۔"  
 "یہ بھی مجھے معلوم ہے۔۔۔۔۔ بلکہ مجھے کیا چرخی جماعت کے بچے کو بھی معلوم ہے۔"  
 "جو چرخی جماعت کے بچے کو معلوم ہے اس پر مجھے حیرت نہیں ہے۔۔۔۔۔ لیکن جس میں معلوم ہے اس پر مجھے ضرور حیرت ہے۔ کیا تم چرخی جماعت تک اسکول گئے ہو؟" اس نے نہایت مصوہیت سے سوال کیا تھا۔  
 "نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اسکول کسے کہتے ہیں۔" میں نے بھی اسی مصوہیت سے جواب دیا۔  
 "مجھے تو پہلے ہی شب تھا۔" وہ اطمینان سے بولی "جس تو تم مصرعوں کو بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے استعمال کرتے ہو۔ شاید یہ بھی تمہارے نزدیک گاجر مولیٰ کی طرح ہیں۔"

”مضمریات میں الجھتا اور دوسرے کو بھی الجھا دیتا تم لڑکیوں پر فتح ہے۔ بات لڑکیوں سے ہی شروع ہوئی تھی اور لسانیات پر جا چکی۔“ میں نے لٹری سانس لے کر کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے چند روز پہلے اس وقت مجھے دیکھ لیا تھا جب میں منیہ کے ساتھ ایک عجیب مصیبت بھگتے کے بعد رجیم گل کی طرف جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا ”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ اس وقت میں نے یہ مصرع بڑھا کیوں تھا؟“

”چلو یہ بھی بتا دو۔“ وہ ہنسی پر غمزدگی نکالتے ہوئے بولی۔

”تمہیں شرم دلانے کے لیے۔“ میں نے کہا ”تم نے اگر مجھے اتنے بڑے حال میں ایک لڑکی کے ساتھ کھرا رکھنے میں تمہانے کی طرف جاتے دیکھ ہی لیا تھا تو بھانے اس کے کہ تم اپنی گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آئیں، مجھ سے پوچھتیں کہ آخر ہم پر کیا چٹاڑی ہے، میرے ساتھ تمہانے چلتیں۔۔۔ انا طنزوں کے تیروں سے قلیجا چھلکی کرنے آئی ہو اور وہ ابھی اتنے دنوں بعد۔ چلو اگر اس وقت تمہیں راستے میں روکتے اور ہمارا حال پوچھتے ہوئے شرم آ رہی تھی تو اتنے دنوں میں کبھی تو پوچھ سکتی تھیں۔ سامنے آکر پوچھنے کی توفیق نہیں تھی تو دنوں پر ہی پوچھ لیتیں۔ کم از کم یہی بتا کر لیتیں کہ

تمہارے اس نکھار قسم کے عاشق تمہانے دارنے ہمیں اٹھا کر حوالات میں تو نہیں ڈال دیا۔“

”اس بے چارے کی کیا مجال جو تمہیں حوالات میں ڈالے۔“ وہ لٹری سانس لے کر بولی ”مجھے ہر حال تمہیں اس حال میں تمہانے کی طرف مڑتے دیکھ کر کوئی خاص تشویش نہیں ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا تم نے کسی نئے بیڑے میں ٹانگے۔ بلکہ دونوں ٹانگیں اڑا رکھی ہوں گی۔ جس قسم کے کام تم کرتے پھرتے ہو ان میں انسان کے ساتھ ایسی اونچ نیچ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ اس سے زیادہ بڑی بھی ہو سکتی ہے۔“

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی ”دیے میں نے بعد میں رجیم گل کو فون کر کے معلوم کر لیا تھا کہ

”اور اس نے تمہیں بتا دیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جس حد تک اسے معلوم تھا اس حد تک تو بتا ہی دیا۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”خدا کی پناہ۔۔۔!“ میں نے اپنے لیے میں دنیا جان کا آٹ سوئے کی کوشش کی ”رجیم گل جیسے آفسر تو اس گلے کو بالکل ہی

انکا، اقبال، سونا گھاٹ، کاپیجاری، غلام روحیں، امبرنیل، درخشاں، خبیث کے بعد انوار صدیقی کا ایک اور پراسرار ناول

## برہمچاری

نیکی اور بدی کا خوفناک تصادم  
خوبصورت سرورق، دیدہ زیب کتابت و طباعت  
قیمت = -/ 150 روپے

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

کر بیٹھ جائیں گے جو کسی راز کو راز بھی نہیں رکھ سکتے۔ اپنے  
فائدے کی رپورٹ افسروں کو بعد میں دیتے ہیں دوستوں کو پہلے دے  
دیتے ہیں۔

”اس میں راز کی کون سی بات تھی؟ ان کے انکشاف سے  
تو نہ سا آسمان ٹوٹا پڑا تھا؟ ان میں سے اکثر انہیں تو اخباروں میں  
سنی جاتی ہیں۔“ ذرا مت بھانک کر بولی ”اور تم ہر وقت بے چارے رحیم  
کو کڑوا بھلا مت کہتے ہا کر۔ اس جیسے گنتی کے چند افسروں کی  
ساتھ سے تو یہ ٹھکے اب تک چل رہا ہے ورنہ یہ تو بہت پہلے کا بیٹھ گیا  
ہوتا۔“

”دو۔۔۔!“ میں نے اب گویا ایک نئے زاویہ نظر سے  
برآج کی طرف دیکھا۔ ”گنا ہے اب اس بے ہودہ آدمی کے لیے  
نہارے دل میں محبت کے۔۔۔ جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔“

”جو اس صحت کو۔۔۔ یہ محبت کے تئیں“ احترام کے جذبات  
پر۔ ایک فرض شناس آفیسر کے طور پر ہر حال میں اس کی عزت  
رکھتی ہوں۔ اس جیسے افسروں کی تعداد اب آٹے میں نمک کے  
برابر ہو گئی ہے۔ وہ وعدے میں پھر جیسا کسی لیکن کردار میں بہت بڑا  
ہے جو کچھ کرنے کے مواقع اسے میسر آتے ہیں جو کچھ ترغیبات  
اسے دی جاتی ہیں انہیں قبول کرنے سے باز رہنے کے لیے بڑا  
دھم اور بڑا مضبوط کردار چاہیے جو آج کل بڑے بڑے واقعوں  
کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ بے چارہ مثالی کردار کے اس  
ظہر پر داد و تحسین پانے کے بجائے با اثر لوگوں کی دھمکیاں  
نہا ہے۔ مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے بعض ماتحتوں کی  
انجمنہ کی کو بھی برواشت کرتا ہے۔“

”مگر وہ تمہاری یہ تقریر دل پر زبر سن لیتا تو خوشی سے ترپ کر  
جی جان دے دیتا۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”خوشی سے ترپ کر جان دیتا۔! اوصاف کیا تعداد خیالی  
ہے!“ اس نے سر ہلایا۔

”میں شادی مرگ والی کیفیت کی بات کر رہا تھا۔“ میں نے گویا  
کی نہایت کم علم اور کوڑھ معزز انسان کو سمجھانے کی کوشش کی  
”انٹرویو تو اس بے چارے کی قسمت میں نہیں ہے لیکن مرگ کا  
انکار ہو سکتا تھا۔“

”کیا محسوس باغی قوم سے مت نکالو۔ انسان کی شکل  
نہی نہ ہو تو بات تو ابھی کرتی چاہیے۔“ وہ نکلی آہستہ انداز  
نہا لی۔

”دیکھا!“ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا اس کہنے کے لیے  
نہارے دل میں جو دہریاں بہت بڑھ چکی ہیں۔ کوئی اس کے لیے  
نکال دیکھ بات کہتے تو تم سے بدداشت نہیں ہوتی۔“ میں نے سر  
ہلایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ تم نے بے چارے کو اپنے چہرے پر ہاتھ بھیرا  
اور اس شکل کو تم خراب کر دی ہو؟ تمہاری فکر تو مزدور نہیں  
کرتی ہے؟ چشمے کی ضرورت تو نہیں پڑتی ہے؟ تمہاری اطلاع کے

لیے عرض ہے کہ میں کسی پاکستانی قلم سازوں کی آفر نہ ٹھکرا چکا ہوں  
جو مجھے بیرونی دنیا چاہتے تھے۔ اگر آج ہالی ووڈ چلا جائے تو وہاں بھی  
ہاتھوں ہاتھ لیا جاوے گا۔“

”۔۔۔ خیر! ہالی ووڈ میں تو تمہارا ہاتھوں ہاتھ لیا جانا سمجھ میں  
آتا ہے کیونکہ وہاں کارٹون فلمیں بھی بنی جاتی ہیں لیکن پاکستانی قلم  
سازوں نے کیا سوچ کر بات کی تھی؟ کہیں وہ گازیٹ تو نہیں تھے؟“  
اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”میں نے صرف اسے گھورتے پر انکشاف کیا تب وہ تھیں انداز  
میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”اچھا۔۔۔ میں سمجھ گئی۔۔۔ سلطان راسی  
صاحب کا اشتغال ہو چکا ہے۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ میک آپ  
دنیو کے سارے تمہاری شکل و صورت کو کافی بہتر بنا کر ان کا غلط  
کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ان کی یہ کوشش ناکام رہتی۔ اچھا  
ہوا تم نے انکار کر دیا۔“

”میں اسے گھورتا رہا۔ وہ معصوم سی شکل بٹائے بیٹھی رہی۔ چند  
لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا ”اب تو تمہاری زبان کی  
کارکردگی بھی کافی بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ راکٹ کی رفتار سے چلنے لگی  
ہے۔“

”میں اس کی آپ دھوا اور تمہارے ساتھ لشت در لشت  
کے اثرات ہیں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”لیکن ان دونوں چیزوں نے تمہیں سنجیدگی اور بروہاری سے  
بات کرنا بالکل بھلا دیا ہے؟“

”میں تو سنجیدگی اور بروہاری سے ہی بات کرنے کے ارادے  
سے آئی تھی لیکن معلوم نہیں دن کا وہ کون سا خوش نصیب لمحہ ہوا  
ہے جب تم سنجیدہ ہوتے ہو۔“ وہ کندھے اٹکا کر بولی۔

”میں تو اس وقت بھی پوری طرح سنجیدہ ہوں۔“ میں نے  
واقعی سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا۔۔۔“ اس نے آنکھیں پھیلانے ہوئے بے چینی سے  
میری طرف دیکھا ”اگر سنجیدگی میں تم اتنی بکرا س کرتے ہو تو غیر  
سنجیدگی میں کتنی کرتے ہو گے؟“

”کیا تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا؟“ میں نے مسکراتے  
ہوئے پوچھا۔

”ارے ہاں۔۔۔ میں تو بار بار محنت چکی ہوں لیکن انسان اپنے  
صدقات اکثر جلدی بھول جاتا ہے۔“ خیر۔۔۔ اس نے سر کو خفیف  
ساجھکا دیا ”اب اگر تمہیں سنجیدگی کا دعویٰ ہے تو پھر کم از کم یہ تو  
بتا دو کہ آج کل تم کتنی پیکروں میں ہو؟ کس کس پر کام کر رہے ہو؟  
کیا پرنس میرا کے قتل کی تحقیق پولیس کے بجائے تم کر رہے  
ہو؟“

”خیر۔۔۔ ایسی بھی بات نہیں ہے کہ میں پولیس کا دیو سراپے  
ڈنٹے لے لوں۔ آخر یہ اتنا بڑا ٹھکے کن لے کر کاری خرقہ پہن رہا  
ہے۔ میری تو بس یونہی راہ چلنے کسی معاملے میں ڈمک پھنس جاتی



ضرورت بھی پڑ جائے۔

”ہدی تو خیر حمیس کوئی کمی نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ ہر وقت تمہاری مدد کو کمر بستہ رہتے ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ جب بھی مدد کے لیے پکارو گے، علامہ اقبالؒ کی تعلیم کا وہی شعر مدد دے گا۔ آج اس کی جو بچپن میں ان کی کتاب میں پڑھا کرتے تھے۔ حاضر ہوں مدد کو جان دو دل سے۔۔۔ پھر اہل اگرچہ۔۔۔ میں ذرا لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بار تمہاری خدمات کس نے حاصل کر رکھی ہیں؟“

”کسی نے بھی نہیں۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ یہ تو معاملے کی نوعیت پر منحصر ہے کہ اس میں دلچسپی لی جائے یا نہیں؟ معاملے کو دیکھتے ہوئے میں خود بھی اپنی خدمات حاصل کر چکا ہوں۔“

”ہاں بھئی۔۔۔ تم مرضی کے مالک ہو۔“ وہ لٹھڑی سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھتے ہوئے بولی ”لیکن کیا یہ اتنا نازک معاملہ ہے کہ فی الحال اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاسکتا؟“

”نہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ اتنا نازک کون سا معاملہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں حمیس بھی نہ بتایا جاسکے۔ اگر تمہارے پاس بات کہنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ہے تو پھر یہ موضوع چھیڑ بیٹھتے ہیں۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ اتنی دیر بکواس کی ہے، دل کی بھڑاس نکال لی ہے، اب سنجیدگی سے ایک دوسرے کا حال احوال اور خیر دعائیت پوچھیں گے۔ کئی دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ تمہارا بھی تو کچھ پتا چلنا چاہیے۔۔۔ آخر تم اتنے دنوں کیا کرتے رہے ہو۔“

”یہ باتیں بھی ہوں گی۔ میں آج خام اوقات نکال کر آئی ہوں لیکن پہلے تم مجھے اپنی پراسرار مصروفیات کے بارے میں بتائی دو۔ میں سخت الجھن اور الجھن میں ہوں۔ اور اپنی رام کمانی شوقا کرنے سے پہلے اچھی سی کانی کا بھی آؤڑوے دو۔ وہ بے کار اور لٹھڑی غار قسم کی کانی نہیں ہونی چاہیے جو تمہارے ہاں گاؤں کو پلائی جاتی ہے۔ خود شیفت کو فون کر کے کہو کہ بت اچھی دلائی۔ اچھل قسم کی گرام کانی بھجواؤ گے۔ اسے خوراک کرنا کہ اگر کانی بکواس ہوئی تو آپ اس کے سر پر بھی اٹا جاسکتا ہے۔“

”شاید اسی حد تک کے پیش نظر وہ بیمار نما سفید ٹوپی پہنے رہتا ہے۔“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا پھر اتنے کام پر کچن میں

ہے۔ میں ذرا کچھ اور ڈاؤن سے اس معاملے کا جائزہ لے رہا ہوں۔ پولیس اپنا کام کرتی رہے گی۔ پولیس کو تو شاید اندازہ ہی نہ ہو سکے کہ اس معاملے کی کتنی شاخص نکلتی چلی آ رہی ہیں۔ معاملہ صرف پرنس میرا کے قتل کا نہیں ہے۔ یہ قتل تو مجھے اور کچھ دوسرے اداہوں کے لوگوں کو بہت سے معاملات کی طرف صرف متوجہ کرانے کا سبب بنا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کمانی کی نہ سے کیا کمانی نکلتی ہے۔“

”بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔“ اس نے بے آواز تالی بہائی ”تم تو مت ہی ہزار۔۔۔ یا پھر شاید ’جاسوسانہ‘ ٹھنگو کرنے لگے ہو۔ اچھے بھلے دیکھی ڈیوڈ سیون معلوم ہونے لگے ہو۔ معلوم نہیں مستقبل کے بارے میں تمہارے عزائم کیا ہیں۔“

”جس کی خرابی ہے تم جیسے لوگوں میں۔۔۔“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کرسی کے کپڑے سے نیک نکاتے ہوئے کہا ”جب میں سنجیدہ ہوتا ہوں تب بھی تم جیسے لوگ سنجیدہ نہیں ہوتے البتہ میری غیر سنجیدگی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تم جیسے لوگوں کی نظر میں بے چارے دیکھی ٹینٹ کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ وہ ان کا مذاق ہی ڈھونڈتے رہتے ہیں اور باہر والوں کی قرضی بے سروا اور حد سے زیادہ اونچی قسم کی کپڑوں پر بھی سروسٹے رہتے ہیں۔ اسی لیے تو میں کو شش کرتا ہوں کہ کسی کو اپنی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔“

”اھ۔۔۔ تم تو برا مان مجھے۔“ وہ چپکارنے کے سے انداز میں بولی ”در اصل میں تو سنجیدہ ہونے کی پوری پوری کوشش کر رہی ہوں لیکن بعض شکلیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ چیخڑ چماڑ کرنے کو مٹی چاہتا ہے۔ انسان بار بار سنجیدگی کی پٹری سے اتر جاتا ہے۔“

میں نے ترم اور تاسف آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا ”جب تم اپنی ذہنیوں پر نہیں تو کبھی اچھی۔۔۔ سیدھی جی۔۔۔ سوہ اور ڈینٹ قسم کی لڑکی ہوا کرتی تھیں۔ فلک بگ رہتے تھے تمہیں کیا سے کیا بناؤ۔۔۔ افسوس صد افسوس۔“

”میں نے کہا کہ یہ یہاں کی آپ ہو اور تمہارے ساتھ فٹسٹ ودر خاصات کے اثرات ہیں لیکن حمیس زیادہ تم زندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اندر سے میں اب بھی دیکھی اچھی۔ سیدھی جی۔ سوہ اور ڈینٹ وغیرہ وغیرہ ہوں۔ دیکھی ٹینٹ کی بھی میں بہت بڑی قدر داں ہوں۔ حمیس تو معلوم ہونا چاہیے، میں تو خود مدد کی گھبراہٹوں تک دیکھی ہوں اور دیکھی ہی رہوں گی خواہ مارے طوڑ طریقے بظاہر کتنے ہی دلائی ہو جائیں۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی ”لیکن وہ بات پھرچ میں ہی نہ جاتی ہے کہ آخر تم کس چکر میں ہو؟ کیا کرتے پھر رہے ہو؟“

”بتا دوں گا۔۔۔ سب بتا دوں گا۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔“ میں نے بے ہوائی سے کہا ”میں ممکن ہے اس خطے میں تمہاری مدد کی

جب امیر کام کا بر بجا۔ میں نے رہبر راٹھایا۔ دوسری طرف امیر قحی "مارے۔۔۔ تم ابھی تک بیٹھی ہو!" میں نے گہری دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"جی سر۔۔۔ اور تخراب میں جانا چاہ رہی تھی اس لیے بادل ناخواستہ اور مجبوراً آپ کی گفتگو میں قتل سوری ہوں۔" وہ معذرت خواہانہ لمبے میں بولی "آپ کی ٹیلی فونی بیانات کی نرے میں ایک اہم پیغام رکھا ہوا ہے۔ آپ نے دودیکھ لیا؟"

"نہیں بھئی۔۔۔ میں نے باہر سے آنے کے بعد ابھی تک کسی دفتری چیز کو کھاتھ نہیں لگایا۔" میں نے دیانت داری سے جواب دیا۔ "مجھے یہی اندیشہ تھا سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اور اسی لیے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کی توجہ اسی طرف دلاؤں لیکن میں آپ کی گفتگو میں قتل بھی نہیں ہوا جانتی تھی۔"

"بھئی کبھی تو قہم بہت ہی باکلف اور بہت ہی مؤذہب قسم کی سیکرٹری بن جاتی ہو امیر!" میں نے حیرت سے کہا "میں ابھی ایسے راز و نیاز نہیں ہو رہے تھے۔ تم کسی بھی وقت کوئی اہم تو کیا غیر اہم بات بھی کر سکتی تھیں۔"

"جی۔۔۔ میں سمجھتی رہی سر! بہر حال پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں یہاں اپنی خوشی سے بھٹی رہی ہوں اور اس دوران میں بور نہیں ہوتی ہوں۔" آفس کے کونے میں جو چھوٹا سا لی دی لگا ہوا ہے اس پر دلچسپ پروگرام دیکھتی رہی ہوں۔ "وہ خوش گزار مجھے میں بولی "بہر حال آپ اب وہ پیغام ضرور دیکھ لیں۔ مجھے وہ کچھ اہم معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے بیانات کی نرے میں سے چھپی ہوئی وہ سلب نکال۔ اس کے نیچے تین اور سلب بھی موجود تھیں۔ ان سب پر ایک ہی شخص کا نام درج تھا اور دیگر اندراجات سے پتا چلتا تھا کہ اس شخص نے مختلف اوقات میں چار مرتبہ فون کیا تھا۔ وہ کسی بہت اہم موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے فون نمبر چھوٹے تھے اور درخواست کی تھی کہ میں جاؤ تو اس سے گھر پہ بھی رابطہ کر سکتا ہوں۔ اس کا نام بھیل احمد تھا اور وہ ایڈوکیٹ تھا۔

وہ کوئی غیر معروف شخصیت نہیں تھی۔ بہت بڑا وکیل تھا۔ کسی زمانے میں سیاست میں بھی سرگرم رہا تھا اور ایک توہ مرتبہ کچھ عرصے کے لیے ایک بہت بڑے حکومتی منصب تک بھی پہنچ گیا تھا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ سیاست سے کنارہ کش ہو گیا تھا حالانکہ سیاست سے شاذ و نادر ہی کسی کو کنارہ کش ہوتے دیکھا جاتا تھا اس کا تو وہی معاملہ تھا کہ۔۔۔ بھئی نہیں ہے نہ سے یہ کافر گئی ہوئی۔۔۔

لیکن اوقات تو سیاست خود بخود دے دے کر انسان کو اپنے ہاں سے نکالتی تھی مجرور نہیں نکلتا تھا اور جب سے لوہا سیاست نے زور پکڑا تھا تو بہت سے سیاست سے نکلنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لوہا سیاست میں زیادہ مزے تھے۔ جس سیاسی کئی کے بھڑا ہوتے

ت سے رابطہ کیا۔ میں پہلی بار یوں براہ راست اس سے بات کیا تھا۔ وہ بے جا ہلکھا گیا۔ میں نے دعایان کرنے کے بعد اسے اصرار کہ رہا ہے کہ وہ بے جا اور ٹھنڈی شمار قسم کی کالی بنا ہوئی جا ہے جو شمارے ہاں گا کہوں کو پلائی جاتی ہے بلکہ وہ ابھی والی اسٹیشن "امپورٹڈ اور گرا کر کم قسم کی کالی ہوئی ہے جو مفت خوروں کو پلائی جاتی ہے۔"

"بھئی سر۔۔۔ میں ابھی ایسی کالی سمجھتا تھا جس کا صرف خوشبو ہاں کا دل خوش ہو جائے گا۔" شیف ذرا ٹوٹی چوٹی سی اردو میں وہ سری لنگن تھا لیکن برسوں پہلے مسلمان ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ لڑنے کے ہونوں میں گزار چکا تھا۔ اس کے بعد سے برسوں سے نہیں میں تھا لیکن اردو اور انگریزی دونوں نے پھوٹے سے ازبک ہی ہوتا تھا البتہ دونوں زبانیں سمجھتا بہت اچھی طرح تھا۔ اگر اچھے اشعار تک سمجھتا تھا۔ اس کی تنخواہ اور دیگر مراعات پرائس کے ملازم سے بھی زیادہ تھیں۔ ہوٹل کے پرسنل منیجر نے ایک بار اس کے بارے میں مجھ سے کوئی لیٹر سائن کروانے بتائے تھے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں ایک اچھی بھلی ٹی وی آرٹسٹ اس سے شادی کے لیے تیار ہو گئی تھی لیکن وہ اپنی سری لنگن بیوی کو ملازم سے چکا تھا لیکن وہ بھیل اس لیے منڈھے نہیں چڑھ سکی تھیں دونوں وہ ایک اور ہوٹل میں کام کرنے والی خاتون شیف نے قتل میں گرفتار تھا اور اس کے فرائض میں اس نے اپنی لنگری لڑائی اور شاید اس سے کچھ بہتر سنائی زبان میں شاعری تک ادا کر رکھی تھی۔

میں نے امیر کام کا رہبر رکھتے ہوئے زمانے سے کہا "نہ اس امید ہے تمہارے لیے کالی تو عموماً آجائے گی۔" پھر میں نے کالی اختصار سے اسے اپنی داستان غم سنائی تاہم امیر صاحب نے اسپورٹ الیکٹورٹ کارپوریشن کے بارے میں جو بہت غامض بات مجھے بتائی تھی اس کا میں نے ذکر نہیں کیا۔ بقول اس کے وہ جب سیکرٹ تھی۔ میں نے فی الحال زمانے جیسی قریبی انتہائی قابل اعتماد دوست سے بھی اس کا ذکر مناسب نہیں لکھا تھا تاہم میرا یہ ارادہ ضرور تھا کہ مناسب وقت آنے پر اسے فہم گا۔ خصوصاً اگر ان معاملات میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی نہ اسے ہر پہلو سے نگاہ رکھنا ضروری ہو جاتا۔

کالی در تک ہم ان معاملات کے بارے میں تبصرے اور تنقید کرتے رہے۔ پھر زمانے اپنے بارے میں بتانے لگی اس کے شرفٹ ہو جانے سے اس کی زمینوں کے معاملات پر توجہ نہیں پڑا تھا لیکن اب وہ کچھ عرصہ گزار جانے کے بعد کچھ غمراہانے لگے تھے مگر اس کے لیے اس قسم کے نئے کوئی کامیابی نہیں دیکھتے تھے۔ وہ صرف چار چار دن کے لیے وہاں جا کر فرائض کا سر پہل آتی تھی۔

اس وقت کالی کا دوسرا دور چل رہا تھا اور باتیں جاری تھیں

١٠٠

”وہی جو عورتوں میں بعض اُن کی باتوں کو سمجھ لینے اور اُن کی  
وہیکی چیزوں کے بارے میں جان لینے کی جس ہوتی ہے۔“

”اچھا!۔۔۔ میں نے ایلک بار پھر اس کی بات کالی ”یہ بتا کر  
ووت میرے خیال میں تو ان کسی طور کنارہ محرومتوں کی مجھ سے تو بڑی  
باتیں بھی نہیں آتیں جنہیں کہہ کہہ کر کسی کی کوہ پی کے کل کوکل  
ہو جاتی ہے اور بعض اوقات انہیں ان چیزوں کے بارے میں کہہ  
کچھ معلوم نہیں ہو پاتا جو ان کی ناک کے نیچے رکھی ہوتی ہیں۔“

دیکھو اسی میں چلے گئے۔ سیاسی پارٹیاں اب پارٹیاں کم اور انیائیں  
 جا سیاسی کہنیاں زیادہ بنی جا رہی تھیں۔ تیز و طرار، شاطر اور چلنے  
 پر تیز قسم کے لوگ جن کا کسی نہ کسی حوالے سے کچھ نام بھی ہوتا  
 تھا وہ اپنے ریکارڈ سے اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی بدنام کیا کیوں نہ ثابت  
 کر دیتے لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی سیاسی کہنی کے دوڑنے  
 ان کے لئے کھلے رہتے تھے اور کہیں نہ کہیں انہیں خوش آمدید  
 ضرور کہا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود ذیل احمد نے سیاست چھوڑ دی  
 تھی جب کہ وہ تو حکومتی منسوب کاغذ بھی چمک چکا تھا۔ یہ بلاشبہ بڑی  
 حیرت کی بات تھی۔

فی الحال اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس نے اتنے ہنگامی انداز میں مجھے فون کیا تھا۔ میری اس سے کوئی واقفیت یا شناسائی نہیں تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا اس سے تو کسی پابندی میں بھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صرف اخبارات میں دو ایک مرتبہ بہت اونچی قسم کی کاروباری تقریبات کے سلسلے میں اس کی تصویر دیکھی تھی اور وہ صورت سے ہی مجھے نہایت شاعرانہ قسم کی چیز دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بارے میں ایک اور اہم بات مجھے یاد آئی تھی۔ پرنس سیرا کے قتل کے بعد جب رجم مکمل تحقیق کے لیے دہاں پہنچا تھا تو اس نے تمام چیزوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔

جس کمرے کو پرنس آئنس کے طور پر استعمال کرتی تھی اس پر پلاسٹک کے ایک خوب صورت سے ڈبے میں درجیم گل کو چند وزٹنگ کارڈ پڑے تھے وہ ان لوگوں کے کارڈ تھے جو پہلے چند دنوں میں پرنس سے ملنے آتے رہے ہوں گے۔ ان میں ایک آدھ آرٹ کیلری کے مالکان، ایک دو وکیل، ایک دو صنعت کار، انجینیری اخباروں، رسالوں کے نمائندے وغیرہ شامل تھے مجھے اچانک یاد آیا تھا کہ انہی میں ایک کارڈ جمیل احمد ایڈووکیٹ کا بھی تھا۔ میں اب اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ شخص شاید پرنس کے قانونی مشیروں میں شامل تھا اور اسی کے معاملات کے سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔

امبروینی "یہ صاحب مجھ سے آپ کے موبائل فون کا نمبر بھی مانگ رہے تھے لیکن میں نے آپ کی اجازت کے بغیر یہ مناسب نہیں سمجھا۔"

”منہج۔ ان معاملات میں تو ہم بہت سمجھ دار ہو لیکن اجازت لینے کے لیے تو ہم میرے موبائل فون پر رابطہ کر سکتی تھیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”ایک تو میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ باہر بھی تو آپ کی مصروفیات کا کچھ چا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“ وہ نصر محمد کر بول ”دوسرے دو جو عورتوں میں ایک خام، جس ہو آ سے۔۔۔۔۔“

”کون سی؟“ میں نے جلدی سے کچھ تشویش کے سے عالم میں پوچھا ”مورتوں میں تو بہت سی نہیں ہوتی ہیں جن میں سے کئی تو

# کالی دنیا

ایم اے راحت کے ایڈوکیٹر

ق

قیمت - 200 روپے

ناشر: مكتبة القریش

~~SECRET~~

**Figure 1**

تقریباً ۵۰۰

”آپ عورتوں کو اتنا اندرا لپیٹی میٹ نہ کیا کریں سر!“ ابر  
 کرد کرولی ”زرتاج بی بی آپ کے پاس بیٹھی ہیں۔ وہ کیا سوچیں  
 گی۔“  
 ”وہ کیا سوچیں گی؟ تم اس کی فکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے کیا سوچا  
 تھا؟“

”سرا میں نے اپنی جس کے ذریعے محسوس کیا تھا کہ جمیل احمد  
 صاحب کو اتنی زیادہ ضروری بات نہیں کہنی تھی جتنا وہ بیان  
 بولا ہے تھے۔ فون تو خیر ویسے بھی ان کی سیکرٹری کر رہی تھی لیکن  
 ریاات دی دے رہے تھے۔ سر حال میں نے سوچا“ جب آپ  
 انیس کے تب بتا دوں گی اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس سے کوئی  
 خاص فرق نہیں پڑے گا۔“

”پہلے..... اگر تمہارا دل کہہ رہا تھا تو اس بے چارے کا مان  
 رکھ کے لیے میں بھی اس سے متفق ہو جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے  
 جمیل احمد کو گھر فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل اس کے آفس  
 پر ہی فون کریں گے۔“

”ٹھیک ہے سر! میں آپ کو یاد دلا دوں گی۔“ وہ بولی۔

میں نے ریپورر رکھ دیا۔ زرتاج اس دوران میں آفس کے  
 اس حصے سے ایک انگریزی رسالہ اٹھائی لائی تھی جو نشست گاہ کے  
 قریب استعمال ہوا تھا۔ وہ اس کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ میں نے  
 ریپورر رکھا تو وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی ”تم اپنی سیکرٹری کو بھی روانہ  
 ہالے سے باز نہیں آتے۔ کسی کو تو بخش دو۔“

”فادر گاڈ سیک زرتاج.....!“ میں نے اس کے سلوٹے ہاتھ  
 ڈھونڈ لیے ”تم تو واقعی میری ریپوٹیشن کا جیڑ غرق کرنے پر تلی ہوئی  
 ہو۔ اگر تم دوسروں کے سامنے میرے بارے میں اس طرح باتیں  
 کوئی تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔“

”سوچیں گی۔“ زرتاج نے گویا تھوکی ”میں اگر کدوں کی تو  
 ننگل کے سامنے اس قسم کی باتیں کدوں کی تاکہ وہ تم پر اعتبار کرنا  
 بخوشی دے۔ پتا نہیں کس کس بے چاری کو الگ الگ تم نے کیا کیا  
 چھوڑ دیے ہوں گے۔“

”تمیں تو یک۔ یک۔ ہی مجھ سے کچھ دشمنی ہو گئی ہے حالانکہ  
 نہیں انجی طرح مظلوم ہے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ جتنا  
 بظاہر افاق کرنا“ زبان چلانا میری عادت ہے..... لیکن یہ بھی پیش  
 نہ ہوتا۔ میری اپنی زبان چل رہی ہو تو میں موقع مل اور  
 دھڑکے کا سوڈا پینے بغیر بھی شروع ہو جاتا ہوں لیکن کبھی کبھی میں  
 موقع مل کے باوجود بالکل سنجیدہ اور BUSINESS LIKE رہتا  
 ہوں..... کام سے کام رکھتا ہوں۔“

مظلوم نہیں کب آتے ہیں ایسے موقع.....! وہ ٹھنڈی  
 ہانسی لے کر بولی ”آئندہ کبھی ایسا موقع آئے جب تم سنجیدہ اور  
 بالکل ٹانگہ نظر آ رہے ہو تو مجھے ضرور فون کرنا۔ میں پریس فونو  
 زانفون کو لے کر آؤں گی تاکہ تمہاری کچھ تصویریں محفوظ

”تم میں اندر ہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔“  
 ”تمہارا تو مجھ پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ ایسا مظلوم ہوتا  
 ہے کہ کسی دشمن نے تمہیں میرے خلاف بڑھکایا ہے۔ ویسے تو خیر  
 تم مجھے دوستوں کے ہوتے ہوئے مجھے دشمنوں کی ضرورت ہی نہیں  
 ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر ایسے دوستوں کو چلے جانا چاہیے۔“ وہ  
 اٹھتے ہوئے بولی۔

”ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر  
 بٹھانے کی کوشش کی۔

”تم ناراض ہوں میرے دشمن۔“ وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی  
 ”فرمت میرے آتے ہی میں تو پھر آجاؤں گی۔ مگر نہ کہ تمہارے  
 دوست غنا دشمن یا دشمن غنا دوست قبر تک تمہارا چہچہا نہیں  
 چھوڑیں گے۔“

”خدا اکالا کھ لاکھ شکر ہے۔“ میں نے طمانیت سے کہا۔  
 ”اگر کبھی خدا تمہیں توفیق دے اور راستے میں ایک بار پھر  
 کوئی امیر جنسی پیش نہ آجائے تو تم بھی میری طرف ایک آدھ پکڑ  
 لگائیں۔“

”تم بھلاؤ اور ہم نہ آئیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کا یہ خادم  
 سر کے بل آئے گا زرتاج بیگم!“ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر منوہا نہ  
 انداز میں جھکتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہ۔ کیا بیویوں میں کوئی تکلیف ہے؟“ اس نے  
 معصومیت سے پوچھا۔

”میں نے حوالہ دیا ہے۔“ میں نے دانت پس کر کہا۔  
 ”اچھا..... اچھا۔“ اس نے سر ہلایا ”ایسے اُلٹے  
 سیدھے حوالے نہ بولا کہ۔ میں تو ذرا سی گئی تھی۔ تم سے کچھ بعید  
 بھی نہیں ہے نا۔ اُلٹے سیدھے کام تو تم کرتے ہی رہتے ہو۔ میں  
 نے سوچا کہیں جی جی سر کے بل نہ چل پڑا اور بچوں کا ایک ہجوم  
 پیچھے لگا لگا جو تم پر پتھر سارہا ہو۔“

”اس صورت میں بھی تمہیں ڈرنے کے بجائے اپنے بچنے کے  
 ٹیرس پر کھڑے ہو کر گانا گانا چاہیے تھا۔ کوئی پتھر سے نہ مارے  
 سرے دجائے کہ۔“ میں نے کہا۔

”میں بالکل نہیں ہوں جو اس قسم کے گانے گاؤں گی۔ میں تو  
 تھریں ان سے درخواست کروں گی کہ اسے اگر مارتا ہی ہے تو  
 ڈنڈے سے مادہ جوڑوں سے مادہ۔ پتھر سے تو نشانہ غلط بھی ہو جاتا  
 ہے۔“

”تم بہت ہی متحمل لڑکی ہو۔“ میں نے اسے ہی تھپ تھپ کرنے  
 کے لیے اس کے ساتھ جا رہا جاتے ہوئے کہا ”مشق کے جراثیم تو تم  
 میں بالکل نہیں ہیں۔“

”بہت تھے۔ تم نے مجھے لے کے بعد بے چارے شرم سے  
 مر گئے۔“ وہ بولی۔

کے۔ چنانچہ پہلے ہماری آپہنری بات کی، پھر امیر نے بات کی اور دونوں طرف ہیکہ ٹیڑیوں کی سطح... پر مذاکرات ہوئے۔ اس کے بعد دونوں طرف کے پاس لائن پر آئے تھے لیکن میری آواز سننے ہی جیل احمد کچھ اس طرح پھٹنے لگا تھا اور اس کی آواز سے کچھ اس طرح شد پھٹنے لگے تھا جیسے ہم برسوں کے شناسا تھے۔

اس نے بتایا کہ وہ کسی کا دوبارہ سلسلے میں بات کرنے کے لیے مجھ سے ملتا چاہتا تھا اور اس کے لیے میرے آفس آئے کہ کبھی ہمارے دفتر میں نے خودی کچھ انکساری کی طرف مائل ہوئے ہوئے اس کے دفتر چلے آئے کی ہائی بملی تھی۔ وہ ملاقات کا وقت مقرر کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے بتایا کہ میری مصروفیات کا شیڈول کچھ غیر یقینی تھا۔ اس میں کچھ ترمیم اور تبدیلیاں ہو سکتی تھیں اس لیے میں دفتری اوقات کے دوران میں کسی وقت بھی آسکتا تھا۔ میں یونی کسی خاص وجہ کے بغیر کسی حد تک اچانک ہی اس کے ہاں پہنچا چاہتا تھا۔ اس نے اس پر بھی بہ خوشی آمادگی ظاہر کر دی تھی اور میں ایک گھنٹے بعد ہی یہاں آکر پہنچا تھا۔

دوسری منزل پر پہنچ کر مجھے اس کا آفس تلاش کرنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ وہ پورا طور پر اس کے پاس تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس عمارت کے پورے ایک طہر پر ایک وکیل کا دفتر ہوتا اس کی کامیابی کی دلیل تھی۔ ایک تفصیلی قسم کے بورڈ سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دراصل وکیلوں کی ایک فرم تھی جس کا سربراہ جیل احمد تھا۔ بارہ وکیل اس کے ساتھ یا شاید اس کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے قابل ذکر بات یہ تھی کہ یہ فرم صرف مالیات کے شعبے میں کام کرتی تھی۔ مالیات کا شعبہ خود بہت سے شعبوں پر مشتمل تھا۔ یہ فرم غالباً ان سب پہلوؤں کا احاطہ کرتی تھی۔

میں ہماری فیس کے خوب صورت اور تاریک دواڑے کو دھکیل کر اندر پہنچا تو تنگ ہوا اور از ریفرشنگ رہی۔ جیسی مکے نے میرا استقبال کیا۔ نے اور دوسرے قسم کے فیض قائلین میں پاؤں دھسنے جارہے تھے سامنے ہی خاصی بڑی جگہ رہ۔ پینشن کے طور پر مخصوص تھی اور وہاں جو رہنمائی تشریف فرما تھی وہ خود کسی فرم کی ڈائریکٹر... وغیرہ سے کم نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ نوجوان اور حسین تھی۔ جرائی اور حسن کا اپنا فک کچھ کم نہیں ہوتا۔ لیکن ہے کچھ دوسرے قسم کے فیس بھی اس کے ذہن کو چومے ہوئے ہوں۔ اس نے کچھ ایسی تحوت اور ناگوار سی سے ناک چڑھا کر میری طرف دیکھا جیسے جو گھر کا کوئی نوکر دیکھتا ہے بنگالی طور پر گھر کا کچھ سودا سلف لینے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن وہ دو تین گھنٹے کی تاخیر سے واپس آیا تھا اور وہ بھی غافل تھا۔

میں نے زندگی میں یہ پہلی رہنمائی دیکھی تھی جو اس تحوت اور ناگوار سی سے ناک سٹیئر کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بڑے سے بڑے لوہارے کی رہنمائی بھی رہا تھا تاہم ان کم از کم اپنی پیش

میں نے چلے چلے راہداری کی جھٹ کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور درد ناک لہجے میں کہا "انسوس! اس دنیا میں کوئی بھی مجھے سمجھ نہیں سکا۔"

"ظاہر ہے... آج کل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ گدھوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔" وہ منہ بنا کر پہلی "دور پھر گدھوں کی ایک ٹیڑی تویہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھتے۔"

○●○

میں نے گاڑی کالشن کی اس نو تعمیر شدہ پندرہ منزلہ خوب صورت کا دوبارہ عمارت کی تنگ سی پارکنگ لائن میں روکی جو فیسٹ اور سینٹ کا خوب صورت استخراج تھی۔ یہاں زمین چونکہ بہت سی بیش قیمت تھی اور اس کی پیمائش کے حساب میں چند انچ کی بھی بڑی اہمیت ہوتی تھی اس لیے پارکنگ جیسے "فضول" سے مقصد کے لیے کم سے کم جگہ میں کام چلانے کی کوشش کی گئی تھی البتہ یہ مرموئی کی کٹی تھی کہ جن لوگوں کے دفاتر یا دکانیں وغیرہ اس عمارت میں تھیں ان کے لیے پارکنگ کی جگہ ذرا زمین بتائی گئی تھی لیکن ان کے لیے بھی وہ بہت کم تھی۔ دوسرے کے لیے تو عمارت کے تین طرف محض ایک تنگ سی پٹی چھوڑی گئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ کاریں ایک دوسرے کی ناک سے ناک جوڑے کھڑی تھیں اور ذرا سی بھی بے احتیاطی سے ٹکالتے وقت وہ ایک دوسرے سے متعلقہ بھی کر سکتی تھیں۔

میں لفٹ کے ذریعے دوسری منزل کی طرف روانہ ہوا۔ بلڈنگ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن لفٹ کی حالت خاصی خراب نظر آنے لگی تھی اور اسے استعمال کرنے والے... ان لوگوں کی "خوش دینی" کی کافی نشانیاں اس میں نمودار ہو چکی تھیں جو اپنے کاموں کے سلسلے میں باہر سے اس عمارت میں آتے تھے۔

میں یہاں جیل احمد سے ملنے آیا تھا جس کا آفس دوسری منزل پر تھا۔ وہ غالباً یہ بلڈنگ بننے کے بعد کہیں اور سے یہاں شفٹ ہوا تھا۔ آج صبح میں نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ مجھے ابہرے بتایا تھا کہ کل اس کے فون کچھ اس ترتیب سے آئے تھے کہ پہلے اس کی آپہنری ہوئی تھی۔ وہ ٹیکہ بنی۔ یہ بات کرائی تھی پھر ٹیکہ بنی "جیل احمد سے بات کرائی تھی۔ میں نے امیر کو ہدایت کی تھی کہ آج وہ بھی اسی ترتیب سے یعنی "تمہارے پر جیل احمد سے رابطہ



میں کہاں سے آیا ہوں۔ کہاں جاؤں گا۔ اس قسم کے سوالات کو رہتے دیکھتے۔ میں نے کاؤنٹر پر کھینچ کر رکھا۔ اس نے فوراً ہی نظر چڑائی اور آخر کام کا نمبر بیچ کرنے لگی۔ اس کی سرمری اور غرور کی اٹھکوں کی خفیف سی روشنی تاراری تھی کہ وہ کچھ نروس ہو چکی تھی۔

”جو زمین! باس سے ملے ایک مسٹر افضل چوہدری آئے ہیں۔“ وہ آخر کام پر ہوئی اور چند سیکنڈ دو سری طرف سے کچھ سنتی رہی۔ اس نے ریسپورڈ رکھا تو اس کا چوہ ”سُخِ روشن“ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ حسین تو وہ پہلے ہی تھی لیکن اب گویا اس کے چہرے پر دو سواں کالج روشن ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر کچھ آہ و تاب آگئی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ دلکش نظر آنے لگی تھی۔

”اندر چلے جائیے سر! جو زمین آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ اس نے اپنے موتیوں جیسے ہوا پر جھللاتے رانٹوں کی نمائش کی۔ ایک سی اس کی آواز میں حترم گنناں جتنے لگی تھیں۔ بعض لوگوں کے اندر گویا بہت سے بنی نصب ہوتے ہیں۔ خوش خلقی کا بن بنایا تو چہرہ دیکھنے لگا، بے سے خند چمکے لگا۔ رکھا کی کاٹھن دیا تو چہرے پر بلیک کواٹ ہو گیا اور آواز خلقی سے کچھ یوں برآمد ہونے لگی جیسے پلگ میں کبڑا آگیا ہو۔

اس نے پیشے کے ایک اور تارک و دواڑے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں آگے جانے کے لیے کاؤنٹر سے کھینچ ہٹا کر سیدھا ہوا تو اسے جیسے کچھ خیال آیا اور وہ شاید خوش خلقی کا کوئی ریکارڈ قائم کرنے کی غرض سے بولی ”آئیے سر! میں آپ کو چھوڑ کر آتی ہوں۔“

وہ کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر دواڑے کی طرف بڑھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس کی چال بہت دلکش تھی۔ انسان اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا سیدھا جا کر کسی اندھے کو نہیں میں بھی گرسکا تھا جس کا احساس اسے کافی تاخیر سے ہوتا۔

ہم ایک بہت بڑے ہال سے گزرتے جس میں بہت سی میزوں پر لوگ تندی اور سرگرمی سے کام میں مصروف تھے۔ کسی کے آگے فائلوں کے انبار تھے، کسی کے سامنے کپڑے تراشا ہوا تھا۔ کوئی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کئے فون سے الجھا ہوا تھا اور ز روشور سے ہاتھ ملا ہوا کر بحث و تمحیص میں مبتلا تھا۔ بعض لوگ عام لباس میں تھے شاید وہ کلرک وغیرہ ہوں۔ بعض کے سیاہ کواٹ، سیاہ ٹائیاں اور نوجوان چہرے تار رہے تھے کہ وہ زیر تربیت وکیل تھے۔

رہنہ نشین مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ میں نے دیکھا یہاں سب کمروں کے دواڑے منشد گھاس کے تھے۔ کمروں سے باہر تو دیکھا جاسکتا تھا، کمروں کے اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ دفتر مکمل طور پر انڈر کینڈا اور دال نوال کار پڑھا تھا۔ ہر دافتر نہایت شان دار اور اس کی آرائش نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ رہنہ نشین مجھے

رہنہ ضرورت اور رہنہ سمجھ کر سی مسکرائیں تھی اور اگر اسے ترانے کی توفیق نہیں ہوتی تھی یا وہ مردوں کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط ہوتی تھی تو کم از کم اپنا چہرہ ساٹھی رکھتی تھی۔ کسی بھی قسم کے جذبات یا تاثرات کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک بھی نہیں تھا لیکن ایسی غرت۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ میں کچھ ایسے کچھ گزرے ملے میں نہیں تھا اور نسبت بھی کچھ ایسی تھی کہ گزری نہیں تھی اس پر موصوفہ کا یہ عالم نہ۔ اگر غلطی سے کبھی کوئی مظلوم الحال یا غریب مسکین قسم کی نسبت رات بھر اس طرف آنکھ تو اس حینہ کے تاثرات نہایت

میں نے اپنی طبیعت پر جبر کرتے ہوئے اپنی محنت اور سنجیدگی کو برقرار رکھا یا بہتر سمجھا اور اس کے قریب پہنچ کر ذرا کھیر سے لیے میں کہا ”مجھے تمیل صاحب سے ملنا ہے۔“

اس نے مجھے ایک نگاہ غلط انداز سے نوازنے کا کرم فرمایا اور پھر ”اپنا منتھن لیا ہوا ہے آپ نے؟“ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہ ری ہو ”بڑے لوگوں سے ملنے کے جواب کا بھی کچھ پتا ہے؟ ان سے ملنے کے لیے پہلے اپنا منتھن لیا جاتا ہے۔ آخر تم جیسے چند ان دنوں میں نہ اٹھا کر کیوں نہاتے ہیں؟“

مجھے اس پر کچھ ترس بھی آیا۔ اللہ نے شکل صورت تو واقعی اتھی بنائی تھی۔ خوش لباس کا طلیق بھی کہیں سے لیکھ لیا ہو گا لیکن شاید کسی دھبک کے دفتر میں یہ اس کی پہلی نوکری تھی اور لگا خیالی تھا کہ وہ دنیا کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ چکی تھی۔ یہ تنہا کی آؤی حد تھی۔۔۔ یا پھر ممکن تھا کہ اس دفتر کی پالیسی ہی کچھ ایسی ہی ہو اور ان کے نزدیک خوش خلقی کا مظاہرہ محنت کے لیے ضمانت دہ ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ دفتر اور اس میں کام کرنے والے لوگ اس سے کہیں زیادہ اہمیت کے مالک ہیں جتنا کہ نظر آ رہا تھا اور رہنہ نشین کو اس کا احساس ہو۔ اسے یہ بھی احساس ہو کہ اس ایک رہنہ نشین کی حیث پر بھی ہونے کے باوجود وہ بہر حال ایک اہم ادارے کا حصہ تھی۔

ایک لمبے کے اندر اندر یہ تمام امکانات میرے ذہن میں سننے میں نے اپنی بو جھیل سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا ”اپنا منتھن تمیل صاحب مجھ سے لینا چاہتے تھے اور میرے آفس نہ لیا جاتے تھے لیکن مجھے تو میری فرصت میری تھی اور اس طرف سے گزرا بھی تھا اس لیے میں نے سوچا خود ہی ملتا چلوں۔“

اب وہ کچھ سنبھلی۔ اس کی غرت اور ماتھے کی ٹھکیں کچھ کم ہو گئیں۔ وہ آخر کام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ذرا بہتر لہجے میں ”کہاں سے تشریف لاتے ہیں آپ۔۔۔ اور آپ کا نام کیا ہے؟“

”تمیل صاحب کی سیکرٹری سے بات کرتی ہوں۔“

میں نے اپنا نام بتایا اور کہا ”ہاں۔۔۔ صرف اتنی کافی ہے۔“

جس کمرے میں چھوڑ کر واپس ہوئی وہ بھی سیکرٹری کے بجائے کسی ایجنٹ کیسٹرو ڈائریکٹر کا کمرہ معلوم ہوا تھا۔

ایک عظیم الشان قسم کی میز کے عقب میں ریپشٹ سے بھی کچھ زیادہ ٹھنڈے دل فریب قسم کی شخصیت میرے استقبال کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ فیض قسم کے اسکرٹ میں تھی اور میز کے عقب میں ہونے کے باوجود اسے ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک دراز قدر لڑکی تھی۔ جو زمین بیٹھا دی تھی۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وہ دیکھی میم تھی لیکن اس کے دلالتی میم ہونے کا دھوکا کھایا جاسکتا تھا کیونکہ وہ سُرخ دھند تھی۔ بال بھروسے اور آنکھیں بھی نیلی تھیں۔ اس کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ میں غصہ اور نکھار بھی انگریزوں والا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کہاں کوئی دیکھا رنگ تھا، کوئی دیکھی خوشبو تھی جس کی میں وضاحت یا نشان دہی نہیں کر سکتا تھا اسے میں صرف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید کوئی غیر مرئی چھاپ تھی جو سم سے برس اس ملک میں گزرنے والوں پر لگ جاتی تھی۔ خواہ وہ انہیں خود بھی نظر نہیں آتی تھی لیکن شاید اسے محسوس کیا جاسکتا تھا۔ کم از کم میں تو محسوس کر ہی لیتا تھا۔

”مسٹر افضل چوڑی...؟“ اس نے نہایت دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اپنا نازک سا ہاتھ معانے کے لیے بڑھایا۔ میں نے قدر دانی کے تمام تر احساس کے ساتھ اس ہاتھ کو تھاما۔ اس میں حرارت، گداز اور ایک مبہم سی مضبوطی موجود تھی۔ نہ جانے کیوں فوراً ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ ہاتھ صرف معافی کرتا ہی نہیں، دوسروں کی کمزوریوں سے کھیلتا بھی بخوبی جانتے تھے۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس کی مسکراہٹ کچھ اور روشن ہو گئی۔ وہ چرانے انگریزوں والے لب و لہجے میں نہایت درست تلفظ کے ساتھ بولی ”آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ مسٹر بیل احمد آپ کا انتظار...“

اس کا جملہ ادھر ادھر رہ گیا جس کا مجھے کوئی الموس نہیں تھا۔ انیسویں اس بات کا تھا کہ اس کا ہاتھ جو ابھی میرے ہاتھ میں ہی تھا نہ جانے کس طرح آہستگی سے پھل گیا۔ دراصل اس کے قریب ہی ایک سیاہ دھواڑے بے آواز طریقے سے اچانک کل گیا تھا اور ایک دراز تہ گدھا باہر آ گیا تھا۔ کم از کم میرا تو اس وقت اسے گدھا ہی کہنے کو ہی چاہا تھا لیکن بادل بخاؤ اس میں اسے انسان تسلیم کرنے پر مجبور تھا کیونکہ وہ دو ٹانگوں پر چل رہا تھا اور نہایت فیض قسم کا قہری ہیں سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ اس کے نقشِ حسیے اور ڈاک اونچی اور نوکلی تھی۔ وہ بیٹھتا کافی مڑا تھا لیکن اس کا چہرہ سُرخ دھند تھا اور آنکھوں میں جڑانوں سے زیادہ چمک تھی۔

وہ بیٹھتا بیل احمد ایڈووکیٹ تھا۔ جو زمین مجھے بتانے لگی تھی کہ وہ میرا انتظار کر رہا تھا لیکن اس بد بخت سے چند سیکنڈ اور انتظار

نہیں ہو سکتا تھا۔ نخوس نے معافی فرم ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور باچیس کھاتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ وہ اپنی خوش خلقی اور گرم جوش کا مظاہرہ کچھ دیر بعد بھی کر سکتا تھا۔ یہی سوچ کر مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا لیکن مجھے مبرا کا گھونٹ پنا پڑا۔ آخر اخلاق اور میزبانی کوئی چیز ہیں۔ خصوصاً ایسے شخص پر آپ کس طرح غصہ ٹھیل سکتے ہیں جو اس طرح آپ کے استقبال کے لیے بڑھ رہا ہو کہ اس کے دونوں بازو بھی پھیلے ہوئے ہوں اور باچیس بھی ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی ہوئی ہوں۔ وہ ایسا آدمی لگتا تو نہیں تھا جو اس طرح کسی کا استقبال کرتا ہو بلکہ میں نے تو محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی خاص غرض کے بغیر کسی کو اپنی خفیہ سی مسکراہٹ سے بھی نوازتے۔

”تمہیں... آئیے مسٹر افضل چوڑی...!“ وہ گرم جوش سے مجھ سے معافی نہیں بلکہ معافہ کرتے ہوئے بولا۔ آدمی وہ ڈالا پتا تھا لیکن اس کا جسم مختلف سائز اور ساخت کی آہنی سلاخوں سے بنا ہوا لگتا تھا۔ اگر اسے محسوس دکھادے کے طور پر ہی گرم جوش کا اظہار کرتا تھا تو رشتہ کی گھل مل لیتا کافی تھا لیکن وہ کیسے تو اپنی مضبوطی اور طاقت کا احساس بھی دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی عام سا آدمی ہوتا تو اس کی ہڈیاں کڑواؤا غصے۔ فکرو کا پتہ اپنے اور میرے سوٹ ڈالی وغیرہ کی خوب صورتی اور غصہ کا بھی خیال نہیں کر رہا تھا۔ ان میں غصے کی پہچان جس حال تک عام حالات میں وہ مجھے رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھنے والا اور تک چڑھا آدمی معلوم ہوا تھا لیکن اس وقت اس نے گویا اپنے تمام حقائق کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

معلوم نہیں وہ کس توقع پر مجھے اتنے جوش و خروش سے پہنچ رہا تھا۔ شاید وہ میرے حلق سے ہزاروں والا کوئی گولا برآمد ہونے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب اس کی یہ کوشش چند سیکنڈ سے زیادہ طول کھینچ گئی تو میں نے اسے ہلکا سا ڈوڑے دیتا ہی بستر بکھا۔ میں نے اپنی حرکات و سکنات سے ظاہر نہیں ہونے والا کہ میں اس کے ساتھ کسی قسم کی زور آزمائی کر رہا تھا کیونکہ اس کی وہ خوب صورت، خوش آوا... سیکرٹری دلچسپی آمیز نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی مسکراہٹ برقرار رکھی لیکن دوسرے عیاں مجھے بیل احمد کے بازوؤں کا کھنچو میرے گرد دھیل پڑ گیا اور اس نے بڑبڑا کر مجھ سے الگ ہونے کی کوشش کی۔

میں نے آہستگی سے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے لیے دو تین سیکنڈ کا ڈوڑی کافی تھا۔ اس کا چھو لال بھجور کا ہو گیا تھا اور تھکے تھکی سے پھول، پچک رہے تھے۔ میں ڈوڑا کر لیا ہوا تھا تو اس کے چہرے پر سُرخئی کے بعد غلاہٹ آ جاتی اور جب میں اسے چھوڑتا تو وہ پٹ سے فرش پر گر پڑتا۔

”میں آپ کو بتا نہیں سکا کہ مجھے آپ کے آنے کی سختی خوشی ہے مسٹر افضل چوڑی!“ وہ اب مجھ سے معافی کرتے ہوئے ذرا

شاید اس نے میری آنکھوں میں یہ خاموش پیغام بڑھ لیا تھا اور اس کا پورا فیصلہ منایا تھا کیونکہ میں نے دیکھا اس کی مسکراہٹ روشن تر ہو گئی تھی اور اس کی نیلی آنکھوں میں ستاروں جیسی جھلکناہٹ ابھری تھی۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ چبھتی لیکن اس کا چہرہ ہماری ہی طرف ہل کر دوسرے ہی لمحے ہم دونوں کے دوسری طرف ہٹ چکے تھے۔

دو روزہ ہمارے عجب میں بند ہو گیا۔ اب ہم جمیل احمد کے کمرے میں تھے۔ اب تک میں نے دفتر کا جتنا بھی حصہ دیکھا تھا اسے نہایت شان دار پایا تھا۔ اس کی آرائش بہت معیاری اور وہاں موجود سازو سامان بے حد قیمتی تھا لیکن میں جتنا کچھ دیکھ چکا تھا، جمیل احمد کا کمرہ اس سے بھی کہیں بہتر تھا۔ پہلی نظر میں وہ کسی دیکل کے بجائے بہت ہی انڈسٹری یا بزنس کے مالک کا کمرہ دکھائی دیتا تھا۔ پورا دفتری کچھ ایسا آڈرنا تھا جیسے یہاں سے کوئی بات بڑا بزنس یا انڈسٹری چلائی جاتی تھی۔ ذرا توجہ سے دیکھنے پر وہ ملائیں دکھائی دیتی تھیں جو دکان سے اس کے تعلق کی نشان دہی کرتی تھیں۔ شٹا باہر پائل میں 'میں نے کالے کوٹوں والے کچھ نو جوانوں کو دیکھا تھا اور جمیل احمد کے کمرے میں بیٹھنے کے دو دروازوں والی خوب صورت الماریوں میں بے شمار کتابیں بھری ہوئی تھیں جن میں سے جیسے ہی قانون کے موضوع پر تھیں۔

جمیل احمد نے خود میرے لیے کرسی کیلپی اور بڑے احرام سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی میں اس سے پہلے وہ کبھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت مجھے دیکھ کر ہوا تھا۔ میں گویا جین میں اس سے ہجڑا ہوا چھوڑا ہائی یا بیٹا تھا جو اتفاقاً اسے مل گیا تھا یا پھر شاید میں اس کا کوئی ایسا لادلہ اور قریب الزم رشتہ دار تھا جو اپنی تمام دولت و جائیداد اس کے نام پر چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہونے والا تھا یا پھر شاید میں کوئی عرب شیخ تھا جو اپنا تیل کا ایک آدھ کراں اس کے نام کرنے آیا تھا۔ اس وقت مجھے دیکھ کر وہ جتنا خوش نظر آ رہا تھا اس کی وجوہات تو کچھ اسی قسم کی ہو سکتی تھیں۔

میری بات یہ تھی کہ جب امیر نے مجھے اس کے فون کے بارے میں بتایا تھا تو میں کچھ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ اتنا بڑا اور دھانسو قسم کا دیکل تھا۔ شاید بار ایسوی ایمین کا عہدے دار وغیرہ بھی رہا تھا۔ ان دنوں میں بھی دو تین جگہ اپنے آپ کو ایک ایسا دیکل کہہ کر حرافہ کر چکا تھا جو باقاعدہ پریکٹس نہیں کرتا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ کہیں جمیل احمد کو میرے اس چہرے سے معصوم سے فزائی خیر نہیں مل سکتی تھی؟ وہ تو شر کے سب دیکلوں کو جانا ہو گا۔ حتیٰ کہ ان کو بھی جسے جن کے پاس صرف ڈگری یا اس کے ساتھ ساتھ پریکٹس کا اجازت نامہ بھی تھا اس کے باوجود وہ باقاعدہ پریکٹس نہیں کرتے تھے۔ جمیل احمد کو ان سب کے بارے میں معلومات ہو گی۔ کہیں وہ مجھ سے اس سلسلے میں کچھ معلومات

مفتش لیے میں بولا۔ وہ اس مختصر روز کے اثرات سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قیمت تھا کہ اب صالے میں اس نے اپنی مضبوطی کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن کئی لمحے تک بازو کو ضرور اس طرح زور شور سے ہلاتا رہا جیسے ہینڈ پمپ سے پانی نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

حتو نہ بتائے جمیل صاحب! بغیر بتائے بھی کام چل جائے گا۔ میں نے دیکھے لیے میں کہا۔

"آہ۔۔۔ آہ۔۔۔ آہ۔۔۔" اس نے خوش دلی سے ایک مختصر اور مضبانہ قہقہہ لگایا۔ اس کی خوش دلی بھی معنوی تھی اور قہقہہ بھی میں اور دوسرے سن چکا ہوں کہ آپ بڑے زندہ دل اور خوش مزاج آدمی ہیں۔ آج کے دور میں ایسے آدمیوں سے مل کر مجھے تو خاص طور پر بہت سی خوشی ہوتی ہے کیونکہ اس نئے زمانے اور ملاؤں لائف میں "گروئن لائف" مقابلے کی دوڑ نے ہماری زندہ دلی اور خوش مزاجی چھین لی ہے۔"

پھر ذرا توقف سے وہ بولا "میں ابھی دوبارہ آپ کے آفس فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چلے جائے۔ اندر چلے۔" اس نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ بری عبت سے اس نے میرا بازو تھامنا ہوا تھا گویا اسے اندیشہ ہو کہ میں اچانک وہاں بھاگ لینے کا ارادہ نہ کر لوں۔

میرے خیال میں ملاقات کا آغاز بڑا نہیں تھا۔ سب سے اچھی بات تو یہ تھی کہ اس دفتر میں داخل ہوتے ہی دو خوب صورت لیول سے سامنا ہوا تھا جسے اچھا سی ٹھکان سمجھنا چاہیے تھا۔ ان سے ایک نے ابتدا میں ہلکے بھونچے حالی تھی لیکن جلد ہی اس کا غوت دور ہو گئی تھی اور دوسری تو سرناپا خوش خلقی ہی بن کر ملی لیا کیونکہ اسے میرے یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ شخص شام کا اس کے پاس کوئے آلی سے انتظار تھا۔ وہ اس وقت بھی سرناپا خوش خلقی ہی بنی کھڑی تھی۔ گراہٹ اس کے ہونٹوں پر گویا مجھ پر کرہ گئی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی دانست میں آنکھوں میں نمونوں میں اٹھارہ افسوس کرنے کی کوشش کی "تم سے ملاقات سے پہلے ہی خوب صورت خاتون! لیکن خیر۔۔۔ اب تو میں سنیہ دفتر دیکھ لیا ہے۔ امید ہے تم سے آئندہ بھی ملاقات رہے گی کہ کچھ عرصہ نہیں کہ ابھی تمہارے اس گورنر نا باس سے مل کر نہیں جانتے۔ اتنی ہی تم سے ذرا تفصیل بات چیت ہو جائے۔ یا اگر تم میں اپنا وزنگ کالڈ تو تمہاری خدمت میں پیش کر دی۔" دیکھو دیکھو میرے فون نمبر۔ میرا ٹھکانا معلوم ہو ہی گیا ہے اور غالباً تمہیں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ میں کون ہوں۔ اس کے علاوہ رابطہ تو کچھ دشوار نہیں۔ اگر تمہاری یہ بی بی تلی مسکراہٹ" دوسری خوش خلقی کچھ حقیقت کا رنگ اختیار کر کے دکھائی دیا اچھا

لے میں کہا۔

"کیا واقعی؟" اس نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا اثر ابھرا جیسا کہ چاہتا ہو "میں زیادہ پارسا بننے کی کوشش کر رہے ہو" لیکن دوسرے ہی لمحے یہ اثر معدوم ہو گیا اور اس کی جگہ صرف حیرت مٹی۔ پھر وہ کندھے اچکا کر بولا "میرا حال۔ جو بھی آپ کے خلق ہوں۔ جو کچھ بھی آپ کو پسند ہو۔ اس کے بارے میں اسے باجپ بھی آپ کا دل چاہے کبھی ہمیں گم دے کر دیکھنے کا ہم ہر معاملے میں کام آنے والے۔ ساتھ دینے والے لوگ ہیں۔" وہ جمع کے بیٹھے میں بات کر رہا تھا۔ معلوم نہیں "ہم" سے مراد صرف اس کی اپنی ذات ہی تھی یا وہ اپنی پوری فرم کی بات کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "آپ جیسے آدمی کو تو چاہئے کافی دنیو کے لیے پوچھتے ہوئے تو مجھے شرم آ رہی ہے۔ ہم بہت ہی عام، بہت ہی رکی اور بہت ہی معمولی سی چیزیں ہیں۔ ہم اپنے بہت ہی رکی سے ملاقاتوں کو ان چیزوں کے لیے پوچھتے ہیں۔"

"ہمیں بھی بہت عام ساری آدمی ہوں۔ عام سی چیزوں سے ہی بل جاتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کی انکساری ہے۔ سرکشہ ہے۔ یا پھر شاید ابھی آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ شرابے ہیں۔ لیکن خوب کوئی بات نہیں۔ اور مکمل جائیں گے وہ چار ملاقاتوں میں۔" اس نے گویا خود ہی اپنے ذاتی سے محفوظ ہوتے ہوئے لگا ساقیہ لگایا پھر آخر کام پر ایک جہن دبا کر بولا "کافی۔ اسٹیکس دنیو۔" صرف اتنا کہہ کر اس نے ریسور رکھ دیا۔

پھر اس نے خود اپنے لیے سگار بجس سے ایک سگار نکال، چھوٹے سے خوب صورت چاقو سے اس کا سر کاٹا مگینہ لٹا ایک خوب صورت طلائی لائٹ سے اسے شعلہ لگا دیا اور ایک طویل سس لے کر روڑا الومک چیز کے پتے سے سر کاٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ گویا اس سس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں اور عضلات سے دیر سے دیر سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ میں بڑے مہو قحط سے بیٹھا ایک لک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں اسی طرح بند رکھتے ہوئے دوسرا سس لیا اور اس بار بھی دھواں اسی آہستگی سے اس کے عضلات اور ہونٹوں کے گوشوں سے خارج ہوتا رہا۔ لگتا تھا کہ کم از کم اس کے لیے سگار کچھ زیادہ ہی سوز پھٹا تھا۔ اس کے پہلے سس کے ساتھ یہ دھواں کسی اور دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے اس دنیا سے واپس لے آئی یا پھر سمجھا اس لیے کھار کر اسے چھٹکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اب کام کی بات ہو جائے۔"

"کام کی بات؟" وہ ایک دم بڑبڑا کر آنکھیں کھل کر سیدھا ہو کر بڑبڑایا۔ اسے تو گویا یادی میں تھا کہ اس نے کئی

کرتا نہیں چاہتا تھا کہ آخر میں یہ کیا پکڑ چلا تا پھر کیا؟ شاید پرنس نے اس سے میرا ذکر کیا ہو اور پھر اس نے میرے بارے میں معلومات کی ہوں۔ لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے ان خیالات کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ کچھ زیادہ ہی اندیشہ ہے دور دراز قسم کی باتیں نہیں۔

اب جس طرح جیل احمد میرے سامنے بچھا جا رہا تھا اس سے کوئی نئی سی کمائی سامنے آئی دکھائی دے رہی تھی۔ زمانے کا دستور تو یہی تھا کہ لوگ اس وقت آپ سے اس طرح ملتے تھے جب انہیں آپ سے کوئی غرض ہوتی تھی، کوئی کام ہوتا تھا۔ میں یہ اندازہ لگاتے سے قاصر تھا کہ جیل احمد کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا؟ اس سے پہلے زندگی میں کبھی اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اس سلسلے میں اپنے آپ کو انہیں میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب جب کہ میں اس کے آفس تک آن ہی پہنچا تھا تو جلدی اس راز سے بھی پردہ اٹھ ہی جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایک انجینی کو بھی دوسرے انجینی سے کام پڑی جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے انجینوں کو جسے جو عابثانہ طور پر ایک دوسرے کو جان سکتے تھے۔ مختلف ذرائع سے ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے تھے اور معاشرے میں فریڑیاں نہیں تھیں۔ وہ میرے مقابل میز کے دوسری طرف جا بیٹھا اور کچھ اس طرح مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا جیسے بات شروع کرنے سے پہلے ہی بھر کے میری صورت دیکھ لیا چاہتا ہو۔ پھر اس نے میز پر سے ایک خوب صورت سگار بجس اٹھا کر کھول کر میری طرف بڑھایا۔ اس میں تقریباً ایک ایک فٹ لمبے سگار موجود تھے۔ سگار کیا اچھے بھلے ڈیزے معلوم ہو رہے تھے جنہیں چھوٹے موٹے فساد اور مار کٹائی میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔

"سگار سے شوق فرمائیے افضل صاحب! ہوائی کی بہترین کبھی کے سگار ہیں۔" وہ غالباً اپنی مسکراہٹ میں غلوں کا کچھ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے اپنے آپ کو اس شوق سے محروم ہی رکھا ہے۔" میں نے رکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "میرا حال۔ شرابیہ۔"

"اوہ!" اس نے آنکھیں مٹھائیں "کوئی اور شوق ہو تو بلا تکلف اس کا حکم فرمائیے آپ کے اس خادم کے ہاں ہر جھکا بندوبست ہے۔ دنیا کی کوئی بھی بہترین اکل والی ڈرکس۔ یا وائن۔ آپ صرف نام لیجئے، ابھی حاضر کر دی جائے گی۔ لیکن خیال رہے کہ ہم صرف وہی چیزیں رکھتے کا تردد کرتے ہیں جنہیں دنیا میں بہترین سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ عام قسم کی چیزوں کو شمار کریں تو پھر نقد لو ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔"

"اگر میں اس شوق سے بھی دور ہوں تو ذرا آپ کی ان تعلیم اور کیا پ سواریات سے ضرور استفادہ کر لے۔" میں نے دھجے

بات سننے کے لیے بہتر توجہ گوارا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ابھی شاید اس کی مٹی بات سننا میرے مندر میں نہیں تھا کیونکہ اسی لمحے شیشے کے دروازے پر خفیف سی ٹھک ہوئی اور اس نے مجھ سے کچھ کہنے کے بجائے یہ آواز بلند کہا "ہیں۔۔۔ کم ان۔"

ایک باوردی "اسرار اور خوش شغل آفس ہوائے جس کی جیب پر باقاعدہ "جیل احمد لادیسوی ہائس" کے الفاظ انگریزی میں کڑھے ہوئے تھے، کافی اور دیگر لوازمات کی زبلی دھکیلا ہوا اندر آیا۔ جو زمین اس کے ساتھ تھی۔ کافی سرو کرنے کا فیصلہ اس نے سنبھالا۔ ہم آفس کے اس قفسے میں جا بیٹھے جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوا تھا۔

جو زمین نے برتن وغیرہ ہمارے سامنے سجانے کے بعد میرے لیے کافی تیار کرتے ہوئے غیر ضروری حد تک میری طرف جھکتے ہوئے مٹی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا "آپ کے لیے شہر کتنی؟" اس کی مسکراہٹ کے بعد شہر کی ضرورت نہیں رہ جاتی تھی لیکن یہ کہنا اچھا نہ لگا اس لیے میں نے کہا "آپ جتنی مناسب سمجھیں" ڈال دیں۔ میں پرہیزی آدمی نہیں ہوں۔ کم یا زیادہ ہونے سے بھی میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

وہ دیر سے میرے کان کے قریب ہی نہیں۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی محک پہلی ہی میرے رگ وپے میں گد گدی سی کر رہی تھی۔ اوپر سے یہ ہنسی بھی غامض مبر آزما تھی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اپنی توجہ جیل احمد کی لومڑی خاصیت پر مرکوز کر لی۔ اس سے میرے رگ وپے میں دوڑتی ہوئی گد گدی میں خاطر خواہ افادہ ہوا۔

جو زمین اور آفس ہوائے ہمیں کافی وغیرہ دینے کے بعد رخصت ہو چکے تو جیل احمد پہلی ہنسی لینے کے بعد ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ پرنس میرا کے قتل کے معاملے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ شاید پولیس سے بھی زیادہ۔"

"میرا خیال ہے یہ بات اب راز نہیں رہی۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ کامران دانش کی بڑی مدد کر رہے ہیں جس پر پولیس پرنس کے قتل کا سب سے زیادہ شبہ کر رہی ہے۔"

"آپ کو یہ بھی درست پتا چلا ہے۔ آپ کی معلومات کے ذرائع قابل رشک ہیں مسٹر جیل احمد! کیا ہیں باتیں آپ کو رحیم گل نے بتائی ہیں؟" میں نے اس کی مکار آنکھوں میں جھانکا جن میں مصیبت پیدا کرنے کی شاید وہ اس وقت سرو قوز کو شش کر رہا تھا۔

"رحیم گل ہماری معلومات کے ذرائع میں سے صرف ایک ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ وہ کچھ زیادہ ہی دیانت دار آفیسر ہے۔"

ضروری بات کہنے کے لیے کئی مرتبہ مجھے فون کیا تھا۔ پھر دوسرے پلائے ہوئے بولا "ہاں۔۔۔ یہ آپ نے بڑے کام کی بات کی اب ہمیں کام کی بات کرنی چاہیے۔ لیکن ایسی جلدی کیا ہے۔ کافی کا دور تو چل جائے۔"

"کافی کا دور ابھی چل رہا ہے۔ ساتھ ساتھ باتوں کا دور بھی چل رہا ہے تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "بعض اوقات کوئی کڑوی بات بھی کافی کے ساتھ کافی آسانی سے نگل جاسکتی ہے۔"

"وہ صاحب! کیا بات کی ہے آپ نے۔۔۔!" اس نے تہستہ سے میرے ہاتھ مار کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ معلوم نہیں آج کل کیا بات تھی۔ شاید ستاروں کی چال کچھ بدلی ہوئی تھی کہ ان دنوں ہر نیا نئے والا شخص مجھے ٹھمن لگانے پر تیار ہوا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم کڑوی باتیں کہنے والے لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو ہمیشہ مٹی مٹی باتیں کرنے کی کو شش کرتے ہیں۔۔۔" وہ ایک باورچرخ کے جیسے ہب بات کرنے کا غما "اور پھر مجھے پتا چلا ہے کہ آپ ایک بڑے بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ شریف وکیل بھی ہیں۔ گویا آپ سے تو کھرا تعلق نکل آیا۔ شریفی سی۔ لیکن ہر حال ہماری اپنی برادری کے آدمی ہیں۔ آپ سے تو بڑے حالات میں بھی کڑوی بات نہیں کی جاسکتی۔"

میں بے آواز طرح سے "اندرونی اندر گویا کر رہا ہوں۔" آخر اس کم بخت تک یہ بات پہنچ ہی گئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کیسے وہ مجھ سے قانونی نصائح پر تیار نہ خیال نہ شروع کرے۔ ویسے تو میری قانونی معلومات بھی کسی وکیل سے کم نہیں تھیں لیکن زیادہ باریکیوں میں جانے سے میرا چل کل بھی سکتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ میرے پاس تو قدر سجد تھا کہ میں کون سا باقاعدہ پرنس بننے والا وکیل تھا اس لیے میں زیادہ باریکیوں اور نصیحتات سے لاعلم بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خود کیوں کو کون کی ہر بات از رہ ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا تھا "مجھے پہلے قابل اور امور وکیل بھی ہر شام بیٹھ کر کتابوں کی مدد سے اگلی صبح کے کیسوں کی تیاری کرتے تھے بلکہ زیادہ بڑے وکیل بن جانے کے بعد وہ وہ اپنے دماغوں پر زور ہی کم دیتے تھے ان کا زیادہ بار ان کے معاونین نے اٹھایا ہوا تھا۔"

میں نے گہری نفرت سے جیل احمد کے چہرے کا بڑھ لیا کہ کیس مجھے گھبرانے کی کو شش تو نہیں کر رہا تھا لیکن اس کے اثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تو بے چون و چرا مجھے وکیل تسلیم کئے بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں تو شاید یہ ہے کہ پرچہ میں تک نہیں بھیجی اور زیادت دینے بھی اس کے لیے شاید زیادہ اہم بھی نہیں تھی۔ اس کا سکہ اس میں کچھ اور تھا اور اس کا ذہن اسی طرف اٹکا ہوا تھا۔

"یہ تو آپ کی نوازش ہے کہ آپ مجھ سے کڑوی بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔" میں نے ملامت ہے کہا "میں آپ کی مٹی

”چلوں کے بارے میں اتنے دھوکے سے بات نہ کریں افضل صاحب! چہرے اٹکڑھو کا دیتے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔  
 ”ہاں۔۔۔ یہ بات اکثر کی جاتی ہے۔ مجھے بالبا اس کا تجربہ بھی ہوا ہے اس لیے میں اس کا قائل بھی ہوں لیکن کامران پر یہ کچھ نظر لڑا کو نہیں ہوا۔“ میں نے دھوکے سے کہا ”لیکن آپ ان باتوں کو چھوڑیے اور اصل بات سمجھئے۔“

یہ بات میں نے اتنی تیزی سے دہترا بدل کر کسی قسم کی ایک لمحے کے لیے وہ گڑ بڑا سا کیا۔ انھیں آمیز سے لمحے میں وہ بولا مثلاً ”مطلب۔۔۔؟ میں سمجھا نہیں۔“

”آپ اتنے نا سمجھ نہیں ہیں جلیل صاحب!“ میں نے مسکراتے ہوئے ملاحظت سے کہا ”آپ یقیناً بہت سمجھ دار ہیں۔ آپ کو انسانوں سے معاملہ کرنے کا۔۔۔ ان سے بات کرنے کا فن بیچنا اچھی طرح آتا ہے لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ذرا غیر روایتی انسان ہوں۔ میرے ساتھ غیر روایتی طور طریقے زیادہ مناسب رہتے ہیں۔ سیدھی سچی اور براہ راست بات چیت مجھے زیادہ اہل کرتی ہے اور اس طرح بات چیت کرنے والے کا وقت بھی بچتا ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ اس نے شاید مزید کچھ دیر انجان بنے رہتا ہوا کہا۔

”اگر آپ انجان بنے رہنے پر مصر ہیں تو میں اور بھی زیادہ سلیس، آسان اور عام فہم زبان میں بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں جلیل صاحب!“ میں نے کسی سانس لے کر صوفے کے پتے سے ٹپک لگاتے ہوئے کہا ”اصل میں آپ کو بات کچھ اور کہنی ہے لیکن آپ بات کچھ اور کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو جانا شمال کی طرف ہے لیکن پہلے آپ جنوب کی طرف مڑ رہے ہیں۔ شاید پہلے آپ مجھے ٹھنکانا چاہتے ہیں لیکن میں آپ کو باتوں کے ان اطمینانی تاہم زیادہ طولانی طریقوں کی ضرورت نہیں۔ آپ کل کس۔۔۔ بے تکلفانہ انداز اختیار کر کے اور خودی پوائنٹ تکھڑ کر کے اپنا اور میرا وقت بھی بچا سکتے ہیں اور اس طرح ہمارے درمیان بات چیت کے لیے زیادہ بہتر تضاد پیدا ہوگی۔ جواب میں دی دوں گا جو۔۔۔“ میں نے لیکن آپ میرے ساتھ زلپٹ بننے کی کوشش کرتے رہیں گے تو آپ کے اور میرے درمیان انداز اسٹینڈنگ پیدا نہیں ہو سکے گی۔“

میری اس تقریر کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے خوش طبعی سے ایک ذرا دراز قہقہہ لگایا جس میں صغیر بہت کم تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھانکا ہوا شاطرا نہ بن بھی گیا کچھ کم ہو گیا۔ اس کے چپکے چپکے غور پر نگاہی کا جو ایک بار وہ سارے چڑھا محسوس ہوا تھا وہ جیسے کم ہو گیا۔ مجموعی طور پر وہ پہلے سے ہلکا انسان دکھائی دینے لگا۔  
 اس کا قہقہہ چھوڑ دینے کی خوش صورت تپائی پر ہاتھ مار کر

ذرا نیڑے اور غرور کا حم کے افسری آنکھ کل دانت دار ہوا افورڈ کر سکتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ان کے پاس بہت مضبوط ہوں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں سے کچھ زیادہ مطلوبہ خاصیت حال کی جاسکتی۔ کچھ بے ضروری باتیں ہی معلوم ہو سکتی ہیں جو وہ کسی کو بھی بتا سکتا ہے۔ بہر حال اسی طرح غصہ غصہ کر کے معلومات کا دیا بن جاتا ہے۔ بہر حال۔۔۔ کامران کو اگر آپ کی حمایت حاصل ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اسے بے گناہ سمجھتے ہوں گے؟“  
 ”ظاہر ہے۔“ میں نے انحصار سے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے اس کے خلاف پولیس کا کس بہت مضبوط ہے اس پر شبہ کرنے کی ان کے پاس ٹھوس وجوہات موجود ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے گالی کی پیالی ہونٹوں سے لگائی لیکن اس کی نظر گھڑی پر مرکوز رہی۔

”پولیس کا کیا ہے جناب!“ میں نے لفظی سانس لی ”پولیس چاہے تو مجھ پر اور آپ پر بھی شبہ کر سکتی ہے کہ ہم دہریس سے افضل جو رچا لائے ہیں۔ آپ وکیل ہیں۔۔۔ خواہ آپ کی پرنس مالیات کے شبہ تک محدود ہو سکی۔۔۔ لیکن پولیس کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ عدالت میں پیش کئے جانے والے پولیس کے سب کچھ سچ تو نہیں ہوتے۔“

”لیکن سب جھوٹے بھی نہیں ہوتے۔“ وہ مسکراتے ہوئے ملاحظت سے بولا۔

”ہاں۔۔۔ یہ میں جانتا ہوں۔“ میں نے تسلیم کیا ”لیکن کامران واقعی کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی گردن پگنی دیکھ کر اس میں پسند افٹ کر دیا جائے۔“

وہ چند لمحے اپنے سگار کے شعلے ہوئے سرے کو پُر خیال انداز میں گھورتا رہا پھر دھیمے لمحے میں بولا ”کامران کے بارے میں آپ بہت پُر اعتماد معلوم ہوتے ہیں اور اس کی بے گناہی پر مصر ہیں۔ کیا آپ اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں؟ وہ آپ کا دوست وغیرہ تو نہیں؟“

”دوست تو نہیں“ صرف وہیو ہے۔“ میں نے جواب دیا ”پرنس کے قتل سے صرف دو دن پہلے میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ بھی صرف چند ٹیکنڈ کے لیے۔ پرنس کے قتل کے بعد میں نے اسے صرف آدھے گھنٹے کے لیے دیکھا۔ اس کی اور میری شناسائی کل انسی دو ملاقاتوں پر محیط ہے لیکن بعض چربے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی ایک آدھ بات یقین سے جاننے کے لیے آپ کو لمبی چوڑی شناسائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کامران کے بارے میں زیادہ کچھ نہ سہی۔۔۔ لیکن کم از کم ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ اردو تا تو کیا وہ اشتعال میں بھی کسی کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ اور ایک ایسی عورت کو تو قتل کرنے کا شاید وہ کسی بھی کیفیت میں تصور نہیں کر سکتا تھا جس سے وہ بچی طرح مرعوب ہو۔“

محدود رہے گی؟ خواہ کسی بھی معاملے میں آپ تعاون کریں یا نہ کریں۔ یہ بھی بات پر آپ ماحول خواہشات میں ہوا انکار نہیں۔ لیکن بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔ کیا آپ مدد کر سکتے ہیں؟

”مگر اس میں کسی بے گناہ کا کیا ہے؟ میرا۔۔۔ اس ملک کا کوئی نقصان نہ ہو تو میں وعدہ کر سکتا ہوں۔“ میں نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔

”نہیں۔۔۔ ان میں سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔“ اس نے مجھے یقین دلایا۔

”تم تک ہے۔ تو پھر میری طرف سے وعدہ کھٹے۔“ میں نے کہا۔

”میرے لیے آپ کا زبانی وعدہ ہی کافی ہے۔“ وہ سار کو ایٹش ٹرے میں رکھ کر دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں بٹھا کر میز پر بازو دکاتے ہوئے بولا۔ وہ شخص مجھے اس قابل ہرگز نہیں لگ رہا تھا کہ اس سے کوئی وعدہ کیا جاتا لیکن اس کی پوری بات سننے کے لیے اسے کوئی تسلی کا ضروری سطور ہو رہا تھا۔

اس نے یہ تو کہہ دیا تھا کہ اس کے لیے میرا زبانی وعدہ ہی کافی تھا۔ اس کے باوجود وہ چند سیکنڈ خاموش رہا اور ایک تک میری طرف دیکھ رہا۔ پھر اس نے کچھ یوں گہری سانس لی جیسے کوئی شخص اونچے ڈائننگ بولڈ سے ایسے سوئمگ پول میں چلا جک لگائے لگا ہو جس میں آبی بھرا ہو۔

”بات یہ ہے افضل صاحب۔۔۔ کہ میں چند بہت بڑے سرمایہ داروں کے ایک گروپ کی نمائندگی کرتا ہوں۔ بڑے دولت مندوں کی ایک سینڈ کیٹ سمجھ لیجئے وہ لوگ پرنس انڈسٹریز کو عملی طور پر خریدنا چاہتے ہیں۔ اس وقت بھی کچھ راستوں سے ان کا پرس انڈسٹریز میں کچھ اثر و نفوذ ہے لیکن وہ اسے پوری طرح اپنی ملکیت میں لینا چاہتے ہیں اور اس کے موجودہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کو ہٹا کر اس کی جگہ اپنا بورڈ آف ڈائریکٹرز مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ پرنس سید کی زندگی میں تو ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی موت کے بعد اس شخص میں صحیح طور پر کوششیں شروع ہوئیں اور کچھ پیش رفت بھی ہوئی۔ اسی سلسلے میں میری پرنس سیرا سے بھی کچھ ملاقاتیں ہوئیں اور اس موضوع پر بات چیت ہوئی۔“

اس کی اس بات سے یہ وضاحت تو ہو گئی کہ پرنس سیرا کے پاس اس کا ورکنگ کارڈ کیوں موجود تھا۔ اس کا یہ اکتشاف میرے لیے واقعی حیرت کا باعث تھا کہ پرنس سید کے مرتے ہی کچھ سرمایہ دار پرنس انڈسٹریز کو خریدنے کے لیے سرگرم ہو گئے تھے۔ اسے خریدنا ایک چھٹی سی سلطنت کو خریدنے کے مترادف تھا۔ وہ کوئی فلاپ اور ذوقی ہوئی انڈسٹری نہیں تھی جسے اونے پونے داموں خرید لیا جاتا۔ پہلے تو اس کا حجم یہ کچھ کم نہیں تھا۔ وہ اگر ”مغز نہ نقصان“ والی حالت میں ہوتی تب بھی اسے خریدنے کے لیے بے

لامتی تمام تر مہر و جہانی کے پادرو آپ تو بہت پیچھے ہوئے ہو گئے ہیں۔ افضل صاحب۔ آپ انسان نے اندر قافی دور تک نہ تک پہنچے ہیں۔ یہ کچھ انجی بات نہیں ہے۔ یہ کسی کی فنی حدود ہی زبردستی واسطے TRES PASSING کے مترادف ہے۔ آپ کی اس خطرناک خبی سے تو خطر رہتا رہے گا۔ بہر حال آپ ان انسان کے بارے میں آپ کی رائے سے متعلق ہونے کے لیے یہاں نہیں آئے کہ میں۔۔۔ کامران کو مدد نہ کر سکتا ہوں۔“

اس کا انداز آہستہ لگائے دلا نہیں تھا لیکن میں نے اسے بھی آہستہ ہی قصور کیا اور اس سے متاثر ہونے بغیر کہا ”یہ تبدیلی واضح ہے۔“

وہ سکار کا ایک خوبصورت لکے کے بعد ایک لمحے خاموش رہا۔ وہ بیٹھا ڈرا دو سرے انداز سے اپنے آپ کو کچھ سے بات کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا جس کا شاید وہ عادی نہیں رہا تھا۔ آخر وہ بڑے ہونے کے لیے میں بولا ”افضل صاحب۔ کیا آپ ایک بہت بڑی ذیل کے بارے میں بات چیت کرنے کے سوچیں ہیں جس میں بڑوں کو بچے کا سرمایہ لگائے جانے کے لیے تیار رکھا ہے؟“

”بیشک صاحب۔ میں اس قسم کا پرس میں تو نہیں ہوں جن کا مزاح بیخود ہی پرس ہو تا ہے۔ جنہیں مدیا کمانے کا ہو گا ہوتا ہے اور جو مدیے کی ہوس میں ہی مر جاتے ہیں۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں مدیے پر پیسے بے نیاز ہوں اور مجھے اس کی ذرا ہی پروا نہیں ہے۔ ظاہر ہے اگر ایسا ہو تا تو میں ایک مفلس وحشی بہت شخص سے اتنا بڑا پرس میں نہ بنتا۔ میں بڑے بڑے سودوں اور بڑے بڑے کامیاداروں کی تجاویز تو بے اور دلچسپی سے سنتا ہوں لیکن اس طرح نہیں کہ میری آنکھیں اٹلی کر ملتوں سے باہر آنے میں اور دل مطلق میں دھڑکنے لگے یا رال پگھلنے لگے۔“ میں نے اسے اپنا غصہ نظر سمجھانے کی کوشش کی جو شاید کافی حد تک اس کی نگہ میں آیا۔ وہ خامے زور شور سے فیکسی انداز میں سر ہل رہا تھا۔

”ذرا توقف کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے کہا میں نے اتنی اتنی قہر تو کر دی اور آپ سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ جس بہت بڑی تباہی آپ بات کر رہے ہیں وہ کس کس کے درمیان ہو گی؟ میرا سامنے کوئی حلق بھی ہو گا یا نہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ کچھ سرج کرولا ”اس سے آپ کا بھی تعلق ہو سکتا ہے۔ اور اگر تعلق نہ ہو تب بھی اس میں آپ کا کوئی بڑا غصہ ہو سکتا ہے۔ کم از کم اتنا بڑا غصہ کہ آپ جیسا بڑا پرس میں بھی اس کے بارے میں سمجھدگی سے سوچنے پر مجبور ہو جائے۔“

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ بات یک دم کامران کی ذات سے ایک بڑی پرس ڈیل پر کیسے جا پہنچی تھی لیکن پھر میں نے خود کو اگلا سہی لی کہ رفتہ رفتہ ساری بات واضح ہو جائے گی۔ مجھے مہمو ان سے انتظار کرنا چاہیے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”کیا تم انڈیہ رکھوں کہ ہمارے درمیان جو گفتگو ہو گی وہ ہم تک ہی

امروزہ دولت درکار تھی لیکن چونکہ وہ بہت چلتی ہوئی اور بہت منافع بخش انڈسٹری تھی اس لیے پہلے تو اسے خریدنے کا قصوری حال تھا کیونکہ ایسی انڈسٹری عام طور پر برائے فروخت نہیں ہوتی اور اگر کسی طرح ان کے مالکان یا وارثین اور حقیقتیں کو فروخت کے لیے آمادہ کر بھی لیا جائے تو اس کے لیے ان کی اصل قیمت سے کہیں زیادہ سرائے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ فی الحال کو دیکھتے ہوئے اگر ان کی کئی گنا زیادہ قیمت طلب کی جاتی ہو تو یہ بھی ممکن زیادہ حیرت کی بات نہیں ہوتی۔

میں نے وری کو شش کی تھی کہ اس کے انکشاف پر حیرت کا اظہار نہ کروں لیکن جمیل احمد نے گویا تصور کے سارے میری اندر کی حیرت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا "دل ہی دل میں آپ ضرور حیران ہو رہے ہوں گے اور آپ کی حیرت بجا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ خریداری کے اس عمل کے لیے تو نہ جانے کتنے سرائے کی ضرورت پڑے گی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلے میں سرائے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جس سینڈیکٹ کی میں نمائندگی کرتا ہوں اس کے لیے کسی بھی حد تک سرائے کا بندوبست کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے صرف ایک اشارے پر کچھ بیٹکوں اور مالیاتی اداروں میں کچھ ہزڈ کے کچھ بن دباے جائیں گے اور فروخت کنندہ پارٹیاں جہاں چاہیں گی وہاں ان کے کماتوں میں رقم منتقل ہو جائے گی۔ جتنے کمیشن کی وہ اعزہ ہینڈلنگ کرنا چاہیں اتنا کمیشن بھی وہ جب چاہیں، جس ملک میں چاہیں اور جس کرنسی میں چاہیں مل جائے گا۔"

اب جمیل احمد کی اصل حیثیت میری نظر میں واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا خاتمہ بات اور اس کی فرم کی دست کا اصل پس منظر بھی میرے سامنے واضح ہونے لگا تھا بلکہ اب تو مجھے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سیکڑے سینے بیٹھا تھا۔ بہت سی مصلحتوں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو نمایاں نہیں کئے ہوئے تھا ورنہ شاید وہ تو اس سے بھی زیادہ فحاش بات اس سے بھی منگی جبکہ اس سے بھی بڑا فخر اور اس سے بھی بڑا اشراف افروز کر سکتا تھا۔ وہ مالیات کا محض ایک کامیاب وکیل نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کتنے بڑے اور کیسے کیسے سرائے داروں کی سینڈیکٹ کی نمائندگی کرتا تھا ان کے مفادات کی نمائندگی کرتا تھا۔ اسے یقین ان کی طرف سے بہت سے فیصلے کرنے کی طاقت اور اختیار حاصل تھا۔ اس قسم کے لوگ بہت ہی اہم اور طاقتور ہوتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ اہم اور طاقتور نہ ہونے کے وہ نظر آتے ہیں۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم سمجھ رہے تھے کہ پرنس سعید کی موت کے بعد ہمارا کام آسان ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بات یہ کہ آگے تو بڑی لیکن کئی رکاوٹیں سامنے آئیں جن میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ویسے تو ہرنے والے کا ذکر اگلے الفاظ میں کرنا چاہیے لیکن افسوس کہ مرنے والے ان

موصوف کے تصور کے ساتھ کچھ زیادہ اچھے الفاظ میرے ذہن میں نہیں آتے۔ بڑا بہت ہو "شیر" چالاک اور شاطر تھا لیکن میرا خیال ہے زندگی کے آخری دنوں میں بعض ایسے لوگ شاید اصل کی زیادتی کی وجہ سے سکی ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں تاکہ زیادتی تو انھی چیز کی بھی بڑی ہوتی ہے۔"

وہ شاید اپنی بات سے محفوظ ہوتے ہوئے مسکرایا اور ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ خواہ اپنے بارے میں اس کا کیا خیال تھا؟ لیکن بوقت ضرورت میں بھی مصلحت سے کام لیتا تھا اس لیے خاموشی اور بہت تن کو شہ رہا۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "ایک تو موصوف صرف مرتے ویسے ہی وراثت کے مسئلے کو خاصا پیچیدہ بنا گئے تھے۔ اور اسے حالات انہیں مزید پیچیدہ بنا رہے ہیں۔"

میرے کان کچھ اور گونجنے ہوئے۔ اگر وہ پرنس سعید کی وراثت کی پیچیدگیوں سے واقف تھا تو پھر وہ یقیناً ایک باخبر آدمی تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "پرنس سیرا کو میں اس موضوع پر مکمل کر بات کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ کسی سے مکمل کر ذکر اکرم کی بات کرتی تھی۔ اسے پرنس اعزیز میں سے جو حصہ مل رہا تھا اس سے اسے اس حد تک تو دلچسپی تھی کہ وہ ایک بہت بڑا لٹریچر تھا اور اس سے بہت بڑی آمدنی ہونا تھی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہونے کی توقع تھی لیکن وہ پرنس اعزیز کو چلانے میں کوئی عملی دلچسپی نہیں رکھتی تھی بلکہ کچھ وجوہات کی بنا پر اسے پرنس اعزیز پسند ہی نہیں تھی۔ وہ ایک آئیڈیلٹ قسم کی خاتون تھی۔ اللہ تعالیٰ ازراہ کرم اسے جنت کے کسی گوشے میں جگہ عطا فرمائے اسے اس بات پر آمادہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ بہت اچھی قیمت پر اپنے شیر ذرہ کو اسے ہم کہیں اور کسی ایسی جگہ اس کا سرائے افریٹ کر دے گا جس کے چاروں سے اتفاق ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ منافع ملتا رہے گا ورنہ کام بھی اس کی پسند اور آئیڈیلٹ کے مطابق ہو گا۔ اس سے میرے مذاکرات کا رخ اس طرف جا رہا تھا لیکن ساتھ ہی اس نے ملاحظہ کیا کہ اگر ہمارے درمیان کچھ ملے بھی جا جاتا تب بھی فوری طور پر اس پر عمل درآمد ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کا نکلنا باپ کچھ فیئر مشرانہ لگا گیا تھا جس پر عمل درآمد کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ ہم نے کہا۔ کوئی بات نہیں، ہم مہربانوں سے انتظار کریں گے ہم بڑے صابر لوگ ہیں۔ ویسے بھی اتنے بڑے بڑے معاملات اتنی جلدی تو ملے نہیں پاتے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور منہنگ کے اس سوز پر ہنسنے کے جہرے پر غم کے پائل چھانکے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خامے رنجیدہ سے لمحے میں بولا "افسوس کہ ہم انتہائی کرتے گئے اور اس دوران میں کسی بد بخت نے پرنس کو ٹھکانے لگا کر صرف ایک خوبصورت ہستی کو زندگی سے محروم کر دیا بلکہ حاملہ



ساری محنت بھی برباد کر دی اور ایک بہت بڑے سوے کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بھی حائل کر دی۔

جیسے احمد کے لیے میں غم کا تاثر حقیقی تھا جیسے یہ غم پیچھے ہنس کے لیے نہیں تھا بلکہ سوے کی راہ میں بڑی رکاوٹ حائل ہونے کا قاعدہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "لیکن دوسری اس سے بھی بڑی رکاوٹ کا آپ نے کیا حل سوچا تھا؟"

اس کے چہرے سے رنگ غم کا بادل فوراً چھٹ گیا۔ اس سے ایک اہم کاروباری سوال کیا گیا تھا اس لیے اس کی ذہنی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں۔ وہ ہمیں اپنا کاتے ہوئے بولا "آپ کا مطلب ہے پرنس میرا کی دوسری کمپنی؟"

"جی ہاں۔ اپنی آدھی حصے کی تو وہ پرنس میرا کی زندگی میں ہی مالک بنی اور پرنس کی موت کے بعد یوں سمجھیں کہ پرنس انڈسٹریز کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں آ گیا ہے جبکہ اس کا اپنا کنٹرول اس کے شوہر احمد پرویز کے ہاتھ میں ہے۔"

وہ دھیرے سے ہنسا "یہ بات آپ نے درست کہی۔ آپ کی معلومات بھی کافی درست معلوم ہوئی ہیں" اس نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔

"مگر پرویز ایک انتہائی شاطر 'سٹاک' منیجر اور خود غرض بزنس میں ہے" میں نے کہا "کیا آپ نے اسے پہلے ہی اپنا حصہ بیچنے پر آمادہ کر لیا تھا؟"

اس نے بڑے قہقہے سے سر ہلایا اور گویا کوئی مشکل مسئلہ کسی غالب علم کو سمجھانے کا آغاز کرتے ہوئے بولا "یہ دینا بڑی عجیب جڑ ہے سٹراٹجی۔"

"مجھے ہوش سنبھالتے ہی اس کا اندازہ ہو گیا تھا" میں نے فقرہ بولا۔

اس نے میری داخل انداز کی کاٹھڑی سے ہنسنے لگا "بات جاری رکھی" بعض اوقات یہاں وہ کام زیادہ آسانی سے ہو جاتے ہیں جو بظاہر مشکل نظر آ رہے ہوتے ہیں اور وہ کام بہت آگتے ہیں جو آسان دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو اس کی بھی ایسے آدمی سے معاملہ کرنا مشکل دکھائی نہیں دیتا جو خالص بزنس میں ہو۔ بس بنیادی طور پر اسے بزنس میں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس میں کون کون سی انسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں؟ ان کی ہمیں زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ وہ خواہ بہت قہقہے پر ہیز کرے اور دھم دھم آوی ہو اور خواہ شاطر 'منیجر' ہلاک خود غرض اور لالچی وغیرہ ہو۔ ہم اس سے نمٹ سکتے ہیں۔ بزنس میں میں۔ بلکہ تقریباً ہر انسان میں بنیادی عنصر لالچ کا ہوتا ہے اگر آپ اس کے لالچ کو پینڈل کرنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لیں تو پھر آپ اس سے کوئی بھی معاملہ کر سکتے ہیں۔"

مجھے دل میں اس کی بات سے اتفاق کرنا چاہا۔ اس نے آدھے انفسوس کے سے عالم میں ایک گرمی سانس لے کر سلسلہ

کلام جو ڈا "ہمیں سب سے زیادہ دشواری ان آئینہ نمٹ اور انٹرنیٹ کی قسم کے لوگوں سے معاملہ کرنے میں پیش آتی ہے جو کسی اتفاق یا درافت کی وجہ سے بڑے بزنس میں آجاتے ہیں ورنہ بزنس کرنا اس قسم کے لوگوں کے مقدر میں نہیں ہوتا۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی بزنس اتفاق یا درافت کے تحت ان کے پاس آجی جاتا ہے تو یہ بہت جلد اس کا تپا پانچا کر دیتے ہیں لیکن اگر کوئی آئینہ نمٹے اور انٹرنیٹ کی قسم کے باوجود بہت طویل عرصے تک بہت دولت مند رہے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کا مقدر بہت سی ذور دار ہے۔ اس صورت میں ان کی اعتقاد خود اعتمادی بہت سی بڑھ جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کاروباری معاملات میں بھی بہت ہو شیار اور ذہین ہیں۔ ایسے لوگوں سے معاملہ کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ کیا وہ اسے ساتھ ہونے پر پسیرا ہوگا کہ پرنس انڈسٹریز کو چھانے یا اس میں اپنا حصہ رکھنے میں پہلے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں اس سے معاملہ کرنے میں دانتوں پیسنے آگئے جبکہ بقول آپ کے احمد پرویز ایک نیزہا تو ہی تھا لیکن اس سے معاملہ کرنے اور اسے قابو میں کرنا ہمیں زیادہ مشکل محسوس نہیں ہوا۔ ایسے آدمیوں کا سب سے بڑا مسئلہ مددگار اور آئینہ نمٹنے کے زیادہ سے زیادہ بڑے مفادات ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا "میرا پیچیدہ تقاضا دیکھ" کا قدر مولا ہمیں اکثر بہت کارآمد محسوس ہوا ہے۔ پرنس انڈسٹریز میں اس کے شہر کی جڑ مارکیٹ ویلیو میں اضافہ مستحکم ہے اس سے اس سے جو کچھ چل چل جاتی ہے سکتے تھے ہم نے اس سے نہیں زیادہ اس کے سامنے پیچیدگی۔ اپنی تمام تر شناختوں کے باوجود وہ خالص بزنس میں ہے۔ وہ بھلا کیسے افکار کر سکتا تھا؟"

وہ جو اب طلب سے انداز میں میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بزنس صاحب! آپ یقیناً تقریر کے فن سے واقف ہیں۔ انسانوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ دیکھیں سے قائل کرنا آپ کو خوب آتا ہے۔ زندگی کے بارے میں آپ کا تجربہ بھی بیکراں معلوم ہوتا ہے۔" پھر میں نے ذرا صاف گوئی سے کام لیا "میرا اندازہ ہے کہ لوگوں کی کمزوریوں سے کھیلنا انہیں بے وقوف بنانا اور سالنے خراب دیکھنا بھی آپ خوب جانتے ہوں گے۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے رک کر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا لیکن اس کے چہرے پر ناگوارائی نہیں آئی۔ وہ بدستور شفقت اور عمل حجازی سے مسکراتا رہا۔ اس نے یقیناً میرے الفاظ کا برا نہیں سمجھا تھا بلکہ شاید اس نے انہیں بھی اپنی تعریف میں شمار کیا تھا چنانچہ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا "شاید اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر آپ نے سیاست میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا تھا لیکن انہی خاص کامیابیوں کے باوجود آپ نے سیاست چھوڑ دی؟ یہ تو ہیروئی کا نقشہ چھوڑنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور دھونک جیتے کے پٹھے سے ٹپک



مست ہیں لیکن اس وقت مست احمد پرویز نہیں تھا۔ اگر احمد پرویز  
کنشولٹ افسر بن جاتا۔ اس کے بیٹے کے تھوڑے وقت میں  
بھی کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ اس کے اور ہمارے درمیان اتنا رشتہ تھا  
یہاں ہوگی۔ یہ تھوڑے عرصے بعد وہ بھی اس  
سینئر ٹیم میں شامل ہو گئی۔ اس میں گماندہی کرتا ہوں۔  
”پھر تو وہ بھی کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ گھر کی سی بات  
ہو جائے گی“ میں نے کہا۔

”نہ“ اس نے تانیہ کی ”لیکن ہم پر اس انداز سوز کا مسئلہ  
بہرحال اس سے پہلے ہی طے کرنا چاہئے ہیں اور ہم چاہتے ہیں جا  
میں بھی احمد پرویز کا اس سے کوئی حق نہ رہے۔ ہم دوسرے دور  
آف! انٹیکسٹو اور بحال تہذیبی ترقی کے اور ان کے اوپر سے بھی  
بچہ دو سرے لوگ اس انداز کی چلائیں گے۔ یہ بات بہرحال  
طے ہو چکی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ احمد پرویز کنشولٹ افسر نہیں بن  
رہا ہے اور اس سے اس کا ادھار خیر یا ہمارے مسئلے کا حل  
نہیں ہے۔ یہ کہ ہم وہ ادھار خیر یا خیر ہی چلتے ہیں۔  
”پھر پھر مسئلہ کیا ہے اور میں اس میں کہاں فٹ ہوتا ہوں“ میں  
نے دریافت کیا۔

”ہمارے مسئلے کا حل ہی آپ کے پاس ہے“ وہ ستراتے  
ہوئے بولا۔

”میرے پاس؟“ میں نے حیرت سے کہا۔  
”ہی! آپ۔۔۔ اب اتنے معصوم نہ بنئے“ وہ اس غریب مسکراہٹ  
خاموشی مجھے دائمی سب کچھ معصوم تھا اور میں محض اس کے میرے  
امتحان بنے اور اس کے ساتھ دوستانہ چیمبر ہمارے غرض سے  
انجان بن رہا تھا۔ مجھے یہ بھی گھر تھی کہ کبھی اس وقت اپنے آپ  
کو اتنا انجان ظاہر کرتا میرے لیے نقصان کا باعث نہ ہو لیکن  
میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے تاثرات  
پر قورری دیکھنا پڑے تاہم میں نے فوری طور پر مزید کہہ بولنے سے  
پرہیز کیا۔

وہ چند سیکنڈ ٹھہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر وہ  
ڈالنے کے سے انداز میں بولا ”یہ خاموشی اور لاعلمی ترک کیجئے  
افضل صاحب! یہ بہت بڑی ذیل ہے۔ اربوں روپے کا سودا ہے۔  
اس میں بیٹھے بٹھائے۔ محض ڈرامائی زبان ملا کر کوڈ کوڈ کر ڈیپ  
کو بھی مل سکتے ہیں۔ مجھے معصوم ہے آپ کا خوش حال آوی ہیں  
لیکن اگر بیٹھے بٹھائے انسان کو کوڈ کوڈ کر ڈال رہا ہو تو اس میں کیا  
حرج ہے؟“

”بیٹھے بٹھائے تو انسان کو سودا سو بھی مل رہا ہو تو اسے بہت  
خوش ہوتا ہے اور مجھے کوڈ کوڈ کر ڈالنے پر نقصان کوئی اعتراض  
نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی ناجائز کام کے عوض نہ مل رہا ہو۔“  
”ہرگز نہیں“ وہ میری بات کاٹنے ہوئے بولا ”آپ کو نقصان کسی  
ناجائز کام کے لیے نہیں کہ جا رہا۔ بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ آپ

میں ہیں بہت اور حیرت کا اپنا ایک لہر ہوتا ہے لیکن میں اب  
اس کے لیے ہی محسوس نہیں کرتا۔ میں اپنے آپ کو وہ محسوس  
دلی طور پر محسوس کرتا ہوں۔“

”میرے لیے یہ لہر جس کی خاموشی چھائی۔ میں  
آپ کے پاس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت میں یہ انداز میں  
رہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ محسوس اپنے آپ کو ہر حال میں  
پیش کرتا۔ اس پر کب عادی تھا؟ میں اس کی پیچھے ہٹتا تھا کہ ایسا  
میں تھا۔ وہ ایک کثرت بار بار یہ وہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ ملنے  
پتے ہوئے ہیں۔ میں اس میں بیٹھ کر اپنے آپ کو ہر حال میں پیش کرتا  
الٹو۔ میں رہتا تھا۔ دوسرے بھی انہیں اس نے ایک خاص در مقام  
پانچ کر سکتا تھا۔ یہودی تھی اور اب وہ اپنی یہ معصوم سینئر ٹیم کی  
طرف سے اس انداز سوز کو خریدنے کی بات کر رہا تھا تو وہ یقینی کوئی  
محسوس آتی نہیں رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا ایسا اندازہ ہی  
بازو کچھ تھا کہ وہ تو مصطفیٰ اپنے آپ کو ایک مختار پیش کرتا ہوگا۔  
میرے سامنے تو وہ کسی وجہ سے کچھ حل رہا تھا۔ شاید صرف اس  
لچک اسے مجھ سے کوئی کام تھا۔

”آپ میرے جواب سے مطمئن ہو گئے؟“ اس نے پوچھا۔  
”یقیناً“ میں نے جواب دیا ”بات معقول ہے۔۔۔ کچھ میں اتنی

”پھر ہم اب واپسی اپنے اصل موضوع کی طرف  
لوٹیں۔“ اس نے بڑی شائستگی سے اجازت مانگی۔

”سورہ صرور“ میں نے جلدی سے کہا ”آپ سے یہ تو ثابت کیا  
آپ تھ احمد پرویز اپنی بیوی کے توسط سے پاس انڈسٹری کے  
آگے لئے کا مالک تھا۔ تک تو اسے وہ حصہ فروخت کرنے کے  
بجائے نہ کرتا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا لیکن اب۔۔۔ جبکہ  
پاس میرا ہی سوت کے بعد باقی ادھار خیر یا اس کی بیوی کے  
اجازت نہ ہوتا ہو اس تک پہنچ چکا ہے یا جلدی پہنچ جائے گا اور  
پاس انڈسٹری کو کنشولٹ افسر بن جائے گا تب بھی کیا آپ  
سے اتنی ہی آسانی سے انداز میں مکمل طور پر فروخت کرنے پر آمادہ  
نہیں گے؟ اس کے معاملات نامعقول مدد تک تو نہیں بڑھ  
ایکس کے؟“

”ویسے تو خیر نہیں نامعقول آدمیوں کو معقول بنانا بھی اچھی  
لگ آتا ہے لیکن ویسا ہی انتہائی ناگزیر حالات میں کرتے ہیں۔ جو  
ہم زیادہ مددیا خیر کرنے سے ہو سکتا ہو وہاں ہم زیادہ مددیا خیر  
کرنے سے نہیں کتراتے۔ محض رقم بچانے کے لیے ہم کبھی بھی  
ادھار نہیں کرتے۔ ہم مددیا پانی کی طرح مانتے ہیں اور پھر اسی  
تازہ میں کاتے ہیں۔ ہم زیادہ کفایت شعارانہ فیملی یا دائروں سے  
بچ کر پیدا خیر کرنے والوں کی طرح کام نہیں کرتے۔ بلکہ اگر  
کچھ روپے سے بھی کسی طرح مل نہ ہو رہا ہو اور ہمارے  
ٹیک اسٹ مل کر بھی ضروری ہو تو پھر ہم کسی اور طریقے پر غور



تیار رکھے جنسی ہے؟ میں نے ایک بار پھر بے وقوفوں کی طرح  
تصدیق چاہی۔

”بے شک! اس نے سادگی سے جواب دیا گویا کوئی معمولی  
سی بات ہو۔“

”اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف۔ کہ میں اس  
محافلے میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”سارا محافلے اب آپ پر ہی تو آن پڑا ہے کیونکہ کامران کو  
آپ نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ برائے کرم کامران کو سامنے لے  
آئیے تاکہ محاملات کے مزید الجھنے سے پہلے ہم یہ سواٹے کر لیں  
اور اس کی بہتری کے لیے بھی جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کریں۔ اس میں  
اگر آپ اپنا کچھ اثرات دکھانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر بھی کوئی  
احساس نہیں۔ اس ذیل میں کچھ رقم آپ کو بھی مل سکتی ہے۔ میں  
نے کوڑو کو ذرا بات کی تھی۔“

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا کیونکہ مجھے بڑے زور کی ہنسی اچھی  
تھی۔ وہ تنگی آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ شاید وہ  
سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی پیش کش کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔  
حقیقت یہ تھی کہ مجھے تقدیر کی ستم گرئی پر ہنسی آ رہی تھی۔

اس سے بڑی ستم گرئی کیا ہو سکتی تھی کہ کامران نے غربت  
سے تنگ آکر اپنی معیشت کے ہوتے ہوئے پرئس میرا سے چند لاکھ  
کے صلواتے کے لیے دکھاوے کی شادی کی تھی۔ اس وقت وہ  
اروں کا مالک بن سکتا تھا۔ اسے صرف چند کاغذات پر دستخط کرنے  
کی ضرورت تھی۔ مگر افسوس کہ وہ اس خرگوش کی طرح نہ جانے  
رکن تارک کو نوں کھدروں میں چھپتا پھر رہا تھا جس کے پیچھے دکاوی  
کئے گئے ہوں۔

اروں کی رقم جس کے انتظار میں تھی وہ خود نہ جانے کہاں اور  
کس حال میں تھا؟ معلوم نہیں اسے آج وہ دولت کی روٹی بھی نصیب  
ہوئی تھی یا نہیں؟ اس کے سر پر کسی چمٹ کا سایہ بھی تھا یا نہیں؟  
یہاں سب کچھ سوئی کرکھے تقدیر کی ستم گرئی پر ہنسی اچھی تھی مگر اس  
ہنسی نے میرے دل کی گرائیوں میں کہیں خراش ہی ڈال دی تھی۔  
میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ تقدیر کو انسان سے ایسا مذاق  
نہیں کرنا چاہیے!

جنی فوراً ہی وہ دستاویز اس کے ایک خاص وکیل کے پاس پہنچ  
گیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے خود اپنے بارے میں تحقیق نہیں تھا  
اور دستاویزات کی حفاظت کر سکتی ہے۔ کاغذات تیار دی  
جی کر آقا۔ اسی کے پاس رہتے تھے۔ وہ بھی ایک معتبر اور بڑا  
پیسے پرئس نے تقریر ضرورت کے تحت کامران وائٹس سے  
لپائی کی تھی اس کا کاغذ نامہ بھی اس کے پاس محفوظ ہے۔“

اس نے میری آنکھوں میں جمائے ہوئے پھر ایک لمحے توقف  
پرئس میرا کی وصیت یہ تھی کہ اس کی موت کی صورت میں  
کی سودی جائداد کا وارث اس کا شوہر ہو گا البتہ اس کی اپنی  
جائداد جو وراثت ملنے سے پہلے موجود تھی وہ اس کے بچوں  
تقسیم کی جائے گی۔ شرط یہ کہ اس کے بچے ہوں۔۔۔ بریکل  
دیتا تھا چلوں کہ ڈاکٹروں نے پرئس کو بتایا تھا کہ اس کے ہاں  
بچہ اولاد نہیں ہوگی۔ وہ واقعی دونوں شادیوں کے دوران کبھی  
بستے تو نہیں ہوئی لیکن اسے امید تھی کہ شاید کبھی وہ شادی  
سے تو ہوں بن جائے۔ اس لیے اس نے یہ شق رقم کی تھی لیکن  
ذاتی احتیاطاً یہ اضافہ کر دیا تھا کہ اگر اس کے ہاں اولاد نہ ہو تو  
کی ذاتی دولت و جائداد تین غلامی اداؤں کو دے دی جائے  
گے اس نے نام بھی لکھے تھے۔ سرجاں! یہ ہمارا موضوع نہیں  
تیار موضوع یہ ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ اب اس کے وصیت  
نامہ کے اسے اس کا شوہر اس کی سودی دولت و جائداد۔ جس  
ابتدائی میں ہے۔ کا مالک ہے۔ کیونکہ وہ اپنے والد کی شرط  
پا کر چکی ہے۔ اس کا وصیت نامہ کل صبح چند گواہوں کی  
حاضری میں کھولا جا چکا ہے۔ اور میرا یہ کتاب ضروری نہیں رہا  
کی کا شوہر کامران وائٹس ہے۔“

میرے جسم میں نہ جانے کیوں ایک سردی لہر دوڑ گئی۔ اتنی دیر  
لکھے یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آپ کا مطلب ہے کہ کامران وائٹس اس وقت اروں کی  
جائداد کا قانونی مالک ہے؟“ میں نے ایک تنک اس کی  
دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔ مجھے خود اپنا انداز بے وقوفانہ  
پہچان

”جی ہاں“ وہ ذرا مجھے لمبے میں بولا۔ ”مگر اس پر پرئس کے  
ساتھ میں مقدمہ چلا بھی ہے تب بھی ہمارے ملک کے  
بڑے صحافی اسے اس دولت و جائداد سے محروم نہیں کیا  
تھیں۔ کا مالک بن چکا ہے۔ اول تو ہمیں امید ہے کہ وہ رہا  
نہ لگے۔ اس کے خلاف کہیں زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ ہماری  
فکری یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی قیمت میں پرئس انڈسٹریز کا باقی  
بقیہ بھی نہیں فروخت کر دے۔ جس قیمت میں ہم احمد پرویز  
اسے میں۔ تو ہم اس کا کہیں بھی پڑیں گے اور پتے پتے  
پھر ہم اسے بری کر دیں گے۔“

تقدیر کہ آپ کی سینڈ کیٹ اس کے لیے اروں کو دے



”جی ہاں“ میں نے بلاناں جواب دیا ”میرے لئے یہ کسی چیز سے تم نہیں تھا۔ ایک ایسا عینہ جس کی تہ میں بہت ہی نرنگی زعفران تھی۔“

جیسے کہ نے پرنسیاں انداز میں ٹھوڑی کھانسی بڑے زور سے اٹھیں اس صبر میں بھی حقائق تھیں۔ اس کی نظروں شاید میری سوچ کی گمانوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس نے سارے کا ایک طوفانی کش لیا اور غصے غصے سے میں بولا۔ ”مفضل صاحبہ میرا خیال تھا کہ میں اور آپ اس طبقے کے قریبی دو دو انسانوں کی باتیں نہیں کی جاتی تھیں۔“

”نہیں ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن کبھی کبھی انسانی باتیں کرتا پڑتی جاتی ہیں“ میں نے طاعت سے کہا ”یوگنڈہ وہاں والا ہے نا۔ وہ بڑی عجیب و غریب طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ کبھی کبھی انسان کی زندگی کو انسانی بنا دیتا ہے۔“

اس نے سارے کا ایک طوفانی کش لیا اور چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اپنی دانست میں اس نے میرے بارے میں سب اندازے لگا لیے ہوں گے کہ میں کس قسم کا آدمی تھا لیکن اب شاید وہ ابھرنے میں پڑ گیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میرے سلسلے میں بہت سے لوگوں کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

آخر وہ دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے بولا ”اگر آپ کے خیال میں اس معاملے میں انسانی پہلو یہ ہے کہ کارمان دانش جیسے مفلس نوجوان کو جینے بچنے کے لئے ایسے ایسے دھوکے دے تو میں حضرت کے ساتھ کونوں کا کہ میرے لئے اس میں کوئی انسانیت نہیں۔ میں مالیات کی دنیا کا آدمی ہوں اور میرا تعلق صرف اس ملک کی حد تک اپنی معاملات سے نہیں ہے میں بین الاقوامی ملک بڑے دولت مندوں کے مالی مسائل کے سلسلے میں خدمات انجام دیتا ہوں۔ میں مالیات کی دنیا میں آنے دن بڑے عجیب و غریب قہارے دیکھتا ہوں۔ میں بہت سے لوگوں کو عرش سے فرش پر آتے اور فرش سے عرش کی طرف جاتے دیکھ چکا ہوں۔ آپ خود ایک بڑے بڑے بین بین ہیں۔ آپ کو بھی ان معاملات کا علم ہو گا۔“

”میں اتنا بڑا بین بین نہیں ہوں کہ اس قسم کے انسانی واقعات پر چند نعروں کے لئے بھی حیران ہوں یا مجھ بول۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”میری کسی دراصل میری جہت کا اظہار تھی۔ اگر آپ کو میری حیرت سے تکلیف پہنچی ہے تو میں حضرت خواہوں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں“ وہ جلدی سے بولا۔ اس کا بوجھ کچھ بدل گیا۔ اس میں پہلی سی خوشگوار واپس آنے لگی۔ ”دراصل آپ کی بات میری سے مجھے وہم ہوا تھا کہ شاید آپ میری پیشکش کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ ہم کا دوبارہ معاملات کو نہایت سنجیدگی سے طے کرنے والے لوگ ہیں۔“

”ہاں۔ مجھے یہ بات سمجھ گئی تھی۔“ وہ دوبارہ آہٹ لوگوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے“ میں نے سہلے

میری اس کی چند سے بعد خود بخود غمگینی۔ دل سے اٹھنے والا۔ یہ سی میرا اس کی برعکس آگئی تھی۔ میری زندگی۔ اس سے کب کب قریب واقعات سے عبارت تھی لیکن یہ واقعہ مجھے کچھ زیادہ ہی عجیب و غریب محسوس ہوا تھا جس کا براہ راست میری ذات سے تو کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں تو شخص اس کا قاتل تھا لیکن اس کی حیرت آموزی کوئی اچھا محسوس ہی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے صرف کارمان دانش کو ہی نہیں اس کی محبت منہ کو بھی زندگی۔ میری غربت اور مسائل کی مستحق تکفل سے بھگت کرنا عجیب و غریب باتیں کرتے سنا تھا۔ ”عجیب و غریب فیصلے کرتے دیکھتا تھا۔ اس کی محبت اپنی غربت اور خواہوں کی شہرت سے اتنی تک آگئی تھی کہ کسی دولت مند آدمی کی داشت بننے پر تیار ہوتی تھی اور اس کے لئے اصرار کر رہی تھی۔ کارمان خود ہندو لاکھ روپے حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کی محبت کو کاٹ کر کے ایک دولت مند عورت سے عارضی شادی کر لے رہا تھا۔ خیر دس لاکھ روپے تو بہت ہی رقم تھی اور اس رقم کے لئے ایک ارب پتی حسین عورت سے دیکھ کر کسی شادی کرنا بھی کوئی ذلت کا کام نہیں تھا۔ اس قسم کے کاموں کی توجہ جانے کتنے نوجوان اپنے دلوں میں آرزو لئے پھر رہے ہیں۔“

کارمان دانش تو شاید اس سے کہیں کمتر رقم کے لئے اس سے نہیں گھبرا گیا کام انجام دینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ وہ زندگی کے مسائل کا تو جنوں مقابلہ کر رہا تھا مگر قسمت کی مزید قسم غرضی یہ رہی تھی کہ جس سیرا جیسی عورت کے قتل کا الزام اس پر آتا۔ کھائی دینے لگا تھا جس کے بعد وہ بے جاہ غربت و غم کے مسائل کو تو بھول گیا تھا جان بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔

مجھے وہ منظر نہیں بھولتا تھا جب میں اس سے ملنے ایک نہایت صبر زدہ علاقے کے جمو پڑی نامکان میں پہنچا تھا جس کے ایک کمرے سے وہ چلے کپڑوں اور برے ہوئے شے کے ساتھ اس طرف نمودار ہوا تھا جیسے کسی گھر سے کوئی سہا ہوا جانور نکل رہا ہو۔ اس وقت تو اسے اپنے اس مزدور دوست کے گھر میں پناہ بھی مل گئی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا۔ اب وہ کہیں اس سے بدتر حال میں نہ ہو۔ اس وقت شاید اس کا کوئی جاننے والا بھی اسے وہاں سو روپے اڑھار دینے پر تیار نہ ہوتا لیکن خود اس سمیت یہ بات کسی کے دہم دہان میں بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ چند مظلوم ارب پتی اسے اوروں میں دے کر بھی واپس نہ لینے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ میری واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس قسم غرضی پر ہنسوں نہیں تو کیا کہوں؟ اس وقت اگر یہ خبر کوئی جا کر خود کارمان کو بھی سنا تھا تو شاید وہ دھو اتوں کی طرح قہقہے لگنے لگتا۔

جیل احمد بدستور عقلی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً جب اس نے محسوس کیا کہ میں پوری طرح سنجیدہ ہو چکا تھا تو وہ ذرا ہلکے سے لہجے میں بولا ”کیا میں نے آپ کو کوئی لطیفہ سنایا تھا۔“

بات ہے؟ ہم جیسے فراخ دل لڑکے آپ کو آج کی دنیا میں بہت کم  
میں کے جہاں ہزار ہزار کے لئے انسان انسان کا گناہ کرنے کے  
ورپے بہت ہیں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہم شاہانہ انداز میں  
دوبارہ خرقہ کرنے والے لوگ ہیں۔ ہم کوئی کام نجوسی سے نہیں  
کرتے۔

وہ جتن کے جھٹلے میں بات کرتا تھا۔ شاید اپنے کلائنٹس کی  
ترجمانی کرتے وقت وہ اپنے آپ کو بھی انہی میں شامل کر لیتا تھا۔  
ان کی فیاضی اور کشادہ دلی اس کی اپنی فیاضی اور کشادہ دلی ہوتی  
تھی۔ ان کی دولت مندی اس کی اپنی دولت مندی تھی۔ ان کی  
خطرہ کی اس کی اپنی خطرہ کی تھی۔ یہ باتیں انسان اور ایسا جذبہ  
کبھی نہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ یہ شخص اس کی  
خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کے کلائنٹس نے واقعی سب کچھ اس پر  
چھوڑ رکھا ہو گا۔ وہ ان کی ناک کا پاں ہو گا اس لئے اس انداز گفتگو  
میں اسے حق پر جانب سمجھا جاسکتا تھا۔

”کیا واقعی کام صرف اتنا ہی ہے کہ میں کامران دانش کو  
سانے لے آؤں؟“ میں نے تصدیق چاہی ”اس کے سوا آپ کچھ  
سے کچھ نہیں چاہتے۔“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ اس نے فوراً جواب دیا اور اس کی  
آنکھوں میں امید کی چمک ابھری۔ شاید اس نے محسوس کیا تھا کہ  
میں ادھر ادھر کی باتیں فحتم کر کے آزادی کا اظہار کرنے والا تھا۔

”آپ کا خیال ہے کہ کامران دانش کو میں نے کیس بچھا رکھا  
ہے؟“ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں مزید پوچھا۔

”ہاں۔ ہمارا یہی خیال ہے اور میں اس کا اظہار بھی کر چکا  
ہوں۔ اسی لئے آپ کو اس ملاقات کی ذمہ داری گئی ہے“ وہ ہلکا  
تال بولا۔

”آپ کے خیال میں مجھے اس گدھے کا اچار ڈالنا تھا یا  
مزید؟“ میں نے ملاٹھت سے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ زرا حیران ہوا۔

”مطلب یہ کہ کسی اعتبار سے وہ چند اس قافلہ ہے کہ میں  
اسے چھپا چھپا کر رکھوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ ایک لمحے کے لئے کڑکرایا لیکن پھر سنبھل کر بولا ”یہ تو مجھے  
معلوم نہیں۔ میں اسے ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ میں نے تو اسے کبھی

دیکھا بھی نہیں۔ البتہ میں نے اس کے بارے میں معلومات کرائی  
تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ وہ دو اپنی ساعظیم یافتہ ایک فریب نوجوان

ہے جیسے کہ ہمارے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو  
اکثر بے روزگار رہتے ہیں۔ اسی قسم کے نوجوان فرسٹریشن کا شکار

ہو کر نہ جانے کس کس کے آواز کاربن کر اپنی اور دوسروں کی زندگی  
جنم بنائے رکھتے ہیں۔“

تب ایک نئے خیال نے میرے ذہن میں سر اُبھارا۔ میں نے  
پوچھا ”آپ کو خیال نہیں آیا کہ اس قسم کے نوجوان کو آپ خود  
تلاش کر کے زیادہ آسانی سے اس قسم کی کسی ذیل کے لئے آمادہ

ہو سکتے ہیں؟“ اس نے قسم کھائی۔

”چلنے میں سنجیدہ ہو جانا ہو۔ بہت زیادہ سنجیدہ۔“ میں  
نے اپنے ہرے پر حد سے زیادہ سنجیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی  
جس نے میرے پیشہ تھا کہ میرے ہرے پر سنجیدگی سے زیادہ رنجیدگی  
یا اہمی ہوئی۔

”پائش غیب“ وہ گویا مصانیت سے سرھاتے ہوئے بولا ”تو پھر  
ہر روز کام کی بات کی طرف آتے ہیں۔“

”میں تو سیری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس میں کام کی بات کہاں  
ہے“ میں نے کہا ”میرا مطلب ہے کہ میں اس معاملے میں کہاں  
نہ ہوتا ہوں؟“

”اس سادگی پر کون نہ سر ہائے اے خدا“ وہ ٹھنڈی سانس  
لے کر مسکراتے ہوئے بولا ”افضل صاحب! آپ بہت اچھی سمجھ

تھے ہیں کہ ہمیں آپ سے کیا کام ہے لیکن آپ بن رہے ہیں۔  
اگر شاید مجھے یہ پتا چلا جائے کہ آپ نہیں بننے کی کوشش کر رہے  
ہیں۔“

”بنانا اور بگاڑنا تو آپ والے کا کام ہے مجھ صاحب! یہ مجھ  
زب کے بس کی بات کہاں“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا

”ویسے بھی اکثر لوگوں کو جو کچھ ہوتا ہے وہ بن چکے ہوتے ہیں۔  
انہیں مزید بگاڑنا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔“

”چلنے ہم عمارت بھی اپنے بننے اور بگڑنے کی بات نہیں  
کرتے۔“ وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا ”ہم صرف کام

کے بننے اور بگڑنے کی بات کرتے ہیں۔ آپ یقیناً اچھی طرح سمجھ  
تے ہیں کہ ہمارا کام بنانا یا بگاڑنا آپ کے اختیار میں ہے۔ میں آپ

آہستہ و آستخ الفظ میں تو بتا چکا ہوں کہ ہمیں کامران دانش کی  
انوریت ہے جسے آپ نے کیس بچھا رکھا ہے۔ آپ سے ہمیں

صرف اتنا سادی کام ہے کہ اسے سانے لے آئیے ہم خودی اس  
سے تمام معاملات طے کر لیں گے۔ اگر آپ اس کے مفادات کی

انفخت کے لئے اس ذیل کے دوران میں اس کے ساتھ رہنا چاہیں  
تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بھی میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں

کہ اس کام میں اگر آپ اپنا کدو نہ کدو کا اثر نہ رکھنا چاہیں تو  
ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔“

یہ بات وہ واقعی پہلے بھی کہہ چکا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا  
تھا کہ شخص اتنے سے کام کے لئے وہ اتنی کشادہ دلی اور فیاضی کا

ظاہر کر رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید بات ابھی عمل میں ہوئی  
گئی شاید اس ذیل کے کچھ اور پہلو بھی تھے جن کی وہ وضاحت

کرنے والا تھا لیکن اگر بات صرف اتنی ہی تھی تو پھر واقعی اس کی  
گتنگ کر جان کر بننے والی تھی۔

اسے خود بھی اپنی کشادہ دلی اور فیاضی کا احساس تھا اور وہ  
سے جنائے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے خاموش دیکھ کر بولا ”افضل

صاحب! ہم آں۔ اس میں اتنی سوچ بچار اور ہچکچاہٹ کی کیا

نہیں رہتا ہو گا۔ بہر حال ان سب اطلاعات کی بنا پر ہم اسی پر  
 پہنچے کہ کسی درجہ سے آپ کی بہت زیادہ ہمدردیاں اس نوجوان کے  
 ساتھ ہوں گی اور اب آپ نے ہی اس کے تحفظ کی خاطر اسے  
 غائب کر رکھا ہو گا۔ آپ کا ارادہ مناسب وقت پر اسے سامنے لانے  
 کا ہو گا۔ ہم نے سوچا کہ وہ مناسب وقت لانے میں اہم کردار ادا  
 کر سکتے ہیں اس لئے ہم نے آپ سے رابطہ کیا۔ اب چونکہ بات  
 چیت آپ کے توسط سے ہونا تھی اس لئے ہم نے سوچا کہ وہ آپ  
 کے اور ہمارے شایان شان طریقے سے ہونی چاہئے۔ کاغذ ان سے  
 براہ راست معاملہ ہوتا تو ہم اس سے اس کی اوقات کے مطابق  
 بات کرتے۔ اگر وہ زیادہ چالاک بنایا ہوا تھ تو اس سے ٹھکانا دکھائی دیتا تو پھر  
 ہم ہندرج اپنی پیشکش پڑھاتے چلے جاتے لیکن ظاہر ہے آپ جیسے  
 لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر تو اس طرح بات چیت کامیاب نہیں ہو سکتی  
 جس طرح عورتیں سبزی بازار تازہ کرتی ہیں۔“

اس کے استدلال میں وزن تھا اور وہ بڑی معقولیت سے بات  
 کر رہا تھا۔ کچھ چالاک کی اور شاطرانہ پن تو ہر کاروباری گفتگو کے پیچھے  
 کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہاں بھی تھا اور میں اسی کے مختلف  
 پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں خاموش رہا تو ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”اگر آپ کو  
 اندیشہ ہے کہ اسے پرنس سمیرا کے قتل کے الزام میں زیادہ سی  
 رگزنے کا کوئی ششک ہے۔“

کر سکتے تھے شاید بہت سی سسٹے داسوں آپ کا کام ہو جاتا۔ وہ بے  
 چارہ تو شاید چند کروڑ کا ذکر سن کر بھی خوشی سے مرنے کے قریب  
 ہو جاتا۔“

”ہم آپ کے سامنے معصوم بچے کی کوشش نہیں کریں گے۔“  
 وہ گویا دانتہ اری سے اعتراف کرنے لگا ”ہم لاکھ فراخ دل اور شاہ  
 خرما سکی۔۔۔ لیکن ہمیں پسلا خیال کیا آیا تھا۔ نظری ہی بات  
 تھی۔ بڑے سے بڑا حاتم خالی بھی پہلے اس قسم کی کوشش کرنے کے  
 بارے میں ضرور سوچے گا۔ کسی کو تلاش کرنے کے سلسلے میں  
 ہمارے وسائل بھی کچھ کم نہیں ہیں لیکن ایک ہی دن کو شش کر کے  
 ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور جو ذیل ہم کرنا  
 چاہ رہے ہیں اس میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم وقت ضائع  
 کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بہت سے معاملات میں نہ جانے  
 کیوں بلاوجہ ہی بہت سی بد نصیبیاں آڑے آنے لگتی ہیں۔ یہ بھی  
 کچھ ایسا ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ پرنس سعید کے وصیت نامے کی  
 درجہ سے ہمیں پہلے ہی پرنس سمیرا کے ساتھ اس ذیل کو مکمل  
 کرنے میں تاخیر ہو گئی ورنہ یہ معاملہ براہ راست مالکن سے ہی طے  
 پا جاتا۔ اب یہ وراثت جس کے ہاتھ میں گئی ہے وہ ویسے ہی نظروں  
 کے سامنے سے غائب ہو گیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اسے تلاش  
 ہی کرتے رہ جائیں اور یہ معاملہ اب کسی اور وجہ سے بگڑ جائے۔“  
 ”چنانچہ آپ نے اپنی داستان میں اس تک پہنچنے کا اشارت



کٹ تلاش کیا؟" میں نے گہری سانس لے کر صوفے پر اپنے آپ کو ذرا اٹھٹلا چھوڑ کر جھینٹے ہوئے کہا "آپ کے خیال میں میری مدد سے آپ کا مران تک نہایت آسانی سے اور کم سے کم وقت میں پہنچ سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ خیال تو ہمارا یہی تھا لیکن آپ کو قائل کرنا اور مٹانا تو کارمان کو تلاش کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام محسوس ہو رہا ہے۔" وہ مسخاندہ لہجے میں بولا "گو کہ ہمیں اندازہ تھا یہ شارٹ کٹ ہمارے لئے منجھا ثابت ہو گا لیکن ہم نے سرائے کی پروا نہیں کی۔ ہم نے سوچا کہ کام بگڑ جانے کی نسبت کام صحتے داسوں ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے ہم نے نہایت دوستانہ فضا میں آپ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ سرائے کو ہم نے اس لئے بھی مسئلہ نہیں بنایا کہ آج ہم جتنا لگا نہیں گئے اس سے نہ جانے کتنا زیادہ کمائیں گے۔ اور کب تک کھاتے رہیں گے۔ پرنس اعظمیٰ سونے کے اندر سے دینے والی مرغی ہے۔"

"میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ وہ چھند کارمان کس اعتبار سے اس قائل ہے کہ میں اسے چھپا چھپا کر رکھوں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ کو اس کی بے گمانی پر بڑا اصرار تھا اور آپ اس کی بہت حمایت کر رہے تھے بلکہ آپ تو باضابطہ طور پر خود عدالت میں جا کر اس کی وکالت کے لئے بھی تیار تھے۔ حالانکہ میرے خیال میں آپ نے ایک مدت سے وکیلوں والا کالا کوٹ

پہنا رکھا ہے۔" میں نے اس بات کی توجہ نہ دیا کی اس نے آپ کی طرف سے نکال دیں۔ ہمارا اور آپ کا اثر رسوخ مل کر اسے قتل کی دس بیس وارداتوں کے الزام سے تو بچا ہی سکتا ہے۔ گو کہ میرا جیسی تو اکیلی عورت کا قتل بھی دس بیس دوسرے آدمیوں کے قتل پر بھاری ہے۔۔۔ اس کے باوجود ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے اور ہمیں معلوم ہے آپ بھی کچھ ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔"

"اگر بات صرف اثر رسوخ استعمال کرنے کی ہو تب تو شاید اس قتل کے الزام سے چھڑانے کے لئے آپ کا یہ خادم اکیلا ہی کافی ہو۔۔۔ خواہ وہ قتل پرنس میرا ہی کا کیوں نہ ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں وہ ہمارے اثر رسوخ کی وجہ سے نہیں بلکہ جج اپنی بے گمانی کی وجہ سے اس الزام سے بری ہو۔" میں نے دھجے لہجے میں کہا۔

"اگر وہ واقعی بے گناہ ہے تو پھر کام بہت ہی آسان ہو جائے گا۔" وہ جلدی سے بولا "اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ وہ حوالات عدالت جیل میں کسی دیوانی لہیا یا بڑے سیاسی لیڈر کی طرح غائب سے رہے گا۔ اسے فی دی اور اے سی تک کی سوتیلیں حاصل ہوں گی۔ خدمت گار بھی ہو گا۔ کھانا اپنی پسند کا ملے گا۔"

"کیس ایسا نہ ہو کہ وہ جیل سے واپس آنے سے انکار کر دے؟" میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

وہ دھیرے سے ہنسا اور بولا "اس کی چند دن پہلے کی اوقات کے مطابق تو یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن اب وہ خود بھی تو کوئی معمولی آدمی نہیں رہا۔ وہ پرنس سعید کے آگے درٹے کا مالک ہے

اور یہ کوئی معمول بات نہیں ہے۔ میں آپ کو نہیں دلا ہوں۔  
مقدمے کی سماعت بھی کم سے کم مدت میں ختم ہو جائے گی۔ اگر کسی  
جائز یا ناجائز کام کے لئے اپنا اثر سوخ استعمال کرنا آپ کی عادت  
نہیں ہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ کامران سر حال بن جائے گا۔ پس  
اب آپ اسے سامنے لے آئیے۔

میں نے ایک آہ بھری اور غمناک لمبے میں کہا "میں آگرو  
مسئلہ انگ رہا ہے۔ آپ کی پیشکش اتنی عمدہ اور سب کے لئے اتنی  
فائدہ مند ہے کہ فوراً کہیں سے کامران کو پکڑ کے لاؤں اور آپ کے  
سامنے پیش کر دوں لیکن افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"  
"کیوں نہیں کر سکتے؟" اس نے ایک تھک میری طرف دیکھتے  
ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے" میں نے سادگی  
سے جواب دیا "کتنا آسان سا جواب ہے آپ کے سوال کا۔۔۔  
لیکن ہم ایسی پہلو پر بات کئے بغیر ساری باتیں کئے جارہے ہیں۔ آپ  
نے بہت سی کمزوری بنیادوں پر یہ مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ میں نے  
اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اسے  
کہیں نہیں چھپا رکھا۔ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔ میں تو  
آپ کی اس عظیم الشان پیشکش سے پہلے ہی اسے منظر عام پر لانا  
چاہتا تھا۔ میں نے اس کے لئے اپنی سی کوشش بھی کی تھی لیکن میں  
اس پر اعتماد کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف سے

بائی تھی اور اپنے لئے مسافری کھربے کرنے تھے بلکہ وہ نہیں  
سامنے پیش ہونے کے تصور سے اس کی مدد نہ ہو رہی تھی۔ اس  
کے مقابلے میں اس نے ہارنا چاہنے کو ترجیح دی حالانکہ میں نے  
بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا ہتھیار نہیں چلے گا۔  
میں نے دباؤ اندازی سے بتایا۔

"اور وہ آپ کے سمجھنے سے بھی قاصر ہیں ہوا؟" نہیں  
انہی بے چینی سے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ آخری بار میں بولا "تو افسوس۔۔۔ میں  
اس بات پر یقین بری نہیں کر سکتا۔"

"آپ کو یقین دلانے کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا؟" میں نے  
یکدم ہی سر پیٹے میں کہا "کیا مجھے آپ کا یہ سفید ہاتھ سے بھر دے  
دیوار سے ٹکرائے؟"

"کیا مطلب؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔ شاید اس نے سوچا بھی نہیں  
تھا کہ میں یوں اچانک بھی پڑی سے اتر سکتا تھا۔

"مطلب یہ کہ بعض اوقات کوئی شخص کسی صحیح بات کو بھی  
حسیم کر کے نہیں دے رہا ہوتا۔ ایسے میں اگر اس کے بال سٹکی میں  
جکڑ کر دو چار مرتبہ اس کا سر زور زور سے دیوار سے ٹکرایا جائے تو  
اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی اس کی کھوپڑی ٹھکانے پر آجاتی ہے اور وہ  
صحیح بات کو مان لیتا ہے" میں نے گویا کسی نا سمجھ بچے کو کوئی سائنسی  
فارمولہ انما بہت نرمی و شفقت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

غافل ہو اور وہ نکل بھاگا۔ اس وقت سے اب تک میں خود اسے تلاش کرانے کے لئے نہ جانے کیا کیا جن کرچکا ہوں۔ اب بتائیں میں آپ کے سامنے کامران کو کہاں سے لاؤں؟

میں خاموش ہوا تو کمرے میں گھرا سکوت چھا گیا لیکن اب اس سکوت میں تناؤ اور کشیدگی کی آمیزش تھی۔ وہ پلٹ جھپکائے پھر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یقیناً میرے بارے میں پہلے بھی کچھ اچھے خیالات تو نہیں تھے وہ صرف کاروباری مصنفین اور اپنے لائف اسٹائل میں شامل ہو جانے والی منافقت کے تحت رنگ بدل بدل کر مجھ سے بھی محبت بھی کر جوئی ابھی اپنائیت اور کبھی شفقت سے بات کر رہا تھا لیکن اب تو جیسے میرے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی اچھا خیال بالکل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ منافقت سے کام لیتے ہوئے مسکراتا بھی بھول گیا تھا۔

”آپ تو شاید میری بات کا یقین نہیں آیا“ میں نے طعنت سے کہا۔

اب اس نے منافقت سے کام نہیں لیا اور صاف صریح بولا ”اس میں یقین کرنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کامران کو اپنی حیثیت کا علم نہ ہو۔ اپنی حیثیت اور وسائل کا علم ہوتے ہوئے وہ آپ جیسے مضبوط ترافی کا سارا چموز کر کیسے بھاگ سکتا تھا؟“

”میں اسرار کر رہا تھا کہ وہ پولیس کے سامنے پیش ہو جائے کیونکہ میرے خیال میں اس نے فرار ہو کر اپنی پوزیشن مضبوط

وہ دھڑلے سے ہنسا لیکن اس جیسی کے دوران میں اس کے دانت کسی بھیڑیے کے دانتوں کی طرح ہر تھون کے عقب سے جھانکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ ایک نف میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا ”آپ مذاق کے معاملے میں بھی کافی بڑا متدبیرانہ فیصلہ صاحب!“

”کون کم بحث مذاق کر رہا ہے“ میں نے طعنت سے کہا۔  
”اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ ہم دیکھیں گے۔۔۔“ اس نے بے پروائی سے ہاتھ بنایا اور ستراتے ہوئے بات کو بظاہر مذاق میں ہی ماننے کی کوشش کی لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ بات سیدھی اس کے دل پر لگی تھی۔ تاہم ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نرم لہجے میں بولا ”میں امید تھی کہ اس معاملے میں ہمیں جموت سننے کو نہیں ملے گا“ افسوس صاحب!۔۔۔“ مجھ بے شک نرم تھا لیکن اس میں ہلاکت سرور تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے اس سے بھی زیادہ مزید بولنے کو کہا ”آپ کا مطلب ہے میں جموت بول رہا ہوں جیسا اچھا ایڈووکیٹ صاحب!“

مجھے زندگی میں شاید صرف دو چار ہی ایسے افراد سے واسطہ پڑا تھا جنہوں نے میرے اس طرح گھومنے کے جواب میں غور نہیں کیا تھا۔ وہ ان میں سے ایک تھا۔

”یقین ممکن ہے“ وہ آکھ جھپکے پھر بولا۔  
میں نے اس کی میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون کا ایک کارڈ لیس چٹا

جانیں گی۔"

میں نے اس کی میز کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر مجھتے ہوئے  
حقارت سے کہا "مجھے بتایا گیا تھا کہ میں نے دس گیارہ ماہ کی عمر میں  
چٹا شروع کیا تھا۔ اس وقت شاید میری انگلیں کانپی ہوں۔ ہوش  
سنبھالنے کے بعد سے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری انگلیں کانپی  
ہوں۔ اور مچھ کسی کا نام سن کر انگلیں کانپنے کا تصور تو میرے  
لئے کسی لیٹنے سے کم نہیں۔ پھر بھی۔۔۔ صرف تمہارا دل رکھنے کے  
لئے پوچھ رہا ہوں۔ کوئی ایک آدمہ نام تو ایسا بتا دو جسے سن کر  
تمہارے خیال میں انگلیں کانپنے کی نوبت آسکتی ہو؟"

وہ ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر گویا کسی فیصلے  
پر پہنچتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "ان میں سے ایک نام سینہ واحد  
کا ہے۔"

یہ نام سننے ہی میرے ذہن میں یادوں کا ایک رطا سا آنا۔  
سینہ واحد ایک ایسی شخصیت تھا جسے کسی تفصیلی تعارف کی  
ضرورت نہیں تھی۔ کسی بھی محفل میں اس کا صرف نام ہی لیا جاتا  
کافی تھا۔ سننے والے کے ذہن میں سارا ایسا منظر خود بہ خود آجاتا  
تھا۔ اس وقت جس قسم کی کنگھو ہو رہی تھی اسے مگر نظر رکھتے ہوئے  
کم از کم جمیل احمد کے منہ سے اس کا نام سن کر اگر میری ہاتھوں  
میں لرزش نہیں تو درگ دے میں ایک خفیف سی سنسنی ضرور ہونی  
چاہئے تھی۔ اور شاید دوڑی بھی ہو لیکن میں اس کی طرف توجہ  
نہیں دے سکا۔ میں یادوں کے ریلے میں زیادہ الجھ کر رہ گیا۔

تھا۔ اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ ملک کی بہت سی بڑی بڑی  
جانی بچائی سیاسی اور سماجی شخصیات اپنی تقریبات میں اس کی آمد کو  
اپنے لئے ایک اعزاز تصور کرتی تھیں۔

میرے ذہن میں یادوں کا جو رطا آیا تھا اس نے مجھے ماضی کی  
بہت دور افتادہ بھول بھلیوں میں پہنچا دیا تھا۔ مجھے دو وقت یاد آگئے  
تھا جب میں نوجوان تھا اور سینہ واحد والی لٹلڈ میں ہی قدم جمائے  
کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا کراچی کا وہ پہلا یاد و سرا پکڑ تھا۔ انہی  
دنوں میں راجیند کے عشق میں گرفتار ہوا تھا اور وہ عشق آج بھی  
میرے پاؤں کی زنجیر تھا۔

سینہ واحد کا کامدیار ان دنوں بھی کراچی لاہور پشاور اور نہ  
جانے کہاں کہاں پھیلنا ہوا تھا لیکن مجھے "ابھرتے" ہوئے نوجوان کی  
شہرت کی خوشبو اس تک بھی جا پہنچی تھی اور اس نے کسی رابطے  
کے ذریعے مجھے بلوایا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ اپنا  
کامداری شریک بنانا چاہتا تھا۔ اس وقت کو کہ میری اختلاقیات کچھ  
زیادہ بلند نہیں ہوئی تھیں اور کسی بھی طریقے سے جلد از جلد تنہا  
کرنے کی تمنا میرے دل میں مچل رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں  
میرے منہ سے انکاری نکلا تھا۔ قدرت نے میرے حق میں پہلے  
یہ کیا تھا۔

اب میرا یہ ایمان اور فکریہ تھا کہ انسان کو اتنا کچھ ہی ملتا ہے  
جتنا اس کے مقدر میں ہوتا ہے لیکن کم از کم یہ اس کے اپنے اختیار  
میں ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز قانونی اور حلال طریقے اختیار

سینہ واحد کی شہرت ملک کے سب سے بڑے اسٹورگن کی تھی۔ وہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں سونے اور الیکٹرونکس کی اس نقل و حرکت کا بادشاہ تھا جسے اسمگلنگ بھی کہہ سکتے تھے اور ناجائز یا متوازی تجارت بھی۔ کہنے کو اس کی شہرت اتنے بڑے اسٹورگن کی تھی لیکن آج تک نہ تو وہ گرفتار ہوا تھا اور نہ ہی صحیح معنوں میں اس پر کوئی مقدمہ چلا تھا۔

اس کے ملک سے باہر جانے یا واپس آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب 'جماں چاہتا تھا' چلا جاتا تھا۔ اس کے وہ پردہ دہندے تو اپنی جگہ تھے 'ان میں سے بھی بہت سے دہندوں کی شاید بچہ جیسے باخبر آدمی کو بھی ہوا نہ تھی ہو' لیکن ان سے قطع نظر اب تو اس کے جائز اور قانونی کاروباروں کا بھی کچھ شمار نہیں تھا۔ پھر نہ سونے کا رغلانے اور کارپوریشنیں تو وہ اس طرح خرید لیتا تھا جیسے بچے گٹ جمع کرتے ہیں۔ غیر ممالک میں اس کے دفاتر تھے۔

نمایب مستبر ذرائع سے مجھے معلوم تھا کہ ہر حربہ ملک میں احتیاجات سے پہلے اس کی تجویزوں کے منہ کھل جاتے تھے اور بڑے بڑے سیاسی گمراہ اس کے در دولت پر ماضی دے کر فیضیاب ہوتے تھے اور بعد میں وزیر سفیر بن کر 'نیکو کار' نہ بنی سے انسانی کی مداخلت کو آگے بڑھاتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ اسے سرکاری نوکروں کی غیر سرکاری تقریبات میں وی ٹی وی پی پی پی ہونے کو ملتا تھا بلکہ ایسی اکثر بڑی بڑی شخصیتوں کی دعوت پر تو وہ جاتی نہیں جاتا

نہرے یا ناجائز غیر قانونی اور حرام طریقے سے اپنے حصے کا مال و متاع حاصل نہرے انسان کے سامنے راستے دونوں کھلے ہوئے ہیں۔ کوئی راستہ خواہ خواہ آسان نظر آ رہا ہو آج ہے اور کوئی راستہ خواہ خواہ مشکل دکھائی دیتا ہے حالانکہ حقیقت میں دونوں ہی راستوں پر یکساں دشواریاں ہوتی ہیں۔ کسی بھی ایک راستے پر چلنا انسان کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اسی لئے 'آ' اور 'سزا' کا نظام رکھا گیا ہے ورنہ تو انسان یہی کہہ کر خدا کے سامنے بری الذمہ ہو سکتا تھا کہ میں نے تو وہی کچھ کیا جو میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا 'اس لئے اس میں میرا کیا قصور؟

مجھے جو نئی تھوڑی سی مثل آئی تھی میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا تھا اور پھر پٹ نہر اس طرف نہیں رکھا تھا۔ اس کے باوجود میں نے شوق کی تھی۔ اگر میں سینہ واحد کے در سایہ نہ نہر ترقی کرنا تو آج میری شہرت بھی اسی قسم کی ہوتی اور سفیر کی مجلس آج بھی میری ہم سفر ہوتی خواہ میں اسے بے بسی کے کہتے ہی ٹھکرے ٹھکرے ڈونڈے کر سلاتے کی کوشش کرنا کیونکہ بعد کے دنوں میں یہ توئے ہوئی گا تھا کہ میرے پاس سفیر نام کی چیز موجود تھی۔

بہر حال سینہ واحد سے شہر کے ایک مخبان آباد علاقے کی خاصی اونچی سی عمارت کے اس آفس میں 'جماں دہشتی' نہ جانے کیوں بہت کم تھی 'مجھے اپنی وہ پہلی ملاقات آج بھی یاد تھی۔ اسی کے بعد بھی دو تین حربہ قلعہ ذرائع سے سینہ واحد کے بیانات

نہیں رہتا ہو گا۔ بہر حال ان سب اطلاعات کی بنا پر ہم اسی سوچنے کے کسی وجہ سے آپ کی بہت زیادہ ہمدردیاں اس نوجوان کے ساتھ ہوں گی اور آپ نے ہی اس کے تحفظ کی خاطر اسے غائب کر رکھا ہو گا۔ آپ کا ارادہ مناسب وقت پر اسے سامنے لانے کا ہو گا۔ ہم نے سوچا کہ وہ مناسب وقت لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اس لئے ہم نے آپ سے رابطہ کیا۔ اب جبکہ بات چیت آپ کے توسط سے ہوتا ہے اسی لئے ہم نے سوچا کہ وہ آپ کے اور ہمارے شایان شان طریقے سے ہونی چاہئے۔ کارخانے سے براہ راست معاملہ ہوتا تو ہم اس سے اس کی اوقات کے مطابق بات کرتے۔ اگر وہ زیادہ چالاک بننا یا ہاتھ سے ٹکنا دکھائی داتا تو پھر ہم ہتھ دینا اپنی پیشکش پر ہاتھ چلے جاتے لیکن ظاہر ہے آپ جیسے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر تو اس طرح بات چیت کا سبب نہیں ہو سکتی جس طرح عورتیں بڑی بھارتیہ تارکین ہیں۔

اس کے استدلال میں وزن تھا اور وہ بڑی معقولیت سے بات کر رہا تھا۔ کچھ چالاک اور شاطرانہ پن تو ہر کاروباری شخص کے بچے کا فرض محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہاں بھی تھا اور میں اسی کے تحفظ پر دوش پور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں خاموش رہا تو ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "مگر آپ کو اندیشہ ہے کہ اسے پرنس میرا کے قتل کے الزام میں زیادہ ہی رگڑنے کی کوشش کی جائے گی تو اب یہ خیال بھی آپ دل سے نکال دیں۔ ہمارا اور آپ کا اثر و رسوخ مل کر اسے قتل کی دس بیس وارداتوں کے الزام سے توجہ دیا جاسکتا ہے کہ کوئی میرا بھی تو اسکی عورت کا قتل بھی دس بیس دوسرے آدمیوں کے قتل پر ہماری ہے۔ اس کے باوجود ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے اور ہمیں معلوم ہے آپ بھی کچھ ایسے کئے گئے ہوں گے نہیں ہیں۔"

"مگر بات صرف اثر و رسوخ استعمال کرنے کی ہو تب تو شاید اس قتل کے الزام سے بچنے کے لئے آپ کا یہ خادم اکیلا ہی کافی ہو۔ خواہ وہ قتل پرنس میرا کا کیوں نہ ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں وہ ہمارے اثر و رسوخ کی وجہ سے نہیں بلکہ جی جی اپنی بے گناہی کی وجہ سے اس الزام سے بری ہو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر وہ واقعی بے گناہ ہے تو پھر کام بہت ہی آسان ہو جائے گا۔" وہ جلدی سے بولا "اس کا بال بھی بیک نہیں ہو گا۔ وہ حالات میں جیل میں کسی ویسی ڈی لہذا بڑے سیاسی لیڈر کی طرح غائب سے رہے گا۔ اسے نی دی اور اے سی تک کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ خدمت گار بھی ہو گا۔ کھانا اچھا پسند کا ملے گا۔"

"کیس ایسا نہ ہو کہ وہ جیل سے واپس آنے سے انکار کر دے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

وہ دھیرے سے جہاں اور بولا "اس کی چند دن پہلے کی اوقات کے مطابق تو یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن اب وہ خود بھی تو کوئی معمولی آدمی نہیں رہا۔ وہ پرنس سید کے آگے دڑنے کا مالک ہے

کر سکتے تھے۔ شاید بہت ہی سستے داموں آپ کا کام ہو جاتا۔ وہ بے چارہ تو شاید چند کروڑ کا ذکر سن کر بھی خوشی سے مرنے کے قریب ہو جاتا۔"

"میں آپ کے سامنے معصوم بننے کی کوشش نہیں کروں گا۔" وہ گویا دانتہ اڑی سے اعتراف کرنے لگا "مگر لاکھ فراخ دل اور شاہ خرمی ہیں۔ لیکن میں پہلا خیال ہی کیا تھا۔ نظریاتی بات تھی۔ بڑے بڑا عالم خالی بھی پہلے اس قسم کی کوشش کرنے کے بارے میں ضرور سوچے گا۔ کسی کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ہمارے وسائل بھی کچھ کم نہیں ہیں لیکن ایک سی دی دن کوشش کر کے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور جو ذیل ہم کرنا چاہ رہے ہیں اس میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم وقت ضائع کرنے کے محفل نہیں ہو سکتے۔ بہت سے معاملات میں نہ جانے کیوں بلاوجہ ہی بہت سی بیذہبیاں آڑے آنے لگتی ہیں۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ پرنس سید کے وصیت نامے کی وجہ سے ہمیں پہلے ہی پرنس میرا کے ساتھ اس ذیل کو مکمل کرنے میں تاخیر ہو گئی ورنہ یہ معاملہ براہ راست مالکن سے ہی ملے پاتا۔ اب یہ وراثت جس کے ہاتھ میں گئی ہے وہ ویسے ہی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اسے تلاش ہی کرتے رہ جائیں اور یہ معاملہ کسی اور وجہ سے بگڑ جائے۔"

"چنانچہ آپ نے اپنی داستان میں اس تک پہنچنے کا شارت کت تلاش کیا؟" میں نے گہری سانس لے کر صوفے پر اپنے آپ کو زرا ڈھیلا چھوڑ کر جھپٹے ہوئے کہا "آپ کے خیال میں میری مدد سے آپ کا مران تک نہایت آسانی سے اور کم سے کم وقت میں پہنچ سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ خیال تو ہمارا یہی تھا لیکن آپ کو قائل کرنا اور مقرر کرنا مران کو تلاش کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام محسوس ہو رہا ہے۔" وہ مسافانہ لہجے میں بولا "مگر کہ ہمیں اندازہ تھا یہ شارٹ کٹ ہمارے لئے مزید ثابت ہو گا لیکن ہم نے سرائے کی پروا نہیں کی۔ ہم نے سوچا کہ کام بگڑ جانے کی نسبت کام مکمل دامن ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے ہم نے نہایت دوستانہ فضا میں آپ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ سرائے کو ہم نے اس لئے بھی مسئلہ نہیں بنایا کہ آج ہم جتنا لگاؤ نہیں گئے اس سے نہ جانے کتنا زیادہ لگاؤ نہیں گئے۔ اور کب تک کھاتے رہیں گے۔ پرنس اندر سبز سونے کے اندر سے دینے والی مرنی ہے۔"

"میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ وہ کچھ کا مران کس اعتبار سے اس قائل ہے کہ میں اسے چھپا چھپا کر رکھوں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں پتا چلا تھا کہ آپ کو اس کی بے گناہی پر بڑا اصرار تھا اور آپ اس کی بہت حمایت کر رہے تھے بلکہ آپ تو باضابطہ طور پر خود عدالت میں جا کر اس کی وکالت کے لئے بھی تیار تھے۔ حالانکہ میرے خیال میں آپ نے ایک مدت سے وکیلوں والا کالا کوٹ

ہائی تھی اور اپنے لئے مسافری گھر بنائے تھے لیکن وہیں سے  
ساتھ چلے جانے کے تصور سے اس کی جھنجھٹا ہو رہی تھی۔ اس  
کے مقابلے میں اس نے جھٹک جانے کو ترجیح دی حالانکہ اس سے  
بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا بچہ نہیں چکے گا۔  
میں نے دواؤں اور دے دیا۔

”دور وہ آپ کے سمجھنے سے بھی قاصر ہیں ہوا“۔ میری  
اچھے بے چینی سے بولا۔

میں نے بھی اس میں سمجھایا تو وہ آخر پڑی میں بولا ”ماضی میں  
اس بات پر یقین رہی ہیں سکتا۔“

”آپ کو یقین دلانے کے لئے مجھے لیا کرنا ہو گا“۔ میں نے  
بکھم بنی سر سے کہہ کر ”لیا مجھے آپ کا یہ سفید ہاتھ سے بخور  
دیوار سے گھرا ہوا ہے؟“

”کیا مطلب؟“ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ شاید اس نے سوچا بھی نہیں  
تھا کہ میں یوں اچانک بھی پڑی سے اتر سکتا تھا۔

”مطلب یہ کہ بعض اوقات کوئی شخص کسی صحیح بات کو بھی  
حسیم کر کے نہیں دے رہا ہوتا۔ ایسے میں اگر اس کے بال طبی میں  
جکڑ کر دو چار مرتبہ اس کا سر زور زور سے دبا رے گھرا جائے تو  
اپنی جگہ سے ہٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔“

”مجھ بات کو مان لیتا ہے“ میں نے گویا کسی نامعلوم شخص کو کوئی سائنسی  
فارمولا ثابت کر رہی تھی۔

وہ دیر سے بٹا لیکن اس جیسی کے دوران میں اس کے  
دانت کسی بھڑپنے کے دانتوں کی حد ہر تھوڑے کے عقب سے

جھانکنے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے  
جھجھکے ہوئے میں بولا ”آپ مذاق کے معاملے میں بھی کافی بڑا

مندرجہ ذیل صاحب۔“

”کون کون جانتا مذاق کر رہا ہے“ میں نے طاقت سے کہا۔

”چھوٹا۔“ وہ ہم دیکھیں گے۔“ اس نے بے پروائی سے

بات چلیا اور استراحت ہونے پر ہاتھ بڑھانے میں ہی ہالے کی  
کوشش کی لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ بات سیدھی اس کے

ذہن پر گئی تھی۔ تاہم ایک لمحے کی غامضی کے بعد وہ نرم سمجھے میں  
بولا ”میں امید تھی کہ اس معاملے میں ہمیں سمجھنے کو سیکھا

تھا کہ افضل صاحب!۔“ وہ بے شک نرم تھا لیکن اس میں ہلاکی

اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلانے ہوں۔  
مقدمے کی سماعت بھی کم سے کم مدت میں ختم ہو جائے گی۔ اگر کسی  
جاننا یا جاننا کام کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا آپ کی عادت  
نہیں ہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ کارخانہ برعکس بن جائے گا۔

اب آپ اسے سامنے لے آئیے۔“  
میں نے ایک تھوڑی دیر غماص لیے میں کہا ”میں ڈاکٹر تو  
مسئلہ انک رہا ہے۔ آپ کی دیکھیں اتنی عمدہ اور سب کے لئے اتنی  
فائدہ مند ہے کہ فوراً کہیں سے کارخانہ کو پکڑ کے لاؤں اور آپ کے  
سامنے پیش کر دوں لیکن افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”کہیں نہیں کر سکتے؟“ اس نے ایک تک میری طرف دیکھتے  
ہوئے پوچھا۔

”اس لئے کہ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے“ میں نے سادگی  
سے جواب دیا ”کتنا آسان سا جواب ہے آپ کے سوال کا۔“

لیکن ہم ابھی پہلو پر بات کے بغیر ساری باتیں کہنے جا رہے ہیں۔ آپ  
نے بہت سی گزشتہ سی باتوں پر یہ مفروضہ قائم کر لیا ہے کہ میں نے

اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اسے  
کہیں نہیں چھپا رکھا۔ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔ میں تو

آپ کی اس عظیم الشان دیکھنے سے پہلے ہی اسے منظر عام پر لا  
چاہتا تھا۔ میں نے اس کے لئے اپنی ہی کوشش بھی کی تھی لیکن میں

اس پر اکتفا کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف سے  
عاطل ہو اور وہ نکل بھاگا۔ اس وقت سے اب تک میں خود اسے

تلاش کرانے کے لئے نہ جانے کیا کیا محنت کر چکا ہوں۔ اب بتائیں  
میں آپ کے سامنے کارخانہ کہاں سے لاؤں؟“

میں خاموش ہوا تو کمرے میں گھبراہٹ چھا گیا لیکن اب اس  
سکوت میں تھوڑا اور کشیدگی کی آمیزش تھی۔ وہ پلٹ جھپکے بغیر

میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یقیناً میرے بارے میں  
پہلے بھی کچھ اچھے خیالات تو نہیں تھے وہ صرف کاروباری مصنفوں

اور اپنے لائق افکار میں شامل ہو جانے والی منافقت کے تحت  
رنگ بدل بدل کر کچھ سے بھی محبت بھی کر بخوشی ایسی اپنائیت اور

کبھی شفقت سے بات کر رہا تھا لیکن اب تو جیسے میرے بارے میں  
اس کے ذہن میں کوئی اچھا خیال بالکل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ منافقت

سے کام لیتے ہوئے مسکراتا بھی بھول گیا تھا۔

”آپ کو شاید یہ بات کاٹھیں نہیں آئے“ میں نے طاقت  
سے کہا۔

اب اس نے منافقت سے کام لیں گیا اور صاف صوبہ بولا  
”اس میں یقین کرنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اب یہ تو نہیں  
سکتا کہ کارخانہ کو اپنی حیثیت کا قلم نہ ہو۔ اپنی حیثیت اور سائنس  
کا قلم ہوتے ہوئے وہ آپ جیسے مضبوط قلمی کا سارا چھوڑ کر کیسے  
بھاگ سکتا تھا۔“

”میں اسرار کر رہا تھا کہ وہ پولیس کے سامنے پیش ہو جائے  
کیونکہ میرے خیال میں اس نے قرار ہو کر اپنی پوزیشن چھوڑ

جائیں گے۔" میں نے اس کی میز کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر سمجھتے ہوئے حمارت سے کہا "مجھے بتایا گیا تھا کہ میں نے دس گیارہ ماہ کی عمر میں چٹا شروع کیا تھا۔ اس وقت شاید میری ہاتھیں کانپی ہوئیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری ہاتھیں کانپی ہوئیں۔ اور محض کسی کا نام سن کر ہاتھیں کانپنے کا تصور تو میرے لئے کسی لطف سے کم نہیں۔ پھر بھی۔ صرف شمار ادا کر کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ کوئی ایک آدھ نام تو ایسا بتا دے جس سے سن کر حمارے خیال میں ہاتھیں کانپنے کی لذت آسکتی ہو؟"

وہ ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھا رہا پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے مجھے لہجے میں بولا "ان میں سے ایک نام سینہ واحد کا ہے۔"

یہ نام سننے ہی میرے ذہن میں یادوں کا ایک رطلہ سا تپا۔ سینہ واحد ایک ایسی شخصیت تھا جسے کسی تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی بھی محفل میں اس کا صرف نام ہی لیا جانا کافی تھا۔ سننے والے کے ذہن میں سارا ایسا منظر خود بہ خود آ جاتا تھا۔ اس وقت جس قسم کی کھنگوہری تھی اسے نہ نظر نہ سمجھنے ہوتے کم از کم بیس اچھ کے منہ سے اس کا نام سن کر اگر میری ہاتھوں میں لرزش نہیں تو رگ دوپے میں ایک خفیف سی سنسنی ضرور رونمائی چاہئے تھی۔ اور شاید دوڑی ہوئی ہو لیکن میں اس کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ میں یادوں کے ریلے میں زیادہ الجھ کر رہ گیا۔

سینہ واحد کی شہرت ملک کے سب سے بڑے اسٹور کی سی تھی۔ وہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں سونے اور الیکٹرونکس کی اس نقل و حرکت کا بادشاہ تھا جسے اسٹاکنگ بھی کہہ سکتے تھے اور جائزہ موازی تجارت بھی۔ کہنے کو اس کی شہرت اتنے بڑے اسٹور کی تھی لیکن آج تک نہ تو وہ گرفتار ہوا تھا اور نہ ہی صحیح معنوں میں اس پر کوئی مقدمہ چلا تھا۔

اس کے ملک سے باہر جانے یا واپس آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب جہاں چاہتا تھا چلا جاتا تھا۔ اس کے پاس پروہ دھندے تو اپنی جگہ تھے "ان میں سے بھی بہت سے دھندوں کی شاید مجھ جیسے باخبر آدمی کو بھی ہوا نہ ملے ہو، لیکن ان سے قطع نظر اب تو اس کے جائزہ اور قانونی کا دباؤں کا بھی کچھ شمار نہیں تھا۔ پھر نہ سونے کا معاملہ اور کاروبار میں تو وہ اس طرح خرید لیتا تھا جیسے بچے کھٹ بیچ کرتے ہیں۔ غیر مالک میں اس کے دو فائز تھے۔

نہایت معتبر ذرائع سے مجھے معلوم تھا کہ ہر مرتبہ ملک میں انتخابات سے پہلے اس کی تجویزوں کے منہ کھل جاتے تھے اور بڑے بڑے سیاسی گھمگھم اس کے درہر دلت پر حاضری دے کر فیضیاب ہوتے تھے اور بعد میں وزیر سفیر بن کر اپنی کاؤنڈیل سے آئینہ کی عداوت کو آگے بڑھاتے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ اسے سرکاری دکانوں کی غیر سرکاری تقریبات میں دی گئی بی بی کوئل دیا تھا بلکہ ایسی اکثر بڑی بڑی منصوبوں کی دعوت پر تو وہ جاتی تھیں یا

تھا۔ اس کے پاس وقت ہی میں ہوتا تھا۔ ملک کی بہت سی بڑی بڑی جانی بھائی سیاسی اور سماجی شخصیات اپنی تقریبات میں اس کی آمد کو اپنے لئے ایک اعزاز تصور کرتی تھیں۔

میرے ذہن میں یادوں کا جو رطلہ تھا اس نے مجھے ہاتھ کی بہت دور افتادہ بھول بھلیوں میں پھنسا دیا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب میں نوجوان تھا اور سینہ واحد والی لفٹ میں ہی قدم بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا کراچی کا وہ بھلا یا بد سرا پکر تھا۔ انہی دنوں میں راجیہ کے مشن میں گرفتار ہوا تھا اور وہ مشن آج بھی میرے یادوں کی زنجیر تھا۔

سینہ واحد کا کلاہ دار ان دنوں بھی کراچی کا لاہور پٹنہ دار رہ جاتے کہاں کہاں پھیلتا ہوا تھا لیکن مجھے "ابھرتے" ہونے نوجوان کی شہرت کی خوشبو اس تک بھی جا پہنچی تھی اور اس نے کسی رابطے کے ذریعے مجھے بلوایا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ اپنا کا دباؤ شریک بنانا چاہتا تھا۔ اس وقت کو کہ میری تعلقات کچھ زیادہ بلند نہیں ہوئی تھیں اور کسی بھی طریقے سے جلد از جلد نشی کرنے کی تمنا میرے دل میں چھل رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں میرے منہ سے انکار ہی نکلا تھا۔ قدرت نے میرے حق میں یہ بکھر ہی کیا تھا۔

اب میرا یہ ایمان اور نظریہ تھا کہ انسان کو اتنا کچھ ہی ملتا ہے جتنا اس کے مقدر میں ہوتا ہے لیکن کم از کم یہ اس کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز قانونی اور حلال طریقے اختیار کرے یا ناجائز غیر قانونی اور حرام طریقے سے اپنے حصے کا مال، متاع حاصل کرے۔ انسان کے سامنے راستے دو ہوتے ہیں۔ کوئی راستہ خواہ خواہ آسمان نظر آ رہا ہو یا بے اور کوئی راستہ خواہ خواہ مشکل دکھائی دے جاتا ہو۔ حلاکت حقیقت میں دونوں ہی راستوں پر یکساں دشواریاں ہوتی ہیں۔ کسی بھی ایک راستے پر چلنا انسان کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اسی لئے جڑ اور سزا کا نظام رکھا گیا ہے ورنہ تو انسان یہی کہ کر خدا کے سامنے بری الذمہ ہو سکتا تھا کہ میں نے تو یہی کچھ کیا جو میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا اس لئے اس میں میرا کیا قصور؟

مجھے جو نبی تھوڑی سی مشل آئی تھی میں نے وہ راست چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر پٹ نہ اس طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہیں نے شری کی تھی۔ اگر میں سینہ واحد کے رہے یا نہ رہے شری کو اتنا توجہ میری شہرت بھی اسی قسم کی ہوتی اور میری کھٹیں آج بھی میری ہم سفر ہوتی خواہ میں اسے بے کسی کے کتے ہی کتے سے بھگتے ہوئے ڈوڑے کر سلاتے کی کوشش کرنا کیونکہ بعد کے دنوں میں یہ تو بے ہوشی ہو گیا تھا کہ میرے پاس میرا نام کی چیز موجود تھی۔

بہر حال سینہ واحد سے شہر کے ایک مخپان آواز ملائے کی خاصی اونچی سی حمارت کے اس آغوش میں جہاں دھشتی نہ جانے کھٹا بہت کم تھی مجھے اپنی وہ پہلی ملاقات آج بھی یاد آ رہی ہے اس کے بعد بھی دو تین مرتبہ مختلف ذرائع سے سینہ واحد کے پیغامات



ملے تھے لیکن میں عطا اور مودبانہ انداز میں اس سے دوری رہنے میں کامیاب رہا تھا۔ پھر شاید اس نے بھی پلٹ کر میری طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا تاہم یہ اس کی نوازش تھی کہ اس نے میرے انکار کو اپنی توہین نہیں سمجھا تھا۔ انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

حیثیت اور دساکل کے اعتبار سے وہ اس وقت بھی ایک باہمی تھا اور میں اس کے سامنے تقریباً چوبیسی تھا لیکن اس نے بیوی کی آزادی سلب کرنے یا اس پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی اور ہم بڑی خاموشی سے اپنے اپنے راستوں پر ہوئے تھے۔ اس عرصے میں نہ جانے کیا کچھ ہو چکا تھا۔ نئے انقلابات آنچے تھے۔ میں نے بھی اپنی جگہ بہت سستی کی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ حیثیت کے اعتبار سے میں آن بھی اس کے سامنے بس تقریباً چوبیسی ہی تھا کہ اس دوران میں وہ خود نہایت جیزی سے پھیلنے پھیلنے نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا۔

دولت بہت بڑی طاقت ہے اور اس میں شک نہیں تھا کہ سینہ واحد نے اپنی اس طاقت کو بہت ہی سنیقہ سے استعمال کیا تھا۔ اس طاقت سے مزید طاقت حاصل کی تھی۔ اسے ابھی طرح معلوم تھا کہ ہمارے ملک میں طاقت کے سرچشمے کہاں کہاں تھے۔ وہاں وہ کسی نہ کسی قسم کی انویسٹمنٹ کئے رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اب وہ اس سے بھی کہیں زیادہ طاقت ور آدمی تھا جتنا کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اگر کوئی غیر ملکی اس موضوع پر ریسرچ کرے گا کہ ہمارے ہاں ایک طرف اتنی غربت تھی اور کسی کیسے غربت زدہ بستیوں میں لوگ کس کس حال میں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن دوسری طرف بعض لوگوں کے پاس کتنی دولت تھی تو وہ شاید حیرت سے بے ہوش ہو جاتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ جس ملک میں اتنے دولت مند موجود تھے اس کا شمار اب تک غریب ملکوں میں کیوں ہوتا تھا؟ اس پر سے غربت کی چھاپ کیوں نہیں ہٹ سکی تھی؟

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سینہ واحد کا کام مٹن کر بہت سے لوگوں کی ہڈیاں کاٹ بیٹھ تھیں۔ خصوصاً اس کی مخالفت کا تصور کر کے ضرور کتاب کھلی تھیں۔ اس لحاظ سے جیل احمد کے دعوے میں کچھ ایسا سائنس نہیں تھا لیکن اب اس کا کیا کیا جاتا کہ میں آدمی ہی ذرا دوسری قسم کا تھا۔ میرا فلسفہ حیات ہی کچھ اور تھا۔ جب میں نے زندگی اور اس کی حقیقت کو اپنی بساط کے مطابق سمجھ لیا تھا تو پھر میری باتوں کا خوف میرے دل سے نکل گیا تھا لیکن یہ بات بے چارے جیل احمد کو معلوم نہیں تھی۔ اسے تو بس یہ معلوم تھا کہ سینہ واحد کے ایک اشارے پر نہ جانے کیا سے کیا ہو سکتا تھا۔ اور یہ بات بہت سے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھی۔

میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہہ دیا کہ میں اس وقت خود کو انا بھی تحریک میں محسوس نہیں کر رہا تھا کہ اس قسم کی باتوں پر ہنسنے لگا تا لیکن میں نے سوچا اس ڈرامے باز کو ذرا نرمائی انداز میں ہی جواب دینا چاہیے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ڈرامے بازی نہیں کر رہا

تھا اور نہ ہی جاننے سے کام لے رہا تھا۔ وہ تو حقائق کو بہت گہرا کر اور کم چٹکنی کے ساتھ لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اصل میں تو میں نے ہی اسے کھلنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دل ہی دل میں اسے ڈرامے باز کا خطاب اس لئے دیا تھا کہ اس کی شخصیت بڑی ڈرامائی سی تھی۔ وہ کسی اونچے درجے کے ڈرامے کا کوئی اہم کردار معلوم ہوتا تھا اور اگر ہم آج بھائی ٹیلی ویژن کے قریب کے مطابق اس دنیا کو ایک ایسے ہی جگہ پر پہنچے تو ہم یہ بات درست ہی تھی۔ جیل احمد واقعی ایک اعلیٰ درجے کے ڈرامے کا ایک اہم کردار تھا۔

میں قہقہہ لگنے کے بعد بھی ایک لمحے کے لئے خاموش رہا اور استہزائیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ غلطی آمیز سے لمبے میں بولا "اس میں قلمی دن کی طرح قہقہہ لگانے کی کیا بات تھی؟"

میں نے طمانعت سے کہا "اگر یہ کسی قلمی دن کا قہقہہ ہوتا تو اس کے پیچھے ہری گھن گرج کے ساتھ ایک مکالمہ بھی لڑ سکتا ہوتا لیکن میں گھن گرج سے مکالمہ بولنے کے بجائے نہایت محبت سے تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سینہ واحد کا نام سننے کے بعد میری انگلیں بالکل نہیں کاچیں۔ اگر تم چاہو تو ہاتھ لگا کر دیکھ سکتے ہو۔۔۔ بلکہ اگر تم سارے پاس ٹیکہ پلاٹ ٹاپے کا کوئی آلہ ہے تو اسے کام میں لائیں گے۔"

اس کی آنکھیں سڑکتھیں۔ ایک لمحے اسی طرح غلطی آمیز سے انداز میں مجھے گھورنے کے بعد وہ کچھ تشویش آمیز سے انداز میں بولا "تمہاری خود اعتمادی ضرورت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے تم اتنے ذہین آدمی نہیں ہو جتنا میں تمہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم اب تک زندہ کیسے ہو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر تم نے اس بات پر حیران ہونا شروع کر دیا تو پھر قدم قدم پر حیران ہی رہتے رہو گے کیونکہ قدم قدم پر تمہیں ایسے لوگ نظر آئیں گے جنہیں تمہارے حساب سے مرچنے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن قدرت کے اپنے کچھ عجیب سی حساب کتاب ہیں۔ جن کے بارے میں تم جیسے لوگ سوچتے ہیں کہ وہ زندہ رہنے کے زیادہ اہل ہیں، بعض اوقات وہ بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولا تو میں نے گہری سانس لے کر کہا "میں۔۔۔ چھوڑ دو ان باتوں کو۔۔۔ میں اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ کاحران کے بارے میں میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ تم اپنی سینہ کیٹ کو بتاؤ۔ اور اس کے بعد خاص طور پر سینہ واحد سے میرے بارے میں مشورے کر لینا کہ کیا میری بات پر اعتبار نہ کرنا اور مجھے ڈراما دھکا کا کوئی مناسب حرکت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں اس سلسلے میں کوئی مشعل مشورہ دے سکے گا۔ وکیل کو پیشہ کاٹھ کو مشورے دینے ہی نہیں دیتا چاہئے، یہی بھی اس سے مشورہ لے لے لیتا چاہئے۔"

میں کسی سے بھی مشورہ لے لوں گا لیکن خدا کے لئے تم مجھے کوئی مشورہ دینے کی کوشش نہ کرو" وہ گویا جل کر ہوا۔

"عانا! کہ میرے ہی مشورے ایک بہتر زندگی گزارنے میں نہیں ذیل کار نیکی کی کتابوں سے زیادہ مدد دے سکتے ہیں" میں نے غصے کی سانس لے کر کہا "لیکن افسوس... مجھے یقین ہی ہے اس بات پر کہ اس قدر تم غلط کر رہے ہو۔"

اس نے میری اس بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے قہقہے ہونے لگا چاکہ ذرا نرم لہجے میں "کچھ دلچسپی سے پوچھا" تم سینہ واحد کو ذاتی طور پر جانتے ہو؟ میرا مطلب ہے... ان سے تساری مل ملاقات ہے؟"

"انہوں نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے اناس سے سوال کیا۔

"ان سے ابھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو سکی" اس نے کہا۔

"میری ان سے زندگی میں صرف ایک ملاقات ہوئی ہے لیکن مجھے امید ہے وہ مجھے نہیں بھولے ہوں گے" میں نے اس سے کہیں زیادہ اطمینان سے کہا جتنا میں اس وقت محسوس کر رہا تھا۔ "اور اہم بات میرے خیال میں یہ نہیں ہے کہ میں سینہ واحد کو جانتا ہوں یا نہیں انہیں تو بے شمار لوگ جانتے ہیں۔ عانا! نہ طور پر بھی جانتے ہیں۔ اہم بات یہی ہے کہ وہ مجھے جانتے ہوں تم میرے بارے میں کوئی بھی باتیں طے کرنے سے پہلے ان سے میرے بارے میں بات ضرور کر لیں۔"

پھر میں نے نرم اور دوستانہ لہجے میں پوچھا "سینہ واحد کے علاوہ اپنی سینڈ کیٹ کے دوسرے سینٹوں کے نام بتانا پسند کرو گے؟"

"وہ... تو بڑا ہی کیلیبر کے لوگ ہیں۔" اس کے لہجے میں کچھ غرور تھا "ان کی تعداد سات ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک بادشاہ ہے۔ مثلاً حامد مصطفیٰ ہیں۔"

"حامد مصطفیٰ شیرازی کی بات کر رہے ہو؟" میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے حد تک چاہی "وہی جن کاسات سو بھری جوازوں کا قلعہ ہے اور جو پاکستان میں ہیں BASE بھی نہیں آتے۔ ان کا ہیڈ آفس روم میں ہے؟"

اس نے انہات میں سر ہلایا اور ذرا پیچھے ہٹے ہوئے سے لہجے میں بولا "شاید ان سے بھی تساری صرف ایک بار ملاقات ہو گئی ہوگی اور تمہارے خیال میں وہ بھی اب تک تمہیں نہیں بھولے ہوں گے؟"

"اس میں کیا شک ہے" میں نے اطمینان سے کہا۔ "تم ان سے بھی کبھی میرے بارے میں بات کر کے دیکھنا۔ اس میں اتنا خطر فرمائے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اسے شاید ایک خفیف سا جھکاؤ تھا لیکن اس نے اس کا کوئی خاص اظہار نہیں ہونے دیا البتہ اب وہ بولا تو اس کے لہجے سے

"اس میں کیا شک ہے" میں نے اطمینان سے کہا۔ "تم ان سے بھی کبھی میرے بارے میں بات کر کے دیکھنا۔ اس میں اتنا خطر فرمائے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اسے شاید ایک خفیف سا جھکاؤ تھا لیکن اس نے اس کا کوئی خاص اظہار نہیں ہونے دیا البتہ اب وہ بولا تو اس کے لہجے سے

"تمہاراں تو میں نے ان دونوں کو بھی قرار نہیں دیا" میں نے اپنا لہجہ نرم کر لیا "میں تو تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ لوگ میرے لئے بہر حال ہوا نہیں ہیں اور میں ان کے لئے کچھ ایسا کیزا نکھڑا بھی نہیں ہوں۔ تم کچھ اسی قسم کی پچویشن تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے تھے تم اتنے پرانے ویل ہو... جہاں وہ انسان... بلکہ گرگ ہماراں دھڑم کی چیز ہو... اتنے بڑے

انڈازہ ہوا کہ وہ کافی حد تک سیدھا ہو چکا تھا" میری تو وہ زمانہ ہی دن میں ایک دوسرے ان سے بات ہوتی ہے چاہے وہ دنیا میں کہیں بھی ہوں۔"

اسے میں ایک عجیب اتفاق ہی کہہ سکتا تھا کہ ابھی اس نے اپنی سینڈ کیٹ میں سے دو نام ہی لئے تھے اور ان دونوں سے واقعی میری باتیں میں ایک ایک اہم ملاقات ہو چکی تھی۔ عجیب اتفاق تھا کہ ایک مرتبہ حامد مصطفیٰ شیرازی نے بھی کسی کے توسط سے باقاعدہ مجھے ملاقات کا پیغام بھیجا تھا ایک بہت بڑے ٹکلف پرنس ڈر کا اہتمام ہوا تھا جس کے لئے حامد مصطفیٰ خاص طور پر اٹلی سے اپنے ذاتی حیارے میں آیا تھا۔ میں اس وقت کاروبار کی دنیا میں آگے آچکا تھا۔ کراچی میں میرا فائبر اسٹار ہوٹل خیر ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود حامد مصطفیٰ کے سامنے بھی میری مالی حیثیت ابھی کے سامنے چوہنی والی ہی تھی۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میرے تمام کاروبار بہت جلد میری کوشش سے خالصتاً پرائیویٹ انٹرپرائز بن گئے تھے۔ اگر میں نے ان کے شیئر مارکیٹ میں رکھے ہوتے تو سینہ واحد اور حامد مصطفیٰ جیسے دولت کے ہاڑ تو مجھے خرید کر ایک طرف پیٹک سکتے تھے۔

چاہتے، مزدور وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ لیکن میں اسی وقت اس کے انٹرکام کا پرنسنگ اٹھا۔ کچھ دیر پہلے کالی آجائے کے بعد اس نے اپنی سیکریٹری کو ہدایت کی تھی کہ اسے نہ تو کوئی فون کال دی جائے اور نہ ہی انٹرکام پر دسترب کیا جائے۔ اس کے باوجود انٹرکام پرنسنگ اٹھا تھا۔ میری وجہ سے اسے پہلے ہی خسر آ رہا تھا۔ اس نے انٹرکام کا ریسور کچھ اس طرح اٹھا یا جیسے پلک جھپکتے میں اسے چا جائے گا۔

ریسیور کان سے لگاتے ہی اس کے آوازیات یکدم بدل گئے۔ پہلے اس کی سلاخی ہوئی، انکمیں پوری طرح کل گئیں۔ پھر اس کا منہ کل گیا۔ وہ بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ جو زمین نے اس کے کان میں نہ جانے کیا پھر کیا تھا کہ وہ خسر، ہمارا منگی بات چیت کے کام ہونے کا مددہ وغیرہ، سبھی کچھ بھول گیا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف حیرت ہی حیرت تھی۔

وہ بے یقینی سے بولا "کیا وہ یہاں آچکے ہیں؟ آفس میں؟" دوسری طرف سے یقیناً اس کی سیکریٹری کا جواب انہات میں تھا کہ نیکہ اس نے فوراً ریسورنگ دیا۔ آئے والا جو کوئی بھی تھا یقیناً جمیل احمد کے لئے بہت بڑا اہم آدمی تھا کہ اس کا نام سننے ہی اس کے جسم میں جھپٹے کی سی مستعدی اور جھپٹتی آنکھیں تھیں۔ انٹرکام کا ریسور رکھتے ہی وہ اس طرح ایک جھٹکے سے اٹھا کہ اگر میر بڑی اور وزنی نہ ہوتی تو الٹ جاتی۔ وہ اس طرح اٹھ کر گرنا پڑا۔ دو دوازے کی طرف بھاگا جیسے ایک لڑکا خیر ہونے کی صورت میں اسے کوئی کڑی سزا پہنچتی پڑے گی۔

ایک اتنے بڑے کامیاب وکیل اور نہایت اہم آدمی کا یہ طرز عمل میرے لئے حیران کن تھا۔ اس نے جس انداز میں میرا استقبال کیا تھا میں تو پہلے ہی پریشان ہوا تھا۔ لیکن اب اس کے موجودہ انداز کے سامنے تو میرا استقبال بہت چھوٹا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دو دوازہ کھولا۔ شاید وہ دوڑنا ہوا دو دوازے سے نکل جانا اور آئے واسلے کے عین سامنے پہنچ کر رہی رکنا لگیں۔ قیمت یہ رہا کہ آئے والا اس وقت تک دو دوازے پر ہی بیٹھ چکا تھا۔

میں ایک طرف کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جمیل احمد کا اگر میں چلا تو شاید وہ آئے والے کے سامنے سجدے میں گر پڑتا یا پھر کم از کم رکوع کی سی حالت میں تو چلا ہی جاتا لیکن اگر دوڑ کانی لوگ جو زمین کے کمرے میں نظر آ رہے تھے، شاید ان کے سامنے ایسا کہتے ہوئے جمیل احمد کو کچھ شرم آجی ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس شخصیت کی ترقی کا راز صرف یہی تھا؟ خوشامد؟ خوشامد۔

پھر میں اسی نیچے پر پہنچا کہ صرف خوشامد کالی نہیں تھی۔ کچھ دوسرے عوامل بھی رہے ہوں گے۔ پھر میں نے اس شخص کو بھی دیکھ لیا جس کے سامنے وہ بچھا جا رہا تھا۔ اس کی شاید مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ چمکے ہوئے ہیں اس کی جگہ یا قالین کی جگہ خود مجھ جاتے اور نوادے سے درخواست کرے کہ وہ اس کے جسم

مقام پر بیٹھ جائے۔ اتنی طاقتور بیڈ کیٹ کی مکمل تہوارے ہاتھ میں ہے لیکن ہمیں اب تک یہ پلنگ نہیں آیا کہ سب کو ایک سی لاکھی سے نہیں اٹکنا چاہئے۔" اس کے چہرے کی سرخی کچھ بڑھ گئی۔ وہ کہنے کہنے سے لمبے میں بولا "میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں نے تو ہمیں تمہاری حیثیت سے بڑھ کر احترام اور اہمیت دی لیکن تم بائیں پر ہی چڑھ گئے۔"

"جب مجھے اپنے پیروں کے قریب زیادہ سناپ پھر اور کلکجورے وغیرہ دیکھتے نظر آتے ہیں تو ایسا طامیں بائیں پر چڑھ جاتا ہوں۔ اس مقدمے کے لئے میں مضبوط قسم کا ذاتی بائیں ساتھ رکھتا ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا "اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ میرے دماغ میں ایک پھر کی فٹ ہے۔ پھر کی بجھتے ہو؟ جب کوئی مجھے سنا ہونے کے باوجود جھوٹا بھگتا ہے یا بلا وجہ مجھے عرصہ پر کہنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ پھر کی گھوم جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ میں کیا کہہ دوں اور کیا کر کر دوں۔"

"تم مجھے کچھ بھیسے ہوئے لگتے ہو۔" وہ شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بے شک۔" میں نے نہایت سعادت مندی سے تسلیم کیا "اس لئے تو مجھ سے بات چیت کرتے وقت بہت محتاط رہنا چاہئے۔ خصوصاً ان لوگوں کو۔ جن کے دماغوں میں کسی نہ کسی وجہ سے فروغیت پھری ہوئی ہے۔ اپنی غرض کے تحت وہ خواہ کتنی ہی خوش ظطنی اور خلوص کا لبادہ اوڑھ لیں لیکن جو نی انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی غرض پوری نہیں ہو رہی۔ کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تو فوراً ان کے چمن پٹاری سے باہر آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی فروغیت اور منافقت کا زہر نکالنے کے کئی نسخے میرے پاس ہیں۔ کوشش کرو کہ ان میں سے کوئی نسخہ مجھے تم پر نہ آزمانا پڑے۔ زندگی میں آئندہ بھی کبھی میرے ساتھ کوئی ڈھنگ کہنے کی ضرورت پیش آئے تو احتیاط سے کرنا۔"

پھر میں نے خامسے خوشگوار لہجے میں کہا "جس طرح شیٹے کے سالان کے ڈلوں پر لکھا ہوتا ہے۔ ہنڈل دو کیڑے۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے تم جیسے لوگوں سے ملنے وقت میں اپنی ٹالی یا کوٹ کی پشت پر کھسکا کر آیا کروں۔ ڈیل دو کیڑے۔ شاید اس سے کچھ فرق پڑ جائے۔"

اس نے ایک نظر گھڑی کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔ میں نے جانے کے لئے پرتوتے ہوئے کہا "میری اس بھانڈا پونچھ سے تمہاری طبیعت کچھ بہتر ہوئی یا نہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شاید کچھ زیادہ ہی خفا ہو چکا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا "تو جی کی اس جھٹکے سے ہم اس نیچے پہنچنے کے ضروری نہیں ہر جھٹکے کی نیچے پہنچنے" اس کے بعد میں گہرا چاہتا تھا کہ میں چلا ہوں بہتادقت ضائع ہو چکا اس پر مبرک کرنا

باؤں رکھا ہوا آگے بڑھے۔

لٹکانے کا کٹھن بہت کم کرتے تھے۔

میں بندھ گھاس کے عقب سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جو زمین کی میز و غبار کا بیشتر حصہ بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ جو زمین نے نوراود کے استقبال کے لئے صرف اپنی جگہ سے اٹھنے اور کئی سواات کی نہایت حسین سکرابٹ ہونٹوں پر چھانے پر اٹھایا تھا۔ نوراود اگر کوئی اور ہوتا تو شاید اس چہرے اور اس شکرابٹ پر ریشہ عملی ہو جاتا لیکن اس شخص نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

البتہ میں دم بخود سا کھڑا نوراود کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ وہ کون ہے اسے برسوں بعد دیکھا تھا لیکن اس میں کچھ اتنی زیادہ تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ بس اس کے سر کے بال کچھ زیادہ سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر معمولی سی چٹائیاں نمودار ہوئی تھیں۔ بد قسمتی عمر نے بس یہیں تک اس کی شخصیت پر اپنے بچے کا رے تھے تاہم ان معمولی سی تبدیلیوں سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔

وہ آہن بھی دی پرانا سیلہ واحد تھا!

آج شاید اتفاقات کا دن تھا۔ میں نے اس وقت اس دفتر میں ایوں اچانک اس سے ملاقات کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور وہ بھی اس کا ذکر آنے کے چند لمحوں بعد ہی۔! واقعی انسان آنے والے کسی بھی لمحے کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے دامن میں آپ کے لئے کیا حیرت چھپی ہو۔

سیلہ واحد کے اندر تھپی کر کے میں چھٹی ہوئی ایئر کنڈیشنر کی خوشبو پر چھٹی کی محک غالب آگئی تھی۔ یہ بڑی تیز اور بیچ ختم کی دھن کی خوشبو تھی۔ برسوں پہلے میں بھی نے یہ بات حیرت سے نوٹ کی تھی کہ وہ بالوں میں چھٹی کی ٹھنڈی لگا تھا۔ آج بھی وہ اپنی روش پر قائم تھا۔ اس نے اپنی خوشبو بدل تھی۔ برسوں پہلے میں وہ بے پناہ دولت مند آدمی تھا اور اس وقت سے اب تک اس نے نہایت تیز رفتاری سے تنہی کی تھی۔ اب تو اس کی دولت کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن اس کی وضع قطع وہی تھی۔

اس کے جسم پر نہایت سستا سا ایک سوٹ تھا۔ جس کی زراش غراش بھی اس کے جسم سے میل نہیں کھاتی تھی۔ سوٹ سرخی تھا تو بال لال پیلے رنگ کی تھی۔ پیروں میں گھسے پٹے سے جوئے تھے ہاتھ میں ایک معمولی اور قدرے سیلا سا ایک سوئی بدال تھا جسے بار بار بائک پر رکھ کر وہ شوش شوشی کئے جا رہا تھا۔ چوہنٹا ہوا اور نہایت غام سا تھا۔

سرسری نظر میں وہ ایک برطان حال دکھ بنائی، گھریلے مسائل اور کم تنخواہ کا شکار ہوا کھرک معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ سڑک کے کنارے تھا کھڑا ہوتا تو شاید کوئی غالی رکھنے والا اسے فروغ سوار بھی سمجھ کر اس کے قریب آکر رکھنے کی رفتار بھی کم کرنے کی زحمت نہ کرتا۔ اگر وہ کسی چلتی پھرتی ایجنسی عورت کی طرف بھی راہ چلتے نظر بھر کر دیکھ لیتا تو شاید وہ بڑا مستجابی کہ اس خیرباد سے

صرف دی نہیں اس کا تقریباً پورا عمل اس وقت اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ دفتر کے بیشتر لوگ اس کے پیچھے پیچھے جو زمین کے کمرے تک آگئے تھے اور انہی کا حال احوال پوچھنے کے بارے سے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے اپنے دو مسلح گارڈز ان کے علاوہ تھے جن کی خدشہناک سیاب مشین گھسیں ہوں ان کے ہاتھوں میں تھیں جیسے وہ کوئی ذرا سی بھی مشکوک حرکت دیکھتے ہی برست مار دیں گے اور وہ ان کا سوں میں بہت زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا نکلن ان کے چہروں سے جھانک رہا تھا اور اس زندگی میں شاید قتل و غارت کے سوا کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ آنے والا کسی کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ تو جمیل احمد کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو مصافحے کے لئے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ شاید جمیل احمد سے مصافحہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے گویا بادل ناخاست اپنے مرل سا ہاتھ جمیل احمد کے ہاتھ میں جانے دیا۔ جمیل نے انتہائی عقیدت اور احترام سے اس سے مصافحہ کیا اس کا ہاتھ چوا پھر انھوں سے لگایا۔

جب وہ بولا تو اس کے سبب سے اس قدر شہنک رہا تھا جو شاید ملکی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ کسی پورٹ بھی کیا جاسکتا تھا "سہ! سہ! میرے آقا۔ میرے پیرو مرشد۔! ایک مدت کے بعد آپ نے اس غلام کو اس اعزاز سے نوازا کہ آپ خود یہاں تشریف لائے۔ اس اعزاز پر میں جتنا بھی خوش ہوں، کم ہے۔ اس کے باوجود میں بھی کون کا کہ آپ نے اتنی زحمت کیوں کی؟ مجھے حکم کیا ہوتا۔ جہاں آپ فرماتے ہیں وہاں حاضر ہو جانا۔"

آنے والے کے طعن سے عجیب سنسناتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی "میرے پاس کچھ وقت تھا اور میں اور ہر تمہارے برسوں میں اپنے دوست سے بھی ملنے آیا ہوا تھا۔" اس نے ملک کی ایک اعلیٰ شخصیت کا نام لیا جس کا طویل و عریض اور عالی شان لمبی جھکا وہاں سے ٹھوڑے سی فاصلے پر تھا ہمیں نے سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔ ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

"زبے نصیب۔ زبے نصیب۔ اندر شریف لایے۔" وہ اس کے لئے خود دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

نوراود نے اپنے گارڈز سمیت بھی کو دروازے پر ہی رکھنے کا اشارہ کر دیا۔ اس جہم سے شاید وہ گھبرا گیا تھا۔ اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ ویسے بھی وہ اعصاب زدہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بندوں کا سا اضطراب تھا۔ وہ سب سے جان چھڑا کر گویا ایک پھرتی سی چھانک لگا کر کمرے میں آگیا۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی میزوں کی طرف واپس چل دیئے۔ صرف اس کے دونوں گارڈز دروازے کے دونوں طرف جم کر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں بدستور ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ شاید وہ انہیں کندھوں پر

بڑا تے کی طرح ہوئی۔

اگر کسی ایسی کو اچانک سینہ واحد کا نظارہ کرانے کے بعد اس کی حیثیت کے بارے میں بتایا جاتا تو وہ طرح کے مدخل سامنے آتے تھے۔ وہ بڑے ہتے دہرا بھی ہو سکتا تھا اور اسے حیرت کا شدید جھکا بھی لگ سکتا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں جب میں نے برسوں پہلے اس کے چرے کی طرف غور سے دیکھا تھا تب بھی محسوس کیا تھا اور آج غور سے دیکھ رہا تھا تب بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ کسی عام آدمی کا چہرہ نہیں تھا اور خود اپنے دل میں جھانک کر میں بڑے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص نفسیاتی اثر نہیں تھا۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ مجھے پہلے سے اس کی اصل حیثیت کا علم تھا۔

میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بغیر عقارب کے بھی کبھی اچانک میرے سامنے آیا ہو گا۔ میں نے کہیں سر راہ ذرا بھی توجہ سے اس کی طرف دیکھا ہو تا تو میں ضرور سوچتا کہ اس شخص میں کوئی ہمت ہی خاص بات تھی۔ وہ ہمت عام ہمت معمولی سا آدمی نظر آنے کے باوجود عام اور معمولی آدمی نہیں تھا۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں تو کسی ہمت ہی خاص آدمی کی آنکھیں تھیں لیکن کچھ میں نہیں آتا تھا کہ ان میں خاص بات کچھ تھی۔ وہ کوئی ظلمانی قسم کی آنکھیں نہیں تھیں۔ ان میں شریک ہی چمک نہیں تھی۔ اس کی نظروں عقابانی نہیں تھیں۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی۔ کوئی راز تھا جو دریافت کئے جانے کا خطرہ تھا۔

اس وقت تو خیر اس نے آنکھ اٹھا کر ابھی میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا لیکن میرے ذہن میں برسوں پہلے کا تاثر تازہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں زندگی کے معاملات میں اتنا تجربہ کار نہیں تھا اور عروج شہسای کا بھی مجھے کوئی خاص دعویٰ نہیں تھا لیکن ذہن پر وہ تاثر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی کو شاید چھڑی ہوئی عجوبہ دلوں کی آنکھیں بھی اس طرح یاد نہ ہوں۔ جس طرح مجھے اس کی آنکھیں یاد تھیں اور اس وقت کو کہ وہ صرف جمیل احمد کی طرف متوجہ تھا لیکن میں اب بھی اس کی آنکھوں کی ان پراسرار خصوصیات اور باطلوں قوت کو محسوس کر سکتا تھا۔

وہ جمیل احمد سے ہاتھ چمڑا چکا تھا لیکن جمیل احمد گویا اب بھی اس کے گلے کا ہار بننے کے لئے بے تاب تھا۔ وہ نہایت محبت و احترام سے اسے بازو سے تھام کر ایک کرسی کی طرف لے جا رہا تھا۔ سینہ واحد نیموا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اکثر نیموا رہتی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے ان میں وہ غیر معمولی بین محسوس کیا تھا جس کی خیریت بھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ عام آدمی شاید یہ سمجھتا کہ وہ نئے میں ہے، محمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ سینہ واحد شراب نہیں پیتا تھا۔

پوری عمر میں میں نے کبھی کسی بھاری سی کی طرف دیکھا تھا اور اس وقت اگر کوئی عام آدمی بھی ذرا توجہ دیتا تو ان آنکھوں کے غیر معمولی بین کو محسوس کر سکتا تھا۔ ان میں کوئی پراسرار دنیا آباد تھی جس کی دستوں کا اندازہ نہیں ہوتا تھا اور جب وہ اپنے مخصوص انداز میں نیموا آنکھوں سے اوجھڑا کر دیکھتا تھا تو مجھے کچھ یوں لگتا تھا جیسے دنیا اس کے سامنے باجینہ اٹھال تھی اور قطعی عدم دلچسپی سے اس کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسے دنیا کے کھیل تماشے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انسان بھی اس کے نزدیک نہایت ہی غیر دلچسپ مخلوق تھے۔ بہت کم لوگ یا بہت کم چیزیں ایسی تھیں جو اسے پوری طرح آنکھیں کھول کر اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی تھیں۔ لیکن بھر میں یہ بھی سوچتا تھا کہ جو انسان دنیا اور دنیا والوں کے بارے میں ایسی بے نیازی اور عدم دلچسپی کا شکار ہوتا وہ اس تندی سے ہر وقت منہور اور غیر منہور دونوں طریقوں سے دولت کمانے میں مصروف نہیں رہ سکتا تھا۔

جمیل احمد نے اسے اپنی میز کے قریب ایک بھاری بھرکم مینیس کریس تک لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کمرے کے وسط میں ہی رک گیا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں نیموا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے احتیاطانہ انداز میں دیوال سے ناک رکڑتے ہوئے شل شل کی بجلی کی آوازیں نکالتے ہوئے بولا "بڑے شیطان! تم جی بچ بڑھے کب ہو گے؟ میں برسوں سے تمہیں اسی طرح دیکھتا آیا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔"

جمیل احمد نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔ سینہ واحد کا کہا ہوا ہر لفظ گویا اس کے لئے خراج تحسین تھا۔ وہ قریب جانے والے انداز میں بولا "سرا! اگر میں بڑھا ہو جاؤں گا تو آپ جیسے بڑے لوگوں کی خدمت کون کسے گا؟"

"اے۔۔۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے" سینہ واحد نے سر ہلایا "ہم جیسے لوگوں کی خدمت میں ہی تمہاری سدا بھارجانی کا راز پوشیدہ ہے اور میں تمہاری اس غولی کا بھی محترف ہوں کہ تم خوشامد بہت اچھی کرتے ہو جمیل احمد! مجھے تمہارا خوشامد کا انداز بہت پسند ہے۔ بہت سے لوگ ناک بھوں چہا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ انہیں خوشامد بالکل پسند نہیں۔ حقیقت میں وہ زیادہ خوشامد پسند ہوتے ہیں۔ میں سیدھا سچا آدمی ہوں۔ صاف مان لیتا ہوں کہ میں خوشامد پسند ہوں۔"

میرے خیال میں وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میرے خیال میں اسے خوشامد پسند نہیں تھی لیکن شاید یہ اس کی کم ہمت کا دوسرے کا خوش چمی یا غلط چمی میں جھٹلار کھنے کا ایک انداز تھا۔ جمیل احمد کو اگر وہ خود بہت پسند بھی پسند کرنا ہو گا تو شاید اس بنیاد پر کرنا ہو گا کہ وہ بہت زیادہ کار آمد آدمی تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ شخص خوشامد کی بنیاد پر کسی کو پسند یا پھر کر سکتا تھا۔ اول تو اس قسم کے لوگ پسند نا پسند کو کچھ میں لاتے ہی نہیں وہ صرف آدمی کی صلاحیتوں سے غرض

لڑکپن میں نہایت نامساعد حالات کا سامنا کیا تھا۔ شاید وہ اس وقت سے ہی پھر کی طرح سخت جان تھا۔ اسی لئے زمانے کی ٹھوکروں میں بھرا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں کچھ باتیں سن کر اندازہ ہوا تھا کہ اس نے شاید مجھ سے بھی زیادہ سختیاں برداشت کی تھیں۔

میں نے اس پھر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی البتہ اسے موقع دیا کہ وہ اچھی طرح مجھ پر زور آزمائی کا شوق پورا کر سکے۔ آخر کار اسے کمانی آگئی تب اس نے مجھے چھوڑا اور چند لمحے منہ پر دھال رکھ کر آہستہ آہستہ کھوں کھوں کرنے کے بعد رنگ آمیزی کی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "فضل! میرے دوست۔ میرے برخوردار! تم بالکل نہیں بدلے۔ بس تھوڑے سے بچھڑاؤ پہلے سے زیادہ ونڈ سم نظر آنے لگے ہو۔ آخر تم کس جگہ کا آکا کھاتے ہو میری جان؟ یہ اس قسم کی جراتی کا لٹو کیا ہے؟ کچھ ہم بڑھوں کھنڈوں کو بھی بتاؤ میرے بارے میں آنا نہیں، بچل کھانا ہوں واحد صاحب! میں نے دیکھے

بچے میں کہا۔  
اس نے خاصا زوردار قہقہہ لگایا اور میرے کندھے پر ہلکا سا ٹھونکا رہا۔  
"تم اب بھی دیسے ہی بد معاش ہو جیسے لڑکپن میں تھے۔ کچھ شاید اب زیادہ ہو گئے ہو" اس کا ٹھونکا بھی پھر کی طرح ہی میرے کندھے پر لگا تھا اہم قیمت تھا کہ یہ پھر کسی نے زیادہ قوت سے کھینچ کر نہیں مارا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دیسے آپ اور جمیل صاحب جیسے بڑے کھنڈوں کو دیکھ کر مت سے جواڑوں کا بھی بڑے کھنڈے ہونے کو دل چاہ سکتا ہے اگر جیسا آنا اس کو کہتے ہیں تو پھر جیسا آئے میں کوئی حرج نہیں۔"  
اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا جس کے ساتھ اسے ہلکی سی کمانی آگئی۔ وہ پہلے اپنے سینے اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا "اسے کہتے ہیں بوڑھوں کا دل رکھنا۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری بات کو خوشامد قرار نہیں دیا تھا۔ پہلے تو جمیل احمد اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نشست گاڑی طرف جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب سیٹھ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس طرف لے چلا اور ذرا پھلتی پھلتی سی سانسوں کے درمیان بولا "بڑے بوڑھوں نے ٹھیک ہی کہا ہے بارگذاہت صحبت باتی۔ انسان زندہ رہے تو کسی نہ کسی سوڑ پر ملاقات ہوئی جاتی ہے۔" پھر اسے کوئی پروا نہ تھی کہ سوڑ پر ملاقات ہوئی ٹھیکس کر میں دنیو کو کے قریب پہنچ کر رکھتے ہوئے بولا۔ "وہیچے تم نے ایک بات پر غور کیا افضل میاں، قزاقیں جیوانے کے ذرائع اور انسان کے دماغ میں جتنے بڑے ہیں اتنی ہی انسان ایک دوسرے کے زیادہ قریب آنے کے بجائے اور بھی دور ہو گیا ہے۔ اب فون ہیں 'سویاگل فون ہے' لکس ہے' کاریں ہیں' ہوائی جہاز ہیں مگر

رکھتے ہیں۔ اس کے کام سے کام رکھتے ہیں۔  
جمیل احمد اس کے تھمرے سے ذرا بھی سخت 'غیالت یا شرمندگی کا شکار نہیں ہوا۔ اس کی مسکراہٹ اس کے چہرے اور آنکھوں کی چمک دیک میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے اس بات پر بھی کوئی کھابہ نہ محسوس نہیں کی کہ یہ سب کچھ وہاں میری موجودگی میں کھا گیا تھا۔ اس سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اکیلے میں کس طرح اس کی خاطر قاضی ہوتی ہوگی۔

وہ اسی محبت اور کر بکوشی سے بولا "اس عزت افزائی کا شکریہ۔ لیکن آپ آگے تشریف تو لے چلے" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا "پھر میں آپ کو ایک صاحب سے ملواتا ہوں۔ آپ کو ان سے مل کر قریبی خوشی ہوگی۔"  
میرا اشارہ کرنا تو درکنار اسے میری طرف اشارہ بھی کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سیٹھ واحد وہیں کھڑے کھڑے میری طرف مڑھوم گیا اور اسی دوران میں بولا "تم غالباً ان کی بات کر رہے ہو۔"

اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا لیکن دوسرے ی لے اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں صرف یہی نہیں اس کی باجیس بھی کھل گئیں۔ وہ یکدم ہی دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا "فضل! میرے دوست۔ میرے برخوردار۔ میری جان! امت بے موت کوئی ہو تو اسی ملک میں رہتے ہوئے بھی تم نے کبھی فون تک نہیں کیا۔ آج برسوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔"

اس کا یہ انداز جمیل احمد کو تشدد رکھنے کے لئے کافی تھا تھا۔ لیکن خود میرے لئے بھی کچھ کم حیران کن نہیں تھا۔ برسوں پہلے کی سرسری سی ملاقات کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا نہ صرف مجھے پہچان لینا بلکہ اس گرم جوشی کا اعتماد کرنا میرے لئے بھی غیر متوقع تھا جب کہ ہمارے درمیان پڑنے کی بھی کوئی لائن نہیں بن سکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے تو میرا نام بھی نہیں سنا ہے کہ کچھ کر پینک دیا ہو گا لیکن اسے تو نہ صرف نام، شکل صورت و فیوچر یاد تھی بلکہ اس کے رویے میں بھی پہلے سے زیادہ کر بکوشی تھی۔

وہ صحیح معنوں میں "تھاہ" کے میرے سینے سے آگے۔ آوی وہ مختصر اور جود ٹھیک سر سے پاؤں تک پھرا رہا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بھی مجھے بازوؤں کے پھٹنے میں لے کر کافی زور سے بچھپا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ اس میں ہر حال جمیل احمد جیسے دراز قد اور تندرست و توانا نظر آنے والے آدمی سے زیادہ طاقت تھی۔ جمیل کو تو میں نے جواباً اپنے بازوؤں کے پھٹنے میں جکڑ کر ہلکا سا ہی ڈونڈا تھا تو وہ چمکڑی بھول گیا تھا لیکن سیٹھ واحد کے بارے میں مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اگر میں اپنی طاقت کا احساس دلانا چاہتا تو مجھے اس کو خاصا ٹھکراؤ ڈونڈنا پڑتا۔ پھر تو آسانی سے نہیں دیا جاسکتا۔ میں نے سنا تھا سیٹھ واحد نے بچپن اور

انسان ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ جب یہ چیزیں نہیں تھیں تو انسان ایک دوسرے سے زیادہ ملتا تھا۔ بلا ضرورت بھی مل لیتا تھا۔ بیکر کام کے بھی مل لیتا تھا۔  
 ۱۳۔ کسی کے پاس وقت ہی کہاں ہے "میں نے مجھے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔۔۔ وقت چلانے والی چیزیں جو ایجاد ہو گئیں ہیں۔ اس لئے اب کسی کے پاس وقت نہیں رہا۔" لہجے سے پہلے اپنا ٹنٹ لپٹا رہا ہے۔ "اوس نے ایک بار پھر مقدمہ لگایا اور یکدم اسے پہلے سے ذرا زیادہ زور کی کھانسی آگئی۔

تاہم کھانسی جلد ہی ختم ہوئی اور وہ معال میں شوں شوں کرتے ہوئے بولا "میرا دل چاہتا ہے دنیا کے سارے ڈاکٹروں کو کسی توپ کے سامنے باندھ کر ڈاڈوں۔ میں دنیا کے قابل ترین ڈاکٹروں کے پاس ہو گیا۔۔۔ ایک کانگ اور برازیل وغیرہ میں دو عالمی علاج کرنے والی ان سونی موٹی ہے ہودہ عورتوں کے پاس بھی ہو گیا جن کے عجیبی طرح کے بونے افسانے سنے تھے۔ لیکن کوئی بھی میری کھانسی کا علاج نہیں کر سکا۔ ایک اور طریقہ میری کھ میں یہ آیا ہے کہ میں اپنی کھانسی کے جراثیم ان سب ڈاکٹروں وغیرہ کے بچپڑوں میں بھی داخل کرادوں۔ کم بخت سیمیا اور سناج بے پھرتے ہیں۔ لاکھوں دپے خرچ کرا دیتے ہیں۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی کھانسیں کے قول کو کچھ تو نشی ہوگی۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ میں کتنا چاہتا تھا کہ شفا دواؤں میں نہیں، ڈاکٹروں کے ہاتھ میں نہیں۔ شفا کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی اس کی طرف بھی رجوع کر کے دیکھے۔ لیکن فی الحال میں نے اسے یہ مشورہ نہیں دیا۔ قدرت کے کام ہوتے غور کی دعوت دیتے ہیں۔ قدرت بعض لوگوں کو اتنا نوازی ہے کہ اس کی نعمتوں کا شمار ممکن نظر نہیں آتا لیکن کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تھکی، کمی، تکلیف یا بے بسی ضرور رکھ دیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ انسان کو اپنی اوقات یاد آتی رہے۔ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اس کے پاس سب کچھ آیا۔ وہ دنیا کی ہر چیز پر قادر ہو گیا۔

سینہ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک مونہ پر بٹانے لگا۔ جیل احمد ایک طرف دم بخود سا کھڑا تھا۔ وہ سینہ واحد کا مجھ سے ملنے کا انداز دیکھ کر اور اس کی مجھ سے محسوس کرنا بھی حیران پریشان تھا۔ سروسٹ تو وہ کمرے میں گویا ایک قاتل سا شخص ہو کر رہ گیا تھا۔ سینہ واحد تو گویا اسے بھول ہی گیا تھا اور میں جان بوجھ کر اس کی طرف توجہ دینے سے گریز کر رہا تھا۔ آخر وہ خودی ذمیت بن کر آگے آگیا اور ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو پیٹنے کا کہتے ہوئے جڑے گئے۔

سینہ واحد اب بھی میری طرف ہی متوجہ رہا اور مسکراتے ہوئے بولا "دو سبے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ میں نے اسے عرصے سے جیسے نہیں دیکھا تھا۔ انسان زیادہ لمبے عرصے بعد کسی کو دیکھتا ہے تو کچھ نہ کچھ تبدیلی کا احساس ہوتا ہے جو اپنے ساتھ کبھی کبھی

خوشگوار حیرت بھی لے کر آتی ہے۔ جیسا کہ اس وقت تمہارا معاملہ ہے۔"

اس نے ایک گرمی سانس لے۔ ایک بار پھر تھوڑی سی شوں شوں کی اور بولا "تم نے بہت ترقی کی ہے افضل! میں جیسے مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے سب پتا چل رہا ہے۔ لاہور اور کراچی دونوں جگہ تم نے کامیاب راجھا بیٹ کر لیا ہے۔ تمہارا ہونٹ بھی اچھا جا رہا ہے۔ جیسے تو اتنی ہی ترقی نہیں ہو سکی کہ ہونٹ کے افتتاح پر ہی مجھے بلا لیتے۔" اسے گویا بریکلنڈ کہہ کر کہنے کا بھی خیال آیا۔

"جانتا تو معمولی بات ہے، میں تو افتتاح ہی آپ سے کر لیتا۔ آپ جیسے مہمان کے انہوں افتتاح ہوتا، اس سے اچھی کیا بات تھی لیکن ان دونوں آپ کسی لمبے سی پردگراہم پر نل ایسٹ گئے ہوئے تھے۔ وہاں بھی آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن رابطہ ہو نہیں سکا تھا۔" میں نے فوراً کہا۔

یہ بات اتفاق سے مجھے یاد آگئی تھی۔ افتتاح وغیرہ تو شاید میں اس سے نہ کرانا لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں نے اسے مدعو ضرور کرنا چاہا تھا اور زندگی میں کی انہی مواقع پر وہ مجھے یاد بھی آیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ جس سہو پیش کا کانگ تھا اس طرح کے لوگوں میں سب سے بہتر لگا تھا۔ شاید اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ میرے لیے نیک خواہشات ہی رکھتا ہو اور شاید اسی لیے میں بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں خفیف سے احتیاط کے جذبات رکھتا تھا۔ ذرا لے خواہ کچھ بھی رہے ہوں۔ لیکن وہ جس مقام پر تھا اور جتنی طاقت کا کانگ تھا اس کے باوجود میں نے اس میں وہ فروغیت اور وہ خفاشیں نہیں دیکھی تھیں جو اس سے کہیں کتر لوگوں میں موجود تھیں۔ آج کل تو چہا بھی ذرا سے مسائل میسر آتے پر دم پر کھڑا ہو جاتا تھا۔

اس کی آنکھیں جو ذرا درپے کے لیے پوری طرح کھل گئی تھیں، اب پھر نیم وا ہو چکی تھیں۔ میری بات سن کر وہ مزید سکون گئیں۔ وہ شاید ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا "لمبے پردگراہم پر تو میں صرف ایک بار ہی نل ایسٹ گیا ہوں۔ اور تم سے یا جیل احمد سے کیا پردہ۔ وہ پردگراہم دوپوشی کا تھا۔ میں احتیاطاً کچھ عرصے کے لیے دوپوش ہو گیا تھا ورنہ اس وقت کی حکومت کی ایک بہت اعلیٰ شخصیت خواہ خواہ مجھ سے نہیں چلیاں کہو زندگی ایشیائی۔"

"ہمارے ہاں ہر دور حکومت میں کسی نہ کسی انداز میں ایسی ہی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں "میں نے ناسف سے کہا۔

"ارے۔۔۔ ان چکرلوں کا کیا پوچھتے ہو۔ سینہ زخموں سے بھرا پڑا ہے "سینہ واحد غر غراہٹ زدہ سی لہجہ کی سانس لیتے ہوئے بولا "اس ملک میں بہت سے لوگ اپنی وراثت میں بعض کتابیں لکھ کر بڑی سستی پھیلانے اور بڑی توپ جڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن اگر کبھی زندگی میں مجھے اپنی سرگزشت لکھنے کا موقع ملے اور اس میں میں تمام واقعات کسی مصلحت اور خوف کے بغیر

دوانداری سے لکھ سکوں تو نہ جانے کس کن ایاموں میں زلزلہ آجائے۔ بڑے بڑے سرکاری دفاتروں اور بڑے بڑے سرکاری افسروں کی نہ جانے کسی کیسی بھیاں تک تصویریں لوگوں کے سامنے آجائیں۔

”تو پھر کسی مصنف کی خدمات حاصل کر کے لکھ ڈالیں یا کتاب“ میں نے سکرانے ہوئے کہا ”آپ تو خدمتِ اعلیٰ طریقے سے چمپا سکتے ہیں۔ اس پرائیکٹ میں بھی بہت سا رویا لگا کر بہت سا رویا نکال سکتے ہیں۔“

”میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔۔۔!“ وہ غصہ ڈی سانس لے کر بولا ”میں تو سب سے زیادہ مصلحتوں کا امیر ہوں۔ بہت منگا پڑے گا مجھے یہ پرائیکٹ۔۔۔ ختم۔ یہ دل جلانے والی باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم میرے دیکھ کے دفتر میں کیوں پائے جا رہے ہو؟ یا پھر یہ تمہارا بھی دیکھ ہے اور مجھے اتفاق سے ابھی تک یہ نہیں چل سکا؟“

”میں کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے ابھی ان کی وکالت سے فیض یاب ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہو سکا“ میں نے جیل احمد کی طرف دیکھا ”انہوں نے تو مجھے ٹیلی فونی بھیجا تھا۔ میں حاضر ہو گیا۔“

وہ تھوڑا سا ہنسا ”تھوڑا سا کھانا پھر خوش دلی سے بولا ”ختم۔ تم اتنے سعادت مند نہیں ہو“ پھر اس نے جیل کی طرف دیکھا۔ اسے گویا میرے یاد دلانے پر یاد آیا تھا کہ جیل احمد بھی وہاں موجود تھا ورنہ وہ جیسے اسے بھول ہی چکا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسا نہیں تھا۔ یہ محض ظاہری انداز و اطوار تھے۔ درحقیقت وہ کسی کو بھی نہیں بھولتا تھا کوئی بات بھی نہیں بھولتا تھا۔

جیل احمد اتنی دور سے گویا چڑکی بھولا ہوا تھا۔ اس کے تاثرات یکدم بدلے۔ اس کی تجزی، طرامی اور شارطانہ پن واپس آنا دکھائی دیا۔ وہ کھنکھار کر کھلا صاف کرتے ہوئے بولا ”وہ پرنس ایڈمز نے والی ذیل افضل صاحب پر ہرگز انک گئی ہے۔“

”افضل ہیں۔۔۔؟“ سیٹھ واحد کی تھموا آنکھیں ایک لمحے کے لیے پھر پوری کھل گئیں اور کھنی بھوس مکان بن گئیں ”افضل کا پرنس ایڈمز سے کیا تعلق؟“

جیل احمد نے دھیمے لمحے میں اسے رام کمانی سانی شروع کی جس سے وہی تاثر تھا تھا کہ کارمان رائٹس کو میں نے کیس بیچا ہوا تھا۔ میں نے اس کی بات میں ذرا بھی مداخلت نہیں کی اور نہ ہی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

آخر میں جیل احمد بولا۔ ”کل شام جب آپ دفن میں تھے اور میری آپ سے فون پر بات ہو رہی تھی تو آپ جلدی میں تھے۔ میں نے مختصراً آپ کو بتایا تھا کہ لاہور کے ایک بزنس مین کی وجہ سے کام خراب ہو رہا ہے جس کے کراچی میں بھی بزنس و۔۔۔ پتھر ہے۔۔۔“

”اور مجھ گدھے نے اس کا نام بھی جاننے کی ذمت نہیں کی

”جی“ سیٹھ واحد غصہ ڈی سانس لے کر بولا۔

”آپ اس وقت نیڈارک جا رہے تھے اور دوسرے ٹیلی فون پر آپ کی کھنی سے بات چل رہی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ بعد میں اس موضوع پر بات کریں گے اور آپ خود مجھے فون کریں گے لیکن آپ کا فون نہیں آیا۔“

”میں خود ”ایما“ سیٹھ واحد بات کانٹے ہوئے بولا ”میری جس دوسرے فون پر بات ہو رہی تھی وہ سٹیٹ لائٹ ٹیلی فون تھا اور سمندر میں بہت دور تھے ہوئے ایک۔ بحری جہاز پر ایک شخص سے میری بات ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ زیادہ ضروری تھی۔ اس لیے میں نے زیادہ لمبی بات نہیں کی تھی۔ پھر میرا نیڈارک جانے کا پروگرام کیٹس ہو گیا۔ آج صبح میں نے سوچا چلو پاکستان چل کر دیکھ ہی لیتے ہیں وہ کون سا بزنس مین ہے جس کی وجہ سے سیٹھ واحد کا کام خراب ہو رہا ہے۔ بلکہ صرف سیٹھ واحد ہی کا نہیں۔ تقریباً اسی جیسے جو دوسرے آدمیوں کا بھی۔۔۔“

میں نے لپکا سا قہقہہ لگایا اور کہا ”راستے میں غالباً آپ نے یہ فیصلہ بھی کر لیا ہو گا کہ اس مردود بزنس مین کو سمندر میں غرق کروانا ٹھیک رہے گا یا اس کی گاڑی کو کسی ٹرک سے چٹا چر کر کھانا زیادہ مناسب رہے گا۔“

میری بات سے گویا سیٹھ واحد کو روحانی صدمہ پہنچا۔ وہ تکلیف زدہ سے لمبے میں بولا۔ ”ایسی دل دکھانے والی باتیں نہ کرو بخیر ودارا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں تشدد پسند آدمی نہیں ہوں۔ میں تو کبھی کبھار اپنے جانی دشمن کو بھی معاف کر دیتا ہوں۔ اگر کوئی چھوٹا بڑا بستی ہی بری طرح لگے میں پھنس جائے“ صرف اسے نکالنے کا بندوبست کرتا ہوں۔ یہ کوئی ایسی زیادتی کی بات نہیں۔ سانس کی آندورفت جاری رکھنے کے لیے گلے کو صاف رکھنا تو ضروری ہے نا۔۔۔ اور سانس لینے کا سب کو حق حاصل ہے۔ کسی کو کسی کی سانس بند کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔“

پھر وہ جیل احمد کی طرف دیکھ کر بولا ”تم نے تو بہت سی غلط آدمی کو میرے سامنے لا کر بٹھایا۔ اس کے ساتھ تو میں کوئی غنی بھی نہیں کر سکتا۔“

”اگر دل میں ایسا کرنے کا کوئی ارمان ابھر رہا ہے تو تم اسے پورا کرنے کی کوشش کر سکتے ہو“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت غیر ارادی طور پر میرے لمبے میں ایک چیخ سا تھک گیا تھا حالانکہ میں غیر ضروری طور پر کسی کو چیخ کرنے سے گریز ہی کرتا تھا۔ خصوصاً سیٹھ واحد کے سامنے تو ایسا کرنے کی قہقا کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں ”آپ“ سے تم پر بھی اتر گیا تھا۔

سیٹھ واحد کے چہرے پر ایک رنگ سا جگر گزر گیا لیکن اس نے اپنی خوش مزاجی میں فرق نہ آنے دیا اور مسکراتے ہوئے بولا ”میں تو مسئلہ ہے۔ انتہائی ناگزیر حالات کے بغیر تو میں کبھی مارنے کے احکامات بھی جاری نہیں کرتا۔ ایسی باتوں کو اتنا کا مسئلہ نہیں



کرنا پڑی تھیں جس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا اور اس سلسلے میں کم از کم جیل احمد نے ابھی تک میرے بچ پر یقین نہیں کیا تھا۔  
 ”اصل کام کی بات اب اتنی سی ہے کہ وہ آدمی کیا نام ہے اس کا؟ کامران دانش؟“ ہاں۔ وہ آدمی ہمیں دے دو۔ وہ بڑے پیار سے بولا۔

”کاش وہ آدمی میری جیب میں رکھا ہوتا تو میں نکال کر تمہارے حوالے کرنا اور اس بک بک سے نجات پاتا“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”سینہ واحد، ایسا تمہارے خیال میں“ اتنا اتق ہوں کہ اتنی بڑی خوش فہمی ایک شخص کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اتنا بڑا فائدہ پہنچے کی امید ہو۔ اس کے باوجود میں اسے چھپا کر رکھوں؟“

”ہو سکتا ہے تمہیں فوری چیکلش پر مجبور مان ہو۔ ہو سکتا ہے اس میں تمہیں اپنا انٹرنٹ کم محسوس ہو رہا ہو۔ ہو سکتا ہے تم مزید کسی قسم کی ضمانت کی ضرورت محسوس کر رہے ہو۔“ سینہ واحد نرم لہجے میں بولا ”شاید تمہارے ذہن میں یہ امکان موجود ہو کہ ہم خطرناک لوگ ہیں۔ اس آدمی کے سامنے آتے ہی اسے لے اڑیں گے۔ اسے تھوڑی بہت رقم دے کر۔۔۔ یا بالکل ہی سوکے سوکے۔۔۔ محض گن پوائنٹ پر اس سے کاغذات پر دستخط کرا لیں گے۔“

”خفیہ۔ اب ایسا بھی انداز نہیں چاہا ہے“ میں نے جس کر اس کی بات کاغذ ہونے کہا ”جس کام میں میری ٹانگ اڑی ہوئی ہو اس میں اب اتنی بھی دھونس دھانی نہیں چل سکتی۔ میرا نام افضل چوہدری ہے اور میں کوئی کچھ نہیں ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔۔۔“ سینہ واحد نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا ”تم اب پیچیدہ سیرم کی چیز نہیں ہو۔ بہت پائس پھیلائے ہیں تم نے۔ لیکن ہم جو بات کر رہے ہیں وہ تمہاری مرغوبیت کے سامنے میں نہیں کر رہے ہیں۔ تم تو ابھی خواہ مخواہ سچ میں نکل آئے ہو لیکن میں تمہیں ایمان داری سے بتا رہا ہوں۔۔۔ تم سچ میں نہ بھی ہوتے تب بھی یہ ایک صاف ستھری ذیل تھی۔ ہم کامران دانش جیسے بے ضرر اور عام سے آدمی سے براہ راست بھی معاملہ کر رہے ہوتے تب بھی کوئی لے ایمانی یا بد معاشری دکھانے کی کوشش نہ کرتے۔ ہم اس ذیل میں کوئی تند ذالانہ نہیں چاہتے۔ اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہم اپنی ضرورت کے تحت مارکیٹ سے ایک اچھی چیز خریدنا چاہتے ہیں۔ ہم اس کی صحیح قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں اس میں کوئی نقصان نہیں ہے ہم یہ سودا فائدہ کے لیے کر رہے ہیں اور ان سب باتوں کے باوجود اگر تمہارے ذہن میں کوئی اندیشہ، کوئی ایمان، کوئی معاملہ موجود ہے تو بلا تکلف بات کر دو۔ اب میرے اور تمہارے آمنے سامنے آنے سے تو صورت حال بالکل ہی بدل گئی ہے۔“

”کوئی خاص نہیں بدلی“ میں نے نرم لہجے میں کہا ”اس لیے کہ وہ بد نصیب جو سارے لٹا کی جڑ ہے وہ نہ جانے کہاں دھکے کھا رہا

وہ سر جھکا کر اور دوسروں کو ان کی بہتری اور بقا کا زیادہ سے زیادہ سونپ دے کر زندہ رہنے کا قائل ہوں۔ یاد ہے جب تم نے اپنی ملاقات میں میری پیشکش کو ٹھکرایا تھا تو تم اتنے سے تھے۔“ اس نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھتے ہوئے وہی اشارہ کیا جو کسی چیز کے چھوٹے پن کو ظاہر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس کے باوجود میں نے اسے ہلکا سا تسلیم نہیں بنایا۔ خواہ مخواہ کے افساد میں وقت تو اتنی اور علیا ضائع ہو گیا ہے خواہ وہ افساد کتنے ہی معمولی حریف سے ہو۔ بہت اس قفلے کی وجہ سے بعض اوقات میرے ساتھی بھی مجھے بیل قرار دے دیتے ہیں لیکن بعد میں وہ قائل ہو جاتے ہیں کہ میں بالکل نہیں“ غصہ تھا۔“

پھر وہ مجھ سے انداز میں مسکرایا اور نیم وا آنکھوں سے پُر نیل انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”اور تمہارا معاملہ تو بہت لمبے لمبے کچھ عجیب سا ہی ہے۔ میں نے جب پہلے تمہیں دیکھا تھا“ ان وقت بھی۔۔۔ اور آج بھی چند لمحوں کے لیے تو میرے دل میں کچھ ایسے جذبات ابھر آتے ہیں جیسے تم میرے بچھڑے ہوئے بیٹے ہو۔“

میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور کہا ”خواہ مخواہ میرے باپ نے اور غلطی سین خلیق کرنے کی کوشش نہ کرو۔ بے شک میرا باپ دنیا میں نہیں ہے لیکن اب بھی اسی کا یگانا کھانا اور محسوس کرنا زیادہ پسند کرنا ہوں۔ وہ ایک سیدھا سادہ، معصوم اور غریب سا بھائی تھا جس نے زندگی میں کبھی اپنے قول و فعل سے کسی کو ذرا ناگہمی تکلیف نہیں پہنچائی۔“

”مجھ میں اس کے مقابلے میں بس ایک سی خرابی ہے کہ میں آپ نہیں ہوں۔“ سینہ واحد ہلکی سی کھانسی کے ساتھ بولا ”ورنہ اگر کوئی مجھے قریب سے جان سکے اور میرے دل میں جھاک سکے تو نہ بھی ایک نہایت سیدھا سادہ اور معصوم سا بھائی ہوں“ اس نے لہجے میں واقعی ہلکی سی افسردگی گھٹی ”مجھے آج تک کسی نے مجھے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حتیٰ کہ میری بیویوں نے بھی نہیں۔ اور اولاد میری بیویوں سے نہیں ہے۔“

”اچھا۔ زیادہ ڈراما کرنے کی کوشش نہ کرو اور اصل کام کی بات کرو“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے ایک نازک موضوع چھیڑ دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی اتنی چیزت ایک خطرناک سے سو ز پر ہی تھی۔ اس کے باوجود اب ذیل میں کوئی تاؤ نہیں رہا تھا اور ایک بے عنوان سی اپنائیت و نہ تنقیدی کی نشا پید ہو گئی تھی۔ مجھے اعتراف تھا کہ یہ میرا نہیں تھا۔ اس کی عجیب و غریب سی شخصیت کا کمال تھا ورنہ میں نے اس سے پہلے چھلکی سی چھیڑ چھاؤں کی تھی اور اس کی وجہ محض یہ تھا کہ میں اپنے دل میں شاید ایک بے نام سی جھنجھلاہٹ محسوس رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ ایک ایسے معاملے میں اپنی مفتائیاں چھٹی

مزد بڑھا دیا۔ اس نے اس سیاہ بیروانی اور پتے جیسی سفید ہفت لگی شوار کے رنگوں کے تضاد نے اس کی شخصیت کو اور نکھار دیا تھا۔ وہ اپنے دیکھنے کے ساتھ اپنی جگہ ایک منفرد اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔

اس کے دامن بائیں دونوں پہلوؤں میں شہر دانی کی جیسے کچھ پھول پھولی لگ رہی تھیں۔ اس کے سر تاپا نہیں ملے ہیں یہ عیب نہیں ہو سکتا تھا لیکن میرے خیال میں یہ اس کی بجزوری تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ڈرائیور ہونے کے ساتھ ساتھ سینہ واحد کا دیکھی اور غیر رسمی بازی گارڈ بھی ہو گا۔ اس کی شہر دانی کی دونوں جیبوں میں یقیناً گنیں موجود تھیں۔ اس دوران میں اڈاکا کا گاڑیاں آس پاس پارک ہوئی تھیں اور ان میں سے اترنے والے لوگوں میں سے کوئی خوفزدہ اور کوئی تجسس نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے اور کالی دور دور رہے ہوئے کی گزرتا چلا گیا تھا کیونکہ سینہ واحد کے دونوں گارڈز الٹ حالت میں تھیں سنبالے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں یوں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں جیسے انھیں ہر ایک پر ہی دھن ہونے کا شبہ ہو۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ گزرنے والوں کی نظروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ انتخابات میرے لیے تھے۔ انھیں شاید گمان بھی نہ گذرا ہو کہ یہ سارے انتخابات اور سارا... ٹھاٹ بات اس پتہ قد پھول سے قطعاً کا تھا جس کے چھوڑے کچھڑی بال ہوا میں لہرا رہے تھے جو معمولی سے ایک سوئی دھال سے بار بار ناک پکڑ کر کشوں کشوں کر رہا تھا۔ جو معمولی قسم کے ایک چمکن آلود اور ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں تھا اور جو اپنے منہ سے ہونے چہرے سے تیار روئیاں دکھائی دے رہے تھا۔

ایک اچھی بات یہ تھی کہ سینہ واحد کو غالباً اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا قطعاً کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے اسے اپنے منہ اور کسی کی پسند نا پسند کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس طرح شائع عام پر کھڑے ہو کر لوگوں کی نظر میں آنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلتے ہی وہ جلدی سے اس میں گھس گیا۔ مجھے اس نے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کی دو کے بجائے تین قطاریں تھیں۔ ڈرائیور کا کنارہ ٹھٹٹ الگ تھا اور اس سے بات کرنے کے لیے شیشے کی دیوار میں مایک لگا ہوا تھا۔ دروازے بند ہونے ہی کچھ یوں محسوس ہوا جیسے ہم ایک چھوٹے سے پُر جنس جہاز میں آن بیٹھے تھے۔ پھر یہ جہاز بے گواہ طریقے سے سڑک پر بھروسے لینے لگا۔ بند گاڑی کی خشک اور خوشبودار فضا میں سینہ واحد کے سر میں گئے ہوئے چینیلی کے تیل کی خوشبو گویا اور بھی تیز ہو گئی تھی اور پہلے سے موجود بھی کئی خوشبو پر غالب آگئی تھی۔

آرام سے چیل کر بیٹھے ہی وہ بولا "اب تم مجھے کامران وائس کے بارے میں ساری بات بتا دو۔"

میں نے کئی پہلوؤں کو چھوڑ کر باقی ساری بات اسے بتا دی۔

میرے خاموس ہونے کے بعد بھی خاموس ہی رہا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چند لمبے وہ گاڑی کے آریک شیشے سے باہر دیکھا رہا۔ بلند ڈیلا عمارتیں اور گاڑیوں کے ریلے گزرتے بارے تھے ڈرائیور کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن اسے گویا معلوم تھا کہ کہاں جانا تھا۔

"کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔  
"کیا ہے؟" اس نے نہایت انحصار سے جواب دیا "میں تو جیران ہو رہا ہوں کہ کیا تقدیر کسی انسان کو اس طرح بھی دکھائی ہے۔ یا یوں کہو کہ کیا کبھی انسان تقدیر کو بھی اس طرح دکھاتا ہے! وہ جب تمہیں دکھا دے کہ کہا کا تو درحقیقت اپنی خوش قسمتی کو دکھا دے کہ کہا گ رہا تھا۔"

"اگر انسان کو آنے والے وقت کا اندازہ ہو تو کوئی بھی اس قسم کے بلکہ کسی بھی قسم کی حماقت نہ کرے" میں نے کہا۔  
"میرا حال تم اس کی ایک اچھی سی تصویر تو مجھے فراہم کر دو۔" وہ میری سانس لے کر بولا۔

"اس شہر میں اس قسم کے غیر اہم... نہایت عام اور بے سراغ شخصیت کو تلاش کرنا ہے تو بہت مشکل۔ لیکن میں اپنی سی کوشش کروں گا اور اپنی سینڈ کیٹ کے دوسرے سینھوں سے بھی کچھ نکالوں گا کہ وہ بھی اپنے وسائل استعمال کریں لیکن اس مسئلے میں قسمت پر ہی بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس کی اور ہماری قسمت میں ہوا تو شاید کوئی بھی قسمت اسے ہمارے سامنے لا کر نہ کرے ورنہ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"تم بھی قسمت پر یقین رکھتے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
"یقین نہیں" وہ جلا تاقل بولا۔ "بلکہ میں تو یقین ہی قسمت پر رکھتا ہوں۔"

"یعنی تمہیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے وہ تم نے اپنی عقل سے بنایا ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو اپنی عقل سے بنے ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔  
"ارے برخود ارے! میں کیا اور میری عقل کیا...! وہ خوش طبع سے بولا مجھے اسے اور تم سے کہیں زیادہ عقلمند لوگ جو اپنی تمام تر چالاکیوں کو بھی ہونے لارہے ہیں سڑکوں پر جوتاں چھانے پھر رہے ہیں۔ عقل بھی کبھی کام آتی ہے جب قسمت اچھی ہو۔ قسمت اچھی نہ ہو تو اچھے بھلے عقلمند انہ کام بھی حماقت ثابت ہوتے ہیں اور قسمت اچھی ہو تو حماقتیں بھی عقلمند بن جاتی ہیں۔"

"جہاں تک کامران کا معاملہ ہے تو اسے میرے تو ہی بھی تلاش کر چکے ہیں۔ پولیس بھی تلاش کر رہی ہے۔ اب تم اور تمہارے ساتھی بھی اپنے وسائل استعمال کر کے دیکھ لیں۔ شاید لی ہی جائے میں نے تو اس شخص کی طرف سے صبر کر لیا ہے" میں نے کہا۔

لے کر اس طرف مزید قہر ہونے کی توقع نہیں تھی۔ یہ اس لاش کا آخری مکان تھا۔ اس سے آگے کافی دور خلیج میں سمندر جھانک اڑا تا دکھائی دیا تھا لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب گاڑی گیت پر رکی تھی۔ مکان کے اندر سے قواد گرد کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گرد و پیش کا نظارہ کرنے کے لیے بہت یا نہیں پر جانا ضروری تھا۔

سیٹھ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر روانہ دار اندر گھستا چلا جا رہا تھا۔ وہ بغیر اطلاع بغیر دستک ہر کمرے کو کھل کر اس میں جھانکنا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ گویا مجھے بھی اپنی نجی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کر رہا تھا اور اس میں بالکل بھی چھپا نہیں رہا تھا کہ اگر صحیح معنوں میں دکھایا جاتا تو ذرا بے فکرتانہ ماحول میں یہ اس کی اور میری پہلی ملاقات تھی جب کہ اس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت ریزروڈ حسم کا آدمی تھا۔ اس سے تو رسمی ملاقات کے لیے بھی بہت سے لوگوں کو بہت طویل انتظار کرنا پڑا تھا۔

آخر ہم ایک لانڈی نما ہال سے گزر کر چائیک ایک بیڈ روم کے دو دروازے پر جا پہنچے۔ وہ دروازہ کھلا ہی تھا۔ وہ ایک نہایت شاندار اور پر نقش بیڈ روم تھا۔ زندگی کی ہر وہ آسائش وہاں موجود تھی جس کا کسی بیڈ روم میں تصور کیا جاسکتا تھا۔ اس کے وسط میں ایک خوبصورت اور شاندار حسم کے بیڈروم کے بیڈ پر کافور کے نہایت اعلیٰ ابلے آرام دہ سے لباس میں ایک عورت گاؤ نکلیں کے سارے نیم دراز تھی۔

تین اچھی خوش شکل اور خوش لباس لڑکیاں جو غلاما میں مطمئن تو نہیں ہوئی تھیں لیکن یقیناً غلاما میں ہی تھیں، اس کی خدمت گزاروں میں معصوم تھی۔ ایک اس کے سرانے بیٹھی نہایت پیار سے تہستہ تہستہ اس کے بالوں میں برش کر رہی تھی۔ ایک اس کے پیلوں میں بیٹھی ایک خوبصورت نرے میں اس کے باطن تراش رہی تھی۔ ایک کسی مٹی آلے سے اس کے پیلوں کو مساج کر رہی تھی۔

خوبصورتی کے مختلف پیمانے ہوتے ہیں۔ اس عورت کو بھی خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ خوبصورتی ایک عجیب سی نہایت شفقت اور شاید مٹا کی تھی۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس عورت کی حرم کا ازم ستر برس تھی اور اس کے بال بدلتی کے گالوں کی طرح سفید تھے۔ اس کے چہرے پر شکستیں تھیں مگر وہ بری نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں دو دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ان بوجھ آتھوں میں انتظار کے چراغ روشن تھے۔ شاید اسی لیے ان میں اتنی چمک تھی ورنہ اس حرم میں ان آنکھوں کو دھندلا جانا چاہیے تھا۔

سیٹھ واحد پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اٹھنے لگی۔ لڑکیوں نے جلدی سے اپنے کام چھوڑ کر اسے سارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ان کی مدد کے بغیر ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ انگلیں بیڈ سے نیچے

دو مسافرانہ انداز میں ہونا "مجھے اس شخص کی قسمت بہت سی خراب لگتی ہے۔ یہ مجھے انہی لوگوں میں سے لگتا ہے جو سونے میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ مٹی ہو جاتا ہے۔"

گاڑی اب اس طویل سڑک پر بھگورے لے رہی تھی جس کے ایک سرے پر پہنچ کر کشتن کی غیرات تقریب ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے مستقبل کے منصوبے زیر غور یا زیر قہر تھے۔ چند منٹ بعد گاڑی ایک نہایت خوبصورت پتنگ کے سامنے جا کر کی جو شاید اس سڑک پر بہت پہلے سے قہر ہوا تھا لیکن اس کا پتہ ان اور خوبصورتی پر قرار رکھنے پر یقیناً بہت تو جلدی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے حاضری انتظامات بھی زبردست تھے۔ ایک تو اس کے طرز قہر میں ہی حاضری پیلوں کا بہت خیال رکھا گیا تھا اور اسے مزید حاضری انتظامات بھی کئے گئے تھے۔ اونچی دیواریں، خاردار چمکتی آئیں جن میں شاید کرنٹ دوڑانے کا بھی انتظام تھا، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فٹ لائٹس وغیرہ گیت بھی زبردست تھا۔ مجموعی طور پر وہ پورا جگہ چھوٹے سے ایک خوبصورت قلعے کی طرح تھا۔

گاڑی کا پان بجایا۔ اندر سے غالباً گاڑی کو دیکھ لیا گیا تھا اور پتہ چل گیا تھا کہ یہ کون سے ہی گیت خود کار انداز میں گھٹا ہوا تھا۔ اندر دو طرف دو چاق و چوبند مسلح گارڈ کھڑے تھے۔ سیٹھ واحد مجھے مخاطب ہوا "میرا بہت سی خیر لگتا ہے۔ عام طور پر جب میں باہر سے آتا ہوں تو ایک آدھ دن کے لیے یہاں پکڑا جاتا ہوں لیکن بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے اور میرے ساتھ تو آج تک یہاں کوئی نہیں آیا۔ ایسے کسی آدمی کو تو ساتھ لانے کا میں ضرور بھی نہیں کر سکتا تھا جس سے زندگی میں صرف ایک دو لڑکیاں ہی ہوئی ہوں۔"

بہرہہ ششکانہ انداز میں مسکرایا "لیکن تمہاری بات دو سہی ہے۔"

میرے لیے بہت مشکل نہیں تھا کہ یہ اس کی کسی بہت سی اس اور سب سے زیادہ دل بند داشتہ کا گھر تھا جہاں وہ شاندار ملت بات کے ساتھ رہتی ہوگی اور یہ سب سیٹھ واحد ہی کی ازمنات ہوں گی۔ اس تصور سے ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں تیز ہوئیں کہ وہ یقیناً کوئی غیر معمولی طور پر خوبصورت اور کی طرح میں دل سے لینے والی عورت ہوگی۔ کوئی عیب نہیں تھا کہ اظہر من الشمس کی کوئی خوش شکل 'خوش ادا' خود آمد اور تروتازہ لڑکی

ہم گاڑی سے اترے تو سیٹھ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ گاڑی وہیں کھڑے رہ گئی۔ اس پتنگ کا لان قابل دید تھا۔ بڑے بڑے ہموار اور تروتازہ لان کسی دیکھنے میں آتے تھے۔ اس کی گلیں فرش کو نہایت خوبصورت رنگارنگ پتھروں والے پودوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پتنگ میں سے فٹنگ پول بھی موجود تھا۔ عام طور پر یہ پتنگ میں اگر سونگ پول موجود ہو تو پیچھے کی طرف سب سے پہلے اس پر پہنچا جاتا ہے۔ پتنگ کے ایک حصہ میں

اور میں یہاں تیری صورت دیکھنے کو تری تری مریاؤں کی۔ اب صرف کیا ایک وعدہ دیا گیا ہے کہ تو جب بھی ملک سے باہر جاؤ گے گا تو واپسی پر سب سے پہلے میرے پاس حاضری دیا کرے گا۔ اس کے بعد کچھ اور کرے گا۔ اس کے سوا تو اب میری تجھ سے کسی موقع پر ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ اب تو نے اس وعدے میں بھی ڈیڑھی مانی شروع کر دی ہے۔

اماں! چھٹی مونی میرا پیسری تو ہو ہی جاتی ہے۔ اب صاف کر دیں نا۔ وہ اتنی پانی مار کر پیٹھے پیٹھے اپنی ماں کی ٹانگیں دبائے گا۔

اماں نے ازراہِ کرم جوتی تو واپس قالین پر بیٹھ دی لیکن ان کے گلے شکوے جاری رہے۔ ایک تو نے اپنے انکھڑی انگ تار کھا چکے تھے۔ دوسری بڑھیا کو اس انکاڑا بیا بان لٹو ورتی گھر میں پیچک رکھا ہے۔

اماں! یہ اجاڑ بیا بان لٹو ورتی گھر ہے؟ سینہ واحد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ یہاں اتنے ملازم اور ملازمتیں ہیں۔ لی وکی ہے۔ دی سی آر ہے۔ ڈشیں لگی ہوئی ہیں۔ اتنے بہت سارے پیچھے ہیں۔ مجھ سے کینڈا میں ایک مہربان ملک کی ایک بہت بڑی ایکٹرس کہہ رہی تھی کہ یو زھول اور بیا بان کے لیے لی وکی وقت گزارا کرتا ہے۔ اچھا ذرا یہ ہے۔

یہ تو کراہا کر لی وکی ڈشیں اور دی سی آر کیا اولاد کا دل ہوتے ہیں؟ اماں نے گویا اس کی محفل پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔ اس طرح تو دنیا کے سب امیر اور دولت مند بیٹوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ماؤں کے اوپر یہ سب چیزیں لاکر انہیں اوٹنی لوٹنی دلا دیں۔ والی ایسی ہی خوبصورت قبول میں دفن کر دیا کریں۔ انہوں نے اپنے استخوانی سے ہاتھوں سے چاندل طرف اشارہ کیا۔

بعض امیر بیٹے تو یہ بھی نہیں کرتے اماں! سینہ واحد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ان کی ساری دولت مندی کے باوجود ان کی ماں نے کیا کیا۔ یا پاپا۔ یا پھر دونوں بڑی عالمی رحم زندگی گزارتے ہیں۔

ماں حسان دھر رہا ہے مجھ پر؟ اماں ایک بار پھر لال چلیا ہر گھنٹے لے جا انکا کراہی یہ ساری چیزیں۔ اور اپنا یہ جھانجا میں کرتا بگھا بھی اپنے پاس رکھ لے مجھے کیا کرنا ہے ان ساری چیزوں کا؟ میں کون سا اس کی دیواؤں کو چاہتی ہوں؟ میں تو ایک کمرے میں بیٹھ رہتی ہوں۔ اور میرے لی وکی دی سی آر یا ڈش وغیرہ میں تو لعنت سمجھتی ہوں۔ میری وقت گزارا کی تو گھر نہ کیا کہ میرا وقت تو اللہ کی یاد میں بہت اچھا گزر جاتا ہے۔ نمازیں۔ نفل وغیرہ پڑھتی رہتی ہوں۔ سچی کہتی رہتی ہوں۔ مجھے تمہاری ان خرافات سے کیا دلچسپی ہے۔ ملازم لڑکیاں چلائے رکھی ہیں تو بھی کھار کوئی پروگرام کچھ نہیں کرتی ہوں۔ ان سب سے کچھ نہ تھا کہ تو میرے پاس رہ کر نا۔ چاہے ہم اپنے گاؤں کے اسی کچھ

سینہ واحد کو گھورنے لگی۔ سینہ واحد اس بچے کی طرح اپنے سے انداز میں اس کی طرف بڑھا جو اسکول سے بھاگ کر گھر پرے اڑا کر آ رہا تھا اور گھر پر اس کی شکایت اس کی آمد سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

وہ جا کر عورت کے قدموں میں بیٹھ گیا جس نے شاید اپنی آواز کو حتی الامکان بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

نہ گئے تھے تم؟

نہیں بھی نہیں اماں۔ فریوٹ سے سیدھا میں آ رہی ہوں۔ اس شخص نے خوف سے سکتے ہوئے جواب دیا۔ یہ وہ شخص تھا جس سے نہ جانے کتنے طرم خان خزانہ رہتے تھے۔

بھوت بول رہے ہو۔ بڑی بی نے آنکھیں نکالیں جن میں اس فریوٹ فون کے معلوم کر چکی ہوں۔ وہاں سے تم پہلے دو گئے پہلے روانہ ہوئے تھے۔

اماں! مجھے راستے میں دو ایک کام پڑ گئے تھے۔ سینہ واحد نے اپنے بیان میں ترمیم کی۔ میں اب پھر اس عورت کو کچھ رہا تھا جو پیٹھ سینہ واحد کی ماں تھی۔ وہ واحد کے ستا پنے میں زیادہ خوش شکل اور گوری جتنی بھی پھر بھی واحد کی شکل میں سر حال اس کی بھلک موجود تھی لیکن شاید وہ زیادہ اپنے باپ پر گیا ہو۔

مگر پھر پہلے بھوت کہاں بولا تھا؟ اماں پہلے سے زیادہ غصے سے بولیں۔ انہوں نے اپنی ٹھیکس سی جوتی اٹھائی جو نرم ٹھیک اور کسی غیر ملک کی بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے ٹھپ ٹھپ کر کے دو تھپیں ہاتھوں اس کی کمر پر رسید کر دیں۔

سینہ واحد نے سر جھکا کر نہایت سعادت مندی سے جوتاں کھائیں پھر جھپٹا ہٹ سے بولا۔ اماں کام تو بڑے ہی رہتے ہیں نا۔ چوتھا تار تھا کہ اس کی یہ جھپٹا ہٹ معنوی تھی ورنہ درحقیقت وہ اس عمل سے بہت محفوظ ہوا تھا۔ اماں نے بھی جوتاں بظاہر تو بڑے غصے میں ماری تھیں لیکن درحقیقت کوشش کی تھی کہ بچے کو چوٹ نہ لگے۔ پائے لڑکیاں اس دوران میں گویا کان دبا کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔ میں دوا دے سے ٹپک لگائے دو ٹون ہاتھ چٹون کی جیوں میں ڈالے کھڑا تھا۔

کام۔ کام۔ کام۔ اماں نے غصے میں اس کی نقل اتارتے ہوئے اسے ایک جوتی اور رسید کی۔ اس بار جوتی سر پر پڑی تھی۔ یہ جوتاں وہ تو ہی کھار تھا جس کے ایک اشارے پر لاشیں گر گئی تھیں۔ اور گر گئی تھیں۔ میں بڑی دلچسپی اور شہماک سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا بلکہ جی پوچھتے تو میں بھوت دیکھتا تھا۔ میں نے یہاں سینہ واحد کی کسی داشتہ سے سامنا ہونے کا یقین لے کر کیا تھا لیکن اس کی جگہ مجھے جو کچھ دیکھنے کو ملا تھا اس سے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا تھا لیکن اب بھی اس جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ اب تو میں اک خوشگوار سی حیرت تھی۔ دونوں بعد ایسی خوشگوار حیرت سے داخلہ پڑا تھا۔



”آپ کو پتا ہے میرے لیے پہلی کھانا ہونا چاہیے“ سینہ

واحد بولا۔

”اے سینہ پتا ہے۔ سب پتا ہے۔ میرے بارے میں مجھ سے زیادہ کسے پتا ہوگا؟“ بڑی بی بی نے ہلکی سی زانت پلانے کے انداز میں کہا ”میں نے پہلی ہی کھانا تیار کرنے کے لیے کہا ہوا ہے لیکن میرے ساتھ وہ گروتہ پر پہلی بھی کر لے گا تو تجھے کچھ نہیں ہوگا۔“

اس دوران میں سینہ واحد حسب معمول دھتے دھتے سے ہلکا ہلکا کھانا بنا تھا۔ اب پرہیز اور پرہیز کا ذکر آیا تو بڑی بی بی کا دھیان اس طرف بھی چلا گیا اس بار وہ بولیں تو ان کے لیے میں تشویش جھلک آئی تھی ”یہ تمہاری کھانسی ٹھیک ہو کر نہیں دے رہی۔ اس زمانے میں تو سنا ہے سوئے بی بی کے مریض بھی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تمہاری یہ معمولی سی کھانسی دنیا بھر کے ڈاکٹروں سے ٹھیک نہ ہوئی مگر پھر بھی تمہیں سبق حاصل نہ ہوا۔ تم نے میرے اس معمول سے کتنے پر عمل کر کے نہ دیا۔“

”کون سا نسخہ امان؟“ سینہ واحد نے عدم دلچسپی سے پوچھا۔

”دیکھ۔ کچھ امروہی رکھنا یا کرشمہ کے ساتھ چائے والا“

اماں نے یاد دلایا۔

”اے ہاں۔“ سینہ واحد کو گویا یاد آگیا ”اس پر بھی عمل کیا تھا۔ ملک کے ایک بہت بڑے حکیم صاحب کو بتا کر ان کے ہاں سے تیار کر کے منگوایا تھا یہ نسخہ بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تین نسخے اپنے بھی تیار کروا کے پیچھے تھے کسی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”اے۔۔۔ ان بڑے حکیم صاحب کا کیا مجھوسا؟“ بڑی بی بی پرگمانی سے بولیں ”وہ کون سا دواں خود بیٹھ کر نسخے تیار کرتے ہوں گے۔ ان کے ملازمین ہی سارے کام کرتے ہوں گے۔ اور ملازموں کا کیا مجھوسا۔ کچھ امروہی رکھ کر ایک جگہ آٹپے کی رکھ کر بیچ دی ہو۔ فائدہ کے بجائے انا نقصان ہو گیا ہو۔“

”اے! اس طرح نہیں ہوتا۔ دنیا کے کام اس طرح نہیں چلتے۔ اتنا بڑا دوا خانہ۔ بلکہ دواؤں کے کارخانے ہیں ان کے۔“

سینہ واحد نے بے چارگی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”مجھے سب پتا ہے دنیا کے کام کیسے چلتے ہیں۔ میں دنیا کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم میری ماں نہیں ہو۔“ اماں نے ایک بار پھر آنکھیں نکالیں ”اے سا کام تم خود اپنے ہاتھ سے نہیں کر سکتے تھے؟“

”بی بی میں خود بیٹھ کر کچھ امروہ کو جلا کر اس کی رکھ تیار کرتا ہوں؟“ سینہ واحد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”اے۔۔۔ لیکن اسے پہلے سے دیکھتے ہوئے کو کون پر جلاتا ضروری تھا؟“ اماں نے درست طریقہ کار کی ضرورت کا احساس دلایا ”اس کے بعد خالص شہد حلاش کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ اور خالص شہد حاصل کرنے کا آج کی دنیا میں ایک ہی طریقہ نہ گیا ہے۔“

”تجھے پتا نہیں کہ میں کبھی کسی کا پڑا نہیں چاہتی۔“

”پتا ہے اے۔۔۔ لیکن ہر حال۔۔۔ میں آپ کو ان حالات میں نہیں رکھ سکے۔ اب آپ ایک بڑے آدمی کی اماں ہیں۔ آپ کو اپنے اور اس کے شاہان شان طریقے سے ہی رہنا ہوگا۔ میں تو کوشش کرتا رہتا ہوں کہ فوجانی کے زمانے کی کوئی حسرت آپ کے دل میں نہ رہے۔ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو دو کھوں کے مکان میں ہم افسانہ میں افراد رہتے تھے۔ اس وقت آپ اب اسے اسی بات پر فورا کرتی تھیں کہ اس گھر میں تو پاؤں پھیلائے کی بھی جگہ نہیں۔ رات کو کھانسی بہار کر سونے کی کوشش کو تو کسی کے ہاتھ جانتی ہے۔ اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آدمی کم ہیں کرے زیادہ۔“

”لیکن اب نہ وہ فوجانی ہے اور نہ میرے ابا ہیں“ بڑی بی بی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں ”جب وی نہ رہے تو ان خالی جگہیں بھائیں کرے کھوں کا میں کیا کر سکتی گی۔“

”اب میں فوجانی اور اماں کی تو دوا میں لانے سے ہوا اماں! اس بار سینہ واحد بھی گویا جل کر ہوا ”انسان کو چوبیس برس ہوتی ہے اس کا بھی شہر ادا نہیں کرتا۔ جو چیز اس کے پاس نہیں ہوتی اسی کا دوا نہ آتا رہتا ہے۔ واقعی انسان کو خوش کرنا اللہ کو خوش کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔“

بڑی بی بی اب دوا میں اٹھ کر اپنے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سینہ واحد فیصل کن لیے میں ہوا ہر حال۔ جس طرح آپ چاہتی ہیں اس طرح تو میں آپ کو نہیں رکھ سکے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ یہ اس آدمی کی ماں ہے جس کی دولت مندی کے قحط دور سے ملوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔“

”جو پھر مجھے گاؤں کی دوا میں بھیج دے“ اماں نے منہ ہی کی۔ ”گاؤں میں بھی اب کچھ نہیں رکھا اماں! دواں بھی اب بے سکتی ہے۔ اب آپ دواں بھی نہیں دے سکتیں گی۔ انسان نے ہر جگہ انسان کا سکون اجاڑ رکھا ہے۔ غرقوں کے صفوں ہر جگہ پاؤں پھیلا چکے ہیں۔“ سینہ واحد سختی سے بولا۔

”چھ! اماں نے فکرت خوردہ سے انداز میں سر ہٹا لیا ”مجھے معلوم ہے تو میری کوئی بات نہیں مانے گا۔ اپنی چائے گا۔ کم از کم اتنا ہی کر لیا کرے کہ میرے پاس ذرا زیادہ دیر کے لیے آجیلا کسے تو ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا ہے“ اگلی میں صحیح طرح تیری شکل بھی نہیں دیکھ پائی۔ اور تو تائب ہو جاتا ہے۔“

سینہ واحد کچھ سوچ کر ہوا ”چھ! آج میں ذرا زیادہ دیر کے لیے آپ کے پاس رک جاتا ہوں۔ آج دیر کا کھانا میں آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ ذرا خانہ میں کو بڑا کر کے دیں کہ میرے لیے بھی کھانا تیار کرے۔“

بڑی بی بیوں کی طرح غرض ہوتے ہوئے ذرا فحرت سے بولیں ”وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج تو دیر کا کھانا میرے ساتھ کھائے گا۔“

اس سے پہلے کہ اماں کوئی جواب دیتی، سینو واحد مجھے ڈانٹنے کے سے انداز میں بولا "سب اماں کے سامنے زیادہ سعادت مند بن کر مجھ سے زیادہ ان کے جیتے بننے کی کوشش نہ کرو۔ جہاں اماں کہہ رہی ہیں وہیں بیٹھ جاؤ۔"

اماں لٹھڑی سانس لے کر بولیں "بیٹا! ہمیں بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے بید کو چست کیا "یہ بیچن میں بھی بڑا حاسد بچہ تھا۔ اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کی ماں کسی اور کو زیادہ پسند کرے۔ شاید اسی لیے یہ اکلوتا ہی رہا۔"

میں ان کے برابر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے پار کیا، دعا کہیں دیر۔ پھر میرے بارے میں پوچھنے لگیں مجھ سے زیادہ ان کے سوالوں کے جواب سینو واحد دیتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اماں مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ ایک تو ویسے بھی وہ احساس ختمی کی ماری ہوئی تھیں۔ میں ان کے لیے گویا باہر کی دنیا کا آدمی تھا۔ دوسرے جب انہیں معلوم ہوا کہ میری والدہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے مر چکی تھیں اور میرے لڑپکے میں میرے والد بھی قتل ہو گئے تھے تو ان کی محبت و شفقت کی انتہا نہ رہی۔ وہ مجھے لپٹا دو سرا بیٹا بنانے پر لگ گئیں۔ سینو واحد نے بڑی مشکل سے انہیں باز رکھا۔ وہ خود کہ چکا تھا کہ وہ میرے لیے اپنے دل میں یہ رات نہ جڈ بات محسوس کرتا تھا۔ یوں یہ کچھ عجیب سا سلسلہ بن رہا تھا۔ میں نے سروسٹ میں بستر سمجھا کہ زندگی جس طرح تڑپ رہی تھی اسی طرح گزارنے دی جائے۔ ان دونوں ہی کی شفقت سے مستفیض ہوئے بغیر بھی گزارا ہو رہا تھا اور بہت اچھا ہو رہا تھا اس لیے میں نے زیادہ بد بانی ہونے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ماں بیٹی کی اتھالی تھی، ادا تہ تھی۔ میں پہلے ہی اس کا جس حد تک تشاکر چکا تھا وہی کافی تھا۔ چند منٹ بعد میں نے اجازت چاہی تو اماں کا کام روٹھیں پھر سنبھلیں کر بولیں "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی تو تم نے یہاں دو گھنٹہ پانی تک نہیں پیا۔ میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ اب کتنا لگے ہی والا ہے۔ تم کھانا کھا کر جاؤ گے۔ واحد کی اماں کے گھر تے تو دشمن بھی چھو کھائے پتے بغیر نہیں جاسکتا۔"

میں نے زیادہ انکار کر دیا تو اماں لال چلی ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی ٹھیکس جوتی اٹھا کر بلا تاہل ایک لمحے بھی رسید نہ کی۔ وہ پھول کی طرح ٹھیک تھی۔ سینو واحد نے اتھالی سعادت خواہانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ہنسی آئی۔ تب اماں ایک جوتی اور رسید کرتے ہوئے بولیں "بے شرم! جوتی کھا کر ہٹتا ہے۔ تجھے اتنا بھی پانی نہیں کہ جوتیاں کھا کر روٹے ہیں۔ شرمندہ ہوتے ہیں۔"

"اماں! اب اس کی دوائے اور شرمندہ ہونے کی عمر نہیں رہی۔" سینو واحد نے گویا اپنی ماں کو سمجھا "اوپر سے اس کا جسم فولاد کی طرح ہے۔ اسے اگر مارا جائے تو کوئی گراؤ اٹھا کر مارو۔ کھوار مارا کھڑائی مانوس۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی سوا سا ڈنڈا ہی اٹھا کر دو۔"

"وہ کیا؟" سینو واحد نے سروے سے مجھے میں پوچھا۔  
"وہ یہ کہ کہیں شدہ کی کھیموں کا چھتا تلاش کر کے تم خود اپنی گھرانی میں اتروا تے اور اس سے شدہ نکالتے۔ اماں نے نہایت اطمینان سے کہا۔"

سینو واحد پہنی پہنی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اماں تھا ہوتے ہوئے بولیں "اس میں اس طرح سے پہاڑ چاڑ کر دیکھنے والی کیا بات ہے؟ یہ کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں ہے۔ اور تمہارے پاس تو ویسے بھی ہر دقت اتنے آدمیوں کی فوج نظر موج موجود رہتی ہے۔ پتا نہیں کن کاموں کے لیے اتنے سنبڑے ہالے ہوئے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو اتنی بڑی بندو قیل آغا کر موت کے فرشتوں کی طرح ساتھ ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔ بلکہ ان کا بس چلے تو شاید تو ہیں اٹھا کر گھومتے گئیں۔ ان سے تم اپنی گھرانی میں اتنا کام نہیں لے سکتے کہ وہ کسی درخت سے نہیں شدہ کا پھتا اتار دیں؟"

"نہیں اماں! میں ان سے یہ کام نہیں لے سکتا۔" سینو واحد نے صاف صاف معذرت کرنی بھر ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "اور خدا کے لیے اب آپ میری جان چھوڑیں۔ آپ نے خوب اچھی طرح میری خبر لے لی ہے۔ اب میری جان بخش دیں۔ کم از کم یہی خیال کر لیں کہ میرے ساتھ کوئی آیا ہوا ہے جو بے جا رہا ابھی تک۔ روزانہ پر ہی کھڑا ہوا ہے۔"

اماں کے دل کی بھڑاس اب اچھی طرح نکل چکی تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے شفقانہ اور معذرت خواہانہ سی نظریے میری طرف دیکھا اور بولیں "ہاں۔۔۔ میں نے کچھ تو کیا تھا لیکن تب بیٹے کی ملاقات اتنے دنوں بعد ہوئی تو پہلے انہیں اپنی باتیں کر لیں چاہئیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ حق تو تمہارا اسمان ایک ماں کو ضرور دے گا۔ کیوں بیٹا؟" انہوں نے دوسرے ہی مجھ سے پوچھا۔

میں گویا دروازے پر کھڑے کھڑے کہی اور ہی دینا میں پہنی ہوا تھا۔ میں نے حکاکر کر گھلا صاف کیا اور مسکراتے ہوئے کہا "اماں! بی بی یہ حق تو آپ صرف واحد کو ہی نہیں مجھے بھی جوتیاں مار کر لے سکتی ہیں۔"

"اماں نے حسین آئینہ نظروں سے سینو واحد کی طرف دیکھا اور سناٹے انداز میں سہلاتے ہوئے بولیں "یہ بھی سعادت مند بچہ ہے۔ نیک۔ والدین کی اولاد معلوم ہوتا ہے شاید اسی لیے تم اسے یہاں تک لے آئے اور انک دوم میں نہیں بٹھایا۔ اچھا نہ کیا۔" مجھے معلوم تھا یہ ڈراما انک دوم میں بٹھانے والا اسمان نہیں ہے۔ "سینو واحد بولا۔"

"یہاں آؤ بیٹا! میرے پاس آؤ۔" اماں نے اشارہ کیا۔  
میں قریب پہنچا تو انہوں نے بیڈ پر اپنے قریب بیٹنے کا اشارہ کیا۔ ایک طرف سینو واحد بیٹھا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے مجھے بیٹنے کا اشارہ کیا تھا لیکن میں نے کہا "اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ دیر کے لیے آپ کے قدموں میں بیٹھ جاؤں؟"

جانے سے بھی قہر کر لیا۔

”جلیس۔ آپ نے اس میں ایک مرتبہ وضو کر لیا۔ میں سمجھوں گا اس کی قیمت وصول ہوگئی۔“ سیٹھ واحد مسکراتے ہوئے بولا ”اور جہاں تک نوکروں کی اعلیٰ پائیاں کرنے کا تعلق ہے تو مجھے امید ہے آپ ان پر بھی کبھی غصہ نہیں ہوں گی۔ آپ ہی نوکرا کرتی ہیں کہ چڑچلاؤ اور بیکار پڑی ہو تو اسے کوئی بھی استعمال کر لے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ آخر بے چاروں نوکروں کا بھی دل ہے۔ وہ کہہ تک جیروں کو اتنے قریب سے دیکھ دیکھ کر ترستے رہیں گے؟“

سیٹھ واحد کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید وہ اپنی لوگوں میں سے تھا جنہیں کوئی نغباتی سی بیماری لاحق ہوئی ہے کہ وہ بے پناہ دولت مند ہونے کے باوجود بے پناہ گھوس ہوتے ہیں۔ کھل انیس ایک بیماری کی طرح چٹ جاتا ہے اور ان کا بیچھا نہیں پھوڑتا۔ وہ کوئی اچھی چیز استعمال نہیں کرتے دنیا کی کسی آسائش سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ایک روپا خرچ کرتے ہوئے بھی ان کی جان لٹکتی ہے اور وہ دولت کے بحر بیکراں کے کنارے رچے ہوئے بھی سوکے کے سوکے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

لیکن آج سیٹھ واحد کی شخصیت کے جو روپ میرے سامنے آتے جا رہے تھے اور اس کے بارے میں جس طرح میری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک شاہ خرچ، فراخ دل اور دولت کی زیادہ پروا نہ کرنے والا آدمی تھا۔ ایسے آدمیوں کے پاس عموماً زیادہ دولت جمع نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی غیر معمولی دولتیں بھی اکٹھے میں آجاتی ہیں۔

شاید وہ کفایت شعار صرف اپنی ذات کی حد تک تھا ورنہ باقی تو وہ ہر دم میں ہر موقع پر ہر کام میں وہ بے تحاشا خرچ کرتا تھا اور اس کا طرز زندگی ہر پلو سے ایک بہت بڑے دولت مند آدمی کے شان و شان تھا۔ اپنی ذات کی شاید اسے پروا ہی نہیں تھی یا پھر اوصاف اس اور خوراک پر اس کی کوئی گارنٹی اس کے خیال میں بے سنی ہو چکی تھی۔ وہ شاید ان مظلوموں سے گزر چکا تھا جب اپنے آپ کو اچھے، مہنگے اور نفیس لباس سے آراستہ کر کے یا خوشبوؤں سے مکا کر انسان سمجھتا ہے کہ اس کی شخصیت میں کچھ بہتری، کچھ تعارف پیدا ہے۔ شاید زندگی نے اسے یہ محسوس ہو چکا تھا کہ وہ بریلے ہر لباس میں اہم تھا۔ اس کے لیے ان مصنوعی ساروں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اب اس کی بات کے جواب میں ٹھنڈی سانس لے کر بولیں ”مجھے تو لگتا ہے تو نے اپنے چاروں بیٹے نوکروں ہی کے لیے ہوائے ہیں۔ تو یوں دن رات دولت کا نام اور اپنے جسم پر معمول جیسا یہ سوت لٹکائے بلکان ہوتا آخر کار ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا اور نہ جانے کون کون تیری دولت پر پیش کرے گا۔ مجھے تو لگتا ہے تو کا نام ہی دوسروں کے لیے ہے۔“

”اس دنیا میں زیادہ تر انسان دوسروں کے لیے ہی کھاتے ہیں اہاں!“ سیٹھ واحد نے بڑے رसान سے سمجھایا ”لیکن انہیں یہ

موتے ہیں۔۔۔ مجھے سند میں خاکہ۔ مائیں کوئی اپنے بچوں کو تکلیف پہنچانے کے لیے خود زانی مارتی ہیں۔ یہ تو صرف ایک اشارہ ہوتا۔ سیٹھ واحد اشارہ کافی اسٹ۔ اور شرم محسوس کرنے والے کو تو پھول کی پتی سے مارنا بھی کافی ہوتا ہے۔ پھول کی پتی سے ات سا کچھ ہیرے کا جگمگ۔“

”ہاں۔ اہاں۔۔۔“ سیٹھ واحد نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے ”اب دو دو سو سال پرانے اندر بنا کر جو دست نیچے گا۔ کھانا لگاوا ہے۔ بھوک لگ رہی ہے۔“

مجھے کھانے کے لیے رکنا ہی پڑا۔ ڈانٹک دوام ڈانٹک نکیل اور کھانا بھی کچھ مدت عرصہ تھا۔ مگر میں ہر کام کے لیے ایک ملازم یا عارضہ موجود تھی۔ سیٹھ واحد نے واقعی اپنی ماں کو اس الگ گھر میں لکان کی حیرت رکھا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد کافی سو ٹنگ پول سے نکلتے آ رہے۔ لیکن پچھتری تھے بیٹہ کر لی گئی۔

سو ٹنگ پول کو، کچھ کر اماں کو بیٹے کوڑھنے کا ایک اور بہانہ بنا کر آیا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے اور سیٹھ واحد کو حلق آمیز نعروں سے دیکھتے ہوئے بولیں ”یہ ایک اور فحش خرابی کر رہی ہے۔ اس صحن لڑکے۔۔۔“

سیٹھ واحد۔۔۔ کچھ سا قہقہہ لگایا اور میری طرف دیکھ کر بولا ”یہ وہ سیٹھ تھے؟“ تسمات اس غلام کو۔۔۔ اس چون سا کرکٹ اور ”یہ وہ کو“ ”کڑا“ کہہ رہی ہیں۔“

”تو اس میں کیا کرنے کی کیا بات ہے؟“ اماں نے مشتعل صورت سے اسے ٹھوڑا۔ ”شکر کرو میں نے تھیں کچھ نہیں کہا۔ بیٹے بیٹیاں تو سوسائٹی میں جو جاتیں۔۔۔ اگر انہیں اندازہ ہو تو ان سے لے کر وہ بیٹیاں ہی رہتی ہیں۔“

اسے دانت پکڑ کر وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں ”یہ سو ٹنگ پول اس نے میرے لیے بنوایا ہے۔ اب تم ہی بناؤ۔۔۔ میں غرض ساری کی بڑھائی۔۔۔ میں سو ٹنگ پول میں تھوں کی شہرت اور۔۔۔ نہیں مرنی کی میں؟“

”اماں آپ انکار کیا کرتی تھیں۔۔۔ کہ شاید اسے پتہ اور کچھ نہیں آتا۔ گاؤں کی گھریلو سہیت تھی تھیں اور دور دور نکل جاتیں تھیں۔۔۔ میں۔۔۔ سوچا آپ تھیں کی میں باہر ہیں۔ شاید کبھی بڑھائی میں بھی آپ کا دل تھوڑے کو کھانے لگے۔۔۔ تو آپ کو اپنی اس خواہش کو دل میں ہی رکھنا پڑے۔“ سیٹھ واحد سمجھتی سے بولا۔

”میں نے تو آج تک اس میں ایک ٹانگ بھی نہیں ڈولی“ اماں ہلکی سی سیٹی لے کر چلنے کے انداز میں بولیں ”وہ مٹھوں مارے نوکری! جب سمجھتے ہیں کہ میں سو رہی ہوں تو اس میں اعلیٰ پائیاں کرتے ہیں۔ میں نے تو آج تک صرف ایک مرتبہ اس کے کنارے بیٹھ کر وضو کیا ہے۔ اس وقت بھی میں زیادہ جھنجھکے کی وجہ سے اس میں کرتے کرتے پانی تھی۔ تب سے میں نے تو اس کے زیادہ قریب



حلی آدمی نہیں ہو۔

”محکم لگانے کی ضرورت نہیں ہے“ میں نے کہا میں اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ شاید یہ اس کی جویشوں کی برکت ہے کہ تم اپنی تمام برید معاشیوں کے باوجود ابھی تک نہ صرف بچے ہوئے ہو بلکہ دن بہ دن زیادہ سے زیادہ چل پھل رہے ہو۔

”تم مجھ پر کن برید معاشیوں کا اصرار عامہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ وہ خفیف سی کھانسی کے ساتھ ہوا میں ایک نہایت شریف آدمی ہوں۔ کبھی ڈاکٹر کے دھندے کے قریب نہیں گیا حالانکہ مجھ پر بہت دباؤ تھا۔ بہت طاقت ور قسم کے لوگ مجھے فریادوں کے زور پر اس کا علاج میں گھسیٹتے رہتے ہوئے تھے اور بہت زیادہ دولت کی کشش بھی تھی جو ہم جیسے لوگوں کی کمزوری ہوتی ہے لیکن میں اپنے فیصلے پر ڈاکٹر کا کہنا نہیں۔ یہ کام نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ شراب میں نہیں پیتا۔ دانشمندی میں بھی رکھتا۔ میں نے ایک نمٹ بٹا رکھا ہے جس کے تحت نہ پانی پیتے نہ کھاتے کام ہوتے ہیں۔ کتنے ہی فیصلوں اور ہواؤں کے دھنچکے بڑے ہوئے ہیں۔ عظیم خانوں اور اچھانوں کو اوراد دیا جاتی ہے۔ اور دوسرے تواریک کرنے کے بجائے میں نے سیدھے سادے شرفاء طریقے سے جن شادیاں کر رکھی ہیں۔ وہ بھی صرف اولاد کی چاہ میں۔ ورنہ شاید ایک ہی قاعدہ کرتا۔

”وہ سب مجھے معلوم ہے“ میں نے سہلایا ”لیکن ان کی کوئی ان سب پر ہماری ہے۔“

وہ ہنسنے لگا۔ انہی کے ساتھ اسے کھانسی آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ہلکتے ہوئے پوچھا ”تم پر کس اعز سرز کیوں غور کیا ہے؟“

”کوئی بھی برنس میں اس قسم کی کوئی چیز کیوں خریدتا چاہتا ہے؟“ سینہ واحد نے اٹھتے سے ہی سوال کر دیا پھر خود ہی جواب دیا ”ظاہر ہے۔“

”لیکن پر کس اعز سرز کیوں؟“ میں نے سوال کیا ”اعز سرز تو بہت سی چم دی ہیں بہت سی سستے داموں بک رہی ہیں بلکہ بعض کے بارے میں تو کہنا چاہیے کہ کوڑیوں کے دام میں رہی ہیں۔ خود حکومت بہت سی اعز سرز بیچ رہی ہے۔ اعز سرز کا بعد بازار لگا ہوا ہے۔ ڈاکٹروں نے بہت اچھا دھندا بنایا ہوا ہے۔ جن کے بیج بھجوں پر مرام ہیں کوڑیوں کے دام اعز سرز لیتے ہیں اس کی صرف ایک قسط دیتے ہیں اور اس کے نام پر اس کی کل قیمت سے زیادہ قرض لے لیتے ہیں۔ اس کے بعد باقی قسطوں کا بھی اللہ حافظ۔ اور اعز سرز بھی جائے بھاڑ میں۔ تم ایسا ہی کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟ تمہاری تو بہت اوپر تک رسائی ہے۔ اور متعدد بھی صرف دولت کمانا ہی ہے۔“

وہ نیم را آنکھوں سے میری دیکھا رہا اور ایک لمبے غاموش اور ہلکے سا سانس لے کر بولا ”میرے پر غور دار دوست! پہلی بات تو یہ کہ سینہ واحد نے کبھی کوئی نئی چیز نہیں خریدی۔

خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے کادے ہیں۔ ایک انسان اکیلا اپنی ذات پر آخر کتنا خرچ کرے گا؟ کس۔۔۔ یہ کسی طاقت نے اس کام پر لگا رکھا ہے۔ یہ دنیا کا نظام چلانے کے اس کے بجائے ہیں۔ آپ ان باتوں پر منہ نہ ہوا کریں۔“

”میں کیوں منہ نہ لگے۔“ میں استغاثہ لیے میں بولیں ”یہ باتیں میں نے تو تجھے سمجھائی تھیں کہ میں نے ان کے لیے اب براہ راست ان کے بیٹا میرے سامنے ہی براہ راست۔“

”جہا۔۔۔ جہا۔۔۔ آپ نے بتائی تھیں۔“ سینہ واحد نے سہلایا ”مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ یہ آپ ہی کی بتائی ہوئی باتیں ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ اصل کی باتیں ہیں کسی اور نے بتائی ہوں گی۔“

اس نے غور کر اسے دیکھا لیکن مزید ڈانٹ ڈھٹ سے پرہیز کیا۔ انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھکا ہوا کہ اس کی طرف دیکھا پھر اٹھے ہوئے بولیں ”میں اب نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ پھر میں تسبیح کروں گی۔ میری دعاؤں تک تم دونوں میں رہا۔“

میں کالی قسم کے کھاتا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”اس میں تو اجازت چاہوں گے۔ میں تو بڑی سی دیر کے لیے آفس سے نکلا تھا لیکن کئی گھنٹے ہو گئے ہیں۔ مجھے اب لانا دیکھنا ہے۔“

”جہا۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے تو بڑی دیر کی ہنگامہٹ کے بعد باہر باغیچہ سے اجازت دے دی ”واحد کو تو یہاں آنے کے لیے وقت نہیں ملا۔ تمہارے پاس وقت ہوا کہ تم ہی آجایا کہ ان کی دعوت میں غلطی بھی تھا اور صرت بھی۔“

”جہا۔۔۔ اس میں کوشش کروں گا۔“ میں نے جواب دیا انہوں نے مجھے جھٹکے کا اشارہ کیا۔ میں جھکا تو انہوں نے میری پیشانی پر دم کر کے خدا حافظ لگا اور اندر چلی گئیں۔

سینہ واحد مجھے رخصت کرنے پر ہی تک آیا اور وہاں رک کر گاڑی سے نکل نکلتے ہوئے بولا ”یار! اگر تمہیں اس کی باتوں سے بورت ہوئی ہو یا ان کا جوئیہ مارا لگا ہو تو مجھے معاف کرنا۔ میں زیادہ محبت میں اگر تمہیں یہاں لے تو کیا تھا لیکن بعد میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں نے غلطی ہی کی۔ مجھے ذرا تاخیر سے خیال آیا تھا کہ تم پورے ہو رہے ہو گے۔“

”نکلا خیال آیا تھا تمہیں“ میں نے زور دے کر کہا ”اور حقیقت آج تم نے مجھے یہاں لاکر رکھ رہا اسان کیا ہے۔ دل میں کہیں ایک محروم سا پھیلا ہوا ہے۔ اس پر آج چند چھینے پڑے ہیں۔ ماؤں کی ایسی باتوں سے کوئی بد فیصلہ ہی ہو رہا ہو سکتا ہے تم بہت خوش فیصلہ انسان ہو۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے پاس بہت سی دولت ہے۔ صرف اس لیے کہ تمہارے پاس اس طرح جو چاہا مارے والی مال ہو رہا ہے۔“

سینہ واحد مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ بہت مختلف قسم کی تھی۔ میرے کندھے پر ہاتھ مارے ہوئے بولا ”مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں جیسے اندازے لگائے تھے میں جیسے دیکھا ہی پایا ہوں۔ زندگی کے بارے میں تم کمر اور ادا رکھتے ہو۔ تم

ہو گئی ہے۔ اگر ہم نے جلدی کچھ نہ کیا تو اس کے شیرازی قریب  
بست چڑھ جائے گی۔ اس لیے فی الحال میں نے سینڈ بیٹ کے ساتھ  
لی کر چٹائی بستر سجھا ہے لیکن ممکن ہے آگے چل کر میں ایکلا جی  
پرنس ایڈمز کا مالک بن جاؤں اور اس کالونیوں میرے ہی ہوں  
آجائے میں ممکن ہے کہ میں اس کے مارکیٹ میں بکھرے ہوں  
شیرازی بھی خرید لوں۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنے موجودہ اثاثوں  
میں سے کچھ ایسے اثاثوں کو بیچنا پڑے جو زیادہ منافع بخش نہیں  
ہیں۔

”ختم۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ پرنس ایڈمز کو  
خریدنا تمہارے مالی بامعہ خواہوں میں سے ایک کی طرح ہو گیا؟“ میں  
نے پوچھا۔

”پرنس سعید کی زندگی میں بھی میں ایک بار سک میں چلتا ہوا  
تھا اور میں نے پرنس ایڈمز کو خریدنے کی کوشش کی تھی۔ میں  
پرنس سے ملا تو اس نے ایڈمز کو بیچنے کی بات کرنا تو رکنا رکھتا تھا۔  
ایک پرنس مین کے شانِ شان سلوک بھی نہیں کیا۔ معلوم ہے  
اس کی وجہ کیا تھی؟“

”تنا ہے اسے اپنی ایڈمز سے بہت محبت تھی۔ وہ اُسے  
اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔ شاید اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس نے  
اسے تسماری زبانی اس کی فوٹو کی بات سننا ناگوار قرار دیا تھا۔  
میں نے خیال ظاہر کیا۔

”یہ تمہی وجہ تھی“ سینہ واحد بولا ”اصل وجہ میری رنج و نیاز  
تھی۔“

مجھے نہ جانے کیوں ابھی اگلی۔ میں نے تری سے کہا ”اس نے  
بادجوو تمہے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ بد اچھا بد نام برا والا تھا تو  
خود بخود اتوار تیار نہیں ہوا۔“

سینہ واحد تائید کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”جیکے  
کلی برس سے میں اپنی رنج و نیاز ہی تہذیب کے منصوبے پر  
کام کر رہا ہوں۔ اسی لیے تو اسے ایڈمز کو فروغ کے بجائے ہالے  
جس دور نے یہ میرا مزاج کہا تھا۔“

”صمت رہ کر دیکھ“ میں نے ناسف سے کہا ”یعنی ہونی عزت  
واپس نہیں آتی۔“

”آجائے گی۔“ آجائے گی۔ وہ بے پروائی سے بولا ”اب آتی  
بھی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ زیادہ تر  
بھوکوں میری کتنی عزت ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے“ میں نے زور سے کر کہا۔

وہ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد بولا ”زندگی میں پہلی بار مجھے  
صرف پرنس سعید کے بدلے سے تو جین کا احساس ہوا۔ وہ اپنے  
آپ کو کوئی بہت ہی اونچی بار سارا دور سونے سے بہتر نہیں  
چیز سمجھتا تھا۔ پہلے میں نے دل ہی دل میں اس کے بارے میں کچھ  
نامناسب ہے پر درگراہم بھی بنائے لیکن پھر اپنی فکری نرمی کے  
باعث وہ خیالات ذہن سے جھٹک دیے۔“

جو چیزیں بک رہی ہیں ان کا پرنس ایڈمز سے کیا تعلق؟ پرنس  
ایڈمز اس قسم کی بیزار پیمبروں کے بغیر کسی سونے کی کان ہے۔  
دوسری بات یہ کہ اس وقت جس قسم کی یہ لوٹ لٹی ہوئی ہے اور  
افزائشی ہوا ہے، میں اس میں حصہ لینا نہیں چاہتا۔ بے شک میں  
دولت کمانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایسی دولت جو میرے ہاتھ اور  
اختیار میں بھی رہے۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ یہ لوگ  
جتنی کسمپانی سے دولت سمیٹ رہے ہیں اتنی ہی آسانی سے یہ ان  
لوگوں کے ہاتھوں سے چل جائے گی۔ کوئی انسانی ہو جائے گی اور  
وقت کا پیرا لٹا پلٹے لگے گا۔ آخر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔

میں اب دم پر خود کا کھڑا تھا۔ یہ باتیں وہ نہیں کر رہا تھا جس  
کی شہرت ملک کے سب سے بڑے پانام اسمگلر کی تھی جب کہ اس  
وقت نہ جانے کیسے کیسے پانام اور نیک نام جو اخباروں میں راستی  
و انداز سے ’خاصیت پندہی‘ ایثار اور حب الوطنی کے درس دیتے  
نہیں سمجھتے تھے ہر اس چیز پر مجھت رہے تھے جو ان کی رسائی میں  
آسکتی تھی۔ جس کے ہاتھ جو آتا تھا۔ لے کر ہاتھ رہا تھا جب  
افزائشی اور چھینا چھینی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا جیسے لوگوں کو کل  
کی فکری نہیں تھی۔ پانام شاید یوں کستا جیسے کہ انہیں کس کی  
کی گھر تھی کہ کل نہ جانے کیا ہو ’موقع ٹے نہ لے‘ کچھ باقی رہے نہ  
رہے ’خدا جتنا سہانا جا سکتا ہے‘ سمیٹ لو۔ ہاتھ دو کے صرف وہی  
بیٹھا تھا جس کا کہیں ہاتھ نہیں پڑا تھا۔

ایسے میں سینہ واحد جیسی شہرت رکھنے والے شخص کی باتیں  
میرے لیے حیران کن تھیں۔ اس کا بیرو سکون اور بہتی نگاہیں کر  
میں ایک طرف کھڑے رہنا حیرت انگیز تھا۔ شاید وہ آنے والے  
دقت کا بھی صحیح ادراک رکھتا تھا جب کہ لوگوں نے کل کی فکر کرنا  
بجزودی تھی۔ وہ سب کچھ آج ہی کر گزرتے پر تھے ہوئے تھے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس کے علاوہ پرنس ایڈمز  
کو خریدنا میرے ان باقی بامعہ خواہوں میں سے ایک خواب بھی ہے  
جو ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوئے۔“

”لیکن تم اسے اکیلے تو نہیں خرید رہے“ میں نے کہا ”جیسے  
اگر نے مجھے بتایا ہے کہ سات بڑے دولت مندوں کی ایک  
سینڈ بیٹ اسے خرید رہی ہے۔“

”ہاں۔ فی الحال وہ میری مجبوری ہے۔“ وہ ہنسنی سانس لے  
کر بولا ”میرے پاس زیادہ رقم کا بندوبست نہیں ہے۔ اور اس  
خریداری میں ساری دولت مٹی چاہیے۔ اس لیے میں سینڈ بیٹ  
کے ساتھ مل کر سودا کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ دوسرے ملکوں کے  
بنکوں میں میری جو رقمیں ہیں انہیں میں فی الحال یہاں لانا نہیں  
چاہتا۔ یہاں میرے زیادہ اثاثے ایڈمز اور جائیداد کی صورت  
میں ہیں۔ ان میں سے بعض کو بیچ کر زیادہ رقم جمع کرنا چاہوں تو  
شاید کافی دقت لگ جائے اور مارکیٹ میں جو نمی ہے خبر بجلی ہے کہ  
پرنس ایڈمز کے بکنے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ جب سے ایک  
عجب کھلی بج گئی ہے۔ زبردست جوڑ توڑ اور ہماگ دو شروع

سانس لے کر کہا۔

”سرا! اس کے ہاں فون نہیں ہے تو کیا ہوا۔ اس کے پاس دل تو ہے۔ اور دل کو دل سے راہ ہوتی ہے“ امبر کے لیے سے شرارت جھلک رہی تھی ”آپ اپنے جانے والیوں کے بارے میں صرف سوچ لیا کریں۔ وہ خود ہی پہنچ جایا کریں گی۔“

امبر میرے پاس آنے سے پہلے بھی غامضی و تردد طرار قدرے شوق اور کسی حد تک جماندہ سی لڑکی تھی۔ لیکن میری نیک بینی کی حیثیت سے ذہن دار ماں سنہالنے کے بعد اس نے کافی عرصہ بالکل سنجیدہ و متوجہ رہ کر اور سر ہٹا کر صرف کام سے کام رکھتے ہوئے گزارا تھا لیکن اب رفتہ رفتہ میرے دوستانہ رویے سے شہ پاکر تھوڑا بہت ہنس مذاق کرنے لگی تھی تاہم اس کا ذہن ابھی دوستانہ ہی ہوتا تھا۔ اس کی باتیں ایسی نہیں ہوتی تھیں جنہیں سن کر کوفت ہوتی۔ وہ میری اور میرے ملحقہ احباب کی بہت جلد مزاح آشنا ہو گئی تھی اور اسی ذہنی سطح پر آکربات کرتی تھی۔

”لگتا ہے منیدہ شمارے سامنے نہیں بیٹھی ہے جو اس طرح چمک رہی ہو“ میں نے کہا۔

”نہیں سرا میں تو اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں۔ میں نے اسے آپ کے کمرے میں بٹھایا ہے۔“ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا ”میں نے غلطی تو نہیں کی سر؟“

”ہرگز نہیں امبرا!“ میں نے ملاٹحت سے کہا ”تمہیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کسے میرے کمرے میں بٹھایا ہے اور کسے میرے سر پر بٹھایا ہے۔ لیکن بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ مجھے حقیقت سے ایک ضروری کام تھا اور میں اس کے ہاں جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔“

”کیوں سرا؟ کیا اس کی گلی میں کوئی رقیب بھی رہتا ہے؟“ امبر نے مصحوبیت سے پوچھا۔

”رقیبوں کو ہم کب غاظر میں لاتے ہیں امبر ذرا!“ میں نے لہجہ کی سانس لے کر کہا ”یہ مصحفیت اور وضع داری کی بات ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ انسان ایک بڑی سی اور مضامنی گاڑی میں بیٹھ کر نچلے متوسط طبقے کی ایک لڑکی کے گھر جائے جو نہایت تنہا گلی میں رہتی ہو۔ اس طرح کی باتیں لڑکی کے حق میں اچھی نہیں ہوتی۔“

”سرا آپ لڑکے کی چیز ہمیں کر سائیکل پر بیٹھ کر چلے جایا کریں“ امبر نے بڑے غلصہ سے مشوہ دیا۔

”حق زمت تو میں تب کون تا جب اس سے میرا کوئی فیض چل رہا ہو۔ تم نے اور ذرا آج نے تو شاید فرض کر لیا ہے کہ جو لڑکی ایک بار کسی فٹ پاٹھ پر میرے قریب سے بھی گزر جاتی ہے وہ بھی مجھ پر عائق ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے امبر ذرا میں ایسا گھلام نہیں ہوں۔ تم اور ذرا آج کیوں مجھے خوش فہمی کی بلند پروازی کر رہے ہو؟“ میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔

”یہ تم نے اس بے چارے کے حال پر بڑا کرم کیا لیکن تم اس کی مدد کو بخشنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اب بعد از مرگ اس کی ایڈمنسٹریشن خرید کر عالم بلا میں اس کی مدد کو ترغیب دلا دیجئے۔ اس سے تمہیں کیا ملے گا؟“

”بہت سامان ملے گا۔ اور بہت سی خوشی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ تم اپنے جو تڑپیں لگے رہو۔ مجھے اجازت دو“ میں نے معاملے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بے نیازی سے اپنا مختصر مگر سچا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور میرے ساتھ گیت کی طرف بڑھتے ہوئے بولا

”ذرا سوچو تمہیں چھوڑ دے گا۔۔۔ اور یاد رکھنا کہ تمہیں کارخانہ دہائی کی ایک اچھی سی تصویر کا بندوبست کرنا ہے۔ جو فی تصویر تمہیں مل جائے مجھے فون کھانا۔ میرا کوئی آدمی آکر تم سے ملے گا۔ میں آج کل ان نمبروں پر پایا جاؤں گا۔“

اس نے جیب میں سے چند کارڈ نکالے۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اس نے ایک کارڈ میرے حوالے کیا۔ اس پر صرف اس کا نام اور چند فون نمبرز تھے۔ ان میں سے دو موبائل فون کے نمبرز تھے۔ ان موبائل نمبروں کے بارے میں اس نے بتایا۔ ”ان میں سے ایک تو اسی کارڈ میں لگا ہوا ہے جس میں تم واپس جاؤ گے۔“

تصویر کے بارے میں اطلاع براہ راست مجھے ہی دینا۔ میں ان میں سے کسی نہ کسی فون پر مل جاؤں گا۔“

گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ گیت کھل چکا تھا مگر میں موجود رہنے والے گاڑی اپنے ہتھیار اتھوں میں لیے مستعدی سے گیت کے باہر دونوں طرف جا کھڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ واحد کے ساتھ آنے والے دونوں گاڑیوں کے دائیں بائیں کھڑے ہو چکے تھے۔ گیت کھلتے ہی چاروں گاڑیوں مستعد ہو گئے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ ابھی کوئی اندر کھس آئے گا۔ میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ چند لمحوں بعد گاڑی کشادہ اور دربان سی سڑک پر بھروسے چلنے لگی۔ میں نے ڈائریکٹ کپارٹمنٹ کی پیش کی دیوار پر آدھریاں پنڈیٹ کے درپے ڈرائیور کو مطلع کیا کہ ہمیں واپس اسی غارت پر جانا تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ مجھے وہاں سے اپنی گاڑی ملنی تھی۔

میں نے پنڈیٹ واپس اس کے کریڈل میں لٹکا دی تھا کہ میری جیب میں موجود موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون جیب سے نکالا۔ دوسری طرف امبر تھی۔ وہ معذرت خواہانہ سے مجھے میں بولی ”سرا میں نے سوچا آپ کی واپس کارڈ گرام نہ جانے کتنا لمبا ہو جائے اس لیے آپ جہاں بھی ہیں وہاں آپ کو اطلاع دے دی جائے۔“

”کس بات کی اطلاع؟“ میں نے دریافت کیا۔

”سرا اصعبی بی بی آپ سے ملنے آئی ہیں“ امبر نے بتایا۔

”اوہ۔۔۔ میں ابھی سوچ رہی تھی کہ اس سے کیسے رابطہ کیا جائے۔ اس کے ہاں فون تو ہے نہیں“ میں نے اطمینان کی گہری

”میں کب مذاق کر رہی ہوں سر!“ وہ حیرت اور تاسف کے تاثرات چہرے پر لاتے ہوئے بولی پھر یکدم اس کا لہجہ غمزہ ہو گیا یہ بھی ایک عام نریشی ہے سب سے کہ بعض لوگ مذاق ازاری سے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو اسے مذاق سمجھا جاتا ہے خیر۔۔۔ چھوڑیے ان باتوں کو۔۔۔ یہ بتائیے کہ آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟ کام تو ہم جیسے لوگوں کو آپ جیسے لوگوں سے پڑتے رہتے ہیں۔“

”پہلے تم بتاؤ کہ اس طرح اچانک بغیر اطلاع کیسے آگئیں؟“  
میں آپ کو پروگرامیں دے رہی تھی سر!“ اس نے اب ذرا سنجیدگی سے جواب دیا ”ادھر سے گزر رہی تھی۔ میں نے سوچا فون وغیرہ کے تلفات میں پڑنے کے بجائے خود حاضر ہو کر سب کچھ بتاتی چلوں۔“

”کیسی پروگرامیں دے رہی تھیں؟“ میں نے واقعی قدرے حیرت سے پوچھا۔

”سر! آپ نے مجھے کسی کام سے لگایا تھا اور اس کے لیے دساک بھی سپانکے تھے۔ آپ بھول بھی گئے؟“ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”خیر۔۔۔ کوئی بات نہیں بڑے لوگوں کا بھی اسٹائل ہوتا ہے۔“

”بہت تجربہ ہے تمہیں بڑے لوگوں کے اسٹائل کا؟“ میں نے اسے گھورا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فی بحث شروع کرتی میں نے جلدی سے کہا ”تمہارا مطلب ہے میں نے تمہیں کوئی کام شروع کرنے کا جو شروع ہوا تھا اس سلسلے میں تم نے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے؟“

”جی سر!“ اس نے سرخم کرتے ہوئے جواب دیا ”میں نے درمیانے درجے کے ایک پلٹے ہوئے یونی پارلر کا سودا کیا اور اس کا بیعانہ بھی دے دیا ہے۔“

”اگر وہ چٹا ہوا یونی پارلر ہے تو اس کا مالک یا مالکین اسے کیوں بیچ رہی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”سر! وہ اس سے بہت زیادہ بڑے ایک پراجیکٹ پر کام کرنے کے لیے ملک سے باہر جا رہی ہے“ اس نے جواب دیا ”میں اسے باقی ہوں اور جب سے اس نے اپنا یونی پارلر بیچنے کا ارادہ کیا تھا تب سے میرے دل میں حسرتوں کا ایک طوفان ہوا تھا۔“

”چنانچہ موقع ملنے ہی تم نے سب سے پہلے اپنی حسرتوں کے اس طوفان کو دھکا دیا؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ میری ٹھنڈی سانس کا مطلب سمجھ گئی۔ حیرت سے بولی ”سر! یہ مت سمجھو گا کہ یہ جگت میں کیا کرنے والا کوئی جذباتی فیصلہ ہے۔ میں اس یونی پارلر اور اس کی مالکین ”دو دنوں کے ان اور آؤت سے اچھی طرح واقف تھی۔ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ پہلے ہی دن سے متعلق دینے والی جگہ ہے۔ اس کی مالکین نے اپنی مجبوری کی وجہ سے مناسب قیمت میں دے دیا ہے کیونکہ اس کی باہر جانے کی تاریخ سر پر آگئی ہے اور وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس کی

”میں آپ کے دشمن سر! ویسے معاملہ تو کچھ ایسا ہی ہے جیسا آپ جان کر رہے ہیں۔ اب آپ اپنی وضع داری شرافت یا دوسروں کا پردہ رکھنے کی خاطر اس کا اعتراف نہ کریں تو بات دوسری ہے۔ بہر حال ہماری تو یہی دعا ہے کہ آپ اتنی تو سہیل کی عمر میں بھی صنفِ بازگ میں پوری تخیل رہیں۔ لڑکیاں پوری آپ کے گرد مٹلائی رہیں۔“ وہ نہایت مددگارانہ لہجے میں بولی۔

”یہ تم دعا دے رہی ہو یا بد دعا؟“ میں نے مصنوعی شکل سے کہا ”اتنی تو سہ سال کی عمر میں سونے کے گرد لڑکیاں مٹلائی ہیں وہ عام طور پر نہیں ہوتی ہیں اور اس وقت انہیں دیکھ کر انسان اپنے بال بونچے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔“

”یہ ضروری نہیں ہے سر!“ وہ ملاحت سے بولی ”مگر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ انسان بال بونچے کے علاوہ کچھ کرسے۔ بہر حال یہ بتائیے کہ آپ واپس آ رہے ہیں یا نہیں؟ میں صنفِ کو بھائے رکھوں یا نہیں؟“

”ضرور بھائے رکھو۔ میں سیدھا دفتر آ رہا ہوں۔ مجھے اس سے ایک بہت ضروری کام ہے“ میں نے تیزی سے کہا۔

”مجھے پہلے ہی معلوم تھا سر!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ایک لمبے کے لیے فون کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

میں آفس پہنچا تو صنفِ نشست گاہ میں بھی انگریزی کا ایک فیشن میگزین اسٹیلٹ رہی تھی۔ میرے پہنچنے پر اس کے چہرے پر ایک خاص رنگ آ گیا اور وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی ”خدا کا شکر ہے کہ آپ جلدی آ گئے۔“

”بچو جاؤ۔۔۔ بچو جاؤ۔“ میں نے اس کے مقابل بیٹھے ہوئے اشارہ کیا ”میں تمہارا پروفیسر نہیں ہوں جو احرام اٹھ کھڑی ہوئی ہو۔“

”خدا ان کرے جو آپ میرے پروفیسر ہوں۔“ وہ فوراً بولی ”اور پھر احرام صرف یہ پروفیسر ہی کا تو نہیں کیا جاتا۔“

”بہر حال۔۔۔ میں آیا نہیں“ بولا یا کیا ہوں۔ امہرے موبائل فون پر مجھے اطلاع دی کہ تم آئی ہوئی ہو۔ یہ سن کر میں فوراً چلا آیا“ میں نے فانی کی گروہ دیکھ کر ہنس پڑا۔

”واحد۔۔۔ موبائل فون بھی کتنے کام کی چیز ہے۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”ادھر۔۔۔ میرا خیال ہے میں بھی کچھ ٹیکسٹ پیج ہوں جو آپ میری آمد کا سن کر فوراً پلے آئے۔“

”مجھے تم سے ایک ضروری کام تھا“ میں نے کہا۔

”ادھر۔۔۔ اچھا وہ آپ نے فوراً ہی میری خوش فہمی دور کر دی“ وہ ہامی سے بولی ”میں تو سمجھی تھی میری وجہ سے آپ فوراً آ گئے۔ کم از کم چند لمبے تو کسی کو خوش فہمی میں جتلا رہے ہوا کریں۔ آپ کا کیا جاتا ہے؟“

”دیکھو صنف۔۔۔! یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت سیریس ہوں۔“ میں نے واقعی سنجیدگی سے کہا۔

دستی رہی ہے۔ اب وہ اور اس کا شوہر کچھ ترقی کر کے کانٹن کے ایک بڑے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ میں نے اس کی خصوصیات کے بارے میں جان کر فوراً اس پر قبضہ کر لیا۔ بہتر سمجھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سہلایا ”کم از کم تمہارے بیان کی حد تک تمہارا یہ فیصلہ بھی ٹھکانہ نہ معلوم ہوا ہے۔“

”یہ وہاں کا فون نمبر ہے۔“ اس نے ایک چٹ میری طرف بڑھائی ”کل میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گی۔“

”بہت خوب۔“ میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا ”تم تو بہت فاسٹ جاری ہو رہی۔“ مجھے تم سے ایسی کارکردگی کی امید نہیں تھی۔ حیرت ہے۔ اب تک ہمیں کس چیز سے ترقی سے روکا ہوا تھا؟

”میرے کی کسی نے؟“ سارا ”وہ سادگی سے ہوئی۔“ اتنی سیدھی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟ مجھے اس پر حیرت ہے!“

”تمہاری حیرت بجا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔

”سرا! بعض لوگوں کا معاملہ بہت اچھی اور طاقتور گاڑی کا سنا ہوتا ہے لیکن وہ صرف ایک ہی درجہ سے ایک جگہ کھڑی ہوتی ہے۔“

”میں میں بیڑول نہیں ہوتا۔“ میں نے مہرے سانس لے کر اس کی بات مکمل کی۔

”جی سارا! اتنی سی بات ہے۔“ اس نے بھروسہ اُچکا نہیں۔

”یہ تم نے کیا سرسری کردارن شروع کر رکھی ہے؟“ میں نے ہلکا سا ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

”سرا! آپ دوست ہیں۔“ مہمان ہیں۔ اس کے باوجود آپ کو سر کرنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”بعض اوقات لڑکیاں ایسی بات کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کچھ انکار ان کے سر پر دید کر دیا جائے۔“ پھر میں نے ایک لمبی سانس لی ”لیکن کیا کون مجھے تمہارا سر عزیز ہے۔“

”مجھے بھی اپنا سر بہت عزیز ہے سارا۔“ وہ ہنس کر اترے ہوئے بولی۔

”اچھا۔“ اب تم یہ بتاؤ کہ اس خاتون کی جگہ کب سے تم خود اس بیڑی پار کو چلا کر شروع کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جنتیہ رقم کی ادائیگی کر کے میں جس دن سے چاہوں اس کی جگہ بیٹھ سکتی ہوں لیکن اس سے پہلے میں دو مہینے چھوٹے چھوٹے کام کرنا چاہتی ہوں۔“ صنفی بیچیدگی سے بولی ”میں ذرا اس کی جھاڑ پونچھ کر کے اور اس میں چند ایک چھوٹے موٹے اضافے اور تبدیلیاں کر کے اسے ایک نئے اور زیادہ بہتر پارکر کی شکل دینا چاہتی ہوں۔“

”یہ پانی کا کچھ خواتین تو اتنی ہی رہیں گی۔“ میں چاہتی ہوں کہ نئے سرے سے اس کا افتتاح کیا جائے اور اسے کچھ پیشی دینے کی کوشش کی جائے۔“

فردشت کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہیں کر سکی تھی۔ مجھے یہ قاعدہ ہو گا کہ میں بالکل نئے سرے سے سارا سیٹ اپ بنانے اور بہت زیادہ بجائ دوڑے سے بچ گئی۔ نئی جگہ میں یہ سب کچھ کرنے کے باوجود رہ کر زیادہ ہونا ہے۔ انسان کے اندازے غلط ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔“

”باتیں تو تم جلدیوں والی کر رہی ہو۔ اب دیکھتے ہیں نتیجہ کیا نکلتا ہے۔“

”تجربہ انشاء اللہ اچھا ہی نکلے گا سارا۔“ وہ اعتماد سے بولی ”میں آپ کو بہت کچھ کر کے دکھاؤں گی۔“

”خیر۔“ اس میں تو مجھے شک نہیں ہے۔“ میں نے سہلایا ”بہت کچھ کر گزرنے کے بہت زیادہ آثار تمہاری شخصیت میں موجود ہیں۔“ مجھے تو حیرت اس پر ہے کہ اب تک تم بہت کچھ کر گزرنے سے کیسے باز رہی ہو۔“

”مجھ پر بہت سی بارداحم کی پابندیاں تھیں سارا۔ بہت مکی ہیں۔“

”تم نے تم پر پڑے ٹھکل لئے ہیں۔“ میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

”جی نہیں۔“ وہ چڑر لہجے میں بولی ”وہ بہت مکی ہیں تو میں ایکشن میں آتی ہوں اور اب میری صلاحیتیں مکمل کر سائے آئیں گی۔“

”اچھا خیر۔“ دیکھیں گے یہ تو قوت ہی بتائے گا کہ قسمت کو کیا منظر ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”بہر حال۔۔۔ یہ ایک مسئلہ تو حل ہوا۔“ مجھے تمہاری یہ پروگریس رپورٹ سن کر خوشی ہوئی ہے۔“

”ابھی پروگریس رپورٹ مکمل نہیں ہوئی ہے سارا میں ایک نہیں دو تین مسئلے حل کر کے آپ کے پاس آتی ہوں۔“ اس کے لہجے میں ذرا آخر تک آگیا۔

”دوسرا مسئلہ کیا تھا؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”میں سادگی پر کون نہ مہماتے اسے خدا!“ اس نے لمبی سانس لی ”وہ سارا مسئلہ میری مناسب دہائیں کا تھا۔“ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق زیادہ اونچی پرواز کی کوشش نہیں کی ہے۔ کٹھن میں ایک مناسب سے پراجیکٹ میں دو کروں کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا ہے۔ اس کی ایک خلیہ تو یہ ہے کہ اس میں فون موجود ہے اور دو سری خلیہ یہ ہے کہ وہاں بھی چلے متوسط طبقہ کے لوگ ہی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ماحول بہت مختلف اور بہتر ہے۔ وہاں لوگ ایک دوسرے کی نجی زندگی میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کرتے۔ بس آپ کی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچا جاسیے۔“

”خوب۔“ میں نے سہلایا ”میں معیار کی جگہوں پر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔“

”جی نہیں اتنے کم وقت میں وہاں کے ماحول کی اس خلیہ کا کچھ نہ چا چل گیا؟“

”میری اس دوست نے مجھے بتایا ہے جو اب تک اس میں

داخل کو سنجیدگی اور بوجھل پن سے بچانے کے لیے میں ایک بار بار  
بہنے لگا۔

وہ گویا جل کر بولی "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ خوب نہیں آسپہ۔۔۔  
کوئی نئی کمائی نہیں ہے اس دنیا میں غریبوں کے غلوں اور محبت کا  
بیٹہ اسی طرح مذاق اڑایا جاتا ہے۔"

"اچھی تو صرف میں نہیں رہا ہوں لیکن جب تم مجھ سے افتتاح  
کراؤں گی تو پورا شہر بہنے لگا۔" میں نے لاف سے کہا "اور یہ  
امیری غریبی کی ظلمی کمائی بیچ میں ملے آتا۔ میری نظر میں تم پہلے  
بھی غریب نہیں تھیں۔ اور جلد ہی شاید دوسروں کی نظر میں بھی  
نہ رہو۔ تمہارا غلوں میرے سر آنکھوں پر ہے۔ صرف یہ غلوں  
ہی تو ہمارے بے عزتوں قتل کی بنیاد ہے۔۔۔ لیکن کادیا میں اس  
قسم کے غلی محسوسات کو آگے نہیں رکھا جاتا۔ سب سے پہلے تو یہ  
بنیادی اصول سمجھ لو۔"

اب وہ دلچسپی اور حقیقی دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی۔  
ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تم شو بزنس کی کسی خوبصورت  
اور مقبول لڑکی سے افتتاح کراؤ۔" میں بھی آسانی سے آجائے گا۔  
تصویریں بھی آسانی سے چھپ جائیں گی۔ دلچسپی سے دیکھی بھی  
جائیں گی۔۔۔ اور جی ہاں یہ ہے کہ ایسے چروں کے ہاتھوں افتتاح  
کی تصویریں اخبارات و رسالوں میں جتنی بھی ہیں۔"

"لیکن۔۔۔ سمجھو۔۔۔ وہ چھپاتے ہوئے بولی "یہ کام بھی آپ کو  
ی کرنا پڑے گا۔ میرے کہنے سے کون آنے گی۔"

"فکر نہ کرو۔۔۔ کوئی اچھا بندہ دست ہو جائے گا۔" میں نے  
سوچتے ہوئے کہا "بلکہ ایسا کرنے میں لاہور سے کسی نئی۔۔۔  
بڑی۔۔۔ فلم اسٹار کو بلا لیتے ہیں۔ صرف فرسٹ کلاس کا جناز  
کارڈن کلک دیا جائے گا۔۔۔ صبرانے کے لیے ہمارا قانع اسٹار  
ہو ٹی موجود ہے۔ امید ہے وہ کوئی اور لہجہ جو زامالہ نہیں کہے  
گی۔ چند گھنٹے کے لیے آکر بیٹ جائے گی۔ اس کی وجہ سے بہت  
اچھی کو رنج مل جائے گی۔"

"کیا واقعی سمجھو؟" منیہ کی آنکھوں میں چمک اٹھی "یا  
ہو جائے گا؟ کوئی بڑی علمی ہیروئن آجائے گی؟" اس کے لیے میں  
کچھ بے چینی ہی تھی۔

"کیوں نہیں سمجھتی۔۔۔ ماما تمہارا بیوی بار بار زیادہ بڑا اور دولت  
مندانہ قسم کا نہیں ہو گا لیکن اس کا افتتاح بہر حال کسی بیوی ہونے  
سے کراویں گے۔ افتتاح سے آگے تم جانو اور تمہارا کام۔" میں نے  
کہا۔

اس کے لیے گویا یہ ایک اور بہت بڑی خوشخبری تھی۔ ابھی  
میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ لاہور میں فلم انڈسٹری میں بھی  
میری ٹانگ پھنسی ہوئی تھی اور ایک کنہ مشن ڈائریکٹر ایک فلم  
کئی میں میرا پارٹنر تھا۔

"کس لڑکی سے بات کریں گے آپ؟" اس نے ایشیائی سے  
پوچھا۔

سچی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اپنے اصل کام کرنے کے بعد  
تمہارے پاس اتنا فاضل سرمایہ نہیں بچے گا کہ تم اسے پلیٹی پر  
خرچ کر سکو اور پلیٹی جب تک خوب زور دار اور موثر نہ ہو تب  
تک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔" میں نے سمجھایا۔

"میں سچی اور باقاعدہ مہم کے انداز میں کی جانے والی پلیٹی  
کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میرا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ کسی  
باہرستی شخصیت کے ہاتھوں افتتاح ہو جائے۔ ہمارا چہ اخباروں  
رسالوں میں تصویر آجائے کہیں کہیں تو ہوا بہت تذکرہ  
آجائے۔ بس اتنی ہی کافی ہے۔ بیوی بار بار تو چلا چلا رہی ہے۔ بس  
اسے تو ہوا سا سارا اور مل جائے تو بہت اچھا ہے۔" اچھی سے اس  
کے انداز سے گفتے لگا تھا جیسے وہ کافی عرصے سے کادیا کر رہی تھی  
"میں کم خرچ پلیٹی کی بات کر رہی ہوں۔ یہ زیادہ موثر ثابت ہوتی  
ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ آئیڈیا زیادہ اچھا ہے۔ افتتاح کے لیے کوئی  
شخصیت ہے تمہارے ذہن میں؟"

"شخصیت تو میرے سامنے ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اطمینان سے

بولی۔

"تمہارا مطلب ہے، میں۔۔۔؟" میں نے بے چینی سے تصدیق  
چاہی۔

اس نے بڑی مستکفی سے اثبات میں سر ہلادیا۔ مجھے بہت زور  
کی ہنسی اٹھنی اور آتی ہی پہلی گئی۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھائے شکل  
آہستہ سے نظروں سے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میری ہنسی تھی تو وہ معنوی مجھ سے بولی "اس میں اتنا ہنس  
بہن کر لوٹ پوٹ ہونے والی کون سی بات تھی؟ میں نے کوئی لطیفہ  
سنایا تھا آپ کو؟"

"ہاں۔۔۔ یہ لطیفہ ہی تھا۔" میں نے جواب دیا "تم نے آج تک  
کسی مرد کو بیوی بار کا افتتاح کرتے دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا تو کیا ہوا؟" وہ اطمینان سے بولی "لوگوں تو پہلی بار  
روایت کو توڑتا ہے نا۔۔۔ اور وہ جو انگریزی کا متول ہے۔"

THERE IS ALWAYS A FIRST TIME.

کیس نہ کیس! کسی نہ کسی وقت تو کوئی کام پہلی مرتبہ ہوتا ہے۔  
رہے میرا خیال ہے ہم نے خواہ دیکھا یا نہ ہو لیکن کیس نہ کیس!  
کبھی نہ کبھی کچھ ضرور بیوی بار کا افتتاح کرچکے ہوں گے اور  
زیادہ امکان یہ ہے کہ دوسروں سفیروں کے ہاتھوں ہر کام انجام پایا  
ہو گا۔ دوسروں سفیروں کو تو لوگ دنیا کی ہر چیز کا افتتاح کرنے کے  
لیے بلا لیتے ہیں نا۔"

"لیکن میں تو وزیر سفیر بھی نہیں ہوں" میں نے مسکراتے  
ہوئے کہا۔

"میرے لیے آپ وزیر سفیر سے زیادہ اہم ہیں۔" وہ ایک عجیب  
معصومانہ سی سنجیدگی سے بولی۔ مجھے اس کی یہ سنجیدگی واقعی بہت  
عجیب لگی۔ میرے محسوسات میں ایک عجیب سی لہر آنے لگی لیکن

لگا؟" وہ گویا جذباتیت میں اچھٹے سے گر پڑ کر رہی تھی۔

میں ابھی تک انھیں میں تھا کہ کامران کے بارے میں سینوں کی سینڈیکٹ کا جو نیا معاملہ سامنے آیا تھا اس کے بارے میں منہ کو تباؤں یا تنہی؟ اس کی زندگی میں پہلی ہی بچپن تاؤں خورد میں کی کوئی کی نہیں تھی۔ اب جب کہ اس کی زندگی میں کچھ غمگداری پیدا ہونے کے آثار نمودار ہو رہے تھے یہ انکشاف اسے ایک نئے اور زیادہ شدید بچپن سے دوچار کر سکتا تھا لیکن یہ اس سے بہتر تھا کہ یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوتی جب وہ کامران سے اور بھی زیادہ دور جا چکی ہوتی۔ میں نے اسے تباہی بستر کھانا میں چاہتا تھا وہ کامران کے بارے میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر کے آکر زندگی میں آگے چل کر کبھی کوئی بہت بڑا بچپن تھا اس کے دل کا سامرو نہ بن جائے۔

ایک نئے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا "منہ! میں تمہیں کامران کے بارے میں ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جو دینے تو بڑی خوشی کا باعث ہوئی چاہیے تھی لیکن اس وقت جو صورت حال ہے اس میں شاید تم یہ بات سن کر مدد سے خون تھوکنے لگو۔"

"ابھی اور اسی وقت خون تھوکنے لگوں گی؟" منہ نے مصنوعی حیرت سے انھیں پچھلا کر سکرانے ہوئے پوچھا "تو کیا ہے مدد سے خون تھوکنے میں تو بڑا وقت لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کو کھن لگتا ہے۔"

"صدر بہت بڑا ہو تو ذرا بھی دل خون ہو سکتا ہے اور خون تھوکنے کی قوت آسکتی ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ اب میں کامران کے بارے میں کسی بھی خبر کی خوشی یا صدمہ اپنے دل پر نہیں لوں گی" وہ "مضبوط خیال میں ہوں۔ اگر افسان اپنے دل پر پسے۔ اپنے محسوسات پر اتنا حاوی ہونے کے قابل ہو جائے تو اس دنیا کے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تپ اتنا سسپنسی پیدا کرنے اور بات کو کھانے پھرانے کے بجائے اگر سیدھی طرح اصل بات بتا دیں تو کیا زیادہ اچھا نہیں ہو گا؟" وہ باتوں کی اگلیاں ایک دوسرے میں پھنسانے ایک تک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ سن پر خفیف سی مسکراہٹ اب بھی برقرار تھی۔

"اچھا۔۔۔ تو پھر دل تمام کر سنو۔۔۔" میں نے سنبھل کر بیٹھے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

اس نے نہایت صبر و سکون سے سب کچھ سنا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولی اور نہ ہی اس کے آثار میں کوئی تبدیلی آئی۔ البتہ میں نے اس کی نظروں میں دور ہلک رہی تھیں گو کہ بظاہر وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیس کوئی کی ہو؟ کیا تمہاری تلاش میں رکشالے کر جانا پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"نہی سے بھی نہیں" میں نے اطمینان سے جواب دیا "کیونکہ میں جب بھی کسی لڑکی سے بات کرتا ہوں تو عام طور پر کوئی نہ کوئی حائل میرے گلے پڑ جاتا ہے۔"

"جیسے مجھ سے بات کر کے پڑ جائے" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تو ذرا بڑا بچہ نہیں ہے اس سے کیس بڑے بڑے نال ہرے گلے پڑنے رہے ہیں۔۔۔" میں نے سر ہاتھ کر کہا۔ "حتیٰ بڑی لڑکی" اتنا بڑا بچہ! "وہ ایک بار پھر بات کا نئے سونے ہونے میں ذرا چھوٹی لڑکی ہوں اس لیے میرا بچہ نہیں سمجھتا ہے۔"

"تم کہاں سے پھرتی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا "مہاجراتو نہ تے تھارا۔"

"میں تمہاری نہیں اُمیدیت کی بات کر رہی ہوں۔" "آج تھیں حیرت کا کیلیکس کچھ زیادہ ہی سنا رہا ہے۔۔۔"

بلکہ آج سے تمہاری حیرت بلند ہو نا شروع ہو چکی ہے۔ ہر حال۔۔۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں کسی لڑکی سے نہیں بلکہ سونے سونے ٹیوشن کا پتہ لگانے والے ایک کرخت صورت سے مراد سے بات کر رہا تھا۔ وہ خود ہی سب کچھ کر لے گا۔ جس سیرس کی سیرس میں بھی تھی موزی بہت کچھ تلاش ہو کر وہ آجائے گی۔ تم اپنے انتظامات مل کر کے مجھے بتا دینا۔"

"دوبری گڈ۔ یہ مسئلہ تو نہایت عمدہ طریقے سے حل ہو گیا" وہ طمانیت سے بولی۔ "اب آپ بتائیے۔۔۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"تمہارے پاس کامران کی کوئی اچھی سی تصویر ہے؟ کوئی کلوز اپ؟ دیو۔۔۔ جس میں اس کے نین نقش بہت اچھی طرح واضح ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرے پاس بیک میں ہی ہے" وہ اپنے ٹولڈریک کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی "اس کی کیا ضرورت آن پڑی؟" "ٹولڈریک کے اور میرے علاوہ بھی کچھ لوگ اسے تلاش کرنے کی خوشی کریں گے" میں نے کہا۔ اس نے ہنڈریک کے ایک ٹیوڈر خانے سے کامران کی ذرا بڑے سائز کی ایک عمدہ رنگین تصویر میری طرف بڑھائی تو میں نے کہا "اس کی تصویر ابھی تک چاک میں سنبھل چکی ہو اور کسی ہو کہ اس کے لیے تمہارے دل میں کوئی بیک نہیں۔"

"ٹھیک ہی تو کہتی ہوں" وہ بلا تامل بولی "اب جگ صرف پر اس میں رہ گئی۔۔۔ بہت دل میں نہیں۔ کچھ عرصے بعد پر اس میں بھی نہیں رہے گی۔ دل خشکی اور ناخوشی کی ایک منزل آئی ہے جب افسان ذرا ناخوش بھی کوئے کھدوں سے نکال بیٹھا ہے۔"

"بہت سفاک ہو نہ؟" میں نے جیسے مجھے کہا۔ "سفاک نہیں۔۔۔ شقت دل ہوں۔ تپ یہ بتائیے کہ آپ کامران کی یہ تصویر کون لوگوں کے لیے لے رہے ہیں۔ آپ کے دوستوں کے علاوہ کون کامران کو تلاش کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں ہمیں ہوں۔ آپ دھوٹے کی کوٹش کر کے اس کی سکر امٹ واضح نہ ہوگی اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لوٹ آئی۔  
"کیا کامران کے بارے میں اپنے فیصلے پر نگرانی نہیں کر دو گی؟"

"صرف اس لیے کہ اس کے پاس بہت دولت آنے والی ہے؟" اس نے ترمیم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے ایسی گھٹیا سوچ کی توقع نہ تھی۔  
"یہ بھی ایک اہم فیکٹر ہے لیکن دوسرے عوامل بھی ہیں۔ اس کی پوزیشن بالکل تبدیل ہو رہی ہے تاکہ حالات عمل طور پر بدل جائیں گے۔ بالکل پلٹا کھائے جائیں گے" میں نے اپنے شرف کا دفاع کرنے کی کوٹش کی۔

"لیکن دل کے حالات روز بروز پلٹا نہیں کھاتے افضل صاحب! وہ گہری سنجیدگی سے بولی "جودل سے آڑ گیا سوا آڑ گیا۔ میرا خیال ہے آپ ابھی تک مجھے سمجھ نہیں پاتے۔"  
"صورت کو مجھے کارروائی کوئی ہے وقفہ ہی کر سکتا ہے۔ اور میں تک تسار مسئلہ ہے۔ تو میرا خیال ہے ابھی تو تم خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتی ہو کوئی اور کیا سمجھے گا۔ لیکن مجھے یاد پڑتا ہے۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے جب تمہاری باتوں سے کچھ ہوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دلچسپا زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مسلسل غربت انسان کو زندگی سے ہزار کر دیتی ہے" اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی چھین لیتی ہے۔

"میں اپنے اس نظریے پر اب بھی قائم ہوں۔ مجھے اس سے انکار تو نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولی "لیکن اس میں کامران کہاں سے آیا؟ کامران سے میں اس کی غربت کی وجہ سے تو قطعاً تعلق نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ غربت اور امارت تو ثانوی چیزیں ہیں۔ کبھی کبھی غربت دور بھی ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی دو دن ہو جاتے ہیں جیسا کہ اس وقت دو دن ہو نا و کمائی دے رہا ہے۔ لیکن انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔ کامران سے دراصل میرا سزا خان بالکل نہیں ملتا۔ دیر سے ہی سہی۔ لیکن قیمت سے کچھ پتا چل گیا۔"

"نہیں۔ کوئی ایسی خاص دیر نہیں ہوئی" میں نے اسے تسلی دی "بعض لوگوں کو تو شادی کے بھی بندہ میں برس بعد پتا چلتا ہے کہ ان میں بیوی کی آنکھیں میں اندر اشیانہ لگ نہیں۔ ظاہر ہے اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کچھ ہو نا ہے تو وہ پہلے سے بھی گرا ہوا ہے۔ ہم اور کامران زیادہ عقلمند کہ تمہارے درمیان شادی سے پہلے ہی طلاق ہو گی پھر بھی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے فیصلے پر نگرانی کر۔ ابھی وقت ہے۔"

"یہ آپ کی اچھائی کی دلیل ہے کہ آپ مجھے اس طرح سمجھا رہے ہیں۔ آج کے دور میں کوئی کسی کو اس طرح مشورے نہیں دیتا۔ میں آپ کا شکر یہ تو ادا کر ہی نہیں سکتی۔" وہ ایک لمحے کے لیے سر ہٹاتے ہوئے بولی "میں چاہوں تو کامران کی داپھی پر اس

سے پسے کی طرح مل سکتی ہوں۔ اسے تو معلوم ہی نہیں ہے کہ اس کی ہر موجودگی میں میں میرے دل کی کائنات میں کیا انقلاب آچکا ہے۔ لیکن میں محض دولت کے لیے اس طرح فدا بازی نہیں کھا سکتی۔ اگر دل اس سے نہیں مل رہا تو میں زندگی بھر کے لیے اس کے ساتھ بندھ کر گھٹنا نہیں چاہتی۔ آپ مجھے کسی کوٹش کر میں افضل صاحب!"

"چھا بابا۔۔۔! سمجھ لیا۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "اب مجھے بخش دو۔ مجاز میں ڈالوان معاملات کو۔ یہ تم دونوں کا خانگی معاملہ ہے۔"

وہ ہنس دی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "دیے۔۔۔ آپ جو کچھ بتا رہے ہیں کیا یہ سب کچھ واقعی بالکل سچ ہے؟"  
"نہیں۔ میں رائے نہ بننے کی شق کر رہا ہوں۔ آزمائشی طور پر پہلے کمائی گھر کر چھیں سنا رہا ہوں" میں نے جمل کر کہا۔  
"خفا نہ ہونا۔۔۔" وہ میرے سے ہنس کر بولی "میرا مطلب یہ سب کچھ واقعی بالکل افسانوی سا نہیں ہے؟"

"آج کے دور میں حقیقی زندگی افسانے سے زیادہ افسانوی ہو گئی ہے۔ اگر ہمیں اس دنیا میں ہر شخص کی کمائی معلوم ہو جائے۔ ہر ایک کے بارے میں ہمیں پتا چل جائے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو شاید حیرت کی زیادتی سے ہمارا ہارت ٹل ہو جائے۔ ہمارا اشتیاق پر طال ہو جائے شاید اسی بے قدرت بہت سی باتوں کو راز ہی رکھتی ہے" میں نے ذرا نرم سے جملے کہا۔  
"وہ تو درست ہے۔ مگر یہ قسمت بڑی بات ہے۔۔۔" وہ انکھ

انکھ کر بولی۔  
"بات بڑی نہیں۔۔۔ اصل میں ہماری اوقات چھوٹی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن اوہ والا جو تک بہت بڑا ہے۔ سب سے بڑا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے کوئی بھی بات بڑی نہیں۔ ہر حال۔ میں صرف یہ جانتے میں دلچسپی رکھتا ہوں کہ حالات میں اس نئی تبدیلی کے باوجود تمہارے فیصلے میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں؟"

"نہیں" اس نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا "میں نے اپنے لیے جو راستہ منتخب کر لیا ہے۔ یا یوں کہنے کے قدرت نے میرے لیے جو راستہ مقرر کر دیا ہے اب میں کسی کی اور مبرو سکون سے اسی پر چلوں گی۔" وہ اصرار نہیں دیکھوں گی۔ شاید اسی پر اصرار میرے لیے کوئی بہتر خطہ ہو۔"

وہ بڑے مضبوط ارادے کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس پر زیادہ زور نہیں دیا اور اس موضوع کو میںیں ختم کر دیا۔ انسان کو اپنی نئی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار تھا۔ ہر حال پہلی ملاقات پر اس نے اپنی سوچ کے ایک رخ سے مجھے حیران کیا تھا۔ آج دوسرے رخ سے حیران کر دیا تھا۔ ابھی اس کی بات میں میرے لیے اور نہ جاننے تھی حیرتیں پہاں تھیں۔  
کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو گئی تو میں نے سینہ واہ کو فون



میں تم نے بھی زرتاج کے ساتھ مجھ کوڑ کر رکھا ہے؟ کیا وہ ہمیں  
 کچھ رشوت دینا چاہتی ہے؟  
 ”رشوت؟“ وہ غصہ کی سانس لے کر بولی ”ہماری ایسی قسمت  
 کمال ہے۔ ہم تو پراسیت ملازم ہیں۔ ہمیں تو کوئی پراسیت کاموں  
 کے لیے بھیجے۔ میرا مطلب ہے کہ جو ڈونمبو کے لیے بھی رشوت  
 نہیں دیتا۔ اور خاص طور پر زرتاج لی لی۔ وہ کیا رشوت دیں  
 گی۔ وہ تو جیسے ہی موقع پاتے ہی مجھے کھلی کھلی غلطیوں سے  
 گھورتی رہتی ہیں۔“

”اس سے زرتاج کر رہتا۔ وہ بہت خطرناک لڑکی ہے۔“ میں نے  
 گویا اسے ڈرایا۔

”مجھے معلوم ہے سہرا۔“ وہ اطمینان سے بولی ”بھلا کوئی بے ضرر  
 اور عام سی لڑکی آپ کی دوست کیسے بن سکتی ہے۔“

میں نے اسے مزید ایک لمحے سختی سے گھورتے پر استغنا کیا۔  
 اس نے مسکین سی شکل بنا کر سر جھکایا۔ میں نے لٹائے کا جائزہ  
 لیا۔ ابھرے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، ٹھیک سی تھا۔ میں  
 نے اسے چمک کیا اور خط کو الٹ پلٹ کر سب سے پہلے اسے  
 ارسال کرنے والے کا نام تلاش کرنے کی کوشش کی۔ خط کے آخر  
 میں جو نام لکھا تھا اسے پڑھ کر میں یکدم سیدھا ہو کر بیڑہ گیا۔

وہ نام کامران تھا۔ آہم کوئی ایڈریس دینا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ  
 خط سے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں سے لکھا گیا تھا۔ میں  
 نے اسے تیزی سے پڑھنا شروع کیا۔ نہ جانے کیوں کامران کی  
 رائٹنگ پر کسی لڑکی کی رائٹنگ کا گمان گزر رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا:  
 افضل صاحب!

سب سے پہلے معذرت چاہوں گا کہ آپ نے مجھ فریب انجی  
 کی خاطر اپنی زحمت اٹھائی لیکن میں نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا  
 سلوک نہیں کیا لیکن شاید کوئی بھی بات ہو تا ہے جو انسان کو اور  
 دوسرے پھرتا ہے۔ مجھے شاید اسی بھی بات نے دکھا دیا تھا اور میں  
 آپ کو دکھا دے کہ بھلا نکلا تھا۔ معلوم نہیں اس کے بعد آپ  
 نے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی یا جھٹکا کر میسے حال پر  
 چھوڑ دیا ہو گا۔

”اگر آپ نے“ پولیس یا کسی اور نے بھی مجھے کراچی میں  
 ڈھونڈنے کی کوشش کی ہوگی تو ظاہر ہے میں انہیں نہیں مل سکا۔  
 جیسی یہ خط کھینے کی نوبت آئی ہے۔ میں کسی کو کراچی میں نہیں مل  
 سکا تھا کہ مجھ میں اسی روز کراچی سے نکل گیا تھا۔ ایک برائیاں  
 شناسا صاحبک راستے میں مجھ سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ میرے لیے براہم  
 دو گار بن گیا۔ وہ نہ صرف اپنے ساتھ محفوظ طریقے سے مجھے کراچی  
 سے باہر لے گیا بلکہ اس نے میرے لیے ایک محفوظ ٹھکانے کا بھی  
 بندوبست کر دیا۔ یوں تو میرا فوری ذمیت کا سلسلہ حل ہو گیا۔

چند دن پہلے تک میری زندگی اس ملک کے ان لاکھوں  
 نوجوانوں جیسی تھی جو غربت اور بے روزگاری کے ہمنوا میں بیٹھے  
 گھر معاش اور دوسری برائیتوں میں غلام و چٹان اور محروم

اطلاع دے دی کہ کامران کی تصویر میرے پاس آگئی تھی۔ چند  
 منٹ بعد ہی اس کا ایک نسخہ آگئی میرے پاس آن پہنچا اور کامران  
 کی تصویر کو کچھ اس طرح حفاظت سے اپنی تحویل میں لے کر روانہ  
 ہوا جیسے وہ محض تصویر نہیں کوئی زندہ سلامت شخص ہو۔ اس سے  
 مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو صرف تصویر کا معاملہ تھا، اگر واقعی کامران  
 خود اس سینٹرلیٹ کے آدمیوں کو مل گیا تو اسے کس حفاظت اور  
 احترام سے نگہ پاس کے پاس لایا جائے گا۔ اور ان لوگوں میں  
 غالباً نگہ پاس سینٹر واحد سی تھا۔ باضابطہ طور پر نہ کسی لیکن غیر رسمی  
 طور پر شاید اسے یہی حیثیت حاصل تھی۔

اس روز کوئی اور قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ دوسرے روز  
 صبح میں ایک کاروباری ملاقات کے لیے چلا گیا جو ناشتہ کی میز پر  
 ”ہی“ کی۔ یہ باہر کے ایک چھوٹے سے دند سے ملاقات تھی۔ ترقی  
 یافتہ ملکوں کے لوگ ہر وقت ”وقت بچانے کی فکر میں“ کے رہتے  
 ہیں۔ انکی کاروباری ملاقاتیں جو زیادہ تر صرف بات چیت تک ہی  
 محدود رہتی تھیں ان کے لیے انہیں نے اب ایک عربی سے بڑی  
 ”چغ“ کے بعد بڑی بریک فاسٹ کا دوران بھی نکال لیا تھا۔ صبح صبح  
 اس قسم کی بات چیت سے نیند کے بعد مزید صبح سے کام نہ لیتے  
 تھے۔ لے ان کے پاس دن کا زیادہ وقت بچ گیا تھا۔

اس ملاقات سے فارغ ہو کر اور اپنے گروپ آف پیپرز کے  
 ”اس“ آفس کا ایک پیکرنگا کر میں ”چغ“ کے بعد اپنے ہوٹل وائے آفس  
 گیا تو ابھرے اس روز کی ڈاک میرے سامنے لا رکھی۔ رسمی اور  
 کاروباری قسم کے خطوط وہ صحت میں تھی۔ جس جس پر کارروائی  
 کرنا اس کے بس میں ہوتا تھا وہ بھی کتنی بھی یا اسٹاف کے مشفقہ  
 لڑکی کو پہنچا دیتی تھی۔ میرے لیے صرف دی ڈاک لاتی تھی جسے  
 ہر ایک نظر دیکھتا، اس پر کوئی نوٹ لکھا یا دھکا کرنا ضروری ہوتا۔  
 ”کچھ بھی بھرا کوئی بھولا بھلا ایسا خط آجاتا تھا جس پر پرسل یا  
 انڈیکس لکھ لکھا ہوتا تھا تو اسے وہ نہیں کھولتی تھی۔“

اس روز اس نے ڈاک کی ٹرے میرے سامنے رکھی اس سے  
 بہت کم دیر ڈاک کی طرف توجہ دیتا ”اس“ نے چٹکی میں پیکر کر ٹرے  
 ٹرے ایک لٹاؤ ڈالا اور اسے ہوا میں لہراتے ہوئے بولی ”اس“ پر  
 ”اس“ میں اشتعالی تھی، لکھا ہوا ہے لیکن اس کی اوقات اشتعالی تھی  
 کی نظر نہیں آتی ہے۔ عام ڈاک کا لٹاؤ جیسے۔ میلا پھیلا اور  
 لیکن وہ ہے۔ ایڈریس بھی اٹا سیر اور ہوا میں ساہجے مجھے تو  
 بہت لگی ہے کہ یہ جڑل تک کیسے پہنچ گیا۔ اگر ہمارا ہو کی مشورہ  
 نہ آتی ہے بھی آپ تک نہ پہنچا۔ لکھا ہے آپ کی کسی بہت سی فریب  
 نہ جانے والی نے کس بہت سی دور دراز سے لکھا ہے پتا نہیں  
 پتا نہ تھا سائیکل کمال کمال تک پہنچی ہوئی ہیں۔ یہی کبھی نہیں  
 ہوتی ہوں کہ اگر چاہے ”صبح“ یا ”ہر“ پر بھی ہڑکیاں پائی جاتیں تو آپ  
 جیتے وہاں سے بھی خط ”فون“ یا ”کس“ دینا کر سکتے۔“

”اس“ نے لٹاؤ اس کے ہاتھ سے لے کر زرا سخت لڑکوں سے اسے  
 ”میرا خیال ہے میری رپورٹیشن خراب کرنے کے سہارے

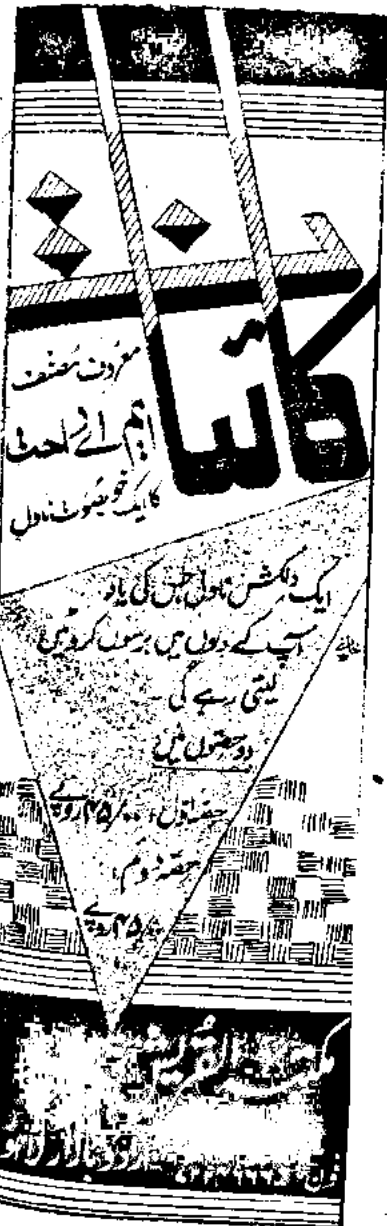
بھرتے رہتے ہیں۔ ان کے مدد و شب میں بڑی یکساہت ہوتی ہے۔  
مردانہ منت نئی باہمیوں کے سوا ان کی زندگی میں کوئی قہر نہ  
ہاں نہیں ہوتی۔ لیکن نیچے چند دنوں میں میری زندگی نے ایسا پٹا  
کھایا ہے اور ہر قدم پر مجھے ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ  
ابھی تک میرا سر گھوم رہا ہے۔ لیکن نہیں آنکہ یہ میں ہی ہوں اور  
انہی ہی زندگی گزار رہا ہوں۔

میں اس وقت ایک ساحلی جہتی میں ہوں۔ بلکہ اسے بہتر  
نہیں کہنا چاہیے۔ یہ اچھا بھلا ایک قصبہ ہے۔ بلوچستان کی حدود  
میں شامل ہے لیکن کراچی سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ مکمل  
انہما میں آپ کو ابھی تو نہیں لیکن جلد ہی دے دل کا گلد شایہ  
خودی آپ تک پہنچ جائیں گا۔ میں چاہتا ہوں ابھی مجھے چند دن کی  
سہلت اور حاصل ہے اور کوئی مجھے آزار نہ پکڑے۔ دراصل مجھے  
کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے اچانک اور اتفاقاً کسی بہت ہی پُر  
اسرار سلسلے کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ افضل صاحب بیان کوئی بہت  
بڑی کڑ بڑ جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ معاملہ گھوم پھر کر پرس  
اعتراف سے ہی ملتا ہے لیکن ابھی تک میں صحیح معنوں میں کوئی  
کارآمد بات معلوم نہیں کر پایا ہوں۔ میں اس سلسلے میں اپنے حور پر  
کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی کسی کو اس طرف متوجہ کرنا نہیں  
چاہتا۔ اگر میں واقعی معاملات کی چند اہم کڑیاں ملانے میں بھی  
کامیاب ہو گیا تو شاید یہ میرا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جائے اور شاید  
اس کے بعد پولیس مجھے بخش دے مجھے پرس میرا کے قتل کے  
شعبے سے بالاتر قرار دے دے۔

بس۔ نی افلاں میں آپ کو اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔ بڑی مشکل  
سے چھپ چھا کر بڑی دشواریوں سے آپ کو یہ خط روانہ کر رہا  
ہوں۔ معلوم نہیں آپ تک پہنچ بھی سکے گا یا نہیں۔ لیکن یہ  
بات تو یہ ہے کہ یہ صرف میں اپنے دل کا بوجھ بٹکانے کے لیے لکھ  
رہا ہوں۔ اصل بات چیت تو آپ سے چند دن بعد ہی ہوں۔ میرا یہ  
میرے اصل تفصیلی خط کا انتظار کیجئے گا۔ شخص اور معذرت خواہ۔  
کامران  
یہ ایک نہایت غیر متوقع اور عجیب و غریب خط تھا۔ میں اس  
کے مندرجات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے کئی لمبے تک حواسش پھینکا  
ملا۔ "میرا آپ تو اس خط کو پڑھتے ہی کہیں کھو گئے" امیر کی آواز  
نے مجھے چڑھایا۔

"ہاں۔ یہ بہت عجیب اور عجیبہ معاملہ ہے امیر! تم اپنے  
کمرے میں جاؤ اور مجھے کچھ سوچنے دو" میں نے گہری سنجیدگی سے  
کہا۔ وہ میرے لمبے کے آثار چھوڑا اور آنکھ کے اشارے کو بخوبی  
سمجھتی تھی۔ فوراً چلی گئی۔

میں نے خط کو اتنا پلٹ کر دیکھا۔ وہ کسی رشتہ سے چھاڑے  
مجھے عام سے کاغذ پر عام سے بال پر اکتے سے لکھا گیا تھا۔ کاغذ پر بھی  
اکھاڑ کا تیل کے دھبے موجود تھے۔ لٹانا عام ڈاک کا تھا اور اس پر نہ  
انہی وندلی اور ناگہل تھی کہ ایک حرف بھی ٹھیک طور پر نہیں پڑھا



جاسکتا تھا۔ دوسری مہر البتہ کراچی کی تھی جو صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ آن بی کی تاسخ کی تھی۔ اس کا کوئی ٹائمہ نہیں تھا۔ اصل مہر دوسری تھی جو اس مقام کی ہو سکتی تھی جہاں سے خط چلا تھا۔ گوکہ یہ بھی ضروری نہیں تھا۔ میں ممکن تھا کہ کامران خود کیس اور موجود رہا ہو اور خط اس نے کیس اور جا کر ڈالا ہو۔ تاہم اس سے کچھ نہ کچھ سراں پاتھ آسکتا تھا۔

میں ابھی خط کو ہاتھ میں لیے انہی سوچوں میں الجھا بیٹھا تھا کہ رحیم گل بغیر کسی اطلاع کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ وردی میں تھا اور غلاف معمول بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی بیچ بچ سنجیدہ۔ ایک خیال اچانک میرے ذہن میں لپکا۔ پولیس تو اپنے وسائل کی بنا پر بہت کم وقت میں بلوچستان کی ان ساحلی بستیوں کے بارے میں مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتی تھی جو کراچی سے زیادہ دور نہیں تھیں۔

وہ میرے سامنے آن پہنچا اور مجھ سے انداز میں ایک ٹک مجھے مہورنے لگا۔ کامران کا خط میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں نے اسے میرے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ میں ابھی الجھن میں تھا کہ خدا سے دکھاؤں یا نہیں۔ میں نے اپنا لہجہ کچھ گھٹتے بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مذہبیت تو ہے؟ پرانے قرض خزاہوں کی طرح کیوں کمزور رہے ہو؟"

"میں تمہیں اپنے ساتھ ایک جگہ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا کر قرار کر کے لے جا رہے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مگر قرار کر کے تو میں کسی دن تمہیں سیدھا چائمی کے تختے پر لائے جاؤں گا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"عدالت میں پیش کئے بغیر؟" میں نے پوچھا۔

"عدالتیں اگر سب مجرموں کو سزا دیتے ہیں کامیاب ہو سکتیں اس معاشرے کی حالت بہت بگڑ چکی ہے۔" وہ گھنٹی سانس لے کر "آؤ۔ چلیں۔"

لیکن میں نے اٹھنے کے بجائے وہ خط اور غلاف اس کے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نیلے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اٹھنے اٹھتے بیٹھ گیا اور بغور غور دیکھنے لگا۔ اس نے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے خط کو ایک بار گھبراہٹ سے اٹھا لیا۔ غلاف نے کامت باریک بینی سے معائنہ کیا اور یقیناً نتیجے پر پہنچا جس پر میں پوچھا تھا۔ اس کے تاثرات میں صرف اس کے لیے عجیب سا تغیر آیا۔

"تو تمہیں کب ملا ہے؟" اس نے پوچھا۔ خط پر کوئی تاسخ وغیرہ نہیں تھی۔

"مجھے۔۔۔ چند منٹ پہلے" میں نے جواب دیا۔ غلاف تو اس نے اس خط کے بارے میں مجھ سے مزید بات نہیں کئے اور اٹھتے ہوئے بولا "اس کے بارے میں ہم بعد بات کریں گے۔ پہلے تم میرے ساتھ چلو۔ میری ہی گاڑی میں جاؤ۔"

لازوال کہانیوں کے خالق

انوار صدیقی کی اپنے قارئین کے لیے

ایک نئی سوغات

## رقص ابلیس

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی

ایک حقیقت جو کہانی بن گئی۔

ایک آشفستہ حال کی داستان عبرت جسے

قانون نے مجرم بنا دیا

قیمت - / 150 روپے

ناشر۔ مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور 2

خط اس نے غلاف سے سمیت کر کے اپنی جیب میں رکھ دیا۔ میں اس کے ساتھ باہر آیا جہاں اس کی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ پچھلی سیٹ پر صرف ایک سٹالین آئی موجود تھا۔ رحیم گل نے خود ڈرائیو سٹیل سنبھال لیا۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد



# سکس



محمود احمد مودی

مجھے اپنی آنکھوں پر چین نہیں آیا تھا کہ وہ کامران دانش کی لاش تھی۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ شاید یہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ لاش کا چو بھی کالی بڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس میں کامران کی شباهت موجود تھی۔ میں نے سوچا شاید بات صرف شبہات ہی کی ہو۔ یہ کوئی اور ایسا نوجوان ہو جس کی شکل کامران سے تھوڑی بہت ملتی ہو۔ کامران بھلا ایسے دردناک انداز میں کیے تھر مرسکتا تھا؟

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو مجھے اس کا خلاصہ موصول ہوا تھا جس میں اس نے خوش خبری لکھی تھی کہ شاید کسی بہت بڑی گزیر کا مارا اس کے ہاتھ آیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں مزید معلومات جمع ہوتی ہی اور مناسب موقع ملنے ہی مجھے تفصیلات سے آگاہ کرے گا۔ ابھی تو وہ خط بھی درجیم گل کی جب میں تھا۔ ابھی تو ہم حج معنوں میں اس کے مندرجات پر غور بھی نہیں کرنے پائے تھے اور اس حالت میں اس کی لاش ہمارے سامنے آگئی تھی۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی غلط فہمی تھی۔ یہ ضرور کوئی اور نوجوان تھا جس پر ہمیں کامران دانش کا دھوکا ہو رہا تھا۔

میں زیادہ دیر تک اپنے آپ کو ان غفلت تسلیوں سے نہ بھلا سکا۔ کسی کو دھوکے میں رکھنا اور خود دھوکے میں رہنا میری عادت بھی نہیں تھی۔ حقیقت سستی بھی تکلیف دہ کتنی بھی ناقابل یقین اور کتنی بھی ناقابل برداشت ہو اس کا اعتراف کر لینا میری بہتر ہوتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ خود کو جھوٹی تسلیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان ایک باریک سی لکیری تو مائل تھی۔ اسے عبور کرتے کون سی دیہ گرتی تھی؟ کامران کا خلا نہ جانے کس طرح اور کہاں کہاں ڈنکا کھتا میرے پاس پہنچا تھا۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ ہی کامران کی لاش بھی تن پہنی تھی تو اس میں تجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ آج کل تو ویسے بھی انسان کم اور لاشیں زیادہ ہو کر رہے اور ہر سڑک پر بھی ”کھچا کھچ“ بھرا ہوا یہ پردہ خانہ اس کرب انگیز حقیقت کا آئینہ وار تھا۔

میں غیر ارادی طور پر ذرا پیچھے ہٹا تو دروازے کے ساتھ ساتھ بی ہوئی چند آنچ اچھوٹی ایک سلیب سے میرا پاؤں ٹکرا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس سلیب پر بھی کئی لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ بعض پر چڑی ہوئی ہاوریں خون سے تر تھیں۔ میں ذرا سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے آپ کو غفلت تسلیوں کے دائرے سے باہر لے آیا۔ میں نے یقین کر لیا کہ کامران مر چکا تھا۔ حریت اور بے یقینی کی جگہ تأسف اور دکھ کی ایک سردی لہر نے لے لی۔

ان گنت سوالوں نے ایک ساتھ ذہن پر غبار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے غامضی بے کسی کو ذرا حال بنائے ہوئے اس غبار کو دھکے کی کوشش کی۔ میں چاہ رہا تھا کہ میرا ذہن چند لمحے کے لیے شل سا ہو جائے تاکہ میں ان گنت سوالوں کی آفت سے بچ سکوں۔ یہ سوال اس لیے بھی زیادہ آفت ناک محسوس ہو رہے تھے کہ فی

الہام مجھے ان کے جواب ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ درجیم گل نے اسپتال کے ملازم کو اشارہ کیا۔ اس نے پوری لاش پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ اسے پوری لاش کسائی غلط تھا۔ درحقیقت وہ اور حوری سی لاش تھی۔ نامکمل اور اعضا بڑھ چکی لاش۔ اس کی ایک ہانگ تقریباً پوری سی غائب تھی۔ دوسری ہانگ بھی کچھ اس طرح پکلی سسلی اور کھنی پھنی سی تھی جیسے کسی بھاری دندانے دار چتر سے اس کا قہرے بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ دوسرے زخم اور چرہ باز اس کے علاوہ تھی۔ اس بچے کچھ جسم پر کپڑوں کی جگہ بھی نقص چند چوتھری سی یاد تھے۔

چند دن پہلے تک میں نے اس نوجوان کو تندرست و توانا زندہ سلامت اور بے نقص دیکھا تھا۔ آج وہ محض شلت و سخ شدہ اعضا کا ایک کراہیت انگیز ڈھیر تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دل خراب ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے چند لمحے کے لیے اپنے محسوسات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن میری ہانگ سمجھ میں نہ آیا۔

اس کی یہ حالت دردوں کی جھینا جھینا کا شائبہ بھی ہو سکتی تھی اور انسانوں کی زندگی کا نمونہ بھی۔ انسان اب انسان کو زیادہ سے زیادہ اذیت دے کر مارنے یا ٹھروں سے بدتر حال میں پھوڑنے کے معاملے میں نئے طریقے، نئے پھل و ریافت کر رہا ہے۔ اس معاملے میں وہ دردوں سے اور پرانے زمانے کے غمخوار انجاس اذیت پرست حکمرانوں سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ درد و انسان کو یا اپنے شکار کو ہلاک کرنا ہے تو اس کا مقصد اسے سکا سکا کر زخا زخا کرنا یا زیادہ سے زیادہ اذیت دے کر ہلاک کرنا نہیں ہوتا۔ اسے تو صرف اپنا پیٹ بھرنے اور جلد از جلد اس ”مہم“ کو ختم کرنے سے غرض ہوئی ہے۔ یہ وصف صرف حضرت انسان میں ہی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیمار اذیت، اپنی اذیت پرست فطرت اور اپنی سس نفس میں پکلی ہوئی دردنگی و شہادت کی تسکین کے لیے جان بھی نہ جانے کتنی کتنی طریقوں سے لیتا تھا۔ چنانچہ کامران کی یہ حالت کچھ انسانوں کی طبع آزمائی کا نتیجہ بھی ہو سکتی تھی۔ شرمیں ایک عرصے سے جو کچھ ہو رہا تھا اس کے بعد تو اب کچھ بھی ہیدا از امکان نہیں رہا تھا۔

آخر کار میں نے درجیم گل کی طرف دیکھا جو چھپا ہوا سا چو لیے کھڑا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں پوچھا ”یہ سب کیا ہے؟“

”کیا سب کیا ہے؟“ اس نے انجان بننے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے اپنی آواز کو سرگوشی کی حد تک نیچے لانے کی کوشش کی تاکہ اسپتال کا ملازم اور کانسٹیبل نہ سننے پائیں ”مجھے مجبور مت کہو کہ میں تمہاری کھوپڑی پر ایسا گونا گوارید کوں کہ تمہارا یہ بے

صرف وجود بھی یہاں بڑی ہوئی ان بت ہی لاشوں میں شامل ہو جائے اور تمہاری یہ بے مغز گھوڑی کسی پتکے ہوئے تیزو کی طرح ادھر ادھر بکھر جائے یہاں تو تمہاری لاش کو کپالے کے لیے جگہ بھی نظر نہیں آ رہی۔

اس نے نیم دای آٹھوں سے نہایت پر سکون انداز میں۔  
بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کسی حد افریقی سے میرا جائزہ لیا پھر میری سانس لے کر بولا "مٹا لے ایتھے ہل لیتے ہو۔ کاش تم سیدھے سادے انداز میں بات کرنے کے مادی ہو سکتے۔"

میں نے اسی موقع پر اس سے بحث میں اچھے کے بجائے اپنے غم و غصے پر قابو رکھتے ہوئے کہا "میں نے اس حال کو پسپا کیا ہے۔"

"یہ ہمیں ابھی معلوم کرنا ہے۔" وہ پرسکون لیے میں بولا "دیوے نہیں سرجن کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق اس کی یہ حالت کسی مگر کچھ کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

"مگر کچھ..." میں نے بے یقینی سے دہرایا۔ میں جی جی ایک لمبے کے لیے اپنا غم و غصہ بھول گیا۔ میں یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ رجیم کل کو ایسے موقع پر بھی مذاق سوجھ سکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتا تو میں نے پوچھا "تم کس قسم کے مگر کچھ کی بات کر رہے ہو؟ چار ٹانگوں پر بیٹھنے والے کسی مگر کچھ کی..." یادو ٹانگوں پر چلنے والے مگر کچھ کی؟

"میں استعداد اور تھکسات میں بات نہیں کر رہا۔" وہ قدورے ناگوار سے بولا "جس حد تک مجھے معلوم ہو سکا ہے وہ جیسے سیدھے اور سچے انداز میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

اس نے اسپتال کے ملازم کو اشارہ کیا۔ اس نے لاش کو دوبارہ کپڑے سے ڈھانپ دیا اور ہم مردہ خانے سے باہر آ گئے اس نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور مجھے ساتھ لیے وہاں سے کچھ دور پر آدے میں آگ لکڑا ہوا۔ وہ یقیناً کسی سوچ میں تھا۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ مجھ سے بات بھی کئے جا رہا تھا۔

میں نے کہا "میں نے آج تک کراچی میں چار ٹانگوں والے مگر کچھوں کے اس حد تک سرگرم عمل ہونے کے بارے میں نہیں سنا تھا کہ وہ انسانوں کا یہ شکر کرنے لگیں۔ میں نے کراچی میں کیسی مگر کچھ دیکھا ہی نہیں۔ حالانکہ یہ شہر سندھ کے کنارے واقع ہے مگر میں نے کسی ساحلی علاقے میں مگر کچھ پائے جانے کے بارے میں آج تک نہیں سنا۔ برسوں پہلے نہ جانے کس پتھر میں یہاں کے چڑیا گھر جانا ہوا تھا تو وہاں میں نے ایک سرپل سا مگر کچھ دیکھا تھا۔ وہ بھی اتنا خضر الزود تھا کہ اسے مگر کچھ کے بجائے ٹنگ سائز جسم کی جھپٹکی کہنا زیادہ مناسب تھا۔"

رجیم کل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے پُر خیال انداز

میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمبے کے توقف سے میں نے کہا "کیسی ایسا تو نہیں کہ یہاں کسی نے نشہ دارم و فیوہ کی طرح... ٹیکہ گھر فارم" کھول لیا ہو؟ اپنے غمی حوض مگر مگر کچھوں کی فارمگ اور بیٹھ جگ شہر گدی ہو؟ وہ ٹانگوں والے مگر کچھ تو بہت سے لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں برسوں سے پائے ہوئے ہیں جو اپنے آقاؤں کے اٹھارے پرنت نے انداز میں شہر میں چابی پھیلانے اور انسانوں کو جھنجھوڑنے پھرے ہیں۔ کیسی اب کسی نے غمی سلح پر چار ٹانگوں والے مگر کچھوں کی افزائش نسل تو شروع نہیں کر دی اور کسی وہ اپنے مستحق کو ان مگر کچھوں کے سامنے تلاب میں تو نہیں پھینکا؟

رجیم کل گویا کسی سمجھ بچے پر ترس کھاتے ہوئے ہماری سانس لے کر کچھ ششادہ سے لیے میں بولا "فضل امیری جان۔ اگر تم نے کوئی چیز نہ دیکھی ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ اس دنیا میں اس شہر میں کسی پائی نہیں جاتی۔"

"یہ تو میں اکثر خود لوگوں سے کہا کرتا ہوں۔" میں نے اس کی بات کانٹے ہوئے کہا۔

"کیا بات بھی خود سے بھی کہہ لیا کرو۔" اس نے مرتبانہ انداز میں مشورہ دیا۔

"میں تو بہت پہلے سے ہی اس کا قائل ہوں۔" میں نے کہا۔ "شکر ہے کہ تم کسی بات کے تو قائل ہو۔" وہ ایک اور غصہ کی سانس لے کر بولا۔

"میرے سوال کا جواب پھر بھی نہ کیا۔ وہ مگر کچھ کراچی میں کہاں پایا جاتا ہے جس نے کامران کو اس انجام سے وہ چار کیا ہے؟" میں نے جانا چاہا۔

"میں نے جذباتی انداز میں کیوں پوچھ رہے ہو؟" رجیم کل نے مجھے گھورا "کیا تم ابھی تک اسالے کر جاؤ گے اور اس کے کھڑے کر دو گے؟ اس سے پہلے شاید تم وہ چار بڑھکیں بھی مالدگے اوئے مگر چھاپیں تم سے ٹوٹے کرن لئی تیاں والں۔ تمہارے دو ٹوٹے میں ایس لئی کراں گا۔ فیرتن ٹوٹے ایس لئی کراں گا۔" وہ فیوہ و فیوہ۔

"مگر تم کیوں اس کرنے میں اپنی زبان کی اتنی توانائی خرچ کرنے کے بجائے خود ہی توانائی میری بات کا جواب دینے میں خرچ کر لینے تو کیسی سست ہو آ۔" میں نے کافی حیل سے کہا۔

"تم کراچی کی بات کیوں کیے جا رہے ہو؟" وہ خفیف سی چڑاہٹ کے ساتھ بولا "جیسے کچھ دیر پہلے کامران کا خطل چکا ہے۔ اس میں اس نے خود لکھا ہے کہ وہ کراچی میں نہیں تھا۔ وہ اسی لہذا کراچی سے نکل گیا تھا جس لہذا جس میں میں نے کہا۔ بلکہ شاید دھکا دے کر بھاگا تھا۔" اس نے جھجکی "کیا تم اتنی جلدی یہ بات بھول گئے؟"

"میں بھولا نہیں ہوں لیکن لاش کی یہ حالت دیکھ کر نہ جانے

کیوں مجھے کہاں گزرا کہ کامران شاید کراچی میں اس انجام سے دو چار ہوا ہوگا۔ میں نے کہا۔

”جس نے کہاں گزرا تو شاید ٹھیک سی گزرا۔“ اس کے لیے میں شاید حقیقی انصاف کی جھلک آتی، متعدد سے نسخہ شعفہ کئی پہلو اور حریف۔ اور جلی اور انسانیت کی انتہائی جھلک کا احساس دلانے والا تھا میں اب اس شرکی شناخت میں گئی ہیں۔

”یہ سب تم لوگوں کا قصور ہے۔“ میں نے فوراً کہا۔

”ہاں۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا، ”میں وہ کار تو صرف ہم ہی ہیں۔ باقی تو سب یہاں فرشتے ہیں اور اپنی فرشتوں والی عظیم منفات کے سارے اس شر کو جنت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ہمت سی باتوں کی دتے داری، سر مال کھوم بھر کر تم لوگوں پر آتی ہے۔“ میں نے اصرار کیا۔

”چھا اپنی چوچ بند رکھو اور ایک طویل دلا بینی بحث مت شروع کرو۔“ وہ ہنسی سے بولا۔

”کامران کے بارے میں جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکا ہے وہ سب مجھے بتا دو۔ میری چوچ بند ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”ہم تمہارے آس واپس چلیں گے وہاں جینے کے آرام سے بات کریں گے لیکن اس سے پہلے میں ذرا میڈیکل لیگل ایڈیٹر سے مل لوں۔ تم میرے ساتھ چلو گے؟“

”ہاں۔“ چلے چلا ہوں۔“ میں نے ایک لمبے سوچ کر کہا۔

”مدت سے مدت سے گوشے آنکھوں سے اونچل ہیں۔ ذرا ان کی حالت ہی دیکھتے چلیں۔“

”حالت تو ہر چیز کی دن بدن خراب سے خراب تر ہی ہو رہی ہے۔ اور معلوم نہیں خرابی کا یہ سلسلہ کہاں جا رہا ہے۔ شاید رکے گا ہی نہیں۔ اور کسی موٹر کوئی جہاز کا انجام ہمارا بھر ہوگا۔“ اس نے بوجھل لمبے میں کہا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

میڈیکل لیگل ایڈیٹر کے دفتر کے سامنے ایک جھوم لگا ہوا تھا۔ اس جھوم میں ہر عمر کے مولود اور عورتیں شامل تھیں۔ بیشتر چوں پر وحشت پریشانی اور غم و اندوہ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بہت سے افراد جو تیز توڑوں میں باتیں کر رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ہم بھیڑ کھینچتے ہوئے آگے بڑھے تو کئی لوگوں نے ہانپتہ یہی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

ہم دروازہ کھول کر اندر جا پہنچے اس پر سے کمرے میں کئی افراد تھے جن میں کئی پولیس والے بھی تھے۔ ان میں سے دو تین نے رجم کل کو سیلیٹ کیا۔ میڈیکل لیگل ایڈیٹر ایک میسر سوجو تھا۔ اسے کئی افراد نے گھیرا ہوا تھا۔ ان میں پولیس والے بھی تھے اور اسپتال کے عملے سے تعلق رکھنے والے بھی۔ ان کے سفید کور کل اور اسٹینڈ کپ ان کی شناخت تھے۔ ممکن ہے وہ میڈیکل کالج

کے طالب علم رہے ہوں۔

وہ سب بیک وقت میڈیکل لیگل ایڈیٹر کو اپنی اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے سامنے میسر کاغذوں اور قاتکوں کا ایک چھوٹا سا انبار تھا۔ اس کا چوبیسے میں بیجا ہوا تھا اور تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا پس نہیں چل رہا۔ اپنے ہال نوچا ہوا کسی جگہ کی طرف نکل بھاگے۔ رجم کل اگر انتظار کرے کہ ایم ایل او اس کی طرف حوجہ ہو تو شاید پروردی گزرا جائے۔ اس نے شاید کسی محسوس کرتے ہوئے ایک دو افراد کو پیچھے بلایا اور اس کے صحن سامنے جا پہنچا۔ اس نے سر اٹھا کر رجم کل کی طرف دیکھا، تھکے تھکے سے انداز میں مسکرایا اور ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں صحن کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ خود آگے رپورٹ لینے؟ کسی کانسٹیبل کو بھیج دیا ہوتا۔“

”مجھے لاش کو ایک نظر دیکھنا تھا اور کسی اور کو بھی دکھانا تھا۔“ اس نے خود چلا آیا۔ ”رجم کل بولا۔ اس نے ایم ایل او سے میرا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”آپ نہیں۔“ ایم ایل او نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر پہلے ہی کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

”بیٹھنا تو دور کی بات ہے اس وقت یہاں کونسا ہوتا بھی اپنے اور آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔“ رجم کل بولا، ”میں وہ ابتدائی رپورٹ مجھے دے دیں۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔“

ایم ایل او نے بے دھیانی سے سر ہلایا اور اپنے سامنے بڑے ہوئے کاغذات کے بے ترتیب انبار میں غلط ذن ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کی بات بھی جاری تھی ”اسٹیکز صاحب! آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم کس قدر پریشر میں کام کر رہے ہیں۔“ اس نے پیشانی سے ہاتھ پرچھا۔ شاید اسے مطلوبہ رپورٹ نہیں مل رہی تھی ”ہر طرف سے پریشر ہے۔“

”میں بہت اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہوں۔ ہم سب بہت زیادہ پریشر ہے۔“ رجم کل کسی سفید کی سے بولا، ”مورے پریشر شاید اٹھ کاغذاب ہے جو ہمارے افعال کے نتیجے میں ہم پر نازل ہوا ہے۔“

میں نے اسے ہلکی سی گھنٹی مار کر سرگوشی میں کہا میں افعال کی بات کرنا ہوں تو تم بڑا سنا جاتے ہو۔“

اس نے مجھے گھورا اور بچی نواز میں بولا ”یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں، چال تو ہی ہمیں کمر ٹھسی کے انکسار کے لیے اس طرح بات کرنا ہوں ورنہ مجھے افعال کم از کم تم سے تو بہتری ہوں گے۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا ”ایم ایل او نے یہاں کے ذریعے ایک دوسرے سے خشک تین چار کاغذ تلاش کر کے اس کی طرف بڑھا دیے اور بولا ”تفصیلی رپورٹ مارٹن رپورٹ تین چار دن بعد مل سکے گی۔ کام بہت زیادہ ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا چو



اس وقت تک ہم گاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اے اللہ! آئی نے جلدی سے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ اس بار بھی ڈرائیونگ سیٹ پر جم کر نے ہی سنبھال دیا۔ وہی کاسٹر غاسوشی سے کتا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس سے پہلے بھی میں صرف اپنے خیالات کو مشترک رکھنے کے لیے ہی بول رہا تھا۔ ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ بہت دیر کے لیے سکوت اختیار کر لیا جائے۔

میں غاسوشی ہو آتا تھا تو ذہنی طوراً کامران کی لاش کی طرف توجہ دیتا جاتا تھا۔ یوں تو کسی بھی بے گناہ کی لاش دیکھنے کے بعد میرے دل میں دیر تک ایک بے عنوان سی افسردگی اور بے رنگ بھائی رہتی تھی لیکن اس وقت تو میں لاشوں کا ایک بے گناہ کا وار دیکھ کر آ رہا تھا جن میں سے نہ جانے کتنی بے گناہوں کی تھیں اور وہ کھن لاشیں نہیں تھیں نہ جانے کسی کسی کی زندگی میرے تھے اور یہاں تک کہ ہم کاسٹر غاسوشی تھیں جو دل کو لہو کر دینے والی سوچوں کو ہم دیتی تھیں۔ دل میں زیادہ افسردگی اور بے رنگی اس احساس سے پھیل چکی تھی کہ ان جیسے جانتے انسانوں کو اس حال کو پہنچانے والوں میں سے کسی کے بھی پتھرے جانے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ انہیں صرف دست قدرت ہی اپنی گرفت میں لے سکتا تھا۔

میری ان اداس سوچوں کے درمیان کامران کی کمانی ٹانف اور پچھتاہوں کا ایک الگ ہی مجموعہ تھی۔ خوش قسمتی جب اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی تو وہ زندگی سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے غربت اور اس کے مسائل کو اپنی جگہ تھے لیکن ہم کم از کم زندہ تھے۔ شاید وہ حیات پر خواہ کرتے پڑے ہی سہی لیکن اپنا سفر جاری تو رکھ سکتا تھا۔ ہاتھ پاؤں تو مار سکتا تھا۔ خوش قسمتی خواہ اسے گئے نہ لگائی فلم از کم وہ زندہ تو رہتا۔

میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں یہ خبر منہ پر کیسے سناؤں گا۔ بے شک وہ اس سے قطعاً تعلق کے ارادے کا اظہار کر چکی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خبریں کر اس کے دل پر خاصا کراؤ ڈال آئے گا جس کے منہ ملنے سے میں نہ جانے کتنا عرصہ گئے اور اگر اس نے کامران کی لاش کی حالت دیکھی تو نہ جانے کتنے برسوں کے لیے اس کے ذہن پر بد صورت یادوں کے شکرے غرضت ثبت ہو جائیں جو اسے نہ جانے کب تک زندگی کی کسی بھی خوب صورتی سے لطف اندوز نہ ہونے دیں۔ یہ اندیشہ بہر حال موجود تھا کہ لاش تدفین کے لیے اس کے قریبی عزیزوں کے حوالے کی جائے گی تو منہ اسے دیکھ لے گا۔ اگر وہ صرف چو دیکھتی تب بھی اسے کچھ کم تکلیف نہ ہوتی۔ کامران کے چہرے کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یہ خبر منہ پر کیسے سنائی جاوے گی۔ اسے یہ خبر اخبارات میں ہی پڑنے کو ملتی تو بہتر تھا۔ ابھی تو اس نے کامیابیوں کی میز پر پہلا قدم رکھا تھا۔ برسوں کی محنتوں کے بعد شاید پہلی بار اسے دور کیس خطی کا نشان نظر آیا تھا۔ میں نے

پیشہ۔  
"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ اب یہ کوئی امیر مرضی کس نہیں رہا۔" رحیم گل اس کی بات کاٹنے ہوئے کچھ شک سے بچے میں بولا اور وہاں کے لیے تڑکھا۔

میں نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے میں پہنچ کر کہا "مے چمے لکھے اور عالم و فاضل انسان! میں اس وقت خود کو تھراپیچہ سمور احموس کر رہا ہوں۔"

"تمہیں اس پر شکر کرنا چاہیے کہ تمہاری کچھ توحیثت بنی ورنہ اس سے پہلے تو تم اس قاتل بھی نہیں تھے۔" وہ بولا۔

"لگتا ہے آج تم نے بہت اعلیٰ درجے کی تکلف کر لی ہے۔"

"میں نے خیال ظاہر کیا۔"

"اگر مجھے کچھ پتا ہی ہو تو پہلے میں کچھ لوگوں کا خون پیتا۔"

وہ بولا۔  
"ہم یہ حسرت دل میں ہی لیے پھرے رہے اور وہ خون نہ جانے کتنے لوگوں کا خون بنی جائیں گے جن کا تم خون پیا نہیں چاہے ہو۔" پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "میرا مال پرنس کیرا کے قتل کے سلسلے میں تھیں جس پر سب سے زیادہ شبہ تھا تو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کیس کے سلسلے میں اب تک تو تمہارے پاس یہ مصروفیت تھی کہ تم کامران کو تلاش کر رہے تھے۔ اب کیا کہو گے؟"

"کامران کو تلاش کرنے کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ کر رہے تھے۔ اب بھی کرتے رہیں گے اور آئندہ بھی جو کچھ کرنا ہوگا ضروری نہیں کہ وہ تمہیں بتا کر ہی کریں۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی۔" میں نے کندھے اچکائے "میں جو کچھ کہوں گا اس کے بارے میں بھی تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ امکان یہ ہے کہ زیادہ نقصان میں تم ہی رہو گے۔"

"مجھے معلوم ہے تم بھی اس سلسلے میں بہت مستعد ہوئے پھر رہے ہو لیکن مجھے یقین ہے تم وقت ہی ضائع کو گے اور اگر تم کچھ معلوم بھی کرو گے تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔"

"ظاہر ہے کام سے بکے دلچسپی ہوتی ہے؟ کام سے تو ہر کوئی فراز جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اپنے حصے کا کام خود کرنے کا عادی ہوں۔ مجھے تمہاری کا پڑا لاش پڑنے کی ضرورت نہیں۔" وہ متنا کر بولا۔

"لیکن جو غمی میں تمہیں کسی کام کا کیڑا دینے کے لیے ملاؤں گا تمہارے بھاگے ہو گے۔" میں نے اسے چالایا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

"وقت تو پہلے ہی بہت کچھ بتا چکا ہے۔ تمہارا امی اس سلسلے میں خاصا داغ دار ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم کرف لوگ اگر آؤں تو وقت میں بھی کسی کے ذرا بھی کام آتا ہے۔ یہ تو ہمیں ہی اس طرح جانتے ہیں۔"

وہ مزید الجھنے کے بجائے اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اسے غالباً کسی مگرچہ یا مگرچھوں نے ہلاک کیا ہے۔"

"اس کے علاوہ بھی جنہیں کچھ معلوم ہو گا۔" میں نے ذرا قفل سے کام لیتے ہوئے کہا "کیا وہ مگرچہ اسے سر راہ کیس پلٹے ہوئے مل گئے تھے؟ کیا کامران دریا میں رہنے لگا تھا اور دریا میں رہتے ہوئے اس نے مگرچہ سے بھر پور مل لے لیا تھا؟ کیا اس کے اور مگرچہ کے درمیان کوئی کاہد پاری رقابت پیدا ہو گئی تھی؟ یا پھر مسئلہ دوسری قسم کی رقابت کا تھا؟ کیا کامران نے کسی مگرچھ کو کھا دیا تھا؟ اس سے دیکھ لیا تھا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ معاملے کا کچھ پس منظر تو ہو گا۔ ہر معاملے کا کوئی نہ کوئی پس منظر ضرور ہوتا ہے۔"

"میں سنطری تو مجھے معلوم نہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تم اپنے منہ سے دماغ پر اتار دو جو دست ڈالو۔ جنہیں جو کچھ معلوم ہے صرف وہ صحیح طور پر بتا دو۔ میں نے پہلے ہی بھی گزارش کی تھی اور اب پھر دست بستہ کی گزارش کر رہا ہوں۔" میں نے بظاہر گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"جیسا۔ دست بستہ گزارش کر رہے ہو۔" اس نے ذرا مطمئن انداز میں سر ہلایا "تو پھر بتا دتا ہوں۔ یہاں سے تقریباً ستر اتنی میل دور بلوچستان کی حدود میں ایک قصبہ ہے۔ لیگھانی اس کا نام ہے اور سیکہ قبیلہ اس میں آباد ہے۔ چھوٹا ٹھکانہ دریا اور جنگ جو قسم کا قبیلہ ہے۔ اس کی زیادہ تر قوت اسی قبیلے میں مرکوز ہے اور قصبہ ایک طرح سے سمندر کے قریب ہی آباد ہے۔ ایک کچی پٹی لیکن بہت بڑی سمندری کھاڑی وہاں تک پھیل گئی ہے جو اتنی کمری ہے کہ بڑے سمندری جہاز بھی اس میں آجاتے تھے۔"

"تم" تھے "کا سینہ استعمال کر رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے اب نہیں آتے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"آ تو سکتے ہیں لیکن اب آتے نہیں ہیں۔ وہ ایک متروک کھاڑی ہے۔ کسی زمانے میں وہ شپ بریکنگ کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ کراچی کے ساحلوں سے بہت دور اس الگ تنگ جگہ کو گویا اس کام کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا جہاں زیادہ تر اسی قبیلے کے مزدور جہازوں کی تیرہ یا زائد توڑ پھوڑیں لگے رہتے تھے۔ یہی روزگار کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ مساکل اور ٹیکوں کے جھگڑوں کی وجہ سے شپ بریکنگ انڈسٹری گزرائی کے قریب منتقل ہوتی چلی گئی۔"

"قبیلے کے لوگوں نے احتجاج نہیں کیا کہ روزگار کا ایک بڑا ذریعہ ان سے دور جا رہا تھا؟" میں نے دریافت کیا "بعض بستیوں کا ذکر بھی تو درحقیقت ایسے ہی کسی روزگار کی وجہ سے وجود میں آجاتا ہے اور اس روزگار کے ختم ہونے پر وہ بھی ختم ہو جاتا

اس کی آنکھوں میں امید کے ستارے جھلکاتے دیکھے تھے۔ اس ابتلا کی سرطیل پر ہی اسے دکھ دینے والی کوئی خبر نہانے کے لیے میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

مجھے سینہ واحد اور اس کی سینڈیکٹ کا بھی خیال آ رہا تھا۔ وہ لوگ گویا اسے بھکاری سے بادشاہ بنانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اس قسم کے لوگ کسی کے ساتھ اتنی قربانی کا سلوک کرنے کا فیصلہ دوزخ میں نہیں کرتے تھے۔ سینہ واحد نے تو کامران کو تلاش کرانے کے لیے کتنے جوش و خروش سے مجھ سے اس کی تصویر بھی منگوائی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ خبر اس کے لیے بھی ایک بڑے دھچکے کا سبب بنے گی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے بھی یہ خبر کسی اور ہی ذریعے سے مل جائے تو اچھا ہے۔

اسی پر جھل سی خاموشی کے سامنے میں ہم آفس پہنچ گئے۔ میں نے ٹالی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اپنی روم الونگ پیئرز ڈھیر ہوتے ہی کہا "اب مجھے وہ سب کچھ بتا دو جو جنہیں معلوم ہے ورنہ میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تم لوگ اپنے "ڈرائنگ روم" میں ذریعہ تحقیق فرماؤں گے کرتے ہو۔"

وہ اس وقت تک میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ہینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا "اتنی بے ٹالی۔؟"

"ہسپتال میں میں نے تم سے تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تمام راستے بھی میں خاموش رہا۔ اب یہاں پہنچ کر تم سے پوچھ رہا ہوں تو اسے بھی بے ٹالی کہہ رہے ہو۔" میں نے اسے گھورا "میرا خیال ہے مجھے تمہارے بوزے ہوئے۔ بلکہ بہتر مرگ پر پہنچنے کا انتظار کرنا چاہیے؟"

اس نے گویا میری بات کو جواب کے قائل نہ سمجھا اور جبب سے کامران دانش کا وہ خط نکال کر ایک پھر پھر پڑھنے لگا جو میں نے ہی اسے دیا تھا۔ پھر وہ اپنی ہاتھ لائی ہوئی ابتلا کی میڈیکل رپورٹ کا جائزہ لینے لگا۔ کئی منٹ تک کمرے میں سکوت رہا۔ آخر میں نے انھیں سے سیر نکھٹاتے ہوئے کہا "میں بھی یہاں موجود ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ کانڈا ات سے ٹھہرنا نہ بھریں بولا۔

"کبھی کبھی میں اپنی موجودگی کا احساس بہت پر گھونسا مار کر بھی دلاتا ہوں۔" میں نے ٹھیلے سے لیپے میں کہا۔

"کس کے منہ پر گھونسا مار کر؟" اپنے منہ پر؟ "اس نے اب مراٹھا کر سیدھی سے پوچھا۔

"نہیں۔ سامنے والے کے منہ پر۔" میں نے واضح کیا۔

"وہ وقت دور نہیں جب تم دونوں باہر کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا یا کہو گے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"اور اس کے بعد غم گناہوں یا دلیوں کرتے ہوئے ہماگ جا یا کہو گے۔" میں نے کہا۔

"تم یہ جانتا چاہے ہو کہ کامران کو کس نے ہلاک کیا؟" آخر

مطموع قاتم اسنے عقل مند ہو گئے۔ کامران کی لاش کھاڑی کے کسی حصے میں پائی گئی تھی؟ میں اپنا کلوں کی ابتداء کی کارروائیوں کے باوجود کچھ ایسی علامتیں دیکھ چکا تھا جن سے ظاہر ہوا تھا کہ لاش پانی اور کچڑ میں رہی تھی۔

”ہاں۔“ رحیم گل کا جواب بھی غصیلہ سا تھا۔

”اور کھاڑی میں گھر گھم پائے جاتے ہیں؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔“ تھے اب پائے جانے لگے ہیں۔ پہلے نہیں تھے۔ اس کے لیے میں غلطی کچھ کم ہو گئی۔ کھاڑی کے کچھ حصے خطرناک مشہور ہو گئے ہیں۔ وہاں رات کو کچھ نمودار ہوتے ہیں۔ ایسا لگا ہے کہ کامران کسی وجہ سے رات کو کھاڑی میں اترا تھا۔ یہاں کسی گھر گھم نے اسے روک لیا۔ صبح کچھ لوگوں نے اس حالت میں اس کی لاش کنارے پر پڑی دیکھی جس حالت میں تم نے دیکھی ہے۔“

”یہ عجیب بات ہے کہ گھر گھم انسان کو مارنے کے بعد لاش کا کچھ حصہ کھانے کے بعد باقی کنارے پر پھینک جائے۔“ میں نے کہا۔

”اس کے دانت جو تھکے دوسرے جانداروں کے دانتوں کی طرح کام نہیں کرتے بلکہ وہ محض دھانے وار طبقے کا کام دیتے ہیں اور جو کچھ اس کی زبان بھی نہیں ہوتی اس لیے وہ اپنے شکار کو چبا نہیں پاتا اور سالم نگہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر شکار زرا ہو تو وہ اسے سالم نہ نگل سکے تو پھر وہ دو تین طریقے استعمال کرتا ہے۔ اگر اسے شکار کے کل جاننے کا اندیشہ نہ ہو تو وہ اسے بار بار دانتوں سے کچل کر نرم ٹکڑوں میں تبدیل کر کے نگل جاتا ہے۔ شکار بہت بڑا ہو تو گھر گھم کو بہت ہموار لگی ہو تو وہ قریب ہی کوئی نشان ڈھونڈتا ہے اور وہ قریب و قریب تلاش کر کے شکار کو جڑ سے ہی مٹا کر دیکھتے ہوئے اس طرح اس سے بار بار کھراتا ہے جس طرح دھولیا کھات پر دھولیا کچل دھوتے ہیں۔ اس طرح شکار نرم پڑ جاتا ہے یا ٹھوہے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کرنے کا موقع نہ ہو تو گھر گھم ہوتا شکار کا کھانا

ہے اتنا کھا کر باقی مرنے کے لیے کسی کسی کو کھو دیتا ہے پھر چھوٹا ہے۔ جب وہ گل سڑ کر نرم ہو جاتا ہے تو پھر وہ اسے نگل جاتا ہے کیا یہ کچھ عجیب سی بات نہیں کہ گھر گھم نے ان میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار نہیں کیا اور صرف ایک ٹانگ پڑپ کرنے اور باجم جو کسی کو تک دانتوں سے چیدنے کے بعد کنارے پر پھینک دیتا ہے؟

رحیم گل اس دوران میں خاموشی اور کرسی چھیدگی سے طرف دیکھ رہا تھا لیکن غرضی میں خاموش ہوا اس کے جوتے استرانیہ سے آغوش آگئے اور وہ چھپتے ہوئے لیے میں! ایک تو ان کیفیت گھر چھیل میں محل نام کو نہیں ہوتی۔ حضور انسان کے پاس ان کے بارے میں بتنا علم ہے۔ بعض اوقات انسان سے ہٹ کر بھی کچھ کرتیں کر گزرتے ہیں اور انسان کو ابھینا نکال جاتے ہیں حالانکہ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ تھوہ

”جیسے صحیح طرح تو مطموع نہیں۔ یہ کافی پرانی بات ہے۔ اس وقت کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن کچھ عرصے پہلے میں نے وہ قصبہ اچھی طرح دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے وہاں شب بریکنگ ختم ہونے سے آکر کوئی فرق پڑا تھا تو وہ مارنسی رہا ہو گا۔ یا پھر شاید کوئی خاص فرق ہی نہیں پڑا۔ لوگوں نے متبادل ذرائع روزگار تلاش کر لیے۔ اس پاس کی زمین بھر نہیں ہے۔ کچھ لوگ کھیتی باڑی اور مزدوری وغیرہ میں لگ گئے۔ کچھ لوگ اپنے صدوں پرانے اور آبائی پیٹے ہائی گیری کی طرف لوٹ گئے۔ چھٹی وہاں کثرت سے پائی جاتی ہے اور ہائی گیری وہاں پہلے بھی ہوتی تھی۔ چھٹی کے تمام اور شوقیہ مگر مدتی قسم کے شکاری ہیں وہ بھی وہاں بیچ جاتے ہیں کیونکہ کسی طرح میں پھیل ہوئی یہ کھاڑی بعض مقامات پر کسادوں کی طرف بہت کم گہری ہے۔ لوگ پانی میں اتر بھی جاتے ہیں تو وہ انہیں تیراکی نہ آتی ہو۔ اور جنہیں تیراکی آتی ہے وہ تو بہت دور تک چلے جاتے ہیں۔ شہروں سے جانے والے چھٹی کے شکار کے شوقین مناسب جلیں دیکھ کر نہیں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔

”اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شب بریکنگ کے خاتمے کے بعد اس قصبے نے زیادہ ترقی کی ہے۔ وہاں زیادہ خوش حالی نظر آتی ہے۔ ایک دور اتناہ قبائلی قصبے کا جو قصور زمین میں دھیرا ہے وہ اس سے کافی مختلف ہے۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں ملتی ہے۔ ایک چھوٹا سا ہوٹل بھی ہے۔ ٹیلی فون ایجنسی تو بعض فنی دھاریوں کی وجہ سے نہیں ہے لیکن چند ٹیلی فون لائنیں کسی کسی اور قصبے سے پہنچی ہوئی ہیں۔ مٹی اور پکی دونوں طرح کی سڑکیں ہیں۔ احوال خاصا مستقل محسوس ہوتا ہے۔ پولیس اسٹیشن بھی ہے۔“

”تو پھر احوال مستقل کیسے ہوا؟“ میں نے اس کی بات کاٹنی ”جہاں پولیس اسٹیشن موجود ہو وہاں کا احوال تو مستقل ہی نہیں ملتا۔“

اس نے کہا جانے والی نگہوں سے مجھے گھورا اور گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا ”اب اگر میں مکمل سنجیدگی سے بات کر لیا ہوں تو تم نیک سے بیٹھے تھے ہو۔ کیا تمہاری چوچ کچھ دیر بند نہیں رہ سکتی؟ یا اس میں سے کوئی مستقل بات برآمد نہیں ہو سکتی؟“

”مستقل بات کسی مستقل آدمی سے ہی کی جاسکتی ہے لیکن خیر۔ چلو۔ میں تم سے الگ نہیں چاہتا اس لیے فی الحال تمہیں آدمی۔ بلکہ مستقل آدمی ہی تسلیم کر لیتا ہوں۔“ میں نے صلج جوتے لیے میں کا ”میں اصل میں یہ کہتا ہوں کہ اچھا کھانا کھانی قصبے کا یہ تفصیلی شرافت تم صرف یہ بتانے کے لیے کر رہے ہو تاکہ کامران کی لاش وہاں پائی گئی تھی؟“

”ہاں۔“ تھوہ درے صلیے سے لیے میں وہ ”میں چاہتا تھا کہ تم مارے میں متھرا داخل تو ابھی طرح کھو۔“

”شکر ہے۔ شکر ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”مجھے نہیں

سے پریشان کن سوالات ہوں گے جو اپنا جواب مانگ رہے ہوں گے۔ یہ تاؤ قمیص کا عمران کی موت کی اطلاع کیسے ملی اور پھر لاش یہاں تک کیسے پہنچی؟ ہمیں نے دریافت کیا۔

”مہلاری خوش قسمتی تھی کہ کارمان کے پاس اس کا شناختی کارڈ موجود تھا جو اس کی ہلاکت کے بعد بھی محفوظ رہا اور اس کی جیب میں موجود رہا۔“

میں بظاہر خواہر رجم گل سے کسی طرح بھی گفتگو کر رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں انور سے مضطرب تھا۔ شاید اسی اضطراب کے باعث میں نے ایک بار پھر رجم گل کی بات کانٹے ہوئے کما ”اکر شناختی کارڈ رابطے کا ذریعہ بنا ہے تو اس صورت میں پہلے اس کے گھر اطلاع جانی چاہیے تھی اور اگر اس کے گھر اطلاع ملتی ہوتی تو اس کے ماموں اور منیف وغیرہ اسپتال میں موجود ہوتے۔ بلکہ منیف تو شاید پہلے مجھے فون کلتا یا دوڑی دوڑی میرے پاس آتی۔“

”ہاں۔۔۔ خیر لڑکوں میں تو یہ بیماری عام ہے۔ وہ اکثر معاملات میں دوڑی دوڑی سب سے پہلے تمہارے پاس آتی ہیں۔“ رجم گل فوراً ہل اٹھا۔

میں نے ایک بار پھر غصے سے اسے گھورا ”میں چند سیکنڈ پہلے تم نے سمجھ دیا کہ تم نے دعویٰ کیا تھا۔“

”تمہیں کوئی خطرہ مزاحیہ بات تو ہوا ہی کر رہا ہوں۔ میں سنجیدگی سے ہی یہ کہہ رہا ہوں۔“ رجم گل نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میرے ساتھ فریڈی کی ہے۔“ ہمیں نے لٹھری سانس لے کر کہا ”میں کسی لڑکی کے بارے میں سیدھے سبھاؤ بھی کوئی بات کرتا ہوں تو تم جیسے عجیب جو خواہہ مر رہو یا عورت۔ اسے فوراً لے اڑتے ہیں۔“

”اکرم ذرا صبر و سکون سے میری پوری بات سن لینے تو قمیص یہ آواز اسی کہنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔“ رجم گل منہ نہ کر بولا ”مجھے یقینی ہے کہ عمران کی لاش کے بارے میں اطلاع سب سے پہلے وہاں کے قاضی اور کوڈی ملتی تھی۔ علاوہ ازیں ہم نے کارمان کی تلاش کے سلسلے میں کراچی کے آس پاس کے چند چھوٹے موٹے شہروں اور قصبوں کے قاضیوں کو بھی امتیاطاً مطلع کر رکھا تھا لیکن اتفاق سے سیکانی کا ہمیں خیالی سی نہیں آیا تھا۔ وہاں کے قاضی کو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی لیکن کسی قاضی کی حدود میں اگر کوئی لاش پائی جاتی ہے اور اس کے بارے میں کوئی سراغ ملتا ہے کہ اس کا تعلق کسی اور علاقے سے ہے تو وہاں کی پولیس محکمہ پہلے اس کے گھر یا لواحقین کو اطلاع دینے سے پہلے حلقہ قاضی کو اطلاع دیتی ہے۔ آگے پھر تمام ذمے داری ان کی ہو جاتی ہے۔ میں کارمان کے ایڈریس کے حوالے سے سب سے پہلے اطلاع اس علاقے کے قاضی میں آئی۔ یہاں کا تو ہر قاضی اس سلسلے میں پہلے ہی الرٹ تھا۔ فوراً ہی مجھے اطلاع مل گئی۔ میری

نے ان کے لیے جو قواعد و ضوابط مقرر کر دیے ہیں اور جن کا انہیں ابھی طرح مشاہدہ و مطالعہ کر رہا ہے انہیں ان تک محدود رہنا چاہیے لیکن یہ کبھی کبھی ان سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں۔“

”تھوڑے فرائی کو شش کر رہے ہو؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”نہیں۔۔۔ میری یہ جرات کھل۔“ وہ سم کر لولا مٹھر کے جملے حق تعالیٰ تو حضور والا کے نام محفوظ ہیں۔“

”میں تو خیر کوئی بات نہیں۔“ میں نے لامعت سے کہا ”تم شوق سے طر فرائی لیکن یہ تمہاری موت کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“

”اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ بڑا مت مٹاؤ۔“ وہ ایک دم نرم پڑتے ہوئے بولا ”میں اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ شاید گھر کے پاس لاش چپا کر رکھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ موجود نہ ہو۔ وہ اپنی دانست میں کنارے پر اسے سڑنے کے لیے ہی چھوڑ گیا ہو اور وہ اس کے خیال میں محفوظ جگہ ہو۔ اس سے پہلے بھی وہاں کنارے پر مختلف مقامات پر اس طرح کئی اودھ لگائی اور کئی پھٹی سی لاشیں مل چکی ہیں۔ زیادہ تر وہ اور اور سے آنے جانے والوں اور واقف لوگوں کی لاشیں تھیں جو اس قسم کے خطرات سے آنکھ نہیں تھمتھاتی باشندے تو ان معاملات میں ہوشیار رہتے ہیں اور احتیاط کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قسم کے واقعات سے ان میں تو کچھ زیادہ خوف اور بے چارن نہیں پھیلا البتہ کراچی اور پور اور کمر کے دوسرے چھوٹے موٹے شہروں سے جانے والے کافی خوف زدہ ہو چکے ہیں اور ان کی وہاں آمدورفت کافی کم ہو گئی ہے۔“

میں نے کمری سانس لے کر کمری کے پستے سے نیک لگاتے ہوئے کہا ”کارمان کو جانے کے لیے جگہ ملنی ہی تو کیسی! اس سے پہلے اس نے شاید کبھی میٹھانی کا نام بھی نہیں سنا ہوگا لیکن اچانک وہ وہاں جا پہنچا۔“

رجم گل میز پر رکھے ہوئے کارمان کے خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”اس میں اس نے کسی مہمان کا ذکر کیا ہے جو اسے وہاں لے گیا لیکن مجھے وہاں سے جو رپورٹ موصول ہوئی ہے اس میں کسی مہمان کا ذکر نہیں ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ اکیلا وہاں پہنچا تھا اور وہاں کے چھوٹے سے انکڑے ہوٹل میں ٹھہرا تھا جو درحقیقت چند کمروں کے ایک مکان پر مشتمل ہے۔ وہاں اس نے اپنے آپ کو پھلی کا شکاری ظاہر کیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ وہ کراچی سے آیا ہے۔ تم نے اس کے فرار ہونے کی جو صورت حال بتائی تھی اس سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی جیب میں پھلی کوڑی بھی نہیں تھی لیکن اس نے ہوٹل میں چند دنوں قیام کے لیے سگلی کرایہ ادا کیا اور جتنی دیر بھی اسے قصبے کا موقع نصیب ہوا اتنے وقت وہ وہاں کے معیار کے حساب سے ”مسامیں“ والے انداز میں خرچ کرتا رہا اور اس کے پاس پھلی کے شمار کا خیانت محہ قسم کا سامان بھی موجود تھا۔“

”صرف یہی نہیں! میرا خیال ہے اس طرح کے اور بھی مدت

ہو۔ "میں نے لٹھری سانس لے کر کہا "جاہل سے جاہل قسم کا خود پرست بھی ایسی بات کرتے وقت تھوڑی بہت انکساری کا اظہار کر لیتا ہے۔"

"میں نے تو جیسے کسی انکساری کا اظہار کرتے نہیں دیکھا۔"

وہ مصحوبیت سے بولا۔

"میری بات چھوڑو۔ میں تو تم سے بھی بڑا جاہل ہوں۔ تم سے بھی زیادہ خود پرست ہوں۔" میں نے کہا۔

"شکر ہے تم نے اعتراف تو کیا۔" اس نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"اس کے ساتھ تمہاری طرف سے بھی اعتراف ہو گیا کہ میرے بعد تمہارا ہی نمبر ہے۔" میں نے کہا "وہ عظیم آدمیوں کے ان عظیم اعترافات کے بعد یہ بتاؤ کہ تم مزید تحقیق کے لیے یسکائی کب جا رہے ہو؟"

"میرا جانا تو کافی دنوں تک ممکن نہیں ہے۔ شاید میں دو یا تین افراد پر مشتمل پولیس بادل بھیج دوں۔" رحیم گل نے جواب دیا۔ "کامران کا کھڑا ہونا کبھی تمہارا تجسس بیدار نہیں ہوا؟ اس نے لکھا ہے کہ وہ اتفاقاً کسی بہت بڑا سرا رسلے کے قریب پہنچ گیا تھا اور وہاں کوئی بہت بڑی گزریا رہی ہے۔"

رحیم گل نے کہا کہ پولیس اب محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارا یہ کامران مرحوم خاصا چنگڑ قسم کا لوبھوان تھا۔ میں محض اس کے دسے ہوئے اشاروں پر اپنا قیمتی وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ یسکائی اور اس کے گرد و خراب کا طائر میرا دکھا ہوا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہاں کوئی بہت بڑا سرا رسلے "اور بہت بڑی گزریا" ہو سکتی ہے۔ مطوم نہیں اس بے چارے کے تعلقات اور معیار کیا رہے ہوں۔ اس کی نظریں جو سلسلہ سمیت بڑا سرا "اور جو گزریا" بڑی گزریا "رہی ہو شاید وہ سول کی نظریں وہ بالکل معمولی باتیں ہوں۔ اس کی موت کے بعد اب صورت حال بہت بدل گئی ہے۔ میں بونچی سوہوم انسانات کے سارے ادھر ادھر تک نوٹیاں مارتے پھرنا انورڈ نہیں کر سکتا۔ جیسے نہیں مطوم کہ میں یہاں کیسے کیسے سنگین معاملات میں بھٹا ہوا ہوں۔"

"مجھے بہت اچھی طرح مطوم ہے۔ میں تو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ پولیس کے گلے کا سارا بوجھ ہی تمہارے ہاتھوں پر ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو شاید پولیس کا ٹکڑی نہ ہوتا۔ دنیا کتنے سکھ میں ہوتی۔" میں نے حسرت سے لٹھری سانس لے۔

"بڑا اچھا۔ جیسا بھی ہے۔ اگر یہ ٹکڑی بھی نہ ہوتا تو تم جیسوں کی محض ٹکڑی کہاں۔" بلجارتے ہوئے جنگوں کی طرف ہانکتے دکھائی دیتے۔ "وہ اٹھتے ہوئے بولا میں اب چلا ہوں۔"

"میں ہم دونوں کے حق میں ہوں۔" میں نے فوراً کہا "کامران کے ہسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں مجھے بتانا بہت بھولنا۔"

میکھائی کے ایس ایچ او سے فون پر تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اسی کی بنیاد پر میں تم سے اتنی دیر سے تفصیلی بات چیت کر رہا ہوں۔ میں نے فوری طور پر لاش اس سے یہاں منگوائی۔ یہ ہے سارا قصہ۔"

اس نے طویل سانس لی پھر بولا "اب دو ٹیمن میں اس کے متعلقین کو اطلاع ہو جائے گی۔ اس ضمن میں اگر تمہاری کوئی تجویز ہے یا تم کوئی رد و بدل چاہتے ہو تو بتاؤ۔" وہ ایک ہی ظاہری طور پر بھی خاصا صباہان دکھائی دینے لگا تھا۔ وہی طور پر تو وہ حتمی دوست ہی تھا۔ یہ تو مجھے اچھی طرح مطوم ہی تھا۔ اس کا آنکھیں دکھانا "لال چٹا ہونا" دیکھیں دیکھیں کہ مصحوبی ہوتا تھا۔

"میں عین کئی تجویز پیش کرنے یا تم پولیس والوں کی دو ٹیمن میں کوئی رد و بدل کرنے کی پوزیشن میں کھڑا ہوں۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا "میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ پولیس کے معاملات پر تو صرف بد معاش اثر انداز ہوتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کئی جوابی حملہ کرنا "میں نے جلدی سے کہا جس معاملہ کی نسبت ہے کہ پولیس اتنی مستعد ہو گئی ہے کہ ایسے علاقے سے اتنی جلدی اطلاع بھی مل گئی اور لاش محض بھی ہو گئی۔ پولیس نے اپنی اپنی سائنس بھی کر لیا اور نہ میں ممکن تھا کہ چاروں تک کامران کا شناختی کارڈی دریافت نہ ہو پاتا۔ اس کے بعد چاروں تک یہ طے نہ ہوا تاکہ اس کا لیسٹر در حقیقت کس تھا۔ کی حدود میں آتا ہے۔ اس کے بعد چاروں تک تلاش میکھائی سے یہاں بھگانے کے لیے ایئر لیس اس کی گاڑی وغیرہ کا بندوبست نہ ہو پاتا۔ غرضیکہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔"

"تم مجھے یہ گمان اور بد زبان کوئی بھی دنیا میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔" وہ نرم تہمت سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "چھاپا یہ بتاؤ جیسے یہ بات بھی وہیں کے قاضی ارٹے بتائی ہے کہ کامران خامی میکھائی پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں نے تو کچھ بھی مطوم نہیں تھا۔" رحیم گل نے جواب دیا "محاشا لٹے کے بعد وہ جتنی بھی مطبات حاصل کر سکا تھا وہ اس نے مجھے محض کوئی نہیں۔ اگر میرے کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا تو اس نے بعد میں فون کر کے اس کا جواب میا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے بہت تعاون کیا۔ اچھا پولیس ایفیر مطوم ہوتا ہے۔"

"تمہاری طرح۔" میں نے طعنے لگے میں کہ۔ "میری طرح ہونا تو غیر بہت مشکل ہے۔" وہ اطمینان سے بولا "میں کے لیے تو یہی مباحث کی ضرورت ہے البتہ اگر وہ مجھ جیسا بننے کی کوشش کر رہا ہو تب بھی یہی بات ہے۔ اسے البتہ اچھی سی دلائل پیش کیے ہوں گے۔"

"اسے کتنے ہیں کمال دھڑائی کے ساتھ خود ساختہ میں جلا



کے دفتر میں مجھ سے ٹھکانی تھی۔ وہ تو بہت سی بلاؤں اور ٹھیس لڑی  
مطلوب ہوئی تھی۔ پھر میں نے سوچا بلاؤں اور ٹھیس لوگ تو ہر لاش  
میں پائے جاسکتے ہیں۔

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس لڑکی کا نام تھینہ  
ہے۔ شاید کچھ افسوس کی بات ہے کہ وہ خاصی بڑھی نکلی ہے۔  
اس نے فلسفے میں ایم اے کیا ہوا ہے۔"

"شاید بہت سی تحسینوں سے گزرنے کے بعد زندگی کا فلسفہ بھی  
اس کی سمجھ میں آگیا ہو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "شاید یہ  
"وش قیل تھنکنا" ہے کہ ہم اسے لالچ اور ہوس کے بجائے  
مجھڑوں کی غلام بنائیں۔ خیر۔ یہ تو جتنی باتیں بیچ میں آئیں گی۔ یہ  
ہاؤ لڑکی ابھی اسی بیگلے میں رہ رہی ہے؟"

"جی ہاں۔ ہماری ٹھکانی کے دوران میں وہ صرف ایک مرتبہ  
تھوڑی دیر کے لیے درانی کی بھرم سوجھ کی میں اس کے ذرا پیور کے  
ساتھ اپنے کھنڈن والے اپارٹمنٹ میں گئی تھی۔ شاید اپنا بیچ کیا  
ہوا کچھ سائڈ سامان پہنچانے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا "میرا خیال  
ہے اب تو وہ صرف اسی وقت وہاں سے نکلے گی جب درانی کا اس  
سے دل بھر جائے گا۔ شاید دل بھرنے سے پہلے ہی وہ کسی اور وجہ  
یا مصلحت کے تحت اسے رخصت کر دے گا۔ بہر حال وہ اپنا مقصد  
پورا کر کے جائے گی۔ تحقیقاتی رپورٹ اب بدل جائے گی۔ کچھ کی  
کچھ ہو جائے گی۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "شفیع شاہ! تم ایک  
کام کرو۔ بلکہ اپنے علاوہ بھی کچھ لوگوں کو اس کام پر لگا دو۔ جن  
لوگوں نے یہ معلومات جمع کرنے کے سلسلے میں کام کیا ہے وہی اس  
کام کے لیے بھی موزوں رہیں گے۔ کام صرف یہ ہے کہ درانی کے  
مختلف رشتے داروں کے نام پر جو جتنے منگے بیگلے ہیں ان کی ملکیت  
کے کاغذات کی فوٹو کاپیاں حاصل کرنی ہیں۔ نیز اگر درانی سے ان  
کی رشتے داری کا کوئی جیمہ سامنے ثبوت مل جائے تو وہ بھی بہتر ہے۔  
یہ کام مشکل تو نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں سر! شفیع شاہ اطمینان سے بولا "کام مشکل ہو  
تب بھی اسے جھڑا تو نہیں جاسکتا۔ اگر کام باکزی ہو تو اسے کرنا ہی  
پڑتا ہے۔ چاہے وہ مشکل ہو یا آسان۔ اس قسم کے کام تو کہیں  
تھوڑی بہت رقم خرچ کر کے اور جہاں رقم سے بات نہ بنے  
وہاں تھوڑی بہت دھوکا دھکی سے ہو جلتے ہیں۔"

"کو شش کو کہ چند دن کے اندر واپس یہ کام ہو جائے۔ اس  
دوران میں اگر درانی کی کرکشن کے کچھ اور ثبوت بھی ہاتھ آسکیں تو  
وہ بھی بیچ کر لو۔" میں نے ہدایت کی۔

"مقتصد یہ کہ درانی کی فاکل تیار کرنی ہے۔" شفیع شاہ بھی سی  
نہی کے ساتھ بولا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "جب یہ محض مالی بے ضابطگیوں  
یا ٹیکس چوری پر دو سروں کی جھولی جی قاتلین تیار کرسکتے ہیں تو ان

قتل۔ ایک طرف لیڈر نہ جانے کیسے کیسے بھیاک جھوٹ کے قلاب  
پہن کر لوگوں کو بے وقوف بنانے اور جانوروں کی طرح ایک  
دوسرے سے لٹوانے میں مصروف تھے۔ دوسری طرف خود غوام  
بھی کچھ کم نہیں تھے۔ کچھ میں تو ویسے ہی جہالت اور تنگ نظری  
نسل در نسل منتقل ہو رہی تھی۔ کچھ وہ خود بھی اس سے بچھا  
چھڑانے کو تیار نہیں تھے۔ وہ خود بھی سب قوتیں اپنے پیوں پر  
کھانڈی چلانے کے عمل کو دل و جان سے آگے بڑھاتے تھے اور  
جس کا جہاں تک بس چتا تھا وہاں تک وہ بھی اس افزائشی ٹکوت  
بار میں سے کچھ نہ کچھ کھوٹے کچھ نہ کچھ کرگزرنے کی فکر میں تھا۔  
مزے کی بات یہ تھی کہ سب طبقات بڑے کام کو اپنا حق سمجھ کر  
کروڑے تھے کسی زمانے میں یہ سب کچھ کرتے وقت لوگ اور کچھ  
نہیں تو کم از کم تھوڑا سا شرمساری ہو گیا کرتے تھے۔ اب تو ہر  
کام اعلانیہ اور خفیہ کیا جاتا تھا۔ نظام کی ایسی جیسی کرنے میں ہر  
کوئی سب قوتیں کچھ ایسے "نشریہ و خفیہ" سے ہاتھ بٹا رہا تھا  
جیسے یہ اس کا اولین اغلائی اور ساری فرض تھا۔ ظاہر ہے ہر چیز کی  
ایک جہ ہوتی ہے۔ اور میرا اندازہ تھا کہ ہم تو حد سے بھی آگے  
گزر چکے تھے۔ نہیں کسی طاقت کی سربانی سے کوئی انسانی مسلت ملی  
ہوئی تھی لیکن آخر کچھ نہ کچھ ہر قسم کی مسلت ختم ہو جاتی ہے۔  
اچانک زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ بہت سے عظیم الشان دور قضا  
پارہت بن جاتے ہیں۔ میں اسی وقت کی آمد سے ڈرتا تھا۔ اور وہ  
مجھے زیادہ دور دکھائی نہیں دیتا تھا۔

امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن نے شاید رشوت میں صرف  
ایک خوب صورت لڑکی سی درانی کے ہمراہ نہیں کی تھی۔ ہماری رقم  
بھی پیش کی ہوگی۔ بڑے نوٹوں کی جو گزری مثال کر دے یہ ناپاڑی سے  
لڑکی کی شاہک کی ادائیگی کر رہا تھا، ممکن تھا وہ گزری بھی اسی رقم میں  
سے ہو۔ رفتیں کہاں سے آتی تھیں، کہاں کہاں کھنٹی ہوئی کہاں  
جاتی تھیں، یہ بھی ایک عجیب سیطانی پکر تھا۔ اگر کسی کو قریب سے  
اس کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا تو شاید اس پر بھی نظام قدرت کے  
کچھ عجیب و غریب پلودا صبح ہوتے۔

"گڑی کے بارے میں کچھ معلومات ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔  
"جی ہاں۔ وہ گمارا در کے دو کردوں کے ایک ٹکڑا کر ایک  
فلٹ سے نکلے اور کچھ ہی عرصہ پہلے کھنڈن کے ایک اچھے اور  
منگے اپارٹمنٹ میں پہنچی ہے۔ تنی کا سزا ابھی جاری ہے۔ اس کا  
کچھ کئی افراد پر مشتمل ہے۔ لگتا ہے سب خاموشی سے اس کے ہم  
سڑوں۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"میرا خیال ہے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں اس کا  
صرف یہ ہو گا؟"

"میرے خیال میں تو جیشہ کریم کے ہیں جو تین چار لوگ ہیں  
موجود ہیں سبھی کا مصرف یہی ہے۔" شفیع شاہ کے لیے میں بھی سی  
گئی اور بھی سی سٹاکی تھی۔ مجھے غزل یاد آئی۔ وہ بھی جیشہ کریم

کے عظیم الشان کارناموں کی قائلیں بھی تو تیار ہونی چاہئیں۔ ہماری قائل ذرا زیادہ رکھیں، عقلمیں زیادہ بھی اور باصور ہوگی۔ تم ایک چھوٹا کیم کارڈ اور انفرادی اسکوپ بھی تیار کرو۔ اگر موقع مل گیا تو شاید آج رات ہی تھوڑی سی سرخنگ ہو جائے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے۔ صرف تم اور میں کریں گے۔

”قابلا ان دور سرخنگ ہوگی؟“ شفیع شاہ ایک چادر پھردھرے سے ہنسا۔

”ہاں۔۔۔ بلکہ کچھ زیادہ سی ان دور ہوگی۔ ظاہر ہے آؤٹ ڈور سرخنگ میں تو کچھ ہاتھ آئے ہے رہا۔“ میں نے کہا۔

”آپ نے درانی کو ابھی طرح ہی کھیر لے کا پودا گرام بنالیا ہے۔“

”یہ اہم پوسٹ پر بیٹھا ہوا گھاکا افسر ہے۔ اس کو گھیرنے سے پہلے کچھ مستفی فیہ انکشافات سامنے آئیں گے۔ اس نے زندگی میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے لوگوں کو ہراساں کیا ہوگا اور اپنے مطلب پورا ہونے پر نہ جانے کیسے کیسے عقلمیں رازوں کو اپنے کسی ذاتی قبرستان میں دفن کر دیا ہوگا یا پھر طویل عرصے تک ان کا خراج وصول کرتا رہا ہوگا۔ اس پر ذرا مضبوطی سے سی ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔ یہ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔ مگر کب باران دیدہ ہم کی چیز ہوگا۔ تم اگر مختلف حکموں سے اس کی جائداد کے کاغذات کی تفصیل نکالو گے اور پھر ہم تھوڑی سی ”سرخنگ“ کریں گے تو کام کافی آسان ہو جائے گا۔“

”کاغذات کی نقول میں جلدی حاصل کرلوں گا۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اخباری لوگ بھی سبکی نہ کسی انداز میں یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اکثر اس قسم کے ثبوت ذاتی متاعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں، ہم انہیں اجتماعی اور قہری مقصد کے لیے استعمال کریں گے۔“ شفیع شاہ بولا۔

”کبھی کبھی اخباری لوگ بھی ایسے ایکٹو لوگوں کا منظر عام پر لاتے ہیں اور اس سے اجتماعی فائدہ ہوتا ہے۔ قوم کی چیز پر سوار کسی غیر قسم یا قسم کے کرپٹ افسر سے جان چھوٹ جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”عام طور پر وہ لوگ اس وقت ایسا کرتے ہیں جب وہ راز دیے بھی راز نہیں رہا ہو اور اس وقت بھی عموماً انہیں کوئی ذاتی حاد ذاتی غرض یا ذاتی نقصان ہی ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ قوی اور اجتماعی سوچ ہمارے کسی بھی شے میں ذرا کم ہی پائی جاتی ہے۔“

”خیر۔۔۔ ان تمام خرابیوں کے ساتھ ہی ہمیں اپنی بڑا کے مطابق کام کرتے رہنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم میرے دنیو کا بندوبست کر کے مجھے اطلاع دینا۔“

”وہ سب چیزیں تو موجود ہیں سرا۔“ شفیع شاہ بولا۔ ”میں انہیں گاڑی میں رکھ لوں گا۔ اصل کام مناسب موقع کا انتظار کرنا ہے۔ مناسب موقع ہمیں آج رات بھی ہاتھ آسکتا ہے۔“

”تم مجھے کسی وقت بھی اطلاع دے سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ سرا جو کسی شے سرخنگ کے لیے سیٹ تیار ہوتا دکھائی دے گا میں فون کر کے ڈائریکٹر کو بلواؤں گا جو اتفاق سے چیف کیمرا میں بھی ہوگا۔“ شفیع شاہ قدرے شرے سے لیے میں بولا۔

”ضروری نہیں ہے کہ ڈائریکٹر چیف کیمرا میں بھی ہو۔ تم وہی دے داریں مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرو۔ یہ کچھ گھٹیا سا کام ہے۔ شاید یہ تمہیں ہی انجام دے دے۔“ میں نے کہا۔

”سہہ! یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“ وہ تنگی آئیز سے لیے میں بولا۔ ”آپ گھٹیا قسم کے کام میرے پروا کرنے لگے ہیں؟“

”یہ ایک ایسا گھٹیا کام ہے جس کے لیے بہت بڑھیا قوی کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

”حاجہ پیرا دل رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن خیر۔۔۔ اس نے لٹری ساسل۔“

”مجھ سے مفہوم ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے مہیاز لیے میں کہا۔ ”میں بھی تو قہیں سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ صورت حال کیا ہوگی۔ تم بے مجھے ایک اور ضروری کام بھی ہے۔ ایک ساحلی قصبہ ہے۔“ میں گھٹائی۔ ”اس کے بارے میں مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کر کے دو۔ کبھی اس جگہ کا کام سنا ہے؟“

”وہ ایک بار پھر اپنے مخصوص دھیمے انداز میں ہنسا۔ ”اس کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے لیے مجھے کیس جانے کی ضرورت تھوڑی سی پڑے گی۔ اس کے بارے میں تو میں خود ایک مرتبہ معلومات ہوں۔ کسی زمانے میں ہمارے اپنے خشک زار میں گھٹائی کی کماڑی تک جاتے رہے ہیں۔ بعد میں کچھ مسائل کی وجہ سے میں نے انہیں اوھر جانے سے روک دیا تھا۔ ہمیں کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ میرا دیکھا ہوا علاقہ ہے۔ وہاں کے بارے میں ہر بات مجھے معلوم ہے۔“

”یہ تو بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔“ میں نے ج ج بڑی طمانیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں تو ہمارے ساتھ بیننگ رکھ کر ہی کام چل جائے گا۔“

”کیا وہاں بھی کوئی کام آج پڑا ہے؟“ اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”مجھ میں صحیح طور پر کچھ کہ نہیں سکتا۔ میں اس سلسلے میں سوچ رہا ہوں اور کچھ انتظار کر رہا ہوں۔ شاید وہاں کے لیے بھی باقاعدہ کوئی پروگرام بنانا پڑے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”حقیقت یہی تھی کہ ابھی اس ضمن میں میرے ذہن میں ابہام تھا لیکن میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”اور کوئی حکم؟“ شفیع شاہ نے دریافت کیا۔

”فی الحال کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری آئندہ ٹیلی فون کال کا منتظر رہوں گا۔“



وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ بول سکا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ اس پر بہت بڑا صدمہ گزر جائے گی ننگائی تھی۔ وہ بڑے بڑے تصانیات اور صدوں کا ہنگامہ کوئی ٹوش نہ لینے والا آدمی معلوم ہوا تھا لیکن اگر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی اندرونی حالت ابھی نہیں تھی اور وہ اس صدمے سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم نے فوری طور پر مجھے اطلاع نہیں دی افضل!“ اس کی توجہ پلٹ کر ابھری۔ اس کے لیے میں خفیف سا کھڑکھا تھا۔

”میں ابھی اس کے لیے بہت جمع کر رہا تھا۔“ میں نے جواز گھڑا اس کے علاوہ میری دو تین ٹیلی فون کالز آچکی تھیں۔ میں مختصر کھٹکوں کے ان سے جان چمڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی میں اس کو شش میں کامیاب ہی ہوا تھا کہ شمار فون آیا۔

اس نے ہنگامہ بھرا اور غالباً اپنے ٹھکانے کو طویل نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ دوبارہ بولا تو اس کے لیے سے جو جھلپ بن عائب ہو گیا تھا۔ صرف ایک جسم سا آئندہ رہ گیا تھا مقدمتہ نے اس کے ساتھ بھی ایک مذاق کیا اور ہمارے ساتھ بھی۔ ”یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی اور گویا اس صدمے کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی جبر حال۔ جو ہوا تھا وہ تو ہنگامہ کارمان اس دنیا میں کسی بھی مقام پر ہوا تو اسے واپس لایا جاسکتا تھا لیکن جہاں وہ جا چکا ہے وہاں سے اسے واپس نہیں لایا جاسکتا بلکہ اگر ٹھکانے سے ہم بھی وہاں پہنچے تو واپس نہیں آسکیں گے اس لیے بہتر ہے ہمیں رہتے ہوئے اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھنے کی کوشش کریں۔“

”تم نے عمل مندی کی بات کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میں ایک بے وقوفی کا کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”اسے تم سانپ گزر جانے کے بعد بکیرہ بٹنا کہہ سکتے ہو۔“ وہ پڑ سکون کے لیے بولا ”کارمان کو تو چاہیے اور جس وجہ سے بھی مرنا تھا وہ مر چکا لیکن میں اس کی تصانیات جانتا چاہتا ہوں۔ میں اپنے طور پر تو کوشش کروں گا۔ لیکن اگر تمہیں اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے تو دوستی اور اپنائیت کے اس بے عنوان سے رشتے کے تحت تا دو دن میرے اور تمہارے درمیان قائم ہو چکا ہے۔“

میں ابھی اس رشتے کے بارے میں تو کچھ زیادہ پوچھ رہی تھی نہیں تھا لیکن میں نے اسے اس سلسلے میں اس حد تک تھامے میں کوئی حرج نہ سمجھا جس حد تک وہ پائیس اور اسپتال دنیو میں موجود اپنے ذرائع سے مطمئن کر سکتا تھا البتہ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ کارمان کی طرف سے آج ہی مجھے ایک خط بھی موصول ہوا تھا۔ جس طرح شہر کی غارت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے شہر کو درخت پر چڑھنا نہیں سکھایا تھا اور ایک واؤ پکار کر رکھا تھا اس

اس نے سلسلہ متعلق کر دیا۔ میں نے ابھی رہی رہ رکھائی تھا کہ میرے سوا کسی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس فون پر میرے پیلو کہتے ہی دوسری طرف اطمینان بھرے انداز میں کمری سانس لی گئی پھر ابھی ہی کما کی کے ساتھ کہا گیا ”خدا کا شکر ہے کہ تم شہر میں ہی موجود ہو۔“

وہ سینہ دھادھادھا۔ میں نے دھجے لیے میں کہا ”اگر میں شہر میں موجود نہ ہوتا تو کیا کوئی بڑا نقصان ہو جاتا؟“

”مجھے اندیشہ ہے کہ نقصان تو تمہارے موجود ہوتے ہوئے بھی ہو چکا ہے۔“ اس کے لیے سے بہت عجیبی جھلک رہی تھی۔ میری دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔ ذرا توقف کے بعد وہ خود ہی بولا ”ابھی ابھی ایک خبر مجھ تک پہنچی ہے جو اگر سچی ہو تو بہت افسوسناک ہوگی۔ اس کی تصدیق یا تردید کے لیے میرے آدمی ٹیلی فون پر مصروف ہیں لیکن میں نے سوچا اتنی دیر میں تم سے بات کروں۔ شاید اس اشاعتی کے تحت تمہیں اس سلسلے میں کوئی صحیح اطلاع مل چکی ہو۔“

”بات کیا ہے؟“ بلا تردید تاؤ ڈالا۔ انا سچ نہیں کیوں پوچھ کر رہے ہو۔“ میں نے معمولی خوش مزاجی سے کہا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ سرکاری اسپتال میں ایک لاش آئی ہے۔“ میرے حوالے کا نام کارمان دانش بتایا جا رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ تم اس کی تردید یا تصدیق کر سکتے ہو؟“ اس کے لیے میں اضطراب تھا۔

میں ایک لمحے خاموش رہا۔ میری خاموشی آئندہ کی خاموشی بھی تھی اور حیرانی کی بھی۔ آئندہ تو کارمان کے انجام کا تھا اور حیرانی سینہ دھادھادھا کے اس قدر باخبر ہونے پر تھی۔ اس شخص کے دماغ اور ذرائع حقیقت حیرت انگیز تھے۔ اس سے بات چیتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اس میں اب کوئی مصلحت نظر نہیں آ رہی تھی دوسرے دینے بھی جس شخص کو اتنی جلدی یہ اڑتی اڑتی ہی خبر مل گئی تھی اس کے لیے اصل اور پوری بات معلوم کر لینا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے آدمی حرکت میں آچکے تھے۔ صرف چند سیکنڈ یا چند منٹ کی بات تھی کہ سارا معاملہ اس کے علم میں آجائے گا۔ میں ابھی اسے اطلاعات فراہم کرنے والے نہ جانے کہاں کہاں بیٹھے تھے۔ مجھے تو یہ خبر... جسم انداز میں ہی سہی لیکن اتنی جلدی اس تک پہنچ گئی تھی۔

”تمہاری خاموشی اس خبر کی تصدیق کر رہی ہے۔“ سینہ دھادھادھا بولا۔ وہ دیکھنے میں اول جلیل سا آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن بیٹھنے اول جلیل تھا نہیں۔ اڑتی چڑا کے پر گھٹنا بھی جانتا تھا اور پر کا گھٹنا بھی۔ ”تمہیں صحیح اطلاع ملی ہے سینہ دھادھادھا! بلا غرض میرے کمری سانس لے کر کہا ”میں چند منٹ پہلے ہی اس کی لاش دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ اسی کارمان دانش کی لاش ہے جس کی تمہیں تلاش تھی۔“

کرسے گی تو میں بھی ظاہر کروں گا کہ مجھے بھی اسی وقت پتا چلا ہے۔  
اسی رات میں اپنے ہوٹل کے ڈاننگ ہال میں کھانا کھاتے  
ہوئے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ موبائل  
فون پر شیخ شاہ کی کال موصول ہوئی۔  
”سرا! آپ فوراً آجائیں۔“ وہ بلا تمہید بولا۔

”کہاں آجائوں بھی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
”لوکیشن پر۔“ اس نے جواب دیا ”لگتا ہے آج ہمیں سین  
شوٹ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ حالات ہر لحاظ سے موافق اور  
سازگار معلوم ہوتے ہیں۔ اوجیز مرہیو آج پھر نوجوان بیرونی کو  
شانگ کر کے لایا ہے۔ لگتا ہے یہ لڑکی عمر بھر کے لیے شانگ انہی  
دشمنوں میں کر ڈالے گی۔ دونوں نے آج ایک فوراً اشار ہوٹل میں  
کھانا بھی کھایا ہے۔ بیرو مجھے کچھ ترنگ میں بھی لگتا ہے۔ کل ان  
کی ملاقات کا تاثر بھی ہو چکا ہے۔ کل کی رات بیرو نے اپنی بیوی  
اور بچوں کے ساتھ لڑائی ہے جبکہ بیرو نے اپنے گھر جانے کے  
بجائے بنگلے پر ہی شاید اس کا انتظار کرتی رہی۔ بہر حال آج پھر  
دونوں ساتھ ہیں اور بنگلے کی طرف توجہ نہیں۔ مجھے حالات ہر  
لحاظ سے سوزوں محسوس ہو رہے ہیں۔“  
”بڑے بے ہودہ وقت پر تم نے یہ اطلاع دی ہے۔ میں اس  
وقت کھانا کھا رہا تھا۔“

”کھانا تب بعد میں بھی کھایا جاسکتا ہے سرا! شیخ شاہ بولا ”آپ  
کو معلوم ہے نیشنل جیو گرافک سوسائٹی والے بھی کبھی محض کسی  
کلی کے کھانے کا چند کینڈا کا منظر فلمانے کے لیے یا کسی کینڈے کا  
اس کی گرل فرینڈ سے ملاقات کا چند منٹ کا شٹ لینے کے لیے  
ہفتوں پہلے کسی خفیہ جگہ پر کیرافٹ کر کے انتظار کرتے رہتے ہیں  
لیکن اگر وہ خاص موقع ہاتھ سے نکل جائے تو از سر نو ساری محنت  
اور نہ جانے کتنا انتظار کرنا پڑتا ہے۔“

”چھابا تم اپنے آپ کو نیشنل جیو گرافک سوسائٹی والوں  
کے ساتھ ملاقات شروع کرو“ میں آ رہا ہوں۔ سامان ہمارے  
پاس تیار ہے؟“ میں نے دایاں ہاتھ نیچوں سے صاف کرتے ہوئے  
کہا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے فون قیام رکھا تھا۔

”سب کچھ تیار ہے سرا! حتیٰ کہ بیرو بیرونی بھی لوکیشن کے  
قریب پہنچ چکے ہیں اسی لیے تو آپ کو فون کر رہا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے  
کہ میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔ ایک آدمی اگر کیرا میں کے  
فرائض انجام دے گا تو دوسرے کو کردوش پر نظر رکھنے اور کسی غیر  
مترقب رکاوٹ سے نسنے کے لیے قریب ہی موجود رہنا چاہیے۔“  
”تھیک ہے۔ میں چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے اٹھتے  
ہوئے کہا۔

میں جتنا کھانا کھا تھا اسی پر صبر کرتے ہوئے میں نے داش دوم  
میں جا کر ہاتھ دھوئے اور چند لمبے بعد ہی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ  
ہو گیا۔ میں نے زیادہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کی ضرورت محسوس

میں میں بھی بعض لوگوں کو پوری بات نہیں پتا تھا۔ ایک آدھ  
بات صرف اپنے تک محدود رکھتا تھا۔

اس نے ساری بات خاموشی سے سنی پھر بولا ”کیا واقعی یہ  
کارمان کی لاش بیگمائی سے آئی ہے؟“ سب کچھ بیگمائی میں ہوا  
ہے؟“ اس کے لمبے سے بے یقینی سی جھلک رہی تھی۔ نہ جانے  
کیوں مجھے یہ بے یقینی کچھ عجیب سی لگی۔

”یہ سندھ سرکاری رپورٹ ہے۔“ میں نے کہا ”جیسے اس  
پر حیرت کیوں ہے؟ کیا بیگمائی میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ یا نہیں  
ہو چاہیے تھا؟“

”جیسا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رک  
میں اور شاید اسی لیے اسے کانسی آگئی۔

”شاید وہ تمہاری دوستی اور اپنائیت کے بے عزتوار رشتے والی  
بات محض مکالمے بازی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے اس رشتے کے دعوے  
کے باوجود تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔“ میں نے کہا۔

”ہو گمان ہونے کی ضرورت نہیں میری جان!“ وہ شفقانہ لمبے  
میں بولا ”میں کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔ چھپانے کے لیے کچھ ہے ہی  
نہیں۔ میں تو فی الحال صرف حیران ہو رہا ہوں۔ زیادہ حیرت مجھے  
اس بات پر ہو رہی ہے کہ اس امس کارمان کو بھاگ کر جانے کے  
لیے کی جگہ کی تھی۔؟“

”میں تو اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ تو ہی خود کہیں نہیں  
جانا“ اسے تقدیر لے جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ یہ تم نے سونہ آئے صحیح بات کی ہے۔“ پھر وہ غصہ  
مانس لے کر بولا ”خیر۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کیا کیا  
جاسکتا ہے۔ اب پرنس انڈسٹری کو کس راستے سے خرید جاسکتا  
ہے۔ یا پھر ہمیں یہ آئیڈیا ہی ذرا پکڑنا چاہیے۔ مجھے اپنے  
ساتھیوں سے ٹیلی فون کا فکرس کرتی چڑے گی۔ ان میں سے دو تین  
لگ سے باہر ہیں۔“

”تم ان مسائل پر غور کرو۔ مجھے کچھ اور مسائل پر غور کرنا  
ہے۔“ میں نے کہا۔

”شفقان؟“ اس نے جانا چاہا۔

”فی الحال اس سوال کو جانے دو۔“ میں نے اسے ہلا۔ میں  
نے محسوس کیا تھا کہ بیگمائی کے معاملے میں اس نے بھی مجھے ہلا  
تھا۔ وہ اس جگہ کا نام سن کر یقیناً چونکا تھا لیکن اس نے مجھے اپنے  
چونکنے کی صحیح وجہ نہیں بتائی تھی۔

”چلتے۔ جانے دیتے ہیں۔“ وہ خوش مزاجی سے بولا پھر اس  
نے خدہ اخافہ کہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں دیر تک بیٹھا صاف کارمان کے بارے میں  
مطلع کرنے کا ارادہ کرتا رہا لیکن میں نے اپنے اندر اس کی جرات  
محسوس نہ کی۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جب اسے پولیس یا  
اخبارات کے ذریعے اس بات کا پتا چلے گا اور وہ مجھ سے رابطہ

تھینے کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔ گاڑا اور ذرائع ر کے علاوہ بس وہ دونوں ہی ہیں۔ ہمارا ہیرو اور ہماری ہیروئن۔ میں نے خود بھی صرف ان چاروں کو ہی دیکھا ہے اور ہمارے آئی نے جو رپورٹ دی ہے۔ اس کے مطابق بھی ان کے سوا اس گھر میں کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ کوئی گھریلو ملازم یا ملازمہ بھی نظر نہیں آتی۔ اب اگر ہمارے محقق پر اچانک کسی کوٹے کھدے سے کوئی مظلوم شخصیت نکل کر سامنے آجائے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے لیے بھی تیار رہنا ہی پڑے گا۔“

”میرا خیال ہے تم اب مزید تاخیر مت کرو۔“ میں نے کہا ”اندر چلے۔“ آخر ہمیں شرنگ کے ابتدائی انقلاط بھی تو کرنے ہیں۔ گاڑا اور ذرائع ر کو خاموشی سے قہر میں کرتا ہے۔ بقول تسمارے کوٹے کھدے سے کوئی نکل آیا تو اس کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ ابھی تو یہ بھی مظلوم نہیں کہ بیڑ دوم کس طرف ہے۔ وہ تلاش کر کے خاموشی سے کمرے کے لیے کوئی جگہ بھی تلاش کرتی پڑے گی جو سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اگر ہمیں کچھ انتظار کرنا بھی پڑا تو اندر جا کر ”ٹوکیشن“ پر ہی کر لیں گے۔ یہاں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ شفیع شاہ نے کندھے اٹکا دئے۔ اس نے چھوٹے سائز کا عمدہ کیم کارڈ اور انفراریڈ اسکوپ انہی چیزوں کے انسپیکٹ کی مدد سے کمرے سے باہر حادوریم گاڑی سے اتر کر پیدل عقیلی گلی کی طرف یوں شٹنے کے سے انداز میں چل دئے جیسے رات کو اس وقت دو بے فکروں کو چل تھری کی سوچ میں ہو۔ علاقے کی سڑکوں پر اس وقت تقریباً دوپہری کی نظر آتی تھی جس سے ہم صحیح معنوں میں استغناء کر رہے تھے۔

عقیلی گلی میں تقریباً تاریکی ہی تھی۔ بچکے کی عقیلی دیوار کاٹنی اونچی تھی لیکن یہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ابھی بات یہ تھی کہ اس دیوار پر مزید کوئی خفاقی انتظام نہیں تھا۔ پہلے میں نے شفیع شاہ کو اپنے کندھوں پہ کھڑا کر کے دیوار پر چڑھایا۔ وہ دیوار سے نیچے نہیں کودا بلکہ اس نے دیوار پر اوڑھنا حالت کر پاتھ نیچے لا کر مجھے چڑھنے میں مدد دی اور ہم یکے بعد دیگرے بیٹوں کے مثل عقیلی لان پر کود گئے۔

ہم نے پہلے تو دیوار پر ہی کے زیر سایہ ساکت رہے ہوئے مٹھ گئیں لینے کی کوشش کی لیکن بھگت تو جیسے ہمیں بھانپ گیا تھا۔ اس میں دو چار افراد کی موجودگی کا قوتیابی نہیں چل رہا تھا۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد شفیع شاہ نے کھڑا اور انفراریڈ اسکوپ پھول دار پودوں کے ایک جھنڈے کے قریب رکھ دیا تاکہ اگر آگے کہیں ہاتھ پائی کی فورت آجائے تو انہیں نقصان نہ پہنچے۔ احوال کو ”محفوظ“ بنانے کے بعد ہم آگے چڑھیں اٹھا کر لے جاسکتے تھے۔ ہم دونوں نے مختلف سمتوں سے اصل عمارت کے گرد گھوم کر سامنے پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

نہیں کی اس کے باوجود میں جلد ہی منزل پر پہنچ گیا کیونکہ رات گہری ہو چکی تھی اور ان علاقوں کی سڑکوں پر ٹریفک بہت کم رہ گیا تھا جس سے مجھے گزرنا تھا۔

دروانی ان دونوں اپنے جس بچکے کو محضت کدے کے طور پر استعمال کر رہا تھا اس کے مانی دور دراز کے کوٹے پر چھوٹی سی ایک کمرشل بلڈنگ تھی جس کے نیچے دو کھمیں اور اوپر غالباً تین منزلوں پر دفاتر تھے۔ اس وقت دو کھمیں اور دفاتر بھی بند تھے۔ عمارت تاریک نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے پارکنگ کے لیے مختصر کمرہ جگہ موجود تھی جس کے سامنے سبزے کی چھوٹی سی باڑھ بھی موجود تھی۔ وہاں مجھے شفیع شاہ کی سفید گاڑی کھڑی نظر آئی۔ وہ بہت دور سے مگر نہایت عمدہ جگہ سے بچکے کی نگرانی کر رہا تھا۔ کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس گاڑی سے اتنی دور کے بچکے کی نگرانی کی جارہی تھی۔ گاڑی میں اس کی موجودگی کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس کے برابر لے جا دی کی اور اپنی گاڑی سے اس کی گاڑی میں منتقل ہو گیا۔ وہ ذرائع تک سیٹ پر تھا اور میری آمد کے بعد صحیح طور پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا ”تم خود ہی نگرانی کا کام کر رہے ہو؟“

”نہیں سراسر اے کار اور کبھی مار قسم کے کام کے لیے تو ایک اور آدمی کو لگایا ہوا ہے۔ وہ سڑک کے دوسرے کوٹے پر گاڑی میں ہے۔“ شفیع شاہ نے بتایا ”میں تو آج خاص طور پر اس قسم کے خیال سے ان کے پیچھے لگا تھا۔“

شفیع شاہ کی گاڑی میں ہی ہم نے گلی کا ایک پکڑ لگایا۔ میں نے دوسرے آدمی کو بھی دیکھ لیا۔ وہ بھی مناسب جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے پچھلی گلی کا بھی پکڑ لگایا۔ گاڑی پچھلی گلی میں رینگ رہی تھی۔ اس طرف سے بچکے کی دیوار پھانڈ کر اندر گھسنا آسان تھا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا ”کیا خیال ہے۔ کام شروع کر دیا جائے؟“

”ایسی جلدی بھی کیا ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا ”وہ ابھی چند منٹ پہلے ہی تو کمر میں داخل ہوئے ہیں۔ ابھی گوہر مراد ہاتھ نہیں کٹے گا۔“

”تمہیں اس قسم کے کاموں کا بہت تجربہ معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے اسے گھورا۔

”ہر مستقل بات تجربے کی بنیاد پر ہی نہیں، عقل کے سارے بھی کی جاسکتی ہے سراسر۔“ وہ دانشورانہ لہجے میں بولا۔

گاڑی ایک بار پھر پہلے والی جگہ پر آن کھڑی ہوئی۔ بھگت ہم چڑا سر اور نیم تاریک نظر آ رہا تھا۔ صرف پوربج میں تھوڑی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اندر کوئی موجود تھا یا نہیں۔ میں نے شفیع شاہ سے پوچھا ”اندر کون کون ہے؟“

”صرف ایک گاؤں۔ ایک ذرائع ر جو کبھی آڑے وقت میں ابیلی تھینے کے لیے گاڑی چلتا ہے ورنہ عام طور پر درانی خودی

لیا۔ میں ممکن تھا کہ ادھر میرے سر کا کچھ حصہ اور ایک آنکھ کھڑی کر فرم میں نمودار ہوئی اور ادھر دوسری طرف سے کوئی چوہا پرو راست میری طرف دیکھ رہا ہوتا۔ یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی۔ ہمیں یہاں اپنی کارروائی کے دوران میں سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ کوئی غیر معمولی آواز نہ پیدا ہوئے۔

میری قسمت اچھی تھی کہ کمرے کے اندر سے کسی آنکھ نے میرا احتیال نہیں کیا حالانکہ وہاں چار آنکھیں موجود تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہاں دو افراد موجود تھے۔ کمرے میں لوہے کی ایک میز اور چند کرسیوں کے سوا کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ دونوں افراد میرے ایک دوسرے کے آگے سامنے تقریباً سر جوڑے بیٹھے تھے اور کسی ایسے موضوع پر تبادلہ خیال کر رہے تھے جو ان کے لیے یقیناً بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔ دونوں کی باتیں مکمل جاری تھیں۔

میں نے ان کی باتیں سننے کی کوشش نہیں کی۔ میری توجہ ان کے تاثرات پر تھی جن سے میں ان کے اشتہاک کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک یقیناً گارڈ تھا اور دوسرا ڈرائیور۔ دونوں باوردی تھے۔ گارڈ کی ٹوکری اس کی کلاحتف رکھی تھی۔ ڈرائیور کی ٹوپی لوہے کی میز پر پڑی تھی۔ وہ منجانباً سٹولا اور ایجنٹر تھا جبکہ گارڈ خاصا صحت مند اور آزاد قد جوان اور مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کھڑی سے سر ہٹایا اور بٹنگ کے دوسرے کونے کی طرف دیکھا۔ اُدھر اندر میرا تھا لیکن اسی لمحے اندر میرے میں دیوار کی ادٹ سے مجھے صرف دو انگلیاں متحرک نظر آئیں۔ یہ مشکل تھا۔ شفیع شاہ اس کونے پر دیوار کی ادٹ میں اپنی موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا۔ پھر انگلیاں غائب ہو گئیں۔

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد شفیع شاہ نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا یعنی دیوار کی ادٹ میں رہتے ہوئے کوئی چیز پیک کر معمولی سے کھٹکے کی آواز پیدا کی۔ میں نے اسی لمحے ایک بار پھر کھڑی کے کونے سے اندر جھانکا۔ ڈرائیور اور گارڈ کو کہ باتوں میں اٹھے ہوئے تھے لیکن گرد و پیش سے بالکل ہی بے خبر معلوم نہیں ہوئے تھے۔ خصوصاً گارڈ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑا مستند معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس خفیہ سے کھٹکے پر بھی بات اور صوری چھوڑ کر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ کلاحتف اس کے ہاتھوں میں آگئی۔

"تم نے بے آواز سی؟" اس نے ذرا میرے تھدہ پر غمازی۔  
"ہاں۔۔۔ کچھ کھٹکا سا ہوا ہے۔" ڈرائیور متذبذب سے لمحے میں بولا "شاہ لان پر پہلے لے کچھ گرایا ہے۔ آج کل ادھر لمبیاں بہت ہو گئی ہیں۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور گھوم کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔

"میں ذرا دیکھ لوں۔" گارڈ بولا "مٹی کے بجائے کوئی پلا بھی ہو سکتا ہے۔ دو گاہوں والا پلا۔ آج کل وہ بھی تو بہت ہو گئے ہیں۔ سو پلے پاتے ہی ہر گھر میں کھٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ زرا ہی اچھ جالی قسم کا گارڈ نہیں تھا۔ توڑی بہت بات کرنا جانتا تھا۔

میں جس طرف سے بے آواز قد سوں کے ساتھ دیوار سے ٹک کر چلا ہوا آگے بڑھا۔ بٹنگ کی ذرا تھک بٹلی گلی تھی۔ اسی طرف مجھے سرونٹ کو اتر بھی نظر آئے لیکن ان کے دروازوں پر آگے بھول رہے تھے اور اندر تاریکی تھی یعنی جو ڈرائیور ہماری معلومات کے مطابق بٹنگ میں موجود تھا وہ بھی اس وقت نہیں اور تھا۔ عملی طور پر یہ بٹنگ آج کل زیادہ تر خالی ہی رہتا تھا شاید ایلے یہاں کوئی خاص خاتمی انتظامات نظر نہیں آ رہے تھے اور درانی نے یہاں غیر ضروری افراد کی بیڑ بھاڑ بھی نہیں رکھی تھی۔

مجھے اصل عمارت کے سامنے والے ایک کونے تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہاں سے مجھے گیٹ کے قریب باڈیروں والے کے قریب بنا ہوا دو چھوٹا سا کمرہ نظر آیا جو گیٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا ہوا۔ کمرے میں روشنی تھی مگر اس کے دروازے کا رخ میری طرف نہیں تھا۔ میری طرف کی دیوار میں چھوٹی سی صرف ایک روشنی دان تھا کھڑکی تھی۔ اس میں سلاخیں تھیں اور کھڑکی مکمل تھی مگر اس میں سے اندر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کم از کم جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس کمرے میں سے باتوں کی نہایت مدھم سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ان کا گارڈ کرنا۔ آوازیں موانہ تھیں۔ دو افراد کپ شپ کے انداز میں باتیں کر رہے تھے لیکن نہایت احتیاط سے اور ہنسی آواز میں۔ حالانکہ اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ خاص درودور تک کوئی ان کی آواز سنے گا لیکن وہ دونوں گویا اپنی ہی پوری کوشش کر رہے تھے کہ ان کی آوازیں کمرے سے باہر نہ جائیں۔

دوسری طرف روشنی کا ایک مستطیل پورج کے فرش تک جا رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ پورج کا فرش خوب صورت ٹائلوں کا تھا اور اس روشنی میں جھٹلا رہا تھا۔ پورج میں کوئی اور لائٹ آن نہیں تھی۔ روشنی کے مستطیل سے ذرا بہت کر دہی سفید گاڑی کھڑی تھی جس میں پہلی حربہ درانی اور تھینڈ کو دیکھ کر میں چو کا تھا لیکن اس دقت مجھے ان کے نام معلوم نہیں تھے۔

میں نے رکشہ کی سی حالت میں بچوں کے مل درمیانی فاصلہ عبور کیا اور چھوٹے سے کمرے کی چھٹی کی کھڑکی والی دیوار سے چپک کر جا کھڑا ہوا لیکن میں نے کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دوران میں شفیع شاہ بٹنگ کے اصل عمارت کے دوسرے کونے پر پہنچ چکا تھا لیکن اس طرف چونکہ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اس لیے اس نے سامنے آنے یا اپنی موجودگی کا کوئی اور اشارہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہمیں پہلے صورت حال کو اچھی طرح سمجھنا تھا۔

آخر میں نے سلاخوں والی کھڑکی سے اندر دیکھنے کا فیصلہ مول

پیدا ہونے پاتے۔ راہداری تاریکی میں ڈوب گئی۔ اب صرف لاؤنج کی طرف سے کچھ روشنی آ رہی تھی جس کی وجہ سے اندھرا کمرہ نہیں تھا۔

"تم جا کر کیرا دنیو لے آؤ۔ میں فی الحال یہیں کھڑا ہوں۔" میں نے دباو سے چپک کر کمرہ ہوتے ہوئے کہا۔ میری سرکشی سن کر شفیع شاہ نے ٹکٹے اندھیرے میں اثبات میں سر ہلایا اور دم ہوا کے جھکے کی طرح کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں نے دواؤں کھلا ہی رہنے دیا۔ وہاں کھڑے کھڑے چند سیکنڈ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ دم ہی کچھ آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں لیکن ان کی نوعیت کا اندازہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ شاید غاصے قاضی پر کسی بندہ کمرے میں نہایت دم آواز میں بیوی یا ریڈیو چل رہا تھا۔ یہ بھی ایک سولت تھی۔ اس سے ہم آسانی سے جان سکتے تھے کہ درانی اور حنینہ کس کمرے میں موجود تھے۔

میں نے رے بنگلے میں فاک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شفیع شاہ جلدی لوٹ آیا۔ اس نے کیرا اور انفراریڈ اسکوپ مجھے تھما دیا۔ میں نے کمرے میں رکھی اور ہم دہے قدموں آگے بڑھے۔ لاؤنج میں روشنی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ساڈا بومز پر وہاں بھی ایک بیوی موجود تھا لیکن وہ بند تھا۔ کہیں اور مل دی پٹے کی آواز اب ذرا سی واضح ہو گئی تھی۔ اس نے ہماری رہنمائی کی اور ہم دیگر کمروں کے بند دواؤں کو چھوڑتے ہوئے اس کمرے کے سامنے جا کر۔

اس کمرے کے دواؤں کے نیچے روشنی کی پٹی سی گیر بھی دکھائی دے رہی تھی اور بڑی سی کھڑکی پر گوکہ پردے پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کے عقب میں روشنی کا احساس ہوا تھا۔ اس کھڑکی اور دواؤں کے سوا کمرے میں بھاٹکے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا اور یہ دونوں راستے بھی بند تھے۔ دواؤں دھوئے ہی بند تھا۔ کھڑکی کے شیشوں والے پٹ بھی بند تھے اور اندر پردے پھیلے ہوئے تھے لیکن قریب پہنچ کر میں نے کھڑکی کا پوری طرح جائزہ لیا تو ایک طرف مجھے عمودی پٹی کی طرح تقریباً کوہ پان اونچ پڑی جگہ خالی دکھائی دے گئی جس کو پردہ ڈھاچنے سے قاصر رہا تھا۔ اسے بہت زیادہ احتیاط سے نہیں پھیلایا گیا تھا۔

میں نے اس پٹی پر آٹھ جاکر شیشے سے اندر کا منظر دیکھا اور میرے اعصاب کو خاصا زوردار جھٹکا۔ تینہ شان دار فیل بند پر اونٹنی لپٹی ہوئی تھی اور جس حالت میں لپٹی ہوئی تھی اس پر اچانک نظر پڑا انسان کے سر پر کوئی چھوٹا سا ہتھوڑا پڑنے کے برابر تھا۔ سامنے سی ساڈا بومز پر لی دی تھا جس کا ریموٹ کنٹرول تینہ کے ہاتھ میں تھا۔ لی دی پیٹیاؤ سی آر سے منسلک تھا جو اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ یہ ایک عجیب قسم قلعہ دار قسم کا اضافی تھا کہ وی سی آر کے ذریعے جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی اسی سے فنی چلتی کوئی چھوٹی موٹی چیز چار کونے کی کمر میں ہم کیرا دنیو

وہ میز کے عقب سے نکل کر دواؤں کی طرف بڑھا۔ ذرا نیچر اس کے ساتھ تھا اور یہ میرے حق میں بہت سی اچھا ہوا تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ دونوں اسٹے کمرے سے نکلیں۔ اس طرح میرا کام آسان ہو جائے۔ شفیع شاہ چونکہ اس جگہ سے کچھ دور تھا اور دواؤں کا رخ اسی کی طرف نہ رہا تھا اس لیے زیادہ دے داری میرے کندھوں پر آئی تھی۔ شفیع کا زیادہ کام اب صرف مجھے کوئی فراہم کرنا ہی تھا۔

ادھر وہ دونوں دواؤں سے نکل کر کچھ آگے پہنچے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹکٹے اندھیرے میں دیکھنے لگے۔ ادھر میں بھی ان کے عقب سے دیوار کی اوٹ سے دہے قدموں نکل آیا۔ وہ دواؤں سے باہر آنے والی روشنی کے مستطیل میں کھڑے تھے لیکن نہ جانے کیوں انہوں نے لان دنیو کا جائزہ لینے کے لیے کوئی لاسٹ آن نہیں کی۔

انہیں ایک آدھ سیکنڈ سے زیادہ دیکھنے کی سہولت بھی نہیں ملی۔ میں نے عقب سے یکے بعد دیگرے دونوں کی گڈی پر مشین ہٹل کا دست رسید کیا۔ ان دونوں ضرروں کے درمیان شاید ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفہ تھا اور نہ ذرا نیچر کو پیچ مارنے کی سہولت مل جاتی۔ شفیع شاہ نے حیرت انگیز بھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اسی لمحے وہ گویا اوڑھ پیر کی اوٹ سے نکل کر وہاں تک پہنچا۔ وہ دونوں فرش پر ڈھیر نہیں ہونے پاتے۔ اس نے انہیں دونوں بازوؤں پر تھام لیا۔ میں نے بھرتی سے مشین ہٹل جب میں رکھا اور ان دونوں کی ٹانگیں بظلم میں دبا کر اٹھائیں۔ دوسرے ہی لمحے ہم انہیں اٹھا کر واپس کمرے میں لے آئے۔

شفیع شاہ نے اپنی بیٹک کی جیبوں سے ٹانگوں کی باریک ڈوری اور نیپ نکالی۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے اور ہوتلوں پر نیپ چپکانے میں بھی ہم نے زبردست بھرتی کا مظاہرہ کیا اور انہیں میز کی آڑ میں ڈال کر کمرے سے نکل آئے۔ کمرے کا دواؤں ہم نے آہستگی سے بند کر دیا۔ یہ کام ہماری خواہش کے مطابق چند لمحوں میں نہایت صفائی سے ہو گیا تھا اور مکان کا سکوت بھی قطعاً ساڑ نہیں ہوا تھا۔

اس کے بعد ہم نے ایک لمحہ خالصتہ کے بغیر بے آواز قدموں سے برآمدے میں پہنچ کر اندرونی دواؤں پر قسمت آزمائی کی اور اسے غیر متعلق پایا۔ اگر وہ متعلق بھی ہوتا تو مجھے امید تھی کہ اس کی جالی گاڑ کی کی جیب بالو پے کی اس میز کی کسی دراز میں مل جاتی جو جلدی کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔

اب ہم دونوں کے ہاتھوں میں محسوس تھیں۔ میں نے نہایت آہستگی سے دواؤں کو کھول کر اندر جھانکا۔ ایک صاف ستھری اور چرسکون سی راہداری گویا مجھے اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس میں صرف ایک چھوٹا سا گلوب روشنی تھا۔ میں نے اندر پہنچ کر اسے بھی آف کر دیا لیکن یہ خیال رکھا کہ سوچ دبانے سے بھگانا



سے نیپ بھی ہٹا دی۔

”ہوش میں آنے کے بعد جب انہیں اندازہ ہوا کہ گھر میں کوئی ڈاکا نہیں پڑا ہے، کچھ چوری نہیں ہوا ہے۔ تو شاید یہ درانی سے اس واقعے کا ذکر ہی نہ کریں۔“ میں نے امید ظاہر کی۔

”اور اگر ذکر کیا بھی۔ تو سب مل کر حیران ہوتے رہیں گے کہ آخر انہیں بے ہوش کرنے والوں کا مقصد کیا تھا۔“ شفیع شاہ بولا۔

”ہم جس راستے اور جس طریقے سے آئے تھے اسی راستے اور اسی طریقے سے واپس گلی میں پہنچ گئے اور کچھ دیر بعد دوبارہ شفیع شاہ کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ شفیع شاہ کیراؤنیو و جھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے طمانیت کی گہری سانس لے کر بولا ”یہ کام تو خلاصہ وقوع بہت ہی آسان ثابت ہوا۔“

”بے شک۔“ میں نے تائید کی ”کاش ہم درانی اور تھینہ کے تعاون کا شکر یہ ادا کر سکتے۔ گاڑی اور زرا نیور نے بھی ہماری پہلی کوشش پر ہی بدوقت بے ہوش ہو کر ہمارا کام آسان کیا۔ وہ بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔“

”یقیناً۔“ شفیع شاہ نے سر ہلا کر ”ہم ان کے لیے دعا کر رہیں گے۔ اب کیا پروگرام ہے؟“

”آج کا سب سے اہم پروگرام یہی تھا۔ کل جس قدر جلد ممکن ہو سکے تم اس کی ایک کاپی تیار کر کے سب سے پہلے مجھے پہنچا دو اور دو تین کاپیاں مختلف جگہوں پر محفوظ کر دو۔“ میں نے ہدایت کی پھر پوچھا ”درانی کی پرائیویسی کے ثبوت حاصل کرنے کے سلسلے میں کام شروع ہو گیا ہے؟“

”جی ہاں۔ میں نے آدمیوں کو لگا دیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کو کوشش کرو کہ اس کے بینک اکاؤنٹس کا بھی پتا چل سکے۔ ویسے یہ کام سب سے زیادہ مشکل ہے ایسے لوگ زیادہ تر سرمایہ ایسے شعبوں میں انویسٹ کئے رکھتے ہیں جہاں اس کا سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ بینکوں یا مالیاتی اداروں میں ان کی رقمیں ہوں تو وہ بھی ایسے طریقوں سے رکھی جاتی ہیں کہ انہیں تلاش کرنا سمندر میں کسی ایک خاص پھل کی تلاش کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ بہر حال درانی بتی ہی اہم نگے میں بہت ہی اہم حد سے بڑے اور ہر اعتبار سے جی بھر کے کرپٹ ہے۔ معلوم نہیں کب سے اور کس حساب سے دولت سمیٹ رہا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ قیمتی جانکاد کے علاوہ اس کے پاس اچھا خاصا سرمایہ بھی ہو گا لیکن اس کا سراغ لگانا بہت مشکل ہو گا۔ وہ تو اپنے جیسے لوگوں، ٹیکس چوروں، بینک مارکیٹیوں، اسمگلروں اور نہیں فراڈنیو کہنے والوں کو پکڑنے پر مامور ہے۔ وہ تو خود نہ جانے کتنے جھگڑوں سے واقف ہو گا۔ ایسے لوگ اپنے جرائم کا سراغ کہاں چھوڑتے ہیں۔“

”ہم اپنی ہی کوشش کریں گے۔ بینکوں اور انویسٹمنٹ کے اداروں میں اپنے جو کنکشن ہیں ان سے کچھ کام لینے کی کوشش

کریں گے اور دوسری ذریعہ بھی ملائیں گے۔“ شفیع شاہ بولا۔ وہ کسی بھی معاملے میں باؤس ہونے والا آدمی نہیں تھا۔

”ہاں۔“ کوشش کرنے میں کوئی رنج نہیں۔“ میں نے اس کی تائید کی ”میں اب چتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے ہر مرحلے کے بارے میں اطلاع دینے رہتا۔“ پھر میں اسے شب بخیر کہہ کر اس کی گاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ہوٹل واپس آ گیا۔ مجھے اپنا رات کا کھانا چھوڑ کر جانا تھا۔ ”یہ صدمہ“ میں ابھی بھولا نہیں تھا اس لیے میں نے دوبارہ کھانا منگوا کر یہ دکھ درد کیا بھراپے کمرے میں جا کر سو گیا۔

دوسرے روز دوسرے کے قریب میں اپنے آفس میں تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں نے صفیہ کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ دروازے ہی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ چہرے پر ایک عجیب سی وحشت تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے ٹھولہ پر بیک پر تھا اور وہ ایک تک میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس صفیہ سے کافی مختلف نظر آ رہی تھی جس سے اب تک میری ملاقات ہوئی ہی تھی۔

میرا ہاتھ ننگا لیکن دوسرے ہی لمحے میری سمجھ میں آ گیا کہ بات کیا ہو سکتی تھی۔ تاہم میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اور اپنا لہجہ خوشگوار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”خیریت تو ہے صفیہ؟ اتنی پریشان سی کیوں نظر آ رہی ہو؟ اور یہ دروازے پر ہی کیوں کھڑی ہو؟ یہاں آکر بیٹھو۔“ میں نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا مگر جب وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی اور وہیں کھڑی ایک تک میری طرف دیکھتی رہی تو میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اچانک ہی میرے سینے سے آن لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سینے سے لگ کر رو رہی ہوئی لڑکی کا تصور بھی میرے لیے ایک آزمائش سے کم نہیں تھا لیکن میں نے کچھ دیر اسے رونے دیا۔ میرے اندازے کی تصدیق ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تھا اس کے دل کا غبار ہلکا ہو جائے کچھ دیر بعد میں نے اس کے آنسو پونچھے اور اس کا بازو حاتم کر اسے ایک کرسی پر بٹھایا۔ اتنی ہی دیر میں اس کی حالت کافی بہتر ہو چکی تھی۔

”بات کیا ہے صفیہ؟“ میں نے اپنی جگہ پر جا کر بیٹھے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔ اس نے سراٹھا کر مجھ پر ہی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابھی پھلکی ہوئی تھیں اور ان میں گھلائی زور سے تیر رہے تھے ”آپ اب بھی امتحان بنے رہنے کی اداکاری جاری رکھیں گے؟ بہت خوشی والے آدمی ہیں آپ!“ وہ آنسوؤں سے بھیگی نوا میں بولی۔

میں نے ایک بے عنوان سی شرمندگی محسوس کی اور میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ وہ گویا مزید کچھ سنیلے ہوئے ہوئی ”آئی ایم سوری۔“ میرا خیال ہے مجھے اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ہوئی ہیں۔" میں نے کسی سانس لے کر کہا۔

"میں جی تو زندگی کو زیادہ پیچیدہ مانتی ہے۔" وہ آدھ کر بولی۔  
چند لمحے کمرے میں گھرا سکوٹ رہا۔ وہ افسردگی سے سر جھکا  
بیٹھی تھی۔ میں زندگی میں شاذ و نادر ہی بول کھلا ہٹ کا شکار ہوتا تھا  
لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی اچانک آمد اور دھڑکنے سے چند منٹ  
کے لیے مجھے بول کھلا دیا تھا۔ اب میں سنبھل چکا تھا تو مجھے احساس  
ہو رہا تھا کہ اس کو حوصلہ دینے کے لیے مجھے کچھ کہنا چاہیے لیکن  
میرے ذہن کے قید خانے سے گویا سارے الفاظ فرار ہو گئے تھے  
اور پھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں نے اکثر بھی محسوس کیا تھا کہ حوصلہ  
کوئی ایسی چیز نہیں جو کوئی کسی دوسرے کو دے سکے۔ یہ تو خود بخود  
انداز سے پھوٹا تھا۔ نہ جانے کس رنگ پہاڑ سے بہنے لگا تھا۔  
میں ابھی مناسب الفاظ کے تعاقب میں ہی بھاگ رہا تھا کہ وہ  
سراٹھاتے ہوئے ایک مغموم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "آپ  
نے میرے دھڑکنے کا راز تو نہیں منایا؟"  
"کس دھڑکنے کا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

وہ سوال کا جواب دینے کے بجائے کھوٹے کھوٹے سے لہجے  
میں بولی "عجیب بات ہے کہ مجھے آپ پر فصد بھی تھا کہ آپ نے کل  
مجھے اس بات کی اطلاع نہیں دی اور میں آپ ہی کے سینے پر سر رکھ  
کر رونے لگی۔ میں کامران کی لاش دیکھ کر اپنے رشتے وادوں  
کے ساتھ گھردا پس جانے تک بالکل نہیں دھڑکی تھی۔ آنسو شاید  
اندرونی انداز انکار سے بن کر میرے وجود کو جلا رہے تھے شکر ہے  
کہ اس شہر ناچر ساں میں کوئی تو تھا جس کے سینے پر سر رکھ کر ان  
آنسوؤں کو بننے کے لیے راستہ دیا جاسکتا تھا۔ اگر آپ نے اس کا  
برا نہیں منایا تو میں آپ کی شکر گزار ہوں۔"

"مغضوب باتیں مت کرو۔" میں نے اسے ابھی ہی ڈانٹ پلائی  
"اتنی زیادہ رسمی محکموں کر مجھے غصہ آنے لگا ہے۔"

"اس غصے کا شکر ہے۔ ایسا فصد خوش نصیبوں کے حصے میں آتا  
ہے۔" وہ بولی اور ہنسنے لگی۔ میں نے نظروں سے میری طرف دیکھتی  
رہی پھر اچانک اس نے ذرا بدلے ہوئے سے لہجے میں کہا "افضل  
صاحبہ! کیا کامران کی موت کچھ پراسراریت کے پردوں میں لپٹی  
ہوئی نہیں ہے؟"

ابھی میں نے اسے کامران کے خط کے بارے میں نہیں بتایا  
تھا۔ اس کے باوجود اس نے کامران کی موت میں پٹیاں  
پراسراریت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کی جھٹی حس تیز تھی اور وہ  
بلاشبہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رجیم گل نے اسے  
کامران کے خط کے بارے میں بتا دیا ہو یا کم از کم کوئی اشارہ قودے  
ہی دیا ہو لیکن میں نے اس سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا  
اور اعتراف کر لیا "بے شک میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اس کی  
موت حادثاتی نہیں ہے۔ میں ذرا یہاں پہلے سے پیچھے ہوئے کچھ  
کام نمٹاؤں پھر میں اس معاملے کو ضرور دیکھوں گا۔ میں خود بخود

میں تو بڑی غیر جذباتی۔ دنیا وادہ ہے حس۔ بلکہ کسی حد تک  
تفاسک بننے کی مشق کر رہی تھی۔ مگر ابھی بھی ہوں نا۔ یہی سی  
چوت پر ٹھہر گئی۔"

میں نے اب بھی کچھ بولنے سے گریز کیا اور غامضی سے اس  
کی طرف دیکھا رہا۔ آخر وہ گویا اتمام حجت کے لیے بولی میں کچھ  
دیر پہلے دوسرے رشتے وادوں کے ساتھ کامران کی لاش دیکھ کر  
آ رہی ہوں۔ پولیس نے ہمیں باضابطہ شناخت کے لیے بلایا تھا۔"  
"اوہ۔" میں نے اب بھی صرف حسانہ سے انداز میں  
ایک مری سانس لینے پر اکتفا کیا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "رجیم گل سے بھی ملاقات  
ہوئی۔ اس نے بتایا کہ آپ کو تو وہ کل ہی لاش دکھا چکا تھا۔ آپ  
نے مجھے اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی؟"  
"بات ضرورت کی نہیں بہت کی تھی مفید!" آخر میں نے  
دھجے لہجے میں کہا "میں واقعی تم سے بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں  
کہ اس خبر کو چھپانے بیٹھا رہا لیکن یقیناً کوئی۔ میں یہ خبر تمہیں  
سنانے کی بہت اپنے اندر نہیں بابا تھا۔ میرا بس پلے تو میں دنیا میں  
کسی کو بھی اس قسم کی کوئی بری خبر نہ سناؤں۔ میں ابھی تک اس کے  
لہجے بہت ہی بیچ کر رہا تھا اور دعا کر رہا تھا کہ تمہیں کسی اور سی  
ذریعے سے اس بات کا پتا چل جائے تو بہتر ہے۔ میری اس کم ہمتی پر  
تم مجھے مزید لسن لسن کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ میں برا نہیں مناؤں  
گا۔"

"آئی ایم سوری۔!" اب اس کی معذرت کا لہجہ دو سرا تھا۔  
اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا "میرا خیال بھی یہی تھا کہ  
وہ صرف یہی ہو سکتی ہے۔ میں خود اس کے بارے میں آپ کے  
ساتھ بیٹھ کر جو جو کہ اس کی رہی تھی اس کے بعد اصولاً تو مجھے  
اس کی موت پر اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے لیکن کیا کروں۔ آخر  
مجھن کا سامنی تھا۔ اور پھر قسمت نے اس کے ساتھ عجیب سی  
مذاق کیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں خواہ خواہ اتنی الجھل پڑا نہ  
ہوئی تو زیادہ اچھا رہتا۔ اگر جواں مرگ ہی اس کے نصیب میں ملتی تو  
عام سے۔۔۔ سیدھے سادے حادثاتی سے انداز میں رخصت  
ہو جاتا۔"

"تم ابھی یہی فرض کرنے کی کوشش کرو۔" میں نے مٹھو  
وہ۔ اس موقع کے لیے مجھے کوئی اور مناسب مٹھو نہ سوجھا۔

"بالہ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ دھجے لہجے میں بولی "موت  
تو بس موت ہی ہے۔ خواہ اس کے بارے میں کچھ بھی فرض کر لیا  
جاسکے۔ قابل ذکر بات تو بس یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی زندگی کی  
کمانی ختم ہو جاتی ہے۔ کامران دانش کی کمانی ختم ہو گئی۔ ہمیں  
ابھی زندگی کے سمر میں گھسنا ہے اور اپنی اپنی کمانوں کے لیے  
انتظام تلاش کرنا ہے۔"

مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب کی کمائیاں ایک دوسرے میں ابھی



جاؤں گا۔"

"اگر آپ صاحب سمجھیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلے گا۔"

بولی۔

میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بلا تامل کہا "ہرگز نہیں۔ ابھی میں نے سیکھائی کے بارے میں زیادہ معلومات جمع نہیں کی ہیں لیکن مجھے اندازہ ہے وہ جگہ اس قابل نہیں ہوگی کہ میں جیسے ساتھ لے جاؤں۔ اس سے میرا کام آسان ہونے کے بجائے میری مشکلات میں اضافہ ہوگا۔"

غلاب تو فتح اس نے اس پر اصرار نہیں کیا اور اٹھنے کے لیے ہر قوت لے ہوئے بولی "میں اب چلتی ہوں۔ مجھے اس وقت گھر پہنچنا ہے۔ کاروان کے والدین تو نہیں ہیں لیکن جن ماموں کے گھر اس کی اور اس کی بہن کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا ہے وہاں ایک کمرہ برا ہے۔ اور پھر میری طور پر ہی الخال وہ لوگوں کی نظر میں تو میرا بگڑتی رہی تھا۔ مجھے بھی اس وقت گھر پہنچنا ہے۔ اور سوگ ملنا چاہیے۔ میرا اپنا سوگ تو یہ تھا جو میں نے آپ کے ساتھ بیٹھ کر مایا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا اب میں لوگوں کے لیے سوگ کس طرح مٹاؤں گی۔ بہر حال... مجھے جانا تو ہے۔" وہ سر کو خفیف سا جھٹکے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا لاش تم لوگوں کو مل گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔ افسردگی کا اپنا ایک عجیب سا ماحول تھا۔ ابھی تک میں اس محرکے زیر اثر تھا لیکن اب دھیرے دھیرے اس عکری گرفت سے آزاد ہوا تھا۔ شاید یہ افسردگی جھوٹ کے مرض کی طرح تھی اور اس وقت از سر نو اس مرض کا حملہ مجھ پر صغیر کی وجہ سے ہوا تھا۔

"ابھی تک تو پوسٹ مارٹم ہی نہیں ہوا۔" اس نے بھی اب قدرے نارمل لہجے میں بتایا "لیکن شاید آج ہی کسی وقت بھی ہو جائے۔ لاش ہمیں کسی بھی وقت مل سکتی ہے اور ہمیں اس کو ہنگامی طور پر دفن کرنا پڑے گا کیونکہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے اور پوسٹ مارٹم کے بعد شاید مزید خراب ہو جائے۔" اس کی آواز جیسے ایک بار ہر طبق میں پھیلنے لگی۔ وہ تیزی سے باہر جانے کے لیے کھڑکی۔

میں اسے چھوڑنے باہر تک چلی۔ وہ جیسی میں آئی تھی اور جیسی باہر ہی گھڑی تھی۔ اب وہ کافی حد تک ٹرسکون نظر آ رہی تھی۔ جیسی میں بیٹھ کر وہ رخصت ہو چکی تھی مجھے کچھ پچھتاوا سا محسوس ہونے لگا۔ میں اسے چھوڑنے ہی چلا جاتا تو کیا حرج تھا؟ شاید میں نے اس کی اس حد تک دلداری نہیں کی جس کی وہ مجھ سے توقع لے کر آئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میری سرچوں کا پانسا پلٹ گیا۔ شاید میں خواہ مخواہ ہی احساسِ جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید اسے میری دلداری کی کچھ اتنی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ وہ کچھ عجیب سی ہی لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔

میں واپس آؤں میں جا بیٹھا لیکن ایک عجیب سے اضطراب نے مجھے گھیر لیا تھا۔ آؤں کے کام میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا اور مجھے صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا کیا چاہ رہا تھا۔ آخر کار میں اٹھ کھڑا ہوا اور پہلے آؤں سے پھر ہوٹل سے ہی نکل آیا۔ معلوم نہیں اس لڑکی صغیر نے میری ذات کی گمراہیوں میں مدفن کس چنگاری کو ہوا دے دی تھی یا یہ وہی انہل... اضطراب تھا جو کسی کینہ پرور پرانے دشمن کی طرح اچانک ہی کسی تاریک گوشے سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔

کچھ دیر ہوئی کہ پارکنگ لائن میں ٹھہرنے کے بعد آخر میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور بے متعدد سے انداز میں ایک طرف دواؤں ہو گیا۔ شاید مجھے خراب چاہیے تھا۔ لیکن کس چیز سے فرار؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

یہ بے وجہ سا فرار بھی شاید میری قسمت میں نہیں تھا۔ جس سڑک پر میرا ہوٹل واقع تھا ہی چند فلائنگ آگے جا کر ایک اور معیاری ہوٹل تھا۔ یہ فوراً اشار ہو گئی ایک عالمی چین سے منسلک تھا۔ اسی کھنی کے ساتھ فریڈرک تھا۔ اس کے اور ہمارے معیار میں تو زیادہ سا ہی فرق تھا۔ میں اس ہوٹل کے سامنے سے... لیکن سڑک کی دوسری طرف سے گزر رہا تھا کہ اس کے کیلے ڈرائیوے میں بیٹھنے والی کی گاڑی سے تھینک کر اترتے دیکھا۔ ڈرائیوے اس کے لیے دواؤں کھول رہا تھا۔ وہ دوسری میں تھا لیکن سر پہ ٹوپی کی جگہ پٹی بندھی تھی۔ یہ میری کل رات کی کارروائی کی نشانی تھی۔ اگر گاڑی ہوٹل کے صدر دواؤں پر رکی ہوئی تو شاید میں انہیں نہ دیکھ پاتا کیونکہ ان کے اور میرے درمیان آراستگی ہوتے دیکھنا حائل ہوتے لیکن صدر دواؤں کے سامنے کافی دور تک گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی وجہ سے ڈرائیوے نے گاڑی سڑک کے قریب ہی روکی ہوئی تھی اور ڈرائیوے کے ساتھ تھینک کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ درانی اس کے ساتھ موجود نہیں تھا۔

میں تھینک کو گاڑی سے برآمد ہونے دیکھ کر نہ جانے کیوں اس بری طرح چونکا کہ اضطرابی طور پر بریک لگانے کا تھا لیکن کسی ٹھیکرے نے ہی مجھے اس حرکت سے باز رکھا ورنہ شاید میرے پیچھے آتا ہوا ڈرائیوے والی گاڑی میری گاڑی میں ٹھونک دیتا اور اس کے پیچھے بھی یہ سلسلہ خاصی دور تک جاتا۔ میں آگے لگا چلا گیا۔

دوسری طرف کی سڑک پر آنے کے لیے مجھے کافی دور تک جانا پڑا۔ پھر راستہ ملا اور وہاں بھی رکنا پڑا۔ ٹریفک کا ہمارا انداز تھا کہ فوراً گاڑی موڑی نہیں جاسکتی تھی۔ ویسے بھی میرے آگے دو ٹھیکرے گاڑیاں منگول کھلنے کی خاطر تھیں اور میں ان کے پیچھے پھنسا کھڑا تھا۔ خدا خدا کر کے جب میں محسوس کر کہ دوسری طرف کی سڑک پر آکر واپس فوراً اشار ہوئی کہ ان کو پچھا تو تھینک اس کی گاڑی اور ڈرائیوے والے کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔

میں نے اپنی گاڑی پارکنگ لائن میں کھڑی کرتے وقت بھی

میں اضافہ کر رہی تھیں۔ وہ نہایت پرسکون انداز میں ٹانگہ پہ ٹانگہ رکھتے بیٹھی تھی۔ شاید کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ میں ممکن تھا کہ درانی کا ہی انتظار کر رہی ہو۔ ان کے درمیان یہاں ملاقات ملے پائی ہو۔

میں نے یہ مشکل اس کی طرف سے نظر ثانی تاکہ یکسوئی سے کچھ سوچ سکوں۔ سوال یہ تھا کہ میں اچانک اسے سربراہ دیکھ کر اس کے پیچھے پیچھے بھاگا کیوں آیا تھا؟ میں اسی پیچھے پر ہنپتا کہ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اس سے بات کرنا عمل از وقت تھا۔ ابھی معاملہ کچا تھا اور درانی ابھی چیز پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ ابھی اس کے بارے میں میرے قوی مواد جمع کرنے سے اور اس لڑکی کو چیمپیزا۔ درانی ہی کو چیمپیزا کے مترادف تھا۔

اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں ستون کی اوٹ سے نکلا اور دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے کھٹنے کے سے انداز میں چلتا ہوا استیروئید نیچوں سے بے ہوئے ہنگلے کے درمیان سے گزر کر کالی بار میں جا پہنچا۔ تھینے نے گردن کھمبے بغیر آنکھوں کی خفیف سی حرکت کے ساتھ ایک اوڑھے بے نیاز سے میری طرف دیکھا۔ میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میری اچانک اس پر نظر پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ششاسنی کا کوئی رنگ نہیں ابھرا تھا اس کے باوجود میں سیدھا اس کی طرف چلا گیا اور اس سے اجازت لیے بغیر کر رہی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

اس نے نہ تو مجھے خوش آمدید کہا اور نہ ہی مسکرا کر میرا استقبال کیا لیکن اس کی پیشانی پر ناگوارگی کی ٹھنسی یا آنکھوں میں پرہیزی کا رنگ بھی نہیں جھلکا۔ وہ اسی پرسکون انداز میں میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے انداز میں ہلکی سی نکتہ بھی تھی۔

”تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی تھینے!“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ میں اس وقت ایک ایسے قوی کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو کسی لڑکی سے نہایت معمولی سی واقفیت کے بعد کہیں سربراہ ملاقات ہونے پر خواہ مخواہ کھل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

خلاف توقع اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا افضل صاحب؟“ اس نے دھیمی اور درگش قوافض میں پوچھا۔

میں گرمی سانس لے کر کہہ گیا۔ جشید کرم کے دفتر میں جب میں نے اسے دیکھا تھا اس نے مجھے صرف کافی سروی تھی اور شکر ڈالنے وقت صرف ایک نظر میری طرف دیکھا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں کرایا گیا تھا۔ میں نے تو خبر اس کے پیچھے آئی لگا کر اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرایا تھا لیکن وہ بھی میرے بارے میں کچھ ایسا بے خبر نہیں تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے پہچان لیا تھا بلکہ اسے میرا نام بھی معلوم تھا۔

سب گاڑیوں کا جائزہ لیا لیکن درانی والی گاڑی یا اس کا ڈرائیور کہیں نظر نہ آیا۔ شاید وہ تھینے کو یہاں اتار کر چلا گیا تھا۔ اس صورت میں تھینے کا ملتا ذرا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ میں ممکن تھا کہ وہ ادھر کسی کمرے میں چلی گئی ہو۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ یہاں بھی اس کی کوئی انسانی تنظیم ہو اور وہ قاصر وقت میں اس کے ساتھ کوئی وعدہ بھانے آئی ہو۔ وہ ایک غیر معمولی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی رنگ و بے میں شاید غیر معمولی توانائیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے بارے میں تھینے سے نہیں کہا جاسکتا تھا۔

لالی میں پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس جسم کے کسی ہونٹ میں یہ پتہ چلا نہ ذرا مشکل ہی ہوا تھا کہ کون سا وزیر کماں کیا۔ خصوصاً جبکہ وزیر خاتون ہو تو اس کی نشانیوں اور طبع و فہم ہوتا کر اس کے بارے میں پوچھنا زیادہ معیوب لگتا ہے اور پوچھنے والا دوسروں کی نظر میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ابھی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ آؤنڈیم کی طرف جانے والے راستے کے قریب کالی بار میں مجھے ایک بھڑک دار نارنجی ساری کی جھلک نظر آئی۔

تھینے بھڑک دار نارنجی ساری میں ہی تھی۔ کچھ اس رنگ کی وجہ سے اور کچھ اپنے خوب صورت سراپا اور رنگ و بے کی وجہ سے وہ گاڑی سے اترتے وقت کچھ ایسی ہی دکھائی دی تھی جیسے عورت نہیں کوئی حسین شعلہ برآمد ہوا ہو۔ میں کھٹنے کے سے انداز میں کالی بار کی طرف چل دیا۔ لالی اور اس کے آس پاس کے راستوں پر کالی چل پھل تھی۔ شاید آؤنڈیم اور کسی ہال میں تقریبات دیکھو چل رہی تھیں۔ سماںوں کی گانیاں بھر بھر کر آ رہی تھیں لیکن کالی بار میں صرف تین چار افراد ہی بیٹھے تھے۔

ان میں سے ایک تھینے تھی۔ وہ باقی افراد سے دور ایک کونے کی میز پر الگ جھلک بیٹھی تھی۔ میں نے ایک ستون کی اوٹ سے اس کا جائزہ لیا۔ ہوں تو ہوں کا تقریباً ہر گوشہ ہی مدوشیوں سے جھلک جھلک کر رہا تھا لیکن تھینے پر ایک فانوس کی پہلو دار روشنی کچھ زیادہ ہی پڑی تھی اور اس نے اس کے خوب صورت سراپا کو گویا مزید اجال دیا تھا۔

خفیہ تھا کہ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ کچھ ایک دوسرے میں اور کچھ یہاں کے ماحول میں الجھے ہوئے تھے۔ کسی کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ میں چند سیکنڈ کے لیے اسے دیکھا نہ گیا۔ وہ اتنی سنجیدگی، کمکت اور تیز باری سے بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی اس کی طرف بے باکی سے دیکھنے کی جرأت بھی ذرا مشکل سے ہی کر سکتا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اس وقت اس کے چہرے پر کچھ قدس بھی نظر آ رہا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہ واقعی وہی لڑکی تھی جسے کل رات میں نے درانی کے بیدوم میں دیکھا تھا؟ کچھ متحرک پر ہمایاں میرے ذہن پر حملہ کر رہی تھیں اور میری بے چینی

بھی تھوڑی سی طبع آزمائی کر کے دیکھ لی جاتے۔

”ہمت نیک خیال ہے۔“ میں نے سر ہلایا ”مجھے یقین ہے کہ تم اپنی عظیم اور گراں پایہ صلاحیتوں کی بدولت اس فیلڈ میں دھوم مچا دو گی۔ لوگوں کو اپنا گمراہ بنانے کی جو ناقابل بیان صلاحیتیں تم میں موجود ہیں ان کی وجہ سے ہر ایڈورٹائزر چاہے گا کہ اس کی پروڈکٹ کے اشتہار میں تم اور صرف تم کام کرو۔“

اس نے اب بھی اس تعریف کو تعریف ہی سمجھا اور مسکراتے ہوئے بولی ”جی ہاں۔“ مجھے یقین ہے کہ میں اس فیلڈ میں آؤں گی تو کم از کم کچھ فضول سی مایڈز کا چراغ تو ضرور گل کر دوں گی۔“ پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی ”اب یہ دیکھ لیجئے کہ ابھی میں کسی پروڈکٹ کے اشتہار میں آئی نہیں ہوں۔۔۔ بلکہ جج پوچھے تو ابھی میں نے کسی ایڈورٹائزر تک سمیٹنے کے دفتر میں قدم بھی نہیں رکھا لیکن آج ایک مشہور انگریزی اخبار کا کلچرل رپورٹر میرا انٹرویو کرنے آ رہا ہے۔ میں دراصل اسی کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”ہمت خوب۔“ میں نے ایک بار پھر حسین آئینہ انداز میں سر ہلایا ”اخبار والوں کو تو اپنے صفات سمجھانے کے لیے آپ جیسے چوں کی ضرورت رہتی ہے۔“

اس لمحے دبیز ہمارے سر پہ آن کھڑا ہوا۔ تھینہ پی ٹکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”آپ کیا کھانا چاہتا ہیں؟“ ”جیسے تو مجھے معلوم ہے کہ آپ اس سے بھی اچھے ہوٹل کے مالک ہیں۔ شاید آپ کو یہاں کی چیزیں پسند نہ آئیں۔“

اس پر دبیز ذرا ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا لیکن متوجہ نہ ہوئے اور اس خاموشی میں کھڑا رہا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ میں اس وقت اپنی دولت مندی کی کچھ بھولی جی کمائیاں بنا کر لڑکی کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اگر اس نے اس بات کو جج بھی سمجھا تھا تب بھی شاید کسی قسم کا بد عمل ظاہر کرنا آدابِ ملازمت کے خلاف سمجھا ہو۔

”ہوٹل کا مالک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں نے ادھر ادھر بیٹھ کر کھانا چاہنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے بچی آواز میں کہا ”موقع محل کے اعتبار سے تو میں اب بھی کسی ٹائیٹل کے بندہ پر بیٹھ کر کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا لیکن اس وقت میں کچھ کھانے پینے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔“

اس نے اپنے لیے آؤس کریم کی آئینش والی ایک کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا اور دبیز کے جانے کے بعد اپنے پرس سے ایک کارڈ نکالتے ہوئے بولی ”آپ بھی مگر تحریف لائیے نا۔ آپ جیسے لوگوں سے مل کر تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔“

”بیچتہ ہوتی ہوگی۔“ میں نے انہات میں سر ہلاتے ہوئے عجیبی سے کہا اور کارڈ پر نظر ڈالی۔ اس پر اس کے کلمنٹن کے اپارٹمنٹ کا پتہ اور فون نمبر درج تھا۔

میرے اندر کوئی خفیہ قوت کسی تاریک گوشے سے نہایت

”یہ سوال تو میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔“ میں نے اب ذرا اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا ”جہاں تک مجھے یاد ہے اس دفتر میں اس بد وقت جیشہ کریم نے تو ہمیں ایک دوسرے سے متعارف نہیں کرایا تھا۔“

”لیکن بعد میں انہوں نے ہی مجھے آپ کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔“ وہ اب ذرا واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”مجھے بھی اسی طرح کسی اور مہمان نے تمہارے بارے میں بتا دیا ہو گا۔“ میں نے کہا ”انسان کو کسی کی ذات میں دلچسپی ہو تو اس کے بارے میں جاننے کے کچھ نہ کچھ ذرائع تلاش کر لی جاتا ہے۔“

”چھا۔ تو آپ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ آپ نے میری ذات میں دلچسپی محسوس کی؟“ وہ بے باکی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے ہوئے بولی۔ مسکراہٹ کچھ اور واضح ہو گئی۔

”ہمت زیادہ۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اسے ابھی قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ میری دلچسپی کی نوعیت کیا تھی۔ میں ایک تک اس کی طرف دیکھتا رہا تو اس نے نظر اڑائی۔ میں نے ملازمت سے پوچھا ”آپ جیشہ کریم کے ہاں کیا کرتی ہیں؟“

”میں امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کارپوریشن میں گیسٹ ریلیشنز مینیجر ہوں۔“ اس نے ایک ادائے خامی سے جواب دیا۔

”ہمت خوب۔“ میں نے ستائشی انداز میں سر ہلایا ”اب امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرنے والی کمپنیاں بھی گیسٹ ریلیشنز مینیجر رکھتی ہیں۔“

”گیسٹ ریلیشنز مینیجر کی ضرورت تو ہر کاروباری ادارے کو پڑ سکتی ہے۔ اب یہ اپنے اپنے نظریات اور حیثیت کی بات ہے کہ کون کھانا افروز کر سکتا ہے اور کون نہیں۔“ وہ خاصی سنجیدگی سے بولی۔

”خصوصاً تم جیسی خوش شکل، خوش آوازیست ریلیشنز مینیجر رکھنے اور پھر اس سے صحیح طور پر ”گیسٹ ریلیشنز“ کا کام لینے کے لیے تو بہت سی بڑا دل اور خصوصی حوصلہ چاہیے۔“ یہ بات گو کہ میں نے خامی سے جیسے ہوئے لیے میں کسی بھی اور وہ کچھ ایسی کوڑھ مغز بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے سر سے گزر گئی۔

وہ اب اپنے ساتھیوں جیسے دھڑول کی نمائش کرتے ہوئے بولی ”اب میں آپ کی اس بات کے جواب میں عام لڑکیوں کی طرح انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے تو نہیں کھوں گی کہ کبھی میں تو بس معمولی شکل و صورت کی عام سی لڑکی ہوں اور حسن تو بس دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔“

”تو پھر تم کیا کوئی؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”خوش شکل اور خوش آواز تو میں ہوں۔“ وہ انوکھا کاراؤں کے سے انداز میں کھدے اچکا کر بولی ”سی لیے ہاؤسنگ کے سلیٹے میں میسٹری آف آرٹس ہیں اور میں سوچ رہی ہوں کہ اس فیلڈ میں

میری ہریات اسے مزید بدحواس کرنے کا باعث بنے گی لیکن دوسرے  
صرف جلدی شہنشاہ گئی بلکہ شاید اس نے جوایا مجھے بھی بدحواس  
کرنے کا ارادہ پانے۔

وہ جب بولی تو اس کی آواز زخمی ناگہن کی پٹکار سے مشابہ تھی  
 ”آپ ان دنوں میری عمرانی کر رہے ہیں اور میرے بارے میں  
 معلومات جمع کر رہے ہیں افضل صاحب؟“

میں ایسے فضول کاموں میں وقت اور توانائیاں ضائع کرتے  
کا کائنات نہیں ہوتا۔ میں نے اعتراف سے کر لیا کہ ”میں جیسے گمراہ  
تو آج کی ماہرین سوسائٹی میں عام ہو چکے ہیں۔ قدم قدم پر بے نظر آئے  
تھے ہیں۔ ان کی محمدا کرانے“ معلومات جمع کرانے کی ضرورت  
نہیں ہوتی۔ ذرا غور سے دیکھو سب کچھ خود ہی سمجھ میں آتا  
ہے۔ معلومات کے ضروری حصوں میں غور نہیں کرتے ہیں۔ سوال غور  
ایسا جواب تلاش کر لیتے ہیں۔“

"شاعری نہ بگھاریں۔ میری بات کا جواب دیں۔" وہ کہتا  
دانت چس کر رہی۔

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ”مجھے کی خاطر اس دنیا میں نہ جانے کیا کچھ ہوا ہے۔ ہر صیاح کمالی کی قبر کو کھود تو حکوم پھر کر اس کی تہ سے پیسے کا فساد ہی نکلے گا۔ پیسے کی خاطر اب بے غیرتی بھی بڑھ گئی ہے۔ پیسے کی خاطر غیرت کا جنازہ تو مدوں سے لگا آ رہا ہے لیکن اب یہ کام بڑے ستانے پر ہونے لگا ہے۔ اس کے طور پر جیسے بھی کافی مایوس ہو گئے ہیں۔ زیادہ محبت اور افسوس کا مقام تو وہ ہوتا ہے کہ جو کام جیشہ حریم تم سے لینے کی کوشش کر رہا ہے، بعض لوگ تو اپنی بیویوں سے بھی وہ کام لینے ہوئے نہیں نکلتا۔“

وہ ایک لمحے کے لیے اس طرح مجھے گھورتی رہی جیسے قتل کرنا چاہتی ہو۔ پھر بولی ”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جغدیہ کرم کے تھمارے ذمے جو کام لگا یا تھا وہ تم نے ورائی سے کرایا ہے یا نہیں؟ ورائی نے اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں اپنی تحقیقاتی رپورٹ چل لی ہے یا ابھی اس کے بیڑ دھم میں اس کے ساتھ تھمارے مذاکرات چل رہے ہیں؟“

اس کی بے خوفی میں ایک لمحے کے لیے دراڑی پڑی لیکن پھر شاید اس نے یہی سوچا کہ اب بات تو مکمل ہی رہی تھی 'اب ذرا ڈنک'، 'خواتین اور حوصلے سے صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ صحیح طور پر جانتی نہیں تھی۔ دوسرے اسے نہ جانے کس کس طرح کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر الفاظ کو گھورا چاہتا ہوئے بولی 'مجھے معلوم ہے آپ بہت بڑے آدمی ہیں اسلئے صاحب!'

مجھے یہ معلوم تھا کہ ان جیسے لوگوں کی دشمنی میں ہرگز

مدم سر کو فیوں میں گھسا مجھے خوابا کر کے کی کوشش کر رہی تھی کہ ابھی مجھے اس کی اصلیت اور اصلی معاملے کی طرف نہیں آنا چاہیے اور اورانی والے چکر کو نہیں جھینٹنا چاہیے، ابھی معاملہ کچا تھا اور میں بے وجہ یا بے قاعدہ قسم کی جذباتیت کا بھی قائل نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں نہ جانے کیوں غبار سا بھرا ہوا تھا۔ معلوم نہیں اصل وجہ کیا تھی، میں اس وقت زیادہ باریکی سے تجزیہ کرنے سے تو قاصر تھا لیکن میں یہ محسوس ضرور کر رہا تھا کہ یہی اندرونی کیفیت اس وقت تک عجیب سی تھی۔ شاید اسی کیفیت کے تحت میں نے ان ہم عمری آوازوں کی طرف توجہ نہیں دی اور اس کی آنکھوں میں جمائے ہوئے پوچھا تھا کہ درد والا کلیتہً تم لوگوں نے چھوڑ دیا کیا؟

”کھارادوسہ؟“ وہ بڑی طرح چرکی۔ اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں اور خوب صبرت میک اپ کی ڈیز ہوئے کے باوجود مجھے اس کی رحمت کچھ پھینکی پڑتی محسوس ہوئی۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا تھا جو اپنا ماضی مقبوح نہ ہونے کے باوجود اس سے ڈرتے تھے۔ کھل اس لیے کہ وہ غرت اور تنگہ منی کے سپاہیوں میں چھپا ہوا تھا۔ شرمندہ تو اسے اپنے حال پر ہونا چاہیے تھا لیکن اس میں شاید اس نے اپنے لیے فکر کے کچھ چلو تلاش کر لیے تھے۔

وہ فوراً ہی منجھل کر بولی "ہم کھارا درمیں تو کبھی نہیں رہتے تھے۔ ہاں البتہ میری ایک رشتہ کی خالہ وہاں رہتی تھیں۔ کبھی کبھار ان کے ہاں چلے جاتے تھے۔ اب تو ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے بعد سے ان کے ہاں آنا جانا قسم ہی ہو گیا۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے بڑی ادا سے سیزر زور اٹھاتے ہوئے پوچھا "آپ کو کس نے بتایا؟"

میں نے کہا کہ بات دلچسپی کی ہوتی ہے۔ بتانے والے تو بہت مل جاتے ہیں اور بہت کچھ بتا بھی دیتے ہیں....." میں نے بے پروائی سے کہا۔ میں اس کے وزنگ کاڑھ کو اٹھوں میں محسوس کیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے کاڑھ کو توجہ سے دیکھا اور کہا "میں تمہارے گھر ضرور آؤں گا لیکن میرا خیال ہے ان دنوں آنے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان دنوں تو تم خود درانی کے بنگلے پر رہ رہی ہو۔ جب تم درانی کی خاطر وادی سے خارج ہو جاؤ تو مجھے فون کرنا۔ میں خود تمہارے ہاں آؤں گا یا جس میں اپنے ہاں مدعو کروں گا۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

دو دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ چند لمحے وہ ایک تنگ میری طرف مڑ کر دیکھ کر  
 رہی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ تاہم وہ زیادہ دیر  
 بدحواس رہنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے جلد ہی اپنے آپ کو  
 سنبھال لیا اور محسوس کر لیا کہ اب بیٹھی بیٹھی باتیں کرنے اور بیٹھی  
 بیٹھی باتیں سننے کا وقت گزر رہا ہے۔ اب لائحہ عمل بدلنے کی  
 ضرورت تھی۔ وہ سیزر پر کچھ آگے کو جھک آئی۔ اس کے چہرے پر  
 ایک بیک سرد مری اور آنکھوں میں سفاکی دور آئی۔ میرا خیال تھا کہ

زندگی زیادہ جیتی ہے۔ یہ زندگی اگر محض بے مقصد سے انداز میں  
آگ سے کھینچے ہوئے ضائع ہوگئی تو یہ بڑے افسوس کی بات  
ہوگی۔"

"اس پر ذہانت اور ہمدردانہ نگاہ پر تو میں تمہارا بہت سی زیادہ  
شکر گزار ہوں لیکن آخر میں کب تک تمہارا شکر یہ ادا کرنا ہوں  
گا۔" میں نے دوستانہ سے لمبے میں کہا "مجھے اپنے ہر سوال کا  
جواب بھی چاہیے۔ اسپورٹ انکسپورٹ کارپوریشن کے بارے  
میں درحقیقت درانی نے کیا رپورٹ تیار کی تھی۔ یا کرنا چاہتا تھا؟  
جیشہ کرم نے اس میں کیا تبدیلیاں کرائیں یا کرنا چاہتا ہے؟ فی  
الحال یہ کام کس مرحلے میں ہے؟ کس پتہ پر؟ تم درانی سے کیا  
دعویٰ لینے میں کامیاب ہوئی ہو؟"

اس نے کمری کے پٹے سے ٹک ٹک کر ایک کمری سانس لی اور  
ترجم آئیریز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا  
جیسے کوئی ہمدرد بزرگ کسی نادان بچے کو کچھ سمجھا سبھا کر تھک گیا  
ہو۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی سی شکر اسٹ لمودار ہوئی اور وہ  
جنہی بیٹھی سی تو از میں بولی "یہ خاصے مشکل سوالوں کی فہرست ہے  
افضل صاحب! کیا یہ بہتر نہیں کہ ان سوالوں کے جوابات آپ  
درانی سے ہی حاصل کرنے کی کوشش کریں؟ میں تو محض ایک کٹہ  
تکی ہوں۔ جس طرح نچایا جاتا ہے، ٹاپنے لگتی ہوں۔ ہر حال میں  
اس پر کوئی شکوہ، شکایت یا دوا دھونا نہیں کرتی۔ کسی کے سینے سے  
لگ کر ٹوسے یا کر ہمدردیاں تلاش نہیں کرتی۔ یہ زندگی میری اپنی  
منتخب کردہ ہے اور میں اس کے نتائج سمجھنے کے لیے تیار ہوں  
لیکن۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ بڑے لوگ اپنے سوالوں کے  
جواب ایک دوسرے سے ہی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

"وہ تو میں کون کا گی۔" میں نے ملائت سے کہا "مجھے  
تمہاری باتوں سے ذہانت اور کمر بٹنی بچی اچھائی کی خوشبو آ رہی  
ہے۔ اگر مجھے تمہارا تعاون حاصل ہو جائے تو بہتر تھا۔ اس طرح شاید  
وہ گھٹیا زندگی تباہ ہونے سے بچ جاتی جو تم نے اپنے لیے بڑے شوق  
سے منتخب کی ہوگی۔"

"مجھے آپ کی ٹکڑ بکس میں آنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ  
غیر متزلزل لمبے میں بولی "میں جس طرف ہوں۔ جس حال میں  
ہوں جس مقام پر ہوں مجھے وہیں رہنے دیجئے۔"

"بہت خوب۔" میں نے حسین آئیز انداز میں سر ہلایا  
"بدکرداری میں بھی انسان کا کوئی کردار ہونا چاہیے۔ مجھے تمہاری  
یہ بات پسند آئی۔"

"بہت شکریہ شستا و معطر!" وہ زہریلے لمبے میں بولی۔ وہ کسی  
بھی انداز میں میری پیش قدمی سے سناڑ ہوئی رکھائی نہیں دیتی  
تھی۔ وہ اپنے مقصد حیات اور نظریات میں بڑی مضبوط معلوم ہوتی  
تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر لاٹھی میں اگر یا کسی بھی اور ہڈے سے  
سناڑ ہو کر میری مدد کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے

کمری کا مطلب دولت مند یا بڑے مددے پر بیٹھا ہوا آدمی ہوتا  
تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لیکن آپ بڑا آدمی ہونے کے  
ذمہ میں مارے نہ چاہئے گا۔"

"مشورے اور تنبیہ کا شکر ہے۔" میں نے زہریلے لمبے میں  
کہا "لیکن یہ اطلاع میرے لیے نئی ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ میں  
تو آج تک ہر کام اپنے آپ کو مت چھوڑا تھا آدمی سمجھ کر ہی انجام  
دیتا آیا ہوں۔"

"اس انکساری کے ساتھ تو آپ اور بھی زیادہ جلدی مارے  
جائیں گے۔" وہ فوراً بولی "آپ ایک کاروباری آدمی ہیں۔ آپ کو  
جیشہ کرم اور درانی جیسے لوگوں سے نہیں اٹھنا چاہیے۔ آپ اس  
کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔"

"اس مشورے کا بھی شکر ہے۔ لیکن اس قسم کے لوگوں سے  
اٹھنا میری اپنی ہے۔" میں نے کہا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض  
ہے کہ میرے پاس تمہاری اور درانی کی ایک نہایت دلچسپ فلم ہے  
جس کی چند کاپیاں ایسی جگہوں پر محفوظ کردی گئی ہیں جہاں سے وہ  
اس وقت منظر عام پر آجائیں گی جب کسی بھی انداز میں میرے  
خلاف کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمہارے بارے  
میں تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ تم تو اس میدان کی  
بہت بڑی فکاہ معلوم ہوتی ہو۔ تمہیں تو شاید ابھی بہت آگے  
تک جانا ہے۔ اس قسم کے انکشافات شاید تمہاری موت پر کوئی  
خاص اثرات نہ ڈال سکیں لیکن درانی ایک بہت اہم لگے ہیں  
بہت اہم مددے پر ہے۔ شادی شدہ ہے۔ اس کے جوان بیٹے  
ہیں۔ وہ فلم اسے خود کشی پر مجبور کر سکتی ہے۔"

اس کی سانسیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔ مرتضیٰ لمبے میں وہ بولی  
"یہ قوت تھائے گا کہ وہ فلم کے خود کشی پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن  
میں آپ کو اتنا ضرور متاثر چاہتی ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر سخت  
باہمی ہوگی ہے۔ جب میں نے آپ کو دفتر میں دیکھا تھا۔ کافی پلائی  
تھی اور ہمد میں جیشہ صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا  
تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ اس قسم کے آدمی ہوں گے۔"  
"کم دیش میں الفاظ میں تمہارے لیے بھی استعمال کر سکتا  
ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری بات چھوڑیں۔" وہ ناک سیڑ کر بولی "میں تو اس  
معاشرے کی بنیاد پر ایک معمولی سا مہم ہوں۔ میرا کیا ہے۔ میں تو  
کبھی اور کھنگھڑائی جاتی ہوں۔ کبھی اور دھرم وقت آئے گا جب میں  
بٹ جاؤں گی۔ اٹھا کر ایک طرف ڈال دی جاؤں گی۔ مجھے یہ سب  
کچھ معلوم ہے اسی لیے وہ وقت آنے سے پہلے اپنے کچھ منصوبے  
کھل کر لٹا چاہتی ہوں تاہم میرا حال بے مستقبل انداز میں نہیں ہے۔  
آپ اپنے بارے میں سوچیں۔ آپ دولت مند طبقے کے ایک اہم  
نفر ہیں۔ آپ کے قوت بڑے بڑے منصوبے ہوں گے۔ بہت سی  
زندگیوں بہت سے مستقبل آپ سے وابستہ ہوں گے آپ کی

طرف دیکھتے ہوئے سرگوئی سے ذرا بلند آواز میں کہا "ہمارا خیال ہے کہ یہ خوب صورت خاتون تمہاری باتوں سے بیزار ہو رہی ہیں۔ تم ان کا چچا چچوڑو اور بارہل کر ذرا نرم سے بات کرو۔"

"کیا... کیا میں بات نہیں ہو سکتی؟" میں نے اپنے لیے یہ ذرا خوف کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" نوجوان فریاد "ہو سکتا ہے میں تم سے کسی دوسری زبان میں بات کر رہی ہوں۔" اور تم دیکھ رہے ہو یہاں کا فز کتنا خوب صورت ہے۔ شیشے ہیں۔ فانوس ہیں۔ خوب صورت لائٹس ہیں۔ منگی کرا کر کی ہے۔ جھل جھل کر فرخ ہے۔ ہوئی دالوں سے فی الحال ہماری کوئی دشمنی نہیں جو ہم کی چیزوں کا بے ادب غصہ کرے۔"

خاطر تھا انہیں ہو مل والوں سے کوئی ایسی ہمدردی نہیں تھی بات صرف یہ تھی کہ کسی قسم کا ہنگامہ بنا کر نہ جانے کی صورت میں یہاں ان کے پکڑے جانے یا پھانے جانے کے امکانات زیادہ اور وہ یہ خلع مول لیتا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دونوں یقیناً تھیں۔ گھرائی کر رہے تھے اور شاید اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ میں اس پیلور نہیں سوچا تھا کہ اس پر نظر رکھنے والا بھی کوئی آس پاس موجود ہو سکتا ہے۔ شاید ایسا صرف اس وقت ہوتا ہو جب دروازے کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔

"یہ دونوں کون ہیں؟" میں نے ذرا خوف زدہ سے پوچھا۔

تھینے سے پوچھا۔

وہ کچھ جھلٹے ہوئے سے انداز میں بولی "آپ نے کیا برائیاں مجھ سے ہی پوچھنے کا تہیہ کر رکھا ہے؟ جس سوال کا جس سے تعلق بھی ذرا لگاتار اس سے بھی پوچھ لیا کریں۔"

"ٹھیک۔" لیے نوجوان نے اب گمن کی ٹال میرے کندہ میں زیادہ سختی سے جھوٹے ہوئے درشت لیے میں کہا "بارہل۔ تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے اپنا تفصیلی شمار بھی کر اویں گے۔ اپنا نمبر و نسب بھی بتا دیں گے۔" دوسرے نوجوان نے بھی اس کی تھید میں گمن کی ٹال زیادہ سختی سے میرے دوسرے کندہ میں چھو لی۔

میں نے رحم طلب انداز میں تھینے کی طرف دیکھا اور اٹھ ہوا۔ انہوں نے مجھے دروازے کی طرف چلنے کے لیے اشارہ کیا۔ پوٹے کا فریضہ صرف دروازہ تو نوجوان نے سنبھالا ہوا تھا۔ وہاں بھی چھٹی سی آواز اور سرگوئی کے انداز میں بولا "چچا پکارا گئے آواز دینے کی کوشش نہ کرو ورنہ ہم مجبوراً ہو مل کا یہ خوب صورت فرش گندہ ہونے کی پروا نہیں کریں گے۔"

وہ دونوں میرے دائیں بائیں ہچک کر چلے گئے۔ کچھ کچھ دونوں کی جھونپڑوں میں چھپی ہوئی گمن کی ٹال میرے دائیں بائیں طرف پھیلنے میں کہیں چھپ جاتی۔ میں ان کی ہدایت کے ساتھ سعادت مندی سے ان کے ساتھ چلتا ہوا پارکنگ لائن میں

اس پر غصہ بھی آیا۔ کچھ غصہ پہلے ہی میرے لاشعور میں کہیں کھلا رہا تھا۔

میں اسے گھور رہا تھا اور فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پچھلے چند سینکڑوں سے وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ مجھ سے نظریں ملا رہی تھیں۔ اس کی نظریں میرے عقب میں اوجھڑو کر رہیں۔ ہلک رہی تھیں۔ میں بھی سمجھا کہ شاید اس کی نظریں اس دہرے کی تلاش میں ہلک رہی تھیں۔ جسے اس سے اتار دینے کے لیے آتا تھا۔ عام طور پر اس قسم کی لڑکیاں تو رہنمائی کو انتظار کراتی تھیں مگر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ وہ دہرے سے پہلے آکر بیٹھ گئی تھی۔

دھنسا اس کی نظریں ایک بار پھر میرے چہرے پر آن لگیں اور وہ دوبارہ میز پر جھک گئے۔ ہونے فہم کے فہم سے لیے میں بولی "مجھے اور درانی کو بلیک میل کرنا آپ کو بہت تنگ کرے گا اصل صاحب! میں اپنی کہنیوں میں کہیں بلی کی پیش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے میز پر دونوں کہنیاں رکھ کر اپنا چہرہ اس کے قریب لائے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "بلیک میل نہیں ہے محترمہ تھینے صاحب! یہ ایک انتہائی گہرے آئینہ کو ایک قوی جرم سے روکنے کی کوشش ہے جبکہ وہ آئینہ اس سے پہلے ہی نہ جانے کتنے سنگین جرائم کا ارتکاب کر چکا ہے۔ بلکہ شاید اس کی پوری پیشہ ورانہ زندگی ایسے ہی جرائم سے عبارت ہو گئی۔"

ایسی باتیں چھڑتی تھیں تو میرا پرانا دہرے جاگ اٹھا تھا اور بات لمبی ہو جاتی تھی لیکن اس وقت بات لمبی نہ ہونے پائی۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ دوسرے میرے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دو سخت سی چیزیں میرے دونوں کندھوں سے آن لگیں۔

میں نے سراٹھا کر دیکھا، وہ سائے نہیں، دو فیشن ائبل سے نوجوان تھے۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ان کا تعلق تو یقیناً نچلے متوسط طبقے سے تھا لیکن شاید وہ اونچے طبقے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے یا داخل ہو چکے تھے۔ لیے بال، جینز، جوگرز، ہاتھوں میں کڑے، منہ میں چوڑا غم اور شکل پہ نہایت۔ دونوں نے چڑے کی سیاہ جینٹیں پہنی ہوئی تھیں اور دونوں کا ایک ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا۔

وہ تقریباً مجھ سے ہلکے پر آن کھڑے ہوئے تھے اور دونوں نے اپنی اپنی جیب میں موجود گمن کی ٹال میرے کندھے سے لگا دی تھی۔ ان میں سے ایک تو اوسط سے قد کاٹھ کا تھا۔ دوسرا ذرا لمبا تر تھا اور کچھ مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ رنگت دونوں کی گندی تھی اور شکلیں بھی عام سی تھیں لیکن اس وقت وہ دونوں یقیناً اپنے آپ کو انگریزی فلموں کے ہیرو ٹائپا کے انداز میں سمجھ رہے تھے۔ لیے نوجوان نے چوٹیں اٹھاتے ہوئے "ہم آؤ انہوں سے میری

تھا۔ مجھے خود بھی وہ تین مہرے ہلا کر ڈی گڑی کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اس علاقے میں چونکہ دروازے میں جلدی چھنی ہو جاتی تھی اس لیے اس وقت یہاں سرزد نہ تھی۔ گاڑی اس نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی لاوارث سی معلوم ہوئی تھی۔ ان پر گرد کی موٹی سی جھلی ہوئی تھی۔ سہرے تک تو یہاں ایک سسٹم گاڑی بھی ہوتا تھا لیکن اس وقت اس پاس بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاندوں طرف قبرستان کی درانی بجلی ہوئی تھی۔

دراز قد نوجوان پہلے خود چپ سے اُترا پھر اس نے ٹی ٹی سے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس اشارے میں چونکہ دروازے تک گئے والا نوجوان گاڑی سے اتر چکا تھا۔ وہ دروازہ سے کمزور لیکن زیادہ چھپتا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بھی جیکٹ کی جیب سے ہسٹل نکال لیا اور مجھے ایک رنگ خورہ اسٹیشن وین کی آڑ میں چلے گا اشارہ کیا۔

میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے وہاں لے جا کر ہسٹل کرنے اور مجھے سبق سکھانے کی کوشش کریں گے۔ میں نے کوئی ایسی حکمت حرکت نہیں کی تھی کہ وہ فوراً ہی مجھے مارنے پر قائل جاتے۔ میرے اور حینہ کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی یقیناً انہوں نے نہیں سنی تھی۔

خلاف توقع گاڑی کی آڑ میں پہنچے ہی دروازہ نوجوان نے ہسٹل کی ٹال میرے پیٹ پر اور چھوئے قد کے نوجوان نے کینیا رکھ دی۔ دروازہ بولا "ایک ساتھ زنگ رہنا۔ اس طرح زیادہ طے آئے گا۔"

میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ محض مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ وہ بلائی سنجیدگی سے یہ بات کر رہے تھے اور ایک انسان کو یہاں تھکنے میں کوئی مارتا ان کے نزدیک ایک کام تھا جس سے وہ لطف اندوز بھی ہوتا چاہتے تھے۔ میں یقین نہ نہیں کہ سکتا تھا کہ انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم تھا یا نہیں۔ اگر معلوم تھا تو یقیناً انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی اور اگر معلوم نہیں تھا تو شاید معلوم کرنے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ یہ سنا اور یہ بے نیازی قابلِ غور تھی۔

چھوئے قد والا بولا "اگر مزید لینا ہے تو پہلے صرف پیٹ کوئی مادہ۔ پھر دیکھنا کیا شرت ہے۔ کچھ دیر بعد نہیں اور کوئی باز گئے۔" اس نے ایک دو بجوں کے نام بھی تجویز کئے جنہیں میں ایک لمبے کے لیے پیری کپٹیاں چاہا۔ انہیں میں نے انہیں تیار دل خیال کا موقع نہیں دیا۔ وہ ایک لمبے کے لیے اپنے پردہ گرا عمل درآمد کے سلسلے میں انہیں میں پڑ گئے تھے اور اسی ایک لمبے استعمال کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے چمکے۔

چھوئے قد والے کا ہسٹل گراس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دروازہ کانی لی میرے وار کے باوجود اس کے ہاتھ میں ہی رہا۔ اس کا رخ آسمان کی طرف ہو گیا اور ایک لمبی جلی جلی جلی گئی۔

جہاں ایک چھٹی سبز چپ آڑی تر جمی گڑی ہوئی تھی۔ وہ بند چپ تھی اور اس میں کئی ڈنٹ پڑے ہوئے تھے۔

اوسط قد کاٹھ کے نوجوان نے ذرا نیچے جھک کر سنبھال لی۔ پارکنگ لٹ میں کوئی نہیں تھا۔ لیے نوجوان نے اپنی گن نکال لیے میں کوئی حرج محسوس نہ کیا اور اسی سے مجھے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ میں بلا ٹیل وینٹ کے بیٹھ گیا۔ نوجوان میرے قریب آ بیٹھا۔ گن اس نے اس طرح میرے پہلو میں گھسیڑی کہ اگر کوئی گنمکی سے جھانک کر دیکھے تو اسے نظر نہ آ سکے لیکن اس وقت میں گن کے بارے میں نہیں ان دونوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ کون ہو سکتے تھے؟ کیا وہ جیشہ کرم کے توی تھے؟ زیادہ امکان اسی بات کا تھا۔ جیشہ کرم کا مدیہ گو کہ میرے ساتھ صل جیوانہ تھا لیکن اس قسم کے لوگوں کے کر کے بعض اوقات اپنے طور پر بھی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں اور پاس سے اجازت بنا محسوس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

میں نے اپنی دانست میں انہیں کیدنے کی معمولی سی کوشش کی۔ جیشہ اس وقت چل پڑی تھی جب میں نے گویا ڈرتے ڈرتے کہا "میں ایک بات تم لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں۔ اگر تم جیشہ کرم کے توی ہو۔۔۔ تو وہ تمہاری اس حرکت کو پسند نہیں کرے گا۔"

نہ جانے کیوں لیے نوجوان کے حلق سے ہندو کے خوشیاں کی سی آواز نکل اور وہ گویا اپنے ٹی ٹی کا دستہ میری کھوپڑی پر رسید کرنے کا ارادہ پکڑی کرتے ہوئے بولا "کیا ہم نے تم سے کسی کی پسند پائند کے بارے میں کچھ پوچھا؟ بلا وجہ کیوں ترن کر رہے ہو؟ ہم کسی کے توی نہیں ہیں۔ بلکہ ہم تو سب سے آؤں ہی نہیں ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے" میں بے ساختہ یہ کہنے لگے رک گیا۔ ظاہر ہی بات تھی کہ وہ بکواس کر رہا تھا۔ اس قسم کے لوگ کسی نہ کسی کے اشارے پر ہی سب کچھ کرتے پھرتے تھے۔ ہوس میں وہ محض حینہ کے چہرے پر ناگواری اور برہمی دیکھ کر یا شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا کوئی خفیف سا اشارہ پا کر محض خدمتِ خلق کے لیے مجھے وہاں پر اغوا کرنے نہیں چلے آتے تھے۔

میں بظاہر سہم گیا اور خاموش رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ دروازہ نوجوان نے اپنے ساتھ کوئی ہدایت نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے کچھ پوچھا تھا لیکن گاڑی تیزی سے فزائے بھر دی تھی۔ اس کا رخ گاڑی کی طرف تھا۔ سبز قطری ثابت ہوا۔ جلدی گاڑی بیگنوں اور انٹورنس کینٹین کے صدر دروازے کی بند دھلا عمارتوں کے درمیان گھوم گئی اور آخر کار ایک چار دیواری کے درمیان پارک۔

یہ چاندوں طرف سے اونچی عمارتوں میں گھرا ہوا ایک خالی پلاٹ تھا جس پر شاید مستقبل میں کوئی بلند دھلا عمارت ہی تعمیر ہوئی تھی لیکن فی الحال یہ باقاعدہ پارکنگ لٹ کے طور پر استعمال ہو رہا

باراک میرے حساب سے اس کی کل بیانی ٹوٹ جانی چاہیے تھیں لیکن جو کچھ ہوا وہ میرے اندازے سے کافی ٹھیک تھا۔ اس کا سروپ کے گولے کی طرح گاڑی کے پچھلے شیشے سے ٹکرایا۔ گاڑیوں کے شیشے عام طور پر آسانی سے نہیں ٹوٹتے اور ان کے درمیان در کی سی پگلی شفاف نہ بھی ہوتی ہے لیکن نہ جانے کس طرح اس کا لیے بالوں سے ڈھکا ہوا بڑا سا سر اس شیشے کو توڑنا ہوا اندر مٹس گیا اور وہیں پھنس کر رہ گیا۔ گارڈ نمودار ہوئے والے اس شفاف کے کناروں پر پتھر کی طرح ٹوٹنے دانت سے ہی گئے تھے۔

اس کا چہرہ اور سر قیہ ہی طرح اوجھڑ کر رہ گیا تھا اور نر کیلے کنارے اس کی گردن میں پست ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ خود قیہ تھا اپنا سر اس شفاف سے باہر نکالنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا لیکن اس وقت اگر کوئی اور بھی ایسی کوشش کرتا تب بھی اس کی موت قطعی تھی۔ اب اس کے بچے کا کوئی امکان نہیں تھا اور یہ ایک اذیت ناک موت تھی۔ میں نے اس کی گردن سے بڑی طرح خون اٹھتے دکھا۔

اس دوران میں دروازہ نے اپنے ٹکڑے بازو کو دوسرے ہاتھ سے قہرے ہوئے انڈے کرکھا گئے کی کوشش کی۔ اس کے خواہ اس حد تک قتل تھے کہ اس نے اپنے قریب ہی گری ہوئی ٹی ٹی ٹک اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ کوکہ میری نظر اس پر بھی پڑی تھی اور اس کی کوئی کوشش کا سیاب نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ پناہ لینے کے لیے قسمت آزمائی تو کر سکتا تھا۔

میرے خیال میں اب اس کا زندہ رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی کی 'فنج' ہوتے کبرے جیسی ہلکی سی خراباٹ بتا رہی تھی کہ وہ زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ میں نے دروازہ فوجان کی ٹی ٹی اٹھائی۔ اچھائی ہوا کہ میں اسی لمحے اس نے لیٹ کر دہشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کم از کم اسے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسے موت کس طرح آ رہی تھی۔ میں نے صرف ایک گولی چلائی جو اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان پست ہو گئی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ایک سرخ سوراخ نمودار ہوتے دکھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ گرا اور کبھی زمین پر دوڑ تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر ٹی ٹی کو ایک ٹشو پیپر سے اچھی طرح صاف کیا اور اور اسی کے ہاتھ میں پھنسا دیا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں موجود ٹی ٹی سے اس نے خود اپنی پیشانی میں گولی ماری تھی یا یہ کسی اور کی کارروائی تھی اس قسم کے سوالوں پر غور کرنے کا کام میں نے وہ سروں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بے غور آنکھیں گویا آسمان کے اس کھوکھے کو تک رہی تھیں جو اوپری عمارتوں کے درمیان نظر آتا تھا۔

میں نے وہاں مزید وقت ضائع نہیں کیا۔ صرف یہ جائزہ لیا کہ

اضطراری طور پر اس کی اگلی سے ٹھیک روپ گیا تھا۔ بلند عمارتوں کے درمیان اس خالی اور بڑا ہواں جگہ پر اس فائر کی آواز بے حسنی سے انداز میں دوسرے ہی لمحے فضا میں معدوم ہو گئی۔ کسی عمارت کی کڑکی نہیں کھلی۔ کسی طرف سے کوئی توجہ نہیں ہوا۔ ایک عرصے سے شہر میں اس قسم کی آگ آوازوں پر تو لوگوں نے توجہ دینی چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تو شاید کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ موجود بھی ہوتا تو شاید بند رہنے والے ایئر کنڈیشنڈ دفاتر کی کڑکیوں سے اس قسم کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچنے کا راستہ مشکل سے ہی ملتا۔ اور ٹی جاتا تو شاید کوئی اس کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہ کرتا۔

یہ تو یقیناً کہہ نہیں سکتے تھے۔ فائر کی آواز معدوم ہونے سے پہلے ہی میری ٹانگ حرکت میں آچکی تھی اور دروازہ فوجان وہاں سے زمین پر گر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ٹی ٹی کا سرخ پیری طرف کرتے ہوئے دوسرا فائر کیا تھا میں نے اس کی وہ گولی پکڑ کر سڑوزی اور بے رحمی سے دیکھ کر فیصلہ کر لیا۔ کڑا کے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کے قتل سے ہلکی سی اذیت زدہ سی چیخ برآمد ہوئی۔

اس دوران میں چھوٹے قد کا فوجان مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا لیکن وہ واضح طور پر بولکھا ہٹ کا شکار تھا۔ بولکھا ہٹ میں اسے کچھ نہیں سوجھا تھا اور اس نے عقب سے مجھ پر گھونٹے پرانے شروع کر دیے تھے۔ اس قسم کے گھونٹوں کا شاید لڑکپن میں بھی مجھ پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔

ان دونوں کو مجھ جیسے شریف، مہذب اور خوش لباس دیکھائی دینے والے غصے سے 'جو خوف زدہ بھی نظر آتا تھا' قیہ کسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی بلکہ شاید اس قسم کی کارروائیوں کے دوران میں انہیں کبھی مزاحمت سے واسطے ہی نہیں پڑا تھا۔ خصوصاً ہتھیاروں کے سامنے اس قسم کی مزاحمت کے بارے میں تو انہوں نے شاید کبھی سوچا ہی نہیں ہوگا۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے اور وہ میرے لیے بہت آسان شکار ثابت ہو رہے تھے۔

درازند کا جو خنی بازو فوجان کے ہاتھ سے نہ صرف ٹی ٹی ٹک لگی بلکہ شاید اس کے جسم سے جان بھی ٹک لگ گئی۔ میں نے اس کا سر گاڑی کے عقبی حصے سے ٹکرایا اور تنبیہ دیکھے بغیر اسے چھوڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زمین پر ڈبیر ہو جائے گا۔ چھوٹے قد والے کی طرف پلٹتے ہوئے میں نے اچانک اس کی گردن ایک ہاتھ کے کھینچے میں پکڑ لی۔ اس کی آنکھیں باہر آئے لگیں۔ اس لمحے شاید اسے سمجھ چرے پر بھی کوئی ایسا تاثر نظر آیا کہ اس کی آنکھوں میں موت کی دہشت اتر آئی۔

میں نے اپنے سینے میں کسی ایک عجیب سا قوی محسوس کیا۔ ایک لمحے کے لیے شاید مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ اس فوجان کی گردن تو میرے ایک ہاتھ کے کھینچے میں ہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی ہڈی کی جگت قہمی میں جکڑتے ہوئے اسے زمین سے اٹھایا اور اتارے زور سے اسٹیشن دیکھ کر پڑے۔





بارے میں بتایا اور سلسلہ کام جاری رکھتے ہوئے کہا ”زیادہ امکان یہی ہے کہ میرے ہاتھوں مرے والے دو درویشوں کے جسدِ کرم کے ہوں گے جو شاید تہذیب کی حفاظت یا پھر کسی اور کام کے لیے مامور ہوں گے۔ اس صورت میں یہ ایک طرح سے جسدِ کرم کے لیے بھی پہنچ ہو گیا ہے۔ یعنی اپنی اپنی کچھار میں بیٹھے ہوئے دو خطرناک درویشوں سے غمخوڑے سے وقت میں تقریباً ایک ساتھ چھوڑ چھاڑ ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک تو فوری طور پر بہت زیادہ اہم ہو جانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے درانی کی پراہن کے بارے میں ثبوت حاصل کرنے کا کام زیادہ تیزی سے کرنا ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہوشیار ہو جائے اور اس سلسلے میں کوئی بندوبست کر ڈالے۔“

”وہ اس سلسلے میں اتنی جلدی کچھ نہیں کر سکتا۔“ شفیع شاہ اطمینان سے بولا ”جانوروں کے کاغذات اتنی جلدی تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ وہ یہ جانداروں اپنے رشتے داروں کے نام پر خرید کر اور ان کے نام پر کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی جہلی کھینچا کر اس کی طرف سے تھوڑا بہت انکم ٹیکس دینے والا کر کے مطمئن ہے۔ وہ بھی محسوس کرنا ہو گا کہ اس نے بڑے بڑے بکے بندوبست کر رکھے ہیں لیکن جھوٹ اور جھوٹ ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں جب بھی کسی قسم کی تحقیقات یا پوچھ گچھ ہوئی، جھوٹ درتہ کھلتا چلا جائے گا۔ ان سب باتوں سے قطع نظر بھی ہمارا کام اندازے سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ جو تکہ اس کام کا مقصد نیک ہے شاید اس لیے قدرت خود بہ خود آسانیاں فراہم کر رہی ہے۔ جس جگہ میں اس قسم کے اطمینانے جاتے ہیں وہیں کسی نہ کسی کوٹنے کھد رے میں ان کا کوئی نہ کوئی مخالف بھی موجود ہوتا ہے جو عموماً کمزور ہونے کی وجہ سے دھکا بیٹھا ہوتا ہے۔ اگر اسے کوئی مضبوط سہارا میرا آجائے تو وہ بھی بڑا کام دکھا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک کلرک سے ہمارا رابطہ ہو گیا ہے۔ ہم اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو نئی اسے یقین ہو گیا کہ اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ گادہ بڑے کارنامے دکھائے گا۔“

”یہ تو تم نے ہی اچھی خبر سنائی۔“ میں نے کچھ طمانیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”ہم شاید ایک دو دن میں ہی اپنا کام ختم کر لیں۔“ شفیع شاہ بولا۔

”ان کاغذات اور ان کی چند نقوش کی غلطیوں بھی مختلف اور محفوظ مقامات پر رکھواؤ۔ انہیں ہر گز واسلے یا دوسرے آفس سے دور رکھنا۔“ میں نے ہدایت کی۔

”میرا بھی ارادہ ہے۔“ شفیع شاہ بولا۔

میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ دھڑکانی لے آیا اور میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن میرے ذہن میں کچھ دیر تک رہی تھی۔ میں اب صحیح معنوں میں پوری تنبیہ کی اور یکسوئی سے پرنس میرا کے قتل سے لے کر اب تک کے واقعات

اور کچھ باہمی کا اعمار کرنے کی کوشش کی ”تم تو شاید ناراض ہو گئیں۔ میں تو تم سے کامو باہمی گفتگو کرنے آیا تھا۔ ہر حال۔ اگر تم کوئی جواب دینا نہیں چاہتیں تو کم از کم درانی کو میرا یہ پیغام ضرور دے دینا کہ اس نے زندگی میں بہت لوٹ مار بہت عیاشی کر لی۔ اب وہ کم از کم ایک کام تو دیانت داری سے انجام دے دے۔ امپورٹ الیکٹرونٹ کارپوریشن کے بارے میں وہ جو بھی رپورٹ تیار کر کے دیانت داری سے تیار کرے ورنہ اس کے اپنے بارے میں ایک بہت حسنی خیر فاعل تیار ہے اور جس الیکٹری کا وہ وعدے دار ہے اس سے بھی زیادہ اہم اور با اختیار کوئی الیکٹری خود اس کے بارے میں تحقیقات شروع کرے گی۔“

پھر جیسے مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا اور میں نے ہنسنے سے بچنے میں کہا ”مگر میں تو یہ پیغام ہی غلط پامیمر کی ذہنی بھیج رہا ہوں۔ تمہاری ذہنی توفیق اس رپورٹ کو تبدیل کرانے پر لگی ہوئی ہے۔ تم بھلا اس قسم کا پیغام اسے کیوں کر دے سکتی ہو۔ میرا خیال ہے مجھے خود ہی اس سے بات کرنی پڑے گی۔“

اس کے وجود میں جیسے پھر ایک اہل سناٹا۔ وہ جاتے جاتے میری طرف جھک کر دیکھی لیکن زہریلی سی آواز میں بولی ”آپ کو بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب تو وہ خود آپ سے بات کرے گا۔ وہ ڈرنے یا دوڑنے کا نالا توئی نہیں ہے۔“

”ظاہر ہے۔ ظاہر ہے۔“ میں نے حسان سے اس کی تائید میں سہلایا ”ڈرنے اور دوڑنے والے توئی یہ سب کچھ تھوڑا ہی کر سکتے ہیں۔ جو وہ نہ جانتے کب سے کر رہا ہے۔ ان سب کاموں کے لیے بھی اختیارات اور موقع کے باوجود حوصلہ بھی درکار ہوتا ہے۔ توئی تو وہ یقیناً حوصلہ مند ہے لیکن اب اس کے حوصلے کا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔“

”بالہ۔ بے شک۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔“ اس نے عجیب سے انداز میں میرے الفاظ دہرائے اور وہاں سے چل دی۔ اس وقت وہ یقیناً پریشانی اور ذہنی غلغلہ کا شکار تھی لیکن اس کی حال کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

وہ نظر سے اوجھل ہو چکی تو میں نے کسی سانس لے کر کرسی کے پٹے سے نیک لگا لیا۔ وہاں ادا کر کے نہیں گئی تھی۔ شاید اسے اچھے یا بُرے کسی بھی قسم کے حالات میں بیشتر بیکوں پر بل ادا کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ میں نے اپنے لیے کافی کا آمزردیا پھر گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر اپنے موبائل فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔

”شفیع نیشنل میں غیر ارادی سے انداز میں کچھ جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھا ہوں۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا ”میں نے درانی کی آواز میں سنی تھی کہ کچھ زیادہ سی جلدی چھوڑنا ہے اور اس کی ذہنی ایک طرح سے درانی کے لیے شفیع بھی بھجوا دیا ہے۔“ پھر میں نے اسے کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کے

میں تو یقیناً رک کر اپنی دانست میں کھرانے سے بچ گیا لیکن آئے  
 والا نہ رک سکا۔ اور درحقیقت وہ آئے "والا" نہیں بلکہ آئے  
 "دانی" تھی۔ وہ مجھ سے کرا کر کرتے کرتے بچی۔ گرنے سے بچنے  
 کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اسے بازوؤں میں قلم لیا تھا۔  
 قدرے آہستگی سے میں نے اسے چھوڑا تو وہ سرخ سا ناسوں  
 کے درمیان ہولی "آئندہ آپ اچانک موڑنے وقت ہاں ضرور  
 دیا کریں۔"

"تمہیں بھی حیرت قاری سے گریز کرنا چاہیے۔ تم بہتول سے  
 نکل ہوئی گولی کی طرح چلتی ہو۔" میں نے اصرار مانا لیا۔  
 "چلیں۔۔۔" ٹھیک ہے۔ آئندہ دونوں خیال رکھیں گے اور  
 حادثات سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اس قسم کے نزلک کے  
 حادثے کبھی کبھی جان بھی لے لیتے ہیں۔" وہ خفیف سی مسکراہٹ  
 کے ساتھ بولی۔ میں نے کمری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ کل والی  
 صفیہ سے قطعی مختلف نظر آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ  
 رات کو سکون سے سوئی تھی اور نیند نے اس کے حواس اور  
 اعصاب پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ بالکل تازہ دم اور شگفتہ نظر  
 آ رہی تھی۔ حتمی کہ اس کی آنکھوں میں بھی گزشتہ روز کے اُلجے کا  
 کوئی نقش دکھائی نہیں دے رہا تھا حالانکہ ابھی تو شاید کامران کی  
 لاش انہیں نہیں ملی تھی اور توفین بھی نہیں ہوئی تھی۔ میری سمجھ  
 میں نہ آیا کہ اس کی اس تبدیلی کی گوسا کی کام دوں یا پھر یہ سمجھوں  
 کہ اس نے حالات سے کچھ الگ ہی انداز سے سمجھنا کرنا سیکھ لیا  
 تھا۔ شاید اس کی نظریں دیر سے دیر سے سب باتیں بے حسنی ہوئی  
 جاری تھیں۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک عجیب  
 لڑکی تھی۔

"شکر ہے تم نے جلدی صلح کا چرچہ کر لیا۔" میں نے ایک  
 لمحے کی خاموشی کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "میں بہت صلح جو لڑکی ہوں۔ حالات سے بھی جلد صلح کر لیتی  
 ہوں اور انسانوں سے بھی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا پھر میرا سر تاپا  
 جائزہ لیتے ہوئے بولی "تو ایسے آپ کے ملنے سے لگ تو نہیں رہا کہ  
 آپ باہر جا رہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ باہر ہی جا رہے  
 ہیں۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ کیا تم مجھ سے ملنے آئی  
 تھیں؟"

"ظاہر ہے۔ ابھی میری اوقات اتنی بلند تو نہیں ہوئی کہ میں  
 اس ہوٹل میں ناشتا کرنے یا دوپہر کا کھانا کھانے آئے لوں اور نہ  
 ہی میری آپ کی سیکرٹری سے اتنی دوستی ہوئی ہے کہ میں دواخانہ  
 اس سے ملنے کے لیے بے چین ہونے لگوں۔" وہ بولی۔  
 "تو پھر کس سے ملنے کے لیے بے چین ہوئے گی ہو؟ مجھ حقیر  
 پر حقیر سے؟" میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت اور  
 بے چینی سے پوچھا۔

پر غور کرنے اور ان کا سر پر تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن  
 ابھی تک میں یہ طے نہیں کیا تھا کہ ان میں سے کن واقعات کا  
 ایک دوسرے سے تعلق تھا۔ ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ تو کبھی  
 واقعات کا سرا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے  
 سے جڑ دکھائی دے رہا تھا لیکن میں ابھی تک کسی بھی نتیجے کے  
 بارے میں کسی چٹنی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اگر کم از کم یہ واضح  
 ہو جاتا ہے کہ پرنس سیرا کا قاتل کون تھا تو شاید دوسری بہت سی  
 باتوں کی وضاحت بھی ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ شروع  
 سے میرے ذہن میں کلک رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس نکتے کی  
 بنیاد پر قاتل پر ہاتھ ڈال دوں، باقی کام پورس خودی کسے گی لیکن  
 میں اس سلسلے میں بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ کچھ  
 اور باتوں سے میرے خیال کی تصدیق ہو جائے تو اچھا ہے۔ معاملہ  
 بڑا نازک تھا اور میں دھیم گئی یا کسی اور کے سامنے ذرا بھی غلط  
 افتخار نہیں چاہتا تھا۔

دوپہر بیٹھے بیٹھے میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ مجھے صبح جا کر پرنس  
 انڈسٹریز کے نوٹی آباد والے پلانٹ کا جائزہ بھی لینا چاہیے لیکن  
 مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں کسی واقعیت کے سارے اپنی اصل حیثیت  
 میں وہاں جاتا اور اگر وہاں واقعی کوئی گزربجاری تھی تو وہاں کے  
 کرائہ وراثت مجھے اس کی ہوا لگنے نہیں دے سکتے تھے۔ مجھے انتہا میں  
 کہ اس اندیشی کا قریب سے جائزہ لینے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے  
 تھی۔ ایک تدبیر میرے ذہن میں آ رہی تھی۔ اس کے ذریعے اپنے  
 مقصد میں جلد کامیاب ہونے کے امکانات تو بہت کم تھے لیکن  
 کوشش کر کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی امید  
 تھی کہ شاید پلانٹ پر جانے سے معلومات کا کوئی ذریعہ نکل آئے۔  
 کامران کے خط اور اس کی الناک موت نے ان معاملات  
 کے سلسلے میں مجھے وہاں تک جانے پر مجبور کر رکھا تھا جہاں کے بارے  
 میں عام حالات میں شاید میں نہ سوچتا اور یہ تمہیں اگر مجھے آسانی  
 سے سلجھتی دکھائی نہ دیتی تو شاید میں انہیں جہاں کی تھاں چھوڑتا  
 لیکن اب جیسے کوئی عجیب حالات مجھے ان بہت پہلو معاملات کی بہ  
 تک جانے اور اس سلسلے میں ہر کوشش کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔  
 یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں کالی ختم کر کے اوپر لدا کر کے وہاں  
 سے نکل کھڑا ہوا۔

دوسری صبح میرا ذرا جلدی ہوئی سے نکلے کا ارادہ تھا لیکن  
 گزشتہ رات چونکہ کوشش کے باوجود مجھے بہت تاخیر سے نیند آئی  
 تھی اس لیے صبح میں جلدی بیدار نہ ہو سکا اور اس کے بعد بھی ایک  
 عجیب سی کالی کے زیر اثر ہر کام میں ہی دیر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار  
 گیارہ بجے کے قریب میں ہوئی سے نکلا تو غیر ارادی طور پر میری  
 رفتار تیز ہو گئی۔

مردہ روزانہ سے نکل کر میں پارک لائٹ کی طرف جانے  
 کے لیے دائیں طرف مڑا ہی تھا کہ کسی سے کھراٹے کھراٹے بچا۔

میری یہ چٹکی خوشیاں ایک آنکھ نہ بھانجیں۔ وہ ملازمت بڑے کمرانے کی ایک کچھ سے زیادہ خوش عمل کچھ سے زیادہ خوش لباس اور کچھ سے زیادہ بڑی کھسی لڑکی کو مل گئی جسے درحقیقت مکان ملازمت یا گاڑی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی سوسائٹی میں ایک خاصے بڑے بیٹے میں رہتی تھی۔ کمر میں تین عین گاڑیاں تھیں اور ملازمت وہ محض اس لیے کرتا تھا جیسی کہ وہ کمر پر بڑے بڑے ہجور ہو جاتی تھی۔ کچنی کے بڑے صاحب کو وہ بہت پسند آگئی تھی۔“

ہوئی اٹھارہ سو سال پہلے کہ انڈیا میں ایک بادشاہ نے ایک نیا شہر بنایا۔ اس شہر کے نام کو "پانچ گڑھ" رکھا گیا۔ اس شہر کے چاروں طرف چار گڑھ تھے۔ ان گڑھوں کے نام تھے "پانی"، "پھل"، "پتھر" اور "پس"۔ بادشاہ نے اس شہر کو "پانچ گڑھ" کا نام دیا۔ اس شہر کے لوگ اس نام سے بہت فخر کرتے تھے۔

”تپ جیسے لوگوں کو ہم غریبوں کا مذاق اڑانے کے سوا کیا آتا ہے۔“ وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”تم اسے مذاق اڑانا چاہتی ہو؟“ میں نے گویا براہِ امتناع ہوتے گھبراہٹ سے کہا۔  
 ”جی نہیں تو تمہارے ساتھ اگلیاں بھردی کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے چند منٹ میں تم نے اتنی ٹھنڈی سانسوں کی پیس کو گاڑی میں اسے ہی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ تمہاری ان سانسوں کو مجھ سے میرا دل کھینچ لیا تھا۔“

”میرت ہے۔“ اس نے سر ہلایا ”صلاً تو دل کو گرم سانسوں سے کھلچا جائے۔“ ٹھنڈ سے تو تجھ میں کھلچا نہیں، جتنی ہیں۔“  
 خصوصاً جن میں سے ہی برقیاتی ہی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔“  
 میں نے کھل پر گاڑی دوکتے ہوئے ٹکری نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے بولی ”ڈرامیو تک کیجئے اور اس بحث کے ضائع جانے کے بعد بھی کے کچھ دن ایسے بھی آئے ہیں جب میں بنجیدگی سے سوچنے لگی کہ ٹیکسی چلانے شروع کروں۔“

”وہ میرے خدا! میں نے بے اختیار آسمان کی طرف  
 دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی! تم تو اس شہر میں امن و امان کا مسئلہ  
 پیدا کر رہے ہو بلکہ یوں کہو کہ اس واپان کا مسئلہ تو پہلے ہی موجود ہے  
 وہ کافی دشمن ہے۔ تم اسے سنگین تر بنا دیتے۔ گناہ بڑا لگتا جب  
 نہیں سڑکوں پر سے گزرتے دیکھ کر لوگ ہاتھ بالا کر دیتے کے  
 لیے آوازیں لگایا کرتے۔“ جیسی۔ جیسی۔! تم نے اس مسئلے  
 کو کچھ نہیں سوچا تھا؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے گھورنے پر اکتفا کیا۔ میں نے کھٹل کھٹلے پر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اور سلسلہ کلام ڈٹے ہوئے کہا تو بچے ہمیں مشکل سے چند دن کیسی چلانے کی ہمت ملی۔ موڈ ڈرائیو میں کی تو کبھی پر ہسٹل رکھ کر ڈاکو انہیں

۳۳ کے جواب میں ڈاکٹر میں ہنس بھی کھینچ کر دیکھ کر کہیں کہیں  
توبہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس نے ٹھنڈی سانس  
لے کر کہا پھر جلدی سے بولی "آپ جا کماں پر چہ ہیں؟"  
"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ تمہارے پاس تمہیں  
جارحین کا پتہ ہے؟" میں نے کہا۔

”مگر قاتلو نہیں بھی ہوں گے تو آپ کے کہنے پر میں انہیں قاتلو قرار دے دوں گی۔“ وہ ہلا تالی بولی ”موجودہ اگر وہ کہنے آپ کے ساتھ گزر رہے تو پھر قاتلو نہیں رہیں گے۔“

میں نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے پارکنگ لائٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”دن چمے ایسی نیم عاشقانہ سی گفتگو میں کیا کرتے ہو۔ خراب ہو جاتا ہے۔“

”مقدور خراب ہونے کی نسبت معدہ خراب ہو جانا پھر بھی بقیت ہے۔“ وہ لٹھنڈی سانس لے کر میرے ساتھ لے لے ڈنگ بھرتے ہوئے بولی۔

”اچھا یہ بتاؤ۔۔۔ کیا تمہیں ڈرائیو تک آتی ہے؟“ میں نے راستے میں پوچھا۔

”یہ آج کیا آپ کو میرا انٹرویو لینے کا خیال آگیا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”اگر یہ انٹرویو ہے تو میں یہ ضرور کونسی کمی یہ بڑی تاخیر سے پورا کر رہا ہوں۔“

”دیر آید درست آید۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔“ میں نے مجید کی سے کہا۔ اس دوران میں ہم گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ بس نے ڈرائیور تک سینٹ سنبھالی۔ وہ برابر بیٹھ گئی۔

”ہاں... آتی ہے۔“ وہ ایک اور لعلی سانس لے کر بولی  
 ”چیت کاٹ کر ڈرائیونگ اسکول کو فیس دے کر چلے جتن سے  
 کیس بھی تھی پھر اٹھی ایک دوست کی گاڑی پر خوب پینکس بھی کی تھی  
 درجہ بی بی ماہر ڈرائیور بن گئی تھی۔“

”کیوں کیا تھا یہ سب زرد تھمے؟“ میں نے گاڑی پارکنگ  
سٹسٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

”آپ یہ سوال کہنے میں حق پر جانب ہیں۔“ وہ سہلانے لگے بولی ”بیسرے حالات تو سائیکل خریدنے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے تو پھر میں ڈراما ٹیگ کیجئے گا تروڑ کیوں کر رہی تھی؟“

”راہل اس وقت یہ امید پیدا ہو چکا تھا کہ چند ماہ بعد مجھے ایک بڑی کنبھی میں ایسی ملازمت مل جائے گی جس میں کسی بہتر علاقے میں مکان اور گاڑی بھی مل جائے گی۔ میں نے بڑی مستعدی دکھائی۔ گاڑی کھانے سے پہلے مل جاتے تھے خواب دیکھ ڈالے اور تارات ایک کر کے ڈراما ٹیگ میں بھی مہارت حاصل کر لی تاکہ کسی کی غلطی نہ ہو کہ کیونکہ کنبھی کی طرف سے ڈراما پور نہیں ملتا تھا۔“

”بھڑکیا ہوا؟“ اس کے جھلوس ہونے پر میں نے پوچھا۔  
”ہو گیا تھا۔“ وہ ایک اور تو بھڑکیا ”فلک“ و قمار کو

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا پھر ایک لمحے کے وقف سے پوچھا  
 ”اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟“  
 ”نہیں۔۔۔ حیرت کی تو کوئی بات نہیں۔۔۔“ اس نے ہنس سے  
 لیے میں جواب دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کامران کے تذکرے  
 پر یک دم بکھری گئی تھی۔ وہ ایک تک اپنے سامنے سڑک کو  
 گھورنے لگی تھی۔ شاید وہ حقائق کے غارزار سے بہ مشکل نکلنے  
 میں کامیاب ہوئی تھی لیکن میں نے اسے واپس واپس دیکھ لیا تھا  
 لیکن یہ بھی ایک مجبوری تھی۔ بعض حقیقتیں خود کائناتوں کی طرح  
 آپ کے دامن سے چٹ جاتی ہیں۔ انہیں الٹ کرنے کی کوششوں  
 میں دامن تار تار ہونے لگتا ہے۔  
 میں نے لائنٹ سے پوچھا ”تم میری طرف کس سلسلے میں تکی  
 تھیں؟“

وہ دھیمی آواز میں بولی ”رغشی۔۔۔ جس سے میں بیوی پارلر  
 خرید رہی ہوں۔ اس نے ایک سیل ڈیڈ تار کرائی تھی جس پر پہلے  
 سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آج دھچکا ہونے سے بچا میں یہ  
 کامران والا واقعہ پیش آیا۔ رغشی کو تو اس واقعے کے بارے میں  
 کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔ وہ آج سیل ڈیڈ لے کر پروگرام پوچھنے  
 میرے پاس تکی تو میں نے اسے کامران والے سامنے کے بارے  
 میں بتایا۔ وہ بے چاری بھی حیران پریشان رہ گئی۔ اس کے باہر جانے  
 کی آواز بھی ملے ہو چکی ہے اور وہ جلد از جلد اس معاملے کو نشانہ

تھیں سے اتار دیتے ہیں اور ٹیکسی لے اڑتے ہیں۔ تمہاری کنبلی پر  
 پتھول رکھ کر وہ تمہیں لے اڑتے اور ٹیکسی وہیں چھوڑ جاتے۔ اس  
 کے بعد تمہاری داستان تک بھی نہ ہوتی داستانوں میں۔۔۔ آج  
 تم یوں میرے پاس بیٹھی مجھے خرخرار نکھلوں سے نہ گھور رہی  
 ہو تھیں۔“

”میں تو کچھ موانہ دوپ وقیہ دھارنے کے بارے میں بھی  
 سمجھتی سے سوچ رہی تھی۔“ اس نے گھٹکا ہٹ آئینے میں لے لیا۔  
 ”واہ۔۔۔ واہ۔“ میں نے استغناء سے کہے میں کہا ”تم تو واقعی شیخ  
 چلی کا زمانہ اپنے پیش ہو۔“

”جی نہیں۔ میں سٹاکی کی حد تک حقیقت پسند ہوں۔“ وہ  
 منہ لے لے میں بولی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے غاسوس نہ کر سکا  
 واقعی۔ کیا وہ کی نہیں کہہ رہی تھی؟

نام میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا ”اس قسم کے پکر صرف  
 قلموں میں چلتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں تو معاملہ یہ ہے کہ تاؤنے  
 والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ سات پروں میں چھپی ہوئی  
 عورت کو بھی سو میل دور سے آواز دیتے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ منع کریں میرے منصوبوں کو۔۔۔ یہ بتائیں کہ آپ اس  
 وقت کس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے روانہ ہوئے ہیں؟ میں  
 نے آپ کو اس سے پہلے اس ملے میں باہر جاتے تو کیا کہتے ہو تھی  
 والے گھریلو قسم کے دفتر میں بھی بیٹھے نہیں رہا تھا۔ یہ ممکن آلود  
 شلوار قمیض۔۔۔ آج غالباً شید بھی نہیں پہنا ہے۔۔۔ بلکہ شاید منہ بھی  
 نہیں دھویا ہے۔ اپنے حساب سے شاید آپ اس وقت منہ  
 اندھیرے کیس جارہے ہیں۔ اس ”جلد بازی“ کی وجہ پوچھ سکتی  
 ہوں؟“

”میں ”جلد بازی“ کی وجہ سے۔۔۔ اور اپنی دانست میں منہ  
 اندھیرے ”اتھ کر نہیں جا رہا ہوں۔“ میں نے اس کی غلط فہمی دور  
 کی ”یہ طیارہ میں نے جان بوجھ کر رکھا ہے۔ میں ایک صبح پر جا رہا  
 ہوں۔“

”اور میں اس صبح میں آپ کے ساتھ شریک ہوں؟“ اس نے  
 اشتیاق سے پوچھا۔

”صرف اس حد تک کہ تم باہر گاڑی میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو  
 گی اور اگر میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک واپس نہ آیا تو تم گاڑی لے کر  
 واپس آ جاؤ گی۔“

”اوہ۔۔۔! وہ تکہ بایس ہو گئی۔

”غور نہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی  
 ”میں کوئی جیس باڈ بھی صبح پر نہیں جا رہا ہوں جس میں شرکت  
 سے تم محروم نہ جاؤ گی۔ میں صرف اس کارخانے کا جائزہ لینے کی  
 کوشش کرتے جا رہا ہوں جس میں کامران ملازم تھا۔“

”اوہ۔۔۔ آپ پر نفس اندھیرے جارہے ہیں۔ نوری آباد۔۔۔“  
 اس نے حیرت سے پوچھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سنگتراش

اقلم علیم

جلد اول :- / 150 جلد دوم :- / 150



اردو بازار لاہور

”تین دنوں سے میں آپ کو بھی بتانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرا اس سے قطع تعلق ناقابل سبب تو نہیں تھا۔ مجھ میں اب اپنی برادری زندگی کو مزید بھاگ کرنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔“ وہ بولی پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا ”میں ایک بات اور آپ کو بتانا بھول گئی۔ کامران کے ذہن میں کچھ نہ کچھ غلط ضرور تھا۔ بچپن میں وہ ایک پار ایک اوپنے بیچے سے سر کے مل کر گیا تھا۔ اس کے سر کی ہڈی پھٹ گئی تھی۔ وہ ٹھیک تو ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد سے ہمیں اس کی عادات و اطوار میں کبھی کبھار کسی عجیب سی تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا جس کی ہم کوئی وضاحت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس میں کسی قسم کا پاگل پن، تنک یا غلط فہمی ہو گیا تھا لیکن کوئی نہ کوئی نفسیاتی گمز ضرور ہو گئی تھی۔ وہ سائل کی کی کی وجہ سے اس کے کسی انجی جگہ پر وچیدہ قسم کے ٹیسٹ تو نہیں ہو سکے لیکن بعض ڈاکٹروں نے ہمیں محض ایک سرے وغیرہ دیکھ کر ہی بتا دیا تھا کہ اب شاید وہ زندگی بھر مکمل طور پر نارمل نہ ہو سکے۔“

تب مجھے اس سے ملاقات اور بات چیت کے بعض لمحے یاد آئے اور ہمیں دکھانے کے اس کے بھانجے کا سفر یاد آیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی مگر محض اس بت پر ان واقعات کے سلسلے میں اس شخص کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا جو اب تک پیش آچکے تھے۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد صفیہ ہنگاماً آئینہ سے لہجے میں بولی ”میرا خیال ہے اب آپ کامران کی پراسرار موت کے سلسلے میں ہی کچھ سرگرم ہونے لگے ہیں۔ میں تو متحسین ہوں جب کامران ہی اس دنیا میں نہیں رہا تو اب ادھر ادھر مغز ماری سے کیا حاصل؟ آپ اب اس معاملے کو ختم ہی کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ کا وقت یقیناً بہت قیمتی ہے۔“

”میرے خیال میں تو معاملہ ختم نہیں بلکہ شروع ہی اب ہوا ہے۔ پہلے میری نظر صرف سطح تک جا رہی تھی، اب کچھ گہرائی کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”کامران کی موت کا معاملہ یقیناً دوسرے بہت سے معاملوں سے بڑا ہوا ہے۔ وہ غیب اپنی جان دے کر کچھ اہم سلامات کی طرف اشارہ دے گیا ہے۔ اگر کسی نے بھی ان کی طرف توجہ نہ دی تو اس بے چارے کی یہ غیر ارادی سی قربانی رانگلاں بلی جائے گی۔“

اس نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا اور خاموشی رہی تاہم میں نے محسوس کیا کہ اب اس کے چہرے پر پہلی سی ہلکی سی دھڑکی تھی۔ ہم فطری ٹکس ملا دے گزرتے تو میں نے راستہ دھوکے والے شخص کو ایک نوٹ دینے کے بعد گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اپنی دانست میں صفیہ کی طبیعت کا جو بھل پن دور کرنے کے لیے دوبارہ کوئی لگا بھلا موضوع چننے کی غرض سے سڑک پر بے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے ہٹ نما کھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”تم تو خواہ مخواہ بی بی پارو وغیرہ کو کھانے کے چکر میں پڑی ہوئی ہو۔ کسی

چاقو حتیٰ لیکن اس سانچے کے بارے میں جاننے کے بعد اس نے اس ڈبل پر عمل درآمد کا پروگرام تین چار دن آگے بڑھا دیا ہے۔ ہم سب مل کر ڈبل کے کاغذات وہ میرے پاس ہی چھوڑ گئی تھی۔ میں چاہ رہی تھی کہ ایک نظر آپ اسے دیکھ لیتے۔ آپ سہرا مل کا دوبارہ ملاقات کو مجھ سے کہیں بھر نہ کھینچے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ابھی پر دیکھ لیں گے۔ اب سلت تو مل ہی چکی ہے۔“ میں نے کہا پھر پھر ”جیسا کامران کی لاش کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟“

”وہ شاید ہمیں کل مل سکے گی۔“ اس نے بتایا ”اور فوری سی اسے دفن کرنا ہوگا۔“ انتظامات تو مکمل ہیں۔“ پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ وضاحت کے سے انداز میں بولی ”اب میں اس کے بارے میں قطعاً جذباتی نہیں ہوں۔ اب یہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے پاس پر دس میں کوئی موت ہو جاتی ہے، انسان تو مڑی دیر کے لیے افسوس کرتا ہے، پھر سوچتا ہے، ”اچھا میں تو مڑا ہوا آؤں اور نکلاں نکلاں ضروری کام نکلتا ہوا ذرا جلدی مگر آج اس کا اور جنازے میں شرکت کروں گا۔“ کچھ اسی قسم کی کیفیت میری ہے۔“

”وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا اور ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب سر جھکا کر بیٹھی تھی۔

پھر لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ہوا لہجے میں پوچھا ”تم نے جس انٹرنل دیکھی ہوئی ہے؟ میرا مطلب ہے تمہیں اس کا تجربہ تھا؟“

”ہم میں کامران کے ساتھ ایک مرتبہ موز سائیکل پر وہاں جا چکی ہوں۔“ صفیہ نے جواب دیا۔

”میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔“ وہ سنا ”تمہاری دوسرے پر اس کے ساتھ چالیس پچاس میل ”ور سوز سائیکل پر چلی تھیں؟“

”ہاں۔“ وہ بھی مانگنے کی سوز سائیکل پر۔“ اس نے مزید بتایا۔

”واقعی جوانی والی لڑکی ہوتی ہے۔“ میں نے ترمیم تیز سے انداز میں سر ہلایا۔

”اس میں بے چاری غریب جوانی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو موت میں چلی گئی تھی۔ کامران مجھے وہ جگہ دکھانے پر تیار ہوا تھا جہاں وہ کام کرتا تھا حالانکہ وہاں وہ کوئی ایسی قابل فخر حیثیت میں کام نہیں کرتا تھا لیکن اس کے خیال میں بتا دیا یہ سزا ایک طرح سے ایف ڈی پر تھی اور پھر کچھ۔“ وہ ابھی میں ہم نے وہیں انٹرنل ایریا کے قریب ہی ایک پچھلے سٹوران سے کھانا بھی کھایا تھا جہاں کھانے کے ساتھ ساتھ کئی ڈرائیور شاید مجھے سوئٹ ڈش کچھ کر گھور رہے تھے۔“

”مگر کہہ کہ صرف گھور رہے تھے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا ”سب تو مجھے بھی یقین آتا جا رہا ہے کہ مرحوم کامران صاحب اللہ تعالیٰ انہیں فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے۔“ غیر محسوس طور پر یہ تو فوجی رواج ہوئے تھے۔“

بلند دیوار میں نصب یہ مشہور آہنی گیت بھی دیواری کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ بارگاہ کی نہیں تھا البتہ گیت پر کال بیل کا ایک جن نظر آ رہا تھا۔ میں نے وہ دیکھا تو چند لمحوں بعد چہرہ سا ایک بھلی گیت کھلا اور سوئی سوئی سوچوں والے ایک کرخت صورت مسخ گارڈ نے باہر بھاگتا۔

"کیا ہے؟" اس نے کندھے پر بھلی کا کھوکھری کی ہال تقریباً میری طرف جھکاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی انگلی زنگ پر تھی اور لمحہ کھڑا تھا۔

"بھرتی کے لیے آیا ہے۔" میں نے ذرا کم دھم لکھے اور مزدور پیشے سے لوگوں والا لمحہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر گویا اطمینان کیا کہ میں اکیلا تھا پھر مجھے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔ اندر ایک بڑا سا باضابطہ گیت ہاؤس موجود تھا۔ تین مسلح اور ہتھیاروں کا گارڈ مزید نظر آ رہے تھے۔ سامنے ہی شاید انتظامی بلاک تھا۔ سرسبز لان پر آمدے اور پیشوں کے دروازوں والے کمرے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری طرف کافی پیچھے دو رنگ شینڈ نا غارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن سے عینوں کی خفیف سی مگر گہرا ہٹ میاں تک پہنچ رہی تھی۔

ایک گارڈ نے میری غلطی کی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ میرے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں تھی تو اس نے سامنے کے بلاک میں ایک کونے کی طرف اشارہ کیا ۳۱۳ دفین میں جاؤ۔"

اس دفین پہنچ کر میں نے دیکھا اس کے دروازے پر انگریزی اور اردو میں "دفین روزگار" کی تختی توڑا ہوا تھی۔ مجھے اس جگہ کو دیکھ کر ایک خفیف اور بے عنوان سی خوشی کا احساس ہوا۔ یہ کسی شرقی یا ترک فک کا کارخانہ معلوم ہوا تھا۔

میں آریک شیشے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے ایک بڑے سے ہال میں دس یا دہ میز لگی ہوئی تھیں۔ سب پر لوگ کام میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں دو میزوں پر دو لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ ایک کی ہینر کچیہ زخمی موجود تھا۔ میرے داخل ہونے پر سب نے کن انھیں سے میری طرف دیکھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ان میں سے کس سے رجوع کروں، اتفاقاً مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر شیشے کا ایک کینس سا نظر آ گیا۔ اس پر حتمی توڑیاں تھیں "بھرتی کے لیے فارم میاں سے حاصل کریں۔"

میں اس کینس پر پہنچا تو شیشے کی دیوار کے عقب سے کھڑک نے میرا سر آٹا جائزہ لیا اور میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی تصدیق چاہی "بھرتی کے لیے آئے ہو؟"

میں نے انہماک میں سر ہلایا تو اس نے ایک فارم نکال کر دلو سے باہر رکھا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہاں بیٹھ کر اسے پُر کرو۔"

میں نے دیکھا قریب ہی چھوٹی سی ایک بڑکری خالی تھی۔ میں

نے اس پر بیٹھ کر اطمینان سے فارم پُر کیا۔ اس پر تین تصویریں اور شناختی کارڈ کی کاپی لگانے کی ہدایت تھی۔ وہ سب چیزیں میں لایا تھا۔ میں نے زندگی میں بھی اس شپتے سے کسی متحدہ کے لیے فارم نہیں بھرا تھا۔

میں فارم بھر کر اٹھا تو شیشے کے کینس میں بیٹھے ہوئے کھڑک نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میرے ہاتھ سے فارم لے کر اس نے باریک بینی سے اس کا جائزہ لیا پھر شاید مطمئن ہو کر ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہاں پر سبلی نمبر کے پاس چلے جاؤ۔ یہ فارم ساتھ لے جاؤ۔"

میں اس دروازے پر پہنچا۔ وہاں کوئی چھری ویفہ موجود نہیں تھا۔ کسی نے مجھے روک کر دروازے سے باہر ہی میرا انتظار لینے کی کوشش نہیں کی۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔ اتر کزنڈ کمرے میں ایک سوڈ ہونڈ آوی شاندار میز کے عقب میں بالکل فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہائی کی گہرہ روست کر کے ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے فارم اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے دو تین مرتبہ فارم کو اور دو تین مرتبہ مجھے دیکھا۔ آخر تصدیق چاہی "بھرتی کے لیے آئے ہو؟"

"جی سر" میں نے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔ "لیبر کے طور پر بھرتی کے لیے آئے ہو؟" اس نے مزید تصدیق چاہی۔

"جی سر" میں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ "بیٹھ جاؤ۔" اس نے اپنے سامنے پڑی شاندار کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں گویا کچھ ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

اس نے ایک زبردست ہنگامہ بھرا اور ایک بار پھر ذرا بلند آواز میں پوچھا "جیسا۔ تو تم لیبر بھرتی ہونے آئے ہو؟" وہ بائیں جانب غصے کا مالک تھا۔ میں نے گویا اس سے مرعوب ہوتے ہوئے سہم کر کہا "جیجی۔ جیسی سر"

"کیا راتوں رات تمہارے حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں؟" پر سبلی نمبر مجھے غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔

"نکستہ کیا مطلب سر؟" میں نے بوکھلانے کی ادکاری کی۔ تب اس نے اپنی میز کی دروازے ایک اخبار نکالا اور مجھے سے میری طرف پھینکا۔ اخبار میری گود میں آگرا۔

میں نے ایک نظر اخبار کی طرف اور ایک نظر سبلی نمبر کی طرف دیکھا گویا میری سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ معاملہ کیا تھا حالانکہ میں کم از کم اتنا تو سمجھ ہی چکا تھا کہ معاملہ خراب ہو چکا ہے۔ آخر میں نے اخبار اٹھا کر سیدھا کیا۔ بات میری سمجھ میں آئے میں نے ذکر کر دیا وہ بھی پوری ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ پر سبلی نمبر نے کیا دکھانا اور کیا بتانا چاہا تھا۔

یہ کتنی دیر پہلے کا وہی شام کا اخبار تھا جس میں پر سبلی نمبر کے قتل کے بارے میں تفصیلی رپورٹ نہایت نمایاں قسم کی

# طلم زادی

☆ ----- ایم۔ اے راحت

روشنی کی دُنیا سے دُور پُراسرار دُنیا  
کی کہانی جہاں مافوق الفطرت زندگی کا  
دور دورہ تھا۔ دو دُشمنوں کی عجیب  
داستان جنہوں نے جب ایک  
دُوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ  
بڑھایا۔ تو ایک ناقابل یقین کہانی نے  
جنم لیا۔

ایم۔ اے راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت: حصہ اول -/150

قیمت: حصہ دوئم -/150

مکتبہ القریش اردو بازار لاہور 2

سوریل کے ساتھ چھپی تھی۔ ان تصویروں میں مابدولت کی بھی  
ایک عمدہ قسم کی تصویر شامل تھی۔ خبریں جہاں میرا تذکرہ کیا تھا  
ہیں ان کی سطروں میں میرا تعارف بھی تھا۔ برٹول فیجرے سب کچھ پڑھ  
ریا درکھے ہوئے تھا اور یقیناً مجھے پہچان چکا تھا۔ صرف یہ نہیں  
سنے وہ اخبار بھی سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کوئی عجب کی بات  
نہیں تھی۔ پرنس میرا کے قتل کی خبر یقیناً اس کے لیے بہت  
مہم رہی ہوگی۔ وہ جس اخبار سنی کا ملازم تھا، میرا اس کے مالک کی  
ساتھی۔ وہ زندہ رہتی تو اس اخبار سنی کی آئندہ مالک بھی ہو سکتی تھی  
نہ انکان میں سے ایک تو ضرور ہوتی۔

میں نے مہری سانس لے کر سر اٹھا کر برٹول فیجرے کی طرف دیکھا  
روکش کی کہ میرے چہرے سے توڑی بہت شرمندگی کا اظہار  
جائے۔ پھر میں نے ذرا بے ہوشی سے کہا "ایک تو یہ  
بہت اخبار انسان کو کہیں نہ دکھانے کے قابل نہیں  
دیتے۔"

وہ بھی اب ذرا نرم لہجے میں بولا "میں نے صرف اس اخبار کی  
بے سی آپ کو نہیں پہچانا ہے" میں دیکھنے بھی آپ کو پہچانتا  
تھی۔"

"یہ تو اور بھی بڑی بات تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں شہر  
اس حد تک بدنام ہو چکا ہوں۔" میں نے افسوس سے کہا۔

وہ شاید میری بات پر توجہ دینے بغیر بولا "میں چند سال ہوئے  
سنی میں بھی کام کر چکا ہوں اور اس شے میں میری دلچسپی آج  
بہر قرار ہے میں تمام بڑے ہوٹلوں کے مالکان کو صورت سے  
انتا ہوں اور ان میں سے بعض مجھے بھی پہچانتے ہیں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر منسلب" میں نے معافی  
مانگنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وجاہت علی۔" اس نے کسی خاص گرجوئی کے بغیر میرا ہاتھ  
متے ہوئے کہا پھر ذرا آنکھیں میکیڑتے ہوئے بولا "اس ذرا سے  
کی کوچہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"گوں کی ذرا سے بڑی؟" میں نے نہایت معصومیت سے  
پوچھ لیا۔

"کلیں۔ میں لیبر کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے امیدوار ہیں  
آئیے۔" وہ جھٹ سے بولا "میرا خیال ہے آپ مجھے لوگوں کے پاس  
ماتم کے مذاق کے لیے وقت نہیں ہوتا۔"

"میں ذرا غلبہ کم کا کامداری تو ہی ہوں۔ میرے پاس  
نئی ہی وقت ہے لیکن مجھے فارغ آدمی پھر بھی نہیں کہا جاسکتا۔"

پھر میں نے کہا "میں نے آپ میں وقت ضائع کرنے تو بہر حال  
نہیں کرتے ہوں گے چنانچہ میرا سوال پھر بھی اپنی جگہ برقرار رہتا  
ہے۔" اس نے اپنی دانست میں ایک تیز و طرار اور شاطر انسان

بننے کی کوشش کرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا اور نہایت  
فحشہ لہجے میں پوچھا "میں آپ کی اس حرکت کا مقصد  
جاننا چاہتا ہوں۔"

"بہت تجسس ہے آپ کو؟" میں نے بھی ہلکے جھپکائے بغیر  
پوچھا۔

"یقیناً ہونا چاہیے۔" وہ بولا "میں یہاں ایک دن سے دار  
پوسٹ پر بیٹھا ہوں۔ اس قسم کا ڈراما میری نظر سے گزرے تو مجھے



بائیں بس اسی طرح اچانک اور آغاچہ معلوم ہو جاتی ہیں۔  
 "میں آپ کا یہ شوق پورا کرنے کے لیے آپ کو ملازم رکھا تھا۔ ہفتہ دس دن آپ لیبر کے طور پر کام کرتے تو آپ کی لپٹ ٹھکانے آجاتی۔ مگر کہ ہمارے پاس کام زیادہ سخت نہیں ہے نہ آپ جیسے آدمی کے لیے تو وہ بھی بہت سخت ہوتا۔ آپ کو یہ ہو جاتا کہ۔ ہیں سچ بہت بندہ مزدور کے اوقات۔ خواہ وہ پرنس انڈسٹری کا ہو۔"

میں دھڑکے سے نہیں دیا۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کر دی اور اسے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں اس کے بجائے میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "چلیں۔ آپ ایک موقع تو ہیں۔ شاید میں کوئی سچی ہی سیکھ سکوں۔" "جی نہیں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں رہ کر کہا "اب جبکہ میں حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہوں تو میں ایسا کر سکتا۔ میں کسی ایسے آدمی کو لیبر بھرتی نہیں کر سکتا جو مزدوری کرتے نہیں بلکہ کچھ دوسرے عزائم لے کر آتا ہے اس کے اپنے اہل نہ جانے کتنے لوگ ملازم ہیں۔ اسے ملازمہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"سوچ لیں وجاہت صاحب! میں نے قدرے معنی سمجھ لیے ہیں۔" "سوچ لیں وجاہت صاحب! میں نے قدرے معنی سمجھ لیے ہیں۔" "سوچ لیں وجاہت صاحب! میں نے قدرے معنی سمجھ لیے ہیں۔" "سوچ لیں وجاہت صاحب! میں نے قدرے معنی سمجھ لیے ہیں۔"

"مشاکب۔۔۔؟" اس کی پیشانی پر لہجہ پڑ گیا۔  
 "آپ نے حال ہی میں عمران نامی ایک شخص کو بھی ملازم رکھا ہے جو نہ صرف بی وی آرٹس رہا ہے بلکہ اسے سیرا کا دو سرا شوہر ہونے کا "اعزاز" بھی حاصل رہا ہے بات بھی خاصی دلچسپ نہیں ہے کہ ایک شخص اس انداز میں مزدور کے طور پر کام کر رہا ہے جو اس کے مرحوم سر کی فکر اور فی الحال اس کی سابق اور محتفل بیوی بھی اس کے ملازم شامل ہے۔"

وہ ذرا چونکا لیکن پھر کرسی سے ٹپک ٹپک کر گئی مانتا ہوا ہوا ہوا "وہ سابق شوہر ہے اصل صاحب! بہت سے آدمی بھی حیثیت سے "سابق" ہو جاتے ہیں۔ وہ تو ویسے بھی ہمیشہ کا کام اور بڑا فتنہ مند کے ہر میدان میں کامیاب رہا ہے۔ اس کے ملازم بہت خراب تھے۔ وہ کسی کی سفارش کے کر میرے پاس نہیں آتے۔۔۔ کی شہرت کیونکہ ابھی تک کسی نے کسی سے نہ کہا اس کے ملازم زنجیر ہے اور اسے خود کو یہ کہیں کچھ زیادہ سی ہے کہ وہ پچھانے میں اس لیے وہ اپنے آپ کو اس پر بھی اتناہ نسبتی کہ شہر میں کہیں کوئی چھوٹا سا کام کر لے کوئی معمولی نوکری یا کہیں ہین جھولوں کا خانہ بندی کا لے اس نے ہنر سیکھا جو شہر سے دور نہ چھپا کر مزدوری کرتا ہے۔ ہر مہینہ کچھ

اسوقت اس کی وجہ جاننے کی کوشش کئی چاہیے۔"  
 "وجاہت صاحب! یہاں کسی بھی قسم کا ڈراما آپ کی فہم سے گزرے تو کیا آپ اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔  
 "یقیناً۔۔۔ لیکن عام طور پر یہاں ڈرامے ہوتے نہیں ہیں۔ یہاں صرف کام ہوتا ہے۔"

"ڈراما بھی ایک کام ہے۔ اور بہت پیچیدہ کام ہے وجاہت صاحب! میں نے سیکھائے ہوئے کہا "اور میرا یہ ڈراما جو شروع ہونے سے پہلے ہی غلط ہو گیا ہے" یہ ایک طرح سے آپ ہی لوگوں کے فائدے کے لیے تھا۔"

"ہم لوگوں کے فائدے کے لیے۔۔۔؟" وہ قدرے حیران ہوا۔  
 "ہاں۔ میں آپ کے مرحوم مالک کی بیٹی کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر پرنس سیرا کا قاتل پکڑا جائے اور اسے اس کے جرم کی مناسب سزا مل جائے تو میرے خیال میں اس سے آپ کو بھی خوشی ہونی چاہیے۔" میں نے پیچیدگی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے خوشی تو ہمیں ہوگی۔ لیکن آپ نے یہ کام کب سے سنبھال لیا؟" وہ معقولیت سے بولا "یہ کام تو پولیس کا ہے۔"

"پولیس تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس قسم کے کام کس طرح انجام دیتے ہیں۔۔۔ اور اگر بعض کیسوں پر وہ صحیح طرح کام کر بھی لے تب بھی وہ شخص اپنا فرض نبھاتا ہوگی۔ وہ زیادہ گمراہی میں جانے کی کوشش نہیں کرے گی جبکہ میں شخص اپنے شوق کے تحت کچھ بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میں اس معاملے کے سارے سابق و سہاٹی کو سمجھتا چاہتا ہوں۔ شاید آپ اس معاملے میں میری کچھ مدد کر سکیں۔"

"میں بھلا کیا مدد کر سکتا ہوں؟" وہ حیرت سے بولا "میں نے پرنس سیرا کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ بھی ڈرامہ دور سے۔۔۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ انہیں کیوں قتل کیا گیا ہے، کون ان کا قاتل ہو سکتا ہے۔ پولیس ریکی پوچھ کر اور چھان بین کے لیے یہاں آچکی ہے اور کچھ افراد سے بیان لے چکی ہے جن میں 'میں' بھی شامل ہوں۔ میں نے انہیں بھی بتایا تھا۔ اس مسئلے میں اخبارات میں جتنے لوگوں کے بیانات آتے رہے ہیں اور جو قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں 'میری' معلومات بھی صرف اتنی تک محدود ہے۔"

میں ایک ٹپک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مختصرانہ انداز میں اپنی کرسی پر پھلپھولتے ہوئے بولا "دیے۔ ہائے داد۔۔۔ آپ یہاں لیبر کے طور پر بھرتی ہو کر کس قسم کی معلومات حاصل کرنے کی توقع لے کر آئے تھے؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" میں نے اعتراف کیا "لیکن کچھ

قیر میں بیٹھ نہایت اعلیٰ میٹرل استعمال ہوا تھا۔

حمارت کا بڑا سا گیت اس وقت کھلا تھا۔ وجاہت اپنا کانپا اندر چلا گیا۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے تھا لیکن اسے شاید اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔ اندر قطار در قطار دور تک بیٹھیں نصب تھیں۔ بہت سے لوگ کور آل ٹوئیاں اور دستاں پہنے ہاں موجود تھے۔ وہ کسی مختصی ادارے کے کارکنوں کے بجائے کسی لیبارٹری کے کارکن معلوم ہو رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے کور آل اور ٹوئیاں خاکی رنگ کی تھیں تاہم ان کے دستاں ویسے نہیں تھے جیسے بعض کارخانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ دستاں سرنگیل قسم کے تھے۔

عام حالات میں تو وہ سب اپنی اپنی عینوں پر پائے جاتے ہوں گے لیکن اس وقت ان میں سے بیشتر ایک کونے کی نشست کے گرد جمع تھے جس کے آس پاس کافی جگہ خالی تھی۔ کارکنوں کے اس بڑے سے دائرے کے وسط میں در حقیقت تین افراد سب کے مرکز نظر تھے۔ ان میں سے ایک تو بیٹھ فورن میں سپروائزر قسم کی چیز تھا۔ دو سراسر ایتھنا کارکن تھا اور اس کی حیثیت لیبرری کی تھی کیونکہ اس کے جسم پر باقی سب لوگوں جیسا لباس تھا۔ اس کی شکل مجھے کچھ مانوس سی لگی اور فورن ہی میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کون تھا۔ وہ بیٹھتے پرنس سمیرا کا دو سرا اور سابق شوہر سابق لیوی آرنسٹ عمران تھا۔ اس کی ٹوٹی لپی درپوں کی مدد سے اس کی گردن میں اٹھی ہوئی تھی اور اس کے گھڑی بال منتشر دکھائی دے رہے تھے۔

اس کی عمر چالیس کے قریب ہی ہوگی لیکن شاید باسعاد حالات اور بے اعتدالیوں نے وقت سے پہلے اس کی شخصیت کو ذوال کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی بچپانے بھاری اور جسم فری باکس دکھائی دے رہا تھا۔ کندھوں میں بھگاڑا تھا مگر کھڑا ہوتی ہوئی یہ حمارت ابھی تک خاصی شان دار تھی۔ وہ اس وقت بھی ایسے بھلے بھوم میں نمایاں دکھائی دے رہا تھا اور ایک عجیب شان بے نیازی سے تیسرے شخص کے سامنے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ تیسرا شخص جو اسے شطہ بار نظروں سے گھور رہا تھا احمد پرویز تھا۔

احمد پرویز کو کہہ قد میں اس سے چھوٹا اور معمولی شکل صورت کا مالک تھا لیکن وہ گینڈے کی طرح تجھے ہوئے جسم کا مالک تھا اور بہترین تراش فراش کے ٹیس سوٹ میں تھا۔ دولت اور مالکیت کا اپنا ایک رعب ہوا تھا۔ شاید اسی رعب کی وجہ سے وہ شخصیت میں کمتر ہونے کے باوجود عمران پر غالب نظر آ رہا تھا۔ عمران کو بڑا اپنی بے نیازی اور بے بنیاد اکڑوں سے اسے نچا دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سپروائزر تیز دندہ لمبے میں عمران کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کچھ سمجھا رہا تھا لیکن وہ شاید اس کا ایک لفظ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو جس اس وقت استہزائیہ سے انداز میں احمد پرویز کو گھورنے میں

ماورائے دینی بھی پلٹی رہے۔ میں نے اس کے مسئلے کو سمجھتے ہوئے اس کی اسے خداوند کیا تھا۔ اور بس۔! آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ سے میں معذرت چاہوں گا۔

دفعہ آخر کام کا ریزنگ اٹھا۔ وجاہت نے ریپور اٹھایا۔ انٹر ایجرنٹ والی آواز اتنی تیز تھی کہ اسے میں بھی سن سکتا تھا۔ فی شخص کر رہا تھا "سرا بلڈنگ نمبر تین میں سیکورٹی والوں کو دوبار کیا گیا ہے۔ شاید کوئی حذرور احمد پرویز صاحب سے ایجنسی کی پیش کر رہا ہے۔ آپ بھی وہاں پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔"

وجاہت بندوں سے نکل کوئی کی تیزی سے اچھل کر کرسی پر اٹھ کھڑا ہوا اور انٹر کام کا ریپورر رکھ کر اس پر خوش کی تیزی سے دو دائرے کی طرف لپکا جس کے پیچھے شکاری گتے لگے ہوں۔ یہ تین تین آگے آرام وہ قسم کی ملازمت کرنے والا ایک سوئٹ شخص جو فری باکس بھی تھا اور انداز و اطوار سے آرام طلب دکھائی دیتا تھا اتنی پھرتی سے حرکت کر سکتا تھا۔ وہ مجھے شاید فورن ہی بھول گیا تھا اور بارہ کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔

میرے خیال میں اس کا تھکا جھکا کر نے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپک پڑا۔ دھوئی بال میں اپنی اپنی میزوں پر کام کر رہے ہوئے کارکن کام چھوڑ کر حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ شاید مالک گزرا ہو کہ میں کسی خطرناک ارادے سے وجاہت کے پاس تھا اور وہ مجھ سے جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔ ہم آندھی کی طرح ان کی میزوں کے درمیان سے گزر گئے۔

میں نے کچھ سے کھوئی دو دائرے کے قریب ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے بڑے تیزی سے دوڑا اور دو دائرے کھول دیا اور یہ وجاہت کے پاس پہنچا ہی ہوا اور نہ شاید وہ دو دائرے کھولنے میں بھی ایک دو گنا تھکا کر آ رہا تھا اور سیدھا سی میں سے گزر جاتا۔ یہ بعد کی بات ہے۔ وجاہت کی حالت میں پہنچا۔

حمارت سے نکل کر وہ پختہ دوش پر دوڑنا چلا گیا۔ دوڑنا بھی سارے تو ہوا کے دوش پر اڑنا کہتا جا چکے تھے۔ میں اس کی رفتار پر حیرت دل میں اسے داد دے بغیر نہ رہ سکا۔ میں تو فری بغیر کسی قسم کی اس کے شائبہ میں چلا جا رہا تھا لیکن کوئی عام آدمی تو تھے شاید اس کی گرد کو بھی نہ پاسکے۔ احمد پرویز کے نام نے اچھے جسم میں گویا بجلی بھری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ فی الحال اسے کسی حد سے وارہا اٹھ کر دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اصل کی وجہ سے کسی کے نام کے بجائے کچھ اور رہی ہو۔

فری اس میں تیزی سے ایک شاخ ہی بہت بڑے رشتے پر پھیلی تھی۔ بلڈنگ نمبر تین میں پہنچنے پہنچنے وجاہت علی اپنے لگ۔ کو کھینچنے لے کر ہال میں ابھی خاصی دروز تھی۔ یہ حمارت بھی بھاگتا تھا اور اس کی طرح ایک بہت بڑے سینڈ سے مشابہ تھی لیکن یہ نہایت خوب صورتی، سلیف اور چہرے سے بچا ہوا تھا اور اس کی

معروف تھا۔ احمد پرویز جو اپا سے قراکوڑ نظروں سے نواز رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند لمبے پہلے ہی ان کے درمیان سخت الفاظ کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

وجاہت کو دیکھتے ہی مزدوروں کا ہجوم ایک طرف سے کافی کی طرح پھٹ گیا۔ احمد پرویز کو بھی فوراً ہی اس کی آمد کا احساس ہو گیا اور اس کی گیند سے جیسی گردن اس کی طرف گھوم گئی۔ میں جلدی سے مزدوروں کی آڑ میں ہو گیا تاکہ وہ مجھے نہ دیکھنے پائے۔ میں ممکن تھا کہ اس وقت اور اس جگہ وہ مجھے پہچان ہی نہ پائیں۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے اصل جھگڑے کو بھول کر اس حیرت انگیز سوال میں الجھ جائے کہ میں اس بدلے بدلے سے طبعی میں یہاں کیوں موجود تھا؟

وجاہت علی کے لیے ہجوم میں خود بہ خود راستہ بن چکا تھا۔ وہ تیزی سے ان تینوں کے قریب پہنچا۔ پروانز نے اسے دیکھتے ہی اپنی تقریر روک لی اور اس کے لیے میدان چھوڑ دیا۔ وجاہت نے نہایت مذہبانہ انداز میں احمد پرویز کو سلام کیا مگر اس نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ وہ عام حالات میں بھی ایک نہایت سنگین انسان تھا۔ اس وقت تو ویسے ہی مجھے میں تھا۔

وجاہت نے سلام کا جواب نہ پا کر بھی قطعاً کھینا ہونے بغیر پروانز کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سب لوگ احمد پرویز کے اس قسم کے سلوک کے عادی تھے "یہ کیا ہنگامہ ہے؟" وجاہت نے پروانز سے پوچھا۔

"سرا احمد صاحب نے چند لمبے پہلے عمران نامی اس شخص کو پہلی مرتبہ یہاں دیکھا ہے اور کھڑے بہروں نوکری سے نکال دیا ہے لیکن یہ یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

وجاہت علی نے یہ سن کر ایک طویل سانس لی۔ اس کی سانس دھمکنی کی طرح جل رہی تھی لیکن یہ بات سن کر گویا اسے اطمینان ہوا تھا اور اس کا سینہ کچھ آسکلی سے پھولنے لگا تھا۔ شاید وہ اس سے زیادہ سنگین معاملے کی توقع کے لے آیا تھا۔ احمد پرویز نے کچھ بولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ صرف نظروں سے ہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا اور کیا چاہتا تھا۔ وجاہت علی، عمران کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے لمبے میں رعب اور معقولیت کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کیشیڑ کے پاس چلے جاؤ۔ وہ ابھی تمہارا حساب صاف کرے گا۔"

"لیکن میرا قصور کیا ہے؟" عمران بارعب لمبے میں بولا۔ اس کی گردن اب بھی تپتی ہوئی تھی۔

"اگر بڑے صاحب تمہیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتے اور انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے تو پھر تمہیں قصور پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو۔ میں سرایہ داروں کی دھمکیوں میں

اردو کے شاہکار سفرنامے ضیاء ساجد ۵/-  
منتخب مشہور سفرنامے ضیاء ساجد ۱۵/-  
منتخب مشہور افسانے ضیاء ساجد ۱۵/-  
منتخب اعلیٰ افسانے ضیاء ساجد ۱۵/-

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2

آنے والا نہیں ہوں۔" عمران کی آواز اب کچھ بلند ہو چکی تھی۔ کوئی انصاف ہے کہ ایک شخص کو اس کا اس کی کوئی غلطی بتائے بغیر نوکری سے نکال دیا جا۔ داروں کے اسی روئے کی وجہ سے دنیا میں سرایہ دارا خلاف تحریکیں چلی آتی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر ہوتی آتی ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جب چاہو انہ کے طور پر بھرتی کرلو اور جب چاہو کان سے پتھر کرنا سرایہ داروں کا یہ ظلم نہیں چلے گا۔ مزدوروں کے سازشیں نہیں چلیں گی۔ میں اس کے خلاف احتجاج کر کورٹ میں جاؤں گا۔ اخبارات میں اس ظلم کی رپورٹ کا۔"

اس نے گویا باقاعدہ تقریر شروع کر دی تھی۔ مزدور لیڈر کا سا ہو گیا تھا۔ آخر اداکار تھا۔ نہ جانے کون سا پر اس میدان میں ناکام رہا ہو لیکن اس کا انداز تو وہ نہایت مختصر نوٹس پر کسی بھی کردار میں داخل جانے رکھتا تھا۔

اپنی تقریر کے اس ابتدائی سوز پر پہنچ کر ہی اس۔ کریں متوقع سی نظروں سے اپنے چاروں طرف کہ مزدوروں کو دیکھا جیسے وہ فوراً اس کی حمایت میں نعرے لگ کر دیں گے لیکن وہ مزدور یا تو بہت جلد منہ سے اس تقریر کے جھانسنے میں آنے والے نہیں تھے یا پھر تھے "اپنے حالات اور اپنی شرائط کار سے مطمئن خاموش کھڑے فکر فکر اس کی طرف یوں دیکھتے رہے دلچسپ تشاؤ پیش کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ اب وجاہت علی بھی کچھ چوسکون نظر آ رہے تھے احمد پرویز کے ہم غصہ کے آثار کچھ کم ہو گئے تھے۔ اب وہ کچھ اس ط

زندگی سے دلچسپی نہیں ہوتی۔

”جیسے یہ مکمل درحقیقت ہے۔ اس کے لوگوں کے سامنے مجھے صاف طور پر درحقیقت دی جا رہی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو تو ان سب کو اس بات کی گواہی دینی پڑے گی کہ مجھے یہاں دو حکمیاں دی گئی تھیں۔ اس نے اور گرد کھڑے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اب بھی اس کی طرف اسی طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ اپنی قواؤں کو بے قابو اور بے بندی کی سے دل میں اس پر ترس کھا رہے ہوں۔

”یہ سب تمہارے جنازے میں موت محبت سے شرکت کرنے آئیں گے۔“ احمد پر دیر غراوا۔

دجاہت مذہبانہ انداز میں اس کے سامنے ہاتھ بھیلانے ہوئے کسی حد تک گڑگڑانے کے سے انداز میں بولا ”سرا مجھے اس معاملے کو پنڈل کرنے دیجئے۔ میں اس سے بات کر لوں گا۔“ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بات بڑھا نہیں چاہتا تھا۔ بات بڑھانے والی تھی بھی نہیں۔ لیکن عمران کے دھنسنے سے یقیناً احمد پر دیر کی آغا بھجوت ہوئی تھی۔ عمران کا رویہ واقعی گلے پڑنے والا تھا۔ جس قسم کے اس کے حالات تھے ان حالات میں بعض لوگ اسی طرح بڑے ادا دلوں یا دولت مند لوگوں کے گلے پڑ کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ کوشش کبھی کامیاب بھی ہو جاتی تھی اور کبھی لینے کے دیئے بھی پڑ جاتے تھے۔

”تم اس معاملے کو کیا پنڈل کرو گے۔“ احمد پر دیر یک دم دجاہت پر برس پڑا ”تم نے ہی تو اس گند کو۔ اس سمیت گند جانے کہاں سے اٹھا کر ہمارے سروں پر مٹا دیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا یہ کون ہے؟“

”معلوم تھا سرا۔“ دجاہت ایک لمبے کے لیے سر جھکاتے ہوئے زور دھمے لینے میں بولا ”مجھے معلوم تھا یہ سابق کی بی بی آر شرافت اور میڈم میرا کا سابق شوہر ہے۔ اس کے حالات بہت خراب تھے میں نے سوچا۔“ بجائے اس کے کہ یہ کہیں اڑھو اڑھو اڑھو اڑھو کام کرنا یا محنت مزدوری کرنا پھرے اور لوگوں کو بتانا پھرے کہ ایک مشہور خاندان کی اور کوڑوڑی عورت کا سابق شوہر ہے ان میں ملازم رکھ لیا جائے۔ ایک طرح سے گھر کی بات گھر میں رہے۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ اگر اس نے یہاں شرافت کا کام کیا تو اسے کسی مستقل اسامی پر کسی دفتر میں بٹھا دیں گے۔“ میں شرافت ہی سے تو کام کر رہا تھا۔“ عمران چلائی یہاں کون سی بدعاشی دکھا رہا تھا۔ بس توج ان کی جھ پڑ گئی۔ اس نے احمد پر دیر کی طرف اشارہ کیا ”میں تو یہ صورت سے ہی غرت ہے۔ اب میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟“ صورت تو تبدیل کرنے سے رہا۔ یہ میرے اختیار میں نہیں؟ سراب یہ دار ہر بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔“

احمد پر دیر نے اب بھی اس کی بات کا براہ راست جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور دجاہت کو مخاطب کیا ”خدا

طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی انتہائی احمق انسان کی حرکات و سکنات پر اپنا فہم ضبط کر رہا ہو۔

اس سارے دل حسن بد عمل کے باوجود عمران نے محنت نہ ہاری۔ وہ شاید اپنی تقریر میں کچھ مدعا چھپنے کے لیے زیادہ عرصہ و خودی کے ساتھ اس کا سلسلہ جوڑنے کا حاکم و جاہت نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ ذرا غصیلے لیے میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”گھر مے کہیں کے۔۔۔ اگر تم نے زندگی میں کسی دھنگ سے کوئی بھی کام کیا ہو نا، تنہائی سے کہیں بھی کوئی کام کیا ہو نا تو تمہیں معلوم ہو نا کہ تمہیں یہاں نہیں جینے کے لیے پریشانی پڑ رہا گیا ہے اور اگر طالب علمی کے زمانے میں تم نے ذرا بھی دھیان سے پڑھا ہو نا تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو نا کہ پوری بشری حیرت کا مطلب کیا ہوتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ عمران احتجاجی لیے میں چٹا ”لیکن۔۔۔“ دجاہت نے اس کی بات کاٹ دی ”لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ پوری بشری حیرت کے دوران میں تمہیں کسی وقت بھی برخواست کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے کوئی وجہ بتانا بھی ضروری نہیں۔“

”پھر بھی مجھے کوئی نوٹس دینو تو ملتا ہے۔“ عمران کا احتجاج جاری تھا۔ ”نوٹس تمہیں نوٹس کی شکل میں مل جائے گا۔“ دجاہت بولا۔ ”جتنے دن تم نے کام کیا ہو گا، تمہیں اس سے ایک ماہ زیادہ کی تنخواہ مل جائے گی۔“

”پوری بشری حیرت میں ماہ کا ہوتا ہے۔ میں نہیں ماہ کی تنخواہ لے کر جاؤں گا۔“ عمران نے اڑھوڑا ہنسا کا مظاہرہ کیا۔ تب احمد پر دیر نے پہلی مرتبہ زبان کھلی اور دجاہت کی طرف دیکھ کر نہایت گھبرے گھبرے لیے میں اختصار سے بولا ”اسے ایک روپیا بھی دینے کی ضرورت نہیں۔ اسے ڈیڑھ ڈیڑھ کے انصاف اور باہر پھٹا دو۔“ ان الفاظ میں اس نے گویا بات ختم کر دی لیکن وہ وہاں سے گیا نہیں۔ وہیں کھڑا رہا۔ شاید وہ اپنے حکم پر عمل درآمد ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔

”میں ٹیکسز کے دواوازے پر نامور مرگ بھوک بڑا ہل کروں گا اگر مجھے ڈیڑھ ڈیڑھ کے انصاف دیکھنا پڑے۔“ دجاہت نے بھگتے بھگتے کہا کہ پرنس انڈسٹریز میں بیجا جام ہو جائے گا۔“ عمران نے جیج کر اعلان کیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس اعلان پر عمل درآمد کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

احمد پر دیر غارت سے منہ پاتے ہوئے غراوا ”تم سے پہلے بھی محنت سے کپڑے کوڑے اس قسم کے جھکڑے آڑا کر ہمارے لیے مسئلہ کھڑے کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمیں ان سے نمٹنا بھی طرح آتا ہے۔ ہمارے سامنے اس طرح بلیک میل بننے کی کوشش وہی کرتے ہیں جنہیں

کھینچوں گا۔"

وہ اب احمد پرویز سے "آپ" کے بجائے "تم" سے خطاب تھا۔ وہ اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ بے خوف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن حقیقت میں میرے اندازے کے مطابق اندر سے وہ خوف زدہ تھا۔ احمد پرویز نے اس کی طرف جس خفارت سے دیکھا اس خفارت سے شاید کوئی کسی کیزرے کوڑے کی طرف بھی نہیں دیکھتا ہوگا۔

"گلدھے کیسے کے۔" وہ دانت چیں کر بولا "پرنس سعید کا اب کون سا خاندان باقی رہ گیا ہے؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ میرا کے حصے کی دولت اور جائداد کے سلسلے میں جو بھی میرے راستے میں رکاوٹ بنے گا میں اسے عدالت میں دیکھ لوں گا۔" عمران نے وضاحت کی۔

"شروع شروع سے احمد پرویز نے سہلاتے ہوئے زہر لیے لیے میں کہا "کسی ایسے دیکھ کو نہیں ادا کرنے کے لیے تم ابھی سے سڑک پر کھڑے ہو کر چندہ جمع کرنا شروع کر دو۔" پھر اس نے کچھ قاصلے پر کھڑے ہوئے چار ٹکڑے سے مسلح منافضوں کو قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس آلہ کے پیچھے کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔"

گارڈز کے کدھوں پر کلا جھوٹے بھی لٹکی ہوئی تھیں لیکن عمران کے سلسلے میں انہیں کلا جھوٹوں کو ہاتھ لگانے کی بھی

امکان کے لیے عرض ہے کہ یہ شخص یہاں کام کرنے نہیں کسی سازش کا موقع تلاش کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ اسے کیس سے بیک بننا ہے کہ پرنس اعظمی میں میرا کے حصے کا مالک اس کی موت کی صورت میں اس کا شوہر ہوگا۔ اس کے علاوہ شاید اسے کچھ مصلحت گنڈے ہو کر بھی ملی ہیں جن سے شاید اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ میرا کے شوہر کا پرنس اعظمی میں ملازم ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ یہاں کچھ اس قسم کا بندوبست کرنے کے چکر میں آیا ہے کہ اپنے آپ کو پرنس اعظمی میں ملازم بھی ثابت کر سکے اور یہ دعویٰ بھی کر سکے کہ یہ ابھی تک میرا کا شوہر ہے یعنی میرا اپنی موت تک اس کی قانونی بیوی تھی۔"

یہ سب لے لے بھی ایک دلچسپ انکشاف تھا۔ وجاہت کی آنکھیں جیت سے جھلک رہی تھیں "یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟ ان کے درمیان تو کئی برس.... پہلے طلاق ہو چکی تھی۔ اخباروں میں خبریں آچکی تھیں۔"

"شاید اس کا خیال ہے کہ کلاذی کار وہ انہوں میں کوئی کسی وہ لٹی جی اور اب یہ اس بات سے کمر بستہ ہے کہ اس نے میرا کو طلاق دی تھی۔ شاید اب یہ ثابت کرنے کے چکر میں ہے کہ قانونی طور پر طلاق واقع نہیں ہوئی تھی اور میرا کے مرنے تک دراصل یہی اس کا شوہر تھا۔ اس طرح یہ بھی وراثت کی اس کھینچائی میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اس طرح یہ زیادہ نہیں ڈکھ حصہ ہی لے سکتے۔ یہ بہت بڑا شیخ چلی ہے اور اس کے شیخ بیل بین نے ہی اسے زندہ کی میں کچھ کہنے نہیں دیا۔ عقل سے انکا پیدل ہے کہ یہاں جیسے ہی اس نے اپنی وراثت میں رازدارانہ انداز میں لوگوں سے اس موضوع پر تبادلہ خیال بھی شروع کر دیا۔ میں یہاں بھی کھار دورے پر آتا ہوں لیکن مجھ تک یہ باتیں پہنچ گئیں۔ تم یہاں پرسنل فیکر ہو۔ روزانہ دفتر آتے ہو لیکن جیسے ان باتوں کی شاید ہوا ابھی نہیں لگی۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے تم غاصے چالیں ہوئے جا رہے ہو وجاہت علی!"

"مصلانی چاہتا ہوں سر! شاید میں اپنی آنکھیں اور کان پوری طرح کھلے نہیں رکھ سکا۔" وجاہت نے نہ است آہستہ آہستہ میں فوراً اپنی کو اتنی حقیقت کہ۔ یہ اس کی عقل مندی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ احمد پرویز کے چہرے پر اس کے لیے برہمی کے آثار کچھ کم ہو گئے۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک دم عمران کی اکڑوں کچھ کم ہو گئی تھیں۔ وہ ایک ایسا غبارہ دکھائی دیا جس کی کافی ہوا ایک بیک فلش کی تھی تاہم وہ جلدی صحت ہارنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم اپنی اہم مقام سوجھن کے معاملے میں وہ کافی ثابت قدم معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ فوراً ہی بول اٹھا "اس میں شیخ بیل والی کوئی بات نہیں ہے۔ تم لوگوں کو اس وقت پتا چلے گا جب میں جیسے قسطنطنیہ کی کو اور پرنس سعید کے پورے خاندان کو عدالت میں

لازوال کمائیوں کے خالق

انوار صدیقی

کلیک پراسرار ایڈوینچر ٹیل

برہمچاری

قیمت: 150 روپے



اردو بازار لاہور

ضرورت نہیں تھی۔ وہ تیزی سے عمران کی طرف بڑھے تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلایا "نہیں۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔"

اس نے جلدی سے ٹوپی اتار چھین لی اور کمر تل بھی اتارنے لگا۔ شاید وہ وہاں سے رُقعہ راز میں رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن اس نے اب اس کا موقع گنوا دیا تھا۔ چاروں گارڈز نے اسے کچھ اس طرح آن دیو چاہیے قسانی کر کے کو روکے تھے۔ انہوں نے اسے ڈنڈا ڈولی کر لیا اور باہر کی طرف لے چلے۔ وجاہت نے ایک بار پھر مدخلت کی کہ روک رہی کو شش کی اور احمد پرویز کو سمجھانا چاہا۔ "سر! ہمارے کارخانوں کی بھی یہ مداخلت نہیں دینی۔"

"نہیں اب! احمد پرویز نے اسے بھی جھڑپائی ۱۳ میں مداخلت شرقا کے لیے ہوئی ہیں۔ فیروز لفظوں کے لیے نہیں۔" وہ بھی گارڈز کے پیچھے پیچھے دوڑنے کی طرف چل دیا۔ اس طرف سے مزدوروں کی بھیڑ کالی کی طرح چھٹ گئی۔

"میری تین ماہ کی تحفہ تو دے دیں۔" عمران غماضوں کی گرفت میں جھولتے ہوئے چلایا۔

"وہ بھی تم عدالت کے در پے ہی لے لیاتے۔" احمد پرویز نے بلند اور ٹکڑک دار آواز میں کہا۔ میں اس وقت اپنی جگہ سے ٹھک کر ذرا اور زیادہ مزدوروں کی آڑ میں ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دو دروازے کی طرف بڑھتے وقت احمد پرویز کی نگرانی پر پڑ جائے۔

عمران اسی حالت میں دو دروازے کے قریب پہنچ کر ایوی سے چلایا "۱۳ چھانسنی! اللہ میری ایک سینے کی تحفہ ہی دے دیں۔" اس کے بارے میں بھی ہم چند سینے سوچیں گے۔ "احمد پرویز نے براؤن لینڈ جواب دیا۔ اس کے چہرے سے بدستور غیظ و غضب کا ہی اظہار ہو رہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس وقت وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"تم جیسے سرمایہ دار سیدھے جہنم میں جاتیں گے۔" عمران چلایا پھر اس نے حلق چماڑ کر غصہ لگایا "سرمایہ داری مردہ پاسبان! کوئی بیچید نہیں تھا کہ وہ اس حالت میں بھی تقرر شروع کر دیتا لیکن گارڈز نے اسے دو چار ماہرانہ قسم کے ہتھکڑے کر اس ارادے سے باز رکھا۔ کہیں کہیں سے مزدوروں کی دلی دلی سی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ مزدور شاید اس ارادے سے گارڈز اور عمران کو ٹھیکرے میں لے کر ہل دے تھے کہ اگر گارڈز کو کوئی دشواری پیش آئے تو وہ ان کی مدد کر سکیں۔

دو دروازے سے نکلنے ہی احمد پرویز دو عمارتوں کے درمیان بنی ہوئی ایک پتہ روش کی طرف مڑ گیا۔ شاید وہ اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا۔ گارڈز میں گٹ کی طرف جارہے تھے جو وہاں سے کالی دور تھا۔ کھلی جگہ میں آخر عمران ایک بار پھر چلایا "میں واپس آؤں گا۔ میرے مزدور رہنا ہوں! میں واپس آؤں گا۔ میں ان کارخانوں کا مالک بن کر واپس آؤں گا لیکن میں تم مزدور بھائیوں کے شانہ بشانہ

کھڑے ہو کر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کروں گا۔" وہ مزدور عام اور بڑے ان پڑھ مزدوروں کی نسبت کچھ سمجھ دار اور ذرا پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے لیکن بہت کچھ دار بہت پڑھے لکھے تو بہر حال معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ عمران کے اس کھسے پے لیڈرانہ جھانسنے میں آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے عمران کا یہ اعلان گویا لپٹنے سے کم نہیں تھا۔ میں نے کئی مزدوروں کو بلند آہنگ قہقہہ لگاتے سنا۔ اب چہ نگہ احمد پرویز بھی دور جا چکا تھا اس لیے وہ مکمل کر فیس رہے تھے۔

وجاہت اس گروپ کے پیچھے چلا جا رہا تھا جو عمران کو "دعہ دعہ" سے رخصت کرنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک فٹ پاتھ لار روش کے قریب ایک سوز کی پک اب کھڑی تھی۔ گیت چنگ کالی دور تھا اس لیے گارڈز نے یقیناً یہ سوچا کہ عمران کو ڈنڈا ڈولی کر کے وہاں تک لے جانا ایک اچھی جملی شقت ہوگی اس لیے انہوں نے اسے پک اب میں لا دیا اور خود بھی اس میں چڑھ کر عمران کو روک کر بیٹھ گئے۔ پک اب میں ڈرائیور موجود تھا۔ انہوں نے اسے گیت کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

وجاہت کو شاید اب بھی عمران سے ہمدردی تھی۔ وہ پک اب کے قریب کھڑے ہو کر اسے ہمدردی آمیز انداز میں ڈانٹتے ہوئے بولا "تم نے خود اپنے پاس پر کھڑائی ماری۔ تمہیں صاحب سے نہیں لکھنا چاہیے تھا۔"

"میں جیسی تمہارے صاحب کی۔" عمران نے جواب دیا۔ ری جل گئی تھی محض ایک لمحہ پہلے ابھی تک نہیں گیا تھا "میں اس سے کب لکھتا تھا۔ وہ تو مجھے تلاش کرتا ہو وہاں پہنچا تھا اور میری صورت دیکھتے ہی گویا اس کا فحشہ اڑ گیا تھا۔" پھر اس نے وجاہت کو اپنے گراں قدر مشورے سے نوازا "وہی تو لوگ اب اس کی اتنی کم گیری کرتا چموز دو۔ یہ اب زیادہ دن کے لیے تمہارا پاس بٹیر ہے۔ اس نے ان کارخانوں میں اپنا حصہ بچا دیا ہے۔ بس میرا حصہ کا فیصلہ ہوتا جاتی ہے پھر تم لوگوں کے سروں پہ نئے ناکار آئیں گے۔"

"ان میں تم بہر حال شامل نہیں ہو گے۔" وجاہت نے بدظن سے کہا اور پک اب کے پاس سے ہٹ گیا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس شخص کو کچھ سمجھنا فضول تھا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ پرنس انڈسٹریز کے بارے میں نازہ ترین مصلحت رکھتا تھا۔ اس سے بھی حدیث ہوتی تھی کہ وہ واقعی میرا کے کی دولت اور املاک کا مالک بننے کا خواب لے کر یہاں آیا تھا۔ مزدور کے طور پر بھرتی ہو کر اپنی دولت میں کچھ مصلحتوں کے ساتھ پورے کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جدوجہد میں کچھ ذرا بیانیہ سید اکسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وجاہت پک اب کے پاس سے ہٹ گیا۔ مزدوروں کی ٹلا کھر گئی اور وہ لوگ ست رفتار سے بلند گئے۔ فہرستیں کی ٹلا

کہیں تو میں آپ کا بہت سی عکسزادہوں کا۔" وہ بولے جیسے انداز میں بولا مصلوم نہیں لوگوں نے کس کس چکر میں یہاں کا رخ کرنا شروع کر دیا ہے۔

وہ تیز رفتاری سے اپنے آنس کی طرف واپس چل دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا لیکن میں نے اسے مزید گھٹ نہیں کیا۔ کافی آگے گھر گھر راستے بدھا ہو گئے۔ وہ اپنے آنس کی طرف مڑ گیا اور میں گیت کی طرف چل دیا۔ میں نے اس پر آپ کو گیت کے قریب ہی اندر کی طرف کھڑے دیکھا جس میں عمران کو لا کر لے جایا گیا تھا۔ گاڑی بھی گیت ہاؤس کے قریب کھڑے دو سرے گاڑی سے ہنس خانی کر رہے تھے شاید وہ چند لمبے پہلے ہی عمران کو باہر پھینک کر واپس آئے تھے لیکن جب میں گیت سے نکلا تو عمران مجھے دور دور تک کہیں نظر نہیں آیا۔ وہاں کوئی سوار ہی بھی میسر نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ شاید اسے کسی آئی جانی گاڑی میں لٹ مل گئی ہو۔

واپس جانے لگے۔ پہلے میں نے سوچا کہ جلد از جلد گیت تک پہنچنے کی کوشش کروں اور گاڑی جب عمران کو باہر پھینک چکے ہوں تو اس سے حصار ہو کر اس کا ہر دوں میں کر اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں لیکن میں نے فوراً ہی اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ عمران محض ایک لاپرواہ اور احمق سا آدمی تھا۔ وہ واقعی یہاں سے اپنے ہی چکر میں آیا تھا۔ میں جس قسم کی معلومات کے چکر میں تھا وہ مجھے اس سے حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔

دجاہت سے بھی کوئی امید رکھنا بے کار تھا۔ اب جبکہ وہ مجھے پہچان چکا تھا تو وہ مجھے ہنس اندر سڑ میں گھسنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر مجھے معلومات حاصل کرنا ہی ہوں گی تو میں اس کے لیے کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔ انہم میں نے پونہ ذرا دجاہت کو چھیننے کے لیے کھار کھار صاف کرتے ہوئے کہا "ہنس۔ تو پھر دجاہت صاحب! مجھے بھرتی کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اتنے کم پیسوں میں اتنا معزز مزدور آپ کو کبھی نہیں مل سکے گا۔"

وہ اب تک میری موجودگی سے بے خبر تھا۔ میرے مخاطب کرنے پر یہی طرح چونک چڑا اور خوف زدہ سے انداز میں میری طرف مڑا "آپ یہاں بھی آگئے؟ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی پیسے سے تر تھا۔

"میں ابھی تو خورای آیا ہوں۔ میں تو آنس سے آپ کے ساتھ ساتھ ہی ہوں۔ آخر مجھے یہاں ملازمت حاصل کرنی ہے۔ میں آپ کا چچا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے خوف زدہ سی نظروں سے لہذا گنگ خبر تین کی طرف دیکھا جس کے اندر سے اب سفید اشارت ہونے کی آواز میں سنائی دینے لگی تھی۔ جو مزدور باہر آئے تھے وہ بھی اب واپس اندر چلے گئے تھے۔ دجاہت کی نظر میں شاید اب بھی کچھ دیر پہلے کا خطر گھوم رہا تھا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اچانک میرے سامنے ہاتھ جوڑ دئے اور بوسے والے انداز میں بولا "خدا کے لیے میرا بیٹا چھوڑ دیجئے افضل صاحب! آپ کو نوکری کا مذاق سوجھ رہا ہے اور میری نوکری کا حق خطرے میں پڑی ہوئی ہے۔ اچھا صاحب! ابھی تو صرف توڑی بہت بھانڈا کر چلے گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے نام بہت سخت قسم کا شوکاراؤں ضرور جاری کریں گے۔ میں نے تو اپنی داستان میں عمران کو یہاں ملازم رکھ کر کئی کئی تھی۔ ابھی تو وہ نیکی ہی میرے گلے پڑی ہوئی ہے۔ اب آپ نہ جانے کس چکر میں یہاں گھسنے کی فکر میں ہیں۔ آپ تو یقیناً کھڑے بیروں مجھے یہاں سے نکلا کر ہی چھوڑیں گے۔"

"آپ تو بہت ہی بوسے آدمی نکلے دجاہت صاحب! میں تو کہتا تھا آپ مجھے پہچاننے کے بعد بھی ایک اعزاز سمجھ کر ہی مجھے ملازمت دے دیں گے۔" میں نے ناپوی سے کہا۔

مگر آپ مجھے مزید بے وقوف بنانے کی کوششیں ترک

ایم اے راحت

کے پراسرار اور ایڈ ونچر قلم سے

ایک شہکار ناول

تاریک وادی

جلد اول 150

جلد دوم 150

اردو بازار لاہور

کمپارمنٹ کی طرف بھی بڑھ گیا تھا۔ شاید وہ کمزری میں کسی انجینی اور محکوک چہرے کو دیکھتے ہی کن نکالنے کے لیے تیار تھی۔ مجھے اس احساس سے نہ جانے کیوں کچھ اطمینان ہوا کہ وہ زیادہ ڈرپوک لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ڈرپوک لڑکیاں مرد کے لیے بازگشتہ داری ہوتی ہیں۔

میری شکل دیکھ کر اس کا کھد کمپارمنٹ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ گرد میں آن کر اور اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے ڈرائیو تک سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا "سزات فرمائے کے لیے ابھی جگہ منتخب کی تم نے۔"

"میں اپنے آپ کو ماحول سے لاقابل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس بے ہودہ سی جگہ پر وقت گزارنے کا یہی ایک طریقہ میری سمجھ میں آیا تھا۔"

پھر میں نے گاڑی پہرائی دے کی طرف جانے والی چھٹی سڑک کی طرف سڑی تو وہ بولی "آپ سنائیں۔ کیسا رہا آپ کا دورہ؟ اپنے مقصد میں کچھ کامیابی ہوئی؟"

"کامیابی بس یہی ہے کہ ایک انجینی لڑکی کے ساتھ لمبی ڈرائیو اور گپ شپ ہو گئی۔ اس کے علاوہ تو اس سرخیں میں خاک ہی بچا گیا ہے۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔

"اچھی سی لڑکی کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر جانا ہی تھا تو کسی اچھے علاقے کی طرف تو جاتے اسے بھی صرف کارخانوں کی لمبی لمبی دیواریں اور اونچی اونچی بنیادیں دکھانے لے آئے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"لڑکی کو چرنگہ مستقبل میں بہت بڑی سرمایہ دار بننا ہے اس لیے میں اسے دکھانے لایا تھا کہ دولت ایسی جگہوں پر جنم لیتی ہے۔ برصالح۔ اب شرجیل کر کسی انجینی سی جگہ پر کھانا کھاتے ہیں۔ شاید اس طرح اس بے ہودہ دورے کی کچھ طاقت ہو جائے۔"

"میںیں آس پاس کسی پھپر رستوران میں کیوں نہ کھالیا جائے؟" اس نے تجویز پیش کی۔

"بھئی تم ابھی سے اپنی اوقات بدلنے کی مشق شروع کرو۔" میں نے شروع دیا "ایک منٹ پہلے تم خودی اس علاقے کو بے ہودہ قرار دے چکی ہو۔ اس کے علاوہ تم کا مران کے ساتھ ایک مرتبہ یہاں کھانا کھانے کا تجربہ بھی بیان کر چکی ہو جس میں کچھ ڈرائیو دن وغیرہ کے گھورنے کا تذکرہ تھا۔ اس کے باوجود تم دوبارہ یہیں کھانا کھانے کی تجویز پیش کر رہی ہو؟"

"میں اس قسم کے تجربات سے گھبرانے والی نہیں ہوں۔ ہمارے ہاں لڑکی کو اس قسم کے تجربات سے تو قدم قدم پر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔" وہ بے پردائی سے بولی۔

"اس کے باوجود میں نہیں چاہوں گا کہ تم یہاں کا کھانا کھا کر اپنے معدے پر اتنا بوجھ ڈالو جتنا کسی بھینس یا اونٹنی کو ڈالنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "کھانا ہم سرخیں کسی ڈھنگ کی جگہ پر کھائیں

گے۔"

"سرخیں پھر آپ کے اپنے ہو گئیں سے زیادہ ڈھنگ کی جگہ کن ہی ہو سکتی ہے۔"

"مگر تمہاری سرخیں وہ ڈھنگ کی جگہ ہے تو پھر وہیں سی۔" میں نے فوراً اس کی تجویز کی تائید کر دی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "لگتا ہے پرنس انڈسٹریز میں آپ کا دورہ بے کاری رہا ہے؟"

"اے۔۔۔ بس معمولی سا ایک تماشا دیکھنے کو مل گیا۔" میں نے کہا اور اسے عمران کے ساتھ پیش آنے والے دانے کے بارے میں بتایا۔

پوری بات سن کر وہ ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "بعض اوقات تو میں یہ سوچ کر حیران ہوتی رہتی ہوں کہ دولت و جائداد کے لیے آخر انسان کیا کچھ کر سکتا ہے؟"

"بھائی بھائی کا کھانا کھاتا رہتا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان اور کیا کرے گا۔"

"جب کوئی بہت دولت مند انسان اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے لواحقین کو کچھ کر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بھوکے بھیڑیوں کا ایک غول اس کی لاش کی چٹا بولی کرنے کے لیے بھجوت رہا ہے۔ وہ جس طرح اس کی دولت و جائداد کے حصے بخروں کے لیے ایک دوسرے کو بھینچوڑتے ہیں اس سے کم از کم مجھے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دولت و جائداد پر نہیں بلکہ مرنے والے کی لاش پر ہی بھجوت رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"کاش میں بتا سکتا۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا "میرا خیال ہے انسان کو جس مٹی سے بنایا گیا ہے اس میں سب سے زیادہ آمیزش لالچ اور ہوس کی ہے۔ بزرگوں نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ زر زمین اور زمین فساد کی جڑ ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ فہرست کچھ اور مختصر ہو گئی ہے۔ اب تو شاید صرف زر اور زمین فساد کی جڑ ہو گئی ہیں۔ زر اور زمین آپ کے پاس ہو تو زن خود بہ خود چلی آتی ہے۔ اس لیے اصل جھگڑا اب صرف زر اور زمین کے حصول کا رہ گیا ہے۔"

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے کمزری سے باہر بے آب و گیاہ میدان کو بھتی رہی پھر گردن گھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "وہ تو غیبیت ہے کہ پرنس سمیرا اپنے پیچھے وارثوں اور دعوے داروں کی فوج نہیں بھجودیتی ورنہ معلوم نہیں اس وقت کیسا میدان کارزار گرم ہو گا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ اتنی بہت سی دولت و جائداد اسے جس کے لیے نہ جانے کون کون کیا کیا کچھ کر سکتا تھا وہ کامران کو صرف ایک رات کی شادی کی وجہ سے مل جاتی بشرطیکہ وہ زندہ رہتا؟"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "یقیناً مل جاتی۔ اس کے لیے اسے دس دسین قاتل و دیوانوں کی ضرورت پڑتی۔ وہ بھی شاید سینھوں



نہیں دی تھی۔ دوسرے اس کے اور میرے درمیان چھوٹی سی ایک نیلی گاڑی عاکل تھی۔ زاویہ یکہ ایسا تھا کہ میں اس گاڑی کی آڑ میں تھا لیکن میں نے اسے صحیح طور پر دیکھ لیا تھا۔

میں جب اس موٹر کے قریب پہنچا تو میں نے بھی رفتار نہایت کم کرتے ہوئے گاڑی اسی سڑک پر موڑ دی۔ صنفیہ جوتھے ہوئے بولی "میں آپ کوئی ایسا 'شارٹ کٹ' اختیار کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں جو اصل راستے سے بھی لبا ہو گا؟"

"میں اس وقت شارٹ کٹ یا 'سلاٹنگ کٹ' کے پکڑ میں نہیں بلکہ اس شخص کے پکڑ میں ہوں جو آگے سیاہ گاڑی میں جا رہا ہے۔" میں نے اصل بات اسے بتادی "جب یہ گاڑی اس طرف مڑی ہے تو شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو۔" کچھ عجیب سا آدمی ہے۔ نیولے کی سی شکل والا۔۔۔"

"اتنی دور سے میں تو یہ بھی نہیں دیکھ سکی کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود بھی تھا یا نہیں۔" وہ ذرا سنبھل کر بیٹھے ہوئے بولی "میرے حال۔" اگر نیلا گاڑی کوئی شخص موجود بھی تھا تو آپ اس کے پکڑ میں کیوں نہ گئے؟ کیا آپ اتنے بدذوق ہو چکے ہیں؟ اگر تعاقب ہی کرنا ہے تو کم از کم مجھ سے بہتر کسی خوش شکل خوش ادا خاتون کا بیٹھے تعاقب کرنے کے لیے کیا یہ نیلا ہی نہ گیا ہے؟"

"کبھی کبھی کسی خوش شکل خوش ادا خاتون پر کسی نیولے کو بھی ترجیح دینی پڑتی ہے۔" میں نے اپنے اور اگلی گاڑی کے درمیان کافی فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ اس سڑک پر دیے بھی گاڑی سے رفتار سے ہی چلائی جا سکتی تھی۔ اگلی گاڑی میں نیلا نما شخص کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کون ہے یہ نیلا؟" صنفیہ نے پوچھا۔

"میں تو میں جانا جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "یہ کوئی خطرناک نیلا معلوم ہوتا ہے۔ پرنس ایڈمز کا داماد اور وہ تو بالکل بے کار رہا۔ شاید اس کا بیچا کر کے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

"اب بے چارے ہم جیسے غریبوں کو کیا معلوم کہ آپ کے لیے کام کی بات کون سی ہے۔" وہ غصی سانس لے کر بولی "مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ اس وقت میرا گھر بڑی قسطوں والی کار بچک دیکھنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ انسان کے جینٹ میں پہلے ہی چرے ہوڑ رہے ہوں تو وہ کار میں ادر ادر ادر چرکلا اور ڈنٹل و مڈیا وڈ اسکرین وینوس سے سمجھو نہ آکاں اچھا لگتا ہے۔"

"خود ہی نہیں ہے کہ یہاں انگریزی قسطوں والی کار بچک ہو۔ اپنے ہاں زیادہ تر کام ملکی اشیاں ہی ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو سڑک ہی دیکھ لو۔ خاص دیکھ گم کی ہے۔ پتھوں اور دھول مٹی کا ایک فہوارا جموہ ہے۔ مسطحے زیدی مرحوم نے اس گم کی سڑکیں دیکھ کر تو برسوں پہلے اپنا وہ مشورہ نہانہ شمر کہہ دیا

کی سٹریٹ اسٹ اسٹ خود ہی فراہم کر دیتی۔ دنیا میں قدرت کے اس طرح کے ٹھیل تھامے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی کوڑھ پڑتی لوگ راتوں رات نکال بھی ہو جاتے ہیں۔"

ایک بار پھر وہ چند لمحے کے لیے خاموش رہی۔ سڑک کی طرف بچتے ہوئے وہ نہ جانے کیا سوچی رہی تھی۔ دفعتاً وہ خود گاڑی کے سے انداز میں بولی "معلوم نہیں انسان پیدا ہی کیوں ہوتا ہے۔ اس دنیا میں اگر انسان نہ ہوتا تب بھی کیا فرق پڑتا؟ انسان نے واقعی زمین پر فساد پھیلانے کے سوا کیا کیا ہے؟"

"خدا خیر کرے۔" تم پر ڈپریشن غلبہ پا رہا ہے۔" میں نے گویا کوئی غصہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کبھی ڈپریشن نہیں ہوتے؟"

"ہوئے لگتا ہوں لیکن میں فوراً ڈپریشن سے بچتا چھڑانے کے لیے حرکت میں آ جاتا ہوں۔ زمین پر انسان کے پھیلانے ہوئے زہریلے اور مسمی اثرات کو کم کرنے کے لیے اگر میں ایک ڈرے کے برابر بھی کوشش کر سکتا ہوں تو میں اس میں لگ جاتا ہوں۔ اگر سوچتے کیجئے اور محسوس کرنے والے لوگ ایسا نہ کریں تو ڈپریشن انہیں کھا جاتا ہے۔ توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ میں اپنی ذمہ داری کوشش کو بھی حیرت کچھ کر تک نہیں کرتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ہر انسان تو آپ کی طرح نہیں ہو سکتا۔" وہ طویل سانس لے کر بولی "کچھ لوگوں کو اللہ نے ڈپریشن سے مطلوب ہونے کے لیے بھی پیدا کیا ہو گا۔"

یہی باتیں کرتے کرتے جب ہم ٹول پلازا سے گزر چکے تو ایک جگہ مجھے سامنے سے آئی ہوئی ایک گاڑی سپرائی دے کر گراس کر کے بائیں طرف ایک نیم پختہ سڑک پر اترتی دکھائی دی۔ یہ سڑک پر ہائی دے کو پختہ رشتی روڈ سے ملاتی تھی لیکن ابھی یہ باقاعدہ طور پر نہیں بنی تھی لیکن بے صبری چرکے ہم میں سے اکثر کا قوی شمار ہے اس لیے جو بھی یہ اس قابل ہوئی تھی کہ اس پر سے جوں توں گاڑی گزر سکے "یار لوگوں نے اسے روکنا شروع کر دیا تھا اس لیے اب یہ خاصی مبرا آنا حالت میں تھی۔

جس گاڑی کو میں نے اس سڑک پر مڑتے دیکھا تھا اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا اس کے باوجود میں نے اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو پہچان لیا کیونکہ وہ ڈرائیونگ سیٹ کے چرے میرے کا مالک تھا۔ اسے دیکھ کر کسی نیولے کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ اس شخص کو میں دو ایک مرتبہ اپنا تعاقب کرتے دیکھ چکا تھا جس کا نہ تو کوئی مقصد میرے ذہن میں آتا تھا اور نہ میں اس شخص کے بارے میں جان سکا تھا کہ وہ کون تھا اور کس کی ہدایت پر میرا تعاقب کر رہا تھا۔

اس وقت یہ اتفاق مجھے بہت خوشگوار محسوس ہوا کہ وہ سامنے سے آ رہا تھا اور اس کے باوجود اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک تو قاتلے قاتلے کی وجہ سے اس نے میری گاڑی کی طرف کوئی توجہ

"ہاں۔ واقعی۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی۔  
 "مجھے نہیں معلوم تھا کوئی خالی پیت بھی اتنا مدینہ تک ہو سکتا ہے۔"  
 "یہ وہانیت نہیں، خالص حقیقت پسندی ہے۔ میں یہ بات بہ قافی ہوش و حواس کہہ رہی ہوں۔" وہ زور سے کہہ بولی۔  
 "تو کیا اس واقعے عجیب ہوتی ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" وہ فوراً بولی "اور جو مجھ بھی غریب ہوتی ہیں وہ اور بھی زیادہ عجیب ہوتی ہیں۔"  
 "بھئی اب تم ہر وقت یہ اپنی غریت کا رونا رونا چھوڑ دو۔ اب تم ایسی غریب نہیں رہی ہو اور مستقبل کی تو تم مجھے بہت ٹھیک ٹھاک کہتم تھی کہ سرایہ دار معلوم ہوتی ہو۔ معلوم نہیں اس وقت اس بندہ حقیر کے لیے تمہارے جذبات کیسا رہیں گے یا تبدیل ہو جائیں گے۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔" وہ جلدی سے بولی "اور جہاں تک جذبات کا تعلق ہے تو وہ اور شدید ہو جائیں گے۔" سفرِ نہایت سست رفتاری سے جاری تھا لیکن ہم کافی فاصلے طے کر چکے تھے۔ منیہ کے ساتھ ہاتھوں کے باوجود مجھے احساس تھا کہ ہم کافی دور نکل آئے تھے اور شاید پونیر مشی روڈ پہنچنے ہی والے تھے۔ اس نامور اور سڑک میں کئی گھماؤ پھیراؤ بھی تھے۔ اچانک مجھے دائیں ہاتھ پر اس سڑک سے غاصے فاصلے پر ایک طویل و عریض محل نما مکان دکھائی دیا۔ میری نظر اس پر اچانک ہی پڑی تھی۔ شاید اسی لیے مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے حق و باطل دیرانے میں وہ مکان اچانک ہی زمین کے سینے پر ابھر آیا ہو۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے ذہن میں ایک کونرا سا لپکا محسوس ہوا۔ دراصل مجھے شیع شاہ کی فراہم کردہ ایک اطلاع یاد آگئی تھی۔ اس نے مجھے جمال سعیدی کے بارے میں رپورٹ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے پیرائی دے کے قریب ویرانے میں ایک شاندار محل نما بنگلا بنا رکھا ہے۔ جمال سعیدی مجید کریم کا قریبی دوست تھا اور ان کے درمیان باضابطہ اور درپردہ قسم کے کاہنہ باری تعلقات بھی تھے۔ اس کے علاوہ جمال سعیدی کے پاس پرئس ایڈیٹر سزنی کی دوسرے ملک کے لیے ڈیڑھ شب بھی تھی۔ اس کا یہ ڈیڑھ شب حاصل کرنا اپنی جگہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا کیونکہ اس نے یہ ایک راتے اور بے متانے ڈیڑھ سے حاصل کی تھی۔ بلکہ یوں کہنے کے فحش بھی تھی۔

یہ واقعہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ حیرت انگیز تھا کہ جمال سعیدی درحقیقت پاکستانی بھی نہیں تھا۔ برسوں پہلے وہ ایک ہندو ملک میں جنگ کے آغاز پر بناد گریس کے طور پر پاکستان آیا تھا مگر جلد ہی شاید تمام کھلی اور بے شمار شاہ وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گیا تھا۔ مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ یہ اسی جمال سعیدی کا مکان تھا کہ ابھی میں اس سے کافی دور تھا لیکن کھلی وقوعہ دی تھا جو

تھا۔ اسی چٹوں پہ چل۔" میں نے ایک لمبائی ماسٹری کی تھوکر کار ایک دم ایک خاصے ہی بڑے گڑھے میں چلی گئی تھی جسے میں بروقت نہیں دیکھ سکا تھا۔ چھوٹی موٹی گاڑی تو وہیں پھنس گئی تھی۔ گاڑی زوردار ہچکولے کے ساتھ گڑھے سے نکل آئی تو میں نے کہا "اس قسم کے راستوں پر انسان کی تو کیا شہر کی بھی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔"

"اور آپ ایسے بے ہودہ آدمی کے پیچھے جانے کے لیے ایسے راستوں سے گزر رہے ہیں۔" اس نے ناک بھونچا حال۔  
 "میں اس سے زیادہ بے ہودہ راستوں پر اس سے زیادہ بے ہودہ آدمیوں کے پیچھے بھی جا چکا ہوں۔" میں نے چڑھن لہجے میں کہا۔ میرے خیال میں سڑک کی شکست حالی میرے حق میں اچھی ہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ بخلا نما مقصص کی تمام تر توجہ ذرا نیچے پر ہوگی اور اسے نقاب کا احساس نہیں ہو سکے گا۔ دینے بھی وہ اپنے مقصد میں کردہ غبار کا ایک چھوٹا سا بادل چھوڑنا چاہتا تھا اور میں نے اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ بھی کافی رکھا تھا لیکن ایک نامناسب بات یہ تھی کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ مجھے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اسے نقاب کا احساس نہ ہو جائے۔ اس صورت میں وہ جہاں جا رہا تھا وہاں جانے کا ارادہ لٹو کر سکتا تھا۔

منیہ بولی "آپ کب تک بے ہودہ راستوں پر بے ہودہ لوگوں کے پیچھے اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے رہیں گے؟ آپ بے ہودگی کی دلیل سے نکلنے کے لئے دوسروں کی توجہ دے رہے ہیں لیکن کبھی اپنے بارے میں بھی سوچیں۔"

"چراغ تلے انداز میں رہنے دو۔" میں نے کہا "دیسے میرے اپنے خیال میں تو میری زندگی کچھ ایسی بے ہودہ بھی نہیں ہے۔ میری زندگی کا ہر لمحہ کوئی نہ کوئی مقصدیت لیے ہوئے ہوتا ہے۔"  
 "اودھ۔ مائی گا۔۔۔!" وہ کراہنے کے سے انداز میں بولی "اسے آپ مقصدیت کہتے ہیں؟"

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور کہا "جس میں کیا معلوم میں کیا کچھ کرتا ہوں؟"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" اس نے یکدم تسلیم کر لیا "ابھی تو میں آپ کو صحیح طور پر جانتی ہی نہیں۔ بہر حال۔۔۔ امید ہے جلدی جان بآزگی۔"

"ہاں۔ اگر اسی طرح میرے ساتھ دھتے کھاتی رہیں تو جلدی جان بآزگی۔"

"میں آپ کے ساتھ دھتے تو کیا ڈنڈے۔۔۔ جو تھکے حتیٰ کہ کوئی کھانے کے لیے بھی تیار ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔  
 "واقعی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا اور ایک بار پھر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ عجیب خواب ناک سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

حاصل کے کسی بھی دوڑنے سے کسی بھی سمت سے کوئی نکل کر اس بالکل پر آسکا تھا اور مکان کے چاروں طرف گھوم سکتا تھا۔ نیچے کا اور گرد و پیش کا سطر آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

مکان گویا اپنی چار دیواری تک ہی محدود نہیں تھا۔ چار دیواری سے باہر بھی چاروں طرف خاص دور تک سرسبز لان پھیلا ہوا تھا جس کے گرد ہیجی سی ایک خوب صورت ٹکڑے دار دیوار بنائی گئی تھی۔ اس سرسبز مٹی میں بھی رنگ رنگ پھولوں سے لدے پودے بار دکھا رہے تھے۔ مکان اور احاطے کے علاوہ اس بھولی لان کو بھی شامل کیا جاتا تو بہت بڑا رقبہ بننا تھا۔ کوئی عید نہیں تھا کہ محال سیدی نے اس زمین پر مفت میں ہی قبضہ کیا ہو۔ اس علاقے میں۔ بلکہ اس کے ارد گرد بھی بہت دور دور تک لینڈ ہافنگ کچھ زیادہ ہی سرگرم تھی۔ بہت بڑے بیٹانے پر زمینوں پر قبضے ہو رہے تھے کیونکہ ضروریات زندگی میسر نہیں اور جہاں میسر نہیں جھیں وہاں بھی کھینچ کر بااثر لوگ لے آتے تھے۔ راتوں رات بڑی بڑی ہشتیاں قیر ہو جاتی تھیں۔ زمینوں کے اصل دعوے دار کہیں اور بیٹھے روئے پینچے اور متحدے بازیاں کرتے رہ جاتے تھے۔ ہشتیاں سرکاری طور پر بھی منکوح ہو جاتی تھیں یہ بہت بڑا اور بہت منظم نا جائز کاروبار تھا۔

مکان کے سامنے پینچے تک میں نے گاڑی کی رفتار ریگنی کی حد تک کم کر دی تھی۔ اب مجھے اس کی پیشانی پر جلی حریف میں "تورنگ پیلس" لکھا دکھائی دیا۔ اپنی تازہ وسعت "خوب صورتی اور صفائی ستھرائی کے باوجود نہ جانے کیوں وہ مکان دیرانی کا آثار دے رہا تھا۔ حالانکہ یہودی لان تک کی گھاس اور پھول پودے خوب سرسبز اور تازہ تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی اچھی طرح نگہداشت کی جاتی تھی اور بہت اچھی طرح خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس بند قلعے میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ نیلا نما شخص کو بھی گاڑی سمیت گویا اس مکان نے نگل لیا تھا۔ گیٹ کچھ اس قسم کا تھا کہ اس سے اندر کی ذرا سی جھلک بھی نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔

میں مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کچھ آگے جا کر غیر ارادی طور پر رک گیا تھا۔ میرا سر مستقل طور پر مکان کی طرف گھوما ہوا تھا۔ گاڑی سڑک کے پتے جیسے پر پہنچ چکی تھی۔ یہاں کوئی باقاعدہ آبادی نہیں تھی۔ چاروں طرف جو کا عالم تھا۔ سڑک کی حالت تباہی تھی کہ اوھر سے کالی کانیاں گزرتی رہی جھیں لیکن شاید حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے ہی آمدورفت کم ہو گئی تھی۔ اس وقت تو دور دور تک کوئی دوسری گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

مکان کے گیٹ پر کوئی گاڑیا عام سا کوئی دوامتی چکی دار بھی موجود نہیں تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی باہر کو کریمینٹ کی ایک بڑی سی گلی موجود تھی لیکن اس پر بھی کوئی نہیں تھا۔ یہی کچھ عجیب

فتح شاہ نے مجھے سمجھایا تھا۔ نہ جانے کیوں چند لمبے کے لیے میرے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ دیرانے میں کھڑا یہ عقیم الشان مکان اپنے اندر ایک عجیب سی چاراسرائت لیے ہوئے تھا۔

میں بالکل بھول گیا کہ ایک لمحہ پہلے میری صفیہ سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔ وہ کیا کہہ رہی تھی اور میں کیسا محسوس کر رہا تھا۔ میری تمام توجہ اس گاڑی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی جس میں وہ نیلا نما شخص موجود تھا۔ وہ گاڑی مکان کی طرف مزید چلی گئی اور میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ سڑک اس مکان کے سامنے تک نہ ہوا اور نہ ہی لیکن وہاں سے اس کا جو حصہ پنیور مشی روڈ تک جا رہا تھا وہ نہایت عمدہ طریقے سے بنا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ صرف ایک نہیں اس سڑک سے اس مکان تک بھی چھوٹی سی ایک ہزار اور سبب سبب سڑک بنی ہوئی تھی۔ اس مکان میں آمدورفت شاید پنیور مشی روڈ کی طرف سے ہی رکھی جاتی تھی۔ اس وقت شاید وہ نیلا نما شخص کسی اتفاق کے تحت سپرائی وے کی طرف سے آ رہا تھا۔ شاید قدرت کو اس سے میرا سامنا کرنا تھا۔

گاڑی مکان کے سامنے صرف ایک لمبے کے لیے رکی تھی۔ پھر خود کار سے انداز میں گیٹ کھل گیا تھا اور گاڑی اندر چلی گئی تھی۔ گیٹ اسی دوائی سے بند ہو گیا تھا جس دوائی سے کھلا تھا۔ قافلہ خاصا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ گیٹ کے صعب میں کوئی موجود تھا یا نہیں۔ میں نے رفتار کچھ اور کم کر دی تھی اور پھر اس مکان کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ صفیہ نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا کہ میں بہت خاص توجہ سے مکان کا جائزہ لے رہا ہوں۔ وہ بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

مکان کے طرز تعمیر اور ڈیزائن میں تو کچھ ایسی جدت نہیں تھی لیکن وہ داخلی اور دوسرے خوب صورت چھوٹے سے پتے ہوئے کسی پھولے موٹے قلعے سے کم نہیں تھا۔ کچھ اور قریب پہنچ کر مجھے اس کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ اس کی اصل دو منزل عمارت بھی کچھ کم لمبی چوڑی نہیں تھی۔ اس سے بھی زیادہ رقبہ اس کے ارد گرد احاطے کی صورت میں موجود تھا جس میں شاید لان وغیرہ ہو گا۔ کچھ درخت چار دیواری سے باہر بھی جھانک رہے تھے چار دیواری زیادہ بلند نہیں تھی پھر بھی اپنی ساخت اور میٹرل وغیرہ کی وجہ سے کسی قلعے کی فیصل سے ہی مشابہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس پر چاروں طرف غباردار آلودہ کچنگا بھی موجود تھا جس کی وجہ سے گویا اس کی اونچائی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اوپر کی منزل پر کچھ عجیب سی ساخت کا ایک اونچا سا کمرہ بنا ہوا تھا جو کسی حد تک واضح طور سے مشابہ تھا۔ کچھ عید نہیں تھا کہ دو واضح دائری کا کام رہا ہو۔ اس میں عجیب سی ساخت کے دو ش دان سے بے بنے ہوئے تھے تاہم ان میں سے کسی کمرے کی ٹال یا کوئی ٹافٹ جھانکنا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دوسری منزل کے چاروں طرف خاص چوڑی ایک ڈنگے دار بالکل نیلی بھی بنی ہوئی تھی۔ دوسری

درمیان چھپنے سے پہلے گاڑی بھاگ سکتا تھا اور شاید وہ مجھے دیکھ کر بھی نہ پانتے۔ صرف کچھ دیر کے لیے صفیہ کے اندیشے کے ماحول انگریزی غلوں والی کارخیز تک جاری رہتی۔ لیکن میں نے اس سے بچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ خواہ مخواہ اپنے کم کو شکوک بنانے والی بات ہوئی البتہ اس دوران میں میرا غصہ پائل نہایت تیزی سے گھوم کپار ٹنٹ سے میری جیب میں ختم ہو گیا تھا۔

منہ کا ہاتھ ابھی تک میرے بازو پر تھا اور اس کی گرفت سخت ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً خوف زدہ تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً پوری پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کے چہرے سے حیا نہ ہو لیکن اس کے اعصاب یقیناً تنے تھے میری مسکراہٹ سے اسے حوصلہ ملا۔ اس نے بھی مسکرا کر کوشش کی اور میرا بازو چھوڑ دیا۔ بظاہر وہ ریلیکس ہو کر چمچہ اٹا ابھی کافی تھا۔

اس دوران میں دونوں ممکن ہزار گاڑیوں سے اتر کر گاڑی کے دائیں بائیں دونوں کڑیوں پر پہنچ چکے تھے۔ ایسا چرے پاٹ تھے لیکن گھنٹیں انہوں نے اپنی مستعدی سے قیام ہوئی تھیں جیسے وہ قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے اہل تھے اور انہوں نے پڑے زور شور سے شاقب کے بعد کسی مہم مجرم کو پکڑا تھا۔ میں نے بنی دبا کر اپنی طرف کی کڑی کا پیشہ کر دیا۔ منیہ نے اپنی طرف کی کڑی کا پیشہ نیچے نہیں کیا۔ اسی طرف کڑے ہوئے شخص نے اس کی فرمائش بھی نہیں کی۔ اس کا اندازہ کہ ایسا تھا جیسے گاڑی کے حرکت میں آتے ہی وہ دھند فارتکب کر دے گا۔ بغیر کسی وجہ کے ان کا یہ جارحانہ قابل غور تھا۔

”غیرت تو ہے؟ یہ آپ لوگ اس طرح کہیں اضعاف  
کیوں کرتے آ رہے ہیں؟“ میں نے بے غوثی سے لیکن نرم  
شائستہ لہجے میں پوچھا۔

”تجربہ اور کس لیے کھڑا ہے؟“ میری کھڑکی پر جھکے  
مضض نے بھی غالباً اپنی دانست میں خاصی شائستگی سے ہرچیز  
اپنے لیے کیے اکھڑیں پر اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔

ہم غلطی سے دوسرا آگے ہیں اور اب راستہ ہماری  
 نہیں آتا ہے ہم سوچ رہے تھے شاید مکان سے کوئی نکلے  
 سے راستہ پوچھ لیں۔ اگر ہم سیدھے جائیں تو کیا پونہ روشی  
 پہنچ جائیں گے؟ میں نے اپنے لیے میں ایک وقت بے فکر  
 سا کی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس معزز شری کی طرف  
 سوچا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تو اسے ڈرنے کا  
 ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ آج کل انہی معزز اور  
 شریوں کی اکثریت زیادہ پریشان رہتی ہے، جنہوں نے کوئی  
 نہیں کیا ہوتا تھا۔

یہی بات تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ اندر کسی مسلح کافہ موجود ہوں  
گئے۔ بظاہر کسی کے ٹھہرنے آنے کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے کچھ  
یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی غیبی آنکھ ہمیں دیکھ رہی تھی۔

اس احساس نے صرف میرے ہی اصحاب میں گونجی نہیں  
 کی بلکہ شاہ صفیہ کو بھی اضطراب میں جگا کر دیا۔ وہ ہولے سے  
 میرا بازو دبا کر ہوئے ہوئی "آپ رک کریں گئے؟ چلیں نا۔"  
 تب میں نے گردن جھکا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے  
 ہوئے کہا "دور گئی؟"

”ہاں“ اس نے چٹکاتے ہوئے اعتراف کیا پھر سر جھٹک کر بولی ”عجیب بات ہے! اظہارِ مہربان ڈرانے والی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ اس کے باوجود خوف محسوس ہو رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

”بعض جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں خوف کے جراثیم ہوا میں موجود ہوتے ہیں۔ انسان کی حساسیت اگر زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو وہ جراثیم اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔“ میں نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

اسی لمحے تیزی غراہٹ کے ساتھ تقریباً ایک وقت دو گاڑیوں کے انجن بیدار ہوئے پھر ان کے آگے بڑھنے کی تراز ستائی دی۔ تراز مکان کے عقب سے اس حصے سے نکلی تھی جہاں میری نظر درپے سے آتے ہوئے بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ پلک جھپکتے میں مکان کے دونوں پہلوؤں سے دو گاڑیاں برآمد ہوئیں اور نہایت تیزی سے میری گاڑی کے آگے اور پیچھے پہنچ کر اس طرح رکیں کہ تاز بڑی طرح پختہ سڑک پر چڑھا اٹھے۔ میں ممکن تھا گاڑیوں کی کچھ دیر بھی چلی ہو اور تھوڑا بہت دھواں بھی بلند ہوا ہو لیکن میری نظر گاڑیوں کے ہانڈوں کی طرف نہیں، سیٹوں کی طرف مچی تھی۔

گازپوں میں سے ایک کھلی جپ بھی اور دوسری ایک پرانے  
ماڈل مگر نہایت عمدہ کنڈیشن کی لینڈ کروڑ۔ دونوں میں صرف دو دو  
توی موجود تھے۔ ایک ایک ڈرائیج کر رہا تھا اور ایک ایک ڈرائیج  
کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ دونوں فاضل افراد خود ناک قسم کی چھتیں  
سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک کے پاس تو شاید اوزی سب مشین مکن  
تھی۔ ان میں سے تین برائش اور سرخ و سپید تھے۔ صرف لینڈ  
کروڑ ڈرائیج کرنے والا کلین شیو اور غالباً مغربی لباس میں قلمروہ  
بھی سرخ رسید تھا۔

مجھے یقین تھا کہ گاڑیاں ڈرائیو کرنے والوں کے پاس بھی ہتھیار ضرور ہوں گے مگر وہ فوری طور پر نظر نہیں آئے تھے۔ ان کی گاڑیاں جو کئی میری گاڑی کے قریب آئی تھیں، میں نے ایک لمحے میں ان کا جائزہ لے لیا تھا۔ گوکہ انہوں نے نہایت ہنری رفتار سے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے میرا راستہ دوکا تھا اور وہ ٹھوڈا رہی مکان کے صعب سے ہوئے تھے جہاں سے میں کسی کی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں چاہتا... تو ان کے

”آپ پورا درستی دودو بعد میں جانے گا۔ پہلے امارے ساتھ بیٹس میں جانے گا۔“ اس نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

”کیوں؟“ میں نے پیشانی پر ہل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”م کو آؤر ڈالا ہے۔“ اس نے سپاٹ لیمے میں جواب دیا۔ وہ زیادہ ہماری بھڑکاپا تبسم نہیں تھا لیکن اس کی جسمانی ساخت سے سخت جانی میاں تھی۔ اس کا منہ کھڑے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے اسٹے کے استعمال میں مہارت حاصل تھی۔ میں نے ایک نظر آگے اور پیچھے دیکھا۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور اپنی اپنی جگہ تھے بیٹھے تھے لیکن ایک تک ہماری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاڑیوں کے انجن بدستور اشارت تھے۔

”کس نے آؤر دیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بڑے خان نے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور اس کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے خاص چیز اس کی آنکھیں ہی تھیں۔

”بڑا خان کون ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

وہ یقیناً میرے سوالوں سے زنج ہو گیا۔ اس کے سپاٹ لیمے میں کچھ کرنگلی آگئی اور وہ گن کو خفیہ سی حرکت دیتے ہوئے بولا ”اندرا چلو اور خود دیکھ لو۔“

دلچسپ بات یہ تھی کہ میری آمد کے وقت میرے اندازے کے مطابق یہ حادثہ افراد مکان کے عقب میں اپنی گاڑیوں ہی میں موجود تھے اور مجھے مکان کے سامنے رکے چند لمحوں کے لیے ہی میں مکان کے اندر کسی طرح نہیں دیکھ بھی لیا گیا تھا اور مکان کے باہر عقب میں موجود افراد تک یہ علم بھی پہنچ گیا تھا کہ ہمیں گھیر کر اندر لایا جائے وہ حادثہ جاق و جہد افراد بلا تاخیر اس حکم پر عمل درآمد کرانے بھی آن پہنچے تھے۔ اس کا مطلب تھا مکان کے باہر بظاہر کسی کے نظر نہ آنے کے باوجود سڑک پر نظر رکھنے اور باہر موجود آدمیوں تک حکم پہنچانے کا کوئی نہایت عمدہ اور موثر نظام موجود تھا۔

مجھے پہلے ہی یہ جانے کیوں کہ اسی قسم کی کارروائی کی توقع تھی لیکن اتنی تیز رفتاری کی توقع میں نہیں کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے چند منٹ تو مکان کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے گا۔ میں خود مکان کے اندر جا رہا تھا اور نہ میں اس وقت مزاحمت اور ان لوگوں سے سننے کی کسی حکمت عملی پر غور کرتا۔ یہ تو ایک طرح سے میرے دل کی مراد برآئی تھی البتہ اب صرف یہ دعا کرنے کی ضرورت تھی کہ ہمیں زندہ سلامت اس مکان سے نکل آنے کا موقع بھی مل جائے۔ غصہ تو ہر حال مول لیتا ہی تھا۔

”کیا ہمیں گاڑی سے اترنا پڑے گا؟“ میں نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ عقاب نے آنکھوں والے فحش نے جواب دیا ”گاڑی بیٹس کی طرف منڈول لیکن بھانسنے کی کوشش کی تو بہت بُرا ہوگا۔“

”میں کیوں بھانسنے کا؟ میں کوئی چر ڈاکو تو نہیں ہوں۔“ میں نے ذرا غصی کا اظہار کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دو دونوں پہلو ہٹ گئے لیکن سڑک کے کنارے کھڑے رہے۔ منوں کا سرنگھانہ گاڑی کی طرف ہی رہا۔ آگے پیچھے دونوں گاڑیاں ذرا کھٹک کھٹکیں۔ اب میں آسانی سے گاڑی مکان کی طرف موڑ سکتا تھا۔ میں گاڑی گیٹ تک لے گیا۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے پکڑ کاٹ کر میرے عقب میں رہیں۔

میری گاڑی کے گیٹ تک پہنچے ہی گیٹ تیزی سے کھل گیا۔ ڈرائیور نے میں دو آدمی دونوں طرف کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی کھنسی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے گاڑی اندر لانا اشارہ کیا۔ میں نے ایک لمبے سوچا پھر تن بہ تقدیر ہو کر جوا کھیلنے فیصلہ کرتے ہوئے گاڑی اندر لے گیا۔ میرے عقب میں گیٹ خوب خود بند ہو گیا۔ اس کے خود کار نظام کا لیور شاہد گیٹ ہاؤس میں قفل ہمیں گھیر کر لائے والی دونوں گاڑیاں باہر ہی رہ گئیں۔

ہم ایک نیم دائرے میں گھومتے ہوئے ایسے ڈرائیور نے سچ چکے تھے جہاں ایک وقت میں پندرہ بیس گاڑیاں آگے کھڑی ہو سکتی تھیں جبکہ اتنی ہی تعداد میں گاڑیوں کی دوسری بھی بن سکتی تھی۔ میرے انجن بند کر کے گاڑی سے اترنے کا گیٹ ہاؤس سے ایک اور فحش نکل کر ہمارے قریب آچکا تھا۔ صفیہ کے قریب کھڑا ہو گیا جو دوسری طرف کے دروازے سے ا رہی تھی۔ وہ صفیہ پر نظر رکھنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاشٹوف تھی۔ وہ بھی بارش کی سن ہو گیا اور مضبوط کام تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں زیادہ تر لوگ ملتی جلتی شکلوں اور لمبے حلیوں والے تھے۔ گو کہ ان کی کوئی مخصوص دوری نہیں تھی نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ وہ کسی کی ملٹی فو ذاتی سیکورٹی فورس کے آدمی تھے۔ وہ یقیناً بے حد مستحکم تھا اپنے آپ کو بہت با اختیار بھی محسوس کرتے تھے شاید ان کا ایک دائرہ اختیار تھا جس میں ان کی حکومت چلتی تھی۔ کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ہمارے ہاں قدم قدم پر ایک حکومت متوازی کتنی تعداد میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں موجود تھیں۔ اتنی بھڑکی ہوئی ہو وہاں حکومت کی دال کیسے گل سکتی تھی۔ مجھے مزید حیرت اس وقت ہوئی جب گاڑی سے اترنے کا استقبال کرنے والے ایک کاشٹوف برادر کا ہاتھ سیدھا مجھ کوٹ کی اس جیب میں چلا گیا جس میں مشین منسل موجود دوسرے ہی سے میرا مشین منسل اس کے ہاتھ میں تھا جبکہ اس دوسرے ہاتھ میں کاشٹوف پہلے ہی سے موجود تھی۔ اسے سناٹے میں اس کی نظر بھی عقاب ہی معلوم ہوئی تھی۔ کبھی ہاتھ سیدھا اسی جیب کی طرف گیا تھا جس میں ہتھیار موجود اس نے میری کسی اور جیب کو ٹوٹنے یا غلطی لینے کی ذمہ داری نہ لی۔ میں جانتا تھا اسے جیب میں ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ دینا سے ایک طرف بہت جانا یا پھر ذرا طاقت سے اس کا ہاتھ روک دینا لیکن اب جبکہ میں نے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر کر

پر تجوری کے تھلوں سے مثلاً دو ڈاکٹر نظر آئے جن پر ہند سے تھے ان لوگوں کا اپنے مطلب افراد کو اندر لانے کا طریقہ بڑا محفوظ اور ساختگ تھا۔ باہر والے محافظوں نے ہمیں گیت سے اندر دھکیل دیا تھا اور خود باہری رہے تھے۔ چار دیواری کے اندر والے محافظوں نے ہمیں مکان کے اندر دھکیل دیا تھا اور خود باہری رہے تھے۔

ہم نے اپنے آپ کو ایک طویل و عریض اور آراستہ و بیراستہ ہال میں پایا لیکن یہ آرائش قدیم اور قبائلی طرز کی تھی۔ فرش پر دھڑا ہوا کالین دیواریں پر آرائشی نقاشی تھی، پھولے پاپوں والی رنگین اور منقش چوڑی کرسیاں، حتیٰ کہ بنی لائٹ بھی پرانی اور شاہانہ سی ساخت کی تھیں۔ میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا تھا کیونکہ ہال میں دو کوئی تیس قابلین تھے جن کا ہر اندر سے کوئی حارس استقبال کے لیے برآمد ہونے والا ہوگا۔

بیرا اندازہ درست ہی تھا۔ ہال کے پچھلے عریض دروازے کا دھڑا خوب صورت رنگینی پر وہ لہلہا اور تقریباً دیباہی ایک بارشیں تھیں پر آمد ہوا جیسا ہم اب تک دیکھتے آ رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی حرز زار زیادہ تھی۔ اس کے بالوں میں کچھ سفیدی جھلک رہی تھی اور اس نے زیادہ بھاری عزم کن نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس کی دھکیلی ڈھالی قیاس پر کر کے گرا ایک کن جھلٹ پر پہنچا ہوئی تھی جس میں صرف ایک ہودا دوازہ بھول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی کرکٹ بھی نہیں تھی جتنی ہم باہر والوں کے چہروں پر دیکھ چکے تھے۔

اس طویل و عریض ہال کا ہر حصہ آراستہ تھا اور اتنے ہی فرش پر قابلین بٹے ہوئے تھے ایک طرف دیوار کے ساتھ ساتھ آگے جانے کے لیے راست چھوڑا گیا تھا اور دوسری طرف فرش ٹھہرا رہا تھا۔ ایک طرف خوب صورت چوڑی بیٹنگ سے آراستہ میزچیاں اوپر جاری تھیں۔ یہ کراٹا ہوا ایک ٹانوی ذرا رنگ بوم تھا۔ کم انیم اور رسمی ممانوں کو ہمیں رہیو کر کے "یہیں بٹھا کر" ہمیں خاطر مدارات اور بات چیت کر کے رخصت کر دیا جاتا ہوگا۔

ایک چیز جس نے سب سے زیادہ میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی وہ بائیں ہاتھ پر ایک بڑا سا دروازہ تھا جس میں کوئی پٹ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے محض اٹھا ہوا اس کی طرف زیادہ توجہ سے نہیں دیکھا کیونکہ سامنے سے آنے والا شخص ہماری طرف آیا تھا۔ میں نے صرف ایک نظری اس دروازے کی طرف دیکھا تھا اور ایک نظر میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ دیکھا جاسکتا تھا وہ مجھے نظر آ گیا تھا۔ اس دروازے سے میزچیاں بیچے جاری تھیں اور ان کے انتظام پر دو دروازہ تھا۔ دو دروازہ بند تھا لیکن میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ خانے کا دروازہ تھا۔

خانے کی میزچیاں کا دروازہ شاید غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے آنے والے کے آثار سے ہوا۔ میں نے نوکر دروازے کی طرف بھاڑا پر ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی لیکن اس کی نظر فوراً دروازے کی طرف گئی اور اس کی چٹائی پر شکلیں ابھرائیں۔

قادران کی کینچا میں آئی گیا تھا تو میرے خیال میں اس قسم کی شخصی فضل تھیں۔ اس سے شروع ہی میں ہرگز پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر مجھے مزاحمت یا غماز آرائی والا انداز اختیار کرنا ہوتا تو اس کے لیے باہر کی مکمل فضا ہی بہتر تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ منہ میرے ساتھ تھی جو اس قسم کے معاملات میں اٹاڑی تھی۔ ابھی تک مجھے یقین تھا کہ اس مکان میں میرا یہ دورہ کچھ ایسا خطرناک ثابت نہیں ہوگا اور میں منہ سمیت بہ خیر عافیت واپس آجاس گا اس لیے میں کوئی ہنگامہ شروع کر کے اس امکان کو دھم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جس شخص نے میری جیب سے مٹھیں ہاتھ نکالا تھا وہ خاصی شانگل اور نرمی سے بولا "جب آپ واپس جائے گا تو آپ کا ہاتھ آپ کو مل جائے گا۔"

یہ ایک اچھا لہجہ تھا کہ کم از کم اس محافظ کے خیال میں میری واپسی کا امکان موجود تھا۔ میں نے بے پروائی سے کہا "مٹھیں لایا ہے۔" اگر واپس نہ بھی ملا تو میں یہ لے جاؤں گا۔ "میں نے دوسرے محافظ کی آدھی سب مٹھیں کن کو چھوڑا۔" یہ زیادہ زبردست اور چاہ کن گئی ہے۔

ان کے چہرے پر بات ہی رہی۔ ان میں غالباً حس مزاح نہیں تھی اور اگر انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ میں یہ بات سنجیدگی سے کر رہا تھا تو شاید انہوں نے اس پر کوئی رد عمل ظاہر کرنا غیر ضروری خیال کیا تھا۔ منہ جلدی سے میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرا محافظ بھی آگیا تھا۔ اب ہم تین مسلح افراد کے درمیان کھڑے تھے ان میں سے ایک نے ہمیں طویل و عریض برآمدے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

لے چڑے لان سے گزر کر اور برآمدے کی سرسری میزچیاں چڑھ کر ہم دو کنوین طرز کے ایک بلند دھالا اور مضبوط چوڑی دروازے تک پہنچے جس پر محض کا کام بھی کیا گیا تھا۔ یہ مکان فنی قسم کے طرز تعمیر کا مجموعہ تھا۔ ایک طرح سے چوں چوں کا مرہ تھا۔ شاید بنوانے والے کو جس طرز تعمیر کی جو بھی چیز ابھی گئی تھی وہ اس میں اپنائی گئی تھی۔ ہر حال چوں چوں کا مرہ ہوتے ہوئے بھی اس میں خوب صورتی اور شان و شوکت کے علاوہ مضبوطی جھلک رہی تھی۔

ہمارے ساتھ آنے والے جس شخص نے مجھ سے مختصری بات کی تھی اس نے جیب سے ایک سنہری چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ اس نے نہ تو کمال بیل بجا کی تھی اور نہ ہی دستک دی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ایک لمبے کی چمکا ہٹ کے بعد ہم اندر چلے گئے منہ نے اب مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ تینوں محافظ باہری رہ گئے۔ دروازہ ہمارے حصب میں بھی سی کلک کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کا آٹا نہایت چوڑا، مضبوط اور بڑے بچے ساخت کا معلوم ہوا تھا۔ وہ باہر سے چابی سے اور اندر سے غالباً قیوں کے چلاب سے کھٹا تھا کیونکہ مجھے اس

مگر کہ یہ مگر ایک خوب صورت زردار چادر میں چمپا ہوا تھا اس کی موجودگی محسوس کی جا سکتی تھی۔

اور اس وقت پر گاڑیوں کے سارے جمال سپرد دراز تھا اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسا ہم کا شیوہ تھیں۔ خیالی بینکروں وغیرہ میں بادشاہوں کو دیکھتے ہیں۔ میں نے جیشید کریم کے دفتر میں دیکھا تو وہ خیر تھا ایک اچلے چلائے بیس سوٹ میں تھا۔ ایک تو اس کی حسامت کسی ہاتھی سے کہ تھی اور سے سوٹ بھی ڈھیلا ڈھالا تھا واقعی خیر معلوم ہو اس وقت وہ ایک اور طرح کے ”خیمے“ میں تھا۔ یہ طبع کپڑے کا ایک ڈھیلا ڈھالا گاڈن تھا لہذا وہ کنگے میں سو موٹی پین اور انگلیوں میں جیتی چتوں کی انگوٹھیاں تھیں۔ وہ فعل فعل کرتے جسم پر چمپا کی تنوں میں پڑے ہوئے تھے۔ دیکھی لہذا میں پانی کی لہروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں کے دامن بائیں۔ سورج چل جانے کے لیے کمرے ہوتے تھے اس کے دائیں دو محافظ ایمری فانیہ تھیں لیے کمرے تھے۔ ان کے لیے اب بھی تقریباً وہی تھیں جو ہم اب تک دیکھتے آ رہے تھے۔ وہ سعیدی کے پاس اس قسم کے لوگوں کی شاید کوئی چوٹی موجود تھی۔ باہر ہم نے جو ایک طبع شیونہ زبان دیکھا تھا غلطی سے بھرتی ہو گیا تھا۔ ممکن ہے پہلے وہ بھی ایسا ہی تھا۔ میں کسی وجہ سے اس نے داڑھی صاف کرا دی ہو۔

اس کے علاوہ اس گھر میں شاید بغیر کمرے کے بھی کوئی رواج نہیں تھا۔ اب تک جمال سعیدی کے علاوہ مجھے کچھ کمرے اٹھائے ہوئے ہی دیکھا تھا اور کمرے بھی کوئی ممبرانہ موٹی نہیں۔ کلا شرف ”اوزی اور ایم کی فانیہ بھی چیز تھیں۔ لگتا تھا سب لوگ کہیں حجاز جنگ پر رہ رہے۔ اس کمرے میں بھی ”جہاں مجھے لانے سے قبل میرا اکا مشین مائل بھی لے لیا گیا تھا جو ”ان گلوں کے سامنے مسکین کی چیز معلوم ہوتا“ اس کے علاوہ میرے ساتھ ”غیر مسلح اور ”غیر لڑاکا“ قسم کی لڑکی تھی وہیں بھی جمال دامن بائیں دو گاڑ خوف ناک قسم کی کمرے میں اٹھائے تھے۔

ہمت سے لوگوں میں ہمت عجیب و غریب قسم ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ ہمت ہی دولت اور ہمت حاصل ہو جانے کے بعد بھی انسان کا بیچا نہیں چھوڑا ہے بادشاہوں کی سی رہائش اور ان کی طرح نشہ جمال سعیدی کا کہیں کہیں رہا ہو پھر ایسے کالو کی جس مصلحت جدت اور قدامت کے درمیان مصلحت ایک دلچسپ ہوتا تھا۔

میرے ساتھ قتلے والے شخص نے مجھے اشارہ جمال سعیدی کے قریب اس کے عین سامنے پہنچ جانے اس کی خاموشی دامت پر عمل کیا۔ صنف بدستور میرا

وہ کچھ بڑا پلاس اس کی بڑا ہٹ میرے لیے ناقابل فہم تھی لیکن یہ اندازہ آسانی سے ہو گیا تھا کہ اس نے کسی کی بے پروائی کے بارے میں ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ بوجھا کر سوچ کر ایک سوچ دیا۔ بظاہر وہ بھی دوسرے سوچوں کی طرح لائن سوچ ہی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے دبانے پر محض سرسراہٹ کی سی آواز کے ساتھ دوار کے اندر سے ایک اور چمپا سی دوار برآمد ہوئی۔ اس نے کنگے دروازے کی جگہ کو ٹکڑیا۔ اس پر بڑی سی ایک خوب صورت پینٹنگ بھی موجود تھی۔ کسی بہت بڑے آبشار کا خوب صورت منظر تھا۔

مجھے جانے والی بیڑیاں چمپا تھیں۔ خانے میں جانے کا راستہ نیچے سے تو بڑی تھا ”اب اور سے بھی بند ہو گیا۔ وہ پینٹنگ دوار پر ہی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند لمحوں پہلے اس دوار میں کوئی دروازہ موجود تھا۔ مجھے یہ بات کچھ عجیب محسوس ہوئی کہ آتے والے شخص نے دروازہ کھلا دیکھ کر تو ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن اسے بند کرنے کے طریقے کے بارے میں کسی رازداری سے کام نہیں لیا تھا۔ اس نے اسے ہمارے سامنے بند کر کے گویا اس راز سے آگاہ کر دیا تھا کہ اسے کھولنے بند کرنے کا سوچ کہاں تھا۔ شاید اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ہم اس کی بے کار دوائی دیکھ رہے تھے اس کے خیال میں شاید اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور خاصی شائستگی سے بولا ”آپ میرے ساتھ آئیں۔ آپ کو سردار نے بلایا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم اس کے پیچھے چل دئے۔ صنف بدستور مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی گویا ہم بڑی بیڑیاں ہوا والی جگہ سے گزر رہے تھے اور اسے اندیشہ تھا کہ مجھ سے چھڑنے جائے۔ اس کے گداز ہاتھ میں اس وقت حرارت کی کمی تھی اور اس کی جگہ خفیف سا ارتعاش محسوس ہوتا تھا ہم وہ کوشش کر رہی تھی کہ چمرے سے خوف زدہ نہ نظر آئے۔

اندر سے وہ مکان اور بھی زیادہ پر شکوہ اور شاندار معلوم ہوتا تھا۔ شاید یہ اس کی شاندار آرائش کا تاثر تھا۔ ہمیں کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی چمرے سے گزر رہے ہوں یا بدستور بڑے قابل سردار کے محل میں پہنچ گئے تھے جس نے رہائش اور آرائش کے سلسلے میں قدیم اور جدید روایات میں امتزاج پیدا کر دیا تھا۔

لاؤنج تھا ایک رازداری سے گزر کر ہم جس کمرے میں پہنچے وہ بھی پہلی بال کی طرح طویل و عریض تھا لیکن اس کی آرائش زیادہ شاندار تھی۔ یہاں زیادہ سا زرد سامان موجود تھا۔ یہاں کچھ اس طرح دیواروں کے ساتھ ترکی ساخت کی ہمت سی کرسیاں رکھی تھیں جیسے اس بال میں دیوار لگتا ہو۔ اس کی تصدیق تو فی الحال نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ کرسیاں خالی تھیں لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہاں واقعی کئی نہ تک شاندار قسم کا ایک تخت موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اسے قوم کے ہمت سے گھر سے آواہم دیا گیا تھا۔

بھگ گیا ہوں۔ کسی سے پوچھا جا رہا تھا اس لیے رک گیا تھا  
مستشہ؟ میں نے گویا اس کا نام جاننے کے لیے سوالیہ انداز میں  
جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”بہت خوب۔ بہت خوب۔“ اس نے حانت سے سر  
ہلایا۔ وہ گویا کسی اچھے شعر بردار دے رہا تھا۔ بھر دہرا سیدھا ہو کر  
بیٹھ گیا اور گرمی سانس لے کر ہلا ”ہمارا یوں انبیوں کی طرح کھٹکھٹو  
کرنا مت ہی نا مناسب معلوم ہو گا جبکہ ہم ایک دوسرے کو کم از کم  
اس حد تک تو جانتے ہی ہیں کہ ایک دوسرے کا صحیح نام لے کر  
عاطف کر سکیں۔“

”اچھا۔“ میں نے حیرت کا اظہار کیا ”مجھے یہ جان کر خوشی  
ہوئی کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا کہ  
ہمارے درمیان وہ واقفیت کب ہوئی تھی۔“

”بھئی کبھی ملاقات کے بغیر بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔“ میں نے  
محسوس کیا کہ اس کے لیے میں دھیرے دھیرے سر دھری آ رہی  
تھی۔ شاید وہ مجھ سے سنجیدی کی توقع کر رہا تھا۔  
”یقیناً۔ یقیناً۔“ میں نے سر ہلایا ”تاہم اگر آپ مجھے اپنا نام  
یاد دلا سکیں تو آپ کی بڑی فراز ش ہوگی۔“

”وہ تو میں یاد دلا ہی دوں گا لیکن میں چاہتا ہوں آئندہ آپ  
میرے نام کے علاوہ بھی کچھ باتیں یاد رکھیں افضل چوہدری  
صاحب! اس کے لیے میں کچھ تنکھا پائی آگیا۔ اس کے سونے  
سوتے سر خاور مرطوب ہو نوزن پر لٹکا سونچاؤ تھا۔

”اوہ۔ ائی گا۔“ آپ تو واقعی میرا نام جانتے ہیں۔“ میں  
نے آنکھیں پھلکا کر حیرت کا اظہار کیا ”میرا خیال ہے اصولاً آپ  
مجھے بھی آپ کا نام یاد آنا چاہیے۔ میرا خیال ہے آپ جلال  
سیدی صاحب ہیں؟“

”آپ کی بڑی فراز ش کہ آپ نے اس ناچز کو پہچان لیا۔“ وہ  
قد سے ذہر لے لیے میں ہولا ”میرے پاس بہت سے ایسے نسخے ہیں  
جن سے انسان کی یادداشت بہت تیز ہو جاتی ہے لیکن وہ میں اتنا ہی  
ناگزیر حالات میں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔“

”آپ کے آواز اجداد شاید حکیم تھے؟“ میں نے نہایت  
سنجیدی سے سہلاتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔“ وہ ہلا ناتی ہولا ”لیکن ان کی حکمت ذرا دوسری  
قسم کی تھی۔ ان کی حکمت کا حلق بڑی بوٹوں سے نہیں تھا۔“

اسی اثنا میں ایک طرف کا دروازہ کھلا اور وہی نیلا نما شخص  
اندر آ گیا جس کا قاقب کرتے ہوئے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ آج  
میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شکل واقعی نیولے  
جیسی لیکن آنکھیں سانپ جیسی تھیں۔ وہ کافی چینی اور فیشن ایبل  
پینٹ شرت اور بلیئر میں تھا لیکن وہ بہت سی سوکھا مراد سا توی  
تھا۔ کپڑے اس کے جسم پر کچھ بون ٹھہرتے تھے جیسے کسی ڈھانچے  
پر ٹکا دئے گئے ہوں مگر اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ  
اسے ڈھانچے کی طرح بے جان نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔  
ایک ناقابل بیان قسم کی قوت تو اس کی آنکھوں میں ہی مقید

ہے کہ وہ ہرے ساتھ تھی۔ ہم اس جوڑے کی طرح اس  
کے سامنے جا کھڑے ہوئے جسے کسی غلط مسلح جرم میں پکڑ کے لایا گیا  
تھا۔ جمال سیدی کے بچے نے گویا اس کی آنکھوں پر پتھر جکے جارہے  
تھے اور اسے ان کو اٹھانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ خاموشی  
رسمی سنجیدی کے ہمارا جائزہ لے رہا تھا۔

ہمارے ساتھ آنے والا بڑی عمر کا شخص اگلے قدموں  
مذاہب کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے گردن جھکا کر اس کی طرف  
دیکھا اور پوچھا ”کیا اب مجھے بارشاد سلامت کے سامنے کورٹش بھی  
بالا ناچے؟“

وہ ہکا بکا سا نہ گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب  
دے۔ خود جمال سیدی نے اسے اس مشکل سے نکالا۔ اس کی  
دلچسپی ختم نہ کرنے کا سکوت درم پر ہم کر دیا۔

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ ایسی ہی بھاری اور  
دلچسپی آواز میں ہولا۔ غصیت کے برعکس اس کی آواز دلکش  
یہ بعض سونے لوگوں کی آواز بڑی باریک ہوتی ہے۔ وہ بولنے  
پر محسوس ہوتا ہے کہ ہاں کے وجود میں خفیہ چوہا فراز کر رہا ہے  
ان جمال سیدی کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ اس کی آواز کسی پیشہ ور  
را کا سے زیادہ دلکش ”بھاری اور گنجیلی تھی۔ اس سے پہلے میں  
نے اسے جید کریم کے دفتر میں اس سے بحث دھکا دھکا کرتے سنا  
۔ اس وقت اس کی آواز اتنی اچھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔  
یہ جیروں کے اندر چھاؤ، موڑ اور موقع محل کے اثرات ہر چیز پر  
لگتے ہیں۔

پھر اس نے اپنے قریب کی دو کرسیوں کی طرف اشارہ کیا  
”یہ جا بٹے۔“ اس کے لیے سے یہ تو اندازہ ہوتا تھا کہ اردو اس  
ازبان نہیں تھی لیکن وہ نہایت عمدگی سے اسے بولنے پر قادر  
ہو گیا تھا۔ ہم بیٹھ چکے تو وہ ہولا ”مجھے نے نہ صرف یہ جانتے  
وہ آپ کو ذمت دی ہے کہ کون سا جتنس آپ کو میرے اس  
بہ خانے کی طرف لے آیا تھا؟“

اس کا مطلب تھا کہ جو جی میں نے باہر اس کے مکان کے  
سنے گاڑی ہوئی تھی اسے اندر بیٹھے بیٹھے معلوم ہو گیا تھا کہ میں  
ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کے آدمیوں  
میرے پاس میں پیغام مل گیا تھا اور چند منٹ بعد ہمیں اس کے  
درمیں پیش کیا جا چکا تھا۔ اس کا مطلب شاید یہ بھی ہو سکتا تھا کہ  
ان میں کسی دوسرے گھبراہٹ کا جو سامنے والی موڑ کو فیرہ پر نظر  
لگنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ میں نے ہال میں چاروں طرف نظر  
ڈال کر شاید کسی مایوس کے طور پر استہلال ہونے والا ہی دی سیٹ  
خود ہو لیکن مجھے کسی ایسی ہی دی یا کوئی اسکرین دکھائی نہیں دیا۔  
”مجھے نہ تو کوئی جتنس تھا اور نہ ہی میں آپ کے مکان کو دیکھنے

وہ اس طرف آیا تھا۔ میں تو راستہ بھول کر اس طرف آ نکلا  
۔“ میں نے خاموشی شاکت بلکہ کسی حد تک مہذبانہ کچھ میں  
سب دیا ”میں نے اپنی دانست میں یونیورسٹی رڈ کی طرف جانے  
وہ شاکت کٹ اختیار کیا تھا لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ



تھی جس کا احساس فوری طور پر اس طرح ہوا کہ اس نے گہری نظر سے منہ کی طرف دیکھا تو منہ نے جلدی سے ایک بار پھر میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جیسے کہیں جنگلوں کی ٹھنک رہی تھیں۔ اس کے علاوہ نہ جانے کیوں اس کے دھانچا نما جسم میں غیر معمولی قوت متبیہ محسوس ہوتی تھی حالانکہ اس نے مجھ سے مصالحت بھی نہیں کیا تھا۔

وہ ہوا کے ایک ٹھیک رفتار جھونکے کی طرح کمرے میں داخل ہوا تھا اور جمال سعیدی کے "تخت شامی" پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرائے کے بعد میری طرف دیکھنے لگے۔ وہ دونوں ایک دلچسپ تصادف کی تصویر تھے۔ جمال سعیدی نعل نعل کرنا ایک چھوٹا سا پھاڑ تھا اور وہ سرخاڑیوں کی ملا۔ انہیں اکٹھے بیٹھے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں مل کر ایک خطرناک جوڑی بنے تھے۔

جمال سعیدی پیار بھرے انداز میں نکلنا نما شخص کا کندھا چھوئے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "اس کے نام سے آپ واقف نہیں ہوں گے لیکن صورت آشنا ضرور ہوں گے افضل صاحب یہ ضرور عام ہے۔"

اس نے اس کا صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔ اس کی حیثیت واضح نہیں کی کہ وہ کون تھا؟ اس کی کیا حیثیت تھی۔ مجرورہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ضرغام سے مخاطب ہوا "افضل صاحب راستہ بھول کر ہمارے قریب خانے کی طرف آ گئے تھے ضرغام!"

دونوں نے ہم آہنگ ہو کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ دونوں کی توازیں بھی بہت مختلف تھیں۔ میں نے اپنے کان ذرا تھپتھپا کر محسوس کئے لیکن فوراً ہی اپنے آپ کو سمجھا پا کر اس میں توہین محسوس کرنے یا ناکہ کھانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے شخص وقت گزارا یا اسے ذرا الجھائے رکھنے کی خاطر جو انہی سیدھی باتیں کی تھیں ان میں تھوڑی بہت شکستہ آرائی کا حق اسے دینا چاہیے تھا۔ کئی بات یہ تھی کہ مجھے صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے بھوت اس کے سامنے میں چلیں گے۔ وہ میرے اندازوں سے زیادہ باخبر آدمی نکلا تھا۔

ضرغام کھرکھرائی کی آواز میں بولا "میں نے سہرا کی دے پر مجھے سامنے سے آتے دیکھ لیا تھا۔ شاید میری صورت دیکھ کر یہ راستہ بھول گئے ہوں۔"

میری یہ خوش فہمی دور ہو گئی کہ سہرا کی دے پر اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ کم بہت نے بے خبر نظر آنے کی بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ اس کی تواضع کچھ ایسی تھی جیسے رنگہ اکبر لوہے پر ریک مال دگڑا جا رہا ہو۔ یہ آواز سن کر نہ جانے کیوں مجھے اپنے رنگہ سپے میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

"واقعی؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا "تمہاری صورت اتنی حسین ہے کہ انسان اسے دیکھ کر راستہ بھول سکتا ہے۔"

کم چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور مسکرا کر مسکراتے ہوئے اس کی صورت کچھ اور عجیب دکھائی دینے لگا۔ "اس میں کیا شک ہے۔" اس کی کھرکھرائی آواز میں کارکن نہیں تھی جیسی صورت میں کچھ تو تشویش ہوگی جو تپ ہل ہل کر سمجھنے چلے آئے۔

مجھ کو اس سے بھی علم تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ اس مجھے ڈانچ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں تھی کہ میں اس کے پیچھے چھوڑاں یا نہ چھوڑاں۔ اس میں کوئی ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ یہ مکان بہر حال کوئی خفیہ مکان تو نہیں تھا۔ کسی عام در سے ہٹ کر ذرا دیرانے میں ضرور رہا ہوا تھا لیکن بہت نمایاں فوراً اپنی طرف توجہ مبذول کراتا تھا اور تباہیوں سے کچھ اٹا کر دور بھی نہیں تھا۔ جمال سعیدی یہاں کسی سے بے چارہ نہیں علی الاطلاق رہتا تھا۔ یہ اس کی باقاعدہ رہائش تھی۔ کوئی خفیہ گاہ نہیں تھی۔ اس علاقے میں تھری سے ترقیاتی کام جاری تھے لیکن مکان تھا پانچ دس سال بعد یہاں بھی مکان ہی مکان ہوتا کوئی نہ کوئی مکان تو ہر علاقے اور ہر ماؤسنگ اسٹیم کا پلاٹا ہوتا ہی ہے۔ یہاں کا پلاٹا مکان جمال سعیدی کا تھا اور اس نے اس وقت بنایا تھا جب یہاں مزید پانچ دس سال تک حیران رجحان ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے ہوں گے۔

جمال سعیدی نے میری طرف دیکھتے ہوئے مشتاقانہ سے کہا "میں سر ہلایا جس سے اس کے جڑوں کا گوشہشت بھی مل اٹھا۔ تمہیں اب پوری طرح کلی تھیں اور ان میں سوچوں کے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں ضرغام کو کوئی جواب دیتا تھا۔" جمیدگی سے بولا "راستہ نہ بھولا کریں افضل صاحب۔ راستہ بہت ہی اور خطرناک عادت ہے۔ راستہ بھول کر آپ کو کمرے کے دفتر میں جا پھینچے ہیں۔ کبھی جمال سعیدی کی کنیا بھی ہیں۔ آپ کا اس شہر میں بڑس ہے۔ ہوئی ہے۔ آپ کے شہر کی بہت خاک چھائی ہوگی۔ آپ یہاں آج بھی تو نہیں جاؤ گے؟"

"ہمارے انجینی ہونے کی کیا پوچھتے ہیں جمال صاحب نے لٹھری سانس لے کر کہا "ہم جیسے لوگ اپنے آپ کو اس شہر میں تو کیا، پورے وطن میں انجینی محسوس کرتے ہیں صدیوں سے اور نسل در نسل سے یہاں رہ رہے تھے۔ ان کچھ کہتے۔ بلکہ سوچتے تھے کہ یہاں نہیں پڑتی جو یہاں اٹھال میں آکر نہانے والے چند سال بعد کرتے ہیں تو یہاں کے اصل باشندوں کو ان کے سامنے ہجر میں ہونا پڑتا ہے۔ انہیں ہمارے ہاں کے راستوں اور ان کی زیادہ واقفیت ہو جاتی ہے اور وہ زیادہ دیر ہی یہاں رہنے اپنی مرضی کا ہر کام کرتے پھرتے ہیں۔ یہاں کی تو کمالی جمال سعیدی صاحب! یہاں تو اکثر "لٹے" یاں بری معاملہ رہا ہے۔" اننا جو کہ توڑاں کو ڈانٹنے والی صورت

آج کل ہر کوئی اپنی اپنی بات کہتا ہے۔ دوسرے کی کوئی نہیں سنتا۔

”سی لے کر کہہ رہا ہوں کہ کم از کم آپ میری بات توجہ سے سنئے گا۔“ وہ گویا دانت پیٹتے پیٹتے نہ گیا۔

”ارشاد... ارشاد...“ میں نے کڑی پر ذرا آگے ٹھکے ہوئے سعادت مندانہ لہجے میں کہا میں اب بھی ان کیاب لوگوں میں شامل ہوں جو دوسروں کی بات سننے ہیں۔ آج کل ایسے تو ہی پرانا اور دورینہ دونوں چیزیں ایک وقت ساتھ لے کر ڈھونڈنے سے لگے ہیں۔

”افضل صاحب! وہ گہری سانس لے کر بولا ”آپ بھی کا دیواری آدمی ہیں اور ہم بھی۔ ایک دوسرے سے الگ الگ ایک دوسرے کی فوج میں رہنا نہ تو ہمیں زنجب دیتا ہے اور نہ ہی ہمارے مخلوق میں ہے لیکن ہمیں کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ مجھے سے آپ نے اپنی توجہ کا دیوار پر سرخیز رکھنے کے بجائے اوپر اوجھڑا کر مارا اور دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا شروع کیا ہے۔“

”ہم؟“ سے آپ کی مراد کون کون ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”میں۔ میرا کا دیواری ساتھی جیشہ کریم۔ اور کچھ دوسرے لوگ جو منظر عام پر نہیں آتے۔“ اس نے جواب دیا۔

”منظر عام پر کیوں نہیں آتے؟“ میں نے فوراً دو سرا سوال پوچھا۔

”ان کی تکلیفیں اس قابل نہیں ہیں اعلیٰ۔“

”موضوع سے بڑے اور بات کو الجھانے کی کوشش نہ کریں افضل صاحب!“ اب اس کا انداز واضح طور پر تنبیہ کا سا ہو گیا۔

وہ بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ضرب نام ایک ٹک ٹک جیسے گورہا قند اس کی آنکھیں واقعی سانپ کی طرح تھیں۔ میں نے اب تک اسے ہلکے جھپکے نہیں دیکھا تھا۔

جلال سعیدی بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”ان کے منظر عام نہ آنے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ہلکے فکر نہیں ہیں۔ زیادہ جانے پہچانے نہیں ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی کسی توجہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ بات آپ کی ہو رہی تھی۔ آپ کا ہو کر بھی اچھا چل سکتا ہے۔“

”جس میں بھی بیٹھ ہے۔“

”سی لے کر تو مجھے کچھ وقت میرے آنے لگا ہے اور میں نے تم سے ہر وقت مزید دولت کمانے کے جنون میں مبتلا رہنے کے بجائے اپنے ضمیر اور اپنے شوق کی تسکین کے لیے بھی کچھ ایسے چھوٹے موٹے کام کر کے جانیں جو دوسرے لوگ نہیں کرتے تم از کم جیسے لوگ نہیں کرتے۔“ میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر رکھی۔

اب اس کی آنکھوں میں برہمی کے سائے نمودار ہونے لگے۔

”تھے۔“

”تھے۔“

”تھے۔“

”دوسروں کی لڑائیاں کرنے“ دوسروں کے جھیلے نہانے“ دوسروں کی فائلی کرنے“ اور دوسروں کو سر پر بٹھانے میں ہی ہماری تو بیشتر توانائیاں خرچ ہوتی رہیں اور اس کے جواب میں ہم جوتے کھاتے رہے۔ ہماری اپنی لٹیرا ڈوب کی طرح نہ زور برابر ہوا نہیں کی۔ ہم تو جیسا ہی لوگ ہیں۔“

وہ دونوں چہرے نے ہلکے جھپکے بغیر میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر تھیل سعیدی پہلو بدل کر بولا ”مجھے عادیوں کی مار مارنے کی کوشش نہ کریں افضل صاحب! آپ بڑھے لکھے آدمی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“ یہ سوا فٹل تک دی فٹسٹ ”SURVIVAL OF THE FITTEST کا نانا ہے۔ جو سخت جان ہوگا، ہر طرح کی سختیاں برداشت کر سکتا ہو گا وہی زندہ رہ جائے گا۔ باقی سب مارے جائیں گے۔ یہ وہاں دھواں نہ ہو رہا اور فٹسٹ شکایتیں کرنا ترک کریں اور ہماری طرح FITTEST بننے کی کوشش کریں۔“

”تھانہ کرے کہ میں ہماری طرح FITTEST بننے کی کوشش کر لوں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”ہمارا نظریہ حیات ذرا مختلف ہے جلال صاحب! میرا خیال ہے جو کچھ ہوگا سچا ہوگا اور اچھا ہو گا وہی سوا فٹسٹ کرے گا“ باقی مارے جائیں گے۔ کچھ سچا اور اچھا آدمی اگر سوسائٹی میں اُن فٹ یا فٹس فٹ بھی نظر آتا ہوگا تب بھی کسی نہ کسی دھیلے سے اس کی ہٹا کا سامنا ہو جائے گا۔ غلط“

”جھوٹا“ دوسروں کے حق میں جڑا ثابت ہونے والا، کسی نہ کسی انداز میں دوسروں کو ضرر پہنچانے والا آدمی واقعی طور پر خواہ کتنے ہی فائدے میں نظر آئے اس پر کتنا ہی عروج و کھانی دے لیکن آخر کار زلت اور تباہی اس کا قدر ہے۔“

”کوئی اور بات کریں افضل صاحب!“ جلال سعیدی آج گول حوٹل سا ہاتھ ہلاتے ہوئے قدرے تیزاری سے بولا ”آپ دیکھا وار آدمی ہیں۔ آپ کے منہ سے دھوا اچھا نہیں لگتا۔“

”یہ دھوا نہیں ہے تو ایک سوٹا سیاہیادی کچھ ہے دنیا بھی آخر کسی اصول پر ہی چل رہی ہے۔ اصول کے بغیر تو پتا بھی نہیں پتا لیکن لوگوں کو اب اس کا اندازہ نہیں رہا۔ لوگوں نے اپنے اپنے اصول بنا لیے ہیں اور انہی کو کچھ سمجھتے ہیں۔“ میں نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

وہ کچھ اور تیز ہو گیا۔ ایک کے بجائے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا ”میں نے آپ سے اس قسم کا بیچر بننے کے لیے آپ کو نہیں بلایا افضل صاحب!“

”مگر پھر کس لیے بلایا ہے؟“ میں نے بڑی محبت سے پوچھا۔

”میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ میری بات سنیں۔ اور دھیان سے سنیں۔“ اس کے کنبے میں ایک خاص قسم کی سختی در آئی۔

”سنائیں۔ سنائیں۔“ میں نے گویا ہر فن کوش ہوتے ہوئے کہا ”میں تو ہر ایک کی بات بڑی توجہ سے سنتا ہوں۔ ہر ایک کی بات سننے سے کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ

”سنائیں۔ سنائیں۔“

”سنائیں۔ سنائیں۔“

وہ ٹرائل ہمارے سامنے لے آیا۔ اس پر ٹھنڈا گرم، بھٹک ٹیک، اسٹیکس اور خاطر مدارات کے دوسرے نہ جانے کون کون سے لوازمات موجود تھے۔ اوپر نیچے بڑی بڑی ٹرائلی کے تینوں شیشے لمبے پھلے ہوئے تھے۔

”آپ کیا پسند فرمائیں گے؟“ خود اودے منوہان لمبے لمبے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے بڑے مہربان اور احتیاط سے جواب دیا حالانکہ پیٹ میں چھ ہوں کا فورٹامنٹ جاری تھا اور پیاس سے طعن میں کانٹے بھی پڑ رہے تھے۔ ایسے میں ٹشو پیسے میں لپٹی ہوئی اورخ دکھائی دینے والی کوئلہ رگھس کی بوتلوں اور آئینے میں رکھی ہوئی برف کی کیوبس وغیرہ کو دیکھ کر ہاتھ دوسے رکھنا بڑے مہربان اور حوصلے کا کام تھا۔ مجھے جین تھا کہ صاف مجھ سے بھی زیادہ کڑی آزمائش سے گزر رہی تھی۔ میرے الفاظ نے اسے بھی ہاتھ اور زبان دوسے رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”کھالی لیس افضل صاحب! کچھ تو کھالی لیس۔“ جمال اب دوستانہ لہجے میں بولا ”میرے اس غریب خانے سے تو دشمن بھی کچھ کھائے پئے بغیر نہیں جاتا۔ اور آپ تو ابھی دشمن بھی نہیں ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ میں دشمن نہیں ہوں۔ اور منافق بھی نہیں ہوں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا ”مجھے منافقت کے یہ کھیل اچھے نہیں لگتے۔ آپ کا دل تو چاہ رہا ہو کہ آپ سامنے والے کو ایک بڑے سے ہانے میں بہت سا زہر گول کر دے دیں لیکن آپ اسے ٹھنڈا گرم ٹھیک اور پیمپٹیاں پیش کر رہے ہوں۔ آپ کا دل تو چاہ رہا ہو کہ آپ کے ہاتھ میں ایک نوٹیلک اور تیز دھار ٹیچر ہو جسے آپ سامنے والے کے سینہ دل کے مقام پر پیوست کر دیں لیکن اس کی جگہ آپ اس کے لیے گلہ سترے گلہ سترے ہوں۔ کھانا پینا تو انہی کے ساتھ اچھا لگتا ہے جن سے دل ملا ہوا ہو۔ میں ان دنوں رابازوں کا قاتل نہیں ہوں۔“

وہ میری صاف گوئی پر ایک لمبے لمبے دم بخود گیا پھر سنبھل کر بولا ”ہم آپ سے دل ہی تو ملانے کی کوشش کر رہے ہیں افضل صاحب!“

”آپ یہ کوشش نہ ہی کریں تو آپ کی بڑی فرازش ہوگی جمال صاحب!“ میں نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے آپ کو جو کتنا تھا آپ کہ چنگ اب میں چتا ہوں۔“

اس نے اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ کچھ اور خوش خلقی سے بولا ”ہم از کم کوئلہ تو ذہک ہی لے لیجئے۔ دل ٹھنڈا کرنے میں کچھ مدد لے لی۔“

”دل اس قسم کی ذہکیں دنیو سے ٹھنڈا نہیں ہوتا جمال صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”دل ٹھنڈا کرنے کے لیے کچھ اور طریقہ کی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔“

”آپ کوئی تجویز پیش تو کریں۔ اگر کوئی تدبیر ہمارے بس میں ہوگی تو ضرور کریں گے۔“ وہ صاف بخانا لہجے میں بولا۔

سیدی کی قوت بداشت جواب دینے لگی تھی۔ اس کا لہجہ کچھ دل میں چمک چمک رہا تھا۔ میں نے اپنے خیر اور شر کی تسکین کے لیے کچھ اور لوگوں کو تختہ مشق بنائیں، کچھ اور ٹھکانے ڈھونڈیں۔ آپ نہ جانے کس کے مالی نقصان کی شکایت لے کر جیڈ کریم کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس نے پابند نہ ہوئے بھی وہ شکایت نہ صرف دور کردی بلکہ ہر جانہ بھی ادا کر دیا اور ہمیں لاکھ کا چیک بھجوا دیا۔ یہ صرف آپ کی خاطر ہماری طرف سے خیرگامی کا اظہار تھا۔

”ایا پھر شاید اس بات کی کوشش تھی کہ میں آپ کی سرگرمیوں کی طرف مزید توجہ نہ دوں۔“ میں نے لقمہ دیا۔ میں نے سرگرمیوں کا لفظ معنی خیز انداز میں استعمال کیا تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی معافی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی اور میری بات کو یا ان سنی کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا ”بعض لوگ خیرگامی کے جذبے کی قدر نہیں کرتے۔ کبھی کبھی وہ بڑے نقصان میں رہتے ہیں۔“

”کیا میں اسے ایک دھمکی سمجھوں؟“ میں نے یکدم اپنا موز تبدیل کرتے ہوئے سر دھمکی میں پوچھا۔ ”میرا خیال ہے اس کے لیے لفظ ”وارننگ“ زیادہ مناسب رہے گا۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

”کیا عجیب زمانہ آیا ہے۔“ میں نے استہزا سے لہجے میں کہا ”جنہیں بہت سے بے باتوں پر وارننگ ملنی چاہئے تھیں وہ خود دوسروں کو وارننگ دیتے ہیں۔“

”آپ شاید میری بات کو سمجھ گئی سے نہیں لے رہے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”نہیں۔“ میں نے اطمینان سے اعتراف کیا ”اس قسم کی دھمکیاں اور وارننگز میں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دتا ہوں حالانکہ معاملہ ایسا بھی نہیں ہے کہ دونوں کانوں کے درمیان جگہ خالی ہو۔“ میں نے ایک بار پھر بے پروا نظرتانے کی کوشش کی۔

اس کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے حالات اور اپنی بات کی سختی کا احساس دلانے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرے۔ اس نے فریام کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گھبراہٹ کی سلیکی چنگاریوں کو جیسے ہوا لہری تھی۔ اس نے گویا مثال کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کر گزرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے دونوں گارڈز کی انگلیاں بچہ چینی سے زبردستی چل رہی تھیں لیکن جمال سیدی اب بھی عمل کا دائرہ بالکل ہی ہاتھ سے چھوڑ دینے پر تیار نہیں تھا۔ میری بے خوفی اس قسم کی ”مانیائی“ شخصیتوں کو بھی الجھن میں ڈال دیتی تھی۔ سرے کے ماحول میں چند لمبے لمبے بے پناہ سکوت اور سیدی کی جھلکی۔

اس سکوت میں سربراہ کی خفیف سی توازن سے ارتعاش پڑا ہوا۔ ایک اور بار میں کھنکھن بڑی سی خوب صورت اور تین منزلہ زلی قاتلین پر چھٹکا ہوا پردے کے عقب سے نمودار ہوا تھا۔

”مناسب وقت آنے پر تاروں گا۔ لیکن مجھے معلوم ہے آپ اس پر عمل نہیں کر سکیں گے۔“ میں نے کہا۔

اس اثنا میں ذرا ہلکی عمر کا وہی گاؤں نمودار ہو چکا تھا جو ہمیں یہاں تک لایا تھا۔ جمال سعیدی نے اسے طلب نہیں کیا تھا لیکن نہ جانے اسے کیسے علم ہو گیا تھا کہ ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے یہاں پڑا سرار قسم کا کوئی خود کار نظام کام کر رہا تھا۔ شمال یا مشرق میں ہمیں مدد کے کی کو شش نہیں کی۔ بڑی عمر کے گاؤں نے ہمیں صرف مکان کے چوبلی دروازے سے نکالنے کا فریضہ انجام دیا۔ باہر پر آمدے میں وہی تینوں گاؤں گویا ہمارے ہی پتھر کھڑے تھے جنہوں نے کچھ دیر پہلے ڈرائیو دے میں ہمارا استقبال کیا تھا۔

وہ گاڑی تک ہمارے ساتھ آئے ہم گاڑی میں بیٹھ چکے تو ایک گاؤں نے واسکٹ کی اندر کی جیب سے میرا مشین ہاسٹ نکال کر نہایت احرام سے میری خدمت میں پیش کرتے ہوئے بڑی شائستگی سے کہا ”تکلیف معاف۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے دوری سے گیت ہاؤس میں کسی کو اشارہ کیا۔ باہر جانے کے لیے ڈرائیو دے کے دوسرے سرے پر دو سرایت تھا۔ وہ دوانی سے کھل گیا۔ اس کا کنٹرول بھی بیٹھ گیت ہاؤس میں ہی تھا۔ میری گاڑی سے آگے مشرق کی گاڑی کے علاوہ تین تین فٹ کا لایاں اور کھڑی تھیں۔ ایک مازہ ترین ماڈل کی ”بیمبو“ ایک سرسبز اور ایک بی ایم ڈبلیو۔ میں ان کے نمبر ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے قریب سے گاڑی نکال کر دوسرے گیت سے باہر آیا اور ایک بار پھر ہم پختہ میں روڈ پر جا پہنچے کوئی ہمارے پیچھے نہیں آیا۔

تب منیہ نے یوں ایک طویل سانس لی جیسے وہ دیر سے سانس روکے ہوئے تھی۔ اس نے گردن کھما کر خوف زدہ سی نگہوں سے مکان اور اس کے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ میں نے ابھی گاڑی کی رفتار دیکھنے کی حد تک ہی رکھی تھی۔ وہ جمجمہ جی سی لے کر بولی ”یقین نہیں آتا کہ ہم محض بات چیت کے بعد خود غایت سے واپس آ گئے ہیں۔ اس سارے سیٹ اپ کو دیکھ کر خوف سا آتا ہے۔ ذرا اس دیرانے کو تو دیکھیں۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اور پھر اس دیرانے کو دیکھ کر تو کبھی خیال آتا ہے کہ یہ چاہیں تو کسی کو مار کر یہاں دفن بھی کر دیں۔“ کون پوچھنے والا ہے۔

میں نے مکان کے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ریتیلی زمین پر کہیں کہیں اور جی پی جی جھانڈاں بکھلی ہوئی تھیں۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”شاید یہاں بارہا ایسا ہو بھی چکا ہو۔ اگر میں کوئی عام معمولی اور گمنام آدمی ہوتا اور ان سے اس طرح بات کرتا تو شاید میرے ساتھ بھی کیا ہوتا۔“

”کوئی عام“ معمولی اور گمنام آدمی ان سے اس طرح بات ہی کہاں کر سکتا تھا۔ ”منیہ لٹری سانس لے کر بولی۔

میں نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ مکان سے دور نکل آئے کے بعد گویا منیہ کو کچھ اطمینان ہوا اور اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ کر

سیٹ کے پیچھے سے نکل گئے ہوئے گویا مجھے مطلع کیا کہ اس قسم کے لوگوں کی پہلی بار تہیب سے دیکھا ہے۔

”میرے ساتھ رہو گی تو تمہیں انکو ویشیائیے لوگوں کو ان سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ یہ خاصا خطرہ کہ سوہا ہم رفاقت سے بچنے کی کوشش کیا کرے۔“

”میں اس کے بارے میں سوچوں گی۔“ کافی دیر بعد پھر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

یونورڈی میں روڈ پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھادی اب میں جلد از جلد ہو کر پہنچتا چاہتا تھا تاہم میرا ذہن ابھی سعیدی میں ہی پھنسا ہوا تھا۔ اس کے دھمکی آمیز اور کھلم کھچے کافی بد مزہ کیا تھا لیکن ساتھ ہی میرا یہ بھی محسوس کہ ایک لحاظ سے یہ ملاقات ابھی ہی رہی تھی۔ میری مطالعاتی اضافہ ہوا تھا۔ مجھے بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملا تھا اور کچھ کچھ دیکھا تھا اس کے بارے میں مجھے جلد از جلد کوئی لاکھ بولنے کا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں ایک خاکہ سا ترتیب ہوا تھا گا لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے میں کھانا کھانا چاہتا تھا۔ میرے ساتھ بے چارہ منیہ بھی بھوکے مر رہی تھی جس کے کھانے کا دل دے ہی اچھے نہیں گزر رہے تھے۔

لگتا کچھ یوں تھا جیسے کھانا اس روز ہماری قسمت میں تھا۔ ہم جب ہوٹل پہنچے تو ایک نئی حیرت ہماری پتھر تھی۔ شفیع شاہ ”میرا اکاؤنٹس منیجر“ جنرل منیجر اور اسٹاف کے دو تھے اور میرے کمرے میں کچھ حیران پریشان سے کھڑے تھے۔ افراد کی موجودگی کے باوجود کمرہ جانے کیوں خالی خالی سا لگا تھا۔ میرا تھا ٹھکانا۔ مجھے اور منیہ کو کمرے میں داخل ہونے دو اور دوسرے کمرے گئے۔

”کیا کوئی منیجنگ ہو رہی ہے؟“ میں نے شفیع شاہ کے کھانا ہاتھ مارے ہوئے خوش مزاجی سے کہا ”کیا تم لوگ کوئی ایجنٹ بنو یا منیہ نے غور کر رہے ہو؟“

شفیع شاہ مسکرایا لیکن مجھے اس کی مسکراہٹ کچھ عجیب محسوس ہوئی۔ میں حسب عادت دھم سے اپنی کرسی پر جا کر اٹھ بیٹھنے لگا۔ انداز میں میرے مقابل بیٹھ گیا۔ باقی سب لوگ اور دوسرے کمرے ہوئے تھے اور گھر گھر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا پھر میری طرف کے چہرے پر جا کر۔ میں نے اسی سے پوچھا ”بڑھاپا؟“ ہے؟ تم لوگوں کے منہ کیوں کھلے ہوئے ہیں؟ کیا تم لوگ باجماعت جیب کٹ گئی ہے؟“

”کیا نے میرے ذہن پر مسکرائے تک کی کوشش نہیں؟“ امیر گویا کسی فائنڈنگ وار خواب کی یادوں سے باہر آئے ہوئے۔ ”سراہمت بڑی خبر ہے۔ وفاقی حکومت کے ایک تحقیقاتی ادارے نے کچھ دیر پہلے ہمارے دفتر بھاپا مارا تھا۔ تمام دفتری کھدیاں وہ لوگ سارا دیکھا ساری فائلیں سارے کاغذات“ ”جی“ ”کیس“ ”فون اور پانی وغیرہ کے وہ مل تک لے گئے جن کا

اور انجی بھی نہیں ہوئی۔ میرے کمرے میں بھی انہوں نے کاغذ کا ہنہ تک نہیں چھوڑا۔

میرے ذہن نے ان الفاظ کے مضمون کو قبول کرنے میں خاصی سستی کا مظاہرہ کیا۔ میں چند لمبے قطعی خاموش رہا۔ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ میری ساعت ٹھیک طور پر کام کر رہی تھی جو کچھ میں نے بتا تھا۔ اس پر نے دہی کہا تھا۔ میں نے شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ملاتے ہوئے بولا "میں تو ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں اور دو قاز کا جائزہ ہی لے رہا تھا۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ کاروباری دفاتر کی تاریخ میں اتنا زبردست چھاپا شاید ہی کبھی پڑا ہو گا جس میں رڈی کی نوکیلاں تک الٹ کر خالی کی گئیں اور ان میں کاغذوں کے جو پرزے موجود تھے وہ بھی سمیٹ کر لے جائے گئے۔ وہ تو یقیناً ہے کہ ان لوگوں کی کارروائی دفتری کمروں تک محدود رہی۔ اگر عام کمروں یا مختلف ہالز وغیرہ میں یہ خبر پھیل جاتی کہ یہاں کسی قسم کا چھاپا پڑا ہے تو یقیناً پھیل جاتا۔ ہونٹوں کے صمان اور دوسرے لوگ نہ جانے کیا سمجھتے۔"

تب مجھے اندازہ ہوا کہ کرا خالی خالی کیوں لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی میز کا جائزہ لیا۔ اس پر کوئی ناقص خط یا کاغذ "کیا" پھولی کسی کوئی چٹ تک نہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر کیمپٹوں "الہاریوں اور دیوار گہرور ازوں وغیرہ کو کھول کر دیکھا۔ ہر چیز خالی تھی اور گویا میرا منہ چڑا رہی تھی۔ میں واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

ابھر ہونٹوں پر زبان بچھرنے ہوئے بولی "میرے کمرے" اکاؤنٹس کنکشن، جنرل منیجر کے کمرے۔ حتیٰ کہ جس کمرے میں ٹیلی فون بورڈ لگا ہے اس کی بھی یہی حالت ہے۔"

انٹاف کے لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان میں تو جیسے کچھ بولنے کی بھی بہت نہیں تھی۔ میں نے شفیع شاہ کی طرف دیکھا اور قہر میں طلب انداز میں کہا "آئی۔ کب درانی؟"

"کلاہرے سر اس کے علاوہ کون اتنی مستعدی دکھا سکتا تھا؟ آج تک کسی ٹکے سے ہمارے معاملات اس اسٹیج پر نہیں پہنچے کہ اسے یوں چھاپا بارنے کی ضرورت پیش آجائے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی "گوکہ میں اس وقت یہاں موجود نہیں تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ایسی ہی کارروائی ہے۔"

"جی سر۔" ابھر نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے قہر میں کی "ڈائریکٹر کے حمدے کا ایک شخص پانی کی قیادت کر رہا تھا۔ اس نے اپنا نام آئی کے درانی ہی بتایا تھا۔ آٹھ دس آدمی تھے ان میں سے بعض دودھ کی تھ۔"

"تم مبالغہ فون پر کم از کم مجھے اطلاع تو دے دیتے۔" میں نے ابھر سے کہا تاہم میرے لیے میں یہی نہیں سمجھتی۔ مجھے احساس تھا کہ اگر مجھے اطلاع مل بھی جاتی تو میں کیا کر سکتا تھا؟ میں کسی حکومتی ادارے۔ خصوصاً مرکزی ادارے کو بذریعہ ملاقات تو اس کی کارروائی سے نہیں روک سکتا تھا۔ اس سے تو بات اور بھی خراب ہو جاتی بلکہ شاید درانی تو دل سے چاہتا ہو کہ میں ایسا ہی کدوں تاکہ اس کے لیے ایک طرف تو کوئی مزید سخت قدم اٹھانے کا

جواز پیدا ہو جائے دوسرے جب میں اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی کدوں تو وہ کہہ سکے کہ یہ محض انتقامی کارروائی تھی۔ من گھڑت الزامات تھے کیونکہ ایک "فرض شناس" اس نے کچھ بد عنوانیوں کی تفتیش کے لیے ایک ممتاز کاروباری شخص کے خلاف کارروائی کی تھی اس لیے اگر اب اس افسر کے خلاف کچھ چیزیں منظر عام پر آ رہی تھیں تو یہ محض کھدائی ملی کے کھبا فونے کے حروف تھا۔ درانی نے غالباً خوب سوچ سمجھ کر اپنی ہال پٹیلے میں پھل کڑی تھی۔ مجھے اعتراف تھا کہ اس کا مدعمل میری توقع کے خلاف تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب اس کی عارضی مجبوری ونازاد اور رفتی شب خیمہ اسے مجھ سے اپنی ملاقات کا احوال سنائے گی اور بتائے گی کہ میں نے کیا کیا تھا تو وہ خوف زدہ ہو جائے گا۔ لیکن وہ خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اٹا مجھے خوف زدہ کرنے کی غلطی نہیں۔ اور وہ یوں ذرا خاکسے میں تھا کہ اس کے ساتھ سرکاری اختیار کی ملاقات تھی۔

ابھر خطمانہ انداز میں ہاتھ لٹے ہوئے بولی "سر! میں اب آپ کو اطلاع دینے کی فکر۔ وہ بھی مجھے شفیع شاہ صاحب نے ذکر یاد دلایا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی کارروائی نے ہمیں بولا کھلا دیا تھا۔"

"آپ لوگ بیٹھ جائیں نا۔ کھڑے کیوں ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا "کاروبار میں اس قسم کی اونچ نیچ تو آتی رہتی ہے۔" وہ سب میز کے ارد گرد بیٹھ چکے تو میں نے جنرل منیجر کو مخاطب کیا "آپ تو کاروبار کی دنیا میں اتنے پرانے اور سینئر آدمی ہیں۔ بہت خفیہ و فراز دیکھ چکے ہوں گے کم از کم آپ کو تو آتا ہے جو اس میں ہونا چاہیے۔"

"میں بد خواہ نہیں" نرمان ہوں سر! "اور جو مراد متاثر کن شخصیت کے مالک جی ایم صاحب سمجھتے ہوئے بولے "یہ سب کچھ ہمارے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ اس قسم کی کارروائیاں یوں اچانک نہیں ہوتیں۔ صورت حال خراب ہونے کے کچھ نہ کچھ آثار پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی نوٹس آتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی کن گمن تھی ہے۔ اتنی مستعدی تو امر کی ادارے بھی نہیں دکھاتے۔ اس طرح بیرون تے سے زمین تو وہ بھی نہیں نکالتے۔"

بے ہمارے جی ایم صاحب کی حیرت بجا تھی۔ انہیں پس منظر میں مضمون تھا۔ پس منظر سے صرف میں اور شفیع شاہ آگاہ تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کبھی کبھی کوئی ایسا دج پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارا کوئی ٹکے اس طرح مستعد ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک دج یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی مصلحتی افسر کی دھم پر پاؤں آجاتا ہے۔ دیے انہوں نے اپنے اس ایمکشن کا کوئی جواز تو پیش کیا ہو گا؟"

"جی ہاں۔" جی ایم صاحب نے اثبات میں سر ملایا "درانی صاحب کا کہنا تھا کہ ان کی اطلاعات کے مطابق اس ہونٹوں کی تھیر سے لے کر اب تک کی ٹیکوں کی ادانگی میں کچھ کھیلے تھے اور ہونٹوں کی تھیر میں جو سرمایہ صرف ہوا اس کے جائز اور قانونی ہونے

چلتا جا رہا ہے تاکہ ہم لوگ ذرا اور بہتر طور پر سکون اور یکسوئی سے اس میں حصہ لے سکیں۔

میں نے امیر کی طرف دیکھا اور اس نے جلدی سے فون پر سب کی پینڈ کے مطابق ٹھنڈے اور گرم دھوپ کا آڈر دیا۔ میں نے منہ کی طرف دیکھ کر اسے تسلیم کر لیا۔ ”تم جلد چھوٹا مت کرنا کہ آپ معاملہ صرف ٹھنڈے گرم پر عمل جائے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ذرا اس چھٹی ہی ہنگامی میٹنگ سے فارغ ہوں پھر کھانا بھی چلے گا۔“

”خدا کی پناہ! منہ آٹھس پھیلاتے ہوئے بولی مہربان کی کھانے کی پڑی ہوئی ہے۔ آپ کچھ رو رہے ہیں میں یہاں کھانے کے اختصار میں بیٹھی ہوں۔ اس آواز افتاد کی خبر سن کر میں تو کھانے کی بھول ہی گئی تھی۔“

”لیکن میں نہیں بھولا ہوں۔“ میں نے فوراً کہا ”جو پروگرام طے ہو گیا اس پر ہر حال میں عمل ہونا چاہیے یہ میرا اصول ہے۔ عمل در آمد میں تو بڑی بہت تاخیر البتہ برداشت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً دوپہر کا کھانا رات کو کھایا جا سکتا ہے۔ آپ مطلب لوگ تو یقیناً کھانا کھا چکے ہوں گے؟“ میں نے اپنی لوگوں کی طرف دیکھا۔

سب کی طرف سے اہانت میں جواب ملا پھر امیر بولی ”آج سے فارغ ہو کر ہی ہم سب دوبارہ اپنے اپنے کاموں پر بیٹھے تھے جب وہ معیت نازل ہوئی۔“

چند منٹ بعد جب سب اپنی اپنی پینڈ کے مطابق ٹھنڈے یا گرم سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو ساتھ ساتھ دوستانہ سے مداخلت میں اس سنگین مسئلے پر میٹنگ بھی چل رہی تھی۔ اکاؤنٹس منیجر قدرے تشویش کے عالم میں بولا ”ہمارے پاس تو کوئی ریکارڈ نہیں رہا۔ ہمارے لیے تو توہل میں فہرے ہوئے مسماؤں کے بل ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔“

”کیا وہ ریسیپشن پر مسماؤں کے اندراجات کے نانہ ترین کارڈز بھی لے گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”خدا کا شکر ہے وہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس طرف وہ گمے ہی نہیں۔“ اکاؤنٹس منیجر نے جواب دیا۔

”ہم۔۔۔ انہی کی مدد سے بل بنانے کی کوشش کیجئے گا۔ کچھ اخراجات کے بارے میں خود مسماؤں سے پوچھ لیجئے گا۔ نقصان بے شک برداشت کر لیجئے گا لیکن مسماؤں کو ناراض مت کیجئے گا۔ یہ دو چار دن کی مشکل ہوگی۔ اس دوران آپ سب لوگ ہنگامی انداز میں یہ کوشش کریں کہ جن جن کاغذات کی بھی ڈیپٹ کاپی حاصل کی جا سکتی ہو وہ حاصل کر لیں خزاہ اس پر کتنا ہی خرچ آئے اس مسئلے میں آپ لوگ اپنے اپنے کام کی ذمیت کے حساب سے شیعہ بانٹ لیں۔ ہر شخص اپنے اپنے شعبے کے کاغذات کی ڈیپٹیکٹس حاصل کر لے یا تیار کرانے کی کوشش کرے۔“

پھر میں نے امی ایم صاحب کو مخاطب کیا ”آپ شفیق شاہ کی موجودگی میں آج ہی کسی وقت اپنے گروپ آف مینیجر کے قانونی مشیروں سے میٹنگ رکھی اور جلد از جلد اپنی کورٹ میں ایک رٹ

کی شادتیں بھی مانگی تھیں۔“

”آپ نے اس گمہ سے کوئی تپا تھا کہ ہوئی کی قسم کے مسئلے میں تمام متعلقہ ٹھکانوں نے کاپیز جس دی تھی جن میں انکم ٹیکس کا ٹکٹ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد سے ہر سال آؤٹ ویو کے لوازمات پورے ہو رہے ہیں اور تفصیلی جانچ پڑتال کے بعد انکم ٹیکس ویو کے ٹکٹے ہمارے گوشارے قبول کرتے اور ہمیں کاپیز دیتے چلے آ رہے ہیں جس کے بعد ان معاملات کو پیچھے نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کوئی اتھارٹی اسے پیچھے کرتی تو ٹیکس کے ٹھکانوں کے متعلقہ اہلکاروں کو بھی اس میں گھسنا پڑے گا؟“

”وہ سب تو بہت سی باتوں سے اپنی جان بچا جائیں گے اور اگر انہیں گھسنا بھی پڑا تو رانی اپنی باطلوں کو زانی پر خاش کی دھ سے انہیں قربانی کا ٹکڑا بنانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ یہ سب باتیں ہوئی تھیں۔ ہم نے خاموش رہ کر انہیں سب کچھ اٹھا کر لے جانے نہیں دیا تھا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس ادارے کو کتنے اختیارات حاصل ہیں۔ یہ قوانین بلکہ خود دہشت کی علامت ہے۔ ان کے پاس بہت سی ایسی قسمیں موجود ہیں جن کے تحت یہ گزے ہوئے اٹھاڑ سکتے ہیں اور بڑے کاروباروں کے حساب کتاب میں اگر کوئی صوبہ دوسرے کے صرف غلطی ہی تلاش کرنے بیٹھ جائے تو یہ سوں کے معاملات میں کچھ غلطیاں ہی چھڑی ہی جا سکتی ہیں۔ خصوصاً جب کسی سے آپ کی فون جائے۔“

امی ایم صاحب کی بات متعلق تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے ”وہ تو ہوئی میل کرانے اور چھ دن کے اندر اندر آپ کو بھی گرفتار کرانے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔“

مجھے اپنے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کا مورال بھی بلند رکھنا تھا۔ شفیق شاہ کے سوا باقی سب کو تسلی بخشی کی ضرورت تھی۔ ویسے تو میری آمد کے بعد سے ان کے چہروں پر دوق آگئی تھی اور وہ ہر سکون انداز میں بیٹھے تھے لیکن ان کا حوصلہ مزید بڑھانے کے لیے میں نے ایک قفقہ لگایا اور بے پروائی سے کہا ”ان باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بعض افسروں کو اپنی دہشت پھیلاتے کا شوق ہوتا ہے۔ اسے بھی اپنا شوق پورا کر لینے دیں۔ دو چار جھگے لگیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی جگہ میں ہو۔ اگر مجھے گرفتار کر بھی لیا جائے تو اس سے کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ میں دو چار دن میں منہات پر باہر آ جاؤں گا۔ مجھے چاہیے کہ وہ چھوڑنے سے رہا۔ ہم کاروباری لوگ ہیں۔ چور ڈاکو قاتل یا دہشت گرد تو نہیں ہیں۔ ہمارے ہاتھ صاف ہیں۔ وہ ہمارے حسابات میں کوئی ایسا جڑا ٹھکانا دریافت نہیں کر سکا جس پر کوئی خاص کارروائی ہو سکے۔ اگر وہ اتنا چڑا ہو تو ساتھ ہی مجھے بھی گرفتار کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ صرف ہراساں کرنے کی کارروائی ہے اور اس کا بہترین جواب یہ ہے کہ آپ ہراساں نہ ہوں۔“

سب کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں نے ذرا غمازیت سے کہا ”مختصر کر آگے بڑھانے سے پہلے ٹھنڈے گرم دھوپ کا ایک دور

اس نے جواب دیا۔

”جنتا ہو گیا ہے یہاں میری توقعات سے زیادہ ہے۔ کل ہی سے تم کچھ ایسا انتظام کرو کہ خاص خاص اخباروں میں اس سلسلے میں خبریں آتی شروع ہو جائیں لیکن دو باتوں کا خیال رکھنا۔ ایک تو یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ رپورٹوں کو سواد اور دستاویزی ثبوت ہماری طرف سے فراہم کئے جا رہے ہیں۔ دوسرے یہ نہ ہو کہ سواد اور دستاویزی ثبوت تو ہم میا کریں لیکن ان کی بنیاد پر کوئی رپورٹر بلا بلا ہی سودے بازی کر لے اور خبر کو پی جائے۔ ان کی توقعات تم خود ہی پوری کر دینا۔ بجائے اس کے کہ وہ کہیں اور سودے بازی کی کوشش کریں۔ دیکھو کیسٹ کی کتابیں بھی ان لوگوں کو پہنچا دو۔ امید ہے وہ انہیں دیکھ کر دیر تک اپنی اپنی کرسیوں پر اچھلے نہیں گئے۔“

”یہ کام آج سے ہی شروع ہو جائے گا۔“ شفیع شاہ بولا۔ ”اس قسم کے کاموں کے لیے اخباری لائسنس کا ہی ایک بہت مناسب ٹوکی میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ میڈیا میں کوئی بھی خبر ”پلاٹ“ کرنے میں بہت مہر ہے۔ کسی کو بچ نہیں پلے پانچہ خبر کی اصل سوری کیا ہے“ اصل مافیا یا بیج کیا ہے۔۔۔ اور کام بڑے عمدہ طریقے سے ہو جاتا ہے۔ وہ شخص بیٹھ کچھ ماسک سے دو چار رہتا ہے۔ اس کے ماسک ہم جیسے لوگ حل کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم جیسے لوگوں کے ماسک حل کرنا رہتا ہے۔ یوں امداد باہمی کے تحت دونوں کا کام چلتا رہتا ہے۔ آدمی مضبوط بھی ہے۔ اس سے اچھے بھلے لوگ ڈرتے ہیں۔“

شفیع شاہ پہلے بھی مجھے اس کے بارے میں بتا چکا تھا اور شاید وہ کچھ موقع... پر ہمارے کام بھی آچکا تھا۔ مجھے یہ سن کر اطمینان ہو گیا کہ اس کی خدمات اب بھی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ شفیع شاہ یہ بھی بڑی خفیہ تھی کہ وہ کام کے لوگوں سے بھی رابطے فونے نہیں دیتا تھا اور قطعاً اس کا یہ تھا کہ مزید پر بھانڈ دینے والا آدمی بھی بہت کام کا ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی اس سے بھی کوئی اہم کام لے لیتا تھا۔ وہ ”داشتہ آئیدہ“ کا کار کا کا کل تھا لیکن اس میں داشتہ سے ان کی مراد رکھی ہوئی چیز نہیں بلکہ دوسرے والی داشتہ ہوتی تھی۔ کسی اور کی داشتہ! وہ خود تو اس قسم کی علت بالے کا کل نہیں تھا۔

ہر محاذ پر ضروری اقدامات کی ہدایات دینے کے بعد میں نے بھی کافی اطمینان محسوس کیا اور اسٹاف کے چہروں پر بھی طمانیت نظر آنے لگی۔ میں نے ان سب کو مخاطب کیا ”میرا بے لگائی بات نہیں۔ اس قسم کی پھولی موتی آزمائشیں زندگی میں آتی رہتی ہیں۔ ہم مل جل کر محنت اور زیادہ محنت سے ان کا مقابلہ کریں گے اور یہ خیر و خوبی ان آزمائشوں سے گزر جائیں گے کسی کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس ہوٹل کو کوئی بند نہیں کر سکتا۔ یہ اعلا آسمان کام نہیں ہے۔ اب آپ لوگ اپنی اپنی سیٹ پر جائیں اور اس کارروائی کا ذکر کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ تندی اور تیزی سے کام شروع کر دیں۔ کسی بھی معاملے میں کوئی

باز کرنے کی تیاری کریں۔ اس میں سب سے اہم نکتہ یہی رکھیں کہ کسی مناسب اور غیر جانبدار محرمان یا کنوینشن کی موجودگی کے بغیر ہمارا تمام ریکارڈ اٹھا لیا گیا ہے اس لیے ہمیں کانڈا میں روڈ بدل یا بعض دستاویزات کی چوری کا اندیشہ ہے۔ اس صورت میں ہمارے خلاف کوئی بھی کارروائی کی گئی تو ہم اسے پہنچ کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے۔ اس کے علاوہ بے شمار نکتے دکھا حضرات خود ہی رات میں شامل کر لیں گے۔ وہ ان کاموں میں بہت ماہر ہیں۔ ورنہ ان کے اختیارات اپنی جگہ۔ لیکن ہم ہر مرحلے پر بحالہ سے مدد لے کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اس قسم کے کرپٹ آفیسر ایسی جگہ میں زیادہ دیر نہیں بک سکتے۔“

اب میں اس بات کو راز رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا کہ لڑائی سے میری پیش پیش درحقیقت آج سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے ان سب کی موجودگی میں ہی شفیع شاہ سے پوچھا ”اس کی پراپٹی کے بارے میں ثبوت حاصل کرنے کی کارروائی تو میرے خیال میں کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھی ہوگی۔ ہمارے آدمیوں کو اس کے لیے زیادہ مہلت نہیں مل سکی۔“

”اس کے باوجود میرے پاس آپ کو کھانے کے لیے خوشخبری ہے۔“ شفیع شاہ اطمینان سے اپنے گلاس میں کیوبس پلاتے ہوئے بولا۔ وہ مسجورہ، محران سے قطعاً متاثر نہیں تھا اور اپنی گولڈ ریک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”ان حالات میں خوشخبری کی اشد ضرورت ہے۔ فوراً سنا ڈالو۔“ میں نے اشتیاق سے کہا۔

”اس کے چار بجش قیمت بیچنے تو کراچی میں ہیں جن کے بارے میں دستاویزی ثبوت مل گئے ہیں۔ دو اسلام آباد میں ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارے آدمی پھان میں کر رہے ہیں اور ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سب اس کے قریبی رشتے داروں کے نام پر ہیں جو ضرورت پڑنے پر قطعاً ثابت نہیں کر سکتے کہ انہوں نے کس طرح اور کس کمائی سے یہ بیچنے خریدے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے ایک بیک اکاؤنٹ کا بھی پتا چلا ہے جس کے سلسلے میں شاید اس نے کسی پر اعتماد نہیں کیا اور اسے اپنے اصل دستخط کے ساتھ آپریٹ کرتا ہے لیکن بیک والوں کو اس کی اصل حیثیت کا علم نہیں ہے۔ اس میں لاکھوں روپے موجود ہیں۔ بیچنے والوں بھی اس نے اس اکاؤنٹ سے کسی خاتون کے نام چار لاکھ کا چیک کاٹا ہے۔ اس چیک کی فوٹو کاپی بھی حاصل کر لی گئی ہے۔“

”دوبری گڈ۔“ میں نے بے اختیار جوش سے میرے ہاتھ مارا ”تم نے تو کمال کر دیا شفیع شاہ! میرا دل چاہ رہا ہے تمہارے ہاتھ چوم لوں۔“

”مرا! اس میں مجھ سے زیادہ کچھ دوسرے لوگوں کا کمال ہے۔“ وہ قد سے شریلے سے انداز میں سر جھکا رہے ہوئے بولا۔

”نہیں تم نے فراخ دلی سے انعام دیا ہے؟“ میں نے دواوت کیا۔

”میں سزاؤ سب اپنی جگہ خوش ہیں اور مزید کام جاری ہے۔“

نمبر فون کیجئے۔" فتح شاہ نے مٹوں دیا اور جب سے چھوڑا  
ایک کچھ تر نکالا جس میں وہ عارضی طور پر فون نمبر اور دوسری  
چھوٹی سونی سطحات محفوظ کرنا تھا۔ اس کی مدد سے اس نے مجھے  
ایک موبائل فون نہایت کیا۔

میں نے وہ نمبر لایا اور دوسری طرف سے ایک بھاری اور  
بارش سی آواز سن کر تعجباً چاہی "دروانی صاحب...؟"

"کیسے؟ اور آپ کون ہیں؟" اس نے جانتا چاہا۔ میں نے  
اسے دیکھا ہوا تھا اور وہ کسی خاص یا قابل ذکر شخصیت کا مالک  
نہیں تھا لیکن آواز خاصی رعب دار تھی۔

"آپ کے آواز میں حشرین میں سے ایک۔" میں نے  
جواب دیا "یعنی ایک چند شہری جو بڑی تکدو سے اس ملک میں  
نت نئے کا بھاری ادارے قائم کرنا ہے کہ خود بھی چار پیسے کائے  
اور بے روزگاری دور کرنے میں... حکومت کا کچھ ہاتھ بٹائے یہ  
چند شہری کچھ زیادہ ہی چند ثابت ہو رہا کیونکہ یہ دولت داری سے  
ہر سال حکومت کے خزانے میں مختلف ٹیکسوں کی مدد میں کروڑوں  
روپے جمع کرنا آتا ہے۔ ایسے بے ہودہ شہری کے تو تمام بزنس  
دیپجروا سی بلی فرصت میں بند کر دیتے ہیں۔"

"بھٹسن رہو۔ ایک ایک کر کے سب بند ہو جائیں گے  
جیسا تم کہہ رہے ہو" ایسا ہی ہو گا۔" اس کا لہجہ یک دم زہریلا سا  
ہو گیا۔ وہ کچھ گیا تھا کہ میں کون بول رہا ہوں۔ وہ بات جاری رکھتے  
ہوئے بولا "جب بھی کسی بد ساش پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے وہ اسی طرح  
مجھ میں کرتا ہے۔ حکومت پر کروڑوں روپے ٹیکس ادا کرنے کا  
احسان دھرتا ہے۔ اپنی بیزار پیمبروں کو بالکل بھول جاتا ہے۔ معصوم  
بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ ہم آئے دن یہی  
قہے کہنا سناتے ہیں۔ مدت ہوئی ہم نے ان سے حشر ہوا چھوڑ دیا  
ہے۔"

میں ریو الوٹک چیز کے پٹے سے ٹیک ڈاک اور ٹانگیں ذرا  
پھیلا کر بیٹھے ہوئے بولا "اوس مرتبہ کوئی نئی کمائی شروع ہوئی نظر  
آ رہی ہے دروانی صاحب! اس میں تمہاری نئی باتیں کم ہوں گی نئی  
باتیں زیادہ۔ کئی نئے کردار بھی اس کمائی میں حشراف کرائے  
جائیں گے جو پیشہ عوام میں بڑی مقبول حاصل کریں گے۔"

مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اس نے اپنے موبائل فون کو بھی نیپ  
کرانے کا بندوبست کر رکھا ہو۔ اس لیے میں مکمل کر کوئی بات کرنا  
یا اسے خیوار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری فون کال کو بلیک میل کی  
شادت کے طور پر بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ چھینٹا  
چھوٹے سے چھوٹے ثبوت کی تلاش میں تھا جس کے ذریعے مجھے  
مضبوطی سے جکڑنے میں کچھ مدد مل سکے۔ میں اس کا یہ کام آسان  
کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن کچھ باتیں اس کے کان میں ڈال بھی دینا  
چاہتا تھا۔

"تم مجھے دمکی دے رہے ہو؟ بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟" وہ  
غرا۔

"میرے نہیں صاحب! میری کیا بھال کہ میں آپ کو دمکی

ایسی رکاوٹ درپیش ہو جس سے تمہارا آپ کو مشکل محسوس ہو تو  
ہمارے بزنس سولا اور ٹریڈ شوز جناب فتح شاہ سے رابطہ کریں۔"

میں نے مسکرا کر محبت سے فتح شاہ کی طرف دیکھا۔ بالی سب لوگ  
بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

وہ مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "مرا کیا آپ مجھے  
بھگانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں تمہیں ایسی جگہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ بالی سب کو  
بھگانا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اسٹاف کے لوگ جانے  
کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے میری تدبیر اور تقریر کا کم از کم اتفاقاً قاعدہ  
ضرور ہوا کہ کمرے سے نکلے وقت وہ لوگ ہنس ہنس کر ایک  
دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کمرے میں صرف میں "فتح شاہ  
اور صفیہ رہ گئے۔"

میں نے صفیہ سے پوچھا "تمہاری اس میٹنگ اور تقریروں سے  
تم پوری تو نہیں ہو رہی؟"

"نہیں۔" وہ شہری سانس لے کر بولی "میں تو سستی حاصل  
کر رہی ہوں۔ واقعی بڑے بڑے لوگوں کے بڑے مسائل ہیں۔ ہر شخص  
دولت بڑے کا دیوار اور زندگی کی اعلیٰ ترین آسائشوں کی شدید  
خواہش رکھتا ہے لیکن کسی کو اندازہ نہیں کہ یہ چیزیں اپنے ساتھ  
کتنے مسائل کے لے کر آتی ہیں۔ غربت کے بھی اپنی جگہ بڑے فائدے  
ہیں۔ انسان سکون سے نائیں پھیلا کے سو تو سکتا ہے۔"

"عبرت بچو۔ کل جب تم بہت بڑی بزنس مین بن جاؤ گی تو  
تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

فتح شاہ اس سے غائب ہوا "بالی! آپ پاس کی باتوں سے  
حوصلہ مت ہار دیے گا۔ اگر آپ دولت مند بننے کی کوششوں میں  
مصروف ہیں تو اپنی کوششیں جاری رکھئے پاس آپ کو ڈرا رہے  
ہیں۔ ہمارے مسائل کا دیوار کی وجہ سے نہیں بلکہ اکثر دیشتر غلط  
سلطنت کے لوگوں کے ساتھ سینگ بھناتے رہنے کی وجہ سے  
ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" صفیہ سرلاتے  
ہوئے بولی "آج صبح سے آپ کے پاس کے ساتھ رہ کر یہ اندازہ تو  
مجھے بھی ہوا ہے۔ بعض لوگ تو مصیبتوں کو دعوت دیتے ہیں یہ خود  
مصیبتوں کے گھر جا کر انہیں بکھر چکے۔ کچھ کچھ کھینچ کر لاتے ہیں۔"

"مجھے ایک بار پھر دوسری ترمیم شدہ مصرعہ چھوڑنا پڑے گا۔ جن  
پہلے تھاوی گئے وہ اب اسے لگے۔" میں نے توجہ کر کہا۔

فتح شاہ جلدی سے بولا "لیکن نی لی۔ اس زندگی کا اپنا ہی  
ایک انگ مڑا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کچھ کر رہے ہیں۔ آپ  
کی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ آپ لاکھوں بھیر بکریوں میں سے ایک  
نہیں ہیں۔"

صفیہ نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔ میں نے فتح شاہ سے  
کہا "میرا خیال ہے ذرا دروانی سے بھی بات ہو جائے۔ ذرا دیکھیں تو  
میری وہ شہر کا دوجہ مگر کچھ کیا کتا ہے۔"

"دو ختمیں تو اس سے رابطہ مشکل ہو گا۔ آپ اس کے موبائل



دول یا ایک میل کرنے کی کوشش کروں۔ میں تو خواب میں بھی ایسا کرنے کا نہیں سوچ سکتا۔" میں نے اپنے لیے سے خوف ظاہر کرنے کی کوشش کی "میں تو ایک عام آدمی ہوں۔ آپ کی رعایا ہوں۔ رعایا بھلا بادشاہ سلامت کو دھمکی دینے یا ایک میل کرنے کا تصور کر سکتی ہے؟ انہیں ذن بچوں سمیت کوئٹہ میں نہیں پلایا جائے گا؟ مجھے جیسے مجھڑے چماتے۔ جن کی کوئی ذن بچہ نہیں ہے انہیں یا دونوں دوستوں اور پرندوں کے ساتھ بھی کوئٹہ میں پلایا جاسکتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں کوئٹہ کا کام خزانے کی بجائے ٹیکسوں کے دفاتر، خلیہ ایجنسیوں اور تقابلی ٹھکانوں وغیرہ سے لیا جاتا ہے اور بادشاہ سلامت کی جگہ آپ جیسے افسروں اور ان کے سرستوں نے لے لی ہے۔"

"تم جتنی زیادہ زبان چلا رہے ہو اتنی ہی اپنا کیس زیادہ خراب کر رہے ہو۔" وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہے جناب! میں تو اپنا کیس پہلے ہی بہت زیادہ خراب کر چکا ہوں۔ میں نے سوچا اگر اس میں مزید خرابی کی گنجائش ہے تو وہ بھی نہ رہنے دی جائے۔ میرا غرض ہوتا ہے میں جو کسے وہ بدوری کوئی جانتے۔ آپ جیسے مہمان روز روز کمال ملتے ہیں۔ انہیں دل کے ارمان نکالنے کا پورا پورا موقع دینا چاہیے۔"

"چند دن بعد تمہاری یہ پچھاوٹ بند ہو جائے گی۔ ابھی تو تم نے تمہارے بارے میں چھان بین کا صرف آغاز کیا ہے۔ ابھی تو صرف تمہاری فاکس کھلی ہے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" اس کا لہجہ واقعی طوفان کی آمد کا ہوتا ہے ہاں تاہم میرے اندر بھی گویا کوئی ٹیلا انسان بہار ہو چکا تھا اور میں نے تیرہ کر لیا تھا کہ مجھے اس سے مرعوب نہیں ہونا تھا۔

"اب تو جس کے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ اسے بھگتنا ہی پڑے گا۔ درانی صاحب! میں نے کبھی سانس لے کر کہا نہیں ہے کہ یہ سوچ کر کوئی دم نہیں اٹھایا کہ میں جو کچھ بھی کروں گا اس کا نتیجہ صرف میرے ہی حق میں اچھا ہو گا۔ میں بڑے نتائج کے لیے بھی تیار رہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے آپ کو اس کی عادت ہرگز نہیں ہوگی۔ اگر آپ کی توقعات کے خلاف کچھ ہو گیا تو آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ درانی صاحب!"

"یہ صاف طور پر دھمکی ہے۔" وہ گویا کچھ اور بھڑک کر بولا۔

"مگر یہ ٹیلی فون نیپ ہو رہا ہے تو اس دھمکی کو بھی میرے اعمال ہائے میں شامل کر لیجئے۔ میں بھی یہ دیکھ چاہوں گا کہ دنیا کی کون سی عدالت اسے دھمکی قرار دیتی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"تم اور کافینڈن آدمی معلوم ہوتے ہو مسٹر افضل چوہدری! واقعتاً اس کے لیے میں کچھ نری آگئی۔ شاید وہ جیٹرا بولنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" میں نے شاید اندازہ نہیں ہے کہ اس قسم کے معاملات میں اور کافینڈن کی کتنا مرگ رہا ہے۔ اسنے میرے سے پرس میں ہونے کے باوجود ابھی تک تم نے شاید صرف

باریں ہی باریں دیکھی ہیں جو یقیناً کچھ قابل یقین کی بات ہے۔ تمہارا انداز یہاں ہے کہ تم بھی کسی طوفان کی بجائے کسی بحران سے گزر رہے ہو جس پر مجھے بھلا طور پر حیرت ہے۔ میرے خیال میں اندازاً دیکھنے بغیر کوئی شخص اتنا بڑا پرس اٹھائے نہیں کر سکتا۔ تم شاید ایسا کرکڑی کر کے خود کو واقعی شہزادہ محسوس کرنے لگے ہو۔ ہم بھی یہی یہ خیال تمہارے دماغ سے نکال دیں گے۔"

"مہمت خوب۔ اسے کہتے ہیں دھمکی۔" میں نے حسین لہجے میں کہا۔ "آپ خواہ خواہ مجھ غریب کی عاجزانہ ٹھٹھکی کو دھمکی قرار دینے پر تلے ہوئے تھے۔ میں بھی آپ سے کچھ اسی قسم کی باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن ظاہر ہے میں تو آپ کی رحمت میں ہوں۔ میں بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔" میں نے ٹھٹھکی سانس لی۔

"اس قسم کے معاملات ٹیلی فون پر طرز مزاج فرمانے سے حل نہیں ہوتے۔" اس نے اب پہلے کی نسبت کچھ اور رساں سے کہا۔ "مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نری کی۔ میں بھی غریبوں پر حال محسوس کی جاسکتی تھی۔" اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ وارنٹ بھیج کر جیس بلواؤں "تم وقت لے کر مجھ سے ملو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا کیس خراب نہ ہو تو تمہیں یہ عدیہ ترک کر کے کوئی دیکھ کرنا ہوگی۔"

جن سے وہ لمبی رتوں کے مطالعے کرنا ہو گا ان سے بھی شاید اس کا انداز ٹھٹھکی ہو تا ہو۔ شاید اس نے اپنا انداز ٹھٹھکی بدلنے کی زحمت نہیں کی تھی خواہ اس کے ذہن میں یہ امکان ہو کہ موجود رہا ہو کہ ٹیلی فون دوسری طرف بھی ٹپ ہو سکتا تھا۔ نہایت بے خوف اور دھڑلے سے سب کچھ کرنے والا آفیسر معلوم ہوا تھا۔ میرا خیال ہے فون پر یا بالمشافہ ٹھٹھکی اس کا پس انداز اشادہ دے رہی تھی یا تو ہو گا تو کچھ خودی اسے خوش کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہوں گے۔ اکثر کیسوں میں تو شاید اسے کوئی اشارہ بھی دینے کی ضرورت نہیں آتی ہوگی۔ میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ مجھے ہلکا کرنا یہ کیسٹ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا جس کا شروع میں تہیہ کے سامنے چھوڑ دیا تھا۔ اسکا تو اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے بارے میں ہم اور بھی کچھ کر چکے تھے۔ وہ فون پر دواؤں کیسٹ کے بارے میں کوئی اشارہ دینے کے معاملے میں احتیاط کر رہا تھا۔

"ضرور۔ ضرور۔ آپ سے ملاقات ضرور ہوگی۔ درانی صاحب! میں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا "لیکن ابھی نہیں۔ کچھ دن بعد۔ جب میرے بچے بھرے بھرے حالات نامی ملاقات کے لیے سازگار ہو جائیں گے۔"

"گٹھا ہے تمہیں اپنے کیس سے۔ بلکہ اپنے مستقبل سے۔ کوئی دلچسپی نہیں۔" اس کے لیے میں ایک بار پھر تھکی آئی لہجہ اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر کے مسکراتے ہوئے منہ اور فٹنگ شاہ کی طرف دیکھا۔ "جیسی اس شاہی کو بہت سی بے وفائی ہے ظاہر کی عادت پڑی ہوئی ہے۔" میں نے فٹنگ شاہ کو بتایا کہ اس نے

میری باتوں کے جواب میں کیا کیا تھا اور کون سی بات کس موڑ میں کی تھی۔ شفیع شاہ نے صرف کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "میرا خیال ہے سب کلاؤں پر سرگرم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ ڈیراں بھی بلا دینی چاہئیں تاکہ دورانی کو معلوم ہو۔" اے کے ہم بچے ایسے ہی کمزور بھی نہیں ہیں۔" پھر میں نے خود ہی صبح کی "ویسے ہمارے پاس "ڈیراں" نہیں صرف ایک ہی دوری ہے جسے ہم ضرورت پڑنے پر بلائے رہتے ہیں۔"

"لیکن وہ دوری بے شمار ڈیریوں پر بھاری ہے۔" شفیع شاہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے ذرا سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا "بلکہ وہ دوری نہیں دے سکتا۔ اتنی تاروں کا بٹا ہوا رستا۔"

صفر کو ان باتوں کے پس منظر کا طعم نہیں تھا اس لیے وہ کبھی میری اور کبھی شفیع شاہ کی شکل دیکھ رہی تھی۔ دور حقیقت اسے تو درانی سے ہماری چپقلش کے اصل پس منظر کا بھی علم نہیں تھا۔ میں نے نہیں صاحب کا اسلام آباد کا نمبر لایا۔ انہیں تلاش کرنے کے لیے کئی ہرمانے پڑے۔ آخر وہ ایک سو بائیس نمبر پر مل گئے موز بھی خوشخوار ہی معلوم ہوا تھا۔ پھر نئے ہی ہوئے "کونکی نیا کھلی تو نہیں کھلایا پر خوردار؟"

انہیں معلوم تھا کہ میں کوئی وقت دینے کے لیے ہی انہیں فون کرتا تھا "یہ خامدہ خواتین سے گفتگو کرتے وقت استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے سرا" میں نے منو بابت لے لے میں کہا۔

"اچھا۔ مجھے کراہے کے خیب و فراز مت سمجھاؤ اور کام کی بات کرو۔ اس وقت میں کسی اور کے گھر پر ہوں۔" وہ ملاٹھ سے اٹھ کر

"آپ کتنے مشین سے توی ہوتے جارہے ہیں۔ جذبات اور سوہات نام کی کوئی چیز آپ میں نہیں رہی۔" میں نے لفظی مانس لے کر کہا۔

"وقت کب ہے اور مقابلہ سخت۔" وہ بولے۔

"کب کا کس سے مقابلہ چڑکیا؟" میں نے قدوے حیرت سے پوچھا۔

"ہمارا تو پوری دنیا سے مقابلہ رہتا ہے۔" وہ بھی جو اپنی لفظی

اس میں بھر کر بولے "ہماری کیا پوچھتے ہو۔ ہم تو ہر وقت گویا حالت

"سرا میں رہتے ہیں۔ تم اپنی سناؤ۔ مسئلہ کیا ہے؟"

بلکہ میں نے آپ کا ہر سرکاری دفتر اور محکمہ ہی بجائے خود

نہ ہر۔ لیکن ان میں بعض افسر تو مت ہی تھیں مسئلہ بن

سپورٹ کارپوریشن کے بارے میں اسٹے کی انڈر گراؤڈ مارکیٹنگ

نہایت جالباب ہے اور ایک خیرہ انجینی اسی کے بارے میں

ماکی بھان کر رہی ہے لیکن بعد میں ایک دوسرے تحقیقاتی ادارے کو

سنے کی ڈنٹے داری دئی گئی ہے اس کا عالم یہ ہے۔" میں نے

انہیں درانی کے کڑوتازا تفصیل سے بتائے۔

میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی کرپشن کے کچھ ثبوت میں نے

خود حاصل کیے تھے اصل بات بتانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا اور یہ

مصلحت کے بھی خلاف تھا۔ میں نے بات بتاتے ہوئے کہا "یہ

فحش اتنی وہ دہری ہے کہ سب کچھ کر رہا ہے کہ اس کی کرپشن کی

خبریں نہ صرف اخبار والوں تک پہنچ چکی ہیں بلکہ کچھ ثبوت بھی ان

کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔ اب تک تو وہ کچھ مصلحتوں اور کچھ اس کے

مددے کے تھوڑے بہت خوف کی وجہ سے ان خبروں کو دبائے بیٹھے

تھے لیکن اب حالات کچھ بدل رہے ہیں۔ ویسے بھی خبریں بھلا کب

تک چھپی رہ سکتی ہیں۔ کسی ایک اخبار کے ذرا سا اشتہار دینے کی

دیر ہے۔ بالی سب کے لیے وہ بارش کا پسلا قطرہ ثابت ہو گا اور وہ

اس موضوع کو لے آؤں گے۔ اداؤں اور افراد کی جو بدنامی ہوگی

اسے تو خیر جانے دیجئے کیونکہ اداؤں اور ایسے افراد کو اپنی بدنامی کی

اب کوئی پروا نہیں رہ گئی ہے لیکن آپ اب یہ سوچیں کہ ایسا تو

امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں جو رپورٹ تیار

کے گا وہ کیا ہوگی؟ میرا خیال ہے آپ خود بھی اپنے تخیل کی مدد

سے چند سطروں میں اس رپورٹ کا خلاصہ لکھ سکتے ہیں۔"

میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو نہیں صاحب اچانک

بولے "تم ایک منٹ بعد مجھے دوبارہ فون کرو۔" اس کے ساتھ ہی

انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جہاں بیٹھے تھے وہاں اس

موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ بات کرنے کے لیے کہیں

اور جا رہے تھے۔

میں نے ایک منٹ بعد دوبارہ نمبر لایا تو انہوں نے فوراً کال

ریسیو کی اور بولے "ہال۔۔۔ اب میں گاڑی میں بیٹھ کر تم سے بات

کروں گا۔ دراصل اس معاملے کی تفتیش پہلے ایک خیرہ انجینی کو

کرتا تھی۔ دی کرتی تو ٹھیک تھا لیکن بعد میں یہ معاملہ کسی کی

داخلت پر اس ادارے کے سپرو کنڈ کیا گیا جو پہلے ہی خاصا بدنام ہے

اور ویسے بھی اس کا دائرہ کار زیادہ تر مالی معاملات تک محدود

ہے۔ لیکن، فیصہ یہ روز بدل اور جو توڑ توڑ سب جگہ چٹائی

رہتا ہے تم تناؤ، تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ اس سارے معاملے میں

تمہاری ٹانگ کماں چھٹی ہوئی ہے؟"

میں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر درانی کو پیغام بھیجا تھا کہ

وہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں وائٹ داری سے

تحقیقات کرے کیونکہ اس کی کرپشن کی گمانیاں پہلے ہی زبان زد عام

ہونے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ نہیں ایسا نہ ہو کہ اس بار ایک

جسٹس رپورٹ اس کے گلے کا پھندا بن جائے۔ لیکن اس نے اس

پیغام کو اپنی ذاتی توہین سمجھا اور جواب میں اپنے اختیارات کے

درجے فرعونیت کا مظاہرہ کرنے پر اتر آیا۔"

میں نے انہیں درانی کی ساری کارروائی اور اس سے ہونے

والی بات جیت سے آگے کیا۔ وہ خاموشی سے ساری بات سننے

رہے۔ میرے خاموش ہونے پر انہوں نے ایک لفظی سانس لی

اور حاشانہ لے لے میں بولے "آخر تم نے میں بھی بیگ

سرحد میں بہت بڑے پیر صاحب کی مشیت حاصل ہے۔ وہاں لوگ ان کو مانتے نہیں بلکہ قربان پختہ ہیں۔ جن خاندانوں میں یہ سب چیزیں ہوتی ہیں وہ عموماً سیاست میں بھی ضرور آجاتے ہیں۔ اس خاندان میں بھی ہر دور حکومت میں کوئی نہ کوئی دزارت ضروری ہے۔ ہر حکومت میں ان کا اثر روشن رہا ہے۔ ویسے آئی کے درانی کسی حد تک اپنے خاندان سے منکنا ہوا سا ہے لیکن آڑے وقت میں ہر حال یہ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ہر جائز ناجائز مسئلے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

”یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ سب کچھ حسب روایت ہے۔“

میں نے کہا۔

”اور تمہیں اس کے ساتھ سینگ بھڑانے وقت ان روایات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“ نہیں صاحب بولے ”لیکن تمہیں یہ سب معلومات حاصل ہی نہیں ہو سکی ہوں گی؟“

”حاصل کرنا چاہیے تو کر لیتے۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن ہم نے تو ساری توجہ صرف اس بات پر دی کہ وہ کتنا کرٹ آفیسر ہے۔ نہ صرف دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو لوٹ رہا ہے بلکہ میاشی اور دودے پیسے کی خاطر ملکی مفادات کا سودا کرنے سے بھی نہیں چمکا اور اپنے اس طرز عمل پر خود کو بڑے محسوس کرنے کے بجائے ہم جیسے درویشوں کو آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔“

”اب دو کیوں رہے ہو بازون دونوں؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ نہیں صاحب بولے ”مسئلہ یہ ہے کہ میں اس معاملے میں تساری کوئی خاص مدد نہیں کر سکتا۔ اس نے تمہیں ٹیکوں کے معاملات میں گھیرا ہے۔ ٹیکوں اور روایات کے معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اپنی سرکاری یا نجی ”دونوں جیشیوں“ میں کوئی دخل نہیں دیتے۔“

”تو آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں؟“ میں نے اپنے دل کا دھڑکنیں کچھ تیز ہوتی محسوس کیں۔

”ہاں۔“ وہ سنجیدہ ہی معلوم ہوتے تھے ”ہماری بھی کچھ حد ہے۔ بعض معاملات میں کوئی قدم اٹھانا خود ہمارے لیے نقصان ثابت ہو سکتا ہے۔ ہماری غیر جانب داری اصول پسندی اور دیانت داری پر حرف آسکتا ہے۔“

”یعنی ایک انتہائی کرٹ بددیانت اور نہایت اطمینان سے ملک کی جڑیں گھوکھلی کرنے والے آفیسر کو ذرا آؤت آفسی دیو جاکر معمولی سی سرزنش کرنے سے آپ کی اصول پسندی ممانعت داری اور غیر جانب داری پر حرف آسکتا ہے؟“ میں نے صاف آہستہ حیرت سے کہا۔ میرے لیے میں غیر ارادی طور پر کچھ عجیب جھٹک آئی۔

”بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے اور اس کے درمیان بہت فاصلہ بہت لا تعلق ہے۔ میرے اس کو سرزنش کرنے کی تمہیں نہیں جتنی۔ میرے اس اقدام کو کوئی غلط رنگ بھی دیا جائے۔“ وہ نرمی سے بولے۔

”آج شاید میری زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز لمحہ

بھنسا لیا۔ اور یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“

”سرسرا! آپ بھی یہ کہہ رہے ہیں؟“ میں نے حیرت اور مدد سے کہا ”کیا آپ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ ہر حکم اور اس کا ہر انفریاء ہی ہو جائے۔ اور آخر کار خدا نخواستہ یہ ملکی ڈھانچا زمین بوس ہو جائے؟ ویسے اس کے زمین بوس ہونے میں اب کس بھی کیا یہ کی ہے؟“

انہوں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ کسی سوچ میں تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولے ”ہم اپنی طاقتوں کے دوران میں ان موضوعات پر بار بار تدارک خیال کر چکے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ان موضوعات پر میرے محسوسات بھی تم سے مختلف نہیں ہیں اور میں بھی وہی کچھ چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو۔ اس ملک اس معاشرے کے بارے میں میرے خواب بھی وہی ہیں جو تمہارے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سب کچھ بہت آگے چکا ہے۔ اتنے مسائل ہیں اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ اکثر اوقات مجھ جیسا بہت بااختیار آدمی بھی اپنے آپ کو بے بسی محسوس کرتا ہے اور شاید تم یقین نہیں کرو گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی میرا بھی اپنے بال بونچے کو دل چاہتا ہے۔“

”یہ تو اور بھی زیادہ افسوس کا مقام ہے۔“ میں نے کہا۔

”بے شک۔“ انہوں نے تسلیم کیا ”لیکن فی الحال ہم صرف تمہارے اور درانی کے مسئلے پر بات کریں گے میں بے غم نہیں رہ سکتا کہ تم نے بہت غلط وقت پر بہت غلط آدمی کے ساتھ سینگ بھڑانے ہیں۔“

”سرسرا! آپ بھی یہ کہہ رہے ہیں؟“ میں نے پہلے سے زیادہ حیرت اور مدد سے یہ الفاظ دہرائے ”کاش یہ سننے سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔“

”تمہیں۔“ نہیں اتنی آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ موت سے پہلے تمہیں نہ جانے کیا کیا شہتا پڑے گا۔“ وہ اطمینان سے بولے ”دراصل میں اتفاق سے درانی کو قاتلانہ طور پر جانتا ہوں۔ آج تک اس سے طاقت تو نہیں ہوئی لیکن میں اس کے خاندانی پس منظر سے واقف ہوں۔ بہت بڑے خاندان سے اس کا تعلق ہے۔“

”ظاہر ہے سر!“ میں نے بگنی سی تکی سے کہا ”بے چارے چھوٹے خاندانوں والے تو ایسے عددوں تک پہنچنے ہی مشکل سے ہیں۔ اور اگر پہنچ بھی جائیں تو اتنے دھڑلے سے ان کی یہ سب کچھ کرنے کی حیرات ذرا مشکل سے ہی ہوتی ہے جو کچھ یہ کر رہا ہے۔ بڑے پیمانے کی ہر خباثت اور برائی انسان میں کسی نہ کسی قسم کی پشت پناہی کی وجہ سے آئی ہے۔ ویسے باغے وا دوسرے آپ اس کے خاندان کو بڑا کس اعتبار سے کہہ رہے ہیں؟ کیا خاندان کے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے؟“

”کیا اس مت کرو۔“ انہوں نے اپنے شہنشاہ انداز میں ڈانٹ پلائی ”تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ اس کے کچھ قریبی عزیز بہت بڑے نہیں دار ہیں اور اس کے تنگ تاناکا کو صوبہ

منے کا دن ہے۔" میں نے واقعی قدوسہ بے جنتی سے کہا "میں نے  
وہنا تھا جس عہدے پر آپ بیٹھے ہیں اس مقام پر بیٹھے ہوئے  
فصل کے اشارت پر سکوت میں تبدیلی ہو جاتی ہیں۔"  
انہوں نے غصے سے انداز میں ایک غصہ لگایا "یہ کام  
سیاست دانوں کا پہلایا ہوا اثر ہے۔ ہمارے معاشرے میں برسوں  
سے ایک جوت پھیلا جا رہا ہے کہ افسانے خدائی سلوم ہونے لگے  
ہیں اور حقیقی افسانہ دکھائی دینے لگی ہیں۔ یہ فضولی کی باتیں  
ہیں۔ کوئی بھی بہت بڑا کام کوئی اکیلا شخص انجام نہیں دے سکتا  
زادہ کتنے ہی اہم اور بڑے عہدے پر بیٹھا ہوا۔ ان معاملات میں  
ت سے عوامل کام کرتے ہیں۔"  
"مقتصد یہ کہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کریں گے؟" کسی  
ت سے مایوسی گویا میرے دل میں غصہ لگانے کی کوشش کر رہی  
لی۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولے  
صرف اس لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا کہ یہ ہمارا معاملہ ہے۔  
ی اور کی بات ہوئی تو میں صاف انکار کر دیتا۔ تم نے مجھے آزمائش  
باز دل دیا ہے۔"

میری کچھ زحمتیں بندھی لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے  
یا مجھے پھر باپ کی طرف دھکا دینے کی کوشش کی  
رحال تم زیادہ اونچی امیدیں نہ رکھنا۔ درحقیقت میں اس سے  
راست بات نہیں کر رہا۔ میں کسی کے ذریعے اسے اپنی  
منگی کا پیغام بھجواؤں گا لیکن میں اس سلسلے میں زیادہ خوش فہمی  
کار نہیں ہوں۔ لیکن ہے اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے۔"  
"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے ایک بار پھر بے جنتی سے کہا

سے بڑے کچھ دار لوگوں میں یہ اثر عام ہے کہ آپ کی طرف  
ملک کی بہت بڑی بڑی شخصیتوں میں سے کبھی کسی کو اگر یہ پیغام  
کہ ان کی کسی بات پر آپ کی پیشانی پر شکن آئی ہے تو اس کی  
ساکینہ لگیں گی۔"

وہ ایک بار پھر کرانے کے سے انداز میں بنے "شاید ماضی میں  
ایسٹ پر بیٹھی ہوئی کسی شخصیت کے بارے میں یہ تاثر درست  
ہو میرے بارے میں نہیں۔ اور پھر میرے ساتھ تو مسئلہ یہ  
پیش لی گیا۔ وہ سال بھی ختم ہونے والا ہے۔ مجھے ایک سال کی  
پہ کہ جب کسی کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ قریب آتی ہے تو لوگ  
کے کاموں کے سلسلے میں اسے ہٹانا شروع کر دیتے ہیں۔ کرسی  
بہت ختم ہے۔ ابھی کرسی ملنے کے آثار پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ  
کے آگے بچھے چکر لگانے لگتے ہیں۔ آپ کے داری عہدے  
کے ہیں اور اگر کرسی جیتنے کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو لوگ  
آپ کے سامنے سے پچھا شروع کر دیتے ہیں۔"  
"میں لوگوں کا تو یہ معاملہ بھی اٹھاتا ہوں۔" میں نے کہا  
کے ریٹائرمنٹ کے دن قریب آتے ہیں تو وہ بولے۔ ہرے کام  
آپ کو کرنا کر دیتے ہیں۔ جانتے جانتے اپنے کچھ بڑے بڑے

ساکینہ حل کرنا جاتے ہیں۔"  
"ہاں۔ شاید بعض لوگوں کا معاملہ ایسا ہوتا ہو۔" وہ ہم  
سے لیے میں بولے "لیکن میرا معاملہ بہت مختلف ہے۔ کچھ حالات  
بھی مختلف ہیں۔ میں جن میں فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ بلکہ شاید  
ملاقات پر بھی نہیں بتا سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ ہمارا ہر کام ہی اٹ  
ہو گیا۔ جیسا کہ تم خود کہے ہو کہ ہمارے بارے میں تاثر یہ ہے  
کہ ہم سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ  
اس وقت سیاست ہم پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ ذلت کا ایک سلاب  
ہے جو ہمیں ہمارے لے جاتا دکھائی دیتا ہے لیکن ہم بڑی مشکل سے  
اپنا دامن بچا کر وقت پر کر رہے ہیں۔" وہ اب برج کے صحنے میں  
بات کر رہے تھے۔ شاید ان کا اشارہ اپنے پورے گھر کی طرف تھا  
یا پھر وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے قریبی ساتھیوں اور ہم خیال رفقاء کی  
بات کر رہے تھے۔

"آپ کے دم سے پیشہ میری بہت بندھتی تھی اور میں اپنے  
آپ کو ہر قسم کی برائیوں، خیانتوں اور فزمن مفت لوگوں کے  
سامنے بڑا مضبوط محسوس کرتا تھا۔" میں نے بغیر نہ سکا "لیکن  
آج آپ سے بات کر کے بڑی باپوسی ہوئی ہے۔"

"وقت وقت کی بات ہے۔" ان کے لیے کی میں ایک  
خفیف سی افسردگی اور شاید کسی حد تک شکستگی محسوس  
تو پھر میں کیا امید رکھوں؟" میں نے پوچھا۔  
"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میرے چاہنے کو چھوڑیں۔" میں نے اختیار استہزائیہ سے  
انداز میں اس دیا "آپ اپنی تمام تر بے بسی کے ساتھ جو کر سکتے ہیں  
وہ کر دیں۔"

"تھک ہے۔" میں اپنی ہی کوشش کر رہا تھا۔ "وہ کمزور لیے  
میں بولے "تو بے چارے اس شخص سے اپنے کی کیا پڑی تھی؟"

"میرا بس چلے تو میں پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے  
ایسے تمام افسروں سے الجھ جاؤں جن کے بوجھ سے اب ملک کی کمر  
ٹوٹنے میں تھوڑی سی کسر نہ رہی ہے۔ مگر افسوس کہ یہ میرے بس کی  
بات نہیں۔" میں نے حقیقی آفس سے کہا "جب یہ آپ جیسے  
لوگوں کے بس کی بات نہیں تو میں بے چارہ کس شمار قرار میں  
ہوں۔"

"ہیں۔ اب زیادہ المناک قسم کے مکالمے بولنے کی کوشش  
نہ کرو۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ جن میں زیادہ پریشان نہ کرے۔"  
"میں صاحب نے طویل سانس لے کر کہا "تمیں چار دن بعد دوبارہ  
بات کریں گے۔"

"جہت بہتر۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ شفیق شاہ  
اور صفیہ اس دوران میں کم از کم کچھ دیکھنے ہی رہے تھے جو میں  
کہہ رہا تھا اور اس سے ہی شفیق شاہ کو ڈپٹی منصف کو بھی اندازہ ہو گیا  
تھا کہ کھنگر کچھ زیادہ امید افزا نہیں رہی تھی۔ مگر کہ اسے یہ نہیں  
معلوم تھا کہ میں کس سے بات کر رہا تھا اور اس کی کیا حیثیت تھی۔  
میرے فون بند کرتے ہی وہ بولی "شاید بات ختم نہیں۔"



بڑے تک تھے۔ آپ دوبارہ دنیا میں کیسے پہنچ گئے؟ وہ حیرت سے

نے گویا مجھے ڈرایا۔  
”تمہیں ہر حال میں پہنچا ہے۔ خواہ جہاز کی دم سے لٹ کر

پہنچو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔  
”اگر جہاز کی دم پر بھی ریش ہو تو ہم لوگ کسی چوہے وغیرہ کی

دم پکڑ کر آجاتے ہیں۔“  
”ہاں۔۔۔ ضرور آجاتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا ”بس ڈرا

ہو شیار رہا۔ چہا کسی اور طرف نہ لے جاسکے۔ بعض چوہے بڑے  
بد معاش ہوتے ہیں۔“

”انی اتہ مت غیث ہو۔“  
”وہ فوازی ہے آپ کی۔“ میں نے کہا ”اور ہاں۔۔۔ اتفاق کو

فون کر کے کہتا ہے کہ ہمیں یہاں بھی لاہور کی طرح کبھی کبھار کسی  
ماہر قہمی میک اپ میں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ایسے کسی کار آمد

آوی کے نام پتے اور فون نمبر سے مجھے آگاہ کر دے اور ہمارے  
پارے میں اسے فون کر کے اطلاع بھی دے دے تاکہ ہمیں اس کو

کچھ سمجھانے کی ضرورت نہ پڑے۔“  
”اوکے پاس کوئی اور حکم؟“ اس نے سعادت مندی سے

پوچھا۔  
”حکم تو مت سے ہیں لیکن ان کے بارے میں بعد میں بات

ہوگی۔“ میں نے شرارت سے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ میرے  
لیجے کی شرارت کو محسوس کرتے ہوئے جو اب کچھ کہتی میں نے سلسلہ

منقطع کر دیا۔  
پھر میں نے اٹھے ہوئے صنف سے کہا ”اس سے پہلے کہ مجھے

کوئی اور کام یاد آجائے“ ڈانٹک اہل میں پلتے ہیں۔“  
”آپ کتنا کھانا پھر کیوں تنے ہوئے ہیں؟ آپ تو دل بھی

نہیں چاہ رہا۔“ صنف یہ کہتے ہوئے ذیلیہ ڈھالے سے انداز میں  
اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بعض اوقات دل نہیں چاہ رہا ہوتا لیکن مدد چاہ رہا ہوتا  
ہے۔ اور دل سے زیادہ مدد کی بات پر دھیان دینا چاہیے۔

جیسے میں دیتا ہوں۔“ میں نے دواوازے کی طرف چلے جا کر اشارہ  
کرتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے فہم دی۔ ہم ڈانٹک ہال میں آ بیٹھے کھانے  
کا آمیزہ دینے کے بعد میں نے ذرا ٹیبل کر بیٹھے ہوئے کہا ”تج کا

دن بہت سی واہیات انداز میں گزرا۔ اگر تم ساتھ نہ ہوتی تو یہ  
اور بھی زیادہ واہیات محسوس ہوتا۔“

”ہو سکتا ہے یہ میری ہی وجہ سے واہیات گزرا ہو۔“ صنف  
نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”یہاں کیسے ہو سکتا ہے فون کی وجہ سے دن واہیات کیسے گزر  
سکتا ہے؟ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ اور اس

رنگ میں ہلکے ڈالنے والے عناصر دوسرے ہوتے ہیں۔“ میں نے  
خود کہا۔

”وہ ذہن جنم کی غلطی سے۔ یا پھر شاید مجھے اپنی اصلاح کا  
ایک اور موقع دیا گیا ہے لیکن آپ اپنی سناں۔“

”مجھے تو مزید سزا کانٹے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میری سزا میں یہ  
بھی شامل ہے کہ میں آپ کی باتیں سنوں۔“ وہ لٹھڑی سانس لے

کر رہی۔  
”میں بہت ہو چکی۔ یہ فضول باتیں کرنے کا وقت نہیں

ہے۔ میں نے تمہیں بہت ضروری کام سے فون کیا ہے۔“ میں نے  
ہلکی سی ڈانٹ لگانے کے انداز میں کہا۔

”وہ تمہیں اندازہ ہو گیا ہے۔ بغیر کام کے آپ بھلا کیسے فون  
کرتے ہیں بیٹو صاحب!“

”دل تو کیا چاہ رہا ہے کہ تم سامنے ہو تیس اور خطر فرمانے کی  
تصاریف اس کو شش پر کوئی تصاریف ہی چیز اٹھا کر میں تمہارے سر پر

سے مارا لیکن میری یہ کوشش بھی یقیناً مجھے پہنچ پڑتی۔ وہ چیز نوٹ  
آئی۔“

”اور اس مدد سے آپ کا پارٹ ٹل ہو جاتا۔ بیٹو لوگ  
بھلا نقصان کمال برداشت کر سکتے ہیں۔“

”جیسے اتنے عرصے سے برداشت کر رہے ہیں۔ اس سے بڑا  
نشان کیا ہو گا۔“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا ”اور اب مزید

نشان اٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔ چنانچہ تمہارے لیے بدایت یہ ہے  
کہ فوری طور پر اپنا مختصر سامان ایک پوٹلی میں بند ہو اور لاٹھی جیپ

لی فوراً کراچی پہنچ جاؤ۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں  
میں کراچی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ فون کو بھی ساتھ لانا ہے۔“

”کیا لوگوں نے تمہیں سراہ پکڑ کر مارنا شروع کر دیا ہے۔  
تم چاہتے ہو کہ ہم دونوں ڈکر تمہیں جھڑائیں؟“

”ہاں۔۔۔ کیا کچھ لوہ۔“ میں نے جواب دیا ”اور ذرا قیامت  
کا۔ یہ بات میں تنبیہ کی سے کہ رہا ہوں۔ یہاں تصاریف اور فون

ضرورت آتا ہی ہے۔“  
”حیرت ہے۔“ وہ برہنہ ”یقین نہیں تھا کہ جس میں وہاں بھی

لی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم ہمیں  
ماٹر لوگ کے عہدے پر فائز کر کے بھول گئے ہو۔“

”تم اپنے آپ کو کلرک کہہ رہی ہو؟“ میں نے بے چینی سے  
”نہ کا بڑا کا دوا بار سنبھالے بیٹھی ہو اور اپنے آپ کو کلرک کہہ

ہو۔“  
”کام تو کر لیا والے ہی ہیں۔“ وہ مفہوم لیجے میں رہی۔

”پھر بھی خدا کا شکر کرو۔ تم میں اہلیت تو کلرکوں والے کام  
کا ہی نہیں تھی۔ یہ تو مایوسی کی دوا دلی تھی کہ جس میں

ہم کام سنبھال دیے اور مزید اہم کاموں کے لیے جس میں کراچی  
آ رہا ہے۔ بس اب چل چل بن کر اور پہلی میر فلاٹ میں

حاصل کرنے کے لیے نزول ایجنٹ کو فون کرو۔“  
”اگر صبح تک کسی بھی فلاٹ میں سہیلی نہ ملیں تو۔۔۔ اس

دفعتاً وہ غصیدہ ہوتے ہوئے برہنہ ہوئی ”فضل صاحب! میری آپ  
سے شناسائی کو جسد جسد آٹھ دن بھی نہیں گزرے۔ آپ یقیناً اتنے

ان کی بہت پوچھا تا ہوں، انہیں حوصلہ دتا ہوں اور اگر مجھ سے ہو سکتا ہے تو وہ بھی کرنا ہوں۔"

"میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ دنیا میں آپ جیسا بھی پائے جاتے ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے سے کہنے لگی۔

"میں بھی تم نے دنیا میں دکھائی کیا ہے۔ بہت سے لوگ جو بہت جلد بخیر ہو جاتے ہیں، بہت کم لوگوں سے مل پاتے ہیں لیکن"

جس کہ یہی کل دنیا ہے۔"

کھانے کے بعد وہ گہری دیکھتے ہوئے بولی "مجھے بہت چاہیے تھا۔"

"نہیں ہے۔ تم اب جائزہ۔ آج کے دن واقعی صبح دم باہر نہیں رہتا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے تمسک نہ ہوئی۔"

"معدرت فرمایا چھوڑیں۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی ان لوگوں کو کامران کی لاش ملنے کا امکان تھا لیکن مجھ

ناخوشوار موضوع چھیڑنا نہیں چاہ رہا تھا اور وہ بھی اس سے دسی تھی۔

میں نے جلدی سے کہا "رخصی سے پہلے بار بار فرمایا تم اب فاصلہ کری ڈالو۔ میں کاغذات وغیرہ دیکھ کر کیا کرنا تو نہیں ایک بڑا ہے اور تمہیں بڑا کہلاتا ہے۔"

میری طرف سے مٹھن اتنی سی بات سن کر اس نے مٹھن کوئی بوجھ اتر گیا اور وہ رخصت ہوتے وقت پہلے مٹھن نظر آئے گی۔ اسے دواڑے پر سی آف کر کے

میں آبیجا۔ آئیں میں تھوڑی بہت اشیائیں دیکھ چکی تھی کوئی چھوٹا سا کام کرنا ہو تو کسوں۔

ابھی مجھے آئیں میں بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے

اتر کا پر اطلاع دی کہ کوئی پولیس انسپکٹر مجھ سے ملنا چاہتا

خیال مجھے یہی آیا کہ شاید وہ رحیم گل خاں کی فراموشی سے اسے تو ابرا چھی طرح پہچانتی تھی۔ اول تو وہ امیر کے

تکلف ہی نہیں کرتا تھا۔ سیدھا میرے پاس چلا آتا تھا

وجہ سے امیر کے پاس رک بھی جاتا تو وہ اتنے تکلف کی آمد کی اطلاع نہ دیتی۔

"کون ہے؟ کس علاقے سے آیا ہے؟ کیوں آتا ہے؟"

میں نے دریافت کیا۔

اس نے بتایا کہ وہ اندرون شہر کے ایک خاندان سے تھا اور کوئی ضروری بات کرنے کے لیے مجھ سے ملنا چاہتا

نام احمد رضا ہے۔

"اسے دس منٹ کے لیے روکو۔ اس دوران میں اس کی خاطر مدارات کرو۔ دس منٹ بعد اسے میں بھیج دیتا۔"

میں نے دانت کی۔

بڑے بھلے کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہوں گے۔ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی کہ آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں لیکن میں کم از کم اپنی

تشویش کا اظہار تو کر سکتی ہوں۔ کہیں آپ کسی مسئلے کو ضرورت سے زیادہ تو نہیں پھیلا رہے؟ کہیں آپ کسی غیر ضروری تصادم کی

تجارتی تو نہیں کر رہے؟ میں چاہتی ہوں آپ جملہ ریس اور اگر کسی سے اچھے سے گزر کر کیا جا سکتا ہے تو گزری کر دیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ تشویش زدہ سی ہو کر بولی "آپ کو میری بات بڑی نہیں لگی؟"

میں ہنس دیا "بڑی بھلا کیوں لگے گی؟ تمہاری یہ تشویش تمہارے غلوں کی علامت ہے۔ اور غلوں سے بھلا کس کو برا لگتا

ہے؟ تمہاری اس تشویش کا شہر ہے۔ لیکن تمہاری یہ تشویش بھی غیر ضروری ہے۔ تمہیں تشویش میں جھلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

ہم لوگ اس قسم کے دھندلوں میں اکثر جھپٹے رہتے ہیں۔ جب ہم ہمیں اچھی طرح جاننے لگو گی تو ہمیں ممکن ہے تم خود بھی ان

مداخلات میں ہمارا ہاتھ مٹانے لگو۔ ہم مجیب سے لوگ ہیں۔ ہمارے ساتھ رہنے والوں پر ہمارا رنگ بہت جلدی چڑھ جاتا ہے۔"

"یعنی آپ کو سمجھاتے سمجھاتے میں خود بھی آپ کے ساتھ شریک ہو جاؤں گی؟" وہ ہنسی۔

"ہاں۔ اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔" میں نے جواب دیا پھر ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا "لیکن تم ہی احوال ایسی کسی بات کے بارے

میں مت سوچو جو تمہیں فکر مند کر دے۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں بیٹھ کر ہم کھانے کے ساتھ ساتھ خوش کن باتیں کریں گے۔ دوستی کی

باتیں۔ کاسیالی کی باتیں۔ حسین مستقبل کی باتیں۔"

"کس کی کس سے دوستی؟ کس کی کاسیالی؟ کس کا حسین مستقبل؟" اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر

پوچھا۔

"تمہاری ہم سب لوگوں سے دوستی۔ جس کا ابھی آغاز ہو رہا ہے۔ تمہاری کاسیالی جس کے ابھی صرف آغاز نمودار ہو رہے

ہیں۔ تمہارا حسین مستقبل جس کی ابھی صرف بنیاد رکھی جا رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کی باتیں سن کر دل میں جلتیجک سے بچتے لگتے ہیں۔" وہ بہت دھجھے لہجے میں بولی۔

"کیوں میں چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ سب لوگوں سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں؟"

"کیا تم نے مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے؟ سب لوگ تو اس قابل نہیں ہوتے کہ ان سے ایسی باتیں کی جائیں۔ بعض لوگوں کو تو دیکھ

کر یا ان کی ایک آدھ بات سن کر ان سے بات کرنے کے بجائے انہیں لات رسید کرنے کوئی چاہتا ہے۔ میں صرف ان لوگوں سے ایسی باتیں کرتا ہوں جن کے بارے میں امید نظر آتی ہے کہ وہ دنیا میں کوئی اچھا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں دنیا کے سارے خوش خیال، خوش باش اور خوش گمان لوگ اس دنیا کو اپنے اور دوسروں کے لیے ایک زیادہ بہتر جگہ بنانے کی کوشش کریں۔ میں

اس نے میرے سوال کا جواب دے بغیر درخت کی تصویر فائل سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ "شاید انہیں کبھی بچاتے ہوں۔" وہ غور میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ بھی انہی فوجیوں کی تصویریں تھیں لیکن انہوں نے ان میں وہ مردہ اور کافی خراب حالت میں نظر آ رہے تھے یعنی جیسی حالت میں انہیں نے انہیں چھوڑا تھا۔ ان کی تقریباً اسی تصویریں ترح کے اشیاءوں میں بھی چھپ چکی تھیں لیکن بلیک اینڈ وائٹ اور کافی پرانی تصویریں دیکھنے کے بعد کوئی مشکل سے ہی کہہ سکتا تھا کہ یہ انہی فوجیوں کی تصویریں تھیں۔ پولیس نے میرے پاس پہنچنے میں بڑی مستعدی دکھائی تھی لیکن یہ مستعدی میرے لیے ناقابل یقین تھی۔

"نہیں۔ میں انہیں بھی نہیں پہچانتا۔" میں نے فنی میں ہر بلایا پھر سلاوی سے پوچھا "کیا یہ بھی انہی۔ دونوں فوجیوں کی تصویریں ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اطمینان سے کرسی کے پیٹے سے ٹک لگاتے ہوئے کہا "تو جو بلیک اینڈ وائٹ تصویریں ہیں وہ پولیس دکاندار کی ہیں۔ کافی پرانی ہیں۔ یہ دونوں اسٹریٹس پر تھے لیکن کلا حیرت سے پولیس کو ان کے بارے میں کچھ بلوم نہیں تھا۔ کل کو کلا میں ملی ہیں۔"

اس نے ہنسنے دار لہجے میں مجھے تحصیل سے اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں سے لاشیں ملی تھیں۔ غار پر مجھے اس جگہ کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں ایک شریف اور سبزز توئی کی ویڈیو کا اظہار کرتے ہوئے سہا رہا۔ پھر وہ بلا "تو بے تو یہ دونوں سڑک کے پتھر بڑے خبیث تھے۔ مفور تھے۔ کوئی آٹھ آٹھ دس دس توکل کے ہوئے تھے۔ آٹھ آٹھ آٹھ کے مارے تھے۔ بستا خوری بھی کافی عرصے کی تھی لیکن پولیس کے پتے پتے چل رہے تھے۔"

یہ میرے لیے ایک حیرت انگیز اطلاع تھی۔ میرے انداز کے مطابق وہ اکثر وہ مشرک میرے شہر میں مصروف سڑکوں پر طرح اٹھائی وہ پرانی جیب یاچہ دی کی کوئی گاڑی دوڑاتے پھرے گئے جس طرح مجھے افوا کرتے کے بعد دوڑاتے جا رہے تھے۔ عرصہ علاوہ بھی وہ نہ جانے کس کس کو کہاں کہاں سے افواہ اس کا کیا حشر کر رہے ہوں گے لیکن وہ پولیس کے پتے نہیں دیتے تھے جو جگہ جگہ سڑکوں اور چوراہوں پر چیکنگ کے لیے کھڑے تھے۔

اس کی بات جاری تھی "تو بے تو یہ اسی قسم کے لوگوں میں ہیں جن کی موت کی خبریں کرپولیس والوں کے منہ سے "خس کم جہاں پاک"۔ کہتی تھیں تو کئی پڑتی ہے۔" میں نے جیل میں جا کر کس نے انہیں قتل کیا ہے۔ مانا کہ اس جارے نے جوائنک کام انجام دیا ہے اور ہمیں پولیس چارہ بدنامی سے بھی بچالیا ہے لیکن پھر بھی ہمیں حقیقتات تو کئی ہیں اور اگر وہ شخص۔ پکڑا جاتا ہے تو اسے جیل بھی بھجوا دیتا ہے۔

میں نے مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ میں آفس کے قریبی دروازے سے نکلا۔ لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے میں پہنچا اور تھری فیس سوٹ پہن کر ٹیبل درست کر کے دائیں آگیا۔ دس منٹ سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ میں نے اتر کام پر ابھرے کما کہ وہ احمد رضا کو بیچ دے۔

وہ ایک بیماری بھر کم گرفت صورت اور پختہ عمر شخص تھا۔ دردی میں تھا اور ہاتھ میں ایک فائل بھی ڈھری کر کے تھا۔ ہونے تھا۔ وہ ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور یہ دیکھ کر ڈا اطمینان کی سانس لی کہ اس کے ہونٹوں پر خوش خلقی کی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

مصافحے کے بعد میں نے اسے بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "مصافحے کیجئے گا" میں ذرا اوپر گیا ہوا تھا اس لیے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ آپ کیا کھانا پینا پسند فرمائیں گے؟" "کھانا پینا؟" نہیں کی۔ نہیں۔ وہ۔ آپ کی سیکڑی نے کافی خاطر قانع کی ہے۔ بڑے اچھے اظلاق کی خاتون ہے۔" وہ کھلے سے زیادہ واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ فائل اس نے میز پر رکھ دی اور بیٹھے بیٹھے ہی اپنی بیٹ درست کرنے لگا پھر اس نے کمری نظر سے میرا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ چند سیکنڈ کمرے میں سکوت رہا۔

"فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے ہی یہ سکوت توڑا۔

"خدمت تو چلی رہی ہے کی۔" وہ کچھ متذبذب سے لہجے میں بولا "تو بے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ آپ اس کو مدین کی کارروائی سمجھیں۔ ضابطے کی تقبیل ہے۔ آپ مشتاق پولی اور جیدی کا کام کے دونوں فوجیوں کو جانتے ہیں؟"

"جی نہیں۔" میں نے کچھ ڈھن پر ہندوڑے کر دیا تھواری سے جواب دیا۔

"یہ تصویریں دیکھیں۔ شاید آپ قتل سے پہچانتے ہوں۔"

اس نے پاسپورٹ سائز کی دو بلیک اینڈ وائٹ تصویریں میرے سامنے رکھ دیں۔ وہ دو اول جلیل سے فوجیوں کی تصویریں تھیں لیکن نہ جانے کیوں ان کی شکلیں مجھے کچھ مانوس محسوس ہو رہی تھیں پھر میرے ذہن میں بھگا کا سا ہوا۔ یہ جیتا ان دونوں فوجیوں کی کافی پرانی تصویریں تھیں جو دو دن پہلے ہی میرے ہاتھوں شہر کے مرکزی علاقے میں ایک خالی پارکنگ سٹاٹ میں..... مارے گئے تھے۔ وہ اس وقت اپنی دولت میں ایک اچھے ہوئی سے مجھے افواہ کر کے ملے تھے جب میں حینہ سے الگ ہوا تھا۔ حینہ نے مجھے ان کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔

میں نے اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر سادگی اور حیرت کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں تو نہیں جانتا انہیں۔ کون ہیں یہ؟"



وقت سے تیز، ایک طوفان بلاخیز  
اجل سے زیادہ سفاک اور چٹانوں سے زیادہ  
سخت۔  
ایک ایسے شخص کی داستانِ مسلسل  
جسے دنیا موت کے ہر کارے کے نام سے  
جانتی ہے۔  
ڈاکٹر ایم اے قریشی

کا

لازوال کردار

13  
ٹائیکر  
حصوں میں

مکمل سیٹ ۶۵۰/- روپے

مکتبہ القریشی، سرگرم روڈ، اردو بازار

لاہور، فون ۶۶۸۹۵۸

ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی میں نے سوچا چلو فرض ادا ہو جائے گا۔  
کارروائی تو نال جا رہی تھی۔ ٹھیک ہے نا؟  
"بالکل ٹھیک ہے" میں نے تھوک نکل کر گویا سکرانے کی  
کوشش کی۔

اس سلایب سے قلم نکالا تو قلم کھلی اور زرد سا ایک کاغذ  
نکل کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولا "میں تو پھر آپ کے بیان میں  
اس سلسلے میں مختصر کیا لکھوں تاکہ آپ کو اس سلسلے میں کچھ مایوس  
نہیں۔ اور مفوضِ طمان یعنی متوکلین کو آپ کسی حیثیت سے  
جاتے پہچانتے نہیں؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ بالکل۔" میں نے جلدی سے کہا۔  
اس نے کاغذ پر کئی منٹ تک سر جھائے رکھنے کے بعد دو دھن  
طرز پر عمل کیں۔ کاغذ پر پہلے سے بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ قلم کی ہیری  
طرف کھسکاتے ہوئے وہ بولا "میں نے کچھ اپنے دستخط سے فرا  
دیں۔"

دیے تھیں کی بات ہے۔ ہم کو شش کریں گے کہ اسے کم سے کم  
سزا ہو اور اسے زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔  
"لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں اور یہ تصویریں  
کیوں دکھا رہے ہیں؟" میں نے انہیں آئینے میں پوچھا۔  
"دراصل۔ جی بات یہ ہے کہ ہمیں ایک ختون کا گناہ میلی  
فون موصول ہوا ہے جس کا کہنا ہے کہ اس نے اتفاق سے ایک فتر  
کی کڑی سے ان دونوں فوجیوں کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ اس نے  
نہیں کہا کہ ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں ایک  
سی شخص کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں اور اتفاق سے وہ اس شخص کو  
پکارتی ہے۔" وہ ڈرامائی سے انداز میں مسکرایا۔  
"اور وہ شخص میں ہوتا۔ یعنی۔ آپ کا مطلب ہے۔۔۔؟"  
میں نے اپنی آنکھیں زیادہ سے زیادہ پھیلائے کی کوشش کی۔ اس  
کے ساتھ ہی مددے کی شدت سے گویا میری آواز گنگے میں اٹک  
گئی۔

"ہاں جی۔ ہمارا تو اصل میں کوئی مطلب نہیں۔ ختون کا  
مطلب جی تھا۔" اس نے کافی حد تک باجیں پھیلاتے ہوئے  
انہماک میں گردن ہلائی۔

"اور آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا؟" مددے کی شدت  
سے گویا میری آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے۔

"ہمارے۔ لیکن کو چھوڑیں جی۔ ہم تو ابھی لیٹی رائے محفوظ  
رکھنا چاہتے ہیں۔" پھر وہ ڈرامائی خیر انداز میں مسکرایا "آپس کی  
بات ہے جسے مجھے ذاتی طور پر تو اس بات پر پہلے ہی یقین نہیں کیا  
تھا۔ ختون نے ہمیں آپ کی حیثیت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔  
مجھے تو اس دکت سی جی آگئی تھی۔ ہمیں تو چاہے آپ جیسے امیر کبیر  
اور صاحبِ حیثیت آدمی ایسے کاموں میں اپنے ہاتھ کندے توڑی  
کرتے ہیں۔ بندہ مروا نا ہی ہو تو لاکھ دو لاکھ کسی خانہ خراب کرائے  
کا قائل کو دے کر صاف شہرے طرحے سے گردن بچا لیتے ہیں۔  
اور آج کل تو ویسے ہی اس کام پر بڑی بہار آئی ہوگی ہے۔ بندہ  
مروانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ ایک شریف اور معزز آدمی میں  
کمال اتنا دم خرم ہوتا ہے کہ اکیلا اس قسم کے دو دو پیشہ ور  
بوساٹوں اور قاتلوں کا یہ شہر کر دے۔ اور آپ کو دیکھنے کے بعد  
تو میرا یقین اور بھی بکا ہو گیا ہے۔"

میں نے ایک گرمی سانس لے کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر  
اس کی باتوں سے مجھے اطمینان ہوا تھا۔ اس کی بات معنی خیز  
سکرانے کے ساتھ جاری تھی "ختون نے خود میرے ساتھ بات  
کی تھی اور مجھے ایک منٹ میں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس پکڑ میں  
کسی معزز آدمی کو پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ گناہ کاٹوں میں  
سے بھی ہم صرف انہی پر کارروائی کرتے ہیں جن میں ہمیں کچھ  
جان نظر آئی ہے۔ تجربے کی وجہ سے ہمیں اندازہ ہوا تو ہوسا جانا  
ہے کہ کون ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کون صحیح  
فوجی کر رہا ہے۔ کون گمراہ بھیڈی ہے اور لٹا ڈھار رہا ہے۔ کون  
کس طرف کے پکڑ میں ہے۔ ان سب باتوں کا ہمیں کافی اندازہ

میں نے دیکھا کاتھ پر پہلے سے جو کچھ لکھا ہوا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ فلاں دن فلاں وقت پر موصول ہوئے دانی محکم ٹیلی فون کال میں جو کچھ کہا گیا اس پر مذکور کرنے پر دستخط خود جا کر مستحقہ شخص سے انکوائری کی اور یہ بیان حاصل کیا۔۔۔ دھتلا کرنے سے پہلے میں نے شکر گزارانہ انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ سختی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا "میں نے آپ کا کام کتنا آسان کر دیا ہے اور کتنے سادہ انداز میں تفتیش کی ہے۔"

"واقعی! آپ بہت مہربان و دانت دار اور تجربہ کار افسر مطوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کے اس خادوں کو بیکش پاور کھوں گا۔" پھر دھتلا کو دینے کے بعد بھی میں نے فائل اپنے سامنے ہی رکھتے ہوئے کہا "آپ ایک منٹ اور غور جائیں۔"

میں نے دفتر کام پر کیشز کو کچھ ہدایات دیں۔ کچھ دیر بعد وہ آیا اور ایک دیگر لفافہ میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے وہ لفافہ فائل میں رکھ کر اسے فائل واپس دیتے ہوئے کہا "ہم آپ جیسے شخص افسروں کے بڑے قدروان ہیں۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" وہ فائل کو ڈھری کر کے مضبوطی سے ہاتھ میں دباتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"ہیں۔ یہ آپ کے حسن اخلاق کے جواب میں ہمارے خلوص کا معمولی سا اظہار ہے۔" میں نے انکساری سے کہا۔ اس نے رخصت ہوتے وقت بڑی گرجوٹی سے مجھ سے معافی کیا۔

اس کے جانے کے بعد میں کئی منٹ تک اپنی کرسی پر ساکت بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ یہ مشتاق بولی اور جیدی کا کا پیٹ وہ بد معاش اور کرانے کا قاتل تھے اور آج کل غالباً جیشہ کرم کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے جس نے انہیں تھینک کی عمرانی اور اسے مختلف خطرات سے بچانے کے لیے قینات کیا ہو گا۔ آخر تھینک اس کا ایک "بھتیجی" تھی اور آج کل ایک اہم براہیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ خصوصاً درانی جیسے توہیں کا قرب حاصل ہونے کے بعد اسے غالباً اپنے اوپر بڑا ناز اور ذمہ تھا۔ اس نے مشتاق بولی اور

جیدی نکاکے قتل کے بعد شاید جیشہ کرم کی ہدایت پر خود بھی منظر میں رہے ہوئے مجھے چھوٹانے کی اپنی ہی ایک لنگڑی لیلیٰ کوشش کی تھی۔ شاید انہیں خود بھی اپنی اس کوشش کی کامیابی کا زیادہ یقین نہ رہا ہو۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ دونوں بد معاش خود پولیس کو مطلوب اور اس کے معتب تھے اس لیے جیشہ کرم صاف طور پر ان سے اپنے نفع کا اظہار نہیں کر سکتا تھا لیکن سہرا لہ وہ اس کے اپنے آدمی اس کے خدمت کار تھے۔ اسے ان کی موت پر فخر تو ہو گا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک کوشش ناکام ہونے کے بعد وہ دوسری کوشش نہ کرے۔ مجھے چھوٹانے یا مردانے کی اس کی کوششیں آئندہ بھی جاری رہ سکتی تھیں اور اب جو کچھ اسے زیادہ بہتر طور پر اندازہ ہو گیا تھا کہ میں آسانی سے قابو میں آنے والا شکار نہیں تھا اس لیے توقع کیا رکھنی چاہیے تھی کہ وہ آئندہ جو کچھ بھی کرے گا زیادہ بہتر انتظامات کے ساتھ کرے گا۔

اچانک مجھے ایک خیال اور آیا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ دونوں

بد معاش دراصل درانی ہی کے آدمی رہے ہوں؟ ہمت سے غور کیا بد معاش اس قبیل کے کرہٹ افسران کے زیر سایہ پورش پائے تھے انہیں بھی ایسے لوگوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور وہ نہایت عمدی سے ان سے کام لیتے رہتے تھے۔ لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ درانی دھڑلے کا توہی قد اگر وہ دونوں بد معاش اس کے آدمی ہوتے اور اسے تھینک کی زبانی معلوم ہو جاتا کہ وہ شاید میرے ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے پھر تو وہ کچھ زیادہ یقین انداز میں قابو میں کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جیشہ کرم کے آدمی نہیں تھے اور تھینک نے شاید کسی مصلحت کی وجہ سے درانی سے ان کے بارے میں کوئی بات تھینک کی تھی۔

آخر کار میں نے ان سب اچھی سوچوں کو ذہن سے جھٹکی کوشش کرتے ہوئے اور ایک فیصلے پر پہنچے ہوئے شفع شاہ کو موبائل نمبر ملایا اور اس سے پوچھا "تم کہاں ہو اس وقت؟" "میں قوی الحال ہوئی ہی کے ہیستمنٹ میں موجود ہوں۔" اس نے بتایا۔

"تمہارے پاس کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

"جی سر۔" اس نے جواب دیا "جی ایم صاحب جی۔"

پرسوں سمجھیں۔۔۔ "اچھا۔ تم ذرا آفس میں آ جاؤ۔" میں نے کہا اور مطلع منتقل کر دیا۔

چند لمبے بعد ہی وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے بھڑکی سا ساتھ کے اسٹیل کے ایک خوب صورت قلم کو ہیلی بارڈر اوپر سے دیکھتے ہوئے اور انہیں میں گھماتے ہوئے کہا "شفع شاہ! یہ جو لڑکی ہے نا تھینک۔ یہ بھتیجی ان دنوں بلیبل کی طرح چمک رہی ہے۔ کس پولیس کے قانون میں رس گھول رہی ہے اور جی ایم سر سرتوں کو نہ جانے کیا کیا نئے ٹنڈا رہی ہے۔ اس کی تھوڑی چکار ہمیں بھی سننا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے سر۔" شفیع شاہ نے سر ہلایا۔

"یہ اپنے اپارٹمنٹ پر۔ یا درانی کے بنگلے پر۔۔۔ جی ایم۔۔۔ سوچ مناسب دیکھ کر اسے اٹھاؤ۔ ہمیں اس سے بات ہی پڑے گی۔" میری آواز اب سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں گئی۔ کام آج رات تک ہو جانا چاہیے۔ آج رات ہمیں ذرا کام ساتھ بیٹنگ کرنا تھی لیکن کل صبح سے پہلے لاہور سے راجپوت لونی بھی پہنچ جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ بیٹنگ ان کے پہنچنے کے ہی رکھ لی جائے اگر ایک ہی نشست میں کام کی تمام تفصیلات ہو جائیں۔ فی الحال آج رات تک تم کیا کام کرو۔ جس کسی کی ضرورت ہو اسے ساتھ لے لو۔"

"فکر نہ کریں سر! کام ہو جائے گا۔ اسے اٹھانے کے بعد لے جاتا ہے؟" اس نے ہدایت سے۔۔۔ میں نے جی ایم کو۔

"میرا خیال ہے تم اپنے بنگلے پر ہی لے جاؤ اور مجھے اطلاع دو۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔" اس نے اطمینان سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

لوگ درانی کا بد عمل دیکھ کر اپنا آنکھ کا لالہ مٹا کر ملے کریں گے۔

”کیس اخبارات یا صحافی دھونس دھکیلا جائے گا؟“  
 ”ابا نہیں۔ درانی اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے پرے گئے کو استعمال کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس گئے کی ہر حال بڑی دہشت ہے۔ اسے بے حساب اخبارات بھی حاصل ہیں اور اس میں موجود درانی جیسے نہ جانے کتنے لوگ ان اخبارات کے بے دریغ اور ناجائز استعمال کے عادی بھی ہو چکے ہیں۔“

”سراسیمہ پوری کوشش کروں گا کہ اخبارات اور صحافی اس سلسلے میں دھونس دھکیلا اور لالہ مٹا نہ آئے پائیں۔“ شیخ شاہ بولا۔

”جہاں ضرورت پڑے وہاں تم اس مقصد کے لیے اپنے تمام تر مالی وسائل بھی استعمال کر سکتے ہو۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”مجھے معلوم ہے سراسیمہ آہستگی سے بولا۔ ”دیکھتے ہیں کہ درانی کے خلاف ہم شروع ہونے کے بعد اس کا انکا قدم کیا ہوتا ہے ہمیں ہر طرح کے بد عمل کے لیے تیار رہنا ہو گا۔“

”ہم تو ہر وقت ہر مصیبت اور ہڑلا کے لیے تیار رہتے ہیں سراسیمہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”اچھا ہو کہ زندگی کا یہ فارمولا آپ نے شروع میں ہی ہمیں سکھا دیا تھا۔ اسی لیے اب کسی بھی قسم کے مسائل سے دوچار ہونے پر ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا ”میرے لیے اور کیا کسم ہے سراسیمہ؟“

”تم تو اللہ متنازعہ پر رہو۔“ میں نے کہا اور فوراً ہی پوچھ لیا ”تمنی کا دھمکی اور کچھ میں آتی ہے؟“

”چھوٹا سا جملہ ہے سراسیمہ میں صرف ایک ہی نقطہ مشکل ہے۔ اتفاق سے اس کا مطلب بھی معلوم ہے۔ آپ کا حکم ہے کہ چونچا پریم داکر کو کھڑے یعنی آرام سے سر جھکا کر ایک طرف بیٹھا جاؤ۔ یہی کام میرے لیے زیادہ مشکل ہے۔“

”صرف چھ گھنٹے کی بات ہے۔ تمہیں صرف راجیل اور ٹونی کے آتے تک آرام سے بیٹھنا ہے اس کے بعد پھر تھوڑی سی مصروفیت درپیش ہے۔ اب تم کسم کا آرام سے سوجاؤ اور وہ جس بیٹے کی کوشش نہ کرے جو اپنے آقا سے ہر وقت کوئی نہ کوئی کام پوچھتا رہتا تھا اور ایک لمحے بھی قانع نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس جن کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوا تھا۔“ میں نے کہا اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”کیا انجام ہوا تھا اس کا؟“ شیخ شاہ نے جانا چاہا۔  
 ”مالک اسے کام بتاتے بتاتے تھک گیا تھا لیکن وہ کام کرتے کرتے نہیں تھکتا تھا۔ آخر جن تھا۔ پلک بھینکتے ہیں ہر کام کسم کے آقا تھا اور اپنے آقا کے سرے سوار ہو جاتا تھا۔ کیا حکم ہے میرے آقا؟“ بے چارے آقا کے پاس کام ختم ہو گئے۔ وہ اپنی اوقات کے مطابق تمام کام کو اچھا تھا۔ آخر کار جن کی مستعدی

شیخ شاہ کے جانے کے بعد میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے امید تھی کہ تینہ ہمارے قادیوں آجی تو شاید اور مدت سی کام کی باغی معلوم ہوں۔ اس کے علاوہ درانی پر کچھ نفسیاتی دباؤ بھی پڑے گا۔ مگر اب وہ اس سلسلے میں کچھ زیادہ پڑا امید نہیں رہا تھا۔ درانی دباؤ میں آئے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن کم از کم اس لڑکی کو تو دباؤ سہا سہا جاسکتا تھا۔ جو تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے کچھ اہم اور فرعون صفت مردوں کے ہاتھوں میں کھلوانی کر رہے تھے۔ بعد شاید خود کو کنگ مگر کھینے لگی تھی۔ میں اسے اس کی حیثیت یاد دلانا چاہتا تھا۔ اپنی دانست میں شاید اس نے مدت ترقی کر لی تھی لیکن میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ دراصل یہ ترقی نہیں مستحکم تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ بہشتی میں جا چکی تھی۔

میری یہ حسرت پوری نہ ہو سکی کہ تینہ کو سبق سکھایا جائے۔ وہ کھینے بعد شیخ شاہ کا فون آیا اور اس نے معذرت خواہانہ سے انداز میں اطلاع دی ”سراسیمہ لڑکی اب نہ تو درانی کے بچنے پر ہے اور نہ ہی اپنے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوا ہے کہ اسے قلاب کر دیا گیا ہے۔“

”دوسرے!“ میں کمری سانس لے کر کہہ گیا ”کیا کوئی اس کی عمرانی نہیں کر رہا تھا؟“

”جی نہیں۔“ شیخ شاہ نے جواب دیا ”اب چوتھ آپ اس سے بات کر بیٹھتے تھے اور وہ اس حقیقت سے باخبر ہو چکی تھی کہ اس کی عمرانی کی جارہی تھی اس لیے اب عمرانی جاری رکھنا بے کاری محسوس ہوا تھا۔“

اس کی دلیل معقول تھی مگر بھی مجھے یہی خیال آیا کہ اسے تینہ کی عمرانی ختم نہیں کرانی چاہیے تھی تاہم میں نے اس سے یہ بات نہیں کہی۔ میں نے لفظی سانس لے کر کہا ”جسید کریم اور درانی اپنے میرے بڑے ہوشیاری سے کھیل رہے ہیں۔ ان کا یہ صواب ہے۔“ لیکن خیمہ کوئی فرق نہیں پڑا۔ صوبوں کو پٹنے سے بچانے کے لیے صرف ہوشیاری ہی کافی نہیں ہوتی۔

”تینہ کی تلاش ہر حال جاری ہے۔“ شیخ شاہ بولا ”میں نے کچھ لوگوں کی ذیولنگ کی ہے۔“

”خیمہ کسم۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اتنا اہم مرہ بھی نہیں ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا ”وہ ہاتھ آجاتی تو اچھا تھا لیکن اگر ہاتھ نہیں آتی تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اب تم انتظار کرو اور دیکھو۔“ دائیں انگریزی محاورے پر عمل کرو۔ تینہ کو جیتے جیسید کریم نے قلاب کیا ہو گا یا قلاب ہونے کی بد امت کی ہوگی۔“

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا ”اخبارات میں درانی کے خلاف ہم شروع ہونے کے انتظامات ہو گئے؟“  
 ”جی سراسیمہ اس نے جواب دیا ”پہلے صرف کچھ شوشے ہوئے تھے۔ اب ہمیں گے۔ ہلکے پھلکے انداز میں ہم شروع ہو گئی مگر وہ

میں دھکے کھا رہے ہیں۔"

"تو کچھ حساب سے غصے کا لہو بھر گئے ہیں۔ اوقات بحرانی باری ہو۔"

"ظاہر ہے آخر اب میں چھوٹی گروپ تک کینیڈی ریزنٹ ڈائریکٹر ہوں۔" وہ اپنا تھکا ہوا صبر بٹانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"آخر ہر بات کو کچھ سے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے ڈانٹنے کے ساتھ انداز میں کہا۔

"میں نے اس کی رہی تھی۔ بہت دلش تھا۔ اور ٹائٹ کچھ بھی لٹ آئی ہے۔ ہم تو کچھ رہے تھے، ہمیں ہنگامی طور پر اہم کام کے لیے بلا دیا گیا ہے اس لیے میں ہمارا عقیم اٹھان انتظار ہو گا۔ سرخ قالین بچے ہوں گے، بچے گھر سے لیے گئے ہوں گے۔"

"اور تم خان کا بیڑا بچا رہا ہو گا۔" میں نے بات مکمل کی۔  
"مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔" وہ اطمینان سے بولا  
میرا حال۔ کچھ نہ بچے تو ہونا چاہیے تھا۔ اب یہ حال تو نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں لینے کے لیے کوئی گدھا گاڑی تک موجود نہیں ہے۔"

"تم اس شرم میں پیدا ہو گئی، ملی بیویوں اور جوانوں میں تھیں جس کے بعد کافی عرصے کے لیے رہائی تو ان میں کوئی نہیں تھی۔ کیا اتنے طویل عرصے کے دوران میں تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ... نکلیاں بھی چلتی ہیں اور وہ ایسے ہی مواقع پر کام آتی ہیں؟" میں نے گویا اپنا صبر ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"جنگلیاں تو میں نے بہت دیکھی ہیں اور ان کا مصروف بھی معلوم ہے لیکن کیا ہماری اب بھی عزت رہ گئی ہے کہ ہم ٹائٹ کچھ۔ بلکہ لٹ ٹائٹ کچھ میں دھکے کھاتے ہوئے آئیں اور یہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر فقیروں کی طرح تمہاری خدمت میں حاضر ہوں؟"

"تم ان چیزوں کو کچھ زیادہ ہی ڈی گریڈ کر رہی ہو۔" میں نے آج تک فقیروں کو ٹائٹ کچھ اور ٹیکسیوں میں سفر کرتے نہیں دیکھا۔  
"وہ تمہیں بتا کر تو نہیں کریں گے۔ تمہیں بتانا اور رہائی کی کوئی بات ایک بار ہے۔ انہیں اعم ٹیکس والوں کو اپنے پیچھے تو نہیں لگوانا ہے۔" رابطہ بولا۔

"جس طرح تمہاری زبان چل رہی ہے اس سے تو کہہ جاؤ کہ سرخ خاں خورشید گزرا ہے۔ تم خواہ خواہ شاموں سے بھی زیادہ مبالغہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"تم ان ڈائریکٹ مجھے جھوٹی قرار دینے کی کوشش کر رہے ہو؟" وہ خرابی "تو اسوج کچھ کہات کہنا۔ ابھی تو وہ ایسی ہی حالت میں تیار کوئی ہے۔ ہم اگلے ہی ہوں گے۔ بلکہ میں کو کہہ اگلے ٹکڑوں والیں چلے جائیں گے۔"

"آخر تم اتنا غصہ بھانڈے اور احسان بنانے پر کیوں تھکی

سے تھک آکر اس نے کلوی کا ایک کھل اور پچاس شہر زمین میں گزرا دیا۔ اسے محل میں ترکیا اور جن کو ہم دیکھا کہ اس پر چڑھ جائے اگر کچھ آؤ تو دوبارہ چڑھو۔ چنانچہ جن بے جاہ اس پر ہئی مشکل سے چڑھا لیکن پھل کر پھر کچھ پہنچ گیا اور نئے سرے سے اوپر پہنچنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا۔"

"ایک مسٹر اور ایلی شیفٹ جن کا یہ دو ہاک انجام ہے۔" شفیع شاہ نے کہہ دیا۔

"شاید اس کا آقا کچھ طاقت پسند قادر و انسانوں کے کام کماں فتح ہوتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ کام کروانے کے لیے صرف زبان ہلائی پڑے۔" میں نے کہا "تمہارے لیے تو صرف چھ گھنٹے کا بریک ہے اس کے بعد کام ہی ہوتا رہے گا۔"

اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔  
اس رات میں سویا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے میں نے گڑی دیکھی۔ صبح کے چوبیس بجے تھے جس کا مطلب تھا کہ میں سات آٹھ گھنٹے سوچنا تھا لیکن محسوس ہی ہوا تھا جیسے ایک آدھ گھنٹہ پہلے ہی سویا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر غور کی زندگی تو آواز میں بولو کا تو دوسری طرف سے راحیلہ کی چستی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ دو۔ شہنشاہ عالم دہاں آرام سے اپنے فانیہ اشار ہوئی کے سوئٹ میں احترام فرما رہے ہیں۔ خواب خرگوش اور خواب لنگور و فیو کے مزے لے رہے ہیں اور ہم یہاں رعایتی عکس والی ٹکڑوں میں دھکے کھا رہے ہیں۔"

"کیا جنازہ سے ہی بول رہی ہو؟" میں نے ایک نظر ریسیور کو دیکھنے کے بعد قہر سے حیرت سے کہا "کیا جنازہ لینا کر رہا ہے اور تم اپنا موبائل فون استعمال کر رہی ہو؟"

"ہاں۔ میں موبائل فون تو استعمال کر رہی ہوں لیکن جنازہ لینا نہیں کر رہا بلکہ لینا کر رہا ہے۔ ہمیں باہر جانا چاہیے اور اب میں اور نوٹی فیکس کی طرح ارا نیل لاؤنچ میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر یہ کیوں کہ رہی تھیں کہ ہم ٹکڑوں میں ہی دھکے کھا رہے ہیں؟" میں نے غصے کا اظہار کرنے کی کوشش کی "میں تو زور دیا تھا کہ شاید دن دس پر جنازہ کے پٹے نے کھلنے سے انکار کر دیا ہے۔ طبعاً فضا میں ہی پکڑ کر رہا ہے اور اب تم مجھ سے درخواست کرو گی کہ اس سلسلے میں بھی نہیں ہی کچھ کر لوں۔"

"اور تم سائیکس ٹیک کرنے والے کسی مستری کو ساتھ لے کر دوڑے آؤ گے۔" اس نے قہر دیا "ویسے جنازہ کی حالت دیکھ کر میں لگ رہا تھا کہ اسے سائیکس مسرت کرنے والے مستری ہی ٹیک کرتے ہوں گے۔ اوپر سے مسافر اور ان کے لالچہ اونچے بھی کچھ ایسے ہی تھے کہ اونسی بس کی یاد آتا ہو رہی تھی۔ شاید اسی لیے جنازہ سے اتر آئے کے بعد بھی محسوس ہوا ہے کہ ابھی اسی



”جھانک! تو یہ تمہارے پاس ہیں؟“ راجیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں پھر معانے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ہوئی ”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

میں نے ایک نظر اس کے پردے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور اپنے ہاتھ پیچھے لے جاتے ہوئے کہا ”میں چھوٹے سونے لوگوں سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا۔ میں آج کل ذرا مشغور ہونے کی پریشانی کر رہا ہوں۔“

”یہ ہاتھ اگر کسی مشغور آدمی کی کھوپڑی پر چڑھائے تو اس کا بھکا بھی باہر آسکتا ہے۔“ وہ اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سلائے اور پھر اس پر ہلکا مارنے کے بعد بولی۔

میں نے ہمت کی طرف دیکھا اور بخوبی سے چپکلیں جھپکاتے ہوئے کہا ”زادہ اور نیچوڑنے سے کبھی کبھی ہمت گر پڑتی ہے۔“

”اگر تمہارا بے غلی ہاتھ کا شوق پورا ہو گیا ہو تو اب تم چلیں۔“ وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔

”تم نے میری پھلتی کی داد نہیں دی۔ میں تم لوگوں کے کافی کپ خالی ہونے سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارے دوسرے کپ ہیں۔ ایک ایک کپ ہم لی چکے ہیں۔“ راجیلہ نے آنکھیں ٹٹالیں۔

”پھر بھی میری پھلتی قابلِ داد ہی رہے گی۔“ میں نے کہا۔

”خیر۔ تمہاری کیا بات ہے۔ تم تو داؤد لوگوں سے جیسے پھرتے ہو۔“ وہ بولی۔

ان دونوں کے بیچ ان کے پیروں کے پاس پڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اب فضول بیکو اس بند کو اور اپنی اپنی پونٹیاں اٹھا کر خاموشی سے میرے پیچھے آجاؤ۔“

راجیلہ کو مزہ کھنے کا موقع ملے بغیر میں داہنی کے لیے مڑ گیا۔ وہ دونوں اپنے اپنے بیگ اٹھائے میرے پیچھے آئے۔ گھ چہ قدم چل کر میں نے راجیلہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا ”تم از کم قسمیں تو میں کوڑے کے ٹک پر ہی لادائے کیا ہوں۔“

”ہاں پرانا کام ابھی تک چھوڑا نہیں تم نے؟“ وہ ٹٹکتے سے بولی۔

”میں تو کام ہر تھوڑے دن بعد چھوڑ دیتا ہوں لیکن پھر مزہ کچھ بکرا آجاتا ہے۔ مجبوراً مجھے پھر میدانِ عمل میں لگانا پڑتا ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ویسے توئی کو میں معزز آدمیوں والی گاڑی میں لے جاؤں گا۔“

خلاف توقع راجیلہ خاموش رہی لیکن پارکنگ لائن میں آکر جب میں نے ان کے بیگ رکھوانے کے لیے سرسبز کیڑی کھلی تو وہ بول اٹھی ”تمہارے کوڑا اٹھانے کے ٹک کا ڈیرہ ان کچھ بدلا ہوا سا لگ رہا ہے۔ اب تو یہ بالکل کارِ مہم ہو رہا ہے۔“

”لیکن اس کا کام آج تک نہیں بدلا۔ اب بھی یہ کوڑا ڈھونڈنے کے ہی کام آتا ہے۔“ میں نے ڈی بند کرتے ہوئے کہا۔ پھر

ی حرکت کے ساتھ ہی دوسرے چلی تھی۔ اس طیلے میں وہ بھی کوئی بہت سی لاپرواہی قسم کی کانچ کرل معلوم ہوئی تھی۔ دونوں خاصے مہر چر تھے۔ اپنی اصل عمر سے کم از کم دس دس سال چھوٹے دکھائی دیتے تھے۔ ٹوٹی کی طرف آنکھیں کسی حد تک اس کی عمر کا سراغ دیتی تھیں۔ ان شفاف نیلی آنکھوں میں لوجوانوں والی سلطنت نہیں تھی اور جب وہ پر خیال انداز میں کسی طرف نظر پھر کر ٹٹکا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی سرد مری اور ہمہ سی سخاکی جھلک آتی تھی جو اس جیسے کھنڈرے اور لاپرواہی نظر آنے والے نوجوانوں کی آنکھوں میں نہیں ہوتی تھی۔

راجیلہ کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھنے پر صرف شبہ ہوتا تھا کہ وہ شاید اس عمر کی بے پردہ اور نوخیز لڑکی نہیں ہے جیسی نظر آتی ہے۔ کچھ وقت اس کے ساتھ گزرا۔ اس کے بعد کسی انجینی کا یہ شبہ قوی تر ہو سکتا تھا۔ میں اسے کافی دنوں بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے کچھ اور کبھی کبھی دیکھا کرتی دے رہی تھی۔

میں نے ٹوٹی سے معافہ کرنے کے بعد بخور راجیلہ کی طرف دیکھا تو وہ بھٹ چراتے ہوئے بولی ”مجھ سے زیادہ فزی ہونے کی کوشش نہ کرنا میں اس طرح کی کوشش کرنے والوں کے پہلو میں خنجر کھنچوا کرتی ہوں۔“

”مجھے بتانے کی ضرورت نہیں مجھے تو معلوم ہے۔“ میں نے فوراً کہا ”کچھ دیر پہلے ہی دی سے بھی خبر آ رہی تھی کہ لاہور سے آنے والی فلائٹ جب دیوائے سندھ کے اوپر سے گزر رہی تھی تو جہاز کا دواخانہ کھل گیا تھا اور دو تین لاشیں غریب سے دوا میں گر گئیں۔ کسی نے ان کے پہلو میں خنجر کھنچ دیا تھا۔ بے چارے فی دی والوں کو کیا معلوم کہ وہ تمہیں جس کے ہاتھوں وہ لوگ انجام کو پہنچے تھے۔“

ٹوٹی مسکراتے لگا اور راجیلہ نے خشکیں نظروں سے مجھے کھورا۔ میں نے جلدی سے کہا ”خیر۔ موبوں کو زیادہ گھورا نہ کرو۔“

نظر جلدی خراب ہو جائے گی۔“

راجیلہ نے ٹوٹی کی طرف دیکھا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”یہ کون صاحب ہیں؟ کچھ دیکھے ہوئے سے لگ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ تین سال پہلے چڑا گھر میں دیکھا تھا لیکن زیادہ نہیں آ رہا کہ خبر کے اندر دیکھا تھا یا باہر۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ ٹوٹی نے کندھے اچکائے ”میں تو کبھی بچپن میں بھی چڑا گھر نہیں گیا۔“

”توئی! تمہارا بھی جواب نہیں۔“ راجیلہ لٹھڑی سانس لے کر بولی ”تم کسی کو مڑی سے بھی زیادہ مکار ہو۔ صاف جان چکا جاتے ہو۔“

”میرا پاس سے مذاق نہیں ہے۔ اور ہاں۔ مجھے اگر تھوڑے دیر سے تو مڑ سے وہ۔ مڑتے چڑوں یا جائز آدموں کے ساتھ تشبیہ دیا جاتا مجھے بالکل پسند نہیں۔“ ٹوٹی بولا۔

”نہیں۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اب۔ خیر۔ تمہارا سر سے کیا قفل۔“ میں نے اس کی طرف سے کہا ”میرا کام تو مستقل لوگوں میں پایا جانا ہے لیکن فی الحال تمہیں بھی تو ذرا صبر کرنا پڑے گا۔ اس طرح کی باتیں کسی آرام سے نہ کر کی جاتی ہیں۔ چلتی گاڑی میں نہیں۔“

”مرضی کے الگ ہو نہ۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی ”تاہم تو کسی عمارت کی چھت سے چھلانگ لگانے کے دوران بھی اہم نوعیت کی گفتگو چھیڑ دیتے ہو اور چاہو تو بند گاڑی میں سڑک کے دوران بھی بات چیت کے لیے موقع مناسب نہیں سمجھتے۔“

کافی دنوں بعد راجیلہ سے آئے سائے نوک جو مکہ ہو چکا تھی شاید اس لیے میں اس میں زیادہ الجھ گیا تھا اور ہول سے دوامی ہونے وقت میں بہت جگہ میں تھا چنانچہ اتر چڑھ کر اس طرف آئے وقت میں اور اب وہاں کے دوران بھی میں اس بات کا کوئی خاص خیال نہیں رکھ سکا تھا کہ میرا تعاقب تو نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی جب میں تعاقب کے سلسلے میں چھ کھڑا تھا تو زیادہ تر گاڑیوں پر کھانا نظر رکھا تھا۔ موٹر سائیکلوں پر میری توجہ کم ہی جاتی تھی۔

اس روز خاصے طویل عمری کے بعد مجھے اچانک احساس ہوا کہ تعاقب تو موٹر سائیکلوں پر بھی کیا جاسکتا تھا۔ خصوصاً طاقتور قسم کی موٹر سائیکلوں پر تعاقب اور بعض وارداتوں میں بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتی تھیں۔ گاڑی تو پھر بھی رش یا ٹک جگہ میں پھنس جاتی ہے۔ موٹر سائیکل کو تو ٹھکنے کے لیے بہت کم جگہ درکار ہوتی ہے اور لمبے دار راستہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

ان سب باتوں کا احساس مجھے قدرے تاخیر سے ہوا۔ اس وقت میں اس سربراہ پر پہنچ چکے تھے جہاں راشد حساس روزگار شاہراہ کیل سے لپٹی تھی۔ مجھے شکل پر رکنا پڑا تھا اور اسی لیے عقب سے دو بیوی قسم کی موٹر سائیکل گازی کے میں آگے آگے دائیں بائیں طرف سے یوں ترچھی ہو کر رک گئیں کہ اگر میں اس لیے خطرے کا احساس ہونے پر گاڑی نکالنا بھی چاہتا تو نکال نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے گاڑی کو پہلے روکنا اور پھر پیچ مینٹرنگ کرنا یا دائیں بائیں موڑ کر تیزی سے ٹھکنے کی کوشش کرنا پڑا جس کے لیے چند سیکنڈ درکار تھے اور میرے پاس شاید چند سیکنڈ بھی ملت نہیں رہی تھی۔

دونوں موٹر سائیکلوں پر دو دو نوجوان تھے۔ پیچھے بیٹھے دو نوجوانوں کے پاس وہ چڑی کیس تھے جن میں مٹار رکھے جاتے ہیں اور موٹر سائیکلوں کے رکنے تک وہ ان کی ڈپ کھینچتے تھے۔ افسوس کا مقام یہ تھا کہ ان کیسوں سے گناہوں کے بجائے ہر گناہ کا شوقین نمودار ہو رہی تھیں۔ موٹر سائیکل چلانے والے نوجوان اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے اور انہوں نے موٹر سائیکل کی اشارت ہی نہ کی۔ دوسرے دونوں نوجوانوں کا جسمیں ٹکانے اور موٹر سائیکلوں سے اترنے کا انداز ہی تھا تاہم قہار کہ کسی کاغذ

میں ڈرائیو تک سیٹ پر آہٹا اور راجیلہ میرے برابر آگے بٹھی۔ گاڑی اشارت کرنے سے پہلے میں نے گاڑی سڑک سے اٹھانے کے لیے ہونے کہا ”ویسے یہ بات میں عجب کی سے گنا چاہتا ہوں کہ تم پہلے سے کچھ زیادہ کھلی کھلی لگ رہی ہو۔ اب تک تو یہ بڑھاپا آجائے گا ہے غالیکن تمہیں تو پورے مینٹرنگ ہوا ہے۔ خیر سے سڑکی سال تو عمر ہو چکی ہوگی؟“

”سڑکی سال؟“ استہزائیہ انداز میں میری طرف دیکھا ”سڑکی سال تو میری عمر دو ڈھائی سو سال پہلے تھی۔ اور بڑھاپا آئے میرے دشمنوں پر۔ میری تو ابھی کھانے کھینے کی سرگشت ہوئی ہے۔“

”کیا کھانے اور کیا کھینے کی؟“ میں نے فوراً پوچھا۔ وہ میرا سوال ان سائے ہونے لگا۔ ”یہ جو میں کھلی کھلی نظر آ رہی ہوں۔“ یہ تم سے دوڑی کا فیض ہے۔ تم سب سوار نہیں ہو تو وہاں لاہور میں ہم سب بہت خوش ہیں۔ سب کی صحت بہتر ہوئی ہے۔“

”فوری فوراً پھیلی سیٹ سے بولا۔“ یہ ان کا ذاتی بیان ہے سارا دوسروں کا اس سے شوق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ”بچہ گیری مت کرو۔“ راجیلہ نے پلٹ کر اسے ڈانٹا ”پاس کو اوقات پر رکنا ضروری ہے ورنہ وہ سرچرچہ جاتے ہیں۔“ میں نے گاڑی پارکنگ لائٹ سے نکالتے ہوئے کہا ”راجیلہ! مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ تمہارا وزن بھی ایک ڈیڑھ چھانک بڑھ گیا ہے۔“

”غلط خیال ہے تمہارا۔“ وہ بولی ”مگر میرا وزن ایک ڈیڑھ چھانک بڑھ چکا ہو نا تو اب تک میں ڈانٹنگ شروع کر چکی ہوں۔“ صبح آگے کھلتے ہی سب سے پہلے میں دست شکن پر کھڑی ہوتی ہوں۔ پھر ایک گھنٹا انیسر ساڑھ کرتی ہوں۔ وہی رانا دھن ہے۔ لیکن خیر۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اگر شکل پہ کچھ کھار نظر آ رہا ہے تو اس کی وجہ وہی ہے۔ یعنی تمہارے سائے سے بچے رہنا۔ لیکن تم سے ہماری خوشی کھانہ دیکھی جاتی ہے۔ اگر خود اگر ہمارے سروں پر سوار نہیں ہوتے تو ہمیں یہاں بٹایا۔ اب ساری صحت اور تازگی خاک میں مل جائے گی۔“

”مجھے اس میں رکھا کرو اور منہ سے اچھی بات نکالا کرو۔“ میں نے مشورہ دیا ”میں ممکن ہے یہاں بڑھاپے کی رہی سی علامتیں بھی دور ہو جائیں۔ نظر ٹھیک ہو جائے گے ہونے دانت جم جائیں۔ ہاتھ ہوں کا دھڑلہ ختم ہو جائے۔“

”میری آؤ لے کر اپنی علامات بیان کرنے کی کوشش مت کرو اور یہ بتاؤ کہ تم سے ہمیں یوں ہنگامی طور پر کیوں بٹایا ہے؟“ راجیلہ بولی۔

”ایک چیز ہوئی ہے۔ میرے“ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کر کہا ”مجھے اس کا نام شاپ ہے۔“

کرنے کی کوشش کرنا، کئی دھکی دیا کسی بھی قسم کی کوئی بار۔ کرا  
ان کا مقصد نہیں تھا۔ وہ یہ کارروائی ایک آدھ منٹ کے اندر اندر  
کمل کر کے انہی سوڑسائیکلوں پر زور دیا جانا چاہیے تھے اسی لیے  
ان کے ساتھیوں نے سوڑسائیکل، اشارت ی رکے تھے اور وہ ان  
کے منتظر ہی تھے۔ بیٹھے تھے وہ اس کارروائی میں اور کسی بھی  
انداز سے حصہ نہیں لے رہے تھے۔

اس قسم کی کارروائیوں میں عموماً ایسے پہلے تجربہ کار لوگ بھی  
گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے پہنچے۔ وہ ان میں پہنچے ہوئے چوبیس کی  
طرح ماتے جاتے ہیں اور شاید ہمارا بھی یہی مشر ہو تاکہ ہم صرف  
ایک دو سیکنڈ کے فرق سے ہڈی پٹ سکتے تھے۔ اگر ہڈی توڑ دینا  
وہ ایک دو سیکنڈ ہمارے پلڑے میں چڑھتے تو زندگی کی مددنی  
ہمارے ہی سروں پر راقی اور اگر یہ ایک دو سیکنڈ ان کے پلڑے  
میں پہنچ جاتے تو بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی موت کی  
تاریک داریوں میں اتر جاتے اور ہمارے خون میں نمائے ہوتے  
جسم گاڑی میں پڑے رہ جاتے۔

انہیں ایک یا دو سیکنڈ کی تاخیر ہو گئی۔ وہ پوزیشن لے کر ہمیں  
سنہالنے کے بعد شاید ٹنکر دبانے ہی والے تھے جب میرے مشین  
پنسل نے نہایت معمولی سی آواز کے ساتھ چار گولیاں اٹکیں۔  
نہایت متعاندہ طریقے سے دو دو گولیاں دونوں نوجوانوں کے صے  
میں آئیں اور وہ ٹنکر دبانے کی حسرت دل میں لیے سڑک پر ڈھیر  
ہو گئے۔ دونوں کا انداز تقریباً یکساں ہی تھا۔ دونوں کی ایک ایک  
ٹانگ ان کے پیچے مڑ کر رہ گئی تھی اور چرے لذت سے مڑ کر رہ گئے  
تھے۔ ایک کی کمر ذرا دور جا کر رہ گئی تھی۔ دوسرے کی اس کے اپنے  
پچھے پڑی آگری تھی۔

سوڑسائیکل سوار نوجوانوں کے بارے میں ہمیں الجھن میں ہی  
رہ گیا کہ انہیں بھی شوٹ کر دیا جائے یا زندہ بچانے کی کوشش کی  
جائے۔ میرے اس ایک لمحے کے تذبذب کا کائدہ اٹھاتے ہوئے وہ  
”دو“ کی زوردار آواز کے ساتھ بیک وقت ہوا ہو گئے۔ ان کا یہ  
برقعہل میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ اپنے  
ساتھیوں کو ڈھیر ہوتے دیکھ کر شاید وہ بھی کہیں سے ہتھیار نکالیں  
گے اور سوڑسائیکلوں سے اتر کر اپنے ادھورے رہ جانے والے  
مشین کی تھیل کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے تو انہیں مڑنے  
دیکھے ہی سوڑسائیکلس گولی کی رفتار سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔  
میں گاڑی سے نکل کر پلو کے بل سڑک پر گر پڑا تھا۔ میں  
سیدھا کھڑا ہوا تو فونی... کو میں نے گاڑی کی اوٹ سے برآمد ہوتے  
دیکھا۔ راجیلہ گاڑی کے عقب میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بھی وہاں سے  
نکل آئی۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بات ختم ہو گئی تھی۔ یہ شاید  
ہماری زندگی کا کسی سے مختصر ترین کھراڑ تھا جو زندگی کا خطرناک  
ترین۔ اور شاید آخری کھراڑ تھی جہاں ہوسکتا تھا کہ اس  
وقت ہمیں اس قسم کے کماؤد ایکشن کی ذرا سی بھی توقع نہیں تھی۔

تم نہیں تھے۔  
شرمیں جس طرح کا رہیں چھینے یا کارسواہوں کو لوٹنے کی  
ادارہ میں عام نہیں اس کے پیش نظر یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ شاید  
ان نوجوانوں کا اسی طرح کا کوئی ارادہ تھا اور اگر ہم اس بات کا  
پیش ہونے تک کہیں اس کا بڑا عمل ظاہر نہ کرتے تو چند نہایت  
پتلی سیکنڈ بھی خارج ہو سکتے تھے لیکن یہی کسی قسم کے بیٹھے جانا تھا  
کہ وہ لوگ گاڑی چھیننے کے لیے اس کے نیچے سے نہیں رک رہے۔  
تھے۔ بات اس سے کچھ بڑھ کر تھی۔

سڑک پر اس وقت... نہیں تھا اور اس لیے تو مجھے  
پن کا پیچے سڑک اٹھانے کی غالی ہو گئی تھی۔ وہ نہ نہ گاڑیوں والے  
مکمل پر رکتے بھی گئے شاید گڑبڑ کے آثار محسوس رہتے ہی  
مکمل ڈاکر لگتے چلے گئے تھے کچھ شاید بلا ضرورت ہی برآمد  
شاس روڈ کی طرف اڑھٹے تھے۔ کچھ کی طرف شاید میری توجہ بھی  
سیج جا سکی۔ میری توجہ تو درحقیقت صرف ان نوجوانوں پر تھی جو  
نہایت چھٹی سے ہمیں نکال کر گاڑی سے ذرا آگے دائیں یا بائیں  
دواں طرف ایک ایک ایک گھٹنے کے بل سڑک پر کھڑے ہوئے  
تھے۔

مجھے یہ بھی احساس تھا کہ راجیلہ اور فونی کے پاس اس وقت  
تھیں انہیں ہوں۔ گھبراہٹ سے سڑک کرتے وقت ہم لوگ الجھنوں  
ت کے لیے احتیاطاً ہتھیار ساتھ نہیں رکھتے تھے... فونی تو  
پیش پیٹ پر ہم، راجیلہ، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ سوڑسائیکلوں  
سے اترتے ہوئے نوجوانوں کو دیکھ بھی پایا تھا یا نہیں۔ میرے پاس  
تاکہ بھی وقت نہیں تھا کہ انہیں کوئی ہدایت دے سکے۔ یہ مشکل چار  
ایک سیکنڈ میں یہ ہوا تھا کہ سوڑسائیکلس ہمارے سامنے آکر رک  
گئی تھیں اور نوجوان گٹار کے کیوں سے ہمیں نکال کر پوزیشن  
لی سنبال چکے تھے۔

میں بھی کی پیچ کے انداز میں صرف اتنی ہی کہ پایا ”راجیلہ...“

مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑے گپ شب  
لے سوڑسائیکل سے اترے تھے اور شاید وہ خاطر خواہ پھرتی سے فوری  
در پر حرکت میں نہیں آسکیں گے لیکن میرا خیال غلط تھا۔ ان کے  
آہستہ زبان پر بعد میں آئے، وہ اس سے پہلے ہی دودھانے کو بل  
رہا تھا۔ پہلے چلے تھے۔ لیکن یہ وہ گاڑی کے پیچے رک گئے  
تھے۔ میں صرف انہیں ایک طرف کے دودھانوں سے ہی اترتے  
لیہ سکے۔ میں خود اس وقت اپنی طرف کا دودھانہ مکمل کر رہا تھا۔  
یہ بھی نہایت تھا کہ میں افزا تھری میں بھی ہو گئی سے دواں  
اس وقت اپنا مشین پائل ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ وہ اس وقت  
اس میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ مجھے اس وقت تک ان کے ارادے  
اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ دو طرف سے اندھا حد تک گاڑی پر قابض کر  
لیا اور معدوم تھیں افراد کو ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ ہمیں انہوں



اگر ہمیں بے پروائی اور غفلت کی حالت میں بھی کوئی مصیبت سامنے دیکھ کر کھٹکی کی سی جھڑی سے حرکت میں آنے کی مشق نہ ہوئی تو آج ہمارا پاساں صاف ہو چکا ہو۔ اپنی تمام تر کھٹکی کے بعد جو بھی ہم پال پال ہی بیچتے تھے۔ پھر ان فوجیوں نے بھی کچھ کم نہیں دکھائی تھی۔ بس شاید قسمت نے ہی ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

میں نے کالی دھوکے سے فرض کر لیا تھا کہ راجیلہ اور ٹونی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہو گا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں تقریباً ایک جیسے دو چھوٹے چھوٹے اور پچھلے پستول نظر آ رہے تھے۔ میں نے انہیں گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت تک سڑک پر گرنے والے دونوں فوجیوں خفیہ سے جھپٹنے لگے کہ سڑک ہو چکے تھے اور موز سائیکلوں پر فرار ہونے والے دونوں فوجیوں نظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔

میں نے ان کا تعاقب کرنے کے بارے میں ایک لمحے کے لیے سوچا لیکن پھر خودی اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر دو بیوی موز سائیکلوں کا تعاقب کرنا ایک بے کاری کو خوش تھی۔ خصوصاً جبکہ انہیں آگے نکلنے کا موقع بھی مل چکا تھا اور اس سڑک پر آگے جا کر انہیں بائیں مڑنے کے لیے کسی راستہ تھے۔

اس سے پہلے کہ کوئی صحیح طور پر سمجھ پاناکہ وہاں کیا ہوا تھا میں نے راجیلہ اور ٹونی کے پیچھے ہی مائل جیب میں دکھا اور اسٹیرنگ دیکل منبھلا۔ دو انہ بندہ کہنے ہوئے میں نے دیکھا ابھی فوجیوں کا خون سڑک پر پھیلا شروع نہیں ہوا تھا۔ دونوں کی لاشیں ایک دوسرے سے اتنے قریب پر پڑی تھیں کہ میں ان کے درمیان سے گاڑی گزار سکتا تھا۔ اس دوران میں شکل بھی مکمل چکا تھا۔ صرف شکل بندہ ہونے اور کھلنے کے درمیان وقفے میں یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔

گاڑی اشارہ دی تھی لیکن اب میں نے سیدھے جانے کے بجائے اسے ٹھہرا لیں سے راشد مناس بدو کی طرف موز لیا۔ اب گاڑی کو ذرا اُدھر اُدھر گھما پھرا کر لے جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے رفتار بھی بڑھا دی۔ چند لمحوں کے خاموشی کے بعد راجیلہ بولی "تم نے تو لاشوں پر ایک نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ کیا تم نے پہچان لیا تھا وہ کون تھے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن میرے لیے یہ جانا اہم نہیں تھا کہ وہ کون تھے۔ تو تمہیں مرے تھے اور مرنے کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ زیادہ ضروری یہ جانا ہوتا ہے کہ کس مرے کو کون سا ہاتھ حرکت دے رہا ہے۔ اس کا مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" راجیلہ نے دریافت کیا۔  
میرا اندازہ بھی تھا کہ وہ جیشہ کریم کے گروہ کے تھے۔ اس کا طریقہ واردات بھی میری سمجھ میں آتا جاتا تھا۔ اس نے دراصل اپنے مستقل کر کے پالے ہوئے نہیں تھے جن سے اس کی کوئی

باقاعدہ دانی بھی ظاہر ہوئی۔ وہ ضرورت پڑنے پر کام کی فوجیوں حساب سے بدحاشیوں اور قاتلوں کی خدمات حاصل کرنا بعض اوقات درجے کے وحشہ باز اس طریقہ کار کو زیادہ اور صاف سمجھتا تھے۔ وہ خود گروہ باز بیٹے کی کوشش کرتے تھے۔ بوقت ضرورت ماہر اور مشتاق لوگوں کی خاصا معقول معلوم کرنے پر حاصل کیوں اور اپنا کام کر دیا۔ اگر کام میں اور معاملہ بگڑا تو ہاتھ بھڑا کر فوج پیر کر لیا تعلق ہو گئے تھے۔

وقت دے کر اسی طرح کے دوسرے پیشہ ورانہ کی خدمات کرتے۔ اس قسم کے لوگوں کی اگر کوئی واردات کام ہو بھی تھی اور کوئی ہر کام کسی کے ہتھے چڑھ بھی جاتا تھا تو خدمات کرنے والا صاف کر سکتا تھا کہ اس کا تو اس شخص سے کوئی نہیں "اس نے تو کبھی اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔" اور پھر

ہو سکتا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ جیشہ کریم خودی پر اور وہ اس قسم کے پیشہ ور قاتلوں ڈاکوؤں یا دہشت گردوں کی حفاظت حاصل کرتا ہو۔ یہ خدمات انجام دینے کے لیے بھی بہت سے وارد ہوں گے۔ جیشہ کریم جیسے لوگ اپنی حیثیت صاف سمجھتا کرتے والے معزز آدمی ہی کی سی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جبکہ بحال سیدی کا معاملہ ذرا مختلف معلوم ہوا تھا۔ یہ خاص وقار آدمیوں کی ایک چھوٹی سی مستقل فوج اپنے گھر پر بند کرنا تھا جو اس کے اشارے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ پھر پکڑے جانے کی صورت میں اپنی جان سے گزر جاتے ہوں گے۔ اپنے آقا کے خلاف زبان نہیں کھولتے ہوں گے۔ طریقہ کار مختلف ہی سی لیکن اصل میں دونوں ایک ہی تھے۔ بوقت ضرورت اپنے اپنے طریقہ کار کے مطابق ایک دوسرے کے بھی کام ہوں گے یہ جو سمجھ پر تازہ حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن تھا کہ اس کا انتظام تو جیشہ کریم نے کیا ہو لیکن اشارہ سیدی ہی کی طرف سے ملا ہو کہ یہ شخص کچھ زیادہ ہی ہلکا تھا۔ لگا نظر آ رہا ہے "اس کا پتا صاف کد۔"

"تمہیں شخص نام بتانے کا کوئی قاعدہ نہیں۔" میں نے سے کہا "ہاں تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اطمینان سے جب تم دونوں کو تحصیل سے سب کچھ بتاؤں گا تب معاملہ آئے گا۔"

اس نے ہلکا سا ہنسا بھرا اور زور کا پانچواں ذرا اونچا اپنا پستول پھنسی سے بندھے ہوئے چھوٹے سے ہوش میں لگی۔ ٹونی بھی اپنا پستول شاید ایسے ہی کسی ٹھکانے پر پانچواں راجیلہ سیدی ہوئے ہوئے بولی "میں تو ہمارا انتہائی ہی طریقے سے ہونے لگا تھا۔ لگتا ہے حالات واقعی خاصے ہیں۔" اس کے ہوش پر خفیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تم شاید اب تک بھی سمجھ رہی تھیں کہ میں ذاتی طور پر دراصل تمہیں لاہور سے اپنے قریب لانے کا ہاتھ

اس میں اس کی کوئی اور صلت رہی ہو۔ بر حال یہ ایک دلچسپ اتفاق تھا۔

چند سینکڑوں ہی مجھے چین ہو گیا کہ دو سواڑ سائیکل سوار اس کے پیچھے نہیں آ رہے تھے۔ تب میں نے تیزی سے گاڑی اس ٹک سی سڑک پر گھمائی اور اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک وہ کافی آگے چلا گیا تھا۔ راجہ اور لٹی نے بھی اسے موڑ پر نمودار ہونے ہی دیکھ لیا تھا۔ راجہ نے بے اختیار دلی دلی سی آواز میں سٹی بجائی تھی اور لٹی آگے جھکتے ہوئے آگے بڑھتا تھا۔ یہ تو وہی ہے۔

میں نے اس وقت ان کے متحمل پر کوئی تبصہ نہیں کیا تھا لیکن جب میں گاڑی موڑ کر اس کے تعاقب میں روانہ ہو چکا تو میں نے کہا "میں نے تو اپنی داستان میں انہیں نکل جانے دیا تھا لیکن ان میں سے اب یہ ایک دلچسپ دوبارہ نظر آئی گیا ہے تو اس سے ملنے کی کوشش کریں چلیں۔ شاید قدرت نے کسی صلت کے تحت اسے اور ہمیں اس طرف بھیجا ہے اور اس طرح ہم سے اس کا سامنا کرنا ہے۔"

"بے شک۔ بے شک۔" راجہ نے بڑے زور و شور سے تائید میں گردن ہلائی۔ میں نے اسے گھورا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی توجہ دوبارہ سڑک پر مرکوز کرنی پڑی۔ وہ ایک ٹک سواڑ اور کتا سے سے ٹوٹی ہوئی ہے جو وہی سڑک تھی۔ سواڑ سائیکل سوار اس پر اڑا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہم سے کافی آگے تھا لیکن میری نظر میں تھا۔ اس کی سواڑ سائیکل ہر قسم کے راستوں پر سفر کرنے کے لیے سوزوں تھی تاہم مجھے امید تھی کہ اس بار وہ ہماری نظر سے اوچھل نہیں ہوئے پائے گا ہر ٹک سواڑی گاڑی ٹک میں یا کسی ٹک جگہ پر نہ چسپاں جاتی۔

اچانک سواڑ سائیکل کی رفتار کم ہوئی اور پھر میں نے اسے بائیں طرف مڑتے دیکھا۔ اس طرف خاصی دور تک ایک رہائشی علاقہ نظر آ رہا تھا جو کچی آبادی سے ملبوم ہوا تھا لیکن اس کی حالت زیادہ خراب نہیں تھی اور یہ کافی عرصے سے آباد ملبوم ہوا تھا۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے تمام مکانات کے نیچے دکانیں موجود تھیں اور ایک چھان آباد علاقے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ مکانات اور دکانوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی سڑک کے کنارے کافی دھڑکی دکھائی دینے لگی۔ آتے وقت بھی میں سڑک کے دوسری طرف سے اسی علاقے کے سامنے سے گزرا تھا لیکن اس وقت میں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

جب میں اس مقام پر پہنچا جہاں سے میں نے سواڑ سائیکل سوار کو بائیں طرف مڑتے دیکھا تھا تو اندازہ ہوا کہ وہ شاید اس آبادی کا سب سے بڑا بازار تھا۔ وہ بھی ایک کشادہ گلی سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں بھی دونوں طرف بیچتر دکانوں کے چوڑے، چھیلے، خراپے وغیرہ بیک وقت کی تھی۔ کبھی کبھی

تو خوش قسم ہو تھے۔ میں نے ایک لٹری سائیکل اور گاڑی کے سواڑ سے بے گھر جہاں کے قریب سے اسٹیشن کی طرف لڑائی سڑک پر سوڑی۔

"حقیقت کو خوش قسمی قرار دے کر اپنی کہیا ہٹ جانے کا یہ بدست موقع ملا ہے جس۔" راجہ نے سر ہلایا "لیکن مجھے یہ ضرورت دلانا۔ ہسپتال میں لے رکھ ضرور لیا ہے لیکن وہ میری بات سے دور نہیں ہے۔"

"چند لمحے پہلے موقع بننے پر تو تم دونوں کے یہ ہسپتال کوئی کام نہ دیکھا۔" میں نے انہیں ذرا چھیڑا۔

"تم گن گالے میں ہماری نسبت ذرا بھرتی دیکھا۔" اس پر اڑانے کی ضرورت نہیں۔" راجہ منہ بنا کر بولی لیکن حقیقت یہ سچی کی سفاکی پیش کرنے کی ایک کوشش تھی۔

"استاد بر حال استادی ہوتا ہے۔" عقب سے لٹی کی آواز

لٹی نے اعدا کے لیے پاس کو ٹھکن لگا کر اس کا داغ خراب کر دیا۔ اس کا داغ بتاتا خراب ہے اتنا ہی کافی ہے۔" راجہ کی طرف سڑک پر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "میں تم سے پہلے بھی خدمت گزار کر چکی ہوں۔"

"میں میں تو اس کا طرف دار ہوں" پاس کی طرف رہوں "لٹی نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں اس طرف جا رہے تھے جہاں یہ سڑک کار سازی کی طرف آنے والی سڑک سے ملتی تھی۔ ہم اس سوڑ کے قریب پہنچے ہی دیکھے حیرت کا ایک خفیف سا جھٹکا۔ میں نے ان دونوں سوڑ میں سواڑوں میں سے ایک کو اس سوڑ پر نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے فیراوری طور پر گاڑی کو بائیں طرف سڑک سے ہٹے ہوئے تقریباً دو کی لیا۔ میرا خیال تھا شاید دوسرا بھی کے پیچھے ہی ہو لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اسی سڑک پر مڑ رہا تھا جس سے ہم تھے لیکن وہ دوسری طرف کی لین میں تھا۔ سڑک کے زیادہ سے نہیں تھی اور ٹک کو دو سمتوں میں تقسیم کرنے کے لیے کے درمیان تقریباً ایک فٹ اونچی دیوار کھڑی تھی۔ سوڑ ل سوار دوسری طرف کی لین میں آندھی طوفان کی طرح اس پر چڑھا چلا گیا۔ ہر قسم سے ہم آ رہے تھے شاید یہ کچھ حواس نمایاں ہو کر نظر آ رہی کہ وہ اس کی تمام توجہ سواڑ سائیکل پر مرکوز تھی۔ اس نے ہماری گاڑی کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ ان دونوں سوڑ سائیکل سواروں نے پیچھے اپنے راستے جدا کرتے ہوئے اور ہماری ہی طرح ان کا مقصد بھی کچھ دیر دیر دوسرے کے بعد کسی خاص سمت میں لگنا تھا۔ یہ سواڑ سائیکل سوار ابھلے پر آگے آ کر کار سازی سے مڑ گیا تھا اور اب اس متوازی سڑک پر ایک طرف سے واپس کا سفر کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ

رکے ٹیکیاں بھی کڑی تھیں۔ تاہم اتنی محتاط باقی تھی کہ ہماری گاڑی جیسی ایک گاڑی آرام سے گزر سکتی تھی لیکن اگر سامنے سے دوسری گاڑی آجانی تو مسئلہ پیدا ہو جاتا۔

میں اس نوجوان کو پانے کے سلسلے میں مایوس ہو گیا کیونکہ اس بازار میں دوائیں بائیں اور شاید آگے بھی کتنے ہی ننگے راستے اور گلیاں بھیل ہوئی تھیں۔ موٹر سائیکل سوار کسی بھی پُر توجہ راستے پر غائب ہو سکتا تھا جبکہ میری گاڑی ان میں سے جیسے تڑکیوں میں داخل بھی نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس وقت مجھے ایک اور خوشگوار حیرت کا تجربہ کیا جب میں نے اس نوجوان کو کالی آگے پان سکرین کی ایک دکان پر کھڑے دیکھا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی قریب ہی ایک بند دکان کے سامنے ترچھی کڑی تھی۔

وہ ہماری طرف پشت کئے کھڑا تھا اور جس وقت میری اس پر نظر پڑی اس وقت دکان دار اسے سکرین کا ٹکٹ تھما رہا تھا۔ میں نے جلدی سے گاڑی ترچھی کر کے کچھ ٹھیکوں اور ایک دکان کے چوڑے کی آڑ میں روک لی۔ اب اگر نوجوان پلٹ کر دیکھ بھی لیتا تو اسے گاڑی کا کچھ ہی حصہ دکھائی دیتا اور وہ اسے پہچان نہ پاتا۔ اس کے قوسیدہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس گاڑی کے مسافروں کو وہ اور اس کے ساتھی کچھ دیر پہلے موت کی نیند سلاتے پہنچے تھے اور ناکام رہے تھے اب وہی گاڑی اس کے تعاقب میں یہاں تک آن پہنچی تھی۔

اس قسم کے ملاؤں میں زیادہ اچھی اور بیش قیمت گاڑی کچھ زیادہ ہی نمایاں دکھائی دینے لگتی ہے لیکن قیمت یہ تھا کہ اس کی طرف متوجہ ہونے والے بہت زیادہ لوگ بازار میں موجود نہیں تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ابھی کس بھی شہر کا نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دکانیں تو ابھی بند ہی تھیں۔ میں گردن ترچھی کر کے اس نوجوان کو دیکھ سکتا تھا۔

وہ سکرین کا ٹکٹ لے کر بند دکان کے سامنے اٹھا تھا اور شر کی طرف منہ کر کے بے تابی سے ایک سکرین سلا رہا تھا۔ گو کہ قافلہ کالی خالین میں یہاں سے بھی اس کے ہاتھوں میں خفیف سا ارتعاش دیکھ سکتا تھا۔ مظلومانہ انداز میں دو تین سس لے کر اس نے شر کی طرف دھماکا لگا پھر شر کے کچھ اور قریب ہوتے ہوئے اس نے جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ دوسرے ہی لمحے وہ نمبر چیک کرنے لگا۔ سکرین بدستور اس کی انگلیوں میں دبلی ہوئی تھی۔

”راجلہ۔۔۔ فونی۔۔۔!“ میں نے نوجوان پر سے نظر ہٹائے بغیر بچی تو آواز میں کہا ”پیدل آگے جا کر اسے دونوں طرف سے گور کرو۔ میں گاڑی آہستہ آہستہ قریب لا رہا ہوں۔ اسے گاڑی میں بٹھانا ہے۔ کوشش کرنا تمہاری تھیں نظر نہیں آئیں۔ اگر شور مچانے کی کوشش کرے تو قسم کروں گا۔“

وہ دونوں خاموشی سے گاڑی سے اُتر گئے۔ راجلہ نے اپنا ہسٹل جرسی کی جیب میں اور فونی لے ٹیکٹ کی جیب میں باقی

صحت ٹھونس لیا تھا۔ وہ لاٹالی سے انداز میں لڑھکائی کر دیکھنے کے بجائے دوسری طرف کی دکانوں کو دیکھنے کو ہٹے بغیر ہی تیزی سے آگے بڑھے۔ چند لمحوں بعد میں نے انہیں فون پر پہنچے دیکھا۔ وہ دوائیں بائیں اس سے بڑھ کر کھڑے تھے۔ فونی کے ہونٹوں کی خفیف سی حرکت میں یہ مشکل بھی دیکھ سکتا تھا لیکن اپنے پلوں میں غالباً راجلہ اور فونی کے ہاتھوں میں محسوس کرتے ہی اس نے اسطرح اس سے انداز میں فون سے ہٹا لیا۔ فونی نے ہاتھ بڑھا کر نہایت اطمینان سے فون پر ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی کہ فونی اس کے آف کا سوچا یا کہ اسے جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت میں گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

نوجوان غالباً فونی کی بدانت پر سڑک کی طرف گھوم چکا تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے دو چار قدم کا قافلہ بھی لے گیا۔ میں نے گاڑی ان کے قریب لے جا کر روک دی تو دیکھا نوجوان اب زبرد پڑ چکا تھا۔ سکرین اس کی انگلیوں سے چھوئے کر بیٹھے تھی اور وہیں پڑی سلگ رہی تھی۔ اس کی موٹر سائیکل بھی کڑی روک لی تھی۔

میں نے ہاتھ جھپٹے لے جا کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اسے تقریباً ریختی ہوئی گاڑی میں داخل کیا۔ راجلہ پہلے ہی میں گھس چکا تھا اور فونی کے اس نوجوان کو دیکھنے میں بھی تھک چکی تھی۔ وہ اس نے پوری کوی۔ ایک ہاتھ میں وہ ہسٹل جیب نکال چکی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے نوجوان کو ہاتھ پر کر اندر کھینٹ لیا۔ اس نے گاڑی میں داخل ہوئے قریب مزاحمت تو نہیں کی تھی لیکن اس کے انداز میں جذباتی تاہم فونی کے دیکھنے ہی اس نے اپنے آپ کو گاڑی میں ڈال دیا۔

وہ فونی اور راجلہ کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا۔ وہ اس کی دہلیوں کے نیچے ہسٹل لگے ہوئے تھے اور اس کی پٹائی کی پٹائی رہ گئی تھی۔ شاید وہ اسے کوئی ڈراؤنا خواب اور اسے توقع ہو کہ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی تو وہ درجن مشن میں کامیابی کا سطر دیکھ رہا ہو گا۔ دروازہ بند ہو چکا گاڑی کی رفتار بڑھا چکا تھا۔

کچھ ہی آگے آکر ایک موٹر پر مجھے گاڑی روک کر مل گیا اور میں نے واپس ہول پتا ہی بہتر سمجھا کیونکہ بتدریج ننگے ہو رہا تھا۔ شاید گزرتے ہی میں دھواں مٹا رہیں راستہ بھی مٹھو نہیں تھا۔ نہ جانے اس طرف سے نکلے گا کوئی مناسب راستہ تھا یا نہیں۔ کسی کو شاید احساس بھی نہیں ہو سکا تھا کہ وہاں کیا ہوا تھا اور ہم وہاں پہنچے تھے۔ بازار سے نکل کر جوئی میں نے گاڑی براہ راست

تقریباً درانی ہی دکھائی دیتی تھی۔

گاڑی کے پیشے تاریک تھے اس لیے ہمیں ٹریک والی جکسون پر بھی یہ اندیشہ نہیں تھا کہ پچھلی سیٹ پر کسی کی نظر پڑ جائے گی اور وہ دیکھ لے گا کہ نوجوان کو کس پوزیشن میں لے جایا جا رہا تھا۔ ان دونوں تو بھرے پڑے علاقوں میں سادہ اور شفاف شیشوں والی گاڑیوں میں بھی غلطی اطلاع کسی کو اس طرح لے جایا جا رہا ہوتا تھا تو لوگ نظر بچا کر کبھی کبھار گزر جاتے تھے سب نے صرف اپنی اپنی جگہ سے غرض رکھنے کا اصول اپنایا تھا اور دوسروں کے بارے میں سمجھا چھوڑ دیا تھا۔ یہ نوجوان تو خیر پیشہ ور قاتل اور بد معاش تھا۔ یہی سلوک آئے دن شر کے عمل کو چوں اور بازوؤں میں شریفوں اور بے گناہوں کے ساتھ بھی ہوتا رہتا تھا۔ محض کسی بے بنیاد اور احتیاط ناسی مخالفت کی بنیاد پر بھی کسی کو بوٹی اٹھا کر کسی لڑکھنڈا یا بچہ سے دو چار کرنے کے لیے لے جایا جاسکتا تھا۔

چند منٹ بعد ہی درانی ہی سڑکوں پر چکرانے کے بعد میں نے ٹوٹی کو ہدایت کی "اس کی گردن چھوڑو۔ البتہ اگر یہ چیتنے کی کوشش کرے تو گولی اس کے قلع میں گمنا رہتا۔"

ٹوٹی نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ نوجوان کی ابھری ہوئی آنکھیں کچھ نیچے ہو گئیں اور وہ تھوڑا سا کھانسنے کے بعد کچھ دیر اپنا رہا پھرولا "تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس کے قلع سے اس کڑے کی سی آواز نکلتی تھی جس کا کھانسی نے دوبارہ کہا۔ وہ میں سے رٹاری سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور وقفے وقفے سے عصب نما آہٹیں میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سخت وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"کیس تو لے ہی جاؤ گے میری جان۔" میں نے تیسری لمبے میں کہا "اتنے معمولی سے سوال پر اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

بھر میں نے ٹوٹی سے کہا "تم نے اس کی تلاش نہیں کی۔" ٹوٹی نے ایک ہاتھ سے کمن اس کی پسلیوں پر ہی رکھی اور دوسرے سے اس کی تلاش چلنے لگا۔ راحیلہ نے اب اس کی کینٹی پر کمن رکھی ہوئی تھی۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے جینز کی پلٹ میں اس کا ہوا ایک لیٹی اور ٹانگ سے بندھا ہوا ایک خوف ناک قسم کا تجزیرہ آدہ ہوا۔ ٹوٹی نے مجھے اطلاع دی کہ اس کے علاوہ اس کے پاس میں ہزار ہزار کے بت سے نوٹ بھرے ہوئے بلکہ خشنے ہوئے تھے۔ کچھ دو سو فیصدی سوٹی جینز اور سلیٹنگ پلو کا ایک چٹا بھی تھا۔ ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں کوئی مدد ملتی۔ اس قسم کے لوگ عموماً ایسی کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ خصوصاً کسی مشین پر روانہ ہوتے وقت تو وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ان کے پاس ان کی شناخت میں مدد دینے والی کوئی چیز موجود نہ ہو۔

"تمام کیا ہے تمہارا؟" میں نے ملاٹمت سے پوچھا۔

ف موزی نوجوان نے شاید محسوس کیا کہ یہ اس کے لیے اتنا ہی کا آخری موقع تھا۔ یہاں تک بھر بھی کچھ موقع تھی اسے سرک پر برائے نام ٹریک تھا۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو دھمکنے کی غرض سے چیتنے کے لیے اچانک منہ کھولا لیکن ٹوٹی کی طرف سے غلطی نہیں تھا اور اس کے لیے اس قسم کی کوئی تفریق صحیح نہیں تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کا ایک بازو ان کی گردن کے گرد محال ہوا اور ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ اسے قلع سے صرف "او" کی آواز برآمد ہو سکی۔

میری نظر صرف ایک لمبے کے لیے عصب نما آہٹنے کی طرف تھی اور اسی ایک لمبے میں مجھے یہ منظر دکھائی دیا۔ گاڑی سیدھی پہلانے کے بعد میں نے ایک بار پھر عصب نما آہٹنے کی طرف اشارہ کیا کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے عصب سے ٹھک کی بجلی نواز خالی دی تھی۔ میں نے دیکھا راحیلہ اپنے ہتھول کے دستے باطن پر پھونک رہی تھی جیسے اسے مٹی لگ چکی ہو۔ نوجوان کی کی ہاکم کو کوشش پر اسے سختی سکھانے کے لیے راحیلہ نے بھی کی کھڑی پڑی ہتھول کا دستہ رسید کر دیا تھا۔

اور ٹوٹی کے بازو کا کھینچ اس کی گردن کے گرد سخت تر ہو چکا۔ نوجوان کی آنکھیں قلعوں سے اٹھ پڑی تھیں۔ ٹوٹی کے لمبے میں یہ اندازہ کرتا تو مشکل تھی۔ کہ وہ کتنی خون میں غافل تھا اس کے چہرے پر جسم کو دیکھ کر اس کی طاقت کے بارے اندازہ کرنا بھی کسی انجینی کے لیے بہت مشکل تھا تاہم اب اس نڈ کے قلعے میں جکڑے جانے اور راحیلہ سے کھڑی پڑی ہتھول سے کی ضرب کھانے کے بعد یقیناً اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ وہ غائب "ملا" قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھا گیا تھا۔ لی قلعوں سے ابھری ہوئی آنکھوں میں اب صرف وحشت راحیلہ کے ہتھول کا دستہ کھڑی پڑی پڑنے کے بعد ان آنکھوں سے پھٹنے پھٹنے پیلے ستارے بھی نکل گئے ہوں گے۔

"ہاتھ ڈرا ہلا ہی رکھنا۔" میں نے نرم لہجے میں ٹوٹی کو ہدایت کی۔ لیکن گردن نہ ٹوٹ جائے یا دم نہ گھٹ جائے۔ فی الحال اسے میں چاہیے۔ اسی اس سے کچھ ضروری باتیں بھی چھٹی ہیں۔" اس کا ایک بازو راحیلہ نے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ اسے لے کر کوشش نہیں کر رہا تھا۔ کوشش کرنا تب بھی کامیاب ہو سکتا تھا۔ ٹوٹی نے شاید اپنی گرفت کچھ ہلکی کر لی۔

کچھ دیر بعد ہم راشد مناسس روڈ پر جا پہنچے اور بائیں طرف کچھ نیچے کے بعد ڈرائیو ان کے قریب سے میں نے گاڑی گھسٹان لی طرف سونلہ۔ میں روڈ پر قلعوں کے بازو سے پڑے پڑے پڑے تھے تو کافی ٹریک نظر آ رہا تھا لیکن اگلے چر گئی سے میں نے طرف گاڑی موزی تو درانی کے آثار شروع ہو گئے۔ ان میں کس کس کو کچھ نہیں اگاؤ کا کائنات نہیں ذرا قہر منسوبے میں تھوڑا زات تھیں مگر زیادہ تر زمین خالی تھی اور ہر طرف

”رحمان۔“ اس نے بیٹی بیٹی سی آواز میں انحصار سے جواب دیا۔

”کیا افسوس کا مقام ہے!“ میں نے غصہ سے سانس لی مہم کیا ہے اور کڑوت کیا ہیں۔“ پھر میں نے غصہ نما آئینے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے پہلے بھی اسی طرح کانڈو ایکشن کے ذریعے سر راضہ یا دوسرے طریقوں سے بہت سے لوگوں کو گھل گیا ہو گا؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یک دم اس حم کا اعتراف کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ راجیلہ نے اس طرح اس کا بازو موڑا کہ بے اختیار اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ راجیلہ کھدوے لمبے میں بولی ”صاحب نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ بستر پر راستے میں ہی سوالوں کے جواب دے دو ورنہ جہاں ہم تمہیں لے جا رہے ہیں وہاں سوال دوسرے طریقوں سے کئے جاتے ہیں۔ کوشش کرو کہ وہاں پہنچتے تک ہمارے پاس کوئی سوال باقی نہ بچے۔“

وہ اب بھی کچھ نہ بولا تو توفی نے غصہ سے سانس لے کر کہا ”گنا ہے یہ اپنا شتر خراب کرانے بغیر زبان نہیں کھولے گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے فوجیان کے رخسار کی ہڈی پر ایک خاص ٹیکنیک سے گھونسا سید کیا۔ وہ بڑی طرح ہلچلا اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے اس جگہ سرخ امبار نمودار ہونے لگا۔

”اسے وہیں لے چلتے ہیں۔“ میں نے معنی خیر لمبے میں کہا ”وہاں دوسری بہت سی چیزیں موجود ہیں جن سے بڑے بڑے سخت جان سوداگروں کی زبانیں کھل جاتی ہیں۔“

تب وہ اچانک پہلے سے کس زیادہ خوف زدہ انداز میں تقریر چلا اٹھا ”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں بتاتا ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہم نے اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو گھل گیا ہے۔“

”کافی پیسے ملتے ہوں گے اس کام کے؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے تعجب نگاہوں سے سر ہلایا تو میں نے پوچھا ”کہتے؟“

”مختلف رشت ہیں۔ اسامی کے حساب سے۔۔۔ وہ بیٹی بیٹی سی آواز میں ایک ایک کر بولا ”گوئی چھوڑا سوتا آوی ہو۔ جس کے قتل پر زیادہ شور شرابا ہونے کا خدو نہ ہو تو ہم کم پیسوں میں کام کر دیتے ہیں۔ جتنا بڑا اور اہم آدمی ہو۔ اس کے قتل میں خدو زیادہ ہو۔ کام مشکل ہو۔ اتنے ہی پیسے لگادے۔“

”میں نمکانے لگانے کے کتنے ملتے تھے؟“

”چالیس لاکھ۔“ اس نے کراہنے کے سے انداز میں جواب دیا۔

”چالیس لاکھ۔؟“ میں واقعی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کافی بڑی رقم ہے۔“

”بہت بڑے آدمی ہیں نا۔۔۔ وہ بولا۔

میں نے استہزائیہ سا تہقید لگایا اور راجیلہ کو قہقہہ لگتا ایک پیشہ ور قاتل کو ایسی دے دیا ہے کہ بادولت ہیں اور بادولت کی اتنی اوقات ضرور ہے کہ ہمارے گل چالیس لاکھ خرچ کئے جاسکتے ہیں۔“

”بعض لوگوں کو تم نے بتانا چاہیے اگر وہ غور ہوں تو شاید چالیس کروڑ میں بھی تمہارا پانچ صاف کر دیا ہو جائیں۔“ راجیلہ منہ بنا کر بولی پھر اس نے رحمان کے بازو تکلیف دہ سا جھکا دے کر اسے اذیت ناک انداز میں کھجور دیا اور پوچھا ”تمہیں ملتے تھے یہ چالیس لاکھ؟“

”نہیں۔۔۔“ وہ تکلیف زدہ سے انداز میں بولا ”میں صرف پانچ پانچ لاکھ ملتے تھے۔ باقی تو میری رقم کچھ دوسرے جاتی تھی۔ کئی جگہ حصہ تقسیم ہوتا ہے۔ ایڈوائس ہم۔ ایک ایک لاکھ لیا تھا۔“

”تمہیں نے یہ کام تمہارے سپرد کیا تھا؟“ میں نے پوچھا ”آخر کمال نامی ایک شخص نے۔“ اس نے جواب دیا میرا انداز درست ثابت ہوا تھا۔ اس نکلے کی کڑا

کرم سے ہی جا کر ملی تھی۔ آخر کمال اس کا تیکہ بڑی باڈی گارڈ بھی تھا۔ شاید اس حم کے کام کرانے کے لیے کے لوگوں سے رابطہ کا ذریعہ دی تھا اور وہی معاملات تھا۔ آہم میں نے انہماں بنے ہوئے پوچھا ”یہ آخر کمال کو

”جس۔۔۔ کوئی امیر تو ہی مطمئن ہوتا ہے۔ میں انہیں جاننا۔ ہمارا ٹیگ لیزر اسے زیادہ جانتا تھا۔ اسی ہمارا اس سے متعارف ہوا تھا۔ اس کے بعد سے جب ضرورت ہوتی ہے وہ خفیہ فون نمبروں کے ذریعے ہم سے رابطہ کر لیتا ہے۔“ اس نے انک انک کرتا۔

”بہت خوب۔ یعنی تمہارا باقاعدہ کوئی ٹیگ اور لیزر بھی ہے۔“ میں نے طویل سانس لی ”گوں ہے نہ پایا جاتا ہے؟“

”اس کا نام فور ہے۔ وہ آج کل ہانک ہانک ہے۔“

”واہ! ایک کا نام رحمان۔ ایک کا نام نور رکھی تم نے اپنے ناموں کی۔“ میں نے سر ہلایا ”میں نے اس طرح اچانک گولیوں کو چلی کر دیتے ہو یا کچھ کرنا بھی مارتے ہو؟“

”جو کارجر کر کے مارنے کا ارادہ لے تو اس کا

ہیں۔ جیسا حکم ملے۔“ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جی گارمنٹ ٹیکنی و فیو میں موصول ہونے والے آواز کے

ہو۔ کہ صاحب! جیسا کپڑا تیار کرنے کا آموز تیار کر دیتے ہیں۔

”تم چاروں کے علاوہ ٹیگ میں اور کتنے آدمی لگا

پہچا۔

”ہم چاروں اور ٹینگ لیڈر نور کے علاوہ تین لڑکے اور تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کے ہاتھوں مرچکا ہے اور دو دشمنوں کے ہاتھوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”دو آج اس خاکسار کے ہاتھوں مارے گئے جسے آج تم لوگوں کے تازہ ترین شکار بننے کا شرف حاصل کرنا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اور ہم ساتھ میں یونٹی پولس میں مارے جاتے۔“ راجیلہ نے بے رحمی سے کہا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”ٹینگ لیڈر ہنگ کانگ بھاگا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے اب صرف ایک تم ہو گئے ہو اور ایک وہ جو دوسری سوز سائیکل پر کسی طرف نکل گیا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا ”ٹھکانا کہاں ہے تمہارا؟“

”ہمت سے ٹھکانے ہیں۔ ہر علاقے میں ہم نے کسی غلیٹ یا مکان پر قبضہ کر لیا ہوا ہے۔ جیسے حالات اور جیسا موقع ہوتا ہے وہاں جاگتے ہیں۔“

”ہمت خوب! ٹی! اس لحاظ سے یہ زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ۔“ میں نے کہا۔

”میں سرائیہ ایک عظیم انسان ہے۔ ہمیں اس کو سیلیوٹ کرنا چاہیے۔“ ٹی نے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ نو پھر اسے سیلیوٹ کرو۔ اس کا کافی مالی نقصان بھی ہو گیا ہے وہ بھی پورا کرو۔“ میں نے صوبہ نما آئینے میں ٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس کی خدمات حاصل کرنے والا تو اب اسے بقیہ ادا نیگی نہیں کرے گا کیونکہ کام پورا نہیں ہو سکا لیکن تم اسے ادا نیگی کرو۔ یہ بھی ایک انوکھی مثال ہوگی۔ شکار نے خود اپنے قتل کا معاوضہ ادا کیا۔ تم تھک جاؤ اس کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتے۔ کچھ کیش اس کی خدمت میں پیش کرو۔“

یہ کہتے ہوئے میں گاڑی کے میں اُتار چکا تھا۔ کچھ آگے کافی بڑے رقبے میں کھنی جھانپاں پھیلی دکھائی دے رہی تھیں۔ دور تک دیرانی کا راج تھا۔ میں نے جھانپوں کے قریب گاڑی لے جا رکھی۔ وہاں زمین بہت نامواہر تھی۔ راجیلہ جلدی سے اتر کر اگلی سیٹ پر آگئی۔ ٹی نے اسی طرف کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رمان سے کہا ”جاؤ۔“

”کہاں؟“ اس نے بے اختیار احتقان سے انداز میں پوچھا۔

”اے گھر! ہم تجھے چھوڑ رہے ہیں۔“ ٹی نے دانت چیر کر بولا۔

شاید اس کے لیے کی سفالی سے خوف زدہ ہو کر رمان دروازے کی طرف کھٹک گیا۔ جو کئی وہ منہ پھیر کر اترنے لگا ٹی

نے اس کی پیٹھ پر ایک زوردار لٹا رسید کی۔ وہ اوجھڑا جھانپوں میں جا کر ا۔ ٹی نے قدم بے انداز میں پھیرا۔ سیلیوٹ تھا۔ اور یہ ہماری طرف سے کیش ہے۔ یہ کہہ کر میں نے دو گاڑیوں کے دیرانے میں قاتلوں کا دھماکا زور بھرا کر دیا۔ نور جو ان اس وقت کا پچھتے ہاتھ بیٹوں سے اٹھنے کی کوشش تھا جس وقت دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں اتر گئیں۔ وہ بچنے کے درمیان ہی ڈھیر ہو گیا۔

”اس کی مانتیں بھی داہیں کرو۔“ میں نے ٹی سے کہا۔ نے نور جو ان کا موبائل فون اور اس کا نوٹوں سے بھرا ہوا پیسہ اس کی لاش پر پھینک دیا اور میں نے گاڑی داہیں کے لیے راجیلہ پلٹ کر دیکھتے ہوئے تاسف سے بولی ”تم سارے چارے کو بالکل ہی ماریا۔“

”تو کیا تمہارے خیال میں آرمیا باچہ خانی موانا چاہیے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ دور تو اور ساتھ رکھتے۔ کچھ اور پوچھ کچھ کر کے کچھ اور سفید باجیں معلوم ہوتیں۔“ معلومات میں اضافہ ہوتا ہوا۔

”آج وقت نہیں تھا۔ یہ معاشرے کی غلط فہمی جلدی اس سے بچھا چھوٹ گیا تھا۔ اچھا ہے۔ اسے کلا ساتھ اٹھائے پھرتے۔ وقت کم ہے۔ مقابلہ سخت۔ اس کی غلط فہمی تو بہت بڑھ چکی ہے۔ ہم مکمل سفالی تو نہیں کر سکتے مکمل سفالی تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے پاس تو ہتھیار کر کے اس کے مزے کسی ساتھی تک پہنچنے کا بھی وقت نہیں ہم زیادہ باریکزوں میں جانے کے شتمل نہیں ہو سکتے۔ چھاپے ایک شیعہ کی تعذیب کرنا تھی۔ وہ ہو گئی۔ وہی سنہم ضروری کام تھا۔“

وہ کھسکے اچکا کر رہ گئی اور خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ ہسپتال ایک بار پھر اس کے ہولسٹر میں ٹی بھی اب خالی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا اور یوں اٹھ گیا۔ سیٹ پر غم و راز تھا جیسے اس نے بہت دیر سے اپنی جگہ بھی نہیں کی تھی۔ چہلے کی خاموشی کے بعد راجیلہ بھی آتے ہی دم لینے کا بھی موقع نہیں ملا۔ آتے ہی کام تھا۔ وہ بھی بہت قلق قسم کا کام۔

”اس لیے تو ہمیں یہاں بلایا ہے۔ تم سے کاتھ کا کام توڑا دی گوا تھا۔ کاتھ کی اور دفتری کام کرنے کے لیے بھی بہت ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کاتھ کی اور دفتری کام ہمارے لیے کام توڑا دی تو آرام ہوتا ہے۔“ راجیلہ نے اعتراف کیا۔

”میں نے بھی سوچا کہ آرام کر کے تمہاری فہم لگ گیا ہو گا۔ جو کڑا کڑا لگے ہوں گے۔ پڑھا ہے

"آج تو میرے شر کا پتھر کا کرہوں پہنچا دے گا۔"  
"پتھر کو کہ بات شر کا پتھر کرنے پر ہی مل گئی۔" بھگلی سیٹ  
سے ٹوٹی ہوا "ورنہ شاید اس وقت ہماری دوسری عالم بالا کا پتھر کا  
ری ہو تھیں۔"

"اب بھی ذرا ہوشیار رہنا اور پیچھے نظر رکھنا۔ اب کب کب کوئی  
اور پیچھے نہ چلا آ رہا ہو۔ یہ جو اپنے افضل صاحب ہیں نا۔ ان میں  
معاذ اللہ کسی سی کشش پائی جاتی ہے۔ لوگ کچھ بچے آتے ہیں۔ بس  
ذرا تکلیف کی بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ ہو۔"

پھر "را حیلہ ہولی۔"  
ٹوٹی ذرا ترچھا ہو کر بیٹھ گیا اور دھڑک دھڑک سے پیچھے نظر ڈالنے  
لگا۔ اب میں بھی چونکا تھا اور عقب نہ آئینے پر نظر ڈال رہا تھا  
گو کہ مجھے اتنی جلدی کسی دوسری کو شش کا اندیشہ نہیں تھا۔  
ہم خیریت سے ہو کر پہنچ گئے کاؤنٹر کلرک نے جلدی سے  
انہیں کمرہوں کے نمبر دے دیے اور ایک پورٹرن کے ایک اوپر لے گیا۔  
میں نے ان سے کہا "اب تم لوگ رات کے کھانے تک آرام  
کر سکتے ہو۔ رات کا کھانا آٹھ بجے ڈانٹک دوم میں کھایا جائے گا۔  
شفیع شاہ اور زرنج بھی کھانے پر موجود ہوں گے۔ اس کے بعد  
میرے کمرے میں میٹنگ ہوگی۔ کل کا پروگرام طے کیا جائے گا۔  
کوئی اعتراض؟"

"اعتراض کر کے ہمیں اپنی کمرہاں نہیں تر دوانی ہیں۔"  
را حیلہ ہولی "پیسے مرق... پر تو ہم جیسے فریڈ برادر ماتحت" میں  
سر "کہہ کر بھرتی سے پاس کو سیویٹ کرتے ہیں۔"  
"اگر تم اپنی فریڈ برادر ہو تو ہماری زندگی بچے اور ہی طرح  
کی ہوتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ایک تو ناشکی کی باتیں کر رہے ہو" اوپر سے اتنی ٹھنڈی  
آہیں بھر رہے ہو۔ ہم تھمارے پاس سے رخصت ہی ہو جائیں تو  
اچھا ہے۔" را حیلہ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور ٹوٹی کے ساتھ  
لٹف کی طرف بڑھ گئی۔ میں آؤس کی طرف جانے لگا تھا لیکن مجھے  
یاد آیا کہ ابھی تو میں نے ناشکی میں کیا تھا۔ میں ڈانٹک ہال میں  
جا بیٹھا۔

ناشے کے بعد میں نے شفیع شاہ کو فون پر اطلاع دی کہ ٹوٹی اور  
را حیلہ آگئے تھے میں نے اسے رات کے کھانے پر آنکھے ہونے  
اور میٹنگ کے پروگرام کی بھی اطلاع دی پھر زرنج سے رابطہ کیا۔  
وہ گھر سے اپنی کچھ دفتری مصروفیات کے سلسلے میں ٹھٹھے دی والی تھی۔  
"خیریت تو ہے۔ یہ آج علی الصباح منہ اندھیرے میری یاد  
کبھی آئی اور فون کرنے کا خیال ہی نہیں آگیا؟" اس نے حیرت سے  
پوچھا "ابھی تو صرف ساڑھے نو بجے ہیں۔ اس وقت تو تمہارے  
خوابوں کی دو مہانی ریلیں چلتی ہوں گی شاید۔"

"ملا خیال ہے تمہارا۔ دنیا میں ایک تم ہی ہو پھر کل نہیں  
ہو۔ کچھ لوگ تم سے بھی کہیں پہلے پیدا ہو کر نہ جانے کس کن

جات اچھی نہیں رہتی۔ یہاں ذرا تمہاری فون غراہی ہو جائے  
گی۔" میں نے کہا۔

"تم خود اپنی فون غراہی کرانے لایو رکھو نہیں آگئے؟" وہ

بلکہ "وہاں بی الحال کوئی مسئلہ جو درپیش نہیں تھا۔ جہاں کام ہو گا  
وہاں تو بد دینی بڑے کی نا۔ یہاں مسائل اور مسائل نکلے ہوئے  
ہیں۔ ایک پتھر کی جڑ سے دوسرا پتھر برآمد ہوا ہے۔" میں نے  
کہا۔

"مسائل اور پتھروں کی تو خبر وہاں بھی کوئی کی نہیں تھی۔  
صرف تمہارے آنے کی خبر تھی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر ہولی  
"جہاں تم ہو گے وہاں مسائل ہی مسائل ہوں گے۔ پتھر کی پتھر  
ہوں گے تمہارے تو پاؤں میں بھی پتھر ہے اور قسمت میں بھی۔  
جب پتھر واری قسمت پائی ہے تم نے۔ یہ افٹنی طور پر ہی پتھروں  
میں خود کھلے مطہم ہوتے ہو۔"

"کل کے پچھلے پھوڑنے کی مشق شروع کر دی؟" میں نے  
سے گھورا۔

"مشق قسمت پرانی ہے۔ میں کبھی آؤٹ تھک پر ٹکس ہوئی ہی  
نہیں۔" وہ اطمینان سے ہولی "بلکہ تمہیں شاید عادت نہ رہی ہو۔  
ان دنوں بعد سامنا ہوا ہے۔"

"میری عادت بھلا کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے میں  
فل سے تمہاری جگہ جگہ کن رہا ہوں۔ اتنے دن آہنا سامنا نہ  
رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ٹپلی فون پر تو رابطہ رہتا ہی تھا۔ اس پر  
لی کام کی بات کم اور اسی قسم کی جگہ جگہ زیادہ سننے کو ملتی  
کی۔" میں نے تکلیف زدہ سے انداز میں کہا۔

"تھو کا شکر ادا کر کہ کہیں یہ جگہ جگہ سننے کو ملتی ہے۔ تم  
بشخصی ہو۔ کہیں تم پر ایسا وقت نہ آجائے کہ یہ جگہ جگہ  
نے کے لیے تڑا کر۔" وہ دوستانہ انداز میں ہولی۔

"ناکہ بڑھاپے کے باعث قبر میں ناگھلے لٹکائے بیٹھی ہو لیکن  
جانے کیوں اس کے باوجود وہ وقت بہت دور لگتا ہے جب تمہاری  
ک جگہ سے نجات ملے گی۔ اس لیے خواہ خواہ ایسا دل خوش  
سننے والی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اپنے سببے  
عامی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

اس نے کہا جانے والی ٹھٹھوں سے مجھے گھبراہ اور گھبراہ وانت  
اپنا کر کھلی "یہ آج تمہیں مجھ کو بڑھاپا ثابت کرنے کا اس قدر  
نکالیں گے جتنا ہے۔"

میں کب انکی کوشش کر رہا ہوں۔ حقائق تو حقائق ہی ہوتے  
ہے۔ اگر اوقات انہیں ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔"

میں جواب دیا۔  
باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ پائندہ رشی مدھ پر پہنچ گئے اور میں  
کاؤنٹر نیپا کی طرف موڑا۔ را حیلہ ٹھنڈی سانس لے کر ہولی

مراحل اور مسائل سے منت کردن نہیں بھی آن بیٹھے ہیں اور بھی کبھی تو انہیں راتوں کو سونا نصیب ہی نہیں ہوتا۔

”اس کی وجہ تو خیر کچھ اور ہو سکتی ہے۔ راتوں کو سونا نصیب نہ ہونے کے پیچھے کئی حوال کار فرما ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان کا تعلق پچھلے جنم میں پرعدوں کی کسی خاص نسل سے رہا ہو۔ اس کے علاوہ ان کی مشکوک اور غلط سلسلہ قسم کی سرگرمیاں بھی ان کے سونے کی راہ میں رکاوٹ ہو سکتی ہیں۔“ وہ خامسے عالمانہ لہجے میں بولی۔

”میرحال تم نے اس وقت فون کر کے مجھے ایک خوشگوار حیرت سے رو چا رکھا ہے۔“

”اب میں تمہیں چھوٹے سے ایک ہتھوڑا مہرے سے چار آٹھ کرنے والا ہوں۔ اصل میں مجھے ایک چھوٹی سی مہرے کے سلسلے میں تمہاری ضرورت آن پڑی ہے۔“

”مجھے تو پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی کام ان پڑا ہو گا جو ہم غریبوں کی یاد آگئی۔“ وہ غصہ کی سانسیں لے کر بولی۔

”ایک تو شاید دنیا کی تمام لڑکیوں کو موقع سے موقع نظر فرمانے اور ہر بات کا غلط مطلب اخذ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔“

”غیر لڑکیوں کے معاملے میں تمہارے تجربے کو کون جھجج کر سکتا ہے۔“ اس موضوع پر مزید بحث نہ کرنا فوراً اختیار ڈال دے۔

”اگر تمہیں میرے مطلب پر مت ہونے کا اتنا ہی یقین ہے تو ٹھیک ہے۔ میں اس موضوع کو رہنے ہی دیتا ہوں۔ ہم تمہارے بغیر بھی کام چلا لیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔ تمہیں تو خفا ہوا بھی آتا ہے۔ لاش میں اس وقت تمہاری صورت دیکھ سکتی۔“ وہ گویا محفوظ ہوتے ہوئے بولی ”اب باقاعدہ دوا مت شروع کرنا۔“ چلو۔ جلدی سے کام بناؤ۔

”شباباش۔“ اس نے گویا کسی بچے کو پکارا۔

”تم نے خود ہی ایک مرتبہ پیش کی تھی کہ کسی قسم کے سلسلے میں اگر میری ضرورت پڑے تو میری خدمات سے بھی استفادہ کر لیا جائے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ہاں۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ میں وعدہ کر کے بھولنے اور پیشکش کر کے واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ کیا ابھی آجاؤں؟“ وہ اطمینان سے بولی۔

”نہیں۔ خیر۔ اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ ابھی تو اس سلسلے میں صرف مینٹک ہو رہی ہے۔ وہ بھی رات کو کھانے کے بعد۔“ میں نے تباہی ”ترج رات کا کھانا تمہارے ساتھ کھاؤ۔“

وہ ہنسنے لگی۔ میں نے اپنے لہجے سے ذرا غلطی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”نہی مجھے اس بات پر آرسی ہے کہ تم ایک بے ہودہ سے آوی ہو اور وہ کام بھی یقیناً بے فائدہ رہے ہودہ ساسی ہو گا لیکن تم اس کے لیے اتنی سنجیدگی سے ڈر اور مینٹک کا احترام کر رہے ہو

جیسے دو بین الاقوامی کمپنیوں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے کے

لے مذاکرات ہو رہے ہیں۔“

”اندازہ تو تمہارا درست ہے لیکن میں اپنی قوی صلاحیت مطابق اسے تسلیم نہیں کروں گا۔ فرض کرو کام بے ہودہ اسے منظم طریقے سے اور تیز سے کرنے کی صورت میں زیادہ شوکت پیدا ہو جاتی ہے۔“

”مکتا شوق ہے تمہیں شان و شوکت پیدا کرنے کی اشتہار ہے انداز میں مزید انس کر بولی ”اگر کسی نقب بھی ملے ذرا شان و شوکت سے لگایا کر۔“

”ہاں۔ اگر وقت میرا ہو تو اس طرح کا کام بھی شہرہ سے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ اندر جیسی ہو تو باہر ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا کھانے پر شیطان کے۔ میرا مطلب ہے تمہارے چلنے چل رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ صرف خاص خاص اور پیچیدہ پیچیدہ لوگوں کی ہے۔“ میں نے تباہی ”میں شفیق شاہ، تمہاری نئی اور رابطہ مل

وہ دونوں بھی لاہور سے آچکے ہیں۔“

”چھا۔“ وہ گویا کچھ چوکی۔ میں نے محسوس کیا رابطہ کے نام پر جو کچھ جی لیکن اس سلسلے میں کوئی ہنسوا

بولی ”بڑی خوشی کا مقام ہے کہ ہم بھی تمہارے خاص پیچیدہ پیچیدہ لوگوں میں شامل ہو گئے۔“

”بہت مرے سے شامل ہو۔ تم تک اطلاع ذرا دیر ہے۔ لائن میں کچھ خرابی ہوگی۔ تمہاری طرف۔“

”ہاں۔ لائن میں ہی یہ خرابی ہے کہ جس پیغام کا کھانا اس لائن پر سنائی نہیں دیتا۔“ وہ غصہ کی سانسیں لے کر

”میرحال۔ میں پہنچ جاؤں گی۔ میرے لائن اور کوئی خدمت دے۔“ اتنی سعادت مندی! ”میں نے کراہ کر کہا

”ہاں۔ میں خوشی سے بھڑک کر جان دوں۔“

”ابھی اس قسم کی کوشش نہ کرنا۔“ وہ ششکانہ سے بولی

”یہ تمہارا حسن نظر ہے اور تم اس فدی کی طرف کر رہی ہو ورنہ من آتم کہ من دانہ۔“ میں نے اگلا

”اس سے پہلے کہ فدی قاری کے ساتھ ساتھ شروع کرے۔“ مجھے اجازت دے لینی چاہیے۔ خدا حافظ

میں نے بھی اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلے متعلق

لے کر لباس تبدیل کرنے کے ارادے سے اوپر اٹھ آیا۔

اس روز مزید کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔

شده وقت سے کچھ پہلے ہی ڈاننگ ہال میں جا بیٹھا

شفیق شاہ بھی آگیا۔ وہ بھی وقت سے پہلے آگیا تھا۔ اس



”مکئی نہ تک تم ٹھیک ہی سمجھی ہو۔ اصل مقصد تو مل بیٹنا ہے لیکن ہم لوگوں میں ایک بڑی عادت ہے کہ جب مل بیٹتے ہیں تو کچھ نہ کچھ کر بھی گزرتے ہیں فی الحال تم مہربانوں سے اپنے سامنے نہ بڑے ہوئے بیٹو سے اپنی ہنسی کی کمانے پینے کی چیزیں منتخب کرنا۔ یہ گزراش باقی ساتھیوں کے لیے بھی ہے۔“ میں نے ٹوٹی شفیع شاہ اور راحیلہ کی طرف دیکھا۔

”تم یہ مہربانہ گزراش نہ کرتے تب بھی ہم کی کام کرتے۔“ راحیلہ اپنے سامنے سے بیٹو اٹھائے ہوئے ہوتی تھیں تو وہ دوسرے کا وقت بھی سو کر گزرا دیا۔ وہ سمجھو کہ تمہاری اس نیافت کے انتظار میں میں نے دوسرے کا کھانا بھی نہیں کھایا۔“

”کمزور شخص لوگ ضیافتیں اور شادی بیاہ کے کھانوں سے پہلے کی کرتے ہیں۔“ میں نے سر لایا۔

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ ذرا تاج کی آہ کے بعد چند لمبے کے لیے مجھے فضا میں ایک بے عنوان سی سرد مری اور تاج کا احساس ہوا تھا۔ شاید وہ میرا وہم ہی رہا ہو تاہم چند ہی لمبے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خفیف سی سرد مری اور تاج اسی فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا پھر ہم سب میرے کمرے میں آگئے۔ درحقیقت وہ کمرہ انہیں سوٹ تھا۔ اس کا آدھا حصہ ذرا تنگ دھم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہم اسی میں تپائی کے گرد صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ٹوٹی، راحیلہ اور ذرا تاج خستہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

چند سینکڑے کے سکوت کے بعد میں نے کہا ”تم تینوں کو اس طرح میری طرف دیکھ رہے ہو جیسے میں تقریر شروع کرنے والا ہوں۔“

”خدا نہ کرے جو تم بھی تقریر کرنے لگو۔“ راحیلہ بولی ”اور خدا ہم پر اتنا بڑا وقت نہ لائے کہ ہمیں تمہاری تقریر سنتی بھی پڑے۔ اگر تمہارے ایسی کوئی کو شش بھی کی تو ہم تمہیں اٹھا کر گزری سے باہر پھینک دیں گے۔“

”جس محفل میں صدر محفل کی یہ عزت ہو اس محفل سے تو واک آؤٹ کر جانا چاہیے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ چاروں بیٹھ کر ٹکڑی طرف دیکھتے رہے۔

”کیا تم لوگ مجھے دوسرے کی بھی کو شش نہیں کر دے گے؟“ میں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“ راحیلہ نے نفی میں سر لایا۔

”محنت ہے تم پر۔“ میں نے یک دم دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا ”جب کوئی دوسرے والا یہ نہ ہو تو پھر جانے کی کو شش کرنے کا کیا فائدہ دیتے بھی اس وقت میری کمی میں دوہرے ہیں واک آؤٹ کا پروگرام چھٹی کرنا ہوں۔“

”آج ہماری معلومات میں یہ گراں قدر اضافہ ہوا کہ تم کہنی کے بل واک آؤٹ کرتے ہو۔“ راحیلہ نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

کارمزوری کی رپورٹ دی۔ نمینہ بدستور عاتب حق سے دوسرے روز سے اخبارات میں درانی کے خلاف خبروں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد راحیلہ اور ٹوٹی بھی آپہنچے۔ وہ اب پہلے سے زیادہ تازہ دم اور خوش لباس نظر آ رہے تھے۔ راحیلہ نے گویا وضاحت کی ”میں تو بہت دیر سے تیار بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹوٹی پر ایک مردہ ہوا گرد کرسم کہہ کر وقت گزرا رہی تھی۔“

”کیوں؟ کیا تمہارے بچے آئے پر کوئی سخت قانونی پابندی لگ چکی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے سوچا جس نے آٹھ بجے بلایا ہے تو آٹھ بجے ہی جائیں گے۔“ وہ کدے کدے اچکا کر گزری دیکھتے ہوئے بولی ”یہ چند منٹ پہلے بھی مجھے ٹوٹی لے آیا ہے۔ اس بے مہرے نے آکر میرے دوازے پر دستک دے دی۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ میں نے متاثرانہ انداز میں سر لایا ”ہوئے کہا۔“ چند منٹ پہلے آئے کے جرم میں تمہیں چودہ سال قید یا مشقت کاٹی ہوگی۔“

”کرسم میرے آقا۔“ وہ میرے قریب کر سی پر بیٹھتے ہوئے گھوم گئی اور آواز میں بولی۔

”اچھا جاؤ معاف کیا۔“ میں نے شاہانہ انداز میں کہا ”کیا یاد کرو گی کس پاس سے پالا بڑا تھا۔“

”اور پھر زانی رہا تھا۔“ اس نے قہر دیا۔

ذرا تاج ٹھیک آٹھ بجے پہنچی۔ وہ نہایت سادہ لیکن نفیس لباس میں تھی۔ پیشہ کی طرح منہ زور اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے راحیلہ سے ہاتھ ملایا۔ راحیلہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمبے کے لیے دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان کے ہاتھ مضبوطی سے ایک دوسرے کی گرفت میں تھے اور دونوں پر ہنسار نہ مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے غامضی کے بجائے ایک دوسرے کا حال دریافت کیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے اس تاثر کو غلط قرار دینے کی کو شش کرتا ہوا کہ اس مگر کو شش کی۔ میں کہیں سرد مری کی لڑھی۔

”کیا بینک شروع ہو گئی؟“ آخر ذرا تاج نے میرے متعلق بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

”بینک تمہارے بغیر کیسے شروع ہو سکتی تھی؟“ میں نے کہا ”ویسے بھی شاید تم ایجنڈا بھول رہی ہو۔“ پہلے کھانا کھایا جائے گا۔ خالی ہینٹ تو بینک ایٹنگ کم اور قرارداد و قیمت زیادہ معلوم ہوگی۔ ویسے بھی بینک اوپر میرے کمرے میں ہوئی ہے۔“

”یہ تمہیں اچھا کیا بینک بینک کھیلنے کی کیا سوچھی؟ سیدھی طرح نہیں بتا سکتے تھے کہ مسئلہ کیا ہے۔ کام کیا ہے؟“ ذرا تاج نے کہا ”مگر وہ جواب کا انتظار کے بغیر بولی ”مجھے تو بس یہ مل بیٹھ کر کھانا کھانے کا بہانہ ملتا ہے۔“

اس طرح کے باقاعدہ تصادم کی فوج تو ہم بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں آنے دیتے ہیں ورنہ ہماری پہلی ترجیح تو یہی ہوتی ہے کہ نہایت خاموشی سے اور بظاہر پُر امن سے انداز میں اپنا مقصد حاصل کر لیں۔ اگر مخالفین کو ٹھکانے بھی لگا دے تو اس طرح لگایا جائے کہ زیادہ شور شراب نہ ہو۔ لوگوں کو بعد میں ہی پتا چلے کہ وہیں کیا ہوا تھا۔ ہماری کارروائی کے دوران لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول نہ ہو۔ ہم تو محرم کے بد معاشوں اور درہشت گردوں کا گردہ بنائے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہمارا مقصد قہری ہے۔

”قہری مقصد کے لیے بھی کبھی کبھی تخریبی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔“ راجیلہ مسکرائی۔

”تخریب تو ہر حال اس میں بھی کچھ نہ کچھ ہوگی لیکن ہمیں اس کا ہندوڑا نہیں بیٹھنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”چھما۔۔۔ یہ اس قسم کی کارروائی ہے۔“ راجیلہ نے قصی انداز میں سر ملایا ”میں کبھی سمجھی کہ اس قلعہ نامکان میں گھسنے کے ساتھ ساتھ جمال سعیدی کو یہ بھی بتانا ہے کہ ہم بھی کچھ کچھ معاش نہیں ہیں۔“

وہ یقیناً سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ اسے ابھی طرح اندازہ تھا کہ میں کیا چاہتا تھا اور ہمارے طریقہ کار میں کیا کیا مصیبتیں چھٹا نظر رکھی جاتی تھیں لیکن وہ سن رہی تھی۔ اب بھی مجبوز مجاز کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی لیکن بظاہر مجبورہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وہ ہماری تسماری بد معاشی سے اتنی آسانی سے مرعوب ہونے والا نہیں ہے۔ وہ خود بہت بڑا بد معاش ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہمت سے لوگ یہاں پہلے ہی چھوٹی چھوٹی بادشاہ قائم کئے بیٹھے ہیں۔ اس نے بھی باہر سے آکر یہاں اپنی ایک چھوٹی سی بادشاہت قائم کر لی ہے۔ ہمارے اداروں کی کرپشن سے بھی اس نے یقیناً پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی لیے شاید اسے ہمارے ہاں کے قوانین اور پابندیوں وغیرہ کی کوئی خاص پروا نہیں ہے۔ دوسری ہمت کی مصیبتوں کی وجہ سے اس نے اپنا وہ قلعہ نامکان بھی ایسے علاقے میں بنایا ہے جو ابھی غیر آباد ہے۔“

”آپ کا منصوبہ کیا ہے؟“ ٹونی نے دریافت کیا۔

میں نے نیالی پر موجود ایک بڑے سے کاتھ پر مار کر سے خاکہ بناتے ہوئے انہیں سمجھانا شروع کیا ”اس مکان کے سامنے کی طرف سے کچھ فاصلے سے یہ ناموار اور کچی کچی سی سڑک گزرتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ مکان میں سامنے کی طرف کسی دنگا کبرے نصب ہیں جن کے ذریعے کسی بھی گزرنے والے یا مکان کے گیٹ پر پہنچنے والے کو روکنا جاسکتا ہے کسی کے بارے میں مجھے ذرا سا شک و شبہ محسوس کرتے ہی کسی کو مشکوک انداز میں مکان کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ صرف فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں بلکہ مکان کے احاطے میں اور پچھلی طرف موجود گاڑوں کو بھی یک دم

”مذاق اور فضل بکواس مت ہو چکی۔ اب میں تم لوگوں کو سنجیدگی سے سارا نقشہ سناتا چاہتا ہوں۔“ میں نے حسیستاً سنجیدگی سے کہا ”یہ ایک شہزادی کی کمائی ہے۔“

”ہم شہزادہ اگامانی نہیں سنیں گے۔“ راجیلہ نے فوراً میری بات کاٹی ”یہ جن بھوتوں کا زمانہ ہے۔ ہمیں کسی جن بھوت کی کمائی سناؤ۔“

”مورا میرے کام لو۔“ میں نے اسے گھورا ”اس کمائی میں ہمت سے جن بھوت موجود ہیں۔ بلکہ اصل میں یہ کمائی جنات ہی کی ہے۔ ایک ماڈرن اور صرف نام کی شہزادی تو اس میں صرف ڈیکوریشن کے لیے موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر سناؤ۔“ راجیلہ نے سر ہلا کر گویا اجازت دے دی۔

”اور اب تم اپنی چوٹی بند رکھنا ورنہ میں یہ جگہ اٹھا کر تمہاری خالی کھوپڑی پر بلا لیتی گا۔“ میں نے پیشے کے جگ کی طرف اشارہ کیا۔

”ناما کہ ہوئی تمہارا اپنا ہے لیکن ایک جگہ کا نقصان کیوں کرتے ہو۔“ وہ ہر دماغ لہجے میں بولی۔ میں نے اسے گھورا جاری رکھا تو وہ سکین کی شکل بناتے ہوئے بولی ”چھما۔ اب میں بالکل نہیں بولوں گی۔ پتا وعدہ۔“

میں نے انہیں پرنس میرا کے قتل سے شروع ہونے والے واقعات سنائے اور بتایا کہ کس طرح ان سب کا ایک دوسرے سے تعلق قائم چلا آیا تھا۔ فصیح شہ تو ان تمام حالات سے آگاہ تھا۔ زرتاج کو بھی کچھ معاملات کا علم تھا لیکن اب وہ پوری کمائی سے باخبر ہو رہی تھی۔ راجیلہ اور ٹونی کے لیے تو ہر حال یہ سارا نقشہ نیا تھا۔ آخر میں میں نے انہیں جمال سعیدی کے قلعہ نامکان ”ٹورنگ بیلنس“ میں اپنی ”پیشی“ کا واقعہ سنایا۔

تمام ہی منظران کے علم میں آپنا تو میں نے کما ”نی الحلال جو سب سے اہم کام رو پیش ہے وہ ٹورنگ بیلنس میں گھستا ہے مجھے وہاں جس نہ خانے کی جھلک نظر آتی ہے مجھے شبہ ہے کہ وہاں کوئی ہمت اہم چیز موجود ہے جو ہمیں جمال سعیدی کی اصل سرگرمیوں کا پتا دے گی۔“

”یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ راجیلہ بے پردائی سے بولی ”کل ہی زبردست طریقے سے سچ ہو کر چلے ہیں اور اس مکان پر دھوا ہوا دیتے ہیں۔“

”میں نے ایسے احتیاط مشورے لینے کے لیے تمہیں اتنی دور سے نہیں بلوایا ہے۔“ میں نے ایک بار پھر صبر سے کا اظہار کرنے کے لیے اسے گھورا ”شاید تم بھول رہی ہو کہ اس قسم کے معاملات میں ہم ایسے تصادم سے گریز کرتے ہیں جس کا بہت شور شرابا ہو۔ لوگ اور ادارے اس طرف متوجہ ہوں اور مخالفین کے ساتھ ساتھ خود ہمارے آدمیوں کے بھی ہلاک یا زخمی ہونے کا امکان موجود ہو۔“



”مہلت مکان کی باؤنڈری والے کے اوپر چاروں طرف خاردار تامل کا جنگلا بھی بنا ہوا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ ان میں کرنٹ دوڑتا ہے۔“ میں نے سلسلہ کلام جوڑا ”پچھلی طرف موجود صلح محاذوں سے خٹنے کے بعد ان تامل کو کاٹنے کا بھی بندوبست کر کے چلنا ہوگا۔ کم از کم آغا بڑا شگفتہ کتا ہوگا کہ ایک ایک کر کے ہم سب خیریت سے گزر سکیں۔“

”یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجئے۔“ شفیع شاہ بولا۔

”ہمیں کھوڑی سی سوپ بازی بھی کرنی پڑے گی۔ اس کا بھی میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ لاہور سے اتفاق نے فون پر ایسا بندوبست کرا دیا ہے کہ ہمیں ہر سولت حاصل ہو جائے گی۔ اگر ہم اپنے اصل طیلوں میں ’خواہ گاڑی میں یا پیدل ان کے قریب پہنچے ہیں تو وہ ہمارے پہنچنے تک بے پناہ مستعد ہوں گے مجھے تو وہ محل سے بچان بھی لیں گے۔ ممکن ہے اس دوران میں وہ اپنے راجلے کے ذریعے سے اندر کسی کو مطلع بھی کر دیں کہ ہم مکان کی طرف آرہے ہیں۔ صرف اسی سے پہنچنے کے لیے ہمیں ذرا سوپ بازی کا ڈراما کرنا ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ میں چاہتا ہوں ہم ان کے قریب اس طرح پہنچیں کہ وہ ہماری طرف سے کوئی خلو محسوس نہ کر رہے ہوں اور ہمارے بارے میں اندر اطلاع نہ پہنچے کی زحمت نہ کریں۔ سوپ بازی کے سب انتظامات ہو چکے ہیں۔ میں آج فون پر کسٹرم کرچکا ہوں۔ ایک جگہ سب چارواں عمل ہیں۔ اب ہمیں صرف یہ طے کرنا ہے کہ یہ چھوڑنا آ رہے ہیں۔ یہ بالآخر سر جری کب کرنی ہے۔“

”جو کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔“ زرنج طرہی سانس لے کر بولی ”اگر مجھ جیسے پارٹ ٹائم خدائی فوجدار اپنی اصل مصروفیات جاری رکھ سکیں۔“

”ہم سب ہی پارٹ ٹائم خدائی فوجدار ہیں۔“ شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا ”فل ٹائم تو ہم صرف برٹس میں ہیں۔“

اس کے بعد کافی دیر تک ماحول کی بچیدگی پر قزاق رہی اور میں نے انہیں جزئیات سمجھانا شروع کیں کہ کس طرح کیا کیا جائے گا اور اگر کوئی بات خلاف توقع ہوگئی تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ بات زیادہ لمبی چڑی نہیں تھی۔ سنجیدگی سے بات ہوئی تو پتہ چلتے ہیں سب کچھ طے ہو گیا۔ اس کے بعد کافی متکوالی کی آواز اچکے بار پھر خوش گویاں ہونے لگیں۔



دوسرے دو دن بیکہ کمانے کے فوراً بعد ہم باہمیوں میری کالاف میں ہو گئے سے روانہ ہوئے۔ شفیع شاہ ذرا راج کر رہا تھا۔ ہم لوگ سیدھے سراب گولڈ سے کچھ قسطے پر واقع ایک اسٹور میں پہنچے وہاں سے مجھے فون پر اطلاع مل چکی تھی۔ افراد وہاں کچھ انتظامات کے ساتھ ساتھ ہمارے بھتر چھ اسٹور میں اپنی صحیح شکلیں اور اصل طیلوں کے ساتھ داخل

”ختم۔ ساتھ چلے کا وعدہ کر کے گھر جا جانے والے لوگ تو نہیں ہیں ہم افضل صاحب! یہ کھڑی سانس لے کر بولی ”آپ نے ابھی ہم کو آزمایا ہی نہیں ہے۔“

”وام۔ واما کیا صدمہ مکالمہ بولا ہے۔ کسی قسم کی یاد تازہ ہوگئی ہے جو بچپن میں ذریعہ دھوپے والی کلاس میں بیٹھ کر دیکھی تھی۔“ شفیع شاہ آلی بجائے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ فونی نے بھی اس اشارے میں اس کا ساتھ دیا۔ زرنج یوں آداب بجالائی جیسے اسے مشاعرے میں کسی اچھے شعر پر داد ملی ہو۔ راجلے کا چھو اس دوران میں پھریا ہوا سارا۔

”اب راجلے سنجیدہ ہوئی ہے تو تم لوگ معزے پن پر اتر آئے ہو۔“ میں نے اپنی سنجیدگی پر قرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”مٹنی۔ شفیع شاہ! تم لوگوں سے یہ امید نہیں تھی۔ تم تو سنجیدہ انسان ہو۔“

”شاید قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے جراثیم لگ گئے ہوں۔“ شفیع شاہ سر جھٹکاتے ہوئے ابھگی سے بولا۔

زرنج نے اسے گھور کر دیکھا کیونکہ اس کے قریب وہی بیٹھی تھی۔ پھر وہ بولی ”تم تو خور ایک جراثیم ہو۔ تمہیں جراثیم بھلا کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”جب دنیا میں انسان کو انسان سب سے زیادہ ضرر پہنچا سکا ہے تو جراثیم کو جراثیم ضرر کیوں نہیں پہنچا سکا۔“ شفیع شاہ جھنجھکے والے انداز میں بولا۔

”انسان کی بات ہی کچھ اور ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے تم کسٹنوشس بنے اور اس کے بارے میں غلط سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ یہی کافی ہے کہ تم نے اپنے آپ کو جراثیم تسلیم کر لیا۔“ زرنج نے اسے جھانپائی۔

”یہا اسارت اور پینڈم جراثیم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔“ فونی بھی بول اٹھا۔

”تم نے بھی اپنے دوست کو کھن لگانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔“ زرنج نے اس کی طرف دیکھ کر خیرہ انداز میں گردن ہلائی ”دو بے تم دونوں ایک ہی جھیلی کے چتے بنے۔ یا یوں کہو کہ ایک ہی پھنچنے کے جراثیم لگتے ہو۔“

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے انہیں گویا اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور شائع سے کہا ”اگر آپ خواتین و حضرات کا اس جراثیمی بحث کو طول دینے کا ارادہ ہو تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔ بیشک پھر کسی دن پر رکھ لیتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کی ضرورت پائی رہی۔“

”سوری۔ سوری۔“ ان خنیوں نے تقریباً ہم آواز ہو کر کہا اور ایک بار پھر سنجیدہ شکلیں بنا کر بیٹھ گئے۔ شفیع شاہ بولا ”آپ کہ رہے تھے کہ مکان کے پچھلی طرف دو بے کیمروں کی موجودگی کا امکان نہیں ہے۔“

"خوش ہو جاؤ۔ تمہیں چھوڑا ہوا ہے۔"

"کیا معلوم اس زبان میں چھوڑا دراصل چھوڑا ہے کہ ہوں۔" میں نے شک نہ کیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ چھوڑا لڑکے کو کہتے ہیں۔ راحیل نے گویا مجھے سہلی دی۔"

ٹرک حرکت میں آیا تو اس کے تمام انگریز کونڈر کھڑے ہو کر ایسا لگتا تھا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد ایک ایک چکر مچا جائے گی اور خط پر پہنچے تک صرف جیسز پر انجن اور گاڑی ذرا تیز رہ جائے گا اور وہ بھی شاید بیٹھا نہیں ہو گا کہ کسی پائوس پسٹے کے کھڑا ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ٹرک اپنے تمام کھڑے کھڑے حصوں کو کسی نہ کسی طرح ساتھ لے کر ایک ایک پرے ہوا دوں دوں رہا۔ اسے ہماری ایک آوی پلا رہا تھا کہ ہم سے ملتے جلتے ہی طے میں تھا۔ کچھ فاصلہ چھوڑ کر ہمارا وہ آوی میری گاڑی لے کر آ رہا تھا لیکن اب ہم اس سے اور بھی بظاہر قطعی لا تعلق تھا۔

ٹرک کا کہیں اونچا نہیں تھا۔ اگر کوئی سامنے سے بھی نظر آئے تو دور سے ہی اندازہ ہو جاتا کہ کنسٹرکشن کے سالن اور مزدوروں سے...

لدا ہوا کوئی ٹرک چلا آ رہا تھا۔ ہمارے چاروں طرف سارا لینے یا ٹنک لگانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ ہم کاٹھ کاٹھ کے درمیان پھنس پھنس کر گویا ایک جڑ سے جڑ چبوترے پر بیٹھے تھے لیکن سب کا اندازہ کچھ ایسا تھا جسے بڑھاپہ اسی طرح سڑک کے عادی چلے آ رہے ہوں۔ ذرا آج شاید اس واقعہ میں حقیقت کا کچھ زیادہ ہی رنگ بھرنے پر تھی ہوئی تھی۔ اسی خشک شدہ سینٹ سے نظر ہوا ایک تھلا اٹھایا اور اسے اسی طرح بچانے کی کوشش کرتے ہوئے گانے لگے:

تمہارے گاڑیوں کے اپنے سین میں بند کر لیں۔

بھیر کس جاتے نہ دیں۔

دوسری گاڑیوں موٹر سائیکلوں وغیرہ کی نسبت ہم ذرا اونچے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ گاڑیوں میں اور موٹر سائیکلوں میں کئی افراد گردشیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ دیکھنے لگے تھے۔ ذرا آج کی توڑ توڑ کو بلکہ نہیں تھی اور ٹرک شور میں دوسرے لوگ تو اسے سن بھی نہیں سکتے تھے لیکن اسی انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ گانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کے اندازاً توڑ کی نہیں تھی۔ بات کچھ اور تھی۔

دراصل ذرا آج اور راحیل دونوں کی خوب صورتی اور

مخلصانہ گیت اب اور معنوی سیاحی میں چھپانے کی کوشش کی کوشش تو کی تھی لیکن ہم بہت ان ملبوں میں بھی

پیشکش لگ رہی تھی۔ اب ان کی شخصیت میں کچھ اور بھی کی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ اگر ہم جن مہمے پھیل

مہمے کے ساتھ نہ جاتے تو وہ توڑ تھکے۔ ایک اور

ہوئے تھے لیکن جب ہم وہاں سے برآمد ہوئے تو ہمارے لیے ایک دوسرے کو بھی پہچانا مشکل تھا۔ اسٹوڈیو سے نکلنے وقت ہم کار میں روانہ نہیں ہو سکے۔ ہماری سوار کی بھی بدل چکی تھی۔ میری گاڑی گیت پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے سنبھال لی جو طے سے ذرا تیز یہی معلوم ہوتا تھا۔ باہر اسٹوڈیو کے گیت کے قریب ایک انتہائی کھٹا کھٹا ٹرک کھڑا تھا۔ اس کا پچھلا حصہ کھلا اور پائٹ تھا۔ اس پر سینٹ کے بلاک لڈے ہوئے تھے جن سے خاصا بڑا ایک چوڑا سا بن گیا تھا۔ اس چوڑے پر کنسٹرکشن میں کام آنے والا کچھ دوسرا پھر سارا سا بن گیا تھا۔ پلے، تھلا، مٹی میں تھری ہوئی ایک بند ہوئی تھی کہ ایک پینے والی ایک ہاتھ مٹی بھی اونٹنی رکھی ہوئی تھی۔ اسی طرح وہ کچھ دوسرا کاٹھ کٹا رہی تھا۔ اسی کاٹھ کٹاڑ کے درمیان جگہ بنا کر ہم انہیں ٹرک پر چڑھ کر بلاکوں کے اوپر بیٹھ گئے۔ میں 'شیخ شاہ اور ٹولی مزدوروں والے' طے میں تھے۔ چنی پرانی اور سینٹ وغیرہ میں تھری ہوئی بے ہضم سی شلوار قمیص ہمارا لباس تھی۔ میرے سر پر مٹی سی ایک بگڑی 'شیخ شاہ' کے سر پر پانی سی ایک مٹی سی سندھی ٹوپی اور ٹوٹی کے سر پر ایک مٹی جال دار ٹوپی تھی۔ تینوں کی چوٹیوں پر مختلف اقسام کی مونچھوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ میرے تو ہاتھیں گال پر سہا سا ایک سنا بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ چھوٹی موٹی تبدیلیاں تھیں جنہوں نے ہمیں ہمارے جاننے والوں کے لیے بھی ناقابل شناخت بنا دیا تھا۔

ذرا آج اور راحیل چتر کوڑنے والی عورتوں کے روپ میں تھیں۔ اپنے پیلے پیلے بھولدار سوتی کھانگروں اور چٹائیوں کے ساتھ وہ اپنی شخصیت میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں لے ہوئے تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی سرخ و سپید رنگت کو بھی ان کے طیلوں کی مناسبت سے ساٹوا کر دیا گیا تھا۔ طے تبدیل ہونے کے بعد جب ہماری پہلی بار ایک دوسرے پر نظر پڑی تھی تو ہم سب کو خوب ہنسی آئی تھی۔ ٹرک پر سوار ہوتے وقت بھی ہم ہنس بول رہے تھے لیکن اب ہمارا انداز بدل چکا تھا۔ ہم محض خوش مزاج سے مزور نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب نے اپنے لیے اور زبان بھی حسب وقت بدل لی تھی۔

سب سے زیادہ حیران مجھے ذرا آج نے کیا تھا۔ اس کی تو چال ڈھال بھی بدل گئی تھی اور وہ اس طے میں سب سے زیادہ "ج" رہی تھی۔ وہ تو نہایت دھاتی سے کچھ راجستانی سی زبان بھی بولنے لگی تھی۔ میں نے ٹرک پر چڑھتے وقت جب اس سے کہا "بھئی تم تو اس گیت اب میں بہت سی ج" رہی ہو۔ خاندانی غائب بدوش معلوم ہو رہی ہو۔" تو وہ کامل عمری آنکھیں ذرا ہٹا کر جھکیں ٹھکوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اپنے کام سے کام رکھو۔ چھوڑو۔ میرے ساتھ پھر پھر زبان چلانے کی ضرورت نہ ہے۔"

اوپر پہنچ کر بیٹھنے کے بعد راحیل مجھے کئی مہمے ہوتے ہوئے

میں نے

میں نے

میں نے

پہلی اٹھنے کے بلادی جسم کے حضرات ضرور ان کے پیچھے لگ جائے گا۔ کم از کم کچھ تو ازبیں تو ضرور کہتے۔  
میں نے بھی تو ازبیں زور تاج سے کہا "بھئی۔ گالے کی نہیں ہو رہی ہے۔ ہم اسٹوڈیو سے ضرور نکلے ہیں لیکن کسی قسم کی شرک نہیں کر رہے ہیں۔"

صحت ہی بدوانی تو ہی ہو تب "اس نے عقل سے میری طرف دیکھا میں تو چادر ہی تھی کہ ایک خطرناک کام پر بھی ہم بٹنے گائے اور بے گری سے روانہ ہوں۔ اس کے علاوہ کہیں اپنی اداکارانہ اور لگاؤ کارانہ صلاحیتوں سے انکار کرنا تصور تھا۔"

"میں انکار بھی ہو گیا اور قائل بھی ہو گیا۔" میں نے کہا۔  
"جیسے باس کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکاتے اور تسلا ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اسے اپنی موٹی موٹی رصاحت کی چوڑیوں اور ہاتھ کی قباب سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہر کچھ آپ کا رہی تھیں۔ ہاں کئے کہ گالے کی کوشش کر رہی تھیں اس کا مطلب تو بتا دیجئے۔" لونی اس کی طرف ذرا نکلے ہوئے بھی تو ازبیں بولتا۔

"کمال ہے! اتنے آسمان سے ہول آپ کی سمجھ میں نہیں آئے؟" زور تاج نے اس کی کم خمی پر افسوس کیا۔ لونی نے مسکین کی شکل بنا کر خمی نہیں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے۔" میں آپ کو کامل بنا کر آنکھوں میں بند کر لوں اور پھر کہیں جانے نہ دوں۔" یہ ایک لڑکی کے اپنے محبوب کے لیے جذبات ہیں۔" زور تاج بولی۔

"محب اتنی بھی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" میں نے قریب سے کہا "وہ انہیں کسی فرض خواہ کے جذبات تو سمجھنے سے بہا۔ یہ ان کا کم تر کم صل اور نادان نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن حجابات کسی سے پوچھی جائے اسے ابھی طرح بیان و سباق کے ساتھ سمجھانا اس کا اخلاقی فرض ہے۔" زور تاج نے بڑے ظور سے کہا پھر وہ بیان لونی کی طرف حجب ہوتے ہوئے بولی "آپ کے لیے کبھی کسی لڑکی نے ایسے جذبات کا اظہار کیا؟" لونی نے کوئی جواب دینے کے بجائے شریطے سے انوار میں سر مٹا لیا۔

"یہ بہت شریف سیدھے اور محو ہدف۔" حم کے نوجوان ہیں۔" میں نے لونی اور قتیق شاہ کی طرف اشارہ کیا "حم ان سے مشکل سوال کر کے انہیں امتحان میں مت ڈالو۔" خصوصاً میرے سامنے۔"

"مجھے تو یہ اتنے شریف اور سیدھے نہیں لگتے۔" زور تاج تجویز غرضے ان کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "اور قتیق شاہ کو تو خیر میں خاص کر ابھی طرح جانتی بھی ہوں۔ میرے خیال میں تو یہ دونوں جیسے اور لگتے ہیں۔ دیکھیں کبھی لڑکی اگر ان میں سے کسی کے سامنے اس قسم کے جذبات کا اظہار کرے تو کیا یہ شریف اور

سیدھے کے بجائے بد معاش اور ٹیڑھے ہو جائیں گے؟"  
لونی کے ساتھ ساتھ قتیق شاہ نے بھی سر مٹا لیا تھا۔ میں نے کہا "نہیں۔ یہ تو ایسے ہی نہیں گے لیکن تم ان کے نسب پر تجزیے اور تحلیل نفسی درویش کا کام اپنے ذمے مت لو۔"

"میں تو کوشش کر رہی تھی کہ یہ بے ہودہ سزا مجھے طریقے سے کٹ جائے مگر کتنے سے تم کہہ کر کہنے ہی نہیں دو گے۔" زور تاج نے کہا پھر وہ راحیل کو کہنی مار کر بولی "بھئی تم ہی کوئی گانا نا سناؤ۔ میرا گانا تو ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوا۔ شاید تمہارا گانا برداشت ہو جائے۔"

"اس سے فرائض مت کرو۔" میں نے جلدی سے کہا۔  
کسی بے خیالی میں میڈیا درویش کا کوئی گانا نہ شروع ہو سکا۔ آپ باس سے جو لوگ اسے نازتے ہوئے گزر رہے ہیں وہ شاید حم کے ٹھوک میں جلا ہو جائیں گے۔"

"مفلکوں والا انداز کتنی صحت اختیار کرو۔" راحیل نے مجھے گھورتے ہوئے بھی تو ازبیں فرماتے سے سے انوار میں کہا۔  
اس وقت سنجیدہ نظر آنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی اور زور تاج کے بارے میں میں نے محسوس کیا تھا کہ اس مرحبہ کی طاقتوں میں وہ راحیل سے اپنا مدد بہ نہایت دوستانہ اور بے تکلف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہم سہیلی دے کے بجائے پھر خوشی موڈ کی طرف سے نورنگ ٹیلس جارہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر ہم بھیجے کی طرف سے مکان تک پہنچنا چاہتے تھے تو پھر پھر خوشی موڈ کی طرف سے جانا پڑا تھا۔ ڈرائیور کو سب کچھ معلوم تھا اور وقت ضرورت میں کڑی جگہ کر اسے ہدایات بھی دے سکتا تھا۔ منزل کے قریب پہنچنے کے آثار شروع ہوئے تو حرج صورت حال کے پیش نظر بھیجے کی خاموشی اپنی پلیٹ میں لینے لگی۔ قہرے بازی "چیز بھڑا اور جلیں بند ہو گئیں۔ یہ خوف نہیں بلکہ اس قسم میں اپنا اپنا کوا ادا کرنے کے خیال سے اعصاب میں رک رکھتے والا خف سا مانتا تھا۔

پھر خوشی موڈ پر مت آگے جا کر ہم بھلی سڑک پر آئے تھے اور کچھ فاصلے طے کرنے کے بعد سڑک نے اس سڑک کو بھی مچھڑا دیا۔ ایک زبردستیراؤسنگ انیم کے عقب میں پہنچنے کے بعد ہم نے کٹا میدان میں سرخ شروع کیا۔ ایک خاص سمت میں سڑک دواں تھا اور تینتے تھا کہ ننگی زراہا ہوا زمین بھی دن رات سے بندھے ہوئے کے باوجود شاید ہلکا اور حرا کر کے لگتے تھے اور ان کے ساتھ ہمارا بھی مٹھرا پ ہو جاتا۔

مکان میں دور سے ہی نظر آیا۔ دور سے وہ کافی پھرنا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اس کی خمی دیوار کی سیدھے میں بندھ رہے تھے پھر ہم آڑے تھپتھپتے تھے لیکن درحقیقت سب کی نظر یہاں کی طرف ہی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ لیا مکان کے عقب ہی ایک جھٹ سا مینا ہوا تھا جس کے سامنے دو مسلح افراد مسلح و کمال

دے رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر تمسک لگی ہوئی تھی۔ قریب سی دو گزیاں گزئی تھیں۔ یہ عالمیادی گاڑیاں تھیں جن میں مسافر افراد نے بیٹھے اور مزید کہ اس وقت وہ قریب ایک میل یا اس مکان کے سامنے سے گزرتے گئے تھے۔

ہم کچھ اور قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ وہ ہٹ ایک باقاعدہ جم گاڑ دوام تھا۔ کافی بڑا ہٹ تھا۔ اسے "ہوم" کہتے تھے شاید صحیح نہیں تھا۔ وہ تو بجائے خود ایک مکان تھا۔ چلتے ہوئے مسافر گاڑیوں نے بھی ٹرک کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا اور شلتا ٹرک کر کے اس کی طرف دیکھنے لگے تھے لیکن ان کے انداز میں تشویش نہیں تھی۔ قافلہ کچھ کم ہونے پر شاید انہیں اچھی طرح اندازہ ہی ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کا ٹرک تھا۔ شاید اس قسم کے ٹرک کبھی کبھار یہاں سے گزرتے بھی ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے غالباً آواز دے کر اپنے ساتھیوں سے کہہ کر کہا تھا کہ یہ ہٹ سے مزید تین مسافر افراد نکل کر باہر آن گئے ہوتے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ گاڑ دوام میں کل یہی "غری" تھی۔ اندر مزید کوئی آدمی نہیں رہا تھا۔ وہ بھی پانچ تھے اور ڈرائیور کو چھوڑ کر ہم بھی پانچ ہی تھے۔ ان کی تعداد ہمارے برابر ہونا ہمارے حق میں اچھا تھا۔ اس طرح ہمارا کام آسان ثابت ہونے کی امید تھی۔ وہ پانچوں بڑے اشتہار اور یکسوئی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی مختلف اقسام کی تمسک کندھوں سے نہیں اتاری تھیں بلکہ ان کے ہاتھ گھون کی طرف بڑھے بھی نہیں تھے۔

مجھے یہی توقع تھی اور ان کے اسی بد عمل کے لیے ہم نے اپنا تردد کیا تھا۔ انہوں نے ٹرک اور اس میں سوار افراد کے بے ضرر ہونے کا اثر لے لیا تھا۔ شاید انہیں یہ توقع بھی رہی ہو کہ ہم مکان کے قریب سے گزرتے چلے جائیں گے لیکن جب ہم انہی کی طرف بڑھتے چلتے گئے تب بھی انہیں کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ بس وہ چونکا کھڑے ہماری طرف دیکھتے رہے۔ ہمارے ڈرائیور نے ٹرک کی رفتار کافی کم کر لی تھی تاکہ ایک تو انہیں اچھی طرح ٹرک اور ٹرک سواروں کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے۔ دوسرے اس دیرانے میں ٹرک کی گھر گھر ہٹ زیادہ بلند نہ ہو۔ ہم چاہتے تھے کہ مکان کے اندر سامنے والے گیٹ کی طرف موجود گاڑیوں تک کسی بھی قسم کی کوئی آواز نہ ہی پہنچے۔ انہیں بھی کسی قسم کے جھٹس یا تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ٹرک ان لوگوں سے جو سات قدم کے فاصلے پر ہی رک گیا۔ ہٹ کا دورانہ چوٹ نکلا تھا مگر بھی اس کا بیشتر حصہ باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا لیکن میں نے ٹرک پر بیٹھے بیٹھے کافی حد تک اندر کا بھی جائزہ لے لیا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ اندر کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ اس وقت وہاں ہی پانچوں محافظ تھیں تھے اور وہ پانچوں باہر آچکے تھے۔ ان میں سے تین تو یہی تھے جنہوں نے مجھے سامنے والی سڑک پر روکا تھا۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک چر تھا

مض بھی تھا جو کلین شیٹ فوجیوں تھا۔ وہ اس وقت نظر میں تھا تھا۔ اس کی جگہ دوسرے دو محافظ موجود تھے۔

انہی بات یہ تھی کہ انہوں نے ابھی تک نہ تو اپنی کندھوں پر قبضہ کیا تھا جو ہمارے حق میں بہت اچھا تھا۔ اس کی وہ جتنیادی تھی کہ ابھی تک انہوں نے ہماری طرف سے کوئی عمل محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ بھی قیمت تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص کا ہاتھ اس کی کن پر تھا اور وہ انہیں سیکڑے ٹرک کا پتہ لے رہا تھا۔

ہمارا ڈرائیور ٹرک میں ہی بیٹھا رہا۔ اسے صرف بات بچھلنے یا کوئی اندر جھنسی پیش آنے پر کچھ کہنا تھا ورنہ صرف ٹرک بند ہونے دیتا تھا۔ وہ ایک طرح سے ہماری "مرزور و فرس" تھا۔ سب سے پہلے میں چلا گیا کہ ٹرک سے اتارنا۔ میرے ہاتھ میں ایک مڑا ڈرا خاک آلودہ کاغذ تھا۔ میں وہ لے لے سیدھا اس محافظ کے پاس پہنچا جس کا ہاتھ گھون پر تھا۔ اس کا چوک کچھ پھولا پھولا اور گتہ تانبے کی سی تھی۔ وہ ایک تندر خدادید مزاج آدمی معلوم ہوا تھا۔ جسمانی طور پر خاصا مضبوط تھا۔ جسمانی طور پر درحقیقت وہ کچھ خاصے مضبوط تھے۔

میں نے کاغذ محافظ کی طرف پھسواتے ہوئے اور اپنا لہو پھانٹوں کا سامنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "خوجہ ایہ حیات کل ٹیکیدار کا بلڈنگ کدہ تھی؟" اس کا ایذا نہیں اسے گرام کو نہیں ملتی اسے۔ "اس کاغذ پر اسی علاقے کا ایک اناسیڈا ایڈریس درج تھا۔"

وہ بھی ایک سی کالیاں ٹوی تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بدستور گھم رہا اور اس نے اپنا دوسرا "خال" ہاتھ بھی کاغذ پکڑنے کے لیے نہیں پھسایا۔ اس کی نظر بھی بدستور مجھ پر مرکوز رہی۔ اس کا آنکھوں میں جگہ سی سرخی اور ان کی گمراہیوں میں کہیں خفیف کا درجہ کی جھٹک موجود تھی۔ اس کے بلوچو ایک لمبے کے لیے گئے اندیش محسوس ہوا کہ شاید اس کی تیز نظریں میرے ہسوپ کا لوازمات کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے میری اصل شکل دیکھ لے گا۔ تھیں۔ یہ بھی قیمت تھا کہ یہ شخص ان محافظوں میں سے نہیں تھا جو مجھے پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس کے بلوچو اسے یہ شبہ ہو چکا تھا کہ اس کا باعث ہو سکتا تھا کہ میں گیٹ اپ میں تھا۔

مکھون جھکیدار حیات کل۔ اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہو میں پوچھا۔ اس کا لہو تیار تھا کہ وہ کافی دیرانی سے اور کچھ بولنے پر قادر تھا۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کسی سادہ لوح شخص کی طرح ڈرا کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ٹیکیدار۔" اس کا نام حیات کل اسے تھا۔ وہ اس ایڈریس پر بلڈنگ بنائی اسے۔ ابی ام اور کیا بتانے لگا

۱۰۰  
 ۱۰۱  
 ۱۰۲  
 ۱۰۳  
 ۱۰۴  
 ۱۰۵  
 ۱۰۶  
 ۱۰۷  
 ۱۰۸  
 ۱۰۹  
 ۱۱۰  
 ۱۱۱  
 ۱۱۲  
 ۱۱۳  
 ۱۱۴  
 ۱۱۵  
 ۱۱۶  
 ۱۱۷  
 ۱۱۸  
 ۱۱۹  
 ۱۲۰  
 ۱۲۱  
 ۱۲۲  
 ۱۲۳  
 ۱۲۴  
 ۱۲۵  
 ۱۲۶  
 ۱۲۷  
 ۱۲۸  
 ۱۲۹  
 ۱۳۰  
 ۱۳۱  
 ۱۳۲  
 ۱۳۳  
 ۱۳۴  
 ۱۳۵  
 ۱۳۶  
 ۱۳۷  
 ۱۳۸  
 ۱۳۹  
 ۱۴۰  
 ۱۴۱  
 ۱۴۲  
 ۱۴۳  
 ۱۴۴  
 ۱۴۵  
 ۱۴۶  
 ۱۴۷  
 ۱۴۸  
 ۱۴۹  
 ۱۵۰  
 ۱۵۱  
 ۱۵۲  
 ۱۵۳  
 ۱۵۴  
 ۱۵۵  
 ۱۵۶  
 ۱۵۷  
 ۱۵۸  
 ۱۵۹  
 ۱۶۰  
 ۱۶۱  
 ۱۶۲  
 ۱۶۳  
 ۱۶۴  
 ۱۶۵  
 ۱۶۶  
 ۱۶۷  
 ۱۶۸  
 ۱۶۹  
 ۱۷۰  
 ۱۷۱  
 ۱۷۲  
 ۱۷۳  
 ۱۷۴  
 ۱۷۵  
 ۱۷۶  
 ۱۷۷  
 ۱۷۸  
 ۱۷۹  
 ۱۸۰  
 ۱۸۱  
 ۱۸۲  
 ۱۸۳  
 ۱۸۴  
 ۱۸۵  
 ۱۸۶  
 ۱۸۷  
 ۱۸۸  
 ۱۸۹  
 ۱۹۰  
 ۱۹۱  
 ۱۹۲  
 ۱۹۳  
 ۱۹۴  
 ۱۹۵  
 ۱۹۶  
 ۱۹۷  
 ۱۹۸  
 ۱۹۹  
 ۲۰۰  
 ۲۰۱  
 ۲۰۲  
 ۲۰۳  
 ۲۰۴  
 ۲۰۵  
 ۲۰۶  
 ۲۰۷  
 ۲۰۸  
 ۲۰۹  
 ۲۱۰  
 ۲۱۱  
 ۲۱۲  
 ۲۱۳  
 ۲۱۴  
 ۲۱۵  
 ۲۱۶  
 ۲۱۷  
 ۲۱۸  
 ۲۱۹  
 ۲۲۰  
 ۲۲۱  
 ۲۲۲  
 ۲۲۳  
 ۲۲۴  
 ۲۲۵  
 ۲۲۶  
 ۲۲۷  
 ۲۲۸  
 ۲۲۹  
 ۲۳۰  
 ۲۳۱  
 ۲۳۲  
 ۲۳۳  
 ۲۳۴  
 ۲۳۵  
 ۲۳۶  
 ۲۳۷  
 ۲۳۸  
 ۲۳۹  
 ۲۴۰  
 ۲۴۱  
 ۲۴۲  
 ۲۴۳  
 ۲۴۴  
 ۲۴۵  
 ۲۴۶  
 ۲۴۷  
 ۲۴۸  
 ۲۴۹  
 ۲۵۰  
 ۲۵۱  
 ۲۵۲  
 ۲۵۳  
 ۲۵۴  
 ۲۵۵  
 ۲۵۶  
 ۲۵۷  
 ۲۵۸  
 ۲۵۹  
 ۲۶۰  
 ۲۶۱  
 ۲۶۲  
 ۲۶۳  
 ۲۶۴  
 ۲۶۵  
 ۲۶۶  
 ۲۶۷  
 ۲۶۸  
 ۲۶۹  
 ۲۷۰  
 ۲۷۱  
 ۲۷۲  
 ۲۷۳  
 ۲۷۴  
 ۲۷۵  
 ۲۷۶  
 ۲۷۷  
 ۲۷۸  
 ۲۷۹  
 ۲۸۰  
 ۲۸۱  
 ۲۸۲  
 ۲۸۳  
 ۲۸۴  
 ۲۸۵  
 ۲۸۶  
 ۲۸۷  
 ۲۸۸  
 ۲۸۹  
 ۲۹۰  
 ۲۹۱  
 ۲۹۲  
 ۲۹۳  
 ۲۹۴  
 ۲۹۵  
 ۲۹۶  
 ۲۹۷  
 ۲۹۸  
 ۲۹۹  
 ۳۰۰  
 ۳۰۱  
 ۳۰۲  
 ۳۰۳  
 ۳۰۴  
 ۳۰۵  
 ۳۰۶  
 ۳۰۷  
 ۳۰۸  
 ۳۰۹  
 ۳۱۰  
 ۳۱۱  
 ۳۱۲  
 ۳۱۳  
 ۳۱۴  
 ۳۱۵  
 ۳۱۶  
 ۳۱۷  
 ۳۱۸  
 ۳۱۹  
 ۳۲۰  
 ۳۲۱  
 ۳۲۲  
 ۳۲۳  
 ۳۲۴  
 ۳۲۵  
 ۳۲۶  
 ۳۲۷  
 ۳۲۸  
 ۳۲۹  
 ۳۳۰  
 ۳۳۱  
 ۳۳۲  
 ۳۳۳  
 ۳۳۴  
 ۳۳۵  
 ۳۳۶  
 ۳۳۷  
 ۳۳۸  
 ۳۳۹  
 ۳۴۰  
 ۳۴۱  
 ۳۴۲  
 ۳۴۳  
 ۳۴۴  
 ۳۴۵  
 ۳۴۶  
 ۳۴۷  
 ۳۴۸  
 ۳۴۹  
 ۳۵۰  
 ۳۵۱  
 ۳۵۲  
 ۳۵۳  
 ۳۵۴  
 ۳۵۵  
 ۳۵۶  
 ۳۵۷  
 ۳۵۸  
 ۳۵۹  
 ۳۶۰  
 ۳۶۱  
 ۳۶۲  
 ۳۶۳  
 ۳۶۴  
 ۳۶۵  
 ۳۶۶  
 ۳۶۷  
 ۳۶۸  
 ۳۶۹  
 ۳۷۰  
 ۳۷۱  
 ۳۷۲  
 ۳۷۳  
 ۳۷۴  
 ۳۷۵  
 ۳۷۶  
 ۳۷۷  
 ۳۷۸  
 ۳۷۹  
 ۳۸۰  
 ۳۸۱  
 ۳۸۲  
 ۳۸۳  
 ۳۸۴  
 ۳۸۵  
 ۳۸۶  
 ۳۸۷  
 ۳۸۸  
 ۳۸۹  
 ۳۹۰  
 ۳۹۱  
 ۳۹۲  
 ۳۹۳  
 ۳۹۴  
 ۳۹۵  
 ۳۹۶  
 ۳۹۷  
 ۳۹۸  
 ۳۹۹  
 ۴۰۰  
 ۴۰۱  
 ۴۰۲  
 ۴۰۳  
 ۴۰۴  
 ۴۰۵  
 ۴۰۶  
 ۴۰۷  
 ۴۰۸  
 ۴۰۹  
 ۴۱۰  
 ۴۱۱  
 ۴۱۲  
 ۴۱۳  
 ۴۱۴  
 ۴۱۵  
 ۴۱۶  
 ۴۱۷  
 ۴۱۸  
 ۴۱۹  
 ۴۲۰  
 ۴۲۱  
 ۴۲۲  
 ۴۲۳  
 ۴۲۴  
 ۴۲۵  
 ۴۲۶  
 ۴۲۷  
 ۴۲۸  
 ۴۲۹  
 ۴۳۰  
 ۴۳۱  
 ۴۳۲  
 ۴۳۳  
 ۴۳۴  
 ۴۳۵  
 ۴۳۶  
 ۴۳۷  
 ۴۳۸  
 ۴۳۹  
 ۴۴۰  
 ۴۴۱  
 ۴۴۲  
 ۴۴۳  
 ۴۴۴  
 ۴۴۵  
 ۴۴۶  
 ۴۴۷  
 ۴۴۸  
 ۴۴۹  
 ۴۵۰  
 ۴۵۱  
 ۴۵۲  
 ۴۵۳  
 ۴۵۴  
 ۴۵۵  
 ۴۵۶  
 ۴۵۷  
 ۴۵۸  
 ۴۵۹  
 ۴۶۰  
 ۴۶۱  
 ۴۶۲  
 ۴۶۳  
 ۴۶۴  
 ۴۶۵  
 ۴۶۶  
 ۴۶۷  
 ۴۶۸  
 ۴۶۹  
 ۴۷۰  
 ۴۷۱  
 ۴۷۲  
 ۴۷۳  
 ۴۷۴  
 ۴۷۵  
 ۴۷۶  
 ۴۷۷  
 ۴۷۸  
 ۴۷۹  
 ۴۸۰  
 ۴۸۱  
 ۴۸۲  
 ۴۸۳  
 ۴۸۴  
 ۴۸۵  
 ۴۸۶  
 ۴۸۷  
 ۴۸۸  
 ۴۸۹  
 ۴۹۰  
 ۴۹۱  
 ۴۹۲  
 ۴۹۳  
 ۴۹۴  
 ۴۹۵  
 ۴۹۶  
 ۴۹۷  
 ۴۹۸  
 ۴۹۹  
 ۵۰۰  
 ۵۰۱  
 ۵۰۲  
 ۵۰۳  
 ۵۰۴  
 ۵۰۵  
 ۵۰۶  
 ۵۰۷  
 ۵۰۸  
 ۵۰۹  
 ۵۱۰  
 ۵۱۱  
 ۵۱۲  
 ۵۱۳  
 ۵۱۴  
 ۵۱۵  
 ۵۱۶  
 ۵۱۷  
 ۵۱۸  
 ۵۱۹  
 ۵۲۰  
 ۵۲۱  
 ۵۲۲  
 ۵۲۳  
 ۵۲۴  
 ۵۲۵  
 ۵۲۶  
 ۵۲۷  
 ۵۲۸  
 ۵۲۹  
 ۵۳۰  
 ۵۳۱  
 ۵۳۲  
 ۵۳۳  
 ۵۳۴  
 ۵۳۵  
 ۵۳۶  
 ۵۳۷  
 ۵۳۸  
 ۵۳۹  
 ۵۴۰  
 ۵۴۱  
 ۵۴۲  
 ۵۴۳  
 ۵۴۴  
 ۵۴۵  
 ۵۴۶  
 ۵۴۷  
 ۵۴۸  
 ۵۴۹  
 ۵۵۰  
 ۵۵۱  
 ۵۵۲  
 ۵۵۳  
 ۵۵۴  
 ۵۵۵  
 ۵۵۶  
 ۵۵۷  
 ۵۵۸  
 ۵۵۹  
 ۵۶۰  
 ۵۶۱  
 ۵۶۲  
 ۵۶۳  
 ۵۶۴  
 ۵۶۵  
 ۵۶۶  
 ۵۶۷  
 ۵۶۸  
 ۵۶۹  
 ۵۷۰  
 ۵۷۱  
 ۵۷۲  
 ۵۷۳  
 ۵۷۴  
 ۵۷۵  
 ۵۷۶  
 ۵۷۷  
 ۵۷۸  
 ۵۷۹  
 ۵۸۰  
 ۵۸۱  
 ۵۸۲  
 ۵۸۳  
 ۵۸۴  
 ۵۸۵  
 ۵۸۶  
 ۵۸۷  
 ۵۸۸  
 ۵۸۹  
 ۵۹۰  
 ۵۹۱  
 ۵۹۲  
 ۵۹۳  
 ۵۹۴  
 ۵۹۵  
 ۵۹۶  
 ۵۹۷  
 ۵۹۸  
 ۵۹۹  
 ۶۰۰  
 ۶۰۱  
 ۶۰۲  
 ۶۰۳  
 ۶۰۴  
 ۶۰۵  
 ۶۰۶  
 ۶۰۷  
 ۶۰۸  
 ۶۰۹  
 ۶۱۰  
 ۶۱۱  
 ۶۱۲  
 ۶۱۳  
 ۶۱۴  
 ۶۱۵  
 ۶۱۶  
 ۶۱۷  
 ۶۱۸  
 ۶۱۹  
 ۶۲۰  
 ۶۲۱  
 ۶۲۲  
 ۶۲۳  
 ۶۲۴  
 ۶۲۵  
 ۶۲۶  
 ۶۲۷  
 ۶۲۸  
 ۶۲۹  
 ۶۳۰  
 ۶۳۱  
 ۶۳۲  
 ۶۳۳  
 ۶۳۴  
 ۶۳۵  
 ۶۳۶  
 ۶۳۷  
 ۶۳۸  
 ۶۳۹  
 ۶۴۰  
 ۶۴۱  
 ۶۴۲  
 ۶۴۳  
 ۶۴۴  
 ۶۴۵  
 ۶۴۶  
 ۶۴۷  
 ۶۴۸  
 ۶۴۹  
 ۶۵۰  
 ۶۵۱  
 ۶۵۲  
 ۶۵۳  
 ۶۵۴  
 ۶۵۵  
 ۶۵۶  
 ۶۵۷  
 ۶۵۸  
 ۶۵۹  
 ۶۶۰  
 ۶۶۱  
 ۶۶۲  
 ۶۶۳  
 ۶۶۴  
 ۶۶۵  
 ۶۶۶  
 ۶۶۷  
 ۶۶۸  
 ۶۶۹  
 ۶۷۰  
 ۶۷۱  
 ۶۷۲  
 ۶۷۳  
 ۶۷۴  
 ۶۷۵  
 ۶۷۶  
 ۶۷۷  
 ۶۷۸  
 ۶۷۹  
 ۶۸۰  
 ۶۸۱  
 ۶۸۲  
 ۶۸۳  
 ۶۸۴  
 ۶۸۵  
 ۶۸۶  
 ۶۸۷  
 ۶۸۸  
 ۶۸۹  
 ۶۹۰  
 ۶۹۱  
 ۶۹۲  
 ۶۹۳  
 ۶۹۴  
 ۶۹۵  
 ۶۹۶  
 ۶۹۷  
 ۶۹۸  
 ۶۹۹  
 ۷۰۰  
 ۷۰۱  
 ۷۰۲  
 ۷۰۳  
 ۷۰۴  
 ۷۰۵  
 ۷۰۶  
 ۷۰۷  
 ۷۰۸  
 ۷۰۹  
 ۷۱۰  
 ۷۱۱  
 ۷۱۲  
 ۷۱۳  
 ۷۱۴  
 ۷۱۵  
 ۷۱۶  
 ۷۱۷  
 ۷۱۸  
 ۷۱۹  
 ۷۲۰  
 ۷۲۱  
 ۷۲۲  
 ۷۲۳  
 ۷۲۴  
 ۷۲۵  
 ۷۲۶  
 ۷۲۷  
 ۷۲۸  
 ۷۲۹  
 ۷۳۰  
 ۷۳۱  
 ۷۳۲  
 ۷۳۳  
 ۷۳۴  
 ۷۳۵  
 ۷۳۶  
 ۷۳۷  
 ۷۳۸  
 ۷۳۹  
 ۷۴۰  
 ۷۴۱  
 ۷۴۲  
 ۷۴۳  
 ۷۴۴  
 ۷۴۵  
 ۷۴۶  
 ۷۴۷  
 ۷۴۸  
 ۷۴۹  
 ۷۵۰  
 ۷۵۱  
 ۷۵۲  
 ۷۵۳  
 ۷۵۴  
 ۷۵۵  
 ۷۵۶  
 ۷۵۷  
 ۷۵۸  
 ۷۵۹  
 ۷۶۰  
 ۷۶۱  
 ۷۶۲  
 ۷۶۳  
 ۷۶۴  
 ۷۶۵  
 ۷۶۶  
 ۷۶۷  
 ۷۶۸  
 ۷۶۹  
 ۷۷۰  
 ۷۷۱  
 ۷۷۲  
 ۷۷۳  
 ۷۷۴  
 ۷۷۵  
 ۷۷۶  
 ۷۷۷  
 ۷۷۸  
 ۷۷۹  
 ۷۸۰  
 ۷۸۱  
 ۷۸۲  
 ۷۸۳  
 ۷۸۴  
 ۷۸۵  
 ۷۸۶  
 ۷۸۷  
 ۷۸۸  
 ۷۸۹  
 ۷۹۰  
 ۷۹۱  
 ۷۹۲  
 ۷۹۳  
 ۷۹۴  
 ۷۹۵  
 ۷۹۶  
 ۷۹۷  
 ۷۹۸  
 ۷۹۹  
 ۸۰۰  
 ۸۰۱  
 ۸۰۲  
 ۸۰۳  
 ۸۰۴  
 ۸۰۵  
 ۸۰۶  
 ۸۰۷  
 ۸۰۸  
 ۸۰۹  
 ۸۱۰  
 ۸۱۱  
 ۸۱۲  
 ۸۱۳  
 ۸۱۴  
 ۸۱۵  
 ۸۱۶  
 ۸۱۷  
 ۸۱۸  
 ۸۱۹  
 ۸۲۰  
 ۸۲۱  
 ۸۲۲  
 ۸۲۳  
 ۸۲۴  
 ۸۲۵  
 ۸۲۶  
 ۸۲۷  
 ۸۲۸  
 ۸۲۹  
 ۸۳۰  
 ۸۳۱  
 ۸۳۲  
 ۸۳۳  
 ۸۳۴  
 ۸۳۵  
 ۸۳۶  
 ۸۳۷  
 ۸۳۸  
 ۸۳۹  
 ۸۴۰  
 ۸۴۱  
 ۸۴۲  
 ۸۴۳  
 ۸۴۴  
 ۸۴۵  
 ۸۴۶  
 ۸۴۷  
 ۸۴۸  
 ۸۴۹  
 ۸۵۰  
 ۸۵۱  
 ۸۵۲  
 ۸۵۳  
 ۸۵۴  
 ۸۵۵  
 ۸۵۶  
 ۸۵۷  
 ۸۵۸  
 ۸۵۹  
 ۸۶۰  
 ۸۶۱  
 ۸۶۲  
 ۸۶۳  
 ۸۶۴  
 ۸۶۵  
 ۸۶۶  
 ۸۶۷  
 ۸۶۸  
 ۸۶۹  
 ۸۷۰  
 ۸۷۱  
 ۸۷۲  
 ۸۷۳  
 ۸۷۴  
 ۸۷۵  
 ۸۷۶  
 ۸۷۷  
 ۸۷۸  
 ۸۷۹  
 ۸۸۰  
 ۸۸۱  
 ۸۸۲  
 ۸۸۳  
 ۸۸۴  
 ۸۸۵  
 ۸۸۶  
 ۸۸۷  
 ۸۸۸  
 ۸۸۹  
 ۸۹۰  
 ۸۹۱  
 ۸۹۲  
 ۸۹۳  
 ۸۹۴  
 ۸۹۵  
 ۸۹۶  
 ۸۹۷  
 ۸۹۸  
 ۸۹۹  
 ۹۰۰  
 ۹۰۱  
 ۹۰۲  
 ۹۰۳  
 ۹۰۴  
 ۹۰۵  
 ۹۰۶  
 ۹۰۷  
 ۹۰۸  
 ۹۰۹  
 ۹۱۰  
 ۹۱۱  
 ۹۱۲  
 ۹۱۳  
 ۹۱۴  
 ۹۱۵  
 ۹۱۶  
 ۹۱۷  
 ۹۱۸  
 ۹۱۹  
 ۹۲۰  
 ۹۲۱  
 ۹۲۲  
 ۹۲۳  
 ۹۲۴  
 ۹۲۵  
 ۹۲۶  
 ۹۲۷  
 ۹۲۸  
 ۹۲۹  
 ۹۳۰  
 ۹۳۱  
 ۹۳۲  
 ۹۳۳  
 ۹۳۴  
 ۹۳۵  
 ۹۳۶  
 ۹۳۷  
 ۹۳۸  
 ۹۳۹  
 ۹۴۰  
 ۹۴۱  
 ۹۴۲  
 ۹۴۳  
 ۹۴۴  
 ۹۴۵  
 ۹۴۶  
 ۹۴۷  
 ۹۴۸  
 ۹۴۹  
 ۹۵۰  
 ۹۵۱  
 ۹۵۲  
 ۹۵۳  
 ۹۵۴  
 ۹۵۵  
 ۹۵۶  
 ۹۵۷  
 ۹۵۸  
 ۹۵۹  
 ۹۶۰  
 ۹۶۱  
 ۹۶۲  
 ۹۶۳  
 ۹۶۴  
 ۹۶۵  
 ۹۶۶  
 ۹۶۷  
 ۹۶۸  
 ۹۶۹  
 ۹۷۰  
 ۹۷۱  
 ۹۷۲  
 ۹۷۳  
 ۹۷۴  
 ۹۷۵  
 ۹۷۶  
 ۹۷۷  
 ۹۷۸  
 ۹۷۹  
 ۹۸۰  
 ۹۸۱  
 ۹۸۲  
 ۹۸۳  
 ۹۸۴  
 ۹۸۵  
 ۹۸۶  
 ۹۸۷  
 ۹۸۸  
 ۹۸۹  
 ۹۹۰  
 ۹۹۱  
 ۹۹۲  
 ۹۹۳  
 ۹۹۴  
 ۹۹۵  
 ۹۹۶  
 ۹۹۷  
 ۹۹۸  
 ۹۹۹  
 ۱۰۰۰

دینے کے بجائے کہا اور ذرا برائی تمیز سے انداز میں اپنے سر  
 تک ہاتھ لے گیا جس پر سختی سے پکڑی پٹی ہوئی تھی جو وقت  
 ضرورت اسلٹ کا کام دے سکتی تھی۔  
 میرا سر کی طرف ہاتھ لے جانا ایک مشکل تھا۔ اس کے ساتھ  
 ہی دیرانے میں ایک ساتھ ہی کئی جسم ہی توازیں ابھریں۔ مجھے  
 اپنی توجہ صرف اپنے فکار کی طرف مرکوز رکھنی پڑی۔ میرا پاؤں  
 اچانک ہی مٹھی انداز میں حرکت میں آیا تھا اور اس کے ہیروں  
 سے ذرا اوپر ایک وقت دونوں ٹانگوں سے کھرا گیا تھا۔ وہ اوندھے  
 منہ کرا۔ اس کا فک منہ سپاٹ ہونے میں شاید ہی کچھ کمری ہو۔  
 اس سے پہلے کہ وہ ذرا بھی سنبھل پاتا میں اپنے پیٹھ سے مٹھن  
 مائل نکال چکا تھا۔ تیزی سے بھٹکتے ہوئے میں نے اس کے سر کے  
 پچھلے حصے پر اتنی قوت سے اس کا دست رسید کیا کہ وہ سرے ہی لئے  
 مجھے اندیشہ محسوس ہوا شاید میں نے اس کی ہلاکت کا سامنا کر لیا  
 تھا۔ وہ ضرب کسی بھجورے کی ضرب سے کم نہیں تھی اور اس  
 کے بری ہڈی شاید ٹوٹ کر اندر دھس گئی تھی حالانکہ سر کی ہڈی  
 بہت مضبوط ہوتی ہے۔ اچھے پچھلے ٹھکین مادوں میں بھی مشکل سے  
 ہی جتنی ہے۔ قدرت نے اسے پورے جسم کو کنٹرول کرنے والی  
 طاقت یعنی دماغ کی حفاظت کے لئے غیر معمولی طور پر مضبوط بنایا ہے  
 مگر میری ضرب غیر ارادی طور پر کچھ زیادہ ہی زوردار ہو گئی تھی۔  
 بہر حال اس وقت اس کے لمبی تجربے کا موقع نہیں تھا۔ میں  
 اور میرے ساتھی پیشہ غیر ضروری خونریزی اور ہلاکت خیزی سے  
 پیشہ گرد بن کر تے آئے تھے۔ یہ ہماری زندگی کے اہم ترین اصولوں  
 میں سے ایک تھا۔ انتہائی ناگزیر حالات میں کوئی ہمارے ہاتھوں  
 انجام کو پہنچتا تھا اور وہ عموماً کوئی ایسی شخصیت ہوتی تھی جس کے  
 پوجہ سے نجات پا کر شاید بے زبان زمین بھی راحت محسوس کرتی  
 تھی۔ اس مٹھن پر آتے وقت بھی میں نے محافظوں اور دوسرے  
 لوگوں سے مٹھنے کے سلسلے میں ایسا ہیادیت کی یاد دہانی کرائی تھی لیکن  
 چونکہ ان لوگوں کے لئے میرے دل میں بہر حال کوئی نرم گوشہ بھی  
 موجود نہیں تھا اس لئے میں نے اپنے ساتھیوں کو "خزری پنڈ" بھی  
 دیا تھا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں اپنے فکار سے فیس "استیقا  
 کی اپنی ہی کو خوش ضرور کریں لیکن اس احتیاط میں ہاتھ اتارنا بھی  
 نہ رہے کہ معرکہ لپا ہوا جائے اس مٹھن کی فوجیت کچھ ایسی تھی کہ  
 اس میں جو کچھ بھی کیا جاتا اس کا پہلی کو خوش میں ہی نتیجہ خیز ہوتا  
 بہتر تھا ورنہ بات لمبی بھی ہو سکتی تھی پکڑ بھی سکتی تھی اور لینے کے  
 دینے بھی پڑ سکتے تھے۔ ان لوگوں سے صحیح طور پر واسطہ نہ پڑنے کے  
 باوجود ان کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ بے دریغ اسطو  
 استعمال کرنے والے لوگ تھے اور انسانی جان کی ان کی نظر میں  
 کوئی وقعت نہ تھی۔ خصوصاً ایسی انسانی جان کہ جس کے بارے  
 میں انہیں شبہ ہو تاکہ وہ کسی بھی اعتبار سے ان کی حفاظت پر مامور  
 تھی۔



اس کے علاوہ اس قسم کے زیادہ تر لوگ اس لیے بھی میری  
 ہمدردی کے مستحق نہیں ہوتے تھے کہ یہ ایک طرح سے بے رحم  
 اور انسانیت کش مشینوں کے کل پرزے ہوتے تھے۔ اس قسم کے  
 لوگ اپنے مالک، یا باس کے ظلم پر آنکھیں بند کر کے کسی بھی  
 انسان کو کسی بھی انداز میں قتل کر سکتے تھے۔ خارج کر سکتے تھے۔  
 انسانیت سوز انداز میں کسی کو بھی سسکا سسکا کر مار سکتے تھے۔ اس  
 قسم کے لوگوں کی اپنی کوئی سوچ، اپنا کوئی ضمیر نہیں ہوتا۔ جب تک  
 دنیا میں اس قسم کے کرائے کے کارندے یا اندھی عقیدوں کے زیر  
 اثر ہرید ترین کام کو جلا جھک کر انجام دینے والے دستیاب رہیں  
 گے تب تک مختلف اقسام کی نرے نئی مافیا میں جتنی رہیں گی۔ بہت  
 سے لوگ کسی نہ کسی گوشے میں اپنی اپنی مافیا کے ساتھ اس وقت  
 تک رائج کرتے رہیں گے جب تک حالات ان کا ساتھ دیں گے۔  
 اکثر ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کا حساب لینے کے لیے دست  
 قدرت ہی درپوش ہے لیکن بظاہر یہ مانہ کچھ بھی بن جاتا ہے۔  
 اس شخص کو وہیں ساکت چھوڑ کر میں جیڑی سے سیدھا ہوا تو  
 یہ دیکھ کر مرگ دینے میں طمانیت کی لہر دوڑ گئی کہ میرے چاندوں  
 ساتھیوں نے باقی چاندوں کا خوں کو بھی ذرا سا بنگا پیدائے بغیر  
 لہا لٹا دیا تھا۔ لٹی نے غالباً پٹیلے سے ہی کام لیا تھا۔ اس کے سامنے  
 جو شخص چاندوں خانے جت پڑا تھا اس کا چواچا ایک طرف سے بالکل  
 بگڑ کر رہ گیا تھا۔ میرے خیال میں تو اس کے زندہ بچنے کی امید بھی کم  
 تھی۔

زرتاج اور راجیل کے ہاتھوں میں گلوک نظر آ رہے تھے جو  
 انہوں نے اپنے گھاروں کی لہجہ چوڑی بیہوش سے برآمد کئے تھے۔  
 یہ مختصر گروخف ہانک گئیں تھیں۔ شفیق شاہ خالی ہاتھ نظر آ رہا تھا مگر  
 اس نے اپنے شکار کے ساتھ نہ جانے کیا کیا تھا کہ وہ سب سے زیادہ  
 مڑا تڑا پڑا تھا اور نزع کے سے عالم میں خیف سے جھٹکے لے رہا  
 تھا۔

اسی اثنا میں ٹرک کا ڈرائیور ٹرک سے پتلی سی ایک بیڑھی اور  
 سینٹ کا ایک تھیلہ اٹھا کر لے آیا تھا۔ اس مڑے تڑے اور  
 آدھے خالی تھیلے میں سینٹ کی ایک ٹمپی بھی نہیں تھی۔ وہ اس  
 میں سے تیزی سے کچھ چیزیں نکال کر زمین پر رکھنے لگا۔ وہ ریز کے  
 لئے دستانے اور کچھ اوزار تھے۔

وہ ابھی چیزیں نکال ہی رہا تھا کہ ہم سب نے اپنے اپنے شکار کو  
 لے جا کر ہٹ میں پھینک دیا۔ ہم نے اندر جانے کی بھی زحمت  
 نہیں کی اور انہیں سامنے نظر آنے والے ہال ٹاکرے میں ہی  
 کاٹھ کپاڑی بورروں کی طرح پھینک دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ  
 زرتاج اور راجیل نے جن دو افراد کو غالباً میرے ہی جیسی کسی  
 ترکیب سے گرا کر گلوک کے دستوں سے بے ہوش کیا تھا انہیں  
 وہی دونوں اپنے اپنے کندھوں پر اٹھا کر ہٹ تک لائیں۔ اگر کوئی  
 دیکھتا تو ضرور حیران ہو تاکہ انتہائی مناسب خود غالی کی مالک خانہ

بدوش لڑکیاں جو کچھ ایسی مضبوط یا جیتیم بھی رکھائی تھیں  
 کتنا وزن اٹھانے کی عادی تھیں جو انہوں نے اچھے بھلے  
 کے مالک دو لیے تڑتے نیم مردہ آدمیوں کو وہیں اٹھا کر کھڑے  
 ڈال لیا تھا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔ یہ ساری  
 نہایت خاموشی اور تیزی سے مشینی انداز میں جاری تھی۔  
 ان پانچوں بے ہوش نیم مردہ افراد کو کاٹھ کپاڑی کی طرح  
 پھینک کر ہم نے ہٹ کا دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا کر  
 تالا لگا دیا جو وہیں کندی میں ٹکا ہوا تھا اور کھلا تھا مگر اس میں  
 نہیں تھی۔ دروازہ مقل ہونے کے بعد اب اگر اندر سے  
 ان لوگوں میں سے کسی کو ہوش آگیا جاتا تو وہ دروازہ توڑ کر  
 آسکا تھا اور دروازہ کالی مضبوط تھا۔ آسانی سے ٹوٹنے والا  
 نہیں رہتا تھا۔

اس دوران میں ڈرائیور نے دیوار کے ساتھ بیڑھی  
 تھی۔ شفیق شاہ نے ریز کے موٹے دستانے پہنے اور چاندوں  
 کسی بندر کی سی پٹھنی سے بیڑھی پر چڑھتا چلا گیا۔ پٹیلے  
 نہایت محتاط انداز میں سر دیوار سے ذرا اونچا کر کے اندر  
 کھنکھارے اٹھا لیے اس طرف کوئی نہیں تھا۔ شاید اس  
 مکان سے باہر ہی یہ گاڑی دم بدم بنا کر اور گاڑی مقرر کر کے  
 سیدی اور دوسرے لوگ مطمئن رہے ہوں اور اندر اس  
 عمرانی کے لیے کسی کے موجود رہنے کی ضرورت محسوس نہ  
 تھی۔

شفیق شاہ نے نیسٹرنگ کر دیکھا۔ خاردار آدمیوں میں کھنکھارے  
 تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی بھی لئے آجاتا یا پھر شاید  
 میں صرف رات کو ہی کرنٹ چھوڑا جاتا ہو اور یہ بھی ممکن  
 ہے کہ میرا انداز ہی غلط ہو۔ نہ جانے کیوں مجھے وہم  
 ان آدمیوں میں ہتی بد ضرور دوڑتی ہوگی۔ اگر اس وقت  
 اس کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی۔ شفیق شاہ بھی شاید میرے وہم  
 تھا اس لیے اس نے چپک کر لینے کے باوجود ریز کے دستانے  
 اتارے اور ان سمیت ہی اس تیزی سے تیسرے کات کر کے  
 پیسے کوئی درزی تیز قینے سے جالی دار کپڑا کات رہا ہو۔ اس  
 آہنی نہیں کے درمیان اتنا بڑا شگاف پیدا کر دیا کہ ہاتھ  
 بھی گزر سکتے تھے۔

ہم چاہے تو تین بیڑھیوں کے بھی اس دیوار پر چڑھ  
 لیکن اب ایک چیز میری تھی تو اس سولت سے قائم اٹھنا  
 کیا گیا۔ شفیق شاہ ذرا ایک طرف کو ہٹے ہوئے بیڑھی پر  
 گھن ہاتھ میں لیے اٹھا لیے میں جھانک رہا کہ اگر کوئی  
 آئے تو اسے وہیں گھنڈا کر سکے اس دوران میں ہم  
 سے یکے بعد دیگرے بیڑھی سے اوپر چڑھ کر پھر دیوار  
 دوسری طرف کو گئے۔  
 ڈرائیور وہیں موجود رہا۔ اسے وہیں ٹرک میں

نے فی الحال دیوار کی اوٹ میں ہی رہنے کی ہدایت کی البتہ سر  
کوشیل میں انہیں سمجھاوا کہ وہ کون سے جہاں کر دیکھتے رہیں  
اور جو نئی میں ایشامہ کون 'حتی الامکان تیز رفتاری سے میرے  
پچھے آجائیں۔ میں گمن ہاتھ میں لے 'نیکر پر انگلی رکھے' دیوار کی  
طرف پشت کئے آگے بڑھ رہا تھا اور محافظ میں آند سے بے خبر تھا۔  
میں اس وقت آوے سے زیادہ قائل لے کر چکا تھا جب وہ گری  
سائس لے کر سر اٹھا کر طالب اخبار کا کوئی اور صفحہ دیکھنے کے لیے  
اسے اٹھنے لگا اور اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کلامہ گیا۔ اس کلمے منہ سے شاید  
کوئی غصے سے بھری تو آواز نکلا کہ برآمد ہوا اس کے ساتھ ہی اس  
کا ہاتھ کندھے سے گن اٹارنے کے لیے بھی بڑھا تھا لیکن میں نے  
اسے ان دونوں ہی کاسوں کی ملت نہیں دی۔ حیرت اس کی  
آنکھوں میں ہی نمود ہو کر رہ گئی کھلا ہوا منہ ایک جھٹکے سے بند  
ہو گیا اور گمن کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ یک دم نیچے گیا 'تھوم' کی  
جگہ ہی آواز کے ساتھ اس کی پیشانی میں ایک سرخ سوراخ نمودار  
ہو گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ بندے میں جانے کے سے انداز میں  
اسٹول سے لڑھک گیا۔ ڈرائیوے کا فرش بھی ماربل کا تھا۔ محافظ  
سر کے بل اس پر گرنا وہ یقیناً فرش تک پہنچے سے پہلے ہی مر چکا تھا  
لیکن اگر اس کے مرنے میں کوئی کسر نہ جاتی تو وہ اس طرح کرنے  
سے پوری ہو جاتی۔ اس کی گمن بھی اس کے ساتھ ہی فرش سے  
گھرائی تھی۔ دونوں کے اس طرح فرش پر گر کرنے سے ابھی  
خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔ اسٹول اس کے ساتھ نہیں گرنا تھا ورنہ  
ابھی خاصی کمزور ٹھانٹ ہی بلند ہوتی۔

اس کے گرے تک میں 'نئی اور راجلہ کو آگے آنے کا  
ایشامہ کر چکا تھا اور خود مزید آگے بڑھ چکا تھا۔ اگلے کونے کے قریب  
سانے کے لان پر موجود کسی شخص نے شاید محافظ کو گرتے دیکھ لیا  
تھا۔ اس نے تشریف دہی کی آواز میں پکار کر کہو پوجا۔ شاید اسی  
لکھ گزرا تھا کہ اسٹول پر بیٹھا ہوا محافظ ہلکا کر رہا تھا۔ شاید اس  
کے دہم دکان میں بھی یہ بات نہیں ہو سکتی تھی کہ اس طرف سے  
تین افراد دیوار سے چپکے چپکے انہیں ہاتھوں میں لے ابل کے فرشتوں کی  
طرح چلے آ رہے تھے۔

میں نے دو فٹے قدموں کی آواز میں نہیں۔ پھر وہ عمارت کے  
کونے سے اچانک ہی ہمارے سامنے اچھل دیا بھی ایک مسلح محافظ  
تھا۔ اس کی گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ انیس دھکے اور خاموش  
رکھنے کے لیے گولی استعمال کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم پر  
نظر پڑے ہی اس نے مشتقی انداز میں گن سیدھی کی گن اس بار  
راجلہ کا گلوک حرکت میں آیا اور جگہ ہی 'تھوم' کی آواز کے  
ساتھ وہ بھی فرش پر گیا۔ وہ اپنی جھونک میں اوزھار کا تھا۔  
میں نے اس پر دو سری نظر ڈالنے کی اہمیت نہیں کی اور جی

ہمت کی جی تھی۔ ہم انہوں کے اندر جا پہنچنے کے بعد بھی مکان کے  
دور سے کوئی اس طرف نہیں آیا۔ ہم نے میز میں بھی اندر داخل  
ہوئی تھی اور خودت کی پشت دوسری چھٹی موٹی چڑیس بھی ہمارے  
اتھ تھی۔ میز میں اندر کی طرف سے دیوار کے سارے کھڑکی کر  
پھر زدی گئی تھی۔

پشتر سے مکانوں کی طرح یہ مکان بھی اسی طرز پر بنا ہوا تھا کہ  
دیواروں کی تقریباً وسط میں اصل عمارت تھی۔ اصل عمارت  
ہا چاند طرف پھر لگا جا سکتا تھا۔ تین طرف لان کے ساتھ  
تھو دیوار سے جڑی ہوئی پتہ دوش جاری تھی۔ ہم بیک کورٹ  
میں کمرے تھے۔ دائیں طرف سے مکان کے سامنے تک پہنچنے  
لے لان اور پتہ دوش موجود تھی جو زیادہ چڑی نہیں تھی۔  
ان طرف کشادہ ڈرائیوے سامنے والے کیٹ تک جا رہا تھا  
گیٹ باؤس بھی تھا اور مسلح محافظ بھی وہیں موجود رہے تھے۔

مجھے 'نئی اور راجلہ کو اس راستے سے آگے بڑھنا تھا۔ ڈرائیوے  
نیچا شاہ کو ہم نے دوسرے راستے سے پیچھا کا فیصلہ کیا۔ مکان  
سامنے پہنچ کر ہم دونوں طرف سے آنے والے اور ہمارے درمیان  
محافظ دھبہ ہوئے۔ ہم عمارت کے اس کونے سے جھانک کر  
تک نظر ڈال سکتے تھے کیونکہ گیٹ اسی سیدھ میں مکان کے  
بے کونے پر تھا۔

ضلع ٹاؤ اور ڈرائیوے رکھ کر ہی حالت میں اپنے راستے پر  
ہو چکے تھے لیکن جب میں نے بعد احتیاط دیوار کی اوٹ سے  
ال کر اپنی طرف کی کشادہ کی گئی میں جھانکا تو مجھے فوری طور پر  
پھر کر پڑا۔ وہاں سے میری نظر گیٹ تک چلی گئی تھی لیکن  
اسے کللی ادھر اصل عمارت کے کونے کے قریب ایک مسلح  
ہوئے اٹھینا سے ایک اسٹول پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ  
سے نیک لگائے ہوئے تھا اور اس کے کندھے پر ایک اوزی  
دلی تھی۔ اس کے پنا طرف ایک تیز رو کھڑی تھی۔ اگر مکان  
مائل میں کوئی اور گاڑی موجود تھی تو وہ مجھے یہاں سے نظر  
نہی تھی۔

مسلح محافظ نہیں بلکہ اسٹول پر گویا ایک رکاوٹ بنی ہوئی  
تھی۔ اور میری غلط جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تو قیمت تھا کہ  
نواہی ایشامہ سے اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا۔  
کیونکہ اس نے مجھے جھانکتے نہیں دیکھا اور اگر اس سے پہلے  
میری توڑی ہمت آواز میں پیدا ہوئی تھی تو وہ بھی اس کی  
تک نہیں پہنچی تھی۔ یہاں سے مجھے گیٹ باؤس اور  
محافظ نظر میں آئے تھے۔ وہ دوسری طرف سے پہنچنے  
ضلع شاہ اور ڈرائیوے پہلے نظر آتے لیکن ہمارا ان سے پہلے  
کی کستہ ہوئے دوسرے کونے کے قریب پہنچنا ضروری تھا۔  
میں نے اپنے چھین ہینسل پر سائینسز کیا اور دیوار کے  
لٹ کر دیہ قدموں آگے بڑھنے لگا۔ 'نئی اور راجلہ کو میں

ایک گھنٹے کے کل بیڑہ کر غایت آہستگی سے اس دروازے اندر بھاگا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ کوئی کوئی میری کمر بھری کسی اور جگہ میں سوراخ کرتی ہوئی نہیں گزرتی تھی میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں موجود تھا۔

سامنے ہل خالی پڑا تھا اور اس سے آگے وہ دروازہ دکھائی دے رہی تھی جس سے گزر کر میں بیابانِ قنات گاہ میں پہنچا تھا جس میں تخت شاہی کسی ایک جگہ تھا۔ اس کے سامنے پیش ہونے کے لیے مجھے کچھ چلنا تھا اور اس دوران میں مجھے گرد و پیش کا کافی مددگار ہو گیا تھا۔ مکان کی ساخت کافی حد تک میری سمجھ میں تھی۔ اس کے باوجود مکان میں گھسنا باہر سے یہاں تک کہ میں زیادہ خطرناک تھا۔ ان کئی جگہوں کے بارے میں تھا کہ کہاں کون موجود ہوگا اور کس خطرے سے گم جائے گا لیکن ان بند کمروں اور باطلوں کو کھولنے کے لیے سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کہاں سے اچانک کھڑا طرح باہر آجائے کہ ہمیں اس کے بارے میں خیال نہ ہو۔

دو لمبے کی تاخیر ہو جائے اور یہ تاخیر ہمیں منگی پڑ جائے کسی بھی سادھی کو کوئی گزند پہنچنے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

سب سے پہلے ہال میں داخل ہو اور میں انتظار کیا کہ شاید کسی طرف سے کوئی آواز دہکائی دے۔ ایسا نہیں ہوا۔ تب میں نے اپنے ساتھیوں کو اندر کھینچا۔ اندر آکر وہ سب ایک دوسرے سے کچھ کاظم انہوں نے اپنا سر بھی مختلف سمتوں میں رکھا۔ ہم ان کی نظر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں سے کسی کا ہوا ہو سکتا تھا۔

وہیں ایک طرف سے بیڑھیاں اور باریقی راجہ کو میں نے اور جانے کا اشار کیا۔ اوپر کی طرف کی دھڑکی داری تھی۔ بیڑھیاں کے قریب ہی وہ سادھا موجود تھا جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ اس کے خانے کی بیڑھیاں نیچے باری تھیں۔ قریب ہی وہ تھا جس کے ذریعے میں نے یہ دروازہ بند ہوتے دیکھا تھا۔ اسی سے ہوگا لیکن مکان کو کھانے کے بغیر اور اس سے نئے بغیر ہم اسے کھولنے کا رعبہ نہیں لے سکتے تھے۔

دروازہ چھینا کسی سوز کے ذریعے دھڑکی دے گا۔ عمل میں ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی تھی جس کی سکوت کے عالم میں چھینا کافی دور تک سنی جاسکتی تھی۔ میں کسی سمت سے اچانک کسی کا آگاہا خطرناک اور ہم بے گھری سے خانے میں داخل ہو گئے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اچانک ہمارے سروں کی طرف سے بجائے ہم ان کے سروں پر اچانک جا پھینکا جائے۔

سے مزید آگے بڑھ گئے۔ اب گیت ہاؤس ہمارے سامنے تھا۔ دو مسلح محافظ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے اسی طرف دیکھ رہے تھے اور تھراگیت ہاؤس کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اس کا پلائی وود کا نظر آ رہا تھا۔ ہمیں ان کے ہاتھوں میں نہیں لین ان میں سے کسی کو بھی نہیں استعمال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

اس وقت تک وہ سرے کوٹنے کی طرف سے زرتاج اور فتح شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔ وہ تینوں محافظ دونوں طرف سے گولے کی زد میں آگئے۔ وہ ہمیں سیدھی کئے بغیر ڈھیر ہو گئے اور کوئی شور شرابا نہیں ہوا۔ مجھے امید تھی کہ سائینسنگی گولے کی مدد ہم آواز میں اس طویل و عریض بند مکان میں اندر تک نہیں پہنچی ہوں گی اور اگر کسی حد تک پہنچی بھی ہوں گی تو شاید انہیں کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہوگی۔ اس قسم کے مضبوط قلعوں میں اور مسلح محافظوں کے حصار میں بیٹھے ہوئے لوگ بڑے مطمئن ہوتے ہیں کہ انہوں نے ہر خطرے کے سامنے بند باندھا ہوا ہے اس لیے انہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

محافظ ڈھیر ہو چکے تو میں نے ایک کمر گیت ہاؤس میں بھاگا مگر اس میں مزید کوئی محافظ موجود نہیں تھا۔ اس کی کھڑکی میں ہمیں جو محافظ نظر آیا تھا وہ گولی کھانے کے بعد توجہ کھڑکی سے باہر اور توجہ اندر لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا مکان کی اصل عمارت سے باہر اور چار دیواری کے اندر صرف یہی پانچ محافظ موجود تھے۔ ان میں وہ محافظ بھی موجود تھا جسے میں نے اس سے پہلے اپنی برائیاں "پیش" کے موقع پر جیب سے اندر دھکی دیا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اس کی تلاش کی اور مجھے میری مطلوب چیز فوراً ہی مل گئی۔ ایک کی رنگ میں دوسری کچھ چابیوں کے ساتھ وہ خوب صورت چابی بھی موجود تھی۔ میرے ساتھی میرے چابی تلاش کرنے سے پہلے ہی بھاگ کر برآمدے کے دروازے کے دونوں طرف دیوار سے چپک گئے تھے۔ فتح شاہ اور زرتاج دروازے کے ایک طرف تھے۔ فونی اور راجہ دوسری طرف۔ یہ ساری کارروائی منٹوں کے نہیں، سیکنڈوں کے حساب سے ہو رہی تھی اور اندر اندر بھاگ دوڑ کے دوران میں ہم مسلسل رکشہ کی سی حالت میں تھکے ہوئے تھے۔ مبادا کسی کھڑکی سے ہمیں دیکھ نہ لیا جائے۔ کھڑکیاں کافی اونچائی پر تھیں اور ایئر کنڈیشننگ یا کسی اور وجہ سے وہ بند تھیں۔ ان کے عقب میں گھرے رکشوں کے پردے پھیلے دکھائی دے رہے تھے۔ مکان کی بڑے مقبرے کی طرح سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے دروازے پر پہنچ کر اس طرح احتیاط سے ٹالا کھولا کہ کلک کی آواز بھی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کے فوراً بعد میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے ایک لمبے کا توقف کیا۔ اس گن لینے کی کوشش کی لیکن اندر اگر کوئی خفیہ سی آواز ابھرتی تو اسے اس ساؤنڈ پروف دروازے سے باہر شہامت مشکل تھا۔ آخر میں نے

کھلی چٹانے میں پہل کر کے کامو قع دنا نہیں چاہئے تھے۔ ان کے پاس میں جس قسم کی تھیں دیکھ چکا تھا وہ اگر انہیں استعمال کرتے تو برست ہی مارتے اور مکان کے کسی ایک حصے میں برست مارے جاتے سے کسی اور جگہ موجود دوسرے افراد بھی ہوشیار ہو سکتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہاں جو کوئی بھی موجود ہو اس کے ہوشیار ہونے سے پہلے ہی اس سے نمٹ لیں۔

اسی طے شدہ حکمت عملی کی وجہ سے ہم نے خانے کے دروازے کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ہال سے متصل ہی وہ دوسرا لہیا چڑا کر تھا جسے جمال سعیدی نے اپنا اصل ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کمرے میں جھانکا تو جمال سعیدی مجھے وہیں نظر آگیا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ تخت اس کی پسندیدہ ترین چیز تھی۔ وہ اسی پر چاروں خانے چت پڑا سو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ انسان نہیں، کوئی ہاتھی کا بچہ پڑا سو رہا تھا۔ اس کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی پڑا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ اس نے سونے کے لیے بھی کسی بڑے دھرم وغیرہ میں جانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ وہ گن لے کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میں اور ذرا آگے کا "سروے" کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہماری واپسی تک شفیع شاہ کو جمال سعیدی کا خیال رکھنا تھا اور اگر وہ تندرست پیدا ہو جاتا تو اس کے روتھل کے مطابق اس سے مشق تھا۔ ذرا آج وٹے میں مجھے رنگین پیشوں والی ایک کمرے نیلے رنگ کی تکیہ کے علاوہ کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی اس لیے میرا اندازہ تھا کہ شاید نیلا نمادہ شخصیت تو اس وقت مکان میں موجود نہ ہو جس سے میرا پہلے واسطہ پڑ چکا تھا۔

آگے راہ واری میں دونوں طرف کھول کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ دروازے نے ایک طرف کی دیوار کے ساتھ چپک کر اس طرف کے دروازے کھول کھول کر اندر جھانکنے کی آئے داری سنبھالی اور میں نے دوسری طرف کے۔ یہ دروازے ہمیں غیر متعلق ہی ملے اور کئی کھول میں کسی خطرے نے بھی ہمارا استقبال نہیں کیا لیکن ان میں جھانکنے پر ایک طرح سے ہمارے سامنے ہر قدم پر ایک نئے جہان حیرت کے در کھلنے چلے گئے۔

جب ہم ایک دوسرے کو اشارہ کرتے کہ فلاں کمرے میں خطرے والی کوئی بات نہیں تھی تو ایک دوسرے کی طرف والے کمرے میں بھی جھانک لیتے تھے۔ ویسے تو ان میں کوئی بہت زیادہ باصط حیرت چیز بھی نہیں تھی لیکن اس اعتبار سے ہم حیران ہونے میں حق بہ جانب بھی تھے کہ اس دیرانے میں کوئی اس قسم کے مکان کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چلا ہر تو مکان باہر سے بھی بہت جدید اور انوکھا نظر نہیں آتا تھا۔ اندر سے بھی اس کے کھول کی ترتیب اور نقشہ کچھ پرانے اسٹائل کا ہی تھا لیکن ایک تو اس کی تعمیر میں انتہائی سٹاک میٹرل

استعمال کیا گیا تھا۔ دوسرے اس میں ایک نہایت جدید اور پیشہ نما مکان کے تمام لوازمات موجود تھے۔ اس میں جتنا ہم "بیمار" ہوا، "لاہری" کی دیکھو سب کچھ موجود تھے۔ جتنا ہم میں دوا تھا، تمام جدید سامان موجود تھا۔ نہ جانے اسے کون استعمال کرتا ہوگا۔ جمال سعیدی کے قتل قتل کرتے دن کو دیکھ کر تو اندازہ ہوا تھا کہ وہ زندگی میں بھی دوا دوا کے سامان کے قریب بھی نہیں بٹکا ہوگا۔ کئی انتہائی بڑی قیل اور آراستہ وی اسٹینڈ بڑے دھرم کی صفوں اور یہ تمام کمرے نہایت کشادہ تھے۔ کچھ کمرے اوپر کی منزل پر تھے جہاں ہم نے راجیل اور فنی کو بھیجا تھا۔ کم از کم جتنے کمرے نے دیکھے تھے ان میں ابھی تک تو ہمیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اس اعتبار سے تو پورے مکان کو دیکھ کر ہی حیرت ہو رہی تھی کہ اگر کس کے لیے بنایا گیا تھا؟ اس میں اتنی آسائشیں اور جمالیات کر لیے رکھی گئی تھی؟

اگر جمال سعیدی کی کوئی فیملی بھی تھی اور اس نے اسے بچا رکھا ہوا تھا تو وہ یقیناً مختصر تھی۔ ابھی تک اس کی موجودگی کے آثار نظر آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ اب تک یہاں صرف ایک حافظہ کی حافظہ دکھائی دے تھے اور وہ یقیناً سونٹ کا دروازہ اور مکان کے عقب میں بنی ہوئی بٹ وغیرہ میں ہی رہتے ہوں گے۔ بھڑکے نے خود کو یہ سمجھا کر اپنی حیرت دور کرنے کی کوشش کی کہ مکان اس کشادگی، ان آسائشوں اور ان سولیات کا کوئی نہ کوئی محل ضرور ہو گا۔ یا بھی نہ کبھی صرف نکل ہی آتا ہو گا۔

مجھے اور ذرا آج کو کھول میں کسی کو دیکھنے کی جو حسرت ہو رہی تھی وہ ایک دم ہی دور ہو گئی۔ راہداری کے اختتام پر بائیں طرف جو دو خانہ تھا وہ عام دروازوں کی نسبت بہت بڑا تھا۔ چھٹ کھلا تھا۔ ذرا آج اس طرف تھی۔ میری طرف کا دو خانہ کھلا ہی تھا۔ یہاں سے کچھ خفیہ سی آوازیں آتی محسوس ہوتی تھیں۔ صرف آوازیں ہی نہیں، کچھ خوشبو بھی بھی آ رہی تھی جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں جس دروازے کی طرف کھٹکھا تھا وہ بالکل سچا تھا اور اس کے سامنے دوسری طرف ڈانگہ تھا۔ ادھر کی دہتے داری ذرا آج کی تھی۔

ہم دونوں ملی کی طرح دے بے قدموں آگے کھٹک کر اپنے اپنے حصے میں آنے والے دروازے کی طرف گھوم گئے۔ یوں چلا ایک دوسرے کی طرف پشت ہو گئی اور ہم ایک دوسرے کا کار گزار می سے بے خبر ہو گئے۔ میرے سامنے واقعی ایک چلا دھریض اور ماڈرن کچن تھا۔ اس کے اندر ہی چار کرسیوں کی ایک خوب صورت ڈانگہ تھیل بھی موجود تھی جس پر ایک جوڑا بیہ تھا جو ایک دوسرے سے سرخوڑے بیجا تھا۔

میں فوری طور پر ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکا لیکن یہ جڑی فوڑی مل گیا کہ وہ دوا دوا میں کھوئے ہوئے تھے اور دوا دوا سے بے خبر تھے۔ ان کے سامنے کھانے کے برتن بھی بچے

کے ہاتھ میں پہنچا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ یوں ہلا جیسے وہ میری طرف اشارہ کرنے لگا ہو۔

اس کے ہاتھ کی اس حرکت کا متعدد ہی بدوقت میری سمجھ میں آیا اور میں کھلی کی سی تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ یہ ہلکے جھپٹے میں ہونے والا زندگی اور موت کا فیصلہ تھا۔ کھلی کی سی لپک کے ساتھ غمخیز کھٹ میں بدست ہو چکا تھا اور قہر قہر اٹھ رہا تھا۔ اگر اسی تیزی سے میں اپنی جگہ سے نہ ہٹا ہوتا تو وہ چو کھٹ کے بجائے میرے سینے میں بدست ہوتا۔ چو کھٹ میں تو وہ شاید صرف ایک آدمہ لٹک کی گرا لی تک گڑا تھا لیکن میرے سینے میں چھینا دیتے تک اتر جاتا۔

میں شاید اب بھی احمق کمال کو شہت نہ کرنا لیکن اس بد بخت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اسے اپنے اس شاندار اور مشاقانہ وار کی کامیابی کا بھی یقین ضرور ہو گا اس کے باوجود غمخیز جھپٹے کی اس کا ہاتھ اپنی بھل کی طرف بھی چلا گیا۔ وہ بھلی ہو لہرے سے گن ٹھال رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں گن کی جھلک بھی دیکھی۔ مجھ پر بھی اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ مجھے رنگہ دیا پڑا۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر اتر گئی تاہم میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ اس کے برابر کوئی عورت گولی کی زد میں نہ آئے پاس۔

اس کے لیے ایک ہی گولی کافی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکے ایک کرسی کو اپنے ساتھ لٹا ہوا زبر ہو گیا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کچھ اس طرح کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے آخری لمحے میں اس نے حیرت سے کہہ کرنا چاہا ہو لیکن موت نے اسے سہلے دی ہو۔ اس کے قریب کوئی عورت کا ہاتھ اس کے منہ پر پہنچا تھا لیکن اس نے چیخ نہیں ماری۔ وہ عقل مند سلوم ہوئی تھی لیکن سک پر برتن دھولی عورت برتن سمیت اچانک محوم گئی تھی۔

اس نے کہنے کا شعور کھٹا، مجھے دکھا، میرے ہاتھ میں موجود گن کو دیکھا پھر اس کی نظر شاید میرے عقب میں ڈانٹک دم تک چلی گئی۔ اس دوران میں اس کی آنکھیں پھٹتی ہی چلی گئیں پھر اس کے منہ سے ایک ایسی بے ہودہ اور کمرہ بچ پر آند ہوئی کہ میں اسے گولی مارنے مارنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں موجود چھٹی کا برتن فرش پر گر کر زور دار تواز کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں اس کی چیخ کا سلسلہ سچ میں ہی منتقل کرنے لگا تھا لیکن میں نے بہ مشکل اپنی اٹھکی کا انظار اسی سے انداز میں رنگہ پر دبا دیا۔ جھانکے سے دوک ایک تو وہ ذرا پڑی عمر کی عورت تھی۔ دوسرے اس کے چہرے اور مجموعی شخصیت پر کچھ ایسی مشکبندی طاری تھی کہ شاید احتمالی ناگزیر حالات میں بھی اسے قتل کر کے مجھے پھینکا دیا محسوس ہوتا۔

غیر وار۔ میں نے گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے تیزی سے اس کا پ اور تواز نہ نکالا۔ اس نے بھی سختی سے اپنے منہ پر ہاتھ جمالیا۔ اس دوران میں

میں شاید وہ کھٹا کھٹکے تھے یا پھر کھٹانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہے تھے لیکن میں صرف دوسری دونوں نہیں تھے ان کی طرف بدست کے ایک عورت اور بھی کھڑی تھی۔ وہ سک پر کوئی برتن دھوری تھی۔ لیکن میں مانگتا ہوں اودھن کو کھٹک رہا لپک زور زور سے دیکھ رہی تھی کچھ نظر آتا تھا۔ وہ گھر کے بجائے کسی بڑے ہوٹل کا کچن معلوم ہوا تھا۔ سک پر کوئی عورت ملازمہ معلوم ہوئی تھی۔ سرگوشیاں کرتا ہوا جوڑا اس کی موجودگی سے اور وہ جوڑے کی موجودگی سے بے نیاز معلوم ہوئی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک عجیب سی کافلی تھی۔ شاید وہ بدست تھی ہوئی تھی۔ اس شخص کے ہاتھ میں چو کھٹ کوئی ہتھیار نہیں تھا اور نہ ہی وہ میری طرف حوچ تھا اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ اسے شہت کرنے یا زنا کر کے بچانے سے گریز کیا جائے۔

”پنڈراپ۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ اسی اثنا میں میں نے اپنے عقب میں زرنج کو بھی پکڑ لیا۔ اس کے بعد بھی کچھ توازیں نکالی دیں۔ جن میں زرنج کی سائیکسنگ کی گن سے فائنوں کی توازی بھی شامل تھی لیکن میں پلٹ کر نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں اپنے صے کے مقام میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

میرے پنڈراپ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ شخص اتنی تیزی سے اٹھا کہ اس کی کرسی تو الٹ ہی گئی لیکن میری اچھل کر نہ گئی۔ وہ میری طرف کھڑا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ جلد کیم کا ٹیکہ پڑی احمق کمال تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ درحقیقت وہ جیش کا پاڈی گاڑا تھا اور جیش کوئی کمانڈو قسم کی چیز تھا لیکن اس وقت وہ جیش کہ نہ جانے کہاں چھوڑ کر اور شاید اپنے فرائض کو ذہن سے جھٹک کر یہاں بچنا نہ جانے کس خاتون سے راز دینا چاہ رہا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی یہ بھی ظاہر کرتی تھی کہ جیش کیم اور جمال سعیدی درحقیقت ایک ہی شخص کے چپے پڑے تھے ان کے درمیان ظاہری طور پر بھی کتنی تو تھا لیکن حقیقت میں اس کی جڑیں کہیں زیادہ گہری سلوم ہوتی تھیں۔

احمق کمال کی نظر ایک لمحے کے لیے مجھ سے ملی۔ اس نے جگہی ہانڈ سے ایک مزدور قسم کے شخص کو اپنے اوپر گن کرنے دیکھ کر بتایا اس سے مرعوب ہوا اور اس کی بدامیت پر عمل کرنا اپنی توہین سمجھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس لمحے میں نے دیکھا کہ میں اس کے قریب ہی جھلٹاتا ہوں ایک خوف ناک قسم کا غمخیز صوفہ تھا۔ ایسا غمخیز جیش کھلی کا صوفہ تو میں تھا۔ ڈانٹک بھلے ہانڈے جانے والے جہزی کاٹھن سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ جیش کھلی سے اوپر درجے کے شکاریوں کے مطلب کا غمخیز تھا۔

میں کچھ نہیں سکا کہ ایک خاتون کے قریب پنڈراپ کھٹا کھٹاے اور راز دینا کرتے وقت اس قسم کا خوفناک غمخیز احمق کمال کے قریب میری گنیں موجود تھا؟ لیکن یہ اس قسم کے سوالات پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ وہ غمخیز پلک جھپٹے میں احمق کمال

عمری کے جھوٹے میں بھلا یہ کہہ اڑا یہ خزاں کیو کر ہو چکی  
احمد کمال اگر اس سے سر جو ذکر کیجئے کے دوران میں مطالعہ  
سے بے خبر تھا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔  
میں نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور وہ آنکھیں بند کر  
لئے آگے پیچھے جھولتی رہی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سار  
دئے رکھا کہ تمہیں وہ کرسی سمیت نیچے نہ گر جائے اس  
آنکھیں کھولی دیں اور دونوں ہاتھ میز پر جما کر بیٹھ گئی۔ اس  
سنبھل گئی تھی اور خوف زدہ سی نظموں سے میری طرف دیکھ  
تھی۔

”تم کون ہو؟“ میں نے زری سے پوچھا۔ شاید یہ سوال عام سے کرنا چاہا رہی تھی لیکن میں نے پہل کر دی تھی۔  
”میں۔۔۔ میں ارمیلا ہوں۔ جمال سعیدی کی بیوی۔ ہم نے بیٹھی بیٹھی ہی آواز میں جواب دیا۔“

”بیوی۔“ جس نے دہرایا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جی  
کسی نے میرے سر پر ڈنکا رسید کر دیا تھا۔ اس انکشاف نے  
مجھے خاصی روحانی تکلیف پہنچائی تھی۔ ایک لمحہ پہلے میرے  
میں اس امکان کا ساہ لرایا تھا کہ شاید وہ جہاں سیدی کی کچھ  
لیکن پھر میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر اس کی بیوی کوئی انتہائی خوب  
صورت عورت رہی ہو تب بھی اس کا بھی کسے بچے کی بیٹی شکر  
ہی ایسی ہو سکتی تھی اور اس امکان کی طرف تو میرا ذہن بالکل  
نہیں گیا تھا کہ سترہ اٹھارہ سال کی یہ پری صورت لڑکی اس کی  
میں ہو سکتی تھی۔

لڑکی کو گویا پہلے ہی توقع تھی کہ مجھے حیرت کا ایسا ہی منظر ملے گا۔ اس نے بہت سی مدھم آواز میں اس تعارف میں اضافہ کیا۔

نہیں چلے میں تھا اس میں بہترین تھا کہ انگریزی کے الفاظ میں نہ نہ نکلتے۔

”تم انگریزی سمجھتے ہو؟“ اس نے اچانک انگریزی میں پوچھا۔ اس کے لیے میں مددگار بن گیا۔ اس کا مطلب تھا وہ انگریزی میں کبھی نہیں سمجھتا۔

میں نے فنی میں سر ہلا دیا۔ تب اس نے شاید میرے ہاتھ کو  
کچھ مطلب اخذ کرتے ہوئے پشتمیں بومھا "پشتمو کیجئے"۔

میں نے ایک بار پھر تھی میں سر ہلادیا۔ اس نے یہ نہیں  
کہ اگر میں یہ دونوں زبانیں نہیں سمجھتا تھا تو میں نے دونوں  
اس کا سوال کیا کہ کمر سمجھا تھا؟ شاید میرے تھی میں سر ہلادیا  
میں نے یہ مطلب اخذ کیا جو کہ میں اس کا سوال بھی نہیں

اس نے ایک لمبے کے لمبے دونوں ہاتھوں سے سرخام لپکا  
 سے پھر پکڑ آئے لگا "جین" دوسرے ہی لمبے سنبل کر فریاد

دوسری عورت بھی پہلے احمد کمالی کی طرف اور پھر میرے عقب میں ڈانٹنگ دھم کی طرف دیکھ چکی تھی اور اس کی آنکھیں بھی پہلے سے زیادہ پھیل رہی تھیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اب بھی گھوم کر ڈانٹنگ دھم کی طرف دیکھنے کا قائل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دونوں عورتیں کسی بھی لمحے کوئی ایسی حرکت کر سکتی تھیں جو میرے لیے کسی پریشانی کا باعث بن سکتی تھیں بلکہ پریشانی اس لمحے شروع ہوتی دکھائی دے۔

میر کے قریب کھڑی عورت نے ہاتھ اچانک منہ سے ہٹا کر یوں ہوا میں لمبایا جیسے پکڑ آنے لگا وہ اور وہ سارے کے لیے کوئی چیز تلاش کر رہی ہو۔ تب میں نے دیکھا وہ درحقیقت عورت نہیں، بہت سی کم عمر لڑکی تھی۔ اس کا جسم دریا بھر اتنا اور میں صحیح طور پر اس کا چہرہ دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ اس لیے بس ایک تبسم سا ابتدائی ناشائستہ تھا جیسے وہ مجھ سے تیس برس کی عمر کی کوئی پختہ کاری عورت ہو لیکن اس نے جسے سے ہاتھ ہٹایا اور میں نے ذرا صحیح طور پر اس کی طرف دیکھا تو پتا چلا کہ وہ تو بہ مشکل اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔

وہ بلاشبہ اتنی خوب صورت تھی کہ اس کے چہرے کو محض چاند چوکھڑا کر دیتا۔ کافانی لگتا۔ سرسری نظر میں اس کی سفید قلم لڑکی کا بھی گماں گزر سکتا تھا کیونکہ اس کے بال منبرے، آنکھیں نیلی اور رنگت سرخ و سفید تھی لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر احساس ہوتا تھا کہ اس کے حسن میں شریعت کی اتنی ایک مخصوص کشش موجود تھی۔ اس کے حسن کی تب و تاب میں مغرب کا پیرا پہن نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ جو اس وقت شاید خوف سے تھر تھرا رہے تھے اس عالم میں بھی یا قوت کی طرح دکھ رہے تھے۔

اس کی کم عمری اور معصومیت کے ساتھ ساتھ اس کی خوف سے بھئی چمکی آنکھیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے ترس بھی آیا اور میں سوچنے بغیر نہ سکا کہ وہاں جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ کم از کم تیس کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ گداز کی ٹھنی ایک لڑکی جو اسی لمبے میں گزر گئی۔ تجھے نہیں معلوم تھا وہ کون تھی اور کسی گھر میں ہونے والی سرگرمیوں میں اس کا کیا کردار تھا۔ بعض معصوم اور خوشمزہ چہرے اپنے پیچھے بڑی بھیاٹ کنجانی لیے ہوتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے پھولوں والے خوب صورت جامنی رنگ کے لیکنی نمالبادے میں تھی جس نے اس کے رنگ و روپ کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔ اس ڈھیلے ڈھالے لبوہ میں بھی اس کے خند مال قیامت ڈھا رہے تھے اور اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہونے لگی تھی کہ سن رہی ہے۔

اسے چکراتے دیکھ کر میں پک کر اس کے قریب پہنچا۔ میرے ایک ہاتھ میں گن تھی۔ دوسرے بازو سے میں نے اسے سارا ادا تو کر دیا پوری سی مجھ پر گن گری لیکن اس کا جوہر مجھ نہیں کھا سیم۔ مرنے کا ایک جھوٹا نعرہ جو میرے بازو میں سٹ آیا تھا۔ لیکن نہیں

کے سارے یا ڈانٹ نکل پڑی رکھی ہوئی ہوں گی اور زرنج کے "پینڈز اپ" کئے کے باوجود وہ یقیناً انہیں اٹھا چکے تھے کیونکہ مرنے کے بعد بھی آڑی زخمی حالت میں پڑے ہوئے کے باوجود ان کے ہاتھ کٹوں پر اور انگلیاں زرنج پر تھیں لیکن زرنج نے انہیں گولی چلانے کی صلت نہیں دی تھی۔ یہ بات بھی شاید ملے تھی کہ اگر کوئی کزن لے کر ان لوگوں کے سر پہ پچھتا پھر موت سی انہیں اپنی تھیں استعمال کرنے اور گولیاں چلانے سے باز رکھ سکتی تھی۔

ان تینوں خاندانوں کی صورتیں مجھے نظر آ رہی تھیں اور یہ صورتیں میرے لیے بالکل ہی ان دیکھی نہیں تھیں۔ ان میں سے دو تو سی تھے جنہیں میں نے پہلی مرتبہ اپنی یہاں آ کر کے موقع پر جمال سعیدی کے دامن بائیں تھیں لیے کھڑے دیکھا تھا۔ تیسرا وہ تاجو میری خاطر درارت کے لیے ٹرائی پر بہت کچھ رکھ کر لایا تھا۔ یہ دو سری بات تھی کہ میں نے اور منیر نے ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ان تینوں کے منہ تھوڑے تھوڑے کھلے ہوئے تھے اور ان میں نواسے نظر آ رہے تھے۔ ایک کے منہ سے تونوال تھوڑا سا باہر آگیا تھا۔

یہ منظر کچھ عجیب سی انداز میں زندگی کی ناانیداری کا احساس دلاتا تھا۔ یوں تو کوئی بھی انسان اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کون سا نوال اس کی زندگی کا آخری نوال ثابت ہو لیکن قابل غور بات یہ تھی کہ جو لوگ خوف ناک قسم کی بدحوقیوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے تھے اور کھانا بھی بدحوقی کے سامنے میں کھاتے تھے وہ بھی اندازہ تک نہیں کر سکتے تھے کہ کون سا نوال انہیں پوری طرح چھانا بھی نصیب نہیں ہوگا۔

میں نے اس منظر سے نظر ہٹائی اور وہ عمل خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ اس اثنا میں فونی اور راجہ بھی اوپر سے واپس آ گئے تھے اور جمال سعیدی والے کمرے میں جانے کے بعد ہم تک آن پہنچے تھے۔ میں نے ارمیلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان تینوں کو بتایا "یہ جمال سعیدی کی پانچویں بیوی ہیں۔"

مجھے خود احساس ہوا کہ میرا انداز کچھ ایسا تھا جیسے ہم وہاں کسی تعریف کے سلسلے میں جمع تھے اور میں بیڑیاں یا کسی اہم مسان کا تعارف دوسرے مسافروں سے کر رہا تھا۔ ان تینوں کی آنکھیں ایک لمبے کے لیے پھیلیں لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور زرنج بخند سی سانس لے کر بولی "بعض لوگ اپنے دولت مند اور طاقت ور ہونے کا مستی یا ناجائز قائدہ لگاتے ہیں۔"

ارمیلا نے مجھ سے نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ فونی نے گویا مجھے رپورٹ دی "مگر صرف تین بیڑیوں کا ایک لاہری اور لاؤنج ہے۔ ہم نے ابھی طرح دیکھ لیا ہے وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"تھیک۔" میں نے طمانیت سے کہا پھر ارمیلا اور ملازمہ

توڑی زخمی پڑی احمد کمال کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دشت زدہ گئے میں بولی "تم نے اسے مار دیا۔"

معلوم نہیں یہ سوال تھا یا محض بیان۔ بہر حال یہ الفاظ اور کرتے وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ غرت تھی۔ میں نے زنی سے کہا "اگر میں اسے نہ مارا تو یہ مجھے مار دیتا۔ بلکہ اپنے خیال میں تو ماری چکا تھا۔" میں نے آنکھوں سے اپنے عجب میں اشارہ کیا جہاں چھ کھٹ میں خنجر یقیناً اب تک پوسٹ تھا تاہم میں نے مگر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ پھر میں نے احمد کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ایک فی ٹی اس کے ہاتھ میں دیا ہوا تھا۔ وہ گن نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ صرف اسے گولی چلانے کی صلت نہیں ملی تھی۔ میری دلیل نے شاید ارمیلا کو کھٹا ستا کر نہیں کیا۔ ملازمہ چپ عورت کو اس دوران میں میں چند لمحوں کے لیے بھول چکا تھا۔ اب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ منک سے ٹپک لگائے کھڑی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرے عجب میں دیکھ رہی تھی۔

پھر میں نے ارمیلا کی آنکھوں میں بھی خوف کی کچھ اور گہری پر چھائیاں نمودار ہوتے دیکھیں۔ وہ بھی میرے عجب میں دیکھ رہی تھی۔ میں چونکا کہ آخر میرے عجب میں ایسی کون سی بلا نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے مجھے صرف زرنج کھڑی نظر آئی۔ گن اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے چہرے پر معنوی سانولے پن کے ساتھ ایک عجیب سی خنجر نمودار ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں بھی ایک خاص قسم کی سرد مہی اور سفاکی تھی۔ ایک تو اس کا طبع عجیب تھا۔ اوپر سے اس تہلیل کی وجہ سے اس کی شخصیت کا تاثر اور بھی زیادہ بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ زرنج میں گولی اور دی دکھائی دے رہی تھی۔

ملازمہ اور ارمیلا شاید اس کا یہ رد دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تو اسے ڈانٹنے کے بعد میں کارروائی کرتے بھی دیکھا ہوگا۔ میری تو اس طرف پشت تھی۔ اب میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ پڑے سے کھلے دو داڑے سے اندر کا سحر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ہال ٹماکر تھا اور اس میں اتنی بڑی ڈانٹ نکل پڑی تھی جس پر شاید دو درجن سے بھی زیادہ افراد کھانا کھا سکتے تھے لیکن اس وقت اس پر صرف تین افراد موجود تھے۔ حقیقت میں تو صرف ایک ہی اس طرح موجود تھا کہ اس کا سر سبز تھا ہوا تھا۔ باقی دو الٹی ہوئی کر سیوں کے قریب فرش پر پڑے تھے۔

وہ تینوں اپنی زندگی کا آخری کھانا پورا نہیں کھا سکتے تھے لیکن مجھے لگے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ زرنج کے لیے بھی انہیں ہلاک کرنا اسی طرح ناگزیر ہو گیا تھا جس طرح میرے لیے اب ہو گیا تھا۔ ان تینوں کی خوف ناک تھیں ان کے پاس ہی موجود تھیں۔ کھانا کھاتے وقت بھی شاید انہوں نے تھیں کر سیوں

ہائپ عورت کی طرف اشارہ کیا ۳۳ نہیں انہی ڈانگک چیریز پر پاندہ  
دو اور منہ پر نیپ چپکادہ - اچھ ذرا بلکائی رکھنا۔

نولی نے اپنی بڑی بڑی جیبوں سے مطلوبہ چیزیں نکالیں۔  
راجیل نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ انہوں نے حیرت انگیز بکھری سے یہ  
کام کر ڈالا۔ جس وقت ارمیلا کے خوب صورت اور یا توئی ہو خوں  
پر نیپ چپکائی جا رہی تھی اس نے عجیب المیہ سی نگھوں سے میری  
طرف دیکھا جیسے کہ رہی ہو علی اب یہ بھی ضروری تھا؟

میں نے اس خاموش شکوے پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور جو  
لاش جہاں پڑی تھی اسے وہیں چھوڑ کر ہم اس شاہی ڈرانگ روم  
نما کمرے میں آگئے جس میں جمال سعیدی اب بھی چپ پڑا خواتانے  
لے رہا تھا لیکن اس کے خواتون کی تواضع کی درخواست سے  
زیادہ بلند نہیں تھی۔ یہ کچھ عجیب سی بات تھی کہ وہ یہاں پڑا کمری  
نیز سو رہا تھا اور اس کی پانچویں نمائت حسین اور نوجوئی ہو جگن میں  
اچھ کمال کے ساتھ سر جوڑے کوئی بہت سی خاص بات کر رہی  
تھی۔ اس قسم کی صورت حال میں بہت سے دلچسپ سوالات جنم  
لیتے تھے جو انسان کے جنس کو ابھارتے تھے لیکن اس وقت ہم ان  
سے کہیں زیادہ اہم اور تعلیم سوالات کے جوابات کی تلاش میں  
یہاں آئے تھے۔

شفیع شاہ گمن تھا۔ جمال سعیدی کے سرہانے جھاکڑا تھا۔  
میں نے اب ذرا ابھی طرح اس کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک چڑچڑھے  
ایک نظر آنی جو میں اس سے پہلے اپنی آمد کے موقع پر نہیں دیکھ سکا  
تھا۔ اس نے میرے جنس کو دور کر دیا۔ کمرے میں اڑکنڈر شنگ  
کے لیے قاسم سیلنگ بنی ہوئی تھی۔ عام طور پر یہ معنوی چھت  
اصل چھت سے کچھ نیچا ہوتی ہے لیکن اس کمرے میں معنوی  
چھت ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پھیلی ہوئی تھی  
بلکہ جہاں جمال سعیدی کا تخت تھا تقریباً وہیں سے کمرے کی اصل  
چھت شروع ہو جاتی تھی۔ معنوی اور اصل چھت کے درمیان جو  
تین چار فٹ کا فاصلہ تھا وہاں خلا نہیں تھا۔ وہ لمبی پٹی کسی بہت بڑی  
گاڑی کے ڈیش بورڈ کی طرح تھی۔

اس ڈیش بورڈ پر دو ٹی وی اسکرینیں اور کئی ڈاکل مشین ویو  
آؤٹ پرے ہوئے تھے۔ ٹی وی اسکرینیں خاصی بڑی تھیں۔ ان پر اس  
وقت بھی مکان کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کا سطر و خلف  
ڈاؤنوں سے نظر آ رہا تھا۔ اس وقت بھی ایک بڑی ڈانگ یک اپ  
مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی جس کے پچھلے حصے میں بھی چند  
رہائی سے مو اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سب قدرے  
عجیب انداز میں مکان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ہم بہت اچھی  
طرح ان کے چرے ٹی وی اسکرینوں پر دیکھ سکتے تھے۔ وہ دیکھ کر  
جہاں کہیں بھی نہ تھا اس میں گویا کوئی ذوم نیس لگا ہوا تھا جو  
تمام جزئیات لپٹا کر دکھا رہا تھا۔

کمرے میں نشیوں ویو کی ترتیب کچھ ایسی تھی کہ جمال

سعیدی وقت پر وقت پر بیٹھے بیٹھے ذرا گردن اٹھا کر اپنے لیے بھی اسکرین  
وی اسکرینوں اور ڈیش بورڈ نما حصے کا جائزہ لے سکتا تھا لیکن اس  
کے سامنے بیٹھے ہوئے صمان اس حصے کی موجودگی سے ہی کچھ  
نہیں ہو سکتے تھے۔ گویا میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا کہ وہ ڈیش بورڈ  
بہر حال موجود تھا اور یہ دونوں ٹی وی اسکرینیں اس کے بائیں بازو  
ان کے پاس جو دوسرے ڈاکل اور سونچ ویو نظر آ رہے تھے ان کا  
صرف میں فی الحال سمجھنے سے قاصر تھا۔ بڑی بیک آپ مکان کے  
سامنے سے گزرتی چلی گئی اور دونوں اسکرینوں پر ایک بار پھر صرف  
سڑک کے ایک مخصوص ٹکڑے اور گیٹ کے سامنے کا سطر و خلف  
جس میں کوئی ڈی مداح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شفیع شاہ نے خاموشی سے تخت کی ایک سائڈ کی طرف اشارہ  
کیا۔ یہ سائڈ بھی سامنے ہے۔ نہیں دیکھی جاسکتی تھی لیکن شفیع شاہ  
نے شاید اہل کے فرشتے کی طرح جمال سعیدی کے سرہانے کون  
کھڑے ہو کر دیکھا کہ آگ جھانک بھی کی تھی۔ میں نے جھانک کر  
اس طرف دیکھا جو مردہ اشارہ کر رہا تھا۔ اس طرف میں سونچ کا  
ضرب تھا۔ جمال سعیدی تخت پر بیٹھے بیٹھے مجھے کی طرف ہاتھ جھکا  
کر کوئی بھی سونچ دکھانا سکتا تھا۔ اس سونچ نے گھر میں نہ جانے کیا  
کس سیکڑم کا جال پھیلا ہوا تھا۔ فی الحال ہمیں اس کے کون  
چکڑوں سے دیکھی نہیں تھی۔ ہمارا سب سے بڑا مقصد اس کچھ  
خانے کی تلاش لینا تھا اور ہم یہ سمجھ کر مطمئن نہیں ہونا چاہتے تھے  
کہ ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ ہم نے تمام ناخاندوں کو راستے سے  
خود ہٹا دیا تھا اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارے  
لیے اب یہاں کوئی خطہ نہیں رہا تھا۔

ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا نہایت ہی جلدی سے کیا تھا اور وہ  
خانے کا جائزہ لے کر آئندہ لاخود مکمل طے کر کے ہم جلد از جلد  
یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ غیر ضروری طور پر ہم یہاں ایک  
منٹ بھی رکتا نہیں چاہتے تھے۔ فی الحال ہم جمال سعیدی کے تخت  
کے قریب جس طرح کھڑے تھے اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا  
جیسے وہ کرا نہیں آ رہے تھیں جیفر تھا اور ہم جمال سعیدی جیسے ہانگا  
کے بچے کو تیرنگ ٹنگ ٹھیلے پر لٹائے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے  
تھے کہ اس کا آپریشن کس سے شروع کیا جائے؟ ہم بہت کی کچھ  
بہت گہری تھی۔ ابھی تک اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کے  
گرد کچھ لوگ جمع تھے۔ اس کی چھوٹے سے گہدے سے مشابہہ  
اسی قوت سے پھل پک رہی تھی۔

میں نے شفیع شاہ اور نولی کو اشارے سے سمجھا کر فی الحال  
ہمیں جمال سعیدی کے ہاتھ پاؤں پاندہ کرا اس کے منہ پر بھی نیپ  
دینی چاہیے۔ ذرا ناچنے اشارے سے پوچھا کہ اس کا بھی نیپ  
پاک کیوں نہیں کر دیتے؟ میں نے سرگوشی میں کہا اس کی ضرورت  
نہیں ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں گمن نہیں ہے اور یہ ہمیں دیکھ  
ی شرط کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔



دیکھیں مارے بندوق بڑا دلوں کی باگ زور تو اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسی کی بدایات کے مطابق کسی بھی شخص کی طرف سے زور سامی غلو محسوس کرتے ہی اسے چھلنی کر دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ "زرتاج سرگوشی میں بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے تسلیم کیا "لیکن فوری طور پر میں اس کی طرف سے جان کا کوئی غلو نہیں ہے اس لیے فی الحال ہم اسے نہیں مارتے۔ اندازہ تو میرا یہی ہے کہ یہ موت کا مستحق ہی ہے گا لیکن ہم اسے یہ مزاحمت میں بھی دے سکتے ہیں۔ اگر ہمیں اپنی ذاتی بدالت انصاف سے اس کو موت کی سزا دینے کے لیے دوا بھی کسی حکم کا منصوبہ تیار کرنا پڑا تو کر لیں گے ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" میں سرگوشی میں بات تو زرتاج سے کر رہا تھا لیکن راجیلہ، شفیق شاہ اور نونی بھی کان لگا کر سن رہے تھے تاہم اس دوران میں ہماری نظر جمال سعیدی پر ہی تھی۔ ہماری سرگوشیوں سے اس کی فیند میں کوئی غلط نہیں پڑا تھا۔

زرتاج کندھے اچکا کر کہہ گئی۔ میں نے شفیق شاہ اور نونی کو جمال کے ہاتھ پاؤں باندھنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہماری مدد کو اور سرگوشیوں سے تو بے شک اس کی فیند میں غلط نہیں پڑا تھا لیکن جو بھی شفیق اور نونی اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے آئے چھوٹیں گے وہ بیدار ہو جائے گا اس لیے پہلے اسے قابو میں کر لہا ہی بڑھتا۔

میں یہ بایا کہ شفیق شاہ اور نونی سہانے اور پاؤں کی طرف کھڑے ہو کر ایک دم اس کے ہاتھ پاؤں قابو میں کریں گے جبکہ زرتاج اور راجیلہ بھرتی سے ان کے گرد بندھیں کس دیں گی۔ ان چاندل نے اپنی چھبیں کر سبوں پر رکھ دیں۔ زرتاج اور راجیلہ نے دوسری سہیلہ۔ شفیق شاہ نے اس کے دونوں بازو اور نونی نے پھول کے قریب سے اس کی شستہ نمائشیں اچانک گرفت میں لے لیں۔ زرتاج اور راجیلہ یقیناً خاطر خواہ بھرتی سے اپنا کام انجام دے سکتی تھیں لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

اس لیے گویا کرے میں زور سا اچھا۔ جمال سعیدی کی فیند چینیہ چپ تھی۔ ایک لمحہ پہلے وہ دنیا اچھا ہے بے خبر غروب تھا۔ دیکھ کر آواز میں خراٹے لے رہا تھا لیکن جسم کو ہاتھ تلے ہی چپے اس ہاتھ کے نیچے کا کوئی مٹی دب گیا اور اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس کی آنکھ پہلے کھلی تھی یا وہ حرکت میں پہلے آیا تھا۔

اس کے ملنے سے چپ ہی تواز غلی تھی جس میں خوف کی بھی تھوڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چاندل ہاتھ پھول کو نذر دیا ہٹا دیا تھا۔ شفیق شاہ اور نونی دور جا کر بے حواس حالت میں آواز دے رہے تھے۔ زرتاج اور راجیلہ نے اس کی ایک بھی گہرا ہاتھ ڈال دیا تھا تو پھر اس کی گرفت سے کھل جانا بہت مشکل ہو چکا تھا۔ وہ انھیں کھنسی کا زور ہو گیا۔ ان کے چہرے سے

جسم فولادی تھے اور ان میں بے اندازہ طاقت مضبوط تھی جبکہ جمال سعیدی کے بارے میں میرا۔ اور شاید مرے ساتھیوں کا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ محض کرکٹ اور جہلی کا پناہ تھا۔ اس سے نہ تو بھرتی کی توقع کی جاسکتی تھی اور نہ ہی اس میں کوئی خاص طاقت ہوتی چاہے بھی لیکن اس نے تو ہم سب کے اندازے بے غلط ثابت کر دیے تھے۔

زرتاج اور راجیلہ بھی اس اُٹھانچ کی زد میں آکر جوت کھا سکتی تھیں لیکن انہوں نے نہایت بھرتی سے اپنے آپ کو بچالیا۔ ان سے کہیں زیادہ بھرتی سے جمال سعیدی اٹھ بیٹھا۔ جاتی سائز کے اس گڈے کی طرح جس میں بہت سے اسپرنگ لگے ہوئے تھے اس کی یہ بھرتی اس وقت بھی میرے لیے ناقابل فیند ہوتی جب وہ پوری طرح بیدار اور ہوشیار ہوتا اور اچانک اسے جان کا غلو محسوس ہوتا۔ اس وقت تو وہ کمری بند سے اٹھا تھا۔ آوی خواہ کتنا بھی ہوشیار اور بھرتی ہو ہماری فیند سے اٹھتے وقت کم از کم چند سیکنڈ کے لیے تو اس کے حواس پوری طرح بیدار نہیں ہوتے لیکن اس ہونے نکل نکل کرے جسم میں تو کوئی شیطانی مدد متعین معلوم ہوتی تھی جس میں کسی درندے کی سی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ وہ تو اس طمانیت کے ساتھ سویا ہوا گڈا کہ اپنے محفوظ اور مضبوط قلعے میں آرام کر رہا تھا جس کے گرد خطرناک، جسیادوں سے مسلح محافظ گشت کرتے تھے۔ اچانک کسی خطرے کا سہہ آگیا تو اس کے کوم دنگان میں بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود اپنے ہاتھ پھول پر کسی کی گرفت محسوس کرتے ہی نہ صرف وہ فیند سے اٹھ بیٹھا تھا بلکہ اسے گویا خطرے کی گھنٹی کا بھی پوری طرح احساس ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھیں جن پر سے پونے اوپر کو اٹھاتا اسے گویا ایک مشکل کام محسوس ہوتا تھا اس وقت بھی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ پونے گویا بھوک سے جاٹے تھے۔ تو نہیں کیا جاسکتا تھا کہ صورت حال فوری طور پر اس کی سمجھ میں آگئی تھی لیکن یہ احساس یقیناً اسے فوری طور پر ہو گیا تھا کہ وہ دشمنوں میں گمراہ تھا۔ اس کا ہاتھ فوری طور پر تخت کی دائیں ساڑھ پر گیا۔

وہ یقیناً کوئی سوچ باندے کا تھا۔ مجھے امید تھی کہ سوچ باندے سے اسے اب کوئی اور میسر نہیں آسکتی تھی لیکن میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ جس کا سوچ باندے کا تھا اس کا مصروف کیا تھا اور اسے دبانے کے نتیجے میں کیا ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے تیزی سے قے جھڑ کر اس کی کٹائی پر مبنی کاروت رسید کیا۔ اس کے ملنے سے ہمایک سی فراغت خارج ہوئی اور اس کے پھولے پھولے چہرے پر ہلا کی وحشت آگئی۔ اس لیے وہ مجھے محض ایک قتل حاصل کرنا انسان نہیں بلکہ ایک عجیب المحت حس کا ہمایک درندہ محسوس ہوا۔

اس کا ہاتھ تخت کی ساڑھ سے دائیں اٹھا لیکن میں چپے سے

کنہ سے پرگواہی کی "دستک" دیتے ہوئے بولی "چلو۔ اب پھر  
بھی دلو۔ اتنی خوب صورت کلائی تو نہیں کہ اسے تمام کرٹیں بن کر  
کھڑے ہو گئے ہو۔"

میں نے گردن ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا  
"تمہارے خیال میں کیا میں اتنا گدھا ہوں کہ کلائی خوب صورت  
ہوتی تو اسے تمام کرٹیں بن کر صرف کھڑی رہتا؟"

"صاف کرنا۔ میرے منہ سے غلط بات نکل گئی۔" زرنج  
نے عذرت کی "تم سے بھلا اتنی شرافت کی توقع کیو نہ کر کی جاسکتی  
ہے۔"

راجیلہ اسے آہستگی سے کہنی مارتے ہوئے دھیمی آواز میں  
بولی "دور ذرا سنجیدگی و محتاط تو لحاظ ہو چیسے دنیا کے سب سے  
بڑے نبض شناس ڈاکٹر کیا حکیم ہیں اور اس سولی کلائی میں نبض کی  
باریکیاں تلاش کر رہے ہیں۔"

میں نے کلائی چھوڑ دی اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم  
دونوں کی موجودگی میں دنیا کا کوئی کام سنجیدگی سے نہیں ہو سکتا۔"  
"دنیا کا سب سے سنجیدہ آدمی کہتے دکھ سے یہ شکوہ کر رہا ہے۔"

راجیلہ نے مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس ل۔

میں نے اسے اور زرنج کو اشارہ کیا "تم دونوں کا کام آسان  
ہو گیا ہے۔ اب جلدی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو اور مندرجہ  
شیب چکا دو۔ شکر ہے کہ یہ سزا آخرت پر روانہ نہیں ہوا۔"

پھر میں اس کی کھوپڑی نکل کر دیکھنے لگا تو راجیلہ بولی "اگر  
کھوپڑی پختی بھی ہوگی تو انکسے کے بغیر یہاں نہیں چلے گا عظیم سرخ  
صاحب!"

"تم خاموش رہو فائدہ غار کی جاہل بڑی! ہماری انگلیاں ہی  
انکسے چھین ہیں۔" میں نے دیکھے لیکن شاہانہ سے لمبے میں کل۔

زرنج جلدی سے ٹھوہ لے کر میں راجیلہ سے غائب ہوئی  
"ہالہ۔ چھپیں مظلوم نہیں پرسوں بھی موصوف کو سب اچھا  
سے ملایا دیا تھا کہ ہماری انکسے مشین خراب ہو گئی ہے۔ یہ  
مربانی آکر ذرا تین چار سو مریشوں کا اپنی انگلیوں سے انکسے  
کر جائیں۔ مظلوم ہے موصوف نے کیا جواب دیا؟"

راجیلہ فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "موصوف نے کہا  
ہو گا کہ اس طریقہ کار کے تحت تو میں صرف نوجوان اور صبیح  
خواتین کے انکسے کرتا ہوں۔"

میں نے پلٹ کر خوشخوار نظروں سے اسے گھورا اور جمال  
سعیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ نوجوان اور صبیح  
خاتون ہے؟"

نہیں کہ سکا تھا کہ وہ سوچ دبا لے سے باز رہا تھا اپنے متعدد میں  
کا سیب ہا تھا۔ ٹوٹی اور فٹخ شاہ جو قاتلین پر جا کر گرے تھے خود  
ان کے لیے بھی یہ اپنی زندگی کا ایک حیرت انگیز تجربہ تھا شاید اسی  
لیے انہیں بدلہ ملنا ظاہر کرنے میں ایک دو سینڈ کی تاخیر ہوئی۔ میں  
اس دوران میں نہ صرف جمال سعیدی کی کلائی پر گن کا دستہ رسید  
کر چکا تھا بلکہ ایک ڈانٹنے کے لیے مجھے خیال بھی آیا تھا کہ اسے  
ٹھنڈا کر دیا جائے۔ گن میرے ہاتھ میں تھی اور زرنج کی اس بات  
کی بازگشت میرے ذہن میں تھی کہ بڑائی کی اصل جز تو وی تھا۔ جن  
وحدوں کا ہمیں اس پر شبہ تھا ان کا ختم اعلیٰ اور ان سے تمام تر  
فائدے اٹھانے والا تو وی تھا جن قاتلین اسی لیے بجلی کے کوندے کی  
طرح یہ خیال بھی میرے ذہن میں لپکا کہ اگر ہمارے شہادت کی  
تصدیق بھی ہو جائی تب بھی نہ جانے کتنے سوالات جو اب طلب رہ  
جائے۔ ان سوالوں کے جواب جمال سعیدی سے ہی مل سکتے تھے۔  
جواب خراہ ہم حاصل کرتے یا کوئی سرکاری محکمہ۔ ہر حال ان کا  
سامنے آنا ضروری تھا۔ صرف اسی خیال سے میری انگلی تڑپنے لگی  
دبے دیتے رہ گیا۔

ٹوٹی اور فٹخ شاہ کا رد عمل ایک دو سینڈ کی تاخیر سے سامنے  
آ گیا لیکن وہ اتنا ہی شدید تھا۔ وہ دونوں حیرت انگیز ذہنی ہم آہنگی کا  
مقاہہ کرتے ہوئے بیک وقت اپنی جگہ سے اچھلے اور ایک لمبی زلف  
کا کر جمال سے آکر اسے ٹوٹی کی کر جمال کے سینے پر پڑی اور فٹخ  
شاہ نے اس کے قریب تخت کے کنارے پر پاؤں بٹاتے ہوئے اس  
کے سر پر کرائے کا ہاتھ رسید کیا۔ جمال دھپ سے تخت پر ہی جیت  
گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کی  
حرکت قلب بند نہ ہو گئی ہو۔ ٹوٹی کی فکر کے نتیجے میں ایسا بھی ہو سکتا  
تھا۔ یہ اس کی نہایت خطرناک فکر تھی جو وہ عین دل کے مقام پر  
رسید کر رہا تھا۔

میں نے پک کر جمال کی نبض دیکھی۔ نبض جل رہی تھی۔  
اس کے سینے پر چہلی کی جو محسوس نہیں انہوں نے بیچ خرب کی  
شدت کو کم کر دیا تھا اور ویسے بھی وہ غیر معمولی طاقت اور قوت  
مداشت کا مالک معلوم ہوتا تھا اور نہ بیک وقت کھوپڑی پر فٹخ شاہ کا  
کرائے کا ہاتھ اور سینے پر ٹوٹی کی یہ خاص فکر کھانے والا شخص  
مشکل سے ہی بچ سکتا تھا۔ وہ دونوں تخت سے اتر کر اب بھی تیار  
کھڑے تھے کہ جمال ذرا بھی حرکت کرے تو وہ اس پر کوئی اور داؤ  
آزما نہیں کھدے۔ ہوش ہی رہا۔ زرنج اور راجیلہ اس دوران میں  
اپنی محسوس کر سبوں سے اٹھا چکی تھیں اور تذبذب کے عالم میں  
کھڑی تھیں کہ اب وہ کیا کریں؟

میں چند لمبے جمال کی کلائی تھا سے ہی کھڑا رہا۔ میں اس کی  
نبض کے بارے میں اطمینان کر لیتا تھا تھا کہ کس دور چہ سینڈ کی  
تاخیر سے توڑنے والی نہیں تھی؟ زرنج اس عالم میں بھی قہرے  
بازی سے باز نہیں رہ سکی اور انکسے ہاتھ کی انگلیوں سے میرے

میں نے بھی زیادہ دوسرے گھر رسید نہیں کی تھی۔ "مٹنی نے بھی گویا مستانی پیش کی۔  
 "اب تو تم کی کمر گے۔" راجیلہ نے پھٹی سے جمال سعیدی کے پاؤں یا ٹیکوں کی ڈوری سے باندھتے ہوئے کہا "حالا کہ سیزان کی طرح آؤ کر بے چارے کے بیٹے سے گھرائے قصہ نہ جانے بے چارے کے بچے سے مصوم دل پر کیا کڑی ہوگی۔"  
 "ہوش میں آئے گا تو پاس بچہ کر محبت سے پوچھ لینا۔" لونی چلے گئے سے انداز میں بولا۔

جمال سعیدی کے بے ہوش ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کے اچھڑانے کی طرف بندھنے کے بجائے اس کی پشت پر باندھ گئے۔ شفیع شاہ نے اسے تھوڑا سا الٹ پلٹ کیا اور زرتاج نے اس کے ہاتھ پیچھے لاکر باندھ دیے۔ اسے کونٹ کے تل لٹا دیا گیا اور ہونٹوں پر نیپ چپکادی گئی۔ میرے ساتھی نہایت ماہر انداز میں اس کام سے قانع ہو چکے تو میں نے راجیلہ اور لونی سے کہا "تم دونوں دوبارہ اور کی منزل پر چلے جاؤ اور جو بالکل مکان کے چاروں طرف موجود ہے اس میں سامنے کی طرف دونوں کونوں پر کھڑے ہو جاؤ۔ تمہارے پاس دو درتیں بھی موجود ہیں۔ ان کے ذریعے پونہ رشتی دھڑ اور پربائی دے دونوں طرف سے اس مکان کی طرف آئے والی سڑک پر نظر رکھو۔ مکان کے اندر تو ہم نے ہر خطرے کا مستیا کر دیا ہے یا اس پر قابو پایا ہے لیکن باہر سے کوئی خطرات نہ ہو سکتا ہے۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر کی طرف چل دیے۔ میں شفیع شاہ اور زرتاج بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی باہر آئے۔ پہلی پل میں پہنچی کروہ سڑکیوں سے اوپر چلے گئے اور ہم تینوں نے غارے کے اس سٹاؤن تک دوڑنے کے سامنے رک گئے جو بھلا ہر ایک بہت ہی پریشانی نظر آتا تھا۔ میں نے وہ سوچ دیا جس کے ذریعے میں نے اس دواؤں کو بندھنے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک بار سوچ دبانے سے دوا نہ کھلا ہوگا۔ دوسری بار دبانے سے بند ہوتا ہوگا۔

میں نے اس سوچ کو کئی مرتبہ دہرایا لیکن دواؤں سے میں جنبش تک نہ ہوئی۔ میں کچھ کچھ سنا گیا۔ جس شخص کے لیے اتنی تک دوا کی تھی اور کل از دوتی جس کام کے سلسلے میں ہم خاصا خون بہا چکے تھے عیاں وہ تختہ جمیل عیاں رہا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے اپنی خوشامی سے دلیدہ پہونتا محسوس ہوا۔ میں نے اس روز پر موجود تمام سیڑیوں کو کئی کئی بار دبا کر دیکھا لیکن کسی سے کوئی لاٹ نہ آئی تھی۔ ہو گئی اور کسی سے کوئی بچھا چلا اور بند ہو گیا۔

زرتاج اور شفیع شاہ پھر ہی غلوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے لہجے کپ پر غصہ آئے گا کہ میں نے کھیں فرض کر لیا تھا کہ جس سوچ سے میں نے دوا نہ بندھوے دیکھا ہے وہی سچے کلمے کا؟ اتنی محنت کی بددلتی جو سے سامی کم ہضم ہو سکتی

تھی۔ مجھے جمال سعیدی کے تختہ دالے کرے میں موجود تھا خیال آتا تھا۔ شاید ان میں سے کسی سوچ کو دبانے سے وہ غلوں دوا نہ کھلا ہو لیکن اس کی تلاش میں ہم تمام سوچوں کو کھینک کر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مجھے وہی اندیشہ تھا کہ نہ جانے کسی سوچ دبانے سے کیا ہوتا ہو۔ جمال بھی بائانی شخصیتوں سے کچھ نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے ٹھکانے پر کیا کیا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ تو دشمنوں میں گھر جانے کے بعد اپنے ساتھ دشمنوں کو بھی سامنے کی فرض سے خود کشی کا بندوبست بھی کر کے رکھ سکتے تھے۔ سوچ دیا اور پورا مکان دھماکے سے آڑ گیا۔ خود اپنا وجود دھماکا گرفتاری کے لیے آنے والے افراد اپنے جرائم کے ثبوت سمیت کچھ ایک لمبے میں پائی ہو گیا۔ اس قسم کے لوگوں کے ذہن کی کوئی خطرات پر کام کرتے ہیں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں جاسکتا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک الگ سی کس ہوتا ہے۔ صرف ایک اندیشہ مجھے تمام سوچوں کو دبانے سے باز رکھے ہوئے تھا۔ کوئی سوچ کہیں کسی اور کو خطرے سے خبردار کرنے کے لیے بھی ہو سکتا تھا۔ مزید گڑبڑ یہ ہو گئی تھی کہ شفیع شاہ اور لونی کے ہاتھوں جمال سعیدی بھی بے ہوش ہو چکا تھا۔

"لیکن میں چل کر جمال سعیدی کی پانچویں دیوڑی سے پوچھ چکی کہ اسے یہ دوا نہ کھلنے کا طریقہ معلوم ہے یا نہیں۔" میں نے کہا اور جھجکا ہٹ میں اس بیڑی سیڑی پر ایک سیڑی رسید کی مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میری ٹانگ البتہ جھجکا کر رہ گئی۔

ہم تینوں اٹھنے ہی لیکن کی طرف چل دیے۔ راستے میں زرتاج نہایت پر خیال انداز میں پہلی "میں سوچ رہی ہوں جمال سعیدی کا باقی چار بیڑیاں نہ جانے کہاں ہوں گی؟"  
 میں نے اسے گھورتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی محبت فرما رہا تھا۔ ہم یہاں جان پر کھیل کر کیا معلوم کرنے آئے ہوئے ہیں اور انہیں یہ جاننے کی فکر پڑی ہوئی ہے کہ اس شخص کی باقی چار بیڑیاں کہاں ہیں۔"

"یہ بھی کوئی کم اہم بات تو نہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے۔" زرتاج نے اپنے منہ کو کاغذ کا ٹکڑا لپیٹ لیا۔ "ہاں۔ واقعی۔" میں نے جل کر کہا "مترتب مالی پاسہ اسی کچے کے گرد گھومنے کی کہ جمال سعیدی کی باقی چار بیڑیاں کہاں ہیں۔ میری دعا ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں آرام سے ہوں۔ شاید جمال کے دھن میں ہوں۔"

"پھر بھلا آرام سے کیسے ہو سکتی ہیں۔" زرتاج نے کہا۔ "شاید وہ جہاں سے ہوں۔ اور اگر میں ہیں تو۔" تمہارا کہہ دیاں پہنچ جائیں۔" میں نے کہا "میں اس کی پانچویں دیوڑی سے غارے کے دواؤں کے بارے میں پوچھیں گے تم اس سے اس کی سڑکیوں کے بارے میں پوچھ لینا۔"  
 ہم کچھ کچھ چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں عورتیں

ہر بات تو ہم اسی کے من پر پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے تھیں یہ بات طے تھی کہ اس سے ہمیں آسانی سے یہ اتنی سی بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر شاید ہمیں انتہا پسندوں والے طریقے آزمانے پڑے۔

میں نے اس کے تخت کے قریب جبکہ کر شخ سوجھ دیا اور دوسرے ہی لمحے واقعی کچھ قائلے سے خفیہ سی گھر گھاٹ کی آواز ابھری۔ ملازمہ کی اطلاع درست ہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دروازہ کھولنے کا سوجھ بھال تھا جبکہ بند کرنے کا سوجھ بھال خاتمے کے قریب ہی تھا۔ ہم تیزی سے وہاں پہنچے پڑا سا دروازہ واقعی کھلا تھا۔ پیشنگ نائب ہو چکی تھی۔

ہم تیزی سے بیڑیاں اتر کر نیچے پہنچے تو ایک اور دروازہ عمارت سے کھلا تھا لیکن یہ لوہے کا ایک عام سا دروازہ معلوم ہوتا تھا اور اس میں ایک عام سادی لٹائی ہوئی تھی۔ شفیع شاہ نے اس پر گن سے دو قاز کے اور دو ٹوٹ گولہ دروازہ کھولنے وقت مجھے بھی اپنی دھمکیاں دے کر تیز محسوس ہوئی۔

اندرونی کر بہمنے دیکھا کہ ایک نہایت کشادہ اور صاف ستھرا دروازہ تھا اور اس کے پیشتر حصے میں چھت تک لکڑی کے بڑے بڑے صاف ستھرے نئے صندوق اوپر رکھے تھے ان پر ہمیں کی

حالت میں پہلی قسم جس میں ہم انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ارمیلا اب بھی ایک جگہ اصرار کمال کی لاش کو دیکھ رہی تھی اور اس کے پہلے سے رخساروں پر آنسوؤں کی گہری کھدیں میں سوچے بغیر نہ رہا کہ اگر اصرار کمال کی جگہ حال سیدی کی لاش پڑی ہوتی کیا یہ بھی اس خوفزدہ حینہ کے رخساروں پر آنسوؤں کی گہری کھدیں ہوتیں؟ وہ دونوں ہمیں دوبارہ آنے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئیں۔ میں نے بڑے کھانے کے ہوٹلوں سے ٹیپ ہائی اور اکھر اپنے لوگوں والے لیے یہ بھی ہوئی سی ادویہ میں پڑھا "تمہیں خبر ہے کہ اوہر جو دروازہ خانہ ہے اس کا دروازہ کچھ کھلا ہے؟"

اس نے خوفزدہ انداز میں سر ہلایا۔ میرے ایک ہاتھ میں کی تھی۔ ذرا پیچھے جا کر دوسرے ہاتھ سے میں نے چوکت میں دست خیز ایک ٹیکے سے نکال لیا۔ دونوں چیزوں کو معنی خیز انداز میں ہاتھوں میں اٹھ پلٹ کر دیکھنے کے بعد میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم سے ٹیک ٹیک بات کرو۔" میں صرف تمہیں "نازعات اور حرکات و سکنات سے اسے دہشتزدہ کرنے کا کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں حقیقت میں اس پر کوئی اس قسم کی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میرے دل اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ بڑے خیال میں واقعی اسے وہ بات معلوم نہیں تھی جو میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

وہ اس وقت کچھ اور خوفزدہ ہو چکی جب میں نے اس کی رفتار قدم بڑھایا۔ وہ تیزی سے لٹی میں سر ہلے ہوئے عرض کیا "میں لٹی" "تھوڑی قسم مجھے نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو فوراً تمہیں مجھے اس مکان سے یہاں کے خاندان سے کسی بھی رشتے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

اسی کے ملازمہ نے "اور اس طرح" کی سی آواز میں نکالے ہوئے ہاتھ پیچھے کر دی ہو کہ میرے من سے ٹیپ ہٹاؤ نہیں بتائی ہوں۔ بے نیلے تالی سے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ چٹائی جس پر وہ گراہ رہی تھی بھرا چنے کے سے انداز میں بولی "تمہیں تمہاں کو کچھ کھانے کی سہولت ہے۔" میرے کو معلوم ہے۔

مکے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے کتھی چلی "مصاب جس تخت پر بیٹھا ہے اس تخت کے ایک طرف میں اٹھتا ہوں۔ بال رنگ کا کفن ہوتا ہے۔ خاندان کا دروازہ کھل جائے۔ وہ خود اس کا کفن کو کچھ مت پوچھو۔"

"یہ بات غلط نہیں ہوئی تھی۔" میں نے ملازمہ کو گوارا دیا۔ "تمہیں نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہو لٹی ہوں۔ میرے کو ہم سے یہ خوف کھ کر نہ لے۔"

مکے نے جلدی سے ان دونوں کے ہونٹوں پر دوبارہ ٹیپ چٹائی۔ ایک بار پھر حال سیدی کے کمرے میں آئے۔ وہ بدستور ہے۔ اٹھ کر ہمیں اتنی آسانی سے دروازہ کھولنے کا طریقہ معلوم

### تاریخی ناول

- |                        |                      |
|------------------------|----------------------|
| خالد بن ولید           | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| سلطان شیو شہید         | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| نواب حیدر علی خاں      | الماس ایم۔ اے۔ / 200 |
| سلطان صلاح الدین ایوبی | الماس ایم۔ اے۔ / 450 |

مکتبہ القریش اردو بازار۔ لاہور 2



پٹیاں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ اسٹیشنل کے ذریعے چمپے ہوئے  
حرف میں ان پر پٹس انڈسٹریز کا نام اور پتہ درج تھا۔ صندوق کی  
وہ تقاریر زیادہ بھرتی پر نہیں تھیں جی اس پر سے ہم نے وہ صندوق  
آگے لے کر کافی دیر تک اس میں آگے لے کر اس میں ہم تینوں کی خاصی  
وقت صرف ہوئی۔

انہیں کھانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس قسم کے امکانات کو  
ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اپنے ساتھ بھی چند سادہ سے اوزار لائے  
تھے لیکن انہیں استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ خانے کی  
ایک دیوار پر لکڑی کے ٹیبلوں میں نہایت عمدہ قسم کے بست سے  
اوزار موجود تھے۔ چھٹا میبل یہ صندوق صرف ذخیرہ ہی نہیں کئے  
جاتے تھے بلکہ انہیں کھولنے یا پیک کرنے کا بھی انتظام تھا۔ ان  
کے ڈھکنے۔ یا پل کھانا ہے کہ اوپر کے تختے پر ایک غیر ملکی فرم  
کا نام چھپا ہوا تھا۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ بھی تھی کہ ان پر  
پینٹڈ فریمو کے اسٹنڈرڈ بھی چمپے ہوئے تھے۔

ہم نے پلا صندوق کھول کر اس میں جھانکا تو جانتے ہی نہ  
گئے۔ نہایت عمدہ قسم کے پینک میٹرل کے ذریعے اندر خانے بنے  
ہوئے تھے اور ہر خانے میں صاف تھری پمپتی ہوئی پی کا شکر  
رکھی تھی۔ صرف اوپر کے خانوں میں پانچ تھیں تھیں۔ صندوق کی  
ساخت پتہ ہی تھی کہ اس سے بچے بھی کئی خانے موجود تھے۔ ایک  
لمبے کے لیے ہم تینوں ساکت کمرے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے  
نہ گئے۔ پھر ہم نے وہاں موجود دست سے صندوق پر نظر ڈالی اور  
پوری مدد کی گرائیوں تک میں ایک سرور لیٹر آئی۔ بہت سی  
حقیقتوں کے بارے میں ہم سمجھ رہے ہیں پڑھ رہے ہیں۔ اس  
کے باوجود ان کی عقل کا صحیح طور پر احساس نہیں ہوا۔ لاشعور کے  
کسی تاریک گوشے میں ہم اپنے آپ کو فریب دیتے رہے ہیں کہ  
شاید یہ حقیقت نہیں، لہذا ہے لیکن حقیقت کو اپنی آنکھوں سے  
دیکھنا کہ اور ہی اثر رکھتا ہے۔

ہم نے وہ سرا صندوق کھولا تو اس میں اسی طرح اوزی تھیں  
رکھی دکھائی دیں۔ یہ مختلف ملکوں کی تھیں لیکن حیرت کی بات  
یہ تھی کہ صندوق پر چھپا ہوا غیر ملکی فرم کا پتہ نہیں ایک ہی تھا۔ پھر  
ہم نے چیک کیا تو جتنے بھی صندوقوں کے بالائی تختے پر ہم نظر ڈال  
سکے ان پر اسی فرم کا نام چھپا ہوا دکھائی دیا۔ صندوقوں پر چمپے  
ہوئے اسٹنڈرڈ کے ذریعے ہماری معلومات میں مزید اضافہ ہوا کہ یہ  
سارا "مال" امپورٹ انکسپورٹ کارپوریشن کے توسط سے منگوا یا  
گیا تھا لیکن انہوں نے یہ پٹس انڈسٹریز کے لیے امپورٹ کیا تھا  
اور صندوقوں پر اسی کے نام دے کر نمائیاں کیا گیا تھا۔ یہ کچھ عجیب  
سی بات تھی۔ لیکن اس پر بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں  
ایک وقت میں اتنی زیادہ تعداد میں اسٹنڈرڈ موجود تھا۔ یہ دھندلہ  
جائے کب سے اسی جائے پر جاری تھا۔ آئی فکرت سے نہ جانے  
کتنا اسٹنڈرڈ گراؤں گراؤں میں کھپا یا جائیگا تھا اور حال سبھی  
یہ اس...

کتنے لوگ جھوٹے پتے جانے پر حسبِ موقع یہ دھندلہ کر رہے  
اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ خطرناک ترین جھوٹا  
کلی پیلے ہوئے تھے۔ جھوٹوں تک میں پچھے ہوئے تھے  
معاشرے کی بنیادوں میں آتش فشاں ملی رہے تھے اور اسی کا  
نتیجہ آئے دن دیکھنے میں آ رہے تھے۔ لوگوں میں اس کے اندر  
طلب پیدا کر دی گئی تھی اور وہ کدوہ کدوہ اس کے خریدار تھے  
سوچ کر بھی جھوٹ ہی آتی تھی کہ یہ چل نہیں کس انجام کی لڑ  
لے جا رہا تھا۔ کئی دوسرے ملکوں کا انجام دیکھ کر بھی ہمارے  
کے لوگ اس سے سبق حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہم  
اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی آنکھوں پر طرح طرح کے قصبات  
کی پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔

ہم شاید کچھ دیر اور اسی طرح تم صم کمرے ان صندوقوں  
دیکھتے رہے لیکن اچانک ٹوٹی ہوئی دھندلہ خانے کے بالائی صندوقوں  
تک پہنچا اور گویا ایک ہی وقت میں نیچے آگیا۔ وہ جب ہوا تو اس  
سائنس پھولی ہوئی نہیں تھی لیکن لمبے میں دبا دیا بیجان ضرور خاص  
سپرانی دے کی طرف سے دو ٹوک آئے دکھائی دے رہے تھے۔  
مڑک کی خراب حالت کی وجہ سے ان کی رفتار سست ہو گئی تھی  
خیال ہے وہ اسی مکان کی طرف آ رہے ہیں۔ ان پر بہت سے بالائی  
قسم کے افراد لدے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔  
آ رہے ہیں۔ یہ بظاہر ممکن تو نظر نہیں آتا لیکن نہ جانے کون  
محسوس ہو رہا ہے کہ کسی طرح ان لوگوں کو یہاں گزیرنے کی اطلاع  
مگنی ہے اور وہ یہاں والوں کی مدد کے لیے آ رہے ہیں۔ شاید  
سیدی کے لیے کمک آ رہی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں ہم  
کریں تو ہمیں پوزیشن سنبھال لینی چاہیے۔

میں نے اسے دیکھا اور پلٹے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں  
ساتھ ہی رفتار سے اوپر چمپے۔ راجہ اور ہی موجود تھی  
اب وہ بالائی کے بجائے ایک کمرے میں تھی اور کمرے کے  
کھلے پٹ سے دو درمیں کے ذریعے سپرانی دے کی طرف سے  
ہوئے دو کھلے ٹوکوں کو دیکھ رہی تھی جو دیکھ بھی دکھائی دے رہے  
تھے لیکن میں نے ٹوٹی سے دو درمیں لے کر دیکھا تو وقت دیکھا  
ٹوٹی کا خیال درست تھا۔ ان میں سے جتنے لوگوں کے جسموں  
کے ذریعے صاف دکھائی دے رہے تھے ان سب کی نظریں  
طرف تھیں۔ ان چوہوں پر ایک عجیب سی وحشت تھی اور وہ  
اٹھائے گویا عاجز جنگ کی طرف آ رہے تھے۔

**جرمن رپورٹر**  
پروفیسر محمد اشرف قیامت

میں نے صرف ایک لمحے سوچا۔

ہم سب کے پاس ہلکے ہتھیار تھے لیکن یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے جن مسلح محافظوں کو لٹکانے لگایا تھا ان کے ہتھیار ہمارے کرم مقابلے پر ہم سب سے تھے۔ یہ خانے میں بیٹے ہتھیار بڑھتے تو ایک چھوٹی سی فوج کو مسلح کرنے کے لیے کافی تھے۔

راہد خانی کے وہاں موجود بعض خیلوں میں ایجوکیشن بھی ہوگی۔ آتے والوں کی تعداد سے بھی میں خوف زدہ نہیں تھا اور مجھے اہم تھا کہ میرے ساتھی بھی ان باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس لحاظ سے بھی ہم ناکامی میں تھے کہ ہم ایک مہینہ اور قریب مکان میں تھے۔ ہم اس میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ سکتے تھے اور صبر تک مقابلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ اس مکان کی تعمیر میں یقیناً بڑے امکانات کو بھی محفوظ رکھا گیا تھا۔ فریسیک وہاں رکنا یا مقابلہ رہنا ہمارے لیے کوئی ایسا خوف زدہ کرنے والا مسئلہ نہیں تھا۔

مسئلہ صرف یہ تھا کہ یہ سب کچھ ہماری معلوماتوں کے خلاف ہے۔ ہمیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی اس میں کوئی فائدہ تھا۔ خواہ مخواہ اپنے اوپر حالت جنگ طاری کرنا ہی فخر میں بہت بڑی سماعت تھی۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ ہم کے معاملات میں ہم ایسے تصادم سے پرہیز کر رہے ہیں جس میں بہت شور مچا رہا ہو۔ لوگ اور ادارے ہماری طرف دہریوں اور چاقیوں کے ساتھ ساتھ خود ہمارے کو یہیں کے بھی سباز دہی ہونے کا امکان موجود ہو۔

میں خود اپنے ساتھیوں کو متنبہ کرتا رہتا تھا کہ اس قسم کے آدم کی فوج تو صرف شدید مجبوری کی صورت میں آتے دیئے گئے مطلقاً اگر کسی ہم چاہوں کی طرح کسی "چوہے دان" میں لے جائیں اور جان پر آگنی ہو تو پھر اس چوہے دان سے نکلنے کے لیے ہم کو تصادم میں لایا جاسکتا تھا اور نہ ہر حال میں ہماری پہلی ہتھیار ہوتی تھی کہ یہ کیمت خاموشی سے اور بظاہر سکون سے نہیں اپنا مقصد حاصل کر لیں۔ اگر دشمنوں کو لٹکانے لگا دیں تو اس طرح لٹکایا جانے کو زیادہ شور مچا رہا ہو۔ لوگوں کو بعد ہی پلے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ ہماری کارروائی کے دوران کسی کی توجہ اس طرف مبذول نہ ہو۔

جب ہم اس گم پر روانہ ہونے کے سلسلے میں میٹنگ کر رہے تھے تو اس نے اپنے ساتھیوں کو اسی معلوم کا پیکر بنا دیا تھا۔ اس نے ہم پر عمل درآمد زیادہ ضروری محسوس ہوا تھا۔ صرف اس کے لیے ہمیں اسے ان ساری باتوں پر غور کیا۔ اپنے ساتھیوں کو اس کے بارے میں پلے۔ ایک لمحے کی مناجات نہ کرو۔ سب کچھ جس جلدی میں اس طرح چھوڑ دو۔

مجھے اپنے اصل مقصد پر اصرار ہونا تھا۔ ہمیں جو کچھ دیکھنا تھا وہ ہم ہاتھ نہ لگانی تھی اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے تھا اس پر بعد میں

قسم کے ہنگامے میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ساتھی میرا حکم سن کر ایک لمحے کے لیے ہچکچائے لیکن پھر شاید ان کے ذہن میں میری ہدایات اور ہماری طے شدہ "پالیسی" تازہ ہو گئی۔ ہم کوئی قبائلی ہتھیار اکیلوں کی بوچھاڑوں کے ذریعے لٹکانے کی غرض سے یہاں نہیں آئے ہوئے تھے۔ ہم بجلی کی سی تیزی سے چپے آئے اور جس راستے سے مکان میں داخل ہوئے تھے اسی راستے سے انتہائی ہمتی سے نکل گئے۔

سب سے آخر میں میں نے قہقی دروازہ پر چڑھ کر بیڑھی اور کھینچی اور کایک کی پھرت پر کوڑے کو گھما دیا۔ ڈرائیور ٹرک اسٹارٹ کر چکا تھا جو بظاہر کھٹار تھا لیکن اس کا انجن بہت مدت سے مرہ حالت میں تھا۔ چند لمحے بعد ہی ہم پہلے کی طرح مزدوروں کے سے انداز میں ٹرک پر بیٹھے تیزی سے داخل ہمارے تھے۔ روانہ ہوتے وقت ہم اور ٹرک اس کایک کی آڑ میں تھے جس میں ہم نے مسلح محافظوں کو بے ہوش یا ہم مرہ کر کے کاٹھ کباڑ کی طرح پھینکا تھا۔ سامنے والی سڑک کی طرف سے ٹرکوں میں آنے والے افراد ہمیں کم از کم روانہ ہوتے وقت نہیں دیکھ سکے ہوں گے۔ ہمیں صرف اتنی سی معلومت درکار تھی کہ ہم اس مکان سے زوردار ہو جائے۔ اس کے بعد کوئی ہمیں دیکھتا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم کیا کر کے آ رہے تھے۔

جلدی ہم پونہ درستی دروازہ پر جا پہنچے مکان اور اس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کچھ دیر پہلے ہی ہماری نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ٹرک شاید اب مکان تک پہنچے ہوں۔ ابھی ان ٹرکوں پر سوار افراد کو مکان میں داخل ہونے اور صورت حال کو سمجھنے کے لیے بھی کچھ وقت درکار تھا۔ اچانک مجھے عقب میں بہت دور سے گاڑی کی خڑا ہٹ سنائی دی۔ فاصلے کی وجہ سے ہمیں وہ تو آدیں بھی سنائی دیں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا مرکز وہ مکان ہی تھا۔

میں طمانیت سے مسکرا دیا۔ ہمارے اندازے اور ہماری حکمت عملی درست ہی رہی تھی۔ دونوں ٹرکوں میں میرے ہونے وہ افراد اس مکان کی طرف ہی آ رہے تھے۔ اگر ہمیں یہ اندازہ لگانے میں تاخیر ہو جاتی یا ہم ان کی آمد سے بے خبر رہتے تو ہم اس مکان میں محصور ہو کر نہ جاسکتے۔ ہمیں باہل ناخواست اور بلا ضرورت ان سے مقابلہ کرنا پڑا اور اس دوران میں ہمارے جنگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی جس کا انجام نہ جانے کیا ہوتا۔

اب وہ لوگ شاید مکان کو گھیرے میں لے کر آتے ہی طور گاڑی کر رہے تھے کہ اندر سے کوئی جواب آئے تو وہ باقاعدہ جنگی قسم کی کارروائی شروع کریں۔ انہیں اندازہ تک نہیں تھا کہ ان کے مطلوبہ افراد اب مکان میں موجود نہیں تھے۔ یہ معا میرے لیے بھی واقعی حیرت کا باعث بنا ہوا تھا کہ آخر وہ اس طرح اچانک کیے کر کہیں پہنچے تھے؟

مواکف فون پر ہی ہوا۔

”تم اس وقت کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے؟ یہ اتنی تیزی سے کیوں بول رہے ہو؟ تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے؟“ اس نے اطمینان سے پوچھا۔  
 ”کیا اچھی بات ہے کہ ایک پولیس والا بھی پولیس سیکر میں سوال کر رہا ہے۔“ میں نے اب جسم کو ذرا ڈھکیا اور سر کے پٹے سے ٹپک نکالتے ہوئے کہا ”تمہارا اندیشہ درست ہے۔ پولیس تو ظاہر ہے شریوں کے پیچھے ہی لگی رہتی ہے۔ جس کے اسے لگتا ہے ان کے آگے لگی رہتی ہے۔“  
 ”شروع ہو گئے۔!“ وہ غرایا۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔ اگر تم یہی طرح جواب دے دیتے تو مجھے شروع ہونے کی ضرورت نہیں نہ آتی تھی۔“

”میں اس وقت ایک رستوران میں ہوں اور وہاں ایک صاحبان کے ساتھ کھانا کھا رہا ہوں۔“ اس نے گویا خود بخود بولنے شروع کر دیے۔

”صحت خوب۔ تم لوگ کھانے میں ہی گئے رہنا۔ شکر اہلابلاب لے جائے۔“ میں اسے مزید چھڑنے بھڑنے نہ دیکر کہتا ہوں۔ ”تم اپنا کچھ اس کا شوق بعد میں پورا کر لیتا۔ میں اپنی فون کر رہا ہوں۔“ وہ شاید اندر ہی اندر مل کھا کر لیکن کچھ بھی بڑا قرار دیکھتے ہوئے ہوا۔

”مخصوصہ۔ مخصوصہ۔ میں تمہیں ایک بہت اہم بات بتانا ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ بھی اچھا ہے کہ اس نے اپنے دو چھوٹے موٹے اصرار کے ساتھ بیٹھے ہو۔ شاید اسے کوئی تمہارے کام پر آجائے۔ میں تمہیں ایک بہت اہم بات دے رہا ہوں جس سے تمہارا اہم مقام اصرار ہلاکی ختم ہو سکتا ہو۔“ اس نے ذرا رعب ابلاغ سے تمہیں جو قدرت ملے گی کے علاوہ ہوگی۔ اگر مجھے کی مالی حالت بہتر ہوگی تو شاید کچھ سوا اہتمام بھی مل جائے۔“

”مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں ہے۔“ وہ بے پروا ہوا۔ ”میں ملے و ستاکش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر کام کر رہا ہوں۔ اصل اہمیت کام کی ہوتی ہے۔ اس کام سے اس ملک کو کچھ فائدہ ہو جائے اور میرا خیر طمانیت محسوس کرنے لے صرف یہی ملے رہا ہے۔ تم یہ تمہید مت دینا۔ بات تازہ۔“ وہ اپنے لیے میں خصوصاً چشمہ روانہ سوچنے لگے کی کو خوش کر رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اسے سچے دل سے پوچھ رہی تھی۔

”اس کے لیے تمہیں دس روپے ملے گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں کچھ دے کر کام کرنا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں کچھ دے کر کام کرنا ہے۔“

مکان کے باہر اور اندر موجود مسلح محافظ تو بیٹھتے سے پہلے ہی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے یا بے ہوش ہو گئے تھے۔ شمال سیدی احمد کمال اور ملازمہ کو بھی کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہم نے انہیں اپنی سمت نہیں دی تھی کہ وہ کسی بھی ذریعے سے کسی کو کوئی اطلاع دے سکتے۔ شمال سیدی کو البتہ جب ہم قابو میں کرنے لگے تھے تو اسے ایک سوچ تک ہاتھ لے جانے کا موقع مل گیا تھا لیکن میں جین سے نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اسے دبانے میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں؟

اگر میں فرض کر لیتا کہ وہ اسے دبانے میں کامیاب ہو گیا تھا تب بھی یہ سوچنا کچھ عجیب سی معلوم ہوتا تھا کہ وہاں سے کتنی دور موجود کچھ افراد اس کے ذریعے خطرے سے آگاہ ہو گئے تھے۔ دوسرا امکان یہی نظر آتا تھا کہ مکان میں موجود کوئی نہ کوئی فرد ہماری نظر سے اوچھل رہے ہیں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے ہمیں چھپے ہوئے کسی ذریعے سے ہمیں خطرے کی اطلاع دی تھی۔ دوسری یہی فون نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ٹیلی فونوں کی آدیں ہم نے کاٹ دی تھیں اور مکان میں ٹیلی فون سیٹ بھی ہم نے ایسی جگہوں پر رکھے دیکھے تھے جہاں وہ ہماری نظر میں رہے تھے۔

مزید حیرت کی ایک بات یہ بھی تھی کہ اس مکان سے اگر کسی طرح اس نامعلوم مقام پر خطرے کی اطلاع پہنچ بھی جاتی تو وہاں سے اتنے بہت سے افراد اسلحہ اٹھا کر یوں سرعام اس کی تلاش کرتے ہوئے فوری طور پر ہمد کے لیے پہنچ سکتے تھے۔ یہ بڑی غور طلب سی بات تھی بلکہ بہت سے لوگوں کو اس پر فکر مند ہونا چاہیے تھا لیکن فکر مند ہونے کے لیے شاید بے جا ہمارے عام آدمی نہ گیا تھا جنہیں درحقیقت اس قسم کے سامنے ہر فکر مند ہونا چاہیے تھا انہیں اپنے ہی پتھروں سے فرصت نہیں تھی۔ انہوں نے فکر کچھ بلکہ شاید ملک کو ہی اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

فی الحال اس سب سے میں سرکپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ پونڈروشی موڈ پر ایک درخت کے نیچے میری گاڑی ہماری نظر تھی۔ ہم ترک سے اتر کر جلدی سے اس میں چڑھ گئے۔ اپنے گیت اپ کی جن جن چیزوں سے ہم بچنا چاہتے تھے ہم نے ہلا دی۔ میں نے اپنی بگڑی اتار دی۔ سوچیں اور مستان کوچ کر پھینک دیا تاکہ اس گاڑی میں بیٹھ کر ہم فائدہ عجیب فائدہ آئیں۔ اس گاڑی کو جس شخص نے اب تک سنبھالا ہوا تھا وہ ترک میں ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا اور ترک صفورا چرگ سے ٹھیک گیت کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنا راستہ بدل لیا تھا تاکہ ہمارے لیے اس کے درمیان بائیس کی کوئی تعلق نظر نہ آئے۔

گاڑی کی ڈرائیور گیت سیٹ فلیج شدہ نے سفید اور ہم شرکی طرف والیں روانہ ہو گئے۔ میں نے ذیل بورڈ سے مواکف فون اٹھایا اور دیکھ لیا کہ رابطہ کیا۔ اس سے رابطہ بھی اس کے

ہے تو سوچنا ہے کہ کاش وہ اس کا خاتمہ کر سکتا۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میرے سوال سے کوئی جاہ نظر نہیں آتا۔ میں یونہی رحیم گل کا قاتل نہیں تھا۔ پولیس کے ہتھکے میں تو دور کی بات تھی اب تو دہائی رہنماؤں میں اس قسم کے لوگ نایاب ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی یہ غلطی تھی نہ جانے کتنی سائنس کی سستی تھی کہ وہ پانچ دہائی سے صرف پولیٹی نہیں بننا تھا بلکہ گرو پیس پر بھی نظر رکھتا تھا۔ جو چیزیں اس کے فرائض کے دائرے میں نہیں آتی تھیں ان کے بارے میں بھی غور رکھتا تھا۔ آج کل تو اپنے فرائض ہی دانت داری سے انجام دینے والے نایاب ہوتے جا رہے تھے چہ جائیکہ کوئی اتنا "فاضل و درو" اپنے دل میں پانا تھا۔

میں نے اندر ہی اندر بے پناہ اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا "میں تو پھر کچھ لو کہ تمہیں میرے علاوہ بھی کوئی چارہ نظر آئے والا ہے۔ یہ دوسری قسم کا چارہ ہو گا۔ سرسبز قسم کا چارہ۔ جی بھر کے چرتا۔"

"میں اس وقت کھانا بیچ میں چھوڑ کر بیٹھا ہوا ہوں۔ میں تمہاری بے سرو پا جو اس ستارہ پر گزرتا ہوں نہیں کروں گا۔ صرف کام کی بات کرو۔ بے گئی انکھے کی تقاضا کوئی ضرورت نہیں۔" وہ تہیہ کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"دور نہ؟" میں نے پہنچ کرنے کے سے انداز میں کہا۔ "دور نہ تم خواہ کیس ہیں جو میں تمہیں تلاش کر کے شوت کروں گا۔" وہ بولا۔

"ہزاروں خرابیوں میں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔" میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا۔ اس سے پہلے کہ اس کے صبر کا پتہ چھٹک چڑتا میں نے کہا تھا۔ میں تم سے یہ پوچھنے کا تھا کہ تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ جمال سعیدی کا پرانی دے اور پورے روشی روڈ کے درمیان ایک ویران مقام پر بڑا عالی شان قلعہ ناما مکان ہے؟

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں ایک بار اس کا دیدار کر چکا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے ذہن میں یقیناً بہت سے سوالات بھی ابھر رہے ہوں گے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"میرے ذہن میں ابھرے والے سوالات کی بات چھوڑو۔" وہ ہاتھ والے انداز میں بولا "میرے ذہن میں تو سوالات کا بہت بڑا گلاب خانہ کھلا ہوا ہے۔"

نے گ۔ "میں نے کہا کہ یہ باتیں اہم نہیں ہیں۔ تم اصل بات چارہ بات کاٹنے ہوئے بولا۔ اب وہ اپنے لیے کی بے باکی چاہتا تھا۔ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

اس کے لیے تمہیں بہت پگھلی سے حرکت میں آنا پڑے گا۔" سب حیدری یاد دہانی کے لیے اصل بات کی طرف بھی تو "وہ شاید ہی شکل سے اپنا قصہ منہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے بھی جمال سعیدی کا نام سنا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ ایک لمبے خاموش رہا لیکن مجھے امید تھی کہ کم از کم مجھ سے بات کرنے ہوئے وہ اس ایک لمبے کی خاموشی میں کوئی ڈیڑھیک جواب نہیں سوچ رہا ہو گا۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے لیے میں بولا "میں نے صرف اس کا نام ہی نہیں سنا بلکہ میں غائبانہ طور پر اسے کافی حد تک جانتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ غیر ملکی ہے لی بڑے دھڑلے سے یہاں کا باشندہ بنا بیٹھا ہے اور اتنے بڑے اسم پر فخر کر رہا ہے جتنے بڑے پائے پر شاید وہ اپنے ملک میں کر کے نہائیں سوچ سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں ملک میں تو شاید اس کا ہماری بھرم و جود اب تک کسی روز گئے گئے کوئی کی زد میں آکر جھجھکتے ہو کر اڑ چکا ہو گا۔ اسے ترک وطن بہت راس آتا ہے۔ لیکن خیر۔ بات یہاں تک بھی آئی تو قیمت تھا۔ میرے ذہن میں اس کے بارے میں کچھ کے قسم کے شبہات ہیں۔"

"مثلاً؟" اب میں نے اس کی بات کاٹی۔ "مٹی اٹھال میں ان کا اعلان نہیں کر سکتا۔" آخر کار وہ ڈیڑھیک وی گیا۔ اس کے لیے میں مصلحت کوئی اتنی تھی لیکن اس میں کئی کائی قصور نہیں تھا۔ آخر وہ سرکاری تھی تھا۔ اس کی اپنی کچھ گجریاں تھیں اور اس وقت وہ اپنے سینئر کے ساتھ بیٹھا بیٹھا تھا کسی اچھے شخص کے لیے تو خیر وہ اپنی بیجوریوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا اور قواعد و ضوابط کے خول میں بند ہونے کے اندر نہ جانتے کیا کچھ کر گزرتا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا دم بہت تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جمال سعیدی پہلے ہی اس کی طرحیں مشکوک افراد کی فہرست میں شامل تھا۔ اس طرح میرے لیے اسے اس کام پر تیار کرنا آسان ثابت ہو سکتا تھا جو میں اسے سونپا تھا۔

بات جاری رکھتے ہوئے بولا "وہ ان لوگوں میں شامل ہے ناک طرف میں دیکھتا ہوں اور لٹھڑی سانس لے کر وہ جاتا ہوں۔ وہ کوئی طرف پھرتا ہوں۔" پھر اس نے اعتراف کر لیا "میری نو گجریاں ہیں۔ بعض لوگوں کے سلسلے میں میرا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے انسان کی مسلک اور خوف ناک مرض کی چہ کامیاب ہو سکتا



اب یہ اس پولیس آفیسر کی صوابدید پر ہے کہ وہ اس پر ضرور کارروائی کرے یا نہیں، بیضا خٹو مزاح سے گفتگو کرتا تھا۔  
 ”بنا ب باخیر اور فرض شناس شہری صاحب!“  
 جیسے لہجے میں بولا ”آپ ایسی بھونٹی موٹی چیز بھی نہیں ہیں،  
 قسم کے کاموں کے لیے اس حقیر فقیر کو ہی یاد فرماتے رہتے ہیں۔  
 عدسے میں غصہ اچھلک رہا ہے۔ اور یہ تو میرے علاقے کا کام  
 نہیں ہے۔ آپ اس علاقے کے ذرا بڑے پولیس افسر ہیں۔  
 راستہ بھی رابطہ فرما سکتے تھے۔“

”بھئی جو بات تم میں ہے وہ کسی اور میں کمال۔“  
 ذرا پار سے کہا ”اے اہم اور سنگین معاملہ کسی تک کا کمال  
 آفیسر کے ہاتھ میں نہیں دیا جاسکتا۔ اگر وہ صرف عدسے  
 سے بڑا ہو جائیگا کردار میں چھوٹا ہوا تو اس کے قواعد  
 بنارے ہو جائیں گے۔ اس معاملے کو دبانے کے لیے تو کیا  
 چلے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے اس علاقے کی پولیس کی آنکھ  
 پہلے ہی مال کی پتی بندھی رہتی ہو۔ اسی لیے تو میں تمہیں انہ  
 پر سوار کرنا چاہتا ہوں تاکہ اگر وہ پہلے سے ہی ان سے ک  
 ہوئے ہوں تو تمہیں اس کا بھی اندازہ ہو جائے اور اگر اب  
 کرنے کی کوشش کریں تو تم ان کے راستے کی دیوار بن سکو۔  
 ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ضرورت پڑنے پر بھی کمال  
 کھن لگا لیتے ہو۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر ملاحظت سے ا  
 کے باوجود میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش ضرور کروں گا کہ  
 میں تم مجھے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو وہ اتنا اطمینان  
 ہے۔۔۔۔۔“

”ہمارے ہاں کی پولیس کے لیے تو کوئی بھی معتقل ہم  
 نہیں ہوتا۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے چڑی اٹھا  
 کوئی نئی بات نہیں بتا رہے ہو۔“

”پہلے میری پوری بات سن لو گھڑکیس کے۔“  
 ”جس ملک سے جمال سعیدی کا تعلق ہے، تمہیں معلوم ہو  
 کچھ برس پہلے اس کے اور ہمارے درمیان سیاسی مسئلہ  
 مضبوط قربت داری تھی۔ ہمیں اپنی نہیں اس کی چاکر  
 پڑی رہتی تھی۔ اس حوالے سے آج تک جمال سعیدی کے  
 ملک میں کچھ مضبوط سیاسی رابطے چلے آ رہے ہیں اور ہم  
 ی ہے کہ اس ملک کے بارے میں ہماری پالیسیوں میں اتنا  
 خاص تبدیلی نہیں آئی خواہ ہم نے ان کا درباروں کی  
 ہماری قیمت ادا کی ہو۔ جمال سعیدی نے اپنی مضبوط  
 کرنے میں اس سارے پس منظر سے پورا پورا کام لیا  
 ہمارے ہاں بھی کچھ اہم لوگوں کے مفادات وہاں سے وہ  
 انہوں نے بھی اس کی پوری پوری مدد کی ہے اور ضرورت  
 بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے سرحدی صوبے کے ایک ذرا  
 خاص طور پر جمال سعیدی پرست ممبران ہیں اور کوئی بھی

ساتھ جمال سعیدی پر ہاتھ ڈالو گے تو جیتے اور موت سے انکشافات  
 ہوں گے۔ بڑی بڑی باتیں سامنے آنیں گی اور شاید پرنس میرا کے  
 قتل کی حقیقت کو بھی سلجھانے میں کچھ دخل ہے۔ وہ تو خالصتاً ہمارا  
 کیس ہے اور کافی اہم ہے۔ شاید اس کی بھی کوئی شاخ جمال  
 سعیدی تک پہنچی ہو۔“  
 وہ جب بولا تو اس کے لہجے سے کچھ یوں لگا جیسے وہ ایک دم چوکتا  
 سا ہو گیا ہو ”تمہاری اس اطلاع کا ذریعہ کیا ہے؟“ اس نے غما  
 لہجے میں پوچھا۔

”خود رسی تھے پولیس والے بن گئے تھے۔“ میں نے افسوس  
 سے کہا ”وہی خواہ مخواہ کی جرح بازی اور فضول سوالات شروع  
 کر دیے۔ تمہیں آہم کمانے سے مطلب ہے یا چوکنے سے؟“  
 ”مالی ڈیڑا! میں بہت سنجیدہ ہوں۔“ اس کے لہجے سے واقعی  
 کچھ زیادہ سی سنجیدگی جھلک رہی تھی۔

”اور میں تمہاری حالت پر رنجیدہ ہوں۔ بہر حال تمہاری  
 اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ یہ پتہ مجھے ایک بہت سی معتبر ذریعے  
 سے ملی ہے۔ بڑی سائنڈپ ہے۔ تم اس کے بارے میں شک میں نہ  
 پڑو۔ انکھیں بند کر کے چل پڑو۔ بہت فائدہ میں رہو گے۔“ میں  
 نے سنجیدگی سے کہا ”نئی لوگوں کے اندر کے ایک ذریعے سے  
 اطلاع ملی ہے۔ وہ ”ذریعہ“ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر آیا  
 ہے لیکن اس وقت وہ اپنی جان بچا کر بھاگنے کی فکر میں ہے۔ میں  
 تمہیں اس کی فراہم کر رہا ہوں اور اطلاعات سے بھی استفادہ کرنے کا  
 موقع دے رہا ہوں۔ وہاں تمہیں چند لاشیں بھی ملیں گی۔ کچھ لوگ  
 زخمی بھی ملیں گے۔ یہ ان لوگوں کی آپس کی لڑائیوں کا نشانہ  
 ہے۔ تم پولیس کی کافی غرضی لے کر جانا کیونکہ وہاں شاید چالیس  
 پچاس مسلح قبائلی قسم کے لوگ بھی ملیں گے جو پتیلیہ اس مکان میں  
 کسی کا گھنا پسند نہیں کریں گے لیکن مجھے یہ بھی امید ہے کہ وہ  
 پولیس سے تصادم سول نہیں لیں گے۔“

”تمہاری ان لوگوں کے اندر مدنی طعنوں تک رسائی کیسے ہو گئی  
 جو تمہیں اندر مدنی جنگوں کی خبریں بھی دیتے لگے؟“ رحیم گل نے  
 چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں معلوم ہے میری جو کاروباری لائن ہے اس میں ہر  
 طرح کے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے۔“ میں نے اسے ہلانے کی  
 کوشش کی۔

”مجھے تمہارے کاروبار اور تمہاری لائن دونوں کا اچھی طرح  
 اندازہ ہے۔“ وہ اب بھی چبھتے ہوئے لہجے میں ہی بولا۔

میں نے اپنے لہجے سے اب ذرا اونچا آواز کا اظہار کرنے کی  
 کوشش کی اور بات ختم کرنے کے سے انداز میں کہا ”ٹھیک ہے  
 بھئی۔ تم مرضی کے ٹانگ ہو۔“ اس اطلاع پر ایکشن لویا نہ تو  
 میرے پاس تو ایک خبر آئی تھی۔ میں نے ایک باخیر اور فرض  
 شناس شہری کی طرح اسے اپنے شناسا پولیس آفیسر تک پہنچا دیا۔

پڑے پر وہ اس کی مدد کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے" کا  
مجھے یقین ہے۔

میں نے حیدرآباد کی گزراؤں میں ایک عجیب سی کھوکھ  
محسوس کرتے ہوئے لٹھری سانس لے کر کہا "ایک تو یہ پڑی  
محبت ہے کہ ہمارے ملک میں کسی بھی شے کے نام کے بارے میں  
چھان بین کرو تو اس کی بے میں ایک بڑا آدمی نکل آتا ہے لیکن کیا تم  
بھی ان باتوں کی پروا کرنے لگے ہو؟"

"اگر مجھے پورا یقین ہو کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بالکل ٹھیک  
ہے اور جن اطلاعات کی بنیاد پر میں کارروائی کر رہا ہوں وہ بھی سو  
فیصد صحیح ہیں تو مجھ میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" وہ گہری سانس لے  
کر بولا "لیکن اگر بعد کے حالات سے یہ ثابت ہو جائے کہ مجھے ملنے  
والی اطلاعات غلط تھیں اور ان کی بنیاد پر میں نے جو کارروائی کی وہ  
بھی غلط تھی تو اس سے جو اچھن اور دشواریاں پیدا ہوں گی وہ تو اپنی  
جگہ ہوں گی لیکن میں خود اپنی نظر میں بھی اپنے آپ کو بہت ذلیل  
محسوس کروں گا۔ اس تصور سے مجھے زیادہ خوف آتا ہے۔"

"اطلاع کے بارے میں تو میں تمہیں گارنٹی دے سکتا ہوں کہ  
اطلاع درست ہے۔" میں نے کہا۔

"بھلا سیدھی جیسے آدمی کے معاملے میں مجھے کم از کم سرچ  
وارنٹ بھی لے لینا چاہیے۔ یہ کام ویسے ہی ہمارے ہاں کچھ آسان  
نہیں ہے اس جیسے آدمی کے معاملے میں اور بھی زیادہ مشکل ہے۔  
یہ کمانیوں، ڈراموں اور قلموں والا سلسلہ نہیں ہے کہ ادھر پولیس  
آفیسر صاحب مجسٹریٹ پاسی اور اتھارٹی کو فون کرتے ہیں اور پھر  
ان کا ادبلی جا کر اچھے آرام سے سرچ وارنٹ لے آتا ہے جتنے  
آرام سے کوئی ڈاک خانے سے ڈاک کٹ بھی نہیں لا سکتا۔ حقیقی  
زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی لیے اکثر پولیس والے اس پکڑ میں  
ہی نہیں پڑتے اور اس کے بغیر یہ کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں  
جس پر آئے دن اخبارات میں طوفان برپا ہوتا رہتا ہے۔ ہم اگر کوئی  
اچھا کام کرنا بھی چاہیں تو کیسے کر سکتے ہیں؟ ہماری جان ہر طرف سے  
محبت میں پھنسی ہوئی ہے۔"

"تمہاری یہ داستان غم من کر میرا دل خون کے آنسو دہا  
ہے۔ ظاہر اس کا شاید یہ ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بہتر ہو اگر  
تم مجھے شروع میں غلامی بتا دیتے، ہم دونوں کا خلاصہ جتنی وقت  
خالی ہونے سے بچ جاتا۔" میں نے مل کر کہا لیکن میرے لیے میں  
نری برقرار رہی۔

"بات کا غلط مطلب اتنے کرنا تم جیسے کوڑھ مغز لوگوں کی خاص  
عادت ہوتی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا "میں نے یہ تو نہیں کہا جو تم  
سمجھ رہے ہو۔"

"تو پھر یہ اعانت سارو داندے کا کیا مطلب ہے؟" میں نے  
تنگی سے پوچھا۔

"میں اس جہان رنگ و بو میں پکڑا رہے ہوں تم جیسے عظیم

کہ مجھے کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ معاملہ میرا نہیں  
تاکہ ہے مجھے سوا نہ رہا۔ وہ والا معاملہ نہیں تھا بلکہ  
کسے چہ جائیگا سولی پر رام بجلی کرے گا۔ اب تم نے  
دشوق سے اطلاع دی ہے تو مجھ نہ کچھ تو۔ کرنا ہی پڑے گا۔  
"نی الحال تو تم صرف انھوں کی جنگلی کردہ ہو۔  
نک سوانے کا سوال ہے تو کیا اس سے پہلے میں نے کسی  
سوالیا ہے؟ ہمیشہ تمہاری عزت اور شان میں کچھ اضافہ کر  
ہے۔"

"بالکل درست فرمایا عالم پتا، اب اگر اجازت ہو تو  
اپنی کھانا کھاؤ؟"

"ظاہر ہے۔ کھانے بغیر تو تم لوگ کہیں سے بٹے کھانا  
نہیں کھاتے۔ اور محبت یہ ہے کہ کھانے کے بعد تو لوگوں  
ویسے ہی ہلا نہیں جاتا۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کام  
اگر تم کم سے کم وقت خالی کرتے تو اچھا تھا۔ ابھی تو  
دوسرے علاقے کی پولیس سے بات کر کے انہیں تھکا  
پڑے گا۔"

"علاقے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انہیں سمجھا دینا  
وقت نہیں لگے گا۔ زیادہ تر علاقوں کے افسران تمہارے ہاں  
کی بات آتھیں بند کر کے مانتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے  
"حیرت ہے!" میں نے حیدرآباد حیرت سے کہا "میں نے  
آدمی کے سامنے سے بھی دور بھاگنا چاہیے۔ تم جیسے کھانا  
سے تو ان کے لیے دشواریاں پیدا ہوتی ہوں گی۔"

"میں اپنی اصول پرستی سے انہیں تک نہیں کر سکتا  
ضرورت جو کام لینا ہو آجے وہ لے لیتا ہوں۔ ان کے سامنے  
اور سامنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ اوپر والے کا کام ہے  
میں سے جتنی اس حقیر حقیر کے سامنے مردوں کی طرف  
رہے ہیں۔"

"ہاں نہیں ان بے جاہلوں کو تم نے کیا کیا پکڑ دے  
بہر حال۔ تو میں امید رکھوں کہ تم حرکت میں آ رہے ہو  
تصدیق چاہی۔"

"یقیناً۔" اس نے بے آواز جواب دیا "مگر تم کہتے ہو  
کھانا کھانے کا پروگرام بھی ملتی کر رہا ہوں۔ میرے  
ڈاکا کھانا کچھ ہے۔"

"بھرتو تو یہ خاکہ تم مزید وقت خالی نہ کر کے  
ہے۔ کھانا تو تم ویسے بھی دن میں آٹھ دس مرتبہ کھاتے  
ہو۔ دوڑا لے کم ہو جائیں گے تو تمہاری صحت پر کچھ  
ی چیزیں گے۔" میں نے کہا۔

"یہ نصیحت اس وحش سے تم جیسا کوئی فائدہ  
ہے۔" وہ لٹھری سانس لے کر بولا "وقت بچانے کی خاطر  
پر کوئی تہمت نہیں کرنا چاہتا۔"

اچھا طریقہ چیتا ہی تھا کہ وہ بات سن کر بھی انجان بن جاتی۔

”جین نہیں تو ہا کہ تم اس قدر عقل مند ہو چکے ہو۔“  
”نہ املقا۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے بھی فون بند کر دیا اور دل ہی دل میں خاص طمانیت  
میں کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا ”ہمیں اپنا  
کام اور اچھا چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ تقریباً اسی  
انداز میں حل ہو گیا جس طرح میں چاہتا تھا۔ معاملہ انہی باتوں  
میں چلا گیا جن میں میں اسے پہچانا چاہتا تھا۔“

”عقل سیدی خواہ کتنا ہی بڑا کچھ سمجھ سکی۔ لیکن اگر رحیم  
میں اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے پر تیار ہو گیا ہے تو پھر وہ اسے ضرور  
رکڑ دالے گا۔“ ذر تاج دھوٹے سے بولی ”اس قسم کے معاملات میں  
نالی نالی ڈی آئی جی سے رجوع کرنے کی نسبت اس شخص سے  
دور کرنا زیادہ بہتر ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ  
فصل اتنی زیادہ دھونس دھمکیوں کا لالچ اور دباؤ کا مقابلہ کیسے کر جاتا  
ہے۔“

”لو پر والا بھی تو آخر اپنے صحیح بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ اس  
کی مدد شامل حال رہتی ہے۔“ میں نے کہا پھر گردن جھکا کر اسے  
گھورا ”میں پہلے بھی تمہارے منہ سے اس کہنے کی تقریریں سن  
چکا ہوں۔ آج کل تم اس کے بہت کچھ سن گئے ہو۔ مجھے تمہارے  
خواب کو کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔“

”ظاہر ہے انسان کو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو  
سوچنا ہی پڑتا ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی ”مہاراجی زندگی پوچھی کسی  
نہم اور بے عنوان سے انتظار کے سارے تو نہیں گزارا  
جاسکتی۔“

گاڑی میں یک دم سکوت چھا گیا۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ ایک تو  
وہ مجھے ذر تاج کی بات قطعی غیر متوقع تھی۔ دوسرے راجیلہ کی  
موجودگی میں تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ذر تاج ایسی بات  
کر سکتی تھی۔ کبھی تک بات میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی  
تھی تو اس نے جواب میں بڑی افسانوی سی باتیں کہیں۔ زندگی  
ایک جہم اور بے عنوان سے انتظار کے سارے ہی گزارنے کا  
ایم ظاہر کیا تھا۔ رحیم گل کو وہ اس کی تمام تر حیرت اس کے تمام  
ترطوں کے باوجود خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن  
اب مجھے اس نے یک دم ہی حقیقت پسندی کی طرف پھلانگ لگا  
دی اور اس کا اعداد بھی ایسے عجیب و غریب پر اچانک ہی گر ڈالا  
تھا۔

میں نے راجیلہ کی طرف دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اس  
موضوع پر کوئی نہ کوئی رد عمل ضرور ظاہر کرے گی اور کچھ نہیں تو  
ایشیترانہ انداز میں جنس ہی دے گی لیکن وہ انجان بنی کھڑکی کے  
پینے کے پار دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ  
اس نے یہ بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ شاید اس معاملے میں زیادہ ہی  
تنبہاوی اور محتاط کا مظاہرہ کرنے پر تلی ہوئی تھی جس کا سب سے

میں ذر تاج سے پوچھتا چاہتا تھا کہ کیا اس نے رحیم گل سے  
شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟ کیا اس کے اندر کوئی انقلاب رونما  
ہو چکا تھا؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو مجھے اس پر خوشی ہی  
ہوتی۔ میری اپنی زندگی بھی ابھی بھی دور میں اسے بھی میرے  
آنکھوں والی محبت کے انتظار میں خواہ جس طرح بھی گزار رہا تھا لیکن  
میں کسی اور کی خوب صورتی و بھرپور جوانی کو محراب میں کھڑے تھا  
درخت کی طرح انتظار کی کڑی دھوپ میں جھلنے اور مرجھانے دیکھنا  
نہیں چاہتا تھا۔ خود انہی کی یہ مشعل میری اپنی ذات تک محدود رہتی  
تو ٹھیک تھا۔ میں کسی اور کو اس بنیادی میں جھلا کر نہیں چاہتا تھا  
تمام میں ذر تاج سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔ اسے کچھ بھی نہ بتا سکا۔  
اس نے بے دھڑک اپنی بات کردی تھی لیکن میں اس بات کو اس کے  
نہ پر حواس کا۔ اگر اس کی تصدیق ہو جاتی تو میرے ذہن سے ایک بوجھ  
اتر جاتا۔ میں خود کو ذر تاج کی زندگی کی بے کئی اور بے مقصدیت کا  
ذائقہ دار محسوس کرتا تھا۔ میرا یہ سوہم سا احساس جرم فہم  
ہو جاتا۔

شاید ہمارے درمیان چھا جانے والے ایک عجیب سے بوجھ  
میں کو محسوس کرتے ہوئے شفیق شاہ نے موضوع تبدیل کرنے کی  
کوشش کی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”سرا! آپ کو کچھ اندازہ ہوا کہ  
اسٹے کی اسٹیلنگ کا پرنس انڈسٹریز سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ میری  
مطوعات کے مطابق تو وہ صاف تھری انڈسٹری ہے اور اسے صاف  
تھرے طریقے سے چلایا جا رہا ہے۔“

”ہم نے پولیس کو اس مسئلے میں صحیح ٹریک پر ڈال دیا ہے۔  
اب اس قسم کے سوالوں کے جواب حاصل کرنا اس کا کام ہے۔“  
میں نے موضوع کی اس تبدیلی پر دل ہی دل میں شفیق شاہ کا شکریہ ادا  
ہوئے ہوئے کہا ”میں کچھ کام پولیس کے لیے بھی چھوڑ دیتا  
چاہیے۔ اسی لیے میں نے رحیم گل کی جیسے آئی کی ٹانگ اس معاملے  
میں اڑا دی ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ تو معلوم کر لی لے گا۔“

”دیکھا۔“ آخر ہمیں بھی کسی نہ کسی مرحلے پر قائل ہونا ہی  
پڑتا ہے کہ وہ کام کا آئی ہے۔“ ذر تاج کا تھانہ لیجے میں بولی۔  
”تھانہ کی پتا۔! ابھی سے اس کہنے کی کیسی ممانت شروع  
ہو گئی ہے!“ میں نے ذر تاج کی طرف دیکھ کر حیرت سے آنکھیں  
پھلپھلایا۔

ذر تاج مجھ سے نچنے چلا کر کچھ کہنے لگی تھی کہ میں نے  
ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بس۔  
بس۔ زیادہ غصا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں مطمئن ہو گیا ہے کہ  
اب اس کا نام سن کر تمہارے دل میں جلتی ہو۔ ہارمونیم اور طبلے  
دغیرہ بجا کریں گے۔ آئندہ ہم اس کے بارے میں تبصرے کرنے  
میں احتیاط رہیں گے۔ بلکہ کوشش کریں گے کہ زیادہ خالص قسم  
کے تبصرے تمہاری خبر موجودگی میں کیا کریں۔“

زرتاج کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار معدوم ہو گئے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم اس غیبت کے قائل تو بہت ہیں لیکن اس کے منہ پر بھی اعتراض کر کے نہیں دیں گے۔ آخر دل لگی بھی تو کوئی چیز ہے۔ چیز خواہاں سے چلی جائے اسد والا معاملہ ہے۔ گو کہ وہ خواہاں سے زناہہ ذوقانی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ بھی سڑی ہوئی۔ لیکن خیمہ اب ہم تمہاری دل شکنی تو نہیں کر سکتے۔ دوستوں کی خاطر ہم تو بڑی بڑی بے ہودہ چیزوں کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ اب اسے بھی برداشت کرنے کی کوشش کیا کریں گے۔"

اس اثنا میں ہم ہل چکی تھیں۔ شفیق شاہ جتنی رات سے گاڑی اندر لے گیا۔ ہمارے اصل کپڑے گاڑی میں ہی موجود تھے۔ سب اپنے اپنے درست کرنے کمروں میں چلے گئے۔ زرتاج راجہ کے ساتھ چل گئی اور شفیق شاہ ڈونلی کے ساتھ ہولیا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سب سے پہلے میں ہی اپنا طلیہ درست کر کے اور تیار ہو کر واپس نیچے آیا اور اپنے آنکس میں جا بیٹھا۔ چند لمحے بعد ہی زرتاج آنکس میں داخل ہوئی اور دو واڑے پر ہی رکھتے ہوئے بولی میں جاری ہوں۔

"مانا کہ تم بہت بڑی جاگیردارانی بہت بڑی بزنس و من ہو لیکن اب ایسی بھی کیا مصروفیت۔!" میں نے کسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "پندرہ منٹ ہم غریبوں کے پاس بھی بیٹھو۔ کچھ لٹھا کر مہینہ جاز۔"

"مزدوری کی مزدوری بھیند خنک ہونے سے پہلے ادا کرنا چاہیے ہو غریب آدمی؟" وہ قریب آکر کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا بھیند بہت پہلے خنک ہو چکا ہے۔"

"میرا مزدوری تم نے ہمارے ساتھ مل کر کی ہے اس کا کوئی معاوضہ تو ہو نہیں سکتا۔ میں تو فیضی تمہاری خاطر وزارت کر کے تمہیں زرخانی کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئندہ بھی اگر کسی سلسلے میں ضرورت پڑے تو بادولت کو یاد کر لیا۔" ہم فیضی تمہارے لیے بار دھاڑ اور جنگ و جدل سے بھرپور ڈراما پیش کرتے رہیں گے۔" وہ فراخ دلی سے بولی لیکن پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ اٹھ اٹھاتے ہوئے بولی "دیکھو۔ کبھی کسی سلسلے میں میرا نام نہ آنے پائے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ خدا نخواستہ اگر تم کسی مشکل صورتحال میں بھی پھنس جاؤ تب بھی میرا نام تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے بلکہ اس ضمن میں کبھی اشارہ بھی کوئی بات نہ کرنا۔" دھیم گنگ کے سامنے بھی نہیں۔ "خام۔!" میں نے ہمت کی طرف دیکھ کر آنکھیں میٹھا نہیں مصطوف نہیں وہ عادیہ اس موقع پر فٹ بیٹھا ہے یا نہیں۔ لیکن

میرا خیال ہے مجھے کہہ دینا چاہیے۔ سوت نہ کہاں لودھلا سے ٹھہر لٹھا۔ ابھی تو ہانسیا ملتی تھی قلعی کا اعلان نہیں ہوا ابھی سے کتنی احتیاطیں شروع کر دیں اس تصور کے بارے میں۔ "خیر۔ اسد جو اسے تصور کیا۔" اس نے آنکھیں میٹھا "مگر سامرا کر جڑ تو زردوں کی۔ تم خود لکھو سے مجھ پر تو نظر کرنا گئے۔"

میں جواباً خاموشی سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا رہا۔ آخر وہ سہٹا کر بولی "یہ اس طرف دیکھ رہے ہو؟" پھر خود ہی سر ہٹا کر بولی "شاید تم کسی کو اس طرح میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی خوش و خرم اور اصل مسئلہ زرتاج کی طرف تمہارے اندر کے بدلتے موسموں کا نظام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے لٹھری سانس لے کر کہا پھر انٹر کام پر ابھر کر کلا پینے کی کچھ چیزیں بھرانے کی ہدایت کی۔ ویسیر رکھ کر میں دوبارہ زرتاج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "تمہیں چھپتا ہوا ہو گا کہ میں نے تمہیں بات کرنے کے لیے روکا ہے۔ کلا نے پتہ تو ایک بمانہ ہے۔ شکر ہے وہ تینوں شیطان ابھی اوپر ہی اٹھ رہے ہیں یا شاید انہوں نے جان بوجھ کر ابھی نیچے نہ آنے کا فیصلہ ہے۔ ان کے سامنے اس موضوع پر بات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے تم نے مجھے کس سلسلے میں بات کرنے کے لیے روکا ہے۔" وہ اطمینان سے بولی "تمہارے دل میں کھڑا ہو رہی ہوگی۔ میں نے درجیم گل کے بارے میں کہا اس جو کر دی۔" "یہ کھنک کھنک اس ہی سے یا واقعی تم اس معاملے میں پہلی ہو؟ کیا واقعی تمہارے اندر کوئی انقلاب آچکا ہے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ میں اب بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

ایک دم اس کی تجوی و طراری کچھ کم ہی ہو گئی۔ وہ سر ہٹاتا ہوئے دھیمے سے بولنے میں لگی "اس میں انقلاب و فیضی کی قیادت کی بات نہیں۔ یہ زندگی کے عام سے مسائل ہیں۔ میں نے بہت حقیقت پسندی کر سوجھا۔ لکھ پوں سمجھو کہ سخا کی سے اپنا تجربہ کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کیا تو میں نے اپنے آپ کو بڑی حریف میں پایا۔ شاید میں اپنی مضبوط لڑکی نہیں ہوں جتنی ہمارے ٹھہرنا ہوں۔ یا پھر شاید میں زندگی کے صرف کچھ معاملات میں مضبوط ہوں۔ ہر معاملے میں مضبوط نہیں ہوں۔ شاید کوئی ہر معاملے میں مضبوط ہوتا بھی نہیں ہے۔ انسان تو آخر انسان ہی رہتا ہے۔ باخلاق الفطرت تو نہیں بن سکتا۔"

میں دم بخود بیٹھا رہا تھا۔ گو کہ وہ دھیمے سے بولنے میں بات کہتا تھی لیکن اس کی آواز کا شیشہ جیسے میرے ذہن کی لہج پر لٹکا ہوا تھا۔ آج پابا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں نے غلطی کی حدت سے جتنی راتوں میں بارہا اس موضوع پر سوچا۔ میرا

مطلوبہ ساروں کی خواہشیں ذہن میں جلد ہی دھندلا جاتی ہیں۔  
 وہ مجھے ابھی گنتی تھی۔ شاید میری ذات کا کوئی گوشہ اس کی  
 محبت میں بھی جھٹکا تھا۔ میں زندگی بھر اسے ابھی دوست دیکھنا چاہتا  
 تھا لیکن میں اسے بیش تشنہ کام اور اس کی زندگی کو بیش ایک کار  
 زماں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ درحقیقت اس نے خود کو ہی نہیں مجھے  
 بھی ایک بے عنوان انسانیت سے آزاد کر دیا تھا۔  
 بھیا میں نے کوئی غلط فیصلہ کیا؟ اس کی آواز نے مجھے  
 پوچھا۔

"نہیں۔ تم نے بہت صحیح اور بہت بروقت فیصلہ کیا۔" میں نے  
 مضبوط لمبے سبز لبڑا۔  
 "تم اس پر خوش ہو؟" اس نے سرکوشی کے سے انداز میں  
 پوچھا۔

"ہاں۔ میں خوش ہوں کیونکہ تم نے مجھے ایک انجانے  
 احساسِ جرم کے بوجھ سے آزاد کر دیا ہے۔ میں تمہاری زندگی میں  
 موجود رہنے والے ظلم اور ویرانی کا ذائقہ دار بیش خود کو محسوس کرتا  
 رہتا۔ اور یقین کر دیکھ میرے بعد تم خود بھی اپنے آپ کو بہت  
 خوش محسوس کرو گی۔" رجیم گل بہت اچھا کوئی ہے اور وہ صحیح  
 معنوں میں تمہارا قدر وادب بھی ہو گا۔ تم نے کم از کم دو زندگیوں کو تو  
 بے مقصدت کی سبب چڑھنے سے بچا لیا ہے۔ کہیں پانے کی  
 طلب رجیم گل کے دل میں اتنی شدید ہے کہ تمہارے انتظار میں  
 اس چند نے اپنی زندگی کو بے ثمر کر دیا تھا۔" میں نے مسکراتے کی  
 کوشش کی۔

"شاید میرے اس فیصلے سے تمہاری اس تنگ دل حینہ کے  
 ذہن میں بھی کچھ تحریک پیدا ہو۔ شاید اس کے چہرہ دل میں بھی  
 تبدیلی کی کوئی کاپل پڑے۔" اب زرنج بھی مسکرائی۔ اس کے  
 چہرے پر ذندہ دل کی علامتیں دایمیں آ رہی تھیں۔ وہ بات باری  
 رکھتے ہوئے بولی "شاید اسے بھی احساس ہو کہ وہ زندگیوں کے  
 بارے میں تو بڑا با بھلا۔ مگر کوئی فیصلہ تو ہو گیا ہے۔ شاید اس طرح  
 وہ بھی قائل ہو سکے کہ باقی دو زندگیوں کے بارے میں بھی اب کچھ  
 سوچ لیانا چاہیے۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔  
 "آؤ۔ کیسی دل کی گمراہیوں سے آواز نکلتی ہے۔" وہ  
 آنکھیں سیکڑ کر بولی۔

میں نے اس کا تہوہ اُن بنا کرتے ہوئے پوچھا "تم نے رجیم  
 گل کو اس ضمن میں کوئی اشارہ دیا ہے؟"  
 "بہت ہی اشارے بازیوں کی قائل نہیں ہوں۔ میں تو  
 کشاکش سے سیدھی بات کہتی ہوں۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان  
 پر ہوتا ہے اور میں اسے زیادہ مصلحت آمیز یا گھماؤ پھراؤ والے  
 الفاظ میں بھی نہیں لپیٹتی۔"  
 "ہاں۔ اپنی اس عادت کا عملی مظاہرہ تو تم آج گاڑی میں

نے کر دیا کہ تم بھی اس لڑکی کے انتظار کے قفس سے نہیں  
 نکل سکو گے جس کا نام راجیل ہے۔ میرا یہ یقین دن بہ دن بڑھتا ہوتا  
 جاتا تھا مجھ پر کل وہ میاں پہنچی تو اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں  
 بہت دل میں امید کی آخری کرن نے بھی دم توڑ دیا۔ وہ میرے  
 لیے فیصلہ کا لمحہ تھا۔ ایک دم ہی میرے اندر جیسے کسی جھنڈا ہٹ  
 گیا۔ مجھ نے سرکوشی کی کہ اب بے یقینی اور بے ثمری کا یہ  
 تجربہ نہ بن جائے۔ کتنی کوئی کنارے لگ جانا چاہیے۔ ہماری  
 سزا ختم ہو جانا چاہیے۔ کتنی کوئی کنارے لگ جانا چاہیے۔ ہماری  
 طرح مزد و شب گزارنے والے جب زندگی کے کسی سوز پر سو  
 زماں کا حساب کرتے بیٹھتے ہیں تو ان کے دامن میں پچھتاہوں کے  
 سوا کچھ بھی نہیں نکلتا۔ وہ گزردہ لمحہ اس وقت ایک طاقتور فیصلے کا  
 بہت ہی گہرا۔ میں ایک دم ایک ہی زندگی میں اس سارے قافلے کو  
 چھوڑ گئی جو ایک بھیاک مچھ کی طرح میرے سامنے پھیلنا ہوا  
 تھا مجھے جیسے کسی بھی قوت نے دھکا دے دیا۔ میرا کام جیسے آسان  
 ہو گیا۔ جن حوالے نے مجھ سے یہ فیصلہ کرایا ان میں شاید رجیم گل  
 کی محبت کی طاقت بھی شامل تھی۔ ہر سچا جذبہ اپنے اندر ایک  
 طاقت تو رکھتا ہے۔"

اس نے نیم سوایہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں کچھ  
 بھی نہ بول سکا۔ میرے اندر ایک بھیاک سناٹا پھیل گیا تھا۔ پھر  
 مجھے یہ محسوس کر کے قدرے حیرت بھی ہوئی کہ میری سوجوں میں  
 کیسی خفیف سی حتیٰ بھی گھلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو  
 ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کیا مجھے اس کے فیصلے سے دکھ پہنچا تھا؟ کیا  
 اس سے میری انا کچھ بھڑک رہی تھی؟ کیا لاشعوری طور پر میں بھی  
 چاہتا تھا کہ وہ ساری زندگی میرے انتظار میں بیٹھ کر گزار دے؟ کیا  
 اس میں میری انا اور میری مہواگی کی تسکین کا کوئی پلو پنہاں تھا؟  
 کیا اس احساس سے میری تشنہ زندگی کے کسی گوشے میں انجانے  
 راحت کی منع روشن رہتی تھی کہ ایک ایسی لڑکی میرے انتظار میں  
 زندگی بتا رہی تھی جو خود اس قائل تھی کہ اس کی آنکھ کے ایک  
 زاویہ سے اشارے پر بیسیوں قائل غمخواران اپنی زندگی انتظار کی  
 صلیب پر معلوب کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے؟

میں نے بہت دیرانتہ ادبی سے اپنے دل ذہن اور ضمیر کے  
 اندر میرے گوشوں میں ان سوالوں کے جواب تلاش کیے اور اسی  
 نتیجے پر پہنچا کہ ان سب کے جواب نفی میں ہی تھے۔ اس کا زندگی بھر  
 کا انتظار یقیناً میرے دل ذہن اور ضمیر پر بوجھ تھا کیونکہ میں اس  
 سے انتظار کا کوئی صلہ نہیں دے سکتا تھا۔ میں اس کی کوئی توقع  
 نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کیا حق پہنچتا تھا کہ میں اس کی زندگی کو  
 بیکس کا گھرا بٹائے رکھتا؟ وہ زندگی جو اس کی سوچ میں محض معمولی  
 کی تبدیلی سے بہت خوب صورت اور بڑا ہمار ہو سکتی تھی۔ نا آسودہ  
 بھینکوں کی تکیوں اور تشنہ و تہیہ خوابوں کی اذیت کا کیا ہے۔ انہیں  
 تو انسان چند برسوں میں چند میٹروں میں اور بعض اوقات تو چند  
 فٹوں میں بھول جاتا ہے۔ جب تہا دل سارے مل جاتے ہیں تو

والہیں آتے وقت کہیں ہو۔" میں نے سر ہلا کر الفاظ کو کہہ بھیجے تھے لیکن انکشاف ہوا واضح تھا جو تم نے کشاکش سے ہم سب کے سر پر دے مارا تھا۔"

"وہیے آپس کی بات ہے۔ اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔" اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ اعتراف کیا "وہ بالکل غیر ارادی طور پر اچانک ہی منہ سے بات نکل گئی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی پچھتاوا محسوس نہیں کیا۔ گاڑی میں جو ہم پانچ افراد موجود تھے وہ سب ہی گویا اپنائیت کی ایک عجیب و غریب زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے ان کا کوئی راز گویا راز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ میں کوئی تک کے بارے میں ایسا ہی محسوس کرتی ہوں حالانکہ وہ لاہور میں رہتا ہے اور ایک تودہ مرتبہ جب کسی کام سے یہاں آیا ہے تو اس سے مختصر سی دو تین ملاقاتیں ہی ہوئی ہیں لیکن گتائی ہے جیسے میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ شاید ہم سب کی ذہنی سطح ایک ہی ہے اس لیے تمہارے خاص خاص ساتھیوں سے اپنائیت کا سارشتہ استوار ہونے میں دیر نہیں لگتی۔"

"میرے یہ ساتھی بڑے قیمتی لوگ ہیں۔ میں نے زندگی میں دو بے پیرے کی صورت میں جو کچھ کیا ہے وہ میری تقریباً وہ اہم نہیں ہے۔ میرا اصل سایہ میرے دوست ہی ہیں جن میں تم بھی شامل ہو۔ درحقیقت میں نے زندگی میں یہ چند دوست ہی "کمائے" ہیں۔ اس طرح کی کمائی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔" میں نے ایک گرمی سانس لے کر کرسی کے پٹے سے ٹپک لگایا "میرا سوال اپنی جگہ ہی رہ گیا۔ میں پوچھ رہا تھا کہ کیا رحیم گل تمہارے اس فیصلے سے آگاہ ہے؟"

"ابھی سے کیسے آگاہ ہو جائے گا وہ۔" وہ بھی اپنے آپ کو ذرا اذیتا چھوڑ کر پہنچے ہوئے ہوئی "کل ہی تو میرے دل کی حرارت میں اس فیصلے نے حتیٰ عمل اختیار کی ہے۔ اب کوئی مناسب موقع آنے کا قوت ہو جائے گی۔ وہ پہنچے میں میرے گھریا دفتر کا کم از کم ایک چکر تو ضرور لگاتا ہے اور جب بھی بات حجت میں وقت آتا ہے اس دوران میں اُو اس لو اس ٹھکانوں سے میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔"

"بے چارہ!" میں نے غصہ سی سانس لی "آج کے دور میں ایسے بے عاشق قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتے ہیں۔" "اور تم جیسے بھی۔" وہ ترکی بہ ترکی ہوئی "فرق صرف یہ ہے کہ تم کسی اور کے ہتھے میں آگے ہو۔"

"میری بات چھوڑو۔ مجھ پر تو تم لعنت بھیجو۔" "ہو تو تم اسی قاتل۔" وہ بات کانٹے ہوئے ہوئی۔ "میں کہنے لگا تھا کہ اپنے اس فیصلے کے بارے میں پہلی فرمت میں اسے اطلاع دے دو لیکن ذرا خیال رکھنا۔ کہیں وہ خوشی کے مارے پھڑک کر تمہارے قدموں میں ہی جان نہ دے

دے۔"

"سب ایسی بد حال قوت سے مت نکلو۔" اس نے ہلکے گھبراہٹ۔

"یہ بد حال نہیں۔ رکھ وحدہ کے ملے جلتے جڑات ہیں۔ میں نے غصہ سی سانس لی۔

"یہ رکھ وحدہ میں کہاں سے آگیا؟" اس نے گھبراہٹ جاری رکھا۔

"میں۔۔۔ آئی جاتا ہے کہیں نہ کہیں ہے۔ یہ صوفی (صوفی) تاجی ہیں۔ تم جیسی کوڑھ مغز لڑکیاں انھیں نہیں سمجھ سکتی۔ میں نے اٹنے والے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اب اس کوڑھ مغز لڑکی کو اجازت ہے۔ وہ کرسی سے اٹھنے ہی لگی تھی کہ وہ نرالی لے کرے میں دال ہو۔ نرالی پر کالی اور لوازمات موجود تھے اسے رکنا چاہا۔

"ہم اس وقت کھانے پینے میں مصروف تھے جب راجہ راجہ شرر بچوں کی طرح کمرے میں جھانکا۔ اس کے ہونٹوں پر شرمیلہ جیسی ہی مسکراہٹ تھی۔ پھر میں نے دیکھا اس کے منہ سے "ا" اور فصیح شاعر بھی جھانک رہے تھے۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں کہ کیا اندر آسکتے ہیں۔" راجہ اندر آتے ہی چلے۔

"نہیں۔" جس نے بھلا کیا ضرورت ہے۔ "میں نے سادگی کہا "اس قسم کے سوالات تو منہ پر اور شائستہ لوگ کیا کہہ ہیں۔"

"جبکہ تمہاری صورت دیکھنے ہی انسان کو متعجب و شام سے نفرت ہو جاتا ہے۔" راجہ نے کہتے ہوئے اندر آگئی۔ اس نے اسٹیکس پر ہاتھ ساف کرنا شروع کر دیا پھر اس نے پلیٹ کر لیا اور فصیح شاہ کی طرف دیکھا جو اندر آکر اس کے پیچھے جھکنا ہٹ تھیں انداز میں کمرے تھے۔

"تم بھی کھاؤ جا بھی۔ اپنا ہی مال سمجھ کر کھاؤ۔" وہ دونوں سے مخاطب ہوئی "ایک تو تم دونوں باس کے سامنے آگے ایسے مٹوب اور شائستہ ہو جاتے ہو جیسے تم نے باس کا متنازعہ قرضہ دیا ہے حالانکہ کچھ دیر پہلے اوپر تم ہی لوگ کہہ رہے تھے باس کے آفس میں جلی کر کھانے پینے کی کچھ چیزیں پر ہاتھ ملے کرتے ہیں۔" پھر اس نے میری طرف دیکھ کر مجھے اٹھایا "میں اوپر ہی غریب لگی تھی کہ تم نے زر تاج کی خاطر وادعہ لے لے کچھ منگوایا ہے۔ جی تو ہم دونوں سے دوڑے آگے وہ نہ آرام سے ناش کی ایک بازی لگانے چننے گئے تھے۔"

"وہ ایک بار پھر منہ چلانے لگی۔ میں ایک ٹپک اسے گھبراہٹ۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا "کیا اس وقت تم یہودی افروغ سے آ رہی ہو؟"

"نہیں۔ کیوں؟" اس نے بے پروائی سے پوچھا۔

”تاہم وہاں کے بعض علاقوں میں قلعہ پڑا ہوا ہے۔ تم اس خبر کی تصدیق ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”ہاں۔ اب تو ہم جس شمالی افرضہ سے آئے ہوئے ی  
 تھیں گے اسے مشکل مشکل کام لینے ہو گے۔ اس کے بعد  
 ہونے نہ بانی کو بھی نہیں پڑے۔ اگر ہم خودی بے شرم بن کر  
 کھانے پینے آجائے ہیں تو قاتل زندہ کہہ کر مٹھ فرمائے ہو۔ دنیا اسی کا  
 نام ہے۔“ اس نے چمت کی طرف دیکھ کر لٹھری سانس لی۔  
 ”اب کیا تمہارے کمرے کا ٹیلی فون کسی دشمن نے کاٹ دیا ہے؟“  
 میں نے لاشعرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا ”مجھے بھی معلوم  
 ہے کہ میں دم سوس کو فون کر کے جو جاہوں سٹھکا سکتی ہوں اور  
 ڈانگ ہال میں جا کر بھی ہم جو چاہیں کھا لی سکتے ہیں لیکن جو مزہ  
 بیزان کی سٹھکائی ہوئی چیزوں پر اتھ صاف کرنے میں ہے وہ خود  
 سٹھکا کر کھانے میں کسا۔“  
 ”گھٹا ہے بچپن کی گندی مادہیں ابھی تک مٹی نہیں ہیں۔“  
 میں نے انہوں سے کہا ”تاہم بچپن میں بھی کئی کئی قصے کہ جو  
 مزہ کسی کے باغ میں درخت پر چڑھ کر چوری کے امداد تو ذکر کھانے  
 میں ہے وہ بازار سے خرید کر کھانے میں کمال۔ لیکن اب تو تم کافی  
 بڑی ہو گئی ہو۔ اب تو اس قسم کی مادہیں چھوڑ دو۔“

”میں تو انسان کی شہیڈی ہے۔“ وہ ایک کرسی سمیٹ کر  
 اطمینان سے بیٹھنے ہوئے ہوئی ”مگر جب وہ چھوڑا اور کم عمر ہوتا ہے تو  
 اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا اور مدد نظر آنے کی کوشش کرتا ہے اور  
 جب وہ بڑا ہے۔ بلکہ کافی بڑا ہو جاتا ہے تو اپنی عمر سے کہیں چھوٹا نظر  
 آنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو بچہ ہی بننے پر کھلا  
 رہتا ہے۔ لٹھری آجیں بھرتا ہے۔ گانے گاتا ہے۔ کوئی لڑکا دے  
 مجھے میرے وہ بچپن کے دن۔ ویسے وہ فریو۔“

میں نے شفیق شاہ اور فونی کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑے  
 ہوئے تھے۔ میں نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”خدا  
 کے لیے اب تم دونوں بھی بیٹہ جاؤ۔ تم کس انتظار میں کھڑے ہو؟  
 یہ خاتون جس بھی اپنی طرح بد فیز اور بد متعبد بنانے کی سر قوت  
 کوشش کر رہی ہیں لیکن تمہیں کرسی نہیں دے رہے۔“  
 ”ہم مرنے دم تک عذاب اور شاکستہ رہنے کی کوشش کریں  
 گے۔“ فونی نے بڑے غلظ سے وعدہ کیا۔ وہ دونوں کرسی سمیٹ کر  
 بیٹھ گئے۔

راجلہ فونی کو گھورتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی ”ادھر  
 کمرے میں لیگا سب سے زیادہ اچھل رہا تھا کہ چل کر باس کو گنگ  
 کہتے ہیں۔ ویسے یہ دونوں ہی منافق ہیں۔ تمہارے سامنے آکر  
 بالکل بدل جاتے ہیں۔ بیٹے بیچے ذرا دے کرے انداز میں باتیں کرتے  
 ہیں۔“

”سب! شفیق شاہ نے اچانک ہی صراحت کی۔

”تم انہیں منافق ہی رہنے دو۔ میرا مطلب ہے کہ یہ جہاں ہیں  
 اور جیسے ہیں انہیں وہیں اور ویسا ہی رہنے دو۔“ میں نے راجیلہ کو  
 مشورہ دیا بھران دونوں کو مخاطب کیا ”تم اب ہاتھ باندھ کر مت  
 بیٹھو اور کھانے پینے کی جو بھی چیزیں نظر آ رہی ہیں ان پر فوٹ پڑو  
 ورنہ تم دیکھتے ہی رہ جاؤ گے اور یہ قاتل زندہ خاتون ٹٹیں بھی نہیں  
 چھوڑیں گی۔ لیکن ممکن ہے پلیسٹک کے بعد ٹرائی بھی پڑا جائیں۔“  
 زرتاج اس دوران خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتی رہی تاہم  
 اس کے ہونٹوں پر بد قسمی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس چھپڑ چھاڑ  
 سے محفوظ ہو رہی ہو لیکن کافی ختم کرتے ہی وہ اندھ کمری ہوئی ”میں  
 اب چلوں گی۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ راجیم کل اپنی کارروائی کے  
 بارے میں جو بھی خبر دے اس سے مجھے بھی مطلع کرنا۔“

”میں سچ میں دلیل بتانے کی تو پہلے بھی کوئی ضرورت نہیں  
 تھی۔ پہلے بھی اس سے تمہارا براہ راست رابطہ تھا لیکن اب تو کچھ  
 زیادہ ہی ”وائرڈ“ ڈانگ۔“ ہو سکتی ہے۔ تم اس سے براہ راست  
 بھی رابطہ کر سکتی ہو۔“ میں نے بظاہر سادگی سے کہا ”میں ممکن  
 ہے کچھ عرصے بعد ویسے بھی وہ تمہیں اپنی ہر کارروائی کی رپورٹ دیا  
 کرے۔“ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر کارروائی کی رپورٹ دینے پر  
 مجبور ہو جائے۔“

اس نے قہر بھرا نظروں سے مجھے گھورا اور دم کی آواز میں بولی  
 ”اللہ کسی کو اتنا کم ظرف اور بیٹ کا بلکا بھی نہ بنائے۔“

”شوگ دو سڑوں کے بارے میں اگلا خیال کرتے وقت اپنی  
 باتیں اور اپنی حرکتیں سختی جلدی بھول جاتے ہیں۔“ میں نے گراہ کر  
 کہا اور فریادی سے انداز میں چمت کی طرف دیکھا۔ زرتاج مزید  
 کچھ کے بغیر راجیلہ سے ہاتھ لاکر رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد چند لمبے کرا سکوٹ رہا پھر راجیلہ  
 لٹھری سانس لے کر بولی ”یہ دھنش لڑکی بھی اپنی زندگی کے بارے  
 میں کسی فیصلے پر پہنچی ہی گئی۔“

”رفز رتھ سب ہی اپنی اپنی زندگی کے بارے میں کسی نہ کسی  
 فیصلے پر پہنچی جاتی ہیں گے۔“ میں نے غم ناک لہجے میں کہا۔ ”آخر میں  
 صرف میں اور تم ہی رہ جائیں گے۔ زندگی کے آخری ایام میں تم  
 کسی پر کئی قانون کی طرح اور میں کسی اٹو اس الو کی طرح کسی غم مند  
 درخت پر بیٹھ کر کچھ مادوں سے لبریز اور دردناک قسم کے گیت گایا  
 کریں گے جنہیں من کر آواز دے کر بھوکا کریں گے۔ درحقیقت وہ  
 بہت نعت و ملامت کر رہے ہوں گے۔“

”تھو اس مت کہ۔“ راجیلہ کے گلاب سے چہرے پر کچھ اور  
 گلاب بکھل اٹھے۔ اس نے کہا ”کیوں نہ فونی اور شفیق شاہ کی طرف  
 دیکھا میں لوگوں کے سامنے زرتاج کی طرح اپنی پرستش لاشعرت  
 کے بارے میں کھٹکھٹا کر ہنسنے لگی۔“

”کیوں لوگ؟ کہاں ہیں لوگ۔؟“ میں نے انجان میں کر  
 چاندوں طرف دیکھا پھر میری نظر فونی اور شفیق شاہ پر آن مکی قسم

انہیں "ٹوگ" کہہ رہی ہو؟ اسے بھی یہ لوگ تھوڑی ہیں۔ یہ تو ٹوٹی اور شفیق شاہ ہیں۔"

"ہاں۔ ہم تو بعض اوقات خود اپنی آواز سن کر بھی ہکا بھکا ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں سنا۔" ٹوٹی مصمویت سے بولا۔

"تم دونوں اول درجے کے اچھے اور بھونے ہو۔ میں تمہیں خوب سمجھتی ہوں۔" راجیلہ انہیں گھوندا کھاکر بولی۔

ٹوٹی اور شفیق شاہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر شفیق شاہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اور سے ہمیں کیسی بیٹھی بیٹھی باتیں کر کے یہاں لائی تھیں۔ یہاں پہنچنے ہی بے عزتی شروع کردی۔ طرح طرح کے اعتابات سے نواز رہی ہیں۔"

"یونیورسٹی دینا بدلتی ہے" اسی کا نام دیا ہے۔" ٹوٹی نے اس سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تم دونوں حضرات اتنی ٹھنڈی آجی ہیں بھر کر یہاں دو دو اور برف۔ جتانے کی کوشش مت کرو اور یہ گرم گرم کالنی ہو تاکہ تمہاری سانسوں میں کچھ گرمی پیدا ہو۔" میں نے ٹرائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ میں یہ مشورہ بھی دوں گا کہ اس خاتون کی باتوں پر بالکل دھیان نہ دو۔ اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے کی بھی زحمت مت کرو۔ دونوں کان مضبوطی سے بند کرو۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ جب سے یہ لڑکی لاہور سے آئی ہے تب سے دیوانی ہی کیفیت میں مبتلا ہے۔"

"اور دیوانہ کی وجہ سائے بیٹھی ہے۔" راجیلہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے تھم دیا۔ ٹوٹی اور شفیق شاہ نے گویا میرے محسوس پر عمل کرتے ہوئے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور خاموشی سے اپنے لیے کالنی اڑا لیتے تھے۔ راجیلہ اپنے لیے پہلے سے کالنی اڑا لیں چکی تھی۔ وہ اس میں کریم کا دودھ ملائے بغیر چسکیاں لینے لگی۔ اس کی ڈانٹنگ میری کچھ سے باہر تھی۔ کالنی میں تو وہ کریم اور دودھ تک ڈالتے سے پرہیز کرتی تھی لیکن پانی سب چیزیں تھیں کہ کریم والی پینوں تک چٹ کر جاتی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی یہ صحت کا کوئی عظیم خفہ کارفرما ہو گا اس لیے میں نے اس موضوع پر اس سے کبھی چارواخالی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کالنی ختم کر کے شفیق شاہ اٹھتے ہوئے بولا "سر! مجھے کچھ کاموں کے سلسلے میں اب حراؤ دھرنا ہے۔ میں اجازت چاہوں گا۔"

ٹوٹی بھی اٹھتے ہوئے بولا "اور اگر آپ اجازت دوں تو میں ٹوٹی کے پچھ بھڑاکے طور پر اس کے ساتھ چلوں؟ اس طرح میرا بھی کچھ سیر پانا ہو جائے گا۔"

میرے جواب دینے سے پہلے شفیق شاہ اسے خوار کرنے کے سے انداز میں بولا "میرے ساتھ نہ کر سیر پانے کے بجائے "مار کھانا" بھی ہو سکتا ہے۔" پھر اس نے گویا وضاحت کی "اب یہ مت پوچھنا کہ مار کھانا کیا ہوتا ہے۔ یہ میں نے سیر پانا کے ساتھ قافیہ ملائے کی کوشش کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ٹوٹی نے سر ہلایا جھٹکھو شامی تو تمہارے خون میں مریج ہوئی ہے۔ بعض اوقات تو زخم کھٹنے پر خون بھی نہیں نکلتا۔ شمری نقل آتا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے ہم میں سے کون کون بھی مار کھانا سے گھبرائے والا نہیں ہے۔ بعض اوقات تو وہ بھی ہمارے سیر پانے ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تم دونوں یہ پروگرام اور ہی سے ہکا کر کے ہو۔" میں نے تھکی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "خوار خواہہ ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو کہ ابھی ابھی اچانک یہ پروگرام کچھ کیا ہے۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظریں جھٹکیں۔ ٹوٹی سر کھانے لگا۔ راجیلہ متنا کر بولی "میں تو تمہیں پہلے ہی خبردار کر چکی ہوں کہ یہ دونوں اول درجے کے اچھے اور بد معاش ہیں۔" "اس سے پہلے کہ تمہاری مزید عزت افزائی ہو، تم پہلے ہی جاؤ۔" میں نے کہا۔

ٹوٹی نے یوں راجیلہ کو گھورا جیسے کہ وہاں "تپ سے تو میں بعد میں نہیں لوں گا۔" پھر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ چہ لیسے کی خاموشی کے بعد راجیلہ بولی "انی! تم نے کبھی سوچا ہے ہم کتنے خوش قسمت ہیں؟ ہماری کوئی جیلی نہیں۔ ہم سب قریبی ساتھیوں کا کوئی خاندان نہیں۔ لیکن ہمیں اس کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم سب ایک جیل ہی کی طرح ہیں۔ ایک عجیب اور انوکھی جیل۔" وہ گویا اس تصور سے کھٹکھٹا ہوتے ہوئے مسکرائی۔

"شاہد جیل سے کچھ بگڑی ہیں۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا "جیلی میں تو بہت سے مسائل۔ بہت سے جگہ۔ بہت سی چیزیں گیلیں اور بہت سی کیڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے درمیان وہ سب نہیں ہیں۔"

"ہاں۔ یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے حلیم کہا۔ "خدا کا شکر ہے تم نے زندگی میں میری کسی ایک بات سے تو اتفاق کیا۔" میں نے طمانیت کی سانس لی "اب تم میری ایک بات اور مان لو۔"

"کیا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔ "جیلی بنانے میں کتنی ہی مسائل، کتنی ہی جگہ، کتنی ہی چیزیں گیلیں سکیں۔ لیکن انسان جیلی بنانے بغیر نہ نہیں سکتا۔" میں نے اندازہ لگے جس میں کھٹکھٹا جا رہی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" اس نے سلامتی سے میری اس بات کو بھی حلیم کر لیا۔

میں نے ظاہر سراسر سے انداز میں بات آگے بڑھانے ہوئے کہا "اور جیلی بنانے کے بغیر نہیں جی اور ہر انسان کی سرکڑ کوشش ہوتی ہے کہ وہ شادی سے محروم نہ ہو جائے۔ مگر سب کو معلوم ہے یہ بار کے لئے ہیں۔ جو کھائے وہ بھی بچھتا ہے اور نہ



کہا "وہیے میں تاریک پولو کی طرف کچھ زیادہ سی نظر رکھتا ہوں اس لیے میں نے مستقبل کا کچھ زیادہ سی حقیقی نقشہ کھینچ دیا۔" جنہیں اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بدترین حالات کے لیے تیار رہتا ہے لیکن اگر اچھے نتائج سامنے آجائیں تو غیر متوقع خوشی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں ادھر والے کی طرف سے یوں سمجھا جاوے۔

"آخر تم کوئی اور اچھی سی لڑکی تلاش کر کے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کوئی بھی لڑکی تم سے شادی کرنے پر تیار ہو سکتی ہے۔" آج وہ بڑی رمان سے اور بڑے ہوروانہ سے انداز میں اس موضوع پر بات کر رہی تھی۔

"تم مجھے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش مت کرو کہ کوئی بھی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو سکتی ہے۔ اور میں کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میں تو تم جیسی بے ہودہ بڑی اور ننگی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جب تم جیسی دلیلیات لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہو رہی تو اچھی لڑکی کہاں سے تیار ہو جائے گی؟" میں نے لٹھڑی سانس لی۔

خلافہ توقع نہ تو سحرگانی اور نہ ہی اس نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی اس کے برعکس وہ بڑے خیال انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کا ذہن شاید کسی اور تھا۔ شاید اس کے اندر کا موسم بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے امید بھرے لیے میں جلدی سے کہا "اب تو ذرا تاج نے بھی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مگر کی ریت ہماری ٹھہری ہے جس پہلے جلدی ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ اچانک سر ہٹا کر مر قش اور مجب سے لہجے میں بولی۔

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا "کیا جنہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے؟ کیا میری شکل کسی جنس محبت سے ملتی ہے؟"

"مجھے مجھے شادی سے ڈر لگتا ہے۔" وہ سراسخانیہ بغیر اسی غصیدہ اور مر قش لہجے میں بولی۔ یہ میرے لیے حقیقتاً حیرت کی بات تھی۔ وہ خدائی سرکش اور مضبوط لڑکی جو بھیاک ترین خطرات سے نہیں ڈرتی تھی شادی سے ڈرتی تھی۔

"جنہیں کس اور جوان لڑکیوں کے بارے میں تو تنے میں آتا ہے کہ وہ شادی سے ڈرتی ہیں لیکن تم نہ تو کس ہو اور نہ ہی جوان۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تم تو شادی کے تجربے سے گزر چکی ہو۔"

"سی لیے تو ڈرتی ہوں۔" وہ فوراً بولی "شادی انسان کے آئیڈیلز کی موت ہوتی ہے اور میں دوسری مرتبہ اپنے آئیڈیلز کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتی گی۔"

"ان سب پولو کی پرہیز جانے والی تھی مرتبہ بات کر چکے ہیں۔ یہی لمبی بحث ہو چکی ہے۔ تمہارے ذہن میں جتنے بھی اچھے اور خدشات ہیں میں ان سب کے بارے میں جنہیں قائل کر چکا ہوں۔"

کہا "وہ بھی بچتا ہے۔" اب ذرا اس کے کان کڑے ہوئے وہ عجمی نظروں سے لکھنے ہوئے بولی "تم کتنا کیا چاہتے ہو؟"

میں نے ایک درخواست سے تمہارے پاس ذرا ہوا پڑی ہوئی ہے میں ایک بار پھر اس کی طرف تمہاری توجہ دلاتا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے اب تو اسے مجازاً پونچھ کر ذرا توجہ سے دیکھ لو۔" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔

خلاف توقع اس بار وہ ایک دم ہنسنے سے نہیں اکڑی۔ اس کے چہرے پر الجھن، سر مری یا بھینٹا ہٹ کے آثار بھی نہیں ابھرے۔ خاموش پنہی ہوئوں پر صانت ہمیں مسکراہٹ لیے میری طرف دیکھتی رہی۔ اچانک اس نے پوچھا "کیا زور تاج نے واقعی رحیم گل کا انتخاب کر لیا ہے؟ کیا وہ میری ہے؟ کیا وہ اس سے شادی کرے گی؟"

"ایک سانس میں تمہیں سوال۔" میں نے لٹھڑی سانس لی "بعض عورتوں کو پیش اپنی شادی سے زیادہ دوسروں کی شادیوں کی فکر ہوتی ہے۔ بر حال تمہارے تین سوالات کا جواب صرف ایک ہے۔" یہ اسی لیے تو مجھے بھی تمہارے پاس پڑی ہوئی اپنی پرانی گرد گودرخواست ایک بار پھر یاد آگئی ہے۔ اب میں بھی شادی کر لی لکھی جاوے۔ شادی کر کے بچھتا بر حال شادی نہ کر کے بچھتا سے بہتر ہے۔ مستقبل قریب میں ہمیں بھی ایک فیملی کی بنیاد رکھنی پڑنی چاہیے۔ ہمارا بھی ایک بھراؤں اٹھکر ہونا چاہیے جس میں مسائل ہوں۔ جھگڑے ہوں، پیچیدگیاں ہوں، کیفیتیں ہوں۔ ملاقاتی اولادیں ہوں جو ہمارے بوجھاپے میں ہی جا ماند کے ہمارے پر لڑنا شروع کر دیں اور ہمارے مرنے کے بعد محفل میں بیٹھ کر کہا کریں "ابائے بھلا ہمارے لیے کیا چھوڑا؟" صرف ایک قاتل اشارہ ہو سکے۔ ہند بچکے اور چند اغڑ سڑتے۔ وہ چاہتے تو اس سے زیادہ بھی کا سکتے تھے لیکن انہوں نے کبھی دھمک سے کام کیا ہی نہیں۔ اور وہ ہماری آتماں! ہمیں تو مسلم ہی نہیں ان کی محبت کا کیا ہوتی ہے۔ انہوں نے کبھی ہمیں وقت ہی نہیں دیا۔ انہیں تو اب کے ساتھ کوٹنے سے ہی فرمت نہیں تھی ذریعہ و فریب۔ ہمیں ان ہم دیات کو قائم رکھنے کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور ٹھٹھیکے بغیر اسی دنیا سے رخصت نہیں ہونا چاہیے۔"

اس بار وہ اس قسم کی باتوں پر لال چلی ہوئے اور مجھے آنکھیں دکھانے کے بجائے جھڑبھڑکی سی لے کر بولی "اگر مستقبل میرا قضا کا ہی بڑا ہے تو اتنی مصیبتیں اور مصیبتوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مختصر تو کم و بیش سب کے مستقبل کا یہی ہوتا ہے لیکن میں نے کہا کہ اگر وہ ان قدر کس کو کہا کہ بچھتا ہے۔" کہا کہ بچھتا ہے سے بہتر ہے ورنہ زندگی بھر انسان کچھ زیادہ ہی بے قرار اور پراسی لہلہا کی طرح بھٹک رہتا ہے۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے

اب تو بات صرف فیصلے پر آکر اٹکی ہوئی ہے۔ میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ خدا کے لیے فیصلہ کر بھی چکو۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ ایک روز تم آئینہ دیکھو گی اور اپنا سر سفید پاؤ گی۔" میں نے حقل سے کہا۔

"تو پھر اس وقت شادی کر لیں گے۔" وہ سر اٹھاتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ پھر اپنے مخصوص غیر سنجیدہ موڈ میں نہ آجائے۔

"اگر ہم اس وقت شادی کر لیں گے تو ہماری شادی کی دوزخ کسی قسم یا ذرا سے میں کامیڈی سین کے طور پر دکھائی جائے گی۔ دیکھو۔ تم ایک بار پھر اس بات کو مذاق میں ماننے کی کوشش نہ کرو۔ آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے آہستگی سے میز پر گھونسا مارا۔

"میرا خیال ہے تمہیں ذرا تاج کے فیصلے نے کچھ زیادہ ہی جذباتی کر دیا ہے۔" وہ بدستور ہنس سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ذرا تاج کے فیصلے کے بارے میں سن کر وہ خود اندر سے ہل گئی تھی۔ اس نے فضول سی دلیلوں کی بنیاد پر اپنے انکار کی جو غارت گیزی کی تھی مجھے اس میں ذرا تیز پڑنی محسوس ہو رہی تھی۔ میں چاہ رہا تھا آج اس غارت کے قائم رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو ہی جائے۔ اور میں محسوس کر رہا تھا کہ آج فیصلہ ہو سکتا تھا۔ اس تصور سے میری دھڑکنیں تیز ہوئی جاری تھیں۔ تاہم میں نے اس کے اندر کی کیفیتوں کے بارے میں کوئی خیال آرائی نہیں کی۔ میں غلطی پر بھی ہو سکتا تھا۔

"ہاں۔ ذرا تاج کے فیصلے نے میرا احساس زباں بڑھا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں آج مجھے معلوم ہو جائے کہ ایک سو سو ہی امید کے سارے زندگی کو ایک بے ثمر درخت کی طرح گزارنا مکمل منہدی ہے یا بے وقوفی؟ آج میں نے محسوس کیا ہے کہ ذرا تاج ہم دونوں سے زیادہ مکمل مند ہے۔"

"تو اب عشق میں محفل بھی کھس آئی؟" اس نے ہنسی سانس لی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور ہلکی پڑ گئی۔

"ہاں۔ زندگی کے ہر معاملے میں کبھی کبھی محفل کے خانے کو بھی تھوڑا بہت نفل لینا چاہیے۔"

میرا طیکہ وہ خانہ خالی نہ ہو۔ "اس نے تھوڑا۔"

"آج مذاق نہیں چلے گا۔ تم از کم اس وقت نہیں چلے گا۔"

میں نے اپنے لیے بے سختی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

اس نے ایک بار پھر سر جھکایا۔ کہے میں گمراہ نہ ہو جاؤں۔ آخر وہ بولی تو اس کی آواز ایک بار پھر مرخص تھی۔

"دیکھو۔ تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ شادی کے بعد دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھے تو شاہد تم سے نہ ہوں کیونکہ میں نے تمہارے ساتھ قریب رہ کر

تمہیں ہر اعتبار سے پرکھ لیا ہے۔ تم بہت اچھے انسان ہو۔ انسان جو اکثر صرف خوابوں اور خیالوں میں رہتا ہے۔" زندگی میں پہلی بار اس دیرینہ غریب کا شکریہ ادا کیا۔ "میں نے کبھی نہیں آ رہا کہ یہ تم کہہ رہی ہو۔" اس نے گریبا اپنی سی دھن میں بات جاری رکھی۔ "مجھ سے شاید تمہیں زندگی میں بہت سی باتیں ہوں۔ شاید میں اچھی نہیں ہوں جتنا اچھا تم نے اپنے ذہن میں میرا تصور قائم کیا ہے۔ شاید میں تمہارے معیار پر پوری نہیں اتر سکتا۔"

میں نے ایک بار پھر اس کی بات کا ٹی "میرا کوئی معیار نہیں ہے۔ میرا معیار صرف تم ہو۔"

"شادی سے پہلے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ جب تک کہ کچھ رسائی میں نہیں ہوتی تب تک بات کچھ اور ہوتی ہے۔ رسائی آنے اور حقیقی تعارف کا یقین پڑتا ہو جانے کے بعد بات کچھ اور ہوتی ہے۔ دیرے دیرے محسوسات میں تبدیلیاں آتی شہدائے محفل ہیں۔ میں اس وقت کی بات کر رہی ہوں۔ اگر اس وقت تمہیں میرے بارے میں بہت سی باتیں کا احساس ہو۔ تمہیں احساس ہو کہ میرے بارے میں تمہاری بہت سی توقعات ہیں۔ میں نہیں ہوں۔ اور تمہیں کسی قسم کا احساس زباں ہو کہ تم نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ تمہارے پاس تو کھانا بڑے اچھے اچھے مواقع موجود تھے۔ اگر تمہیں اس طرح کا کوئی بھی احساس ہو تو پلیز اس کا میرے سامنے اظہار نہ کرنا۔ زندگی میں کبھی ایسا کوئی بات مجھ سے نہ کہنا۔ اگر ایسا کوئی احساس پیدا ہو بھی جائے اسے دل میں ہی رکھنا۔ کبھی مجھ پر ظاہر نہ ہونے دینا۔ یہی حکم ہے۔ یہی ایک فرمائش ہے۔" میں ایک مطالبہ ہے۔ میں زندگی بھر اس سے اور کچھ بھی نہیں مانگوں گی۔"

ایک لمحے کے لیے تو میں تجھ اور بے چینی کے عالم میں اپنی جگہ دم بخود سا بیٹھا رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں تھا۔ غلطی نہ تھی کہ شادی کے مقابلے میں اس کی فرمائش "اس کا مطالبہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی صرف ایک تودہ پٹھے پول کے عوض کسی بچے کو خریدنے کی کتنی کتنی آہ کے پڑا۔"

"کیا۔ کیا تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟" میں نے غصے کو پوچھا اور اچانک میز پر جھٹکے کی کوشش میں کرسی سے گر پڑے۔ چلا۔ میں نے زندگی میں کبھی خود کو ایسا محفل بنا دیا۔ محسوس نہیں کیا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے یہ جوا کیلئے ہی پڑے۔ مجھ اس کے لئے مجھے جین سے رہنے نہیں دو گے۔" وہ سر اٹھاتے ہوئے بڑبڑاتا ہی توازن میں ہولی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی ہنس اور دم کا مسکراہٹ تھی جو دھندلے دھندلے سے نمودار ہو جاتی تھی۔ یہ مسکراہٹ اب مجھے کچھ بچہ اسرار سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ کبھی مجھ سے مذاق تو نہ



”کیوں۔ کیا تمہارے خیال میں تم.... کسی غیر انسانی حقوق سے شادی کرنے کی اپنی بھرتی ہو جو تمہیں اس خیال سے مانوس ہوئے میں اتنا وقت لگے گا؟“ میں نے انہیں نکالیں۔

”تقریباً ہی سمجھ لو۔“ وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔  
”اور یہ اچانک تم نے پڑی کیوں بدل لی؟ اگر میری کیوں بولتی شہنشاہ کر دی؟“ میں نے جانا چاہا۔

”جیسی باتیں اپنی زبان میں کہنا کچھ مشکل سا کام لگتا ہے۔ پرانی زبان کا سارا لہجہ جاتا ہے۔ مجھے تو بہت دیر سے تمہاری باتوں کا جواب دینے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ تمہیں شاید آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اندر سے میں بہت شرمیلی لڑکی ہوں۔“

”چھال لپیٹ ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے بعد زور سے ”اُاُاُ“ بھی کر دیا۔ مجھے معلوم تھا وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ کسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اندر سے وہ کبھی بھی کس مزاج اور کن عادات کی مالک تھی۔ وہ بھی پتہ چلے میرے باطن سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس کے باوجود انہیں بنے رہنے اور نہایت عجیبگی سے ایک دوسرے کو چھیڑنے اور ایک دوسرے کا مذاق اڑانے میں پورا لطف آتا تھا۔

”وہ قدر کمزوروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی ”ہر ایک الہ دین کے جن کی طرح زیادہ اُاُاُ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھی میں نے باضابطہ طور پر ان میں کی ہے۔ میں اپنا فیصلہ واپس بھی لے سکتی ہوں۔“

”یہی اہم باتیں کہہ کر گھرنے والوں کے ساتھ میں بہت بُرا سلوک کیا کرتا ہوں۔“ میں نے بھی جواباً اسے خوشخوار نظروں سے گھورا۔

”کیا کرو گے تم؟“ اس نے اڑ کر پوچھا۔  
”میں ممکن ہے میں تمہیں گولی مار کر لاش سمندر میں پھوٹا دوں۔ بھوکے پھلیاں تمہیں فوج کرکھا میں گی اور وہ بھی تمہاری طرح بھوتی اور ہرجائی ہو جائیں گی۔ وہ بھی اپنے بھٹکوں سے کوئی وعدہ کر کے مکر جایا کریں گی۔“

”جالی آ رہی! پھلیوں کا کوئی پھل نہیں ہوتا۔ وہ ہر مافوقِ اُست ہوتی ہیں۔“ اس نے اپنی داستان میں میری مصلحت میں اضافہ کیا۔

”ہر مافوقِ اُست؟“ میں نے جان بوجھ کر انہیں بٹتے ہوئے پوچھا ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”سی لے کر کتنی ہوں اگر تو کہیں میں کچھ عرصہ دل جی سے اسکول اور کالج چلے جاتے تو جماعت کا یہ عالم نہ ہوتا۔“  
”تمہارا مطلب ہے کہ ہر مافوقِ اُست کا مطلب آجائے سے میری ساری جماعت دور ہو جاتی؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔  
”کچھ فرق تو نہ آ۔“ وہ بولی۔

میں نے سر کھاتے ہوئے کہا ”مجھے یاد تو نہ آئے کہ کالج کے

ناتے میں ’میں نے دولہائی کی کتاب میں یہ لفظ پڑھا تھا۔‘  
وقت مطلب یاد نہیں آتا۔“

اس نے گویا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے کہا ”ہر مافوقِ اُست جاندار ہوتے ہیں جو تر اور مادہ دونوں ہوتے ہیں۔“

”جہت خوب۔ یعنی نو ان دنوں۔ اوپر والے کے ہم زرا لے ہیں۔“ میں نے جب کا اظہار کیا ”وفا اور سہمہ و قیل و قال جھڑپا نہیں۔ ایک عمل اور خود قبیل جاندار اس کو کہا جاتا ہے۔ لیکن۔۔۔ ہر حال ان کے اپنے کچھ مسائل اور پھرتی ہوں گی۔ سرکف یہ خیال رکھنا کہ تمہارا یہ انکشاف مجھے تم کو مارنے اور تمہاری لاش سمندر میں پھینکنے سے باز نہیں رکھ گا۔“

”ٹھیک ہے۔ مار دینا گولی۔“ وہ ہنسی سے بولی ”تھو تمہاری بک بک سننے سے تو گولی کا کمر ہانا بہتر ہے۔“

”واہ۔ واہ! تم تو ابھی سے برسوں پرانی ہی جیسے سنا بولنے لگی ہو۔ شادی کے بعد کیا عالم ہو گا!“ میں نے حیرت اور ہنسی کا اظہار کیا۔

”سی لے میرا مشورہ ہے اب بھی سوچ لو۔ ابھی وقت ہے! وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”سنت مشورے کا شکریہ۔ لیکن تم اٹھ کر کہاں چلی گی؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں۔“

”آرام کے لیے اللہ نے رات بنائی ہے۔ وہ سنت چڑی شادی کی تیاریوں اور حلقہ نصیلات ملے کہنے کی تو ابھی اجازت نہیں دے رہیں لیکن تمہارے ہائی بھرے کی خوشی میں چھو کا مونا جشن تو ہو جانا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو آج رات وہاں ہاتھوں ساتھیوں کو لکھا ہو کر نہایت شاندار ذکر کرنا چاہیے۔ کونجی اطلاع دے دیتے ہیں۔“

”مجھے معلوم تھا تمہاری ٹان کھانے پر ہی اُتر گئے گی۔ وقت کھانے بیٹے پر ہی گئے رہتے ہو۔“

”شکر کو“ چٹا نہیں ہوں۔ صرف کھاتا ہوں۔ اگر ہوں تو بے ضروری چیزیں چٹا ہوں۔ تم ہی تازہ پھل کھانے کے میری زندگی میں کون سی دلچسپی ہے؟ ایک کھانے کے ساتھ رکھا کیا ہے۔! میں نے طویل سانس لی۔

”کل بھی ہم نے شاندار مژدہز کیا تھا۔“ وہ بولی۔  
”شکر ہے تم نے چھ ماہ پہلے کے کسی ذرا دار کو نہیں۔“

اور یہ نہیں کہہ دیا کہ فی الحال ہمیں اس پر اکتفا کرنا چاہیے انسان کو دن میں کم از کم تین مرتبہ کھانے کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کی بھی فوٹ آسکتی ہے۔ یہ اس کی سرگرمی ہے۔“

بھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بچ ہونے کے باوجود  
نہیں تو دیکھیں نہیں ہے۔ "وہ بولی۔

"ایک خاندانی راز ہے جو شادی کے بعد بھی تمہاری کچھ  
نا نہیں آئے گا۔" میں نے شان بے نیازی سے کہا "ویسے  
مادی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں جتنا چاہوں ہوں اتنی ہی افلی  
رہے گا تو کس بھی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی "صرف کوہان کی کسر ہے  
نہ اے اوٹ ہوتے۔ اور اوٹ بھی وہ جو پانی کا نہیں بلکہ  
راک کا ذخیرہ کرتا ہے۔ سر حال تم ڈر کا پروگرام بناؤ۔ مجھے  
مطمئن ہے تم اس کے بغیر باز نہیں آؤ گے۔ جس کو چاہے وہ جو کر لیا  
ان وقتوں میں بچے سے پہلے کا مت رکھنا۔ میں اب دس بجے سے  
نہیں نہیں آؤں گی۔"

صمت بہر حال علیہ! میں نے سر جھکا کر ہونے کا "صمان  
جی دیے بھی پیش لیٹ آتا ہے۔ آج کے ڈر کی صمان  
ہی تم ہوگی۔"

مجھے اس اعزاز کے بغیر ہی ٹھیک ہوں۔ "وہ اچھو جوڑنے  
نے پہلا اور پہلا۔ ڈر کے موقع پر اعلان کرنے مت بیٹہ جانا  
انہیں دھڑکتے ابروؤں کی نگاہوں اور کھینچا تانی کے بعد آخر کار  
پلٹنے مجھے سے شادی کے لیے پانی بھری ہے۔ اس خوشی میں  
ہرگز تھکنا نہ بجائیے۔" ابھی تم کسی سے اس کا ذکر بھی نہ  
لے لی اعلیٰ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہتی

تھیں۔ کیا یہ اتنی ہی بُری بات ہے؟ میں نے حیرت سے  
پوچھا۔ میں نے تو تم کا ڈی پر لاؤڈا ڈیکٹرٹ کر کے شرمیں  
یا کر دے۔ اعلیٰ! اخبار میں پچھو دل۔ دیکھ لو اعلیٰ ہی سے  
یا کر دے۔"

"مجھے تم سے اسی بھانپنے کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے تو کہہ دی  
مجھے اس پر کوئی شرم نہ کی نہیں ہے لیکن پھر بھی۔ دو سوں  
اور میرے دوسرے آگاہ کرنا ہی بہتر ہے گا۔ یک دم سب کے  
پہنچانے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ طاقت سے بولی۔

میں نے پہنچ گیا ہمارے سے اعلان کر دیا۔  
میں نے پہنچ گیا ہمارے سے اعلان کر دیا۔

کہ زور آج ہی کے فیصلے نے مجھے بھی فیصلے پر پہنچے میں مدد کی  
اس کے بعد دو گھنٹے میں اس کی طرح یک دم بے ساختگی سے  
نہ جرات ہوئی ہے۔ "ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "یہ  
کون سا قسم ہے۔ جس طرح ایڈیٹر کا معاملہ نگار کی رائے  
پر مبنی کی رہا ہے۔ اس طرح ہونے والے شہر کا  
والہ ہوئی کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ تم جو چاہو

اور جو مناسب سمجھو کرنے رہا۔ خدا حافظ۔"

وہ سر حال آخری فیصلے کا اختیار مجھے دے کر رخصت ہو گئی۔  
میں دیر تک ایک عجیب سرشاری کے عالم میں بیٹھا رہا۔ کئی بار مجھے  
شب ہو کر وہ سب کچھ میں نے راجیلہ کے منہ سے خواب کے عالم  
میں تو نہیں سنا تھا؟ اور یہ خواب جلدی ٹوٹ تو نہیں جائے گا؟ لیکن  
رہتا رہتا مجھے یقین آتی گیا اور پھر میرے احصاب بھی معمول پر  
آگئے۔ میں نے شیخ شاہ اور ٹی کو موبائل فون پر خصوصی ڈر کے  
پروگرام سے مطلع کیا۔ انہوں نے نہ تو کسی خاص حیرت کا اظہار کیا  
اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی سوال کیا لیکن جب میں نے زور آج  
سے رابطہ کر کے اسے مدعو کیا تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"میں جب تمہارے ہاں سے رخصت ہوئی تھی اس وقت ہی  
تا دیتے۔" وہ بولی "اب تو میں نے ایک اور برس ڈر پر پہنچنے کی  
ہاں بھری ہے۔" لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود ہی بول اٹھی  
"خیر۔ اس سے تو میں محضرت کروں گی۔ تمہاری فضول ہے وہ وہ  
اور بے موقع دعوؤں پر پچھتاؤ زیادہ ضروری ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ  
میرے آنے کے بعد اساتذہ محترم سے وقت میں نہیں کون سی خوش  
خبری سننے کو مل گئی؟ کیا راجیلہ نے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے؟"

ایک لمحے کے لیے تو میں گڑ بگڑا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے  
آپ جسم کے کسی حصے کو سب سے زیادہ چاہا جا رہے ہوں لیکن  
کوئی طرف میں اسی حصے کو آگ کر دار کر دے۔ اس کے تحلیل  
نے یک دم صحیح سمت میں پرواز کی تھی لیکن مجھے سر حال راجیلہ کی  
بات کا بھرم رکھنا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "یہ حکیم راجہ تو جس  
دن مولنا ہو گا اس دن میں صرف دو چار قریبی ساتھیوں کو نہیں بلکہ  
دو چار ہزار افراد کو اپنے ہوش میں ڈر کر آؤں گا۔"

"میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم بھی جس میں اپنی زندگی  
میں ہی شادی کے گھات اترتے دیکھ لیں تو اچھا ہے۔" وہ ٹھنڈی  
سائیں لے کر بولی "سر حال۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ اگر بات خوشی کی  
ہے اور تم ڈر پر پڑ جا رہے ہو تو میں آج اس کی اور کچھ؟"

"ہیں۔ ہماری فرمائش تو اسی ہی ہے ضرر جسم کی ہوا کرتی  
ہیں۔" میں نے جواب دیا پھر جلدی سے کہا "میں سوچ رہا ہوں اگر  
تمہارا وہ بامدعی عاشق زاد آج رات قاصر ہو تو اسے بھی  
بلاؤں۔"

"وہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں  
کھنکھی۔ سر حال اگر وہ کیا تو تم اس کے سامنے کوئی اتنی سیدھی  
کہو اس نہ کرنا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے کہ اس کہنے کی۔ تم لوگوں کو جو بھی  
کہو اس کوئی ہو انہی میں خودی کرتے رہا۔" میں نے بے گنجائش  
منانے ہوئے کہا۔

"اس بے چارے کا اتنا مشکل ہی لگتا ہے۔ تم نے خودی تو  
اسے لے چکی ہیں بیٹا سنا ہے۔" وہ بولی۔

چکے رہے۔ میں نے ملائمت سے کہا "دیے تم کسی سون کرنا  
سانے بیٹے کے قافل تو نہیں ہو لیکن میں ازراہ اتفاق تم  
دعوت دے رہا ہوں کہ اپنے سامنے بیڑی اس کر ہی پر چڑھو  
کچھ پس مھر کے ساتھ بیان کرو کہ آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟  
"میں تمہارا سارا معززانہ پن ایک گھونٹے میں نکال  
گا۔" اس نے گھونٹا ہوا میں لرایا۔

"آج تو تمہیں کچھ زیادہ ہی نورو داروں چاہیے  
میں نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر ہر دو ان انداز میں سر ہلا کر  
ڈاکٹر کو بھی جب تک تکلیف کے بارے میں کچھ طور پر نہ بتا دیا  
وہ بھلا کیسے کوئی دار تجویز کر سکتا ہے؟ میں تو تم سے کوئی بڑی  
خری نہی اور پھر تمہیں ایک بہت بڑی خوشخبری سناتے کے  
میں بیٹھا ہوا تھا لیکن تم نے آتے ہی یوں چٹنا شروع کیا؟  
تمہاری ٹوم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا ہے اور اٹھنا بھل گیا ہے؟  
"خوش خبری؟" وہ سر ہلاتے ہوئے خوشخوار لگے  
"خوش خبری سننا چاہتے ہو تم مجھ سے۔؟" اس نے نڈر سے  
گھونٹا مارا "اتو پھر سنو۔ خوش خبری یہ ہے کہ آج تم نے  
افروں کے سامنے بتاؤ لیل کرایا ہے اتنا میں کبھی زندگی میں  
ہوا تھا۔"

"خیر۔ ہر جگہ کا کوئی نہ کوئی پسلان تو ہوتا ہے۔ میں  
ساختہ کیا لیکن پھر میں نے ذرا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا  
واقعی بہت زیادہ وحشت زدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے  
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کمری سنجیدگی سے کہا "تم  
سے بیٹھ کر بات کرو ورنہ میں ہیچ وٹ کھینچ اداں گا۔"  
میں نے جی جی پیس وٹ اٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ حال  
درمک پر وہ اور بھی مشتعل ہو گا لیکن غلاب تو نے وہ جلدی  
کیا تاہم اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ میں نے  
سے پوچھا "کیا دشواری پیش آئی؟ تم کس طرح افسران کی  
دلیل ہو گئے؟ کیا جمال سعیدی کے اس قلعہ نما مکان میں  
دشوار تھا؟ کیا تمہیں باپوسی کا تہہ دیکھنا پڑا؟ کچھ تو بتاؤ۔"  
میں جس کے پس منظر پر کچھ تو دھنسی ڈال دیا۔

"چھاپا مارنے میں واحد دشواری یہ پیش آئی کہ مجھ  
کوئی اسطرح برآمد نہیں کر سکے۔" وہ گویا انکار سے جانتے  
"میں اتنے جوش و خروش سے اس علاقے کی پائیں کی  
دستیاب تھی کہ تقریباً زبردستی افکاروں کے لیے گیا۔  
اچھا پوچھ لی کہ رہا تھا کہ اسے یہ خبر ٹیک نہیں  
جبری کی ہے؟ وہ جمال سعیدی کو جانتا ہے؟" اس کے  
طرح اسٹے کی کھپ برآمد ہونے کا کوئی امکان نہیں  
تو میں کے پاس ہتھیار ضرور ہوتے ہیں لیکن۔  
"ظاہر ہے اس سے تو اسی قسم کی باتیں سننے کی  
جاسکتی تھی۔" میں نے رخ لیے میں کہا "ملائے کی پائیں

"میرے نہیں۔ وہ بڑا پھر نکلا آئی ہے۔ رات تک تو وہ ایسے  
نہ جانے کتنے چکر مٹا دے گا۔ اگر وہ بھی کمانے پر آجائے تو  
اچھا ہے۔ کمانے کی سبب ہوگی۔ اس پر طوطیہ کہ تم موجود ہوگی۔  
ان لوازمات کی موجودگی میں تو وہ بڑی آسانی سے تفصیلی رپورٹ  
دے دے گا۔ جمال سعیدی کے نورنگ پکس میں اس کے چھاپے  
کے دوران میں جو کچھ ہوا ہو گا تمام تجزیات کے ساتھ بتا دے  
گا۔"

"وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھتے ہو۔" وہ بگلی  
سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"نی الحال تو شاید نہ ہو۔ شادی کے بعد ہو جائے گا۔" میں نے  
کہا۔  
"مغضول ہاتھی مت کرو۔" اس نے کہا اور سلسلہ متعلق  
کھڑا۔

مجھے رحیم گل سے رابطہ کرنے اور زرد فیر کی بات کرنے کی  
ضرورت پیش نہیں آئی۔ ابھی میں نے ریسور و رکھائی تھا کہ رحیم  
گل یوں دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آیا جیسے وہ باہر کھڑا انتظار  
ی کر رہا تھا کہ میں بات ختم کروں تو وہ اندر آجائے اس کا چہرہ کچھ  
جھپٹا ہوا تھا پھر شاید مفاد سی کیفیات کا مظہر تھا۔ وہ تھا کہ ابھی  
لگ رہا تھا اور سخت غصے میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ  
ساتھ اس کے چہرے سے بے بسی کی جھلکاوت بھی جھلک رہی  
تھی۔ وہ درودی میں ہی تھا لیکن غلاب معمول اس کی درودی زیادہ  
صاف ستھری اور نہیں حالت میں نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ  
بڑی ہماگ دوڑ اور مشقت میں مصروف رہا تھا۔ آنکھیں سرخ  
تھیں۔

وہ میرے مقابل آکر میز کے دوسری طرف ایک جھکے سے  
رک گیا اور ذرا مائی انداز میں ایک کھ مجھے گھورنے لگا جیسے پتا چلے  
کسے کی کوشش کر رہا ہو۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی آنکھیں کسی  
پناہ کے بجائے زخمی درندہ کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔  
ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے کچا چبانے کی فکر میں تھا۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری آنکھوں سے ہلاک کے شعلے کیوں  
برآمد ہو رہے ہیں؟ کیا جمال سعیدی کے آدمیوں نے بہت مارا  
ہے؟" میں نے گھٹتے لیے میں پوچھا۔

"جمال سعیدی کے آدمی تو خیر مجھے کیا ماریں گے لیکن میں  
تمہیں بہت اداں گا۔" وہ غرایا۔

میں یوں پس رہا جیسے کسی بچے نے مجھے کوئی گھسا پٹا سالیف  
ٹپا ہوا لیکن مجھے لیلیف سے زیادہ اس کی مصوبیت پر ہنسی آئی ہو  
"تمہاری اس قسم کی باتوں پر مجھے دی مصری پر متا پڑتا ہے۔  
بڑا سٹل خراشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم لگے۔ ویسے حیاق د  
سہاٹی کے بغیر بات کرنا کوئی اچھی عادت نہیں ہے۔"  
وہ بدستور خوشخوار تھلے سے مجھے گھور رہا۔ تھنے پھرتے

غارتہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔

میں نے کسی سانس لے کر سہلائے ہوئے کہا "سانس نے واقعی بڑی ترقی کر لی ہے۔ پولیس کے پیچھے تک اسلئے کی بیٹیاں بھولوں کی بیٹیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔"

"کیا تم حسب عادت پولیس پر خطر فرمانے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس نے آنکھیں میچ کر ایک نئے انداز سے مجھے گھورا۔

"نہیں۔ پولیس پر تو ایک زمانہ صبح سے شام تک خطر کرتا رہا ہے۔ میں کروں گا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اپنی یہ عادت ترک ہی کروں۔ خواہ خواہ اپنی انہی ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟"

"حیرت ہے! وہ زہریلے لمبے میں بولا "جن کی پوری زندگی ضائع ہو رہی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ضائع ہو چکی ہے" انہیں بھی انہی ضائع ہونے کی فکر ستانے لگی۔

"گلا ہے خطر فرمانے کا شوق تمہاری طرف منتقل ہو رہا ہے۔" میں نے کہا پھر جلدی سے پوچھا "خیر۔۔۔ یہ بائیس چھوڑو۔ یہ بتاؤ فون پر مجھ سے بات ہونے کے کتنی دیر بعد تم پولیس فورس کے ساتھ وہاں جا پہنچے تھے؟"

"ایک گھنٹہ تو گری گیا تھا۔" اس نے اب سیدھی طرح جواب دیا "بیس وقت تم نے مجھے فون کیا میں اندرون شہر کے ایک رستوران میں کھانا کھا رہا تھا۔ میں فوراً ہی کھانا چھوڑ کر اس علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ظاہر ہے اس میں بھی کچھ وقت لگا۔ پھر وہاں کے لوگوں کو قاتل کرنے اور بغیر وارنٹ کے چھاپا مارنے کے لیے تیار کرنے میں بھی کچھ دیر لگی۔ فورک پیلس بھی وہاں سے قریب نہیں تھا۔ وہاں پہنچنے میں بھی کچھ وقت لگا۔ اس بے کم وقت میں یہ سب کچھ ممکن ہی نہیں تھا۔ اب تم یہ فرمانے کی کوشش مت کرنا کہ پولیس نے ایکشن لینے میں دیر کر دی۔"

"نہیں۔ خیر۔۔۔ میں یہ فرمانے کی جرات تو کبھی نہیں سکتا۔ اتنے کم وقت میں تو واقعی تم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس پر خطر فرمانے کے بجائے میں تمہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ خراج تحسین ہمیں مل کر جمال سیدی کو پیش کرنا چاہیے۔ وہ ہمارے اندازوں سے زیادہ بڑا مفکر معلوم ہوتا ہے۔"

یہ کتنے وقت میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ہم نے دوڑوں میں جن قبائلی ہاتھ لوگوں کو جمال سیدی کے مکان کی طرف آتے دیکھا وہ شاید اس کے لیے صرف نوادگان فورس کے طور پر ہی نہیں آ رہے تھے بلکہ اس کے اسلئے کی بیٹیوں کی کچھ بھولوں کی بیٹیاں رکھنے کا بندوبست بھی کر کے آ رہے تھے۔ لیکن کیا انہیں معلوم تھا کہ اس کی ضرورت پیش آئے گی؟ یہ بھی ممکن تھا کہ جمال سیدی کے پاس وہیں آس پاس کوئی دوسرا بندوبست موجود رہا ہو۔ یہ اندوہ پڑا اسرار سا سلسلہ ضرور تھا لیکن ناممکنات میں سے بہر حال نہیں تھا۔ کاش ہمیں وہاں سے راہ فرار اختیار نہ کرنی پڑتی۔ ہاتھ کیا ہوا

سچی نے غور کر جب میں ڈال رکھا ہو گا۔ ہاں کہ وہ دیرانے میں بچا ہے لیکن علاقے کی پولیس پھر بھی اس کی سرگرمیوں سے بالکل باخبر نہ رہیں ہو سکتی۔"

"لیکن میں تو چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے جان بچاؤ۔ میں نے تو اس علاقے کے پولیس افسروں کو پہلے سے فون کر کے اپنی آمد سے بھی مطلع کر دیا تھا۔ اور پھر تمام وقت میری ان پر نظر رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی جمال سیدی کو غور نہیں کر سکتے تھے کہ اس کے گھر چھاپا پڑے والا تھا۔ اگر وہ دیکھ لیتے تھے تب بھی میرے سامنے جمال سیدی کو کوئی اطلاع دینے سے محذور تھے۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

اس نے جملہ اور حوا چھوڑ کر ایک طویل سانس لی۔ سانس کیا تم کو ایک ایک پتھر کا تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں میں غور و خیز کا اثر پڑھاتے ہوئے مجھے گھورا۔ میں نے زری سے کہا "پھر مجھے اس طرح گھورنے میں اپنی انہی ضائع کرنے کے بجائے اگر تم صحیح انداز انسانوں کی طرح سیدھے سادے انداز میں مجھے ساری بات بتاتے جاؤ تو اس میں تمہاری بھی بھلائی ہے اور یہی بھی۔ ہاں۔۔۔ تم۔۔۔ اس کے باوجود کیا ہوا؟" میں نے مشتعلانہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"اس کے باوجود جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں نہ تو اسلئے کی کھپ تھی اور نہ ہی کوئی قبائلی۔" رحیم گل نے جملے جیسے جیسے میں جواب دیا "وہاں صرف جمال سیدی کے چند محافظوں وغیرہ کی لاشیں تھیں اور وہ ان کے بارے میں رپورٹ درج کرانے کے لیے ہوا گئی فون پر ڈی آئی جی صاحب سے بات کر رہا تھا۔"

میں ایک لمبے کے لیے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میرے رگ دپے میں ہر پوری لہرو ڈھکی۔ راجہ کی طرف سے آج مجھے جو خوش کن غلط فہمی کا خلا تھا اس نے میرے جسم میں ایک نئی زندگی بخش لاریت دوڑا دی تھی لیکن رحیم گل جو کچھ کہتا تھا اس کی وجہ سے وہ حرارت کو ایک دم مفقود ہو گئی۔ میرے اندر ریرف کی ہر چار کی ہو گئی۔ وہ جہول میں ایک نئی زندگی ابھری تھی وہ دم توڑنے لگی۔

ایک لمبے کے نہایت تیز رفتور سکوت کے بعد میں نے منہ پھلنے لگے پوچھا "تم لوگوں کو وہاں کوئی خطرہ نہ تھا؟" "خاندان تو قتل کیا۔ وہ تو کھلا ہی تھا لیکن افسوس کہ اس میں اسلئے کے بجائے بھولوں کی بیٹیاں پڑی تھیں۔" اس کے لمبے میں اب بھی یہی تھی "ہمارے آدمیوں نے ایک ایک جہی کو کھول کر دکھایا۔ میں نے خود ان کا ہاتھ بٹایا لیکن ان میں سیدوں "انگوڑوں اور فوٹانوں وغیرہ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جمال سیدی نے بتایا کہ اس کا ایک دور کا عزیز جو اس کے ساتھ اسی گھر میں رہتا ہے" بھولوں کا دوبارہ کرتا ہے۔ وہ بھولوں کا دوست ہے اور ان کو کوئی بڑی کچھ خود بھی خرید کر رکھ لیتا ہے۔ جمال نے ازراہ سوالی اسے اپنا

فکار نکل گیا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو صبر تمامہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جمال سعیدی نے تمہیں کیا کمائی سنائی؟"

"میں نے پہلے وہ فون پر ڈی آئی بی صاحب کو گھوگر توڑ میں اپنی کمائی سن رہا تھا کہ مزدوروں کے طے میں نظر آنے والی دو عورتوں اور تین مردوں نے اس کے ہاں کاغذ و ایکشن کیا تھا۔ اس کے ایک پارنر کے بیکریٹری اور کئی محاندوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ کئی کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ وہ مزدور ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ مزدوروں کے روپ میں جیتے بچے ہوئے دہشت گرد یا کاغذ تھے۔" "یہ الفاظ خود جمال سعیدی نے استعمال کیے تھے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس نے معاذانہ سے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے اس پر ہنسی آئی۔ وہ ایک بار پھر ذرا زیادہ خفا ہوتے ہوئے بولا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"ہنسی کے تو اس میں بہت سے کچھ نہیں ہیں لیکن اب میں تم جیسے جاہل آدمی کو کیا سمجھاؤں۔" میں نے مہربان لہجے میں کہا "کلیا ستم عرفی ہے کہ ایک شخص جو خود نہ جانے کتنے بہت سے دہشت گردوں کا سرور ہے، خود عملی طور پر بھی دہشت گرد معلوم ہوتا ہے، دہشت پسندانہ ذہنیت کا مالک ہے۔ دہشت گردی کو بہت بڑے پیمانے پر ایجوکیشن فراہم کرتا ہے، وہ اپنے سے کہیں بہتر انسانوں کو دہشت گرد کر رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ وہ اس سے بہتر انسان تھے؟" اس نے مجھے گھورا۔

"جو اس قسم کے لوگوں کو سنبھالتے ہیں، میرے خیال میں وہ ان سے بہتر قرار دیے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔" میں نے بات مٹانے کی کوشش کی۔ میری زبان ذرا پھسل گئی تھی جس پر میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ جمال سعیدی اس حد تک برا آدمی ہے کہ اسے اس قسم کا سبق سکھایا جانا چاہیے؟" اس نے مجھے گھورا جاری رکھا۔

"گلتا ہے اگلے ہافس پر ملی کو چل پڑے ہیں۔" میں نے ذرا چڑنے کی لڑا کاڑی کی "یار تم تو ہر وقت نرے پولیس والے کے پولیس والے ہی رہتے ہو۔ تم نے تو اتنا مجھ سے ہی تحقیق شروع کر دی۔ میں نے تو تمہارے افسروں کی نظر میں تمہارا مقام اونٹیا کرانے کی کوشش کی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ دیکھو تو تم میں ترقی کرنے کی صلاحیت ذرا کم ہی ہے۔ میں نے سوچا تھا شاید اس طرح ہی تمہارا عہدہ کچھ بڑھ جائے شاید تم انٹیکلر کے عہدے سے کچھ آگے کھسک جاؤ۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تمہارے مجھے نے اب

کسی بھی قسم کے کارڈے پر وقت سے پہلے ترقی دینا مجھزامعہ اس سے پدموشن کے حکام میں بڑی گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے کارڈوں پر صرف نقد انعام اور تعریفی سرٹیفکیٹ دیے جاتے ہیں۔" اس نے میری مطوعات میں اضافہ کیا کہ "زہریلے لہجے میں بولا "اور یہ جو تم نے میری عزت افزائی کا عظیم موقع فراہم کر کے میری آنے والی نفلوں پر جو اسلحہ فرمایا تھا اس میں درحقیقت میری جلی اتارنے اترنے کی جگہ اس کی ابھی مصیبت پر ہی طرح غلی نہیں ہے۔ ابھی میرے بارے میں زیادہ بارگاہی سے جہان بین ہو سکتی ہے۔"

"اس لیے تم نے اس سے پہلے ہی اس سلسلے میں میرے بارے میں باریک بینی سے جہان بین شروع کر دی ہے۔" مجھام طعنے لہجے میں کہا۔

"جہان بین تو میں ابھی کوں کا بر خوردار! اس نے دم آئینہ انداز میں سر ہلایا "تم نے مجھے مروانے میں کوئی کریم چھوڑی تھی۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں اس بجلی میں سے نکل گیا۔"

"دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ پیکس بہت ہی زندگی رہی تو آئندہ کسی بجلی میں بس جاؤ گے۔" میں نے غصے میں کہا۔

"ظاہر ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا کہ "تم جیسے پار آئین قسم کے دوست ہوں ان کا بھی انعام ہے۔ کہیں وہ کہیں کے ساتھ کھن کی طرح بس جاتے ہیں اور کہیں کہیں کے ساتھ ہونے کا بہانہ بھی ضروری نہیں ہوتا۔ دیکھو کیا جاتے ہیں۔"

"تم کس منہ سے مجھے آئین کا سانپ کہہ رہے ہو۔ تم آئین کے اڈو ہے ہو۔" میں نے غصے سے کہا "مگر تمہاری جیسے دوست نہ ہوتے تو تم بہت پہلے بس چکے ہوتے۔ تمہارا ظاہر کا بھی سر نہ بن چکا ہوتا لیکن میں احسان جتنا پسند نہیں کرتی تمہیں معلوم ہے میرا عرف بہت بڑا ہے۔"

"اے۔" مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے۔" اس نے کہا میں سر ہلایا "تمہارا عرف تو بچپن سے دونوں عہدوں کی مالی نمائندگی بھی رکھتا تھا۔"

"میں نے یک دم اصل سوسائٹی کی طرف پلٹنے ہوئے کہا "اتھوں نے ظاہر کر دیا ہو گا کہ جمال سعیدی کے ہاں تم چھاپا کی غرض سے پہنچے تھے؟"

"ظاہر ہے۔ تمہاری فراہم کردہ اطلاع کی مدد سے میں جیسا کہ تم نے کہا کہ اندر سے سے قبائلی جیسے جیسے ہوں گے۔ ممکن ہے ہم پر قازق کوئل دیا جائے۔ اس لیے ہم نے مکان قریب بیچے ہی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ لگاتار شروع کیا۔ کافی شور شرابا کیا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اندر تو جمال



تھایا جس کی مجھے توقع تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے تو سب کا بھلا چاہا تھا۔ تمہارا۔ اپنا۔ اس ملک کا۔ اور ہم سب کی آنے والی نسلوں کا۔ لیکن بعض اوقات نیک خواہشات بھی قبول نہیں ہوتیں۔ شاید میں اس بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہوتی ہوگی۔ اور والا اپنے کاموں کو بہتر سمجھتا ہے۔ میں تم سے مہذرت خواہ ہوں کہ حمیس افغان و اکرام و مومل کرنے کے بجائے جھاڑ منشا پڑی لیکن تم اس مایوسی کا اندازہ نہیں کر سکتے جس کا اس وقت مجھے سامنا ہے۔ میں نے ایک طویل اور سرد سانس لی۔

”اس قسم کی مولوانہ تقریر سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ کچھ بدلے ہوئے سے لیے میں بولا۔ ”یہ مت سمجھو کہ میں اتنی آسانی سے تمہاری جان چھوڑ دوں گا۔ ابھی تو میری اپنی جان بھی صحیح معنوں میں نہیں چھوٹی ہے اور اگر میری جان چھوٹی گئی تبھی میں تمہاری جان اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اصل بات نہیں معلوم کر لوں گا۔“

”مگر یہ اصل بات ہے؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہ کہہ چکا ہوں کہ اس اطلاع کا میں نے لی تھی؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ بہت عجیبہ نظر آ رہا تھا۔

”مگر یہ اصل بات ہے؟“ میں نے انہماک سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ دانت چیر کر بولا ”جی ہاں“ میں نے اس کی بات کو دہرایا تھا کہ جمال سعیدی کے ہاں یہ خانے میں اسٹے کی بہت بڑی کھپ موجود ہے۔ وہاں بہت سے قبائلی ٹائپ لوگ بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ مزاحمت کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ حمیس یہ باتیں کیسے معلوم ہوئی تھیں؟“

میں نے چند لمحوں کے بعد گہری سانس لے کر کہا ”ہمارے انسپکٹر اگر میں چاہوں تو سرے سے اس بات سے ہی منکر ہو سکتا ہوں کہ میں نے حمیس کوئی اطلاع دی تھی لیکن تم چونکہ میرے دوست ہو اس لیے میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے ایک ایسے شخص نے اطلاع دی تھی کہ جو کچھ میرے پہلے تک خیال سعیدی ہی کا کارندہ تھا لیکن... کچھ اختلافات کی وجہ سے وہ لے چھوڑ کر فرار ہو چکا ہے۔“

”کہاں ہے وہ۔ اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟“

”ظاہر ہے وہ درویش ہے۔ کبھی کبھی مجھے فون کر کے کوئی اہم بات بتاتا ہے۔ پہلے کبھی کبھار وہ میرے ہونٹوں میں ٹھہرا کرتا تھا۔ اس دوران میں اس سے کچھ دوستی ہو گئی تھی۔ وہ خود تو جمال سعیدی کا کچھ باز نہیں سکتا لیکن اس امید پر مجھے اس کے بارے میں دو تین مرتبہ کچھ باتیں تا چکا ہے کہ میں اس کے خیال میں اثر رسوخ والا آدمی ہوں شاید میں خود بھی سطر میں رہے ہوئے جمال سعیدی کو کوئی نقصان پہنچا سکوں اور یوں اس کے جذبہ انتقام کی تسکین ہو سکے۔ مگر کاہیدی ہے، لگاؤ ڈھانے کی کوشش کر رہا

میں معلوم کی کہانی شروع ہو چکی تھی۔ جب ہمارے لیے گیت لکھا گیا تھا اور انداز بھی چھاپا ہمارے والا تھا۔ اگر ہمیں صحیح طور پر معلوم ہو تاکہ اندر کیا صورت حال ہے تو ہم جمال سعیدی کے سامنے بڑا مذاںہ کر سکتے تھے کہ ہمیں اس مکان میں گزیرنے کی اطلاع ملی تھی اور ہم اس کی مدد کے لیے آئے ہیں لیکن ہم یہ بڑا نہیں بنا سکتے اور ہمارا انداز بھی اسے سب کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ یہی سہی مگر حلقہ پولیس انسپکٹر نے پوری کوشش کی۔ اس نے صاف بتا دیا کہ وہ لوگ میرے اصرار پر چھاپا مارنے آئے ہیں۔ اس پر جمال سعیدی نے دودھ کر دی اتنی ہی صاحب سے مزید فریاد کی کہ ایک تو اس کے گھر پر حملہ ہوا ہے اس کے توئی مارے گئے ہیں اور اسے ایک دوسرے علاقے کا ایس ایچ او اس کے علاقے کی پولیس فوری کر ساتھ لے کر اس کے ہاں دھاوا چل رہا ہے۔ اگر میری جگہ لگتی اور ایس ایچ او ہوتا تو وہی اتنی ہی صاحب شاید اسے ٹیلی فون پر ہی قتل کر دیتے۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا ”وہ تو غیبت رہا کہ میں نے ذی اتنی ہی صاحب سے فون پر بات کرتے وقت یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں نے اس کی اطلاع پر یہ کارروائی کی تھی ورنہ تم بھی پلٹ میں آ جاتے۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں نے ایک گناہ اطلاع پر کارروائی کی تھی۔ اس پر ذی اتنی ہی صاحب نے تمام تر لحاظ داری کے باوجود مجھے خاصی جھاڑ پائی کہ کیا مجھے جیسے تفسیر کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے خلاف گناہ اطلاعات پر اس انداز میں کارروائی نہیں کی جاتی۔“

”بڑے بڑے لوگ...!“ میں نے صاف کراد افہا ”جریم گل فٹز آفر ہمارے ہاں بڑا آدمی کھانے کا معیار کیا ہے؟“

”مگر حمیس اب تک معلوم نہیں ہے کہ تم بہت بڑے گھر سے جریم گل بل کر لولا“ یہ بات تو چھوٹے سے چھوٹے افسر کو بھی معلوم ہے کہ ہمارے ہاں بڑا آدمی کسے کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے پھلانگ دینا تو دولت ہے جس کے بارے میں کوئی نہیں پوچھتا کہ غائب کے پاس کہاں سے آئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے افادات ہیں۔ سیاسی اثر رسوخ، سیاسی بلیک میلنگ، اسٹے کی طاقت، فٹز اگر ذی کی طاقت، امن و امان درہم برہم کرنے کی طاقت جن کے پاس یہ سب کچھ ہے انہیں ہمارے بڑے سرکاری افسران بھی ”بڑے“ یا ”مہتمم“ کو کہہ کر قرار دے کر ان کی چال چلی میں سمجھتا ہوں۔“

”مجھے یہ بات معلوم تو سمجھن سے ہے۔ یونیورسٹی یا دواشت کے کھانے کے لیے تم سے پوچھ رہا تھا۔“ میں نے کراہنے ہی کے انداز میں اس کی سمجھنی دے کر اسے جیسے ہے ہورہ لوگوں کی محبت میں بیچ کر فٹز اور دواشت کے لیے دفتر پر کورس کروا دیتا ہوں۔ بہر حال۔۔۔“

وقت پر خوب گزری۔ یہ لیکن مظلوم ہوتا ہے تم نے ان کے لئے  
زادہ قابل توجہ نہیں سمجھا۔

”اے ہلے۔ میں تو دانی میں ان الفاظ کو ان کا  
کیا۔ میں نے جو تک کہ کہا ہر غضب ناک خیر آئے گی کو خوش  
”یعنی تم نے صاف طور پر مجھے جوہر قرار دینے کی کوشش کی۔“  
”جھوٹا؟“ اس نے اسرودہ سے لیے جس میں وہ ہلاکت  
تمہارے لیے بہت چھوٹا تھا ہے۔ میری کچھ میں نہیں آتا  
تمہارے لیے کیا تھا استعمال کروں۔ بلکہ جی بات تو یہ ہے  
تمہارے سلسلے میں تو الفاظ استعمال کرنا وقت کا زیاں محسوس  
ہے۔ تمہارے ساتھ تو کسی اور ہی زبان میں بات کرنا چاہیے۔“

”وہ تو خیر تم پولیس والوں کی عادت ہوتی ہے لیکن یہ  
محالے میں تمہاری یہ پرانی حسرت بدستور حسرت ہی رہے گی  
بہر حال تم نے اگر اتنے دھمکے اس دھڑلے۔ یہ جوہر قرار دینے  
کو کوشش کی تو میں جس ڈنڈا ڈولی کر کے باہر بھٹکا ہوں گا۔“  
”تمہاری یہ حسرت بھی حسرت ہی رہے گی۔“ وہ فریاد  
جس میں ڈنڈا ڈولی کرانے کی بھی زحمت میں کھول گا۔ ضرورت  
تو میرے آدمی جس میں گھینے ہوئے یہاں سے لے جائیں گے۔  
”میں جس باجی آنکھوں سے خواب دیکھنے سے بچ  
کر سکا کہ نہ میری یہ کوشش فضول ہوگی۔ تم اس سے باز نہیں  
گئے۔“ میں نے اسی سے کہا۔ ”لیکن تمہاری کیا اس اب  
برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“

”اس وقت میں اتنی آسانی سے جانے کے لیے نہیں  
ہوں۔“ وہ کچھ پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کچھ ضروری  
کے جواب چاہئیں۔ اگر تم شرافت سے جواب نہیں دے گے  
جس قاتل نے بھی ہلاک کیا ہوں۔“  
وہ واقعی عجیبہ نظر آ رہا تھا۔ میرے سینے سے بے انتہا  
کراہی نکل گئی اور میں نے پھٹ کر طرف دیکھ کر کہا کہ  
”نہ ٹھیک ہی کہا تھا۔ پولیس والوں کی دوستی ابھی نہ دشمنی  
میں تو سونے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ انسان ان سے دشمنی تو  
لے لے لیکن ان سے دوستی بھی نہ کرے۔ میں تو جس  
سعدی والے مشن پر بھیج کر بچتا رہا ہوں۔ اس سہ سے  
دشمن تو کچھ نہیں ہوا لیکن تم خواہ مخواہ دانی ڈالنے  
ہو گئے۔“

”یہ تو جس چند دن بعد پچھلے کا کہ میرا دانی  
درست ہے۔“ وہ تھکے پھلتے ہوئے بولا۔ ”میں جیل میں  
ہوں کی لاٹھیاں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اور لاٹھیاں خواہ کسی کی  
ان کا معاملہ سمجھیں ہوتا ہے۔ میں اس معاملے کی بہت  
باریک بینی سے تفتیش کروں گا۔“

”ناشاؤ اللہ۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں  
جائزہ دیا جس ملائی اور جھٹی اسرودہ کے جواب تو  
”میں نے پہلے تو تم نے اس کی فراہم کردہ کوئی اطلاع کچھ تک  
میں پہنچائی۔“ ”رجیم کل پہنچے ہوئے لیے میں بولا۔  
”اس سے پہلے اس نے جو دو تین باتیں بتائیں ایک تو وہ اتنی  
اہم نہیں تھیں۔ دوسرے وہ کچھ تاخیر سے بتا رہا تھا۔ میں نے  
اندازہ لگا کر ان کے بارے میں کوئی ثبوت حاصل نہیں ہو سکے گا  
اس لیے جسیں زحمت دینا فضول ہے۔“ میں نے دانی سے کہا  
”لیکن اس بار اس نے مجھے جو اطلاع دی وہ اتنی سنگین تھی کہ میں  
نے سوچا جسیں زحمت دے ہی دی جائے لیکن شاید ہماری قسمت  
اچھی نہیں تھی۔ حال سعدی ہم سے پہلے ہاتھ دکھا گیا۔“  
”جس کیوں اتنا سنگین ہے کہ تمہارے اس خبر کی اطلاع  
درست ہی تھی؟ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ شاید وہ جسیں اپنے  
مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہوں؟“ ”رجیم کل بدستور جیسی  
نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔  
”میں نے اس سلسلے میں اپنی چھٹی جس پر مجھروا کیا تھا۔ یہ تو  
بہر حال جس میں مظلوم ہے کہ حال سعدی کوئی ٹھیک آدمی نہیں  
ہے۔ بات صرف ثبوت کی ہے۔ اگر اس کے واقعات سے  
بہت نہ ہماری جائے اور کوشش جاری رکھی جائے تو ثبوت بھی کبھی  
نہ کبھی مل ہی جائے گا۔“ میں نے نہایت متانت سے کہا۔  
”بھئی جس۔؟“ وہ استہزائیہ سے انداز میں جہاں پہلے اپنی  
پانچ جھوٹوں سے توضیح طرح کام لیتا تھا۔ بہر حال۔ تم نے یہ  
عجیبوں والی کمالی خوب گزری ہے۔ اور دانی الودیعہ گزری ہے۔ تم  
اور دھر اور میدان میں نہ تو تارے ہی رہتے ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ  
تم نے اب تک کمانی کار یا ڈراما گار بننے کی کوشش کیوں نہیں کی۔  
جس دانی سے تم کمانی گزرتے ہو مجھے امید ہے تم اس میدان میں  
بھی جھنڈے گاڑ سکتے ہو۔“

”اس لیلہ میں چہ نہیں ہے۔ میں صرف اس لیلہ میں کام  
کرتا ہوں جس میں چہ ہو۔“ میں نے بے نیازی۔ یہ جواب دیا۔  
”شہرت تو ہے۔“ وہ بولا۔  
”خالی شہرت کو کیا میں شہرت کا کچھ نہیں گاہا؟“ میں نے نہ بنا کر  
کہا۔ ”شہرت کا مجھے قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھ جیسے آدمی کے لیے  
کمانی زیادہ قائمہ مند ہے۔ اگر مجھے مشہور ہونا ہوتا تو میں کمانی گار  
ڈراما گار یا ڈراما گار بننے بغیر بھی ہو سکتا تھا لیکن میں تو میڈیا کے لوگوں  
سے نہ بچتا رہا ہوں۔“

”خیر۔ یہ نہ اسی قابل ہے کہ تم اسے میڈیا کے لوگوں سے  
بچا کر رکھو۔ تم تو واقعی اس خوش قسمتی میں جلا ہو گئے کہ میں جسیں  
رائٹر بننے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ زیادہ نہیں خیر تو تمہاری خالی  
کھوپڑی کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ میرا اشارہ اصل میں تمہاری  
فرائض سے جھوٹ بولنے کی صلاحیت کی طرف تھا بلکہ اشارہ کیا۔  
میرا تو صاف طور پر مرض کیا تھا کہ یہ خبری دانی کمانی تم نے میں

میں پیش سے لائق اور مخلص ہوں۔ تم میرے بارے میں کتنا  
 فیاض بنو گئے کی کوشش کرتے رہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں  
 پڑے گا۔ میرے استغاثہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا  
 دیکھ جا چکا ہے کہ لاہور سے تمہارے دو قریبی ساتھی لٹی اور  
 راجہ بھی آئے ہوں ہیں اور آج دھیر ذرا آج اور شفیع شاہ بھی  
 مل آئے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ سے پانچ بیچے کے  
 درمیان کیا نہیں کہاں تھے؟

”ہاں۔“ میں نے آنکھیں پھیلائی ”تم نے تو واقعی اس  
 وقت خود کو شراک ہو کر محسوس کرنا شروع کر دیا ہے لیکن میرے  
 دل سے صبح سناؤں میں کہنے پر پڑا کرتے ہو۔ بہر حال۔۔۔  
 دلی سے تم نے میرے دوستوں کی آمد کے بارے میں معلوم  
 کیا ہے؟ وہیں سے باقی باتیں بھی معلوم کرو۔“ میں نے بے نیازی  
 سے اور بڑاڑی کے اعتبار کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ کر زوردار معافی  
 لاوار کہا ”تم نے دیکھا۔؟ تمہاری باتوں سے مجھے کتنی لمبی لمبی  
 غامضیاں آتے گی ہیں۔“

”تمہاری غامضیاں دھری دھری جاں نہیں گی۔“ وہ دانت پیس کر بولا  
 ”مغرب تم جس شے میں پھنسنے والے ہو اس میں تم غامضیوں کو  
 بدل جاؤ گے اور تمہاری لمبی لمبی چھٹیوں نہیں گی۔“  
 ”پولیس والے تو شاید مجھ جیسے ہر خوش و خرم شخص کو دیکھنے  
 کے بعد ہی خواب دیکھتے گئے ہیں۔ یہ کوئی نئی دھمکی نہیں ہے۔“  
 میں نے بے پروائی سے کہا۔

”تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں، شرافت اور بھیدگی  
 سے میرے سوال کا جواب دے دو۔“ وہ مجھے اپنے سمجھوتہ ہونے کا  
 جین دلائے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔  
 ”جن کی لاشوں کا تم ذکر کر رہے ہو ان لوگوں کے کاہن بادی  
 وہ سے نہ جانے کہاں کہاں کتنی لاشیں گری ہوں گی۔ تم ان کے  
 تمہیں کیوں ڈبٹے ہوئے گئے اور تم نے کیوں اس طرح تحقیق  
 نہ کیا کہ جسے وہ تمہارا علاقہ بھی نہیں ہے؟“ میں نے ذرا پلے  
 پلے سے بولے کہا۔

گلاش بہر حال لاش ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں تحقیق کرنا  
 ظاہری اہم ترین ذمے داریوں میں سے ایک ہے۔“ وہ بدستور  
 چمکیں سے بولا۔

”اب اگر میں تمہاری ذمے داریوں اور فرائض کے بارے  
 میں کوئی بات کروں گا تو بحث بہت لمبی ہو جائے گی۔ تمہارے درمیان  
 انہی کی بات کے بھی بحث بہت لمبی ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں  
 اس سے گریز کرتے ہوئے صرف ان باتوں کو کہہ گا کہ تم تحقیق ضرور کرو  
 میں تمہارے راستے کی رکاوٹ ہرگز نہیں بنوں گا لیکن بغیر کسی  
 ثبوت کے مجھ پر یا میرے کسی ساتھی پر افراہم مانہ کرنے کی کوشش  
 نہ کرو۔ یہ بھی مت سوچنا کہ تم اپنے اختیارات سے کوئی ناجائز  
 قاعدہ اٹھاؤ گے تو میں تمہیں جیل دلاؤں گا۔ اگر تم فضول قسم کی فرض

شکای میں الجھ گئے تو میں بھی غور کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ میرا  
 اثر رسوخ کہاں کہاں ہے۔“

”مجھے معلوم ہے تمہارا اثر رسوخ کہاں کہاں ہے۔“ وہ طعنیہ  
 انداز میں مسکرایا۔ ”اگر ضرورت پڑی تو میں تمہارے اثر رسوخ کی  
 بھی ایسی نیکی کروں گا لیکن فی الحال میں نے اپنے اختیارات کا  
 جائز قاعدہ اٹھانے کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ ناجائز قاعدہ  
 اٹھانا تو دور کی بات ہے۔ اگر میں صرف رکی کارروائی کرنے کا  
 ارادہ کروں تب بھی تمہاری گاڑی، اس دفتر اور تمہارے با  
 تمہارے ساتھیوں کے کہوں کی طاقت سے آغاز کروں۔ میں ممکن  
 ہے ان میں سے کسی جگہ پر مجھے مزید مدد والے پترے امداد نہیں  
 مل جائیں جن سے قاز کر کے جمال سعیدی کے آدھیل کو ہلاک کیا  
 گیا ہے۔“

حقیقت یہ تھی کہ ان میں سے کچھ چیزیں گاڑی میں اور کچھ  
 کہوں میں واقعی موجود تھیں۔ ابھی ہم نے ان سے چھانچا حاصل  
 کرنے کے بارے میں سوچنے کی بھی ذمت نہیں کی تھی۔ یہی ممکن  
 تو میری جیب میں موجود تھی لیکن میں نے کمال دھڑائی کا مظاہرہ  
 کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”مگر تم  
 دوست بن کر یا مجھے پکڑو کہ کسی طرح سے یہ طاقتی لینے کی  
 کوشش کرتے تو شاید کامیاب ہو جاتے لیکن اب چو کہ تم کچھ اس  
 قسم کے پولیس والے بننے کی کوشش کر رہے ہو جس کے دل میں  
 شرفا سے زیادہ جھیل کا درد ہوتا ہے اس۔۔۔ لیے میں تمہیں اس  
 کرسی کے نیچے جمائے کی بھی اجازت نہیں دوں گا جس پر تم بیٹھے  
 ہو۔ اس کے لیے بھی تمہیں سرچ وارنٹ حاصل کرنا پڑے گا۔“

اس نے زہر پلے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی۔ ”تمہارا خیال  
 ہے کہ سرچ وارنٹ حاصل کرنا کوئی مشکل کام ہے؟ میں نہیں بیٹھے  
 بیٹھے سرچ وارنٹ منگوا سکتا ہوں۔ مجھے تمہارے سامنے سے ایک  
 لمبے کے لیے اٹھ کر کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور تم  
 اس دوران میں ان چیزوں کو غائب بھی نہیں کر سکو گے۔“

”ہم آج تک ایسی چیزوں کو غائب کرنے کے پانچ پانچ میں جلا  
 ی نہیں ہوئے جو ہمارے پاس موجود ہی نہ ہوں۔“ میں نے بے  
 پروائی سے کہا۔ ”تاہم میں تمہیں ایک بات ضرور یاد دلانا چاہوں  
 گا۔ شاید بوجھانے کے باعث تمہاری یادداشت خاصی خراب ہو گئی  
 ہے۔ آج چند چھوٹے پتلے بلب میں نے فون پر تمہیں جمال سعیدی  
 کے پاس چھاپا مارنے کے لیے کہا تھا تو تم نے ارشاد فرمایا تھا کہ سرچ  
 وارنٹ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مجھے تمہارے اس وقت کی  
 اور اب کی باتیں سن کر تمہارے تیر دیکھ کر تو کچھ ایسا محسوس ہو  
 رہا ہے جیسے تم پر حقیقت جمال سعیدی جیسے لوگوں کے مفادات کے  
 لیے کام کر رہے ہو۔ لگتا ہے مال نے کام دکھا دیا ہے۔ مگر اس  
 قسم کے لوگ دل کھل کر دھپہ خرچ کرتے ہیں۔“

غلاف تو فتح اس نے مزید غصہ ناک ہونے کے بجائے ایک

حضرت سافلی لوری اور افسوس زدہ سے کہنے میں بولا۔ "پولیس کو اس کے فرائض کی ادائیگی سے روکنے کے لیے تم مجھے شاطر لوگوں کے پاس یہ بھی ایک بڑا حربہ ہوتا ہے جو زیادہ تر کارکن بھی رہتا ہے۔ بڑے اطمینان سے کہہ دیا جائے کہ فلاں پولیس آفیسر فلاں کام اس لیے کر رہا ہے کہ اس کو فلاں جگہ سے مال لے گیا ہے اور چونکہ پولیس کی شہرت اچھی نہیں اس لیے زیادہ تر لوگ آنکھیں بند کر کے اس الزام کو درست تسلیم کر لیتے ہیں۔" وہ سچے منہ سے غور سے آنے لگا۔

"یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "بہر حال..... اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اگر تم فون کر کے سرچ وارنٹ منگوانا چاہتے ہو تو یہ فون حاضر ہے۔" میں نے فون اس کی طرف دکھایا۔ "کوئی اور کارروائی کرنا چاہتے ہو تو اس کا شروع بھی پورا کرلو۔"

"سرچ وارنٹ کے بارے میں میں نے تم سے پہلے بھی غلط نہیں کیا تھا اور اب بھی غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" وہ بولا۔ "کمال ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "دو حضار باتیں بیک وقت صحیح قرار سے دیتے ہو یہ تم پولیس والوں کا ہی کمال ہے۔" "میرا مطلب تھا کہ یہ کام بھی بہت آسان بھی ثابت ہو سکتا ہے اور بھی بہت دشوار۔" اس نے بات بدلائی۔ "یہ ایک قسم کا جُڑا ہے اور جب معاملہ تم جیسے جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا ہو تو میں جُڑا کھیل سکتا ہوں۔" "تو پھر کیلئے۔" میں نے فون کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں کس نے روکا ہے؟"

"خود میں نے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "انسان کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ عقل کی بات اگر دشمن بھی کہہ رہا ہو تو اس پر قویہ دینا چاہیے۔ میں نے چند لمحے پہلے ہی تمہاری اس بات پر غور کیا تھا کہ واقعی یہ میرے علاقے کا کیس نہیں ہے۔ میں کیوں اس میں سر کیا رہا ہوں۔ کیوں اپنے لیے کام بڑھا رہا ہوں اور کیوں اپنے تعلقات خراب کر رہا ہوں؟ چنانچہ میں نے اس مسئلے میں مستعدی دکھانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر کبھی متعلقہ تقبیلی افسر نے مجھ سے میری رائے مانگی تو میں اسے اپنی بے لاگ رائے سے ضرور مطلع کر دوں گا۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں واقعی سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان پر اچانک دوا لگی کا درد پڑ سکتا ہے اسی طرح اچانک کسی اسے عقل بھی آسکتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ کبھی اچانک اس پر عقل کا درد بھی پڑ سکتا ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ میں دل ہی دل میں خوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کینتہ رحیم گل بھی بڑا بدحاش تھا۔ وہ اب تک خواہ

علاقہ کی معنوی شکل اور رعب بھارا تھا۔ اس کا کچھ بھی نہ کرانے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ مجھ پر صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اصل بات کتنی حد تک سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس کے لئے اعتراض نہیں تھا۔

"مجھ پر عقل کا زیادہ شدید درد پڑنا تمہارے لیے خطرہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" وہ خیرباد کہنے والے انداز میں بولا۔ "میری بات تو چھوڑو۔ یہ درد خود تمہارے اپنے لیے ہو نقصان رہ ثابت ہو سکتا ہے۔ زیادہ عقل تمہارے لیے نہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"بالکل اسی طرح جیسے عقل سے بالکل ہی محروم ہونا نقصان ہے۔" وہ خیرباد کہتا ہوا ہے۔ "وہ زخم آج بھی غلوں سے ہمارے طرف سے کہتے ہوئے بولا۔"

"تم نے مسلسل بے ہودہ قسم کی گفتگو کر کے خود کو ایک غلط عقیم خوشخبری سے محروم کر لیا ہے۔" میں نے جواباً اس سے کہا۔ "زخم آج بھی از میں اس کی طرف دیکھا۔"

"خوشخبری؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا تم کبھی کسی انسان کو کوئی خوشخبری بھی سننے کو مل سکتی ہے؟"

"خوشخبری یعنی یہی ہم جیسے انسانوں سے ہے اس وقت کسی کے لیے میں نے بزرگانہ کہنے میں کہا۔ "لیکن خوشخبری سننے کے لیے آپ کو اس کا اعلیٰ ثابت کرنا پڑتا ہے۔ تم اس قابل ہرگز نہیں کہ تمہیں کوئی خوشخبری سنائی جائے۔"

اس کا تجسس بے نتیجہ رہا چکا تھا لیکن بظاہر وہ بے پناہی فرماتے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تم خوشخبری مجھے پہلے تمہاری اس کے قابل بعد میں ہو جاؤں گا۔"

"اس قسم کے احمقانہ وعدوں پر تو خوشخبریاں نہیں سنائی جاتی لیکن میں تم پر ترس کھا کر یہ خوشخبری سننا رہا ہوں۔" میں نے کچھ بڑی کشش کے بعد دل ہی دل میں اس فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "دراصل خوشخبری کیا ہے۔ بس ایک قسم کی نپ ہے۔ خوشخبری بارے میں ایک نپ ہے۔ کسی مقام پر ایک بہت بڑی خوشخبری تمہارا انتظار کر رہی ہے اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کب اس پہنچتے ہو۔"

"الغرض بچکا کہ بنے اور زیادہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ خیربادی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "مجھ کو بھی کہنا ہے اپنے مخصوص بے ہودہ انداز میں حکم کہہ دو۔" "اگر مجھ پر بے جا تحید کا سلسلہ جاری رکھو گے تو میں خوشخبری کے بارے میں نپ دینے کا ارادہ ہٹاتی بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے دھمکی دی۔

وہ اچانک ہی اُٹھتے ہوئے بولا۔ "میں خوشخبری سننے کا ارادہ ہٹاتی کر سکتا ہوں۔ تم جیسے کم ظرف آدمی سے کیا خوشخبری منگنا جو ذرا سی بات بھی اس طرح ترسا ترسا کر دیتا ہو۔ میں باہر جا رہا ہوں۔"

وہ بھی میں تمہارے ساتھ کافی مفراری کر چکا ہوں۔  
 "تم تو کسی سناں دو ٹیڑی طرح بڑا مان گئے۔ مجھ سے  
 اب تم اتنی آسانی سے تو نہیں جاسکتے۔ اور ہاں۔ اتنی  
 بڑی طلبہ جانی مت کہو کہ تم نے میرے ساتھ مفراری کی ہے مفر  
 مانی کا دعویٰ صرف وہ کر سکتا ہے جس کے پاس مفر موجود ہو۔  
 وہ بائل ناخدا سے بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔ "تم نے وہ فلم دیکھی  
 تھی۔" "سنہ مان جائے گی" میں تو خیر اس وقت چھوڑا تھا جب یہ  
 ریلیز ہوئی تھی لیکن تم تو اس وقت بھی تمہیں چاہیے کے  
 ہو گئے۔  
 "میں تو خیر اس وقت فوت ہو چکا تھا اور تم شاید پیدا بھی نہیں  
 ہوئے تھے۔" اس نے جمل کر گویا کھجک۔ "تم جی کبھی سے کیوں  
 کام لے رہے ہو؟"

"میں نے سوچا کہ میں تم پرانہ مانا جاؤ۔"  
 "نہیں۔ میں تو بالکل بڑا نہیں مانتا۔ تم چاہو تو میرے  
 سامنے فیڈ ریا چوٹی بھی منہ میں لے کر بیٹھ سکتے ہو۔ اور جہاں  
 تک فلم کا تعلق ہے تو مجھے یاد نہیں کہ اس نام کی بھی کوئی فلم بنی  
 تھی۔"

"ظہور کے بارے میں تمہاری معلومات بہت کم ہیں۔ بلکہ  
 زندگی کے زیادہ تر معاملات میں تمہاری معلومات کمزور ہی ہیں۔  
 اس فلم کا نام تو میں نے بڑی ایک استعارے کے طور پر رکھا ہے۔ یہ فلم  
 کا نام نہیں ہوں۔ سمجھو تمہاری زندگی کا خلاصہ تھا۔ ایک امید تھی  
 جس کے گرد تمہاری زندگی گھوم رہی تھی لیکن اب تمہاری آواز اس  
 بڑائی کو منہ مل جائے گی۔ تمہاری دیران اور کسی اجڑی ہوئی  
 چراگاہ جیسی بے کیف زندگی میں بار آجائے گی۔"

وہ ایک لمحے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا رہا کہ جیسے میرا  
 داغ جل گیا ہو۔ پھر لہجہ بڑی سانس لے کر بولا۔ "عام حالات میں  
 بھی تم جیسے تجربہ کار لوگوں کی باتوں کو سمجھنا کاردار ہوتا ہے لیکن  
 اس وقت تو شاید تم پر بالکل ہی بڑائی کیفیت طاری ہے۔"

"جب بھی کسی ذہنی مفرد کو کوئی شخص عقل کی بات بتانے کی  
 کوشش کرنا ہے تو اسے یہی محسوس ہوتا ہے جیسے سامنے والے پر بڑائی  
 کیفیت طاری ہے۔" میں نے گویا اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔  
 "میں اصل میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اب  
 تمہاری زندگی میں جو فلم چلنے والی ہے اس کا نام ہوگا "حیدرمان تھی  
 ہے" بول کچھ لو اب اس پرانی فلم کا پارت نمس۔ یعنی حصہ دوم  
 شروع ہو رہا ہے۔"

وہ اب بھی انھیں آہستہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں  
 نے دانت چرس کر کہا۔ "یارا تم تو بالکل ہی کماز ہو۔ خیر اس میں  
 تحریر کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کماز ہو بھی ہو نہیں  
 ہو۔ اچھا یہ تاتس۔ تم زرنج سے شادی کرنے کی خواہش میں  
 کسے جا رہے تھے نا؟"

وہ یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی تھکی تھکی آنکھوں میں  
 چمک سی آگئی۔ وہ جب بولا تو اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔ "یہ تم اتنی  
 دیر سے مجھے زرنج کے بارے میں اشارے دینے کی کوشش کر  
 رہے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جمل کر کہا۔ "مگر اشارے کنا ہے، تم جیسے  
 گدھوں کی سمجھ میں کلاں آتے ہیں۔ زرنج کا نام لے کر بات کی تو  
 کیا باہر بزار دولت کا کرنت لگا۔"

"چند کہیں کہیں۔" ان کل زمانہ ہی زرنج کا نام لے کر بات کرنے کا  
 ہے تمہاری طرح اتنی سیدھی سیلیاں کون بکھو آتا ہے۔ تم اتنی  
 سیدھی سی بات سیدھی طرح مجھے نہیں بتا سکتے تھے؟ اس کا چہرہ  
 تشہارہ تھا۔ اس کے وجود میں گویا ایک نئی مدح طولی کر گئی تھی۔  
 مگر پھر یکدم ہی وہ بچھ سا گیا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مگر یہ  
 بات مجھ سے پہلے تمہیں کیسے معلوم ہو گئی ہے۔ میں تو تقریباً ہر ہفتے  
 ہی اس سے ملتا ہوں لیکن مجھے تو ایسا کوئی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ مجھ  
 سے شادی کے لیے تیار ہے۔"

"گھو کہ تمہارے گم نہیں ہے اور تم چلنے بھی دو ٹانگوں پر ہو۔  
 لیکن اس میں کام نہیں کہ تم اوپر رہے کے گدھے ہو۔" میں  
 نے ملاحت سے کہا۔ "یہ کوئی پرانی خبر نہیں ہے جو میں تم تک پہنچا  
 رہا ہوں۔ یہ آج کی آواز خبر ہے۔ زرنج نے بھی ظاہر ہے نہ چاڑ  
 کر تو مجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ یہ تو میں نے خود ہی اس کی باتوں  
 سے اندازہ لگایا ہے کہ اگر آئندہ تم نے اس سے شادی کی  
 درخواست کی تو وہ قبول کر لے گی۔ گویا میں تمہارے ساتھ دوسرے  
 کتہہ بکھرے بھی نیکی کر رہا ہوں۔ یعنی میں تمہیں غلطے سے خبردار  
 کر رہا ہوں۔"

اس کے چہرے کی مدنی بحال ہو گئی۔ اس نے پڑاشتاقی لہجے  
 میں تصدیق چاہی۔ "کیا واقعی زرنج نے اس قسم کی کوئی بات کی  
 تھی؟"

"بات نہیں کی تھی اس کی! بلکہ وہ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی  
 ہے، ماڈرن ہے، کدو پتی ہے، ڈیفنس میں رہتی ہے لیکن اس کے  
 وجود میں ہر حال ایک مشرقی مدح شدید ہے۔ باتیں تو کچھ اور ہورہی  
 تھیں لیکن مجھے اس کی باتوں سے ایک ہم سا اشارہ ملا ہے۔ اس  
 لیے میں بھی تم سے اشارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ میں نے اس  
 سے وضاحت نہیں چاہی تھی لیکن میری سمجھ میں جو باتیں آئیں وہ  
 میں نے تمہیں بتادی ہیں اگر میں نے غلط مطلب اٹھ لیا ہے اور  
 اس کی وجہ سے غلط نتائج برآمد ہوئے تو اس کی خادمہ پر کوئی ذمے  
 داری مانگ نہیں ہوگی۔"

"کس خادمہ پر؟" اس نے مسروریت سے پوچھا۔  
 "مجھی اس خادمہ پر۔" میں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "یعنی  
 مجھ پر۔"  
 "اچھا۔ اچھا۔" اس نے سمجھادی سے سر ہلایا۔ "تم

خود اپنا ذکر کر رہے تھے۔ یہی محمدؐ اور اذوالیٰ احد میں اپنا ذکر کرتے ہو۔

”اب تم شادی کی پرانی مسترد شدہ درخواست نکالو اور مجاز پر کچھ کر دو باہ اس کی خدمت میں لے جاؤ۔ بہت زیادہ امکان نظر آ رہا ہے کہ اس بار تمہاری درخواست کو شرف قبولیت بخشا جائے گا۔ کب بہت کر رہے ہو؟“

”دو باہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ اس نے جھکی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”میں نے تو آج تک ایک مرتبہ بھی اس سے شادی کی درخواست نہیں کی۔ اس موضوع پر تو سرے سے کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔ بس میرا دماغ اس پر واضح تھا اور اس کا افکار مجھ پر ظاہر تھا۔ اب بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ شاید اب بھی نظروں میں بات نہ ہونے پائے۔ شاید اب بھی میں خاموشی ہی کی زبان میں بات کروں اور وہ خاموشی کی زبان میں ہاں کو کہے۔“

”اور کوئی تو آموز انسان نکالو اس پر مگر کئی محنت“ یا ”مشق ہے زہن“ کے عنوان سے افسانہ لکھ ڈالے۔“ میں نے لکھنی سانس لے کر کہا۔ ”میں تمہیں ایک اور اہم بات بتاتا ہوں۔ آج رات ڈنر پر چند افراد جمع ہو رہے ہیں۔ شفیع شاہ، زنی اور راحیلہ کے علاوہ ذرا کچھ بھی ہوگی۔ میں میزبان ہوں۔ یہی ذرا مل بیٹھے کا باند ہے۔ ویسے تو خیر۔ شرف اور معززین کا چھوٹا سا اجتماع ہو گا۔ لیکن۔۔۔ چلو خیر تمہیں بھی بلا لیتے ہیں کیا یاد کر کے موت اور وضع داری بھی کوئی چیز ہے۔“

اس نے ہونٹ بھیجے لیے لیکن میں نے کہا اس کی کیفیت سے بے خبر رہے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”اس دن میں تم باتوں باتوں میں ذرا کچھ کو ٹھنک کر دیکھو۔ واضح رہے کہ میں صرف باتوں باتوں میں ٹٹولنے کے لیے کہہ رہا ہوں، تمہارا ذہن کیسے باتوں کی طرف نہ چلا جائے۔ بعد میں تم کہہ دو گے کہ مجھ سے بیٹھے میں غلطی ہوئی تھی۔“

”تو اس سب کو“ وہ غصے سے بولا۔ ”میں نہیں آ رہا ہوں تمہارے دنوں میں۔ میرے پاس تم جیسے فضول لوگوں کے پاس بیٹھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“

”شاید اسی لیے ڈنرہ گھنٹے سے بیٹھے ہوئے ہو۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”وہ تو میں سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بیٹھا ہوا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ڈیوٹی کے سلسلے میں تو انسان کو گھر کے ساتھ بھی بیٹھنا پڑتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ یہ بات تو ٹھیک ہے۔“ میں نے اتفاق کیا۔ لیکن تمہارے منہ سے اس جملے کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ تمہیں تو یوں کہنا چاہیے کہ ڈیوٹی کے سلسلے میں گھر کو بھی انسان کے ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ بہر حال گھر کے لیے بڑا آزمائش کا کام ہے۔“

وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے تصدیق چاہی۔ ”اس تمہیں نہیں آ رہے ہو؟“

”نہیں۔۔۔ وہ غلطی سے بولا۔“ مجھے ویسے بھی لوگوں کے سامنے اپنے غلطی سائل پر بھیڑنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ذرا آج سے بھی ملاقات ہوئی ہی رہتی ہے۔ اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو میری مناسب دیکھ کر بات کر لوں گا ورنہ جیسے میں کہہ چکا ہوں۔ شاید خاموشی کی زبان میں ہی بات ہو جائے۔“

”اور کوئی کٹاں خواں خاموشی کی زبان میں کٹاں چھوڑے۔“ خاموشی ہی کی زبان میں ایک باپ و قول ہو جائیں۔ اس کے بعد تم سماں بھی خاموشی سے ذہنی گزارنا شروع کر دو اور خاموشی ہی کی زبان میں برہات کیا کرو۔“ میں نے ایک جھٹکے سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”خدا کے لیے تم اپنی خاموشی کو اتنا طویل مدت دے رہا۔“

”میرا کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ مسکرایا۔ ”شادی کے بعد وہاں بیوی خاموش کیسے رہ سکتی ہیں؟ ذہنی اب اتنی آئیڈیل بھی نہیں ہو سکتی۔“

”شکر ہے تمہیں یہ بات معلوم ہے۔“ میں نے گھرا اطمینان کی سانس لی۔

”اب میں چلتا ہوں۔“ وہ ایک بار بھراٹھ کر رہا ہوا۔

”میں نے تمہاری زندگی کی جتنی بڑی خوشخبری تمہیں سنائی ہے اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم اپنے فریضے پر میرے ہی ہوگی میں دس میں دو سہول کو کچھ سمیت حکیم الشان زور دیتے لیکن تم اتنے سڑیل اور شکرے انسان ہو کہ انہیں تمہیں دزدے ہا ہوں اور تم میری دعوت کو پائے عداوت سے ٹھکرا کر جا رہے ہو۔“ ”میں میں آج پہلی بار میں ہا ہوں کہ دعوت کو بھیجائے عداوت سے ٹھکرا کر جا سکتا ہے۔“ وہ دزدے حیرت سے سر ہلا کر بولا۔ ”اور اس لفظ کو سن کر نہ جانے کیوں مجھے سری پائے یاد آ جاتے ہیں۔“ ”برانا کا دوبار انسان کو کسی نہ کسی زمانے یاد آتی جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے جھجک سے انابت میں سر ہلایا۔ ”اس سے پہلے کہ میرا تمہارے بھی سری پائے بنانے کوئی چاہے، میں چلا ہی جاؤں تو بہتر ہے۔“ وہ دواڑے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کی سانس لی۔ خیر عداوتی رہی تھی کہ وہ اپنے منفرضوں اور اعزازوں پر زیادہ نہیں اڑا تھا۔ دوست ضرور تھا لیکن مجھے معلوم تھا اس میں ایک آدھ نیز می رنگ بھی موجود تھی۔ اگر اس پر قانون بندی کا زیادہ ہی شدید دباؤ نہ جاتا تو وہ میرے لیے کوئی مشکل کمزری کر سکتا تھا لیکن چھایا ہوا آقا کہ بات صرف کھوکھلی دھمکیوں پر کئی تھی۔ میں نے اذیتا فزون کہنے کے اپنے ایک آدمی کو بلا دیا اور اسے بتایا کہ یہی کافی

خلاف ہو جاتے ہیں جس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ اکثر مختلف  
اشرافی فرعونیت کے ذم میں پیش نہیں ہوتے۔ ان کے دیکل  
ہم دیکھیے کہ یسوں کو چنل کستے ہیں۔ اکثر کیس ہو سکے اور  
کھولے ہوتے ہیں۔ ان سب حوالہ کی وجہ سے ان کی اکثر  
کارروائیاں کاہنم قرار پاتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ ورائی نے اگر  
تمام تر دیکھی کے ساتھ بھی قانونی کارروائی کے قاعدے پر سے گئے  
اور اپنے گھمے کی طاقت بھی استعمال کی تب بھی وہ عدالت میں نہیں  
تک گئے گا۔ حد سے زیادہ بد عنوان شخص بہر حال اپنی کارروائیوں  
کے دفاع میں جتنا کہ کرکڑا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ اس کا  
سامنا کسی مضبوط طرف سے ہو جائے۔

دوسری طرف اخباروں میں اس کے خلاف ہم شروع ہو چکی  
تھی۔ اس کی عیاشیوں اور پیش قیمت جائیدادوں کے بارے میں  
رستادہ بنی بیوقوف کے ساتھ ٹھوس قسم کی اسٹوری سامنے آ چکی  
تھی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ انہی سے مجھے میں کافی کھلی گئی تھی۔  
اس نے رپورٹوں اور اخباروں کو اس سلسلے میں دھکاتے اور ان  
ڈائریکٹ طریقوں سے مروجہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن فنیج  
شاہ اس عیانہ پوری طرح چرکس تھا۔ اس کی یہ کوششیں کامیاب  
نہیں ہو سکی تھیں۔

ادھر ٹیکس صاحب نے بھی اپنی ناپسندیدگی کے جذبات ان  
ڈائریکٹ طریقے سے ہی اس تک پہنچا دیے تھے۔ ان کا صرف اتنا  
کر دیا ہی کافی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ سب سے زیادہ ورائی کے  
یوں گئے تھے اسی وجہ سے زمین نقل ہو گئی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ مجھے  
میں اس کے خلاف فضا تیار ہونے لگی تھی اور وہ بڑی طرح ہلکا  
چکا تھا۔ ہو کر پر چھاپا مارنے وقت اور تمام کاغذات وغیرہ اٹھا کر  
لے جاتے وقت شاید اس کے دہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس  
نے غلطی سے مجھوں کے پچھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ وہ یقیناً اب  
تک بڑی بڑی کاروباری شخصیتوں کو ایک ہی دھمکی سے ترس کر ہانپتا  
دیکھنے کا مادی تھا۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اسے میرے بارے میں بہت سی  
اہم باتیں معلوم نہیں تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مجھے  
اپنا کاروبار اپنی جان، عزت اور اتنا سے زیادہ عزیز نہیں تھا۔ اس  
نے آج تک یہی دیکھا ہو گا کہ جس کا جتنا زیادہ بڑا کاروبار تھا اسے  
وہ اتنی زیادہ عزیز تھا۔ بعض کو تو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتا  
ہے اور دولت سے بچنے دینا ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اپنی  
دولت اور کاروبار کو بچانے کے لیے وہ بڑی بڑی زیادتیاں بھی  
بدولت کر لیتے تھے۔ میرا معاملہ یہ نہیں تھا۔ میں نے بڑی مشکل  
سے اپنے آپ کو۔ باہیں گئے کہ اپنی دولت کو اس بات کی تربیت  
دی تھی اور امیری امیر اپنے آپ کو بیش تیار رکھا تھا کہ اگر بھی  
ہاتھ بھڑا کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھی الگ تھلک کھڑے ہو جائے  
جائے تو دل و جان پر کوئی خاص صدمہ نہ کرے۔ دولت جڑی

اور کھل میں کچھ چیزیں موجود تھیں۔ میں نے اسے تسلی  
دیا کہ ساتھ سمجھا کر انہیں کھل کھل اور کس طرح  
نکلے گا تھا۔

یہ کام ہو چکے کے بعد مجھے کچھ اور اطمینان ہو گیا۔ اس رات  
انہیں پہلے دوست بکریا ہوئے اور حسب روایت باہیں چھاڑ  
اور پہلے بازی چلتی رہی لیکن یہ کچھ کر سکی کو افسوس ہو کہ اس  
مٹن میں ہماری صحت خالص ہی تھی لیکن سب سے کم افسوس اور  
پوری خود مجھے کسی۔ دل ہی دل میں میرا یہ عزم کچھ اور بڑھ گیا تھا  
کہ اب تو مجھے بہر حال میں جمال سعیدی پر ہاتھ ڈالنا تھا۔ مجھے یقین  
تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔ اب کم از کم یہ تو طے  
ہو چکا تھا کہ اس کی اصلیت کیا تھی۔ وہ کس طرح ہمارے ملک کی  
بنیادوں میں بادلوں بھر رہا تھا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس  
بات کی تصدیق ہونا زیادہ بڑا مسئلہ تھا۔ اس سے غصہ اب مجھے کچھ  
زیادہ کمین مسئلہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اب میرا ذہن  
کلانہ تک ہلکا تھا اور میرے خوشگوار موڈ کی وجہ سے دفتر رش بھی  
پھٹے گئے تھے میں نے زر آج کو یہ بھی بتا دیا کہ میں نے رجم کل کو  
اس کے بارے میں اٹھا دے دیا تھا۔ جس پر وہ خفا بھی ہوئی اور  
اس نے مجھے چند خطبات سے نوازا لیکن مجھے معلوم تھا اس کی یہ  
غلط معنوی تھی۔ ہماری محفل نہایت خوشگوار ماحول میں ختم ہوئی۔

اگلے تین چار دن میں ویسے تو کوئی زیادہ ہنگامہ خیز واقعہ پیش  
نہیں آیا لیکن ہر غاڑ پر کسی نہ کسی حد تک پیش قدمی جاری رہی۔  
میں کسی بھی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں نے نیگلیائی کیا کہ اسے  
میں تمام ضروری معلومات جمع کر لی تھیں اور ان کی روشنی میں  
دوستوں کو بھی سمجھا دیا تھا کہ انہیں کس وقت کیا کرنا تھا اور میرے  
نیگلیائی روانہ ہونے کے بعد ہمیں کس طرح آپس میں رابطہ رکھنا  
تھا اور کس مسئلہ کے لیے ہر کس کو کیا کرنا تھا۔ ہمارے پورے لائحہ  
عمل کا خاکہ سامنے چکا تھا۔ صرف جزئیات طے ہونا باقی نہیں وہ  
مجھے روانہ ہوتے وقت طے کر لی تھیں۔ میں کسی بھی روز روانہ  
ہونے کے لیے تیار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں وہاں جاؤں گا نہ بہت  
کی اہم باتیں سامنے آئیں گی۔

میں صرف ورائی والے معاملے کی وجہ سے گواہ تھا۔ ایک  
تو میں نے اپنے گروپ آف کپیٹلز کی طرف سے اس کے خلاف  
اقدامات کے ناجائز استعمال کی جو پیش پیش ڈائری ہوئی تھی وہ  
عدالت کے لیے منظر ہو گئی تھی اور تاریخ مل گئی تھی۔ میں اپنا ہاتھ  
کہ کم از کم پہلی پیش پر موجود وہ کچھ عدالت کے موڈ کا اندازہ کر لوں  
اس کے بعد ہمارے دیکل اس معاملے سے غصے ہیں۔ مجھے یقین  
تھا کہ ورائی کو عدالت میں پیش نہیں ہو گا۔ سرکاری دیکل اس  
حکم کے معاملات کو کھینچے رہے ہیں۔ سرکاری محکموں کو بے شمار  
تفصیلات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر فیصلے ان کے

ہمارے میں سوچ رہا تھا اور ارادہ پختہ رہا تھا کہ کل ضرور اس کے پاس جاؤں گا۔ ایک لمحہ میں نے ایک ایسے شخص کو ڈانٹنا شروع کیا اور اصرار سے دیکھا کہ سارے پروگرام میرے ذہن سے نکل گئے اور میں غیر ارادی طور پر ایک جگہ اس کی طرف لوٹنا لگا۔

وہ حال سعیدی تھا جو مست باغی کی طرح مجھ سے ڈانٹنا شروع کیا۔ میں گھس گیا تھا اور ایک جگہ رک کر میزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہینڈ بزنس کے پاس پہنچا تھا اور طالب اس کی رہنمائی کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اس روز ہال میں کچھ ریش نظر آ رہا تھا۔ کوئی میز خالی نہیں تھی۔ میں خود ایک کونے میں صرف دو کرسیوں والی ایک میز پر بیٹھا تھا۔ اس قسم کی معمولی میزیں الگ سی ایک دہریہ کے ساتھ لگی ہوتی تھیں اور عام طور پر ان پر جوڑے اگر بیٹھے تھے۔

میں اس وقت باقی کا کلاس اٹھانے لگا تھا جب میری نظر محل سعیدی پر پڑی تھی اور میرا ہاتھ گلاس پر ہی ساکت رہ گیا تھا۔ وہ اس وقت خیرہ تھی مگر میں سوٹ میں تھا اور اپنے تمام تر سواچے کے باوجود بالکل تازہ دم دکھائی دے رہا تھا۔ چند دن پہلے کے واسطے کا کوئی اثر اس کی شخصیت پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خوشخبری کا شعلہ دل میں دو بارش کاغذ اس کے ساتھ تھے جن کے کندھوں پر کلا شکر تیس موجود تھیں اور ان کے ہاتھ ان کے دستوں پر ہی گئے ہوئے تھے۔ وہ کمرے پر رنگوں کی ذیلی ڈھانچہ کمر تیس شلوار تیسوں میں تھے۔ سروں پر گرم ٹوپیاں تھیں۔ ان کی مقابلی نظروں نے چند لمحے میں ہال کا جائزہ لے ڈالا تھا۔

کلا شکر ہوا دونوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ہال میں موجود مسافروں میں اضطراب کی سی لہر پڑا ہوئی۔ باتوں کی تیز جھڑپٹ اور بے غلوں پر چھری کاٹوں کی ٹھٹھکیاں لے کے لیے کچھ بے رحم پڑی مگر پھر جیسے سب کچھ معمول پر آ گیا۔ سب پہلے ہی کی طرح اپنی اپنی باتوں اور کھانے پینے میں لگ گئے۔ اس وقت تک محل سعیدی کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی۔ میں جگہ جگہ اپنے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا رد عمل کیا ہو گا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں پر دھکے ہوئے پونے کچھ اور اوپر اٹھ گئے۔ مرنے مرنے 'تو زو کی کاٹوں جیسے سرخ ہونٹ کچھ پھیل گئے اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ہلکے سے لپٹا ہوا میری طرف بڑھا۔ دونوں حافظہ مستحضر سے اس کے دائمی بائیں چلے آ رہے تھے۔ ان کی محظرب مقابلی نظریں گرد و پیش سے ذرا بھی غافل نہیں تھیں۔ میں نے محل سعیدی کے کمر میں بیٹھے بھی حافظہ دیکھے تھے۔ یہ دونوں مجھے ان سب سے زیادہ مستحق 'تجربہ کار اور تجرباتیے معلوم ہوتے۔

میرے ہاتھ میز پر ہی ساکت تھے لیکن محل سعیدی کے ہاتھ دوستانہ انداز میں پھیل چکے تھے اور میرے قریب پہنچے تھے۔ کچھ مجھ سے بھٹ کر ہونے کے لیے آئے۔ آخر نظر آنے لگا تھا۔

ایک ہے۔ یہ انسان کے پاس جتنی زیادہ آتی ہے اس کی اتنی ہی زیادہ محبت دل میں گھر کر لیتی جاتی ہے۔ اس سے عزم ہوتا، قطع قلم کرنا ایسی زیادہ دشوار۔ بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے صدمے بعض لوگوں کی جان لے لیتے ہیں۔

میں نے اپنے آپ کو سمجھ لیا تھا کہ میں کامیابی کی دنیا میں بہر حال اب زیادہ پرانے کسی ایک چھوٹا سا باغی تھی تو ضرور تھا اور محل مشہور ہے کہ مرا باغی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اگر مجھ پر بہت بڑا وقت بھی آجائے، میرا تقریباً سب کچھ جھین جاتا ہے۔ میں اس قابل تو نہ سکتا تھا کہ بغیر ہاتھ پاؤں مارے بھی باقی زندگی سفید پوشی اور عزت و آرام سے گزار سکتا تھا اور اگر تھوڑے سے ہاتھ پاؤں مار لیتا تو شاید از سر نو بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ انسان کو بھلا اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ کی طلب تو ہوس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور ہوس کا کیا ہے۔ ہوس تو ایک بیکراں دلدل ہے۔ اس میں قدم رکھنے کے بعد تو کھانا بھی نصیب ہوتا ہے۔ ورنہ تو نہیں معلوم تھا کہ میز پر بیٹے کی آواز اور بے غلوں بھی میرا بہت بڑا ہتھیار تھی۔ خود درانی اس ہتھیار سے محروم تھا۔ اس نے تو اپنی دولت و املاک کا جائزہ لیا اور محنت سے بھی حاصل نہیں کی تھی اس کے باوجود وہ یقیناً اس سے عموماً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے شاید یہ تصویر ہی سہانہ رہتی ہو۔ تیس صاحب سے میری فون پر بات ہوئی تو انہوں نے تصدیق کی کہ درانی پر کھانا چکا تھا لیکن آدھی

شادی تھا۔ ایسا کوئی قدم مشکل سے ہی اٹھا سکتا تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ اس نے اپنی غلطی پر شکست تسلیم کر لی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کے خلاف ٹھکے جاتی کارروائی شروع ہے۔ بے جانے پر غور رہا تھا۔ اگر اس کی کرپشن کا اسٹینڈل زیادہ پھیل جاتا تو وہ محفل بھی ہو سکتا تھا۔ سرکاری محکموں میں اس قسم کے کام بھی خاصی بہت رفتاری سے ہوتے تھے لیکن درانی کے ٹھکے اور اس کی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے تیس صاحب کے خیال میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کافی تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ درانی شاید اب وہ اپنی کارروائی شروع کرنے سے پہلے ہوئی کے کاغذات واپس کرنے کا کوئی باعزت راستہ تلاش کر رہا تھا۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ پرنس میرا کا قتل بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا جو درحقیقت ان سب واقعات کا نقطہ آغاز تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اس کے قاتل کو بھی درحقیقت مجھے ہی تلاش کرنا ہو گا۔ اس کی تصدیق کے لیے مجھ پر پرنس کے عجیب مقررہ منہ کے گھر یا کہ اس سے ملاقات کرنا پڑتا تھا۔ ذاتی طور پر کسی کے گھر یا کہ مشاہدہ کرنے سے بعض اوقات غیر متوقع طور پر بھی بہت سی باتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس شام شاید میں اس کے پاس جا چکا ہوتا لیکن کچھ دفتری مصروفیات میں الجھا رہنے کی وجہ سے نہ جا سکا۔ رات کو میں کھانا کھانے کے ارادے سے ڈانٹنگ ہال میں جا کر بیٹھا تو اس کے

میں شام شاید میں اس کے پاس جا چکا ہوتا لیکن کچھ دفتری مصروفیات میں الجھا رہنے کی وجہ سے نہ جا سکا۔ رات کو میں کھانا کھانے کے ارادے سے ڈانٹنگ ہال میں جا کر بیٹھا تو اس کے



بیٹھ سکتے ہیں۔ کھانا کھا سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے البتہ اگر آپ کے کچھ اصول ہیں پڑھو تو کوئل وغیرہ کا مسئلہ ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ لیکن بیٹھنا آپ کو بڑی ہیڑی پڑے گا۔ یہ میرا آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ میں کہتا یہ چاہتا تھا کہ یہ میرا آپ کی جسامت سے مناسب نہیں رکھتی۔ لیکن میں نے نہیں کہا۔ میں اور بھی بہت کچھ کہتا چاہتا تھا جو میں نے نہیں کہا۔ وہ بھی یقیناً کہنا کچھ اور چاہتا تھا لیکن کہہ چکا اور رہا تھا۔ ہم دونوں اس وقت بازارن دور کی دوستیوں اور دشمنیوں کے منافقت بھرے ذراصلوں کے دو کردار تھے۔ میں تو یہی ذرا لطف اندوز ہونے کے لیے اس کردار میں الجھ گیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کی مصلحت اور مقاصد کیا تھے؟

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی میز کی طرف لے چلا۔ اس نے کہا۔ "میں یہ کہنے کی جرات تو نہیں کر سکتا کہ آپ کسی کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں ہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے اپنی حفاظت کے سلسلے میں کبھی اپنے مسلمانوں میں یا غیر خواہوں کو تکلیف نہیں دی۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔"

"مجھے جواب! آپ اپنے اصولوں پر عمل کرتے رہیں۔" میں نے اسے ٹھانے کے بعد خود بھی بیٹھے ہوئے کسی سانس لے کر کہا۔ "تم آپ کی جو خدمت کر سکتے ہیں وہی سہی۔ اس وقت کھانا ہماری طرف سے ہے۔ آپ اس وقت صرف لفظی طور پر نہیں کچھ ہمارے مسلمان ہیں۔"

وہ ایک بار پھر خوشدلی سے نہا۔ "سوچ لیجئے افضل صاحب! میں بہت بچہ آری ہوں۔ اور دعوت قبول کرنے میں میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتا۔ آپ نے تو ہمارے ہاں کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن میں ایسا سوچتا تھا کہ میں نہیں جانتا رہتا۔"

"میں اس وقت ذرا تکلف میں آیا تھا۔ اب آپ کا تو تکلف نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "چیز تو میں بھی کچھ کم نہیں ہوں لیکن پھر بھی۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی آخر کتنا کھانا چاہیے گا۔ اس ہو کہ میں بڑا ذخیرہ ہے۔ اور سہلائی کا ایک باقاعدہ نظام بھی ہے۔ ہم چاہیں تو یہیں بیٹھے مرتے دم تک کھاتے رہیں۔"

"دوست! کیا خوبصورت تصور ہے۔! اس نے گویا کسی شعر پر واردی۔ "انسان مرتے دم تک کھانا کھائے۔ یہ تو یوں کہنا چاہیے کہ کھاتے کھاتے مر جائے۔ میری نظر میں یہ ایک خوبصورت موت ہوگی۔"

"خیر۔ میں اس حد تک پیٹ پرست نہ ہوں۔ نہیں نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

"آپ کے حق میں یہی سچ ہے۔ ورنہ آپ بھی میرے جیسے ہو جاتیں گے۔" وہ نہا پھر اس نے سینو اٹھا کر انڈر کھوٹا شروع کیا۔ میں نے اپنی ہنسی کی ایک تھوڑی سی شاہل کی۔ میں نے دیکھا اس دوران میں اس کے دونوں گانڈز کچھ اس طرح کینے توڑ

زمنوں طور پر اطمینان کی سانس لی۔ اس کی آواز کا انداز لفظی بہت قلم مجھے بھی اپنی جگہ سے اٹھنا ہی پڑا۔ میں نے اسے دھڑکاپے ساتھ بغل گیر ہونے کا سوچ نہیں دیکھا۔ دونوں انہوں نے نہایت مضبوطی سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے مجھے اپنی قفل قفل کرتے تو نہ سے تقریباً لگائی پڑا جس کی قمر خرابت سے انہوں نے ہوا کہ وہ خوش دلی اور خاموشی سے غصہ رہا تھا۔ کھانسی کی اس خاموشی بھی کا سلسلہ تھا اور مصافحہ قسم ہو تو وہ بہت کدے پر اپنا جھاتی سائز کا ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "آپ نے یہاں ہی کر بڑی خوشی ہوئی افضل صاحب! بڑی اچھی بات ہے کہ آپ بھی یہاں ایک کونے میں مجھے بیٹھے ہیں۔ ہم یہاں کھانا کھاتے آئے تھے لیکن یہاں تو کوئی میز ہی خالی نظر نہیں آری۔ چاہو آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ کا خود اپنے ہو کہ میں کم از کم انڈر سوخ تو ہو گا کہ ہم جیسے چھوٹے سوتے شاماسوں کو کوئی دیا نہیں۔"

"میں صاحب!۔۔۔! آج کل بالکل کو کون پوچھتا ہے۔" میں نے لفظی سانس لے کر کہا۔ "لیکن ہم جیسے غریبوں کے اس ہمارے میں آپ جیسے معززین بھی روز روز نہیں آتے۔ اس لیے میں اپنی ہی خوش کرتا ہوں۔"

اس بار وہ ذرا بات آواز نہا۔ اس کی توہم میں ایک بار پھر ظالم ہوا۔ "آپ کی انکساری کا جواب نہیں افضل صاحب! یہ وہ لفظ ہے جو آج کل کے لوگوں میں مٹا ہو چکی ہے۔" اس نے ایک دیر تک مجھ سے میرے کدے پر ہاتھ مارا۔ کوئی عام سا آدمی اس کی بات کے اس اظہار پر بھی لڑکھڑا سکتا تھا۔

"میں ذرا میرے خیالات کا آدمی ہوں کچھ پرانی قدروں کو پہننے سے ناگوار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے نہایت سادگی سے گوارے ہونے کا اور ہیڈ وغیرہ کو اشارہ کیا کہ ہمارے لیے میز کا خدمت کرے۔ ایسے مواقع کے لیے عموماً چارچہ کریموں والی ایک آٹھ میز "ریوروز" کی تختی لگا کر دوک کر رکھی جاتی ہے۔ یہ میز تو کئی میزوں پر ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بڑھتی جی ریوروز میں ہیں لیکن ایک آٹھ اس لیے بھی روک کر رکھی جاتی ہیں کہ ان کی بہت سی اہم شخصیت ان پہننے سے ریوروز کے بغیر بھی ہونا چاہیے ہو تو کام آئے۔ حال ہی میں اس قسم کی شخصیت ہرگز کسی شخص میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا میرے ساتھ بیٹنے کا سوا تھا۔

میں نے ہنسنے لگا۔ اس کا سوچ دے دیا جائے۔

میں نے سوتا نہ انداز میں میں ایک بڑی میز کی طرف چلے گا اشارہ کیا لیکن محال بولا۔ "ہمارا کام تو اس میز سے بھی چل جائے گا۔ کچھ میرے گاؤں کھانا نہیں کھائیں گے۔ یہ کفر ہے وہیں۔"

میں نے اس کے حال صاحب! یہاں آپ ہمارے مسلمان ہیں۔

میں نے اس کا انکار کر دیا۔ یہ ضرورت نہیں۔ یہ اطمینان سے



"ہیچ" وہ سراٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر سٹراٹے ہوئے بے ساختہ ہلانگین پھر گیا مصلحت نے اسے اس بیان میں تبدیلی پر مجبور کر دیا۔ "شاید میں کچھ زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو رہا ہوں۔ مجھے ہیچ نہیں بلکہ شاید کہنا چاہیے۔"

میں نے گہری سانس لے کر اپنے سوپ کی طرف توجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "مرے صاحب! آپ مرضی کے مالک ہیں جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ ویسے... بائے واوے... آپ ایسے کون سے کام کرتے ہیں جو آپ کے اتنے دشمن ہیں؟"

وہ گویا میرے سوال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کو کوشش کر رہا تھا کہ اس کے خیال میں 'میں نے سوال خزانہ میں کیا تھا۔' "جناب! ان باتوں کا تو آپ کو مجھ سے زیادہ علم ہونا چاہیے۔ ادھر آوی کے پاس چار پیسے آئے۔ ادھر وہ سوسائٹی میں ذرا نمایاں ہوا! ادھر اس کے بیسیوں دشمن پیدا ہو گئے۔ آپ کے دشمن نہیں ہیں کیا؟"

"میں تو خود دشمن بنانا ہوں نا۔" میں نے دیکھے لیجے میں کہا۔ "میں تو لوگوں کو پکڑ پکڑ کے... ان کے بلوں سے... میرا مطلب ہے ان لگے گھروں سے کھینچ کھینچ کے باہر لانا ہوں اور انہیں دشمنی پر آمادہ کرنا ہوں۔ یہ میرا مشغلہ ہے۔ لگے ہوں کتنے مجھے یہ باری لاحق ہے لیکن میری یہ دشمنی بد فطرت 'غیبت' جرائم پیشہ اور ملک یا معاشرے کی جڑیں کو کھلی کرنے والے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اچھے لوگوں کا میں بہت بداندیش ہوں۔"

"شاید لوگوں کا نظریہ میں آپ خود اچھے نہ ہوں افضل صاحب! وہ سٹراٹے ہوئے بڑی طاقت سے ہوا۔"

"ہاں۔ اگر ہر فرد یا گروہ اچھائی اور برائی کے اپنے انگ بنانے پالنے کا اور ان سے ہر ایک کو ناپے کا پھر تو نہ جانے کون کون 'کس کس کو گردن زنی قرار دے دے۔' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "آپ تو بہت زیادہ ڈھٹائی کا دور آگیا ہے۔ اب تو غیبت قسم کے مجرم کی نظریں روانہ اور پولیس آفیسر برا آدمی ہے۔" رند بلا نوش کی نظریں واضح بہت برا آدمی ہے۔ ڈاکو کی نظریں چوکیدار بہت برا آدمی ہے اور درندہ صفت لوگوں کی نظریں وہ بہت برے ہیں جو انہیں ان کی درندگی کے مظاہروں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ان سب لوگوں کے بکواس کرنے سے اچھائی اور برائی کے اصل پیمانے بدل کر نہیں جائیں گے۔ ان کے بنائے ہوئے معیار تو دنیا میں رائج نہیں ہو جائیں گے۔"

"بہت خوب... بہت خوب۔" جمال سعیدی نے بچہ رکھ کر اپنے موٹے موٹے ہاتھوں سے خاموش کالی بجانے کا اشارہ کیا۔ "آپ کو تو سیاہی پلڑہ ہونا چاہیے تھا افضل صاحب!"

"خدا نہ کرے!" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ مجھے، عاتق ندیم۔"

"دراصل آنکھوں کا تذکرہ اس لئے نکل آیا کہ مجھے ایک بار اپنے کمر میں کھنسنے والے دشمنوں کا خیال آگیا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "جانتے کے بعد ہوا۔" انہوں نے ملنے بولے ہوئے تھے۔ لیکن اس طرح کے بعض لوگ ملنے تبدیل کرتے وقت زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ آنکھوں کو اکڑ بھیل جاتے ہیں حالانکہ آپ تو آنکھوں کو بیکر تبدیل کرنا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔ بھڑوں کو کھپا کر لیا جاتا ہے اور کا بجٹ ایس کے ذریعے آنکھوں کا رنگ بھی چھاپا جاتا ہے اور اگر بار دہاڑ ہونے اور اس میں چشمہ رکھانے کا اندیشہ نہ ہو تو تاریک چشمہ اس مسئلے کا سب سے مناسب حل ہے اسی لیے تاریک چشمہ جرائم پیشہ لوگوں میں بہت مقبول ہے۔"

وہ بڑے سرسری سے انداز میں بات کر رہا تھا جیسے محض وقت گزاری کے دوران میں کسی دوست یا شاہساک مصلحت میں تھوڑا سا منافذ کر رہا ہو۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر اس موقع پر میں اس سے نظر اٹانے کی کوشش کرتا تو یہ اور بھی غلط دھڑکت ہوئی لیکن وہ میری طرف دیکھنے کے بجائے اپنے سوپ کے پالنے کی طرف توجہ دے رہا تھا اور فضل کے انداز میں سوپ کا بچہ بکر کر رہا تھا۔

میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب ہم اس کے پاس گئے تھے تو ایک آپ میں نے ہماری آنکھوں میں کچھ تیریلیاں کی تھیں یا نہیں؟ مجھے یاد پڑتا تھا کہ راجیہ ٹوٹی اور شفیق شاہ کی آنکھوں اور ہاتھوں کے رنگ تبدیل کیے گئے تھے کیونکہ ان تینوں کی آنکھیں لہری اور بال بھورے یا ہلکے رنگ کے تھے کہ کوکے تینوں کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لیکن وہ شینڈر بہال اتنے عام نہیں تھے اور ان کا جو مطلبہ بنایا جا رہا تھا اس سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتے تھے اس لیے انہیں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس میں خاصی محنت اور وقت صرف ہوا تھا لیکن میری اور رند کی ان کی آنکھیں اور بال سیاہ تھے جو بہت زیادہ لوگوں کے ہوتے ہیں اور عمارے کیلیوں کے ساتھ بھی غیر موزوں معلوم نہ ہوتے اس لیے انہیں زیادہ نہیں چھیڑا گیا تھا۔ صرف ان کی خاصیت فتم کی گئی تھی۔

میں یہ اندازہ بھی لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جمال واقعی کچھ کچھ تھا یا محض شرش چھوڑ کر مجھے اور میرے قوسے سے میرے ہاتھوں کو نفسیاتی الجھن میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا؟ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ امکان دونوں ہی باتوں کا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کسی پر سکون رہتے ہوئے انتظار کرو اور دیکھو! کی پالیسی اپنائی جاویے۔ شاید وقت خود ہی بہت سے سوالوں کے جواب فراہم کرے گا۔ میں نے کبھی بظاہر سرسری سے انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے اگر آپ دوبارہ ان لوگوں کو کسی بھی ملے میں دیکھیں گے لیکن کس گئے؟"

دیکھا تھارا بھی اسی وقت یہاں آکا ضروری تھا

بظاہر میں سے ہونٹوں پر بڑی خوش خلق سی مسکراہٹ سی  
 کر جمال کو مخاطب کیا۔ "ہاں سے ملے۔ یہ میری دوست ہوگی  
 اور لاہور میں ہمارے گروپ آف کپٹیز کی ریڈیٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔  
 بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔" جمال نے زور زور سے اپنا ہاتھ  
 سا سر ہلا کر گویا کسی اچھے شعر کی داد دی۔ اس نے صرف اسی  
 اکتفا نہیں کیا بلکہ راجیلہ کو باقاعدہ تعظیم دینے کے لیے اپنی کمری  
 سے اٹھ کھڑا ہوا اور بڑی تہذیب و شائستگی سے اسی نے سرنگم لکھ  
 جو اُپ راجیلہ نے بھی معنوی لیکن خوبصورت مسکراہٹ سے  
 نوازا۔ جمال نے تو شاید مصائب کے لیے بھی ہاتھ بڑھانے کا دوا  
 کیا لیکن راجیلہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے کھڑی تھی اور اس کا ہاتھ  
 آگے لانے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ شاید اس لیے جمال نے  
 بھی ارادہ ترک کر دیا اور میری طرف دیکھ کر نہایت شیریں لہجے میں  
 بولا۔ "اب تمام بھی بتا دیجئے۔"

"راجیلہ" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔" جمال نے ایک بار پھر سر ہلا  
 اور انگریزی میں راجیلہ سے مخاطب ہوا۔ "بلاشبہ آپ ایک  
 خوبصورت اور دلکش خاتون ہیں یہ بات حقیقہ مجھ سے پہلے بھی بہت  
 لوگوں نے آپ کو بتائی ہوگی۔"

راجیلہ جسے عام طور پر اکساری کا اظہار کرنے اور میری طرح  
 خود استہزائی کی عادت تھی اس موقع پر ذرا بھی اکساری کا لفظ  
 کیے بغیر بولی۔ "تمی ہاں۔ لیکن پہلی ملاقات میں اس سے پہلے تم  
 نے نہیں بتایا تھا۔" وہ بھی یکدم انگریزی پر آگئی تھی۔

"ہو سکتا ہے یہ ہماری پہلی ملاقات نہ ہو۔" جمال کا جواب  
 بھی شیریں تھا۔ "میرا مطلب ہے۔۔۔ بعض لوگوں سے لی کر ایسا  
 محسوس ہوتا ہے جیسے آپ انہیں برسوں سے جانتے ہیں۔"

"تمی ہاں۔ یہ بات میں نے اسکول کے زمانے میں ایک زمانہ  
 رسالے کے افسانے میں پڑھی تھی۔" راجیلہ بھی نہایت حشاش  
 سے بولی۔ "میرا حال اس خوش کن منگھو کا ہے شہر ہے۔ آپ حقیقہ  
 خواتین میں بہت متنبہل ہوں گے۔"

اس نے ایک ہلکا کر کو نیچلا سا قندہ لگایا۔ "متنبہل ہوتی تو  
 نہیں۔ لیکن متنبہل ہونے کی کوششیں کرنا رہتا ہوں۔ اس سر ہلا  
 کے ساتھ بھلا کوئی خواتین میں کیسے متنبہل ہو سکتا ہے؟" اس نے  
 اپنے سر ہلا کی طرف اشارہ کیا۔ مٹھکرا بھی انگریزی میں ہی جا رہی  
 تھی۔

راجیلہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "تم اکثر ادھر ادھر اسی طرف  
 کراتے ہو۔ تم نے ان کا نام تو بتایا نہیں۔"

"وہ۔۔۔ سہیلی۔ یہ جمال سیدی ہیں۔ شر کے بہت بڑے  
 بڑے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ راجیلہ نے جمال کے نام سے  
 لاواقفیت کا یہ اچھا پتہ دیا تھا۔

"تشریف رکھئے۔ تشریف رکھیے خاتون۔ اور ہمارے

"تپ اسے بد دعا سمجھتے ہیں؟" وہ حیرت سے بولا۔ "کیا آپ  
 نے دوا قحی بھی سیاست کی طرف آنے کا نہیں سوچا؟"

"نہیں خدا نے مجھے اس طاعون سے محفوظ رکھا ہے۔" میں  
 نے ٹھکانے لہجے میں کہا۔ "یہ سیاست ہی تو ہے جس کی وجہ سے  
 آج انصافیت اپنا دیدہ و بند اور گارڈ آف ہنر کیلئے خاک بہ سر ہجر  
 رہی ہے۔ خصوصاً ہمارے خطے میں۔ کیونکہ ہم نے سیاست کو  
 سیاست نہیں رہنے دیا، اسے خباثت بنا دیا۔ ہم نے اس کے معانی  
 ہی تبدیل کر دیے۔ اب کوئی ہمارے ساتھ بد معاشی، چالاکا،  
 منافقت یا دھوکے بازی کر جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ میرے ساتھ  
 بڑی سیاست کر گیا۔"

وہ اب اپنی خیمہ وا آنکھوں میں ایک نیا انسان کے لیے میری  
 طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سونے سونے سرخ ہونٹوں پر عجیب سی  
 مسکراہٹ تھی جیسے وہ میری باتوں سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہو لیکن  
 میرے بارے میں پہلے سے زیادہ الجھن میں بھی پڑ گیا ہو۔

"تپ بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں افضل صاحبہ۔"

آخر وہ بولا۔ "بظاہر اس نے گویا یہ بات مذاق میں بھی کہی تھی۔  
 "وہ تو میں ہوں۔" میں نے بھی بظاہر گویا مذاق میں ہی  
 اعتراف کیا۔ اس اثنا میں کھانا آگیا اور کھانا لانے والے روٹر کے  
 پیچھے پیچھے راجیلہ بھی پل آئی۔ وہ قریب بیچتے سے پہلے ہی چٹکی۔  
 "میں تمہارے آفس میں جھانک کر آ رہی ہوں۔ میں فوراً سمجھ گئی  
 تھی کہ تم یہاں ہوں گے۔ یہاں کھانا۔۔۔ وہاں افضل۔"

جمال سیدی کی اس کی طرف پشت تھی لیکن وہ ایسا خبر  
 معمولی جسامت کا آدمی تھا کہ اگر راجیلہ نے اس کی طرف ذرا بھی  
 توجہ دی ہوتی تو عقب سے دیکھ کر بھی اسے پہچان لیا ہوتا مگر وہ اپنی  
 دھن میں پل آ رہی تھی البتہ قریب آکر اس نے اچانک جمال کا  
 چہرہ دیکھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی حاضردہائی کی داد دے بغیر نہ  
 رہ سکا۔ وہ ذرا بھی نہیں چوچی اور نہ ہی اس نے ذرا سی بھی حیرت کا  
 اظہار کیا۔ اس کا طرز عمل بالکل ایسا ہی رہا جیسے اس کے خیال میں  
 میرے ساتھ کوئی نامعلوم مہمان بیٹھا تھا۔

جمال کے گاؤں راجیلہ کو قریب آتے دیکھ کر کچھ زیادہ چونکا  
 ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھ گھٹنوں پر کچھ اس طرح جم گئے تھے جیسے ٹپک  
 جھپکنے میں وہ انہیں کندھوں سے اتار لیں گے مالاٹک صاف نظر  
 آتا تھا کہ راجیلہ بالکل خالی ہاتھ تھی اور عام حالات میں کسی گڑا  
 کی طرح بے ضرر نظر آتی تھی۔ اس کے باوجود اسے حیرت سے  
 آتے دیکھ کر دونوں گاؤں ضرورت سے زیادہ مستعد ہو گئے تھے۔ وہ  
 قریب آکر رک جکی تو دونوں گاؤں کچھ یوں اس پر نظر جم کر کھڑے  
 ہو گئے جیسے اسے گولیوں سے چھلپی کشتے کا کوئی ہتھیار تلاش کر رہے  
 ہوں۔ جمال کی سوالیہ نظر بھی اس پر جم کر رہ گئی تھی مگر وہ سرے ہی  
 لمبے میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظر سوالیہ نہیں تھی۔ وہ دھمکی  
 نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں راجیلہ کو  
 وہ چار چھوٹے سونے خطابات سے نوازا اور یہ زبان خاموشی ڈالتا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جلال کے پاس اب بائیس ختم ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر وہ دھڑا دھڑکا جاتے تھے لیکن اسے یقین معلوم نہیں تھا کہ کسی میز سے اس کی عمرانی ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد جلال سعیدی نے نہایت اطمینان سے کافی کے تین گم نوش کیے پھر ہوا کا دھواں سگڑا کر اس کے کش لینے لگا۔ سگار اس نے مجھے بھی پیش کیا تھا جن میں نے انکار کر دیا۔ وہ نہایت مسکونہ مہلتیں اور صحت خرابی تھا۔ اسے گویا کہیں جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ فرصت ہی فرصت تھی اور وہ کھانے کافی اور سگار دینے سے ابھی طرح لطف اندوز ہوتا جاتا تھا۔ اس کے ذہن میں کیا کچھڑی پک رہی تھی اس کا اندازہ اس کے چہرے سے لگاؤ قلبی ہاں لگتا تھا۔

اس کے گاؤں پر ستور جموں کی طرح اس کے دائیں بائیں  
استادہ تھے۔ لگتا تھا کہ وہ یوں ساکت کھڑے رہنے سے اکتانے یا  
تھکنے نہیں تھے۔ صرف ان کی آنکھیں حرکت کرتی تھیں۔ آخر کار  
جمال نے اپنے ٹنگ سائز سگار کا آخری کش لے کر اسے ایش  
رے میں مسلا اور دیگر کمل لانے کا اشارہ کیا لیکن میں نے دیگر  
طرف دیکھ کر نفی میں گردن ہلا دی۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت  
نہیں کی۔

”میں نہیں آئے گا جمال صاحب!“ میں نے کہا۔ ”میں نے عرض کیا تھا کہ آج کی شام آپ ہمارے مہمان ہیں۔“

”واقعی...؟“ وہ کافی آمیز سے انداز میں مسکرایا۔ ”آپ نے تو واقعی ہمیں اپنا انک کھلا دیا۔“

”تاج کے دور میں ان باتوں کی کون پروا کرتا ہے۔ جمال صاحب! انگ حرامی بہت آسان ہو گئی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آپ کو بھلا اس کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟“

”کیوں نہیں آسکتی جناب!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔  
 ”میں تو بڑا گناہ کار سا انسان ہوں۔ آپ کی طرح مضامین نہیں  
 ہوں۔ مصلح قوم نہیں ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”وہ تو میں بھی نہیں ہوں۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔  
 ”مظاہر اوراد و معراج قوم غنا تو بہت دور کی بات ہے۔ میں تو صرف  
 انسان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی تو میں اس میں بھی کامیاب  
 نہیں ہوا۔“

”آپ نے اپنے لئے کام ہی بڑا مشکل چن لیا ہے افضل صاحب! وہ میرے کندے پر ہاتھ مار کر ہنسا۔ ”تمہارا خدا حافظ۔“ وہ بائیں کی طرف جھومتا جھومتا رخصت ہو گیا۔ اس نے تو لٹ کر نہیں دیکھا لیکن اس کے خوشخوار صورت گارڈ نے ڈانٹنگ ہال کے دروازے پر پہنچ کر یوں لٹ کر دیکھا جیسے کہ رہے ہوں۔ ”تم سے پھر ملاقات ہوگی“ میں نے ششمان سے انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا۔ وہ جلدی سے محکم کر دروازے سے نکل گئے۔

ملا کر ہماری عزت افزائی فرمائیے۔ ”جمال نے خود آگے  
بڑھ کر ہی کھسکا۔

میں نے کہا: ”میرے بھائی! آپ کی عزت افزائی کو کوئی طرح نکل آئے۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔ میں تو یہی نہیں ہوں اس طرف نکل آئی تھی۔ آپ سمجھو اور کھانا جاری

چاہے ہمارے میں کسی ہوئی ہیں؟ محل نے حسرت کی طرف  
کرتے ہوئے غلطی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ وہ راجیلہ کے  
نقصد دل نہیں ہوا تھا۔

میں نے کہا: "میرا اپنا ایک گھر بھی ہے یہاں۔" راحیلہ نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا: "اب اس پر کیا کر کے اچھائی کیا تھا۔"

اس سے پہلے جمال سعیدی اس سے اس کا ایڈریس معلوم کر کے کوئٹہ پہنچا اور چار اگلیاں ہلا کر خدا حافظ کہتے ہوئے گئے۔ دو روز بعد وہ ڈانٹنگ بال سے غائب ہو چکی تھی۔ معلوم تھا کہ جمال سعیدی کو ایسے خود بخوار صورت گارڈز بھی بھرتے ہیں، دیکھ کر کھٹک گئی تھی۔ گو کہ بظاہر ہم نہایت راز پرستانہ ماحول میں کھانا کھا رہے تھے لیکن راجہ جلیقہ قبائلی صبح کرنے لگی تھی۔

بل سیدی نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی سہیل کو کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور انگریزی آبادی اور کی پڑی پڑتے ہوئے حسین امیر بھیجے ہوئے۔  
مہماتوں نہیں۔ بہت عمو۔ کافی دنوں بعد اس سہیل کی سے لے کا اتفاق ہوا۔

کی کانٹا زخمی کیا تھا جسے نے اڈل کی کسی کاری قریب کر  
 نہیں لے گا نکالتے ہوئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے  
 لگا۔ چند لمحوں بعد میں نے ڈانٹک ہال کے ایک کونے میں  
 کھپائی کی گنجو دپا۔ اس صبر پہلے تین کاروباری سے افراد  
 اور خروش سے بات چیت میں مصروف نظر آ رہے تھے۔  
 قلم اٹھانے کو چکا تھا۔ وہ مجھے یا کافی کا کپ لیے بیٹھا تھا اور  
 جس طور پر کسی بھی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن میرے لئے  
 اس مشکل نہیں تھا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ راجیل  
 فریڈم کے طور اسے یہاں بھیج دیا تھا۔

ہوئے بعد وہ گاندھاری افراد تو رخصت ہو گئے اور ان کی  
ساتھ ہوا رہ گیا۔ شاید وہ کہیں اس پاس ہی موجود تھا اور  
خود سہاکی فون پر اس سے رابطہ کر کے اسے بلا بھیجا تھا۔  
وہ جب حکام اتفاقاً وہیں سے چلا آیا ہو اور رابطہ نے اسے بھی  
خاکہ دیا ہو۔ وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط برت رہی تھی۔ کچھ بعید  
خاکہ وہ خود بھی کہیں سے ڈانٹنگ والی ٹھگرالی کر رہی ہو۔  
خاکہ کیساتھ جانے والی فون شی میں شریک ہو گیا تھا۔  
خاکہ اور شریک سعودی اب خاص شی سے کھانا کھا رہے تھے۔

انہیں گئے ہوئے بہ مشکل ایک منٹ ہی ہوا ہو گا کہ راجلہ دوبارہ ڈانٹک ہال میں نمودار ہوئی۔ وہ تھر کی طرح میڑ میڑکی طرف آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ٹوٹی اور شفیق شاہ بھی آگئے وہ تینوں میرے آس پاس بیٹھ گئے۔

"جنت ہے میرے بھائی لوگ!" میں نے مستانہ انداز میں سرتاپا۔ "ہوئی ہے ان کے نکلنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور اگر میرے سر پر سوار ہو گئے۔"

"چلے گئے ہیں وہ" راجلہ نے اطلاع دی۔ "میں نے انہیں گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہوتے دیکھ لیا ہے۔ یہی تو آئی ہوں۔"

"اور نہ تک یہ آئی ہیں اس لیے ہم بھی آگئے ہیں۔" ٹوٹی نے گویا معافی پیش کی۔

"ہو سکتا ہے ابھی ہال میں اس کا کوئی آدمی موجود ہو۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے بغیر کہا۔

"اب اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ دفعہ کو" راجلہ بے پروائی سے بولی۔ "یہ تادیب بلا کس طرح اور کس سلسلے میں نازل ہوئی تھی؟ یہ کس قسم کی ملاقات تھی؟ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

وہ سب کچھ جاننے کے لئے بے آپ نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے شروع سے آخر تک اس ملاقات کا احوال سنا دیا۔ ساری باتیں دہرا دیں۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر راجلہ بولی۔ "خاصی منافقانہ سی ملاقات تھی۔ اس سے کوئی بات واضح نہیں ہوئی۔ یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اصل بات سمجھ چکا ہے اور یہ امکان بھی نظر آتا ہے کہ وہ بلف کر رہا ہے۔ شاید وہ کسی شکاری کی طرح رات کے سانے میں چتر پیکر کو رد عمل دیکھنا چاہتا ہے۔"

"دونوں صورتوں میں ہمیں صرف ہوشیاری رہنا ہے۔ کوئی رد عمل ظاہر نہیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت اس کا پتا صاف کری دیا ہوتا تو سہتر رہتا۔" راجلہ بولی۔ "اب یہ ابھی پہلے سے زیادہ برا خطوط بن کر منڈلا آ رہے گا۔"

شاہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی تبصرو نہیں کیا۔ چند لمحوں بعد راجلہ سر جھٹک کر بولی۔ "بھاڑ میں کیا جمل سیدی! تم کھانا کھلاؤ۔ یہ دو بیٹیم سکین بچے بھی بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔" اس نے ٹوٹی اور شفیق شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"تکس کے بچے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ اپنے والدین کے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کچھ دیر پہلے تو تم نے کہا تھا کہ تم کھانا کھا چکی ہو۔" میں نے اسے گورا۔

"وضع داری بھی آخر کوئی چیز ہے۔ اب ہم اس موٹے کے سامنے تو بھوک سے ہلکا کر نہیں کہہ سکتے تھے کہ حضور والا! اللہ کے نام پر ہمیں کھانا کھانا دیجئے۔" راجلہ منہ بنا کر چلی۔

ان تینوں نے اپنے لئے کھانا منگوایا اور میں سامنے بیٹھ کر انہیں کھاتے دیکھا۔ اسی اثنا میں ایک دیگر ایک لفظ سنا۔ میرے پاس آیا اور بولا۔ "سرا یہ جی ایم صاحب نے بھی لایا ہے۔ کورسز سموس سے آیا ہے۔ اور جنت ڈنڈے دی ہے۔"

اس طرح بے وقت کورسز سموس اور اور جنت ڈنڈے کی عمر جی ایم قسم کے کا داری خلوت آتے تھے لیکن ایسا اظہار کیا ہوا تھا۔ زیادہ ایم باتیں تو فون پر ہوتی تھیں اور ہنگامی طور پر کاغذات کی ضرورت بھی پڑتی تھی تو ٹکس پر آجاتے تھے جیڑیا کی اور جیل کی شرط نہ ہوتی۔ میں نے لفافے کو کالٹ پلٹ کر دیکھا کہ قطعی غیر کا داری خط معلوم ہوا۔ وہ بالکل ساتھ ساتھ تھا اور ایم کہیں ٹرے ٹاپ شدہ میرے نام و بچے کی چٹ کاٹ کر دیکھا کہ تھی۔ لفافے پر داہنی کا کوئی ایڈریس نہیں تھا جس سے جنت کے تذبذب کے بعد احتیاط سے اسے کھولا۔ اندر سے خاصا پالا صاف ستر کاغذ پر آدھا ہوا جس پر کہیں ٹرے ٹاپ شدہ حروف بنیئر کی القاب و فیوہ کے لکھا تھا۔

"کراچی کے قبرستان کس جڑی طرح بھر گئے ہیں۔ کسی دکان رکھے کو بھی جگہ نہیں ہے۔ خصوصاً ایسے علاقوں کے قبرستان جہاں یہ حال ہے کہ وہاں مردہ ٹوکیا، مردے کی ایک انگلی بھی دفن نہیں کیا جاسکتی۔ اور تو ایک خوشحال آدمی ہو، ظاہر ہے کسی ایسے خانے کے قبرستان میں ہی دفن ہوا ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ ہے بھی ہے کہ جس میں ایک آدھ نہیں پوری پانچ قبروں کی ضرورت پڑے۔ آخر تمہارے چار ساکھی بھی تو تمہارے ساتھ دفن ہوں گے۔ تم نے اس مسئلہ کا کوئی حل سوچا ہے؟ خواہ کتنی ہی رقم خرچ ہو تو کتنی ہی بڑی سفارش لگائی پڑے، تم ہر حال میں اپنی ہڈی کے قبرستان میں پانچ قبروں کا بندوبست کر کے رکھو۔ انسان کو موت خواہ کتنی ہی دلت سے آئے لیکن اس کی پھینک دینا تو ذرا زیادہ داند سے ہونی چاہئے۔ کیا خیال ہے؟"

خط کے آخر میں بھی کوئی نام نہیں تھا۔ اس قسم کے خط آخر میں نام کی توقع رکھی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ اگر نام ہو جاتا تو یقیناً فرض ہوتا۔ خط بھجوانے وقت کورسز سموس کے نام میں بھی اگر داہنی کا کوئی پتا لکھوایا گیا ہو گا تو یقیناً وہ فرض تھا۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی تحقیق بے کار تھی۔ سوچنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط کو دوبارہ پڑھا۔ ایک لمحوں کے لئے میرے دل کو چپکائی کی گردن ذرا سست پڑی لیکن پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ یہ تینوں ساکھی کھانا کھاتے ہوئے پڑ جنس انھوں سے ملتی دیکھ رہے تھے میں مسکرایا۔

ایک لمحوں کے لئے میں فیصلہ نہ کر پایا کہ مجھے خط ان کا دیا جائے یا نہیں؟ پھر میرے اندر سے کوئی آواز ابھری۔ میں نے ان سے کچھ بھی چھپانا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے خط شفیق شاہ کی طرف پڑھا تو راجلہ اسے درمیان سے اچٹے ہوئے ہلکا کر فرسٹ۔

یہاں آیا ہو۔ "فونی بولا۔ "مگر پاس اتفاق سے نہ مل جائے تو شاید وہ خود انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ شاید اس کے اندازے کے مطابق خط پاس کو مل چکا تھا لیکن درحقیقت وہ اس کے اندازے سے ذرا لپٹ ہو گیا۔ اس کی یہی سوچ تھی جس نے اتفاق تو نہیں ہو سکتا۔ وہ جیتا بکھڑا کچھ سوچ کر آیا تھا۔"

"اس منوٹے میں بہت سے شاید ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن چنگی فی الحال ہمارے پاس اس سے بڑھ کر کوئی منوٹہ نہیں۔ چنانچہ ہم اسی گزارے لائق منوٹے پر اتکا کر لیجئے۔"

"توبہ" جب کرنا کیا ہے؟ "فونی نے بانٹا ہوا۔

"کچھ بھی نہیں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ظاہر ہے اس قسم کے خطوں کا جواب تو نہیں دیا جاسکتا۔ یہ اندھیرے میں تھم چلنے سے بھی زیادہ اطمینان حرکت ہوگی۔ ہمیں مصیبتوں سے اس کے کسی عملی اقدام کا انتظار کرنا ہوگا جس نے یہ خط لکھا ہے۔ تم تینوں کو اب میرے سے بھی کچھ زیادہ ہوشیار اور مستعد رہنا ہوگا۔" پھر میں نے شیخ شاہ کو مخاطب کیا۔ "تم آج کل زیادہ بھاگ دوڑیں موقوف ہو۔ تم ذرا زیادہ ہوشیار رہنا۔ میرا خیال ہے میں ذرا تاج کو بھی مزید خبردار کر دوں۔"

"وہ بھی سوچے گی کہ ہمارا ساتھ دے کر کس مصیبت میں پھنس گئی۔" راجیلہ مسکرائی۔

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے کہا۔ "اوتھوں والوں سے دوستی رکھنے کے لئے گھر کے دروازے تو بڑے رکھتے پڑتے ہیں۔ ویسے وہ گہرائے والی لڑکی نہیں ہے۔"

"گہرائے والی ہوتی تو اس طرح کے کام میں اس انداز سے ہمارا ساتھ نہ دیتی۔" شیخ شاہ بولا۔

میں نے خط کو پڑھ کر ایش زبے میں ڈال دیا۔ فونی بولا۔ "یہ آپ نے کیا کیا۔ شاید یہ خط بھی شہادت کے طور پر کام آجائے۔"

"مختی سوہوم امیدوں کو دل میں جکڑت دو" میں نے ملازمت سے کھٹا ہاتھ پائوں سے لٹکانے میں۔ "سادہ کاغذ ہے۔ بغیر کسی القاب اور بغیر کسی نام و پتے کے۔ کچھ نرکے ڈیرے لکھا گیا خط بھلا کیا شہادت بنے گا۔"

اس رات مختل برخاست ہونے تک ہم گویا اس خط کو تو بھول چکے تھے۔ ہم پیش کی طرح نہیں بول رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ تم از کم میں اسے نہیں بھولا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے بارے میں میرا یہی خیال تھا۔ میں اس وقت تک خط بھیجے والے کے بارے میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ جمال سعیدی کے الفاظ کی بازگشت میرے ذہن میں ابھری تھی۔ "بعض اوقات ہم اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کون سی حرکت کس دشمن کی ہے لیکن ہم انجان بن جاتے ہیں۔ ہم کبھی ایسے وقت پر ایسے موقع پر اور ایسے انداز میں جا کر اسے مارتے ہیں کہ اسے حیران ہونے کی بھی صلت

ہم پہنچتا ہو۔" شیخ شاہ نے حیرت سے اس کی طرف الجھا کر سر جھک کر بولا۔ "چما ہوا تھامو! ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرتا۔" میں نے تھکا ہوا۔ شیخ شاہ ہاتھ دے بیٹھنے سے اسے انداز میں فنی میں سر ملایا۔ راجیلہ نے دونوں کو گھورا پھر خط دیکھنے لگی۔ ایک ہاتھ سے اس نے دھیرے دھیرے لکھا لکھا جاری رکھا۔ دوسرے ہاتھ میں خط تھامے بغیر ہی۔ خط پڑھ کر اس نے کسی تبصرے کے بغیر شیخ شاہ کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی کم دیش اسی انداز میں بغور خط دیکھا اور فونی ہارٹ پر چڑھا۔ خط پڑھ چکے کے بعد بھی تینوں کے تاثرات میں تبدیلی نہ آئی لیکن چند لمحوں میں خاموش رہے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

آخر راجیلہ نے یہ سکوت توڑا۔ "حیرت ہے! لوگ آج کل لڑنے میں بھی ایسی ذرا مائی حرکتیں کرتے ہیں۔ کون ہو سکتا ہے لکھنے والا از دن سلطانہ ڈاکو؟"

"جمال سعیدی۔" فونی نے بلا تامل کہا۔ "شیخ شاہ نے کوئی ہونے سے گریز کیا۔ وہ خاموش تھا اور کسی خیال میں الجھا ہوا۔"

"نہیں۔" راجیلہ نے فوراً فنی میں سر ملاتے ہوئے فونی کے لیے کی تردید کر دی۔ "جمال سعیدی۔" فنی نہیں جاکر اپنا پیغام رکھنے والا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے ذرا مائی طاقت میں الجھنے کا مادی معلوم نہیں ہوتا۔"

میں خود کو بھی اس ضمن میں کوئی رائے دینے سے قاصر رہا کہ کیا تھا ہم اپنے ساتھیوں کی سوائے نظروں کو محسوس نہ ہوئے میں نے کہا۔ "وہ جیشہ کرم بھی ہو سکتا ہے۔ اس بالکل آدمی ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ وہ کرائے کے سے دور دھت گرد کسی۔ لیکن ہر حال ان کی خدمات جیشہ ملت حاصل کی تھیں۔ وہ ان سے جو کام لینا چاہتا تھا وہ نہیں لے سکا۔ جمال سعیدی کے پاس اس کا چھٹا اور اہم ترین آدمی احمد ایچا مارا گیا۔ ہو سکتا ہے اس ملے کے بارے میں جمال سعیدی غائب سے بات چیت کرتے ہوئے ہمارے متعلق شہادت کا مل کر رہا ہو اور اب وہ اپنے طور پر ہمارے بارے میں کوئی نئی برہنہ کر رہا ہو۔"

انہیں چند لمحوں خاموش رہے پھر راجیلہ بولی۔ "لیکن وہ لڑاکا ہی تھا ان کے چنے بنے ہیں۔ دونوں مل کر بھی کوئی لاکھ ڈاکو کر سکتے ہیں۔ مل کر تو ہم انھارے سے ان کی طاقت بھی بہت بڑھ سکتی ہے۔"

میں صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ اس خط کے بھیجے جانے میں سعیدی کی مرضی بھی شامل ہو۔ "شیخ شاہ نے پہلی بار گھر سے یہ خط لکھا تھا۔" شیخ شاہ نے پہلی بار

نہیں ملتی اس وقت غلو اس کے دوہم دکان میں بھی نہیں ہوتا۔  
اگر جمال حیدی اس سوچ کا آدمی تھا تو پھر وہ اس قسم کا فطرت  
کھینے یا کھوانے کے حق میں نہیں ہو سکتا تھا جس سے دشمن الٹ  
ہو جاتا اور نہ جانے کب تک الٹ ہی رہتا۔ وہ تو شاید صرف کچھ  
دیر کے لئے ہمارے ساتھ غفلتوں کے ذریعے چرے ملی کا کھیل کھیلے  
اور درحقیقت اپنے بے پروا انداز سے ہمیں خوش فہمی اور بے  
فکری میں جکارتے آیا تھا۔ یہ فطرت اور اس کا رویہ "ایک دوسرے  
سے کافی مختلف قسم کی چیزیں تھیں۔ نیند نے مجھے ان ابھی ہوئی  
سوچوں سے نجات دلا دی۔

دوسرا دن خیریت سے ہی گزرا۔ شام کو میں آنس میں بیٹھا ہوا  
تھا کہ امبر نے بتایا کہ کوئی خاتون فون پر مجھ سے بات کرنا چاہتی  
تھی لیکن وہ اپنا نام نہیں بتا رہی تھی۔ انہوں نے ہوٹل کے  
ٹیلیفون بورڈ کے توسط سے فون کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کے  
پاس میرا ڈائریکٹ نمبر نہیں تھا جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ کوئی  
قریبی جاننے والی نہیں تھی۔ ویسے بھی خیر خیر جاننے والی کو نام  
چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ایک لمبے سوچا اور فیصلہ کیا  
کہ نام نہ بتانے والی خاتون سے بھی بات کرنے میں کوئی حرج نہیں  
ہے۔ آخر وہ خاتون تھی۔ میں نے امبر سے لائن ملانے کے لئے  
کہا۔

میں نے پہلو کیا تو اس خاتون نے بڑے فحشی سے لمبے میں  
تصدیق چاہی۔ "آپ افضل صاحبہ ہی ہوں رہے ہیں نا؟"

میں نے انہیں یقین دلانے کے ساتھ ساتھ ذہن پر زور دیا۔ یہ  
آواز سن کر ذہن میں کوئی گھنٹی تو بجی تھی لیکن اس کی آواز بہت ہی  
مدھم تھی۔ خود خاتون کی آواز بھی نہایت مدھم تھی۔ ایسا معلوم  
ہوتا تھا جیسے ان کے آس پاس کوئی موجود تھا اور وہ اس سے  
رازداری رہتے ہوئے فون پر بات کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
ان کی آواز مجھے کچھ سنی ہوئی لگ رہی تھی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ  
کہاں سنی تھی۔

جب انہیں یقین آیا کہ میں افضل ہی ہوں رہا ہوں تو تنہا سا  
کی الجھن انہوں نے خود ہی حل کر دی۔ "میں وایدہ بول رہی  
ہوں۔ وایدہ پردیز۔۔۔ امبر پردیز کی بیوی "خاتون نے رازدارانہ  
سے انداز میں بتایا اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ آواز میں  
نے صرف ایک ہی مرتبہ بہت مختصر سے جلوں کی حد تک سنی تھی  
اور اس وقت موقع مل بھی بہت مختلف تھا۔ پرنس سیرا کی لاش  
دریافت ہونے کے موقع پر میرا اس سے سامنا ہوا تھا اور پہلے اس  
نے مجھے ہی قاتل سمجھ کر پتھر شروع کر دیا تھا۔ اس عورت کو مجھے  
فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی؟ میں حیران ہوئے بغیر نہ وہ  
سکا۔ وہ پرنس سیرا کی بیوی تھی۔

جی۔۔۔ فریڈے؟ "میں نے غایت شائستگی سے کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ ایک پھر گزرا کر رہ گئی۔ اس نے مجھے فون تو کر لیا

تھا لیکن شاید وہ اب بھی الجھن میں تھی کہ مجھ سے بات کرے  
کرے۔ اس نے اس الجھن کا اعتراف بھی کر دیا۔ "میں کچھ  
نہیں آ رہا کہ مجھے آپ سے بات کرنی بھی چاہی یا نہیں۔"  
تو پھر آپ پہلے فیصلہ کر لیجئے۔ "میں نے طمانعت سے کہا  
"نہیں۔۔۔ نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میرا مطلب یہ ہے  
۔۔۔ معلوم نہیں آپ میری درخواست پر توجہ دیں گے یا نہیں۔  
اس کی اہمیت کو محسوس کر سکیں گے یا نہیں۔" مجھے کچھ  
بہت پریشانی اور دوشت سی معلوم ہو رہی تھی۔  
"آپ بات تو کیجئے" میں نے اخلاص سے کہا۔ "بات  
اپنی اہمیت خود بتا لیتی ہے۔"

"میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔  
فون پر نہیں۔" آخر اس نے گویا جرأت سے کام لیا۔  
اصل مقصد بیان کر ڈالا۔ "بات بہت ضروری اور اہم ہے۔  
ایسا کیجئے۔۔۔ میں آج شام اپنی ایک دوست کو سی آف کر  
پورٹ جاؤں گی۔ اسے اکثر پیش زرمینل پر سی آف کرنے  
میں موقع دیکھ کر ڈرامیٹک ڈیپارچر لاؤنج میں آتا ہوں۔  
میں گیت نمبر تھو کی طرف جانے والے راستے پر مجھے ملے  
بلیٹ کے قریب۔۔۔ وہ ذرا محفوظ جگہ ہے۔ آؤں گی  
اور صرف مسافروں کا گزر ہوتا ہے۔"

میں نے اس جگہ کا نقشہ ذہن میں لانے کی کوشش کرنا  
"کتنے بچے؟"

"آپ ٹھیک سات بچے وہاں پہنچ جائیں گے۔" وہ  
"ساتھ سے جو بیٹے میری دوست کی فلاح کے لیے جاتے  
کے ذرا گروڈیش کا جائزہ لیتی ہوئی سات بچے ٹھیک  
جاؤں گی۔ جب میں خود آپ کے قریب آ کر آپ کو چاہے  
تب تک مجھے سے بات کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔"

"آپ کس سٹیلے میں بات کرنا چاہتی ہیں؟"

نری سے پوچھا۔  
"فون پر میں آپ کو یہ بھی نہیں بتا سکتی۔" اس نے  
بے بسی اور دوشت تھی۔

"کیا یہ فون نمپ ہو آئے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا  
"دیکھیں۔۔۔ ایسا باتیں بھی فون پر نہیں ہوتیں۔  
میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ٹھیک سی گہری  
ایک لمبے خاموش رہا تو وہ بڑی باؤس سے بولی۔ "جی۔۔۔  
نہیں آئیں گے؟"

"میں ضرور آؤں گا۔" میں نے مضبوط لمبے میں کہا۔  
"میں آپ کا انتظار کروں گی۔" اس کا نام  
رنگ سے یکدم کچھ بدل سا گیا۔ دوسرے ہی لمحے  
ہو گیا۔



سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بھی میں چند سینکڑ تک ریسپور کان سے ہی لگا کر بیٹھا رہا جیسے واپدہ پروں کی آواز مجھے دوبارہ سنائی دینے لگے گی۔ یہ ایک نہایت ہی غیر متوقع فون کال تھی اور اس نے واقعی مجھے حیران کر دیا تھا۔ آخر واپدہ پروں مجھے کیا بتانا چاہتی تھی؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ مجھے یہ کیوں بتانا چاہتی تھی؟ میں اس کا کوئی ایسا قریبی واقف تو نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت دولت مند اور صاحبِ حیثیت آدمی کی بیوی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے طبقہ احباب میں نہ جانے کیسے کیسے لوگ شامل ہوں گے کیا ان میں سے کسی کو بھی اس نے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اس سے وہ بات کی جاسکتی؟ کہیں یہ کوئی ہال تو نہیں تھی؟ مجھے اس کے میاں کا خیال آیا جس کے مزاج میں خاصی فروعیت پائی جاتی تھی اور جو پہلی ملاقات میں ہی مجھ سے اور درجیم کل سے غار کھا گیا تھا۔ اس کے گھر پہ اس سے دوسری ملاقات کے دوران میں تو درجیم ٹھکلنے اس کی دُوم پر کافی زور سے پاؤں رکھ دیا تھا اور پھر اگر اس ملاقات کی یاد دہادی مجھے سنائی تھی۔

سے بلا۔ وہ بہت کھری کھری اور نمانہ دم لگ رہی تھی۔  
 آرام کر کے انہی حسی اور نیچے ہی آنے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔  
 میں نے بلا تھپہ نہایت سنجیدگی سے کہا "میں ان پراٹھ پراٹھ  
 عورتوں سے ملنے جا رہا ہوں۔"  
 "بھان اٹھ! ایسی خوش کن اطلاع ہے۔" وہ قہر کھو نکلا  
 "مجھے گھورتے ہوئے بولی" "مگر یہ اطلاع مجھے ہی دینا چاہی  
 تھی؟"

لیجے میں کیا۔

”ترس۔۔۔؟“ اس نے آنکھیں نکالیں ”میں تو تمہاری شخصیت کا یہ بے ہودہ پہلو بھی درست کہنے کی فکر میں ہوں۔ شادی کے بعد تمہیں اپنی یہ حدود سرگرمیاں بھی ترک کرنی پڑیں گی۔“

”یعنی۔۔۔ شادی ہوئی نہیں۔۔۔ اور اصلاحی پروگرام بھی ترتیب پاگیا! میں نے بے جتنی سے آنکھیں پھیلائی۔“

”یہ تو ہوا ہی ہے۔“ اس نے بے یازگی سے کہہ مے اچکائے ”اس طرح تو ہونا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“

”یعنی جیسی لڑکی سے چاہو شادی کرو تو نتائج جیسی ظلمیں گے۔“ میں نے کراہ کر کہا۔

”بے شک۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔

”مطمون نہیں مزا اس کے باوجود شادی کرنے سے باز کیوں نہیں رہتے۔ کہہ میں کسی کے! میں نے جملے بننے لیجے میں کیا۔

”یہ ایک راز ہے جس پر دنیا بھر کے سائنس دانوں کو کلی کر رہی ہے۔“ اس نے عجیبی سے سہلاتے ہوئے کہا۔

”معبیت یہ ہے کہ سائنس دان خود بھی تو شادی شدہ ہوتے ہیں۔ وہ تو پی سی اس قسم کے موضوعات پر رہیج کے لیے نا اہل قرار پاتے ہیں۔ خود اپنی محتاجوں پر رہیج کرنا تو ذرا مشکل کام ہے۔“ خیر۔۔۔ تم اس بات کو چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم نے لڑکیوں کے بارے میں میرے کردار کا جو نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے؟ یہ مطومات تمہیں کہاں سے حاصل ہوئیں؟ تو تاپ سیکرٹس ہیں جو تمہارے ہاتھ لگ گئی ہیں۔“

”مطومات مجھے کہاں سے حاصل ہونا چاہیں بھلا۔“ وہ تیزی سے بولی ”میں کیا اس مسئلے میں کیس سرورے کئی رہی ہوں؟ یہ تو میرے اندازے ہیں۔ آخر اتنے عرصے سے تمہارے اتنے قریب رہ رہی ہوں۔“

”کیسی لڑکیاں بھی تری معیت ہی ہوتی ہیں جن کا مشاہدہ آج تک ہو۔“ میں نے لفظی سانس لی۔

”اسی لیے تو بار بار کہہ رہی ہوں! ابھی وقت ہے۔۔۔ سوچ لو۔ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔“ وہ بولی۔

”معبیت یہ ہے کہ مابدولت کو معیت مول لینے کا شوق ہے اور مابدولت خدی بھی داخ ہوئے ہیں۔ جو منہ سے نکل گیا۔ سو نکل گیا! میں نے شانہ انداز میں کہا۔

”مزید سختی معیتیں مول لینے کا ارادہ ہے؟“ اس نے سچے لیجے میں پوچھا۔

”مزا اس بولی معیت سے نہٹ لیں پھر دیکھیں گے۔“ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”لکھا ہے تم ساری شام اسی قسم کی فضول باتوں میں گزار دو گے۔ یہ بتاؤ مجھے اوپر سے کس لیے بلوایا ہے؟“

”جب بھی وقت ہے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔

”میں یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر نے کامل تو شادی کے بعد شروع کیا۔“ میں نے سہلایا پھر منے سے اسے گھورا ”وہیے میری فراست قبول کرتے وقت تو تم بڑی مصوم اور مسکین بنی ہوئی تھیں۔ صرف ایک ہی معمولی شرط یا فرائض سامنے رکھ دی تھیں اور میں نے سوچا تھا کہ چلو اسے پورا کرنا یا اس بات کا خیال رکھنا تو کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اب ایک توجہ دن گزرتے ہی تم نے پھیلتا شروع کر دیا۔ شادی کی نوبت آنے تک تو نہ جانے کیا ہوگا۔ اور پھر شادی کے بعد نہ جانے کیا ہوگا!“ میں گویا اس تصور سے کانپ اٹھا۔

”مگر تم نے اسی طرح تو ادنی جاری رکھی تو دنیا والے ایک روز انہادوں میں پڑھیں گے کہ ایک نہایت محبت کرنے والی بیوی نے اپنے شوہر کو کا شکیف کا برست مار کر ہلاک کر دیا۔“ اس نے سرسلی لیجے میں کہا۔

”مگر محبت میں تمہارا یہ عالم ہے تو قدرت میں کیا عالم ہوگا۔“ میں نے آنکھیں سیکڑ کر اسے گھورا۔

”خودی اندازہ کرو۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”یہ شادی تو برا خطرناک سوا ہے۔“ میں نے بظاہر تشویش سے نظر کرنے کی کوشش کی ”اس سے تو بہتر ہے کہ میں جاپان کے کسی آئل فٹال پیاز سے شادی کروں۔ اس میں کم خطرات پڑتے ہیں گے۔“

”جینینہ۔۔۔“ اس نے تائید کی ”لیکن خیال رہے۔۔۔ پیاز ڈر ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے لیے کوئی چھوٹی سولی پیازنی تلاش کر لے۔ لیکن پیازنی آئل فٹال نہیں ہوتی۔“

”میں چند لمبے خاموشی سے اسے گھورتا رہا پھر میں نے نہایت عجیبی سے پوچھا ”کیا واقعی تم بھی مجھے تو ادنا اور میاش قسم کا توئی سمجھتے ہو؟“

”نہیں۔۔۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تو پھر کیا کہو اس ہے؟“ میں نے اچانک گرج کر کہا۔

”تمہیں سوا حق تو حاصل رہے ہیں نا۔۔۔“ وہ میرے گرجنے سے آرا بھی حار ہوئے بغیر اطمینان سے بولی ”مجھے مطمون ہے اس بات میں تم نے ایک علفہ گمراہ ہوا ہے۔ تم پیشہ ور عورتوں کے لیے نہیں جانتے۔ کسی کی بیجوری سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ جو لڑکیاں معیتیں شریف ہوتی ہیں ان پر ڈور سے ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن جو لڑکیاں ذرا آزاد خیال ہوں! ان کی تم سے دوستی انتظار ہو جائے اور وہ کسی بات میں کوئی حرج بھی محسوس نہ کرتی ہیں تو پھر تم بھی کچھ ایسے پرہیزگار اور پار سائیں رہتے۔“

”تم خود ہی سوچو اس طرح میرے لیے سوا حق کتنے حدود ہو جائے ہیں۔ تمہیں تو مجھ پر ترس آتا چاہیے۔“ میں نے مظلومانہ

جرات دینے کے لیے مجھے بلایا تھا؟ اس نے آنکھیں ٹٹلیں نہ  
بات تم فون پر بھی کر سکتے تھے۔

”ہو سکتا ہے کسی کو تھماری پٹکار زہ صورت دیکھنے کا شوق ہو  
اور اسے تم سے دوستی بات کر کے ہی اطمینان ہوتا ہو۔“ منی نے  
جواز پیش کیا۔

”منیر داس۔ جو تم نے میری صورت کو پٹکار زہ کئے کی  
کو شش کی۔ تھماری صورت شہادت کے قائل نہیں رہے گی۔  
وہ تمھیں پہچنے ہوئے ہوں۔

”موسیٰ کو۔ کیا تم مشتعل میں ایک باجیل شہادت آؤ گی  
یہی کہلا پتہ نہ کر دے گی؟“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ بشرطیکہ دو چار افراد نے  
گواہی دے دی کہ وہ آؤ گی ہی ہے۔“

”گواہی کیا لوگ تو اٹھارہ ہندو بھی کریں گے کہ دیکھو اب  
بے چارے انسانوں کی شادیاں چڑھیں سے بھی ہونے لگیں اہا  
گنا ہے اس بے چارے کے لیے تو لڑکوں کا کل پر کیا تھا۔“ منی  
نے لفظی سانس لے کر کہا۔

”جب کوئی چیز میرا جاتی ہے تو اس کے بارے میں انکی  
تقدیر کی باتیں کی جاتی ہیں۔“ اس نے افسوس سے سہلایا۔

”منی نے گفزی دیکھتے ہوئے کہا ”مزید تقدیر کی باتیں  
وہیں آکر کھوں گا۔ اب میں اڑ پورٹ جا رہا ہوں۔“ منی اٹھ کر  
دواڑے کی طرف بڑھا۔

”اس نے تمھیں اڑ پورٹ پر ہی کیوں بلایا ہے؟“ وہ میرے  
ساتھ دواڑے تک آئے ہوئے ہوئی ”کیا وہیں سے وہیں لٹھارا  
اس کو بھاگ کر لے جانے کا ارادہ ہے یا وہ تمھیں بھاگ کر لے جانے کی  
نیت سے آؤ گی ہے؟“

”میں نے اس کا دواڑہ دیکھ کر تمھیں بتایا ہے۔ اس کے بارے  
میں تمھارے بھاگنے کی باتیں کر رہی ہو۔ تمھیں ابھی تک نہیں  
آیا کہ وہ اس قبیل کی عورت نہیں ہے؟“ منی نے غفلت سے  
”ہم چھوٹے ٹھیکر ہیں۔ جب تم اکیلے وہیں آ جاؤ گے تو  
تجربہ کر لوں گی۔“ اس نے کہا ”مجھے نسلی دلی دیکھو منی  
کرے میں وہیں جا رہی ہوں۔“

”تم جاؤ تو میری جگہ آفس میں بیٹھ سکتی ہو۔“ منی نے  
”اٹا ہا!۔“ وہ کالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ہوئی ”تجربہ  
کیسے اول جلیل لوگ تم سے ملنے آتے ہوں گے۔ وہ تمھاری  
مجھے بیخود بھیس گے تو خواہ خواہ انھیں حیرت کا شہہ بھٹکا  
بیٹھے بیٹھے یہ افضل صاحب کو کیا ہو گیا۔“

”تم خوش ہوں گے وہ۔“ منی نے کہا۔

”اس لیے تو میں اوپر جا رہی ہوں۔ ان کی خوشی مجھے  
میں جانے گی۔“

”میں اسے خدا حافظ کہہ کر بارنگ کلاٹ سے اپنی گاڑی لے

”بتایا تو ہے کہ میں ایک عورت سے ملنے جا رہا ہوں۔“ منی  
نے جان بوجھ کر اس سے آگے نہ بڑھا۔  
”تو مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے بڑی بیچوگی  
سے مشورہ طلب انداز میں پوچھا ”تمھارے ساتھ چل کر اس  
عورت کی کمپنی تو لینی چاہیے یا تمھیں ریسوں سے باز کر دینا  
بہتر ہے؟“

”تمھیں اس قسم کی کوئی بے ہودہ حرکت نہیں کرنی چاہیے  
بلکہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنے اور میرے حق میں دعائے خیر کرنی  
چاہیے۔“ منی نے بیچوگی سے کہا ”مجھے فون کر کے بلایا گیا ہے۔  
یہ کوئی سازش بھی ہو سکتی ہے اس لیے میں تمھیں خبردار کر کے جا رہا  
ہوں کیونکہ شفیق شاہ بھی یہاں نہیں ہے۔ کاموں کے سلسلے میں غلط  
ہوا ہے۔ تم اور ٹولی اپنے اپنے کمروں میں ذرا ہوشیاری سے رہنا  
اور بچنے کی بھی فکر رکھنا۔“

”ٹولی تو آج بھی شفیق شاہ ہی کے ساتھ ہے۔“ اس نے بتایا۔  
”اس صورت حال میں تو تمھیں اور بھی زیادہ ہوشیار رہنے کی  
ضرورت ہے۔“ منی نے کہا۔

”ہم تو خیر ہر وقت ہی ہوشیار رہتے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے  
ہولی ”لیکن اگر یہ کوئی سازش ہے تو میں سازش کرنے والوں کی  
مطلوبات کی داد دوں گی۔ انھوں نے تمھیں عورت سے ملنے کا بہانہ  
کر کے بلایا ہے۔ انھیں مطمئن عورت کا نام سن کر تم نہ نہیں سکو  
گے۔ دوڑے پلے آؤ گے۔“

”میں نے دانت چس کر اسے کھوڑا اور کہا ”میں اس عورت کو  
جاننا ہوں۔ وہ چالیس سے اوپر کی ہے۔ خامے بڑے بچوں کی ماں  
ہے۔ شریف اور گھریلے قسم کی عورت ہے۔ خود بھی کوڑھی خاندان  
سے تعلق رکھتی ہے اور ایک کوڑھی ٹولی کی بیوی ہے۔“

”ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ منہ بنا کر بولی ”ان  
میں سے کوئی بھی بات تمھیں اس پر عاشق ہونے سے نہیں روک  
سکتی۔ اس کی جو بھی خصوصیت تم بتا رہے ہو وہ اس کی ڈس  
کراؤنگیشن نہیں بلکہ کراؤنگیشن ٹار ہو گی۔“

”تم تو بہت ہی بے ہودہ فزنی ہو۔“ منی نے متاثرانہ انداز میں  
سہلایا ”تمھارے بارے میں میرے تمام اندازے غلطی ثابت نہ  
ہو جائیں۔ تمھیں پوری بات جاننے بغیر کسی شریف عورت کے  
بارے میں ایسے رمارکس نہیں دینے چاہئیں۔ میں پرنس پیرا کا  
قصہ سناتے وقت اس کے بارے میں بتا بھی چکا ہوں۔ وہ محتولہ کی  
بڑی بہن وادہ پرویز ہے۔ احمد پریز کی بیوی۔“

”میں عورت کے بارے میں رمارکس نہیں دے رہی۔“ وہ  
”اطمینان سے بولی ”میں تو تمھارے بارے میں رمارکس دے رہی  
ہوں۔ میں تمھیں جانتی ہوں عورت کو نہیں۔“

”اگر اسے تم جانتا کسے ہو تو گفت ہے تمھارے پاس پڑے۔“  
”تم نے کیا یہ فضول سی بات بتانے اور ایک غیر ضروری سی

میرا لنگ بیک رکھے، یعنی سنووی سامنے سے گزریں۔ ان میں سے کئی اس قابل تھیں جنہیں دیکھ کر مجھے ایک لمے کے لیے خیال آیا کہ انسان کو کبھی کبھی بلا ضرورت بھی ہوائی سفر کرنا چاہیے۔ ایک نے تو سراسر جھوٹا چموز کر آگے بڑھ جانے کے بعد گردن گھما کر پیچھے بھی دیکھا اور گری نکلواں۔ میرا جائزہ لیا۔ میرا خیال ہے یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کے ہوتنوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی ابھری تھی۔ اگر راجیلا وہاں موجود ہوتی تو میں اُسے جلائے کے لیے کٹ اور پوک کر مارنے کے بغیر ہی اس کے پیچھے چل دیتا۔

پھر میں نے سامنے سے ایک ڈبل پلے فوجان کو دیکھا جس کے لیے ہل تل میں چڑے ہوئے تھے۔ وہ سبکی سی شرٹ اور برائی جینز میں تھا۔ شرٹ، جینز سے باہر تھی۔ اس کی کلائی میں نعلی کڑا اور اٹھیں میں انگوٹھیں تھیں۔ وہ طے سے نچلے پلٹے کا فرد معلوم ہوا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ایک نہایت شاندار نعلی اور پیش بکٹ بریف کیس تھا۔ وہ مظلومانہ سی نگاہوں سے ابڑھ کر اصرار دیکھتا تھا۔ "خیر، تم جہان آباد جا رہا تھا۔"

ایک لمحے کو خیال آیا کہ شاید اس کا برف کیس بڑے نونوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا ہو اور یہ رقم اس نے بیک سے نکلائی ہو۔ بیک کے ذریعے نہیں۔ لی لی یا کلا صرف کے ذریعے۔۔۔ اور اب وہ اسے کسی محفوظ جگہ بچانے جا رہا ہو۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا تھا کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی رقم موجود ہوئی تو وہ اسے ایسا عمدہ برف کیس خریدنے سے پہلے اپنا حلیہ بہتر بنانے کی کوشش کرتا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ بعض لوگوں کے عجیب عجیب کمپلیکس ہوتے ہیں جو ان سے عجیب عجیب حرکتیں کراتے ہیں کوئی عید نہیں تھا کہ میرا پتلا خیال ہی درست ہو۔

ایک مظلوم الحال سی بی بی تھا جاتی دکھائی دیں۔ انہوں نے ایک پر ملی بی بی محبت سے سنے سے لگائی ہوئی تھی۔ وہ بھی کچھ اس طرح دزدیدہ سی نظموں سے اُدھر اُدھر دیکھتی جا رہی تھیں جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ کوئی ان کے ہاتھوں سے وہ پر ملی اچک کر نہ لے جائے۔ ان کے بارے میں بھی مجھے کبھی کبھار کہنا تھا کہ شاید ان کی مظلومِ اُمالی محض لوگوں کی نظموں کو دھوکا دینے کی کوشش ہو۔ ان کی پر ملی میں بیروں کے پرانے خانہ دانی زیورات ہوں جن کی ہمارے آج کے دور میں لاکھوں... بلکہ شاید کروڑوں میں ہو۔

پھر مجھے خود ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ میرا ذہنی دولت کی طرف  
کیوں جا رہا تھا۔ دنیا میں ابھی کچھ لوگ تو ایسے باقی ہوں گے جن کی  
ظہریں دولت کے علاوہ کچھ چیزیں اہم ہوں گے۔ میں ممکن ہے  
پہلی ہی کی پہلی میں نوجوانی کے زمانے کی کچھ نشانیوں ہوں۔ عطر کی  
کوئی خالی شیشی ہو، دھندلائی ہوئی سی کوئی انگوٹھی ہو، پرانا سا کوئی  
دھال ہو۔ اور یہ چیزیں انہیں زمانے بھر کی دولت سے زیادہ  
عز ہوں۔

ہارٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس روز شفیق شاہ اور ثمنی کافی  
 ہنس رہے تھے۔ ایک لمبے کے لمبے میں سوچا کہ خون کر کے ان  
 سے کسی ایک کو لالوں کہ وہ میرے ہزاروں کے طور پر ساتھ  
 چہ دور نہ کر گھر آ کر آسے اور کسی معاملے میں مداخلت کی  
 بات دے دے تو گورنر نے خدوش قسم کے حالات میں اکثر شفیق  
 ملا اور بھی کھار کوئی اور اس قسم کے ہزاروں کے طور پر ڈھونڈ سبھا  
 فاجی اس وقت میں نے بغیر کسی خاص وجہ کے اس احتیاط کو  
 رک گیا تھا اور اکیلا ہی ان پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا تھا تاہم  
 یہ بات ضرور تھا۔ میں نے تمام راستے یہ خیال رکھا کہ میرا  
 نائب نہیں ہو رہا تھا؟ اس سلسلے میں اپنے اطمینان کے لیے میں  
 نے کچھ خاص پتھر بھی لگاے۔ لیکن راستے میں کئی ایسی جلی مڑیں بھی  
 آئی تھیں جن پر ٹھیک برائے نام تھا۔ آخر مجھے یقین ہو گیا کہ  
 بدانتظام نہیں کیا جا رہا تھا۔

واحد ہر روز نے انگریزوں پر سات بجے کا گھنٹہ بجا دیا تھا۔  
اس نے سات بجے ہی ڈیپارچر لاؤنج سے ذرا آگے اس کی بتائی  
جگہ پہنچ کر دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا۔ انگریزوں پر میری توقع  
تھی کہ زیادہ گھبراہٹ ہوگی۔ مگر وہ دودھ وار سے اٹھ کر پر رہے تھے  
اور کبھی بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ جلیلوں کی طرح فرش سے باہر  
نہیں تھے۔ اسپتال کے اسٹیشن 'بوائے کلینک' میں اسٹاپ۔  
انگریزوں کے ہر جگہ انسانوں کا یہ بیکراں جھوم دیکھ کر کسی کو حیرت ہوتی  
تھی۔ جن کا انگریزوں پر بس پر بھی اتنا اثر ہو سکیا تھا۔  
چند منٹ میں نے اسی بات پر حیران ہونے کے فضل میں مشغول  
ہو کر گزار دیے۔

سات بج گئے لیکن واپس لاؤنج کی طرف آنی دکھائی نہ دی۔  
گلاب اصل انتظار شروع ہو رہا تھا۔ مسافروں کا زیادہ جھوم  
فریل ہوئی لاؤنج میں ہی تھا۔ وہاں سے لوگ مختلف مراحل سے  
گزر رہے تھے اور ہر ایک کا رُخ وہاں سے لے کر تھا۔ لیڈوں کی صورت  
میں مجھے سامنے سے گزرتے جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ مجھے پر  
نور ہو چکا تھا۔ حرکت راستے بھی بنا رہا تھا۔ کچھ لوگ اس پر بھی  
اگر کھڑے ہو رہے تھے اور ہر قدم تیزی سے خود اپنے خود آگے  
بڑھ رہے تھے جیسے ان کے پیروں میں پتے لگے ہوں اور کوئی  
انہیں روک رہا ہو۔

انظارِ شایہ بھیجی کے لئے کوٹ کا باٹ ہو ناچہ میرے  
لے چکے ہو نہاد ہی میرا ہوا تھا۔ میں علق طے بانوں سے  
ڈر کر کھٹکے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھیجی میں رُحو اور حرکتِ جنوں یعنی  
کرنا تھا۔ دُعا کی بھی جائزہ لینے لگا تھا اور بھی اپنے سامنے سے  
گرتے ہوئے انوارِ دُعا اللہ کے چہلوں کے بارے میں دل ہی دل  
میں پانے لگے کی کوشش کرتا۔

ہم شیکسپیر کی اپنی زیوٹی پر جانے کے لیے کبھی ہسٹل ریلیوں پر اپنے

پچاس روپے دے کر جان چھڑانے کی کوشش کھل گئی۔ اس کے بجائے میں آپ کو لاہور اسلام آباد پٹنار یا کوئٹہ کی کسی تیار فلائٹ کا ٹکٹ دلوا کر بیچ کر جہاز میں بیٹھوں گا اور پھر آپ کو کھلی سے واپس آتا بھی مشکل ہو جائے گا۔

وہ خاموش واپس لاؤنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنے کار کے پارے میں اندازہ ظاہر ہو جانے کے باوجود وہ اس مہم میں جھپٹے ہوئے تھے۔ اور نہ ہی ان کے دقار اور محتاطی میں کوئی فرق تھا۔ وہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ کے قائل مہم ہوتے تھے۔

میں ایک بار پھر دوسرے چوں میں الجھ کر وقت گزارنے کی مہم کرنے لگا۔ حتیٰ کہ آٹھ بج گئے۔ واجدہ پرویز کے دسلے ہوئے وقت سے ایک گھنٹہ اوپر ہو گیا تھا اور اب وقت گزرا ہے۔ میں گزر رہا تھا۔ ایک ایک سینکڑے جیسے رہتا ہوا گزر رہا تھا البتہ میری رگوں میں لوہی گردش کافی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے ایک قسم توہین کا احساس ہوا تھا۔ کیا واجدہ پرویز نے مجھ سے کسی قسم ذائقہ کیا تھا؟ لیکن وہ ذائقہ کرنے والی عورت معلوم نہیں ہوئی تھی۔ خصوصاً کسی انجینی سے۔ تو پھر کیا اسے کوئی مجھ پر توجہ پڑی تھی؟ کیا وہ اپنی دوست کو کسی آف کرنے بھی نہیں آتی تھی؟

آخر میری آنکھ انتظار جواب دے گئی تاہم میں نے ان پورٹ کی حدود سے نکلنے سے پہلے خاموشا پھر کات کر انٹر چینل لہجہ لاؤنج میں جا کر بھی اچھی طرح ہر طرف کا جائزہ لیا لیکن مجھے واجدہ پرویز کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔ میرا فہم بکھ اور پھر مجھ میں نے ایک انٹرائن کے کاؤنٹر سے ٹیلی فون ڈائریکٹری باقی اس میں احمد پرویز کے گھر کے فون نمبر تلاش کر کے نوٹ کیے اور پھر ادا کر کے ڈائریکٹری واپس کرنے کے بعد لاؤنج کے ایک کمرے میں پہنچ کر جاپیشا جنس لوگوں کا شور شرابا ذرا کم پہنچ رہا تھا۔ اپنے موبائل فون پر میں نے نمبر طایا۔

دوسری طرف کسی مرنے فون ریمیور کیا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ احمد پرویز معلوم نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ سب کچھ کہہ کہات کر رہا تھا۔ میرا خون کو کہ اس وقت کھل رہا تھا میں نے نہایت شائستگی سے اس سے درخواست کی "سیکرم واجدہ پرویز سے بات کرایئے۔"

وہ شاید ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر بولا "تپ کی تعریف۔"

میرا دل چاہا کہ اپنا نام افضل چودری کے بجائے افضل چند جٹاؤں لیکن میں نے صرف افضل ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ اس نے شاید کہیں اور ملائی گئی تھی۔ چند لمحے بعد ایک نسوانی توازن ملنے لگی لیکن وہ واجدہ پرویز کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ میں نے تصدیق چاہی "آپ واجدہ پرویز بول رہی ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں ان کی سیکرٹری بول رہی ہوں۔ آپ کو کس

یہ سب مشاہدے اور یہ سب سوچیں وقت گزارنے کا بہانہ تھیں۔ اور وقت بہر حال گزرنا چاہا تھا۔ ساڑھے سات بج چکے تھے۔ میری نگہیں واجدہ پرویز کی تلاش سے بھی غافل نہیں ہوئی تھیں لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ اس سے فون پر بات کرتے وقت کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس جیسی وقت کی کیا بند جو نہیں دنیا میں کم ہی پائی جاتی تھیں لیکن اب وہ نہ جانے کہاں تھی۔ میں اپنے منہ کی لہر کو دبانے کے لیے اپنا ذہن اور دھڑکنا الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی اثنا میں ایک سفید پوش اور سفید ریش بڑے سماں اپنی طرف آئے دکھائی دیے۔ اچھے نکلے معزز آدمی معلوم ہو رہے تھے۔ سر کھٹ گئی سفید دہلی ٹوپی اور پیروں میں سلیم شادی تھی۔ کرتہ پاجامہ بھی سفید اور کھٹ لگا تھا۔ کندھے پر دو بال تھا۔ قریب آکر انہوں نے کچھ پتلی اور رازدارانہ سی آواز میں خالص مرلی جیسے میں السلام علیکم کہا۔ قد میں وہ مجھ سے کافی چھوٹے تھے۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ قدرے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔

مجھے بھی گھل گزرا کہ شاید وہ واجدہ کے ملازم ہوں اور اس کا کوئی پیغام لائے ہوں کہ وہ کہیں اپنے دودے کے مطابق نہیں پہنچ سکی۔ میں جلدی سے تجسس کے سے انداز میں ان کی طرف جھک گیا۔ وہ نہایت درست شین کاف کے ساتھ خطیبانہ لہجے لیکن پتلی آواز میں بولے "برخودار! میں کوئی پیشہ ور ہیکاری نہیں۔ میں خود ایک پھوجہ سونا تاجر ہوں لیکن اس وقت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔"

"کف میرے خدا! یہاں بھی! میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا اور سیدھا ہو گیا۔ میں نے بیزاری سے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ ذرا بھی غالت زدہ نظر نہیں آئے۔ اس کھیل کے پرانے کھلاڑی معلوم ہوتے تھے۔ پہلے بھی نہ جانے کسی کیسی پھونکنا سامنا کر چکے ہوں گے۔ تاہم انہوں نے اپنی داستان غم سنانے کا پروگرام لٹھی کر دیا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ سا کہ پہلے تو صرف سڑک کے کنارے یا کسی بازار میں کسی سیدھے شریف اور سفید پوش سے راہ گیر کو روک کر اس قسم کا کوئی فنکار کمائی سنا کر کرتا تھا کہ اسے قریبی شریا لگاؤں جانا تھا اور اس کی جیب کٹ گئی تھی اس لیے سخت مجبور کی حالت میں وہ حرف کرائے کا طالب تھا۔

لیکن کیا اب ان پورٹ پر سنانے کے لیے بھی کوئی کمائی تیار ہو گئی تھی؟ کیا بڑے سماں یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ لاہور اسلام آباد یا پشاور جا رہے تھے مگر ان کی جیب کٹ گئی اور اب میں انہیں ان کی منزل کا ٹکٹ لے دوں؟

تاہم بڑے سماں کی زبانی مجھ میں کوئی نازہ ایجاد شدہ کمائی سننے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے پتے پتے لیے میں کسا "قبلہ! یہ مت کیجیے گا کہ آپ کی داستان غم سننے کے بعد میں آپ کو سو

اس میں میرا کردار کیا تھا؟ کردار کچھ میں نہ آنے کی وجہ سے میں اسے صحیح طور پر ادا نہیں کر سکا۔ کیا یہ دو ٹاکن والے کسی کردار کے کا کردار تھا؟

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور جب وہ بولی تو اس کے لمحے میں قدرے تیزی تھی ”آپ شر کے ایک ممتاز اور معزز آدمی ہیں افضل صاحب! میں سوچ کر میں نے آپ کا فون دیکھ کر کیا تاہم مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو بھی نپلے جیتے کے تھوڑا کاس لوگوں کی طرح فون پر خواتین سے اتنی سیدھی باتیں کرنے کی بیماری لاحق ہے۔ اور بڑی حیرت کی بات ہے کہ یہ حرکت آپ اپنا نام بتا کر کرتے ہیں۔ ہمارے جیتے کے لوگوں کے پاس اس قسم کے ٹٹ پوٹیں مسائل کے لیے دقت کماں ہو تا ہے۔ مجھے تو شبہ ہو رہا ہے آپ کوئی اور صاحب ہیں۔ خواہ خواہ افضل صاحب کا نام استعمال کر رہے ہیں۔“

ابھی بات یہ تھی کہ موبائل فون تیار کرنے والے اپنے ٹیلی فون سیٹ کی بیماری میں اچھا اور مضبوط میٹرل استعمال کر رہے تھے ورنہ جتنی سختی سے اس وقت میں نے ٹیلی فون سیٹ کو پکڑ رکھا تھا، شاید وہ پٹک جاتا یا اس کے ٹھکے ہو جاتے۔ اس کا مقصد واضح ہو چکا تھا۔ وہ معصوم بن رہی تھی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں آواز پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔

میں نے اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ شاید کسی وجہ سے اس کا ازبم رٹ آنے کا پروگرام ملتی ہو گیا ہو لیکن اس وقت وہ کسی مجبوری کی وجہ سے اس کا اعتراف نہ کر رہی ہو۔ اگر وہ پہلے ہی اپنے گھر سے ہی فون کر رہی تھی تو اس وقت اس کا انہماک بنا کچھ میں آتا تھا۔ اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کے گھر کی ٹیلی فون لائنیں قابلِ اعتماد نہیں تھیں۔ شاید میرا یوں کر کہنا کچھ مناسب نہیں تھا۔

میں نے ایک دم ہڑی بدلتے ہوئے ذرا معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ”میرا خیال ہے مجھے کوئی غلطی تھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں نے آپ سے اس قسم کی گفتگو کی۔ باوجود شایہ کسی نے مجھ سے مذاق کیا تھا۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش تو ضرور کروں گا کہ اصل میں معاملہ کیا ہے لیکن فی الحال بات یہیں ختم کرتے ہیں۔“

میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دے لیا۔ فون بند کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میرا دایم ٹپے جانا ہی سہی تھا چنانچہ میں نے پارکنگ لائٹ کا سرخ کلبہ چھوڑ دیا۔ پلے کے بعد ہی میری کھوپڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی ہر ماں بلی تھی۔ زندگی میں ان دنوں پہلے ہی ابھرتی اور مضمون کی کچھ کی نہیں تھی۔ لیکن یہ واقعہ پروردگار ایک اور معاملے کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

جب میں ہوئی کچھ کا گڑی سے آؤ کر اندر جا رہا تھا تو اچانک

جلد میں ان سے بات کرنی ہے؟ عورت نے جانا چاہا۔

میں نے اختیار ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر کہہ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک سادگی پسند اور قدرے گھریلو عورت نظر آتی تھی لیکن مجھے شاید یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ وہ ہر ماں ایک بہت بات مند آدمی کی بیوی تھی۔ اس گھر اس کی ایک عدد بڑی بھی بچی جاتی تھی۔ کوئی عید نہیں تھا کہ وہ دولت مند بیگمات کی کسی نمائندگی کی تھی۔ عظیم یا کلب کی عمدہ اور بھی ہو لیکن میں نے یہی نہیں اس کا تذکرہ نہیں کرنا چاہا۔

میں نے اپنے منہ پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”مطلب فی الحال تو کوئی نہیں ہے لیکن آپ ان سے بات تو کر دیجئے۔“

”جی۔ کیا مطلب؟“ سیکرٹری قدرے تیزی سے بولی۔

مجھے انڈیش محسوس ہوا کہ وہ اسے محسوس کوئی ہے ہودہ اور نعل کمال کچھ کر فون بند نہ کرے اس لیے میں نے جلدی سے کہا ”صاف کیجئے گا۔۔۔ میں کسی اور خیال میں کہہ گیا تھا۔ پھر میں نے یہ طور پر اپنا تعارف کرایا اور کہا ”ان سے کہئے مجھے ان سے ان کی پہلی سہ ماہی سیر کے قتل کے سلسلے میں کچھ بات کرنی ہے۔“

”ایک منٹ ہولڈ کیجئے۔“ سیکرٹری کا لہجہ اب نارمل ہو گیا اور دوسری سی میرے کانوں میں دوسری نسواں کی آواز ابھری۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ یقیناً واقعہ پروردگار کی آواز تھی۔ گو کہ اس آواز میں کتنی بھی تیزی تھی لیکن اس میں شیرینی اور لہجہ بھی نہیں تھا۔ ایک بار سننے کے بعد دوبارہ سننے پر اسے آسانی سے پہچاننا سکتا تھا۔ تمام آواز شام چند گھنٹے پہلے اس نے جس طرح مجھ سے بات کی تھی اب اندازاً اس سے مختلف تھا۔

”جی۔ فرمائیے افضل صاحب؟“ اس کا لہجہ نہایت ہی رسمی تھا۔

”کیا آپ از پورٹ کا راستہ بھول گئی ہیں؟ میں نے اپنی بات میں اپنے لیے کئی محاسبات میں اپنے تمام تر فیسے کا زبردستی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔“

”میرا مطلب ہے کہ از پورٹ تو اپنی جگہ قائم ہے۔ اس کا پتہ تو ابھی میں بھلا اس کے باوجود آپ وہاں نہیں پہنچ سکتے۔“ اس کی مجبوری آن پڑی تھی؟ میں نے اپنے آپ کو دانت بکھڑے باز رکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے اب بھی کچھ نہیں کیا۔ افضل صاحب! وہ اس وقت کیسے میں بولی ”آخر آپ نے کس لیے فون کیا ہے؟“

میں نے یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ یہ کس قسم کا ڈراما ہے اس کا اسکرپٹ کس نے لکھا تھا۔ دانت کا رکن تھا اور

میرے عقل نے قہاڑی کھائی۔ ایک ٹاکنہ ایک بڑا خیال ایک  
نا اندیش بھلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لگا۔ کبیں ایسا تو  
نہیں کہ میں معاملے کے اصل رخ کی طرف نہ دیکھ سکوں بلکہ یہ  
بھی تو ممکن تھا کہ بے چارے واجدہ پھرنے والے واقعی مجھے نہ ڈنکے  
ہوں۔ کسی اور نے ہی اس کی آواز نہ کر یہ ڈرا لیا ہو۔ لیکن خدہ  
کیا ہو سکتا تھا؟

کیا کوئی کافی دیر کے لیے مجھے ہوٹل سے ہٹانا چاہتا تھا؟ کیوں  
...؟ جب کہ اس دوران میں شفیع شاہ اور نفی بھی ہوٹل میں موجود  
نہیں تھے۔ صرف راجہ ہوٹل میں تھا۔ مگر کئی تھی!

یہ خیال ذہن میں آئے ہی جیسے کوئی تیر سائل میں اتر گیا۔  
ایک طویل عرصے سے میں یہ سمجھتا آیا تھا کہ شاید میں خوف سے  
نا آشنا ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی محنت اور شعوری کوشش سے خود کو  
اس بات کا عادی بنایا تھا کہ کسی بھی معاملے میں خوف محسوس کرنا  
چھوڑ دوں لیکن اب یہ احساس ہوا کہ یہ محسوس میری خوش فہمی تھی  
کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس وقت خوف  
اچانک ایک سولہ کی طرح میرے جسم میں اتر آیا تھا لیکن میں نے  
کوشش کی کہ اس خوف سے مفلوج یا کمزور ہونے کے بجائے ایک  
نئی طاقت ایک نئی توانائی حاصل کر لوں۔

دوسرے ہی لمحے میں گولے کی طرح اپنے آفس کی طرف  
دوڑا۔ یہ بھی غیبت تھا کہ میں آمدورفت کے لیے زیادہ تر شخصی  
راستہ استعمال کرتا تھا ورنہ ٹرافک لوگ تو شاید اس بات پر حیران  
ہوتے کہ بظاہر اچھا بھلا معزز نظر آنے والے ایک شخص کو یہ کس  
قسم کا درد پڑا کہ آرام سے چلے چلے پٹاک آدھی طرفان کی طرح  
دوڑ پڑا جب کہ اس کے پیچھے پیچھے ڈاکو یا پولیس بھی نظر نہیں  
آئی۔ اگر جاننے والے اور ہوٹل کے محلے کے لوگ دیکھتے تو حیرت  
سے مکی سوچنے کوں تو افضل صاحب اپنے ہوٹل کو ہر قسم کے  
تھامسے سے محفوظ رکھنے کے لیے سرتوز کوشش کرتے ہیں لیکن اس  
وقت خود تماشا پیش کر رہے ہیں۔

اپنے آفس میں جانے کے بجائے میں نے پہلے امیر کے کمرے  
پر ہی رک کر دوا ڈالے۔ جہاں تکے ہوئے وحشت زدہ لمحے میں  
پوچھا "راجہ کہاں ہے؟" یہ سوال میں نے پہلے ہی کیا اور یہ بعد  
میں دیکھا کہ امیر کمرے میں موجود بھی تھی کہ نہیں؟ شاید اتفاق  
سے یا کسی مصونیت کی وجہ سے وہ موجود تھی۔ وہ فون پر کسی سے  
بات کر رہی تھی۔ سر اٹھا کر اڑتھ ہیں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے  
حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی "تم؟"

اس نے میرا سوال ہی نہیں سنا تھا۔ اس وقت مجھے شاید پہلی  
بار اس پر غصہ آیا۔ دل چاہا کہ وہی ریمو اس کے ہاتھ سے لے کر  
اس کی ٹھونڈی پ دے مگر "راجہ کہاں ہے؟" میں نے گھٹی  
گھٹی آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ مجھے پھونٹی مولتی ہے بنیاد باتوں پر  
اور بلاوجہ کبھی غصہ نہیں آتا تھا لیکن ترچ کا دن شاید کچھ عطف

تھا۔ اس وقت خوف میرے ذہن میں ایک گولے کی سی صورت  
اختیار کر چکا تھا اور میں یہ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا کہ میں  
راجہ کو امیر کی تحویل میں دے کر نہیں گیا تھا ورنہ ہی میں اس  
اسے بدانت کی تھی کہ وہ راجہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھے  
"مجھے تو معلوم نہیں سر! شاید۔ اپنے کمرے میں ہوں کہ۔"  
اس نے سسے سے سسے میرے جواب دیا۔ وہ عجیب سی تھکنے  
میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے میرے چہرے پر کوئی عجیب  
تبدیلی نظر آ رہی تھی۔

"تم بہت ہی گھٹی لڑکی ہو۔" میں نے اسے بھڑکایا اور  
لاڈلج کی طرف دوڑا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس بھی ہو گیا کہ  
اسے بلاوجہ ہی بھڑکائی تھی لیکن اب آسف کے اکابر  
مضرت کا وقت نہیں تھا۔ میں نے لفٹ کے انتظار میں بھی بیٹھنے  
شائع نہیں کیے حالانکہ ایک لفٹ مجھے ہی آ رہی تھی اور بیٹھنے  
پر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے نیچے چھوٹے رکٹے اور وہاں دوا  
ہونے سے پہلے میں راجہ کے کمرے تک پہنچ جاؤں گا گو کہ اس  
کمرے میں اس وقت بھی کوئی نہ تھا۔

میں ایک ساتھ چار چار بیڑیاں پھلانگتا چلا گیا۔ اس وقت  
اگر اسٹاپ واقعہ ڈیو کے ذریعے میرے اس مختصر سفر کا دوا نام  
ہونے کا کوئی بندوبست ہوتا تو شاید پتا چلتا کہ میں نے کمرے کون  
میں ساتویں منزل پر پہنچے کا کوئی دیکھا نہ قائم کیا تھا۔ مجھے اپنی جگہ  
اور اصحابی سنبھولی کے بارے میں بیش بڑا اطمینان رہا تھا کہ  
حالات نے اکثر آزمائشیں سرطوں میں مجھے کافی حد تک ایک نیک  
مصلحتی آدمی ثابت کیا تھا۔ اس کے باوجود اس دوا میں جس راز  
سے ساتویں منزل پر پہنچا اس سے میرا بھی سرگرم کیا۔

"راجہ..." میں نے اس کے کمرے کے دوا ڈالنے  
دیکھ دینے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں پکارا۔ میں نے یہ کئی  
اپنی آواز پر قابو رکھا تھا ورنہ شاید یہ نام ایک چیخ ایک پکار کی  
صورت میں میرے حلق سے برآمد ہوتا۔ اندر سے کھلی جواب نہ  
آئی۔ میں نے تاپ کھائی۔ دوا دان منتقل تھا۔

میں نے پہلے سے ذرا بلند آواز میں پکارا اور دھمکی دہانی  
بار بھی کوئی جواب نہ آیا۔ کسی بے عنوان اندیشے سے مجھے  
دھمکی نہیں بہت تیز ہو چکی تھی حالانکہ میں اپنے آپ کو بھلا  
بھی کوشش کر رہا تھا کہ شاید راجہ اپنے کمرے سے باہر آئے  
مرضی سے کہیں گئی ہو۔ اور اگر اندر موجود ہو تب بھی ہاتھ  
آنے کی کوئی وجوہات ہو سکتی تھی لیکن دل میں نہ بنائے گئے  
مابینہ کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا تھا کہ کچھ ہو چکا ہے۔  
سیدھا طریقہ تو یہ تھا کہ میں نیچے رہے پشیمانی فون سے اس  
کے کمرے کی ڈیلمکٹ چابی منگواتا اور آرام سے دوا دان کھلا کر  
اندر موجود حال کا جائزہ لیتا لیکن بعض اوقات بنگالی کی طرح  
حال میں انسان پر کچھ ایسا خفا سوار ہوتا ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے

تھا۔ اس کے وجود سے افسی ہوئی، جیسی جیسی ی ناگی انہر مک  
پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ بولنے میں پہل اسی نے کی "تم  
اپنے سینک اور دم کلب بھول آئے؟ اور ہاں۔ تمہیں تو چادریں  
ہاتھ یوں سے دوڑتے ہوئے تھنوں سے شوں شوں کی توازیں  
لٹکتے ہوئے آنا چاہیے تھا۔ تم صرف وہ ٹانگوں پر کیسے چلے آ رہے  
ہو؟"

اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس وقت کوئی مزاحیہ بات سننے  
اس سے لطف اندوز ہونے یا اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں  
نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت میرے دل کی  
دھڑکنیں کیسی بے ترتیب تھیں اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوا تھا۔ میں  
نے ایک دم ہی آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ بڑی طرح  
پچھلے اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

جب وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی تو اس کا چوڑی طرح  
تھمنا رہا تھا لیکن اس پر پانی کی پوندیں بھی ٹپک رہی تھیں۔ شط  
و ختم کی ششیاں کا صحیح معلوم اس وقت میری سمجھ میں آیا۔ ان  
دونوں چیزوں کو بکباد دیکھنا واقعی ایک عجیب تجربہ تھا۔  
"کیا بکواس تھی؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھنے کی  
کوشش کرتے ہوئے بڑی طحاس سے پوچھا۔

اس نے میرے دونوں ہاتھ جھٹک دیے اور گویا بھر کسی اندیشے  
کے تحت ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "میں کی خیریت پوچھنے کے  
لیے کیا تم نے اب یہ خاطر یہذا کا اختیار کیا ہے؟ میں محسوس کر رہی  
ہوں کہ جب سے میں سے تم سے شادی کے لیے ہانی بھری ہے تم  
کچھ زیادہ ہی فری ہونے لگے ہو۔"

پھر وہ ایک کرسی سے ایک تو لیا، اٹھا کر اپنے بالوں پر لپیٹنے ہوئے  
بولی "اگر تم صرف ایک منٹ اور مبر کر لیتے تو میں ذرا اطمینان سے  
داش دوم سے باہر آئی۔ میں نے جی کر کہا تھا کہ ذرا مبر کو  
ابھی دروازہ کھولتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری توازنائی نہیں دی۔ شاید شاور ٹھکا ہو گا۔  
لیکن حیرت ہے مجھے پانی گرنے کی بھی توازنائی نہیں دی۔" میں  
نے اب صحیح معنی میں اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔

وہ بات کانٹے ہوئے بولی مگر یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں  
تو جب سے یہاں آئی ہوں جہی سے محسوس کر رہی ہوں کہ  
تمہارے حواس جواب دیتے جا رہے ہیں۔ کبھی بھی تو مجھے سوچ کر  
تشویش ہونے لگتی ہے کہ آخر تمہارا بے کا کیا؟

"اب تو جو کچھ بھی بنے گا اس کی تو می ڈتے دار تم ہو گی۔"  
میں نے جواب دیا اور ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا "یہ تازہ میاں کوئی  
گزیدہ تو نہیں ہوئی تھی؟ کسی نے تمہارے کمرے میں گھسنے کی  
کوشش تو نہیں کی تھی؟"

"تمہارے علاوہ تو کسی نے ایسی کوشش نہیں کی۔" اس نے

سپلے سے ہنگامی انداز میں منتنا فوادہ گج ہے اور اس میں کم وقت  
صرف ہو گا۔ میں نے بھی اس وقت وہی طریقہ اختیار کیا جس میں  
چند سینکڑے بھی انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یعنی میں پیچھے  
بٹ کر راہروی کی دوسری دوار تک پہنچا۔ میرا ارادہ دوسری قوت  
سے دروازے کو کھدے سے کھلنے کا تھا۔ اشارت کے لیے کہ  
کہ جگہ کم تھی اور دروازہ معیاری و مضبوط تھا اس کے باوجود مجھے  
ایسے بھی کہ دو تین گھنٹوں میں کام ہی جاتے گا۔

میری پہلی گھڑی کچھ زیادہ کامیاب ہوئی۔ یعنی میں دروازے  
سے گزرتا چلا گیا۔ ایک لمبے کے لیے تو مجھے حیرت بھی ہوئی کہ کیا  
دروازہ اتنا ہلکا اور غیر مہیا سا ہو گیا تھا کہ میری گھر سے ہوا کے  
بھرنے کی طرح اڑتا چلا گیا لیکن فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا کہ میں  
اسی لمبے جب میری زوردار گھر دروازے پر پڑنے والی تھی دروازہ  
خود بخود کھل گیا اور میں کسی اے سے پیسنے کی طرح گزرتا چلا گیا تھا۔  
میں نے یہ گھر رسید کے لیے اتنی قوت جمع کی تھی کہ میں  
مکن تھا میں یو جی بکولے کی طرح گزرتا ہوا کمرے کے دوسری  
طرف بڑی کمزری کے پیٹھے کو توڑتا ہوا باہر جا کر آتا ہوا کہ میں نے پتھر  
بلر کی ایک قلم میں دیکھا تھا لیکن قلموں میں تو جگہ کامیابی حقیقی  
کرنے کے لیے ایسے واقعات کھڑے جاتے ہیں اس لیے ان کا  
انجام بخیر ہوتا ہے یعنی بہتر کمزری کا پیشہ توڑتا ہوا سو تنگ پول یا  
کسی اور نرم چیز پر جا گرتا ہے جس سے اس کا طیلہ خراب ہونے  
کے سوا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن میں اگر کمزری سے  
گزر جاتا تو میری زندگی کا یہ سین کامیابی سے نریختی میں تبدیل  
ہو جاتا کیونکہ میں ہوش کے کپاؤ میں جا کر گرتا جس کا فرش  
ٹکڑے ٹکڑے تھا۔

ساتویں منزل سے تو خیر سو تنگ پول میں گر کر بھی انسان کا  
طیلہ بن سکتا ہے لیکن ٹکڑے کے فرش پر گرنے کے بعد تو بے  
چارے افضل چودری کی باقیات کو بچانا بھی مشکل ہوتا لیکن میں  
بہر حال کمزری سے دو چار قدم پہلے ہی اپنے آپ کو بریک لگانے میں  
کامیاب ہو گیا۔ پھر میں بہت آہستگی سے گھبرا۔

میرے آگے تھی سے گھوننے کی وجہ یہ تھی کہ ابھی اندیشوں نے  
میرا دھیما نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں پلٹ کر دیکھوں گا تو  
کوئی خبیث صورت قسم کا محسوس کن ہاتھ میں پکڑے میرا نشانہ لے  
کر اڑا ہو گا۔ اچھا ہوا کہ میں نے اس سلسلے میں حفظ اہتمام کے طور پر  
بکھ دیکھے ہالے بغیر گھومتے گھومتے کوئی کارروائی نہیں کرائی۔  
کیونکہ جب میں پلٹا تو دروازے کے صتب میں راحیلہ کمزری تھی جو  
آہستگی سے دروازہ بند کر رہی تھی لیکن حیرت سے میری طرف دیکھ  
رہی تھی۔

ایک لمبے کے لیے میں کچھ بھی نہ بولی سدا اور بے اختیار ایک  
بہت سی طویل سانس لے کر رہ گیا۔ راحیلہ گھائی رنگ کے ایک  
نفسے ہاتھ مدب میں تھی اور اس کے بالوں سے ابھی پانی ٹپک رہا



جواب دیا "وہ ہے۔ یہ ہمیں سوچنی پڑی تھی۔ کیا تم نے کوئی غلط  
سلوک نہ کیا تھا جس کے اثرات بدداشت نہیں ہو رہے تھے۔ یا  
کسی قسم کا کوئی درد و غم نہ تھا؟"

"آج کل واقعی نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔" میں نے لٹھری  
سانس لینے ہوئے کہا "کسی کے لیے پریشان ہونے یا اس کے بارے  
میں فکر مند ہو کر بھاگنے کا یہ سلسلہ ہے آج کل۔ اس طرح بے  
عزتی کرانی پڑتی ہے۔"

"وہی تو میں جانتا چاہ رہی ہوں کہ آخر اچانک میرے بارے  
میں تشویش کیوں ہو گئی تھی؟"

"شاید رسول بعد آج میری مظلوم جس نے میری غلط رہنمائی  
کی۔ یا پھر شاید میں کسی دباہے کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے اچانک کچھ  
ایسا دکھ تھا جیسے ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ یہ بالکل ناگاہک اور انجلی لڑکی ہوں۔  
میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی؟"

"بے خبری میں بعض اوقات اچھے بھلے طرہ خاں بھی مارے  
جاتے ہیں۔"

"تم تو واحد پروردگار سے ملنے گئے تھے۔" اچانک وہ آنکھیں  
سکھڑے ہوئے بولی "ہمیں تو وہاں صرف اپنی مظلوم" جیوں کو

بیدار رکھنا تھا جیسے تھا۔ یہ مظلوم جس اچانک کیوں بیدار ہو گئی؟  
مظلوم نہیں۔" میں نے بے بسی سے کندھے اچکائے "شاید

اس لیے کہ بہت دیر تک وہاں کسی مضطرب آنکھ کی طرح انتظار کرنے  
کے باوجود راجدہ نہیں آئی۔ اور پھر میں نے اسے فون کیا تو وہ

نہایت صفائی سے کمرنگی کہ اس نے تو سر سے... مجھے کبھی فون  
ی نہیں کیا۔"

"جنت خوب۔ بہت خوب۔" اس نے بے توازن تکی بجائی  
اور میرے مقابلہ دو سرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اس کا مطلب ہے

کہ وہ ایسی بھی سیدھی سادی شریف اور گھریلو عورت نہیں جیسی  
تم اسے ثابت کرنے پر تے ہوئے تھے۔ خاصا اچھی فضا کا مظلوم

ہوتی ہے۔"

"نیکی اگال یہ پکیر میری کچھ میں نہیں کیا اس لیے کوئی رائے  
دینے سے پرہیز کروں گا۔"

"دھرو۔ یہ اتنے پرہیزی کب سے ہو گئے تم؟" اس نے  
استہزاء سے لہجے میں کہا۔

"اب پرہیزی بن جانے میں ہی عافیت ہے۔ ذرا سی بد پرہیزی  
کی کوشش کرنا تو تم بے چین بکری کی طرح الجھانے لگتی ہو۔

گھونٹے چلانے لگتی ہو۔"

"یاد کو کیس سے کیس لے جانے میں تمہارا جواب  
نہیں۔" اس نے صوفے سے مجھے گھورا۔

"تم یہ بتاؤ کہ ہمیں یہ اچانک فصل قربانے کی کیا سوچ  
تھی؟ شام صبح میں نے ہمیں کچھ بلایا تو تم اچھی خاصی صاف

ستھری اور تانہ دم نھر آری تھیں۔ اگر اس وقت ہمیں دانش وادب  
سے برآمد ہونے میں مدد تھیں سیکھ کر بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید روانہ  
یا اس کا تلافی نہ پکا ہوتا اور اس طور پر اچھا خاصا تماشاک  
جاتا۔"

"میںیں تم جیسے احمق بنائے جاتے ہیں وہاں تاشے تو بہر حال  
لگے ہی رہتے ہیں۔" وہ منہ ہانک کر بولی "اب میں اپنے نمائے اور سو  
دھونے کا شیلڈول باقاعدہ اور باضابطہ طور پر تیار کر کے تم سے اس کی  
منگوری۔ حاصل کر کے تو اس پر عمل نہیں کر سکتی۔ میں تو اپنی  
مصروفیات اور موسم کی مناسبت سے دن میں دو دو تین تین مرتبہ  
نہا لیتی ہوں۔"

"اچھا۔؟" میں نے بغیر اس کی طرف دیکھا "تمہاری  
مصروفیات کچھ مشکوک قسم کی مظلوم ہوتی ہیں۔ لگتا ہے مجھے  
سرے سے تمہارے بارے میں کچھ تحقیق اور تحقیقات کرنا چاہی  
گی۔"

"کیوں اس مت کو اور اب فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے  
تیار ہونا ہے۔" وہ کچھ کھپکھپائی۔

"کس سے ملنے کے لیے؟" میں نے فوراً پوچھا۔  
"ہماری ایسی قسمت کہاں کہ کسی ڈسک کے آوی سے ملے

جاسکیں۔" وہ لٹھری سانس لے کر بولی "ہماری قسمت میں تو تم  
جیسا گناہ مزی لکھا ہوا ہے۔ کچھ پکیر کر دیکھو سانسے آجاتا ہے۔"

"شکر کرو یہ گناہ مزی بوقت تمہارے ہاتھ لگ گیا۔ اگر یہ  
نہیں بھی بعد بازار کی کچھ نرس سل و فیرو میں نکل جاتا تو ہاتھ لگتی نا

جاتی۔" میں نے احسان نہانے والے انداز میں کہا۔  
"ہاں۔ اس صورت میں تو بات ہاتھ لگنے پر ہی ٹل جاتی۔

لیکن اب تو کس زندگی دیا اداوں سے سرگودھڑے ی نہ کر رہے۔"  
اس نے ایک اور لٹھری سانس لی۔

"اے ہونے والے مجازی خدا کو اتنا بھی ڈی گریڈ نہیں کیا  
جاتا۔ اس کی اتنا بھی بھروسہ ہو سکتی ہے۔" میں نے گویا خود اذیت

وہ اتھ کر میرے سامنے آنکھیں ہولٹی اور دھکیلیہ انداز میں  
چنگی بجاتے ہوئے بولی "اس سے پہلے کہ ادا کے ساتھ ساتھ

تمہاری ٹانگ یا کان بھی بھروسہ ہو جائیں۔ تم فوراً یہاں سے  
رخصت ہو جاؤ۔"

"آخر ہمیں ایسی کیا تباہی کرنی ہے؟ تم میرے سامنے بھی  
تیار ہو سکتی ہو۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میں کون سا گناہ

تجاریوں میں مداخلت کروں گا یا کسی چیز پر اعتراض کروں گا۔ میں  
نے سادگی سے کہا۔

اس کا گونا گونا قطعی غیر متوقع طور پر حرکت میں آیا۔ شاید ہوا  
جزا اس کا شانہ تھا لیکن میں نہایت صفائی سے بوقت صوفے

کچھ کھل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا گونا گونا سرے کی پشت  
گاہ پر پڑا اور خود میرے اوپر گرے کرتے لگی۔ نہایت پھلتی سے

ایک طرح خوب کر ایک طرف کو کھینچے۔ میں نہایت صابرانہ  
 رہی مگر سانس لینے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 "آپ تم فوراً میل سے چلے جائے۔" وہ صبر سے بولی۔  
 "نیک ہے۔ میں جا رہا ہوں قدر ناشائستہ عورت! ایک  
 نئے گاہک تم میرے پیچھے پیچھے ڈم پلائی پھوکی۔ اور  
 یہ ہم بھی کسی سے مستعار نہیں پڑے کی۔ مگر میں تمہیں ذرا  
 لکھائیں نہیں ڈالوں گا۔ خدا حافظ۔" میں نے بارب لمبے میں  
 اور دُور کا راند اسی قدم اٹھا کر دوازے کی طرف چل دیا۔  
 دوازے کے قریب پہنچ کر میں نے ہلٹ کر ذرا آہستگی سے کہا۔  
 "میں نے تمہیں ہرگز نہیں دیکھا تھا۔"  
 اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہونٹ پیچھے کھڑی مجھے گھورتی  
 رہی۔ میں باہر آیا اور اس بار نہایت مبہوس کن سے لٹ کے  
 بیٹھے پتلا۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں نے ایک بار  
 ابرکے کمرے میں بھاٹکا۔ وہ بیڑ پر ساکت بیٹھی غلامی گھورتی  
 رہی۔  
 "موسیٰ امیر ذرا!" میں نے گفتگو کیے میں کہا "مجھے ذرا ایک  
 بات گزیر کا اندازہ محسوس ہوا تھا اس لیے کچھ تینش میں تھا۔  
 یہ ٹھیک ہے۔"  
 "اے خدا! چھینکے گا!" اس نے مگر سانس لے کر کہا اور  
 بکے کمرے پر جیسے دو تھوٹ آئی۔  
 "میں میں سکون سے گھر جا سکوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ہاتھ پائی سکر اٹھ کے ساتھ اسے شب بیکر کا اور اپنے آفس  
 یا انجیل۔ اب جب کہ میں اپنے آپ کو پر سکون محسوس کر رہا تھا  
 اندر آرام سے تنہائی میں بیٹھ کر سوچ بچار کرنا چاہتا تھا۔  
 یہی سوچ بچار وہ وقت سے زندگی کے دیگر معمولات کے  
 ساتھ وہ سرے دن تک جاری رہی۔ دوسرے روز دھیرے کے  
 یہ بھی میرا ذہن کچھ اسی قسم کے مسائل میں الجھا ہوا تھا جن کا  
 طاق کا کاروبار زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس وقت  
 انہیں اپنے دفتر کی کام نہ تھا۔ اچانک امیر دوازہ کھول کر  
 نکلی اور میرے قریب پہنچ کر رازدارانہ انداز میں بولی "سرا  
 یہ صبح پوٹ عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔ جیسی میں آئی ہے۔  
 اس نے باہر اسے اتارے بھی دیکھا تھا۔ میں اتفاق سے اس وقت  
 وہاں سے آ رہی تھی۔"  
 کچھ اشارہ ہو گیا میں جیسی میں تھا آئے والی برقع پوش  
 اتفاق کو اسی وقت تک ذرا عجیب سی نظروں سے دیکھا جاتا ہے  
 تاکہ ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل نہ ہو جائیں۔  
 "میں نے یہ کہہ کر ان کی طرف جانے کی کوشش نہیں  
 کی۔ میں نہیں بتاؤں گی۔" میں نے دریافت کیا۔  
 "میں نہیں سزاؤں گا کہتا ہے کہ ایک بہت اہم کام مجھے سلیط میں  
 لے کے پاس آئی ہے اور آپ اسے جانتے ہیں۔ وہ تو میرے

ساتنے بھی غائب چہرے سے نہیں ہٹا رہی۔" امیر نے بتایا۔  
 میں نے ذہن پر زور دیا۔ میں کسی برقع پوش خاتون سے واقف  
 نہیں تھا۔ میں نے اسی کا پوچھا مگر وہی معلوم ہوئی ہے؟  
 "جی سرا بظاہر تو عورت ہی معلوم ہوئی ہے۔" امیر نے  
 مسکراتے ہوئے جواب دیا "دیے اچھے ذیل ڈول کی مالک ہے۔"  
 "سلیط ہے۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا "مگر برقع کے  
 اندر سے کوئی کٹا مودا پر نہ ہو گیا تو میری بد قسمتی ہوگی۔ میرے حق  
 میں دعا ہے خیر کرے۔"  
 "سرا میں ممکن ہے یہ اس بے چارے کی بد قسمتی ہو۔" امیر  
 مسکراتے ہوئے بولی اور رخصت ہو گئی۔ میں نے اپنی جیب میں  
 موجود مشین ہاتھ کو چھپتایا اور بظاہر بے پروائی سے لیکن  
 درحقیقت پوری طرح مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ چند لمبے بعد ایک ٹیس  
 قسم کے برقع میں جو عورت کمرے میں داخل ہوئی وہ خاص لمبی  
 ڈنگی اور حجاب قسم کی دکھائی دے رہی تھی۔ عورت اگر لمبی ڈنگی  
 اور ذرا نمایاں ذیل ڈول کی ہوتی نہ جانتے کیوں برقع میں اور بھی  
 زیادہ جسم دکھائی دیتی ہے۔ تاہم اس عورت کی جسامت اور برقع  
 پوشی کے باوجود اس کے خد و خال سے نہایت نمایاں تھی۔ مجھے  
 اس کے بارے میں چند سینکڑے بھی جنس اور تشویش میں جھلا نہیں  
 رہتا پڑا کیونکہ اس نے اندر آتے ہی غائب ہو گیا۔  
 وہ دابہ پر پڑی تھی!  
 میں تو اس عورت میں خوب صورتی کے تمام لوازمات موجود  
 تھے۔ آنکھیں خوب صورت تھیں، نعرش جیسے تھے، رنگ گورا تھا  
 اور لمبی ڈنگی ہونے کے باوجود وہ بے ذول نہیں تھی لیکن نہ جانے  
 کیوں وہ خوب صورت نہیں لگتی تھی۔ بظاہر اس میں کوئی کی نظر  
 نہیں آتی تھی تاہم اس وقت برقع میں وہ خوب صورت لگ رہی  
 تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ وہ میری میز کے سامنے آئی۔ میں  
 پلک جھپکے بغیر چند لمبے اس کی طرف نہکنا رہا۔  
 وہ کچھ مضطرب معلوم ہوئی تھی اور اس دوران میں شاید اندر  
 ہی اندر اپنے اس اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔  
 اچانک وہ بلا تہدید بولی "میں چاہتی ہوں کہ جتنی دیر بھی میں اس  
 کمرے میں موجود رہوں اس دوران میں نہ تو کوئی اندر آئے اور نہ  
 ہی آپ۔ کوئی فون وغیرہ انیڈ کر سں تاکہ ایک دو وقت ضائع نہ ہو۔  
 دوسرے بجے کوئی یہاں بیٹھنے نہ دیکھے۔ ممکن ہے آپ کے ہوٹل  
 کے اسٹاف میں سے کوئی مجھے پہچانتا ہو۔"  
 "میں کوشش کھول گا کہ آپ کی ان خواہشات کی تکمیل کا  
 انتظام ہو سکے بشرطیکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ آپ نے کس سلیط  
 میں مجھے شرف ملاقات بخشے گا کیلئے کیا ہے۔" میں کوشش کے  
 باوجود اپنے لیے کاٹھا پین نہ چھپا سکا تاہم میں نے اسے بیٹھنے کا  
 اشارہ ضرور کر دیا۔  
 وہ بیٹھتے ہوئے بولی "مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے عداوت ہیں

کے لیکن میں مجبور تھی اس لیے آپ کو وقت دے کر اور ملاقات ملے کرنے کے بعد دو گلی نہیں آسکتی۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "چلو بروہار افضل! ہم از کم ایک معائنہ مل ہو اگر فون خود انہی موصوف نے کیا تھا۔"

زبان سے میں نے کہا "وہہ کہہ کے آپ کا نہ آنا اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا بعد میں آپ کا انجان بن جانا۔"

"وہ میری مجبوری تھی۔" وہ اپنے پرس سے ایک نشوونما نکال کر چٹائی سے پسند پوچھتے ہوئے بولی "میرے شوہر اس وقت میرے پاس موجود تھے اور ان کے سامنے میں ہرگز یہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی کہ میں نے آپ کو فون کر کے ملنے کی کوشش کی تھی۔ جی بات تو یہ ہے کہ آپ کے فون نے مجھے اچھی خاصی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اپنے شوہر کے سامنے بات بتانا مشکل ہو گیا تھا کہ میرے لیے آپ کا فون کیوں آیا تھا۔ مجھے بالکل انجان بننا پڑا کہ شاید آپ نے کسی غلط فہمی کی بنا پر مجھے فون کر ڈالا ہے۔ شکر ہے وہ کچھ مطمئن ہو گئے تھے۔"

اس کی آنکھوں اور چہرے سے اس کی ذہنی کشیدگی اور اوصالی ناز کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پر کسی بھی قسم کی خفگی کا اظہار کرنے کے بجائے اسے بولنے کا موقع دینا بہتر تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے سلسلہ کلام جوڑا "دراصل میری اس دوست کا اس لحاظ سے جانے کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا۔ اس بات کی اطلاع دینے کے لیے جب اس کا فون آیا، اس وقت تک خلاف توقع میرے شوہر مگر آپ کے خیمے انہوں نے بھی سن لیا تھا کہ میری دوست کا پروگرام کینسل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد گھر سے نکلنے کا کوئی جواز نہ رہا۔ یہ اطلاع اور اچانک میرے شوہر کی آنکھوں پر دوغول ایسی فرماتے تھے جیسا کہ میں کبھی بدحواس ہی ہو گئی۔ گھر سے نکلنے کے لیے میں کوئی دوسرا بہانہ نہ بنا سکی اور میرے شوہر نے مجھے اس کا موقع بھی نہیں دیا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے میں دل ہی دل میں کتنی شرمندہ تھی۔" اس نے سر جھکا لیا۔ شرمندگی اس کے چہرے سے نمایاں تھی۔

میں آپ کے لیے چنے کو کچھ شکوہ اس میں نے ملا تھا۔ سے پوچھا اچانک مجھے آداب میزبانی کا خیال آیا تھا اور میرے دل میں اس کے بارے میں غم و غصہ بھی نہیں رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ غصہ نہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اس وقت میں ان گفتگو کی محفل نہیں ہو سکتی۔ مجھے معلوم ہے کل آپ کو کتنی کوفت ہوئی ہوگی اسی لیے آج میں نے جلد از جلد اس کی خلائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت میں درحقیقت یہاں سے کچھ ہی دور راج ایک آؤنڈرزم میں ہونے والے خواتین کے ایک سینٹر میں شریک ہوں جو کافی دیر جاری رہے گا۔ میری

گاڑی وہیں کھڑی ہے اور ڈرائیور اس میں بیٹھا ہے۔ میں کچھ دوا دازے سے نکل کر یہ برقع پہن کر یہاں آئی ہوں جو میں گھر کے اپنے پینڈ بیگ میں چھپا کر لے گئی۔"

اس کا مطلب تھا سیدھی "شریف اور مزاجیہ" کی طرح دینے والی عورت بھی اگر کبھی چاقی تو کسی مجبوری "خود بخود" ضرورت کے تحت تھوڑی مدت فنانس دیکھا سکتی تھی۔

"یہ سارا تردد کیا ہے؟ میں اصل بات جاننے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کلمہ میں اصل موضوع پر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں جھوٹ کی کوئی علامت عیاں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں مجھے انجمن اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ملا۔

"میں خود بھی اصل بات کسی کو بتانے کے لیے تکتی ہوں۔ پریشان اور بے چین ہوں۔ وقت نے مجھے ایک عجیب سی تبدیلی میں ڈال دیا ہے۔ میں اپنے دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ لگا رہی ہوں۔ ایک اذیت ناک انجمن یہ بھی گئی کہ میں فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ یہ بات کہے یا نہ؟ ایسا کوئی بھی خطر نہیں آتا جسے یہ بات بتا کر میں توقع رکھ سکتی کہ نتیجہ میری خواہش کے مطابق نکلے گا۔" وہ ایک بار پھر انجمن تیز سے انداز میں غصہ ہو کر بولی۔ "لیکن پھر آپ فیصلہ پر پہنچ گئیں۔" میں نے کہا اسے اپنا جاری رکھنے کے لیے آگیا۔

"جی ہاں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "آپ میرے لیے ایسی ہیں لیکن میں نے جو اچھلے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"تجربا اس بات کا قائل آپ کی چھٹی ہن پر ہنس بھراؤ کل سے ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "آپ بالکل ٹھیک سمجھ گئے۔" اس کی آنکھوں میں ایک لمبے لمبے چمک ابھری اور معلوم ہو گئی "جیت سوچنے کے بعد میرا دماغ آپ کی طرف گیا اور رتہ رتہ میرا ارادہ مضبوط ہو گیا۔ آپ اس معاملے سے دلچسپی بھی ہے۔ آپ کی پوزیشن بھی اتنی مضبوط ہے کہ آپ اس معاملے میں ٹانگ اڑا کر کہہ کر چاہیں کر سکتے ہیں اور مجھے پس منظر میں رکھتے ہوئے خود کوئی قدم اٹھانا ہے۔ متعلقہ پولیس آفیسر بھی آپ کا اچھا دوست ہے۔ فون کرنا لگا ہے آپ مجھے سونڈل توڑی دکھائی دے۔ بس اس خود بخود صرف اس بات کی ہے کہ آپ کے دل میں میرے لیے تو دل تھا اور وہی پیدا ہو جائے اور آپ اس معاملے کو اس طرح چھل کر کے لیے تیار ہو جائیں جس طرح میں چاقی ہوں۔ آپ کا مجبوری کو کچھ نہیں۔"

"آپ اصل بات تو سمجھتی باقی باتیں تو بعد میں اظہار ہوئی رہے گی۔" میں نے طاقت سے کہا "آپ کا نام کس کا ہے؟ کل کے بارے میں کچھ باقی ہے۔" اس قصور سے مجھے اپنے جسم میں کچھ حسنی عروس تھا

صورت حال کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔

”صنعت خزانہ ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا میرا خیال ہے مجھے کوئی تجربہ کرنے سے پہلے آپ کی پوری بات سمجھنا چاہیے۔“

”جی ہاں۔ اور اس کے بعد مجھے صاف صاف بتا دیجئے گا کہ آپ کو اس بات پر یقین کیا یا نہیں۔ اور یہ کہ اس سلسلے میں آپ کا ارادہ کیا ہے۔“ وہ آپ کو کچھ پرسکون کیسے میں بولی میری چاہیں گے تو ہم بات ہمیں غم کیوں گے ہم دونوں ہی فرض کیوں گے کہ میں یہاں آئی ہی نہیں تھی۔“

”بالکل ٹھیک۔“ میں نے طمانیت کی سانس لے کر کہنے لگے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ وہ خفا ہو کر جلیں نہ جائے یہی شکل ہے اس سچی کے کھلنے کے آثار پیدا ہوئے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”میں نے آپ کی بات برا نہیں مانتا ہے۔ آپ میرے شوہر پر رش کرنے میں تھی۔ بہت ہیں۔ پولیس خود ابھی تک ڈنگے چھپے انداز میں ان کے بارے میں تحقیق کر رہی ہے۔ اسی لیے وہ بھی اصل قاتل تک نہیں پہنچ سکے۔“ دولت کے لالچی میں کل دلی تھوڑی بھی درست ہے اس دنیا میں تو بعض اوقات چند ہزار روپوں کے لیے نہ جانے کیا کیا ہو جاتا ہے اور ہمارے بارے میں تو خود ہمارے بارے میں کیا کیا فرمایا ہے کہ میری امت کا فائدہ مال ہے۔“

اس کا جواب دیا تھا کہ وہ ذہنی رجحان بھی رکھتی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”مجھے ہر وقت یہ شک کی نظر آتا ہے کہ میرا کوئی قاتل کرنے میں مصروف نہ رہا ہو۔“ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرے اندازے کے مطابق اس وقت وہ بہت زیادہ اشتعال میں آیا تھا جبکہ اچانک چکر کا وہ بتا تھا کہ اس کے سوا مار بٹھا۔ ظاہر ہے اشتعال کے عالم میں انسان اپنے عقول و فہم حساب کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ دوسری بات یہ کہ پولیس اندیشہ کے معاملات اس قدر پیچھے ہوئے اور اچھے ہوئے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ خود مصروف نہ رہا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ فیصلہ کرنا کم از کم ہم لوگوں کے لیے مشکل ہے وہ میرا کہہ کر فائدہ میں رہا ہے یا نقصان میں۔“

”آپ کی یہ بات بھی اپنی جگہ ابھی ہوئی لیکن دلچسپ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے سرخ ویدہ چہرے پر حیرت طالع کے سامنے برقرار رہے اور وہ کھوٹے کھوٹے سے لیے میں چلا ”اس رات بظاہر تو میں اس وقت میرا کے اسٹوڈیو میں بیٹھی تھی جب آپ اس کی لاش کے قریب پہنچے تھے لیکن درحقیقت میں اس سے پہلے بھی وہاں آچکی تھی اور اس وقت میں نے میرا کو مصروف کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔“ اس کی تواضع ایک لمحے کے لیے رندہ ہو گئی۔

”مجھے۔“ میں نے کچھ اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”جی کہ شاید وہ مجھے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ بتا چکا ہو۔“ جی شادی ہی پر نس سیرا کا قاتل تھا اور اپنے شوہر کے بارے میں ایسی بات بتانا واقعی اس جیسی عورت کے لیے بہت ہی آزمائش تھی۔ اس انکشاف کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی مطمئن رکھنا چاہتی تھی۔ اپنا اتنا بڑا راز کسی کے ہاتھ میں دے کر خود بھی مطمئن رہنے کی خواہش۔ پچھلے بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

”میں۔“ نہیں بلکہ ”سب کچھ“ جانتی ہوں۔“ وہ ذرا تندر سے لیے میں بولی ”میرا مطلب ہے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ میرا قاتل کس نے کیا تھا۔ اور میرا خیال ہے یہی بات سب سے اہم ہے۔ اتنا جان لیتا ہی سب کچھ جان لینے کے مترادف ہے پولیس کو اگر صرف اتنا ہی معلوم ہو جائے تو باقی باتیں وہ خود ہی معلوم کر لے گی۔“

”ہاں۔ آپ کا خیال درست ہے۔ آپ بتائیں تو سی آپ کے خیال میں پر نس سیرا کا قاتل کون ہے؟“ میں نے نہایت نرمی سے دریافت کیا۔

”میں اپنا خیال ظاہر نہیں کر رہی۔ بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے سیرا کو قتل کرتے دیکھا تھا۔“ وہ جانتی ہوئی آنکھوں سے گویا کوئی خواب دیکھتے ہوئے جھرمجھری لے کر بولی۔ ”وہ مصروف نہ تھا۔“ اس نے جیسے اپنے گلے میں پھنسا ہوا کوئی گولا اگل دیا۔

”مصروف نہیں۔“ میں یک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ اپنے شوہر سے قتل کا شبہ دھانے کی کسی سازش میں شریک تھی اور اسی غم پر غلٹی ہوئی تھی۔

”آپ کو بہت حیرت ہوئی؟“ اس نے جلیبی سے پوچھا۔ ”ظاہر ہے۔“ میں نے اپنا ہاتھ ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مصروف نہ ہو کر سیرا کے قتل سے بہت نقصان پہنچا ہے اس کی خاطر وہ اپنی ہی کو طلاق دے رہا تھا اور اسی کی مدد سے وہ بہت زیادہ ترقی بنے جا رہا تھا۔ اس نے زندگی بھر کے لیے جو پلاننگ کی تھی سیرا کے قتل سے تو وہ برباد ہو کر رہ گئی۔ سیرا کے قتل سے تو کسی اور کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔“

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ اس میں افسردگی بھی تھی اور غمی بھی۔ جو جمل ہی سانس لے کر وہ بولی میں سمجھ گئی۔ آپ کا اشارہ میرے شوہر کی طرف ہے۔ آپ کا خیال درست ہی ہے۔ میرے شوہر کی کوئی خفیہ صفت تو ہی نہیں ہیں۔ بہت زیادہ دولت کے لیے وہ بھی کسی کو قتل کرا سکتے ہیں لیکن سیرا کے بارے میں ایسا سوچنے کی ان میں بہت نہیں تھی البتہ اس معاملے میں ان کا کردار کچھ اور ہے۔ میں اس کے بارے میں بھی آپ کو بتاؤں گی لیکن پہلے خود کو اپنی طور پر تیار کر لیں کہ آپ کو میری بات پر یقین کرنا ہے یا نہیں۔ میں آپ کے پاس قیاس آرائیوں یا اندازوں کے بارے میں سمجھاؤں گا۔ آنکھوں دیکھی

حکمت کر سکتی تو میں دبے قدموں وہاں سے بھاگ لی کہ نہ مضر  
ابھی وہاں سے نکلے کی تپاؤں کہنا تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ  
دھنگے وہاں دیکھے ورنہ دھنگے بھی گل کر دیتا۔

پھر اس نے شاید میرے تاثرات دیکھے اور بولی "آپ شاید  
میری بات پر حیران ہو رہے ہوں گے مسئلہ یہ ہے کہ مضر مضر کے  
بارے میں کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے اور کتنے  
خطرناک لوگوں سے اس کے روابط ہیں۔ مجھ جیسی عورت۔۔۔ احمد  
پرویز جیسے آدمی کی بیوی بھی اس سے خوف زدہ رہتی تھی۔ میں  
افغان سے اسے نوجوانی کے زمانے سے جانتی ہوں۔ وہ ایک  
چراسرا اور مافیائی قسم کی شخصیت ہے اور مافیائی قسم کے لوگوں سے  
ہی اس کے رابطے ہیں۔ وہ ایک مذہب، خوش اطوار اور پڑھے  
لکھے شخص کے لباس میں چھپا ہوا ایک بھیلہ ہے۔"

"مضرت ہے؟" میں نے پوچھا۔ "آپ کی بہن کو زندگی بھر  
شادی کرنے کے لیے کوئی دھنگ کا توئی نہیں مل سکا۔ اس نے  
پہلے جن دو شخصیات سے شادی کی وہ بھی عجیب و غریب تھیں اور یہ  
میرا توئی منتخب کیا تو یہ آپ کے بیان کی روشنی میں کمال کی چیز  
ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ افسردگی سے بولی "یہ شاید  
اسے کسی کی بددعا لگی ہوئی تھی۔ ماں باپ کی تو وہ پیش تاقران رہی۔  
اس کے مزاج میں ایک عجیب سی سرکش تھی۔ ویسے بظاہر وہ کچھ  
ایسی تاقران بھی مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ بس اس نے شادی کے  
معاہدے میں بھی ڈیڑی کی نہیں مانی۔ شاید اسے اسی بات کی سزا مل  
رہی تھی کہ دنیا کی باتی ہر وقت اسے بہت افزا سے حاصل تھی  
لیکن زندگی میں کوئی ہم سفر صحیح نہیں مل سکا۔ ہر بار کوئی عجیب سی  
آدمی اسے کھرا جاتا تھا اور وہ اس کے چکر میں آ جاتی تھی حالانکہ  
وہ کوئی ایسی بے وقوف بھی نہیں تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ دنیا  
کھڑے ہوئے تھی۔ دولت و جائیداد کے معاملات بڑی عمدگی سے  
سنجھائے ہوئے تھی۔ غرض کہ اور کسی بھی اعتبار سے بے وقوف  
مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ اس کا یہ میرا انتخاب تو پچھلے دو سے بھی  
بڑھ کر تھا۔ مضر نہ صرف سانپ کی طرح زہریلا اور خطرناک تھا  
بلکہ شادی شدہ بھی تھا۔"

"آپ نے کبھی میرا کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟" میں  
نے پوچھا۔ "ہو سکتا ہے وہ اس حقیقت سے باخبر ہی ہو کہ مضر ایک  
مافیائی قسم کی شخصیت ہے اور مافیائی شخصیتوں سے اس کے رابطے  
ہیں۔"

"میں نے اسے کئی مرتبہ خبردار کیا لیکن وہ ایسی باتوں کو خاطر  
میں کھال لاتی تھی۔" واجدہ دکھ سے بولی "جس نے ان معاملات  
میں کبھی باپ کی نہیں مانی وہ میری بھلا کیا مافی۔ بس کر سکتی تھی کہ  
یہ تو بہت اچھی بات تھی کہ مضر خطرناک آدمی تھا۔ بے ضرر شوہر  
بھلا کس کام کا؟ اس کا کہنا تھا کہ اس جیسی لڑکی کے لیے خطرناک

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا اس یاد کی اذیت کو ذہن  
میں جھینکے ہوئے بولی "میرا کہ مضر اور اسٹوڈنٹ کے طور پر استعمال  
انے والے دنوں بنگلوں کی ایک ایک قافل چالی چالی میرے پاس  
جاتی تھی۔ میں جب چاہتی تھی اس کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس  
بات بھی میں اچانک بغیر کسی پروگرام کے اس کے اسٹوڈنٹ چلی گئی  
تھی۔ میرے ساتھ ذرا بیٹھ رہی تھی۔ کڑی میں خود ہی ڈرائیو  
کر رہی تھی۔ اسٹوڈنٹ پہنچ کر صوبہ حیات میں ٹالا کھل کر سیدھی  
درمیں لگی۔ میں نے کافی دیر سے ہی بڑے ہال میں بحث و مکرار کی  
وازی سنیں۔ میرا اکثر وہیں بیٹھ کر کام کرتی تھی۔ میں نے  
وازی بھی سنا لی۔ وہ میرا اور مضر کی آوازیں تھیں۔ اس  
پہلے بھی میں نے انہیں کئی بار بحث و تمحیص کرتے سنا تھا لیکن  
میں نے اسے بات کرتے بھی نہیں سنا تھا۔ میں دواڑے کی طرف  
لے کے بجائے قتل دوار کی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور کان لگا  
رہنے لگی۔"

ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "ان کے درمیان بحث  
ایک کافی دیر سے جاری تھی اور میں اس کا بیشتر حصہ نہیں سن سکی  
لیکن جو باتیں میں سن سکی تھیں اور میری اپنی بھی جو معلومات  
میں ان کی روشنی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ موضوع بحث کیا تھا۔  
اس اسٹوڈنٹ کو سنہوں کی کوئی سینڈیکٹ خریدنا چاہ رہی تھی۔  
بڑا پانچا حصہ بیچ دینے کے لیے تیار تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ  
نہ تھی جب کہ مضر اسے منع کر رہا تھا۔ ایک دوسرے پر بہت  
بے اڑت بات بھی لگائے تھے۔ بحث طویل صورت اختیار کر گئی۔  
ہاں وہ دران میں کھڑکی کے ایک کونے سے بھاگ کر اندر دھکیلتے  
لی گئی تھی۔ مضر نے میں شاید اسے تھپتھا کھوٹنا مارنے کے لیے  
چلا لیکن کسی چیز سے الجھ کر گر پڑا۔ شاید اسے خائے زور کی چوٹ  
لی۔ اس کا فینڈا غضب کچھ اور بڑھ گیا۔ وہ کسی زخمی درخت کی  
سراغ لگا۔ میرا اس وقت بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اس کے گویا  
مردگان میں بھی نہیں تھا کہ اسے مضر کی طرف سے کوئی غلطو  
دکھا تھا۔ مضر نے نہایت چھٹی سے کالے پتھر کا درت اٹھایا اور  
بڑا کی کھڑکی پر پوری قوت سے دے مارا۔ وہ فرش پر گر گئی اور  
فات ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی تھی اور اس کے ساتھ  
لیگا کھڑے جسم سے جان نکل گئی۔ "یاد کے اس زخم سے اٹھنے  
میں نے اسے اسے کچھ دیر کے لیے بونے پر بھجور کھڑا چند لمحے وہ  
انہوں نے اسے شہر بھر سے آنکھیں پونچھتی رہی۔ میں نے اسے دل کا  
اڈا کٹنے کا موقع دیا۔"

آخر جب میں نے محسوس کیا کہ وہ جواب دینے کے قابل  
ہو گیا ہے تو پوچھا "آپ کا تو عمل کیا تھا؟"

"میرا کام یہ تھا کہ اس نے بلا تامل جواب دیا۔ چند لمحے تک مجھے  
اس کی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور جب یقین آیا تو دنیا گویا میری آنکھوں  
سائے کھوٹے گئی۔ جب مجھ میں اتنی جان آئی کہ صحیح طور پر

شوہری سوٹ کرتا ہے۔ اسے ایسے ہی شوہر کی ضرورت تھی۔ جہاں تک اس کی پہلی بیوی کا تعلق تھا تو وہ بھی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ اسے وہ طلاق دے دیا تھا۔ سیرا نے شاید کبھی یہ سوچنے یا دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اس کی بیوی کون تھی؟ کس قسم کی عورت تھی اور نہ ہی سیرا نے کبھی اس بات پر کوئی بچتا دلالت بخش محسوس کی کہ صدر کی بیوی کو محض اس کی وجہ سے طلاق ہو رہی تھی۔ وہ اس قسم کی جذباتی سوچوں میں الجھنے کی قائل نہیں تھی۔

”کمرے میں چند سیکنڈ گمراہی سے سوچا تو اس نے پورا مسطور لے کر حرکت کر گزرنے کے بعد فوری طور پر کیا کیا؟“

”وہ چند سیکنڈ کے لیے سیرا پر جھکا۔ اس کی نبض دیکھی جس سے یقیناً اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکی تھی۔ اسے شاید صرف خفیف سا دھچکا لگا تھا جیسے کسی کے ہاتھ سے غیر ارادی طور پر گلاس کر کر ٹوٹ جائے لیکن پھر میں نے اسے پوچھی کہ تم نے دیکھا جیسے دلی میں سوچ رہا ہو؟ پلو کوئی بات نہیں۔ ایک گلاس ہی تو تھا۔ اگر ٹوٹ گیا تو کیا ہوا۔ پھر اس نے نہایت اطمینان سے مجھے کا سر صاف کیا۔ اس نے اسے سر کی طرف سے ہی پکڑا تھا۔“

”میں نے اسے بتایا۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ پولیس کی تفتیش سے پتا چلا تھا کہ اس واقعے سے پہلے کا مران وہاں موجود تھا۔ سیرا نے اسے کہا کہ وہ غیرہ لینے بیٹھا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں مسطور وہاں پہنچا۔ اس کے ہاتھوں سیرا کا قتل ہوا اور وہ رخصت بھی ہو گیا۔ کا مران وہاں نہیں آیا تو اسے سیرا کی لاش ملی اور وہ وہاں سے باہر ہو کر صاف گیا۔ لیکن ہے اسی دوران میں اس نے مجھے کہا تھا کہ گایا ہوا پھر شاید اس سے پہلے جب وہ وہاں موجود تھا تو سیرا نے مجھ سے اسی سے انکار کر اپنے قریب منگوایا ہو کیونکہ وہ اس جگہ نہیں رکھا ہوتا تھا جہاں مسطور کا ہاتھ اچانک ہی اس پر گر گیا۔“

”اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گیا؟“

”میں نے رخصت ہونے نہیں دیکھا لیکن وہ اپنا کوٹ پہننے لگا تھا جو اس نے ایک کمری پر لٹکایا ہوا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رخصت ہونے لگا تھا۔ میں بڑبا کر اس سے پہلے ہی وہاں سے نکل بھاگی۔“

”یہ ایک غیر فطری سا رد عمل تھا۔ آپ کو وہاں شور مچانے یا پولیس کو فون کرنے کے لیے کسی طرح فون تک پہنچنے کا خیال نہیں آیا؟“

”شوہر؟“ وہ استغناء سے انداز میں جیسی ”آپ نے وہ جگہ۔ وہ جگہ۔ وہ علاقہ دیکھا ہوا ہے۔ وہاں میرا شور مچا رہا تھا۔ میری پہلی ہی جگہ کے دوران میں شاید وہ میرے سر آن پہنچا اور میرا ہلکا دھارتا یا مجھے کوئی مار دیا۔ وہاں تو معمولی کی آواز کی طرف بھی شاید کسی کا توجہ نہ جاتی۔ البتہ فون تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں

تھا۔ فون تو میری اس گاڑی میں بھی موجود تھا جس میں بیٹہ کبھی وہاں پہنچتی تھی۔ اسی میں بیٹہ کبھی مجھ پر غریب کیفیت میں وہاں سے گھر آتی۔ گھر آکر کچھ دیر میں میری حالت سنبھل گئی لیکن فون میں پھر بھی نہ کر سکتی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”آپ کے شوہر اس وقت کہاں تھے؟“

”وہ فوری آبادوارے کا رخائے میں تھے۔“

”آپ کو انہیں اطلاع دینے کا خیال نہیں آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے فون کی صلاحیت بھی مرنے تھی۔“ وہ پہلی مسطور کے کچھ طور پر گرفت میں آنے کا ارادہ طریقہ بھی تھا کہ وہ رکتا ہوا تھا۔ جانتے مجھے معلوم تھا کہ اب خواہ ہم کیا ہی کر سکیں گے اس کے شاطر وکیل اور اس کی پشت پناہی کرنے والے پڑا سر اور خطرناک لوگ اسے بچا کر نکل لے جائیں گے اور اگر وہ کچھ اور نیل میں رہے گی کیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے جانے کیسے کیسے بدکار باہر ہوں گے۔ جس کسی نے بھی سامنے آئے اس پر قتل کا الزام عائد کیا ہو گا اس کی زندگی خطرے میں رہے گی اور وہ جلد یا بدیر جانے اسے اتھو دھو بیٹھے گا۔ اس خوف نے مجھے کبھی بھی فیصلے پر نہ پہنچنے دیا۔“

”آپ نے بہت بڑی غلطی کی۔“ میں نے تاحف سے کہا۔

”آپ نے بہت سے لوگوں کو بوجھ بہت سی تکلیفوں میں مبتلا کر دیا۔ اسی چکر میں ایک بے گناہ کی جان بھی چلی گئی اور قاتل کو قتل کی آزاد رہا۔ آپ کو از کم ایک گناہ ملے گا۔ فون کال کر کے پولیس کو اطلاع دے سکتی تھیں۔ پولیس اور۔۔۔ خاص طور پر آپ کو کچھ کل خواہ مسطور پر قتل کا الزام ثابت نہ کر پاتا لیکن ایک بار کلا۔“

”جی اس کے ذہن میں پھرت پڑا اور صحیح سمت میں اس کی ہدایت رہنمائی ہو جاتی تو پھر وہ اسی طرف نکلتا اور مسطور کو کچھ دواوانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال ہی لیتا۔ وہ اس قسم کے حالات میں بہت ضدی ہے۔ اگر ایک بار اسے خود کسی وجہ سے گناہات یقین ہو جائے تو پھر وہ اسے ثابت کر کے چھوڑ دیتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اسے یقین نہ نہ آئے۔“ واہدہ افسردہ لہجے سے بولا۔

”میرا حال میں اپنی غلطی تو تسلیم کر رہی ہوں اور اسی کی غلطی کا طریقہ تو میں تلاش کر رہی ہوں۔“

”ختم۔ تو آپ کے گھر پہنچنے کے بعد کیا ہوا؟“ میں نے نکلنے سے کہا۔

”کچھ دیر بعد مسطور کا فون آگیا۔ کہنے لگا کچھ دیر پہلے اس کی سیرا سے فون پر بات ہوئی تھی۔ کسی وجہ سے وہ پہلے ہی چلی گئی تھی پھر ان کے درمیان پوچھی تو کچھ جھجک سی گئی تھی۔ سیرا نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سیرا کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس نے درخواست کی کہ میں جا کر ذرا اسے سمجھائوں اور خیال رکھیں کہ

فک ان کے پاس دساک ہیں دولت ہے ان کا کافی اثر و رسوخ بھی ہے اور وہ اپنے مدد سے بہت سے غریبیوں کو کھانسی دیتے ہیں لیکن مزاجاً وہ درحقیقت ایسے قوی نہیں ہیں۔ وہ اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کر سکتے خصوصاً مفرد ضمیر کا کوئی بندہ دست کرنے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ اسے آنکھیں ضرور دکھاتے رہتے ہیں لیکن مل می مل میں وہ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ وہ شاید اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

”میرا حال آپ نے شوہر کے شہر کے باغیچے پر عمل کیا؟“  
”جی ہاں۔ لیکن میں اس پر خوش نہیں تھی۔ پھر کاروان داخل کے پراسرار انداز میں مارے جانے کی خبر آئی۔ اس کے بعد سے تو ہم سب کو باکلی ہی چپ لگ گئی۔ لیکن اب یہ غامضی میرے لیے بالکل ناقابل برداشت ہوئی جا رہی ہے۔ میں کسی کی مدد کی اشد ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میں نے اچانک ہی آپ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا۔ کل رات طے کرنے کے باوجود ملاقات نہیں ہو سکی۔ اسی لیے آج میں فون کے بغیر ہی اچانک آگئی۔ میں نے سوچا کل کی گزیر سے آپ جتنی کوفت اٹھائے ہیں اس کے بعد اگر میں نے آج بھی ملاقات کے لیے وقت طے کرنے کی غرض سے آپ کو فون کیا تو کہیں آپ مجھے میں مجھے برا بھلا کہانی شروع نہ کر دیں۔“

”خیر ابھی میں اتنا مفرد اور بد اخلاق نہیں ہوا کہ خواتین کو برا بھلا کہنے لگوں۔“

”میں آپ سے مدد لینے تو آگئی ہوں لیکن مسئلہ یہی ہے کہ میں اتنی دیر زبان بند رکھ چکی ہوں کہ اب واقعی اپنے آپ کو مفردی کے درجے کا مجرم محسوس کر رہی ہوں۔ اب تو میں سامنے آنے کی بالکل ہی ہمت نہیں کر سکتی۔ اب تو نہ صرف یہ کہ میں قانون کی طرف سے کسی اور رو کی مستحق نہیں محسوس کی بلکہ میرے اپنے شوہر کی حمایت بھی شاید مجھے حاصل نہ رہے۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے کتنے بار اصرار ہوں اور اس کا انجام کیا ہو۔ خواہش میری یہی ہے کہ انصاف کے قاعے بھی پورے ہو جائیں اور مجھے سامنے بھی نہ آنا پڑے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مجھ زیادہ سی بی خواہش ہے۔ اور کافی خود غرضانہ بھی ہے۔ میں اس کی مستحق نہیں ہوں کہ میری یہ خواہش پوری ہو۔ آپ چاہیں تو انکار بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی شک نہیں ہو گا۔“

پھر اس نے گویا مجھے خواب دیکھا ”لیکن اگر آپ نے مجھے سامنے لانے اور کسی کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ باتیں میں نے آپ کو بتائی تھیں تو میں صاف کھر جاؤ گی۔ میں ہرگز تسلیم نہیں کروں گی کہ میں بھی آپ سے ملی تھی یا آپ سے میری اس موضوع پر کبھی کوئی بات ہوئی تھی۔“

”بہت خوب۔“ میں نے سہلایا۔  
وہ خفیف سی شرمندگی کے ساتھ ہلے۔ ”اگر آپ مجھے واقعی

جہاں حرکت نہ کر کر رہے۔ میں کچھ گئی نہ چاہتا تھا کہ میں باکر لائی دیکھتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ شاید لاش جلد فٹ ہو کر بہتری حالت ہو گا۔ اس لیے میں وہاں پہلی گئی اور جنت میں نے آپ کو وہاں موجود پایا۔“

”آپ نے مجھے دیکھ کر یوں چیخ ماری تھی جیسے واقعی آپ مجھے سمجھ رہی ہوں۔“ میں نے کہا ”آپ میں آپ کی اداکارانہ اداکارانہ ملا جلیوں کی یاد ہے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”شاید ہر انسان کے اندر ایک اداکار چھپا ہوتا ہے۔“ وہ زرا ت سے ہلے۔ ”مجھے اس وقت ایک انجمن اور بے خبر انسان کا اداکار کا تھا۔ عام طور پر اس قسم کی صورت حال میں جانے پر اچانک پہنچنے والے کا رد عمل یہی ہوتا ہے کہ وہ مجھے بھی کے قریب جھکا ہوا دیکھتا ہے اسے ہی قائل سمجھتا ہے۔ پولیس کو بھی سمجھتی ہے۔ ظہور ڈراموں میں بھی اسی طرح دکھایا ہے۔“

”خیر آپ نے اپنے الزام پر اصرار نہیں کیا تھا۔“ میں نے

”مصلحت مجھے معلوم ہو تھی۔“ وہ مجھے لیے میں بولی ”مجھے لی کا اعتبار کرنے پر پہلے ہی ندامت تھی۔“

”مگر جب پولیس نے کاروان داخل کو اپنے تمام تر شہادت لے لیا تب آپ کا رد عمل کیا تھا؟“ میں نے پوچھا ”پھر بھی سامنے زبان کھولنے کے بارے میں نہیں سوچا؟“

”صحت سوچا۔ اور پھر اس پر عمل بھی کیا۔“ اس نے جواب

”چھا۔۔۔ وہ کیسے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا کیونکہ اس

اگر واقعی زبان کھولی تھی تو پھر حالات بہت مختلف ہونے چاہئیں

”میں نے صرف اپنے شوہر کے سامنے زبان کھولی۔ میں نے

ن ساری بات بتا دی۔ وہ پہلے تو کچھ خفا ہوئے جس کی مجھے توقع

نہیں تھی۔ لیکن سچوں میں الجھ گئے۔ انہوں نے پورا ایک دن

فائل میں گزار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اس بات کو اتنی دیر

بجھا کر خود بھی شریک جرم بن گئی تھی لیکن انہوں نے خود بھی

انہیں مسامحہ کر دیا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے مشورہ

دیا کہ اب مجھے زبان بند رکھنی چاہیے اور حالات جس رخ

اپنے تھے انہیں سامنے دینا چاہیے۔ تھوڑے عرصے بعد میں مفرد کو

بکلیکے کی سزا دینے کا کوئی اور طریقہ نکالیں گے۔“

”یعنی یہ معاملہ اعتدال پزلے کے بعد بھی کرائے کے قاتلوں

ہاں کو نکالنے کو اور اس کے؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”جی ہاں۔ ان کا قصہ یہی رہا ہو۔“ وہ فیرواد میں ہلے۔

”اگر وہ اپنی زبان سے اپنے شوہر کے ایسے جرائم کی تصدیق تو

کر لے سکتی تھی۔“ لیکن مجھے معلوم ہے وہ ایسا کر نہیں سکتے۔ ہے

"تم پران محسوس کریں۔ میں آپ پر تجدد نہیں کرنا اور نہ ہی واقعہ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں صرف ایک بیان کر رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا "جو سکا ہے صورتحال ایسا ہوتا ہو جیسا آپ نے تصور کر رکھا ہے۔"

"یہی بات نہیں ہے۔" وہ خطرناک انداز میں ہلکا سا چٹکا کرے۔ خطرناک لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ جب سے اس سے شامانی ہوئی ہے کہ ہارایا اتفاق ہو چکا ہے کہ کئی کے بارے میں اس نے پچھندہ کی یا غرت کا اظہار کیا اور پھر بدوہ شخص قاتل ہو گیا یا عبرت ناک انداز میں ہار گیا۔" یہ تو خاصی دلچسپ بات تھی آپ نے۔"

"میں تو پھر بھی کسی حد تک گھر کی دنیا میں گن رہے عورت ہوں لیکن میرے شوہر تو ہر کی دنیا میں رہتے ہیں اور وہ میں ان کی رہائی ہے۔ وہ آسانی سے خوف زدہ ہونے والے بھی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود میں نے میرا کے گل کے بارے حقیقت انہیں بتائی تو وہ خوف زدہ ہو گئے تھے اور انہیں چپ مچی تھی۔ انہوں نے صرف یہی تبصرہ کیا تھا کہ صورتحال سنا ہے جس کے راستے میں نہ آئی بہتر ہے۔ ہم چار لوگ ہیں ایک زندگی کو ضائع ہوئی چکی ہے۔ ہم دوسری زندگی داؤ پر نہ لگائیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صورتحال آوی نہیں ہے۔" مہنا نظر آتا ہے شاید کبھی وہ معمولی رہا ہو لیکن اب اس کی جڑیں کہیں اور پکٹی چکی ہیں۔ اپنے کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے زبان بند رکھنے کے بارے محسوس کرتی ہوں کہ میری نگرانی ہو رہی ہے۔ میں جھل جاتی کوئی تاویہ آگہ میری نگرانی کرتی ہے۔ شاید ہمارے لیے خوف نپ ہوئے ہیں۔ میں کوئی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتی لیکن یہ کہتا ہے کہ یہ سب میرا وہ نہیں ہے۔"

"میں دہلی کے ساتھ سوچنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ آپ کے خیال میں یہ سب آپ کا وہ نہیں ہے اور اس کے مصدر کا ہاتھ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ میرا اسٹوڈیو سے خوف زدہ انداز میں نکل کر فرار ہو رہی تھی وقت اس نے آپ کو دیکھ لیا تھا؟"

"میں سن رہی ہوں۔" اس نے تائید کی۔ "اگر ایسا ہوا اور مصدر واقعی اتنے خطرناک تو یہ کہ آپ اسے چارٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں تو آپ سلف نہیں دے سکتا تھا۔ اب تک وہ آپ کی زبان میں میں بند کر چکا ہوتا۔ وہ اتنے دن تک اپنے سرگرم کارخانہ رہا۔ آپ کو شاید میرا کے اسٹوڈیو سے اپنے گھر تک سلف نہ ملے۔"

وہ ابھرنے آہرے انداز میں خاموش رہی تو میں نے اسے زیادہ حقیقت پسند بن کر سوچنے کی کوشش کی۔

توڑی سی ہورہی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں اور آپ کے پاس ایک وقت اور حوصلہ ہے کہ بغیر کسی غرض کے میری کچھ مدد کر سکیں تو اس کے لیے آپ کو مجھے سچ میں لائے بغیر ہی کچھ کرنا ہوگا۔ کوئی ایسا طریقہ سوچنا ہوگا جس میں میرا نام سچ میں لائے کی ضرورت نہ پڑے۔" پھر اس نے قدرے اچانک سے مجھے پوچھا "کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟" اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے میں امید کا پتہ بھی تھا۔

"میں کوشش کروں گا لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔" میں نے تامل سے کہا۔

"میرا حال آپ واڈوری کا وعدہ کر رہے ہیں؟" "ہاں۔" میں نے تامل جواب دیا "مگر آپ نے مجھ سے شامانی نہ ہونے کے باوجود اتنی اہم بات کے سلسلے میں مجھ پر بھروسہ کیا ہے تو میں آپ کا نام سامنے نہ لائے گا وعدہ کرتا ہوں خواہ اس معاملے میں کوئی فیصلہ رشتہ ہوا نہ ہو۔"

"شکریہ۔۔۔ میرے لیے اتنی قلبی دعا کافی ہے۔" اس نے اطمینان کی کمری سانس لی "آپ اعانہ نہیں کر سکتے کہ جب سے یہ واقعہ ہوا ہے تب سے میں کیسے ذہنی کرب کا زور خوف کے عالم میں وقت گزار رہی ہوں۔ آپ سے کل کی ملاقات کا پورا گرام گزرا ہو جانے کے بعد میں نے اپنا وہی ترک کر دیا تھا لیکن آج صبح پھر گویا کسی نئی طاقت نے مجھے مجبور کر دیا اور خواتین کے اس سہیوار کی آڑ میں مجھے رو کر امانتے کا موقع مل گیا۔"

"ایسا بھی کیا خوف!" اس نے ملاحظہ سے کہا "آپ کوئی ایسی معمولی یا ادارت عورت تو نہیں ہیں جو جی بات کے سلسلے میں اتنی خوف زدہ رہیں۔"

"جی ہاں۔ جو لوگ میری اور میرے شوہر کی پوزیشن سے واقف ہیں تو یہ بات سن کر یہی کہیں گے۔ لیکن اصل کیفیت کو صرف میں ہی محسوس کر سکتی ہوں۔ جس دن میں میرا کو قتل ہونے دیکھ کر خوف زدہ انداز میں اس ہنگامے سے نکل کر بھاگی تھی اس کے بعد سے ایک عجیب سا خوف میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

"سچ کو چھپانے کا خوف ہے۔" میں نے فوراً کہا "جب ہم کسی پر قلم اور زبانی کو دیکھ کر چپ رہتے ہیں اپنی زبان کو کالا لگاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی خوف ہمارا تعاقب کرنے لگتا ہے۔ اپنی دانست میں ہم خوف اور بڑے تنازعے سے بچنے کے لیے یہ خاموشی اختیار کرتے ہیں لیکن خوف پھر بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا اور بڑے تنازعے کسی نہ کسی دوسری شکل میں ہمارے منظر رہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی این ڈائریکٹ سزا ہوتی ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن زبان بند رکھنے والا اپنی مجبوری خود ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ کوئی دوسرا اس پر صرف تبصرہ کر سکتا ہے۔ مشورے دے سکتا ہے۔" اس کے لیے کی میں بھی جی ہنسی نہ کر رہی۔



لیں کہ اسبہ میرا سرود ہے۔"

جست شکر ہے۔ "اس کے لیے میں طمانیت جھٹک آئی" مجھے امید تھی کہ آپ سے مل کر کچھ نہ کچھ بات ضرور بنے گی۔ شکر ہے میرا اندازہ درست نکلا۔ "بکھرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔" آپ میں چلتی ہوں۔ آپ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ میں خودی کوئی مناسب موقع اور مناسب ذریعہ دیکھ کر آپ سے رابطہ کر لیا کروں گی۔"

اس نے دہرا خطاب چربہ پر گرایا اور جانے کے لیے مڑی تو میں نے پوچھا "آپ کے لیے گاڑی منگوائیں؟"

"نہیں۔ میں جس ٹیکسی میں آئی تھی اسے میں نے روک رکھا ہے۔" اس نے کہا اور رخصت ہو گئی۔

اسے مجھ سے ہاتھ اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں نہ آئی۔ چند گھنٹے بعد ہی رحیم گل کا فون آیا اور خطاب معقول وہ کسی تمہید یا چمیز چھاڑ کے بغیر بولا "میرے پاس ایک ایسے سناک اطلاع ہے۔ بظاہر تو اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں بننا لیکن چونکہ تم پر سنس سیزا والے معاملے میں گہری دلچسپی لے رہے ہو اس لیے میں نے سوچا یہ خبر اخبارات میں آنے سے پہلے تمہیں سنا دوں۔ تقریباً دو گھنٹے پہلے واجدہ پرویز کو جمنانہ والی سڑک پر قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ خواتین کے سینار میں شرکت کر کے گھروالیں آنے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔"

"نہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں نے گویا اس دلچسپے سے سنبھلنے کے لیے سارے کے طور پر ریڈیو کو مضبوطی سے تھام لیا "کیسے... کیسے... ہوا ہے؟"

"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ موٹر سائیکل پر سوار تھیں نو جوانوں نے اس کے ذریعہ سے گاڑی چھیننے کی کوشش کی لیکن اس کیس۔ اور شاید واجدہ کی بھی مزاحمت پر دونوں کو گولی مار دی۔" اس کے لیے میں آسف تھا "تمہیں معلوم ہے اس قسم کے واقعات کا کوئی گواہ میر نہیں آتا۔ بڑی مشکل سے ایک گواہ میر تیا ہے۔ وہ ایک پارکنگ لٹ میں چوکیدار ہے۔ اس نے بھی خاصی دور سے یہ واقعہ دیکھا تھا اس لیے اس کا اندازہ ہے کہ یہ گاڑی چھیننے کی کوشش تھی جو کام ہو گئی۔ ممکن ہے اصل بات کچھ اور ہو اور ذرا پیور کو چار اور واجدہ کو پانچ گولیاں مار دی گئی ہیں گویا یہ یقین کرنا مقصود تھا کہ دونوں لاڈا موقع پر ہی مر جائیں۔ کسی کے زخم رہنے کا کوئی امکان نہ رہے۔"

اس اطلاع نے واقعی میرے دل پر ایک گہری خراش ڈال دی۔ میں تو ابھی یہی فیصلہ نہیں کیا تھا تھا کہ اس نے مجھے جو بات بتائی تھی وہ رحیم گل کو بتائی جائے یا نہیں۔ کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ کیا یہ فیصلہ دالی احتیاط کے باوجود کسی نے اسے میرے ہاں آتے دیکھ لیا اور پہچان لیا تھا؟ اس صورت میں تو شاید اسے میرے ہاں سے جاتے ہوئے ہی مار دیا جاتا۔ ممکن ہے اس

کی آنکھوں نے آپ کی گھرائی اور نہیں کانوں نے آپ کی ہر بات کی کوشش اس وقت سے تو شروع نہیں کی جب سے آپ نے بات اپنے شوہر کو بتائی ہے کہ سیرا کا قاتل منور ہے؟"

"نہیں۔ نہیں۔" میرا مطلب سمجھتے ہوئے اسے جھٹکا سا اور اس نے بھی جیسی ہی آنکھوں سے میری طرف دیکھا "میرے بڑا بچہ نہیں ہو سکتے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"آپ ایک شوہر پرست عورت ہیں اور آپ کا یہ جذبہ قاتل رہے۔ آپ کے بچے میں آپ جیسی عورت آپ کی ہی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ دنیا ہر حال ایک عجیب جگہ ہے۔ اور جہاں بہت زیادہ ہولت اور طاقات کے حصول کی کشش جاری رہتی ہے ان قوت کا تو بہت ہی عجیب حال ہے۔ وہاں کچھ بھی ممکن ہے اور کسی ہی چربے کے پیچھے سے کوئی ناقابل یقین کمائی برآمد ہو سکتی ہے۔ دیکھا ہے اس بات میں آپ کے شوہر کا کچھ مفاد پوشیدہ ہو کہ آپ اپنی زبان بند رکھیں، قتل کا الزام منور پر نہ آئے اور کسی طرح انسانی قاتل ثابت ہو جائے۔"

"یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بے چینی سے بولی اس کی انہیں اب بھی پہچانی ہوئی تھی۔

"یہ میں محض ایک نظریہ پیش کر رہا ہوں۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ درست ہی ہو۔ ہر حال یہ بھی ایک امکان ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ آپ سوچ رہی ہیں وہی درست ہو۔ میں ابھی تک بہت سب سے زیادہ سوچوں کا اور جلد ہی کوئی ایسا قدم اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ حقیقت سامنے آجائے لیکن آپ کو سامنے نہ آتا ہے۔ آپ کے خاندان میں وراثت کی تقسیم اور خاص طور پر اس کی تقسیم اور فروخت کا معاملہ بہت پیچیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں بہت سے زاویوں سے سوچ بھاری ضرورت ہے اور کوئی بھی بات ممکن ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں آپ سے بھی گزارش کروں گا کہ جہاں تک آپ کا ذہن کام کرتا ہے وہاں تک آپ بھی خوش کماں اور خوش قسم بن کر نہیں بلکہ سفاکی کی حد تک قسمت بہند ہو کر سونے کی کوشش کیجئے۔"

"میں کوشش تو کروں گی۔" وہ تھوک ٹھل کر بولی "لیکن آپ کیا میرے دل کو نہیں لگ رہی۔"

"حقائق ہماری کوششوں سے بھی سامنے آتے ہیں اور کبھی ان تک پہنچنے کا خود بہ خود کوئی ذریعہ بھی نکل آتا ہے اور کبھی ان حقائق خود بھی اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔" میں نے بڑا دلوری طور پر ذرا غصہ کیا "میں خود ہوا سا انتظار کر رہی ہوں۔ شاید میں اس دوران میں کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح آپ قطعی غیر معمولی طور پر ایک انکشاف کے کمر سامنے آئی ہیں کسی طرح کوئی اور ایسا ذریعہ نکل آئے جس سے کوئی انکشاف ہو۔ آپ ان ساری باتوں کو ذہن سے جھٹک دیں اور خاموشی سے گزر جائیں۔ یوں کچھ

وقت فوری طور پر کہیں سے جیسی بھی سونر سائیکلیں اور ماہرین دور  
تاکوں کا فوری طور پر بندوبست نہ ہو سکا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ  
میرے ہاں آٹا ہی وادجہ کے فوری قتل کا باعث نہ بنا ہو بلکہ اسے  
قتل کیے جانے کا پروگرام پہلے ہی سے طے ہو لیکن نامعلوم لوگوں کو  
مناسب موقع اب ہاتھ آیا ہو۔

"کوئی سراغ؟" کو کہ مجھے سوہم ی بھی امید نہیں تھی  
لیکن نہ جانے کیوں یہ سوال میری زبان سے پھل گیا۔

وہ خود استثنائی انداز میں ہنسا "بھری پری سڑکوں پر دو تھما  
ہونے والے اس قسم کے واقعات کا کوئی گواہ نہیں ملتا تو سراغ  
کمال سے ملے گا؟ سونر سائیکل جیٹا جیٹا ہوئی ہوگی۔ اسطرح بے  
حساب موجود ہے۔ دہشت گردی اور اس کی سرپرستی کے نزدیک  
یکب گلی گلی کیلے ہوئے ہیں۔ لیکن نہیں۔ شاید میں غلط کہہ رہا  
ہوں۔ سارا قصور ہم پولیس والوں کا ہے جن میں تو کرم سے  
زیادہ جاہل "کال" کرہٹ اور غافل ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ان میں  
سے بھی اکثریت بڑے بڑے سرکاری اور غیر ملکی سفارتی لوگوں کی  
حفاظت پر مگنی رہتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خود پولیس افسروں کو اپنی  
حفاظت کے لیے کافی پولیس چاہیے ہوتی ہے۔ پانی جو بجتی ہے ان  
میں سے جو بے چارے ایماڈار اور فرض شناس ہیں ان کی لاکھوں  
آنکھیں ہوتی چاہئیں تاکہ وہ ہر وقت شہر کے گلی کو سچے اور ہر موڑ پر  
نظر رکھ سکیں۔"

"یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا موقع نہیں ہے۔" میں نے  
اسے احساس دلانے کی کوشش کی "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"  
"آفس سے۔" اس کے لیے میں تسکین بخشک آئی "میں  
ایڈائیٹیشن اور وادجہ کی لاش اسپتال پہنچانے کے بعد واپس آیا  
ہوں۔"

"امح پرویز پہنچ گیا تھا؟"

"ہاں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دے  
گا۔ یہ شخص وقت کا زیاں اور لاش کی بے حرمتی ہوگی جب کہ  
موت کی وجہ صاف ظاہر ہے۔" رحیم گل نے بتایا۔

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا "مجموعی طور پر اس کا  
رد عمل کیا تھا؟"

"وہ مجھے ایک بالکل مختلف امح پرویز دکھائی دیا۔ اس نے نہ تو  
مجھ سے اپنے کسی کوشش کی اور نہ ہی پولیس کے مجھے کو اس کی عالمی  
پر بڑھلا کہا۔ اس نے زی آئی جی اور آئی جی صاحبان سے اپنی  
شکایتی کے حوالے بھی نہیں دیے۔ اس میں وہ پرانی آنکڑوں بالکل  
ہی دکھائی نہیں دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس واقعے نے اسے  
بالکل توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے بلکہ میں یہ بھی کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ  
میں نے اسے اندر ہی اندر دیکھ کر خوف زدہ بھی محسوس کیا۔ میں سوچ  
بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا سامنا ایسے امح پرویز سے ہوگا۔"  
"تم نے اس مسئلے میں کیا کارروائی کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نی الحال تو وہی رہا جی سے اقدامات کیے ہیں۔" لاسٹا  
سے بولا "جائے واردات کا تفصیلی معائنہ کیا جانا ہے کہ  
فنگر پر شش تلاش کیے جا رہے ہیں۔ گولیوں کے خول جی کے کم  
کا معائنہ کیا جانا ہے۔ پولیس کو ارٹ کر دیا گیا ہے کہ کھول  
ٹاکا ہندی کر دی گئی ہے۔ یہ سب خانہ پری کی باتیں ہیں۔ سنا ہے  
جانے کے بعد میسر کر پنے والی بات ہے۔ جب تک حثت  
عطف مقامات پر تعینات رہنے والی پولیس چو کس نہیں ہوگی  
حیات داری سے اپنے فرائض انجام نہیں دے گی تب تک  
قسم کی وارداتوں کی روک تھام بڑی مشکل ہے۔ سنا ہے  
ی سمت کہ میں پھر ان میں مستعد بے خوف اور وادجہ وار  
کاروں کی تعداد اور بھی کم ہے۔ واردات کے بعد تو منصب  
کے تحت ایسے ماہر اور مشاق لوگوں کو تعینات ہونے کے لیے  
دس منٹ کی صلت بھی کافی ہے۔ کوئی بھی گمران کی پناہ گز  
ہے۔"

مجھے اس کی بے چارگی کا احساس تھا۔ گندے پانی کے پے  
ہوئے ایک ریلے میں بے چارہ ایک جھکا کر کھٹکا تھا؟ گندے پانی  
بڑی بہت والا "جھکا" تھا۔ اپنی ہی کوشش کرتا ہی رہتا تھا۔  
بو جھل جھل سے کہا "بہر حال۔ جو کچھ ہو بہت بڑا ہوا۔"  
"میں اس کی شک ہے۔" وہ گمری سانس لے کر بولا "جی  
طرح ایک جھوٹ کو بھاننے کے لیے سو جھوٹ بولے جاتے ہیں  
طرح بعض اوقات ایک قتل چھپانے کے لیے مزید کئی قتل کیے  
پڑتے ہیں لیکن لوہر مال خود قاتل کا سراغ دیتا ہے۔ صورت حال  
بڑی مایوس کن ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ کٹنا  
قاتل کے قریب پہنچ رہا ہوں۔"

"کبھی کبھی خوش گمانی میں جھٹا ہوتا بھی اچھا ہوتا ہے۔ میں نے  
سے ہجرات کروں گا۔ شاید ہمیں ایک بہت ضروری ملاقات  
پڑے۔" میں نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر  
"کوئی اور بات جو تمہیں اہم خاص یا عجیب لگی ہو؟"  
"ہاں۔ ایک بات عجیب لگی۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے  
بولا "وادجہ پرویز کے بیڑ ٹیک میں ایک سیاہ برقع موجود تھا جب کہ  
وہ برقع نہیں پہنتی تھی اور قتل کے وقت بھی وہ برقع میں نہیں  
تھی۔"

"اچھا۔؟" میں نے لیے میں نے دلچسپی کا اظہار کرنے کی کوشش  
کی "وہ تمہارے خیال میں اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟"  
"میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وادجہ پرویز  
سے خفیہ ملاقات کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی۔ اب میں  
نہیں کہہ سکتا کہ وہ ملاقات ہو چکی تھی یا ابھی ہونا تھی۔"  
ایک لمبے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ  
خیال درست ہو۔ بہر حال۔ اگر اس مسئلے میں کچھ پیش رفت  
مجھے ضرور بتانا۔ میں بھی ایک ٹریک پر کام کر رہا ہوں۔" میں نے

شہادت اس کی طرف مرکوز رہنے دیے۔ اس نے پولیس کی تلاش جی دور کرنے اور صحیح سمت میں اس کی رہنمائی کرنے کی کوئی ذرا سی بھی کوشش نہیں کی۔ میں چونکہ اب ان لوگوں کی وراثت کی پیروی نہیں کرتا اور پرنس اعظمی کی صورت حال سے اچھی طرح واقف تھا اور کاہن باری دنیا کے بچہ دہم سے بھی آشنا تھا اس لیے رفتہ رفتہ احمد پڑنے کے اس بد عمل کی وجہ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

آخر کار میں نے اپنے آپ کو افسردگی کے خول سے نکالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب حرکت میں آنا ضروری ہو گیا تھا تاکہ ذہن پر چھائی ہوئی دھند کچھ بھٹ سکتی۔ سب سے پہلے مندر منیر کے گھر کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس کا ڈسٹریکٹ کاؤڈ میرے پاس موجود تھا۔ اس نے ایک مرتبہ درخواست بھی کی تھی کہ میں کبھی اس کے گھر پر اسے "شرط ملاقات" بخشوں۔ عین ممکن تھا کہ گھر پر اس سے بھی ملاقات ہو جائے۔ اس وقت اس سے ملاقات کرنا زیادہ سو مند ثابت ہو سکتا ہے۔ کچھ عہد نہیں تھا کہ وہ تین نو جوان بھی اس وقت اس کے گھر پر ہی موجود ہوتے جنہوں نے نازک کر کے واہدہ اور اس کے ذرائع پر ہلاک کیا تھا لیکن اگر وہ میرے سامنے آجائے تب بھی میرے پاس انہیں پہچاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کہ وہ واقعی وی نو جوان تھے۔ تاہم میں کچھ اندازے ضرور لگا سکتا تھا۔

مندر منیر کا مکان ہی پہلے تو میرے اندازوں سے بہت مختلف ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چھوٹا سا کوئی ماڈرن بنگلا ہو گا لیکن وہ پرانے فنکشن کے علاقے میں واقع ایک پرانا اور عریض عریض بنگلا ثابت ہوا جس کے احاطے میں بڑا بڑا گھر سے تھے اور ان کی بالائی جزیں کسی ساوہری جہاؤں کی طرح زمین پر پھیلی ہوئی تھیں۔ لکڑی کا پرانا سا خوردہ گیت چوٹ کھا تھا جیسے کینوں کو اس دور میں بھی چوری ڈاکے وغیرہ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ شاید ایسا اس لیے کہ کین خود نہ جانے کیسے خطرناک ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کا۔ سردار تھا۔

لان کی گھاس بھاڑ بھٹکا ڈکی طرح بڑھی ہوئی تھی۔ درختوں پر جوں میں چھپے ہوئے نہ جانے کس کس نسل کے پرندے وقفے وقفے سے چھڑا رہے تھے۔ ساتھ وہ چوٹی گیت پر صرف نمبر کی پرانی سی محنتی توہراں تھی۔ کوئی نام وغیرہ نہیں تھا۔ وہ ادوں پر سیاہی مائل گائی سی جی ہوئی تھی۔ دیکھتے میں یہ بنگلا آجیب ذہ سا تھا لیکن اس کی مارکیٹ ویلو کا اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر کسی بھی بلڈر کے منہ میں پانی آسکتا تھا اور وہ فوراً ہی اسے زمین ہوس کر کے اس کی جگہ دس بیس حوطہ عمارت بنانے کے منصوبے تصور ہی تصور میں شروع کر سکتا تھا۔ صرف اس کی زمین ہی کہہ ڈول کی مالیت کی تھی۔

میں نے احتیاطاً گاڑی باہر ہی چھوڑ دی حالانکہ ڈرائیو وے بہت دیر تھا۔ اس میں مجھے مندر منیر کی کیوں کی چھت والی سرخ

ہے اٹھادسے دسایتر سجھا۔ ہم شش کر کہ وہ نرک جنس مجھ سے دور نہ لے جائے۔ اس نے خوار کرنے والے انداز میں کہا اور سلسلہ متعلق کر دیا۔

میں اس کے بعد پرنس کی ملاقات میں الجھا رہا۔ واہدہ کی امانی موت کی خبر نے واقعی دل پر بھل کر دیا تھا۔ اب میں ایک پلو پر بھی غور کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میرا کے قتل سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ جن لوگوں تک پہنچا جا رہا تھا شاید وہ اتنے فراہم نہیں تھے جتنے میں سمجھ رہا تھا۔ مرعوب نہ ہونا میں نے اپنی بات بتائی تھی اور اگر کوئی فرد گروہ یا نوا لفظ کا رتھا، خبیث تھا تو پر خدوہ وہ کتنا ہی خطرناک تھا، میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں خود آگے بڑھ کر بھی بلا سبب اس سے الجھنے میں کوئی خوف نہیں کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ میری یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی ہوئی تھی کہ سچائی کی طاقت میرے ساتھ ہے لیکن آج میں پہلی بار سوچنے پر مجبور ہوا کہ کہیں میں غیر ضروری الجھنیں تو مول نہیں لے رہا تھا؟ کہیں میں مانیائی لوگوں کو بہت سی گھڑیاؤں سے تو نہیں مانے لگا تھا؟ مانیائی نے تو ان ملکوں میں ہی مذہب معاشرے کو ناکوں پہنے پزار کے تھے جہاں قانون کی عمرانی تھی۔ ہمارے ہاں تو صورت حال اور بھی اتر تھی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں تو مانیائی خواہ کتنی ہی طاقتور سی لیکن بر حال مانیائی کی کلائی نہیں اور قانون ان کی بیخ کنی کے لیے اپنی سی کوشش کرتا رہا تھا۔ ہمارے ہاں تو سلسلہ اور بھی گہیر تھا۔ مانیائی نے اپنے پورے طرح کے خول چڑھا رکھے تھے اور وہ کلی نظام میں دھکیل گئے تھے سوچ لینا چاہیے تھا کہ کہیں میں اپنے لیے اتنی پریشانی اہل نہیں لے رہا تھا جس سے منسا میرے لیے مشکل ہو جائے؟

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھا یا کہ ایسی مادی سی دلیل غلطی کا مقام بھی نہیں آیا تھا کہ میں اس قسم کے سوالات پر غور کرنے لگا۔ ابھی تو میں نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طاقت کو پوری طرح انکشاف نہیں تھا۔ ہم میں اتنا دم خرم تو موجود تھا کہ اچھی خاصی بڑی چیزوں کا مقابلہ کر سکتے۔ ابھی تو ہم پر کوئی ایسی قابل ذکر آزمائش نہ پڑی تھی۔ میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم بلاطہ یا بلا واسطہ الجھ چکے تھے انہیں اب سنی سکھا ضروری تھا۔ معاشرے کے پاسور تھے۔

اپنے اس فیصلے پر طمانیت محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک دیگر آج صورت حال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں اتنا۔ واہدہ پر روزے بنے جو انکشاف کیا تھا اس سے ایک بڑا مسما ل ہوا تھا لیکن اب اس کے اپنے قتل نے ایک بڑا سوالیہ نشان ڈال دیا تھا۔ میں نے اس لمحے پر بھی بہت غور کیا تھا کہ جب اس نے اپنے شہر کو تباہ کر سیرا کا قابل مندر تھا تو اچھ روز نہ صرف وہ غلامی رہا بلکہ اس نے اپنی بیوی کو بھی زبان بند کرنے کی جتنیں لیا اور پولیس کو کاروان دانش ی کی تلاش میں بھٹکنے دیا۔ تمام

تھے

گازی بھی کھڑی دکھائی دے گی۔ اس کی بھت اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی دیکھنے میں تو چھٹی سی تھی لیکن یہ فوراً کا ایک منگ اور اسپورٹس ماڈل تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مندر اچھی خاصی موٹی اسائی تھا اور نیچے ذوق رکھتا تھا۔ دیکھی تو میں نے صرف اس کا مکان اور گاڑی ہی دیکھی تھی جو بھی کو نظر آجائے والی چیزیں تھیں۔ ابھی اس کے خلیہ اٹاٹوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا اور وہ اٹاٹے کن ذرائع سے بنے ہوں گے اس سلسلے میں تو کچھ کمات ہی شکل تھا۔

ذرائع دے میں مجھے کوئی دوسری گاڑی یا موٹر سائیکل دکھائی نہیں دی البتہ برآمدے کے ستون کے ساتھ ایک اچھی قسم کی سائیکل کھڑی تھی۔ شاید مندر نے ورزش کے نقطہ نظر سے رکھی ہو شاید وہ اپنے آپ کو فٹ رکھنے کا اہتمام کرتا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ سائیکل کسی نوکر دیوہ کے لیے مخصوص ہو۔ میں نے صرف دودھہ نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا کیونکہ میں ممکن تھا کسی کھڑی کسی روزن سے کوئی میرا بھی جائزہ لے رہا ہو۔ میں نے کال تل بجائی اور بظاہر بڑے مہربانوں سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ حقیقت یہ تھی کہ اندر سے میں مضطرب تھا۔ میرے اصاب مٹے ہوئے تھے اور گرد و پیش پر میری غیر محسوس انداز میں نظر تھی۔ میں پوری طرح چرکنا تھا۔ اندر آنے کے بعد اس مکان کا آسپ زدگی کا سا تاثر اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ ہر طرف پکرا کر دو غبار کے بے اور پردوں کی غلامت پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا جیسی تھا کہ اب کسی کو اس مکان کی دیکھ بھال سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

چند لمبے بعد کبڑی کا پرانا اور بھاری بھرکم دروازہ ہلکی سی جڑا ہت کے ساتھ کھلا اور اس کے عقب سے ایک چوہا طلع ہوا۔ وہ ایک ہاتھال چوہا تھا اور اس کا سامنے آنا واقعی طلع ہونے ہی کا سامع تھا کیونکہ اس آسپ زدہ سے داخل کو اس کے یک دم جگہ کا سا تھا۔ وہ یہ مشکل میں بائیس سال کی لڑکی تھی اور بے حد خوب صورت تھی لیکن یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ خوب صورت لڑکیاں تو نظر آتی رہتی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ زندگی سے بھرپور چوہا تھا۔ ابھی میری نظر چہرے سے نیچے نہیں گئی تھی لیکن زندگی کی اس بھرپور مثالی کشش اور ہنگ نے گویا آنکھوں کو امیر کر لیا تھا۔ چلبلاہن گویا صرف اس کی آنکھوں سے ہی نہیں امید و شہد و شہد فریاد چہرے کے ہر حصے سے پھوٹا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میری نظر اس کے چہرے سے نیچے چلتی وہ میرا سر تاپا جائزہ لے چکی تھی اور اس کی آنکھوں کا چلبلاہن کچھ بڑھ چکا تھا "جی" فرمایا "اس کی تواز سے بھی گویا کسی کا اعتبار پھوٹا رہا تھا لیکن میں نے کچھ فرمائے سے پہلے اس کا سر تاپا جائزہ لے لیا میرا سمجھا۔ چہرے سے نیچے اس کی شخصیت گویا مزید صبر آزا ہوئی چلی گئی تھی۔ چہرے سے وہ صرف میں بائیس سال کی لکھی تھی لیکن اس کے بھرپور ضد خال گویا عمر کی ان حدود سے آگے نکل گئے

آخر میں نے ایک لٹری سانس لے کر پڑ سکون لیے کھینچا

"جی ہاں۔" اس نے طائل جواب دیا۔ اس کی غمیر چہرے سے نہیں ہٹ رہی تھی اور وہ گویا ایک بے آپ نہی کو شکل سے اپنی آنکھوں اور دونوں کے فکس میں قہر کے جھلک تھی۔ پہلے مجھے گلاں گزرا کہ شاید وہ اس بات سے غصہ ہو رہی تھی اور دل ہی دل میں میرا مذاق اڑا رہی تھی کہ میں نے بہت کمزور نظر ہے اس کا جائزہ لیا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ ایسا بات نہیں تھی۔ نظروں کی اس محنت سے تو شاید وہ لطف اندوز ہونے لگی اور مجھ سے کہیں زیادہ گہری نظروں سے خود اس نے میرا جائزہ لیا تھا۔ شاید اس طرح ملنا دیکھنا اور بات کرنا اس کی عادت تھی اس کا اسٹائل تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی عادت کا اسٹائل تھا تو بہت بڑے کے لیے بہت چار کن ثابت ہو سکتا تھا اور شاید خود اس کے اپنے لیے بھی۔ لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہر ایک کے ساتھ اس کا یہ انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور جگہ اور چلبلاہن اپنی جگہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے پناہ چالاکائی بھی دکھائی دے تھی۔ وہ کم ضرر ضرر تھی لیکن بے وقوف ہرگز نہیں تھی۔ شاید کچھ زیادہ ہی چالاک زیادہ ہی تیز و طرار تھی۔ وہ لمبے سے ایک سیکی لٹا لٹا رہے میں تھی جو ذھیلا ڈھالا ہونے کے باوجود اس خسیب و فرازی حشری کی چھپانے میں ناکام تھا۔ اس پر سامنے طرف دل کی تل کی دو سیسیں لگی ہوئی تھیں۔ اب اس نے اپنے خوب صورت ہاتھ اپنی جیبوں میں ٹھونس لیے تھے۔

"کیا وہ گھر پر ہیں؟" میں نے طانت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے پہلے ہی کی طرح متیہ تھی سے کھنکی تو میں جواب دیا۔

میں نے اپنا ذہننگ کارڈ نکال کر اس کی طرف چلبلاہن سے کہنے میں ان سے لئے آیا ہوں۔

اس نے کارڈ اندر لے جانے سے پہلے وہیں کھڑے کھڑا پہلے خود بڑے خود سے اسے بڑھا اور گویا ایک نئے زاویہ حرکت میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک چمک تھی۔ اس نے اندر جا کر مندر سے پوچھا بھی ضروری نہ سمجھا مجھ سے ملنا بھی چاہتا تھا یا نہیں؟ وہ مجھے اندر آنے کے لیے بلا کر جوڑی اور خوش خلقی سے دعوت دیتے ہوئے ایک طرف کوٹ گئی۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اصاب میں گد گدی کرنے والی خوشبو کا ایک جھوٹا میرے منتھن سے ٹکرایا۔

وہ آہستگی سے دروازے کا پوٹ چڑھانے لگی۔ اپنی سامنے کا مضبوط تالہ کلک کی ہلکی سی تواز کے ساتھ پہلے ہی بند ہو چکا تھا میں نے ایک بار پھر غیر محسوس سے انداز میں اپنی جیب میں

بہل کو جھو اور پوچھے بغیر نہ سکا۔ آپ کون ہیں؟ میں  
 بالکل یہ نتیجہ تو اخذ کر چکا تھا کہ وہ صفدر کی بیوی نہیں  
 تھی۔ بیوی تو یقیناً کیے بیٹھی ہوگی۔ اس سے طلاق کی  
 دانی چل رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اتنی کم عمر  
 نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے بڑے مصوم سے انداز میں ایک ادھلی  
 لپکا لپکے کے عالم میں سر کھینچا پھر جیسے دل ہی دل میں فیصلے پر  
 بڑے جلدی سے بولی "تم میں صفدر صاحب کی خادمہ ہو۔۔۔  
 تم کی ملازمہ ہو۔۔۔ گھر کے کام کاج وغیرہ کتنی ہو۔۔۔"  
 بہت خوب۔۔۔! میں نے بے اختیار کہا اور سناٹا انداز  
 سر ہلایا۔

میں نے کیا میں ملازمہ کے طور پر ٹھیک نہیں ہوں؟ اس  
 اپنے سرایا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا اپنے آپ کو  
 نے کے لیے پیش کیا۔ اس دوران میں وہ ضرورت سے کچھ  
 ہی قریب کھڑی تھی۔

میں نے نہیں۔۔۔ تم تو کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہو۔ میں نے سر  
 زور دل میں سوچا "جس گھر میں تم جیسی ملازمہ ہو وہاں بیوی کی  
 کیا ضرورت اور اہمیت رہ جائے گی؟" صفدر نے شاید بیوی سے  
 ملنے کے فوراً بعد ہی یہ بندوبست کر لیا تھا اور اس دوران میں وہ  
 اس سیرا جیسی چیز کو بھی گھیر چکا تھا۔ غیبت بہت ہی اونچے  
 بے کافرا مظلوم ہوا تھا۔

میرا خیال ہے جس وقت صفدر کی بیوی اس کے ساتھ رہتی  
 اس وقت تم اس گھر میں نہیں ہوگی؟ میں نے پوچھ لی۔  
 وہ ت پر ہاتھ رکھ کر شرر سے انداز میں دھیرے سے ہنسی  
 کی گھر میں بیوی موجود ہو وہاں مجھ جیسی خادمہ کیسے رکھ سکتی  
 ہے؟ آپ خود ہی سوچیں سرا۔

میں نے تقیسی انداز میں سر ہلایا۔ ہم بال کے گلے سے  
 دھیرے میں دروازے کے قریب ہی رک کر باتیں کرنے لگے  
 تھا۔ اسے بھی جیسے اندر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور میں گویا  
 ناکے لیے تھا۔ اجنبی نہیں تھا۔ میرے دلچسپ نگاہوں نے تو گویا  
 لپک لپک زیادہ ہی جاو کا سا اثر کیا تھا۔ اس کارڈ سے میری  
 انسانی طبیعت کا کافی حد تک اندازہ ہوتا تھا اور شخصیت اس  
 کے سامنے ہی تھی۔

وہ تھا اندر سے ایک خاد زہ عمرز کراتی ہوئی سی آواز ابھری  
 آواز آیا ہے کئی؟

میں نے صفدر کو متعلقہ آواز میں بات چیت کرتے سنا تھا  
 لیکن اس وقت بھی میں نے پہچان لیا۔ یہ صفدر کی ہی آواز تھی۔ وہ  
 غصے میں مظلوم ہوا تھا۔ کئی یقیناً کی ہو چکی اور جب خادمہ بھی جو  
 اس وقت نہایت اطمینان سے مجھ سے ہم کام تھی۔ کئی سال اس  
 کی تربیت یا بارگاہ کام تھا اور بہت مناسب تھا۔ لوگ عام طور پر بلی  
 لاتی کہہ کر مارتے ہیں۔ وہ بھی ایک خوب صورت بلی ہی مظلوم

ہوتی تھی جس میں زندگی کی توانائی کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی تھی۔  
 غلط میں شاید وہ خوشنوار بھی ثابت ہوتی ہو۔

وہ وہیں کھڑے کھڑے بے آواز بلبلے ہوئی "ایک بہت معزز آدمی  
 تم سے ملنے آیا ہے۔ میں اسے تمہارے پاس لا رہی ہوں۔"

یہ میں نے پہلی خادمہ دیکھی تھی جو عمر میں اپنے سے بڑے  
 مالک کو "تم" کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ خوب۔ یہ کوئی اہم بات  
 نہیں تھی۔ وہ تو یقیناً ہر اعتبار سے ہی ایک انوکھی خادمہ تھی۔

وہ راز دارانہ سے انداز میں میری طرف جھکی تو مجھے اس کے  
 وجود سے ملک کے ساتھ ساتھ خفیف سی حرارت بھی پھونتی  
 محسوس ہوئی۔ اس نے مجھے نیچی آواز میں مطلع کیا "صفدر صاحب  
 اس وقت "فصل" کر رہے ہیں اور میں ان سے پوچھے بغیر ہی آپ  
 کو ان کے پاس لے جا رہی ہوں لیکن امید ہے وہ بڑا نہیں متائیں  
 گے۔ میرے ساتھ آئیے۔"

اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور میں اپنے حواس کو  
 سنبھال کر اس کی رہنمائی میں چل دیا کہ وہ کسی بھی طرح رہنمائی کی  
 اہل مظلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو راست بھلانے والوں میں سے تھی۔  
 وہ سیدھا مجھے طویل و عریض لاؤنج میں لے گئی جہاں صفدر ایک  
 صوفے پر نیم دراز تھا۔ "اچھا، میں اس کے تپائی پر نکلتی ہوئی  
 تھیں۔ تپائی پر بولتے گا اس آگسٹے وغیرہ موجود تھی۔ سگریٹوں  
 کا ٹیف و حواں بھرت سے فرش تک پھیلا محسوس ہو رہا تھا۔ گوکہ  
 اتنے بڑے لاؤنج میں وہ اکیلا ہی بیٹھا رہا تھا اس کے باوجود وہ سکی  
 اور سگریٹوں وغیرہ کی بو سے مجھے کچھ یوں لگا جیسے کسی مٹھی مالک  
 کے پُر جھرمبہ میں کھس آیا تھا۔

صفدر نے سرخ سرخ آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ وہ  
 چیز اور نئی شرٹ میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہرے پر دھشت  
 تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں  
 میں سگریٹ سلگ رہی تھی۔ وہ مددے میں نہ جانے کتنی اغماز پکا  
 تھا لیکن پوری طرح حواس میں مظلوم ہوا تھا اور مجھے دیکھ کر تو شاید  
 اس کے حواس کچھ اور تیز ہو گئے۔ وہ گلاس رکھ کر اٹھا اور بڑے  
 احترام و عقیدت سے جھکتے ہوئے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں قیام  
 کر لیا۔

"فصل صاحب۔ افضل صاحب۔! یہ آج اچانک میرے  
 نصیب کیسے جاگ اٹھے۔" وہ عاجزی سے بولا۔ اس کی آواز غار  
 زدہ ضرور تھی حتیٰ کہ اس میں بجلی سی تلاپت بھی آتھیں تھی لیکن وہ  
 بکا ہوا تھا نہیں تھا "آپ نے بغیر اطلاع یوں اچانک ڈاکر بھیج  
 سنوں میں مجھے سرانزدہ ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکا تھا کہ  
 کبھی آپ اچانک یوں میرے قریب خانے پر تشریف لائیں گے۔"  
 اس نے بڑے اصرار سے مجھے اپنے قریب ہی مٹنے پر  
 بٹھایا۔ وہیں اس کا موبائل فون بھی پڑا ہوا تھا۔ وہ اس نے اٹھا کر  
 تپائی پر رکھ دیا اور پوری محبت سے مجھ سے مخاطب ہوا "کیا پلے کا؟  
 اسکاچ۔ جس۔! واڈا کسا؟ اس وقت گھر میں تین موجود

ہیں۔

”شہر ہے۔ میں پتا نہیں ہوں۔“ میں نے ذرا خشک ہجے میں کہا  
”تو جانے کس طرح میں یہ شوق پالنے سے بچ گیا۔“  
اس نے ایک عجیب و غریب دشت زدہ ساقیہ لگا اور میرے گھنے  
پراچہ مار کر بولا ”اے افضل صاحب! شربانے یا کھانا میں  
پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ مجھے دوستوں کی طرح سمجھیں تو  
یہ میرے لیے ایک اعزاز ہو گا اور دوستوں میں اس طرح کا کھلف  
نہیں پہلے۔ خصوصاً ہمارے طبقے میں۔“

وہ اس وقت خامسا بلا ہوا لگ رہا تھا۔ یہ وہ دھیمہ مذہب اور  
وضع دار نظر آنے والا حضور نہیں تھا جس سے میں ملا تھا۔ وہ حواس  
میں غرق تھا لیکن حرکات و سکنات سے ظاہر ہونے والی ایک عجیب  
سی دشت تباری تھی کہ اکھل کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور تھا۔ کہیں وہ  
کچھ بھلانے یا اس وقت ذہن کی طرف سے ہٹانے کے لیے تو اس  
طرح سو کر اسے ماحول میں بیٹھا نہیں لی رہا تھا؟ میں نے کمری نظر  
سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ”اگر کچھ شوق ہو تو تو میں ذرا بھی  
کھلف نہ کرتا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں کھلف کی کیا ضرورت  
ہے؟ میں واقعی بالکل بھی پینے پلانے کا عادی نہیں ہوں۔“

”بہت عجیب بات ہے!“ اس نے بے چینی سے سر ہٹا کر اس  
وقت کئی ایک بار پھر دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے سامنے کھڑی کچھ  
عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ حضور اس  
سے مخاطب ہوا ”اے احمق لڑکی! افضل صاحب آئے ہیں۔ ان  
کی کچھ خاطر مدارات کہہ دیجئے معلوم نہیں ہے یہ بہت بڑے آدمی  
ہیں۔“

”مجھے معلوم ہو چکا ہے۔“ اس نے میز اوپر ٹنگ کارڈ انگلیوں  
میں محماتے ہوئے اسے دکھایا ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں  
ان کی کیا خاطر مدارات کروں۔ اوپر کمرے میں لے جاؤں  
انہیں؟“

”حق۔۔۔ الو کی چٹکی!۔۔۔“ حضور نے گویا اسے سمجھ کر مارنے  
کے لیے ارعاد کر کوئی سوزن چڑھا رکھی تھی جو اسے نہیں ملی۔ کئی  
نے اس دوران میں اپنی جگہ سے ہنسی نہیں کی۔ ایک لمحے کے بعد  
حضور برقی سے بولا ”بہت سی بے ہودہ ہوتی جاری ہو تمہیں۔ تمہیں  
تو اس کے سوا کچھ سوچنا ہی نہیں ہے افضل صاحب کے لیے  
کھانے پینے کے لیے کچھ تو لاؤ۔“

”مجھے بس ایک کوٹھڑیک لاؤ۔“ میں نے دھیمے ہجے میں کئی  
سے کہا اور وہ بچن بچن چلی گئی۔

”بہت کمال کی ملازمہ ڈھونڈی ہے آپ نے۔“ میں نے بچی  
آواز میں کہا ”میں نے آج تک کسی گھر میں ایسی ملازمہ نہیں  
دیکھی۔“

”ملازمہ کیا ہے جی۔۔۔ بس۔۔۔“ اس نے متوجہ نہ ہو کر  
ساتھ جملہ ادھر ادھر پھوڑ دیا ”اس کی مہمانی ہے کہ گھر سنبھالے  
ہوئے ہے۔ سوزن نہ ہو تو کوئی کام نہیں کرے گی۔ آپ کو پہنچے تو

آپ لے جائیگی۔“

اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے گھر میں رکے ہوئے کسی گھر  
یا ایٹل زبے کا ذکر کر رہا ہو جو اس کے کسی معزز سمان کہنہ لگا  
ہو۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا ”اسے سلام  
ہو گیا ہے کہ آپ ایک دولت مند آدمی ہیں۔ دیکھو اور وہ ان کی  
ہیں۔ وہ بڑی خوشی سے آپ کے ساتھ چل دے گی۔ اس کی زندگی  
کا واحد مقصد زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا ہے۔ اس کا کتا ہے کہ  
جو کھا اس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی کہ اس کی باقی زندگی میں  
و آرام سے گزر سکے تو یہ امرکا چل جائے گی اور وہیں کہیں سیکر  
ہو جائے گی۔ لوگ دولت کمانے کے لیے امریکا جانا چاہتے ہیں۔ یہ  
دولت خرچ کرنے کے لیے امریکا جانا چاہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ  
اگر یہ ہمیں پینتیس سال کی عمر سے پہلے پہلے اپنی مطلوبہ دولت کے  
ساتھ امریکا پہنچے میں کامیاب ہو گئی تو اس کے حلقہ احباب میں  
آئے والے بہت سے امریکیوں کو بھی دلائل پیشے آجائیں گے۔“  
میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا تو وہ بولا ”آپ نے  
میری فراخ دلانہ پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا۔“

”مجھے ایسی لڑکیوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں جنہیں ڈیکوریشن  
فیس کی طرح ایک گھر سے اٹھا کر دوسرے گھر میں رکھا جاسکا  
ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”دیری گنس۔۔۔ دیری گنس۔۔۔“ اس نے سناٹھی انداز میں سر  
ہلایا۔ دفعتاً اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون  
اٹھایا اور جن دبا کر کان سے لگایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ذرا عجیب سے  
بولا ”میں اس وقت تم سے بات نہیں کر سکتا۔ میرے پاس مہمان  
بیٹھے ہیں۔“

میں گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے  
محسوس کیا کہ اس کے چہرے کے خطوط میں تاؤ جھک آیا تھا۔ چہ  
یکٹھ اس نے کچھ سا پھر قدرے جھجھکاتے ہوئے سے انداز میں بولا  
”میں نے کہا تھا کہ اس وقت میں بات نہیں کر سکتا۔“ اس نے فون  
نہ صرف بند کر دیا بلکہ ڈس کنیکٹ بھی کر دیا۔ اب اس پر کوئی آ  
ی نہیں سکتی تھی۔

اس نے گلاس میں پانی ہلکی ہلکی ایک سی سانس میں مٹھ  
میں اڑی لی اور قدرے معنوی سی مسکراہٹ ہو سنوں پر چائے  
ہوئے میری طرف جبکہ کروڑا دارانہ سے انداز میں بولا ”میں تو گنا  
کروں گا کہ آپ گھرانہ نعت کر رہے ہیں۔“

”کس کا ذکر کر رہے ہیں؟“ ہلکی کایا کئی کاہ۔ میں نے وضاحت  
چاہی۔

”دونوں کا۔“ وہ آنکھ دبا کر بولا۔

”میری طرف سے بھی آپ ہی ان دونوں نصیحتوں سے لطف  
اندوز ہوتے رہیں۔“ میں نے کہا۔

اس نے ایک غبار زدہ ساقیہ لگا اور اپنے لیے گلاس میں  
میزہ اڑا لیتے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ہلکا سا رتھاش تھا۔ میں نے

”اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ آپ صورت سے کیا نظر آتے ہیں تو فی الحال اسے رہنے دیجئے۔ اس کا جواب میں آنکھ کسی ملاقات پر دوں گی جب ہمارے درمیان اس سے زیادہ بے تکلفی ہو جائے گی۔“

”تمہیں امید ہے ہمارے درمیان اس سے زیادہ بے تکلفی بھی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ انسان کو مستقبل سے بیشہ امیدی میں رکھی جاتیں۔“ وہ ایک آنکھ دارا ہاتھ ہوئے بولی ”ویسے میں آپ کے سوال کا جواب بہر حال دے دیتی ہوں۔ یہاں جو لوگ آتے جاتے رہتے ہیں ان میں زیادہ تر دوسرے شہروں سے آنے والے مفرد صاحب کے کا دیواری شناسا اور دوست وغیرہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار بارہ سے بھی کوئی باہلی آجاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا مفرد صاحب کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔“ میں نے دیکھے بے میں کہا۔ وہ علائکہ میرے ہی سوال کا جواب دے رہی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھے باتوں میں لگائے رکھے اور میرا دھیان بنائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اسی لمحے اس نے جو سوال کیا اس سے میرے ذہن کو تعقیرت ملی۔

”کیا آپ شادی شدہ ہیں؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہائے اللہ! اتنی اچھی بات ہے۔“ اس نے یوں بے اختیار آئی بجا کر دونوں ہاتھ سمجھ لے جیسے بہت سی دلچسپ مزیدار اور خوشی کی خبر سننے کو ملی ہو۔

”اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔

”یہ بہت پوچھیں۔ یہ بات بس مجھ تک ہی رہنے دیں۔“ وہ بڑی ترنگ میں بولی۔

”کیا تمہیں غیر شادی شدہ مرد سے مل کر ای طرح خوشی ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب میں اتنی بھی گری پڑی نہیں ہوں کہ ہر ایک سے ملتی اور اس کے غیر شادی شدہ ہونے پر خوشی کا اظہار کرتی پھروں۔“ وہ ایک دم ہی یکہ اڑی گئی۔

اسی اثنا میں مفرد لوٹ آیا۔ میں اس وقت کولڈز ریک کی چٹکیاں لے رہا تھا۔ موبائل فون مفرد کی جیب میں تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی یکہ اور بیڑھ چکی تھی۔ وہ ایک بار پھر میرے برابر بیٹھتے ہوئے بولا ”اور سنا لیجئے۔ آج آپ نے کیسے اس خادم کے گھر تک آنے کی زحمت کر لی؟“

”میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ یکہ دیر پہلے ہی مجھے ایک بڑی خبر ملی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ خبر آپ کو بھی سنانا چلوں۔ علائکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ انسان بولی بار بھی کسی کے گھر جائے تو بڑی خبری لے کر جائے۔“ میں نے دیکھے بے میں کہا۔

مفرد نے جواباً یکہ بولنے سے پہلے کئی کی طرف دیکھا اور وہ

ایک فون آنے کے بعد سے اس کا ذہن کہیں اور چلا گیا تھا۔ ”کار کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کی توجہ مجھ پر نہ آخروہ نہ نہ سکا۔ مزید ایک لمحوں بھر کر ایک اعلیٰ ہوئے مفردت خواہانہ انداز میں بولا ”میں ابھی آیا۔“ وہ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک بار پھر وہ دم میں چلا گیا لیکن عجیب بات تھی کہ وہ ہاتھ بھی اپنا موبائل فون ساتھ لے جاتا نہیں بھولا تھا۔ اس نے ہی کچھ دیر کی ایک خوب صورت ٹرے میں کولڈ ڈرنک اور دیگر بڑے سلیٹے اور فاسٹ کے ساتھ نشوونما وغیرہ لے کر آئی۔ گلاس میں برف کی کیوبس بھی تھیں۔

”کچھ چیزیں بنا کر ٹرے رکھنے لگی تو میں غور سے اس کی دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص شراب انداز میں مسکرائی۔ ہنسی کی طرح اس کے دوا میں موم سے پھوٹ رہی تھی ”کیا ہے؟“ وہ ٹھنکائی آواز میں بولی ”اچھی طرح دیکھ لیں۔“ وہ ہلک گئی۔

”خدا قسمی عجیب چیز ہو۔“ میں نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا۔ اس میں کیا شک ہے۔“ وہ سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بڑی باتوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی ”مجھ جیسی چیزیں موزا نہیں ہوتیں۔“

دوا والوں کے حق میں یہ اچھا ہی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی لے کر کما بھرا اپنے سنتائے ذہن کو کسی اور طرف لگانے کا مصلحت حاصل کرنے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس گھر میں صرف تم دونوں ہی رہتے ہو؟“

”ہاں۔ ہم دونوں جس قسم کے انسان ہیں اس لحاظ سے تو مل کر رہنے کے لیے ہم ہی کالی ہیں۔“ وہ شوخ بے میں بولی۔ ”کیسے سنا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ اس کی بات کے بہت دم نکلے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”لیکن یہاں دوسرے لوگ بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا گاہر ہے۔“

”آج لوگ؟“ میں نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”اب کیا یہاں جاسوسی کرنے آئے ہیں؟“ اس نے بلا تکلف کہا ”آخری انداز ایک لمحے کے لیے گھبرا گیا لیکن میں نے غلامی نہیں ہونے یا اور جو الی حملہ کیا ”کیا یہاں ایسی کوئی بدشگونی کی جاسوسی کی ضرورت پیش آئے؟ اور کیا میں تمہیں نہ کوئی جاسوس نظر آتا ہوں؟“

”پہلی کے قاش تو میں بہت ہی چیزیں ہیں۔“ وہ بدستور بولی ”ایک تو میں ہی ہوں جس کی بہت زیادہ جاسوسی ہے۔“

”لہذا اس میں تو شک نہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

گویا اس کا اشارہ کئے ہوئے فوراً وہاں سے چلی گئی۔ مندر میرا  
 ہو کر بیٹھے ہوئے گلاس جھیل کر زرا تشویش سے بولا "میری خبر؟"  
 کسی بھی خبر؟ اپنی زندگی تو اب گویا ہری خبریں سننے کے لیے ہی  
 وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ بھی سنا دیکھئے کوئی ترغیب نہیں۔"  
 "واحدہ پرویز کو آج میں موٹر سائیکل سواروں نے گولی مار  
 دی۔" میں نے کہا۔

"کب؟ کہاں؟ کیوں؟" وہ ہری طرح چونک کر ابھیں  
 پچھلے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ اگر یہ ایکٹنگ تھی تو  
 بلاشبہ بہت عمدہ ایکٹنگ تھی۔ اور میرے خیال میں یہ ایکٹنگ ہی  
 تھی۔ اگر کوئی شخص اتنی پینے کے بعد بھی ایسی ایکٹنگ کر سکتا تھا تو وہ  
 یقیناً داد کا مستحق تھا۔ مجھے اس واقعے کے بارے میں جو کچھ راجم  
 محل سے معلوم ہو سکا تھا وہ اس کے گوش گزار کرنا پڑا اور یہ خاصا  
 مہر آزار کام تھا۔ جب آپ کو معلوم ہو کہ سامنے والا آپ سے  
 زیادہ جانتا ہے لیکن انجان بن کر پوچھ رہا ہے تو اسے کچھ بتانے کے  
 لیے دل پر خاصا جبر کرنا پڑتا ہے۔

"اگر خدا یا! سب کچھ سن کر اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ  
 چھپایا اور مرتضیٰ تو از میں بولا "یقین نہیں آتا۔" میں تو افسار  
 افروسی کے لیے بھی نہیں جاسکتا۔ احمد پرویز تو میری صورت دیکھتا  
 بھی گوارا نہیں کرتا۔ بہر حال۔۔۔ واحدہ انجی عورت تھی۔ میں  
 اسے برسوں سے جانتا تھا۔" اس نے ہلکی سی سی۔  
 "میری عورت تو پر نس میرا بھی تھی۔" میں نے گویا یونانی  
 پر سہیل تذکرہ کیا۔

"جی ہاں۔" اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے میری  
 طرف دیکھا "بلاشبہ وہ بھی بہت اچھی عورت تھی۔ بھر بھی۔۔۔  
 واحدہ کسی اور انداز میں ابھی تھی۔ وہ میرا سے بہت مختلف  
 تھی۔ معلوم نہیں اکثر اچھے لوگ اس دنیا سے اتنی جلدی کیوں  
 چلے جاتے ہیں۔"

"یہاں پہنچ سہلے جاتے ہیں۔" میں نے کھڑا کیا "اور غیبت و  
 شیطان صفت لوگ اپنے چوں پر نہ جاتے کتنے چہرے بجائے بہت  
 لمبے عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ آپ کچھ کہہ رہے ہیں۔" اس نے میری آنکھوں  
 میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی حیرت لگی تھی۔ معلوم  
 نہیں یہ غبار کے باعث تھی یا اس نے اپنی اداکاری میں حقیقت کا  
 رنگ بھرنے کے لیے کسی طرح آنسوؤں کی چھلی سے "برآمد" کی  
 تھی پھر اس نے نئی سکرٹ ملکانے کے لیے سکرٹ کا پکٹ اٹھایا  
 مگر وہ خالی تھا۔

"جی! اس نے ہانک لگائی حورا میرے پیٹھ سے سکرٹ  
 توڑ۔"

مگر کسی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ چپے مگر میں ہی  
 نہیں تھی۔ مندر کو شاید سکرٹ کی طلب شدید تھی۔ وہ پڑھایا  
 "ایک تو یہ ان کی بچی پر تھوڑی دیر بعد نہ جانے کس جانب ہو جاتی

ہے۔" یہ کہہ کر وہ خود اٹھ کھڑا ہوا اور معذرت کر کے سرگرمی  
 چلا گیا۔ دفعتاً میری نظر اس جگہ پر پڑی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں  
 صوفے کے پٹے اور بچے کے کٹن کا جوڑ تھا وہاں مجھے کسی جھلکی  
 چیز کی جھلک دکھائی دی۔ وہ اوپر بچے کے فوم کے درمیان پھنسی ہوئی  
 کوئی چیز تھی۔ میں نے ہلکے سے پکڑ کر اسے کھینچ لیا اور اسے دیکھ کر  
 میرے دل میں طمانیت کی ایک لہری دوڑ گئی۔ وہ ایک گھڑی تھی۔  
 مجھے اس گھڑی کی تفصیلی تلاش لینے کا موقع ملنے کی خوشحالی  
 امید نہیں تھی لیکن اگر مجھے ایسا کوئی موقع مل بھی جاتا تب بھی  
 شاید یہ گھڑی مجھے مشکل سے ہی ملتی جو اس وقت اپنی جگہ بیٹھے  
 بٹھائے مل گئی۔ شاید یہ ادا نہیں تھی۔ یہ گھڑی ایک اہم شہادت  
 ثابت ہو سکتی تھی اور مستقبل قریب میں کام آسکتی تھی۔ یہ ایک  
 قیمتی اور بغیر میل دانی تو بیگ گھڑی تھی جو دن اور رات بھی قابل  
 تھی۔ یہ گھڑی میں نے مندر کی گالٹی میں اس روز دیکھی تھی جب  
 پر نس میرا کے اسٹوڈیو میں پہنچا تھا اور بظاہر اس پر "مکشافہ"  
 ہوا تھا کہ میرا قتل ہو چکی تھی۔

اس وقت اس گھڑی کا بیشہ چٹا ہوا تھا اور یہ آٹھ بج کر  
 صحت پر رکی ہوئی تھی۔ پولیس سرجن نے میرا کی سوت کا وقت  
 تعیین کرنے کے سلسلے میں اپنی رپورٹ میں یہی لکھا تھا کہ اس کی  
 موت آٹھ اور نو بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ واحدہ  
 نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق اس دوران میں اسٹوڈیو میں  
 آکر میرا کو قتل کر کے باجنا تھا۔ بعد میں وہ وہاں مصوم اور افغان  
 بن کر جانے کو قہر پر پہنچا تھا۔

واحدہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے جب مندر کو میرا  
 حملہ آور ہونے دیکھا اس وقت وہ کسی چیز میں الجھ کر کراہی خاصی  
 سے اس کے اشتغال میں اور بھی افسانہ ہو گیا تھا۔ شاید یہ گھڑی  
 اسی وقت بہت دور سے کسی چیز سے کرا کر رکی تھی اور اسی لمحے  
 اسی دن "اسی وقت پر رک گئی تھی۔" مندر نے نہ تو اسے ٹھیک کہا  
 تھا اور نہ ہی اس سے نجات حاصل کی تھی۔ یہ آج بھی اسی حالت  
 میں تھی۔ شاید اس نے اسے بے پروائی سے اٹار کر پیکسنگ ٹاؤن  
 اس نے غالباً اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے خیال میں  
 ہمارے ہاں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی  
 اور وہ اپنی داستان میں صاف بچ گیا تھا۔ اب اس نے وہ سب  
 مکمل خطرے و واحدہ پرویز کا بھی مظاہرہ کرنا تھا۔ قتل کی اطلاع نہایت  
 میں تھا لیکن اسے امید ہوئی کہ وہ اپنی اس وادعات میں بھی صاف  
 بچ سکے گا۔

میں نے گھڑی جیب میں ڈال لی تھی اور ایک بار پھر  
 کونڈرک کی چپکیں لینے لگا تھا۔ اسی اثنا میں وہ لوٹ گیا۔  
 پکٹ کھول کر سکرٹ نکال چکا تھا۔ میرے قریب بیٹھ کر کہہ چلا  
 نسبت پڑ سکن لہجے میں بولا "آپ کو اس واقعے کے بارے میں کچھ  
 معلوم ہو؟" آپ کہیں افسانہ سے جاتے تو قہر کے آس پاس ہی  
 نہیں تھے۔"



”میں نے فقی میں سر ہلایا“ آپ کو معظوم ہے پولیس پکڑ کر جیم کل میرا دوست ہے میں نے اتفاق سے کسی کام سے فون کیا تو اس نے اس آواز واقف کے بارے میں بتایا۔“  
”اوہ!“ اس نے قدرے طہایت سے سر ہلایا ”کتنی دیر رہی اس سے بات ہوئے؟“

”یہاں آنے سے چند منٹ پہلے ہی ہوئی تھی۔“ میں نے راجہ دیا پھر سرسری سے انداز میں کہا ”تمہارے بچے کو اپنا ہسپتال پہنچا تھا۔ اس نے کل وہ دوسری بجے راجہ کل سے ملاقات ملے کی ہے راجہ کل بتا رہا تھا کہ وہ اپنا تفصیلی بیان دیکھا کرنا چاہتا ہے شاید وہ اپنی بیوی کے قتل کے سلسلے میں کوئی اہم بات بتانا چاہتا ہے۔“

”اچھا!“ صفور کی بھوسیں غیر ارادی سے انداز میں یک دھڑک اٹھیں۔ میں بظاہر بے پروائی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ”کل دس بجے۔“

”ہاں۔“ میرا خیال ہے یہی وقت بتایا تھا۔ میں نے کچھ زیادہ آدھے سے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ واجدہ پرویز کے قتل کی خبر سن کر مجھے جو جھٹکا لگا تھا اس وقت تک میں اس سے سنبھلا نہیں تھا۔ میں نے صفور سے فریاد نہ کی تھی لیکن میرا ہر ذہن پر زور دینے کی ایک جگہ کی ”ہاں۔“ مجھے یاد آگیا۔ پچھلے ہی وقت بتایا تھا۔ راجہ کل کہہ رہا تھا کہ احمد پرویز خود پولیس اسٹیشن آکر باضابطہ طور پر اپنا بیان دیکھا کرے گا۔ شاید اس کی بیوی نے ایک آٹھ دن پہلے ہی کوئی اہم بات اسے بتائی تھی۔ اور آج وہ ہے ہماری ماری کی۔“

میں نے آفیسر زوہ سے انداز میں کسی سانس لی۔  
”اچھا۔“ صفور نے بھوسیں اچکا نہیں پھر وہ بھی اپنے لیے یہی کچھ دیکھ سونے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ”معظوم نہیں یہ کیا پکارا رہا ہے۔ بہر حال۔ میری زندگی اور میرے مستقبل کے تمام پروگرام تو اس دن برباد ہو گئے تھے جس دن کسی عالم نے میرا جی نہیں اور زندگی لڑکی کو زندگی سے محروم کیا تھا۔“ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بولا ”میں ممکن ہے یہ واجدہ پرویز والا واقعہ درحقیقت گاڑی چھیننے کی لاش وارانت ہو۔“

”ہاں۔“ میں ممکن ہے۔“ میں نے کدھے اچکائے ”آئے لائن جانے کیسے کیسے واقعات وہ تھا ہو رہے ہیں۔“

صفور نے گلاس ہٹائی پر رکھا تھا۔ یک ایک پینے پلانے سے گلاس کا دل بھر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر تھوڑا سا بڑھ گیا تھا۔ میں نے کچھ دیر تک غم کے اٹھتے ہوئے کہا میں اب چلا ہوں۔ میں نے آپ کا کافی وقت خراب کر لیا اور آپ کو کوئی اچھی خبر بھی نہیں مل سکی۔“

”میرے نہیں جناب! یہ تو آپ کی فواہش ہے کہ آپ بھولے ہو اور انٹیک خیال کیا ہے۔ اچھی بری خبریں تو زندگی میں ملنے لگتی ہیں۔“ وہ بھی اٹھتے ہوئے بولا ”لیکن بھروسہ ہو

کہ آپ کھانا کھا کر جاتے۔ کئی بہت اچھا کھانا پکائی ہے۔“  
”اچھا۔! تو اسے کھانا پکانا بھی آتا ہے؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”میرے صاحب! اپنی ہر فن مولا قسم کی لڑکی ہے۔ جیسی تو میں نے سارا گھر اسے سوپ رکھا ہے۔“ وہ میرے ساتھ دروازے کی طرف چلے ہوئے بولا۔

”خیر۔“ پھر کبھی وقت ملا تو اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کر دیکھیں گے۔“

وہ میرے ساتھ گیٹ تک آیا اور یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ کئی ڈرائیوے میں نہایت سٹائی سے سائیکل چلا رہی تھی۔ ہم گیٹ پر پہنچے تو اس نے بھی وہیں پہنچ کر سائیکل چھوڑ دی اور انہی ہنسی اور دھمکی آنکھوں سے بے باکی سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی ”پھر کب آئیں گے؟“ صفور کی موجودگی کی اسے کوئی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

”شاید بہت جلد۔“ میں نے جواب دیا۔

”امید تو کی ہے۔“ اس نے آنکھ دھکی پھر ہر جھٹکا کر میری گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے رنگ سے بولی ”آپ کی گاڑی بہت شاندار ہے۔ آج کل میں دغا کر رہی ہوں کہ مجھے بھی اللہ کا کوئی نیک اور نیک بندہ اسی قسم کی کوئی گاڑی تحفہ پیش کر دے۔“

”مجھے تمہاری دعا کے الفاظ کچھ مناسب معظوم نہیں ہوتے۔“ میں نے دھمکے لیے میں کہا ”نہیں اس قسم کی دعا میں تو یہ کتنا چاہتا ہے کہ اللہ کا کوئی بڑا کار اور عیاش کر فرما دل اور اسحق بندہ اس قسم کی گاڑی تحفہ پیش کر دے۔“

صفور نے اسے ہلکی سی ڈانٹ ملائی ”اب تم اتنی زیادہ بگو اس بھی مت کیا کرو۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”تو ایسے آپ اسے سچ سچ غلام قسم کی چیز مت سمجھ لیجئے گا۔ یہ بڑی ڈراما باز لڑکی ہے۔ اس کا اپنا بیچاس ساٹھ لاکھ کا ٹائون ہاؤس ہے اور ہڈا کا لڑکا گاڑی ہے۔ یہ تو یونی ڈراما دہشی اور فتنہ میں میرے پاس کبھی چند دن گزار جاتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے اور اس کے خواب بہت اونچے ہیں۔“

اگر وہ سچ کہہ رہا تھا تو پھر اس لڑکی کے عجیب ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اس دنیا میں واقعی قدم قدم پر عجیب کرارہ پڑے ہوئے تھے لیکن فی الحال میں اپنا ذہن اس میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میری اصل توجہ صفور پر تھی۔ میں غیر محسوس طریقے سے اس کی تمام حرکات و سکنات اور تاثرات پر غور کر کے ہوتے تھا میرا یہاں آنے کا مقصد ہی باریک بینی سے اس کا جائزہ لینا اور اس پر اپنی باتوں کا رد عمل دیکھنا تھا۔ میں چاہتا تو اس وقت بھی اسے گردن سے پکڑ کر اور قابو کر کے راجہ کل کے حوالے کر کے ساری بات بتا سکتا تھا۔ باقی تحقیق وہ خود کر سکتا تھا لیکن میں صفور کو مزید کچھ ڈھکی دے رہا تھا۔ میں ایک تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید میرا تجربہ کامیاب ہو جائے۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت

مجھے صرف تعزیت نہیں کرنی ہے۔ یہی بات تعزیت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

اس نے شاید باطل تاخیرات ہو کر ان کے لئے کہا۔ چہرہ سیکڑ ہو کر کلک کی آواز ابھری اور وہ بولا "بات کیجئے" دوسری نے اچھے اچھے پرویز کی آواز ابھری۔ اس آواز سے وہ رعب اور کرارا پن غائب تھا جو اس کی پہچان تھا۔ اس کی جگہ شگفتگی، تسکین اور غنودگی غالب تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اکھڑے اکھڑے سے انداز میں قدرے ہزاری سے پوچھا "آپ کو مجھ سے کیا بات کرنے کی ضرورت پیش آئی؟"

"بات کرنے کی ضرورت تو اصل میں آپ کو تھی لیکن آپ کو اس کا علم نہیں ہے۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "میں نہیں چاہتا کہ آپ کا انجام بھی آپ کی بیوی جیسا ہو اس لئے میں آپ سے بات کرنے میں اپنا قیمتی وقت اور توانائی صرف کر رہا ہوں۔ میرا اہم کام اور اسی وقت آپ سے ملنا ضروری ہے۔" پھر میں نے کچھ اور وضاحت کی کہ میرا اس سے ملنا کیوں ضروری تھا۔

"نہیک ہے۔ آجائے۔ یہی بات ختم ہونے پر وہ ٹکست خورہ سے انداز میں بولا۔

میں نے فون بند کیا اور فوراً ہی ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ اس بار میں اپنی گاڑی میں روانہ نہیں ہوا۔ میں نے ہوٹل کے کاموں میں استعمال ہونے والی ایک عام اور سستی سی گاڑی نکالی تاہم اسی پر ہوٹل کا نام یا کوئی نشان وغیرہ نہیں تھا۔ اس بار بھی میں تعاقب کے سلسلے میں ہوٹل پر ہوٹل رہا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا۔ چند منٹ بعد ہی میں نے گاڑی ڈیڑھ بیس میں احمد پرویز کے شاندار بیٹے سے کچھ دور لے جا کر روکی۔ گاڑی میں نے ایک دوسرے بیٹے کے گیٹ کے قریب چھوڑ دی اور پیدل احمد پرویز کے بیٹے پر پہنچا۔

بگلا کیا ایک چھوٹا موٹا قلعہ تھا۔ اس کی چار دیواری اور گیٹ کافی اونچا تھا۔ دیوار زرد پتھر کی تھی۔ میں نے کال بیل کا بزن دیا تو کھنٹی اندر نہیں بلکہ گیٹ کے قریب ہی کیس بجی۔ اس کے جواب میں گیٹ باطل گیٹ نہیں کھلا اور نہ ہی اثر کام پر کوئی آواز ابھری بلکہ گیٹ میں چھوٹا سا ایک مستطیل شکاف پیدا ہو گیا اور دو بڑی بڑی سونچوں نے باہر جھانکا۔ ایک لمبے کی آغیز سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان سونچوں کے ساتھ ایک عدد چوہو بھی خشک تھا مگر سونچیں اتنی بڑی تھیں کہ چوہو غرضی چیز معلوم ہوتا تھا۔

"دو سرخ سرخ آنکھوں نے مجھے گھورا پھر کات کھالے والے انداز میں پوچھا کیا بات ہے؟"

"یہ گاڑی احمد پرویز صاحب کو بھجواؤ۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اپنا وزنگ کارڈ سونچوں کے نیچے تقریباً گھمبیر دیا جہاں میرے اندازے کے مطابق اس کاٹ ہوتا چاہیے تھا۔ وہ بڑبڑا کر جیسے بنا اور سونچوں کی جگہ میں نے ایک ہاتھ نمودار ہوتے دیکھا۔

ہو گیا۔ کئی سنے کچھ زیادہ سی جوش و خروش سے ہاتھ ملائے ہوئے مجھے خدا حافظ کہا۔ میں عقب نما آگے میں کچھ دور تک اس کا عکس دیکھتے ہوئے سوچے بغیر نہ روکا کہ زمانہ واقعی بہت تیز رفتار ہو گیا تھا خصوصاً اپنے طبقے میں تو وقت کچھ زیادہ سی تیزی سے انتخاب لا رہا تھا پھر شاید وہ لوگ خود ہی بہت تیز رفتار تھے۔ پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی معاملے میں دنیا سے پیچھے نہ رہیں۔

میں روڈ پر آنے کے بعد بھی میں نے پیچھے توجہ رکھی اور یہ یقین کرنے کے بعد مجھے خیف سی حیرت ہوئی کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا۔ میں نے راستے ہی میں موبائل فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا اور اسے دو ایڈریس سمجھا کر ہدایت کی کہ وہ ان جگہوں کی عمرانی کا بندوبست کرے پھر میں نے اسے یہ بھی سمجھا کہ مجھے کس کس وقت کس کس بات کی اطلاع دینا ضروری تھا۔ ایک فون میں نے راجہ گل کو بھی کیا۔ گوکہ وہ اس وقت بہت مصروف تھا لیکن اس نے توجہ سے میری بات سن لی۔ پھر میں ہوٹل واپس پہنچ کر اپنے معمولات میں الجھ گیا۔ راجہ گل کو میں نے تازہ ترین صورت حال سے تو آگاہ کر دیا لیکن فی الحال اسے کوئی ذمہ داری نہیں سونپی۔

رات بارہ بجے کے بعد تجھے وہ ٹیکل فون کال موصول ہوئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ شفیع شاہ نے بتایا "سر! اب تمام مسمان اور تعزیت کرنے والے رخصت ہو چکے ہیں۔ اوپر کے ایک کمرے میں اسے جاتے دیکھا گیا ہے۔ شاید وہ اس کی اسٹڈی ہے۔ کچھ دیر سے وہ ہیں ہے۔"

"عمرانی میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔ "نہیں سر! شفیع شاہ نے جواب دیا "اس کے بیٹے کے سامنے والا بگلا اتفاق سے ہمارے ایک جاننے والے کا بیٹا نکلا تھا۔ ہم نے اپنے آدمی کو اس کی پھت پر واقع ایک کمرے میں بھجوا دیا تھا۔ وہاں سے سامنے والے بیٹے پر نظر رکھنا زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی ابھی رپورٹ ملی ہے کہ اب میدان صاف ہے۔ سامنے والے بیٹے پر سکوت چھا چکا ہے۔"

"نہیک ہے۔ کوئی بھی ضروری بات ہو تو فوراً مجھے اطلاع کرنا۔" میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک تہرہ لایا۔ دوسری طرف سے جو موانہ آواز نکلتی دی اس سے غنودگی اور تسکین عیاں تھی۔

"احمد پرویز صاحب سے بات کراؤ۔" میں نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

"سر! وہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے اب وہ کسی سے بات نہیں کریں گے۔ آپ کو شاید معلوم ہی ہو اس گھر پر کیا حاوی مگر ذرا ہے۔" وہ کوئی غامض مہذب اور شائستہ ملازم معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اس کی بات کانٹے کانٹے کہا "مجھے اسی حادثے کے بارے میں ان سے بات کرنی ہے۔ تم انہیں میرا نام بتاؤ اور کوکو

اس نے کارہا تمام لیا اور ایک جھگے سے ہولا چھا۔ اس کے ساتھ ہی پھنسی کی وہ کڑکی بند ہو گئی۔

مجھے چند منٹ بچنے کے سامنے لٹا ہوا۔ آخر جلی گیت کھل گیا اور سو گھنوں والی گرائیڈل شخصیت نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیک وقت دو تصاویر دکھا کھوف اور اڈور سے مسلح تھا۔ کوئی جبر نہیں تھا کہ اس کے سینے میں لی لی اور ڈھیلی ڈھالی فزاک خالی کی جیب میں پستول بھی موجود رہا ہو۔ اس سے چند قدم پیچھے باریل کے ایک فٹ پانچ انچ لمبا تار سے پر ایک باوردی ملازم میرا ہتھکڑ تھا۔ اس کی رہنمائی میں ایک ہال سے گزر کر میزبوں کے ذریعے اوپر پہنچا۔ تمام راستہ دینے والوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ قلعہ نما اس طویل و درمیں بچنے پر اس وقت موت کا ماسکوت طاری تھا۔ قاتلین کی وجہ سے ہمارے قدموں کی آہٹ تک نہیں ابھر رہی تھی۔

ایک نعرہ پر روک کر ملازم نے سامنے چند قدم کے قافلے پر نظر آنے والے بندہ دوازے کی طرف اشارہ کیا "صاحب اس کمرے میں ہیں۔" وہ مجھے وہیں کھڑا چھوڑ کر واپسی کے لیے مڑ گیا اور چند سینکڑ میں غائب ہو گیا۔ میں نے ایک گرمی سانس لے کر ٹھکے اندر میرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ فصاحتیں مختلف پھولیں اور بیگنے بیگنے سبزے کی مکہ پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ہی تقریباً آدھ کی میں ڈوبا ہوا وہ بگلا نظر آ رہا تھا جس کی بالائی حلق سے پچھلے اس وقت بھی ہمارا آدمی اس بیگنے کی گھرائی کر رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر آہٹگی سے کمرے کے دوازے پر دستک دی۔ جس کی کڑکیوں کے بلا منہ ذکے عقب میں روشنی نظر آ رہی تھی "آجائے دوازہ کھلا ہے۔" ایک بہت سی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ گھرا تقریباً ساڑھے پورف تھا۔ آواز شاید یہ شکل ہی باہر پہنچی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔

ایک نہایت شاندار رائٹنگ ٹیبل کے عقب میں مرد الوحک چپکے جو احمد پورہ نیم دراز تھا وہ مجھے اس احمد پورہ سے بہت مختلف نظر آیا جسے میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا۔ وہ ایک مصلح، لکھت خودہ اور ذہیل ڈھلا انسان نظر آ رہا تھا جس میں اکثر فون نام کو نہیں تھی۔ وہ ابھی تک سوٹ میں تھا لیکن یہ سوٹ ٹھنک آ رہا تھا۔ ٹائی ڈھیلی ہو کر ایک طرف کو مڑی ہوئی تھی۔ اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے ہٹل آنکھ سے انداز میں مجھے گھورا۔ بہت کم وقت میں اس کی آنکھوں کے گرد پتے بھی نمودار ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھیں دھنسی دھنسی لگ رہی تھیں۔ جو ستا ہوا تھا۔ شاید آج ہی آج میں اس کی عمر پوس سال کا اضافہ ہو گیا تھا۔

تاہم مجھے اس سے کوئی بھڑکی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کوئی بہت بڑا عیب یا بد معاش تو نہیں تھا لیکن بھڑکی کا سستی بھی برہم حال نہیں تھا۔ میں نے ایک کرسی سمجھ کر اس کے متعلق بیٹھے ہوئے کہا "تمیں معلوم ہے کہ میں درحقیقت یہاں کس لیے آیا ہوں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے ایک لمبے کے لیے رات بچھ لیے پھر اسے گھورتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں کہا میں تمیں صرف تھوڑا سا ڈھیل کرنے آیا ہوں کیونکہ تم ڈھیل ہونے کے مستحق ہو لیکن مجھے معلوم ہے تمیں کوئی ڈھیل نہیں کسے کا کیونکہ تم بہت دولت مند آدمی ہو۔ معاشرے میں تمہاری مثال عزت ہے۔"

میرا خیال تھا کہ میرے الفاظ اسے کچھ کے فائدہ میں کے اور اس کی پرانی فرعونیت کسی نہ کسی حد تک عود کر آئے گی لیکن اس کے چہرے پر کوئی تغیر نہ آیا۔ وہ اسی طرح بیٹھا نکلی تیز حرکت خود سے انداز میں مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اسی کھٹے کھٹے لیکن خیلے لیے میں کہا "تمہاری بیوی جو تمہارے مقابلے میں کہیں نہاد معقول اور شریف عورت تھی۔ تمہارے معصوم بچوں کی دیکھی جرم بے گناہی میں ماری جا چکی ہے اور کسی نہ کسی حد تک تم بھی اس کی موت کے ذمے دار ہو۔"

وہ ایک بیگنے سے کچھ سکڑ سٹ سا گیا جیسے کسی نے کوئی جھوٹا اے چھوڑ دی ہو تاہم اس نے احتجاج یا تردید نہیں کی۔ اس کے ہونٹوں کو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ میں نے اسے زبان سے الفٹ پہنچانے کا عمل جاری رکھا "تمہاری بیوی سے غلطی ہو گئی تھی کہہ بن کو قتل ہوتے دیکھنے اور اصل قاتل سے واقف ہونے کے باوجود خوف کے باعث خاموش رہی لیکن اس نے جلد ہی تمیں اصل بات بتا کر اپنی غلطی کی ٹھانی کر دی تھی مگر وہاں سے تمہارا کینٹکی کا ٹھیل شروع ہو گیا۔ تم نے بھی زبان بند رکھی اور اسے گناہ زبان بندی رکھنے پر قائل کر لیا۔ وہ شوہر بہت عورت دیک کر بچے گئی۔"

اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں لیکن اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی تھی۔ اسے جیتے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی مجھ سے ملی تھی یا اس نے کسی ذریعے سے مجھے اصل بات بتائی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں تھی اس لیے اس لیے میں نے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم برہم حال مہربا پوزیشن کے مالک تھے۔ تمہارا اثر و رسوخ بھی تھا۔ تم پانچ تو حقیقت سامنے لائے تھے اور اس کے علاج کا مقابلہ بھی کر چکے تھے اگر اس کے نتیجے میں تمیں کوئی نقصان پہنچے گا تو میں بھی تھا تو تمیں اس کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔ ہر دو گنا کاغذ خالی تھا تم نے نہ صرف اپنی بیوی سے بھی زیادہ بڑی کاغذ خالی کیا تھا۔ چالاکی دکھانے اور اپنا ٹیکہ کھینچنے کے لیے بھی اس سوچ کو غائب جانا۔ پولیس کا مران داخل کو قاتل سمجھ رہی تھی اور میری گری سے اسے تلاش کر دی تھی۔ وہ بے وقوف بھی ذمہ دار کے ساتھ پہنچا رہا تھا۔ تم نے پولیس کو اسی غلط فہمی میں اور بے جاہے کا مران دیا تھا۔ کو اس بھیاک خوف میں گرفتار رہنے دیا۔ حتیٰ کہ وہ بے جاہے بھی پڑا سراد حالات میں مارا گیا۔"

آزاد تھ۔ جسے اپنی انا، خدا اور دولت بھی تو بہت عزیز ہیں۔ دولت کے لالچ کے ساتھ ساتھ یہ ایک دوسری بڑی خرابی ہے تمہیں۔

پہلی بار اس کے ملنے سے خفیہ سی ایک آواز برآمد ہوئی۔ یہ کراہنے کی آواز تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر رحم طلب سے انداز میں مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا لیکن میں نے بات جاری رکھی۔ ”تم نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا، کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا اور باقاعدہ طور پر کسی کے قتل کی سازش تیار نہیں کی اس کے باوجود تم کسی قاتل سے کم نہیں ہو۔ تم ایک خاموش قاتل ہو۔ تم نے اپنی خاموشی سے تین سادہ دل بے ضرر اور شریف انسانوں کو قتل کیا ہے اور ان میں سے ایک تو تمہاری ذات شاریبی تھی۔ آج جب تم اپنی بیوی کی لاش پر اسپتال پہنچے جہاں اس سارے پتھر میں خواہ مخواہ لقمہ اہل بن جانے والے ڈرائیور کی لاش بھی موجود تھی، تب بھی تم نے زبان بند رکھی۔ رجم گل سے تمہاری ملاقات ہوئی لیکن تم نے اب بھی اس سے کچھ نہیں کہا۔ گویا تم نے اب بھی مجبزی کمال میں بیٹھے ہوئے ایک مجبزا صفت قاتل کو بچنے کے لئے پورا پورا موقع دیا۔ میری کچھ میں نہیں آتا تم کس قسم کے انسان ہو اچھ پرویز!“

اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے بتھوں پر تھے۔ اس نے اتنے زور سے بتھوں کو پکڑا ہوا تھا کہ اس کی انگلیاں سفید سفیدی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر پیسے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ اس کے ہونٹ بے مگر کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ میں نے غرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی ”میری کچھ میں نہیں آتا کہ تمہارے ہاں کے لوگوں میں دولت کی ہوس کبھی ختم کیوں نہیں ہوتی۔ جرائم پیشہ لوگ تو فیروز ایک الگ سی ذات کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ تو ہر چیز جرم کے ذریعے دولت کھینچنے میں لگے ہی رہتے ہیں لیکن تم جیسے معزز لوگ جن کے پاس بے شمار دولت ہوتی ہے اور ابھی مزید دولت کی آمد کا سلسلہ جاری ہی ہوتا ہے وہ بھی بعض اوقات مجبوزانہ انداز میں ایسی کبھی بننا سب اور ناجائز ذریعے سے حاصل ہونے والی دولت کی آگ میں رہتے ہیں۔ آخر کس لیے؟ جب کہ دنیا کی ہر بڑی سے بڑی نعمت انہیں پہلے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی میری کچھ میں نہیں آتی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں نمی جھلکانے لگی تھی۔ میں نے بے رحم سے لمبے میں کہا ”آئندہ بھانے کی کوشش نہ کرنا۔ آئندہ بھانے کا وقت اب گزر چکا ہے۔ تم چاہتے تو کامران دانش اپنی والدہ اریبی اور ڈرائیور کو مرنے سے بچا سکتے تھے۔ اب تم اپنی سیاہ سوچ پر سفیدی بکھرنے کی کوشش مت کرنا۔ اب اس کا وقت گزر چکا ہے مجھے نہیں معلوم تمہاری قانونی پوزیشن کیا ہے۔ جس میں کوئی سزا مل سکتی ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ہاں اس قسم کی شہادتوں کو چھپانے پر سزا کا قانون موجود ہے لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ اس کے تحت تمہیں کوئی خاص سزا

میں نے ایک کمری سانس لی اور اپنے لمبے کی تیزی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”میں مجھے ان پر اسرار حالات کے بارے میں بھی حقائق معلوم کرنے میں لیکن کامران بہ حال زندگی سے محروم ہو چکا ہے۔ میرے نقطہ نظر کے مطابق اس کی موت کے بھی تم کسی نہ کسی حد تک ذمہ دار ہو۔ کبھی کبھی صحیح وقت پر بولا ہوا ایک سچ بہت سی جانیں بچا سکتا ہے۔ بہت سی بچیوں کو بچا سکتا ہے۔ کوئی ایک انسان ذرا سا مخلوق مول لے کر، خمیر کی آواز پر لپک کئے ہوئے بہت سے انسانوں کی بچا کا سامان کر سکتا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔“

میں نے کچھ اور غرت سے اسے گھورا ”تمہارے اس طرز عمل کی وجہ کوئی اور شاید نہ کچھ سکے لیکن میں سمجھ گیا ہوں۔ میں نے اس پر بہت سرکھپایا ہے۔ تم نے اپنی بیوی کو بھی اذیت میں مبتلا رکھا۔ وہ بے چاری بچکی کے دوپٹوں میں پستی رہی۔ اسے شوہر کی خوشنودی عزیز تھی اس لیے اس نے زبان بند رکھی لیکن دوسری طرف متحذل بہن کی محبت بھی جو شرمناک تھی اور یہ خرافات بھی شہوت سے ابھری تھی کہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ اصل قاتل کو سزا ملے۔ اصل قاتل کو شاید شروع ہی سے شہ ہو چکا تھا کہ تمہاری بیوی حقیقت سے آگاہ ہے۔ نہیں آکھیں تمہاری بیوی کی گواہی کرنے لگی تھیں۔ شاید تمہارے گھر کے فون بھی نیپ ہو رہے ہوں۔ حتیٰ کہ اس موت نے اسے آن ہی لیا جس کے خوف سے اس نے ابتدا ہی میں زبان کو تالا لگا لیا تھا۔ یہ بھی ثابت تھا کہ موت سے قبل اس نے یہ راز کم از کم مجھ تک منتقل کر دیا تھا ورنہ تمہارے سرا کوئی بھی اس سے واقف نہ ہوتا اور اب اس کی موت کے بعد شاید تم اور بھی زیادہ سختی سے زبان بند کر لینے کی جگہ اب تو تمہاری پوزیشن زیادہ شرمناک ہو گئی ہے۔“

اتنی دیر میں وہ پہلی بار اپنی آواز میں دھڑکھڑاہٹ سے کہنے لگی ”سائنس لے کر کہا“ ”شکر کرو کہ میں نے اس معاملے میں ایک آزادی ہے ورنہ واقعہ کے بعد شاید اب تمہارا نمبر ہوتا۔ میرا کہ قاتل سے جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ نہ جانے کہاں جا کر رکنا۔ اس نام مرتبے میں تمہارے زبان بند رکھنے کی بڑی وجہ صرف اور صرف لالچ تھا۔ کامران دانش کے روپ میں تمہیں بہت سی اچھا نواہی کا بکرا نظر آیا تھا اور تم نے اسی کو پولیس کا ڈرائیور بنا رہے تھے۔ صرف اس لیے کہ تمہیں اس کی قانونی پوزیشن کا علم ہو گیا تھا۔ جس میں پل گیا تھا کہ اگر وہ سامنے آیا اور بے گناہ ثابت ہو گیا تو میرا کہ شوہر کی حیثیت سے پرنس سعید کی وصیت کے مطابق وہ کبھی پرنس ایڈمز سٹریٹ اور دوسرے اثاثوں کا مالک ہو جاتا۔ دو راتوں رات مجبوزانہ انداز میں گویا فقیر سے بادشاہ بن جاتا لیکن تم نے یہ گوارا نہ کیا۔ ابکہ تو وہ دوسرا تو حاضہ بھی نہیں اپنی طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے شاید ایک مفلس دھڑلے نوجوان کا راتوں رات تمہاری بھسری کے قاتل ہونا بھی ممکن گوارا نہیں تھا۔ یہ تمہاری ضد، انا اور فرعونیت پر ایک

لی سکے گی۔ اگر تھمارے خیمہ میں زندگی کی کوئی رشتہ باقی ہے تو شاید میری تمہیں کوئی سزا دے سکے۔  
 پھر میں نے تم خیال انداز میں سر ہلایا "تمہیں سزا دلوانے کا ایک طریقہ اور ہے کہ میں خواہ مخواہ اس معاملے میں جانگ اڑانے رکھنے کا ارادہ ترک کر دوں اور تمہیں اسی شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں جو تمہاری سالی اور بیوی کی موت کا ذمہ دار ہے۔ وہ تمہیں بھی چھوڑے گا نہیں۔ اور یہ تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہی ہے کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ کیسے خطرناک آدمیوں سے اس کے مراسم۔ بلکہ شاید پارٹنر شپ ہے۔ تم کہاں تک اپنی حفاظت کا انتظام کرو گے؟ اور وہ تو ایسے لوگ ہیں کہ تمہارے تمام تر خانقاہی انتظامات کے باوجود ہماری چڑی مرکز پر بھی تمہیں گولیوں سے چھنک کر کے جاسکتے ہیں اور اس کے بعد بھی شاید کوئی کچھ نہ کر سکے۔"

اچانک میری جیب میں موجود موبائل فون کی ٹھنکی بج اٹھی۔ وہ خوف زدہ سے انداز میں تقریباً اچھل پڑا۔ میں نے موبائل فون جیب سے نکالا تو احمد پور پر خوفناک نگل کر رہ گیا۔ اس کے اندر یقیناً زبردست شکست و ریخت جاری تھی اور اس نے میری کسی بات کی تردید نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے انداز سے درست ہی تھے۔ خوف اور بدعوا سی بھی اس پر غلبہ چکی تھی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ کچھ نہ کچھ اذیت سے گزرے۔ اس نے کچھ نہ کرتے ہوئے بھی جو کچھ کیا تھا اسے اس کی کچھ نہ کچھ سزا تو ملے۔

میں نے موبائل فون نکال کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف شفیع شاہ تھا "سرا! آپ وہیں ہیں؟" اس نے پوچھا۔  
 "ہاں۔ میں وہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے سوال کا مطلب کیا تھا اور وہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ میرے جواب کا مطلب کیا تھا۔  
 "وہ اپنے ٹھکانے سے روانہ ہو چکا ہے۔ اس نے راستے میں آدمیوں کو ساتھ لیا ہے جو دو مختلف جگہوں پر اس کے انتظار میں طے ہوئے تھے۔ اب اس کا رخ اسی طرف معلوم ہوتا ہے جہاں آپ نے اندازہ ظاہر کیا تھا۔" شفیع شاہ نے بتایا۔  
 "ٹھیک ہے۔ آئے دو۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔  
 "ادھر کی جگہوں سے بھی تمہارا رابطہ ہے؟"  
 "جی سرا! ایک ایک لمحے کی خبروں کا تبادلہ ہو رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔  
 "ٹھیک ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ کس صورت حال میں کیا کیا ہے؟" میں نے کہا۔  
 "جی سرا! جواب ملا اور میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔"

وہ پھر میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے سبز کے بیچ اشارہ کرتے ہوئے اسے مزید ہدایت کی "تم اس کے بارے میں بالکل خبر نہ رہا۔ تم سمجھتا کہ تم نے یہ چیز دیکھی ہی نہیں۔ اوکے؟"

اس نے شک ہوئی زبان پھیری اور آہستگی سے اذیت میں نے شاید اسی طرح تمہارے کیسے کی ایک آدھ فیصد غلطی ہو جائے۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کسی کو پکارنے یا مدد کے لیے بلانے کی ضرورت نہیں۔ جتنا زیادہ ہنگامہ ہو گا اتنی ہی زیادہ جانیں خطرے میں پڑیں گی اور خونریزی کا امکان بڑھ جائے گا۔ اس لیے تم صرف ذہنی ہی کر میٹھے رہنا۔ اس میں تمہارے لیے زیادہ عافیت ہے۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اسے یہ ہدایت دیں پھر جیب سے چھوٹا سا آلہ نکال کر اس کی میز کے نیچے ڈپکا دیا۔

وہ پھر میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے سبز کے بیچ اشارہ کرتے ہوئے اسے مزید ہدایت کی "تم اس کے بارے میں بالکل خبر نہ رہا۔ تم سمجھتا کہ تم نے یہ چیز دیکھی ہی نہیں۔ اوکے؟"

اس نے شک ہوئی زبان پھیری اور آہستگی سے اذیت

میں سر ملایا۔ شاید اگر وہ لوگ جیتر اس کا وجود دیکھ سکتا تھا تو اس کا رنگ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں تین دیواروں پر چھت سے فرش تک بھاری بھر کم خوب صورت آرائشی پردے آویزاں تھے۔ بالی ایک دیوار پر لکڑی کی خوب صورت چیلنگ تھی۔ اسی دیوار میں کھڑکی تھی جس کے نیچے ایک اتر کھڑکی تھا۔ میں از سر نو ایک بار کمرے کا جائزہ لینے کے بعد ایک دھڑ پردے کے پیچھے چلا گیا۔ جیسے کے لیے وہ جگہ بری نہیں تھی۔ وہاں دھول مٹی کی بو نہیں تھی۔ پردوں کے پیچھے بھی حیرت انگیز حد تک صفائی تھی۔ میں پردوں کے درمیان ایک بار یک سی بھی مٹائے کرے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ امیر پرویز بار بار نشہ پیچہ سے چھوٹک کر رہا تھا۔ وہ یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن آج اس کے اعصاب استقامت اور استقامت سے گزر رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ پردے کی طرف نہ دیکھے۔

ہمارا انتظار طویل ثابت نہیں ہوا لیکن طویل محسوس ضرور ہوا۔ پہلے کچھ قاصلے سے مدد می کچھ آوازیں ایسی سنائی دیں جیسے سونے سونے چوہے ننگے فرش پر دوڑ رہے ہوں۔ اس کے چند لمحوں بعد ٹیس کے فرش پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ ٹیس کے فرش سے اوپر کھلا آسمان تھا اس لیے وہاں قائلین نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد تیزی سے دروازے کی تاب کھوی اور گویا پلک جھپکتے میں دو نوجوان اندر آ گئے۔ وہ دو مٹی دھاتی تصوں اور جیتر میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لٹی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے مندر اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک پستول نظر آ رہا تھا۔

دونوں نوجوانوں نے پھرتی سے میز کے دونوں طرف پہنچ کر امیر پرویز کو نشانے پر لے لیا۔ مندر کا پستول والا تھا بے نیازی سے اس کے پستول میں لٹکا ہوا تھا۔ شام میں نے اسے قمار زدہ دیکھا تھا لیکن اب تک یقیناً اس کا نشہ پوری طرح اتر چکا تھا اور وہ اس پیچھے کی طرح چرکتا نظر آ رہا تھا جو شکار پر نکلا ہوا تھا۔ امیر پرویز خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری تسلیاں اپنی جگہ تھیں لیکن وہ بچہ خوف زدہ تھا۔ خوف زدہ ہونے کی اداکاری نہیں کر رہا تھا۔

”تم کہاں سے آئے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی حیرت بھی حقیقی تھی۔

”انسان کو جہاں پہنچنے کی گھن ہو وہاں کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ مل ہی جاتا ہے۔“ مندر مسکرایا۔ اس وقت وہ واقعی ایک مختلف انسان نظر آ رہا تھا۔ نہایت سفاک اور زبردست سازشی! وہ پستول سے اپنی ران تھپکتے ہوئے آنکھوں سے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”میرے یہ دوست سپاٹ دیواروں پائپوں حتیٰ کہ نوکیلے حفاظتی جنگلوں پر بھی چڑھنے میں بڑے ماہر ہیں۔ تم ڈرے مت خیر انہوں نے مجھے بھی سکھا دیے ہیں۔ یہ بھی ایک اچھا اتفاق ہے کہ میں اس جنگل کی ساخت سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

اس کی سفاک مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی میں نے اس کی قوت آپ کی کچھ خاص عادات سے بھی واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے جب آپ زیادہ پریشان اور الجھے ہوتے ہوئے ہیں تو رات کے تک یہاں استراحت میں بیٹھتے ہیں۔ تھانہ کرسچن پکار کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے آپ کی استراحت کم اور مراقبہ کا زیادہ ہے۔ میں تو اور بھی زیادہ بہتر طور پر ایک دوسرے کے گھبراہٹ اور عادات سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ آخر ہم ایک دوسرے کے ہم زلف بننے والے تھے۔ آپ تو بہت خوش ہوں گے کہ آپ اس رشتے میں چھپنے سے بال بال بچ گئے۔ لیکن میں آپ کو زیادہ دن خوش ہونے کا موقع نہیں دے سکتا۔ میں پہلے ہی کافی غلطیوں میں پھنس چکا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ امیر پرویز نے کھلی کھلی توجہ میں پوچھا۔ ”میں نے تمہاری بیوی کو کافی دن زندہ رہنے دیا اور میں اس دوران میں بہت پریشان رہا۔ جس رات میں مجھے میں میرا کوہ بیٹھا اور اس جنگل سے نکلا تو میں نے تمہاری بیوی کی گاڑی گلی کے سڑ پر مڑنے دیکھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کچھ دیکھ چکی تھی لیکن میں اس کا تعاقب نہیں کر سکا پھر میں نے اس سے فون پر بات کی تو اس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کچھ جان چکی تھی بلکہ میری درخواست پر وہ استغیروا کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئی۔ وہ بالکل بے خبر بنی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مصطفیٰ ایسا کر رہی تھی۔ خوف زدہ تھی۔ کبھی جھگڑے میں پڑا نہیں جاسکتی تھی۔ بس کی جیت کو اس نے دبا لیا تھا۔ شاید یہ تصور بھی اس کے احساسات کا غالب آ گیا تھا کہ اب بس کی وراثت بھی اس کی طرف منتقل ہونے والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کوئی بات تمہیں بتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس نے تمہیں ضرور بتا دیا ہو گا لیکن تم بھی خاموش رہے۔ تمہارا مصطفیٰ کو سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن میں اس غلطی کا راز کے ساتھ اس عورت کو زندہ رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اور کئی دن کی گھرائی کے بعد آخر مجھے موقع تلاش کرنا پڑا۔“

”میرزا سائیکل پر جن تین نوجوانوں نے واجدہ کو مارا وہاں ہلاک کیا۔ ان میں دو کیا کی ہیں؟“ امیر پرویز نے گویا بہت کچھ پوچھا۔

”غیر ضروری سوالات نہیں کیا کرتے۔“ مندر مسکرایا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ کل تم نے اس بیورو ٹاپ پولیس انسپکٹر سے اور کوئی بیان دینے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب مصطفیٰ کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جس کی بدولت بہت دیر ہو چکی ہے مائی فیز امیر پرویز! اب میں تمہیں اپنے لیے اجازت نہیں دے سکتا اور وہ کدھا انسپکٹر تو مجھے ایک آگے نہیں بھاتا۔ اس خبیث کے دماغ میں دیانت داری کا فتنہ ہے۔ اب تک میں اسے جکڑ دینے میں کامیاب رہا ہوں۔ اس کے اس بارے کا تو مجھے سمجھنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ ساری بات یہی ہو رہی ہے۔“

کے تو ہماری بہت سی دشواریوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر تم اپنی خودکشی کے سلسلے میں کوئی غلط و غیو بھی کچھ دیکھتے تو بہت اچھا ہوتا لیکن مجھے معلوم ہے تم میری یہ درخواست نہیں مانو گے اس لیے ہمیں اس کے بغیر ہی کام چلانا پڑے گا۔ کرسی ذرا دبا دبا ہے یہاں سیر کے قریب لے تو۔ تمہاری لاش وہاں کوٹنے میں تمہی ہوئی کرسی پر کچھ ابھی معلوم نہیں ہوگی۔

اس نے اشارہ کیا۔ احمد پوڑی نے اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہادری دکھانے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس میں خوف کے باعث اپنی جگہ سے ہٹنے کی سکت نہیں تھی۔ اسے شاید یہ بھی نہیں تھا کہ میں بروقت پروے کے پیچھے سے نکل کر دھات کڑوں گا اور اگر یہ اہلٹ کرنے کی جرات کر بھی بیجا تھا بھی شاید میں مسلح اور مشتاق قسم کے بد معاشوں کے سامنے شاید میری اپنی جان کے لالچے نہ جانتیں۔ میں اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔ مجھے دھات کڑے میں پہل کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔

میں اسی لیے خاموشی سے دروازے کی باپ گھومی اور دروازہ کھولا ہوا کے چھوٹے سے بے ترازو طرچے سے کھل گیا لیکن اندر آنے والا ہوا کا جھوٹا نہیں "رجیم گل تھا۔ وہ وہی میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ٹی ٹی تھی۔

"ہنڈ زاپ۔" وہ کہہ رہا۔ وہ تینوں اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے تیزی سے گھرے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اس کی دہائی کی پروا کیے بغیر فائر کریں گے اس وقت تک میں ٹکلی کی سی تیزی سے پروے کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔ غصہ یہ تھا کہ ان تینوں کی توجہ اس سے پہلے پروے یا دروازے کی طرف نہیں رہی تھی اس لیے انہیں صورت حال کو سمجھنے میں ایک لمبے کی تاخیر ہو گئی۔ میں نے ایک نوجوان کی کٹائی پر اپنے دشمن ہٹل کے دوتے سے وار کیا اور ساتھ ہی دوسرے کی گولی پر ٹھاکہ لگ کر رسید کی۔ وہ اونٹ سے گر کر اور جس کی کٹائی پر ہٹل کا دوتہ پڑا تھا اس کے ہاتھ سے ٹی ٹی بڑے ندر سے قالین پر گر گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کٹائی ٹوٹ گئی ہوگی۔

رجیم گل نے صدر کے ہاتھ پر ٹھوکر رسید کی۔ گولی ہٹل گئی مگر اس کا رخ ہمت کی طرف بدل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن وہ صاحب کی طرح جھپٹ کر رجیم گل سے الجھ پڑا۔ وہ بھی اس سے اس کی ٹی ٹی چھیننے کی فکر میں تھا۔ اس نے رجیم گل کی کٹائی گرفت میں لے لی تھی اور دونوں قالین پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ احمد پوڑی جھنڈا ہاتھ میں مار دھاڑ شروع ہوتے ہی سیر کے پیچھے کھس گیا تھا۔

رجیم گل نہایت آسانی سے صدر سے منٹ لیا لیکن اسی دوران میں فصیح شاہ اندر آیا اور اس نے اس کا کام بہت سی تسان کر دیا۔ اس نے صدر کی پٹیلیوں میں ایسی ٹھوکر رسید کی کہ وہ ذرا ہوتے ہوئے کمرے کی طرح ہلکا کر دوڑ جا کر اس میں اس دوران میں

اس گھر سے کوئی خرید ابھی نہیں جاسکا اور وہ آسانی سے نہ لے بھی نہیں لگا۔ اس قسم کے گدھے جان دے دیتے ہیں جنہوں کی بات نہیں مانتے۔

تمہارا خیال ہے کہ دراجہ کے بعد مجھے بھی مار کر تم کو جواز دے دیں۔ نہیں۔ نہیں۔ نیر احمد پوڑی۔ "صدر شہانہ سے بچے پڑا۔ وہ شاید اس وقت اپنی پوزیشن سے کچھ زیادہ سی لطف دے رہا تھا۔ "تم تمہیں نہیں ماریں گے تم خود اپنے آپ کو مارو۔ تم خود کشی کو گھر کے کم از کم ظاہر تو یہی ہو گا اور اخباروں میں لکھی جائے گی۔ گا دیاری انجینس۔ یو کی فاکل۔ اخبارات فاکل کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حساب سے قیاس آرائیاں ہی گے۔ پولیس بھی ان سے شفق ہو جائے گی۔"

بارود بیک کی طرف تہہ پہنچاتے ہوئے پولا ۳ کٹر دولت مند ہانپتے بندہ دم میں ساٹھ میل کی دراز میں آیا پھر اٹلی میں سیر ہوا۔ اور بعض اوقات تو دونوں ہی جگہ راجہ پوڑی ہٹل سے ضرور رکھتے ہیں۔ امید ہے تمہاری اس سیر کی دراز میں بھی ملے کچھ ضرور ہو گا۔"

اس نے آگے بڑھ کر احمد پوڑی کی راجہ ٹھوک جیڑ کو دھکا دیا۔ راجہ پوڑی سمیت کوٹنے میں دیا دوسے جا گرائی۔ دونوں ظاہر بہ ستور اسے گڑ کیے ہوئے تھے صدر نے جھک کر سیر کی اپنی کھلیں۔ ایک دراز میں اسے ہٹل لی لی۔

مہمت اچھا ہوا کہ یہاں تمہارا اپنا ہٹل موجود ہے۔ صدر نے اپنی ہاتھ میں نیچاتے ہوئے پولا ۳ خودکشی کا ڈراما بہت سے زیادہ قریب نظر آئے گا ورنہ ہمیں اپنے ہی ہٹل سے ڈرا کر پڑا۔ اس ہٹل کی گولی تمہاری کھوپڑی میں سوراخ سے لگی اور یہی تمہارے ہاتھ میں پھنسا ہوا پایا جائے گا۔ یہاں تک کہ ابھی کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ اس لیے سیدھا سادہ لے جاؤ کہیں ہو گا۔"

راجہ پوڑی کرسی میں سٹکر سٹھو اتو تھا۔ لیکن اب وہ گویا اور سٹکر کیا اور خوف زدہ ہی آواز میں پولا "تم سے کس نے کہا کہ رجیم گل سے ملے اور کسی قسم کا بیان نہ دینے کا ارادہ ہے؟"

راجہ پوڑی نے اخلاق سے اٹھتی آواز کی خبر لی جاتی ہیں۔ اس نے اپنے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ یونہی تمہارے کام چلے رہے ہیں۔

لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جس کی نے ظاہر کیا ہے۔ احمد پوڑی کھنٹی کھنٹی آواز میں پولا۔

صدر دھڑ سے انداز میں ہنسا "مجھے معلوم تھا تمہی کو گھر کے اندر آئے اس میں ہیں کہ تمہاری بات پر یقین کر لیں۔"

دونوں نوجوانوں کو گردن سے پکڑ کر ان کے سر انہیں میں گھرا چکا تھا جس کے بعد وہ بالکل ڈھیلے پڑ گئے تھے اور قاتلین سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شفیع شاہ کے ہاتھ میں بھی مچھلی تھی لیکن اسے صرف ایک لٹ ہی چلانی پڑی۔ ہم تینوں کوئی انتہائی ناگزیر حالت میں چلنا چاہتے تھے۔ رحیم گل نے اچھے اچھے نیو نوٹس میں رکھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ کام ایک ذریعہ منت میں منت گیا تھا۔

صنوبر پولیس پر ہاتھ رکھے پراکراہ رہا تھا۔ تکلیف میں شاید یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کی جیب میں ایک ہتوتل موجود تھا۔ رحیم گل نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے منہ پر ایسا پیچیز رسید کیا کہ اس کا منہ گھوم گیا اور ہونٹ پھٹ گئے۔ مجھے امید تھی کہ جب تک وہ رہے اس پیچیز کے اثرات ظاہر ہوں گے تو صنوبر کی شکل خاصی بدل چکی ہوگی۔ ساتھ ہی اس نے صنوبر کو دو تین گندی گندی گالیوں سے نوازا۔ بوقت ضرورت وہ یہ کام بھی کر لیتا تھا۔ تندیب و دشمنی کو بلائے طاق رکھ دیتا تھا اور "سحق" لوگوں کو ان کے اعمال کی مناسبت سے منکلمات سے نوازا تھا۔ پھر اس نے اس کی ناف کے نیچے اچانک کھنکھار رسید کیا۔ صنوبر ایک بار پھر بری طرح بلٹا اٹھا۔ اب اس میں ذرا بھی دم خم نہیں رہا تھا۔

رحیم گل نے اسے قاتلین پر رخ دیا۔ گستاخا کہ اسے صنوبر پر کچھ زیادہ ہی غصہ آ رہا تھا۔ وہ اسے ایک خاصی نامناسب سی جگہ پر مزہ ایک ٹھنڈ رسید کرتے ہوئے بولا "تم جیسے بھیڑی کی کھال میں چھپے ہوئی بھیڑیوں کو پکڑنے میں ہمیں سب سے زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔"

پھر اس نے آواز دی۔ دو اے ایس آئی کا شکوہ نہیں لے مستعدی سے اندر آ گئے اب وہاں ان کے کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا تاہم وہ چند لمحوں کا شکوہ نہیں اور اُدھر کھاتے ہوئے چونکا سے انداز میں کمرے کا جائزہ لیتے رہے جیسے انہیں زبردست پولیس مقابلے کا اندیشہ ہو۔ رحیم گل نے انہیں قابو میں آنے ہوئے تینوں افراد کو جھکواں لگائے اور ان کے احتیاط قبضے میں لینے کا حکم دیا۔ ان میں سے ایک نے کاٹھف کدھے پر لٹکائی اور خاصی مستعدی سے یہ کام انجام دیا۔ دوسرا اسی طرح چاقو دھونڈ کھڑا رہا۔

رحیم گل زرا اٹھ رہے سے انداز میں یہ توازن بلند بولا صبیحہ صاحب! اظہارِ گل کیا ہے میز کے نیچے سے نکل آجئے۔"

احمد پرویز نے کسی خوف زدہ خرگوش کی طرح میز کے نیچے سے سر نکالا ہر دھیرے دھیرے باہر آ کر کسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ یوں ہانپ رہا تھا جیسے مٹوں دوڑ کر آیا ہو حالانکہ وہ کمرے کے اس کونے میں ہی رہا تھا۔ پولیس والوں نے دونوں نوجوانوں کو کھڑا کیا تو ان میں سے ایک جس کی گدی پر میں نے کھانگ لک رسید کی تھی، سنبھل چکا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چو خاصا جیواک نظر آ رہا تھا۔

رحیم گل کو گھورتے ہوئے اور کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارا مٹونے پڑے۔ ابھی وقت نہ زندگی چاہتا ہے تو اب بھی ہمیں چھوڑ دے۔ بات نہیں کی جا گی۔ ابھی طرح سوچ لے۔"

رحیم گل نے اس کے پیٹ میں زوردار لٹا دیا۔ دھرا ہو گیا اور پھر اس نے وہیں میں قیمت نہیں قاتلین پر کدی۔ رحیم گل نے گریبان سے پکڑ کر بے رحمی سے بھڑکے ہوئے صنوبر کو سیدھا کیا اور دانت بھیج کر بولا "تجھے بھی ک ڈاٹیا لگ بولتا ہے تو بول لے دو غامگوں والے کتے!"

صنوبر سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا تاہم اس نے اور رحیم گل کی طرف باری باری اس طرح دیکھا جیسے کہ باہر کچھ رہے ہو ہمارے پکڑے جانے سے بات ختم ہو جائے گی۔ رحیم گل نے اس کی طرح منت لیں گے۔ اتنے ہی جلد ہو گئے۔

رحیم گل اسے چھوڑ کر احمد پرویز کی طرف متوجہ ہوا اور گھنٹی مگر فیکٹ آلودی آواز میں بولا "اس سارے معاملے میں تمنا کروار بھی مجھ پر واضح ہو چکا ہے میں سرکاری دیکھ لے گا۔ دو چار دوسرے اچھے دیکھوں سے مٹوں کون کا کھانے ہا میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں اگر تمہیں کوئی سزا نہ بھی دلا سزا بھی تمہیں آتا گھینٹوں کا ضرور کہ تمہیں اپنی پیدائش پر غور ہونے لگے گی۔"

سروست اس نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ ہم باہر آئے تو دیکھا احمد پرویز کے ملازم اور گاڈز و فیو ٹیورس پر موجود پولیس نے جگہ کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ نیچے کچھ کچھ رہا رحیم گل اپنے تئوں بھرموں کو ایک سواگل میں بٹھانے کے اپنی لپٹ کدڑ میں بیٹھنے سے پہلے صبیحہ سے مجھے سے حصار کرے ہوئے دیکھے۔ مجھے میں بولا "ہمت شریہ۔"

ان دو الفاظ میں اس کے تمام جذبات کھلے ہوئے تھے۔ اچھی طرح احساس تھا کہ میں نے اس کے لیے کتابچہ کام کیا لیکن وہ زیادہ لے چوڑے الفاظ میں تفکر کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ میں اور شفیع شاہ وہیں سے الگ ہو گزریں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔

دوسرے روز مجھے ایک اور خوش خبری سننے کو ملی۔ صاحب نے مجھے اسلام آباد سے فون کیا اور حضور اللہ علیہ و آلہ و سلم نے دعا فرمائی کہ "میں سر! مجھے تو کچھ پتا نہیں چلا۔ کیا ہو گیا؟"

سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "مہمتر ہے! میں تو سمجھ رہا تھا تم نے اس کے گلے میں ہاتھ دبا کر چھوڑ رکھے ہیں اور خود بھی کراچی میں بیٹھے ہو۔" رحیم گل نے فوراً جواب دیا کہ "خبر مل گئی ہوگی۔" وہ بولا۔





”ایک تو یہ بیوہ کسی ہمارے ہر شے میں کمی ہوتی ہے۔“  
میں نے غصی سانس لے کر کہا ”ہر کام کچھ زیادہ ہی طرے سلیقے سے ہوتا ہے۔ آخر میں صرف طریق سلیقہ ہی رہ جاتا ہے کام کا کچھ چاہ نہیں چلا کہ اس کا کیا کیا۔ آپ کا خفیہ ارادہ تو اس خیال سے مطمئن بیٹھا ہو گا کہ یہ پیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے۔ یعنی آپ لوگوں کو یہ اطمینان ہے کہ اگر یہ کبھی غائب بھی ہوئے تو آپ انہیں دھمکے نکالیں گے۔ گستاخی صاف سراپہ آپ لوگوں کی خوش چمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ پچاس لوگ ملک سے باہر بھاگ جاتے ہیں۔ ہزاروں ملک میں ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ آپ ان لوگوں کی بات کر رہے ہیں جن کے اتنے دساک ہیں“ اندرون اور بیرون ملک نہ جانے کہاں کہاں راجے ہیں۔“

”خمس باق کے بارے میں زیادہ تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ خیس صاحب نے گرا مجھے تسلی دی۔ ”میں ہم ان لوگوں کو آزادانہ نہیں ہے کہ خیرہ اور اے ان کی طرف حوجہ ہو چکے ہیں۔ فی الحال یہ صرف پولیس کو ہی اپنے لیے خلوہ دیکھتے ہیں اور اس کا بندوبست بھیہ رکھتے ہیں۔ وہ خلوہ در حقیقت ان کے لیے خلوہ نہیں ہے۔ پولیس بعض اوقات تو ان کے لیے مددگار کا بدلہ ادا کرتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں یہ ابھی اسی طرح مطمئن رہیں۔“

”ابھا صاحب! آپ کی مصلحتیں آپ کے ساتھ۔“ میں نے ان سے بحث میں الجھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا ”لیکن مجھے اچانک آپ کو زحمت دینے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔“

”کیا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولے ”یہ تو کراچی میں چشتی صاحب موجود ہیں۔ انہیں تم میرا ہی متبادل سمجھو لیکن اگر معاملہ زیادہ ہی اہم ہو اور تم مجھے ہی اس پر صافے میں اور ریٹائرمنٹ کے آخری دنوں میں زحمت دینا ضروری سمجھو تو کسی بھی ذریعے سے اطلاع دے دتا۔ میں چند کمپنیوں کے نوٹس پر بھی چٹکی جادیں گا۔“

”ممت شکریہ۔“ میں نے گرمی طمانیت سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے سلسلہ متعلقہ کر دیا۔ میں نے دسمبر رکھا تو راجہ ایک تک مجھے گھور رہی تھی۔ شاید وہ میرے پاؤں کا نوا لگانے پر ابھی تک حیران تھی اور کچھ خفگی بھی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے چرانے کے لیے ایک بار ہر پیلے سے زیادہ پرجوش انداز میں ایک کے بجائے دونوں ہاتھ ہوا میں بندھ کر دے ہوئے پاؤں کا نوا لگایا لیکن احتیاطاً توازن اتنی رکھی کہ کرے سے باہر نہ جانے پائے۔

”لیکن اس جذبے اور حرارت کو بے معاد نہ چھوڑ دتا۔ میں ایک بار بحر حسیں کی طوبہ دہل گا۔ بلکہ فصاحت کروں گا کہ مجھے تانے بفر کوئی اہم قدم نہ اٹھانا۔“ وہ زور سے کہہ لے۔  
”جناب! میں تو آپ کو پہلے ہی خیوا کر رہا ہوں کہ شاید ہمیں آپ کو تکلیف دینی پڑے۔ اگر میرا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو میں یہ بات کیوں کرتا۔“

”خیمہ مجھے تمہاری طرف سے اطمینان تو ہے کہ تم کوئی معاف نہیں کرو گے لیکن کبھی کبھی غیر ارادی طور پر بھی انسان سے کوئی عافیت سرزد ہو جاتی ہے۔ بہت عطا رہتا۔“ ان کا لہجہ افسرانہ تھا اور کچھ صاحبانہ۔

”میرا خیال ہے کہ یہ پانے پر اسلے کی ناجائز تجارت کے ذریعے ملک کی بنیادوں میں بارود بھرنے میں اسپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے ساتھ ایک بہت طاقتور مالیاتی قسم کی شخصیت بھی شریک ہے۔ اس کا کام حمل سیدی ہے۔ وہ ایک غیر ملکی ہے لیکن۔“

میرا انہیں یہ بتانے کا ارادہ نہیں تھا کہ حمل سیدی کے سلسلے میں میں کیا کچھ معلوم کر چکا تھا اور اپنی آنکھوں سے کیا دیکھ چکا تھا۔ تاہم میں انہیں اس کے بارے میں کچھ اشارے ضرور دینا چاہتا تھا کہ انہوں نے جتنے ہوئے میری بات کاٹ دی اور بولے ”مجھے معلوم ہے۔ وہ شخص بھی ہماری لسٹ پر ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جشیہ کریم بھی غیر ملکی ہے۔ اس کا مصلحت ہمارے ایک دوسرے قریبی ملک سے ہے۔ وہ حمل سیدی سے بھی بہت پہلے سے پہلے ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو میں سچ بھی پکے ہیں۔ کافی طور پر بریس کے باشندے بن چکے ہیں اور اب تو کسی کے لیے یہ جانا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ یہ اصل میں غیر ملکی تھے۔ یہ اس ملک میں سچ میں ضرور گئے لیکن اس کے خیر خواہ کبھی نہیں بن سکتے۔“

”کیا ان کی گمراہی ہوتی ہے؟“ میں نے اس نئی اطلاع پر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”مستحق طور پر تو نہیں۔ البتہ بھی کھانا ان پر نظر رکھی جاتی ہے۔ خصوصاً جب یہ کسی غیر ملکی دورے سے واپس آتے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”بہت خوب!“ میں نے تھوڑے طرے لیے میں کہا ”متمنی خطرہ کہ وہ تک مشتبہ لوگوں کی گمراہی کا انا شاہد ارانتظار ہے۔“  
”مخبر فرمائے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے ”مشکوک افراد کی حیثیت سے یہ حال ہی میں تقریریں آتے ہیں۔ ہمارے ہاں کارروائی اسی طرح درجہ درجہ آگے جوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ان کی طرف سے اس لیے بھی زیادہ تشویش نہیں ہے کہ یہ پیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر نہیں نہیں بھاگ سکتے۔ ان کے بہت زیادہ معلومات یہاں پہلے ہوئے ہیں۔“

طرف تھا۔ وہ زمیلی زحالی شلواریوں میں تھے۔ دونوں کے گلے میں لمبے لمبے رنگین منظر جھول رہے تھے اور وہ چپوں سے ڈاکو یا کرائے کے قافلے معلوم ہو رہے تھے۔ دونوں خامسے جسم تھے اور کینڈوز نظروں سے صرف مجھے محسوس ہو رہے تھے۔ راجہ کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ شاید لڑکی ہونے کے باعث انہوں نے اسے بے ضرر شمار کیا تھا۔

راجل کا اچھ تیزی سے قیس کے نیچے جانے کا قہا گین میں نے اس کی طرف کی نگہیں سے صرف ایک ٹھوکر کچ کر زرب لب تیزی سے "حق" کا اور وہ رک تھی۔ کا ٹھوکر بڑا رشا پہ۔ کیجئے کہ میں نے ان پر نظر ڈالتی دوںوں اچھ ضامیں پلہ کر لے تھ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کا قہا تھ سے انداز میں مسکرائے گوا کہ مے ہوں "نکھاسا؟" اہی! تھی دشت ہے!"

تب میں نے نہایت اطمینان سے اچھ نچھ کر لیے۔ انہوں نے  
 کھا جنکو نہیں سیدھی کہیں لیکن اس وقت تک ان کے پیچھے ایک اور  
 شخص بڑے بارعب سے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اندر آچکا تھا۔ وہ  
 سادہ بوڑھا تھا اور کچھ اس طرح اندر آ رہا تھا جیسے گاڑی آف آف آ کر  
 معائنہ کر رہا ہو۔ وہ درانی تھا۔ اس کے چہرے پر زبردست جاکڑ  
 کشیدگی اور میرے لیے نفرت تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے امیر کا خوف  
 زدہ سا چہرہ نمودار ہوا۔

اس نے سنائی ہی تو ازمیں گویا صفائی پیش کی "سرا میں نے انہیں روکنے کی جہت کوشش کی لیکن۔"

میں نے بے پروائی سے ہاتھ چلا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ طوطا بد فطرتی تم جیسی مذہب لڑکی سے کہیں رکھے والا ہے اس پر غصہ اٹھ جا کر آرام سے ٹیلی فون بوزن سنبھالو اور کالروں پر ہنسنے لگو۔"

وہ دانی کے لیے مرنے لگی تو درانی حکمانہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "نہیں" تم اپنے کمرے میں نہیں جاؤ گی لڑکی! تم بھی یہیں بیٹھو۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ گی تو سیکرٹری بھی دالوں کو بلانے کی میں کسی قسم کی ڈسٹرینس اور ہنگامہ نہیں چاہتا۔ میں صرف دو منٹ کے لیے بات کرنے آیا ہوں۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ایک کاشکوف ہمدار کی کاشکوف کا سر ابر کی طرف ہو گیا تھا۔ اس نے اجازت طلب کی نکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر کو خفیف سی جنبش دی اور وہ سسے سے سسے انداز میں اندر آگئی۔ درحقیقت میں اس کے انداز پر ہی مسکرایا تھا۔ وہ اتنی سخی ہوئی تھیں جتنی غائب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سبے غصے کی کاشکوف کا سر میری طرف تھامیں دوڑائی نے دونوں کی گھون کی ٹال بھیجی کرنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے باطل خواہست تھیں دہن کی کھیں کھیں کھیں اس طرح میری طرف دیکھتے رہے جبکہ اس اشارہ بخشتی نہ جانے کتنے دیرت مار کر میرے پرانے ڈان میں سے ایک غلامی فعل مزاج بزرگ کی طرح مسکرائی کی کوشش کرنا تھا۔

درانی خزانے کے سے انداز میں مجھ سے غائب ہوا جس خوش حالی میں مت رہنا کہ میں محفل ہو گیا ہوں تو بالکل بے دست رہا ہو گیا ہوں۔ ابھی تو میں صرف محفل ہوا ہوں۔ نوکری سے نکال نہیں کیا ہوں۔ لیکن اگر نکال دیا گیا تب بھی میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ سرکاری نوکری میں پھر بھی انسان کے ہاتھ پاؤں کچھ بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں کوئی بھی کارروائی کرتے وقت قانونی قاعدوں ضابطوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔ نوکری سے نکلنے کے بعد میں زیادہ آزاد ہو جاؤں گا۔"

"یعنی شتر بے سار ہو جاؤں گا۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔

اس نے میرے الفاظ پر کوئی خاص توجہ دیے بغیر غصیلے سے انداز میں بات جاری رکھی "تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ میرا انتقال ایک بہت بڑے گھرانے سے ہے جو قیامی بھی ہے اور جاگیردار بھی۔ یعنی دو آتہ معاملہ ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہیں ورثی بہت لمبی چلتی ہے۔ اپنی عداوت کے مطابق میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے لیکن یہ پہلا اور آخری موقع ہے کہ اس طرح بات ہو رہی ہے۔ آج کے بعد بات نہیں ہوگی، بانی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے حسین امیر انداز میں تلی بجائی  
”تھماری اور تھمارے ان بچوں کی پرکار میں قابل حسین تھی  
دروانی تیر! ڈانٹا لگ ڈلو یہ بھی بہت عمدہ تھی۔ افسوس کہ یہاں  
کوئی کبیرا نہیں تھا جس کے ذریعے تھماری اس عظیم الشان  
پرکار میں کو حوام اتاس تک پہنچایا جاسکتا۔ اس کا مجھے افسوس  
رہے گا۔“

رہے۔ رات پہلے نے نہایت سنجیدگی سے اور بڑے دلدور سے میری تائید میں سر ملایا۔ زورانی کا چوہا سرخ ہو گیا۔ اس کے جیزوں کے پھڑکتے ہوئے عضلات نے بتایا کہ اس نے دانت پیچے تھے۔ میں نے نہایت نرم اور دوستانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "میں تمہیں صرف اتنی سی بات ہی کہنی تھی" اس کا پیغام ہی مجھ تک پہنچا تھا تو قلی فون پر بھی کہہ سکتے تھے۔ تم نے خواہ خواہ خود بھی زحمت کی اور اپنے ان دو گدھوں پر کھانچکھوکھ کا وزن بھی لادنا۔"

سے اپنے لیے کمرے کا قحبہ بن کر ان کے چہرے حریف سرخ  
 ہو گئے انہوں نے بے چینی سے کھانچوں کی حرکت دی۔ وہ  
 صرف دورانی کے اشارے کے منتظر تھے اس میں کوئی شک نہیں  
 تھا کہ وہ دورانی کے معمولی سے اشارے پر گولیوں کی پوجا کر سکتے  
 تھے لیکن مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ دورانی آج بےوقوف نہیں  
 ہو سکا تھا کہ علی الاطلاق نہیں تھا۔ یہی ہو گئی میں سوچا کہ خود  
 اپنے لیے چابی کا راستہ ہوا کر لیتا۔ اسے پیچھا آتا تو ان کو تھا کہ  
 یہاں کا رنگ کرنے کے بعد وہ اس کے سامنے خزاں نہیں ہو سکتے  
 تھے۔ فی الحال وہ صرف ہمیں مروجہ کرنے کی کوشش کرنے کی

اس کی کمر اپنے ماؤز کی ٹال رکھی ہوئی تھی۔ ان تینوں کے چہرے پر عجیب سی جھلکاہٹ اور کھپاہٹ تھی۔

میں نے امیر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ دراصل وہ جب چند منٹ پہلے ان تینوں کے پیچھے خوف زدہ سے انداز میں آئی تھی تو اپنے کمرے سے اٹھتے اٹھتے بیچنا ایک خفیہ بین دہا کر سیکر مٹی والوں کو الارم کے ذریعے مطلع کر دیا تھا کہ اس طرف ان کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے شفیع شاہ اور لونی بھی ہوٹل میں موجود تھے۔ انہیں بھی اطلاع ہو گئی تھی۔ میں ممکن تھا کہ جس وقت درانی اپنی دھمکیوں سے ہمیں مرعوب اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس وقت بھی ان میں سے کوئی جھبی دوہاڑے کی طرف سے اور کوئی سانے کی راہ رادی کے کسی ستون کی اوٹ سے کمرے پر نظر رکھنے کے لیے بھی بیٹھ چکا ہو لیکن کوئی حقیقی خطرہ محسوس نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے نہ اٹھنے کی ہو البتہ اب ان کے واپس جاتے وقت انہوں نے گات لگا کر نہایت خاموشی سے انہیں قابو میں کر لیا تھا۔ کوئی ہلکا سا پراسیس ہوا تھا۔ کوئی اصطاف نہیں ہوئی تھی کوئی گولی نہیں چلی تھی اور وہ انہیں بزموں کی طرح پکڑ کے لے آئے تھے۔

”ان کا کیا کرنا ہے سر؟“ شفیع شاہ نے پکے اس طرح پوچھا جیسے وہ سازد سلمان کے کچھ بڈل یا کارٹن تھے جن کے بارے میں وہ جانتا چاہ رہا تھا کہ انہیں کمال رکھنا تھا۔

”یہ تو تم نے خاصا مشکل سوال کر دیا نیر! میں نے سر رکھاتے ہوئے کہا“ مجھے ابھمن میں ڈال دیا۔ ہمارے یہ معزز مسلمان نہایت عمدہ جسم کی قسمی دھمکیاں دینے کے لیے تعریف لائے تھے جو اس میں ٹیپ ہو چکی ہیں۔“ میں نے سیر کی دروازے سے چھوٹا سا ایک ٹیپ ریکارڈر نکال کر انہیں دکھایا حالانکہ جس وقت درانی دھمکیاں دے رہا تھا اس وقت یہ ٹیپ ریکارڈر آن نہیں تھا۔ یہ بیس یونی ورائز میں ڈال رہا تھا۔ کبھی بوقت ضرورت کام آسکتا تھا۔ اس پر درانی کی کٹنگو پر گزرتی ٹیپ ہوئی تھی لیکن میں نے سوچا خوش چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں نے ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھتے ہوئے سلسلہ کلام چر ڈالا۔ یہ دونوں حضرات جو کچھ کھکھ فیس اٹھاتے ہوئے آئے تھے یہ تو ہمارے بہت زیادہ معزز اور خاص الخاص مسلمان ہیں۔ ان کی کٹنگو فوں سے کلپ نکال لو اور انہیں ذرا زیادہ عزت افزائی کے ساتھ باہر سڑک تک چھوڑ آؤ۔ ورائی صاحب ذرا کم معزز آدمی ہیں۔ انہیں ذرا کم عزت افزائی کے ساتھ ان کی گاڑی تک پہنچا دو۔“

وہ میرا مطالب سمجھ گئے۔ شفیع شاہ اور لونی نے درانی کے دونوں توہمیں کی باتوں کے پچھلی طرف نہایت مہارت سے بظاہر ہلکی سی لگ لگائی۔ وہ دونوں بوریاں کی طرح دھب سے قالین برگر پڑے۔ بازوؤں کے گرد منظر کشا ہوئے کی وجہ سے وہ جلدی اٹھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ سیکر مٹی کے جھانوں اور لونی و شفیع شاہ نے مل کر انہیں ذرا ڈھکی کر کے اٹھالیا۔ دائیں چہرے پر ستور ورائی

درا نی نے اپنی زبان سے میرے اس انداز کے تصدیق بھی کر لی۔ گو کہ اس کا چہرہ میرے سرخ ہوا تھا لیکن وہ مسکراتے ہوئے اپنے آدمیوں کو محل سے کام لینے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ”جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ اسے مارنا ضرور ہے لیکن اس کے قتل کے الزام میں ہمارا کتا بھی جیل نہیں جائے گا۔“

”گتوں کی جیل دیے بھی ابھی ہمارے ہاں نہیں مٹی ہے جہاں تمہارے آدمیوں کو رکھا جاسکے۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم چکیت بہت زیادہ ہو۔“ ورائی میری طرف دیکھ کر گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا ”کچھ دن اور چمک لو۔ اس شہر کی کوئی سڑک بہت جلد تمہارے خون کا ذائقہ بھی چکھے گی۔“

اس نے اپنے آدمیوں کو واپس پلے کا اشارہ کیا اور وہ تین تیزی سے کمرے سے رخصت ہو گئے۔ میں راجیلہ اور امیر تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ راجیلہ حیرت سے بولی ”یہ کیا چیز تھی یہی؟“

”یہ ورائی تھا۔“ میں نے لھڑی سانس لے کر کہا۔

”وہ تو میں سمجھ گئی تھی لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ کہا اس قسم کے سرکاری افسر بھی پائے جاتے ہیں؟“ وہ تعجب سے بولی۔

”سرکاری افسر تو عجیب و غریب اقسام کے پائے جاتے ہیں۔ تم نے ابھی نہ دیکھا ہی کیا ہے۔“ میں نے پہلے سے زیادہ لھڑی سانس لے کر کہا ”اور ذرا یہ بھی غور کرو کہ کچھ فیس اور کچھ شکوفہ ہمارے خلاف کتنے عام ہو گئے ہیں۔ چند سال پہلے تک جہاں اس طرح جھاڑو اٹھاتے بھی نہیں پھرتے تھے جس طرح اب پچ پچ کا شکوفہ اٹھاتے پھر رہا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ سوائی ہے بہت سے موانعوں کی۔“ راجیلہ نے بھی لھڑی سانس لی ”سب کو ایک دوسرے کے خلاف“ مصروفہ جہاں کر رکھا ہے۔ اس طرح لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں بھجوتی ہیں کہ ہر کوئی اس بات میں ہے کہ دوسرے کو قتل کر کے ہی اسے دنیا اور آخرت میں منت لے گی۔“

ان باتوں میں ہمیں شاید ایک ڈیڑھ منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ ورائی اور اس کے دونوں آدمی لوٹ آئے لیکن اس بار ان کے آنے کا انداز مختلف تھا بلکہ یہ گناہا پیسے۔۔۔ کہ وہ آئے نہیں بلکہ لائے گئے تھے۔ کمرے میں وہ تینوں ہی داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ اچھا خاصا ایک چھوٹا سا جلوس چلا آیا تھا۔ ورائی کے دونوں آدمی اپنے ہی مظلوم کے پھندے میں اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ ان کے بازو ان کے ہٹلوں سے چمک کر رہ گئے تھے۔ ان کی کٹنگو فیں ہوٹل کے سیکر مٹی کے دوہاڑی اور چاند چاند جھانوں کے پاس تھیں جن کے اپنے ماؤز ان کے ہٹلوں میں ہو لٹوئوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ ان دونوں توہمیں کی پشت پر لونی اور شفیع شاہ تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تھیں تھیں جن کی ٹال ان کی کمرے لگی ہوئی تھی۔ سیکر مٹی کے انچامچ دائود نے ورائی کو قابو میں کیا ہوا تھا اور

ہے مازور لگائے کھڑا رہا۔ راحیلہ نے پھر قی سے اٹھ کر دونوں  
 بچوں سے کلپ نکال لیے اور غلطی محسوس انہی کے پیٹ پر رکھ  
 دیکھ دیر پہلے اسیں اٹھائے ہوئے آئے تھے۔  
 پہلے جناب! "داؤد نے درانی کو باہر چلنے کا اشارہ کرتے  
 نہایت متوجہانہ انداز میں کہا "مگر عزت افزائی کا مطلب یہی  
 ہے کہ میں پراخت پر اس کی گاڑی تک پہنچا دیا جائے اور  
 نہت افزائی کا مطلب یہ تھا کہ کلا حلف برداروں کو ڈنڈا ڈھلی  
 کے پیر لے جا کر سڑک پر پھینک دیا جائے جاتے وقت درانی  
 جی ٹھکوں سے میری طرف دیکھا انہیں الفاظ میں بیان کرنا  
 مشکل ہے۔

اس روز اس واقعے کے بعد سکون سی رہا اور ہمارے باقی  
 حالت میں کوئی پہل بدل نہیں ہوئی۔ دوسرے روز دس بجے کے  
 ہمارے بڑے وکیل نے مجھے مطلع کیا کہ درانی کا حکم ہمارا  
 ہمارا وکیل نہیں کرنے کے لیے رضامند ہو چکا تھا بشرطیکہ ہم اپنی  
 جیت سے بیست ہواپس لے لیتے۔ محض ایک شخص درانی کی وجہ  
 نہ لگے کی بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ یہ تھے والدین کا کتا تھا۔ شاید  
 باغیال تھا کہ ویسے ان کا حکم بہت نیک نام تھا۔ وکیل صاحب  
 نے بھی بتایا کہ حکم جاتی تحقیقات کے نتیجے میں درانی کے ہر طرف  
 جانے کے بہت زیادہ امکانات تھے یہ بات مجھے شیع شاہ بھی بتا  
 آگے۔ اسے یہ بات مجھے کے اندر کے آدمیوں سے معلوم ہوئی

وکیل صاحب میری مرضی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ہم بیٹیشن  
 لگالینے کے لیے تیار تھے یا نہیں ہمیں یہی یہ کہ مجھے سے کوئی لڑائی  
 تھی اور میرا مسئلہ تقریباً حل ہو چکا تھا اس لیے مجھے بدعتی  
 نہ کہ آگے بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے صرف  
 بدلے سوچا پھر وکیل صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ بیٹیشن  
 لگالینے کی کارروائی مکمل کر لیں اور ہوش کے جزل غیور اور  
 شہر کے ساتھ لے کر اس الجھنی کے دفتر سے اپنا ریکارڈ بھی  
 لے لیں۔ جی ایم اور بی ایم کو اس لیے ساتھ لے جانا  
 اپنی تھا کہ وہ دیکھ لیں ہمارا کوئی ضروری ریکارڈ یا کوئی اہم  
 نوٹ بک نہ کھو گئی ہو۔

خوبی دیر میں یہ خوش خبری ہوئی کے تمام دفتری اسٹاف  
 رات ہی چلی گئی۔ یہ ہماری ایک بہت بڑی اخلاقی فتح تھی۔ حالات  
 اپنی کی طرف واپس آ رہے تھے گزشتہ روز درانی جو بد مزگی پیدا  
 یا تھا اس کی بانٹو شکواریاد کے باوجود وہی کالی اطمینان محسوس  
 جاتا تھا کہ یہ کتنا بھی ہے جانتا تھا کہ میں کسی حد تک ترمیم میں  
 رہا ہوں کے قریب راحیلہ اور فونی سے باتوں کے دوران میں  
 آگ مجھے یاد آیا کہ رحیم کل نے قصور اور اس کے دودھ دگا  
 کھانوں کو قابو میں کرنے کے بعد ان کے بارے میں کوئی خبری  
 نہیں تھی کہ ان سے تفتیش میں کوئی اہم بات معلوم ہوئی تھی یا  
 نہ؟ مسئلہ کہاں تک پہنچا تھا؟

یہ بڑی غیر معمولی بات تھی کہ اس نے اس سلسلے میں کوئی  
 فون نہیں کیا تھا ورنہ وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں بھی فون  
 کرتا رہتا تھا۔ میں نے بھی اسی لاشعوری ہی ذہن کے باعث اسے  
 فون نہیں کیا تھا کہ جب کوئی خاص بات ہوگی تو وہ خود ہی فون کر لے  
 گا لیکن اب چونکہ اس کی طرف سے خاموشی کو تقریباً دو دن گزر  
 گئے تھے اس لیے مجھے خود ہی فون کر لینا چاہیے تھا۔

یہ سوچ کر میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا یہی تھا کہ امیرا دو  
 کا ایک اخبار لے کر میرے دماغ پر ٹپکا۔ اس کی رنگت کچھ اڑی  
 اڑی اور آنکھیں پھیلی پھیلی تھیں۔ ٹیلیفون کی طرف بڑھتا ہوا  
 میرا ہاتھ رک گیا۔ امیر میز کے قریب پہنچ کر اخبار میری طرف  
 بڑھاتے ہوئے ہوئی "سرا! آپ نے یہ دیکھا!"  
 وہ شام کے اخبار میں سے ایک تھا۔ صبح کے اہم انگریزی  
 اور اردو کے اخبار میں سرسری نظر سے دیکھ چکا تھا۔ شام کے  
 اخبارات میں بھی کھاری دیکھا تھا جب کچھ زیادہ ہی فرصت میر  
 ہوئی تھی یا ان میں ہماری دلچسپی کی کسی خبر کی طرف کوئی نشان دہی  
 کر دیتا تھا۔ وہ کل میں بہر حال بھی اخبار آتے تھے اور امیر تو شام  
 کے اخبار میں بھی ایک نظر ضرور ڈالتی تھی۔ یہ اخبار ہوئی کی  
 لالی میں نہیں رکھے جاتے تھے۔ ہوئی کے متعلقہ دفتری شعبوں میں  
 ہی گردش کرتے تھے۔ امیر ایک با تصویر خبر کی طرف اشارہ کر رہی  
 تھی جس کی سرخی کالی نمایاں تھی۔ اس سرخی کے نیچے وجہ اور  
 اساتذہ انپکڑ رحیم کل کی سکرانی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ

وردی میں تھا۔ فونی اور تارک یک جہت کے باوجود میرے لیے اس کو  
 پہلی نظر میں ہی پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ یہ ایک عمدہ پورٹٹ تھا جو  
 میں اس کے گھر میں بھی دیکھ چکا تھا۔  
 فوری طور پر مجھے یہ خیال آیا کہ شاید یہ نس سیرا کے قتل کا  
 معاملہ ہوئے اور صندوق کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں آئے ہیں  
 کچھ تاخیر ہو گئی ہے۔ آج خبر آ رہی ہے اور چونکہ اس کا سامانی کا سرا  
 رحیم کل کے سر ہی بندھنا تھا اس لیے اسی سلسلے میں اس کی تصویر  
 چھپی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک باوردی پولیس والے کی  
 تصویر اور نظر آ رہی تھی جو لوہان اور مرہہ معلوم ہوتا تھا۔ تب  
 میں نے ذرا ڈوٹے ڈوٹے سرخی پر نظر ڈالی اور سیرا دل بیٹھے گا۔ سیاہ  
 پٹی میں سفید الفاظ گویا کانٹن کی طرح میری آنکھوں میں بچا ست  
 ہو گئے سرخی تھی۔  
 "میں معلوم ہوا ہے کہ گردوں کی جائزہ سے انپکڑ رحیم کل اور  
 ایک کانسٹیبل ہلاک۔"

نیچے محض سرخی تھی۔  
 "تجارت لگا کر پولیس سب اہل کو نشانہ بنایا گیا اور اہم حادثہ  
 جائزہ کی گئی۔"

یہ جلی الفاظ تو میں نے پڑھ لیے لیکن باریک الفاظ میں خبر کا  
 متن میری آنکھوں کے سامنے ڈھنڈلائے گا۔

آخر کار میں نے بہت کسے خبر نہ ڈالی۔ خبر مختصری تھی اور اس میں اس سے زیادہ معلومات نہیں تھیں جتنی سرخیوں میں ظاہر کر دی گئی تھیں۔ گناہی قمار کے خبر پھیلنے کے لیے جانے تک کراٹم رو پر رو کچھ زیادہ حقیقات معلوم نہیں کر سکے تھے۔ خبر شام کے ۱۰ بجے اخبار میں بھی موجود تھی اور اتنی ہی مہم تھی۔ واقعہ رات کے پچھلے پر کا تھا۔ رحیم گل اپنے قاتلے میں بہت دور تک مصروف رہنے کے بعد رات کے پچھلے پر ایک اسے ایس آئی اور وہ کانٹیلوں کے ساتھ موبائل میں روانہ ہوا تھا۔

اسے راستے میں اپنے گھر آگیا تھا جب کہ اسے ایس آئی اور کانٹیلوں کو آگے گئیں جانا تھا۔ قاتلے سے کچھ ہی دور ایک دفتری عمارت کی آڑ میں کچھ دھشت گرد گھات لگائے بیٹھے تھے۔ عمارت اس وقت دیر اور تاریکی میں ڈھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر کچھ بھی اندھا چرا پھیلا ہوا تھا۔ یکدم قازنگ شروع ہونے پر پولیس کی گاڑیاں اکثر موت کے قفس ثابت ہوتی تھیں۔ شاید ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ فوری طور پر انہیں کچھ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ رحیم گل گاڑی ڈرائیو کرنے والے کانٹیل کے ساتھ آگے بیٹھا تھا اس لیے وہ دونوں دھشت گرد اس پر چڑھنے کے ساتھ ہی مارے گئے۔ پچھلے حصے میں موجود اسے ایس آئی کو پوزیشن لے کر جوابی قازنگ کرنے کی سلت مل گئی۔ اس کے پاس ایک ایس ایم جی موجود تھی۔ اس کی قازنگ کی دھ سے دھشت گرد فرار ہو گئے۔ اسے ایس آئی نے انہیں محض بیرونی کی سی صورت میں ایک گاڑی میں فرار ہوتے دیکھا لیکن وہ نہ تو گولی ایسی چڑھ کر کہ سا جران کی شناخت میں مدد دیتی اور نہ ہی ان کا تعاقب کر سکا کیونکہ موبائل کے آگے دونوں ہوٹل پر رست ہو چکے تھے اور تعاقب کرنے کے لیے اس کے پاس غولی بھی نہیں تھی۔

تین اخبارات میں تقریباً پچھلے معلوم کی یہ خبر پڑھنے کے بعد محمد پرنگ کم مہم بیٹھا رہا۔ رابطہ اور فونی نے بھی خبر دی کہ یہ بھی ہم سے خود پینے تھے۔ اس پر بھی میرے سامنے غم زدہ ٹھہری گئی۔ میرے دل کی گواہیوں میں ایک دوا ڈی پڑی تھی جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ حقت بھی اسے نہیں بھر سکے تھے اس کو کھانسی ہو کر کہ گئے تھے۔ میری کچھ لمحہ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

آہم میں نے چھ لے بعد خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور نہ جانے کس مہم امید کے ساتھ اس کے قاتلے کا نمبر ڈال کر کیا۔ شہری طور پر دیر اور متحد اس واقعے کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا اور حقیقت معلوم کرنا قاضیوں کا شہورہی تھا۔ شاید کسی مجرم کی تنہائی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے میں نے رحیم گل کا ڈائریکٹ نمبر ڈال کر کیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے کمرے میں کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ کچھ بعد میں قاتلے اس کے کمرے میں خود افسرین کا ٹھکانا ہوا۔ قاتلے کے کام نمبر تو قیون نمبر

وصول کرتا تھا اور وہ نمبر آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ اس وقت تو مجھے رحیم گل کا ڈائریکٹ نمبر بھی آسانی سے ملنے کی امید نہیں تھی کہ مل گیا اور وہی عینیں کے بعد "ہیلو" کی خبر تو آسانی سے مل گئی۔ رحیم گل کی یہ تھی۔

میں نے اسے اپنا دم سمجھا۔ میں اس نمبر اس تو آواز نہ کا کافی حد تک مادی تھا شاید اسی لیے میرا لا شعور میرے ساتھ کوئی شرارت کر رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک کچھ بھی نہ بول سکا۔ تب میری حریف ذرا زور سے بولا "ہیلو"۔ کون ہے بھی؟ بات کنی ہے یا نہیں؟

"بات تو بہت لمبی کنی ہے لیکن پہلے تمہیں تو جانے کہ تم کون ہو غیبت تیری؟" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"چھا۔ تو یہ تم ہو؟" وہ دھڑکے سے ہنسا میں کیا سوچا ہوا تھا کہ اب تک تمہارا فون کیوں نہیں کیا۔ میں موبائل فون پر تمہارے کال کی توقع کر رہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں تھا کہ تم قبر میں بھی موبائل فون ساتھ لے کر جاؤ گے ورنہ موبائل پر ہی کرنا۔" وہ بچے بھی اس وقت میں نے اپنی دانست میں فون نہیں کیا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تمہاری کرسی پر تمہاری جگہ اس وقت کوئی نہ ڈالے دار افسر بیٹھا ہوگا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق تم تو اس وقت عالم ادراج میں ہو۔ اور میرا خیال ہے بدحوالے۔ خصوصاً بدحوالے سے ٹیلیفون پر بات نہیں کی جا سکتی۔

"بدحوالے سے تو ٹیلی فون پر رابطہ زیادہ آسان ہوتا ہے۔" ایک بار پھر ہنسا "میری مدد۔" بلکہ بقول تمہارے بدحوالے۔ اس کمرے اور اس فون سے اتنی باتیں ہے کہ اسے چھوڑ کر جانے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔ اس نے جسم کے قفس سے آواز ہونے کے بعد بھی ان چیزوں پر قبضہ پر قرار رکھا ہوا ہے اور اپنی ٹیلیفون پر خودی ویسیو کر رہی ہے۔ خودی جواب دے رہی ہے اور اسی کام میں کافی مصروف ہے۔ ابھی میں ویسیو روکھا ہوں کہ وہ میرے ہی لیے پھر کھینچ جاتی ہے۔

"وہ کیا اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے قبیلے سے انداز میں فراتے ہوئے کہا "ڈر کیو، کا" طرح ہنسا بدحوالے اور یہ بات کہ یہ کیا پکڑ ہے؟

"گلوں سا پکڑ؟" وہ مصروف سے بولا۔

"آہ مصروف بننے کی ضرورت نہیں۔" میں نے قیون نہی رکھتے ہوئے لیکن اس میں زیادہ سے زیادہ ضرر سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ شام کے اخبارات میں تمہاری حالت حال کیا تھی ہوئی ہے؟" میں "امیر" رابطہ اور فونی تو اس وقت یہاں قیون تھا اس منتہ کے بیٹھے ہیں۔ قیون شام کی غھرے شام کے اخبارات میں گھرے ہوئے وہ بھی کسی سے گرا پڑا تھا ہوگا۔

وہ بدستور گفتے لیے میں بولا "پھر بھی تمہارا خون میری توقع سے کسی زیادہ تاخیر سے آیا۔ اب تک تو میں بجاسوں کا پس دیکھ کر کچکا ہوں۔"

"میں نے اخبار کا پی ٹی وی سے دیکھا۔ بلکہ ہمیں تو اب بھی امیر نے لا کر دکھائے ہیں۔ لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ میں یا میرے ساتھی غزوہ پریشان یا تشویش زدہ ہیں۔ ہم نے تو خبر دیتی ہی ایک زبان کا تھا جس کی جملیں پاکستہ۔ لیکن انیسویں صدی کا ایک سانا خواب تھا۔ تم سے بھلا اتنی آسانی سے ہماری جان کیے بھڑکتی ہے۔" میں نے غصہ کی سانس لی پھر یک دم جوبہ لے ہوئے کہا "خوش تو رہو! اب بتائی دو یہ کیسے ہوا؟ اخبار میں یہ خبر کیسے آ گئی؟ کیا یہ تمہاری اپنی شرارت تھی؟"

"نہیں۔ میری مراد شرارتوں کی نہیں رہی۔ اور میں تو خیر جہن میں بھی شرارتی نہیں تھا۔" وہ میری سانس لے کر بولا "سب دراصل غلط فہمی میں ہوا لیکن اچھا ہی ہوا۔ اس میں شاید قدرت کی کوئی مصلحت تھی۔ مجھے اس سے کچھ فائدہ ہی پہنچنے کی امید ہے۔ گو کہ یہ غلط فہمی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہے گی۔ کل کے اخباروں میں اس کی تردید آجائے گی لیکن اس غلط فہمی کا اتنی دیر تک برقرار رہنا بھی قیمت ہے۔"

اس نے ایک لمبے وقفہ کیا بھرتائے گا "میں واقعی اسی سوا کل میں جانے کے لیے قحطی سے نکلا تھا اور اس میں بیٹھ بھی گیا لیکن قحطی کے گیت پر میں اسی وقت چھلے ایک برس میں دوست کچھ پریشانی کے عالم میں تھن پہنچا۔ اسے اپنے ایک نہایت بااثر کام کے سلسلے میں میری مدد کی فوری ضرورت تھی۔ میں سوا کل سے ان کر اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔ اگر اس وقت دہشت گردوں کا ایجنٹ کسی سے میری عمرانی کر رہا تھا شاید وہ یہ تبدیلی نہیں دیکھ سکا۔ اور اگر قحطی میں ان کا کوئی تجربہ قحطی انہیں اس کی اطلاع نہیں دے سکا۔ سوا کل دوسرے راستے سے روانہ ہوئی جب مرے میں اپنے گھر بھی جانا غصہ میں اپنے دوست کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے راستے سے روانہ ہو گیا۔ سوا کل پر راستے میں گھات لگا کر فزک کی گئی۔ اس وقت ذرا پور کانسٹیبل کے ساتھ میں نہیں ایک سب انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہلاک ہو گئے۔ ایک اسے اتنی گاڑی سے کہ وہ فزک کے کہنے میں کامیاب ہوا۔ مراد صلح کی جب پس والے جانے کو وہ پر اور پھر اسپتال پہنچے تو دوڑیں جگہ کچھ دوسرے لوگ موجود تھے جنہیں کچھ صورت حال کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے میرا نام لیا۔ انہوں نے کیا یاں پس میں جانے کا وقت ہو رہا تھا اور صبح کے اخبار تو مارکیٹ میں آچکی تھیں۔ صبح کے اخبار اس خبر کو اہم سمجھتے ہوئے "مس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے زیادہ تظہین کے بغیر کھلت میں خبر لکھی۔ گو کہ انہیں اخبار مارکیٹ میں کتنے تک اپنی غلطی کا اعادہ ہو چکا تھا جو دراصل ان کی بھی غلطی نہیں

"چھوڑو؟ کیا واقعی تم لوگوں کو میرے بھرنے کا مدد ہوا تھا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔  
"نہیں۔ ہم تو خوشی کے مارے ڈانس کر رہے تھے۔ شادی کے بارے میں لیکن انیسویں صدی کے یہ خبر لگتی تھی۔ میں نے جل کر کہا "لگتا ہے تم اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہو رہے ہو۔ شاید اس وقت ہاجیس کی پڑ رہی ہیں۔"  
"مگر مجھے اپنے دو آدمیوں کے مارے جانے کا دکھ نہ ہوتا تو شاید اس وقت ایسا ہی ہوتا۔ اگر ہر انسان کو مرنے کے بعد کسی طرح چوری چھپے اپنی موت پر دنیا کا تامل دیکھنے کا موقع ملتا تو کافی لطف رہتا۔ اس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے۔ مثلاً مجھے لے لے لے۔ وہ پیشہ ور بزم اور دہشت گرد جو کسی نہ کسی وجہ سے آزاد پھر رہے ہیں اور جو آئندہ مجھے ہلاک کرنے کی دھمکیاں دیا کرتے تھے اس وقت اخبارات کو میری "ہنگامی موت" پر نہایت دو دہرے الفاظ میں تعزیتی پیغامات بھیج رہے ہیں۔"  
"مثلاً ہر ہے۔ سیاست بھی کوئی جڑ ہے۔" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا۔  
"میرا حال۔۔۔ مرنے کے بعد مجھے پتا چلا ہے کہ میں خاصا مشہور آدمی ہوں۔" وہ بولا "صرف شام کے تین اخبارات میں میری موت کی خبر مجھے سے خاصی اہل بگ تھی۔"  
"کمزور خبیث لوگ اسی طرح مشہور ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ شہرت نہیں۔ رسوائی ہے۔ شہرت اور رسوائی میں بڑا فرق ہے لیکن انہیں یہ فرق نظر نہیں آتا۔"  
"جستہ چلے گئے کہ رہے ہو۔" وہ ہر اٹانے بغیر بولا۔  
"نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم تو خوشی سے ہو اوس میں اڑے جا رہے ہیں۔ کیسے آدمی! تمہاری وجہ سے دو تین شرفا کو ہارت اٹنگ ہوتے ہوئے پچا ہے۔" میں نے کہا۔  
"اس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ مصمانہ سے لیے میں بولا۔  
"تمہارا قصور یہ ہے کہ چھپے ہی چھپیں پتا چلا تھا کہ تمہارے بارے میں ایسی کوئی خبر چھپ گئی ہے۔ جس کی کم از کم اپنے قریبی لوگوں کو فون کر کے اطلاع دے دینی چاہیے تھی کہ اگر یہ خبر ان کی نظر سے گزرے تو وہ پریشان نہ ہوں۔ تم اپنی تمام تر بے شری کے ساتھ سب سابق زندہ اور سلامت ہو۔" اتنی اہل کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ "میں نے واقعی جل کر کہا۔  
"زور تان کو تو میں نے اطلاع دے دی تھی۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"ہاں۔۔۔ اب زور تان کے علاوہ جس دنیا میں بھلا کوئی کہاں نظر آئے گا۔ کسی اور کو اطلاع دینے کا خیال بھلا جس کیسے آسکتا تھا۔ ہمیں نے مزید جل کر کہا۔  
"میں نے جان بوجھ کر اطلاع نہیں دی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا، جس میں اور تمہارے ساتھیوں کو کچھ تشویش ہوتی ہے یا نہیں۔"

گولڑیوں کے معمولات میں ویسے ہی شامل ہے۔ کسی کی خصوصی خواہش پر اس قسم کا کوئی کام کرنا ان کے لیے تشنگی کی مسئلہ نہیں ہوتا۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہر شے میں مدت پڑی ہوگی۔ پھر ان کے ایسے ایسے سرگشت پیچھے ہوئے ہیں جن کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔

۳۔ منول نے یہ سب کچھ مان لیا ہے؟ میں نے پوچھا۔  
 مہمت کچھ مان لیا ہے۔ بہت کچھ مجھے خود امانانہ ہے۔ مجھے کے پاس بہت کچھ معلومات موجود ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اب یہ کام ہمارے مجھے کے بس کا نہیں رہا۔ خصوصاً جب کہ مجھے میں اس قدر کرکشن ہے اور اس کرکشن کے باوجود اگر کوئی کچھ کرنے لگا ہے تو اس کے ہاتھ پائے دھلے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ زیرِ حجاب بھی آجاتا ہے۔ یہ ایک بہت پراسرار گولڑی اور کنبیر چکر ہے جس کا ایک بہت معلوم سا سرا میرے ہاتھ آتا ہے۔ ابھی میں نے صرف اپنی بیابا کے مطابق ہی کچھ کرنے کی کوششیں شروع کی تھیں کہ کچھ اعلیٰ شخصیات کا دباؤ پڑنے لگا۔ میں اس دباؤ کو خاطر میں نہیں لایا تو تھانے کو بم سے اڑا لے اور مجھے گولڑیوں سے چھٹی کرنے کی دھمکیاں دی جاتے تھیں۔ گزشتہ رات اس سلسلے میں زیرِ حجاب بھی پیش کر دیا گیا۔ ابھی اصل فلم بھی چل سکتی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ اس فلم میں میرا کردار تو رات ہی انجام کو پہنچ چکا ہوتا۔ وہ تو محض ایک اتفاق نے بنالیا۔

میرا خیال ہے انہی ساری باتوں کی وجہ سے تم نے منور منیر اور ان کرکوں کی گرفتاری کی خبر بھی اخبارات میں نہیں آئے دی۔ میں نے کہا۔

ہاں۔ تم ٹھیک سمجھو۔ اور اخبارات سے یہ خبر چھپا کر دیا ہے کہ تھے چہانے کے حرافوف محسوس ہوا۔ بعض اوقات اخباروں میں کوئی خبر چھپے گا کہ وہاں منور منیر ہوا ہے اور بعض اوقات کوئی خبر چھپانے میں تاخیر ہونے آجاتی ہے۔ بہر حال جن تک پہنچی تھی ان تک پہنچی تھی اور غلط فہمی حرکت میں آگئی۔  
 تمہیں جیشہ کریم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تو کچھ کرنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔

تم کچھ کرنے کی بات کر رہے ہو۔ میں تو سب کچھ کرنے پر تیار تھا۔ میں نے اسے باقاعدہ گرفتار کر کے لے لے چھاپا مارا تھا لیکن حساری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ تائب ہو چکا ہے۔ اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

میرے محل سے بے اختیار ایک کراہی لکھ چکی تھی۔  
 چھ! میں نے ذرا بک کر کہا لیکن مجھے صحیح طور پر خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ نصرت میں نے کس پر بھیجی تھی۔ اسی لیے ایک خیال مجھے کے کونے کی طرح میرے ذہن میں لگا اور میں نے تیزی سے کہا کہ جیشہ کریم تائب ہو گیا ہے تو پھر کیسی مثال مسجدی بھی مناسب نہ ہو جائے گی کہ یہ ایک ڈنڈہ کی دو مضبوط ترین کڑیاں ہیں۔

ہمارے مجھے کے لوگوں کی غلطی تھی لیکن اب اس سلسلے میں یہ سب کچھ تھا۔ اب تو وہ کل کے اخبارات میں ہی اس کی خبر کے شایع ہمارے آدمیوں کی ہڑتوں پر ہمارے لئے بھی ہے۔ یہ بھی کل دراستان غم۔  
 راجی کھارا زندہ بچا جاتا ایک دراستان غم ہی ہے۔ میں نے ہانس نے کر کہا۔

ہمارے دو آدمی تو بہر حال جرم ہے مگر ان میں ہمارے مجھے اس کے سبب میں آسف بھٹک گیا میں صرف اس خیال پر زیادہ غم زدہ نہیں ہوں کہ انہیں شہادت نصیب ہوگی بلکہ کہ اس سلسلے میں کچھ جاکر رہا ہے؟ کچھ امانانہ ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

لیکن نہیں۔ بہت اچھی طرح امانانہ ہو چکا ہے۔ وہ ہے بولا۔ یہ سلسلہ منور منیر اور اس کے دو ساتھی کرکوں لڑی سے جڑا ہوا ہے۔

اب منور منیر اور اس کے ساتھی کرکوں کے پیچھے ایسے لوگ ہیں طرح طرح پولیس موبائل پر۔ اور خصوصاً تم جیسے پولیس چکر کرنے کی جرات کر سکتے؟ میں نے پوچھا۔

تم کس دنیا میں بیٹھے ہو بھولے بادشاہ! وہ ٹھنڈی سانس لے رہا تھا تو ایسے ایسے کرہ موجود ہیں جو ملک کی بہت بڑی قیادت پر محلوں کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ میں بے چارہ ہوں۔

نہ مجھے معلوم ہے لیکن میرا مطلب ہے۔ کیا منور منیر کو پکڑے جانے والے کرکوں کی جڑیں وہاں تک پہنچی تھیں؟ میں نے جانا چاہا۔

نہ ٹھیک۔ "رجیم کل نے جواب دیا۔ "ان کا تعلق اس قسم کے لوگوں میں سب سے بڑے گروہ سے ہے جنہوں نے اس شرکی اور معاشرت دونوں کو کر فٹل بنا رکھا ہے۔ ان کے ڈاکوؤں کا سلسلہ تو اتنی بک۔ جو بین فٹن میں کچھ ایسی مالیاتی قسم کی شخصیت بھی ہیں جو انہیں باطل تاخوات سمجھتے ہوئے کے لیے خوش سے بڑی بڑی رقمیں دیتی ہیں اور اسی مناسبت سے جیشہ کریم اور بھانے کام کراتی ہیں۔ یعنی یہ لوگ ان کے لئے کی گولڑی فورس کے فروغ میں انجام دیتے ہیں۔ اسی قسم کی شخصیتوں میں سے ایک جیشہ کریم ہے۔ یہ دونوں کر کے جیشہ کریم کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے۔ منور منیر میں جو کچھ امانانہ خانہ گرا کا دعویٰ کیا ہو رہا ہے وہ سب کچھ منور منیر کو کوئی ضرورت پڑتی ہے یا اس پر ہے تو جیشہ کریم اسے کرائے کے گورنر فراہم کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے "انوار کا" ہمارے کراہ کرکٹ لہنا راتوں میں لکھنا دفتر یا مارکیٹ کو آگ لگانا ان کے کرائے کے



لیتا ہوں کہ جن سے واسطہ پڑا ہے وہ واقعی بہت نوجوان ہیں۔  
 خیار ہیں۔ کم از کم ان کا فرق تو ہے مجھ میں اور وہ سب سے بڑے ہیں۔  
 میں۔

جمہرہ مال۔ اگر جشیہ کریم اور تھیل سیدی ہی صاحبہ  
 تو کچھ ساری جوشو دی ہے کار ہوگی۔ میں نے کتبہ  
 بوجھل سانس لے کر کہا تھیلو کی بڑ اور عادی نائب ہو گیا ہے  
 صرف وہ چار بچوں کو سنبھالے بیٹھے رہو۔ اس سے کیا فرق  
 ہے۔ اصل کہانی تو انہی کے گھر میں آئے کے بعد کچھ  
 تھی۔ لیکن اللہ تو صرف پر نس میرا کے گل کا معاملہ ہوا ہے  
 اس سے آگے معاملہ کہاں تک جا رہا تھا اور یہ کیا کیا  
 پہلا ہوا تھا اس کی قصیدت کا اب سامنے آنا مشکل ہو گیا  
 مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ نائب ہونے میں اتنی بڑی کامیابی  
 تو میں اپنے کم وسائل کے ساتھ ہی ان کی نگرانی کا بعد سے کل  
 میں تو اسی غلطی میں رہا کہ یہ اتنے بڑے عمر کے ہیں۔  
 نہیں بھاگیں گے۔

میں بھی اسی غلطی میں رہا۔ "رجیم گل نے اجازت  
 "دوسرے ہمارے پاس غری کی بھی کی ہوئی ہے۔ ہر حال میں  
 اعلیٰ افسران سے کہہ کر شہر بھر کی پولیس کو وارنٹ کروا رہا ہے۔  
 اڑے دو سو پور بھی نظر رکھی جا رہی ہے لیکن ایک خوار کی یہ  
 کہ ان لوگوں کے نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل نہیں  
 ان پورٹ سیکورٹی والے اس معاملے میں کوئی شک  
 کر رہے۔

"یہ ایک اور افسوس ناک پہلو ہے کہ ایسے عجیب  
 بھی ہمارے اداؤں کے درمیان حفاظت نہیں ہے۔ اس  
 سے بھی خطرناک لوگ پر اپنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔  
 اداؤں نے اس قسم کے لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں  
 کرنے کا تہہ کر رکھا ہے۔" میرے لیے میں ایک بار بھر  
 آئی۔

جمہرہ مال۔ امید نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنی تھیل سے  
 ہو سکیں گے۔ "رجیم گل نے گویا امید کا پہلو تلاش کیا  
 مستقل نائب ہونے کو بھی یہ لوگ ترجیح نہیں دے سکتے  
 یہاں بہت لمبے چوڑے مفادات پہلے ہوئے ہیں۔  
 چوڑے بیٹ اپ کو چھوڑ کر یہ پیشہ کے لیے نائب نہیں  
 ان سانچوں نے ماضی طور پر اپنے بلوں میں پہلی ہلکے  
 میں نے ملک کی ایک اہم شخصیت کو بھی اس قسم کی  
 جی پی جی کھٹ کر کے ہونے کا حال۔ "میں نے افسوس  
 اس فعل قتل کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر ان کی  
 ماضی ہوئی تب بھی میں ممکن ہے کہ جب وہاں  
 حالات ان کے حق میں ہوں۔ کوئی ان کا کچھ بھی نہ کرے  
 میرے اندر بچے کے مطابق مستقل طور پر نائب

تھیلو اگر اچھی اوقات نہیں ہے کہ اس پر ہاتھ ڈال سکو تو کم از کم  
 اس پر فخر رکھنے کا بندوبست تو کر لو۔ لیکن ہے جسے جلدیاد پر اس  
 پر ہاتھ ڈالنے اور کسی بہت سے کیس کا کریٹ لینے کا موقع مل  
 جائے۔

"تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں کافی افسوس کے ساتھ  
 اطلاع دے رہا ہوں کہ وہ اچھی کاچر بھی نائب ہو چکا ہے۔ اس  
 نے کسی خاص باسٹ کے بغیر کہا۔ میرا دل بیٹہ سا گیا اور یکدم ہی  
 میرے حواس میں جھنجھی ہو گئی۔  
 کیا واقعی؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ سیدہ اطلاع ہے۔ میں نے اسے تلاش کر لیا تھا مگر  
 وہ کہیں نہیں ملا۔"

"جس اس کو تلاش کرنے کا خیال کیا تو کرا گیا؟ میری اطلاع  
 پر تم نے اس کے ہاں چھاپا مارا تھا اور وہ ناکام رہا تھا تو تم مجھ سے  
 بہت خفا تھے۔ جس میں اس کے سامنے کافی سخت انٹیلیجنس رہی تھی اور  
 میرا خیال تھا آئندہ تم اس کے پاس بھی نہیں پہنچو گے۔ مگر تم نے  
 اسے کس سلسلے میں تلاش کرانے کی کوشش کی تھی؟ میں نے  
 قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ناخ صرف تمہارے پاس ہی نہیں۔ تمہارا سا دانغ  
 ہمارے پاس بھی ہے۔"  
 "یہ تو بڑی حیرت انگیز اطلاع ہے۔" میں نے تھکا ہوا۔

وہ میرے الفاظ پر توجہ دے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا  
 "اندازہ تو مجھے بھی ہو چکا ہے کہ ایک نوخیز کی لڑکیاں ہیں۔ میرے  
 پاس کچھ اطلاعات بھی ہیں اور صندوق منیر کے ساتھ جو درگاہ  
 ہاتھ لگے ہیں، ان سے بھی بڑی اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔  
 انہی کی بنیاد پر تو میں نے جشیہ کریم کو پکڑنے کا پابندوبست کر لیا تھا  
 لیکن افسوس کہ ذرا سی تاخیر ہو گئی اور وہ ہمارے ہاتھ سے پہل  
 گیا۔ یہ دونوں گر گئے کوئی عام اور معمولی قسم کے بدعاش نہیں  
 ہیں۔ یہ بڑے ہی گراں درشت گرد ہیں۔"

"انہوں نے آسانی سے تو زبان نہیں کھولی ہوگی؟ میں نے  
 خیال ظاہر کیا۔

"اس قسم کے لوگ آسانی سے زبان کھولتے ہیں۔ جب  
 وہ خون کی آفتاب کرنے لگے اور موت کی دعا میں اٹھتے تھے تب ان  
 کی زبان کھلی۔" اس نے جواب دیا۔

"تم بھی اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہو؟  
 "مگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ کیا  
 کچھ کرتے رہے ہیں تو تم کو کہے کہ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ ہر  
 ہتھکنڈہ صرف جائز ہے بلکہ ان کے افعال کے نتائج میں نہایت  
 کثرت ہے۔ میں خصل شک کی بنا پر کسی کے ساتھ اس قسم کے  
 ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتا۔ حتیٰ الامکان احتیاط کرتا ہوں۔  
 صرف "سستی" کو ان فراشات کا سوا چھٹا ہوں۔ پہلے چین کر



کرنے کے لیے بھی کہا اور آخر کار دوسرے روز صبح روانہ ہو کر گرام طے پا گیا۔ یہ بھی طے پا گیا تھا کہ میں اکیلا ہی روانہ ہو گا۔

دوسرے روز میں آری ڈی ہائی وے کے ذریعے اس طے روانہ ہوا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس سفر کے لیے تھک و مہلک گی، اسی لیے میں نے اس کا بندوبست کیا تھا اور علی الصبح روانہ ہو گیا تھا۔ مختصر مگر ضروری سامان میرے ساتھ تھا۔ ہمارے پاس ایسی سڑکیں جنہیں ہائی وے کہا جاتا ہے، ہائی وے کے نام پر دی جاتی ہیں لیکن وہ بہت سی دوسری چیزیں بھی ہیں اور کم ہرج و مرج سے گزارا کرنے کے عادی ہیں اس لیے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ پھرتی سڑکیں رکاوٹوں سے قطع نظر جہاں تک ہائی وے پر میرا جاری رہا وہ تقریباً خوش گواہی تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنی حاصل کردہ معلومات اور تجربے روشنی میں گاڑی دائیں طرف کیے میں آملہ۔ میں تو نہ برا پگڑھی دور سے نظر آتی تھی لیکن مجھے کوئی گاڑی اپنے سے پچھلے میں اس طرف مڑتی دکھائی نہیں دی۔ وہ مل کھائی پگڑھی ہی پھاڑوں کے درمیان غائب ہوئی دکھائی دی۔ ان میں سے پچھلے پھاڑو وار کی طرح بالکل بندھے کھڑے تھے لیکن وہ وار کی طرح ہوا د نہیں تھے۔ ان پر گڑھے، دراڑیں اور گچھ سے بھرے ہوئے تھے۔ کہیں سیاہ کالی جی ہوئی تھی اور کہیں سے پچھلے مال گھاس پھوس نے سرکھلا ہوا تھا۔

ان پھاڑوں کی حالت دیکھ کر نہ جانے کیوں کہاں گزرا تھا شاید صدیوں پہلے سمندر یہاں تک تھا اور یہ بلند وہاں پہاڑ سمندر میں ہی ڈوبی ہوئی تھیں اور صدیوں تک ڈوبی ہی رہی تھیں لیکن پھر مزید کچھ صدیوں کے تغیر و تبدل کے بعد سمندر دھیرے دھیرے ملجوں پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن ان پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے اپنے نقوش چھوڑ گیا تھا۔ یہ پرانے وقتوں کی باتیں تھیں کہ سمندر اور وہاں قدرت کے اشدادوں پر کسی طرف کھٹ جاتے تھے رات بدل لیتے تھے فطری تغیر و تبدل کے تحت سکونت جاتے تھے دست اختیار کر لیتے تھے مگر اب انسان بہت سرکش اور کھڑکیا تھا۔ وہ سمندر کو پیچھے دھکیلتے اور دریاؤں کے راستے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ میں نے گزشتہ دنوں ہی دیکھا کہ کراچی میں کھنسن اور ڈینس کے ایک دور افتادہ حصے میں ایک چینی فرم کے تعاون سے سمندر کو پیچھے دھکیل کر ڈیوڈ کھنسن کہہ چکے زمین حاصل کی گئی تھی اور ڈینس کو حزد و دست دے کے لیے اس میں پلاٹ بنائے جا رہے تھے۔

یہاں شاید صدیوں پہلے سمندر خود پیچھے ہٹ گیا تھا کہ کوئی ڈاکر آباد نہیں ہوا تھا۔ زمین کے ٹکڑوں کا بھی اپنا پتہ نہیں ہوتا ہے۔ یہاں سے ملجوں آگے سمندر کے عین کنارے تھے۔ ان پھاڑوں کے درمیان کہیں تو بالکل یوں محسوس ہوا تھا

معلوم ہو گا وہ معلوم کر لیا ہو گا۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا "میں دوسری سمت میں کام کرنا چاہیے۔ شاید کسی کو تو کچھ کامیابی حاصل ہوئی جائے میں ذرا نیگھالی کا ایک چکر لگاتا ہوں۔ اگر چند دن وہاں رہنا پڑا تو وہ جاؤں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس جگہ کو کھجال لینا چاہیے۔ کامران دانش کی موت کے بعد سے وہیں جانے کا ارادہ کیا ہوا ہے لیکن یہاں الجھا ہونے کی وجہ سے نہیں جاسکا۔ شاید وہاں سے ان دونوں عظیم شخصیات کا کچھ سراغ اچھ آئے یا ان کے پکڑوں کا مزید کوئی سراغ اچھ آسکے۔"

"یا پھر شاید کوئی نیا چکر شروع ہو سکے۔" ٹونی نے تقریر کیا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" راجہ پول اٹھی۔ "جی نہیں۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا "وہ کوئی ایسی مدعا پرور جگہ نہیں ہے جہاں تم میرے ساتھ جاؤ۔"

"اگر وہاں پرور جگہ ہوئی تو کون کہنت تمہارے ساتھ جانے کی فرمائش کرے۔" وہ منہ ہانک کر بولی "اس صورت میں تو تمہارے ساتھ جانے سے کہیں بہتر ہو گا کہ میں کسی ٹکڑے کے ساتھ چلی جاؤں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ شاید اس طرح جیسے دیکھ کر لوگ وہ مشہور زمانہ مصری ٹنگٹا تھے۔" پھلوئے نور میں لنگور خدا کی قدرت۔ "اس ہمانے تم خود کو حور کھولنے کی کوشش کرتی لیکن میں جیسے یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری یہ حسرت پھر بھی پوری نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔

"آج کل واقعی نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میں تو اس خیال سے تمہارے ساتھ جانے کی پیش کش کر رہی تھی کہ جیسے کوئی تھیم لاء آرٹ سمجھ کر اپنی اپنی خرابیاں کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہاں کے بارے میں جو شیشیں ہوتی رہی ہیں اور میرے سامنے جو معلومات جمع کی گئی ہیں، ان کے مطابق تو وہ کچھ خطرناک اور پراسرار ساحل تھی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا "دیکھو اگر وہاں میرا ایک ٹوہہ دن خیریت سے گزرنے کی امید ہوگی تو تمہاری موجودگی میں وہ بھی نہیں گزرے گا۔ جیسے شاید وہاں آتا تو بڑے۔ بلکہ تم تینوں کو آنا پڑے گا۔ لیکن رات اور طریقہ مختلف ہو گا۔ میرا خیال ہے اب ہم اس مسئلے کو فائل کر لی لیں اور میں صبح روانہ ہو جاؤں۔" میرا ذہن اس مسئلے میں تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔" راجہ پولی تھکے جوش و خروش سے بولی۔ "میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔" ابھراٹھے ہوئے بولی۔ وہ اصل منہ لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا اب جس موضوع پر بات شروع ہو رہی تھی اس میں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہم ذرا قریب قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ کچھ نقشے بھی نکالے گئے۔ تمام تفصیلات طے کی گئیں۔ میں نے شفیع شاہ کو کچھ چیزوں کا انتظام

ہاڑیاں ہے آپ دیکھا نہیں تھیں۔ ان میں سے بیشتر بڑے سے  
دھکی ہوئی تھیں لیکن بے سہو کھ سائی بائیں قلعہ کے بچے مکانات  
میں کہیں تھیں اور کہیں بے ترغیبی دکھائی دے رہی تھی۔

قیسے میں لہذا سا ایک میں بازار نظر آ رہا تھا۔ اس کے دائیں  
بائیں کچھ گلیاں سیدھی گھر آری تھیں لیکن ان سے ہٹ کر بہت  
سے مکان بے ترغیبی سے بھی بنے ہوئے تھے جن میں سے بعض کو تو  
محل سمجھنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سامنے چھوٹے سے  
تار کر کے میں ہر طرح کا قہقاریا سامان استعمال کیا گیا تھا۔ کوئی  
کے تختے نہیں کی چادریں ہلکے یا تیشیں پتھر مٹی سینٹ پٹا نہیں  
گھاس پھوس بلیاں ہاتھ۔ غرض کہ جسے جو میرا تھا اس نے  
اسے استعمال کرتے ہوئے رہنے کا لٹکا ہاتھ تھا۔ کچھ مکانات  
چھوٹی موٹی چاڑیوں پر بھی کھڑے ہوئے تھے۔

بیشتر مکانات کے طرز تعمیر سے فہم تھا کہ یہاں قہقاریا  
کے سامنے انہی خاصہ محفل گاہیاں بھی کھڑی دکھائی دے رہی  
تھیں۔ چھوٹے ڈانچ ٹرک تو کافی نظر آ رہے تھے جو اس قسم کے  
ملاحقوں میں کار کا کام انجام دیتے ہیں اور بار بار وہی میں بھی  
استعمال ہوتے ہیں۔ بعض جگہوں پر تو کچھ بے چارے بھی کھڑی دکھائی  
دیں۔ فضا میں چھٹی کی ٹو بھی چھٹی ہوئی تھیں لیکن مجھے کس بھی  
گہری کے لوازمات دکھائی نہیں دے۔ کہہ کر ساحل پر کسی چھوٹی  
بڑی کھیتیاں اور دو چار لالچیاں بھی بندھی ہوئی تھیں لیکن ان میں  
جال و دیو نہیں تھے اور ان کی حالت پتلی تھی کہ وہ ابھی گہری کے  
لیے استعمال نہیں ہوئی تھیں۔ شاید محدود پیمانے پر ابھی گہری ہوئی  
ہو اور کہیں چھلپاں ذخیرہ کی جاتی ہوں۔

بہت سے گھروں کے پاس میں نے بہت سی چادروں کے  
پوے پوے ٹیک رکھے دیکھے۔ ان میں بیٹھے پنے کاپانی ذخیرہ کیا جاتا  
تھا جو نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ کہنے کو اس قسم کے لوگ سمندر  
کے کنارے بیٹھے تھے لیکن یہاں بیٹھے پنے کاپانی میر نہیں تھا۔ شاید  
کہیں سے ٹیکوں کے ذریعے آتا ہو یہاں زمین کاپانی حقیقت گھارا  
ہو گا۔ ہمیں نہ مل ہی بل میں اندازہ لگا۔

میں نے جس جگہ گاڑی دوکی ہوئی تھی۔ وہاں سے ایک وقت  
میں صرف ایک ہی گاڑی گزرنے کی جگہ تھی لیکن عجیب اتفاق تھا  
کہ ابھی تک نہ تو سامنے سے کوئی گاڑی آئی تھی اور نہ ہی عقب  
سے کسی گاڑی نے مجھے اور تنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس  
پورے راستے میں تنگ حیرت انگیز حد تک کم تھا۔ اس لیے کہ  
سگوت اور گھبراہٹ بھی کچھ نہ تھی حیرت انگیز نہیں تھا۔ چاندل طرف  
ایک عجیب سا سکون اور خاموشی چھٹی ہوئی تھی۔

اس قسم کی تباہیوں میں عام طور پر گلی گلیوں میں بیچ بہت  
زائد تھا وہیں کھیلنے کو لے اور دوڑنے بھاگتے نظر آتے ہیں لیکن  
یہاں گلیوں یا کھلی جگہوں پر بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔  
لوگوں کی آمد رفت بھی بہت کم تھی۔ ذرا بھل و بھلا بھی کچھ

آگے جانے کے لیے قطعاً کوئی راستہ نہیں ہو گا اور پکڑی مہم  
ہوئی دکھائی دیتی تھی لیکن چنان کے میں قہقاریا بچ کر احساس ہونا  
تھا کہ پکڑی آگے بھی جاری تھی۔

میری معلومات کے مطابق سیکھائی کی آبادی ابھی خاصی  
تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس راستے پر بھی ابھی خاصی آمد رفت  
رہتی ہوگی لیکن اپنے سفر کے دوران میں اس کی دورانی دیکھ کر مجھے  
کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے ابھی کسی نے اس راستے کو دریافت  
ہی نہیں کیا تھا۔ پندرہ بیس گلو میٹر تک سفر کی حد تک پتھری کی  
طرف جاری رہا تھا۔ اس کے بعد ایک تو پکڑی غایت دشوار  
گزار اور ناہموار ہو گئی اور سرے خلیج کی طرف جانے لگی۔ ایک  
طرف پانچواں تھیں اور دوسری طرف گہری کھائیاں۔ راستے میں  
کہیں چھوٹے پوے چڑھے جن کے پارے میں گلیں گزرتی تھیں  
گاڑی ان پر سے گزرتی تو وہ اپنی جگہ سے کھٹک جاتیں گے اور  
گاڑی تو ڈنڈن کو بیٹھتی گی۔ کہیں ایسے ٹیزے پڑے اور بے جھم  
گڑے تھے جن کے پارے میں شہ ہوا تھا کہ گاڑی کا پیسہ ان  
میں چٹا گیا تو میں پشیمان ہو گیا۔

میں نے پابا خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے یہ اندیشے غلط ثابت  
ہوئے۔ سب سے پہلی زبردستی کی تھی اور بہت لالچا ب گاڑی  
غایت ہو رہی تھی۔ اس دشوار گزار راستے کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی  
کہ اس طرف ابھی خاصی آبادی کا قہقاریا کیسے بس گیا تھا۔ ایک  
لٹا ہے یہ لوگ کسی بھی شے سے تقریباً کئے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاں  
اکثر ملاحقوں میں زندگی دیے بھی کچھ کم دشوار گزار نہیں ہے۔ ایسے  
ملاحقوں میں اور بھی دشوار گزار ہو جاتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ  
اس کے باوجود ہمارے ہاں بہت سی تباہیاں ایسی جگہوں پر ہیں جہاں  
تک رسائی بہت مشکل ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سیکھائی میں اگر  
کچھ چڑا سرگرمیاں جاری تھیں تو پھر یہ شاید اس کی خفیہ شمار  
ہوئی ہو کہ اس کا راستہ اندازاً دشوار گزار تھا اور یہ علاقہ کسی بھی شے  
سے صحیح طور پر منسلک نہیں تھا۔ ایسی جگہیں بعض لوگوں کے لیے  
جنت ہوتی ہیں۔

خدا نہ اگر کے میرا سفر ختم ہوا اور مجھے خلیج میں سمندر کے  
کنارے آ کر قہقاریا دکھائی دیا۔ سفر کو طویل نہیں تھا لیکن مجھے  
بہت طویل محسوس ہوا تھا۔ کسی زمانے میں مجھے اس قسم کے سفر کی  
بڑی مطلق تھی۔ اب بھی کافی حد تک وہی مطلق کام آتی تھی۔ پہلے  
میں نے پتھری پر ہی گاڑی روک کر قہقاریا کا جائزہ لیا۔ غہری حسن  
کے اعتبار سے وہ ایک قابل دید جگہ تھی لیکن کئی پہلوؤں سے  
تعدادات کا مجموعہ بھی تھی۔

ساحل بہت خوب صورت تھا۔ یہاں سمندر کاپانی دور تک کا  
دکھائی دے رہا تھا۔ سبز رنگ اور نیلا۔ میں نے غیر ممالک میں بھی  
کئی خوب صورت ساحلوں کا نظارہ کیا تھا لیکن ایک ہی ساحل پر وہ  
رنگوں کا ایسا خوب صورت احراج نہیں دیکھا تھا۔ اور گرد کی

لوکیشن کے اعتبار سے یہ ایک شاندار جگہ تھی۔ مگر کسی ترقی یافتہ ملک میں ہونا تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی لیکن یہاں اس کی ہر چیز سے کچھ نہ کچھ ہمسائیگی اور غربت میاں تھی۔

جس حصے میں ہوئی کا اشتباہ دفتراور دوسرے لوازمات تھے وہ کمروں سے ہٹ کر بنا ہوا تھا۔ یہ ابھی بجلی عمارت تھی لیکن ہنرمندی کا کمال یہ تھا کہ حرف کارے، کھڑکی کے تختوں اور سرکنڈا سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی اغراضت بھی شاید کسی تھی۔ اس میں خوب صوفیہ پیداکرنے کی پوری کوشش کی گئی اور ڈیزائن کسی محل کا سا بنایا گیا تھا۔ اس کے سامنے کافی بڑے حصے میں شاندار آبادوں کا جنگلا لگا ہوا تھا جس کے اندر کچلے آسمان تلے لوسے کی مینیں اور کرسیاں ترتیب سے بچی ہوئی تھیں۔ وہیں کرشت مرغیاں دھنپو تلے اور باہلی کیو کا انتظام تھا لیکن اس وقت وہاں کوئی ملازم یا کبک نظر نہیں آتا تھا۔ اس پرے سوشل لٹا ہوئی پر بھی دیرانی کا اثر غالب تھا۔ میں جس بازار سے گزر کر آیا تھا اس میں مجھے تقریباً ہر اس چیز کی دکان نظر آتی تھی جس کی ضرورت کسی بھی بڑی آبادی کو ہو سکتی تھی لیکن وہاں بھی مجھے کوئی خاص دھنپو نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے پے چھو ہوئی کے قریب اس چھوٹے سے میدان میں روکی تھی جسے غالباً پارک کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں دو تین گاڑیاں پہلے سے کھڑی ہوئی تھیں۔ میں گاڑی سے اتر کر پھری کا سارا لے کر نکلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ پھری اور نکلتا لے گاؤڑا صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے تھا کہ میں جہاں طور رہتا تھا نظر آنے کے باوجود اس وقت کسی تکلیف میں مبتلا تھا یا مجھے کوئی چوٹ دھنپو لگی ہوئی تھی۔ اس طرح میرے قریب آنے والا مجھ سے کچھ زیادہ خلوص محسوس نہ کرتا اور مجھے کسی حد تک محذور ہی شمار کرتا۔

میں جس کمرے میں داخل ہوا وہ غالباً اشتباہی اور لابی دونوں کا کام رہتا تھا۔ اس میں ایک طرف دیوار کے ساتھ پلاسٹک کی چند نہایت پرانی اور اناکارورق قسم کی کرسیاں اور بوسیدہ کی ایک تپائی رکھی تھی۔ دوسری طرف دیواری ایک پرانا سا ڈنڈر تھا جس کے عقب میں کوئی موجود تھا لیکن اس سے پہلے میری نظر اس کے پیچھے دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی سی تصویر پر لگی۔ وہ کافی بڑا اور فریم شدہ رنگین فوٹو گراف تھا۔

دھندلی ہونے کے باوجود وہ ایک جاذبہ نظر تصویر تھی۔ اس میں نہایت ہی خوش فرم کے جسم کی ایک ایک نوجوان لڑکی تھوڑی کے لباس میں ایک نہایت کمرہ قسم کے بہت بڑے کمرچھ کی پیٹ پر سوار تھی۔ ویسے تو یہ سحر اسی طرح ہوتا ہے کہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ سٹریٹ دنیا کے فوٹو گرافر کسی نہ کسی گوشے سے اس قسم کے ٹھکانے پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اس تصویر کا یہ معاملہ بھی نہیں تھا۔ سرسری نظر میں تو وہ اس طرح پھینکی گئی تصویر تھی جس

فائدہ حرکت میں دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کہیں کہیں آگاہی آئی یا مگر جا گاڑی دھنپو آتی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ آبادی بھی بڑی تھی۔ اس کے مقابلے میں یہ خاموشی اور سکون مجھے کچھ عجیب لگا رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ایک ہی جگہ سے آ رہا تھا جس میں زندگی اپنی دھنپو اور خوب صورت گاہوں کے ساتھ نہیں بلکہ تمام تر مادہ حار کے ساتھ دوں دوں رہا تھا۔ اس مشین اور بارودی زندگی کی پیچ پیچھاڑ میں ہر شخص دوسرے کا کھانا کھاتے ہوئے کھل کر آگے نکل جانے کی فکر میں تھا۔ ناپاک دو ذمائی محسوس میں وہاں سے نکل کر یہاں پہنچ کر کھائے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں ایک قطعی علقہ دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ یہاں یہاں کے حساب سے یہ ماحول، یہ خاموشی، یہ سکون غیر فطری نہیں تھا مگر مجھے لگا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں شبہ سا ہوا تھا جیسے یہاں کی نوعی آبادی کہیں گئی ہوئی ہے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک اور بڑے شہدہ نقشہ نکالا اور ایک نئے زاویے پر نظر سے قیے کا جائزہ لیا۔ اس باندی پر بیٹھ کر قیے کا جائزہ لیتا نہ جانے کیوں ایک پر لطف ساحل محسوس ہوا تھا۔ یہ قدر شعاعی شاد نے کچھ خصوصی ذرائع سے حاصل کیا تھا۔ اس کی عود سے قیے کو کھینچا نکل آسمان ہو گیا۔ نقشے میں جن چند خاص خاص جگہوں کی نشاندہی کی گئی تھی وہ مجھے وہیں بیٹھے بیٹھے نظر آ گئیں یا ان کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں تھیں لیکن اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ قیے کے مین بازار سے گزرتے ہوئے تین بار افرارے میری گاڑی کی طرف دیکھا تھا اور کچھ چوٹے تھے۔

میری گاڑی جہاں کھڑی تھی وہاں کم از کم مین بازار سے گزرتے والے لوگ اسے آسانی سے دیکھ سکتے تھے اور شاید یہاں کے لوگوں کو نہایت آسانی سے اندازہ بھی ہو جاتا تھا کہ کون سی گاڑی ایسی تھی۔ مجھے کچھ پہل لگا جیسے میری گاڑی کی طرف توجہ دے والوں نے آنکھوں سے آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا ہو تھا۔ بھلا ہر وہ اسی طرح بارل انداز میں ادھر ادھر چلے ہوئے آٹھوں سے ادھبل ہو گئے جیسے اپنے اپنے کاموں سے جا رہے ہوں لیکن میری ماحولم جس نے مجھے گویا خواب کیا کہ بہت جلد بہت سے لوگ قیے میں ایک اجنبی کی آمد سے باخبر ہو جائیں گے۔ ہر حال یہ فطرتاً پر ہونا ہی تھا۔ میں اپنی آمد کو خیرہ دکھائی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے نقشہ یہ کر کے گھوم کیا کہ منٹ میں رکھا اور پکی کچی سلطان پر گاڑی آگے بڑھادی۔ چند منٹ بعد میں نے مین بازار سے گزر کر گاڑی ایک پناہی کے واسطے میں واقع بیگناہی ہوئی کے سامنے لے جا دی۔ ہوئی نہیں بلکہ ایک غریبانہ قسم کا سوشل سلوم ہونا تھا کیونکہ یہ ایک الگ کھوں پر مشتمل تھا۔ یہ نیم پختہ کمرے دو قطاروں میں چیلے ہوئے تھے۔ ان کے آگے گھاس کی لاندہ دھنپو لگا کر انہیں خوب صورت بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔



اس نے ایک بار پھر بھی آواز نکالتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اثبات میں سرھلاتے ہوئے بولا "آپ بالکل ٹھیک بولا صاحب! لیکن ہمارے سروار کا فرمان اسے کہ مگر مجھ کے قریب بھی جاؤ جب تم کو بہرہ دیا ہو کہ تمہارے پاس اس کو کھانی کرنے کا بندوبست اسے خالی دینی مگر مجھ زادہ خلدناک ہوتا ہے۔"

"خوشی تو کوئی بھی دوندہ زادہ خلدناک ہوتا ہے مقلی خان! جب اس سے بچا لے لیا تو مارا اور مڑاؤ۔" میں نے جھڑپا انداز میں سرھلاتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی کچھ بے خیالی کے سے عالم میں میری تائید میں سرھلایا۔ درحقیقت وہ کمری نظروں سے ابھی تک میرا جائزہ لے رہا تھا پھر یک دم اس نے کچھ چمکتے ہوئے کاؤنٹر پر ہی ایک رنگ آلودی کی تختی پر دو تین مرتبہ ہاتھ مارا۔ تختی گویا جی نہیں بلکہ کراہ اٹھی۔ اندر سے ڈھیلی ڈھالی شرار لہیں میں بلبوس ایک نور مر سلاز کا لپک کراہ رہا تھا۔ اس کی رحمت کمری سانولی اور بال بہت ٹھنکرا لے تھی۔

"صاحب کو کراہی خبر دس میں چھڑاؤ اور کبھی کبھی صاحب کے پاس پکڑ گاتے رہتا۔ صاحب کے آرام کا خیال رکھنا۔" مقلی خان نے بارعرب لہجے میں اسے ہدایت کی اور پیچھے لگی ہوئی مگر مجھ اور لڑکی والی تصویر کے نیچے تو رہاں چمڑے سے ایک بورڈ سے ایک چالی اتاری جس کے ساتھ پلاسٹک کا ایک ٹیک ٹھنک تھا۔ اس پر دس نمبر ابھرا ہوا تھا۔

"نمبر سامان گاڑی میں ہے۔" میں نے ٹوکے کو بتایا۔ اس نے مستعدی سے سرھلایا اور میرے ساتھ چل دیا۔ میں اب بھی لنگراتے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ مقلی خان کی نگاہیں میرا حلقہ کر رہی تھیں۔ پے پیچہ میں میرے ایک مختصر سے سنری بیگ کے علاوہ چھلنے کے شکار کا نہایت جدید قسم کا سامان اور ایک ریڈیو بھی موجود تھا۔ لڑکے نے سگراتے ہوئے سب سامان اٹھالیا اور میں اس کی رہنمائی میں کراہی خبر دس تک پہنچا۔

اندر پہنچ کر سامان رکھوانے اور لڑکے کو شپ دے کر فارغ کرنے کے بعد میں نے اطمینان سے کمرے کا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ کراہی کشادہ اور ہنستہ تھا۔ اس درجے کے خوشی یا خوشی کے کمرے اتنے بڑے نہیں ہوتے تھے۔ تاہم کراہی اور اس میں موجود ہر چیز پرانی اور سالودہ تھی۔ فرنیچر نہایت مختصر اور بوسیدہ تھا۔ بیڈ کے کدے کے بارے میں مجھے شبہ محسوس ہوا کہ اس میں کھل نہ ہوں۔ اس کمرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے عقب میں بڑی سی ایک کڑی تختی جس میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کڑی سے دو رنگے سمندر اور نیل دھندلاہٹ میں لینے ہوئے پھاڑوں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ ہمارے ملک کا ایک خوب صورت مگر کم نام گوشہ تھا اور

"صاحب! میں نے تمہیں انداز میں سرھلایا کیا نام ہے تمہارے سروار صاحب کا؟"

"سروار فاروق خان سیگھانی۔" اس نے غصے سے فرمایا۔

"اور تمہارا؟"

"مقلی خان سیگھانی۔" اس کا جواب اب بھی غصے ہی رہا۔

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مقلی خان! میں نے معاملے کے لیے ہاتھ بٹھلایا۔ اس کا ہاتھ کافی حد تک استخوانی سا ہی تھا لیکن جب وہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی بھاری سا آہنی جھانچا ہوا ہوا۔"

"مارے کو بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اسے سینہ افضل صاحب! وہ پہلے سے زیادہ کمرہ نشی سے بولا۔ اس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی بھی کوشش کی۔ وہ دلا ضرور تھا مگر تیل کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ زیادہ سے زیادہ ڈھیلار کھینے کی کوشش کی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میں مجھ سے پہلے اگر میرے بارے میں کچھ معلومات نہیں پہنچ سکی تھیں تو میرا تاثر ایک عام اور ڈھیلے ڈھالے سے قوی کا بجائے میں صاحب وقت آنے سے پہلے اپنی کسی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"مقلی خان سے معاملہ کا مرحلہ طے ہو چکا تو میں نے جان بوجھ کر اس کے سامنے پرس اس طرح کھولا کہ وہ دیکھ سکے کہ اس میں ہزار ہزار کے بہت سے نوٹ چھپے ہوئے تھے۔ میں نے دونوں کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا "دس دن کا بیٹگی کرایہ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے اس سے زیادہ دن ضرور دے جائے میں چھٹیوں کا شکار کیلئے آیا ہوں تو اب ابھی طرح شکار کیلئے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

وہ نوٹ اٹھا کر جلدی سے کاؤنٹر کے نیچے کسی دروازے میں ڈالتے ہوئے خوش دلی سے بولا "مارے صاحب! اگر چھلپیاں آپ کے ہاتھ آجائیں تو آپ ضرور ان کا شکار کھلیں۔۔۔ بلکہ اگر آپ چاہیں تو مگر چھپوں کا بھی شکار کھلیں۔ ہمارے علاقے میں مگر مجھ بھی پائے جاتے ہیں مگر ابھی تک سرکار کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں اسے اس لیے ان کے شکار پر نہ تو کوئی پابندی لگی اسے اور نہ ہی شکار کو کوئی لائسنس یا فیس دینیو مقرر ہوئی اسے۔۔۔" اس نے نہ جانے کیوں کچھ اس انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا جیسے کوئی نچ بوئی ہو۔

"مگر مجھ تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں مقلی خان! میں نے اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "لیکن ان میں سے اکثر تو اتنے بڑے اور خطرناک ہوتے ہیں کہ سرکار ان کی طرف دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر گئی ہے۔ ویسے بھی ہمارے بڑے بوڑھے ہمیں کھجائے آئے ہیں کہ دنیا میں وہ مگر مجھ سے ہیڑ رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔" سے حالانکہ بعض مگر مجھ اتنے بڑے معاش ہوتے ہیں کہ انہیں پہلی فرست میں ٹھکانہ لگا دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

اسے قتل دے کر نہ جانے کیا سے کیا بنایا جاسکتا تھا۔ مگر مجھے خیال آیا کہ ہمارے پاس تو ایسے مقامات نہ جانے کتنے تھے اور اس نے جنہیں قتل دے کر نہ جانے کیا سے کیا بنایا جاسکتا تھا۔ دست قدرت نے تو ہمیں نوازنے میں کوئی کمی دواں نہیں رکھی تھی۔ مگر میں ایک لفظ کی سانس لے کر رہ گیا۔ اس "مگر" سے آگے بات بہت لمبی ہو جاتی تھی۔

چند لمحے کوئی سے سمندر کا کھانا کرنے کے بعد میں اپنے مختصر سے بیک سے کپڑے نکال کر بوسیدہ اور پرانی الماری میں نکالنے کا جو ذرا سے ہاتھ لگانے پر ادھر ادھر پہنچے تھے تھے۔ میں تن کے کپڑوں کے علاوہ صرف ایک سوٹ اور دو شلوار سوٹ لے کر آیا تھا۔ میں نے ملکی خان کے سامنے خواتین کو یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ میں یہاں دس دن سے زیادہ بھی رک سکتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں تو دس دن بھی رکتا نہیں جاتا تھا۔ میں تو جلد از جلد کچھ ضروری ملحقات حاصل کر کے اور آمدن و غائب حالات کی کچھ نوٹ لے کر واپس چلے جاتا جاتا تھا۔

میں اپنا بیک الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھ رہا تھا اور میرا ہاتھ الماری کے تختے بتلی کی کسی پتلی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے اسے اٹھنے سے باز رکھا کہ کیا تو وہ فرش پر اٹری۔ وہ چھوٹا سا کوئی فوٹو تھا جو اوپر فرش پر لگا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو مجھے حیرت کا خلیفہ سا جھٹکا۔ وہ کامران والہ کی تصویر تھی۔ وہ اسی تصویر کا چھوٹا سا سائز کا پرنٹ تھا جو کچھ دن پہلے میری فرمائش پر صفحہ نے مجھے دی تھی۔

پانچ روٹ ساڑھے اس پرنٹ کو میں کافی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھ رہا۔ اس کی پشٹ پر چند ماہ پہلے کی کوئی تاریخ درج تھی۔ غالباً اس تاریخ کو یہ تصویر کھینچی گئی تھی۔ پرنٹ بھی کچھ میلہ اور ذرا مڑا مڑا سا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کامران کے اپنے پرانے بیگ میں ہی موجود رہا ہو گا۔ اس کا مطلب تھا کہ کامران بھی اس کمرے میں قیام کر چکا تھا۔ کیا مجھے جان ہو کہ کر دی کر دیا گیا تھا؟ میں یہ ایک اتفاق تھا؟ میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ تصویر کو میں نے واپس دیکھ دیا جہاں وہ پڑی تھی۔ اب وہ میرے کسی کام کی نہیں تھی۔ تصویر والی دنیا میں نہیں رہا تھا۔

میں کچھ دیر تک بیٹھ کر انکھوں کے سامنے غیم دراز رہا اور سوچا رہا کہ میرا آنکھ کا لاغور عمل کیا ہونا چاہیے۔ ریڑھ میں نے تن کر دیا تھا اور اسے کارن پر رکھ دیا تھا۔ وہ بھی تو ان میں بیٹھا رہا تھا۔ میرے مہمان کوئی فون نے یہاں کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ہوئی میں اشتیاق کا بخیر سیاہ رنگ کا پرانے مال کا ایک فون رکھا دیکھتا تھا لیکن وہ بیٹھا ہوئی کا اکھڑا فون تھا۔ اس پر تو صرف دی باتیں کی جاسکتی تھیں جو میں جان بوجھ کر مشکل خان کو سناتا جاتا تھا جن کے بارے میں میں نہیں محسوس کر رہا تھا کہ انہیں مشکل خان بھی سن لیتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ میرے پاس راپٹل کا ایک اور ذریعہ

بھی تھا لیکن فی الحال میں اسے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی مجھے ہر حال قیام کا ایک پکڑنا تھا۔ ویسے تو مجھے امید تھی کہ کچھ خصوصی لوگوں تک میری آمد کی اطلاع پہنچ چکی ہوگی لیکن اگر نہیں پہنچی تھی تو میرے ادھر ادھر کھنسنے کے لئے پہنچ جاتی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد میں کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے آتے وقت بازار میں ایک جگہ بیگ کھل آؤں گا وہ دیکھا تھا۔ میں چوڑی کے سامنے ٹھکراؤا ہوا دھڑے دھڑے کھلنے کے انداز میں اس طرف چل رہا۔

وہ تقریباً سیاسی بازار تھا جیسے عام طور پر دیہات اور قصبوں میں ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ ذرا ترقی یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی نسبت تھا کہ محل وقوع عجیب ہونے کے باوجود اس قصبے میں بجلی موجود تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ عرصے پہلے ہی یہاں سے چند میل دور ایک جزیرہ خاتمہ پر ایک بڑا قمری بجلی گھر لگایا گیا تھا۔ اس قصبے میں شاید بجلی میں بجلی آئی تھی اور یہاں کے لوگوں نے اس سے استفادہ کرنے کی سب سے پہلی صورت شاید یہ سہی تھی کہ جب جب ڈشنگ لگتی تھی اور وہ ایک عام سے چائے خانوں میں بھی میں نے کھڑی دی اور دی سی آ پڑنے لگے۔ جہاں کچھ کام کی پیشہ جوے ذوق و شوق سے عہدہ دیکھ رہے تھے۔

میں نے جہاں بی بی او کا بورڈ دیکھا تھا وہ درحقیقت ایک میڈیکل اسٹور تھا وہیں باہر چوڑے پر ایک سیر کری رک کر بیگ کھل آؤں گا سلسلہ چلانے کا انتظام تھا۔ میڈیکل اسٹور کا مالک شاید عوام کی تلاش کی خاطر دکان کے فرائض انجام دیتا تھا۔ جس وقت میں وہاں پہنچا وہ ایک مریض کی مزمین بی سے قاصر ہونے کی اسے انکسش لگانے کی تیار کر رہا تھا اور دوسرے دو تین مریض غالباً اپنی ہاسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ بیگ فون پر گاؤں کو انینڈ کرنے کے لئے دوسرا فون موجود تھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکے ایک رسالے کے مطالعے میں مشغول تھا۔ ٹیلی فون پر نہ جانے کچھ کھیاں بیک رہی تھیں۔

مگر اچانک ایک فون ہو سکتا ہے جناب؟ میں نے بڑے احترام اور شائستگی سے جواب دیا۔

اس نے بڑبڑا کر رسالہ ایک طرف اونچا رکھا اور میری ہی طرح احترام اور شائستگی سے بولا کہ میں نہیں جناب۔! پھر وہ بطور میری طرف دیکھتے ہوئے سگڑا لیا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا کہ آپ جہاں کہیں وہاں فون ہو سکتا ہے اور کافی کفایت سے ہو سکتا ہے۔ نمبر بتائیے۔ اس نے مستعدی سے ہال پر اٹھتے سنبھال لیا اور کلپ بورڈ پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں نے اسے ایک نمبر بتایا اور چند لمحے کی کوشش کے بعد اس نے نمبر دیا۔ ساتھ ہی اس نے قریب رکھی ایک اسٹاپ واٹنگ گاڑی میں بھی بداد تھا۔ وہ دھڑا پھٹا۔ سانولا سانولا جوان تھا جس کے دانت کافی زرد تھے۔ رسیور مجھے کھانے کے بعد وہ وہاں رہا۔



کے بازوؤں کے پٹے کافی حد تک شاندار تھے بلکہ یہ کتا بھی ہے جا  
میں تھا کہ وہ جموی طور پر ہی ایک شاندار جسم کا مالک تھا لیکن  
اس پر زوال کے آثار نمودار ہونا شروع ہو چکے تھے جس کی وجہ  
نشانی تھی کہ اس کی توجہ نمودار ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔

اس نے شاید بڑے اہتمام سے ایسے کپڑے پہنے تھے جن میں  
اس کی جسمانی ساخت کی زیادہ سے زیادہ نمائش ہو سکے یعنی ایک  
پرائیویٹ جیٹ جیسے کوئی سے بھی کم آستینوں کی ایک پستلی  
شرٹ جس پر محل کی محولی سی پچتاہٹ بھی نظر نہ رہی تھی۔ اس  
کے ایک بازو کے مسل پر بیسی سی گزری کا نیو بھی گڑا ہوا تھا۔ وہ  
اپنے بازو کا مسل بھڑکا تو اس کے ساتھ ساتھ گزری اپنی جگہ سے  
حرکت کر لی دکھائی دیتی تھی۔ اچھا آئینہ تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ  
اس علاقے میں مجھے اس قسم کا کوئی نمونہ نظر آئے گا۔ اس کے  
چہرے پر مختصر لیکن مکمل داڑھی تھی۔ سوچیں خاص بارب سوئی  
موتی آنکھوں میں سرخی اور بال نکل میں چڑے ہوئے تھے۔

وہ کہہ اس قسم کا باڈی بلڈر مطوم ہوتا تھا جسے باڈی بلڈر  
ترک کیے کئی سال ہو چکے تھے شاید اسے باڈی بلڈر کے زمانے  
میں بھی اپنی باڈی پر بازو کرنے اور اس کی بلا ضرورت نمائش کرنے  
کی عادت تھی جو ابھی تک برقرار تھی حالانکہ اس قسم کے بھی بہت  
سے لوگوں نے یہ سوچ کر یہ عادت ترک کر دی تھی کہ اب تو  
رہبران ملک و ملت کی مہمانوں سے اسطرح بہت عام ہو گیا ہے۔  
جسمانی قوت اب کچھ ایسی قابل فخر قابل نمائش یا قابل محوساجز  
نہیں رہی تھی۔ بارہ سال کا ایک بچہ لی کا ایک نمونہ دیکھنا تھا اور  
اچھا بھلا پولٹون ایک طرف کو لوٹک جاتا تھا۔ اب تو اس قسم کی  
جان رکھنے والے بھی اگر داد گیری بد معاشی یا دوسرے بھوان  
دھندے کرتے تھے تو اسلئے کے زور پر ہی کرتے تھے میں نے قوت  
کرتے وقت غیر محسوس طور پر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے چست  
کپڑوں میں مجھے کسی بھکاری کی موہوگی کے آثار دکھائی نہیں  
دے۔

وہ بدستور اپنی جگہ بھاگتا تھا اور کچھ اس طرح مجھے گھور رہا تھا  
جیسے میرا کوئی بڑا قرض خواہ تھا اور مسلسل وعدہ خلافیوں پر مبنی  
طرح کار کا کر فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا  
سلوک کیا جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ پلک فون کا مالک فوجوان  
بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ سڑکتا گیا تھا اور رسالے کے مطالعے  
میں زیادہ شہک نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے مجھے گنا گزرا  
کہ شاید باڈی بلڈر صاحب کو بھی فون کرنا تھا اور وہ اس بات  
پر غار کھا رہے تھے کہ میں ان کی آمد سے پہلے فون کیوں نہیالے  
بیٹھا تھا انہیں میدان باگل صاف اور ٹیلی فون باگل قائم کیوں  
نہیں ملا تھا۔ لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ موصوف کی توجہ کا مرکز  
میں ہی تھا ٹیلی فون سے انہیں کئی دیکھی نہیں تھی۔  
میں نے بات جاری رکھی تو وہ اپنے اصل موقع اور

محلے میں شہک نظر آنے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ جانے  
کیوں مجھے لیکن تھا کہ اب اس کا دھیان محلے میں نہیں تھا۔  
اس کے کان یقیناً میری طرف لگ چکے تھے۔ میں اس کے قریب  
پڑے اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔

دوسری طرف سے میری مطلوبہ آواز سنائی دی تو میں نے کہا  
میں لیگائی جا چکا ہوں اور وہ محل میں گھر گیا ہوں۔  
"میں مطوم ہو چکا ہے۔" دوسری طرف خفیف سی ہنسی کے  
ساتھ کہا گیا۔

"عجب اتفاق ہے کہ مجھے اس محل میں ہی کرا ملا ہے جس  
میں میرے اندازے کے مطابق کامران داخل بھی گھر چکا تھا۔"  
میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے آئندہ جیس اس سے زیادہ عجیب اتفاقات پیش  
آئیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا "یہ تاؤ جگہ کیسی ہے اور وہ  
وہ کس کیسا ہے جہاں تم گھر ہوئے ہو؟"

"جگہ۔۔۔ میں شہک ہے۔۔۔" میں نے مصمم لہجے میں کہا  
"میںاں خوب صورتی بھی ہے اور بد صورتی بھی۔" بازو کے  
سرے پر مجھے ایک دلدل نظر آئی تھی جو تقریباً سمندر تک پہنچ گئی  
تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کے کنارے کنارے قدرتوں گھاس  
اکی ہوئی تھی جو کسی حد تک قدرتی حفاظتی باڑھ کا کام دے رہی تھی  
اور مزید اچھی بات یہ تھی کہ اس باڑھ کے ساتھ ساتھ دو تین جگہ  
پھر لے پھرنے پر زفسب کر کے لوگوں کو خیردار کروایا گیا تھا کہ اس  
سے آگے دلدل تھی۔ قدرے حیرت کی بات یہ تھی کہ گاؤں کبھی کی  
طرف سے لگائے گئے ان پورٹوں پر خیردار کرنے کا اعلان انگریزی  
میں بھی لکھا گیا تھا۔ اس دلدل کی اپنی ایک بڑی جھل کی خفیف  
کی بڑے کے ساتھ مل کر محول کی خوب صورتی کے تاؤ کو کم کر دی  
تھی۔

"خوب صورتی اور بد صورتی۔۔۔ بلکہ شاید ہر طرح کے  
تضادات دنیا میں ہر جگہ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔" دوسری  
طرف سے کہا گیا "یہ تاؤ کہ پھلیوں کے شکار پر کب لگ رہے  
ہو؟"

"پہلے کچھ اندازہ تو ہو کہ پھلیاں کہاں پالی جاتی ہیں۔ جہاں  
شکار کا کوئی صحیح پروگرام بن سکتا ہے۔ وہیے اور اور پھلیوں کے  
لے چارہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ اب دیکھا ہوں کب کوئی چھل  
آکر نہ مارے گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس دوران میں ایک باڈی بلڈر چپٹھض جس کی عمر  
بیتیس سال کے قریب ہوگی اس دکان کے قریب آن کھڑا ہوا۔  
دکان کے آگے لہب کے موٹے موٹے ہاتھوں کے سارے کان پڑا  
نہیں کا چھاپا تھا۔ وہ انہی میں سے ایک پائپ سے ٹپک لگا کر  
دونوں بازو اس طرح بکسل میں دبا کر کھڑا ہوا تھا جیسے اپنے بازوؤں  
کے پٹوں کی نمائش کر رہا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس

میں نے قدر سے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا "یعنی تمہیں مجھ پر نظر ڈالنے کی ملامت ہو گیا کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں؟"

اوسے صاحب! یہ کوئی لندن یا نیواارک تو نہیں ہے جہاں پڑوسی کو پڑوسی کا پتا نہ ہو۔" وہ بھی دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے صاف اس میں بولا "میں دلچسپ تو ہوں، ہم لوگ مل جل کر ایک دوسرے سے نہ ملیں گے، ایک دوسرے کو ابھی طرح جانتے ضرور ہیں۔ دو میل دور سے دیکھ کر پتا دیتے ہیں کہ جو شخص کا ہے یا کس اور کا۔"

میں نے سر ہلایا اور خاموش رہنے پر اکتفا کیا تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔ میں نے مختصر جواب میں کہا "قبضہ وقت اچھا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جنہوں کے اچھے یا بُرے ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ جیسے اہم نہیں ہوتی اہم تو لوگ ہوتے ہیں۔ فرق تو لوگوں سے پڑتا ہے۔ میری نظر میں تو ہر وہ جگہ اچھی ہے جہاں کے لوگ اچھے ہیں۔"

اس نے زور دھرتے ہوئے میری تائید میں سر ہلایا۔ اس دوران میں وہ اٹھ کر جانے والے گاؤں سے پیسے بھی لیتا جا رہا تھا۔ ایک گاؤں کو رخصت کرنے کے بعد وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ آپ کو یہاں لوگ بھی اچھے ہی ملیں گے۔" پھر اس کے چہرے پر غیر معمولی شجیدگی، جھک آئی اور آواز شاید غیر ارادی طور پر کچھ نیچی ہو گئی "مساوائے کچھ لوگوں کے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا "آپ کی یہ اطلاع کچھ تشویش ناک ہے۔"

"اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔" وہ غور کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ اسی لیے تو ہر جگہ کا ہی حال خراب ہے۔ کہتے ہیں ایک چھلی سارے جل کر کندہ کرتی ہے۔ جہاں بہت سی چھلیاں گزرتی ہوں وہاں تو حال زیادہ خراب ہوتا ہے۔" ایک لمحے کے وقف کے بعد میں نے گہری سانس لے کر کہا "پھر بھی بعض جگہوں پر اچھے اور بُرے لوگوں کا تناسب اتنا خطرناک نہیں ہوتا اور ان کے درمیان کچھ نہ کچھ حدود ضرور باقی رہتی ہیں جو اچھے اور بُرے میں امتیاز کرنے میں مدد دیتی ہیں لیکن بعض جگہ اچھے اور بُرے اس طرح غلط فطرت ہو جاتے ہیں کہ کچھ تو نہیں چلتا! اچھا کہ ہے اور بُرا کون؟ کس ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑے سے بُرے لوگ بہت زیادہ اچھے لوگوں پر غالب آجاتے ہیں؟ انہیں بے فلاح بنالیتے ہیں۔" صورتیں زیادہ ہی اور خطرناک ہوتی ہیں۔ ایسی جگہوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔"

وہ پُر خیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے، کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن پھر ہٹ کر گیا۔ شاید کوئی صحبت آئے۔

ماحول کے اعتبار سے ایک خوب صورت اور پُر سکون قصبہ ہے لیکن یہاں کوئی عجیب بات ضرور ہے جسے میں صرف محسوس کر سکتا ہوں! بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال ابھی میں اُدھر اُدھر چہلوں کا اور دیکھوں گا کہ کامران داخل کی موت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ اس کے علاوہ بھی شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔"

"ہمیں جب حرکت میں آنا ہو تو ہمیں مشکل دے دینا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"وہ تو شاید تمہیں خود بہ خود ہی مل جائے۔" میں نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ نوجوان نے جلدی سے رسالہ چھوڑ کر اسٹاپ واپس بند کی اور وقت دیکھ کر مجھے رقم بتادی۔ اسے ادائیگی کر کے میں نے اپنی چھتری سنبھالی اور نظر آتا ہوا اس شخص کے قریب سے گزر کر بازار میں چل دیا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی لیکن جب میں اس کے قریب سے گزرا تو اس کی آنکھوں میں خود بخود کچھ اور بدھ گئی۔ میرا ہی چاہا کہ اسے آنکھ ماردوں لیکن میں نے بے مشکل اپنی اس خواہش پر قابو رکھا۔ میں اپنا سراپا ایک مسکین شخص کا سا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا طرز عمل بھی فی الحال اسی کے مطابق ہوتا تو سمجھتا۔ بہر حال ہوئے سے نکل کر فون کرنے کا شاید مشکل خان کے سامنے فون کرنے سے زیادہ فائدہ ہوا تھا۔ میری توقع سے زیادہ جلدی کوئی میری طرف متوجہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو میری نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ تاہم اس نے میرا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ وہاں کھڑے کھڑے بھی آسانی سے دیکھ سکتا تھا کہ میں کہاں جا رہا تھا اور اگر میں اس کی نظر سے اوجھل بھی ہو جاتا تب بھی وہ آسانی سے میرے بارے میں معلوم کر سکتا تھا۔ بلکہ شاید اسے پہلے ہی سے معلوم ہو۔

راتے میں دیکی طرز کے ایک مخصوص رستوران سے مجھے کڑائی گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو آئی اور مجھے یاد آیا کہ ابھی میں نے کہا تھا ابھی نہیں کھایا تھا۔ رستوران میں صرف چند گاؤں موجود تھے۔ باہر سڑک کے کنارے بھی لوہے کی میزیں لگائیں اور ایک آدھ چارپائی بھی موجود تھی۔ میں جان بوجھ کر کاؤنٹر کے قریب ہی ایک میز پر جا بیٹھا۔ کاؤنٹر پر ایک معقول صورت سا ادویہ مرخص موجود تھا۔ اس کا لباس صاف ستھرا بلکہ کافی حد تک سبز رنگ تھا۔ شاید وہ اس رستوران کا مالک ہی ہو۔ اس نے گہری نظر سے میرا جائزہ لیا۔

میں نے فوراً سر سوار ہونے اور فرانے سے زبانی بیٹھو سنانے والے ہرے کے کڑائی گوشت کا آرڈر دیا۔ اس کے جانے کے بعد کاؤنٹر پر بیٹھا شخص میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور دوستانہ لہجے میں بولا "کیسا ناگوار قصبہ؟"

اس دوران میں دیگر کڑی گوشت اور نان لے آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ چھپس رکھنے کے بعد اس شخص کی موجودگی کی وجہ سے دیگر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے کسی قسم کا شکر ظاہر نہیں اس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ سے خواتین آمیز سے انداز میں اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

”کھانا کھاؤ۔“ میں نے کمانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نہایت سرسری اور رکھی ہوئی کہا۔

”نی اکل تم ہی کھاؤ۔“ اس نے کچھ اس طرح کہا جسے مستقبل میں مجھے کچھ کھانا نصیب ہونے کا معاملہ ذرا مشکوک تھا۔ میں نے بے نیازی سے کھانا کھانا شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس دوران میں کھانے والی نکلوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ شاید اسے میری بے نیازی پر تآؤ آتا تھا۔

دو تھے حلق سے اٹارنے کے بعد میں نے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ کسی اجنبی کا یہاں آنا ہی بڑی خبر ہوتا ہے اور تم اس کے بارے میں اتنے ہی باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ چند دن پہلے ایک اور اجنبی بھی یہاں آیا تھا۔ اس کا نام کاروان داخل تھا اور وہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا جہاں میں ٹھہرا ہوں۔ پھر شاید اسے وہاں ٹھہرایا گیا تھا۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے اس نام کا ایک تو یہاں آیا تھا۔“ وہ اطمینان سے بولا ”سرنے کے بعد کسی کو بڑے الفاظ میں یاد نہیں کرنا چاہیے لیکن میں اچانک سے نہیں رہ سکتا کہ وہ دست ہی پاگل کا بچہ تھا اس نے کمر چھوٹ کا نوالہ بن گیا۔ یہ ایک افسوس ناک حادثہ تھا۔ یہاں سے کچھ دور ایک کھانسی ہے جو پچھلیوں کے شکار کے لیے بہت اچھی ہے لیکن رات کو وہاں سے بھلیاں بھاگ جاتی ہیں اور گرہ لگے آجاتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ گرہ مارا تو وہاں کیا کرنے چلا گیا تھا۔“

میں نے ہوا میں سے کہا ”مگر چھوٹے عام طور پر پانی کے قریب کوئی کھودو فیوہار بھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے شکار کو ہلاک کرنے کے بعد وہاں چھپا دیتے ہیں اور اس کے گھٹے سرنے کا انتظار کرتے ہیں تاکہ اسے آسانی سے گل کیس کیس کر کے وہ کسی بھی چیز کو چھپائے بغیر بیٹھتے ہیں۔ کاروان کو ہلاک تو یقیناً کسی گرہ لگنے ہی کیا تھا لیکن اس کی لاش شاہے ساحل پر پائی گئی تھی۔“

اس کے سونے سونے ہو توں پر خفیف سی طرہی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تو یہاں سے تو اس کے بارے میں پوچھنے سے بھی چھان بین نہیں کی تھی۔ یہی سلطوت کے سلطان نام پوچھنے والے بھی نہیں ہو اور نہ ہی اس قسم کی کسی دوسری اجنبی سے تساروا تعلق ہے۔ پھر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ کچھ کر رہے ہو؟ کیا وہ تساروا کوئی رشتہ دار تھا؟“

”نہیں۔ رشتہ دار تو نہیں تھا لیکن ہر انسان میں دلچسپی رہتی

ہی تھی۔ بعض مصطفیٰ بہت سے لوگوں کو اجتماعی خود کشی کی ریف لے جاتی ہیں۔ چند لوگوں کے لیے ہمارے درمیان تآؤ آمیز خاموشی کی دیوار کھڑی ہو گئی حالانکہ اس دوران میں بیوی کی ریت تو آواز میں گاہکوں کی جھجھکت اور لی وی کی تآؤ بدستور بچتی رہی تھی۔“

کچھ دیر خاموشی کے اس احساس میں اس وقت اضافہ ہو گیا پ میں نے اسی بادی بلند و غائب شخص کو رستوران میں داخل دے رکھا جسے میں اس سے پہلے فون کرتے وقت دیکھ چکا تھا۔ وہ بہت عادی سیر کی طرف آیا اور یوں میرے مقابل بیٹھ گیا جسے میرا بلا سنا تھا اور اس وقت اس جگہ اس کے ساتھ میرا ملاقات کا پروگرام طے تھا۔ دونوں کہناں اس نے یوں سیر کرنا نہیں کیوں کہ اب سے بھی اس کے روزگاری باورزد اور ان میں سے ایک کے اصل پر ہر چند سینکڑے بعد متحرک نظر آنے والے کمرے کا نظارہ لڑکھوں۔

”تساروا افضل چہ پوری ہے نا؟“ اس نے اکڑے اکڑے سے لہجے میں تعجب پتہ چائی۔ الفاظ اور لہجہ کھودا ضرور تھا لیکن پھر بھی زیادہ تو جہن آمیز نہیں تھا۔ یہ یقیناً اس کا نارل لہجہ تھا۔ بشر لوگوں سے وہ اسی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ رستوران کا مالک بھی اسے دیکھنے ہی اپنی جگہ کچھ گراست گیا تھا اور اچانک ہی چھوٹے سونے کاموں میں زیادہ صرف نظر آنے لگا تھا۔ گاہکوں کی باتوں کی جھجھکت تک یکدم بہت کم ہو گئی تھی۔

”نہیں کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں؟“ میں نے لائٹ سے پوچھا۔ میں کو شش کر رہا تھا کہ نہ تو اس سے مرعوب نظر آؤں اور نہ ہی جارحانہ انداز اختیار کر لوں۔

”چونکہ۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا ”میں کسی اجنبی کا نام ایک خبر ہوتی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اجنبیوں سے کچھ زیادہ دلچسپی ہے۔ یقیناً شاید انداز ہو گیا ہو گا کہ یہاں لوگوں کے لیے کچھ زیادہ دلچسپیاں موجود نہیں ہیں۔ تفریح کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ڈش اور لی وی کے بعد ابھی لوگ ہی ہماری تفریح کا قصورزا بہت سامان ہوتے ہیں۔“

”تساروا خیال ہے کہ میں تساروے لیے دلچسپی اور تفریح کا سامان ثابت ہوں گا؟“ میں نے پلک جھپکاتے بغیر پوچھا۔

”امکانات تو کافی نظر آ رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ کی ایسی خاصی ادا ہو کر رہا تھا۔ صرف لہجہ ذرا ہلکے دار تھا۔

دار کی وجہ سے تو نہیں لی جاتی تھی۔ میں نے منہ چلائے ہوئے جواب دیا "تک رہتے دامن میں تو انسان کی دلچسپی دن دن کم ہی ہوتی جاتی ہے۔"

"تو میرا اس سلسلے میں دلچسپی لینے کی وجہ؟" اس نے تجھے لیے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس کی موت کے پیچھے کوئی کمانی تھی۔ میں وہ کمانی جاننا چاہتا ہوں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نے یہ موقع مناسب سمجھ کر اپنا اصل مقصد واضح کرنا بہتر سمجھا تھا۔  
"یہ پولیس کے کہنے کے کام ہیں۔ تم ان پولیس میں کام لے کر دیکھو ہو سکتا ہے!"

"پولیس پرچہ تک کام کا بہت بوجھ ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے کام وہ کرنا نہیں چاہتی بہت سے کام وہ کہنے کی اہلیت نہیں رکھتی اس لیے کبھی کبھار لوگوں کو بھی محض کام اپنے ذمے لے لینے چاہئیں" میں نے بدستور راحت سے کہا۔

اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میں واقعی اس کے لیے تفریح اور دلچسپی کا سامان ثابت ہونے لگا تھا "میں کل جو کام لوگوں کے ذمے دیں ہیں وہ انہیں انجام نہیں دیتے" ان میں ڈنکی مارنے میں لگے رہتے ہیں۔ تم دوسروں کے کام اپنے ذمے لے رہے ہو۔ اور وہ بھی پولیس کے کام۔ جن میں انسان کی جان جانے کا بھی ذمہ ہوتا ہے۔ خود پولیس نے اپنے ذمہ کام کہنے چھوڑ دیے ہیں جن میں جان جانے کا ذمہ ہوتا ہے۔"

"جان کا کیا ہے میری جان!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر شہق انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "جان تو اک دن جاتی ہی ہوتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ جان کی جتنی زیادہ حفاظت کرو اتنی ہی جلدی جاتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اپنے اس شاندار اور پہلے چلائے جسم کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہو گے؟"

اسے شاید کچھ جھکا سا لگا۔ وہ شاید یہ توقع لے کر میرے سامنے آکر نہیں بیٹھا تھا کہ چھری کا سہارا لے کر اور نگہا کر ملنے والا ایک شخص اس کے ساتھ اتنے اطمینان اور بے خوفی سے جھگڑ کرے گا۔

"نہیں۔" اس نے تیزی سے جواب دیا "لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں چلتی ٹرین کے آگے جا کر لیٹ جاؤں یا دو گدوہوں کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑ میں جا کر کھڑا ہواؤں جبکہ میرا ان گولیوں میں سے کسی سے بھی کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔"

"میں ان میں سے کون سی صورت حال ہے؟ تم چلتی ٹرین ہو یا دو گدوہوں کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے؟" میں نے مصمویت سے پوچھا۔

"یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے۔ وہ جھکا کر لا بھراں لے چکی سی طرفوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ کیا تم واقعی کوئی بیوقوف ہو؟" مجھے ہنسا

چلا ہے کہ شرمیں تمہارا قافیہ اشار ہوئی اور دوسرے برفی ہیں؟ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں۔ سچ تو ہے" میں نے غصہ کی سانس لے کر کہا "لیکن مجھے تمہاری معلومات پر حیرت ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟ کسی آنی ڈک۔ کیسے کرتے ہو؟ یا اسکاٹ لینڈ؟"

"میں نے سوئے سوئے نام لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ سیدھے سادے طریقوں سے کام چلائے ہیں۔ وہ منہ بولا کہہ کر تم بھی سیدھے سادے طریقے سے مجھے بتاؤ کہ تم اپنی پیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر کس لیے یہاں آئے ہو۔ تو شاید تمہارے حق میں اچھا ہو۔"

"تم سے کسی نے کہا کہ وہاں سیدھے شرمیں صرف پیش و آرام ہی کی زندگی گزارتے ہیں؟ شرمیں ان کی جان کو تو بیسیوں غراب لگے ہوتے ہیں۔ ان سے جان چھڑانے کے لیے کبھی کبھی وہ سارے کچھیلوں سے نکل کر ایسی جگہوں کی طرف بھاگ آتے ہیں۔" میں نے گردو پیش کی طرف اشارہ کیا "یا پھر ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی کوئی نہ کوئی ایسا ہی غمناک تلاش کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ٹھکانے ان ترقی یافتہ ملکوں کی مناسبت سے زیادہ خوب صورت، زیادہ سبز اور زیادہ صاف تھکے ہوئے ہیں۔ لوگ زیادہ ملازمت اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہوتے ہیں۔ سوشل مینا ہے تو میں بھی ایسی جگہوں کی طرف نکل جاتا ہوں لیکن کبھی کبھی طبیعت پر اپنا دیکھی بن غالب آتا ہے تو بیگمناکی بھی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔ بعض سینٹوں بے چاروں کو جنگ سے باہر ملک کے اندر کہیں بھی جانے کی ترغیب نہیں ہوتی۔ وہ بے چارے اپنی بے شمار مصروفیات میں ہی پھنس کر گھبرا جاتے ہیں۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا پھر پوچھا "میری بات تمہاری سمجھ میں آئی؟"

"تم اب بے تابی کی کوشش کر رہے ہو کہ تم میں تفریح کے لیے آئے ہو؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ میں اصل میں تو میں چھیلی کے شکار کے لیے آیا ہوں لیکن ساتھ میں اگر کامران کی موت کے بارے میں بھی اصل باتیں معلوم ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں" میں نے کہا۔  
"چھیلی کے شکار کے لیے تو میں کبھی کبھار تھوڑے سے لوگ آجاتے ہیں۔ اور آج کل تو بیڑیاں ہی نہیں ہے۔ یہ جگہ چھیلی کے شکار کے لیے بہت زیادہ مشہور تو نہیں ہے۔"

تو پھر کس چیز کے لیے مشہور ہے؟ ہمیں نے فوراً پوچھا۔  
"کبھی کبھی چیز کے لیے نہیں" وہ گویا چکر لگا رہا "کسی نسلے میں ملنا ہی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہوتی۔" مجھے۔ کیا چھیلیاں میں سے فراہم ہوتی ہیں؟ میں نے

سادگی سے پوچھا۔

”اب یہاں آگیا ہوں تو قسمت آزمائی کر کے دیکھ لیوں۔“  
میں نے مطمئن انداز میں منہ چلاتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے ایک  
تک مجھے غور غور نظروں سے گھورتا رہا لیکن میں اس دوران میں  
گھبراہٹ کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ اگر اس کے میرا چھوٹا سا بھائی لبرز ہو گیا تو  
وہ وہیں افغانی کرنے کی کوشش کرے گا اور میں بظاہر بے پروا نظر  
آنے کے باوجود اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کیے بیٹھا تھا لیکن  
میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ وہ اندھ کر کھڑا ضرور ہو گیا لیکن خلاف  
توقع ہاتھ پاؤں چلانے کے بجائے ٹھنڈی سانس لے کر گھبراہٹ  
کے بروگرام کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کرتے ہوئے بولا ”تم یہ  
میں کھڑے ہو گئے کہ تمہیں کسی نے خبردار نہیں کیا تھا۔“

”میں تو ویسے بھی شکوک شکایت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ میں  
نے نہایت صابرانہ لہجے میں کہا اور بدستور کمانے میں مصروف رہا۔  
وہ تیزی سے گھبرا اور اکڑا ہوا رستوران سے نکل گیا۔ میں  
نے بے کوازی بلند اسے عقب سے پکارا ”سنو۔ تم نے اپنا نام تو  
بتایا ہی نہیں۔“

وہ پلٹ کر دوبارہ میری سیز کے قریب آیا اور ذرا جھنجھکتے ہوئے  
فرانے کے سے انداز میں بولا ”مجھے بلڈوز عرف اسٹریچر کہتے ہیں۔“  
جب میں کسی کو بلڈوز کرتا ہوں تو اسے اسٹریچر زوال کر لے جایا  
جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ تابوت میں ڈال کر لے .....  
جانے کا ہوتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے داؤد طلب سے  
انداز میں پوچھا ”کیسا نام ہے؟“

اپنی راست میں اس نے اپنا یہ نام بتا کر بڑی ذہانت اور بڑے  
سنجی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے مہینانہ انداز میں سہلایا پھر سرسری  
سے لے کر کہا ”جہا ہے۔ بس ذرا غیر انسانی سا نام لگتا ہے۔“  
ویسے تم نے تابوت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس حساب سے تو تمہارا نام  
بلڈوز عرف اسٹریچر عرف تابوت ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح اس  
میں ذرا زیادہ وزن پیدا ہو جاتا۔“

وہ چند سیکنڈ پر خیال انداز میں مجھے گھورتے ہوئے ٹھوڑی  
کھپکھپاتا ہوا پھر لپکتے کر خاموشی سے چل رہا۔ اس کے جانے کے بعد  
مجھے چند سیکنڈ تک محال میں غور اور کشیدگی کا احساس پر قرار رہا۔  
میں نے کاؤنٹر پر موجود شخص کی طرف دیکھا جو میرے اندازے کے  
مطابق رستوران کا مالک ہی تھا۔ وہ ذرا زیادہ نظروں سے میری طرف  
دیکھ رہا تھا۔

صوبہ کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ ہمدردانہ سے انداز میں بول  
اٹھا ”میرا خیال ہے کہ آپ ایک شریف اور معزز آدمی ہیں۔ آپ  
کو اس گینڈے کے بچے سے نہیں الگنا چاہیے تھا۔“

”شریف اور معزز لوگوں میں یہ دو ان صفت بنتے ہیں کہ وہ  
اس قسم کے گینڈے کے بچوں سے نہیں الگتے۔ اسی لیے رتو رتو  
انہوں نے شہر کو کھیل ڈال دی ہے۔“ میں نے ملتا جلتے سے کہا۔

”جی کچھ لو۔ کچھ یہاں مگر پھول کی آمد کی وجہ سے۔۔۔ اور  
کچھ بڑے ٹراکٹروں کے شکار کی وجہ سے۔۔۔ مچلیوں دور تک پھلنے کی کمی  
ہو گئی ہے۔ پھول لانیوں والے زیادہ دور دراز تک نہیں جاسکتے۔“  
اس نے بڑا سادہ سنا کر جواب دیا۔

”میں کچھ کہہ رہا ہوں۔ یہاں سے پھلیاں تو بھاگ ہی جاتی  
ہیں۔“ میں نے ناظرانہ انداز میں سہلایا ”اس کے باوجود پھول  
کے شکار کے لیے آنے والوں کے ہاتھ کچھ نہ کچھ تو لگتا ہی ہوگا۔“  
میں نے اسی بازار میں پھلیوں کے شکار کے سامان کی ایک دکان  
میں دیکھی ہے جو ان دنوں بھی کھلی ہوئی ہے۔“

”دوڑی کمانے کی آپ پر لوگ کسی نہ کسی چیز کی دکان کھول کر  
تو بیٹھے ہی رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں دیکھ کر  
دوسرے بھی اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے بیٹھ جائیں۔۔۔ اور ساتھ  
ساتھ اپنی قیمتی جان کو بھی خطرے میں ڈالیں۔“ اس نے اب صاف  
نظروں میں خبردار کیا۔

”میری جان کو کسی کی طرف سے خطرہ ہے۔؟ تمہاری طرف  
سے؟“ میں نے بانی کا لٹرم کا گلاس اٹھا لے کر نہایت سرسری  
سے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ مگر پھول کی طرف سے۔“ اس نے شاعرانہ انداز  
میں مسکراتے ہوئے جواب دیا ”جو لوگ اس علاقے سے بہت  
ابھی طرح واقف نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ  
وہ پھول کے شکار پر آئیں اور خود کچھ کا شکار بن جائیں۔“

”مجھے پہنچ قبول کرنا بہت پسند ہے۔“ میں نے چند گھونٹ پانی پی  
کر گلاس واپس رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا ”چاہے وہ چار  
تائیں والے کچھ کی طرف سے ہو اور چاہے وہ تائیں والے  
مگر پھول کی طرف سے۔“

میں نے ایک بار پھر کمانا شروع کر دیا تاہم میری نظر اس پر  
تھی۔ اس کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لیے اشتعال کی سرخی  
آئی مگر معدوم ہو گئی۔ وہ آنکھیں میکر کر مجھے گھورتا لگا۔ شاید وہ  
میرے بارے میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ مجھے چھڑی کے سارے  
”سارے“ پر چلے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں تنہا قہرے میں آیا  
تھا۔ شاید اس کی کچھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کے باوجود میں اتنا  
مطمئن اور بے فکر کیوں تھا؟

اس نے جتنا بڑے اور قد سے نرم لہجے میں بات کرنے کا  
فیصلہ کیا لیکن اس نرم لہجے میں بھی برطانوی دھمکی پنہاں تھی جیسا  
مشہور کیا ہے کہ تم پھل کا شکار کرنے یا پہنچ قبول کرنے کا شکار  
پورا کرنے کی اور علاقے کی طرف نکل جاؤ۔ ملک میں ایک سے  
ایک ایسے علاقے موجود ہیں جہاں بہت ابھی نسل کی پھلیاں بہت  
نواہ بانی جاتی ہیں۔ کچھ علاقے تو تمہارے شہر کرچی سے بہت  
نہیب بھی ہیں۔“

”ویسے اس کا اصل نام کیا ہے؟“

”اصل نام تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ سب اسے صرف بھی کے نام سے جانتے ہیں۔ ویسے اس کی عزت بلند زری ہے۔ یہ زیادہ اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا یہ اتنی زیادہ عجیب و غریب ہے جتنا اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا؟“

”اس سے کہیں زیادہ بڑا۔“ اس نے خوف زدہ سی نظروں سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ”بڑی حیرت کی بات ہے کہ آپ کے ساتھ اس نے اتنی نرمی دکھائی۔ اتنے سوال و جواب کرنے والوں کو تو یہ لوگ فوراً اٹھا کر لے جاتے ہیں۔“

”یہ لوگ۔“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں صاحب! یہ چار اسی قسم کے آدمیوں کا ٹولہ ہے۔ صبح ستوں میں قحبے پر اب انہی کا راج ہے۔ یہ چاندوں اپنے زمانے کے بڑے جاتے پھرتے دہشت گرد اور بد معاش ہیں۔ برسوں پہلے جیل توڑ کر بھاگے تھے۔ کچھ عرصہ مد پش رہے۔ جب معاملہ ٹھنڈا پ گیا تو یہاں نمودار ہوئے اور جب سے اب تک یہیں ہیں۔“

”جیل توڑ کر بھاگے ہوئے۔“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”چند لمبے کے لیے میں کھانے کا بھول گیا“ کیا کسی کو یہاں ان کی موجودگی کا علم نہیں ہے؟ کوئی ان کو پکڑنے نہیں آیا؟“

اس نے بے چارگی سے کندھے اچکائے ”میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب! ظلم تو ہو گا۔ کئی برس سے یہ یہاں ہیں۔ یہاں پولیس بھی ہے۔ تھانہ بھی ہے۔ سارے قحبے والوں کو پتا ہے تو پولیس کو بھی پتا ہو گا۔ معلوم نہیں کیوں آج تک انہیں پکڑنے کے لیے کوئی پارٹی نہیں آئی۔ شاید یہ بھارتیہ سیرے اور آپ جیسے شریف آدمیوں کے ہونے کی نہیں ہیں۔“

وہ کاؤنٹر پر آنے والے ایک گاہک سے پیسے لینے کے لیے چند لمبے کو خاموش ہوا اور اس کے جانے کے بعد گھڑی سانسی لے کر ہلا ”شاید یہ بھی اتنے زیادہ افسوس کی بات نہیں تھی کہ کوئی ان کو پکڑنے نہیں آیا۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ الٹا انہوں نے اس قحبے کو پکڑ لیا ہے۔ میرا مطلب ہے قابو میں کر لیا ہے۔ اس زمانے میں ہمارا سردار ادھر ہی رہتا تھا۔ وہ ایک شریف آدمی ہے لیکن معلوم نہیں یہ لوگ کس حوالے سے سردار سے ملے اور پھر معلوم نہیں اندر ہی اندر کیا کر رہے ہوئے؟“ دندنہ قحبے پر مکی طور پر پیسے ان کا قبضہ ہوا کیا۔ قحبے کا وہ طبقہ جو زیادہ تر مادی گیری کرتا تھا۔ بہت زیادہ عزت کا شکار تھا۔ اس کو انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ ملا لیا۔“

وہ ایک کمرے کے لیے خاموش ہو کر دستخانہ سے انداز میں ہوا میں گھومنے لگا۔ میں دم بخود سا بیٹھا تھا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ مجھے کس قسم کی افسوسناک کہانی سنائے گا یا بہت کچھ کہہ کر

میں کہانی ”کسی نہ کسی انداز میں ملک کے بہت سے حصوں میں دہرائی جاری تھی۔ کہیں اس پر قبائلی اثر و نفوذ کے سائے تھے۔ کہیں مذہبی اور کہیں سیاسی اثر و نفوذ کے۔ دھیرے دھیرے اور دھڑ دھڑا کر مختلف کونے کھدوئوں میں تہذیبیں کونہیں لے رہی تھیں۔ آتش فشاں جھٹکتے کیے جا رہے تھے اور اپنا لٹکا کر کسی کو آتے والی تباہ کاریوں کا نشانہ بننا اور نہ ہی کوئی فکر تھی بلکہ بعض جگہوں پر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دانشور دانشور تھے سرکاری سطح پر ایسے حوالے کی دہادور سرپرستی کی جاری تھی جو ملک اور معاشرے کی جڑوں میں بادلوں بھر رہے تھے اور بڑے پیمانے پر دوسری طرح کی تہذیبوں غریبوں اور مساکین کے لیے فضا ہموار کر رہے تھے۔ مختلف محاذوں پر طرح طرح کی آگ بھڑک کر سارے معاشرے کو دھماکنے کو ڈھکیاں اڑا رہے تھے اور یہاں ایک اور دنیا بول کر کہنے کے منصوبوں پر کام ہو رہا تھا۔ ایسی دنیا جہاں ہر طرف لوٹ مار، افزائش، چند سکون کے لیے قتل و غارت گاہی مصمت قزوئی اسٹے کی ریل جیل، مصنوعی آسمانوں کا لالچ، ہر طرح کا بھران، معاشی کساد بازاری، خوفناک قسم کی پھینا جینی اور انتہائی عدم تحفظ کا احساس غالب ہو۔ دنیا کے بہت سے طبقوں کا یہ حال ہو چکا تھا اور ہمارے ہاں مختلف سمتوں سے اس پر کام ہو رہا تھا لیکن کسی کو ان خطرات کا ادراک نہیں تھا اور کوئی ان سے بچاؤ کے سلسلے میں تھکس اور بچیدہ نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنے ”بیم“ میں لگا ہوا تھا۔

وہ شخص بھی شاید یہی طرح کچھ اندیشوں میں گرفتار تھا۔ ایک لمبے کی خاموشی کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا ”دندنہ ان کے گھروں میں کسی نہ کسی حد تک خوشحالی نظر آنے لگی۔ رنجیں ٹی دی، دی سی اور آدر ڈشیں نظر آنے لگیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید قسم کا اسلحہ بھی۔ لوگوں کے رہن سہن کے ساتھ ساتھ ان کے طور طریقے۔ حتیٰ کہ بات چیت کرنے کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ پہلے وہ عزت کے باوجود کھینچے ہوئے اور بہت کرنے والے نظر آتے تھے۔ اب وہ بد معاش، لالچی اور نفرت کرنے والے معلوم ہوتے ہیں۔“

”تمہارے سردار کا اس دوران میں کیا رویہ رہا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”بہت سے دوسرے سرداروں کے برعکس اس کی دولت و جائیداد میں اپنے ہمائی ملائے میں کم تھی۔ بس ایک خوپلی اور قزوئی سی زمین تھی لیکن ہر حال وہ خاندانی سوار تھا۔ اس کی زیادہ توجہ کاغذ اور صنعت کاری کی طرف ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے زیادہ کاغذ باری معاملات شریں ہی پڑتے تھے۔ یہاں سے اس کو کچھ زیادہ آمدنی نہیں تھی اور اس نے یہاں اپنی آمدنی کے ذرائع بڑھانے پر زیادہ توجہ بھی نہیں دی۔ پھر جب سے یہاں پہلی اور اس کے ساتھیوں کا اثر و رسوخ بڑھا اس نے یہاں رہنا بھی بہت کم کر دیا۔ اب سرور سب حال یہ ہے کہ وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہتا

درد میں جمال سعیدی کی جھلک نظر آتی تھی لیکن کئی فرق پڑے  
نہیں تھے۔ جمال سعیدی سرخ و سپید تھا۔ اس پولیس انسپکٹر کی  
رنگت سامانی تھی۔ جمال سعیدی کے قتل قتل کرنے کے بعد وہ  
قتل نظر اس کے چہرے سے نہ جانے کیوں احساس ہوا تھا کہ وہ  
درحقیقت ایک صحت مند آدمی تھا اور وقت ضرورت بے پناہ پہلی  
کا مظاہرہ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی پہلی کا مظاہرہ ہم دیکھ بھی چکے  
تھے۔ یوں میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہو چکی تھی لیکن اس  
انسپکٹر کے چہرے پر کھنکھار اور بیزاری تھی۔ وہ گویا بڑی کوشش سے  
اپنے ہماری وجود کو پیچھے بھربھا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے نو  
ہوئی۔ ٹوٹی کے نیچے اس کے بال جتنے نظر آ رہے تھے ان میں سفیدی  
نہلیاں تھیں۔

وہ سیدھا میری بیزاری طرف آیا اور مجھ سے پوچھے "اُمی  
دعوت کا انتظار کرنے کے خلف میں چلے بغیر میرے متاثر کر دی  
ذمہ ہو گیا۔ وہ اپنا پورا سا کل منہ اٹھ مصافحے کے لیے بڑھانے  
ہوئے بولا "مجھے انسپکٹر جیسیہ گورانی کہتے ہیں۔ میں یہاں کے  
انکوائٹ تھا۔ کالیں اچھ اچھی ہوں" وہ پھٹی پھٹی سی سانسوں  
کے درمیان بول رہا تھا جس طرح عمر آدھی تھی کی شفقت سے تھک  
جانے والے سونے افراد بولتے ہیں۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" میں نے دھیلے دھالے  
انداز میں اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

مجھے اپنا خائف کرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ خود ہی بولا  
"آپ سینئر افضل ہیں اور کراچی سے آئے ہیں۔"  
میں نے ہلکی سی آنکھ کے ساتھ کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس  
قبیلے میں میرے آنے کے بعد تو ڈیڑھ بج رہی ہے سب کو پتا چل گیا ہے  
کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟"

"یہاں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے" وہ صاف سے بولا "پھر  
صاحب ہے انہی توڑا نظر آ جاتے ہیں۔"

"کیس ایسا تو نہیں کہ انہیں ہر بلور خاص نظر رکھ جاتی  
ہو؟" میں نے سرسری سے لیے میں کہا "اور خلف طریقوں سے  
خوف و وحشت پھیلا کر ان کی آمد دیکھنے کی بھی کوشش کی جاتی  
ہو؟ شاید کامران دانش کی موت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔"  
اس نے انہوں نے زور سے انداز میں سر ہلا دیا اور لہجہ سانس  
لے کر بولا "جب ایسی لوگ آتے ہیں اس قسم کی باتیں شروع  
کندیں تو پھر ان کی حفاظت کا خیال رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔"  
"کامران دانش نے تو اس قسم کی کوئی بات نہیں کی ہوگی جن  
میرا خیال ہے اسے کسی چیز کی کٹھن کٹھن مل گئی ہوگی جس کی وجہ سے  
اسے پتا ہو کر مجھ سے ہلاک کر دیا۔"

"ہمارے خیال میں جس طرح بھی اس کی موت واقع ہوئی ہوگی  
میں نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا تھا" وہ بدستور نرم لہجے میں بات  
کر رہا تھا میں تو بڑی کوشش کرتا ہوں کہ میرے دل سے کسی

بہ اس کے کاروبار ملک سے باہر بھی پھیل چکے ہیں۔ یہاں یہ  
چار کا ٹولا کافی حد تک سیاہ و سفید کا مالک بن چکا ہے۔ دوسرے بہت  
سے لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ صرف مجھ جیسے کچھ لوگ یہ سب  
کچھ دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ سردار نے قہر سے کہے کہ جیسے اس کے مال پر  
بھروسہ ہے۔ سردار عام طور پر ایسا کرتے نہیں ہیں لیکن شاید اس  
کی کوئی وجہ ہو۔"

میری فرمائش پر کھانے کے بعد کڑک چائے آچکی تھی۔ میں  
نے اس کی چٹکی لے کر کرسی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور دیکھے  
ایسے میں کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے صحت میں بھی اسی قسم کی  
کمانی سننے کو ملے گی۔"

"بات شر اور دہشت کی نہیں ہے۔ ملک تو ایک ہی ہے۔"  
سب جگہ ملتی جلتی ہی کمانی چل رہی ہے۔ واردات کے طریقے اور  
عمل کرنے والے چہرے ذرا بدلے ہوئے ہوتے ہیں "وہ قدرے عجیب  
لہجے میں بولا۔

"تمہارے خیال میں یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اندر ایک کمانی چل  
رہی ہے؟ یہ لوگ اندرون خانہ کیا انتخاب لاتے ہیں؟" میں نے  
دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

یکدم ہی اس کا چہرہ پات سا ہو گیا۔ اس نے خوف زدہ سی  
نظروں سے ایک بار پھر سڑک کی طرف دیکھا اور کھمبے اچھا کر کافی  
خلف لیے میں بولا "مجھے کیا معلوم۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو  
آپ کو صرف وہ باتیں بتا رہا ہوں جو سب کو معلوم ہیں۔ جن کے  
بارے میں کبھی کبھی مجھے دو چار لوگ چنہ کر چکیں تو آواز میں تارلا  
خیال کر لیتے ہیں۔ اس سے آگے میں اپنی ذمہ داری پر کوئی بات  
نہیں کرنا چاہتا۔"

"افسوس یہ مصلحت کو ٹی۔" میں دوسرے سے فہم دیا۔  
"میں صاحب! آپ ایسے پولیس۔" ہائے زور انسان کی  
مجھ پر ہوا۔ "وہ کرسی چیمبر سے بولا۔ وہ زیادہ بڑھا کھٹا معلوم  
نہیں ہوتا تھا لیکن جیتنے ایک لکھا ہوا اور ذہین انسان تھا۔

اچانک کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھر اٹ سٹائی دی جو تیزی  
سے قریب آئی گئی۔ پھر ایک نمائندہ پرائیویٹ سبز پینٹسٹورن  
کے مین سامنے تن رک۔ دستوران کا مالک یکدم ہی کچھ اس  
طرح سیدھا اور مجھ سے لا تعلق سا ہو کر بیٹھ گیا جیسے وہ مجھ سے  
قطعا کوئی بات نہیں کرنا تھا بلکہ شاید وہ قریبی موجودگی سے بھی  
لاطم تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے گھبرا کر کہ شاید جب میں  
بلڈور کے ساتھی آئے ہوں گے جن کی عرضیں ریکٹر کریں یا  
رہے انجن دیکھ ہوں گی مگر جب میں نے سر اٹھا کر صحیح طور پر  
جب کی طرف دیکھا تو مجھے اس میں صرف ایک ہی شخص نظر آیا اور  
وہ پولیس کی وردی میں تھا۔

وہ گاڑی سے اتر کر دستوران میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا  
وہ اکیلا دو تین تو میں کے برابر تھا۔ اس کے قتل قتل کرنے

آج تک گرفتار رکھیں نہیں کیا؟

”اس لیے کہ مجھے آج تک ایسا کوئی آئندہ نہیں ملا“ اس نے ہنسنے میں جواب دیا پھر اس کے لیے میں استراحتیہ سارنگ بھٹک گیا۔ ”تم تو صبح کے بعد سے ہیں جناب! ایسا صبح تھا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ برس برس سے عمارت ملک میں کیا تھا لگا ہوا ہے؟ آج ایک آدمی بھاسا نقل کرتا ہے، ”کوڑوں کی پرانی چاہ کرتا ہے“ دوسرے طبقوں سے بھاسا لگا رہا جاتا ہے۔ ہم جان پر کھیل کر اس کو پکڑ کے تیل میں ڈالتے ہیں، کل کو حالات اس کے حق میں موافق ہو جاتے ہیں۔ اور اسے آئندہ آتے ہیں، ”ان جیسے سب کو چھوڑ دو۔ ہم ان کو نہ صرف چھوڑتے ہیں بلکہ سیلنٹ بھی کرتے ہیں۔ وہ جواب میں ایسے گالیاں دیتے ہیں۔ ہر دو چار سال بعد یہی تماشہ ہوتا ہے۔ جب ہم کو یہی تماشہ دیکھتا ہے تو ہمیں کیا پڑی ہے جیتے جی سولی پر لٹکے رہنے کی؟ ہم بھی انسان ہیں جناب! ہمارا بھی گھبراہٹ ہوئی ہے ہوتے ہیں۔ ہم لوہے کی شکنیں یا غیر انسانی قوتیں نہیں ہیں۔“

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میرے حواس پر ہدف کی پوجا ڈی کر دی تھی۔ وہ شکل سے توڑا سا اہلکار کہہ گاؤں کی نظر آیا تھا مگر درحقیقت ایسا تھا نہیں۔ ایک بار پھر میرے اس نظریے کو تفتیشی کی تھی کہ ہر مشکل مسئلے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ ہر پہلو کا جائزہ لیے بغیر انصاف کی بات نہیں کی جاسکتی۔

آخر میں نے ایک حاشیائی طویل سانس لے کر کہا ”چنانچہ تم نے بلڈوزر اور اس کے ساتھیوں سے سمجھوتا کر لیا۔۔۔ اور مزے میں رہے؟“

”مزے میں تو جناب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ وہ ٹوٹی انداز کر اپنے چھری ہاتھوں پر ہاتھ بچھرتے ہوئے بولا ”مجھے اپنے غریبے ہوئے اور کچھ دوسروں کے مسئلے کیے ہوئے مذاہب تقریباً بھی کے گلے پڑے ہوئے ہیں اور سبھی کو انہیں بھگتنا ہے۔“

وہ میرے سوال کو ایک ایسے طے میں گول کر گیا جس میں بڑی حد تک حقیقت تھی۔ پھر ٹوٹی دواہا سر رکھتے ہوئے وہ بولا ”اور پھر سوال صرف بلڈوزر اور اس کے ساتھیوں کا نہیں ہے جناب! بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہیں“ ان سے خوش ہیں، انہیں اپنا آقا بنائے ہوئے ہیں۔“

”تمت سے لوگوں کو اپنے جیسے بھلے کی تیز نہیں ہوتی۔ مگر اور شاطر لوگ ان کے ذہنوں میں بہت سا جھوٹ بھرتے ہیں۔ وہ کوئی نظر ہو جاتے ہیں۔ چھٹی چھٹی باتوں اور پھر نے چھوٹے چھوٹے مفادات میں الجھ کر اچھی قدریں“ ایسے تعلیمات سب کچھ بھول جاتے ہیں“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ اس کی توجہ میں بوجھ بھل سا گیا۔ لوہے کی میز بھی اس کی توجہ کے زبردست سے توڑا سا بننے لگی۔ میں نے اسے گھورا

باغوش کو اور واقعہ دیکھا۔ وہ اسی لیے میں آپ کی آمد کی خبر ملے گی آپ کو بھی بعض خطرات سے آگاہ کرنے چلا آیا ہوں۔“

”تمت خوب۔ آپ تو کافی فرض شناس پولیس آفیسر معلوم ہوتے ہیں۔“

وہ میرے لیے میں چپے چڑھ کر نظر انداز کرتے ہوئے بولا ”آپ کو واقعی چھٹی کے شکار سے کوئی روک ٹوک ہے تو میں آپ کو ایک دو بجوں کے بارے میں بتا دوں گا جہاں واقعی چھٹی پائی جاتی ہے۔ آپ صرف وہیں تک محدود رہیں اور صرف دن میں شکار کریں، دن میں ہی باہر نکلیں۔ رات کو اپنے ہوٹل کے کمرے تک محدود رہیں۔ ہرگز باہر نہ نکلیں“ چاہے کوئی آپ سے کچھ بھی کہے۔ اس طائفے میں کچھ خطرات پائے جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ راستہ یا بارانستہ ان میں اڑیں۔ مجھے آپ اپنا بہنو اور دوست ٹھکر کریں۔ میں واقعی دل سے چاہتا ہوں کہ آپ خود عافیت سے اپنے گھر واپس چلے جائیں۔“

”کس قسم کے خطرات؟“ میں نے اب ذرا سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح کچھ حلقہ حلقہ کی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”خطرات تو بس خطرات ہوتے ہیں۔ کبھی وہ انسانوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور کبھی مگر چھٹی کی شکل میں“ وہ اب بھی نرمی سے بولا ”ان کے بارے میں چھان بین کرنے کے بجائے ان سے بچنا بہتر ہوتا ہے۔“

میں نے چاہے کا کپ میز پر رکھ کر کرسی کے پٹے سے ٹپک لگاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”کیا عجیب زمانہ آیا ہے۔ پولیس توڑ کر بھاگے ہوئے دہشت گرد اور پولیس دونوں ایک ہی جہتی بائیں کرنے لگے ہیں“ ایک جیسے طور سے دینے لگے ہیں۔ یہ لگتی لگتی علامت نہیں۔ دہشت گردوں، بد معاشوں اور پولیس میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا۔“

وہ ذرا چونکا۔ اس کی سانسوں کی شوشوں کچھ تیز ہو گئی ”آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“

”مجھے کچھ ہی دیر پہلے آپ کی جگہ ایک گینا ناما شخص بیٹھا تھا، وہ اپنا نام بلڈوزر بتا رہا تھا۔ وہ بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا جسکی آپ کر رہے ہیں۔ آپ کے الفاظ کی میں بھی درحقیقت میں متوجہ چھپا ہوا ہے کہ میں واپس چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ وہ ذرا زیادہ واضح طور پر یہی مشورہ دے رہا تھا۔ آپ کے اور اس کے خیالات میں کتنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔“

”آپ کو کس نے بتایا کہ وہ جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے؟“ وہ اب ذرا چونکے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کبھی کبھی ہوا میں میرے ٹھکانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں اور یہ کہ ہم بائیں بتا جاتی ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسے اور اس کے ساتھ ساتھ جیل توڑ کر بھاگے ہوئے مجھ اور بد معاشوں کو آپ نے



”اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟“

”اب تو کوئی حصل کی تیز کی۔ کسی کو سمجھانے سے حارنے کی بات کرنا ہے تو اس پر ہنسی آتی ہے جناب! یہ دوسری بات ہے کہ اس ہنسی کے ساتھ مجھے لوگوں کے دل سے ایک نئی سی بھی اٹھتی ہے لیکن یہ اب ایک غیر اہم کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ ایک بڑے اور بالدار کوئی ہو کر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ دولت والے تو بڑے دنیا دار ہوتے ہیں۔ وہ تو اب بالکل سی اس قسم کی باتوں میں نہیں اچھٹے۔ اس قسم کی باتیں کہنے والا اب اس سماج میں دیرانہ سا لگتا ہے کیونکہ کوئی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا۔ میں تو پھر بھی اچھا آدمی ہوں جناب!۔ کہ آپ کی بات پر صرف ہنس رہا ہوں۔ بعض اوقات تو لوگوں کو کوئی حصل کی بات سمجھانے والے کے سینے پر غصہ سے کوئی آکر لگتی ہے۔“

”یہ بہاؤ جیسا تن و قش رکھتے ہوئے بھی تم نے مدت جلد مدت ہادی انہیں جیشہ!“ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لیے میں کہا۔

”اگر آپ کے پاس بچہ موجود ہے تو میری ایک بات لکھ کر رکھ لیں جناب!“ وہ کچھ عجیب آدمی سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”ایک روز آپ بھی بہت ہار جائیں گے۔“

اس نے اتنی قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھنا نہ گیا۔ پھر اچانک سی مجھے اس سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ شاید یہ خوف اس کی ذات سے نہیں، آگہی کے احساس سے تھا۔ مجھے یوں لگا کہ اس کے مونہ، حصل حصل کرتے اور بظاہر بے حس سے نظر آنے والے وجود کے اندر کوئی نہایت نازک اور حساس آدمی چھپا بیٹھا تھا جو مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار، جماعتیادہ اور سرد گرم چشموں تھا۔ وہ اپنے وجود میں نہ جانے کتنی تلخیاں سمیٹے ہوئے تھا اور اس کی ذات کے محار میں نہ جانے کتنے تجربات کی دھول اڑ رہی تھی۔ کمینٹ نے ایک بار تو میری ذات کے مضبوط قلعے کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ بعض اوقات کسی دور افتادہ اور پسماندہ ہی جگہ پر کسی عجیب شخصیت سے آپ کی ملاقات ہو جاتی ہے جو آپ کی شخصیت پر کمرے سے نفوش پھوڑ جاتی ہے۔ مجھے کچھ یوں لگا کہ وہ بھی ایسی ہوئی کوئی شخصیت ثابت ہونے والا تھا۔

وہ کچھ اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے صرف سستانے کے لیے یہاں آن بیٹھا تھا اور اب اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ تودہ پر اپنی جیلن درست کرتے ہوئے بولا ”آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ آپ کو کسی نے خیر وار نہیں کیا تھا۔“

”عجیب بات ہے۔“ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بالکل ایسی بات مجھ سے بلند ذرے بھی جانتے وقت کہی تھی۔“

”بعض اوقات بات ایک سی ہوتی ہے۔۔۔ الفاظ بھی ایک

جیسے ہوتے ہیں لیکن نیٹوں میں فرق ہوتا ہے۔“ اس نے ہنس سی مٹکا ہٹ کے ساتھ کہا اور حصل حصل کرنا گاڑی کی طرف چل دیا اور چند لمبے بعد اس میں چن کر نظر سے اوجھل ہو گیا۔

رستوران کے مالک کو غالباً جب یقین ہو گیا کہ وہ مدت دور باپ کا قاتل ہے وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا اور غرت سے بولا ”حرام خورد کیں کا۔“ اس کا یہ تبصرا انہیںکڑ جیشہ کے لیے تھا۔ یہ اور اس کا مانتہ فلسفہ۔ سب کچھ ہوئے ہیں۔ اسی لیے ابھی تک یہاں بگے ہوئے ہیں ورنہ اب تک ان کے تھوڑے ہو چکے ہوتے۔“

تایم مجھے اب انہیںکڑ جیشہ سے غرت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ صرف ایک ناسف دہکا تھا۔ کسی سے غرت کہنا بہت آسان ہے۔ غرت کے لیے مدت معمولی سا جواز کافی ہوتا ہے اور بعض اوقات تو جواز کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی اگر آپ کی کسی ذمہ داری کو چھوڑ کر آپ کے دل میں کسی کے خلاف غرت کی آگ بھڑکا سکتا ہے۔ آپ خود بھی اسے خوب ہوا دے سکتے ہیں لیکن کسی کے متوقف کو سمجھنے اور اس پر کان دھرنے کے لیے بڑے حقل احتیاط سے اور اعلیٰ غرتی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ لوگ ہر معاملے میں خود کو بالکل بے قصور، معصوم اور بے الذمہ سمجھتے ہیں اور اپنی کوتاہیوں کا بوجھ لادنے کے لیے بھی دوسروں کے کندھے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”آج کل رگ بھوں کے زور پر معاشی دکھانے کا زمانہ نہیں۔ میں نے بلند ذرے کے پاس کوئی جتیار نہیں دیکھا۔ کیا وہ اپنے ہاتھ پیروں کے زور پر ہی بد معاشی دکھانا پھر رہا ہے؟“

رستوران کا مالک کچھ انداز میں ہنسا۔ اسے شاید میری بات کافی پکوانے لگی تھی۔ وہ عطا انداز میں سروک کا جائزہ لینے کے بعد بولا ”آپ نے اسٹیج پر کبھی بازیگر کے کتب تو دیکھے ہوں گے؟ وہ چل جاتا ہے، ہوا میں ہاتھ مارتا ہے، کبھی اس کے ہاتھ میں گیند کبھی پھول اور کبھی تاش کا پتہ آ جاتا ہے۔ بلند ذرے اور اس کے سامنے بھی ایک طرح کے بازیگر ہیں۔ اکثر تو ان کے پاس جتیار موجود ہی ہوتے ہیں لیکن اگر نہ ہوں تب بھی ضرورت پڑنے پر چل جاتے ہیں ان کے ہاتھ میں جتیار آ جاتے ہیں۔ یہ کسی سروک پر کسی گلی میں کھڑے ہو کر مخصوص انداز میں آوازیں دیں اور کچھ بھائیوں کو جتیار دان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سا بڑی والا کون سا کم کا گاڑی والا یا کون سا خواجہ والا اپنے سامان میں ان کے لیے جتیار چھپائے پھر رہا ہو۔“

”وہ مانی گا۔“ میں متاستانہ انداز میں صرف اتنی ہی کہہ سکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ارا لگی کر کے میں رستوران سے باہر آیا۔ میری وہ رات بیکھانی ہو گئی میں خیریت سے گزر گئی۔ میں ہمیشہ نیند نہیں سو سکا۔ سوچ میں بھی گویا چوکناسی رہا اور میرے

بد حال سی رہا ہوگا۔

میں نے اسے کچھ پتھر قلم دی جو اس نے میرے بے حد اصرار کے بعد رکھی ورنہ وہ مسلسل انکار کیے جا رہا تھا۔ توڑی سی رقم یا کمرہ مت زیادہ شکر گزار ہوا۔ میں نے موقع مناسب سمجھتے ہوئے اس سے فوراً پچھلی کے شمار کے لیے ساحل پر کسی سوزوں جگہ کی تلاش کے سلسلے میں رہنمائی چاہی۔ اس نے نہایت تفصیل سے مجھے دو جگہوں کے بارے میں سمجھایا۔ وہ بے چارہ تو میرے ساتھ چلنے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ یہ بھی ثابت تھا کہ میری اس طلسمی پر اس نے مجھے شک زدہ انداز میں نہیں دیکھا۔

بجیرو میں چند کمرے تھے جسے سے کل کر ساحل کے ساتھ ساتھ اس کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہوا۔ یہ تاہوار اور ٹیڑھا میزھا ساحل تھا۔ چار منٹ کے ست رفتار سفر کے بعد ہی میں مطلوبہ مقام تک جا پہنچا لیکن بجیرو مجھے کچھ دور سی چھوڑی دی کیونکہ وہاں دلدل زمین شروع ہو گئی تھی اور بجیرو اس میں دھنسی جا رہی تھی۔ مجھے لیو تری سی ایک مسلح چٹان پر چڑھنا تھا جو زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک محفوظ جگہ چنی بھی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس پر بجیرو نہیں چل سکتی تھی اس لیے سامان اٹھا کر میں پیدل ہی وہاں تک پہنچا۔

چٹان پر پہنچ کر مجھے اور گرد کا ماحول ہی خوب صورت معلوم ہوا۔ سورج کی تفرقی شعاعیں دور سے سمندر پر دلچسپ انداز میں رقصاں تھیں۔ شبیب و فراز میں کہیں سبزہ کہیں درخت چھایا ہواں میں گھرے ہوئے اونچے نیچے رنگارنگ سے مکانات یہ سب کچھ نظروں کو بہت جلد لگ بھگ تھیں جو کہ کہیں قریب کے لئے نہیں آیا تھا اس کے باوجود میں نے ایک عجیب سی ذرت محسوس کی۔ مجھے پچھلی کے باضابطہ شمار کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اس وقت میں خود کو شمار ہی محسوس کر رہا تھا۔ نہایت افسانہ اور کلن سے میں نے ایک نہایت صحت مند قسم کا بچہ اکتھب کر کے کانٹے میں لگایا اور پانی میں ڈور ڈال کر پٹان پر بندھ گیا۔

میں خود تو اپنے آپ کو پچھلی کا شمار ہی محسوس کر رہا تھا لیکن اگر اس وقت کوئی اور بھی مجھے دیکھ تو شاید ہی محسوس کرنا۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ لگائے کی کوشش کی کہ کیا کہیں سے میری عمر گرائی کی جا رہی تھی؟ کسی جگہیں ایسی تھیں جہاں سے دور بین کے ذریعے نہایت آسانی سے میری تمام حرکات و سکنات کا جائزہ لیا جاسکتا تھا اور کوئی بید نہیں تھا کہ ایسا بھی جا رہا ہو۔

اس جگہ سے کچھ آگے کھڑی اتنی گہری معلوم ہو رہی تھی کہ شاید کوئی بحری جہاز بھی وہاں تک آسکتا تھا تاہم جہاں میں نے ڈور ڈالی ہوئی تھی وہاں میرے اندازے کے مطابق پانی کم ہی گہرا تھا۔ پانی کی سطح پر لمبر زیادہ تیز نہیں تھیں۔ پلاسٹک کا بکتر خاصے

کان دھواڑے کی طرف گئے رہے کہ شاید کسی بھی لمحے کوئی مشکوک آواز سنائی دے جائے میرے لیے تو دھواڑہ ٹوٹنے کی آواز بھی غیر متوقع نہ ہوئی۔ گوکہ میں دھواڑہ منتقل کر کے اور لوٹ چھا کر سوا تھا لیکن وہ کھوکھلا، کھردور اور سالنہ دھواڑہ دھواڑہ بلند و زبر چبے توئی کی دھواڑہ بھی نہیں سرسکتا تھا۔

میرے سہارے نہایت چچی آواز میں بیڑ پر چلا رہا اور جب بیڑ کا وقت ختم ہوا تو میں نے اسی سے منسلک نیپ دیکھا مگر ایک کیٹ نہایت دھنسی آواز میں چلا رہی۔ یہ کیٹ انوریک سسٹم کے تحت ریمس اور ریمز ہوتی تھی۔ میرے سونے کے دوران میں بھی کمرے میں دھنسی دھنسی موسیقی ابھرتی رہی۔ یہ تو آواز میرے کمرے سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ میں موسیقی کا اتنا زیادہ شوقین نہیں تھا کہ سونے کے لیے بھی مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہوتی لیکن کمرے میں ہر وقت بیڑ یا نیپ دیکھا مگر چلائے رکھنے میں ایک مصلحت تھی۔ رات کے دوران میں دو ایک مرتبہ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ ستانے میں دور کیس کسی انجن کی گھر گراہٹ ابھرتی تھی۔ شاید وہ کسی لانچ کے انجن کی آواز تھی جو بھی معلوم ہوئی اور کسی دھواڑہ سنائی دینے لگی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جا رہی تھا۔ ایسا معلوم ہوا تھا کہ سمندر میں کہیں نقل و حرکت جا رہی تھی۔ تاہم میں نے حرکت میں آنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ سیکھائی میں یہ میری پہلی رات تھی۔ میں ابھی حالات کو ذرا مزبور طور پر سمجھنا چاہتا تھا۔

دوسرے روز میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میں پچھلی کے شمار پر آنے کا دعویٰ کر رہا تھا تو مجھے پچھلی کے شمار کا بھی تصور ڈالنا سزاوار اور اگر لیتا چاہیے تھا۔ میں جن لوگوں کی نظر میں تھا ان میں نہ جانے کتنے آتے تھے کہ میں واقعی پچھلی کے شمار میں دلچسپی لے رہا تھا۔ لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میرے پاس شمار کا توجہ یہ قسم کا سامان موجود تھا لیکن میں سامان کی ہمتی دکان پر جا پہنچا کہ شاید وہاں سے پچھلی کا چارائی مل جائے۔ دکان دار بے چارہ بیٹھا کیاں دار رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باجیں کل گئیں۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس نے شمار کے سچے چارے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے قیوں میں سیای اگلے کچھ بھر کر ان میں کچھ سے رنگے ہوئے تھے اس کے پاس اوسط درجے کی اور مختلف اقسام کی بنیاں ڈور اور کانٹے و فیو بھی موجود تھیں لیکن ان کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔

دکان دار نے بطور خاص مجھے انکیشل کچھ سے نکال کر ایک قیل میں ڈال کر دیا جو اتنے صحت مند تھے کہ مجھ کو سونے میں مانپ معلوم ہو رہے تھے۔ شاید وہ پاؤں لہڑیوں اور کچھ دوس میں لہڑیوں سے مقام کے حامل رہے ہوں۔ میں اس دکان دار کی بہت کی داد دے بغیر نہ رہ سکا جو اس علاقے میں کابک کے نام و نشان نہ ہونے کے باوجود اس قسم کے سامان کی دکان کھولے بیٹھا تھا۔ اگر لائین میں کچھ کا بھی لیتا ہو گا تب بھی بے کاری کے یہ دن گزار کر

ہر سون انداز میں صلح آپ پر ہوتا تھا۔

آدھے گھنٹے تک بیکری طرحی طرحی تھوڑا جس کا مطلب تھا کہ اب تک کوئی چللی اس کاٹنے کی طرف حوج نہیں ہوئی تھی جس میں "چار" یعنی کچھ اچھٹا ہوا تھا۔ یہ خاصی ہلکی سن صورت حال تھی۔ میرا مہربانہ جواب دینے لگا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ چللی کے کنارے کے واقعی بڑے مہربانہ کی ضرورت ہوئی تھی۔ میں اس وقت جبکہ میں چللی کے کنارے کی اداکاری کو پالانے ملان رکھتے ہوئے ڈوری لینے کا ارادہ کر رہا تھا "اچانک پلانک کانگر ڈوب گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ چللی نے چارے پر رت مارا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈوری کو ڈھیل دیا شروع کی۔ چللی یقیناً پھنس چکی تھی اور کانٹے کو دور لے جا رہی تھی۔ میں نے اسے دور جانے کا موقع دیا۔ آخر میں نے محسوس کیا کہ ڈوری کو کھینچنے کا عمل رک گیا تھا۔ چنانچہ میں نے تیزی سے چوٹی کے ذریعے ڈوری لینے شروع کی اور جب سکر دوہا صلح آپ پر دکھائی دینے لگا تو جیسی کو ایک ہمتاؤ سے کرنا پڑا۔ ڈوری اور یہ دیکھ کر میں خود اپنی نظروں میں شرمندہ ہو گیا کہ کتنا خالی تھا۔ چللی "چار" غایت متاعی سے کھانسی تھی اور اس نے شاید کانٹے پر رت نہیں مارا تھا۔ شاید پھلیوں کو بھی اندازہ ہوا جانتے کہ کنارے پر کوئی اناڑی بیٹھا ہے۔

میں نے چند لمحوں کے سوچنے کے بعد مت کر کے دوہا چار لگایا اور ایک بار پھر ڈوری ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس بار پھر منٹ بعد ہی ایک چللی پھنس گئی لیکن وہ اپنی جھولی تھی کہ میں نے اس پر ترس کر کار اسے کانٹے سے نکال کر دوہا کھانسی میں چھوڑ دیا۔ اپنی جھولی چللی کو پکڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری اس حرکت پر پھلیاں خوش ہونے کے بجائے شاید برا متاؤں کیونکہ اس کے بعد کوئی چللی نہیں پھنسی۔ آخر کار میں اپنے اس فضل سے اٹھا کر ہوئی واپس آیا۔

اس رات شاید میں ہوئی کے کمرے میں کچھ گہری نیند سو گیا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ اس وقت رات کا کون سا پر تھا جب میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے کوئی خواب میں مجھے بکار رہا تھا۔ پھر مجھے اچانک ہی احساس ہوا کہ یہ خواب کی نہیں "حقیقت" کی دنیا کی بات تھی۔ کسی نے نہ صرف پہلے سے زیادہ بلند آواز میں مجھے بکارا تھا بلکہ میری پھلیوں میں کسی چیز سے ٹوکا بھی دیا گیا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور چمکتی سے اٹھنا چاہا لیکن فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا ایک دم اندھ کر بیٹھا ٹھیک نہیں تھا۔ میرے دائیں بائیں اور بائیں کی طرف ہار کا کھوکھو بڑا کھڑے تھے اور ان کی کلا کھوکھوں کا رخ میری ہی طرف تھا۔ ان میں سے ایک بلند زور تھا۔ باقی تینوں بھی اسی کی کھوکھوں کے آری تھے۔ ان میں سے صرف ایک ذرا بہت قد تھا لیکن وہ بھی مجھے ہونے ورنہ شرم کا مالک تھا۔

وہ چاروں منہ ملی اکٹاؤں میں لڑنے والے دن نچلے درجے کے

ریسلر سلوم ہو رہے تھے جو عام طور پر بیڈیکٹ کے لیے لڑتے ہیں۔ رینگ کی دنیا میں ان کا کوئی خاص مقام نہیں ہو سکا ہے ایمانی کے سارے بڑے ستارے جیسے بارنگ میں فساد والے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کلا کھوکھ نہیں بہاں ان کے پاس بھی نہیں ہوتی۔ بلند زور میں میری بائیں کی کانٹے کے پاس کھڑا تھا اور سب سے پہلے میری اسی سے نظروں کی تھی۔ باقی تینوں اس سے زیادہ خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اپنی ہی نظروں سے ان تینوں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دوہا بلند زور کی طرف دیکھا تو وہ غایت مجھے انداز میں سکر اپنا تھا۔ میں کو جنش دیتے ہوئے بولا "مہربانہ افضل" انھیں چللی کے کنارے کا مت شوق ہے نا۔ اور تم کس اور جانے پر بھی تیار نہیں ہو۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے "خمس" میں ذرا اچھی طرح چللی کا کنارہ لکھایا جائے لیکن اس کے لیے ہمیں ذرا اس وقت رات کو باہر چلنے کی زحمت کرنا پڑے گی۔ رات کو چللی کے کنارے کا لکھنا ہی کچھ اور ہے۔"

میں آنکھوں سے اندھ بیٹھا کمرے کا دوہا بند تھا۔ میں اسے منتقل کر کے سویا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بیڈیکٹ چالی سے نکال کر اندر آئے تھے کمرے کی لائٹ آن تھی اور میرے سرہانے کارنس پر غایت نیچی آواز میں نیپ چل رہی تھی۔ یہ دونوں چیزیں میں اسی طرح چھوڑ کر سویا تھا۔ میرے سرہانے کھڑے ہوئے شخص نے میرے کھینچے کے نیچے ہاتھ ڈال کر یوں میرا مشین ہٹل نکال لیا جیسے اسے پہلے سے علم تھا کہ وہاں ہو گا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اگر آوی کے پاس چھوٹا موٹا ہتھیار ہو تو انہیں جیکے سوئے وقت عموماً وہ اسے کھینچے کے نیچے ہی رکھتا ہے۔ اس نے مشین ہٹل کر ایک نظر دیکھ کے سٹائی انداز میں سولایا اور اسے جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

"اگر اجازت ہو تو چلے سے پہلے میں یہ نیپ دیکھاؤ رہ کر دوں؟" میں نے قدرے خوف زدہ لہجے میں کہا اور نیپ دیکھاؤ کی طرف اشارہ کیا جس پر اس وقت بھی ایک نم زدہ سائیکٹ دھبی آواز میں چل رہا تھا۔ مجھے اجازت دینے کے بجائے میرے سرہانے کھڑے ہوئے شخص نے خود ہی ہاتھ بچھا کر اس کا ہٹن دیا۔ "کمرے میں آؤ اس کی کھینچ لے ہوئی نم زدہ سی آواز خاموش ہو گئی۔ تب میں نے ذرا اور خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا "تم لوگ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"تایا تو ہے۔" چللیوں کے کنارے پر "بلند زور نے غایت مل کر اسٹ کے ساتھ جواب دیا۔  
"جو ہم میں اپنی فٹنگ راز بھی ساتھ لے لوں؟" میں نے کہا کسی بہت ہی اعتماد خوش فہمی کے تحت پوچھا۔  
"مہربانہ خوب۔" بلند زور فراق دلی سے بولا "لیکن چارہ ساتھ مت لے نا۔"

ہوتی تھی۔

پک اپ کا ڈرائیور بھی ہمارے قریب آکر کھڑا تھا۔ وہ ان کی طرح لبا ترکا، مضبوط اور ہڈی ہلڈر ٹائپ نہیں تھا تاہم ایسا کیا گزرا بھی نہیں تھا اور غلی ہاتھ بھی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ماؤزر تھا۔ اب میں پانچ افراد کے زمرے میں تھا۔ چند سینکڑ کے لیے میں نے جدوجہد کے امکانات پر غور کیا۔ امکانات زیادہ روشن تو نہیں تھے اور خطرات زیادہ تھے اس کے باوجود میں نے ہجے کرنے کے بارے میں سوچا لیکن فوراً ہی ارادہ ہٹ کر دیا۔ ابھی یہی مصلحت میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ انہیں کچھ دیر اور خوش ہو لینے کا موقع دیا جائے۔

”آگے چلو“ سب سے ہلڈوڑ نے میری کریمیں کاٹھکھوکھ کی ٹال جھوٹے ہوئے غم لدا۔

”کیا پانی میں اتر جائیں؟“ جس نے غلامت سے پوچھا۔  
 ”ہاں۔ پانی میں اتر جائیں گے پھر وہ ہم بھی ہمارے ساتھ ہیں“ اس نے گویا مجھے تسلی دی۔ انہوں نے بدستور مجھے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہمیں اسی طرح ان کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ ہم چھوڑے گئے۔ چھ افراد شربٹ شربٹ کرتے پانی میں آگے بڑھے۔ چند قدم آگے پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں پانی کافی دور تک گرا نہیں تھا۔ اچانک میں نے دیکھا پانی میں ایک کھمبا سا سر اٹھانے لگا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

اس وقت پانی ہم سب کی تقریباً گریٹ پہنچ چکا تھا۔ پلے میں بھی سمجھا تھا کہ شاید مجھے کھڑکی میں ڈالنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میری لاش صبح کھڑکی میں پھنسی پالی جائے لیکن جب وہ ہاتھ سے انداز میں اس کھمبا ناچنے کے پاس رکے تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ ان کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ پتہ نہ تھا کہ وہ شخص نے اپنی گئی دوسرے سا جی کو کھائی اور یکدم ہی غریب سے پانی میں بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ اس نے کوئی بھاری سی چیز میرے گھٹے سے ڈرا اور ایک ٹانگ کے گرد گھمائی تھی اور شاید کوئی کھٹکا سا دبا دیا تھا۔ یہ کھٹکا سا گویا میرے ہاتھ کے قریب نہیں بلکہ میرے ذہن میں دبا تھا۔ میرے ذہن میں کھٹکی کا ہمکا سا ہوا اور میرا دل ڈب ڈبے لگا۔ مجھ سے بہت بڑی عافیت ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اپنے آپ پر حد سے زیادہ خدا کا دی اور کسی کو خود زنی کی ذمہ داری دے دینا اپنی جدوجہد کا فیصلہ ایک لمحے کے لیے متاخر کرنا بھی انتہائی خطرناک ہوتا ہے بازی باطل پلٹ جاتی ہے۔

اس وقت تک انہوں نے دائرہ بڑا کر لیا تھا اور مجھ سے کچھ دور ہٹ گئے تھے۔ پتہ نہ تھا کہ میں پانی میں کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور میرے بدترین شے کی تصدیق ہو گئی۔ پھر میں نے ذرا ہلکا کر اور پانی میں چھپی ہوئی اپنی ایک ٹانگ ڈرا اور

اس سے آگے اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا مقصد واضح تھا۔ شاید وہ یہی کہنا چاہتا تھا ”ہمارا آج تم خود ہو گے“

اس جگہ سے کمرے میں چاند کی موجودگی سے مجھے ایک جھوم سا ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں چلانے کی بھی جگہ نہیں رہی تھی۔ ان چاند نے نہایت مستحی سے مجھے گھیرا ہوا تھا اور وہ میری طرف سے ڈرا بھی ہے پروا کھائی نہیں دے رہے تھے۔ میری ننگی راڈ اور اس کے ساتھ چھوٹی موٹی چیزوں کا پھیلاؤ دار کے قریب موجود تھا۔ وہ دونوں چیزیں بہت قد شخص نے اٹھائیں۔ اس نے تھیلے کی ڈوری ڈھیلی کر کے اس میں جھانک کر تالبا یہ اطمینان بھی کر لیا کہ اس میں کوئی خطرناک چیز موجود نہیں تھی۔

”ہلکے“ انھوں نے ہلڈوڑ نے کہا اور چاند نے ایک وقت گنتوں کو حرکت دی۔ میں نے پتے سے پاؤں لیے کہے جو گڑھ پڑے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ قربانی کے کمرے کی طرح میں ان کے زمرے میں باہر کی طرف چل دیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ کھڑا دو ٹانگوں پر چل رہا تھا۔ باہر آکر میں نے ہوس کے استقبالیہ کمرے کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں اندھا نظر آیا۔

انہوں نے مجھے میری ہی جھیر میں بٹھایا۔ پتہ نہ تھا کہ ذرا آگے تک سیٹ سنبھال لے۔ پانی تیل گنتوں سمیت مجھے گھیر کر بیٹھ گئے۔ جھیر کے پیچھے ڈبل کین کی ایک بھاری ڈائننگ پک آپ ادھر سے چاند کی دھم سی چاندنی میں جھللا رہی تھی۔ اس کی ذرا آگے تک سیٹ پر بھی ایک شخص موجود تھا۔ وہ ان کا پانچواں ساتھی تھا۔ ان کی گاڑی جھیر سے بھی زیادہ کار آمد تھی۔

رات کے سنانے میں جھیر کا انجن فرایا اور اس کے ساتھ ہی ایک ایک بھی اشارت ہو گئی۔ میں نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا لیکن مجھے اندازہ نہ ہوا کہ پک آپ پے جیو کے پیچھے پیچھے ہی روانہ ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ گاڑی اسی طرف چاری گئی جہر میں آج دن میں چھلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سمندر سے دور ہی رہتے ہوئے ہم اس جگہ کو چھوڑ کر آگے بڑھنے چلے گئے۔ ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ذرا آگے کے فرائض انجام دینے والے پتہ نہ تھا کہ شخص نے گاڑی ساحل کی طرف گھمائی اور چھوٹے پتے پر ہم پانچوں کے درمیان گھری ہوئی ایک اور گاڑی کے قریب جا پہنچے۔ یہاں بھی دھمکی کی بو پھیلی ہوئی تھی لیکن جھیر کے پیچھے چھوٹے محسوس نہیں ہوتے۔

گاڑی کی سار پر بھی دھم گھریں دھنکی چاندنی میں جھللا رہی تھی اور دور سے سمندر میں موجوں کا شور اس سکوت شب میں کسی خاص نصیب کی مسلسل آہوں کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ میں ان کے ترے میں گاڑی سے اترتا تو ساحل کی پراسرار صحت نے ایک بار تو میری ریڑھ کی ہڈی میں بھی سوئی لہر دوڑا دی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ جس جگہ کو میں دھمکی کی بو سمجھا تھا شاید وہ دھمکی کی نہیں تھی۔ شاید اس قسم کی بو ہفتہ خانوں کے آس پاس محسوس



ان کی تجارت زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوئی رہے گی۔  
 "تقصد نہیں۔ اس میں خیریت اور شفا کو" میں نے غرت سے کہا۔

اس نے فقہ لکھا اور یوں میں جس احتیاج کا ذکر کر رہا ہوں ان میں تم بھی شامل ہو۔ تم ذرا دوسری طرح کے احتیاج ہو لیکن ہر حال احتیاج ہی ہو۔"

اس نے اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا لیکن غلطی سے یہی رہا "امید ہے اب تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی اور اب تم آرام سے سرسکے ہم جا رہے ہیں۔ آج رات ایک جنازہ کو بکھڑا کارگو" میں انہارے ہوئے گزرتا ہے۔ ہم چل کر مال وصول کر لیں۔ ہر حال تذریل یہاں موجود رہے گا۔ وہ تھرا خیال رکھے گا۔ میرا مطلب ہے وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ اگرچہ تمہاری ایک آدھ ٹانگ الگ کر کے تمہیں زندہ حالت میں نہ چھوڑ جائے۔"

"جنازہ کہاں پہنچ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔  
 "تم جان کر کیا کرو گے؟ تم شاید اس وقت تک زندہ نہ رہو۔" وہ گڑی دیکھتے ہوئے یوں "اس کے پیچھے میں ابھی ایک زینہ لٹکا ہے۔"

"وہ کہاں بیٹھے گا؟" میں نے یہ آواز بلند پوچھا۔  
 "تم بھی کیا یاد کرو گے۔ تمہارے ہر سوال کا جواب دے دیتا ہوں۔ یہ تمہاری زندگی کے آخری سوالات ہیں۔" وہ اطمینان سے یوں جھجکا وہاں پہنچے گا جہاں آج تم پھیلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں وہاں بیٹھ کر پھیلیاں پکڑنے والے تخت ذہر لگتے ہیں۔ شکر کرو کہ ہم نے تمہیں اس وقت دو درار رکھل سے کوئی نہیں ماری تھی۔"

میں چین سے نہیں کہہ سکا تھا کہ امتحان وہ تھا یا میں؟ شاید دونوں ہی رہے ہوں۔ ہر انسان سے اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ حقائق ضرور ہوتی ہیں۔ عقل کل تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اس وقت وہ بھی مجھے خود اسامی امتحان محسوس ہوا تھا۔ اس نے میرے کمرے میں موجود ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ کوئی عام "ٹوائزن" نہیں تھی۔ اس میں ایک طاقتور اور حساس ٹرانسیسٹر بھی موجود تھا۔ جب ریڈیو یا ٹیپ کو آف کیا جاتا تھا تو ٹرانسیسٹر آن ہو جاتا تھا۔ میں اسی لیے اسے ہر وقت دھیمی آواز میں چلائے رکھتا تھا کہ اگر کبھی مجھے کمرے سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تو میں اسے آف کرنے کا موقع تو تلاش کری لوں گا۔ اس کے بعد کمرے میں ہونے والی تمام گفتگو کو سٹ گاڑنے کے ایک چھوٹے بکری جنازہ پر مبنی جاسکتی تھی جو وہاں سے جیکب میں میل دور ایک جڑیہ پر نظر انداز تھا۔

صرف یہی نہیں "میری فٹنگ راؤ کے موٹے دستے میں بھی مختصر سا ایک ریلے سسٹم موجود تھا جو اپنے آس پاس ہونے والی

شاید تم چپکے چپکے ثبوت تلاش کرنے کے چکر میں چلے آئے۔  
 چلے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ پورا خود چل کر چوہے دان تک پہنچا۔"

"شاید مجھے اتنی زیادہ معلومات نہیں ہیں جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ تم مجھے بتائی کہیں نہیں دیتے؟" میں نے کسی حد تک اطمینان سے اسے کہا۔

وہ ایک لمبے خاموش رہا۔ میری موت جو تکہ اب چینی ہو چکی تھی شاید اس لیے اس نے مجھے بتانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ نہایت اطمینان سے وہ یوں۔ "تمہارے پاس بحال سعیدی کے اسٹے کی اسٹاک کے دوٹ کا سب سے اہم اسٹیشن یہی ہے۔ کئی مہینوں سے آئے والے مخصوص کپڑوں کے مال بردار بکری جنازہ کراچی آتے وقت اپنا رات تو خورا سادہ کر چکے رات کے وقت میں زور سے ہوتے ہوئے گزرتے ہیں اور دس میں بیٹیاں خاموشی سے اُدھر اُدھر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے مال امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے لیے آئے ہیں۔ لیکن اصل کائنات میں اس کی کہیں اثری نہیں ہوتی۔ ان بیٹوں میں اسٹو بالکل الگ الگ حصوں میں ہوتا ہے۔ کوئی حصہ کہیں۔ کوئی کہیں۔ تاکہ اگر کبھی کہیں چٹانک بھی ہو جائے تو انہیں بیٹوں کے پڑوسے کہہ کر بچنے کی کوشش کی جائے۔ بعض اوقات کچھ حصوں کی کیپ ایک جنازہ سے پہنچتی ہے اور دوسرے حصوں کی کیپ دوسرے جنازہ سے۔ یہاں ان کی اسٹاک ہوتی ہے۔ اسٹاک کے بہترین ماہر یہاں تیار کیے گئے ہیں۔ یہاں سے مال تیار ہو کر بحال سعیدی کے ثقہ گوداموں میں جاتا ہے۔ اس راستے پر کوئی خاص چٹانک نہیں ہے جو توڑی بہت ہے اس کا ہم نے بغور دیکھ کر رکھا ہے۔"

"اچھا۔ تو بحال سعیدی تھرا یا اس ہے؟" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "جب سے اس نے یہاں پہنچے گا تو" "جب سے حالات بدل گئے تو کوئی طور طریقہ بدل گئے۔"

"بے شک۔ وہ سردار سے بھی دوستی کاغذ چکا ہے۔" بلند زور سے غر سے بتایا۔ "سب کچھ بالکل ٹھیک چل رہا تھا لیکن تمہیں نہ جانے کیوں اپنی کمزوری تاکہ ان معاملات میں اڑوانے کا اتنا زیادہ شوق چڑھ گیا۔ تمہاری وجہ سے ہمارے پاس کوئی احوال مدد پر ہوا پڑا ہے۔ اب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ بعض اوقات پرانے معاملات میں اڑوانی جانے والی تاکہ میں جیڑی بھی پڑ جاتی ہے اور بیش و آدم میں رہنے والوں کو کچھ بھی کھا جاتے ہیں۔"

"کیا تمہارے ہاں واقعی اسٹے کی اتنی بڑی اندر گراؤڈ مارکیٹ موجود ہے؟" اتنی کہت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً۔" وہ مسکرایا۔ "ایشیائی ملکوں میں چند ایک ایسے ہیں جہاں خاص طور پر ناجائز اسٹے کی کچھ بہت زیادہ ہے کیونکہ وہاں لوگ جذبہ جنازہ کے ساتھ ایک دوسرے کا مٹایا کرنے کی غرض میں رہتے ہیں۔ دنیا میں جب تک احتیاج پائی ہیں، تقصد ہمارے نہیں کر سکتے۔"

مکھڑ کو میرے کمرے میں موجود ریڑی تک منتقل کرنا تھا اور وہ اسے کوٹ گاڑ کے جہاز کے ریڑی میں داخل کرنا تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ کمرے میں میرے ریڑی اور ٹیپ دیکھار کے آتے ہوئے کے بعد سے اب تک کی تمام مکھڑ کوٹ گاڑ کے جہاز میں گنتی جاری تھی۔

اس جہاز پر کوٹ گاڑ کی ایک خاص ٹیم کے علاوہ وحید شفیق شاد، مثنیٰ اور پستی صاحب بھی موجود تھے۔ کئی بار میں تھا کہ پستی صاحب کی جگہ خود نہیں صاحب موجود ہوتے لیکن ان کی موجودگی کفر نہیں تھی۔ اس سلسلے میں میرے پاس کوئی نامہ ترسیں اطلاع نہیں تھی۔ میرے نہیں ساتھیوں کی موجودگی جو بحال تھی تھی۔ وہ کوٹ گاڑ کی ٹیم کے شانہ بشانہ کسی بھی کارروائی میں عملی حصہ لے سکتے تھے۔

یہ سب انتظامات اپنی جگہ بہت اچھے اور بہت ترقی بخش تھے لیکن ایک مسئلہ بڑا غلطہ انک گیا تھا اور وہ مسئلہ میں خود تھا۔ جہاں ہزار جہاز کارگو کی آڑ میں اسلحے کے آ رہا تھا اور جسے بلند زور اور اس کے ساتھ ریڑیوں پر لگے تھے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچے والا تھا اور کوٹ گاڑ کے جہاز کو بھی اپنے آپ کو غیر نمایاں رکھتے ہوئے جہاز سے یہاں تک پہنچے کہ اسے کم دیش اتنا ہی دقت دور کار تھا۔ مگر اگر میری پوچھا کہ اس سے پہلے اس طرف آنے تو میرا انجام عبرت ناک ہی ہو سکتا تھا۔

وہ لوگ کتاب پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں چار ڈانسن میں بیٹھ کر وہیں روانہ ہو گئے۔ پستہ قد شخص جس کا نام بلند زور نے ذریل بتایا تھا کھانکھو لیے کتاب پر چلنے لگا۔ اوچھرا چلا بھی اب دھندلے سفید دلوں کے پیچھے جا چکا تھا۔ چاندنی کھل طور پر مصدوم تو نہیں ہوئی تھی لیکن برائے نام ہی باقی رہ گئی تھی۔ اچھل مزید دھندلا گیا تھا۔ ذریل بھی کسی گردن گھما کر میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ میں اتنی کم روشنی میں اتنے فاصلے سے اس کے اثرات کا صحیح جائزہ تو نہیں لے سکتا تھا لیکن محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ اس قسم کے لوگ شاید دنیا میں نفرت کرنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

اچانک وہ رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں بولا "تم چھٹی نہیں پکڑ رہے تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ قسمت آزمائی کر کے دیکھ لو کہ کتنے ہیں کون کس کو پکڑا ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک بار پھر چلنے لگا۔ میں نے اس کی نظر پکار کر ایک بار پھر دیکھو اور کہیے کہ صحیح طور پر زور آزمائی کہ میں نے اتنا زور لگا کر پالی میں کھڑا ہونے کے باوجود ایک بار تو مجھے پیچیدہ آگیا۔ میں اپنے آپ کو غیر معمولی طاقت کا مالک محسوس کرنا تھا۔ اور انسانی پٹائیوں کے مطابق شاید میرا یہ خیال درست بھی تھا۔ لیکن اس لمحے اور موتی کاہنی ذخیرے سے نجات حاصل کرنے کے لیے میری ہی طاقت ناکافی تھی۔

چھ منٹ ملتے کے بعد ذریل شاید زور ہو گیا۔ کتاب پر چڑھا۔ ایک چھڑا اٹھا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا اور سگرنٹ سگرا کر میرے دھیرے کش لینے لگا۔ مگر اس نے ڈاک کے سامنے کھڑی کی تھی۔ ایک سگرنٹ کے بعد اس نے دوسری سگرنٹ۔ شاید اس کے لیے انتظار کی گھڑیاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر وہ مضطرب سے لہجے میں بولا "یہ لوگ کتنے گھر گھر بھی آج معلوم نہیں کہاں مر گئے ہیں۔ لگتا ہے آج کہیں اور ان کی دعوت ہو گئی۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ ہم نے یہاں ان کے لیے دعوت کا انتظام کیا ہوا ہے۔"

شاید اس کیفیت کے انکسار میں جلد کا اثر تھا۔ اسی لیے میرے حسب میں پانی میں ٹپل سی ہوئی اور دھیرے ہی ایک غزوت نما تھوڑا سا تانی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا پانی کی سطح پر لہا سا ایک چھوٹا نمودار ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ وہ کچھ تھکی ہوئی روشنی کے باوجود میں اسے تقریباً صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک جسم گھر گھر تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں ہلک سی تھیں۔ اپنی تمام تر بے فنی کے باوجود میری ریزہ کی ہڈی میں ایک سردی سردی زد تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ لہجہ پانی میں اتنی دیر سے کمرے رہنے کے اثرات تھے۔

ذریل نے بھی گھر گھر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سردی سے لہجے میں بولا "تھوڑا سا انتظار نہ شاہکار آگیا۔ شاہداد اللہ کالی ہوا ہے۔" غیر ارادی طور پر میں نے ہنسی کو یوں مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے وہ کوئی بہت بڑا ہتھیار تھا اور اسے جسم گھر گھر سے جہاز میں بچھہ دے سکتا تھا۔ ذریل نے مزید تبصرہ کیا "ہر کامی معلوم ہوتا ہے۔" پھر اس نے تاج سے گھر گھر پر روشنی ڈالی۔ روشنی میں اس کا کراہت آمیز سرلا مزید واضح ہوا تو مجھے ایک اور جھرمجی سی لگتی۔

روشنی آنکھوں پر پڑنے کا گھر گھر پر دو عمل حیرت انگیز تھا۔ کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ اس نے اتنے زور سے دم لائی کہ پانی میں بھرچال سا گیا اور جھاک پیدا ہو گیا جس کی گہم کی ایک ضرب میرا کام تمام کرنے کے لیے کافی تھی۔ گھر گھر نے پانی میں غوطہ کھایا۔ پانی کی پھل سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دور جا رہا تھا۔

"ادھو۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اس پر تاج سے روشنی نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔ میں بھول گیا تھا۔" ذریل آہستہ سے بولا "لیکن۔۔۔ غم۔۔۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ شکار کو دیکھ گیا ہے۔ جلد ہی واپس آئے گا۔ میں ممکن ہے وہ اپنے ساتھیوں کو بلائے گیا ہو۔ شاید بڑے گھر گھر جو کچھ بھی کہاتے ہوں، اتحاد اور اتفاق سے کہاتے ہوں۔"

وہ صبیح اس صورت حال سے لطف بھی لے رہا تھا۔ استہزائیہ لہجے میں بولا "تم اپنی ہنسی اور زور سے اس گھر گھر کو پکڑنے کی

کوشش کیوں نہیں کرتے؟ یہ بھی ایک دیکھاؤ ہو گا کہ ایک صاحب نے جھل پکڑنے کی دُور سے کمرہ پکڑ لیا۔

تب میں نے اپنے جسم میں پھیلنے والے خفیت سے ارتعاش پر قابو پایا اور جیب سے گھٹے کی ایک چوٹی سی نیلا نکال۔ اس میں بڑے سائز کا ایک بھاری اور مضبوط اور خوشگام کاٹا موجود تھا۔ میں نے وہ کاٹا دُور ہی میں لگا دیا۔ اپنے اور خیرل کے درمیان واسطے کا اندازہ نہ کیا اور جیسی کو تیزی سے ہوا میں گھملائے گا۔ دُور ہی اور جیسی سے شائیں شائیں کی آواز آنے لگی۔ خیرل بے تحاشا ہنسنے لگا۔ شاید اس کے خیال میں خوف کی شدت سے میرا دل جاگل گیا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک سی ایک تدبیر آئی تھی اور میں نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ موت تو سامنے نظر آتی رہی تھی۔ اس مرحلے پر کسی بھی انداز سے قسمت آزمائی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ یک دم ہی خشک راڈ کو ٹھپے لاتے ہوئے میں نے اپنا داؤ ڈکھلا۔ ٹھٹھک۔ کسی سی آواز کے ساتھ کاٹا خیرل کی گردن پر جا کر پڑا۔ اس کے ملنے سے چیخ نکلی تھی۔ وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سٹپت ہوئی سرکٹ اس کے گردن میں چلی گئی۔ یہ میرے لیے ایک اور نہیں اداوہی جس نے اسے بُری طرح پکھلا دیا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا، پہلے وہ کہہ کر توجہ دے۔ ایک بار اس نے بوکھلاہٹ میں اپنی گردن پر ہاتھ مارا۔ مجھے اس سے اسی حرکت کی توقع تھی۔ اس طرح اس نے گانے کو اپنی گردن میں اور بھی گرا بہت کر لیا۔ جھل کے گانے کی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے نہیں نکلتا اور اس سے جتنی چیزیں چھڑ جاز ہو یا اس پر داؤ ڈرے اتنی ہی اور گرا بہت ہو جاتا ہے۔ وہ گوشت کو چاڑے بغیر باہر نہیں آتا۔

خیرل کے ملنے سے ایک اور چیخ نکلی اور اس نے گردن سے ہاتھ ہٹا کر سرکٹ گردن کے ٹھٹھے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش میں اسے کامیابی ہوئی مگر اس دوران میں میرے دُور ہی کچھنے کی وجہ سے وہ غیر ارادی طور پر پانی کے کچھ قریب آچکا تھا۔ اس کی کاکھٹھ اچھل کر کچھ دور جا گئی تھی اور اب وہ اس سے دو قدم کے واسطے پر تھی۔ میں نے بڑی کو لاک کر دکھا تھا۔ اس نے گن کی طرف بدھنے کی کوشش کی تو میں نے اصل میں وہی اور گردن میں شدید تکلیف کے باعث وہ رکے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ہاتھ بھڑا کر بھی کاکھٹھ نہیں اٹھا سکا تھا۔

خیرل۔ میری جان اٹھ اور جانے کی کوشش میں کوٹے کے کچھ میری طرف آئے۔ میں نے زہی سے کہا میرے پاس اگر تم میری جیسی مکمل دو تھیں تمہارا یہ کاٹا نکال دیا گا۔ میری مدد کے بغیر یہ کاٹا میں کل سکا کر کے تم اسے دیکھ میں سکتے۔ اگر تم اسے اٹھتے ہوئے طرح سے۔ دُور نہ دتی کہے کے ٹھٹھے کی کوشش کر کے تو تمہاری گردن کی کئی ڈانک رنگ کھانے کے نور تم ہونے

ساقیوں کے پاس پہنچے سے پہلے مرنا۔  
وہ ملنے سے تکلیف زدہ سی تو از میں نکال رہا تھا لیکن اس نے میری بات توجہ سے سن لی تھی اور اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ دُور ہی جی ہوئی تھی۔ میں نے اس پر ہلکا سا داؤ ڈالا۔ وہ بڑی طرح چیخ اٹھا۔ میں نے لاشٹ سے کہا "سوچ کیا رہے ہو؟ آؤ۔" میری طرف آگیا۔ میری جان بخش کر اگر تمہاری جان بچ سکتی ہے تو سو اور مانگا نہیں۔ میں خاموشی سے ہماگ جاؤں گا۔ بیچو وہ نہیں چھوڑ جاؤں گا۔ تم کہہ رہے کہ میری جگہ بھلی کر کے لے گئے۔  
میرے پاس تو اس شخص پر جا چل جائے گا کہ تم زندہ ہو۔ وہ اذیت زدہ لہجے میں بولا۔

عجب تک تم اپنے چھڑ کا بندھت کر لیا۔ اب بھی اسی کی چیخ تیار ہے۔ اگر تمہارے دوستوں کو تم سے ذرا بھی محبت ہوگی تو وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔ زندگی بہت اہم ہے۔ میری جان نہ آؤ۔ آؤ۔" میں نے دُور کو ایک اور خفیت سا جھٹکا دیا۔ وہ ایک بار پھر اذیت سے پٹایا پھر اس نے نالوں کی اس انتہائی مضبوط دُور کو گردن کے قریب سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"اس طرح بھی تم اپنا چھڑ نہیں کر سکتے۔" میں نے دُور کو جیسی کی مدد سے ہی کچھ کھینچا تو وہ اس کے ہاتھ سے پھٹنے لگی اور وہ آخر کار ملنے سے کہنا کہ سی تو از میں نکال رہا تھا۔ میرے دھیرے میری طرف آئے۔ میرے رنگ وپے میں غصہ تھی کہ لڑو ڈھکی۔ یہ میری زندگی کا حسین ترین منظر تھا۔ میں دُور کھینچتا ہوا اور وہ میرے قریب آتا رہا۔ میں نے جیسی بائیں ہاتھ میں پکڑ لی تھی اور دائیں ہاتھ سے بڑی تھمکا کر دُور دھیرے دھیرے پھٹ رہا تھا۔ یہ زندگی اور موت کی ایک عجیب کشش کے لحاظ تھے۔

میرے قریب پہنچ کر اس نے میری فرمائش کے بغیر ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے مضبوطی سے جیسی کو پکڑ کر ذرا دُور ہی رکھا اور دایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "چابی مجھے دے دو۔"

اس کی گردن سے خون کی ایک موٹی دھار بہتی ہوئی اس کے گردن میں جاری تھی۔ وہ سخت تکلیف میں تھا اور اب اس میں اور زیادہ دُور اور از میں گرفتار ہونے کی بہت نہیں تھی۔ اس نے چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں نے اسے ملنے میں بند کرتے ہوئے اسی ہاتھ سے اچانک سی اس کی کھینچ پر پوری قوت سے ایک گھونسا رسید کیا اور دُور ڈھکی چھوڑ دی۔ وہ آواز سے نہ پانی میں گرا اور ڈیکھیں کھانے لگا۔ اسے بکر گیا تھا پھر گھٹنے سے اس کے حواس حقل ہو گئے تھے۔ وہ خود کو چیلنے کی جہد میں کہنا تھا۔ میں نے اسے ڈھپنے دیا اور پانی میں خٹل کر تیزی میں سوراخ میں چابی نکالی۔ ٹھٹھے کے خفیت سے احساس کے ساتھ اتنی جلد سے کل ٹیک میں نے پکڑ لی تھی اسے خیرل کی ڈانک میں پھنسا کر دھپنا۔ خٹل کھوا۔ میں نے اس کی جیب سے اپنی بیچو کی چابیاں بھی



بد معاشوں کے بہتے چڑھ گئے ہو۔ اب کیا صورت حال ہے؟  
 ”ہم۔۔۔ قسمت اچھی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ان کے پگل سے لکل آیا ہوں بلکہ یوں کہنے کی جگہ جو کی خیانت کا سامان بنے سے بال بال بچا ہوں۔ اس وقت اکیلا اور خطرے سے دور ہوں۔ آپ اس جہاز پر کیسے پائے جا رہے ہیں؟ آپ کی آؤ کی کوئی توقع نہیں تھی اور یہ کام آپ کے شانہ شان بھی نہیں تھا۔“

”شانہ شان کو تو چھوڑو۔“ وہ لٹھڑی سانس لے کر بولے  
 ”جیسے کیا معلوم کہ کبھی کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاملہ کچھ کہ اہم نہیں ہے۔ اس کی جڑیں وہاں تک جاری ہیں جہاں تک ہماری نظر نہیں جاسکتی۔ ایک تو میں اس لیے گیا کہ یہ اسلئے کے ایک بہت بڑے بین الاقوامی ایکٹ کا حصہ ہے جس کا تعلق ہمارے قلعے کی سیاست سے بھی ہے۔ دوسری بات یہ کہ کل میری ملازمت کا آخری دن ہے۔ میں نے چار بجے اور کرنے کی تیار کارروائی مکمل کر لی ہے۔ عملی طور پر میں بالکل فارغ ہو چکا ہوں میں نے سوچا اس قاصر وقت میں ایک اور کام کا کرپٹ مل جائے تو کیا سچ ہے۔ ذاتی طور پر جاننے کی بات یہ کچھ اور ہوتی ہے۔“  
 پھر اچانک کھڑا انہیں خیال آیا اور وہ یکدم ہڑکی بدلتے ہوئے بولے ”تم ٹھیک تو ہوتا؟“

”جی ہاں۔۔۔ فی الحال تو ٹھیک ہوں“ میں نے لٹھڑی سانس لے کر کہا ”آپ نے اپنی صورت حال نہیں بتائی؟“

”ہم نے اس جہاز کو اسات کر لیا ہے۔ وہ ہمارے ایک بڑے مہیاں اور ترقی یافتہ ملک کا کارگو شپ ہے۔ وہ غالباً اسی کھاڑی طرف بڑھ رہا ہے جس کا تذکرہ ہم نے کچھ دیر پہلے ریڈیو پر سنا دینے والی گفتگو میں تھا۔ ہم اپنی تمام لائسنس وغیرہ آف کر کے بہت دور سے اس کا تقاب کر رہے ہیں۔ وہ معاملے کے قریب چکا ہے۔ ہم ان لوگوں کو رکھنے انھوں پکڑیں گے غیر کچھ کارگو شپ کا معاملہ ہے۔ ثبوت ذرا انھوں ہونے چاہیے۔“

”معاملے پر جو لوگ کھپ وصول کرنے کے لیے موجود ہیں شاید چھاپے کے وقت بھاگنے کی کوشش کریں۔ انہیں روکنے کے لیے میں اکیلا ہی ہوں گا اور میرے پاس صرف ایک کاکٹروف ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میں انہیں روک لوں گا۔“  
 ”کیا کیا جائے۔۔۔ تمہیں خود ہی جیسے باز کی طرح اکیلے جگہ جانے کا شوق ہے؟“ وہ لٹھڑی سانس لے کر بولے۔

”جہاں بڑے بڑے فوے پورے نام جہام کے ساتھ جا رہے ہیں وہاں کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ان کا سراغ ملنے ہی سب ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرے حال گھر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ جہاں ہی صورت حال کو کنٹرول کر لیں گے۔“ میں نے صاحب نے اشارہ کیا ”ہمارے پاس سب بخیر بہت ہے۔ یہ کارگو شپ ہے۔“

نکال لیں اور پھر بے رحمی سے کاٹا اس کی گردن سے کھینچ لیا۔ خون بھل بھل بننے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ خون کی بڑبڑت تیزی سے مگر چھوٹوں کو اس طرف کھینچ کر لائے گی۔

میں اسے ڈوتا چھوڑ کر تیزی سے پانی سے نکلا اور اس کی کلا کھنکھاتا ہوا۔ پھر وہیں جا بیٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے ساتھی کہاں تھے لیکن اس طرف جانے سے پہلے میرا اپنے کمرے میں جانا ضروری تھا۔ میری خشک راڈ کے دستے میں جو مختصر سا ریلے سسٹم نصب تھا اس کے ذریعے کوئٹہ گاڑ کے جہاز پر موجود افراد سے میری بات نہیں ہو سکتی تھی لیکن میرے کمرے میں جو ریڈیو سیٹ موجود تھا اسے ٹوڈے کیا جاسکتا تھا اور میری ان سے بات ہو سکتی تھی۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میں ان کی پوزیشن سے واقف ہونا اور یہ جانا چاہتا تھا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

راتے میں وہ کھاڑی بھی آئی تھی جہاں آج میں پھنسا ہوا پکڑنے پھان پر بیٹھا تھا اور جہاں اس وقت وہ لوگ موجود تھے۔ مجھے ان کی نظروں سے بچتے ہوئے جانا تھا اس لیے میں نے ہیڈ لائٹس آف کر رکھی اور اصل راتے سے بہت دور رہتے ہوئے ناہوار راستوں سے گزرا۔ یوں مجھے کمرے تک پہنچنے میں کافی وقت پیش آئی اور غاصدات بھی لگ گیا لیکن یہی قیمت تھا کہ میں خیر و عافیت سے کمرے تک پہنچ گیا۔ ہوئی کے اشتباہ اور دیگر کمرے اسی طرح تاریکی اور سکوت میں ڈوبے ہوئے تھے جس طرح میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔

اندھ بھیج کر یہ دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی کہ ریڈیو جوں کا توں کارنس پر موجود تھا۔ میں نے اس کا ایک خفیہ ٹین دکرا سے ٹوڈے ریڈیو میں تبدیل کیا۔ ریڈیو کے ڈاکٹر پر ایک چھوٹا سا سرخ بلب روشن ہوا اور مجھے دوسری طرف سے مکمل لانا ”جی جی دن نو ٹھیک۔ پوزیشن پلیز۔“ یہ تو آواز میرے لیے اچھی تھی۔

”اے۔۔۔ ایم ٹین۔“ میں نے کوڈ ورڈز ادا کیے اور پوچھا ”کیا چنٹی صاحب جہاز پر موجود ہیں؟“ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

”چنٹی صاحب تو نہیں ہیں لیکن میں صاحب موجود ہیں“ جواب ملا۔ ”ہاں کرئیے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ مجھے جہاز پر ان کی موجودگی کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ شاید وہ آج ہی کسی وقت پہنچے تھے۔ ان کے منصب کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ اہم مہم نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کس طرح اور کیا سوچ کر آ گئے تھے۔ شاید انہیں کافی فاصلہ وقت میرا گیا تھا۔“

دوسرے ہی لمحے ریڈیو پر ان کی آواز ابھری ”کیا حال ہیں بد معاش!۔۔۔ وہ جب کافی خوش گوار سوا میں ہوتے تھے تو مجھے بد معاش کہہ کر پکارتے تھے۔ جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولے ”جیسے تمہارے بارے میں سخت تشویش تھی۔ ریڈیو پر موصول ہونے والی کواڈل سے اندازہ ہوا تھا کہ تم ان کا بیچنے کے

چوڑی دوار سے مشابہ چٹان پر جا پہنچا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ چٹان پر پہنچنے ہی مجھے خطرے کا احساس ہو گیا ورنہ صورت حال میرے حق میں بہت خراب ہو جاتی۔ میری ساری احتیاط بے کار جاتی اور کل از وقت میری موجودگی کا راز کھل جاتا۔

دراصل چٹان کے مین کنارے پر ایک شخص سمندر کی طرف منہ کیے بیٹھ کے مل لیتا ہوا تھا۔ وہ یقیناً انہی کا ساتھی تھا اور گرد و پیش پر ملاحظہ خصوصاً سمندر پر نظر رکھنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ اس امکان کی طرف میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا کہ ان کا کوئی ساتھی وہاں بھی موجود ہو سکتا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کی میری طرف پشت تھی اور میں نہایت محتاط انداز میں بے توازدہ سوں سے چٹان پر پہنچا تھا اس لیے وہ فوری طور پر میری آمد سے باخبر نہیں ہو سکا۔

میں اس وقت جب کہ میں اس کے سر پہنچ چکا تھا اسے غالباً اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے چلا کھانسی کا تھا کہ میں نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر نہایت ہلکے انداز میں کھٹکھٹ کا دستہ رسید کیا۔ وہ وہیں ساکت ہو گیا لیکن اسی لمحے ایک اور گڑبہ ہونے لگا۔ اس کے پاس یعنی کھٹکھٹ موجود تھی۔ شاید وہ اس کے اٹھوں سے پھوٹ کر چٹان کے کنارے سے پانی میں جا گرتی اور اس کے چھپا کے سے نیچے والے اوپر کی طرف متوجہ ہو جاتے اور انہیں کسی گریز کا احساس ہو جاتا لیکن میں نے بدوقت اسے دے کر ہاتھ سے روک لیا۔ یوں میرے پاس دو کھٹکھٹیں ہو گئیں۔

میں نے بے ہوش شخص کو کھٹک کر ایک طرف کیا اور اس کی جگہ خود بیٹھنے کے مل لے کر پہلے دائیں جانب نیچے کھڑکی کے کنارے کی طرف جھانکا۔ وہاں سے لالچ کے انجھ کی آواز اور لوگوں کے باتیں کہنے کی کھٹکی سی جھنساہٹ سنائی دے رہی تھی۔ مجھے کمر بھ کی خوراک بننے کے لیے چمڑ کر صرف چار افراد روانہ ہوئے تھے لیکن اس وقت نیچے نو افراد موجود تھے۔ وہ سب کے سب ایک ہی لالچ میں بیٹھے خوش گھوٹوں کے سے انداز میں باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں وہ چاروں افراد بھی شامل تھے جو مجھے دوسری کھٹکھٹ لڑائی پر چمڑ آئے تھے۔ ان کے علاوہ بھی ایک شخص کی صورت میرے لیے جانی پہچانی تھی اور اسے وہاں دیکھ کر مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ وہ نیگمائی ہو کر کا استہلہ کرک تھا۔ لالچ کے کھٹے حصے میں لائٹ آن تھی اور اس کی چمڑ اس روشنی میں چمک رہی تھی۔ باقی صورتیں میرے لیے نئی تھیں۔ جس شخص کو میں نے بے ہوش کیا تھا اسے بھی میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اچانک ان لوگوں میں سے ایک نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیچے سے کچھ کما جو میری سمجھ میں نہیں گیا لیکن ان سب میں خوشی کی لہری دوڑ گئی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ ایک بچی جہاز کی دو فٹیلوں دکھائی دے رہی

ہے اس کے محلے کے لوگ۔ اور اگر اس پر کچھ دے کر لوگ بھی موجود ہوں تو وہ مقابلے کی کو خوش نہیں کریں گے۔ ساحل والے بد معاش بھی راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کریں گے۔ کو خوشی کرنا کہ انہیں تم صرف دشمنی کر کے مدد سکھ بلاک نہ کرنا۔ اگر کچھ ہمارا بھی گئے تو ہمیں دیکھا جائے گا۔“

میرے ساتھی بھی جہاز پر موجود ہیں؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”بالکل۔“ ملے شدہ ہو کر ام کے مطابق وہ نہ صرف موجود ہیں بلکہ پوری سرگرمی سے اس آپریشن میں حصہ بھی لیں گے۔ میں نے انہیں خصوصی اجازت دوائی ہے۔ کیا تم ان میں سے کسی سے بات کر کے؟“

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں اب کھڑکی کی طرف روانہ ہونا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے اپنے بیٹے کے سر پر ہنسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اللہ حافظ۔“ محتاط رہنا۔“ انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس بار میں کمرے سے نکلا تو میں نے ریڈیو اور دیگر مختصر سامان بھی بیگ میں ڈال کر ساتھ لے لیا۔ زیادہ امکان یہی نظر آ رہا تھا کہ مجھے اس کمرے میں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پچھو میں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اس کھڑکی کی طرف روانہ ہوا جہاں میں نے پہلی بار چٹان پر بیٹھ کر پچھلیاں بکھڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ پچھو مجھے کھڑکی سے بہت دوری درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب چھوڑنا پڑی ورنہ وہ لوگ میری آمد سے آگاہ ہو سکتے تھے۔ وہاں تک سفر میں نے بیڑا لائنیں آن کیے بغیر کیا تھا۔ باقی قاصل میں نے کچھ اندر سے میں کسی کو چلے یا ورنہ سے کی طرح طے کیا۔

آخر مجھے چھوڑا سا وہ پگڈنڈی نما راستہ نظر آیا جس پر چلنے ہوئے میں نے چوڑی دوار سے مشابہ اس پٹی چٹان پر پہنچ سکتا تھا جہاں میں آج صبح بیٹھا تھا۔ گرد و پیش پر نظر رکھنے کے لیے وہ ایک بہترین جگہ تھی۔ اس کے پہلو میں اور سامنے کی طرف وہ گہرے پانی والی کھڑکی تھی جو تین طرف سے پھاڑوں میں گہری ہوئی تھی۔ خشکی سے اس پھاڑی تک پہنچنے کا ایک ہی ٹھک سا راستہ تھا جو پھاڑوں کے درمیان سے ہی گزرتا تھا۔ پگڈنڈی نما راستے پر احتیاط سے چلے ہوئے میں ان لوگوں کی نظریں آتے بغیر پگڈنڈی پر پہنچ سکتا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ کھڑکی میں موجود تھے اور ان کے پاس کوئی لالچ بھی تھی جس کا انہیں انہوں نے اشارت ہی کر دیا تھا۔ مجھے انجھ کی تدبیر ہی تو اواز سنائی دی تھی۔ میں نے کمرے کی ہی حالت میں چلے ہوئے ٹھک پگڈنڈی نما راستے طے کیا اور

بازو ہونے کے لئے چنانچہ انہوں نے اپنی لائٹس آن کر دیں۔ اس جہاز پر فلائٹس بھی سب قہیں۔ وہ جہاز اپنا سر ڈرا سادے لئے ہوئے اس طرح آگے آئے گا کہ کارگو شپ کے دوسری طرف بھی دیکھا جاسکے۔ شاید ان لوگوں کو اندازہ تھا کہ ادھر کنی لائچ وغیرہ موجود تھی۔

جلد ہی فلائٹس وغیرہ کی وجہ سے وہ حصہ تیز رفتاری میں مٹا گیا۔ اب کوئٹہ گاؤں کے جہاز کا بل نام اور نشان وغیرہ دیکھا جاسکتا تھا۔ جہاز فوہ پانچس تھا لیکن تیز رفتار تھا۔ اس سے لاؤڈ اینجیئر کے ذریعے اعلان کیا جائے گا کہ کوئٹہ گاؤں کی طرف سے سیون اشارہ شینگ لائن اور اس لائچ کے افراد کو باخبر کیا جاتا ہے کہ اسلحہ کی اسٹاک کے جرم میں انہیں اور اس جہاز کو حراست میں لیا جاتا ہے۔ اپنی نقل و حرکت بند کر دیں اور اپنے آپ کو ہر امن طریقے سے قانون کے حوالے کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ نظر ڈالنے لگے۔ اعلان دہرے آگرمہر میں ہی دہرا گیا۔

اس اعلان کا جواب انہیں گولیوں کی بوجھار کی صورت میں ملا۔ وہ ایک محفوظ جہاز تھا اور اس کی ساخت میں وہی وہی کھسک عملی کی پیش نظر رکھا گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر ہے کہ حیرت ہوئی کہ کہنے کو غیر ملکی جہاز کارگو تھا لیکن اس پر مسلح افراد موجود تھے۔ یہی پوزیشنیں لے کر فائرنگ کرنے لگے تھے۔ یہ وہی وہی کی اتھ تھی۔ لائچ والوں نے بھی اسے خود بخود فائرنگ شروع کر دی تھی۔ مگر نے کوئٹہ گاؤں کے جہاز کے مرے ہوئے سفید پست لباس میں، جہاز کو اڑھار اڑھار ہاتھ دیکھا۔ پھر وہ غائب ہو گئے۔

کارگو شپ اور لائچ سے زبردست فائرنگ جاری تھی۔ شاید موقع کر ہے تھے کہ وہ کوئٹہ گاؤں کے جہاز کو ہانپنے پر مجبور کر دیں گے۔ لائچ سے تو جہاز پر ایک چنڈ گرنیڈ بھی پھینکا گیا لیکن اتفاقاً وہ اس تک پہنچنے کے بجائے پانی میں گر گیا۔ تیز رفتاری میں بہت سے افراد بھی فائر میں تھے لیکن میں نے ہاتھ دے کر رکھا اور کسی نشانہ نہیں بنایا۔ کوئٹہ گاؤں کے جہاز پر پڑا سر اسر سکوت طاری تھا۔ لائچ سے اس پر ایک اور گرنیڈ پھینکا گیا اور اس کی ساؤنڈ ڈھیر سے بھڑکی، ایک شگاف سا نمودار ہو گا۔ کھائی دیا۔

اس کے بعد یکدم ہی گولا گر دھڑکی کی ہرجے مچا رہا تھی۔ کوئٹہ گاؤں کے جہاز سے دشمن گولیوں کے ذریعے خوف ناک فائرنگ کا نشانہ بن رہی تھی۔ لائچ میں تو شاید فوری ہی اس افراد اس فائرنگ کا نشانہ بن گئے کیونکہ اس پر پوزیشن لینے کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ کارگو شپ پر بھی کچھ فائرنگ طاری رہی۔ کوئٹہ گاؤں کے جہاز شاید کچھ مارز کیں بھی موجود تھی۔ ایک الگ ہی قسم کی گولہ توڑ کے ساتھ ایک ہاتھ ہوا اور کارگو شپ کے اگلے حصے کا آٹا پھٹی کٹا اڑ گیا۔ وہ سر اسر فائر اس سے پہلے کہ کچھ دور حصہ گیا۔

یہ شکار انہوں نے نہ ہی کیا تھا۔ اس کے بعد اپنی

قہیں۔ انہیں یقیناً اسی کا انتظار تھا۔ ان میں سے کچھ انجن کے کمپن کی پھٹ پر اور کچھ پچھلے حصے پر چڑھ گئے۔ کچھ کی جگہ انہوں نے خالی کر دی۔ لائچ کافی بڑی اور نہایت عمدہ کنڈیشن میں تھی۔

جہاز تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ میں نے اس کے عقب میں اور دائیں بائیں سمندر کی کھڑاں تاریکی میں نظر دوڑا لی۔ مت آہٹیں جہاز جہاز کر دیکھا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا لیکن جب جہاز کھاڑی کے صحن قریب پہنچ چکا تو مجھے دور تاریکی میں ایک فوہ تاریک ہیرلا دکھائی دیا۔ وہ ہیرلا بھی اسی سمت میں بڑھ رہا تھا۔ یہی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔

تو کارگو جہاز کھاڑی کے دہانے پر تین راکٹ نظر ڈال دیا گیا۔ جہاز آگے بھی آسکتا تھا لیکن شاید انہوں نے کھاڑی میں لانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ خطرہ لوگ لائچ کو جہاز کے قریب لے گئے۔ بلڈوزر اس صم کا انچارج معلوم ہوا تھا۔ سب اس کی ہدایات کے تحت کام کر رہے تھے۔ میں بہت سے پلوادی سفید قاصوں کو جہاز کے مرے اور نیچے حصوں میں پلے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

پھر کڑی کی کافی بڑی بڑی مینیاں کھن اور رتوں کی مدد سے جہاز سے لٹکائی جانے لگیں اور لائچ میں موجود افراد انہیں سنبھال سنبھال کر بڑی مشاقی اور صہارت سے لائچ میں رکھنے لگے۔ مزید افسوس کا مقام یہ تھا کہ اس کارگو شپ کا تعلق اس بڑے اور ترقی یافتہ ملک کی ایک بہت بڑی جہازوں کی فہلی سے تھا جس کے بہو پے ہی مقروض و ممنون رہتے تھے۔ بہت سے اس کے احکامات پر عمل کرتے تھے۔ اس کی ہدایت پر ادھر ادھر جا کر دھول کی جھپٹیں لڑنے پر بھی کمر بستہ رہتے تھے اور ان جھپٹوں کی "بیرکت" سے دیے بھی ہمارے پاس اسٹے کی ریل تیل ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہیں کے کچھ لوگ کچی طور پر بھی ہمارے زیر زمین دفن کے پڑے ہوئے گروہوں کے اسٹے کی ہاتھ تھوڑے تھوڑے میں حسب توقع مدد دیتے ہیں مصروف تھے۔ میں وہاں کھلے آسمان سے سمندر کے کنارے ٹھوٹی جگہ پر غصی ہوا میں لپٹا تھا اس کے باوجود یہ سب کچھ دیکھ کر میری کچھنوں میں چنگاڑاں ہی بھری جا رہی تھیں۔

اچانک فضا میں ایک دوسرے جہاز کے انجن کی تدمر سی تواڑ ابھری جو میرے دھیرے تیزی ہوئی جا رہی تھی۔ کارگو شپ پر یقیناً وہ تواڑ سن لی تھی اور میں وہاں جگہ ڈکے تیار نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ایک چنی تو اس وقت بھی رسے کے ذریعے لٹائی جا رہی تھی۔ مینیاں کی منتقلی کا کام ابھی چل رہا تھا۔ وہ سفید کام افراد نے جہاز سے جھک کر لائچ والوں کو ایک اور جہاز کی آمد سے خبردار کیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے کیرا ہٹ کا فائر فہر آئے لیکن پھر میں یہ دیکھ کر حیران نہ کیا کہ انہوں نے داؤد فرار اختیار کرنے کے بجائے جہاز سنبھالنا شروع کر دیے اور لائچ کے اندر ہی پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ اس وقت تک کوئٹہ گاؤں کے جہاز والوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کارگو شپ دہانے اور دیگر افراد بھی کی قدر سے

غیب کی طرف چل دیا۔ بلڈوزر اور اس کے ساتھیوں کی لالچ خود  
 ہی کنارے پر آکر ریت میں پھنس چکی تھی۔ مجھے امید تھی کہ میں  
 اسے ریت سے نکال کر اسی کے ذریعے کوئٹہ گارڈ کے جنازہ تک  
 پہنچ جاؤں گا۔

میں راستے سے اتر کر میں کھاڑی کی طرف گھبرا اور آگے  
 بڑھا تو راستے میں مجھے بلڈوزر اور اس کے دو ساتھی بڑے نظر آئے  
 جو میری ہی چلائی ہوئی کرکٹوں سے ڈنچی ہوئے تھے۔ دونوں ساتھی  
 بے ہوش تھے۔ صرف بلڈوزر ہوش میں تھا اور وہ بھی حرکت کرنے  
 سے محذور تھا۔ مجھے دیکھ کر اس تکلیف کے عالم میں بھی اس کی  
 آنکھیں پھیل گئیں۔

میں نے اس کے قریب رک کر کلاسٹ سے کہا "میرا جان ہونے  
 کی ضرورت نہیں۔ افضل کو تو کمر بھگنا چکے ہیں۔ میں تو صرف  
 اس کی مدد ہوں۔"

میں اسے اسی طرح حیران چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم  
 تھا کہ جلد ہی ان لوگوں کو بھی کوئٹہ گارڈ کے جنازہ پر منتقل  
 کر لیا جائے گا اور فوراً ہی ان سے دوسرے لوگوں کے بارے میں  
 معلومات حاصل کر لی جائیں گی جو قیے میں موجود تھے اور اس  
 تجارت کے اہم ستون تھے۔ اس وقت تک کوئٹہ گارڈ کے  
 دوسرے آدمی فحش کے راستے قیے میں پہنچ چکے ہوں گے۔ انہیں  
 جنازے وائرلیس پر ہدایات دی جائیں گی کہ وہ وہاں لوگوں کو گرفتار  
 کر لیں گے۔ اگر کوئی فرار ہو گیا تو بعد میں دوسرے آدمیوں کی مدد  
 سے اسے تلاش کیا جائے گا۔

یہ سب کچھ سوچا ہوا میں لالچ کی طرف پہنچا۔ پہلے میں نے  
 اس میں چڑھ کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ چار افراد مرچکے تھے اور  
 تین ڈنچی حالت میں بڑے کراہ رہے تھے۔ میں نے ان کے ہتھیار  
 اٹھا کر انہیں والے کیمپ میں جمع کرا دیے۔ مہاراجہ کی ڈنچی مجھے کسی  
 اور طرف متوجہ پار کر لی تھی اٹھا کر کچھ پر ہی فصد نکال بیٹھے۔  
 انہوں نے میری کارروائی کے دوران میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ  
 چھینا ہوا ہتھیار تھے اور انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا خدا  
 انہیں کام کو پہنچ گیا تھا۔ وہ اب اپنے لیے مصائب میں اضافہ کرنا نہیں  
 چاہتے تھے۔

میں نے لالچ کو دھکا دیا۔ اس میں کچھ زیادہ قوت صرف نہیں  
 ہوئی اور لالچ ریت سے نکل گئی۔ اسے خود چلائے ہوئے میں  
 کوئٹہ گارڈ کے جنازہ تک پہنچا جو زیادہ دور نہیں تھا۔ لالچ کو میں  
 نے اس کے پہلو میں لٹکایا۔ میرے لیے سوئے ریت کی ایک  
 بیڑی نکالی گئی۔ اس وقت تک وحشت کی دوسری طرف اور  
 فوڈنگ بیڑی کے ذریعے کارگو شپ کے ملے دیوہ کی منتقلی کا کام  
 جاری تھا۔

میں سوئے ریت کی بیڑی کے ذریعے اوپر جا پہنچا۔ جنازہ کے  
 نوڑے تک پہنچا۔ یہاں سے افراد نظر آ رہے تھے۔ صورت حال کوئٹہ

پیش کی جا سکتی تھی۔ کارگو شپ غریب بھی ہو سکتا تھا اور اس پر نہ  
 جانے کتنی مالیت کا دوسری کمپنیوں کا جنازہ اور قانونی مال بھی لدا ہوا  
 تھا۔ وہ علاقہ بحری جنگ کا حشر پیش کر رہا تھا۔ کوئٹہ گارڈ کی طرف  
 سے پیش کیا گیا ٹریڈی کافی ہوا۔ چند سینکڑے ہدیہ کارگو شپ سے  
 میگافون کے ذریعے اعلان کیا گیا کہ وہ لوگ گرفتاری دینے اور  
 ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار تھے بلکہ انہوں نے قہور دی سی فائرنگ  
 بھی غلط فہمی کے تحت کی تھی ورنہ وہ پہلے ہی گرفتاری پیش  
 کر دیتے۔ یہ چارے۔!

لالچ میں جو افراد ذرا پیچھے تھے اور ڈنچی ہوئے سے بھی  
 محفوظ رہے تھے۔ انہوں نے راہ فرار اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔  
 ساحل سے لالچ کا قافلہ زیادہ نہیں تھا۔ لالچ گھوڑی اور ساحل کی  
 طرف بڑھی۔ اچانک اس سے ذرا آگے رارڑ گئی۔ ایک گرلا پانی  
 میں پھینکا گیا۔ یہ اس کے لیے گویا رکھنے کا اشارہ تھا۔ لالچ گھوڑی اور  
 تین افراد نے ہتھیار چھوڑ کر اس پر سے پانی میں چلا گیا۔ لگادی۔  
 شاید انہیں حیر کر غیبت سے ساحل پر پہنچنے کا امکان نظر آیا تھا۔  
 انہوں کو شاید پوچھا ہوتا تھا یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ مشین  
 گن کی کرکٹوں کی رسائی تو ساحل تک بھی آسانی سے ہو سکتی تھی۔  
 تاہم نہ جانے کیوں ان کے ساحل پر پہنچ جانے کے بعد بھی  
 جنازہ کی طرف سے ان پر فائرنگ نہیں ہوئی۔ فائرنگ اب دونوں  
 طرف سے بند ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں اب میرے لیے بھی  
 اپنی موجودگی کا ثبوت دینا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ تینوں ساحل پر  
 بھاگتے گئے تھے اور ان میں بلڈوزر بھی شامل تھا۔ میں نے دجوار نما  
 پٹان پر سے بھٹکتے ہوئے بہت عداوت انداز میں ان کی ٹانگوں کو دھک  
 دیا۔ ہوتے ہوئے ایک برست مارا۔ وہ تینوں تقریباً ایک ساتھ ڈھیر  
 ہو گئے۔ کوئٹہ گارڈ والے حمایت آسانی سے اندازہ کر سکتے تھے کہ  
 یہ کارروائی کسی کی تھی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک طرف کو جا کر روشنی کی زد میں  
 آیا۔ میں نے جنازہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تاکہ مجھے دیکھ لیا  
 جائے۔ سفید لباس میں کوئی شخص جنازہ کے مرنے پر گھبرا ہوا اور  
 اس نے جو ایسا ہاتھ ہلایا جس کا مطلب تھا کہ مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ وہ  
 چونکہ غلط فہمی کے جذبہ میں تھا اس لیے میں اسے نہیں پہچان  
 سکا۔ اس دوران میں کوئٹہ گارڈ کے جنازے کے ایک فوڈنگ بیڑی  
 کھل کر کارگو شپ تک پہنچی۔ جاری تھی اور لڈاؤ آہستہ آہستہ اس کے  
 ملے دیوہ کو ہدایت کی جا رہی تھی کہ وہ بیڑی کے ذریعے ایک ایک  
 کر کے کوئٹہ گارڈ کے جنازہ پر آجائیں۔ ان کے جنازہ کو کوئٹہ گارڈ  
 کے آدمی خود اپنی تحویل میں لے کر ساتھ لے جائیں گے۔

اس ہدایت پر جلد ہی عمل شروع ہو گیا۔ میں نے ایک سفید  
 کام بلورسی شخص کو بندر کی طرف چار ملے ہاتھ دیوں کے بلی اس  
 بیڑی کے راستے دوسرے جنازہ پر جانے کھلا۔ تب میں نے دونوں  
 کا کھنکھن کرنا دیکھا۔ یہ ٹانگیں نور تک سے راستے کے لیے

لیکن پہلی نظر میں مجھے یہی گمان مگرا کہ یہ کسی جسم کا مذاق تھا جو کچھ اس کے چہرے پر اذیت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ پہلے تو مجھے یہ گمان ہی لگا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک بے مدعا اور حمید سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے بے اختیار اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں کسی شلتہ بچہ کے ہاتھوں کی طرح خاموش تھیں۔

مجھے کچھ یوں لگا جیسے آسمان لوٹ کر میرے سر تن پر گرا تھا اور زمین چھوٹنے سے بے گھر گئی تھی۔ کائنات کی ہر جگہ قس قس غصہ ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود گویا صرف راحیلہ کے دل کی دھڑکنیں ہی خاموش نہیں تھیں بلکہ میرے ہاتھوں طرف غضب کی خاموشی تھی۔ بعد ازاں قیامت کا سکوت تھا۔ یہ سکوت ایک ملک زہری کی طرح ہر سام جان سے میرے وجود میں اثر رہا تھا اور ہر احوال دواں مریبا تھا۔

ایک دم نہ جانے کس طرح میں سیدھا ہوا اور جب بولا تو مجھے خود اپنی آواز پہلی پہلی محسوس ہوئی تھی کہ کس طرح ہوا؟  
 تھیں صاحب نے جواز کی سائڈ کی طرف اشارہ کیا۔ لمبے کی سونے دیوار میں گول گول سوراخوں کی ایک لائن موجود تھی۔ اس جسم کے جوازوں سے "ایسے سوراخوں سے تھیں نکال کر قاتل کی جانی جاتی تھی۔ تھیں صاحب بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولے "اس سوراخ سے گمن کی نال نکال کر یہ قاتلک میں حصہ لے رہی تھی۔ پھر سوراخ سے آگے لگا کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔ کارگو شپ سے قاتلک ہو رہی تھی۔ ایک گولی اسے لگ گئی۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔"

میں نے تھاڑ میں کڑے سفید قاسموں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی کوئی خاص لگرمند یا شرمندہ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بے نیازی سے سب کی طرف دیکھ رہے تھے۔  
 "قاتلک تم لوگ کر رہے تھے؟" میں نے گمنی گمنی تو انہیں اگھر ہی میں پوچھا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان میں سے گلی نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔ ایک ابلتہ پٹا اور جذبات سے ماری لپٹے میں بولا "وہی آ رہی ہے۔"

میرے ذہن میں ایک دم ہی کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا۔ کا کھوف اس وقت بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے روک پاتا۔ میں نے کا کھوف سیدھی سی اور ان سب سے ایک برست ماندا۔ وہ سب ہی گرتے دکھائی دے۔ میں شاید کدے سے وہ ساری کا کھوف بھی اتار کر ان پر خالی کھینچا لیکن مجھے چاروں طرف سے بیک وقت بہت سے لوگوں نے روک لیا۔ شاید ان میں فونی اور شفیع شاہ بھی شامل تھے۔

گاما کے ہتھیار برداروں کے کنٹرول میں تھی۔ انہوں نے کارگو شپ سے آنے والے سفید قاسموں کو ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا رکھا۔ وہ نو دس آدمی تھے۔ ابھی مزید افراد بیڑی کے ذریعے آ رہے تھے۔ تھیں صاحب فونی اور شفیع شاہ بھی مجھے نظر آ گئے۔ وہ تینوں نئی دالوں کی طرح سفید اور نظام نکالباں میں تھے۔ فونی اور شفیع شاہ کے پاس ہلکی مشین تھیں تھیں۔  
 "مبارک ہو تھیں صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "مکی نقصان کے بغیر خاما اہم آپریشن مکمل ہو گیا ہے۔ اس سے شاید بہت جلد ہی بڑی سازشوں کی کڑیاں ملیں گی۔"

"ہاں۔ لگتا تو یہ ہے۔ ابھی ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ اس جواز پر ایسی آبکاری سے متاثرہ فاضل کیپٹل و فیو کے ذمہ بھی لگے ہوئے ہیں۔ یہ انتہائی مسلک آؤے بھی ہمارے ساحلوں پر نہ جانے کب سے پیچھے جا رہے ہیں۔"

"واقعی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ افواہیں تو کافی عرصے سے سننے میں آ رہی تھیں لیکن بعد میں انہیں محض افواہیں ہی قرار دے کر ہار دیا گیا تھا۔"

"ان افواہوں میں کافی حد تک حقیقت ہے۔ اس قسم کے جواز کثیر القاصد ہر طریقوں سے ایک ایک پکڑ میں نہ جانے کیا کیا خدمات انجام دے کر جا رہے ہیں۔" تھیں صاحب نے فنی سائیں لے کر بولے "لیکن تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ یہ آپریشن بغیر کسی نقصان کے ہو گیا ہے۔ نقصان تو بہت بڑا ہوا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے جگ جگ کر پوچھا۔  
 وہ خاموش ہی رہے پھر انہوں نے بے بسی سے فونی اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ ان میں گویا بولنے کی بہت نہیں رہی تھی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ فونی اور شفیع شاہ کے چہروں پر عجیب سی وحشت نظر آ رہی تھی۔ پہلے میں اسے صورت حال کی تشدد کی اور جھوٹا نتیجہ سمجھا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس قسم کی مسرکہ آرائی ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے سہالیہ ٹھہروں سے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے سر جھٹک لیا۔ ان میں بھی گویا بولنے کی بہت نہیں تھی۔

تھیں صاحب قہقہہ لگ کر بولے "مفضل! ہمارے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔ ایک بہت سی بری خبر ہے۔" وہ تینوں ایک طرف کو ہٹ گئے اور تب میں نے دیکھا کہ عقب میں پیچھے پر چادر سے ڈھکا ہوا کوئی انسانی جسم موجود تھا۔ میں نے ہلناک انداز سے قہقہے لگے پھر کہ جھٹ کر اس پر سے چادر ہٹائی۔ مجھے ابھی تک وہاں راحیلہ نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جواز کے انہرے ایک پر پھر نہیں اور مصروف ہو کر کمرہ اس چادر تلے اس عالم میں موجود تھی کہ اس کی باتیں آگے سے ذرا اوپر چڑھائی میں سوراخ تھا اور غرن سے اس کا چہرہ اور سفید موانہ تھیں کا کار سرخ تھا۔ گولی چاہا اس کے سر سے پار لگ گئی تھی

ہیں۔ معیشت ان کے قابو میں آجائے تو آپ خود یہ خود ان کے  
اشادوں پر پانچے گئے ہیں۔ ہماری کرپشن نے ہجرت سیاست ایک  
دوسرے کے خلاف ہر وقت مصروف جہاد رہنے کی عادت ہے اعلیٰ  
اور حرام خوری نے ان کا کام بہت آسان کر دیا تھا۔

ان کے ہوا کے تحت خفیہ ادا اداوں نے مجھے حراست میں لے  
لیا تھا۔ نہیں صاحب نے ہمیں صفائیاں پیش کرنے کی ہدی  
کو ششیں کیں۔ انہیں بتایا کہ کس طرح کن موقوفوں پر میں  
نے وطن کی دشمن سرگرمیوں میں مصروف قوتوں کے خلاف  
قوت میں سب سے مقدمہ ان ادا اداوں کا تھا بتایا تھا لیکن کوئی میرے  
بارے میں ان کی وکالت پر کان نہیں دھربا تھا۔ وہ راجہ ہو چکے  
تھے۔ آؤں کر رہی ہو تو شیر ہو جائے۔ کس کی ہجرت ہائے تو لوگ اسے  
چراغ بھگتے جلتے ہیں۔ اور پھر یہاں تو معاملہ پورا پورا کے ہوا کا تھا  
نہیں صاحب کو تو خود لینے کے دینے پڑے نظر آ رہے تھے۔ ان سے  
وضاحت طلب کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی خفیہ ایجنسی کی مسات میں  
عام شہروں کو کیوں شریک رکھتے رہے تھے؟

مجھے حقیقت کے ہند نام نہان مراکز میں بھی لے جایا گیا لیکن  
قیامت ہوا کہ بات صرف پوچھ چوچھ اور حقیقت تک ہی محدود رہی۔  
دراصل باہر نہیں صاحب سمیت بہت سے لوگ میرے لیے ہماگ  
ہو کر رہے تھے اس لیے میں بہت سے حروں کا نشانہ اور تختہ مشق  
بننے سے بچا ہوا رہتا تھا۔ لیکن حاکم میں غم جاناں کو بھی بھول  
جاتا۔ بہت سے ذمہ دار افسران اس دوران میں مجھ سے سب سے  
زیادہ زور و شور کے ساتھ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ  
میں کس ملک کا ایجنٹ تو نہیں تھا؟ جب بھی تمہارا پورا کرکس نہ کسی  
ذرا پورے سے کسی سوال کیا جاتا، مجھے بے اختیار ہنسی آتی لیکن یہ  
وہ ہنسی ہوتی تھی جو کہ کب کی پیدوار ہوتی ہے جس کی یہ میں خون  
کے آنسو ہل رہے ہوتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کی کوششوں اور میرے اپنے بہت سے  
وساکی کے استعمال کے بعد میرا معاملہ عام پولیس اور عدالت کے  
مرد کو کیا گیا جس کے بعد کارروائیوں کا سامنا ہمارے لیے کچھ آسان  
ہو گیا لیکن یہاں بھی پانچ کوڑ دینا ہفتہ در ہفتہ کی صورت میں  
سرکاری غروے میں جج کرانے کے بعد میری شناخت منظر ہوئی۔  
اس کے ساتھ محض شناخت بھی شامل تھی۔

محض شناخت سینٹر رمضان نے دی اور در ہفتہ یعنی پانچ  
کوڑ دینے کے ساتھ واحد نے جج کرانے حاکم میں لے بہت اسرار  
کیا کہ یہ رگم میں خود بھول گا۔ میں کوئی ایسا کیا کرنا تو نہیں تھا یہ  
رگم تو آسانی سے بھر سکتا تھا لیکن سینٹر واحد نے بھرے نہیں دی۔  
اس کا کہنا تھا کہ وہ سب کو بھی تو ہوجی کے اعتماد کا کوئی موقع ملتا  
چاہیے تھا۔ سینٹر رمضان نے میری محض شناخت دی تھی یہ بھی  
بہت ہی بات تھی۔ میں جن ادا اداوں کے زیرِ حاکم آیا تھا اور  
جس پوزیشن میں تھا اس میں میری شناخت دنیا کسی کی حمایت میں

آخری آواز جو میں نے سنی وہ نہیں صاحب کی تھی۔ وہ  
نابیت آتھ زندہ لیے جس کہ رہے تھے "تم نے بہت بڑا کیا  
افضل! اتم نے بہت بڑا کیا۔"  
اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔



وہ میری زندگی کا ایک عجیب دور تھا۔ راجہ کی موت نے گویا  
مجھے اندر سے مار دیا تھا۔ دنیا کی ہر چیز میرے لیے بے معنی ہو چکی  
تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ ہر کام۔ کاروبار لگتا تھا۔ ہر  
چیز بے مصرف معلوم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ زندگی بھی! میری بے فکر  
حیثیت اپنے پیچھے جو زخم چھوڑ گئی تھی مجھے لگتا تھا کہ اسے وقت بھی  
کبھی نہیں بھر سکے گا۔ دوست "احباب" ساتھیوں اور شناساؤں نے  
اسی طرح سمجھا جس طرح سمجھانے کا حق ہوتا ہے لیکن الفاظ  
میرے لیے اپنے معانی کو چھوڑتے تھے۔ سب نے میری دلچسپی کی اپنی  
سی کوششیں کیں لیکن جوں جوں پاد پاد ہو چکا وہ بھلا کیسے بدل سکتا  
تھا۔ ذرا آج اور رجم گل تقریباً دوڑانہ ہی میرے پاس آئے اور  
گھنٹوں بیٹھے مجھے سمجھاتے رہے لیکن ان کے الفاظ گویا میرے  
شل ذہن اور سخت حساس کے آس پاس سے گزر جاتے۔

شفیع شاہ اور نورانی کو زیادہ لفظی نہیں آتی تھی لیکن بے جا دلوں  
سے جو بھی میں پڑتا تھا، کتنے رہتے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ  
میرے دل کا نظم اپنے سینے میں جالیں اور خوشی اگر کہیں کوہ کاف  
میں بھی ملتی ہو تو لا کر میرے دامن میں ڈال دیں۔ لاہور کے سب  
ساتھی بھی آئے تھے۔ ہر ایک نے میرا دکھانے کے لیے اپنے سے  
جس کیے تھے آخر وہ انسان تھے۔ اتنا ہی کر سکتے تھے۔ کوئی منجھوڑ  
ان کے بس میں نہیں تھا۔

راجہ کو کراچی میں ہی ڈینٹس کے قبرستان میں دفن کیا گیا  
تھا۔ پہلی چند تو میں موزانہ اس کی قبر پر جاتا تھا۔ میں قبر کے  
پاس بیٹھا گھنٹوں خیالوں کی خیالوں میں اس سے باتیں کرتا رہتا۔  
شاید میرا یہ عمل جا رہی رہتا اور رفتہ رفتہ مجھے دلچسپی کے قریب لے  
جاتا لیکن ہوا یہ کہ اس کے بعد خفیہ ادا اداوں نے مجھے حراست میں  
لے لیا تھا۔

میری جذباتی حالت سے قطع نظر یہ پکر میکانی والے آپریشن  
کے بعد سے ہی چل رہا تھا۔ شاید مجھے اسی روز حراست میں لے لیا  
جانا لیکن نہیں صاحب کا اثر سوخ کام گیا۔ دراصل سفید قاصدوں  
پر میرے بہت بارے والا معاملہ بہت تکلیف صورت اختیار کر گیا  
تھا۔ ان میں پانچ موقع پر ہی سرگئے تھے اور چار شدید زخمی تھے۔ وہ  
اسر کی باشندے تھے۔ جہاز بھی اسر کی تھا۔ ایف بی آئی کی ٹیم  
حقیقت کے لیے پہنچ گئی تھی۔ حکومت پر سخت دباؤ تھا۔ لاچار  
کو تو ال کو ڈانٹنے والا معاملہ تھا۔ قرضوں کی معیشت میں بکڑے  
ہوئے ملک کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آج کل بڑی طاقتیں کسی  
ملک کو غلام بنانے کے لیے تو نہیں نہیں سمجھتی، معاشی مشیر سمجھتی

تیا۔ اس نے کہا تھا "حم دحم کو ڈھیل دیتے ہیں۔ ہم بھی ایسے وقت پر" ایسے موقع پر اور ایسے انداز میں یا کر اسے مارے ہیں کہ اسے حیران ہونے کی بجائی ملت نہیں پتی۔ اس وقت خلو اس کے دھم گان میں بھی نہیں ہوتا۔"

بکہ دیر بعد میں اپنے شکستہ خوابوں کی کڑیاں آنکھوں میں لے کر اتر چلا گیا۔

دوسرے روز تک مجھے چا چل سکا کہ میرے والوں اور ذمہ ہونے والوں میں کچھ صمان، کچھ رستوران دہو میں آنے والے گاہک، دو تین دھڑا اور بیچے ہوئے شاہک آؤ گئے کہ کچھ دکان دار شامل تھے۔ باقی اسٹاف اور ترقی دوست تجر عافیت ہی رہے تھے۔ امیر تو اس وقت گھر جا چکی تھی۔ ٹیٹی اور شعیب شاہ ہو کر میں ہی موجود تھے لیکن خوش قسمتی سے وہ بالکل تھوڑے تھے۔

یہ بھی قیامت تھا کہ اس واقعے کی تفتیش آخر میں رجم کی کے پاس ہی آگئی تھی ورنہ اس سے ذرا اونچے درجے کے انٹرنل نے عجیب سی نیزے نیزے سوال جواب شروع کر دیے تھے۔ اب تو کام ہلا کی نظر میں بدل گئی تھی۔ صرف ایک بے ہارے شخص صاحب تھے جو رستار ہونے کے باوجود اب تک ہر سٹاپ میں میرے شانہ بٹانہ کرتے تھے۔ ان کا ہاتھ بھی اثر در سرخ پانی تھا۔ اسے میرے لیے کام میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہو کر بھی میرے دل کی طرح اڑا سا گیا تھا۔ اسی اڑے ہوئے ہو کر کے کافی بار میں بیٹھے ہوئے ایک روز میں نے ان سے پوچھا "آپ ان معاملات میں ماہر بھی ہیں اور آپ کی معلومات کے ذرائع ابھی عمل طور پر ختم نہیں ہوئے۔ آپ کچھ تو رائے دیں کہ یہ ہو کر میں ہم بلاست والی حرکت کسی کی ہو سکتی ہے؟ مجھے فلیپنگ نہیں" کچھ اور بھی رائے چاہیے۔ دیئے بھی اب آپ رستار ہو چکے ہیں۔ آپ کو فلیپنگ رائے دینے کی زیادہ ضرورت نہیں دی۔ اب تو آپ کو سیدھا جھول سکے ہیں" بے لاگ رائے دے سکے ہیں۔

"تمل سیدی۔" انہوں نے سار کا طولی کلے کر جواب دیا "خود بخود رہے لیکن اس کا نیندر رک میں کام کر رہا ہے۔ اس کے توئی اس قسم کی کارروائیاں میں مت ماہر ہیں۔"

میں نے ایک لفظی مافسٹی لی جس سے میرے بیٹے میں ایک نہیں ہی اچھی گھس نے سکرانے ہوئے کا "تیس صاحب آپ اتنے بڑے" اتنے عظم "اتنے طاقت ور ادارے کے سربراہ تھے۔ اس کے علاوہ بھی ملک میں دوسرے بڑے عظم ادارے خود بخود ایجنسیاں موجود ہیں جن پر اس فوق ملک کے بے شمار ماسکی فرج ہوتے ہیں۔ کئے کوہ سب کام کر رہے ہیں لیکن کیا یہ بات عجیب نہیں کہ دہشت گرد اور اس ملک کا خون چوس کر ان کی جوتوں میں باوند بھر لے دالے اپنی تمام تر دہشت گردی اور ہیکل قسم کے باختر کا دواؤں کا جال بچانے کے بعد غلو صرت کئے

چائسی کے چندے تک جانے کے لیے تیار رہنے کے حراف تھا۔ کا دواؤں دنیا میں اس قسم کے دوستوں کا میرا ہونا ہی غیر معمولی بات تھی۔

میں بظاہر تو داپس آگیا تھا اور اپنے معمولات زندگی میں حصہ لینے کے لیے آزاد تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں کچھ نہیں سمجھتا تھی۔ گھرانی ہو رہی تھی۔ میرے لیے فون ٹپ ہو رہے تھے شاید وہاں فون بھی بجا ہوا نہیں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں فون کو بھی اس کے اپنے ڈیجیٹل انکس پیچ سے ٹپ کرنے کی ٹیکہ دینی موجود تھی۔ ایف لی فون کی نیم اپنی رپورٹ عمل کر کے چل دینی تھی لیکن امر کی دواؤں بھی جاری تھا۔

انہی دنوں مجھے اس عاورے کے حریف صداقت ہونے کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ مصیبت تھا نہیں آئی۔ ایک رات میں ذرا آج کے ہاں سے داپس آگیا تھا کہ مجھے وہاں فون پر اطلاع ملی کہ میرے ہو کر میں ہم کا رکھا ہوا تھا اور اس کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ منہم ہو گیا تھا۔ کئی لوگ مر گئے تھے اور بہت سے زخمی ہو گئے تھے۔ دل جو پہلے ہی زخم زخم تھا اس خبر سے اس پر ایک گماڑا کا اضافہ ہو گیا۔

میں جب ہو کر پہنچا تو وہاں فائر فیکٹ کی گاڑیاں اور امپولنس اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ سائزن گوج رہے تھے۔ پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ ایک جرم ہو کر کے گرد جمع تھا۔ بلکہ ڈیٹی ہوئی تھی۔ میں گاڑی دوسری طرف کی سڑک کے کنارے روک کر ایک طرف بھاڑوں کھڑا ہو گیا جیسے کسی اور کی تباہی کا علاقہ کہنے آیا تھا لیکن اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی؟ میں ہی بھر جاتا تھا۔

ہو کر کی دائیں طرف کی تین حوٹیں ساڑھ ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا ہم ان میں سے کسی حوٹ پر رکھا گیا تھا۔ خوب صورت عمارت کے گواہ پولیس کثاف پڑ گیا تھا اور بد صورت نظر آنے لگی تھی۔ کافی حصے میں لمبا کھر گیا تھا۔ کچھ نقصان اس سے بھی ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آگ پر قابو پایا گیا تھا۔

دیر سے دیر سے یہ سحر میری آنکھوں کے سامنے ڈھنڈلانے لگا۔ میں نے رخساروں پر ہاتھ بھرا تو احساس ہوا کہ ان پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ راجہ کی موت کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب میری آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔ یہ ہو کر میری فوجوانی کا ایک خوب صورت خواب تھا جو آج ٹوٹ گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کی مرمت ہو سکتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح نقصان کا ازالہ ہو سکتا تھا۔ جالی نقصانات پر حقیقتیں کو دیر سے دیر سے جبراً مسکا تھا لیکن اس ہو کر کا اب کوئی مستقبل نہیں تھا۔ اس درجے کے جس ہو کر میں جاکر ہوا جائے۔ آئندہ نہ جانے کتنے برس تک کوئی اس کا رخ کرنے کے بارے میں مشکل سے ہی سوچ سکا تھا۔ چہ منہ بعد میں نے قاضی سے آنکھیں شک کر لیں۔ مگر مجھے عمل صحیح یاد

ی نہایت اطمینان سے ملک سے فرار ہو جاتے ہیں لیکن ان کے پیسہ روک کام کرتے رہتے ہیں۔

”میں صاحب نے افسوس ہی افسوس سے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر کرب کی لکیریں ابھر آئیں۔ وہ مجھے لیے میں بولے ”اس کا جواب اتنا طویل ہے کہ میں تانے لگا تو میری عمر گزر جائے گی اور تم توڑے ہو یاؤ گے۔ میں صرف اتنا خود کوں گا کہ حضور وار صرف کہی نہیں ہیں۔“

پھر وہ نہ پھیر کر دیر سے دیر سے سارے کس لینے لگے۔ مجھے معلوم تھا وہ اس کو بچے تھے۔ وہ اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے بھی مزید کہہ نہ سکا۔ ان باتوں کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ یہی بات تو یہ تھی کہ اب مجھے کسی بھی بات کا کوئی قاعدہ نظر نہیں آتا تھا۔

”میں صاحب ان دنوں کراچی میں ہی مقیم تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ اسلام آباد میں اپنے ذاتی مکان کی تعمیر شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے قرضہ وہ کراچی کے ایک آرکیٹیکٹ سے بنا رہے تھے لیکن وہ قرضے کی وجہ سے نہیں دے پائے۔ کراچی میں مقیم تھے۔ ایک روز اچانک رات گئے وہ بغیر کسی اطلاع اور بغیر کسی پردہ گرام کے میرے پاس پہنچے۔ وہ نہ جڑے ضابطہ پسند توئی تھے۔ فون کر کے وقت ملے کر کے آئے تھے یا مجھے اپنے پاس بلاتے تھے۔ وہ دھنیں میں اپنے بیٹے کے بچنے پر مقیم تھے۔ وہ نہایت مشکل اور ناموافق حالات میں بھی اپنے چہرے سے فکر مندی کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے لیکن اس روز وہ کچھ فکر مند دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے عقب میں دو داغ بھی کچھ خاص انداز میں بند کر کے باقاعدہ منتقل کیا۔

”جیتنے ہی بلا تھیں۔ بولے ”فضل! میرے پاس قصاب سے لے کر کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“

”میں بھی خبروں کا انتظار کرتا تو میں نے چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں امریکیوں کے قتل والا معاملہ لٹھ اڑنے کے بجائے عکسین سے عکسین ترہونا جا رہا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولے ”کبھی کبھی جذباتیت کا ایک لمحہ زندگی بھر کا دو گن جاتا ہے۔“

”مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ اب تو یہ زندگی ہی ایک دو گن ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ زخم بھر جائیگا۔ لیکن میں نہیں چاہتا تم مزید جذباتیت میں پھنسے رہو۔“ غور سے میری بات سنو۔ اس کے بعد ہمیں میری رہنمائی میں اور محض دو شور کی مدد سے فیصلہ کرنا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم جیسا توئی ایک نامنصفانہ سے قہقہے میں اچھ کر اٹھیں چلا جائے۔“ وہ میری طرف جھکتے ہوئے بھی تو از میں بولے ”کچھ ایسی اندیشہ ہو کہ کرا بگڈ Bugged تھا“ ماری مٹھو کیس کن جاسکتی تھی۔

”میں اندازہ نہ ہی کیا ہو گا کہ رٹا کڑا ہے۔ دخل ہو جانے کے بعد مجھے جیسے کوئی کی بھی کیا حیثیت نہ جاتی ہے لیکن پھر بھی۔ کچھ نہ کچھ راپٹے ہیں جو اب بھی کام آ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں میرے لیے شرم لحاظ ہے اس لیے کچھ نہ کچھ کام ہو جاتے ہیں۔“ کچھ نہ کچھ اطلاعات بد وقت مل جاتی ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ ہمیں جلد دہلیہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ کوئی بعد نہیں کہ عدالتی کارروائی کے بعد ہمیں جیل میں قید کیا جائے گا۔ موت سے دی جائے گا۔ لگے لگے انہی لائی کی ایک خصوصی ٹیم یہاں آ رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ حاکم دو دنوں گھنٹوں کے درمیان بھروسوں کے چارے یا تحویل کا معاہدہ یا ضابطہ طور پر موجود نہیں ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہی ہے کہ۔ ہے جرم حقیقی کی سزا مرگ ملنا چاہیے۔“

”جرم حقیقی کی نہیں۔ جرم قرضہ خوری اور الف لیلی قسم کے اے اے اے اے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ ان سنی کہتے ہوئے بولے ”اگر ہمیں ان کے حوالے کر دیا گیا تو پھر نہیں کیا پاسکا کہ قصابا مستقبل کیا ہو گا۔“

”وہ تو ویسے بھی اس دنیا میں کوئی انسان نہیں ہے۔ نہیں کہ سکا کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا۔“ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ تم معاملے کی تحقیق کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ قصاب سے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ وہ سگار کو حلقہ انداز میں اٹھیں میں سمجھاتے ہوئے بولے۔

”آپ کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے افسردگی کی کوکھ سے جنم لینے والی اپنی مسکراہٹ پر ہوا ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں تم یہاں سے کھل جاؤ۔“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولے۔

”میں آج کا مطلب۔“ میں ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”مطلب یہ کہ تم خاموشی سے لندن یا پیرس کی طرف کھل جاؤ۔ بلکہ ان حالات میں فرار ہو کر کمائی کی زندگی گزارنے کے لیے لندن زیادہ مناسب ہے۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے؟“ میرا پاپورٹ سرکاری تحویل میں ہے۔ میرا نام انگریز کنٹرول لسٹ میں ہے۔ اس کے علاوہ حالیہ تمام تر دھچکوں کے باوجود میرا یہاں کوئی پتا کا دوبارہ پتلا ہوا ہے۔ اس صورت حال میں یہاں میں کیسے کھل سکتا ہوں۔ اور وہ بھی پیش کے لیے۔“

”میں ان تمام باتوں کا جائزہ لینے کے بعد بات کرنے



صمات میں جان بھری پر رک رک ملک دشمن طاقتوں سے کر لے۔ ان حالات میں ایک جذباتی لمبے میں اگر اس بزم کہنی کے کچھ آدمی میرے ہاتھوں مارے جاتے ہیں تو میں اپنی حکومت کے بھی زیر عتاب ہوں اور وہاں والے بھی مجھے بھیڑ بکری کی طرح ایک کر لے جانے کی تیار کر رہے ہیں۔" میں نے حقیقتاً متاثر نہ ہونے میں کہا۔

"آج کی دنیا میں بھی جس کی لامبھی اس کی بھینس کا راجہ قانون چل رہا ہے۔" رئیس صاحب نے لٹریٹری سائنس کی اس کے باوجود شاہد ایسی قوت نہ آتی لیکن ہمارے ملک میں جس انداز کی سیاست ہو رہی ہے اور جس طرح حکومتیں چلائی جاتی رہی ہیں اس کا نتیجہ یہی نکلتا تھا۔ کچھ لوگوں کے اعمال کی سزا بہت زیادہ لوگوں کے بلکہ پوری قوم کو بھینسا پڑتی ہے۔"

کرے میں ایک لمبے جو بھلی سی خاموشی رہی پھر میں نے کہا "آپ مجھے لندن جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ بھی ایک طاقت ور اور ترقی یافتہ مغربی ملک کا دار الحکومت ہے۔ ہم ایشیائیوں کی ٹانگ کھینچنے انہیں سزا دینے اور نقصان پہنچانے کا سوال آتا ہے تو یہ ملک اپنے اختلافات بھلا کر ایک ہو جاتے ہیں۔ کیا امریکی حکومت وہاں سے مجھے زیادہ آسانی سے نہیں سمجھنے لگی۔"

"تم وہاں بالکل ایک گم نام آدمی بن کر رہنا۔ نمایاں ہونے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کرنا۔ کسی دور افتادہ مضامنی علاقے میں رہائش اختیار کر لینا۔" رئیس صاحب نے مشورہ دیا۔

"میں میری شخصی خفایت سینہ رمضان نے دی ہوئی ہے میں تو جرم بے گناہی کی پیٹ میں ہوں ہی۔ لیکن میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرنا کہ ایک دوست کو اس کی ہمدردی کے عوض زیادہ بڑی مصیبت میں ڈال جاؤں اور خود جان بچا کر نکل جاؤں۔ میرے فرار سے اس کی شامت آجائے گی۔ میں خود چائیں چہ چاہا یا کسی جیل میں باقی عمر گزارا اس سے بہتر سمجھتا ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تم سے بات کرنے سے پہلے میں سینہ رمضان سے بات کر کے آیا ہوں۔ اسے اندر میرے سرکشانے میں بھی گوارا نہیں کیا۔" رئیس صاحب نے سرگوشی میں یہ بات کہ مجھے حیران کر دیا "خاص کی زیادہ شامت نہیں آتی۔ جب اصل شکاری نکل جائے تو کوئی نقص نہ تم کو پہنچ کر کیا کرے گا۔ اس کے باوجود میں نے سینہ رمضان کے تحفظ کے بارے میں بھی سوچ لیا ہے۔ اسے ہم سال اڑبہ سال کے لیے علاقہ غیر کی طرف نکال دیں گے امید ہے اتنے عرصے بعد وہ واپس آکر گردن پچی رکھ کر باقی زندگی گزار سکے گا۔ وہ یہ قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہے۔"

"شکر ہے زندگی میں چند ایسے لوگ بھی میرے دوست بن گئے تھے جو بظاہر زیادہ اچھے دکھائی نہیں دیتے مگر بہت سے اچھوں سے اچھے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کل ہی یہ یہ انتظامات شروع کر رہا تھا۔" رئیس

تھمارے پاس آیا ہوں۔" وہ بدستور بچی آواز میں بولے "مرا ہوا ہاتھی بھی سوالا کہ کا ہوتا ہے۔ میرے اب بھی کچھ راپیلے ہیں جو ہمارے کام آجائیں گے۔ تمہارے لیے ہمیں سے دوسرے پاسپورٹ کا بھی انتظام ہو سکتا ہے لیکن ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں نام ہونے کی وجہ سے تم یہاں سے جہاز میں سوار نہیں ہو سکو گے اس لیے بہتر ہو گا کہ تم لالچ کے ذریعے دہلی کی طرف نکل جاؤ۔ اس کا بندوبست تم خود بھی کر سکتے ہو ورنہ سینہ واحد کر دے گا۔ یہ اس کے پاس ہاتھ کا کام ہے۔ وہاں تم دو چار دن گزارنا۔ اس کے بعد ایک شخص انکر تم سے ملے گا۔ وہ شخص تمہارا اپنا پاسپورٹ دے گا جس پر پاکستان سے تمہارے ایگزٹ اور دہلی میں انٹری کی سر دیکھو بھی ہوگی۔ ویزا وغیرہ بھی موجود ہوگا۔ اس پاسپورٹ کے ذریعے تم یہاں سے لندن کی طرف پرواز کر جاؤ۔ راپیلے کا طریقہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ اس کے ذریعے تم مجھے اپنے بچے وغیرہ سے آگاہ کر سکتے رہنا۔ وہاں بھی تمہیں ہر قسم کی مدد فور رہنائی سیر آتی رہے گی۔ سینہ واحد بھی اس شخص میں بہت کار آمد ثابت ہوگا۔"

"اور یہ جو چہ میں مجھے یہی گرانٹی ہو رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"ضرورت کے وقت انہیں چاہیے اور دو چار مہینوں کے لیے ان کی نظر ہے اور عمل ہوتا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ جب بڑے لوگ انہی طریقوں سے فرار ہو سکتے ہیں ہر شے میں ان کے بھی کچھ نہ کچھ ہمد نکل آتے ہیں تو پھر ایک اچھا آدمی کیوں نہیں نکل سکتا۔"

"اچھا ہوتا مجھے کافی منگ پڑ رہا ہے۔" میں ایک بار پھر مسکراتے بغیر نہ نکلا۔

"بھئی بھئی یوں بھی ہوتا ہے۔ ان راستوں پر کبھی کبھی تو اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑ جاتی ہیں۔ تمہیں تو انتہاء اللہ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آنا نہیں تو موروں پر آتی ہی رہتی ہیں۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا پکڑا پھر گرا کر کاش لے کر بولے "ضروری نہیں کہ تم میرے کے لیے باہر رہو۔ ہم حالات کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ ویسے امریکی اس قسم کے کیسوں کی فائل بھی بند نہیں کرتے لیکن اگر کبھی حالات سازگار دکھائی دیں تو تم وہاں آ جاؤ۔ تب تک تمہارے ساتھی یہاں تمہارا بزنس چلاتے رہیں گے۔ اگر چند برس بعد ضرورت پڑی تو میں کوشش کروں گا کہ رفتہ رفتہ تمہارا بزنس یہاں واپس آئے آپ کر کے تمہارا پچھا پانگ کانگ یا سوئزر لینڈ کے توسط سے وہیں پہنچایا جاسکے جہاں تم اس وقت رہ رہے ہو گے۔"

"کیا عجیب بات ہے کہ ایک ملک کی کھین کا روٹی کا آڑ میں ہمارے ہاں اسلحہ اسمگل کرتی ہے۔ ہمارے ساتھوں کو تباہ کاری کے ملک اثرات سے آلودہ کرتی ہے۔ اس کے آدمی ہمارے حساس سرکاری اداروں سے فائرنگ کا تبادلہ کرتے ہیں اس میں میری ہونے والی یہی داری جاتی ہے۔ اور ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے کئی

کی۔ تجھے منظور ہو گا تو میرے یہ کزور ہاتھ بھرمت طاقتور ہوں گے۔ یوں تو یہ زندگی بھی بہت مختصر بہت عارضی ہے۔ لیکن یہ اتار چھاؤ اس سے بھی مختصر اس سے بھی زیادہ عارضی ہے۔ اگر یہ کوئی آزمائش ہے تو اس میں پورا اترنے کی طاقت بھی تجھے ہی حاصل کرے گا۔ میری زندگی کی کتنی سرحال تیرے ہی سپرد ہے۔ تو میرا خدا ہی نہیں، میرا خدا ابھی ہے۔ توجہ حریص جانے گا میں بعد خوشی اور حریص جانے کو تیار ہوں۔“

دل ہی دل میں خالق کائنات سے یہ سرگوشیاں کرنے کے بعد گویا تجھے قرار سا مل گیا۔ بہت دنوں سے دکھ سے بوجھل دل جیسے یک دم ہلکا پھلکا سا ہو گیا اور میں آرام سے سو گیا۔

میں نے نفیس صاحب کی تجویز قبول کر لی۔ شاید اسی میں واقعی میری ہمزگی تھی۔ دل دیے بھی کچھ اکرا اکرا سنا تھا۔ اگلے دو دنوں میں سب باتوں کا مکمل ہو گیا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کو جو کچھ سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ تیسری رات باہر بجے سے کچھ پہلے ایک دینر چائے کی ٹرے اور لاٹری شاپ کا ایک پٹالہ لٹا کر میرے کمرے میں آیا۔ دو واڑہ اپنے عقب میں بند کرنے کے بعد اس باوردی دینر نے اپنی ٹولنی آزاری اور زیر مونچھ مسکرایا۔ وہ نفیس صاحب تھے۔ ان کی سر نہیں نکلی تھی۔ ہوا انہوں نے اتار کر تجھے دے دیں۔

لاٹری کا پڑا پلاسٹک بیگ وہ بیڈ پر پھینکے ہوئے ہوئے اس میں دینر کی دوسری پیٹھ نام ہے۔ تم جلدی سے یہ پین لوہ میں بیٹھ بیٹھو گے۔ تم فرانی لے کر باہر چلے جاؤ۔ عقی دواڑے سے ہوٹل سے نکلتا۔ سب باتوں کا مکمل ہیں۔ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح میں نے نفیس بتایا تھا۔ تمہارا سامان لالچ پر پہنچ چکا ہے۔“

”اگے سر!“ میں نے انہیں سیٹ کیا اور پلاسٹک بیگ اٹھا کر ہاتھ دھو کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد میں باہر آیا تو انہی کی طرح دینر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دینر کی دوسری میں ایک سوئے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے سگاری رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھے اور مجھے گلے سے لگا کر میری پیٹھ پھینکتے ہوئے بولے ”مڈلک مائی یو اے۔ ایڈ ڈونٹ لی ٹو ہارٹینس۔“

”آئی ایم ٹاٹ ڈس ہارٹیز ایٹ آل سرائے!“ میں نے ان سے الگ ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور ٹرائل دھکیلا اور باہر چلا گیا۔

مجھے پہنچ کر کرائی کچن میں چھوڑ کر جب میں ہوٹل کے عقی دواڑے سے باہر نکلا تو رحیم گل ایک پولیس موبائل لے گئی میں موجود تھا۔ وہ موبائل میں اکیلا تھا ورنہ میں تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ میں خاموشی سے اس کے برابر جا بیٹھا۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پولیس موبائل میں جانے کا کاغذ یہ تھا کہ اسے راستے میں روکے جانے کا امکان نہ ہوئے کے برابر تھا۔

چند منٹ بعد ہی ہم کیناڈی جا پہنچے اندر خفیہ میں جہاں سے دن میں کرائے کی لاٹریاں چلتی تھیں وہیں ایک بڑی سی تقریباً نئی اور کیمین والی لاٹری میزیموں سے لگی کھڑی تھی۔ بس اسٹاپ ٹا

صاحب کی تواضع اور سچی ہو گئی۔ ”مجھے اس ضمن میں اگر کوئی بات کرنی ہو کرے گی تو میں خود انکرکٹنگ گا اور اگر تمہیں کوئی بات کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس نمبر پر فون کر کے مجھے بلاؤ۔“ انہوں نے ایک کانڈر پر مجھے ایک نمبر لکھت کر دیا۔ ”دور اس سلسلے میں تم بیٹھ پلگ فون سے فون کرنا۔ تمہارے اپنے ہوٹل کے قریب اسی سڑک کے کونے پر بھی پلگ فون موجود ہے۔ پر ممکن احتیاط کرنا۔ تمہاری گھرائی نرم کرانے کے سلسلے میں بھی تجویز میں کچھ احتیاط کرنا ہوں۔“

”یعنی آپ نے مجھے دھکا دینے کا تہیہ کر ہی لیا ہے؟“ میں نے سگراتے ہوئے کہا۔

”اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ وہ خفیہ سی اندر کی سے بولے ”دور نہ جو کچھ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اگر وہ ہو گیا تو میری اپنی بات زندگی بھی مزید پچھتاووں میں ہی گزرے گی۔ تم صبح سے ہی تیاریاں شروع کر دو۔ کل کے بعد تمہیں کسی وقت بھی روانہ ہونے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔“

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میرے اندر ایک عجیب سی نکلتی جا رہی تھی۔ ایک عجیب نکلتی۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ رات ڈھل رہی تھی مگر سڑک پر اس وقت بھی کچھ ٹریفک تھا۔ رتھیں شیشے کے بارود شیاں ٹھوک ٹھوک آ رہی تھیں۔ گورنٹ کے سکوت اور تانے کا احساس ابھی غالب تھا مگر زندگی بھی وہاں وہاں تھی۔ زندگی اسی طرح وہاں لٹاؤں رہتی ہے۔ چھوٹے بڑے کدو آتے جاتے رہتے ہیں۔

اس لمحے میرا دل اپنے خالق سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ ”اے رب کائنات! میں تیرا ایک بہت سی حقیر اور گناہ گار سا بندہ ہوں۔ سزا کا نام۔ سزا پانچ گزیر۔ میری اپنی زندگی کا اتنا کچھ اچھا نہیں نا لیکن جو کچھ مجھے تمہاری ہی سمجھ، تمہاری ہی عقل عطا ہوئی میں نے کچھ کو صحیح اور غلط کو غلط سمجھنے کی کوشش کی۔ بشری کزوریاں مجھ پر غالب رہیں تو میں ان پر شرمندہ رہا۔ میں نے بیٹھ اچھا لی اور بھی قدموں کو افضل سمجھا اور میرا ایمان رہا کہ بیٹھ اچھا لی اور بھی قدموں کی ہی ہوتی ہے خواہ راستے میں کتنی ہی مشکلات آئیں اور برائی خواہ کتنی ہی طاقتور ہوتی نظر آئے لیکن شکست اس اندر ہوتی ہے۔ اس کا مروج عارضی اور تائیدار ہونا ہے۔ میں لیج کر میں اچھا لی اور ابھی قدموں کے لیے اپنی پیاد کے مطابق رہا بھی رہا۔ اس راستے میں تو نے بھی میری مدد کی۔ تمہیں میں بعض بڑے کام کرنے میں بھی کامیاب ہوا جو بظاہر ناممکن نظر آتے تھے۔ اب جو مجھ پر یہ مشکلات سی آئی ہیں ان سے بھی میرا ایمان میرا غرور متزلزل نہیں ہوا ہے۔ شاید مجھ سے ہی غلطی سرزد ہوئی۔ ناپید میرے سارے طریقے ہی غلط تھے۔ شاید مجھے زندگی گزارنے کا صحیح ہی نہیں آیا۔ لیکن کچھ بھی سچی۔ مجھے امید ہے یہ مشکلات عارضی ہوں گی۔ تجھے منظور ہو گا تو میں پھر واپس آؤں گا۔ تجھے منظور ہو گا تو میری ذات لا ندال بھر مجھ سے کوئی کام لے

نہیں جانتی۔ میں ٹپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔"

میں نہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکا مفید ڈیڑھا گھرے  
اکیلے جانے کا بندوبست ہی مشکل ہے ہوتا ہے۔ دوسرے میں تم  
سے شادی نہیں کر سکتا۔"

”شادی کرنے کو کون کہہ رہا ہے۔“ وہ غریب کرہیل ”تپ  
مجھے نوکر کے طور پر اپنے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ زندگی بھر تپ کی  
خدمت کریں گی۔ آپ کا ہر کام کریں گی۔“

ہم بہت اچھی لڑکی ہو مگر بننا ہمارا خصل نہیں ہے۔ میں نے اس کا ذکر ہا ہشتیا نہ ہوئے کہا۔ تمہیں ابھی بہت ترقی کرنی ہے۔ جب تم ایک کامیاب اور دولت مند لڑکی بن جاؤ گی تو کوئی اچھا سا لڑکے کو اس سے شادی کر لے گا۔

”مترقب! دولتِ احمدیہ سا اثر کسے ہونے لگا ہے۔“  
اس نے غصے سے کہا اور دونوں قہقہوں میں منہ پھا لیا۔ آنسو اس  
کے ہاتھوں کے درمیان سے اترنے لگے۔  
”یہ واحد ہے اپنے مخصوص خصلتِ احمدیہ میں پکارا سہم  
ہو رہا ہے۔ ہمیں صبح کا انجیل نمودار ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جانا  
چاہیے۔“

میں سفید کو باندھ سے پکار کر پائی لوگوں کے پاس واپس لے آیا۔ وہ بلا ہنگامہ زانو ہاتھ زدہ رہی تھی اور کسی کو بھی اس کے آنسوؤں کی طرف توجہ دینے کا خیال نہیں تھا۔ درجاء میرا اور رحیم کے کا ایک باندھا تھا ہے عرض تو ازیں ہوتی ہے ہم دونوں بہت جلد تم سے ملے آئیں گے تم جہاں بھی ہوئے ہم وہیں آئیں گے۔

”منورہ“ میں نے اس کا اور رحیم گل کا کندھا پتہ پتہ پایا مگر  
روانہ ہونے سے پہلے شادی کرنا نہ بھول جانا۔ جی جی مون کے  
اخراجات میرے ذمے۔“

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مجھے کیا کہے

میں ان سب کو خدا حافظ کہہ کر کالی اور سیلن سے اتر چلا  
میرا ہاتھ لایا میں پہنچا لایا کے باوجود یہ نہیں اور اس کے  
ایک ساتھی نے میرا استقبال کیا۔ بانی لوگ اور کھڑے رہ گئے  
میں نے بعد لایا کا انجمن اشارت ہوا اور وہ حرکت میں آگئی۔ یہی  
زندگی کا ایک طویل باب ختم ہو رہا تھا۔ اور شاید ایک نیا باب  
شروع ہونے کا تھا۔ لایا ایک نئے راستے پر ایک نئی خطی کی  
طرف روانہ ہو چکی تھی۔

میں ایک چمکے جسے میں کڑا کرتا رہ کر کھڑے ہوں گا  
طرف دیکھ کر ہاتھ پٹا رہا تھا کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے  
دھندلانے لگے۔ میں جیسے سے نہیں کر سکا تھا کہ اس کی وہ  
قاصلہ تھی۔! میری آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن اردو بکس آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- 1- گروپ میں یا گروپ ایڈمن سے کوئی بھی بات / درخواست / فرمائش کرتے وقت السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کو فروغ دیں۔
  - 2- ایڈمنز یا دیگر ممبرز جو بھی اچھی پوسٹ کریں اس پر کمینٹس / عکسز / ایویجز / رائے لازمی کریں تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور دیگر ممبران کو بھی اس کتاب / پوسٹ کی اہمیت کا اندازہ ہو۔
  - 3- گروپ ایڈمنز سے پرسنل سوالات یا بحث مت کیجئے۔ صرف کتب کے متعلق دریافت کریں یا درخواست کریں۔
  - 4- ایڈمنز اور ممبرز سے اخلاق سے پیش آئیں۔ اگر ہم ادبی گروپ میں موجود ہیں لیکن ہماری اخلاقیات معیاری نہیں تو ہمیں ادبی گروپ کا ممبر کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ کوئی ممبر کسی دیگر ممبر کے انباکس میں میسج نہیں کرے گا ورنہ ریپوڈ کر دیا جائے گا۔
  - 5- گروپ میں یا ایڈمن کے انباکس میں وائس میسج، ویڈیوز بھیجنے کی حرکت مت کریں ورنہ ریپوڈ اور بلاک کر دیئے جائیں گے۔
  - 6- گروپ میں کسی بھی قسم کی مذہبی فرقہ پرستی / سیاسی / انتشار پھیلانے والی گفتگو سختی سے منع ہے
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخ رسول، گستاخ صحابہ و اہلبیت، دہشت گرد / کالعدم / پاکستان مخالف تنظیموں کے افراد یا ایسے غیر مسلم جو پاکستان اور اسلام کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے فزیکل / روحانی / ذہنی سپورٹرز ہوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص سے گزارش ہے کہ گروپ جو ان کے کرنے کی بالکل بھی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریپوڈ کر دیا جائے گا۔

7- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے وٹس ایپ گروپس میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

8- یاد رہے کہ ہمارا کوئی کتب خانہ / دوکان / شاپ / سٹور نہیں ہے نہ ہم کوئی کتاب پبلش کرتے ہیں نہ ہی اسکیں کرتے ہیں۔ نہ ہی ہمیں کسی پبلشر کی خدمات ہی حاصل ہیں کہ ہم کسی کی کتاب چھاپیں۔ جو کتاب انٹرنیٹ سے نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔

(گروپس میں صرف ناولز، لطائف، تاریخ، اسلام اور تدریسی کتب ہی شیئر کی جاتی ہیں کسی بھی متنازعہ / بین شدہ / پاکستان

### وادارہ مخالف یا ممنوعہ کتاب سے ایڈوائس (معذرت)

جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

7- ہمارا گروپ جو اُن کرنے کے لئے درج ذیل لنکس پر کلک کریں اور وٹس ایپ سلیکٹ کر کے جو اُن کر لیں۔ صرف ضروری گروپ ہی جو اُن کریں۔

8- گروپ رولز سخت ہیں لیکن ممبرز کی سہولت کے لئے ہیں

گروپ فل ہونے یا لنک ریووک ہونے کی صورت میں ایڈمن سے صرف وٹس ایپ پر لکھ / ٹائپ کر کے میسج کریں۔ وائس نوٹ سے گریز کریں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل سم پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔

9. ڈیمانڈ صرف صبح 9 سے 2 بجے تک کریں (جمعہ اور اتوار کو چھٹی) اپنی ڈیمانڈ کے بعد 48 گھنٹے تک پوسٹنگ کا انتظار فرمائیں نہ ہونے پر دوبارہ یاد کروادیں (ایڈمنز کی مصروفیت کی بناء پر اپنی ڈیمانڈ یاد کروانا ممبرز کی ذمہ داری ہے)۔ پوسٹنگ گروپ میں ہی ہوگی انباکس میں نہیں کی جائے گی۔ شکریہ

فیمل کے لئے الگ گروپ موجود ہے جو صرف فیملز کو ہی مہیا کیا جائے گا

اللہ کریم ہم سب کا حامی و ناصر ہو